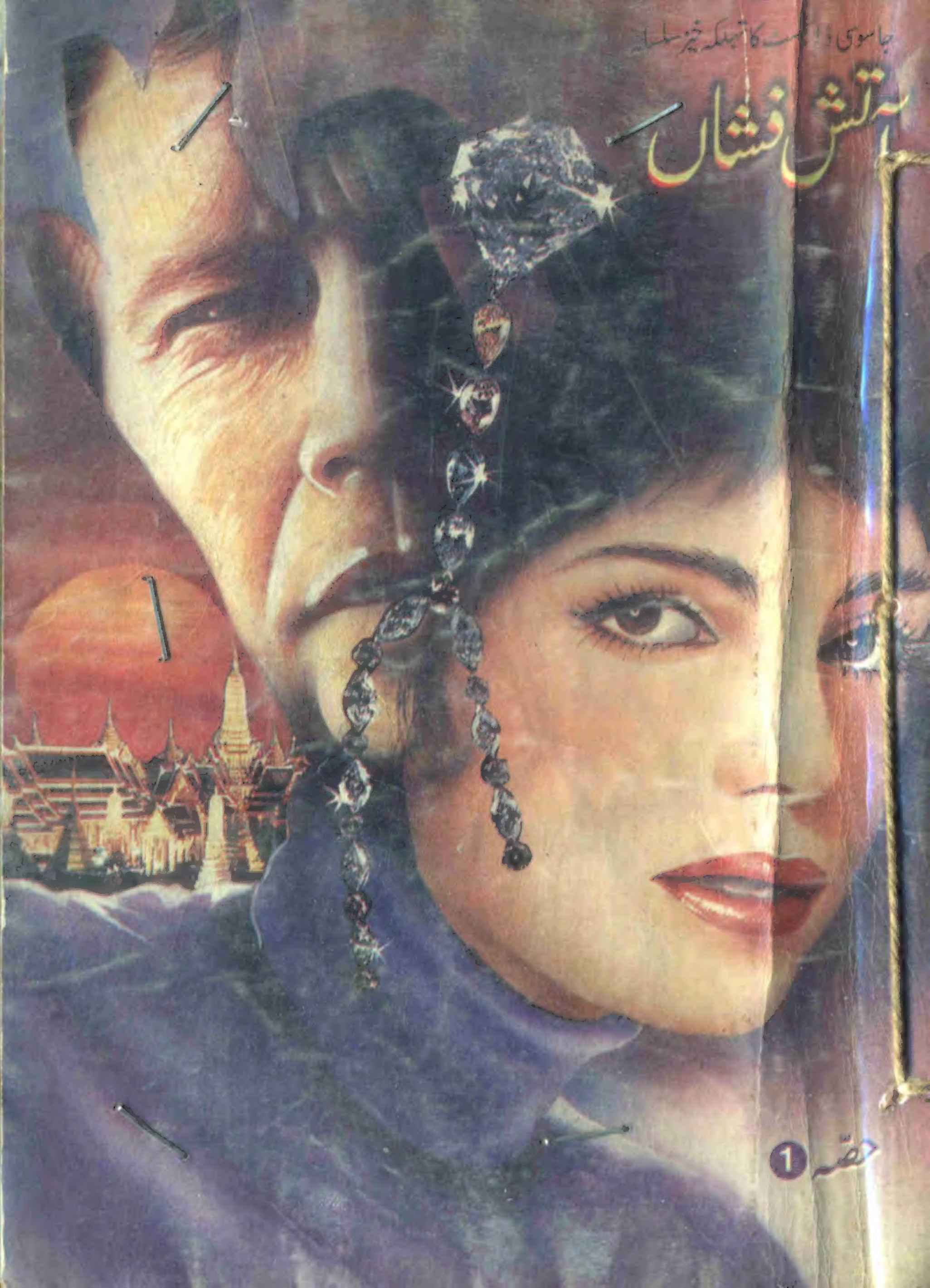
جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 1

آتش فشاں

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے [illegible] سینے میں ایک قبر[illegible] ماں باپ کے [illegible] قتل کا عینی شاہد تھا۔ [illegible] آتش فشاں کی طرح [illegible] کسی [illegible] کے لئے نت نئے [illegible] ایجاد تھا اور اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے کاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بنا سکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں۔ بالاخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

اس ٹمٹماتے چراغ کا احوال جو اچانک ہی آندھیوں کی زد پر آگیا تھا

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اس کی بیوی شگفتہ اسے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

"کیا بات ہے عابد! تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا؟" شگفتہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی خاص بات نہیں۔ دکان پر بیٹھے بیٹھے طبیعت خراب ہوگئی تھی۔" عابد علی نے جواب دیا اور بیٹے کی ط: متوجہ ہوگیا جو اپنے کمرے سے نکل کر وہاں آگیا تھا۔

عابد علی رات کو گھر آتے ہوئے عام طور پر کوئی پھل وغیرہ لے آیا کرتا تھا لیکن آج وہ خالی ہاتھ تھا۔ کمسن وجدان نے بھی تاڑ لیا تھا کہ اس کا باپ کچھ پریشان ہے۔ اس لیے اس نے یہ پوچھا بھی نہیں کہ وہ خالی ہاتھ کیوں آیا ہے۔

"اچھا تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ وجدان نے بھی آج ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔" شگفتہ کہتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔

عابد علی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ چند لمحے کمرے میں کھڑا رہا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ باہر نکلا تو شگفتہ میز پر کھانا لگا چکی تھی۔ وجدان پہلے ہی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔

"لگتا ہے آج تمہیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔" عابد علی اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جی ابو۔ آج آپ نے بہت دیر کردی۔" وجدان نے جواب دیا۔

"آج تو میں نے دکان بھی جلدی بند کردی تھی لیکن راستے میں کام پڑ گیا جس کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ اچھا! چلو۔ [illegible] کھانا شروع کرو۔"

شگفتہ بھی عابد علی کے سامنے اپنی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ وہ لوگ کھانا کھانے لگے۔ عابد علی نے ابھی چند ہی لقمے کھائے تھے کہ لاؤنج میں رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ عابد علی نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر شگفتہ اس سے پہلے ہی اٹھ گئی۔

"آپ کھانا کھایئے۔ میں دیکھتی ہوں۔" شگفتہ اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا "ہیلو" وہ ماؤتھ پیس میں بولی لیکن جواب میں خاموشی رہی۔ اس نے دوسری مرتبہ ہیلو کہا تو جواب میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی گہری سانس لے رہا ہو "کون بدتمیز ہے۔" شگفتہ قدرے درشت لہجے میں بولی۔ اس مرتبہ ریسیور پر گہرے سانسوں کی آواز سنائی دی تو شگفتہ نے ریسیور پٹخ دیا اور دوبارہ کھانے کی میز پر آگئی۔

"کون تھا؟" عابد علی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کون بدتمیز تھا۔" شگفتہ نے جواب دیا "میں نے پوچھا کون ہے تو جواب میں گہرے گہرے سانسوں کی آواز سنائی

دینے لگی۔"

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ شگفتہ نے دوبارہ اٹھنا چاہا لیکن اس مرتبہ عابد علی پہلے اٹھ گیا اور لاؤنج میں آکر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو!" وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ جواب میں گہرے گہرے سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے کتا غرا رہا ہو۔ عابد علی کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر کھانے کی میز پر آگیا۔

"کیا ہوا.... کون تھا۔ تم ایک دم پریشان کیوں ہوگئے ہو؟" شگفتہ نے پوچھا۔ عابد علی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

"کچھ نہیں۔" عابد علی اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "پتا نہیں کون بدتمیز ہے۔ بہرحال، تم کھانا کھاؤ۔"

اس کے بعد فون کی گھنٹی نہیں بجی۔ کھانا ختم کرنے کے بعد وہ لاؤنج میں آگئے۔ وجدان بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ سمجھ دار بچہ تھا۔ اپنے ماں باپ کو پریشان دیکھ کر وہ الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔

"جاؤ بیٹا۔ تم جا کر سوجاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے۔" عابد علی نے وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وجدان نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"کیا بات ہے عابد!" شگفتہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "جب سے تم گھر میں داخل ہوئے ہو تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں۔ اس فون کال کے بعد تو تمہارے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ تم نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں چھپایا لیکن آج کوئی ایسی بات ضرور ہے جو تم مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔"

"نہیں شگفتہ۔ میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔" عابد علی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر بتاؤ نا کیا بات ہے؟" شگفتہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں ملک نواز ش علی یاد ہے؟" عابد علی نے پوچھا۔

"اس شیطان کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔" شگفتہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "اس خبیث کی وجہ سے ہی تو ہمیں نہ صرف اپنا گھر بلکہ اپنا وطن بھی چھوڑنا پڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وجدان اس وقت صرف دو مہینوں کا تھا۔ ہم اس معصوم بچے کو لیے کس طرح اس شیطان سے چھپتے پھر رہے تھے۔ اس شیطان کو میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ لیکن آج تمہیں ملک نوازش علی کیسے یاد آگیا؟"

"جس طرح بارہ سال گزرنے کے بعد ہم ملک نوازش علی کو نہیں بھولے اسی طرح شاید وہ بھی ہمیں نہیں بھولا۔" عابد علی نے کہا۔

"کیا مطلب! کیا کہنا چاہتے ہو؟" شگفتہ کا چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا۔

"اگر تم ملک نوازش علی کو نہیں بھولی ہو تو تمہیں دارا بھی یاد ہوگا۔" عابد علی بولا۔

"دارا!" شگفتہ کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے "وہ تو انسان نہیں درندہ ہے۔ اسے تو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس نے ہمارے گھر کو آگ لگا کر ہمیں زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔ ہم آگ میں گھرے ہوئے تھے اور وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کے شیطانی قہقہے تو آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس روز اگر پولیس بروقت نہ پہنچ جاتی تو ہم بھی اس مکان کے ساتھ جل کر راکھ ہوچکے ہوتے۔"

"میں اسی دارا کی بات کررہا ہوں۔" عابد علی نے کہا "آج وہ میری دکان پر آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جسے میں نہیں جانتا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا کیونکہ اس کے دکان میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے اسے دیکھ لیا تھا اور کاؤنٹر سے اٹھ کر دکان کے پچھلے کمرے میں چلا گیا تھا۔ دارا پانچ چھ منٹ تک دکان میں رہا تھا اور اسٹیٹ ایکسپریس کا ڈبا خرید کر واپس چلا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کا میری دکان پر آنا محض اتفاق تھا اور اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ ٹیلی فون کال.... مجھے یقین ہے کہ فون اسی نے کیا تھا۔ اگرچہ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس نے مجھے سنگا پور میں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" شگفتہ کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا "کیا ہمیں یہاں سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ وجدان کو یہ سب کچھ معلوم ہوگا تو وہ کیا سوچے گا۔ بارہ سال پہلے جب ہم پاکستان سے بھاگے تھے تو وہ صرف دو مہینے کا تھا۔ کچھ نہیں سمجھتا تھا۔ کچھ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اب وہ بارہ سال کا ہوچکا ہے۔ سمجھ دار ہے۔ وہ صورتِ حال کو سمجھ سکتا ہے۔ کیا سوچے گا۔ کیا ہوگا...."

"کچھ نہیں ہوگا۔" عابد علی نے اس کی بات کاٹ دی "یہ لاہور نہیں ہے۔ سنگا پور ہے۔ یہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ دارا اگر ہماری ہی تلاش میں یہاں آیا ہے تو یہاں اسے کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔"

"یہ مت بھولو کہ دارا ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور ایسے لوگ ہر جگہ اپنا کام کر گزرتے ہیں۔" شگفتہ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "میری مانو تو سردار پرتاب سنگھ سے بات کرو۔ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ اسے علم ہے کہ ہم یہاں کن حالات میں آئے تھے۔ سب سے پہلے ہماری ملاقات اسی سے

ہوئی تھی۔ ہمیں یہاں سیٹل ہونے میں اس نے مدد دی تھی۔ اس کے یہاں کے بڑے لوگوں سے قریبی تعلقات ہیں۔ اس سے بات کرو۔ وہ یقیناً اس معاملے میں بھی ہماری مدد کرے گا۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔" عابد علی نے کہا "پرتاب سنگھ سے بات کرنی ہی پڑے گی۔"

وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے کی کال بیل بجی۔ خاموشی میں گھنٹی کی آواز ان دونوں کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ دونوں اچھل پڑے۔ جس قسم کی صورتِ حال سے وہ دوچار تھے، اس کے پیشِ نظر ان کا خوف زدہ ہوجانا فطری بات تھی۔ شگفتہ کو یوں لگا تھا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہو۔ عابد علی کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی تھی۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔

"تم یہیں رکو۔ میں دیکھتا ہوں۔" عابد علی دروازے کی طرف بڑھا۔

شگفتہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ وہ جیسے ہی کمرے کے دروازے سے باہر نکلا، شگفتہ نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی سب سے نیچے والی دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا پستول نکال لیا۔ یہ جرمن لوگر پستول انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس کے استعمال کی نوبت اگرچہ کبھی نہیں آئی تھی مگر عابد علی وقتاً فوقتاً اس کی صفائی کرتا رہتا تھا۔ شگفتہ پستول لے کر کمرے سے باہر آگئی اور دبے قدموں چلتی ہوئی لاؤنج کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

عابد علی کمپاؤنڈ میں قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا اس دوران میں کال بیل ایک مرتبہ اور بج چکی تھی۔

"کون ہے۔ باہر کون ہے؟" عابد علی نے دروازے کے قریب رک کر پوچھا۔

"میں ہوں یار۔" باہر سے سردار پرتاب سنگھ کی آواز سنائی دی "دروازہ کھولو۔ سوگئے تھے کیا؟"

"اوہ!" عابد علی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

پرتاب سنگھ کے اندر آنے کے بعد عابد علی نے دروازہ بند کردیا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر کی طرف آنے لگے۔ شگفتہ نے بھی پرتاب سنگھ کی آواز سن لی تھی۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔

دروازے میں داخل ہونے کے بعد سردار پرتاب سنگھ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"یہ خاموشی کیسی ہے۔ پابھو سوگئی ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ شگفتہ بھی جاگ رہی ہے۔" عابد علی نے جواب دیا۔

"آج تم میرے ہاں نہیں آئے۔ سوچا میں ہی چکر لگالوں۔" پرتاب سنگھ نے کہا اور پھر کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شگفتہ کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا گل ہے پابھو۔" پرتاب سنگھ بولا "آج یہ اسلحہ کیوں اٹھایا ہوا ہے۔"

"اوہ! کچھ نہیں بھائی جی۔" شگفتہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "ایسے ہی۔ میں نے سوچا کوئی چور ڈاکو نہ ہو اس لیے میں نے...."

"واہ پابھو واہ۔" پرتاب سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی "ہمیں ہی چور ڈاکو سمجھ لیا۔"

"نہیں بھائی جی یہ بات نہیں ہے۔" شگفتہ جلدی سے بولی "صورتِ حال ہی ایسی پیدا ہوگئی ہے کہ ہمیں احتیاط سے کام لینا پڑ رہا ہے۔"

"کیا بات ہے بھائی عابد علی؟" پرتاب سنگھ عابد علی کی طرف گھوم گیا۔ اس کے لہجے میں ایک دم سنجیدگی آگئی تھی "کیا مسئلہ ہے۔ مجھے نہیں بتاؤ گے اپنے یار کو۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو جلدی بتاؤ۔ سوں رب دی...."

"ایک گمبھیر مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔" عابد علی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "میں کچھ دیر میں تمہاری طرف آنے ہی والا تھا۔ آؤ۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔ شگفتہ تم چائے بنا کر وہیں آجاؤ۔"

شگفتہ کچن کی طرف چلی گئی اور وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔ پرتاب سنگھ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم دیکھ کر عابد علی کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے یہ گھر بنانے میں بڑی محنت کی تھی لیکن اب اسے یہ چھوٹا سا آشیانہ بھی بجلیوں کی زد میں نظر آرہا تھا۔

"ہاں بھئی عابد علی۔ اب بتاؤ کیا بات ہے؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

"پرتاب سنگھ۔" عابد علی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں یہاں کب اور کن حالات میں آیا تھا۔ یہاں اگر تم میری مدد نہ کرتے تو نجانے مجھ پر کیا بیت چکی ہوتی۔ میری کوئی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ میں نے تمہیں یہ بھی بتایا تھا کہ میں اپنی بیوی اور دو ماہ کے بچے کو لے کر پاکستان سے بھاگ کر یہاں کیوں آیا تھا، اگر میں اپنے ایک دوست کی مدد سے پاکستان سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوپاتا تو ملک نوازش علی ہم تینوں کو ختم کروا دیتا۔" عابد علی چند لمحوں کو خاموش ہوگیا۔ اسی دوران میں شگفتہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک ایک کپ ان دونوں کے سامنے رکھ دیا اور ایک کپ خود لے کر بیٹھ گئی۔

"مجھے معلوم ہے۔" پرتاب سنگھ نے عابد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور میں

تمہاری سچائی ہی سے متاثر ہوا تھا لیکن یہ تو پرانی بات ہو چکی ہے۔ اب کیا معاملہ ہے؟"

"اگرچہ بارہ سال کا طویل عرصہ بیت چکا ہے لیکن جس طرح ہم ملک نوازش علی کو نہیں بھولے اسی طرح ملک نوازش علی نے بھی ہمیں فراموش نہیں کیا۔" عابد علی بولا۔

"کیا وہ ملک یہاں آگیا ہے؟" پرتاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ملک نوازش علی نہیں مگر اس کے آدمی یہاں پہنچ گئے ہیں۔" عابد علی نے کہا اور پھر اسے دارا کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا "میرا خیال تھا کہ شاید اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن اب میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس نے نہ صرف مجھے دیکھا ہے بلکہ میرے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کر چکا ہے... اس نے میرا فون نمبر معلوم کرلیا ہے اور شاید وہ گھر بھی دیکھ چکا ہے۔" عابد علی نے کہا اور فون کالز کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔" پرتاب سنگھ نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "میرا مطلب ہے اس نے واقعی تمہیں نہ دیکھا ہو اور وہ فون کالز بھی کسی کی شرارت ہو۔"

"نہیں پرتاب سنگھ۔" عابد علی نے کہا "میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہتا۔ میں نے تمہیں یہ سب کچھ اس لیے بتایا ہے کہ میں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا سنگاپور چھوڑ دوں؟"

"میرے خیال میں تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" پرتاب سنگھ نے کہا "آج یہاں سے بھاگ جاؤ گے تو کل کہیں اور سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ اگر دارا نے واقعی تمہیں دیکھ لیا ہے تو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چھپنے یا بھاگنے کے بجائے صورتِ حال کا مقابلہ کرو۔ یہ پاکستان نہیں سنگاپور ہے۔ یہاں اگر کوئی جرم کرتا ہے تو اسے پہلے دس مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔ اتنے عرصے میں تم بھی دیکھ چکے ہو کہ یہاں قانون کی گرفت بڑی سخت ہے۔ دارا ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا کہ قانون کے جال میں پھنس جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں تصویر کے دوسرے رخ کو بھی نظرانداز نہیں کروں گا۔ اگر تمہیں اس سے اپنی جان کا خطرہ ہے تو تمہاری حفاظت کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ میں صبح ہی اپنے دو بندے تمہاری حفاظت کے لیے مقرر کردیتا ہوں۔ وہ دونوں آدمی مسلح ہوں گے اور چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے دوست چیانگ شو کو صورتِ حال سے آگاہ کردیتا ہوں۔ چیانگ شو کو تم جانتے ہو۔ وہ ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہے۔ وہ تمہاری حفاظت کا بندوبست کردے گا۔"

"لیکن۔ یہ حفاظتی انتظامات کب تک رہیں گے؟" عابد علی نے کہا "میں ساری زندگی تو پولیس اور باڈی گارڈز کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

"گھبراؤ نہیں یار۔" پرتاب سنگھ بولا "چار چھ روز کی بات ہے۔ دارا جب تمہارے گرد حفاظتی انتظامات دیکھے گا تو خاموشی سے واپس چلا جائے گا۔ وہ جب تک یہاں رہے گا تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ اگر اس نے کوئی ایسی حرکت کی تو سوں رب دی وہ زندہ بچ کر نہیں جاسکے گا۔"

پرتاب سنگھ کی باتوں سے عابد علی اور شگفتہ کو بڑا حوصلہ ملا تھا۔

"تم فکر ہی نہ کرو پابھو۔" پرتاب سنگھ، شگفتہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "دارا تم لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا اور بھائی عابد علی۔" وہ اس کی طرف مڑ گیا "تم بھی اپنے دل سے خوف نکال کر صبح اپنی دکان پر جاؤ اور تسلی سے اپنا کاروبار کرو۔ کسی خوف کو دل میں جگہ نہ دو۔"

وہ تینوں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہے اور پھر رات ایک بجے کے قریب پرتاب سنگھ انہیں تسلیاں دیتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد عابد علی نے خود تمام دروازے لاک کیے اور شگفتہ کے ساتھ بیڈ روم میں آگیا۔

وہ بستر پر لیٹے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نیند دونوں میں سے کسی کو بھی نہیں آرہی تھی۔ پرتاب سنگھ نے اگرچہ انہیں بھرپور تسلی دی تھی اور ان کی حفاظت کا بندوبست بھی کردیا تھا لیکن عابد علی مطمئن نہیں تھا۔ وہ ملک نوازش علی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے درندہ صفت کارندوں سے بھی واقف تھا۔ دارا اس کا سب سے قابلِ اعتماد اور معتبر ساتھی تھا۔ انتہائی سفاک اور بے رحم انسان بلکہ اسے تو انسان کہنا ہی انسانیت کی توہین تھی۔ انسانی زندگی اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ بارہ سال پہلے عابد علی اس سے بچ نکلا تھا۔ سنگاپور آنے کے بعد عابد علی مطمئن تھا کہ ملک نوازش علی اور اس کے کارندے اس کا سراغ نہیں لگا سکیں گے لیکن بارہ سال بعد انہوں نے اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ دارا جتنا بے رحم تھا، اتنا ہی عیار بھی تھا۔ اس نے عابد علی کو دیکھ لیا تھا مگر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اسے نہیں دیکھا تھا لیکن رات ہی کو خاموش فون کالز نے عابد علی کو یقین دلا دیا تھا کہ دارا نے اسے دیکھ لیا ہے۔

عابد علی رات بھر سوچتا رہا اور بالآخر اس نے پرتاب سنگھ کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پرتاب سنگھ نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ بارہ سال پہلے وہ ان سے ڈر کر پاکستان سے بھاگا تھا۔ آج ان کے خوف سے سنگاپور چھوڑ دے گا۔ کل اسے کسی اور جگہ سے بھی بھاگنا پڑے گا۔ کیا وہ ان کے خوف سے زندگی بھر بھاگتا رہے گا۔

"نہیں۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔" عابد علی بڑبڑایا۔ ڈر اور خوف کے سائے میں زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ اسے یہ خوف دل سے نکالنا ہوگا۔ نڈر ہو کر صورتِ حال کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ وہ یہاں سے نہیں بھاگے گا۔

ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد عابد علی کو یوں محسوس ہوا جیسے

اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کرنے لگا۔ اس کی پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں اور وہ نیند کی پُرسکون وادی میں پہنچ گیا۔

صبح ناشتے کے دوران میں اس نے شگفتہ کو بھی اپنے اس فیصلے سے آگاہ کردیا کہ وہ ملک نوازش علی اور دارا کے خوف سے یہاں سے بھاگنے کے بجائے یہیں رہ کر صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا۔ ناشتے کے بعد وہ دکان پر جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ عابد علی قریب کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو!" وہ پُرسکون لہجے میں ماؤتھ پیس میں بولا۔

جواب میں پہلے گہری گہری سانسوں اور پھر کتے کے غرانے جیسی آواز سنائی دی۔ عابد علی کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی لیکن اس نے جلد ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دارا ہی تھا۔ عابد علی کا دل چاہا کہ وہ فون پر ہی دارا کو کھری کھری سنا دے اور اس پر واضح کردے کہ اب وہ اس سے ڈر کر بھاگے گا نہیں مگر یہ سب کچھ کہنے کے بجائے اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

"کون تھا؟" شگفتہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہی بدتمیز۔" عابد علی نے جواب دیا "لیکن تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی پرتاب سنگھ سے بات کرتا ہوں۔ وہ چیانگ شو کو فون کرکے ایک دو پولیس والوں کو یہاں بلالے گا۔ وہ پولیس والے تمہاری حفاظت کے لیے یہاں رہیں گے۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ پرتاب سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ دارا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"اپنا خیال رکھنا۔" شگفتہ نے اس کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

عابد علی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ ساتھ والا مکان پرتاب سنگھ کا تھا۔ عابد علی نے کال بیل بجائی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور پرتاب سنگھ اندر کی طرف کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اونچی سی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ اوپر بنیان تھی اور سر کے بال ایک جالی دار ٹوپی میں لپیٹ رکھے تھے۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا بھائی عابد علی۔" پرتاب سنگھ بولا "میں نے آدھا گھنٹا پہلے چیانگ شو کو فون کردیا ہے۔ اس کے بھیجے ہوئے دو کانسٹیبل یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔ تم اطمینان سے دکان پر جاؤ۔ میرے دو آدمی تمہاری دکان پر پہنچ جائیں گے۔ سوتر سنگھ کو تم جانتے ہونا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوگا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ شیر بن کر جیو۔"

"ہاں۔ اب میں نے شیر بن کر ہی جینے کا فیصلہ کیا ہے۔" عابد علی نے کہا۔

"خوش کیتا ای۔ واہ گرو دی قسم۔ تم نے دل خوش کردیا۔ جاؤ۔ اب دکان پر جاؤ۔ تمہیں دیر ہورہی ہے۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

عابد علی اس سے ہاتھ ملا کر مکان سے باہر نکل آیا۔ گلی سے نکلتے ہی اسے ٹرشا مل گیا اور وہ اپنے معمول کے وقت سے صرف پانچ منٹ کی تاخیر سے دکان پر پہنچ گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد سوتر سنگھ اور اس کا ایک ساتھی بھی آگیا۔ وہ دونوں اونچے لمبے جوان تھے۔ ان میں سے ایک دکان کے باہر کھڑا ہوگیا اور دوسرا اندر۔

اس روز عابد علی دکان پر سہما سہما سا بیٹھا رہا۔ اس کے دل میں خوف تھا۔ وہ بار بار اپنی سیٹ پر بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ دکان کے سامنے سے گزرنے والا ہر شخص اسے مشتبہ نظر آتا۔

اگلے دو تین دن بھی اسی خوف کی کیفیت میں گزرے۔ اس دوران میں نہ تو دارا نظر آیا تھا اور نہ ہی اس کا وہ اجنبی ساتھی اور اس دوران میں اس کے گھر پر وہ پُراسرار خاموش فون کال بھی نہیں آئی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے دل سے خوف بتدریج دور ہوتا گیا۔ اب عابد علی کو یقین ہوگیا تھا کہ دکان پر دارا کی آمد محض ایک اتفاق تھی اور اس نے عابد علی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموش پُراسرار فون کالز بھی کسی کی شرارت تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ چیانگ شو کے فراہم کردہ دو پولیس والے بدستور عابد علی کے مکان کی حفاظت کر رہے تھے۔ پرتاب سنگھ کے آدمی اس کے باڈی گارڈز کے فرائض انجام دے رہے تھے اور اس دوران میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جسے غیر معمولی قرار دیا جاسکتا۔ بالآخر عابد علی اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے کوئی خطرہ نہیں ہے اور اس لیے اسے اپنی یا اپنے گھر کی حفاظت کے لیے پولیس اور باڈی گارڈز کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خوف اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ اس رات اس نے شگفتہ سے مشورہ کیا اور پھر اگلے روز پرتاب سنگھ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس نے پولیس اور باڈی گارڈز کو ہٹا دیا۔

عابد علی اب پہلے کی طرح معمول کے مطابق اپنا وقت گزارنے لگا۔ اس کے دل میں کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا۔ پہلے چند روز کی کیفیت کو بھیانک خواب سمجھ کر اس نے نظرانداز کردیا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا اور اتفاق سے اس روز وجدان کی سالگرہ تھی۔ وہ پورے بارہ سال کا ہوچکا تھا اور اس کی زندگی کا تیرھواں سال شروع ہونے والا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی سالگرہ بڑی باقاعدگی سے مناتے تھے لیکن انہوں نے سالگرہ کا ہنگامہ کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ یا تو گھر پر بڑی سادگی سے کیک کاٹ لیتے یا کسی ہوٹل میں جا کر ڈنر کرلیتے۔ انہوں نے کبھی کسی مہمان کو سالگرہ پر مدعو نہیں کیا تھا۔ پرتاب سنگھ، عابد علی کا بہترین دوست تھا لیکن عابد علی نے اسے بھی کبھی وجدان کی سالگرہ پر مدعو نہیں کیا تھا۔

اس روز وہ صبح سویرے ہی سنتوشا جزیرے پر چلے گئے۔ دن بھر اس خوب صورت جزیرے پر پکنک منائی گئی۔ شام کو واپس آکر کچھ دیر آرام کیا اور پھر ہوٹل رائل ہالی ڈے اِن میں ڈنر کا پروگرام بنالیا۔

اسکاٹس روڈ پر واقع رائل ہالی ڈے اِن ہوٹل تک جانے میں تو انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گھر سے کچھ ہی دور جا کر ٹیکسی مل گئی تھی لیکن رات گیارہ بجے جب وہ ہوٹل سے باہر نکلے تو اتفاق سے اسٹینڈ پر یا آس پاس کوئی ٹیکسی نہیں تھی۔ انہیں آرچرڈ روڈ کے چوراہے تک پیدل آنا پڑا۔ ڈائینا سٹی ہوٹل کے سامنے انہیں ٹیکسی مل گئی۔

اپنے بنگلے کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر عابد علی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا کہ ایک کار تیزی سے اس گلی میں مڑی اور ان کی ٹیکسی کے قریب آکر رک گئی۔ سیاہ رنگ کی اس کار کے دروازے کھلے اور چار آدمی کار سے اتر کر عابد علی' شگفتہ اور وجدان کی طرف بڑھے۔ ان میں سب سے آگے والے آدمی کو دیکھ کر عابد علی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ دارا تھا!

موت کے ان فرشتوں کو اپنے سامنے دیکھ کر عابد علی اور شگفتہ کی حالت غیر ہوگئی۔ وجدان کا چہرہ بھی دھواں ہوگیا۔ اسے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کار رکتے دیکھ کر پہلے تو وہ سمجھا تھا کہ شاید اس کے ڈیڈی کے دوست آئے ہیں لیکن وہ لوگ جس طرح عجلت میں کار سے اترے تھے' وہ انداز دوستانہ نہیں تھا پھر دوستوں کے ہاتھوں میں اسلحہ نہیں ہوتا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بھی صورتِ حال بھانپ لی تھی۔ ٹیکسی کا انجن اسٹارٹ تھا اور اس نے ابھی تک کرایہ نہیں لیا تھا لیکن کار سے اترنے والے ان لوگوں کے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی اور اس نے کرایہ لیے بغیر بڑی پھرتی سے گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور اسے زبردست جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر عابد علی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ وہ گزشتہ بارہ سال سے جن لوگوں سے چھپنے کی کوشش کرتا رہا تھا' آج بالآخر انہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔

ان کی تعداد پانچ تھی۔ ایک کار کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ چار آدمی کار سے اترے تھے۔ ان میں سب سے آگے دارا تھا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس کے ساتھ کار سے اترنے والے تین آدمیوں میں سے دو تو چینی تھے اور ایک غالباً یوریشین تھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں چاقو اور خنجر تھے اور چہروں پر بے پناہ سفاکی تھی۔ عابد علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کرائے کے غنڈے تھے اور دارا نے بھاری معاوضہ دے کر ان کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔

عابد علی کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر شگفتہ اور وجدان کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے چیخ اٹھا۔

"بھاگ جاؤ۔ تم لوگ بھاگ جاؤ۔"

"بھاگ کے کہاں جاؤ گے۔" دارا نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ چہرے کی طرح اس کے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی "اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے تھے لیکن بالآخر ہم نے تمہیں تلاش کر ہی لیا۔ تمہیں دنیا کے کسی کونے میں ہم سے پناہ نہیں مل سکتی۔ تم اگر پاتال میں بھی چھپے ہوتے تو ہم تمہیں ڈھونڈ نکالتے۔"

"تت.... تم.... کیا چاہتے ہو دارا۔" عابد علی ہکلایا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" دارا نے کہا "تم نے ملک نوازش علی کے ساتھ غداری کی تھی۔ اسے دھوکا دیا تھا۔ اسے کروڑوں کا نقصان پہنچایا تھا۔ تم اگرچہ ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے مگر ملک نوازش علی تمہیں نہیں بھولا تھا۔ تمہاری تلاش جاری رہی اور بالآخر ہم نے تمہیں ڈھونڈ ہی لیا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ عابد علی۔"

"مجھے مار کر تم لوگوں کو کیا ملے گا۔" عابد علی نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں تم لوگوں سے بالکل لاتعلق ہو چکا ہوں۔ مجھ سے تم لوگوں کو اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میرا اب پاکستان آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں...."

"تم ہمارے لیے خطرہ بن سکتے ہو۔" دارا نے اس کی بات کاٹ دی "ہم نے آسٹریلیا میں اپنے مال کی کھپت کے لیے ایک نئی منڈی تلاش کی ہے۔ سنگاپور کو ہم علاقائی ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور تم جیسے لوگ یہاں ہمارے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ ویسے بھی تم سے تو پرانا حساب چکانا ہے۔ تمہیں زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا... چی فانگ" وہ ایک چینی غنڈے کی طرف مڑ گیا "ختم کردو اسے۔"

"نہیں...." شگفتہ چیختے ہوئے آگے آگئی۔

دارا پستول لیے کھڑا رہا اور تینوں غنڈوں نے خنجروں سے عابد علی پر حملہ کردیا۔ شگفتہ اپنے شوہر کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خنجر کے کئی وار اس کے جسم پر بھی لگے۔ شگفتہ اور عابد علی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن خنجر کا ہر وار انہیں چیخنے پر مجبور کردیتا۔ ان کی چیخوں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں۔

وجدان ایک طرف کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف ودہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک غنڈے نے اس پر بھی حملہ کرنا چاہا مگر عین وقت پر عابد علی سامنے آگیا۔

"بھاگ جاؤ۔ وجدان۔ بھاگ جاؤ۔" عابد علی چیخا۔

وجدان چیختا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ ایک بنگلے کے سامنے لان کی باڑھ میں چھپ گیا اور اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ تینوں غنڈے عابد علی اور شگفتہ پر خنجروں سے وار کر رہے تھے اور وہ دونوں بری طرح چیخ رہے تھے۔

ان کی چیخیں دور دور تک گونج رہی تھیں لیکن کوئی ان کی مدد کے لیے باہر نہیں آیا۔ قریب کھڑا ہوا دارا وقفے وقفے سے پستول سے فائرنگ کر رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز نے ہی لوگوں کو اپنے گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔

چی فانگ نامی چینی غنڈا شگفتہ کو پکڑے ہوئے تھا۔ شگفتہ کا جسم لہولہان ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر کئی گہرے زخم آچکے تھے۔ جن سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر ایک طرف دوڑی۔ چی فانگ بھی خنجر لیے اس کے پیچھے لپکا۔ شگفتہ پرتاب سنگھ والے بنگلے کے سامنے لان کی باڑھ سے الجھ کر گر گری۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن چی فانگ نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کے سینے پر پے در پے وار کرنے لگا۔

عابد علی زخموں سے چُور ہونے کے باوجود اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر اسے بھی موقع مل گیا اور وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا لیکن زخموں سے چُور ہونے کے باعث زیادہ دور نہیں جا سکا اور لڑکھڑا کر سامنے والے بنگلے کے لان کے قریب گر گیا۔ ایک حملہ آور خنجر تانے اس کی طرف لپکا لیکن ٹھیک اسی وقت پچھلے موڑ سے ایک گاڑی گلی میں مڑی۔

"بھاگو!" دارا چیخا "چی فانگ بھاگو۔ گاڑی میں۔"

وہ سب اپنی کار کی طرف لپکے۔ کار حرکت میں آگئی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے کار میں گھس گئے اور کار تیز رفتاری سے اگلا موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ دوسری کار گلی میں چند قدم آگے آچکی تھی۔

وجدان جھاڑیوں سے نکل کر اپنی ماں کی طرف دوڑا۔

"ممی.... ممی...." وہ شگفتہ کو جھنجوڑتے ہوئے چیخ رہا تھا مگر شگفتہ اس کی پکار کا جواب دینے کے لیے زندہ نہیں رہی تھی۔ وجدان باپ کی طرف دوڑا اور اس سے لپٹ کر چیخنے لگا۔

عابد علی کے جسم پر کئی زخم تھے۔ سینے پر بھی کئی جگہوں سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔

"وجدان۔" عابد علی کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی "بھاگ جاؤ۔ یہ لوگ تمہیں بھی مار ڈالیں گے.... اپنی ماں کو.... لے کر بھاگ.... جاؤ...."

گلی میں داخل ہونے والی کار قریب آکر رک گئی۔ دو آدمی نیچے اترے۔ ان میں ایک پرتاب سنگھ اور دوسرا اس کا دوست نریش کمار تھا۔ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں وہ منظر دیکھ کر پرتاب سنگھ کانپ اٹھا اور چیختا ہوا وجدان کی طرف دوڑا۔

"اوئے کیا ہوا کاکے۔ یہ سب کیا ہوا؟" پرتاب سنگھ نے وجدان کو عابد علی سے الگ کرتے ہوئے چیخ کر کہا۔

"چاچا!" وجدان چیخ کر اس سے لپٹ گیا "انہوں نے میرے ابو کو مار دیا۔ میری ممی کو بھی مار ڈالا۔"

پرتاب سنگھ اپنے بنگلے کی طرف دوڑا۔ گیٹ کے ساتھ ہی لان کی باڑھ میں شگفتہ پھنسی ہوئی تھی۔ پرتاب سنگھ اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ ختم ہو چکی تھی۔ وہ دوڑ کر دوبارہ عابد علی کے قریب آگیا۔

"او بھائی عابد علی۔ یہ سب کیا ہوا۔ کون تھے وہ لوگ...." وہ عابد علی کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔

"پرتاب سنگھ۔" عابد علی کراہا "مجھے مت اٹھاؤ.... مم.... مجھے کہیں لے جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میرے جسم پر اتنے زخم لگے ہیں کہ میرا زندہ بچنا ممکن نہیں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میری بات.... غور سے.... سنو...."

"تم بچ جاؤ گے عابد علی.... میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم بچ جاؤ گے۔" پرتاب سنگھ نے کہا اور اپنے دوست کی طرف دیکھ کر چیخا "نریش کمار! ڈاکٹر کو بلاؤ۔ پولیس کو فون کرو۔ جلدی کرو۔ میرے یار کو بچاؤ۔"

"ڈاکٹر کو بلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا پرتاب سنگھ۔" عابد علی نے کراہتے ہوئے کہا "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میری بات غور سے سن لو۔"

"ہاں ہاں۔ بولو۔ میں سن رہا ہوں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ اس نے عابد علی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"انہوں نے شگفتہ کو مار ڈالا۔ میں بھی مر رہا ہوں۔" عابد علی رک رک کر کہہ رہا تھا "میرا بیٹا اکیلا رہ جائے گا۔ اس کا خیال رکھنا۔"

"تم فکر مت کرو عابد علی۔" پرتاب سنگھ بولا "وجدان میرا پتر ہے۔ میں اسے اپنے پتر کی طرح پالوں گا۔ سوں رب دی۔"

"ایک بات اور سن لو۔" عابد علی نے کہا "ملک نوازش علی اپنے کالے دھندے کے لیے سنگاپور میں قدم جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے یہاں میری موجودگی کا پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا۔ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے دارا جیسے درندے کو یہاں بھیج دیا۔ ہم اس کے بارے ششش و پنج کا شکار رہے لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے علاوہ...."

عابد علی خاموش ہوگیا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کی رنگت بالکل پیلی پڑ گئی تھی اور بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

"سوں رب دی۔" پرتاب سنگھ بولا "میں ان درندوں سے تمہارے اور پابھو کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

"تم نہیں۔" عابد علی بولا "انتقام میرا بیٹا لے گا۔ اس کی پرورش اس طرح کرنا کہ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہے۔"

"تم فکر ہی مت کرو۔" پرتاب سنگھ بولا "میں اسے انتقام کا شعلہ بنا دوں گا' لاوا بھر دوں گا اس کے جسم میں۔ آتش فشاں بنا دوں گا اسے۔ جب پھٹے گا تو سب کو جلا کر راکھ کردے گا۔ وہ تمہارا

انتقام ضرور لے گا۔"

"میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں۔" عابد علی نے کہا۔ اس کی آواز کچھ اور کمزور سی ہوگئی تھی "وجدان کی پرورش کے لیے تمہیں.... دولت کی کمی نہیں ہوگی۔ میں اس کے لیے اتنا سب کچھ چھوڑ کر جارہا ہوں کہ اسے ساری زندگی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"میرا سب کچھ بھی تو اسی کا ہے عابد علی۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"میں تمہیں جو بات بتانا چاہتا ہوں' وہ غور سے سنو پرتاب سنگھ۔" عابد علی رک رک کر بولا "ملک نوازش علی بظاہر تو ایک زمیں دار ہے لیکن دراصل وہ ایک بہت بڑا بین الاقوامی اسمگلر ہے۔ بارہ سال پہلے اس کے اسمگل شدہ سونے کی ایک کھیپ میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ میں نے پانچ کروڑ مالیت کا وہ سونا غائب کردیا تھا اور اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ سونا میں نے راوی کے پُل سے دریا میں پھینک دیا تھا۔ وہ میرا بدترین دشمن بن گیا۔ اس نے میرے گھر کو آگ لگا کر مجھے' میری بیوی اور میرے بچے کو زندہ جلانے کی کوشش کی لیکن میں بچ نکلا اور چوری چھپے پاکستان سے فرار ہو کر یہاں آگیا۔ مجھے بعد میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پتا چلا کہ اس نے غالباً میری اس بات کا یقین کرلیا تھا کہ پانچ کروڑ روپے مالیت کا وہ سونا میں نے دریا میں پھینک دیا تھا۔ وہ سونے کی تلاش کے ساتھ مجھے بھی ڈھونڈتا رہا اور بالآخر اس کے آدمی مجھ تک پہنچ گئے اور اپنا وار کر گزرے۔ مم.... میں.... میں نے وہ سونا دریا میں نہیں پھینکا تھا۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ سونا کہاں ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر جب بولا تو اس کی آواز کچھ اور بھی کمزور ہوگئی تھی۔

اس دوران میں آہٹ سن کر پرتاب سنگھ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ نریش کمار اس کے قریب کھڑا تھا۔

"میں نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے۔ اسپتال بھی فون کردیا ہے۔ ایمبولینس بھی آنے والی ہے۔" نریش کمار نے اسے اپنی طرف متوجہ پاکر کہا۔

"پانی لاؤ تھوڑا سا۔ جلدی کرو۔" پرتاب سنگھ بولا۔

اس دوران میں آس پاس کے بنگلوں سے کچھ لوگ بھی نکل آئے تھے لیکن آگے کوئی نہیں آیا تھا۔ سب اپنے اپنے دروازوں کے سامنے کھڑے تھے۔ نریش کمار ایک گھر سے پانی مانگ لایا۔ پرتاب سنگھ' عابد علی کے حلق میں پانی ٹپکانے لگا مگر پانی اس کے ہونٹوں سے باہر بہہ رہا تھا۔ عابد علی نے قریب بیٹھے ہوئے وجدان کا ہاتھ پکڑلیا۔ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس کے جسم کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور پھر وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

پرتاب سنگھ اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا لیکن عابد علی کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ پرتاب سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس نے عابد علی کی آنکھیں بند کردیں اور اس کا سر بڑی آہستگی سے زمین پر ٹکا دیا اور وجدان کو سینے سے لپٹالیا۔ وجدان دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور پھر پرتاب سنگھ کی بانہوں میں جھول گیا۔

وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

ٹھیک اسی وقت پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد پولیس کی جیپ اس گلی میں مڑی۔ اس کے پیچھے ہی ایمبولینس بھی تھی۔ دونوں گاڑیاں جائے وقوعہ سے چند گز کے فاصلے پر رک گئیں۔ جیپ رکتے ہی نصف درجن پولیس والے اتر کر ادھر اُدھر پھیل گئے۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج پرتاب سنگھ کا دوست چیانگ شو تھا۔ لوگ پولیس کو دیکھ کر اپنے اپنے گھروں میں گھس گئے تھے۔

"چیانگ شو!" پرتاب سنگھ اسے دیکھتے ہی چیخا "یہ.... یہ دیکھو کیا ہوگیا ہے۔ انہوں نے میرے یار اور پابھو کو مار ڈالا۔"

"وہ لوگ بچ کر نہیں جائیں گے۔" چیانگ شو نے کہا "ہم کو بتاؤ۔ یہ سب کیا ہوا۔ تم نے ان لوگ کو دیکھا؟"

"نہیں۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "میں اپنے دوست نریش کمار کے ساتھ آیا تھا۔ ہماری کار جیسے ہی اس گلی میں مڑی وہ لوگ ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہوگئے لیکن میں جانتا ہوں وہ دارا تھا۔ عابد علی کو اس سے جان کا خطرہ تھا۔"

چیانگ شو ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پرتاب سنگھ ابھی تک عابد علی کی لاش کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ بے ہوش وجدان اس کی گود میں تھا۔

"اس بچے کو کیا ہوا؟" چیانگ شو نے پوچھا "کیا یہ بھی...."

"نہیں۔ یہ بے ہوش ہوگیا ہے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "یہ عابد علی کا بیٹا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماں باپ کو قتل کیا گیا ہے۔ یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکا۔ بے ہوش ہوگیا ہے۔ اگر اسے ہوش میں نہ لایا گیا تو اس کی جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔"

اسی وقت سامنے والے گھر سے ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک عورت نکل کر پرتاب سنگھ کے قریب آگئے۔ پرتاب سنگھ نے وجدان کو ان کے حوالے کردیا۔ وہ آدمی وجدان کو گود میں اٹھا کر اپنے بنگلے میں لے گیا۔ پڑوس کی دو تین عورتیں ان کے پیچھے ہی بنگلے میں داخل ہوگئی تھیں۔

انسپکٹر چیانگ شو عابد علی کی لاش کا معائنہ کررہا تھا پھر وہ شگفتہ کی لاش کے قریب چلا گیا۔ کچھ دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا پھر اپنی جیپ کے پاس آگیا اور ریڈیو ٹرانسمٹر پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرکے فوٹوگرافر اور دیگر ماہرین کو جائے وقوعہ پر بھیجنے کی درخواست کی اور ریڈیو آن کرکے اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے جائے واردات کا جائزہ لینے لگا۔ آس پاس کے بنگلوں میں رہنے والے کچھ

لوگ اب پھر گھروں سے نکل آئے تھے۔ عابد علی اور شگفتہ کی لاشیں دیکھ کر سب ہی لوگ افسوس کا اظہار کررہے تھے۔

انسپکٹر چیانگ شو' شگفتہ کی لاش سے چند قدم آگے رک گیا۔ جھاڑیوں کے قریب ہاتھی دانت کے دستے والا ایک خنجر پڑا ہوا تھا۔ خنجر کا بلیڈ خون آلود تھا۔ کچھ خون دستے پر بھی لگا ہوا تھا۔ چیانگ شو نے جیب سے رومال نکالا اور اس کی مدد سے بڑی احتیاط سے خنجر اٹھا کر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ خنجر کے بلیڈ پر لگا ہوا خون ابھی پوری طرح جما نہیں تھا۔

"یہ خنجر احتیاط سے رکھ لو۔" چیانگ شو نے خنجر اپنے ایک ماتحت کے حوالے کردیا اور ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ کچھ اور آگے آگئے تھے۔ ان میں ہندوستانی بھی تھے چینی بھی اور دوسری قوموں کے باشندے بھی

"آپ لوگوں میں کوئی اس واردات کے بارے میں کچھ جانتا ہو تو پلیز آگے آکر ہمیں بتائیے تاکہ ہم قاتلوں کو آسانی سے تلاش کرسکیں۔" چیانگ شو نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن کوئی بھی آگے نہیں آیا۔ سب لوگ اپنی جگہوں پر کھڑے رہے۔

"دیکھیے!" چیانگ شو ایک بار پھر لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "قاتلوں کا سراغ لگانے کے لیے ہمیں کچھ نشانیاں درکار ہیں۔ اگر کوئی کچھ جانتا ہو تو ہماری مدد کرے۔"

اس مرتبہ عابد علی کے سامنے والے بنگلے میں رہنے والا تائی ٹی نامی ایک ادھیڑ عمر چینی آگے آگیا۔

"یس مسٹر!" چیانگ شو اس کی طرف متوجہ ہوگیا "آپ کچھ جانتے ہیں؟"

"میں اس وقت کچن میں تھا۔" تائی ٹی نے کہا "پہلے میں نے ایک گاڑی کے رکنے کی آواز سنی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد ایک اور گاڑی بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہمارے بنگلے کے سامنے رکی اور پھر شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں ایک آواز عابد علی کی تھی جو چیخ چیخ کر اپنی بیوی اور بیٹے سے کچھ کہہ رہا تھا پھر اس کی بیوی اور بیٹے کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں کچن سے نکل کر باہر کے گیٹ کے پاس آگیا۔ گیٹ کھولنے سے پہلے میں نے جھری میں سے باہر جھانک کر دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ تین چار آدمی عابد علی اور اس کی بیوی پر خنجروں سے حملے کررہے تھے۔ لمبے قد کا ایک آدمی کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر ہوائی فائر کردیا اور پھر وہ وقفے وقفے سے فائر کرتا رہا۔ میرے خیال میں اس طرح اس کی فائرنگ کا مقصد یہ تھا کہ کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکے۔" تائی ٹی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "حملہ آور بے دردی سے عابد علی اور اس کی بیوی پر خنجروں سے حملے کررہے تھے۔ ان کا بیٹا بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا۔

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

احساس کمتری

اسباب
تدارک
علاج

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

- احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
- کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔

قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 944 ... کراچی 74200
فون: 5802552-5896313 فیکس: 5802581
کتابوں کی قیمتیں اور ڈاک خرچ موجودہ ہیں ان میں کسی بھی وقت تبدیلی ہوسکتی ہے 1-6-2001

kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

میں دوڑ کر اندر آگیا۔ میں ان لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا لیکن پولیس کو تو اطلاع دے سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے پولیس کو اطلاع دینے کے لیے فون کا ریسیور اٹھایا تو پتا چلا کہ فون ڈیڈ پڑا ہے۔

"میں دوبارہ گیٹ کے پاس آگیا۔ اس وقت حملہ آور سیاہ رنگ کی ایک کار میں فرار ہو رہے تھے۔ میں نے ان میں سے صرف ایک آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ لمبے قد کا قدرے بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ہندوستانی یا شاید پاکستانی تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس شخص کا حلیہ بتانے لگا۔

"اس کے ساتھی کون تھے؟" انسپکٹر چیانگ شو نے پوچھا۔

"چینی تھے لیکن میں ان کی شکلیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔" تائی شی نے کہا۔

"تم نے اس کار کا نمبر دیکھا تھا مسٹر تائی شی؟" چیانگ شو نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نمبر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ سیاہ رنگ کی ٹویوٹا تھی۔" تائی شی نے بتایا۔

"اگر دوبارہ اس آدمی کو دیکھ لو تو پہچان لوگے؟" چیانگ شو نے پوچھا۔

"شاید۔" تائی شی نے مختصر سا جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" چیانگ شو بولا "میں آپ کا تحریری بیان لینے کے لیے آپ کو دوبارہ زحمت دوں گا۔ کسی کو کوئی اور بات معلوم ہو تو پلیز ہماری مدد کرے۔"

لیکن کوئی آگے نہیں آیا۔ اسی دوران میں پولیس کی ایک اور گاڑی گلی میں آکر رکی۔ اس میں سے تین آدمی نیچے اترے۔ ایک تو پولیس کا فوٹو گرافر تھا اور دو ہومی سائیڈ کے ماہرین۔ فوٹو گرافر چیانگ شو کی ہدایت پر جائے واردات اور لاشوں کی تصویریں کھینچنے لگا جبکہ ہومی سائیڈ کے ماہرین نے اپنے طور پر تحقیق شروع کردی تھی۔

مختلف لوگوں کے بیانات لیے گئے۔ واردات کا چشم دید گواہ کوئی نہیں تھا۔ تائی شی کے علاوہ سب ہی نے یہ بتایا تھا کہ انہوں نے چیخنے اور فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں لیکن خوف کی وجہ سے کوئی بھی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ البتہ یہ بیان سب نے دیا تھا کہ عابد علی ایک شریف آدمی تھا۔ اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ مکان اس نے تقریباً چھ سال پہلے خریدا تھا۔ تمام پڑوسیوں سے اس کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ چھ سال کے اس عرصے میں کسی سے اس کا کوئی معمولی سا جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی بیوی شگفتہ بھی بہت خوش اخلاق اور ملنسار عورت تھی۔ پڑوس میں سب گھروں میں اس کا آنا جانا تھا اور اس گلی میں رہنے والی تمام خواتین سے اس کے تعلقات بہت خوش گوار تھے۔

پولیس آفیسر گلی کے لوگوں کے بیانات لے رہا تھا کہ کسی نے آکر بتایا کہ وجدان ہوش میں آگیا ہے۔

"وجدان کون ہے؟" ہومی سائیڈ کے ایک آفیسر نے چیانگ شو کی طرف دیکھا۔

"مقتولین کا بارہ سالہ بیٹا اور اس واردات کا واحد چشم دید گواہ۔" انسپکٹر چیانگ شو نے بتایا۔

"اوہ!" ہومی سائیڈ آفیسر چونک گیا "اس کا بیان بہت ضروری ہے۔ وہ ہمیں قاتلوں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔"

وہ لوگ اس بنگلے میں آگئے جہاں وجدان ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل پیلا ہو رہا تھا۔ جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی جھلک رہی تھی اور وہ پلک جھپکے بغیر سامنے والی دیوار کو گھور رہا تھا۔

"کاکا۔" پرتاب سنگھ اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا "اب کیسے ہو بیٹا۔"

"چاچا۔" وجدان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے "میری ممی.... میرے ابو....."

"حوصلہ کر بیٹا۔" پرتاب سنگھ نے اسے اٹھا کر گلے سے لگالیا۔

"وجدان ڈیئر!" ہومی سائیڈ آفیسر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نے ان لوگوں کو اپنے ڈیڈی اور ممی پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بتا سکتے ہو وہ کون لوگ تھے؟"

"دا.... دارا....." وجدان روتے ہوئے بولا "ابو نے اسے دارا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور تھے۔"

"وہ تین آدمی کون تھے؟" آفیسر نے پوچھا۔

وجدان جواب دینے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"آفیسر!" پرتاب سنگھ ہومی سائیڈ آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ بچہ ابھی اس قابل نہیں ہے کہ تفصیل سے کوئی بیان دے سکے۔ اس وقت اس سے کوئی سوال نہ کریں۔ یہ صدمے سے نڈھال ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے مسٹر پرتاب سنگھ۔" ہومی سائیڈ آفیسر نے کہا "آپ ان کے پڑوسی ہیں۔ یہ بچہ آپ کی تحویل میں رہے گا۔ ان کے کوئی اور رشتے دار ہوں تو انہیں بھی اطلاع دے دیں۔ اس بچے کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے اور حفاظت بھی۔" ہومی سائیڈ آفیسر، چیانگ شو کی طرف مڑ گیا "انسپکٹر! یہ بچہ اس واردات کا واحد چشم دید گواہ ہے۔ اس کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اگر مسٹر پرتاب سنگھ کی گاڑی اس وقت گلی میں نہ مڑتی تو شاید وہ لوگ اسے بھی مار دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ لوگ اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کریں گے اس لیے اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔"

"فکر مت کرو آفیسر۔" چیانگ شو نے جواب دیا "میں اس مکان پر دو مسلح کانسٹیبلوں کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔"

وہ لوگ مکان سے باہر آگئے۔ لاشیں اٹھوانے سے پہلے عابد علی کے لباس کی تلاشی لی گئی تھی اور جیبوں سے برآمد ہونے والی تمام اشیا کی فہرست بنا کر مشیر نامہ تیار کیا گیا۔ مکان کی چابیاں پرتاب سنگھ کے حوالے کردی گئیں اور کچھ دیر بعد جب لاشیں اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالی گئیں تو وجدان دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ پرتاب سنگھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ یہ اندوہ ناک منظر دیکھ کر وہاں کھڑے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

وجدان ایک بار پھر بے ہوش ہوگیا۔ پرتاب سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وجدان ہوش میں آگیا لیکن پرتاب سنگھ کو خطرہ تھا کہ اس کا ذہنی توازن نہ بگڑ جائے۔ اس معصوم بچے پر قیامت ہی ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماں باپ کو قتل کیا گیا تھا۔ یہ تو بچہ تھا۔ کوئی بڑا بھی ہوتا تو شاید اپنے آپ کو نہ سنبھال پاتا۔

پرتاب سنگھ کے مکان میں کچھ اور لوگ بھی جمع ہوگئے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں جو وجدان کو سینے سے لپٹا لپٹا کر اسے دلاسا دے رہی تھیں۔ گلی کے تمام گھروں میں وجدان کا آنا جانا تھا۔ وہ ان تمام خواتین سے مانوس تھا۔ ہر ایک سے لپٹ لپٹ کر رو رہا تھا۔

"نرلیش کمار۔" پرتاب سنگھ اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ڈاکٹر رحمٰن کو فون کردو۔ مجھے ڈر ہے کہ وجدان کو کچھ ہو نہ جائے۔ سوں رب دی۔ اسے کچھ ہوگیا تو میں...... تم ڈاکٹر رحمٰن کو فون کرو۔"

نرلیش کمار لاؤنج میں رکھے ہوئے فون کے قریب آگیا اور ریسیور اٹھا کر ڈاکٹر رحمٰن کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ کال کافی دیر بعد ریسیو کی گئی تھی۔ ڈاکٹر رحمٰن، پرتاب سنگھ اور عابد علی کا مشترکہ دوست تھا بلکہ پہلے اس کی دوستی عابد علی سے ہوئی تھی اور اس کے بعد پرتاب سنگھ سے متعارف ہوا تھا۔ ان تینوں میں بڑی گہری دوستی ہوگئی تھی۔ نرلیش کمار کی بھی کبھی کبھی اس سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

"ڈاکٹر رحمٰن۔" نرلیش کمار لائن ملنے پر بولا "عابد علی اور اس کی بیوی کو کسی نے قتل کردیا ہے۔ اس کے بیٹے کی حالت تشویش ناک ہے۔"

"عابد علی اور شگفتہ کو قتل کردیا گیا ہے۔" ڈاکٹر رحمٰن کی آواز سے نیند کا خمار غائب ہوگیا۔ اس نے نرلیش کمار کی آواز بھی پہچان لی تھی "تم کہاں سے بول رہے ہو نرلیش۔ انہیں کس نے قتل کیا ہے۔ کہاں...."

"ان دونوں کو ان کے گھر کے سامنے قتل کیا گیا ہے۔" نرلیش کمار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میں پرتاب سنگھ کے گھر سے بول رہا ہوں۔ تم یہیں آجاؤ۔"

"وجدان زیادہ زخمی ہے کیا؟" ڈاکٹر رحمٰن نے پوچھا۔

"وہ زخمی نہیں ہے۔" نرلیش کمار نے جواب دیا "جب اس کے ماں باپ کو قتل کیا جا رہا تھا تو وہ چھپ گیا تھا جس وجہ سے وہ بچ گیا لیکن صدمے سے وہ بار بار بے ہوش ہو رہا ہے۔ خدشہ ہے کہ اس کے دماغ پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔" ڈاکٹر رحمٰن نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔ نرلیش کمار نے ریسیور رکھ دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر رحمٰن پہنچ گیا۔ وجدان کی حالت اس وقت بھی کچھ بہتر نہیں تھی۔ اب وہ رونے کے ساتھ ساتھ ایسی باتیں کرنے لگا تھا جو دوسروں کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ ڈاکٹر رحمٰن نے اسے انجکشن لگا دیا۔

"اچھا کیا جو تم نے مجھے بلالیا پرتاب سنگھ۔" ڈاکٹر رحمٰن نے کہا "یہ صدمہ اس کے لیے بہت شدید ہے۔ باہمت لڑکا ہے جو اب تک سب کچھ برداشت کرلیا۔ اس کا ذہن متاثر ہو سکتا ہے۔ میں نے انجکشن لگا دیا ہے۔ سو جائے گا۔ اسے سکون اور آرام کی بہت ضرورت ہے۔"

"میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا سوں رب دی۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے؟" ڈاکٹر رحمٰن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے چند روز پہلے عابد علی کو اپنا ایک پرانا دشمن نظر آگیا تھا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "انہی لوگوں کے خوف سے یہ بارہ سال پہلے اپنا وطن ... چھوڑ کر یہاں آگیا تھا۔ اس روز دارا کو دیکھ کر عابد علی ڈر گیا تھا۔ میں نے اس کی حفاظت کا بندوبست کردیا تھا۔ دو باڈی گارڈ رکھ دیے تھے لیکن دس بارہ دن تک کوئی بات نہیں ہوئی۔ عابد علی یہی سمجھا کہ شاید دارا نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ محض سیر و تفریح کے لیے یا کسی اور کام سے سنگاپور آیا ہو اور اتفاقاً عابد علی کی نظروں میں آگیا ہو اور عابد علی یہ سمجھا ہو کہ وہ اسی کی تلاش میں آیا ہے۔ بہرحال جب کچھ نہیں ہوا تو عابد علی نے باڈی گارڈز ہٹا دیے۔ وہ سمجھا ہوگا کہ شاید دارا واپس جا چکا ہے لیکن اس کے سارے اندازے غلط نکلے۔ دارا اس کی تاک میں تھا اور موقع کی تلاش میں تھا۔" پرتاب سنگھ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "کل وجدان کی سالگرہ تھی۔ وہ بارہ سال کا ہوگیا تھا۔ یہ لوگ سارا دن سنتوشا میں پکنک مناتے رہے۔ رات کو شاید ڈنر کے لیے کسی ہوٹل میں گئے تھے اور مجھے یقین ہے کہ دارا اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کی تاک میں ہوگا۔

"اتفاق سے میں بھی نرلیش کمار کے ساتھ ڈنر پر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر ہماری کار جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی یہاں پہلے ہی سے

کالے رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ میں نے اپنی کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تین چار آدمیوں کو دوڑ کر کالے رنگ کی اس کار میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ کار تیزی سے آگے روانہ ہو گئی۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ کون لوگ تھے اور اس طرح کیوں بھاگے تھے مگر جب ہم نے اپنی کار روکی تو خون خرابا نظر آیا۔ بابو شگفتہ ختم ہو چکی تھی۔ عابد علی شدید زخمی تھا۔ اس نے میری گود میں دم توڑا تھا۔ میں وہ سب کچھ نہیں بھول سکتا یار۔ یہ معصوم بچہ جس طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے۔ تم خود سوچو یار۔ جس بچے کے سامنے اس کے ماں باپ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہو‘ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو....؟"

"اسے کچھ نہیں ہو گا پرتاب سنگھ۔" ڈاکٹر رحمٰن نے وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے زیادہ سے زیادہ نیند اور آرام کی ضرورت ہے۔ دو چار دن اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔ اس کے بعد بتدریج صدمہ کم ہوتا چلا جائے گا اور یہ اپنے آپ کو سنبھال لے گا۔"

"اور اس کے بعد؟" پرتاب سنگھ بولا "کیا وجدان یہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے‘ اسے فراموش کر دے گا؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر رحمٰن نے کہا "وجدان یہ سب کچھ کبھی نہیں بھول سکے گا۔ یہ واقعہ بھیانک یاد بن کر اس کے دماغ میں چپکا رہے گا اور شاید یہی بھیانک یاد اس کی زندگی کا راستہ بدل دے۔"

"اسے اپنی زندگی کا راستہ بدلنا ہو گا۔" پرتاب سنگھ نے کہتے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ انجکشن اپنا اثر دکھا رہا تھا اور وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔ نیند میں بھی وہ سسکیاں بھر رہا تھا۔

○☆○

پرتاب سنگھ تین دن تک بڑا مصروف رہا تھا۔ عابد علی اور شگفتہ کی تدفین کا بندوبست اس نے ڈاکٹر رحمٰن سے مل کر کیا تھا۔ عابد علی ایک مخلص اور ملنسار آدمی تھا۔ اس جزیرے پر اس کے کئی دوست تھے جن میں ہر قومیت کے لوگ شامل تھے۔ ان میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ تدفین‘ قرآن خوانی اور سوئم وغیرہ کے تمام انتظامات ڈاکٹر رحمٰن اور اس کے مسلمان دوستوں نے کیے تھے۔

وجدان اس دوران میں زیادہ تر نیند کی کیفیت میں رہا تھا۔ ڈاکٹر رحمٰن اس کا خیال رکھے ہوئے تھا۔ وہ ہر دو تین گھنٹوں بعد اسے دیکھ لیتا تھا۔ چوتھے روز ڈاکٹر رحمٰن نے اسے انجکشن نہیں لگایا۔ کیونکہ اس کے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ نیند اور بیداری کے وقفوں کے دوران میں ڈاکٹر رحمٰن اور پرتاب سنگھ اس سے اس طرح کی باتیں کرتے رہتے تھے جس سے صدمے کا اثر کم ہو جائے اور اس میں حوصلہ پیدا ہو۔

وجدان ایک باہمت لڑکا تھا۔ اس کے ذہن نے بہت جلد صورت حال کو قبول کر لیا۔ پرتاب سنگھ کی باتوں نے بھی اسے سنبھلنے میں بڑی مدد دی تھی۔

اس دوران میں اخبارات... بڑی باقاعدگی سے نمایاں طور پر اس واقعے کو کوریج دیتے رہے تھے۔ جزیرے پر یوں تو وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اخبارات میں جرائم کی خبریں بھی چھپتی رہتی تھیں لیکن دُہرے قتل کی ایسی خوفناک واردات کبھی نہیں ہوئی تھی اس لیے اخبارات بھی اسے اچھی خاصی اہمیت دے رہے تھے اور لوگ بھی دلچسپی سے یہ خبریں پڑھتے تھے۔ ہر شخص یہ جاننا چاہتا تھا کہ قاتلوں کا سراغ ملا یا نہیں۔

اخبارات کے نمائندے اور فوٹو گرافرز بار بار پرتاب سنگھ کے گھر کے چکر لگا رہے تھے۔ وہ لوگ وجدان کا انٹرویو چھاپنا چاہتے تھے لیکن پرتاب سنگھ نے کسی کو بھی وجدان کے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ پولیس بھی وجدان کا بیان لینا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر رحمٰن نے اجازت نہیں دی۔ اس نے پولیس پر واضح کر دیا تھا کہ وجدان ابھی ذہنی طور پر اس قابل نہیں ہے کہ پولیس کے سوالات کے جواب دے سکے۔

اخبارات نے یہ بھی لکھا تھا کہ وجدان اس لرزہ خیز واردات کا واحد چشم دید گواہ ہے۔ وہ ایک طرف اگر پولیس کے لیے اہم تھا تو دوسری طرف قاتلوں کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اخبارات نے یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ عابد علی اور شگفتہ کے قاتل وجدان کو بھی اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے اس لیے اس کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جائے۔ پولیس نے اس کی حفاظت کے لیے صرف دو کانسٹیبل تعینات کیے تھے اور اخبارات نے اس پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا۔

○☆○

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صورت حال کسی قدر نارمل ہو گئی تھی اور ڈاکٹر رحمٰن کے خیال میں وجدان بھی اب اس قابل تھا کہ پولیس کا سامنا کر سکے اس لیے اس نے پولیس کو اس کا بیان لینے کی اجازت دے دی۔

انسپکٹر چیانگ شو اور ہومی سائیڈ آفیسر‘ وجدان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور وجدان انہیں بتا رہا تھا کہ اس روز یہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔

"تم نے کہا ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے اس شخص کو دارا کے نام سے مخاطب کیا تھا۔" ہومی سائیڈ آفیسر نے کہا "کیا تم بتا سکتے ہو یہ دارا کون ہے۔ اس سے پہلے تم نے اسے دیکھا تھا۔ وہ تمہارے ڈیڈی سے ملنے تو آتا ہو گا۔"

"نہیں۔ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" وجدان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "وہ کبھی میرے ڈیڈی سے

ملنے کے لیے نہیں آیا۔"

"اپنے ڈیڈی اور ممی کی باتوں میں تم نے کبھی اس کا نام سنا تھا۔" آفیسر نے پوچھا۔

"ہاں۔" وجدان نے جواب دیا "قتل سے چند روز پہلے ایک رات ڈیڈی جب گھر آئے تو بہت خوف زدہ تھے۔ اس رات میں نے ممی اور ڈیڈی کو باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ ملک نوازش علی ہمیں نہیں بھولا اور دارا یہاں آ گیا ہے۔"

"ملک نوازش علی کون ہے؟" ہومی سائیڈ آفیسر نے پوچھا۔

"یہ بچہ اسے نہیں جانتا۔ میں بعد میں آپ کو بتاؤں گا کہ ملک نوازش علی کون ہے اور دارا کون ہے۔" پرتاب سنگھ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"اس رات تم نے دارا کو دیکھا تھا۔ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" آفیسر نے وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وجدان چند لمحے خاموش رہا پھر وہ دارا کا حلیہ بتانے لگا۔ دارا اور اس کے آدمیوں نے کار سے اتر کر جب ان لوگوں کو گھیرا تھا تو اس وقت وجدان اگرچہ خوف زدہ تھا لیکن دارا کا حلیہ اسے یاد تھا۔ اس خونی کا چہرہ تو اس کے ذہن کی لوح پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" ہومی سائیڈ آفیسر نے اٹھتے ہوئے کہا "اب تم آرام کرو بیٹا اور دل و دماغ پر زیادہ بوجھ مت ڈالو۔ تم جوان اور باہمت لڑکے ہو۔ تم نے جس طرح یہ صدمہ برداشت کیا ہے‘ وہ قابل تعریف ہے۔ ہم تمہارے ڈیڈی اور ممی کے قاتلوں کو ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔ وہ قانون کی گرفت سے بچ کر نہیں جا سکتے۔"

"اگر قانون انہیں نہ ڈھونڈ سکا تو میں اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو تلاش کروں گا۔" وجدان نے کہا۔

ان سب نے چونک کر وجدان کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"دل خوش کیتا ای پتر!" پرتاب سنگھ‘ وجدان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا "اگر قانون تمہارے ماں باپ کے قاتلوں کا سراغ نہ لگا سکا تو تم انہیں تلاش کر کے کیفر کردار کو پہنچاؤ گے۔ ان کی تلاش میں‘ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ وہ یہاں نہ ملے تو ہم پاکستان جائیں گے۔ وہاں بھی نہ ملے تو پوری دنیا میں انہیں تلاش کریں گے۔ ہم انہیں چھوڑیں گے نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

دونوں پولیس آفیسر گھور گھور کر پرتاب سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ رخصت ہونے سے پہلے جب وہ پرتاب سنگھ سے ہاتھ ملا رہے تھے تو انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

"پرتاب سنگھ! تم ہم سے ملنا۔ تم سے بات کرے گا۔"

"ضرور ملوں گا انسپکٹر۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر رحمٰن کچھ دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر وہ بھی چلا گیا۔ پرتاب سنگھ اسے چھوڑنے کے لیے باہر کے دروازے تک آیا تو ایک فوٹو گرافر دروازے پر متعین پولیس والوں سے بحث کر رہا تھا۔ وہ ان سے اندر جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا تاکہ وجدان کی تصویریں کھینچ سکے۔

"کیا بات ہے بھائی۔ کیوں بحث کر رہے ہو ان سے۔" پرتاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"ایک تصویر۔ صرف ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں پرتاب سنگھ جی۔" فوٹو گرافر نے کہا۔ وہ اسٹریٹس ٹائمز... کا فوٹو گرافر تھا اور یقیناً پرتاب سنگھ کو جانتا تھا۔

"ایک کیا۔ تم جتنی تصویریں بنا لو میرے یار۔ پورا رول کھینچ ڈالو۔ میں تیار ہوں۔" پرتاب سنگھ اپنی پگڑی درست کرتا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"آپ کی تصویر نہیں سردار جی۔ اس بچے کی تصویر۔" فوٹو گرافر نے کہا۔

"کیوں۔ میرا چوکھٹا پسند نہیں آیا۔" پرتاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"آپ کی ایک تصویر تو میں چھاپ چکا ہوں سردار جی۔ اگر آپ مجھے اس بچے کی صرف ایک تصویر کھینچنے دیں تو میرا کیریئر بن جائے گا۔" فوٹو گرافر بولا۔

"اور اس بچے کا کیریئر بلکہ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔" پرتاب سنگھ نے اسے گھورتے ہوئے کہا "عقل سے کام لو تم لوگ۔ تم جانتے ہو وہ اس واردات کا واحد چشم دید گواہ ہے اور قاتل اسے نہیں پہچانتے۔ اگر اس کی تصویر اخبار میں چھپ گئی تو وہ آسانی سے شناخت کر لیا جائے گا اور شاید اس کے بعد وہ دو چار دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ جا میرے یار۔ بچ کر جا جا۔ وہاں کسی چٹی چمڑی والی میم کی تصویر کھینچ کر اخبار میں چھاپ دینا۔"

"سردار جی....!"

"نہیں بھائی۔ اب تم یہاں سے چلے ہی جاؤ تو بہتر ہے۔" پرتاب سنگھ نے سرد مہری سے جواب دیا اور دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔

اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے اور گھر میں پرتاب سنگھ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ کمرے میں آ کر کچھ دیر تک وجدان سے باتیں کرتا رہا پھر کچن میں آ کر چائے بنانے لگا۔

پرتاب سنگھ اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی عمر اگرچہ پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن صحت قابل رشک تھی۔ اچھی صحت کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے بہت کم لگتا تھا۔

پرتاب سنگھ جب اپنے ماں باپ کے ساتھ سنگاپور آیا تھا تو اس کی عمر پندرہ سال تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے اپنے باپ کے ساتھ بڑی محنت کی تھی۔ اس کے باپ گورکھ سنگھ کی جالندھر میں کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان تھا۔

لیکن دکان اتنی نہیں چلتی تھی۔ سرمائے کی کمی کی وجہ سے دکان کا سامان پورا نہیں تھا۔ اکثر گاہک مطلوبہ چیز نہ ملنے کے باعث واپس چلے جاتے تھے۔

انہی دنوں گورکھ سنگھ کا ایک رشتے دار دو سال سنگاپور میں رہنے کے بعد واپس آیا تو اسے دیکھ کر گورکھ سنگھ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ شخص جب جالندھر سے گیا تھا تو اس کے پاس صرف تن کے کپڑے تھے اور دو سال بعد واپس آیا تو محلے والے بھی اسے دیکھ کر دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ گئے تھے۔ وہ اتنا پیسہ اور سامان لے کر آیا تھا کہ لوگوں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے صرف دو سال میں کمایا ہے۔ حالانکہ دو سال کے اس عرصے کے دوران میں بھی وہ اپنے گھر والوں کو ہر مہینے پیسے بھیجتا رہتا تھا۔

اسے دیکھ کر گورکھ سنگھ یہی سمجھا کہ سنگاپور میں دھن برستا ہے۔ جالندھر میں رہ کر وہ غربت اور افلاس کی چکی میں پس رہا تھا۔ کہنے کو وہ دکان دار تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ دکان کی کمائی سے اس کا اپنے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ ان کا کنبہ صرف چار افراد پر مشتمل تھا۔ وہ خود، اس کی بیوی اور دو بچے۔ ایک پرتاب سنگھ اور دوسری اس کی بہن سریندر کور۔

گورکھ سنگھ نے بھی سنگاپور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے دکان اور مکان بیچ دیا اور ڈیڑھ ماہ کے اندر اندر سنگاپور پہنچ گیا۔ یہاں آکر اسے پتا چلا کہ سنگاپور میں بھی جائز ذرائع سے دولت کمانا آسان نہیں ہے۔ وہ کچھ عرصہ محنت مزدوری کرتا رہا پھر اسے ایک پرانی ٹیکسی سستے داموں مل گئی اور وہ ٹیکسی چلانے لگا۔

پرتاب سنگھ کو پڑھنے کا شوق تھا۔ اسے تاریخ سے دلچسپی تھی۔ اس خوب صورت جزیرے کی سیر و سیاحت کے دوران میں اسے احساس ہوا کہ جزیرے کی تاریخ پر ایک دلچسپ کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اس نے محکمۂ سیاحت سے رابطہ قائم کیا تو اسے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ محکمۂ سیاحت پہلے ہی ایسی ایک نہیں کئی کتابیں چھاپ چکا ہے مگر پرتاب سنگھ نے ہمت نہیں ہاری اور بالآخر ایک مہربان کے توسط سے سنگاپور کے ایک سپر ڈیلکس ہوٹل سے اس کا معاہدہ ہوگیا۔

ہوٹل نے مختلف ممالک میں اپنی پبلسٹی کے لیے پہلے ہی سے ایک منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اس منصوبے کے تحت مختلف زبانوں میں کئی کتابچے چھپ چکے تھے۔ پرتاب سنگھ سے ہندی زبان میں کتابچہ لکھنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ پرتاب سنگھ ہندی زبان بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یہ مختصر سا کتابچہ لکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس کا لکھا ہوا کتابچہ بہت پسند کیا گیا تھا۔ خوب صورت تصاویر نے اس میں اور بھی خوب صورتی پیدا کردی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اپنے طور پر سنگاپور کی تاریخ مرتب کرنے میں پرتاب سنگھ نے بڑی محنت کی تھی اور اس میں کئی مہینے لگے تھے۔

۶۲۲ مربع کلو میٹر رقبے پر پھیلے ہوئے اس جزیرے کو جنوبی ایشیا کا دروازہ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں ایشیا کی تمام تہذیبیں موجود ہیں۔ یہ چھوٹا سا خوب صورت جزیرہ ملائشیا کے قدموں میں واقع ہے اور ایک تنگ سی سمندری پٹی اسے ملائشیا کے مین لینڈ سے الگ کرتی ہے۔ مڈل ایسٹ، جنوبی ایشیا اور...... چین کے سمندری راستوں کے سنگم پر ہونے کی وجہ سے سیاحت اور تجارت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

سنگاپور میں ہندوستانی باشندوں کی آمد ۱۸۰۰ء میں شروع ہوئی۔ ایک تجارتی معاہدے کے تحت کلکتہ میں 'ایسٹ انڈیا کمپنی' کے برطانوی افسروں نے سنگاپور میں کام لینے کے لیے ہندوستانی قیدیوں کو وہاں بھیجنا شروع کردیا۔ وہاں انہیں جیلوں میں رکھنے کے بجائے مکمل آزادی دے دی گئی اور وہ اپنی پسند کے کاروبار کرنے لگے۔

ہندوستانی باشندے جس علاقے میں آباد ہیں، اسے **لٹل انڈیا** کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ **سیرانگون** روڈ پر واقع ہے۔ یہاں پہنچ کر یہی محسوس ہوتا ہے جیسے بھارت کے کسی قدیم علاقے میں آگئے ہوں۔ یہاں ہر قسم کی دکانیں ہیں اور ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے۔

پرتاب سنگھ کا مرتب کیا ہوا ہندی زبان میں چھپا ہوا یہ کتابچہ اس سپر ڈیلکس ہوٹل کی طرف سے ہندوستان میں تقسیم کیا گیا تھا اور پرتاب سنگھ کو اس کتابچے کی تیاری کے سلسلے میں ایک ہزار ڈالر ملے تھے۔ اس کام کا یہ معاوضہ اگرچہ بہت کم تھا لیکن پرتاب سنگھ نے اسے بھی غنیمت سمجھا تھا۔ اس آمدنی کے علاوہ اسے کتابچے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ سنگاپور کی تاریخ سے آگاہی کے علاوہ اسے اس جزیرے کے چپے چپے سے واقفیت ہوگئی تھی۔

پرتاب سنگھ کالج کے آخری سال میں تھا۔ فائنل **ایگزیمز** ہونے میں تقریباً دو مہینے باقی تھے۔ اس روز وہ کالج سے واپسی پر اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ سارا دن اس کا باپ گورکھ سنگھ ٹیکسی چلاتا تھا رات آٹھ بجے کے بعد پرتاب سنگھ ٹیکسی چلایا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کی رہائش لٹل انڈیا میں واقع ایک تنگ سی گلی کے چھوٹے سے مکان میں تھی۔ ٹیکسی باہر مین روڈ پر کرائے کے ایک گیراج میں کھڑی کی جاتی تھی۔ اس روز گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے گیراج کے سامنے ٹیکسی کھڑی ہوئی نظر آگئی۔ اسے اس وقت ٹیکسی دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ عام طور پر اس کا باپ شام سات بجے واپس آیا کرتا تھا۔

"کی گل ہے باپو۔ آج تم جلدی آگئے۔" اس نے گھر میں داخل ہو کر باپ کا سامنا ہوتے ہی پوچھا۔

"آہو پتر!" گورکھ سنگھ نے جواب دیا "پاکستان سے ایک فیملی سیر و تفریح کے لیے آئی ہے۔ انہوں نے مجھے رات بھر کے لیے بک کرلیا ہے۔ سات بجے جانا ہے۔ میں نے سوچا کہ ٹیکسی کو کچھ آرام کرادوں۔"

"مجھے جانا ہوگا؟" پرتاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ میں ہی جاؤں گا۔" گورکھ سنگھ نے جواب دیا "تمہاری ماں اور بہن کھارا سنگھ کے گھر جارہی ہیں۔ میں انہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔ تم رات دس بجے کے قریب انہیں جا کر لے آنا۔"

"ٹھیک ہے باپو۔ اس دوران میں تھوڑا پڑھ لوں گا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

پانچ دس منٹ بعد پرتاب سنگھ کے گھر والے چلے گئے اور وہ پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا اور پھر اس کے بعد اسے اپنی بہن اور ماں باپ کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ نو بجے کے قریب اسے اطلاع ملی کہ اس کے گھر والوں کو حادثہ پیش آگیا ہے۔ اطلاع لانے والا بھی ایک ٹیکسی ڈرائیور ہی تھا۔ پرتاب سنگھ اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

برکت نام کا وہ ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور مسلمان تھا۔ پرتاب سنگھ بھی اسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ برکت راستے میں اسے بتا رہا تھا کہ گورکھ سنگھ کی ٹیکسی کو حادثہ ڈرائے کاٹ ایونیو پر **ٹینگلن کلب** کے قریب پیش آیا تھا۔ پرتاب سنگھ کے دل میں طرح طرح کے وسوسے آرہے تھے۔ اس کے باپ کا دوست کھارا سنگھ ٹینگلن کلب میں کام کرتا تھا اور اس کی رہائش بھی کلب کے قریب ہی تھی۔ پرتاب سنگھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ ٹیکسی کو حادثہ کلب کی طرف جاتے ہوئے پیش آیا تھا یا واپسی پر۔

"باپو ٹیکسی میں اکیلا تھا یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔" پرتاب سنگھ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے برکت سے پوچھا "میرا مطلب ہے میری بہن اور بے بے بھی گاڑی میں تھیں یا نہیں۔ وہ انہیں کھارا سنگھ کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ اس کے بعد باپو کو کہیں اور جانا تھا۔ پاکستان سے آنے والی کسی فیملی نے رات بھر کے لیے اس کی ٹیکسی بک کروائی تھی۔"

"اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں اور وہ یقیناً تمہاری ماں اور بہن ہوں گی۔" برکت نے ٹیکسی کو ایک دوسری سڑک پر موڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ حادثہ کیسے پیش آیا۔ تم نے دیکھا ہے انہیں۔ وہ کیسے ہیں؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔ اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"ڈرائے کاٹ ایونیو پر ایک موڑ کاٹتے ہوئے پیٹرول کا ایک تیز رفتار ٹینکر ٹیکسی سے ٹکرا گیا تھا۔" برکت نے جواب دیا۔ وہ پوری بات گول کر گیا تھا۔

پرتاب سنگھ کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ ٹیکسی کے پیٹرول ٹینکر سے ٹکرانے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ اپنے سوال کا جواب سننے کی اپنے اندر ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"حوصلہ رکھ یار۔" برکت نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایسے حادثے تو زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ زندگی حادثوں ہی کا تو نام ہے۔"

پرتاب سنگھ خاموش بیٹھا خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔ تقریباً چالیس منٹ بعد وہ ڈرائے کاٹ ایونیو پر پہنچ گئے۔ کچھ آگے جا کر برکت کو ٹیکسی روک لینی پڑی۔ آگے ٹریفک جام تھا اور اس سے کچھ آگے لوگوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔

پرتاب سنگھ ٹیکسی سے اتر کر دوڑنے لگا۔ ہجوم کے قریب پہنچ کر وہ لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا لیکن آگے نکلتے ہی اسے ایک جھٹکے سے رک جانا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

بڑا ہی خوف ناک منظر تھا اس کے سامنے۔ پوری سڑک پر تیل بکھرا ہوا تھا۔ سڑک کے عین وسط میں پیٹرول کا ٹینکر الٹا پڑا تھا۔ ٹینکر جلا ہوا تھا۔ اس کی آگ غالباً کچھ دیر پہلے ہی بجھائی گئی تھی۔ کہیں کہیں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ ٹینکر سے تقریباً دس گز آگے اس کے باپ کی ٹیکسی بھی الٹی پڑی تھی۔ ٹیکسی بھی جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔ پچھلی طرف کا کچھ حصہ جلنے سے محفوظ رہ گیا تھا اور لائسنس پلیٹ کا نمبر صاف نظر آرہا تھا۔ چار پانچ پولیس والے جلی ہوئی ٹیکسی کے قریب کھڑے تھے۔

پولیس والوں نے لوگوں کو دور رکھنے کے لیے سڑک کو گھیر رکھا تھا۔ پرتاب سنگھ لوگوں کو ہٹاتا ہوا جیسے ہی آگے بڑھا، دو پولیس والوں نے اسے روک لیا۔

"اے سردار! رک جاؤ۔ تم آگے نہیں جاسکتے۔ پیچھے ہٹو۔" ایک پولیس والے نے چیخ کر کہا۔

"وہ.... وہ.... ہماری ٹیکسی ہے۔ اس میں میرا باپو اور...." پرتاب سنگھ ہکلا کر رہ گیا۔ وہ جملہ مکمل نہیں کرسکا تھا۔

پولیس والا عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے نہ صرف پرتاب سنگھ کو آگے جانے کی اجازت دے دی بلکہ خود بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ قریب پہنچ کر اس نے ایک آفیسر کو پرتاب سنگھ کے بارے میں بتایا۔

پرتاب سنگھ ایک پولیس آفیسر کو ہٹاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ ٹیکسی بری طرح کچلی ہوئی تھی۔ پیٹرول کا ٹینکر غالباً اسے دور تک گھسیٹتا ہوا لایا تھا۔ ٹیکسی کے دروازے اندر کو دھنس کر پھنس گئے تھے اور ٹیکسی میں تین لاشیں پڑی تھیں۔ جلی ہوئی لاشیں۔ اس کے باپو، ماں اور بہن کی لاشیں جل کر کوئلہ ہو چکی تھیں۔

پرتاب سنگھ اس اندوہناک منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے لہرایا

اور پھر دھڑام سے نیچے گر گیا۔

پرتاب سنگھ کئی روز بعد اپنے آپ کو سنبھال سکا تھا۔ اس کی بہن اور ماں باپ ختم ہو چکے تھے۔ دنیا میں ان کا کوئی بدل نہیں تھا لیکن حکومت کی طرف سے اسے اتنا معاوضہ مل گیا کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا سہارا مل گیا۔ اگر وہ پیٹرول ٹینکر گورنمنٹ کا نہ ہوتا تو اسے کچھ بھی نہ ملتا۔

امتحان سے فارغ ہوتے ہی اس نے کسی کام دھندے کے بارے میں سوچا۔ وہ ٹیکسی چلا سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ ایک نہیں چار ٹیکسیاں خرید سکتا تھا لیکن ٹیکسی چلانے کا خیال اس نے ذہن سے نکال دیا۔ سنگاپور کی تمام مارکیٹوں میں گھومنے اور جائزہ لینے کے بعد اس نے وہ کام شروع کر دیا جس میں نقصان کا اندیشہ کم تھا۔ وہ بڑے بیوپاریوں سے مال لے کر چھوٹے دکان داروں کو سپلائی کرنے لگا۔ اس میں اگرچہ محنت زیادہ تھی لیکن چار پیسے بچ جاتے تھے۔

کئی سال تک پرتاب سنگھ یہی کام کرتا رہا پھر اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خود امپورٹ کا کام شروع کر دیا۔ وہ ہندوستان سے مرچ مسالے منگوا کر سنگاپور میں سپلائی کرنے لگا۔ یہاں مسالا جات کے تین امپورٹر اور بھی تھے مگر پرتاب سنگھ کو اس فیلڈ میں قدم جمانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

لٹل انڈیا والا مکان چھوڑ کر وہ فورٹ کیننگ روڈ والے مکان میں منتقل ہو گیا۔ لٹل انڈیا والا مکان اس کے باپ نے کرائے پر لیا تھا۔ ماں باپ کے.... انتقال کے بعد جب اس کے پاس پیسے آئے تو اس نے وہ مکان خرید لیا اور اب جبکہ وہ فورٹ کیننگ روڈ والے مکان میں منتقل ہو چکا تھا تو اس نے وہ مکان بھی نہیں چھوڑا تھا۔

آج سے بارہ سال پہلے اس کی ملاقات عابد علی سے ہوئی تھی۔ عابد علی اور اس کی بیوی شگفتہ چند روز پہلے ہی پاکستان سے آئے تھے اور لٹل انڈیا میں واقع ایک گھٹیا سے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی روز ان کا سامان چوری ہو گیا تھا۔ شگفتہ کی گود میں دو ماہ کا بچہ تھا اور وہ دونوں میاں بیوی کام کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔

پرتاب سنگھ کے پاس بھی عابد علی کام کی تلاش ہی میں آیا تھا۔ اس وقت شگفتہ بھی اس کے ساتھ تھی جس نے دو ماہ کے بچے کو اپنے سینے سے لپٹا رکھا تھا۔ پرتاب سنگھ کو نجانے عابد علی میں ایسی کیا بات نظر آئی کہ اس نے عابد علی کو نہ صرف اپنے پاس ملازم رکھ لیا بلکہ رہائش کے لیے اپنا لٹل انڈیا والا مکان بھی دے دیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک مہینے کا راشن بھی ڈلوا دیا اور دو مہینے کی تنخواہ بھی ایڈوانس دے دی۔

چھ مہینے بعد پرتاب سنگھ نے عابد علی کو سنٹر پوائنٹ میں ملازمت دلوا دی۔ سنٹر پوائنٹ سنگاپور کا سب سے بڑا شاپنگ آرکیڈ تھا۔ یہاں تنخواہ بھی زیادہ تھی اور کمیشن بھی اچھا خاصا مل جاتا تھا۔

پرتاب سنگھ اور عابد علی دوستی کے گہرے رشتے میں منسلک ہو چکے تھے۔ وہ شگفتہ کو پابھو کہتا۔ شگفتہ بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ لگتا تھا جیسے پرتاب سنگھ بھی اسی مختصر سے کنبے کا ایک رکن ہو۔

وجدان، پرتاب سنگھ کی گود میں پلا بڑھا تھا۔ وہ اسے چاچا کہتا تو پرتاب سنگھ جھوم اٹھتا۔ عابد علی نے چند سال نوکری کی۔ اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ اس نے نوکری چھوڑ کر چائنا ٹاؤن میں جنرل اسٹور کھول لیا۔ اس سے پہلے اس نے پرتاب سنگھ کے پڑوس میں وہ مکان خرید لیا تھا۔ مکان کی خرید اور اسٹور کھولنے کے سلسلے میں پرتاب سنگھ نے عابد علی کی مالی مدد بھی کی تھی۔

پرتاب سنگھ کی شادی چھ سال پہلے ہوئی تھی لیکن شادی کے ایک سال بعد زچگی کے دوران میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے جس بچی کو جنم دیا تھا، وہ بھی زندہ نہیں بچ سکی تھی۔ اس کے بعد پرتاب سنگھ کے کئی دوستوں نے اسے دوسری شادی کا مشورہ دیا تھا لیکن پرتاب سنگھ نے اب شادی کا خیال ذہن سے نکال دیا تھا۔ اس موضوع پر ایک روز عابد علی سے بھی بڑی گرما گرم بحث ہوئی تھی لیکن پرتاب سنگھ نے دوسری شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔

ان سب کی زندگی بڑے سکون سے گزر رہی تھی اور پھر اچانک ہی عابد علی کی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ دارا کو دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ پرتاب سنگھ نے اگرچہ اسے تسلی دی تھی کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی حفاظت کا بھی معقول انتظام کر دیا گیا تھا لیکن انہیں کیا معلوم کہ موت گھات لگائے بیٹھی ہے اور پھر موقع پاتے ہی موت ان پر جھپٹ پڑی تھی۔

وجدان کے ساتھ جو کچھ بیت رہی تھی، پرتاب سنگھ کو اس کا احساس تھا۔ وہ بھی اس کرب سے گزر چکا تھا۔ وہ بھی چشم زدن میں اپنے ماں باپ سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے یہ صدمہ برداشت کیا تھا۔ اس نے اپنی بہن اور ماں باپ کی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں۔ انہیں چیختے اور تڑپتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ وجدان نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو چیختے، تڑپتے اور مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بڑا باہمت لڑکا تھا جو یہ سب کچھ سہہ گیا تھا۔ ماں باپ کے معاملے میں دونوں بدقسمت ثابت ہوئے تھے۔

پرتاب سنگھ اور وجدان میں یہ فرق تھا کہ پرتاب سنگھ کے ماں باپ ایک حادثے کا شکار ہوئے تھے اور حکومت نے اسے معاوضہ بھی دے دیا تھا جس سے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ جبکہ وجدان ایک مختلف صورتِ حال کا شکار تھا۔ اس کے ماں باپ قتل ہوئے تھے اور وہ اس دُہرے قتل کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے قاتلوں کو دیکھا تھا۔ انہیں پہچان سکتا تھا۔ قاتلوں کو بھی احساس تھا کہ وجدان انہیں پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتا ہے۔ وہ یقیناً اس کی تاک میں ہوں گے۔ اس طرح وجدان کی زندگی کو بھی خطرہ تھا۔ اگرچہ اس کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا تھا لیکن پرتاب سنگھ جانتا تھا کہ اس کے دشمن موقع ملتے ہی اس پر وار کریں گے۔

پرتاب سنگھ گھر میں بھی سائے کی طرح وجدان کے ساتھ لگا رہتا۔ ایک لمحے کو بھی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ وہ اگر ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا تو بھی پرتاب سنگھ اس کے پیچھے پہنچ جاتا۔ باہر دو مسلح پولیس والے چوبیس گھنٹے موجود رہتے تھے۔ پرتاب کے اپنے دو گن مین تھے جو ہر وقت مکان کے آس پاس ٹہلتے رہتے تھے اور گلی سے گزرنے والے ہر شخص پر نگاہ رکھتے تھے۔

پرتاب سنگھ کو اپنے کاروبار کی فکر نہیں تھی۔ کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے اس کے قابلِ اعتماد ملازمین موجود تھے۔ وہ خود بھی ٹیلی فون پر اپنی پارٹیوں سے بات کرتا رہتا تھا۔ اسے صرف وجدان کی فکر تھی۔ وہ اسے نہ صرف دشمنوں سے بچانا چاہتا تھا بلکہ اس کی پرورش اس انداز سے کرنا چاہتا تھا کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام لے سکے اور اپنے دشمنوں کو خاک و خون میں لوٹا سکے۔

پرتاب سنگھ نے کالج کی تعلیم کے دوران میں مارشل آرٹ سیکھا تھا۔ وہ بلیک بیلٹ تھا اور مزید آگے جانا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں اس کے ماں باپ کو وہ حادثہ پیش آ گیا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے جتن کرنے لگا۔ مارشل آرٹ سے اس کی دلچسپی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن اب اس کے پاس وقت نہیں تھا اور اب اس صورتِ حال میں ایک بار پھر اس نے دل میں مارشل آرٹ کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ وہ وجدان کو بھی مارشل آرٹ کا ماہر بنانا چاہتا تھا تاکہ آئندہ زندگی میں اپنا دفاع کر سکے۔

اس شام وہ کئی روز بعد وجدان کو ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلا۔ دونوں پولیس کانسٹیبل بھی ان کے ساتھ تھے اور پرتاب سنگھ کے اپنے باڈی گارڈ بھی۔ اس رات پرتاب سنگھ نے سنچری پارک شیرٹن ہوٹل میں ڈنر کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ ہوٹل اس کے مکان سے خاصا دور تھا اور پرتاب سنگھ نے اس کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا۔ وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ کسی کی نظروں میں آتے ہیں یا نہیں۔

ایک کار میں پرتاب سنگھ اور وجدان سوار تھے۔ پچھلی سیٹ پر دونوں کانسٹیبل بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری گاڑی پر تاب سنگھ کے دونوں باڈی گارڈ تھے۔ دونوں گاڑیاں فورٹ کیننگ روڈ سے نکل کر کلی مینسی ایونیو پر آ گئیں اور تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد پیٹانگ روڈ پر مڑ گئیں۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان تقریباً تین گز کا فاصلہ تھا۔

اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے پرتاب سنگھ کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ سامنے لگے ہوئے آئینے میں پیچھے آنے والی باڈی گارڈز کی گاڑی پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

کار سمرسٹ روڈ پر امریکن ایکسپریس سنٹر کے سامنے سے گزرتی ہوئی آرچرڈ بلے وارڈ کی طرف مڑ گئی۔ اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اس کشادہ سڑک پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ پرتاب سنگھ بڑے محتاط انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔

ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد کار ٹالمن سن روڈ پر مڑ گئی اور کچھ آگے جا کر ایک اور موڑ کاٹتے ہوئے سینٹ مارٹن ڈرائیو کی طرف گھوم گئی۔ سنچری پارک شیرٹن ہوٹل اس سڑک کے اختتام پر تھا۔

وسیع و عریض پارکنگ لاٹ پر گاڑی روکنے کے بعد وہ نیچے اتر آئے۔ دوسری گاڑی بھی ان سے کچھ فاصلے پر رک گئی تھی۔ دونوں پولیس والے باہر ہی رک گئے لیکن پرتاب کے باڈی گارڈز جو سادہ لباس میں تھے، ان کے ساتھ اندر آ گئے۔ پرتاب نے پہلے ہی میز بک کروا رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے ہیڈ ویٹر نے انہیں ان کی میز پر پہنچا دیا۔

وجدان اپنے ماں باپ کے ساتھ اکثر ہوٹلوں میں جاتا رہا تھا لیکن یہاں وہ پہلی بار آیا تھا۔ اس کے لیے ہر چیز نئی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کی میز پر کھانا سرو کر دیا گیا۔ کھانا سرو کرنے والی حسین ویٹرس نے بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا اور اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی کاٹ لی۔

کھانے کے بعد وہ تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر ہوٹل کے شاپنگ آرکیڈ میں گھومنے لگے۔ ایک گفٹ شاپ سے پرتاب سنگھ نے وجدان کو دو تین چیزیں خرید کر دیں اور پھر ہوٹل سے باہر آ گئے۔

دونوں کاریں ہوٹل کی حدود سے نکل کر سڑک پر آ گئیں۔ سینٹ مارٹن ڈرائیو کے اختتام پر پرتاب سنگھ نے کار آرچرڈ بلے وارڈ کے بجائے ٹینگلن روڈ پر موڑ لی اور کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ آرچرڈ روڈ پر آ گئے۔

یہ شہر کی سب سے بڑی اور بارونق سڑک تھی۔ تمام بڑے بڑے ہوٹل، شاپنگ سینٹرز، بڑی بڑی عمارتیں، نائٹ کلب اور کاروباری دفاتر اس سڑک پر اور اس کے آس پاس واقع تھے۔ یہ علاقہ شہر کا دل کہلاتا تھا۔ آٹھ بجے تک بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز کھلے رہتے تھے۔ دوسری دکانیں اور ہوٹل وغیرہ دیر تک کھلے رہتے تھے اور اسی طرح تقریباً آدھی رات تک یہاں رونق رہتی تھی۔

لیڈو تھیٹر سے ذرا پہلے ایک ٹریفک سگنل پر پرتاب سنگھ کو گاڑی روک لینی پڑی۔ اس سے آگے دو گاڑیاں اور تھیں۔ پہلے ہی گاڑیوں کی قطار لگ گئی تھی۔ وجدان اپنی سیٹ پر بیٹھا اِدھر اُدھر

دیکھ رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل کار کے قریب ہی آکر رکی۔ موٹر سائیکل پر دو آدمی سوار تھے۔ وجدان ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں چینی تھے۔ آگے والے آدمی کے ہاتھ موٹر سائیکل کے ہینڈل پر جے ہوئے تھے اور وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ جیسے ہی وجدان کی نظروں میں آیا' وہ چیخ اٹھا۔

"چاچا.... یہ ہے وہ غنڈا۔ اس نے مارا تھا میری ممی کو۔"

پرتاب سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ موٹر سائیکل سوار چینی نے بھی وجدان کی چیخ کی آواز سن لی تھی۔ اس نے وجدان کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ سیدھا ہوگیا۔ موٹر سائیکل اچھل کر آگے بڑھ گئی۔

پرتاب سنگھ اور پولیس والے بڑی پھرتی سے کار سے اتر آئے لیکن موٹر سائیکل چوراہے پر پہنچ کر بڑی تیزی سے سگنل توڑتی ہوئی سامنے والے ٹریفک کے ہجوم میں غائب ہو چکی تھی۔

پرتاب سنگھ اور دونوں کانسٹیبل دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ پرتاب نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کر کلچ پر پیر رکھ دیا۔ سگنل ایک منٹ بعد کھلا تھا۔ آگے والی دونوں گاڑیاں جیسے ہی حرکت میں آئیں' پرتاب سنگھ نے اسٹیئرنگ موڑتے ہوئے کلچ چھوڑ دیا۔ گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے اچھل کر آگے بڑھی۔ پرتاب سنگھ نے ایکسیلریٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا۔ گاڑی طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی۔

اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا پرتاب سنگھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اسے اس موٹر سائیکل کی تلاش تھی۔ کراؤن پرنس ہوٹل کے موڑ پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک لی اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیڈو تھیٹر سے کراؤن پرنس ہوٹل تک راستے میں دائیں بائیں کئی چھوٹی بڑی سڑکیں پھوٹتی تھیں۔ وہ موٹر سائیکل نجانے کس طرف نکل گئی ہوگی۔

"نکل گئے۔" پرتاب سنگھ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے حملہ کیا تھا؟"

"ہاں چاچا۔" وجدان بولا "موٹر سائیکل پر جو شخص آگے بیٹھا ہوا تھا' اس نے ممی کو قتل کیا تھا۔ دوسرے کو میں نہیں جانتا لیکن ان چہروں کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتا جنھوں نے میرے ماں باپ کو مارا ہے۔"

"فکر نہ کر پتر۔" پرتاب سنگھ نے کہا "یہ لوگ بچ کر نہیں جائیں گے۔ سوں رب دی میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میرا خیال ہے کہ وہ ہمارا پیچھا نہیں کررہے تھے محض اتفاق سے سامنے آگئے تھے۔ تم انھیں پہچان کر چیخے تو وہ بدحواس ہوکر بھاگ گئے۔"

اسی دوران میں دوسری گاڑی بھی ان کے پیچھے آکر رک گئی۔

سوتر سنگھ نامی گارڈ اپنی گاڑی سے اتر کر ان کے قریب آگیا اور پرتاب سنگھ کی طرف کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولا۔

"کیا گل ہے جی۔ آپ اتنی تیزی سے وہاں سے کیوں نٹھے تھے۔ ہم تو پریشان ہوگئے تھے۔"

"ایک بندہ نظر آگیا تھا۔" پرتاب سنگھ نے کہا "وجدان نے اسے پہچان لیا تھا۔ اس نے چیخ کر مجھے اس کے بارے میں بتایا تو وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ تو اپنی پھٹ پھٹی نکال لے گیا لیکن میرے آگے دو گاڑیاں تھیں۔ مجھے سگنل کھلنے کا انتظار کرنا پڑا۔ سگنل کھلتے ہی میں نے گاڑی دوڑا دی لیکن وہ پتا نہیں کہاں غائب ہوگئے۔"

سوتر سنگھ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک موٹر سائیکل وہاں آکر رکی۔ وہ پولیس کا سارجنٹ تھا۔ اسے دیکھ کر پرتاب سنگھ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اسے یاد آگیا کہ سڑک پر اس طرح گاڑی کھڑی کرنا خلافِ قانون ہے۔ اس نے جلدی سے انجن اسٹارٹ کردیا لیکن اس دوران میں سارجنٹ موٹر سائیکل سے اتر کر اس کے قریب آچکا تھا۔ وہ چینی تھا۔

"تم کو معلوم اس طرح گاڑی کھڑی کرنا جرم ہے!"

"معلوم جی معلوم۔" پرتاب سنگھ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "غلطی ہوگئی سرکار۔ اس مرتبہ معاف کردو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"معاف کردیا۔" چینی سارجنٹ بولا "ہم تم کو وارننگ دیتا۔ آئندہ ایسا غلطی مت کرنا مانگتا۔"

"نہیں مانگتا سرکار۔" پرتاب سنگھ نے کہتے ہوئے گاڑی کو گیئر میں ڈال دیا اور اسے ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ اس دوران میں سوتر سنگھ بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی گاڑی بھی حرکت میں آچکی تھی۔

پرتاب سنگھ کی کار کی رفتار ہلکی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ شاید وہ موٹر سائیکل سوار کہیں نظر آجائیں مگر وہ بھی اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ پہچان لیے جانے کے بعد بھی اسی علاقے میں گھومتے رہتے۔

گھر پہنچنے کے بعد پرتاب سنگھ دیر تک سوچتا رہا کہ عابد علی اور شگفتہ کے قاتلوں نے ابھی تک شاید یہ بات نہیں سوچی تھی کہ اس واردات میں زندہ بچ جانے والا بچہ ان کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے لیکن اب جبکہ وجدان نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا تھا' انہیں خطرے کا احساس ہوجائے گا اور وہ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔

وجدان کے لیے اب خطرہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

ماں باپ کے قتل کے بعد سے وجدان اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ وہ پرتاب سنگھ کے گھر پر ہی رہ رہا تھا لیکن آج اچانک ہی اسے گھر کی یاد آگئی۔

"چاچا۔" وہ پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے اپنا گھر یاد آرہا ہے۔ لے چلو نا مجھے۔"

"میں نے تمہارے مکان کی چابیاں پتا نہیں کہاں رکھ دی ہیں پتر۔" پرتاب سنگھ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "میں صبح تمہیں لے چلوں گا۔"

چابیاں پرتاب سنگھ کے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ گھر بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ساتھ والا دروازہ تو تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر ٹال دیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی ایک ایک چیز کو دیکھ کر وجدان کو اپنے ماں باپ کی یاد آجائے گی تو وہ رونا شروع کردے گا۔ اس کی طبیعت خراب ہوجائے گی اور اس کی رات بے چینی میں گزرے گی۔

وہ وجدان کو بہلانے کے لیے دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس چینی کے بارے میں بھی اس نے کئی سوال کیے تھے۔

"اس کی شکل میں کبھی نہیں بھول سکتا چاچا۔" وجدان نے اس کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "اسے تو میں جہاں بھی دیکھ لوں گا پہچان لوں گا اور ہاں.... مجھے یاد آرہا ہے کہ دارا نے اسے نام سے بھی مخاطب کیا تھا۔ وہ نام کیا تھا...." وہ خاموش ہوکر سوچنے لگا لیکن نام اسے یاد نہیں آیا "ابھی یاد نہیں آرہا۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی "لیکن یاد آجائے گا۔ میں رات بھر سوچوں گا۔"

"مجھے یقین ہے کہ دارا نے تمہارے ماں باپ پر حملہ کرانے کے لیے کرائے کے قاتلوں کی خدمات حاصل کی ہوں گی اور وہ بھی ان میں سے ایک ہوگا۔ اگر اس کا نام معلوم ہوجائے تو اسے آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ زیرِ زمین دنیا میں میرے بھی کچھ جاننے والے ہیں۔ کسی نہ کسی سے اس کا پتا چل جائے گا۔"

"فکر مت کرو چاچا۔" وجدان نے پُراعتماد لہجے میں کہا "میں نے اسے صورت سے پہچان لیا ہے تو اس کا نام بھی مجھے یاد آجائے گا۔"

"اچھا پتر۔" پرتاب سنگھ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اب تم سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

"میں کب تک گھر میں بند رہوں گا چاچا۔" وجدان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرے اسکول کا کیا ہوگا۔ میری پڑھائی کا حرج ہورہا ہے۔"

"ابھی چند روز تک تو تمہیں اسکول سے چھٹی کرنی پڑے گی۔ جب تک یہ لوگ پکڑے نہیں جاتے' آزادی سے گھومنا پھرنا تمہارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ جہاں تک تمہاری پڑھائی کا تعلق ہے تو ایسا کرو۔ کل سے میں تمہیں پڑھا دیا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے چاچا لیکن اگر وہ لوگ نہ پکڑے گئے تو کیا میں کبھی گھر سے نہیں نکل سکوں گا؟" وجدان نے کہا۔

"وہ لوگ پکڑے جائیں گے۔ ضرور پکڑے جائیں گے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "اگر قانون ان کا سراغ نہ لگا سکا تو میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ تمہارے ماں باپ کے قاتلوں کی تلاش کو میں نے اپنا مشن بنالیا ہے۔ جب تک ان سے انتقام نہیں لے لوں گا' مجھے بھی چین نہیں آئے گا۔ تم فکر نہ کر۔ میں زندہ ہوں۔ نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچنے دوں گا اور نہ ہی عابد علی اور پابھو شگفتہ کے قاتلوں کو معاف کروں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا چاچا۔" وجدان نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"ہاں پتر۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "انتقام ہم دونوں کا مشن ہے اور ہم اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچائیں گے۔"

وجدان جواب میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے چھت کو گھورتا رہا۔ پرتاب سنگھ بھی خاموش رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وجدان تو سوگیا مگر پرتاب سنگھ جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو وجدان پہلے ہی جاگ چکا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ناشتے سے نمٹ کر پرتاب سنگھ نے چابیاں اٹھائیں اور وجدان کو لے کر مکان سے باہر آگیا۔ کچھ دیر تک وہ گلی میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں گلی میں رہنے والا کیقباد نامی ایک پارسی اپنے گھر سے نکل کر وہاں آگیا۔ وہ لوگ کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے پھر کیقباد کے جانے کے بعد پرتاب سنگھ نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور عابد علی کے مکان کے گیٹ کا تالا کھولنے لگا۔

دو تین منٹ بعد وہ مکان کے اندر موجود تھے۔ مکان کا دروازہ کئی روز بعد کھلا تھا۔ ہر چیز گرد آلود تھی۔ اسے یاد تھا شگفتہ صفائی کا بڑا خیال رکھتی تھی۔ گھر کی ہر چیز سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی اور صاف ستھری نظر آتی مگر اب ہر چیز پر گرد جمی ہوئی تھی۔ پرتاب سنگھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سسکیوں کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وجدان لاؤنج میں نظر نہیں آرہا تھا۔ سسکیوں کی آواز بیڈ روم سے آرہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا' بیڈ روم میں داخل ہوگیا۔

وجدان آتش دان کے سامنے کھڑا تھا۔ کارنس پر اسٹین لیس اسٹیل کے خوب صورت فریم میں عابد علی اور شگفتہ کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ شگفتہ کی گود میں وجدان تھا۔ جس وقت یہ تصویر کھینچی گئی تھی اس وقت وجدان کی عمر ایک سال یا اس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

وجدان نے دونوں ہاتھوں سے فریم کو تھام رکھا تھا اور تصویر کو دیکھ کر سسکیاں بھر رہا تھا۔ پرتاب سنگھ نے اس کے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔

"وجدان پتر!" وہ نرم لہجے میں بولا "مجھے معلوم ہے تمہارے دل پر گہرے زخم لگے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

میں نے بھی اپنے ماں باپ کی جلی ہوئی لاشیں دیکھی تھیں تو اپنے حواس کھو بیٹھا تھا لیکن تم نے جس حوصلے سے یہ صدمہ جھیلا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اب صبر کرو پتر! جانے والے واپس نہیں آتے مگر اپنی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔ تم جس اذیت اور کرب سے گزر رہے ہو' اس کا مجھے اندازہ ہے مگر اب صبر کرو۔ حوصلہ اور صبر ہی اس دکھ کا علاج ہے۔ حوصلے سے کام لو پتر!"

"اتنا حوصلہ کہاں سے لاؤں چاچا۔" وجدان کہتے ہوئے اس سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

پرتاب سنگھ اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ کتنی دیر بعد وجدان اپنی کیفیت پر قابو پاسکا تھا۔ وجدان پورے گھر میں گھوم رہا تھا اور ایک ایک چیز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پرتاب سنگھ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک بار پھر بیڈ روم میں آگئے۔

بیڈ روم میں ایک دیوار کے ساتھ تقریباً چھ فٹ چوڑی اور آٹھ فٹ اونچی لکڑی کی الماری بنی ہوئی تھی۔ جس کے تین دروازے تھے۔ ایک دروازے میں چابیوں کا گچھا بھی لٹکا ہوا تھا۔ وجدان نے چابی گھما کر وہ دروازہ کھول دیا۔ الماری کے اس حصے میں شگفتہ کے کپڑے ہینگروں پر ٹنگے ہوئے تھے۔ زیادہ تر ساریاں تھیں۔ نچلے حصے میں شیلفوں پر تہ شدہ کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دروازہ بند کرکے الماری کا دوسرا حصہ کھول لیا۔ اس الماری میں عابد علی کے کپڑے تھے۔ وجدان کچھ دیر ان کپڑوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے الماری کا تیسرا دروازہ کھول لیا۔

الماری کے اس حصے میں اوپر نیچے کئی شیلف بنے ہوئے تھے۔ جس میں فائلیں اور رجسٹر وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ سب سے نیچے ایک دراز تھی۔ وجدان نے جھک کر وہ دراز کھول لی۔ پرتاب سنگھ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وجدان جب سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر پرتاب سنگھ چونک گیا۔

"ارے بیٹا! یہ کیا۔ لاؤ یہ پستول مجھے دے دو۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"نہیں چاچا۔" وجدان نے پستول پر مضبوطی سے گرفت جماتے ہوئے کہا "یہ پستول میرے پاس ہی رہے گا۔ میں اس پستول کی گولیوں سے ان لوگوں کے سینے چھلنی کروں گا جنہوں نے میرے ماں باپ کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"

پرتاب سنگھ کو یوں لگا جیسے وجدان ایک دم جوان ہوگیا ہو۔

"نہیں پتر!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ابھی یہ پستول تمہارے پاس رہنا مناسب نہیں ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں خود پستول تمہارے ہاتھ میں دوں گا۔ لاؤ۔ اس وقت یہ مجھے دے دو۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"وعدہ چاچا؟" وجدان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ وعدہ۔" پرتاب سنگھ مسکرایا۔

وجدان نے پستول اس کے ہاتھ میں دے دیا اور مڑ کر دراز میں رکھی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پرتاب سنگھ قریب ہی کھڑا تھا۔ اس دراز میں اور بہت سی دوسری چیزوں کے علاوہ نیچے ایک پرانی سی ڈائری بھی رکھی ہوئی تھی۔ وجدان نے وہ ڈائری نکال لی اور وہ اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ پرتاب سنگھ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ڈائری لے لی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

ڈائری بہت پرانی تھی۔ اس کے کاغذ پیلے پڑ چکے تھے۔ پہلے صفحے پر عابد علی کا نام اور اس کے ساتھ لکھی ہوئی تاریخ دیکھ کر پرتاب سنگھ چونک گیا۔ بارہ سال پہلے کی تاریخ تھی۔ پرتاب سنگھ کا خیال تھا کہ عابد علی چونکہ کاروباری آدمی تھا اس لیے اس ڈائری میں بھی حساب کتاب ہی ہوگا لیکن جب اس نے اوراق پلٹے تو اسے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ اس ڈائری میں حساب کتاب نہیں تھا بلکہ مختلف تاریخوں میں یادداشتیں لکھی ہوئی تھیں۔

"اس ڈائری میں تمہارے ڈیڈی کی یادداشتیں ہیں۔" پرتاب سنگھ بولا "اگر تم اجازت دو تو میں اسے اپنے پاس رکھ لوں۔ پڑھنے کے بعد تمہیں لوٹا دوں گا۔"

"مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے چاچا۔" وجدان نے کہا۔

پرتاب سنگھ نے ڈائری بند کرکے بغل میں دبالی اور وجدان کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر مکان میں گھومنے لگا۔ وہ تین چار گھنٹوں تک اس مکان میں رہے اور جب باہر نکلنے لگے تو وجدان نے اپنا بستہ بھی اٹھا لیا تھا۔

اپنے گھر میں آکر پرتاب سنگھ نے ڈائری میز کی دراز میں رکھ دی اور سوتر سنگھ کو بلا کر دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔ گھر میں صرف صبح کا ناشتا تیار ہوتا تھا یا چائے بنتی تھی۔ کھانا ہوٹل ہی سے آتا تھا۔

ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ انہوں نے کھانا کھا لیا۔ کھانے کے بعد وجدان قالین پر اپنی کتابیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور پرتاب سنگھ ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب پرتاب سنگھ' وجدان والے کمرے میں آیا تو وہ قالین پر سو رہا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف کتابیں اور کاپیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

پرتاب سنگھ کو ایک ضروری کام سے باہر جانا تھا۔ اس نے سوتر سنگھ کو بلا کر گھر میں بٹھا دیا۔ کچھ ہدایات دیں اور باہر چلا گیا۔

اس کا اپنا دفتر لٹل انڈیا میں سیران گون روڈ کی بغل میں واقع ایک تنگ سی گلی میں تھا۔ اس علاقے میں آکر یہی لگتا تھا جیسے کوئی ہندوستان کے قدیم علاقے میں آگیا ہو۔ تنگ اور پُرہجوم گلیاں' سامان سے بھری ہوئی دکانیں۔ پرتاب سنگھ کا دفتر جس گلی میں تھا' وہ بھی خاصی تنگ تھی۔ اس طرف زیادہ تر مرچ مسالوں اور

کریانے کی دکانیں تھیں۔ ایک خستہ سے دو منزلہ مکان کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں۔ پہلی منزل پر پرتاب سنگھ کا دفتر تھا اور اس سے اوپر والی منزل پر ایک ہندو فیملی رہائش پذیر تھی۔

پرتاب سنگھ کئی روز بعد اپنے دفتر آیا تھا۔ وہ کام میں اس قدر مصروف ہوا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔ جب سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو دیوار گیر گھڑی آٹھ بجا رہی تھی۔ وہ کھاتے بند کرتا ہوا ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"اچھا بھئی اوتار سنگھ۔" وہ اپنے منشی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "صبح سب سے پہلے تم کل آنے والا کنسائنمنٹ کلیئر کروا لینا۔ میں دوپہر کے بعد چکر لگاؤں گا۔"

وہ دفتر سے نکل کر تنگ سی گلیوں میں چلتا ہوا سیران گون روڈ پر اس پارکنگ لاٹ پر آگیا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک آواز سن کر اچھل پڑا۔

"یہاں سے تم سیدھا چائنا ٹاؤن چلو گے۔ نہیں.... اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے بیٹھے رہو اور گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

پرتاب سنگھ کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

"کون ہو بھئی تم؟ تم میری گاڑی میں...."

"بولو مت۔ گاڑی چلاؤ۔" غراتی ہوئی آواز میں کہا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بات اگرچہ اردو میں کر رہا تھا لیکن لہجہ چینی تھا۔

پرتاب سنگھ نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر آتے ہوئے اس نے سامنے لگے ہوئے آئینے کا زاویہ درست کرنے کی کوشش کی مگر پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے پستول کی نال اس کے ہاتھ پر ماری۔ پرتاب سنگھ کے منہ سے اوہ کی آواز نکلی اور وہ زور زور سے ہاتھ جھٹکنے لگا۔

"آرام سے بیٹھا رہ جانور دیا پترا۔" وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بولا۔

"گاڑی چلاتے رہو۔ خاموشی سے۔" وہ شخص غرایا اور اس کے ساتھ ہی پستول کی نال پرتاب سنگھ کی گردن سے لگ گئی۔

پرتاب سنگھ ایک بار پھر گہرا سانس لے کر رہ گیا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ سڑکوں پر ٹریفک تھا۔ پرتاب سنگھ کار ڈرائیو کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کر رہا تھا کہ اس شخص کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کرسکے لیکن کوئی ایسا موقع نہیں مل سکا۔

چائنا ٹاؤن کی طرف آنے کے لیے اسے ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ کار اس وقت کیرن ہل روڈ پر تھی۔ یہ زیادہ تر رہائشی علاقہ تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ پرتاب سنگھ نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا وہ شخص آگے کو جھکا ہوا تھا اور پستول کی نال اس نے پرتاب سنگھ کی گردن سے لگا رکھی تھی۔

"اے۔ کیا کرتا ہے۔ گاڑی آہستہ چلاؤ۔" وہ شخص غرایا۔

رفتار بتانے والی سوئی اس وقت پچپن اور ساٹھ کے درمیان تھرک رہی تھی۔ پرتاب سنگھ نے دونوں ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جما دیے اور پوری قوت سے بریک لگا دیا۔

بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز فضا میں گونجی۔ کار سڑک پر لٹو کی طرح گھوم گئی۔ زوردار جھٹکا لگنے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا وہ شخص اچھل کر اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرایا۔

پرتاب سنگھ بڑی پھرتی سے اپنی سیٹ پر گھوم گیا۔ اس نے گھومتے ہی اس شخص کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس شخص کا ہاتھ دروازے پر لگا۔ اتفاق سے اس کا ہاتھ ہینڈل پر پڑا تھا۔ اس نے دو انگلیاں اندر ڈال کر ہینڈل اٹھا دیا۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ وہ شخص مچھلی کی طرح پرتاب سنگھ کے ہاتھوں سے پھسل کر دروازے سے باہر گرا۔ پرتاب سنگھ تیزی سے پلٹا۔ اس نے بھی دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔

زمین پر گرا ہوا وہ شخص سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے پرتاب سنگھ کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا تو فائر کردیا۔ گولی پرتاب سنگھ کی پگڑی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ پرتاب سنگھ بڑی تیزی سے نیچے جھکا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے لات گھما دی تھی۔ پیر کی ٹھوکر اس شخص کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا دور جا گرا۔ پرتاب سنگھ نے دوسری ٹھوکر مارنا چاہی مگر اس شخص نے دونوں ہاتھوں سے اس کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ پرتاب سنگھ لڑکھڑاتا ہوا گرا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا' اس شخص نے پرتاب سنگھ پر چھلانگ لگا دی۔

وہ شخص اگرچہ موبلا پتلا تھا مگر اس میں بلا کی طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پرتاب سنگھ کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ پرتاب سنگھ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا گلا کسی آہنی شکنجے میں پھنس گیا ہو۔ اسے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ اس شخص کی کلائیوں پر جما دیے اور اپنے گلے پر سے گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ایک ٹانگ موڑ کر پیر اس شخص کے پیٹ پر رکھا اور پوری قوت سے اسے اوپر اٹھانے لگا۔ وہ شخص پرتاب سنگھ کے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل پیچھے گرا۔

پرتاب سنگھ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس شخص نے بھی اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔ پرتاب سنگھ نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر کھڑی ہتھیلی سے وار کیا۔ چوٹ اس شخص کے کندھے سے ذرا نیچے بازو پر لگی۔ پرتاب سنگھ نے دوسرا وار کیا مگر اس شخص نے بڑی تیزی سے ایک ہاتھ سے بلاک کیا اور دوسرے ہاتھ سے وار کردیا۔ کھڑی ہتھیلی کا وار پرتاب سنگھ کے بائیں کندھے پر لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔

تکلیف سے وہ نیچے جھک گیا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔

وہ شخص بھی سنبھل چکا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے نکال لیے تھے۔ اس کے انداز کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بھی مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔ وہ پرتاب سنگھ پر حملے کے لیے پر تول رہا تھا لیکن پرتاب سنگھ نے موقع دیے بغیر اس پر حملہ کردیا۔ اس نے دائیں ٹانگ کو اس طرح حرکت دی تھی جیسے اسٹریٹ کک لگانا چاہتا ہو۔ دوسرے شخص نے اسٹریٹ کک سے بچنے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کی مگر پرتاب سنگھ اسٹریٹ کک لگانے کے بجائے بڑی تیزی سے اپنی جگہ پر گھوم گیا۔ اس کی اسپن کک اس شخص کی پسلیوں پر لگی۔ وہ بلبلا کر لڑکھڑا گیا۔ پرتاب سنگھ نے ایک اور اسپن کک لگائی' وہ شخص نیچے گرا۔ پرتاب سنگھ کو تیسرا وار کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ شخص کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس نے بڑی قوت سے پرتاب سنگھ کے سینے پر فلائنگ کک لگائی تھی۔ پرتاب سنگھ لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔

وہ شخص پرتاب سنگھ پر حملہ کرنے کے لیے پھر آگے بڑھا لیکن ٹھیک اسی وقت ایک کار اس سڑک پر مڑی۔ وہ دونوں کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں نہا گئے۔ وہ شخص ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے کار کی طرف دیکھا اور پھر پرتاب سنگھ پر حملہ کرنے کے بجائے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ ایک بنگلے کی دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ تین آدمی نیچے اتر کر پرتاب سنگھ کی طرف دوڑے جو اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک آدمی نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ وہ تینوں ہندوستانی تھے۔

"کیا ہوا۔ کون ہو تم اور وہ کون تھا؟" ایک آدمی نے پوچھا۔

"شرافت کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" پرتاب سنگھ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ اس لڑائی میں اس کی پگڑی سر سے گر گئی تھی اور لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر سر کے اوپر جوڑا بنایا اور زمین پر پڑی ہوئی پگڑی سر پر جما لی۔

"لیکن ہوا کیا۔ یہ آدمی کون تھا جو تمہیں مار رہا تھا۔" ایک آدمی نے پوچھا۔

"وہی تو بتا رہا ہوں بھائی جی کہ شرافت کا زمانہ ہی نہیں رہا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "اس بندر نے لفٹ مانگی تھی۔ میں نے اسے کار میں بٹھا لیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سڑک سنسان دیکھی تو پستول نکال لیا۔ وہ مجھے لوٹنا چاہتا تھا لیکن بھائی جی! اپنی محنت کی کمائی کوئی آسانی سے تو کسی کے حوالے نہیں کرتا نا۔ میں نے اسے زیر کر ہی لیا ہوتا لیکن آپ لوگوں کی گاڑی اس طرف مڑتے دیکھ کر بھاگ گیا۔"

"اچھا ہوا بھاگ گیا ورنہ ہو سکتا ہے وہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا دیتا۔" ایک اور آدمی نے کہا "آپ کو چاہیے کہ فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔"

"پولیس میں رپورٹ کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔" پرتاب سنگھ کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا "ایسے لوگوں کو تلاش کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میں نے ہی اس کی شکل اچھی طرح نہیں دیکھی تھی۔ پولیس کیسے تلاش کرے گی اسے۔ بہرحال' آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ آپ لوگوں کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔"

وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی وہاں سے رخصت ہو گئی۔ پرتاب سنگھ اِدھر اُدھر گھوم کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ بالآخر اسے حملہ آور کا وہ پستول مل گیا جو اس کی کار سے چند گز دور پڑا تھا۔ اس نے پستول اٹھا کر چیک کیا اور پھر جیب میں رکھ لیا۔

"پتر جی! اب تمہارے اسی پستول کی گولیاں تمہارے جسم میں اتاروں گا۔"

وہ بڑبڑاتا ہوا کار میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ اس وقت کیرن ہل روڈ پر تھا۔ اگلے موڑ پر اس نے گاڑی بائیڈ فورڈ روڈ پر موڑ دی اور اس سڑک پر ہوتا ہوا آرچرڈ روڈ پر پہنچ گیا۔

پرتاب سنگھ کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ یہ آدمی پہلے سے اس کی کار میں چھپا ہوا تھا۔ جس سے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق دارا گروپ سے تھا۔ دارا یقیناً اس بات سے باخبر ہوگا کہ وجدان اس کی تحویل میں ہے۔ وجدان' اس لرزہ خیز واردات کا واحد چشم دید گواہ تھا اور دارا کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ اسے یقیناً اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ مکان پر پولیس کا پہرا تھا۔ دو پرائیویٹ گارڈز بھی موجود تھے۔ وہاں وہ حملہ کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے غالباً یہی سوچا ہوگا کہ پرتاب سنگھ کو قابو میں کیا جائے اور پھر اس کے ذریعے وجدان کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا جائے لیکن اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دارا نے پرتاب سنگھ کو پکڑنے کے لیے جو آدمی بھیجا تھا' اسے خود ہی اپنی جان چھڑا کر بھاگنا پڑا تھا۔

وہ آدمی پرتاب سنگھ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا لیکن اب پرتاب سنگھ کو وجدان کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دارا نے ایک طرف اسے اغوا کرنے کی کوشش کی ہو اور دوسری طرف وجدان کو اٹھانے کے لیے اس کے مکان پر حملہ ... کر دیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی اس نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

جب وہ اپنے مکان والی گلی میں داخل ہوا تو اسے اطمینان سا ہوا۔ گلی میں کسی گڑبڑ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے کار اپنے بنگلے کے سامنے روک لی اور انجن بند کرکے نیچے اتر آیا۔ ایک پولیس والا گیٹ کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا رائفل کندھے پر لٹکائے اس کے آس پاس ہی ٹہل رہا تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

"خیریت ہے نا۔ یہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

"نو سر!" ایک پولیس والے نے جواب دیا "کوئی گڑبڑ نہیں ہوا۔ سب اوکے ہے۔"

پرتاب سنگھ گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ صحن سے گزرتے ہوئے اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اس کا ایک باڈی گارڈ چھت پر منڈیر کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ ہلاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

وجدان اور سوتر سنگھ لاؤنج میں قالین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وجدان کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ ایک کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔

"اوئے سوتر سنگھ۔" پرتاب سنگھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "پڑھ لے اوئے تو بھی پڑھ لے۔ اس بچے سے ہی کچھ پڑھ لے۔"

"سردار جی!" سوتر سنگھ مسکراتے ہوئے بولا "میرے تو پیو نے نہیں پڑھایا تو میں پڑھ کر کیا کروں گا۔"

"تم کھوتے کے کھوتے ہی رہو گے۔" پرتاب سنگھ بولا "اچھا جا۔ چائے بنا کر لا۔"

وہ وجدان کے پاس بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ پرتاب سنگھ کو بہرحال اس بات کی خوشی تھی کہ پڑھائی شروع کر دینے سے وجدان کا دھیان بٹ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد سوتر سنگھ چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے ان دونوں کے سامنے ایک ایک کپ رکھ دیا... اور تیسرا کپ خود لے لیا۔

"سردار جی۔" وہ پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "لگتا ہے کپڑوں سمیت کسی سے کشتی لڑ کے آ رہے ہو۔"

"ہاں۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "راستے میں ایک کانگڑی پہلوان مل گیا تھا۔ اس نے کشتی کے لیے چیلنج کر دیا اور مجھے کپڑے اتارنے کا موقع نہیں مل سکا۔"

"کشتی کا فیصلہ کیا ہوا سردار جی؟" سوتر سنگھ نے پوچھا۔

"فیصلہ کیا ہونا تھا۔" پرتاب سنگھ بولا "وہ کانگڑی پہلوان بھاگ گیا اور میں سڑک پر کھڑا کپڑے جھاڑتا رہ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ...."

"ہاں ہاں۔" پرتاب سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی "مطلب وہی ہے جو تو سمجھ رہا ہے۔ اب بات کو آگے نہ بڑھا۔"

سوتر سنگھ خاموش ہو گیا۔

تقریباً ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ پرتاب سنگھ نے سنگاپور شاپنگ سینٹر میں واقع ایک ریسٹورنٹ کو فون کرکے اپنے اور وجدان کے لیے کھانا منگوا لیا۔ ریسٹورنٹ کا منیجر بھی سکھ ہی تھا اور پرتاب سنگھ کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے وہ فون کرنے پر کھانا پیک کرکے فوراً ہی بھیج دیا کرتا تھا۔ سوتر سنگھ وغیرہ اپنے لیے کھانا خود ہی لے آیا کرتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد وجدان اور پرتاب سنگھ باتیں کرتے رہے۔ گیارہ بجے کے لگ بھگ وجدان سو گیا۔ پرتاب سنگھ کو عابد علی کی ڈائری کا خیال آ گیا۔ اس نے میز کی دراز سے ڈائری نکال لی اور پلنگ پر نیم دراز ہو کر پڑھنے لگا۔

بارہ سال پہلے جب عابد علی سنگاپور آیا تھا تو پرتاب سنگھ نے اسے یہاں سیٹل ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔ عابد علی نے اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن اب عابد علی کی ڈائری پڑھتے ہوئے پرتاب سنگھ اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ عابد علی نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا تھا' وہ سب کچھ سچ تھا لیکن اس ڈائری سے اسے ایسے ایسے سنسنی خیز انکشافات ہو رہے تھے کہ پرتاب سنگھ دنگ رہ گیا۔ عابد علی کی ڈائری کی تحریر ایک طرح کی سرگزشت تھی۔

اس تحریر کے مطابق عابد علی لاہور کے ایک نواحی گاؤں رکھاں والی کا رہنے والا تھا۔ یہ گاؤں پاک بھارت سرحد پر واقع تھا۔ سرحد کے دوسری طرف ضلع امرتسر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ان دونوں بستیوں کے لوگوں میں بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور یہ تعلقات ملک تقسیم ہونے کے بعد بھی قائم رہے تھے۔

عابد علی کا باپ چوہدری حاکم علی ایک چھوٹا زمیں دار تھا۔ اس کی زمین سرحد پر تھی۔ بعض کھیت تو سرحد سے ملے ہوئے تھے۔ ملک رمضان اس گاؤں کا سب سے بڑا زمیں دار تھا۔ اس کی زمینیں اگرچہ گاؤں کے دوسری طرف تھیں لیکن وہ سرحد کے ساتھ والی کچھ زمین بھی خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ چوہدری حاکم علی سے بات کی تھی کہ وہ سرحد سے ملے ہوئے چند کھیت اس کے ہاتھ فروخت کردے لیکن چوہدری حاکم علی اس بات پر آمادہ نہیں تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ملک رمضان سرحد سے ملی ہوئی وہ زمین کیوں خریدنا چاہتا ہے۔

ملک رمضان کے سرحد کے دوسری طرف واقع بھارتی گاؤں رام پور کے چوہدری کرم داس سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ وہ رات کی تاریکی میں چوری چھپے سرحد پار کرکے ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے تھے۔

ملک تقسیم ہونے کے بعد سرحد کے دونوں طرف بہت سے مسائل پیدا ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا تھا۔ جنہیں صرف اور صرف اپنا فائدہ عزیز تھا اپنے ذاتی مفاد کے لیے وہ دوسروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ سرحد کی پٹی قائم ہو جانے کے بعد ایسے ہی لوگوں نے فائدہ اٹھایا تھا۔

ملک رمضان کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ یہ نقصان کسی فرد کو پہنچ رہا ہے یا

اجتماعی طور پر پوری قوم یا پورا ملک اس سے متاثر ہورہا ہے۔ ملک تقسیم ہونے کے بعد دونوں طرف جو گمبھیر مسائل پیدا ہوئے تھے ان کا فائدہ انہی لوگوں نے اٹھایا تھا۔ ملک رمضان اور کرم داس نے سرحد پر کاروبار شروع کردیا تھا۔ غیر قانونی طور پر مال سرحد کے اِدھر اُدھر لے جانے کو وہ لوگ بزنس ہی کہتے تھے۔ ان کا یہ بزنس پہلے محدود پیمانے پر تھا پھر اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ ملک رمضان پہلے سرحد پار کرنے کے لیے دوسروں کی زمین استعمال کرتا تھا۔

اسمگلنگ کا دھندا ترقی کرگیا تو اس نے چوہدری حاکم علی کی زمین خریدنے کی کوشش شروع کردی۔ پہلے وہ دوستانہ انداز میں بات کرتا رہا پھر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس نے گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ذریعے بھی دباؤ ڈلوانے کی کوشش کی۔ وہ اگرچہ اصل سے دُگنی قیمت دے رہا تھا مگر چوہدری حاکم علی کسی قیمت پر بھی اپنی زمین بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ اپنی ان کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد ملک رمضان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔ دھمکیاں تو وہ دیتا ہی رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے حاکم علی کا کھلیان جلا دیا۔

عابد علی ان دنوں لاہور کے اسلامیہ کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ لاہور میں بھی ان کا ایک گھر تھا۔ عابد علی فائنل کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ اگرچہ ہفتے میں ایک بار گاؤں آجایا کرتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ امتحان دینے کے بعد مستقل طور پر گاؤں آجائے گا اور کھیتی باڑی سنبھال لے گا۔

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ گاؤں جانے کی تیاری کررہا تھا کہ اسے وہ اندوہناک اطلاع ملی جس نے اس کی دنیا اندھیر کردی۔ اس کے باپ کو کسی نے قتل کردیا تھا۔ اطلاع دینے والے نے بتایا تھا کہ چوہدری حاکم علی صبح سویرے اپنے کھیتوں پر کام کررہا تھا کہ چند گھوڑا سوار وہاں آگئے۔ انہوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ انہوں نے آتے ہی فائرنگ شروع کردی جس سے چوہدری حاکم علی اور دو مزارع موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔

عابد علی بھاگم بھاگ وہاں پہنچ گیا۔ چوہدری حاکم علی کی لاش شہر کے اسپتال بھجوائی جاچکی تھی لیکن پولیس گاؤں میں موجود تھی۔ عابد علی پولیس سے الجھا رہا پھر شام کو اسپتال سے لاش وصول کرکے لے آیا اور تدفین ہوگئی۔

گاؤں کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ یہ کس کے اشارے پر ہوا تھا لیکن کوئی بھی شخص وہاں پر ملک رمضان اور اس کے بیٹے نوازش علی کا نام لینے کو تیار نہیں تھا۔ سب ان سے ڈرتے تھے۔

عابد علی بھی جانتا تھا کہ یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے لیکن اس کے پاس ملک رمضان اور اس کے بیٹے نوازش علی کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی۔ پولیس نے اگرچہ ملک رمضان اور اس کے بیٹے کو بھی تفتیش میں شامل کیا تھا لیکن ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ واردات کے وقت وہ شہر میں تھے اور پھر پیسے نے بھی بہت کام دکھایا تھا اس لیے وہ دونوں صاف بچ نکلے تھے۔

چھ مہینے گزر گئے۔ پولیس چوہدری حاکم علی کے قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ اس دوران میں ایک اور واقعہ ہوا۔ رمضان گھوڑی پر سوار ایک دوسرے گاؤں سے اپنے گاؤں آرہا تھا کہ اچانک ہی گھوڑی کسی چیز سے بدک کر سرپٹ دوڑنے لگی۔ ملک رمضان نے اسے سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ گھوڑی سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ تقریباً دو سو گز آگے نہر تھی۔ ملک رمضان جانتا تھا کہ اگر گھوڑی کو قابو نہ کیا گیا تو اس کا انجام بہت خطرناک نکلے گا۔ وہ گھوڑی کو قابو کرنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ نہر بالکل قریب آچکی تھی۔ ملک رمضان بدحواس ہورہا تھا۔ گھوڑی نے چھلانگ لگا کر نہر پار کرنے کی کوشش کی مگر اس کے اگلے دونوں پیر نہر کے دوسرے کنارے پر لگے اور وہ الٹ کر نہر میں گرگئی۔

ملک رمضان گھوڑی سے گرگیا تھا مگر اس کا پیر رکاب میں پھنسا رہا۔ وہ گھوڑی کے نیچے دب گیا۔ گھوڑی نہر سے نکل کر دوڑنے لگی۔ ملک رمضان کا پیر رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ سر کے بل تقریباً ایک فرلانگ تک گھوڑی کے ساتھ گھسٹتا رہا۔

کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن ملک رمضان کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔ ملک رمضان کا پیر رکاب سے نکل گیا۔ وہ وہیں گرگیا اور گھوڑی اسے کچلتی ہوئی آگے نکل گئی۔ لوگ دوڑ کر وہاں پہنچ گئے لیکن ملک رمضان میں کچھ نہیں رہا تھا۔ مسلسل زمین پر گھسٹنے اور گھوڑی کے پیر لگنے سے اس کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح بگڑا تھا کہ پہچاننا مشکل ہوگیا تھا۔

ملک رمضان کی اس عبرت ناک موت پر گاؤں میں میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر شخص دبے لفظوں میں کہہ رہا تھا کہ رمضان سے قدرت نے چوہدری حاکم علی کے قتل کا انتقام لیا ہے۔

اس واقعے کے تین مہینے بعد ایک اور شوشہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ملک رمضان کے بیٹے ملک نوازش علی نے عابد علی کی ان زمینوں پر قبضہ کرلیا جو سرحد کے ساتھ واقع تھیں۔ اس نے اپنے مسلح آدمی زمین پر بٹھا دیے تھے اور لوگوں سے یہ کہا تھا کہ یہ زمین چوہدری حاکم علی نے اس کے باپ کے پاس بیچ دی تھی۔ اس نے کاغذات بھی دکھائے تھے۔ کاغذات پر اسی گاؤں کے دو آدمیوں کے بطور گواہ دستخط بھی موجود تھے۔ وہ دونوں آدمی ملک نوازش علی کے نمک خوار تھے۔

عابد علی کے لیے یہ انکشاف مزید سنسنی خیز ثابت ہوا کہ ملک رمضان نے پٹواری کو پیسہ کھلا کر سرکاری کاغذات میں بھی ردوبدل کروالیا تھا۔ زمین فروخت کرنے اور ملک رمضان کے نام انتقال اراضی کی تاریخ چوہدری حاکم علی کی موت سے صرف چند روز پہلے کی تھی۔ ملک نوازش علی کے کہنے کے مطابق وہ اب تک اس لیے خاموش رہا تھا کہ پہلے چوہدری حاکم علی کا انتقال ہوگیا پھر اس کا

باپ اس دنیا سے رخصت ہوگیا لیکن اب وہ مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس نے زمین پر قبضہ کرلیا تھا۔

عابد علی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کی زمین ہتھیانے کے لیے ایک گہری سازش تیار کی گئی تھی جس میں پٹواری اور محکمۂ اراضی کے بعض دوسرے لوگ بھی شریک تھے اور ظاہر ہے ان سب کو پیسہ دیا گیا تھا۔

عابد علی نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا۔ ظاہر ہے ایسے مقدمات کا فیصلہ دو چار دن یا مہینہ دو مہینہ میں نہیں ہوتا۔ ایسے مقدمات تو برسوں چلتے ہیں۔ عابد علی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہ مقدمہ برسوں تک چلتا رہا۔ ہر مہینے دو مہینے پر عدالت میں پیشی ہوتی اور پھر آگے پیشی پڑجاتی۔ ملک نوازش علی پیسے والا تھا۔ زمینوں کے علاوہ اس نے باپ کا چھوڑا ہوا ناجائز کاروبار بھی سنبھال لیا تھا۔ اس کے تعلقات پولیس سے بھی تھے اور دوسرے بڑے بڑے لوگوں سے بھی جو اسمگلنگ جیسے گھناؤنے کاروبار میں اس کی پشت پناہی کررہے تھے۔ علاقے کے اسمبلی کے ممبر اس پر مہربان تھے۔ ہر الیکشن کے موقع پر نوازش علی ان کی انتخابی مہم چلاتا جس پر اس کا لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا اور اس کا فائدہ وہ کروڑوں کی صورت میں اٹھا رہا تھا۔ اس طرح اسے اسمگلنگ میں بارسوخ لوگوں کی بھی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

مسئلہ تو عابد علی کے لیے تھا۔ سرحدی پٹی والے کھیتوں پر قبضے کے بعد اس کے پاس چند کھیت باقی رہ گئے تھے جن پر صرف اتنا اناج پیدا ہوتا تھا کہ بمشکل اس کا سال بھر کا گزارہ ہوپاتا تھا۔ اس آمدنی سے وہ عدالت کے اخراجات بھی پورے کررہا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے باپ نے کہا تھا کہ خدا ہر انسان کو پولیس، ڈاکٹر اور عدالت سے محفوظ رکھے۔ اس وقت یہ بات عابد علی کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ وہ اس چکر میں اس طرح پھنسا تھا کہ نکلنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ وہ اس مقدمے سے دستبردار ہوجائے اور دستبرداری کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اراضی پر فاتحہ پڑھ لے اور اس پر ملک نوازش علی کا قبضہ تسلیم کرلے۔ اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ دادا کی اراضی سے اس طرح دستبردار نہیں ہوسکتا تھا۔

عابد علی کی رہی سہی زمین بھی تھوڑی تھوڑی کرکے بکتی رہی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس مقدمے کچہری میں کچھ نئے لوگوں سے اس کے تعلقات بھی استوار ہوئے۔ ان میں سلطان پور کا ایک زمیندار چوہدری برکت علی بھی تھا۔ وہ پیسے والا آدمی تھا۔ اس کی تعلیم صرف آٹھویں تک محدود تھی لیکن اسے سیاست کا چسکا تھا۔ پچھلی مرتبہ وہ الیکشن میں کھڑا ہوا تھا لیکن ملک عبدالرحمن سے ہار گیا تھا۔ برکت علی کو کسی نے مشورہ دیا تھا کہ اگلے الیکشن میں وہ خود کھڑا ہونے کے بجائے کسی ایسے آدمی کو کامیاب کروائے جو اس کی مٹھی میں رہے۔ چوہدری برکت علی کو یہ مشورہ پسند آیا تھا اور اس کی نظرِ انتخاب عابد علی پر پڑی تھی۔

الیکشن آنے والے تھے۔ چوہدری برکت علی نے عابد علی کو آمادہ کرلیا تھا کہ وہ صوبائی اسمبلی کی سیٹ پر اس علاقے سے ملک عبدالرحمن کے مقابلے میں کھڑا ہوجائے۔ عابد علی تعلیم یافتہ تھا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن چوہدری برکت علی نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ اگر کامیاب ہوگیا تو وہ نہ صرف اپنے باپ کی زمین واپس حاصل کرلے گا بلکہ مزید اراضی بھی خرید سکے گا۔ عابد علی کو مزید اراضی کا لالچ نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے باپ کی زمین حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی ایک بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ زندہ رہنے اور اپنا حق لینے کے لیے طاقت ضروری ہے۔ اسے ایک موقع مل رہا تھا۔ چوہدری برکت علی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ الیکشن کے تمام تر اخراجات خود برداشت کرے گا۔ اس کے عوض اسے یہ تحریر لکھ کر دینا ہوگی کہ کامیابی کے بعد چوہدری برکت علی کے کیا کیا مطالبات پورے کرے گا۔

عابد علی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے تحریر لکھ کر دے دی اور چوہدری برکت علی نے اسے اپنے امیدوار کی حیثیت سے متعارف کرانا شروع کردیا۔ یہ خبر ملک نوازش علی کے لیے تشویش ناک تھی۔ پہلے وہ ملک عبدالرحمن کے لیے انتخابی مہم چلایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ اس نے خود الیکشن لڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ دوسروں کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرتا تھا اور پھر بھی ان کا محتاج رہتا تھا۔ اگر وہ خود کامیاب ہوگیا تو تمام فائدے خود ہی اٹھائے گا اور عابد علی جیسے لوگوں سے بھی نمٹ لے گا۔

کچھ ہی عرصہ بعد الیکشن کی گہما گہمیاں شروع ہوگئی تھیں۔ ہر علاقے میں انتخابی مہم زوروں پر تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں تو میلوں کا سماں تھا۔ عابد علی کے حلقے سے چار امیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ اس روز پولنگ ہوئی اور رات تک رزلٹ بھی سامنے آگیا۔ عابد علی کو اگرچہ ملک نوازش علی سے زیادہ ووٹ ملے تھے لیکن کامیاب وہ بھی نہیں ہوسکا تھا۔ وہ تیسرے نمبر پر رہا تھا۔ دوسرے نمبر پر ملک عبدالرحمن کو ووٹ ملے تھے اور عبدالرشید نامی ایک ایسا امیدوار چند سو ووٹوں کی اکثریت سے جیت گیا تھا جس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

ووٹ بٹ جانے کی وجہ سے ملک عبدالرحمن پہلی مرتبہ الیکشن ہارا تھا۔ وہ اس کا ذمے دار نوازش علی کو ٹھہرا رہا تھا اور ملک نوازش علی اپنی شکست کا باعث عابد علی کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں اگر عابد علی اس کے مقابلے پر کھڑا نہ ہوتا تو وہ ضرور کامیاب ہوجاتا۔ ہارا عابد علی بھی تھا لیکن اسے اپنی شکست کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ وہ سیاست کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے اپنی شکست کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ وہ تو ایک خاص مقصد کے لیے کسی کے اکسانے پر الیکشن میں کھڑا ہوا تھا۔

جیت جاتا تو اس کا مقصد پورا ہو جاتا۔ ہارنے اسے کوئی غم نہیں ہوا تھا لیکن ملک نواز ش علی نے اس شکست کو اپنی اَنا کا مسئلہ بنالیا تھا۔

نوازش علی اور عابد علی میں دشمنی کی جڑیں کچھ اور گہری ہوگئیں۔ عابد علی کو صرف اپنے باپ دادا کی اراضی کے حصول سے دلچسپی تھی۔ جبکہ نوازش علی نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کرکے اپنا بہت کچھ داؤ پر لگا دیا تھا اور وہ بہت کچھ ہار گیا تھا۔ ملک عبدالرحمن نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا تھا کیونکہ وہ اسی کے حلقے میں اس کے مقابلے میں کھڑا ہوا تھا۔

ملک نوازش علی کا بہرحال اپنا ایک حلقہ تھا۔ اس کا اسمگلنگ کا بزنس اس شکست سے متاثر ضرور ہوا تھا لیکن رکا نہیں تھا۔ اسمگلنگ کے حوالے سے اسے اب بھی ان لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی جو پہلے بھی اس کے سرپرست تھے۔

الیکشن سے پہلے تو ملک نوازش علی اور عابد علی کی دشمنی صرف مقدمے بازی تک محدود تھی مگر اس سیاست کے کھیل نے انہیں ایک دوسرے کی جان کا دشمن بنا دیا تھا۔ عابد علی بھی اب سر اٹھانے لگا تھا۔ سلطان پور کا چوہدری برکت علی اس کی پشت پر تھا جس سے اس کا حوصلہ کچھ بڑھ گیا تھا۔

رکھاں والی کا علاقہ چوہدری برکت علی کے لیے بھی اہمیت رکھتا تھا اور اسی لیے وہ عابد علی کی پشت پناہی بھی کررہا تھا۔ الیکشن میں عابد علی کی شکست پر اسے بھی کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے جس حساب سے ووٹ لیے تھے۔ اس سے چوہدری برکت علی کو یقین تھا کہ اگلے الیکشن میں عابد علی ضرور کامیاب ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عابد علی کو اپنے قریب رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ عابد علی کو مزید قریب لانے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی تھی۔

شگفتہ اس کے ایک دور کے رشتے دار کی بیٹی تھی۔ اس نے سلطان پور ہی کے ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کررکھا تھا۔ وہ نہ صرف حسین تھی بلکہ بڑی... خوش اخلاق اور سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی تھی۔ چوہدری برکت علی نے عابد علی کو اس سے رشتے پر آمادہ کرلیا اور چند مہینوں کے اندر اندر ان کی شادی بھی ہوگئی۔

والدین کے انتقال کے بعد عابد علی اکیلا ہی رہتا تھا۔ شگفتہ کے آجانے سے گھر میں رونق سی آگئی لیکن دوسری طرف عابد علی کے لیے الجھنیں بڑھ رہی تھیں۔ ملک نوازش علی بھی اپنے باپ کی طرح اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔

ان دنوں دارا کو عابد علی نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ اونچا لمبا ہٹا کٹا آدمی تھا۔ ملک نوازش اسے نجانے کہاں سے لے کر آیا تھا لیکن رکھاں والی میں آتے ہی دارا نے ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا دیا تھا۔ وہ گاڑی میں اور زمینوں پر دندناتا پھرتا۔ گاؤں والوں اور مزارعوں سے مارپیٹ اس کا روز کا معمول بن گیا تھا۔ لوگ ملک نوازش علی کے پاس اس کی شکایت لے کر جاتے اور ملک گ... رہ جاتا۔ ایک مہینے کے اندر اندر دارا نے گاؤں کے لوگوں پر غنڈا گردی کا رعب جمالیا تھا۔ اب کسی کو اس کے سامنے سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

دوسرے مہینے دارا نے عابد علی کے ایک مزارع کی ٹانگ توڑ دی۔ پولیس میں دارا کے خلاف رپورٹ لکھوائی گئی۔ پولیس اور ملک نوازش علی کی حویلی میں دعوت اڑانے کے بعد مزارع، اس کے بھائی اور باپ کو گرفتار کرکے لے گئی۔ عابد تلملا کر رہ گیا۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کرسکا تھا۔

عابد علی کی شادی کو دس مہینے ہوگئے تھے۔ شگفتہ ماں بننے والی تھی۔ گاؤں میں شہر جیسی سہولتیں نہیں تھیں۔ عابد علی شگفتہ کو لاہور شہر والے مکان میں لے گیا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے گاؤں کی ایک عورت بھی ساتھ آگئی تھی۔

شگفتہ نے بیٹے کو جنم دیا تو ان کی زندگی میں بہار آگئی۔ یہ ان کے گلشن کا پہلا پھول تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ بچے کی پیدائش کے بعد شگفتہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ گاؤں نہیں جائے گی بلکہ مستقل طور پر شہر میں رہے گی۔ عابد علی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

عابد علی بھی شہر ہی میں رہنے لگا۔ وقتاً فوقتاً وہ گاؤں کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل لے لی تھی جس سے اسے آمدورفت کے لیے سہولت ہوگئی تھی۔

اس روز وہ دوپہر کے کچھ دیر بعد گاؤں آیا تھا۔ شگفتہ سے اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ رات کو واپس آجائے گا۔ وہ سیدھا گاؤں میں داخل ہونے کے بجائے کھیتوں کی طرف نکل گیا جہاں اس کا چھوٹا سا ڈیرا تھا۔ مویشی بھی یہیں بندھے ہوتے تھے اور ایک آدمی یہاں رہتا تھا۔ عابد علی پگڈنڈی پر موٹر سائیکل چلاتا ہوا اس ڈیرے پر آیا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک یہاں بیٹھا مزارع اکبر سے باتیں کرتا رہا پھر موٹر سائیکل ڈیرے پر چھوڑ کر گاؤں آگیا۔

رات کا کھانا اس نے گاؤں ہی میں کھایا تھا۔ وہ واپس جانے کے لیے دوبارہ ڈیرے پر آگیا۔ اس وقت اکبر نے اسے ایک بات بتائی جسے سن کر عابد علی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اکبر نے کہا کہ اسے بڑے خفیہ طریقے سے یہ پتا چلا ہے کہ ملک نوازش کے آدمی آج سونے کی ایک بھاری کھیپ لے کر سرحد پار کرکے دوسری طرف جانے والے ہیں۔ اکبر کو یہ اطلاع کیسے ملی تھی؟ اس سے عابد کو کوئی غرض نہیں تھی لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ ملک نوازش اور سونے کی اسمگلنگ کررہا ہے۔ عابد علی نے رات وہیں رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ آج وہ ان کی اسمگلنگ کی کوشش ناکام بنادے گا۔

وہ ڈیرے کے آس پاس ٹہلتا رہا۔ وہ ایک پرانے کنوئیں کے پاس رک گیا۔ اس کنوئیں پر پہلے رہٹ لگا ہوا تھا لیکن ایک سال پہلے کچھ فاصلے پر بورنگ کرکے ٹیوب ویل لگوالیا گیا تھا جس وجہ سے یہ کنواں متروک ہوگیا تھا۔ کنوئیں پر بہرحال رہٹ کے باقیات اب بھی موجود تھے۔ عابد علی رہٹ کی لکڑی پر بیٹھ گیا اور وقت گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ اکبر نے اسے بتایا تھا کہ وہ لوگ آدھی رات کے بعد اس طرف سے گزریں گے۔

عابد علی انتظار کرتا رہا۔ رات تین بجے کے لگ بھگ اسے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ کوئی کار تھی جو سڑک سے ہٹ کر کھیتوں کی طرف آرہی تھی۔ عابد علی اپنی جگہ سے اٹھ کر ایک طرف دوڑنے لگا اور تقریباً دو سو گز دور کھیتوں کے درمیان اس کچے راستے پر رک گیا جہاں سے اس گاڑی کو گزرنا تھا۔ وہ راستے کے قریب ہی پودوں میں چھپ گیا۔ اس نے جیب سے پستول نکال لیا اور گاڑی کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ پستول اس نے چند مہینے پہلے اپنی حفاظت کے لیے خریدا تھا اور اس کے پاس اس کا لائسنس بھی موجود تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا تھا، پستول کو اپنی جیب میں ڈالنا نہیں بھولتا تھا۔

وہ کار ہی تھی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنیاں بجھ گئیں۔ عابد علی پودوں میں چھپا کار کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا اور پھر جیسے ہی کار اس کے سامنے پہنچی، اس نے فائر کردیا۔ اس کی گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی اور کار کا اگلا ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ کار لہرا کر ایک کھیت میں گھس کر رک گئی۔

تین آدمی کار سے اتر کر ایک طرف دوڑے۔ قدو قامت کی وجہ سے عابد علی نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ دارا تھا۔

"تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے جاچکے ہو۔ ہتھیار پھینک دو۔" عابد علی چیخا۔

عابد علی کا خیال تھا کہ وہ لوگ ٹریپ میں آجائیں گے لیکن وہ لوگ اندھادھند فائرنگ کرتے ہوئے کھیتوں میں ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ عابد علی نے بھی ایک دو فائر کردیے۔

عابد علی دوڑ کر کار کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر دو کینوس کے بڑے بڑے تھیلے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دارا اور اس کے ساتھی دوڑتے ہوئے وہاں سے بہت دور جاچکے تھے۔ عابد علی دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کرکے اسے کھیتوں میں موڑ دیا۔ ایک ٹائر برسٹ ہونے کی وجہ سے کار گھسٹ کر چل رہی تھی۔

اکبر ڈیرے پر نہیں تھا۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کر کہیں بھاگ گیا تھا۔ عابد علی نے کار کی پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے کینوس کے تھیلے کھول کر دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ دونوں تھیلوں میں سونے کے بسکٹ بھرے ہوئے تھے۔

عابد علی نے کار سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دونوں تھیلے باہر نکال لیے جو خاصے وزنی تھے۔ اس وقت ایک بار پھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھیں۔ غالباً دارا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے تھے کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور وہ فائرنگ کرتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔ عابد علی نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان تھیلوں کو کہاں چھپایا جائے اور بالآخر ایک جگہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے دونوں تھیلوں کے زپ اچھی طرح بند کردیے اور انہیں رہٹ والے کنوئیں میں پھینک دیا۔

دارا اور اس کے ساتھی قریب آرہے تھے۔ عابد علی اپنی موٹر سائیکل کی طرف دوڑا۔ دارا نے اسے دوڑتے ہوئے دیکھ لیا اور اس پر فائرنگ شروع کردی۔ عابد علی نے کک لگا کر موٹر سائیکل کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسے گیئر میں ڈال کر ایکسیلریٹر گرپ پوری طرح گھمادی۔ موٹر سائیکل اچھل کر آگے نکلی تھی۔

دارا اور اس کے ساتھی پیچھے دوڑتے ہوئے فائرنگ کررہے تھے۔ گولیاں عابد علی کے آس پاس سے گزر رہی تھیں لیکن عابد علی ان سے محفوظ ہی رہا۔ موٹر سائیکل اچھلتی ہوئی کھیتوں میں دوڑتی رہی۔ سڑک پر آکر اس نے موٹر سائیکل دائیں طرف موڑ دی۔ یہ سڑک سیدھی راوی کے پل تک چلی گئی تھی۔

شہر میں اپنے گھر پہنچنے کے لیے عابد علی کو ایک طویل چکر کاٹنا پڑا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ بدحواسی اور نجانا سا خوف عابد علی کے چہرے پر نمایاں تھا۔ شگفتہ اسے دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ وہ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن عابد علی نے اسے ٹال دیا۔

اس کے تین دن بعد دارا اور اس کے ایک ساتھی نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ وہ آدھی رات کے قریب اس کے گھر میں گھس آئے تھے۔ ان دونوں کے پاس پستول تھے۔ وہ عابد علی سے سونے کے ان دو تھیلوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو اس نے غائب کیے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق کار میں سونے کے چھ تھیلے تھے۔ چار ڈکی میں ... دو پچھلی سیٹ پر، پچھلی سیٹ والے تھیلے غائب تھے۔ دارا کے ... مطابق ان دو تھیلوں میں تقریباً پانچ کروڑ روپے مالیت کا سونا تھا۔ اگر عابد علی وہ تھیلے ان کے حوالے کردے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن عابد علی لاعلمی کا اظہار کرتا رہا۔ اسے تو اس بات کا افسوس ہورہا تھا کہ اسے ڈکی کا خیال کیوں نہیں آیا تھا۔ اس وقت اسے ڈکی کا خیال آجاتا تو وہ باقی چار تھیلے بھی کنوئیں میں پھینک دیتا۔

دارا انسان نہیں درندہ ثابت ہوا تھا۔ اس نے عابد علی کو مار مار کر ادھ موا کردیا۔ شگفتہ کو بھی اس نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ عابد علی اور شگفتہ کی چیخیں فضا میں گونجتی رہیں لیکن کوئی ان کی مدد کو نہیں آیا۔ گلشن راوی ان دنوں نیا نیا آباد ہوا تھا۔ بہت سے مکان زیر تعمیر تھے۔ آباد مکان ایک دوسرے سے خاصے دور تھے۔

عابد علی کا مکان بھی کسی قدر الگ تھلگ تھا اس لیے کوئی ان کی مدد کو نہ آسکا۔ ان کی چیخوں کی آوازیں یقیناً سنی گئی تھیں لیکن کس کو پڑی تھی کہ آدھی رات کو اپنے گھر سے نکلتا۔

عابد علی کی ہمت جواب دینے لگی۔ بالآخر جان بچانے کے لیے اس نے دارا کو بتایا کہ دونوں تھیلے اس نے راوی میں پُل کے دوسرے ستون کے قریب پھینک دیے تھے۔ دارا نے اسے یہ دھمکی دی تھی کہ اگر اس جگہ دریا میں تھیلے نہ ملے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔

عابد علی نے صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ مکان چھوڑ دیا۔ وہ اپنی بیوی اور دو ماہ کے بچے کو لے کر فیروز پور روڈ پر اچھرہ کے ایک مکان میں آگیا لیکن تین دن بعد دارا نے انہیں یہاں بھی ڈھونڈ نکالا۔ اس رات عابد علی غافل نہیں تھا۔ اس نے دارا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ دارا اور اس کے ساتھی مکان میں داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ انہوں نے مکان کو آگ لگادی۔

مکان میں آگ بھڑک رہی تھی۔ دارا اور اس کے ساتھی باہر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس کے آجانے سے دارا اور اس کے ساتھی بھاگ نکلے اور لوگوں نے پولیس کی مدد سے عابد علی' اس کی بیوی اور بچے کو تو بچالیا تھا مگر وہ مکان جل کر راکھ ہوگیا تھا۔

عابد علی کو اپنے ایک دوست کے ہاں پناہ ملی تھی۔ اس کی وجہ سے ملک نوازش علی کو پانچ کروڑ روپے کا نقصان پہنچا تھا۔ وہ اسے کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ یہاں کوئی جگہ اس کے لیے محفوظ نہیں تھی۔ فیصل آباد میں اس کے رشتے دار تھے۔ اس نے سوچا وہاں چلا جائے لیکن اسے یقین تھا کہ ملک نوازش علی کے آدمی اسے وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس کے دوست نے اسے ملک چھوڑ دینے کا مشورہ دیا۔ وہ خود انہیں لے کر کراچی پہنچ گیا۔ یہیں سے انہوں نے پاسپورٹ بنوائے اور سنگاپور آگئے۔

پرتاب سنگھ نے ڈائری بند کردی۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔ عابد علی جب سنگاپور آیا تھا تو اس نے پرتاب سنگھ کو اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن پانچ کروڑ روپے مالیت کے سونے والی بات نہیں بتائی تھی۔ البتہ چند روز پہلے مرنے سے تھوڑی دیر قبل اس نے سونے کے بارے میں انکشاف کیا تھا۔ ڈائری پڑھنے کے بعد پرتاب سنگھ کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا اسے تلاش کرتا ہوا یہاں اسی لیے آیا ہے کہ سونے کے بارے میں معلوم کرسکے۔

اچانک پرتاب سنگھ کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ہوسکتا ہے ملک نوازش علی سب کچھ بھول چکا ہو اور دارا اپنے طور پر سونا حاصل کرنا چاہتا ہو اور وہ عابد علی کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک پہنچ گیا اور ملک نوازش علی کو اس کا پتا بھی نہ ہو۔ ایسا ہوسکتا تھا۔

دارا کے بارے میں عابد علی نے جو کچھ بھی بتایا تھا اور ڈائری میں جو کچھ بھی پڑھا تھا' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دارا جیسے لوگ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔

عابد علی کی ڈائری پڑھنے کے بعد پورا پس منظر پرتاب سنگھ کے سامنے آگیا۔ عابد علی اور اس کی بیوی شگفتہ ایک اسمگلر کی نفرت اور انتقام کا شکار ہوگئی تھی لیکن افسوس کی بات تو یہ تھی کہ یہ قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوگیا تھا۔ وجدان' عابد علی ہی کا بیٹا تھا اور بدقسمتی سے اپنے ماں باپ کے قتل کا واحد چشم دید گواہ تھا۔ مزید بدقسمتی یہ تھی کہ قاتل وہی لوگ تھے جنہوں نے وجدان کے ماں باپ کو اپنی ہی سرزمین پر چین سے نہیں رہنے دیا تھا اور بارہ سال پہلے انہیں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا اور بالآخر موت کا شکار ہوگئے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوگیا تھا بلکہ مزید دراز ہوگیا تھا۔

وجدان نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ کو بے دردی سے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ دارا کے بارے میں اس نے اپنے ماں باپ کو باتیں کرتے ہوئے بھی سنا تھا اور جب وہ اپنے باپ کی ڈائری پڑھے گا تو اس کی نفرت دوچند ہوجائے گی اور وہ مجسم انتقام بن جائے گا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے نہیں روک سکے گی۔

پرتاب سنگھ نے یہ سب کچھ سوچتے ہوئے ڈائری بند کرکے تکیے کے نیچے رکھ دی اور سامنے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھنے لگا۔ دو بج چکے تھے۔ اس نے گردن گھما کر وجدان کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

پرتاب بھی سیدھا ہو کر بستر پر لیٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے چونک جانا پڑا۔ چھت پر ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے اٹھا پٹخ ہو رہی ہو۔ اس نے تکیے کے نیچے سے پستول نکالا اور چپل پہنے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ لاؤنج میں پہنچ کر چھت پر اٹھا پٹخ کی آوازیں زیادہ واضح سنائی دینے لگیں۔

"سوتر سنگھ.... اوئے سوتر سنگھ! کیا ہو رہا ہے۔ کہاں ہو تم؟"

اس نے دو تین مرتبہ سوتر سنگھ کو پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آگیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دائیں طرف چھلانگ لگادی۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوجاتا۔ سامنے سے اس پر گولیوں کی بوچھار کردی گئی تھی۔

موت پرتاب سنگھ کے بہت قریب سے گزری تھی۔ اگر اسے چھلانگ لگانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوچکا ہوتا۔ لاؤنج والے اس دروازے کے سامنے کشادہ برآمدہ تھا جس کے فرش اور سیڑھیوں پر ماربل کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ برآمدے کی چھت کو سہارا دینے کے لیے دو ستون تھے۔ ان پر بھی سفید سنگِ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے

برآمدے میں دیواروں کے ساتھ اور فرش کے کناروں پر موزائک سے بنے ہوئے بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے جن میں پھولوں کے پودے تھے۔ ستونوں کے ساتھ ٹکے ہوئے دو گملوں میں باریک پتیوں والی بیلیں تھیں جو ستون پر بل کھاتی ہوئی اوپر چھت تک چلی گئی تھیں۔ پرتاب سنگھ روزانہ صبح سویرے اٹھ کر ان گملوں میں پانی ڈالا کرتا تھا اور اب یہی گملے اس کی زندگی کے ضامن بن گئے تھے۔

گولیوں کی بوچھار ہوتے ہی اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی تھی اور فرش پر گرتے ہی ان بڑے بڑے گملوں کی آڑ میں لیٹ گیا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ برآمدے کی بتی نہیں جل رہی تھی اگر روشنی ہوتی تو اسے دیکھ لیا جاتا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ حملہ آوروں کی نظروں سے محفوظ ہوگیا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہوئے اس کا پستول بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن یہ پستول تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سامنے سے فائرنگ ہو رہی تھی اور گولیاں برآمدے والے دروازے' سامنے والی دیوار اور ستونوں پر لگ رہی تھیں۔ آٹومیٹک رائفل یا سب مشین گن سے ہونے والی فائرنگ بہت شدید تھی۔

پرتاب سنگھ گملوں کے پیچھے بے حس و حرکت لیٹا وجدان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز سے اس کی بھی آنکھ کھل گئی ہوگی اور پرتاب سنگھ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ کہیں وہ بستر سے اٹھ کر باہر آنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسی صورت میں اس کا بچنا مشکل ہوجاتا۔

فائرنگ بند ہوگئی۔ پرتاب سنگھ نے ایک لمحے کو انتظار کیا اور پھر بڑی احتیاط سے دونوں ہاتھ پھیلا کر آس پاس فرش کو ٹٹولنے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ پستول اسے قریب ہی فرش پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔ اس نے بڑی آہستگی سے سیفٹی کیچ ہٹایا اور سامنے دیکھنے لگا۔ اب تک اس کی آنکھیں کسی حد تک تاریکی سے مانوس ہوچکی تھیں۔ گلی میں اگرچہ اسٹریٹ لائٹ جل رہی تھی لیکن گنجان شاخوں والے ایک درخت کی وجہ سے وہ روشنی پرتاب سنگھ کے مکان کے صحن تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھور رہا تھا۔

پرتاب سنگھ کو حملہ آوروں کے بارے میں اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً دارا کے آدمی تھے جو ہر قیمت پر وجدان کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے تاکہ ان کے جرم کا واحد عینی گواہ اس دنیا میں موجود نہ رہے لیکن اسے حیرت تو

اس بات پر تھی کہ وہ دونوں پولیس والے کہاں گئے تھے جنہیں مکان کی حفاظت پر تعینات کیا گیا تھا۔ سوتر سنگھ اور دوسرا باڈی گارڈ دربار سنگھ مکان کی چھت پر ڈیوٹی دیا کرتا تھے۔ چھت پر سے کسی قسم کی آوازیں سن کر ہی وہ چونکا تھا۔ اس نے برآمدے والے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوتر سنگھ کو آوازیں دی تھیں۔ اس

کی طرف سے تو کوئی جواب نہیں ملا تھا البتہ اس پر فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ گیٹ کی بتیاں کیوں بجھی ہوئی تھیں۔

اس پر فائرنگ سامنے سے کی گئی تھی جس کا مطلب تھا کہ فائرنگ کرنے والا سامنے ہی کسی جگہ موجود تھا لیکن تاریکی میں وہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پرتاب سنگھ دیدے گھماتا ہوا تاریکی میں گھور رہا تھا اور پھر اچانک وہ چونک گیا۔ ایک سیاہ ہیولا سامنے والی دیوار کے قریب حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ پرتاب سنگھ نے بڑی احتیاط سے پستول والا ہاتھ گملوں کے بیچ میں سے آگے نکالا اور ٹریگر دبادیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا۔ گولی کمپاؤنڈ کی دیوار میں لگی۔ سیاہ ہیولا برق رفتاری سے اچھل کر درخت کی آڑ میں چلا گیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے پرتاب سنگھ پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ گولیاں گملوں پر اور برآمدے کے ستون پر لگ رہی تھیں۔ پرتاب سنگھ گملوں کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔

فائرنگ ایک لمحے کو رکی تھی اور اس ایک لمحے سے فائدے اٹھاتے ہوئے پرتاب سنگھ نے ایک بار پھر سر اٹھا کر گملوں کے اوپر سے دیکھا۔ درخت کے پیچھے دبکا ہوا سیاہ ہیولا اب آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ سرک رہا تھا۔ پرتاب سنگھ نے فوراً ہی ٹریگر دبادیا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ گونج اٹھی اور پھر وہ ہیولا اس طرح اچھل کر دیوار پر چڑھا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ پرتاب سنگھ نے ایک بار پھر ٹریگر دبادیا۔ وہ دیوار کے دوسری طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔ گولی دیوار پر لگی تھی۔

پرتاب سنگھ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ وہ اس سیاہ ہیولے کے پیچھے گلی میں جانا چاہتا تھا لیکن مکان کے اندر سے وجدان کی چیخ سن کر چونک گیا۔ اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کردیا اور پلٹ کر برآمدے کے دروازے کی طرف لپکا۔

وجدان اس کے بیڈ روم میں سویا کرتا تھا۔ پرتاب سنگھ کا خیال تھا کہ فائرنگ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ڈر کر چیخا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم کی طرف دوڑا۔ وجدان کے چیخنے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پرتاب جیسے ہی اپنے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا' اس طرح ٹھٹک کر رک گیا۔ جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔

ایک دبلا پتلا سا چینی کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے وجدان کی گردن دبوچ رکھی تھی۔ پرتاب سنگھ نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن گولی نہیں چلائی۔ وجدان اس چینی کے قبضے میں تھا۔

"تم پستول پھینک دو پرتاب سنگھ۔" چینی نے اپنے پستول کی نال وجدان کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کہا "اگر کوئی چالاکی دکھایا تو ہم اس لڑکے کا کھوپڑی اڑا دے گا۔"

صورت حال انتہائی نازک تھی۔ لڑکے کی زندگی خطرے میں تھی۔ پرتاب سنگھ اس وقت کوئی چالاکی نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس چینی کی انگلی کی معمولی سی حرکت وجدان کی زندگی کا خاتمہ کرسکتی تھی۔ اس نے پستول پھینک دیا۔

"تم بچ کر نہیں جاسکو گے۔" وہ چینی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہارا ایک ساتھی میرے ہاتھوں زخمی ہو کر بھاگ گیا ہے۔ باہر دو پولیس والے اور میرے دو گارڈ مکان کی چھت پر موجود ہیں۔ تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ بہتر ہے اس لڑکے کو چھوڑ دو اور اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔"

"یہ لڑکا اس وقت میرا زندگی کا ضمانت ہے۔" چینی نے کہا "میرا زندگی کا ضمانت بھی اور دس ہزار ڈالر کا چیک بھی۔ میں اس لڑکے کو زندہ لے جائے گا تو میرے کو دس ہزار ڈالر ملنے کا ہے اور تمہارے گارڈز۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "ہمارے جانے کا بعد تم چھت سے ان کا لاشیں اٹھالینا۔"

پرتاب سنگھ چونک گیا۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا سوں رب دی۔" پرتاب سنگھ بولا "اس لڑکے کو چھوڑ دو۔"

"ابھی تم میرا راستے سے ہٹ جاؤ۔" چینی نے پستول سے اشارہ کیا "اس طرف آجاؤ۔ کمرے کے اندر۔ ادھر..."

پرتاب سنگھ ابھی تک دروازے ہی میں کھڑا تھا۔ وہ اندر آگیا۔ چینی وجدان کو گردن سے پکڑے اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ پستول سے اس نے پرتاب سنگھ کو زد میں لے رکھا تھا۔ خوف کی شدت سے وجدان کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا لگتا تھا' اس کے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ چینی اسے اپنے ساتھ کھینچتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ پرتاب سنگھ بھی محتاط انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا دروازے سے باہر آگیا تھا۔

چینی وجدان کو گرفت میں لیے راہداری میں الٹے قدموں چلتا ہوا عقبی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مکان کے پچھلی طرف وسیع لان تھا۔ کوئی کمپاؤنڈ وال نہیں تھی بلکہ دوسرے مکانوں کے لان ساتھ ملے ہوئے تھے۔ پرتاب سنگھ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جب وہ مکان کے سامنے والے رخ پر دوسرے حملہ آور سے نبرد آزما تھا' اس وقت یہ چینی کسی طرح عقبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ حملہ آور صرف دو ہی تھے۔ ایک وہ جو پرتاب سنگھ کے ہاتھوں زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور ایک یہ جو چھت پر اس کے دونوں محافظوں سے نمٹنے کے بعد عقبی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا اور اب اسی راستے سے واپس جا رہا تھا۔

چینی وجدان کو گرفت میں لیے آہستہ آہستہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے پستول کا رخ اب بھی پرتاب سنگھ کی طرف تھا اور پرتاب سنگھ بھی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اس چینی کو روکنا چاہتا تھا لیکن ابھی تک کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور پھر وہ چینی کے پیچھے دیکھتے ہوئے اچانک ہی چیخا۔

"نہیں آفیسر گولی مت چلانا۔"

اس کا یہ نفسیاتی حربہ سو فی صد کامیاب رہا تھا۔ چینی بڑی تیزی سے پیچھے مڑا تھا۔ پرتاب سنگھ کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا چینی کے اوپر جا گرا۔ چینی بدحواس ہوگیا۔ وجدان کی گردن پر اس کی گرفت چھوٹ گئی البتہ دوسرے ہاتھ میں پستول موجود تھا۔

پرتاب سنگھ اسے لیے ہوئے ساتھ گرا تھا۔ اس نے سب سے پہلے چینی کے پستول والے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا تھا۔ اس نے چینی کی کلائی اس طرح مروڑ دی کہ پستول کا رخ دیوار کی طرف ہوگیا۔ ہاتھ پر دباؤ پڑنے سے ٹریگر دب گیا۔ گولی دیوار میں پیوست ہوگئی۔

"وجدان بھاگ جاؤ۔ کمرے میں جا کر دروازہ بند کرلو۔" پرتاب سنگھ چیخا۔

وجدان بھی اس چینی کے ساتھ ہی فرش پر گرا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے کی طرف دوڑا اور اندر گھس کر دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔

پرتاب سنگھ کے نیچے دبا ہوا چینی اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کررہا تھا لیکن پرتاب سنگھ کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس کی کلائی کو مروڑتا چلا گیا۔ پستول کا رخ اب چینی کے سر کی طرف ہوگیا تھا اور بالآخر پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگ گئی۔ چینی کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ وہ ٹریگر سے انگلی ہٹانے کی کوشش کرنے لگا لیکن پرتاب سنگھ نے اس کے ہاتھ کو اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ پرتاب سنگھ نے اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے زور دار جھٹکا دیا۔ ٹز کی آواز ابھری اور پستول کی نال سے نکلنے والی گولی اس کی کنپٹی میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ خون کے چھینٹے پرتاب سنگھ کے چہرے پر پڑے۔

"تیرا ستیا ناس۔" پرتاب سنگھ نے بڑبڑاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو ایک اور جھٹکا دیا۔ چینی کے جسم میں پیدا ہونے والے تشنج سے ٹریگر ایک مرتبہ پھر دب گیا۔ یہ گولی بھی کھوپڑی ہی میں پیوست ہوئی تھی۔

پرتاب سنگھ اسے چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس نے کرتے کے دامن سے اپنے چہرے سے خون کے چھینٹے پونچھے اور چینی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی کھوپڑی سے بہنے والا خون راہداری کے فرش پر بچھے ہوئے قالین کو تر کر رہا تھا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔

پرتاب سنگھ مڑ کر بیڈ روم کی طرف دوڑا۔

"وجدان پتر۔ دروازہ کھول۔" وہ دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔

چند سیکنڈ کے بعد دروازہ کھل گیا۔ وجدان سامنے کھڑا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پرتاب سنگھ نے اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ وجدان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا "ختم ہوگیا وہ۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کچھ ہوسکتا ہے؟ تو تو بڑا بہادر لڑکا ہے۔" اس نے قالین پر پڑا ہوا اپنا پستول اٹھا کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا "اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تو اندر سے دروازہ بند کرلے اور اگر کوئی آجائے تو اڑا دینا اسے گولی سے۔ ویسے آئے گا کوئی نہیں۔ ایک بھاگ گیا۔ ایک مرگیا۔ ڈرنا مت۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"تم کہاں جا رہے ہو چاچا۔" وجدان بولا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی۔

"میں چھت پر سوتر سنگھ کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ دروازہ بند کرلے۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ اس کے باہر نکلتے ہی وجدان نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا۔

پرتاب سنگھ برآمدے میں آگیا۔ اس نے بلب جلا دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا' دیواروں پر گولیوں کے کئی نشان تھے۔ ایک دو گملے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ وہ برآمدے سے اٹھ کر باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ دونوں پولیس والوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ وہ دروازہ بند کرکے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

اس کے دونوں گارڈز چھت پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں کو ہلا جلا کر دیکھا۔ دربار سنگھ ختم ہوچکا تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی گئی تھی۔ البتہ سوتر سنگھ زندہ تھا لیکن بے ہوش پڑا تھا۔ پرتاب سنگھ دوڑتا ہوا نیچے آگیا اور لاؤنج میں رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

پولیس کو وہاں پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اسے بتایا گیا کہ گلی میں رہنے والے ایک اور شخص نے پولیس کو فون پر فائرنگ کی اطلاع دے دی تھی اور پولیس پہلے ہی روانہ ہوچکی تھی۔

پرتاب سنگھ فون کا ریسیور رکھ کر باہر آگیا۔ پولیس پارٹی کا انچارج انسپکٹر چیانگ شو تھا۔ اس نے آتے ہی چند پولیس والوں کو گلی میں پھیلا دیا۔ تین پولیس والوں کو اس نے اپنے ساتھ رکھا تھا۔

پرتاب سنگھ اسے بتا رہا تھا کہ کس طرح وہ مکان کی چھت پر اٹھا پٹخ کی آوازیں سن کر کمرے سے باہر نکلا تھا اور جب وہ اپنے باڈی گارڈ سوتر سنگھ کو آواز دیتا ہوا برآمدے والے دروازے سے باہر آیا تو اس پر زبردست فائرنگ شروع کردی گئی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا تھا۔ اگر وہ بروقت گملوں کے پیچھے چھلانگ نہ لگا دیتا تو وہ چھلنی ہوچکا ہوتا۔

"حملہ آور وجدان کو اغوا کرکے لے جانا چاہتے تھے۔" پرتاب سنگھ انسپکٹر کو بتا رہا تھا "اگر اسے قتل کرنا مقصود ہوتا تو وہ چینی اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرنے کے بجائے گولی مار کر ہلاک کردیتا جس کا اسے موقع بھی حاصل تھا لیکن وہ اسے زندہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے بدلے اسے دس ہزار ڈالر ملنے کی توقع تھی۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ اسے دس ہزار ڈالر ملنے والے تھے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے اسے گھورا۔

"اس نے خود کہا تھا۔" پرتاب سنگھ بولا "مجھے اس کے الفاظ اچھی طرح یاد ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ لڑکا نہ صرف یہاں سے نکلنے کے لیے اس کی زندگی کی ضمانت ہے بلکہ دس ہزار ڈالر کے چیک کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ وہ زندہ اسے ساتھ لے جائے گا تو اسے دس ہزار ڈالر ملیں گے۔"

"تمہارے خیال میں حملہ آور کون ہوسکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان کا تعلق کس سے ہوگا؟" انسپکٹر چیانگ شو نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دارا۔" پرتاب سنگھ نے بلا جھجک جواب دیا "اس کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔ وجدان اپنے والدین کے قتل کا چشم دید گواہ ہے۔ دارا اسے ہر قیمت پر ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہوگا کہ وجدان کو اس کے سامنے قتل کیا جائے تاکہ اسے اطمینان ہوجائے کہ اب اس کے جرم کا چشم دید گواہ زندہ نہیں رہا اور غالباً اسی لیے اس نے وجدان کو اغوا کرانے کے لیے ان چینی قاتلوں کی خدمات حاصل کی تھیں لیکن اس کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکا۔"

"بات سمجھ میں آتی ہے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے گردن ہلائی "تم نے بتایا تھا کہ تم نے چھت پر دھینگا مشتی کی آوازیں دو بجے کے قریب سنی تھیں' کیا تم اس وقت سوچکے تھے یا جاگ رہے تھے؟"

"میں اس وقت سونے کی تیاری کررہا تھا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "بات دراصل یہ ہے کہ رات دس بجے کے قریب ہم نے ہوٹل سے کھانا منگوا کر کھایا تھا..... پھر وجدان تو تھوڑی دیر بعد سوگیا تھا لیکن میں اپنے بستر پر لیٹا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ کتاب خاصی دلچسپ تھی۔ میں نے اسے ختم کرکے ہی چھوڑا۔ کتاب رکھ کر میں نے گھڑی دیکھی تھی' اس وقت دو بج چکے تھے۔" پرتاب سنگھ خاموش ہو کر باہر والے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ عابد علی کی ڈائری کا تذکرہ وہ دانستہ طور پر گول کر گیا تھا "اور ہاں۔" وہ چند

طالوت
قیمت فی حصہ 50 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
③ حصوں میں (مکمل)
کتابیات پبلی کیشنز
7 بکس 23 کراچی 74200
فون: 6802552-6895313 فیکس: 6802551

لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ایک اور اہم بات بتانا تو میں بھول ہی گیا۔"

"وہ کیا؟" انسپکٹر بولا "کیا اس بات کا اس واقعے سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے انسپکٹر۔" پرتاب سنگھ نے کہا "گزشتہ روز ہم ہوٹل سے کھانا کھا کر واپس آ رہے تھے تو ٹریفک سگنل کی وجہ سے ہمیں ایک چوراہے پر گاڑی روکنی پڑی تھی۔ وجدان میرے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک موٹر سائیکل ہماری کار کے قریب آ کر رکی جس پر دو چینی سوار تھے۔ وجدان نے ان میں سے ایک کو پہچان لیا۔ وہ اس کے ماں باپ کے قاتلوں میں سے ایک تھا۔ اس نے پابھو پر خنجر سے وار کر کے اسے ہلاک کیا تھا۔ وجدان نے چیخ کر مجھے اس کے بارے میں بتایا تو میں جلدی سے گاڑی سے اتر آیا۔ ان چینیوں نے بھی وجدان کے چلّانے کی آواز سن لی تھی اور غالباً اس شخص نے بھی وجدان کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھادی اور سگنل توڑتے ہوئے نکل گئے۔ ہم نے ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔"

"کیا تم نے ان کے چہرے دیکھے تھے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں ان میں سے کسی کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا لیکن لڑکے نے انہیں پہچان لیا تھا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔

"لڑکا کہاں ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"اندر کمرے میں۔" پرتاب سنگھ نے اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اس سے ملتا ہوں لیکن پہلے ادھر کا معائنہ کر لیں۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

وہ سب سے پہلے زینے پر سے ہوتے ہوئے چھت پر آ گئے۔ دو کانسٹیبل انسپکٹر کے ساتھ تھے۔ انسپکٹر نے جھک کر ٹارچ کی روشنی میں پہلے دربار سنگھ کو دیکھا، وہ ختم ہو چکا تھا، وہ سوتر سنگھ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ زندہ ہے۔" وہ بڑبڑایا پھر کانسٹیبلوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسے نیچے لے چلو اور ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔"

دونوں کانسٹیبلوں نے جھک کر سوتر سنگھ کو اٹھا لیا اور نیچے لے آئے۔ انسپکٹر اور پرتاب سنگھ بھی نیچے آ گئے اور اندر داخل ہو کر راہداری میں اس چینی کی لاش کے قریب رک گئے جس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ چہرہ خون سے تر ہو رہا تھا۔

"یہ کیسے مرا تھا۔ کیا تم نے....."

"نہیں بادشاہو۔" پرتاب سنگھ نے اس کی بات کاٹ دی "یہ اپنے ہی پستول سے اپنے ہی ہاتھوں مرا ہے۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔"

انسپکٹر چیانگ شو جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے لباس کی تلاشی بھی لی تھی۔ سگریٹ کا ایک پیکٹ، لائٹر اور کچھ رقم برآمد ہوئی تھی۔ ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جس سے اس کی شناخت ہو سکتی۔

پرتاب سنگھ نے دستک دے کر بیڈ روم کا دروازہ کھلوالیا تھا۔ وجدان پستول ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے سائے رقص کر رہے تھے۔

"پولیس آ گئی ہے۔ اب ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لاؤ پستول مجھے دے دو۔" پرتاب سنگھ نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

وجدان نے پستول اس کے حوالے کر دیا اور خود بھی اس سے لپٹ گیا۔ پرتاب سنگھ اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔ کچھ دیر بعد انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ وجدان سے پوچھ گچھ کرنے لگا اور پرتاب سنگھ بستر کی چادر اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے چادر راہداری میں پڑی ہوئی چینی کی لاش پر ڈال دی تھی۔

انسپکٹر چیانگ شو اس چینی کے بارے میں وجدان سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ وجدان اب بڑی حد تک اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تھا اور بڑے پُراعتماد لہجے میں اس کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس دوران میں پرتاب سنگھ دوبارہ کمرے میں آ گیا۔

"ٹیلی فون کہاں ہے؟" انسپکٹر نے پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دوسرے کمرے میں۔ میرے ساتھ آؤ۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

ان کے ساتھ ہی وجدان بھی لاؤنج میں آ گیا۔ انسپکٹر نے فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس اسٹیشن کے نمبر ڈائل کیے اور ایمبولینس اور فوٹوگرافر کو بھیجنے کی ہدایت دے کر فون بند کر دیا۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی انسپکٹر۔" پرتاب سنگھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہاں ڈیوٹی دینے والے تمہارے دونوں کانسٹیبل کہاں غائب ہو گئے۔"

"یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ سکی۔" انسپکٹر نے جواب دیا "انہیں سختی سے ہدایت تھی کہ وہ ڈیوٹی کے دوران میں غفلت نہ برتیں۔ اگر وہ ڈیوٹی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں تو اس بے پروائی پر انہیں سخت ترین سزا دی جائے گی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان سے اس قسم کی کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

اور پھر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ پرتاب سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ ایک لمحہ بات کی پھر ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھادیا۔

"تمہارے لیے کال ہے۔"

"یس۔ انسپکٹر چیانگ شو۔" انسپکٹر ریسیور کان میں لگاتے ہوئے بولا۔

فون پر بات کرتے ہوئے انسپکٹر چیانگ شو کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ پرتاب سنگھ گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ انسپکٹر تقریباً پانچ منٹ تک چینی زبان میں بات کرتا رہا

پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پرتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا اندازہ درست نکلا۔ گڑبڑ کی تصدیق ہو گئی ہے۔ وہ دونوں کانسٹیبل ڈبلن روڈ پر بے ہوش پڑے پائے گئے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں وہ یہاں آ جائیں گے ان سے صورتِ حال کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"میں نے فون پر تمہاری باتوں سے کچھ اندازہ لگا لیا تھا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ وہ طویل عرصے سے سنگاپور میں رہ رہا تھا۔ چینی زبان اگرچہ وہ روانی سے نہیں بول سکتا تھا لیکن سمجھتا اچھی طرح تھا۔

سوتر سنگھ ابھی تک ہوش میں نہیں آ سکا تھا۔ پرتاب سنگھ کو اس کے بارے میں بھی تشویش تھی کہ وہ کہیں بے ہوشی کی حالت میں ہی اگلے جہاں کو نہ سدھار جائے۔ اس نے انسپکٹر چیانگ شو سے اپنی تشویش کا اظہار کیا تو انسپکٹر نے سوتر سنگھ کو اپنی جیپ میں ڈال کر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اسپتال بھجوا دیا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایمبولینس آ گئی اور فوٹوگرافر بھی پہنچ گیا۔ رات کا... اگرچہ پچھلا پہر تھا لیکن کچھ لوگ گھروں سے نکل کر گلی میں آ گئے تھے۔ کچھ لوگ تو فائرنگ کی آوازیں سن کر جاگ گئے تھے لیکن اس وقت مارے ڈر کے کوئی اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا اور اب پولیس کے آنے کے بعد کچھ لوگ صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے گھروں سے باہر آ گئے تھے۔

انسپکٹر چیانگ شو اپنی نگرانی میں مختلف زاویوں سے لاشوں کی تصویریں کھنچوا رہا تھا۔ چینی کی لاش کی تصویریں کھنچوانے کے بعد اس نے لاش کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول نکال لیا اور اسے رومال میں لپیٹ کر ایک کانسٹیبل کے حوالے کر دیا اور لاشیں اٹھانے کا حکم دے دیا۔ تقریباً اسی وقت پولیس کی ایک جیپ ان دونوں کانسٹیبلوں کو بھی لے کر آ گئی۔

ان کانسٹیبلوں کا بیان بڑا دلچسپ تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق ڈیڑھ بجے کے قریب ایک کار وہاں آ کر رکی تھی جس میں تین پولیس والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آرچرڈ روڈ پر لکی پلازا کے قریب ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں زیادہ سے زیادہ پولیس نفری کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ہم ان کے ساتھ چلیں۔ چنگ نامی کانسٹیبل نے کہا "میں نے انہیں کہا بھی تھا کہ ہماری ڈیوٹی یہاں لگائی گئی ہے۔ ہم کہیں نہیں جا سکتے لیکن ان میں سے ایک نے کہا کہ انسپکٹر چیانگ نے انہیں فوری طور پر طلب کیا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ٹیلی فون پر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ سردار صاحب شاید سو چکے تھے۔ چھت پر ان کے باڈی گارڈز بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ بھی شاید اونگھ گئے تھے۔ یہاں سے ٹیلی فون کرنے کے لیے سردار صاحب کو جگانا پڑتا جسے میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ کار میں آنے والی پولیس پارٹی کے سربراہ نے کہا کہ ہم چوراہے پر لگے ہوئے فون باتھ سے بات کر سکتے ہیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے مشورہ کیا اور کار میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے میرے ساتھی کو بھی کار میں بٹھا لیا۔ ان میں سے ایک تو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور دو پچھلی سیٹ پر ہمارے دائیں بائیں۔ ہم ان دونوں کے درمیان دب کر رہ گئے۔

"کار اسٹارٹ ہوتے ہی ان میں سے ایک آدمی نے ہمیں سگریٹ دیے۔ ہم سگریٹ کے کش لگاتے رہے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں باتوں میں لگائے رکھا اور ہمیں احساس بھی نہیں ہوا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ شاید اس سگریٹ میں کوئی نشہ آور چیز ملی ہوئی تھی کیونکہ میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ اعضا ڈھیلے پڑ رہے تھے اور ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

"میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے میری رائفل لینا چاہی تو ایک لمحے کو میں چونک سا گیا۔ اس وقت مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں نے اس وقت مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو اس شخص نے جیب سے پستول نکال کر میرے سر پر دستے سے ضرب لگائی۔ سگریٹ کا نشہ پہلے ہی اپنا کام دکھا رہا تھا۔ پستول کی ضرب سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

"مجھے ہوش آیا تو میں پولیس اسٹیشن میں تھا اور ایک پولیس والا منگ کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہمیں یہاں لے آیا گیا۔"

"مسٹر پرتاب سنگھ۔" انسپکٹر نے کانسٹیبل چنگ کے خاموش ہونے پر پرتاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارروائی باقاعدہ پلاننگ کے تحت کی گئی تھی اور ان کی تعداد پانچ تھی۔ تین آدمی دھوکے سے میرے کانسٹیبلوں کو یہاں سے ہٹا لے گئے اور دو نے اس لڑکے کو اغوا کرنے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک زخمی ہو کر بھاگ گیا اور دوسرا موت کا شکار ہو گیا۔"

"میرا ایک بندہ مارا گیا اور دوسرے کے بارے میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" سردار پرتاب سنگھ نے کہا "لیکن کیا تمہارے آدمی اتنے بے وقوف ہیں کہ تصدیق کیے بغیر ان لوگوں کے ساتھ چل پڑے جو پولیس کی وردیاں پہن کر آئے تھے۔ کیا یہ لوگ اپنے اسٹیشن کے پولیس والوں کو نہیں پہچانتے؟"

"اس سلسلے میں انکوائری ہوگی اور ان دونوں کے خلاف محکمانہ کارروائی کی جائے گی۔ بہرحال۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میں دوسرے کانسٹیبل یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں اور ہاں۔" وہ وجدان کی طرف متوجہ ہو گیا "بیٹا۔ یہ وہی آدمی تو نہیں تھا جس نے تمہاری ماں کو قتل کیا تھا؟" اس کا اشارہ اس چینی کی طرف تھا جس کی لاش اب اٹھائی جا چکی تھی۔

"نہیں۔ یہ وہ نہیں تھا۔" وجدان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے پرتاب سنگھ۔" انسپکٹر نے کہا "امید ہے ملزموں کا سراغ مل جائے گا اور ہم بہت جلد انہیں گرفتار کر لیں گے۔"

"دیکھیں جی۔ کیا ہوتا ہے۔" پرتاب سنگھ بولا "ویسے سوں رب دی۔ اگر وہ میرے ہاتھ لگ گئے تو انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ اگر ان میں سے کوئی نظر آجائے تو خود کوئی کارروائی کرنے کے بجائے پولیس کو مطلع کردینا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

پولیس رخصت ہوگئی۔ اس وقت صبح کے چار بجنے والے تھے۔ پولیس کے جاتے ہی گلی میں کھڑے ہوئے کچھ لوگ پرتاب سنگھ کے پاس آگئے اور حملہ آوروں کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔

"اگر اتنا پتا ہوتا کہ وہ کون لوگ تھے تو اب تک ان سب کو چن چن کر ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔

آدھا گھنٹا لوگوں کے سوال و جواب میں گزر گیا۔ لوگ ہمدردی جتا رہے تھے اور پرتاب سنگھ کو الجھن ہو رہی تھی۔ اس کا ایک بندہ مرچکا تھا اور دوسرا اسپتال میں تھا۔ اس کے بارے میں اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ ہوش میں آیا تھا یا نہیں۔ وہ وجدان کو اکیلے چھوڑ کر کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی جان کے دشمن موقع کی تاک میں تھے اور پرتاب سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ وجدان کو کوئی نقصان پہنچے۔

کمرے میں آکر اس کی نظر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی عابد علی کی ڈائری پر پڑ گئی۔ اس نے ڈائری اٹھا کر میز کی سب سے نچلی دراز میں بھرے ہوئے کاغذوں کے نیچے رکھ دی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے چاچا۔"

پرتاب سنگھ، وجدان کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"ڈر کس بات کا پتر۔" پرتاب سنگھ نے کہا "چلو اب تم اپنے بستر پر لیٹ کر سو جاؤ۔ مجھے ابھی کچھ کام کرنے ہیں۔ ڈرنے کی کیا بات ہے۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"

وجدان اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے لیکن بہرحال تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔ پلنگ کی پٹی پر بیٹھا ہوا پرتاب سنگھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس چھوٹی سی عمر میں وہ کتنے سنگین اور خوفناک حالات سے گزر رہا ہے۔ پہلے اس نے اپنے ماں باپ کا خون ہوتے دیکھا اور اب اس کے سامنے دو خون اور ہوئے تھے۔ پرتاب سوچ رہا تھا کہ جب وجدان کی کنپٹی پر پستول رکھا گیا تھا تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس نے مڑ کر ایک بار پھر وجدان کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر لاؤنج میں آگیا۔ بیڈ روم کا دروازہ اس نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔

فون کا ریسیور اٹھا کر اس نے اپنے ایک دوست کا نمبر ملایا۔ کال تقریباً ایک منٹ بعد ریسیو کی گئی تھی۔ ایک آدمی کی خوابیدہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"رب بھلا کرے۔ کون ہے بھئی تڑکے تڑکے؟"

"میں پرتاب سنگھ بول رہا ہوں دلدارا۔" پرتاب سنگھ نے کہا "یہ سونے کا ویلا نہیں ہے۔ تم جلدی سے بستر سے اٹھو اور میرے گھر آجاؤ۔ پابھو کو بھی ساتھ لیتے آنا۔ یہاں اس کی ضرورت بھی پڑے گی۔"

"پر ہوا کیا ہے؟" دلدار سنگھ نے پوچھا "سرندر کور کی ضرورت کیوں پڑے گی۔ تڑکے تڑکے تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

"بڑا ہی غضب ہوگیا ہے یار۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "چینی غنڈے عابد علی کے پتر وجدان کو اغوا کرنے آئے تھے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے مگر دربار سنگھ ان کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ سوتر سنگھ کی حالت بھی نازک ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔ تم دونوں جلدی سے یہاں آجاؤ۔"

"تم تو ٹھیک ہو نا!" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"او میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہٹا کٹا۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ بس تم لوگ آجاؤ۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

"ہم آرہے ہیں تھوڑی دیر میں۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر لائن بے جان ہوگئی۔

پرتاب سنگھ نے کریڈل دبا کر اسپتال کا نمبر ملایا اور سوتر سنگھ کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

"وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آسکا۔" ایک ڈاکٹر نے جواب دیا "ہوش میں آنے کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔"

"ویسے وہ بچ تو جائے گا نا ڈاکٹر صاحب۔" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

"میں نے کہا نا کہ ہوش میں آنے کے بعد ہی کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پرتاب سنگھ نے ریسیور رکھ دیا اور لاؤنج سے نکل کر برآمدے میں آکر کھڑا ہوگیا۔ اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گلی میں رہنے والے جو لوگ صورتِ حال معلوم کرنے آئے تھے، وہ اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ گیٹ کے باہر وہ دو پولیس والے کھڑے چینی زبان میں باتیں کر رہے تھے جنہیں انسپکٹر چیانگ شو چھوڑ گیا تھا۔

پرتاب سنگھ ان چینی غنڈوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ ان میں سے تین دھوکے سے پولیس والوں کو لے گئے تھے اور دو نے مکان پر ہلہ بول دیا تھا۔ ان میں سے ایک زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا اور دوسرا مارا گیا تھا لیکن پرتاب کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ سوتر سنگھ اور دربار سنگھ اتنی آسانی سے ان کے قابو میں کیسے آگئے تھے۔ وہ دونوں چھ چھ فٹ کے گبرو جوان تھے۔ لڑائی میں تو دو چار آدمیوں کے قابو میں نہیں آسکتے تھے لیکن دربار سنگھ کس قدر خاموشی سے اپنی گردن تڑوا بیٹھا تھا اور سوتر سنگھ ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

ظاہر ہے ان چینی غنڈوں کی خدمات کرائے پر حاصل کی گئی تھیں اور ان کی پشت پر دارا کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ دارا..... جو اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس کی دشمنی عابد علی سے تھی اور وہ عابد علی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ اس نے عابد علی اور اس کی بیوی کو ختم کردیا تھا اور اب ان کے بیٹے کو ختم کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ صرف وجدان ہی اسے شناخت کرسکتا تھا اور وجدان کی گواہی اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتی تھی۔ وہ ہر صورت میں وجدان کو ختم کرنا چاہتا تھا اور اس چکر میں اس نے پرتاب سنگھ سے بھی دشمنی مول لی تھی۔ پرتاب سنگھ کا ایک بندہ مارا گیا تھا اور دوسرا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

"تمہیں میری دشمنی مہنگی پڑے گی دارے۔" وہ مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑایا "میں دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں۔"

دارا کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ دانت کچکچانے لگا۔ جبڑوں کے مسل ابھر آئے تھے۔ پہلے تو وہ اپنے جگری دوست عابد علی اور اس کی بیوی کے قتل کا انتقام لینا چاہتا تھا لیکن اب اس میں ذاتی انتقام کا عنصر بھی شامل ہوگیا تھا اور اب اس نے واقعی طے کرلیا تھا کہ وہ دارا کا پیچھا دنیا کے آخری کونے تک کرے گا۔

باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سن کر اس کے خیالات منتشر ہوگئے۔ اس نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ گیٹ بند تھا لیکن اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دلدار سنگھ آیا ہوگا۔ دلدار سنگھ کی رہائش ریور ویلی روڈ پر تھی۔ عام حالات میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں پہنچا جاسکتا تھا لیکن اسے سوتے سے جگایا گیا۔ تیار ہونے میں کچھ وقت لگا ہوگا۔ اب بیس پچیس منٹ ہوچکے تھے۔ انہی کی گاڑی ہوگی اور پھر دلدار سنگھ کی آواز سن کر اس کی تصدیق ہوگئی۔ گیٹ پر متعین پولیس والے اسے روک کر سوال و جواب کر رہے تھے۔ پرتاب سنگھ نے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔

"انہیں اندر آنے دو کانسٹیبل۔" اس نے ایک کانسٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اندر آگئے۔ پرتاب سنگھ نے گیٹ بند کردیا۔

"کیا ہوگیا بھایا۔" دلدار سنگھ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"ہونا کیا ہے۔ وہ شیطان ہاتھ دھو کر اس معصوم کے پیچھے پڑگئے ہیں۔" پرتاب سنگھ نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "آج بھی وہ اسے اٹھانے آئے تھے لیکن جب تک پرتاب سنگھ زندہ ہے، وہ اس بچو نگڑے پر آنچ نہیں آنے دے گا۔"

"کہاں ہے وہ؟" سرندر کور نے پوچھا۔

"اندر کمرے میں سو رہا ہے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "کتنا معصوم سا بچہ ہے یار۔ اس پر کیسے کیسے ظلم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں۔ اس روز اس کی نظروں کے سامنے اس کے ماں باپ کو بے دردی سے قتل کردیا اور آج اس کی کنپٹی پر پستول رکھ دیا۔ کیا حالت ہوئی ہوگی اس معصوم کی۔"

"اور دربار سنگھ کیسے مرا۔ سوتر سنگھ کیسا ہے؟" دلدار سنگھ نے پوچھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے لاؤنج میں آگئے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنی گردن کی ہڈی کیسے تڑوا بیٹھا۔ سوتر سنگھ بھی ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ میں اسپتال جانا چاہتا تھا لیکن اس لڑکے کو نہ تو یہاں اکیلے چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی ساتھ لے جاسکتا تھا اسی لیے میں نے تم لوگوں کو بلوالیا ہے پابھو۔" وہ سرندر کور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم کچن میں جا کر چائے بنالو۔ آنکھوں میں جلن اور دماغ میں دھماکے سے ہو رہے ہیں۔ ایک کپ چائے پی لوں تو پھر اسپتال جا کر سوتر سنگھ کا پتا کروں۔ ساری چیزیں کچن میں موجود ہیں، دودھ کی بوتل بھی فریج میں رکھی ہوئی ہے۔"

سرندر کور کچن میں چلی گئی۔ وہ تینتیس چونتیس سال کی ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ قد لانبا اور حسن بھی خدا نے اسے جی بھر کے دیا تھا۔ وہ اس وقت شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی۔

دلدار سنگھ کی عمر اڑتیس سال تھی۔ وہ بھی صحت مند جسم اور لمبے قد کا مالک تھا..... وہ سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر پر پگڑی نہیں تھی۔ بال سفید نیٹ میں کھوپڑی پر جوڑے کی طرح پھنسے ہوئے تھے۔ سیاہ گول داڑھی اس کے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

دلدار سنگھ سے پرتاب کی دوستی بڑی پرانی تھی۔ شہر میں چلنے والی تین درجن ٹیکسیاں اور تقریباً چالیس ٹرشا اس کی ملکیت تھے۔ وہ یہ گاڑیاں کرائے پر چلاتا تھا۔ تقریباً بیس سال پہلے جب وہ سنگاپور آیا تھا تو اس نے کرائے پر ٹرشا لے کر چلانا شروع کیا تھا۔ وہ اس وقت اٹھارہ سال کا نوجوان تھا۔ کام اور محنت کا جذبہ تھا۔ وہ یہ آرزو لے کر سنگاپور آیا تھا کہ محنت کرے گا اور کمائے گا۔ اس نے واقعی محنت کی اور کمایا۔ ایک سال کی محنت سے اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹرشا خرید لیا پھر دوسرا پھر تیسرا۔ ٹرشا کے ساتھ اس نے ٹیکسیوں پر بھی ہاتھ ڈال دیا اور اب بیس سال گزرنے کے بعد وہ ٹرشا اور ٹیکسیوں کے حوالے سے سنگاپور کی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ دوسرے ممالک، خاص طور پر ہندوستان سے روزگار کی تلاش میں آنے والے لوگ جب ہر طرف سے مایوس ہوجاتے تو دلدار سنگھ کے پاس آجاتے۔ وہ انہیں بغیر کسی ضمانت یا سیکیورٹی کے ٹیکسی یا ٹرشا کرائے پر دے دیتا۔ ویسے اس کے زیادہ تر ڈرائیور مستقل ہی تھے۔ دلدار سنگھ کی روزانہ کی آمدنی ہزاروں میں تھی۔ اس نے ریور ویلی روڈ پر ایک شان دار بنگلا بنا رکھا تھا۔

اس کی شادی بھی سنگاپور میں رہنے والی ایک سکھ فیملی میں ہوئی تھی اور یہ رشتہ کرانے میں پرتاب سنگھ کا بھی ہاتھ تھا۔ سرندر کور حسین ہونے کے ساتھ بڑی سگھڑ اور تعلیم یافتہ تھی لیکن خدا

نے ان دونوں کو ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم ہی رکھا تھا مگر وہ مایوس نہیں تھے۔ ولدار سنگھ کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن خدا ان کی جھولی بھی بھر دے گا۔

سریندر کور چائے بنا کر لے آئی۔ ایک کپ اس نے پرتاب سنگھ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دوسرا اپنے شوہر کو دیا اور تیسرا خود سنبھال کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔

"یہ پتا نہیں چلا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ انہوں نے عابد علی اور اس کی بیوی کو قتل کیوں کیا اور وہ ان کے بیٹے کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں؟" ولدار سنگھ نے پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی پرانی دشمنی ہے۔" پرتاب سنگھ نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "انہوں نے عابد علی اور اس کی بیوی اور بیٹے کو لاہور میں بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھاگ کر یہاں آگیا۔ یہ بارہ سال پہلے کی بات ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر عابد علی کی کہانی سنانے لگا۔ سونے والی بات وہ گول کر گیا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا "بارہ سال تو سکون سے گزر گئے۔ عابد علی کا خیال تھا کہ وہ لوگ اسے بھول گئے ہوں گے لیکن موت کسی کو نہیں بھولتی۔ وہ دونوں تو ختم ہوگئے لیکن میں اس معصوم کو ان درندوں کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔ انہوں نے میرے گھر پر حملہ کر کے اور میرے بندے کو مار کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب وہ میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔" اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا "اپنی گاڑی کی چابی مجھے دو۔ میں اسپتال جا رہا ہوں اور پابھو۔ تم ذرا کاکے کا خیال رکھنا۔ میں نے تڑکے تڑکے تمہیں بھی تکلیف دی۔"

"نہیں بھاجی۔" سریندر کور نے جواب دیا "تکلیف کیسی۔ بندہ ہی تو بندے کے کام آتا ہے۔"

ولدار سنگھ بھی سلیپنگ سوٹ کی شرٹ سے چابیوں کا گچھا نکالتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے چابیوں کا گچھا پرتاب سنگھ کی طرف بڑھا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

پرتاب سنگھ اس کی مرسڈیز کار میں بیٹھ کر رخصت ہوگیا تو اس نے گیٹ بند کر دیا اور اندر آگیا۔

پانچ بج چکے تھے۔ رات کی تاریکی دن کے اجالے میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ سڑکوں پر ابھی صرف دودھ والوں کی گاڑیوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تھی یا کوئی اکا دکا کار نظر آجاتی۔ پرتاب سنگھ کو سڑکیں زیادہ تر خالی ہی ملی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ گاڑی متوسط رفتار سے چلا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مقررہ حد سے تیز گاڑی چلانا جرم تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کوئی نہ کوئی سارجنٹ کہیں نہ کہیں ضرور چھپا کھڑا ہوگا۔ تیز رفتار گاڑی کو دیکھتے ہی وہ اپنی موٹر سائیکل پر تعاقب شروع کر دے گا۔ جس کے نتیجے میں چالان تو ہوگا ہی کچھ وقت بھی ضائع ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ اڑ کر اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن اس نے گاڑی کی رفتار قابو میں رکھی تھی۔

ٹیگن روڈ پر واقع اسپتال پہنچنے میں اسے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ انکوائری کاؤنٹر سے پتا چلا کہ سوتر سنگھ کو تیسری منزل پر ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔ پرتاب سنگھ کمرے کا نمبر دریافت کر کے تیسری منزل پر پہنچ گیا۔ وہ جیسے ہی ایک راہداری میں مڑا، چند گز آگے دو پولیس والوں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ اس کا مطلوبہ کمرا وہی ہے جس کے سامنے پولیس والے کھڑے تھے اور ان پولیس والوں نے اسے کمرے میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔

"اوئے وہ میرا متر ہے۔ تم مجھے اندر جانے سے کیسے روک سکتے ہو۔" پرتاب سنگھ نے پولیس والے کو گھورتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر چیانگ شو کی اجازت کے بغیر تم اندر نہیں جاسکتے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"کہاں ہے انسپکٹر چیانگ شو۔ اسے بتاؤ سردار پرتاب سنگھ آیا ہے۔" پرتاب نے کہا۔

کانسٹیبل نے پہلے اسے گھور کر دیکھا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس کی واپسی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے پرتاب سنگھ کو اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔

کمرے میں انسپکٹر چیانگ شو کے علاوہ سادہ لباس میں ہوم سائیڈ کا ایک آفیسر بھی موجود تھا۔ بیڈ کے دوسری طرف ایک ڈاکٹر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نرس بھی تھی۔

سوتر سنگھ بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ اسے دیکھ کر پرتاب سنگھ جلدی سے آگے بڑھا مگر انسپکٹر چیانگ شو نے اسے روک لیا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

پرتاب سنگھ تڑپ کر رہ گیا۔ وہ بیڈ کے قریب سوتر سنگھ کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ سوتر سنگھ نے اس کی طرف دیکھا بھی تھا لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ شناسائی کی رمق بھی نظر نہیں آئی تھی۔ بیڈ پر جھکا ہوا ڈاکٹر سوتر سنگھ سے بار بار کچھ پوچھ رہا تھا لیکن اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ وحشت زدہ سی نظروں سے باری باری ان سب کی طرف دیکھتا رہا۔

"سوری آفیسر۔" ڈاکٹر سیدھا ہوتے ہوئے بولا "ابھی تم اس کا بیان نہیں لے سکتے۔ مجھے اندیشہ ہے اس کی یادداشت اور قوت گویائی متاثر ہوئی ہے۔"

"کیا....؟" پرتاب سنگھ کانپ اٹھا اور پھر وہ ڈاکٹر اور انسپکٹر کی پروا کیے بغیر آگے بڑھا اور سوتر سنگھ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا "تم بولتے کیوں نہیں سوتر سنگھ۔ میری طرف دیکھو۔ مجھے پہچانو۔ میں پرتاب سنگھ ہوں۔ دیکھو۔ مجھے غور سے دیکھو.... پہچانو مجھے...."

سوتر سنگھ کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے۔ پرتاب سنگھ نے اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اس نے پرتاب سنگھ کی طرف دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ اس کے ہونٹوں کو بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔

انسپکٹر چیانگ شو نے آگے بڑھ کر پرتاب سنگھ کو بازو سے پکڑ کر پیچھے ہٹالیا۔ اب پرتاب سنگھ، سوتر سنگھ کو اس طرح خاموشی سے دیکھ رہا تھا جیسے اس کی اپنی قوت گویائی سلب ہوگئی ہو۔ سوتر سنگھ کے بارے میں ڈاکٹر کے سنسنی خیز انکشاف سے اس کے حواس پر بجلی سی گری تھی۔

"مسٹر پرتاب سنگھ۔" انسپکٹر چیانگ شو نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا "ہوش میں آؤ پرتاب سنگھ۔ ہوسکتا ہے شدید صدمے کی وجہ سے وقتی طور پر اس کے حواس مختل ہوگئے ہوں اور بولنے کی سکت نہ رہی ہو۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو۔"

"کیا یہ ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر!" پرتاب سنگھ نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا "کیا انسپکٹر ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

"ہاں۔ تمہارے آنے سے پہلے ہم یہی بات کر رہے تھے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا "یہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے ہوش میں آیا ہے۔ عین ممکن ہے کچھ وقت گزرنے کے بعد اس کی قوت گویائی اور یادداشت بحال ہو جائے۔ بہرحال، چند ٹیسٹ ہوں گے۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی بات بتائی جاسکے گی۔"

"اس کی زندگی کو تو کوئی خطرہ نہیں؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی زندگی محفوظ ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"لیکن اس زندگی کا کیا فائدہ۔" پرتاب سنگھ بولا "نہ یہ بول سکے گا نہ کسی کو پہچان سکے گا۔ اسے تو اپنی پہچان بھی نہیں رہے گی۔ اسے تو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ یہ خود کون ہے۔"

"مایوس نہ ہوں مسٹر پرتاب۔" ڈاکٹر نے کہا "ہم پوری کوشش کریں گے کہ اس کی قوت گویائی اور یادداشت لوٹ آئے۔"

"میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں ڈاکٹر۔ میں اپنی ساری دولت لٹا دوں گا۔ اسے......"

"حوصلہ رکھو مسٹر پرتاب۔" انسپکٹر چیانگ شو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "یہاں کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آؤ باہر چلیں۔"

ہوم سائیڈ آفیسر بھی ان کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا تھا۔

"کوئی امپروومنٹ ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا ڈاکٹر۔" انسپکٹر چیانگ شو نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پرتاب سنگھ کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے دروازے پر متعین پولیس کانسٹیبلوں کو سختی سے ہدایت کی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی بھی غیر متعلق شخص کو کمرے میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔

وہ اسپتال کی عمارت سے باہر آکر لان میں کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ پرتاب سنگھ کی آنکھوں میں جیسے مرچیں سی بھر گئی تھیں اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔

"اب تم گھر جاؤ پرتاب سنگھ۔" انسپکٹر چیانگ شو اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے دربار سنگھ کی آخری رسومات بھی تمہیں ہی ادا کرنی ہوں گی اور اس سلسلے میں تمہیں انتظامات بھی کرنے ہیں۔"

"میرے سوا ان کا یہاں ہے بھی کون۔" پرتاب سنگھ گہرا سانس لیتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولا "ان دونوں کے خاندان تو ہندوستان میں ہیں۔ میں ٹیلی فون پر دربار سنگھ کے گھر والوں کو اطلاع دے دیتا ہوں۔ اس کی ڈیڈ باڈی امرتسر بھجوانی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پولیس کی طرف سے کاغذات تیار کر کے کسی کانسٹیبل کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔ تم اسپتال سے ڈیڈ باڈی منگوا لینا اور اپنا خیال رکھنا۔ تم پر بہت سی ذمے داریاں آن پڑی ہیں۔ تمہیں اس بچے کا بھی خیال رکھنا ہوگا جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ میں اس کی حفاظت کے لیے مزید انتظامات کروں گا۔ جاؤ، اب تم گھر جاؤ۔"

• پرتاب سنگھ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"اب کوئی مائی کا لعل کاکے تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

وہ انسپکٹر چیانگ شو سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

○☆○

شہر کے مرکز سے دور صوفیہ روڈ کی ایک بغلی گلی میں واقع اس خوب صورت بنگلے کے ایک کمرے میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں چینی تھے۔ ان میں ایک تو بہت دبلا پتلا تھا۔ قد بھی چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ انڈے کے چھلکے کی طرح بالکل صاف اور چکنا سر، موٹی موٹی آنکھیں جن میں ہلکی سی نیلاہٹ تھی۔ بھویں گہری، خم دار اور درمیان میں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ وہ کلین شیو تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ اس کے چہرے پر قدرتی طور پر بال تھے ہی نہیں اور اسے کبھی شیو بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے ہاتھ بہت دبلے پتلے اور انگلیاں لمبی اور مخروطی تھیں۔ ناک بھی کھڑی اور پتلی سی تھی۔ ہونٹوں پر سرخی نظر آرہی تھی۔ وہ شخص اس قدر دبلا پتلا تھا کہ گمان ہوتا تھا جیسے بانس پر کھال منڈھ دی گئی ہو۔

دوسرے دونوں آدمی متوسط قد و قامت کے مالک تھے۔ ان میں ایک تو قدرے بھاری بھرکم تھا اور دوسرا پہلے آدمی کی طرح دبلا پتلا۔ ان کے نقوش بھی عام چینیوں جیسے ہی تھے۔ بھاری بھرکم آدمی کے سر کے بال قدرے لمبے تھے اور گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔ الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کبھی کنگھا کرنا نصیب نہ ہوا

ہو۔ ان دونوں نے جینز اور سینڈوکٹ دھاری دار ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ ان کا تیسرا ساتھی جو بانس کی طرح قد آور تھا براؤن چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کا بالوں سے بے نیاز سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ اس نے براؤن رنگ ہی کی پینٹ پہن رکھی تھی جس کے تنگ پائنچے ٹخنوں سے چند انچ اوپر پنڈلیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ کی کلائی میں اسٹین لیس اسٹیل کا ایک کڑا نظر آ رہا تھا۔

اس وقت رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ چمڑے کی جیکٹ والا وہ دراز قامت چینی بار بار دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔

"ایک گھنٹا ہو چکا ہے۔ اب تک انہیں آ جانا چاہیے تھا۔" وہ شخص اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ انداز بڑبڑانے والا تھا۔

"کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو مسٹر کم۔" فربہ اندام چینی نے کہا۔

"تم لوگوں نے ان کانسٹیبلوں کو کہاں چھوڑا تھا؟" دراز قامت کم بولا "وہ بے ہوش بھی ہوئے تھے یا نہیں؟"

"بے ہوش تو وہ ایسے ہوئے تھے کہ صبح سے پہلے ہوش میں نہیں آ سکیں گے۔" اس شخص نے جواب دیا "انہیں ہم نے ڈیلن روڈ پر ایک خالی پلاٹ پر جھاڑیوں میں پھینک دیا تھا اور میرا خیال ہے وہ صبح سے پہلے کسی کی نظروں میں بھی نہیں آ سکیں گے۔ ان کی طرف سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔"

"پولیس کی وردیوں کا کیا کیا تم نے؟" مسٹر کم نے پوچھا۔

"وردیاں اتار کر ہم نے گاڑی ہی میں ڈال دی تھیں۔" اس شخص نے جواب دیا "وہ گاڑی ہم نے پلازا سنگا پور کے قریب سے چوری کی تھی۔ ہوفانگ وہ گاڑی چھوڑنے گیا ہے۔ وہ گاڑی کسی بھی ویران جگہ پر چھوڑ کر اپنے گھر چلا جائے گا۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ وہ تو ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہی نہیں تھا لیکن بیوی کے علاج کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت ہے اس لیے وہ آمادہ ہو گیا تھا۔"

"تمہارے خیال میں اگر سب ٹھیک ہے تو چانگ اور تھانگ چو ابھی تک کیوں نہیں آئے۔" کم بولا۔

"ایسے کاموں میں تھوڑی بہت تاخیر تو ہو ہی جاتی ہے... مسٹر کم۔" اس شخص نے جواب دیا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی "میرا خیال ہے وہ لوگ آ گئے۔" ڈوئے تھانگ نامی وہ بھاری بھرکم شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا "میں دیکھتا ہوں۔"

ڈوئے تھانگ کمرے سے نکل کر راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے والا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باہر کسی گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ڈوئے تھانگ تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے چونک جانا پڑا۔ کار سے اترنے والا چینی لڑکھڑاتا ہوا بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے دایاں ہاتھ بائیں کندھے سے ذرا نیچے رکھا ہوا تھا۔

"اے چانگ۔ کیا ہوا۔ تھانگ چو کہاں ہے اور وہ لڑکا کہاں ہے۔" ڈوئے تھانگ تیزی سے آگے بڑھا۔

"گڑبڑ ہو گئی۔" چانگ نے کراہتے ہوئے جواب دیا "مجھے گولی لگی ہے۔ شاید ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

ڈوئے تھانگ، چانگ کو سہارا دے کر اندر لے آیا۔ روشنی میں اس نے چانگ کی طرف دیکھا تو بری طرح بدحواس ہو گیا۔ چانگ کے کپڑے خون سے تر ہو رہے تھے۔ اس کا ہاتھ بھی خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے پر مردنی کے آثار تھے۔ ڈوئے تھانگ اسے سہارا دے کر کمرے کے اندر لے آیا۔ سامنے صوفے پر بیٹھا ہوا مسٹر کم اسے دیکھتے ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دوسرا ساتھی ہوانگ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا تھا۔ چانگ کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی تھی۔

"ہوں۔" دراز قامت مسٹر کم، چانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی بھویں سکڑ گئی تھیں "تمہاری حالت تم لوگوں کی ناکامی کی داستان سنا رہی ہے۔ تھانگ چو کہاں ہے؟"

"اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں مسٹر کم۔" چانگ نے کراہتے ہوئے جواب دیا "ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ مکان کے اندر تین چار آدمی تھے جنہوں نے ہم پر فائر کھول دیا۔ مجھے پتا نہیں تھانگ چو زندہ ہے یا مارا گیا۔ مجھے گولی لگی ہے۔ پلیز! ڈاکٹر کو بلاؤ مسٹر کم۔"

"ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا علاج تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ شاید تم بھول گئے ہو کہ میں بھی ایک کوالیفائڈ فزیشن اور سرجن ہوں۔ ایک غیر قانونی آپریشن کی وجہ سے مجھے اسپتال کی ملازمت سے نکال دیا گیا لیکن اسپتال سے نکالے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے اندر وہ تمام صلاحیتیں ختم ہو چکی ہوں۔ تمہارا علاج میں زیادہ بہتر طور پر کر سکتا ہوں لیکن پہلے مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" مسٹر کم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہم پروگرام کے مطابق ڈوئے تھانگ وغیرہ کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچے تھے۔" چانگ نے کراہتے ہوئے جواب دیا "پولیس والوں کو اگرچہ وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا لیکن ہمیں معلوم تھا کہ پرتاب سنگھ کے دو گارڈز چھت پر بیٹھے رہتے ہیں۔ میں مکان کے سامنے والے رخ سے آگے بڑھا اور تھانگ چو مکان کے پچھلی طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے مجھے مکان کی چھت پر سے سگنل دیا۔ وہ گارڈز پر قابو پا چکا تھا۔ میں دیوار پر چڑھ کر کمپاؤنڈ کے اندر پہنچ گیا۔ پروگرام کے مطابق مجھے سامنے والے رخ سے اور تھانگ چو کو مکان کے عقبی دروازے سے اندر داخل ہونا تھا۔ ہمارے خیال میں اب مکان کے اندر پرتاب سنگھ اور اس لڑکے کے سوا کسی کو نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ مکان کے اندر پرتاب سنگھ کے علاوہ کم از کم دو آدمی اور تھے۔ انہیں کسی طرح ہماری موجودگی کی خبر ہو گئی۔ ایک آدمی نے برآمدے والے دروازے سے فائرنگ شروع کر دی۔ جواب میں، میں نے بھی فائر کھول دیا۔ میں اس وقت درخت کی آڑ میں تھا۔ اپنی پوزیشن بدلنے کے لیے درخت کی آڑ سے نکلا تو ایک گولی کی زد میں آ گیا۔ شاید ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکل سکا ہوں۔"

"تم صرف اپنی جان بچا کر بھاگے۔" مسٹر کم نے اسے گھورا اور کمرے میں رکھی ہوئی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا "تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمہارا ساتھی کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے تو اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے ہر قیمت پر وہ لڑکا چاہیے لیکن تم اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکے اور بزدلوں کی طرح وہاں سے بھاگ آئے اور اب ایک جھوٹی کہانی سنا کر مجھے دھوکا دینا چاہتے ہو۔ جانتے ہو مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ میں ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا جو اپنی کمزوریاں چھپانے کے لیے اپنے ساتھیوں کو بھی دھوکے میں رکھنے کی کوشش کریں۔"

"مم... میں نے جھوٹ نہیں بولا مسٹر کم!" چانگ کا چہرہ دھواں ہو گیا "وہاں واقعی تین چار آدمی تھے جن کی وجہ سے مجھے زخمی ہو کر پسپائی اختیار کرنی پڑی۔"

"تم جانتے ہو میں پلاننگ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔" مسٹر کم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں نے آج پورا دن ان لوگوں کی نگرانی کرائی تھی۔ وہ لڑکا گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک آدمی پرتاب سنگھ کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس سے ایک حماقت ہو گئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ میں پرتاب سنگھ کو اٹھوانا چاہتا ہوں۔ وہ موقع پا کر پرتاب سنگھ کی گاڑی میں چھپ گیا اور اس نے پستول کے زور پر پرتاب سنگھ کو اغوا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور اسے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد پرتاب سنگھ سیدھا اپنے گھر گیا تھا۔ انہوں نے کھانا بھی ہوٹل سے منگوا کر گھر ہی میں کھایا تھا۔ اس کے بعد نہ ان میں سے کوئی گھر سے باہر گیا تھا اور نہ ہی کوئی ان کے ہاں آیا تھا اور تم بتا رہے ہو کہ مکان کے اندر پرتاب سنگھ کے علاوہ بھی دو تین آدمی موجود تھے۔ تم جھوٹ بول کر اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے مسٹر چانگ۔"

مسٹر کم نے خاموش ہو کر میز کی دراز کھولی اور اس میں رکھا ہوا پستول نکال لیا۔ پستول کی نال پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر چانگ کانپ اٹھا۔

"مم... میں سچ کہتا ہوں مسٹر کم۔" چانگ گھگھیایا "تم تھانگ چو سے پوچھ لینا۔ وہ میری بات کی تصدیق کر دے گا۔"

"وہ زندہ ہوگا تو تمہاری بات کی تصدیق کرے گا نا۔" مسٹر کم نے کہا "اگر وہ زندہ ہوتا تو تم سے پہلے یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ پرتاب سنگھ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے تھانگ چو کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہوگا اور تم... تمہارے لیے اب میرے پاس کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ تم جیسے جھوٹے اور بزدل آدمی کی تو اس دنیا ہی میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"مجھے معاف کر دو مسٹر کم۔" چانگ گڑگڑایا "ڈاکٹر کو بلا دو پلیز میں ٹھیک ہو جاؤں تو اپنی اس کوتاہی کی تلافی کر دوں گا۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہارا علاج کسی اور ڈاکٹر سے بہتر کر سکتا ہوں۔" مسٹر کم نے کہا اور پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

چانگ اب بھی گڑگڑا رہا تھا۔ مسٹر کم نے ٹریگر دبا دیا۔ سٹک کی ہلکی سی آواز ابھری اور پستول سے نکلنے والی گولی چانگ کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ چانگ کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوف ناک تھی۔ وہ کھڑے کھڑے لہرایا اور پھر دھڑام سے نیچے گر گیا۔ اس کی پیشانی سے بہنے والی خون کی دھار اس کے چہرے اور گردن کو تر کرتی ہوئی قالین میں جذب ہونے لگی۔

"تمہیں اتنی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا مسٹر کم۔" ڈوئے تھانگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ چانگ کا انجام دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے "تھانگ چو سے اس کی بات کی تصدیق تو کر لیتے۔"

"کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔" مسٹر کم نے اسے گھورا "میری اس بات کا یقین کر لو کہ تھانگ چو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اگر تم چاہو تو خود وہاں جا کر اس امر کی تصدیق کر سکتے ہو اور ہاں... اس کی لاش کو اٹھا کر یہاں سے دور کسی ویرانے میں پھینک آؤ۔ لاش اٹھانے سے پہلے اس کے لباس کی تلاشی لے لینا۔ جیبوں میں ایسی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے جس سے اس کی شناخت ہو سکے اور تم لوگ بھی اپنے اپنے ٹھکانوں تک محدود رہو گے۔ مجھے کسی وقت تم لوگوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس نے پستول میز کی دراز میں رکھ دیا اور اندرونی دروازے میں داخل ہو کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ڈوئے تھانگ نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا پھر دونوں نے جھک کر چانگ کی لاش اٹھائی اور باہر چلے گئے۔

مسٹر کم دوسرے کمرے میں آ کر ایک صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تھکن اور بیزاری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کا سارا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ اس نے دارا سے اس لڑکے کو اغوا کرانے کے پچاس ہزار ڈالر لیے تھے لیکن چانگ اور تھانگ چو کی کسی حماقت کی وجہ سے اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ نجانے اسے یہ یقین کیوں تھا کہ تھانگ چو بھی زندہ نہیں بچا ہوگا۔

مسٹر کم سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا ہوتا تو اس کے لیے آگے کے راستے کھل سکتے تھے۔ دارا سے اس کی

ملاقات اگرچہ چند روز سے زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن ان چند دنوں میں ہی اس نے دارا کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ دارا یہاں کی ایک اور پارٹی سے مل کر پاکستان سے سنگاپور کے راستے سفید پاؤڈر کی اسمگلنگ کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ وہ پانی کی طرح دولت بہا رہا تھا۔ دوسری پارٹی مقامی ہی تھی۔ کم، مسٹر ہوئے کوئے کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بظاہر ایک نائٹ کلب کا مالک تھا لیکن اس کا اصل بزنس منشیات کی اسمگلنگ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک گولڈن ٹرائی اینگل کی ایک دو پارٹیوں سے اس کے تعلقات تھے جن کی شراکت سے اس نے بہت کمایا تھا لیکن چند مہینے پہلے وہ دوسری پارٹی کے ایک ایجنٹ کے ہمراہ بنکاک میں پولیس کے نرغے میں آ گیا تھا۔ اس وقت ان کے پاس تقریباً دو ملین ڈالر کا مال تھا۔ دوسری پارٹی کا ایجنٹ پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ کم بال بال بچا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی تھی۔ اسے دو ملین ڈالر کا وہ مال بہرحال چھوڑنا پڑا تھا۔

اس واقعے کے بعد دوسری پارٹی کے سربراہ سے اس کے تعلقات بگڑ گئے تھے۔ وہ امریکن ڈرگ مافیا کا ایک بہت بڑا ڈان تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کم نے مال ہضم کرنے کے لیے یہ ڈراما کھیلا تھا۔ کم خود بھی بے حد خطرناک اور سفاک آدمی تھا لیکن ڈان کے خوف سے وہ چھپتا پھر رہا تھا۔ اس نے ایک اور آدمی کو بیچ میں ڈالا جس نے امریکی ڈان کو یہ یقین دہانی کرا دی کہ اس معاملے میں کم بالکل بے قصور تھا۔ وہ خود بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا تھا۔ امریکی مافیا کے ڈان نے اپنے طور پر بھی اس معاملے کی تحقیقات کرائی تھیں۔ یہ تو ثابت ہو گیا تھا کہ کم نے اس کے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی لیکن وہ سمجھتا تھا کہ اسے دو ملین ڈالر کا یہ نقصان کم کی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے کم کو معاف تو کر دیا لیکن اس سے کاروباری تعلقات ختم کرلیے تھے۔

اس واقعے کے بعد کم اکیلا رہ گیا۔ اس کی ساکھ ختم ہو گئی تھی۔ اس پر لوگوں کا اعتماد ڈانواں ڈول ہو گیا۔ بڑی پارٹیاں اس سے دور ہی رہنے لگیں۔ چھوٹی پارٹیوں سے اتنا پیسہ نہیں مل رہا تھا۔ کم جرائم کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے لگا اور پھر اسے ایک مڈل مین کے ذریعے دارا کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ مڈل مین بمبئی کا ایک ہندو نارائن پرکاش تھا۔ کم اسے بہت عرصے سے جانتا تھا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر اگرچہ بمبئی ہی تھا لیکن وہ اکثر و بیشتر سنگاپور آتا رہتا تھا۔ تقریباً تین ہفتے پہلے کم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے اسے دارا سے ملا دیا تھا۔

دارا کی باتوں سے کم کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کے لیے اوپر چڑھنے کا ایک زینہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دارا آسٹریلیا کو مال سپلائی کرنے کے لیے سنگاپور کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانا چاہتا تھا اور یہاں اسے کم جیسے آدمیوں کی ضرورت تھی۔

"لیکن اس سے پہلے میں تم سے ایک اور کام لینا چاہتا ہوں۔" دارا نے کہا تھا۔

"وہ کیا....؟" کم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہمارا ایک پرانا دشمن ہے جو آج کل سنگاپور میں موجود ہے۔" دارا نے کہا "بارہ سال پہلے وہ پاکستان سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے ہمیں کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ ہم اسے تلاش کرتے رہے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ وہ سنگاپور میں موجود ہے۔ اس کی موجودگی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اس لیے کام شروع کرنے سے پہلے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہے اور یہ کام تم کرتے ہو۔"

"وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟" کم نے پوچھا۔

دارا نے اسے عابد علی، اس کی بیوی اور بچے کے بارے میں بتا دیا پھر بولا "ان تینوں کا ختم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی بچ گیا تو ہمارے لیے مستقل خطرہ بنا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" کم نے کہا "تم چند روز میں ان کے بارے میں سن لوگے کہ اب اس دنیا میں ان کا وجود نہیں رہا۔"

اور پھر کم نے دو چار آدمی جمع کرلیے۔ ایک آدمی کے ذریعے وہ عابد علی کی نگرانی کراتا رہا۔ اس کے معمولات کا جائزہ لینے کے بعد وہ موقع کی تاک میں رہنے لگا اور پھر اس روز وہ دارا کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ عابد علی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ہوٹل ہالی ڈے اِن میں بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ کم فوراً ہی اٹھ گیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" دارا بھی تیار ہو گیا "میں اپنے پرانے دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے ختم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اور پھر وہ لوگ ایک کار میں بیٹھ کر ہوٹل ہالی ڈے اِن کی طرف روانہ ہو گئے۔ کار میں ایک آدمی پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یوریشین تھا۔

وہ لوگ ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھے انتظار کرتے رہے اور جب عابد علی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھا تو ان کی کار اس کے تعاقب میں لگ گئی اور جب عابد علی اپنے مکان کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کر رہا تھا تو ان کی کار وہاں پہنچ گئی۔ دارا سب سے پہلے کار سے اترا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ کم اس وقت ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھے رہنا ہی مناسب سمجھا۔ البتہ اس کے ساتھی نیچے اتر کر عابد علی اور اس کی بیوی پر جھپٹ پڑے تھے۔

اور جب ایک اور کار گلی میں داخل ہوئی تو وہ لوگ انہیں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ کم اور دارا کا خیال تھا کہ ان کے آدمیوں نے عابد علی اور اس کی بیوی کے ساتھ ان کے بچے کو بھی ختم کر دیا تھا

لیکن اگلے روز اخبار میں خبر پڑھ کر کم سناٹے میں آ گیا۔ عابد علی کا بیٹا بچ گیا تھا۔ وہ اس واردات کا چشم دید گواہ تھا۔ اس نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ ان میں سے کسی کو شناخت بھی کر سکتا تھا۔ اس لڑکے نے پولیس کو دارا کا نام بھی بتایا تھا۔

دارا، کم پر برس پڑا۔

"اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے۔" وہ چیخا "وہ لڑکا میرے لیے مستقل خطرہ بنا رہے گا۔ اس نے پولیس کو میرا نام بھی بتا دیا ہے۔ اگر میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو حلیہ بھی بتا دیتا۔"

"وہ لڑکا صرف تمہارے لیے نہیں میرے لیے بھی خطرہ ہے۔" کم نے جواب دیا "میں تو گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن اس نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ جس چینی نے اس کی ماں پر خنجر سے وار کیے تھے، اسے دوبارہ دیکھے گا تو پہچان لے گا۔ اگر اس نے چی فانگ کو کہیں دیکھ کر پہچان لیا تو پولیس اس کے ذریعے مجھ تک بھی آسانی سے پہنچ جائے گی۔"

"تو پھر ختم کر دو اس سنپولیے کو۔" دارا چیخا "اس کی زندگی ہماری موت کا پیغام ہے۔ وہ جب تک زندہ ہے ہم یہاں اپنا کام بھی شروع نہیں کر سکتے۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے ختم کر دو اسے۔"

اور کم، وجدان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک بار پھر موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ پولیس نے اس کی حفاظت کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دو مسلح کانسٹیبل چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ پرتاب سنگھ کے دو گارڈز بھی سائے کی طرح اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ کم کو کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔

اور پھر اس نے وہ منصوبہ بنایا لیکن اس کے آدمی ہی بودے نکلے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ احتیاط اور عقل مندی سے کام لیتے تو یہ منصوبہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ چانگ زخمی ہونے کے بعد بزدلوں کی طرح بھاگ کر یہاں آ گیا تھا اور اس نے ایک جھوٹی کہانی سنا کر کم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کم جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور اسے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسا آدمی تو اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ جبکہ تھانگ چو کے بارے میں بھی اسے یقین تھا کہ وہ مارا جا چکا ہے۔

کم اس وقت یہی سب کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کے شان دار مستقبل کا دارو مدار اس بات پر تھا کہ وہ عابد علی کے بیٹے کو ختم کر دے۔ بات اس لڑکے کو ختم کرنے کی ہوتی تو اسے دور سے بھی گولی ماری جا سکتی تھی یا اس مکان کو بم سے اڑایا جا سکتا تھا لیکن گزشتہ رات دارا نے کہا تھا کہ وہ اس لڑکے کو زندہ اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے اور آج کا منصوبہ وجدان کو اغوا کرنے کے لیے ہی بنایا گیا تھا جو ناکام رہا تھا۔

کم کی ساری زندگی جرائم کے اندھیروں میں گزری تھی۔ ابتدا میں اس نے چھوٹے چھوٹے جرائم کیے تھے۔ اس میدان میں اس کے قدم جمتے چلے گئے۔ اس نے کرائے کے قاتل کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ اسے اب یاد نہیں تھا کہ وہ کتنے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ اس کا نام دہشت کی علامت بن گیا تھا پھر وہ منشیات کی اسمگلنگ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس دھندے میں اس نے خوب کمایا تھا۔ بعض انٹرنیشنل گروہوں سے تعلقات بھی استوار ہو گئے تھے لیکن بنکاک میں پیش آنے والے واقعے کے بعد اس کی ساکھ ختم ہو گئی تھی۔ وہ تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا تھا اور اب اسے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل رہا تھا۔

کم اچھی طرح جانتا تھا کہ گولڈن ٹرائی اینگل کے بعد منشیات کی پیداوار کے حوالے سے پاکستان دوسرے نمبر پر تھا۔ یہاں منشیات کے چند ایسے اسمگلر بھی تھے جو امریکا کی ڈرگ مافیا سے بھی زیادہ طاقت ور تھے۔ ان کا مال دنیا کے کونے کونے میں پہنچ رہا تھا۔ بعض نام تو ایسے تھے جنہوں نے امریکا جیسی سپرپاور کو بھی جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ امریکا کی بعض ایجنسیوں کے ایجنٹ ان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ امریکا انہیں گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن امریکی ایجنٹ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے تھے۔ ان کی طاقت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا تھا کہ پاکستان کی حکومت بھی ان کے سامنے بے بس تھی۔

نارائن پرکاش کے بارے میں تو کم بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بھی ایک انٹرنیشنل گروہ کا آدمی تھا اور اس کی باتوں سے بھی کم نے اندازہ لگا لیا تھا کہ دارا کا تعلق بھی کسی بہت بڑی پارٹی سے ہے۔ جو لوگ سنگاپور کو بیس بنا کر آسٹریلیا کی منڈی تک اپنا مال پھیلانا چاہتے ہوں، وہ کوئی معمولی پارٹی نہیں ہو سکتی تھی اور کم ہر صورت میں اس پارٹی میں اپنی جگہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو وہ ایک بار پھر اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔

کم جیسے جیسے سوچ رہا تھا، اس کا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر الماری کھولی اور اس کے نچلے خانے میں سے پلاسٹک کا ایک ڈبا نکال کر اپنے سامنے کافی ٹیبل پر رکھ لیا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے اس ڈبے کو دیکھتا رہا پھر ڈھکنا اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں پلاسٹک کی ایک لمبی سی نلکی، فورٹل کے چند چھوٹے چھوٹے ٹرے، جو ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ بڑے نہیں تھے، اسٹیل راڈ کی تین ٹانگوں والا ایک چھوٹا سا اسٹینڈ اور ایک پلاسٹک کی تھیلی رکھی ہوئی تھی جس میں سفید پاؤڈر نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک لائٹر بھی تھا۔

کم چند لمحے ان چیزوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے تین ٹانگوں والا اسٹینڈ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ یہ اسٹینڈ ایک بالشت سے زیادہ اونچا نہیں تھا لیکن ساخت میں یہ اس اسٹینڈ جیسا تھا جو فوٹوگرافرز کیمرا رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ البتہ اس کے اوپر کی جگہ خالی تھی۔ کم نے فورٹل کی ایک ٹرے ڈبے میں سے نکال کر اسٹینڈ پر رکھ دی۔ وہ اس جگہ بالکل فٹ آ گئی تھی۔ اس نے پلاسٹک کی تھیلی

میں سے چٹکی بھر سفید پاؤڈر فورٹل کی ٹرے کے عین وسط میں رکھ دیا اور پلاسٹک کی لمبی سے نلکی اٹھا کر میز کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ اس نے لائٹر جلا کر اس کا شعلہ فورٹل کی ٹرے کے نیچے کردیا۔ چند سیکنڈ بعد ٹرے میں رکھے ہوئے پاؤڈر سے دھواں اٹھنے لگا۔ کم نے پلاسٹک کی نلکی کا ایک سرا نتھنوں سے لگایا اور دوسرا سرا دھواں چھوڑتے ہوئے پاؤڈر سے ذرا اوپر رکھ کر سانس اندر کھینچنے لگا۔

پاؤڈر سے اٹھنے والا سارا دھواں اس نلکی کے ذریعے کم کے پھیپڑوں میں منتقل ہوتا رہا۔ کم اس وقت تک سانس کھینچتا رہا جب تک اس کے پھیپڑوں کی قوت نے اس کا ساتھ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم سرخی بھر گئی تھی اور پانی بہہ نکلا تھا۔

کم نے لائٹر میز پر ڈال دیا۔ پلاسٹک کی نلکی بھی ہاتھ سے چھوڑ دی اور بے سُدھ سا ہو کر قالین پر دراز ہوگیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

منشیات فروخت کرنے والے خود منشیات استعمال نہیں کرتے۔ یہ زہر تو وہ دوسروں کے خون میں منتقل کرتے ہیں لیکن کم منشیات کے دھندے میں آنے سے پہلے 'منشیات استعمال کرنے کا عادی بن گیا تھا لیکن اسے جلد ہی عقل آگئی اور اس نے اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ وہ اس سے مکمل طور پر نجات حاصل نہیں کرسکا تھا۔ تین چار مہینے بعد یا اس سے بھی طویل عرصے بعد جب وہ کسی ذہنی کرب میں مبتلا ہوتا تو اس طرح ایک کش لگالیا کرتا تھا۔ آج بھی وہ کچھ ایسے ہی ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ اس ایک کش سے اسے بڑا سکون ملا تھا۔ وہ تقریباً بیس منٹ تک قالین پر پڑا رہا پھر اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ جانتا تھا کہ یہ سرخی صبح تک برقرار رہے گی۔ اس نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ وہ ڈوئے تھانگ کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ چانگ کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے بعد صورتِ حال معلوم کرکے اسے اطلاع دے مگر ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

اور پھر سوا چار بجے کے قریب صوفے کے قریب سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کر صوفے کے دوسرے کنارے پر آگیا اور فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"ڈوئے تھانگ بول رہا ہوں مسٹر کم۔" اس کی ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔

"یس۔ کیا رپورٹ ہے۔ کیا معلوم کیا تم نے؟" کم نے پوچھا۔

"تھانگ چو مر چکا ہے۔ اس کے سر میں دو گولیاں لگی ہیں۔ میں نے اسپتال میں اس کی لاش دیکھی ہے۔ پرتاب سنگھ کا ایک گارڈ بھی مارا گیا ہے اور دوسرا گارڈ اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ زندہ بچ جائے گا یا وہ بھی ختم ہوجائے گا۔" ڈوئے تھانگ نے بتایا۔

"تھانگ چو کی موت کا مجھے پہلے ہی یقین ہوچکا تھا۔ میں مزید ایک بات جاننا چاہتا ہوں۔" کم چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر "ان دو گارڈز کے علاوہ پرتاب سنگھ کے بنگلے میں کتنے آدمی تھے؟"

"کوئی نہیں۔ بنگلے کے اندر پرتاب سنگھ اکیلا تھا۔" ڈوئے تھانگ نے جواب دیا "تھانگ چو چھت پر دونوں گارڈز سے نمٹنے کے بعد عقبی دروازے سے بنگلے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کی لاش راہداری میں ملی تھی۔ وہ غالباً پرتاب سنگھ کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ چانگ زخمی ہونے کے بعد فرار نہ ہوتا تو مشن کامیاب ہوسکتا تھا۔"

"کامیاب ہوسکتا تھا۔" کم نے اس کے الفاظ دُہرائے "لیکن چانگ بزدل نکلا۔ گولی لگنے کے بعد وہ وہاں سے بھاگ نکلا اور اس کے فرار ہی کی وجہ سے تھانگ چو کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اگر وہ دونوں ہوتے تو اس وقت وہ لڑکا ہمارے قبضے میں ہوتا اور ہم اپنی کامیابی کا جشن منا رہے ہوتے۔ بہرحال ہم نے چانگ سے نجات حاصل کرنے کا جو فیصلہ کیا' وہ غلط نہیں تھا۔ ایسے بزدلوں کی میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"ہاں واقعی تمہارا وہ فیصلہ درست تھا مسٹر کم۔" ڈوئے تھانگ کی آواز سنائی دی "اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم اپنے ٹھکانے پر چلے جاؤ۔ ضرورت پڑی تو فون کروں گا۔" کم نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

اس وقت چانگ کو زخمی حالت میں اپنے سامنے دیکھ کر اس نے صورتِ حال کا جو اندازہ لگایا تھا' وہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ چانگ کی بزدلی کی وجہ سے تھانگ چو کو بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے لیکن اسے ان دونوں کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اسے افسوس تو اس بات کا تھا کہ اس کا شکار اس کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا اور پرتاب سنگھ سے دشمنی الگ ہوگئی۔ پرتاب سنگھ کو جانتا تھا۔ وہ ایک بزنس مین تھا۔ اس کے تعلقات بہت اوپر تک تھے۔ کئی پولیس آفیسروں سے تو اس کی ذاتی دوستی تھی اور یہ اتفاق تھا کہ اس کیس کو چیانگ شو ہینڈل کر رہا تھا اور پرتاب سنگھ کی چیانگ شو سے بڑی گہری دوستی تھی۔ چیانگ شو کو بھی وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بہت گھاگ پولیس آفیسر تھا۔ وہ جس کے پیچھے لگ جاتا' اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔

لیکن اس وقت کم کے لیے مسئلہ نہ تو پرتاب سنگھ تھا اور نہ ہی انسپکٹر چیانگ شو۔ سب سے بڑا مسئلہ تو دارا کا تھا۔ وہ اسے کیا جواب دے گا۔ کم کی اس ناکامی سے دارا اس سے بددل ہوسکتا تھا اور دارا کے بددل ہونے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کا مستقبل تاریک ہوجاتا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے کم کا ذہن ایک بار پھر الجھنے لگا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ اب آنکھوں میں جلن ہو رہی تھی اور کنپٹیاں بھی سلگنے لگی تھیں۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سوگیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے وہ جاگ گیا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے مٹھی بھر مرچیں آنکھوں میں جھونک دی ہوں۔ بڑی شدید جلن ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات بج رہے تھے۔ وہ صرف دو گھنٹے سویا تھا۔ دل چاہ رہا تھا دوبارہ آنکھیں بند کرلے اور صوفے پر لیٹ کر سوجائے لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ اس نے بادلِ ناخواستہ ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔

"چی فانگ بول رہا ہوں مسٹر کم۔" اس کی ہیلو کے جواب میں ایک بھاری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"چی فانگ۔" کم کے دماغ کو جھٹکا سا لگا "کیا بات ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو اور فون کیوں کیا ہے۔"

"میں کلب میں ہوں۔" چی فانگ نے جواب دیا "مسٹر دارا اس وقت یہاں موجود ہے اور وہ فوری طور پر تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"دارا۔" کم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دارا کا نام سن کر اس کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ بالآخر دارا کو بھی اس کی ناکامی کی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اس کے نائٹ کلب پہنچ گیا تھا۔ دارا سے اب تک جتنی ملاقاتیں ہوئی تھیں' وہ اس کے نائٹ کلب والے دفتر ہی میں ہوئی تھیں "کیا وہ دفتر میں بیٹھا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے اسے نیچے استقبالیہ روم میں بٹھا دیا ہے۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ تم کہاں ہو۔" چی فانگ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اس سے کہو انتظار کرے میں آرہا ہوں۔" کم نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سوجائے لیکن وہ دارا کو ملاقات سے انکار کرکے اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ چند لمحے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹوں سے حواس کچھ بحال ہوئے۔ دوسرے کمرے میں آکر وہ ایک لمحے کو رکا پھر میز کی دراز سے سائلنسر لگا پستول نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور باہر آکر دروازہ بند کردیا۔ اس کی کار کمپاؤنڈ میں کھڑی تھی۔ اس نے پہلے باہر کا گیٹ کھولا۔ کار اسٹارٹ کرکے اسے باہر نکالا اور نیچے اتر کر گیٹ بند کرنے لگا۔

اسے اپنے نائٹ کلب تک پہنچنے میں چالیس منٹ لگے تھے۔ رات سے پچھلے پہر تین بجے تک تو کلب میں زندگی کے ہنگامے جاری رہتے تھے لیکن اس وقت یہاں اُلو بول رہے تھے۔ وہ کار سے اتر کر اندر آگیا۔

دارا کلب کے استقبالیہ میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر چی فانگ بھی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ وہ کلب ہی میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ رات تین بجے کلب بند ہونے کے بعد نوکروں کے ذریعے کام سمیٹتے ہوئے چار بج جاتے۔ اس کے بعد وہ سونے کے لیے چلا جاتا اور دن کے گیارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں اٹھا تھا اور آج دارا نے اسے صبح سویرے ہی جگا دیا تھا۔

دارا کے چہرے پر بھی بیزاری کے تاثرات تھے اور آنکھوں میں سرخی بھی تیر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی رات بھر نہیں سویا تھا۔

"مسٹر کم!" دارا خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں نے تمہاری آزمائش کے لیے تمہیں ایک کام دیا تھا لیکن تم ابھی تک کچھ بھی نہیں کرسکے۔"

"کچھ کیوں نہیں کرسکا۔" کم نے جواب دیا "تمہاری خاطر میں نے دو مرڈر کیے۔ میرا اپنا ایک آدمی گزشتہ رات مارا گیا اور دوسرا لاپتا ہے اور تم کہتے ہو' میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔"

"تم نے کہا تھا کہ آج اس لڑکے کو میرے حوالے کردو گے لیکن وہ لڑکا تو اپنے گھر میں سکون کی نیند سو رہا ہے۔ البتہ تمہارے دو آدمی مارے گئے۔ ایک پرتاب سنگھ کے گھر میں اور دوسرے کی لاش بھی پولیس کو مل گئی ہے۔ گزشتہ رات کے واقعے سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ تم نے احمقوں کی فوج پال رکھی ہے۔" دارا چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے کہا تھا کہ پرتاب سنگھ کو نہیں چھیڑنا لیکن تم نے اس کا ایک بندہ مار دیا اور دوسرا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس موقع پر کسی کی دشمنی کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ وجدان' پرتاب سنگھ کا بیٹا نہیں ہے۔ اسے اغوا کرلیا جائے یا مار دیا جائے تو اس کی صحت پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔ دو چار دن چیخ چلا کر خاموش ہوجاتا لیکن اپنے آدمیوں کے قتل پر وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اس طرح ہمارے لیے نئے مسئلے کھڑے ہوجائیں گے۔ جبکہ اس لڑکے کی صورت میں خطرہ اپنی جگہ موجود ہے۔"

کم خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جیب سے پستول نکالے اور دارا کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دے لیکن وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا اور جب دارا خاموش ہوا تو اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"مسٹر دارا۔ گزشتہ رات میرے آدمیوں سے واقعی حماقت ہوگئی۔ یہ سب کچھ دراصل ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر وہ غلط فہمی نہ ہوتی تو وہ لڑکا اس وقت ہمارے قبضے میں ہوتا۔"

"اگر تم یہ کام نہیں کرسکتے تو اب بھی منع کردو۔ میں یہ ذمے داری البرٹ کو سونپ دوں گا۔" دارا نے کہا۔

البرٹ کے نام پر کم چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ دوغلی نسل کا

تھا۔ باپ انگریز اور ماں چینی۔ باپ بھی جرائم پیشہ آدمی تھا جو پولیس کے ہاتھوں مارا گیا اور اب البرٹ جرائم کی دنیا میں قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ کام البرٹ کو سونپ دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ کم کے لیے چانس ختم ہو جاتا۔

"مجھے ایک موقع اور دو مسٹر دارا۔" کم اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تین دن کے اندر اندر وہ لڑکا تمہارے پاس ہوگا۔"

"وہ لڑکا اب مجھے نہیں چاہیے۔" دارا نے کہا "میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں۔ ختم کردو اسے۔ اگر وہ تین دن کے اندر ختم نہ ہوا تو میرا اور تمہارا معاہدہ ختم۔ اب میں چلتا ہوں۔ تین دن بعد تم سے ملاقات کروں گا۔"

دارا کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا اور کم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا دروازے کو گھورتا رہ گیا۔

○☆○

دربار سنگھ کی میت اگرچہ امرتسر بھیج دی گئی تھی مگر پرتاب سنگھ نے اپنے ہاں بھی اس کے تیجے کی رسم ادا کردی تھی۔ اب اسے سوتر سنگھ کی فکر تھی۔ تین دن گزرنے کے بعد بھی اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کے کئی ٹیسٹ کیے تھے اور ڈاکٹر اسکاٹ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کی یہ کیفیت چند روز تک اور برقرار رہ سکتی تھی۔ وہ تین دن مزید انتظار کریں گے اور اگر اس دوران میں کوئی فرق نہ پڑا تو دماغ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔

پرتاب سنگھ زندگی میں کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا تھا۔ سوتر سنگھ اس کے پاس پندرہ سال سے ملازم تھا۔ وہ اسے ملازم ہی نہیں اپنا ایک قابلِ اعتماد دوست بھی سمجھتا تھا۔ دربار سنگھ کی موت اور سوتر سنگھ کی حالت پر وہ خون کے آنسو بہا رہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ بہرحال اس نے یہ طے کرلیا تھا کہ سوتر سنگھ کے علاج کے لیے وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھے گا۔

دوسری طرف اسے وجدان کی بھی فکر تھی۔ یہ تو قسمت اچھی تھی کہ وجدان بچ گیا تھا۔ اگر وہ چینی اسے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو یقیناً اسے مار دیا تھا۔ لیکن عین وقت پر عقل نے اس کا ساتھ دیا اور اس کا نفسیاتی حربہ کامیاب ہو گیا۔ اگر اس کے چیخنے پر وہ چینی پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا تو وہ بھی وجدان کو نہیں بچا سکتا تھا۔

ان کے خلاف یہ کارروائی باقاعدہ پلاننگ کے تحت کی گئی تھی۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے پیچھے دارا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ دارا نے مقامی چینی غنڈوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور وہ خود چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔

پرتاب سنگھ نے پہلے تو یہی پروگرام بنا رکھا تھا کہ وہ وجدان کو دارا سے بچانے کی کوشش کرتا رہے گا اور براہِ راست کسی تصادم سے گریز کرے گا لیکن اب اس نے اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ دارا نے براہِ راست اس پر حملہ کیا تھا۔ اس کا ایک آدمی مارا گیا تھا دوسرا مفلوج ہو گیا تھا۔ اب خاموش بیٹھے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

اس کے بنگلے میں مرنے والے چینی کی شناخت ہو گئی تھی وہ ایک تھرڈ ریٹ غنڈا تھا۔ عرب اسٹریٹ اور لٹل انڈیا جیسے علاقوں میں دادا گیری کرکے لوگوں سے چار پیسے اینٹھ لیتا تھا۔ زیادہ تر ہندوستانی، پاکستانی اور ملائشین باشندے اس کا شکار بنتے تھے۔ چھوٹی دکانوں سے اس نے ہفتہ بھی باندھ رکھا تھا لیکن وہ کئی لوگوں سے پٹ بھی چکا تھا۔ کبھی وہ اپنے ایک دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر رہزنی اور لوٹ مار کی وارداتیں بھی کرتا تھا۔ ہندوستان، پاکستان سے آنے والے بھی بڑی آسانی سے اس کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ پکڑا گیا تھا اور اسے تین مہینے کی سزا ہوئی تھی۔ کسی کو سزا عام طور پر اصلاح کے لیے دی جاتی ہے لیکن جرائم پیشہ لوگ جب کوئی سزا کاٹ کر جیل سے نکلتے ہیں تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔

یہ کیس انسپکٹر چیانگ شو کے پاس تھا۔ اس کی تحقیقات سے انکشاف ہوا تھا کہ تھانگ چو نامی اس چینی غنڈے کے پاس اچانک ہی کوئی بڑی رقم آگئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں دیکھی گئی تھی۔ کوئی لڑکی اسے لفٹ ہی نہیں کراتی تھی۔ گزشتہ دنوں اسے ایک یوریشین لڑکی کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو اس لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا کہ وہ لڑکی کون تھی۔ نہ ہی اسے ابھی یہ معلوم ہوا تھا کہ تھانگ چو کے پاس رقم کہاں سے آئی تھی اور وہ کس کے لیے کام کر رہا تھا۔ انسپکٹر چیانگ بھی جانتا تھا کہ ان سارے ہنگاموں کے پیچھے دارا کا ہاتھ تھا۔ لیکن دارا اس قسم کے تھرڈ ریٹ غنڈوں سے براہِ راست رابطہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے یقیناً کسی ایسے آدمی سے رابطہ کیا ہوگا جو تھانگ چو جیسے غنڈوں کا بندوبست کرسکتا ہو اور انسپکٹر چیانگ شو کو اس کی تلاش تھی۔ اگر وہ شخص مل جائے تو اس کے ذریعے دارا تک پہنچا جا سکتا تھا۔

پرتاب سنگھ نے انسپکٹر چیانگ شو سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ تمام معلومات اسے چیانگ شو ہی سے حاصل ہوئی تھیں۔ چیانگ شو اس وقت بھی اس کے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دراصل حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے آیا تھا۔ پہلے دو کانسٹیبل تعینات تھے اب ان کی تعداد پانچ کردی گئی تھی۔ دو بنگلے کے سامنے، دو پیچھے، ایک چھت پر۔ تمام بنگلے ایک جیسے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ملے ہوئے تھے۔ گلی کے ایک کارنر والے بنگلے کی چھت پر چڑھ کر آسانی سے آخری بنگلے کی چھت تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اس لیے ایک آدمی کی چھت پر موجودگی ضروری تھی۔

"یار چیانگ۔" پرتاب سنگھ سامنے بیٹھے ہوئے انسپکٹر چیانگ شو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں تو سکھ ہوں۔ ہمارے بارے میں

مشہور ہے کہ ہم عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔ لیکن تم تو عقل مند آدمی ہو یار۔ تمہارے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی؟"

"کون سا والا بات؟" چیانگ شو نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دارا پاسپورٹ پر ہی یہاں آیا ہوگا۔" پرتاب سنگھ بولا "تم امیگریشن آفس سے معلوم کیوں نہیں کرتے کہ دارا کون ہے۔ اس طرح اسے آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں اسی روز آئی تھی جب عابد علی اور اس کی بیوی کو قتل کیا گیا تھا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہوگا کہ وجدان نے اپنے بیان میں دارا کا ذکر کیا تھا اور پھر تم نے بھی مجھے دارا کے بارے میں بتایا تھا۔ میں نے دوسرے ہی روز امیگریشن سے رابطہ کرکے اس سلسلے میں معلومات حاصل کی تھیں لیکن اس نام کا کوئی شخص پچھلے دو ہفتوں کے دوران میں پاکستان سے یہاں نہیں آیا تھا۔ میں نے ہوٹلوں اور پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز میں مقیم ان پاکستانیوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی تھیں جو اس عرصے کے دوران میں پاکستان سے یہاں آئے تھے لیکن دارا نام کے کسی شخص کا سراغ نہیں ملا۔"

"اس کا مطلب ہے وہ کسی اور نام سے یہاں آیا ہوگا۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"وہ کسی نام سے بھی آیا ہو قانون سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا "میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے نہیں بیٹھا ہوں۔ میرے آدمی اس کی تلاش میں ہیں۔ ایک نہ ایک دن اس کا پتا چل ہی جائے گا۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ کوئی غیر معمولی بات اپنے آس پاس محسوس کرو تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔"

انسپکٹر چیانگ شو چلا گیا اور پرتاب سنگھ بیڈ روم میں آگیا۔

وجدان اپنے بیڈ پر کتابیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور پرتاب سنگھ بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ وہ روزانہ رات کے کھانے کے بعد ایک ڈیڑھ گھنٹا اسے پڑھاتا تھا لیکن گزشتہ تین دنوں کے دوران میں پرتاب سنگھ نے محسوس کیا تھا کہ حالات وجدان کے ذہن کو متاثر کرنے لگے تھے۔ کتاب اس کے سامنے کھلی ہوتی لیکن اس کی نظریں کہیں اور ہوتیں جیسے خلا میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ اکثر ذہنی طور پر بھی غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ پرتاب سنگھ اس سے کوئی سوال پوچھتا تو وہ اس طرح چونک جاتا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہو۔

آج تین دن بعد وہ اپنا بستہ کھول کر بیٹھا تھا۔ پرتاب سنگھ بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"یار کاکے۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ تمہاری پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔ میں بھی تمہیں زیادہ وقت نہیں دے پاتا۔ تمہارے لیے ٹیوٹر نہ رکھ دیا جائے؟"

"مجھے اب لوگوں سے ڈر لگنے لگا ہے چاچا۔ پتا نہیں ٹیوٹر کون ہو، کیسا ہو؟" وجدان نے جواب دیا۔

پرتاب سنگھ چونک گیا۔ اب واقعی حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ وہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ دربار سنگھ کے قتل کے بعد سکھ برادری کے کئی لوگ پرسے کے لیے پرتاب سنگھ کے پاس آتے رہے تھے اور کل اس کے تیجے کے سلسلے میں بھی گھر میں بھجن وغیرہ کا پروگرام تھا۔ بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے اور پرتاب سنگھ نے محسوس کیا تھا کہ وجدان لوگوں سے الگ تھلگ ہی رہا تھا اور زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔

پرتاب سنگھ کے خیال میں یہ صورتِ حال اچھی نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ وجدان خوف زدہ تھا لیکن اگر خوف اس کے دل اور دماغ میں بیٹھ گیا تو وہ زندگی بھر سہما رہے گا۔ بزدل بن جائے گا۔ کسی اجنبی کا سامنا نہیں کر سکے گا جبکہ وہ اس کے سینے میں انتقام کا لاوا بھرنا چاہتا تھا اور انتقام لینے کے لیے حوصلے اور ہمت کی ضرورت تھی۔ وہ اسے بے حوصلہ نہیں ہونے دے گا۔ اسے بزدل نہیں بننے دے گا کہ مارے خوف کے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرے۔

"کسی اجنبی کا گھر میں آنا تو میں بھی پسند نہیں کروں گا لیکن مس ازابیل کیسی رہے گی۔ وہی جو سامنے والی لین کے کونے والے بنگلے میں رہتی ہے۔" پرتاب سنگھ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر وہ تو ریٹائر ہو چکی ہیں چاچا۔ وہ مجھے کیسے پڑھائیں گی۔" وجدان نے کہا۔

"ریٹائر ہو چکی ہے تو اچھی بات ہے نا۔" پرتاب سنگھ نے کہا "اب تو وہ فارغ ہے۔ تمہارے لیے زیادہ وقت نکال سکے گی۔ میں صبح ہی اس سے بات کروں گا۔ تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں نا!"

"نہیں چاچا۔" وجدان نے جواب دیا "مس ازابیل بہت اچھی خاتون ہیں، وہ امی کے پاس بھی آتی تھیں۔ اگر وہ راضی ہو جائیں تو میں ان سے ضرور پڑھوں گا۔ ویسے وہ بہت اچھا پڑھاتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل ہی اس سے بات کرتا ہوں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

مس ازابیل کو بھی گلی کے اس بنگلے میں رہتے ہوئے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ پرتاب سنگھ کی بیوی جب زندہ تھی تو اس کا آنا جانا تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد اس کا آنا جانا بند ہو گیا۔ البتہ راستے میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

مس ازابیل کانوینٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ اس کی عمر اگرچہ پچاس سال ہو چکی تھی لیکن شادی نہیں کی تھی۔ اس کی ماں کا انتقال تو اس وقت ہو گیا تھا جب وہ گیارہ برس کی تھی۔ باپ نے کچھ عرصہ تنہائی کاٹی پھر دوسری شادی کرلی۔ ازابیل کی سوتیلی ماں بھی

انگریز عورت تھی۔ ازابیل کے ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں تھا اور جب ازابیل گریجویشن کررہی تھی تو اس کا باپ ڈیوٹی کے دوران میں ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں آفیسر تھا۔ اس کے انتقال کے بعد حکومت کی طرف سے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ وہ رقم ازابیل کی سوتیلی ماں نے اپنے قبضے میں کرلی اور سب کچھ بیچ باچ کر انگلینڈ چلی گئی۔ ازابیل بے یارو مددگار رہ گئی لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ کبھی کسی ریسٹورنٹ میں ویٹریس کا کام کرتی کبھی کسی اسٹور پر سیلز گرل کی حیثیت سے کام کرنے لگتی۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھی۔ گریجویشن کرنے کے بعد اسے کانوینٹ اسکول میں ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ اس ملازمت کے ساتھ وہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتی رہی اور رقم جمع کرکے اس نے یہ مکان خریدلیا۔ وہ تین چار مہینے پہلے سروس کے پچیس سال مکمل کرنے کے بعد ریٹائر ہوئی تھی۔ وہ اگرچہ اپنی سروس مزید جاری رکھ سکتی تھی لیکن اب وہ تھک گئی تھی۔ اس کے پاس اتنی جمع پونجی تھی کہ باقی زندگی آرام سے گزار سکتی تھی۔

پچاس سال کی ہونے کے باوجود اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ رنگت تو گوری چٹی تھی ہی، چہرے کے نقوش اس عمر میں بھی جاذبِ نظر تھے۔

پرتاب سنگھ نے مس ازابیل سے وجدان کے لیے بات کی تو تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ تیار ہوگئی۔ وقت کا انتخاب اس نے مس ازابیل پر ہی چھوڑ دیا تھا اور ازابیل نے صبح کے وقت کا انتخاب کیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ وہ اگلے روز سے وجدان کو پڑھانا شروع کردے گی۔

پرتاب سنگھ نے جب مس ازابیل سے یہ بات کی تو اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ جب وہ واپس آیا تو وجدان لان میں پائپ سے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ وہ بھی صبح جلدی اٹھ جایا کرتا تھا۔

"لو بھئی کاکے۔ تمہاری استانی کا بندوبست تو ہوگیا۔ وہ کل سے تمہیں پڑھانا شروع کردے گی۔ اچھا۔ اب میں ناشتا تیار کرلوں۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔"

پرتاب سنگھ کہتا ہوا کچن میں گھس گیا اور پھر اس کے آدھے گھنٹے بعد وہ میز پر بیٹھے ناشتا کررہے تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پرتاب سنگھ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"مسٹر پرتاب سنگھ۔" اس کے ہیلو کے جواب میں ریسیور میں ایک مردانہ آواز سنائی دی "تم مجھ سے واقف نہیں ہو لیکن میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے اپنے اوپر غیر ضروری ذمے داریوں کا بوجھ لاد رکھا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنا کچھ بوجھ ہلکا کردو۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کون ہو تم؟" پرتاب سنگھ بولا۔ یہ آواز اس نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا ٹوٹی پھوٹی اردو میں کررہا تھا۔ لہجہ اردو نہیں تھا بلکہ چینی لہجے کی جھلک نمایاں ...

"تم مجھے اپنا دوست بھی نہیں کہہ سکتے۔" دوسری طرف ... جواب ملا "لیکن تمہیں میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ عابد علی ... کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالو اور اس لڑکے کو ہمارے حوالے ... میں تمہیں سوچنے کے لیے صرف بارہ گھنٹے کی مہلت دے رہا ہوں ... رات نو بجے دوبارہ فون کروں گا۔ اگر تم اس لڑکے کو ہمارے حوالے کردو تو مستقبل میں بہت سی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے ... میں تمہاری زندگی اجیرن کردوں گا۔"

"اوہ۔" پرتاب سنگھ بولا۔ اس نے اپنی آواز دھیمی رکھی ... تاکہ وجدان اس کی باتیں نہ سن سکے "تو تم وہی ہو جس نے ... رات وجدان کو میرے گھر سے اغوا کرانے کی کوشش کی تھی ... نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ پرتاب سنگھ نہ تو بزدل ہے اور نہ غافل ... میرا ایک آدمی تمہاری وجہ سے مارا گیا ہے اور دوسرا مفلوج ... ہے۔ میں تو خود تمہاری تلاش میں ہوں۔ اگر مجھے پتا چل جائے ... تم کون ہو تو میں پاتال سے بھی تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ اور تمہارا ... حشر کروں گا کہ دنیا یاد رکھے گی۔"

"اگر تمہیں میرے بارے میں معلوم بھی ہوجائے تو تم زند... کے آخری سانس تک مجھے تلاش نہیں کرسکو گے۔" دوسری طرف ... سے کہا گیا "لیکن میرا خیال ہے کہ باتوں میں وقت ضائع کرنے ... ضرورت نہیں ہے۔ اس لڑکے سے تمہارا کوئی رشتہ تو نہیں ہے ... اس کے لیے کیوں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہے ہو۔ اس لڑکے ... ہمارے حوالے کردو۔ ہماری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"میرے گھر پر حملہ کرکے اور میرے بندے کو مار کر دشمنی ... نے خود مول لی ہے۔ تم پنجاب کے جاٹوں کو نہیں جانتے۔ وہ دو... میں اپنی جان دے دیتے ہیں اور دشمنی میں اس وقت تک چین ... نہیں بیٹھتے جب تک اپنے دشمن کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیں ... جاٹ دوستی میں بھی انتہا پسند ہوتا ہے اور دشمنی میں بھی اور تم ... بچے کو لاوارث مت سمجھو۔ میں جب تک زندہ ہوں کوئی اس ... بال بھی بیکا نہیں کرسکتا اور تمہارے لیے تو وہ بچہ ڈیتھ وارنٹ ... حیثیت رکھتا ہے۔ تم بچ نہیں سکو گے۔"

"میں تمہیں سوچنے کے لیے رات نو بجے تک کا وقت دے ... ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا "اگر تم نے عقل مندی کا ثبوت ... دیتے ہوئے مثبت فیصلہ کیا تو بہت سی مصیبتوں سے بچ جاؤ گے ... بصورتِ دیگر پورے سنگاپور کی پولیس بھی تمہیں اور اس لڑکے ... نہیں بچا سکے گی۔"

پرتاب سنگھ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف سے لائن ... کٹ گئی۔ اس نے بھی ریسیور رکھ دیا اور دوبارہ ناشتے کی میز ... آگیا۔

"کون تھا چاچا؟" وجدان نے پوچھا۔

"تھا کوئی پاگل دا پتر۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا "کہہ رہا ... میں ہندوستان سے آیا ہوں۔ یہاں کوئی روزگار نہیں ملا۔ آپ کی خدا ترسی کی بہت تعریف سنی ہے۔ مجھے یا تو کوئی روزگار دلا دو یا تھوڑی سی مالی مدد کردو۔ اب تم ہی بتاؤ کاکے۔ خدا ترسی کرکے کس کس کی مدد کرتا رہوں۔ پیسہ کوئی آسانی سے تو نہیں کمایا جاتا نا۔ یہ لوگ تو منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ سمجھتے ہیں سنگاپور میں دولت کی بارش ہوتی ہے۔ یہاں آتے ہی نوٹوں کی بوریاں بھرنا شروع کردیں گے۔ ارے بھائی۔ پردیس میں آئے ہو تو محنت کرو اور کماؤ۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلاتے ہو۔"

"تمہاری باتیں سن کر تو وہ بہت مایوس ہوا ہوگا چاچا؟" وجدان نے کہا "تمہیں اس کی تھوڑی بہت مدد کردینی چاہیے تھی۔ ویسے یہ دوستی اور دشمنی کی کیا بات تھی چاچا۔"

پرتاب سنگھ کے ہاتھ سے مکھن لگا ڈبل روٹی کا سلائس چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ اس نے ایک من گھڑت کہانی سنا کر وجدان کو ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن لگتا تھا وہ اس کی باتیں توجہ سے سنتا رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی دوستی اور دشمنی کا بھی ذکر نکلا تھا۔ انسان کے دوست اور دشمن تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا۔ چل اب تو ناشتا کر خاموشی سے اور یہ سیب بھی کھالینا۔ پاکستان کے گولڈن سیب ہیں۔ پوری دنیا میں اس جیسا سیب نہیں ہوتا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

"ویسے یہ دشمنی بہت بری چیز ہوتی ہے چاچا۔" وجدان بولا "اس دارا کی بھی میرے ڈیڈی سے پرانی دشمنی تھی نا۔ میرے ڈیڈی مجھے اور ممی کو لے کر اس کے ڈر سے اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آگئے تھے مگر وہ یہاں بھی پہنچ گیا اور اس نے ممی اور ڈیڈی کو قتل کردیا۔ میں تو اس خوفناک منظر کو کبھی نہیں بھول سکوں گا چاچا۔"

پرتاب سنگھ اس کی بات سن کر سناٹے میں آگیا۔ اس کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ وجدان کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟" اس نے وجدان کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"مجھے سب پتا چل گیا ہے چاچا۔" وجدان نے جواب دیا "کل شام کو جب تم گھر پر نہیں تھے تو میں اپنے اور تمہارے بستروں کی چادریں درست کررہا تھا تو تمہارے تکیے کے نیچے ایک پرانی سی ڈائری رکھی ہوئی تھی۔ اس پر ڈیڈی کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں وہ ڈائری پڑھنے لگا۔ اس سے مجھے سب کچھ معلوم ہوگیا کہ میری ممی اور ڈیڈی کو کس نے اور کیوں قتل کیا ہے۔ میں نے وہ ڈائری دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دی۔ کل رات کو تم تو سو گئے تھے لیکن میں دیر تک جاگتا رہا تھا۔ اب میرے دل سے وہ سارا خوف نکل گیا ہے چاچا۔ اب میرے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا ہوگیا ہے۔ میں نے زندگی کا ایک مقصد بھی متعین کرلیا ہے اور وہ مقصد ہے اپنے ماں باپ کے دشمنوں کو تلاش کرنا اور انہیں موت کے گھاٹ اتارنا۔ اب میں بزدلوں کی طرح چھپ کر نہیں بیٹھوں گا۔"

پرتاب سنگھ گہری نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے حماقت کی تھی کہ عابد علی کی ڈائری کو اس طرح تکیے کے نیچے رکھ چھوڑا تھا لیکن اب اس حماقت پر اسے کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس ڈائری کی تحریر نے وجدان میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ایک نیا جذبہ پیدا کیا تھا اس کے اندر۔

اس کی گفتگو کا انداز بدل گیا تھا۔ وہ خود بدل گیا تھا اور اس میں یہ تبدیلی بڑی حوصلہ افزا تھی۔ وجدان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے یکایک وہ اسے اپنی عمر سے بڑا لگنے لگا۔ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"گھر میں اس طرح چھپ کر بیٹھنا بزدلی نہیں ہے پتر۔ تم ابھی چھوٹے ہو۔ ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تم ابھی ان کی نظروں سے اوجھل ہی رہو۔ تم جانتے ہو وہ تمہیں بھی قتل کرنا چاہتے ہیں اور موقع کی تاک میں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں ایسا کوئی موقع ملے۔ میں جو ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے وہ تمہارے قریب نہیں پھٹک سکتے۔ تم ابھی کھاؤ پیو۔ اپنے اندر جان پیدا کرو۔ اس جذبے کو اپنے سینے میں پروان چڑھاتے رہو جس نے آج تمہارے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"لیکن میں کب تک گھر میں بند رہوں گا چاچا؟" وجدان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس۔ چند روز کی بات ہے۔" پرتاب سنگھ نے کہا "آج تم ان سے چھپ کر بیٹھے ہوئے ہو اور کل وہ تم سے چھپتے پھریں گے لیکن انہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"ہاں چاچا۔" وجدان بولا "میں انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ انہیں اس طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ موت بھی پناہ مانگنے لگے گی۔"

"ہاں لیکن فی الحال تم سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔" پرتاب سنگھ نے کہا "ناشتا کرو اور اپنی کتابیں لے کر پڑھنے کے لیے بیٹھ جاؤ۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ جلدی واپس آجاؤں گا۔"

"ڈیڈی کی دکان کا کیا ہوگا چاچا۔ کئی روز سے بند پڑی ہے۔" وجدان نے کہا۔

"اس کا بھی بندوبست کرتے ہیں پتر۔" پرتاب سنگھ نے کہا "پرنام سنگھ تمہارے باپ کا پرانا ملازم ہے۔ دیانت دار اور قابلِ اعتماد ہے۔ میں اپنا ایک آدمی اس کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔ وہ دونوں دکان سنبھال لیں گے۔"

"اور چاچا۔" وجدان اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے

کہا ”ڈیڈی نے ڈائری میں لکھا ہے کہ انہوں نے ملک نوازش علی کے آدمیوں سے پانچ کروڑ روپے کا سونا چھین کر کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ کیا وہ سونا اب بھی وہاں موجود ہوگا۔ پانچ کروڑ بہت بڑی رقم ہوتی ہے نا؟“

”ہاں بہت بڑی اور اب تو اس سونے کی مالیت تقریباً دگنی ہوگئی ہوگی۔“ پرتاب سنگھ نے جواب دیا ”تمہارے باپ کی ڈائری پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کی موت کی وجہ وہ سونا ہی تھا۔ زمین کا مقدمہ چل رہا تھا‘ چلتا رہتا لیکن تمہارا باپ تو ان کی دوسری غیر قانونی سرگرمیوں میں بھی رکاوٹ بن گیا تھا۔ اس نے ملک نوازش علی کے آدمیوں سے سونا چھین کر کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ وہ یقیناً بعد میں پولیس یا کسی اور کو ملک نوازش کی غیر قانونی سرگرمیوں اور اس سونے کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا ہوگا لیکن ملک کے آدمیوں نے اسے چھین سے بیٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اسے اپنی اور تم لوگوں کی جانیں بچا کر ملک سے بھاگنا پڑا لیکن..... یہ اسمگلر جو ہوتے ہیں نا۔ بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ ان کا دھرم صرف اور صرف دولت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ دولت کے لیے دوسروں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اور پھر پانچ کروڑ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ سونا اب بھی وہاں موجود ہو لیکن اس کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ فی الحال تو ہمیں یہاں دارا اور اس کے کرائے کے ٹٹوؤں سے نمٹنا ہے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔ ایک دو گھنٹے میں آجاؤں گا۔“

پرتاب سنگھ ناشتے کی میز سے اٹھ گیا۔ اپنے کمرے میں جا کر اس نے لباس تبدیل کیا اور باہر آکر پولیس والوں کو ہدایات دیتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کی اپنی گاڑی کئی روز سے کام کے سلسلے میں ورکشاپ میں کھڑی تھی۔ اس نے اپنے دوست دلدار سنگھ کی مرسیڈیز مستعار لے لی تھی۔ اس گاڑی کو وہ باہر گلی میں ہی کھڑی کیا کرتا تھا۔

مرسیڈیز ڈرائیو کرتے ہوئے وہ محتاط نظروں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ پولیس اسٹیشن جا کر انسپکٹر چیانگ شو کو اس دھمکی آمیز فون کال کے بارے میں آگاہ کرے گا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا اور کار کا رخ اپنے دفتر کی طرف موڑ دیا۔

وہ کئی روز بعد دفتر آیا تھا۔ بہت سارے کام اس کی توجہ کے منتظر تھے لیکن اس نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کرلیا فون پر انسپکٹر چیانگ شو سے رابطہ کرکے اسے اس ٹیلی فون کال کے بارے میں بتانے لگا۔

”گڈ۔“ انسپکٹر چیانگ شو نے کہا ”اس کا مطلب ہے کہ وہ رات نو بجے تم سے دوبارہ فون پر رابطہ کرے گا لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سی آئی ڈی کے کچھ آدمی تمہارے مکان کے اطراف میں پھیلا دیتا ہوں۔ ہم فون ٹیپ کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ کال کہاں سے کی گئی ہے اور وہ ... ہے۔“

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ انسپکٹر چیانگ شو نے جواب دیا ”تم گھر پر رہو گے۔ اگر موقع ملا تو اس وقت میں خود بھی تمہارے پاس موجود رہوں گا۔ اگر کوئی اور ایمرجنسی... آن پڑی تو اپنا آدمی بھیج دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں رات کو انتظار کروں گا۔“ پرتاب سنگھ نے کہتے ہوئے فون بند کردیا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

وہ دوپہر تک اپنے کام میں مصروف رہا پھر منیجر کو ہدایات دیتا ہوا اٹھ گیا۔

راستے میں ایک ہوٹل سے اس نے دو لنچ بکس لیے اور سیدھا گھر پہنچ گیا۔ مکان پر ڈیوٹی دینے والے پولیس اہلکاروں کے کھانے پینے کا بندوبست بھی اس کے ذمے تھا۔ وہ ان پولیس والوں کو پیسے دے دیا کرتا تھا اور وہ اپنا ایک آدمی بھیج کر کسی قریبی ہوٹل سے کھانا لے آتا تھا۔

پرتاب سنگھ گھر پہنچا تو دو بج رہے تھے۔ کمرے میں وجدان کے ساتھ سامنے والے بنگلے میں رہنے والی مسز فائے بھی موجود تھی۔ پرتاب سنگھ کو دیکھ کر مسکرا دی۔ مسز فائے کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ خاصی حسین عورت تھی۔ شگفتہ زندہ تھی تو وہ اکثر ان کے ہاں آیا کرتی تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کبھی کبھار وجدان کے پاس آجاتی تھی۔

”میں نے سوچا‘ وجدان اکیلا گھبرا رہا ہوگا اس لیے میں یہاں آگئی تھی۔“ اس نے پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بہت اچھا کیا تم نے۔“ پرتاب سنگھ بولا ”اس بچے کو کمپنی کی ضرورت ہے۔ میں تو کچھ مصروف رہتا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم روزانہ کچھ دیر کے لیے اس کے پاس آجایا کرو۔“

”فائے آنٹی بہت اچھی خاتون ہیں پرتاب چاچا۔“ وجدان نے ان کی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا ”بڑے مزے مزے کی باتیں کرتی ہیں۔“

”ہاں پتر۔“ پرتاب سنگھ بولا ”تم نے دیکھا نہیں یہ خود بھی کتنے مزے کی ہیں۔ کبھی کبھی گلی میں مل جاتی ہیں تو ان سے باتیں کرکے واقعی مزہ آجاتا ہے۔ بہرحال‘ تم منہ ہاتھ دھولو۔ میں کھانا لے آیا ہوں۔ آج تمہاری یہ فائے آنٹی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گی۔“

فائے نے کھانے سے معذرت کرکے جانا چاہا مگر وجدان کے اصرار پر رک گئی۔ کھانے کے بعد وجدان اور فائے لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور پرتاب سنگھ کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر اونگھ لیا کرتا تھا۔

لیکن آج وہ زیادہ ہی اونگھ گیا تھا۔ آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ مسز فائے اس وقت بھی وجدان کے پاس موجود تھی لیکن کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس کی وجہ سے وجدان کا آج کا دن اچھا گزر گیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا‘ پرتاب سنگھ کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس کی نظریں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو اس نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ یہ انسپکٹر چیانگ شو کی کال تھی۔

”میں انسپکٹر چیانگ بول رہا ہوں پرتاب سنگھ۔“ دوسری طرف سے آواز... سنائی دی ”وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ بینڈرن ہوٹل کے قریب ایک مرڈر ہوگیا ہے۔ میں وہاں جارہا ہوں تم پریشان مت ہونا۔ میں نے تمام انتظامات مکمل کرلیے ہیں۔ سی آئی ڈی کے نصف درجن آدمی تمہارے مکان کے آس پاس موجود ہیں۔ تم نے صرف اتنا کرنا ہے کہ وہ فون کال آئے تو ایکسچینج سے اس کال کے بارے میں معلوم کرکے اس نمبر پر اطلاع دے دو۔ میرے آدمی تیار بیٹھے ہوں گے۔ تمہاری طرف سے اطلاع ملتے ہی وہ حرکت میں آجائیں گے۔ ویسے میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں۔ وہ تمہارے پاس موجود رہے گا۔ نمبر نوٹ کرلو۔“

پرتاب سنگھ نے انسپکٹر چیانگ کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کرلیا اور فون بند کردیا۔ نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ بنگلے کے گیٹ پر متعین ایک پولیس والے نے سی آئی ڈی کے ایک آفیسر کی آمد کی اطلاع دی۔ پرتاب سنگھ فوراً ہی گیٹ پر آگیا۔

”میرا نام آنگ کانگ ہے۔ میں سی آئی ڈی آفیسر ہوں۔ مجھے انسپکٹر چیانگ شو نے یہاں بھیجا ہے۔“ اس شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ وہ درمیانے قد کا اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔

”تم آنگ کانگ ہو یا ہانگ کانگ۔ اندر آجاؤ۔“ پرتاب سنگھ نے کہا۔ اس نے اس کا شناختی کارڈ چیک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اسے تسلی ہوگئی تھی کہ انسپکٹر چیانگ شو نے یہی نام بتایا تھا۔

وہ شخص اندر آگیا اور لان میں کھڑا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ پرتاب سنگھ کے ساتھ چھت پر بھی چکر لگا آیا۔ پرتاب سنگھ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ حفاظتی انتظامات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اندر آکر بھی اس نے پورے مکان کو چیک کیا۔ ایک ایک کمرے میں جھانک کر دیکھا پھر لاؤنج میں آگیا جہاں وجدان صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

”ہیلو بوائے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا ”تم ڈر تو نہیں رہے؟“

”چاچا پرتاب سنگھ میرے پاس ہے تو مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر میں بزدل بھی نہیں ہوں۔“ وجدان نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں بڑی خود اعتمادی تھی۔

”گڈ۔“ آنگ کانگ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا اور پرتاب سنگھ سے باتیں کرنے لگا جو بار بار بے چینی سے ٹیلی فون کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نو بج کر پانچ منٹ پر فون کی گھنٹی بجی تو پرتاب سنگھ نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ آنگ کانگ اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا تھا۔

”ہیلو۔ پرتاب سنگھ اسپیکنگ۔“ پرتاب سنگھ فون پر بولا۔ چند لمحے دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر اس نے کہا ”تم جو کوئی بھی ہو میری بات غور سے سن لو۔ وجدان کو تمہارے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ تم جو کوئی بھی ہو تمہیں بہت جلد ڈھونڈھ نکالوں گا اور پھر تم سے ایک ایک چیز کا حساب لیا جائے گا۔“

جواب میں دوسری طرف سے کچھ کہا جارہا تھا لیکن پرتاب سنگھ نے کریڈل کو دو مرتبہ ٹیپ کرکے ریسیور رکھ دیا۔ اسے انسپکٹر چیانگ شو نے ہی بتایا تھا کہ اس کے فون پر آبزرویشن لگا دیا گیا ہے۔ کریڈل کو اس طرح ٹیپ کرنے سے وہ نمبر ریکارڈ ہوجائے گا جہاں سے کال کی گئی تھی۔

نمبر معلوم کرنے کے لیے ٹیلی فون ایکسچینج سے رابطہ کرنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ آنگ کانگ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

”ایکسچینج سے کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر پرتاب سنگھ۔“ آنگ کانگ کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی ”یہ کال ایک پبلک فون بوتھ سے کی گئی تھی۔“

پرتاب سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنگ کانگ کے ہاتھ میں پستول تھا جس پر سائلنسر لگا ہوا تھا اور پستول کا رخ وجدان کے سینے کی طرف تھا۔ وجدان کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آنگ کانگ نے اسے زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ وہ چیختا ہوا صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔

پرتاب سنگھ کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اسے

ایک مقبول ترین سلسلہ
شاطر
قیمت فی حصہ 50 روپے | 2 حصے مکمل | ڈاک خرچ 23 روپے
کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے
شاطر کو مشہور انعام یافتہ مصنف شکیل انجم نے اپنے خاص انداز میں تحریر کیا ہے۔
ایک ایسی دلچسپ‘ ہنگامہ آرا اور سنسنی خیز داستان جس میں قدم قدم سسپنس اور سطر سطر قیامت آرائی ہے۔
کتاب کی قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5885313 فیکس: 5802551

سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سی آئی ڈی آفیسر آنگ کانگ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریسیور رکھ دیا اور آنگ کانگ کی طرف بڑھا۔

آنگ کانگ نے بڑی پھرتی سے پستول کا رخ اس کی طرف کرکے گولی چلا دی۔ سٹک کی آواز ابھری اور گولی پرتاب سنگھ کے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے جھکا تھا۔ جب سیدھا ہوا تو پستول کی زد میں تھا۔

"یہ گولی تمہاری کھوپڑی کے پرخچے بھی اڑا سکتی تھی۔" آنگ کانگ غرایا "میں نے تمہیں صرف وارننگ دی ہے۔ اب اگر تم نے کوئی حرکت کی تو اگلی خاموش گولی تمہاری کھوپڑی یا سینے میں پیوست ہو جائے گی۔"

"تم کون ہو؟" پرتاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"میں تمہیں اپنا نام اور پتا نہیں بتاؤں گا۔" آنگ کانگ نے جواب دیا "آج صبح جب میرے باس نے تمہیں فون کیا تھا تو اسے یقین تھا کہ تم پولیس کو اس کی اطلاع دو گے اور رات کو آنے والی ٹیلی فون کال ٹریس کرنے کے لیے ٹیلی فون کے ساتھ کوئی حرکت کی جائے گی۔ ہمارا باس بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا اور پھر ٹیلی فون کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کرنا ہم بھی جانتے ہیں۔ ہم نے آج صبح ہی یہاں سے نصف میل دور ڈسٹری بیوشن کیبن میں تمہارے فون کی لائن ٹریس کرکے یہاں سے چوتھی گلی میں واقع ایک بنگلے کے فون سے کنیکٹ کرلی تھی۔ ہم دو آدمی صبح سے اس بنگلے میں موجود تھے اور تمہاری لائن کو ٹریس کر رہے تھے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ہمیں زیادہ خطرہ انسپکٹر چیانگ شو کی طرف سے تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ نو بجے وہ بھی یہاں موجود ہوگا۔ اسے یہاں آنے سے روکنے کے لیے ہم نے ہوٹل میٹڈرن کے عقب میں ایک راہ گیر کو قتل کردیا اور پولیس اسٹیشن اطلاع کر دی۔ ہماری توقع کے عین مطابق انسپکٹر چیانگ ہی جائے واردات پر گیا لیکن جانے سے پہلے اس نے تمہیں فون پر اطلاع دے دی کہ وہ آنگ کانگ نامی سی آئی ڈی آفیسر کو بھیج رہا ہے۔ آنگ کانگ ہمارے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ہم نے اسے راستے ہی میں اچک لیا اور اسے اسی بنگلے میں پہنچا دیا جہاں ہم نے ٹیلی فون والا سیٹ اپ کر رکھا ہے۔ آنگ کانگ اس بنگلے کے ایک کمرے میں بندھا پڑا ہے اور میرا ساتھی اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ تم واقعی سکھ ہو۔" آنگ کانگ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہہ رہا تھا "اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوتی تو میرا شناختی کارڈ طلب کرتے۔ ایسی صورت میں میرے لیے خطرہ ہو سکتا تھا لیکن تم آنگ کانگ کا نام سن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے۔"

"ہاں۔ یہ حماقت واقعی مجھ سے ہو گئی تھی کہ میں نے تمہارا شناختی کارڈ چیک نہیں کیا تھا لیکن کیا تم یہاں سے زندہ واپس جاسکو گے؟" پرتاب سنگھ بولا۔

"مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔" آنگ کانگ نے مسکرا[...]
ہوئے جواب دیا "یہاں آتے ہی میں نے حفاظتی انتظامات کا جا[...]
لیا تھا اور یہ بات میرے لیے باعثِ اطمینان تھی کہ گھر کے اند[ر]
تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ باہر کے محافظ مجھے نہیں رو[ک]
سکیں گے۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ یہاں سے زندہ واپس چلے [جاؤ]
گے۔" پرتاب سنگھ نے اس کے پستول والے ہاتھ کی طرف دیکھ[تے]
ہوئے کہا۔ وہ اسے باتوں میں لگا کر کسی موقع کی تلاش میں تھا [مگر]
آنگ کانگ خاصا محتاط واقع ہوا تھا۔ وہ بھی اس کی ایک ایک
حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

"مجھے اس لڑکے کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔" آنگ کانگ
کہہ رہا تھا "میں اس وقت بڑی آسانی سے اسے گولی مار سکتا ہو[ں]
لیکن میں اسے یہاں قتل نہیں کروں گا۔ اگر اسے یہاں قتل کردیا [تو]
پھر میرا نکلنا واقعی ممکن نہیں رہے گا۔ یہ لڑکا اس وقت میری زند[گی]
کی ضمانت ہے۔ میں اسے ڈھال بنا کر یہاں سے باہر نکلوں گا اور [تم]
بھی میرے ساتھ چلو گے۔ باہر گلی میں تمہاری گاڑی کھڑی ہے۔ [تم]
گاڑی ڈرائیو کرو گے۔ یہ بات ذہن نشین کرلو کہ اگر باہر کسی نے
کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو میرے پستول کی خاموش گو[لی]
اس لڑکے کی زندگی کا خاتمہ کردے گی۔ چلو۔ اب باہر نکلو۔"

آنگ کانگ نے بڑی پھرتی سے پوزیشن بدل کر صوفے پر پڑ[ے]
ہوئے وجدان کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ خوف و دہشت سے وجدان
کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ آنگ کانگ نے ایک ہاتھ سے اسے
گرفت میں لیے رکھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی
کنپٹی سے لگا دیا۔

پرتاب سنگھ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دروازے کی
طرف بڑھ گیا۔ ابھی اس نے دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ فون کی گھنٹی
بج اٹھی۔ اس کے قدم رک گئے اور وہ فون کی طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں۔ تم کال ریسیو نہیں کرو گے۔" آنگ کانگ کے منہ
سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی "باہر چلو۔"

پرتاب سنگھ پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ راہداری میں پہنچ
کر اس نے مڑ کر آنگ کانگ کی طرف دیکھا۔ کوئی موقع نہیں تھا۔
پستول کی نال وجدان کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ اور اس کی کوئی
بھی حرکت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ ایک
بار پھر رک گیا۔

"گیٹ اور چھت پر کھڑے ہوئے محافظوں سے کہہ دو کہ اگر
کسی نے کسی طرح کی بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکے
کو گولی ماردی جائے گی۔ چلو۔ آگے بڑھو۔" آنگ کانگ نے کہا۔

پرتاب سنگھ کمپاؤنڈ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چھت پر
پولیس کانسٹیبل منڈیر کے قریب کھڑا تھا۔ پرتاب سنگھ نے آگے
بڑھ کر باہر والا دروازہ کھول دیا۔ گیٹ کے باہر دونوں پولیس والے

باتیں کر رہے تھے۔

"ان سے کہو اپنی رائفلیں پھینک دیں اور دور ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔" آنگ کانگ نے پرتاب سنگھ سے کہا۔

کانسٹیبل اس کی آواز سن کر چونک گئے۔ انہوں نے مڑ کر اندر کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک نے فوراً ہی صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تو پرتاب سنگھ نے چیخ کر کہا۔

"نہیں۔ تم میں سے کوئی بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جو وجدان کی زندگی کے لیے خطرے کا باعث بن سکے۔ اپنی رائفلیں پھینک دو اور ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے چھت پر کھڑے ہوئے محافظ کو بھی رائفل اوپر چھوڑ کر نیچے بلا لیا۔

آنگ کانگ وجدان کو گرفت میں لیے کھڑا تھا۔ اس نے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی۔ تینوں پولیس والے نہتے ہو کر ایک طرف ہٹ گئے تو وہ وجدان کو لے کر گیٹ سے باہر آ گیا۔ گلی میں پرتاب سنگھ کی مرسڈیز کھڑی تھی۔

"چلو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھو۔ تمہاری کوئی غلط حرکت اس لڑکے کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔" آنگ کانگ نے کہا۔

پرتاب سنگھ اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولنے لگا۔ آنگ کانگ نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول لیا۔ پہلے وجدان کو اندر دھکیلا پھر خود بھی اندر بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ اس دوران میں پرتاب سنگھ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ تینوں پولیس والے دیوار کے قریب کھڑے وحشت زدہ سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"گاڑی آگے بڑھاؤ۔" آنگ کانگ غرایا "اس گلی سے نکلو تو میں تمہیں راستہ بتاتا رہوں گا۔"

پرتاب سنگھ نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ گلی کے موڑ پر سادہ لباس میں سی آئی ڈی کا ایک آدمی سامنے آ گیا۔ اس نے اسٹیئرنگ کے سامنے پرتاب سنگھ اور پچھلی سیٹ پر وجدان کو ایک اجنبی کے ساتھ بیٹھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ لوگ گھوم پھر کر مکان کی نگرانی کریں گے اور مشتبہ شخص پر نگاہ رکھیں گے۔ انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ وجدان کو کہیں اور بھی منتقل کیا جائے گا۔

مرسڈیز گلی کا موڑ گھوم کر دوسری طرف نکل گئی۔ سی آئی ڈی کا وہ آدمی چند لمحے کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر پرتاب سنگھ کے بنگلے کی طرف دوڑا۔

"گاڑی تیز چلاؤ۔" آنگ کانگ غرایا۔ اس نے سی آئی ڈی کے اس آدمی کو بنگلے کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ فوراً ہی پرتاب سنگھ نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور آنگ کانگ کی ہدایات پر عمل کرتا ہوا گاڑی کو اوکسلے مانٹرکی طرف لے آیا۔

"اگلے موڑ پر گاڑی کو اوکسلے روڈ پر اور وہاں سے لائیڈ روڈ کی طرف موڑ لینا۔ رفتار بڑھاؤ۔" آنگ کانگ دہاڑا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اب اس پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس نے پستول کی نال وجدان کے پہلو سے لگا رکھی تھی۔

پرتاب سنگھ نے مرسڈیز کی رفتار بڑھا دی اور پھر رفتار کم کیے بغیر اس نے اگلے موڑ پر گاڑی اوکسلے روڈ کی طرف گھما دی۔ اس نے موڑ پر ٹریفک کے ایک سارجنٹ کی موٹر سائیکل دیکھ لی تھی۔ اسے دیکھ کر پرتاب سنگھ نے گاڑی کی رفتار مزید تیز کردی تھی تاکہ ٹریفک سارجنٹ اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔

ابھی تو ساڑھے نو بجے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ پرتاب سنگھ بڑی مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ٹریفک سارجنٹ کی موٹر سائیکل بھی بڑی تیز رفتاری سے اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ آنگ کانگ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

"اس موٹر سائیکل سے پیچھا چھڑاؤ۔" آنگ کانگ چیخا "گاڑی کو لائیڈ گارڈنز کی طرف موڑ لو۔"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ موٹر سائیکل قریب آ رہی تھی اور پھر موٹر سائیکل سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی عقبی ونڈ اسکرین توڑتی ہوئی موٹر سائیکل سوار سارجنٹ کے پیر پر لگی تھی۔ موٹر سائیکل بے قابو ہو کر سڑک پر لڑھک گئی۔

وجدان خوف زدہ تھا لیکن آنگ کانگ نے جیسے ہی اس کے پہلو سے پستول ہٹایا، اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور اس نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

موٹر سائیکل سوار پر گولی چلا کر آنگ کانگ ابھی پیچھے کی طرف ہی جھکا ہوا تھا کہ وجدان نے دونوں ہاتھوں سے اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پکڑلی اور دانت اس کے بازو میں گاڑ دیے۔ آنگ کانگ بلبلا اٹھا۔ وہ بازو کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ انگلی سے پستول کا ٹریگر دب گیا۔ پستول کا رخ چھت کی طرف تھا۔ گولی چھت میں سوراخ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

پرتاب سنگھ نے یہ صورتِ حال دیکھی تو لمحہ بھر کو بدحواس ہو گیا۔ اسی بدحواسی میں کار بے قابو ہو گئی۔ اس نے بریک پیڈل دبا دیا اور اسٹیئرنگ چھوڑ کر سیٹ کے اوپر سے پیچھے جھک گیا اور آنگ کانگ کی گردن میں بازو ڈال کر اسے پوری قوت سے پیچھے کی طرف کھینچنے لگا۔ پستول سے ایک اور گولی نکلی۔ یہ گولی عقبی اسکرین توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔

وجدان نے دانتوں سے آنگ کانگ کا بازو بھنبوڑ ڈالا۔ پستول آنگ کانگ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ وجدان اسے بری طرح دانتوں سے بھنبوڑ رہا تھا۔ دوسری طرف پرتاب سنگھ نے اس کی گردن کو بازو کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اسے سانس گھٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔

مرسیڈیز سڑک پر لہرا رہی تھی۔ وہ سامنے سے آنے والے ایک ٹرک سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور لہراتی ہوئی سڑک سے اتر کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔

آنگ کانگ نے تکلیف کے باوجود بازو کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ وجدان نے ایک مرتبہ پھر زور سے بھنبوڑا اور پھر اس کے بازو سے دانت ہٹا لیے۔ اس کے منہ میں خون بھر گیا تھا اور وہ متلی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ آنگ کانگ کے بازو سے بوٹی لٹک گئی تھی اور خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ وہ اب اپنے آپ کو پرتاب سنگھ کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

پرتاب سنگھ نے اس کی گردن کو آہنی شکنجے کی طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ پیچھے سے ایک کار بڑی تیز رفتاری سے اس طرف آ رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی آواز بھی پرتاب سنگھ کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ پولیس نہیں ہو سکتی تھی۔ پولیس گولیاں نہیں چلاتی' سائرن بجاتی ہے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آنگ کانگ کے ساتھی تھے۔

"کاکے!" وہ چیخا "گاڑی سے اتر کر بھاگ جا۔ وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا چاچا۔" وجدان بولا۔

"میری پروا مت کر۔ بھاگ جا یہاں سے۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ بھاگ جا یہاں سے۔ کسی بھی محفوظ جگہ پر چلا جا۔ میں تمہیں تلاش کر لوں گا۔ بھاگ جا۔ وہ لوگ آ گئے تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بھاگ جا کاکے۔ جلدی کر۔" پرتاب چیخا۔

وجدان نے ایک لمحے کو سوچا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ آنگ کانگ نے ٹانگ آگے کر کے اسے روکنے کی کوشش کی تھی مگر وجدان نے اس کی ٹانگ پر بھی دانتوں سے کاٹ لیا اور کار سے اتر کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اس نے ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا۔ گولیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ تیز رفتار کار مرسیڈیز سے چند گز پیچھے رک گئی۔ وجدان مڑ کر تاریکی میں دوڑنے لگا۔ اس کا رخ لائیڈ گارڈنز کی طرف تھا۔

○☆○

وجدان تاریکی میں اندھا دھند دوڑا جا رہا تھا۔ اس کا سانس پھول گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا' تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ وہ رک گیا اور پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے منہ میں اب بھی خون کا ذائقہ بھرا ہوا تھا اور پھر دفعتاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے خون کا کوئی لوتھڑا اس کے حلق میں پھنس گیا ہو۔ اسے متلی محسوس ہونے لگی۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور قے کرنے لگا۔

اس کے پورے سینے میں آگ سی لگ گئی۔ بڑی شدید جلن ہو رہی تھی۔ پیٹ میں آنتیں جیسے کٹی جا رہی تھیں۔ وہ پیٹ پکڑ کر دُہرا ہوا جا رہا تھا۔ اگرچہ وہ بہت بڑی الٹی کر چکا تھا۔ کھایا پیا سب کچھ نکل چکا تھا مگر لگتا تھا جیسے اب بھی حلق میں کچھ اٹکا ہوا ہو۔ وہ پیٹ کو دباتے ہوئے ابکائیاں لیتا رہا۔

اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی بہہ نکلا تھا۔ منہ میں خون کا ذائقہ بھی ابھی تک محسوس ہو رہا تھا اور بالآخر وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس لمبی چوڑی الٹی کی وجہ سے وہ نڈھال سا ہو گیا تھا۔ وہ پانی پینا چاہتا تھا مگر پانی کہاں سے ملتا۔ وہ گھاس پر بیٹھ گیا اور سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو شاید اس علاقے کو پہچان لیتا مگر رات کے اندھیرے میں اس کی سمجھ میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا اس کے آس پاس قد آدم جھاڑیاں تھیں اور دائیں طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر درختوں کے تاریک ہیولے نظر آ رہے تھے دوسری طرف بہت فاصلے پر کچھ روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

اچانک ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کافی فاصلے پر دو انسانی ہیولے دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ انجانا سا خوف اس کے دماغ کو اپنی گرفت میں لینے لگا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اگر وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور رینگتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا اور ایک جگہ دبک کر بیٹھ گیا۔ جھاڑیاں خاصی گنجان تھیں۔ وہ انہیں دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن قدموں کی آواز سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ قریب آ رہے تھے۔

وجدان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ آنگ کانگ کے ساتھی تھے جو اس کی تلاش میں اس طرف آئے تھے۔ وہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس سارے شیطانی کھیل کے پیچھے دارا کا ہاتھ تھا اور وہ دارا کے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ دارا کسی قیمت پر اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے کرائے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں جو اسے ٹھکانے لگانے کے لیے موقع کی تاک میں تھے اور اس کی قسمت اچھی تھی کہ ہر مرتبہ وہ بچتا رہا تھا۔ قسمت نے آج پھر اس کا ساتھ دیا تھا۔

اس کے ذہن میں پرتاب سنگھ کا خیال ابھر آیا۔ وہ اکیلا رہ گیا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا ہوا ہوگا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اس سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی پھر ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔ وہ چینی زبان میں بات کر رہا تھا۔ وجدان کی پرورش اس جزیرے پر ہوئی تھی جہاں کی آبادی میں چینیوں کی اکثریت تھی۔ وہ مینڈرن زبان بولتے تھے۔ وجدان اگرچہ روانی سے یہ زبان نہیں بول سکتا تھا لیکن سمجھ لیتا تھا۔ وہ شخص کہہ رہا تھا۔

"وہ اسی طرف آیا تھا۔ یہاں تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ ممکن ہے وہ پارک کی طرف نکل گیا ہو۔ وہاں چھپنے کی بہت سی جگہیں ہیں۔"

"چھپنے کی جگہیں تو اس طرف بھی بہت ہیں۔ ان جھاڑیوں میں پوری فوج چھپ سکتی ہے۔ لیکن چلو۔ پارک ہی کی طرف چلتے ہیں۔ وہ اس طرف گیا ہوگا۔ اسے وہاں کسی سے مدد ملنے کی توقع بھی ہوگی۔" دوسرے نے کہا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد وجدان نے جھاڑیوں سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دونوں دائیں طرف والے درختوں کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ موت ایک بار پھر اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ وہ چند لمحے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر جھاڑیوں سے باہر نکلنے کے بجائے اس طرف چلنے لگا جہاں روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

وجدان کا دل خوف سے کانپ رہا تھا لیکن وہ اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تیز تیز چلتا رہا۔ سناٹے میں جھاڑیوں کی سرسراہٹ کی آواز دور تک سنی جا سکتی تھی لیکن اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی تھی۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

تقریباً دو سو گز دور جھاڑیوں سے نکل کر وہ کھلی جگہ پر آ گیا۔ تیز تیز چلتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ جھاڑیوں میں غلط سمت میں نکل آیا تھا۔ وہ روشنیاں اب دائیں طرف رہ گئی تھیں۔ آگے ایک ٹیلا سا تھا اور دبیز گھاس تھی۔ وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے وہ ایک بار پھر رک گیا۔ ٹیلے کے دوسری طرف نشیب میں بھی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ پیچھے مڑا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ دو انسانی ہیولے جھاڑیوں سے نکل کر اسی طرف آ رہے تھے۔ یہ یقیناً وہی تھے جو پارک کی طرف گئے تھے لیکن اُس طرف اس کی تلاش میں ناکام ہو کر اس طرف آ گئے تھے۔

ان کے درمیان فاصلہ اگرچہ تین سو گز کے قریب تھا لیکن وجدان بلندی پر ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں نشیب سے اسے آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا اور پھر ایک چیختی ہوئی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔

"وہ رہا..... بھاگو..... بچ کر جانے نہ پائے۔"

اس کے ساتھ ہی فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ وجدان نے دوسری طرف نشیب میں دوڑ لگا دی۔ ایک موقع پر اس کا پیر رپٹ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور کئی گز تک ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ بالآخر وہ سنبھل گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا' وہ لوگ ابھی ٹیلے کی چوٹی پر نہیں پہنچے تھے۔ وہ ایک بار پھر دوڑنے لگا۔

فائر کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وجدان دوڑتا رہا۔ وہ روشنیاں اب بھی تقریباً تین سو گز دور تھیں۔ وجدان سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح وہاں تک پہنچ جائے تو موت کے ان فرشتوں سے بچ سکتا تھا۔

وہ پوری قوت سے دوڑتا رہا اور بالآخر ایک درخت کی آڑ میں رک گیا۔ سامنے شاپنگ ایریا تھا۔ ایک عمارت پر جگمگاتا ہوا ایک جانا پہچانا نیون سائن دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ وہ ریورویلی روڈ پر آ گیا ہے۔ یہ علاقہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ سائیکل پر کئی مرتبہ اس طرف آ چکا تھا۔ اس علاقے میں چند بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز تھے اور بھی بہت سی دکانیں تھیں۔ چند فاسٹ فوڈ کے اسٹالز اور تین چار اسنیک بارز تھے۔

وجدان ایک بار پھر دوڑنے لگا اور بالآخر ریورویلی روڈ پر پہنچ گیا۔ بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور بند ہو چکے تھے۔ البتہ چند چھوٹی دکانیں' ریسٹورنٹ اور فاسٹ فوڈ کے اسٹالز کھلے ہوئے تھے اور اس علاقے کی طرف زیادہ رونق تھی۔

وجدان ایک ریسٹورنٹ سے کچھ فاصلے پر ایک کار کی آڑ میں رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں آدمی بھی نظر آ گئے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر وجدان چونک گیا۔ یہ وہی چینی تھا جس نے خنجروں کے وار کر کے اس کی ماں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کا نام اب بھی اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر وہ کانپ اٹھا تھا۔ اس کی سفاکی کا مظاہرہ وہ دیکھ چکا تھا۔

وہ دونوں ایک جگہ پر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر آگے بڑھنے لگے۔ وجدان متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ یہ جگہ اس کے لیے محفوظ نہیں تھی۔ کسی بھی وقت وہ ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ وہ کاروں کے پیچھے چھپتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں سے گزر کر اس طرف آ گیا جہاں فاسٹ فوڈ کی دکانیں تھیں۔ سڑک اور دکانوں کے درمیان وسیع لان تھے جہاں میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔

اس طرف تیز روشنیاں تھیں۔ وجدان سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی کاروں کے پیچھے چھپتا ہوا ایک باربی کیو والی دکان کی طرف آ گیا۔ یہ سبحان علی نامی ایک پاکستانی کا باربی کیو تھا۔ وجدان اپنے والدین کے ساتھ کئی مرتبہ یہاں آ چکا تھا۔

سامنے کے رخ پر بڑے بڑے کباب دان تھے اور کئی کبابچی دہکتے ہوئے کوئلوں پر کباب اور چکن تکے وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

پچھلی طرف ایک دیوار کے ساتھ کوئلے کی بوریوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ وجدان ایک کار کی آڑ سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے ان دونوں چینیوں کو دیکھ لیا جو ایک جگہ کھڑے متجسس نظروں سے لوگوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے ہی دوسری طرف گھومے' وجدان نے کار کی آڑ سے نکل کر کوئلے کی بوریوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ دیوار اور بوریوں کے درمیان تنگ سی جگہ تھی۔ وہ گھستا ہوا اندر

گھس گیا۔ اس کے خیال میں یہ جگہ اگرچہ محفوظ تھی لیکن اگر انہیں شبہ ہوگیا تو پھر اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔

دیوار اور بوریوں کے درمیان جگہ بہت تنگ تھی۔ وہ پھنس کر کھڑا ہوا تھا۔ دو تین منٹ گزر گئے اور پھر باتوں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ ایک چینی ٹوٹی پھوٹی اردو میں کسی سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے کسی لڑکے کو ادھر آتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔ دوسرے آدمی کا جواب وہ نہیں سن سکا تھا لیکن بہرحال اسے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ لوگ آس پاس ہی کہیں موجود تھے اور اسے تلاش کر رہے تھے۔

جگہ اگرچہ بہت تنگ سی تھی لیکن وجدان مزید آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا جسم بوریوں سے رگڑ کھا رہا تھا۔ پانچ چھ بوریاں نیچے اوپر رکھی ہوئی تھیں۔ ایک بوری غالباً کچھ آڑی تھی۔ اس کا بیلنس درست نہیں تھا۔ اپنی جگہ بنانے کے لیے وجدان نے دھکا دیا تو اوپر والی بوریاں دھڑام سے دوسری طرف گر گئیں۔

بوریاں گرنے کی آواز سن کر لوگ اس طرف متوجہ ہوگئے۔ ہوٹل کے ایک ملازم نے وجدان کو بوریوں کے پیچھے دیکھ لیا۔

"اوئے۔ کون ہو تم۔ یہاں گھسے ہوئے کیا کر رہے تھے۔" وہ ملازم اس کی طرف بڑھتے ہوئے چیخا "ساری بوریاں گرا دیں۔ تمہارا باپ اٹھائے گا انہیں۔"

وجدان کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ خوف زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک آواز سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"وہ رہا۔ بوریوں کے پیچھے۔ پکڑو۔"

وجدان کو ایک لمحے کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بوریوں کے پیچھے سے نکل کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں چینی اس سے تقریباً چالیس گز دور تھے۔ وہ بھی اس کے پیچھے لپکے۔

اور پھر اچانک ہی فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ وجدان ٹھیک اسی وقت ایک فاسٹ فوڈ کی دکان کے ساتھ مڑ گیا تھا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گولی اس کے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو جاتی۔

وہ اندھا دھند ایک طرف دوڑتا رہا۔ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ گولی چلنے سے اس علاقے میں خوف و ہراس سا پھیل گیا تھا۔ فاسٹ فوڈ کی دکانوں کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر محفوظ جگہوں کی طرف دوڑنے لگے تھے۔

وجدان دو بلند عمارتوں کے درمیان ایک تنگ سی گلی میں دوڑتا ہوا پھر کھلی جگہ پر نکل آیا۔ یہ پارکنگ ایریا تھا۔ وجدان نے سوچا ان کاروں کے درمیان کہیں چھپ جائے یا کسی کار کا دروازہ کھول کر اندر گھس جائے لیکن وہ لوگ اسے ڈھونڈ لیتے۔ وہ پارکنگ ایریا کے پیچھے دیوار کی طرف دوڑا۔

دیوار تقریباً پانچ فٹ اونچی تھی۔ وہ دوڑتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے سے پہلے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک چینی اسی تنگ گلی میں دوڑتا ہوا آرہا تھا جہاں سے وہ گزر کر آیا تھا۔ اس نے فائر کردیا۔ اس دوران میں وجدان دیوار سے چھلانگ لگا چکا تھا۔ گولی اس کے اوپر سے گزر گئی۔ اس مرتبہ بھی وہ بال بال بچا تھا۔

دوسری طرف کچی زمین تھی۔ اس نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے پودے تھے۔ اِکا دُکا درخت بھی تھے اور ان سے آگے گھاس کا قطعہ تھا جس کے دوسری طرف ایک بہت لمبی چوڑی دو منزلہ عمارت تھی۔

وجدان نے اس عمارت کو پہچان لیا۔ وہ ایک ہائی اسکول کی عمارت تھی۔ وہ اٹھ کر پودوں کو پھلانگتا ہوا درختوں کی طرف دوڑا۔ درختوں کے قریب پہنچ کر بھی وہ رکا نہیں بلکہ عمارت کی طرف دوڑتا رہا۔

عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کشادہ برآمدے میں پہنچ کر وہ رک گیا اور متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے بڑا مرکزی دروازہ تھا جو بند تھا۔ برآمدے میں ایک کمرا دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف۔ دائیں طرف والا کمرا تو استقبالیہ روم تھا اور بائیں طرف کا کمرا ویٹنگ روم تھا۔ بچوں کے والدین ٹیچرز وغیرہ سے ملنے یا کسی اور وجہ سے آتے تو انہیں اسی ویٹنگ روم میں بٹھایا جاتا تھا۔

دھب کی آواز سن کر وجدان چونک گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا ایک چینی غنڈا کمپاؤنڈ وال سے کود گیا تھا۔ وجدان نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر استقبالیہ روم کی طرف بڑھا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہوگیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر کے کنڈا لگا دیا۔

باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وجدان چند لمحے دروازے کے قریب ہی کھڑا تاریکی میں گھورتا رہا۔ برآمدے کے بالکل سامنے تقریباً بیس گز دور مین گیٹ کے ساتھ سڑک کے کنارے بجلی کے کھمبے پر تیز روشنی والا مرکری بلب جل رہا تھا۔ اس کی نہایت مدھم روشنی کھڑکی کے راستے اس کمرے تک بھی پہنچ رہی تھی۔ روشنی اتنی نہیں تھی کہ صاف طور پر کچھ نظر آسکتا۔ اندھیارے پر روشنی کا گمان سا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وجدان کی آنکھیں اس اندھیارے سے مانوس ہوئیں تو وہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ سلیقے سے کچھ کرسیاں آراستہ تھیں اور درمیان میں ایک سینٹر ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ وجدان ٹٹولتا ہوا کرسیوں کے پیچھے ایک دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا۔

دوسری طرف ایک کشادہ اور طویل راہداری تھی جس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ بائیں طرف آخری سرے پر مدھم روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ وجدان نے دائیں طرف اوپر جانے کا زینہ دیکھا۔ وہ زینے کی طرف لپکا۔ ابھی اس نے تیسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز برآمدے میں پہنچ کر رک گئی۔ وہ دونوں برآمدے میں پہنچ گئے تھے اور مرکزی دروازے کو دھڑ دھڑا رہے تھے۔

وجدان کے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔ دوڑتے دوڑتے ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ وہ پناہ کی تلاش میں بھاگا پھر رہا تھا لیکن اسے کہیں بھی پناہ نہیں مل رہی تھی۔ موت کے فرشتے اس کے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔

اچانک چھناکے کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ ان لوگوں نے برآمدے والے دروازے کا شیشہ توڑ دیا تھا۔ اب وہ دروازہ کھول کر اندر آجائیں گے اور وہ چوہے کی طرح پکڑا جائے گا۔ نہیں وہ پکڑا نہیں جائے گا۔ وہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔

وجدان نے ایک لمحے کو کچھ سوچا اور پھر دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ زینے کے اختتام پر کشادہ راہداریاں تھیں۔ ایک دائیں طرف ایک بائیں طرف اور ایک بالکل سامنے۔

نیچے سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ لوگ اسے نیچے تلاش کر رہے تھے۔ وجدان نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دائیں طرف کی راہداری میں چلنے لگا۔ لاتعداد کمرے تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندر ڈیسک لگے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سوچ رہا تھا کہ اسکول کی اس عمارت کا چوکی دار کہاں چلا گیا۔ اگر وہ عمارت میں موجود تھا تو اس نے شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنی ہوگی۔ اب تک چوکی دار کی آواز سنائی کیوں نہیں دی۔ وہ صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے کیوں نہیں آیا۔

وجدان یہی سب کچھ سوچتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ راہداری کے دونوں طرف کلاس رومز تھے۔ وہ لوگ نیچے کی تلاش مکمل کرنے کے بعد اوپر آجائیں گے۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اوپر آکر غلطی کی تھی۔ اگر نیچے ہی کسی کلاس روم میں چھپ جاتا تو کھڑکی کے راستے بھاگنے کا موقع مل سکتا تھا۔

وہ راہداری کے آخر میں پہنچ کر رک گیا۔ سامنے تقریباً تین فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار کے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ نہیں۔ وہ یہاں سے چھلانگ نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ سامنے دیکھنے لگا۔ اسکول کی کمپاؤنڈ وال کے دوسری طرف وہی علاقہ تھا جہاں سے وہ بھاگ کر آیا تھا۔ وہاں اب پہلے جیسی رونق نظر آرہی تھی اور کوئی افراتفری نہیں تھی۔

قدموں کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں غالباً سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے اوپر آرہے تھے۔

اس کے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہوگئی۔ وہ کسی بھی لمحے پکڑا جا سکتا تھا۔ نہیں۔ ان میں سے کسی کی گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر راہداری کا آخری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

دروازہ کھلتے ہی ناگوار سی بُو کا زبردست بھبکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا اور اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس دروازے کے اندر چھوٹے چھوٹے بیت الخلا بنے ہوئے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا اور بائیں طرف والے آخری بیت الخلا کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ اسپرنگ والا دروازہ خود بخود بند ہوگیا اور وہ دروازے کے پیچھے دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ یہ آخری بیت الخلا تھا اور اس میں باہر والی دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی۔ کھڑکی اگرچہ کھلی ہوئی تھی اور ہوا بھی اندر آرہی تھی لیکن بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

اس کی تمام تر توجہ آوازوں پر مرکوز تھی۔ وہ دونوں اس راہداری میں تھے اور کلاس رومز کے دروازے کھول کھول کر دیکھ رہے تھے۔ دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بیت الخلا والے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک آدمی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"لعنت ہو۔ یہ تو لیٹرین ہے۔"

"دیکھو۔ اندر جا کر دیکھو۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں چھپا ہوا ہو۔" دوسری آواز نے کہا۔

اور پھر بیت الخلا کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وجدان کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ موت اور اس کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔ خوف کی شدت سے اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس ڈر سے کہ اس کے منہ سے چیخ نہ نکل جائے، اس نے اپنے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ لیا۔

اور پھر اس باتھ روم کا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ منہ کو ہاتھ سے دبائے سانس روکے دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے کان کسی بھی لمحے گولی کی آواز سننے کے منتظر تھے مگر گولی نہیں چلی۔ دروازہ دھڑ سے بند ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی اور وہ باہر نکل گیا۔ جب باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تو وجدان نے آنکھیں کھول دیں لیکن منہ کو ہاتھ سے دبائے رکھا۔

"وہ یقیناً اسی عمارت میں کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔" باہر سے ایک آواز سنائی دی "تم سامنے والی راہداری میں تلاش کرو چی فانگ۔ میں دوسری راہداری میں دیکھتا ہوں۔"

وجدان کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ چی فانگ۔ یہی نام

تھا اس چینی کا جس نے اس کی ماں کو اس کی نظروں کے سامنے خنجروں کے پے در پے وار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چی فانگ کو اس نے اگرچہ دیکھتے ہی پہچان لیا تھا اور اب اس کا نام بھی یاد آگیا تھا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی۔ وجدان نے اپنے منہ سے ہاتھ ہٹالیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ بدبو سے اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا لیکن اس بدبو ہی کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔ موت ایک بار پھر اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔

دوسری راہداریوں میں کلاس رومز کے دروازے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے خیال میں راہداری میں نکلنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے باتھ روم کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

کھڑکی سے تقریباً تین فٹ کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ ڈرین پائپ تھا۔ جو عمارت کی چھت سے لے کر نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ کھڑکی کے فریم پر چڑھ گیا۔ ایک ہاتھ سے کھڑکی کی چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا ایک پیر جما کر چوکھٹ پر رکھا اور ڈرین پائپ کی طرف جھکنے لگا۔

فاصلہ تین فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ آسانی سے پائپ تک پہنچ گیا۔ اس نے پائپ پر گرفت جمالی اور کھڑکی کو چھوڑ دیا۔ دوسرا ہاتھ بھی بڑی پھرتی سے پائپ پر جمالیا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے پھسلنے لگا۔

زمین پر قدم ٹکتے ہی وہ کمپاؤنڈ وال کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اسے دیوار پر چڑھنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئی اور پھر کسی کے چیخنے کی آواز سن کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چی فانگ یا اس کے ساتھی نے کسی کلاس روم کی کھڑکی سے اسے دیکھ لیا تھا۔

وجدان نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس وقت شاید بارہ بج چکے تھے لیکن اس علاقے کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہاں کے بیشتر ریسٹورنٹ اور فاسٹ فوڈ کی دکانیں رات بھر کھلی رہتی تھیں۔ اتفاق سے وجدان جس جگہ دیوار سے کودا تھا اس سے چند گز کے فاصلے پر بابلی کیو کی وہی دکان تھی جہاں وہ کوئلے کی بوریوں کے پیچھے چھپا تھا۔ اس وقت بھی دکان کے اس ملازم نے اسے دیوار سے کودتے ہوئے دیکھ لیا۔

"اوئے۔ کون ہے تو۔ بھاگ جا یہاں سے۔ وہ چینی تجھے مار دیں گے۔" دکان کا ملازم چیخا۔

وجدان نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ کوڑے سے لدا ہوا ایک ٹرک گلی سے نکل کر بائیں طرف مڑا تھا۔ وجدان دوڑ کر اس ٹرک پر چڑھ گیا اور کوڑے کے ڈھیر پر لیٹ گیا۔ اس نے ان دونوں چینیوں کو بھی اسکول کی دیوار پر چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ٹرک کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ دونوں دور رہ گئے اور وجدان کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

وجدان ٹرک میں بھرے ہوئے کوڑے کے کنارے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ٹرک اس سڑک پر جا رہا تھا جس [illegible] اوبیرائے امپیریل واقع تھا۔ ہوٹل کا نیون سائن دور سے [illegible] تھا۔

ٹرک ابھی ہوٹل سے دور ہی تھا کہ ایک ٹریفک سارجنٹ کی موٹر سائیکل تیز رفتاری سے اس کے برابر آگئی۔ سارجنٹ نے ٹرک کے ڈرائیور کو گاڑی سائڈ میں روک لینے کا اشارہ کیا۔ [illegible] طرح کھلے ٹرک پر کوڑا لے جانا جرم تھا اور سارجنٹ نے اسی [illegible] اسے روکا تھا۔

ٹرک کی رفتار جیسے ہی کم ہوئی وجدان نے چھلانگ لگا دی۔ [illegible] سڑک پر گرا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر ہوٹل کی طرف دوڑنے لگا۔ ہوٹل کے سامنے کچھ رونق نظر آ رہی تھی۔ اور وجدان کو [illegible] تھا کہ وہاں اسے پناہ مل جائے گی۔

وجدان کی ٹانگیں دوڑتے دوڑتے شل ہو چکی تھیں۔ [illegible] پھیپھڑے پھٹے جا رہے تھے۔ سامنے فٹ پاتھ پر کچھ لوگ آ رہے تھے۔ وجدان کا رخ انہی کی طرف تھا۔ قریب پہنچ کر اسے کسی [illegible] سے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے سے آنے والے ایک [illegible] کے قدموں میں گر گیا۔

وجدان کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ منہ سے کف بہہ رہا [illegible] اس کے دونوں ہاتھ سامنے کھڑے ہوئے شخص کے پیروں کے قریب تھے۔ اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اسے [illegible] میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ دارا تھا!

وہ انسان نہیں موت کا فرشتہ تھا جسے دیکھ کر وجدان کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

دارا گردن کو ذرا سا خم کیے اپنے قدموں پر گرے ہوئے اس لڑکے کو دیکھ رہا تھا جس کی تلاش میں اس نے چینی غنڈوں کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں اور اب تک ہزاروں ڈالر خرچ کر [illegible] تھا۔ وجدان اس کے جرم کا چشم دید گواہ تھا اور وہ اسے ہر قیمت پر موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا لیکن اسے قدم قدم پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور اس وقت وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے قدموں میں آن گرا تھا۔ دارا اپنی خوش بختی پر دل ہی دل میں مسکرا اٹھا۔ ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وجدان اس طرح بھی اس کے سامنے آجائے گا۔

وجدان اس کے لئے ڈیتھ وارنٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔ [illegible] کا دل چاہا تھا کہ ذرا سا نیچے جھکے اور اس لڑکے کی گردن مروڑ کر فٹ پاتھ کے ساتھ کیاری میں لگے ہوئے پودوں کے پیچھے پھینک دے لیکن وہ بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پا سکا تھا۔ [illegible] جگہ ویران اور سنسان نہیں تھی۔ ایک بارونق جگہ [illegible] اگرچہ اس وقت بارہ سے اوپر کا وقت تھا لیکن سڑک پر اکا دکا گاڑیوں کی آمدورفت بھی جاری تھی اور فٹ پاتھ پر لوگ بھی آ جا رہے تھے۔ اس وقت کوئی معمولی سی غلطی بھی اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

دارا نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دو یورپین عورتیں اور ایک ادھیڑ عمر مرد ٹہلنے والے انداز میں اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے سامنے ایک لڑکے کو دوڑتے ہوئے اور پھر گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے قریب پہنچ گئے۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے دارا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"یہ بچہ شاید کسی سے ڈر کر بھاگ رہا تھا۔ دارا نے قریب کھڑی ہوئی ادھیڑ عمر یورپی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے ہماری مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں دیکھتا ہوں یہ کون ہے؟" وہ آہستہ آہستہ نیچے جھکنے لگا جیسے وجدان کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھانا چاہتا ہو۔ "ہیلو بوائے۔" وہ وجدان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے۔ کس سے ڈر کر بھاگ رہے ہو۔ کیا کوئی بدمعاش تمہیں پکڑنا چاہتا ہے؟"

وجدان کا ننھا سا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ دارا کے ہونٹوں پر اگرچہ مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں بے پناہ سرد مہری اور سفاکی تھی۔ وجدان موت کو نچا دے کر بھاگا تھا اور موت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کو تو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دماغ بھی سُن ہو گیا ہو۔ اس نے سر کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور ذرا سی گردن گھما کر قریب کھڑے ہوئے اس یورپین مرد اور عورتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سامنے کافی فاصلے پر تین چار عورتوں پر مشتمل ایک اور ٹولی اس طرف آ رہی تھی۔ وجدان کے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس نے سوچا، وہ شور مچا دے کہ یہ شخص اس کے ماں باپ کا قاتل ہے اور اسے بھی قتل کرنا چاہتا ہے لیکن اس میں اندیشہ اس بات کا تھا کہ دارا اسے فوراً ہی گولی مار دے گا اور اسے وہاں سے فرار ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس وقت دارا سے بچنے کا ایک اور طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ خود وہاں سے فرار کی کوشش کرے۔

"آؤ بیٹا، میرا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ اور بتاؤ، کون بدمعاش تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیں گے۔" دارا نے کہا۔

وجدان چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے آپ کو اس طرح حرکت دی جیسے اٹھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھ دارا کے چمکتے ہوئے جوتوں پر رکھ دیئے اور دونوں گھٹنے زمین پر ٹکا دیئے۔ وہ تینوں یورپین بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ادھیڑ عمر عورت نے آگے جھکتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"تم بہت دلیر لڑکے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دیں گے۔"

وجدان نے اپنے آپ کو کچھ اور حرکت دی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوتوں سے ہٹا کر دارا کے ٹخنوں کے پیچھے رکھ دیئے اور پھر اس نے وہ حرکت کی جس کے بارے میں دارا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

وجدان نے دارا کے دونوں پیر پیچھے سے پکڑ کر اپنے جسم کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ دارا لڑکھڑا کر پشت کے بل فٹ پاتھ پر گرا۔ اس کے منہ سے گندی گالی نکل گئی تھی۔

وجدان ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے تھوکا اور فٹ پاتھ کے ساتھ کیاری میں لگے ہوئے پودوں کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ یورپین مرد اور عورتیں بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔ فٹ پاتھ پر آنے والی عورتوں کی ٹولی بھی قریب آگئی تھی۔ انہوں نے بھی یہ دلچسپ منظر دیکھا تھا۔ یہ بھی یورپین عورتیں تھیں جو ہوٹل اوبیرائے امپیریل میں قیام پذیر تھیں اور غالباً ٹہلنے کے لئے نکلی ہوئی تھیں۔

وجدان نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ پودوں میں چھلانگیں لگاتا ہوا بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا اور پھر اچانک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی اس کے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پودوں میں گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یورپین عورتیں چیختی ہوئی اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں اور دارا دوڑتا ہوا پودوں کی طرف آ رہا تھا۔ وجدان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دائیں طرف عمارتوں کے درمیان کچھ تاریکی تھی۔ وہ اسی طرف بھاگ اٹھا۔ وہ عمارتوں کے درمیان دوڑتا ہوا ہوٹل اوبیرائے کی پچھلی طرف نکل آیا۔ ہوٹل کی عمارت سے ذرا ملی ہوئی دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ وہ اس عمارت کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ عمارت کے اندر کسی بھاری مشین کے چلنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس چھوٹی سی عمارت کے سامنے گھاس پر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی اور ایک آدمی مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ وجدان بڑی آہستگی سے دیوار کی آڑ سے نکلا اور تیزی سے چلتا ہوا اس چھوٹی سی عمارت کے کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ ہوٹل کا ائرکنڈیشننگ پلانٹ تھا۔ اگرچہ وہاں بڑی بڑی مشینیں چل رہی تھیں مگر آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس نے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ان مشینوں کے درمیان چلتا ہوا پچھلی طرف پہنچ گیا۔

مشینوں کے شور کے باوجود اسے باہر سے دوڑتے ہوئے

قدموں کی آواز سنائی دے گئی تھی پھر ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے دو آدمی جھگڑنے والے انداز میں چیخ چیخ کر باتیں کر رہے ہوں اور پھر گولی چلنے اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

وجدان کے دل و دماغ پر طاری خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چی فانگ اور اس کے خونخوار ساتھی سے جان بچا کر بھاگا تو دارا کے قدموں میں آن گرا تھا... اور اب دارا خونخوار بھیڑیے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ باہر گولی کی آواز سن کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ گولی کس نے چلائی تھی اور وہ چیخ کس کی تھی۔ وجدان ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر چونک گیا۔ قدموں کی وہ آواز اس مشین روم کے سامنے آکر رک گئی۔ وجدان پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔

قدموں کی آواز اب مشین روم کے اندر سنائی دے رہی تھی۔ وجدان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مشینوں کی پچھلی طرف ایک ڈرم اوندھا پڑا تھا۔ اس ڈرم کے سوا چھپنے کی کوئی اور جگہ نہیں تھی۔

"وجدان! مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔" یہ آواز یقیناً دارا کی تھی۔ اس کے لہجے میں بھی اس کی آنکھوں جیسی سفاکی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"

وجدان کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ موت پھر اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بڑی آہستگی سے مشین کے پیچھے پڑے ہوئے ڈرم میں گھس گیا۔ اگر دارا نے اس ڈرم میں جھانکنے کی کوشش نہ کی تو وہ بچ جائے گا۔ دوسری صورت میں وہ اسے ڈرم سے نکلنے کا موقع دیے بغیر گولیوں سے چھلنی کردے گا۔ مشینوں کے شور میں قدموں کی ہلکی سی آواز سنائی دیتی رہی جو بالآخر ڈرم کے قریب آکر رک گئی۔ وجدان نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور سانس تک روک لیا۔ اس کے اور بے رحم موت کے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا اور اس کی معمولی سی حرکت اس کی زندگی کا خاتمہ کرسکتی تھی۔

چند سیکنڈ بعد قدموں کی آواز دور ہٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی اور پھر مشینوں کی آواز میں معدوم ہوگئی۔ اب صرف مشینوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وجدان نے کچھ دیر اور انتظار کیا اور پھر بڑی آہستگی سے ڈرم سے باہر نکل آیا۔ وہ غالباً تیل کا خالی ڈرم تھا۔ اس کے ہاتھ پیر، چہرہ اور کپڑے تیل سے کالے ہو رہے تھے۔ وہ مشینوں کے درمیان محتاط انداز میں چلتا ہوا دروازے کے قریب آگیا اور باہر جھانکنے لگا۔ چند گز آگے ایک آدمی گھاس پر بے حس و حرکت اوندھا پڑا ہوا تھا۔ وجدان نے کپڑوں سے پہچان لیا۔ یہ وہی آدمی تھا جسے اس نے مخالف سمت میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور غالباً اسے دارا نے گولی مار کر ہلاک کردیا تھا۔

وجدان کا دل کانپ رہا تھا اور دماغ میں دھماکے ہو رہے... اس کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا... کہ زور زور سے چیخنا شروع کردے۔ پہلے اس نے سوچا کہ یہاں سے نکل کر کسی طرح ہوٹل میں پہنچ جائے لیکن اس نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ اگر دارا باہر کسی جگہ موجود ہوا تو اسے دیکھتے ہی... مار دے گا۔ اس نے مڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندر چند قدم کے فاصلے پر ایک چھوٹی میز پڑی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے دیوار پر ایک... فون سیٹ لگا ہوا تھا۔

ٹیلی فون دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی اُبھر آئی۔ وہ... تیز قدم اٹھاتا ہوا میز کے قریب پہنچ گیا اور ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھا... لیا لیکن اچانک ہی اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں... آرہا تھا کہ وہ کسے فون کرے۔ اسے اپنے والد کے کئی دوستوں کے... نمبر یاد تھے لیکن اس وقت کسی کا نمبر یاد نہیں آرہا تھا پھر اس کے... دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ زندگی اور موت کی اس آنکھ مچولی میں... پرتاب سنگھ کو تو بھول ہی گیا تھا۔ اب اسے یاد آرہا تھا کہ جب وہ... سے اتر کر بھاگا تھا تو پرتاب سنگھ اس شخص کو قابو کرنے کی کوشش... کر رہا تھا جو سی آئی ڈی آفیسر کے بھیس میں پستول کے زور پر انہیں... کہیں لے جانا چاہتا تھا اور پھر دوسری کار پر چی فانگ اور اس کے... ساتھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ چی فانگ اور اس کا ایک ساتھی تو اس... کے پیچھے لگ گئے تھے اور اگر ان کے ساتھ کچھ اور افراد تھے تو... پرتاب سنگھ سے الجھ گئے ہوں گے۔ پرتاب سنگھ پتا نہیں کس حال... میں ہوگا۔ وہ زندہ بھی ہے یا اسے ختم کردیا گیا ہے۔ وجدان اس... امید پر پرتاب سنگھ کا نمبر ملانے لگا کہ اگر وہ زندہ ہوا تو شاید اب... تک گھر پہنچ گیا ہو۔ وہ پورے نمبر نہیں ملا پایا تھا کہ ایک نسوانی... آواز سنائی دی۔

"جوجو ..... تمہیں معلوم ہے، تمہاری لائن ڈائریکٹ نہیں... ہے۔ اس وقت کسے فون کرنا چاہتے ہو؟" اس عورت نے انگریزی... میں بات کی تھی لیکن لہجہ چینی تھا۔

"میں جوجو..... نہیں ہوں۔ میں چاچا پرتاب سنگھ کا نمبر ملانا... چاہتا ہوں۔ تم کون ہو؟" وجدان نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں... کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

"میں ہوٹل کی آپریٹر ہوں۔ تم کون ہو، جوجو .... کہاں ہے؟" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"مجھے پتا نہیں جوجو لیکن کون ہے۔" وجدان نے جواب دیا۔ "دارا مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں اس سے بچنے کے لئے اس... مشین روم میں آکر چھپ گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے یہاں سے نکل کر گیا ہے۔ پلیز! چاچا پرتاب سنگھ کو بتا دو، میں یہاں ہوں۔ وہ مجھے آکر لے جائے۔"

"وہ!" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "تم ٹیلی فون رکھ دو اور وہیں کھڑے رہو۔ میں سکیورٹی گارڈز کو بھیجتی ہوں۔ مشین روم سے باہر مت نکلنا۔"

"جلدی سے آجاؤ آنٹی۔ اگر دارا آگیا تو مجھے مار دے گا۔" وجدان نے کہا۔

"ڈرو نہیں۔ ہم ابھی آرہے ہیں۔ تم فون کا ریسیور رکھ دو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

وجدان نے ریسیور ہک پر ٹانگ دیا۔ ایک بار پھر باہر جھانک کر دیکھا۔ نیلے کپڑوں میں ملبوس وہ آدمی اب بھی اسی طرح بے حس و حرکت گھاس پر پڑا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ یہ شخص جوجو..... تو نہیں جس کے بارے میں آپریٹر نے پوچھا تھا۔

وہ دروازے سے ہٹ کر ایک مشین کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ تقریباً دو منٹ بعد باہر سے بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر ایک آدمی کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو بوائے۔ کہاں ہو تم؟"

وجدان جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے وہ کسی کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اگرچہ فون پر آپریٹر نے کہا تھا کہ وہ لوگ آرہے ہیں لیکن عین ممکن تھا اس سے پہلے دارا دوبارہ وہاں پہنچ گیا ہو۔ اس نے اپنی جگہ سے بہت آہستگی سے حرکت کرتے ہوئے مشین کی آڑ سے جھانک کر دیکھا اور پھر اس کے منہ سے اطمینان کا سانس نکل گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر چینی عورت تھی۔ اس کے ساتھ ہوٹل کا نائٹ سپروائزر اور دو سکیورٹی گارڈز تھے۔ وہ چاروں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

"ہیلو بوائے۔ میں ہوٹل کی وہی آپریٹر ہوں جس نے فون پر تم سے بات کی تھی۔ کہاں ہو تم؟"

یہ وہی آواز تھی جو وجدان نے فون پر سنی تھی۔ وہ مشین کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

"او مائی گاڈ۔" عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے آگے بڑھ کر وجدان کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ "یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔ کہاں چھپے ہوئے تھے تم۔ اور جوجو کہاں ہے؟"

"میں دارا سے بچنے کے لئے ڈرم میں چھپ گیا تھا۔" وجدان نے جواب دیا۔ "مجھے پتا نہیں جوجو کہاں ہے۔ باہر گھاس پر ایک آدمی اوندھا پڑا ہوا ہے۔ وہ شاید مر گیا ہے۔ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔"

وہ عورت ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔ ہوٹل کا نائٹ سپروائزر اور دونوں گارڈز بھی چونک گئے۔

"کہاں..... کہاں ہے وہ.....؟" سپروائزر جلدی سے بولا۔ "کس نے گولی ماری ہے اسے؟"

"دارا نے۔" وجدان نے جواب دیا۔ "نیلے کپڑوں والا وہ آدمی اس طرف گھاس پر پڑا ہے۔" وجدان نے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

سپروائزر اور دونوں گارڈز تیزی سے باہر آگئے اور پھر انہوں نے وہ لاش دیکھ لی جو دائیں طرف تقریباً بیس گز کے فاصلے پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ چینی عورت بھی وجدان کو لے کر مشین روم سے باہر آگئی تھی۔ وہ لاش کے قریب نہیں گئی بلکہ دور کھڑی ہو کر اس طرف دیکھتی رہی۔ اس نے وجدان کا بازو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔

"مس کاماشی۔" سپروائزر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ "تم ہوٹل میں جا کر پولیس کو فون کردو۔ جوجو ختم ہوچکا ہے اور اس لڑکے کا خیال رکھنا۔ یہ اس سلسلے میں بہت اہم ثابت ہوسکتا ہے۔"

"پولیس کو ہوٹل کے سامنے فائرنگ کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ انہیں اب تک آجانا چاہیے۔ میں دوبارہ فون کرتی ہوں۔" مس کاماشی نے کہا۔

"میں خود دیکھتا ہوں۔" سپروائزر یہ کہتے ہوئے خود آگے بڑھ گیا۔ اس چھوٹی عمارت کے ساتھ ہی دائیں طرف ہوٹل کی عمارت میں ایک دروازہ تھا۔ سپروائزر اس دروازے میں داخل ہوگیا۔ مس کاماشی بھی وجدان کا بازو پکڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔ دو تین راہداریوں سے گزر کر وہ ہوٹل کی استقبالیہ لابی میں پہنچ گئے۔ سپروائزر استقبالیہ کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر غالباً پولیس اسٹیشن کا نمبر ملا رہا تھا۔ مس کاماشی وجدان کو استقبالیہ کاؤنٹر کے ساتھ بنے ہوئے سپروائزر کے دفتر میں لے آئی۔

"دس پندرہ منٹ پہلے ہوٹل کے سامنے سڑک پر فائرنگ ہوئی تھی۔ ہم نے پولیس کو فون پر اطلاع دی تھی مگر پولیس ابھی تک نہیں پہنچی۔" مس کاماشی کہہ رہی تھی۔ "تم کون ہو بوائے اور دارا کون ہے۔ وہ تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟"

"ہوٹل کے سامنے بھی دارا نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی مگر میں بھاگ گیا تھا۔" وجدان نے بتایا۔ "اس نے میرے ممی ڈیڈی کو قتل کردیا تھا۔ اب وہ مجھے بھی مارنا چاہتا ہے۔ چاچا پرتاب سنگھ کو بُلا دو آنٹی پلیز....."

مس کاماشی اس کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ دہرے قتل کی بہیمانہ واردات زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی۔ اس واردات کے حوالے سے اخبارات کئی روز تک فرنٹ پیج پر خبریں چھاپتے رہے تھے۔ ان خبروں میں وجدان نام کے ایک لڑکے کا

خاص طور پر تذکرہ رہا تھا۔ وہ مقتولین کا بیٹا تھا جو بچ گیا تھا اور وہ اس واردات کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ قاتلوں کو پہچانتا تھا اور قاتل اسے بھی ختم کرنے کے لئے کئی بار کوشش کر چکے تھے۔ اخبارات ایسی خبروں کو نمایاں طور پر شائع کرتے رہے جنہیں لوگ بڑی دلچسپی سے پڑھتے۔ کسی نے اس لڑکے کو نہیں دیکھا تھا مگر سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔ مس کاماشی بھی اخباروں میں یہ خبریں پڑھتی رہی تھی اور اسے بھی اس لڑکے سے ہمدردی ہوگئی تھی جو ان خونخوار بھیڑیوں سے چھپتا پھر رہا تھا اور اب وہی لڑکا اس کے سامنے تھا۔ اسے واقعی وجدان پر ترس آرہا تھا۔ کتنا معصوم سا لڑکا تھا جو موت سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔

"ڈرو نہیں۔ اب تم بالکل محفوظ ہو۔" مس کاماشی نے وجدان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ خوف سے وہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ "تم تو بہت بہادر لڑکے ہو۔ اب وہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ کچھ دیر میں پولیس آنے ہی والی ہوگی۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"چاچا پرتاب سنگھ کو بلا دو آنٹی۔" وجدان نے کہا۔

"پولیس آجائے تو پرتاب سنگھ کو بھی بُلا دیں گے۔" مس کاماشی نے کہا۔

اسی لمحے دروازہ کھلا اور سپروائزر اندر داخل ہوا۔

"پولیس روانہ ہو چکی ہے۔ وہ لوگ چند منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اس لڑکے نے اپنے بارے میں کچھ بتایا۔ یہ کون ہے اور اسے کون قتل کرنا چاہتا تھا؟"

"یہ وہی بچہ ہے جس کے والدین کو کچھ عرصہ پہلے بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا تھا۔" مس کاماشی نے کہا اور پھر اسے وجدان کے بارے میں بتانے لگی۔

تقریباً پانچ منٹ بعد پولیس پہنچ گئی۔ اس پولیس پارٹی کا انچارج نچلے درجے کا آفیسر تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہی اس نے فون پر انسپکٹر چیانگ شو کو اطلاع دے دی۔ انسپکٹر چیانگ شو کو وہاں پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے آتے ہی وجدان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔

دارا کے کھاتے میں ایک اور قتل کا اضافہ ہوگیا تھا اور اس واردات کا گواہ بھی وجدان ہی تھا۔ وجدان نے اگرچہ اپنی آنکھوں سے دارا کو جوجو پر گولی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن یہ طے شدہ بات تھی کہ جوجو کو اسی نے قتل کیا تھا۔ جوجو ہوٹل کے ائرکنڈیشننگ پلانٹ کا آپریٹر تھا۔ وہ غالباً ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر فائرنگ کی آواز سن کر صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے اس طرف جا رہا ہوگا کہ دارا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے شاید دارا کو اس طرف آنے سے روکنے کی کوشش کی ہوگی جس پر دارا نے اسے گولی مار دی بعد ازاں وہ وجدان کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس چلا گیا۔

انسپکٹر چیانگ شو نے تحقیقات کی ذمے داری اپنے ایک ماتحت آفیسر کو سونپ دی اور وجدان کو لے کر پولیس اسٹیشن آگیا۔

"چاچا پرتاب سنگھ کہاں ہے۔ مجھے ان کے پاس لے چلیں نا انکل۔" وجدان نے چیانگ شو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پرتاب سنگھ اسپتال میں ہے۔ اسے ٹانگ میں گولی لگی تھی لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں۔ معمولی زخم ہے۔ دو چار روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "پرتاب سنگھ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا کہ کس طرح تم دونوں کو پستول کی زد پر لے جانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور دارا سے تمہارا سامنا کیسے ہوا؟"

"کار رکتے ہی چاچا پرتاب سنگھ نے مجھے بھاگ جانے کو کہا تھا۔" وجدان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر مشین روم میں وہ خالی ڈرم نہ پڑا ہوتا تو دارا مجھے ہلاک کر دیتا۔"

"اس کے ہاتھوں ایک اور آدمی قتل ہو گیا ہے۔" انسپکٹر چیانگ شو بولا۔ "وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جوجو کے قتل کے وقت تم آس پاس ہی کہیں موجود تھے اور تم اس قتل کے بارے میں بھی اس کے خلاف گواہی دو گے۔ تم نہ صرف ہمارے لئے بلکہ اس کے لئے بھی پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے ہو۔ تم نے بتایا ہے کہ دو آدمی تمہارے تعاقب میں تھے۔ کیا تم ان میں سے کسی کو پہچان سکتے ہو۔ تمہارے بتائے ہوئے حلیے سے تصویری خاکہ تیار کر کے انہیں تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔"

"او.... یس انکل۔" وجدان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ "ان میں ایک آدمی وہی تھا جس نے میری ممی کو قتل کیا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد آگیا ہے۔ وہ چی فانگ ہے۔" وجدان ایک بار پھر اس کا حلیہ دہرانے لگا۔

"چی فانگ۔" انسپکٹر چیانگ شو اُچھل پڑا۔ "یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہوا ہے۔" وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اپنے ایک ماتحت کو بُلا کر ہدایت کی کہ پولیس ریکارڈ میں چی فانگ کا نام تلاش کرے پھر ایک اور کانسٹیبل کو بُلا کر کہا۔ "اسے باتھ روم لے جاؤ اور منہ ہاتھ دھلا کر ہوٹل سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔ پرتاب سنگھ نے بتایا تھا کہ انہوں نے ابھی رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔"

کانسٹیبل وجدان کو واش روم میں لے گیا۔ وجدان کے جسم اور کپڑوں پر تیل کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ منہ ہاتھ تو اس نے دھو لیا لیکن کپڑوں کی مجبوری تھی۔ کانسٹیبل اسے انسپکٹر کے کمرے میں چھوڑ کر کھانا وغیرہ لینے کے لئے چلا گیا۔

وجدان اب اپنے آپ پر مکمل طور پر قابو پا چکا تھا۔ پولیس کی موجودگی میں وہ اپنے آپ کو بالکل محفوظ سمجھ رہا تھا اور اس کے ذہن سے خوف نکل گیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر کا ماتحت ایک

بہت بڑا فوٹو البم لے کر آگیا۔

"ہمارے ریکارڈ میں چی فانگ نام کے دو آدمی ہیں۔ ان کی تصویریں بھی موجود ہیں۔" ماتحت نے کہتے ہوئے البم اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

چی فانگ نام کے وہ دونوں آدمی مختلف جرائم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ ان میں سے ایک پر قتل کا الزام بھی تھا اور ایک سال پرانی پولیس رپورٹ کے مطابق وہ ملائیشیا کی طرف فرار ہو گیا تھا۔

وجدان نے ان دونوں کی تصویریں دیکھیں اور نفی میں سر ہلا دیا۔ "ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔" اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پورا البم دیکھو۔ شاید ان میں کوئی ایسا چہرہ ہو جسے تم شناخت کر سکو۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

وجدان البم کا ایک ایک ورق پلٹ کر ان پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے لگا۔ یہ سب جرائم پیشہ لوگ تھے۔ ان میں مقامی بھی تھے اور غیر ملکی بھی۔ وہ سب کسی نہ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب تھے۔ بعض تو چہرے سے بہت شریف اور بھولے بھالے لگتے تھے۔ ایسی تصویریں دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا کہ یہ لوگ بھی کسی جرم میں ملوث ہوں گے۔ بعض چہروں پر بے پناہ سفاکی تھی اور انہیں دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔

"نہیں انکل۔ میں نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔"

وجدان نے البم بند کر دیا۔

انسپکٹر چیانگ شو نے البم اپنے ماتحت کے حوالے کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دوسرا کانسٹیبل وجدان کے لئے کھانا لے آیا۔ وجدان واقعی بھوکا تھا۔ جب وہ جعلی سی آئی ڈی آفیسران کے گھر آیا تھا تو اس وقت تک انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور اس کے بعد تو اس کا تمام وقت بھاگ دوڑ ہی میں گزرا تھا۔ اس کے تو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کھانے کا تو اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ انسپکٹر چیانگ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وجدان کا کیا کرے۔ پرتاب سنگھ اسپتال میں تھا۔ وہ وجدان کو اس کے گھر پر اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کسی ایسے ذمے دار شخص کا نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہا تھا جسے وجدان کا نگراں مقرر کیا جائے۔ بالآخر اس نے وجدان کو اپنے گھر لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"آؤ چلیں۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"کہاں۔۔۔؟" وجدان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر۔" چیانگ شو نے کہا۔ "تم رات بھر یہاں تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ چلو میں تمہیں اپنے گھر چھوڑ دوں۔"

"مجھے پرتاب چاچا کے پاس لے چلیں نا۔" وجدان نے کہا۔

"وہ اسپتال میں ہے۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے۔ میں تمہیں اسپتال نہیں لے جا سکتا اور نہ ہی تمہیں پرتاب سنگھ کے مکان پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ آج کی رات میرے گھر پر رہو۔ کل صبح تمہیں پرتاب سنگھ کے پاس لے چلوں گا۔" انسپکٹر نے کہا۔

وجدان بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ جانے پر تیار ہو گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انسپکٹر چیانگ شو نے پلٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔

"یس۔ انسپکٹر چیانگ شو اسپیکنگ۔"

"پرتاب سنگھ بول رہا ہوں بھائی۔" دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ "میں پوچھ رہا ہوں۔ وجدان کا کوئی پتا چلا۔"

"او.... یس۔ پرتاب سنگھ۔" انسپکٹر چیانگ شو بولا۔ "لڑکا مل گیا ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔"

"شکر ہے سوہنے رب کا۔" پرتاب سنگھ کی آواز سنائی دی۔ "میں نے دو آدمیوں کو اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم فکر مت کرو۔" چیانگ شو بولا۔ "وہ بڑے خوفناک حالات سے گزرا ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ تم اپنی تسلی کے لئے اس سے مختصر بات کر لو۔ میں اسے اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔ کل دن میں تمہاری ملاقات کراؤں گا۔" اس نے ریسیور وجدان کی طرف بڑھا دیا۔

وجدان کچھ دیر تک پرتاب سنگھ سے بات کرتا رہا پھر اس نے ریسیور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ انسپکٹر نے اس مرتبہ بہت مختصر سی بات کی پھر ریسیور رکھ دیا اور وجدان کو اشارہ کرتا ہوا باہر آگیا۔

دو مسلح کانسٹیبل بھی جیپ میں ان کے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ انسپکٹر چیانگ شو کی رہائش آرچرڈ روڈ کی دوسری طرف ایمرالڈ ہل روڈ پر واقع ایک سات منزلہ پلازا کی تیسری منزل پر تھی۔ سڑکوں پر اکا دکا گاڑیوں کی آمدورفت تھی۔ ڈرائیونگ انسپکٹر چیانگ شو ہی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر وجدان تھا اور دونوں کانسٹیبل پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

آرچرڈ روڈ کراس کر کے انسپکٹر جیپ کو کیم ہل روڈ پر لے آیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ہیولٹ روڈ پر موڑ دیا۔ اگلے موڑ پر اس نے جیپ کو جیسے ہی ایمرالڈ ہل روڈ پر موڑنا چاہا' دائیں طرف سے آنے والی ایک تیز رفتار کار بریک کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ جیپ سے چند گز آگے رک گئی۔

انسپکٹر چیانگ شو نے بڑی پھرتی سے بریک پیڈل دبا دیا تھا۔ جیپ ایک زوردار جھٹکے سے رک گئی۔ وجدان اچھل کر ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور پھر بھد سے اپنی سیٹ پر گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی اچانک جھٹکا لگنے سے لڑھک گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ انسپکٹر چیانگ شو کچھ سمجھ سکتا، آگے رکنے والی کار کے پچھلے دونوں دروازے کھلے اور دو آدمی بڑی پھرتی سے باہر نکل کر جیپ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں موجود رائفلوں کا رخ انہی کی طرف تھا۔

انسپکٹر چیانگ شو کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہی ان کا تعاقب شروع ہو گیا تھا اور جب جیپ آرچرڈ روڈ سے کیم ہل روڈ پر مڑی تھی تو تعاقب کرنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ وجدان کو اپنے گھر لے جا رہا ہے۔ انہوں نے کیم ہل روڈ پر تعاقب جاری رکھنے کے بجائے دوسرے راستے کو ترجیح دی تھی اور وہ آرچرڈ روڈ پر دائیں طرف مڑ گئے تھے اور کچھ آگے جا کر وہ ایمرالڈ ہل روڈ پر آ گئے تھے اور انسپکٹر کی جیپ جیسے ہی ہیولٹ روڈ سے ایمرالڈ ہل روڈ پر آئی تو انہوں نے کار آگے لا کر راستہ روک لیا اور اس طرح انسپکٹر چیانگ شو کو بھی جیپ روک لینا پڑی تھی۔

وہ بڑی گہری نظروں سے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں چینی تھے اور صورتوں ہی سے چھٹے ہوئے لگتے تھے۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آگے کھڑی ہوئی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک شخص بیٹھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سر نظر آ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے غالباً اطمینان تھا کہ اس کے دو ساتھی بحسن و خوبی اپنا کام سر انجام دے لیں گے۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا تاکہ وہاں سے فوری طور پر روانگی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

انسپکٹر چیانگ شو نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ کار والوں سے ایک ٹیکنیکل غلطی ہو گئی تھی۔ انہیں چاہیے تھا کہ کار موڑ کر اس طرح روکتے کہ جیپ کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں رہتی اور وہ جیپ میں بیٹھے ہوئے انسپکٹر وغیرہ کو دیکھ سکتے لیکن ان کی کار چند گز آگے اس طرح رکی تھی کہ اس کا رخ آگے کی طرف تھا۔ وہ دونوں چینی کار کے پچھلے حصے کے قریب کھڑے تھے۔ وہ خود تو مکمل طور پر جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں تھے اور انسپکٹر وغیرہ روشنی کے پیچھے قدرے تاریکی میں۔ انسپکٹر کو یہی ایڈوانٹیج حاصل تھا اور اس نے اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس کی کھوپڑی اڑا دی جائے گی۔" سامنے کھڑے ہوئے ایک چینی غنڈے نے چیخ کر کہا۔ "انسپکٹر چیانگ شو! اس لڑکے کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ اس کے ساتھ ہی ہم تمہیں اور تمہارے دونوں ساتھیوں کو بھی بھون ڈالیں گے۔"

"کیا تم [illegible] ہو کہ پولیس والوں کو اس طرح ڈرایا جا سکتا ہے۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے بھی چیخ کر کہا۔ "بہتر ہے تم لوگ ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔"

"اپنی بکواس بند کرو اور لڑکے کو نیچے اتار دو۔" چینی غنڈے نے چیخ کر کہا "میں تین تک گنوں گا۔ اس کے بعد تم پر فائر کھول دوں گا۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی چینی غنڈے نے گنتی شروع کر دی

"ایک..... دو....."

"رک جاؤ۔" انسپکٹر چیانگ شو چلایا "میں لڑکے کو نیچے اتار رہا ہوں۔"

"تم خاصے عقل مند ہو۔" چینی غنڈے نے کہا "جلدی کرو۔ اسے فوراً نیچے اتار دو۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے سرگوشیانہ انداز میں وجدان سے کہا "نیچے اترتے ہی سڑک کے کنارے پر واقع جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دینا" پھر وہ مسلح کانسٹیبلز کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "تم دونوں بھی تیار رہو۔ جیپ جیسے ہی حرکت میں آئے، تم دونوں پلک جھپکنے میں اطراف میں کود جانا۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے بائیں پاؤں سے کلچ پیڈل دبا رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر بڑی مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ اس نے غیر محسوس انداز میں ایک ہاتھ نیچے لٹکا لیا اور گیئر لیور پر ہاتھ رکھ کر بڑی سرعت سے انجن کو گیئر میں ڈال لیا۔ اس کے بعد وہ وجدان کی جانب دیکھے بغیر بلند آواز میں بولا۔

"اب تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے بوائے۔ جیپ سے نیچے اترو اور خود کو ان لوگوں کے حوالے کر دو۔"

وجدان کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ انسپکٹر چیانگ شو جب اسے ہوٹل اوبیرائے سے پولیس اسٹیشن لے کر آیا تھا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ اب اس کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہا اور جب وہ پولیس اسٹیشن سے جیپ پر روانہ ہوئے تھے، اس وقت بھی وہ مطمئن تھا۔ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ بھلا پولیس والوں کی موجودگی میں کون اس کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھ سکتا تھا لیکن یہاں پہنچ کر صورت حال یک دم بدل گئی تھی۔ بدمعاش ان کے سامنے رائفلیں تانے کھڑے تھے اور لگتا تھا جیسے انسپکٹر اور اس کے دونوں کانسٹیبل اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کر رہے ہوں۔ اس صورت حال نے وجدان کو خاصا بدحواس کر دیا تھا اور خوف ایک بار پھر اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا۔ اس نے انسپکٹر چیانگ شو کی سرگوشی سن لی تھی اور وہ سوچے بغیر نہیں رہا تھا کہ کیا انسپکٹر اسے موت کے حوالے کر دے گا؟ اس نے گردن گھما کر بے بس نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

"نیچے اتر جاؤ۔ میری شکل کیا دیکھ رہے ہو؟" انسپکٹر نے اس طرح چیخ کر کہا جیسے اس سے واقعی پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ انسپکٹر کا لہجہ محسوس کر کے وجدان کانپ اٹھا۔ اس نے

پیر جگہ سے ہٹا کر جیپ کے پائیدان پر رکھ دیے اور پھر پوری قوت سے چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے انسپکٹر چیانگ شو نے چیختے ہوئے ایک دم کلچ پر سے پیر ہٹا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا تھا۔

جیپ زوردار جھٹکے سے اس طرح اچھلی تھی کہ اس کے اگلے پہیے چند انچ اوپر اٹھ گئے تھے۔ سامنے کھڑے ہوئے چینی غنڈوں کے لئے یہ صورت حال بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ جیپ سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھے۔ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹنے کی کوشش کے ساتھ ہی انہوں نے فائر کھول دیے تھے۔ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ ان دونوں چینیوں نے اگرچہ پوری کوشش کی تھی لیکن اپنے آپ کو جیپ کی زد میں آنے سے نہیں بچا سکے تھے۔ ایک کا پیر پھسل گیا۔ وہ سڑک پر گرا۔ جیپ کا اگلا ایک پہیا اسے روندتا ہوا گزر گیا۔ دوسرے کی ایک ٹانگ جیپ سے ٹکرائی تھی۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا سڑک پر کنارے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی جیپ سے چھلانگیں لگا چکے تھے۔ ایک کو گھٹنے میں چوٹ آئی تھی اور وہ سڑک پر پڑا بلبلا رہا تھا۔ البتہ دوسرے نے نیچے گرتے ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ اس کی رائفل گر گئی تھی اور وہ رائفل تلاش کر رہا تھا۔

وجدان نے اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے چھلانگ لگائی تھی۔ وہ تقریباً پانچ فٹ دور پیروں کے بل گرا اور وہاں سے قلابازی کھاتا ہوا سڑک کے کنارے جھاڑیوں میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک اور قلابازی کھائی اور جھاڑیوں میں چند فٹ اور آگے نکل گیا۔ اسی لمحے فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ وجدان نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ خوف کی شدت سے سرتاپا بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گولیاں اس پر چلائی گئی تھیں مگر اسے کوئی گولی نہیں لگی۔ وہ آنکھیں بند کئے جھاڑیوں میں پڑا کانپتا رہا۔

انسپکٹر چیانگ شو اسٹیئرنگ کے نیچے جھک گیا تھا۔ سامنے سے چلائی جانے والی لاتعداد گولیاں ونڈ اسکرین کو چکنا چور کرتی ہوئی نکل گئی تھیں۔ جیپ ان دونوں چینیوں سے ٹکرانے کے بعد بڑی تیزی سے سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں گھس گئی تھی۔ زمین ناہموار تھی۔ جیپ بری طرح اچھل رہی تھی۔ وہ ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا اور جیپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

ابھی وہ پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا کہ سڑک کی طرف سے زبردست فائرنگ کی جانے لگی۔ وہ ہڈ کے بغیر کھلی جیپ تھی۔ کئی گولیاں انسپکٹر چیانگ شو کے آس پاس سے گزر گئیں۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گولیاں اس کار سے برسائی جا رہی تھیں جس نے ان کا راستہ روکا تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو نے جیپ سے چھلانگ لگا دی اور جھاڑیوں میں گرتے ہی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ اسے اندیشہ تھا کہ وجدان اٹھ کر جیپ کی طرف آنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس نے ایسی حماقت کی تو چھلنی ہو جائے گا۔

"وجدان۔" وہ اس کی طرف رخ کر کے چیخا۔ "جھاڑیوں میں چھپے رہو۔ باہر مت نکلنا۔"

اس کے خاموش ہونے سے پہلے ہی دو گولیاں زناٹے کی آواز سے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ انسپکٹر ایک دم سینے کے بل لیٹ گیا اور سانپ کی سی تیزی سے جھاڑیوں میں ایک طرف رینگنے لگا۔

فائرنگ ایک بار پھر ہوئی۔ اس مرتبہ آواز دوسری طرف سے آئی تھی اور گولیوں کا رخ بھی جھاڑیوں کی طرف نہیں تھا۔ انسپکٹر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا ایک کانسٹیبل سڑک کی دوسری طرف جھاڑیوں میں مورچا بنائے کار پر فائرنگ کر رہا تھا اور کار والے نے بھی اپنی فائرنگ کا رخ اسی طرف موڑ دیا تھا۔

انسپکٹر چیانگ شو رینگتا ہوا آگے بڑھ گیا اور ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک فائر کر دیا۔ کار کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں لیکن انجن کی غراہٹ کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک انسانی ہیولا کار کے اگلے دروازے کے قریب نظر آیا۔ انسپکٹر نے فائر کر دیا۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ وہ ہیولا نیچے گرا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ لگتا تھا جیسے وہ آٹومیٹک رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ کر اسے اٹھانا بھول گیا ہو۔ انسپکٹر چیانگ شو پھر سینے کے بل لیٹ گیا تھا اور گولیاں اس کے اوپر سے گزر رہی تھیں اور جب فائرنگ رکی تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ہیولا کار کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ رہا تھا اور پھر اسی لمحہ ایک اور ہیولا سڑک سے اٹھ کر لنگڑاتا ہوا کار کی طرف دوڑا۔ کار حرکت میں آ چکی تھی۔

"کم..... رک جاؤ..... کار کو روکو کم....." لنگڑاتا ہوا ہیولا چیخا۔

کار رکی نہیں۔ البتہ اندر بیٹھے ہوئے ہیولے نے کسی قدر باہر کی طرف جھک کر فائرنگ شروع کر دی۔ کار کی طرف دوڑتے ہوئے آدمی کے منہ سے خوف ناک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا سڑک پر

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں
بزرگانِ دین کے ایمان افروز واقعات
روشنی کے مینار
قیمت -/150 روپے
ڈاک خرچ -/25 روپے
مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر 1

ڈھیر ہو گیا۔ کار، بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح تیزی سے آگے چلی گئی۔

انسپکٹر چیانگ شو چند لمحے جھاڑیوں میں دبکا رہا پھر اٹھ کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ دو انسانی ہیولے سڑک پر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ انسپکٹر ریوالور تانے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ ان دونوں ہیولوں میں سے کسی میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ انسپکٹر چیانگ شو کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ اپنے کانسٹیبلوں کے نام لے کر پکارنے لگا۔ ایک کانسٹیبل تو رائفل سنبھالے جھاڑیوں میں سے نکل کر دوڑتا ہوا سامنے آگیا مگر دوسرے کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔

"شین کہاں ہے؟" انسپکٹر نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

"جیپ سے کودتے ہوئے اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بے ہوش ہے۔ میں نے اسے جھاڑیوں میں گھسیٹ لیا تھا۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"تم یہیں رکو۔ میں جیپ لے کر آتا ہوں۔" انسپکٹر نے کہا اور وجدان کو آوازیں دیتا ہوا جیپ کی طرف چل پڑا۔

وہ جیپ اسٹارٹ کرکے سڑک پر لے آیا لیکن وجدان جھاڑیوں سے نہیں نکلا۔ انسپکٹر نے اسے دو تین مرتبہ پکارا پھر جیپ سے اتر کر جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔

وجدان کو ایک جگہ جھاڑیوں میں بے حس و حرکت دیکھ کر انسپکٹر چیانگ شو کو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس نے جھک کر پہلے وجدان کے جسم کو ٹٹولا پھر اسے اٹھا کر سڑک پر لے آیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں اس نے ایک بار پھر وجدان کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ وہ بے پناہ خوف اور دہشت سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

"تم انہیں دیکھو۔ میں وائرلیس پر پولیس اسٹیشن اطلاع دیتا ہوں۔" انسپکٹر یہ کہتے ہوئے جیپ کے پاس آگیا اور ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے ریڈیو کا مائیک اٹھا کر کال نشر کرنے لگا۔

دس منٹ کے اندر اندر وہاں پولیس کی کئی گاڑیاں پہنچ گئی تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس دوران میں کوئی پرائیوٹ گاڑی اس سڑک پر نہیں آئی تھی اور شاید اگر کوئی آئی بھی ہو گی تو فائرنگ کی آواز سن کر دور ہی سے کسی اور طرف مڑ گئی ہو گی۔

پولیس کی گاڑیوں کے ساتھ دو ایمبولنس گاڑیاں بھی پہنچ گئی تھیں۔ ایک ایمبولنس میں بے ہوش وجدان اور کانسٹیبل کو ڈال دیا گیا اور دوسری ایمبولنس میں ان دونوں چینیوں کو۔ ایک چینی کی لاش گولیوں سے چھلنی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو لنگڑاتا ہوا کار کے پیچھے دوڑا تھا اور کار والے نے فائرنگ کرکے اسے زخمی کر دیا تھا اور دوسرا وہ تھا جو جیپ سے ٹکرا کر گرا تھا اور جیپ کا اگلا پہیا اس کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا۔

ظاہر ہے، گھر جانے کا اب انسپکٹر چیانگ شو کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ بھی ایمبولنس گاڑیوں کے ساتھ ہی اسپتال پہنچ گیا۔

وجدان کو تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش آسکا تھا۔ خوف سے اس کے چہرے کی رنگت بالکل سفید ہو رہی تھی۔ ایک ہی رات میں پے درپے تین ایسے خوف ناک واقعات پیش آئے تھے جنہوں نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ واقعی باہمت لڑکا تھا۔ بڑا دل گردے والا تھا جو سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ اگر کوئی جوان آدمی ہوتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہوتا۔

وجدان کی طرف سے مطمئن ہو کر انسپکٹر چیانگ شو اس کمرے میں آگیا جہاں بے ہوش چینی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن ڈاکٹر اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور وہ ہوش میں آئے بغیر ہی دم توڑ گیا۔

وجدان کے ہوش میں آنے کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگا دیا اور وہ سو گیا تھا۔

اس وقت اسپتال میں درجنوں پولیس والے موجود تھے۔ سکیورٹی کے ان انتظامات سے مطمئن ہو کر انسپکٹر چیانگ شو پولیس اسٹیشن آکر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

○☆○

وجدان کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سر کو ہولے ہولے جھٹکنے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی کراہیں سی خارج ہو رہی تھیں۔

اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں۔ نظروں کے سامنے اس وقت بھی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی پھر یکایک دھند میں لپٹا ہوا ایک چہرہ اس پر جھک گیا۔ اس چہرے کے نقش واضح نہیں تھے۔ وجدان سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس پر جھکا ہوا دھندلا چہرہ کس کا ہے۔ وہ ایک بار پھر سر کو جھٹکے دینے لگا۔

اور پھر اسے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ وہ چی فانگ اور اس کے ساتھی سے بچ کر ہوٹل اوبیرائے کی طرف آگیا تھا جہاں دارا سے سامنا ہو گیا۔ دارا سے بچ کر نکلا تو انسپکٹر چیانگ شو کے ساتھ اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے مسلح چینی غنڈوں نے ان کی جیپ روک لی تھی۔ اس نے جیپ سے چھلانگ لگا دی تھی اور جھاڑیوں میں چھپ گیا تھا اور پھر فضا زبردست فائرنگ سے گونج اٹھی تھی۔ اس وقت اسے اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اسے اپنے چاروں طرف ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو آرام دہ بستر پر پا رہا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ اس دوران میں ایک مرتبہ اس کے حواس بحال ہوئے تھے۔ اس وقت انسپکٹر چیانگ شو اس کے پاس موجود تھا اور پھر اسے اپنے بازو میں سوئی کی چبھن محسوس ہوئی تھی اور اس کے بعد اس کا ذہن ایک بار پھر

تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا تھا اور اب اس کے چاروں طرف دھند کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ دھند میں لپٹا ہوا وہ چہرہ اب اس پر جھکا ہوا تھا۔

"کاکے۔" ایک مانوس اور پیار بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "اب کیسے ہو کاکے....؟"

"چا.... چا...." وجدان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ سر کو ایک بار پھر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند چھٹنے لگی اور اس نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ وہ پرتاب سنگھ تھا جو اس کے بیڈ کی پٹی پر بیٹھا ہوا تھا۔ "چاچا.... تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟" وہ اٹھ کر پرتاب سنگھ سے لپٹ گیا۔

"میں تجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا پتر۔" پرتاب سنگھ نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اس کی آواز گلوگرفتہ تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ "شکر ہے، تو مجھے مل گیا ورنہ میں رب کو کیا منہ دکھاتا۔" وہ وجدان کی پیشانی پر بوسے دینے لگا۔

"چاچا، تم رو رہے ہو؟" وجدان نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پتر۔" پرتاب سنگھ آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "ایسے ہی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔ اب تو کوئی خوشی بھی برداشت نہیں ہوتی نا۔ اچھا اب تو آرام سے لیٹ جا۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔ تجھے تیز بخار ہو رہا ہے۔"

پرتاب سنگھ نے بیڈ کے پیچھے دیوار پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا اور اس وقت وجدان نے دیکھا تھا کہ پرتاب سنگھ پلنگ سے اٹھ کر لاٹھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا دیوار تک گیا تھا۔

"تمہاری ٹانگ کو کیا ہوا چاچا؟" وجدان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں پتر۔" پرتاب سنگھ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کل رات کو گولی لگ گئی تھی۔ معمولی سا زخم ہے۔ دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بھاگ گئے۔ ورنہ سوہنے رب دی، ایک آدھ کی گردن مروڑ دیتا۔ مجھے خوشی تو اس بات کی ہے کہ تو مجھے زندہ سلامت واپس مل گیا ہے۔ دو تین دن کی بات ہے۔ ٹھیک ہو جاؤں تو ان سے بھی نبڑ (نمٹ) لوں گا۔"

"چاچا، تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟" وجدان بولا۔

"میں بھی تو اسی اسپتال میں ہوں۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "صبح ایک نرس نے بتایا تھا کہ انسپکٹر چیانگ شو کچھ لاشوں اور زخمیوں کو لے کر آیا ہے اور ان میں ایک لڑکا بھی شامل ہے۔ اوئے لڑکے کا سن کر میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ نرس کے منع کرنے کے باوجود میں اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آگیا۔ تجھے زندہ اور صحیح سلامت دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ معمولی بخار ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جاؤ گے پھر ہم نبڑ لیں گے ان سے۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ نرس بھی تھی۔

"ہیلو بوائے۔" ڈاکٹر وجدان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

وجدان کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

نرس نے وجدان کا ٹمپریچر لے لیا تو ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ نرس کو ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔

"تشویش کی کوئی بات نہیں۔" وہ پرتاب سنگھ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تھکن اور خوف سے بخار چڑھ گیا ہے۔ ایک دو دن میں اتر جائے گا۔" اس نے نرس کو کچھ مزید ہدایات دیں اور چلا گیا۔

نرس کچھ دیر کمرے میں رہی پھر وہ بھی چلی گئی۔ پرتاب سنگھ پھر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا تھا۔

"چاچا۔ مجھے اس آدمی کا نام یاد آگیا ہے جس نے ممی کو خنجر مارے تھے۔" وجدان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے چیانگ انکل کو بتا دیا تھا۔ اس کا نام چی فانگ ہے۔ کل رات کو جب میں کار سے اتر کر بھاگا تھا تو وہی میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔"

"چی فانگ...." نام کچھ سنا ہوا ہے۔" پرتاب سنگھ بڑبڑایا۔ "اگر یہ بندہ ہاتھ آجائے تو اس سے دارا کا پتا لگ سکتا ہے۔"

"کل رات دارا نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔" وجدان نے کہا اور پھر اسے تمام واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ رب نے تمہیں کس آزمائش میں ڈال دیا ہے۔" پرتاب سنگھ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ انسپکٹر چیانگ شو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے وجدان کو وش کیا اور پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ بوائے بہت بہادر ہے۔ اس نے بہت ہمت سے حالات کا مقابلہ کیا۔ کل رات موت اس کے پیچھے لگا رہا اور اس نے بڑی بہادری سے موت کو شکست دیا۔"

"ہاں۔ یہ واقعی بہت بہادر ہے۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "اس نے اس آدمی کو بھی پہچان لیا ہے جس نے اس کی ممی کو...."

"اس نے ہم کو بتایا۔" چیانگ شو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ہمارا پولیس ریکارڈ میں دو چی فانگ ہے۔ ہم نے اس کو ان کا تصویریں دکھایا۔ وہ چی فانگ ان میں نہیں ہے۔ یہ کوئی تیسرا چی فانگ ہے۔"

"رات کو جو دو آدمی مرے ہیں ان کی شناخت نہیں ہو سکی؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

"ان میں ایک کا شناخت ہو گیا ہے۔ ہم اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رات کو ایک اور نام کا بھی پتا چلا ہے۔ اس کے بارے میں بھی معلوم کر رہے ہیں۔"

"کیا نام ہے وہ؟" پرتاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کم۔" چیانگ شو نے جواب دیا۔

"کم۔" پرتاب سنگھ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ "ایک کم کو تو میں بھی جانتا ہوں۔ اس کا ایک چھوٹا سا نائٹ کلب ہے۔ نائٹ کلب کیا ہے' جوئے شراب اور طوائفوں کا اڈا ہے۔"

"اس کم کے بارے میں' میں بھی جانتا ہوں۔" چیانگ شو بولا۔ "میں نے معلوم کیا' وہ پچھلے کئی روز سے غائب ہے۔ میرے آدمی اس کے کلب کا نگرانی کررہا ہے۔"

"اب میں یہ بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ چی فانگ بھی اسی کلب میں ملے گا۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"ہم اس کو جلدی تلاش کرلے گا۔ ویسے تمہارے لئے ایک خوش خبری ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"وہ کیا؟" پرتاب سنگھ بولا۔

"تمہارا آدمی سوتر سنگھ اب اچھا ہورہا ہے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے بتایا۔ "ہم ادھر گیا تھا۔ سوتر سنگھ کو بھی دیکھا۔ ڈاکٹر سے بھی ملا۔ ڈاکٹر نے ہم کو بتایا کہ اس کی یادداشت بحال ہورہی ہے۔ تھوڑا تھوڑا بولنے بھی لگا ہے۔ ایک دو روز میں وہ ٹھیک ہوجائے گا۔"

"شکر ہے رب کا۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "میں آج ہی اسے دیکھنے جاؤں گا۔"

"تم ایک دو دن ادھر نہیں جانے کا۔" چیانگ شو نے کہا۔ "تمہارا ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہے اور ڈاکٹر لوگ نے بھی منع کیا ہے ایک دو دن تک کوئی آدمی سوتر سنگھ سے نہیں ملے گا۔"

"ٹھیک ہے بھئی۔" پرتاب سنگھ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔ "ایک دو دن اور انتظار کرلیں گے۔"

"اب میں چلتا ہوں۔" انسپکٹر چیانگ شو اٹھتے ہوئے بولا۔ "وجدان کو اب ادھر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اپنا بھی خیال رکھو۔"

انسپکٹر چیانگ شو کے جانے کے بعد پرتاب سنگھ وجدان سے باتیں کرنے لگا۔ سوتر سنگھ دوسرے اسپتال میں تھا۔ پرتاب سنگھ تو فوراً ہی اس سے ملنا چاہتا تھا لیکن انسپکٹر نے اسے منع کردیا تھا۔

تین چار روز گزر گئے۔ پرتاب سنگھ کے شب و روز وجدان ہی کے کمرے میں گزر رہے تھے۔ وجدان کا بخار اتر گیا تھا۔ کمزوری باقی تھی۔ اسے فی الحال اسپتال ہی میں رکھنے کا فیصلہ کیا گیا تھا کیونکہ یہی جگہ اس کے لئے محفوظ بھی تھی۔ پرتاب سنگھ کی ٹانگ کا زخم بھی بہتر ہورہا تھا اور وہ سہارے کے بغیر آہستہ آہستہ چلنے پھرنے بھی لگا تھا۔

اخبارات میں ان کے بارے میں مسلسل خبریں چھپ رہی تھیں۔ دو دن پہلے سوتر سنگھ کے بارے میں بھی خبر چھپی تھی کہ اس کی قوتِ گویائی اور یادداشت لوٹ رہی ہے اور وہ ایک دو روز میں پولیس کو بیان دینے کے قابل ہوجائے گا۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وجدان اونگھ رہا تھا۔

"لے بھئی کاکے۔" پرتاب سنگھ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو تھوڑا آرام کرلو اور میں سوتر سنگھ کو دیکھ آؤں۔"

اسپتال کی عمارت سے باہر آکر پرتاب سنگھ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا اور پھر ٹیکسی پر دوسرے اسپتال پہنچنے میں اسے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ راہداری میں تین چار پولیس والے کھڑے تھے۔ ان میں سے دو پرتاب سنگھ کو پہچانتے تھے اس لئے کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سوتر سنگھ والے کمرے سے چند قدم دور ہی تھا کہ ایک نرس اس کمرے سے نکلی۔ اس کے ہاتھ میں کڈنی شیپ ٹرے تھی جس میں ایک سرنج' ایک چھوٹی بوتل' ایک انجکشن کا خالی ایمپیول رکھا ہوا تھا۔ وہ نرس پرتاب سنگھ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

"ہیلو۔" پرتاب سنگھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیسا ہے میرا یار؟"

"اچھا ہے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "اس وقت سو رہا ہے۔ اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔"

"بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گا جی۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔

دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ پرتاب سنگھ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

سوتر سنگھ دوسری طرف کروٹ لئے سو رہا تھا۔ پرتاب سنگھ بیڈ کے قریب کھڑا ہوگیا۔ نرس نے اگرچہ اسے منع کیا تھا کہ مریض کو ڈسٹرب نہ کیا جائے مگر پرتاب سنگھ اس سے بات کئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔

"سوتر سنگھ۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "سوتر سنگھ۔ اٹھو یار۔ دیکھو میں آیا ہوں۔ پرتاب سنگھ۔"

اس نے تین چار مرتبہ پکارا لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ پرتاب سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔ اس کے ہاتھ کے دباؤ سے سوتر سنگھ سیدھا ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی پرتاب سنگھ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

سوتر سنگھ کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

اسپتال میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ سوتر سنگھ کو پوائزن انجیکٹ کیا گیا تھا جس سے فوری طور پر اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

اس نرس کی تلاش شروع ہوگئی جسے پرتاب سنگھ نے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ پرتاب سنگھ اور کمرے کے دروازے پر متعین پولیس کانسٹیبل نے نرس کا جو حلیہ بتایا تھا' پورے اسپتال میں اس حلیے کی کوئی نرس نہیں تھی۔ لمبا قد' چہرے کے نقوش میں ہندوستانی رنگ نمایاں تھا۔ ہرنی جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اور نچلے ہونٹ کے دائیں کونے پر سیاہ رنگ کا مسور کے دانے کے برابر تل۔

پرتاب سنگھ نے جب اسے دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا کہ یہ دوغلی نسل کی ہے۔ ہوسکتا ہے ماں چینی اور باپ ہندوستانی ہو۔

یہ علاقہ اگرچہ انسپکٹر چیانگ شو کا نہیں تھا لیکن چونکہ سوتر سنگھ اس کے ایک کیس کا اہم کردار تھا اس لئے اطلاع پاکر وہ بھی آگیا تھا جبکہ انکوائری مقامی پولیس آفیسر ہی کررہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود اسپتال کی تمام نرسوں کو جمع کرلیا گیا۔ پرتاب سنگھ اور پولیس کانسٹیبل ایک ایک نرس کو غور سے دیکھتے رہے لیکن وہ نرس ان میں نہیں تھی جسے پرتاب سنگھ نے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ پہلے یہ سوچا گیا تھا کہ شاید ڈیوٹی نرس نے سوتر سنگھ کو غلط انجکشن لگا دیا تھا لیکن اس نئی صورت حال سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا۔ سوتر سنگھ ایک کیس کا اہم گواہ تھا۔ جب تک اس کی یادداشت اور قوت گویائی سلب رہی' وہ محفوظ رہا تھا لیکن اخبارات میں یہ خبر چھپنے کے بعد کہ اس کی قوت گویائی اور یادداشت واپس لوٹ رہی ہے اسے ختم کردیا گیا تھا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ پولیس کی موجودگی میں سوتر سنگھ پر حملہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اسے راستے سے ہٹانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس کے لئے کسی ایسی لڑکی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو تربیت یافتہ نرس تھی کیونکہ انجکشن نس میں لگایا گیا تھا اور نس میں انجکشن لگانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی اور یہ کام بڑے اطمینان سے کیا گیا تھا۔ اس کے لئے باقاعدہ پلاننگ کی گئی تھی۔ یہ سب کچھ پہلے ہی سے دیکھ لیا گیا تھا کہ ڈاکٹر کس وقت وزٹ پر آتا ہے اور نرس کس وقت مریض کو دیکھنے آتی ہے۔

پولیس کوشش کے باوجود اس نرس کا سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ وہ لڑکی جو کوئی بھی تھی اسے اپنا کام کرکے اسپتال سے نکلنے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا۔

اس روز پرتاب سنگھ کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے ساتھی کی لاش اٹھائی تھی اور وہ اس کا ذمے دار وہ صرف اور صرف دارا کو سمجھتا تھا۔ کاش! وہ دارا کا سراغ پاسکتا لیکن دارا بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ وہ خود پس پردہ رہ کر یہ سب کچھ کررہا تھا۔ اس کے پاس غالباً پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس نے مقامی غنڈوں کی خدمات حاصل کررکھی تھیں اور وہ روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ اب تک کئی قتل ہوچکے تھے۔ دو بندے پرتاب سنگھ کے مارے جاچکے تھے اور پرتاب سنگھ جانتا تھا کہ یہ کھیل اس وقت تک ختم نہیں ہوگا جب تک دارا وجدان کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیتا۔ وجدان ہی وہ واحد ہستی تھی جو دارا کو پہچانتا تھا۔ اسے ختم کرنے کے بعد دارا اطمینان سے اپنے دوسرے کام کرتا رہے گا لیکن پرتاب سنگھ نے بھی یہ طے کرلیا تھا کہ وہ دارا کے آدمیوں کو کبھی بھی وجدان تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اسے حیرت تو اس بات پر تھی کہ پولیس اب تک دارا کا سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ پولیس ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ پرتاب سنگھ جانتا تھا کہ پولیس ملزموں کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن بدقسمتی سے اس الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

دوسرے اسپتال میں سوتر سنگھ کے قتل کے بعد اس اسپتال میں سکیورٹی بڑھا دی گئی تھی جہاں وجدان زیر علاج تھا۔ وجدان اگرچہ اب ٹھیک ہوچکا تھا مگر ایک منصوبے کے تحت اسے اسپتال میں رکھا گیا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ وہ فی الحال یہاں زیادہ محفوظ ہے۔ پولیس کو سختی سے ہدایت کردی گئی تھی کہ کسی غیر متعلق شخص کو اس راہداری میں بھی داخل نہ ہونے دیں جہاں وجدان والا کمرا تھا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کے بارے میں بھی نئی حکمتِ عملی اختیار کی گئی تھی۔ وجدان کو دیکھنے کے لئے اب صرف ان دو ڈاکٹروں اور دو نرسوں کو آنے کی اجازت تھی جنہوں نے شروع میں وجدان کو اٹینڈ کیا تھا۔ کسی دوسرے ڈاکٹر یا نرس کو اس کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

پرتاب سنگھ بھی اسی کے کمرے میں تھا۔ وہ اپنی ٹانگ کا زخم چیک کرانے کے لئے دن میں ایک بار اپنے متعلقہ ڈاکٹر کے پاس چلا جاتا اور پھر وجدان کے کمرے میں آجاتا۔

وجدان کو پرتاب سنگھ کی وجہ سے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ ماں باپ کے قتل کے بعد اگر پرتاب سنگھ جیسا ہمدرد اور غم گسار شخص نہ ملتا تو نہ جانے اس کا انجام کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ "وِل پاور" بھی تھی جو اسے سہارا دیئے ہوئے تھی اور دراصل یہ اس کی قوتِ ارادی ہی تھی جس سے وہ ایسے سنگین حالات کا مقابلہ کررہا تھا۔ پے در پے قاتلانہ حملوں کے بعد اس کا صحیح الدّماغ رہنا بھی ایک معجزہ ہی تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ اس عمر میں مضبوط اعصاب کا مالک ہونے کے باوجود خوف کے سائے بھی اسے گھیرے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی تو اس پر اس قدر بے زاری طاری ہوتی کہ اپنے ہی بال نوچ لینے کو دل چاہنے لگتا تھا۔

اس اسپتال میں اسے دس دن ہوچکے تھے۔ اب وہ بالکل ٹھیک تھا۔ بہترین خوراک اور دیکھ بھال سے اس کی کمزوری بھی بڑی حد تک دور ہوچکی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ باہر نکلے' گھومے پھرے' اپنی عمر کے لڑکوں کے ساتھ کھیلے لیکن وہ تو ایک ہی کمرے میں محصور ہوکر رہ گیا تھا۔ زیادہ وقت پرتاب سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ پرتاب سنگھ نہ ہوتا تو نرس آجاتی جو دیر تک اس کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔

اس روز وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ پرتاب سنگھ تقریباً ایک گھنٹا پہلے کہیں گیا تھا۔ اس کے بعد نرس آئی تھی اور تھوڑی دیر کمرے میں رکنے کے بعد چلی گئی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے کام سے

فارغ ہوتے ہی واپس آجائے گی۔

وجدان بیڈ سے اتر کر کھڑکی کے سامنے آگیا۔ دھوپ کی وجہ سے کھڑکی پر نیلے رنگ کا پردہ کھنچا ہوا تھا۔ اس نے پردہ ایک طرف ہٹا دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ یہ کمرا عمارت کی چوتھی منزل پر مین گیٹ کے رخ پر تھا۔ یہاں سے نہ صرف اسپتال میں آنے جانے والے لوگ بلکہ سامنے والی سڑک کا منظر بھی نظر آتا تھا۔ سڑک کی دوسری طرف بلند عمارتیں تھیں۔

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وجدان کو کھڑکی میں کھڑے ہوئے تقریباً پندرہ منٹ ہو چکے تھے۔ اس کی نظریں اسپتال کے گیٹ کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک ٹیکسی پر جمی ہوئی تھیں جو چند سیکنڈ پہلے ہی وہاں آکر رکی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ٹیکسی کا دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت آدمی نیچے اترا۔ اس نے سفید پینٹ اور نیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ آدھی آستین کی تھی اور اس کے ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو گردن میں پڑی ہوئی سلنگ میں لٹکا ہوا تھا۔

ٹیکسی آگے نکل گئی۔ وہ شخص جیسے ہی اس طرف مڑا' وجدان اس کا چہرہ دیکھ کر اچھل پڑا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود اس نے اس شخص کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو جعلی سی آئی ڈی آفیسر بن کر پرتاب سنگھ کے گھر میں آیا تھا اور ان دونوں کو پستول کی زد پر وہاں سے لے گیا تھا اور وجدان نے اس کے بازو پر دانتوں سے کاٹ لیا تھا اور یقیناً بازو کے اسی زخم پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ شخص سڑک پار کر کے اسپتال کے گیٹ کی طرف آرہا تھا۔ وہ شخص جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوا' وجدان کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا اور دروازے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ وجدان اس سے ٹکرا گیا۔ وہ دونوں دھڑام سے نیچے گرے۔ نرس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وجدان اٹھ کر پھر دروازے کی طرف دوڑا۔

"اے کیا ہوا۔ کہاں بھاگ رہے ہو؟ رک جاؤ۔" نرس مینڈرن زبان (ایسی چینی زبان جو تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقے میں بولی جاتی ہو۔ اسے مینڈرن "MANDARIN" کہتے ہیں جیسے لکھنؤ یا دلی میں بولی جانے والی نستعلیق اردو زبان) میں چیخی اور اس کے پیچھے لپکی۔

جب وہ دروازے سے باہر نکلی تو راہداری میں کھڑا ہوا کانسٹیبل حیرت سے وجدان کی طرف دیکھ رہا تھا جو راہداری میں ایک طرف دوڑا جا رہا تھا پھر اس نے نرس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ معاملہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" نرس اس مرتبہ بھی مینڈرن زبان میں چیخی۔ "اسے روکو.... وہ کہاں جا رہا ہے۔"

کانسٹیبل جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے چیخ کر راہداری کے اگلے موڑ پر کھڑے ہوئے دو کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ وہ اس لڑکے کو پکڑ لیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود بھی اس طرف دوڑ پڑا۔

راہداری کے موڑ پر کھڑے ہوئے دونوں کانسٹیبلوں نے وجدان کو پکڑ لیا۔

"چھوڑو مجھے۔" وجدان اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا۔ "اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اسے پکڑنے جا رہا ہوں۔"

چند قدم دور کھڑا ہوا سادہ لباس میں چھوٹے رینک کا پولیس آفیسر تیزی سے ان کے قریب آگیا۔ اس کے پوچھنے پر وجدان نے اسے بتا دیا کہ جس شخص نے اسے پرتاب سنگھ کے ساتھ اغوا کیا تھا وہ ابھی ابھی اسپتال میں داخل ہوا ہے۔

سادہ لباس پولیس آفیسر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ روز پہلی اس لڑکے پر ایک ہی رات میں تین مرتبہ قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ دشمنوں سے بچانے کے لئے اس کے لئے حفاظتی انتظامات اس طرح کئے گئے تھے کہ اس وقت بھی اسپتال میں کم از کم ایک درجن پولیس والے موجود تھے۔ کچھ یونیفارم میں اور کچھ سادہ لباس میں۔ اس لڑکے نے اس شخص کو دیکھ لیا تھا جس نے روز پہلے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ اس سے چھپنے کے بجائے اسے پکڑنے کے لئے دوڑا جا رہا تھا۔

"تم اس شخص کا حلیہ بتا کر اپنے کمرے میں جاؤ۔ ہم اسے پکڑ لیں گے۔" سادہ لباس آفیسر نے کہا۔

"تم لوگ اسے نہیں پہچان سکو گے۔ وہ بھاگ جائے گا۔ میں ساتھ چلتا ہوں۔" وجدان نے کہا۔

سادہ لباس آفیسر کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی اور پھر اس نے اپنے طور پر قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے آس پاس موجود دو تین سادہ لباس پولیس والوں کو اشارہ کیا اور وہ وجدان کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے لفٹ کی طرف چل پڑے۔

انہیں نیچے پہنچنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وجدان لفٹ سے نکلتے ہی اسپتال کی فرنٹ لابی کی طرف بھاگا۔ سادہ لباس پولیس والے اس کے پیچھے ہی تھے۔ وجدان ایک جگہ رک کر متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"وہ جگہ کہاں ہے جہاں زخموں پر ڈریسنگ کی جاتی ہے؟" اس نے سادہ لباس آفیسر سے پوچھا۔ "اس کا بازو زخمی ہے اور وہ یہاں پٹی لگوانے آیا ہے۔ وہ اسی طرف گیا ہوگا۔"

"اس طرف آؤ۔" سادہ لباس آفیسر نے کہا اور وہ ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔

اس طرف بھی ایک بہت کشادہ لابی تھی۔ جہاں مناسب فاصلوں پر لوگوں کے بیٹھنے کے لئے صوفہ نما سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے گملے بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بہت لمبا چوڑا کاؤنٹر بنا ہوا تھا جہاں لوگوں کی رہنمائی کے لئے پانچ اٹینڈنٹس موجود تھیں۔ کاؤنٹر پر ٹیلی فون سیٹ بھی رکھے

تھے اور پچھلی دیوار پر مختلف چارٹس لگے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر کے سامنے بھی کچھ لوگ کھڑے تھے اور ان میں وہ آدمی بھی تھا جس کا بازو زخمی سلنگ میں ٹنگا ہوا تھا۔ وہ ایک اٹینڈنٹ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

"وہ رہا۔" وجدان اس کی طرف اشارہ کر کے چیخا۔

سادہ لباس والوں نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وجدان کے ساتھ آنے والے آفیسر نے پستول نکال لیا اور تیزی سے اس آدمی کی طرف لپکا لیکن وجدان نے کچھ زیادہ ہی پھرتی دکھائی تھی۔ وہ آفیسر سے پہلے ہی دوڑتا ہوا کاؤنٹر کے قریب پہنچ گیا اور اس شخص کے زخمی بازو کو گرفت میں لے کر چیخنے لگا۔

"پکڑو.... پکڑو.... پکڑلو اسے.... یہ قاتل ہے۔"

وجدان کی یہ حرکت واقعی بچکانہ تھی یا پھر اس کے اندر اچانک ہی ایسا جذبہ ابھر آیا تھا جس سے اس کے دل و دماغ سے ہر قسم کا خوف مٹ گیا تھا۔

وہ شخص بری طرح بدحواس ہو گیا اور جب اس نے وجدان کو دیکھا تو اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وجدان اس کے زخمی بازو کو جھٹکے دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے لیکن زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وجدان کے شور مچانے پر لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس نے ان دو سادہ لباس پولیس والوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو پستول تانے تیزی سے اس کی طرف آرہے تھے۔

اس شخص نے بڑی پھرتی سے تندرست ہاتھ اپنی جیب میں ڈال کر پستول نکال لیا اور ہوائی فائر کر دیا۔

گولی کی آواز گونجتے ہی لابی میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ اٹینڈنٹ لڑکیاں چیختی ہوئی کاؤنٹر کے پیچھے چھپ گئیں۔ لابی میں موجود لوگ بھی چیختے ہوئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ دائیں طرف سے ایک وارڈ بوائے ایک اسٹریچر ٹرالی کو دھکیلتا ہوا لا رہا تھا۔ اسٹریچر پر پڑا ہوا مریض بے ہوش تھا۔ وارڈ بوائے ٹرالی چھوڑ کر چیختا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وجدان اب بھی اس شخص کے زخمی بازو کو جھٹکے دیتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ اس شخص نے ایک اور ہوائی فائر کر دیا اور اپنا بازو چھڑا کر وجدان کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن ٹھیک اسی لمحے وہ ٹرالی اس سے ٹکرا گئی۔ وہ کراہتے ہوئے لڑکھڑا کر گرا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکتا۔ تین سادہ لباس پولیس والے اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ ان تینوں نے اسے پستولوں کی زد پر لے لیا۔

وہ شخص چکنے فرش پر پشت کے بل پڑا تھا۔ ہاتھ میں پستول ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ایک گولی چلائی تو ان گنت گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو جائیں گی۔ اس نے پستول ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ دو پولیس والوں نے بڑی پھرتی سے اسے گرفت میں لے لیا اور تیسرا وجدان کا ہاتھ پکڑ کر اسے تقریباً کھینچتا ہوا وہاں سے نکال لے گیا۔

اس کے دو گھنٹے بعد انسپکٹر چیانگ شو اسپتال میں وجدان والے کمرے میں موجود تھا۔ تھوڑی دیر پہلے پرتاب سنگھ بھی آگیا تھا۔ پرتاب سنگھ یہ سب کچھ سن کر سناٹے میں آگیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"یہ واقعی شیر دا پتر ہے۔" وہ وجدان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولا۔ "جو کام پولیس نہیں کر سکی وہ اس نے کر دکھایا۔"

"یہ شیر دا پتر اگر اس کی گولی کا نشانہ بن جاتا تو تم سارا الزام پولیس پر رکھ دیتے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔ "ہم اس کی جان کی حفاظت کے لئے پریشان ہیں اور یہ قاتلوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ کوئی بڑا [illegible] بھی ہوتا تو اتنا بڑا رسک کبھی نہیں لیتا۔"

"یہ بچہ ہے مگر ڈرپوک اور بزدل نہیں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "میں اسے سمجھا دوں گا کہ آئندہ اس طرح اپنی جان کو خطرے میں نہ ڈالے۔ بہرحال' اس آدمی سے کچھ معلوم ہوا؟"

"وہ کم کے لئے کام کرتا ہے۔" انسپکٹر نے بتایا۔ "یہ وہی کم ہے جس کے بارے میں تمہیں اور مجھے پہلے ہی سے شبہ ہے۔ اب ہم بہت جلد کم کے خلاف کارروائی کرنے والے ہیں۔"

"اس بے وقوف کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وجدان کی حفاظت کے لئے سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔ کیا اسے اپنی جان پیاری نہیں تھی کہ یہاں چلا آیا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

"وہ وجدان کے پیچھے یہاں نہیں آیا تھا۔ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ وجدان کو یہاں رکھا گیا ہے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔ "اس کی بیوی اس اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ ڈیلیوری ہونے والی ہے۔ کیس کچھ پیچیدہ ہے۔ ڈاکٹر نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ وہ کاؤنٹر پر ڈاکٹر کے بارے ہی میں دریافت کر رہا تھا کہ وجدان آکر اس سے لپٹ گیا۔ یہ تو شکر کا بات ہے کہ اس نے گولی وجدان پر نہیں چلائی تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اسپتال میں وجدان کی سکیورٹی بھی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ اسے زیادہ دن یہاں بھی رکھا نہیں جا سکتا۔ ویسے میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔"

"وہ کیا؟" پرتاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اس کو چند روز کے لئے لازارس آئی لینڈ پر لے جاؤ۔ وہ جگہ اس کے لئے زیادہ محفوظ ہے۔ ہمارا دو آدمی تمہارا ساتھ جائے گا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"لازارس آئی لینڈ۔" پرتاب سنگھ بڑبڑایا۔

سنگاپور ستاون چھوٹے چھوٹے جزیروں پر مشتمل ملک ہے۔ زیادہ تر جزائر غیر آباد ہیں اور وہاں گھنے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ قابلِ ذکر جزائر میں سنتوشا' ایس ٹی جان اور کوسو ہیں۔ سنتوشا سب سے زیادہ قریب اور سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ یہ سنگاپور کی سب سے

بڑی تفریح گاہ بھی تھی۔ سنگاپور جانے والا ہر شخص اس جزیرے پر جانا ضروری سمجھتا ہے۔ بعض جزیروں کے لئے تو باقاعدہ فیری سروس موجود ہے لیکن بعض چھوٹے چھوٹے جزیرے ایسے ہیں جہاں کوئی باقاعدہ فیری سروس نہیں ہے۔ البتہ کشتی چارٹر کی جا سکتی ہے۔ لازارس بھی ان میں سے ایک تھا جہاں جانے کے لئے کوئی کشتی خاص طور پر چارٹر کرانی پڑتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ جزیرہ وجدان کے لئے محفوظ تھا لیکن دارا اور اس کے آدمیوں سے اس طرح بھاگتے رہنا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ اس نے یہی بات دہرائی تو انسپکٹر چیانگ نے جواب دیا۔

"چند روز کا بات ہے۔ ہم دارا کو پکڑ لیں گے۔ اس کے بعد وجدان کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"یہ بات تو میں کئی دنوں سے سن رہا ہوں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "لیکن پولیس تو ابھی تک اس کا کوئی سراغ ہی نہیں لگا سکی۔ پکڑیں گے کیسے؟"

"پکڑ لیں گے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔ "اب ہمیں آگے بڑھنے کا ایک راستہ تو مل گیا ہے۔ اب اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ تم اس لڑکے کو لے کر آج رات لازارس آئی لینڈ چلے جاؤ۔ تم تیاری کرلو۔ ہم ایک گھنٹا پہلے تم کو اطلاع دے گا اور ہمارے آدمی تم کو یہاں سے لے جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارا مشورہ مان لیتے ہیں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "لیکن مجھے لگتا ہے، پولیس کچھ نہیں کرسکے گی اور ہمیں سنگاپور چھوڑنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم چلتا ہے۔ روانگی سے ایک گھنٹا پہلے تمہیں اطلاع دے گا۔" انسپکٹر چیانگ شو اس سے ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

اور پھر اسی رات دو بجے انسپکٹر چیانگ شو کے دو آدمی انہیں لینے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ انہیں کمرے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے پہلے پرتاب سنگھ نے ڈیوٹی پر موجود دوسرے پولیس والوں سے یہ تصدیق کرلی تھی کہ آنے والے یہ دونوں آدمی پولیس ہی کے تھے اور ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو رہا تھا۔

وہ اسپتال کے عقبی دروازے سے باہر نکلے تو گلی میں سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر پہلے ہی سے ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ پرتاب سنگھ، وجدان اور ایک آدمی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دوسرا پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ کار فوراً ہی حرکت میں آگئی تھی۔ گلی میں تقریباً پچاس گز پیچھے کھڑی ہوئی ایک اور کار بھی حرکت میں آئی تھی۔ اس کار میں بھی سادہ لباس مسلح پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ وجدان کو اسپتال سے منتقل کرنے کا منصوبہ اگرچہ نہایت خفیہ رکھا گیا تھا لیکن انسپکٹر چیانگ شو نے ہر پہلو کو مدنظر رکھا تھا۔

سڑکیں سنسان تھیں۔ دونوں کاریں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی فیری گھاٹ پر پہنچ گئیں۔ وہ لوگ کاروں سے اتر کر اس طرف آگئے جہاں ایک موٹر بوٹ ان کی منتظر کھڑی تھی۔ وہاں انسپکٹر چیانگ شو بھی موجود تھا۔ موٹر بوٹ میں ایک عورت اور تین آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ عورت چینی تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے گلابی رنگ کا پاجامہ اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی جس پر گہرے سرخ پھولوں کے پرنٹ تھے۔ اس کا نام حارہ کاشی تھا۔ اس نے وجدان کو اسی سیٹ پر بٹھا لیا اور اس کی کمر پر بازو لپیٹ کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ حرکت میں آکر گھاٹ سے نکلنے لگی۔ لازارس آئی لینڈ جنوب میں چند میل کے فاصلے پر تھا۔ گہرے پانی سے ہوتے ہوئے وہاں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

ایک تنگ سی کھاڑی ساحل پر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔ کھاڑی کے دونوں طرف درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ بوٹ آہستہ آہستہ تیرتی ہوئی تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کر کے کنارے کے ساتھ رک گئی اور وہ لوگ نیچے اتر آئے۔

وہاں سے تقریباً پانچ سو گز دور ایک کاٹیج مکمل طور پر گنجان درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ کاٹیج کی تمام بتیاں جل رہی تھیں اور ایک آدمی پہلے سے وہاں موجود تھا۔

اس وقت رات ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وجدان رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ حارہ کاشی نام کی وہ عورت وجدان کو لے کر ایک کمرے میں چلی گئی۔ بیڈ پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ حارہ کاشی نے بستر پر لیٹ کر وجدان کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وجدان کو یوں لگا جیسے تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر ممتا کی ٹھنڈی اور پیار بھری آغوش میں آگیا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور فوراً ہی سو گیا۔

○☆○

اس رات کم کے آدمی وجدان کو پکڑنے یا اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں قطعی ناکام رہے تھے۔ اس نے منصوبہ تو بہت شاندار بنایا تھا۔ پولیس اور سی آئی ڈی کے آدمی اگرچہ پرتاب سنگھ کے مکان کے اردگرد پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی بھی مشتبہ آدمی ان کی نظروں میں آئے بغیر مکان کی طرف نہیں جا سکتا تھا لیکن کم نے جو منصوبہ بنایا تھا، ابتدائی مرحلے میں تو وہ سو فیصد کامیاب رہا تھا۔ انہوں نے پرتاب سنگھ کے ٹیلی فون پر انسپکٹر چیانگ شو کی باتیں سن لی تھیں اور اس کا ایک آدمی شوتو سی آئی ڈی انسپکٹر آنگ کانگ کے بھیس میں پرتاب سنگھ کے مکان پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور وہ پرتاب سنگھ اور وجدان کو پستول کی زد پر وہاں سے نکال بھی لایا تھا لیکن راستے میں گڑبڑ ہوگئی اور وہ لڑکا کار سے اتر کر بھاگ نکلا۔ اس نے شوتو کو بھی دانت سے کاٹ کر زخمی کردیا تھا۔ اگرچہ جی فانگ وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے تھے لیکن کچھ ہی دیر بعد پولیس کے آجانے کی وجہ سے کم کے آدمیوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ جی فانگ اپنے ایک آدمی کے ساتھ وجدان کے تعاقب میں تھا لیکن وجدان

نہ صرف انہیں دھوکا دے کر بچ نکلا بلکہ ہوٹل اوبیرائے کے قریب وہ دارا کو بھی پہنچا دے گیا تھا۔

دارا ہی نے بعد میں کم کو فون پر اطلاع دی تھی کہ وجدان پولیس اسٹیشن میں موجود ہے اور ظاہر ہے وہ رات بھر پولیس اسٹیشن میں نہیں رہے گا۔ اسے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے گا۔ کم اپنے دو آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور دور رہ کر پولیس اسٹیشن کی نگرانی کرنے لگا اور پھر رات دو بجے کے قریب انسپکٹر چیانگ شو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ وجدان کو لے کر جیپ پر روانہ ہوا تو کم کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اسے اپنے گھر لے جا رہا ہے۔ راستے میں انسپکٹر چیانگ شو وغیرہ کو گھیر لیا گیا لیکن اس کے دونوں آدمی پرلے درجے کے احمق نکلے۔ نہ صرف خود مارے گئے بلکہ اسے بھی ٹانگ پر گولی لگی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو سکا تھا اور اب کم اپنے ایک خفیہ ٹھکانے میں چھپا ٹانگ کا زخم ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جی فانگ کو بھی نائٹ کلب سے ہٹا دیا تھا اور شوتو کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ وہ چند روز تک گھر سے باہر نہ نکلے کیونکہ نہ صرف وجدان نے بلکہ پرتاب سنگھ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ ان پولیس والوں کی نظروں میں بھی آگیا تھا جو اس رات پرتاب سنگھ کے مکان پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ یہ لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان لیتے۔

کم کو اپنے سارے خواب چکنا چور ہوتے نظر آرہے تھے۔ اسے نائٹ کلب میں اپنے ایک آدمی سے مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ دارا اس سے ملنا چاہتا ہے لیکن کم ان پیغامات کو نظرانداز کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ دارا نہ صرف اس سے یہ کام واپس لے لے گا بلکہ اپنی اس خطیر رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کرے گا جو وہ اب تک کم کو دے چکا تھا۔ ان میں یہی طے ہوا تھا کہ کم، وجدان کو زندہ اس کے حوالے کرے گا یا اسے ٹھکانے لگا دے گا تو دارا اسے اتنی ہی رقم ادا کرے گا۔ ناکامی کی صورت میں کم کو وہ ساری رقم واپس کرنی پڑے گی جو وہ اب تک دارا سے لے چکا تھا اور کم اپنے مشن میں تقریباً ناکام ہی رہا تھا.... اور ستم یہ کہ وہ اپنے تین چار آدمی بھی مروا چکا تھا لیکن معاملہ ابھی تک وہیں تھا جہاں سے شروع ہوا تھا۔ بارہ سال کا وہ لڑکا اس کے لئے دنیا کا سب سے سنگین مسئلہ بن گیا تھا۔

اس دوران میں کم نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ پرتاب سنگھ کے باڈی گارڈ سوتر سنگھ کی یادداشت اور قوتِ گویائی لوٹ رہی ہے۔ سوتر سنگھ کی صحت یابی بھی کم کے لئے بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے سوتر سنگھ کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا اور اس کے لئے مائے فانگ نامی ایک خوبصورت عورت کی خدمات حاصل کی گئیں۔

مائے فانگ دوغلی نسل کی تھی۔ اس کی ماں چینی اور باپ ہندوستانی تھا۔ اس کی عمر اگرچہ تیس سے اوپر ہی تھی لیکن جسمانی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کم از کم دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ وہ ایک تربیت یافتہ نرس تھی۔ کم جب ڈاکٹر کی حیثیت سے پریکٹس کیا کرتا تھا تو مائے فانگ اس کے پاس ملازم تھی۔ کم پر پابندی لگی تو مائے فانگ بھی کسی اور ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ مائے فانگ بھی اپنی پریکٹس کے حوالے سے غیرقانونی سرگرمیوں میں ملوث تھی۔ کم نے پانچ ہزار ڈالر کے عوض مائے فانگ کو اس کام پر آمادہ کرلیا تھا اور اس نے اپنا کام بڑی مہارت اور خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا۔

کم، سوتر سنگھ کی طرف سے تو مطمئن ہوگیا تھا لیکن آج دوپہر اسے یہ سنسنی خیز اطلاع ملی کہ شوتو پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو دیکھنے کے لئے اسپتال گیا تھا کہ اسی اسپتال میں موجود وجدان نے اسے دیکھ لیا اور اس طرح شوتو پکڑا گیا۔

کم کا ایک آدمی اسپتال کی نگرانی کر رہا تھا کہ وجدان کو کہیں اور منتقل کیا جائے تو اس کو پتا چل جائے لیکن دوسرے روز صبح سویرے کم کو اپنے اسی بندے سے اطلاع ملی کہ وجدان کو گزشتہ رات نہایت خفیہ طور پر کسی نامعلوم مقام پر منتقل کردیا گیا ہے۔

"اس کی منتقلی نہایت خفیہ طور پر عمل میں آئی تھی۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "میں اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ میں نے ان میں سے کسی کو بھی اسپتال کی عمارت سے باہر جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں رات تین بجے عمارت کی چوتھی منزل کا ایک چکر بھی لگا کر آیا تھا۔ اس وقت پولیس والے کمرے کے سامنے اور راہداری میں اپنی جگہ پر موجود تھے لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے ان تمام پولیس والوں کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اور جب میں اوپر گیا تو وجدان کا کمرا خالی تھا۔ وہ لوگ شاید عمارت کے پچھلے دروازے سے گئے تھے۔ اس پروگرام کو اتنا خفیہ رکھا گیا تھا کہ ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی پتا نہیں چل سکا۔ صبح تک پولیس والے اس لئے دروازے پر کھڑے رہے کہ کسی کو شبہ نہ ہوسکے۔"

کم کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا۔ اس نے زندگی میں بڑے بڑے معرکے سرانجام دیے تھے۔ منشیات کے ایک بہت بڑے بین الاقوامی گروہ کے ساتھ وابستہ رہا تھا۔ اسے اپنے کسی مشن میں کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ صرف ایک موقع پر اسے ناکامی ہوئی تھی اور دراصل وہیں سے اس کا زوال بھی شروع ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور جب اسے دارا سے یہ کیس ملا تھا تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کیس میں کامیابی کے بعد اسے ایک بار پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل جائے گا۔ اس نے بڑی آسانی سے عابد علی اور اس کی بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس موقع پر اس سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ ان کا بیٹا زندہ بچ گیا تھا۔ اس کا انکشاف دوسرے دن کے اخبارات سے ہوا تھا۔ دارا نے اسے ختم کردینے کا حکم دیا تھا اور کم کا خیال تھا کہ وہ اسے چیونٹی کی طرح مسل دے

گا لیکن وہ کم سن لڑکا تو اس کے لئے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا تھا۔ کم کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ غیر محسوس انداز میں ایک خوفناک دلدل میں دھنستا جا رہا ہو۔ اگر اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش نہ کی تو یہ دلدل اسے نگل جائے گی اور اس کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

اس نے بڑی محنت سے وہ نائٹ کلب بنایا تھا لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ لڑکا ہاتھ نہ لگا تو یہ نائٹ کلب بھی ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ سڑکوں پر بھیک مانگتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ اپنا یہ انجام سوچ کر ہی کانپ اٹھا تھا۔

ان ہنگاموں میں اب تک اس کے تین چار آدمی مارے جا چکے تھے اور کوئی نیا آدمی اس کے لئے کام کرنے کو تیار نہیں تھا اور جو کام کرنے کو تیار تھے وہ چار گنا زیادہ معاوضہ مانگ رہے تھے اور کم کے پاس اتنا پیسا نہیں تھا۔

فون پر اپنے آدمی سے بات کئے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔ اس دوران میں وہ یہ بھی اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وجدان کو کہاں لے جایا گیا ہوگا لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں مائے فانگ کا خیال آگیا۔ اس نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور مائے فانگ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال ریسیو ہونے میں پورا ایک منٹ لگا تھا۔

"فانگ کہاں تھیں تم؟ کال ریسیو کرنے میں اتنی دیر؟" کم نے ریسیور پر ہیلو کی آواز سنتے ہی کہا۔

"میں سو رہی تھی۔" فانگ کی خوابیدہ سی آواز سنائی دی۔

"تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" کم نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

"میں تمہیں یہ بتانے کی پابند نہیں ہوں کہ میرے پاس اور کون ہے۔" فانگ نے بھی خشک لہجے میں جواب دیا۔

"جو کوئی بھی ہے اسے جلد سے جلد رخصت کرکے میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے اور مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" کم نے کہا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ "دیکھو فانگ۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ اگر تمہیں میرا لہجہ برا لگا ہو تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ تم صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتی ہو اور....."

"ٹھیک ہے۔ مزید تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

کم کچھ کہنا چاہتا تھا مگر لائن کٹ گئی تھی۔ اس نے بھی ریسیور پٹخ دیا اور دانت کچکچانے لگا۔ فانگ اسی کے ٹکڑوں پر پلتی رہی تھی اور اب وہ بھی اس لہجے میں بات کرنے لگی تھی کہ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر کچن میں آگیا اور اپنے لیے کافی بنانے لگا۔ صبح ہی صبح اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

وہ برآمدے میں بیٹھا کافی کی چسکیاں لیتا رہا اور صورتِ حا[ل پر] غور کرتا رہا۔ صورتِ حال سنگین سے سنگین تر ہوتی جا رہی [تھی] لیکن اس سے نبرد آزما ہونے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا [تھا]

وہ بار بار گیٹ کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ فانگ نے ایک گھ[نٹہ] کہا تھا اور اب دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ بالآخر وہ اٹھ کر کمرے [میں آیا] اور فون کا ریسیور اٹھا کر فانگ کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف [گھنٹی] بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی جس کا مطلب تھا کہ فانگ [گھر] پر نہیں تھی۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا اور ایک بار پھر برآمدے [میں] آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

کم کی یہ نئی پناہ گاہ ایک خوبصورت کاٹیج تھی جو شہر [سے] ذرا ہٹ کر واقع تھی۔ اس علاقے میں ایک دوسرے سے فا[صلے پر] اسی قسم کے خوبصورت کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ کاٹیج کے گرد [ایک] وسیع لان تھا۔ گیٹ برآمدے سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر [تھا۔] پودوں کی اونچی باڑ لگی ہوئی تھی۔ پام کے علاوہ بھی دوسرے [گھنی] شاخوں والے درختوں کی بہتات تھی۔ کھلی جگہ پر بیٹھے ہوئے [بھی] کم کو یہ اطمینان تھا کہ اسے باہر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

مائے فانگ تین گھنٹے بعد آئی تھی۔ اس نے اپنی کار با[ہر] کھڑی کر دی اور گیٹ میں داخل ہو کر بڑے اطمینان سے چلتی [ہوئی] اندر آئی تھی۔

"تم دو گھنٹے لیٹ ہو۔" کم نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پا[نے] کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری پابند تو نہیں ہوں مسٹر کم!" فانگ نے خشک [لہجے] میں جواب دیا۔ کم کا خون کھول اٹھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے [آپ] پر قابو پا سکا تھا۔

"ہاں۔ تم میری پابند تو نہیں ہو لیکن میں نے سوچا کہ [شاید] تمہیں کچھ رقم کی ضرورت ہو۔ یہ معمولی سا کام میں کسی اور [سے] بھی لے سکتا تھا لیکن ظاہر ہے ہمارے پرانے تعلقات ہیں [اس] لئے سب سے پہلے مجھے تمہارا ہی خیال آیا تھا۔ آؤ اندر بیٹھ [کر] اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" کم کہتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا۔

وہ دونوں اندر آگئے۔

"کچھ پیو گی؟" کم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" فانگ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "گزشتہ رات اتنی [پی] لی کہ ابھی تک سینے میں جلن ہو رہی ہے۔ تم مطلب کی بات کرو۔ کس لئے بلایا ہے مجھے؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو، میں آج کل کس الجھن میں ہوں۔" کم کہنے لگا۔ "وہ لڑکا کم بخت میرے لئے عذاب بن گیا ہے۔ [میرا] مستقبل داؤ پر لگا ہوا ہے۔ جب تک اس کا قصہ تمام نہیں ہو[تا] میں اپنے بارے میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے [بولا۔] "کل تک وہ اسپتال میں تھا لیکن گزشتہ رات وہ پراسرار طور پر [غائب] ہو گیا۔"

"لاپتا ہو گیا؟" فانگ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اسے نہایت خفیہ طور پر کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کو بھی علم نہیں ہے کہ اسے رات کو کس وقت وہاں سے لے جایا گیا تھا۔ میرا ایک آدمی اسپتال میں موجود ہے لیکن اسے بھی پتا نہیں چل سکا کہ اس لڑکے کو کس وقت وہاں سے نکالا گیا تھا۔"

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" فانگ نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس لڑکے کو تلاش کرو۔" کم نے کہا اور الماری میں سے کرنسی نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے سامنے میز پر پھینک دی "یہ پانچ ہزار ڈالر ہیں۔ ان کے ٹھکانے کا سراغ لگا لو تو اتنی ہی رقم اور دوں گا۔"

"تم آج کل بہت کنجوس ہو گئے ہو۔" فانگ نے یہ کہتے ہوئے نوٹوں کی گڈی اٹھا لی۔ "پرتاب سنگھ کے ایک آدمی کو ٹھکانے لگانے کا معاوضہ بھی تم نے صرف پانچ ہزار ہی دیا تھا حالانکہ وہ کم سے کم پچاس ہزار ڈالر کا کام تھا۔"

"یہ مشن کامیاب ہو جائے تو تمہیں اتنا کچھ دوں گا کہ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔" کم نے کہا۔

"لیکن ایک بات شاید تمہارے ذہن میں نہیں آئی۔" فانگ نے کہا۔ "جب میں پرتاب سنگھ کے آدمی کو پائزن انجیکٹ کرنے کے بعد کمرے سے نکل رہی تھی تو پرتاب سنگھ بھی وہاں آگیا تھا۔ اس نے رک کر مجھ سے بات کی تھی۔ اس نے میرا چہرہ اچھی طرح دیکھا تھا۔ اگر اس نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا تو.....؟"

"اس دن سے تم آزادانہ گھوم رہی ہو۔ تمہیں ابھی تک کسی نے شناخت نہیں کیا۔" کم نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "اس روز تم یہیں سے تیار ہو کر گئی تھیں۔ تمہارے نچلے ہونٹ کے دائیں کونے پر ایک تل تھا۔ تمہارے بال گولڈن تھے اور اس وقت تم یونیفارم میں تھیں۔ تمہارے نرس والے حلئے اور اس حلئے میں بڑا فرق ہے۔ تمہیں شناخت کرنا آسان نہیں ہوگا اور پھر تمہیں پرتاب سنگھ کے قریب تو نہیں جانا۔ صرف ان کا ٹھکانا معلوم کرنا ہے۔ دور رہ کر....."

"ٹھیک ہے۔" فانگ گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ کام اگرچہ پرخطر اور خاصا مشکل ہے لیکن تمہارے لئے یہ بھی سہی۔"

"اگر تم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئیں تو مالا مال کر دوں گا تمہیں۔" کم نے جواب دیا۔

مائے فانگ کے جانے کے بعد کم نے فون کا ریسیور اٹھایا اور اپنے ایک آدمی کا نمبر ملا کر اسے فانگ کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

"میرا خیال ہے، وہ یہاں سے سیدھی اپنے فلیٹ پر جائے گی۔" کم کہہ رہا تھا۔ "تم نے دور رہ کر اس کی نگرانی کرنی ہے۔ اسے ایک لمحے کو بھی تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ اسے یہ شبہ بھی نہ ہو کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب وہ مائے فانگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب اچھے دن تھے تو وہ پالتو کتیا کی طرح اس کے قدموں پر لوٹا کرتی تھی اور اب وہ نہ صرف برابری پر اتر آئی تھی بلکہ اپنے آپ کو اس سے برتر سمجھنے لگی تھی۔

وہ دن گزر گیا اور پھر دوسرا دن زیادہ بے چینی میں گزرا تھا۔ اس دوران میں اسے نہ تو مائے فانگ کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی اور نہ ہی اس کی نگرانی کرنے والے آدمی کی طرف سے۔ اس روز شام کو اس نے چی فانگ کے ٹھکانے پر فون کے ذریعے اس سے رابطہ کیا۔

"صورتِ حال بہت سنگین ہے مسٹر کم۔" چی فانگ نے بتایا۔ "پولیس نے شوتو سے سب کچھ اگلوا لیا ہے۔ اس نے نہ صرف اپنے دوسرے ساتھیوں کے نام بتا دیے ہیں بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ لوگ تمہارے لئے کام کر رہے ہیں۔ پولیس نے ایک آدمی کو عرب اسٹریٹ کے علاقے سے گرفتار کر لیا ہے اور تمہارے نائٹ کلب کی بڑی سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔ سی آئی ڈی کے کم از کم تین آدمی ہماری نظروں میں آچکے ہیں اس لئے تم نائٹ کلب کی طرف جانے کا خیال بھی ذہن میں مت لانا۔"

"اور دارا کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟" کم نے دریافت کیا۔

"وہ بھی تمہاری تلاش میں ہے۔" چی فانگ نے بتایا۔ "اسے بھی پتا چل گیا ہے کہ تمہارے کلب کی نگرانی ہو رہی ہے اور تمہارے لئے ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ مسٹر دارا، البرٹ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ البرٹ آج کل سنگاپور میں نہیں ہے۔ وہ کوالالمپور گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی تقریباً ایک ہفتے بعد ہوگی۔ اگر ہم اس کے واپس آنے سے پہلے پہلے اس لڑکے کو ٹھکانے لگا دیں تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر سب کچھ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا اور ہمارے کھاتے میں وہ سنگین جرائم رہ جائیں گے جو ہمیں پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گے۔"

"یہ دارا میری توقع سے زیادہ چالاک نکلا۔" کم نے کہا۔ "خود صرف ایک مرتبہ سامنے آیا تھا۔ اس کے بعد سے مسلسل پس منظر میں ہے۔ اس نے ہمیں آگے کر رکھا ہے لیکن بچ کر وہ بھی نہیں جائے گا۔ بہرحال، البرٹ کی عدم موجودگی سے ہمیں کچھ اور مہلت مل گئی ہے۔ اب ہمیں ہر صورت میں وجدان کو تلاش کرکے ٹھکانے لگانا ہے اور تم فی الحال ذرا محتاط رہنا۔"

"میری فکر مت کرو مسٹر کم۔" چی فانگ نے جواب دیا۔ "میں بالکل محفوظ جگہ پر ہوں۔ نہ صرف محفوظ ہوں بلکہ صورتِ حال پر بھی نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔"

کم کچھ دیر اور اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر اس نے فون بند دیا۔

اسی روز شام کو کم کے اس آدمی کا فون آگیا جسے مائے فانگ کی نگرانی کا کام سونپا گیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کم۔" اس شخص نے کہا۔ "میں نے کل دوپہر کو مائے فانگ کی نگرانی شروع کی تھی لیکن اسے شاید پتا چل گیا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے دھوکا دے کر غائب ہوگئی۔ میں اسے تلاش کرتا رہا۔ وہ رات کو اپنے گھر پر بھی نہیں آئی۔ میں آج صبح سے اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے اپنے فلیٹ پر واپس آئی تھی لیکن آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ وہ عمارت کے پچھلے دروازے سے غائب ہوگئی ہے۔"

"اگر تم میرے سامنے آکر یہ سب کچھ بتاتے تو میں تمہاری گردن مروڑ دیتا۔" کم نے چیختے ہوئے کہا اور فون کا ریسیور پٹخ دیا۔ یہ رپورٹ سن کر اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ دارا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس نے احمقوں کی فوج پال رکھی ہے۔ واقعی یہ سب لوگ احمق تھے۔ اب تک ان سے کوئی کام نہیں ہوسکا تھا بلکہ یہ لوگ ہر کام کو بگاڑتے چلے گئے تھے۔

کم یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ برآمدے میں کسی کے قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور مائے فانگ اندر داخل ہوئی۔ اس نے ڈینم کی شرٹ اور اسٹون واش جینز پہن رکھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"تم کہاں....." کم نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموش ہوگیا۔

"میں کہاں غائب ہوگئی تھی؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا!" فانگ یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ آئی۔ "میرا خیال ہے، تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں رہا اسی لئے تم نے اپنا ایک آدمی میرے پیچھے لگا دیا تھا لیکن وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ثابت ہوا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں میں نے اس سے اس طرح پیچھا چھڑا لیا کہ وہ ٹاپتا رہ گیا ہوگا۔ ویسے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے اسے میرے پیچھے کیوں لگایا تھا؟"

کم کا دماغ سلگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فانگ کی گردن مروڑ دے لیکن یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ اس قسم کی خواہش پوری کی جاسکتی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"تمہاری حفاظت۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر بات بناتے ہوئے بولا۔ "صورتِ حال کی سنگینی سے تم بھی واقف ہو۔ میرے تین چار آدمی اب تک موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں۔ میں نے تمہاری حفاظت کے لئے اپنے ایک آدمی کو تمہاری نگرانی پر لگا دیا تھا۔"

"میری حفاظت کے لیے یا میری نگرانی کرکے وہ میری سرگرمیوں پر نگاہ رکھ سکے تاکہ اگر میں اس لڑکے کا سراغ لگا لوں تو مجھے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے؟" فانگ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو فانگ۔" کم اپنی ندامت مٹاتے ہوئے بولا۔ "اس آدمی کو پیچھے لگانے کا مقصد واقعی تمہاری حفاظت تھا۔ بہرحال......"

"میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں کم۔" فانگ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ اس لڑکے کو یہاں سے کہاں لے جایا گیا تھا لیکن صحیح لوکیشن معلوم کرنے کے لئے تمہیں بھی تھوڑی سی محنت کرنی پڑے گی اور میرا خیال ہے تم آسانی سے وہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"کہاں؟" کم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پہلے باقی رقم۔" فانگ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ پھیلایا۔

"کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں رہا؟" کم نے اسے گھورا۔

"اب مجھے کسی پر بھروسا نہیں رہا۔" مائے فانگ نے جواب دیا۔ "تائی من پرسوں رات بھر میرے جسم سے کھیلتا رہا۔ اس نے مجھے بڑے سبز باغ دکھائے تھے لیکن صبح جاتے ہوئے میرے پرس سے بھی رقم نکال کر لے گیا۔ میں اسے بہت شریف آدمی سمجھتی تھی لیکن وہ اس طرح مجھے دھوکا دے کر چلا گیا۔ اب کہیں ملا تو اگلی پچھلی ساری کسر نکال لوں گی۔ اگر تم مزید کچھ جاننا چاہتے ہو تو باقی رقم....." اس نے دوبارہ ہاتھ پھیلا دیا۔

کم چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد واپس آکر اس نے نوٹوں کی گڈی اس کے سامنے میز پر رکھ دی۔

"یہ پانچ ہزار ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن اگر اطلاع غلط ہوئی تو......"

"میری اطلاع سو فیصد درست ہے۔" مائے فانگ نے نوٹوں کی گڈی پرس میں رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ تھوڑی سی محنت تمہیں بھی کرنی پڑے گی۔"

"اب میں اصل بات سننا چاہتا ہوں۔" کم نے اسے گھورا۔

"وہ لوگ اس رات پرتاب سنگھ اور اس لڑکے کو لازارس آئی لینڈ لے گئے تھے۔" فانگ نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "اس روز شام کو پیٹرسن کے نام پر ایک موٹر بوٹ کرائے پر لی گئی تھی اور رات کو ڈھائی بجے کے قریب وہ لوگ وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔"

"لازارس آئی لینڈ۔" کم بڑبڑایا۔ "انہیں وہاں کیسے تلاش کیا جائے گا؟"

"تم جانتے ہو، وہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔" مائے فانگ نے جواب دیا۔ "ایک دن میں جزیرے کا چپا چپا چیک کیا جاسکتا ہے۔"

"لیکن اس طرح تو انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم ان کی تلاش میں جزیرے پر پہنچ گئے ہیں۔" کم نے جواب دیا۔

"یہ سوچنا اب تمہارا کام ہے کہ انہیں تلاش کس طرح کیا ... سا جائے۔ یہ بہرحال طے ہے کہ وہ لوگ اسی جزیرے پر موجود ہیں۔ اچھا اب میں چلتی ہوں۔" فانگ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"بیٹھو۔ ابھی تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" کم نے کہا۔

مائے فانگ چند لمحے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

○ ○

اس جزیرے پر ان کا تیسرا دن تھا۔ وجدان کو اب کسی حد تک آزادی مل گئی تھی۔ وہ کاٹیج کے آس پاس گھومتا رہتا۔ وہ درختوں میں گھرا ہوا ایک خوبصورت کاٹیج تھا۔ درخت اس قدر گنجان تھے کہ بعض جگہوں پر دھوپ بھی زمین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ انہیں یہاں بھیجنے سے پہلے انسپکٹر چیانگ شو نے تمام انتظامات مکمل کرلئے تھے۔ کچن کے اسٹور میں سات آٹھ آدمیوں کا کم از کم ایک مہینے کا راشن موجود تھا اور کھانا پکانے والا ایک آدمی بھی۔

ان کے ساتھ تین آدمی آئے تھے اور چوتھی حارہ کاشی نام کی وہ عورت تھی جس کا تعلق بھی پولیس کے محکمے ہی سے تھا۔ وجدان بہت جلد اس سے مانوس ہوگیا تھا اور وہ رات کو سوتا بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ ممتا کے احساس نے وجدان کو ذہنی طور پر بھی بڑی حد تک پرسکون کردیا تھا۔ دن میں بھی وجدان کا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزرتا تھا۔

اس جزیرے پر زیادہ لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ جو لوگ آتے وہ بھی چند گھنٹوں کی سیر و تفریح کے بعد واپس چلے جاتے۔ ویسے اس جزیرے پر کچھ پرائیوٹ گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ وہ گیسٹ ہاؤسز بھی ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔

پولیس کے تینوں آدمی سادہ لباس میں تھے اور اس کاٹیج کے اطراف میں خاصے فاصلے پر اس طرف آنے والے راستوں کی نگرانی کررہے تھے۔

وجدان اس روز صبح دس بجے کے قریب حارہ کاشی کے ساتھ ٹہلتا ہوا کاٹیج سے کافی دور نکل گیا۔ حارہ کاشی نے بیل باٹم اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ پینٹ کے ڈھیلے ڈھالے پائنچے کے اندر دائیں پنڈلی پر چمڑے کے فیتے سے بندھے ہوئے ہولسٹر میں چھوٹی نال والا ولسن اینڈ اسمتھ ریوالور رکھا ہوا تھا۔ یہ ریوالور بظاہر چھوٹا سا کھلونا ہی لگتا تھا لیکن درحقیقت یہ اعشاریہ تین آٹھ کے ریوالور سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔

وہ ایک جگہ پر رک گئے۔ وہاں درخت قدرے چھدرے تھے۔ چمکتی ہوئی دھوپ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ ہر طرف خوش رنگ پھولوں کے پودے نظر آرہے تھے۔ وجدان پھول توڑنے لگا اور حارہ کاشی ایک پتھر پر بیٹھ کر کبھی اس کی طرف دیکھتی اور کبھی اطراف میں دیکھنے لگتی۔

"تم یہ گلدستہ کس کے لئے بنا رہے ہو؟" وہ وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں دو گلدستے بناؤں گا آنٹی۔" وجدان نے جواب دیا۔ "ایک میں آپ کو دوں گا اور دوسرا پرتاب چاچا کو۔"

"پرتاب سنگھ تمہیں اچھا لگتا ہے؟" حارہ کاشی نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔" وجدان بولا۔ "وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میری وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان کی ٹانگ میں گولی بھی میری وجہ سے لگی تھی۔ کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ اگر چاچا پرتاب سنگھ نہ ہوتے تو پتا نہیں میرا کیا انجام ہوتا۔ ویسے آپ بھی بہت اچھی ہیں آنٹی۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں آپ۔" اس نے ایک اور پھول توڑ کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گچھے میں شامل کیا اور حارہ کاشی کے قریب آگیا۔ "یہ لو آنٹی۔ آپ کا گلدستہ تو تیار ہوگیا۔ اب میں چاچا پرتاب سنگھ کے لئے گلدستہ بناؤں گا۔"

"ایک بات بتاؤ وجدان۔" حارہ کاشی گلدستہ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ تم اپنے ماں باپ کے مرڈر کے چشم دید گواہ ہو اس لئے دارا تمہیں قتل کرانا چاہتا ہے لیکن تمہارے ماں باپ کی اس سے کیا دشمنی تھی۔ اس نے انہیں کیوں قتل کرا دیا؟"

"ممی ڈیڈی نے تو مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا لیکن ان کے قتل کے بعد ایک روز میں نے ڈیڈی کی ڈائری پڑھی تھی۔" وجدان کہہ رہا تھا۔ "پاکستان میں ڈیڈی کی اپنے گاؤں میں کسی سے دشمنی تھی۔ زمین کا معاملہ تھا اور ڈیڈی نے ان کا پانچ کروڑ روپے کا سونا....."

"وجدان..... حارہ کاشی..... کہاں ہو تم لوگ؟"

دور سے آتی ہوئی یہ آواز سن کر وجدان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پرتاب چاچا ہمیں ڈھونڈ رہا ہے۔" وجدان بولا اور پھر اونچی آواز میں پرتاب سنگھ کو بتانے لگا کہ وہ کہاں ہیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی پرتاب سنگھ درختوں سے نکل کر سامنے آگیا۔

"میں تمہیں بیچ کی طرف تلاش کررہا تھا اور تم یہاں پھول توڑ رہے ہو؟" پرتاب سنگھ نے قریب آکر کہا۔

"آنٹی حارہ کاشی کے ساتھ سیر کرتا ہوا اس طرف آگیا تھا۔" وجدان نے جواب دیا۔ "اس طرح گھومنا پھرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے چاچا۔"

"ہاں واقعی بہت اچھا لگ رہا ہے اور یہ جگہ تو بہت ہی اچھی ہے۔" پرتاب سنگھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ یہ جگہ قدرے بلندی پر تھی اور بائیں طرف ساحل کا کچھ حصہ بھی نظر آرہا تھا۔ ساحل پر چند ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ "آج مجھے ایک بات کا خیال آیا ہے۔" پرتاب سنگھ نے دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور تمہاری ٹریننگ شروع کردی جائے۔"

"کیسی ٹریننگ چاچا؟" وجدان نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی

طرف دیکھا۔

"مارشل آرٹ کی ٹریننگ۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "مارشل آرٹ ایک ایسا فن ہے جس سے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی دشمن کو زیر کیا جاسکتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک مرتبہ بتایا تھا کہ میں خود بھی بلیک بیلٹ ہوں اور ایک موقع پر میں نے تمہاری ٹریننگ شروع بھی کی تھی لیکن ہمیں یہ پروگرام ادھورا چھوڑنا پڑا تھا اور اب موقع ہے کہ اس پروگرام پر دوبارہ عمل شروع کردیا جائے۔"

"لیکن چاچا۔ تمہاری تو اپنی ٹانگ زخمی ہے۔ تم مجھے ٹریننگ کیسے دوگے؟" وجدان۔

"میری ٹانگ اب ٹھیک ہے اور تمہیں ایک اور بات بتاؤں۔ تمہاری یہ جو آنٹی ہے نا۔" اس نے حارہ کاشی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔ سیکنڈ ڈان ہے یہ۔ اس کی موجودگی سے بھی تم فائدہ اٹھا سکتے ہو۔"

"کیا واقعی؟" وجدان نے مڑ کر حارہ کاشی کی طرف دیکھا۔

حارہ کاشی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلا دیا۔ وہ پولیس میں تھی اور جرائم پیشہ لوگوں سے نمٹنے کے لئے پولیس والوں کو بھی خاص طور پر مارشل آرٹ کی تربیت دی جاتی تھی۔

"ٹھیک ہے چاچا۔" وجدان بولا۔ "لیکن آج میرا موڈ تو بالکل نہیں ہورہا۔ کیوں نہ اس پروگرام پر کل عمل شروع کیا جائے۔ میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلوں گا۔"

"وجدان ٹھیک کہہ رہا ہے۔" حارہ کاشی نے کہا۔ "ہم کل صبح سویرے اس پروگرام پر عمل شروع کردیں گے۔"

"ٹھیک ہے، بھئی۔" پرتاب سنگھ کہتے ہوئے حارہ کاشی کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

وجدان گھوم پھر کر پھول توڑتا رہا۔ اس نے گلدستہ مکمل کرکے پرتاب سنگھ کو دے دیا اور مزید پھول توڑنے لگا۔

"اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔ تم لوگ بھی تھوڑی دیر میں آجانا۔" پرتاب سنگھ کہتے ہوئے کاٹیج کی طرف چل پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وجدان بھی حارہ کاشی کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ حارہ کاشی چند لمحے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم پاکستان میں اپنے فادر کے دشمنوں کے بارے میں کیا بتا رہے تھے۔ یہ بات شاید پانچ کروڑ کے سونے کی ہورہی تھی۔ وہ کیا قصہ تھا؟"

"مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ میں بعد میں آپ کو بتاؤں گا۔" وجدان کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ "آیئے۔ اس طرف سے گھومتے ہوئے کاٹیج کی طرف چلتے ہیں۔"

حارہ کاشی بھی اٹھ گئی اور وہ دونوں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پر رک گئے۔ یہ کسی چشمے کا پانی تھا جو بلندی کی طرف سے آرہا تھا۔ وجدان پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ حارہ کاشی نے کنارے پر بیٹھ کر دونوں پیر پانی میں ڈال دیے اور پیروں کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی ... اور پھر عقب میں ایک آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے مڑ کر ... ایک بہت حسین عورت درختوں سے نکل کر ان کی طرف ... تھی۔ وجدان نے بھی اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔

"ہیلو۔" وہ عورت حارہ کاشی اور وجدان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"ہیلو۔" حارہ کاشی نے بھی مسکراتے ہوئے گردن ہلائی ... گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ عورت جینز اور اوپن شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بتا رہے تھے کہ اس کے ماں باپ میں سے ایک کا تعلق ہندوستان سے ضرور ہے۔

"ہم آج صبح ہی بوٹ پر یہاں آئے تھے۔" اس عورت نے خود ہی بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھی پہاڑی کی طرف نکل گئے ہیں۔ انہی کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔"

"ہوسکتا ہے وہ تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں۔" حارہ کاشی نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" عورت نے کہا اور پھر وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "بڑا پیارا بچہ ہے۔ تمہارا بیٹا ہے؟"

"ہاں۔" حارہ کاشی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ حسین عورت وجدان میں زیادہ دلچسپی لے رہی تھی۔ باتیں تو وہ حارہ کاشی سے کررہی تھی لیکن اس کی توجہ کا مرکز وجدان تھا۔

حارہ کاشی نے ایک اور بات خاص طور سے نوٹ کی تھی۔ اس عورت کے انداز میں ایک طرح کی بے چینی تھی اور وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ حارہ کاشی کی چھٹی حس نے اسے کسی گڑبڑ سے آگاہ کردیا تھا۔ اس نے دائیں ٹانگ اس طرح ... کہ ضرورت کے وقت فوری طور پر پنڈلی پر بندھے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور نکال سکے۔

"وجدان۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "چلو، واپس چلیں۔ بہت دیر ہوچکی ہے۔"

وجدان بھی کھڑا ہوگیا۔ اس نے دوسری عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور حارہ کاشی کے ساتھ چل پڑا۔ حارہ کاشی نے وجدان کو اپنے آگے ہی رکھا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ مڑ کر بھی دیکھا تھا۔ وہ عورت وہیں کھڑی ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ دونوں گنجان درختوں میں گھس گئے۔ تنگ سی پگڈنڈی جسے بعض جگہوں پر جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ حارہ کاشی کو جانے بار بار یہ احساس کیوں ہورہا تھا کہ کوئی ان کا تعاقب کررہا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا لیکن گنجان درختوں میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا اور پھر ایک موقع پر چند گز دور قد آدم جھاڑیوں میں تیز سرسراہٹ کی آواز سن کر وہ بڑی پھرتی سے نیچے جھکی اور جب سیدھی ہوئی تو ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ جھاڑیوں سے برآمد ہونے والا ان کا اپنا آدمی تھا۔

"اوہ۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" حارہ کاشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ دراصل اس طرف ایک عورت سے ہمارا آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ مجھے اس پر کچھ شبہ سا ہوا تھا۔"

"میں نے بھی اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "اسی لئے میں درختوں اور جھاڑیوں میں چھپ کر تم لوگوں کی نگرانی کرتا ہوا آرہا تھا۔ تم اس لڑکے کو لے کر چلی جاؤ۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔"

حارہ کاشی وجدان کو لے کر کاٹیج میں آگئی۔ پرتاب سنگھ کاٹیج کے سامنے کھلی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دونوں بھی اس کے پاس بیٹھ گئے۔ حارہ کاشی نے اس عورت کے بارے میں بتایا تو پرتاب سنگھ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"اس کا حلیہ بتاؤ۔ اس ... یہاں پر چھوٹا سا تل تو نہیں تھا؟" پرتاب سنگھ نے ہونٹوں کے گوشے پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" حارہ کاشی نے نفی میں سرہلا دیا اور اس عورت کا پورا حلیہ بتانے لگی۔

"میں نے اسپتال میں سوتر سنگھ کے کمرے سے جس عورت کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا اس کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن اس کے ہونٹوں کے گوشے پر سیاہ تل تھا اور بال گولڈن تھے لیکن تم نے اس کے قد و قامت اور چہرے کے جو نقوش بتائے ہیں اس پر مجھے شبہ ہورہا ہے۔ کہاں دیکھا تھا تم نے اسے؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

"اس طرف، ندی کے قریب۔" حارہ کاشی نے اشارے سے بتایا۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" پرتاب سنگھ اٹھ کر اسی طرف چل پڑا۔ اس کی واپسی تقریباً دو گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ کافی دور تک کا چکر لگا کر آیا تھا لیکن وہ عورت اسے کہیں نظر نہیں آئی تھی۔

حارہ کاشی کے علاوہ پرتاب سنگھ کو بھی شبہ ہوچکا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔ رات کو زیادہ خطرہ ہوسکتا تھا۔ پرتاب سنگھ کو شبہ تھا کہ اگر دارا کے آدمی اس جزیرے پر پہنچ گئے ہیں تو وہ رات کو کسی وقت کاٹیج پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ حارہ کاشی کے ساتھیوں نے چینی ساختہ اے۔ کے ۴۷ سب مشین گنیں نکال لی تھیں اور وہ رات بھر کاٹیج کے آس پاس ٹہلتے ہوئے پہرا دیتے رہے۔ معمولی سی آہٹ یا جھاڑیوں کی ذرا سی سرسراہٹ پر بھی وہ چونک پڑتے لیکن کچھ نہیں ہوا۔ رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح ہوتے ہی پرتاب سنگھ نے اپنے پروگرام پر عمل شروع کردیا۔ وہ وجدان کو لے کر کاٹیج سے نکل گیا۔ حارہ کاشی بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ کاٹیج کے آس پاس جوگنگ کرتے رہے پھر ایک جگہ رک کر ایکسرسائز شروع کردی۔ وجدان نے ٹھیک کہا تھا کہ ٹانگ کے زخم کی وجہ سے پرتاب سنگھ زیادہ نہیں دوڑ سکے گا۔ زخم اوپر سے اگرچہ ٹھیک ہوچکا تھا لیکن اسے تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ ایکسرسائز کی ذمے داری حارہ کاشی نے سنبھال لی۔ پرتاب سنگھ ایک طرف بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

ناشتے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد مارشل آرٹ کی کلاس شروع ہوگئی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے قدرے کھلی جگہ کا انتخاب کیا تھا جو کاٹیج سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ حارہ کاشی وجدان کو سامنے کھڑا کرکے اس حربی فن کے بارے میں لیکچر دے رہی تھی اور پرتاب سنگھ ایک پتھر پر بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔

دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پرتاب سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ مغرب کی طرف سبزے سے ڈھکی ہوئی ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے اس پہاڑی پر کچھ نقل و حرکت محسوس کی تھی اور یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس جزیرے پر بھی سیاحوں کی آمدورفت تھی اور وہ سیر کے لئے کسی بھی طرف جاسکتے تھے۔

حارہ کاشی اب وجدان کو اسٹریچنگ (پٹھوں کے پھیلاؤ) کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اسٹریچنگ کو مارشل آرٹس میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ جسم میں جتنی زیادہ لچک ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ یہ فن سیکھنے میں آسانی ہوگی بلکہ حریف پر حملہ آور ہونے کی قوت میں بھی اضافہ ہوگا۔ وجدان زمین پر بیٹھا اپنی دونوں ٹانگوں کو دائیں بائیں پھیلانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس پوزیشن میں بیٹھی ہوئی حارہ کاشی اسے بتا رہی تھی کہ ٹانگوں کو کس طرح زیادہ سے زیادہ اسٹریچ کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی ٹانگیں نوے کے زاویے پر پھیلا رکھی تھیں۔ پرتاب سنگھ دلچسپ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

فضا اچانک ہی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ وجدان کے پیچھے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر ایک پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

حارہ کاشی اور پرتاب سنگھ بیک وقت وجدان کی طرف لپکے تھے۔ حارہ کاشی زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی تھی۔ وہ ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں وجدان کے قریب پہنچ گئی اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی ٹھیک اسی جگہ پر لگی تھی جہاں ایک سیکنڈ پہلے وجدان بیٹھا ہوا تھا۔

پرتاب سنگھ نے دوڑ کر وجدان کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ دونوں اسے گھسیٹتے ہوئے ایک پتھر کے پیچھے جاگرے۔ گولیاں اب اس پتھر پر لگ رہی تھیں اور پتھر کے ٹکڑے اڑ اڑ کر فضا میں بکھر

رہے تھے۔

فائرنگ ایک لمحے کو تھمی۔ پرتاب سنگھ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اسے پہاڑی پر ایک جگہ چمک سی نظر آئی۔ وہ غالباً کسی رائفل کی نال تھی جو دھوپ میں چمکی تھی۔ اسی لمحے فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ پرتاب سنگھ اگر پھرتی سے نیچے نہ جھک جاتا تو اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ جاتے۔ گولی اس کے اوپر سے ہوتی ہوئی پیچھے ایک درخت کے تنے میں پیوست ہو گئی تھی۔

پرتاب سنگھ نے گردن گھما کر دیکھا۔ حارہ کاشی نے وجدان کو اپنے نیچے دبا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی نظر آ رہا تھا۔ پرتاب نے غیر ارادی طور پر قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا لیا۔ حارہ کاشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"ان کی فائرنگ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے ہو؟" وہ پرتاب سنگھ کی طرف دیکھ کر بولی۔

پرتاب سنگھ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر کو گھور کر دیکھا اور اسے ایک طرف اچھال دیا اور ٹھیک اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ گولی زمین پر اسی جگہ لگی تھی جہاں پتھر گرا تھا۔

"بڑے پکے نشانچی ہیں بھئی یہ تو۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "ہم تو یہاں سے ہٹ بھی نہیں سکتے۔ پر ہمارے بندے کہاں چلے گئے ہیں؟"

اس کا جملہ مکمل ہوتے ہی کاٹیج کے قریب بھی دو مختلف جگہوں سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ ان کے محافظوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔

پہاڑی سے فائرنگ کا رخ اب بدل گیا تھا۔ پرتاب سنگھ نے چند لمحے انتظار کیا اور پھر سر اٹھا کر پہاڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ پہاڑی تین چار سو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہاں درختوں میں ایک جگہ سے فائر ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ فائرنگ کرنے والا اکیلا تھا جبکہ نیچے سے تین مختلف جگہوں سے جواب دیا جا رہا تھا۔

پہاڑی سے فائرنگ رک گئی۔ حارہ کاشی وجدان کے اوپر سے ہٹ گئی۔ اس نے وجدان کا ہاتھ پکڑا اور اٹھ کر تیزی سے گنجان درختوں کی طرف دوڑی۔ اس مرتبہ ان پر فائرنگ نہیں کی گئی۔ چند سیکنڈ بعد پرتاب سنگھ بھی دوڑتا ہوا ان کے قریب آ گیا اور وہ کہیں رکے بغیر گنجان درختوں میں کاٹیج کی طرف دوڑنے لگے۔

جزیرے پر تقریباً آدھے گھنٹے تک فائرنگ ہوتی رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ دو محافظ واپس آ گئے جبکہ تیسرا جنگل میں گھوم پھر کر فائرنگ کرنے والے کو تلاش کرتا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد اس نے واپس آ کر بتایا کہ ایک عورت اور دو آدمیوں کو ایک موٹر بوٹ پر وہاں سے کچھ دور ایک اور چھوٹے جزیرے کی طرف فرار ہوتے دیکھا گیا ہے۔

اس نئی صورت حال نے پرتاب سنگھ کو پریشان کر دیا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا کو یہاں ان کی موجودگی کا پتا [illegible] تھا اور اس نے وجدان کو ختم کرنے کے لئے اپنے کرائے کے غنڈے یہاں بھی بھیج دیئے تھے۔ حارہ کاشی نے کل صبح جس [illegible] کے بارے میں بتایا تھا' پرتاب سنگھ کو اب یقین ہو چکا تھا کہ [illegible] عورت تھی جس نے نرس کے بھیس میں سوتر سنگھ کو زہر کا انجکشن لگایا تھا۔ اس نے کل صبح ان لوگوں کا سراغ لگانے کے بعد [illegible] ساتھیوں کو اطلاع دے دی تھی۔ پرتاب سنگھ کو توقع تھی کہ [illegible] رات ہی گڑبڑ ہوگی لیکن وہ لوگ شاید کسی بہتر موقع کی تلاش [illegible] تھے اور آج انہیں موقع مل گیا تھا۔ پہاڑی سے فائرنگ کر[illegible] ایک ہی آدمی تھا۔ اس نے وجدان کو نشانہ بنانے کی کوشش [illegible] لیکن قسمت اچھی تھی کہ وجدان اس مرتبہ بھی بال بال بچ گیا [illegible]

وائرلیس پر انسپکٹر چیانگ شو کو صورتِ حال سے آگاہ [illegible] گیا۔ ایک گھنٹے بعد تین موٹر بوٹس جزیرے کی طرف آتی ہوئی [illegible] آئیں۔ تینوں بوٹس پر پولیس کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک [illegible] تو اسی طرف آ گئی اور دو بوٹس اس جزیرے کی طرف چلی گئیں [illegible] کے بارے میں انسپکٹر چیانگ شو کو اطلاع دی گئی تھی کہ ایک [illegible] موٹر بوٹ اس طرف گئی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد انسپکٹر چیانگ شو درجن بھر مسلح سپاہی[illegible] کے ساتھ دوڑتا ہوا کاٹیج کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے ایک بار [illegible] پرتاب سنگھ اور اپنے آدمیوں سے صورتِ حال معلوم کی اور [illegible] اس کے مسلح سپاہی پورے جزیرے پر پھیل گئے۔

اس جزیرے پر سیاحوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ جب [illegible] فائرنگ ہوئی تھی تو سیاح اپنی تفریحی سرگرمیوں میں مصروف [illegible] بعض لوگ ساحل پر پیراکی میں مشغول تھے اور بعض ریت پر [illegible] سن باتھ لے رہے تھے۔ فائرنگ سے خوفزدہ ہو کر وہ لوگ [illegible] ہاؤسز میں جمع ہو گئے تھے۔

پولیس نے پورے جزیرے کو چھان مارا۔ کوئی مشتبہ [illegible] نہیں ملا۔ دوسرا جزیرہ وہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر [illegible] اس طرف سے ہوا کے دوش پر آنے والی فائرنگ کی آوازوں [illegible] اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں پولیس اور ان لوگوں میں تصادم ہو گیا تھا [illegible] بالآخر فائرنگ کی یہ آوازیں بند ہو گئیں۔ اس کے تقریباً ڈیڑھ [illegible] بعد پولیس کی دونوں موٹر بوٹس اس طرف آتی ہوئی نظر آئیں۔

مزید آدھے گھنٹے بعد وہ پولیس والے کاٹیج میں پہنچ گئے [illegible] پولیس والے نے کندھے پر کسی عورت کو لاد رکھا تھا۔ وہ زخمی [illegible] اور اس کے زخم سے بہنے والے خون سے پولیس والے کی [illegible] بھی تر ہو رہی تھی۔ اس نے عورت کو کاٹیج کے برآمدے میں [illegible] پر لٹا دیا۔ وہ بے ہوش تھی۔

اس عورت کا چہرہ دیکھ کر حارہ کاشی' وجدان اور پرتاب [illegible] اچھل پڑے۔ یہ وہی خوب صورت عورت تھی جو کل صبح حارہ [illegible] اور وجدان کو جنگل میں ملی تھی۔

"وہی ہے۔ رب دی سوں وہی ہے۔" پرتاب سنگھ چیخا۔ "یہ وہی نرس ہے جس نے سوتر سنگھ کو زہر کا انجکشن لگایا تھا۔ اس وقت اس کے بال گولڈن تھے اور ہونٹ کے گوشے پر تل تھا لیکن بالوں کی رنگت تبدیل ہونے اور تل کے نہ ہونے سے اس کی اصلیت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہی ہے۔"

اس عورت کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور شاید خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ حارہ کاشی دوڑ کر اندر سے فرسٹ ایڈ باکس لے آئی اور زخم صاف کر کے ڈریسنگ کرنے لگی۔ فوری طور پر یہی کیا جا سکتا تھا کہ مزید خون نہ بہنے پائے۔ مزید پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ ہوش میں آ گئی۔ خون بہہ جانے اور خوف کی وجہ سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اپنے اردگرد پولیس والوں اور خاص طور پر پرتاب سنگھ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشت پھیلتی چلی گئی۔ وجدان بھی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"کل صبح تو تم بہت مزے مزے کی باتیں کر رہی تھیں آنٹی لیکن تم تو بہت خطرناک نکلیں۔" وجدان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

وہ مائے فانگ تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور وحشت زدہ سی نظروں سے اپنے اردگرد کھڑے ہوئے پولیس والوں کو دیکھنے لگی اور پھر اچانک اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس کی نظریں ایک پولیس والے کے ہولسٹر میں لگے ہوئے ریوالور پر جم کر رہ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلی اور پولیس والے کے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے وجدان کو پکڑ کر اپنی گود میں گرا لیا تھا۔

"دور ہٹ جاؤ۔ تم لوگ دور ہٹ جاؤ ورنہ میں اس کو مار دوں گی۔" اس صورتِ حال سے ماحول پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا۔ پرتاب سنگھ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے خیال میں مائے فانگ کے اس اقدام میں جرأت اور بہادری کو دخل نہیں تھا۔ وہ چاروں طرف سے پولیس میں گھری ہوئی تھی۔ اس پر سوتر سنگھ کے قتل کا الزام تھا وہ اور بھی بہت سے سنگین جرائم میں ملوث تھی۔ اسے اپنے سامنے موت نظر آ رہی تھی اور اس نے یہ قدم انتہائی مایوسی کی کیفیت میں اٹھایا تھا کہ شاید اس طرح بچنے کا موقع مل جائے۔

پولیس والوں نے رائفلیں سیدھی کرنا چاہیں مگر انسپکٹر چیانگ شو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا۔ اس کی عقابی نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مائے فانگ کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کا سیفٹی کیچ لگا ہوا تھا۔ وہ شاید پستول یا ریوالور کا استعمال نہیں جانتی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ محض ٹریگر دبا دینے سے گولی چل جاتی ہے۔ اگر وہ ریوالور کے استعمال سے واقف ہوتی تو ریوالور ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے سیفٹی کیچ چیک کرتی۔

"دیکھو۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔ "تم اپنے لئے مزید مشکلات پیدا کر رہی ہو۔ تم گولی نہیں چلا سکتیں۔ تمہارا صرف ہاتھ ہی نہیں' پورا جسم کانپ رہا ہے۔ اس لڑکے کو چھوڑ دو اور ریوالور مجھے دے دو۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"عقل کے ناخن لو لڑکی۔" اس مرتبہ پرتاب سنگھ بولا۔ "اگر تم نے اس لڑکے کو گولی مار دی تو درجنوں گولیاں تمہارے جسم میں پیوست ہو جائیں گی۔ زندگی ہر حال میں موت سے بہتر ہوتی ہے۔ ریوالور پھینک دو۔"

"دور ہٹ جاؤ مجھ سے۔ کوئی آگے نہ آئے۔" مائے فانگ چیخی۔

لیکن انسپکٹر چیانگ شو مزید ایک قدم آگے آ گیا۔ مائے فانگ خونخوار بلی کی طرح غرائی اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈال دیا مگر نہ تو ٹریگر دبا اور نہ ہی گولی چلی۔ وہ ٹریگر پر دباؤ ڈالنے لگی اور پھر انسپکٹر چیانگ شو اس پر جھپٹ پڑا۔

قریب کھڑی ہوئی حارہ کاشی نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر وجدان کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور اسے لے کر دوڑتی ہوئی کاٹیج میں گھس گئی۔

مائے فانگ کی یہ آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ انسپکٹر نے اس سے ریوالور چھین لیا اور دو پولیس والوں کو اشارہ کیا۔ وہ مائے فانگ پر جھپٹ پڑے اور اس کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر ہتھ کڑی پہنا دی۔

پرتاب سنگھ اندر دوڑ گیا۔ حارہ کاشی وجدان کو سینے سے لپٹائے کھڑی تھی۔ پرتب سنگھ نے وجدان کو اس سے لے کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ دوسری مرتبہ موت کے منہ سے نکلا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔

○☆○

"لگتا ہے' سنگاپور سے اب اپنا دانہ پانی ختم ہو چکا ہے اور ہمیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا۔" پرتاب سنگھ نے انسپکٹر چیانگ شو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں اس وقت پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم یہاں سے کدھر جائے گا؟" انسپکٹر چیانگ شو نے اسے گھورا۔ "وجدان کے لئے سب سے محفوظ جگہ سنگاپور ہے۔ یہاں پولیس اس کی حفاظت تو کرتی ہے۔ کسی دوسری جگہ جائے گا تو وہ آسانی سے مارا جائے گا۔"

"پولیس خاک حفاظت کر رہی ہے اس کی۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "پولیس کی موجودگی میں بھی اس پر بار بار حملے ہو رہے ہیں۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی ہے کہ اب تک بچتا رہا ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ پولیس اب تک دارا کا سراغ نہیں لگا سکی۔ وہ ایک پراسرار طاقت بن گیا ہے۔ اس کے آدمی ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔"

"تم جانتے ہو کہ پولیس ہمیشہ سے مستعد رہی ہے۔" چیانگ شو نے جواب دیا۔ "کل لازارس آئی لینڈ پر پکڑے جانے کے بعد مائے فانگ نے کچھ سنسنی خیز انکشافات کئے تھے۔ دارا کو ان لوگوں میں سے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس کا تعلق کم سے ہے اور یہ لوگ کم کے لئے کام کر رہے ہیں۔ مائے فانگ کی نشان دہی پر گزشتہ رات ہم نے کم کے خفیہ اڈے پر چھاپا مارا تھا لیکن وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اس کے نائٹ کلب پر بھی چھاپا مارا گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں ملا۔ پولیس اسے تلاش کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔"

"جب تک کم اور دارا نہیں پکڑے جائیں گے اس وقت تک لڑکے کی جان خطرے میں رہے گی۔ خوف و دہشت سے تو وہ ویسے ہی آدھا ہو گیا ہے۔ وہ ایک بہادر لڑکا ہے۔ اب تک اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے ہے لیکن اس سے پہلے کہ اس کی ہمت جواب دے جائے' میں اسے یہاں سے لے کر چلا جاؤں گا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

"کہاں جاؤ گے؟ اس کے لئے خطرہ تو ہر جگہ موجود ہے۔" چیانگ شو بولا۔

"کچھ عرصے کے لئے ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں وہ خطرات سے محفوظ رہے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔

"پرتاب سنگھ۔" انسپکٹر چیانگ شو اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تم کو اس لڑکے کا اتنا زیادہ فکر کیوں ہے۔ اس کے لئے تم نے اپنا کاروبار سے توجہ چھوڑ دیا۔ اپنا جان کو خطرے میں ڈالا۔ دشمنی مول لیا۔ کیوں؟"

"تم اچھی طرح جانتے ہو کہ عابد علی میرا دوست تھا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "ان میاں بیوی کے قتل کے بعد وجدان اکیلا رہ گیا ہے۔ ایک دوست ہونے کے ناتے میرا فرض ہے کہ اس کی مدد کروں۔ ہم جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں' وہاں رشتوں ناتوں اور دوستی کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ہم لوگ تو دوستی پر اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔"

"دوستی پر یا دولت پر؟" چیانگ شو نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"دولت!" پرتاب سنگھ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہ سب کچھ اس کی دولت ہتھیانے کے لئے کر رہا ہوں۔ عابد علی کی جائداد کتنی ہو گی۔ ایک مکان اور ایک دکان اور چند ہزار کا بینک بیلنس جبکہ......"

"میں اس جائداد کی بات نہیں کر رہا۔" چیانگ شو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ پانچ کروڑ روپے مالیت کے سونے کا بھی کوئی معاملہ ہے۔"

"سونا۔" پرتاب سنگھ اچھل پڑا۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور چیانگ شو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ تم میرے کاروبار سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ تمہارے خیال میں اس وقت میری مالی حیثیت کیا ہو گی؟"

"تم بیس پچیس کروڑ ڈالر کا اسامی تو ہو۔" چیانگ شو مسکرایا۔

"تو پھر پانچ کروڑ کے سونے کی میرے نزدیک کیا حیثیت ہے۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں دولت کے لئے وجدان کا ساتھ دے رہا ہوں۔"

"مجھے تمہاری نیت پر کوئی شبہ نہیں۔" چیانگ شو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن یہ پانچ کروڑ کے سونے کا قصہ ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟" پرتاب سنگھ بولا۔

"حارہ کاشی' وجدان سے اس کے ماں باپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ اس سونے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن کسی وجہ سے بات پوری نہیں ہو سکی تھی۔ کیا قصہ ہے یہ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وجدان ایسا کوئی راز جانتا ہو اور وہ لوگ اس لئے بھی اسے ختم کرنا چاہتے ہوں؟"

"میرے خیال میں دارا کو یہ معلوم نہیں ہے کہ وجدان سونے کے راز سے واقف ہے۔ اگر اسے علم ہوتا تو وجدان کو ختم کرنے کے بجائے زندہ پکڑنے کی کوشش کی جاتی اور وہ سونا... اس کی حقیقت کچھ یوں ہے کہ......" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر عابد علی کی ڈائری کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ سونا اب بھی اسی جگہ موجود ہے جہاں عابد علی نے اسے چھپا دیا تھا۔ میں اسے حکومت پاکستان کی ملکیت سمجھتا ہوں اور میرے خیال میں اس میں سے کچھ حصہ وجدان کو بھی ملنا چاہیے۔"

"اس سونے کے بارے میں تم حکومت پاکستان کو اطلاع کیوں نہیں دے دیتے؟" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

"ابھی نہیں۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "جب تک وجدان کا کوئی بندوبست نہیں ہو جاتا اس وقت تک یہ راز ہی رہے گا کہ سونا کہاں ہے۔"

"او کے۔ تمہارا مرضی۔" انسپکٹر نے کندھے اچکائے۔ "لڑکا اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ محفوظ ہے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "میں پولیس کی کارکردگی سے بے حد مایوس ہو گیا ہوں اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ وجدان کی حفاظت میں خود کروں گا۔ او کے۔ اب میں چلتا ہوں۔ تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

پرتاب سنگھ پولیس اسٹیشن سے نکل آیا۔ اس وقت دوپہر کا ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دارا کے آدمی اب تاک میں بھی ہیں اور موقع ملتے ہی اسے بھی ٹھکانے لگا دیں گے۔ اس لئے وہ خاصا محتاط تھا۔ اس کی جیب میں ہر وقت پستول موجود رہتا تھا لیکن لازارس جزیرے پر مائے فانگ کے پکڑے جانے کے بعد پولیس واقعی کچھ زیادہ مستعد ہو گئی تھی۔ کئی جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے تھے۔ درجنوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ پولیس کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے عام جرائم پیشہ لوگ بھی محتاط ہو گئے تھے اور وہ بھی اپنی سرگرمیاں معطل کر کے روپوش ہو گئے تھے۔ پولیس نے ویسے تو کئی مشتبہ لوگوں کو پکڑا تھا لیکن اصل ملزم غائب ہو گئے تھے۔ کم کے گروہ کے ایک دو آدمی پکڑے بھی گئے تھے۔ انہوں نے کم کے بارے میں تو بتایا تھا لیکن دارا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ پرتاب سنگھ سڑک پر چلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر کم پکڑا جائے گا تو دارا تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا لیکن اصل مسئلہ تو کم کے پکڑے جانے کا تھا۔ وہ تو گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد پرتاب سنگھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائے کاٹ ایونیو پر واقع ٹینگ لن کلب آ گیا۔

ڈائننگ ہال میں زیادہ گاہک نہیں تھے۔ وہ کونے کی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک باوردی ویٹر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ پرتاب سنگھ نے مینو دیکھ کر کھانے کا آرڈر نوٹ کرا دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ویٹر میز پر کھانا سرو کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا جسے پرتاب سنگھ بڑے غور سے سن رہا تھا۔

"سردار جی۔ وہ لڑکا بہت تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے' چاچا کے پاس لے کر چلو۔ آج صبح کو وہ گھر سے نکل بھی گیا تھا۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اسے واپس لے گیا تھا۔"

"اس وقت گھر میں کون ہے؟" پرتاب سنگھ نے ایک پلیٹ اپنی طرف سرکاتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"سب لوگ گھر میں ہیں جی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے گلاب سنگھ بھی آ گیا تھا۔ شاید اس کے ساتھ دل لگ گیا ہو۔" ویٹر نے جواب دیا۔

"تم گھر کس وقت جاؤ گے؟" پرتاب سنگھ نے پوچھا۔

"ویسے تو میری چھٹی چھ بجے ہو گی لیکن اس سے پہلے ایک چکر تو لگا آؤں گا۔" ویٹر نے جواب دیا۔

"اس سے کہنا' میں آج رات کو آؤں گا۔" پرتاب سنگھ نے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ویٹر کچھ دیر وہاں کھڑا رہا جیسے کسی آرڈر کا منتظر ہو پھر واپس چلا گیا۔

وہ ویٹر بھی سکھ ہی تھا۔ پرتاب سنگھ کے باپ کے دوست کھارا سنگھ کا بیٹا' کھارا سنگھ اور پرتاب سنگھ کے باپ گورکھ سنگھ کی دوستی بڑی پرانی تھی۔ کھارا سنگھ بھی ٹینگ لن کلب ہی میں ملازم تھا۔ کھارا سنگھ کے انتقال کے بعد اوتار سنگھ کو اس کلب میں نوکری مل گئی تھی اور رہائش کے لئے وہ کوارٹر بھی جہاں پہلے سے ان کی رہائش تھی۔

اوتار سنگھ سے پرتاب سنگھ کی ملاقات کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ جزیرے سے واپس آنے کے بعد پرتاب سنگھ کے ذہن میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ کیوں نہ وجدان کو چند روز کے لئے اوتار سنگھ کے گھر چھوڑ دیا جائے۔ وہاں کسی کو شبہ بھی نہیں ہو گا اور پھر اسی رات وہ وجدان کو لے کر ٹینگ لن کلب کے عقب میں واقع ملازمین کے رہائشی کوارٹروں والے حصے میں پہنچ گیا تھا۔ کوارٹروں کے سامنے وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا اور کمپاؤنڈ میں کوئی نہیں تھا۔ پرتاب نے اوتار سنگھ کے دروازے کی بیل بجائی تو باہر اوتار سنگھ ہی آیا تھا۔ پرتاب سنگھ وجدان کو لے کر اندر آ گیا تھا اور سرگوشیوں میں اوتار سنگھ کو سمجھانے لگا کہ وجدان دو تین دن اس کے ہاں رہے گا۔

اوتار سنگھ بدحواس سا ہو گیا تھا۔ وجدان کے حوالے سے جو ہنگامے ہو رہے تھے وہ ان سے واقف تھا۔ آئے دن اخبارات میں خبریں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ عابد علی کے دشمن موت کے سائے کی طرح وجدان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس پر کئی قاتلانہ حملے ہو چکے تھے۔ اس چکر میں پرتاب سنگھ کے دو بندے بھی مارے جا چکے تھے۔ اوتار سنگھ ایسی کوئی ذمے دار قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"کوئی نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے درمیان کچھ تعلقات ہیں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "کسی کو شبہ بھی نہیں ہو گا کہ وجدان یہاں ہے اور یہاں تو اسے کوئی جانتا بھی نہیں۔ بس دو تین دن کی بات ہے۔ اس کے بعد میں اسے لے جاؤں گا۔"

اوتار سنگھ بڑی مشکل سے آمادہ ہوا تھا۔ پرتاب سنگھ نے اسے کچھ رقم بھی دی تھی۔ اور پرتاب سنگھ آج تیسرے دن یہاں آیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسی قسم کی بات سننے کو ملے گی۔ اوتار سنگھ کے گھر والے وجدان کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ وہ یقیناً خود بھی پریشان ہو رہا ہو گا اور دوسروں کو بھی پریشان کر رہا ہو گا۔

پرتاب سنگھ کھانا کھانے کے بعد بھی تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھا رہا اور پھر کلب سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھا اور سیدھا اپنے گھر آ گیا۔ وہ اپنے گھر میں کئی روز بعد آیا تھا۔ ہر چیز پر دھول جمی ہوئی تھی۔ وہ آتے ہی صفائی میں مصروف ہو گیا اور پھر اس کام سے فارغ ہو کر برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

وجدان کے بارے میں سوچ سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ سنگاپور میں وہ بالکل محفوظ نہیں تھا۔ اب تک تو قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ بچتا رہا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ قسمت ہر مرتبہ اس پر مہربان رہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ وجدان کو لے کر بنکاک چلا جائے جہاں اس کے کچھ جاننے والے بھی موجود تھے۔ وہ وجدان کو وہاں چھوڑ کر واپس آ جائے گا اور

جب دارا کا معاملہ نمٹ جائے گا تو وجدان کو واپس لے آئے گا۔

پولیس ابھی تک کوئی خاطر خواہ کارکردگی نہیں دکھا سکی تھی۔ پرتاب سنگھ خود کوئی جوابی کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن وجدان اس کے پاؤں کی بیڑی بنا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے بھی وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ وجدان یہاں نہیں ہوگا تو اسے کھل کر کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور فون کا ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملانے لگا۔ رابطہ قائم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

"بھائی خشونت سنگھ، میں پرتاب بول رہا ہوں۔" وہ دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سن کر بولا۔ "آج رات تم لوگوں کا کہیں جانے کا پروگرام تو نہیں؟"

"نہیں۔ فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"میں آج رات کا کھانا تمہارے ہاں کھاؤں گا۔ اسی وقت باتیں بھی ہوں گی۔ اچھا۔ رب راکھا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

اس نے الماری میں رکھا ہوا براؤن رنگ کا ایک بریف کیس نکالا اور مختلف جگہوں سے اپنے اہم اور ضروری کاغذات نکال کر بریف کیس میں رکھنے لگا۔ عابد علی کی ڈائری بھی اس نے بریف کیس میں رکھ لی اور پھر وہ مختلف جگہوں پر فون کرنے لگا۔

جب وہ گھر سے باہر نکلا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گلی میں ایک دو آدمیوں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کچھ دیر تک ان سے گپ شپ کرتا رہا پھر گلی سے نکل کر پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔ وہ فورٹ کیننگ روڈ سے ہوتا ہوا پیننگ لین پر آگیا جہاں ریڈ کراس ہاؤس کے سامنے سے اسے ایک ٹیکسی مل گئی۔ ڈرائیور ایک ادھیڑ عمر مسلمان تھا۔ پرتاب سنگھ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اسے صوفیہ روڈ چلنے کو کہہ دیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"کس طرف جانا ہے سردار جی؟"

ڈرائیور کی آواز سن کر پرتاب سنگھ نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ وہ صوفیہ روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ ایک بلند عمارت کو دیکھ کر اس نے ڈرائیور کو عمارت کے ساتھ بائیں طرف والی سڑک پر گاڑی موڑنے کو کہہ دیا۔

سڑک پر آگے بلند عمارتیں تھیں اور ان کی پچھلی طرف بنگلے تھے۔ دو تین سڑکوں پر مڑنے کے بعد اس نے ایک گلی میں ٹیکسی رکوا لی اور کرایہ دے کر نیچے اتر آیا۔ اس وقت ایک اور کار گلی میں مڑی تھی۔ وہ کار ہلکی رفتار سے چلتی ہوئی قریب سے گزر گئی۔ پرتاب سنگھ نے اس پر توجہ نہیں دی اور چند گز آگے بڑھ کر ایک بنگلے کے گیٹ پر لگی ہوئی کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

یہاں تمام بنگلوں کے سامنے کشادہ لان تھے۔ بعض لوگوں نے اپنے بنگلوں کے لان کے آگے لکڑی کی چھڈیوں کی جافری لگا رکھی تھی اور بعض نے خاردار تاروں کے جنگلے کھینچ رکھے تھے۔ پرتاب سنگھ نے جس بنگلے کی ڈور بیل بجائی تھی اس کے سامنے جافری لگی ہوئی تھی۔ تقریباً ایک منٹ بعد ایک جوان اور خوبصورت لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ خشونت سنگھ کی بیٹی ارملا کور تھی۔

پرتاب سنگھ اس کے ساتھ اندر آگیا۔ خشونت سنگھ کسی کام سے گیا ہوا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھی آگیا اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میز پر کھانا لگا دیا گیا۔

خشونت سنگھ ایک بزنس مین تھا۔ ارملا کور اس کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی عمر انیس بیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی ماں رجنی بھی صحت مند خوبصورت عورت تھی۔ وہ چاروں کھانے کی میز پر باتیں کرتے رہے۔ ان کی گفتگو کا موضوع وجدان ہی تھا۔

"اب مجھے پولیس پر بھی بھروسا نہیں رہا۔" پرتاب سنگھ کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اسے کچھ عرصے کے لئے تھائی لینڈ لے جاؤں۔ بنکاک میں میرے کچھ جاننے والے ہیں۔ وجدان کو ان کے پاس چھوڑ کر واپس آجاؤں گا اور دارا وغیرہ سے حساب برابر کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"اس وقت وہ لڑکا کہاں ہے؟" رجنی نے پوچھا۔

"اوتار سنگھ کے پاس۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "اس کا دو کمروں کا چھوٹا سا کوارٹر ہے۔ وہاں وہ گھبرا گیا ہے اور ان لوگوں کو بھی پریشان کر رہا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ اسے ایک دو دن کے لئے یہاں لے آؤں، تمہارے پاس۔ میں اس دوران میں تیاری کر لوں گا اور پھر اسے لے کر چلا جاؤں گا۔"

رجنی اور خشونت سنگھ جانتے تھے کہ وجدان کو اپنے گھر میں پناہ دینا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر رجنی پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہم اتنے سنگ دل نہیں ہیں جیٹھ جی۔ وہ بن ماں باپ کا معصوم بچہ ہے۔ مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے۔ اگر ہماری وجہ سے اسے کچھ سکھ پہنچ سکتا ہے تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔"

"خش کیتا ای پابھو۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "رب تینوں خوش رکھے۔ میں آدھی رات کے بعد کسی وقت اسے لے آؤں گا۔ ارملا کے ساتھ اس کا دل لگا رہے گا۔ بس ایک دو دن کی بات ہے۔"

"جتنے دن مرضی رہے جی۔ رب اسے سلامت رکھے۔" رجنی نے کہا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ لوگ لان میں آکر بیٹھ گئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سوا بارہ بجے کے قریب پرتاب سنگھ اٹھ گیا۔

"میں تمہاری گاڑی لے کر جا رہا ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔" اس نے خشونت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

خشونت سنگھ کی گاڑی باہر ہی کھڑی تھی۔ اس نے چابی پرتاب سنگھ کے حوالے کر دی اور پرتاب سنگھ کے ساتھ ہی وہ بھی باہر آگیا تھا۔

پرتاب سنگھ تقریباً چالیس منٹ بعد ٹینگ لن کلب پہنچا تھا۔ اس نے گاڑی کلب کی پچھلی طرف ایک تنگ سی سڑک پر روکی اور نیچے اتر کر رہائشی کوارٹروں والے کمپاؤنڈ میں داخل ہو گیا۔ وہ تقریباً دس منٹ وہاں رکا تھا اور پھر وجدان کو لے کر باہر آگیا۔

"تم پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "ہو سکتا ہے راستے میں کسی کی نظر تم پر پڑ جائے اس لئے احتیاط ضروری ہے۔"

وجدان پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا اور پرتاب سنگھ انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ماؤنٹ الزبتھ روڈ پر آگئی۔ وہاں سے اس نے گاڑی کو جیسے ہی کیم ہل سرکل کی طرف موڑا، وجدان اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ سڑک تو سنسان پڑی ہے چاچا۔ یہاں مجھے کون دیکھے گا۔" وہ بولا۔

پرتاب سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن چند لمحوں بعد ہی وہ عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھ کر چونک گیا۔ وہ گاڑی بڑی تیزی سے قریب آرہی تھی۔

"سیٹ پر لیٹ جاؤ کاکے۔ جلدی کرو اور اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔" پرتاب سنگھ نے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پتلون کی جیب سے پستول بھی نکال لیا تھا۔

وہ گاڑی بڑی تیزی سے قریب آرہی تھی۔ پرتاب سنگھ نے گردن گھما کر دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ گاڑی کی کھڑکی میں اسے رائفل کی نال نظر آگئی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے بڑی پھرتی سے نیچے جھک کر پوری قوت سے بریک پیڈل دبا دیا۔

کار بریک کی تیز چرچراہٹ کی آواز سے لہراتی ہوئی سڑک کے کنارے کی طرف مڑ گئی۔ عین اسی لمحے فضا فائرنگ سے گونج اٹھی لیکن یہاں بھی قسمت نے پرتاب سنگھ اور وجدان کا ساتھ دیا وہ گاڑی جیسے ہی برابر پہنچی تھی، اس کا اگلا ایک پہیا سڑک پر پڑے ہوئے ایک پتھر پر پڑا تھا جس سے گاڑی اچھل گئی اور اس کار سے چلائی جانے والی گولیاں پرتاب کی گاڑی کے اوپر سے گزر گئی تھیں۔

پرتاب سنگھ نے بڑی پھرتی سے اپنی گاڑی سنبھال لی۔ اسی دوران میں دوسری کار پتھر پر سے اچھل کر غالباً ڈرائیور سے بے قابو ہو گئی تھی اور وہ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کار سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی پلیا کی ریلنگ سے ٹکرا کر گھوم گئی۔

پرتاب سنگھ نے اپنی گاڑی سنبھالتے ہی پستول والا ہاتھ باہر نکال کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی دوسری کار کے آگے والے پہیے پر لگی۔ ٹائر پھٹنے کا زوردار دھماکا ہوا تھا۔

"کاکے۔ سیٹ پر لیٹے رہنا۔ اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔" پرتاب سنگھ نے چیختے ہوئے کہا اور اسٹیئرنگ گھما دیا۔

کار کو جھٹکے لگنے سے وجدان سیٹ سے لڑھک کر آگے گر گیا تھا۔ ایک زوردار جھٹکا اور لگا تو اس کا سر اگلی سیٹ کے بیس سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا کاکے؟" پرتاب سنگھ چیخا۔

"کچھ نہیں چاچا۔ چوٹ لگ گئی ہے۔" وجدان نے جواب دیا۔

پرتاب سنگھ گاڑی کو گھما کر سڑک پر لے آیا۔ گاڑی کا رخ اس طرف تھا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ پرتاب سنگھ نے ہاتھ پیچھے گھما کر دوسری کار کی طرف ایک اور فائر کر دیا اور اسٹیئرنگ سنبھال کر ایکسیلیٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا۔

گاڑی بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی اور پھر اسی لمحے عقب سے فائرنگ ہونے لگی مگر ان کی کار فائرنگ کی رینج سے بہت دور نکل چکی تھی۔ اگلے موڑ پر پرتاب سنگھ نے کار سانڈرز روڈ پر گھما لی اور ایک اور سڑک پر ہوتا ہوا کونج روڈ پر نکل آیا۔

"اب میں اٹھ جاؤں چاچا؟" پچھلی سیٹ کے سامنے پر پڑے ہوئے وجدان نے کہا۔

"اٹھ جا یار۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ وجدان اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا اور سر پر لگنے والی چوٹ سہلانے لگا۔ پرتاب سنگھ گاڑی کو کلی مینسی ایونیو سے گھماتا ہوا صوفیہ روڈ کی طرف لے آیا اور پھر خشونت سنگھ کے بنگلے تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

خشونت سنگھ، اس کی بیوی اور بیٹی ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ رجنی نے وجدان کو سینے سے لپٹا لیا۔

"جیٹھ جی۔ کیا بات ہے۔ لڑکا کچھ سہما ہوا سا لگ رہا ہے۔" رجنی نے پرتاب سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بہت بہادر لڑکا ہے پابھو۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی موت سے مقابلہ کر کے آیا ہے۔ اس نے اتنی سی عمر میں اور اتنے مختصر عرصے میں موت کو اتنی بار شکست دی ہے کہ اس کا نام تو گنیز بک آف ریکارڈز میں آنا چاہیے۔"

خشونت سنگھ چونک گیا۔ وہ اس واقعے کی تفصیل پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں۔ ان کم بختوں کو کیسے پتا چل گیا کہ میں اسے وہاں سے لے کر نکل رہا ہوں۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ کار ٹینگ لن کلب سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ بھلا ہو اس پتھر کا جو عین وقت پر کار کے پہیے کے نیچے آگیا تھا اور کار اچھل گئی تھی۔ ورنہ ہم دونوں کے ساتھ تمہاری کار بھی چھلنی ہو چکی ہوتی۔"

"کار پر لعنت بھیجو جی۔ تم دونوں کی جان بچ گئی۔ رب کا شکر

ادا کرو۔" خشونت سنگھ نے کہا پھر بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم لڑکے کو کمرے میں لے جاؤ جی..... سلا دو اسے..... دو بج گئے ہیں۔"

رجنی وجدان کو لے کر ایک بیڈ روم میں چلی گئی۔ ارملا بھی اٹھ گئی تھی۔ پرتاب سنگھ اور خشونت سنگھ نشست گاہ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

تقریباً تین بجے وہ اٹھ گئے۔ خشونت سنگھ اسے ایک کمرے میں لے آیا تھا جہاں ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ دونوں اسی بیڈ پر لیٹ گئے۔ خشونت سنگھ نے مرکزی ٹیوب لائٹ بجھا کر نائٹ بلب روشن کردیا تھا۔ پرتاب سنگھ نے پستول پتلون کی جیب سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

خشونت سنگھ تو لیٹتے ہی سو گیا مگر پرتاب جاگتا رہا۔ وہ آج کے واقعہ پر غور کرکے سوچ رہا تھا کہ اب اسے واقعی جلد سے جلد سنگاپور چھوڑ دینا چاہیے۔

اس وقت چار بجنے والے تھے کہ گلی میں ایک گاڑی کے رکنے کی آواز سن کر پرتاب سنگھ چونک گیا۔ وہ کروٹ کے بل بستر پر لیٹا رہا۔ وہ کوئی کار تھی جس کے دروازے کھلنے اور آہستگی سے بند ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے کوئی باہر سے گیٹ کھولنے کی کوشش کررہا ہو۔

پرتاب سنگھ بستر سے اٹھ گیا اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اچھل پڑا۔ ایک آدمی باہر سے گیٹ پر چڑھ رہا تھا۔ پرتاب سنگھ نے تیزی سے پلٹ کر تکیے کے نیچے رکھا ہوا پستول اٹھالیا اور خشونت سنگھ کو بھی جھنجوڑ کر جگا دیا۔

"میرا خیال ہے، وہ لوگ یہاں بھی پہنچ گئے۔" پرتاب سنگھ نے سرگوشی کی۔ "تمہارے پاس کوئی اسلحہ ہے تو نکال لو۔ ہم انہیں اندر نہیں گھسنے دیں گے۔"

خشونت سنگھ دوسرے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ پرتاب سنگھ نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ آدمی اندر کی طرف اتر کر گیٹ کھول رہا تھا۔ گیٹ کھلتے ہی دو اور آدمی اندر آگئے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی اور دو کے پاس ریوالور یا پستول۔ ان میں سے ایک آدمی اشارے سے اپنے ساتھیوں کو کچھ بتا رہا تھا۔ دو آدمی دائیں بائیں ہوگئے۔ تیسرا آدمی جیسے ہی آگے بڑھا پرتاب سنگھ نے اسے للکارا۔

"خبردار! آگے مت بڑھنا ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔"

وہ آدمی بڑی پھرتی سے زمین پر گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آواز کی سمت فائر کردیا تھا۔ گولی کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔

پرتاب سنگھ پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باہر کی طرف فائر بھی جھونک دیا تھا۔

باہر سے زبردست فائرنگ شروع ہوگئی۔ خشونت سنگھ دوسرے کمرے کی کھڑکی سے فائرنگ کررہا تھا۔

چند منٹ گزر گئے اور پھر اندر سے رجنی کی چیخ سن کر پرتاب سنگھ اچھل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوڑ کر راہداری میں آگیا اور رجنی والے بیڈ روم کی طرف لپکا۔

وہ منظر بہت ہی خوف ناک تھا۔ ایک دبلا پتلا چینی وجدان کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ رجنی وجدان سے لپٹی ہوئی تھی اور وجدان بھی چیخ رہا تھا۔ پرتاب سنگھ کو دیکھ کر چینی نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور چینی زبان میں کچھ چیخا بھی تھا مگر پرتاب سنگھ نے ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر فائر کردیا۔ گولی چینی کے سر میں لگی۔ اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے۔ خون کا فوارہ رجنی اور وجدان کے لباس کو تر کرنے لگا۔ چینی دروازے کے قریب ہی ڈھیر ہوگیا۔ پرتاب سنگھ نے اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور لاش کو گھسیٹ کر راہداری میں ڈال دیا۔

"پابھو۔ دروازہ اندر سے بند کرلو۔" وہ چیختا ہوا دوسری طرف دوڑا۔

خشونت سنگھ جگہ بدل بدل کر فائرنگ کرتے ہوئے حملہ آوروں کو روکے ہوئے تھا۔ باہر اب دو جگہ سے فائرنگ ہورہی تھی۔ پرتاب سنگھ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کا تیسرا ساتھی کسی طرح چھت پر چڑھ کر سیڑھیوں کے راستے اندر آنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس نے واجدان کو قبضے میں بھی کرلیا تھا۔ اگر پرتاب سنگھ کو وہاں پہنچنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو وہ یا تو وجدان کو گولی مار دیتا یا اسے گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوجاتا ہوتا۔

باہر سے اب داخلی دروازہ توڑنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ پرتاب سنگھ نے اندر سے دروازے پر دو تین فائر کردیے۔ پہلے ایک چیخ اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پرتاب سنگھ دوڑ کر کمرے کی کھڑکی میں پہنچ گیا۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا اور دوسرا لڑکھڑا کر گیٹ کے قریب گرا۔ آگے دوڑنے والا آدمی لوٹ کر واپس آیا اور اپنے ساتھی کو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ دوسری طرف سے خشونت سنگھ نے فائر کردیا تھا۔ اسی لمحے پولیس کے سائرن کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ وہ آدمی زمین پر گرے ہوئے ساتھی کو چھوڑ کر باہر دوڑا۔

باہر کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ ان کا ایک اور ساتھی اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ مینڈرن زبان میں کچھ چیخنے کی آواز سنائی دی اور کار تیزی سے حرکت میں آگئی۔

پرتاب سنگھ دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور دوڑتا ہوا زمین پر گرے ہوئے آدمی کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے پستول سے اس شخص کو زد پر لے لیا۔

سائرن کی آواز اب بہت تیز ہوگئی تھی اور صرف ایک سیکنڈ بعد پولیس کی گاڑی ایک لمحے کو گیٹ کے سامنے رکی۔ دو مسلح کانسٹیبل نیچے اتر آئے اور گاڑی تیزی سے آگے روانہ ہوگئی۔ انہوں نے شاید اس کار کو وہاں سے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ دونوں پولیس والوں نے پرتاب سنگھ پر رائفلیں تان لیں۔ پرتاب سنگھ نے پستول پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"اس کو سنبھالو۔ پتا نہیں، زندہ ہے یا مرگیا۔ ایک لاش اندر بھی پڑی ہے۔"

ایک پولیس والے نے پرتاب سنگھ کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور پھر وہ دونوں آگے بڑھ کر زمین پر پڑے ہوئے شخص پر جھک گئے۔ وہ ختم ہوچکا تھا۔ اس کی گردن میں گولی لگی تھی۔

○☆○

گرے رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس وہ دراز قامت شخص بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ قریب سے ترشے ہوئے سیٹ بال، آنکھوں پر تاریک شیشوں والا چشمہ، کلین شیو اور پیروں میں سفید پمپ شوز تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں سیاہ رنگ کا درمیانے سائز کا سوٹ کیس تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے بارہ تیرہ سال کی عمر کی لڑکی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ کتھئی رنگت کے لہریے دار بال اس کی گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔ سر پر سفید رنگ کا خوبصورت ہیر بینڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے ملٹی کلر کا خوبصورت فراک پہن رکھا تھا جس کا دامن گھٹنوں سے ذرا نیچے تھا۔ پیروں میں بلیک سینڈلز اور سفید اسٹاکنگس تھیں جن سے اس کی ٹانگیں اوپر تک چھپی ہوئی تھیں۔ اس لڑکی کی نظر شاید کمزور تھی۔ آنکھوں پر سفید شیشوں والا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اگرچہ خاصے دل فریب تھے لیکن اپنے آپ کو مزید پرکشش بنانے کے لئے اس نے چہرے پر میک اپ کی تہ بھی بٹھا رکھی تھی۔ سرخ ہونٹ اور ٹھوڑی پر دائیں طرف تل اس کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ اس کی ناک میں دائیں طرف نتھنی کی طرح کالا دھاگا پڑا ہوا تھا۔ دھاگے کے آس پاس ناک کسی قدر سرخ نظر آرہی تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ناک حال ہی میں چھدوائی گئی تھی۔ کانوں میں بھی سونے کی بالیاں تھیں اور ماتھے پر سرخ رنگ کی چھوٹی سی بندیا بھی چمک رہی تھی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس خوبصورت نوعمر لڑکی اور اس کے دراز قامت ساتھی کا تعلق کسی ہندو خاندان سے ہے۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ سنگاپور سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر خاصی گہما گہمی تھی۔ کوالالمپور جانے والی ٹرین تیار کھڑی تھی۔ ٹرین کی روانگی میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے اور اس پلیٹ فارم پر کچھ افراتفری بھی نظر آرہی تھی۔ لوگ اپنی اپنی بوگیوں کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔

سفاری سوٹ والا وہ شخص لڑکی کا ہاتھ پکڑے داخلی گیٹ سے ذرا آگے ایک جگہ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید کسی کی تلاش تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھرنے لگے تھے اور پھر ایک پست قامت آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ اس شخص کے لباس اور چہرے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ ملائیشیا کا رہنے والا ہے۔

"میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔ ٹرین روانہ ہونے والی ہے۔" اس شخص نے قریب آکر انگریزی میں کہا اور دراز قامت شخص کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔

سفاری سوٹ والا لڑکی کا ہاتھ پکڑے تیز قدموں سے اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اسی لمحے فضا انجن کی وسل سے گونج اٹھی۔ پلیٹ فارم پر افراتفری میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔

وہ آدمی تیسری بوگی میں گھس گیا۔ سفاری سوٹ والے نے پہلے لڑکی کو سوار ہونے میں مدد دی پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ٹرین بھی حرکت میں آگئی۔ ان کے پیچھے ہی دو تین اور مسافر بھی ٹرین میں گھس آئے تھے۔

وہ چند لمحے وہاں کھڑے رہے اور پھر وہ ملائی باشندہ سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے راہداری میں ایک طرف چلنے لگا۔ کچھ اور لوگ بھی اپنی سیٹوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

ان کی سیٹیں پانچویں بوگی میں تھیں۔ یہاں کچھ چینی اور ملائیشین مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر ملائیشین عورت اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس نوعمر لڑکی کے پاس آکر بیٹھ گئی اور اس کی کمر میں ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی۔

"ہیلو۔ کہاں جارہی ہو۔ تم نے فراک تو بہت اچھا پہن رکھا ہے۔"

لڑکی کسمسا کر رہ گئی۔ وہ جواب دینے کے بجائے بے بسی سے سفاری سوٹ والے کی طرف دیکھنے لگی۔ سفاری سوٹ والا ایک جھٹکے سے اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔

"بچی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میڈم۔ پلیز اسے ڈسٹرب مت کرو۔" اس نے کہا اور پھر بچی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے، تم سو جاؤ۔ آؤ میں تمہیں برتھ پر پہنچا دوں۔"

ٹرین میں مسافروں کے بیٹھنے کی سیٹیں الگ تھیں اور سونے کے لئے الگ۔ وہ آدمی بچی کو لے کر سامنے والے کمپاؤنڈ میں آگیا۔ ایک آدمی اور دو عورتیں پہلے ہی اپنی اپنی سیٹوں پر لیٹی ہوئی تھیں۔ اس شخص نے بچی کو سامنے اوپر والے برتھ پر چڑھا دیا۔

"اب نیچے مت اترنا۔ آرام سے سو جاؤ۔"

وہ شخص کمپارٹمنٹ کے سامنے ایسی سیٹ پر بیٹھ گیا جہاں سے

وہ نہ صرف کمپارٹمنٹ کے دروازے پر بلکہ سامنے والے برتھ پر بھی نگاہ رکھ سکتا تھا۔ وہ ملائی باشندہ کچھ دیر سفاری سوٹ والے کے پاس کھڑا سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا پھر راہداری میں نکل کر ٹرین کی آگے والی بوگی کی طرف چلا گیا۔

سات گھنٹے کا سفر تھا۔ صبح پانچ بجے کے قریب ٹرین سیرم بان اسٹیشن پر رکی تو وہی ملائی باشندہ اس کمپارٹمنٹ میں آگیا۔ اس نے سفاری سوٹ والے سے کچھ سرگوشیاں کیں۔ سفاری سوٹ والے نے کمپارٹمنٹ میں سوئی ہوئی بچی کو جگا دیا۔ بچی آنکھیں ملتی ہوئی اس ملائیشین کے ساتھ چلی گئی۔

ٹرین یہاں تقریباً دس منٹ رکنے کے بعد آگے روانہ ہوئی تھی۔ کوالالمپور اب زیادہ دور نہیں تھا۔

دن کی طلوع ہوتی ہوئی روشنی میں کوالالمپور کا ریلوے اسٹیشن بہت خوبصورت منظر پیش کر رہا تھا۔ کنگوروں والی محرابیں اور لاتعداد مینار۔ لگتا تھا جیسے وہ ریلوے اسٹیشن نہیں بہت بڑی مسجد ہو۔

ٹرین رکتے ہی سفاری سوٹ والا اپنا سوٹ کیس اٹھائے ٹرین سے اتر آیا۔ رات بھر جاگنے سے اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ وہ مسافروں کی بھیڑ میں چلتا ہوا ریلوے اسٹیشن سے باہر آگیا اور ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ ملائیشین بھی اس لڑکی کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔

"ویل مسٹر سنگھ۔" وہ شخص لڑکی کو سفاری سوٹ والے کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارا امانت۔ اب تم ہوٹل جا کر آرام کرو۔ مجھے ابھی تمہارے اگلے سفر کے انتظامات کرنے ہیں۔ میں رات گیارہ بجے تمہارے پاس ہوٹل میں پہنچ جاؤں گا۔ اگر آج سارے انتظامات ہو گئے تو ہم رات دو بجے والی ٹرین سے روانہ ہو جائیں گے۔ بصورت دیگر کل کسی ٹرین سے روانگی ہوگی۔"

"شکریہ مسٹر عمر۔" سفاری سوٹ والا ملائیشین سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا اور پھر جیب سے سو سو والے امریکی ڈالر کے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ رکھ لو۔ اخراجات کے لئے کام آئیں گے۔"

عمر نے نوٹ لے کر جیب میں رکھے۔ لڑکی کے گال پر ہلکی سی چٹکی کاٹی اور ہاتھ ہلاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد سفاری سوٹ والا اس لڑکی کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہا تھا۔

میکسم ہوٹل میں ان کے لئے کمرا بک تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سفاری سوٹ والے نے دروازہ بند کر دیا اور دھم سے ایک کرسی پر گر گیا۔

"چاچا۔ اب میں یہ کپڑے اتار دوں۔ مجھے بڑی الجھن ہو رہی ہے۔" لڑکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری ناک اور کان بھی چھدوا دیے ہیں۔ بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔"

"یہ تو معمولی سی تکلیف ہے پتر۔ انسان کو زندہ رہنے کے لئے پتا نہیں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔" وہ شخص بولا۔ "میری طرف دیکھ، تیری خاطر میں نے اپنے دھرم سے بغاوت کر دی۔ کیس اور داڑھی منڈوا دی۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں بابا گرونانک کا ماننے والا سردار ہوں؟"

وہ شخص پرتاب سنگھ تھا اور وہ لڑکی وجدان۔

"ویسے اب تم پہلے سے اچھے لگ رہے ہو چاچا۔" وجدان نے کہا۔

"ہاں۔ اب میری کھوپڑی میں تھوڑی سی عقل بھی آگئی ہے۔" پرتاب سنگھ بولا۔ "اچھا' اب ایسا ہے کہ میں ویٹر کو بلا کر ناشتا منگواتا ہوں۔ ناشتا کر کے سو جانا۔ آج کا دن آرام کر لو۔ آگے ایک لمبا سفر ہے۔ بنکاک پہنچنے کے بعد ہی تمہارا حلیہ تبدیل کیا جائے گا۔ جب تک ہم ملائیشیا میں ہیں' تمہارا لڑکی بنے رہنا ہمارے مفاد میں ہے۔"

"ٹھیک ہے چاچا۔" وجدان بولا۔ "اب جلدی سے ناشتا منگوا لو۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے اور نیند بھی آرہی ہے۔ ٹرین میں تو ڈھنگ سے سو بھی نہیں سکا تھا۔"

پرتاب سنگھ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور سروس کاؤنٹر پر ناشتے کے لئے کہہ کر واپس آگیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ویٹر ناشتا لے کر آیا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد وہ دن بھر سوئے رہے اور پھر شام سے پہلے پرتاب سنگھ کی آنکھ کھلی تھی۔ اس سے تھوڑی دیر بعد وجدان بھی جاگ گیا۔

رات کو ٹھیک گیارہ بجے عمر پہنچ گیا۔

"دو بجے کی ٹرین سے تم لوگوں کی روانگی ہے۔" اس نے بتایا۔ "لیکن میں ایک اور بات سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ خطرہ تمہارے تعاقب میں یہاں بھی آگیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" پرتاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"آج شام کم اور چی فانگ کو یہاں دیکھا گیا ہے۔" عمر نے بتایا۔ "وہ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز سے تمہارے بارے میں پوچھتے پھر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں بھی آئے ہوں لیکن یہ کمرا چونکہ تمہارے نام سے بک نہیں ہے اس لئے انہیں یہاں سے کچھ معلوم نہیں ہوا ہوگا۔ بہرحال' ٹرین ٹھیک دو بجے روانہ ہوگی۔ تم لوگ وقت سے چند منٹ پہلے اسٹیشن پر پہنچ جانا۔ میں تمہیں ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب ملوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم پہنچ جائیں گے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔

"کم یہاں بھی پہنچ گیا۔ اب کیا ہوگا چاچا؟" وجدان نے عمر کے جانے کے بعد کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا پتر۔" پرتاب سنگھ نے اسے تسلی دی۔ "وہ ہمیں پہچان نہیں سکے گا۔ یہاں تک ہمارے پیچھے آیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ بنکاک تک ہمارا تعاقب کرے گا۔ یہاں تو میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا لیکن بنکاک میں اس سے نمٹ لیں گے۔"

وجدان خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

ٹھیک ایک بجے وہ اپنے کمرے سے نکل آئے۔ پرتاب سنگھ نے کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دے دی اور سوٹ کیس اٹھا کر ہوٹل کے مرکزی دروازے سے باہر آگیا۔ دروازے سے آگے سڑک تک چھ سات سیڑھیاں تھیں جن پر چکنی ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے ہی دروازے سے باہر نکلے' ایک ٹیکسی سامنے آکر رکی اور اس ٹیکسی میں سے کم اور چی فانگ کو اترتے دیکھ کر وجدان کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"ڈرو نہیں۔ آرام سے چلتے رہو۔" پرتاب سنگھ نے سرگوشی کی۔

کم اور چی فانگ ٹیکسی سے اتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ انہیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتے دیکھ کر وجدان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں پھر اچانک چکنے ٹائل پر اس کا پیر پھسلا اور وہ نیچے گر گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

کم اس وقت بالکل اس کے سامنے تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر وجدان کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا اور اس کا رخسار ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"خیال سے بے بی۔ تمہیں چوٹ بھی لگ سکتی ہے۔"

وجدان کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا اور کئی مرتبہ اس پر قاتلانہ حملے کر چکا تھا اور اس کی تلاش میں سنگاپور سے یہاں آیا تھا۔ اگر وجدان اپنے اصل حلئے میں ہوتا تو موت کا یہ فرشتہ گال تھپتھپانے کے بجائے اس کی کھوپڑی میں گولی اتارنا پسند کرتا۔

پرتاب سنگھ نے وجدان کا ہاتھ پکڑ لیا اور سیڑھیاں اتر کر بائیں طرف کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی فوراً ہی حرکت میں آگئی۔ وجدان نے مڑ کر دیکھا۔ کم اور چی فانگ ہوٹل کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔

ٹیکسی مختلف راستوں سے ہوتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑنے لگی۔ کوالالمپور کا اپنا ہی رنگ تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کا ایک بج چکا تھا لیکن بعض علاقوں میں لگتا تھا جیسے ابھی شام ہوئی ہو۔ بڑی گہما گہمی تھی۔

تقریباً چالیس منٹ بعد وہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے پہنچ گئے۔ پرتاب سنگھ نے ٹیکسی اس جگہ رکوائی تھی جہاں عمر نے ملاقات کے لئے کہا تھا۔ عمر حسب وعدہ اس جگہ موجود تھا۔ پرتاب سنگھ نے جب اسے کم اور چی فانگ کے بارے میں بتایا تو عمر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" وہ بولا۔ "اس نے ہوٹل سے تمہارے بارے میں معلوم کیا ہوگا۔ اسے جب بتایا گیا ہوگا کہ ایک آدمی اور لڑکا تو نہیں بلکہ ایک آدمی اور بارہ تیرہ سال کی ایک لڑکی یہاں آکر ٹھہرے ہوئے تھے تو اسے شبہ ہو جائے گا۔ اس نے تم لوگوں کو ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ بدلے ہوئے حلئے کی وجہ سے وہ تم لوگوں کو نہیں پہچان سکا لیکن شبہ ہوتے ہی وہ اسی طرف دوڑ لگا دے گا۔ ہو سکتا ہے' وہ تمہارے پیچھے ہی آرہا ہو۔"

"تو پھر۔۔۔" پرتاب سنگھ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "آج کا سفر ملتوی کر دیا جائے اور کوئی اور موقع تلاش کیا جائے۔ یا بس پکڑی جائے۔"

"بس میں تو تم لوگ آسانی سے پکڑے جاؤ گے۔" عمر نے کہا۔ "ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی چند منٹ باقی ہیں۔ ایک ترکیب ہے میرے ذہن میں کہ کم سے بھی بچا جائے اور اسی ٹرین پر تمہارا سفر بھی جاری رہ سکے۔"

"وہ کیا۔۔۔؟" پرتاب نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم ٹیکسی پر' ٹرین سے پہلے تائی پنگ پہنچ جائیں اور وہاں سے ٹرین پر سوار ہوا جائے۔" عمر نے کہا۔ "تقریباً سو میل کا فاصلہ ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ ڈھائی گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"تو پھر سوچ کیا رہے ہو۔ پکڑو کوئی ٹیکسی۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"ٹیکسی یہاں سے نہیں پکڑی جائے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔" عمر نے اس کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور تیزی سے ایک طرف چلنے لگا۔ پرتاب سنگھ بھی وجدان کا ہاتھ پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

تقریباً پانچ سو گز دور وہ ایک اور ٹیکسی اسٹینڈ پر رک گئے۔ عمر نے ایک ٹیکسی والے سے کچھ بات کی اور پھر وہ تینوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ پرتاب اور وجدان پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور عمر آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر۔ وجدان نے سیٹ پر نیم دراز ہو کر پرتاب کی گود میں سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

عمر کا خیال درست نکلا تھا۔ ان کی ٹیکسی جیسے ہی ایک موڑ گھومی' پرتاب سنگھ نے دائیں طرف سے ایک ٹیکسی تیز رفتاری سے آتے ہوئے دیکھی۔ اس نے کم اور چی فانگ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹیکسی تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔ ٹرین کے روانہ ہونے میں ابھی بارہ منٹ باقی تھے اور پرتاب کو یقین تھا کہ کم اور چی فانگ ٹرین کا کونا کونا چھان ماریں گے۔

ان کی ٹیکسی شہری حدود سے نکل کر تیز رفتاری سے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

فاصلہ سو میل سے بھی کچھ زیادہ ہی تھا۔ وہ ٹرین سے پندرہ منٹ پہلے تائی پنگ اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ ٹرین یہاں تقریباً پانچ منٹ

رکتی تھی۔ وہ پلیٹ فارم کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عمر پلیٹ فارم پر گھوم کر ٹرین کو چیک کر رہا تھا اور جب اطمینان ہوگیا کہ کم یا چی فانگ اس ٹرین پر نہیں ہیں تو وہ ٹرین چلنے سے ایک منٹ پہلے اس بوگی میں سوار ہوگئے جہاں ان کی سیٹیں ریزرو تھیں۔

سفر خیریت سے گزر گیا۔ ٹرین دوسرے دن شام چھ بجے کے قریب بنکاک پہنچی تھی۔ ٹرین سے اترتے ہی وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر رامادن روڈ اور پھلن چٹ روڈ سے ہوتے ہوئے سوکھم وٹ روڈ پر آگئے۔ یہ شہر کا سب سے بڑا اور بارونق شاپنگ ایریا تھا۔ کشادہ سڑک کے دونوں طرف بلند وبالا عمارتیں تھیں۔ لگتا تھا جیسے رنگ برنگی روشنیوں کے سیلاب نے اس علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو۔ ابھی شام کی ابتدا ہوئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام بھی تھا اور پیدل چلنے والوں کا ہجوم بھی۔ کشادہ مرکزی سڑک کے دائیں بائیں لاتعداد چھوٹی سڑکیں اور گلیاں تھیں۔ زیادہ تر رہائشی ہوٹل اور ریسٹورنٹس اس علاقے میں تھے۔

ان کی ٹیکسی سوئے ٹونٹی فرسٹ اسوک روڈ کی طرف مڑ گئی اور تھوڑا ہی فاصلے طے کر کے ایک اور ذیلی سڑک پر مڑ کر ہوٹل سٹی لاج کے سامنے رک گئی۔

ان کے لئے تیسری منزل پر کمرا پہلے سے بک تھا۔ عمر عبدالرحمٰن' پرتاب سنگھ کے لئے بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے تمام انتظامات بڑی خوش اسلوبی سے کئے تھے۔ آج کے دور میں پاسپورٹ ویزے کے بغیر ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہونا آسان نہیں ہوتا لیکن ان لوگوں نے سنگاپور سے تھائی لینڈ تک کا سفر کیا تھا۔ دو ملکوں کی سرحد پار کی تھی لیکن راستے میں کسی نے ان سے پوچھا تک نہیں تھا۔

اس رات خشونت سنگھ کے مکان پر کم کے آدمیوں کے حملے کے بعد پرتاب سنگھ نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ وقت ضائع کئے بغیر وجدان کو لے کر سنگاپور سے نکل جائے گا۔ اس حملے میں کم کے دو آدمی مارے گئے تھے۔ اگلا سارا دن پولیس کے ساتھ معاملات طے کرتے ہوئے گزرا تھا اور اس سے اگلے روز پرتاب سنگھ نے سنگاپور سے نکلنے کی تیاری شروع کردی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ سیدھے سادے طریقے سے جائے گا تو دارا اور کم کے آدمی اسے سنگاپور سے نکلنے بھی نہیں دیں گے۔ وہ دو دن تک معلومات حاصل کرتا رہا اور پھر اپنے ایک پرانے جاننے والے کے ذریعے اسے عمر عبدالرحمٰن کے بارے میں پتا چلا۔ عمر سے ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی۔ پرتاب کو اسے پوری بات بتانی پڑی تھی کہ وہ اس طرح چوری چھپے سنگاپور کیوں چھوڑنا چاہتا ہے اور اس طرح بھیس بدلنے کا مشورہ عمر ہی نے دیا تھا۔

پرتاب سنگھ اس مشورے پر سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ داڑھی اور کیس اس کے دھرم کا حصہ تھا لیکن جب ٹھنڈے دل سے سوچا تو اسے یہ مشورہ ماننا ہی پڑا تھا۔ وجدان کی جان بچانے کے لئے یہ قربانی دینی پڑی اور پھر عمر ہی کے مشورے پر اس نے وجدان کا بھی حلیہ بدل ڈالا۔ اس کی ناک اور کان چھدوائے گئے تھے۔ ... بہت سٹپٹایا تھا۔ لڑکیوں والا لباس پہننے کے بعد تو وہ بالکل لڑکی لگ رہا تھا۔

کم کو بھی کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ وہ سنگاپور فرار ہو رہے ہیں۔ اس نے کوالالمپور تک ان کا پیچھا کیا۔ پرتاب سنگھ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ لوگ ان بدلے ہوئے حلیوں میں نہ ہوتے تو کم اور چی فانگ انہیں دیکھتے ہی گولیوں سے بھون ڈالتے لیکن وہ انہیں پہچان نہیں سکے تھے اور کم نے تو سیڑھیوں پر نہ صرف وجدان کو سہارا دے کر اٹھایا تھا بلکہ اس کا گال بھی تھپتھپایا تھا۔ وہ اس وقت انہیں نہیں پہچان سکا تھا لیکن ہوٹل سے جب اسے یہ معلوم ہوا ہوگا کہ سنگاپور سے آنے والا ایک آدمی اور بارہ تیرہ سال کی ایک لڑکی یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور وہ ابھی ابھی ریلوے اسٹیشن گئے ہیں تو اسے شبہ ہوا ہو اور اس نے ریلوے اسٹیشن کی طرف دوڑ لگا دی تھی مگر اس موقع پر بھی عمر عبدالرحمٰن کی ذہانت کام آئی تھی اور وہ ایک مرتبہ پھر بچ نکلے تھے لیکن پرتاب سنگھ کو یقین تھا کہ کم اور چی فانگ ان کے پیچھے بنکاک بھی ضرور آئیں گے۔

عمر عبدالرحمٰن ایک ڈیڑھ گھنٹا ان کے پاس کمرے میں رہا تھا۔ اس نے سان پھو نامی ایک شخص کا فون نمبر دیا تھا کہ اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو اس سے رابطہ کرلیا جائے۔

عمر عبدالرحمٰن کے جانے کے بعد پرتاب سنگھ نے کمرے کا دروازہ بند کردیا اور سوٹ کیس میں سے اپنے کپڑے اور شیونگ کٹ نکال کر باتھ روم میں گھس گیا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد باتھ روم سے نکلا تو اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔

"چل بھئی کاکے۔ تو بھی نہا کر کپڑے بدل لے پھر کھانا کھانے چلیں گے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے وجدان کو کرسی سے اٹھا کر باتھ روم کی طرف دھکیل دیا۔

"میں نہا کر اپنے کپڑے پہنوں گا چاچا۔" وجدان بولا۔

"نہیں۔ ایک دو دن تمہیں ایسے ہی کپڑے پہننے پڑیں گے۔ میں بندوبست کر رہا ہوں۔ اس کے بعد تو جو کپڑے مرضی آئے پہن لینا۔" پرتاب سنگھ نے یہ کہتے ہوئے سوٹ کیس میں سے ایک اور خوبصورت فراک نکال کر بیڈ پر پھینک دی۔

وہ تقریباً نو بجے ہوٹل سے نکلے۔ قرب و جوار میں واقع ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور پھر ریسٹورنٹ سے نکل کر وہ ایک طرف چلنے لگے۔ پرتاب نے وجدان کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس وقت بھی ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور سڑکوں پر خاصی رونق تھی۔

وہ مختلف ذیلی سڑکوں پر گھومتے ہوئے سوئے الیون چائی یاٹ پر آگئے۔ اس سڑک پر بھی بڑے بڑے اسٹور اور شاپنگ سینٹرز تھے۔

پرتاب ایک جگہ رک گیا۔ سڑک کی دوسری طرف ریڈی میڈ گارمنٹس اور ٹیلرنگ کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ اس دکان کا مالک ایک سکھ تھا۔ اتم سنگھ کئی سال پہلے سنگاپور میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں بھی اس نے ٹیلرنگ کی دکان کھول لی تھی مگر اسے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور وہ بنکاک آگیا۔ یہاں پہلے اس نے ایک چھوٹی سی دکان کھولی تھی اور اب ایک بہت بڑے گارمنٹس اسٹور کا مالک تھا۔ ٹیلرنگ کے حوالے سے بھی وہ بنکاک میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ پرتاب سنگھ اپنے بزنس کے سلسلے میں جب بھی بنکاک آتا' اتم سنگھ سے ضرور ملتا تھا۔ اس وقت بھی اتم سنگھ اس سے بڑے تپاک سے ملا۔

"تم تو کہتے تھے تمہاری کوئی اولاد نہیں۔ یہ لڑکی کون ہے؟" اتم سنگھ نے پوچھا۔

"یہ لڑکی مجھے اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز ہے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا۔ "تم نے ابھی مجھ پر طنز کیا تھا کہ میں نے داڑھی اور کیس کیوں منڈوا دیئے ہیں۔ تو یہ سب کچھ اسی کی خاطر ہے اور یہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔"

"کیا؟" اتم سنگھ اچھل پڑا۔

پرتاب سنگھ چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے بتانے لگا کہ اس نے اپنی داڑھی اور کیس کی قربانی کیوں دی تھی اور اس لڑکے کا حلیہ تبدیل کیوں کیا تھا اور یہ کہ وہ سنگاپور سے بھاگ کر یہاں کیوں آیا ہے۔

"اوہ۔" اتم سنگھ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ بنکاک میں صرف ایک ایسا شخص ہے جو اس سلسلے میں تمہاری مدد کرسکتا ہے۔"

"وہ کون؟" پرتاب سنگھ نے پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مہاراج وانگ ونگ یائے۔" اتم سنگھ نے جواب دیا۔ "وہ ایک بھکشو ہے لیکن اسے تھائی لینڈ میں موئے تھائی کک باکسنگ پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے اور اس کی عمر اس وقت اگرچہ ستر برس کے قریب ہے لیکن وہ جوانوں سے زیادہ پھرتیلا اور طاقتور ہے۔ بیک وقت لڑنے والے دو چار آدمیوں کو تو وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ کئی سال پہلے میں نے بھی موئے تھائی کک باکسنگ کا فن اس سے سیکھا تھا لیکن آج کل اس سے ملنا بہت بڑا مسئلہ ہے۔"

"کیوں؟" پرتاب سنگھ نے اسے گھورا۔

"وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دھرم سیوک بن گیا ہے۔ کئی کئی روز تو وہ ٹمپل سے باہر نہیں نکلتا۔ اس شہر میں اس کے ہزاروں شاگرد ہیں جو موئے تھائی کے نامی گرامی ماسٹر سمجھے جاتے ہیں۔ مہاراج وانگ ونگ یائے سے ملنے کے لئے انہیں بھی کئی کئی روز تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"مجھے بتاؤ' وہ کہاں رہتا ہے۔ میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

"ہولام پھونگ ریلوے اسٹیشن سے ذرا آگے ٹریمٹ ٹمپل ہے۔" اتم سنگھ نے بتایا۔ "بہت بڑا ٹمپل ہے۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں بدھا کے پیروکار یہاں آتے ہیں۔ دن کے وقت تو اس سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ رات کو کوشش کی جاسکتی ہے۔ تم ایسا کرو' کل اسی وقت میرے پاس آجانا۔ میں اس کے ایک شاگرد ماسٹر پھو پھانگ سے بات کروں گا۔ ہوسکتا ہے' اس کی وجہ سے کچھ آسانی ہوجائے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں کل آؤں گا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اتم سنگھ کی دکان سے نکل آئے۔ وجدان تھکا ہوا تھا اور سونا چاہتا تھا۔ پرتاب سنگھ اسے لے کر ہوٹل واپس آگیا۔

دوسرے دن وہ پھر اتم سنگھ کی دکان پر پہنچ گیا لیکن اسے مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ اتم سنگھ نے بتایا کہ ماسٹر پھو پھانگ موئے تھائی کے ایک مقابلے میں حصہ لینے کے لئے چیانگ مائی گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی تین دن بعد ہوگی۔

پرتاب سنگھ وجدان کو لے کر دکان سے نکل آیا۔ کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ محتاط انداز میں اطراف میں دیکھا تھا لیکن بیسیوں لوگوں کی موجودگی میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ان کا تعاقب کون کر رہا تھا۔ پرتاب سنگھ کی چھٹی حس اسے کسی قسم کے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی۔ وہ وجدان کو لے کر ہوٹل واپس آگیا۔

وہ کمرے میں بیٹھا سوچتا رہا۔ ہوسکتا ہے۔ اس کا وہم ہو لیکن رات ایک بجے تصدیق ہوگئی کہ یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ کمرے میں ایک طرف رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا تھا۔ یہاں اسے کون فون کرسکتا ہے پھر خیال آیا کہ شاید اتم سنگھ نے وانگ ونگ سے ملاقات کا بندوبست کرلیا ہو اور اسے اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہو۔ اس نے بیڈ پر سوئے ہوئے وجدان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ریسیور اٹھالیا۔

"آپ کے لئے کال ہے مسٹر سنگھ۔" یہ ہوٹل کی آپریٹر کی آواز تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر ایک اور آواز سنائی دی۔ "میں دارا بول رہا ہوں پرتاب سنگھ۔ تم میری نظروں سے چھپ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ کوالالمپور میں کم سے حماقت ہوگئی تھی۔ وہ تمہیں اور وجدان کو شناخت نہیں کرسکا تھا۔ تم نے اس لڑکے کی خاطر اپنے دھرم کے اصولوں کی خلاف ورزی کر کے واقعی بہت بڑی قربانی دی ہے اور تم نے اس کا حلیہ بھی خوب بدلا ہے۔ کم جیسا گھاگ آدمی دھوکا کھا گیا لیکن دیکھ لو' ہم نے تمہیں بنکاک پہنچنے کے دوسرے ہی دن تلاش کرلیا۔"

"تم جو کچھ بھی کرلو لیکن جب تک میں زندہ ہوں' تم اس لڑکے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن مجھے واقعی حیرت ہے تم نے ہمیں تلاش کیسے کرلیا۔" پرتاب سنگھ بولا۔

"بنکاک جیسے شہر میں جہاں انسانوں کا جنگل آباد ہے' کسی کو تلاش کرلینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔" دارا نے جواب دیا۔ "مجھے یقین تھا کہ تم یہاں اپنی ہی برادری کے کسی آدمی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو گے۔ یہاں کم کے تعلقات کام آئے اور اس نے اپنے مقامی دوستوں کی مدد سے بعض سکھوں کی نگرانی شروع کرادی اور اس طرح تم ہماری نظروں میں آگئے۔" چند لمحے خاموشی رہی پھر کہا گیا۔ "میں تمہیں صبح دس بجے کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم اس لڑکے کو میرے حوالے کردو تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ بصورت دیگر تم دونوں کو کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔"

"تم جو کچھ بھی کہہ لو۔ میری لاش پر سے گزر کر ہی تم لڑکے تک پہنچ سکو گے۔" پرتاب سنگھ نے جواب دیا اور مزید کچھ سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

اس نے سوچنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ دروازے سے باہر نکل کر ادھر ادھر جھانکنے لگا اور محتاط انداز میں چلتا ہوا راہداری کے موڑ پر پہنچ گیا جہاں نائٹ سروس کا ایک اٹینڈنٹ کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ پرتاب سنگھ نے اسے کندھے سے ہلایا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"کچھ نامعلوم لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی ابھی فون پر دھمکی دی ہے۔ مجھے اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" پرتاب سنگھ نے یہ کہتے ہوئے جیب سے بیس امریکی ڈالر کا نوٹ نکال لیا۔

"میں نائٹ سپروائزر کو بتاتا ہوں۔ وہ پولیس کو بلالے گا۔" اٹینڈنٹ نے کہا۔

"پولیس میری کوئی مدد نہیں کرسکتی۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "وہ لوگ سنگاپور سے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تم میری مدد اس طرح کرسکتے ہو کہ مجھے کسی کی نظروں میں آئے بغیر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بتادو۔ یہ بیس امریکی ڈالر تمہارا انعام۔ ہوٹل کے بل کی فکر مت کرو۔ ایک ہفتے کا ایڈوانس دیا ہوا ہے۔"

اٹینڈنٹ کچھ دیر ہچکچایا پھر اس نے نوٹ لے کر جیب میں رکھ لیا اور اسے وہیں رکنے کا اشارہ کرکے کمرے سے نکل گیا۔ پرتاب سنگھ نے وجدان کو جگا دیا۔ وہ اس طرح جگائے جانے پر کچھ بدحواس سا ہوگیا تھا۔

"موت کے ان فرشتوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔" پرتاب سنگھ نے کہا۔ "ہم یہاں سے جارہے ہیں۔ ایک محفوظ جگہ پر۔"

وہ اٹینڈنٹ تقریباً پندرہ منٹ بعد واپس آیا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ اور یہ چابی رکھ لو۔" اس نے ایک کی رنگ پرتاب کی طرف بڑھا دیا۔ "پچھلی گلی میں سفید رنگ کی ایک کار کھڑی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ تمہیں یہاں سے جانے کے لئے کار کی ضرورت پڑے گی۔ میں یہ چابی چرا کرلایا ہوں۔ کار تم کہیں بھی چھوڑ دینا اور....."

"خوش کیتا ای۔" پرتاب سنگھ نے چابی لے لی اور اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بیس ڈالر کا ایک اور نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" اٹینڈنٹ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

پرتاب سنگھ بھی وجدان کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر آگیا۔ اس اٹینڈنٹ کے پیچھے دبے قدموں مختلف راہداریوں میں چلتے رہے اور بالآخر عقبی زینے سے نیچے آگئے۔ اٹینڈنٹ نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھول دیا اور گلی میں آکر چند گز دور کھڑی ہوئی سفید کار کی طرف اشارہ کردیا۔ گلی میں کچھ اور بھی کاریں کھڑی تھیں۔ پرتاب سنگھ محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا وجدان کو تقریباً گھسیٹتا ہوا لے گیا اور کار کا دروازہ کھول کر وجدان کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور خود اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا۔

کار گلی سے نکل کر سوکھم وٹ روڈ پر مڑی ہی تھی کہ تقریباً پچاس گز دور کھڑی ہوئی ایک اور کار کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ پرتاب سنگھ کی کار کے پیچھے لگ گئی۔

پرتاب سنگھ نے اس کار کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے ایکسپریس وے عبور کیا اور پھلن چٹ روڈ پر نکل آیا اور پھر گزشتہ روز ریلوے اسٹیشن سے ٹیکسی پر جن راستوں سے آیا تھا' کار کو انہی راستوں پر گھماتا رہا۔ اگرچہ رات کے دو بج چکے تھے لیکن بعض سڑکوں پر اکادکا گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی اور پرتاب سنگھ کم از کم دو مرتبہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔

فاصلہ اگرچہ بڑھ گیا تھا لیکن وہ کار بدستور تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے آگے نکل کر اس نے کار ٹریمنٹ روڈ پر موڑ دی اور پھر بڑی تیزی سے اسے ایک تنگ سی گلی میں گھما دیا۔ اس طرح وہ وقتی طور پر تعاقب میں آنے والی کار کو جھانسا دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ کار کو گھما کر ایک اور گلی میں لے آیا۔ اس طرف بھی ٹریمنٹ ٹمپل کا ایک گیٹ تھا۔ اس نے کار روک کر پچھلی سیٹ سے وجدان کو اتارا اور اس کا بازو پکڑ کر گیٹ کی طرف دوڑا۔

وہ موٹی موٹی آہنی سلاخوں والا بہت بڑا گیٹ تھا جو اس وقت بند تھا۔ گیٹ کے اوپر تیز روشنی کا مرکری بلب جل رہا تھا۔ گیٹ کی بائیں طرف لوہے کی سلاخوں ہی سے ایک تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا جس سے بہ مشکل دو آدمی پہلو بہ پہلو گزر سکتے تھے۔ پرتاب سنگھ وجدان کو کھینچتا ہوا اس راستے سے اندر داخل ہوگیا۔

سامنے بہت وسیع و عریض صحن تھا۔ دائیں طرف پیگوڈا کی طرز کی ایک مختصر سی عمارت تھی اور سامنے صحن کے اس پار ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ پرتاب وجدان کو کھینچتا ہوا پہلے دائیں طرف والی عمارت کی طرف دوڑا۔ ٹھیک اسی لمحے تعاقب کرنے والی وہ کار گیٹ کے سامنے رکی اور دو آدمی اتر کر گیٹ کی طرف دوڑے۔ پرتاب سنگھ مڑ کر مرکزی عمارت کی طرف دوڑا۔

بھاگ دوڑ کی آوازیں سن کر پہلو والی چھوٹی عمارت کا ایک دروازہ کھلا اور ایک بھکشو مقامی زبان میں چیخنے لگا۔ پرتاب سنگھ اس کے چیخنے کی پروا کیے بغیر مرکزی عمارت کی طرف دوڑتا رہا اور پھر فضا اچانک ہی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں پرتاب سنگھ اور وجدان کے آس پاس سے گزر گئیں۔

مرکزی عمارت کا شیشے والا بلند دروازہ کھل گیا۔ شاید کوئی بھکشو باہر آنا چاہتا تھا مگر فائرنگ کی آواز نے اسے اندر ہی رہنے پر مجبور کردیا۔ پرتاب سنگھ وجدان کو کھینچتا ہوا دروازے میں داخل ہوگیا۔ سامنے چبوترے پر فاسٹنگ بدھا کا بہت بڑا مجسمہ تھا۔

فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں پرتاب سنگھ کی پشت میں پیوست ہوگئیں۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے وجدان کو اپنے سامنے کھینچ لیا اور پھر اس طرح گرا کہ وجدان اس کے نیچے دب گیا۔ وجدان کے منہ سے بھی ایک خوفناک چیخ نکلی تھی۔

فائرنگ رک گئی۔ صحن میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر بڑی عجلت میں کار کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔

وجدان پرتاب سنگھ کی لاش کے نیچے دبا ہوا چیخ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر چیخنے کی کوشش کی مگر آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

وجدان کو جب دوبارہ ہوش آیا تو اس کا سر ایک بوڑھے آدمی کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ ہوچی منہ کی طرح کی داڑھی' مونچھوں کی جگہ بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے چند بال' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور اس بوڑھے شخص کی آنکھوں میں عجیب سی کشش تھی۔

وہ مہاراج وانگ ونگ یائے تھا۔

وانگ ونگ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے وجدان کو گود میں اٹھا لیا اور بدھا کے مجسمے کے سامنے سے ہوتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ وجدان عجیب سی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

○☆○

مارشل آرٹ

کراٹے

ابتدا سے بلیک بیلٹ تک کی مشقیں

ان لوگوں کے لئے جو تنہا یا کسی ایک ساتھی کے ساتھ کراٹے سیکھنا چاہتے ہیں۔

اردو میں پہلی بار کراٹے سکھانے کی ایک مکمل اور آسان کتاب

قیمت 40 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

[illegible] کراچی 74200

فون: 5802552-5898313 فیکس: 5802551

[illegible]

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

چند منٹ پہلے جو کچھ ہوا تھا وہ وجدان کو دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اسے ابھی تک پوری طرح یہ ادراک نہیں ہو سکا تھا کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔ اسے تو بس اتنا یاد تھا کہ پرتاب سنگھ اسے لے کر دوڑتا ہوا ٹمپل میں گھس گیا تھا۔ طویل صحن میں دوڑتے ہوئے اس نے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں، کسی کے چیخنے اور پھر فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ پرتاب سنگھ اسے لے کر ٹمپل کے اندرونی مرکزی دروازے میں داخل ہو گیا تھا اور فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ پرتاب سنگھ نے اسے اپنے سامنے کھینچ لیا تھا اور پھر چیختا ہوا اس طرح گرا تھا کہ وجدان اس کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ خوف و دہشت سے بری طرح چیخ رہا تھا اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے تاریکی چھاتی چلی گئی تھی اور اب ہوش میں آنے پر اس نے اپنے آپ کو ایک بوڑھے کی آغوش میں پایا تھا۔

وہ مہاراج وانگ ونگ یائے تھا جو اسے گود میں اٹھائے مہاتما بدھ کے مجسمے والے چبوترے کے پیچھے ایک تنگ سی راہداری میں چل رہا تھا۔ اپنے آپ کو ایک پُراسرار بوڑھے کی آغوش میں پا کر وجدان کے ذہن پر ایک بار پھر خوف غالب آنے لگا۔ اس بوڑھے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور مقناطیسی کشش تھی۔ وجدان اس کے چہرے سے نظریں ہٹانا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ لگتا تھا، اس پُراسرار بوڑھے کی نظریں اس کی روح کی گہرائیوں تک میں اتری جا رہی ہوں۔

مہاراج وانگ ونگ یائے ایک اور راہداری میں داخل ہو کر ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر ہلکی ہلکی ٹھوکریں ماریں مگر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ چند لمحے توقف کے بعد بوڑھے نے قدرے زور سے ٹھوکریں ماریں۔ اس مرتبہ نتیجہ خاطر خواہ نکلا اور دروازہ کھل گیا۔

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ عمر بائیس تیئس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ گہری نیند سے جاگی تھی۔ آنکھوں میں سرخی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گیروے رنگ کی ایک چادر جسم کے اوپر والے حصے پر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اوپر کے دونوں سرے گردن کے پیچھے گرہ میں بندھے ہوئے تھے جبکہ نیچے والے سرے کمر پر بندھے ہوئے تھے۔ اس طرح اس کے جسم کا سامنے کا حصہ پوری طرح چھپ گیا تھا۔ جسم کے نچلے حصے پر ایسی ہی ایک چادر لنگی کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ سرخ آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور ذہن پر بھی غالباً غنودگی سی طاری تھی لیکن اس بوڑھے کو دیکھ کر اس کی نیند غائب ہو گئی۔ اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں ہاتھ آگے باندھ لیے اور اس کے سامنے جھک گئی۔

مہاراج وانگ ونگ یائے نے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ وہ ایک دم سیدھی ہو گئی اور کچھ کہے بغیر وجدان کو بوڑھے کی گود سے لینے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

وجدان کے حواس کسی قدر بحال ہو رہے تھے۔ اس نے لڑکی کی آغوش میں منتقل ہونے کے بجائے ایک پیر نیچے لٹکا دیا اور بوڑھے کی گود سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ بوڑھے نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر آہستگی سے نیچے اتار دیا۔ اس نے تھائی زبان میں نرم لہجے میں کچھ کہا مگر وجدان ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔ مہاراج نے لڑکی کی طرف دیکھ کر پھر تیز لہجے میں کچھ کہا اور واپس مڑ گیا۔

لڑکی چند لمحے مہاراج وانگ ونگ یائے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر اس نے وجدان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا۔ وجدان متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ کمرا خاصا وسیع تھا۔ چھت بہت اونچی اور دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ ایک دیوار کے قریب تین چار فٹ اونچا چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی ڈیڑھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ چبوترے پر مہاتما بدھ کا تقریباً ایک فٹ اونچا ایک مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایش ٹرے نما ایک بہت خوب صورت ٹرے رکھی ہوئی تھی جس میں لوبان یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز سلگ رہی تھی۔ کمرے کی فضا میں بھینی بھینی سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

کمرے کی ایک دیوار کے قریب فرش پر ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے قریب ایک چھوٹا سا ریک استادہ تھا جس میں چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان چیزوں کے سوا کمرے میں کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ لڑکی پاتونگ راہبہ تھی۔ وہ وجدان کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسے فرش پر بچھی ہوئی چادر کے قریب لے آئی اور دلچسپ نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ وجدان کا فراک خون آلود تھا۔ بانہوں اور ٹانگوں پر بھی خون لگا ہوا تھا۔

پاتونگ اس کی بانہوں اور ٹانگوں کو چھو کر دیکھنے لگی پھر اس کے پورے جسم کو ٹٹول ڈالا۔ کسی موقع پر بھی وجدان نے تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پاتونگ کے چہرے پر طمانیت سی آ گئی۔ وہ زخمی نہیں تھا۔ اس کے لباس، بانہوں اور ٹانگوں پر خون کہیں اور سے لگا تھا۔

وجدان نے بھی پہلی مرتبہ اپنے لباس اور جسم پر خون دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی تیر گئی اور پھر یکایک اسے یاد آ گیا کہ گولیاں چلی تھیں اور پرتاب سنگھ چیختا ہوا اس کے اوپر ڈھیر ہو گیا تھا۔ وہ یقیناً زخمی ہوا تھا اور یہ خون اسی کا تھا۔ وہ پُراسرار بوڑھا اسے تو یہاں اٹھا لایا تھا لیکن پرتاب سنگھ کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس حال میں تھا۔ وہ زندہ تھا یا

وجدان کانپ کر رہ گیا تھا۔ اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکا تھا۔

پاتونگ اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی اور اسے دونوں بانہوں سے پکڑ کر بڑی دلچسپ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وجدان نے لڑکیوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ ناک میں کالے دھاگے کی نتھنی بھی تھی اور کانوں میں بالیاں بھی۔ گوری چٹی رنگت، چہرے کے دل فریب نقوش اور سرخ ہونٹ۔ وہ اسے لڑکی ہی سمجھ رہی تھی اور اسے یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگی تھی کہ اس کا تعلق کسی ہندوستانی فیملی سے تھا۔ بنکاک میں بڑی تعداد میں ہندوستانی آباد تھے۔ اس نے بہت سی ایسی ہندوستانی لڑکیوں کو دیکھا تھا جن کی ناک میں اس طرح کی کالے دھاگے کی یا سونے اور چاندی کی نتھنی ہوتی تھی۔

پاتونگ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے تھائی زبان میں کچھ کہا بھی تھا مگر وجدان ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا اور ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پاتونگ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے کتابوں والے ریک کے اوپر دیوار میں بنی ہوئی ایک الماری کھولی۔ چند لمحے الماری کے اندر کچھ دیکھتی رہی پھر گیروے کپڑے کی ایک چادر باہر نکال لی۔ اس نے چادر کو فرش پر ڈال دیا اور وجدان کے فراک کی پیچھے کی زپ کھولنے لگی۔ وجدان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ مچل کر مزاحمت کرنے لگا۔ پاتونگ تھائی زبان میں بڑبڑاتے ہوئے فراک کی زپ نیچے کی طرف کھینچتی چلی گئی اور جب اس نے فراک نیچے کھینچا تو اس کے ساتھ چڈی بھی کھینچتی چلی گئی اور پھر پاتونگ چیختی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چند لمحے متوحش نظروں سے وجدان کو دیکھتی رہی پھر تیزی سے دروازے کی طرف لپکی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ باہر جاتے ہوئے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

وجدان بدحواس سا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔ اس کا راز کھل گیا تھا۔ وہ لوگ اسے اب تک لڑکی سمجھتے رہے تھے اور یہ راز کھلنے کے بعد کہ وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے، پتا نہیں وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اس نے چڈی اوپر کھینچ کر دوبارہ فراک پہن لی لیکن وہ پیچھے کی زپ نہیں لگا سکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا اور اس نے دروازہ کھول بھی لیا مگر ایک قدم باہر نکلتے ہی رک گیا۔ وہ کہاں جائے گا؟ پرتاب سنگھ کے بارے میں بھی پتا نہیں کہ وہ کس حال میں ہے اور کہاں ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ بھیانک موت قدم قدم پر اس کا پیچھا کر رہی تھی۔ ایسی حالت میں یہی جگہ اس کے لیے محفوظ تھی۔ اس نے ابھی تک صرف اس پُراسرار بوڑھے اور اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ ان دونوں کا سلوک مشفقانہ تھا۔ یہ لوگ اس کے دشمن نہیں تھے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اس کے لیے یہی جگہ سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ وہ اندر آ گیا اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

وہ کمرے کے وسط میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سپاٹ دیواروں پر ایک ہی کہانی لکھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ موت کے فرشتے اس کے تعاقب میں تھے اور وہ اب تک ان سے بچتا رہا تھا۔ پرتاب سنگھ اس پر زندگی کا سایہ بنا ہوا تھا لیکن وہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ وجدان یہ سب کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ وہ لڑکی بھی اسے کمرے میں چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ شاید اس بوڑھے کو اس کے بارے میں بتانے گئی تھی۔ اس کے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ ایک غبار سا تھا جو دماغ میں بھرتا جا رہا تھا۔ اس نے چبوترے پر رکھے ہوئے مہاتما بدھ کے مجسمے کی طرف دیکھا۔ بدھ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اسے کچھ حوصلہ ملا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا مجسمے کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ بدھ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ شاید اسے یہ پیغام دے رہی تھی کہ زندگی کے مصائب میں گھر کر بھی مسکرانا سیکھو۔

وجدان مجسمے کو دیکھ رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ سن کر پیچھے گھوم گیا۔ پاتونگ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ قریب آ کر چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے فرش پر بچھی ہوئی چادر پر لے آئی اور کچھ کہتے ہوئے اس کا فراک اتارنے لگی۔ اس مرتبہ وجدان نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور اس مرتبہ چڈی بھی اپنی جگہ سے نہیں سرکی تھی۔

پاتونگ نے خون آلود فراک تہ کر کے ایک طرف رکھ دیا اور اسے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے آئی..... راہداریوں میں گھومنے کے بعد وہ ایک کشادہ باتھ روم میں آ گئے۔ ایک طرف باتھ ٹب بھی تھا جو پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے اوپر دیوار کے ساتھ ایک شیلف پر چند بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ پاتونگ نے ایک بوتل اٹھا کر سیال کے چند قطرے پانی میں ٹپکائے اور وجدان کی طرف دیکھنے لگی۔

وجدان اس کی نگاہوں کا مطلب تو سمجھ گیا تھا مگر اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ پاتونگ اس کا ہاتھ پکڑ کر بیسن کے پاس لے گئی۔ پہلے اس کے خون آلود بازو دھلائے اور پھر ٹانگیں۔ وجدان دروازے کی طرف واپس مڑنا چاہتا تھا کہ پاتونگ نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور مسکراتے ہوئے ٹب کی طرف اشارہ کرنے لگی اور پھر وجدان چڈی اتارے بغیر ٹب میں گھس گیا۔ پانی میں بڑی مسحور کن سی مہک تھی۔ وہ پانی میں بیٹھا رہا اور پاتونگ اسے مَل مَل کر نہلاتی رہی اور بالآخر وہ ٹب سے باہر آ گیا۔ پاتونگ کھونٹی پر ٹنگا ہوا بڑا سا تولیا اٹھا کر اس کا جسم رگڑنے لگی۔ وجدان نے اس سے تولیا لے کر جسم پر لپیٹ لیا اور گیلی چڈی اتار کر ٹب کے قریب ہی فرش پر ڈال دی۔ پاتونگ اسے دوبارہ اسی کمرے میں لے آئی اور اس کے

کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

وجدان کو سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر پانی کے دو گھونٹ پیتے ہی اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ویران سی نظروں سے مہاراج کی طرف دیکھنے لگا۔

"سچائی وہ چیز ہے جس میں سب سے زیادہ کڑواہٹ ہوتی ہے۔" مہاراج اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اگر ایک مرتبہ یہ کڑوا گھونٹ بھر لیا جائے تو خوب صورت فریب میں لپٹا ہوا جھوٹ اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ میں جھوٹ کا فریب دے کر تمہیں پرتاب سنگھ کے زندہ ہونے کی خبر سنا سکتا تھا۔ تمہیں سہارا تو مل جاتا مگر وہ عارضی ہوتا اور جب تمہیں حقیقت کا پتا چلتا تو اس سے زیادہ دکھ ہوتا جس دکھ کا تم اس وقت سامنا کر رہے ہو۔ زندہ رہنے کے لیے ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم سچائی کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھاؤ گے تو راستہ کھلتا چلا جائے گا۔"

وجدان کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ مہاراج کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ اور اگر کوئی بات سمجھ میں آئی تھی تو یہ کہ پرتاب سنگھ ختم ہو گیا تھا۔ ماں باپ کے بعد وہی اس کا سہارا تھا اور اب یہ سہارا بھی اس سے چھن گیا تھا۔

"چاچا پرتاب کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔ آواز میں نقاہت تھی۔

"شاید تم میری بات سمجھے نہیں!" مہاراج نے کہا۔

"میرا مطلب ہے' اس کی لاش کہاں ہے؟" وجدان بولا۔

"اس کی لاش پولیس لے گئی ہے۔" مہاراج وانگ ونگ یائے نے کہا "اس کے لباس سے جو کاغذ برآمد ہوئے ہیں' ان سے پتا چلا ہے کہ پرتاب سنگھ نام کا وہ شخص سنگاپور کا ایک بہت بڑا تاجر تھا۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "فائرنگ کی آواز سن کر اس وقت میں باہر نکلا تھا تو پرتاب سنگھ کی لاش خون میں لت پت تھی۔ اس کی پشت پر لاتعداد گولیاں لگی تھیں۔ تم اس کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم بھی مر چکے تھے لیکن جب تمہیں اس لاش کے نیچے سے نکالا گیا تو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا تھا اسی لیے میں نے تمہیں اندر پہنچا دیا تھا تاکہ بہتا ہوا خون دیکھ کر تمہارے ذہن پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ میرا خیال تھا کہ تمہاری حالت سنبھل جائے گی تو تمہیں پولیس کی تحویل میں دے دیا جائے گا لیکن پاتونگ نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ تم لڑکی نہیں لڑکے ہو۔ اس انکشاف کے بعد میں نے تمہیں پولیس کی تحویل میں دینے کا فیصلہ بدل دیا۔ میرا خیال ہے معاملہ وہ نہیں جو میں پہلے سمجھ رہا تھا۔ اب سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کون ہو؟ مقتول سے تمہارا کیا تعلق تھا اور وہ لوگ کون تھے جنہوں نے عبادت گاہ کے تقدس کا خیال بھی نہیں کیا اور یہاں خون بہا کر چلے گئے؟"

"انہوں نے چاچا کو مار دیا۔ وہ مجھے بھی مار دیں گے۔ وہ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔" وجدان نے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔

"کون ہیں وہ لوگ؟ تم نے کیا بگاڑا ہے ان کا؟" مہاراج نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وجدان نے ہچکی لیتے ہوئے کہا "نا معلوم کون لوگ ہیں۔ انہوں نے میرے ماں باپ کو بھی مار دیا تھا۔ مجھے بھی مار دینا چاہتے ہیں۔ چاچا پرتاب سنگھ مجھے ان سے بچاتا رہا۔ انہوں نے سنگاپور میں کئی آدمیوں کو قتل کر دیا۔ سنگاپور کی پولیس بھی میری حفاظت نہیں کر سکی۔ میں جہاں جاتا' وہ لوگ مجھے ڈھونڈ لیتے۔ چاچا پرتاب مجھے یہاں لے آیا' بنکاک میں۔ وہ مجھے مہاراج وانگ ونگ یائے کے پاس لے جانا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم مہاراج تک پہنچتے' دشمنوں نے ہمارا سراغ لگا لیا اور...." وہ بات پوری نہیں کر سکا۔ ہچکیاں لینے لگا۔

مہاراج وانگ ونگ یائے اس کی بات سن کر چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے وجدان کو دیکھتا رہا پھر بولا "پرتاب سنگھ تمہیں مہاراج کے پاس کیوں لے جانا چاہتا تھا؟"

"اس کا خیال تھا کہ مہاراج ہی ایک ایسا آدمی ہے جو مجھے دارا اور کم جیسے موت کے فرشتوں سے بچا سکتا ہے۔ اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے کوشش کی تھی لیکن پتا چلا کہ مہاراج سے ملنا بہت مشکل ہے۔ اس نے مہاراج کے ایک شاگرد پوچانگ سے ملنے کا مشورہ دیا تھا لیکن وہ بھی بنکاک سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"دلچسپ۔" مہاراج وانگ ونگ یائے کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "پرتاب سنگھ کی تو مہاراج سے ملاقات کی خواہش پوری نہ ہو سکی مگر تم خوش قسمت ہو کہ موت کا مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک آ گئے۔ مہاراج وانگ ونگ یائے اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔"

وجدان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ہچکیاں رک گئیں۔ اسے یہ بوڑھا پہلے سے زیادہ پُراسرار نظر آ رہا تھا۔

"لارڈ بدھا نے بھائی چارے اور امن و آشتی کا درس دیا تھا مگر لوگ ان کی تعلیمات کو بھول گئے۔ شیطان کے جال میں آ کر لوگ اچھائی کو بھول کر برائی کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں اور عبادت گاہوں میں بھی بے گناہوں کے خون کے چھینٹے اچھالے جا رہے ہیں۔" مہاراج بات کرتے کرتے رک گیا پھر وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے تمہاری باتوں میں سچائی کی مہک محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے تفصیل سے بتاؤ سب کچھ۔ وہ لوگ کون ہیں اور تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر تم وانگ ونگ یائے کی نظروں میں بے گناہ ہوئے تو بڑی سے بڑی قوت کا ہاتھ بھی تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ وہ تمہارے سائے سے بھی ڈرنے لگیں گے۔"

وجدان چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور

جسم پر لپٹا ہوا تولیا اتار کر گیروے رنگ کی چادر ساڑی کی طرح اس کے جسم پر لپیٹ دی اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ اس کے قریب ہی فرش پر بچھی ہوئی چادر پر بیٹھ گیا۔

"سبائی ڈی ریو....؟" پاتونگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے تھائی زبان میں پوچھا تھا کہ اب وہ کیسا ہے یا کیا محسوس کر رہا ہے۔

وجدان نے سنگاپور میں رہتے ہوئے مینڈرین زبان تو اچھی خاصی.... بولنا سیکھ لی تھی۔ انگلش بھی اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا تھا۔ جزیرے پر اردو' ہندی اور پنجابی زبانیں بھی بولی جاتی تھیں۔ وہاں تھائی باشندے بھی موجود تھے لیکن وجدان کا کبھی ان سے واسطہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ تھائی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ پاتونگ نے کیا کہا تھا۔

"کھون چیو آ رائی؟ (تمہارا نام کیا ہے؟) پاتونگ نے پوچھا۔ وجدان اس مرتبہ بھی ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پاتونگ نے ایک جملہ اور کہا۔ وجدان اس مرتبہ بھی کچھ نہیں سمجھ سکا۔ پاتونگ کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر دروازے پر دستک کی آواز سن کر چونک گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہی بوڑھا تھا جو وجدان کو گود میں اٹھا کر یہاں لایا تھا۔ اسے دیکھ کر نجانے کیوں وجدان پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

مہاراج وانگ ونگ یائے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تھائی زبان میں کچھ کہا لیکن وجدان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں اس سے پوچھنے کی کوشش کر چکی ہوں کہ یہ کون ہے' اس کا نام کیا ہے مگر یہ تھائی زبان نہیں سمجھتا۔" پاتونگ نے مہاراج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ اور اندازِ تخاطب بہت مؤدبانہ تھا۔

"کیا تم انگریزی سمجھ سکتے ہو لڑکے؟" مہاراج وانگ نے وجدان کی طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"او... یس!" وجدان جلدی سے بولا "چاچا پرتاب کیسا ہے۔ اسے شاید گولی لگی تھی؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" مہاراج.... وانگ یائے نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا پھر پاتونگ سے تھائی زبان میں کچھ کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

وجدان بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ دونوں کمرے سے نکل کر مختلف راہداریوں میں چلتے رہے۔ بعض راہداریاں تو کافی کشادہ تھیں اور بعض تنگ۔ ایک موقع پر وہ پانچ چھ سیڑھیاں بھی اترے تھے اور پھر ایک راہداری کا موڑ گھومتے ہوئے مہاراج نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

وجدان کو اچھی طرح یاد تھا کہ پرتاب سنگھ کے ساتھ وہ کار سے اتر کر دوڑتا ہوا ایک بہت بڑے واٹ' بدھ خانقاہ میں داخل ہوا تھا۔ اس نے پرتاب سنگھ کے ساتھ گرنے سے پہلے مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ بھی دیکھا تھا لیکن اسے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کون سی جگہ تھی۔ تہ خانے اور راہداریاں .... اسے اگرچہ ان راہداریوں اور تہ خانے سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ اس بوڑھے کی طرف سے مطمئن تھا کہ وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بوڑھے کا اب تک کا رویہ دوستانہ تھا اور پاتونگ بھی اس کے ساتھ بڑے ہمدردانہ طریقے سے پیش آئی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلایا تھا اور اس کا لباس تبدیل کیا تھا۔

بالآخر وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے میں بھی ایک چبوترے پر بدھ کا ایک چھوٹا سا مجسمہ نصب تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ سیاہ پتھروں کا ایک لمبا سا چبوترا تھا جس کے ایک طرف تکیے کی طرح معمولی سا ابھار تھا۔ وجدان کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ چبوترا بیڈ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کی دوسری طرف ریک تھے جو کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ فرش پر ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ بوڑھے نے وجدان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کا بیٹھنے کا انداز یوگا کے اسٹانس (آسن) سے ملتا جلتا تھا اور اس عمر میں بھی اس کی کمر بالکل سیدھی تھی۔ معمولی سا جھکاؤ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"تم کون ہو۔ مجھے یہاں کیوں لائے ہو اور چاچا پرتاب کہاں ہے؟" وجدان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پرتاب غالباً وہ آدمی ہے جو تمہارے ساتھ خانقاہ میں داخل ہوا تھا؟" مہاراج وانگ ونگ یائے نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ میرا چاچا ہے۔ اسے شاید گولی لگی تھی۔" وجدان بولا۔ "ہاں۔ اسے گولیاں لگی تھیں۔" وانگ ونگ یائے نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا لڑکے۔ تمہارا چاچا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔"

وجدان سناٹے میں آ گیا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دماغ میں غبار سا بھرتا جا رہا تھا اور پھر وہ بیٹھے بیٹھے جھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی جا رہی تھیں۔ بوڑھے مہاراج وانگ ونگ یائے نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا اور بڑی آہستگی سے فرش پر لٹا کر اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔ پھر اس نے گلاس فرش پر رکھ کر اس کے گال تھپتھپائے۔ وجدان نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے کی رنگت ایک دم بدل گئی تھی۔ مہاراج نے الماری میں سے ایک بوتل نکال کر اس میں بھرے ہوئے سیال کے چند قطرے پانی میں ملا کر اسے شروع سے بتانے لگا کہ وہ کون ہے اور اس خوف ناک کہانی کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی تھی۔

"جب سنگاپور میں رہنا مشکل ہو گیا تو چاچا پرتاب سنگھ بھیس بدل کر مجھے یہاں لے آیا۔ پہلے ہم کوالالمپور آئے تھے۔ کم ہماری تلاش میں وہاں بھی پہنچ گیا۔ ہم بال بال بچے تھے۔ اسی رات ہم چوری چھپے کوالالمپور سے نکل آئے تھے اور آج رات...." میں خاموش ہو گیا۔ چند لمحے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے مہاراج وانگ ونگ یائے کو دیکھتا رہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "آج رات میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ چاچا پرتاب سنگھ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس نے بتایا کہ دارا نے ہمارا سراغ لگا لیا ہے اور ٹیلی فون پر دھمکی دی ہے کہ صبح دس بجے سے پہلے پہلے مجھے اس کے حوالے کر دیا جائے۔ بصورتِ دیگر وہ چاچا پرتاب کو بھی ہلاک کر دے گا۔ چاچا پرتاب نے ہوٹل کے ویٹر کو کچھ رقم دے کر ایک گاڑی کا انتظام کر لیا تھا۔ ہم چوری چھپے ہوٹل سے فرار ہوئے تھے مگر انہیں پتا چل گیا اور ایک گاڑی ہمارے پیچھے لگ گئی۔ چاچا پرتاب کا خیال تھا کہ اس خانقاہ میں داخل ہو کر ہم ان سے بچ جائیں گے لیکن موت نے چاچا پرتاب سنگھ کو جھپٹ لیا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ میرے ڈیڈی سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لیے اس نے اپنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ اپنے مذہب تک سے بغاوت کر ڈالی تھی۔ اس نے داڑھی اور کیس منڈوا دیے تھے۔ مجھے د... رں سے بچانے کے لیے بالآخر اس نے اپنی جان بھی دے دی۔ اس نے میرے مرتے ہوئے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہے گا' مجھ پر آنچ نہیں آنے دے گا۔ وہ واقعی مجھ پر زندگی کا سایہ بن کر رہا اور اب...." میری آواز گھٹ کر رہ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور پھر میں ہچکیوں سے رونے لگا۔

مہاراج وانگ ونگ یائے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگیا اور میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"زندگی نام ہی نشیب و فراز کا ہے۔ اچھے برے وقت انسان پر آتے ہی رہتے ہیں۔ دشواریوں پر قابو پانا ہی حوصلہ مندی ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ تم کم عمری میں ہی مشکلات کے بھنور میں پھنس گئے ہو اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ تم ایک حوصلہ مند بچے ہو۔ نہیں۔ میں تمہیں بچہ نہیں کہوں گا۔ تم تو ایک بہادر اور دلیر نوجوان ہو۔ اب تم میری پناہ میں آگئے ہو۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دشمن کا سایہ بھی تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ میں تمہاری ان بانہوں میں فولاد بھر دوں گا۔"

"لیکن مہاراج...." میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "دارا بنکاک میں موجود ہے۔ اگر اس نے مجھے تلاش کر لیا تو....؟"

"نہیں۔ وہ اب تمہیں تلاش نہیں کر سکے گا۔" مہاراج نے جواب دیا "وہ تمہیں اس وقت تک تلاش نہیں کر سکے گا جب تک میں نہیں چاہوں گا۔"

"کیا میں پرتاب چاچا کو دیکھ سکتا ہوں مہاراج؟" میں نے کہا

"اس کا یہاں کوئی نہیں ہے۔ اس کی آخری رسومات کون کرے گا۔"

"اس کا انتظام ہو جائے گا۔" مہاراج نے کہا "اب بہت ہو چکی ہے۔ پولیس نے پرتاب سنگھ کی لاش اسپتال پہنچا دی تھی۔ صبح میں تمہیں اسپتال لے جاؤں گا۔ آخری بار دیکھ لینا اس کو۔ اب تم سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

وہاں سونے کے لیے فرش ہی تھا جس پر چادر بچھی ہوئی تھی۔ مہاراج وانگ ونگ تو اٹھ کر اس چبوترے پر لیٹ گیا جسے میں نے دیکھتے ہی بیڈ تصور کر لیا تھا۔ میں فرش پر بچھی ہوئی چادر پر لیٹ گیا۔ تکیے کے لیے ایک موٹی سی کتاب اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

دارا کا فون آنے کے بعد جب ہم ہوٹل سے نکلے تھے تو اس وقت رات کا ڈیڑھ بجنے والا تھا اور اب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کیا بجا ہو گا۔ کمرے میں نہ تو کوئی گھڑی تھی اور نہ ہی کھڑکی یا روشن دان جس سے باہر کی فضا دیکھ کر وقت کا اندازہ لگایا جا سکتا۔ میں نے گردن گھما کر مہاراج کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے چبوترے پر لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر طمانیت سی تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ بوڑھا شخص کس طرح اطمینان سے پتھر پر سو گیا تھا۔ مجھے نیند نہ آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ فرش مجھے چبھ رہا تھا۔

میں بڑے ناز و نعم میں پلا تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے مجھے ماں باپ کی تمامتر توجہ حاصل تھی۔ انہوں نے میری آسائش اور آرام کا ہر سامان مہیا کر رکھا تھا۔ میری ہر خواہش پوری ہو جاتی۔ مجھے ذرا سی تکلیف ہوتی تو وہ دونوں تڑپ اٹھتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ گلی میں سائیکل چلاتے ہوئے میں گر پڑا تھا۔ میرے بازو اور گھٹنوں میں رگڑ لگنے سے خون رسنے لگا تھا۔ مجھے حالانکہ زیادہ تکلیف نہیں تھی لیکن ممی بدحواس تھیں۔ وہ مجھے فوراً ہی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے میری رگڑ کھائی ہوئی کھال پر لال دوا لگا کر ممی کو تسلی دی تھی کہ معمولی بات ہے ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور مجھے بھی یاد ہے کہ اس کے کئی روز بعد تک ممی اپنے ہاتھ سے میرا منہ ہاتھ دھلاتی اور اپنے ہاتھ سے مجھے کھانا کھلاتی رہی تھیں۔

یہ ماں باپ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اولاد کی معمولی سی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ میرے ماں باپ نے میرے بڑے ناز نخرے اٹھائے تھے اور اب میں ننگے فرش پر پڑا کروٹیں بدلتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے نیند نہ آنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ میرا دماغ اس وقت منتشر خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں کوئی بات بھی ڈھنگ سے نہیں سوچ پا رہا تھا۔ پرتاب سنگھ کا خیال مجھے

سسکیاں بھرنے پر مجبور کر رہا تھا اور جب دارا اور کم کا خیال آتا تو روح تک کانپ اٹھتی۔ میرے خیال میں وہ دنیا کے سفاک ترین انسان تھے۔ انہوں نے جس طرح میرے ماں باپ کو قتل کیا تھا' وہ منظر یاد کر کے میرا دل کانپ اٹھتا تھا۔ اور اس کے بعد تو وہ موت کے فرشتے کی طرح... میرے پیچھے لگ گئے تھے۔ کتنے حملے ہوئے تھے مجھ پر۔ کتنے بے گناہ مارے گئے تھے مگر میں ہر مرتبہ بچتا رہا تھا۔ پرتاب سنگھ واقعی مجھ پر زندگی کا سایہ بنا ہوا تھا اور اب وہ سایہ ہٹ گیا تھا۔

پرتاب سنگھ مجھے سنگاپور سے بچا کر لے آیا تھا اور یہاں اس کے دوست آتم سنگھ نے اسے مہاراج وانگ ونگ یائے سے ملنے کو کہا تھا۔ اس کے خیال میں مہاراج واحد شخص تھا جو ہمیں دارا اور کم جیسے بھیڑیوں سے نجات دلا سکتا تھا۔ پرتاب اپنی زندگی میں تو مہاراج تک رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن اس کی موت نے مجھے مہاراج وانگ ونگ یائے کو سونپ دیا تھا۔

چاچا پرتاب سنگھ میرا ساتھ چھوڑ چکا تھا اور اب میں مہاراج وانگ ونگ یائے کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ بوڑھا ابتدا ہی میں میرے لیے پراسرار ثابت ہوا تھا۔ اس کی عمر ستر کے لگ بھگ تھی۔ وہ تو خود اتنا کمزور سا لگ رہا تھا وہ شاید خود دوسروں کی مدد کا محتاج تھا۔ میری حفاظت کیا کر سکے گا لیکن وہ جس طرح پتھر کے چبوترے پر اطمینان سے سو رہا تھا اس پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

میری آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی۔ دماغ میں غبار سا بھرتا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور بالآخر وقت کو مجھ پر رحم آگیا اور میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

اور پھر مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے اوپر جھکا ہوا ہو۔ سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی اور بڑی مسحور کن سی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اس چہرے کو غور سے دیکھنے لگا جو میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ نیند کا خمار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا اور میں نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ وہ پاتونگ تھی۔ بڑا حسین چہرہ تھا اس کا اور بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی اس کے ہونٹوں پر۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ کسی قدر پیچھے ہٹ گئی۔

"آہان چاؤ......"

میں اس کی بات کا مطلب تو نہیں سمجھا لیکن جب سیدھے ہاتھ کو ایک مخصوص انداز میں حرکت دی تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ناشتے یا کھانے کو کہہ رہی ہے۔

"ٹائم کیا ہوا ہے؟" میں نے کلائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"گاؤ..." پاتونگ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عجیب عورت تھی۔ میں نے وقت پوچھا تھا اور وہ مجھے گانے کو کہہ رہی تھی۔ میں نے پھر کلائی کی طرف اشارہ کیا تو اس نے ایک بار پھر "گاؤ" کہا اور اس مرتبہ اس نے ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اور دوسرے ہاتھ کی چار انگلیاں میرے سامنے کر دیں۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ مجھے گانے کو نہیں کہہ رہی تھی بلکہ وقت بتا رہی تھی۔ نو بجے تھے پھر اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا اور اس کمرے سے باہر لے گئی اور مختلف راہداریوں میں گھومتے ہوئے مجھے اس باتھ روم میں لے آئی جہاں پہلے میں غسل کر چکا تھا۔

ٹب بھرا ہوا تھا۔ اس نے اسی خوشبودار سیال کے چند قطرے پانی میں ٹپکا دیے اور مجھے اشارہ کیا۔ اس مرتبہ اس کے سامنے کپڑے اتارتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوئی۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کے قریب لے گیا اور باہر دھکیل دیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے مجھے اس کے ہلکے سے قہقہے کی آواز سنائی دی تھی۔

میں نے جسم پر ساری کی طرح لپٹی ہوئی چادر اتار کر ایک طرف ٹانگ دی اور ٹب میں گھس گیا۔ ٹھنڈے اور خوشبودار پانی میں غسل سے میری ساری کسل مندی دور ہو گئی۔

ٹب سے نکل کر میں نے تولیے سے جسم خشک کیا اور وہی چادر دھوتی کی طرح لپیٹ کر باہر آگیا۔ پاتونگ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی اور میری وہ چادر تبدیل کر دی۔ دوسری چادر پہلے جیسے مخصوص انداز میں لپیٹی گئی تھی۔

وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آئی۔ یہ بہت بڑا کمرا تھا جہاں تقریباً دو فٹ چوڑی لمبی لمبی لاتعداد میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ میزوں کے دونوں طرف لکڑی کے بینچ رکھے ہوئے تھے۔ چند بھکشو مختلف جگہوں پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ یہ اس واٹ (خانقاہ) کا ڈائننگ ہال تھا جہاں اس واٹ کے بھکشو کھانا کھاتے تھے۔ ان میزوں کی تعداد اور لمبائی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس خانقاہ میں کتنے بھکشو ہوں گے۔

پاتونگ نے مجھے ایک جگہ بٹھا دیا اور کچن سے میرے لیے ناشتا لے آئی۔ دو تین چیزیں تھیں جو میری سمجھ میں نہیں آسکیں۔ میں نے سموسے جیسی ایک چیز اٹھا کر چکھی۔ اس کا ذائقہ بھی سموسے جیسا تھا۔ میں نے اس سموسے اور ایک پیالی چائے پر اکتفا کیا اور پاتونگ کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ گیا۔

میرے لیے یہ بات باعث اطمینان تھی کہ یہ ڈائننگ ہال تہ خانے میں نہیں تھا بلکہ خانقاہ کی پچھلی طرف واقع تھا۔ اس کی عقبی کھڑکیاں غالباً کسی گلی میں کھلتی تھیں۔ پاتونگ برتن کچن میں رکھنے گئی تو میں موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس طرف گلی میں چھوٹی دکانوں پر مشتمل تنگ سا بازار تھا۔ بیشتر دکانوں پر ایسی چیزیں نظر آ رہی تھیں جو کسی مزار پر نذرانے کے طور پر چڑھائی جا سکتی ہیں یا تحائف کے طور پر لے جائی جا سکتی ہیں۔ بدھ کے چھوٹے بڑے مختلف مجسمے ہر دکان میں بھرے ہوئے تھے۔ اس

تنگ سے بازار میں خاصا رش تھا۔

مجھے وہاں کھڑے ہوئے دو منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ پاتونگ نے قریب آکر میرا ہاتھ پکڑلیا اور مجھے ڈائننگ ہال سے باہر لے آئی۔ اس مرتبہ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے جانے کے بجائے ایک اور کمرے میں لے آئی اور یہاں میں مہاراج وانگ ونگ یائے کے ساتھ ایک پولیس آفیسر کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ بڈھا کہیں مجھے پولیس کے حوالے تو نہیں کرنا چاہتا لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ پاتونگ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مہاراج نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پولیس آفیسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ انسپکٹر پھوکٹ ہے۔ قتل کیس کا انچارج۔ یہ کم اور دارا کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ وہ کون ہیں اور تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔"

مجھے ایک بار پھر اپنے والدین کے قتل سے اب تک کے واقعات تفصیل سے بیان کرنا پڑے۔ میں نے سنگاپور کے انسپکٹر چیانگ شو کے بارے میں بھی بتایا کہ سنگاپور میں وہ اس کیس کو ڈیل کر رہا تھا۔

ہم لوگوں میں گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ انسپکٹر پھوکٹ کی انگریزی زیادہ اچھی نہیں تھی۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ بیچ میں تھائی زبان کے الفاظ بھی بول جاتا تھا جس کی وضاحت مہاراج کو کرنی پڑتی۔

ہمارا یہ میٹنگ سیشن تقریباً دو گھنٹوں تک جاری رہا پھر مجھے بتایا گیا کہ اب مجھے اسپتال جانا ہوگا تاکہ میں آخری مرتبہ پرتاب سنگھ کو دیکھ سکوں۔ مہاراج وانگ ونگ یائے نے دروازے کی طرف رخ کر کے کسی کو آواز دی۔ فوراً ایک بھکشو دروازہ کھول کر اندر آگیا اور دونوں ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے جھک گیا۔ مہاراج نے اس سے کچھ کہا اور وہ باہر نکل گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد انسپکٹر پھوکٹ تو خانقاہ کے سامنے والے دروازے سے چلا گیا اور مہاراج مجھے لے کر راہداریوں میں گھومتا ہوا سائیڈ اسٹریٹ کے ایک دروازے سے باہر آگیا۔ گلی میں ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ ایک بھکشو نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور ہم دونوں اندر بیٹھ گئے۔ وین کے شیشے تاریک تھے۔ نہ تو اندر سے باہر دیکھا جاسکتا تھا اور نہ باہر سے اندر۔ ڈرائیور اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بھی سیاہ رنگ کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔ ہمارے بیٹھنے کے فوراً ہی بعد اسٹیشن ویگن حرکت میں آگئی۔

اسٹیشن ویگن چند منٹ بعد ہی سویا پا روڈ پر واقع ایک اسپتال کی عمارت کے سامنے رک گئی۔ ہم جب ویگن سے اترے تو اسپتال کے مرکزی دروازے پر انسپکٹر پھوکٹ اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ موجود تھا۔ ہر پولیس والے کے بیلٹ میں ریوالور لٹکا ہوا تھا اور وہ سب بہت محتاط نظر آرہے تھے۔ ہم انسپکٹر کے ساتھ گیٹ میں داخل ہوگئے۔ راستے میں ملنے والا ہر شخص مہاراج وانگ ونگ یائے کو دیکھ کر جھک رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں میں مہاراج کا کتنا احترام ہے۔

ہم اسپتال کی مختلف راہداریوں میں چلتے ہوئے مردہ خانے میں آگئے۔ بہت وسیع کمرا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے برف خانے میں آگیا ہوں۔ کمرے میں ہلکی سی دھند بھی تھی۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ میز کی درازوں کی طرف بڑے بڑے کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ ہر دراز پر نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ کمرے میں پہلے سے موجود ایک آدمی نے انسپکٹر پھوکٹ کا اشارہ پاکر ایک دراز کو باہر کھینچ لیا۔ مہاراج نے مجھے اشارہ کیا تو میں دراز کے قریب آگیا اور پھر چاچا پرتاب سنگھ کا چہرہ دیکھ کر میرے ہونٹوں سے کراہ سی خارج ہوگئی۔ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ میرا محسن، میرا مربی، جس نے قدم قدم پر مجھے سہارا دیا تھا، میری حفاظت کی تھی۔ وہ میرے سامنے مردہ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہا ہو "دیکھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی دشمن کو تمہارے قریب نہیں آنے دیا۔ میں نے تمہارے باپ سے کیا ہوا وعدہ پورا کردیا۔ رب راکھا۔"

میں سسکیاں بھرنے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ یہ آنسو اس شخص کو خراج عقیدت پیش کر رہے تھے جس نے مجھے دشمنوں سے بچانے کے لیے اپنے دھرم سے بھی بغاوت کر ڈالی تھی۔

مہاراج نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے وہاں سے پیچھے ہٹالیا۔ اٹینڈنٹ نے دراز بند کردی اور ہم مردہ خانے سے باہر آگئے۔ کچھ جذبات کی شدت اور کچھ کمرے کی یخ بستگی کی وجہ سے میں اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ انسپکٹر پھوکٹ ہمیں لے کر ایک دفتر نما کمرے میں آگیا۔

"پرتاب سنگھ اور تم غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے۔" انسپکٹر پھوکٹ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "پرتاب سنگھ تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اور تمہیں مہاراج نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے لیکن تم اس بات کو ذہن نشین رکھو گے کہ لا اینڈ آرڈر کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرو گے۔ ہم اپنی تفتیش جاری رکھیں گے اور پرتاب سنگھ کے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے اور۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "پرتاب سنگھ سکھ تھا۔ یہاں سکھ بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ میں نے اس کی آخری رسومات کے لیے ان کی ویلفیئر سوسائٹی سے رابطہ کیا ہے لیکن تم نے بتایا تھا کہ پرتاب سنگھ کا کوئی دوست بھی یہاں ہے۔ اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"اس کا نام اتم سنگھ ہے۔" میں نے جواب دیا "اس کی ٹیلرنگ اور ریڈی میڈ گارمنٹس کی بہت بڑی دکان ہے لیکن میں دکان کا پتا نہیں بتا سکوں گا۔"

"پتا بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھ گیا۔ اتم سنگھ کو شہر کا ہر وہ شخص جانتا ہے جو اچھے کپڑے پہننا چاہتا ہے۔" انسپکٹر پھوکٹ نے کہا اور پھر مہاراج کی طرف مڑ گیا "آپ کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں مہاراج۔" وہ مہاراج کے سامنے جھک گیا۔

ہم انسپکٹر کے ساتھ اسپتال سے باہر آگئے اور اسٹیشن ویگن میں بیٹھ گئے۔ انسپکٹر پھوکٹ اور اس کے ماتحت گیٹ کے پاس رک گئے تھے۔ اسٹیشن ویگن حرکت میں آگئی۔

خانقاہ سے اسپتال جانے میں صرف چند منٹ لگے تھے لیکن واپسی پر ویگن تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چلتی رہی۔ میں نے ایک دو مرتبہ الجھی ہوئی نظروں سے مہاراج کی طرف دیکھا بھی تھا اور مہاراج نے ہر مرتبہ صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا اور بالآخر اسٹیشن ویگن ایک جگہ رک گئی۔ میرا خیال تھا کہ مہاراج دروازہ کھول کر نیچے اترے گا لیکن وہ اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ دس منٹ گزر گئے۔ میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا اور پھر کسی اور گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد اسٹیشن ویگن کا دروازہ کھلا۔ سامنے تین چار بھکشو کھڑے تھے۔ وہ سب مہاراج کو دیکھتے ہی جھک گئے۔ مہاراج نے تیز لہجے میں ان سے کچھ کہا اور پھر ایک بھکشو نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور ویگن سے نیچے اتار لیا۔

چاروں طرف ویرانہ تھا۔ دور دور تک کوئی آبادی تو کیا، کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ سڑک کی دوسری طرف بھی ایک چھوٹی بند وین کھڑی تھی۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے بھی سیاہ تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وین کے پچھلے حصے میں کوئی بیٹھا ہوا تھا یا نہیں لیکن اسٹیئرنگ کے سامنے ایک خوف ناک شکل والا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر بھی بھکشوؤں جیسا گیروے رنگ کا لباس تھا۔ جن بھکشوؤں نے مجھے اسٹیشن ویگن سے اتارا تھا ان میں سے دو کی شکلیں تو بہت ہی خوف ناک تھیں۔ ان سب کے سر گنجے تھے۔ لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے ہی سروں پر استرا پھروا کر آئے ہوں۔ دھوپ میں ان کے سر چمک رہے تھے۔

یہ صورت حال دیکھ کر میرے دل پر خوف سا طاری ہونے لگا۔ میں خاموش کھڑا متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان بھکشوؤں کے حوالے کرتے ہوئے مہاراج وانگ ونگ یائے نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ایک بھکشو اب بھی وین کے دروازے کے سامنے کھڑا بڑے مودبانہ انداز میں اس سے باتیں کر رہا تھا پھر وہ بھی پیچھے ہٹ گیا اور اسٹیشن ویگن کا دروازہ بند کردیا۔ اسٹیشن ویگن حرکت میں آگئی اور یوٹرن لیتی ہوئی اس طرف چلی گئی جس طرف سے آئی تھی۔

ایک بھکشو نے ابھی تک مجھے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔ اسے شاید خدشہ تھا کہ میں کہیں بھاگ نہ جاؤں لیکن میرا بھاگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس ویرانے میں کہاں جاسکتا تھا۔ دوسرے بھکشو نے وین کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور مجھے آگے دھکیلتے ہوئے وہ سب وین میں بیٹھ گئے۔ وین حرکت میں آگئی اور یوٹرن لیتی ہوئی مخالف سمت میں روانہ ہوگئی۔

میرا خیال تھا، ہم اس وقت شہر سے میلوں دور تھے اور کسی آبادی سے ہمارا فاصلہ مزید بڑھتا جارہا تھا۔ میرے دل پر طاری خوف بڑھتا جارہا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ مہاراج نے مجھے ان کے حوالے کیوں کیا تھا اور یہ لوگ مجھے کہاں لے جارہے تھے۔ ایک انجانا سا خوف اور وسوسے بڑھ رہے تھے لیکن پھر میں نے ان منفی خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مہاراج وانگ ونگ یائے میرے ساتھ دھوکا نہیں کرسکتا۔ اس نے تو مجھے دشمنوں سے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے کسی دشمن کے حوالے کیسے کرسکتا تھا۔

وین تقریباً آدھا گھنٹا اسی سڑک پر چلتی رہی۔ اس دوران میں کسی گاڑی کی آواز سنائی نہیں دی تھی اور پھر وین دائیں طرف مڑ گئی۔ یہ غالباً کچی یا پتھریلی سڑک تھی۔ بہت بری طرح سے جھٹکے لگ رہے تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں بھکشو غالباً میرا دل بہلانے کے لیے ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کر رہے تھے لیکن ہنسنے سے ان کے چہرے کچھ اور خوف ناک ہو رہے تھے۔ ان کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی تھی اور میں خاموش بیٹھا سہمی ہوئی نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بالآخر وین ایک جگہ رک گئی۔ ایک بھکشو نے مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے اتارا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پہلے کی طرح میرا بازو پکڑے رکھے گا لیکن اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ میں ان کے قریب کھڑا متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ جس جگہ وین رکی تھی وہ ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس سے تقریباً سو گز آگے ایک ٹیلے پر ایک خانقاہ نظر آرہی تھی۔ عمارت کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ عرصے سے ویران پڑی تھی۔ چاروں طرف تاحد نگاہ ویرانہ تھا۔ تیز ہوا سے جھاڑیوں کی سرسراہٹ کی آواز ایک عجیب سا تاثر پیدا کر رہی تھی۔

وین اس میدان سے گزر کر خانقاہ والے ٹیلے کی پچھلی طرف چلی گئی اور وہ بھکشو مجھے لے کر خانقاہ میں آگئے۔ خانقاہ دو حصوں پر مشتمل تھی۔ ایک حصہ بارہ دری کی طرح کھلا تھا۔ کئی ستون تھے جن کا پلستر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ دوسرا حصہ ایک بڑے ہال پر مشتمل تھا۔ اس میں بھی کئی ستون تھے۔ بڑی بڑی کھڑکیوں سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ اس خانقاہ کی پچھلی طرف بھی کوئی عمارت تھی۔

ہال میں پہلے ہی سے دو بھکشو موجود تھے۔ میرے ساتھ آنے والا ایک بھکشو ان سے باتیں کرنے لگا اور پھر وہ بھکشو مجھے لے کر

خانقاہ کی پچھلی طرف آگئے۔ اس طرف نشیب میں چند چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ایک اکھاڑا سا بنا ہوا تھا جس کے چاروں طرف موٹے موٹے رسے تنے ہوئے تھے۔

ایک کمرے میں دو بدھ راہبہ عورتیں کھانا تیار کررہی تھیں۔ کمرے کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہورہی تھیں۔ کھانا پکانے والے برتن بھی کالے ہوچکے تھے۔ ان عورتوں میں ایک ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان عورت تھی۔ میرے خیال میں اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ان دونوں عورتوں نے اسی طرح کا لباس پہن رکھا تھا جیسا میں نے شہر والی خانقاہ میں پاتونگ کے جسم پر دیکھا تھا۔ ایک چادر لنگی کی طرح بندھی ہوئی تھی اور دوسری چادر نے جسم کا بالائی حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ دونوں بھکشو مجھے ان عورتوں کے حوالے کرکے چلے گئے۔ جوان عورت مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ یہ رہائشی کمرا تھا۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور کچھ اور چیزیں بھی بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔

"تم بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔ یہاں آرام کرو۔ میں اپنے کام سے فارغ ہوکر آؤں گی تو تم سے باتیں کروں گی۔" اس عورت نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈرو نہیں۔ تم دوستوں میں ہو۔" عورت نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں حفاظت کے خیال سے یہاں بھیجا گیا ہے اور یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اگر چاہو تو ادھر اُدھر گھوم پھر بھی سکتے ہو۔ ویسے میرا نام پھی پھی ہے۔ تم بے تکلفی سے مجھے اس نام سے پکار سکتے ہو۔ اچھا۔ اب تم بیٹھو۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گی۔"

پھی پھی مجھے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلی گئی۔

ایک گھنٹے بعد پھی پھی مجھے آکر لے گئی۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ ہم پیگوڈا کی بارہ دری میں آگئے جہاں ایک بہت بڑی چادر بچھی ہوئی تھی اور تمام بھکشو ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے سامنے مٹی کا ایک پیالہ اور ایک پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ پلیٹ ذرا گہری تھی اور مٹی ہی کی بنی ہوئی تھی۔ پیالوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ درمیان میں چادر پر ایک پتیلا رکھا ہوا تھا جو دھوئیں سے کالا ہورہا تھا۔ پتیلے میں دلیے سے ملتی جلتی کوئی چیز بھری ہوئی تھی جس سے بھاپ اڑ رہی تھی۔

پھی پھی مجھے ساتھ لے کر بیٹھ گئی اور دوسری عورت بھکشوؤں کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹوں میں دلیا ڈالنے لگی۔ میری پلیٹ بھی بھردی گئی۔

دوسرے بھکشو بڑے مزے لے لے کر دلیا کھاتے رہے اور میں اپنی پلیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ پھی پھی نے مجھے اشارہ کیا تو میں نے انگلی سے پہلے تو اس دلیے کو چکھا۔ وہ غالباً چاول تھے جس میں مصالحے اور کچھ اور چیزیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ ذائقہ اتنا برا نہ تھا۔ ویسے اگر بھوک لگی ہو تو ذائقے کی پروا کون کرتا ہے۔ آگ بجھانے کے لیے ہر چیز انڈیل لی جاتی ہے۔ میں بھی سارا دلیا کھا گیا۔

کھانے کے بعد کمرے میں آکر پھی پھی نے مجھے شربت کا گلاس پلا دیا۔ وہ شربت اگرچہ میٹھا تھا مگر اس کا ذائقہ کچھ عجیب تھا۔ شربت پینے کے فوراً ہی بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں وہیں دری پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد گہری نیند سو چکا تھا۔

آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا سا تھا لیکن کھلے ہوئے دروازے سے باہر ہلکی سی دھوپ نظر آرہی تھی۔ سورج اپنا دن کا سفر مکمل کرکے غروب ہونے کی تیاری کررہا تھا۔

مجھے اپنے آپ میں کچھ عجیب سی تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔ شربت میں شاید کوئی نشہ آور چیز تھی جس سے میں اتنی گہری نیند سویا تھا اور سر میں دُکھن اور بھاری پن سا محسوس ہورہا تھا۔ میں نے سر پر ہاتھ رکھا تو اچھل پڑا۔ سر پر ہاتھ رکھتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ میں اپنے آپ میں کیا تبدیلی محسوس کررہا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ دیوار پر ایک چھوٹا سا آئینہ ٹنگا ہوا تھا۔ میں نے لپک کر وہ آئینہ اتارا اور دروازے کے قریب جاکر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے لگا۔ آئینے پر نظر پڑتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میرے سر میں میرا سر اور بھویں مونڈ دی گئی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا آئینے میں اپنے بدہیت حلیے کو دیکھتا رہ گیا۔

○☆○

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ مجھے شہر سے ملانو ویرانے میں واقع اس خانقاہ میں کیوں بھیجا گیا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ مجھے دشمن کی نگاہوں سے اوجھل رکھا جائے اور نمبر دو یہ کہ مجھے یہاں مارشل آرٹ کی ٹریننگ دی جانے والی تھی تاکہ میں اس قابل ہوسکوں کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے کسی دوسرے کی ضرورت نہ پڑے اور میں اپنی قوت بازو پر بھروسا کرکے دشمن کا مقابلہ کرسکوں۔

یوں تو مارشل آرٹس کے بہت سے اسٹائل ہیں۔ ہر اسٹائل کسی خاص علاقے سے منسوب ہے اور ہر اسٹائل کا اپنا ایک نام ہے۔ تھائی لینڈ میں کک باکسنگ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اسے قومی کھیل کا درجہ بھی حاصل ہے۔ یہاں دوسرے اسٹائلز کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

موئے تھائی کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی ابتدا پندرھویں صدی کے اختتام یا سولھویں صدی کے آغاز میں اس وقت ہوئی جب تھائی لینڈ اور برما ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ تھائی فوج کا ایک سپاہی برمی فوج کی قید میں چلا گیا۔ اس فوجی کو بارہ برمی فوجیوں کی حفاظت میں ایک ایسی جگہ قید میں رکھا گیا جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ تھائی سپاہی نے قید سے

فرار کا منصوبہ بنایا اور وہ خالی ہاتھ بارہ مسلح برمی فوجیوں کا مقابلہ کرکے انہیں شکست دے کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

تائے کھانون ٹوم نامی وہ تھائی سپاہی وطن واپس پہنچا تو بہت جلد اس کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی۔ اسے قومی ہیرو کا درجہ دیا گیا اور شہنشاہ نارے سو آن کے حکم سے تائے کھانون ٹوم کے خالی ہاتھ لڑائی کے فن کو فوجی تربیت کا ایک لازمی حصہ قرار دیا گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ حربی فن پورے ملک میں پھیل گیا اور اسے ایک باقاعدہ قومی کھیل کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

موئے تھائی میں حریف ایک دوسرے پر آزادانہ حملہ کرتے ہیں۔ ہاتھ یا پیر سے جسم کے کسی بھی حصے پر ضرب لگائی جاسکتی ہے۔ جبکہ کھیل کے دوران میں سر پر ضرب لگانا فاؤل سمجھا جاتا ہے لیکن عام لڑائی میں اس بات کی پروا نہیں کی جاتی کہ حریف کے جسم کے کس حصے پر ضرب لگتی ہے۔ پہلے یہ کھیل واقعی خالی ہاتھ کھیلا جاتا تھا لیکن اب اس میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ کوئی خطرناک ہتھیار اگرچہ اب بھی استعمال نہیں ہوتا لیکن اس قسم کے دستانے خاص طور پر تیار کرائے جاتے ہیں جن سے حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔

اس خانقاہ میں آنے کے دوسرے ہی دن میری ٹریننگ شروع کردی گئی۔ مجھے صبح پانچ بجے جگا دیا گیا۔ پھی پھی کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اس خانقاہ میں صرف ان بھکشوؤں کے لیے کھانا پکانے کے لیے آئی ہوئی ہے لیکن یہ انکشاف میرے لیے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ وہ بھی موئے تھائی کی ماہر تھی۔ وہ صبح سویرے مجھے اٹھا کر جوگنگ کے لیے لے گئی۔

ننگے پیر پتھریلی زمین پر دوڑنا میرے لیے عذاب بن گیا تھا۔ میں تو کبھی ننگے پیر گھر کے فرش پر بھی نہیں چلا تھا اور یہاں مجھے پتھروں پر دوڑایا جارہا تھا۔ میں زیادہ دور تک اس کا ساتھ نہیں دے سکا اور ایک جگہ رک کر ہانپنے لگا۔ پھی پھی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر دوڑنے لگی لیکن اس مرتبہ بھی میں زیادہ دور تک نہیں جاسکا۔

ہم ایک ٹیلے کی دوسری طرف نکل گئے تھے۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ میں ایک جگہ بیٹھ کر سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ پھی پھی بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور مجھے بتانے لگی کہ کسی بھی کھیل کے لیے اسٹیمنا ضروری ہوتا ہے جو جوگنگ، ایروبکس اور یوگا جیسی ایکسرسائز سے اسٹیمنا کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔

ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے اس سے آگے نشیب میں تاحد نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور فضا دھان کی مہک سے رچی ہوئی تھی۔ چند منٹ بعد پھی پھی نے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑا اور آہستہ آہستہ دوڑنے لگی۔

پھی پھی کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ پڑھی لکھی خاتون تھی۔ اس نے اپنے کیریر کی ابتدا درس و تدریس سے کی تھی۔ اسکول میں ٹیچر کی ملازمت شروع کرنے کے ساتھ ہی اس نے موئے تھائی کی ٹریننگ بھی شروع کردی تھی۔ پہلے اس نے ایک اور استاد سے تربیت حاصل کی اور پھر مہاراج وانگ ونگ یائے کی شاگردی میں آگئی۔ اس کا شمار وانگ ونگ کے ان چند شاگردوں میں ہوتا تھا جو اس کے بہت قریب تھے۔

وانگ ونگ یائے کا بہت شہرہ تھا۔ اسے پورے ملک میں گرینڈ ماسٹر کا درجہ حاصل تھا۔ موئے تھائی سیکھنے کا شوقین ہر کوئی اس کی شاگردی میں آنا چاہتا تھا لیکن پھر یکایک مہاراج وانگ ونگ یائے کے اطوار بدل گئے اور وہ مذہب کی طرف مائل ہوتا چلا گیا اور بالآخر وہ شہر کی ایک بڑی خانقاہ سے وابستہ ہوگیا۔ وہ خانقاہ سے بہت کم باہر نکلتا تھا لیکن شاگردوں سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ اس نے اپنا جیم (تربیت گاہ) اپنے چہیتے شاگرد پھوپھانگ کو سونپ دیا تھا۔

مہاراج وانگ ونگ یائے خانقاہ سے وابستہ ہوا تو پھی پھی اسکول کی ملازمت چھوڑ کر واٹ میں آگئی اور راہبہ بن گئی۔ وہ کئی سال تک خانقاہ میں آنے والے بدھا کے زائرین کی خدمت کرتی رہی۔ ڈیڑھ دو سال تک وہ دیہی علاقوں میں گھوم کر پھر کر بدھا کی تعلیمات کی تبلیغ کرتی رہی۔ ان تبلیغی دوروں کے دوران میں اسے مارشل آرٹ کی آزمائش کا موقع بھی ملا۔

تبلیغی پارٹیوں سے وابستہ بدھ بھکشو جنگلوں اور ویرانوں میں میلوں پیدل چل کر بستیوں تک پہنچتے تھے۔ کئی کئی روز تک فاقوں سے نا تا رہتا اور دوران سفر میں لٹیروں اور رہزنوں سے بھی واسطہ رہتا۔ ان تبلیغی پارٹیوں سے وابستہ بھکشوؤں کو خاص طور پر مارشل آرٹ کی تربیت دی جاتی تھی تاکہ دوران سفر میں وہ خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی شیطانی قوتوں کا مقابلہ کرسکیں۔

کچھ عرصہ بعد پھی پھی کو ویرانے میں واقع اس خانقاہ میں بھیج دیا گیا جہاں بھکشوؤں کو موئے تھائی کی تربیت دی جاتی تھی۔ پھی پھی کو یہاں آئے ہوئے دو سال ہوچکے تھے۔ اور ان دو برسوں میں وہ صرف دو یا تین مرتبہ شہر گئی تھی۔ ان دو عورتوں کے علاوہ وہ چھ بھکشو تھے جو اس خانقاہ سے وابستہ تھے۔ وہ سب کے سب اپنے فن کے ماسٹر تھے اور یہی سب مل کر یہاں آنے والے بھکشوؤں کو موئے تھائی کی تربیت دیتے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے ایک گروپ ٹریننگ مکمل کرکے گیا تھا اور آج کل یہ لوگ فارغ تھے لیکن فارغ اوقات میں بھی ان کا اپنا ٹریننگ کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور ان کے معمولات میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

میری ایروبکس، یوگا اور جوگنگ کی تربیت پھی پھی کے ذمے تھی جبکہ اسٹریچنگ اور ابتدائی ٹریننگ کا ذمہ سامولی نامی ایک اور بھکشو نے لے لیا تھا۔ سامولی وہی بھکشو تھا جس نے وین میں مہاراج وانگ ونگ سے بات کی تھی۔

مجھے اس خانقاہ میں رہتے ہوئے تین مہینے ہوگئے۔ میری

ٹریننگ کا سلسلہ جاری تھا۔ روزانہ شام کو یہ تمام بھکشو رنگ میں آپس میں بھی مقابلے کرتے تھے۔ وہ سب اپنے فن کے ماسٹر تھے۔ میں رنگ کے باہر بیٹھا بڑی دلچسپی سے ان کے مقابلے دیکھتا۔ بڑا مزہ آتا تھا۔

ان تین مہینوں میں روزانہ باقاعدگی سے میرا سر مونڈا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے احتجاج بھی کیا کہ میرے سر پر بال تو ہیں نہیں، استرا چلانے کا کیا فائدہ مگر ساموُلی نے مجھے بری طرح ڈانٹ دیا تھا کہ ان معاملات میں مجھے احتجاج کا کوئی حق نہیں ہے۔

مجھے جسم پر چادر لپیٹنا بھی آ گیا تھا۔ گنجا سر، مُنڈی ہوئی بھویں اور گیرو لباس۔ میں چھوٹا سا بھکشو ہی لگتا تھا۔ اس عرصے میں، میں نے ان بھکشوؤں سے تھائی زبان کے چند الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔

ایک روز صبح جوگنگ کے بعد میں پھی پھی کے ساتھ ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا کہ فضا اچانک ہی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی ہم سے چند فٹ دور ایک پتھر پر لگی۔ پتھر کی کرچیاں اڑ کر بکھر گئیں۔ ایک ٹکڑا پھی پھی کی پیشانی پر لگا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے بازو سے پکڑ کر ڈھلان میں چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ اس دوران میں دو فائر مزید ہو چکے تھے۔

ٹریننگ کے دوران میں پھی پھی مجھے یہ بھی بتاتی رہتی تھی کہ قوت فیصلہ پر مکمل کنٹرول ہونا چاہیے۔ حریف کسی بھی لمحے کوئی بھی پینترا بدل کر وار کر سکتا ہے۔ دماغ اس قدر حاضر ہو کہ نہ صرف بروقت حملہ روکا جائے بلکہ اس دوران میں یہ بھی فیصلہ کر لیا جائے کہ جوابی کارروائی کس طرح کی جانی چاہیے اور اس وقت پھی پھی نے تو قوت فیصلہ کی ایک بہترین مثال پیش کی تھی۔ پہلا فائر ہوتے ہی اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ گولی کس طرف سے آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگلی گولی سے بچنے کے لیے اسے کس طرف چھلانگ لگانی چاہیے۔ اس طرح دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی وہ مجھے ساتھ لیتی ہوئی دوسری گولی سے محفوظ ہو گئی تھی۔

ہم ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے بیس پچیس منٹ تک ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔ آگے گنجان جھاڑیاں تھیں جنہوں نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ جھاڑیاں خاصی اونچی تھیں۔ وہ مجھے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گئی اور سر اٹھا کر اوپر دیکھنے لگی۔

ڈھلان پر لڑھکنے سے میرے جسم پر کئی جگہ پتھروں سے رگڑ لگی تھی۔ بعض جگہوں سے کھال چھل گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا۔ تکلیف برداشت کرنے کے لیے میں نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ میں نے پھی پھی کی طرف دیکھا۔ اسے بھی کئی جگہ رگڑ لگی تھی اور پیشانی پر جس جگہ پتھر کا ٹکڑا لگا تھا وہاں سے خون رسنے لگا تھا۔

"فائرنگ اس طرف سے ہوئی تھی۔" وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اور وہ لوگ اس ٹیلے کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ہماری طرف آنے کی کوشش کریں گے لہٰذا ہمیں اس طرف سے نکلنا چاہیے۔ ہمارے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اٹھو۔ ہری اپ۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میرا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں جھاڑیوں میں دوڑنے لگے۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں دوڑنے سے دونوں کے جسموں پر لپٹی ہوئی چادریں پھٹ گئی تھیں۔ جسموں پر مزید خراشیں آ رہی تھیں مگر ہم رکے بغیر دوڑتے رہے۔

دو منٹ میں ہم ٹیلے کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے کافی دور نکل گئے اور پھر اوپر چڑھنے لگے۔ اچانک ہی پھی پھی کا پیر پھسل گیا اور وہ ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اس لیے میں بھی اس کے ساتھ لڑھکتا رہا۔ پھی پھی کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔

جب ہم سنبھلے تو میں نے اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی مگر اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دایاں پیر تھام لیا تھا۔ ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے گر گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے پیر میں موچ آ گئی تھی اور چلنا تو درکنار، وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔

"تم یہیں بیٹھی رہو۔ میں اوپر جا کر ساموُلی یا کسی اور کو بلا کر لاتا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اگر تم گولی کا نشانہ بن گئے تو...."

"میں اس طرف سے جاؤں گا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا اور اس سے ہاتھ چھڑا کر جھاڑیوں میں ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈھلان پر چڑھتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پھی پھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئی تھی تاکہ اگر فائرنگ کرنے والے تلاش میں اس طرف آئیں تو وہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکے۔

میں گھاٹی پر دوڑ رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ فائرنگ دو طرفہ تھی جس کا مطلب تھا کہ اب دو پارٹیوں میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ دوسری پارٹی کون ہو سکتی ہے کیونکہ خانقاہ میں رہنے والے بھکشوؤں کے پاس تو اسلحہ نہیں تھا۔ ان تین مہینوں کے دوران میں میں نے پھل کاٹنے والی چھری کے سوا یہاں کوئی ہتھیار نہیں دیکھا تھا۔

میں جب ٹیلے پر پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ خانقاہ وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی اور دو بھکشو آٹومیٹک رائفلیں اٹھائے فائرنگ کرتے ہوئے اس طرف دوڑے جا رہے تھے جدھر سے پہلے ہم پر فائرنگ ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔

مجھے اس وقت کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ یہ تین مہینے کی ٹریننگ کا نتیجہ تھا کہ میں کسی قدر نڈر ہو گیا تھا۔ میں بھکشو کو متوجہ کرنے کے لیے چیختا ہوا دوڑتا رہا اور پھر میں نے

ساموُلی کو ایک آڑ سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ میری آواز سن کر وہ مڑا اور پھر میری طرف دوڑنے لگا۔ دوسرے ٹیلے سے بے تحاشا گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ وہ مجھے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ایک پتھر کی آڑ... میں لے گیا۔

"ہوتی ہائے پھی پھی۔" اس نے چیخ کر مگر رک رک کر پوچھا کہ پھی پھی کہاں ہے؟

میں نے گھاٹی کی طرف اشارہ کر دیا اور رک رک کر تھائی زبان کے الفاظ میں اسے بتانے لگا کہ پھی پھی کے پیر میں چوٹ لگی ہے اور وہ چل نہیں سکتی۔ ساموُلی نے آواز دے کر ایک اور بھکشو کو بلا لیا۔ چیخ کر اس سے کچھ کہا اور مجھے اس کے حوالے کر کے گھاٹی کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ دوسرا بھکشو مجھے ہاتھ سے پکڑے پتھروں کی آڑ میں خانقاہ کی طرف چلنے لگا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی اور اس کی نظریں سرچ لائٹ کی طرح چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

وہ مجھے خانقاہ کی بارہ دری میں لے آیا اور پھر ہم دوڑتے ہوئے ہال میں پہنچ گئے۔ وہاں بھی کھڑکی کے قریب ایک بھکشو آٹومیٹک رائفل لیے کھڑا تھا۔ پہلا بھکشو مجھے کھینچتا ہوا ہال کے ایک کونے میں لے گیا جہاں فرش پر چار مربع فٹ کا ایک خلا نظر آ رہا تھا۔ اندر سیڑھیاں تھیں۔ ہم تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے تہ خانے میں آ گئے جہاں سوانا بھالے نام کی دوسری ادھیڑ عمر عورت موجود تھی۔ مجھے سوانا کے سپرد کر کے وہ بھکشو دوبارہ سیڑھیوں کی طرف بھاگ گیا۔

سوانا نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور پھی پھی کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

میرے جسم پر جگہ جگہ خراشوں سے خون رس رہا تھا مگر میں اپنی تکلیف بھول کر حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ خانقاہ کے نیچے اس وسیع و عریض تہ خانے کی موجودگی میرے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ مشعل جل رہی تھی اور اِدھر اُدھر کچھ ایسی چیزیں پڑی تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ تہ خانے کے آخری سرے پر لکڑی کا ایک بھاری دروازہ تھا جو بند تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ساموُلی سیڑھیوں پر نمودار ہوا۔ اس نے کندھے پر پھی پھی کو لاد رکھا تھا۔ اندر آ کر اس نے پھی پھی کو فرش پر لٹا دیا اور سوانا سے کچھ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ سوانا، پھی پھی کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے پیر کو ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ پھی پھی کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے۔

باہر سے فائرنگ کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر وہ آوازیں معدوم ہوتی چلی گئیں اور بالآخر خاموشی چھا گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد ساموُلی ایک اور بھکشو کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس نے مجھے اور پھی پھی کو بغور دیکھا اور دوسرے بھکشو کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔ وہ بھکشو تہ خانے سے باہر چلا گیا اور دس منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کریم کی دو شیشیاں تھیں۔ اس نے دونوں شیشیاں فرش پر رکھ دیں۔

ساموُلی نے ایک شیشی اٹھا کر دیکھی پھر اسے رکھ کر دوسری اٹھالی اور اس میں سے گلابی رنگ کی کریم انگلی سے نکال کر پھی پھی کے پیر پر ملنے لگا۔ پھی پھی کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس طرح مالش کرنے سے بھی اسے تکلیف ہو رہی تھی اور پھر ساموُلی نے اس کے پیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ پھی پھی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ ساموُلی بڑبڑاتے ہوئے پیر کی مالش کرتا رہا اور پھر اس کے پیر پر کپڑا لپیٹ دیا۔ پھی پھی بتدریج پُرسکون ہوتی چلی گئی۔

اس دوران میں سوانا کریم کی دوسری شیشی اٹھا کر میری طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ میرے جسم پر لاتعداد خراشیں تھیں۔ کئی جگہوں سے کھال چھل گئی تھی۔ شدید جلن ہو رہی تھی لیکن میں اپنی تکلیف ضبط کیے بیٹھا تھا۔ سوانا میرے جسم کے متاثرہ حصوں پر کریم مل رہی تھی۔ جس جگہ کریم لگتی وہاں عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا اور پھر میں بھی پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ میرے جسم پر جلن اور درد حیرت انگیز طور پر غائب ہو گیا تھا۔ سوانا اب وہی کریم پھی پھی کے جسم کی خراشوں پر لگانے لگی تھی۔

ساموُلی وہاں سے اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا تھا جہاں ایک چھوٹی میز پر ریڈیو کی شکل سے ملتا جلتا ایک بکس رکھا ہوا تھا۔ وہ میز کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلے اس بکس میں سے انٹینا کھینچ کر باہر نکالا اور پھر بکس پر لگے ہوئے مختلف ڈائلز کو حرکت دینے لگا۔

وہ ٹرانسسٹر تھا۔ ساموُلی کسی سے رابطہ کر رہا تھا پھر وہ تقریباً دس منٹ تک ٹرانسسٹر پر کسی سے باتیں کرتا رہا اور بالآخر ٹرانسسٹر بند کر کے ہمارے پاس آ گیا۔ سوانا اور پھی پھی سے چند جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد وہ میری طرف دیکھتا ہوا تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ دوسرا بھکشو بھی اسی کے ساتھ ہی تھا۔

میں پھی پھی کے قریب ہی فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا لباس بھی میری طرح جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گیا تھا اور سامنے سے اس کا جسم دو تین جگہوں سے برہنہ ہو رہا تھا۔ پھی پھی نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا یہ سب کچھ بھی بدھ کی تعلیمات میں شامل ہے؟" میں نے تہ خانے میں پڑی ہوئی رائفلوں اور دوسری چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بدھ نے امن و آشتی اور بھائی چارے کا درس دیا ہے۔" پھی پھی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "تحمل، صبر اور

برداشت بھی بدھ کی تعلیمات میں شامل ہیں لیکن یہ بالکل نہیں کہا کہ اپنے آپ کو ظالم کے سامنے ذبح ہونے کے لیے پیش کر دو۔ اپنے دفاع کا حق تو دنیا کے ہر مذہب نے دیا ہے۔ جب پانی سر سے گزر جائے تو قوت برداشت بھی جواب دے جاتی ہے۔ صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور پھر اپنے آپ کو بچانے اور انسانیت کو شیطانی قوتوں سے بچانے کے لیے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینی پڑتی ہے۔ یہ ہتھیار ایک طرف انسانیت کی تباہی کا باعث بنتے ہیں تو دوسری طرف تحفظ کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس اپنے تحفظ کے لیے ہتھیار نہ ہوتے تو وہ لوگ ہم سب کو گولیوں سے بھون دیتے۔"

"وہ کون لوگ تھے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔" پھی پھی نے جواب دیا "ہم سے کوئی دشمنی ہوتی تو خانقاہ پر حملہ کیا جاتا لیکن پہلی گولی وہاں چلائی گئی تھی جہاں تم میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ اس خانقاہ میں رہتے ہوئے میں اپنے دشمنوں کو تو بھول ہی گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کاک میں میری تلاش میں ناکام ہو کر وہ لوگ میرا خیال ذہن سے نکال کر واپس چلے گئے ہوں گے۔ ان کے تصور کے بغیر یہ دن کتنے سکون سے گزرے تھے لیکن شاید میری قسمت میں سکون نہیں لکھا تھا اور انہوں نے بالآخر مجھے ڈھونڈ... نکالا تھا۔ پھی پھی کا کہنا درست تھا۔ یہ حملہ میرے اوپر ہی کیا گیا تھا۔ ان کی چلائی ہوئی پہلی گولی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر لگی تھی اور دوسری گولی چلنے سے پہلے ہی پھی پھی نے مجھے دھکا دے کر وہاں سے ہٹا دیا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو یقیناً وہ مجھے گولیوں سے بھون دیتے۔ بہرحال، کھیل دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔

اس صورت حال سے مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہوا کہ حملہ کرنے سے پہلے وہ لوگ یا ان کا کوئی آدمی میری نگرانی کرتا رہا تھا۔ میرے معمولات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ مجھ پر حملہ کرنے کا بہترین وقت وہ ہوگا جب ہم صبح سویرے جوگنگ کے بعد اس جگہ بیٹھ کر کچھ دیر آرام کیا کرتے تھے لیکن خوش بختی ایک بار پھر میری ڈھال بن گئی تھی۔

"سامولی اس ریڈیو پر کس سے بات کر رہا تھا؟" میں نے میز پر رکھے ہوئے بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ماسٹر پھوپھانگ سے۔" پھی پھی نے جواب دیا "ہمارا ہیڈ کوارٹر بنکاک میں ہے اور ماسٹر پھو اس کا انچارج ہے۔ اسے صورت حال سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ ہیڈ کوارٹر سے کچھ آدمی یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

ہم میں یہ گفتگو جاری تھی کہ سامولی تہ خانے میں آ گیا۔ وہ پہلے سوانا اور پھر پھی پھی سے کچھ باتیں کرتا رہا پھر اس نے جھک کر پھی پھی کو گود میں اٹھالیا اور تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ سوانا اور میں بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ اوپر والے ... میں کھڑکی کے قریب ایک بدھ بھکشو اب بھی رائفل تانے ... تھا۔ اس کھڑکی سے ٹیلوں کی طرف کا دور دور کا علاقہ نظر آ ... ایک بھکشو رہائشی کوارٹرز کے قریب ایک جگہ پوزیشن لیے ... اور تین بھکشو حملہ آوروں کی تلاش میں ٹیلوں کی طرف گئے ... تھے۔

پھی پھی کو کمرے میں دری پر لٹا دیا گیا اور سامولی اسے ... ہدایات دیتا ہوا باہر چلا گیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس ... صبح کے آٹھ بجے ہوں گے۔ ہم لوگ سات بجے ناشتا کر لیا ... تھے لیکن آج اس گڑبڑ کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی۔ سوانا ناشتہ ... کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ناشتا ہو، دوپہر ... کا کھانا، چاول ہی استعمال ہوتے تھے۔ البتہ ہر مرتبہ ذائقہ مختلف ہوتا تھا۔

دس بجے کے قریب دو گاڑیاں وہاں پہنچ گئیں۔ ایک بند ... تھی جس سے تین آدمی اترے تھے اور دوسری پک اپ تھی ... کے پچھلے حصے میں بنچوں کی طرح آمنے سامنے سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ اس پک اپ میں چھ آدمی تھے۔ وہ سب نیچے اتر آئے ... میں کوئی بھی بھکشوؤں جیسے لباس میں نہیں تھا۔ کسی نے ... شرٹ پہنی ہوئی تھی، کسی نے صرف نیکر۔ سب کے بال بے ... بڑھے ہوئے تھے۔ ان حلیوں میں وہ چھٹے ہوئے بدمعاش ... تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ کسی کے پاس رائفل تھی کسی کے ... پستول اور کسی کے پاس ریوالور۔

میں خانقاہ کی بارہ دری میں کھڑا ان لوگوں کو دیکھ رہا ... سامولی اور دو بھکشو ان کے استقبال کے لیے وہاں پہنچ گئے ... سامولی بند ویگن سے اترنے والے ایک دراز قامت آدمی ... رہا تھا۔ اس شخص نے نیلی جینز اور ڈینم کی اوپن شرٹ پہن ... تھی جس کے بٹن سامنے سے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بال ... اگرچہ لمبے تھے لیکن پیچھے کی طرف سلیقے سے بنے ہوئے تھے ... باریک مونچھیں تھیں اور ٹھوڑی پر چند بال تھے۔ وہی ایک ... تھا۔ جو ان سب میں معقول دکھائی دے رہا تھا۔

وہ لوگ خانقاہ کی طرف آنے لگے تو میں دوڑتا ہوا ... والے کمرے میں پہنچ گیا اور اسے ان لوگوں کے بارے میں ... لگا۔ میں نے دراز قامت اور نسبتاً معقول حلیے والے ... بارے میں بتایا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

"وہ ماسٹر پھوپھانگ ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ...

"مہاراج وانگ ونگ یائے کا نائب اور سب سے زیادہ قابل ... آدمی۔ وہ ہیڈ کوارٹر کا انچارج ہے۔"

پھی پھی نے پہلے بھی پھوپھانگ کے بارے میں بتایا ... اب مجھے یاد آ گیا کہ جب میں اور پرتاپ سنگھ 'اتم سنگھ' ... پہنچے تو اس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اگر مہاراج سے ملاقات ...

ہو تو پہلے اس کے نائب پھوپھانگ سے ملا جائے لیکن پھوپھانگ ان دنوں چیانگ مائی گیا ہوا تھا اور اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

چند منٹ بعد باہر سے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور پھر ماسٹر پھو اور سامولی اندر داخل ہوئے۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر ان دونوں کو بو کیا۔ تھائی، جاپانی اور چینی باشندے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو تعظیماً جھک جاتے ہیں۔ مارشل آرٹ میں تو اسے ایک بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ کھلاڑی جب آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو بو BOW کرتے ہیں۔

ماسٹر پھو ایک بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے میرا کندھا تھپتھپایا اور پھر پھی پھی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ماسٹر پھو نے کچھ کہا اور وہ دوبارہ لیٹ گئی۔ ماسٹر پھو اس سے باتیں کرتا رہا اور میں دونوں ہاتھ باندھے احتراماً ایک طرف کھڑا رہا۔ ایک بھکشو اور ماسٹر پھو کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمی باہر کھڑے تھے۔ تقریباً بیس منٹ بعد ماسٹر پھو باہر نکل گیا۔ باہر کھڑے ہوئے بھکشو نے اندر آ کر پھی پھی کو گود میں اٹھالیا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ پھی پھی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ میں بھی ساتھ چلوں۔ ہم لوگ شہر جا رہے ہیں۔

پھی پھی کو بند ویگن کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور میں بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماسٹر پھو اور ایک اور آدمی ویگن میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور پہلے سے موجود تھا۔

ہماری وین کے پیچھے پک اپ بھی تھی اور اس میں صرف تین آدمی تھے۔ باقی تین آدمیوں کو اس خانقاہ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ وین پتھریلے راستے پر چلتی ہوئی سڑک پر آ گئی اور تیز رفتاری سے ایک طرف دوڑنے لگی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم شہر میں داخل ہو گئے۔ وین مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی واٹ ٹریٹ سے ذرا آگے چائنا ٹاؤن کی طرف گھوم گئی اور ایک تنگ سی گلی میں مڑ کر رک گئی۔ پک اپ بھی چند گز پیچھے رک چکی تھی۔

وہ تنگ سی گلی تھی، جس مکان کے سامنے وین رکی تھی۔ اس کا دروازہ گلی کے دوسرے مکانوں کی نسبت زیادہ کشادہ تھا۔ دروازے کے اوپر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر تھائی اور انگریزی میں مہاراج وانگ ونگ یائے جمنازیم اینڈ موئے تھائی اسٹیڈیم لکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے انٹرنیشنل ہیڈ کوارٹر کے الفاظ بھی لکھے ہوئے تھے۔

ماسٹر پھو وین سے اتر گیا۔ وین رکتے ہی دو آدمی جمنازیم کے دروازے سے باہر آ گئے تھے۔ ماسٹر پھو نے ان سے کچھ کہا اور وہ دونوں تیزی سے وین کے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک نے جھک کر پھی پھی کو گود میں اٹھالیا اور دوسرے نے میرا بازو پکڑ کر نیچے اتار لیا۔

باہر سے مختصر نظر آنے والا یہ مکان اندر سے بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کا ایک حصہ جمنازیم پر مشتمل تھا اور دوسرا اسٹیڈیم پر۔ جمنازیم کے پچھلی طرف رہائشی کمرے تھے۔ اسٹیڈیم میں دائرے کی شکل میں سیڑھیوں کی طرح سیٹیں بنی ہوئی تھیں جہاں تقریباً دو ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ درمیان میں لکڑی کے تختوں کا چبوترا تھا جس کے چاروں طرف موٹے موٹے رسے تنے ہوئے تھے۔ یہ رنگ تھا جہاں مقابلے ہوتے تھے۔

ہمیں جمنازیم کے پچھلی طرف ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک لکڑی کا تخت تھا جس پر موٹی سی دری بچھی ہوئی تھی۔ دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ پھی پھی کو اس تخت پر لٹا دیا گیا اور میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں آدمی کچھ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد ماسٹر پھو ہمارے کمرے میں آ گیا۔ وہ دیر تک پھی پھی سے باتیں کرتا رہا۔ ان کی گفتگو میں کئی مرتبہ میرا نام بھی آیا تھا۔ میں ان کی ساری باتیں تو نہیں سمجھ سکا لیکن مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ماسٹر پھو کے جانے کے بعد پھی پھی نے مجھے بتا بھی دیا کہ وہ میری اب تک کی ٹریننگ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

یہ رہائشی کمرے جمنازیم کے پچھلی طرف تھے۔ کئی کمرے تھے اور یہاں کچھ اور لوگ بھی رہائش پذیر تھے۔ ان کمروں کے آگے وسیع صحن تھا اور اس کے بعد عقبی دیوار خاصی اونچی تھی۔ عقبی گلی میں آمدورفت کے لیے دروازہ بھی تھا جو ہمارے آنے کے بعد لاک کر دیا گیا تھا۔

یہاں دو تین دن ہمیں ریسٹ کا موقع دیا گیا۔ اس دوران میں میرے جسم کی خراشوں پر باقاعدگی سے دوا لگائی جاتی رہی اور پھی پھی کے ٹخنے کی مالش بھی ہوتی رہی۔ تین چار دن بعد میں تو ٹھیک ہو گیا لیکن پھی پھی ابھی چلنے کے قابل نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اس پیر پر دباؤ ڈال کر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

یہاں آنے کے بعد میرا لباس بدل دیا گیا جس کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ میری ناک سے نتھنی والا کالا دھاگا تو شروع ہی سے نکال دیا گیا تھا۔ البتہ ایک کان میں سونے کی بالی میں نے خود ہی رہنے دی تھی۔ وہ بالی مجھے اچھی لگتی تھی اور ویسے بھی میں اس بالی کو چاچا پرتاپ سنگھ کی یادگار کے طور پر اپنے کان میں رکھنا چاہتا تھا۔

ایک ہفتے بعد میری ٹریننگ کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ مجھے ہوچن نامی ایک ماسٹر کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ چینی النسل تھا اور ماسٹر پھو کا معتمد خاص سمجھا جاتا تھا۔ یوں وہ بہت حلیم، ہمدرد اور ہنس مکھ آدمی تھا لیکن ٹریننگ کے دوران میں وہ بالکل ایک مختلف آدمی نظر آتا تھا۔ چہرے پر کرختگی اور لہجے میں

سرد مہری۔ جمنازیم میں آنے والے سبھی لوگ اس سے خائف رہتے تھے۔ میرے ساتھ بھی اس کا رویہ دوسروں سے مختلف نہیں تھا لیکن ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ مجھ پر اس کی خاص توجہ تھی۔ ٹریننگ سیشن ختم ہونے کے بعد بھی وہ مجھے پکڑ لیتا اور میری تربیت کا سلسلہ دیر تک جاری رہتا۔

جمنازیم میں شام چھ بجے سے رات دس بجے تک بڑا ہجوم رہتا۔ لگتا تھا جیسے شہر کے سارے نوجوان یہیں پر تربیت حاصل کرنا چاہتے ہوں اور یہ شاید مہاراج وانگ ونگ یائے کے نام کا اثر تھا۔ یہ شہر کا سب سے بڑا جمنازیم تھا۔ سیکڑوں ایسی مشینیں تھیں جن پر مختلف قسم کی ایکسر سائز کی جاتی تھیں اور نوجوانوں کو اپنی باری کے لیے دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔

ماسٹر ہوچن جمنازیم بند ہونے کے بعد مجھے پکڑ کر لے آتا اور کم سے کم ایک گھنٹے تک پنچنگ اور ککنگ کی پریکٹس کرواتا۔ ہوا میں معلق وزنی بیگ پر پنچنگ کرتے کرتے میرا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ بازو شل ہو جاتے اور قدم لڑکھڑانے لگتے۔

پنچنگ کی ٹریننگ کا سلسلہ قدرے مختلف اور بڑا کٹھن تھا۔ بیگ پر تین مختلف جگہوں پر دائرے بنے ہوئے تھے۔ مجھے ان دائروں پر پنچ مارنے تھے اور اپنی جگہ سے ہلنا بھی نہیں تھا۔ فرش پر بھی نشان لگے ہوئے تھے اور مجھے اپنے پیر ان نشانات کی حدود میں ہی رکھنے تھے۔ میں مُکا مارتا کہیں تھا اور لگتا کہیں تھا اور اپنی جگہ سے بھی ہل جاتا تھا۔ میری پنچنگ کی یہ پریکٹس دراصل ایکوریٹ نشانے کے لیے ہی ہو رہی تھی۔

اس ٹریننگ میں، میں بری طرح تھک جاتا تھا اور جب میں سونے کے لیے لیٹتا تو فوراً ہی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ صبح پانچ بجے پھر جگا دیا جاتا۔

پھی پھی بھی ٹھیک ہو گئی تھی اور اس نے بھی کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ماسٹر پھو کے آدمی ان لوگوں کو تلاش کر رہے ہیں جنہوں نے ویرانے والی خانقاہ پر ہم پر حملہ کیا تھا لیکن ابھی تک ان کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ یہ تو بہرحال طے شدہ بات تھی کہ وہ حملہ مجھے ختم کرنے کے لیے کیا گیا تھا اور مہاراج وانگ ونگ یائے بہت ناراض تھا کہ وہ لوگ اب تک پکڑے کیوں نہیں گئے تھے۔

ویسے تو مجھے کوئی بھی لباس پہننے کی اجازت تھی لیکن ٹریننگ کے دوران میں نیکر پہنتا تھا اور جسم کے بالائی حصے پر کوئی کپڑا نہیں ہوتا تھا حالانکہ مجھے بنیان پہننے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی۔ میرے سر پر اب بھی روزانہ باقاعدگی سے اُسترا پھیرا جاتا تھا اور بھویں بھی ہر چند روز بعد صاف کر دی جاتی تھیں۔ ٹریننگ میں شامل میرے ہم عمر لڑکے بھی گنجے ہی تھے۔ یہ تو مجھے بعد میں بتایا گیا کہ ان گنجے لڑکوں کا تعلق کسی نہ کسی خانقاہ سے تھا جنہیں موئے تھائی کی ٹریننگ کے لیے یہاں بھیجا جاتا تھا۔

ایک رات کھانے کے بعد میں ٹہلتا ہوا اسٹیڈیم والے حصے کی طرف نکل گیا۔ اسٹیڈیم میں کسی طرف صرف ایک بتی جل رہی تھی۔ روشنی صرف اس حصے میں تھی جبکہ باقی اسٹیڈیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس اسٹیڈیم میں آمدورفت کے لیے تین گیٹ تھے۔ کوئی بھی گیٹ سات آٹھ فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ہر گیٹ کے اندر دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جو ڈریسنگ روم کہلاتے تھے۔

میں ایک گیٹ میں داخل ہو کر اسٹیڈیم کے وسط میں بنے ہوئے لکڑی کے تختوں کے چبوترے پر پہنچ گیا۔ چبوترا تین فٹ اونچا تھا اور اس کے چاروں کناروں پر لکڑی کے پول تھے جن کے درمیان موٹے موٹے رسے بندھے ہوئے تھے۔ میں اس رنگ اور اسٹیڈیم کی سیٹوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ایک دن میں بھی یہاں کسی حریف سے مقابلہ کروں گا۔ ٹریننگ حاصل کرتے ہوئے اب میرے دل میں بھی خواہش مچلتی تھی کہ میں موئے تھائی کا ماہر بنوں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سامنے والے گیٹ کے اندر کی طرف ایک سائے کو متحرک دیکھ کر چونک گیا۔ اس طرف تاریکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کارکنوں میں سے کوئی ہوگا لیکن بعد میں مجھے اپنا یہ خیال بدلنا پڑا۔ وہ یہاں کا آدمی ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ میں نے جیسے ہی اس طرف ...دیکھا وہ تاریکی میں چھپ گیا تھا۔

میں دل میں ہلکا سا خوف محسوس کرنے لگا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھر آیا کہ وہ دارا یا کم کا کوئی آدمی ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اب بھی میری تاک میں ہوں گے اور موقع ملتے ہی حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں جس طرف جانا چاہتا تھا اس طرف بھی ایک گیٹ تھا لیکن میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ وہ آدمی تاریکی سے نکل کر سامنے آگیا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس وقت اسٹیڈیم میں صرف ایک ہی بتی جل رہی تھی اور اس کی بہت مدھم سی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ شخص اب رِنگ کے دوسری طرف پہنچ گیا تھا۔ مدھم سی روشنی میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے اور چہرہ بڑا خوف ناک لگ رہا تھا۔ وہ رِنگ کے دوسری طرف گھومتا ہوا میری طرف آرہا تھا اور میں اپنے آپ کو اس سے دور رکھنے کے لیے رِنگ کے ساتھ گھوم رہا تھا۔

اس نے مسلسل میری طرف بڑھتے ہوئے ایک جملہ کہا تو میں کانپ اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں سے مجھے کوئی نہیں بچائے گا۔ اس کی بات کسی حد تک درست تھی۔ اگر میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنا بھی شروع کر دیتا تو شاید میری آواز اسٹیڈیم کے باہر کسی کے کانوں تک نہ پہنچ سکتی۔ ویسے میں اس شخص کی ہمت پر داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکا تھا۔ مہاراج وانگ ونگ یائے کا یہ جمنازیم

کی کچھار تھا اور وہ شخص اس کچھار میں گھس آیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی طرح چھپ کر اندر رہ گیا ہو لیکن اس کا یہاں سے بچ نکلنا آسان نہیں ہوگا۔

اس شخص نے کالے رنگ کی پتلون اور سفید ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور اس سفید ٹی شرٹ کی وجہ سے ہی وہ میری نظروں میں تھا اور پھر اچانک ہی وہ دوڑ کر دوسری طرف آگیا۔ اب چبوترے کے ایک سرے پر وہ تھا اور دوسرے پر میں۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر میں کانپ اٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چیختے ہوئے تماشائیوں کی نشستوں والی سیڑھیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سیڑھیاں لکڑی کے تختوں کی تھیں۔ میرے دوڑنے سے دھب دھب کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ وہ شخص بھی چیختا ہوا میرے پیچھے دوڑا۔ میں سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا تاکہ کوئی تو میری آواز سن سکے۔

آخری سیڑھی پر پہنچ کر میں نے دوسری طرف جھانکا۔ اس طرف تقریباً پچاس فٹ نیچے اسٹیڈیم کے پچھلی طرف والی گلی تھی اور اتفاق سے اس وقت گلی سنسان پڑی تھی لیکن میں چیختا رہا کہ شاید کوئی میری آواز سن لے۔

وہ شخص مجھ سے پانچ چھ سیڑھیاں نیچے رک گیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے دانت نکوسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر آتا رہا۔ میں نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیرونی منڈیر کے ساتھ ساتھ اس تختے پر بھاگنے لگا۔ بیرونی منڈیر تین فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی اور مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ میں کہیں باہر کی طرف نہ گر جاؤں۔

وہ شخص مجھ سے تین سیڑھیاں نیچے میرے متوازی دوڑ رہا تھا اور پھر مجھ سے ذرا آگے نکل کر وہ بھی اوپر آگیا۔ میں نے رک کر ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا اور پھر دوڑتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ وہ شخص بھی میرے پیچھے تھا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے سر پر پہنچ چکا ہے تو میں اچانک ہی نیچے بیٹھ گیا اور وہ شخص جیسے ہی قریب پہنچا، میں نے بڑی پھرتی سے ایک ٹانگ آگے پھیلا دی۔ وہ شخص میری ٹانگ میں الجھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور سیڑھیوں پر لڑھکتا چلا گیا۔

میں موقع پا کر دوسری طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ شخص کئی سیڑھیاں نیچے جا کر سنبھلا تھا لیکن اسے غالباً اچھی خاصی چوٹیں لگی تھیں اور اب چاقو بھی اس کے ہاتھ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ سیڑھیوں پر اس گیٹ کی طرف دوڑتا چلا گیا جہاں سے میں اندر داخل ہوا تھا اور اب وہ شخص میرا راستہ کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس سے پہلے وہاں پہنچ گیا اور گیٹ کھول کر باہر نکل آیا۔

باہر آتے ہی مجھے پتا چل گیا کہ اس شخص میں اتنی ہمت کیسے پیدا ہوئی تھی کہ وہ اکیلا شیروں کی کچھار میں گھس آیا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے نصف درجن ساتھی اور تھے اور یہاں معرکہ گرم تھا۔ مجھے اپنے آدمیوں میں ماسٹر ہوچن بھی نظر آگیا جو ایک حریف سے بھڑا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے حریف کے سر پر زوردار کک لگائی۔ وہ شخص الٹ کر گرا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

ماسٹر ہوچن نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ میری طرف دوڑا اور میرا ہاتھ پکڑ کر جمنازیم والے حصے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ مجھے ایک کمرے میں بند کر کے وہ واپس دوڑ گیا اور پھر میرے کمرے کا دروازہ تقریباً ایک گھنٹے بعد کھلا تھا۔ جمنازیم میں پولیس بھری ہوئی تھی۔ حملہ آوروں میں سے ایک آدمی مارا گیا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی اور ایک زخمی حالت میں پکڑا گیا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے مجھے اسٹیڈیم میں گھیرنے کی کوشش کی تھی۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، اس وقت ماسٹر پھو جمنازیم میں موجود نہیں تھا۔ سارا معاملہ ماسٹر ہوچن نے سنبھالا تھا۔ پولیس اپنی کارروائی میں مصروف تھی اور ماسٹر ہوچن اس زخمی کو ایک کمرے میں لے گیا تھا اس کے ساتھ دو شاگرد اور بھی تھے لیکن ان میں سے کسی کو ہاتھ پیر ہلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ زخمی خود ہی فر فر بولنے لگا تھا۔

اس کا نام پھوکیٹ تھا اور وہ بازار کا تھرڈ ریٹ غنڈا تھا اور بلیک ٹائیگر نامی ایک بڑے غنڈے کے لیے کام کر رہا تھا۔ بلیک ٹائیگر نے اس کی خدمات صرف دو روز پہلے حاصل کی تھیں اور دس ہزار بھات پر معاملہ طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ پانچ آدمی اور تھے۔ وہ لوگ باقاعدہ منصوبہ بنا کر یہاں آئے تھے۔ ان کی پلاننگ یہ تھی کہ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکیں تو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ وہ لوگ دو دن سے جمنازیم میں آرہے تھے اور آج انہیں موقع مل گیا تھا۔ ان سب کے پاس چاقو اور خنجر وغیرہ تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ پھوکیٹ مجھے گھیرنے کی کوشش کرے گا اور اگر کسی نے مداخلت کی تو اس کے ساتھی مزاحمت کریں گے۔ اتفاق سے میں گھومتا ہوا اسٹیڈیم میں آگیا تھا اور پھوکیٹ میرے پیچھے لگ گیا تھا جبکہ اس کے ساتھی اسٹیڈیم کے باہر جمنازیم کے دوسرے حصوں میں موجود تھے۔

اس وقت میرا خیال تھا کہ میری چیخوں کی آواز کوئی نہیں سنے گا لیکن اسٹیڈیم کے باہر میری چیخیں سن لی گئی تھیں۔ ماسٹر ہوچن فوراً ہی حرکت میں آگیا تھا۔ اسے یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میں کہاں پر ہوں۔ دو تین آدمی اِدھر اُدھر دوڑا دیے تھے اور پھر پھوکیٹ کے آدمیوں سے تصادم ہو گیا تھا۔ پھوکیٹ اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ لوگ مجھے وہاں سے لے جانے یا موت کے گھاٹ اتارنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر میں نہ چیختا تو شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے لیکن میری چیخوں نے بازی پلٹ دی تھی۔

پولیس نے پھوکیٹ کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ وہ مجھے بھی

اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے تھے لیکن ماسٹر ہوچن اڑ گیا تھا کہ مہاراج کی اجازت کے بغیر وہ مجھے لے جانے کی اجازت نہیں دے گا اور مہاراج وانگ ونگ یائے سے الجھنا پولیس کے چھوٹے افسروں کے بس کی بات نہیں تھی۔

بہرحال یہ بات مہاراج وانگ ونگ یائے تک پہنچ گئی تھی کہ مجھے جمنازیم سے اغوا یا قتل کی کوشش کی گئی تھی۔ پہلے شہر سے باہر واقع خانقاہ پر حملہ کیا گیا تھا اور اب جمنازیم میں گھس کر کوئی کارروائی کرنا گویا اس کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بہرحال پتا چل گیا تھا کہ ان حملہ آوروں کی پشت پر بلیک ٹائیگر تھا۔ بلیک ٹائیگر کو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

بلیک ٹائیگر بہت اونچا بدمعاش تھا۔ اس کا ایک باقاعدہ گروہ تھا جو مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس نے یہاں امریکی مافیا سسٹم اپنا رکھا تھا۔ ایک گروہ منشیات کے بزنس کو کنٹرول کرتا تھا اور دوسرا طوائفوں کے کاروبار کی نگرانی کرتا۔ اس طرح تمام شعبے بٹے ہوئے تھے۔

اس معاملے میں بلیک ٹائیگر کے ملوث ہونے پر مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا نے اس سے رابطہ کرلیا تھا۔ اس کے ذریعے مجھے یا تو اغوا کرانا چاہتا تھا یا مروا دینا چاہتا تھا۔

بلیک ٹائیگر کا گروہ اگرچہ بہت طاقت ور تھا لیکن مہاراج وانگ ونگ یائے کی طاقت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے عام شہریوں کی اخلاقی حمایت بھی حاصل تھی۔ اس کے شاگردوں کی تعداد ان گنت تھی۔ اس کے معمولی سے اشارے پر لوگ کٹ مرنے کو بھی تیار ہو جاتے۔ لیکن مہاراج خون خرابا نہیں چاہتا تھا اس نے بلیک ٹائیگر کو پیغام بجھوا دیا کہ وہ دارا یا کم کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لے اور اس شہر کا امن و امان برباد نہ کرے لیکن بلیک ٹائیگر شرافت کی زبان سمجھنے والا نہیں تھا۔ جو آدمی مہاراج کا پیغام لے کر گیا تھا' اس کی واپسی ایمبولینس پر ہوئی تھی۔

مہاراج وانگ ونگ یائے نے ماسٹر پھو کو سگنل دے دیا۔ ماسٹر پھو بھی اگرچہ مہاراج کی طرح دنگا فساد نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے بھی ایک کوشش ضرور کی تھی کہ یہ معاملہ خیر و عافیت سے طے ہو جائے لیکن پھر اسے اس بات کا یقین کرلینا پڑا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے اور اس طرح بلیک ٹائیگر اور ماسٹر پھو میں ایک خوف ناک جنگ چھڑ گئی اور یہ جنگ میری وجہ سے شروع ہوئی تھی۔

جمنازیم میں روزانہ سیکڑوں لوگ آتے۔ ہر سنڈے نائٹ کو اسٹیڈیم میں کک باکسنگ کے مقابلے ہوتے تھے جنہیں دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں لوگ آتے تھے اور کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی تھی۔ اس واقعے کے بعد جمنازیم میرے لیے غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ اس لیے مجھے وہاں سے فیلا فیلا چائی روڈ کے پہلو میں واقع ایک عمارت میں منتقل کردیا گیا۔ یہ گنجان آبادی والا علاقہ تھا۔

یہاں کی آبادی اگرچہ ملی جلی تھی لیکن اکثریت ہندوؤں کی... اس علاقے میں ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔

مجھے ملہوترہ مینشن نام کی جس چھ منزلہ عمارت میں... بھی ایک ہندو کی ملکیت تھی۔ دو دو اور تین تین کمروں کے فلیٹ تھے۔ فلیٹ کیا مرغیوں کے ڈربے تھے جن میں انسان... مجبور تھے۔ آمد و رفت کے لیے دو تنگ سے زینے اور ایک... تھی۔ لفٹ اکثر خراب رہتی تھی۔ زینوں پر اس قدر... غلاظت بکھری رہتی تھی کہ آتے جاتے ابکائیاں آنے لگتی...

ہمارا تین کمروں پر مشتمل فلیٹ دوسری منزل پر تھا... کے سامنے کے رخ پر تو تنگ سی گلی تھی اور پچھلی طرف... جہاں صبح سے رات تک ایک ہنگامہ سا رہتا تھا۔ مجھے حیرت... اس پُرہنگام علاقے میں لوگ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔

میرے ساتھ دو آدمیوں کو بھیجا گیا تھا۔ مجھے فلیٹ میں... کے بعد ایک آدمی واپس چلا گیا اور دوسرے کو وہیں رہنا... فلیٹ میں دو ہندو عورتیں رہائش پذیر تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر... دوسری جوان۔ وہ دونوں بہنیں تھیں۔ جوان عورت کی... کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ میں اسے مہاراج کے جمنازیم... ایک دو مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ اس روز باتوں میں انکشاف ہوا... نام کی وہ خوب صورت عورت ماسٹر پھو کی شاگرد تھی اور... علاقے میں ٹریننگ سینٹر چلا رہی تھی۔ اس کی بڑی بہن شانتی... وٹ روڈ کے ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر ملازم تھی۔ وہ... اور واپسی رات کو ہوتی لیکن میرے آنے کے بعد وہ... جاننے والے کے ہاں منتقل ہوگئی تھی۔

تین دن نہایت سکون سے گزرے۔ کوشلیا کا اب زیادہ... گھر پر ہی گزرتا۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی۔ سنگاپور سے نکلنے... بعد مجھے پہلی مرتبہ یہاں انڈین کھانے' کھانے کو ملے۔ کوشلیا... خود گوشت نہیں کھاتی تھی لیکن اس روز اس نے میرے لیے... طور پر گوشت کا سالن تیار کیا تھا جو بہت لذیذ تھا۔

دن میں دو تین مرتبہ ماسٹر پھو ٹیلی فون پر صورت حال... کرلیا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے بھی اس سے بات کی تو... میں نے اسے یہ بتایا کہ میں یہاں بور ہو رہا ہوں تو اس نے... تھا کہ دو چار روز میں مجھے کسی اور جگہ منتقل کردیا جائے گا... بوریت نہ ہو۔

میرے کمرے کی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی۔ دن... اس کھڑکی کے سامنے دبیز پردہ پڑا رہتا لیکن شام کا اندھیرا... بعد میں کمرے کی بتی بجھا کر کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا اور بازار... دیکھتا رہتا۔

مجھے اس فلیٹ میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا... دوران میں فلیٹ کے دروازے کی طرف بھی نہیں گیا تھا... ساتھ جو محافظ بھیجا گیا تھا' وہ داخلی دروازے کے ساتھ...

کمرے میں بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا اور دوسری طرف باتھ روم۔ آگے دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں رات کو میں سوتا تھا اور دوسرے میں کوشلیا۔ میرے کمرے میں ایک چھوٹا سا باتھ روم بھی تھا۔

رات کو سوتے وقت دونوں کمروں کے دروازے اندر سے بند کرلیے جاتے تھے۔ ان دونوں کمروں کے بیچ میں بھی ایک دروازہ تھا جو کھلا رہتا تھا۔

اس رات کوشلیا دیر تک میرے کمرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہی اور جب نیند سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں بستر پر لیٹ گیا۔ فوراً ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میں شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ ایک حسین اور جوان عورت مجھ سے لپٹی جارہی تھی۔ کبھی وہ میری پیشانی پر بوسے دیتی اور کبھی گالوں پر۔ اس کے ہاتھ مسلسل حرکت میں تھے۔ میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ ایک لطیف سے احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ایسا احساس میں نے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا اور پھر اس حسین عورت نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر جما دیے اور مجھے بھینچنے لگی۔ میرا سانس گھٹنے لگا۔ میں اپنے آپ کو اس عورت کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کے لیے کسمسانے لگا لیکن اس نے بڑی سختی سے مجھے دبوچ رکھا تھا۔

اپنے آپ کو اس عورت کے شکنجے سے چھڑانے کی جدوجہد میں میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں کانپ کر رہ گیا۔ وہ کوئی خواب نہیں تھا۔ ایک خوف ناک حقیقت تھی۔ کوشلیا مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں اسے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ارے۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔" کوشلیا نے سرگوشی کی۔

"یہ۔۔۔۔ یہ آپ کیا کررہی ہیں۔" میں ہکلایا "میری نظروں میں آپ کا بہت احترام ہے۔ میں تو۔۔۔۔"

"مجھے اپنی بہن یا آنٹی سمجھتے ہو۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا۔" اس نے میری بات کاٹ دی "یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں۔ باقی سب فریب ہے۔ جس شخص نے سب سے پہلے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے تیس سال بڑا تھا اور مجھے بیٹی کہتا تھا۔ میں کسی رشتے کو نہیں مانتی۔ تم مجھے آنٹی کہو یا دیدی لیکن میں تمہیں صرف اور صرف ایک مرد سمجھتی ہوں جو میری خواہش پوری کرسکتا ہے۔ اب تم خاموشی سے وہ کرتے رہو جو میں کہوں۔"

"نہیں نہیں۔" آواز میرے حلق میں اٹک رہی تھی "پلیز! مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کسی ایسے کام کے لیے مت کہو جسے میں برا سمجھتا ہوں اور جس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم بچے نہیں ہو۔ بھرپور نوجوان ہو۔" کوشلیا نے کہا۔ اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں "تم کچھ نہیں جانتے۔ یہی تو میں بتانا چاہتی ہوں کہ زندگی کیا ہے۔ زندگی کی اصل رنگینیاں اب تک تمہاری نگاہوں سے اوجھل رہی ہیں اور میں تمہیں ان سے متعارف کرانا چاہتی ہوں۔ آؤ۔ مجھ سے دور مت ہٹو۔ دیکھو۔ میری طرف دیکھو۔۔۔۔"

"نہیں۔" میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا اور بیڈ سے اتر کر کھڑکی کے قریب آگیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

کوشلیا بھی میرے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں کے اوپر سے آگے لٹکا دیے اور میری پشت سے چپک کر کھڑی ہوگئی۔

"تم زندگی کی ایک بہت بڑی نعمت کو ٹھکرا رہے ہو۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے انکار کیا تو اس کا نتیجہ۔۔۔۔"

"پلیز!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "آپ میرے پاس سے ہٹ جایئے ورنہ میں رومیو کو آواز دے کر بلالوں گا۔" رومیو اس محافظ کا نام تھا جو باہر والے کمرے میں سو رہا تھا۔

یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ وہ مجھے چھوڑ کر الگ ہوگئی۔ اس نے مجھے بانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ کسی کی نظروں میں ایسی سرد مہری میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"تم اپنی زبان بند رکھو گے۔" اس کی سرگوشی میں بھی دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرے بازو چھوڑ دیے اور پیر پٹختے ہوئے اندرونی دروازے سے گزر کر اپنے کمرے میں بیڈ پر جا گری۔

میں بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ میری عجیب کیفیت تھی۔ دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے اور پورے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ جسم کے مسام پسینہ اگل رہے تھے اور سانس تیز ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا اور تازہ ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

میں نے اپنے بارے میں پہلے کبھی نہیں سوچا تھا لیکن اب کوشلیا کے اس طرزِ عمل نے میرے دماغ میں ہلچل سی مچا دی تھی۔ کیا میں واقعی اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ عورتیں مجھ سے اس قسم کی توقعات وابستہ کرسکیں؟ میں تو اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھتا تھا اور کبھی ایسی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ میں نے کئی عورتوں کو نیم برہنہ بھی دیکھا تھا۔ سنگاپور میں تو حارہ کاشی کے ساتھ لپٹ کر سوتا رہا تھا لیکن میرا ذہن کبھی پراگندہ نہیں ہوا تھا۔ حارہ کاشی کی آغوش میں مجھے ہمیشہ سکون ملا تھا۔ اس کے سینے سے لپٹ کر میں نے ہمیشہ ماتا کی گرمی محسوس کی تھی۔ کئی مہینوں تک خانقاہ میں پھی پھی کے ساتھ رہا تھا۔ وہ کوشلیا سے زیادہ جوان اور حسین تھی اور رات کو میں اکثر

اسی کے ساتھ لپٹ کر سویا کرتا تھا لیکن میرے ذہن میں کبھی کوئی شیطانی خیال نہیں آیا تھا۔ کوشلیا کے ساتھ رہتے ہوئے بھی دل میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی لیکن آج کوشلیا نے جو حرکت کی تھی، اس نے مجھے اپنے بارے میں بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کوشلیا اپنے بیڈ پر بے لباس آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ اس کے کپڑے میرے بیڈ پر پڑے ہوئے تھے۔ میں چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اس کے کپڑے اٹھا کر دبے قدموں اس کے کمرے میں آگیا۔ کپڑے اس کے بیڈ پر رکھ دیے، چادر اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دی اور دوبارہ کھڑکی کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

عمارت کے پیچھے کی وہ سڑک جہاں دن بھر زندگی کے ہنگامے جاری رہتے تھے اور لوگوں کی ہاہو میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، اس وقت سنسان پڑی تھی۔ میری آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ دور کسی کلاک نے تین بجے کا اعلان کیا تو میں نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوشلیا اسی پوزیشن میں اپنے بستر پر پڑی تھی۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر اپنے بیڈ پر آگیا اور آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دماغ میں اب بھی ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے میں نے کسی کلاک ٹاور سے چار بجنے کے گھنٹے کی آواز بھی سنی تھی اور پھر نجانے کب میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

صبح جب آنکھ کھلی تو کوشلیا میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ میرے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے مجھے جگا رہی تھی۔

"اٹھ جاؤ۔ دس بج چکے ہیں۔ تمہاری وجہ سے میں نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

اس نے مزید جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا تو میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں ڈر گیا تھا کہ کہیں وہ اس سے آگے نہ بڑھ جائے لیکن پھر کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر مجھے اطمینان سا ہوا۔

"رات کو جو کچھ بھی ہوا، اسے بھول جاؤ۔" کوشلیا نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "نجانے مجھے کیا ہوگیا تھا۔ مجھے معاف کردو ڈیئر اور بھول جاؤ سب کچھ۔ مجھے یقین ہے کہ تم کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرو گے۔"

"میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔" میں کہتے ہوئے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

کوشلیا بظاہر اپنے کیے پر نادم تھی لیکن میں محتاط رہنے لگا تھا۔ جبکہ اس کے رویے سے لگتا تھا جیسے میری چاپلوسی کررہی ہو۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ اس رات میں اور کوشلیا باتیں کررہے تھے کہ سیڑھیوں کی طرف سے شور سا سنائی دیا۔ ہم دونوں چونک گئے۔ شور کی آواز نیچے سے آرہی تھی۔ کوشلیا کے اشارے پر رومیو دروازہ کھول کر فلیٹ سے باہر نکل گیا اور صورت حال معلوم کرنے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگا لیکن پہلی سیڑھی سے مڑ کر وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ بدحواسی میں کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ کوشلیا دوڑ کر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اسی لمحے رومیو اسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا اور وہ دونوں بھاری فرنیچر کھینچ کر دروازے کے سامنے رکھنے لگے۔

"وجدان۔ وہ لوگ آگئے۔ کسی جگہ چھپ جاؤ۔" کوشلیا چیخی اور اس نے دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تلوار اتارلی۔ اس تلوار کا پھل آگے سے بالشت بھر چوڑا تھا اور اندر کی طرف سے خم کھاتا ہوا بتدریج چوڑائی کم ہوتی چلی گئی تھی۔

یہ سمورائی تھی۔ زمانہ قدیم میں یہ وزنی تلوار جنگ کے لیے بہت کارگر اور اہم ہتھیار سمجھی جاتی تھی لیکن اب تو یہ نمائش و آرائش کے لیے رہ گئی تھی۔ تاہم مارشل آرٹس کے کھیلوں میں تلوار اور سائی قسم کے کچھ اور قدیم ہتھیار استعمال ہوتے تھے۔ رومیو نے بھی ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔

میرے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اس چھوٹے سے فلیٹ میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ باتھ روم میں یا کسی بیڈ کے نیچے چھپنے کی کوشش کرنا ایسا ہی تھا جیسے کبوتر بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلے اور سمجھے کہ میں محفوظ ہوں۔

بھاگ دوڑ اور شور کی آوازیں اب اوپر آتی جارہی تھیں۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ اگر کوئی ہمارے فلیٹ پر حملہ کرنے آیا تھا تو انہیں نیچے روکنے والے کون تھے اور پھر کوشلیا سے مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ماسٹر چھو کے دو آدمی ہر وقت نیچے گلی میں موجود رہتے تھے اور حملہ آوروں کا انہی سے تصادم ہوگیا تھا۔

ہنگامہ اب ہماری سیڑھی سے نیچے والی لینڈنگ پر ہورہا تھا۔ اچانک دو فائر ہوئے اور اس کے ساتھ ہی ایک بھیانک چیخ سنائی دی تھی۔

"تم اپنے کمرے کے باتھ روم میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کرلو۔" کوشلیا چیخی۔ وہ تلوار کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالے دروازے کے ایک طرف کھڑی ہوگئی تھی اور رومیو ریوالور سنبھالے دوسری طرف دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا تھا۔

وہ لوگ اوپر پہنچ گئے تھے۔ بلڈنگ میں رہنے والے لوگوں کی عورتوں کے چیخنے کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں اور ہمارے فلیٹ کا دروازہ زور زور سے دھڑدھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی تھائی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہا جارہا تھا۔

"وجدان۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔" کوشلیا میری طرف دیکھ کر چیخی۔

باہر سے فائر کی آواز سنائی دی۔ گولی دروازے کے تالے پر چلائی گئی تھی اور پھر یوں لگا جیسے دروازہ توڑنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ میں بھاگ کر اپنے کمرے میں آگیا اور باتھ روم میں گھستے گھستے رک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا اور پھر لپک کر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باتھ روم والی سائڈ پر دیوار کے ساتھ ڈرین پائپ تھا جو بلڈنگ کے اوپر سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ گیا اور بائیں طرف لٹک کر ایک ہاتھ سے اس ڈرین پائپ کو پکڑلیا اور کھڑکی کی چوکھٹ سے دوسرا ہاتھ بھی چھوڑدیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے ڈرین پائپ کو پکڑے تیزی سے نیچے پھسلنے لگا۔ فلیٹ کے دروازے پر زور آزمائی کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

پہلی منزل کی کھڑکی سے ذرا نیچے بجلی کے تار تھے..... میں بڑی احتیاط سے ان تاروں سے بچتا ہوا نیچے آیا اور پھر کڑک کی ہلکی سی آواز سن کر مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس جگہ ڈرین پائپ کا ایک جوڑ تھا اور پائپ کو دیوار کے ساتھ سہارا دینے والا بریکٹ ایک طرف سے ٹوٹا ہوا تھا۔ میرے بوجھ سے دوسرے بریکٹ کی کیل بھی نکل رہی تھی اور پائپ آہستہ آہستہ دیوار سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔

میں نے گردن موڑ کر نیچے دیکھا۔ اس وقت اگرچہ سوا گیارہ بج رہے تھے مگر بازار میں اب بھی رونق تھی۔ روشنیوں سے بازار جگمگا رہا تھا۔ بہت سی دکانوں کے اوپر دھوپ اور بارش سے بچنے کے لیے کینوس کے سائبان تنے ہوئے تھے۔ میرے نیچے والی دکانوں پر بھی سائبان تنے ہوئے تھے۔

اسی دوران میں سڑک پر ایک راہ گیر نے مجھے دیکھ لیا اور وہ اوپر اشارہ کرتے ہوئے شور مچانے لگا۔ فلیٹ سے دو گولیاں چلنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں نے پھر نیچے دیکھا اور اس سے پہلے کہ پائپ پوری طرح اپنی جگہ چھوڑ دیتا، میں نے پائپ کو چھوڑ دیا۔

میں ترپال کے سائبان کو ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔ سائبان میں ہلکا سا تناؤ ہونے کی وجہ سے مجھے چوٹ نہیں لگی تھی البتہ اس دکان کے سامنے کھڑے ہوئے دو تین آدمی سائبان کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ راہ گیر میری طرف دیکھ کر شور مچا رہے تھے۔ میں سنبھلتے ہی اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ٹھیک اسی لمحے فلیٹ کی کھڑکی سے فائر ہوا۔ گولی سڑک پر کھڑی ہوئی ایک کار کی ونڈ اسکرین پر لگی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور دوڑتا ہوا ایک گلی میں گھس گیا۔

میں رکا نہیں۔ گلیوں ہی گلیوں میں دوڑتا رہا۔ ایک تاریک گلی میں ٹھوکر کھا کر گرا۔ میرے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑا گھٹنا سہلاتا اور کراہتا رہا۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں۔ میں اس شہر میں بالکل اجنبی تھا۔ مجھے جہاں بھی لے جایا گیا تھا بند گاڑیوں میں۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ کون سا راستہ کس طرف جاتا ہے۔ اپنے آپ کو یکا و تنہا اور بے سہارا محسوس کرکے میرے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کیا مجھ جیسا کوئی بدقسمت اس دنیا میں ہوگا جس کے ماں باپ کو اس کی آنکھوں کے سامنے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہو اور وہ موت کے فرشتوں سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا ہو۔

میں کچھ دیر دیوار کے ساتھ کھڑا مضروب گھٹنا سہلاتا رہا اور پھر لنگڑاتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ میں اس سڑک سے ابھی زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے ان گلیوں میں بھی آنکلیں گے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ رومیو اور کوشلیا کا کیا حشر ہوا ہوگا لیکن اتنا جانتا تھا کہ اگر میں ان کے ہاتھ لگ گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

میں ایک گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بائیں طرف کی گلی سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ میں پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اور پھر چند گز پیچھے جا کر ایک مکان کے سامنے تھڑے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس طرف مکانوں کے ساتھ ساتھ ایک گندی نالی تھی۔ گھروں کا گندہ پانی اس نالی میں گرتا تھا اور بعض گھروں کے دروازوں کے سامنے اس طرح کے سیمنٹ کے چبوترے بنے ہوئے تھے کہ نالی بھی ان کے نیچے سے رواں تھی اور گھروں میں آمدورفت کے لیے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔

میں اس چبوترے کے پیچھے دبک کر قدموں کی آوازیں سننے لگا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ میں نے جھانک کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ شخص مجھ سے صرف بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس نے کالی پتلون اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ بال گردن تک لمبے تھے اور سر پر سرخ بینڈ لگا ہوا تھا۔ اس وقت میری کیفیت واقعی اس کبوتر جیسی تھی جس نے بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلی ہوں۔

میرے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہوگئی تھی۔ جسم پسینے میں تر ہونے لگا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ گلی سنسان تھی۔ اگر آمدورفت ہوتی تو یقیناً کسی نہ کسی کی نظروں میں آجاتا۔ چند سیکنڈ بعد قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پھر گردن نکال کر دیکھا۔ وہ آدمی دوسری طرف جارہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر وہ اس گلی میں آجاتا تو میں پکڑا جاتا۔

قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میں چبوترے کی آڑ سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا موڑ پر آگیا اور جھانک کر دیکھنے لگا۔ بائیں طرف تقریباً پچاس گز آگے وہ ایک اور آدمی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ دونوں سامنے والی گلی کی طرف مڑ گئے۔ میں بھی اس گلی سے نکل کر دوسری گلی کی طرف دوڑا۔ اسی لمحے مجھے چیخنے کی آواز سنائی

دی۔ انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور وہ دونوں چیختے ہوئے میرے پیچھے دوڑ پڑے۔

میں جان توڑ کر اس گلی میں دوڑ رہا تھا۔ جوگنگ اور ایروبکس کی ٹریننگ میرے کام آ گئی تھی۔ مجھے دوڑتے ہوئے ذرا بھی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ پکڑے جانے کا خوف مجھے مزید تیز دوڑنے پر اکسا رہا تھا۔

دو تین گلیوں میں دوڑتا ہوا میں ایک اور کشادہ بازار میں آ گیا اور سڑک عبور کر کے ایک اور گلی میں داخل ہو گیا۔ چند گز آگے ایک نائٹ کلب تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرا تعاقب کرنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں کلب میں گھس گیا۔

دروازے میں گھستے ہی ایک آڑ میں کھڑے ہو کر میں اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا اور پھر مختصر سی ڈیوڑھی گھوم کر میں مرکزی ہال کی طرف آ گیا۔

ہال کی ساری میزیں بھری ہوئی تھیں۔ فضا میں تمباکو کی بو رچی ہوئی تھی۔ سامنے اسٹیج پر عورتوں کی باکسنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ مختصر سے لباس میں دو جوان لڑکیاں تھیں جو ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھیں اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگ شور مچا رہے تھے۔

کوشلیا نے مجھے بتایا تھا کہ بنکاک میں خواتین میں بھی کک باکسنگ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ نائٹ کلبوں میں بھی خواتین کے ان مقابلوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ نچلے درجے کے نائٹ کلبوں کا بزنس عورتوں کے ان باکسنگ کے مقابلوں پر چلتا ہے۔

یہ بھی کوئی ایسا ہی نچلے درجے کا کلب تھا لیکن میں اس ہال میں نہیں رکا۔ دیوار کے ساتھ تیز تیز چلتا ہوا ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ آگے ایک تنگ سی راہداری تھی۔ جس کے اختتام پر ایک اور دروازہ تھا۔ میں وہ دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بڑی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے متلی سی ہونے لگی۔ اس ہال کے ایک کونے میں کم روشنی کا صرف ایک بلب جل رہا تھا۔ پورا ماحول نیم تاریک تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی تھی۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ فرش پر کئی لوگ آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ ہال میں پھیلی ہوئی شدید ناگوار بو کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ وہ سب لوگ نشہ کر کے اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ نیم تاریک ماحول میں کہیں کہیں مدھم سی چنگاریاں بھی سلگتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ حشیش کے سگریٹ پی رہے تھے۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا اور پھر اپنے عقب میں وہی دروازے کی آواز سن کر چونک گیا جس سے گزر کر میں یہاں تک آیا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں بڑی پھرتی سے فرش پر ایک ایسے آدمی کے قریب لیٹ گیا جس کے نہ صرف منہ سے بلکہ لباس سے بھی بڑی ناگوار بو آ رہی تھی۔ میں نے فرش پر گر کر عقل مندی کی تھی کیونکہ اسی وقت پینٹ اور سفید شرٹ والا وہ آدمی ہال میں داخل ہوا جس نے سرخ رنگ کا بینڈ لپیٹا ہوا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ غالباً اس نے پستول جیب میں ڈال لیا تھا۔

وہ چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا رہا اور پھر آگے بڑھ کر نشے میں دھت لوگوں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ ایک آدمی کو ٹھوکر لگی تو اس نے بڑی غلیظ گالی دی۔ وہ غنڈا بھی گالیاں بکتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر وہ واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دو تین منٹ تک فرش پر پڑا رہا۔ فرش پر اس طرح پڑے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری ایک پنڈلی گیلی ہو رہی ہے۔ شاید فرش پر پانی گرا ہوا تھا۔ ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا تو مجھے ابکائی سی آ گئی۔ میرے ساتھ جو آدمی نشے میں مدہوش پڑا تھا، اس کی پتلون گیلی ہو رہی تھی۔ مجھے کراہیت آنے لگی۔ میں نے اپنی نیکر سے ہاتھ صاف کیا اور گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اس طرف عقبی گلی میں نکلنے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔

ہال کے اختتام پر ایک تنگ سی راہ داری تھی۔ میں اس راہداری میں گھستا چلا گیا۔ آگے یہ راہداری دائیں طرف مڑ رہی تھی۔ جبکہ بائیں طرف اوپر جانے کے لیے لکڑی کا ایک تنگ زینہ تھا۔ میں راہداری میں مڑنا ہی چاہتا تھا کہ اس طرف قدموں کی آواز سن کر بڑی پھرتی سے زینے کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک آدمی راہداری میں مڑ گیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آواز سنائی دی۔ وہ اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"پہلے وہ لوگ آئیں جنہیں سگریٹ چاہئیں۔ اس کے بعد انجکشن والے آئیں۔ رقم ہر ایک کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ ایک بھات بھی کم ہوا تو کچھ نہیں ملے گا۔"

میں بڑی آہستگی سے زینے کے پیچھے سے نکلا۔ ٹھیک اسی وقت ہال کی طرف سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے سارے موالی ایک ہی مرتبہ اس آدمی پر جھپٹ پڑے ہوں۔ میں زینے کے پیچھے سے نکل کر سامنے راہداری میں جانے کے بجائے غیر ارادی طور پر لکڑی کے زینے پر چڑھتا چلا گیا۔ زینے کے اختتام پر ایک مختصر سی راہ داری تھی۔ اس راہداری میں آمنے سامنے ایک ایک کمرا اور ایک دروازہ بالکل سامنے تھا۔ سامنے والا دروازہ کسی کمرے کا نہیں تھا کیونکہ اوپر کھلا آسمان نظر آ رہا تھا۔

دائیں بائیں دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ بائیں طرف والے کمرے میں تاریکی تھی جبکہ دائیں طرف والے کمرے میں روشنی تھی۔ سامنے نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اس دروازے کے قریب پہنچ گیا اور ذرا سا پردہ سرکا کر

جھانکنے لگا۔ وہ دفتر نما کمرا تھا۔ سامنے والی کرسی پر نیلی شرٹ میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ دائیں طرف صوفہ چیئر پر بُلڈاگ کی شکل والا ایک بھاری بھرکم آدمی تھا۔ دونوں طرف جبڑوں پر اس کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دوسری صوفہ چیئر پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھ کر مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ چی فانگ تھا۔ میری ماں کا قاتل!

ٹھیک اسی لمحے نچلے ہال کی طرف سے دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے وہ تینوں آدمی چونک گئے۔ نیلے سوٹ والا اور چی فانگ اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے پردہ چھوڑ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر میں بڑی تیزی سے سامنے والے کمرے میں گھس گیا۔

○☆○

وہ دونوں کمرے سے نکل کر تیزی سے زینہ اترتے چلے گئے۔ لکڑی کی سیڑھیوں پر ان کے قدموں کی دھڑدھڑ کی آواز سنائی دیتی رہی۔ اسی دوران میں ایک اور گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا تو وہ تیسرا بھاری بھرکم آدمی بھی سامنے والے کمرے سے نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور کسی کھلونے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اس کے بوجھ سے تختے چرچرا رہے تھے۔

وہ جیسے ہی سیڑھیوں سے غائب ہوا میں کمرے سے نکل کر تیزی سے اس تیسرے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ لاک بھی تھا اور اس سے ذرا اوپر بولٹ بھی لگا ہوا تھا۔ پہلے میں نے لاک کی ناب اوپر اٹھا دی۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز ابھری۔ زنگ آلود بولٹ ذرا ٹائٹ تھا۔ اسے کھولنے میں کسی قدر دشواری پیش آرہی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن بڑی تیز تھی اور میرا ہاتھ بھی کچھ کانپ رہا تھا اور پھر جب میں نے سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز سنی تو میرا دل بھی کانپ اٹھا۔ غالباً وہی موٹا آدمی واپس آرہا تھا۔ وہ سیڑھی کے تختے پر قدم رکھتا تو پہلے دھب کی آواز ابھرتی پھر تختہ چرچرانے لگتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت میرے اور موت کے درمیان تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ گولی کسی بھی لمحے میری پشت میں پیوست ہوجائے گی۔ وہ بُلڈاگ کسی بھی لمحے اوپر آسکتا تھا۔

میں نے کنڈے کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ کھٹ کی آواز سے بولٹ کھل گیا۔ آواز کچھ زیادہ ہی ابھری تھی۔ دھکا دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ دوسری طرف نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کے اختتام پر بھی ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو سیڑھیوں پر مجھے اس بُلڈاگ کی کھوپڑی نظر آئی۔ اگلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ دروازہ کھلا ہوا دیکھ سکتا تھا میں مڑ کر بڑی تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اوپر سے مجھے چیخنے کی آواز سنائی تھی۔ اس شخص کی آواز بھی بُلڈاگ جیسی ہی تھی۔

ابھی چار پانچ سیڑھیاں باقی تھیں کہ میں نے چھلانگ لگا دی۔ تقریباً چھ فٹ لمبا فرش اور پھر دروازہ تھا اور یہ غنیمت تھا کہ دروازے میں بولٹ نہیں تھا صرف آٹومیٹک لاک تھا۔ ناب اوپر اٹھا کر ہینڈل گھما دیا اور دروازہ کھولتے ہوئے پیچھے دیکھا۔ وہ بھاری بھرکم آدمی اوپر والے دروازے کے قریب اور غالباً فائر کرنے کے لیے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا رہا تھا۔ میں دروازے کے باہر چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے فائر ہوا اور گولی دروازے کے ایک پٹ کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔

میں نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ایک تنگ اور اندھیری سی گلی تھی۔ بائیں طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ اس طرف بازار تھا۔ میں نے اسی طرف دوڑ لگا دی۔

میں اس گلی کے سرے پر پہنچا ہی تھا کہ کلب کی پچھلی طرف والے اس عقبی دروازے سے دو آدمی باہر نکلے۔ وہ گلی میں ایک لمحے کو رکے پھر ایک تو مخالف سمت میں دوڑتا چلا گیا اور دوسرا میری طرف آنے لگا۔ میں سڑک پر آکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک عورت کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر جم کر بیٹھ رہی تھی۔ وہ کار کا انجن اسٹارٹ کرچکی تھی اور اسے گیئر میں ڈال رہی تھی۔ کار جیسے ہی حرکت میں آئی میں نے دوڑ کر سڑک پار کی اور پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اس عورت نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”پلیز! گاڑی مت روکو۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ وہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں۔“ میں نے عورت کی طرف دیکھتے ہوئے التجا دینے والے لہجے میں کہا۔

میری حالت دیکھ کر اس عورت کو شاید مجھ پر ترس آگیا تھا۔ اس نے سنبھل کر اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کار کی رفتار بڑھا دی۔ کچھ دور جا کر اس نے سائڈ میں لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا۔ میں بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھا قدرے محتاط انداز میں پچھلی ونڈ اسکرین سے دیکھ رہا تھا۔ گلی میں دوڑنے والا شخص سڑک پر آگیا تھا۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر مخالف سمت میں ایک ریسٹورنٹ کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس کے روپوش ہوتے ہی میرے منہ سے بے اختیار اطمینان کا سانس نکل گیا۔

کار تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی وائرلیس روڈ پر آگئی۔ اگرچہ وہاں سے کافی دور نکل آئے تھے لیکن میں سیٹ پر دبکا رہا۔ میرے خیال میں ابھی خطرہ دور نہیں ہوا تھا۔ اگر انہوں نے موٹرسائیکلوں یا کاروں پر میری تلاش شروع کردی تو یہ کار ان کی نظروں میں آسکتی تھی۔

وائرلیس روڈ کے ایک طرف وسیع و عریض لم فینی پارک تھا اور دوسری طرف لم فینی باکسنگ اسٹیڈیم۔ اس وقت رات کے دس بجنے والا تھا اور پارک سنسان پڑا تھا۔ اسٹیڈیم والی سائڈ پر بھی

ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے اس عورت نے کار کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی۔ لیکن آگے راما فور روڈ کے چوراہے پر رفتار کم کرنی پڑی۔ سامنے دو متوازی سڑکیں تھیں۔ ایک سیتھوم فوسوڈ اور دوسری سیتھوم تائی روڈ۔ یہ دونوں سڑکیں چاؤ فیا ریور کی طرف چلی جاتی تھیں۔

راما فور روڈ پار کرکے اس عورت نے کار سیتھوم تائی روڈ پر ڈال دی اور سامنے لگے ہوئے آئینے کا زاویہ درست کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا خیال ہے اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔“

میں سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کار اس وقت سینٹ لوئس اسپتال کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

”کرائے کھون....“ وہ آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”کھون چو آرائی؟“ تم کون ہو۔ تمہارا نام کیا ہے؟

”ڈائی جان چیو وجدان۔“ میں نے اپنا نام بتا دیا اور رک رک کر بتانے لگا کہ ہمارے فلیٹ پر کچھ غنڈوں نے حملہ کردیا تھا اور میں ان سے جان بچا کر بھاگ نکلا تھا لیکن وہ میرے تعاقب میں تھے۔ اگر وہ مجھے اپنی کار میں بیٹھنے کی اجازت نہ دیتی تو وہ غنڈے مجھے شاید اب تک قتل کرچکے ہوتے۔ مجھے اس طرح اٹک اٹک کر بولتے دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ میں تھائی نہیں ہوں۔ میرا چہرہ بھی اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ میں ہندوستانی یا اسی خطے کے کسی اور ملک کا باشندہ ہوں۔ بنکاک میں بہت سے ہندوستانی آباد تھے۔ اور مجھے بھی ہندوستانی سمجھ لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میں نے اس عورت کو اپنے بارے میں تفصیل سے سب کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

ٹاکسن برج سے دریا پار کرکے کار کرونگ تھان بوری روڈ پر آگئی اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد سوئے و تانا کی طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ اس کے دونوں طرف بنگلے بنے ہوئے تھے اور پھر ایک نہر کا پل پار کرتے ہی کار ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ اس عورت نے کار کا انجن چلتا چھوڑ دیا اور نیچے اتر کر بنگلے کا گیٹ کھولنے لگی اور پھر وہ دوبارہ کار میں آکر بیٹھ گئی اور کار کو اندر لیتی چلی گئی۔

میں پورٹیکو میں کار سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ عورت باہر کا گیٹ بند کرنے چلی گئی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ عورت یہاں اکیلی رہتی تھی۔ بنگلے کا لان بہت بڑا تھا اور اسی حساب سے رہائشی حصہ بھی تھا۔

برآمدے والا دروازہ بھی چابی لگا کر ہی کھولا گیا تھا۔ اندر داخل ہو کر اس عورت نے بتیاں جلا دیں اور مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ کمرا بہت وسیع اور شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک کارنس پر بدھ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوب صورت فریموں میں کچھ رنگین تصویریں بھی آویزاں تھیں۔

وہ عورت مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اس عورت کو۔ اس نے گھٹنوں سے اوپر ہلکے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور اسی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ شہد کی رنگت کے بال مردانہ اسٹائل میں کٹے ہوئے تھے۔ گلے میں سونے کی چین تھی جس میں ایک چھوٹا سا خوب صورت لاکٹ بھی جھول رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس یا بتیس سال رہی ہوگی اور وہ بڑی حسین عورت تھی۔

میری حالت اس وقت بڑی ابتر ہو رہی تھی۔ گلی میں دوڑتے ہوئے گھٹنے پر رگڑ لگنے سے کھال چھل گئی تھی۔ خون تو نہیں نکلا تھا لیکن وہ جگہ سرخ ہو رہی تھی۔ میں اس وقت نیکر اور شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ نائٹ کلب کے ہال میں اس نشئی کے ساتھ لپٹنے سے میرے کپڑے گندے ہوگئے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مجھے اپنے آپ سے بھی کراہت محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا نام تھائی وانگ تھا۔ وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی اور پھر مجھے ایک اور کمرے میں لے آئی۔ یہ بیڈ روم تھا۔ اس نے اندر کا ایک اور دروازہ کھول کر مجھے اشارہ کیا۔ میں جھجکتا ہوا اس دروازے میں داخل ہوگیا۔ وہ باتھ روم تھا۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور کپڑے اتار کر شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ ٹھنڈا پانی اس وقت مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں دیر تک نہاتا رہا۔ تقریباً بیس منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور میں بدحواس سا ہو کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔

”اگر نہا چکے ہو تو یہ تولیا لپیٹ کر باہر آجاؤ۔“ تھائی وانگ نے کہتے ہوئے گلابی رنگ کا ایک تولیا آگے بڑھا دیا۔

اس کے ہاتھ سے تولیا لیتے ہوئے میں ایک بار پھر گڑبڑا گیا۔ باتھ روم کی سامنے والی دیوار میں قد آدم آئینہ لگا ہوا تھا اور تھائی وانگ دروازے میں کھڑی مجھے اس آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے تولیا اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور دروازہ بند کردیا اور آئینے میں دیکھنے لگا۔

میں اب واقعی سنگاپور والا وجدان نہیں رہا تھا جسے بچہ سمجھا جاتا تھا۔ ان چند مہینوں کے دوران میں نہ صرف میرا قد بڑھا تھا بلکہ جسم میں بھی کچھ تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں۔ سینہ چوڑا اور بازوؤں کے مسل ابھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ یہ شاید پچھلے چند مہینوں کی بھاگ دوڑ، مشقت اور موئے تھائی کی کٹھن ایکسر سائز اور پریکٹس کا نتیجہ تھا کہ میں جسمانی اعتبار سے اپنی عمر سے کہیں بڑا اور جوان لگ رہا تھا۔ گزشتہ کئی روز سے میرے سر پر اُسترا نہیں پھرا تھا۔ سر اور بھوؤں پر بھی کچھ بال نظر آرہے تھے۔

میں نے جسم پونچھ کر تولیا اچھی طرح لپیٹ لیا۔ پہلے دروازہ تھوڑا سا کھول کر جھانکا اور پھر باہر آگیا۔ تھائی وانگ کمرے میں نہیں تھی۔ باتھ روم سے نکلتے ہوئے میں اپنے کپڑے بھی اٹھا لایا تھا۔ اور نیکر پہننے ہی لگا تھا کہ تھائی وانگ کمرے میں داخل ہوئی۔

”گندے کپڑے دوبارہ پہن رہے ہو۔ ایک طرف ڈال دو انہیں۔“ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی ”لو..... فی الحال یہ پہن لو۔ صبح کوئی بندوبست کروں گی۔“ اس نے ایک نیکر اور بنیان بیڈ پر ڈال دی۔ میں نے نیکر اٹھالی اور اس کے باہر جانے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نیکر اور بنیان اٹھا کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اور جب باہر نکلا تو تھائی وانگ اس وقت بھی کمرے میں کھڑی تھی اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تمہارے لیے کافی بنائی ہے۔ آؤ..... دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

ہم نشست گاہ میں آگئے۔ کافی ٹیبل پر دو مگ رکھے ہوئے تھے جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں اس وقت واقعی کافی یا چائے جیسی چیز کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے صوفے پر بیٹھ کر ایک مگ اٹھالیا اور گرم گرم کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ تھائی وانگ بھی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”تم نے بتایا تھا کہ کچھ غنڈوں نے تمہارے فلیٹ پر حملہ کیا تھا اور وہ تمہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔“ تھائی وانگ نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا ”ان غنڈوں کی تم سے کیا دشمنی ہے اور وہ تمہیں کیوں قتل کرنا چاہتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ سوچ رہا تھا کہ اسے اصل بات بتاؤں یا کوئی فرضی کہانی سنا دوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مصیبت کے وقت یہ میرے کام آئی تھی۔ مجھے اپنی کار میں وہاں سے نکال لائی تھی۔ اب تک میرے ساتھ اس کا سلوک ہمدردانہ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

”مجھے اپنا دوست سمجھو۔“ مجھے خاموش پاکر وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی ”تم مجھ پر بھروسا کرسکتے ہو۔ اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔“

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے شروع سے سب کچھ بتا دیا۔ میں اس شہر میں اجنبی تھا۔ مجھے کسی ہمدرد کی ضرورت تھی۔ مجھے رہنے کے لیے ٹھکانا بھی چاہیے تھا اور تحفظ بھی۔ مہاراج وانگ ونگ یائے نے اگرچہ میری حفاظت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا اور دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے میری تربیت بھی شروع کر رکھی تھی لیکن میرے دشمنوں کو پتا چل گیا تھا کہ میں اس کی تحویل میں ہوں اور مجھ پر حملے شروع ہوگئے تھے۔ دارا ..... کم اور چی فانگ اس شہر میں موجود تھے۔ انہوں نے شہر کے سب سے بڑے بد .. ش کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔ مہاراج اور بلیک ٹائیگر کے گروہ میں ٹھن گئی تھی۔ بلیک ٹائیگر کے غنڈے تین مرتبہ مجھ پر قاتلانہ حملے کرچکے تھے اور تینوں مرتبہ میں بال بال بچا تھا۔ آج رات تو میں پوری طرح ان کے گھیرے میں آگیا تھا۔ اگر میں کھڑکی کے راستے فلیٹ سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو پاتا تو یقیناً مارا جاتا۔ کوشلیا اور رومیو کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ ان کا کیا حشر ہوا تھا۔ فلیٹ سے فرار ہونے کے بعد میں پناہ لینے کے لیے ایک نائٹ کلب میں گھس گیا تھا اور وہاں چی فانگ کو دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی تھی۔ اس نائٹ کلب میں چی فانگ کی موجودگی سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس نائٹ کلب سے اس کا کوئی تعلق ضرور ہے۔

ان حالات میں، میں مہاراج کے جمنازیم کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے قتل و غارت ہوتی رہے اور بے گناہ مارے جاتے رہیں۔ میں چند روز کے لیے کسی ایسی جگہ رہنا چاہتا تھا جہاں کسی کو میرے بارے میں معلوم نہ ہوسکے اور اتفاق سے مجھے تھائی وانگ مل گئی تھی۔ اس لیے میں نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔

”بلیک ٹائیگر بہت بڑا بدمعاش ہے۔“ وہ میرے خاموش ہونے پر بولی ”تھائی لینڈ کے سفاک ترین آدمی اس کے گروہ میں شامل ہیں۔ کسی انسان کی زندگی ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ان کی وجہ سے آئے دن شہر میں ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ پولیس بھی ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مہاراج وانگ ونگ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے عوام کی اخلاقی حمایت بھی حاصل ہے۔ لوگ اس کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہوجائیں گے۔ مہاراج کے پاس بھی دنیا کے بہترین فائٹر ہیں مگر مہاراج نے انہیں ہمیشہ امن و آشتی اور عدم تشدد کی تعلیم دی ہے۔ مہاراج لارڈ بدھا کا سچا پیرو کار ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ مہاراج کے آدمی قتل و غارت گری کرسکیں گے۔“

”میں بھی قتل و غارت نہیں چاہتا۔“ میں نے جواب دیا ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس صورت حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی کو نہیں جانتا۔ میرے پاس تو رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔“

”تم اپنے آپ کو بے یارومددگار مت سمجھو۔“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی۔ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا مشورہ ہے کہ کچھ عرصہ یہاں رہو اور جب حالات کچھ بہتر ہوجائیں تو خاموشی سے اس شہر سے نکل جاؤ۔ میں اس سلسلے میں بھی تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔ ہوسکتا ہے اس دوران میں تمہا ے دشمن بھی مایوس ہو کر یہاں سے چلے جائیں۔“

”میرا خیال ہے انہوں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ”میں اپنے والدین کے قتل کا واحد عینی دید گواہ ہوں۔ ان لوگوں کو شناخت کرسکتا ہوں۔ اگر معاملہ صرف قتل کا ہوتا تو وہ لوگ خود کہیں غائب ہوجاتے اور میرا پیچھا چھوڑ دیتے لیکن چاچا پرتاب سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ دارا دراصل سنگاپور میں ایک سینڈیکیٹ قائم کرنا چاہتا ہے۔ آسٹریلیا کی طرف ہیروئن کی اسمگلنگ کے لیے وہ سنگاپور کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانا چاہتا ہے اور میں جب تک زندہ ہوں اس کے لیے مستقل خطرہ بنا رہوں گا اس لیے وہ ہر قیمت پر مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اگر بات صرف قتل تک ہوتی تو وہ یہاں تک میرا پیچھا نہ کرتا۔ اس کے علاوہ.....“

”اس کے علاوہ کیا؟“ مجھے خاموش پاکر اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”میرے والد جب پاکستان میں تھے تو انھوں نے دارا کے باس کا پانچ کروڑ روپے مالیت کا سونا چھپا دیا تھا۔ ہوسکتا ہے دارا کو کسی طرح بھنک مل گئی ہو کہ وہ سونا ابھی تک محفوظ ہے۔ اس وقت اس سونے کی مالیت دگنی ہوچکی ہوگی اور وہ اس سونے کا پتا بھی چلانا چاہتا ہوگا۔“

سونے والی بات سن کر تھائی وانگ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

”ٹھیک ہے مسٹر وجدان۔ تم اطمینان سے یہاں رہو۔ یہاں تمہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا اور میں کوشش کروں گی کہ تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچا کر کہیں دور بھیج دوں جہاں وہ تم تک نہ پہنچ سکیں اور میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔“

میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ تین بجنے والے تھے۔ وہ مجھے ایک بیڈ روم میں لے آئی۔

”آج سے یہ تمہارا کمرا ہے۔“ اس نے کہا ”کسی خوف و خدشے کے بغیر آرام سے سو جاؤ۔“ اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں چلی گئی اور میں بستر پر لیٹ گیا لیکن مجھے دیر تک نیند نہیں آسکی۔ میں کوشلیا اور رومیو کے بارے میں سوچتا رہا۔ مہاراج اور ماسٹر پھو کو بھی یقیناً فلیٹ پر حملے کا پتا چل گیا ہوگا۔ مجھے غائب پاکر وہ لوگ پریشان تو ضرور ہوئے ہوں گے اور مجھے تلاش بھی کر رہے ہوں گے۔

میں رات کو اگرچہ دیر سے سویا تھا مگر صبح جلدی آنکھ کھل گئی۔ تھائی وانگ مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ کچن سے برتنوں کی آواز سن کر میں اس طرف چلا آیا۔ وہ ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”اچھا ہوا تم جاگ گئے۔ میں ناشتا تیار کر رہی ہوں۔ تم بھی جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔“

میں وہاں رکے بغیر اپنے کمرے میں آکر باتھ روم میں گھس گیا اور پندرہ بیس منٹ بعد جب باہر نکلا تو وہ لاؤنج میں کافی ٹیبل پر ناشتا لگا رہی تھی۔ پہلے جب میں کچن میں آیا تھا تو تھائی وانگ پر توجہ دیے بغیر واپس چلا گیا تھا اور اب جو دیکھا تو اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ وہ پنڈلیوں سے اوپر تک کھلے پائنچے کی پاجامہ قسم کی کوئی چیز پہنے ہوئے تھی۔ اوپر اوپن شرٹ تھی جس کے اوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔ وہ میرے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور جب نوالہ منہ میں ڈالنے کو آگے جھکتی تو میری نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتیں۔

ناشتے میں خائی یاڈ سائی اور ڈبل روٹی تھی۔ یہ انڈے کا آملیٹ تھا جس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، پیاز، مٹر شامل تھے۔ شاید شکر بھی ڈالی گئی تھی کیونکہ ذائقے میں ہلکی سی مٹھاس تھی۔ یہ ڈش یقیناً مزے دار تھی لیکن میری توجہ بٹ گئی تھی اور میں ناشتے سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تھائی وانگ نے جان بوجھ کر قمیص کے بٹن کھول رکھے تھے کیونکہ میں نے نوٹ کیا تھا کہ وہ بھی بار بار کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

خدا خدا کرکے ناشتا ختم ہوا۔ تھائی وانگ اپنے کمرے میں چلی گئی اور تقریباً ایک گھنٹے بعد تیار ہو کر باہر نکلی۔

”میں اپنے آفس جا رہی ہوں۔ میری واپسی چھ بجے ہوگی۔“ وہ میری طرف دیکھ کر رک رک کر کہنے لگی ”تم بنگلے میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہو۔ اگر ٹیلی فون کی گھنٹی بجے تو تم کال ریسیو نہیں کرو گے۔ ذاتی طور پر مجھ سے ملنے کے لیے کوئی نہیں آتا اس لیے کسی کے آنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ میں آؤں گی تو گیٹ کا تالا اپنی چابی سے کھول لوں گی۔ فریج میں انڈے وغیرہ رکھے ہوئے ہیں۔ ڈبل روٹی بھی موجود ہے۔ اپنی پسند کا کھانا بنا کر کھالینا۔“ وہ مجھے کافی دیر تک ہدایات دیتی رہی اور پھر میز پر سے اپنا وینٹی بیگ اور چابیوں کا گچھا اٹھا کر باہر چلی گئی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ تھائی وانگ نے کار سے اتر کر خود ہی گیٹ کھولا اور کار باہر لے جا کر بند بھی کردیا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں تقریباً رات بھر جاگا تھا۔ صبح جلدی اٹھ گیا تھا۔ بیڈ پر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں جاگ گیا۔ میں بیڈ سے اتر کر لاؤنج کی طرف لپکا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا مگر لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں یکایک رک گیا۔ مجھے تھائی وانگ کی ہدایت یاد آگئی تھی کہ ”تم کال ریسیو نہیں کرو گے“ فون کی گھنٹی بجتی رہی اور میں دیکھتا رہا پھر فون خاموش ہوگیا۔ میں نے کھڑے کھڑے کندھے اچکا دیے۔

صبح میں نے ڈھنگ سے ناشتا نہیں کیا تھا اور اب بھوک لگ رہی تھی حالانکہ ابھی صرف بارہ ہی بجے تھے۔ میں کچن میں آگیا۔ صبح کا تھوڑا سا خائی یاڈ سائی بچا ہوا تھا۔ میں نے انڈے کا یہ آملیٹ گیس ہیٹر پر گرم کیا اور ڈبل روٹی کے ساتھ کھا گیا۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد میں گھوم پھر کر بنگلے کا جائزہ لینے

لگا۔ وسیع و عریض ڈرائنگ روم اور لاؤنج کے علاوہ پانچ بیڈ رومز تھے۔ ہر بیڈ روم ہر طرح کے سازو سامان سے آراستہ تھا۔ بستر بہت آرام دہ تھے اور ہر کمرے کے فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک اور بات بھی میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہر بیڈ روم میں حسین تھائی لڑکیوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ میں نے تھائی عورتوں کو دیکھا تھا۔ وہ عام طور پر ایسا لباس پہنتی تھیں جس سے جسم کا اوپر کا حصہ پوری طرح ڈھک جاتا تھا لیکن ان تصویروں میں ان لڑکیوں نے جو لباس پہن رکھے تھے' وہ شرم ناک تھے۔ یہاں بنکاک میں اور سنگاپور میں بھی میں نے بہت سی عورتوں کو اس قسم کے لباس پہنے دیکھا تھا کہ مرد انہیں گھورتے رہتے تھے۔

میں گھومتا ہوا تھائی وانگ کے بیڈ روم میں آگیا۔ یہ کمرا بھی قیمتی اور شان دار سازو سامان سے آراستہ تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر میک اپ میں استعمال ہونے والی چیزوں کے علاوہ دو موٹے موٹے البم بھی رکھے ہوئے تھے اور دو تین رسالے بھی تھے۔ پہلے میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ رسالہ انگریزی زبان میں تھا۔ اس میں مضامین کم اور اشتہار زیادہ تھے۔ نائٹ کلبوں اور ریستورانوں کے علاوہ اشتہارات کی زیادہ تعداد ایسے اداروں کی تھی جو سیاحوں کے لیے گائیڈز اور انٹر ٹینمنٹ کی خدمات فراہم کرتے تھے۔ ایسے ہر اشتہار میں مساج' مالش پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ہر اشتہار کے ساتھ کسی خوب صورت لڑکی کی نیم عریاں تصویر تھی اور ہر اشتہار کا مضمون بھی تقریباً ایک ہی جیسا تھا۔ "تھائی لینڈ کی روایتی مالش کے لیے جوان و حسین ماڈل خواتین اور نو عمر خوب صورت لڑکی کی خدمات حاضر ہیں۔ آپ کی تسکین کی ضمانت کے ساتھ۔ کسی بھی وقت' کسی بھی جگہ۔ چوبیس گھنٹے سروس۔" ہر اشتہار کے ساتھ ایڈریس کے علاوہ ٹیلی فون اور فیکس نمبر بھی دیے ہوئے تھے۔

ایسے اشتہار دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کیا یہاں کے لوگ مالش ہی کرواتے رہتے تھے۔ میں نے گنتی کی تو ایک رسالے میں سب سے زیادہ اشتہار مالش کی خدمات کے تھے۔ اس کے بعد نائٹ کلبوں اور آخر میں ریستورانوں کا نمبر تھا۔ میں نے وہ رسالہ رکھ کر ایک البم اٹھالیا جو ضخیم تھا۔ اس البم کو دیکھ کر بھی میرا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ نیم عریاں لباس میں خوب صورت لڑکیوں کی رنگین تصویریں تھیں۔ ہر تصویر کے نیچے ایک نام اور نمبر لکھا ہوا تھا۔ ان میں تھائی لڑکیاں بھی تھیں' یوریشین اور غیر ملکی بھی۔ دوسرے البم میں نو عمر اور جوان لڑکوں کی تصویریں تھیں۔

میرا ذہن بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ تھائی وانگ نے ان لڑکیوں اور لڑکوں کی تصویریں کیوں جمع کر رکھی تھیں؟ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن الجھتا گیا لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ میں اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے اور ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ پھر غیر ارادی طور پر لڑکیوں کی تصویروں والا البم اٹھا کر دیکھنے لگا۔

ان تصویروں کو دیکھتے ہوئے میرے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ پلکیں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ کوشش کے باوجود میں آنکھیں نہ رکھ سکا اور اسی طرح نیم دراز نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر سویا تھا۔ آہٹ سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ تھائی وانگ میری گود میں رکھا البم اٹھا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے آپ سے اس شرمندگی محسوس کرنے لگا جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گیا ہوں۔ میری گود میں لڑکیوں کی تصویروں والا البم دیکھ کر سوچ رہی ہوگی۔

"میں وقت سے پہلے آگئی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "سو جاؤ۔ میں تو تمہیں چادر اوڑھانے لگی تھی۔"

"اوہ نہیں۔" میں بیڈ سے اتر گیا "بیٹھے بیٹھے یہ البم دیکھ رہا کہ آنکھ لگ گئی۔ تم نے مجھے آزادی سے گھومنے پھرنے کی اجازت دی تھی لیکن شاید مجھے اس کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی "میں نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔" وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی "آؤ۔ دیکھو۔ میں تمہارے لیے کیا لائی ہوں۔"

میں اس کے ساتھ لاؤنج میں آگیا۔ صوفے پر دو تین بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بنڈل اٹھا کر کھولا تو جینز کی ایک پینٹ اور ڈینم کی شرٹ تھی۔ دوسرے پیکٹ میں بھی کپڑے تھے۔ البتہ تیسرا پیکٹ اس نے نہیں کھولا۔

"یہ کپڑے پہن کر دیکھو۔ میں اندازے سے لائی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں فٹ آئیں گے۔" تھائی وانگ نے کہا۔

میں کپڑے اٹھا کر اپنے کمرے میں آگیا اور دروازہ بند کر کے باری باری پتلونیں پہن کر دیکھنے لگا۔ مجھے تھائی وانگ کے اندازے کی داد دینی پڑی۔ پتلونیں بالکل فٹ تھیں۔

میں نے ایک پینٹ شرٹ پہن لی اور باقی کپڑے بیڈ پر چھوڑ کر باہر آگیا۔ لاؤنج میں لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔

"کیسا گزرا آج کا دن؟" تھائی وانگ نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"تقریباً سوتے ہوئے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت اسمارٹ لگ رہے ہو۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

میں جھینپ کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد ہم لان میں آگئے جہاں گارڈن چیئرز رکھی ہوئی تھیں۔

"تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔" وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گزشتہ رات تم نے مجھے اپنے بارے میں جو کہانی سنائی تھی اگرچہ مجھے یقین آگیا تھا لیکن میں اپنے طور پر بھی تصدیق اس پر کرلینا چاہتی تھی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے آج اپنے دفتر میں کوئی کام نہیں کیا۔ سارا کام اپنی اسسٹنٹ کو سونپ دیا اور خود تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی۔ میں وات ٹریمیٹ بھی گئی تھی۔ وہاں سے تمہارے اس بیان کی تصدیق ہوگئی کہ چند مہینے پہلے رات کے وقت ایک آدمی کو گولیاں مار کر قتل کردیا گیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ سنگاپور کا ایک سکھ بزنس مین تھا۔ جو غیر قانونی طور پر بنکاک آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی تھی جو معجزانہ طور پر اس فائرنگ سے بچ گئی تھی لیکن بعد میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا تھا لیکن تم نے مجھے بتایا تھا کہ۔۔۔"

"وہ لڑکی میں تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "چاچا پرتاب سنگھ مجھے لڑکی کے بھیس میں سنگاپور سے لے کر آیا تھا۔ میرے کان میں اس بالی کو دیکھ رہی ہو۔" میں نے دائیں کان میں بالی کو چھوا "یہ اس وقت کی یادگار ہے اور میں اسے اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا۔"

"میں نے تم پر کوئی شبہ نہیں کیا۔" وہ مسکرائی "مہاراج وانگ ونگ یائے کے کیمپ سے تعلق رکھنے والے ایک آدمی سے اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ وہ لڑکی دراصل ایک لڑکا تھا جسے چند روز وات ٹریمٹ میں رکھنے کے بعد شہر سے باہر ایک خانقاہ میں بھیج دیا گیا تھا جہاں بھکشوؤں کو موئے تھائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ یہ سارے ہنگامے اس لڑکے کے لیے ہو رہے ہیں۔ کل رات بلیک ٹائیگر کے پانچ آدمیوں نے فیلا فیلا چائی روڈ کے اس فلیٹ پر حملہ کیا تھا جہاں تم چھپے ہوئے تھے۔ تم تو وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے مگر وہاں دو آدمی مارے گئے۔ ایک آدمی بلیک ٹائیگر کا اور دوسرا مہاراج کا جو اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ تمہاری حفاظت کے لیے گلی کی نگرانی کر رہا تھا۔"

"اور وہ عورت۔۔۔ میرا مطلب ہے کوشلیا؟" میں نے پوچھا۔

"اسے بلیک ٹائیگر کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ اسے یرغمال بنا کر مہاراج کو بلیک میل کریں گے اور تمہیں اپنی تحویل میں لینے کا مطالبہ کریں گے۔" اس نے کہا۔

"کیا تمہارے خیال میں مہاراج ان کے دباؤ میں آسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" تھائی وانگ نے نفی میں سر ہلایا "مہاراج ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اس نے سچائی کو جان کر تمہیں اپنی پناہ میں لیا تھا۔ وہ اپنی گردن کٹوا دے گا مگر کسی کے دباؤ میں نہیں آئے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ کوشلیا نام کی اس عورت کو بھی ان کے چنگل سے چھڑا لے گا۔ ویسے میری معلومات کے مطابق گزشتہ رات کے واقعے کے بعد آج صبح ماسٹر پھو نے خانقاہ میں جا کر مہاراج سے ملاقات کی تھی اور اس سے تمام تر اختیارات کے ساتھ بلیک ٹائیگر کے خلاف کارروائی کرنے کی اجازت حاصل کرلی ہے اور میرا خیال ہے کہ ایک دو دن میں ان دونوں پارٹیوں کے درمیان خوف ناک جنگ چھڑنے والی ہے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ اس میں زیادہ نقصان بلیک ٹائیگر کا ہوگا۔"

"اور میرا خیال ہے تم نے اس نائٹ کلب کے بارے میں بھی معلوم کیا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ فطری بات ہے بلکہ سب سے پہلے میں اسی طرف گئی تھی۔" تھائی وانگ نے بتایا "وہ ایک تھرڈ کلاس نائٹ کلب ہے جہاں نشے بازوں کو منشیات فراہم کی جاتی ہے اور نیم عریاں عورتوں میں کک باکسنگ کے مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ لوگ دراصل باکسنگ کے مقابلے نہیں' ان عورتوں کی فحش حرکتیں دیکھنے کے لیے ایسے کلبوں میں جاتے ہیں۔ تماشائیوں کا تعلق بھی نچلے طبقے سے ہوتا ہے۔ ایسے نائٹ کلبوں میں آئے دن اس قسم کے ہنگامے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن گزشتہ رات والے ہنگامے کی بنیاد تم تھے۔ تمہارا تعاقب کرنے والوں نے تمہیں کلب میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پہلے انہوں نے اس ہال کو چیک کیا جہاں باکسنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا پھر وہ اس ہال میں آگئے جہاں موالی نشے میں دھت پڑے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تم بھی انہی میں گھس کر کہیں چھپ گئے ہو۔ پہلے انہوں نے دو ہوائی فائر کیے تھے تاکہ وہاں پڑے ہوئے نشئی اٹھ کر خارجی دروازے کی طرف بھاگیں اور تمہیں تلاش کر کے پکڑ لیں لیکن فرش پر پڑے ہوئے ایک نشئی نے اس غنڈے کو گولی مار دی جس نے ہوائی فائر کیے تھے اور اس طرح وہاں اچھا خاصا ہنگامہ ہوگیا جس میں دو آدمی مارے گئے تھے۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم کلب کے عقبی راستے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔"

"اور اس سے زیادہ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہاں سے نکلتے ہی مجھے تم مل گئی تھیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھائی وانگ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ہم شام کا اندھیرا پھیلنے تک لان میں بیٹھے رہے اور پھر اندر آگئے۔ لاؤنج میں ٹیلی فون کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے اچانک ہی ایک خیال آیا اور میں نے کہا۔ "کیا ٹیلی فون پر مہاراج سے رابطہ ہو سکتا ہے؟"

"مہاراج سے تو نہیں البتہ ماسٹر پھو سے بات کی جاسکتی ہے۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں جمنازیم کا نمبر موجود ہوگا۔" تھائی وانگ نے کہا "لیکن تم اس سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں خیریت سے ہوں اور محفوظ جگہ پر ہوں۔ اس کے علاوہ اسے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ چی

فانگ کو کہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کل رات میں نے اسے نائٹ کلب کے دفتر میں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر نمبر تلاش کرنے لگی۔ تقریباً دس منٹ بعد اس نے ایک نمبر الگ کاغذ پر لکھ لیا اور ڈائریکٹری بند کر کے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ میں نے وہ نمبر پڑھنے کی کوشش کی مگر وہ تھائی ہندسوں میں تھا۔

تھائی وانگ نے وہ نمبر ملایا۔ کال غالباً فوراً ہی ریسیو کر لی گئی تھی۔ وہ تھائی زبان میں کسی سے باتیں کرتی رہی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بات پر ضد کر رہی ہو پھر خاموش ہو گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ پھر بولنے لگی۔ اس مرتبہ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ جیسے وہ اپنے مخاطب کے لہجے سے مرعوب ہو گئی ہو۔ اس کی باتوں میں ایک مرتبہ میرا نام بھی آیا تھا اور پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ماسٹر پھو سے بات کرو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

فون پر میری آواز سنتے ہی ماسٹر پھو جیسے چونک گیا تھا۔ وہ مجھے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بولا۔

"ایک نمبر نوٹ کرو اور دو منٹ بعد اس نمبر پر رنگ کرنا۔"

وہ انگریزی میں نمبر لکھوانے لگا۔ ریسیور پر کچھ اور آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہ غالباً جمنازیم کے دفتر کا نمبر تھا اور دفتر میں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور ماسٹر پھو ان کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کاغذ پر وہ نمبر نوٹ کر کے ریسیور رکھ دیا اور تھائی وانگ کو بتانے لگا۔

ٹھیک دو منٹ بعد تھائی وانگ نے ریسیور اٹھا کر وہ نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ تھائی وانگ نے ایک جملہ کہا اور ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہم تمہارے لیے بہت پریشان تھے۔ تم کہاں ہو؟" ماسٹر پھو نے میری آواز سن کر کہا۔

"میں بالکل محفوظ جگہ پر ہوں۔" میں نے کہا اور گزشتہ رات کے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں میں نے کہا "فلیٹ سے فرار ہونے کے بعد میں نے جس نائٹ کلب میں پناہ لینے کی کوشش کی تھی' اس کے دفتر میں چی فانگ کو دیکھ کر مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن جب میں وہاں سے فرار ہوا تو اس بل ڈاگ کی شکل والے آدمی نے مجھ پر گولی چلائی تھی لیکن میری شکل وہ بھی نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ میں دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔"

"بہت اہم خبر ہے۔" ماسٹر پھو نے کہا "اس نائٹ کلب کا نام بتاؤ اور چی فانگ کا حلیہ بھی۔"

میں نے تھائی وانگ سے کلب کا نام پوچھ کر بتا دیا اور چی فانگ کا حلیہ بتانے لگا۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ ماسٹر پھو بار بار پوچھ رہا تھا کہ میں یہاں محفوظ ہوں یا نہیں۔

میں نے اسے بتا دیا کہ تھائی وانگ ایک بالکل غیر متعلق عورت ہے۔ کسی نے مجھے اس کے ساتھ آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں ہوں اور یہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اس کے بعد ماسٹر پھو' تھائی وانگ سے بھی کافی دیر تک باتیں کرتا رہا پھر تھائی وانگ نے ریسیور رکھ دیا۔

"تم نے اسے یہاں کا پتا یا فون نمبر تو نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"میں بے وقوف نہیں ہوں۔" تھائی وانگ مسکرائی اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے سوچتا رہا کہ کیا ماسٹر پھو... چی فانگ' دارا اور کم تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا؟

○☆○

مجھے تھائی وانگ کے اس بنگلے میں رہتے ہوئے تین دن ہو گئے تھے۔ اس دوران میں دو مرتبہ ماسٹر پھو سے فون پر میری بات ہوئی تھی اور تین دنوں کے دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ البتہ ماسٹر پھو نے یہ بتایا تھا کہ کوشلیا کی رہائی کے لیے کوشش جاری ہے اور روز کلب کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے لیکن چی فانگ کے حلیے کا کوئی شخص ابھی تک نظروں میں نہیں آیا۔

تھائی وانگ معمول کے مطابق صبح ناشتے کے بعد چلی جاتی۔ اس کی واپسی پانچ اور چھ بجے کے درمیان ہوتی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنے بارے میں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کرتی کیا ہے اور نہ ہی میں نے البم میں لگی ہوئی ان تصویروں کے بارے میں کچھ پوچھا تھا لیکن ایک بات کا اندازہ تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ عالی شان بنگلا' قیمتی اور شان دار فرنیچر اور شان دار کار۔ اس کے گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا اور نہ ہی کسی کی آمد و رفت تھی۔ گھر کے سارے کام وہ خود کرتی تھی اور ممکن ہے میری وجہ سے اس نے اپنے ملنے والوں کو یہاں آنے سے منع کر دیا ہو۔

وہ چوتھا دن تھا۔ شام کے چھ بج گئے تھے اور خلاف معمول تھائی وانگ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ چھ بجے سے پہلے پہنچ جایا کرتی تھی۔ میں نے کوئی زیادہ توجہ نہیں دی۔ کسی کام کی وجہ سے لیٹ ہو گئی ہو گی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا رہا' میری پریشانی بڑھتی رہی۔

آٹھ بج گئے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے ابھارنے لگے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بلیک ٹائیگر کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ اس رات جب میں نائٹ کلب سے بھاگ کر اس کی کار میں سوار ہوا تھا تو تقریباً پچاس گز آگے ایک گل فروش کی دکان کھلی ہوئی تھی اور کار اسی دکان کے سامنے سے گزری تھی۔ جبکہ میرے تعاقب میں آنے والا ایک آدمی ایک

سڑک پر رک کر مخالف سمت میں ایک ریسٹورنٹ کی طرف دوڑ گیا تھا۔ ان لوگوں نے میری تلاش تو جاری رکھی ہوگی اور اب میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے ان لوگوں نے اس گل فروش سے بعد میں پوچھا ہو اور اس نے تھائی وانگ کی کار کے بارے میں بتا دیا ہو اور آج وہ کار ان کی نظروں میں آ گئی ہو اور اس طرح تھائی وانگ ان کے ہتھے چڑھ گئی ہو۔ ایسی صورت میں میرے لیے بھی خطرہ ہو سکتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آرام سے بیٹھا تھائی وانگ کی واپسی کا انتظار کرتا رہوں یا بھاگنے کی تیاری شروع کر دوں۔

یکایک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ ماسٹر پھو کو صورت حال سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ اس کا فون نمبر تو میرے پاس موجود تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کر ٹیلی فون والے کمرے میں آ گیا اور پھر میں نے فون کا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ گیٹ کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ ایک منٹ بعد گیٹ کھلا اور تھائی وانگ کو دیکھ کر میرے چہرے پر طمانیت سی آ گئی۔

تھائی وانگ اندر داخل ہوئی تو اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کا چہرہ مضمحل سا لگ رہا تھا جیسے تھکن سے چُور ہو۔

"کیا ہوا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ٹھیک ہوں۔ پریشانی کی بات نہیں۔" تھائی وانگ نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مجھے پریشانی تو تھی۔ وہ جب بھی باہر سے آتی کافی دیر تک مجھ سے باتیں کرتی رہتی تھی لیکن آج میری بات کا مختصر سا جواب دے کر اپنے کمرے میں گھس گئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد لباس تبدیل کر کے باہر آئی تھی۔ کھلے پائنچوں کا پاجامہ اور اوپن شرٹ۔ گھر میں وہ یہی لباس پہنتی تھی۔

اس وقت نو بج رہے تھے۔ وہ کسی ریسٹورنٹ سے کھانا لے کر آئی تھی۔ بنڈل کھول کر اس نے کھانا پلیٹوں میں نکال لیا۔ اس نے بے رغبتی سے ایک دو لقمے لیے تھے اور پھر اٹھ گئی تھی۔

"لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"جسم ٹوٹ رہا ہے۔" اس نے مردہ سے لہجے میں جواب دیا "تم کھانا کھا کر میرے کمرے میں آ جانا۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تقریباً دس منٹ بعد میں اس کے کمرے میں آیا تو وہ اپنے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئی اور دیوار کے ساتھ استادہ ایک الماری کو دھکیلنے لگی۔ الماری کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر مجھے اشارہ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

میں کئی مرتبہ تھائی وانگ کے بیڈ روم میں آیا تھا مگر الماری کے پیچھے اس دروازے کا انکشاف پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ یہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور ایک دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ سامنے والی دیوار میں ایک ہفضی الماری تھی کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔

میں جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا' تھائی وانگ نے دروازہ بند کر دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔ چہرہ مضمحل ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی جیسے شکار کو گھیرنے کے بعد شکاری کی آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے۔ تھائی وانگ کے یہ طور دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی مجھے کوشلیا یاد آ گئی جس نے رات کو سوتے میں میرے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ میں جب سے یہاں آیا تھا یہ بات تو میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ تھائی وانگ جب گھر میں ہوتی تو عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے مجھے چوکنا ہونا پڑتا لیکن اس وقت میں کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔

تھائی وانگ نے الماری کھول کر ہنٹر نکالا تو میرے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہو گئی۔ میں وحشت زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے کمرے سے نکل جانے کا ارادہ کیا لیکن میری نیت کو بھانپتے ہوئے وہ دروازے کے سامنے آ گئی اور ہنٹر کو مخصوص انداز میں پکڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"قمیص اتارو۔" اس کی آواز میں عجیب سی سرسراہٹ تھی۔

"مم.... میں سمجھا نہیں۔" میں ہکلا کر رہ گیا۔

"میں کہتی ہوں قمیص اتار دو۔" اس مرتبہ اس کی آواز میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہنٹر والے ہاتھ کو اس طرح جھٹکا دیا کہ کمرا سڑاک کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور خاموشی سے قمیص اتار دی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس کے لیے کھلونا نہیں بنوں گا اور اگر اس نے حد سے بڑھنے کی کوشش کی تو مزاحمت کروں گا اور اگر زیادہ ہی گڑبڑ ہوئی تو یہاں سے بھاگ نکلوں گا۔

میں نے قمیص اتار کر قالین پر پھینک دی۔ تھائی وانگ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے ہنٹر میرے سامنے پھینک دیا۔

"ہنٹر اٹھاؤ اور مجھے مارو۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی "میں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے بازوؤں میں بڑی طاقت ہے۔ مجھ پر اس وقت تک ہنٹر برساتے رہو جب تک تم خود نڈھال نہ ہو جاؤ۔"

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ مجھے جو خدشات تھے۔ وہ بے بنیاد نکلے۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اس کی یہ فرمائش سن کر میرا

ذہن بری طرح الجھ گیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں اس کی پٹائی کیوں کرتا۔ اس نے میرا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو میری محسن تھی۔ اس نے مجھے موت کے منہ سے بچایا تھا۔ میں اس پر ہاتھ کیسے اٹھا سکتا تھا۔ چہ جائیکہ وہ مجھے ہنٹر سے پیٹنے کو کہہ رہی تھی۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"میری قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔" اس کی آواز بدلی ہوئی تھی "جلدی کرو۔ ہنٹر اٹھالو اور میری کھال ادھیڑ دو۔"

میں اب بھی خاموش کھڑا متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ کوئی ذی ہوش انسان یہ خواہش نہیں کر سکتا تھا کہ ہنٹر سے اس کی کھال ادھیڑ دی جائے۔

"میرا خیال ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تھائی وانگ۔" بالآخر میں نے مدھم لہجے میں کہا "بہتر ہوگا تم ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔ یا مجھے نمبر بتاؤ۔ میں فون کرکے ڈاکٹر کو بلا لیتا ہوں۔"

"میرا علاج ڈاکٹر نہیں' تمہارے یہ مضبوط بازو ہیں۔" اس نے آگے بڑھ کر میرے دونوں بازو پکڑ لیے پھر اس نے جھک کر قالین پر پڑا ہوا ہنٹر اٹھا کر میرے سیدھے ہاتھ میں تھما دیا "اب دیر مت کرو۔ شروع ہو جاؤ۔"

اس نے اپنی قمیص بھی اتار کر پھینک دی اور دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکا لیے تھے۔ میں اس کی طرف دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اس کی پیٹھ پر لاتعداد سرخ دھاریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ میں ہنٹر ہاتھ میں لیے بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر میری طرف گھوم گئی۔ اس کی آنکھوں میں اچانک ہی سرخی ابھر آئی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ میں نے عورت کو ہمیشہ ماں کے روپ میں دیکھا تھا لیکن اس رات کوشلیا نے اپنی بے ہودہ حرکت سے میرے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی تھی کہ عورت ماں کے علاوہ کچھ اور بھی ہوتی ہے۔ وہ اگرچہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی لیکن میرا ذہن پراگندہ ہو گیا تھا اور اب تھائی وانگ کو اس حالت میں سامنے کھڑے دیکھ کر میں ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

تھائی وانگ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر اچانک ہی اس نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

"میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔" وہ غرائی "تم مرد نہیں ہو۔ تمہیں شاید کسی گدھی نے جنم دیا تھا۔ بزدل....."

میرا دماغ گھوم گیا۔ اس نے اگر صرف تھپڑ مارنے پر اکتفا کیا ہوتا تو میں چپ رہتا لیکن اس نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ میں اپنی ماں کو دنیا کی عظیم ترین ہستی سمجھتا تھا اور اس گالی نے میرے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیے تھے۔ تھائی وانگ نے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن میں نے بائیں ہاتھ سے کلائی پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گری۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک بار پھر بزدلی کا طعنہ [illegible] مرتبہ میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آگیا۔

چمڑے کی پتلی پٹیوں کا بنا ہوا ہنٹر سڑاک سے اس کے [illegible] لگا۔ وہ کراہ اٹھی۔ میں نے دوسرا وار کیا۔ اس مرتبہ ہنٹر پشت پر لگا۔ اس نے ایک سسکاری سی بھری اور ایسے [illegible] رہی جس سے میرا اشتعال بڑھتا رہا اور میں غصے میں بے قابو اس پر ہنٹر برساتا رہا۔ وہ قالین پر لوٹتی رہی اور میں اسے ہنٹر [illegible] بناتا رہا۔ اس کی پشت اور پیٹ پر لاتعداد نئی سرخ دھاریں [illegible] آئی تھیں۔ وہ قالین پر لوٹتی رہی اور میں اس پر ہنٹر برساتا رہا۔ [illegible] ضرب پر وہ اس طرح سسکاریاں بھر رہی تھی جیسے اس مار سے [illegible] اندوز ہو رہی ہو اور بالآخر وہ لوٹتی ہوئی میرے قدموں میں [illegible] اس کے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر تھے۔ وہ اب بھی سسکاریاں [illegible] رہی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ ہنٹر پھینک دیا اور میں پیر پٹختا ہوا اس کمرے سے نکل گیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں بیڈ پر گر گیا۔ میرا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ [illegible] وانگ نے جب ماں کی گالی دی تھی تو اس وقت میرا دل تو چاہا [illegible] میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں لیکن میں نے اپنا غصہ [illegible] طرح اتارا تھا کہ اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی تھی۔

میں اپنے بستر پر لیٹا یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ میں تھائی وانگ [illegible] بہت احترام کرتا تھا۔ وہ میری نظروں میں ایک ایسا مقام [illegible] جس کا درجہ بہت ارفع و اعلیٰ ہو سکتا تھا لیکن اپنی اس حرکت سے میری نظروں سے گر گئی تھی۔ میرے دل سے اس کا احترام ختم [illegible] تھا اور اسے بھی میں کوشلیا جیسی عورتوں کے زمرے میں شمار [illegible] لگا تھا' نوجوان' خوب رو اور صحت مند مردوں کو دیکھ کر جن کی [illegible] ٹپکنے لگتی ہے اور اپنے شہوانی جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتیں۔ [illegible] وانگ کی اس بیچ حرکت کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب [illegible] نہیں رہوں گا۔

یکایک میرے ذہن میں آیا کہ ماسٹر پھو کو صورت حال سے [illegible] کرکے اسے بتا دینا چاہیے کہ اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ [illegible] سوچتے ہوئے اٹھ کر لاؤنج میں آگیا اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا [illegible] نمبروں والے بٹن دبانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ [illegible] گیا۔ ریسیور میں ٹون کی مخصوص آواز سنائی نہیں دے رہی [illegible] میں نے کریڈل کو دو تین مرتبہ دبایا۔ تار کو ہلا جلا کر دیکھا [illegible] فون ڈیڈ ہی رہا۔ میں نے ریسیور پٹخ دیا اور دوبارہ اپنے کمرے [illegible] آگیا۔

میرے دماغ میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی تھی اور کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ میں کھڑکی کھول کر کھڑا ہو گیا اور تازہ ہوا [illegible]

لمبے سانس لینے لگا۔ اس وقت دُور کہیں کلاک ٹاور نے بارہ بجے کا اعلان کیا۔ گھڑیال کی آواز دیر تک فضا میں گونجتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔

میں جب سے تھائی وانگ کے ہاں آیا تھا عام طور پر گیارہ بجے تک سو جاتا تھا اور صبح میری آنکھ بھی جلدی کھل جاتی تھی لیکن آج کے اس واقعے کے بعد میری نیند اڑ گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کب تک کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر کھڑکی کھلی چھوڑ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی تھی اور اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح نیند آجائے تو اس ذہنی کرب سے نجات ملے لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور ذہنی اذیت بڑھتی جا رہی تھی۔

میں اس وقت کھڑکی کی طرف منہ کیے لیٹا ہوا تھا کہ اپنے کندھے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس کرکے چونک گیا۔ ظاہر ہے وہ تھائی وانگ کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ میں نے توجہ نہیں دی اور خاموش لیٹا رہا۔

"ناراض ہو؟" تھائی وانگ کی مدھم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "تم نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟"

"مجھے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اپنے کندھے پر سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا "تم نے میری ماں کو گالی دی تھی۔ میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"وہ میری غلطی تھی اور میں تم سے اس غلطی کی معافی مانگنے آئی ہوں۔" تھائی وانگ نے جواب دیا "تم جیسے نوجوان کو جنم دینے والی کوئی معمولی عورت نہیں ہو سکتی' اس کا رتبہ بہت عظیم ہے۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے قابل اعتراض الفاظ استعمال کرکے تمہیں دکھ پہنچایا اور تمہارے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں وہ سب کچھ نہ کہتی تو تمہیں غصہ نہ آتا اور تم میری پٹائی نہ کرتے۔"

"کیا....؟" میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تمہارا کردار تمہاری ماں کی تربیت کی دلالت کرتا ہے۔" تھائی وانگ نے کہا "اگر کوئی اور نوجوان ہوتا تو مجھے برہنہ دیکھ کر بھوکے بھیڑیے کی طرح مجھے بھنبھوڑ ڈالتا مگر تمہارے ذہن میں وہ سب کچھ نہیں تھا جو دوسرے نوجوان ایسے موقعوں پر سوچتے ہیں۔ نہ ہی میرے ذہن میں کوئی ایسا گندہ خیال تھا۔ تمہاری شرافت اور کردار کی عظمت کا اندازہ تو میں نے پہلے ہی روز لگا لیا تھا جب تم مجھ سے نظریں چرا رہے تھے۔ تمہاری ماں کی شان میں وہ گستاخانہ الفاظ میں نے اس لیے کہے تھے کہ تم میں اشتعال پیدا ہو اور تم اس ہنٹر سے میری کھال ادھیڑ دو۔"

"کیوں۔ آخر کیوں؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کمرے کی بتی اگرچہ بجھی ہوئی تھی لیکن راہداری سے آنے والی روشنی اتنی کافی تھی کہ ہم ایک دوسرے کو باآسانی دیکھ سکتے تھے۔ اس نے جسم پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔

"اب پوچھا ہے تم نے کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟" اس کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ آگئی "آؤ۔ میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ مجھے امید ہے کہ میری بات سننے کے بعد تمہارے دل میں میرے خلاف پیدا ہونے والی نفرت ختم ہو جائے گی۔"

وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر لاؤنج والے کمرے میں لے آئی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ بنیان پہنے ہوئے تھا اور قمیص تو غصے میں اسی کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔

"یہ بازو واقعی بہت مضبوط اور طاقت ور ہیں۔" وہ میرے دونوں بازو تھپتھپاتے ہوئے بولی "اور مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں فولاد بھرتا جائے گا اور تمہارا کوئی دشمن ایک ہاتھ کی مار بھی نہیں سہہ سکے گا۔"

"تم مجھے کچھ اور بتانے کے لیے یہاں لائی تھیں۔" میں نے کہتے ہوئے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ دو بجنے والے تھے۔

"وہی بتانے جا رہی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میز پر سے کریم کی ایک شیشی اٹھا کر میرے ہاتھ میں تھما دی "پہلے یہ کریم میرے جسم پر لگا دو۔ جب تم ہنٹر سے میری پٹائی کر رہے تھے تو بہت مزہ آ رہا تھا۔ اب تکلیف ہو رہی ہے۔ یہ کریم لگانے سے تکلیف کچھ کم ہو جائے گی۔"

وہ جسم سے چادر اتار کر قالین پر اوندھی لیٹ گئی۔ اس کا بدن دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ ہنٹر کی ضربوں کے لاتعداد نشان تھے۔ بعض سے خون رس رہا تھا اور بعض جگہ نیل پڑ گئے تھے۔ میں اس کے زخموں پر کریم لگانے لگا۔ اس کے منہ سے کبھی سسکاری سی نکل جاتی اور کبھی وہ کراہ اٹھتی۔ وہ اس وقت بھی میرے سامنے برہنہ تھی۔ لیکن میرے ذہن میں کوئی شیطانی خیال نہیں تھا۔

وہ اٹھ کر قالین پر دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور جسم پر چادر لپیٹ لی۔ میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جب میرے والدین کا انتقال ہوا تو میں چودہ سال کی تھی اور ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھی۔" تھائی وانگ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "میرا باپ مرتے وقت مجھے میرے چچا کے سپرد کر گیا تھا۔ ہوانگ دراصل میرے والد کا سوتیلا بھائی تھا۔ اس نے مجھے اپنی سرپرستی میں تو لے لیا لیکن اس کی نظریں میرے باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد پر تھیں۔ شہر کی گنجان آبادی میں ایک فلیٹ' اور تقریباً تین لاکھ بھات کا بینک بیلنس' میرا باپ الیکٹرونک انجینئر تھا۔ اس کی موت فیکٹری میں ڈیوٹی کے دوران میں ایک حادثے میں ہوئی تھی اور کمپنی نے بھی اس کے مرنے کے بعد گراں قدر معاوضہ دیا تھا۔

"میرا چچا ہوانگ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کی غربت میں اس کا اپنا ہاتھ تھا۔ اس نے کبھی ٹک کر کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کی

بیوی ایک فیکٹری میں ملازم تھی اور اسی کی تنخواہ پر گزارہ تھا۔ چچا کو شراب اور جوئے کی عادت بھی تھی۔ وہ چچی کی تنخواہ کی رقم بھی چھین کر اپنی عیاشی میں اڑا دیتا۔ کبھی کبھی وہ ہمارے ہاں آجاتا تھا کہ میرا باپ اس کی تھوڑی بہت مدد کردیا کرتا تھا۔

"میرے باپ کو فیکٹری میں حادثہ پیش آیا تو وہ شدید زخمی ہوا تھا اور شاید اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گا اس لیے اس نے چچا ہوانگ کو میرا سرپرست مقرر کردیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارا کوئی اور قریبی رشتے دار تھا بھی نہیں۔ حادثے کے تین دن بعد میرا باپ مرگیا۔

"چچا ہوانگ نے چند روز تک تو شرافت دکھائی پھر اپنے اصل رنگ میں آگیا۔ میرے باپ کا بینک بیلنس چند ہفتوں میں ختم ہوگیا۔ باپ کے مرنے کے بعد فیکٹری سے جو معاوضہ ملا تھا' وہ بھی شراب اور جوئے میں اڑا دیا۔ میری چچی پہلے تو روک ٹوک کرتی رہی پھر وہ بھی اس کے رنگ میں رنگتی چلی گئی۔

"ہمارا فلیٹ بہت بڑا تھا۔ جب نقد سرمایہ ختم ہوگیا تو چچی اور چچا مجھے شہر کے نہایت گندے علاقے میں واقع اپنے دو کمروں کے فلیٹ میں لے آئے اور مجھے کہا کہ ہمارے والا فلیٹ کرائے پر دے دیا گیا ہے۔ اس کی آمدنی سے گھر کے اخراجات چلاتے رہیں گے۔ مجھ سے کچھ کاغذات پر دستخط بھی کروائے گئے تھے لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ چچا نے ہمارا فلیٹ اونے پونے بیچ دیا ہے اور اس سے ملنے والی رقم بھی تین چار مہینوں میں اڑا دی گئی۔

"گھر میں فاقے ہونے لگے تو میری تعلیم کا سلسلہ منقطع کردیا گیا اور مجھے مجبور کیا جانے لگا کہ میں کہیں نوکری کرکے رقم کماؤں۔ چچا اور چچی مجھے بری طرح پیٹتے رہتے تھے۔ مجھے ایک ریسٹورنٹ میں ویٹریس کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ تو کم تھی لیکن گاہکوں سے بخشش میں روزانہ اچھی خاصی رقم مل جاتی تھی۔ جب میں گھر آتی تو چچی میری تلاشی لے کر ساری رقم چھین لیتی۔ اس کا خیال تھا کہ میں کچھ رقم چھپاتی بھی ہوں۔ وہ مجھے بری طرح پیٹ دیتی اور میں روزانہ اس کی مار کی عادی ہوچکی تھی۔

"چودہ پندرہ سال کی عمر بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ ریسٹورنٹ میں آنے والے گاہکوں کا خیال تھا کہ میں صرف یہاں نوکری نہیں کچھ اور بھی کرتی ہو۔ بعض گاہک مجھ سے فحش مذاق کرتے اور بعض زیادہ سے زیادہ ٹپ دے کر مجھے اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔ میں بڑی مشکل سے وقت کا نباہ کررہی تھی۔

"ایک مرتبہ چچی اور چچا مجھے کنچن بوری لے گئے۔ یہ بنکاک کے شمال میں ایک سوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوب صورت ہل اسٹیشن ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے کی چھٹیاں منانے کے لیے کنچن بوری جارہے ہیں۔ اس خوب صورت شہر میں انہوں نے رہائش کے لیے جو کاٹیج لیا تھا' وہ شہر سے تقریباً چھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ چاروں طرف سے سبزے اور اونچے درختوں میں گھرا ہوا وہ کاٹیج بڑا شان دار اور قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ چچی اور چچا کی مالی حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ اس قسم کا کاٹیج کرائے پر لے سکتے۔ بنکاک سے روانگی سے ایک دن پہلے انہوں نے میرے لیے چند نئے کپڑے بھی خریدے تھے اور مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی تھی۔

"وہ دن اور وہ رات ہم نے بڑے خوشگوار ماحول میں گزاری تھی۔ دوسرے دن شام سے کچھ پہلے ایک شان دار کار ہمارے کاٹیج کے سامنے آکر رکی۔ ڈرائیور کے علاوہ اس کار میں صرف ایک آدمی تھا۔ سات فٹ کے قریب قد اور بھاری ڈیل ڈول۔ مجھے تو وہ جن زاد ہی لگا تھا۔ چچی اور چچا سٹنگ روم میں بیٹھے دیر تک اس سے رازدارانہ انداز میں گفتگو کرتے رہے۔

"شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں اس وقت باتھ روم میں تھی کہ مجھے کار کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے شکر ادا کیا کہ وہ دیو قامت شخص چلا گیا ہے کیونکہ اسے دیکھ کر ہی مجھے وحشت ہوتی تھی لیکن جب میں باتھ روم سے نکلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ شخص تو نشست گاہ میں بیٹھا ہوا تھا اور چچی اور چچا غائب تھے۔ میں خارجی دروازے کی طرف بڑھی تو اس شخص نے بتایا کہ وہ دونوں جاچکے ہیں۔ میں سٹپٹا سی گئی۔ چچی اور چچا مجھے اکیلے چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں۔ جب یہ انکشاف ہوا کہ چچی اور چچا مجھے کوچیانگ نامی اس شخص کے ہاتھ فروخت کرگئے ہیں تو میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پہاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے راستے پر کار کے انجن کی آواز ابھی سنائی دے رہی تھی۔ میں کاٹیج سے نکل کر بھاگی تو اس دیو قامت کوچیانگ نے مجھے پکڑلیا۔

"یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ کوچیانگ سے میرے سودے کی بات کئی روز سے چل رہی تھی اور چچا ہوانگ وقتاً فوقتاً اس سے چھوٹی موٹی رقمیں بھی لیتا رہا تھا اور بالآخر پروگرام بنا کر وہ دونوں مجھے دھوکے سے یہاں لے آئے اور مجھے اس کے حوالے کرکے چلے گئے۔ آخری قسط کے طور پر انہیں صرف دس ہزار بھات ملے تھے۔ یہ کاٹیج بھی کوچیانگ کا تھا۔

"اس رات مجھ پر جو بیتی میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ شہر سے دور ویرانے میں میری چیخیں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں آخری لمحے تک مزاحمت کرتی رہی۔ کوچیانگ نے ہنٹر سے میری کھال ادھیڑ ڈالی تھی۔ یوں تو میں چچی اور چچا سے مار کھاتی رہتی تھی لیکن اس رات ہنٹر کی مار پہلی مرتبہ کھائی تھی۔

"پندرہ دن تک میرے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا۔ کوچیانگ پہلے ہنٹر سے مجھے پیٹتا اور پھر بھیڑیوں کی طرح مجھے نوچنے لگتا۔ میں بھاگنے کا موقع تلاش کرتی رہی لیکن اس نے میری نگرانی کے لیے شہر سے ایک ہٹی کٹی عورت کو بلالیا تھا۔ وہ شکل سے ہی حرافہ لگتی تھی۔ سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہتی۔

"سولھویں شب مجھے موقع مل گیا۔ کوچیانگ شراب کا عادی تھا لیکن اس رات اس نے کچھ زیادہ ہی چڑھالی تھی اور وہ نشے میں ہورہا تھا۔ اس طرح مجھے اس کے پستول پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے چھ کی چھ گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔ میں جب کمرے سے باہر نکلی تو میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر نگران عورت چیختی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں پہاڑیوں میں اس بل کھاتے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے کسی نہ کسی طرح شہر پہنچ گئی اور اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردیا۔

نگران عورت اور میری چچی چچا بھی پکڑے گئے تھے۔ کیس چلا اور مجھے سات سال کی سزا ہوئی جبکہ چچی اور چچا کو مختلف الزامات میں طویل مدت کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ جیل میں بھی میرے ساتھ کوئی قابل تعریف سلوک نہیں ہوا۔ میں نہ صرف قیدی عورتوں سے پٹتی رہتی بلکہ جیل کی ایک وارڈن میری پٹائی کرتی رہتی۔ اسے تو شاید مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہوگیا تھا۔ وہ جب تک دن میں ایک مرتبہ مجھے پیٹ نہ لیتی اسے چین نہیں آتا تھا اور میں بھی اس پٹائی کی عادی ہوگئی تھی۔"

تھائی وانگ خاموش ہوگئی۔ میں بھی خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی کہانی سن کر مجھے واقعی اس سے ہمدردی ہوگئی تھی۔

"جیل سے نکلنے کے بعد میں جس طرح وقت سے لڑتی رہی وہ ایک طویل داستان ہے۔" تھائی وانگ کہہ رہی تھی "چچا اور چچی جیل میں ہی مرگئے تھے اور مجھے ان کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ میں اب آزاد تھی۔ میں نے اپنے قدم جمانے کے لیے بڑی تگ ودو کی۔ آج میں ایک کامیاب بزنس وومن ہوں لیکن ماضی میں میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' اس نے مجھے اذیت پسند بنا دیا۔ میرا جسم مار کا عادی ہوچکا ہے۔ جب تک میں تشدد کا نشانہ نہ بنوں مجھے چین نہیں آتا۔ بڑی عمر کے مردوں پر مجھے بھروسا نہیں ہے۔ میں تمہاری عمر کے نوجوانوں کو پیسے کا لالچ دے کر ان سے یہ کام لیتی ہوں۔ ہنٹر سے پٹائی کے بعد جب تک جسم میں جلن رہتی ہے مجھے سکون ملتا ہے اور جیسے جیسے جلن کم ہوتی جاتی ہے' میری بے چینی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ جب میرے جسم پر کوڑے پڑتے ہیں تو تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ مجھے کتنا حظ اور سکون ملتا ہے۔ آج کی یہ پٹائی چار چھ روز کے لیے کافی ہے۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ پٹائی اس کے لیے گویا ایک طرح کا نشہ تھا۔ جیسے جیسے اس کا اثر زائل ہونا شروع ہوگا' اس کی بے چینی بڑھنے لگے گی۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اسے بھی شاید وقت کا خیال آگیا تھا۔ وہ اپنے جسم پر لپٹی ہوئی چادر سنبھالتی ہوئی اٹھ گئی۔

"مجھے امید ہے کہ اب تم نے مجھے معاف کردیا ہوگا۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "تمہیں برا بھلا کہنے کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ تمہیں اشتعال دلایا جائے اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ میں تمہارے ان خیالات کے سامنے بند باندھنا چاہتی تھی جو مجھے برہنہ دیکھ کر تمہارے ذہن میں آسکتے تھے۔ میرے خیال میں اب تمہارے دل میں کوئی ایسی بات نہیں رہنی چاہیے۔"

میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں گھس گیا اور بستر پر لیٹ کر دیر تک تھائی وانگ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی کہانی واقعی افسوس ناک تھی۔ اس کے ساتھ ظلم ہوا تھا اور میرے ساتھ کیا ہورہا تھا؟ میرے ماں باپ کو میری آنکھوں کے سامنے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا تھا۔ میرے دشمن موت کے فرشتوں کی طرح میرے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ میں جہاں بھی پناہ لیتا' چند روز بعد وہ مجھے ڈھونڈ نکالتے۔ کیا میں زندگی بھر اسی طرح بھاگتا رہوں گا؟

تھائی وانگ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہوا تھا لیکن اس نے حالات کا مقابلہ کیا تھا اور آج وہ سکون کی زندگی بسر کررہی تھی۔ اس نے اپنے دشمنوں کو ختم کردیا تھا۔ مجھے بھی ایسا ہی کرنا ہوگا۔ اس طرح چھپ کر زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔

میں رات کے آخری پہر سویا تھا۔ آنکھ کھلی تو دن کے بارہ بج رہے تھے۔ گھر میں خاموشی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تھائی وانگ صبح اپنے دفتر جاچکی ہوگی۔ اس نے مجھے نہیں جگایا ہوگا کہ میں اپنی نیند پوری کرلوں۔ جاگ جانے کے بعد بھی میں دیر تک بستر پر پڑا رہا اور پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جانے لگا تو تھائی وانگ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نگاہ بے اختیار اندر کی طرف اٹھ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور تھائی وانگ بستر پر اوندھی پڑی تھی۔ چادر اس کے جسم پر سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر کوڑے کی ضربوں کے نشان دور ہی سے نظر آرہے تھے۔ میں غیر ارادی طور پر کمرے میں گھس گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ میں نے رات کو غصے میں کچھ زیادہ ہی دھنائی کرڈالی تھی۔

تھائی وانگ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ میں نے دو تین آوازیں دیں مگر کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ہولے سے ہلایا مگر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی۔ مجھے تشویش ہونے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ..... میں نے سر جھٹک دیا۔ رات ساڑھے تین بجے تک تو وہ بیٹھی باتیں کرتی رہی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑ دیا۔ اس نے کسمساکر آنکھیں کھول دیں تو مجھے قدرے اطمینان ہوا۔

ایک گھنٹے بعد ہم دونوں ناشتا کررہے تھے۔ تھائی وانگ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بتارہی تھی کہ تشدد اور اذیت کا نشانہ بننے کے بعد بھی اس کے معمولات میں کبھی فرق نہیں آیا تھا اور یہ شاید

پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح بے سُدھ پڑی رہی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میں نے قوت بازو کچھ زیادہ ہی استعمال کرڈالی تھی۔

اس روز وہ اپنے دفتر نہیں گئی۔ بستر پر اوندھی پڑی رہی۔ میں کبھی اس کے پاس بیٹھ جاتا اور کبھی اِدھر اُدھر گھومنے لگتا۔

دوسرے روز وہ دفتر گئی تو معمول کے مطابق چھ بجے سے پہلے ہی واپس آگئی۔ اس نے آتے ہی اعلان کردیا تھا کہ ہم آج رات کا کھانا گھر سے باہر کسی ہوٹل میں کھائیں گے۔

جب ہم گھر سے نکلے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میرے دل میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو...! لیکن تھائی وانگ نے مجھے تسلی دی کہ ہر شخص تو مجھے نہیں پہچانتا۔ دو چار آدمی ہی مجھے پہچانتے ہوں گے اور ضروری نہیں تھا کہ جہاں ہم جائیں وہاں ان میں سے کوئی موجود ہو۔

کار متوسط رفتار سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی اور میں محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پورا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ہمارے سفر کا اختتام راجہ پراپ روڈ پر واقع عالی شان اندرا رنجیت ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر ہوا۔ اس ہوٹل کا سالا تھائی ریسٹورنٹ روایتی تھائی کھانوں کی وجہ سے خاص شہرت رکھتا تھا یہاں گاہکوں کا دل بہلانے کا بھی معقول بندوبست تھا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے کے بعد اسٹیج پروگرام شروع ہوجاتا تھا جس میں سیام کے قدیم روایتی رقص پیش کیے جاتے تھے۔ اس ہوٹل میں صرف وہی لوگ آسکتے تھے جن کی جیبیں کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی ہوں۔ عام آدمی کا اس طرف سے گزر نہیں تھا۔

ہم دیر تک کھانے، مشروبات اور رقص سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اس دوران میں، میں واقعی بھول گیا تھا کہ میری جان کے دشمن پورے شہر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ ہم گیارہ بجے ریسٹورنٹ سے نکلے اور جیسے ہی پارکنگ میں کار کے قریب پہنچے تھائی وانگ ٹھٹک گئی۔ کار کے دائیں طرف کے دونوں ٹائر فلیٹ تھے۔ ہم کار کے سامنے سے گھوم کر دوسری طرف آگئے۔ اس طرف کے دونوں ٹائر بھی فلیٹ تھے۔ مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ کار کے چاروں ٹائر فلیٹ ہونا محض اتفاق نہیں ہوسکتا تھا۔ پہیوں کی ہوا جان بوجھ کر نکالی گئی تھی۔ میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔

میری طرح تھائی وانگ بھی متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ پھر ہم دونوں نے بیک وقت ہوٹل کے سامنے والی سڑک پر دوسری طرف اس شخص کو دیکھ لیا تھا جو بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس نے سفید پینٹ اور سفید ہی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر سامنے کے رخ پر کوئی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ گلے میں سرخ اسکارف بندھا ہوا تھا۔

"مسٹر وجدان۔" تھائی وانگ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "اندر چلو۔ ہم اس طرف سے نہیں جاسکتے۔"

"میں نے بھی سرخ اسکارف والے اس آدمی کو دیکھ لیا ہے۔" میں نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "لیکن فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

تھائی وانگ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"گڈ! تم واقعی دلیر نوجوان ہو۔ اگر تم میں واقعی ایسا جوہر پیدا ہوتا رہا تو وہ لوگ واقعی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

اس نے اگرچہ میری حوصلہ افزائی کی تھی لیکن میں جھینپ گیا۔ میں نے اس سے ساتھ ہونے والی بات ایسے کہہ دی تھی جیسے خطرہ مجھے نہیں اسے ہے اور میں اس کی حفاظت کے لیے ساتھ آیا ہوں۔

ہم دونوں دوبارہ ریسٹورنٹ میں گھس گئے لیکن وہاں رکے نہیں۔ میزوں کے درمیان چکراتے ہوئے دوسرے دروازے سے ہوٹل کے اندرونی حصے کی طرف نکل گئے۔ تھائی وانگ یقیناً پہلے بھی یہاں آتی رہتی تھی۔ اسے ہوٹل کے راستے معلوم تھے۔ مختلف راستوں سے گھومتے ہوئے پچھلی طرف آگئے۔ ہوٹل کا ایک دروازہ سوئے اندرا والی سائڈ پر بھی تھا لیکن تھائی وانگ جیسے ہی باہر نکلی ٹھٹک کر رک گئی۔ اس طرف بھی گلی میں چند گز کے فاصلے پر اسی حلیئے سے ملتا جلتا ایک آدمی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے گلے پر اسکارف نہیں تھا البتہ سر پر پیلے رنگ کا ایک الاسٹک بینڈ نظر آرہا تھا۔ تھائی وانگ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے پیچھے مڑ گئی۔

مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ہم ایک کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہ ہوٹل کے ٹیلی فون آپریٹر کا کمرا تھا۔ سوئچ بورڈ کے سامنے دو خوب صورت لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک تو فون پر کسی سے بات کررہی تھی اور دوسری نے بات ختم کرکے سوئچ بورڈ پر سے پلگ آف کیا تھا۔ وہ گردن گھما کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔

"مجھے ایک فون کرنا ہے۔ ایمرجنسی ہے۔" تھائی وانگ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"لابی میں پبلک بوتھ لگے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ بوتھ فارغ ہیں۔" لڑکی نے گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"ایمرجنسی ہے پلیز!" تھائی وانگ نے کہا "ہمیں جان کا خطرہ ہے۔ ہم لابی میں نہیں جاسکتے۔"

"پولیس کو فون کرنا ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"نہیں۔ پلیز۔ مجھے فون کرلینے دو۔ وہ لوگ ہماری تلاش میں یہاں آگئے تو......"

"یہ ڈائرکٹ لائن ہے۔" لڑکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ایک ٹیلی فون سیٹ آگے سرکا دیا "فون کرکے تم لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

تھائی وانگ نے ریسیور اٹھالیا اور نمبر پریس کرنے لگی۔ کال ریسیو ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس کی باتوں سے

اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ماسٹر پھو کو اس صورت حال سے آگاہ کررہی تھی پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ماسٹر پھو چند منٹ میں یہاں پہنچ جائے گا۔ اس وقت تک ہمیں ان لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ کر ہمیں کہیں وقت گزارنا ہے۔ آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔"

اس نے ٹیلی فون آپریٹر کا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں اس کمرے سے نکل آئے۔ دو راہداریوں میں گھوم کر ہم لابی کی طرف نکل آئے لیکن تھائی وانگ فوراً ہی پیچھے مڑ گئی اور ایک اور راہداری میں ہوتے ہوئے ایک زینے پر چڑھ گئی۔ زینے کے اختتام پر ایک فلور تھا۔ تھائی وانگ نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دوڑتے ہوئے کارنر کے ایک کمرے میں گھس گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی تھائی وانگ نے دروازہ بند کردیا تھا۔

خاصا وسیع و عریض کمرا تھا۔ کسی لائبریری کی طرح بڑے بڑے ریکس بنے ہوئے تھے لیکن ان ریکس میں کتابوں کے بجائے تہ کیے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ چادریں، پردے، تولیے، غلاف، میز پوش اور اسی قسم کی چیزیں تھیں۔ تھائی وانگ نے کمرے کی بتی بجھادی اور ہم ان ریکس کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک کھڑکی کے قریب آکر رک گئے۔

یہ کھڑکی مین روڈ کی طرف تھی اور یہاں سے نہ صرف ہوٹل کا گیٹ بلکہ اس کے سامنے کی سڑک بھی نظر آرہی تھی۔ سرخ اسکارف والا وہ بدمعاش اب بھی سڑک کے دوسری طرف بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ میں کھڑکی کے ایک طرف کھڑا شیشے سے جھانک کر دیکھ رہا تھا اور پھر دو کاریں مخالف سمت سے آکر بیک وقت گیٹ کے سامنے رکی تھیں، ایک کار سے ماسٹر پھو کو اترتے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی لیکن دوسرے ہی لمحے دوسری کار سے چی فانگ کو اترتے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ماسٹر پھو کی کار سے بھی دو اور آدمی اتر آئے تھے۔

اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا، اسے میں جنگ کا نام ہی دوں گا۔ ماسٹر پھو اور چی فانگ پہلے ایک دوسرے کو للکارتے رہے اور پھر بھیڑیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ ان دونوں کے ساتھ آنے والے بھی آپس میں بھڑ گئے تھے۔

ہوٹل کی انتظامیہ نے گیٹ بند کرا دیا تھا۔ لان میں جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ ریسٹورنٹ وغیرہ کے دروازے بھی بند کردیے گئے تھے۔

میں دم بخود سا کھڑا سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر پھو اور چی فانگ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے دو پہاڑ آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ وہ چیختے چنگھاڑتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہورہے تھے۔ چی فانگ کو میں نے پہلے لڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پہلی مرتبہ اس وقت دیکھا تھا جب اس نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔ وہ جس بے رحمی سے میری ماں پر خنجر سے وار کررہا تھا، وہ منظر میں آج تک نہیں بھول سکا پھر وہ موت کا سایہ بن کر میرے تعاقب میں لگا تھا اور آج میں اسے لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بھی اپنے فن کا ماسٹر تھا۔

چی فانگ کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ وہ ماسٹر پھو کو فلائنگ کک مارنا چاہتا تھا۔ ماسٹر پھو نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر پیچھے اچھال دیا۔ چی فانگ قلا بازی کھاتا ہوا پیروں کے بل گرا اور فوراً ہی سنبھل گیا لیکن ماسٹر پھو نے اسے مزید سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے یوں حرکت کی جیسے پنچ مارنا چاہتا ہو لیکن اس کی لیفٹ کک پوری قوت سے چی فانگ کی ٹھوڑی کے نیچے نرخرے پر لگی اور وہ ڈکراتا ہوا پیچھے الٹ گیا اور پھر ماسٹر پھو نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اسپن، راؤنڈ ہاؤس اور بیک ککس چی فانگ پر برستی رہیں لیکن ایک موقع پر چی فانگ نے ماسٹر کی کک روک لی اور اسے پیچھے اچھال دیا۔ ماسٹر پھو الٹ کر پیچھے گرا مگر اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

چی فانگ نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پتلون کا پائنچہ اوپر اٹھایا اور پنڈلی پر چمڑے کے فیتے سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر میری آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔

ماسٹر پھو نے چی فانگ کے خنجر والے ہاتھ پر کک لگانے کی کوشش کی مگر چی فانگ اس داؤ کو بچا گیا۔ اس نے جوابی وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ ماسٹر پھو نے اپنے آپ کو بچالیا مگر اس کے ساتھ ہی اس کا پیر پھسل گیا اور وہ پشت کے بل گر گیا۔ ماسٹر پھو نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن عین اس وقت چی فانگ کا ایک آدمی ماسٹر پھو کے ایک آدمی کا پنچ کھا کر ماسٹر پھو کے اوپر گرا اور اس نے موقع ملتے ہی ماسٹر پھو کے دونوں بازو گرفت میں لے لیے۔

چی فانگ بڑی تیزی سے آگے بڑھا اور چنگھاڑتے ہوئے خنجر پوری قوت سے ماسٹر پھو کے سینے میں اتار دیا۔ چی فانگ نے خنجر کا دوسرا وار کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ماسٹر پھو کے بازو اس بدمعاش کی گرفت میں تھے۔ اس نے دونوں پیر زمین پر ٹکا کر پوری قوت استعمال کرتے ہوئے برج بنایا اور اس طرح اچھلا کہ وہ بدمعاش اچھل کر دور جا گرا۔ ماسٹر پھو اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے چی فانگ کا دوسرا وار روکنے کی کوشش کی مگر لڑکھڑا گیا۔ خنجر دوسری مرتبہ اس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور ٹانگیں ہولے ہولے کانپنے لگیں۔ ماسٹر پھو زخمی ہونے کے باوجود چی فانگ کی طرف بڑھ رہا تھا اور چی فانگ پے در پے اس پر خنجر کے

وار کر رہا تھا اور پھر میں نے ماسٹر پھو کو سڑک پر گرتے ہوئے دیکھا۔

اسی لمحے وہاں ایک اور کار آکر رکی اور چار پانچ آدمی نیچے اترے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ چی فانگ کے آدمی تھے یا ماسٹر پھو کے۔

تھائی وانگ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے دروازے کی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا۔ ہم اس کمرے سے نکل کر راہداری میں دوڑنے لگے۔ راہداری میں کچھ لوگوں سے آمنا سامنا بھی ہوا۔ وہ سب خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ ہم اسی تیزی سے زینے سے اتر کر راہداریوں میں ہوتے ہوئے ہوٹل کے پچھلے دروازے کی طرف آگئے۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ اس طرف ہوٹل کی نگرانی کرنے والا بدمعاش بھی غالباً ہوٹل کے سامنے والے رخ پر چلا گیا تھا۔

میں تھائی وانگ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا اور ہم دوڑتے ہوئے سونگ فور کی طرف مڑ گئے اور دوسری طرف کے مین روڈ پر آگئے۔ سامنے ہی ایک ٹک ٹک کھڑا تھا۔ ہم دونوں رکشے سے ملتی جلتی اس سواری میں بیٹھ گئے۔

"راماون روڈ۔ ہری اپ!" تھائی وانگ چیخی۔

ٹک ٹک فوراً ہی حرکت میں آگیا۔ تھائی وانگ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ راماون روڈ پر ٹک ٹک چھوڑ کر ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ سیام اسکوائر کے قریب وہ ٹیکسی چھوڑ کر ہم ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور اس طرح ٹیکسیاں بدلتے ہوئے ہم تاسکن برج پر پہنچ گئے۔ آخری ٹیکسی ہم نے بیوری روڈ پر چھوڑ دی تھی اور وہاں سے آگے پیدل ہی آئے تھے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی تھائی وانگ نے دروازے اس طرح لاک کر لیے جیسے وہ ہمارے تعاقب میں آرہے ہوں۔

تھائی وانگ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس نے اپنی ڈریسنگ ٹیبل کی دراز سے پستول نکال لیا تھا۔

ہماری وہ رات جاگتے ہوئے گزری تھی۔ خوف زدہ میں بھی تھا۔ ماسٹر پھو کے انجام نے میری روح تک کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ میری وجہ سے چی فانگ جیسے سفاک آدمی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔

تھائی وانگ کی کار اندرا ریجنٹ ہوٹل کے پارکنگ میں کھڑی تھی لیکن دوسرے دن صبح بھی وہ گھر سے نہیں نکلی۔ اس نے تمام دروازوں کو تالے لگا رکھے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اور تھائی وانگ لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ تھائی وانگ اٹھ کر فون کے قریب چلی گئی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

"تم کون ہو؟ تمہارا میری کار سے کیا تعلق ہے۔ جب چاہوں گی، لے آوں گی۔"

میں نے تھائی وانگ کو ماؤتھ پیس میں کہتے سنا اور پھر دوسری طرف سے جو کچھ بھی کہا گیا تھا۔ اسے سن کر تھائی وانگ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا ہوا.... کس کا فون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے کار کے نمبر سے میرا ایڈریس معلوم کرا لیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم یہاں ہو۔" تھائی وانگ کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی "وہ.... وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دل زور زور سے دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میری زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔

○☆○

میں سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا تھائی وانگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب اس طرح کھڑی تھی جیسے پتھر ہو گئی ہو۔ اسٹینڈ سے نیچے لٹکا ہوا ٹیلی فون کا ریسیور کلاک کے پینڈولم کی طرح جھول رہا تھا۔ ریسیور میں کوئی آواز ابھر رہی تھی۔ لیکن وہ صرف آواز تھی۔ میرے لیے ان الفاظ کے معنی یا مفہوم ختم ہو چکا تھا۔ وہ صرف آواز تھی۔ جیسے موت کی چاپ!

تھائی وانگ کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے اس کے جسم میں گردش کرنے والے خون کے سرخ سیل اچانک ہی ناپید ہو گئے ہوں۔ اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ قوت گویائی تو میری بھی سلب ہو چکی تھی۔ مجھے تو یوں لگا تھا جیسے ایک لمحے کو زمین کی گردش رک گئی ہو۔ کائنات پر سکوت طاری ہو گیا ہو اور زندگی گمبھیر سناٹے میں ڈوب گئی ہو اور پھر اچانک یہ سکوت اور سناٹا ٹوٹ گیا۔

"و.... وج.... دان...." تھائی وانگ کے لرزتے ہونٹوں سے کپکپاتی ہوئی سی آواز نکلی تو میں بھی جیسے ہوش میں آگیا "وہ لوگ.... کسی بھی وقت یہاں پہنچ جائیں گے۔ ایک ایک لمحہ ہمارے لیے قیمتی ہے۔ ہری اپ....!"

مجھے اس کی ہمت کی داد دینی پڑی۔ یہ فون کال گویا موت کی کال تھی جس نے ایک لمحے کو ہم دونوں کو دہلا کر رکھ دیا تھا لیکن تھائی وانگ نے بڑی سرعت سے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک دم حرکت میں آگئی تھی۔

میں بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے ساتھ بیڈ روم میں آگیا تھا۔ اس نے الماری کھول کر کرنسی نوٹوں کے کچھ بنڈل اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ نمایاں طور پر کانپ رہے تھے۔ الماری میں تہ در تہ رکھے ہوئے کپڑے اور دوسری کئی سی چیزیں نیچے گر گئی تھیں لیکن شاید اسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ الماری سے ہٹ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آگئی اور باری باری سارے دراز باہر کھینچ لیے لیکن شاید اسے مطلوبہ چیز نہیں مل رہی تھی۔ اس پر خوف کے ساتھ اب جھنجلاہٹ بھی طاری ہو رہی تھی۔

"میں نے یہیں رکھا تھا۔ پتا نہیں کہاں غائب ہو گیا۔" وہ... بڑبڑائی۔

"کس چیز کی تلاش ہے؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز میں بھی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"پستول!" وہ بولی "میں نے چیک کر کے یہیں رکھا تھا۔ کسی دراز میں۔"

"پستول تمہارے تکیے کے نیچے ہے۔" میں نے کہا۔

تھائی وانگ نے تکیہ اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور جھپٹ کر پستول اٹھا لیا۔

"اب نکل چلو یہاں سے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتے ہیں۔" وہ کہتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف گھوم گئی۔

بیڈ روم سے نکل کر میں نے لاؤنج کی طرف قدم بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"ادھر نہیں۔" اس کا لہجہ اب سرگوشیانہ تھا "ہوسکتا ہے کوئی آدمی بنگلے کی نگرانی کر رہا ہو۔ اس طرف.... ہم پچھلے دروازے سے نکلیں گے۔"

میں اس کے ساتھ دوسری طرف مڑ گیا اور پھر راہداری میں گھوم کر ہم عقبی دروازے کے قریب آگئے۔ اس نے بیگ میرے حوالے کر دیا جسے میں نے کندھے پر لٹکا لیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں پستول تھا اور بائیں ہاتھ سے وہ بڑی آہستگی سے دروازے کا بولٹ گرا رہی تھی۔ گھر کی تمام بتیاں کھلی چھوڑ دی گئی تھیں تاکہ اندھیرا ہو جانے پر کسی کو شبہ نہ ہو سکے۔

بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر ہم باہر آگئے۔ اس طرف کھلی جگہ پر چند درخت تھے اور ان سے آگے تقریباً سات فٹ اونچی باؤنڈری وال تھی۔ میں دن میں ایک دو مرتبہ اس طرف بھی آچکا تھا اور ایک مرتبہ تو میں نے دیوار پر سے جھانک کر بھی دیکھا تھا۔ اس دیوار کے دوسری طرف ایک کشادہ گلی تھی لیکن اس بنگلے کے عین سامنے کوئی بنگلا وغیرہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ تھائی وانگ کے بنگلے کے پہلو سے گزرنے والی نہر میں اس جگہ کسی قدر خم تھا۔

ہم دونوں عقبی دروازے سے نکل کر درختوں میں باؤنڈری وال کی طرف چلنے لگے۔ موت کے فرشتے جب تعاقب میں لگے ہوئے ہوں تو معمولی سی آہٹ بھی دہلا دیتی ہے۔ درختوں کے نیچے خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔ پیروں کے نیچے دبنے سے چرچراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ تھائی وانگ بہت محتاط انداز میں قدم اٹھا رہی تھی اور بار بار پیچھے دیکھ رہی تھی۔

دیوار تقریباً سات فٹ اونچی تھی۔ تھائی وانگ کے لیے اوپر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ پہلے میں دیوار پر چڑھ گیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ ابھی ہم دیوار کے دوسری طرف کودنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے کہ بنگلے کے گیٹ کی طرف سے دھب کی آواز سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

تھائی وانگ نے چیخ روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس کا یہ خیال بالکل درست نکلا تھا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔ دھب کی اس آواز کا مطلب تھا کہ کوئی آدمی بنگلے کی سامنے والی دیوار سے اندر کودا تھا۔

"جلدی کرو پلیز.... وہ لوگ آگئے ہیں۔" تھائی وانگ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

خوف سے میری بھی گھگی بندھی ہوئی تھی لیکن میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے تھائی وانگ کا ایک ہاتھ پکڑ کر اسے دیوار کی دوسری طرف لٹکا دیا اور پھر خود بھی دونوں ہاتھ

ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق تخلیق اور تنقید چار عظیم شاعروں کی کہانیاں

خُدایانِ سُخن

مضبوط جلد

خوبصورت سرورق

میر غالب مومن اور داغ

✷۔ ان چار "خُدایانِ سخن" کی زندگی سے وابستہ چونکا دینے والے راز!

صفحات 320

قیمت 200 روپے ✷ ڈاک خرچ 25 روپے

طلبہ اور شائقین ادب کے لئے بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

دیوار پر جا کر نیچے لٹک گیا اور بڑی آہستگی سے نیچے اتر گیا۔ اگر میں چھلانگ لگاتا تو دھب کی آواز کسی کو متوجہ کر سکتی تھی۔

اس وقت اگرچہ آٹھ ہی بجے تھے لیکن اس طرف گلی میں کوئی نہیں تھا۔ بنگلوں میں روشنیاں زندگی کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔ ایک دو بنگلوں کے سامنے کاریں بھی کھڑی تھیں۔ ہم دونوں نے دیوار سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سامنے کی طرف دوڑنے لگے۔

"اس طرف۔" تھائی وانگ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس طرف پیدل آمدورفت کے لیے نہر پر لکڑی کا ایک پُل ہے۔ وہ پُل پار کرکے چاروئے ناکھن روڈ کی طرف نکل سکتے ہیں۔"

ہم دونوں نہر کی طرف مڑ گئے۔ بنگلوں اور نہر کے درمیان تقریباً چھ فٹ چوڑی پٹی تھی۔ اس کچے راستے پر عام طور پر پیدل یا سائیکل سوار لوگ ہی آیا جایا کرتے تھے۔ یا کبھی کبھار موٹر سائیکل والے بھی یہ راستہ استعمال کرتے تھے۔ ذرا آگے نہر پر لکڑی کے تختوں کا ایک پُل تھا جس کی چوڑائی چار فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے دونوں طرف نیچے اوپر بانس کے دو دو ڈنڈوں کی ریلنگ بھی لگی ہوئی تھی۔ یہ پُل دراصل پیدل آمدورفت کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ تاکہ نہر کے دوسری طرف جانے کے لیے سڑک والے پُل کا طویل فاصلہ طے نہ کرنا پڑے۔

کچے راستے پر دوڑتے ہوئے ہمیں دھب دھب کی آوازیں سنائی دیں۔

"تیز بھاگو۔" تھائی وانگ چیخی "وہ لوگ بنگلے کی دیوار کود کر باہر آگئے ہیں۔"

میں تو تیز بھاگ رہا تھا لیکن خود تھائی وانگ ہی پیچھے تھی۔ میں نے مڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بھی اپنے ساتھ تیز دوڑانے لگا۔ ہم دونوں ننگے پیر تھے' اس لیے کچی زمین پر دوڑنے سے زیادہ آواز پیدا نہیں ہو رہی تھی۔

ہم لکڑی والے پُل کے قریب پہنچ گئے۔ پیچھے سے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک آدمی تھائی زبان میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"ادھر۔ ان بنگلوں میں دیکھو اور تم نہر کی طرف جاؤ۔ جلدی کرو۔ اگر وہ نکل گئے تو ٹائیگر ہم میں سے کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"تھائی وانگ۔" میں پُل کے قریب رک گیا "اگر ہم دوڑتے رہے تو پکڑے جائیں گے۔ اس وقت ہمارے لیے محفوظ ترین جگہ یہ پُل ہے۔ اس کے نیچے چھپ کر ہم ان کی نظروں سے بچ سکتے ہیں۔"

میری بات تھائی وانگ کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا اور پُل کے بالکل ساتھ نہر میں اتر گئی۔ اس کے فوراً ہی بعد میں بھی بڑی آہستگی سے پانی میں اتر گیا اور تھائی وانگ کو اپنے ساتھ لیتا ہوا پُل کے نیچے پہنچ گیا۔ میں نے بیگ کا اسٹریپ گردن میں لپیٹ کر اسے کندھے پر لٹکا لیا تھا۔ تھائی وانگ نے بھی پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم پُل کے نیچے پہنچے، ہم نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر گردن گھمائی تو ایک آدمی کچے راستے پر دوڑتا ہوا نظر آیا۔

ہم دونوں نہر کے کنارے کے ساتھ لگے پُل کے نیچے کھڑے رہے۔ اس جگہ پانی میرے سینے کے برابر پہنچ رہا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے پُل کے تختوں کے نیچے ایک لکڑی کو پکڑ رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ تھائی وانگ کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اس نے بھی ایک ہاتھ سے آگے والی لکڑی کو تھام رکھا تھا۔

چند سیکنڈ بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی اور پھر وہ آدمی پُل پر پہنچ گیا۔ دھڑ دھڑ کی آواز ہمارے سروں پر سے گزر گئی۔

پُل کے نیچے گہری تاریکی تھی۔ اگر وہ شخص پُل کے نیچے جھانکنے کی کوشش بھی کرتا تو شاید ہم تاریکی میں اسے نظر نہ آتے لیکن ہم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت سانس روکے کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ آدمی پُل پر دوڑتا ہوا بنگلوں کی طرف واپس چلا گیا۔ کچے راستے پر اس کے قدموں کی ہلکی آواز بھی بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تھائی وانگ کانپنے لگی ہو اور پھر اس کے منہ سے عجیب ڈری ڈری سی آوازیں بھی نکلنے لگیں۔

"کیا ہوا؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا "سردی لگ رہی ہے کیا؟"

"اس.... اسنیک....." اس کے منہ سے بمشکل آواز نکل سکی "م.... میری گردن پر.... اسنیک... (سانپ) لپٹ گیا ہے۔"

میں نے ایک جھٹکے سے اس کی کمر سے ہاتھ ہٹا لیا اور پھر دوبارہ ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر بڑھانے لگا۔ میرا دل بھی خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کی گردن پر لپٹے ہوئے سانپ نے مجھے ڈس لیا تو؟ اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا۔ ڈیڈی سے ایک مرتبہ سنا تھا کہ پانی کے سانپ زیادہ خطرناک اور زہریلے ہوتے ہیں۔

سانپ کا خوف بھی عجیب ہوتا ہے۔ آدمی رائفل کی گولی کا تو سامنا کر سکتا ہے لیکن سانپ سے ڈسے جانے کا تصور ہی بڑا خوفناک ہوتا ہے۔ یہ خوف میرے دل پر بھی طاری ہو رہا تھا لیکن میرا ہاتھ آہستہ آہستہ تھائی وانگ کے شانے پر رینگتا ہوا گردن پر پہنچ گیا اور پھر میں نے سانپ کو گرفت میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ کسی جھاڑی کی لچک دار شاخ تھی جو نجانے کہاں سے پانی میں بہتی ہوئی آرہی تھی اور تھائی وانگ کی گردن سے لپٹ گئی تھی۔

"سانپ نہیں۔ جھاڑی تھی۔" میں نے کہتے ہوئے وہ جھاڑی

پانی میں پھینک دی اور پھر پُل پر قدموں کی آواز سن کر چونک گیا۔

"[illegible] کوئی آرہا ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

پُل کے تختوں پر قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ ایک عورت اور ایک مرد تھا جو دوسری طرف سے آئے تھے اور باتیں کرتے ہوئے پُل پر سے گزر گئے تھے۔

"وہ لوگ ہمیں بنگلوں کی طرف ڈھونڈ رہے ہیں۔" تھائی وانگ نے سرگوشی کی "اور اب میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

میں نے تھائی وانگ کو چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ کنارے کے ساتھ حرکت کرتا ہوا پُل سے باہر جھانکنے لگا۔ بنگلوں کی طرف سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ غالباً زبردستی بنگلوں میں گھس کر ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ اپنے بنگلے سے بھاگ کر ہم نے کسی اور بنگلے میں پناہ لے رکھی ہے۔ میں محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بڑی آہستگی سے نہر سے نکل آیا اور تھائی وانگ کو بھی باہر کھینچ لیا۔

کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا تھا۔ اب تک نجانے کتنے لوگ مارے جا چکے تھے۔ ماسٹر چو کا حشر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اب انہوں نے تھائی وانگ کا بھی سراغ لگا لیا تھا جس نے مجھے پناہ دے رکھی تھی۔ اگر ہم دونوں بنگلے میں ان کے ہاتھ لگ جاتے تو نجانے ہمارا کیا انجام ہوتا۔

اگرچہ اصل ٹارگٹ میں تھا لیکن نجانے میرے ذہن میں یہ بات کیوں سما گئی تھی کہ مجھے تھائی وانگ کی حفاظت کرنی چاہیے۔ وہ میرے لیے اس مصیبت میں پھنسی تھی اور اس کی حفاظت کی ذمے داری بھی اب مجھ پر ہی عائد ہوتی تھی اور پھر میں نے غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم پُل پار کرکے دوسری طرف نکلے۔ دوسری طرف ایک تنگ سی سڑک تھی جو آگے جا کر چاروئے ناکھن روڈ سے جا ملتی تھی۔

کپڑوں سے ابھی تک پانی دھار کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ ہم تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ تقریباً پچاس گز آگے والے موڑ سے ایک موٹر سائیکل اس طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ اس موٹر سائیکل کو دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا۔ میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں بھی غالباً کوئی ایسی ہی بات آئی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں بڑی پھرتی سے سڑک سے ہٹ کر جھاڑیوں میں دبک گیا۔

تھائی وانگ سڑک کے بیچ میں کھڑی ہوگئی۔ اس نے پستول والا ہاتھ پشت پر رکھ لیا اور دوسرے ہاتھ سے موٹر سائیکل کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ موٹر سائیکل اس کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ تھائی وانگ نے بڑی پھرتی سے موٹر سائیکل سوار پر پستول تان لیا۔

"اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو بائیک اسٹینڈ پر کھڑی کرکے خاموشی سے اس طرف دوڑ لگا دو۔ اگر تمہارے منہ سے کوئی آواز نکلی تو گولی مار دوں گی۔"

موٹر سائیکل سوار دبلا پتلا سا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ پستول دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے نیچے اتر کر موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر دی اور منہ سے آواز نکالے بغیر جھاڑیوں میں دوڑتا چلا گیا۔

میں جھاڑیوں سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ تھائی وانگ نے پستول پاجامے کی جیب میں ٹھونس لیا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر کک لگانے لگی۔ میں اس دوران میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور پھر مجھے ایک غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

فضا اچانک ہی روشن ہوگئی تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ نہر کے دوسری طرف تھائی وانگ کی کوٹھی سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ غالباً پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی تھی۔ تھائی وانگ ایک لمحے کو سکتے کی سی کیفیت میں بے حس و حرکت موٹر سائیکل پر بیٹھی رہی پھر وہ موٹر سائیکل سے اتر گئی اور جیب سے پستول نکال لیا۔

"میں..... میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ایک ایک کو ختم کر دوں گی۔" اس کے منہ سے خوفناک غراہٹ نکلی۔

میں چونک گیا اور دوسرے ہی لمحے میں بھی سیٹ سے اتر گیا۔ موٹر سائیکل دوسری طرف الٹ گئی۔ تھائی وانگ پُل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

"کہاں جا رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" میں اسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"انہوں نے میرا گھر جلا دیا..... سب کچھ راکھ کر ڈالا۔ میں ان سب کو ختم کر دوں گی۔" وہ چیخی۔

"پاگل مت بنو تھائی وانگ۔ ہوش کے ناخن لو۔" میں نے بھی چیخ کر کہا "وہ تمہیں دیکھتے ہی گولیوں سے بھون دیں گے۔ یا تمہیں اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیں گے۔"

تھائی وانگ چیختے ہوئے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنا بنگلہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں دیکھ کر اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"پاگل مت بنو۔" میں نے کہا "اس وقت اس طرف جانا خودکشی کے مترادف ہے ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ البتہ وہ ہم دونوں کو ہلاک کر دیں گے۔ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ تمہارے گھر کی بربادی کا بدلہ ہم ان سے ضرور لیں گے۔ ہم زندہ رہے تو ایسے کئی مواقع ملیں گے۔ اس وقت یہاں سے نکلو۔"

تھائی وانگ وحشت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ زوردار تھپڑ کھانے کے بعد میری بات شاید اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"اب یہاں کھڑے کھڑے وقت ضائع مت کرو۔ کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔ جلدی کرو۔" میں نے کہا۔

تین چار آدمی بنگلوں کے ساتھ نہر کے کچے راستے پر دوڑتے ہوئے پُل کی طرف آ رہے تھے۔ تھائی وانگ نے پستول پھر جیب میں ڈال لیا اور موٹر سائیکل سیدھی کی اور کک لگا کر اسے اسٹارٹ کر دیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے گیئر میں ڈال کر موٹر سائیکل کو واپس موڑا اور اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بنگلے سے اٹھنے والے شعلے اب آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور لوگوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

تھائی وانگ موٹر سائیکل چلانے میں بڑی ماہر ثابت ہوئی تھی۔ رفتار بہت تیز تھی۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ اس کی بغلوں سے نکال کر اس کے سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔ میرے کندھے پر لٹکا ہوا بیگ کبھی ایک طرف جھول جاتا اور کبھی دوسری طرف۔

چاروئے ناکھن روڈ تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہاں سے اس نے موٹر سائیکل کرونگ تھیپ برج کی طرف موڑ لی۔ دریا کے پُل پر اس وقت ٹریفک زیادہ تھا لیکن تھائی وانگ بڑی مہارت سے موٹر سائیکل کو گاڑیوں کے بیچ سے گھماتی ہوئی نکال رہی تھی۔

پُل پار کر کے اس نے موٹر سائیکل کو نیو روڈ کی طرف موڑ دیا اور پھر مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی چین روڈ پر آ گئی اور پھر انڈین ٹمپل کے عقب میں ایک گلی میں موٹر سائیکل روک لی۔ اس گلی میں کئی کئی منزلہ مکان تھے اور زیادہ آبادی ہندوستانیوں کی تھی اور ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ یہاں ایک بہت بڑا مندر بھی تھا۔

اس وقت ساڑھے نو بجے تھے۔ کشادہ گلی میں کچھ بچے کھیل رہے تھے لیکن کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ وہ سب اپنے کھیل میں مشغول رہے۔ تھائی وانگ نے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا اور نیچے اتر کر ایک مکان کی بیل بجا دی۔ میں موٹر سائیکل پر ہی بیٹھا رہا۔ پیر میں نے دونوں طرف زمین پر ٹکا لیے تھے۔ تھائی وانگ کا کاٹن کا پاجامہ تو تقریباً سوکھ گیا تھا لیکن میری جینز کی پتلون کے پائنچوں سے ابھی تک پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

کال بیل بجانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی کوئی عورت تھی۔ تھائی وانگ نے اس سے کوئی بات کی اور مڑ کر مجھے اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ میں سیٹ سے اتر کر موٹر سائیکل کو کھینچتا ہوا اندر لے گیا۔ مکان کے دروازے کے سامنے غالباً سائیکل لانے لے جانے کے لیے سیمنٹ کا ایک چھوٹا سا ریمپ بنا ہوا تھا جس وجہ سے مجھے موٹر سائیکل اندر لانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

دروازہ کھولنے والی ایک بوڑھی ہندو عورت تھی۔ سفید کاٹن کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ دوسری طرف [illegible] آواز دے رہی تھی۔

ہمارے اندر آنے کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک کمرے [illegible] کھل گیا اور اس کمرے سے برآمد ہونے والی عورت [illegible] نجانے کیوں میں کچھ عجیب سا محسوس کرنے لگا۔

کھلتی ہوئی گندمی رنگت کی مالک دراز قامت [illegible] حسین تھی۔ گلابی رنگ کی ساڑھی بھی اس پر خوب [illegible] اس کی ہرنی جیسی سیاہ آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک [illegible] ماتھے پر بندیا بھی ستارے کی طرح چمک رہی تھی۔ [illegible] کے بعد وہ حیرت سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھ [illegible]

میں اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ادھر اُدھر [illegible] درمیان میں کشادہ صحن تھا اور اطراف میں کمرے۔ [illegible] دیوار کے ساتھ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ [illegible] طرح کے کمرے تھے لیکن صحن نہیں تھا۔ کمروں کے [illegible] بالکونیاں تھیں۔ یہ ڈبل اسٹوری مکان مجموعی طور پر [illegible] پر مشتمل تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت ان دو عورتوں [illegible] یہاں اور کوئی نہیں تھا۔

"ہیلو تھائی!" وہ خوب صورت عورت آگے بڑھتے ہوئے [illegible] "کیا ہوا؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اور یہ کون ہے؟" [illegible] طرف دیکھنے لگی۔

"کمرے میں چلو۔ سب کچھ بتاتی ہوں لیکن... بندو [illegible] کہ یہ باہر [illegible] راز ذکر نہ کرے۔ یہ سمجھ لو کہ یہاں [illegible] آیا۔" تھائی وانگ نے آخری الفاظ اس بوڑھی عورت [illegible] دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

"اس کی تم فکر مت کرو۔ اس نے تو کچھ دیکھا [illegible] اس خوب صورت عورت نے کہا "آؤ۔ اوپر چل کر بیٹھتے [illegible]"

تھائی وانگ نے مجھے بھی اشارہ کر دیا اور ہم اوپر آ [illegible] جو کھولا گیا تھا' بیڈ روم تھا۔ بستر بہت آرام دہ تھا۔ بیڈ [illegible] ایزی چیئر کی طرح ایک لمبی سی کرسی بھی تھی جس پر لیٹا [illegible] تھا۔ دو کرسیاں اور تھیں۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر میک اپ [illegible] ہونے والی مختلف چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ میرے لیے [illegible] زیادہ حیرت کی بات وہ تصویریں تھیں جو دیواروں پر خوب [illegible] فریموں میں لگی ہوئی تھیں۔ دو تصویریں نیم عریاں لباس [illegible] صورت لڑکیوں کی تھیں اور ایک تصویر میں عورت کے [illegible] مرد بھی تھا۔ دونوں نیم عریاں لباس میں تھے۔

اس قسم کی لڑکیوں کی نیم عریاں تصویریں میں نے [illegible] کے گھر میں بھی دیکھی تھیں اور یہاں بھی۔ مجھے حیرت [illegible] تھی کہ گھروں میں ایسی گندی تصویریں کیوں لگائی جاتی [illegible]

[illegible] یاد تھا کہ ایک مرتبہ ڈیڈی ایک میگزین لے کر آئے [illegible] میگزین میں بھی ایسی ہی تصویریں تھیں۔ اس روز میں وہ [illegible] دیکھ رہا تھا کہ ممی نے میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کے بعد پھر نہ تو گھر میں وہ میگزین دکھائی دیا اور نہ ہی ڈیڈی کبھی اور میگزین گھر لے کر آئے لیکن یہاں ایسی تصویریں بڑے شوق سے لگائی گئی تھیں۔

اس کمرے میں آنے کے بعد تھائی وانگ نے ہمارا تعارف بھی کرا دیا۔ وہ خوب صورت عورت جانکی دیوی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس علاقے میں اس کا ایک کلینک بھی تھا۔

"میرا خیال ہے پہلے تم لوگوں کو اپنے حلیے درست کر لینے چاہئیں۔" جانکی دیوی نے کہا اور الماری میں سے ایک لنگی اور کرتہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ باتھ روم ہے۔ تم نہا کر کپڑے بدل لو۔ ہم دوسرے کمرے میں تمہارا انتظار کریں گے۔"

وہ دونوں اس کمرے سے چلی گئیں۔ میں نے کندھے پر لٹکا ہوا بیگ اتار کر بیڈ پر ڈال دیا اور دروازہ بند کر کے باتھ روم میں گھس گیا۔

آدھے گھنٹے بعد باتھ روم سے نکلا تو اپنے آپ کو بالکل ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔ لنگی اور کرتہ بھی مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بالکل ہلکا پھلکا۔ گھر میں ڈیڈی کو بھی اکثر یہ لباس پہنے دیکھا کرتا تھا۔ اس میں آدمی اپنے آپ کو بہت ایزی محسوس کرتا ہے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ جانکی دیوی سے تھائی وانگ کا کیا تعلق تھا لیکن ہم دونوں موت کے منہ سے نکل کر بھاگے تھے اور ہمیں کسی ایسی جگہ کی ضرورت تھی۔ جہاں کم سے کم دو تین دن تک سکون سے رہ سکیں اور آئندہ کے بارے سوچ سکیں۔ تھائی وانگ مجھے لے کر یہاں آئی تھی جس کا مطلب تھا کہ اسے جانکی دیوی پر مکمل اعتماد ہوگا۔

میں کرسی پر بیٹھا صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہم واقعی موت کے جبڑوں سے نکلے تھے۔ اگر ہمیں بنگلے سے نکلنے میں چند لمحوں کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت وہاں ہماری لاشیں پڑی ہوتیں۔ ہم تو ان کے ہاتھ نہیں آئے تھے لیکن انہوں نے تھائی وانگ کے بنگلے کو آگ لگا دی تھی۔ اس بنگلے میں لاکھوں کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ہر چیز قیمتی تھی۔ اس نے یہ گھر بنانے میں بڑی محنت کی تھی۔ گھر۔ وہ آشیانہ جس کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ماں کی آغوش جیسا آرام اور سکھ ملتا ہے لیکن اب وہاں کچھ نہیں رہا تھا۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا اور مجھے اس کا بہت دکھ ہوا تھا اور میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ اس بربادی کا انتقام ضرور لوں گا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے ماسٹر پھو کی موت کا منظر ابھر آیا۔ اسے کس بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان کے بنگلے کی وجہ سے مجھے اور تھائی وانگ کو ہوٹل سے بھاگنے کا موقع مل گیا تھا لیکن انہوں نے دوسرے ہی دن ہوٹل میں رہ جانے والی تھائی وانگ کی کار سے ہمارا پتا چلا لیا تھا۔

تھائی وانگ آج صبح سے گھر سے باہر نہیں گئی تھی۔ اس کے ہاں نہ تو اخبار آتا تھا اور نہ ہی دن بھر کسی سے رابطہ ہوا تھا۔ اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ شہر کی صورت حال کیا تھی۔ ویسے یہ بات تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ماسٹر پھو کے قتل پر مہاراج وانگ ونگ یائے خاموش نہیں بیٹھا رہا ہوگا۔ ماسٹر پھو اس کا بعض خاص آدمی تھا۔ میں یہ سب کچھ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ کیا ہوا تھا۔

یکایک مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا۔ دوپہر کو بھی میں نے کھانا بڑی بے دلی سے کھایا تھا اور اس وقت ہم شام کی چائے پی رہے تھے جب وہ فون کال آئی تھی اور اس وقت سے اب تک بھاگ دوڑ ہو رہی تھی۔ زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پیٹ کا خیال کسے آتا لیکن اب جائے پناہ ملی تھی تو بھوک بھی احساس دلانے لگی تھی۔

میں نے کرسی سے اٹھ کر باہر جانے کے لیے جیسے ہی دروازہ کھولا' ٹھٹک کر رک گیا۔ بوڑھی بندو ساتھ والے کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔

میرے دل میں انجانا سا خوف سر ابھارنے لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کمرے میں جانکی دیوی اور تھائی وانگ موجود تھیں اور بندو چوری چھپے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ بندو کی اس حرکت نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور میں فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ بوڑھی ہندو عورت قابل اعتماد نہیں تھی اور ہمارے لیے خطرے کا باعث بن سکتی تھی اور تھائی وانگ کو اس سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

دو تین منٹ بعد میں نے دوبارہ دروازہ کھولا۔ اس مرتبہ جان بوجھ کر آواز پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور جب میں باہر نکلا تو بندو سیڑھی کی طرف جا رہی تھی۔ میں نے ساتھ والے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔

"آؤ۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن پھر تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے پہلے کھانا کھا لیں پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

ہم لوگ نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ٹیبل زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس پر چنا ہوا کھانا دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کھانا بازار سے منگوایا گیا تھا اور اس میں گوشت بھی تھا۔ ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ جینز کی پینٹ اور سُرمئی رنگ کی ٹی شرٹ جس پر ہالی ووڈ کے فلم اسٹار وین ڈیم کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ اس کی داہنی

کلائی میں سیاہ چمڑے کا تقریباً تین انچ چوڑا بینڈ تھا جس پر ڈرائنگ پنوں جیسی اسٹیل کی کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ اپنے اس حلیئے سے وہ کوئی سڑک چھاپ غنڈا ہی لگتا تھا۔ تھائی وانگ کو تو شاید وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔ اس لیے اس پر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ البتہ مجھے وہ بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

"موٹر بائیک میں نے لم فینی باکسنگ اسٹیڈیم کے پارکنگ ایریا میں چھوڑ دی ہے دیدی۔" بالآخر وہ جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "پولیس خود ہی اس کے مالک کا سراغ لگا لے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ ضرورت ہوگی تو تمہیں بلالوں گی۔" جانکی نے کہا اور وہ میری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

کھانے کے بعد ہم اوپر آگئے۔ میں تو اسی کمرے میں آگیا اور وہ دونوں ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں۔ میں بستر پر لیٹا اس نئی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ بوڑھی بندو کے رویے نے میرے دل میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کردیے تھے اور پھر غنڈوں جیسے حلئے والا وہ نوجوان۔ میرے ذہن میں الجھن بڑھتی جارہی تھی۔ پتا نہیں میں اپنے آپ کو یہاں غیر محفوظ کیوں سمجھ رہا تھا۔ میں تھائی وانگ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

میں جیسے جیسے سوچتا گیا میری الجھن بڑھتی گئی۔ دماغ میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں بیڈ سے اٹھ کر قالین پر دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور اس کے ساتھ ہی میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ بوڑھی بندو دوسرے کمرے کے دروازے سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اس کا رخ اس وقت بھی دوسری طرف تھا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر سوچا کہ آگے بڑھ کر اسے گرفت میں لے لوں۔ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر وہ بتا بھی دے گی کہ چھپ کر ان کی باتیں کیوں سن رہی ہے اور میرے خدشات کی تصدیق بھی ہوجائے گی۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہناتا سیڑھیوں پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور آہستگی سے دروازہ بند کردیا اور کھڑکی کی طرف آگیا۔ کھڑکی کے سامنے نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پردے کا کنارہ سرکا کر باہر جھانکا۔ غنڈوں جیسے حلئے والا وہی نوجوان سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا اشارہ کررہا تھا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی بندو میرے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف چلی گئی اور پھر وہ دونوں سیڑھیاں اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ اس بدہیت نوجوان اور بوڑھی بندو میں کیا رشتہ تھا لیکن مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں ہمارے خلاف کوئی سازش کررہے تھے۔ میرے حوالے سے دنوں سے ہنگامے ہورہے تھے۔ ہوسکتا ہے کبھی بندو کی موجودگی میں جانکی دیوی کو میرے بارے میں جب ہم یہاں آئے تھے تو بندو سمجھ گئی ہو کہ میں نے وہ موٹر سائیکل بھی اسی نوجوان کے ہاتھ کہیں یہ بات تو اس غنڈے نے میرے سامنے ہی بتائی بائیک لم فینی اسٹیڈیم کے پارکنگ ایریا میں چھوڑ آیا تھا۔

میرے دل میں خدشات بڑھتے جارہے تھے کہ ہمیں یہاں رات گزارنا مشکل ہوجائے گا۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے لیکن تھائی وانگ سے بات کرنا ضروری تھا۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ بج رہے تھے۔ مزید انتظار کرنا اب میرے لیے ممکن اٹھ کر باہر آگیا۔ ساتھ والے کمرے کے دروازے کی ہوئے میں نے بالکونی کی ریلنگ سے نیچے جھانک کر بندو اس وقت مکان کے دروازے سے باہر جارہی تھی کی سفید ساری کا پلو ہی دیکھ سکا تھا۔ میں نے مڑ کر دروازے پر بہت ہلکی سی دستک دی۔ چند سیکنڈ کے بعد کھل گیا۔ وہ تھائی وانگ تھی۔ اس نے جانکی دیوی کا خوابی کا لباس پہن رکھا تھا جو کھلے پائنچے والے پاجامے ڈھالی بشرٹ پر مشتمل تھا۔ جانکی دیوی بیڈ پر نیم دراز تھی اس کی ٹانگوں پر سے اس طرح ہٹی ہوئی تھی کہ میں اس کی طرف نظریں اٹھانے کی ہمت نہ کرسکا لیکن جانکی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"اوہو۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم سوگئے ہو۔" تھائی میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نیند نہیں آرہی۔" میں نے جواب دیا۔ اس کے دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ باتیں کرتے ہوئے روتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہوئی تھیں۔

"شاید اکیلے بیٹھے بور ہورہے ہو۔ آجاؤ۔ یہیں ایسی باتیں نہیں کررہے۔" یہ الفاظ جانکی دیوی نے اب سیدھی ہوکر بیٹھ گئی تھی۔

میں کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھائی جانکی کے ساتھ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی درست نکلا۔ وہ دونوں اسی موضوع پر باتیں کررہی

"میں سمجھتی ہوں تم نے اسے سہارا دے کر ہے۔" جانکی دیوی نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کا اشارہ میری طرف تھا "میں جانتی ہوں تم نے وہ محنت سے بنایا تھا جو جل کر راکھ ہوگیا لیکن میں

جانتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب اسے پتا چلے گا کہ تمہارا اس لڑکے کی وجہ سے برباد ہوا ہے تو وہ تمہارا نقصان پورا کرے گا۔"

"مجھے اپنے نقصان کی پروا نہیں۔" تھائی وانگ نے کہا "جب میں اسے اپنے گھر لے کر آئی تھی تو مجھے اسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے پناہ دے کر میں نے دنیا کے سفاک ترین انسانوں سے دشمنی مول لے لی ہے۔ میں جانتی تھی کہ وہ ایک نہ ایک دن مجھے بھی ڈھونڈ نکالیں گے لیکن میرے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔"

"مجھے تم دونوں سے ہمدردی ہے۔" جانکی دیوی نے کہا "بہت اچھا کیا کہ تم یہاں آگئیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا زیادہ دن یہاں رہنا بھی ممکن نہیں ہے۔ آج کی رات تو گزار لو۔ کل شام کے بعد میں تم لوگوں کو ناتھابوری والے مکان میں بھیج دوں گی۔ وہاں تم لوگ کسی خوف و خدشے کے بغیر چند روز آرام سے رہ سکو گے۔ اچھا۔ اب میں چلتی ہوں۔ تم لوگ بھی سوجاؤ۔ اب صبح ملاقات ہوگی۔"

جانکی دیوی اٹھ کر چلی گئی۔ ہم دونوں بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آگئے اور بالکونی کی ریلنگ کے قریب کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ نچلے آنگن میں پہنچ کر اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا اور ایک کمرے میں چلی گئی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد میں نے غنڈوں جیسے حلئے والے اس نوجوان کو بھی دیکھا تھا جو ایک کمرے سے نکل کر ہماری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"یہ بندو کا نواسہ ہے۔" تھائی وانگ نے بتایا "بندو کی بیٹی اندرا بہت بدقسمت واقع ہوئی تھی۔ اس کا شرابی شوہر اسے بہت مارتا تھا۔ وہ جُوا بھی بہت کھیلتا تھا۔ راجو کی پیدائش کے بعد ایک روز وہ اپنی بیوی کو بھی جُوئے میں ہار گیا۔ راجو اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ پانچ چھ مہینے کا۔ اس کی ماں نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ اس کے باپ کو پولیس نے پکڑلیا لیکن وہ جیل سے بھاگنے کی کوشش میں پولیس کی گولی کا نشانہ بن کر ختم ہوگیا۔ راجو کو اس کی نانی بندو نے پالا ہے لیکن وہ اچھا لڑکا نہیں ہے' آوارہ لوگوں کے ساتھ پھرتا ہے۔"

"اور بندو کون ہے؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"جانکی کی ملازمہ۔" تھائی وانگ نے جواب دیا "اس نے جانکی کو گود میں کھلایا ہے۔ جانکی' راجو کو پسند نہیں کرتی مگر بندو کی وجہ سے اسے رکھا ہوا ہے۔"

"کیا تمہارے خیال میں یہ لوگ قابل اعتماد ہیں۔ جانکی کو تم کب سے جانتی ہو؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"کئی سال سے۔" تھائی وانگ نے جواب دیا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "یہاں کھڑے ہوکر ایسی باتیں کرنا ٹھیک نہیں۔ آؤ.... اندر آؤ۔" میں اس کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ دروازہ میں نے جان بوجھ کر کھلا رہنے دیا تھا "تمہیں ان کے بارے میں کیا شبہ ہے۔ جانکی میری قابل اعتماد دوست ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"لیکن بندو اور اس کا نواسہ راجو ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کررہے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا اور پھر اسے بوڑھی بندو کے بارے میں بتانے لگا کہ وہ کس طرح چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اسے راجو کے بارے میں بھی خدشات سے آگاہ کردیا۔

"وجدان...." وہ اچانک ہی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی آواز ایک دم بھرا گئی تھی۔ میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے اپنے سے الگ کیا "ہم کہاں جائیں" وہ گلوگرفتہ سی آواز میں بولی "جب ہم وہاں سے بھاگے تھے تو مجھے یہی ایک پناہ گاہ نظر آئی تھی۔ اس لیے میں یہاں آگئی لیکن تم نے جو کچھ بتایا ہے' وہ بھی غلط نہیں ہوسکتا۔ جانکی دیوی کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتی لیکن راجو.... اس پر واقعی بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم جس حالت میں یہاں آئے تھے وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہم کسی افتاد میں مبتلا ہیں۔ ہماری باتیں سن کر بندو نے اسے بتادیا ہوگا کہ تم کون ہو۔ راجو کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ نہ اپنی نانی کے کنٹرول میں ہے اور نہ جانکی دیوی کے۔ ہوسکتا ہے.... ہوسکتا ہے وہ اس وقت بھی کسی جوڑ توڑ میں مصروف ہو۔ اس کا باربار باہر آنا جانا مجھے بھی شبہات میں مبتلا کررہا ہے۔ اس میں ایسی بے چینی اور ایسا اضطراب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ بہرحال' ہمیں آج رات تو یہاں گزارنی ہی ہے۔ میں صبح ہی جانکی سے بات کروں گی کہ ہمیں کسی طرح ناتھابوری والے مکان میں بھیج دے اور ان دونوں کو پتا نہ چلنے دے کہ ہم کہاں گئے ہیں۔"

"کل صبح کیوں؟" میں نے کہا "آج رات ہی کیوں نہیں۔ ہمیں رات ہی میں کسی وقت یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ راجو اور بندو کی پراسرار سرگرمیوں سے مجھے شبہ ہے کہ آج رات ہی کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔"

"فکر مت کرو۔" وہ بولی "اتنی جلدی کچھ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی یہاں آیا تو...." اس نے جھک کر بستر پر پڑا ہوا تکیہ اٹھادیا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی "مم.... میرا پستول کہاں گیا؟ میں جب نہانے گئی تھی تو یہیں رکھا ہوا تھا اور جب ہم کھانا کھانے کے لیے نیچے گئے تھے تو پستول میں نے یہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس تکیے کے نیچے۔"

"اس کا مطلب ہے میرے خدشات بے بنیاد نہیں ہیں۔" میں نے کہا "ہوسکتا ہے پستول بندو یا راجو نے اس وقت غائب کیا ہو جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" تھائی وانگ نے کہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے "یہاں رہنا ہمارے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ ہمیں رات ہی کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"میرے ساتھ آؤ۔ دوسرے کمرے میں۔" میں نے اسے اشارہ کیا۔

کمرے سے نکل کر میں نے بالکونی سے نیچے جھانکا۔ بالکونی کے نیچے کسی جگہ زیرو کا بلب جل رہا تھا۔ صحن میں بہت مدھم روشنی تھی۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھائی وانگ کا بیگ اٹھایا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہاں آنے کے بعد وہ بیگ میں نے اس ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور اس کے بعد اس کی طرف دیکھا تک نہیں تھا لیکن اب جو بیگ اٹھایا تو وہ مجھے بہت ہلکا لگا۔ میں نے زپ کھولی تو میرے خدشے کی تصدیق ہوگئی۔ اپنے بنگلے سے فرار ہونے سے پہلے تھائی وانگ نے میرے سامنے اس بیگ میں کرنسی نوٹوں کے کئی بنڈل رکھے تھے اور اب وہ سارے بنڈل غائب تھے۔ تھائی وانگ کے ذاتی استعمال کی چند چیزیں اور کچھ ریزگاری رہ گئی تھی۔ میں نے کھلا ہوا بیگ تھائی وانگ کے سامنے کردیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی پھیل گئی۔

"اب ایک منٹ بھی یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔" میں نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر پہلے ہم نے راجو کو باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ واپس آئے تو اکیلا نہ ہو اس لیے ہمیں اس کی واپسی سے پہلے ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"ایک منٹ۔ مجھے سوچنے دو۔" تھائی وانگ بولی۔

"سوچنے کا وقت نہیں ہے تھائی وانگ۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "اگر تم جانکی دیوی سے کوئی شکایت کرنا چاہتی ہو تو بیکار ہے۔ تم پہلے ہی بتا چکی ہو کہ راجو کسی کے کنٹرول میں نہیں ہے۔ میں تو اس کا حلیہ دیکھ کر ہی چونک گیا تھا اور مجھے اسی وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ اب دیر مت کرو۔ وہ کسی بھی وقت واپس آسکتا ہے۔"

اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا۔ تھائی وانگ نے کمرے سے نکل کر بالکونی سے نیچے جھانکا وہاں خاموشی تھی۔ وہ مجھے اشارہ کرتے ہوئے بالکونی میں ریلنگ کے ساتھ ساتھ ایک طرف چلنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے دبے قدموں چلتا رہا۔ اس طرف بالکونی کے آخر میں چھت پر جانے کے لیے تنگ سی سیڑھیاں تھیں۔ ہم دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔

سیڑھیوں پر تاریکی تھی اور ان کے اختتام پر دروازہ تھا جو بند تھا۔ میں دروازے کو ٹٹولنے لگا۔ دوپٹ کے اس دروازے پر اوپر زنجیر لگی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے زنجیر ہٹائی اور پھر اچانک ہی زنجیر میری انگلیوں سے پھسل کر دروازے پر لگی۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز ابھری لیکن یہ آواز بھی سناٹے میں بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔

میں ایک لمحے کو سانس روکے کھڑا رہا پھر آہستگی سے دروازہ کھول دیا اور ہم دونوں چھت پر آگئے۔ دائیں بائیں چار چار چھوٹے مکان تھے۔ گلی کے رخ پر تقریباً تین فٹ اونچی منڈیر تھی اور پچھلی طرف ایک سنگل اسٹوری مکان تھا۔ یعنی اس مکان سے ایک منزل نیچے۔ لیکن بارہ چودہ فٹ نیچے اترنا آسان نہیں تھا۔ میں صورت حال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سیڑھیوں والے دروازے سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ بندو تھی اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"رک جاؤ۔ اگر تم لوگوں نے چھت سے کودنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گی۔" بندو غرائی "تم لوگ سمجھتے تھے کہ آسانی سے بھاگ جاؤ گے۔ میں تو اپنے کمرے میں بیٹھی بھی تم لوگوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔"

"بندو۔" تھائی وانگ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ہم بھاگ کر کہاں جائیں گے۔ کمرے میں گھٹن سی ہو رہی تھی۔ ہم تو ہوا کھانے کے لیے اوپر آگئے تھے اور تم نے ہم پر یہ پستول کیوں تان رکھا ہے؟"

"اب تم دونوں اس وقت تک پستول کی زد پر رہو گے جب تک راجو نہیں آجاتا۔" بندو نے کہا "تم دونوں نیچے چلو۔ کسی کے منہ سے آواز نکلی تو بلا دریغ گولی مار دوں گی۔" وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔

پہلے میں دروازے سے گزر کر سیڑھیوں پر آگیا اور پھر تھائی وانگ آگے بڑھی لیکن اس نے اچانک ہی پلٹ کر بڑھیا پر حملہ کردیا۔ یہ حملہ بندو کے لیے غیر متوقع تھا۔ اس کی انگلی سے پستول کا ٹریگر دب گیا۔ گولی سیڑھیوں کی چھت پر لگی تھی۔ تھائی وانگ نے اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا اور کلائی مروڑ کر پستول چھین کر چھت پر پھینک دیا۔ میں نے جھپٹ کر پستول اٹھالیا۔ تھائی وانگ بندو سے لپٹ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے بندو کا منہ دبا رکھا تھا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے اور پھر وہ دونوں نیچے گر کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئیں۔

میں پستول لیے سیڑھیوں پر کھڑا رہا۔ میرا خیال تھا کہ فائر کی آواز سے جانکی جاگ گئی ہوگی لیکن شاید وہ گہری نیند میں تھی اور اس کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ تھائی وانگ بندو کے سینے پر سوار تھی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا نرخرہ دبا رکھا تھا۔ بندو بری طرح مچل رہی تھی لیکن تھائی وانگ نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہوگئی۔

اور پھر اسی لمحے گلی میں ایک گاڑی رکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں دوڑ کر چھت کی گلی والی منڈیر کی طرف پہنچ گیا اور جھانک کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ راجو ایک اور غنڈے کے ساتھ کار سے اتر رہا تھا۔ میں دوڑ کر تھائی وانگ کے قریب پہنچ گیا۔

"راجو آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور بدمعاش بھی ہے۔" میں نے کہا... "جلدی کرو۔ اس مکان کی چھت پر چھلانگ لگادو۔"

لیکن بارہ چودہ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانے کا مطلب تھا کہ اپنی ہی کوئی ہڈی تڑوالی جاتی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے پستول تھائی وانگ کو تھما دیا۔ پہلے سیڑھیوں کا دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا لگایا اور پھر بندو کی ساری کھولنے لگا۔ بندو بے ہوش تھی یا مر چکی تھی۔ ساری کھینچنے سے وہ بھی فرش پر لوٹنی گئی۔

ساری کھول کر اس کا ایک سرا میں نے منڈیر سے باندھ دیا اور دوسرا سرا پچھلے مکان کی طرف لٹکا دیا۔ تھائی وانگ منڈیر پر چڑھ کر دوسری طرف لٹک گئی اور ساڑی کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔

اسی وقت سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے دھڑ سے کمروں کے دروازے کھولے گئے ہوں اور پھر راجو کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ تھائی زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا اور پھر اوپر والی سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں منڈیر پر چڑھ کر ساری سے لٹک گیا اور بڑی تیزی سے نیچے پھسلنے لگا۔ میں نے نیچے والی چھت پر پیر رکھا ہی تھا کہ اوپر سیڑھیوں کا دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ لگتا تھا جیسے دروازہ توڑ دیا جائے گا۔

اس طرف ساتھ ساتھ دو تین مکان سنگل اسٹوری میں تھے۔ ہم ایک مکان سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے مکان کی چھت پر آگئے اور پھر ہمیں نیچے اترنے کا راستہ بھی مل گیا۔ ہم گلیوں میں دوڑتے ہوئے انڈین ٹمپل کی طرف نکل آئے۔

سڑک پر سناٹا تھا۔ مندر بہت بڑا تھا۔ آگے کی طرف بہت کشادہ برآمدہ تھا جس کی چھت کو بڑے بڑے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ شام کے وقت تو یہاں بہت ساری بتیاں روشن ہوتی ہوں گی لیکن اس وقت صرف ایک بتی جل رہی تھی جس کی روشنی سامنے سڑک پر پڑ رہی تھی۔ مندر سے آگے کچھ دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر زیادہ تر وہ چیزیں فروخت ہوتی تھیں جو مندر میں چڑھاوے کے طور پر چڑھائی جاتی تھیں۔

ہم جانکی دیوی کے گھر سے تو بھاگ آئے تھے لیکن اب ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائیں۔ راجو اور اس کا ساتھی ہمارے تعاقب میں تھے اور مجھے یقین تھا کہ ہم بہت جلد پکڑے جائیں گے۔ دکانوں کے ساتھ دو ٹیلی فون بوتھ دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ماسٹر ہو کے جمنازیم فون کرکے اطلاع دو۔ ماسٹر ہوچن وہاں موجود ہوگا۔ وہ ہماری مدد کو آسکتا ہے۔" میں نے تھائی وانگ سے کہا۔

تھائی وانگ فوراً ہی ایک فون بوتھ کی طرف لپکی۔ اس نے پستول میرے حوالے کردیا اور بیگ لے کر بوتھ میں داخل ہوگئی۔ اس نے بیگ میں سے کچھ سکے نکالے اور پھر فون نمبر ملانے لگی۔ میں بوتھ کے باہر کھڑا محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

تقریباً دو منٹ بعد تھائی وانگ ٹیلی فون بوتھ سے باہر آگئی۔

"ماسٹر ہوچن نے کال ریسیو کی تھی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے اسے یہاں کا پتا سمجھا دیا ہے۔ وہ اپنے آدمی لے کر تھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گا۔"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک کار تیز رفتاری سے اس سڑک پر مڑی۔ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز فضا میں پھیل گئی۔ ڈرائیور شاید موڑتے ہوئے کار کی تیز رفتاری پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ کار موڑ پر ایک دکان کے بند شٹر سے ٹکرا گئی۔

"یہ وہی ہیں۔" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بھاگو۔ اس طرف.... مندر کے برآمدے میں۔"

ہم دوڑتے ہوئے مندر کے برآمدے میں آگئے۔ یہاں بڑے بڑے ستون ہمیں وقتی طور پر پناہ دے سکتے تھے۔ ہم ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔

راجو اور اس کا ساتھی کار سے اتر کر گلی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ راجو کا ساتھی تو مندر کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا اور راجو برآمدے میں آگیا۔ وہ ایک ایک ستون کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ بہت محتاط تھا وہ۔

ہم جس گول ستون کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، وہ اتنے محیط میں تھا کہ اگر میں اور تھائی وانگ مل کر بھی کوشش کرتے تو ہماری بانہوں کی لپیٹ میں نہیں آسکتا تھا لیکن اس کے پیچھے ایک ہی جگہ کھڑے رہنا حماقت ہی ہوتی۔ راجو کی پوزیشن دیکھتے ہوئے ہم بھی پلر کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ اچانک چکنے فرش پر میرا پیر پھسل گیا اور میں دھڑام سے پشت کے بل نیچے گرا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ راجو ایک دم اچھل کر میرے سامنے آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ خنجر لہراتا ہوا میری طرف لپکا۔ مجھے موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی تھی۔ اس نے خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور وار کرنے کے لیے نیچے جھکا۔ میں نے اس کے وار سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرلیا تھا لیکن اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔

تھائی وانگ کی چلائی ہوئی گولی راجو کے سینے میں لگی۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔ اس کا ہاتھ سینے پر تھا جہاں گولی لگی تھی۔ وہ چند سیکنڈ کٹے ہوئے درخت کی طرح

لہراتا رہا اور پھر تیورا کر نیچے گرا۔ میں اس دوران میں اپنی جگہ پر بڑا دہشت زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس کے خون کے کچھ چھینٹے میرے لباس اور چہرے پر بھی پڑے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور کرتے کی آستین سے چہرے کا خون پونچھنے لگا۔ اس وقت مجھے بڑی کراہت سی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ غنیمت تھا کہ ٹیلی فون بوتھ سے نکلتے ہی تھائی وانگ نے میرے ہاتھ سے پستول لے لیا تھا۔ اگر وہ پستول میرے پاس ہوتا تو شاید میں اسے سلیقے سے استعمال نہ کرپاتا کیونکہ یہ ہتھیار میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھ میں لیا تھا۔

تھائی وانگ میرا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف دوڑی۔ ہم سیڑھیاں اتر کر سڑک پر دوڑنے لگے اور اس کار کے پیچھے جا کر چھپ گئے جو دکان کے شٹر سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔ راجو کا ساتھی بھی فائر کی آواز سن کر پہلے مندر کے برآمدے میں گھسا تھا پھر اس نے ہمارے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔

ہم کار کے پیچھے کھڑے تھے اور وہ بدمعاش ہمارے سامنے کار کے دوسری طرف۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ یہ وہی بدمعاش تھا جسے ہم نے اندرا رنجیت ہوٹل کے گیٹ کے سامنے نگرانی کرتے دیکھا تھا۔

"تم لوگ بچ نہیں سکتے۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔" وہ خنجر والا ہاتھ لہراتے ہوئے غرایا۔

"بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گی۔"

تھائی وانگ نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھالیا۔

لیکن لگتا تھا پستول کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا' کار کی پچھلی سیٹ پر ایک ہاکی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پھرتی سے جھک کر وہ ہاکی اٹھالی۔ تھائی وانگ کے ہاتھ سے ایک خون ہوچکا تھا اور میں سمجھ گیا کہ اب وہ گولی چلانے میں ہچکچا رہی تھی لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گی۔

میں ہاکی پکڑ کر کار کے اوپر سے گھوم کر سامنے آگیا۔ اس بدمعاش کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے ہاکی سے اس پر حملہ کردیا لیکن وہ نہ صرف اس حملے سے بچ گیا بلکہ اس نے بھی مجھ پر جوابی وار کیا تھا۔ خنجر نے میرے بازو سے کرتہ چیر دیا۔ میں محتاط ہوگیا۔ وہ تربیت یافتہ اسٹریٹ فائٹر تھا اور میں اناڑی بلکہ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ میں اس طرح کسی کے مقابلے پر آیا تھا اور یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔

میں نے پھر اس پر حملہ کیا۔ وہ اس مرتبہ بھی بچ گیا لیکن میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر دوسرا حملہ کیا۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ ہاکی اس کے بائیں کندھے کی ہڈی پر لگی۔ وہ بلبلا اٹھا لیکن میں نے اگلا وار کیا تو اس نے بڑی پھرتی سے ایک ہاتھ سے ہاکی پکڑلی اور دوسرے ہاتھ سے خنجر کا وار کردیا۔ میں بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ہاکی کو بھی زوردار جھٹکا دیا تھا۔ وہ میرے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل پیچھے گرا۔ میں اس سے پہلے ہی سنبھل گیا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر پے درپے ہاکی سے وار کرنے لگا۔ وہ زمین پر لوٹ لوٹ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہا تھا۔

"مارو... اور مارو..." تھائی وانگ چلاّ رہی تھی "مار دو اسے۔ ختم کردو۔" وہ ہاتھ میں پستول لیے کبھی ایک طرف ہوجاتی اور کبھی دوسری طرف۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں اس قسم کی لڑائی کا ماہر بن گیا تو اور میں اس بدمعاش سے زیادہ بہادر تھا۔ مجھے تو لڑنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا تھا لیکن جب موت تعاقب میں ہو تو بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میرے اندر بھی اس وقت حوصلہ پیدا ہوگیا تھا اور وہ جھجک دور ہوگئی تھی جو شریف لوگوں کو لڑائی جھگڑوں سے دور رکھتی تھی۔

پہلے فائر اور پھر شور کی آوازیں سن کر مندر کے دو تین پجاری ذیلی دروازہ کھول کر باہر آگئے تھے۔ اس گلی میں دکانوں کے اوپر رہائشی مکان تھے۔ ان لوگوں نے بھی آوازیں سنی ہوں گی۔ لوگ نیند سے بیدار ہوگئے ہوں گے لیکن باہر کوئی نہیں آیا تھا۔ البتہ بعض لوگ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔

اسی دوران میں کھلی چھت والی ایک جیپ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ وہاں آکر رکی۔ ماسٹر ہوچن اور اس کے ساتھ تین اور آدمی چھلانگیں لگا کر جیپ سے اترے۔ صورت حال دیکھ کر ماسٹر ہوچن نے اپنے آدمیوں کو دور ہی روک لیا۔

"شاباش۔" ماسٹر ہوچن چیخا "مارو.... اور مارو.... سر پر۔ زور سے۔" ماسٹر ہوچن چیخا۔

اور پھر وہ سب چیخ چیخ کر میرا حوصلہ بڑھانے لگے۔ میں نے رِنگ میں مقابلوں کے دوران میں کھلاڑیوں کے حمایتیوں کو اس طرح چیختے ہوئے دیکھا تھا۔ رِنگ کے باہر بیٹھے ہوئے تماشائی اس طرح چیخ چیخ کر اپنے پسندیدہ کھلاڑی کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور وہ جوش و خروش سے اپنے حریف پر حملے کرتا تھا۔

میں جوش کی حد پھلانگ کر جنون کی حدود میں داخل ہوگیا تھا اور پھر جب ماسٹر ہوچن کے آدمیوں نے بڑی مشکل سے مجھے گرفت میں لے کر جیپ میں ڈالا تھا تو میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"چھوڑ دو مجھے۔ ماسٹر پھو کو مارنے والوں میں یہ بھی شامل تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ہوچن کے آدمی مجھے گرفت میں لیے ہوئے تھے اور پھر تھائی وانگ نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میں بتدریج پرسکون ہوتا گیا اور جب اپنے آپ کو سنبھال کر سیدھا ہوا تو جیپ تیز رفتاری سے ایک سنسان سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

○☆○

وہ میرے ہاتھوں ہونے والا پہلا قتل تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا تھا' اپنے دفاع میں کیا تھا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا تھا۔ دنیا کا کوئی بھی قانون اور کوئی بھی معاشرہ آپ کو ذاتی دفاع کا حق استعمال کرنے سے روک نہیں سکتا۔ یہ فطرت تو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے کہ جب کوئی دوسرا جانور حملہ آور ہوتا ہے تو حملے کی زد میں آنے والا جانور نہ صرف اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ حملہ آور کو نقصان بھی پہنچاتا ہے تاکہ اس کے شر سے محفوظ رہ سکے اور انسان تو پھر انسان ہے۔ اشرف المخلوقات۔ خدا نے اس مخلوق اشرف کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے اور اس نے اپنے آپ کو دوسروں کے شر سے محفوظ رکھنے اور انہیں نقصان پہنچانے کے لاکھوں ہتھکنڈے ایجاد کر رکھے ہیں۔ اگر کوئی بلا اشتعال اور بلا کسی معقول وجہ کے دوسرے پر حملہ کرے.... تو وہ جارح اور ظالم کہلاتا ہے اور دوسرا فریق مظلوم۔ جس کا ساتھ دوسرے لوگ بھی دیتے ہیں اور اس کے حق میں آواز اٹھاتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو مظلوم ہی سمجھتا تھا۔ میں نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن وہ لوگ میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ مجھے صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے تھے۔ میں مظلوم تھا اور اس لیے لوگ میرا ساتھ دینے پر تیار ہوجاتے تھے۔

چاچا پرتاب سنگھ نے مجھ پر ظلم ہوتے دیکھا تھا۔ مجھے ان لوگوں سے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دے دی۔ مہاراج وانگ ونگ یائے کو میری سچائی کا یقین آگیا۔ اس نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا اور میری تربیت کرنے لگا تاکہ میں اپنے دشمنوں سے خود نمٹ سکوں۔ اس کا ایک بہترین آدمی ماسٹر پھو میری حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا۔ تھائی وانگ نے مجھے اپنی پناہ میں لیا تھا۔ وہ ایک کمزور عورت تھی اور یہ جانتی تھی کہ اس کا انجام کیا ہوسکتا ہے لیکن اس نے ہاتھ نہیں کھینچا۔ اس کے بنگلے کو جلا کر راکھ کردیا گیا اور میری جان بچانے کے لیے اسے ایک انسان کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے۔ ایک طرف اس قدر خلوص اور چاہت تھی کہ کوئی میرے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رہا تھا اور دوسری طرف لالچ اور ہوس نے کسی کو اس قدر اندھا کردیا تھا کہ وہ گھر آئے ہوئے مہمانوں کو بھی دشمن کے حوالے کرنے کو تیار ہوگیا تھا۔

یہ بھی مقام شکر تھا کہ مجھے راجو اور اس کی نانی بندو پر شبہ ہوگیا تھا اور ہم بروقت وہاں سے نکل آئے تھے۔ اگر سوچنے میں کچھ وقت گزار دیا جاتا تو شاید میں یہ سب کچھ بتانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔

میرے ہاتھوں راجو کے ساتھی کی موت میرے لیے بھی حیرت انگیز تھی۔ وہ ایک تربیت یافتہ اسٹریٹ فائٹر تھا۔ میں نے اسے اندرا ہوٹل کے سامنے لڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ وہ میرے ہاتھوں کیسے مارا گیا تھا۔ کیا اس میں اس کی کوئی غلطی تھی یا میرے اندر اتنی طاقت آگئی تھی کہ میں اس پر حاوی ہوگیا تھا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ڈر اور خوف ہی انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ ہاتھوں پیروں کی طاقت سلب کرلیتا ہے اور مفلوج کرکے رکھ دیتا ہے۔ خوف زدہ آدمی چاہنے کے باوجود کچھ نہیں کرسکتا لیکن اگر کسی میں حوصلہ پیدا ہوجائے اور وہ خوف پر غالب آجائے تو بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا تھا۔ میں جسمانی طور پر کمزور نہیں تھا لیکن خوف نے مجھے بزدل بنا دیا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کا نام سنتے ہی تھر تھر کانپنے لگتا تھا لیکن اس بدمعاش کو موت کے گھاٹ اتار کر میں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس خوف سے چھٹکارا پانے اور میرے اندر حوصلہ پیدا کرنے میں تھائی وانگ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس غنڈے سے لڑائی کے دوران میں تھائی وانگ چیخ چیخ کر جس طرح میرا حوصلہ بڑھاتی رہی تھی' وہ مجھے اب بھی یاد ہے۔ بہرحال' اس واقعے سے میرے اندر جو حوصلہ پیدا ہوا تھا' میں اسے ناقابل شکست بنا دینا چاہتا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ زندہ رہنے کے لیے صرف جسمانی طاقت ہی نہیں' حوصلے اور عزم و ہمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے' بزدل آدمی نہیں جی سکتا۔

اس رات ماسٹر ہوچن مجھے جمنازیم میں لے آیا تھا۔ یہاں آتے ہی اس نے فون پر مہاراج کو صورت حال سے آگاہ کردیا اور اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ماسٹر ہوچن مجھے اور تھائی وانگ کو لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس بند وین میں ہمارے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ وین بنکاک کی حدود سے نکل کر نانتھابوری کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

شہر سے تقریباً بیس میل نکلنے کے بعد ماسٹر ہوچن نے وین ایک کچی سڑک پر موڑلی۔ اس سڑک پر پہلے تو دونوں طرف دھان کے کھیت تھے اور پھر جنگل کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جنگل بتدریج گنجان ہوتا جارہا تھا۔ تقریباً پانچ میل کا فاصلہ مزید طے کرنے کے بعد وین ایک کھلی جگہ پر رک گئی۔

میں وین سے اتر کر حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک بہت بڑا میدان تھا جس کے چاروں طرف گنجان جنگل تھا۔ میدان کے ایک طرف چند جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک جھونپڑے میں مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی جبکہ باقی جھونپڑے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وین رکنے کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک طرف سے غراتی ہوئی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس طرف جھاڑیوں میں کوئی آدمی چھپا ہوا تھا اور غراتی ہوئی آواز میں تھائی زبان میں کہہ رہا تھا۔

"تم سب ... میری رائفل کی زد پر ہو۔ اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

ماسٹر ہوچن نے اس طرف مڑ کر دیکھا اور وہ آدمی جھاڑیوں سے نکل کر دوڑتا ہوا قریب آگیا اور ماسٹر ہوچن کے سامنے جھک گیا۔

"اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے ماسٹر۔ یہ کون ہیں؟" اس شخص نے کہتے ہوئے تھائی وانگ اور میری طرف دیکھا۔

"مہمان ہیں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "ہانگ سو۔ کو جگاؤ۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رکوں گا۔"

اس شخص نے ایک بار پھر رکوع کیا اور ایک جھونپڑے کی طرف دوڑ گیا اور پھر چند منٹ میں ہی جھونپڑے میں سوئے ہوئے سب لوگ جاگ گئے۔ ہم ایک کشادہ جھونپڑے میں آگئے جس کے فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔

ماسٹر ہوچن' ہانگ سو کو میرے بارے میں بتا رہا تھا اور ہانگ سو۔ اس طرح .... بار بار گردن ہلا رہا تھا جیسے ساری باتیں اس کی سمجھ میں آرہی ہوں۔ وہ بار بار میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

ماسٹر ہوچن اپنے آدمیوں کو لے کر صبح ہونے سے پہلے پہلے واپس چلا گیا۔ ہانگ سو۔ ہم دونوں کو ایک چھوٹے جھونپڑے میں لے آیا۔ یہاں بھی چٹائی بچھی ہوئی تھی اس نے تھائی وانگ سے کچھ کہا اور باہر چلا گیا۔

"رات ختم ہونے والی ہے۔" تھائی وانگ نے چٹائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "سو جاؤ۔ باتیں صبح ہوں گی۔"

میں بھی اس سے ذرا ہٹ کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ تکیے کی جگہ پتھر تھے جن پر پیال یا اسی سے ملتی جلتی کسی پودے کی بہت باریک شاخیں لپٹی ہوئی تھیں۔ پوری رات بھاگ دوڑ میں گزری تھی۔ نیند کی شدت سے آنکھوں میں جلن سی ہو رہی تھی لیکن کھردری چٹائی پر دیر تک نیند نہیں آسکی اور جب آنکھ لگی تو پھر کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔

میں دوپہر تک سوتا رہا۔ تھائی وانگ مجھ سے پہلے جاگ گئی تھی لیکن وہ بھی جھونپڑے ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔

مجھے سب کچھ عجیب سا لگا۔ دس بارہ جھونپڑے تھے۔ ان کے سامنے کھلا میدان جہاں بیس بائیس آدمی مختلف قسم کی ایکسرسائز میں مصروف تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ بھی ایک ٹریننگ کیمپ تھا جہاں بھکشوؤں کو موئے تھائی کی تربیت دی جاتی تھی۔

ایک بھکشو مجھے دیکھتے ہی اس طرف آگیا۔ میں گنجے سر والے بھکشو کو آدمی ہی سمجھا تھا لیکن جب وہ قریب آیا تو انکشاف ہوا کہ وہ مرد نہیں عورت تھی۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر جھونپڑے میں جھانکتے ہوئے تھائی وانگ سے کچھ کہا۔ تھائی وانگ بھی باہر آگئی۔ ہم اس عورت کے ساتھ ایک اور جھونپڑے میں آگئے۔

کھانے میں ہمیں چاولوں کا وہی مسالے والا دلیا دیا گیا جو پہاڑیوں والے پگوڈا میں بھی کھا چکا تھا۔

وہ دن میری آزادی کا دن تھا۔ میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ جھونپڑوں کے پچھلی طرف تقریباً تیس گز کے فاصلے پر جنگل تھا۔ ایک نہر بھی بہہ رہی تھی جس کا پاٹ آٹھ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ نہر پر ایک جگہ درخت کا ایک تنا رکھا ہوا تھا جو پل کا کام دے رہا تھا۔

اُس دن میں آزادی سے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ یہ جگہ اگرچہ بہت محفوظ تھی لیکن میں نے جنگل میں دو مختلف جگہوں پر ایسے آدمیوں کو بھی دیکھا تھا جو آٹومیٹک رائفلیں اٹھائے ہوئے تھے۔

شام سے پہلے کھانا کھا کر کچھ بھکشو تو اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلے گئے اور کچھ میدان میں ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں تھائی وانگ کے ساتھ جھونپڑے کے سامنے بیٹھا ہوا تھا کہ ہانگ سو بھی آگیا اور ہمارے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ہانگ سو کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آبادی سے دور اس جگہ میں رہتے ہوئے بھی وہ بہت باخبر آدمی تھا۔ شہر کے حالات سے اسے پوری واقفیت تھی۔ اس کی باتوں سے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا کہ ماسٹر پھو کے قتل کے بعد اگلے روز مہاراج کے آدمیوں نے شہر میں ٹائیگر کے کئی ٹھکانوں پر حملے کیے تھے اور ان حملوں میں ٹائیگر کے کم از کم تین آدمی مارے گئے تھے۔ ٹائیگر اور مہاراج کے آدمیوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پورے شہر میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ عام شہری خوف زدہ تھے۔ دو تین دن کے اندر اندر شہر کے نائٹ کلب ویران ہو گئے تھے کیونکہ ہنگامے کی ابتدا کسی نہ کسی نائٹ کلب سے ہی ہوتی تھی۔ لوگوں نے نائٹ کلبوں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔ شہر کی انتظامیہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ پولیس کمشنر دونوں پارٹیوں میں راضی نامہ کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور مہاراج نے مطالبہ کیا تھا کہ ماسٹر پھو کے قاتلوں کو اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ ٹائیگر کو معاف کر دے گا لیکن ٹائیگر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔

"گزشتہ رات تمہارے ہاتھوں جو دو آدمی مارے گئے تم جانتے ہو وہ کون تھے؟" ہانگ سو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ ٹائیگر گروہ کے تھے۔ ان میں شانگ' ٹائیگر کا خاص آدمی تھا جسے تم نے مار ڈالا۔" اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا "کسی کو بھی تم سے اس کام کی توقع نہیں تھی۔ شانگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ٹائیگر کے گروہ کا سب سے خطرناک آدمی تھا۔ مہاراج تمہارے اس کارنامے سے بہت خوش ہیں۔ شانگ کی موت کے بعد ٹائیگر طوفان کھڑا کر دے گا۔ شہر میں تمہارے لیے خطرات ہو سکتے ہیں اسی لیے تمہیں یہاں بھیج دیا گیا ہے۔ تاکہ تمہاری حفاظت کے ساتھ ساتھ کم سے کم وقت میں تمہاری تربیت مکمل کی جائے اور تمہاری ان بانہوں میں فولاد بھر دیا جائے۔" اس نے میرے دونوں بازو پکڑ کر مسل دبائے "تم خوش قسمت ہو کہ مہاراج تم پر اس قدر مہربان ہیں۔ ہم جیسے لوگ تو ان کے قریب جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ گزشتہ رات دو آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے ماسٹر ہوچن نے سب کچھ بتا دیا تھا۔" ہانگ سو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "دو مرتبہ تمہاری ٹریننگ شروع کی گئی اور دونوں مرتبہ ادھوری رہ گئی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ یہ ہمارا محفوظ ترین کیمپ ہے۔ کسی مداخلت کا اندیشہ نہیں ہے۔ کل سے میں خود تمہاری ٹریننگ شروع کروں گا۔ مہاراج کا حکم ہے کہ تین مہینے کے اندر اندر تمہیں پوری طرح تیار کر دیا جائے۔"

"اور مجھے کیا کرنا ہوگا؟" تھائی وانگ نے پوچھا۔

"تمہیں بھی حفاظت کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے۔" ہانگ سو نے جواب دیا "اگر چاہو تو تم بھی ٹریننگ لے سکتی ہو۔ ویسے تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ تم چاہو تو کھانا پکانے میں نیشا اور چانگی کا ہاتھ بٹا سکتی ہو۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

ہانگ سو چلا گیا اور ہم دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتوں کے لیے ہماری زبانیں تو چل ہی رہی تھیں' ہمارے دونوں ہاتھ بھی مسلسل حرکت میں تھے۔ مچھروں کی اس قدر بہتات تھی کہ انہیں مارنے کے لیے دونوں ہاتھوں کو مسلسل حرکت میں رکھنا ضروری تھا۔

ان مچھروں کی وجہ سے رات کو نیند بھی بڑی مشکل سے آسکی تھی۔ صبح چھ بجے مجھے جگا دیا گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ مجھے پہلے کی طرح بھکشوؤں جیسا لباس نہیں پہنایا گیا بلکہ ایک نیکر دے دی گئی تھی اور پھر میری ٹریننگ کا نیا دور شروع ہو گیا۔

یہ ٹریننگ پہلے سے زیادہ سخت تھی اور لگتا تھا کہ ہانگ سو واقعی تین مہینوں میں مجھے تیار کر دے گا۔ جوگنگ' ایروبکس' یوگا' اسٹریچنگ' کلنگ' پنچنگ میری ابتدائی ٹریننگ کا حصہ تھے۔ یہ کوئی جمنازیم نہیں تھا۔ نہ ہی یہاں ایکسرسائز کے لیے جدید مشینیں تھیں لیکن ٹریننگ کا معیار کسی طرح بھی کسی جدید جمنازیم سے کم نہیں تھا۔ ایکسرسائز مشینوں کا کام جنگل کے درختوں سے لیا جا رہا تھا۔ پنچنگ بیگز بھی درختوں کی موٹی شاخوں سے لٹکے ہوئے تھے اور کلنگ کے لیے بھی درختوں ہی سے کام لیا جاتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ صبح سے شام تک کی مشقت مجھے بری طرح تھکا دیتی۔ رات کا کھانا کھاتے ہی میں اس طرح سو جاتا کہ صبح سے پہلے مجھے کوئی ہوش ہی نہ رہتا۔ موٹے موٹے مچھر رات بھر میرا خون چوستے رہتے مگر مجھے پتا نہ چلتا۔

تھائی وانگ بھی کبھی بھکشوؤں کے ساتھ یوگا' ایروبکس اور اسٹریچنگ وغیرہ میں شامل ہو جاتی لیکن اس میں کوئی باقاعدگی نہیں تھی۔ اس کا زیادہ وقت نیشا اور چانگی کے ساتھ کھانا وغیرہ تیار کرنے میں گزرتا تھا۔ کھانا وہی چاول کا دلیا جو ذائقے دار بنانے کے لیے مختلف طریقوں سے تیار کیا جاتا تھا۔ جس طرح کی ہم مشقت کر رہے تھے اس کے پیش نظر یہ کھانا بالکل ناکافی تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ جسم کی توانائیاں بحال رکھنے کے لیے چاولوں کا یہ دلیا تمام ضروریات پوری کر رہا تھا۔ اس دلیے کے علاوہ رات کو سونے سے پہلے مجھے ایک گلاس شربت بھی پینے کو دیا جاتا تھا۔ گاڑھا سا یہ شربت بہت خوش ذائقہ تھا اور میرا خیال ہے جڑی بوٹیوں سے تیار کیے ہوئے اس شربت میں کوئی ایسی بات تھی جو جسم کی توانائی بحال رکھے ہوئے تھے اور غالباً دلیے میں جو مسالے ڈالے جاتے تھے۔ ان میں بھی کوئی ایسی چیز شامل ضرور ہوتی تھی۔

ایک مہینے بعد میری ٹریننگ کا نیا مرحلہ شروع ہوا۔ ریت کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ ہانگ سو نے مجھے حکم دیا کہ میں اس ڈھیر پر اس وقت تک پنچنگ کرتا رہوں جب تک مجھے رکنے کو نہ کہا جائے۔ یہ بھی حکم تھا کہ میرا بازو کہنی تک ریت کے اندر جانا چاہیے۔ میں نے بڑے جوش و خروش سے ریت کے اس ڈھیر پر پہلا پنچ مارا۔ میرا بازو کہنی تک اندر دھنستا چلا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے میں نے اپنا ہاتھ دہکتی ہوئی بھٹی میں داخل کر دیا ہو۔ ریت بہت گرم تھی۔ میں نے ہانگ سو کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔ اس کا مطلب تھا میں اپنی مشق جاری رکھوں۔ انکار کی مجال نہیں تھی۔ میں نے دوسرے ہاتھ کا پنچ مارا۔

شروع کے دو چار پنچ مارنے سے مجھے انگلیوں کی پوروں سے لے کر کہنی تک جلن محسوس ہوئی' لگتا تھا جیسے میری کھال جھلس رہی ہو لیکن اس کے بعد تو گویا مجھ پر جنون سا طاری ہو گیا۔ میں ریت کے ڈھیر پر پنچ مارتا رہا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ریت کی تپش میرے پورے جسم میں سرایت کر رہی ہو۔

دس منٹ بعد ہانگ سو نے مجھے ہاتھ روک لینے کا حکم دیا اور پھر وہ میرے دونوں ہاتھ اور بازو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

مجھے اس رات نیند نہیں آسکی۔ دونوں ہاتھ اور بازو جیسے سلگ رہے تھے۔ شام کو جب تھائی وانگ نے میرے ہاتھ اور بازو دیکھے تھے تو دہل گئی تھی۔

"کیا یہ تمہارے ساتھ ظلم نہیں ہو رہا؟" وہ میرے ہاتھ اور بازو سہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ تو محنت ہے۔ اگر میں محنت نہیں کروں گا تو یہ فن کیسے سیکھوں گا۔ دشمن کا مقابلہ کیسے کروں گا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" تھائی وانگ نے کہا "کامیابی محنت کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔"

تپتی ہوئی ریت پر میری پریکٹس کئی روز تک جاری رہی اور اس کے بعد ایک اور مرحلہ آیا جو اس سے زیادہ خطرناک تھا۔ اب مجھے کانچ کے ٹکڑوں پر پنچنگ کرنی تھی۔ شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا ڈھیر گرم ریت سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہانگ سو میرے قریب کھڑا تھا۔ اس نے مجھے سمجھا دیا کہ کانچ کے ٹکڑوں کے اس ڈھیر پر پنچ کس طرح مارا جائے۔ غلط پنچ ہاتھ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

موئے تھائی میں زیادہ اہمیت پنچنگ اور ککنگ کو دی جاتی ہے۔ اس لیے ان دونوں چیزوں کی پریکٹس پر بھی زیادہ زور دیا جاتا۔...... اس پریکٹس سے یہ بات بھی میری سمجھ میں آرہی تھی کہ کس طرح کم سے کم طاقت استعمال کر کے حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔

موئے تھائی کے علاوہ مجھے مارشل آرٹس کے بعض دوسرے اسٹائلز کے بھی مخصوص داؤ پیچ سکھائے جا رہے تھے۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی بھکشو کے ساتھ میری اسپیرنگ بھی ہوتی جس میں مجھے بتایا جاتا کہ حریف پر کس طرح حملہ آور ہونا چاہیے اور حریف کے حملے سے کس طرح بچا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ انسانی جسم میں کتنے اور کون کون سے پریشر پوائنٹس ہوتے ہیں اور کس پریشر پوائنٹ پر کس طرح وار کر کے کیا نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ہانگ سو نے مجھے یہ بھی سمجھایا کہ اگر خالی ہاتھ کسی حریف سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہاں کسی بھی ایسی چیز کو ہتھیار یا طاقت کے سرچشمہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے جسے اٹھانا بھی ممکن نہ ہو۔ مثلاً آس پاس موجود کوئی درخت یا دیوار۔ مجھے اگر حریف پر فلائنگ کک لگانی ہے اور وہ مجھے اس کا موقع نہیں دے رہا تو ایسے موقع پر مجھے چاہیے کہ میں دوڑتا ہوا دیوار کی طرف جاؤں اور فلائنگ کک کے انداز میں اچھل کر کم از کم چار فٹ اوپر دونوں پیر دیوار سے لگا کر دیوار کو پوری قوت سے دھکیلوں اور پلٹ کر اپنے حریف پر فلائنگ کک لگاؤں۔ اس ٹیکنیک سے میرے حملہ آور ہونے کی قوت دگنی ہو جائے گی اور حریف کو ایسی کاری ضرب لگے گی کہ اس کے لیے اٹھنا ممکن نہیں رہے گا۔

اس روز میں دن بھر یہی پریکٹس کرتا رہا لیکن مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

اس رات میں گہری نیند سویا ہوا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے کندھے سے پکڑ کر ہلا رہا ہے۔ میں نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی لیکن دوسرے ہی لمحے پھر کسی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر ہلا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں لیکن تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا۔

البتہ ہلکی ہلکی کراہوں نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اپنے کندھے پر رکھا ہوا ہاتھ ٹٹول کر محسوس کر لیا کہ وہ تھائی وانگ تھی۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

"کیا ہوا تھائی۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

"میری حالت بگڑ رہی ہے۔" وہ کراہی "میں کئی روز سے برداشت کر رہی ہوں لیکن اب قوتِ برداشت جواب دے رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کہا اور پھر چونک گیا۔ تھائی وانگ نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے اور انگلیاں مسلز میں گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میری دن رات کی مشقت اور پریکٹس نے مسلز پتھر کی طرح کر دیے تھے۔ تھائی وانگ کی یہ کیفیت دیکھ کر اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ مہینہ پہلے اس پر ہنٹر برسائے تھے۔ اسے پندرہ سولہ دن بعد پٹائی کی ضرورت تھی اور مجھے حیرت تھی کہ ڈیڑھ مہینے تک وہ کیسے خاموش رہی تھی۔ شاید صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے وہ برداشت کرتی رہی تھی اور اب غالباً اس کی قوتِ برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔

"مطلب تم سمجھتے ہو۔" تھائی وانگ نے کہا "اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا پلیز....!"

"صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرو تھائی۔" میں نے سرگوشی کی "سب لوگ سو رہے ہیں۔ آواز سن کر اٹھ جائیں گے اور ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ رات گزار لو۔ کل کسی طرح صبح سب سے پہلے تمہارا کام کروں گا۔"

رات کا باقی حصہ کس طرح گزرا، میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ تھائی وانگ کی وجہ سے میں ایک لمحے کو بھی نہیں سو سکا تھا۔ صبح پانچ بجے سے پہلے ہی ہم اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگئے۔ اس وقت سناٹا تھا۔ سب لوگ اپنے جھونپڑوں میں سو رہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ اس کیمپ کی نگرانی کرنے والے کہیں موجود ہوں گے۔

تھائی وانگ کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا جھونپڑوں کے پیچھے نہر کی طرف آیا۔ نہر کے قریب پہنچ کر میں نے ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ توڑ لی۔ تھائی وانگ گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی اور میں اس کی پشت پر چھڑی سے ضربیں لگانے لگا۔ وہ پہلے تو کراہتی رہی پھر اس کے منہ سے سسکاریاں سی نکلنے لگیں۔

وہ زمین پر اوندھ گئی۔ میں نے چھڑی ایک طرف پھینک دی اور تھائی وانگ کے قریب جھک کر دیکھنے لگا۔ چھڑی کے کچھ نشانات اس کے کندھوں پر پڑے تھے جس سے کندھوں پر سرخ دھاریاں سی نمایاں تھیں۔

"تم ٹھیک ہو تھائی؟" میں نے ہولے سے پوچھا۔

"ہاں... میں ٹھیک ہوں۔" وہ کراہی۔ اس کی حالت شرابی جیسی تھی جو نشے میں دھت ہو رہا ہو "تم نے اگرچہ ہلکی ضربیں لگائی ہیں مگر... تمہارے بازوؤں میں بڑی طاقت آگئی ہے۔ تم جاؤ... میں آجاؤں گی۔"

میں نے واپس جانے کے بجائے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ تقریباً سارے ہی بھکشو صبح یا شام کو اس نہر میں نہایا کرتے تھے۔ آج میں سب سے پہلے آگیا تھا۔ نہر زیادہ گہری نہیں تھی۔ پچھلے چند روز کے دوران میں اس نہر میں مجھے تیرنا بھی سکھایا گیا تھا۔ میں نہاتے ہوئے بار بار تھائی وانگ کی طرف دیکھ رہا تھا وہ کنارے پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی۔

اسی دوران میں دو بھکشو نہر کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ دونوں مشتبہ نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی تھائی وانگ کو دیکھ رہے تھے۔ میں پانی سے نکل آیا۔ تھائی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اسے سہارا دے کر چلاتا ہوا جھونپڑوں کی طرف آگیا۔ تھائی وانگ چٹائی پر اوندھی لیٹ گئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کئی گھنٹے اسی طرح پڑی مار کا خمار اتارتی رہے گی۔

اسی روز ہانگ سو مجھے پکڑ کر الگ لے گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اسے ان دونوں بھکشوؤں نے کچھ بتایا ہوگا لیکن بات کچھ اور نکلی۔ ان دونوں بھکشوؤں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ کیمپ کی نگرانی کرنے والے محافظ نے مجھے تھائی وانگ کی پٹائی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہانگ سو کے پوچھنے پر مجھے ساری بات بتانی پڑی۔

"اوہ۔" ہانگ سو کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "اب تم فکر مت کرو۔ میرے پاس اس کا علاج ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی اور پھر اسے پٹائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اس روز مجھے ایک اور کرتب سکھایا جانے لگا۔ میں اسے کرتب ہی کہوں گا لیکن درحقیقت یہ بھی کک کا ایک اسٹائل تھا۔ اس کا تعلق تائی کونڈو سے تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ موئے تھائی میں کچھ دوسرے بین الاقوامی اسٹائلز کی بعض کارآمد ٹیکنیک بھی اپنائی جا رہی تھی اور کورین تائیکونڈو کی سمر سالٹ نام کی یہ ٹیکنیک بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اس ٹیکنیک میں دوڑتے ہوئے اچھلنے کے ساتھ قلابازی کھاتے ہوئے بلندی پر رکھی ہوئی کسی چیز کو کک لگائی جاتی تھی۔

اس کی پریکٹس میں مجھے بارہ دن لگے اور تیرھویں دن میں کیمپ کے تمام لوگوں کے سامنے اس کا مظاہرہ کر کے داد وصول کر رہا تھا۔

ایک بھکشو بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس کے کندھوں پر دوسرا بھکشو کھڑا ہو گیا۔ اس نے دستے کی طرف سے ایک خنجر دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ خنجر کی نوک پر ایک سیب پھنسا ہوا تھا۔ میں تقریباً پندرہ فٹ دور سے دوڑتا ہوا آیا۔ مخصوص نشان پر پہنچ کر اچھلا اور ہوا میں قلابازی کھاتے ہوئے کک لگائی اور پیر کے انگوٹھے سے خنجر کی نوک پر لگے ہوئے سیب کو ہوا میں اچھال دیا۔ خنجر اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا۔ وہ بھکشو بھی اپنے ساتھی کے کندھوں پر اسی طرح کھڑا رہا۔

میرے اس کامیاب مظاہرے پر بھکشوؤں نے مجھے کندھوں پر اٹھا لیا۔ میں کامیابیوں کے راستے پر گامزن رہا۔ میری اس کامیابی کی سب سے زیادہ خوشی تھائی وانگ کو تھی۔ اگر کسی کٹھن مرحلے پر میں ہمت ہارنے لگتا تو وہ میری حوصلہ افزائی کرتی۔ مجھے آگے بڑھانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

بریکنگ بھی مارشل آرٹس کی پریکٹس میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مجھے اس میں بھی مہارت حاصل ہو گئی تھی اور میں چار چار انچ کی نیچے اوپر رکھی ہوئی دو پختہ اینٹوں کو کھڑی ہتھیلی سے بڑی آسانی سے توڑ لیتا تھا۔ ناریل توڑنا تو میرے لیے کھیل بن گیا تھا۔

روزانہ شام کو میری اسپیرنگ ہوتی۔ کبھی ایک، کبھی دو اور کبھی تین تین آدمیوں سے لڑایا جاتا۔ میری ٹریننگ کا مقصد محض اسپورٹس مین کے طور پر فن سیکھنا نہیں تھا بلکہ مجھے ایک مکمل جنگ جو بنایا جا رہا تھا تاکہ میں عملی زندگی میں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکوں۔

اسپیرنگ کے دوران میں ییلنگ YELLING پر زور دیا جاتا۔ مارشل آرٹس کے تمام اسٹائلز میں ییلنگ پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔ حریف پر حملہ آور ہوتے وقت حلق پھاڑ کر چیخنے کا مقصد نہ صرف حریف پر دہشت طاری کرنا ہوتا ہے بلکہ اس طرح اپنے اندر کا جذبہ بھی ابھرتا ہے۔

میری ٹریننگ کو تین مہینے ہو گئے تھے۔ ہانگ سو میری ٹریننگ سے مطمئن تھا اب زیادہ زور اسپیرنگ پر تھا۔ میرے مقابلے روزانہ باقاعدگی سے کرائے جا رہے تھے اور ہانگ سو میری اس ڈیمانسٹریشن سے مطمئن تھا اور پھر ایک روز اطلاع ملی کہ مہاراج وانگ دنگ یائے اگلے روز یہاں آرہا ہے۔

کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ مہاراج کبھی یہاں نہیں آیا تھا۔ ٹریننگ کیمپوں کے معائنے کے لیے ہمیشہ ماسٹر پھوچی جایا کرتا تھا۔ ماسٹر پھوچی اب نہیں رہا تھا اور شاید یہ ذمے داری اب ماسٹر ہوچن کو سونپ دی جائے لیکن یہ اطلاع ہانگ سو کے لیے بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی کہ مہاراج خود یہاں آرہے ہیں اور شاید وہ ان کے آنے کا مطلب بھی سمجھ گیا تھا۔

مہاراج دوسرے روز سہ پہر چار بجے کے قریب کیمپ میں پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ ماسٹر ہوچن اور دو آدمی بھی تھے۔ ہانگ سو نے مہاراج کے استقبال کی تمام تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ مہاراج کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد کیمپ میں ٹریننگ حاصل کرنے والوں کی کارکردگی کے مظاہرے شروع ہو گئے۔

میری باری بھی آگئی۔ میرے فن کے مظاہرے کا آغاز کاتا

سے شروع ہوا اور سمر سالٹ پر ختم ہوا۔ کاتاز دراصل وہ مختلف اسٹانس ہوتے ہیں جنہیں فائٹ میں بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اسٹانسز سے ہی کراٹے کاز حریف پر حملہ آور ہونے کی اگلی پوزیشن بناتا ہے۔

آخر میں مقابلے تھے۔ کھیل میں عام طور پر بیلٹ کلر اور ویٹ کے حساب سے باؤٹ ہوتے ہیں لیکن اس کیمپ میں بیلٹ کلر کا کوئی تصور نہیں تھا البتہ ٹریننگ کے دوران میں اسپرنگ میں ویٹ کا کسی حد تک خیال رکھا جاتا تھا۔ مقابلے ہوتے رہے اور ان میں حصہ لینے والے دوسروں سے داد حاصل کرتے رہے۔ آخر میں میری باری تھی۔ میرے باؤٹ میں جس شخص کو میرے مقابلے پر لایا گیا' اسے دیکھ کر سب ہی چونک گئے تھے۔

وہ تھنگ چو تھا۔ اس کیمپ کا سب سے طاقت ور اور خطرناک بھکشو۔ اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ عمر بتیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس کا جسم اگرچہ دبلا پتلا تھا لیکن وہ چیتے کی طرح طاقت ور اور پھرتیلا تھا۔ ٹریننگ کے دوران میں بھی کیمپ کے دوسرے لوگ عام طور پر اس سے دور ہی رہا کرتے تھے۔

نمائشی مقابلوں میں عام طور پر ہیڈ گیئر استعمال کیے جاتے تھے تاکہ سر پر چوٹ نہ لگے لیکن میرے باؤٹ میں کچھ مختلف طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ ہم دونوں کو نہ تو ہیڈ گیئرز دیے گئے اور نہ ہی باکسنگ گلوز۔ اس سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ میرے حریف تھنگ چو نے ہاتھوں پر رسیاں لپیٹی ہوئی تھیں۔ بان جیسی کھردری رسیوں پر چھوٹی چھوٹی گرہیں لگی ہوئی تھیں۔ موئے تھائی کے مقابلوں میں حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے بڑے عجیب و غریب ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے۔ گلوز میں کوئی ایسی سخت چیز چھپالی جاتی جس سے حریف کو زیادہ چوٹ لگتی لیکن یہ سب کچھ چوری چھپے ہوتا تھا اور یہاں تو صورت حال مختلف تھی۔ تھنگ چو نے ہاتھوں پر گرہوں والی جو رسیاں لپیٹ رکھی تھیں' وہ سب کی نظروں میں تھیں جبکہ میں خالی ہاتھ تھا۔

میں نے مہاراج کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی الجھن سی نظر آرہی تھی اور تھائی وانگ کے چہرے پر تو خوف کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آرہے تھے لیکن میں خوف زدہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسا تھا۔

ریفری کے فرائض ایک سینئر انجام دے رہا تھا۔ میں اپنے حریف کے سامنے کھڑا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بو کیا اور ریفری کا اشارہ ملتے ہی مقابلہ شروع ہوگیا۔ تھنگ چو میرے سامنے اچھل رہا تھا۔ اس نے اچانک ہی کک لگانے کے لیے پیر اٹھایا۔ میں نے الٹے ہاتھ کی کلائی سے اس کی کک روکی اور بڑی پھرتی سے اس کا پنچ روکنے کے لیے سیدھا ہاتھ بھی اٹھا دیا۔ اس نے جیسے ہی پیر اٹھایا تھا' میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اصل داؤ کک نہیں پنچ ہوگا جسے میں نے بڑی کامیابی سے روکا تھا۔

تھنگ چو پے در پے حملے کر رہا تھا اور میں زیادہ تر مدافعت ہی کرتا رہا۔ کبھی کبھار ایک آدھ حملہ بھی کر دیتا جسے وہ کامیابی سے روک لیتا۔ میں اپنی طرف سے مدافعت کے ساتھ اسے اشتعال بھی دلانا چاہتا تھا اور میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا۔

ہمارا یہ مقابلہ پانچ راؤنڈز کا تھا۔ پہلے دو راؤنڈز میں وہ تین پوائنٹ لے گیا۔ تیسرے راؤنڈ میں اس پر تھکن کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ اب میں نے مدافعت کی پالیسی ترک کرکے جارحانہ انداز اختیار کرلیا۔

تھنگ چو نے ایک حملہ کیا تو میں نے اس کا پنچ کلائی پر روکا اور اس کے ساتھ ہی الٹی قلا بازی کھا گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میری کک اس کی ٹھوڑی کے نچلے حصے پر لگی اور وہ پیچھے الٹ گیا اور پھر تو میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ پے در پے اس پر حملے کرتا رہا۔ اس راؤنڈ میں مجھے دو پوائنٹ ملے۔

یہ رِنگ کوئی باقاعدہ رِنگ نہیں تھا۔ اس کے اطراف میں رسے بھی تنے ہوئے نہیں تھے۔ اکھاڑے کی طرح تھا جس کے چاروں طرف سب لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے محسوس کیا تھا کہ زیادہ ہمدردیاں تھنگ چو کے ساتھ تھیں۔ میرے حق میں بھی چند آوازیں اٹھ رہی تھیں اور سب سے نمایاں آواز تھائی وانگ کی تھی۔

چوتھے راؤنڈ میں مجھے مزید دو پوائنٹ ملے۔ پانچویں راؤنڈ میں یہ مقابلہ فری اسٹائل میں تبدیل ہوگیا تھا۔ تھنگ چو نے تمام قواعد و ضوابط کو نظر انداز کردیا تھا۔ میرے اب تک مقابلے پر کھڑے رہنے سے وہ شاید اپنی توہین محسوس کرنے لگا تھا اور ہر قیمت پر مجھے شکست دینا چاہتا تھا۔

یہ واقعی اسٹریٹ فائٹ تھی جس میں کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہوتا۔ بس حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھنگ چو نے دائیں ہاتھ کا دھوکا دے کر بائیں پنچ کا وار کیا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر اس کا پنچ میرے کندھے پر لگا۔ ہاتھ پر لپٹی ہوئی کھردری رسیوں اور گرہوں کی وجہ سے میرے کندھے کی کھال چھل گئی لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور اشتعال میں آنے کے بجائے ہوش و حواس میں رہتے ہوئے مقابلہ جاری رکھا۔ تھنگ چو مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے پنچ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو میں طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرے دائیں پیر اس کی بغل کے نیچے لگا۔ وہ پیچھے ہٹا تو میری لیفٹ کک اس کے دائیں پہلو میں لگی اور پھر تو میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ پنچ کک.... پنچ کک.... وہ بری طرح لڑکھڑا رہا تھا اور جب اس نے سنبھلنے کی کوشش کی تو میں ایک بار پھر ہوا میں اچھلا اور پوری قوت سے فلائنگ کک اس کے سینے پر ماری۔ وہ لڑکھڑا کر گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ میں بجلی کی سی سرعت سے

آگے بڑھ کر جھکا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی گردن پر تھا اور دوسرا جانگھ پر۔ میں نے پوری قوت استعمال کرتے ہوئے اسے اپنے سر سے اوپر اٹھالیا اور کک لگا کر ایک طرف اچھال دیا۔ وہ تماشائیوں میں گرا۔ اس کے حمایتی اس کی حوصلہ افزائی کے لیے چیخ رہے تھے۔ میں اس کے قریب کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ ریفری نے گنتی شروع کردی تھی۔ تھنگ چو نے دو مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ ریفری نے چیخ کر دس کہا اور پھر میرا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

میں یہ مقابلہ جیت گیا تھا۔ مہاراج ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ تھائی وانگ چیختی ہوئی اکھاڑے میں آگئی اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے حمایتیوں نے شور مچاتے ہوئے مجھے کندھوں پر اٹھالیا اور پھر مہاراج کے سامنے لے جاکر زمین پر اتار دیا۔ میں نے مہاراج' ماسٹر ہوچن اور ہانگ سو کو بو کیا۔ مہاراج نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہانگ سو۔" وہ میرے استاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "ہم تم سے بہت خوش ہوئے۔ ایک سال کی ٹریننگ تین مہینوں میں۔ مجھے تم پر فخر ہے۔"

"مجھے اپنے اس شاگرد پر فخر ہے مہاراج۔" ہانگ سو نے بو کرتے ہوئے کہا "یہ سب اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔ میرا خیال تھا اتنی مختصر سی مدت میں یہ کچھ بھی نہیں سیکھ پائے گا لیکن اس نے کسی موقع پر بھی مجھے مایوس نہیں کیا۔ بڑی محنت کی ہے اس نوجوان نے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "تھنگ چو میرے کیمپ کا سب سے سینئر اور سب سے خطرناک آدمی ہے۔ یہ اسٹریٹ فائٹنگ میں بھی عملی طور پر حصہ لے چکا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا چھ مہینے پہلے تو آپ ہی نے بعض خاص ہدایات کے ساتھ اسے یہاں بھیجا تھا۔ ان چھ مہینوں کے دوران میں اس نے یہاں بھی بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس نوجوان نے تھنگ چو کو جس طرح ناک آؤٹ کیا ہے' وہ بھی آپ نے دیکھ لیا۔ اب یہ نوجوان کسی سے مار نہیں کھائے گا۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔

اپنی ٹریننگ پر مہاراج کا تبصرہ سن کر میں پھولے نہیں سمایا تھا۔ یہ میری زندگی کی پہلی فائٹ تھی جس میں' میں نے اپنے سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور طاقت ور حریف کو ناک آؤٹ کردیا تھا۔

میری ٹریننگ مکمل ہوگئی تھی اس لیے میرے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں اس رات مہاراج کے ساتھ ہی بنکاک واپس آگیا اور ظاہر ہے تھائی وانگ بھی ہمارے ساتھ تھی اور مجھے تھائی وانگ پر حیرت تھی۔ ان تین مہینوں کے دوران میں وہ صرف ایک مرتبہ میرے ہاتھ سے پٹی تھی اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بہت ناخوشگوار ثابت ہوا تھا کہ مجھ سے تھائی وانگ کی حالت جاننے کے بعد ہانگ سو اسے ایک مخصوص ایکسر سائز کرواتا رہا تھا اور

ہمارے واپس آنے سے پہلے اس نے تھائی وانگ کو ہدایت کردی تھی کہ وہ کچھ عرصے تک یہ ایکسر سائز جاری رکھے۔

ہم رات نو بجے کے قریب شہر میں داخل ہوئے تھے اور پھر مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے واٹ ٹریمٹ پہنچ گئے۔ یہ وہی خانقاہ تھی جہاں پر تاب سنگھ کو قتل کیا گیا تھا اور مہاراج وانگ ونگ یائے نے مجھے اپنی پناہ میں لیا تھا۔ ہم عقبی راستے سے خانقاہ میں داخل ہوئے تھے لیکن خانقاہ میں موجود تمام بھکشوؤں کو پتا چل گیا کہ مہاراج واپس آگئے ہیں۔ مجھے اور تھائی وانگ کو پاتونگ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ پاتونگ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کے ساتھ حیرت کے تاثرات بھی نمایاں تھے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم وہی ہو جسے چند مہینے پہلے نہایت خستہ حالت میں یہاں میرے پاس لایا گیا تھا۔ کیسا قد نکالا ہے تم نے۔" پاتونگ نے آگے بڑھ کر مجھے دونوں بانہوں سے پکڑلیا اور پھر وہ چونک گئی۔ میرے بازو کے مسل ٹٹولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی "تم پر مہاراج کی محنت ضائع نہیں گئی اور مجھے لگتا ہے مہاراج بہت جلد تمہیں کوئی اہم ذمے داری سونپ دیں گے۔"

"تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ مہاراج مجھے کوئی ذمے داری سونپ دیں گے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دو دن پہلے وہ ماسٹر ہوچن سے باتیں کر رہے تھے اور میں نے اس سے کچھ اندازہ لگالیا تھا۔" پاتونگ نے جواب دیا۔

"تمہیں یہاں کے حالات کا کچھ علم ہے۔ شہر میں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ۔" پاتونگ نے جواب دیا "وہ ہندو لڑکی تھی نا کوشلیا جس کے فلیٹ میں تم چند روز رہے بھی تھے۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ کوشلیا کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ کیا اسے ٹائیگر کی قید سے چھڑالیا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ تو غدار نکلی۔" پاتونگ نے جواب دیا "اس کے فلیٹ پر حملہ اس کی غداری کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے کسی طرح ٹائیگر تک یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ تم اس کے فلیٹ میں ہو اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ تمہاری حفاظت کے لیے کیا انتظامات کیے گئے ہیں۔ ٹائیگر کے آدمیوں نے موقع ملتے ہی اس کے فلیٹ پر حملہ کردیا تھا۔ تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور وہ ٹائیگر کے آدمیوں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ بعد میں یہی تاثر دیا گیا کہ ٹائیگر کے آدمی اسے اٹھا کر لے گئے ہیں اور اس کی رہائی کے بدلے تمہیں ان کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا تھا کہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہوا تھا۔"

"وہ اب کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے کوشلیا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ کوشلیا کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دماغ گھوم رہا

تھا۔ وہ رات مجھے اچھی طرح یاد تھی جب اس نے مجھ سے اپنی ہوس کی آگ بجھانے کی کوشش کی تھی اور میرا خیال ہے اس کے بعد ہی اس نے کسی طرح ٹائیگر کے آدمیوں سے رابطہ کرکے میرے بارے میں بتایا ہوگا۔ کوشلیا جوان اور حسین عورت تھی۔ اگر وہ کسی مرد کو اشارہ بھی کردے تو وہ اس کے قدموں پر لوٹنے لگے گا۔ میرے بارے میں بھی شاید اس نے یہی سوچ لیا تھا اور بے لباس ہو کر میرے بستر پر آگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے برہنہ دیکھ کر میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھوں گا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق مجھ سے اپنی خواہش پوری کرے گی لیکن میں نے اسے دھتکار دیا تھا اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے اس نے ٹائیگر کے آدمیوں سے مل کر مجھے مروانے کی سازش کی تھی لیکن خوش قسمتی سے میں تو بچ گیا تھا لیکن اس کا راز بھی بالآخر فاش ہوگیا تھا۔

"اس کا ٹریننگ سینٹر بند ہوچکا ہے۔" پاتونگ کہہ رہی تھی "آج کل وہ ایک تھرڈ کلاس نائٹ کلب میں فائٹ کے پروگرام کررہی ہے۔ ماسٹر ہوچن تو اسے اٹھوانا چاہتا تھا لیکن مہاراج نے منع کردیا۔ وہ ایک غدار عورت کے لیے اپنے کسی آدمی کی زندگی داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔ مہاراج کا خیال ہے کہ کوشلیا ایک روز خود ہی اس کے قدموں پر آکر گر جائے گی۔"

"ہوں۔" میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

"ایک بات اور۔" پاتونگ نے کہا "ٹائیگر کے آدمی تم دونوں کو بڑی سرگرمی سے تلاش کررہے ہیں۔ اس کے دو آدمی تم دونوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں۔ اس نے مہاراج سے بھی مطالبہ کیا تھا کہ تم دونوں کو اس کے حوالے کردیا جائے۔ تمہیں شاید ایک دو دن سے زیادہ اس ٹمپل میں نہ رکھا جائے اس لیے جہاں بھی جاؤ ذرا محتاط رہنا۔"

"اور کچھ....؟" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اور یہ کہ اب تم نہالو۔ عجیب حلیہ ہورہا ہے تمہارا۔" پاتونگ نے کہا "تمہیں باتھ روم دکھاؤں۔" اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"نہیں.... میں خود ہی چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا اور اس وسیع وعریض کمرے سے باہر نکل گیا۔

پاتونگ کا خیال درست نکلا تھا۔ دوسرے دن شام کے بعد مجھے اور تھائی وانگ کو کلانگ روڈ کے قریب ایک بہت بڑے واٹ (خانقاہ) میں بھیج دیا گیا۔ اس خانقاہ سے متصل ایک بہت بڑا میدان تھا اور اس کے قریب ہی واچھونوٹن کک باکسنگ اسٹیڈیم تھا۔ یہ شہر کا دوسرا سب سے بڑا اسٹیڈیم تھا۔ اس خانقاہ میں بھکشوؤں اور راہباؤں کے لیے الگ رہائشی کوارٹرز تھے اور وہاں کسی غیر متعلق شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ رہائشی کوارٹرز کا ایک راستہ تو خانقاہ کے اندر سے تھا اور دوسرا پچھلی طرف ایک تنگ سی گلی میں۔ یہ دروازہ عام طور پر بند ہی رہتا تھا۔

یہاں ہمیں الگ الگ دو کمرے دیے گئے تھے۔ ماسٹر ہوچن ہمارے ساتھ آیا تھا۔ یہاں بھی راہبوں اور راہباؤں کو کک باکسنگ کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ مجھ سے پہلے جو ٹرینر تھا اسے اس روز اور جگہ بھیج دیا گیا تھا اور سب بھکشوؤں کو بتا دیا گیا تھا کہ آئندہ انہیں ٹریننگ میں دوں گا۔ ماسٹر ہوچن نے انہیں میرا نام ماسٹر ہاہا بتایا تھا۔

میرے خیال میں میرا تعارف کراتے وقت اس کے ذہن میں کوئی نام نہیں آسکا تھا اس لیے ہاہا ہی بتا دیا تھا اور یہ نام مجھے پسند آیا تھا۔ مجھے یہاں بھیجنے کی ایک وجہ میری سمجھ میں آگئی۔

اس خانقاہ میں مہاتما بدھ کا سونے کا ایک بہت بڑا مجسمہ تھا جس کے گرد لوہے کا مضبوط جنگلا لگا ہوا تھا۔ دن میں دو مرتبہ اس جنگلے کا دروازہ کھولا جاتا اور زائرین مجسمے کو چھو کر سکون قلب حاصل کرتے اور اپنے عقیدے کے مطابق دعائیں مانگتے۔ اس مجسمے کی حفاظت کے خیال سے یہاں کے بھکشوؤں کو موئے تھائی کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یوں تو میں سمجھ گیا تھا کہ یہاں کا بھکشو بہترین فائٹر تھا لیکن ماسٹر کے خیال میں انہیں ایکٹو رکھنے کے لیے مجھ جیسے آدمی کی ضرورت تھی۔

جنگل والے کیمپ سے آنے کے بعد میں نے آئینے میں اپنا حلیہ دیکھا تھا تو چونک گیا تھا۔ وہاں تین مہینوں میں صرف ایک مرتبہ قینچی کے ساتھ بڑی بے ترتیبی سے میرے بال کاٹے گئے تھے جو اب بڑھ کر گردن تک پہنچ گئے تھے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ قینچی ہی سے اپنے بال خود ہی کاٹ لوں لیکن پھر کچھ سوچ کر انہیں چھوڑ دیا تھا۔ ان بے تحاشا بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے میرا حلیہ بڑی حد تک بدل گیا تھا اور بدلا ہوا حلیہ میرے لیے ضروری تھا۔

ایک دو دن تو میں خانقاہ تک محدود رہا پھر ایک روز کسی کو بتائے بغیر باہر نکل گیا۔ حفاظت کے لیے میں نے اپنے لباس میں ایک خنجر چھپالیا تھا۔ میں اس روز بہت دیر تک شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتا رہا۔ میں پہلی مرتبہ اس شہر میں اکیلا باہر نکلا تھا۔ راستوں کا علم نہیں تھا۔ بس منہ اٹھائے گھومتا رہا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ کچھ راستوں سے واقفیت ہوگئی اور پھر ایک بازار میں چلتے چلتے میں ایک دکان کے سامنے رک گیا۔ دکان کے شوکیس میں ایسی چیزیں سجی ہوئی تھیں جو عام طور پر تھیٹروں میں استعمال ہوتی ہیں۔ نقلی بالوں کی وگیں، نقلی مونچھیں اور ماسک وغیرہ۔

میں دکان میں داخل ہوگیا۔ میں نے اپنے لیے ایک فرنچ کٹ داڑھی پسند کی جسے دکان دار نے بڑی نفاست سے میرے چہرے پر چپکا دیا۔ اس داڑھی کو کسی اضافی چیز کے بغیر آسانی سے ٹھوڑی پر چپکایا اور اتارا جاسکتا تھا۔ دکان دار نے سیاہ شیشوں والی عینک بھی میری آنکھوں پر لگا دی اور جب میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو اچھل پڑا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔ میں نے قیمت ادا کی اور یہ دونوں چیزیں جیب میں ڈال کر دکان سے

باہر آگیا۔

میں نے روز نائٹ کلب کے قریب اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے بھی پی جس کے قریب سے میں تھائی وانگ کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہاں اس وقت بہت سے گاہک تھے اور ہوسکتا ہے یہاں ٹائیگر کا کوئی آدمی بھی موجود ہو لیکن کسی نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر میں ایک ٹک ٹک میں بیٹھا اور گولڈن ہارس ہوٹل کے سامنے اتر گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سے میں پیدل ہی جاؤں گا۔ مجھے اس طرح آزادی سے گھومنا پھرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں کوئی ڈر خوف بھی نہیں تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا پیچھا کیا جارہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ایک غنڈے کو بھی میں نے ایک ٹک ٹک سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ بڑی سڑک پار کرکے میں ایک تنگ سی گلی میں گھس گیا اور بڑی پھرتی سے ایک دیوار کی آڑ میں ہوگیا۔ وہ دن کا وقت تھا لیکن اتفاق سے اس وقت وہ گلی سنسان پڑی تھی۔ وہ آدمی جیسے ہی گلی میں مڑا میں نے برق رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی اور اس کے منہ پر گھونسا مارنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی شکل دیکھ کر میرا ہاتھ رک گیا اور میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ماسٹر ہوچن کا آدمی تھا۔

یہ انکشاف میرے لیے خاصا دلچسپ ثابت ہوا کہ مہاراج کے کہنے پر ماسٹر ہوچن نے میری نگرانی شروع کررکھی تھی۔ انہیں شاید پہلے ہی سے یقین ہوگا کہ میں واٹ سے باہر نکلنے کی کوشش کروں گا اس لیے میری نگرانی شروع کردی گئی تھی۔ کوئی نہ کوئی آدمی ہروقت واٹ کے آس پاس موجود رہتا تھا اور اس شخص نے واٹ سے نکلتے ہی میرا تعاقب شروع کردیا تھا لیکن میری نظروں میں اس وقت آیا جب میں گھوم پھر کر واپس آرہا تھا اور میں نے موقع ملتے ہی اسے چھاپ لیا تھا۔

ایک جگہ بند ہو کر بیٹھے رہنا میرے لیے مشکل ہوگیا تھا۔ میں کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ویسے میں اکثر رات کی تنہائی میں سوچا کرتا تھا کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے۔ میرے ماں باپ کو سنگاپور میں میری نظروں کے سامنے قتل کردیا گیا تھا پھر وہ میری جان کے بھی دشمن ہوگئے۔ چاچا پرتاب سنگھ مجھے ان سے بچانے کے لیے بنکاک لے آیا اور میری جان بچانے کی کوشش میں وہ خود مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد میں مہاراج وانگ ونگ یائے کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ مجھے بہت بڑا مارشل آرٹسٹ بنانا چاہتا تھا تاکہ میں اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرسکوں۔ میرے وہ دشمن بھی شاید آہنی اعصاب کے مالک تھے جو اب تک میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ جبکہ میرے خیال میں انہیں تو بہت پہلے میرا پیچھا چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ انہیں تو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ میں تو خود اپنی جان کے خوف سے بھاگا پھر رہا ہوں۔ انہیں کیا نقصان پہنچاؤں گا لیکن شاید صورتِ حال ایسی نہیں تھی جیسا میں سوچ رہا تھا۔ واقعات کا ایک ایسا تسلسل بنتا گیا جس سے وہ اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے رہے۔ پہلے سنگاپور کی پولیس میری حفاظت کے ساتھ ساتھ انہیں بھی تلاش کرتی رہی پھر پرتاب سنگھ مجھے بنکاک لے آیا اور میں مہاراج کی تحویل میں آگیا۔ مہاراج کے بارے میں وہ بھی جانتے ہوں گے۔ انہیں زیادہ خطرہ محسوس ہوا اور اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انہوں نے ٹائیگر جیسے آدمی کی خدمات حاصل کرلیں جس کا انڈر ورلڈ پر ہولڈ تھا۔

اور پھر ان کے ہاتھوں مہاراج کا بہترین آدمی ماسٹر پھو مارا گیا۔ اس طرح دونوں پارٹیوں میں تصادم شروع ہوگیا۔ تھائی وانگ ایک بالکل غیر متعلق عورت تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے مجھے پناہ دی تھی۔ میری وجہ سے اس کا سب کچھ تباہ ہوگیا تھا اس کی اپنی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو مجھے چھوڑ کر کسی اور شہر جاسکتی تھی لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں جب بھی تھائی وانگ کے بارے میں سوچتا مجھے بڑا افسوس ہوتا۔

مجھے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ دارا اور کم وغیرہ واپس جاچکے تھے یا ابھی تک بنکاک ہی میں موجود تھے۔ میرے اصل دشمن تو وہی تھے اور مجھے ان سے انتقام لینا تھا۔ میرے ماں باپ کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا اور میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا۔ مجھے ہر صورت میں دارا اور چی فانگ وغیرہ سے انتقام لینا تھا۔ اس کے لیے چاہے مجھے دنیا کے آخری سرے تک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اب تو میں ان سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب یہ مجھ سے چھپتے پھریں گے اور انہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ اس سے پہلے مجھے اپنے آپ کو پوری طرح تیار کرنا تھا۔ ہانگ سو کی تربیت نے اگرچہ مجھے ماسٹر بنا دیا تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ تربیت ہی کافی نہیں تھی۔ مجھے تجربے کی ضرورت تھی۔ ابھی اور کٹھن مراحل سے گزرنا تھا۔

میں اپنے آپ کو ٹائیگر کے معاملات میں الجھانا نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے کترایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے دو آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے اور وہ میری تلاش میں تھا اور کبھی تو میں سوچتا کہ اچھا ہے۔ اس طرح تجربہ بھی حاصل ہوگا۔

اس روز میں نے پھر باہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں رات تقریباً آٹھ بجے اپنے کمرے میں تیاری کررہا تھا۔ میرے بال اتنے لمبے تھے کہ میں نے انہیں پیچھے سمیٹ کر چٹیا بنالی اور ٹھوڑی پر فرنچ کٹ داڑھی چپکا کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ سیاہ شیشوں والا چشمہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ داڑھی لگانے سے ہی میرا چہرہ بہت بدل گیا تھا۔ یوں بھی رات کے وقت سیاہ شیشوں والا چشمہ مشکوک بنا سکتا تھا۔

میرا قد پانچ فٹ کے قریب تھا۔ مارشل آرٹ کی کٹھن ٹریننگ نے میری جسمانی نشوونما پر بھی بڑا اثر ڈالا تھا۔ میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ لگنے لگا تھا اور فرنچ کٹ داڑھی تو میرے چہرے پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کی آواز سن کر پیچھے مڑا۔ وہ تھائی وانگ تھی۔ وہ میری شکل دیکھتے ہی اچھل پڑی۔

"کک.... کون ہو تم اور...."

میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ اس داڑھی سے تھائی وانگ بھی مجھے نہیں پہچان سکی تھی۔ میری آواز سن کر وہ ایک بار پھر اچھل پڑی۔

"اوہ۔" اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی "یہ.... یہ کیا۔ میرا مطلب یہ داڑھی.... شام کو تو نہیں تھی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے داڑھی اتار دی اور پھر آئینے کی طرف رخ کر کے اسے دوبارہ چپکا لیا۔

"میں باہر جا رہا ہوں۔ تاکہ صورتِ حال کا جائزہ لے سکوں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تو میرا دم گھٹنے لگا ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے تائیگر کے آدمی تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو...."

"تم مجھے نہیں پہچان سکیں تو کوئی اور کیسے پہچانے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے کہا۔

"تاکہ تمہارے ساتھ ہونے سے مجھے بھی پہچان لیا جائے۔" میں نے کہا "پریشان مت ہو۔ میں نے اپنی حفاظت کرنا سیکھ لیا ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

میں بڑی مشکل سے اسے سمجھا سکا تھا۔ اس رات میں نے واٹ سے باہر جانے کے لیے واٹ کا عقبی چھوٹا دروازہ استعمال کیا تھا۔ تھائی وانگ اس دروازے تک میرے ساتھ آئی تھی اور میں نے واپس آنے کا راستہ بھی تلاش کر لیا تھا۔

گلیوں ہی گلیوں میں گھومتا ہوا میں واٹ سے بہت دور گولڈن ہارس ہوٹل کے قریب سڑک پر نکل آیا اور اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے ایک ٹک ٹک پر بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو روز کلب چلنے کا کہہ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

روز نائٹ کلب میں بڑی رونق تھی۔ پہلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو اس وقت میری اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ میں تو چھپنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا اور اس کلب کے بارے میں ٹھیک سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اب پہلی مرتبہ اس کلب کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ یہ واقعی تھرڈ کلاس قسم کا کلب تھا۔ یہاں زیادہ تر وہ لوگ آتے تھے جن کا تعلق نچلے طبقے سے تھا۔ دن بھر محنت مزدوری کرنے کے بعد رات کو تھوڑا سا وقت سستی عیاشی میں گزار لیتے تھے اور اس سستی عیاشی میں ہی ان کی جیبیں خالی ہو جاتی تھیں۔

اس روز بھی میں نے دیکھا تھا اور اب تو مجھے ٹھیک طرح سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کلب منشیات کا بہت بڑا اڈا تھا۔ مرکزی ہال تو ان گاہکوں کے لیے مخصوص تھا جو کافی چائے، کولڈ ڈرنکس اور شراب وغیرہ پینے کے ساتھ اسٹیج پروگرام سے لطف اندوز ہوتے تھے اسٹیج پر کبھی ڈانس کا پروگرام ہوتا اور کبھی عورتوں کی کک باکسنگ کا۔ دوسرا ہال ان لوگوں کے لیے تھا جو منشیات استعمال کرتے تھے۔

میں نے کلب میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بہت سی میزیں بھری ہوئی تھیں۔ نیم عریاں لباس میں فاحشہ عورتیں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں جو کسی نہ کسی طرح گاہکوں کی جیبوں کا بوجھ ہلکا کرنے میں مصروف تھیں۔

اسٹیج پر اس وقت ایک رقاصہ تھرک رہی تھی۔ میں میزوں کے درمیان چلتا ہوا ایک کونے والی خالی میز پر بیٹھ گیا۔ نیم عریاں لباس میں ایک ویٹریس فوراً ہی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں نے اسے کافی کے لیے کہہ دیا اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔

پہلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو چی فانگ کو اس کلب میں دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرا اور اس کا آمنا سامنا اس کلب میں ہوگا۔ ویٹریس کافی لے کر آئی تو اس نے مجھ سے بل بھی وصول کر لیا۔ اس کلب کی روایت شاید یہی تھی۔ چیز سرو کرنے کے ساتھ ہی بل وصول کر لیا جاتا۔

میں کافی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ ایک عورت بڑی بے تکلفی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے اگر بھونڈے انداز میں میک اپ نہ کر رکھا ہوتا تو چہرہ پُرکشش ہو سکتا تھا۔ اس کا لباس اور حرکات و سکنات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کا تعلق کس طبقے سے ہو سکتا ہے۔ وہ جب میز پر ذرا سا آگے کو جھکی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

"اس کلب میں شاید پہلی مرتبہ آئے ہو۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں اس کلب میں ہی نہیں بنکاک میں بھی پہلی مرتبہ آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ.... اس کا مطلب ہے کہ اکیلے ہو اور تمہیں ایک دوست کی بھی ضرورت ہوگی۔ وقت گزارنے کے لیے۔ کسی کلب میں آدمی اکیلا ہو تو بڑی بوریت ہوتی ہے۔ میں تمہاری بوریت دور کر سکتی ہوں۔" وہ بولی۔

"وہ کس طرح؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جس طرح تم چاہو گے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا "لیکن پہلے میرے لیے کچھ پینے کو تو منگواؤ۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔" اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ویٹریس کو بلا کر اپنے لیے شراب منگوا لی اور اس کا بل مجھے ہی دینا پڑا تھا۔

اس کا نام شائی وان تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اندر کی کچھ باتیں بھی جانتی تھی اور اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کا رخ ہماری میز کی طرف ہی تھا۔ وہ جیسے جیسے قریب آ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تائیگر کا آدمی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو آنے والی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا۔

وہ ہماری میز کے قریب آ کر رک گیا۔ پہلے گھورتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا پھر شائی وان کی طرف جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور واپس چلا گیا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد شائی وان بھی اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"حرامی! اپنے آپ کو پتا نہیں کیا سمجھتا ہے۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"کون۔ کس کی بات کر رہی ہو؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تائیگر۔" اس نے کہا "اپنے آپ کو اس شہر کا مالک سمجھ بیٹھا ہے۔ یہ ایک دن کتے کی موت مرے گا۔"

"تائیگر تو سنا ہے یہاں کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔" میں نے کہا "لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق؟"

"وہ کلب میں آنے والی مجھ جیسی ہر عورت سے ٹیکس لیتا ہے۔" شائی وان نے جواب دیا "تم سے کچھ ملے نہ ملے لیکن اس کے کارندے نے مجھ سے سو بھات ہتھیا لیے۔"

"میں تمہیں سو بھات دے دوں گا۔ ویسے تم اس کلب میں کب سے آ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کئی سال ہو گئے۔" شائی وان نے جواب دیا "تائیگر پہلے ایسا نہیں تھا۔ اس نے ہمیں کبھی نہیں چھیڑا تھا لیکن جب سے وہ حرامی دو چینی یہاں آئے ہیں اور مہاراج کا سینئر ماسٹر پھوان کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس وقت سے وہ زیادہ ہی پھیل گیا ہے۔ ہیروئن اور عورتوں کی کمائی سے اس کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو گیا ہے لیکن میرا خیال ہے اس کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔ مہاراج کے آدمی اس کی تاک میں ہیں۔ یہ کسی نہ کسی دن کتے کی موت مارا جائے گا۔"

شائی وان کی باتیں مجھے چونکا دینے کے لیے کافی تھیں۔ خصوصاً دو چینیوں کے تذکرے سے تو میرے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہو گئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کم اور چی فانگ کی بات کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اندر کی بہت سی باتیں جانتی تھی۔ وہ اس وقت تائیگر کے خلاف غصے میں تھی اور اس سے بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا لیکن میرے خیال میں یہاں ایسی باتیں کرنا مناسب نہیں تھا۔

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم میری بوریت دور کر سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن یہاں نہیں۔" وہ بولی "اگر یہاں رہے تو یہ لوگ تمہیں بھی پریشان کریں گے۔ آؤ چلیں۔"

میں اس کے ساتھ کلب سے باہر آ گیا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی ایک ٹیکسی کی طرف بڑھ گئی۔

پچھلی سیٹ پر وہ میرے اوپر جھکی ہوئی بیٹھی تھی اور مجھے اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ٹیکسی راما نائن روڈ سے ہوتی ہوئی رائل سٹی ایوینیو کی طرف مڑ گئی اور تقریباً پانچ منٹ تک مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد ایک کشادہ گلی میں ایک کاٹیج کے سامنے رک گئی۔ اس گلی میں دونوں طرف خوب صورت کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور شائی وان کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ کاٹیج کا دروازہ شائی وان نے اپنی چابی سے کھولا تھا۔

تین کمروں کا ایک مختصر سا کاٹیج تھا۔ ایک دروازہ عقبی گلی میں بھی کھلتا تھا۔ وہ مجھے نشست گاہ میں لے آئی۔ فرنیچر اوسط درجے کا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا بوجھ میرے اوپر تھا۔ میں اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ میرے اوپر جھکی جا رہی تھی۔ میرے جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

"تم تائیگر اور ان دو چینیوں کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔" میں نے صوفے سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ان حرامیوں کی بات چھوڑو۔ اس وقت اپنی بات کرو۔" وہ بھی صوفے سے اٹھ گئی۔ اسے کرسی کی طرف آتے دیکھ کر میں دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"تم تو مجھ سے اس طرح ڈر رہے ہو جیسے میں تمہیں کھا جاؤں گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ.... دراصل بات یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ اس لیے آیا ہوں کہ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"صرف باتیں کرنے کے لیے۔" اس نے مجھے گھورا "کیا صرف باتیں کرنے کے لیے رقم خرچ کر رہے ہو۔ باتیں تو وہاں بھی ہو سکتی تھیں۔"

"رقم کی فکر مت کرو۔ تمہیں پورا معاوضہ ملے گا لیکن جو باتیں میں کرنا چاہتا ہوں وہاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری باتیں دوسرے بھی سن لیتے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟" اس نے مجھے

گھورا۔

"تائیگر کے ساتھ دو چینی کون ہیں؟" میں نے کہا اور پھر ان دونوں کا حلیہ بھی بتا دیا "کیا ان میں سے ایک کا نام چی فانگ اور دوسرے کا کم ہے؟"

"ہاں شاید یہی نام ہیں مگر تم انہیں کیسے جانتے ہو؟" شائی وان نے کہا۔

"وہ دونوں سنگاپور سے بھاگے ہوئے ہیں۔" میں نے جواب دیا "وہاں ان دونوں کے ہاتھوں کئی بے گناہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں تھی۔ وہ دونوں بھاگ کر یہاں آ گئے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ دو آدمیوں کے تعاقب میں یہاں آئے تھے۔ ان میں ایک مارا گیا اور دوسرا لاپتا ہے۔ ان چینیوں نے اس سلسلے میں تائیگر سے رابطہ کیا تھا کیونکہ انہیں پتا چل گیا تھا کہ جس نوجوان کی انہیں تلاش ہے' وہ مہاراج کی پناہ میں ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس نوجوان کی وجہ سے مہاراج کا خاص آدمی ماسٹر پھو بھی مارا گیا تھا اور پھر وہ نوجوان تائیگر کے دو آدمیوں کو مار کر غائب ہو گیا۔ تائیگر غصے میں پاگل ہو رہا ہے۔ اسے اس نوجوان کی تلاش ہے مگر...... تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"تھائی لینڈ ان تین ممالک میں سے ہے جو گولڈن ٹرائی اینگل بناتے ہیں" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم جانتی ہو۔ دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئن اس خطے میں پیدا ہوتی ہے اور اسی حوالے سے تھائی لینڈ ہیروئن اور دیگر منشیات کے اسمگلروں کی جنت ہے۔ سنا ہے یہاں بہت سے انٹرنیشنل سینڈیکیٹس کام کر رہے ہیں اور ہم بھی اسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تم مجھے میرے سینڈیکیٹ کا نمائندہ کہہ سکتی ہو۔ میں یہاں صرف یہ جائزہ لینے آیا ہوں کہ ہمیں یہاں قدم جمانے کا موقع مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ میں آج ہی یہاں آیا ہوں اور سب سے پہلے مجھے تائیگر ہی کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔ سنا ہے انڈرورلڈ پر اس کا کنٹرول ہے اور میرے خیال میں تم اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ میں نے تم پر بھروسا کر کے یہ ساری باتیں کی ہیں۔ اگر تم اس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو تو میں تمہیں معقول مالی فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔" میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

منشیات کی اسمگلنگ اور گولڈن ٹرائی اینگل کے بارے میں مجھے کیمپ کے بھکشوؤں سے بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ یہ بھکشو لوگ تھائی لینڈ' برما' لاؤس' ویت نام' چین اور ہندوستان میں آزادی سے گھومتے رہتے تھے۔ سرحدیں ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ یہ لوگ بہت کچھ دیکھتے تھے۔ بہت کچھ سنتے تھے لیکن اپنی زبانیں اور آنکھیں بند رکھتے تھے۔ ان معاملات سے قطعی لاتعلق تھے۔ یہ صرف بدھ کی تعلیمات کا پرچار کرتے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان علاقوں میں سفر کرتے ہوئے ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جاتی تھی اور انہیں کوئی روک ٹوک پیش نہیں آتی تھی۔ میری بات سن کر شائی وان کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔

"یہاں بہت ساری سینڈیکیٹ کام کر رہی ہیں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "لیکن انہیں دوسرے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ صرف تائیگر ایک ایسا آدمی ہے جس نے چاروں طرف ٹانگیں پھیلا رکھی ہیں۔ یہ ہیروئن اسمگل نہیں کرتا۔ اس نے ہیروئن اور دیگر منشیات کی سپلائی کے لیے شہر میں کئی اڈے قائم کر رکھے ہیں۔ منشیات کے علاوہ وہ دوسرے بھی بہت سے ناجائز دھندے کرتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو شہر بھر کے غنڈے اس کے کنٹرول میں تھے لیکن جب سے مہاراج سے ان بن شروع ہوئی ہے' کچھ لوگ اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ وہ مہاراج سے ڈرتے ہیں۔ اس کا ساتھ چھوڑنے والے اگرچہ مہاراج کے ساتھ بھی نہیں ملے۔ وہ لڑائی جھگڑوں میں دونوں سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ مہاراج سے ان بن کی وجہ سے تائیگر کے کاروبار پر بھی بڑا اثر پڑا ہے لیکن وہ ضدی آدمی ہے۔ مہاراج کے سامنے جھکے گا نہیں۔"

"ان دو چینیوں کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی آیا تھا۔" میں نے اسے وارا کا حلیہ بتایا "کیا وہ بھی تائیگر کے ساتھ ہے؟"

"وہ سنگاپور چلا گیا ہے لیکن سنا ہے تائیگر کے ساتھ مل کر ایک الگ ریکٹ بنانا چاہتا ہے۔ وہ اسی سلسلے میں سنگاپور واپس چلا گیا ہے۔ چند روز میں آجائے گا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اس نے تائیگر کو اس نوجوان کی تلاش کے لیے ایک بڑی رقم دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب تک وہ نوجوان زندہ ہے یا اس کی گرفت میں نہیں آجاتا اس وقت تک وہ سکون سے کام نہیں کر سکتا۔"

"کم اور چی فانگ۔ میرا مطلب ہے وہ دونوں چینی کہاں ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کم کا تو پتا نہیں لیکن چی فانگ کو اکثر تائیگر کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ پہلے اس نے روز کلب کو اپنا اڈا بنا رکھا تھا لیکن آج کل اس کا زیادہ وقت نائٹ ہیون کلب میں گزرتا ہے۔" شائی وان نے جواب دیا۔

"سنا ہے مہاراج کی ایک بہت قریبی شاگرد بھی تائیگر سے مل گئی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"اوہ۔ تم شاید کوشلیا کی بات کر رہے ہو۔" شائی وان نے کہا "وہ ہندوستانی لڑکی آج کل اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ مہاراج سے غداری کر کے اس نے اپنے آپ کو بے ... کر لیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ تائیگر اسے بہت بڑا انعام دے گا لیکن اب وہ اسے منہ نہیں لگاتا۔ البتہ تائیگر نے اسے اپنے ایک کلب میں کک باکسنگ کے مقابلوں کی اجازت دے دی ہے۔ اس

اس نے کوشلیا سے ہمدردی نہیں اپنے فائدے کو مدنظر رکھا تھا۔ کوشلیا ایک اچھی کک باکسر ہے۔ جوان اور حسین ہے۔ لوگ اسے دیکھنے کے لیے نائٹ کلب جاتے ہیں۔"

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دوسرے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس نے ٹائیگر اور دارا وغیرہ کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو رِنگ کے باہر کا آدمی نہیں جان سکتا۔ ایک لمحے کو مجھے یہ بھی شبہ ہوا کہ میرے ساتھ دھوکا تو نہیں ہو رہا۔ شائی وان نے ایسی باتیں کس قدر آسانی سے مجھے بتا دی تھیں لیکن پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایسی شکاری عورتوں کو صرف پیسے کا لالچ ہوتا ہے۔ وہ مجھے موٹی اسامی سمجھ کر میرے قریب آئی تھی۔ اس کا مقصد میری جیب سے زیادہ سے زیادہ رقم نکلوانا تھا اور میری باتوں سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے اچھی خاصی رقم بٹور لے گی اور اس لیے وہ میری ساری باتوں کا جواب دیتی چلی گئی تھی۔

دوسرے کمرے کا دروازہ ذرا سائڈ پر تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ شائی وان مجھے نظر نہیں آئی البتہ اس کی بہت مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد میں اپنے کندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ محسوس کرکے چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ شائی وان تھی جو صوفے کے پیچھے سے میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر اب لباس نام کے دو نہایت مختصر سے چیتھڑے تھے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی لیکن وہ کچھ اور جھک گئی اور اس کے دونوں ہاتھ میرے سینے پر آ گئے۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر ہٹانے کے لیے جھٹکا دیا تو وہ صوفے کے اوپر سے ہوتی ہوئی میرے اوپر آن گری۔

شائی وان کی اس حرکت سے میں بری طرح بدحواس ہو گیا تھا اور اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ مجھے لائی ہی اسی مقصد کے لیے تھی۔ اس کا اسے معاوضہ لینا تھا لیکن اس کے ساتھ آنے کا میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ مجھے اس سے بہت سی باتیں معلوم ہو گئی تھیں اور میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں اس سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ قہقہے لگاتی ہوئی مجھ سے لپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اچھا۔ میں چلتا ہوں۔" میں نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیے "پھر ملوں گا تم سے۔"

"ابھی تم کیسے جا سکتے ہو۔" شائی وان مجھ سے لپٹ گئی "میں جس کام کا معاوضہ لیتی ہوں وہ پورا کرتی ہوں۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو گاہک کی جیب سے رقم نکلوا لیتی ہیں لیکن اسے اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتیں۔ میں۔۔۔ میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی۔۔۔ آؤ نا۔"

"نہیں۔" میں نے اس کے دونوں بازو جھٹک کر اپنے سے الگ کر دیا "اب مجھے چلنا چاہیے پھر ملاقات ہوگی تم سے۔"

دھب کی آواز سن کر میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ یہ آواز باہر سے آئی تھی اور صاف لگا تھا کہ کوئی دیوار سے کودا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ برآمدے والا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ ہوا نے دروازے میں معمولی سی جھری پیدا کر کے باہر جھانکا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دو آدمی باہر کی دیوار کود کر اندر آئے تھے اور ان میں ایک جی فانگ تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا اور شائی وان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

اب مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ مجھے بڑی خوب صورتی سے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ نائٹ کلب میں داخل ہونے کے بعد غالباً مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا۔ شائی وان ایک پلاننگ کے تحت میری میز پر آئی تھی اور جب ٹائیگر اسے بلا کر لے گیا تھا تو شاید اسے کچھ ہدایات دی گئی تھیں۔ واپس آ کر شائی وان ٹائیگر کو گالیاں بکنے لگی تھی اور میں واقعی احمق تھا جو اس کے سامنے کھلتا چلا گیا اور پھر طے شدہ منصوبے کے مطابق وہ مجھے یہاں لے آئی تھی اور میں اس سے باتوں میں سب کچھ بتاتا چلا گیا۔ میں نے اگرچہ صاف طور پر اپنے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن میں جس طرح ٹائیگر 'کم' جی فانگ اور کوشلیا وغیرہ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔ اس سے شائی وان کو یقین ہو گیا کہ میں وہی ہوں جس کی ان لوگوں کو تلاش ہے اور جب فون کی گھنٹی بجی تھی تو وہ فون سننے کے لیے اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ ٹائیگر یا جی فانگ نے میرے بارے میں پوچھا ہوگا اور اس نے تصدیق کر دی تھی کہ میں وہی ہوں اور اب جی فانگ اپنے ایک اور آدمی کے ساتھ یہاں پہنچ چکا تھا۔

میں جانتا تھا جی فانگ ایک بہت زبردست مارشل آرٹسٹ ہے۔ وہ بہت سفاک آدمی تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں اپنی ماں کو قتل ہوتے دیکھا تھا اور پھر اس نے جس طرح ماسٹر ہو کو موت کے گھاٹ اتارا تھا' وہ بھیانک منظر بھی مجھے یاد تھا۔

میں نے شائی وان کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بڑے مطمئن انداز میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے پینٹ کے پائنچے کے اندر پنڈلی پر چمڑے کے فیتے سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔

"مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو جھوٹ بولتے ہیں اور دوسروں کو فریب دیتے ہیں۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "میرا تو کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے لیکن تم ان سے انعام کی رقم وصول کرنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکو گی۔"

"تم۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں۔" وہ مسلسل پیچھے ہٹتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں بولی "حقت۔۔۔ تم جب۔۔۔ کلب میں داخل ہوئے تھے تو ٹائیگر کو تم پر شبہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے تمہاری اصلیت معلوم کرنے کے لیے مجھے تمہارے پیچھے لگایا تھا۔"

"اور تم نے انہیں میری اصلیت بتا دی۔" میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ میز کے کونے سے ٹکرا کر لڑکھڑائی اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے صوفے پر گر گئی۔

میں خنجر لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جی فانگ اور اس کا ساتھی دروازہ توڑنے کی کوشش کریں گے تو میں شائی وان کو گرفت میں لے لوں گا اور اسے ڈھال بنا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ البتہ قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لوگ کیا کر رہے تھے اور پھر اچانک میں کانپ اٹھا۔

پیٹرول کی تیز بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

شائی وان نے بھی صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی اور بند دروازے کی طرف لپکی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بولٹ گرا کر دروازے کو اپنی طرف کھینچا لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ انہوں نے باہر سے دروازے کا کنڈا لگا دیا تھا۔

شائی وان مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر بولٹ دوبارہ لگا دیا اور شائی وان کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ تمہارا انعام ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ابھی وہ چھڑکے ہوئے پیٹرول کو ماچس کی تیلی دکھائیں گے اور تمہارا یہ مکان آگ کے شعلوں میں گھر جائے گا اور تھوڑی دیر بعد تمہاری لاش راکھ کا ڈھیر بن جائے گی لیکن اس سے پہلے کے چند منٹ کتنے اذیت ناک ہوں گے' اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔ آگ کے شعلے تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ تمہارا گوشت جلنے اور گلنے لگے گا۔ جان نکلنے سے پہلے وہ لمحات کتنے تکلیف دہ ہوں گے۔ تم چیخو گی۔ چلاؤ گی' اپنے آپ کو جلتے ہوئے دیکھو گی لیکن کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا اور آگ بجھنے کے بعد جب لوگوں کو تمہاری لاش ملے گی تو وہ لاش نہیں ہوگی۔ راکھ کا ڈھیر ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔ ایسے مت کہو۔" وہ چیخی "میں مرنا نہیں چاہتی۔ انہوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ کچھ کرو۔ وجدان کچھ کرو۔"

"اوہو۔ تمہیں تو میرا نام بھی معلوم ہے۔ حالانکہ میں نے تمہیں اپنا نام نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

"نام مجھے انہوں نے بتایا تھا۔" شائی وان نے جواب دیا "لیکن مجھے تم سے نام معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تمہاری باتوں سے پتا چل گیا تھا کہ تم وجدان ہو جسے وہ موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہیں۔"

"میں تو مروں گا لیکن تم بھی میرے ساتھ مرو گی اور یہ اذیت ناک موت تمہارا انعام ہوگا۔" میں نے کہا۔

اور پھر وہ ہوا جس کی توقع میں بہت دیر سے کر رہا تھا۔ باہر ایک دم شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ انہوں نے سامنے والے پورے حصے پر' برآمدے میں' دیواروں پر اور ہر جگہ پیٹرول چھڑکا تھا۔

شائی وان چیختی ہوئی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی اور میں کھڑکی کے باہر شعلے اٹھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جو بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے۔

آگ کے شعلے پھیل رہے تھے اور اب باہر سے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پھر دو تین فائر کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ جی فانگ اور اس کا ساتھی باہر موجود تھے۔ انہوں نے لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی ہوگی تاکہ کوئی آگ بجھانے کی کوشش نہ کرے۔

اب تک مجھ پر بیسیوں حملے ہو چکے تھے اور اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے تھے اور میں ہر مرتبہ بچ نکلا تھا۔ اس مرتبہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ شاید میں اس مرتبہ بھی بچ نکلوں۔ اس لیے انہوں نے چانس نہیں لیا تھا اور پیٹرول چھڑک کر کاٹیج کو آگ لگا دی تھی۔

"پلیز! کچھ کرو ورنہ ہم دونوں جل کر مر جائیں گے۔" شائی وان مجھے دونوں بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے چیخی۔

"یہ کاٹیج تمہارا ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ آگ کی تپش سے برآمدے والی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور نہ صرف دھواں کمرے میں بھر رہا تھا بلکہ شعلے بھی اندر کی طرف لپک رہے تھے۔

"یہ کاٹیج میرا نہیں ہے۔ انہوں نے مجھے چابی دے کر تمہیں لانے کو کہا تھا۔" شائی وان نے جواب دیا۔

"پچھلی گلی کی طرف کوئی دروازہ تو ہوگا۔ آؤ' میرے ساتھ آؤ۔" میں کہتے ہوئے تیزی سے اس کمرے میں گھس گیا جہاں ٹیلی فون تھا۔

لیکن اس کمرے میں پچھلی طرف دروازہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں بھی کوئی عقبی دروازہ نہیں تھا۔ میں جب دوبارہ نشست گاہ میں پہنچا تو چونک گیا۔

ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اندر آنے والے شعلوں سے پردوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ جلتا ہوا پردہ نیچے گرا تو اس کے ساتھ ہی نیچے قالین نے بھی فوراً ہی آگ پکڑ لی اور اس طرف رکھی ہوئی کرسیاں بھی شعلوں کی لپیٹ میں آ رہی تھیں۔

اب کاٹیج میں نہ صرف دھواں پوری طرح بھر گیا تھا بلکہ شعلے بھی بڑی تیزی سے پھیل رہے تھے۔ جلتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز دلوں پر مزید دہشت طاری کر رہی تھی۔ باہر سے شور کی آوازیں بھی مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔

شائی وان خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ میرے قریب رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آگ کی تپش اس کے جسم کو جھلسانے لگی تھی۔ خوف زدہ میں بھی تھا کہ اگر باہر نکلنے کا راستہ نہ مل سکا تو میں بھی جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔

نشست گاہ کے دائیں طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ میں بڑی تیزی سے راہ داری میں داخل ہو گیا۔ اس کے اختتام پر چھوٹا سا کچن تھا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ کچن ہی میں عقبی گلی کا دروازہ بھی تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر بولٹ گرا دیا۔ دروازہ کھولنے کے لیے اسے باہر کی طرف دھکا دیا لیکن دروازہ آدھے انچ سے زیادہ نہیں کھلا۔ میرے لیے یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز تھا کہ دروازے کے باہر کی طرف ایک آٹھ انچ چوڑا اور تقریباً ایک انچ موٹا تختہ لگا کر کیلیں ٹھونک دی گئی تھیں اور یہ کارروائی غالباً اس وقت کی گئی تھی جب کلب میں شائی وان نے مجھے باتوں میں لگا رکھا تھا۔

کچن کی ایک چھوٹی کھڑکی صحن کی طرف بھی کھلتی تھی اور اس کھڑکی میں بھی شعلے لپک رہے تھے۔ کچن میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ شائی وان گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ کھانستے کھانستے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ دھواں میرے پھیپھڑوں میں بھی داخل ہو رہا تھا۔ آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے کے علاوہ دھوئیں سے میرا سانس بھی گھٹنے لگا تھا۔

میں نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور کندھے سے دروازے پر ٹکریں مارنے لگا۔ چھ سات ٹکریں مارنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تختے کے ایک طرف کی کیلیں اپنی جگہ چھوڑ رہی ہیں۔

راہداری میں بچھے ہوئے قالین نے بھی آگ پکڑ لی تھی اور اس طرف سے بھی شعلے کچن میں پہنچ رہے تھے۔ شائی وان ایک دیوار کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ آگ کی تپش اور کھانسی سے وہ بد حال ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے پر ٹکریں مارنے کا عمل جاری رکھا اور بالآخر ایک طرف سے تختے نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ دروازہ کھل گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ شائی وان اپنی جگہ پر پڑے پڑے زمین پر اوندھ گئی تھی۔ اب وہ کھانس بھی نہیں رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے موت کے جال میں پھنسایا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے یہیں پڑا رہنے دوں۔ اس کی سزا یہی ہونی چاہیے کہ اسے جل کر راکھ ہونے دیا جائے لیکن میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا۔ میں نے جھک کر پہلے اسے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر کندھے پر اٹھا لیا۔ پیر کی ٹھوکر سے میں نے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور پھر باہر نِ... دی۔

لوگوں کا ہجوم مکان کے سامنے والے رخ پر تھا۔ شو... آوازیں اسی طرف سے آرہی تھیں۔ عقبی گلی میں بھی کچھ ... ہونے لگے تھے۔ میں دروازے سے باہر نکل کر دو تین قدم ... تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی اور اس کے ساتھ ... کندھے پر لدی ہوئی شائی وان کے جسم میں ہلکا سا جھٹکا ... تھا۔ اسے جسم کے کسی حصے میں گولی لگی تھی۔ میں رکے بغیر ... رہا اور پھر یکے بعد دیگرے دو فائر اور ہوئے لیکن یہ فائر ... سمت سے ہوئے تھے اور ان کا نشانہ میں نہیں تھا۔ یہ گولیاں ... شخص پر چلائی گئی تھیں جس نے مجھ پر فائر کیا تھا۔ فائرنگ ... سے گلی میں موجود لوگ اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے ... تیزی سے دوڑتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ... تھا۔

"اس طرف، اس گلی میں بھاگو۔" وہ ایک طرف اشارہ ... ہوئے چیخا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ میرا ہمدرد تھا۔ میں تیز ... دوڑتا ہوا اس تنگ سی گلی میں گھوم گیا۔ میں نے ایک ہاتھ ... شائی وان کو سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔

پچھلی گلی سے ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی اور ... کے ساتھ ہی ایک خوف ناک چیخ بھی گونجی تھی اور اس کے چ... سیکنڈ بعد میرا وہ ہمدرد دوڑتا ہوا اس گلی میں آگیا۔ گلی کے اگ... پر ایک ٹک ٹک کھڑا تھا۔

"جلدی بیٹھو۔" میرا ہمدرد چیختا ہوا ڈرائیونگ سیٹ پر ... گیا۔

میں نے پہلے بے ہوش شائی وان کو ٹک ٹک میں ڈالا اور خود بھی سوار ہو گیا۔ اس دوران میں ٹک ٹک اسٹارٹ ہو کر ... میں آچکا تھا۔

ابھی بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک تھا۔ ... ہمدرد بڑی مہارت اور تیز رفتاری سے ٹک ٹک چلا رہا تھا۔ ... آدھے گھنٹے بعد ہم کرسٹل ہوٹل کے قریب سے ہوتے ہوئے ... سانگ کمرو روڈ پر پہنچ گئے۔ ٹک ٹک ایک بہت بڑے بنگلے ... سامنے رکا۔ چند سیکنڈ بعد گیٹ کھلا اور ٹک ٹک اندر داخل ... میرا وہ ہمدرد بڑی پھرتی سے نیچے اترا اور کچھ چیختا ہوا ... طرف بھاگ گیا۔

میں نے نیچے اتر کر شائی وان کو اٹھانا چاہا تو ایک ... ہوا وہاں آگیا اور اس نے شائی وان کو کندھے پر اٹھا لیا۔ ... ریوالور سے چلائی ہوئی گولی اس کے کندھے کے قریب ... تھی۔ اگر اس کا بازو زد میں نہ آتا تو وہ گولی میری گردن ... جو شخص مجھے وہاں سے نکال کر لایا تھا، وہ گانگ تھا۔ ...

ماسٹر ہوچن نے میری نگرانی پر لگا رکھا تھا۔ اس نے واٹ سے نکلتے ہی میرا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ اس نے ٹک ٹک کا انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ کہیں آنے جانے کے لیے میں کسی ٹک ٹک یا ٹیکسی پر ہی سفر کروں گا اور پھر روز کلب سے جب میں ٹیکسی پر شائی وان کے ساتھ روانہ ہوا تو اسے شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے ٹک ٹک پر ہمارا تعاقب شروع کر دیا اور جب ہم گلی میں اس کاٹیج کے سامنے ٹیکسی سے اتر گئے تو اس نے اپنا ٹک ٹک گلی کے دوسری طرف روک لیا تھا۔ اس نے چی فانگ اور دوسرے لوگوں کو اس مکان میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ پھر کاٹیج کو آگ لگتے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ چی فانگ مجھے زندہ جلا دینا چاہتا ہے۔ وہ کاٹیج کے سامنے والے رخ سے میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس طرف چی فانگ اور اس کا ساتھی موجود تھے۔ وہ اپنا ٹک ٹک لے کر پچھلی گلی میں آگیا۔ اس طرف بھی چی فانگ کے دو آدمی موجود تھے جن میں سے ایک کو تو وہ گھسیٹتا ہوا ایک تاریک گلی میں لے گیا تھا اور اس کا گلا گھونٹ کر لاش گلی میں پھینک دی تھی اور جب دوبارہ اس گلی میں پہنچا تو اس وقت میں بے ہوش شائی وان کو کندھے پر لادے عقبی دروازے سے نکل رہا تھا۔ چی فانگ کے دوسرے آدمی نے مجھ پر گولی چلا دی تھی۔ اس موقع پر گانگ نے جوابی فائرنگ کر کے مجھے تحفظ فراہم کیا اور مجھے دوسری گلی میں بھیج کر فائرنگ کرتا ہوا چی فانگ کے آدمی کے پیچھے دوڑا تھا۔ چی فانگ کے آدمی کو گولی لگی تھی۔ گانگ کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ زندہ بچ گیا تھا یا مر گیا تھا۔ وہ بہر حال مجھے وہاں سے نکال لایا تھا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بنگلا کس کا تھا۔ شائی وان کو ایک میز پر لٹا دیا گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اس کے بازو کے زخم سے خون بہہ رہا تھا اور ایک آدمی اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جس طرح شائی وان کو طبی امداد دے رہا تھا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی ڈاکٹر تھا۔

گانگ دوسرے کمرے میں فون پر کسی سے بات کر رہا تھا پھر اس نے فون بند کر دیا اور مجھے لے کر باہر آگیا۔ پورچ میں ایک کار بھی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چند سیکنڈ بعد ہی کار بنگلے سے نکل کر تیز رفتاری سے مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ہمارے اس سفر کا اختتام اسی واٹ پر ہوا تھا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ مجھے واٹ کے سامنے کار سے اتار کر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

واٹ کے رہائشی حصے میں سناٹا تھا۔ بعض کمروں میں روشنی ہو رہی تھی مگر دروازے بند تھے۔ کچھ بھکشو رات کو دیر تک اپنی مذہبی کتب کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ میرا کمرا اوپر والی منزل پر تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر دبے قدموں گیلری میں چلتا ہوا اپنے کمرے کے سامنے پہنچا تو دروازہ بند تھا مگر اندر روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

تھائی وانگ میرے بستر پر سو رہی تھی۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور کرسی پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا اور پھر ہلکی سی آہٹ سن کر تھائی وانگ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ کہنیاں ٹیکتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے بہت تھکی ہوئی ہو۔ چہرہ ستا ہوا تھا، میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ شاید نیند کی وجہ سے وہ ست ہو رہی تھی۔

"یہ..... یہ تمہارا حلیہ کیا ہو رہا ہے۔" وہ جیسے چونک گئی "کوئی گڑبڑ.....؟"

میں جواب دینے کے بجائے اٹھ کر آئینے میں دیکھنے لگا۔ میری فرنچ کٹ داڑھی غائب تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ لباس اور چہرے پر دھوئیں کے کچھ اثرات بھی نظر آرہے تھے۔ چہرے پر ایک دو جگہ سیاہ دھبے سے نظر آرہے تھے۔ دونوں ہاتھوں پر بھی دھبے تھے۔

"اوہ۔" میں نے کہا "ہاں گڑبڑ ہو گئی تھی۔ چی فانگ نے ایک کاٹیج میں مجھے زندہ جلانے کی کوشش کی تھی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔

"وہ لڑکی کہاں ہے؟" تھائی وانگ نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"اس بنگلے میں جہاں گانگ مجھے لے کر گیا تھا۔" میں نے جواب دیا "مجھے پتا نہیں وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے لیکن میرے خیال میں اگر وہ زندہ ہے تو اس سے چی فانگ اور ٹائیگر وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے اس لڑکی کے بارے میں مہاراج کو اطلاع دی گئی ہوگی۔" تھائی وانگ نے کہا "اگر وہ زندہ بچ گئی تو مہاراج کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔"

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے کمرے سے نکل کر دیکھا تو تین چار آدمی سیڑھیوں پر آرہے تھے۔ ان میں سب سے آگے ماسٹر ہوچن تھا۔ جسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس وقت اس کی آمد بلا مقصد نہیں ہو سکتی تھی۔

ماسٹر ہوچن جیسے ہی قریب پہنچا، میں نے اسے بو کیا اور کمرے میں داخل ہونے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ ماسٹر ہوچن کمرے میں آگیا جبکہ باقی آدمی باہر ہی رک گئے تھے۔ ماسٹر ہوچن میرے سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا پھر وہ میرے دونوں بازو پکڑ کر مسلز ٹٹولنے لگا۔

"بہت خوب!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں نے اس کی آواز میں ہلکا سا طنز محسوس کر لیا تھا "مجھے خوشی ہے کہ تم میں اتنی ہمت اور اتنا حوصلہ تو پیدا ہوا کہ کسی کو للکار سکو۔ تم نے کچھ داؤ پیچ بھی سیکھ لیے ہیں اور تمہارے بازوؤں میں اتنی طاقت بھی ہے کہ بیک وقت دو تین حریفوں کا مقابلہ کر سکو لیکن تمہارا یہ اپر چیمبر بالکل خالی

ہے۔" اس کا اشارہ میرے سر کی طرف تھا "طاقت کے ساتھ کھوپڑی بھی استعمال کرنی پڑتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عقل سے بالکل عاری ہوگئے ہو۔ شہر میں گھومنے پھرنے کی حد تک تو معاملہ ٹھیک تھا لیکن شیروں کی کچھار میں گھس کر تم نے بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ میں نے شیروں کی کچھار کے الفاظ اس لیے استعمال کیے ہیں کہ اپنے گھر میں بلی بھی شیر بن جاتی ہے۔ روز کلب ٹائیگر کا سب سے مضبوط گڑھ ہے اور تم اکیلے وہاں گھس گئے تھے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "میں تمہارے جذبات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں دوست لیکن اس طرح کی حماقتیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اپنے دشمن کو کبھی بھی کمزور یا بے وقوف مت سمجھو۔ ٹائیگر اور چی فانگ جیسے دشمن پر وار کرنے سے پہلے پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہم نے تم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمہارا انتقام ضرور لیں گے۔ کیا مہاراج نے تم سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمہیں اس قابل بنا دیں گے کہ تم خود اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرسکو۔ اس میں شبہ نہیں کہ تمہیں اس قابل بنا دیا گیا ہے کہ تم کسی حریف کا مقابلہ کرسکو لیکن اس میں تجربے کی ضرورت ہے جو ابھی تمہارے پاس نہیں ہے۔ اس طرح ان کا سامنا کرکے تم اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ مہاراج تمہارے بارے میں کس قدر فکر مند رہتے ہیں۔ اگر ہم سے ایسی غلطی ہوئی ہوتی تو مہاراج ہماری کھال کھنچوا دیتے لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ مہاراج تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں کچھ بنانا چاہتے ہیں اس لیے تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو سمیٹ کر رکھو۔ جب مناسب وقت آئے گا تو ہم خود تمہیں آگے کریں گے۔ یہ مہاراج کا حکم ہے کہ اب تم اجازت کے بغیر اس واٹ سے باہر نہیں نکلو گے۔"

میں خاموش کھڑا ماسٹر ہوچن کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ اگر میں نے اس موقع پر اپنی من مانی شروع کردی تو نقصان میرا ہی ہوگا۔ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا اور پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ میری ان حرکتوں کی وجہ سے مہاراج اپنا ہاتھ کھینچ لے اور میں اکیلا رہ جاؤں۔ میں نے ماسٹر ہوچن سے وعدہ کرلیا کہ آئندہ اجازت کے بغیر اس واٹ سے باہر نہیں نکلوں گا۔

ماسٹر ہوچن نے دروازے کی طرف رخ کرکے کسی کو آواز دی۔ ایک آدمی فوراً ہی اندر آگیا۔ ماسٹر نے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ وہ آدمی مجھے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے گیا اور گیلری میں فرش پر بٹھا کر قینچی سے میرے بال کاٹنے لگا۔ میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے سر پر اس طرح قینچی چلاتا رہا جیسے دنبے کے بال اتارے جاتے ہیں۔

ماسٹر ہوچن مجھے مزید ہدایات دینے کے بعد چلا گیا۔ میں جب کمرے میں داخل ہوا تو تھائی وانگ مجھے دیکھ کر بے اختیار قہقہے لگانے لگی اور میں نے جب آئینہ دیکھا تو میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردوں۔ میرا سر ایسا تھا جیسے بنجر زمین پر ہل چلا دیا گیا ہو۔

اس دن کے بعد میں کئی روز تک واٹ سے باہر نہیں نکلا۔ معمول کے مطابق دن گزرتے رہے لیکن اس دوران میں میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ تھائی وانگ روز بروز کاہل اور سست ہوتی جارہی تھی۔ کبھی تو وہ بے جان سی پڑی رہتی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی نظر آنے لگے تھے۔ جب ہم کیمپ سے روانہ ہوئے تھے تو ماسٹر ہانگ سو نے تھائی وانگ کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی ایکسرسائز جاری رکھے۔ یہاں آکر وہ چند روز تک تو یہ ایکسرسائز کرتی رہی تھی پھر اس میں ناغے ہوتے چلے گئے اور اب تو کئی روز سے اس نے ایکسرسائز نہیں کی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ سستی اور کاہلی ایکسرسائز نہ کرنے کا نتیجہ تھا۔ وہ جب تک ایکسرسائز کرتی رہی تھی، اس نے ایک بار بھی اذیت پہنچانے کی بات نہیں کی تھی لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ کسی بھی وقت مجھ سے ایسی فرمائش کرسکتی تھی۔

میں نے ایک بات خاص طور سے یہ بھی نوٹ کی تھی کہ وہ روزانہ شام کے وقت خانقاہ کے اس حصے میں چلی جاتی تھی جہاں زائرین آیا کرتے تھے۔ میں اس وقت بھکشوؤں کو ٹریننگ دینے میں مصروف رہتا تھا اس لیے کبھی یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ اس طرف کیوں جاتی ہے۔ کبھی تو واپس آنے کے بعد وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند نظر آنے لگتی اور کبھی اس کے چہرے پر بے پناہ مایوسی دکھائی دیتی۔

اور پھر ایک روز وہ آدھی رات کو مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس نے دروازہ بند کردیا اور بستر کے نیچے چھپائی ہوئی ایک لچک دار چھڑی میری طرف پھینک دی اور قمیص اتار کر بستر پر اوندھی لیٹ گئی۔ میرے پاس اس کی پٹائی کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ پٹتی رہی اور سسکاریاں بھرتی رہی اور پھر میں اسے چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

چند روز اور گزر گئے۔ عام طور پر پٹنے کے بعد تھائی وانگ چند روز تک ہشاش بشاش اور چاق و چوبند رہتی تھی لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر افسردہ اور مضمحل سی رہنے لگی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے مزید گہرے ہوگئے تھے اور گال پچکے ہوئے سے محسوس ہونے لگے۔ میں اس کے لیے فکر مند ہونے لگا۔ وہ بڑی حسین عورت تھی لیکن اس کا حسن غارت ہونے لگا تھا۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اسے اپنا گزرا ہوا وقت یاد آرہا ہے۔ وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی لیکن میری وجہ سے اس کا سب کچھ ختم ہوگیا اور اب وہ ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی دوسروں کی محتاج تھی۔ اس کی آزادی سلب ہوکر رہ گئی تھی۔ وہ ہر وقت کے گرگے موت کے فرشتوں کی طرح اس کی تاک میں تھے۔ [illegible]

نکلتے ہی ماری جائے گی اور شاید یہی غم اسے اندر ہی اندر کھائے جارہا تھا۔ ایک روز میں نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو وہ ٹال گئی۔ اس سے اگلے روز میں نے اسے عجیب سی کیفیت میں دیکھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ بار بار اپنی انگلیاں منہ میں ڈال کر ہولے ہولے دانتوں میں چبا رہی تھی۔ کبھی وہ اپنے جسم پر چٹکیاں کاٹنے لگتی۔

"کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔ سردی لگ رہی ہے۔ تم جاؤ۔ میں چادر اوڑھ کر سو جاؤں گی تو ٹھیک ہو جاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔

میں اپنے کمرے میں آگیا لیکن تھائی وانگ کا خیال ذہن سے نہیں نکال سکا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بدھ کو ماسٹر ہوچن آئے گا تو اس سے بات کروں گا۔

اس روز شام کو جب میں رنگ میں اپنے شاگردوں کو پریکٹس کرا رہا تھا تو میں نے تھائی وانگ کو واٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آئی تھی اور سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے اسے دوبارہ دیکھا تو وہ بڑی حد تک چاق و چوبند نظر آئی تھی۔ تھائی وانگ کی اس تبدیلی پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اس رات میں دیر تک اس کے کمرے میں رہا۔ وہ بہت چہک چہک کر باتیں کرتی رہی تھی۔

صبح جب میں اس کے کمرے میں گیا تو وہ موجود نہیں تھی۔ شاید وہ باتھ روم گئی ہوئی تھی۔ باتھ رومز گیلری کے آخر میں بنے ہوئے تھے۔

میں اس کے بیڈ پر نیم دراز ہوگیا اور تکیہ اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں چونک گیا۔ تکیے کے نیچے پلاسٹک کی دو پڑیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں سفید رنگ کا کوئی پاؤڈر تھا۔ ایک پڑیا کھلی ہوئی تھی اور دوسری بند تھی۔ اس میں پاؤڈر کی مقدار دو گرام سے زیادہ نہیں ہوگی۔ میں نے کھلی پڑیا وہیں رہنے دی اور پیک شدہ پڑیا اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ تکیے کو اس کی جگہ پر رکھا اور بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

میرا خیال تھا وہ کوئی دوا تھی جو تھائی وانگ استعمال کر رہی تھی لیکن اس نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا تھا کہ وہ کوئی دوا استعمال کر رہی ہے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

میں نے ہیروئن کبھی دیکھی نہیں تھی صرف نام سنا تھا۔ جنگل والے کیمپ میں بھکشوؤں سے یہ بھی سنا تھا کہ ہیروئن کا نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ اچھے بھلے صحت مند آدمی کو چند روز کے اندر اندر نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ نشہ باز کو ہیروئن نہ ملے تو وہ مردوں کی طرح پڑا رہتا ہے۔ بھوک نہیں لگتی۔ جسم ٹوٹنے لگتا ہے اور وہ اپنے آپ کو نوچنے لگتا ہے۔

میرا دماغ چکرانے لگا۔ کئی روز سے میں تھائی وانگ کو اسی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ کھانے سے اسے کوئی رغبت نہیں رہی تھی۔ اسے میں نے اکثر مردوں کی طرح پڑے دیکھا تھا۔ اس کے گال پچک گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنستی جارہی تھیں۔ ایک روز پہلے میں نے اسے اپنی انگلیاں چباتے اور اپنے آپ کو نوچتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر شام کے بعد جب وہ باہر کا چکر لگا کر آئی تھی تو اس کے ایک گھنٹے بعد وہ بڑی حد تک نارمل نظر آئی تھی۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کیا تھائی وانگ ہیروئن استعمال کرنے لگی تھی۔ اسے یہ ہیروئن کون لا کر دیتا تھا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

تھائی وانگ سے میری ملاقات اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ میں نے ظاہر ہی نہیں کیا کہ اس کے کمرے میں گیا تھا اور پھر اس روز میں نے ایک بوڑھے بھکشو کو الگ لے جا کر وہ پڑیا دکھائی تو یہ تصدیق ہوگئی کہ یہ ہیروئن ہی تھی۔

یہ تصدیق ہو جانے کے بعد میں اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ تھائی وانگ کو یہ عادت کیسے لگی تھی اور وہ ہیروئن کہاں سے لیتی تھی پھر میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا۔ وہ روزانہ شام کو خانقاہ کی طرف جاتی تھی۔ شاید اسی طرف وہ کسی سے ہیروئن لیتی تھی۔

شام کے بعد میں تھائی وانگ کے کمرے میں گیا تو عجیب صورت حال نظر آئی۔ کمرے کی ہر چیز بکھری ہوئی نظر آئی۔ بستر الٹا ہوا تھا۔ تکیے کا غلاف بھی الگ پڑا تھا۔

"کیا ہوا۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ کچھ کھو گیا ہے کیا؟" میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوں.... نہیں.... کک.... کچھ نہیں...." وہ گڑبڑا سی گئی۔

"تو پھر یہ سب کیا ہے؟" میں نے بکھری ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"او۔ کچھ نہیں۔ ایسے ہی.... پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔" وہ چیزیں اٹھا کر اِدھر اُدھر پھینکنے لگی۔

میں اسے پکڑ کر باہر لے آیا۔ میرا خیال تھا تازہ ہوا میں اس کی کیفیت کچھ سنبھل جائے گی لیکن اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔

دوسرے روز شام کو وہ خانقاہ کی طرف گئی تو میں نے اسی بوڑھے بھکشو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اٹھ کر تھائی وانگ کے پیچھے چل پڑا۔ تھائی وانگ آدھے گھنٹے بعد واپس آئی اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بوڑھا بھکشو بھی واپس آگیا۔

"تمنگ چو۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "وہ گیٹ کے جنگلے کے ساتھ کھڑا ہے۔ اس کے پاس کچھ اور لوگ بھی آرہے

ہیں۔ تھائی وانگ نے اسی سے کوئی چیز لی تھی جسے وہ اپنے لباس میں چھپا کر واپس آگئی۔"

میں اچھل پڑا۔ تھنگ چو وہی بھکشو تھا جسے میں نے جنگل والے کیمپ کے مقابلے میں ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ میں تو اسی رات مہاراج کے ساتھ کیمپ سے واپس آگیا تھا اور بعد میں پتا چلا تھا کہ دوسرے روز تھنگ چو نے بھی طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کیمپ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے دو تین روز بعد میں نے اسے ایک مرتبہ اس خانقاہ میں بھی دیکھا تھا۔

"وہ بڑا کینہ پرور اور کمینہ آدمی ہے۔" بوڑھا بھکشو کہہ رہا تھا "مجھے یاد ہے۔ اسے کم از کم دو مرتبہ مہاراج سے سزا بھی مل چکی ہے۔ سنا ہے تم نے کیمپ میں اسے بڑی عبرت ناک شکست دی تھی۔ تھائی وانگ بھی تو وہاں تھی۔ ہو سکتا ہے یہ عادت اسے وہیں سے پڑی ہو۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "میں سمجھ گیا معاملہ کیا ہے۔ اب تم ایک اور کام کرو۔ تم ابھی اور اسی وقت ماسٹر ہوچن کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کہو کہ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں اور ایک بات ذہن میں رکھنا۔ کسی کو اس بات کا پتا نہ چلے۔"

بھکشو چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ تھنگ چو واقعی بہت کمینہ اور کینہ پرور ثابت ہوا تھا۔ وہ اپنی شکست کو نہیں بھولا تھا۔ میں تو اس مقابلے کو کھیل ہی سمجھا تھا لیکن اس نے مقابلے کے دوران میں بھی کچھ اس طرح سے مجھ پر حملے کیے تھے جیسے حقیقی لڑائی لڑ رہا ہو اور مجھے ہر قیمت پر شکست دینا چاہتا ہو اور جب میرے ہاتھوں ناک آؤٹ ہوا تو اسے اپنی توہین سمجھا۔ اس نے دوسرے ہی روز کیمپ چھوڑ دیا۔ وہ شاید مجھ سے بدلہ لینے کے لیے موقع کی تاک میں تھا۔ مجھ پر وار کرنے کا تو موقع نہیں مل سکا البتہ تھائی وانگ اس کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے تھائی وانگ کو ہیروئن کا عادی بنا دیا۔ اس طرح وہ مجھ سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔

میں ذہنی طور پر اس قدر اپ سیٹ ہو چکا تھا کہ میں نے کلاس ڈس مس کر دی اور اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ تھائی وانگ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں رک گیا۔ دروازہ بند تھا اور اندر بتی جل رہی تھی۔ یہ دو پٹ کا دروازہ تھا۔ تختوں میں بہت معمولی سی جھری تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو کانپ اٹھا۔ تھائی وانگ بیڈ پر مردوں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں بازو اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ سانس تیز ہونے کی وجہ سے اس کے سینے کا زیر و بم دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ بیڈ کے قریب چھوٹی میز پر چاندی جیسے کاغذ کا ایک ٹکڑا پلاسٹک کی اسٹرا جیسی ایک نلکی، ماچس اور سفید پلاسٹک کی ایک پڑیا پڑی ہوئی تھی۔

میں نے دروازے کو دھکا دیا۔ اندر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔ میں نے دستک دینے کے ساتھ ہی جھری سے آنکھ لگا دی۔ تھائی وانگ بمشکل بیڈ سے اٹھی۔ اس نے پلاسٹک والی پڑیا اٹھا کر تکیے کے نیچے چھپا دی۔ دوسری چیزیں بیڈ کے نیچے پھینک دیں اور دروازہ کھول کر دوبارہ بیڈ پر جا گری۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کیا ہوا تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے سونے دو۔ جاؤ۔ تم بھی سو جاؤ۔" تھائی نے جواب دیا۔ اس کی آواز گہرے کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"تھائی وانگ۔" میں کرسی کھینچ کر اس کے قریب بیٹھ گیا "اب مجھ سے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا چل گیا ہے تمہاری یہ حالت کیوں اور کیسے ہوئی۔ تم جو زہر اپنے خون میں شامل کر رہی ہو، وہ تمہیں آہستہ آہستہ موت کی طرف لے جا رہا ہے لیکن میں تمہیں اس طرح مرنے نہیں دوں گا۔"

"تت..... تم جھوٹ بولتے ہو..... مم..... میں..... میں نے کوئی زہر نہیں پیا۔" اس نے رک رک کر جواب دیا۔ ہیروئن کا نشہ اپنا اثر دکھا رہا تھا۔

"یہ..... یہ کیا ہے؟" میں نے تکیے کے نیچے سے پڑیا نکال لی "کیا تم نہیں جانتیں کہ یہ ایسا زہر ہے جو ایک دن تمہیں موت کی نیند سلا دے گا۔ جس روز تھنگ چو نے تمہیں پڑیا دی تھی تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تمہیں ہیروئن کا عادی بنا کر موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔ بولو۔ جواب دو۔"

"تو..... م..... کون ہوتے ہو..... مجھ سے..... پوچھنے والے۔ ہاں....."

میں نے اسے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا اور اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ دوبارہ بیڈ پر گر گئی۔ اُسے تھپڑ مارنے کا افسوس بھی ہوا۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھی اور میں جانتا تھا کہ جب وہ ہوش میں آئے گی تو اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرے گی۔

"مجھے..... سونے دو..... جاؤ..... تم جاؤ۔" وہ رک رک کر بولی۔

میں نے اس کا تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ کھلی ہوئی پڑیا کے علاوہ ایک اور پیک شدہ پڑیا بھی تھی۔ میں نے دونوں پڑیاں جیب میں ڈال لیں۔ بیڈ کے نیچے سے ماچس، اسٹرا اور وہ کاغذ بھی نکال لیا جو فوائل پیپر تھا جو درمیان میں دونوں طرف سے کالا ہو رہا تھا۔ یہ چیزیں لے کر کمرے سے باہر آگیا اور دروازہ بھیڑ کر بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔ یہ بلاک کچھ اس طرح بنا ہوا تھا کہ اوپر دونوں طرف زینے تھے اور کمروں کے سامنے تقریباً چار فٹ چوڑی لمبی بالکونی تھی۔ اس طرح کسی کمرے تک پہنچنے کے لیے کسی بھی زینے سے آیا جا سکتا تھا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد ماسٹر ہوچن آگیا۔ اس کے ساتھ وہ بوڑھا بھکشو بھی تھا جسے میں نے بھیجا تھا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہیروئن کی پڑیاں اور اسٹرا وغیرہ اس کے حوالے کر دیے۔

اندر آکر ماسٹر ہوچن نے تھائی وانگ کو دیکھا۔ وہ اس وقت بالکل بے سدھ پڑی تھی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" ماسٹر ہوچن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ٹھیک ہو جائے گی لیکن ہمیں کل ہی تھنگ چو کا بندوبست کرنا ہو گا۔ میں تھائی وانگ کو لے جا رہا ہوں۔ کل دن میں کسی وقت تم سے ملوں گا۔" اس نے بوڑھے بھکشو کو اشارہ کیا۔

بھکشو آگے بڑھا تو میں نے اسے اشارے سے روک دیا اور خود آگے بڑھ کر تھائی وان کو کندھے پر اٹھا لیا۔ چند روز پہلے تک وہ بڑی صحت مند عورت تھی لیکن ہیروئن کے استعمال نے اسے کھوکلا کر دیا تھا۔ اس کا وزن آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں اسے لے کر سیڑھیوں سے اترا تو کچھ اور بھکشو بھی اس طرف آگئے تھے اور حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

بوڑھے بھکشو نے عقبی دروازہ کھول دیا۔ باہر گلی میں ماسٹر ہوچن کی وین کھڑی تھی۔ میں نے تھائی وانگ کو وین میں ڈال دیا۔ ماسٹر کے اشارے پر وہ بوڑھا بھکشو بھی وین میں بیٹھ گیا۔ ماسٹر ہوچن نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

وین حرکت میں آکر دور ہوتی چلی گئی اور میں وہیں کھڑا اس کی عقبی سرخ بتیوں کو دیکھتا رہا۔ میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

وہ شام کا وقت تھا۔ واٹ میں اس وقت زائرین کا ہجوم تھا۔ اس وقت اس آہنی جنگلے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا جس میں مہاتما بدھ کا سونے کا مجسمہ نصب تھا۔ خالص سونے کا یہ ٹھوس استادہ مجسمہ تقریباً آٹھ فٹ بلند تھا اور اس کا محیط اتنا تھا کہ میں اسے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں نہیں لے سکتا تھا۔ اس مجسمے کی تیاری میں کئی من سونا استعمال ہوا تھا۔

میں اور ماسٹر ہوچن گیٹ سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے ہم تو گیٹ کے آس پاس تمام لوگوں کو دیکھ سکتے تھے لیکن ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ماسٹر ہوچن نے اپنے کچھ آدمی گیٹ کے اندر اور باہر پھیلا رکھے تھے۔ بتیاں جلے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹا ہو چکا تھا اور وہاں روشنی اتنی تھی کہ اگر سوئی بھی گرتی تو اسے آسانی سے تلاش کیا جا سکتا تھا۔

اور پھر وہ نظر آگیا، تھنگ چو۔ اس نے بھکشوؤں والا گیروے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ گلے میں کپڑے کا ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ وہ گیٹ سے کچھ فاصلے پر دیوار کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اکا دکا لوگ اس کے قریب آکر رکتے۔ ہاتھ ملاتے اور پھر الگ ہو جاتے۔

ماسٹر ہوچن نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے ایک طرف چلا گیا اور پھر چند منٹ بعد ہی دو آدمی تھنگ چو کے قریب پہنچ گئے۔ تھنگ چو نے شاید ان میں سے کسی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال کر ہوائی فائر کر دیا اور ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی مگر وہ دونوں آدمی اس سے لپٹ گئے اور چند سیکنڈ کے اندر ہی وہاں پانچ چھ آدمی اور پہنچ گئے۔ تھنگ چو کے ہاتھ سے پستول چھن چکا تھا۔ اسے گھیرنے والے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر رہے تھے۔

فائر کی آواز سے وہاں بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ زائرین خوف زدہ ہو کر ادھر اُدھر بھاگنے لگے لیکن جب پتا چلا کہ فائر کرنے والا پکڑا گیا ہے تو لوگ پُرسکون ہو گئے۔ اسی دوران میں ایک بند وین وہاں آکر رکی۔ تھنگ چو کو اٹھا کر وین میں ڈال دیا گیا اور وین تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ صورتِ حال معمول پر آگئی تھی ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔

"میرے ساتھ آؤ۔" ماسٹر ہوچن نے کہتے ہوئے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں واٹ کے اندر آگئے اور مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک بوڑھا راہب آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ وہ بوڑھا اس قدر کمزور اور دُبلا پتلا تھا کہ اس کی ہڈیاں واضح طور پر گنی جا سکتی تھیں۔ ماسٹر ہوچن نے مؤدبانہ لہجے میں کچھ کہا۔ بوڑھے نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سیدھا ہاتھ آشیرباد دینے والے انداز میں اوپر اٹھا دیا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں عجیب مقناطیسی کشش تھی۔ کوشش کے باوجود میں اس سے نظریں نہیں چُرا سکا تھا۔ بوڑھا براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں اور پھر اچانک مجھے یوں لگا جیسے سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہو۔ صرف وہ دو آنکھیں تھیں جو مجھے اپنے سامنے نظر آ رہی تھیں۔

پھر اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ بوڑھے نے میرے چہرے سے نظریں ہٹا لی تھیں۔ میں شاید ایک لمحے کو کہیں گم ہو گیا تھا۔ میں نے سر جھٹکتے ہوئے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ اب میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ ماسٹر ہوچن سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اگرچہ تھائی زبان اب اچھی طرح بول اور سمجھ لیتا تھا لیکن وہ بوڑھا نجانے کس زبان میں بات کر رہا تھا۔ ایک بھی لفظ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔

ماسٹر ہوچن نے مجھے اشارہ کیا تو میں اٹھ گیا۔ میرے دماغ میں اب بھی دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کمرے سے نکل کر راہداریوں میں چلتے ہوئے بھی میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ دو آنکھیں میرا

تعاقب کر رہی ہیں۔

ماسٹر ہوچن دوبارہ میرے کمرے میں آگیا اور دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مجھے اس بوڑھے کے پاس کیوں لے کر گیا تھا۔ وہ بوڑھا بھی بڑا پُراسرار ثابت ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے جسم پر ابھی تک چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں اور دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔

بدھ مت کے پیروکاروں کے بارے میں وقتاً فوقتاً بڑے عجیب وغریب اور حیرت انگیز انکشافات ہوتے رہتے تھے۔ مہاتما بدھ نے دنیا کو تج کر بڑی کٹھن زندگی گزاری تھی ان کا زیادہ وقت ریاضت اور فاقوں میں گزرا۔ ان کے پیروکار بھی ایسی باتوں کو ترجیح دیتے تھے جن سے نفس پر قابو پانے میں مدد ملتی ہو۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ریاضت اور روحانیت سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ دنیا بھر کی دولت خرچ کرکے بھی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ میں نے بڑی بڑی ہستیوں کو زندگی کے کٹھن ترین مرحلوں سے گزرتے دیکھا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح سونا بھٹی میں تپ کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح انسان کی روح بھی ریاضت اور نفس کشی کے مرحلے سے گزر کر نکھر جاتی ہے۔

میں نے مہاراج وانگ ونگ یائے کو بھی دیکھا۔ جو پتھر پر سوتا تھا اور اب یہ پُراسرار بوڑھا جو زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ان کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ اپنے لیے دنیا کی ہر آسائش مہیا کرسکتے تھے لیکن یہ فاقے کرتے اور کھردری زمین پر سوتے تھے۔

میں ماسٹر ہوچن سے اس بوڑھے کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن دل کی بات زبان پر نہ لاسکا اور نہ ہی ماسٹر ہوچن نے خود کچھ بتایا۔ وہ اور باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ شائی وان بچ گئی تھی۔ وہ اگرچہ مجھے مروانے کی سازش میں شریک تھی مگر اسے چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ جہاں چاہے جاسکتی ہے لیکن اس نے جانے سے انکار کردیا تھا۔ شائی وان کا کہنا تھا کہ چونکہ ٹائیگر نے اسے بھی زندہ جلا دینے کی کوشش کی تھی اس لیے اب وہ اس کے پاس واپس نہیں جائے گی بلکہ اسے ڈر تھا کہ اگر وہ واپس گئی تو ٹائیگر اسے مروا دے گا۔ وہ اسی بنگلے میں رہ رہی تھی اور اس نے ٹائیگر اور چی فانگ کے بارے میں کچھ سنسنی خیز انکشافات بھی کیے تھے مگر مہاراج نے ابھی تک ٹائیگر کے خلاف کسی کارروائی کا حکم نہیں دیا تھا۔

میں تھائی وانگ کے بارے میں زیادہ فکرمند تھا۔ ماسٹر ہوچن نے مجھے تسلی دی کہ وہ ٹھیک ہوجائے گی تاہم اس کے علاج اور مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کئی دن لگیں گے۔

ماسٹر ہوچن کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ اس رات میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ میں تھائی وانگ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ میری محسنہ تھی اور مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اس نے مجھے اِس وقت پناہ دی تھی جب موت کے ہرکارے میرے تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو مجھے ان لوگوں کے حوالے کرکے نہ صرف اپنے آپ کو بچا سکتی تھی بلکہ انعام بھی حاصل کرسکتی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو لٹا دیا۔ وہ خود برباد ہوگئی لیکن مجھے بچا کر لے آئی۔ ٹھاٹ کی زندگی بسر کرنے والی عورت میرے ساتھ خوف کے سائے میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہی تھی۔

یہ تو میں سمجھ گیا تھا کہ مجھ سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تھنگ چو نے کسی طرح تھائی وانگ کو اپنے جال میں پھنسا کر ہیروئن کا عادی بنا دیا تھا لیکن میرے خیال میں بات یہیں تک محدود نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے خلاف کوئی بڑی سازش تیار کی گئی تھی جس میں تھنگ چو شامل تھا۔ تھنگ چو اب ماسٹر ہوچن کے قبضے میں آگیا تھا۔ وہ معلوم کرلے گا کہ اصل قصہ کیا ہے؟

تھائی وانگ نے آج تک میرے لیے جو کچھ کیا تھا میں اسے زندگی کے آخری لمحوں تک نہیں بھول سکتا تھا۔ میری زندگی اس کی مرہونِ منت تھی۔ میرے اور تھائی وانگ کے بیچ ایک ایسا رشتہ استوار ہوچکا تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا تھا اور شاید یہ وہی انجانا رشتہ تھا جس نے مجھے اس قدر جذباتی کردیا تھا اور میں نے اس کے منہ پر تھپڑ بھی مار دیا تھا۔ ماسٹر ہوچن نے اگرچہ مجھے تسلی دی تھی کہ وہ ٹھیک ہوجائے گی۔ لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر تھائی وانگ کو کچھ ہوگیا تو میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا جو اس کے ذمے دار تھے۔

تھائی وانگ کے بارے میں سوچتے ہوئے میری ذہنی رو بھٹک گئی اور اب میں اس پُراسرار بوڑھے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کون تھا اور ماسٹر ہوچن مجھے اس کے پاس کیوں لے کر گیا تھا اور ان دونوں نے آپس میں کیا باتیں کی تھیں۔

اس رات میں تقریباً جاگتا ہی رہا تھا۔ کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا اور کبھی اٹھ کر باہر آجاتا۔ صبح چار بجے کے قریب میں بستر پر لیٹا تھا اور نیند مجھے اس وقت آئی تھی جب صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔

میں صبح اور شام کو ٹریننگ کلاس لیا کرتا تھا لیکن اس روز پڑا سوتا رہا اور کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ میری آنکھ گیارہ بجے کے قریب کھلی تھی اور پھر میرا سارا دن بوریت اور بیزاری میں گزرا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ ماسٹر ہوچن کی طرف سے تھائی وانگ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور نہ ہی تھنگ چو کے بارے میں کچھ پتا چلا تھا۔ میں تھائی وانگ کے بارے میں پریشان تھا۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی۔

اور پھر اس رات آٹھ بجے کے قریب ماسٹر ہوچن کا آدمی گانگ آگیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں وات کے اس حصے سے باہر نکلے جہاں زائرین کی آمد و رفت تھی۔ مرکزی گیٹ کے بائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ٹک ٹک کھڑا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر

انجن اسٹارٹ کیا اور پھر وہ ٹک ٹک تیز رفتاری سے مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگا۔

گانگ مجھے راما سکس روڈ پر واقع راما تھیبوڈی اسپتال لے آیا۔ راستے میں گانگ نے بتایا کہ یہ ٹک ٹک اس کا ہے۔ یہی اس کی روزی کا وسیلہ ہے۔ وہ دو سال پہلے شوقیہ طور پر موئے تھائی سیکھنے کے لیے مہاراج کے جمنازیم میں آیا تھا اور اپنی کارکردگی کی بنا پر بہت جلد ماسٹر پھو کے مقربین میں شامل ہوگیا۔ ماسٹر پھو کے بعد اب وہ ماسٹر ہوچن کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔

اسپتال کی دوسری منزل پر ایک راہداری کے آخری کمرے کے سامنے رک کر گانگ نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی پھر ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا اور میرے لیے راستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ بھی میرے پیچھے ہی اندر داخل ہوگیا اور دروازہ بند کردیا۔

میں دو قدم آگے بڑھ کر رک گیا تھا۔ سامنے ہی بیڈ پر تھائی وانگ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر ہلکے نیلے رنگ کی ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ بیڈ کے قریب ہی کرسی پر نرس بیٹھی تھی۔

تھائی وانگ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک نمی آئی اور پھر آنسو اس کے رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ اس نے نظریں جھکالیں۔ میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس لعنت پر قابو پالیا گیا تھا جو اسے بتدریج موت کی طرف لے جارہی تھی۔ موت کا یہ سفر ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا اور اس کے راستے میں بند باندھ دیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ دھبے غائب ہورہے تھے۔ پچکے ہوئے گال بھی اب کچھ بھرے بھرے سے لگ رہے تھے اور ان میں کچھ سرخی نظر آنے لگی تھی۔

"تھائی وانگ!" میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

تھائی وانگ نے جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اشک بار آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ میں نرس اور گانگ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ تھائی وانگ والہانہ انداز میں میرے گالوں اور پیشانی پر بوسے دے رہی تھی اور میں کچھ عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔

"سوری وجدان۔" وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی "دراصل میں....."

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے "تمہیں احساس ہوگیا ہے یہی کافی ہے۔"

میں تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں ڈاکٹر بھی ایک مرتبہ کمرے میں آچکا تھا۔ اس نے بتایا کہ تھائی کو کم از کم دو ہفتے اور اسپتال میں رہنا پڑے گا۔ تھائی سے مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ تاہم وہ جب بھی اس موضوع کی طرف آتی' میں اسے ٹوک دیتا۔

اسپتال سے باہر آتے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا کہ ماسٹر ہوچن کے کچھ آدمی مختلف حلیوں میں اِدھر اُدھر موجود تھے اور یقیناً اسپتال کے اندر بھی کوئی موجود ہوگا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تھائی وانگ کو لاوارث نہیں چھوڑا گیا تھا۔

گانگ کا ٹک ٹک سڑک کے دوسری طرف پارکنگ لاٹ پر کھڑا تھا۔ ہم سڑک پار کر رہے تھے کہ گانگ اس طرح رک گیا جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"تم چل کر ٹک ٹک میں بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔" گانگ نے کہا اور مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دوبارہ اسپتال میں داخل ہوگیا۔ پارکنگ میں داخل ہوکر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑا کسی ادھیڑ عمر عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ عورت اسپتال کی یونی فارم پہنے ہوئے تھی اور ظاہر ہے اسپتال کی ملازمہ ہی تھی۔ میں ٹک ٹک کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ ابھی مجھے وہاں کھڑے ہوئے چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ پارکنگ میں کھڑی ہوئی کاروں میں کہیں سے نکل کر آیا تھا اور اس کا رخ میری ہی طرف تھا اور پھر دوسری طرف سے بھی ایک آدمی نمودار ہوا۔ اب مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کون تھے۔

وہ دونوں طرف سے اس طرح قریب آرہے تھے کہ میرے اِدھر اُدھر نکلنے کا راستہ بند ہوگیا تھا۔ ان میں سے ایک نے کالی پینٹ اور کالی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جبکہ دوسرے کے جسم پر نیلی جینز کی پینٹ اور سفید شرٹ تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ گلے میں پڑی ہوئی سونے کی چین نظر آرہی تھی۔

وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ یہاں تک آتے آتے ان دونوں نے چاقو نکال لیے تھے۔

"کیا خیال ہے مسٹر۔" سفید شرٹ والے نے کہا "پارکنگ کے ساتھ سڑک پر ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ سفید رنگ کی۔ ہمارے ساتھ شرافت سے چلتے ہوئے اس میں بیٹھو گے یا تمہاری آنتیں نکال کر اس جگہ پھیلا دی جائیں۔"

"نہ تو میں تمہارے ساتھ گاڑی میں بیٹھوں گا اور نہ میری آنتیں نکالنے کی تمہاری حسرت پوری ہوگی۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا "میں اتنا تر نوالہ نہیں ہوں جسے آسانی سے حلق سے اتارا جاسکے۔"

"ہمیں معلوم ہے تم بار بار بچتے رہے ہو۔" کالی شرٹ والا بولا "لیکن اس مرتبہ قسمت تمہارا ساتھ نہیں دے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تمہاری دوست اس اسپتال میں زیرِ علاج ہے۔ ہم ایک ہفتے سے اس اسپتال کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گے اور بالآخر تم آہی گئے۔ اب تم یہاں سے زندہ نہیں

جاسکو گے۔ اب تمہاری لاش کا پوسٹ مارٹم اسی اسپتال میں ہو گا۔" اس نے خاموش ہو کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور پھر وہ دونوں نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھے۔

میں بالکل خوف زدہ نہیں تھا۔ اگر چند مہینے پہلے اس طرح گھیرے میں آجاتا تو اتنی دیر میں میری پتلون یقیناً گیلی ہو چکی ہوتی لیکن اب میں بزدل نہیں رہا تھا۔ میرے اندر حوصلہ، قوت اور خود اعتمادی تھی اور میں اس قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

وہ دونوں چیختے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں ان سے زیادہ بلند آواز میں چیخا اور اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پوری قوت سے اچھلا۔ میں زمین سے تقریباً چھ فٹ اوپر اٹھا تھا اور پھر میرے پیر سامنے والی کار کی چھت پر ٹکے تھے۔ وہ دونوں اپنی جھونک میں ٹک ٹک سے ٹکرا گئے تھے۔ وہ سنبھل کر تیزی سے مڑے۔ اس دوران میں، میں نے یل YELL کرتے ہوئے کار سے چھلانگ لگا دی۔ نیچے آتے ہوئے میرا ایک پیر سفید شرٹ والے کے سینے پر اور دوسرا کالی شرٹ والے کے کندھے پر لگا تھا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے ڈھیر ہو گئے۔ ان میں ایک فوراً ہی اٹھ گیا۔ میں اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر چاقو سے وار کیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بائیں کلائی اس طرح آگے کر دی کہ اس کی کلائی میری کلائی سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی میں بڑی پھرتی سے ایک پیر پر گھوم گیا۔ اسپن کک اس کے جبڑے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس دوران میں کالی شرٹ والا اٹھ گیا تھا۔ وہ چاقو لہراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس نے حملہ کیا تو میں نے بائیں ٹانگ سے اس کا وار روکا اور ساتھ ہی اس کے جبڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ جبڑے پر گھونسا لگنے سے وہ لڑکھڑا گیا تھا۔ سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے اسے ایک اور اسپن کک رسید کر دی۔ وہ پشت کے بل گرا۔ میں نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اس پر چھلانگ اس طرح لگائی تھی کہ میرا سر اس کے سینے پر لگا اور میں الٹی قلابازی کھاتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہ بری طرح چیخ اٹھا تھا لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس وقت اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے بازو کندھوں کے قریب سے گرفت میں لے کر پیچھے کی طرف مروڑنے لگا۔ اس کی پشت میرے سینے سے ملی ہوئی تھی۔ اور میں اس کے بازوؤں پر دباؤ بڑھا رہا تھا۔ اس طرح اس کے کندھوں کے جوڑ اکھڑ سکتے تھے۔

اچانک اپنے پیچھے دہاڑنے کی آواز سن کر میں اپنے حریف کو اسی طرح گرفت میں لیے ہوئے تیزی سے گھوم گیا۔ سفید شرٹ والا چیختے ہوئے چاقو سے حملہ آور ہو رہا تھا۔ اس نے حملہ تو میری پشت پر ہی کیا تھا مگر میں نے گھوم کر گرفت میں لیے ہوئے حریف کو سامنے کر دیا تھا۔ سفید شرٹ والے کا چاقو دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوف ناک تھی۔

میں نے اب بھی اسے گرفت میں لے رکھا تھا اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح ان لوگوں نے ماسٹر پھو کے سینے پر خنجروں کے وار کیے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کا اپنا ایک آدمی مارا گیا تھا۔

حملہ آور بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے پھٹی پھٹی سی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر چاقو اپنے ساتھی کے سینے ہی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ پارکنگ سے باہر سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی اس سفید کار کی طرف تھا جس میں وہ مجھے اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے۔

کالی شرٹ والا ابھی تک میری گرفت میں تڑپ رہا تھا۔ میں نے اسے نیچے پھینک دیا اور سفید شرٹ والے کے پیچھے دوڑا۔ ٹھیک اسی لمحے کانگ بھی چیختا ہوا اس کار کی طرف دوڑ رہا تھا۔

سفید شرٹ والا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ انجن اسٹارٹ کرنے میں بھی ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ میں ابھی چند گز دور تھا لیکن کار حرکت میں آچکی تھی۔ کانگ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی مگر کار سے ٹکرا کر گر گیا۔ کار بڑی تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور کانگ کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔

"بھاگ گیا۔" کانگ اپنی سیدھی ٹانگ جھٹکتے ہوئے بولا "ہاتھ میں آجاتا تو اس کی گردن مروڑ دیتا۔"

"ایک بھاگ گیا مگر دوسرا اُدھر پڑا ہوا ہے۔" میں نے پارکنگ کی طرف اشارہ کیا اور پھر کانگ اس لاش کو دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا۔

"نہیں۔" میں نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے ان دونوں میں سے کوئی ایک میرے ہاتھوں مارا جاتا مگر اتفاق سے یہ اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں مارا گیا۔ چاقو سے وار تو مجھ پر ہی کیا گیا تھا مگر یہ میری ڈھال بن گیا اور میری موت کو اس نے اپنے سینے سے لگا لیا۔"

"میرے ساتھ آؤ... جلدی۔" کانگ نے کہا۔

ہم دونوں اسپتال میں گئے۔ استقبالیہ کاؤنٹر والے لاؤنج میں موجود دو تین آدمیوں نے دروازوں کے شیشوں سے ہماری لڑائی کا منظر دیکھا ہو گا لیکن انہیں شاید یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ایک لاش گر چکی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کی طرف سے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کانگ نے استقبالیہ کاؤنٹر پر رکھا ہوا ٹیلی فون ایک طرف سرکایا اور ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ لائن فوراً ہی مل گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تیز تیز لہجے میں باتیں کرتا رہا اور پھر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی ہوئی ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔

اس عورت نے میرے کپڑوں پر خون کے چھینٹے بھی دیکھ لیے

تھے وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ وہ دیوار پر لگے ہوئے انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر تیز لہجے میں کسی سے بات کرنے لگی پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

کانگ مجھے اشارہ کرتا ہوا لفٹ کی طرف دوڑا۔ یہاں تین لفٹیں تھیں اور اس وقت تینوں اوپر تھیں۔ ہم لفٹ کا انتظار کرنے کے بجائے زینے کی طرف دوڑے۔

تھائی وانگ بیڈ پر نیم دراز تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور نرس کرسی پر بیٹھی ہوئی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا تو نرس گھبرا گئی اور تھائی وانگ نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ میرے لباس پر خون دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی۔

"تم تھوڑا سا پیدل چل سکتی ہو؟" کانگ نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر کہا۔

"ہاں۔ میں پیدل چل سکتی ہوں۔" تھائی وانگ اٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے غالباً صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا "یہ... یہ کیا... تم ٹھیک ہو؟" اس نے میرے کپڑوں پر خون کے دھبوں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا "یہ جگہ اب تمہارے لیے محفوظ نہیں رہی اس لیے تمہیں یہاں سے لے جا رہے ہیں۔"

دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے تھائی وانگ کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے لپک کر اسے کندھے پر لاد لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ نرس پھٹی پھٹی سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہ گئی۔ ہم نے نیچے آنے کے لیے بھی لفٹ کا انتظار نہیں کیا۔ کانگ زینے پر مجھ سے آگے تھا۔

لابی میں بیٹھے ہوئے لوگ ہمیں دیکھ کر گڑبڑا سے گئے۔ وہ سمجھے شاید دو غنڈے کسی مریض کو اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔ کانگ کے ہاتھ میں خنجر نے انہیں کچھ اور بھی ڈرا دیا تھا۔

کانگ نے مجھے دروازے کے اندر ہی رکنے کا اشارہ کیا اور خود دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ ڈیڑھ منٹ بعد اس کا ٹک ٹک گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ میں گیٹ سے نکل کر دوڑتا ہوا سڑک پر آگیا۔ پہلے تھائی وانگ کو سیٹ پر ڈالا اور پھر خود بھی اچک کر سوار ہو گیا۔ اس دوران میں ٹک ٹک حرکت میں آچکا تھا۔

ہمیں دوبارہ اسی واٹ میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں ماسٹر ہوچن پہلے سے موجود تھا۔ ہم اس کمرے میں جمع تھے جہاں تھائی وانگ کو لٹایا گیا تھا۔ کانگ ماسٹر ہوچن کو اس واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"ویری گڈ۔" ماسٹر ہوچن میری طرف دیکھ کر مسکرایا "یہ لاش تمہاری طرف سے ٹائیگر کے لیے دوسرا تحفہ ہو گی اور اس لاش سے اسے یہ پیغام بھی مل جائے گا کہ تم پر ہاتھ ڈالنا اب اتنا آسان نہیں۔ اسے رپورٹ مل چکی ہو گی اور اس وقت وہ پاگلوں کی طرح اپنے بال نوچ رہا ہو گا۔"

"تھینک یو ماسٹر۔" میں نے اس کی تعریف پر بو کرتے ہوئے کہا "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ جب میں اسپتال کے گیٹ سے باہر نکلا تھا تو میں نے آس پاس دو تین ایسے آدمی بھی دیکھے تھے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ ہمارے آدمی ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی میری مدد کو نہیں آیا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ماسٹر ہوچن مسکرایا "ہمارے آدمی وہاں موجود تھے لیکن انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ تم بہت خوب صورتی سے اپنے حریفوں کا مقابلہ کر رہے ہو اس لیے وہ تم سے دور ہی رہے۔ اگر تمہیں کوئی خطرہ ہوتا تو وہ لوگ تم تک پہنچنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کرتے۔ کانگ سے پہلے مجھے ان آدمیوں کی طرف سے رپورٹ مل چکی تھی۔ یہ تمہاری پہلی باقاعدہ فائٹ تھی۔ تمہاری کامیابی پر مجھے خوشی ہوئی اور مہاراج کو جب اطلاع ملے گی تو وہ بھی بہت خوش ہو گا۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ لوگ چلے گئے اور میں دیر تک تھائی وانگ سے باتیں کرتا رہا۔ صبح ایک جوان اور خوب صورت عورت تھائی وانگ کے لیے دوائیں لے کر پہنچ گئی۔ وہ نرس تھی اور اسے اس وقت تک یہاں رہنا تھا جب تک تھائی وانگ ٹھیک نہ ہو جاتی۔

تین دن بعد رات نو بجے کے قریب ایک بھکشو نے آکر بتایا کہ ایک عورت مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ وہ عورت کون ہو سکتی ہے۔ میں اس بھکشو کے ساتھ واٹ کے اس حصے میں آگیا جہاں زائرین کی آمد و رفت رہا کرتی تھی لیکن اس وقت وہاں اِکّا دُکّا لوگ ہی تھے۔ مرکزی گیٹ کے باہر دونوں طرف گنجان پودے اور قد آور درخت تھے۔ بھکشو نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ چند گز دور ایک درخت کے نیچے تاریکی میں ایک عورت چادر لپیٹے کھڑی تھی۔

میرے ساتھ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ اس عورت نے اپنا چہرہ بھی چادر میں چھپا رکھا تھا لیکن میں جیسے ہی قریب پہنچا، اس نے چہرے سے چادر ہٹا لی۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر اچھل پڑا۔

وہ کوشلیا تھی۔

"میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر یہاں آئی ہوں۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"کہو کیا بات ہے۔" میں نے خشک لہجے میں پوچھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔" وہ بولی "مہاراج سے غداری کر کے میں نے واقعی حماقت کی تھی۔ میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ اگر مہاراج بھی مجھے معاف کر دیں تو میں انہیں ایک بہت بڑی سازش سے آگاہ کر سکتی ہوں۔" کوشلیا نے کہا۔

"کوئی نئی سازش؟" میں نے اسے گھورا۔

"میں اپنے کیے پر نادم ہوں وجدان۔ میری بات کا یقین کرو۔" اس نے کہا "میں اب کسی سازش میں شریک نہیں ہوں بلکہ مہاراج کو ایک خطرناک سازش سے آگاہ کرکے اپنے گناہوں کا اوپائے کرنا چاہتی ہوں۔ میں ماسٹر ہوچن یا کسی اور کے پاس بھی جاسکتی تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ مہاراج تمہاری بات نہیں ٹالیں گے۔"

"وہ سازش کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سازش اس ٹمپل سے متعلق ہے۔ اگر تفصیل جاننا چاہتے ہو تو گیارہ بجے فلائی اسکائی ریسٹورنٹ میں ملو لیکن اس وقت تمہیں یہ ضمانت دینا ہوگی کہ مہاراج نے مجھے معاف کردیا ہے۔" کوشلیا نے کہا۔

"اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم میرے خلاف کوئی نئی سازش نہیں کررہیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں۔" کوشلیا بولی "میں اپنی غلطی پر اب تک پچھتا رہی ہوں۔ ٹائیگر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے روز کلب کا پارٹنر بنادے گا لیکن اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ دو وقت کی روٹی کمانے کے لیے کلبوں میں کک باکسنگ کے مقابلوں میں مجھے اپنے آپ کو برہنہ کرنا پڑتا۔ میں اب تک بہت ذلت اٹھا چکی ہوں۔ اتفاق سے مجھے اس سازش کا پتا چل گیا تھا۔ میں اکیلی کچھ نہیں کرسکتی لیکن تم....." وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "پلیز! میرا ساتھ دو وجدان۔ مجھے تباہ ہونے سے بچالو۔"

مجھے اس کے لہجے میں سچائی کی کچھ جھلک نظر آرہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "میں مہاراج سے بات کرتا ہوں۔ اگر انہوں نے گیارہ بجے تم سے ملاقات کی اجازت دے دی تو سمجھو تمہارے لیے معافی کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے لیکن اگر میں گیارہ بجے وہاں نہیں پہنچا تو سمجھ لینا کہ......"

"ایسی صورت میں صبح شہر کی کسی سڑک پر میری لاش ملے گی۔" کوشلیا نے میری بات کاٹ دی "میں چلتی ہوں۔ اب میری زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

اس نے اپنا چہرہ چادر میں لپیٹ لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مخالف سمت میں چلی گئی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر میں بھی مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واٹ کے گیٹ میں داخل ہوگیا۔

میں رہائشی حصے کے مہتمم کے کمرے میں آگیا جہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ مہتمم وہی بوڑھا بھکشو تھا جسے میں پہلے بھی ایک مرتبہ ماسٹر ہوچن کے پاس بھیج چکا تھا۔ وہ اس وقت کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر ماسٹر ہوچن کا نمبر ملایا اور رابطہ قائم ہونے پر اسے کوشلیا کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہولڈ رکھو۔ میں دوسرے فون پر مہاراج سے بات کرتا ہوں۔" ماسٹر ہوچن نے میری بات سننے کے بعد کہا۔

میں ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ مجھے ماسٹر ہوچن کی ... سی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ مہاراج سے بات کررہا تھا۔ ... منٹ بعد وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے وجدان۔ کچھ دیر میں گانگ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ تم اس کے ساتھ فلائی اسکائی ریسٹورنٹ ... میرے کچھ آدمی تم سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں گے اگر ... کی کوئی سازش ہوئی تو کوئی زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔"

"او کے۔ میں ٹھیک گیارہ بجے وہاں پہنچ جاؤں گا۔" ... کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

کمرے میں آکر میں نے تھائی وانگ کو بتا دیا کہ کس ... جارہا ہوں۔ سوا دس بجے کے قریب گانگ بھی پہنچ گیا اور ... کچھ ہی دیر بعد ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ گانگ اس وقت ... تک نہیں سیاہ رنگ کی کار لے کر آیا تھا۔

مجھے اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ماسٹر ہوچن نے اسے بتا دیا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی سوکھم وٹ روڈ پر آگئی۔ گانگ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی ... نظر آرہا تھا۔ اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں ... نے کار سوئے فور کی طرف موڑلی۔ اس کے ساتھ ہی سوئے ... اسٹریٹ تھی۔ اس سڑک پر یونان کا سفارت خانہ بھی ... سفارت خانے کے پیچھے ایک اور گلی میں مڑگئی اور کچھ ہی ... طے کرنے کے بعد ایک جگہ رک گئی۔ سامنے فلائی اسکائی ریسٹورنٹ تھا۔

گانگ کار ہی میں بیٹھا رہا۔ میں نیچے اتر کر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک آدمی نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ... کی۔

"ریسٹورنٹ کے دائیں طرف والی سیڑھیوں پر چلے جاؤ۔"

میں نے چلتے چلتے اپنا رخ بدل لیا اور دروازے میں داخل ہو کر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میں نے گانگ کو بھی کار سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ شاید کچھ الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا کیونکہ پروگرام کے مطابق مجھے ریسٹورنٹ میں جانا تھا۔

ریسٹورنٹ کے اوپر ایک میرج بیورو کا دفتر تھا۔ جہاں کوشلیا کے علاوہ ایک ادھیڑ عمر تھائی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ کوشلیا کے چہرے پر ڈر اور خوف کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ تھائی عورت گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی ... محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور کوشلیا کے قریب صوفے پر ... گیا۔ اگر یہاں میری موت کا بندوبست کیا گیا تھا تو گانگ اور ... کے ساتھی بھی مجھے نہیں بچا سکتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ... میرا خاتمہ ہوچکا ہوتا۔

کوشلیا نے اشارہ کیا۔ وہ عورت اٹھ کر دوسرے کمرے ...

"کہو کیا بات ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے کوشلیا ... کہا "اس واٹ کے خلاف کیا سازش ہورہی ہے؟"

... پہلے میں مہاراج کی بات سننا چاہتی ہوں۔ کیا کہا ہے انہوں ... کوشلیا نے کہا۔

"اگر تمہاری بات درست نکلی تو مہاراج نہ صرف تمہیں ... کریں گے بلکہ تمہاری پہلی پوزیشن بھی بحال کردی جائے گی ... تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

کوشلیا چند لمحے خاموش رہی اور پھر سرگوشیوں میں اس سازش کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کی باتیں سن کر میرا دماغ گھوم رہا تھا۔

"یہ کب ہوگا؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"ایک ہفتے کے اندر اندر۔" کوشلیا نے جواب دیا "لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر انہیں شبہ ہوگیا تو وہ مجھے مار ڈالیں گے۔"

"تم چند روز کے لیے کہیں روپوش ہوجاؤ۔" میں نے کہا "ماسٹر ہوچن کا فون نمبر تمہارے پاس ہے۔ ایک ہفتے بعد ان سے رابطہ کرلینا۔ تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کردیا جائے گا۔"

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں جب اس دفتر سے باہر نکلا تو گانگ سیڑھیوں پر ایک اور آدمی کے ساتھ کھڑا باتیں کررہا تھا۔ میں ان کے قریب سے گزرتا ہوا سیڑھیاں اتر کر باہر آگیا اور گانگ کی کار میں بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد گانگ بھی آگیا۔

"ماسٹر ہوچن کے پاس چلو۔" میں نے کہا۔

چائنا ٹاؤن میں واقع جمنازیم میں پہنچ کر میں نے ماسٹر ہوچن کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ مجھے لے کر فوراً ہی واٹ ٹریمٹ میں مہاراج وانگ ونگ یائے کے پاس پہنچ گیا۔ میری بات سننے کے بعد مہاراج کافی دیر خاموش رہے اور پھر کچھ ہدایات دینے کے بعد ہمیں رخصت کردیا۔

دوسرے دن واٹ میں چند بھکشوؤں کا اضافہ ہوگیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ مہاراج کے آدمی تھے جنہیں خاص طور سے یہاں بھیجا گیا تھا۔

اب میں زیادہ تر اس خانقاہ میں گھومتا رہتا تھا۔ ماسٹر ہوچن پہلی مرتبہ مجھے اس پُراسرار بوڑھے کے پاس لے کر گیا تھا لیکن اب میں اپنے طور پر گھومتا رہتا۔ تہ خانے اور پُراسرار راستے مجھے حیران کیے دے رہے تھے۔ اگلے روز میں نے ایک ایسا راستہ بھی دریافت کرلیا جو واٹ کے نیچے ایک نالے سے جاملتا تھا۔

یہ نالا بہت کشادہ تھا۔ درمیان میں چار پانچ فٹ چوڑی جگہ پر ... بہہ رہا تھا۔ اطراف میں پتھروں کا پختہ فرش تھا۔ کہیں ... خشک تھا اور کہیں کیچڑ تھی۔ واٹ کے اس پُراسرار راستے کی ... نالے کے اندر تک چلی گئی تھیں۔ انہیں باقاعدہ ... نہیں کہا جاسکتا تھا۔ لوہے کے موٹے موٹے سریے نالے ... کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ میں ان آہنی سیڑھیوں سے اتر کر نالے میں آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی بہت بڑی سرنگ میں آگیا ہوں۔ یہ سرنگ اتنی بڑی تھی کہ اس میں ایک بڑا ٹرک آسانی سے چل سکتا تھا۔ دیواروں کے ساتھ اوپر ٹیلی فون اور بجلی کے کیبلز لگے ہوئے تھے۔ آس پاس کے علاقوں کو بجلی اور ٹیلی فون کے کنکشن نالے میں لگے ہوئے انہی کنکشن سے دیے جاتے تھے۔ واٹ میں بھی بجلی اور ٹیلی فون کے کنکشن یہیں سے تھے۔

میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور پھر اچانک چونک گیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ سرنگ نما نالا واٹ کے کمپاؤنڈ کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ اور اس کمپاؤنڈ میں مہاتما بدھ کا سونے کا وہ مجسمہ نصب تھا جس کے گرد لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا۔

میں تقریباً آدھا گھنٹا اس نالے کا جائزہ لیتا رہا پھر واپس آگیا اور وہ راستہ اسی طرح بند کردیا۔

وہ کوشلیا سے ملاقات کے بعد پانچواں دن تھا۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ واٹ میں زائرین کا رش تھا۔ اچانک ہی شور سن کر میں چونک گیا۔

"لوگو۔ دیکھو۔" ایک آدمی چیختے ہوئے کہہ رہا تھا "لارڈ بدھا میں زندگی کی حرارت پیدا ہورہی ہے۔ آؤ۔ دیکھو۔ لارڈ بدھا کا معجزہ دیکھو۔" میں تیزی سے آگے بڑھا۔ لوگ لوہے کے جنگلے میں داخل ہو کر مجسمے کو چھو چھو کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ عقیدت کے تاثرات۔

میں لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا جنگلے میں داخل ہوگیا اور مجسمے کو چھو کر دیکھا۔ اس میں واقعی حرارت پیدا ہورہی تھی۔ میں جنگلے سے باہر آگیا۔ مہاراج کے بھیجے ہوئے محافظ بھکشو جنگلے کے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ واٹ کے بھکشو مارے عقیدت کے سجدہ ریز ہوئے جارہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے ممی اور ڈیڈی کے ساتھ ایک فلم دیکھی تھی۔ جس میں چور ایک بینک سے سونے کا ذخیرہ لوٹنے کے لیے بینک کے نیچے نالے میں گھس کر بہت ہی عجیب و غریب طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میں نے ایک بھکشو کو ساتھ لیا اور واٹ کے اندر مختلف راہداریوں میں دوڑتا ہوا اس خفیہ راستے کے سامنے پہنچ گیا جو نالے کی طرف کھلتا تھا اور پھر میں نے جیسے ہی وہ راستہ کھولا میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ چار آدمی تھے۔ جو ایک جگہ پر کھڑے تھے۔ ان میں ایک ڈرل مشین جیسی کسی مشین سے نالے کی چھت میں سوراخ کررہا تھا اور اوپر سے سونے کے ٹکڑے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر بچھی ہوئی ایک چادر پر گر رہے تھے۔ اس آدمی کا چہرہ تو میں نہیں دیکھ سکا لیکن باقی تین آدمیوں کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

ان میں ایک ٹائیگر تھا۔ دوسرا چی فانگ اور تیسرا دارا!

چی فانگ کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی اور ان دونوں کے

ہاتھوں میں ریوالور۔ اب مجھے چوتھے آدمی کے بارے میں بھی اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ لباس اور قد سے میں نے اسے بھی پہچان لیا تھا۔ وہ کم تھا۔

کم لکڑی کے ایک اسٹول پر کھڑا دونوں ہاتھوں سے کسی ڈرل مشین جیسی وہ مشین چلا رہا تھا۔ مشین کی آواز بہت ہلکی تھی اور پھر آواز بند ہوگئی۔ کم نے سوئچ آف کردیا تھا۔ اور پھر وہ اسٹول سے اُتر آیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کچھ گھوم گیا تھا۔ اب اس کا رخ میری طرف تھا اور پھر یکایک وہ یوں بے حس و حرکت ہوگیا جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

اور پھر مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ کم براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

وہ چند لمحے صدیوں پر بھاری ثابت ہوئے۔

کم براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نجانے ایسی کیا بات تھی کہ میں کوشش کے باوجود اپنی نظروں کا زاویہ نہیں بدل سکا تھا۔ میں نے ایک ایسے بے حد زہریلے سانپ کے بارے میں سن رکھا تھا جو اپنے شکار کو ڈسنے سے پہلے پھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ شکار جب اس کی طرف دیکھتا ہے تو گویا اپنی موت کے پروانے پر خود ہی مہر ثبت کردیتا ہے۔ سانپ کی آنکھوں کی کشش کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ وہ پلک جھپکنا بھول جاتا ہے اور دماغ سن ہو جاتا ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہتی کہ جسم کے کسی حصے کو حرکت دے سکے اور وہ ناگ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر شکار کو اس طرح ڈستا ہے کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکلتی۔ سریع الاثر زہر اس سرعت سے خون میں پھیلتا ہے کہ اگلا سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔

کم بھی ایسا ہی زہریلا ناگ تھا جس نے کئی بے گناہ لوگوں کو ڈسا تھا۔ وہ مجھے بھی ڈسنا چاہتا تھا اور عرصے سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور آج ہمارا آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ خدا کی پناہ.... اس کی نظروں میں کیسی سرد مہری تھی۔ کتنی سفاکی تھی۔ ایسی سفاکی تو میں نے.... خوں خوار درندوں کی آنکھوں میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ میرا دماغ سن ہو رہا تھا اور جسم جیسے پتھر کے مجسمے میں ڈھل گیا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی لیکن پیر اس قدر بھاری ہو رہے تھے کہ کوشش کے باوجود انہیں حرکت نہیں دے سکا۔

کم پتلون اور چمڑے کی بغیر آستین کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کے سامنے کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ڈرل مشین تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ڈرل مشین چھوڑ دی جو دھب کی آواز کے ساتھ اس کے پیر کے قریب گری اور یہ دھب کی آواز ہی مجھے ہوش میں لے آئی تھی۔ کم نے چیختے ہوئے بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

فائر کی آواز سرنگ میں گونج سی پیدا کرتی چلی گئی۔ گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے سے گزرتی ہوئی دیوار میں لگی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ ٹائیگر اور دارا وغیرہ نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور پھر یوں لگا جیسے وہاں بھونچال آگیا ہو۔ ... فانگ کی آٹومیٹک رائفل سے نکلنے والی گولیوں نے سامنے والی دیوار کو چھلنی کردیا تھا۔

میں اس دیوار کی آڑ میں تھا جس پر اس خفیہ راستے کو کھولنے اور بند کرنے کے لیے بٹن لگا ہوا تھا۔ وہ بٹن مجھ سے تقریباً ... کے فاصلے پر تھا اور درمیان میں وہ کھلا ہوا راستہ تھا جس سے ... نالے کی دیوار میں سیڑھیوں کے طور پر لگے ہوئے کڑوں پر ... جاسکتا تھا۔ بٹن دبانے کے لیے مجھے اس کھلے ہوئے راستے کے سامنے سے گزر کر دوسری طرف جانا پڑتا جو ممکن نہیں تھا۔ ... گولیوں سے بھون دیا جاتا لیکن اس راستے کو کھلا بھی نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ میں اس خوفناک حقیقت سے پوری طرح واقف تھا۔ اگر ان وحشی درندوں کو اندر آنے کا موقع مل گیا تو وہ قیامت برپا کر دیں گے۔ واٹ میں اس وقت بیسیوں زائرین موجود تھے۔ ان کی جانوں کا نقصان ہوسکتا تھا۔ کئی بے گناہ مارے جاتے۔

میں دیوار کے ساتھ دبکا کھڑا رہا اور پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نالے کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے۔ میں باہر جھانکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ البتہ میں نے پوری توجہ اس آہٹ پر مرکوز رکھی جو سیڑھیوں پر پیر رکھنے سے پیدا ہو رہی تھی۔ وہ آہٹ بہت ہلکی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی شخص بہت احتیاط سے اوپر آرہا ہے۔

میں خالی ہاتھ تھا اور ہر طرح کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ مجھے پہلے ایک ہاتھ نظر آیا پھر رائفل کی نال دکھائی دی اور اچانک اس رائفل نے شعلے اگلنا شروع کردیے۔ جو کوئی بھی تھا اس نے حفظ ماتقدم کے طور پر فائرنگ کی تھی۔ میں نے بھی اپنے آپ کو بالکل تیار کرلیا اور پھر فائرنگ بند ہوتے ہی وہ میں ایک دم سامنے آگیا۔

وہ چی فانگ تھا جس کا چہرہ اس خلا کے بالکل سامنے تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے سیڑھی کا سریا پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا لیکن میں نے اسے سوچنے کا موقع دیے بغیر اس کے تھوبڑے پر زوردار کک لگادی اور اس کے ساتھ ہی اچھل کر خلا کے دوسری طرف اس جگہ پہنچ گیا جہاں دیوار پر وہ بٹن لگا ہوا تھا۔

چی فانگ کے منہ سے چیخ نکلی۔ وہ آٹھ دس فٹ کی بلندی سے نیچے گرا۔ گرتے ہوئے اس کی انگلی نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ رائفل کی نال سے نکلنے والی گولیاں نالے کی چھت پر لگیں۔ ٹائیگر اور دارا وغیرہ نے یہ صورتِ حال دیکھتے ہی فائرنگ شروع کردی۔ کچھ گولیاں اندر سامنے والی دیوار پر لگیں۔ ان میں سے کوئی سیڑھیوں کی طرف دوڑا بھی تھا لیکن میں وہ بٹن دبا چکا تھا۔ چند سیکنڈ میں وہ خفیہ راستہ بند ہوگیا۔

میں اس دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ میں اندازہ...

... موت کے بھیانک جبڑوں کے دہانے پر پہنچ گیا تھا اور قسمت نے اس بار بھی میرا ہی ساتھ دیا تھا۔

میرا اور چی فانگ کا پہلی مرتبہ آمنا سامنا ہوا تھا۔ وہ میری ماں کا قاتل تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ کس طرح میری ماں پر خنجر کے وار کرتا رہا تھا۔ میری ماں کی بھیانک چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

یوں تو میں نے کئی مرتبہ چی فانگ کو دیکھا تھا لیکن اس طرح آمنا سامنا پہلی بار ہوا تھا اور مجھے خوشی تھی کہ میں نے اپنے اس دشمن پر پہلی مرتبہ کاری ضرب لگائی تھی۔ ممکن ہے اسے زیادہ نقصان نہ پہنچا ہو لیکن میں نے پہلی بار براہِ راست اس پر حملہ کیا تھا اور اسے چیخنے پر مجبور کردیا تھا اور یہ میرے لیے ایک اچھا شگون تھا۔ اگر وہ خالی ہاتھ ہوتا یا میرے پاس بھی اس قسم کا اسلحہ ہوتا تو یقیناً صورتِ حال کچھ مختلف ہوتی۔

میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہانپ رہا تھا اور مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ نالے کی طرف سے دیوار پر گولیاں برسائی جارہی تھیں۔ دیوار خاصی موٹی تھی لیکن گولیاں لگنے سے ہلکی سی دھمک میں بھی محسوس کر رہا تھا۔

یہ سب کچھ دو منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا تھا لیکن لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میرے بھیجے ہوئے بھکشو کے ساتھ دو اور بھکشو دوڑے آرہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور یہ ان بھکشوؤں میں سے تھے جنہیں میری رپورٹ ملنے کے بعد مہاراج نے خاص طور پر اس واٹ میں بھیجا تھا۔

"وہ لوگ نالے کے اندر ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا "کسی کو دوسری طرف سے نالے کے اندر بھیجو۔ تاکہ انہیں بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔"

"چار آدمی تاؤ روڈ کی طرف سے نالے میں جاچکے ہیں۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا "انہیں اس طرف سے بھی گھیرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن اس طرف سے بھی کور کرنا ضروری ہے تاکہ انہیں بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔"

دیوار کے دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی اور پھر فائرنگ کی آوازیں دوبارہ سنائی دینے لگیں لیکن اس مرتبہ گولیاں اس دیوار پر نہیں برسائی جارہی تھیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ دو پارٹیوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔

کرونگ نامی ایک مسلح بھکشو نے مجھے اور میرے ساتھ نہتے بھکشو کو وہاں سے ہٹنے کا اشارہ کیا۔

"یہ راستہ کیسے کھلے گا؟" کرونگ نے پوچھا۔

"وہ بٹن دبا دو گے تو دیوار... کا یہ حصہ سلائڈنگ ڈور کی طرح اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔" میں نے اشارے سے بتایا۔

کرونگ نے ایک بار پھر اشارہ کیا۔ میں اور دوسرا بھکشو دیوار کی آڑ میں ہوگئے۔ کرونگ نے بٹن دبا دیا۔ وہ اور اس کا ساتھی دونوں طرف پوزیشن سنبھال کر کھڑے ہوگئے تھے۔ دیوار کا ایک حصہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے ہٹنے لگا۔

نالے میں فائرنگ کی آوازیں اب واضح ہوگئیں۔ کرونگ اور اس کے ساتھی نے بھی فائر کھول دیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد لگا جیسے کم اور اس کے ساتھی پسپائی اختیار کر رہے ہوں۔ تاؤ روڈ کی طرف سے نالے میں داخل ہونے والے محافظ فائرنگ کرتے ہوئے قریب آگئے تھے۔ کرونگ نے اپنے ساتھی کو اسی جگہ رکنے کو کہا اور خود نالے میں اتر گیا۔

میرے خیال میں اب سامنے آنے میں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ کرونگ اور ایک اور محافظ رائفلیں تانے اس جگہ کھڑے تھے۔ جہاں کم وغیرہ اپنی کچھ چیزیں چھوڑ گئے تھے لیکن وہ چادر وہاں نہیں تھی جس پر میں نے سونے کے ٹکڑے گرتے ہوئے دیکھے تھے۔ دوسرے محافظ نالے میں بائیں طرف فائرنگ کرتے ہوئے کافی آگے نکل گئے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں بھی اب نالے میں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں سیڑھیاں اترنے کے بجائے چھلانگ لگا کر نالے میں اتر گیا۔ دس بارہ فٹ اونچی جگہ تھی۔ نیچے ہلکی سی کیچڑ تھی۔ میرا پیر پھسلا لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ کرونگ اور دوسرا محافظ میری طرف دیکھ رہے تھے۔

کیچڑ میں میرا پیر ایک بار پھر پھسلا۔ اس مرتبہ سنبھلتے ہوئے میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں آس پاس خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے یا تو چی فانگ کو گرنے سے ایسی چوٹ لگی تھی جس سے خون بہہ نکلا تھا اور یا کوئی فائرنگ میں زخمی ہوا تھا۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ کرونگ یا دوسرے محافظ نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یقیناً میری حیثیت سے واقف تھے۔

اس جگہ لکڑی کے ایک اسٹول کے علاوہ ایک ڈرل مشین، ہتھوڑی، گول ریتی اور ایک چھینی پڑی ہوئی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر موٹر کی ایک بیٹری تھی جس کے ساتھ ایک سوئچ بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ کچھ تبدیلیاں کرکے اس بیٹری کو اس قابل بنایا گیا تھا کہ اس سے ڈرل مشین چلائی جاسکے۔ دیوار کے ساتھ ٹنگا ہوا ایک طاقت ور بلب بھی اسی بیٹری سے روشن تھا۔

میں جھک کر اس ڈرل مشین کو دیکھنے لگا۔ اس کے آگے نوک دار بٹ نہیں تھی بلکہ چھینی کی طرح ایک انچ.... چوڑی بٹ لگی ہوئی تھی۔ اس کا آگے والا حصہ خاصا تیز تھا۔ اس سے وہ مجسمے کے اندر کا سونا کاٹ رہے تھے۔ زمین پر کنکریٹ وغیرہ کے ٹکڑے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جن میں سونے کے کچھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور ذرات بھی چمک رہے تھے۔ ان کا منصوبہ واقعی خوف ناک تھا۔ پہلے انہوں نے نالے کی چھ سات انچ موٹی چھت کاٹی ہوگی اور پھر اوپر رکھے ہوئے مجسمے کے بیس تک پہنچے ہوں گے۔ ان

کا منصوبہ غالباً یہی تھا کہ اندر سے سونا نکال کر مجسمے کو کھوکھلا کردیا جائے لیکن ڈرل مشین چلنے سے مجسمہ گرم ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے مجسمے کے گرم ہوجانے کو لوگ لارڈ بُدھا کا معجزہ ہی سمجھتے۔ وہ مارے عقیدت کے مجسمے کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہتے اور ٹائیگر وغیرہ مجسمے کے اندر کا سارا سونا نکال کر رفوچکر ہوجاتے لیکن میری ذہانت نے ان کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ وہ تھوڑا سا سونا لے جاسکے تھے۔ جو میرے خیال میں چند کلو سے زیادہ نہیں تھا۔ اگر وہ رات کو ایسے وقت' جب واٹ زائرین کے لیے بند کردیا جاتا ہے' اپنے منصوبے پر عمل کرتے تو یقیناً اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے تھے۔

ٹائیگر وغیرہ کے تعاقب میں جانے والے محافظ واپس آگئے تھے۔ پورے شہر کے نیچے اس قسم کے سرنگ نما نالوں کا جال بچھا ہوا تھا اور وہ لوگ کسی طرف غائب ہوگئے تھے۔ میرے حکم پر واپس آنے والے محافظوں نے بھی سرنگ کے دونوں طرف پوزیشن سنبھال لی تاکہ اگر کوئی سرنگ میں..... داخل ہونے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ محافظوں نے بلا چون وچرا میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میرے بارے میں انہیں جو ہدایات دی گئی تھیں' وہ بہت واضح تھیں۔

یہ خبر زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکی۔ خانقاہ میں زائرین کا ہجوم تھا۔ یہ خبر پھیلتے ہی کھلبلی سی مچ گئی۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مہاراج بھی پہنچ گئے اور پولیس کی بھاری نفری بھی۔ پولیس نے فوراً ہی خانقاہ کو زائرین سے خالی کروالیا اور چاروں طرف پوزیشن سنبھال لی۔ کچھ پولیس والوں نے نالے والی سرنگ میں پوزیشن سنبھال لی تھی اور لاتعداد پولیس والے شہر کے نیچے سرنگوں کے اس جال میں پھیل گئے تھے اور میرے خیال میں یہ بیکار تھا۔ چی فانگ اور ٹائیگر جیسے لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اب تک کسی نالے میں چھپے ہوں گے جبکہ مجھے یقین تھا کہ وہ نالے سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچ چکے ہوں گے۔

پولیس کے اعلیٰ ترین افسران نے بھی وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ بنکاک میں واقع تمام بڑی بڑی خانقاہوں کے راہب بھی پہنچ چکے تھے اور اپنے اپنے انداز میں غم وغصے کا اظہار کررہے تھے۔

اخبار نویسوں اور فوٹوگرافروں کی بڑی تعداد بھی وہاں موجود تھی۔ سرنگ کے اندر فوٹوگرافر چھت کے اس حصے کی تصویریں کھینچ رہے تھے جسے کاٹا گیا تھا۔ ان تمام چیزوں کی تصویریں بھی کھینچی گئیں جن سے چھت کاٹنے میں مدد لی گئی تھی۔ میری بھی لاتعداد تصویریں کھینچی گئیں۔ مختلف پوز مختلف اسٹائلز میں۔ مہاراج کے ساتھ اور تمام بڑی بڑی خانقاہوں کے راہبوں کے ساتھ۔ بڑے بڑے راہب میرے ساتھ تصویر کھنچوانے میں فخر محسوس کررہے تھے کیونکہ میں ہی وہ شخص تھا جس کی ذہانت سے ان کا لارڈ بُدھا لٹنے اور کھوکھلا ہونے سے بچ گیا تھا۔

مہاراج بڑے فخر سے اخبار نویسوں کو میرے بارے میں بتا رہا تھا۔ اخبار نویس مجھ سے بھی طرح طرح کے سوالات کررہے تھے۔ مجھے یہ شبہ کیسے ہوا؟ میں ان کے سوالات کے جواب بتا اور تصویریں بھی بنواتا رہا۔ میں نے انہیں ان چاروں کے بارے میں بتادیا۔

اس سارے ہنگامے میں رات آدھی ہوگئی۔ واٹ کو فوری طور پر زائرین کے لیے بند کردیا گیا تھا اور نالے والی سرنگ میں بھی پولیس کا بھاری پہرا بٹھا دیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ مہاراج کے بھی کچھ محافظ تھے۔

مہاراج مجھ سے بہت خوش تھا۔ خوشی مجھے بھی تھی۔ میں ان کے کسی کام تو آیا۔ حقِ نمک تو ادا کیا۔ مجھے زیادہ خوشی اس بات کی بھی تھی کہ میں نے بدھ کے پیروکاروں کو گمراہ ہونے سے بچالیا تھا۔ اگر میری ذہانت کام نہ آتی تو وہ لوگ مجسمے کے گرم ہونے کو مہاتما کا معجزہ ہی سمجھتے اور اس طرح نئی نئی بدعتیں پیدا ہوتیں اور شاید یہ انکشاف کبھی نہ ہوتا کہ مجسمہ کھوکھلا ہوچکا ہے اور مہاتما میں پیدا ہونے والی گرمی چوروں کی پیدا کردہ تھی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ مہاراج اور کئی بڑے بڑے بھکشو واٹ ہی میں تھے۔ البتہ مہاراج نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں خانقاہ والے حصے سے نکل کر رہائشی حصے میں داخل ہوا تو نیم تاریکی میں دو ہیولے دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر میں نے انہیں پہچان لیا۔ ایک تھائی وانگ تھی اور اس کے ساتھ اس کی نرس۔

تھائی وانگ مجھے دیکھتے ہی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی "تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے وجدان۔" وہ میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی "تم شاید اسے کوئی معمولی بات سمجھتے ہوگے لیکن یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جسے ہماری قوم کبھی نہیں بھولے گی۔ کاش! میں وہ منظر دیکھ سکتی جب مہاراج اور بنکاک کے بڑے بڑے بھکشو تمہاری پیشانی پر بوسے دے رہے تھے۔"

"تو تم وہاں آجاتیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے آنے نہیں دیا گیا۔" تھائی وانگ نے مایوسانہ لہجے میں جواب دیا "میں تو کب سے یہاں کھڑی تھی کہ تم آؤ تو تمہیں اس کارنامے پر مبارک باد دوں۔"

"مبارک باد میں نے وصول کرلی۔ اب کمرے میں چلو۔ اگر تھکن چڑھ گئی تو طبیعت خراب ہوجائے گی۔"

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر رہائشی حصے کی طرف چل پڑا۔ نرس بھی ہمارے ساتھ تھی۔ جب ہم روشنی میں پہنچے تو بہت سے بھکشوؤں نے مجھے گھیرلیا۔ وہ شاید میرے ہی انتظار میں وہاں کھڑے تھے اور سب بڑی عقیدت مندانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دو تین بوڑھے بھکشوؤں نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پر بوسے بھی دیے تھے۔

میں تھائی وانگ والے کمرے ہی میں آگیا تھا۔ وہ نجانے کب سے میرے انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

"اب تم لیٹ جاؤ۔" میں نے کہا "اگر تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تو بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔"

"میں تم سے سب کچھ تفصیل سے سننا چاہتی ہوں۔ تم بھی میرے قریب بیٹھ جاؤ۔" تھائی وانگ نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

میں بیڈ کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نرس بھی ایک طرف کھڑی میری باتیں سن رہی تھی۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ جب بدھ کے مجسمے کے گرم ہونے والا شور مچا تو مجھے اچانک ہی اس فلم کا خیال آیا تھا جو میں نے بہت عرصہ پہلے ممی اور ڈیڈی کے ساتھ سنگاپور میں دیکھی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد میں انہیں بعد کے واقعات کی تفصیل سُنانے لگا۔

"جانتے ہو تم نے اس قوم پر کیا احسان کیا ہے؟" تھائی وانگ نے میرے خاموش ہونے پر کہا اور پھر وہی عقیدت والے خدشے کا اظہار کیا جس کا خیال مجھے بھی آیا تھا "اس سے ایک نئی بدعت پیدا ہوجاتی۔ طرح طرح کے شوشے چھوڑے جاتے اور لوگ لارڈ بُدھا کی اصل تعلیمات کو بھول کر ایک نئی راہ پر چل نکلتے جس سے ظاہر ہے انتشار ہی کو ہوا ملتی۔"

"یہی خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔" میں نے جواب دیا "لیکن سونے کی چوری کے انکشاف سے یہ طے ہوگیا کہ وہ کوئی معجزہ نہیں تھا۔"

"مجھے ایک اور خیال آرہا ہے۔" تھائی وانگ نے کہا "اتفاق سے آج وہ چاروں بیک وقت تمہارے سامنے آگئے۔ صورتِ حال نہایت سنگین ہونے کے باوجود تم نے بڑی حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ وہ چی فانگ پر تمہارا پہلا حملہ تھا جسے وہ ہمیشہ یاد رکھے گا لیکن اس کے ساتھ ہی اب تمہیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔ اب مجھے واقعی محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا "کم' دارا اور چی فانگ کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ انہیں کوئی نہیں جانتا لیکن ٹائیگر کو بنکاک کا بچہ بچہ جانتا اور پہچانتا ہے۔ جہاں تک غنڈہ گردی اور بدمعاشی کا معاملہ ہے لوگ اس سے ضرور دبتے ہیں۔ ہر شریف آدمی غنڈوں اور بدمعاشوں سے بدکتا ہے لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔ بات مذہب کی ہے۔ کوئی شرابی' زانی اور بدکار آدمی بھی لارڈ بُدھا کی توہین برداشت نہیں کرے گا۔ وہ ٹائیگر کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کر ڈالیں گے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ ٹائیگر کسی کے ہاتھ آسکے گا۔" میں نے کہا "اسے بھی اس بات کا احساس ہوگا کہ اسے شناخت کرلیا گیا ہے۔ وہ روپوش ہوجائے گا اور جب معاملہ ٹھنڈا پڑجائے گا تو نکل آئے گا اپنی کمین گاہ سے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تھائی وانگ! بات دراصل یہ ہے کہ اس دنیا کے لوگ' خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقے سے ہو' فطرت میں بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات کسی معمولی بات پر اس طرح بھڑک اٹھیں گے کہ قتل وغارت سے بھی باز نہیں آتے اور بعض اوقات بڑی سے بڑی بات بھی ان کے سر پر سے گزر جاتی ہے اور ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ لوگ کسی بات پر اشتعال میں آکر اس طرح بھڑک اٹھتے ہیں جیسے پوری دنیا کو جلا کر راکھ کرڈالیں گے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے ان کا جوش وجذبہ ماند پڑجاتا ہے اور بالآخر وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ مذہب ایک ایسا شعبہ ہے جس کی آڑ لے کر لوگوں کو قتل و غارت پر اکسایا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں یہ چوری کی واردات تھی۔ ان کا مقصد سونا حاصل کرنا تھا۔ لارڈ بُدھا کی توہین کا تو انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگ اسے لارڈ بُدھا کی توہین سمجھیں گے اور کچھ گڑبڑ پھیلانے کی کوشش بھی کریں گے۔ سیاست داں اور شرپسند لوگ اس موقع سے فائدہ بھی اٹھائیں گے لیکن میرا خیال ہے کہ مہاراج اور بنکاک کی دوسری خانقاہوں کے بڑے بڑے راہب اس آگ کو زیادہ نہیں بھڑکنے دیں گے۔ میں نے ان کی باتیں سنی ہیں۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک محض چوری کی واردات تھی اور اس سے قانونی طریقوں سے ہی نمٹا جائے گا۔"

"وہ لوگوں کے بھڑکے ہوئے جذبات کے آگے کیسے بند باندھ سکیں گے؟" تھائی وانگ نے کہا۔

"وہ سمجھ دار لوگ ہیں۔ روحانی پیشوا ہیں۔ لارڈ بُدھا کی تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں۔ لوگ ان کی بہت سی باتیں مانتے ہیں۔ شاید یہ بات بھی مان لیں۔" میں نے کہا۔

"تو گویا تمہارے خیال میں اس معاملے کو مذہبی ایشو نہیں بنانا چاہیے۔" تھائی وانگ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا "یہ چاروں ایسے آدمی ہیں جن کا شاید کوئی مذہب نہیں ہے۔ دولت ہی ان کا دھرم ہے۔ یہ زر کی پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ تم شاید بھول گئی ہو کہ انہوں نے میرے ماں باپ کو کیوں قتل کیا تھا۔ میرے باپ نے برسوں پہلے انہیں بھاری مالی نقصان پہنچایا تھا پھر دارا ہیروئن کی اسمگلنگ کا ریکٹ قائم کرنے کے لیے سنگاپور آیا تھا۔ وہاں اس نے میرے باپ کو دیکھ لیا۔ اس کے ذہن میں لازمی طور پر یہ بات آئی تھی کہ میرا باپ ان کے راستے کی رکاوٹ بنے گا۔ اس نے کرائے کے قاتلوں کے ذریعے میرے باپ کو راستے سے ہٹا دیا اور پھر میں ان کی نظروں میں آگیا۔ میں ان کے جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ جب تک میں زندہ رہوں گا' ان کے لیے خطرہ بنا رہوں گا۔ وہ مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے اور میں ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا یہاں تک آگیا۔ اصولی طور پر وہ میرے دشمن ہیں۔ انہوں نے یہ جو کچھ بھی کیا ہے میری دشمنی ہی میں کیا ہے لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ ان کا منصوبہ صرف سونا

چُرانا نہیں تھا۔"

"تو پھر....؟" تھائی وانگ نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا

"وہ اس کیس میں مجھے پھنسانا چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب! تمہیں کس طرح پھنسانا چاہتے تھے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"وہ سمجھ گئے تھے کہ جب تک میں مہاراج کی پناہ میں ہوں وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مجھے مہاراج کی نظروں سے گرانے کے لیے انہوں نے یہ سازش تیار کی تھی۔ یہ سازش دراصل دارا کے ذہن کی پیداوار تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کامیاب ہوگئے تو ایک طرف انہیں لاکھوں ڈالر مالیت کا سونا مل جائے گا اور دوسری طرف مہاراج مجھے دھکے دے کر نکال دے گا یا ہو سکتا ہے میرے لیے کوئی ایسی اذیت ناک سزا بھی تجویز کردے جسے میں برداشت نہ کرسکوں لیکن مجھے اس سازش کا بروقت پتا چل گیا تھا اور میں نے مہاراج کو اس سے آگاہ کردیا تھا؟"

"کیسی سازش؟" تھائی وانگ کی آنکھوں کی الجھن بڑھ گئی تھی۔

"شینو۔" میں نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے آج رات کھانا نہیں کھایا تھا۔ کچن میں اس وقت شاید کھانے کو تو کچھ نہ ملے۔ البتہ چائے کا سارا سامان وہاں موجود ہوگا۔ اگر تم میرے لیے ایک کپ چائے بنانے کی زحمت کرو تو میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں گا۔"

"چائے میں بھی پیوں گی۔ کھانا تو میں نے بھی نہیں کھایا تھا۔" تھائی وانگ نے کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں.... چائے کے بہانے نرس کو وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔ نرس کے جانے کے بعد وہ میری ....طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہاں۔ اب بتاؤ۔ وہ کیا سازش تھی؟"

"تمہیں یاد ہے ایک روز شام کے بعد کوشلیا خانقاہ کے باہر مجھ سے ملنے آئی تھی اور پھر رات گیارہ بجے میں اس سے ملنے کے لیے گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم نے واپس آکر بتایا تھا کہ وہ مہاراج سے معافی مانگنا چاہتی ہے اور اس کے لیے تمہیں وسیلہ بنا رہی تھی کیونکہ مہاراج تمہاری بات مان لیتے۔" تھائی وانگ نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے تمہیں یہی بتایا تھا اور یہ بات درست بھی تھی۔ مہاراج نے مجھے سختی سے منع کردیا تھا کہ اصل بات تمہیں بھی نہ بتاؤں۔" میں نے کہا۔

"اور وہ اصل بات کیا تھی؟" تھائی وانگ نے پوچھا۔

"کوشلیا ان دنوں تائیگر کے رحم و کرم پر تھی اور اس کی اجازت سے کسی نائٹ کلب میں کک باکسنگ کے شو کرکے دو وقت کی روٹی کما رہی تھی۔" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا "پندرہ روز پہلے دارا نے کوشلیا کو دیکھ لیا۔ وہ ہندوستانی لڑکی بڑے تیکھے نقوش کی مالک ہے۔ مردوں کے لیے اس میں بڑی چاشنی ہے۔"

"مگر تم تو اسے ٹھکرا کر بھاگ گئے تھے۔" تھائی وانگ مسکرائی۔

"ہاں۔ میں اسے لغویات سمجھتا ہوں۔ بہرحال۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "دارا نے تائیگر سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تائیگر اس رات کوشلیا کو لے کر اس بنگلے پر پہنچ گیا جہاں دارا رہائش پذیر تھا۔ وہاں کم اور چی فانگ بھی موجود تھے۔ کوشلیا ان کے لیے کھلونا بن گئی۔ وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے شراب پلاتی رہی اور پھر اسی دوران میں دارا نے یہ منصوبہ ان تینوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس منصوبے کے مطابق وہ میرے نام سے ایک مکان کرائے پر لیتے اور سونا چوری کرکے اس کا کچھ حصہ اس مکان میں پہنچا دیتے پھر کسی ذریعے سے مجھے اس مکان تک لایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے غالباً کسی لڑکی کو استعمال کیا جاتا پھر مہاراج کو اطلاع دے دی جاتی کہ میں نے بعض لوگوں کے ساتھ مل کر بُدھا کے مجسمے کا سونا چُرالیا ہے۔ مہاراج مجھے اس مکان میں اس لڑکی اور سونے کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیتے۔ وہاں ایک دو آدمی بھی ان کے قابو آجاتے جو یہ گواہی دیتے کہ یہ سازش میں نے ہی کی تھی کیونکہ میں تھائی لینڈ سے بھاگنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد دارا وغیرہ کو مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے کچھ نہ کرنا پڑتا۔ مہاراج ہی میرا قصہ تمام کردیتے۔" میں خاموش ہو کر گہرے سانس لینے لگا۔ یہ تفصیل بتاتے ہوئے مجھے خود اپنے آپ میں سنسنی کی سی کیفیت محسوس ہورہی تھی۔

"جب وہ لوگ یہ منصوبہ بنا رہے تھے تو کوشلیا انہیں جام بھر بھر کر پلا رہی تھی۔ مہاراج سے غداری کرکے وہ پچھتا رہی تھی کیونکہ تائیگر سے اسے ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ وہ خاموشی سے یہ باتیں سنتی رہی۔ اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ ان کی باتوں میں دلچسپی لے رہی ہے۔ ویسے اس کے ذہن میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ اگر وہ مہاراج کو اس سازش سے آگاہ کردے تو اسے معافی مل سکتی ہے۔

"اگلے روز شام کے بعد وہ اس واٹ کے باہر چوری چھپے مجھ سے ملی اور کہا کہ اگر مہاراج اسے معاف کردیں تو وہ انہیں اس واٹ کے خلاف ایک خوفناک سازش سے آگاہ کرسکتی ہے۔ میں مہاراج سے بات کرنے کے بعد رات گیارہ بجے فلائی اسکائی ریسٹورنٹ کے اوپر ایک میرج بیورو کے دفتر ہی میں اس سے ملا اور کوشلیا نے مجھے اس سازش سے آگاہ کیا۔ کوشلیا سے اس ملاقات کے بعد میں مہاراج کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے اس سازش سے تفصیل سے آگاہ کردیا۔ کوشلیا یہ نہیں بتا سکی تھی کہ مہاتما کے مجسمے کا سونا چُرانے کا طریقۂ کار کیا ہوگا۔ واٹ میں مجسمے کی حفاظت کا بندوبست کردیا گیا لیکن اس سرنگ کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ تو اتفاق ہے کہ میرے ذہن میں وہ بات آگئی تھی۔ اس طرح ان کی دونوں سازشیں ناکام ہوگئیں۔ سونا چُرانے کی بھی اور مجھے پھنسانے کی بھی۔ مہاراج اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ

زیادہ سے زیادہ چار پانچ کلو سونا نکالنے میں کامیاب ہو سکے تھے جو اپنے ساتھ لے گئے۔"

"تو یہ بات ہے۔" تھائی وانگ نے گہرا سانس لیا "کوشلیا کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا "میں نے اسے روپوش ہونے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اگر تائیگر کو پتا چل گیا تو اسے قتل کردیا جائے گا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد ماسٹر ہوچن سے فون پر رابطہ کرلے۔ میں نہیں جانتا وہ اس وقت کہاں ہوگی۔"

تھائی وانگ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ نرس شینو چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک چھوٹی ٹرے میں دو مگ رکھے ہوئے تھے۔ ایک مگ مجھے دے دیا اور ٹرے تھائی وانگ کے سامنے بیڈ پر رکھ دی۔

"اگر میری ضرورت نہ ہو تو میں جاؤں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" پہلے تھائی وانگ اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ آرام کرو۔" تھائی وانگ نے کہا۔

نرس شینو کے جانے کے بعد ہم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ تھائی وانگ جماہیاں لینے لگے اور میرا دماغ بھی نیند سے بوجھل سا ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی۔

صبح تھائی وانگ نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ اس وقت آٹھ بجے تھے۔ میں چار بجے کے لگ بھگ سویا تھا۔ چار گھنٹوں میں نیند پوری نہیں ہوسکی تھی۔ اس طرح جگائے جانے پر دماغ میں سنسناہٹ سی ہورہی تھی۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" میں تقریباً چیخ اٹھا تھا۔

"یہ دیکھو۔ یہ کیا ہے؟" تھائی وانگ بولی۔ اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔

میں چند لمحے آنکھیں ملتا رہا۔ نظروں کے سامنے کچھ دھند سی تھی۔ تھائی وانگ کے ہاتھ میں دو اخبار تھے۔ ان اخباروں کی ہیڈ لائنز پڑھ کر میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

مہاتما بدھ کے مجسمے سے سونے کی چوری کی خبر رات ہی کو جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ لوگوں کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ یہ واردات تائیگر نے اپنے بعض نامعلوم ساتھیوں کے ساتھ مل کر کی تھی۔ لوگوں نے رات ہی کو ہنگامے شروع کردیے تھے۔ ایسے تین نائٹ کلب جلا دیے گئے تھے جن کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ تائیگر کی ملکیت ہیں۔ پولیس اور شرپسندوں کے درمیان رات بھر جھڑپیں ہوتی رہی تھیں جن میں تین آدمی مارے گئے تھے اور کئی زخمی ہوئے تھے۔

ہنگاموں کے علاوہ بدھ کے مجسمے سے سونے کی چوری کی خبریں بھی نمایاں طور پر شائع کی گئی تھیں۔ میری.... تصویریں بھی چھپی تھیں۔ میں اپنی تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ اخبار نے میرے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا۔ مجھے ہیرو قرار دیا گیا تھا۔ اگر میں ذہانت سے کام نہ لیتا تو تائیگر اور اس کے ساتھی مجسمے سے سارا سونا نکال کر لے جاتے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق تائیگر اور اس کے ساتھی مجسمے میں سے تقریباً دس کلو سونا نکال لے گئے تھے۔

"دیکھا.... دیکھا تم نے۔" تھائی وانگ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم اسے چوری کی معمولی واردات سمجھتے تھے۔ رات کو ہنگاموں میں تین آدمی مارے گئے ہیں۔ یہ ہنگامے اور بڑھیں گے اور لوگ مارے جائیں گے۔ لوگ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک تائیگر اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دیتے۔"

"اصل لوگ ہاتھ نہیں آئیں گے اور بے گناہ مارے جائیں گے۔" میں نے کہتے ہوئے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور بستر سے اٹھ گیا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں تھائی وانگ کے ساتھ بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ ناشتے کے دوران میں بھی ہماری گفتگو کا موضوع یہی تھا۔ اسی دوران میں مجھے یہ اطلاع ملی کہ شہر میں اس وقت بھی ہنگامے ہو رہے تھے۔ مہاراج اور دوسرے بڑے بڑے راہب لوگوں کو ہنگاموں سے روکنے کے لیے پورے شہر میں پھیل گئے تھے۔

ایک طرف شہر میں ہنگامے ہو رہے تھے اور دوسری طرف ایک اور دلچسپ صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔ میں اس وقت تھائی وانگ کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ واٹ کے مرکزی دروازے کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد کرونگ دوڑتا ہوا ہمارے کمرے میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں آٹو میٹک رائفل تھی اور چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"کیا بات ہے۔ یہ شور کیسا ہے؟" میں نے کرونگ سے پوچھا۔

"واٹ کے سامنے سیکڑوں لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے اس محسن کو دیکھنا چاہتے ہیں جس نے لارڈ بُدھا کو لٹنے سے بچایا تھا۔" کرونگ نے کہا "میرے ساتھ چلو۔ تمہیں شوفانگ نے بلایا ہے۔"

شوفانگ اس واٹ کا مہتمم تھا۔ میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ تھائی وانگ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ ہم اندرونی دروازے سے ہوتے ہوئے شوفانگ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ شوفانگ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے چینی اور اضطراب نمایاں تھا۔ اس نے پہلے مجھے اور پھر تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے یہ صورتِ حال پسند

نہیں آئی تھی۔

"باہر کچھ لوگ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے دیوتا بننے کی ضرورت نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کچھ اور خرافات شروع ہو جائیں۔ تم صرف دو منٹ ان کے سامنے رکو گے اور واپس چلے آؤ گے اور ان کے سامنے کوئی بھاشن دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ امید ہے تم میری باتوں کا خیال رکھو گے۔"

شوفانگ کی یہ باتیں میرے لیے خلافِ توقع نہیں تھیں۔ جب مجھے اس خانقاہ میں بھیجا گیا تھا' اس سے اگلے ہی روز میں نے شوفانگ کا رویہ محسوس کر لیا تھا۔ یہاں میری تقرری کو شاید وہ اپنے معاملات میں مداخلت سمجھتا تھا لیکن میں نے ان باتوں پر کبھی توجہ نہیں دی تھی اور میرے خیال میں شوفانگ کے دل میں میرے بارے میں کوئی خدشات تھے تو وہ بے بنیاد تھے۔ اتنا عرصہ خانقاہوں میں اور بھکشوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے ایک بات میری سمجھ میں آئی تھی کہ یہاں بھی ایک دوسرے کے خلاف سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہر شخص اپنا درجہ بڑھانے اور دوسرے کو گرانے کے چکر میں رہتا تھا لیکن میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نہ تو کوئی بھکشو تھا اور نہ ہی اس حیثیت سے کوئی مذہبی مقام حاصل کرنے کی خواہش تھی مگر شوفانگ شاید یہ سمجھتا تھا کہ میں اس کی جگہ لینا چاہتا ہوں لیکن میرے دل میں ایسی کوئی تمنا نہیں تھی۔ میں تو ایک غریب الوطن اور بے سہارا آدمی تھا جو اپنے آپ کو دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے مہاراج جیسے شخص کا سہارا مل گیا تھا۔ میں صرف اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتا تھا۔ اس کے سوا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں نے تھائی وانگ کو اشارہ کیا اور کرونگ کے ساتھ شوفانگ کے کمرے سے نکل گیا۔ مختلف راہداریوں میں گھومتے ہوئے جب ہم مرکزی ہال سے نکل کر کمپاؤنڈ میں آئے تو سامنے کا منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ کمپاؤنڈ کے بڑے گیٹ کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں' مرد بھی اور بچے بھی۔ پھولوں کے گلدستے تقریباً ہر ایک کے ہاتھ میں نظر آ رہے تھے۔ گیٹ کے اندر اور باہر بھی مسلح پولیس والے موجود تھے جو لوگوں کو گیٹ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کرونگ کے کہنے پر میں ذیلی دروازے سے نکل کر گیٹ کے سامنے پتھر کے ایک چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر لوگوں کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ ان کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

میرے ساتھ تھائی وانگ بھی تھی اور پولیس والوں نے ہمیں گھیرے میں لے رکھا تھا۔ لیکن لوگ آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ وہ قریب سے مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نظروں میں عقیدت تھی۔ اپنے لیے لوگوں کی یہ عقیدت اور یہ جوش و خروش میرے دماغ میں سنسنی سی ہو رہی تھی۔ میں جسے معمولی سی واردات سمجھتا رہا تھا۔ وہ دراصل کوئی نہیں تھی۔ وہ معمولی سی واردات دراصل لارڈ بُدھا ناکام بنا کر میں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ میں کوئی کارنامہ انجام دے رہا ہوں لیکن اب اپنے سامنے مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ میں نے واقعی کوئی انجام دیا تھا مگر میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ چھوٹا سا فرض ادا کیا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ تھا' اس کا ذمے دار میں تھا۔ نہ میں اس خانقاہ میں نہ دارا وغیرہ مجسمے کے سونے کی چوری کا منصوبہ بناتے۔

میرے سامنے چبوترے پر اور اس کے اردگرد بلند ہوتا جا رہا تھا۔ لوگ مجھ پر عقیدت کے پھول تھے۔ صرف پھول ہی نہیں قیمتی چیزیں بھی میرے کر رہے تھے۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار کر میرے ڈال دیے تھے۔ مرد اپنی کلائیوں پر بندھی ہوئی گھڑیاں' انگوٹھیاں نذرانے کے طور پر مجھے پیش کر رہے تھے۔

یہ صورتِ حال میرے لیے دلچسپ بھی تھی اور بھی۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک انجام دے کر لاکھوں دلوں کا محبوب بن جاؤں گا۔

خانقاہ کے مہتمم شوفانگ نے مجھے صرف دو منٹ لیکن مجھے اس چبوترے پر کھڑے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تین چار بھکشو چبوترے کے ہونے والی قیمتی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔

میں نے ایک بار مڑ کر دیکھا تو شوفانگ دو اور ساتھ بُدھا کے مجسمے والے جنگلے کے قریب کھڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں اس کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ میری اس سے کوئی میں اسے کوئی دکھ نہیں پہنچانا چاہتا تھا اس لیے اب میں سے ہٹنے کا فیصلہ کر لیا اور تھائی وانگ کی طرف دیکھتے کی۔

"شوفانگ نے مجھے صرف دو منٹ دیے تھے اب سے زیادہ وقت ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے اب چاہیے۔"

"میں بھی دیکھ رہی ہوں۔" تھائی وانگ مسکرائی خون جلا رہا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ کھڑے

"میرا خیال ہے یہ اچھی بات نہیں ہے۔" شوفانگ کو ناراض کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔"

"اس میں دشمنی کی کیا بات ہے؟" تھائی وانگ بولی۔

"تم نے اس کی باتوں سے اندازہ نہیں لگایا۔" میں نے جواب دیا "وہ اس واٹ کا مہتمم ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ یہاں اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا مقبولیت حاصل کرے۔ اسے یہ بھی اندیشہ ہے کہ شاید میں اس کے اختیارات چھیننا چاہتا ہوں۔ جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ مجھے تو یہاں صرف بھکشوؤں کو مارشل آرٹ کی ٹریننگ دینے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن مہاراج نے کچھ اضافی ذمے داریاں سونپ دیں۔ یہی بات غالباً شوفانگ کو ناگوار گزری ہے لیکن میں بات کو آگے نہیں بڑھانا چاہتا اور واقعی مجھے ہیرو بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" تھائی وانگ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اگر تم اس طرح پیچھے ہٹنا چاہتے ہو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

میں چبوترے سے اترنا ہی چاہتا تھا کہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی لوگوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ... گلدستہ اٹھا رکھا تھا۔ لوگ گلدستے چبوترے پر اور اس کے آس پاس رکھتے ہوئے چلے جا رہے تھے لیکن وہ لڑکی شاید گلدستہ میرے ہاتھ میں دینا چاہتی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے نیلے رنگ کا منی اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں تھائی وانگ کے ساتھ چبوترے کی سیڑھی کی طرف بڑھ گیا۔

"کھور تھاڈ!" وہ لڑکی چیخی "ایکسکیوز می۔"

میں رک گیا۔ وہ لڑکی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے آگئی اور گلدستہ میری طرف بڑھا دیا۔

"خوب کھن.... شکریہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے گلدستہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اس لڑکی کے چہرے پر اس طرح طمانیت آگئی جیسے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ چند لمحے وہاں کھڑی میری طرف دیکھتی رہی اور پھر لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی واپس چلی گئی۔

میں تھائی وانگ کے ساتھ چبوترے سے اتر آیا۔ تین چار بھکشو اب بھی وہ چیزیں سمیٹنے میں مصروف تھے جو لوگوں نے میری خدمت میں نذرانے کے طور پر پیش کی تھیں اور اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

گیٹ کے ذیلی دروازے کے دائیں بائیں دو مسلح پولیس والے کھڑے تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے وہ گلدستہ ایک پولیس والے کے ہاتھ میں دے دیا جسے اس نے آہنی جنگلے کی سلاخوں میں پھنسا کر اٹکا دیا۔ گیٹ کے سامنے اب بھی سیکڑوں لوگ جمع تھے۔

میں سونے کے مجسمے والے جنگلے کے قریب سے گزرا تو وہاں کھڑا ہوا شوفانگ بڑی ناگوار سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تھائی وانگ تو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی مگر میں نے چہرے سے کوئی تاثر نہیں دیا تھا۔

ہم دونوں خانقاہ والے حصے سے نکل کر رہائشی حصے کی طرف آگئے اور پھر اسی وقت وہ کان پھاڑ دینے والا دھماکا سنائی دیا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش بھی نہ کرسکا اور نیچے گرا۔ تھائی وانگ بھی گر چکی تھی۔

دھماکے کے فوراً ہی بعد آہ و بکا اور چیخوں کا شور سنائی دینے لگا۔ میرے حواس مختل ہوگئے تھے۔ کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں جیسے تیز آندھی چل رہی ہو۔ ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ چند لمحوں تک تو میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ ہوا کیا ہے۔ اچانک میں جیسے ہوش میں آگیا۔ چیخوں کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ تھائی وانگ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔

"تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میرے پیچھے مت آنا۔" میں ... ہوا خانقاہ کی طرف دوڑا۔

ایک عجیب قیامتِ صغرا کا منظر میرے سامنے تھا۔ کیا ... تین چار بھکشو فرش پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ گیٹ کے پاس ... پولیس والوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور ذیلی دروازے کے قریب جو دو پولیس والے کھڑے تھے ان کے جسموں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ جسمانی اعضا اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ گیٹ کے باہر بھی کچھ لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں دو بھکشوؤں اور ... گیارہ سال کے ایک بچے کی لاش بھی تھی۔

کچھ دیر پہلے یہاں بڑا روح پرور منظر تھا۔ بُدھا کے عقیدت مند اپنے محسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے پُرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ مذہبی گیت گا رہے تھے مگر اب چیخم دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ آہ و بکا کی آوازیں تھیں۔ عجیب افراتفری تھی۔ سیکڑوں لوگ بھاگنے کی کوشش میں ایک دوسرے کے اوپر گرے پڑ رہے تھے۔

ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ گوشت کے لوتھڑے دیواروں سے چپکے ہوئے تھے جن سے خون ٹپک رہا تھا۔ گیٹ مکمل طور پر تباہ ہوگیا تھا۔ سونے کے مجسمے والے جنگلے کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ شوفانگ جنگلے کے قریب فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک ... سے خون بہہ رہا تھا۔

یہ روح فرسا منظر دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ جو محافظ اور پولیس والے زخمی ہونے سے بچ گئے تھے، انہیں اس خوف ناک منظر نے ذہنی طور پر مفلوج کردیا تھا۔ میری طرح شاید ان کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا اور پھر اچانک ایک ... چیخ اٹھا۔ یہ کرونگ تھا۔

"لوگوں کو یہاں سے ہٹاؤ۔ زخمیوں کو اٹھاؤ۔ وہ مر رہے ہیں۔"

کرونگ بھی زخمی تھا لیکن اس نے اپنے حواس بحال رکھے ...

... میرے محافظ اور پولیس والے بھی حرکت میں آگئے۔ میں خود ... متحرک ہوگیا اور ہم زخمیوں کو اٹھانے لگے اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہر طرف سے سائرن کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا تھا جیسے ... شہر کی پولیس کاروں اور ایمبولینسوں نے اس طرف کا رخ کر لیا ہو اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے واٹ کے اردگرد کے علاقے کو ... نے گھیرے میں لے لیا۔ امدادی پارٹیوں نے کام شروع کر دیا۔ لاشوں اور زخمیوں کو اٹھا اٹھا کر ایمبولینسوں میں ڈالا جانے ...

... ایک بار پھر شہر کی تمام خانقاہوں کے راہب اور پولیس کے ... افسران پہنچ گئے۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی ... ماہرین نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ وہ بم کس جگہ پر پھٹا تھا۔

میری نظروں کے سامنے نیلے لباس والی اس خوب صورت ... کا چہرہ گھوم گیا جس نے سب سے آخر میں مجھے گلدستہ دیا تھا اور وہ گلدستہ میں نے ذیلی دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ایک پولیس کانسٹیبل کو تھما دیا تھا جسے اس نے جنگلے کی سلاخوں میں پھنسا ... تھا۔ بم اس گلدستے میں تھا۔ سب سے زیادہ وہی جگہ متاثر ہوئی تھی اور اس ذیلی دروازے کے قریب کھڑے ہوئے دونوں پولیس والوں کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

ایک ایک لمحہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ نیلے لباس والی وہ خوب صورت لڑکی کس طرح ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے مجھے آواز دے کر روکا تھا اور گلدستہ میرے ہاتھ میں دینے کے بعد اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی تھی۔ وہ بڑا سا گلدستہ پلاسٹک کے ایک خوب صورت گلدان میں تھا۔ مجھے وہ گلدستہ دوسرے گلدستوں کی نسبت قدرے وزنی محسوس ہوا تھا لیکن اس وقت میں نے خیال نہیں کیا تھا اور اب بات سمجھ میں آرہی تھی کہ اس لڑکی نے وہ گلدستہ خاص طور پر میرے ہاتھ ہی میں کیوں دیا تھا۔ اس گلدستے میں حجم میں چھوٹا مگر نہایت طاقت ور ٹائم بم تھا۔

اگر وہ گلدستہ چند منٹ اور میرے ہاتھ میں رہتا تو میرے جسم کے پرخچے اڑ جاتے۔ لیکن قسمت نے ایک بار پھر میرا ساتھ دیا تھا۔ میں تو بچ گیا تھا مگر کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔

مہاراج بھی صورتِ حال کو سمجھ گئے تھے۔ اس وقت وہاں ... بڑے راہبوں میں یہ بحث بھی چھڑ گئی تھی کہ یہ مذہبی جنگ ... بُدھا کے مجسمے سے سونا چرایا گیا اور پھر واٹ میں یہ خون ... لیکن مہاراج وانگ ونگ پائے بڑی مشکل سے ان راہبوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ یہ کوئی مذہبی جنگ نہیں ایک جرائم پیشہ گروہ کی مجرمانہ سرگرمیاں ہیں۔ جو صرف اور صرف مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہیں۔ وہ گلدستہ خاص طور پر میرے ... دیا گیا تھا تاکہ میری زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

اس واٹ کو دور دور تک پولیس کی بھاری نفری نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ واٹ کے نیچے نالے میں بھی پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ شام تک وہاں سے ملبا ہٹا دیا گیا اور خون میں لت پت دیواریں اور فرش بھی دھو دیا گیا۔

شام کو میں تھوڑی دیر کے لیے تھائی وانگ کے پاس آگیا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور بڑی نڈھال سی لگ رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی تھی جس سے اس کی طبیعت مزید خراب ہوگئی تھی۔ شینو نام کی وہ نرس اپنے کام کے سلسلے میں بڑی فرض شناس واقع ہوئی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے تھائی وانگ کو سنبھال رکھا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس صورتِ حال میں کھانے پینے کا ہوش ہی کسے رہا تھا۔ تھائی وانگ اور شینو بھی بھوکی بیٹھی رہی تھیں۔ اس وقت شینو نے عقل مندی یہ کی کہ کچن سے چائے بنوانے کے علاوہ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لے آئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں دوبارہ واٹ میں آگیا جہاں مہاراج کے علاوہ چند اور راہب بھی موجود تھے۔ بم دھماکے سے خانقاہ کی بجلی اور ٹیلی فون کی لائنیں بھی متاثر ہوئی تھیں جنہیں درست کردیا گیا تھا اور اس وقت کچھ ایسے ماہرین بھی موجود تھے جو اس بات کا جائزہ لے رہے تھے کہ مہاتما بُدھ کے سونے کے مجسمے کو کھلی جگہ سے ہٹا کر مرکزی ہال میں کس جگہ رکھا جائے۔

رات دس بجے کے قریب میں کمرے میں آیا تو مہاراج بھی میرے ساتھ تھا۔ تھائی وانگ مہاراج کو دیکھ کر بیٹھ گئی۔ مہاراج کے کھانے کا بندوبست بھی وہیں کردیا گیا تھا۔ ہم تینوں بلکہ چاروں نے وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ نرس شینو بھی ہمارے ساتھ تھی کھانے کے بعد شینو کو وہاں سے ہٹا دیا گیا اور مہاراج مجھ سے وہ باتیں کرنے لگا جو دوسروں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تمام صورتِ حال تمہارے سامنے ہے۔" مہاراج کہہ رہا تھا "تم نے ان کا سونے کی چوری والا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا۔ یہ اس کا ردِ عمل ہے کہ آج تمہیں بم سے اڑا دینے کی کوشش کی گئی لیکن ہمیشہ کی طرح تم اس مرتبہ بھی بچ گئے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ تم سچائی پر ہو اور سچائی کو کبھی شکست نہیں دی جا سکتی لیکن اس کے ساتھ ہی تمہارے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ تم پر پہلے سے زیادہ شدت سے حملے ہوں گے اور کل رات سے اب تک جو صورتِ حال سامنے آئی ہے، اس سے میں نے یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ اندرونی طور پر بھی تمہارے خلاف کچھ سازش ہو رہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں تمہیں کوئی نقصان پہنچے اس لیے میں نے فوری طور پر تمہیں یہاں سے ہٹانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"مجھے اپنے خلاف اس اندرونی سازش کا کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔" میں نے مہاراج کے خاموش ہونے پر مسکراتے ہوئے کہا

"شوفانگ کو مجھ سے جو نفرت پیدا ہو گئی ہے اس کی ایک جھلک میں نے آج صبح اس کی آنکھوں میں دیکھ لی تھی اور آج شام کو تو اس نے واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ اس واٹ میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا ذمے دار میں ہوں۔ وہ کھل کر تو نہیں کہہ سکا لیکن اس کی خواہش ہے کہ میں جلد سے جلد یہاں سے چلا جاؤں۔"

"شوفانگ کینہ پرور آدمی ہے۔" مہاراج نے کہا "لارڈ بُدھا کی تعلیمات ہمیں ایک دوسرے سے محبت اور رواداری کا درس دیتی ہیں لیکن تم شاید ابھی ان باتوں کو نہ سمجھ سکو۔ سیاست کی طرح مذاہب میں بھی دھوکا، ریاکاری، فریب اور منافقت پیدا ہو چکی ہے۔ کسی ایک ہی فرقے کے مذہبی پیشوا ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ ہمارے ہاں بھی ہو رہا ہے۔ بعض اندرونی سازشیں ہمارے اس مذہب کو کمزور کر رہی ہیں۔ اگر تم مطالعہ کرو گے تو تمہیں پتا چلے گا کہ لارڈ بُدھا نے ہندومت کو ترک کر کے اس مذہب کی بنیاد رکھی تھی جس کا مقصد سچائی اور رواداری کا پرچار ہے۔ لارڈ بُدھا کی تعلیمات قتل، چوری، زنا، جھوٹ، نشہ، عیش و عشرت اور دنیاوی جاہ و حشم کی طلب سے روکتی ہیں لیکن آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ ریاضت، فاقہ کشی اور رہبانیت ایک طرح سے اس مذہب کی بنیاد ہے لیکن آج کتنے راہب ہیں جو اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان تعلیمات کا درس دینے والے خود گناہوں کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ شوفانگ کا شمار بھی ایسے ہی راہبوں میں ہوتا ہے۔ جھوٹ، مکرو فریب اور ریاکاری کو اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔ وہ بظاہر تو بھکشو ہے لیکن رئیسوں جیسی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس نے اپنے کمرے کو عشرت کدہ بنا رکھا ہے۔ وہ سازشی ذہن کا مالک ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ خود تمہارے خلاف کچھ نہیں کر سکتا لیکن لالچ میں آ کر کسی کا آلۂ کار بن سکتا ہے اس لیے میں نے تمہیں یہاں سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں رہتے ہوئے تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ ویسے بھی تمہاری تربیت کا کچھ حصہ باقی ہے اور میں چاہتا ہوں اس دوران میں تم اپنی وہ تربیت بھی مکمل کر لو۔"

"اب مجھے کہاں جانا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے آدمی تمہیں لینے کے لیے آج رات کسی وقت پہنچ جائیں گے۔" مہاراج کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

اور جب میں نے ان کے لیے کمرے کا دروازہ کھولا تو باہر گیلری میں دروازے کے قریب ہی ایک بھکشو کو دیکھ کر چونک گیا۔ نجانے مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ وہ چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ کسی کو چھپ کر ہماری باتیں سننے کی کیا ضرورت تھی اور پھر یہ بھکشو تو میرا شاگرد تھا، وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو دیکھ کر رکوع کیا اور مؤدبانہ انداز میں ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

مہاراج کے جانے کے بعد میں دوبارہ تمائی وانگ کے کمرے میں آ گیا۔ نرس شینو اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ تمائی وانگ نے اپنے کپڑے اور دوائیں وغیرہ ایک بیگ میں پیک کر لی تھیں۔ میں بھی اپنا بیگ پیک کر کے اس کمرے میں لے آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نرس شینو بھی اپنا بیگ لے کر اس کمرے میں آ گئی۔ تمائی وانگ اگرچہ اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ وہ دوائیں خود بھی استعمال کر سکتی تھی۔ اب اگرچہ اسے نرس کی ضرورت نہیں تھی لیکن چونکہ مہاراج نے اس سلسلے میں کوئی خاص ہدایت نہیں دی تھی اس لیے اگر شینو ہمارے ساتھ جا رہی تھی تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

رات دو بجے مہاراج کے آدمی ہمیں لینے کے لیے پہنچ گئے۔ ان میں ایک کانگ تھا اور دوسرا چیانگ۔ موخر الذکر چینی النسل تھا۔ کانگ کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ جان پہچان کا آدمی تو تھا۔

عقبی گلی والے دروازے کے سامنے سیاہ رنگ کی ایک وین کھڑی تھی۔ ہم تینوں کو وین کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ چیانگ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کانگ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

شہر کی سڑکیں سنسان تھیں۔ کسی سڑک پر کوئی اکا دکا گاڑی نظر آ جاتی۔ چیانگ وین کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتا رہا۔ میرا خیال ہے وہ اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تعاقب تو نہیں ہو رہا پھر مطمئن ہو کر اس نے گاڑی ایک کشادہ سڑک پر موڑ دی۔ یہی سڑک آگے جا کر ہائی وے تھری سے جا ملتی تھی۔ چند میل اس ہائی وے پر مشرق کی طرف سفر کرنے کے بعد وین جنوب کی طرف ایک اور ہائی وے پر مڑ گئی۔

سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر سبزے اور درختوں کی بہتات تھی۔ تقریباً دو گھنٹے اس ہائی وے پر سفر کرنے کے بعد وین پہاڑیوں میں ایک اور تنگ سی سڑک پر مڑ گئی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ ایک تنگ سا پتھریلا راستہ تھا جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بل کھاتا ہوا چلا گیا تھا۔ وین کی رفتار بہت ہلکی تھی اور پھر تقریباً چالیس منٹ بعد وین ایک جگہ رک گئی۔ کانگ اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ شینو اور تمائی وانگ اونگھ رہی تھیں۔ میں نے جھنجوڑ کر دونوں کو جگا دیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ میں وین کے قریب کھڑا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اوپر کسی جگہ مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ پہاڑی زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اوپر چڑھنے کے لیے ایک تنگ سا راستہ تھا جو چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ چیانگ آگے تھا۔ اس کے پیچھے شینو، تمائی وانگ اور میں۔ آخر میں کانگ تھا جس نے کندھے پر آٹومیٹک رائفل لٹکا رکھی تھی۔ اس تنگ سے راستے کا اختتام تقریباً دو سو فٹ اوپر ایک مسطح جگہ پر ہوا تھا۔ یہ خاصا وسیع میدان تھا جس کے ایک طرف کوئی کاٹیج یا مکان تھا۔

ایک دو کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ روشنی جو نیچے سے نظر آ رہی تھی اس تنگ سے راستے کے اختتام پر ایک بلب کی تھی جو راستے کی نشان دہی کے لیے جلایا گیا تھا۔

کانگ نے برآمدے میں پہنچ کر دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔ دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی سی جوان لڑکی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ غالباً سو رہی تھی اور دروازہ دھڑدھڑانے کی آواز سے جاگ گئی تھی۔

"دروازہ آرام سے نہیں کھٹکھٹا سکتے تھے۔ تمہیں کال بیل کا بٹن نظر نہیں آیا تھا۔" لڑکی کے لہجے میں ناگواری تھی۔ وہ کانگ کو گھور رہی تھی۔

"سوری مس بٹرفلائی۔" کانگ نے معذرت آمیز لہجے میں کہا "رات کا آخری پہر ہے، میں سمجھا تھا تم گہری نیند سو رہی ہو گی۔ اس لیے..."

"ٹھیک ہے۔" مس بٹرفلائی نے اس کی بات کاٹ دی "اب اندر آؤ گے یا باہر ہی کھڑے باتیں کرتے رہو گے۔"

ہم اندر آ گئے۔ رات کی تاریکی میں باہر سے اس مکان کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن اندر سے یہ خاصا کشادہ تھا۔ غالباً پانچ چھ کمرے تھے۔ ایک وسیع و عریض ہال اس کے علاوہ تھا۔ مس بٹرفلائی نے اندر آ کر ساری بتیاں جلا دی تھیں۔ میں نے ہال کی ایک دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔

"جو کمرا پسند آئے قبضہ کر لو۔" کانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر بیڈ پر ایک ادھیڑ عمر عورت سو رہی تھی۔ میں نے وہ دروازہ بند کر دیا اور دوسرے کمرے میں آ گیا اور اپنا بیگ ایک کرسی پر پھینک دیا۔ تمائی وانگ اور شینو نے بھی ایک ایک کمرے پر قبضہ کر لیا تھا۔

صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ تب پتا چلا کہ کانگ اور چیانگ ہمیں یہاں چھوڑنے کے تھوڑی ہی دیر بعد واپس چلے گئے تھے۔ البتہ دو دوسرے آدمی دکھائی دیے تھے۔ ان میں سے کسی کی عمر بھی [illegible] سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک کلین شیو تھا۔ دوسرے کی مونچھیں چوہے کی دم کی طرح ہونٹوں کے کناروں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ دونوں کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ ایک نے [illegible] چٹیا بنا رکھی تھی اور دوسرے کے بال گردن پر بکھرے ہوئے تھے۔ پیشانی پر بالوں کو روکنے کے لیے ہیئر بینڈ لگایا ہوا تھا۔ دونوں نے دھاری دار ٹی شرٹس اور جینز پہن رکھی تھیں۔ اپنے حلیوں سے وہ سڑک چھاپ غنڈے ہی لگتے تھے۔ میں جب سے مہاراج کی پناہ میں آیا تھا ایسے ہی لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا اور میں جانتا تھا اس قسم کے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔

مس بٹرفلائی کے ساتھ دوسری ادھیڑ عمر عورت میں بھی بڑی کشش تھی۔ ہمارے لیے ناشتا اسی نے بنایا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ انہیں ہمارے بارے میں پہلے ہی سے بتا دیا گیا تھا۔ باہر بیٹھے ہوئے ان دونوں آدمیوں کے بارے میں تو میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں ہماری حفاظت کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن مس بٹرفلائی اور مس رتانا نے اپنے بارے میں بتانے سے گریز کیا تھا۔

وہ مسطح میدان فٹ بال گراؤنڈ کے برابر تھا۔ وہ مکان بھی خاصا بڑا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر دو یا تین کمروں پر مشتمل ایک اور کاٹیج تھا۔ اس میدان کے چاروں طرف گنجان درخت تھے جو گویا چار دیواری کا کام دے رہے تھے۔ ایک راستہ وہ تھا جس طرف سے ہم آئے تھے اور دوسرا راستہ اس چٹان کے دوسری طرف تھا۔ یہ راستہ خاصا کشادہ تھا اور اس سے گاڑی بھی آ سکتی تھی۔ اوپر لوہے کے پائپوں کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ اس قسم کا گیٹ چٹان کے دامن میں بھی تھا تاکہ کوئی غیر متعلق گاڑی اس راستے پر نہ آ سکے۔ چٹان کے دوسری طرف نشیب میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر دور تک جان بوری شہر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سمندر کا ساحل تھا جو خم کھاتا ہوا اس چٹان کے دوسری طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے سے جنوب کی طرف چلا گیا تھا۔

بڑی خوب صورت جگہ تھی اور محفوظ بھی۔ مہاراج نے اسی لیے صرف دو آدمیوں کو یہاں بھیجا تھا۔ بجلی کے علاوہ یہاں ٹیلی فون کی لائن بھی موجود تھی۔ اس روز ناشتا کرنے کے بعد ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ دونوں محافظ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی البتہ ان کی نظریں ہمارا تعاقب کرتی رہی تھیں۔

دوپہر سے کچھ دیر بعد ایک بوڑھا آدمی بھی وہاں پہنچ گیا۔ میرے خیال میں اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ دُبلا پتلا سا۔ ٹھوڑی پر چند بال جنہیں داڑھی کہا جا سکتا تھا۔ چند بال ہونٹوں کے کناروں پر بھی تھے جن پر مونچھوں کا شائبہ ہوتا تھا۔ اس کا نام پکولا تھا اور یہ عجیب سا نام تھا۔ جبکہ حلیے کے اعتبار سے میرے خیال میں اس کا نام نیولا ہونا چاہیے تھا۔ وہ اس تنگ سے راستے سے آیا تھا جس راستے سے رات کو ہم آئے تھے۔ چٹان پر چڑھتے ہوئے ہمارا تو سانس پھول گیا تھا لیکن وہ بالکل تازہ دم لگ رہا تھا جیسے اس بلندی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔

پکولا کو مہاراج نے یہاں بھیجا تھا تاکہ میری تربیت کا اگلا مرحلہ مکمل ہو جائے اور وہ مرحلہ تھا چی کی پریکٹس۔ اور اگلے روز میری پریکٹس شروع ہو گئی۔ مجھے صبح سویرے ہی جگا دیا گیا اور پکولا مجھے چی کے بارے میں لیکچر دینے لگا۔

چی ہر جاندار کے اندر وہ پوشیدہ قوت ہے جسے اگر دریافت کر لیا جائے تو نادیدہ قوت کا ایسا خزانہ حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی

خواہش سب ہی لوگ کرتے ہیں۔ ایک کمزور ترین آدمی اپنے سے کئی گنا طاقت ور آدمی کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔ آنکھوں میں وہ پُراسرار قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظروں کے اشارے پر بڑی سے بڑی اور وزنی چیز کو اس کی جگہ سے ہلایا جاسکتا ہے۔ دماغی قوت ایسے ایسے کارنامے انجام دیتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن آج تک دنیا میں بہت کم لوگ اپنے اندر چی کی یہ پُراسرار قوت بیدار کرسکے ہیں کیونکہ اس کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

چی کی قوت کا اندازہ سانپ سے لگایا جاسکتا ہے۔ سانپ.... زمین پر رینگنے والا معمولی سا کیڑا۔ جس کا جسم اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ اسے آسانی سے مسلا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے اندر چی کی یہ پُراسرار قوت موجود ہے اور وہ اس سے کام لیتا ہے۔ سانپ کے زہر سے قطع نظر، سانپ اگر بھاری بھرکم اور طاقت ور پہلوان کی ٹانگ سے لپٹ جائے تو ٹانگ کی ہڈی توڑ دیتا ہے۔

انسان میں بھی چی کی یہ پُراسرار قوت بدرجہ اتم موجود ہے لیکن ننانوے فی صد لوگ اس سے واقف ہی نہیں ہیں اور جو واقف ہیں، وہ اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور جو کوشش کرتے ہیں ان میں لاکھوں میں ایک ایسا ہوگا جسے کامیابی نصیب ہوتی ہو۔

پکولا مجھے بتا رہا تھا کہ چی کی اس پُراسرار قوت کو کس طرح اندر سے ابھارا جاتا ہے۔ اس نے مجھے یوگا کے ایک اسٹانس میں بٹھا دیا۔ آلتی پالتی مار کر۔ دونوں ہاتھ سامنے گھٹنوں پر اور کمر بالکل سیدھی، گردن اکڑی ہوئی۔ وہ خود بھی اسی پوسچر میں تھا اور مجھے مخصوص انداز میں سانس لینے کو بتا رہا تھا۔

مارشل آرٹس کی تربیت کے دوران میں بہت ہی کٹھنائیاں برداشت کرچکا تھا لیکن اس پوزیشن میں تو آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں بیٹھ سکا۔ میری تختے کی طرح اکڑی ہوئی کمر خود بخود جھکنے لگی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ابھی میری یہی تربیت جاری تھی۔ ابھی میرا پوسچر پرفیکٹ نہیں ہو سکا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آگے چل کر یہ تربیت کس قدر کٹھن ثابت ہوگی۔

اس روز شام کو ٹریننگ ختم ہونے کے بعد میں نے ایک سوال کیا تو پکولا نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"آج کے دور میں تو میں کسی کے بارے میں نہیں جانتا۔ اٹھارہ بیس سال پہلے امریکا کے چیمبرلین نامی قصبے میں کیری نام کی ایک ایسی لڑکی موجود تھی جو اس قسم کی پُراسرار قوتوں کی مالک تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کیری کے بارے میں بتانے لگا۔

کیری کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ باپ جرائم پیشہ، شرابی اور جواری تھا۔ ماں کٹر قسم کی مذہبی عورت تھی۔ کیری کے باپ کا انتقال ہوا تو وہ اس وقت صرف تین سال کی تھی۔

بدصورت ہونے کے ساتھ اسے دوسری محرومیوں کا بھی احساس تھا جس نے اس چھوٹی سی عمر میں ہی اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ ... سے زیادہ بدمزاج اور چڑچڑی تھی۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر ... پیٹ کر رکھ دیتی۔

چی کی یہ پُراسرار قوت ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے اسے حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ پُراسرار قوت کیری میں بھی تھی لیکن کیری کو اس کے لیے کوئی محنت نہیں کرنی پڑی۔ اسے یہ قوت خود بخود حاصل ہوگئی تھی اور اس کا انکشاف محض اتفاق سے ہوا تھا۔

اس روز وہ اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے وہ اپنی ماں کے ہاتھوں بری طرح پٹ چکی تھی۔ چائے پیتے ہوئے کیری کے دل میں خواہش ابھری کہ کاش اس کی ماں کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹ جائے اور اس کے نئے کپڑوں کا بیڑا غرق ہو جائے۔ اس نے کپ کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے چائے کا کپ ماں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کے نئے کپڑوں کا ستیاناس ہوگیا۔

کیری چونک گئی۔ اس کی خواہش پوری ہوگئی۔ اسے احساس ہوگیا کہ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی قوت موجود ہے، جس سے وہ اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتی ہے۔ وہ اس قوت کو ابھارنے کے لیے پریکٹس کرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اتنی قوت پیدا ہوچکی تھی کہ وہ اپنی نظروں سے بھاری سے بھاری چیز کو اس کی جگہ سے حرکت دے سکتی تھی۔ وہ کھانے کی میز کو اس کی جگہ سے ... فٹ اوپر اٹھا دیتی۔ بھاری مسہری کو ہاتھ لگائے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتی۔

اور پھر کیری کو اپنے اندر موجود ایک اور پُراسرار قوت کا احساس ہوا۔ یہ قوت اس کے دماغ میں تھی۔ وہ اپنی سوچ سے ایسے کام لے سکتی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک روز ماں سے ڈانٹ پڑی تو اس نے اپنی سوچ سے کام لے کر اپنے مکان کی چھت پر پتھروں کی بارش کروا دی۔ لطف کی بات تو یہ تھی کہ پڑوس کے کسی مکان پر ایک پتھر بھی نہیں گرا تھا۔

کیری کی یہ صورتِ حال لوگوں سے چھپی نہیں رہ سکی۔ کیری کے بارے میں عجیب و غریب افواہیں پھیلنے لگیں۔ نفسیات اور مختلف علوم کے ماہرین چیمبرلین نامی اس قصبے میں پہنچنے لگے۔ کیری کے طبی معائنے اور نفسیاتی تجزیے ہوتے رہے لیکن ماہرین کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔

کیری جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، اس کی اس پُراسرار قوت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ بدصورت ہونے کی وجہ سے اس کے دوست اس کا مذاق اڑاتے۔ اسکول میں بھی وہ اس مذاق کا نشانہ بنی رہتی جس سے اس کے دل میں دوسروں کے لیے نفرت بڑھتی رہی۔

۱۹۷۹ء میں اسکول کی سالانہ تقریب تھی۔ بہت بڑے تعداد میں لوگ جمع تھے۔ کیری اسٹیج پر تھی۔ اسے اسکول کی طرف سے بہت بڑا اعزاز ملنے والا تھا۔ دوست اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور جب ایک لڑکے نے اس پر رنگ کی بالٹی انڈیل دی تو اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ کیری نے اپنے اندر کی اس پُراسرار قوت کو بھرپور انداز میں استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ قصبے کے لوگوں سے اپنی توہین کا بدلہ لیا جائے۔

ہال میں لاتعداد آرائشی برقی قمقمے لگے ہوئے تھے۔ کیری نے نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بجلی کے تار ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔ ایک کونے میں آگ لگی تو کھلبلی مچ گئی۔ لوگ بدحواس ہو کر دروازوں کی طرف دوڑے لیکن تمام دروازے بند ہوگئے۔ آگ پھیل رہی تھی۔ چیختے چلّاتے ہوئے لوگ بدحواسی میں ایک دوسرے پر گرنے لگے۔

کیری ایک دروازے کے سامنے پہنچی تو دروازہ خود بخود کھل گیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی باہر آگئے لیکن پھر فوراً ہی دروازہ بند ہوگیا۔ ہال میں آگ پھیلتی جارہی تھی۔

آگ نے عمارت کو پوری طرح لپیٹ میں لے لیا۔ لوگ دروازے اور کھڑکیاں توڑ کر باہر نکل رہے تھے۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی اس کی طرف دوڑ رہی تھیں۔

کیری کی نفرت نقطۂ عروج پر تھی۔ اس کی نظریں اور دماغی قوت پوری طرح کام کررہی تھی۔ اسکول کی عمارت کے آس پاس تمام ہائیڈرنٹ ٹوٹ گئے تھے۔ پانی سڑکوں پر پھیل رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کو آگ بجھانے کے لیے پانی نہیں مل سکا۔ آگ دوسری عمارتوں تک پھیل گئی تھی۔

پورے قصبے میں بجلی کے تار ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ پانی کی پائپ لائنیں پھٹ گئی تھیں۔ آگ اور پانی.... قصبے کی سڑکوں پر پانی تھا اور آگ عمارتوں کو لپیٹ میں لے رہی تھی۔ قیامتِ صغرا کا منظر تھا۔ چیختے چلّاتے ہوئے لوگ پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ آس پاس کے قصبوں میں فائر بریگیڈ کی گاڑیاں طلب کرلی گئی تھیں مگر آگ پھیلتی گئی۔

چیمبرلین قصبہ راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ ساٹھ افراد موت کا شکار ہوئے تھے اور سیکڑوں زخمی ہوئے تھے۔ قصبے سے کچھ دور ایک ٹیلے پر کیری کی لاش بھی ملی تھی۔ اس کی موت دماغ کی نسیں پھٹ جانے سے واقع ہوئی تھی۔

"چی کی قوت بڑی خوف ناک ہے۔" پکولا کہہ رہا تھا "کیری میں یہ قوت خود بخود ابھر کر آئی تھی لیکن اس نے اسے منفی انداز میں استعمال کیا۔ جس نے ایک قصبے کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا لیکن اگر اس قوت کو مثبت انداز میں استعمال کیا جائے تو اس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔"

میری تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ جب میں سانس روک کر بیٹھتا تو بعض اوقات یوں لگتا جیسے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔ اب میں پینتیس چالیس منٹ تک بالکل سیدھا بیٹھ سکتا تھا۔

اس دوران میں مجھے یہ بھی اطلاع ملی کہ شوفانگ کو واٹ سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ اس واٹ کا مہتمم تھا۔ یہاں لاکھوں ڈالر کے نذرانے جمع ہوتے تھے اور ان سب کا حساب رکھنا اس کی ذمے داری تھی۔ واٹ میں رونما ہونے والے ان واقعات کے بعد واٹ کا حساب بھی چیک کیا گیا تو بڑی بے قاعدگیوں کا انکشاف ہوا۔ جس بنا پر اسے واٹ سے نکال دیا گیا تھا۔

مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ تھائی وانگ اب پوری طرح صحت یاب ہوچکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے جیسی چمک اور رخساروں پر سرخی آگئی تھی۔

اس روز شام کے کچھ بعد ہم برآمدے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ گھاٹی والے راستے سے دو آدمی اوپر آگئے۔ ان کے حلیے بھی ہمارے ان دو آدمیوں سے مختلف نہیں تھے جو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ رنگوٹی تھا۔ اسے میں نے عرصہ پہلے مہاراج کے جمنازیم میں دیکھا تھا۔

"مہاراج نے ہمیں حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا کر دوبارہ بنکاک پہنچا دیا جائے۔" رنگوٹی نے مجھے بو کرتے ہوئے کہا۔

"آج صبح فون پر مہاراج سے بات ہوئی تھی۔ انہوں نے تو ایسا کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔" میں نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ پروگرام اچانک ہی بنا ہے۔" رنگوٹی نے جواب دیا "دراصل ناٹیگر کو تمہارے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا ہے۔ وہ آج رات کسی وقت یہاں حملہ کرسکتے ہیں اس لیے تم لوگوں کو یہاں سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔ اگر تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہو تو فون پر مہاراج سے تصدیق کرسکتے ہو۔"

میں چند لمحے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کمرے میں آگیا جہاں فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر نمبر ملانا چاہا تو پتا چلا کہ فون ڈیڈ ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ کریڈل ٹیپ کیا لیکن لائن میں جان پیدا نہیں ہوئی۔ میں ریسیور رکھ کر باہر آگیا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم رنگوٹی کے ساتھ اس تنگ سے چٹانی راستے پر اتر رہے تھے۔

وہ نیلے رنگ کی بند وین تھی جس کے شیشوں پر سیاہ شیٹس لگی ہوئی تھیں۔ وین کے اندر سے ہم تو باہر دیکھ سکتے تھے لیکن باہر سے اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ رنگوٹی کا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور رنگوٹی پچھلے حصے میں ہمارے ساتھ۔

وین جان بوری شہر سے ہوتے ہوئے ہائی وے پر آگئی اور پھر ہائی وے تھری پر مڑ کر تیز رفتاری سے بنکاک کی طرف دوڑنے لگی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد ہم بنکاک شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ وین وکٹری مونومنٹ کے قریب سے ہوتی ہوئی رو تھن روڈ کی طرف مڑ گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد سوئے اری ون پر گھوم کر ایک کاٹیج کے سامنے رک گئی۔ ہارن بجانے پر گیٹ کھل گیا اور وین اندر آ کر پورچ میں رک گئی۔

وین سے اترتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ رنگوٹی کے دونوں ساتھی باہر ہی رک گئے تھے جبکہ رنگوٹی ہمیں لے کر ایک کمرے میں آ گیا۔ یہ وسیع و عریض کمرا قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک دیوار پر بڑے سے فریم میں نیم عریاں عورت کی تصویر آویزاں تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ مہاراج کا تعلق کسی ایسی جگہ سے نہیں ہو سکتا تھا جہاں اس طرح کا پُر آسائش و قیمتی فرنیچر ہو اور کسی عورت کی ایسی عریاں تصویر لگی ہوئی ہو۔ جسے دیکھتے ہی پسینہ آنے لگے۔

"تم لوگ آرام سے بیٹھو۔" رنگوٹی نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ماسٹر ہو چن یہاں موجود ہے میں اسے بلا کر لاتا ہوں۔"

رنگوٹی کمرے سے نکل گیا۔ میں' نرس شینو اور تھائی وانگ کی طرف دیکھنے لگا۔ شینو کو تو شاید کچھ اندازہ نہیں تھا لیکن تھائی وانگ کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور تین آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک رنگوٹی تھا' دوسرا اس کا وہی ساتھی تھا جو ہمارے ساتھ آیا تھا اور تیسرے کو دیکھ کر میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

وہ خانقاہ کا معزول مہتمم.... شوفانگ تھا۔

○☆○

میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تھا بلکہ میں دھوکا کھا گیا تھا۔ رنگوٹی کو عرصہ پہلے میں نے مہاراج کے جمنازیم میں دیکھا تھا اور پہاڑی والے مکان پر اسے دیکھ کر یہی سمجھا تھا کہ وہ اب بھی مہاراج کے کیمپ میں ہے لیکن یہ بھول گیا تھا کہ یہاں وفاداریاں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی' پیسے کے لیے لوگ اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں۔

شوفانگ نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے ایک ایسے آدمی کو بھیجا تھا جس پر شبہ نہ کیا جا سکے اور اس سے پہلے ٹیلی فون کی لائن کہیں سے کاٹ دی گئی تھی۔ رنگوٹی نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ ٹیلی فون پر مہاراج سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ٹیلی فون پر رابطہ نہیں ہو سکے گا۔

میں اپنے آپ میں اس وقت سے کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا جب ہم ان کے ساتھ پہاڑی والے مکان سے روانہ ہوئے تھے اور تھائی وانگ بھی غالباً کسی ایسی ہی کیفیت میں مبتلا رہی تھی اور اب شوفانگ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

اس کے جسم پر لباس تو وہی بھکشوؤں والا تھا۔ پیلے کپڑے کے تین ٹکڑے۔ ایک جسم کا نچلا حصہ ڈھانپنے کے لیے دوسرا درمیانی حصے کے لیے۔ تیسرا جسم کے اوپر والے حصے کو چھپانے کے لیے جو بوقتِ ضرورت سر کو بھی ڈھانپ سکے۔ بھکشو عام طور پر بہت سستی قسم کا کپڑا استعمال کرتے ہیں لیکن شوفانگ اور بعض دوسرے بھکشوؤں کے جسم پر میں نے ہمیشہ قیمتی کپڑا دیکھا تھا۔ جوتا یا چپل وغیرہ استعمال کرنا بھی بھکشوؤں کے لیے ممنوع تھا لیکن شوفانگ کے پیروں میں اس وقت سیاہ مخمل کے خوب صورت سلیپر نظر آ رہے تھے۔

اس کے ہونٹوں پر بڑی کمروری سی مسکراہٹ اور چہرے پر خباثت تھی۔ میں اسے دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شینو اور تھائی وانگ نے بھی میری تقلید کی تھی۔ ان دونوں کے چہروں پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ شینو کو بھی اب صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"مہاراج کے چیتے!" شوفانگ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا "تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے تھے اور وہ مہاراج! وہ تو اپنے آپ کو واقعی مہاراج سمجھ بیٹھا ہے۔ چند غنڈوں کو اپنے اردگرد جمع کر کے وہ اپنے آپ کو بہت طاقت ور سمجھنے لگا ہے۔ شاید وہ بھول گیا ہے کہ نہلے پر دہلا بھی ہوتا ہے۔ لیکن آج کے بعد اس کا راج پاٹ ختم ہو جائے گا۔ میں اسے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دوں گا اور تم... تمہیں تو ایسی سزا ملے گی کہ نہ مر سکو گے اور نہ ہی جی سکو گے۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے شوفانگ۔" میں نے کہا "تم یہ سمجھتے تھے کہ میں تمہاری جگہ لینا چاہتا ہوں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بھکشو نہیں ہوں۔ میرا تو تمہارے مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسی صورت میں' میں تمہاری جگہ کیسے لے سکتا تھا۔ مجھے تو یہاں صرف بھکشوؤں کی مارشل آرٹ کی ٹریننگ کے لیے بھیجا گیا تھا۔ میرا واٹ کے معاملات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"یہی تو افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسے شخص کو ہم پر مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس کا ہمارے دھرم سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔" شوفانگ نے کہا "میں جانتا ہوں۔ مہاراج کو بھی اس دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ ہماری دھرمی کونسل پر حاوی ہو رہا ہے تاکہ بنکاک کی تمام خانقاہوں پر قبضہ کر سکے۔ یہ خانقاہیں عبادت گاہیں نہیں سونے کی کانیں ہیں۔ یہاں روزانہ کروڑوں بھات کے نذرانے چڑھائے جاتے ہیں اور مہاراج سونے کی ان

کانوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اگر اس میں سے تھوڑا سا حصہ وصول کر لیا تو اسے ناگوار گزرا اور دھرمی کونسل کے ذریعے مجھے برطرف کروا دیا۔ یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔ اگر تم نہ ہوتے تو میرا یہ سلسلہ چلتا رہتا اور وہ منصوبہ بھی ناکام نہ ہوتا جس پر میں نے بڑی محنت کی تھی مگر تمہاری مداخلت سے ساری محنت پر پانی پھر گیا۔"

"کون سا منصوبہ؟" میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"لارڈ بُدھا کے مجسمے سے سونا چرانے کا منصوبہ۔" شوفانگ نے کہا "وہ منصوبہ دراصل میرا ہی تھا۔ میں نے ہی ٹائیگر کو اس واٹ کے نقشے وغیرہ فراہم کیے تھے تاکہ انہیں تالے میں ٹھیک جگہ پر پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ہم میں ففٹی ففٹی معاملہ طے ہوا تھا۔ اگر وہ مجسمے کے اندر کا سارا سونا نکال کر لے جاتے تو اس میں سے آدھا مجھے ملتا لیکن کچھ اس کے آدمیوں کی حماقت اور کچھ تمہاری چالاکی کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور پھر دوسرے روز میں نے ہی ٹائیگر کو اطلاع بھجوائی تھی کہ تم واٹ کے گیٹ کے سامنے کھڑے عقیدت مندوں کو درشن دے رہے ہو۔ وہ گلدستہ اس نے تمہیں بھجوایا تھا جس میں طاقت ور ٹائم بم نصب تھا۔ خیال ہی نہیں یقین تھا کہ بم پھٹے گا تو تمہارے جسم کے چیتھڑے اڑ جائیں گے مگر تم ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی بچ گئے اور اس کے دو تین دن بعد واٹ کے حساب میں بے قاعدگیوں کی وجہ سے مجھے بھی برطرف کر دیا گیا۔ میں مہاراج سے انتقام لینے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے پہلے بھی میرے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ مہاراج کو شاید یہ شبہ ہو گیا تھا کہ واٹ میں رہتے ہوئے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے گی اس لیے تمہیں وہاں سے ہٹا دیا گیا لیکن پورے بارہ دن کی کوشش سے میں نے پتا چلا لیا کہ تم کہاں ہو اور اب دیکھ لو... تم میرے سامنے کھڑے ہو۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ مہاراج نے اس روز ٹھیک ہی کہا تھا کہ شوفانگ بہت کینہ پرور اور سازشی آدمی تھا۔ یہ انکشاف میرے لیے واقعی بڑا سنسنی خیز تھا کہ بُدھا کے مجسمے سے سونے کی چوری کا منصوبہ اس نے بنایا تھا۔ تھائی وانگ کے ساتھ رہتے ہوئے میں بدھ مت اور خصوصاً بھکشوؤں کے بارے میں تھوڑا بہت جان چکا تھا۔ بدھا کا پیروکار کوئی بھی شخص بھکشو بن سکتا تھا۔ اس کے لیے ذات پات یا رنگ و نسل کی کوئی قید نہیں۔ البتہ چند شرائط پر پورا اترنا اس کے لیے ضروری ہے۔ باپ کا قاتل نہ ہو اور چھوت چھات کی کسی بیماری میں مبتلا نہ ہو۔ بھکشو بن جانے کے بعد بھی اس کے لیے چند باتوں پر کاربند رہنا ضروری ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ محنت مزدوری یا کوئی اور کام دھندا نہ کرے۔ دوسروں کی کمائی پر عیش کرے یعنی کھانا مانگ کر کھائے۔ کسی کو قتل نہ کرے' چوری نہ کرے' جھوٹ نہ بولے' زنا نہ کرے بلکہ عورت کا خیال بھی دل میں نہ لائے' رقص و موسیقی سے دور رہے' کوئی نشہ آور چیز استعمال نہ کرے اور دوپہر کے بعد کھانا نہیں کھائے' اونچی اور آرام دہ جگہ پر مت بیٹھے اور کسی سے بھیک میں بھی سونا چاندی قبول نہ کرے۔

میں طویل عرصے سے بھکشوؤں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ بہت کم ایسے بھکشو دیکھے تھے جو واقعی ان راہبانہ اصولوں پر عمل پیرا تھے۔ جبکہ اکثریت ایسے بھکشوؤں کی دیکھنے میں آئی تھی جو بڑے دھڑلے سے ان اصولوں یا بدھا کی تعلیمات کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ میں ٹریننگ کے دوران میں کیمپوں میں بھکشوؤں کے ساتھ رہا تھا۔ وہاں بہت سے بھکشو ایسے تھے جو دوپہر کے بعد رات کا کھانا بھی کھاتے تھے اور جھوٹ بھی بڑے دھڑلے سے بولتے تھے۔

اور شوفانگ۔ اس میں تو بدھ مت کے یہ تمام شرعی عیب موجود تھے۔

"مجھے حیرت ہے۔" میں نے شوفانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم لارڈ بدھا کے پیروکار ہو' راہب ہو۔ تمہیں تو تارک الدنیا ہونا چاہیے۔ ان سب چیزوں سے تمہارا کیا سروکار اور پھر بدھا کے مجسمے سے سونے کی چوری۔ کیا یہ گناہ نہیں؟"

"گناہ!" شوفانگ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "یہ کہاں کا انصاف ہے کہ دوسرے لوگ تو عیش کریں۔ ان کے پاس دنیا کی ہر آسائش موجود ہو۔ وہ خوب صورت عورتوں سے دل بہلائیں اور ہم فاقے کریں۔ ہم عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں تو اسے گناہ سمجھا جائے۔ اور پھر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ منوں کے حساب سے سونا اس طرح ضائع کر دیا جائے۔ لارڈ بدھا کو سونے کی ضرورت نہیں۔ اس کی آتما یہ دیکھنے کے لیے نہیں آئے گی کہ اس کا مجسمہ سونے میں ڈھالا گیا ہے یا کسی پتھر سے تراشا گیا ہے۔ سونے کی ضرورت تو ہم جیسے لوگوں کو ہے تاکہ اس سے زندگی کی آسائشیں حاصل کی جا سکیں۔ میں نے یہ سونا حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کامیاب نہیں ہو سکا کوئی بات نہیں لیکن اب مجھے ایسا ایک اور موقع مل گیا ہے کہ اس سونے کی مالیت سے کئی گنا زیادہ رقم حاصل کر سکتا ہوں۔"

"کوئی اور شیطانی منصوبہ۔" میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اسے میری ذہانت کہو۔" شوفانگ کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آ گئی۔ "تمہاری وجہ سے ٹائیگر کو بھی بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے اور پھر اس کے دوستوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے ان کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ وہ دنیا کے ایک سرے سے تمہارا پیچھا کرتے ہوئے آئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ تم ان کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہو۔ وہ تمہارے سر کی منہ مانگی قیمت دے سکتے ہیں۔ میں آج رات ہی ٹائیگر کو پیغام بھجوا دوں گا کہ تم میرے قبضے میں ہو۔ مجھے تمہاری منہ مانگی قیمت مل جائے گی۔ میں نے اتنی دولت جمع کر رکھی ہے کہ میری آنے والی

چار پانچ نسلیں بھی کوئی کام کئے بغیر عیش کرسکتی ہیں۔ تمہاری قیمت وصول کرتے ہی میں ہندوستان چلا جاؤں گا۔ وہاں کے مندروں میں بھی بڑے بڑے جگادری پنڈت پڑے ہیں۔ دو چار سے تو میرا رابطہ بھی ہے۔ میں نے یہاں سے نکلنے کے تمام انتظامات مکمل کرلیے ہیں۔"

"لیکن شاید تم ایسا نہ کرسکو۔" میں نے کہا "مہاراج کو اب تک پتا چل گیا ہوگا کہ ہمیں اغوا کرلیا گیا ہے۔ وہ تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا اور پھر تم ٹائیگر اور اس کے ساتھیوں کو نہیں جانتے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں تمہارے قبضے میں ہوں' وہ تمہاری زندگی کا چراغ گل کردیں گے۔"

"میں ایسا بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ اسے دعوت دے کر یہاں بلالوں۔" شوفانگ نے کہا "اس سے بات چیت دوسرے ذرائع سے ہوگی اور تمہیں اس کے حوالے اس وقت کیا جائے گا جب وہ مطلوبہ رقم میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا دے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کہنے لگا "مجھے تمہاری وجہ سے وقت سے پہلے یہاں سے بھاگنے کا پروگرام بنانا پڑا۔ مجھے واٹ کے مجسمے کا سونا حاصل نہ کرسکنے کا افسوس رہے گا۔ اس وقت میرا دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ تمہارے ٹکڑے کرکے کتوں کے آگے ڈال دوں لیکن میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا کیونکہ اس طرح تمہاری قیمت کم ہوجائے گی۔ البتہ تمہاری یہ دوست۔" اس نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا "اس دوران میں میرا دل بہلا سکتی ہے۔ اس کو دیکھ کر نجانے کیوں میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ صرف میں ہی نہیں۔ اس واٹ کے چند اور بھکشوؤں کی نیت بھی ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ اگر یہ ساری گڑبڑ نہ ہوتی تو ہم لوگ کسی رات واٹ کے تہ خانے ہی میں اس کی دعوت اڑاتے لیکن آج یہ صرف میرا دل بہلائے گی۔"

تھائی وانگ کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ مجھ سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ ہمارے درمیان شیشے کے ٹاپ والی ایک کافی ٹیبل حائل تھی۔ شوفانگ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا تھائی وانگ کے سامنے پہنچ گیا۔ رنگوٹی اور اس کے ساتھی نے رائفلیں تان لیں۔

شوفانگ کی نظریں تھائی وانگ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور پھر اس نے اچانک ہی ہاتھ بڑھا کر تھائی وانگ کے گریبان کو زوردار جھٹکا دیا۔ قمیص کے سارے بٹن ٹوٹ گئے اور وہ سامنے سے برہنہ ہوگئی۔

"تت.... تم شیطان.... اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکو گے۔" تھائی وانگ چیخی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شوفانگ کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

شوفانگ نے اچانک ہی اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ تھائی وانگ چکرا کر پشت کے بل صوفے پر گر گئی۔ شوفانگ کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ چہرے پر درندگی سی آگئی۔

وہ کپڑے کے پلّو سے اپنے چہرے پر سے تھوک صاف کرنے لگا۔

"میری زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئی ہیں۔ اپنے آپ کو پیش کردینے والی بھی اور تم جیسی خود سر بھی لیکن کسی میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی کہ میرے منہ پر تھوک سکے۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم میرے پیروں کے تلوے چاٹنے پر مجبور ہو جاؤ گی لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ کومو۔" اس نے آخری لفظ رنگوٹی کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "رادھو کو بلاؤ اور اسے تہ خانے والے کمرے میں پہنچا دو۔"

کومو جس آدمی کا نام تھا۔ اس نے آواز دے کر رادھو نامی اس آدمی کو بلالیا جس نے گیٹ کھولا تھا۔ وین ہمیں یہاں چھوڑنے کے بعد واپس چلی گئی تھی مجھے اس بات کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ شوفانگ کے علاوہ اس کاٹیج میں صرف تین آدمی اور تھے۔ رنگوٹی' کومو اور رادھو۔

شینو ایک طرف کھڑی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ موجودہ صورتِ حال سے اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوگا جو تھائی وانگ کے ساتھ ہونے جا رہا تھا۔ وہ آنے والے لمحات کے تصور ہی سے کانپ رہی تھی۔

کومو اور رادھو نے تھائی وانگ کو بانہوں سے پکڑ لیا اور اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگے۔ تھائی وانگ پوری طرح مزاحمت کر رہی تھی مگر ان مسٹنڈوں کے سامنے اس کی پیش نہیں گئی اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔

"اس کا کیا کرنا ہے؟" رنگوٹی نے شینو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آج رات بھر کے لیے تم تینوں کی ہے۔" شوفانگ نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "لیکن پہلے اسے بھی تہ خانے میں پہنچانا ہوگا۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا "اس لڑکی کے ساتھ میں جو کچھ بھی کروں گا' اس کی موجودگی میں کروں گا۔"

میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وہ واقعی شیطان تھا۔ میں نے شینو کی طرف دیکھا۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے جسم کا سارا خون نچڑ گیا ہو۔ میں نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ شوفانگ اور میرے بیچ میں کافی ٹیبل حائل تھی۔ رنگوٹی بائیں طرف پانچ چھ قدم کے فاصلے پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو شاید مجھے کوئی کارروائی کرنے کا موقع مل جاتا لیکن اس وقت جو صورتِ حال تھی' اس کے پیشِ نظر میرے لیے کوئی موقع نہیں تھا۔

کومو اور رادھو تھائی وانگ کو چھوڑ کر آگئے۔ شوفانگ کے اشارے پر ان دونوں نے شینو کو گرفت میں لے لیا اور رنگوٹی نے مجھے رائفل کی زد پر لے کر وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم اس کمرے سے نکل کر ایک شاندار بیڈ روم میں آگئے

ایک الماری اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی اور اس جگہ دیوار میں خلا نظر آرہا تھا اندر روشنی تھی اور سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔

تہ خانے کا وہ وسیع و عریض کمرا بھی بہت شاندار تھا۔ دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف شاندار ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک صوفہ سیٹ تھا۔ دو تین سیدھی پشت والی کرسیاں تھیں۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی اور دیواروں پر عریاں تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں بھی ایسی تھیں کہ شیطان بھی دیکھ کر شرما جائے۔ اس کمرے میں ہر وہ چیز موجود تھی جو کسی عیاش آدمی کے کمرے میں ہونا چاہیے تھی۔

تھائی وانگ سیدھی پشت والی ایک کرسی سے بندھی ہوئی تھی۔ شوفانگ نے رنگوٹی سے رائفل لے کر مجھے زد میں لے لیا اور رنگوٹی کو اشارہ کیا۔ اس نے مجھے دوسری کرسی پر بٹھا کر باندھ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" اس نے رنگوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ضرورت ہوئی تو تمہیں طلب کرلوں گا۔ میری اجازت کے بغیر اندر آنے کی کوشش مت کرنا۔"

رنگوٹی اوپر چلا گیا۔ تہ خانے کا راستہ خود بخود بند ہوگیا تھا۔

"یہ کاٹیج میں نے اپنی مرضی سے تعمیر کروایا تھا۔" شوفانگ بولا "چند وفادار کتوں کے سوا کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔ اس کاٹیج میں ایسے ایسے کمالات ہیں کہ تمہیں دیکھ کر حیرت ہوگی لیکن میں تمہیں کاٹیج دکھانے کے لیے نہیں لایا۔ اس وقت تو میں ایک ایسی چیز دکھاؤں گا کہ تم دونوں کی طبیعت خوش ہوجائے گی۔"

اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی اوپر والی دراز کھولی۔ اس میں رکھا ہوا پستول میرے علاوہ تھائی وانگ نے بھی دیکھ لیا تھا لیکن اس نے پستول نہیں نکالا۔ ریموٹ کنٹرول جیسی کوئی چیز نکال کر اس نے دراز بند کردی۔ ریموٹ کنٹرول کا رخ ایک دیوار کی طرف کرکے اس نے بٹن دبا دیا۔ دیوار کا چار مربع فٹ کا ایک ٹکڑا شٹر کی طرح اوپر اٹھ گیا۔ اس خلا میں ایک خوب صورت ٹی وی ٹرالی رکھی ہوئی تھی۔ ٹی وی کے ساتھ ہی ایک ٹیلی فون سیٹ بھی تھا۔ اس نے ٹرالی باہر کھینچ لی اور ٹیلی فون اٹھا کر قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

"شوفانگ بول رہا ہوں مسٹر ٹائیگر۔" وہ ماؤتھ پیس میں بولا "مجھے افسوس ہے ہمارا وہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکا تھا لیکن ہمارے درمیان ایک اور ڈیل ہوسکتی ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہ کر دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر بولا "گڈ۔ تم سمجھ دار ہو۔ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ وہ اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ ٹھیک ہے سودا ہوسکتا ہے۔ کل صبح گیارہ بجے میرا آدمی تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔ اس سے معاملہ طے ہوجائے گا۔ وہ جو فیصلہ بھی کرے گا قابل ہوگا۔ گڈ.... تو پھر کل صبح گیارہ بجے میرے آدمی کا انتظار کرنا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا اور ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا "تم آج کی رات میرے مہمان ہو۔" وہ بولا "مجھے امید ہے کہ کل یہ سودا ہوجائے گا اور تمہیں کل شام تک تمہارے ان دوستوں کے حوالے کردیا جائے گا جو عرصے سے تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"اس میں شبہ نہیں کہ میں اس وقت تمہارے قبضے میں ہوں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا یہ شیطانی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکے گا۔" میں نے کہا۔ میں بالکل خوف زدہ نہیں تھا اور نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔

میرے ہاتھ کرسی کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں اپنی کلائیوں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہاتھوں کو اس طرح حرکت دینے سے نائیلون کی رسی ڈھیلی ہوجائے گی اور مجھے کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

اس میں بھی شبہ نہیں کہ شوفانگ شیطان سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ جو شخص راہب بن کر اپنے دھرم کو دھوکا دے سکتا ہے اس سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس نے ٹرالی کے نچلے حصے میں رکھے ہوئے وی سی آر پر ایک ویڈیو کیسٹ لگا کر ٹی وی آن کردیا۔ اسکرین پر چند لمحے ذرّات سے جھلملاتے رہے اور پھر فلم شروع ہوگئی۔

جذبات کو بھڑکانے والی نہایت شرمناک فلم تھی۔ مرد اور عورت شیطانی کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے ایک لمحے کو آنکھیں بند کرلیں۔ وہ تھائی وانگ کی کرسی کی پشت پر پہنچ کر رک گیا اور پشت پر بندھے ہوئے اس کے ہاتھ کھولنے لگا۔

وہ تھائی وانگ کو بانہوں کے شکنجے میں جکڑ کر آگے لے آیا اور دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔ تھائی وانگ نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو شوفانگ نے اسے گرفت میں لے لیا۔ شوفانگ اس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا مگر تھائی وانگ مزاحمت کرتی رہی۔ اس مزاحمت میں اس کی قمیص پھٹ کر جسم سے الگ ہوگئی۔ وہ اوپر سے بالکل برہنہ ہوگئی تھی۔

میں اپنے ہاتھوں کو مسلسل حرکت دے رہا تھا لیکن رسی کی گرہیں کسی طرح ڈھیلی ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ رسی کی رگڑ سے میری کلائیوں میں تکلیف ہونے لگی تھی لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ میرا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

تھائی وانگ' شوفانگ کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ اس نے اچانک ہی شوفانگ کی ٹانگوں کے بیچ میں ضرب لگائی۔ شوفانگ بلبلاتا ہوا بیڈ پر الٹ گیا۔ تھائی وانگ اسے دھکیلتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ جیسے ہی بیڈ سے اتری' شوفانگ نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

میرے ہاتھ اگرچہ کرسی کی پشت پر بندھے ہوئے تھے مگر پیر آزاد تھے اور یہ رنگوٹی کی بہت بڑی غلطی تھی کہ اس نے میرے پیر کرسی کے پایوں کے ساتھ نہیں باندھے اور اب میں نے اس کی

اس غلطی سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں اس طرح اٹھ کر کھڑا ہوگیا کہ کمر دُہری تھی۔ میں قریب پہنچا تو شوفانگ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکا۔ میں بڑی تیزی سے گھوم گیا۔ کرسی کا پایہ اس کے گھٹنے کی ہڈی پر لگا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک اور وار کیا۔ اس مرتبہ کرسی کا پایہ اس کے دائیں بازو کی کہنی پر لگا۔ انسانی جسم کے یہ دو ایسے پریشر پوائنٹ تھے کہ ان پر لگنے والی معمولی سی چوٹ بھی تڑپا دیتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تھائی وانگ نے گھٹنے کی ایک اور ضرب اس کی ٹھوڑی پر لگا دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف لپکی تھی۔

شوفانگ کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ اپنی تکلیف بھول کر تھائی وانگ کی طرف لپکا لیکن میں اس کے راستے میں آگیا۔ میرے ہاتھ کرسی کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور کرسی میری پشت پر تھی جس سے میری کمر دہری ہو رہی تھی لیکن میری ٹریننگ کام آرہی تھی۔ کمر دہری ہونے کے باوجود مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں ایک بار پھر پوری قوت سے گھوم گیا۔ اس مرتبہ کرسی کا پایہ اس زور سے اس کے کولہے پر لگا کہ پایہ بھی ٹوٹ گیا۔ شوفانگ بلبلاتا ہوا منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر تھائی وانگ کو اس مرتبہ ڈریسنگ ٹیبل تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے بڑی عجلت میں دراز کھول کر پستول نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دراز میں رکھا ہوا ایک خنجر بھی اٹھالیا تھا۔

شوفانگ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھائی وانگ نے اس کے منہ پر زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ پیچھے الٹ گیا۔ تھائی وانگ اچھل کر میری پشت پر پہنچ گئی اور میری بلاشیں کاٹنے لگی۔ دو دھاری خنجر خاصا آبدار تھا۔ ایک ہی جھٹکے میں رسیاں کٹ گئیں۔ میں نے رسیوں اور کرسی کو اپنے جسم سے الگ کیا اور کلائیاں مسلنے لگا۔ تھائی وانگ نے پستول میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

شوفانگ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر خنجر بکف تھائی وانگ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت سی ابھر آئی اور وہ قالین پر گھسٹتا ہوا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"بس! شوق پورا ہوگیا۔" تھائی وانگ اس کے سامنے رک گئی "ابھی تو کھیل شروع بھی نہیں ہوا تھا۔ دیکھو۔ کتنا خوب صورت ہے میرا جسم۔ مجھے دیکھ کر تمہارے دل میں گدگدی ہونے لگتی ہے نا۔ اب پیچھے کیوں ہٹ رہے ہو۔ آؤ۔ کھیلو نا میرے جسم سے۔ ڈر کیوں رہے ہو۔ آؤ میرے عاشق.... میں تمہارے سامنے ہوں۔ پیچھے مت ہٹو۔ اپنی حسرت پوری کرلو۔"

شوفانگ کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں اور پھر اچانک ہی وہ چیخ چیخ کر رنگوٹی اور کومو وغیرہ کو پکارنے لگا۔ تھائی وانگ نے ٹی وی کا فل والیوم کھول دیا تاکہ اس کے چیخنے کی آواز تہ خانے سے باہر نہ جاسکے۔

میں تھائی وانگ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جنونی کیفیت میں جتلا ہو رہی تھی۔ وہ جو کچھ کرنے جا رہی تھی میں اسے نہ روک سکتا تھا۔ شوفانگ نے جیسے ہی اٹھنے کی کوشش کی تھائی وانگ کی طرح جھپٹی۔ دو دھاری خنجر شوفانگ کے پیٹ میں ہوگیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ تھائی وانگ نے خنجر کھینچا تو پیٹ سے خون کی دھار بھی بہہ نکلی۔

"میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گی۔" وہ غرائی "تمہیں اس قابل بھی نہیں چھوڑوں گی کہ اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرسکو۔"

وہ جنونی انداز میں اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر خنجر کے وار کرتی رہی۔ شوفانگ کے جسم سے خون کی دھاریں بہہ رہیں اور وہ چیختا رہا اور پھر تھائی وانگ نے جب اس کے نچلے حصے پر بندھا ہوا کپڑا کھینچ کر الگ کیا تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میں کانپ اٹھا۔ تھائی وانگ نے خنجر کے ایک ہی وار سے اس کی مردانگی جڑ سے اکھاڑ پھینکی تھی۔

"ان زخموں سے تم مروگے نہیں۔ ڈاکٹر تمہیں بچالیں گے۔" وہ اس کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولی "تم زندہ رہو گے اور زندگی کے آخری لمحے تک یہ یاد رکھو گے کہ تمہارا یہ حال اس کمزور اور بے بس عورت نے کیا تھا جسے تم پامال کرنا چاہتے تھے۔ میں چاہوں تو ایک ہی وار سے تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتی ہوں لیکن میرے خیال میں موت سزا نہیں، نجات کا باعث بنتی ہے۔ سزا تو وہ ہے جسے زندگی کی آخری سانس تک یاد رکھا جائے۔ تم جب تک زندہ رہو گے اس سزا کو یاد رکھو گے۔"

شوفانگ جان دار آدمی تھا۔ اتنے زخم کھانے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ تھائی وانگ نے ایک بار پھر اس کے منہ پر تھوکا اور مڑ کر مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں بہت محتاط انداز میں تہ خانے سے باہر آگئے۔ تھائی وانگ جسم کے بالائی حصے سے برہنہ تھی لیکن اسے شاید اپنی برہنگی کا احساس نہیں تھا۔ اس پر اب بھی جنون سا طاری تھا۔

ہم محتاط انداز میں دبے قدموں آگے بڑھتے رہے۔ ایک کمرے سے دبی دبی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ بند ہوا تھا لیکن دونوں پٹوں کے بیچ میں تقریباً آدھے انچ کی جھری تھی۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہ تینوں اس کمرے میں تھے۔ میں نے ایک زوردار ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا اور اچھل کر اندر آگیا۔ تھائی وانگ بھی میرے ساتھ تھی۔

"بس۔ اب کھیل ختم ہوگیا۔ چھوڑ دو اسے۔" میں نے کہا۔ پستول اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھا۔

وہ تینوں شینو کو چھوڑ کر اچھل پڑے۔ ان کی رائفلیں ایک طرف پڑی ہوئی تھیں۔ رنگوٹی نے اس طرف چھلانگ لگائی مگر میں

اس سے پہلے ہی حرکت میں آگیا۔ میں کھڑے کھڑے طاقت ور اسپرنگ کی طرح ہوا میں اچھلا۔ ہوا ہی میں لٹو کی طرح گھوما اور میری زوردار اسپن کک رنگوٹی کے منہ پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا الٹ کر پیچھے گرا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔

"اب کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو ہاتھوں یا پیروں کو حرکت نہیں دوں گا صرف ایک انگلی کو حرکت دوں گا۔" میں نے پستول سے اشارہ کیا۔

تھائی وانگ نے جلدی سے آگے بڑھ کر ایک رائفل اٹھالی اور ان تینوں کو زد میں لے لیا۔ خنجر اس نے وہیں پھینک دیا تھا۔ شینو دوڑ کر ہماری طرف آگئی۔ وہ لوگ اسے ابھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ تھائی وانگ کی طرح برہنہ تھا اور نوچ کھسوٹ کے نشان نظر آرہے تھے۔

ان میں صرف کومو کے جسم پر لباس تھا۔ رنگوٹی اور راوھو بے لباس تھے۔ میں نے تھائی اور شینو کو اشارہ کیا۔ انہوں نے راوھو اور رنگوٹی کی شرٹس اٹھا کر پہن لیں۔

"سزا تو تم تینوں کو بھی ایسی ہی ملنی چاہیے جو شوفانگ کو دی گئی ہے لیکن ہم تم لوگوں کے گندے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتے۔" میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم لوگوں کو اس لیے زندہ چھوڑا جا رہا ہے کہ پولیس کو اپنے اور شوفانگ کے کالے کرتوتوں کی تفصیل بتا سکو۔ رنگوٹی!" میں نے اس کی طرف دیکھا "وہ اس الماری کے اوپر کچھ رسیاں نظر آرہی ہیں۔ پہلے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو باندھو پھر تمہاری باری آئے گی۔"

رنگوٹی نے بلا چون و چرا الماری پر رکھی ہوئی رسیاں اتاریں اور راوھو اور کومو کو باندھنے لگا۔ رنگوٹی کو میں نے خود باندھا اور پھر ہم اس کمرے میں آگئے جہاں ہمیں سب سے پہلے لایا گیا تھا۔ وہاں ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے مہاراج کو اطلاع دی جائے۔" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ ایک اور جگہ میرے ذہن میں ہے اور میرا خیال ہے وہاں ہم زیادہ محفوظ رہ سکتے ہیں۔" تھائی وانگ نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ اس وقت رات کا ایک بج چکا تھا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے میں تقریباً دو منٹ لگے تھے۔ تھائی وانگ تقریباً تین منٹ تک بات کرتی رہی۔ اس نے فون پر جو کہا تھا اسے سن کر میں بری طرح اچھل پڑا تھا۔ فون کا کریڈل ٹیپ کرکے اس نے پولیس کا نمبر ملایا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ لائن ملنے پر مختصر سی تفصیل بتاتے ہوئے بولی "اس کاٹیج کا نمبر بھی نہیں بتا سکتی۔ البتہ یہ کاٹیج ناسوئے اری دن پر واقع ہے۔ جب آپ لوگ یہاں پہنچیں گے تو اس کا گیٹ کھلا ہوا اور تمام بتیاں جلتی ہوئی ملیں گی۔"

اس نے فون بند کردیا۔ ہم نے پستول اور رائفل وہیں پھینک دی اور باہر آگئے۔ پورچ میں سفید رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔

"تم گیٹ کھولو۔ میں کار باہر نکالتی ہوں۔" تھائی وانگ کہتے ہوئے کار کا دروازہ کھولنے لگی۔

ادھر اس نے انجن اسٹارٹ کیا ادھر میں نے گیٹ کھول دیا۔ وہ کار کو ریورس گیئر میں باہر لے آئی۔ میں نے گیٹ کھلا چھوڑ دیا اور شینو کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شینو ابھی تک کپکپا رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنا سارا بوجھ میرے اوپر ڈال رکھا تھا۔ میں نے ایک بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کردیا اور اس کا بازو ہولے ہولے تھپتھپانے لگا۔

کار تیز رفتاری سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی اور پھر وہ کار ہم نے راما ون روڈ پر سیام اسکوائر کے قریب چھوڑ دی۔ اس سے ذرا آگے رات بھر کھلے رہنے والے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے ایک ٹک ٹک مل گیا۔

یہ ٹک ٹک بھی ہم نے سیتھون روڈ پر برما کے سفارت خانے سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا اور وہاں سے پیدل چلتے ہوئے چین روڈ پر مڑ گئے۔ شینو اب بڑی حد تک اپنے آپ پر قابو پاچکی تھی۔ وہ زندگی کے خوفناک ترین تجربے سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں یقیناً یہ بات رہی ہوگی کہ بے آبرو کرنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور ظاہر ہے اس خوف کا تھوڑا بہت اثر تو اب بھی باقی تھا اور اسی لیے وہ تھائی وانگ کے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

چین روڈ پر چلتے ہوئے ہم ایک اور گلی میں مڑ گئے اور پھر ہندوؤں کے مندر کے سامنے سے گزر کر ہم دوسری گلی میں گھوم گئے۔ اس طرف مڑتے ہوئے میں اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں ٹائیگر کا ایک آدمی میرے ہاتھوں مارا گیا۔

ہم تینوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور پھر کچھ ہی دیر بعد تھائی وانگ، جانکی دیوی کے مکان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

دروازہ کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ تھائی وانگ نے شوفانگ کے کاٹیج سے فون کرکے جانکی دیوی کو بتا دیا تھا اور وہ ہمارے انتظار میں جاگ رہی تھی اسی لیے پہلی مرتبہ ہلکی سی دستک دینے پر ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

دوبارہ اس گھر میں قدم رکھتے ہوئے میں ایک عجیب...... سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں موت ہمارے سروں پر پہنچ گئی تھی اور ہم اس کے پنجوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اگر اس روز ہمیں چند منٹ کی بھی تاخیر ہوجاتی تو آج ہم دوبارہ اس چوکھٹ پر قدم رکھنے کے لیے زندہ نہ ہوتے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں میری اور اپنی جان بچانے کے لیے تھائی وانگ نے جانکی دیوی کی ملازمہ بندو کو گلا گھونٹ کر ہلاک کردیا تھا اور اس

وقت تھائی وانگ بھی اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سب کچھ سوچ رہی تھی جو میرے ذہن میں تھا۔

جانکی دیوی اور تھائی وانگ اس طرح پُرجوش انداز میں گلے ملی تھیں جیسے بچھڑی ہوئی سگی بہنیں طویل عرصے بعد ملی ہوں پھر جانکی دیوی، شینو کو دیکھ کر بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"او... شینو۔ تم... تم ان کے ساتھ کیسے؟" وہ کہتے ہوئے شینو سے لپٹ گئی۔

جانکی دیوی ڈاکٹر تھی اور شینو نرس۔ ان دونوں کا تعلق ایک ہی شعبے سے تھا۔ ایک دوسرے کو اس طرح پہچان لینا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

"اس کی قسمت بھی پھوٹ گئی ہے۔" تھائی وانگ نے مسکراتے ہوئے کہا "ہمارے ساتھ یہ بھی موت سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔"

"آؤ۔ اندر کمرے میں آجاؤ۔" جانکی دیوی نے کہا "لگتا ہے تم لوگ کسی بہت ہی سنگین قسم کی صورتِ حال سے نکل کر آرہے ہو۔ تم لوگ کمرے میں بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں اور تم کیسے ہو مسٹر وجدان۔" آخری الفاظ اس نے میری طرف دیکھ کر کہے۔

میں نے سرہلانے پر ہی اکتفا کیا۔ جانکی دیوی کچن کی طرف چلی گئی اور ہم تینوں اس کمرے میں آگئے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ جانکی دیوی گھر میں اکیلی ہی تھی لیکن نجانے کیوں میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد جانکی دیوی چائے بنا کر لے آئی۔

"اس روز جو کچھ ہوا، مجھے اس کا افسوس ہے۔" جانکی دیوی نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "راجو کے بارے میں تو میں جانتی تھی کہ وہ آوارہ اور اوباش ہے۔ اس کا ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا جن کا پیشہ ہی راہزنی اور لوٹ مار تھا۔ ایک مرتبہ تو میں نے بھی راجو کو ضمانت پر رہا کروا دیا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ قتل و غارت جیسی وارداتوں میں بھی ملوث ہوگا۔ سب سے زیادہ دکھ تو مجھے بندو کے بارے میں جان کر ہوا تھا۔ وہ بڑھیا قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی لیکن لالچ میں آکر اس نے میری ساری نیکیاں بھی بھلا دیں۔ ایسے بے ضمیر لوگوں کا انجام تو یہی ہونا چاہیے تھا۔"

"اور تمہارے ساتھ کیا ہوا؟" تھائی وانگ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "میرا مطلب ہے ہمارے جانے کے بعد تمہیں ٹائیگر نے تو پریشان کیا ہوگا۔"

"ٹائیگر نے اور پولیس نے بھی۔" جانکی دیوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ٹائیگر مُصر تھا کہ میں نے تم لوگوں کو پناہ دی تھی۔ کیونکہ اس رات راجو، ٹائیگر کے ایک نائٹ کلب گیا تھا اور وہاں سے ایک آدمی کو لے کر واپس آیا تھا اور اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا تھا جس کی اسے توقع نہیں تھی۔ راجو نے وہاں ایک اور آدمی کو بتایا تھا کہ میرے گھر میں دو ایسے افراد چھپے ہوئے ہیں جن کی ٹائیگر کو تلاش ہے اور ٹائیگر اس بات کو بنیاد بنا کر مجھ سے تم لوگوں کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے میرے گھر کی تلاشی بھی لی تھی لیکن یہاں سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی تھی جس سے تم لوگوں کی موجودگی ثابت ہوتی۔ تم دونوں کے کپڑے میں نے جلا کر راکھ گٹر میں بہا دی تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "پولیس کو بھی میں نے یہی بیان دیا تھا کہ ایک عورت اور ایک نوجوان لڑکا زبردستی میرے گھر میں گھس آئے تھے۔ انہوں نے اسلحے کی زد پر ہمیں یرغمال بنا لیا تھا۔ راجو کو کسی طرح باہر نکلنے کا موقع مل گیا لیکن اس کے واپس آنے سے پہلے ہی ان لوگوں نے بھاگنے کی کوشش کی۔ بندو نے انہیں روکنا چاہا تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بعد میں راجو اور اس کا ساتھی بھی انہی کے ہاتھوں مارے گئے۔ تم لوگوں کو روکنے کی کوشش میں میں بھی زخمی ہوئی تھی۔ میری ٹانگ میں گولی لگی تھی۔"

"کیا۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا ٹائیگر اور پولیس نے تمہارے اس جھوٹ پر یقین کر لیا تھا۔"

"جھوٹ نہیں۔ یہ سچ تھا۔" جانکی دیوی نے کہا "میں نے اپنے پستول سے اپنی ٹانگ میں گولی ماری تھی اور زخم سے وہ گولی اسپتال میں نکالی گئی تھی۔" اس نے ساری اور پیٹی کوٹ دائیں ٹانگ پر سے ہٹا دیا۔ ران پر زخم کا نشان موجود تھا جو زیادہ پرانا نہیں تھا۔ جلد کے زخم والے حصے پر گلابی پن نمایاں تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ میری طرح وہ بھی خاصی متاثر نظر آرہی تھی۔

"اپنے آپ کو گولی مار کر میں نے تم لوگوں پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔" جانکی دیوی کہہ رہی تھی "اس کا سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی ہوا تھا۔ مجھے دونوں طرف سے پریشان تو کیا گیا تھا لیکن بالآخر میری بات پر یقین کر کے میرا پیچھا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اگر میں نے اپنے آپ کو گولی نہ ماری ہوتی تو نہ تو ٹائیگر اور نہ ہی پولیس میرا پیچھا چھوڑتی۔ ٹائیگر تو شاید مجھے زندہ نہ چھوڑتا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اب اس گھر میں تم لوگوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ اس گلی میں رہنے والا کوئی بچہ بھی تم لوگوں کو نہ دیکھ سکے اور یہ ذرا مشکل کام ہوگا۔"

"بس۔ ایک دو دن کی بات ہے۔" تھائی وانگ نے کہا "پولیس اس کاٹیج میں پہنچ چکی ہوگی۔ ہو سکتا ہے آج ہی رات ٹائیگر کی تلاش میں بھی چھاپے مارے جائیں اور ہمارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے پولیس مہاراج سے بھی رابطہ کرے۔ ایک دو دن بعد معاملہ ٹھنڈا ہوگا تو ہم مہاراج سے رابطہ کریں گے۔ وہ یقیناً ہمارے لیے کوئی مناسب بندوبست کر دیں گے۔"

"لیکن اس مرتبہ میں مہاراج کے پاس نہیں جانا چاہتا۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "مہاراج پھر مجھے کسی واٹ تک محدود کر دیں گے اور میں پھر اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگوں گا۔ میرا خیال ہے اس دوران میں ہم کوئی ایسا بندوبست کر لیں گے کہ محفوظ بھی رہیں اور آزادی سے نقل و حرکت بھی کر سکیں۔"

"ایسی صورت میں میرے پاس ایک تجویز ہے۔" جانکی دیوی نے کہا "دریا کے اس پار وانگ ونگ یائے روڈ پر میرا ایک مکان ہے۔ تمہیں یاد ہے میں نے وہ مکان تقریباً چھ سال پہلے خریدا تھا۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ میں خود وہاں منتقل ہو جاؤں گی لیکن پھر وہ کرائے پر دے دیا تھا۔ تقریباً ایک مہینہ پہلے وہ مکان خالی ہوا ہے۔ کچھ مرمت اور رنگ و روغن وغیرہ کی وجہ سے وہ مکان خالی پڑا ہے۔ اس مرتبہ میرا ارادہ یہی ہے کہ وہاں اپنی ایک اور دوست کے اشتراک سے بیوٹی پارلر کھولوں گی لیکن اگر تم لوگ چاہو تو اس مکان میں رہ سکتے ہو۔ وہ مکان محفوظ بھی ہوگا اور تم لوگوں کو کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔"

"یہ تو اور اچھی بات ہے۔" تھائی وانگ بولی "ایسی صورت میں کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کل ہی وہاں منتقل ہو جائیں۔"

"کل شام کے بعد۔" جانکی دیوی نے کہا "کل دن میں ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچا دوں گی۔ اور پھر شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد تم لوگوں کو لے چلوں گی لیکن ابھی تم نے کسی کاٹیج پر پولیس کے چھاپے کی بات کی تھی۔ کیا قصہ ہے؟"

"یہی اصل بات ہے جو میں تمہیں بتانا بھول گئی تھی۔" تھائی وانگ نے کہا اور پھر اسے اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی "فون میں نے تمہیں وہیں سے کیا تھا لیکن اس وقت کچھ بتانے کا موقع نہیں تھا۔"

"بھگوان جانے اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔" جانکی دیوی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ تو ایسا ہے کہ اسے دل میں چھپا کر رکھا جائے اور وہ کم بخت اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔"

"سن رہے ہو وجدان۔" تھائی وانگ نے شوخ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "اس نے تو اپنے دل میں تمہارے لیے اتنی جگہ پیدا کر لی۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ان کی محبت کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ ان کی باتوں سے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"اچھا۔ اب ایسا ہے کہ اس وقت تین بجنے والے ہیں۔" جانکی دیوی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اب تم لوگ آرام کرو۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔"

ہم لوگ اس کمرے سے نکل آئے۔ اس مکان کے گراؤنڈ فلور پر بھی چار پانچ کمرے تھے اور ہر کمرا بیڈ روم کے طور پر آراستہ تھا۔ پچھلی مرتبہ اوپر والے کمرے دیکھے تھے۔ وہ بھی تمام بیڈ رومز تھے۔ جانکی دیوی یہاں رہتی تو اکیلی تھی پھر اتنے سارے آراستہ بیڈ رومز۔ لگتا تھا جیسے یہ کوئی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس ہو۔

ایک کمرا مجھے دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ والا نرس شینو کو۔ تھائی وانگ جانکی دیوی کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نے دروازہ بند کر کے نائٹ بلب جلا لیا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں پچھلے چند گھنٹوں کے درمیان رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شوفانگ نے کس ہوشیاری سے ہمیں چان بوری کے پہاڑی کاٹیج سے اغوا کرایا تھا۔ ہم ایک بار پھر موت کے جال میں پھنس گئے تھے۔ شوفانگ واقعی انسان نہیں شیطان تھا۔ وہ اپنے دھرم کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔ اگر ان کا بدھا کے مجسّمے سے سونا چرانے کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس میں کسی بھکشو کا ہاتھ ہوگا۔

ہم لوگ ایک بار پھر موت کا حصار توڑ کر بھاگ نکلے تھے اور ہماری کامیابی تھائی وانگ کی مرہونِ منت تھی۔ صورتِ حال نہایت سنگین ہونے کے باوجود اس نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے ایک اور بات واضح ہو گئی تھی کہ عورت کو تو ہمیشہ کمزور سمجھا گیا تھا لیکن جب اس کے اندر کی عورت جاگتی ہے تو وہ بھری ہوئی شیرنی بن جاتی ہے اور پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے انتقام سے روک نہیں سکتی۔ تھائی وانگ نے شوفانگ سے اپنی توہین کا انتقام جس طرح لیا تھا، وہ بہت ہی بھیانک تھا۔ اگر شوفانگ پولیس کے آنے تک زندہ رہا ہوگا تو اس نے ضرور بتایا ہوگا کہ اس کی یہ حالت کس نے کی تھی۔

میرے ذہن میں مہاراج کا خیال ابھر آیا۔ اسے بھی ہمارے اغوا کا پتا چل ہی گیا ہوگا۔ اس کے آدمی ہمیں چان بوری اور بنکاک میں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔ مہاراج نے میری خاطر بہت سے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا تھا۔ میں اکثر یہ سوچتا تھا کہ میرے اندر آخر ایسی کیا بات تھی کہ مہاراج مجھ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مجھے کیا بنانا چاہتا تھا۔ میری حفاظت کے لیے تو وہ اب تک اپنے کئی آدمی مروا چکا تھا اور پھر خانقاہ کے گیٹ پر بم دھماکا۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن میں بچ گیا تھا اور اس دھماکے میں گیارہ بے گناہ ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔

بم دھماکے کا خیال آتے ہی اس لڑکی کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ کیسی چمک تھی اس کی آنکھوں میں اور کتنی معصومیت تھی اس کے چہرے پر لیکن اس کی معصومیت کتنے بے گناہوں کی موت کا باعث بنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں اس لڑکی سے سامنا ضرور ہوگا۔

اس لڑکی کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے ذہن میں کوشلیا کا خیال ابھر آیا۔ کوشلیا اگر مجھے کم اور ٹائیگر کے سونے کی چوری کے منصوبے کے بارے میں نہ بتاتی تو ان کا منصوبہ ضرور کامیاب ہو جاتا لیکن اب وہ کہاں تھی۔ اس نے ماسٹر ہوچن سے رابطہ کیا تھا یا نہیں۔ ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا تھا کہ وہ زندہ بھی تھی یا اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔ کسی نے انگلی سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ میرے خیال میں تھائی وانگ ہوگی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا مگر باہر کوئی نہیں تھا۔ اس دوران میں دستک کی آواز دوبارہ ابھری اور یہ آواز میرے اور شینو کے کمروں کے درمیان والے دروازے سے ابھری تھی۔ میں نے باہر کا دروازہ بند کر دیا اور بیچ والے دروازے کا بولٹ آہستگی سے گرا دیا۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور شینو میرے کمرے میں آگئی۔

"مجھے کمرے میں اکیلے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "باہر کا دروازہ کھول کر تھائی وانگ والے کمرے میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا شاید تم جاگ رہے ہو۔"

"نیند تو مجھے بھی نہیں آرہی تھی لیکن اس کی وجہ کسی قسم کا خوف نہیں۔ بس سوچوں نے دماغ کو گھیر رکھا ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔" میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

درمیان کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا۔ شینو والے کمرے میں ٹیوب لائٹ جل رہی تھی اور اس کی روشنی اس کمرے میں بھی آرہی تھی۔ شینو کرسی پر بیٹھ گئی اور میں بھی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

"تم جانکی دیوی کو کیسے جانتی ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اور کیا تمہارے خیال میں اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟"

"ہاں۔ جانکی دیوی ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد عورت ہے۔" شینو نے جواب دیا "میں اسے بہت عرصے سے جانتی ہوں۔ ان دنوں میں نے نرسنگ کا امتحان پاس کیا تھا اور مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔ دو مہینوں کی جستجو کے بعد مجھے جانکی دیوی کے کلینک میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں اس کا کلینک سام سین روڈ پر نیشنل لائبریری کے قریب ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک بڑی کامیاب ڈاکٹر تھی۔ خصوصاً ان خواتین میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی جو اپنے گناہوں کے بوجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ ایسی مریضوں میں زیادہ تعداد نوجوان لڑکیوں کی ہوا کرتی تھی جو اپنے بوائے فرینڈز کی ہوس کا شکار ہو جاتیں اور جب مہینے ڈیڑھ مہینے بعد انہیں پتا چلتا کہ ان کی نام نہاد محبت نے انہیں کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے تو وہ جانکی دیوی کے کلینک کا رخ کرتیں اور جانکی دیوی معقول فیس لے کر انہیں اس مصیبت سے نجات دلا دیتی۔ یہ اگرچہ غیر قانونی کام تھا لیکن جانکی دیوی اسے برا نہیں سمجھتی تھی۔ اس سلسلے میں اس کا اپنا ایک نظریہ تھا۔

"ایک روز جانکی دیوی پکڑی گئی۔ ایک ایسی لڑکی اس کے پاس آئی تھی جو اس سے پہلے کسی اور ڈاکٹر کے پاس جاچکی تھی اور کیس بگڑ چکا تھا۔ جانکی نے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے پہلے تو کیس لینے سے انکار کر دیا لیکن اس لڑکی کی ماں جانکی کے قدموں پر گر گئی۔ وہ بھی ہندو تھی۔ کچھ اپنے دھرم کی وجہ سے اور کچھ اس بڑھیا کی منت و سماجت کی وجہ سے جانکی دیوی کا دل پسیج گیا اور اس نے وہ کیس لے لیا۔

"کیس پہلے ہی بہت بگڑ چکا تھا۔ جانکی دیوی نے لڑکی کو اس کے پیٹ میں پلنے والے گناہ سے تو نجات دلا دی لیکن خود اس لڑکی کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اسے اسپتال لے جانا پڑا اور اس طرح یہ بات پولیس تک پہنچ گئی۔ اسپتال میں اس لڑکی کی جان تو بچ گئی لیکن جانکی دیوی قانون کی زد میں آگئی۔ لڑکی کی بوڑھی ماں نے' جو پہلے جانکی کے قدموں پر گر کر گڑگڑائی تھی' جانکی دیوی کے خلاف بیان دیا۔ اس طرح جانکی دیوی پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ پانچ سال تک میڈیکل پریکٹس نہیں کرے گی۔ اگر اس نے خلاف ورزی کی تو اس کی میڈیکل کی ڈگری ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دی جائے گی۔ میں چونکہ جانکی دیوی کی معاونت کرتی تھی اس لیے مجھ پر بھی دو سال کے لیے پابندی لگا دی گئی۔"

"اوہ۔" میں اس کے خاموش ہونے پر بولا "اس کا مطلب ہے کہ جانکی دیوی لالچی عورت ہے۔ وہ یہ غیر قانونی کام پیسے کے لیے کرتی تھی اور کوئی لالچی انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"نہیں۔" شینو نے نفی میں سر ہلایا "جانکی لالچی عورت نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا ناکہ اس سلسلے میں اس کا اپنا ایک نظریہ ہے۔ شہر میں بیسیوں ایسے ڈاکٹر ہیں جو یہ غیر قانونی کام کرتے ہیں اور وہ ایسی عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاری معاوضہ وصول کرتے ہیں اور بعض ڈاکٹر تو اپنی مریضوں کو بلیک میل کرتے ہیں لیکن جانکی دیوی ایسی نہیں تھی۔ وہ بہت معمولی فیس وصول کرتی اور اس نے کبھی اپنی کسی مریض کو بلیک میل بھی نہیں کیا۔"

"برائی آخر برائی ہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا ناکہ جانکی دیوی اسے برائی نہیں' بھلائی سمجھتی تھی۔ بہرحال' میڈیکل پریکٹس پر پابندی لگنے کے بعد اس نے اس مکان میں مساج پارلر کھول لیا۔ میں نے یہاں چند مہینے کام کیا تھا پھر چھوڑ کر چلی گئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "مساج یا مالش تھائی لینڈ کی ایک قدیم روایت ہے لیکن اب اسے ایک کاروبار بنا لیا گیا ہے۔ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے اخبارات اور جرائد میں طرح طرح کے اشتہارات شائع کرائے جاتے ہیں۔ ان اشتہارات میں خوب صورت لڑکیوں اور لڑکوں کی تصاویر... بھی شائع کی جاتی ہیں۔ یہ بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔

اس میں حسین لڑکیوں اور نو عمر خوب صورت لڑکوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مساج کی آڑ میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کی اخلاق اجازت نہیں دیتا۔ اس کاروبار پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ ایک گھٹیا ترین رہائشی ہوٹل سے لے کر بڑے بڑے فائیو اسٹار اور ڈیلکس ہوٹلوں میں بھی مساج پارلر موجود ہیں۔ شہر کی ہر سڑک اور گلی کوچے میں تمہیں مساج پارلرز کے بورڈ نظر آئیں گے۔ ان پارلرز کی آڑ میں فحاشی کا کاروبار عروج پر ہے۔

"جانکی دیوی نے بھی اپنی ایک دوست کی شراکت سے اس مکان میں ایسا ہی ایک مساج پارلر کھولا تھا۔ جانکی صرف سلیپنگ پارٹنر تھی جبکہ سارا بزنس اس کی دوست نے سنبھالا ہوا تھا۔ یہ کمرے تم نے دیکھے ہوں گے۔ تمام کمرے اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان کمروں میں لگی ہوئی نیم عریاں تصویریں اس دور کی یاد دلاتی ہیں۔ مساج پارلرز میں ایسی تصویریں اس لیے لگائی جاتی ہیں کہ گاہک زیادہ سے زیادہ تسکین حاصل کر سکے۔ گاہک کو پہلے تصویروں کے البم دکھائے جاتے ہیں۔ وہ مساج کے لیے اپنی پسند کی لڑکی یا لڑکے کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان پارلرز کے گاہکوں میں بڑی تعداد میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ کچھ عورتیں تو لڑکیوں ہی کو پسند کرتی ہیں جبکہ اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو مساج کے لیے نو عمر اور خوب رو لڑکوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ جیسے.... جیسے تم...."

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بات کرتے ہوئے نظریں پھیر لی تھیں لیکن اچانک ہی میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ تھائی وانگ اذیت پسند تھی۔ اس نے خود ہی بتایا تھا کہ اذیت کے لیے وہ نو عمر لڑکوں کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ یہ خدمت وہ مجھ سے بھی کئی مرتبہ لے چکی ہے۔ مجھے اچانک ہی ایک اور خیال آیا۔ میں نے تھائی وانگ کے بنگلے میں خوب صورت لڑکیوں کی نیم عریاں تصویریں اور وہ البم دیکھے تھے جن میں لڑکیوں اور لڑکوں کی لاتعداد تصویریں لگی ہوئی تھیں۔

"تھائی وانگ کے بارے میں جانتی ہو۔ کیا وہ بھی کوئی مساج پارلر چلاتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں' میں کچھ نہیں جانتی۔" شینو نے جواب دیا "اس سے میری پہلی ملاقات اسپتال ہی میں ہوئی تھی جہاں اسے ہیروئن کے علاج کے لیے داخل کرایا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے بھی کبھی ایسا شوق رہا ہو لیکن تمہارے بارے میں اس کے خیالات بہت مختلف ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اس نے مجھے بتایا تھا۔" شینو مسکراتے ہوئے بولی "پہلی مرتبہ جب اس نے تمہیں اپنی گاڑی میں دیکھا تھا تو اس نے یہی سوچا تھا کہ ایک اچھا جاندار لونڈا ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ یہی سوچ کر تمہیں اپنے گھر لے آئی تھی لیکن پھر یہ بات وہ بھی نہیں سمجھ سکی کہ تمہارے بارے میں اس کے خیالات کیوں بدل گئے تھے۔ پہلی مرتبہ جب اس نے اپنے کپڑے اتار کر ہنٹر تمہارے ہاتھ میں دیا تھا تو اس کا خیال تھا کہ تم بھی وہی کچھ کرو گے جو تمہاری عمر کے لڑکے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جب ذہن آسانی سے بھٹک جاتا ہے اور شہوانی جذباتی غالب آجاتے ہیں مگر تم مختلف ثابت ہوئے اور تمہارا یہی کردار اسے پسند آیا۔ اس کے بعد بھی کئی ایسے مواقع آئے کہ وہ تمہارے سامنے بے لباس ہوئی لیکن تم نے اپنے جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ اس وجہ سے وہ تمہیں پسند کرتی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ تمہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے۔"

"یہ سب کچھ تمہیں اس نے خود بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

"ہاں۔" شینو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی "میں کئی روز سے اس کے ساتھ ہوں۔ ہم راتوں کو دیر تک جاگ کر باتیں کرتے رہتے تھے۔"

"اب پھر ذرا جانکی کے بارے میں بات کرتے ہیں۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ جانکی دیوی نے اپنا مساج والا بزنس بند کر دیا ہے۔ یہ کاروبار اتنا منافع بخش ہے تو اس نے اسے ختم کیوں کر دیا۔"

"چند مہینے پہلے اس کا میڈیکل لائسنس بحال کر دیا گیا تھا اور اس پر سے پابندی ہٹا لی گئی تھی۔" شینو نے جواب دیا "یہ بزنس اس نے اپنی ایک دوست کے مشورے سے شروع تو کر دیا تھا مگر اسے پسند نہیں تھا۔ اس لیے وہ کچھ دور دور ہی رہی تھی۔ اپنی میڈیکل پریکٹس پر سے پابندی ہٹتے ہی اس نے یہ بزنس ختم کر دیا اور اس علاقے میں ایک چھوٹا کلینک کھول لیا۔ اس نے مجھے اپنے کلینک میں لانا چاہا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا کیونکہ میں اسپتال میں ملازمت کر رہی تھی۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا "پھر اس اسپتال میں...؟"

"نہیں۔" شینو نے انکار میں سر ہلا دیا "اب میں اسپتال واپس نہیں جاسکتی۔ ٹائیگر کے آدمیوں نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا ہے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ میں اسپتال تو کیا یہ شہر ہی چھوڑ دینا چاہتی ہوں تاکہ ان کی نظروں میں نہ آسکوں۔"

"مگر ٹائیگر کے آدمیوں کو تو ہم اس کاٹیج میں رسیوں سے باندھ آئے تھے۔ اب تک تو پولیس نے انہیں آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہوگا۔ وہ تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔"

"ٹائیگر بہت طاقت ور ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" شینو نے کہا "خانقاہ میں جو کچھ ہوا' اس سے قطع نظر وہ اب بھی پوری طرح فارم میں ہے۔ وہ اپنے آدمیوں کو چھڑا لے گا۔ اگر نہ بھی چھڑا سکا تو اس کے پاس اور بھی بہت سے آدمی ہیں۔ میں کئی روز سے تھائی وانگ کے ساتھ ہوں۔ ان لوگوں کو یقیناً میرے بارے

میں پتا چل گیا ہوگا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور میں زندگی بھر تم لوگوں کے ساتھ رہ نہیں سکتی۔ اب مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کہاں جاؤ گی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چیانگ رائے۔" شینو نے جواب دیا "تھائی لینڈ کے شمال میں برما کی سرحد کے قریب یہ ایک قدیم شہر ہے۔ بنکاک سے تقریباً آٹھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر واقع چیانگ رائے جانے کے لیے بس تقریباً گیارہ گھنٹے کا وقت لیتی ہے۔ یوں تو ہوائی جہاز سوا گھنٹے میں پہنچا دیتا ہے لیکن میں ٹرین سے جاؤں گی۔ اس میں اگرچہ وقت زیادہ لگتا ہے مگر کرایہ کم ہے۔ ہوائی جہاز یا ائرکنڈیشنڈ بس کے کرائے کی میں متحمل نہیں ہو سکتی۔"

"کرائے کی تم فکر مت کرو۔ ہم تمہیں ہوائی جہاز کا کرایہ بھی دے دیں گے لیکن کیا تم نے واقعی ہمیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"تھائی وانگ پوری طرح صحت مند ہو چکی ہے۔ اسے اب میری ضرورت نہیں ہے۔ ویسے اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ اسے دوبارہ نشے کی لت نہ لگ جائے۔ ہیروئن کا نشہ ایک لعنت ہے۔ مریض صحت یاب ہونے کے بعد بھی دوبارہ راغب ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بات کا خیال اب تمہیں رکھنا ہے کہ وہ دوبارہ اس لعنت کو اپنے قریب نہ آنے دے۔ وہ تمہارا بہت خیال کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے شینو۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "ویسے اگر تم چاہو تو مہاراج سے کہہ کر تمہارے لیے کوئی دوسرا بندوبست کیا جاسکتا ہے جہاں تمہیں معقول تنخواہ بھی ملے گی اور تحفظ بھی حاصل ہوگا۔"

"نہیں۔ اب مجھے جانا ہی ہوگا۔" شینو نے کہا "چیانگ رائے میں میری بوڑھی ماں ہر مہینے میرے منی آرڈر کا انتظار کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی روز اسے منی آرڈر کے بجائے میری موت کی خبر ملے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "ہم کہیں سیٹ ہو جائیں تو دو چار دن میں تمہارے جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔" میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے پانچ بجنے والے تھے "اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ کل دن میں بات کریں گے۔"

"مجھے اپنے کمرے میں ڈر لگ رہا ہے۔ میں یہیں تمہارے بیڈ پر ایک طرف سو جاتی ہوں۔" شینو نے کہا۔

"ڈر کیسا۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ بیچ کا دروازہ کھلا رہنے دو۔" میں نے کہا۔ دراصل مجھے شینو کو اپنے بیڈ پر سلانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ صبح تھائی وانگ یا جانکی دیوی اسے میرے بستر پر دیکھیں اور انہیں میرے یا شینو کے بارے میں کوئی غلط بات سوچنے کا موقع ملے۔

وہ بادلِ ناخواستہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے بیچ والا دروازہ پوری طرح کھول دیا تھا۔

میں بستر پر لیٹا پہلے شینو اور پھر تھائی وانگ اور جانکی دیوی کے بارے میں سوچتا رہا۔ شینو نے ان دونوں کے بارے میں بڑے دلچسپ انکشافات کیے تھے۔ جانکی دیوی کے بارے میں شینو کی باتوں سے مجھے یہ اطمینان ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرے گی اور تھائی وانگ کے بارے میں یہ انکشاف بھی بڑا دلچسپ تھا کہ اس رات وہ مجھے کس مقصد کے تحت اپنے گھر لائی تھی اور اب میرے بارے میں کیا سوچتی تھی۔

دوسرے دن شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہم روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ جانکی دیوی نے ضرورت کی تمام چیزیں دوسرے مکان میں پہنچا دی تھیں۔ اس کے پاس اپنی گاڑی تھی جسے وہ گھر سے کچھ دور کرائے کے گیراج میں کھڑی کیا کرتی تھی۔ دن میں کئی چکر لگا کر ساری چیزیں اس نے اس گاڑی میں ڈھوئی تھیں۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اس نے گاڑی کو دروازے کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا۔ گاڑی کے اندر کی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ ہم تینوں بڑی احتیاط سے مکان سے نکل کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں شینو اور تھائی وانگ کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ جانکی نے مکان کے دروازے کو تالا لگایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی چاؤ فریا ریور پار کر کے لاڑیا روڈ پر آگئی اور کنگ ٹاکسن کے اسٹیچو والے چوراہے سے ہوتی ہوئی وانگ ونگ یائے روڈ پر آگئی۔ سڑک پر اس نام کا بورڈ پڑھ کر مجھے مہاراج یاد آگئے۔ ان کا بھی یہی نام تھا۔

جانکی دیوی نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ اس سڑک پر تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی دائیں طرف ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ یہاں آبادی قدرے چھدری تھی۔ خوب صورت کاٹیج تھے۔ جو ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے۔ بالآخر جانکی دیوی نے ایک کاٹیج کے سامنے گاڑی روک لی۔ پہلے نیچے اتر کر گیٹ کھولا اور پھر گاڑی کو اندر لے آئی۔ گاڑی پورچ میں روک کر وہ ایک بار پھر گیٹ کی طرف گئی اور گیٹ بند کر کے واپس آگئی۔

کاٹیج خاصا بڑا تھا۔ تازہ رنگ و روغن کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ دو کمرے ایسے تھے جہاں بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ سٹنگ روم میں تین چار کرسیاں اور ایک بڑی کافی ٹیبل پڑی تھی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ کچن میں ایک چھوٹا فریج اور ضرورت کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ باتھ رومز میں بھی ضرورت کی چیزیں موجود تھیں۔ یہ تمام انتظامات آج دن میں جانکی دیوی نے کیے تھے اور اب کئی روز تک کوئی پریشانی نہیں ہو سکتی تھی۔

جانکی دیوی نے آتے ہی کافی بنائی اور ہم سٹنگ روم میں بیٹھے چسکیاں لیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔

"یہاں ٹیلی فون موجود ہے۔" جانکی دیوی نے کمرے کے ایک کونے میں اسٹینڈ پر رکھے ہوئے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں میرا زیادہ آنا جانا مناسب نہیں ہوگا لیکن اگر کوئی ایمرجنسی ہو یا کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو فون کر دینا۔"

"ایک دو دن تک تو شاید کسی چیز کی ضرورت نہ پڑے لیکن ہمیں ایک اور کام کرنا ہوگا۔" میں نے جانکی دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا۔۔؟" جانکی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"شینو ہمارے حالات سے خوف زدہ ہے۔" میں نے جواب دیا "چیانگ رائے اپنی ماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے ٹکٹ اور کچھ رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ کیا تم اتنی رقم کا بندوبست کر سکو گی؟"

"رقم تو میرے پاس بہت ہے۔" جانکی دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا "جب تم لوگ میرے مکان سے بھاگے تھے تو بعد میں بندو کے سامان کی تلاشی لینے پر اس کے سوٹ کیس میں سے کرنسی نوٹوں کے بنڈل ملے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ بندو کے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آگئی۔ وہ رقم میں نے چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ پولیس کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"وہ رقم ہماری ہے۔" تھائی وانگ جلدی سے بولی "جب ہینگر کے آدمی میرے گھر پر آئے تھے تو وہاں سے بھاگتے ہوئے میں نے جلدی میں کچھ رقم بیگ میں رکھ لی تھی اور تمہارے گھر میں وہ بیگ وجدان کے کمرے میں تھا۔ اس رات ہم تینوں تمہارے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے وجدان نے بندو کو چھپ کر ہماری باتیں سنتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس پر وجدان کو کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا تھا اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ میرے کمرے میں تکیے کے نیچے رکھا ہوا پستول اور وجدان کے کمرے میں میرے بیگ میں سے رقم غائب تھی۔ اس کے بعد ہی ہم نے تمہیں بتائے بغیر وہاں سے بھاگنے کا فیصلہ کیا تھا اور بندو نے اسی پستول سے ہمیں چھت پر روکنے کی کوشش کی تھی۔"

"اوہ۔" جانکی دیوی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "اس کا مطلب ہے کہ بندو شروع ہی سے اپنے نواسے کی سازش میں شریک تھی۔ بہرحال' وہ رقم میرے پاس جوں کی توں موجود ہے۔ میں تمہیں لا دوں گی۔"

"تم کب جانا چاہتی ہو؟" میں نے شینو سے پوچھا۔

"جتنی جلدی ممکن ہو۔" شینو نے کہا۔

"کل تو نہیں۔ میں پرسوں صبح کی فلائٹ سے تمہارے لیے سیٹ بک کروا دوں گی۔ پہلی فلائٹ صبح سات بجے روانہ ہوتی ہے۔ تم پرسوں صبح ساڑھے پانچ بجے تیار رہنا۔ میں تمہیں لینے کے لیے پہنچ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تیار ملوں گی۔" شینو نے جواب دیا۔

جانکی دیوی رات گیارہ بجے کے قریب واپس چلی گئی۔

دوسرا دن کاٹیج ہی میں گزرا۔ دن کے وقت تو ہم کمروں سے بھی باہر نہیں نکلے تھے۔ شام کو میں نے ماسٹر ہوچن کو ٹیلی فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر غالباً اچھل پڑا تھا۔

"مہاراج تمہارے لیے پریشان ہیں۔ کہاں ہو تم لوگ؟" اس نے کہا۔

"ہم محفوظ ہیں۔" میں نے جواب دیا "مہاراج کو بتا دینا۔ ہم چند روز تک الگ ہی رہنا چاہتے ہیں۔"

"مہاراج تمہارے اس کارنامے پر بہت خوش ہیں اور تمہاری گمشدگی پر پریشان بھی۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "آج کے تمام اخبارات انہی خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بھکشو شوفانگ زندہ بچ گیا ہے اور اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کرلیا ہے۔ تھائی وانگ نے اسے جو سزا دی ہے وہ اسے زندگی کے آخری لمحوں تک یاد رکھے گا۔"

"یہ کارنامہ دراصل تھائی وانگ ہی نے انجام دیا تھا۔" میں نے کہا "بہرحال' مہاراج کو بتا دینا کہ ہم خیریت سے ہیں۔ میں دو چار دن بعد رابطہ کروں گا اور ہاں ٹائیگر اور اس کے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟"

"پولیس ان کی تلاش میں بھی چھاپے مار رہی ہے لیکن وہ لوگ بھی روپوش ہیں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا۔

"کوشلیا نے تم سے کوئی رابطہ کیا یا نہیں؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"نہیں۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "خانقاہ میں بم دھماکے کے چند روز بعد اس نے فون کیا تھا لیکن میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ مزید چند روز تک اپنی پناہ گاہ سے باہر نہ نکلے۔ اس کے چند روز بعد میں نے خود اس کے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا تھا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا اور نہ ہی کوشلیا نے دوبارہ ہم سے رابطہ کیا ہے۔"

میں نے ماسٹر ہوچن سے کوشلیا کا وہ فون نمبر لے لیا اور فون بند کر دیا اور پھر تھائی وانگ کو ماسٹر ہوچن سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

اور پھر اس رات گیارہ بجے کے قریب جانکی دیوی کا فون آگیا کہ اس نے شینو کے لیے صبح سات بجے کی فلائٹ پر سیٹ بک کروالی ہے۔ وہ پانچ بجے اسے لینے کے لیے آئے گی۔ شینو کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

شینو کو اس رات نیند نہیں آئی تھی بلکہ ہم بھی جاگتے رہے تھے۔ میرے والے کمرے میں سنگل بیڈ تھا جبکہ دوسرے کمرے میں ڈبل بیڈ' شینو اور تھائی وانگ اس بیڈ پر سویا کرتی تھیں اور اس رات ہم تینوں وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

جانکی دیوی صبح ٹھیک پانچ بجے پہنچ گئی۔ کار کی ڈکی پر ایک بڑا سوٹ کیس بھی تھا جسے وہ اٹھا کر اندر لے آئی۔

"یہ تمہارے لیے ہے شینو۔" اس نے سوٹ کیس کھولتے ہوئے کہا "میں نے اندازے سے تمہارے لیے کچھ کپڑے خرید لیے ہیں اور کچھ تحائف ہیں۔ تمہارے لیے اور تمہاری والدہ کے لیے۔"

شینو بہت خوش ہو رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ جانکی دیوی نے کپڑے کا ایک تھیلا تھائی وانگ کی طرف بڑھا دیا۔

"وہ ساری رقم اس میں جوں کی توں موجود ہے۔" اس نے کہا۔

تھائی وانگ نے تھیلا کھولا اور نوٹوں کے چند بنڈل نکال کر شینو کے حوالے کر دیے۔

"لو یہ رکھ لو۔" وہ بولی "یہ اتنی رقم ہے کہ تم کئی مہینے کام کیے بغیر آرام سے گزار سکتی ہو۔"

فرطِ جذبات سے شینو کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ وہ شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسے یہاں سے اتنی محبت ملے گی۔ وہ تھائی وانگ سے لپٹ گئی۔

"میں تمہارے لیے ناشتا بناتی ہوں۔ ہم آخری بار اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کریں گے۔" تھائی وانگ نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے اپنے سے الگ کیا۔

شینو اب جانکی دیوی سے لپٹ گئی تھی اور پھر اس نے مجھے بھی گرفت میں لے کر میری پیشانی پر بوسے دیے۔

تھائی وانگ ناشتا بنا کر لے آئی۔ ہم سب نے بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر شینو جانکی دیوی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

ان کے جانے کے بعد میں جو سویا ہوں تو دن کے ساڑھے گیارہ بجے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں اپنے کمرے سے نکلا تو تھائی وانگ بھی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ ہم دونوں الجھی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے کہ کس کا فون ہو سکتا تھا؟

"شاید جانکی کا فون ہو۔" تھائی وانگ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "میں دیکھتی ہوں۔" اس نے ریسیور اٹھا لیا اور پھر دوسری طرف کی آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی "شینو کا فون ہے۔ چیانگ رائے سے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر فون پر باتیں کرنے لگی۔

دو تین منٹ بعد اس نے فون بند کر دیا اور شینو سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگی۔

میں بھی تھائی وانگ کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گیا۔ ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر تھائی وانگ کھانا تیار کرنے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

ہم تین دن اس کاٹیج میں محدود رہے۔ اس دوران میں ماسٹر ہوچن سے بھی ایک مرتبہ فون پر رابطہ ہوا تھا۔ ان تین دنوں کے دوران میں جانکی دیوی نے بھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا البتہ فون پر رابطہ رکھا تھا۔

اس شام مجھے اچانک ہی کوشلیا کا خیال آ گیا۔ میں نے ماسٹر ہوچن سے اس کا فون نمبر لے کر نوٹ کر رکھا تھا۔ میں نے اس نمبر پر فون کیا۔ دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ ٹیلی فون کے قریب ہی دو ڈائریکٹریاں بھی رکھی ہوئی تھیں اور اتفاق سے ان میں ایک نمبر یکل ڈائریکٹری تھی۔ تھائی وانگ اس ڈائریکٹری میں وہ نمبر تلاش کرنے لگی۔

وہ نمبر پراتونام ڈسٹرکٹ میں سونگ تھری اسٹریٹ پر واقع ایک فلیٹ کا تھا اور یہ ٹیلی فون کسی راجا دتھی کے نام پر تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ راجا دتھی کوئی عورت تھی یا مرد۔ بہرحال تھائی وانگ نے وہ ایڈریس ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔

"میرا خیال ہے۔ اب ہمیں باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے۔" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس طرح ہم کب تک بند ہو کر بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا۔"

"لیکن اس حالت میں ہم باہر نہیں نکل سکتے۔ فوراً پہچان لیے جائیں گے۔" تھائی وانگ نے کہا "ویسے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔ میں جانکی دیوی کو فون کرتی ہوں۔ وہ کچھ چیزیں لے آئے تو ہم اپنا حلیہ تبدیل کر سکتے ہیں۔"

اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ فون کا ریسیور اٹھا کر جانکی دیوی کا نمبر ملانے لگی۔

اس رات گیارہ بجے کے قریب جانکی دیوی مطلوبہ چیزیں لے کر آ گئی۔ ان میں ہمارے لیے کپڑے تھے اور کچھ اور چیزیں جنہیں حلیہ تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

اس سے اگلے روز رات نو بجے کے قریب ہم اس کاٹیج سے باہر نکلے۔ ہمارے حلیے ایسے تھے کہ ہمیں آسانی سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مین اسٹریٹ پر آتے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے تھائی وانگ نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے ہوٹل اندرا رنجیت کا نام لے دیا تھا۔

ٹیکسی ہم نے سوئے اندرا کے موڑ پر چھوڑ دی اور جب ہم ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہونے لگے تو گیٹ پر کھڑا ہوا دربان ہمیں دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔ ہم دونوں کے حلیے غیر ملکی ہپیوں جیسے تھے اور اس شہر میں ہپیوں کی کمی نہیں تھی۔

کئی روز بعد ہم نے ڈھنگ کا کھانا کھایا اور مشروبات پیے۔ ہوٹل سے نکل کر کچھ آگے ایک سگریٹ فروش کی دکان تھی۔ تھائی وانگ اس دکان میں داخل ہو گئی اور سگریٹ کا پیکٹ خرید کر کندھے پر لٹکے ہوئے بیگ سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال لیا۔

دکان میں دو اوباش قسم کے نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ تھائی وانگ کے جسم پر لباس بہت مختصر تھا۔ نیکر بہت اونچی تھی جس سے اس کی ٹانگیں اوپر تک برہنہ ہو رہی تھیں۔ اور بلاؤز بھی بہت مختصر تھا۔ وہ دونوں اوباش ہوس بھری نظروں سے تھائی وانگ کی طرف دیکھ رہے تھے اور جب تھائی وانگ نے بیگ میں سے نوٹوں کا بنڈل نکالا تو ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ ان دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان کی نیتوں میں فتور آ گیا ہے۔

ہم دکان سے نکل کر پیدل چلتے ہوئے سونگ تھری اسٹریٹ میں داخل ہو گئے۔ یہ کشادہ گلی تھی جس کے دونوں طرف بلند عمارتیں تھیں۔ ہمیں مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

عمارت کے گیٹ پر کوئی دربان وغیرہ نہیں تھا۔ ہم اندر داخل ہو کر دیوار پر لگے ہوئے اس بورڈ کو دیکھنے لگے جس پر فلور وائز فلیٹوں کے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ بعض نمبروں کے سامنے نام بھی لکھے ہوئے تھے۔ ہمارا مطلوبہ فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ اس عمارت میں لفٹ تو موجود تھی لیکن وہ خراب تھی۔ لوگ زینوں ہی سے آ جا رہے تھے۔ زینے پر آتے جاتے لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ فلیٹ تیسری منزل کی راہداری کے آخری سرے پر تھا۔ دروازے پر دو مرتبہ دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ اس دوران میں سامنے والے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکل کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے جسم پر ساری دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہندو تھی۔

"کس سے ملنا ہے۔ یہ فلیٹ کئی روز سے خالی ہے۔ یہاں کوئی نہیں رہتا۔" اس عورت نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مس کوشلیا۔ اس نے ہمیں یہی پتا بتایا تھا۔ کئی روز پہلے۔" تھائی وانگ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ کک باکسنگ والی لڑکی جو نائٹ کلبوں میں پروگرام کرتی تھی۔" اس عورت نے کہا "وہ چند روز یہاں رہی تھی پھر کئی روز پہلے اپنی بہن کے ساتھ چلی گئی۔"

بہن کے نام پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کوشلیا کی ایک بڑی بہن بھی ہے جو سوکھم وٹ روڈ پر واقع کسی بڑے اسٹور پر سیلز گرل کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔ مجھے اس اسٹور کا نام یاد آ گیا۔

جب ہم اس عمارت سے باہر نکلے تو سگریٹ فروش کی دکان سے ہمارے پیچھے لگنے والے وہ دونوں غنڈے گلی میں موجود تھے۔ میں اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ وہ تھائی وانگ کے پاس ایک بڑی رقم دیکھ کر ہمارے پیچھے لگے تھے۔ ان سے نمٹنا زیادہ مشکل نہیں تھا مگر میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تھائی وانگ سے سرگوشی کی اور ہم دوبارہ اس عمارت میں داخل ہو گئے اور کچھ ہی دیر بعد ہم اس عمارت کے عقبی دروازے سے نکل رہے تھے۔ اس طرف چند گز کا فاصلہ طے کرتے ہی ایک خالی ٹک ٹک مل گیا۔ ہم نے ٹک ٹک پر بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا مگر وہ غنڈے نظر نہیں آئے۔ شاید وہ اب بھی عمارت کے سامنے والے رخ پر کھڑے تھے۔

سوکھم وٹ روڈ کی ایک ذیلی اسٹریٹ سوئے فائیو پر وہ اسٹور تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ یہ شہر کا سب سے بارونق علاقہ تھا۔ بڑے بڑے اسٹورز اس علاقے میں تھے یہاں ہوٹلوں اور ریستورانوں کی بھی بھرمار تھی۔ اسٹورز تو گیارہ بجے تک بند ہو جاتے تھے مگر ہوٹل اور ریسٹورنٹ رات بھر کھلے رہتے تھے۔ جن کی وجہ سے رات گئے تک یہاں بڑی رونق رہتی تھی۔

وہ اسٹور بند ہو رہا تھا لیکن کوشلیا کی بہن شانتی سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی شکل بڑی حد تک کوشلیا سے ملتی جلتی تھی لیکن عمر میں تقریباً دس سال کا فرق تھا۔

"تم لوگ کون ہو۔ کوشلیا سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف گھورتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

"اس سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ تمہیں نہیں بتا سکتے۔" میں نے کہا۔

"وہ اپنی جان بچانے کے خوف سے چھپتی پھر رہی ہے۔ میں خود اس کے لیے پریشان ہوں۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہو گی۔ ویسے تم لوگوں کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"دیکھو شانتی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے کہ چند روز پہلے تم اسے سونگ تھری اسٹریٹ والے فلیٹ سے لے گئی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ ہم اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔"

"کون ہو تم....؟" شانتی چونک گئی۔

"اس کا دوست۔" میں نے جواب دیا۔

"کل بھی ایک آدمی اسے پوچھتا ہوا آیا تھا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو کوشلیا کا دوست کہا تھا لیکن میں اس کی باتوں ہی سے سمجھ گئی تھی کہ وہ دوست نہیں ہو سکتا۔ اسے بھی میں نے یہی جواب دیا تھا کہ میں کوشلیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" شانتی نے کہا۔

"میں واقعی اس کا دوست ہوں۔ مہاراج کا آدمی۔" میں نے کہا "اگر تم چاہو تو مہاراج کے جمنازیم میں ماسٹر ہوچن کو فون کر کے میرے بارے میں تصدیق کر سکتی ہو۔ میرا نام وجدان ہے۔"

"وہ.... وجدان۔" وہ ہکلا کر رہ گئی "وہ تم ہو جس کی وجہ سے کوشلیا بھی مصیبت میں مبتلا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہی...."

"اور میں ہی اسے اس مصیبت سے نکالنا چاہتا ہوں۔ جس میں وہ خود پھنسی تھی۔ بہرحال' یہاں کھڑے ہو کر باتیں نہیں ہو سکتیں۔ اگر تم کوشلیا کے بارے میں جانتی ہو تو ہمیں بتادو۔" میں نے کہا۔

وہ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ سونگ تھری اسٹریٹ والے فلیٹ میں رہ رہی تھی۔"

"چند روز پہلے اس نے ماسٹر ہوچن کو اپنا فون نمبر لکھوایا تھا۔ بعد میں ماسٹر ہوچن نے کئی مرتبہ فون کیا مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس وقت ہم اسی فلیٹ میں گئے تھے۔ سامنے والی پڑوسن نے بتایا کہ کوشلیا کو اس کی بہن لے گئی تھی ہم اس لیے تمہارے پاس آئے ہیں۔ یقین کرو ہم اس کے دوست ہیں اور مہاراج بھی اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ ہم اس وقت دکان کے باہر کھڑے باتیں کررہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم تینوں محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہے تھے۔

شانتی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ہمارا ٹیکسی کا سفر سوئے ٹونٹی ٹو پر ختم ہوگیا۔ ٹیکسی کا کرایہ تھائی وانگ نے ادا کیا۔

وہ بلڈنگ سات منزلہ تھی اور شانتی کا فلیٹ آخری منزل پر تھا۔ ہم لفٹ سے باہر نکل کر شانتی کے پیچھے چلتے ہوئے ایک فلیٹ کے سامنے رک گئے۔ شانتی نے دو مرتبہ بیل بجائی مگر دروازہ نہیں کھلا۔ اس نے اپنے بیگ سے چابی نکال کر تالا کھولا اور دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔

"کوشلیا۔ کہاں ہو تم؟ دیکھو کون آیا ہے۔" وہ آواز دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

تھائی وانگ اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی چل رہے تھے۔ مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی گڑبڑ ہو۔ شانتی نے ایک کمرے کا دروازہ کھول دیا اور جیسے ہی بتی جلائی' اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔

میں جلدی سے آگے بڑھا اور سامنے کا منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کوشلیا بیڈ پر اس طرح آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی کہ اس کا ایک پیر نیچے لٹکا ہوا تھا۔ شہ رگ کٹی ہوئی تھی اور ایک خنجر دستے تک سینے میں پیوست تھا۔

کوشلیا کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں اور چہرے پر اذیت کے تاثرات منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ کسی ایک آدمی کا کام نہیں تھا۔ کوشلیا موئے تھائی کی ماہر تھی۔ وہ ایک یا دو آدمیوں کے قابو میں آنے والی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دو سے زیادہ آدمی تھے۔ افراتفری کی کیفیت صرف اسی کمرے میں تھی۔ یہیں پر کچھ چیزیں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں جیسے دھینگا مشتی ہوئی ہو۔

میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہوگیا تھا جبکہ شانتی مسلسل چیخ رہی تھی۔ تھائی وانگ شانتی کو سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کوشلیا کے بازو کو چھو کر دیکھا۔ بازو ٹھنڈا اور اکڑا ہوا تھا جس سے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اسے کئی گھنٹے پہلے قتل کیا گیا تھا۔ بستر کی چادر پر بکھرا ہوا خون بھی جم کر سیاہی مائل رنگت اختیار کرچکا تھا۔

شانتی کے چیخنے کی آواز سن کر دروازے پر کچھ لوگ جمع ہوگئے تھے۔ ایک عورت اور دو آدمی اندر آگئے اور یہ منظر دیکھ کر وہ لوگ بھی کانپ اٹھے۔

"آج دن میں یہاں کوئی آیا تھا؟" میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔

"گیارہ بجے کے قریب تین آدمی آئے تھے۔ میں اس وقت اپنے بچے کو لیے دروازے میں کھڑی تھی۔" اس عورت نے جواب دیا "ان میں سے ایک نے بیل بجائی تھی۔ کوشلیا نے دروازہ کھولا تو وہ چند لمحے کوشلیا سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے کے بعد اندر چلے گئے تھے۔ میں نے ان تینوں کو واپس جاتے ہوئے نہیں دیکھا کیونکہ آدھے گھنٹے بعد میں بھی کسی کام سے چلی گئی تھی۔"

دو عورتیں اور اندر آگئیں اور وہ سب شانتی کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں جو بری طرح بکھری جارہی تھی۔ میرے خیال میں اب وہاں رکنا ہمارے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے تھائی وانگ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں خاموشی سے باہر آگئے۔

کوشلیا کے قتل کی خبر نہ صرف پوری بلڈنگ میں بلکہ اس گلی میں بھی پھیل گئی تھی۔ لوگ بلڈنگ کے سامنے جمع ہورہے تھے اور کچھ لوگ بلڈنگ کے اندر داخل ہورہے تھے۔ بعض لوگوں نے ہماری طرف بھی دیکھا تھا مگر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں نے تھائی وانگ کو اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ میں جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا تاکہ ہم کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔

ہم سوئے ٹونٹی ٹو سے نکل کر ایک اور گلی میں گھومتے ہوئے سوئے سکستین پر نکل آئے اور وہاں سے ہمیں ایک ٹک ٹک مل گیا۔

میں ٹک ٹک پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ ڈرائیور کے دائیں طرف باہر کی طرف لگا ہوا عقبی منظر پیش کرنے والا آئینہ میرے سامنے تھا اور میں آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ وہ کوئی موٹر سائیکل

تھی جس کی ہیڈ لیمپ کی روشنی آئینے میں نظر آرہی تھی۔ پہلے تو میں نے ... نہیں کیا لیکن پلاش چٹ روڈ پر پولیس سینٹرل اسپتال کے ... پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس دوران میں ہم کئی ... مڑے تھے اور اس موٹر سائیکل کا پیچھے لگے رہنا محض ... نہیں ہو سکتا تھا۔

"میں نے اس کی طرف جھک کر سرگوشی کرتے ہوئے تھائی سے کہا ... ایک موٹر سائیکل ہمارے پیچھے آرہی ہے اور میرا خیال ہے ... سوئے ٹونٹی ٹو سے ہی ہو رہا ہے۔"

تھائی وانگ نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ... روڈ پر ریلوے برج پار کرنے کے بعد میں نے ٹک ٹک چائنا ٹاؤن کی طرف مڑوا لیا۔ اس طرف گنجان آبادی تھی اور دو تین ... کے علاوہ رات بھر کھلے رہنے والے کئی ریسٹورنٹ تھے ... میں نے ایک موڑ پر ٹک ٹک رکوا لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ موٹر سائیکل تقریباً بیس گز آگے نکل کر ایک ریسٹورنٹ کے سامنے ... موٹر سائیکل پر دو آدمی تھے اور دونوں ہی چہروں سے چھٹے بدمعاش لگ رہے تھے۔ تھائی وانگ نے ٹک ٹک والے کو ... ادا کیا اور ہم سڑک پار کرکے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ... اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے لیکن اس علاقے میں ... ایسی تھی جیسے ابھی شام اتری ہو۔ اس علاقے میں تنگ و ... گلیاں بھی تھیں۔ ایسے علاقے عام طور پر جرائم پیشہ لوگوں ... سرگرمیوں کا مرکز بنے رہتے ہیں۔ رہزنی اور لوٹ مار کی ... باتیں روز کا معمول تھیں۔

ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی ایک میز پر گانگ کو بیٹھے دیکھ ... ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے ساتھ دو ... اور تھے اور ان دونوں کا تعلق مہاراج کے جمنازیم سے تھا۔ ... وانگ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

"میں یہاں اسی لیے آئی تھی۔" وہ ایک میز کے سامنے کرسی ... بیٹھتے ہوئے بولی "یہ علاقہ چائنا ٹاؤن سے متصل ہے بلکہ اسے بھی ... ٹاؤن کا ایک حصہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ واٹ ٹرمٹ اور ... کا جمنازیم یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ ... کے کیمپ کا کوئی نہ کوئی آدمی یہاں ضرور نظر آئے گا۔"

میں بھی اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب ہم ... ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تھے تو گانگ نے سرسری سی نگاہوں ... سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ اس کے بعد توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا ... مطلب تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کو نہیں پہچان سکا تھا لیکن مجھے ... حیرت تھی کہ ان دونوں غنڈوں نے ہمیں کیسے پہچان لیا تھا جو سوئے ... ٹونٹی ٹو سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا ... کہ وہ پہلے ہی سے اس بلڈنگ کی نگرانی کررہے ہوں۔ ... ہم کوشلیا کی بہن کے ساتھ تھے اس لیے ہمیں مشتبہ سمجھ کر ... ہمارا پیچھا شروع کردیا گیا تھا اور پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ کوشلیا کو کس طرح تلاش کرکے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

ٹائیگر کو کسی طرح پتا چل گیا ہوگا کہ اس کے منصوبے کی مخبری کوشلیا نے کی تھی۔ کوشلیا کے غائب ہوجانے سے اس کا شبہ یقین میں بدل گیا ہوگا۔ وہ اسے تلاش کررہے تھے اور پھر کسی طرح انہوں نے کوشلیا کی بہن شانتی کا پتا چلالیا۔۔۔۔ صرف ایک روز پہلے دو آدمی کوشلیا کے بارے میں پوچھنے شانتی کے پاس گئے تھے اور شانتی نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور پھر شانتی کی نگرانی کرکے اس کے فلیٹ کا پتا چلالیا گیا تھا اور آج جب شانتی اسٹور پر تھی تو تین آدمی فلیٹ پر پہنچ گئے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے کوشلیا کو دوست اور ہمدرد ظاہر کیا ہو جس پر کوشلیا نے انہیں اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی تھی اور پھر انہوں نے کوشلیا کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو بدمعاشوں کو ایک جوان اور حسین عورت کے ساتھ کرنا چاہیے تھا اور پھر انہوں نے نہایت بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کسی نے کوشلیا کے چیخنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ اس نے مزاحمت کی ہوگی۔ اس کے چیخنے کی آواز شاید اس لیے نہیں سنی گئی تھی کہ اس کا منہ بند کردیا گیا ہوگا۔

یقیناً سب کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ میں نے سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔ تھائی وانگ نے کافی کا آرڈر دے دیا تھا۔ ویٹریس نے دو مگ ہمارے سامنے رکھ دیے اور ہم دونوں اپنے اپنے مگ اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔ اسی دوران میں' میں نے ان دونوں کو ریسٹورنٹ کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے ہماری میز کی طرف آرہے تھے۔ میں نے گانگ وغیرہ کی طرف دیکھا۔ گانگ کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات نظر آرہے تھے۔ شاید وہ ان دونوں کا انداز دیکھ کر چونک گیا تھا۔

وہ دونوں ہماری میز پر کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک کے چہرے پر چگی سی داڑھی تھی۔ دوسرا کلین شیو تھا۔ داڑھی والے نے اپنی کرسی تھائی وانگ کی طرف گھسیٹ لی اور بڑی بے تکلفی سے اس کی ران پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔

تھائی وانگ کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اس میں غصہ بھی تھا اور کچھ خوف بھی شامل تھا۔ اس نے داڑھی والے کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"اگر یہاں بیٹھنا ہے تو شرافت سے بیٹھو ورنہ کسی اور میز پر چلے جاؤ۔" تھائی نے ہولے سے غراتے ہوئے کہا۔

"شرافت۔" اس شخص نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "اب تک تو ہم شرافت کا ثبوت ہی دیتے آئے ہیں ورنہ تم جیسے لوگوں کو تو پہلے ہی روز کچل دینا چاہیے۔"

"کیا بکتے ہو!" تھائی نے خونخوار نظروں سے اس کی طرف

دیکھا "کیا سمجھتے ہو تم ہمیں۔ تمہارا ہم سے کیا تعلق ہے۔ کیا یہاں غیر ملکی مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ اگر بدتمیزی کی تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کردوں گی۔"

"پولیس کے پاس تو شاید تم خود بھی نہیں جانا چاہو گی۔" اس شخص نے کہا "اس لیے کہ پولیس تو پہلے ہی تم لوگوں کی تلاش میں ہے۔ بھکشو شوفانگ موت کی دہلیز سے پلٹ کر آیا ہے۔"

تھائی وانگ کا چہرہ متغیر ہوگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

"اے مسٹر۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "تم لوگ شرافت سے یہاں سے اٹھو گے.... یا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہم ٹورسٹ ہیں۔ ہمارا کسی بھکشو سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

"اگر تم یہ ثابت کردو کہ واقعی ٹورسٹ ہو تو ہم خاموشی سے یہاں سے اٹھ کر چلے جائیں گے۔ بصورتِ دیگر ٹائیگر تم لوگوں کو پاکر بہت خوش ہوگا۔" کلین شیو والے نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی ٹائیگر کو نہیں جانتے۔ تم لوگ شرافت سے اٹھ جاؤ یہاں سے۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوشلیا کو تو تم ضرور جانتے ہوگے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "تم لوگ کوشلیا سے ملنے اس کی بہن کے ساتھ اس کے فلیٹ پر گئے تھے لیکن اس کی لاش دیکھ کر وہاں سے بھاگ نکلے لیکن اب تم بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگ خاموشی سے اٹھ کر ہمارے ساتھ چل پڑو۔ اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تم دونوں کا حشر بھی کوشلیا سے مختلف نہیں ہوگا اور کوشلیا کی لاش تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

اب معاملہ مختلف ہوگیا تھا۔ ان کا تجزیہ بہت صحیح تھا۔ وہ ہمیں پہچان گئے تھے۔ کلین شیو والے نے خنجر نکال لیا تھا۔ اس نے خنجر کی نوک اس طرح میرے پہلو سے لگادی کہ کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے۔

"مجھے معلوم ہے تم بہت اچھے فائٹر ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم خودکشی کرنا پسند نہیں کروگے۔" کلین شیو والے نے کہا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ خنجر کی نوک میرے پہلو میں چبھ رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گا لیکن میں نے ٹریننگ کی سختیاں اس لیے نہیں اٹھائی تھیں کہ اپنے آپ کو اس طرح آسانی سے کسی کے حوالے کردوں۔ میں نے دونوں پیر فرش پر جمائے اور پوری قوت سے اپنے آپ کو پیچھے دھکیلا۔ کرسی الٹ گئی۔ میں نے بھی کرسی کے ساتھ ہی فرش پر الٹی قلابازی کھائی تھی۔ کلین شیو والا بڑی پھرتی سے اٹھ گیا لیکن میں اس سے پہلے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ کرتا، میں نے اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ [illegible] لگائی۔ وہ اچھل کر دوسری میز پر گرا۔ داڑھی والا میز [illegible] اس وقت میں بھی فرش پر گرا ہوا تھا۔ داڑھی والا جیسے ہی [illegible] حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا، میں بیٹھے ہی بیٹھے [illegible] گھوم گیا۔ میرا ایک پیر اس کے گھٹنے کے جوڑ کے پچھلی طرف [illegible] وہ اچھل کر پشت کے بل گرا۔ اس دوران میں کلین شیو والا [illegible] حملہ آور ہوچکا تھا، خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس [illegible] روکا اور پیر سے اس کی بغل میں زوردار ضرب لگائی [illegible] اوپر سے الٹ کر دوسری میز سے ٹکرایا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ [illegible] تک میری گرفت میں تھا۔ میں اس کا ہاتھ چھوڑے بغیر [illegible] ہوگیا اور اس کے اس بازو پر کندھے کے قریب زوردار [illegible] وہ بلبلا اٹھا۔

داڑھی والا پھر میری طرف لپکا اب اس کے ہاتھ میں بھی خنجر تھا۔ وہ میری پشت پر وار کرنا چاہتا تھا۔ میں بڑی پھرتی سے [illegible] گیا۔ وہ میرے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا ایک اور میز [illegible] گیا۔

تین میزیں الٹ چکی تھیں۔ گاہکوں میں مرد بھی تھے اور ان کے ساتھ شکاری قسم کی عورتیں بھی۔ ریسٹورنٹ میں بھگدڑ [illegible] گئی تھی۔ عورتیں بری طرح چیخ رہی تھیں۔ تھائی وانگ بھی [illegible] طرف کھڑی چیخ چیخ کر میری حوصلہ افزائی کررہی تھی۔

اب وہ دونوں مقابلے پر کھڑے ہوگئے تھے۔ داڑھی والے نے حملہ کردیا۔ وہ جیسے ہی آگے لپکا، میں بڑی پھرتی سے پشت [illegible] فرش پر گر گیا اور دونوں پیر حملہ آور کے پیٹ پر جماکر [illegible] قوت سے اچھال دیا۔ وہ قلابازی کھاتا ہوا پچھلی میز پر گرا اور [illegible] سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ میں ابھی فرش پر ہی تھا کہ کلین [illegible] والے نے حملہ کردیا۔ میں پھرتی سے لوٹ لگا کر ایک طرف [illegible] گیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا اور پھر میں نے حرکت کرنے کا [illegible] دیے بغیر اسے چھاپ لیا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر [illegible] طرف دہری کردیں۔ بوسٹن کریب کا یہ داؤ بڑے بڑے سورماؤں کو چیخنے پر مجبور کردیتا ہے۔ وہ تو ایک معمولی سا لڑاکا تھا۔ [illegible] پر ذرا سا دباؤ پڑا تو بلبلا اٹھا۔

گانگ اور اس کے ساتھی ابھی تک میز پر بیٹھے یہ سب [illegible] دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس لڑائی میں [illegible] کوشش نہیں کی تھی۔

اس دوران میں داڑھی والا بھی سنبھل چکا تھا اور [illegible] اسی وقت دو اور غنڈے ہاتھوں میں خنجر لیے پہنچے ہوئے [illegible] ہوئے۔ ظاہر ہے کہ انہی کے ساتھی تھے جن سے میں [illegible] ان نئے آنے والوں کو دیکھ کر گانگ بھی اپنے ساتھیوں [illegible] ہوا اٹھ گیا۔

"گانگ!" میں چیخا "یہ ٹائیگر کے آدمی ہیں۔ ان [illegible] مار ڈالا ہے۔ یہ لوگ بچ کر نہ جانے پائیں۔"

[illegible] اب تک مجھے پہچان نہیں سکا تھا لیکن میری آواز سن کر [illegible] اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اور اس کے ساتھی نئے آنے [illegible] والے غنڈوں پر ٹوٹ پڑے۔

[illegible] نے اپنے حریف کی دونوں ٹانگیں اپنی کمر کے گرد لپیٹ [illegible] زمین سے ذرا اوپر اٹھا کر اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے [illegible] اور پھر میں نے اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں۔ وہ چیختا ہوا [illegible] ٹکرا کر فرش پر گرا۔

[illegible] اور اس کے ساتھیوں نے میرے حریفوں کے خلاف محاذ [illegible] تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں اب باقاعدہ جنگ چھڑ چکی تھی۔ [illegible] میں اب کوئی گاہک نہیں رہ گیا تھا۔

"اب یہاں ہماری ضرورت نہیں رہی۔ نکل چلو۔" میں نے [illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"[illegible] پچھلے دروازے سے۔" تھائی وانگ نے اشارہ کیا۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف [illegible] نکلنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اندر گھمسان [illegible] ہورہی تھی۔ گانگ اور اس کے ساتھیوں کا پلہ بھاری نظر [illegible] مجھے وہاں سے نکلنے میں کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ میں جانتا [illegible] گانگ اور اس کے ساتھی مار نہیں کھائیں گے۔

ہم اس تاریک گلی میں دوڑتے ہوئے دوسری طرف سڑک پر [illegible] ایک کار گلی کے موڑ پر آہستہ ہوئی تو تھائی وانگ نے [illegible] آگے بڑھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کار رک گئی۔ اس [illegible] ایک ہی آدمی تھا۔ تھائی وانگ نے مجھے اشارہ کیا اور خود [illegible] سائڈ پر چلی گئی۔

"ہمیں وائٹ آرچڈ اسپتال جانا ہے۔ ایمرجنسی ہے پلیز۔" وہ [illegible] جھک کر ملتجی لہجے میں بولی۔ وائٹ آرچڈ اسپتال اسی طرف [illegible] تھا جس طرف کار کا رخ تھا۔

اور پھر اس سے پہلے کہ وہ آدمی کوئی جواب دیتا، تھائی وانگ [illegible] ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا اور اس آدمی کو بازو سے پکڑ کر [illegible] کھینچ لیا۔ یہ سب کچھ اس آدمی کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ [illegible] اسے دھکا دے کر دور گرا دیا اور بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ [illegible] سنبھالنے بیٹھ گئی۔ اس دوران میں بھی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول [illegible] کر بیٹھ چکا تھا۔ انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ تھائی نے گیئر میں ڈال [illegible] ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

[illegible] کار ہم نے چکرا پیٹ روڈ پر برج کے قریب چھوڑ دی۔ وہاں [illegible] ٹیکسی تک پر بیٹھ کر کنگ ٹاکسن کے اسٹیچو والے چوراہے [illegible] اور وہاں سے پیدل چلتے ہوئے وانگ ونگ یائے روڈ پر [illegible] اپنے کاٹیج والی گلی میں آ گئے۔

[illegible] میں داخل ہوتے ہی تھائی وانگ بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔ اس [illegible] جوشِ جذبات میں اس نے سب کچھ برداشت کرلیا تھا لیکن اب ان سنگین لمحات کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس کے چہرے پر پیلاہٹ سی آگئی اور جسم ہولے ہولے کانپنے لگا جیسے سردی لگ رہی ہو۔

"کیا ہوا تھائی۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" میں نے پوچھا میرے لہجے میں بھی تشویش تھی۔

"کوشلیا کی لاش.... انہوں نے کس بے رحمی سے اسے قتل کیا تھا۔" اس کے ہونٹوں پر بھی کپکپاہٹ تھی "اور تمہیں کس طرح ان دونوں نے گھیر لیا تھا۔ اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو....." وہ خاموش ہوکر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اس نے اٹھ کر والہانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور میری پیشانی اور رخساروں پر بوسے دینے لگی۔

میں اس کی آغوش میں سمٹ گیا۔ اس کی آغوش کی گرمی سے مجھے عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ عورت کسی بھی روپ میں ہو، محبوبہ ہو یا بیوی ہو، مرد کو اس میں ماں کی جھلک نظر آجاتی ہے اور اس کی آغوش میں سما کر بڑا سکون سا محسوس کرتا ہے۔ یہی کیفیت اس وقت میری بھی تھی۔ میرا تھائی وانگ سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ نہ وہ میری ماں تھی نہ بیوی اور نہ محبوبہ۔ وہ عورت تھی۔ اس میں مامتا تھی اور میں تھائی وانگ کی آغوش میں مامتا کی اس گرماہٹ کو محسوس کررہا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے یا شاید کئی صدیاں بیت گئیں۔ تھائی وانگ نے مجھے اپنے سے الگ کردیا۔ چند لمحے میرے چہرے کو دیکھتی رہی پھر میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

"تم میرے کون ہو وجدان۔ میرا تم سے کیا رشتہ ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں۔ لیکن میں تمہیں اپنے وجود کا حصہ کیوں سمجھنے لگی ہوں۔"

"انسانیت کا رشتہ سب سے مقدس اور عظیم ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا "یہی رشتہ انسان کو انسان بناتا ہے۔ اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے تو انسان، انسان نہیں رہتا۔ حیوان بن جاتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" تھائی وانگ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "انسانیت کا یہ رشتہ ہی ہمیں ایک دوسرے کے قریب رکھے ہوئے ہے۔"

میں جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک ابھر آئی تھی۔ شاید اس کے سر سے وہ بوجھ اتر گیا تھا۔ ذہن سے وہ دھند چھٹ گئی تھی جس نے اسے کسی الجھن اور کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا۔

مجھے اس رات نرس شینو نے سب کچھ بتادیا تھا۔ مجھے وہ رات یاد تھی جب میں اپنی جان بچانے کے لیے روز کلب سے بھاگا تھا اور سڑک پر پہنچ کر اس کی کار میں پناہ لی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور پھر کچھ پوچھے بغیر کار کو وہاں سے بھگا لے گئی تھی۔

اس نے کتنی سچائی سے شینو کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ مجھے کس نیت سے وہاں سے لے کر آئی تھی۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے ایک دو دن تو میں نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا کرتی تھی اور پھر وہ میرے سامنے برہنہ ہوگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں کوئی حرکت کروں گا۔ میرے سفلی جذبات مجھے کچھ کرنے پر مجبور کریں گے مگر میں اس کے جسم پر کوڑے برسا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے بعد بھی کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا لیکن وہ موقع کبھی نہیں آیا تھا جس کا شاید اسے انتظار تھا۔

تھائی وانگ طویل عرصے سے شاید اسی ذہنی کشمکش میں تھی کہ میرے ساتھ کون سا رشتہ استوار کرے اور آج اس کے دماغ پر چھائی ہوئی دھند چھٹ گئی تھی۔ اس کا ذہن صاف ہوگیا تھا۔

"تھائی!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج شاید تمہیں بھی سکون مل گیا ہے۔ تمہاری بے قراری میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔ تمہارے چہرے کی طمانیت اور آنکھوں کی چمک بتا رہی ہے کہ....."

"ہاں۔ مجھے واقعی قرار آگیا ہے۔" اس نے بات کاٹتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے "میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ آج میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی ہوں۔" وہ چند لمحے خاموش ہوئی پھر اٹھتے ہوئے بولی "تم یہیں بیٹھو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ہم چائے پئیں گے اور دیر تک باتیں کریں گے۔ بہت ساری باتیں۔"

"تم چائے بناؤ۔ میں ذرا ماسٹر ہوچن کو فون کرکے معلوم کروں کہ ادھر کی صورتِ حال کیا ہے۔" میں بھی بیڈ سے اٹھ گیا۔

تھائی کچن کی طرف چلی گئی اور میں سٹنگ روم میں آگیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ اس وقت اگرچہ ڈیڑھ بجنے والا تھا مگر کال فوراً ہی ریسیور کرلی گئی۔ وہ ماسٹر ہوچن ہی تھا۔

"تم کہاں ہو۔" وہ میری آواز سنتے ہی چیخا "کانگ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تمہیں ان دونوں بدمعاشوں سے لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ کاش! میں بھی تمہاری وہ 'فائٹ' دیکھ سکتا لیکن وجدان۔ کیا یہ تمہاری حماقت نہیں۔ اس طرح تو تم اپنے آپ کو کسی مصیبت میں پھنسا لوگے۔"

"میں زندگی کے کچھ تجربات کرنا چاہتا ہوں ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "فی الحال کسی ایسی سنگین صورتِ حال سے میں خود بھی بچنا چاہتا ہوں لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ ان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ دراصل میں تھائی وانگ کے ساتھ کوشلیا کی تلاش میں نکلا تھا۔ ہم اس کے ٹھکانے تک پہنچ گئے تھے لیکن اسے قتل کیا جا چکا تھا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا "ان دونوں نے وہیں سے ہمارا تعاقب کیا تھا۔ کوشلیا کو شاید دن میں کسی وقت قتل کیا گیا تھا اور میرا خیال ہے اس وقت سے اس بلڈنگ کی نگرانی کی جارہی ہوگی۔ کوشلیا نے چونکہ سونے کی چوری کے منصوبے کا راز مجھے بتایا تھا اس لیے انہوں نے سوچا ہوگا کہ اس کے قتل کی خبر سن کر شاید میں وہاں آؤں گا۔ میرا وہاں پہنچنا محض ایک اتفاق تھا۔ وہ مجھے یا تھائی کو پہچان نہیں سکے تھے۔ انہوں نے محض شبے کی بنا پر ہمارا تعاقب کیا تھا۔ تھائی مجھے اس ریسٹورنٹ میں لے گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم وہاں سے انہیں دھوکا دے کر نکل سکیں گے۔ وہاں کانگ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ ان کی موجودگی بھی اتفاقیہ تھی لیکن انہیں دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھا تھا۔ ہم نے اس قدر [illegible] حلیہ بدلا ہوا تھا کہ کانگ بھی مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ وہ تو میری آواز سن کر متوجہ ہوا تھا۔"

"اگر کانگ وغیرہ نہ ہوتے تو جانتے ہو کیا ہوتا۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

"اگر کانگ مجھے نظر نہ آتا تو ہم عقبی دروازے سے نکل جاتے اور کسی نہ کسی طرح ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ دیر پہلے مہاراج کو بھی تمہارے بارے میں رپورٹ مل چکی ہے۔ انہیں اگرچہ تمہاری قوتِ بازو پر پورا بھروسا ہے لیکن وہ تمہارے لیے پریشان ہیں کہ کہیں دھوکے میں نہ مارے جاؤ۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

"صرف چند روز اور ماسٹر۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھا وہ ٹرے لیے کچن سے نکل رہی تھی "میں ایک دو دن بعد دوبارہ رنگ کروں گا ماسٹر۔"

"وِش یُو گُڈ لک بوائے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میں تھائی والے کمرے میں آگیا۔ تھائی نے ٹرے بیڈ پر رکھ دی اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ٹرے میں رکھے ہوئے مگوں سے بڑی خوشگوار خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ چائے کے بجائے کافی بنا کر لے آئی تھی۔

تھائی ابھی تک وہی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ مختصری نیکر اور مختصر سا بلاؤز۔ وگ اس کے سر پر بھی تھی اور میرے سر پر بھی۔ دراصل انہی وگوں نے ہمارے حلیے اس حد تک بدلے تھے کہ کانگ بھی ہمیں نہیں پہچان سکا تھا۔ میں نے اپنی وگ اتار کر کرسی پر پھینک دی۔ تھائی کو بھی وگ کا خیال آگیا۔ اس نے بھی وگ اتار پھینکی اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

تھائی جس انداز میں میرے سامنے بیٹھی تھی وہ بڑا شر انگیز تھا۔ میرے دل میں اگرچہ کبھی اس کے بارے میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا لیکن نظروں کو قابو میں رکھنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے شاید میری بے چینی کو بھانپ لیا تھا۔ وہ اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی اور چند منٹ بعد باہر نکلی تو میرے منہ سے اطمینان کی سانس نکل گئی۔ اس نے سلیپنگ سوٹ پہن لیا تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے سامنے بیٹھ گئی اور اپنا مگ اٹھا کر کافی کی چسکیاں لینے لگی۔

ہم چند لمحے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تھائی وانگ اپنے بارے میں وہ باتیں بتانے لگی جو اس نے پہلے کبھی نہیں بتائی تھیں۔

"میں نے زندہ رہنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے۔" وہ کہہ رہی تھی "تم نے میرے بنگلے میں لڑکیوں کی نیم عریاں تصویریں اور البم دیکھے ہوں گے۔ دراصل پانچ سال پہلے میں نے شہر میں ایک مساج پارلر کھولا تھا۔ پہلے میں اکیلی تھی پھر دو لڑکیاں اور رکھ لیں۔ کاروبار بڑھتا گیا تو میرے پاس لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ انہی دنوں جانکی دیوی نے بھی اپنی کسی دوست کے ساتھ مل کر اپنے مکان میں مساج پارلر کھول لیا تھا۔ میں نے اپنا ذاتی مساج پارلر بند کردیا اور شہر کے دوسرے بڑے بڑے مساج پارلرز کو لڑکے اور لڑکیاں سپلائی کرنے لگی۔ میں نے سوکھم وٹ روڈ جیسے مہنگے علاقے میں اپنا دفتر کھول رکھا تھا۔ بڑی کمائی ہے اس بزنس میں۔ میں نے بھی خوب دولت کمائی۔ بنکاک کے ویسٹرن یونین بینک میں میرے اکاؤنٹ میں آج بھی خطیر رقم موجود ہے لیکن موجودہ حالات میں، میں اپنے بینک کا رخ نہیں کرسکتی۔

"اس بزنس میں کمائی ہے تو پریشانیاں بھی بہت ہیں۔ کبھی پولیس پریشان کرتی ہے کبھی سر پھرے گاہک اور کبھی کام کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں۔ میں بہت عرصے سے یہ کام چھوڑنے کا پروگرام بنا رہی تھی لیکن کوئی اور کام میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ چند مہینے پہلے جانکی دیوی کا میڈیکل پریکٹس کا لائسنس بحال کردیا گیا تو اس نے اپنا مساج پارلر بند کرکے دوبارہ کلینک کھول لیا اور پھر اس کے کہنے پر میں نے بھی اپنا بزنس کسی اور کو فروخت کردیا۔ میرا خیال تھا کہ میں ٹریول ایجنسی کھولوں گی۔ کچھ عرصہ آرام کرنے کے بعد میں نے اپنی ایک دوست کے اشتراک سے ٹریول ایجنسی کھول لی۔ دراصل اس کے پاس لائسنس موجود تھا اور سرمایہ میں نے لگایا تھا۔ مجھے اس دفتر میں جاتے ہوئے چند ہی ہفتے ہوئے تھے کہ تم سے ملاقات ہوگئی اور سب کچھ ختم ہوگیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے ندامت کا اظہار کیا کیونکہ اس کا سب کچھ میری ہی وجہ سے ختم ہوا تھا۔

"لیکن مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" تھائی وانگ نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "مجھے تم جیسا انسان مل گیا ہے۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یوں تو یہ شہر انسانوں کا جنگل ہے لیکن مجھے انسانیت کہیں نظر نہیں آئی۔ ہر شخص نے اپنے آپ پر تہذیب کا ملمع چڑھا رکھا ہے۔ جھوٹ، دھوکا اور ریاکاری لوگوں کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ دیانت، خلوص اور لگاؤ مجھے کسی میں نظر نہیں آیا۔ میں نے بہت دھوکے کھائے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کے باوجود میں اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے دور نہیں رکھ سکی۔ میں نے اپنی دولت بھی لٹائی اور عزت بھی لیکن مجھے دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں ملا۔ جس مرد سے میں نے ذرا بے تکلفی سے بات کی، اس نے پہلی فرصت میں مجھے اپنے بستر کی زینت بنانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ ایک ادھیڑ عمر بھکاری جسے میں نے ترس کھا کر کھانا کھلانے کے لیے اپنے گھر میں بلالیا تھا وہ بھی کھانے کو نظر انداز کرکے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید میں نے اپنے جنسی جذبات کی تسکین کے لیے اسے گھر میں بلایا ہے۔ ہر شخص کی نظروں میں ہوس ہے۔ دولت کی ہوس، جنس کی ہوس....." وہ خاموش ہوکر گہرے گہرے سانس لینے لگی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "پھر تم مجھے ملے۔ میں تمہیں کسی اور نیت سے لائی تھی مگر تم دوسروں سے مختلف ثابت ہوئے۔ یقین کرو میں ایسے شرمناک لباس کبھی نہیں پہنتی لیکن تمہارے سامنے نہ صرف ایسے ادھورے لباس پہنے بلکہ برہنہ تک ہوگئی مگر شاید تمہارے اندر برف کی سل رکھی ہوئی ہے جو ذرا بھی نہیں پگھلی۔ ایسے موقعوں پر میں نے ہمیشہ تمہاری آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں دیکھیں اور تمہاری یہ نفرت، جسے میں ہی محسوس کرسکتی تھی، مجھے کشاں کشاں تمہاری طرف کھینچتی چلی گئی۔ مجھے تمہارے اور قریب لے آئی اور یہ مجھے یقین ہوگیا کہ تم ہی وہ ہستی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں اپنا سب کچھ کھو کر بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتی تھی لیکن میرا ذہن شدید الجھن کا شکار تھا۔ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ کس ناتے تمہیں اپنے ساتھ رکھوں یا کس رشتے کا سہارا لے کر تمہارے ساتھ رہوں لیکن آج تم نے میری یہ الجھن حل کردی۔ جو گتھی میں کئی مہینوں کے ذہنی کرب سے بھی نہ سلجھا سکی، وہ تم نے چند لفظوں میں سلجھا دی۔ انسانیت کا رشتہ۔ واقعی بہت عظیم ہے۔ یہ رشتہ۔ قومیت، مذہب، رنگ و نسل کوئی بھی چیز رکاوٹ نہیں ہے۔ اپنے اور تمہارے بیچ یہ رشتہ مجھے پسند آیا۔ اب مجھے واقعی کسی چیز کا افسوس نہیں ہے نہ کوئی دکھ ہے مجھے اپنے گھر کے راکھ ہوجانے کا۔ اب میں تم سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتی لیکن اگر کبھی تم نے اپنا راستہ بدلنے کی کوشش کی تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

"نہیں تھائی۔" میں نے جواب دیا "میں احسان فراموش نہیں ہوں۔ تم نے اس رات مجھے موت کے منہ سے بچایا۔ میری خاطر اپنا سب کچھ تباہ و برباد کرڈالا اور آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہیں بہایا۔ میری خاطر اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا رکھی ہے تم نے۔ تم بہت عظیم ہو۔ تمہارے پاس رہ کر تو مجھے ایسا سکون ملتا ہے جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں تم سے الگ کیسے رہ سکوں گا۔"

تھائی میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور پھر وہ باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا۔ اس نے خالی مگ اور

ڑے اٹھا کر کرسی پر رکھ دیے تھے۔ اور وہ نیم دراز ہوگئی تھی۔ میں نے بھی ایک تکیہ اپنے سر کے نیچے رکھ لیا اور آڑا ہو کر بیڈ کے ایک حصے پر نیم دراز ہو کر اس کی باتیں سنتا رہا۔ رات اختتام پذیر تھی۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ تھائی کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ یہ آواز کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور پھر میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو کھڑکی سے دھوپ اندر آرہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا' تھائی وانگ میرے پیروں پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی طمانیت اور بڑی معصومیت تھی۔

میں نے بڑی آہستگی سے پیر ہٹا کر اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا اور اٹھ کر سٹنگ روم میں آگیا۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بج چکے تھے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا اونگھتے ہوئے ذہن سے سوچ رہا تھا کہ کیا میری زندگی کا صرف یہی ایک مقصد رہ گیا ہے۔ چھپ چھپ کر زندہ رہنا تو کوئی زندگی نہیں تھی۔ میں کتنا بھی بہادر سہی مجھے یہ اعتراف بہرحال کرنا ہی پڑا کہ میرے دل میں وہ خوف اب بھی موجود تھا جس نے مجھے پابند کر رکھا تھا۔ اگر کوئی خوف نہ ہوتا تو آزادی سے گھومتا پھرتا۔ کوئی کام کرتا۔ اپنی تعلیم جاری رکھتا اور زندگی کی رنگینیوں میں دلچسپی لیتا۔

میں کرسی پر شاید بیٹھا یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ پیروں کی ہلکی سی چاپ سن کر چونک گیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ تھائی وانگ تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میری وجہ سے یہ بھی اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی اور اس کی آزادی بھی سلب ہوگئی تھی۔

تھائی چند لمحے وہاں کھڑی میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔

وہ دن بھی اسی طرح گزرا۔ کبھی اونگھتے ہوئے کبھی باتیں کرتے ہوئے اور کبھی اسکریبل اور ڈرافٹ جیسے گیم کھیلتے ہوئے لیکن اب مجھے ان چیزوں سے بھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔

میں اس شام بھی گھر سے نکلنا چاہتا تھا مگر ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ وگ سے میرا حلیہ بدل گیا تھا اور اب میں اس حلئے میں بھی باہر نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے ایک نئے گیٹ اپ کی ضرورت تھی مگر یہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے میں اپنا حلیہ بدل سکتا۔ اتفاق سے پانچ بجے کے قریب جانکی دیوی کا فون آگیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آج کے اخبارات میں کوشلیا کے قتل اور چائی نروڈ پر ایک ریسٹورنٹ میں ہنگامے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ پولیس کو ان دو ہپیوں کی تلاش تھی جو مقتولہ کوشلیا کی بہن شانتی کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آئے تھے اور بعد میں ریسٹورنٹ میں ہونے والے ہنگامے میں بھی یہی دونوں ملوث تھے۔ جھگڑا انہی کی وجہ سے ہوا تھا لیکن بعد میں یہ دونوں غائب ہوگئے۔

"کیا شانتی کا بھی کوئی بیان اخبار میں چھپا ہے اور کیا اس کے بیان میں میرا نام بھی شامل ہے؟" میں نے جانکی دیوی سے پوچھا۔

"بیان تو شائع ہوا ہے مگر تمہارا نام نہیں ہے۔" جانکی دیوی نے جواب دیا "اس نے صرف یہ کہا ہے کہ وہ اسٹور سے چھٹی لے کر نکل رہی تھی کہ ایک ہپی نوجوان اور ایک عورت اسے مل گئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس پیسے نہیں ہیں' انہیں رات گزارنے کے لیے جگہ کی ضرورت ہے۔ اس ہپی عورت نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر وہ رات کو فٹ پاتھ یا کسی پارک میں سوئیں گے تو پولیس یا غنڈے اور بدمعاش انہیں پریشان کریں گے۔ شانتی کے بیان کے مطابق وہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پر ان ہپیوں کو اپنے فلیٹ پر لے آئی تھی مگر کوشلیا کی لاش دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگئے تھے اور بتائے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔ شانتی کے بیان میں کہیں بھی تمہارا ذکر نہیں ہے۔"

میں جانکی دیوی سے اخبار میں شائع ہونے والی خبروں کے حوالے سے کچھ اور باتیں پوچھتا رہا اور پھر اسے ان چیزوں کے بارے میں بتا دیا جن کی مجھے ضرورت تھی۔

جانکی دیوی رات گیارہ بجے کے قریب آئی تھی۔ وہ میری مطلوبہ چیزوں کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی لے آئی تھی جن کی مجھے کسی وقت بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اگلے روز شام کو جب میں تیار ہونے لگا تو تھائی وانگ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہونے لگی لیکن میں نے اسے منع کردیا۔

"آج میں اکیلا ہی جاؤں گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" اس نے مجھے گھورا "اگر کسی مصیبت میں پھنس گئے تو؟"

"وہ مصیبت تم سے زیادہ بڑی نہیں ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بدستور تھی۔

"میں.... میں مصیبت ہوں۔" وہ چیخی' اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا وہ چیل کی طرح مجھ پر جھپٹی۔

میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اپنا دفاع نہیں کرسکا۔ تھائی نے مجھے کرسی سے گھسیٹ کر قالین پر گرا دیا اور میرے سینے پر سوار ہو کر پنجے میرے چہرے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔ سچ بتاؤ کیا میں واقعی تمہارے لیے مصیبت ہوں۔"

"ہاں۔ بہت بڑی مصیبت۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "دیکھو۔ یہ مصیبت کس طرح میرے سینے پر سوار ہے۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیے۔ وہ میرے سینے سے اتر گئی

"بات یہ ہے تھائی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اگر تم میرے ساتھ ہوگی تو میں آزادی سے نقل و حرکت نہیں کرسکوں گا اور اس طرح

ہوسکتا ہے ہم واقعی کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔"

بات شاید تھائی کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"میں تمہارے لیے فکرمند رہوں گی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں محتاط رہوں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور تیاری کرنے لگا۔

اس مرتبہ میں نے اپنا جو حلیہ بنایا' وہ سڑک چھاپ غنڈوں جیسا تھا۔ گردن پر بکھرے ہوئے بال جنہیں پیشانی پر سے ہٹانے کے لیے الاسٹک کا ہیئر بینڈ لگا لیا تھا۔ الاسٹک کا سیاہ رنگ کا تین انچ چوڑا ایک بینڈ میری دائیں کلائی پر بھی تھا۔ دائیں رخسار پر زخم کا ایک نشان بھی بنا لیا تھا اور ناک کے قریب بائیں طرف ایک تل بھی نظر آرہا تھا۔ جسم پر نیلے رنگ کی کھلے پائنچوں کی پتلون اور چمڑے کی بغیر آستین کی جیکٹ تھی جس کے اوپر کے دو بٹن میں نے کھلے رکھے تھے تاکہ میرے گلے میں پڑی ہوئی سنہری چین واضح طور پر نظر آسکے۔ دائیں پنڈلی پر میں نے چمڑے کے فیتے سے خنجر بھی باندھ لیا تھا۔

یہ حلیہ بدلنے میں تھائی وانگ نے بھی میری بڑی مدد کی تھی اور پھر چند قدم دور ہٹ کر وہ گہری نظروں سے میرا تنقیدی جائزہ لینے لگی۔

"اگر تم اس گیٹ اپ میں میرے سامنے آتے تو شاید میں بھی تمہیں نہ پہچان سکتی۔ ویسے اس وقت تو تم واقعی چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے ہو۔" تھائی وانگ نے کہا اور اپنے بیگ میں سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا "ویسے تو غنڈے اور بدمعاش قسم کے لوگ جیب سے پیسہ خرچ کرنے کے بجائے لوگوں سے چھین جھپٹ کر ہی کماتے ہیں لیکن میں چاہتی ہوں تم اپنی جیب سے خرچ کرو۔"

کاٹیج سے نکل کر میں پیدل چلتا ہوا مین روڈ پر آگیا اور وہاں سے ٹک ٹک میں بیٹھ کر سب سے پہلے اسی ریسٹورنٹ میں پہنچا جہاں گزشتہ رات لڑائی ہوئی تھی۔ وہاں اس وقت بھی مہاراج کے کیمپ سے تعلق رکھنے والے دو تین لڑکے موجود تھے جو مجھے وجدان کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے تھے اور میں نے انہی کی میز پر بیٹھ کر کافی پی تھی۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکے تھے۔ دراصل یہاں آنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا۔ میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ میرے گیٹ اپ میں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی تھی۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر میں ایک ٹیکسی پر سوار ہوا اور سوکھم وٹ روڈ پہنچ گیا۔ یہاں بڑے بڑے ہوٹل اور نائٹ کلب تھے۔ میں غنڈوں والے اس حلئے میں کسی بڑے نائٹ کلب یا ہوٹل میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسی کوئی کوشش بھی کرتا تو مجھے روک دیا جاتا۔ میری منزل تو وہ نائٹ کلب تھا جہاں نچلے درجے کے لوگ اور مجھ جیسے غنڈے ہی آسکتے تھے۔ میری لینڈ نائٹ کلب ٹائیگر کی ملکیت

عورتوں کی نفسیات

- عورتوں کی قسمیں
- عورت اور محبت
- عورت اور شادی
- عورت اور دوستی

اور بہت کچھ....!

ان عورتوں کیلئے جو خود کو سمجھنا چاہتی ہیں اور ان حضرات کیلئے جو عورتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

قیمت 45 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

74200

فون: 5802562-5885313 فیکس: 5802561

1-6-2001

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

تو نہیں تھا لیکن اس کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ یہاں عورتوں کے کک باکسنگ کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ یہ مقابلے شام آٹھ بجے ہی شروع ہو جاتے اور رات دو بجے تک جاری رہتے تھے۔

سوئے فائیو پر فیڈرل ہوٹل سے کچھ فاصلے پر واقع میری لینڈ نائٹ کلب میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ کئی میزیں خالی پڑی تھیں۔ اسٹیج پر کک باکسنگ کا مقابلہ جاری تھا۔ دو ادھیڑ عمر عورتیں تھکی ہوئی بلیوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر اگرچہ لباس برائے نام ہی تھے لیکن ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو تو شاید ان سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے ابھی دو منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک آدمی بڑی بے تکلفی سے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ کسی قدر دراز قامت' بال چڑیا کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے' کلین شیو' گلے میں سیاہ ڈوری اور سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا۔ اس نے جینز اور بغیر آستین کی دھاری دار بنیان پہن رکھی تھی۔ اس کا جسم گٹھا ہوا اور بازوؤں کے مسل ابھرے ہوئے تھے۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔

"ہیلو باس!" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ہیلو۔" میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ پہلے تو میں اسے اپنی میز پر بیٹھتے دیکھ کر چونکا تھا لیکن اب مجھے احساس ہونے لگا کہ اس شخص سے مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔

"لگتا ہے تمہارا دھندا خوب چل رہا ہے۔" وہ میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "یہاں دھندا تو سب کا ہی چل رہا ہے۔ ایک میں ہی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔"

"کیا کام کرتے ہو؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی بھی کام مل کر سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا "ویسے میں موٹر مکینک ہوں۔ پتایا میں اچھا خاصا کام چل رہا تھا۔ ایک دوست کے بہکانے پر یہاں آ گیا۔ وہ سالا چوری کے جرم میں پکڑا گیا اور میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔"

"شاید تمہیں واپسی کا کرایہ چاہیے۔" میں نے کہا۔ بہت سے ہڈ حرام قسم کے لوگ پیسے بٹورنے کے لیے دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو مظلوم بنا کر پیش کرتے ہیں۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا "میں اپنے ساتھ ناکامی اور نامرادی کی داستان لے کر واپس نہیں جانا چاہتا۔"

"چائے یا کافی پیو گے۔" میں نے پوچھا۔

"میں نے کل رات سے کھانا نہیں کھایا۔" اس کے لہجے میں ندامت بھی تھی اور افسردگی بھی۔

میں نے ایک بار پھر غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی باتوں میں اور اس کے چہرے پر سچائی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔

"ویٹرلیس آ رہی ہے۔ جو کھانا چاہو منگوا لو۔" میں نے کہا۔

"یہاں نہیں۔" اس نے کہا "یہ نائٹ کلب ہے تو تھرڈ کلاس مگر یہاں کے ریٹ زیادہ ہیں۔ ادھر ایک ریسٹورنٹ ہے۔ سستا کھانا ملتا ہے۔"

میں ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ وہ مجھے یہاں سے اٹھا کر کہیں اور لے جانا چاہتا تھا۔ کسی گڑبڑ کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے بہرحال رسک لینے کا فیصلہ کر لیا اور ہم میری لینڈ نائٹ کلب سے نکل کر ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں آ گئے اور پھر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے نہایت سستے قسم کے کھانے کا آرڈر دیا تھا۔ حالانکہ ایسے موقع پر جب بل دوسرے کی جیب سے ادا ہونا ہو' اچھی سے اچھی اور مہنگی چیز منگوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں نے ویٹرلیس کو بلا کر اس کا آرڈر کینسل کر دیا اور بڑھیا قسم کے کھانے کا آرڈر دے دیا۔

کھانا کھانے کے بعد کافی بھی پی گئی۔ وہ میرا بے حد احسان مند نظر آ رہا تھا۔

"میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اگر آج بھی مجھے کھانا نہ ملتا تو شاید....."

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "کسی کو ایک وقت کا کھانا کھلا دینا کوئی ایسی بات نہیں ہوتی۔"

"میں تو اسے احسان سمجھتا ہوں اور ہمت ہوئی تو کبھی اس بوجھ کو اتارنے کی کوشش کروں گا۔" اس نے کہا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال گزرا۔ ماسٹر کے رنگ سے باہر بھی مجھے کسی ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو قابلِ بھروسا ہو اور باہمت بھی اور مجھے یہ شخص پسند آیا تھا اور اس مختصر سی ملاقات میں' میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اگر اسے مناسب طریقے سے ڈیل کیا جائے تو یہ میرے لیے جان بھی دے سکتا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نام رامن پرساد ہے اور رہائش فٹ پاتھ پر۔" اس نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آ گئی تھی "ایک مہینہ پہلے پتایا سے یہاں آیا تھا۔ دو چار دن ہوٹل میں رہا پھر فٹ پاتھ پر آ گیا۔"

"دوستی کرو گے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"دوستی۔" اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی "اس کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"اس کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ تم ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"دوستی کے نام پر جان بھی چلی جائے تو مجھے افسوس نہیں

ہوگا۔" اس نے کہا۔ رامن پرساد بدھ کا پیروکار تھا۔ اسے دھرم سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا جس نے زندگی کے چند اصول وضع کر رکھے تھے۔ جن پر وہ عمل پیرا تھا۔

فی الحال یہ اپنے پاس رکھو۔" میں نے جیب سے کئی نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے "آج کی رات کسی ہوٹل میں بسر کرو۔ کل مجھے اسی جگہ پر ملنا میں تمہیں کچھ اور رقم دوں گا۔ اپنے لیے کچھ کپڑے خرید لینا اور کسی فلیٹ کا بھی بندوبست کر لینا۔" وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "تم تو دوستی میں جان بھی دینے کو تیار ہو اور میں تو کاغذ کے یہ چند ٹکڑے دے رہا ہوں۔"

رامن پرساد نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"آؤ۔ اب یہاں سے چلیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم ایک بار پھر میری لینڈ نائٹ کلب میں آ گئے۔ اس وقت گاہکوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اسٹیج پر فائٹنگ کا مظاہرہ کرنے والی لڑکیاں بھی دوسری تھیں۔

"یہاں کچھ نہیں ہے باس۔" رامن پرساد نے کہا "آؤ۔ میں تمہیں ایک ایسی جگہ لے چلوں کہ ساری زندگی یاد کرو گے۔"

ہم میری لینڈ سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ رامن پرساد نے ڈرائیور کو ناکسن برج کی طرف چلنے کو کہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جب میں پتایا سے یہاں آیا تھا تو میرا وہ دوست مجھے اس جگہ لے گیا تھا۔ وہاں بعض چیزیں دیکھ کر تمہیں حیرت ہوگی۔"

نیا ریور کے ناکسن برج سے وہ کاٹیج زیادہ دور نہیں تھا جہاں ہم رہائش پذیر تھے۔ لیکن میں نے رامن پرساد کو نہیں بتایا۔

ٹیکسی دریا کے کنارے سڑک پر رک گئی۔ شنگریلا اور اورینٹل ہوٹل کے درمیان وہ ایک بہت بڑا پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس تھا۔ گیٹ پر گیسٹ ہاؤس کے نام کا نیون سائن بھی روشن تھا۔ ایک بہت بڑا رقبہ چار دیواری نے گھیر رکھا تھا جہاں درختوں کی بہتات تھی۔

میں نے رامن پرساد کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میری لینڈ جیسے گھٹیا نائٹ کلب میں میرا جانے کا مقصد کیا تھا۔ اس کے ساتھ یہاں میں اس لیے چلا آیا تھا کہ میں اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔

گیسٹ ہاؤس کا بڑا ہال کچھ عجیب ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ لگتا تھا میں کسی پرستان میں آ گیا ہوں۔ نوجوان اور خوب صورت ویٹرلیس ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر لباس برائے نام ہی تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ گیسٹ ہاؤس عیاشی کا بہت بڑا اڈا تھا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ میں نے رامن پرساد پر بھروسا کر کے غلطی تو نہیں کی۔ ایسا تو نہیں کہ اس نے مجھے پہچان لیا ہو اور ایک فرضی کہانی سنا کر مجھے اعتماد میں لے کر دھوکے سے یہاں لے آیا ہو؟ لیکن بہرحال اب تو میں یہاں آ ہی گیا تھا۔ اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔ اب موسلوں کا انتظار تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے کہ اندرونی دروازے سے ایک آدمی کو برآمد ہوتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ دارا تھا۔ میرا اصل دشمن جس نے جہنم کی بلائیں میرے پیچھے لگا رکھی تھیں۔ اس کے جسم پر بہترین سوٹ تھا۔ بائیں طرف بغل کے نیچے کچھ ابھار سا نظر آ رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بغلی ہولسٹر تھا جو کوٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا اور رامن پرساد نے میری بے چینی کو محسوس کر لیا تھا۔

"کیا بات ہے باس۔ تم اس لمبے آدمی کو دیکھ کر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔

"اوہ۔ کچھ نہیں۔" میں نے کہا پھر جُوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا "اسے دیکھ کر کچھ پرانی یادیں ذہن میں ابھر آئی ہیں۔"

"اگر اس نے تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچایا ہو تو مجھے بتاؤ باس۔ ابھی اس کی گردن کا اسکریو ڈھیلا کرتا ہوں۔" رامن پرساد نے کہا۔

میں نے گہری نظروں سے رامن پرساد کی طرف دیکھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور اس پر مکمل بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

"یہ بہت خطرناک آدمی ہے پرساد۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اس نے میرے ماں باپ کو قتل کیا تھا۔ یہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی بھی ہیں۔ وہ بھی دنیا کے سفاک ترین آدمی ہیں۔ یہ لوگ مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے بچنے کے لیے سنگاپور سے بھاگ کر پہلے کوالالمپور اور پھر یہاں آ گیا۔ یہ لوگ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے ٹائیگر سے یاری گانٹھ لی ہے اور یہ سب لوگ مجھے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ کئی بے گناہ بنکاک میں بھی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ آج میں ان کی تلاش میں نکلا تھا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ اچھا ہوا تم مجھے یہاں لے آئے اور یہ میری نظروں میں آ گیا۔"

"اس نے بھی تمہیں دیکھا ہے لیکن حیرت ہے تمہاری طرف توجہ نہیں دی۔" رامن پرساد نے کہا۔

"میں نے اس وقت اپنا حلیہ بدل رکھا ہے اس لیے نہیں پہچان سکا۔" میں نے کہا۔

"اب تم فکر مت کرو باس۔" رامن پرساد نے کہا "میں ابھی اس کی گردن کا اسکریو ڈھیلا کرتا ہوں۔"

"یہاں نہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "سب سے پہلے میں اس کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ہم دو ان کا کچھ نہیں بگاڑ

سکتے۔ یہاں اس کے کچھ اور ساتھی بھی ہوں گے۔ ہاں تم ایک بات یاد رکھو۔ اگر ہم یہاں سے بچھڑ گئے تو کل شام آٹھ بجے جانتا ٹاؤن میں مہاراج جمنازیم کے قریب ریسٹورنٹ میں میرا انتظار کرنا۔"

"اتنا لمبا انتظار کیوں باس۔ ابھی کیوں نہیں۔" رامن پرساد نے کہا۔

"ابھی وہ تمہاری گردن کا اسکریو ڈھیلا کردیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ ایک اچھے دوست سے محروم ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔

رامن پرساد کندھے اچکا کر رہ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ایک بار پھر چونک جانا پڑا۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ وہی خوب صورت لڑکی تھی جس نے اس روز خانقاہ کے گیٹ پر مجھے وہ گلدستہ دیا تھا جس میں ٹائم بم فٹ تھا۔ وہ لڑکی چند لمحے دارا کے پاس رک کر باتیں کرتی رہی پھر اندرونی دروازے میں چلی گئی۔ دارا بھی وہاں سے ہٹ کر ایک میز پر بیٹھ گیا جہاں دو خوب صورت لڑکیاں پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ان سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔

"تم اس پر نگاہ رکھنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے رامن پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور اٹھ کر اس دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے کے دوسری طرف ایک کشادہ راہداری تھی۔ بائیں طرف اوپر جانے کے لیے زینہ تھا۔ اس لڑکی کو میں نے اس طرف مڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ زینے پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ میں اوپر چڑھتا چلا گیا۔

زینے کے اختتام پر وہ کشادہ راہداری بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔ آخر میں انگریزی کے حروف ٹی کی طرح دائیں بائیں مڑ گئی تھی۔ راہداری میں دونوں طرف کمرے تھے۔ تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ میں راہداری کے آخر پر پہنچ کر رک گیا۔

دائیں طرف آخری کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ اس راہداری کے دائیں بائیں کمرے تھے اور آخر میں کھلی جگہ تھی۔ صرف تین فٹ اونچی منڈیر تھی۔ اس کے دوسری طرف نیچے لان تھا۔

دروازے کے سامنے گہرے نیلے رنگ کا پردہ پھیلا ہوا تھا۔ میں آڑ میں کھڑے ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا اور سامنے ایک صوفے پر کم ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا اور اس کے قریب کھڑی ہوئی وہ لڑکی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔

میں ان لوگوں کی باتیں سننے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے احساس ہی نہ ہو سکا کہ کب کوئی میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ چونکا تو میں اس وقت جب کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ دارا تھا۔

اور اس سے پہلے کہ دارا کچھ سمجھ سکتا، میں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھل کر اس کے جبڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔ دارا کراہ کر پیچھے ہٹا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کردی۔ اس مرتبہ وہ بلبلا اٹھا۔ وہ آگے کو جھک گیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے تھوبڑے پر کک رسید کردی۔ وہ الٹ کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کا سر بڑی زور سے دیوار سے ٹکرایا تھا۔

میں اس کی طرف بڑھتے ہوئے رک گیا۔ میں نے کمرے کے اندر کسی قسم کی نقل و حرکت محسوس کرلی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے کم باہر آگیا۔ اس کی تیز نظروں نے فوراً ہی صورت حال کا اندازہ لگا لیا لیکن اسے کچھ کرنے کا موقع دینے سے پہلے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس کے سینے پر پڑی۔ وہ کراہتا ہوا دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کے سینے کی طرف اس کے پیٹ پر سر سے ٹکر مار دی۔ کم نے سنبھلنے کی کوشش میں میرے بال پکڑ لیے۔ میں نے سر کو زوردار جھٹکا دیا۔ میری وگ کم کے ہاتھوں میں رہ گئی اور میں پیچھے ہٹ گیا۔

میری صورت دیکھ کر کم اچھل پڑا۔ وگ اتر جانے کے بعد مجھے پہچان لینا زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ دارا نے بھی میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ وہ کوٹ کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں راہداری کی طرف سے ایک سایہ ہوا میں اڑتا ہوا آیا اور دارا پر گرا۔ دارا چیخ اٹھا۔

وہ رامن پرساد تھا۔

میں نے کم کو سنبھال رکھا تھا اور رامن پرساد نے دارا کو سنبھال لیا تھا۔ وہ بھی ایک اچھا فائٹر تھا اور دارا کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ کمرے کے اندر وہ لڑکی شاید ٹیلی فون پر چیخ چیخ کر کسی سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد دوسری راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔

"رامن..... بھاگو۔ اس طرف!" میں نے چیخ کر کہا۔

رامن نے دارا کو زوردار کک لگا کر نیچے گرا دیا اور منڈیر پر چڑھ کر پچھلے لان کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کم مجھ سے لپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ گھٹنے کی دوسری ضرب اس کی ٹھوڑی پر لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا الٹ گیا اور پھر میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر منڈیر سے چھلانگ لگا دی۔

نرم زمین پر گرتے ہی میں سنبھل گیا لیکن پھر یوں لگا جیسے کندھے سے ذرا نیچے انگارے سے بھر گئے ہوں۔ فائر کی آواز بھی دور تک پھیل گئی تھی۔ میں نے ایک طرف چھلانگ لگا دی اور باؤنڈری وال کی طرف دوڑنے لگا۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں دوڑتا ہوا باؤنڈری وال کے قریب پہنچ گیا۔ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف چھلانگ لگانے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ دائیں پنڈلی میں انگارے سے بھرتے چلے گئے۔ میں دیوار کے دوسری طرف گرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی سیاہ چادر پھیلتی چلی گئی۔ مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے۔ وہ آوازیں مجھے واضح طور پر سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ تھائی زبان میں چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ لگتا تھا فائرنگ کی یہ آواز میرے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے چاروں طرف اب بھی تاریکی تھی۔ اتنی گہری تاریکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر مجھے احساس ہوا جیسے کسی نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہو۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے کسمسایا تو میرے بائیں بازو اور دائیں ٹانگ میں ٹیسیں اٹھیں اور درد کی لہریں پورے جسم میں پھیلتی چلی گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ سی نکل گئی۔ اسی لمحے ایک ہاتھ نے میرا منہ دبا دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک نہایت مدھم سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آرام سے لیٹے رہو۔ منہ سے آواز مت نکالنا اور نہ ہی اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔ وہ ہمیں تلاش کر رہے ہیں اور ہمارے بہت قریب ہیں۔ کوئی معمولی سی آواز بھی انہیں ہماری طرف متوجہ کر سکتی ہے۔"

وہ آواز اجنبی ہونے کے باوجود شناسا سی لگ رہی تھی۔ میرے حواس ابھی پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی اور میں سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میرے بدن میں ٹیسیں کیوں اٹھ رہی ہیں۔ یہ کون شخص ہے جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔

فائر کی ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ آواز قدرے قریب سے سنائی دی تھی۔ میرے گرد وہ گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی اب قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔ میرے منہ پر یکبارگی پھر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا تاکہ کوئی آواز نہ نکل سکے۔

میری آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور میں قبر جیسی اس تاریکی میں گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔ میرے بازو اور ٹانگ میں مسلسل ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے دائیں ہاتھ کو آہستگی سے حرکت دے کر بائیں بازو پر رکھا تو نمی اور چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا اور مجھے یاد آگیا کہ کیا ہوا تھا۔

رامن پرساد مجھے ایک گیسٹ ہاؤس میں لے کر گیا تھا جہاں دارا اور کم سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ تاریکی میں گھورتے ہوئے وہ مناظر کسی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ ایک ایک لمحے کی یاد تازہ ہوتی چلی گئی۔ مجھے یہ بھی یاد آگیا کہ وہاں سے فرار ہوتے ہوئے میرے بازو میں گولی لگی تھی اور جب میں باؤنڈری وال پر سے کود رہا تھا تو دوسری گولی میری ٹانگ میں لگی تھی

اور میں نیچے گر کر کسی ناہموار ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا تھا اور پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک بے ہوش رہا تھا مگر میرے چاروں طرف بکھری ہوئی گمبھیر تاریکی بتا رہی تھی کہ یہ رات ہی کا کوئی حصہ تھا مگر یہ کون سی جگہ ہے اور یہ آدمی کون ہے جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے؟ گرفت دوستانہ تھی اور تھوڑی دیر پہلے اس نے میرے کان میں جو سرگوشی کی تھی اس سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرا کوئی ہمدرد ہے جو مجھے دشمنوں سے بچاتا

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عبرت
جو حالات کے جال میں پھنس کر جرائم
کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعام یافتہ مشہور مصنف جبار توقیر کا منفرد انداز تحریر

گمراہ
8 حصے

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

چاہتا ہے۔
اچانک میرے ذہن میں رامن پرساد کا خیال اُبھرا۔ میں اس کا نام لینا چاہتا تھا مگر میرے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔
"اے.... اس طرف...." ایک چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ شخص مجھ سے صرف چند گز کے فاصلے پر موجود ہو۔
"یہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آتے۔ اس طرف چلو.... دریا کے پل کی طرف۔ وہ اُدھر سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"
میں اپنی اکڑتی ہوئی ٹانگ کو حرکت دینا چاہتا تھا لیکن یہ آواز سن کر بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ تاریکی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر یہ آوازیں بتدریج گھور اندھیرے میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔
میرے منہ سے ہاتھ ہٹالیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گہرا سانس لینے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔
"پرساد...." میرے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔
"ہاں۔ یہ میں ہوں باس۔" جواب میں سرگوشی سنائی دی "ابھی خاموش رہو اور آرام سے پڑے رہو۔ وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے۔ پلٹ کر آبھی سکتے ہیں۔"
اس مرتبہ میں نے بات نہیں کی البتہ دائیں ٹانگ کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی جو لکڑی کے تختے کی طرح اکڑی جارہی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ سی نکل گئی۔
"کیا ہوا؟" رامن پرساد نے پوچھا۔
"بہت تکلیف ہورہی ہے۔" میں پھر کراہا "میرے بازو اور ٹانگ میں گولیاں لگی ہیں۔ یہ اذیت اب ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی ہے۔"
"برداشت کرو۔" پرساد نے کہا "تم ایک بہادر اور باہمت نوجوان ہو۔ یہ تو معمولی سی تکلیف ہے۔ تھوڑی دیر برداشت کرو۔ وہ لوگ ابھی زیادہ دور نہیں ہیں۔ موقع دیکھ کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔"
"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے پوچھا۔
"مجھے بھی معلوم نہیں۔" پرساد نے جواب دیا "میں نے تمہیں چیخ کر دیوار سے گرتے اور ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جب میں تمہارے قریب پہنچا تو تم بے ہوش ہو چکے تھے۔ میں تمہیں وہاں سے اٹھا کر بھاگ نکلا تھا۔ مجھے چھپنے کے لیے یہی جگہ نظر آئی تھی۔ اب تک تو یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ ہی رہی ہے۔ وہ لوگ چند قدم کے فاصلے پر ہمارے قریب سے گزر گئے ہیں لیکن ہماری موجودگی کا پتا نہیں چلا۔ ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔ ہمیں کچھ دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم خاموشی سے بیٹھے رہیں تاکہ اگر وہ دوبارہ اس طرف نکل آئیں تو...."
وہ یکایک خاموش ہوگیا۔ دور سے فائر کی ایک اور آواز سنائی دی تھی۔
"انہوں نے غالباً خاصے بڑے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔" پرساد نے سرگوشی کی "ہمیں یہاں سے نکلنے میں مشکل تو پیش آئے گی مگر ظاہر ہے ہم رات بھر یہاں بیٹھے بھی نہیں رہ سکتے۔ بہرحال ہمیں کچھ اور انتظار کرنا پڑے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی میرے ذہن کو الجھا رہی ہے۔"
"وہ کیا....؟" میں نے پوچھا۔
"یہاں سے نکل کر ہم جائیں گے کہاں؟" رامن پرساد نے کہا "مجھے تمہاری فکر ہورہی ہے باس۔ تمہیں طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر بروقت کوئی طبّی امداد نہ ملی تو زخم بگڑ جانے کا اندیشہ ہے جس سے تمہاری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔"
"ہمیں یہاں آئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"تقریباً ایک گھنٹا تو ہوچکا ہے۔" اس نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر بعد میں یہاں سے نکل کر دیکھوں گا کہ کیا صورتِ حال ہے لیکن سوال پھر وہی ہے کہ یہاں سے نکل کر ہم جائیں گے کہاں؟"
"اس کی تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا "ضرورت صرف یہاں سے بچ کر نکلنے کی ہے۔ دریا کے پار وانگ ینگ بائے روڈ پر ایک ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں ہم پناہ لے سکتے ہیں اور مجھے میڈیکل ایڈ بھی مل سکتی ہے لیکن ہم دریا کی دوسری طرف کیسے جائیں گے۔ ان کے آدمی تو برج پر بھی موجود ہوں گے اور کوئی شخص ان کی نظروں سے بچ کر نہیں جاپائے گا۔"
"صورتِ حال کا اندازہ لگانے کے بعد میں کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔" پرساد نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تم یہیں رکو۔ میں صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔"
میرا سر پرساد کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے آہستگی سے اٹھا دیا۔ تاریکی میں اب بھی کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم زمین پر تھے یا پاتال میں.... ایسی گہری اور دبیز تاریکی! میں نے اندھوں کی طرح ٹٹول کر دیکھا تو پتا چلا کہ ہم ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں تھے اور وہ جگہ کچھ زیادہ کشادہ بھی نہیں تھی۔ ہمارے سروں کے اوپر چھت نما کوئی چیز بھی تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میرا ہاتھ چھت کو چھو گیا تھا۔
پرساد رینگتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ میں نے پتھر سے پشت ٹکا کر ٹانگیں پھیلالی تھیں۔ بازو اور ٹانگ سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور یہ درد پورے جسم میں پھیل رہا تھا۔ تکلیف کی شدت کو کم کرنے کے لیے میں نے بڑی سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔
مجھے یہاں پڑے ہوئے ایک گھنٹا ہوچکا تھا اور اس ایک گھنٹے میں میرے زخموں سے اچھا خاصا خون بہہ چکا تھا اور اب میں اپنے آپ میں نقاہت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ پرساد نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مجھے فوری طور پر طبّی امداد کی ضرورت تھی ورنہ زخم بگڑ جائے گا اور میری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔
رامن پرساد کو یہ بھی پریشانی تھی کہ یہاں سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے اور میں نے فوری طور پر اسے اپنے ساتھ گھر لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہاں.... وہ گھر ہی تو تھا جہاں میں اور تھائی وانگ رہ رہے تھے۔ رامن پرساد قابلِ اعتماد اور بھروسے کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے میری خاطر اپنی زندگی بھی خطرے میں ڈال دی تھی۔ ان لوگوں کے ہاتھ لگ جانے کی صورت میں وہ پرساد کو بھی اذیتیں دے کر ہلاک کرڈالیں گے۔ اس لیے میں نے اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ اگر خود غرض ہوتا تو وہاں جھگڑا شروع ہونے کے بعد صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ لگاتے ہی مجھے چھوڑ کر بھاگ نکلتا لیکن اس نے اپنی جان کی پروا نہیں کی تھی اور مجھے ان درندوں سے بچالایا تھا۔ اس جیسے وفادار اور جاں نثار کو اس طرح چھوڑا نہیں جاسکتا تھا۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد سرسراہٹ کی ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی زمین پر رینگ رہا ہو۔ چند سیکنڈ بعد ہی پرساد کی سرگوشی سنائی دی۔
"باس!"
"ہاں پرساد۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔
وہ رینگتا ہوا میرے قریب آگیا۔
"سڑک یا کسی اور راستے سے نکلنے کا کوئی چانس نہیں ہے باس۔" پرساد نے کہا "انہوں نے پورے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی بچا ہے۔"
"اور وہ راستہ کون سا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔
"دریا!" پرساد نے جواب دیا "کیا تم تیرنا جانتے ہو باس؟"
اس کی بات سن کر میں کانپ اٹھا۔ پیراکی تو مجھے آتی تھی اور یہ پیراکی میں نے سنگاپور کے ایک سوئمنگ کلب میں سیکھی تھی لیکن سوئمنگ پول اور دریا میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پول کے ٹھہرے ہوئے پانی میں تیرنا اور بات ہے اور دریا کے گہرے اور بہتے ہوئے پانی میں تیرنا دوسری بات.... اور پھر اس وقت میری حالت؟ بازو اور ٹانگ میں گولیاں لگی تھیں۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے میں کمزوری محسوس کررہا تھا لیکن بھیانک موت نے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا اور موت کے اس حصار کو توڑنے کا وہی ایک راستہ تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "یہ رسک لینا ہی پڑے گا۔"
"تو ٹھیک ہے۔ اس طرف چلو.... لیکن کچھ دور تک رینگنا ہی پڑے گا۔" پرساد نے کہا۔
ممکن ہے "اس طرف" کہتے ہوئے اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ بھی کیا ہو لیکن دبیز اندھیرے میں تو میں اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتا تھا اس کا ہاتھ کیا نظر آتا۔ پرساد کے رینگنے سے.... سرسراہٹ کی جو ہلکی سی آواز پیدا ہورہی تھی میں اسے فالو کرتے ہوئے اس کے پیچھے رینگتا رہا۔ میرے زخمی بازو اور ٹانگ میں تکلیف کی شدت بڑھ گئی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہم اس تنگ سی جگہ سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے۔ چہرے سے ٹکرانے والی تازہ ہوا بڑی خوشگوار لگی تھی۔ اس جگہ اگرچہ روشنی نہیں تھی لیکن سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر روشنیاں جگمگارہی تھیں اور ان سے اندھیرے کی گھٹن کا احساس بھی ختم ہوگیا تھا۔
رامن پرساد اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ میری زخمی ٹانگ نے بوجھ اٹھانے سے صاف انکار کردیا تھا اور معمولی سا بوجھ پڑنے سے زخم سے جو ٹیس اٹھی تھی وہ میرے پورے وجود میں پھیلتی چلی گئی تھی۔
پرساد فوراً ہی میری طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے میرا سیدھا بازو اپنی گردن میں حمائل کرلیا اور مجھے سہارا دے کر آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ میرا دایاں پیر زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ گولی میری پنڈلی کی پچھلی طرف لگی تھی اور اندر ہی رہ گئی تھی جس وجہ سے مجھے زیادہ تکلیف ہورہی تھی۔ پوری ٹانگ میں شدید تناؤ اور کھنچاؤ تھا۔
چند قدم چلنے کے بعد ہم رک گئے بلکہ میں تو گر سا گیا تھا۔ میں نے تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ گیسٹ ہاؤس بائیں طرف تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس سے پرے ہوٹل شنگریلا کا جگمگاتا ہوا نیون سائن نظر آرہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا جہاں سے ہم نکل کر آئے تھے۔ اس جگہ کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کسی پل کا ابتدائی حصہ تھا۔ ہوسکتا ہے پہلے یہاں دریا پر پل بنانے کا منصوبہ بنا ہو لیکن فنی وجوہات کی وجہ سے یہ منصوبہ ترک کرکے وہاں سے تقریباً ہزار گز آگے پل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس جگہ زمین سے پل کی بنیادیں اور سائڈ کی دیواریں اٹھا کر شروع کے حصے میں کنکریٹ کی بھرائی کی گئی تھی اور آگے کچھ حصے پر کنکریٹ کے دیو قامت گارڈر ڈال کر چھت یا سڑک کا کچھ حصہ بھی بنایا گیا تھا لیکن بعد میں اسے نامکمل چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس چھت کے نیچے بڑے بڑے پتھر اور ملبے کے ڈھیر ایسے ہی پڑے رہ گئے تھے اور پرساد مجھے اس کے آخری حصے میں ایک ایسے ہی بڑے پتھر کے پیچھے لے گیا تھا جس وجہ سے ہم تلاش کرنے والوں کی نظروں سے محفوظ رہے تھے۔
"یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے باس۔" پرساد کی آواز نے مجھے چونکا دیا "اگر وہ لوگ دوبارہ اس طرف نکل آئے تو ہمارے پاس چھپنے کی کوئی اور جگہ بھی نہیں ہے۔"

اس نے مجھے دوبارہ سہارا دے کر اٹھا دیا اور میں اس کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ ہمارا رخ دریا کی طرف تھا۔ بنکاک والوں نے شہر کے وسط میں بہتے ہوئے اس دریا سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ کئی یاٹ کلب تھے۔ دریا کے ساتھ بڑے بڑے ہوٹلوں نے بھی کناروں تک کی جگہ گھیر رکھی تھی جہاں چھوٹی چھوٹی جیٹیاں تعمیر کرکے اپنے مہمانوں کے لیے بوٹنگ کی سہولتیں فراہم کر رکھی تھیں۔ بعض لوگوں نے ویسے ہی جگہ گھیر کر چھوٹے چھوٹے گھاٹ بنا رکھے تھے جہاں دریا کی سیر کے لیے آنے والوں کو کرائے پر کشتیاں فراہم کی جاتی تھیں لیکن بہت سی جگہیں ایسی تھیں جو اب بھی ویران پڑی تھیں۔ ان جگہوں پر آس پاس تو گھرے کھنڈ تھے یا کسی اور وجہ سے انہیں نظرانداز کردیا گیا تھا۔

اس وقت ہم جس جگہ پر موجود تھے وہاں سے بائیں طرف تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر تو وہ گیسٹ ہاؤس تھا اور دوسری طرف تقریباً پانچ سو گز تک ویرانہ تھا۔ اس سے آگے روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ بیچ کے اس ویرانے میں جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

"میرا خیال ہے اس طرف کنارے پر ہمیں کوئی ایسی جگہ مل جائے گی جہاں سے ہم دریا میں اتر سکیں۔" رامن پرساد نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مگر پرساد۔" میں کراہ اٹھا "مجھ سے تو قدم نہیں اٹھایا جارہا۔ بازو بھی بُری طرح اکڑا ہوا ہے۔ دریا میں کیسے تیر سکوں گا؟"

"فکر نہ کرو باس۔" پرساد بولا "میں صرف موٹر مکینک ہی نہیں ہوں۔ ایک بہت اچھا پیراک بھی ہوں۔ پتایا کے گہرے ساحل پر پیراکی کے کئی خطرناک مقابلے جیت چکا ہوں۔ تم میری پشت پر سوار ہوجانا۔ میں تمہیں بڑی آسانی سے دوسرے کنارے تک لے جاؤں گا۔ راستے میں تمہارے کپڑے تک گیلے نہیں ہونے دوں گا۔ بس ہمیں دریا میں اترنے کے لیے مناسب جگہ مل جائے۔"

رامن پرساد مجھے سہارا دے کر جھاڑیوں میں گھسیٹتا رہا۔ اس طرح چلنے سے میری ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جارہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ دارا اور کم کے آدمی شکاری کتوں کی طرح آس پاس کے علاقے میں ہماری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ کسی لمحے اس طرف بھی آسکتے تھے۔

ہم اس جگہ سے کافی دور نکل آئے تھے۔ آس پاس جھاڑیاں اگرچہ خاصی اونچی تھیں مگر زیادہ گنجان نہیں تھیں۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے آسانی سے راستہ مل رہا تھا اور پھر اچانک ہم ٹھٹک کر رک گئے۔

ہم سے تقریباً پندرہ گز آگے ایک شعلہ سا چمکا تھا۔ میں نے غور سے اس طرف دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ وہاں قدرے اونچی جگہ پر ایک آدمی کھڑا تھا جس نے سگریٹ سلگانے کے لیے دیا سلائی جلائی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ دیا سلائی کی روشنی میں اس کا چہرہ تو نظر نہیں آیا تھا لیکن بکھرے ہوئے بال اور دھاری دار ٹی شرٹ سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔ وہ یقیناً دارا ہی کا کوئی گرگا تھا جو نگرانی کے لیے وہاں کھڑا تھا۔

رامن پرساد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے آہستگی سے جھاڑیوں کی آڑ میں زمین پر بٹھا دیا اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر جھک کر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا۔ پرساد میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا مگر وہ آدمی اپنی جگہ پر کھڑا اطمینان سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ غالباً بہت ہی گھٹیا قسم کا تھا۔ ہوا کا رخ ہونے کی وجہ سے اس کی ناگوار سی بو یہاں تک آرہی تھی۔

اور پھر اس شخص کے عقب میں چند قدم کے فاصلے پر پرساد کو نمودار ہوتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور میں دل ہی دل میں اس کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا۔ پرساد بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور پھر شاید اس کا پیر کسی جھاڑی میں الجھ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔

آواز سن کر وہ شخص تیزی سے پیچھے پلٹا۔ اس نے سگریٹ پھینک دیا اور پرساد کی طرف لپکا۔ پرساد سنبھل گیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ دونوں زمین پر گرے پھر اٹھ گئے۔ میں کسی قدر نشیب میں تھا اور وہ دونوں اونچی جگہ پر تھے۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کے پس منظر میں مجھے ان دونوں کے ہیولے تو نظر آرہے تھے مگر یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ ان میں پرساد کون سا ہے اور وہ غنڈا کون سا۔

وہ ایک بار پھر زمین پر گرے۔ اب وہ مجھے نظر نہیں آرہے تھے لیکن جھاڑیوں کے چٹخنے کی آوازوں سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے اور پھر ایک خوف ناک چیخ فضا میں ابھری۔

یہ چیخ پرساد کی بھی ہوسکتی تھی۔ یہ خیال آتے ہی میں اپنی جگہ سے گھسٹتا ہوا گنجان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ دو منٹ گزر گئے اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ایک ہیولا ٹھیک اس جگہ پر آکر رک گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں موجود تھا۔

"باس!" یہ پرساد کی آواز تھی۔

"میں یہاں ہوں پرساد۔" میں نے اسے آواز دی۔

"وہ ختم ہوگیا باس۔" پرساد تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آگیا "میں نے اس کی گردن مروڑ دی ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی جیٹی پر دو کشتیاں بھی کھڑی ہیں باس۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "اس مردود کی چیخ سناٹے میں دور تک پھیلی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ اس کا کوئی ساتھی اس طرف پہنچ جائے، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"میں اٹھ نہیں سکتا۔ مجھے سہارا دو پرساد۔" میں نے اپنا تندرست ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ میں اس وقت کچھ زیادہ ہی نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔

پرساد نیچے جھکا اور سہارا دینے کے بجائے مجھے پشت پر لاد لیا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی۔ اس کا ایک ہاتھ میری ٹانگ کے زخم پر پڑا تھا۔

پرساد مجھے اٹھا کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگا۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرکے اس نے مجھے جیٹی پر اتار دیا۔ یہاں دریا کے کنارے پر ایک پختہ چبوترہ بنا ہوا تھا اور ایک تنگ سی کھاڑی اس چبوترے کے ساتھ ہی اندر کو نکلی ہوئی تھی۔ یہاں دو چھوٹی کشتیاں تھیں جن کی رسیاں ایک آہنی پائپ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ یہ چپوؤں والی کشتیاں تھیں۔ پرساد نے مجھے اٹھا کر ایک کشتی میں ڈال دیا اور پائپ کے ساتھ بندھی ہوئی رسی کھول کر چپو سنبھال لیے۔ وہ کشتی کو کھاڑی سے نکال کر دریا میں لے آیا اور اسے دوسرے کنارے کی طرف کھینے لگا۔

میں کشتی کے فرش پر نڈھال سا بیٹھا تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ زخمی ٹانگ اور بازو تختے کی طرح اکڑ گئے تھے اور درد نے مجھے نڈھال کر رکھا تھا اور میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں۔

"اب پریشانی کی کوئی بات نہیں باس۔" پرساد نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے تھے "دریا کا پانی بہت پرسکون اور ہموار ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں دوسرے کنارے پر پہنچ جائیں گے۔ وہاں سے ہمیں کتنی دور جانا ہوگا؟"

مجھے اس کی باتوں سے حوصلہ مل رہا تھا۔ وہ واقعی وفادار تھا۔ محض میری وجہ سے اس نے ایک انسان کے خون میں ہاتھ بھی رنگ لیے تھے۔ چند گھنٹے پہلے جب میں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا تو اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں دوستی کا مفہوم جانتا ہوں یا نہیں۔ اگرچہ ہماری دوستی کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے خود ہی مجھے دوستی کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔

"میری بات کا جواب نہیں دیا باس۔" پرساد نے دوبارہ کہا "ہمیں کتنی دور جانا ہوگا؟"

"تقریباً ایک میل!" میں نے سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کنگ تاکسن کے مجسمے سے ذرا آگے۔"

"وانگ وِنگ یائے ریلوے اسٹیشن کے قریب؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی مخالف سمت۔" میں نے جواب دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دریا کا پانی واقعی پرسکون تھا اور اسے کشتی کھینے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ دریا کے دونوں طرف دور دور تک رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس وقت شاید بارہ بجنے والے ہوں گے۔ میں تھائی وانگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد گھر سے نکلا تھا اور تھائی سے کہا تھا کہ دو تین گھنٹوں میں واپس آجاؤں گا۔ اب مجھے تقریباً چار گھنٹے ہوچکے تھے۔ وہ یقیناً پریشان ہو رہی ہوگی۔ کہیں اس نے گھبرا کر ماسٹر ہوچن کو فون نہ کردیا ہو۔

دوسرے کنارے تک پہنچنے میں تقریباً دس منٹ لگے تھے۔ رامن پرساد نے کشتی ایک ویران جگہ پر روکی تھی۔ کشتی کو کنارے سے لگا کر اس نے مجھے اپنے اوپر لاد لیا اور کشتی کے کنارے پر کھڑے ہو کر چھلانگ لگا دی۔

"مجھے نیچے اتارو۔ میں تمہارا سہارا لے کر چلنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں باس۔" پرساد نے جواب دیا "ہوسکتا ہے ان کا کوئی آدمی اس طرف بھی موجود ہو اور کشتی کو آتے ہوئے دیکھ لیا گیا ہو۔ کچھ دور تک تو تم میرے اوپر ہی سواری کرتے رہو۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر میں تمہیں اتار دوں گا۔"

رامن پرساد کا خیال غلط نہیں ہوسکتا تھا لیکن ہمیں بڑی سڑک تک کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ سڑک پار کرکے ہم ایک گلی میں داخل ہوگئے۔ پرساد نے مجھے نیچے اتار دیا۔ زمین پر پیر رکھتے ہی میرے ہونٹوں سے کراہ سی خارج ہوگئی۔

"باس!" پرساد نے میرا تندرست بازو اپنی گردن پر ڈال لیا "مجھے معلوم ہے تمہاری حالت بہت نازک ہو رہی ہے۔ تمہارا جسم بھی تپنے لگا ہے۔ تمہارے زخموں سے خون بہت بہہ چکا ہے مگر تم واقعی ایک حوصلہ مند نوجوان ہو۔ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار چکا ہوتا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہیں فوری طور پر طبّی امداد کی ضرورت ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو میں اپنے آپ کو معاف نہیں کرسکوں گا۔ گھر پہنچ کر کسی ڈاکٹر کو بلانے میں دیر لگے گی اور یہ بھی ممکن ہے وہ ڈاکٹر تمہاری حالت دیکھ کر کوئی ٹریٹ منٹ دینے سے انکار کردے۔ میں نے مین روڈ کی طرف ایک اسپتال کا نیون سائن دیکھا ہے۔ اگر کہو تو میں تمہیں اسپتال لے چلوں۔ ہم پولیس کو بھی ان لوگوں کے بارے میں اطلاع کردیں گے۔"

"نہیں پرساد۔" میں نے کہا "تم ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ انسان نہیں درندے ہیں۔ پورے بنکاک کی پولیس آج تک ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ تم میری حالت کی پروا مت کرو۔ مجھے گھر لے چلو۔ ڈاکٹر کا انتظام ہوجائے گا۔"

وہ میری حالت دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ چلنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے اپنے اوپر لاد لیا اور تیزی سے چلنے لگا۔ میں اسے راستہ بتاتا جا رہا تھا اور بالآخر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم مطلوبہ گلی میں پہنچ گئے۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے مجھے نیچے اتار دیا۔ میں ستون

کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ پرساد نے کال بیل کا بٹن دبادیا۔ صرف ایک منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھل گیا۔ وہ تھائی وانگ تھی اور نجانے کب سے میرے انتظار میں برآمدے میں بیٹھی تھی اور کال بیل کی آواز سنتے ہی گیٹ پر پہنچ گئی تھی لیکن دروازہ کھولتے ہی میرے بجائے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ حواس باختہ سی ہوگئی۔

"کون ہو تم۔ میں تمہیں نہیں جانتی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" اس نے دھڑسے دروازہ بند کردیا۔

"میں ہوں تھائی۔ دروازہ کھولو۔" میں نے کمزور سی آواز میں کہا۔

دروازہ ایک دم کھل گیا۔ تھائی نے گردن نکال کر باہر جھانکا اور پھر مجھے ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر بدحواس سی ہوگئی۔

"کیا ہوا تمہیں۔ اس طرح کیوں کھڑے ہو۔"

"میں زخمی ہوں تھائی۔ مجھے اندر لے چلو۔" میں نے کہا۔

پرساد نے جھک کر مجھے گود میں اٹھالیا۔

"یہ..... یہ کون ہے؟" تھائی بولی۔

"میرا دوست ہے۔ گھبراؤ نہیں۔" میں نے کہا۔

تھائی وانگ راستے سے ہٹ گئی۔ پرساد کے اندر داخل ہونے کے بعد اس نے گیٹ بند کردیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہمارے ساتھ چلنے لگی۔ برآمدے کی بتی بھی بجھی ہوئی تھی لیکن کمرے میں داخل ہونے کے بعد میری حالت دیکھتے ہی تھائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"یہ..... یہ کیا ہوا تمہیں! کس نے کی ہے تمہاری یہ حالت۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" تھائی وانگ چیخ رہی تھی۔ اس دوران میں پرساد نے مجھے کمرے میں لاکر بستر پر لٹادیا تھا۔

"میں زندہ ہوں تھائی۔ میں زندہ ہوں۔ اپنے حواس قابو میں رکھو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے گولیاں لگی ہیں۔ خون بہت ضائع ہوچکا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری حالت زیادہ بگڑ جائے' جانکی دیوی کو فون کرکے بلالو۔ اسے بتا دینا' ایک گولی ابھی تک میری پنڈلی کے اندر موجود ہے۔ جاؤ تھائی۔ دیر نہ کرو۔"

تھائی دوڑتی ہوئی ٹیلی فون کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ملا کر جانکی کا صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگی پھر ریسیور رکھ کر واپس آگئی۔

"ہوا کیا۔ تمہیں کیسے گولی لگی اور یہ کون ہے؟" تھائی نے کہا اور پرساد کی طرف دیکھنے لگی۔

"کچھ خطرناک لوگوں سے آمنا سامنا ہوگیا تھا۔" میں نے جواب دیا "اور یہ" میں نے پرساد کی طرف دیکھا "یہی مجھے موت کے منہ سے نکال کرلایا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ثابت ہوتی۔ مجھے تو اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔"

"اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے باس۔ میں نے تو حقِ دوستی ادا کیا ہے۔" پرساد نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "اب میں جاؤں باس!"

"نہیں۔ تم یہیں رہو گے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

تھائی وانگ کی عجیب حالت ہورہی تھی۔ اس کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بھی میرے پاس الفاظ نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر بڑبڑاہٹ تھی۔ میرا خون آلود لباس دیکھ کر بار بار اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

جانکی دیوی تقریباً چالیس منٹ بعد وہاں پہنچی تھی۔ میری حالت دیکھ کر وہ بھی گڑبڑا گئی۔ میری حالت اب غیر ہورہی تھی۔ مسافر جب منزل پر پہنچتا ہے تو تھکن سے نڈھال ہوکر گر پڑتا ہے۔ میری بھی شاید کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ میں موت کو دھکے دیتا ہوا اپنوں میں پہنچ گیا تھا اور میرا حوصلہ پست ہوگیا تھا۔ ہمت اور قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ نقاہت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اب غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی اور میرے لیے اپنے آپ کو ہوش میں رکھنا مشکل ہورہا تھا۔

تھائی وانگ نے پہلے ہی پانی گرم کر رکھا تھا۔ جانکی دیوی نے سب سے پہلے پرساد کی مدد سے میرے کپڑے اتروا کر خون سے لتھڑا ہوا جسم صاف کروایا اور آپریشن کی تیاری شروع کردی۔

پہلے میرے بازو کی ڈریسنگ کی گئی۔ یہاں گولی گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بازو کی ڈریسنگ مکمل کرنے کے بعد وہ میری ٹانگ کی طرف متوجہ ہوئی۔ جانکی نے ٹانگ پر لوکل انستھیسیا دے کر آپریشن شروع کردیا۔ اس وقت تک میں مکمل طور پر غنودگی کی لپیٹ میں آچکا تھا اور مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہورہا تھا۔

کئی گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد میری آنکھ کھلی تو کمرے میں کھڑکی کے راستے آنے والی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بیڈ کے قریب دائیں طرف تھائی وانگ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں سے ہلکی سی کراہ خارج ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ میری نظروں کے سامنے دھند سی پھیلی ہوئی تھی جو رفتہ رفتہ صاف ہوتی چلی گئی۔ میں نے پہلے تھائی وانگ کی طرف دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ بیڈ کے ساتھ ہی ایک اسٹینڈ پر خون کی بوتل ٹنگی ہوئی تھی جس کا خون غیر محسوس رفتار سے میری رگوں میں منتقل ہورہا تھا۔

تھائی وانگ میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور کچھ کہے بغیر میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔

منٹ بعد جانکی دیوی بھی آگئی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میری پیشانی پر ہاتھ رکھا اور خون کی بوتل کو چیک کرنے لگی۔ اس نے تقریباً پندرہ منٹ میرے معائنے پر لگادیے۔

"اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "بخار تیز ہے۔ اسے شام تک اتر جانا چاہیے۔"

وہ بھی قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ جانکی دیوی رات کو یہاں آنے کے بعد گھر واپس نہیں گئی تھی۔ میرے لیے خون کا بندوبست اسی نے کیا تھا۔ گزشتہ رات میری ٹانگ سے گولی نکالنے کے بعد اس نے زخم کی ڈریسنگ تو کردی تھی لیکن خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے وہ میرے لیے خاصی پریشان تھی۔ اس نے تھائی کو دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میرے لیے خون کا بندوبست ہونا بہت ضروری تھا۔ اگر خون نہ ملا تو میری زندگی خطرے میں پڑسکتی تھی اور پھر رات ہی کو وہ ایک سرنج میں میرا خون لے کر چلی گئی تھی۔ ایک پرائیویٹ اسپتال میں اس کی کچھ جان پہچان تھی۔ اس نے خون کا گروپ ٹیسٹ کروایا۔ اس گروپ کا خون اسے اسپتال ہی کے بلڈ بینک سے مل گیا تھا۔ اس نے اسپتال کے ڈرگ اسٹور سے کچھ ضروری ادویات بھی لے لی تھیں۔ دو گھنٹے بعد واپس آکر اس نے مجھے خون کی بوتل لگادی تھی۔ یہ خون کی دوسری بوتل تھی جو تقریباً آدھا گھنٹا پہلے لگائی گئی تھی۔ خون کی یہ بوتل جانکی دیوی صبح اسپتال سے لے کر آئی تھی۔ ان تمام انتظامات کے لیے جہاں اسے بھاگ دوڑ کرنی پڑی تھی وہاں اچھی خاصی رقم بھی خرچ ہوئی تھی۔ بہرحال بروقت خون مل جانے سے میری جان بچ گئی تھی اور اب میری حالت خطرے سے باہر تھی۔

تھائی وانگ کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو اور جانکی دیوی کی اس بھاگ دوڑ سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ دونوں مجھے کتنا چاہتی تھیں لیکن ان سے میرا کیا رشتہ تھا؟ ہم تینوں کا خون الگ تھا۔ مذہب الگ تھا۔ کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ہمارا تعلق نسلِ انسانی سے تھا۔ اس دنیا میں سب انسان ہی تو بستے ہیں۔ جو حیوانوں سے زیادہ بدتر اور درندوں سے زیادہ خوں خوار ہیں۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے وہ بھی انسان ہی کہلاتے ہیں' مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے ہیں اور یہ بھی انسان ہی ہیں جو میرے لیے اس قدر پریشان ہیں کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا رکھا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تھائی اور جانکی نے اس رشتے کی شناخت کرلی ہے جس کے لیے مذہب اور خون کا ناتا ہونا ضروری نہیں۔ انسانیت ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو خون اور دھرم کی پروا کیے بغیر ایک دوسرے کو قریب لاتا ہے۔

"اب تم ٹھیک ہوجاؤ گے۔" جانکی دیوی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "لیکن کئی روز تک تم بستر سے نہیں اٹھ سکو گے۔"

"پرساد کہاں ہے۔ کیا وہ چلا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" تھائی نے جواب دیا "وہ تو رات بھر تمہارے پلنگ کی پٹی سے لگا بیٹھا رہا ہے۔ ایک گھنٹا پہلے میں نے زبردستی اسے یہاں سے اٹھایا ہے۔ سو رہا ہے اس وقت لیکن یہ ہے کون؟ کیا تم نے اسے یہاں لاکر غلطی نہیں کی؟"

"نہیں۔" میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی "یہ قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ اگر مجھے اس پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو اسے یہاں کبھی نہ لاتا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر رک رک کر بتانے لگا کہ رامن پرساد کون ہے اور اس سے میری ملاقات کیسے ہوئی تھی "اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو میں اس گیسٹ ہاؤس سے زندہ لوٹ کر نہیں آسکتا تھا۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی ہے۔"

"اس نے گیسٹ ہاؤس میں ہونے والے ہنگامے کی تفصیل بتا دی تھی لیکن وہ کون لوگ تھے۔ ٹائیگر یا اس کے آدمی؟" تھائی نے پوچھا۔

"کم اور دارا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا.....؟" تھائی اچھل پڑی۔

"ہاں۔" میں نے کہا "زندگی میں پہلی بار براہِ راست ان دونوں سے سامنا ہوا تھا۔ وہ شاید اب بھی مجھے بچہ ہی سمجھ رہے تھے لیکن میں نے ان کی جو درگت بنائی ہے اسے شاید وہ عرصے تک نہیں بھول سکیں گے۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو شاید کیا بلکہ یقیناً کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا تھا لیکن رامن پرساد بروقت وہاں پہنچ گیا تھا۔"

"اسی لیے میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اکیلے باہر مت نکلو۔" تھائی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو..... تو....." وہ اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔

میں بھی کچھ کہنے کے بجائے گہری نظروں سے تھائی کی طرف دیکھتا رہا۔

اسی رات تھائی نے میرے کہنے پر ماسٹر ہوچن کو فون کیا تو یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ ان لوگوں کو گزشتہ رات ہی اس واقعے کا علم ہوگیا تھا اور ماسٹر ہوچن کے آدمی مجھے شہر بھر میں تلاش کررہے تھے تاکہ میری حفاظت کا بندوبست کیا جاسکے۔

"میں بالکل محفوظ ہو ماسٹر ہوچن!" میں نے کہا "اب میں نے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونا سیکھ لیا ہے۔ تم میری فکر مت کرو۔"

"وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں تمہیں تلاش

کرتے پھر رہے ہیں۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "آج دوپہر وہ ہمارے آدمیوں سے بھی الجھ پڑے تھے۔ ہمارا ایک آدمی شدید زخمی ہوا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ رات کو گیسٹ ہاؤس میں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو نا۔ تمہاری آواز سے مجھے شبہ ہو رہا ہے۔"

"رات کو مجھے دو گولیاں لگی تھیں۔" میں نے جواب دیا "پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے ماسٹر۔ ایک گولی جسم میں رہ گئی تھی جسے آپریشن کر کے نکال دیا گیا ہے۔ میں چند روز میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اگر تم اپنا ٹھکانا بتا دو تو تمہاری حفاظت کا بندوبست کر دیا جائے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

"میں بالکل محفوظ ہوں ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "اگر کسی اور کو میری حفاظت کے لیے رکھا گیا تو وہ دوسروں کی نظروں میں آجائے گا اور اس طرح میں بھی نگاہوں میں آجاؤں گا۔ فی الحال ویسے بھی میں بستر سے نہیں اٹھ سکوں گا اس لیے چند روز تک تو میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی تو میں فوراً رابطہ کروں گا۔"

"اوکے بوائے۔" ماسٹر ہوچن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم بہت ضدی ہو۔ اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ ایک ایک دن برسوں پر محیط ہو رہا تھا۔ میرے زخم اگرچہ تیزی سے مندمل ہو رہے تھے لیکن مجھے بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جانکی دیوی مجھے دیکھنے کے لیے دن میں دو مرتبہ ضرور آتی تھی اور تھائی وانگ ..... اس نے تو اپنے آپ کو میرے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ زیادہ تر میرے پاس ہی بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ وہ میرا منہ ہاتھ دھلاتی' اپنے ہاتھ سے ناشتا اور کھانا کھلاتی اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔

رامن پرساد بھی قید ہو کر رہ گیا تھا بلکہ وہ خود بھی مجھے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی میرے آس پاس ہی منڈلاتا رہتا۔

"باس۔" ایک روز وہ میرے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں اور تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ تو تمہاری تلاش میں ہوں گے۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرتے پھر رہے ہوں گے لیکن ہم ان کی سرگرمیوں سے قطعی لاعلم ہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کریں۔" پرساد نے کہا۔

"مہاراج کے آدمی ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ میں جانتا ہوں۔" پرساد بولا "ٹائیگر اور اس کے آدمی مہاراج کے آدمیوں کو پہچانتے ہیں۔ میرا مطلب تھا کوئی ایسا آدمی جسے وہ نہ جانتے ہوں اور وہ ان کے بیچ میں رہ کر ان کی سرگرمیوں سے آگاہ ہو سکے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔ ویسے میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

"باس! یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے تنگ آگیا ہوں یا یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔" پرساد نے کہا "مجھے وہ لوگ نہیں جانتے۔ اگر میں ان کے اندر گھسنے کی کوشش کروں تو ان کی سرگرمیوں کا پتا چل سکتا ہے۔"

"اس رات تم میرے ساتھ تھے۔ پہچان لیے جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں باس۔" پرساد مسکرایا "ہمارا ساتھ تو چند منٹ کا تھا۔ انہیں تو پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب میں نے اوپر آکر ان پر حملہ کیا تھا تو ان دونوں میں سے کسی کو اتنا ہوش کہاں رہا ہو گا کہ میرا چہرہ یاد رکھ سکیں۔ تمہیں تو اس لیے پہچان لیا گیا کہ وہ تمہیں پہلے سے جانتے تھے۔ مجھے کوئی نہیں پہچان سکے گا اور اگر پہچان بھی لیا گیا تو وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔ وہ میری بوٹی بوٹی کر ڈالیں تو میری زبان پر تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

"مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔" میں نے کہا "لیکن ایسا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"رسک تو لینا ہی پڑے گا باس۔" پرساد نے کہا "ہم زندگی بھر تو اس چار دیواری میں قید ہو کر نہیں رہ سکتے اور میں جانتا ہوں کہ ٹھیک ہونے کے بعد تم بھی چین سے نہیں بیٹھو گے۔ تمہارے پاس پہلے سے کچھ معلومات ہوں گی تو تمہیں اپنے کام میں آسانی رہے گی۔"

"ویسے میں بھی سوچ رہا ہوں کہ ہمارے پاس ایک اور پناہ گاہ ہونی چاہیے تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں ہمیں کوئی پریشانی نہ ہو۔" میں نے کہا "تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم کل صبح یہاں سے نکلو اور سب سے پہلے کسی ایسے فلیٹ یا مکان کا بندوبست کرو جو بوقت ضرورت ہمارے کام آسکے اور اگر اس دوران میں تم ان کی نظر میں آگئے تو....."

"فکر مت کرو باس۔" پرساد نے میری بات کاٹ دی "ایسی صورت میں' میں ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔"

تھائی وانگ خاموشی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پرساد کی باتوں سے اتفاق کیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ مناسب تجویز تھی۔ دارا وغیرہ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا ضروری تھی۔

اگلے روز صبح دس بجے کے قریب پرساد میرے سامنے آیا تو میں اسے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ میرے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کا چہرہ بھی بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔ کل رات تک اس کے بال گردن تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اب اس کے بال چھوٹے اور سلیقے سے تراشے ہوئے تھے۔

"یہ تھائی وانگ کے ہاتھوں کا کمال ہے۔" پرساد نے مسکراتے ہوئے کہا "اس نے مجھے آدمی بنانے میں پورا ایک گھنٹا لگایا ہے۔"

اسی لمحے تھائی وانگ بھی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے نوٹوں کا ایک بنڈل پرساد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"سب سے پہلے تمہیں مکان کا بندوبست کرنا ہے۔" وہ بولی "اور مکان ایسا ہو جو ہر لحاظ سے ہمارے لیے محفوظ ہو۔ اس کے بعد تم کسی دوسرے کام پر توجہ دو گے۔"

جواب میں پرساد نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گیا۔ تھائی وانگ باہر کا گیٹ بند کر کے میرے پاس آگئی۔

"صبح جانکی کا فون آیا تھا۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "وہ کسی مصروفیت کی وجہ سے اس وقت نہیں آسکتی۔ شام کو چکر لگائے گی۔ ویسے اس نے کہا تھا کہ تمہیں اب اٹھ کر تھوڑا بہت چلنا چاہیے۔"

"پندرہ دن ہو گئے بستر پر پڑے پڑے۔ میں خود بھی اکتا گیا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ابھی شروع ہو جائے یہ ایکسرسائز!" تھائی نے کہا۔

میں اس وقت نیم دراز تھا۔ اپنے آپ کو اوپر کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ان پندرہ دنوں میں شروع کے دو چار دن تو میں بالکل ہی بے حس و حرکت رہا تھا پھر لیٹے لیٹے ٹانگ اور بازو کو آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا تھا۔ ٹانگ میں زیادہ تکلیف تھی۔

تھائی وانگ نے مجھے سہارا دے کر فرش پر کھڑا کر دیا۔ میں نے اپنا تندرست بازو اس کی گردن پر ڈال دیا۔ تھائی نے بھی اپنا ایک بازو میری کمر کے گرد حمائل کر دیا تھا۔ اس طرح میرا سارا بوجھ تھائی پر تھا۔

دائیں ٹانگ کی نسوں میں تناؤ تھا۔ شروع میں تو پیر زمین پر رکھتے ہوئے بھی تکلیف محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ کھچاؤ کم ہوتا گیا۔ تھائی مجھے سہارا دیے پندرہ بیس منٹ تک پورے کمرے میں گھماتی رہی اور پھر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔

رامن پرساد اس رات واپس نہیں آیا اور نہ ہی اگلے روز اس نے کوئی خبر دی حالانکہ اس کے پاس یہاں کا ٹیلی فون نمبر موجود تھا۔

"تم نے بتایا تھا کہ وہ موٹر مکینک ہے اور پیسہ کمانے کے لیے ہملا سے یہاں آیا تھا۔" تھائی وانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت میرے بیڈ پر بیٹھی اپنے ہاتھ سے مجھے سوپ پلا رہی تھی "کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک بڑی رقم اس کے ہاتھ آئی تو وہ رفوچکر ہو گیا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں نے جواب دیا "میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کسی وجہ سے وہ ہم سے رابطہ نہ کر سکا ہو لیکن یہ بات تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔"

اور پھر ہم دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اس روز جانکی دیوی بھی نہیں آئی تھی اور نہ ہی اس نے فون کیا تھا۔

میں جب سے بیمار ہوا تھا' تھائی وانگ میرے ہی کمرے میں سوتی تھی۔ اس نے بیڈ کے قریب ہی سیٹی ڈال لی تھی۔ وہ زیادہ تر تو کرسی پر ہی بیٹھی رہتی اور جب میں سو جاتا تو وہ بھی سیٹی پر لیٹ کر اونگھ لیتی۔ سوتے میں کروٹ بدلتے ہوئے میرے منہ سے کراہ بھی نکلتی تو وہ اٹھ کر میرے پاس آجاتی۔ وہ جس طرح میری دیکھ بھال کر رہی تھی میرے خیال میں اس کی کوئی مثال ملنا مشکل تھی۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ پرساد کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اب مجھے بھی اس کی طرف سے پریشانی ہونے لگی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ پیسے لے کر بھاگ گیا ہو گا بلکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔ اس دوران میں میری ایکسرسائز جاری تھی۔ پہلے میں تھائی کا سہارا لے کر چلتا تھا اب بغیر سہارے کے چلنے لگا۔ جانکی بھی میرے علاج پر پوری توجہ مرکوز رکھے ہوئے تھے۔ ماسٹر ہوچن سے بھی رابطہ ہوتا رہا تھا۔

پرساد کو گئے ہوئے وہ گیارھواں دن تھا۔ میں بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ دماغ پر کچھ غنودگی سی طاری تھی۔ شاید میں سو جاتا لیکن ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے میں چونک گیا۔ گہری خاموشی میں وہ آواز بم کے دھماکے سے کم ثابت نہیں ہوئی تھی۔ سیٹی پر اونگھتی ہوئی تھائی بھی اچھل پڑی۔ کئی روز سے ٹیلی فون اسی کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ تھائی نے متوحش نظروں سے پہلے میری طرف دیکھا اور پھر سیٹی کے سرہانے کی طرف ایک سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف دیکھنے لگی۔

"اس وقت..... کس کا فون ہو سکتا ہے؟" وہ کچھ نروس سی نظر آرہی تھی۔

"شاید جانکی دیوی ہو۔ اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

تھائی وانگ نے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ ریسیور کان سے لگائے خاموش رہی۔ اس نے ہیلو بھی نہیں کہا تھا اور جب دوسری طرف سے ہیلو کہا گیا تو وہ بولی۔

"ہیلو۔ کون ہو تم..... کس سے بات کرنی ہے؟"

"اور پھر دوسری طرف کی آواز سن کر تھائی کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ اس نے رامن پرساد کا نام لیتے ہوئے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو پرساد۔ کہاں غائب ہو۔ خیریت تو ہے؟" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"سوری باس! اتنے دن تک تمہیں اطلاع نہیں دے سکا۔" ریسیور پر ساد کی آواز سنائی دی "دراصل کچھ ایسی صورتِ حال میں پھنس گیا تھا کہ مجھے تم سے فون پر بھی رابطہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میرے پاس کچھ دلچسپ اور سنسنی خیز اطلاعات ہیں۔ اگر تم جاگ رہے ہو تو میں آجاؤں۔"

"تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وانگ ونگ یائے ریلوے اسٹیشن کے ایک پبلک فون بوتھ سے۔" پرساد نے جواب دیا "مجھے وہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے کہہ کر ریسیور تھائی وانگ کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے کریڈل پر رکھ دیا "وہ وانگ ونگ یائے ریلوے اسٹیشن کے قریب ہے۔ چند منٹ میں پہنچ جائے گا۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وانگ ونگ یائے ریلوے اسٹیشن کنگ ٹاکسن کے مجسمے والے چوراہے سے ذرا آگے تھا۔ ہمارے گھر کا فاصلہ آدھے میل سے زیادہ نہیں تھا اور میرے خیال میں رامن پرساد کو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

میرا خیال درست نکلا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد کال بیل کی آواز سنائی دی۔ تھائی نے اس وقت سلیپنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے ٹیبل پر رکھی ہوئی پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد وہ رامن پرساد کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔

رامن پرساد نیلے رنگ کی بیل باٹم پتلون اور سفید شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ کلین شیو اور سلیقے سے بنے ہوئے بال۔ وہ خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے مجھ سے ہاتھ ملایا پھر پیشانی پر بوسہ دیا اور بیڈ کے قریب بیٹھ کر میری خیروعافیت دریافت کرنے لگا۔

"کہاں غائب رہے؟" بالآخر میں نے پوچھا "اور وہ دلچسپ اور سنسنی خیز خبریں کیا ہیں جن کا تم نے ٹیلی فون پر ذکر کیا تھا۔"

"ان چند دنوں کے دوران میں' میں یہ جان چکا ہوں کہ کم اور دارا کون ہیں اور وہ تمہارے دشمن کیوں ہیں۔" رامن پرساد نے کہا "میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جاؤں گا کیونکہ تمام حالات و واقعات تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دارا ہیروئن کی اسمگلنگ کا ایک ریکٹ بنانے کے لیے سنگاپور آیا تھا لیکن وہاں تمہارے باپ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ دارا کا خیال تھا کہ تمہارا باپ سنگاپور میں اس کے راستے کی رکاوٹ ثابت ہو سکتا تھا اس لیے اس نے کم اور چی فانگ جیسے سفاک درندوں کی مدد سے تمہارے باپ اور ماں کو قتل کروا دیا

لیکن یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ تم بچ گئے ہو اور اس واردات کے چشم دید گواہ ہو۔ انہوں نے تمہیں قتل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں جن میں وہ اب تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ لوگ تمہارا تعاقب کرتے ہوئے پہلے کوالالمپور اور پھر یہاں آگئے۔ یہاں انہوں نے ٹائیگر جیسے ایک سفاک درندے کی خدمات حاصل کر لیں لیکن تمہیں بھی مہاراج نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس لیے ان کا کام کچھ مشکل ہو گیا۔ ٹائیگر مہاراج سے تصادم نہیں چاہتا تھا مگر دارا کے اکسانے پر بالآخر اسے مہاراج کے خلاف قدم اٹھانا پڑا جس کے نتیجے میں دونوں طرف کے کئی آدمی مارے گئے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"دارا نام کا وہ شخص جو تمہارا اصل دشمن ہے' تمہیں فنا کے گھاٹ اتارنے کی ذمے داری ٹائیگر وغیرہ کو سونپ کر کئی مرتبہ سنگاپور جا چکا ہے اور اس نے اپنا وہاں ایک سینڈیکیٹ قائم کر لیا ہے جس میں تین بڑے شامل ہیں۔ ایک آدمی پاکستانی ہے جو کچھ عرصہ پہلے ہی وہاں آیا ہے' دوسرا ایک مقامی یوریشین ہے اور تیسرا ایک انڈین ہندو ہے۔ اس سینڈیکیٹ کا سربراہ دارا ہی ہے۔ ابھی مال کی آمد یا ترسیل کا سلسلہ شروع نہیں ہوا۔ ابتدائی انتظامات ہو رہے ہیں اور اس کے علاوہ....."

"اور کیا.....؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دارا اور ٹائیگر گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چی فانگ اس سلسلے میں ان دنوں چیانگ رائے گیا ہوا ہے۔" رامن پرساد نے جواب دیا۔

یہ دونوں خبریں واقعی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی تھیں۔

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے باس۔" پرساد مسکرایا "اس روز یہاں سے نکلنے کے بعد میں نے سب سے پہلے تمہاری خواہش کے مطابق ایک مکان کا بندوبست کیا۔ یہ مکان دریا کے اس طرف فران نوک روڈ کی ایک بغلی گلی سوئے نفتی سیون پر واقع ہے اور ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور دلچسپی کی بات یہ کہ اس کے نیچے ایک تہ خانہ بھی ہے۔ بہرحال....." وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اس رات میں اس گیسٹ ہاؤس میں گیا جہاں دارا اور کم سے تصادم ہوا تھا۔ میرے دل میں ہلکا سا خوف بھی تھا کہ اگر پہچان لیا گیا تو وہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہاں دارا بھی تھا اور کم بھی۔ وہ دو تین مرتبہ میرے قریب سے گزرے لیکن مجھے نہیں پہچان سکے۔ تصادم والی رات ان کی تمام تر توجہ تو تم پر تھی۔ میں تو سائے کی طرح ان کے سامنے آیا تھا۔ وہ تو میرا چہرہ بھی اچھی طرح نہیں دیکھ سکے ہوں گے اس لیے مجھے پہچان نہیں سکے تھے۔ وہیں پر میری ملاقات پامیلا نامی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ اس لڑکی کا باپ ہندو اور

غالب ہے۔ اس کی ماں بھی ایک شکاری عورت تھی۔ بیٹی بھی ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔

پامیلا نے مجھے بھی شکار سمجھ کر پھانسنے کی کوشش کی تھی اور میں پھنس گیا تھا۔ وہ مجھے ایک دولت مند بگڑا ہوا نوجوان سمجھ رہی تھی اور میرے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ میں نے اسے بڑھیا سے شراب پلائی اور اس پر دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔

پامیلا کو میں نے بتایا کہ میرا تعلق چیانگ رائے سے ہے اور یہاں کوئی بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے مختلف مشورے دیتی اور پھر ہوا یہ کہ میں روزانہ پامیلا سے ملنے لگا۔ میں اسے ایک بھی اپنے اس مکان پر لے کر نہیں گیا بلکہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتی رہی۔ وہ چائنا ٹاؤن کے علاقے میں واقع ایک گھٹیا سے مکان میں اپنے باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ پامیلا کی ماں پچھلے سال کسی غنڈے کے ہاتھوں ماری گئی تھی اور باپ شرابی ہے۔ اسے کام دھندے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے شراب ہی کو اپنی زندگی بنا لیا ہے۔ جب اسے شراب کے لیے پیسے نہیں ملتے تو بیٹی کو پیٹتا ہے۔

میں نے پہلے ہی روز اندازہ لگا لیا تھا کہ پامیلا کا تعلق ٹائیگر کے سرکل سے ہے۔ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس لیے پامیلا کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے اس پر پیسے لٹاتا رہا اور اس کے باپ کو بھی برداشت کرتا رہا۔ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ ان لوگوں کو بھی شاید مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا۔ پامیلا مجھ سے تھائی وانگ' وجدان اور مہاراج کے کچھ خاص آدمیوں کے بارے میں کریدتی رہتی تھی۔ مہاراج کے آدمیوں کے نام پر تو میں بری طرح بھڑک اٹھتا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اسے یہ تاثر دیا تھا کہ مہاراج کے آدمیوں کے ہاتھوں میرا ایک عزیز ترین دوست مارا گیا تھا اس لیے میں مہاراج اور اس کے آدمیوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا ہوں۔ لیکن میرے پاس اتنی طاقت نہیں کہ اپنے دوست کے قتل کا انتقام لے سکوں اور اس نفرت کی وجہ سے میں مہاراج اور اس کے کسی آدمی کا نام بھی سننا نہیں چاہتا اور پھر کئی روز بعد میری محنت رنگ لائی اور کل رات پامیلا نے ان باتوں کا انکشاف کیا جو میں ابھی بتا چکا ہوں۔"

"تم تو واقعی بہت کام کے آدمی نکلے۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ویسے یہ وجدان کون ہے جس کے بارے میں پامیلا مجھ سے کرید کرید کر پوچھ رہی تھی؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"وجدان یہ تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔" تھائی وانگ نے پہلی بار زبان کھولی "اسی کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے ان وحشیوں کے گروہ نے۔"

"اوہ!" پرساد چونک گیا "سوری باس۔ مجھے تمہارا نام معلوم نہیں تھا۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ تمہارے نام نے ان پر دہشت طاری کر رکھی ہے۔ وہ تمہیں ہر قیمت پر ختم کرنا چاہتے ہیں۔"

"اور میں ان کے لیے ڈیتھ وارنٹ کی حیثیت رکھتا ہوں۔" میں نے کہا "میں ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوں۔ اس روز جو کچھ بھی ہوا اس سے انہوں نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابھی مجھے اتنی طاقت نہیں ملی کہ کھل کر ان کا مقابلہ کر سکوں اس لیے میں خود بھی ان سے چھپتا پھر رہا ہوں۔"

"فکر مت کرو باس۔" پرساد نے کہا "آج تم ان سے چھپتے پھر رہے ہو' کل وہ اپنی جان بچانے کے لیے جائے پناہ ڈھونڈتے پھریں گے۔ ویسے پامیلا کے بارے میں ایک بات بتانا بھول گیا۔"

"وہ کیا.....؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دارا بنکاک آیا تھا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات پامیلا سے ہوئی تھی۔" پرساد نے کہا "وہ کئی روز پامیلا کے پاس رہا تھا اور پھر پامیلا ہی کے توسط سے اس کی ملاقات ٹائیگر سے ہوئی تھی۔ پامیلا کبھی کبھی ٹائیگر کے کسی کلب میں ڈانس پروگرام بھی کرتی ہے لیکن گزشتہ رات اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ دارا سے کچھ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دارا اب دوسری لڑکیوں پر زیادہ توجہ دینے لگا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بات ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا "عورت کی فطرت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ وہ جب کسی مرد کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتی ہے تو اسے اپنی ملکیت سمجھ لیتی ہے اور جب وہ مرد کسی اور عورت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اسے پسند نہیں کرتی اور بعض اوقات تو وہ ایسا بھیانک انتقام لیتی ہے کہ دیکھنے والے کانپ اٹھتے ہیں۔ اب تمہیں کرنا یہ ہے کہ باتوں کا جال بچھا کر پامیلا کو اپنی گرفت میں لے لو اور کسی طرح اس سے سنگاپور کے ان تینوں آدمیوں کے نام وغیرہ معلوم کرنے کی کوشش کرو جو دارا کی سینڈیکیٹ کے عہدے دار ہیں۔ یہ کام تمہیں بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ اگر اسے ذرا بھی شبہ ہو گیا تو تمہاری زندگی کا چراغ گل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں ایک اور کام بھی کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟" پرساد نے پوچھا۔

"چائنا ٹاؤن کے علاقے میں ایک مختصر سا فلیٹ کرائے پر لے لو تاکہ تمہارے پاس ایک عارضی ٹھکانا ہو جائے۔" میں نے کہا "اگر تمہیں مزید پیسوں کی ضرورت ہو تو....."

"میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ میں مزید ایک مہینہ آرام سے گزار سکتا ہوں۔" پرساد نے جواب دیا "تو ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"رکو گے نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" پرساد نے نفی میں سر ہلایا "اگر رات بھر غائب رہا تو

کہیں پامیلا کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو جائے۔"
"او کے۔ وش یو گڈ لک۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔
"سیم ٹو یو۔" پرساد نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔
اس کے جانے کے بعد تھائی گیٹ بند کر کے آئی تو وہ بیڈ پر لیٹنے کے بجائے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میری طرح شاید اب اس کی نیند بھی غائب ہو گئی تھی۔
"سوری وجدان۔ مجھے اس لڑکے کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔" تھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"آج تو میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں سوچنے لگا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر ہم پرساد ہی کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

پرساد نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے صرف ایک وقت کا کھانا کھلایا تھا اور وہ میرا زر خرید غلام بن گیا تھا۔ میرا اس پر کوئی دباؤ نہیں تھا لیکن وہ دوستی کے نام پر میرے لیے اپنی جان تک لٹانے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ واقعی ایک سچا اور کھرا آدمی تھا۔ اگر وہ نہ ملتا تو دارا کے بارے میں یہ تمام معلومات حاصل نہ ہوتیں۔ مجھے پتا ہی نہ چلتا کہ وہ سنگاپور میں سینڈیکیٹ قائم کر چکا تھا۔ اس کا پاکستان سے سنگاپور آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ وہاں ہیروئن کی اسمگلنگ کا اڈا بنانا چاہتا تھا لیکن میرے باپ کو وہ اپنے راستے کی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ اس نے میرے باپ کو تو راستے سے ہٹا دیا تھا لیکن میں موجود تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ دارا کو اس کے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔
ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ رامن پرساد پھر گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا تھا لیکن اب مجھے اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک دلیر اور ذہین نوجوان ہے اور ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنا جانتا ہے اور اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔
میں اب کسی سہارے کے بغیر چلنے لگا تھا۔ زخموں سے خون بہہ جانے سے میرے اندر جو کمزوری پیدا ہوئی تھی وہ بتدریج دور ہو رہی تھی۔ جانکی دیوی کی دی ہوئی دوائیں بڑی تیزی سے اپنا اثر دکھا رہی تھیں اور سب سے بڑھ کر تھائی وانگ کی تیمارداری۔ مجھے اس عورت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے میرے لیے دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ اس طرح میری دیکھ بھال کر رہی تھی کہ کوئی ماں اپنے بچے کی دیکھ بھال بھی نہ کرتی ہو گی لیکن وہ مجھے اپنا بچہ تو بہرحال نہیں سمجھتی تھی۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر مجھ سے کیا رشتہ وابستہ کر رکھا تھا لیکن اس رشتے کی گہرائی کا اندازہ بہرحال میں لگا سکتا تھا۔
جانکی دیوی اب روزانہ نہیں دو تین دن کے وقفے سے آتی تھی۔ مجھے اس تیزی سے رو بہ صحت ہوتے دیکھ کر وہ بھی حیران تھی۔ اس رات وہ مجھے دیکھنے کے لیے آئی تو میں حسبِ معمول لان میں ٹہل رہا تھا۔ تھائی لان کے بیچ میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ تھائی نے میری ایکسرسائز میں کبھی ناغہ نہیں ہونے دیا تھا اور میرا خیال ہے، یہ تھائی وانگ ہی تھی جس کی وجہ سے میں اس وقت چل رہا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتی تو میں اب تک شاید بستر ہی پر پڑا ہوتا۔ تھائی نے میرے اندر اتنی ہمت پیدا کی تھی اور اب تو وہ مجھے ایک ایک گھنٹے تک چلاتی رہتی تھی۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ مجھے ٹہلتے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔ کبھی میں رک کر تھائی سے باتیں کرنے لگتا اور کبھی پھر چلنے لگتا۔ اسی دوران میں ایک کار گیٹ کے سامنے اس طرح رکی کہ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی گیٹ کی جھریوں سے اندر آنے لگی۔ میں لان کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں پودوں کی بہتات تھی۔ پودوں کے پیچھے دیوار کے ساتھ چلتا ہوا میں گیٹ کے قریب پہنچ کر پودوں کے پیچھے رک گیا۔ تھائی ابھی تک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور جب کال بیل کی آواز سنائی دی تو وہ اٹھ کر گیٹ کی طرف چلنے لگی۔ میں بھی تیار کھڑا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو فوراً کارروائی کر سکوں۔ تھائی نے میری طرف دیکھا اور گیٹ کھولنے سے پہلے اونچی آواز میں پوچھا۔
"کون ہے..... باہر کون ہے؟"
"میں ہوں۔ جانکی!"
یہ آواز سن کر میرے منہ سے بھی گہرا سانس نکل گیا۔ تھائی نے گیٹ کھول دیا اور جانکی اندر آ گئی۔ اس نے ایک باسکٹ بھی اٹھا رکھی تھی جس میں ضرورت کی اور چیزوں کے علاوہ پھل وغیرہ بھی تھے۔
جانکی دیوی بھی کچھ دیر ہمارے ساتھ وہاں بیٹھی رہی اور پھر ہم اندر آ گئے۔ جانکی نے خود ہی باسکٹ سے چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں اور دو سیب پلیٹ میں کاٹ کر لے آئی۔
"مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی بستر سے اٹھ کر اس طرح چلنے پھرنے لگو گے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں تمہارے حوصلے اور قوتِ ارادی کی داد دیتی ہوں۔ بعض لوگ تو معمولی سی تکلیف پر بھی مہینوں بستر سے لگے پڑے رہتے ہیں اور تمہاری طرح مضبوط قوتِ ارادی کے مالک لوگ بیماری کی حالت میں بھی بستر پر لیٹنا پسند نہیں کرتے۔"
"اس میں قوتِ ارادی کا دخل تو ہے لیکن۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے اس طرح چلنے پھرنے میں تھائی کی کوششوں کا زیادہ دخل ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو میں اب تک واقعی بستر پر پڑا ہوتا۔"
"ہاں۔ میں تھائی کی ہمت کی بھی داد دوں گی۔" جانکی نے
"اچھا۔ اب تم اپنا بازو دکھاؤ۔"
میں نے شرٹ کی آستین اوپر اٹھا دی۔ پٹی تو کئی روز پہلے

تھی۔ زخم کی جگہ پر اور اس کے آس پاس سرخ نشان سا رہ
... پر باقاعدگی سے مرہم لگایا جا رہا تھا۔ جانکی نے سر ہلا دیا
... طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"اب اس صوفے پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہاری پنڈلی کے زخم کا
... گی۔"
میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔
"ٹھیک ہے۔" وہ میری ٹانگ کا معائنہ کرنے کے بعد بولی۔
"... استعمال کرتے رہو۔ صرف چند روز کی بات ہے اس کے
... گھوڑے کی طرح دوڑنے لگو گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش
... باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اب
... لیے ایک اور اطلاع ہے۔"
"کیا...؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"کل شام ایک بھکشو میرے کلینک پر آیا تھا۔" جانکی نے کہا
"... بھکشو کا کلینک پر آنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سرکاری اسپتال
کے باوجود یہ بھکشو لوگ اپنا علاج کرانے کے لیے جس کلینک
... گھس جاتے ہیں لیکن وہ بھکشو بیمار نہیں تھا۔"
"تو پھر...؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف

"... مجھے کسی عورت کو دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے جانا
... تھا۔" جانکی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی
"... قت کلینک پر کچھ مریض موجود تھے۔ میں نے اسے ایک گھنٹے
... نے کو کہا اور ایک گھنٹے بعد جب میں کلینک بند کرنے کے لیے
... تو وہ بھکشو ایک طرف بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے اس
... جانا پڑا۔ وہ بھکشو مجھے سیلوم روڈ کی ایک بغلی گلی میں واقع
... ارت میں لے گیا جس کی تیسری منزل پر واقع فلیٹ میں وہ
... موجود تھی۔ جسے وہ دکھانا چاہتا تھا۔"
"... عورت کون تھی؟" میں نے پوچھا۔
"میں اسے نہیں جانتی۔ اس کا نام شائی وان ہے۔ بھکشو نے
... یہ لڑکی اسے سڑک پر بڑی ابتر حالت میں پڑی ہوئی ملی تھی
... اٹھا کر اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ پڑوس کے فلیٹ میں رہنے
... ارت کی مدد سے اس کا حلیہ درست کروایا اور اس بلڈنگ
... ہنے والی ایک نرس کو بلا لیا لیکن بات نرس کی سمجھ میں نہیں
... یا جان بوجھ کر وہ پیچھے ہٹنا چاہتی تھی۔ اس نے مشورہ دیا
... لڑکی کو اسپتال لے جایا جائے اور وہ بھکشو اسپتال لے
... نے کے بجائے میرے پاس آ گیا۔"
"... نام بتایا تھا تم نے...؟ شائی وان؟" میں نے پوچھا۔
"... بلا... بڑی خوب صورت سی لڑکی ہے۔" جانکی نے جواب

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔" میں بڑبڑایا "بھکشو تو عام طور
... خانقاہوں میں رہتے ہیں۔ اگر اسے ابتر حالت میں کوئی عورت سڑک پر پڑی ہوئی مل گئی تھی تو وہ اسے کسی سرکاری اسپتال میں پہنچا دیتا لیکن فلیٹ میں....."
"تم یہاں کے بھکشوؤں کو نہیں جانتے۔" جانکی نے کہا "یہ لوگ تو ہمارے مندروں کے پجاریوں سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ بعض لوگ تو محض اس لیے بھکشوؤں کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں کہ ان سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ ایسے بھکشو کرپٹ ہوتے ہیں۔ وہ ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹتے ہیں اور ایسے ایسے غیر قانونی دھندے کرتے ہیں جن کے بارے میں سن کر ہم جیسے لوگوں کی گردن شرم سے جھک جاتی ہے۔ میرا خیال ہے، تھائی نے تمہیں کوئی نہ کوئی ایسی کہانی ضرور سنائی ہو گی۔"
"کہانی سنانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔" تھائی وانگ نے کہا "شو فانگ کو تو تم نہیں بھولے ہو گے جس نے ہمیں پہاڑ والے کاٹیج سے اغوا کروایا تھا۔ وہ بھی تو ایک بھکشو ہی تھا۔"
"میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "بہرحال تم کچھ بتا رہی تھیں۔ ویسے شائی وان کے نام سے ایک چہرہ میرے ذہن میں ابھر رہا ہے۔ پہلے تم اپنی بات پوری کر دو پھر میں بتاؤں گا۔"

"میں نے شائی وان کا معائنہ کیا تو انکشاف ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ ہیروئن کی عادی بھی ہے۔" جانکی نے کہا "میں نے تھنگ چو نامی اس بھکشو کو بتا دیا کہ میں اس کا علاج نہیں کر سکتی۔ وہ اسے سرکاری اسپتال لے جائے۔"
میں اچھل پڑا۔ شائی وان اور پھر یہ نام تھنگ چو۔ میں نے جانکی سے اس کا حلیہ پوچھا تو میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تھنگ چو وہی بھکشو تھا جو جنگل والے کیمپ میں میرا حریف تھا اور جسے میں نے مہاراج کی موجودگی میں ایک مقابلے میں زبردست شکست دی تھی اور اس نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے تھائی وانگ کو ہیروئن کا عادی بنا دیا تھا۔
میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے۔
"یہ وہی شیطان ہے۔" وہ چیخ اٹھی۔
"اور شائی وان نامی یہ لڑکی بھی وہی ہے جو مجھے ایک نائٹ کلب میں ملی تھی اور ایک مکان میں لے آئی تھی جہاں مجھے اور اسے زندہ جلانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ تو گانگ کی تحویل میں تھی جسے پرشا سانگ کمرو روڈ کے ایک بنگلے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ چی فانگ اور ٹائیگر کے خوف سے خود بھی وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن....." میں خاموش ہو کر تھائی وانگ کی طرف دیکھنے لگا "لیکن شائی وان وہاں سے نکلی کیسے..... تھنگ چو کے ہاتھ کیسے لگ گئی اور وہ بھی اس حالت میں کہ....." میں نے ایک بار پھر خاموش ہو کر جانکی دیوی کی طرف دیکھا "کیا تمہیں یقین ہے کہ

تمہارے گرد کوئی جال نہیں بنا جارہا۔ تھنگ چو بہت خطرناک آدمی ہے۔ مجھ سے اپنی عبرت ناک شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس نے تھائی کو ہیروئن کا عادی بنا کر موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ کہیں اسے شبہ تو نہیں ہوگیا کہ تمہارا ہم سے کوئی تعلق ہے۔ اور اس طرح تمہارے ذریعے وہ ہم تک پہنچنا چاہتا ہو؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ اسے مجھ پر کوئی ایسا شبہ ہے یا نہیں لیکن اس طرف آتے ہوئے میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی ہوں کہ میری نگرانی یا تعاقب تو نہیں ہو رہا۔ آج بھی میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا۔" جانکی نے جواب دیا۔

"اس کے بعد تھنگ چو نے دوبارہ تم سے رابطہ نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" جانکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اب تم خود اس سے رابطہ کرو گی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے اس کے فلیٹ پر جاؤ گی اور شائی وان سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو گی کہ وہ تھنگ چو کے ہاتھ کیسے لگی اور اصل معاملہ کیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل وہاں جاؤں گی۔" جانکی نے جواب دیا۔

ہم کچھ دیر اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ مجھے یاد تھا کہ اس رات جب تھنگ چو آخری مرتبہ خانقاہ کے گیٹ پر تھائی وانگ کو ہیروئن دینے کے لیے آیا تھا تو اسے پکڑ لیا گیا تھا بلکہ اسے پولیس کے حوالے کردیا گیا تھا لیکن وہ اس طرح آزادی سے کیسے گھوم رہا تھا۔

جانکی دیوی کے جانے کے بعد میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر ماسٹر ہوچن کا نمبر ملایا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے لیکن کال ماسٹر ہوچن ہی نے ریسیو کی تھی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے پوچھا۔

"ماسٹر ہوچن۔ تمہیں شائی وان نامی وہ لڑکی یاد ہے جس کے ساتھ مجھے زندہ جلانے کی کوشش کی گئی ہے؟"

"ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "لیکن وہ تین چار دن بعد ہی کسی کو بتائے بغیر اس بنگلے سے چلی گئی تھی اور ہم نے بھی اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر تمہیں وہ کیسے یاد آگئی؟"

"اور وہ بھکشو تھنگ چو جسے ہیروئن فروخت کرنے کے جرم میں پولیس کے حوالے کیا گیا تھا؟" میں نے جواب دینے کے بجائے ایک اور سوال کیا۔

"اس نے اپنی ضمانت کروالی تھی۔ اس کا کیس چل رہا ہے مگر تم یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

"شائی وان ان دنوں تھنگ چو کے پاس ہے اور وہ ماں بننے والی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا۔ تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"میرے کچھ ذرائع ہیں۔" میں نے جواب دیا "میں اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہوں اور تمہیں معلوم ہے کہ ٹائیگر اور دارا ہیروئن کی اسمگلنگ کے سلسلے میں گولڈن ٹرائی اینگل کی کسی پارٹی سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟"

"لڑکے!" ماسٹر ہوچن کی آواز سنائی دی "تمہارے کچھ زیادہ ہی پر پُرزے نہیں نکل آئے؟"

"یہ بات تو ہے ماسٹر!" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "دراصل مجھے ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جس پر مکمل بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام معلومات میں نے اسی کے ذریعے حاصل کی ہیں اور میرا خیال ہے چند روز بعد میں اس پوزیشن میں آجاؤں گا کہ دارا اور ٹائیگر پر ایک بھرپور وار کرسکوں۔"

"زیادہ اونچا اڑانے کی کوشش کرو گے تو....."

"نہیں ماسٹر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں نے اڑنے کی تربیت تم سے حاصل کی ہے گروں گا نہیں۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہارے اندر اتنی خود اعتمادی پیدا ہوگئی ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "بہرحال' اپنا خیال رکھنا۔ مہاراج تمہارے لیے بہت فکر مند ہیں۔"

"میں چند روز بعد مہاراج کے پاس آؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور چند اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کردیا۔

اور پھر دو دن بعد مجھے رامن پرساد سے بھی رپورٹ مل گئی۔ اس نے ان تینوں آدمیوں کے نام معلوم کرلیے تھے جو سنگاپور میں دارا کی سربراہی میں قائم ہونے والے ریکٹ کے عہدے دار تھے۔ نہ صرف نام بلکہ ان کے سنگاپور کے فون نمبر بھی اسے معلوم ہوگئے تھے۔ پرساد یہ رپورٹ دینے کے لیے خود آیا تھا۔

"حیرت ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پامیلا نے تمہیں یہ سب کچھ اتنی آسانی سے کس طرح بتادیا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا باس کہ دارا جب بنکاک آیا تھا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات پامیلا سے ہوئی تھی اور چند روز وہ اس کے گھر پر بھی رہا تھا۔ پامیلا اسے اپنی ملکیت سمجھ بیٹھی تھی لیکن اب اسے اپنے ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر اس کی سوچ کا انداز بدل گیا ہے۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ اس سے انتقام لینے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اسے مجھ پر شبہ ہوگیا ہے کہ میں دارا اور ٹائیگر کی کسی مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ شاید وہ اپنے اس منصوبے میں مجھے استعمال کرنا چاہتی ہے اسی لیے آہستہ آہستہ یہ سب کچھ اگلتی جارہی ہے۔" پرساد نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "لیکن اسے تم پر شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔"

"رامن پرساد کی زبان کھلوانا آسان نہیں باس۔" پرساد مسکرایا۔

"کیا تم مجھے پامیلا سے ملوا سکتے ہو!" میں نے کہا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال آیا تھا۔

"کیا؟" پرساد نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ تھائی وانگ بھی مجھے گھورنے لگی تھی۔

"یس تھائی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت آرام ہوچکا اور میرے اس آرام سے فائدہ اٹھا کر دارا اور ٹائیگر بہت آگے نکل گئے۔ آج کل کامیابی اس کو ملتی ہے جو وقت کے ساتھ چلتا ہے مگر ہم تھوڑا پیچھے رہ گئے۔ اب ہمیں ذرا تیزی دکھانی ہوگی تاکہ ان کے بڑھتے ہوئے قدم روکے جاسکیں۔ اگر سنگاپور میں ان کے ریکٹ نے کام شروع کردیا اور گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی یہ لوگ اپنا ریکٹ بنانے میں کامیاب ہوگئے تو پھر انہیں روکنا مشکل ہوجائے گا۔ یہ ہمارے لیے بہترین موقع ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے جو پامیلا جیسی اندر کی عورت دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمیں معلومات فراہم کررہی ہے۔ اگر ہم نے یہ موقع کھودیا تو شاید پھر کبھی ایسا چانس نہ مل سکے۔"

"مگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم بھاگ دوڑ نہیں کرسکو گے۔" تھائی وانگ نے کہا۔

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم دونوں کی محبت نے مجھے پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا کردیا ہے۔ جانکی دیوی نے جس توجہ سے میرا علاج کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ تم دونوں نہیں بلکہ تینوں میرے لیے بہت بڑا سہارا ہو اور میں تم میں سے کسی کا شکریہ اس لیے ادا نہیں کروں گا کہ اس سے تم لوگوں کی توہین ہوگی۔ بہرحال۔"

میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ میرے لیے ایک بہترین موقع ہے اور میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی ہم کب تک چوہوں کی طرح بل میں دبکے رہیں گے۔ اگر ہم اسی طرح چھپ کر بیٹھے رہے تو دارا اور اس کے ساتھی وہ سب کچھ کر گزریں گے جس سے ہم انہیں روکنا چاہتے ہیں۔ تو پھر تم پامیلا سے کب ملاقات کروا رہے ہو؟" میں نے آخری الفاظ پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

"کل تو نہیں۔ کوشش کروں گا کہ پرسوں اس سے تمہاری ملاقات کروادی جائے۔" پرساد نے جواب دیا۔

"پرسوں یہ ملاقات ہر حال میں ہونی چاہیے۔" میں نے کہا "ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں۔"

"وہ کیا.....؟" پرساد نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"پرسوں رات دس بجے تم پامیلا کو لے کر سورا وانگ روڈ پر واقع انڈین ریسٹورنٹ پہنچ جاؤ۔ یہ ریسٹورنٹ ہوٹل منوہرا کے سامنے ہے۔ ہم بھی وہاں آجائیں گے اور تم یہ ظاہر کرو گے کہ ہماری ملاقات محض اتفاقیہ ہوئی ہے۔ تھائی وانگ تمہارے شہر کی رہنے والی ہے اور وہاں تم لوگ ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ہم اپنے اصل حلیوں میں ہوں گے۔"

"کیا....؟" تھائی چونک گئی "خودکشی کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں۔" میں مسکرا دیا "میں دارا اور اس کے ساتھیوں کو یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ اب میرے دل میں کوئی ڈر خوف نہیں رہا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں تھائی۔ ہمارے اس طرح سامنے آجانے سے وہ کچھ نہ کچھ اثر تو لیں گے اور ویسے بھی ہم ساری زندگی اپنے چہرے تو نہیں چھپا سکتے۔"

"باس ٹھیک کہتا ہے۔" پرساد نے کہا "تو ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔ پرسوں انڈین ریسٹورنٹ میں ملاقات ہوگی۔ رات دس بجے۔"

پرساد چلا گیا۔ تھائی میرے سامنے بیٹھی کچھ کہے بغیر میرے چہرے کو تکتی رہی۔ اس کے چہرے پر اس وقت کچھ عجیب سے تاثرات تھے۔

"کیا بات ہے تھائی۔ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"اوہ کچھ نہیں۔" تھائی جیسے چونک سی گئی۔

"سنگاپور کا کوئی فون نمبر معلوم ہے تمہیں۔ کوئی بھی؟" میں نے کہا۔

"اس میگزین میں سنگاپور کے کئی ہوٹلوں کے نمبر موجود ہیں مگر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" تھائی نے میز پر رکھے ہوئے میگزین کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے وہ میگزین اٹھالیا۔ ایک ہوٹل اسی علاقے میں تھا جہاں ہماری رہائش ہوا کرتی تھی۔ میں دراصل انسپکٹر چیانگ شو کو فون کرکے دارا کے سینڈیکیٹ کے بارے میں اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن مجھے اس کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ وہ انٹرنیشنل ڈائلنگ کوڈ ڈائریکٹری میں موجود تھا۔ میں نے سنگاپور کے اس ہوٹل کو فون کرکے انسپکٹر چیانگ شو کا نمبر حاصل کرلیا اور چند سیکنڈ بعد اس کا نمبر ملانے لگا۔

انسپکٹر چیانگ شو اس وقت پولیس اسٹیشن پر ہی تھا۔ جب میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ پرتاب سنگھ کے قتل کا پتا تو اسے انہی دنوں چل گیا تھا لیکن میرے بارے میں اسے کوئی اطلاع نہیں تھی۔ تقریباً پانچ منٹ تک دونوں طرف سے رسمی جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا پھر میں اصل موضوع پر آگیا۔

"انکل۔ آپ کو معلوم ہے' دارا اور کمو وغیرہ آج کل بنکاک میں ہیں لیکن دارا نے سنگاپور میں بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی ہیں۔"

"میرے کو اس کا دو تین مرتبہ آنے کا پتا چلا مگر وہ غائب ہوگیا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

"دارا نے جو مقصد حاصل کرنے کے لیے میرے ماں باپ کو

قتل کیا تھا اور مجھے بھی ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اس نے سنگاپور میں اپنے اس منصوبے کی بنیاد رکھ دی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔ کھل کر بتاؤ۔" چیانگ شو بولا۔

"اس نے ہیروئن کی اسمگلنگ کے لیے سنگاپور میں ایک ریکٹ قائم کرلیا ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے اپنی معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔ میں نے ان تینوں افراد کے نام اور ٹیلی فون نمبر بھی لکھوا دیے "ان فون نمبروں سے ان کے ایڈریس معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ میں کل رات دوبارہ فون کروں گا تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ میری اس اطلاع کا نتیجہ کیا نکلا۔"

"تم اچھی خبر سنے گا مائی سن۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا "اپنا خیال رکھنا۔ وش یو گڈ لک!"

"یہ سب کچھ مجھے وقت نے سکھایا ہے۔" میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور لہجے میں سنجیدگی آگئی "اس وقت نے جس نے میرا سب کچھ چھین لیا اور مجھے وقت سے پہلے جوان کردیا۔ میری عمر کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے ہیں' کھیلتے کودتے ہیں اور اپنی پسند سے وقت گزارتے ہیں۔ کراٹے آج کا مقبول کھیل ہے۔ لڑکے اسے کھیل سمجھ کر ہی سیکھتے ہیں لیکن میں اسے اپنی زندگی کے بچاؤ کا وسیلہ بنا رہا ہوں۔ میری آزادی چھن گئی ہے۔ میں چاروں طرف سے خونی بھیڑیوں میں گھرا ہوا ہوں۔ اپنے آپ کو ان درندوں سے بچانے کی کوشش کررہا ہوں۔ اگر میرے ساتھ وہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاید کیا بلکہ یقیناً ان ساری تلخیوں سے دور ہوتا۔"

میری آواز بھرا گئی۔ انسپکٹر چیانگ شو سے فون پر باتوں کے دوران میں کچھ پرانے زخم چھل گئے تھے۔ وہ زخم اتنے پرانے بھی نہیں تھے کہ انہیں بھول جاتا۔ انہی یادوں کے سہارے تو میں جی رہا تھا۔ وہی جذبہ تو مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ چیانگ شو کی باتوں نے میرے زخموں میں ٹیس سی پیدا کردی تھی اور میں بے چین ہوگیا تھا۔

تھائی وانگ نے فوراً ہی میری کیفیت کو محسوس کرلیا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر آگئی اور مجھے اپنے ساتھ لپٹالیا اور پھر ایک عجیب سے احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں پرسکون ہوتا چلا گیا اور تھائی وانگ کی گود میں سر رکھے رکھے سوگیا۔

اس رات میں کئی روز بعد پرسکون اور گہری نیند سویا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ تھائی وانگ اس وقت کچن میں تھی۔ برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں بھی اٹھ کر کچن میں آگیا۔ تھائی چائے بنا رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر مسکرادی۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ جانکی دیوی آگئی۔ اسے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ ابھی ساڑھے سات بجے تھے اور اتنی صبح وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ تھائی کی آنکھوں میں بھی الجھن سی تیرگئی تھی۔

"کیا ہوا جانکی۔ تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟" تھائی نے کہا۔

"وہ لڑکی میرے گھر آگئی ہے۔ آج صبح پانچ بجے۔" جانکی نے کہا۔

"کون سی لڑکی؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہی شائی وان!" جانکی نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم کہ اسے میرے گھر کا پتا کیسے چلا لیکن اس نے جو انکشاف کیے ہیں وہ بڑے سنسنی خیز ہیں۔"

"ایک منٹ!" تھائی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی "میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔ پھر بات کرتے ہیں۔"

تھائی دس منٹ بعد چائے بنا کر لے آئی۔

"ہاں۔ اب بولو کیا قصہ ہے؟" وہ جانکی کی طرف کپ بڑھاتے ہوئے بولی۔

"صبح پانچ بجے کال بیل کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔" جانکی دیوی کہنے لگی "میں ایک دم بدحواس سی ہوگئی۔ میرے ذہن میں اچانک ہی خیال ابھرا تھا کہ کہیں تم لوگوں پر تو کوئی افتاد آن نہیں پڑی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ اس وقت دن کی روشنی بھی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ میں اس کا چہرہ بھی پوری طرح نہیں دیکھ سکی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ مجھے دھکا دے کر اندر آگئی اور خود ہی دروازہ بند بھی کردیا۔

"میں اسے دیکھ کر چونک گئی اور وہ میرے قدموں پر گرگئی اور رو رو کر کہنے لگی کہ مجھے بچالو۔ میں اسے کمرے میں لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بتایا کہ ایک رات تم اسے جلتے ہوئے مکان سے بچا کر لے گئے تھے اور ایک کاٹیج میں چھوڑ دیا تھا جہاں دو آدمی تھے۔

"شائی وان کے کہنے کے مطابق وہاں اسے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ آزادی سے پورے گھر میں گھومتی پھرتی تھی لیکن اس کے دل میں چور تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے تمہیں پھنسایا تھا اور تم واپس آؤ گے تو اس سے بازپرس ضرور کرو گے۔ اس کے لیے اگرچہ باہر بھی خطرہ تھا لیکن تمہاری بازپرس کے خوف سے وہ ایک رات اس کاٹیج سے نکل گئی۔

"وہ دو تین دن تک ادھر ادھر چھپتی رہی اور پھر ایک روز تھنگ چو کے ہاتھ لگ گئی۔ تھنگ چو کو بھی کسی طرح پتا چل چکا تھا کہ تم اسے جلتے ہوئے مکان سے نکال لے گئے تھے اور اس کا خیال تھا کہ تم نے ہی اسے پناہ دے رکھی تھی۔ وہ اسے بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گیا اور شہر میں ایک مکان میں چھپائے رکھا۔ اس دوران وہ نہ صرف اس سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہا بلکہ اسے ہیروئن بھی استعمال کراتا رہا۔ ہیروئن کے نشے نے شائی وان کو زیر کردیا اور اس نے اس کاٹیج کا پتا بتادیا جہاں تم اسے لے کر

گئے تھے۔ تھنگ چو نے اس کاٹیج کی نگرانی شروع کردی۔ کئی روز بعد اس پر یہ انکشاف ہوا کہ تمہارا اس کاٹیج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم اسے دھوکے سے وہاں چھوڑ گئے تھے اور کاٹیج میں رہنے والے دو آدمیوں کو ایک معقول رقم دے گئے تھے کہ دو چار دن بعد اس لڑکی کو وہاں سے رخصت کردیا جائے۔

"تھنگ چو نے شائی وان کو اذیتیں دینا شروع کردیں۔ ہیروئن کی ایک وقت کی خوراک روک لینا ہی اس کے لیے سب سے بڑی اذیت تھی۔ وہ اس کے ساتھ مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ دراصل وہ ہر قیمت پر تمہارا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ انڈرورلڈ میں ہارا اور ٹائیگر کا یہ اعلان گردش کررہا ہے کہ جو شخص تمہیں ان کے حوالے کرے گا اسے ایک ملین بھات کا انعام دیا جائے گا۔ وہ اس لیے ہر صورت میں تمہارا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تمہیں پکڑ کر ان کے حوالے کردیا جائے۔ اس طرح اسے انعام بھی مل جائے گا اور اس کا انتقام بھی پورا ہوجائے گا۔

"ہنوز پھر نجانے اسے کس طرح یہ شبہ ہوگیا کہ میرا تم سے کوئی تعلق ہے۔ شائی وان جتنے دن تھنگ چو کی قید میں رہی تھی وہ روزانہ اس پر مجرمانہ حملے کرتا رہا تھا اور بالآخر جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی تو تھنگ چو نے اسے قتل کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اسی روز اس کے ذہن میں اس شک نے سر ابھارا اور اس کے شیطانی ذہن میں وہ ترکیب آگئی۔ اسے پتا تھا کہ شائی وان کے پیٹ میں اس کا گناہ پل رہا ہے۔ وہ اسے اپنے منصوبے کے تحت فلیٹ میں لے آیا اور پڑوسیوں کو بھی یہی کہانی سنائی جو اس نے مجھے سنائی تھی۔ یعنی وہ شائی وان کو بے سہارا سمجھ کر انسانی ہمدردی کے تحت اٹھا لایا تھا۔ اس نے شائی وان کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے زبان سے ایک لفظ بھی نکالا تو اسے مار دیا جائے گا۔

"پہلے روز شائی وان کی حالت دیکھ کر میں نے اس کا علاج کرنے سے انکار کردیا تھا۔ کل رات تھنگ چو پھر میرے کلینک پر پہنچ گیا اور مجھے شائی وان کے علاج کے لیے ایک بھاری رقم کی پیشکش کی۔ دراصل وہ اس کے علاج کے بہانے مجھے کسی چکر میں پھنسانا چاہتا تھا تاکہ مجھ سے تمہارے بارے میں کچھ اگلوا سکے۔ گزشتہ رات گیارہ بجے میں اس کے گھر پر تھی۔ مجھے چونکہ تم سے شائی وان کے بارے میں معلوم ہوچکا تھا اسی لیے میں نے تھنگ چو کو ایک انجکشن لینے کے بہانے فلیٹ سے باہر بھیج دیا اور اس سے پہلے کہ اس کے جانے کے بعد میں شائی وان سے کچھ پوچھتی' اس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ تھنگ چو مجھے کسی چکر میں پھنسا کر بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔

"اور آج صبح پانچ بجے وہ میرے گھر پہنچ گئی۔ اس نے مجھے یہ ساری کہانی سنائی ہے۔ اسے یقین ہے کہ اب وہ تھنگ چو کے ہاتھ لگی تو وہ اسے مار ڈالے گا۔ میں نہیں جانتی کہ اسے میرے گھر کا پتا کیسے چلا تھا اور یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ اب میں اس کا کیا کروں۔ اسے گھر میں بھی نہیں رکھا جاسکتا اور یہاں بھی نہیں لاسکتی۔ وہ ہیروئن کی عادی ہے۔ ایسے لوگوں کا جب نشہ ٹوٹتا ہے تو وہ اپنے آپ کو نوچنے لگتے ہیں۔ چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ گھر میں اس کی موجودگی کو راز میں نہیں رکھا جاسکتا۔"

"وہ اس وقت کس حالت میں ہے؟" میں نے جانکی دیوی کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"میں نے اسے ویلیم فائیو کا انجکشن لگا دیا تھا۔" جانکی نے جواب دیا "وہ کم از کم پانچ چھ گھنٹے سوئی رہے گی۔"

میں اور تھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مسئلہ واقعی خاصا گمبھیر تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کرنا ضروری تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ تھنگ چو کسی نہ کسی طرح ہم سے جانکی کی وابستگی کا پتا چلالے اور ایسی گڑبڑ شروع ہوجائے جس پر نہ صرف ہمارے لیے قابو پانا مشکل ہوجائے بلکہ نقصان بھی اٹھانا پڑے۔

"اس سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ سمجھ میں آتا ہے۔" تھائی وانگ نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم دبنے کی کوشش کرو گی تو تھنگ چو کے شک کو تقویت ملے گی اس لیے اس سے پہلے کہ وہ تمہارے خلاف قدم اٹھائے تم اس پر چڑھ دوڑو۔"

"وہ کیسے؟" جانکی نے پوچھا۔

"پولیس کو اطلاع دے دو۔" تھائی نے جواب دیا "تھنگ چو پہلے ہی ہیروئن کے کیس میں ملوث ہے اور ضمانت پر ہے۔ اگر شائی وان بھی اس کے خلاف بیان دے گی تو اس کے لیے بچنا مشکل ہوجائے گا۔"

تھائی کی تجویز معقول تھی لیکن اب یہ سوچنا باقی تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ اگر تھنگ چو پولیس کے ہاتھ نہ لگ سکا یا شائی وان نے اس کے خلاف بیان نہ دیا تو خود جانکی دیوی کی زندگی خطرے میں پڑجائے گی۔

ہم تینوں سر جوڑ کر بیٹھے سوچتے رہے اور پھر یہ طے پایا کہ جانکی دیوی پہلے شائی وان کو مضبوط کرے اور اگر وہ تھنگ چو کے خلاف بیان دینے پر آمادہ ہوجائے تو ٹھیک ہے۔ بصورت دیگر اسے رات کی تاریکی میں گھر سے کہیں دور چھوڑ دیا جائے۔ اس کا نشہ جب ٹوٹے گا۔ وہ چیخے گی' چلائے گی اور کوئی نہ کوئی اس کے بارے میں پولیس کو اطلاع دے ہی دے گا۔

"میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی ہے۔" جانکی نے کہا "کیوں نہ اسے رات تک اپنے گھر میں ہی رکھا جائے اور سمجھا بجھا کر آدھی رات کے لگ بھگ اسے اکیلے ہی پولیس اسٹیشن بھیج دیا جائے۔ اسے یہ سمجھا دیا جائے کہ میں پس منظر میں رہ کر اس کی مدد کرتی رہوں گی لیکن اس معاملے میں میرا نام نہ آنے پائے۔"

"اگر یہ بات وہ مان جائے تو سارا مسئلہ حل ہوجائے گا لیکن اسے تمہارے گھر سے پولیس اسٹیشن کون لے کر جائے گا۔" میں نے کہا اور پھر میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا "رامن پرساد" میں... بڑبڑایا "ہاں پرساد یہ کام کرسکتا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" تھائی نے کہا "اس کا ایک کونٹیکٹ نمبر ہمارے پاس موجود ہے۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو اس نے یہ نمبر دیا تھا۔ آج دوپہر تم اس نمبر پر اس کے لیے پیغام چھوڑ دو۔ وہ شام کو یہاں آجائے گا۔"

"تو ٹھیک ہے۔" میں نے جانکی دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم معمول کے مطابق اپنے کلینک پر جاؤ لیکن تمہیں اس بات کا یقین کرلینا چاہیے کہ تمہاری عدم موجودگی میں شائی وان کوئی نیا مسئلہ کھڑا نہ کردے۔"

"میں اس بات کا خیال رکھوں گی۔" جانکی دیوی نے کہا۔

تھائی وانگ کچن میں جاکر ناشتا تیار کرنے لگی اور پھر ساڑھے نو بجے کے قریب جانکی ناشتا کرکے رخصت ہوگئی۔

میں نے گیارہ بجے کے قریب پرساد کے نمبر پر فون کیا جہاں میں نے باس کے حوالے سے پیغام چھوڑ دیا۔ وہ دراصل ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کا نمبر تھا جہاں پرساد اس وقت ناشتا کرنے آتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہی پرساد کا فون آگیا۔ ظاہر ہے فون پر ایسی کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے اسے یہاں آنے کے لیے کہہ کر فون بند کردیا۔

"صورتِ حال واقعی خوفناک ہوگئی ہے۔" تھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تھنگ چو کو یقین ہوگیا کہ جانکی دیوی کا ہم سے کوئی تعلق ہے تو وہ ہمارا سراغ لگالے گا اور ہمارے لیے خطرات بڑھ سکتے ہیں۔"

"خطرات تو پہلے ہی ہمارے چاروں طرف منڈلا رہے ہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ہم ان سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "ہوسکتا ہے ہمیں یہ پناہ گاہ بھی چھوڑنی پڑے لیکن میرا خیال ہے کہ پرساد سچویشن کو ہینڈل کرلے گا۔ مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔ ویسے ہمیں بھی اپنے طور پر تیار رہنا چاہیے۔"

"ویسے میرے ذہن میں ایک اور تجویز ہے۔" تھائی نے کہا "کیوں نہ ہم کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر چلے جائیں۔ مثلاً چیانگ رائے.... وہاں شینو موجود ہے۔ وہ ہماری رہائش کا بندوبست کرسکتی ہے۔"

"شہر سے باہر تو رہائش کا بندوبست کہیں بھی ہوسکتا ہے لیکن فی الحال میں بنکاک چھوڑنا نہیں چاہتا۔" میں نے جواب دیا "یہاں کی صورتِ حال ایسی ہے کہ ہمارے راہِ فرار اختیار کرنے سے ان کے لیے راستہ کھل جائے گا اور میں ان کے لیے آسانیاں پیدا نہیں کرنا چاہتا۔"

تھائی وانگ جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھتی رہی پھر وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ دوپہر دو بجے کے قریب رامن پرساد آگیا۔ اس سے تقریباً ایک گھنٹے تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔

"ٹھیک ہے باس۔" پرساد نے کہا "آج یہ کام ہوجائے گا اور اگر تھنگ چو نے راستے میں آنے کی کوشش کی تو اس کی کہانی بھی ختم کردی جائے گی۔"

"تم کس وقت جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں رات بارہ بجے کے بعد کا وقت مناسب رہے گا۔" پرساد نے جواب دیا۔ تھائی نے اسے جانکی دیوی کے گھر کا پتا اچھی طرح سمجھا دیا اور اس کے کچھ دیر بعد وہ رخصت ہوگیا۔

اس شام آٹھ بجے کے قریب جانکی دیوی کا فون آگیا۔ وہ اس وقت اپنے کلینک پر تھی۔

"سارا معاملہ طے ہوگیا ہے۔" اس نے بتایا "وہ ہمارے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے کو تیار ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ پس منظر میں رہ کر اس کی بھرپور مدد کروں گی۔ اسے نہ صرف اس بھکشو سے نجات مل جائے گی بلکہ میں اس کا علاج بھی کروں گی۔"

"بھکشو کو یہ شبہ تو نہیں ہوا کہ وہ تمہارے پاس ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" جانکی نے جواب دیا "آج صبح بجے کے قریب وہ کلینک پر آیا تھا۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ شائی وان مجھ سے کوئی مشورہ کرنے یا دوا وغیرہ لینے کے لیے تو یہاں نہیں آئی تھی۔ بہرحال وہ تسلی کرکے چلا گیا تھا لیکن کہہ نہیں سکتی کہ اسے میری بات کا یقین آگیا تھا یا نہیں۔ میں آج دن بھر خاصی محتاط رہی ہوں۔ میں نے اپنے آس پاس کسی ایسے شخص کو بھی نہیں دیکھا جس پر شبہ ہو کہ وہ میری نگرانی کررہا ہے۔"

"گڈ۔" میں نے کہا "پرساد آج رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت تمہارے ہاں پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔" جانکی نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کردیا اور تھائی کو جانکی دیوی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا اور پھر اسی رات گیارہ بجے کے قریب میں نے سنگاپور فون کیا۔ انسپکٹر چیانگ شو شاید میری کال کا منتظر تھا۔ وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔

"تمہاری اطلاع بالکل درست تھی مائی سن۔ میں نے کل رات ہی تمہارے بتاتے ہوئے فون نمبروں سے ان تینوں کے ایڈریس معلوم کرکے دو گھنٹوں کے اندر اندر ان کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرلی تھیں اور آج صبح سویرے تینوں جگہوں پر بیک وقت چھاپے مارے گئے تھے۔ ان کارپوریشن پارٹنرز تعلق رکھنے والا پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ البتہ انڈیا سے پارٹنر بھولا ناتھ اور پاکستانی پارٹنر جمال پکڑے گئے ہیں۔ جمال دارا

انڈرسن ہے اور بھولا ناتھ کے قبضے سے دس کلوگرام ہیروئن برآمد ہوئی ہے جسے وہ یورپ کی طرف اسمگل کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان لوگوں سے ہم تفتیش کررہے ہیں۔ اور امید ہے کہ مزید سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔"

"تھینک یو چیانگ انکل۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ یہ دارا کے خلاف میری پہلی بڑی کامیابی ہے۔ اب میں اسے یہاں بھی ٹکنے نہیں دوں گا۔"

"یہ لوگ بہت خطرناک ہیں مائی سن۔ اپنا خیال رکھنا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا "اپنا نمبر دو تاکہ کبھی تم سے رابطہ کرلیا جائے۔"

میں نے ماسٹر ہوچن کا نمبر بتا دیا "کبھی کوئی بات ہو تو اس نمبر پر پیغام دے دیا کریں۔ میں بعد میں خود ہی آپ کو فون کرلیا کروں گا۔"

میں نے فون بند کردیا اور تھائی وانگ کو بتانے لگا کہ سنگاپور میں دارا کے تین خاص آدمیوں میں سے ایک پولیس کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور دو گرفتار ہوگئے ہیں جن میں ایک دارا کا کزن ہے۔ پولیس نے ان سے بھاری مقدار میں ہیروئن بھی برآمد کی ہے۔

"دارا کو یہاں اطلاع مل چکی ہوگی۔ وہ تو اپنے بال نوچ رہا ہوگا۔" تھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اسے اپنی بوٹیاں نوچنے پر مجبور کردوں گا۔" میں نے کہا۔

ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب جانکی دیوی نے فون پر اطلاع دی کہ پرساد تھوڑی دیر پہلے شائی وان کو لے جاچکا ہے۔ اب مجھے شائی وان کی طرف سے اطلاع کا انتظار تھا۔

دو بجے کے لگ بھگ رامن پرساد خود ہی آگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔

"ہاں۔ گڑبڑ تو ہوئی ہے۔" اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا "میں نے شائی وان کو لے جانے کے لیے ایک ہوٹل کے پارکنگ پلاٹ سے ایک گاڑی چرائی تھی۔ میں شائی وان کو سینٹ لوکس اسٹریٹ پر واقع پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی میں سیتھوم روڈ پر پہنچا ایک کار میرے پیچھے لگ گئی۔ مجھے کسی ممکنہ گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کیونکہ اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں نے ایک آدمی کو بھکشوؤں جیسے لباس میں دیکھ لیا تھا اور مجھے شبہ ہوگیا تھا کہ وہ تھنگ چو کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔

"میرا شبہ درست نکلا۔ وہ تھنگ چو ہی تھا جو ہمارا پیچھا کررہا تھا۔ میں نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گاڑی روک لی۔ شائی وان ابھی اتر کر پولیس اسٹیشن کے گیٹ کی طرف جارہی تھی کہ پیچھے سے آنے والی کار ایک لمحے کو وہاں رکی۔ اس کار سے یکے بعد دیگرے کئی گولیاں چلائی گئیں۔ شائی وان چیخ کر ڈھیر ہوگئی۔ میں اس وقت اپنی کار ایک سائڈ اسٹریٹ پر موڑ رہا تھا۔ میں کار روک کر نیچے اتر آیا۔ دوسری کار تیز رفتاری سے سیدھی نکل گئی تھی لیکن اتفاق سے دو پولیس آفیسر موٹر سائیکلوں پر سوار اس طرف نکل آئے۔ انہوں نے کار کا تعاقب شروع کردیا۔

"فائرنگ کے تبادلے کے دوران میں کار بے قابو ہوکر فٹ پاتھ پر چڑھ کر الٹ گئی۔ پولیس نے تھنگ چو کو شدید زخمی حالت میں حراست میں لے لیا ہے۔ شائی وان ختم ہوچکی ہے۔ اسے ایک گولی سر میں لگی تھی جس سے فوری طور پر اس کی موت واقع ہوگئی۔"

مجھے شائی وان کی موت کا افسوس ہوا تھا لیکن اس کی موت کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جو خطرہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا وہ فی الحال ٹل گیا تھا۔

رامن پرساد نے وہ رات ہمارے پاس ہی گزاری تھی۔ صبح ناشتا کرکے وہ چلا گیا۔

اور پھر اس رات ٹھیک دس بجے میں اور تھائی انڈین ریسٹورنٹ میں داخل ہورہے تھے۔ تھائی کے اصرار پر ہم نے اپنے حلیے کسی حد تک تبدیل کرلیے تھے۔ رامن پرساد ایک لڑکی کے ساتھ کونے والی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی کی پشت ہماری طرف تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ قریب کی میز پر بیٹھتے ہوئے میں اچانک ہی پرساد کی میز کی طرف بڑھا۔

"ارے پرساد۔ تم.... تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہورہی ہے۔ چیانگ رائے سے کب آئے؟" میں نے قریب پہنچ کر کہا۔

رامن پرساد نے بھی ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر اس لڑکی کی شکل دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ظاہر ہے' وہ پامیلا تھی اور یہ وہی لڑکی تھی جو خانقاہ کے گیٹ پر مجھے وہ گلدستہ دے کر گئی تھی جس میں بم لگا ہوا تھا۔

رامن پرساد نے پامیلا کو یہی تاثر دیا کہ میں اس کا پرانا دوست ہوں اور بس اتفاقیہ طور پر یہ ملاقات ہوگئی ہے۔ اس کی دعوت پر ہم بھی اس میز پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی غالباً تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں آئے تھے اور انہوں نے ابھی تک کوئی آرڈر نہیں دیا تھا لہٰذا یہ ذمے داری میں نے سنبھال لی۔

ہم آدھے گھنٹے بعد وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ رامن پرساد ہمیں چائنا ٹاؤن کے علاقے میں واقع ایک فلیٹ میں لے آیا تھا۔ یہ فلیٹ اس نے اپنے لیے لے رکھا تھا اور یہاں ضرورت کی تمام چیزیں موجود تھیں۔

پامیلا کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی تھی اور اس کی باتوں سے بھی مایوسی جھلک رہی تھی۔

"میرا خیال ہے تمہیں کوئی ایسا صدمہ پہنچا ہے جس نے

تمہیں اپ سیٹ کر رکھا ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "کوئی ایسی بات ہے تو ہمیں بتاؤ۔ شاید ہم تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔"

"مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس کینے سے میں اکیلی ہی نمٹوں گی۔" پامیلا نے کہا۔

"اوہ!" میں نے چونکنے والے انداز میں کہا "میرا خیال ہے تمہارے کسی بہت قریبی دوست نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔"

"ایسا ویسا دھوکا۔" پرساد بیچ میں بول پڑا "یہ ایک اجنبی کو چاہنے لگی تھی اور اسے اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی تھی۔ وہ اجنبی کچھ عرصے تک تو اسے باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ صرف اسی کا ہے۔ دراصل وہ یہاں اپنے قدم جمانا چاہتا تھا اور جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اسے نظر انداز کرنے لگا۔ پامیلا کو اس بات کا دکھ ہے۔"

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا "اس کا نام پتا بتاؤ۔ ہم اسے پکڑ کر سڑک پر جوتے لگائیں گے۔"

"وہ بہت بڑا گینگ لیڈر ہے۔" پامیلا نے کہا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر دارا کے خلاف بولنے لگی۔

میں یہی چاہتا تھا کہ وہ اپنے منہ سے کچھ اگلے۔ یہ زیر زمین دنیا بھی بڑی عجیب ہے۔ یہاں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں چلتی رہتی ہیں اور پامیلا جیسی حسین لڑکیاں ان سازشوں میں بڑے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ کبھی تو وہ اپنے آقا کے لیے جان تک دینے کو تیار ہو جاتی ہیں اور کبھی کسی معمولی سی بات پر اس طرح بگڑتی ہیں کہ اپنے آقا کو تباہی کے غار میں دھکیل دیتی ہیں۔ پامیلا کا شمار بھی ایسی ہی لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اس نے دارا اور ٹائیگر کے کہنے پر مجھے بم سے اڑانے کی کوشش کی تھی اور اب مجھے اپنا ہمدرد پاکر دارا کے خلاف دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

"دارا سنگاپور سے آیا تھا۔" میں نے پامیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور آج ہی مجھے پتا چلا ہے کہ سنگاپور میں اس کے کچھ آدمی پکڑے گئے ہیں اور مالی طور پر بھی اسے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"

"تت.... تمہیں کیسے پتا چلا؟" پامیلا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ایسی خبریں چھپی نہیں رہتیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "انڈر ورلڈ میں تو سب ہی لوگ یہ بات جان چکے ہیں کہ سنگاپور میں پکڑے جانے والے دارا کے آدمی تھے۔"

"یہ سچ ہے۔" پامیلا نے کہا "اسے کل شام کو یہ اطلاع ملی تھی اور وہ پاگل ہوا پھر رہا ہے۔ سنگاپور میں اس کے آدمیوں کے پکڑے جانے کے حوالے سے یہ بات بھی سننے میں آئی ہے کہ ان کی مخبری وجدان نے کی تھی۔"

"لیکن وجدان تو یہاں بنکاک میں ہے۔ وہ سنگاپور میں کسی کی مخبری کیسے کر سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"دارا نے اپنے ذرائع سے تصدیق کرلی ہے۔ سنگاپور کے اخبارات میں اس کا نام چھپا ہے۔ اس نے یہاں سے سنگاپور کے کسی پولیس آفیسر کو فون کیا تھا۔ دارا پہلے ہی اس کی تلاش میں تھا۔ وہ اس پر کئی وار کرچکا ہے لیکن وہ ہر مرتبہ بچ نکلتا ہے۔ اسے کچھ عرصہ پہلے بم سے اڑانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ پھر بچ نکلا اور ایک مہینہ پہلے تو وہ گیسٹ ہاؤس میں دارا اور کم کی پٹائی کرکے چلا گیا۔ دارا کو یقین ہے کہ گیسٹ ہاؤس سے فرار ہوتے ہوئے اسے کم سے کم دو گولیاں ضرور لگی تھیں۔ گیسٹ ہاؤس میں لان سے دیوار تک خون کے دھبے دیکھے گئے تھے۔ دارا اور ٹائیگر کے آدمیوں نے شہر کے تمام سرکاری اور پرائیویٹ اسپتال چھان مارے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"اب دارا کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا چاہتی ہو تم؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مجھ پر بھی شبہ کرنے لگا ہے اور مجھے دوسری عورتوں کے سامنے ذلیل کرتا رہتا ہے۔ میں اس سے ایسا انتقام لینا چاہتی ہوں کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے۔" پامیلا نے کہا۔

"کیوں نہ ہم مل کر کام کریں۔ مجھے بھی اس سے کچھ پرانا حساب چکانا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا....؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"دارا نے تمہیں دکھ پہنچایا ہے۔ تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تمہارے دل کو چور چور کیا ہے۔ اگر تم اس سے انتقام لینے میں واقعی سنجیدہ ہو تو ہم تمہارا ساتھ دے سکتے ہیں۔ ویسے تم پہلی لڑکی نہیں ہو جو دارا کے فریب کا شکار ہوئی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ....."

"ہاں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "دارا ایک جرائم پیشہ آدمی اور پیشہ ور شکاری ہے۔" میں اس کی آتش انتقام کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا تھا "سنگاپور کی باتوں پر شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن یہاں کی چند مثالیں دوں گا۔ میں جن لڑکیوں کے نام لے رہا ہوں انہیں تم بھی بہت قریب سے جانتی ہوگی۔ کوشلیا.... وہ ہندو لڑکی جسے دارا نے اپنے جال میں پھانس کر پہلے اسے مہاراج کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اور اسے اپنے بستر کی زینت بناتا رہا۔ جب اس کا مقصد پورا ہو گیا اس سے طبیعت بھر گئی تو اسے نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شائی وان.... اس کے بارے میں تو تم نے آج ہی سنا ہوگا۔ اخباروں میں بھی چھپا ہے اس کے متعلق۔ گزشتہ رات دارا کے آدمیوں نے اسے اس وقت گولیوں سے بھون ڈالا جب وہ دارا کے خلاف فریاد لے کر پولیس اسٹیشن جارہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے اسی شائی وان کو ایک مکان میں زندہ جلا دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ صرف یہی دو مثالیں نہیں ہیں۔ میں تمہیں اور بھی بہت سی لڑکیوں کے نام گنوا سکتا ہوں جو

دارا کے ظلم کا شکار ہوئی ہیں۔ ایک تازہ ترین مثال تو تم خود ہو....." پامیلا پھٹی پھٹی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں اسے موقع دیے بغیر بولتا رہا "تم نے دارا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اسے اس وقت پناہ دی جب وہ یہاں اجنبی تھا اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ تم نے نہ صرف اسے پناہ دی بلکہ اپنے آپ کو بھی اس کی سپردگی میں دے دیا۔ اس کے قدم رفتہ رفتہ جمتے گئے۔ تم نے اسے ٹائیگر تک بھی پہنچا دیا۔ وہ نہ صرف خود تمہیں کھلونے کی طرح استعمال کرتا رہا بلکہ تمہیں اپنے نئے دوستوں کے سامنے بھی پیش کرتا رہا جن سے وہ کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ تم اس کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ تم نے ایک ایسے شخص کو بھی بم سے اڑانے کی کوشش کی جسے تم جانتی تک نہیں۔"

"تت..... تم.... یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟" وہ ہکلائی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا خوف تھا اور آنکھوں میں وحشت تھی۔

"اس دھماکے میں کئی بے گناہ مارے گئے تھے اور درجنوں زخمی ہوئے تھے۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی "لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ دارا اس نوجوان کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟" میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس لیے کہ وہ نوجوان دارا کے ایسے جرائم کا چشم دید گواہ ہے جو اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا سکتے ہیں۔ دارا نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ماں باپ کو ذبح کروایا تھا۔ وہ دارا سے چھپتا پھر رہا تھا لیکن اب وہ....."

"تت..... تم....." پامیلا ایک بار پھر ہکلائی۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ میں ہی وہ شخص ہوں جسے دارا اپنا بدترین دشمن سمجھ کر ہر قیمت پر موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔" میں نے سر پر سے وگ اور بالائی ہونٹ پر چپکی ہوئی باریک سی مونچھیں اتار دیں۔

وہ اچھل پڑی۔ اس کا چہرہ خوف سے ایک دم سفید ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا "میں نے تمہیں اسی روز پہچان لیا تھا جب گیسٹ ہاؤس کی اوپری منزل پر میں نے کم اور دارا کی پٹائی کی تھی اور اس سے اگلے ہی دن سے میرا یہ دوست تمہارے ساتھ رہا ہے۔" میں نے رامن پرساد کی طرف اشارہ کیا "اگر ہم چاہتے تو تمہیں کسی بھی وقت موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ میں جانتا ہوں' تم بے قصور ہو۔ دارا تمہیں استعمال کر رہا ہے اور اب شاید اس کی نظروں میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اس لیے وہ تمہیں مسلسل نظر انداز کر رہا ہے۔ اس نے تمہارے ساتھ دھوکا کیا ہے' تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ تم شاید یہی سمجھتی ہو کہ اب اسے تمہارے جسم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لیے وہ تمہیں نظر انداز کر کے دوسری لڑکیوں پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ بات صرف اتنی سی نہیں ہے پامیلا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اب تم اس کے لیے بیکار ہو چکی ہو۔ البتہ ایک لحاظ سے تم اس کے لیے اہم ہو سکتی ہو کہ تم اس کے بہت سے رازوں سے واقف ہو اور اسے جیسے ہی اس بات کا احساس ہو گا وہ تمہیں بھی کوشلیا اور دوسری لڑکیوں کی طرح موت کے گھاٹ اتار دے گا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ وہ سنگاپور والے معاملے میں تم پر بھی شبہ کرنے لگا ہے۔"

"اس نے کھل کر شک کا اظہار نہیں کیا لیکن اس کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات میرے ذریعے سے باہر نکلی ہو۔" پامیلا نے کہا۔

"شبہ اور کیسا ہوتا ہے۔" میں نے اسے گھورا "وہ ایک دو دن تم پر نگاہ رکھے گا اور پھر....."

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟" وہ کانپ اٹھی۔

"وہی جو تم کرنا چاہتی ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ہم تمہارے ساتھ ہیں اور اس معاملے میں تمہاری ہر مدد کرنے کو تیار ہیں۔"

"تمہاری باتیں سن کر مجھے لگتا ہے کہ وہ شیطان اب واقعی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" پامیلا نے کہا "میں اب واقعی اسے معاف نہیں کروں گی۔ تم بتاؤ۔ تم کیا چاہتے ہو؟"

میں فوری طور پر جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا کہ دارا کی ایک اہم ساتھی کو اس سے توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ نہ صرف دارا بلکہ ٹائیگر وغیرہ کے بہت سے جرائم کی بھی چشم دید گواہ تھی۔ پولیس کو اب بھی ان لوگوں کی تلاش تھی جنہوں نے خانقاہ کے سامنے بم دھماکا کرایا تھا اور جس میں کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ کم اور ٹائیگر وغیرہ کے خلاف اگرچہ بدھ کے مجسمے سے سونا چرانے والی رپورٹ بھی موجود تھی لیکن وہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور پولیس کو بھی شاید اس معاملے سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن بم دھماکے میں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ پولیس کے سامنے پامیلا کا بیان ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا۔

ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں' میں نے پامیلا سے دارا وغیرہ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کر لی تھیں اور پامیلا کو بہت سی باتیں سمجھا بھی دی تھیں۔

جب ہم پرساد کے فلیٹ سے نکلے تو رات کا ایک بج چکا تھا۔ باہر آنے سے پہلے میں نے ہونٹ پر باریک مونچھیں اور سر پر وگ جما لی تھی۔ گلی سے نکل کر ہم بڑی سڑک پر آ گئے۔ ایک خالی ٹک ٹک مل گیا۔ پرساد پامیلا کو اس ٹک ٹک پر لے کر روانہ ہو گیا اور میں تھائی وانگ کے ساتھ چوراہے کی طرف پیدل چلتا رہا۔

تھائی وانگ چلتے چلتے اچانک ہی لڑکھڑا گئی تھی۔ اگر میں اسے سہارا نہ دیتا تو وہ یقیناً گر پڑتی۔ میں نے پرساد کے فلیٹ میں بھی یہ محسوس کی تھی کہ تھائی جتنی دیر وہاں رہی تھی' بے چینی سی محسوس کرتی رہی تھی۔ کبھی وہ بیٹھ جاتی اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی اور اس وقت تو وہ اس طرح لڑکھڑائی تھی جیسے نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ کبھی ہاتھ موڑ کر کمر اور پشت سہلانے لگتی اور کبھی دوسرے ہاتھ سے۔ میں تشویش آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس کی یہ حالت کیوں ہو رہی تھی۔ تھائی نے پچھلے تین مہینوں سے ہانگ سو کی بتائی ہوئی ایکسرسائز چھوڑ رکھی تھی اور اب یہ بے چینی اسی کا نتیجہ تھی۔

"کیا ہوا تھائی؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے اسے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اب تک بڑی مشکل سے برداشت کرتی آ رہی ہوں۔" تھائی نے کراہتے ہوئے کہا "کوئی سواری تلاش کرو اور جلد گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔"

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چوراہا تقریباً سو گز آگے تھا۔ وہاں کچھ ٹیکسیاں اور ٹک ٹک کھڑے نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک ٹک ٹک ایک گلی سے نکل کر ہمارے سامنے آ رکا اور ہم دونوں اس میں بیٹھ گئے۔

ٹک ٹک کنگ ٹاکسن اسٹیچو والے چوراہے پر چھوڑ کر باقی راستہ ہمیں پیدل ہی طے کرنا پڑا اور یہ راستہ بڑی مشکل سے طے ہوا۔ بنگلے کے گیٹ میں داخل ہو کر میں تو اندر سے گیٹ بند کرنے لگا اور تھائی اس دوران میں برآمدے میں پہنچ چکی تھی اور جب میں برآمدے والا دروازہ بند کر کے اندر آیا تو تھائی بیڈ پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی پیٹھ برہنہ تھی۔ میں نے بیڈ کے نیچے سے بید کی چھڑی اٹھائی اور آنکھیں بند کر کے تھائی کی پیٹھ پر وار کرنے لگا۔ ہر ضرب پر وہ کراہ اٹھتی لیکن میں آنکھیں بند کیے اس کی پیٹھ پر چھڑیاں برساتا رہا۔

○☆○

تھلونگ ٹوئی ڈسٹرکٹ کے علاقے میں ایکسپریس وے اور ریلوے لائن سے ذرا ہٹ کر کوسا روڈ پر واقع وہ بنگلا تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ بہت بڑا بنگلا تھا۔ جس نے خاصے وسیع و عریض رقبہ گھیر رکھا تھا۔ چار دیواری خاصی اونچی تھی لیکن اس کے اوپر خاردار تاروں کا جنگلا بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ ہم غلط جگہ پر تو نہیں آ گئے تھے لیکن رامن پرساد نے اس امر کی تصدیق کر دی تھی کہ ہم ٹھیک جگہ پر آئے تھے۔

"آج دن میں پامیلا یہیں آئی تھی۔" پرساد نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی "اور دو گھنٹوں بعد میں نے اسے ٹائیگر کے ساتھ یہیں سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"تمہارے خیال میں یہاں اس وقت کتنے لوگ موجود ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹائیگر' دارا اور پامیلا کے علاوہ صرف ایک اور آدمی ہونا چاہیے۔" پرساد نے جواب دیا "پامیلا نے شام کو بتایا تھا کہ چیانگ رائے سے ایک آدمی آیا ہوا ہے جسے دارا آج کی رات یہاں عیاشی کرانا چاہتا ہے۔ پامیلا کو اس سلسلے میں یہاں بلایا گیا ہے۔ میرا خیال ہے چیانگ رائے سے آنے والا وہی شخص ہے جس سے گولڈن ٹرائی اینگل کے سلسلے میں مذاکرات چل رہے ہیں اور میرا خیال ہے' آج رات یہاں بزنس کی بات بھی ہو گی۔ وہ ٹھیک بارہ بجے یہاں آئے گا۔"

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ ہم کوٹھی کے سامنے کا ایک چکر لگا کر پیچھے کی طرف ایک نیم تاریک گلی کے موڑ پر کار میں بیٹھے ہوئے تھے اس کار کا بندوبست پرساد نے ہی کیا تھا۔ تھائی وانگ بھی ہمارے ساتھ تھی اور وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

اس رات پامیلا سے گفتگو کے بعد یہ پروگرام بنا تھا کہ وہ کسی مناسب موقع پر ہمیں اس کوٹھی تک لے جائے گی جو دارا کی خفیہ پناہ گاہ تھی۔ دارا کی اس کوٹھی کے بارے میں ٹائیگر' کم اور چی فانگ کے سوا کسی اور کو علم نہیں تھا یا پھر پامیلا اور ایک دو وہ لڑکیاں اس کوٹھی کے بارے میں جانتی تھیں جنہیں وہ عیاشی کے لیے وقتاً فوقتاً یہاں لے کر آتا تھا لیکن ان لڑکیوں میں یہ ہمت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ کسی اور پر اس کوٹھی کا راز فاش کر دیں۔

پامیلا نے آج شام ہی پرساد کو بتایا تھا کہ آج رات اس کوٹھی میں دارا کا ایک اہم مہمان آنے والا ہے اور اس میٹنگ میں ان کی طرف سے دارا اور ٹائیگر کے سوا اور کوئی نہیں ہو گا۔

"اگر کوئی بزنس میٹنگ ہے تو اس میں کم اور چی فانگ کی عدم شرکت میرے لیے باعث حیرت ہے۔ وہ دونوں تو اس کے بازو ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے پامیلا نے بتایا تھا کہ دارا اب ان دونوں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔" پرساد نے جواب دیا "گولڈن ٹرائی اینگل میں رابطہ ہو جانے کے بعد وہ انہیں بھی شاید ٹھکانے لگا دے۔ اس کی شاید یہی فطرت ہے کہ نئے لوگوں سے ملاقات کے بعد وہ پرانے آدمیوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ گولڈن ٹرائی اینگل والے معاملے میں رازداری کے خیال سے ان دونوں کو اس میٹنگ میں نہیں بلایا گیا۔"

"لیکن چی فانگ کو تو اس سلسلے میں خاص طور پر چیانگ رائے بھیجا گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"صرف پیغام رساں کی حیثیت سے۔" پرساد نے جواب دیا

"اس نے بھی بیچ کے ایک آدمی کو پیغام پہنچایا تھا۔ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ چیانگ رائے سے کوئی آدمی یہاں آیا ہوا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہم بعد میں اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

تھائی وانگ خاموشی سے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پرساد نو بجے کے قریب ہمارے پاس آیا تھا۔ اس کے ساتھ پروگرام بنانے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ آج ہم اپنے اصلی چہروں کے ساتھ اس مشن پر جائیں گے تاکہ دارا کو یہ بتا سکیں کہ ہم اس کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

پونے بارہ بجے کے قریب پرساد کار سے اتر کر سڑک کی طرف چلا گیا۔ میں اور تھائی وانگ کار میں بیٹھے رہے۔ پرساد کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے کار میں رکھا ہوا ایک تھیلا اٹھا کر اس میں سے ایک دو چیزیں نکالیں اور مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"وہ لوگ آگئے ہیں۔ کار میں ٹائیگر اور ایک بھاری بھر کم آدمی کے علاوہ ایک لڑکی بھی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' دارا پہلے ہی سے کوٹھی میں موجود تھا۔ پامیلا بھی یہیں ہوگی۔" میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا اور تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اپنا خیال رکھنا تھائی۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو ہمارا انتظار کرنے کے بجائے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں سے نکل جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ جاؤ۔" تھائی نے سر ہلا دیا۔

میں اور پرساد اس تاریک گلی میں چلتے ہوئے کوٹھی کی دیوار کے قریب آگئے۔ یہ کوٹھی کی عقبی گلی تھی۔ سامنے والی کوٹھیوں کے پچھواڑے بھی اس طرف تھے۔ اس طرح اس گلی میں رات کے وقت لوگوں کی آمدورفت نہیں ہوتی تھی اور یہاں روشنی کا انتظام بھی نہیں تھا۔

دیوار کے ساتھ ایک جگہ کوڑے کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں اس ڈھیر پر چڑھ گئے۔ دیوار کی بلندی اس طرح تین چار فٹ رہ گئی تھی اور اوپر خاردار تاروں تک بھی ہاتھ آسانی سے پہنچ سکتا تھا۔ پرساد نے جیب سے الیکٹرک ٹیسٹر نکالا اور ایک ایک تار کو چیک کرنے لگا۔ اندیشہ تھا کہ شاید رات کو ان تاروں میں برقی رو چھوڑ دی جاتی ہو لیکن کسی تار میں کرنٹ نہیں تھا۔ اس نے ٹیسٹر جیب میں رکھ لیا اور کٹر سے تار کاٹنے لگا۔ آٹھ آٹھ انچ کے فاصلے پر نیچے سے اوپر تک پانچ تار لگے ہوئے تھے۔ اس نے ایک طرف سے تمام تار کاٹ دیے۔

ہم دونوں دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے اندر کود گئے۔ درختوں کی وجہ سے اس جگہ اگرچہ اندھیرا تھا مگر کوٹھی کی کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے اور الگ الگ کھڑکیوں میں جھانکنے لگے۔ ایک کھڑکی سے جھانکتے ہی میں چونک گیا۔

وہ شان دار فرنیچر سے آراستہ بہت کشادہ ہال نما کمرا تھا۔ ایک صوفے پر دارا اس لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جو دوسرے آدمی کے ساتھ آئی تھی اور دوسرے صوفے پر پامیلا اس موٹے آدمی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ درمیانے قد کے اس آدمی کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر چینیوں جیسی مشابہت تھی۔ وہ نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا مگر ٹائی نہیں تھی۔ سفید قمیص کا کالر کوٹ کے کالر کے اوپر تھا۔ ایک سامنے کا اوپر والا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا۔

پامیلا اور اس دوسری لڑکی کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ دراز قامت کی مالک وہ لڑکی بھی بڑی حسین تھی۔ ان کے سامنے شراب کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ باتیں بھی کر رہے تھے مگر کھڑکی بند ہونے کی وجہ سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹائیگر اس کمرے میں نظر نہیں آرہا تھا۔

پرساد دبے قدموں چلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا اور آگے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم چل کر ہم رک گئے۔

"ہم برآمدے سے یا عقبی دروازے سے اندر داخل نہیں ہوسکتے۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "البتہ چھت پر پہنچ جائیں تو زینے کے راستے راہداری میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس طرف آؤ۔"

ہم دونوں دیوار کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوئے دوسری طرف آگئے اور وہاں سے چھت پر پہنچنا ہمارے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔ پرساد نے سیڑھیوں والے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر احتیاط سے گھمایا تو دروازہ آواز پیدا کیے بغیر آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ سیڑھیوں کا یہ دروازہ اندر سے لاک کرنے کی ضرورت شاید اس لیے نہیں سمجھی گئی تھی کہ وہ اس بنگلے کو محفوظ سمجھتے تھے اور کسی کے اندر داخل ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

سیڑھیوں پر اور نیچے راہداری میں اندھیرا تھا کیونکہ راہداری سے ہال میں داخل ہونے والا دروازہ بند تھا۔ ہم دونوں نے اپنے خنجر نکال لیے اور دبے قدموں سیڑھیاں اترنے لگے۔

اس راہداری کا دوسرا دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے کی جگہ پر شاید باتھ روم بنا ہوا تھا اور دوسری طرف بھی ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔

ہم دونوں ہال والے دروازے کے قریب رک گئے۔ میں نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ ٹائیگر اب بھی کمرے میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس موٹے آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دیا تھا۔ اس نے بغلی ہولسٹر پہن رکھا تھا اور بائیں بغل کے نیچے ریوالور کا دستہ جھانک رہا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"ٹائیگر نظر نہیں آرہا۔" میں نے پرساد کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

اندر ہی ہوگا۔" پرساد نے کہا "ہوشیار۔ میں دروازہ کھولنے لگا ہوں۔"

ں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا لیکن اس سے پہلے ہینڈل گھماتا' چٹ کی ہلکی سی آواز آئی اور راہداری میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ہم دونوں بیک وقت گھوم گئے۔ راہداری میں طرف والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ٹائیگر ریوالور ہاتھ میں لیے تھا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ریوالور کا رخ طرف تھا۔

خنجر پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھالو۔" ٹائیگر کے حلق سے غراہٹ "اتفاق سے میں نے تم لوگوں کو دیوار سے کودتے ہوئے دیکھ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ تم لوگ چور ہو مگر یہ چوری کا وقت ہے اور چور اس گھر میں کبھی نہیں گھستے جہاں تمام بتیاں جل رہی ہوں۔ خنجر پھینک دو۔"

اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم دونوں نے خنجر پھینک دیے۔

"ارے!" ٹائیگر بولا "تمہیں تو شاید میں نے پہلے بھی دیکھا ہے مگر مجھے اجنبی سا لگ رہا ہے۔" اس نے آخری الفاظ میری طرف دیکھ کر کہے تھے۔ ٹائیگر کا اور میرا آج تک آمنا سامنا نہیں ہوا تھا اور شاید اس لیے وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا "بہرحال' دروازہ کھولو اور اندر داخل ہو جاؤ۔ ہم معلوم کرلیں گے کہ تم لوگ کون ہو اور کس نیت سے یہاں آئے ہو۔ اے.... تم ایک ہاتھ سے دروازہ کھولو۔ دوسرا ہاتھ سر سے اوپر ہی رہنا چاہیے۔" اس نے پرساد کو اشارہ کیا۔

پرساد نے دایاں ہاتھ جھکا کر دروازے کے ہینڈل پر رکھ دیا۔ دوران میں ٹائیگر بھی اس دروازے سے نکل کر راہداری میں ہمارے پیچھے آچکا تھا۔ پرساد نے دروازہ کھول دیا۔

کمرے کا منظر بہت ہی شرم ناک تھا۔ دارا اس دراز قامت لڑکی کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھا اور پامیلا دوسرے آدمی کی بانہوں میں تھی۔ دروازہ کھلنے پر دارا نے لڑکی کے چہرے پر جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا اور پھر اس لڑکی کو دھکا دے کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس کے منہ سے ہلکا سا قہقہہ نکل گیا۔

"بہت تبدیلیاں آگئی ہیں تم میں مگر میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تم بالآخر میرے جال میں آہی گئے مسٹر وجدان۔ اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں نہیں بچا سکتی۔"

میرا نام سن کر ٹائیگر بھی اچھل پڑا "یہ.... یہ وجدان ہے۔" اس کے لہجے میں شدید حیرت تھی "پھر تو اسے فوراً ہی ختم کر دینا چاہیے تاکہ قصہ ہی تمام ہو جائے۔" اس نے ریوالور کا رخ میری طرف کر دیا۔

"نہیں ٹائیگر ابھی نہیں۔" دارا نے ہاتھ اٹھا دیا "اسے یہاں لانے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑی ہے۔ بڑا لمبا چوڑا جال پھیلانا پڑا تھا۔ یہ اس قدر آسانی سے ہمارے ہاتھ نہیں آیا جتنا تم سمجھ رہے ہو اور ابھی تو اس سے کچھ حساب بھی کرنا ہے۔ بہت نقصان پہنچایا ہے اس نے مجھے۔ اسے تو میں اس طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ دوسرے بھی عبرت حاصل کریں گے اور دارا کے سامنے آنے کی ہمت نہیں کریں گے۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے دارا۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ یہ انکشاف میرے لیے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ پامیلا ٹوٹی نہیں تھی بلکہ اس کے ذریعے ہمارے خلاف جال پھیلایا گیا تھا "اب وقت بدل چکا ہے۔ پہلے میں تم سے چھپتا پھر رہا تھا اور اب بھاگنے کی تمہاری باری ہے۔ تم زندگی بھر اس لیے بھاگتے رہو گے کہ تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"چھپڈی چھپڈی کا شوربا۔" دارا نے قہقہہ لگایا "ویسے اب تم بڑے ہو گئے ہو اور بڑی بڑی باتیں کرنا بھی سیکھ گئے ہو لیکن محض باتوں سے تو کوئی معرکہ سر نہیں کیا جا سکتا۔ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو؟"

"شاید تم بھول گئے ہو کہ صرف دو دن پہلے سنگاپور میں تمہارے تین آدمی اور دس کلوگرام ہیروئن پکڑی گئی ہے۔ انسپکٹر چیانگ شو کو میں نے ہی یہاں سے فون کرکے تمہارے ان آدمیوں کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور ان تین میں تمہارا کزن جمال بھی شامل ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم نے میرے باپ کو صرف اس لیے قتل کیا تھا کہ وہ تمہارے گھناؤنے مقاصد میں رکاوٹ پیدا کرسکتا تھا۔ میرا باپ نہیں رہا تو کیا ہوا۔ میں تو ہوں.... میں کہیں بھی تمہیں ٹکنے نہیں دوں گا اور مجھے تم سے اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا انتقام بھی لینا ہے۔"

دارا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ پہلے شاید وہ یہی سمجھتا رہا تھا کہ سنگاپور والے واقعے میں میرا نام محض مبالغہ ہے لیکن میرے منہ سے اپنے کزن جمال کا نام سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہا تھا۔

ٹائیگر ریوالور لیے تیار کھڑا تھا۔ دوسرا آدمی بھی صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا' پامیلا بھی اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"میں تمہیں اس گندگی سے نکالنا چاہتا تھا۔" میں نے پامیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن اب پتا چلا کہ گندگی کے کیڑے گندگی ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔"

"تم مجھے بے وقوف سمجھتے تھے کہ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے تمہارے ساتھ چھپتی پھرتی۔" پامیلا نے کہا "رامن پرساد پر تو مجھے پہلے ہی دن شبہ ہو گیا تھا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ تمہارا آدمی ہے تو صرف تین دن پہلے میں نے دارا کو بتا دیا اور پھر وہ سارا ڈراما تمہیں پھنسانے کے لیے کیا گیا تھا۔ تم

واقعی بے وقوف ہو۔ کس قدر آسانی سے میرے جال میں پھنس گئے۔"

"لیکن یہ جال بہت کچا ہے۔" میں نے جواب دیا "میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ مہاراج کے آدمی اس کوٹھی کو گھیرے میں لے چکے ہوں گے۔ تم لوگوں میں سے کوئی بھی یہاں سے بچ کر نہیں جاسکے گا۔"

دارا کے چہرے پر تشویش کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ اس نے جیب سے پستول نکال کر ہمیں اپنی زد میں لے لیا اور ٹائیگر کو اشارہ کیا۔ ٹائیگر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔

"باہر دور دور تک کوئی نہیں۔ یہ بلف کر رہا ہے ہمیں۔" اس نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ٹائیگر۔" دارا نے کہا "فی الحال ان دونوں کو باندھ کر ساتھ والے کمرے میں ڈال دو۔ ہم مسٹر شانگ سے بزنس کی بات کرلیں۔ بعد میں ان سے نمٹ لیں گے۔"

پامیلا اس وقت بھاری بھرکم شانگ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات تھے اور پھر اس نے وہ حرکت کی جس کی کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے مسٹر شانگ کے بغلی ہولسٹر میں سے ریوالور کھینچ لیا اور پشت پر پہنچ کر ریوالور کی نال شانگ کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے غرائی۔

"نہیں ٹائیگر۔ تم اس کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔ ریوالور پھینک دو اور تم بھی مسٹر دارا۔ میں تم دونوں کو صرف تیس سیکنڈ کا وقت دے رہی ہوں۔"

"یہ..... یہ تم کیا کر رہی ہو۔ پاگل ہوگئی ہو کیا؟" دارا چیخا۔

"پستول پھینک دو۔" پامیلا غرائی "میں صرف تین تک گنوں گی اور تین کہتے ہی اس کی کھوپڑی اڑا دوں گی۔" اس نے گنتی شروع کردی اور پھر اس نے جیسے ہی دو کہا' دارا اور ٹائیگر نے ہتھیار پھینک دیے۔

"اس میں شبہ نہیں کہ تم بہت چالاک ہو لیکن حد سے زیادہ چالاکی اور خود اعتمادی بھی لے ڈوبتی ہے۔" پامیلا دارا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں تمہاری فطرت سے واقف ہوچکی ہوں۔ اپنا مقصد پورا ہوجانے کے بعد تم اپنے وفاداروں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتے ہو۔ انسانی زندگی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ تم صرف اور صرف اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہو۔ تمہارا منصوبہ یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ مجھے بھی ختم کروا جائے کیونکہ اب میں تمہارے لیے اہم نہیں رہی۔ تمہیں شبہ تھا کہ سنگاپور میں تمہارے آدمیوں کے نام اور پتے میں نے وجدان کو دیے تھے اس لیے تم نے پروگرام بنایا تھا کہ وجدان ہاتھ آجائے تو اس کے ساتھ مجھے بھی ختم کردیا جائے۔"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے پامیلا۔" دارا نے کہا۔

"مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ میں نے فون پر ٹائیگر سے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔" پامیلا نے کہا "اور تم نے یہ بھی کہا تھا کر وجدان نے تمہارے بھائی کو قتل کیا تھا۔ اور تم اس قتل کا بدلہ لینا چاہتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نے اس کے بے گناہ ماں باپ کو قتل کیا تھا اور اسے بھی راستے سے ہٹانا چاہتے ہو کیونکہ یہ تمہارے اس سنگین جرم کا چشم دید گواہ ہے۔"

"یہ کہانی تم کو اس نے سنائی ہوگی۔" دارا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ بہت چالاک آدمی ہے۔ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی جھوٹی اور من گھڑت کہانیاں سناتا رہتا ہے اور اسی لیے اب تک بچا ہوا ہے۔"

"یہ درست ہے کہ یہ کہانی مجھے اس نے سنائی تھی لیکن۔" پامیلا کہہ رہی تھی "کل کی رات کا باقی حصہ میں نے کم کے ساتھ گزارا تھا۔ کم کے ساتھ میں پہلی مرتبہ بستر پر لیٹی تھی اور وہ اتنا خوش تھا کہ میری ہر بات کا جواب دیتا چلا گیا۔ اس نے اس کہانی کی تصدیق کردی ہے۔ تم ہی نے کم اور چی فانگ کو پیسے دے کر اس کے ماں باپ کو قتل کروایا تھا۔ تم بھی اس وقت وہاں موجود تھے اور پھر تم لوگ اس کے پیچھے پڑ گئے۔ تم نے کم سے وعدہ کیا تھا کہ اسے سنگاپور ریکٹ کا سربراہ بنا دو گے لیکن تمہارا اصل منصوبہ یہ ہے کہ وقت آنے پر کم اور چی فانگ کو بھی راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اب تمہیں ٹائیگر مل گیا ہے اور ٹائیگر کے ذریعے تم گولڈن ٹرائی اینگل تک پہنچنا چاہتے ہو۔ لیکن تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ تم نے میرے ساتھ بھی دھوکا کیا ہے لیکن تم شاید یہ بھول گئے ہو کہ عورت جب انتقام لینے پر آتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی روند ڈالتی ہے۔" پامیلا کے لہجے میں بے پناہ نفرت تھی۔ زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "پرساد۔ کھڑے کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ ریوالور اور پستول اٹھالو۔"

"تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو پامیلا۔" دارا بولا "میری باہیں اب بھی تمہارے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میرے دل میں میل آگیا تھا لیکن میں تمہیں قتل ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ آدمی بہت خطرناک ہے اگر بچ کر نکل گیا تو نہ صرف ہمیں بلکہ تمہیں بھی ختم کردے گا۔ بھول جاؤ۔ سب کچھ..... اب بھی وقت ہے۔"

"بند کرو بکواس۔" پامیلا چیخی۔

پرساد پستول اور ریوالور اٹھانے کے لیے آگے بڑھا تو ٹائیگر نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسادی۔ پرساد لڑکھڑا کر پامیلا سے ٹکرا گیا۔ پامیلا بھی لڑکھڑا کر پیچھے گر گئی۔

ہر ایک نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ ٹائیگر نے قالین پر پڑے ہوئے پستول کی طرف چھلانگ لگائی مگر پرساد نے سنبھل کر اسے چھاپ لیا۔ دارا بھی اپنے ریوالور کی

طرف جھپٹا لیکن میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرا ایک پیر دارا کے بائیں کندھے پر اور دوسرا پیشانی پر لگا تھا۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا تھا۔ میں اس کے قریب کھڑی ہوئی لڑکی سے ٹکرایا اور ہم دونوں صوفے پر گرے۔ صوفہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس لڑکی کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔

پامیلا صوفے کے پچھلی طرف گری تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر صوفے کے نیچے جا گرا تھا۔ بھاری بھرکم شانگ پہلے تو کچھ گڑبڑایا پھر وہ پامیلا کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ پامیلا نے اس کی کلائی پر دانت گاڑ دیے اور بری طرح بھنبوڑنے لگی۔ شانگ بلبلا اٹھا۔

پرساد ٹائیگر کی گرفت میں آچکا تھا لیکن پھر اچانک ہی اس نے ٹائیگر کے چہرے پر سر کی زوردار ٹکر ماری۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ پرساد نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بازی پلٹ دی۔ اب وہ ٹائیگر پر تابڑتوڑ حملے کر رہا تھا۔ ٹائیگر جس طرح پرساد کے ہاتھوں پٹ رہا تھا اس سے ایک اندازہ ہوا کہ اس جیسے بڑے بڑے بدمعاش خود اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ وہ خود کسی کا مقابلہ کرنے کی تاب نہیں رکھتے۔ ان کے رعب و دبدبے اور طاقت کا دارومدار ان کے کارندوں پر ہوتا ہے۔

دارا اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔ غصے کی شدت سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بھلا یہ بات اس کے لیے قابلِ برداشت کیسے ہوسکتی تھی کہ جو لونڈا اس کے خوف سے چھپتا پھر رہا تھا آج اس پر اس طرح بے خوف ہو کر حملہ آور ہو۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ گینڈے کی طرح طاقت ور تھا لیکن اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ لڑائی کے داؤ پیچ سے واقف نہیں تھا اور مجھے اس پر یہ برتری حاصل تھی کہ میں لڑائی کے فن سے واقف تھا۔

دارا نے مجھ پر حملہ کیا لیکن میں وار بچا گیا۔ دوسرے حملے میں میرا ہاتھ اس کی گرفت میں آگیا لیکن میں نے بازو چھڑانے کی کوشش کرنے کے بجائے کھڑے کھڑے اچھل کر الٹی قلابازی کے انداز میں اپنے جسم کو دہرا کیا اور اس کی گردن کو دونوں ٹانگوں کی قینچی میں لے کر اپنے آپ کو نیچے کی طرف جھٹکا دیا۔ میں خود تو نیچے گرا تھا لیکن دارا بھی سر کے بل نیچے گرا اور قلابازی کھاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس نے اٹھنے میں بھی بڑی پھرتی دکھائی تھی لیکن میں اس سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے گھونسا مارنے کے لیے حملہ کیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اچھل کر اس کی بغل میں زوردار کک لگا دی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کا بازو ابھی تک میری گرفت میں تھا۔ میں نے اچھل کر ایک اور کک لگائی اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر اس لڑکی پر گرا جو اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک فائر کی آواز سن کر میں پلٹا۔ بھاری بھرکم شانگ نے نہ صرف ریوالور پر قبضہ کرلیا تھا بلکہ پامیلا بھی اس کی گرفت میں تھی۔ اس نے پامیلا کو بازو کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پامیلا کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔

"اب اگر تم دونوں میں سے کسی نے حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔" شانگ چیخا۔

بازی پلٹ گئی تھی۔ ٹائیگر نے بھی بڑی پھرتی سے ریوالور اٹھا کر پرساد کو زد پر لے لیا تھا۔

دارا بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی میری کنپٹی پر زوردار گھونسا مار دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کئی کلوگرام وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ میں لڑکھڑا گیا۔ دماغ جھنجھنا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالنے میں کامیاب ہوسکا تھا۔

دارا نے آگے بڑھ کر پامیلا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"آوارہ کتیا!" وہ اس کے بالوں کو جھٹکے دیتا ہوا غرایا "تمہارا خیال درست تھا۔ اب مجھے واقعی تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ پہلے تو شاید ایک ہی گولی سے تمہارا خاتمہ کردیا جاتا لیکن اب تمہاری موت اتنی آسان نہیں ہوگی۔ میں تمہارے اس خوب صورت جسم کو اس طرح کاٹوں گا کہ....."

پامیلا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔ دارا نے اس کے بالوں کو جھٹکا دے کر سر اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر کئی گھونسے رسید کردیے۔ پامیلا ہر ضرب پر بلبلا اٹھتی۔ دارا نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اسے نیچے گرا دیا اور لپک کر راہداری والے دروازے کے قریب پڑا ہوا خنجر اٹھالیا۔

ٹائیگر نے مجھے اور پرساد کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا کرکے ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع نہیں تھا۔

پامیلا اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دارا نے پہلے اسے دو تین زوردار ٹھوکریں ماریں اور پھر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔

"میں تمہیں ایک وار میں نہیں' قسطوں میں موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ پہلے یہ تمہارے خوب صورت ہونٹ' پھر رخسار اور پھر تمہارے یہ..... جنہوں نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا تھا۔"

دارا اس کے سینے پر اس طرح بیٹھا تھا کہ پامیلا کی دونوں بانہیں بھی گھٹنوں کے نیچے دبا رکھی تھیں۔ پامیلا سر پٹخ رہی تھی۔ دارا نے بائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی کو گرفت میں لے لیا اور خنجر کی دھار اس کے ہونٹوں پر پھیر دی۔ پامیلا کے منہ سے خوف ناک چیخ نکلی۔ اس کا نچلا ہونٹ کٹ گیا تھا۔ دارا نے ٹھوڑی تک گوشت کاٹ ڈالا تھا۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

میں کانپ کر رہ گیا۔ دارا نے پامیلا کا ایک رخسار بھی کاٹ دیا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر ٹائیگر نے

ریوالور کو اس طرح حرکت دی کہ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔

دارا نے وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا اور پامیلا کے بلاؤز پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا سینہ برہنہ ہوگیا۔ دارا کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس کا خنجر والا ہاتھ حرکت میں آیا اور پامیلا کے سینے پر دائیں طرف سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ اس نے خنجر کا دوسرا وار سینے کے بائیں طرف کیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور میری بند آنکھوں کے سامنے وہ خوف ناک منظر ابھر آیا جب چی فانگ نے میری ماں پر اسی طرح خنجر سے وار کیے تھے۔ کردار بدل گئے تھے۔ منظر وہی تھا۔ پامیلا کی چیخوں کی آواز سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دارا اب پامیلا کے پیٹ پر خنجر کی نوک سے ایک گہری لکیر کھینچ رہا تھا۔ پامیلا ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح مچل رہی تھی لیکن دارا نے اسے اپنے بوجھ تلے نیچے دبا رکھا تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے پرساد کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلا۔ ٹائیگر نے فائر کردیا۔ گولی میرے پہلو کے قریب سے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسری گولی چلاتا' میری کک اس کی ٹھوڑی پر نیچے کی طرف لگی۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

پرساد بھی اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کی ٹھوکر دارا کے سر پر لگی تھی۔ دارا الٹ کر صوفے سے ٹکرایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ پامیلا قالین پر تڑپ رہی تھی۔ اس کے زخموں سے خون فواروں کی طرح اچھل رہا تھا۔

شانگ کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے فائر کردیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں ایک دم نیچے گر گیا تھا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ یہ گولی کھڑکی کے باہر سے چلائی گئی تھی جو شانگ کے بازو میں لگی تھی اور وہ بھی چیخ اٹھا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو مجھے تھائی وانگ کا چہرہ دکھائی دیا۔ دارا اور اس کا ساتھی یہ سمجھے کہ مہاراج کے آدمی آگئے ہیں۔ انہوں نے بیک وقت راہداری کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اور پرساد بھی ایک ہی وقت میں اپنی اپنی جگہ سے اچھلے تھے اور پھر ہم دونوں نے ٹائیگر ہی کو گرفت میں لیا تھا۔ میں ٹائیگر کو چھوڑ کر راہداری کی طرف لپکا لیکن باہر نکلتے ہوئے دارا نے دروازے کو دھکا دیا۔ میری پیشانی دروازے سے ٹکرائی۔ میں چیخ کر گر گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر پھر دروازے کی طرف لپکا۔ بدحواسی میں مجھ سے دروازہ بھی نہیں کھل سکا اور جب میں دروازہ کھول کر راہداری میں دوڑتا ہوا باہر آیا تو مجھے دیر ہو چکی تھی۔ دارا اور شانگ باہر کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ چکے تھے اور کار تیزی سے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔

اس دوران میں تھائی وانگ بھی دوڑتی ہوئی سامنے آگئی۔ دارا کا پیچھا کرنا بیکار تھا۔ میں اور تھائی اندر آگئے۔ پرساد ٹائیگر کو بری طرح رگید رہا تھا اور وہ دوسری لڑکی بے ہوش ہو چکی تھی۔

پامیلا کو دیکھ کر تھائی وانگ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پامیلا اب تڑپ نہیں رہی تھی۔ اب وہ ایک ہی جگہ پڑی تھی اور اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ زخموں سے بہنے والا خون اس کے جسم کے نیچے اور اردگرد ایک چھوٹے تالاب کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

"پامیلا.... آنکھیں کھولو پامیلا۔" تھائی وانگ اس کے قریب جھک کر بولی۔

پامیلا کی پلکوں کو حرکت ہوئی مگر اس کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ وہ جان کنی کی کیفیت میں تھی۔ اس کے جسم کو اب بھی ہولے ہولے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کا نچلا ہونٹ اور نیچے کا گوشت ٹھوڑی تک غائب تھا۔ نیچے والے دانت' جڑوں تک اور مسوڑے واضح نظر آ رہے تھے۔ ایک رخسار کٹا ہوا تھا۔ سینے کے دونوں طرف گوشت کے کٹے ہوئے لوتھڑے تھے اور پیٹ پر ناف تک تقریباً چھ انچ لمبی اور گہری دراڑ تھی جس سے اب بھی خون ابل رہا تھا۔ ایسی سفاکی کا یہ مظاہرہ میں نے اپنی آنکھوں سے دوسری مرتبہ دیکھا تھا اور ایک بات بہرحال طے تھی کہ ہم پامیلا کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اسے زندہ بچا لیا جاتا تو وہ میڈیکل سائنس کا ایک معجزہ ہی ہوتا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ پرساد نے ٹائیگر کو فرش پر اوندھا لٹا کر گھٹنے سے اس کی کمر کو دبا رکھا تھا اور اس کے گلے سے ٹائی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔ ٹائیگر کا چہرہ فرش سے چند انچ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے گلے سے ٹائی نکال کر پرساد کے حوالے کردی۔ پرساد نے ٹائیگر کے دونوں ہاتھ پشت پر سمیٹ کر ٹائی سے باندھ دیے اور اٹھ کر اس کی پسلیوں پر زوردار ٹھوکر رسید کردی اور پلٹ کر پامیلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت میں نے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ وہ پامیلا کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اس نے باری باری اس کی دونوں آنکھوں کو کھول کر دیکھا اور پھر گہرا سانس لیتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"گاڑی کہاں ہے؟" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔

"وہیں کھڑی ہے۔ گلی کے موڑ پر۔" تھائی وانگ نے جواب دیا۔

میں نے پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے باہر دوڑ گیا۔ صرف پانچ منٹ بعد پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور اس کے چند سیکنڈ بعد پرساد اندر آگیا۔ اس نے ٹائیگر کو بالوں

سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے اٹھایا اور باہر لے جانے کے لیے اس کے کولہے پر زوردار کک لگا دی۔ اس دوران میں' میں اس بے ہوش لڑکی کو اٹھا چکا تھا۔ وہ ہوش میں آچکی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور خوف سے چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ وہ پامیلا کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"اور یہ.... کیا اسے یہیں چھوڑ دیا جائے؟" تھائی وانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے پامیلا کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھائی۔" میں نے جواب دیا "یہ ہو سکتا ہے کہ باہر جا کر کہیں سے پولیس کو فون کردیں۔ پولیس نے اسے اسپتال پہنچا بھی دیا تو.... ویسے میرا خیال ہے کہ اب دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکے گی۔"

تھائی وانگ چند لمحے پامیلا کی طرف دیکھتی رہی اور پھر خاموشی سے باہر آگئی۔

"پرساد۔ تم اسٹیئرنگ سنبھالو۔ ہمیں دو نمبر مکان میں جانا ہے۔" میں نے کار کے قریب پہنچ کر کہا۔

پرساد نے ٹائیگر کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر دروازہ اندر سے لاک کردیا۔ میں نے دوسری طرف سے پہلے اس لڑکی کو اندر بٹھایا اور اس کے ساتھ خود بھی بیٹھ گیا۔ تھائی وانگ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ پرساد نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

کار کوٹھی سے نکل کر جیسے ہی گلی کے موڑ پر پہنچی' عقب سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ پولیس کی ایک گاڑی دوسری طرف سے گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ پرساد نے بڑی پھرتی سے کار دوسری گلی میں گھما دی۔

کوٹھی میں فائرنگ کی آوازیں سن کر کسی نے پولیس کو فون کردیا تھا اور ہم بروقت وہاں سے نکل آئے تھے۔

کوسا روڈ سے نکل کر گاڑی راما فور روڈ پر آگئی اور تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ ایک بجے کے لگ بھگ کا وقت تھا۔ سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا اس لیے پرساد کو گاڑی دوڑانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ یہ سیدھی سڑک واٹ ٹریمٹ اور اس سے آگے چائنا ٹاؤن کی طرف چلی گئی۔ پرساد نے واٹ ٹریمٹ سے پہلے ہی بنکاک سینٹر کے قریب سے کار ایک اور سڑک پر موڑ لی اور ہم سونگ واٹ روڈ سے ہوتے ہوئے چکرا پھیٹ روڈ پر آگئے اور پھر کنگ راما ون کے اسٹیچو والے چوک سے کار بائیں طرف مڑ گئی۔

میموریل برج سے دریا پار کر کے ہم تھان بوری ڈسٹرکٹ میں داخل ہو گئے تھے۔ پرساد بڑی مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ پولیس نے کوٹھی میں زخمی پامیلا یا اس کی لاش دیکھ کر ریڈیو ٹرانس میٹر پر اطلاع نشر کردی ہوگی اور اگر چیکنگ شروع ہوگئی تو ہم پھنس جائیں گے۔

لیکن خیریت گزری۔ ہم کسی حادثے سے دوچار ہوئے بغیر فران نوک روڈ پر پہنچ گئے۔ پرساد نے کار کی رفتار اس وقت کم کی تھی جب سوئے ننتی سیونتھ کی طرف مڑتا تھا۔

گلی میں سناٹا تھا۔ ایک بنگلے کے سامنے اس نے کار روک لی۔ بڑی پھرتی سے نیچے اتر کر گیٹ کھولا اور پھر کار اندر لے گیا۔

پرساد مشینی انداز میں حرکت کر رہا تھا۔ ہمارے کار سے اترنے سے پہلے وہ باہر کا گیٹ بند کر آیا تھا۔

وہ بنگلا تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں تہ خانے کا راستہ تھا۔ پرساد نے فرش پر بچھے ہوئے قالین کا کونا ہٹا کر چار مربع فٹ کا ایک تختہ ہٹا دیا جس کے نیچے تاریک سیڑھیاں تھیں۔ پرساد نے دیوار پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ آن کردیا۔ سیڑھیوں پر روشنی ہوگئی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر چند فٹ چوڑی لینڈنگ تھی اور ایک آہنی دروازہ تھا۔ پرساد نے دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہو کر بتی جلا دی۔ اس کے پیچھے ہی میں ٹائیگر کو لے کر اندر داخل ہوا تھا۔

تہ خانہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سیلن اور ایک ناگوار سی بو کا احساس نمایاں تھا۔ اس سیلن ہی کی وجہ سے دیواروں کا پلستر بھی جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ اس تہ خانے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر بھی گرد جمی ہوئی تھی۔

"ہاں تو مسٹر ٹائیگر۔ تم کچھ دیر یہاں آرام کرو۔ ہم بعد میں تم سے بات کریں گے۔" پرساد نے ٹائیگر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔

تہ خانے کا دروازہ بند کر کے ہم اوپر آگئے۔ تختہ فرش پر ڈال کر قالین برابر کردیا گیا۔ دوسرے کمرے میں تھائی وانگ اس لڑکی کو ریوالور کی زد پر لیے کھڑی تھی۔ وہ لڑکی ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں اور اس کا جسم اب ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' اس پر ریوالور تاننے کی ضرورت نہیں۔" میں نے تھائی وانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ نہ تو شور مچائے گی اور نہ ہی بھاگنے کی کوشش کرے گی۔ یہ تو پہلے ہی نیم مردہ ہو رہی ہے۔ اسے مزید دہشت زدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

تھائی وانگ نے ریوالور ہٹا لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں کافی بنا کر لاتا ہوں باس۔ اس کے بعد کوئی بات کریں گے۔" پرساد یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

میں تھائی وانگ کو اس لڑکی کے پاس چھوڑ کر گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ آراستہ و پیراستہ مکان تھا۔ ضرورت کی ہر چیز نظر آ رہی تھی۔ کچن میں ایک چھوٹا فریج بھی تھا کچھ برتن اور سربند خوراک کے کئی ڈبے بھی نظر آ رہے تھے۔

"میں ہر دوسرے تیسرے دن یہاں چکر لگا لیتا تھا۔" پرساد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے اندازہ تھا کہ ہمیں کسی ہنگامی

صورتِ حال میں ہی پناہ لینی پڑے گی اس لیے میں نے ضرورت کی ہر چیز یہاں جمع کر رکھی ہے باس۔"

میں نے پسندیدگی کے انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ کافی تیار کر چکا تھا۔ میں نے اپنا مگ اٹھالیا۔ پرساد نے باقی مگ ایک ٹرے میں رکھ لیے اور ہم کچن سے نکل کر کمرے میں آگئے۔ ایک مگ اس لڑکی کو بھی دیا گیا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے مگ سامنے چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

"تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔" میں نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں ہم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کافی پیو۔ اس سے تمہیں اپنے حواس پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔"

ہم سب اس وقت کافی جیسی تلخ چیز کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ کافی کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد میں اپنے آپ کو کچھ پرسکون سا محسوس کرنے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دارا کی درندگی دیکھ کر میں اپنے حواس پر قابو نہیں رکھ سکا تھا۔ اگر تھائی وانگ بروقت مداخلت نہ کرتی تو شاید میرا دماغ پلٹ جاتا۔

"تم وہاں اچانک کیسے پہنچ گئی تھیں؟" میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے تھائی وانگ کی طرف دیکھا۔

"تم لوگوں کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی تھی۔" تھائی نے جواب دیا "فائر کی آواز سنائی دی تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ نجانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم دونوں کسی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ میں نے ہینڈ بیگ میں سے ریوالور نکالا اور کار سے اتر کر اس طرف آنے لگی۔ جس وقت میں ٹوٹے ہوئے تاروں والے حصے سے دیوار پھاند کر کھڑکی کے سامنے پہنچی تو اندر کا منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس موٹے نے تم پر گولی چلائی تھی اور دوسرا فائر کرنے کا موقع دیے بغیر میں نے اس پر گولی چلادی۔ اگر میں وہاں نہ پہنچتی تو وہ تم دونوں کو بھی ختم کردیتے۔"

"اس وقت درپیش صورتِ حال کو دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میری موت یقینی تھی لیکن تم نے ایک بار پھر میری زندگی بچالی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اس لڑکی کی طرف دیکھنے لگا "تم بتاؤ۔ تم کون ہو؟"

"مم.... میں بے گناہ ہوں۔" وہ لڑکی ہکلائی "میں کچھ نہیں جانتی۔ آج ہی شام کو شانگ کے ساتھ چیانگ رائے سے آئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہاں آکر کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گی۔"

"شانگ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کک.... کچھ نہیں۔" اس نے جواب دیا "میں چیانگ رائے کے ایک نائٹ کلب کی رقاصہ ہوں۔ رقص میں نے شوقیہ طور پر سیکھا تھا لیکن حالات کی مجبوری مجھے نائٹ کلب تک لے گئی۔ مجھے کلب میں ڈانس کرتے ہوئے ابھی صرف تین ہی مہینے ہوئے ہیں۔ آج سے تقریباً بیس دن پہلے اس نائٹ کلب میں شانگ سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت جلد میرے قریب آگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بنکاک کے کسی بڑے نائٹ کلب میں اپنے فن کا مظاہرہ کروں۔ اس کا کہنا تھا کہ جو دولت اور شہرت مجھے بنکاک کے کسی بڑے نائٹ کلب میں صرف دو چار دن میں مل سکتی ہے وہ میں چیانگ رائے میں رہتے ہوئے زندگی بھر نہیں کما سکتی۔ میں لالچ میں آگئی۔ دولت اور شہرت ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے۔ میں نے بھی کوئی غلط نہیں سوچا تھا۔

"اور پھر ایک روز شانگ نے بتایا کہ اس نے بنکاک کے کلب ٹونٹی سکس سے بات کرلی ہے۔ یہ بہت بڑا نائٹ کلب ہے۔ اس کی شہرت میں نے چیانگ رائے میں بھی سنی تھی۔ میں نے شانگ سے پروگرام بنالیا اور آج اس کے ساتھ یہاں پہنچ گئی۔ ہم نے رائل بینجا ہوٹل میں قیام کیا۔ اس ہوٹل میں ہمارے لیے پہلے ہی سے ڈبل بیڈ کا ایک لگژری روم بک تھا۔ میں تو اتنے بڑے ہوٹل میں قیام کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"ہم گیارہ بجے تک ہوٹل کے کمرے میں رہے۔ اس دوران میں شانگ بار بار کسی کو فون کرتا رہا پھر ایک آدمی ہمیں لینے کے لیے پہنچ گیا۔ بعد میں اس کا نام ٹائیگر معلوم ہوا۔ شانگ نے مجھے بتایا تھا کہ ہم نائٹ کلب کے مالک سے ملنے جارہے ہیں۔ وہ مجھے اس بنگلے میں لے آیا۔ شانگ نے مجھے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اگر میں نے کلب کے مالک کو خوش کردیا تو مجھے کل ہی سے پروگرام ملنا شروع ہوجائیں گے۔

"لیکن اس بنگلے میں پہنچ کر ان کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ شانگ ہیروئن کی اسمگلنگ کے کسی ریکٹ کا ایجنٹ ہے اور وہ شخص بھی اسی بزنس سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے بہرحال اس کی پروا نہیں تھی۔ نائٹ کلبوں کی آڑ... میں ایسے بزنس تو ہوتے ہی ہیں۔ مجھے تو اپنے کام سے کام تھا۔ میں تو بنکاک کے سب سے بڑے نائٹ کلب میں ڈانس کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ صرف ایک رات پروگرام پیش کرکے میں اسٹار بن جاؤں گی۔ ٹائیگر کے بارے میں بھی مجھے بتا دیا گیا تھا کہ وہ بنکاک کی زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے۔ تمام چھوٹے بڑے نائٹ کلب اس کے کنٹرول میں ہیں۔ مجھے اس کو بھی خوش رکھنا پڑے گا۔ اس بنگلے میں جیسے ابھی یہی باتیں ہورہی تھیں کہ تم لوگوں کی مداخلت سے وہاں خونی کھیل شروع ہوگیا۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں تو ایک معمولی سی رقاصہ ہوں۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ اب مجھے یہ بھی یقین ہوگیا ہے کہ شانگ مجھے دھوکے سے یہاں لایا تھا۔" بات کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تمہارا نام کیا ہے اور چیانگ رائے میں کون سے نائٹ کلب میں تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام نویتا ہے اور میں وہاں کنٹری کلب میں تھی۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پرساد کو اشارہ کیا کہ وہ ٹیلی فون پر معلوم کرے کہ رائل بینجا ہوٹل میں شانگ کے نام سے کوئی کمرا بک ہوا تھا یا نہیں۔ پرساد اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

"اس ہوٹل میں مسٹر اور مسز شانگ کے نام سے ڈبل بیڈ لگژری روم بک ہے۔ وہاں سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ یہ دونوں گیارہ بجے کے لگ بھگ باہر گئے تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے۔" پرساد نے بتایا۔

"اس حد تک تو تمہارا بیان درست ہے۔" میں نے نویتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کل دن میں ہم چیانگ رائے سے بھی اس کی تصدیق کرلیں گے۔"

"مجھے کنٹری کلب کا فون نمبر معلوم ہے۔ ابھی تصدیق کرلو۔" نویتا جلدی سے بولی۔

میں نے پرساد کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے کمرے سے فون اٹھالایا اور اس کا پلگ دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا۔ میں نے نویتا سے پوچھ کر چیانگ رائے میں کنٹری کلب کا نمبر ملایا۔ اس سے پہلے مجھے ایریا کوڈ زیرو فائیو تھری ملانا پڑا تھا۔

کنٹری کلب میں رات دو بجے تک پروگرام چلتا تھا اور ابھی دو نہیں بجے تھے۔ میری کال جلد ہی ریسیو کرلی گئی۔ جب میں نے نویتا کے بارے میں دریافت کیا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

"وہ آج بنکاک جاچکی ہے۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ سپر اسٹار بننا چاہتی ہے۔ اب ہمارے کلب سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔"

"نویتا تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" میں نے کہتے ہوئے ریسیور نویتا کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ تقریباً دو منٹ تک رو رو کر فون پر بات کرتی رہی پھر میں نے اس سے ریسیور لے لیا "کیا تم اس آواز کو پہچانتے ہو؟"

"ہاں۔ یہ نویتا ہے لیکن اگر یہ بنکاک میں کسی مصیبت میں پھنس گئی ہے تو ہم اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔ ہمارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔"

میں نے فون بند کردیا۔ نویتا کے بیان کی تصدیق ہوگئی تھی۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ محض دولت اور شہرت کے لالچ میں شانگ کے ورغلانے پر اس کے ساتھ چلی آئی تھی اور شانگ اس سے کوئی اور کام لینا چاہتا تھا لیکن پہلی ہی رات زیر ہوگئی۔

"اب صورتِ حال یہ ہے۔" میں نے نویتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ایک قتل کی چشم دید گواہ ہو۔ پولیس کو بھی تمہاری ضرورت ہے اور پولیس سے زیادہ دارا اور شانگ کو تمہاری ضرورت ہوگی۔ وہ کبھی یہ نہیں چاہیں گے کہ تم پولیس تک پہنچ سکو۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی گولیوں سے بھون ڈالیں گے۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم پولیس کی پناہ میں چلی جاؤ۔ ان حالات میں پولیس ہی تمہیں تحفظ فراہم کرسکتی ہے۔"

"میں انہیں سمجھ گئی ہوں۔ وہ درندے ہیں۔ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ مجھے اس نے بتایا تھا کہ وہ بنکاک میں پہلی دفعہ آئی ہے۔ یہاں اس کا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔

"ٹھیک ہے۔ ہم صبح تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

میں اور پرساد تہ خانے میں آگئے۔ ٹائیگر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے اسے شاید اس طرح بیٹھنے میں بھی تکلیف محسوس ہورہی تھی۔

"ہاں تو مسٹر ٹائیگر۔" میں اس کے قریب پہنچ کر بولا "کیا تم ہمارے کچھ سوالوں کا جواب دینا پسند کروگے؟"

اور ٹائیگر نے جس طرح جواب دیا وہ ہمارے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کا گھونسا میرے جبڑے پر اور پیر کی زوردار ٹھوکر پرساد کی پنڈلی پر لگی تھی۔ ہم دونوں کراہ اٹھے۔ ٹائیگر نے اٹھ کر دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی تھی لیکن اسے دروازے تک پہنچنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے اور پرساد نے بیک وقت اس پر چھلانگ لگائی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ ٹائیگر نے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کس طرح کھول لیے تھے لیکن اب بہرحال وہ میرے اور پرساد کے بیچ میں فٹ بال بن گیا تھا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو ہمارے گھونسوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہا ہو۔ اس کی ناک، منہ اور کان سے بھی خون بہہ رہا تھا۔

پرساد نے تو ہاتھ روک لیا تھا لیکن میرے جنون میں کمی نہیں آئی۔ بنکاک کی زیر زمین دنیا کا شہنشاہ جس کے نام سے ہی لوگ کانپتے تھے، مکمل طور پر بے بس تھا اور میرے رحم و کرم پر تھا۔ ہم دونوں زمین پر گرے ہوئے تھے۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ہاتھ پیر پٹخ رہا تھا۔ اس وقت مجھے پکولا کے الفاظ یاد آرہے تھے۔ سانپ اپنے اندر مخفی چی کی قوت سے کام لے کر موٹے تازے پہلوان کی ٹانگ کی ہڈی بھی توڑ دیتا ہے۔ میں نے اپنا بازو سانپ ہی کی طرح ٹائیگر کی گردن پر لپیٹ رکھا تھا اور میرے جسم کی تمام تر قوت اس بازو میں سمٹ آئی تھی اور پھر میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ "کڑک" کی آواز ابھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ٹائیگر بری طرح مچل رہا تھا لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا جسم بے حس و حرکت نہیں ہوگیا۔

اور جب ہم لاش کو گھسیٹتے ہوئے تہ خانے سے باہر

لے کر آئے تھے تو نویتا ایک بار پھر خوف کی شدت سے تھر تھر کانپنے لگی تھی۔

یہ پرساد ہی کی تجویز تھی کہ رات ہی رات میں ٹائیگر کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔

"تم فکر مت کرو باس۔" پرساد نے کہا تھا "میں اسے اس طرح لے کر جاؤں گا کہ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو شبہ نہیں کرے گا۔"

پرساد ٹائیگر کی لاش کو کار میں ڈال کر لے گیا۔ اس کی واپسی دو گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔

"صبح تک وہ مچھلیوں کی خوراک بن چکا ہوگا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ ٹائیگر کی لاش کو دریا میں پھینک آیا تھا۔

رات اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ میں رہ رہ کر نویتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پولیس کے پاس بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ٹائیگر اور دارا وغیرہ کے خلاف پولیس کے پاس پہلے ہی سے بہت سارے ثبوت موجود تھے لیکن پولیس بھی شاید بے بس ہو گئی تھی کہ ان کے خلاف آج تک کوئی کارروائی نہیں ہو سکی تھی۔ اگر کوئی کارروائی ہوئی بھی تھی تو چھوٹی مچھلیاں ہی پکڑی گئی تھیں یہ مگرمچھ ہمیشہ محفوظ رہے تھے۔

نویتا پامیلا کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی چشم دید گواہ تھی۔ وہ یہی کہہ سکتی تھی کہ دارا نے اس کی موجودگی میں پامیلا کو ذبح کیا تھا لیکن آگے کوئی کارروائی کرنا تو پولیس کا کام تھا۔ اور پولیس اب تک تقریباً بے بس ہی نظر آئی تھی اور مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ نویتا کو پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے گا۔ موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔ کوشلیا' شائی وان اور اب پامیلا کی مثالیں میرے سامنے تھیں۔ انہیں بھی اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا کہ وہ ٹائیگر اور دارا کے خلاف زبان کھولنا چاہتی تھیں۔

ٹائیگر ختم ہو چکا تھا۔ بنکاک کی زیر زمین دنیا کا وہ بے تاج بادشاہ جس کے نام نے پورے شہر میں دہشت پھیلا رکھی تھی' اس کی موت بالآخر میرے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ویسے وہ بہت بزدل نکلا تھا۔ تہ خانے سے بھاگنے کی معمولی سی کوشش کے سوا اس نے اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بالکل کھوکھلا ثابت ہوا تھا اور میرے خیال میں ایسے لوگوں کا مر جانا ہی بہتر تھا۔

اس رات نویتا کو ایک کمرے میں بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا تاکہ ہماری غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم رات کے آخری پہر سوئے تھے اور تقریباً پورا دن سوتے رہے تھے۔ شام کو میں نے ماسٹر ہوچن کو فون کیا تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ٹائیگر کی لاش آج صبح سویرے ہی دریا سے مل گئی تھی۔

"شہر کے چند نوجوان صبح سویرے دریا پر مچھلیاں پکڑنے گئے تھے۔" ماسٹر ہوچن بتا رہا تھا "ٹائیگر کی لاش کنارے کے قریب ہی زیر آب جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کی قمیص ایک نوجوان کی مچھلیاں پکڑنے والی کنڈی میں پھنس گئی۔ پولیس کو اس لاش کے بارے میں اطلاع دی گئی اور جب لاش کی شناخت ہوئی تو پورے شہر میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آدھے سے زیادہ شہر بند ہو گیا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ ٹائیگر کے گرگے شہر میں تباہی مچا دیں گے۔ ٹائیگر کے زیرِ اثر علاقوں میں تو اب بھی شدید خوف و ہراس ہے۔ تمام نائٹ کلب اور شراب خانے بھی بند ہیں۔ چند بڑے ہوٹل کھلے ہیں جہاں پولیس کا زبردست پہرا ہے۔ سڑکوں پر بھی پولیس گشت کر رہی ہے۔ بعض علاقوں میں اِکّا دُکّا چھوٹے ہنگامے تو ہوئے ہیں لیکن کوئی بڑا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔"

"حیرت ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ لوگ ٹائیگر جیسے شخص کی موت پر خوشیاں منائیں گے۔ مٹھائیاں بانٹیں گے لیکن مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ ڈر کے مارے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے ہیں۔"

"ٹائیگر جیسا کوئی آدمی مرتا ہے تو اس قسم کا ردِ عمل تو ہوتا ہی ہے لیکن لوگوں نے بہرحال اس کی موت پر سکھ کا سانس لیا ہے۔ بہرحال' میں اس آدمی کی ہمت کی داد ضرور دوں گا جس نے ٹائیگر کی گردن مروڑ کر اس کی لاش دریا میں پھینک دی تھی۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

"یہ سعادت بھی تمہارے اس شاگرد کو حاصل ہوئی ہے ماسٹر۔" میں نے کہا۔

"کیا....؟" ماسٹر ہوچن شاید اچھل پڑا تھا۔

میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کی تفصیل بتا دی اور آخر میں کہا "وہ لڑکی نویتا اب میرے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا کروں۔"

"اسے ایک دو دن اپنے پاس ہی رکھو۔ بعد میں اس کے لیے کچھ سوچیں گے لیکن" ماسٹر ہوچن ایک لمحے کو خاموش رہ کر بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تم تو ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر نکلے۔ اب مجھے یقین ہے کہ دارا تمہارے سامنے نہیں ٹک سکے گا۔ اسے بھاگتے ہی بن پڑے گی۔"

"وہ بھاگنے والا نہیں ہے ماسٹر۔ میں اس کی فطرت کو سمجھ گیا ہوں۔ وہ ایک دو دن تک اپنی چوٹیں سہلائے گا اور پھر مجھ پر بھرپور وار کرنے کی تیاری کرے گا اور میں اس کی طرف سے غافل نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"گڈ۔" ماسٹر ہوچن بولا "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم اپنا دفاع کر سکتے ہو لیکن ہمیں تمہاری فکر رہتی ہے۔ ملاقات کب ہو رہی ہے؟"

"بس۔ ایک دو دن میں ماسٹر۔" میں نے کہا اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا۔

دارا وغیرہ کے خلاف ایک دو کامیابیوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں بہت طاقت ور اور اس پر حاوی ہو گیا ہوں۔ وقت اور تجربات نے اگرچہ مجھے زندہ رہنے کے چند گر سکھا دیے تھے لیکن ابھی تو اس راہِ خار زار پر میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ مجھے ابھی بہت کچھ سیکھنا تھا اور مجھے ماسٹر ہوچن اور مہاراج جیسے لوگوں کی سرپرستی کی ضرورت تھی۔ میں اس وقت بھی جو کچھ تھا انہی کی بدولت تھا۔ اگر مہاراج مجھے اپنی پناہ میں نہ لیتا تو آج میں اس طرح خود اعتمادی سے دشمن کے سامنے کھڑے ہونے کے بجائے اپنی جان بچانے کے خوف سے کہیں چھپا ہوا ہوتا۔ مجھے ماسٹر ہوچن اور مہاراج جیسے لوگوں کی ضرورت تھی۔ انہیں چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد تھائی وانگ نے جانکی دیوی کو فون کیا۔ وہ ہمارے لیے بہت پریشان تھی۔ صبح پہلے وہ خود بنگلے پر گئی تھی پھر دن میں کئی مرتبہ فون کیا تھا۔ تھائی نے اسے بھی تمام واقعات سے آگاہ کر دیا اور بتایا کہ ہم محفوظ ہیں۔ ایک دو دن بعد اس کے بنگلے پر جائیں گے۔ تھائی نے اسے یہاں کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔

نویتا نے ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ ساری صورتِ حال اب اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ یہاں سے باہر نکلتے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اس مکان کی چار دیواری ہی اس کے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ تھی۔ وہ اس پناہ گاہ سے باہر نہیں نکلنا چاہتی تھی اس لیے مجھے بھی اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اس پر ہم نے کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ اسے اگرچہ پورے گھر میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی لیکن وہ خود ہی ایک کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کچن تک چلی جاتی۔

نویتا پہلی مرتبہ بنکاک آئی تھی۔ اس کا باپ چیانگ رائے میں ٹورسٹ گائیڈ تھا۔ لیکن عرصہ پہلے ایک حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس وقت نویتا کی عمر بارہ سال تھی۔ ماں نے ایک ویٹرس کی حیثیت سے ہوٹل میں ملازمت کر لی۔ نویتا بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ جز وقتی کام کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ رقص کی تربیت بھی حاصل کرتی رہی۔ سیام (تھائی لینڈ) کے روایتی رقص کے علاوہ اس نے ہندوستانی رقص بھی سیکھا تھا لیکن یہ محض اس کا شوق تھا۔

ماں کی موت کے بعد وہ اکیلی رہ گئی۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور اس نے ملازمت شروع کر دی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر نہیں تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک تو بقول اسے وہ قیامت بن گئی تھی اور پھر وہ لباس بھی ایسے پہنتی کہ اس کے بدن کے نشیب و فراز نمایاں ہو جاتے۔ مردوں کی ہوس بھری نظریں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ وہ خوف زدہ ہونے کے ساتھ ایسی باتوں سے محظوظ بھی ہوتی تھی جن سے مردوں کے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہو۔ بعض اوقات تو وہ جان بوجھ کر بھی ایسی حرکتیں کرتی تھی۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنے آپ کو صاف بچا لے جاتی تھی لیکن ایک روز بکری چھری کے نیچے آ ہی گئی۔

نویتا کو اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ مرد اس کے حسن و شباب کے شیدائی ہیں۔ وہ اسے اپنے بستر کی زینت تو بنانا چاہتے ہیں لیکن نویتا کو کسی میں خلوص کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ وہ صرف اس کے جسم کے طلب گار تھے اور نویتا اس طرح مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے رقص کو اپنا وسیلہ روزگار بنانے کا فیصلہ کر لیا اور تین مہینے پہلے اس نے رقاصہ کی حیثیت سے کنڑی کلب میں پروگرام شروع کر دیے۔ یہاں شانگ سے ملاقات ہو گئی اور وہ اسے دھوکے سے بنکاک لے آیا۔ یہاں آ کر وہ ایسی مصیبت میں پھنس گئی کہ اسے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

اس دوران میں نویتا میرے بارے میں تھوڑا بہت جان چکی تھی۔ اس پر موت کا خوف طاری تھا اور وہ جانتی تھی کہ میں ہی اس کی کوئی مدد کر سکوں گا اس لیے وہ اس قدر شرافت کا ثبوت دے رہی تھی اور اس نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو تین دن گزر گئے تھے۔ نویتا سے باتوں میں انکشاف ہوا کہ پٹایا میں اس کی رشتے کی ایک خالہ رہتی ہے جو وہاں محکمہ سیاحت میں ٹورسٹ گائیڈ ہے۔

"بنکاک میں تمہاری زندگی محفوظ نہیں۔ چیانگ رائے تم واپس نہیں جانا چاہتیں۔ میرے خیال میں تم پٹایا چلی جاؤ۔ اپنی خالہ کے پاس۔ وہ جگہ تمہارے لیے محفوظ رہے گی۔" میں نے نویتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ظاہر ہے ہم اسے زیادہ عرصے تک اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تھے۔

نویتا بڑی مشکل سے آمادہ ہوئی تھی۔ دراصل وہ ہمارے ساتھ رہنے کو اپنے لیے محفوظ سمجھتی تھی اور ہمارا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔

پامیلا کے قتل (دوسرے روز مجھے پامیلا کی موت کی خبر مل گئی تھی) والے واقعے کو پانچ دن ہو چکے تھے۔ پولیس کی سرگرمیاں اگرچہ ماند پڑ گئی تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ ٹائیگر اور دارا کے آدمی شکاری کتوں کی طرح ہماری تلاش میں پورے شہر میں پھر رہے ہوں گے۔

پٹایا۔ یہ خوب صورت ساحلی شہر بنکاک کے مشرق میں تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے یہاں بہت سی دلچسپیاں تھیں۔ مقامی باشندے بھی بڑی تعداد میں اس طرف جاتے رہتے تھے۔ ہائی وے نمبر تین سے ڈھائی تین گھنٹوں کا راستہ تھا۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے علاوہ پرائیویٹ بسیں اور

کو چند بھی چوبیس گھنٹے چلتی رہتی تھیں۔

اس روز ہم صبح پانچ بجے گھر سے نکلے تھے۔ اسٹیرنگ کے سامنے حسب معمول پرساد تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر میں اور پیچھے تھائی وانگ اور نویتا بیٹھی ہوئی تھیں۔ مشرقی بس ٹرمینل تک پہنچنے کے لیے پورا شہر پار کرنے کی ضرورت تھی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ نویتا کو پتایا جانے والی بس پر بٹھا کر ہم جانکی دیوی والے بنگلے پر واپس چلے جائیں گے۔

اس وقت سڑکوں پر ٹریفک برائے نام ہی تھا۔ پرساد کو تیز رفتاری سے کار چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ مختلف سڑکوں اور پھر سوکھم وٹ روڈ پر ہوتے ہوئے ہم چھ بجے سے پہلے ہی بس اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ ہر دس پندرہ منٹ بعد کوئی نہ کوئی بس اڈے سے نکل رہی تھی۔

نویتا خوف زدہ تھی۔ میں بھی محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ نویتا ایک کوچ پر بیٹھ چکی تھی۔ تھائی وانگ نے اسے کچھ رقم بھی دے دی تھی۔ ہم اس وقت تک ٹرمینل پر کھڑے رہے جب تک بس حرکت میں نہیں آگئی۔

واپسی پر ہم ایکسپریس وے سے ہوتے ہوئے تھنگ ڈسٹرکٹ کی طرف نکل آئے اور مختلف چھوٹی سڑکوں پر ہوتے ہوئے تاکسن برج پار کرکے تھان بوری ڈسٹرکٹ میں داخل ہوگئے۔ وہاں سے جانکی دیوی والے بنگلے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بنگلے میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تھائی وانگ ناشتا تیار کرنے کے لیے کچن میں گھس گئی۔ ناشتے کے لیے کچھ چیزیں ہم راستے سے لیتے آئے تھے۔

جانکی دیوی کو ہم نے کل رات ہی اپنے پروگرام سے آگاہ کردیا تھا اس لیے نو بجے کے قریب اس کا فون آگیا۔

"تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے وجدان۔" جانکی نے کہا۔

"میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے بتایا تھا کہ اس رات کے ہنگامے میں شانگ' تھائی وانگ کی گولی سے زخمی ہوگیا تھا۔" جانکی دیوی نے کہا "میں نے اس چینی کا سراغ لگالیا ہے؟"

"کیا۔" میں اچھل پڑا۔ میں نے جانکی کو اس قسم کی کوئی ذمّے داری نہیں سونپی تھی کیونکہ میں اسے ان ہنگاموں سے دور ہی رکھنا چاہتا تھا "میں نے تو تمہیں ایسا کوئی کام نہیں کہا تھا جانکی دیوی۔" میں نے کہا۔

"محض اتفاق سے ہی اس کا پتا چلا ہے۔" جانکی دیوی نے جواب دیا "کل شام تمہارا فون آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میری ایک دوست سونالی مجھ سے ملنے آگئی تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ اسپتال میں سرجن ہے۔ اس نے بتایا کہ چند روز پہلے آدھی رات کے بعد اس کے گھر میں دو آدمی گھس آئے تھے۔ ایک بھاری بھرکم چینی اور دوسرا انڈین تھا۔ وہ دونوں زخمی تھے۔ چینی کو بازو میں گولی لگی تھی اور اس انڈین کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ میرا خیال ہے یہ اس رات کی بات ہے جب تمہاری دارا وغیرہ سے جھڑپ ہوئی تھی۔ انہوں نے سونالی کے چھ سالہ بیٹے کو یرغمال بنالیا اور سونالی سے اپنا علاج کرواتے رہے۔ وہ دونوں اب بھی اس کے گھر پر ہیں۔ انہوں نے سونالی کو دھمکی دی ہے کہ اگر اس نے ان کی موجودگی کے بارے میں کسی کو بتایا تو نہ صرف اس کے بیٹے کو بلکہ اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

"اوہ..." میں یہ بات سن کر اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شانگ کے ساتھ دوسرا آدمی دارا تھا۔ اس رات وہ میرے ہاتھوں بری طرح پٹا تھا "کیا تم مجھے سونالی کے گھر کا پتا بتا سکتی ہو؟"

"اگر تمہارا کچھ کرنے کا ارادہ ہے تو اس طرح سونالی اور اس کے بیٹے کی زندگی خطرے میں پڑجائے گی۔" جانکی دیوی نے کہا۔

"میں صرف اس مکان کی نگرانی کرنا چاہتا ہوں تاکہ جب وہ لوگ وہاں سے نکلیں تو ان کا تعاقب کرکے ان کے ٹھکانے کے بارے میں معلوم کیا جائے۔ یقین کرو جانکی۔ میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا نہیں تو اور کس کا یقین کروں گی۔" جانکی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "سونالی کا مکان اس جگہ سے زیادہ دور نہیں جہاں تھائی وانگ کا مکان تھا۔ تاکسن روڈ پر اسٹریٹ ایٹی ٹو میں دائیں طرف تیسرا مکان ہے۔"

"گڈ۔" میں نے کہا "اگر کوئی اور بات معلوم ہو تو مجھے فوراً اطلاع دینا۔" میں نے فون بند کردیا اور تھائی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"تاکسن روڈ۔ اسٹریٹ ایٹی ٹو۔" اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی "میرا مکان اس کے سامنے نہر کی طرف تھا۔ اسٹریٹ ایٹی ٹو میں میری ایک دوست رہتی ہے۔ ایک منٹ مجھے سوچنے دو۔ میں اس کا فون نمبر یاد کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

یہ ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ تھائی وانگ طویل عرصے سے اس علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ کچھ لوگوں سے اس کے تعلقات ضرور ہوں گے اور اتفاق سے اسٹریٹ ایٹی ٹو میں اس کی کوئی دوست بھی موجود تھی۔

"ایک منٹ!" تھائی وانگ خود کلامی کے انداز میں بولی اور پھر کاغذ اور بال پین اٹھا کر کچھ لکھنے لگی "یہ ہے اس کا نمبر۔ میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔"

وہ فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگی۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کرلی گئی۔

"ہیلو مائے۔ میں تھائی وانگ بول رہی ہوں۔" تھائی وانگ بولی۔ کچھ دیر تک دوسری طرف کی آواز سنتی رہی پھر بولی "ہاں مجبوری ہے۔ میں فی الحال سامنے نہیں آسکتی۔ تمہاری گلی میں سونالی نام کی کوئی ڈاکٹر رہتی ہے۔ اس کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہے۔"

"اس بے چاری کے ساتھ تو بہت بڑی ٹریجڈی ہوگئی ہے تھائی۔" دوسری طرف سے کہا گیا "دو بدمعاش پانچ چھ روز سے اس کے گھر میں گھسے ہوئے تھے۔ اسے دھمکی دی تھی کہ اگر ان کے بارے میں کسی کو بتایا تو وہ اسے اور اس کے بیٹے کو قتل کردیں گے۔ آج صبح چار بجے وہ اس کے بیٹے کو یرغمال بنا کر اس کے گھر سے نکلنا چاہتے تھے۔ سونالی نے مزاحمت کی تو انہوں نے نہ صرف اس کے بیٹے کو قتل کردیا بلکہ سونالی بھی شدید زخمی ہوئی ہے۔ وہ اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا اسپتال میں پڑی ہے۔ اس کے گھر پر پولیس کا پہرا ہے۔ پولیس والے اس گلی میں رہنے والوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ وہ کون لوگ تھے مگر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی تھیں؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ بھنک ملی تھی۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے میرا گھر جلایا تھا۔ میں سونالی کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن..."

"تم پولیس کو بتا کر اب بھی اس کی مدد کرسکتی ہو۔" سونالی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اگر پولیس کو ان کے بارے میں بتا دیا جائے تو انہیں آسانی سے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔"

"ہاں... میں پولیس سے رابطہ کروں گی اور ایک دو روز بعد تم سے ملاقات کروں گی۔" تھائی وانگ نے یہ کہتے ہوئے جواب کا انتظار کیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

"مائے کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور ساری باتیں سن لی تھیں۔ مجھے اس افسوس ناک واقع پر افسوس ہوا تھا۔ دارا واقعی خوں خوار بھیڑیا تھا۔ انسانی زندگی کی اس کے نزدیک واقعی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ بڑی بے رحمی سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا تھا۔

"مائے کا مساج پارلر ہے۔ ہوٹل پلازا میں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" تھائی وانگ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"اگر یہ قابلِ اعتماد ہو تو اس سے کچھ کام لیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا "دارا کے ٹھکانے کا پتا لگانا ضروری ہے اور اس کا سراغ اسی گیسٹ ہاؤس سے ہی مل سکتا ہے جہاں پہلی بار میری اس سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔ میں اور پرساد وہاں جا نہیں سکتے۔ تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ کام کسی ایسی ہستی سے لیا جاسکتا ہے جس پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا جاسکے۔"

"ایسی صورت میں مجھے خود مائے کے پاس جانا پڑے گا تاکہ اسے بات سمجھائی جاسکے۔" تھائی وانگ نے جواب دیا۔

اور پھر اسی رات بارہ بجے کے قریب ہم تاکسن روڈ کی اسٹریٹ ایٹی ٹو پر واقع مائے کے گھر میں موجود تھے۔ اپنے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے تھائی وانگ کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ مکان کی جگہ پر ملبے کا ڈھیر ابھی تک پڑا ہوا تھا۔

مائے کی عمر بتیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قامت اور حسین عورت تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ میں نے کسی میگزین کے ایک اشتہار میں اس کی تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن اس کا شوہر کئی سال پہلے برما گیا تھا اور اس کے بعد لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں خیال تھا کہ مر کھپ چکا ہے۔ زندہ ہوتا تو اس کے بارے میں کوئی اطلاع ضرور ملتی۔

مائے کو اپنی بات سمجھانے میں آدھا گھنٹا لگا تھا اور بالآخر وہ ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہوگئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "میں کل ہی سے اس مشن پر کام شروع کردیتی ہوں۔"

مائے سے رخصت ہوکر ہم واپس پہنچے تو رات کے دو بج رہے تھے۔

اس کے تیسرے ہی دن مائے سے ایک دلچسپ رپورٹ مل گئی۔ تھائی وانگ نے اسے خود فون کیا تھا۔ مائے نے بتایا کہ شانگ تو چیانگ رائے واپس جاچکا ہے اور دارا وقتی طور پر سوامی رگوناتھ کے آشرم میں پناہ لے چکا ہے جبکہ کم اور چی فانگ بھی شہر میں کسی جگہ روپوش ہیں۔

سوامی رگوناتھ کے آشرم کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ یتیم خانے کی طرح کا بے سہارا بچوں اور عورتوں کا کوئی ادارہ ہوگا لیکن تھائی وانگ میری یہ بات سن کر مسکرا دی تھی۔

"یہ اس طرح کا آشرم نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔" اس نے کہا۔

"آشرم تو آشرم ہی ہوتا ہے۔" میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر کہا۔ "میرا خیال ہے جانکی دیوی یہ کام کرسکتی ہے۔ وہ ہندو ہے اور کسی ہندو عورت کے لیے آشرم میں داخل ہونا زیادہ مشکل نہیں۔"

"پہلے میری بات سمجھ لو پھر اپنی بات کرنا۔" تھائی نے کہا "تم نے رجنیش دیوتا کے بارے میں کچھ نہیں سنا ہوا۔ یہ ہندوستان کا سنیاسی تھا۔ یہ غالباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔ اس نے ہندوستان کے شہر پونا کے قریب ایک چھوٹے سے آشرم میں عجیب و غریب اور پراسرار قسم کے روحانی خیالات کا پرچار شروع کیا۔ وہ فطرتاً ایک عیاش آدمی تھا۔ عورت' شراب اور دولت اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی مگر وہ کھل کر اپنی یہ خواہشات پوری نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے مذہب اور روحانیت کی آڑ لے کر ایسے خیالات کا اظہار کرنا شروع کردیا جن میں بنیادی طور پر جنسی بے راہ روی کو آزادی کا نام دیا گیا۔ دولت مند گھروں کی آزادی پسند لڑکیاں اور لڑکے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ اس کے چیلوں کی تعداد میں روز

بروز اضافہ ہوتا رہا۔ نشہ اور جنسی بے راہ روی اس کے مذہب میں جائز تھی۔ وہ خود ایسی اخلاق سوز حرکتیں کرتا اور اپنے چیلوں کو بھی اس کی ترغیب دیتا۔ اس کے چیلوں میں ایسی غیر ملکی عورتیں اور مرد بھی شامل تھے جو روحانیت کی تلاش میں دنیا بھر میں بھٹکتے رہتے تھے۔

"ہندوستان میں رجنیش پر پابندیاں لگنے لگیں تو وہ امریکا منتقل ہوگیا۔ وہاں بھی لوگ اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے چیلوں کو روحانی آسودگی حاصل ہوئی یا نہیں؟ یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن رجنیش کی خواہشات پوری ہو رہی تھیں۔ اس کے پاس عیاشی کا ہر سامان موجود تھا۔ سفر کے لیے لاتعداد رولس رائز کاریں' رہائش کے لیے عالی شان مکان' بڑھیا شراب اور جوان و حسین لڑکیاں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو روحانیت کی جستجو میں اس کے پاس آتی تھیں اور اس کے ایک اشارے پر بے لباس ہو کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگتی تھیں۔ رجنیش روس کے راسپوٹین سے زیادہ گندہ اور غلیظ آدمی تھا۔ وہ کچھ ایسی پراسرار قوتوں کا مالک تھا کہ ایک مرتبہ اس سے نظریں ملانے والا بھی کوئی شخص اس کے جال سے نکل نہیں سکتا تھا۔

"۱۹۸۵ء میں جب امریکیوں نے محسوس کیا کہ اس کی تعلیمات نوجوانوں کو جنسی بے راہ روی اور گمراہی کی طرف لے جارہی ہیں تو امریکی حکومت نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس پر لاتعداد مقدمات بھی قائم ہوئے پھر اسے ملک بدر کردیا گیا اور بالآخر ۱۹۹۰ء میں بھارت میں اس کا انتقال ہوگیا۔" تھائی وانگ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ سوامی رگوناتھ بھی اسی قسم کا آدمی ہے جو چند سال پہلے بھارت ہی سے یہاں آیا تھا۔ کچھ عرصہ وہ انڈین ٹمپل میں رہا لیکن اس کی غیر اخلاقی اور حیا سوز حرکتوں کی وجہ سے اسے مندر سے نکال دیا گیا۔ اس نے بنکاک کے مشرق میں قدیم شہر سے کچھ فاصلے پر ایک آشرم بنالیا تھا۔ جہاں وہ ایسی ہی تعلیمات دیتا ہے جس کا پرچار رجنیش بھگوان کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً اخبارات میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا ہے۔ بعض اخبارات نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ آشرم منشیات اور جرائم کا بہت بڑا اڈا ہے۔ لوگ سنگین جرائم کرنے کے بعد یہاں پناہ لیتے ہیں لیکن قانون آج تک اس کے خلاف حرکت میں نہیں آیا کیونکہ اس کے چیلوں میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو حکومت میں اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"دلچسپ۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "اس کا مطلب ہے' مائے کی رپورٹ درست ہی معلوم ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ جانکی دیوی کو مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں بھیجنے میں کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر وہ تیار نہیں ہوئی تو؟" تھائی وانگ نے کہا۔

"تو پھر کوئی اور ترکیب سوچیں گے۔ بہرحال' صبح میں خود جانکی سے بات کروں گا۔" میں نے کہا۔

اگلے روز جانکی دیوی سے بات ہوئی تو وہ فوراً ہی اس کے لیے تیار ہوگئی "اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو وہاں سے نکلنے میں دیر مت کرنا۔" میں نے کہا۔

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ وہ آشرم جرائم کا بہت بڑا اڈا ہے اور جرائم پیشہ لوگ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہیں پناہ لیتے ہیں اور جب ان کا معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو وہ آشرم سے نکل کر دوبارہ اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ بہرحال' میں کوشش کروں گی کہ معاملہ الجھنے نہ پائے۔" جانکی دیوی نے کہا۔

جانکی دیوی کے جانے کے بعد اس رات میں نے ماسٹر ہوچن سے بات کی۔ اس نے یہ دلچسپ خبر سنائی کہ ٹائیگر کی موت کے بعد پیڈرو نے زیر زمین دنیا کی کمان سنبھال لی تھی اور اس نے اعلان کیا تھا کہ جب تک ٹائیگر کے قتل کا بدلہ نہیں لے گا۔ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ ٹائیگر نے میرے سر کی قیمت ایک ملین بھات مقرر کر رکھی تھی۔ پیڈرو نے یہ قیمت دو ملین بھات کردی۔

پیڈرو کے بارے میں معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ کون ہے اور یہ معلومات صرف اور صرف رامن پرساد ہی حاصل کرسکتا تھا۔ رامن پرساد کو یقین تھا کہ اسے ٹائیگر کے کسی آدمی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سات آٹھ دن پامیلا کے ساتھ رہا تھا اور اس دوران میں اس نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ کبھی کسی آدمی کو اپنی نگرانی کرتے ہوئے نہیں پایا تھا۔ لیکن پھر یکایک مجھے ایک اور خیال آگیا۔ پرساد نے بتایا تھا کہ شروع میں اسے پامیلا کے ساتھ دیکھ کر انہیں کسی قسم کا شبہ ہوا تھا اور اس کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ پرساد کو ان کے کسی اڈے پر بھیجنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

"تم اس کی فکر مت کرو باس۔ وہ مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔" پرساد نے کہا "تمہیں یاد ہے جب میں یہاں سے گیا تھا تو میرے بال چھوٹے تھے اور لباس سے بھی میں بندے دا پتر ہی لگ رہا تھا اور ویسے بھی کئی روز ہوچکے ہیں۔ اگر بال بڑھا کر مونچھیں رکھ لی جائیں تو ان کے فرشتے بھی مجھے نہیں پہچان سکیں گے۔"

"لیکن اس میں کئی روز لگ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"کئی روز۔" پرساد مسکرایا "مونچھیں اور بال تو چٹکی بجانے میں آسکتے ہیں۔" وہ الماری میں سے براؤن بالوں والی ایک وگ اور مونچھیں نکال لایا۔

"یہ چیزیں کئی روز پہلے میں نے یہاں لا کر رکھی تھیں اور اب ان کے استعمال کا وقت آگیا ہے۔" اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وگ سر پر جمائی اور ٹوتھ برش ٹائپ کی مونچھیں ہونٹوں پر چپکالیں۔ اس حلیے میں واقعی اس کے چہرے میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔

"میں ایسے ہی ذرا ان کے علاقے کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ اگر کوئی گڑبڑ نظر آئی تو پروگرام بدل دیں گے۔"

میں جانتا تھا کہ پرساد میرے روکے نہیں رکے گا اس لیے میں نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس کی واپسی تقریباً چار گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ نویتا کو کار سے اترتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آرہی تھی۔ اندر آکر اس نے مجھے اور تھائی کو دیکھا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے پرساد کی طرف دیکھنے لگی۔ پرساد نے وگ اور مونچھیں اتار دیں تو نویتا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

"ہم نے تو تمہیں اس روز پتایا جانے والی کوچ پر سوار کرایا تھا۔ تم دوبارہ یہاں کیوں آگئیں؟" تھائی وانگ نے اسے گھورا۔

"یہ تمہیں کہاں سے ملی؟" میں نے نویتا کے بولنے سے پہلے پرساد سے پوچھا۔

"میں سوکھم واٹ روڈ کی طرف سے آرہا تھا کہ یہ ہوٹل بلیوارڈ کے سامنے کھڑی ہوئی نظر آئی۔ میں گاڑی روک کر اس کے پاس آگیا۔ میں نے اس سے بات کرنا چاہی تو یہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ ممکن ہے کہ مجھے کوئی غنڈا سمجھ کر شور مچا دیتی لیکن میں نے اسے اپنا نام بتایا اور کچھ پچھلی باتیں یاد دلائیں تو یہ خاموشی سے میرے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ تم لوگوں کو دیکھنے سے پہلے تک یہ ڈری ہوئی تھی اور شاید یہی سوچ رہی تھی کہ کسی غلط آدمی کے ہاتھ لگ گئی ہے۔"

"تم واپس کیوں آگئیں؟" اس مرتبہ میں نے نویتا سے پوچھا۔

"جب میں پتایا پہنچی تو بڑی مشکل سے میں نے اپنی خالہ کا ایڈریس تلاش کیا لیکن پتا چلا کہ وہ چیانگ رائے گئی ہوئی ہے اور ایک ہفتے بعد واپس آئے گی۔ وہاں مجھے خالہ کا ایک دوست مل گیا۔ وہ بھی محکمہ سیاحت میں ٹورسٹ گائیڈ ہے۔ اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر میں رہنے کو جگہ دے دی۔ تین چار روز تو خیریت سے گزر گئے اور پھر ایک روز وہ شراب کے نشے میں میرے کمرے میں گھس آیا۔ وہ اپنی ہمدردی کی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچایا اور صبح ہوتے ہی وہاں سے نکل گئی۔ دو تین دن ایک ہوٹل میں گزارے۔ وہاں بھی میں ہر وقت اپنے لیے خطرہ محسوس کرتی رہی۔ کل میں نے محکمہ سیاحت کے دفتر سے خالہ کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس نے ایک ہفتے کی مزید چھٹی لے لی ہے۔ میں آج دوبارہ بنکاک آگئی اور یہاں تم لوگوں کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ اگر شانگ کے آدمیوں نے دیکھ لیا تو مجھے گولی مار دیں گے۔"

"بنکاک جیسے شہر میں ایڈریس کے بغیر کسی کو تلاش کرلینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم پرساد کی نظروں میں آگئیں اور وہ تمہیں یہاں لے آیا۔ ویسے مجھے ایک اور بات یاد آرہی ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اس روز تم نے بتایا تھا کہ شانگ کے ساتھ شام کے وقت بنکاک پہنچی تھیں اور رات گیارہ بجے تک ہوٹل کے کمرے میں رہی تھیں پھر ٹائیگر اور شانگ کے ساتھ اس کوٹھی میں آگئی تھیں جہاں دارا تم لوگوں کا منتظر تھا۔ کیا اس دوران میں کسی اور آدمی سے بھی تم لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی؟"

"نہیں۔" نویتا نے مختصر سا جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ٹائیگر' پامیلا' دارا اور شانگ کے سوا کوئی اور تمہیں نہیں پہچانتا۔" میں نے کہا "پامیلا اور ٹائیگر مرچکے ہیں۔ شانگ چیانگ رائے واپس جاچکا ہے اور دارا ایک ایسی جگہ روپوش ہے جہاں سے کئی روز تک وہ باہر نہیں آئے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے اور تم آزادی سے گھوم پھر سکتی ہو۔"

بات نویتا کی سمجھ میں آگئی تھی۔

اور پھر اسی رات رامن پرساد اپنے مشن پر روانہ ہوا تو نویتا بھی اس کے ساتھ تھی۔ میری باتوں سے نویتا کا خوف بڑی حد تک ختم ہوگیا تھا اور اس کا اعتماد کسی حد تک بحال ہوا تھا۔

ان دونوں کی واپسی رات دو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ تشویش ناک خبر یہ تھی کہ پیڈرو نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ایک ڈیتھ اسکواڈ تشکیل دیا تھا جس میں بنکاک کے چار سفاک ترین پیشہ ور قاتل شامل تھے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ مجھے جہاں بھی دیکھیں' پکڑنے کی کوشش کرنے کے بجائے میرے ٹکڑے کردیں اور وہ ٹکڑے ایک بوری میں بند کرکے تحفے کے طور پر مہاراج کو بھیج دیے جائیں۔

ماسٹر ہوچن نے کئی بار مجھے خطرات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کی ہر بات کو ٹال دیا تھا لیکن اب صورت حال سنگین تر ہوچکی تھی۔ میں بزدل تو نہیں تھا۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا تھا اس سے میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی لیکن حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ میں ایک دو دشمنوں کا مقابلہ تو کرسکتا تھا لیکن قاتلوں کا ایک گروہ میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

اگلے روز ایک اور تشویش آمیز خبر سننے کو ملی۔ پیڈرو کے آدمیوں نے فران نوک روڈ والے اس مکان کا سراغ لگا لا تھا جہاں میں نے ٹائیگر کو ہلاک کیا تھا اور تہ خانے سے ٹائیگر کی گھڑی بھی انہیں مل گئی تھی جو لڑائی کے دوران میں اس کی کلائی سے نکل کر وہاں گر گئی تھی۔

یہ خبر بھی اس روز پرساد ہی نے سنائی تھی۔ اس رات وہ

گیسٹ ہاؤس کا چکر لگا کر آیا تھا اور جس میز پر وہ نویتا کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اس کے پیچھے والی میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمی یہ باتیں کر رہے تھے۔

"پیڈرو تو کچھ زیادہ ہی تیز جا رہا ہے۔" میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس نے فران نوک والے مکان کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتا ہے۔ سب سے پہلے وہ لوگ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ مکان کس نے کرائے پر لیا تھا۔"

"مکان کے ایگری منٹ کے ذریعے تو وہ میرا سراغ نہیں لگا سکتے۔ میں نے ایک فرضی نام اور پتا لکھوایا تھا اور جب نوٹ سامنے رکھے ہوئے ہوں تو اسٹیٹ ایجنٹ بھی کسی بات پر زیادہ اصرار نہیں کرتا۔ اسے اپنے کمیشن سے مطلب ہوتا ہے۔ البتہ یہ کار ہمارے لیے کچھ الجھن پیدا کر سکتی ہے۔" پرساد نے کہا۔

میں کچھ بولنے کے بجائے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کار کرائے پر لیتے وقت میں نے فلیٹ کا پتا لکھوایا تھا۔ اس فلیٹ سے وہ کچھ معلوم نہیں کر سکتے لیکن کار کی نمبر پلیٹ.... یہ کار اس مکان میں بھی جاتی رہی ہے اور یہاں بھی۔ اس مکان کے پڑوسیوں سے وہ کار کے بارے میں بھی معلوم کر لیں گے اور پھر اگر وہ لوگ ادھر آ گئے، جیسا کہ مجھے توقع ہے، تو ان کے لیے یہ معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ اس کار کا تعلق اس بنگلے سے بھی ہے۔"

"اور انہیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ یہ بنگلا جانکی دیوی کا ہے۔ اس طرح جانکی کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم اسے خطرے سے آگاہ کر سکیں۔" میں نے کہا۔

"ایک طریقہ ہے۔" پرساد بولا۔

"وہ کیا....؟" میں نے پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم یہ بنگلا فوری طور پر چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ پر منتقل ہو جائیں اور میں آج ہی رات سوامی رگوناتھ کے آشرم پہنچ جاتا ہوں تاکہ جانکی دیوی کو اس خطرے سے بچایا جا سکے۔" پرساد نے کہا۔

"تجویز معقول ہے۔" میں نے کہا اور فون کا ریسیور اٹھا کر ماسٹر ہوچن کا نمبر ملانے لگا۔

کال ماسٹر ہوچن کے ایک شاگرد نے ریسیو کی تھی لیکن میرا نام سنتے ہی اس نے ماسٹر ہوچن کو بلا دیا۔

"تم کہاں ہو۔" ماسٹر ہوچن میری آواز سنتے ہی چیخا "تم اس وقت سخت خطرے میں ہو۔ تمہیں چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میری ایک اطلاع کے مطابق وہ تمہارے ایک ٹھکانے کا پتا لگا چکے ہیں۔ اس مکان کے تہ خانے سے انہیں تائیگر کی گھڑی اور کچھ ایسی چیزیں ملی ہیں جو تمہاری نشان دہی کرتی ہیں۔ پیڈرو کو سو فی صد یقین ہے کہ تائیگر کو تم نے ہی ہلاک کیا ہے۔ وہ تمہارے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا ماسٹر ہوچن!" میں نے پوچھا۔

"ہم نے تمہاری طرف سے آنکھیں بند نہیں کر رکھیں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "ہمارے آدمی چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور یہ خبر تو پورے انڈر ورلڈ میں گردش کر رہی ہے کہ پیڈرو نے تمہارے ایک ٹھکانے کا پتا چلا لیا ہے اور وہ بہت جلد تمہیں چھاپنے والا ہے۔ ویسے تم ہو کہاں پر۔ مجھے اپنی لوکیشن بتاؤ تاکہ میں اپنے آدمی بھیج دوں۔"

"یہ تمام خبریں مجھے بھی مل چکی ہیں ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "میں بھی اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میری یہ پناہ گاہ محفوظ نہیں رہی۔ میں اس وقت ناکسن روڈ کے قریب ہوں اور ہم یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں۔"

"تمہارے ساتھ تھائی وانگ کے علاوہ اور کون ہے؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"دو افراد اور ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ایک گھنٹے بعد ایک سیاہ وین تمہیں کنگ ناکسن کے اسٹیچو والے چوراہے کے قریب کھڑی ملے گی۔ گانگ کو تم پہچان لو گے۔ ویسے میرے کچھ آدمی ریلوے اسٹیشن کی طرف بھی موجود ہیں۔ میں انہیں خبردار کر دیتا ہوں۔"

فون بند ہو گیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور ان لوگوں کو صورت حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے وہاں سے نکلنے کی تیاری شروع کر دی۔ ہم نے ہر وہ چیز سمیٹ لی جس سے وہاں ہماری موجودگی کا ثبوت مل سکتا تھا۔ ویسے میرے خیال میں یہ بیکار ہی تھا کیونکہ جب انہیں پتا چل جائے گا کہ ہم یہاں تھے تو کسی موجودگی یا عدم موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

کنگ ناکسن کے مجسمے والا چوراہا وہاں سے صرف دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جب ہم بنگلے سے نکلے تو گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گاڑی ہم نے بنگلے ہی میں چھوڑ دی تھی۔ اسے استعمال کرنا اب خطرناک ہو سکتا ہے۔ گیٹ کو تالا لگا کر چابیوں کا گچھا تھائی نے اپنے بیگ میں ڈال لیا اور ہم چاروں اکٹھے ہی چوراہے کی طرف چلنے لگے۔

ناکسن اسکوائر پر اس وقت خاصی رونق تھی۔ چوراہے کے وسط میں بہت بڑا گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ چبوترے کے عین وسط میں ایک اور چبوترے پر کنگ ناکسن کا مجسمہ تھا۔ اس کے بیس پر چاروں طرف چار شیروں کے مجسمے تھے۔ اس بیس کے اطراف میں ایک حوض سا بنا ہوا تھا۔ چاروں شیروں کے منہ میں فوارے لگے ہوئے تھے۔ شام کو یہ فوارے کھولے جاتے تھے تو پانی اس تالاب میں گرتا رہتا تھا۔ بڑے چبوترے کے گرد تقریباً چار فٹ اونچا لوہے کا جنگلا تھا۔ آمدورفت کے لیے چار آہنی سلاخوں والے دروازے بھی تھے لیکن وہ دروازے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ جنگلے کی کئی سلاخیں بھی غائب تھیں اور کئی جگہوں پر کچھ سلاخیں مڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

جنگلے کے اندر والے چبوترے اور اس کے اطراف میں گولائی میں بنے ہوئے فٹ پاتھ پر چرسیوں اور موالیوں کا قبضہ تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو نشے کے عادی تھے اور ان کے پاس سر چھپانے تک کو جگہ نہیں تھی۔ دن میں تو یہ لوگ اِدھر اُدھر گھومتے رہتے اور شام ہوتے ہی یہاں جمع ہونا شروع ہو جاتے۔

چوراہے پر پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سیاہ وین کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک سفید رنگ کی ایک کار اس گلی کے موڑ پر رکی۔ اس میں تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دو پیچھے۔ وہ کار چند سیکنڈ وہاں رکی اور پھر گلی میں داخل ہو گئی۔

"وہ کار دیکھی تم نے؟" پرساد نے میرے قریب آکر سرگوشی کی "وہ تینوں تائیگر کے آدمی ہیں۔ جو شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اسے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

صورت حال خطرناک ہو گئی۔ اگر وہ گلی میں مڑنے کے بجائے سیدھے ہماری طرف آ جاتے تو ہمیں دیکھ لیا جاتا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سیاہ وین کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"یہاں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔" میں نے انہیں اشارہ کیا ہم سڑک پار کرکے مجسمے والے چبوترے پر آ گئے۔ جنگلے کے بیرونی فٹ پاتھ پر بھی موالی قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ ہم جنگلے کے اندر آ گئے۔ یہاں عجیب صورت حال تھی۔ کوئی لیٹا ہوا تھا، کوئی سر نیہوڑائے بیٹھا ہوا تھا اور کوئی ہونق سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف تھوڑی سی جگہ نظر آئی تو ہم وہاں بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب ہی دو آدمی بیٹھے حشیش بھرے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ حشیش کی بو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی انکشاف ہوا کہ ان دونوں میں ایک عورت تھی۔

ہم ان موالیوں کے درمیان اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ اگر سڑک پر سے کوئی اس طرف دیکھے تو ہم نظروں میں نہ آ سکیں۔

دس منٹ گزر گئے۔ سیاہ وین ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میری تشویش بڑھ رہی تھی اور پھر اسی لمحے وہ سفید کار گلی سے نکل کر تیز رفتاری سے ایک طرف چلی گئی۔ اس میں صرف ڈرائیور تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ انہوں نے وہ بنگلا تلاش کر لیا تھا۔ پیڈرو واقعی بہت تیزی دکھا رہا تھا۔

تین اور موالی ہمارے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ان میں ایک مرد تھا اور دو عورتیں۔ وہ بھی حشیش بھرے سگریٹ پی رہے تھے۔ ایک عورت نے سلگتا ہوا سگریٹ تھائی وانگ کی طرف بڑھا دیا۔ تھائی وانگ نے سگریٹ لے کر کش لگایا اور سگریٹ واپس کر دیا لیکن سگریٹ کے ایک ہی کش نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ تھائی وانگ بُری طرح کھانسنے لگی۔ اس کی آنکھوں اور ناک سے بھی پانی بہہ نکلا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال سکی تھی لیکن اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

پانچ منٹ اور گزر گئے اور پھر سیاہ رنگ کی ایک وین چوراہے کی دوسری طرف سڑک کے کنارے پر رکی اور پھر میں نے گانگ کو وین سے اترتے دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

"چلو.... وین آ گئی ہے۔ اس طرف۔" میں نے سرگوشی کی۔

ہم چاروں اٹھ کر چبوترے کی دوسری طرف چلنے لگے۔ حشیش بھرے سگریٹ کے ایک ہی کش نے تھائی وانگ کی حالت بگاڑ دی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ میں نے تھام رکھا تھا۔ آہنی جنگلے سے نکل کر ہم سڑک پر آ گئے۔

ہم سڑک کے وسط میں تھے کہ وہ سفید کار بائیں طرف سے گھومتی ہوئی ہمارے سامنے سے گزری اور چند گز آگے جا کر بریکوں کی تیز چرچراہٹ سے رک گئی۔ دروازہ کھلا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ ہماری طرف تھا۔ نویتا کے منہ سے خوف ناک چیخ نکل گئی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ آدمی گولی چلاتا فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ وین کے قریب کھڑے ہوئے گانگ نے اسے دیکھ لیا تھا اور صورت حال کا اندازہ لگاتے ہی اس نے گولی چلا دی تھی۔

گولی اس شخص کے پیٹ میں لگی۔ وہ نیچے گرا۔ ریوالور بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چند فٹ دور جا گرا تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ شخص سڑک پر رینگتا ہوا ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

"وجدان بھاگو۔ وین میں.... جلدی۔" گانگ چیخا۔ اس نے ایک اور گولی چلا دی تھی۔

وین کا پچھلا دروازہ کھلا۔ ایک اور آدمی نیچے اترا۔ اس نے بھی فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے پہلے تھائی اور نویتا کو وین میں سوار کرایا پھر خود اوپر چڑھ گیا۔ پرساد میرے ساتھ ہی تھا۔ گانگ نے چیخ کر کہا اور وین تیزی سے حرکت میں آ گئی۔ گانگ کا دوسرا ساتھی دوڑتا ہوا چلتی وین پر سوار ہوا تھا۔

چوراہے پر بھگدڑ مچ گئی تھی لیکن ہماری وین چند سیکنڈ میں ہی وہاں سے بہت دور نکل چکی تھی۔

ہماری منزل واٹ ٹرِیمٹ تھی۔ جسے مہاراج نے اپنا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ یہ وہ خانقاہ تھی جہاں فاسٹنگ بدھ کا خالص سونے کا دنیا کا سب سے بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

ہمیں فوراً ہی مہاراج کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہاں ماسٹر ہوچن بھی تھا۔ مہاراج نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کہا کچھ نہیں پھر ماسٹر ہوچن کو اشارہ کر دیا۔

ہمیں ایک اور وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ مہاراج کے رویے سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مجھ سے ناراض تھے۔

دوسرے دن بڑی مشکل سے میں مہاراج سے اجازت لے کر پرساد کے ساتھ سوامی رگوناتھ کے آشرم کی طرف روانہ ہوگیا۔ مہاراج نے ہمیں ایک کار بھی مہیا کردی تھی۔ آشرم کے سامنے ایک وسیع میدان میں لاتعداد کاریں کھڑی تھیں۔ آشرم کے گرد بہت اونچی چار دیواری تھی جس نے کئی ایکڑ زمین گھیر رکھی تھی۔ آمدورفت کے لیے صرف ایک ہی گیٹ تھا۔ گیٹ کے اندر ایک استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا جہاں نیم عریاں لباس میں ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک کمرا تھا۔

سوامی رگوناتھ کے حلقے میں داخل ہونے کے لیے دھرم کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ لڑکی نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور ایک طرف رکھی ہوئی بڑی سی پیٹی کی طرف اشارہ کیا جس پر ڈونیشن لکھا ہوا تھا۔ میں نے اور پرساد نے کچھ نوٹ اس پیٹی میں ڈال دیے۔ لڑکی نے دو ہڈ کاؤنٹر کے نیچے سے نکال کر ہماری طرف بڑھا دیے۔ کپڑے کے بنے ہوئے یہ ٹوپ پہن لینے سے نہ صرف پیشانی بلکہ چہرے کا بہت سا حصہ بھی چھپ گیا تھا۔ ہم ٹوپ پہن کر ایک دروازے میں داخل ہوگئے۔

اندر کی دنیا ہی نرالی تھی۔ ایک طرف آشرم کی عمارت تھی اور اس کے سامنے کنکریٹ کی چھت والا بہت بڑا شیڈ تھا۔ چھت کو سہارا دینے کے لیے لاتعداد ستون تھے۔ نیچے پختہ فرش تھا۔ اس شیڈ کے نیچے بیک وقت پندرہ سولہ سو افراد بیٹھ سکتے تھے۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ تقریباً دو سو افراد اس وقت وہاں موجود تھے اور ہماری طرح بہت سے افراد آرہے تھے۔ شیڈ سے آگے تاریک ویرانہ تھا جہاں اونچے نیچے ٹیلے اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

اتنے لوگوں میں کسی کو تلاش کرلینا آسان نہیں تھا جبکہ لوگوں کے چہرے ہڈ میں چھپے ہوئے تھے لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی جستجو کے بعد ہم نے جانکی دیوی کو تلاش کرلیا۔

"کیا دارا یہاں موجود ہے؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وہ آشرم کے اندر ہے۔ سوامی کے ساتھ ہی باہر آئے گا۔" جانکی نے جواب دیا۔

لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور پھر ٹھیک بارہ بجے لوگ اس وسیع و عریض شیڈ میں جمع ہوگئے۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی سوامی آشرم سے برآمد ہو کر ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ وہ عجیب بدہیئت آدمی تھا۔ گنجا سر، بٹن جیسی چھوٹی آنکھیں، پھولے ہوئے گال، نوک دار ٹھوڑی اور بہت بھدے اور بھاری ہونٹ۔ اس کی گردن بہت مختصر تھی۔ لگتا تھا تربوز جیسا بڑا سر شانوں پر ٹکا دیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ چار پانچ لڑکیاں تھیں جن کے جسموں پر لباس برائے نام ہی تھا۔ وہ لڑکیاں اس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔ ہڈ والے تین آدمی پیچھے کھڑے تھے۔

سوامی رگوناتھ بھاشن دینے لگا۔ لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ سوامی کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ اشتعال دلانے والا۔ اس کی باتوں کا رخ بدلتا جارہا تھا۔ ننگی اور عریاں باتیں۔ جنسی جذبات کو بھڑکانے والی باتیں۔ اس کے قدموں میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اب حرکت میں آگئی تھیں۔ کوئی اس کی بانہوں سے اور کوئی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ شیڈ میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی کسمانے لگے تھے۔ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کو چھونے لگے تھے۔ شیڈ کی بتیاں اس طرح بجھ رہی تھیں جیسے آہستہ آہستہ شام ڈھل رہی ہو اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ سوامی کی آواز اس اندھیرے میں پھیل رہی تھی۔

"تم سب ایک دوسرے کے لیے ہو۔ مرد اور عورت کو ایک دوسرے کے لیے بنایا گیا ہے۔ سماج معاشرہ ڈھونگ ہے۔ ایک دوسرے سے دور ہوگے تو گھاٹے میں رہوگے۔ قریب ہو جاؤ فاصلہ مٹا دو کہ فاصلے ہی دوریاں پیدا کرتے ہیں....."

لوگ ایک دوسرے کی طرف جھک رہے تھے۔ جانکی دیوی نے مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا اور ہڈ کھسکا کر میرے چہرے پر بوسے دینے لگی۔

"یہ کیا کررہی ہو جانکی!" میں نے سرگوشی کی۔

"مجھے اپنی بانہوں میں لے لو۔" جانکی نے بھی سرگوشی کی "ورنہ کوئی اور مجھے لے جائے گا۔"

لوگ جوڑوں کی صورت میں اٹھ اٹھ کر اِدھر اُدھر جانے لگے تھے۔ شیڈ میں دور کہیں مدھم سی روشنی کا ایک بلب جل گیا۔ جانکی دیوی مجھے اس طرف لے جارہی تھی جہاں بہت مدھم سی روشنی ہورہی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ پرساد بھی ہمارے پیچھے ہی کسی عورت کو دبوچے ہوئے آرہا تھا۔

"ہم پچھلے دروازے سے آشرم کی عمارت میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔" جانکی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

ہم لوگوں کے ہجوم سے دور ہٹتے جارہے تھے اور پھر اچانک ایک آدمی بے خیالی میں ہم سے ٹکرا گیا۔ اس کے ساتھ بھی ایک عورت تھی۔ ٹکر اس طرح ہوئی تھی کہ ہم دونوں نیچے گرے تھے۔ میرے سر سے ہڈ گر گیا تھا۔ مجھ سے ٹکرانے والے شخص اور اس کی ساتھی عورت کے سر سے بھی ہڈ گر گئے تھے اور جب ہم دونوں سیدھے ہوئے تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

میرے سامنے دارا کھڑا تھا!

وہاں روشنی بہت مدھم تھی اور ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہم دونوں صرف دو تین فٹ کے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

وہ صرف چند گھڑیوں کی بات تھی۔ چند پل.... لیکن لگتا تھا جیسے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے صدیاں بیت گئی ہوں۔ ہم دونوں میں سے کسی نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ جو کچھ ہونا تھا، پلک جھپکنے کی دیر میں ہی ہونا تھا۔

اور پھر سانپ جیسی وہ پھنکار میری سماعت سے ٹکرائی تو میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بعد اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پالیا۔

"تمہاری موت ہی تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے نادان چھوکرے۔" ناگ کی پھنکار جیسی یہ سرسراتی ہوئی آواز دارا کے ہونٹوں سے نکلی تھی "اس بنگلے میں دھوکے سے ہمیں گھیر کر تم نے سمجھ لیا تھا کہ بہت بڑا تیر مار لیا ہے لیکن تم نے دیکھ لیا نا کہ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے تھے۔ میں تو تمہارے جال سے بچ نکلا تھا مگر تم نے یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تم یہاں سے واپس نہیں جاسکو گے۔"

"یہ تمہاری بھول ہے دارا۔" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا "وہ جال میں نے نہیں، تم نے ہی بچھایا تھا اور خود تمہیں ہی چوٹ کھا کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ تم صرف ان لوگوں پر حاوی ہو جو تمہارے سامنے آواز نہیں اٹھا سکتے۔ تم نے کس بے دردی سے پامیلا کو قتل کردیا تھا، کتنی بہادری دکھائی تھی تم نے ایک کمزور اور نہتی عورت کا گلا کاٹنے میں لیکن میرے اوپر تم نے کتنے حملے کرائے ہیں۔ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ آج بھی تم مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ میں اسی طرح اپنے قدموں پر چل کر واپس جاؤں گا جس طرح آیا ہوں۔ البتہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری واپسی کس حالت میں ہوگی۔ اس وقت تو میں تم سے صرف اس معصوم بچے کا حساب لوں گا جسے تم نے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کی ماں سونالی اب بھی زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا بگاڑا تھا انہوں نے تمہارا! تم نے ان کے گھر میں پناہ لی۔ اس عورت نے تمہارا اور تمہارے ساتھی کا علاج کیا۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر کھلایا اور تم نے اس کی نیکیوں کا کیا صلہ دیا؟ اس کے معصوم بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور وہ خود زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ تم جیسا کم ظرف، بے حس اور بے ضمیر آدمی آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا۔ تمہیں ایک ایک بات کا حساب دینا ہوگا دارا۔ تم بچ نہیں سکو گے۔"

"ایسے مکالمے فلموں میں بولے جاتے ہیں۔" دارا نے کہا۔ "اور ہم کسی فلم کی شوٹنگ میں حصہ نہیں لے رہے۔ تم نے واقعی یہاں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہ سوامی رگوناتھ کا آشرم ہے۔ یہاں صرف اس کا حکم چلتا ہے۔ اس چاردیواری کے اندر لاشیں بچھا دی جائیں تو بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ قانون کی رکھشا کرنے والے اس کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ تو یہاں آکر سوامی رگوناتھ کے تلوے چاٹتے ہیں۔ تمہاری لاش بھی یہاں پڑی سڑتی رہے گی اور کوئی پوچھے گا نہیں۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے دارا۔" میں نے جواب دیا "دوسروں پر بھروسا کرنے والا ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ تمہیں تو ٹائیگر پر بھی بڑا ناز تھا۔ اس کا حشر تم نے دیکھ لیا۔ وہ تو میرے ان ہاتھوں کا ایک ہلکا سا جھٹکا بھی برداشت نہیں کرسکا تھا اور اب یہ سوامی....." میری نظریں اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ مجھے نہیں جانتی تھی لیکن ہمارے درمیان مکالمات کے تبادلے سے اسے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے اور آنکھوں میں دہشت سی پھیل رہی تھی اور پھر کسی خطرے کا احساس کرکے وہ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہٹنے لگی۔

فضا میں اب موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جذبات کو بھڑکا دینے والی ہیجان خیز موسیقی کی مدھم سی آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ سوامی رگوناتھ نے روحانی تعلیمات کی آڑ میں اپنے چیلوں کی عیاشی کا مکمل بندوبست کر رکھا تھا۔ وسیع و عریض شیڈ کے لاتعداد ستونوں میں اسپیکر پوشیدہ تھے جن سے ہیجان خیز موسیقی کی یہ آواز پھوٹ رہی تھی اور یہ آواز ہر طرف سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لوگ کونوں کھدروں میں جگہ تلاش کررہے تھے۔ شاید ان لوگوں کے لیے اپنے شہوانی جذبات پر قابو پانا مشکل ہورہا تھا۔

دارا کے ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کا ہاتھ غیر محسوس انداز میں پتلون کی جیب کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا، میرے قریب کھڑا ہوا رامن پرساد حرکت میں آگیا۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا دارا سے ٹکرایا۔ دارا اپنی ساتھی لڑکی سے ٹکرا گیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں چیختی ہوئی پیچھے گری۔ اس کی چیخ پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہوش ہی کسے تھا۔ موسیقی کی آواز بھی لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔

دارا اپنے آپ کو پرساد سے بچا کر سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ میں اسے گرفت میں لینا چاہتا تھا لیکن وہ مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گیا اور اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی وہ بھاگ نکلا تھا۔

اس کی ساتھی لڑکی اب بھی زمین پر پڑی چیخ رہی تھی۔ میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر دارا کی طرف لپکا لیکن وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہوگیا۔ شیڈ کے اس حصے میں کچھ کھلبلی سی مچ گئی تھی اور دارا نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ ہڈ پہن کر ان لوگوں میں غائب ہوگیا تھا۔ میں نے بھی اپنا چہرہ ہڈ میں چھپا لیا تھا۔

جانکی اب بھی میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بازو سے

پکڑ کر ایک طرف کھینچتی چلی گئی۔ کسی متوقع جوابی حملے سے بچنے کے لیے جگہ تبدیل کرنا ضروری تھا اور جانکی دیوی مجھے وہاں سے کئی گز دور لے گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پرساد بھی ہمارے ساتھ تھا یا وہیں رہ گیا تھا۔

جگہ تبدیل کرنے کا جانکی کا فیصلہ بڑا سود مند ثابت ہوا تھا۔ چند منٹ بعد ہی وہاں ایک بار پھر کھلبلی سی مچ گئی جہاں دارا سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ دو لمبے تڑنگے آدمی وہاں لوگوں کے چہروں سے بڈ نوچ رہے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں اور بعض مرد انہیں گالیاں دے رہے تھے لیکن وہ دونوں افراد عورتوں کی چیخوں اور گالیوں سے بے نیاز اپنی کارروائی میں مصروف رہے۔

جانکی دیوی میرا ہاتھ پکڑے وہاں سے مزید دور ہٹتی چلی گئی۔ مجھے پرساد کی فکر تھی۔ کہیں وہ ان کے ہاتھ نہ لگ جائے لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے قریب ایک سرگوشی سن کر میں اچھل پڑا۔

"وہ آشرم کے اندر چلا گیا ہے باس۔ اس کے گرگے ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ پرساد مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

"اس طرف سے آؤ۔ ہم پچھلے دروازے سے آشرم میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔" یہ جانکی دیوی کی آواز تھی۔

ہم تینوں لوگوں کو دھکیلتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔ وہاں عجیب صورتِ حال تھی۔ ہیجان خیز موسیقی کی آواز کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ لوگ منہ چھپا کر یہاں اس لیے آتے تھے کہ سوامی کی روحانی تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر اپنے سفلی جذبات کو تسکین پہنچا سکیں اور کسی کی نظروں میں بھی نہ آئیں لیکن آج ان میں کچھ بے چینی پھیل رہی تھی۔ وہ دو لمبے تڑنگے آدمی بدستور لوگوں کے چہروں سے بڈ نوچتے پھر رہے تھے۔

ہم تینوں تیزی سے ایک طرف بڑھ رہے تھے۔ جانکی دیوی سب سے آگے تھی۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے کچھ فاصلے پر رامن پرساد تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ لوگ شیڈ سے نکل کر کھلی جگہوں پر اِدھر اُدھر پھیل رہے تھے۔ اس چار دیواری کے اندر کئی ایکڑ رقبہ گھرا ہوا تھا۔ ایک حصے پر وہ آشرم اور وسیع و عریض شیڈ بنا ہوا تھا جبکہ باقی جگہ خالی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور گنجان جھاڑیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

ہم ایک طویل چکر کاٹ کر آشرم والی عمارت کے پچھلی طرف آگئے۔ اس طرف بھی عمارت کے سامنے ایک کشادہ برآمدہ تھا۔ سرخ پتھروں کی پانچ کشادہ سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچا جا سکتا تھا۔ برآمدے کا ایک مرکزی دروازہ تھا۔ ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف۔ مرکزی دروازہ تو ہال میں داخلے کے لیے تھا اور یہ دونوں دروازے الگ الگ کمروں میں کھلتے تھے۔

برآمدے میں تاریکی تھی لیکن اندر ہال میں بہت مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ جانکی دیوی پچھلے کئی روز سے یہاں تھی اور وہ اس آشرم کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر چکی تھی۔ اسے آشرم کی عمارت کے اندر آنے کا موقع بھی ملا تھا اور اسے معلوم تھا کون سا دروازہ کس کمرے میں کھلتا ہے۔

برآمدے کا مرکزی دروازہ بند تھا۔ اس نے دائیں طرف کا دروازہ آزمایا لیکن یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ وہ بائیں طرف والے دروازے کے سامنے آگئی اور ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ حرکت دینے لگی لیکن یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔

میں اسی دوران میں دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑکی کے سامنے آگیا اور اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اندر تاریکی تھی۔ کھڑکی پر کوئی گرل وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے شیشے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا تو کھڑکی کھلتی چلی گئی۔ میں نے وہ کھڑکی پوری طرح کھول دی اور جانکی اور پرساد کو اشارہ کرتا ہوا چوکھٹ پر چڑھ کر آہستگی سے اندر کود گیا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں بھی اندر آگئے۔

میں نے اپنے لباس میں چھپایا ہوا خنجر نکال لیا اور تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورنے لگا۔

"اس طرف۔" جانکی دیوی نے سرگوشی کی "اس دروازے سے گزر کر ہم ہال میں داخل ہو سکتے ہیں۔"

ہم تاریکی میں دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

ہال میں بہت مدھم سی روشنی تھی۔ کسی جگہ کوئی بلب جل رہا تھا جس پر شیڈ لگا ہوا تھا اور روشنی زیادہ نہیں پھیل رہی تھی۔ دائیں طرف اوپر جانے کے لیے ایک کشادہ زینہ تھا جس پر قالین بچھا ہوا تھا۔ ہال کے فرش پر بھی دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ ہم دبے قدموں آگے بڑھنے لگے۔

"یہ تمام کمرے سوامی رگوناتھ کے چیلوں کے ہیں۔" جانکی دیوی نے سرگوشی کی "اس کا کمرا اوپر ہے اور دارا بھی اوپر ہی رہتا ہے۔ میرا خیال ہے وہ اس وقت بھی اوپر ہی ہوگا اور وہاں سے نیچے شیڈ میں ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا ہوگا۔"

ہم زینے پر چڑھنے لگے۔ قالین کی وجہ سے ہمارے قدموں کی ہلکی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر ایک کشادہ گیلری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے بنے ہوئے تھے۔

ایک دروازے کے نیچے روشنی دیکھ کر میں رک گیا۔ میں نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگا دی اور دوسرے ہی لمحے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بالکل سامنے دیوار کے ساتھ ایک چوڑا سلیب لگا ہوا تھا جو دائیں سے بائیں چلا گیا تھا۔ سامنے ہی چوڑی اسکرین والا ایک رنگین ٹی وی سیٹ رکھا ہوا تھا اور اسکرین پر جو منظر دکھائی دے رہا تھا وہ بڑا شرمناک تھا۔ ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک نوجوان

عورت لڑکی..... اس مرد کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا اور میرے دماغ میں ایک اور دھماکا ہوا۔ وہ چہرہ میں نے پہچان لیا وہ ایک سیاسی لیڈر قسم کا آدمی تھا اور اس کی تصویریں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔

ٹی وی کے سامنے کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا اور اسی کے ...نے سلیب پر ریکارڈنگ کے آلات رکھے ہوئے تھے اور وہ ...ن کے منظر کی ویڈیو ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر ...نہ لگی کہ وہ سیاسی لیڈر آشرم کے کسی کمرے میں تھا جہاں خفیہ ...نصب تھا اور اس کی شرمناک حرکتیں ... ریکارڈ کی جارہی تھیں۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سوامی ...ناتھ کی روحانی تعلیمات کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ...کے بارے میں اخبارات میں بھی کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا تھا لیکن اس ...خلاف اب تک کوئی کارروائی کیوں نہیں ہو سکی تھی؟ اس کی ...بھی اب سمجھ میں آگئی تھی۔ اگرچہ تھائی وانگ نے بڑی ...بات سے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا اور اب میں نے اپنی ...آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ سوامی رگوناتھ یہاں آنے والے بڑے ...بڑے لوگوں کی ویڈیو فلمیں بنا لیتا تھا اور پھر انہیں بلیک میل کرتا ...ان فلموں کے ذریعے وہ ان لوگوں سے نہ صرف بڑی بڑی ...رقمیں اینٹھتا ہوگا بلکہ وہ اپنی زبان بند رکھنے پر بھی مجبور تھے اور ...اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے بھی قاصر کیونکہ اس طرح ...ان کا کچا چٹھا کھل جاتا اور انہیں ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔

اوپر اس ایک کمرے کے علاوہ باقی سب کمرے خالی تھے اور ...ہم تینوں اس وقت اس کمرے میں کھڑے تھے جسے سوامی رگوناتھ کا ...بیڈ روم یا عشرت کدہ کہا جا سکتا تھا۔ بہت شان دار کمرا تھا۔ اس کی ...ایک دیوار شیشے کی تھی۔ یہ شیشہ اگرچہ بظاہر ٹرانس پیرنٹ ...تھا لیکن اس کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے اندر سے باہر کا ...نظارہ تو کیا جا سکتا تھا لیکن باہر سے اندر کا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مزید ...یہ شیشہ بلٹ پروف تھا۔

میں اس شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ شیڈ اور آس پاس کا پورا ...منظر یہاں سے نظر آرہا تھا۔ وہاں پانچ چھ آدمی لوگوں کے چہروں سے ...نقاب ہٹا رہے تھے۔ کچھ لوگ مزاحمت کرتے ہوئے اپنے ...چہرے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڈ اتارنے والوں کا انداز ...جارحانہ تھا۔ لوگ ان کی اس حرکت پر احتجاج کر رہے تھے۔ ایک ...افراتفری سی پھیل رہی تھی۔

"یہ کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔" جانکی نے میرے کان میں ...سرگوشی کی "عام حالات میں نہ تو باہر کی آواز اندر آسکتی ہے اور نہ ...اندر کی آواز باہر سنی جا سکتی ہے لیکن سوامی رگوناتھ نے ایسا انتظام ...کر رکھا ہے کہ وہ ضرورت کے وقت باہر کی آواز بھی سن سکتا ہے ...اور اپنی آواز بھی باہر پہنچا سکتا ہے۔"

"لیکن وہ گیا کہاں اور دارا کہاں غائب ہو گیا؟" میں نے کہا۔ "اوپر کے تو تمام کمرے خالی ہیں۔ وہ کسی نیچے والے کمرے میں تو نہیں؟"

"ہو سکتا ہے۔" جانکی دیوی نے جواب دیا "آؤ۔ نیچے دیکھتے ہیں۔"

ہم اس کمرے سے باہر آگئے لیکن اسی لمحے زیریں ہال میں ایک آدمی کو دیکھ کر ہم دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ وہ شخص غالباً عمارت کے سامنے والے دروازے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

"آؤ۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ اس کمرے میں ہوں۔" میں نے سرگوشی کی اور پھر ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے زینے سے اتر کر زیریں ہال میں آگئے۔ یہاں ہمیں زیادہ محتاط ہو جانا پڑا۔ ہال میں کسی قسم کا فرنیچر نہیں تھا۔ فرش پر دیوار سے دیوار تک دبیز قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک طرف دیوار کے ساتھ چار فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا اور زمین سے دو فٹ اونچا تخت بچھا ہوا تھا۔ جس پر آرام دہ فوم کا گدا پڑا تھا۔ اس پر سرخ مخمل کی چادر بچھی ہوئی تھی اور سرخ مخمل کے کور والا کشن رکھا ہوا تھا۔

"یہاں دن کے وقت سوامی رگوناتھ اپنی بے ہودہ تعلیمات کا پرچار کرتا ہے اور اس سیشن میں صرف منتخب لوگ شامل ہوتے ہیں۔ ان کا انتخاب بھی وہ خود ہی کرتا ہے۔" جانکی دیوی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

یہاں بھی چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس لیے ہمیں زیادہ محتاط ہونا پڑا تھا۔ پرساد نے بھی اپنا خنجر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ہم اس دروازے کے قریب پہنچ گئے جہاں باہر سے آنے والا وہ شخص داخل ہوا تھا۔ میں نے جانکی اور پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں دائیں بائیں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے ہو گئے۔ میں آگے بڑھ کر ایک لمحے کو رکا اور پھر جھک کر دروازے کے ہول سے آنکھ لگا دی۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی، کمرے میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا لیکن اندر سے کوئی معمولی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے سیدھے ہو کر پرساد اور جانکی کی طرف دیکھا اور دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

دروازہ آواز پیدا کیے بغیر کھلتا چلا گیا۔ میں ہینڈل چھوڑ کر بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ کر جانکی کے قریب دیوار کے ساتھ چپک گیا اور کسی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ خنجر کے دستے پر میری گرفت مضبوط تھی اور صرف میں ہی نہیں، جانکی اور پرساد بھی ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔

چند لمحے گزر گئے۔ دروازہ کھلنے کا کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ اندر سے نہ تو کوئی آہٹ سنائی دی تھی اور نہ ہی کوئی باہر آیا

تھا۔ میں نے دوسری طرف کھڑے ہوئے پرساد کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو آہستگی سے دھکیل کر پوری طرح کھول دیا اور ایک لمحے کے انتظار کے بعد اچھل کر اندر داخل ہوگیا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چھلانگ لگائی تھی لیکن کمرا خالی تھا۔ یہ بیڈ روم تھا لیکن یہاں کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے حالانکہ وہ شخص اسی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"کہاں گیا وہ؟" میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

اس کمرے میں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں کوئی چھپ سکتا۔ باتھ روم کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا۔ پرساد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

باتھ روم بھی خالی تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ شخص اس کمرے میں داخل ہو کر کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اچانک میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ باتھ روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ شخص کمرے میں آنے کے بعد باتھ روم میں داخل ہوا تھا اور یہاں سے غائب ہوگیا تھا۔ یقیناً یہاں کوئی تہ خانہ موجود تھا اور اس کا راستہ بھی اس باتھ روم میں ہوگا۔ میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور پھر ہم تینوں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔

جانکی دیوی ایک چھوٹے سے کارنس پر رکھی ہوئی گنیش دیوتا کی مورتی کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کئی روز سے یہاں رہتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ سوامی رگوناتھ تو کسی دیوی یا دیوتا کو نہیں مانتا تھا پھر گنیش دیوتا کی مورتی کی موجودگی کا کیا جواز اور وہ بھی باتھ روم میں۔

وہ مورتی کو چھو کر دیکھنے لگی۔ میں بھی اس مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ ہندو اپنے دیوتاؤں کی مورتیاں اپنے اپنے انداز میں بناتے ہیں اور اس میں زیادہ سے زیادہ خوب صورتی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گنیش دیوتا کی کسی مورتی میں ہاتھی دانت بنائے جاتے ہیں اور کسی میں نہیں لیکن اس مورتی میں دانت موجود تھے۔

جانکی تقریباً چھ انچ لمبے ایک دانت کو چھو کر دیکھنے لگی۔ وہ دانت کسی خاص انداز سے مڑ گیا تھا یا دب گیا تھا لیکن اس کا نتیجہ بہت ہی حیرت انگیز نکلا۔ اسی دیوار کے قریب فرش پر رکھا ہوا پانی کا ٹب اپنی جگہ سے حرکت کرنے لگا۔ وہ ٹب سرکتا ہوا دوسری دیوار کے ساتھ جا لگا اور ٹب کی جگہ فرش میں خلا نظر آرہا تھا جس میں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ جانکی نے ہاتھی کے دوسرے دانت کو حرکت دی۔ ٹب اپنی جگہ پر آگیا۔ اس نے دوبارہ پہلے والے دانت کو دبایا تو باتھ ٹب پھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

"پرساد۔" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی "تم یہیں رکو۔ میں اور جانکی اندر جارہے ہیں۔ اگر کوئی آجائے تو ہمیں سگنل دے دینا۔"

"تہ خانے میں اترنا خطرناک ہوسکتا ہے۔" پرساد نے جواب دیا "کیا ہمارے لیے اتنا کافی نہیں کہ ہم دارا کے اس ٹھکانے کے بارے میں بھی اتنا کچھ معلوم کرچکے ہیں جو اسے بدحواس کردینے کے لیے کافی ہے۔ میرا خیال ہے تہ خانے میں اترنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ ہم تو پہلے ہی بھیڑیوں کے بھٹ میں گھسے ہوئے ہیں۔ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

"اوکھلی میں سر دے چکے ہیں تو موسلوں سے اب کیا ڈرنا۔" میں نے کہا "اگر اندر کوئی خطرہ محسوس ہوا تو ہم فوراً واپس آجائیں گے۔"

پرساد کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ویسے میں سمجھتا تھا کہ مجھے تہ خانے میں جانے سے منع کرکے وہ کسی قسم کی بزدلی کا مظاہرہ نہیں کررہا تھا۔ بزدل ہوتا تو میرے ساتھ یہاں تک نہ آتا۔ وہ میری طرح گرم دماغ کا نہیں تھا۔ سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا چاہتا تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔" پرساد نے مجھے بضد پاکر کہا "جانکی دیوی۔ آپ یہیں رکیں۔ میرا خیال ہے اس الماری کے پیچھے کھڑی ہوجایئے۔ آپ فوری طور پر کسی کی نظروں میں نہیں آسکیں گی اور یہ اپنے پاس رکھ لیں۔ میں باس کے ساتھ تہ خانے میں جاؤں گا۔" اس نے اپنا خنجر جانکی دیوی کی طرف بڑھا دیا۔

جانکی نے میری طرف دیکھا اور پھر پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس اپنی حفاظت کا سامان موجود ہے۔" اس نے اپنے لباس کے اندر سے ایک چھوٹا لیڈی آٹومیٹک پستول نکال کر دکھایا۔

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جانکی نے مجھے ابھی تک پستول کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن بہرحال، وہ ہم سے پہلے یہاں آئی تھی اور اپنی حفاظت کا بندوبست کیے بغیر نہیں آسکتی تھی۔

پرساد نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اس خلا میں سیڑھیوں پر اتر گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی سیڑھی پر قدم رکھ دیا اور اس سے نیچے والی سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے مڑ کر دیکھا۔ جانکی دیوی پستول ہاتھ میں لیے الماری کے پیچھے چھپ گئی تھی۔

وہ پندرہ سیڑھیاں تھیں جن کے اختتام پر ایک مختصر سا ہال تھا اور تین چار کمرے تھے۔ ایک طرف ایک کشادہ راہداری تھی اور اس راہداری میں بھی آمنے سامنے دو کمرے تھے۔ ہال میں مدھم روشنی ہورہی تھی۔

ہم دونوں تمام کمروں کے دروازوں کے کی ہولز میں جھانکتے رہے۔ تمام کمرے اندر سے تاریک تھے۔ ایک دو دروازوں کے ہینڈلوں کو آزما کر بھی دیکھا تھا۔ وہ لاک تھے۔ میں نے پرساد کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا۔ جو کچھ بھی تھا، راہداری والے کمروں ہی میں تھا۔ ہم دبے قدموں چلتے ہوئے راہداری میں آگئے۔

ایک دروازے کے کی ہول سے جھانک کر دیکھا۔ اندر روشنی تھی لیکن کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اگر کوئی تھا بھی تو کی ہول کی رینج میں نہیں تھا۔ میں نے پرساد کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا مگر میں احتیاطاً کی ہول سے جھانکنے لگا۔ کی ہول سے آنکھ لگاتے ہی میں چونک گیا۔

اس کمرے میں تین آدمی تھے۔ دو تو سامنے نظر آرہے تھے اور تیسرا ذرا سائڈ میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی صرف ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔

سامنے جو دو آدمی نظر آرہے تھے، ان میں ایک سوامی رگوناتھ تھا۔ میرے خیال میں وہ دنیا کا بدہیئت ترین آدمی تھا۔ اسے دیکھ کر ہی کراہت محسوس ہوتی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ نوجوان اور حسین لڑکیاں نفرت کیے جانے کے لائق اس شخص سے لپٹی رہتی تھیں۔ کمرے میں دوسرا آدمی دارا تھا۔ جس کے سامنے ایک رنگین ٹیلی وژن سیٹ رکھا ہوا تھا اور وہ کسی ڈیوائس کو حرکت دے رہا تھا جس سے اسکرین کا منظر ہر لحہ تبدیل ہورہا تھا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہاں شارٹ سرکٹ ٹی وی سسٹم نصب تھا اور دارا اس ڈیوائس کے ذریعے باہر لگے ہوئے کیمروں کو مانیٹر کررہا تھا۔ ٹی وی اسکرین پر باہر کے شیڈ اور اس کے آس پاس کا منظر تھا جو ہر لحہ تبدیل ہورہا تھا۔ ایک اسپاٹ لائٹ سی تھی جو حرکت کرتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ باہر اگرچہ تاریکی تھی لیکن ٹی وی اسکرین پر ہر منظر روشن نظر آرہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ کیمرے میں انفراریڈ شعاعوں والے لینس لگے ہوئے تھے جو تاریکی میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور دارا اسی طرح کیمرے کو مانیٹر کرتے ہوئے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

باہر خاصی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ دارا کے پانچ چھ گرگے بدستور لوگوں کے سروں سے ہڈ کھینچ رہے تھے۔ ایک جگہ کچھ ہاتھا پائی کا منظر بھی دکھائی دیا تھا۔

"حیرت ہے۔ وہ لوگ کہاں غائب ہوگئے۔" دارا کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔ اس کی آواز بہت ہلکی تھی۔

"وہ باہر تو جا نہیں سکتے۔" اس شخص کی آواز سنائی دی تھی "اس چار دیواری کے اندر اس وقت ساڑھے تین چار سو لوگ موجود ہیں۔ اس طرح ان سب کو چیک کرنا اتنا آسان نہیں۔ ایک طریقہ ہوسکتا ہے کہ سوامی آج کا سیشن ختم ہونے کا اعلان کروے اور اس طرح باہر جاتے ہوئے ان سب کو چیک کیا جاسکتا ہے۔"

"ہاں۔ میرا خیال ہے یہی کرنا پڑے گا۔" دارا نے کہا "سوامی سیشن ختم کرنے کا اعلان کرنا ہی پڑے گا۔"

"میں ایسا نہیں کرسکتا۔" سوامی نے جواب دیا "تمہارے آدمیوں نے پہلے ہی بہت گڑبڑ پھیلا دی ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو کوئی بھی یہاں نہیں آئے گا۔ اپنے آدمیوں سے کہو یہ تماشا اب ختم کردیں۔ یہاں ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو معاشرے میں بہت باعزت مقام رکھتے ہیں۔ انہیں اس طرح دوسروں کے سامنے بے نقاب کیا جارہا ہے۔ اگر وہ لوگ ہتھے سے اکھڑ گئے تو انہیں سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ کس کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔" دارا کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "مجھے وہ لڑکا چاہیے۔ ہر صورت میں۔ اگر آج وہ اس چار دیواری سے باہر نکل گیا تو میں اس کی نظروں میں ذلیل ہوجاؤں گا۔"

"وہ تو تم ہو ہی۔" سوامی نے جواب دیا "وہ یہاں سے بچ کر نہیں جائے گا۔ میں کوئی طریقہ سوچتا ہوں۔ پہلے تم اپنے آدمیوں سے کہو کہ یہ تماشا بند کردیں اور مزید اشتعال نہ پھیلائیں۔"

دارا نے بھی جواب میں کچھ کہا تھا جسے میں نہیں سن سکا کیونکہ ٹھیک اسی لمحے دوسرے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ رامن پرساد ایک دراز قامت آدمی کو گرفت میں لینے کی کوشش کررہا تھا۔ دھینگا مشتی کی آوازیں شاید دارا والے کمرے میں بھی سن لی گئی تھیں۔

"کون ہے باہر۔ کیا ہورہا ہے؟" دارا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ دارا نیم وا دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں ایک دم سیدھا ہوگیا اور بڑی پھرتی سے باہر سے دروازے کا کنڈا لگا دیا۔ اندر سے پہلے تو دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی اور پھر دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دارا کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"دروازہ کھولو۔ کون ہو تم۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھوگے۔ دروازہ کھولو۔"

"مسٹر دارا۔" میں نے دروازے پر ہاتھ مارتے ہوئے چلّا کر کہا "مجھے سزا دینے کی حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی۔ میں تمہیں یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ پاتال تک تمہارا پیچھا کرسکتا ہوں۔ میں اگر چاہوں تو اس آشرم کو آگ لگا کر تمہیں راکھ کرسکتا ہوں لیکن اس طرح بہت سے بے گناہ بھی مارے جائیں گے۔ میں جارہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ بہت جلد ہمارا ون ٹو ون مقابلہ ہوگا اور میں تمہارا حساب بے باق کردوں گا۔"

"حرام زادے! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اندر سے دارا کی دہاڑ سنائی دی۔

پرساد اس آدمی کو بُری طرح رگید رہا تھا لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آدمی پرساد پر حاوی ہوگیا۔ پرساد زمین پر تھا اور وہ شخص اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس کا ہاتھ بلند ہوتے دیکھا تو میں کانپ اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خنجر کا وار پرساد کے سینے پر کرتا، میرا خنجر اس کی پشت میں پیوست ہوگیا۔ اس شخص کے منہ سے ایک خوف

ناک چیخ نکل گئی۔ میں نے خنجر ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ پرساد نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور پھرتی سے اٹھ گیا۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور اس شخص کے سینے میں پیوست کردیا۔ اس کے منہ سے ایک اور بھیانک چیخ نکلی۔

دوسرے کمرے سے دارا کے دہاڑنے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی پھر ایک اور آواز سنائی دی۔

"دوسرا دروازہ....." یہ سوامی کی آواز تھی "اندر والا دروازہ کھولو اور مائیک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو الرٹ کردو۔ جلدی کرو۔" اگرچہ کمرے کے دروازے کو میں نے باہر سے لاک کردیا تھا تاہم سوامی رگوناتھ اتنی تیز آواز میں احکامات صادر کررہا تھا کہ میں انہیں بہ آسانی سن رہا تھا۔

"پرساد۔" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا "بھاگو۔ وہ باہر آنے کے لیے کوئی اور راستہ استعمال کررہے ہیں۔ انہوں نے اگر مائیک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو الرٹ کردیا تو ہمارے لیے یہاں سے نکلنا مشکل ہوجائے گا۔"

رامن پرساد نے اس شخص کے سینے سے اپنا خنجر کھینچ لیا اور ہال کی طرف دوڑا۔ اس مختصری راہداری سے نکل کر ہم ہال میں پہنچے ہی تھے کہ اوپر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد ایک فائر ہوا۔ یہ پستول یا ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔ میرے ذہن میں جانکی دیوی کا خیال ابھرا اور میں تیزی سے دوڑتا ہوا پرساد سے پہلے اوپر جانے والی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ پرساد بھی میرے ساتھ سیڑھیوں پر دوڑ رہا تھا اور ہم دونوں بیک وقت ہی تہ خانے سے باہر آئے تھے۔

اوپر کا منظر دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے۔ جانکی دیوی ایک آدمی سے گتھم گتھا تھی۔ جانکی کا پستول کموڈ کے قریب پڑا ہوا تھا اور وہ آدمی جانکی کو فرش پر رگید رہا تھا۔ مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ہم جب تہ خانے میں اترے تھے تو جانکی دیوی اس الماری کے پیچھے چھپ گئی تھی جس میں کپڑے وغیرہ ٹنگے ہوئے تھے۔ اس دوران میں یہ آدمی اس طرف آگیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس شخص نے جانکی کو دیکھ لیا ہو یا جانکی نے اسے روکنے کی کوشش کی ہو۔ اس شخص نے جانکی کو پکڑنے کی کوشش کی ہوگی اور اس دوران میں گولی بھی چلی ہوگی لیکن نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ پستول دور پڑا تھا اور وہ شخص جانکی کو رگید رہا تھا۔ اس شخص کے مقابلے میں کمزور ہونے کے باوجود جانکی دیوی بھرپور انداز میں مدافعت کررہی تھی۔

میں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس شخص کے سر پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ وہ شخص بلبلا اٹھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی جانکی دیوی اپنے آپ کو چھوڑ کر کھڑی ہوگئی۔ سب سے پہلے وہ پستول کی طرف جھپٹی تھی۔ پرساد بھی تیزی سے حرکت میں آگیا تھا۔ اس نے اس شخص پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ وہ شخص اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر ماردی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر کموڈ پر گرا اور اس وقت پہلی مرتبہ میں نے دیکھا کہ اس کے بائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

رامن پرساد نے جھک کر اس شخص کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اسی لمحے تہ خانے سے دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ چیخ کر کسی سے کچھ کہہ رہا تھا اور پھر سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"رامن جلدی کرو۔ وہ اوپر آرہے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا۔

پرساد نے اس شخص کو سر کے اوپر سے گھما کر تہ خانے کے دہانے میں پھینک دیا۔ دارا ایک اور آدمی کے ساتھ سیڑھیوں پر آرہا تھا۔ وہ شخص ان کے اوپر گرا۔ وہ دونوں چیخ اٹھے اور سیڑھیوں پر لڑھکتے ہوئے نیچے چلے گئے تھے۔

"بھاگو۔ اس طرف۔" میں نے چیخ کر کہا اور جانکی دیوی کا ہاتھ پکڑلیا۔

باتھ روم سے باہر نکلتے ہوئے پرساد نے دروازہ دھڑ سے بند کردیا۔ بیڈ روم سے نکلتے ہوئے جانکی دیوی راستے میں پڑی ہوئی ایک کرسی سے ٹکرائی اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

باہر آکر میں نے بیڈ روم کا دروازہ بھی بند کردیا تھا۔ میں اس دروازے کا کنڈا لگانا چاہتا تھا کہ پرساد کی چیخ سنائی دی۔

"باس بچو۔"

میں بڑی تیزی سے نیچے جھک گیا۔ کوئی چیز زن سے میرے سر کے اوپر سے گزر کر دروازے میں پیوست ہوگئی۔ میں نے سنبھل کر دیکھا تو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ ترسول تھا۔ جو سامنے کے دروازے سے داخل ہونے والے ایک شخص نے پھینکا تھا اور میں بال بال بچا تھا۔

وہ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ تیزی سے آگے لپک رہا تھا لیکن اسی لمحے ہال کی فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ جانکی دیوی کے پستول سے نکلی ہوئی گولی اس شخص کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی اور وہ چیختا ہوا وہیں ڈھیر ہوگیا تھا۔ دوسرا وہ آدمی تھا جس نے مجھ پر ترسول پھینکا تھا۔ اس نے بھی اپنے لباس میں سے خنجر نکال لیا تھا اور چیختا ہوا ہماری طرف دوڑ رہا تھا۔ پرساد نے اپنا خون آلود خنجر اس پر پھینک مارا۔ میں پرساد کے نشانے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ خنجر اس شخص کے حلق میں ترازو ہوگیا تھا اور وہ چیختا ہوا وہیں ڈھیر ہوگیا تھا۔ پرساد نے دروازے میں گڑا ہوا ترسول کھینچ لیا۔

میں سمجھ گیا کہ دارا نے مائیک سسٹم پر اپنے آدمیوں کو ہمارے بارے میں آگاہ کردیا تھا اور یہ دو آدمی ہماری تلاش میں ہی اندر آئے تھے۔ ان میں سے ایک جانکی دیوی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور دوسرا پرساد کے ہاتھوں لیکن یہ دونوں دارا کے گروہ کے آخری آدمی نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں ہی ہمارے فرار کے

راستے مسدود کردیے جائیں گے۔ گیٹ سے تو فرار کا سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ وہاں سے کوئی بھی شخص ان کی نظروں میں آئے بغیر نہیں جاسکتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ آشرم کی اس عمارت کو گھیرے میں لے لیا جائے ہمیں یہاں سے نکل کر کمپاؤنڈ میں پہنچ جانا چاہیے تھا۔

"اس طرف۔ جلدی....." جانکی دیوی عقبی برآمدے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخی۔

ہم تینوں اس طرف دوڑے۔ شیشے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ پرساد نے لاک کھولنے کی زحمت کرنے کے بجائے ترسول کی ضرب سے شیشہ توڑ دیا اور ہم تینوں باہر آگئے۔ اس طرف ابھی کوئی نہیں آیا تھا لیکن ٹھیک اس وقت جب ہم عقبی برآمدے سے نکل رہے تھے، سامنے والے دروازے سے دو اور آدمی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں دیکھ لیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

"وہ رہے۔ پچھلی طرف..... وہ اس طرف سے بھاگ رہے ہیں۔"

ہم تینوں دوڑتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں سے اترے اور کمپاؤنڈ میں اس طرف دوڑ لگادی جہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میرا خیال تھا کہ شیڈ یا کمپاؤنڈ میں دوسرے لوگوں کے بیچ ہم تھوڑی دیر تک محفوظ رہ سکتے تھے۔

ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ساڑھے تین چار سو افراد تھے جو دارا کے آدمیوں کی حرکتوں سے مشتعل ہو رہے تھے۔ ایک دو جگہوں پر تو لوگوں میں ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی۔

میں نے ابھی تک جانکی دیوی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستول تھا جبکہ میرے ایک ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا اور پرساد ترسول اٹھائے ہوئے تھا۔ ہم لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے آگے گھسے جارہے تھے۔ مختلف جگہوں پر لگے ہوئے اسپیکرز پر وقفے وقفے سے ایک آواز سنائی دے رہی تھی۔

"شانت ہوجاؤ بالکو..... شانت ہوجاؤ۔ کچھ اپرادھی (جرائم پیشہ افراد) ہمارے آشرم میں گھس آئے ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ ساری گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ان کی تلاش جاری ہے۔ یہ سب کچھ تم لوگوں کی سرکشا (حفاظت) کے لیے کیا جارہا ہے۔ وہ جلد ہی پکڑے جائیں گے۔"

یہ سوامی رگوناتھ کی آواز تھی جو لوگوں کو پُرسکون رہنے کی ہدایت کررہا تھا لیکن لوگ ایسی زیادتی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے کہ انہیں دوسروں کے سامنے بے نقاب کیا جائے۔ وہ باعزت لوگ تھے۔ ان کا تعلق معزز گھرانوں سے تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں منہ چھپا کر اپنے جذبات کی تسکین کے لیے یہاں آتے تھے اور یہ کیسے برداشت کرسکتے تھے کہ انہیں دوسروں کے سامنے بے نقاب کیا جائے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔ یہاں سے نکلنا بظاہر مشکل نظر آرہا تھا لیکن اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہوگیا اور چیخ چیخ کر بولنے لگا۔

"لوگو سنو! سوامی رگوناتھ بہت بڑا فراڈ ہے۔ وہ تم سب کے ساتھ دھوکا کررہا ہے۔ راز داری کی قیمت لے کر وہ تم سب کو دوسروں کے سامنے بے نقاب کررہا ہے۔ تم لوگوں کو دوسروں کے سامنے ذلیل و رسوا کررہا ہے اور اس کا فائدہ بھی وہ خود ہی اٹھائے گا۔ تم لوگوں کو بلیک میل کیا جارہا ہے اگر تم لوگوں نے اس زیادتی کے خلاف مزاحمت نہ کی تو سوامی رگوناتھ تم لوگوں کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ تم لوگ پیسے خرچ کرکے یہاں جذبات کی تسکین اور سکون کی تلاش میں آتے ہو لیکن اپنے ساتھ یہ زیادتی کیسے برداشت کررہے ہو تم لوگ؟" میں ملی جلی انگریزی اور تھائی زبان میں چیخ چیخ کر لوگوں کو رگوناتھ کے خلاف اکسا رہا تھا۔ پرساد کے خیال میں، میں پوری طرح اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کرپا رہا تھا۔ اس لیے یہ ذمے داری اس نے سنبھال لی اور میری جگہ پر کھڑے ہوکر تھائی زبان میں چیخنے لگا۔ اس کے منہ سے گالیاں بھی نکل رہی تھیں۔

"یہی ہیں وہ اپرادھی۔" اسپیکروں پر سوامی رگوناتھ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی "انہی کے آدمی تم لوگوں کے چہرے بے نقاب کررہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے تین سیوکوں کی ہتیا (قتل کرنا) کردی ہے۔ یہ قاتل ہیں۔ پکڑلو انہیں۔ جانے نہ پائیں۔"

اور پھر اسی لمحے فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ دارا کے کسی آدمی نے آٹومیٹک رائفل سے فائرنگ کی تھی۔ کئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ انہوں نے فائرنگ شاید ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے کی تھی لیکن صورتِ حال بگڑ گئی۔ لوگ مشتعل تو تھے ہی۔ فائرنگ سے مزید اشتعال پیدا ہوا اور وہاں بھگدڑ سی مچ گئی۔

ہمارے آس پاس موجود کچھ لوگوں نے ہمیں بھی پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم صورتِ حال کا اندازہ لگا چکے تھے۔ میں نے جانکی دیوی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چھلانگ لگادی۔ پرساد بھی جھکائی دے کر ایک طرف سٹک گیا تھا۔ جو لوگ ہمیں پکڑنا چاہتے تھے آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔

سوامی رگوناتھ بار بار اپرادھیوں یعنی ہمارے بارے میں اعلانات کررہا تھا لیکن پرساد کی باتیں بھی کام کرگئی تھیں۔ لوگ زیادہ مشتعل ہوگئے تھے اور پھر فائرنگ نے تو ان کے صبر کا پیمانہ چھلکا دیا تھا۔ انہوں نے ان لوگوں کو پکڑلیا جو ان کے چہروں سے نقاب نوچ رہے تھے۔

ایسے مواقع پر ہوتا یہ ہے کہ اصل آدمی تو ہاتھ نہیں آتے لوگ آپس ہی میں الجھ پڑتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں رہتا کہ

کون دوست ہے اور کون دشمن۔ اس وقت بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ لوگ آپس میں الجھ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے اور اب لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ کچھ لوگ ٹیلوں اور جھاڑیوں کی طرف بھاگ رہے تھے شاید وہ دیوار کود کر باہر جانا چاہتے تھے۔

"اس طرف باس۔" پرساد نے چیخ کر کہا "گیٹ سے نکلنا ممکن نہیں۔ دیوار کود کر ہی جانا پڑے گا۔"

اور پھر ہم جھاڑیوں کی طرف دوڑنے لگے۔ دیوار خاصی اونچی تھی۔ اوپر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ ہم دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتے رہے اور پھر ایک جگہ رک گئے۔ وہاں دیوار کا اوپر کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ پرساد دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ پہلے جانکی دیوی اس کے ہاتھوں پر کھڑی ہو کر دیوار پر چڑھی اور پھر میں دیوار پر پہنچ گیا۔ جانکی دیوی دوسری طرف چھلانگ لگا چکی تھی۔ میں پرساد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپر کھینچ رہا تھا کہ ہم تیز روشنی میں نہا گئے۔ آشرم کی عمارت پر لگی ہوئی سرچ لائٹیں روشن ہو گئی تھیں۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ان لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا لیکن یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم گولیوں کی زد سے محفوظ رہے۔ گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھیں لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ ہم دوسری باڑ سے بھی محفوظ رہتے۔ میں پوری قوت سے پرساد کو اوپر کھینچنے لگا۔

"باس۔ مجھے چھوڑ دو۔ تم دیوار سے کود کر گاڑی کے پاس پہنچ جاؤ۔ میں کسی اور طرف سے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔" پرساد چیخا۔

"نہیں۔ پیر دیوار پر جما کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

پرساد نے دونوں پیر دیوار پر جما دیے اور میں نے اسے پوری قوت سے اوپر کھینچ لیا۔ اسی لمحے ایک اور باڑ ماری گئی۔ اس مرتبہ گولیاں دیوار کے اس حصے پر لگیں جہاں چند سیکنڈ پہلے پرساد لٹکا ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی دیوار پر پہنچا ہم نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور اس کے ساتھ ہی پرساد کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

باہر سے دیوار تقریباً پندرہ فٹ اونچی تھی۔ زمین بھی ہموار نہیں تھی اور تاریکی میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ نیچے کیا ہے۔ پرساد کا پیر ایک پتھر پر پڑ کر مڑ گیا تھا جس سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ میں بھی نیچے گر کر ناہموار زمین پر لڑھکتا چلا گیا تھا۔

جانکی دیوی چند فٹ دور دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہ تیزی سے میری طرف دوڑی۔ میں اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے مڑ کر پرساد کی طرف دیکھا۔ وہ اسی جگہ پڑا کراہ رہا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا ہوا پرساد؟" میں نے پوچھا۔

"میرے پیر میں موچ آگئی ہے باس۔" پرساد کراہا "مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔"

میں نے اور جانکی دیوی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ پرساد کے بائیں ٹخنے میں موچ آگئی تھی اور اس سے پیر زمین پر نہیں رکھا جا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر دارا کا کوئی گن مین دیوار پر چڑھ گیا تو ہم تینوں بڑی آسانی سے اس کی گولیوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ وہ جگہ چٹیل میدان جیسی تھی اور چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ میں اور جانکی دیوی پرساد کو بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹتے رہے۔ آشرم کے گیٹ کے آس پاس بھی ہنگامے کی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ لوگوں نے گیٹ توڑ دیا تھا اور سڑک کے دوسری طرف میدان میں دوڑ رہے تھے جہاں لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم پرساد کو گھسیٹتے ہوئے اس میدان میں آ گئے۔

جب ہم وہاں آئے تھے تو پندرہ بیس گاڑیاں نظر آئی تھیں لیکن اب وہاں لاتعداد گاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور ہماری گاڑی ان میں کہیں پھنس گئی تھی۔ بدحواس لوگ اپنی اپنی گاڑیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ اپنی گاڑیوں تک پہنچ گئے تھے اور انجن اسٹارٹ کر کے آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈ رہے تھے۔

"باس!" پرساد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "اپنی گاڑی تلاش کرنا مشکل ہے۔ کوئی اور گاڑی پکڑ لیں۔"

"وہ گاڑی مہاراج نے فراہم کی تھی۔ اگر یہاں چھوڑ دی گئی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ چلو.... میرا خیال ہے ہم نے گاڑی اس طرف کھڑی کی تھی۔ اس ویگن کے پاس۔" پرساد نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اور جانکی اسے سہارا دے کر گھسیٹتے ہوئے اس سفید ویگن کے قریب پہنچ گئے۔ اس ویگن کے ساتھ ہی ہماری گاڑی کھڑی تھی لیکن اس کا اگلا ایک ٹائر فلیٹ ہو رہا تھا۔

"شٹ!" میں نے غصے میں گاڑی پر ہاتھ مارا۔

"اب تو کوئی اور گاڑی ڈھونڈو باس۔" پرساد نے کہا اور گاڑی کے ساتھ ٹیک لگا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "باس! وہ دیکھو۔ وہ اکیلی عورت ہے جو اس گاڑی میں بیٹھ رہی ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

دائیں طرف سفید رنگ کی وہ چوتھی گاڑی تھی۔ ایک عورت دروازے پر جھکی ہوئی تھی۔ اب پرساد کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے جانکی دیوی کو اشارہ کیا۔ وہ دبے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اس کار کے قریب پہنچ گئی اور پھر صرف ایک منٹ بعد اس نے ہمیں اشارہ کر دیا۔

میں پرساد کو سہارا دے کر چلاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

کی دیوی نے اس عورت کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔

"یہ شریف عورت ہمیں اپنی گاڑی میں لفٹ دینے کو تیار ہے۔ تم لوگ پیچھے بیٹھ جاؤ۔" جانکی دیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گیٹ کی طرف سے آنے والی مدھم سی روشنی میں اس عورت کے چہرے پر خوف کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔ ایک تو آشرم کے ہنگامے نے اسے خوف زدہ کر رکھا تھا اور مزید ستم یہ کہ جانکی دیوی نے پستول اس کے پہلو سے لگا رکھا تھا۔

اس عورت کی عمر تیس بتیس سال رہی ہوگی۔ وہ اسکرٹ اور سلیولیس بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرے کا میک اپ بھی بگڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس اور پھر یہ گاڑی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے تھا۔

میں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر پہلے پرساد کو اندر بیٹھنے میں مدد دی اور پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ جانکی دیوی نے اس عورت کو اشارہ کیا۔ وہ ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ جانکی دیوی نے پسنجرز سیٹ سنبھال لی تھی۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" جانکی دیوی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور ہم بھی تمہاری طرح اس جہنم سے نکل کر شہر پہنچنا چاہتے ہیں۔ تمہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن...." اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں۔ میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گی ڈاکٹر جانکی۔" اس عورت نے کہا۔

اس عورت کے منہ سے جانکی کا نام سن کر نہ صرف جانکی بلکہ میں بھی اچھل پڑا تھا۔

"تت.... تم مجھے جانتی ہو؟" جانکی دیوی کسی قدر بدحواس ہو گئی تھی۔

"تم اس شہر کی ایک معروف فزیشن اور سرجن ہو۔" اس عورت نے جواب دیا۔ اب اس کے چہرے سے خوف کے تاثرات بھی زائل ہو چکے تھے "آدھے سے زیادہ شہر تمہیں جانتا ہے لیکن.... تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔"

"ہم اس مقصد سے نہیں آئے تھے جو تم سمجھ رہی ہو۔" جانکی دیوی نے کہا "گاڑی آگے بڑھاؤ۔ وہ آگے والی گاڑی نکل رہی ہے۔"

وہ عورت انجن اسٹارٹ کر چکی تھی۔ اس سے آگے ایک گاڑی باہر نکل رہی تھی۔ اس نے بھی اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ دارا کے آدمی آشرم سے باہر نہ آ جائیں۔ انہوں نے ہمیں دیوار سے کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یوں بہت سے لوگ دیوار سے کود کر باہر آئے تھے۔ یہاں دارا کے سوا ہمیں چہرے سے کوئی نہیں پہچانتا تھا لیکن عین ممکن ہے وہ باہر آ کر ہماری تلاش کرنے کی کوشش کریں اور ان کے ساتھ دارا بھی ہو۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

بات اگر لوگوں کے چہروں سے ہڈ اتارنے تک محدود رہتی تو اتنی گڑبڑ نہ ہوتی لیکن فائرنگ سے صورتِ حال بگڑ گئی تھی اور لوگ بدحواس ہو کر دوڑے تھے۔

سڑک پر بھی گاڑیاں بے ترتیبی سے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہماری گاڑی ابھی سڑک پر نہیں پہنچ پائی تھی۔ میں گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا جو ٹوٹ چکا تھا اور لوگ اب بھی ہجوم در ہجوم ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ اور پھر اچانک گیٹ کے دوسری طرف آشرم کی عمارت میں ایک جگہ سے دھواں اٹھتے دیکھ کر میں چونک گیا۔

"گاڑی جلدی نکالو۔ اب یہاں ایک اور ہنگامہ شروع ہونے والا ہے۔" جانکی نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی آشرم کی عمارت سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور غالباً کچھ دیر بعد پیش آنے والی صورتِ حال کا کچھ اندازہ بھی لگا لیا تھا۔

دھواں صرف ہم نے نہیں اور بھی بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا۔ اندر سے اب شور کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ کسی دل جلے نے آشرم کی عمارت کو آگ لگا دی تھی۔ دھوئیں کے ساتھ اب شعلے بھی بلند ہونے لگے تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت اب خاصی بدحواس ہو رہی تھی۔ سڑک پر آ کر اس نے تین مرتبہ اپنی گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکرائی تھی۔ ہنگامہ بڑھ گیا تھا اور لوگ اب جلد سے جلد وہاں سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔

کمپاؤنڈ کے اندر سے ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ کچھ چیخیں بھی گونجی تھیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اسٹریٹ فائرنگ کی گئی تھی یا ہوائی۔ لیکن بہرحال، اس فائرنگ سے لوگ مزید بدحواس ہو گئے تھے۔

آشرم کی عمارت اور بیرونی گیٹ کے آس پاس دیواروں پر سرچ لائٹیں جل رہی تھیں لیکن پھر یکایک تاریکی چھا گئی۔ آشرم کی عمارت میں لگنے والی آگ بجلی کے تاروں تک پہنچ گئی تھی اور اس طرح بجلی بھی فیل ہو گئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی چھا گئی۔ اِدھر اُدھر لہراتی ہوئی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس عجیب سا تاثر پیش کر رہی تھیں۔

آشرم کی عمارت سے اٹھنے والے شعلے اب بلند ہو رہے تھے۔ گیٹ کے سامنے سڑک پر گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں لیکن بہرحال وہ عورت اپنی کار ہجوم سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی اور کھلی جگہ پر آتے ہی اس نے ایکسیلریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔ کار بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس سے آگے بھی کچھ گاڑیاں اسی تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ غالباً ہر شخص جلد سے جلد اس علاقے سے دور نکل جانا

چاہتا تھا۔

میں پیچھے مڑ کر آشرم کی عمارت سے اٹھتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت تک غالباً پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آچکی تھی اور شہر کے تمام فائر اسٹیشن مل کر بھی اس آشرم کو خاکستر ہونے سے نہیں بچا سکتے تھے اور ویسے میرے خیال میں فائر بریگیڈ کے وہاں تک پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آگ پھیلنے سے پہلے اگر فون پر شہر کے کسی فائر اسٹیشن کو اطلاع دے بھی دی گئی ہوگی تو فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ ایک گھنٹے سے پہلے فائر بریگیڈ کی کوئی گاڑی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور جس طرح سے آگ بھڑک رہی تھی‘ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ اس ایک گھنٹے میں پوری عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے گی۔

میں سوامی رگوناتھ اور دارا کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کا کیا انجام ہوا ہوگا۔ کیا وہ بھی اس آگ میں جل مرے ہوں گے یا بچ گئے ہوں گے۔ ویسے زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو بچالیا ہوگا۔ دارا اور اس کے ساتھی تو ہمیں کمپاؤنڈ میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ یقیناً بچ گئے ہوں گے۔ البتہ سوامی رگوناتھ تہ خانے میں تھا۔ اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔

اچانک پرساد کے کراہنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اپنے خیالات میں الجھ کر اسے تو میں بھول ہی گیا تھا اور اسی دوران میں غالباً وہ بھی اپنی تکلیف بھولا ہوا تھا اور اب ہم اس ہنگامے سے دور ہوئے تو وہ بھی کراہنے لگا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت تکلیف ہورہی ہے باس۔“ پرساد نے کراہتے ہوئے جواب دیا ”پیر سوج رہا ہے۔“

میں نے جھک کر اس کا پیر ٹٹولا تو وہ ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ اس کا پیر ٹخنے کے قریب سے واقعی بہت سوج گیا تھا۔

”تھوڑی دیر تک تو تمہیں یہ تکلیف برداشت کرنی ہی پڑے گی۔“ جانکی دیوی نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا ”اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد ہی اس کا کچھ علاج ہوگا۔“

پرساد نے سختی سے دانت بھینچ لیے۔

کار تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ اسی دوران میں پیچھے سے آنے والی دو اور کاریں بڑی تیز رفتاری سے ہمیں اوور ٹیک کرتی ہوئی آگے نکل گئی تھیں۔ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھی ہوئی وہ عورت بھی بڑی ماہرانہ ڈرائیونگ کا ثبوت دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جانکی دیوی سے باتیں بھی شروع کردی تھیں۔ باتیں کیا۔ بس وہ سوامی رگوناتھ اور اس کے لوگوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ جانکی دیوی ہوں ہاں میں اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ باتوں میں اس نے اپنا نام بھی بتادیا تھا۔ وہ ہپ لیونگ تھی۔

شہر کا پہلا چوراہا ابھی تقریباً ایک میل دور تھا۔ ہماری کار تقریباً سو کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ پیچھے سے آنے والی ایک اور تیز رفتار کار آگے نکلنے کے لیے ہمارے برابر پہنچی تو اس کے اندر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی۔ وہ دارا تھا۔ اس کار کا ڈرائیور اور اس کے ساتھ دوسری سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی شکل ہی سے غنڈے لگ رہے تھے۔

دارا نے پہلے تو شاید خیال نہیں کیا لیکن اس کی کار جیسے ہی کچھ آگے نکلی تو اس نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی چیختی ہوئی آواز سنی تھی۔

”وہ حرام زادہ اس کار میں ہے۔ روکو اسے۔“

وہ کار تیزی سے آگے نکل کر ہماری کار کے سامنے آگئی۔ رامن پرساد نے بھی دارا کی آواز سن لی تھی۔ وہ سیٹ پر نیم دراز تھا۔ ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔

”باس وہ۔۔۔وہ۔۔۔“

”دارا ہے۔“ میں نے کہا ”گھبراؤ نہیں۔ نمٹ لیں گے ان سے۔“

جانکی دیوی نے بھی دارا کو دیکھ لیا تھا اور ہماری کار کی ڈرائیور ہپ لیونگ نے بھی صورتِ حال کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس کے چہرے پر زردی پھیلنے لگی۔

دارا والی کار ہمارے بالکل سامنے آگئی تھی اور اس کی رفتار کم ہورہی تھی۔ ہماری ڈرائیور نے اپنی کار کو سائڈ سے نکالنا چاہا لیکن اگلی کار لہرا گئی اور بریک کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ ہپ لیونگ نے بھی بریک پیڈل دبادیا لیکن کار رکتے رکتے بھی اگلی کار سے ٹکرا گئی تھی۔

”تم یہیں بیٹھے رہو۔ اپنی جگہ سے ہلنا مت۔“ میں نے پرساد کی طرف دیکھ کر کہا اور دروازہ کھول کر پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ دارا اور اس کے دونوں ساتھی بھی اپنی کار سے اتر آئے تھے۔

”مجھے معلوم تھا کہ تم بھاگنے میں دیر نہیں لگاؤ گے اس لیے میں نے بھی وہاں رک کر وقت ضائع نہیں کیا۔“ دارا میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا ”پکڑلو اسے۔“ اس نے اپنے گرگوں کو حکم دیا ”پہلے میں اسے ختم کرنا چاہتا تھا لیکن اب یہ مجھے زندہ چاہیے۔ اگر زیادہ مزاحمت کرے تو ایک آدھ ہڈی توڑ دینا مگر مرنا نہیں چاہیے اسے۔ یہ اب میرے لیے بہت قیمتی ہوگیا ہے۔“

”بس۔ یہ دو آدمی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا ”کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ مجھے قابو کرسکیں گے؟“

”اب تم کچھ نہیں کرسکو گے کتے کے پلے۔“ دارا غرایا۔

”تو پھر دیکھنا یہ ہے کہ کتے کی طرح بھونکتا کون ہے۔ میں یا تم۔۔۔؟“ میں نے جواب دیا اور ان دونوں کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دونوں مجھ سے چند فٹ دور تھے اور جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان جیسے دو تو کیا‘ میں چار آدمیوں سے بھی نمٹ سکتا تھا لیکن میرے لیے سب سے بڑا خطرہ دارا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے مزاحمت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ ٹھیک اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ کار میں بیٹھی ہوئی جانکی دیوی نے اپنے پستول سے گولی چلادی تھی۔ گولی دارا کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ وہ چیخ کر اچھلا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگرا تھا۔ جانکی بڑی پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی تھی۔ دارا نے ایک بہت بڑی غلطی یہ کی تھی کہ اس نے کار میں بیٹھی ہوئی عورتوں کو نظرانداز کردیا تھا اور ساری توجہ میرے اوپر مبذول رکھی تھی جس کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔

”اب اگر تم میں سے کسی نے حرکت کی تو گولی ماردوں گی۔“ جانکی دیوی نے غراتے ہوئے کہا۔ دارا ایک طرف کھڑا تھا اور وہ دونوں غنڈے دوسری طرف۔ جانکی پستول کا رخ کبھی ایک طرف کرتی اور کبھی دوسری طرف۔

دارا نے اپنے گرگوں کی طرف دیکھا اور انہیں آنکھ سے اشارہ کردیا۔ وہ دونوں غنڈے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ جانکی دیوی نے پستول کا رخ ان کی طرف کرکے انہیں للکارا اور دارا نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جانکی دیوی پر چھلانگ لگادی۔

جانکی دیوی نے گولی چلادی مگر اس مرتبہ نشانہ خطا ہوگیا۔ دارا نے آگے بڑھ کر بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر لگادی تھی۔ پستول جانکی کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔ دارا نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گرفت میں لے لیا۔

وہ دونوں غنڈے بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ان کا انداز اسٹریٹ فائٹروں جیسا تھا۔ میں دفاعی انداز میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ دونوں میرے بہت قریب آگئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتے‘ میں بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا اور بائیں پیر کی ایڑی پر گھومتے ہوئے لات چلادی۔ ان میں سے ایک تو پنڈلی پر میرے پیر کی ٹھوکر لگنے سے ڈھیر ہوگیا لیکن دوسرا بروقت اچھل کر اپنے آپ کو بچا گیا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اپنے آپ کو بائیں طرف جھکا کر دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکا کر میں پورے قد سے قلابازی کھا گیا اور میرے پیر کی ٹھوکر اس کے جبڑے پر لگی۔ اس کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔

میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ پہلا حریف اٹھ کر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں نے اس کا پنچ روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ گھونسا وزنی ہتھوڑے کی طرح میرے جبڑے پر لگا اور میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا‘ دو اور گھونسے میرے جبڑوں پر لگے۔ میرا دانت ہل گیا۔ منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کرکے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں نے اس کا اگلا وار روک لیا۔ ایک ہاتھ سے اس کی کلائی کو گرفت میں لیے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے اسی کندھے پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ بلبلا کر آگے جھکا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی تو وہ بلبلاتا ہوا سیدھا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے جبڑے پر گھونسے رسید کرتے ہوئے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ساتھی پر گرا جو اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔

”کم آن۔“ میں نے اسٹانس بدلتے ہوئے دونوں ہاتھ آگے نکال دیے۔ میرا انداز اشتعال دلانے والا تھا۔ میں نے اپنے استاد ماسٹر ہوچن سے ایک بات سیکھی تھی ”لڑو مگر اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ حریف کو اشتعال دلاؤ اور موقع پاکر اپنا وار کرو“ میں اس وقت یہی پالیسی اپنائے ہوئے تھا۔ وہ دونوں اگرچہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور تھے اور مجھ سے زیادہ گرم دماغ بھی۔ میں نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا تھا مگر وہ اشتعال میں آگئے تھے۔ وہ دونوں اٹھ کر میری طرف بڑھے۔ میں اب بھی اپنے ہاتھوں کو اسی طرح حرکت دے رہا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے‘ میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور اپنے آپ کو کئی فٹ اوپر تک اٹھاتا چلا گیا اور پھر نیچے آتے ہوئے میں نے دونوں ٹانگوں کو اس طرح جھٹکا کہ میری دونوں ککس ان دونوں کی کھوپڑیوں پر لگیں۔ یہ ڈوئل کک مجھے جنگل والے کیمپ میں ماسٹر ہانگ سو نے سکھائی تھی اور اس کے لیے مجھے کئی ہفتوں تک بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے آٹھ نو فٹ سیدھا اوپر اٹھ سکتا تھا۔

وہ دونوں بلبلاتے ہوئے دائیں بائیں گرے تھے۔ میں زمین پر پیر ٹکاتے ہی سنبھل گیا اور مجھے ادھر ادھر دیکھنے کا موقع مل گیا۔

ہپ لیونگ اسٹیئرنگ پر سر جھکائے بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی اور جانکی دیوی کو دارا نے دبوچ رکھا تھا۔ جانکی اپنے آپ کو چھڑانے کی پوری جدوجہد کررہی تھی۔ دارا نے اس کے ایک دو کرارے ہاتھ بھی ماردیے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے خون بھی بہہ رہا تھا۔ میں دارا کی طرف لپکا لیکن ان دونوں غنڈوں نے اٹھ کر مجھے دبوچ لیا۔ رامن پرساد کار میں بیٹھے بیٹھے چیخ رہا تھا۔

ان دونوں غنڈوں نے مجھے بری طرح جکڑلیا تھا۔ میں نے زور آزمائی کرنے کے بجائے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ سمجھے کہ میری قوتِ مدافعت جواب دے چکی ہے لیکن میں نے اپنا جسم صرف ایک لمحے کو ڈھیلا چھوڑا تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور پہل کرتے ہوئے جسم کی پوری قوت بازوؤں میں سمیٹ لی اور جب میں نے بازوؤں کو جھٹکا دیا تو وہ دونوں اچھل کر کئی فٹ دور جاگرے تھے۔ میں پشت کے بل پڑا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے زمین پر ٹکالیے‘ پیروں کو سمیٹ کر اپنے جسم کا برج بنایا اور ایک جھٹکے سے سیدھا ہوتے ہوئے سامنے کی طرف قلابازی کھائی۔ اس

مرتبہ میرے دونوں پیران کے سینوں پر پڑے تھے۔

"شاباش باس..... ویری گڈ!" پرساد مجھے داد دیتے ہوئے چیخ رہا تھا اور پھر جانکی دیوی کی چیخ سن کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

اور پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا کہ پرساد کار کے کھلے ہوئے دروازے سے کسی پرندے کی طرح اڑا اور دارا کے اوپر جا گرا جو جانکی کو بالوں سے پکڑے اس کے جسم پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔

پرساد دارا کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت اس نے اپنی تکلیف کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ بھی دارا کو بری طرح رگید رہا تھا لیکن پھر دارا کا داؤ چل گیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور پرساد پر ٹھوکریں برسانے لگا۔ پیر کی تکلیف کی وجہ سے پرساد اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ زمین پر پڑے پڑے اپنا دفاع کرنے لگا۔

اور پھر آشرم والی سڑک سے دو کاروں کو آتے دیکھ کر دارا اور اس کے ساتھی گڑبڑا سے گئے۔ دارا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پرساد کو چھوڑ کر اپنی کار کی طرف دوڑا۔ ان دو غنڈوں میں سے ایک تو میری گرفت میں تھا مگر دوسرے نے دارا کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ جیسے ہی پرساد کے قریب پہنچا، پرساد نے اچھل کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ غنڈا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر پرساد جونک کی طرح اس کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔

دارا کی کار کا انجن اسٹارٹ ہو چکا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ کار ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آ گئی۔ صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے دارا نے راہِ فرار اختیار کر لینے ہی میں عافیت سمجھی تھی اور وہ اپنے گرگوں کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا۔ ان میں ایک کو پرساد نے گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرا میرے قابو میں تھا۔ پہلے میرے مقابلے پر دو تھے لیکن اب ایک ہی رہ گیا تھا۔ یوں تو میں پہلے بھی ان کے سامنے کمزور نہیں پڑا تھا لیکن اب ون ٹو ون کی بات تھی۔ میں نے اپنے حریف کو پیر ٹکانے کا موقع نہیں دیا اور گھونسوں اور ٹھوکروں سے اس کی تواضع کرتا رہا۔

آشرم کی طرف سے آنے والی کاروں میں آگے والی کار کی رفتار بڑی تیز تھی۔ ہم اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں تھے اور پھر وہ کار بریک کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔

دھڑ دھڑ کر کے کار کے دروازے کھلے اور تین آدمی نیچے اتر آئے۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بھی دارا کے گرگے ہوں گے۔ میں نے اپنے آپ کو ان سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ جانکی دیوی نے کار کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک پر پڑا ہوا نہ صرف اپنا بلکہ دارا کا پستول بھی اٹھا لیا تھا اور ہپ لیونگ کی کار کی آڑ میں پوزیشن لے کر کھڑی ہو گئی۔

وہ دارا کے نہیں بلکہ مہاراج کے آدمی تھے۔ ان میں ا[ایک] گانگ تھا۔ اس کے دونوں ساتھیوں نے ان غنڈوں کو سنبھالا اور گانگ نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

"مجھے افسوس ہے ہمیں یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی۔" گانگ نے کہا "دراصل ہم لوگ تمہیں اور دارا کو وہاں تلاش کر رہے تھے پھر ہم نے تمہیں ایک گاڑی میں وہاں سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی دارا کو بھی ایک کار میں وہاں سے نکلتے دیکھ لیا۔ ہم تو فوراً ہی اس کے پیچھے آنا چاہتے تھے لیکن ہماری کار پھنس گئی تھی پھر بھی ہم بروقت یہاں پہنچ گئے۔ دارا کہاں گیا؟"

"وہ بھاگ گیا۔ بزدل۔" میں نے جواب دیا۔

"تم لوگ نکل چلو یہاں سے۔ ہم ان دونوں سے نمٹ کر آتے ہیں۔" گانگ نے کہا۔

جانکی دیوی نے پہلے گانگ کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت صورتِ حال کو سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی تھی۔ وہ کار کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی۔ میں نے پرساد کو سہارا دے کر ہپ لیونگ کی کار میں ڈال دیا اور خود بھی اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جانکی اگلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ ہپ لیونگ وحشت زدہ سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور انجن اسٹارٹ کر کے کار کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

"کچھ نہیں ہوا لیونگ۔" جانکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "احتیاط سے گاڑی چلاؤ۔ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔"

"وہ آگے گیا ہے۔ اگر....."

"اب وہ ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔" جانکی نے کہا "اب وہ کئی روز تک کسی بل میں چھپا اپنی چوٹیں سہلاتا رہے گا۔ آرام سے گاڑی چلاؤ۔"

"جب سے یہ آدمی آشرم میں آیا تھا اسی روز سے گڑبڑ ہو رہی تھی۔" ہپ لیونگ نے کہا "میں نے تو سوچا تھا کہ وہاں جانا ہی چھوڑ دوں گی۔ اب تو سب کچھ ختم ہو گیا۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر جانکی دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے آشرم میں یہ سارا ہنگامہ تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ کون ہے؟" اس نے پیچھے میری طرف اشارہ کیا۔

"لمبی کہانی ہے۔" جانکی نے جواب دیا "اس کی وجہ سے تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ درست ہے کہ دارا کو اسی کی تلاش تھی اور یہ تلاش بہت عرصے سے ہے لیکن جب تم اس کی کہانی سنو گی تو تمہیں اس سے ہمدردی اور دارا سے نفرت ہو جائے گی۔"

"دارا وہی شخص ہے نا جو بھاگ گیا ہے؟" ہپ لیونگ نے پوچھا۔

"ہاں وہی۔" جانکی نے گردن ہلائی "دنیا کا سب سے سفاک

[اور س]ب سے بزدل آدمی۔"

"[اس] کی سفاکی اور بزدلی کا اندازہ مجھے بھی ہو گیا ہے۔" ہپ [لیونگ نے] کہا "دو دن پہلے اس نے ایک آدمی کو آشرم کے اندر [بری] طرح پیٹ ڈالا تھا۔ اس کی ایک پسلی توڑ دی تھی اور [اسے] باہر پھنکوا دیا تھا۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ....."

"[اس] نے سوامی کے پیر چومنے سے انکار کر دیا تھا۔" جانکی نے [با]ت پوری کر دی۔

"[تمہیں] معلوم ہے؟" ہپ لیونگ نے چونک کر اس کی طرف [دیکھا]۔

"[ہ]اں۔ میں وہاں موجود تھی۔ میں تو اس بدمعاش کی تلاش [میں آ]ئی تھی اور اس کی حرکتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔" جانکی [نے جوا]ب دیا۔

"[ک]یا تمہارا پولیس سے بھی کوئی تعلق ہے؟" ہپ لیونگ نے [پوچھا]۔

"[پو]لیس..... نہیں۔" جانکی دیوی نے جواب دیا "یہ ایک [ذا]تی کا معاملہ ہے۔ تم اس کے بارے میں تھوڑا بہت بھی [سنو گی] تو کانپ اٹھو گی۔ پچھلے چند مہینوں میں شہر میں جتنے بھی [واقعات] ہوتے رہے ہیں، ان کے ذمے دار ٹائیگر اور دارا ہیں۔ [انہوں] نے مہاتما بدھ کے مجسمے سے سونا چرانے کی کوشش کی تھی۔ [جس شخص] نے سونا چوری ہونے سے بچایا، دارا اور ٹائیگر نے اسے [...] کے سامنے بم سے اڑا دینا چاہا۔ وہ کئی بے گناہوں کا قاتل [ہے۔ ٹا]ئیگر تو چند روز پہلے وجدان کے ہاتھوں مارا گیا اور دارا ابھی [تک ب]چا ہوا ہے۔ وہ گردن تک گناہوں اور جرائم کی دلدل میں [دھنسا ہو]ا ہے۔"

"[او]ہ۔" ہپ لیونگ چونک گئی "وجدان وہی تو نہیں جس کا [...] کے حوالے سے اخباروں میں بھی نام آتا رہا ہے لیکن [تمہارا] اس سے کیا تعلق ہے؟"

"[می]رے اور وجدان کے تعلق کا اندازہ تم اس طرح لگا سکتی [ہو کہ و]ہ اس وقت میرے ساتھ ہے۔" جانکی نے کہا۔ وہ جذبات [میں] کچھ زیادہ ہی بول رہی تھی۔

"[و]گ..... کیا.....؟" اسٹیئرنگ پر ہپ لیونگ کے ہاتھ کانپ [گئے اور] کار سڑک پر لہرانے لگی۔

"گاڑی سنبھالو!" جانکی دیوی چیخی۔

ہپ لیونگ نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور سامنے [لگے ہ]وئے آئینے کا زاویہ درست کر کے مجھے دیکھنے لگی۔ میرے [ساتھ] پرساد بھی تھا اور اس کے لیے شاید یہ فیصلہ کرنا دشوار [تھا کہ] ہم دونوں میں وجدان کون ہے۔

"[ان میں]..... وجدان کون ہے؟" بالآخر اس نے جانکی سے یہ سوال [کر ہی ڈا]لا۔

"[و]ہ جس نے تھوڑی دیر پہلے دارا کے دو غنڈوں کی پٹائی کی تھی۔" جانکی دیوی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ہپ لیونگ آئینے میں مجھے دیکھنے لگی۔ شاید اسے جانکی کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ عام آدمی کے لیے میرے بارے میں ایسی بات کا یقین کرنا ممکن بھی نہیں تھا لیکن ہپ لیونگ چونکہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکی تھی اس لیے اسے یقین تو کرنا ہی پڑا تھا۔

ہم سے پہلے جو لوگ شہر پہنچ چکے تھے، انہوں نے شاید پولیس کو آشرم میں ہونے والے واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور اب سامنے سے کچھ گاڑیاں آتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سائرن کی آوازیں بھی فضا میں گونج رہی تھیں۔ ان کی چھتوں پر لگی ہوئی لائٹوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں تھیں۔

ہپ لیونگ نے کار سڑک کے کنارے پر لگا کر روک لی۔ پولیس کی کئی گاڑیاں اور لاتعداد فائر انجن سائرن بجاتے ہوئے تیز رفتاری سے آشرم کی طرف دوڑے جا رہے تھے۔

تقریباً دس منٹ بعد ہپ لیونگ نے گاڑی آگے بڑھا دی لیکن اس نے رفتار ہلکی ہی رکھی کیونکہ سامنے سے اب بھی کچھ گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھیں۔ گرینڈ ہوٹل سے اس نے کار مین سوکھم وٹ روڈ پر موڑ لی۔ ابھی رات کے گیارہ ہی بجے تھے۔ اس سڑک پر خاصی رونق تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ کسی ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب ہم کار رکوا کر اتر جائیں گے اور وہاں سے کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر واٹ ٹریمٹ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ اس سڑک پر کچھ آگے جا کر ہپ لیونگ نے کار ذیلی سوکھم وٹ سکسٹی ٹو ایکامائے روڈ پر موڑی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ آگے بیٹھی ہوئی جانکی دیوی نے بھی نوٹ کر لیا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔

"اس طرف کہاں جا رہی ہو؟" وہ ہپ لیونگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہمیں مین روڈ پر کسی ٹیکسی اسٹینڈ پر ڈراپ کر دیتیں تو....."

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم تینوں کو فرسٹ ایڈ کی ضرورت ہے۔" ہپ لیونگ نے اس کی بات کاٹ دی "تمہارا وہ تیسرا ساتھی تو تکلیف سے مسلسل کراہ رہا ہے۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ تم تینوں کو فرسٹ ایڈ مل سکتی ہے۔"

جانکی نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ میرے خیال میں ہپ لیونگ پر اعتماد کیا جا سکتا تھا اور پھر میں اس حالت میں مہاراج کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔

"کیا ہم تم پر اعتماد کر سکتے ہیں لیونگ؟" جانکی نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کرنا ہی پڑے گا۔" ہپ لیونگ پہلی مرتبہ مسکرائی "تم جانتی ہو، میں نے تمہیں اپنی کار میں بیٹھتے ہی پہچان لیا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اور تمہاری باتیں سن کر مجھے تم لوگوں سے ہمدردی ہو گئی

ہے۔ اگر تم لوگوں کے خلاف میرے دل میں کوئی بات ہوتی تو تم لوگوں کو کہیں ڈراپ کردیتی اور پھر پولیس کو تمہارے بارے میں بتادیتی لیکن....."

"شکریہ لیونگ۔" جانکی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

کار سوئے چارڈن سک روڈ پر مڑ گئی اور تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد سوئے تھانگ لو پر گھوم گئی۔ یہ سارا پُرسکون رہائشی علاقہ تھا۔ سوئے تھانگ لو ایک کشادہ گلی تھی جس کے دونوں طرف بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ہپ لیونگ نے ایک بنگلے کے سامنے کار روک لی۔ سامنے ونڈ اسکرین کے قریب رکھے ہوئے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر گئی۔ جانکی دیوی اپنی جگہ سے سرک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی اور جب ہپ لیونگ نے گیٹ کھولا تو کار آگے بڑھادی۔ لیونگ مسکرادی تھی۔ کار اندر جانے کے بعد اس نے گیٹ بند کردیا۔

جانکی نے پورچ میں کار روک لی اور انجن بند کردیا۔ اس دوران میں ہپ لیونگ بھی وہاں پہنچ گئی اور بر آمدے میں داخل ہو کر دروازہ کھولنے لگی اور پھر اندر داخل ہو کر وہ بتیاں جلاتی چلی گئی۔ جانکی دیوی بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے اندر گئی اور پھر ہپ لیونگ کا اشارہ پاکر باہر آگئی۔

میں نے اور جانکی نے پرساد کو سہارا دے کر کار سے اتارا اور اسے اندر لے آئے۔ وہ بُری طرح کراہ رہا تھا۔ اندر آکر روشنی میں دیکھا تو میں اچھل پڑا۔ اس کا پیر سوج کر کُپا ہو رہا تھا۔ پہلی مرتبہ موچ آنے کے بعد اگر وہ آرام سے بیٹھا رہتا تو شاید اتنی زیادہ تکلیف نہ ہوتی لیکن دارا سے گتھم گتھا ہونے کے بعد تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اسے ہال نما کمرے میں ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ جانکی دیوی فوراً ہی جھک کر اس کے پیر کا معائنہ کرنے لگی۔ اس نے جیسے ہی پیر پر ہاتھ رکھا' وہ چیخ اٹھا۔

"تم لوگ اپنے حلیے درست کرلو۔ میں اس کا پیر دیکھتی ہوں۔" ہپ لیونگ نے کہا۔

"ہم ٹھیک ہیں لیکن پہلے اس کا پیر دیکھو۔" جانکی نے کہا پھر چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "لیکن تم کیا کرسکو گی۔ کیا تم بھی ڈاکٹر ہو؟"

"ڈاکٹر تو تم ہو۔ میں مساجر ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس وقت اس کا علاج میں کسی ڈاکٹر سے بہتر طور پر کرسکتی ہوں۔" ہپ لیونگ نے جواب دیا۔

جانکی دیوی مسکرا کر رہ گئی۔ ہپ لیونگ نے غلط نہیں کہا تھا۔ جوڑوں کی اس قسم کی تکالیف کا علاج پاکستان اور ہندوستان میں تو پہلوان قسم کے لوگ ہی کیا کرتے تھے اور بنکاک میں بھی اس قسم کے لوگ موجود تھے۔ جبکہ ڈاکٹری علاج ایک لمبا پروسس تھا۔ ہپ لیونگ مساجر تھی اور شاید اس نے مساج کی باقاعدہ ٹریننگ حاصل کی تھی۔ مساج کرنے والے بھی ایسے کاموں میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ جسم کے ایک ایک جوڑ اور رگ پٹھوں سے واقف ہوتے ہیں۔ پرساد کے ٹخنے کا جوڑ ہل گیا تھا اور اس وقت اسے ہپ لیونگ ہی بٹھا سکتی تھی۔

ہپ لیونگ کچن میں چلی گئی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ پانی گرم کرکے لے آئی۔ پلاسٹک کا ایک ٹب بھی تھا جو اس نے پرساد والی کرسی کے قریب قالین پر رکھ دیا اور نیلے رنگ کی چوڑے منہ والی ایک ڈبیا لے آئی جس میں نیالے سے رنگ کی کریم بھری ہوئی تھی۔ وہ کرسی کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ ٹب کو پرساد کے پیر کے نیچے رکھا اور گرم پانی سے اس کا پیر دھونے لگی۔ پیر کو حرکت ہونے سے پرساد بار بار کراہ رہا تھا اور جب وہ تولیے سے پیر خشک کر رہی تھی تو پرساد نے بڑی بے بسی سے جانکی کی طرف دیکھا تھا۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک حسین عورت تمہارے پیر دھو رہی ہے۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہپ لیونگ بھی اس کی بات سن کر مسکرادی تھی۔ اب وہ کریم سے پرساد کے پیر پر مالش کر رہی تھی۔ اس نے اگرچہ ہلکا ہی ہاتھ رکھا تھا مگر پرساد سسکاریاں بھرتے ہوئے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ ہپ لیونگ کا اشارہ پاکر میں کرسی کے پیچھے کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ پرساد کے کندھوں پر رکھ دیے۔

ہپ لیونگ پرساد کے پیر پر مالش کرتی رہی۔ پیر بُری طرح سوج گیا تھا۔ وہ ٹخنے کے آس پاس کی جگہ کو انگوٹھوں سے سہلا رہی تھی۔ پرساد اب زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ ہپ لیونگ نے ایک ہاتھ پنجے پر رکھا اور دوسرا ایڑھی پر اور پھر اس نے اچانک ہی پیر کو زوردار جھٹکا دیا۔ پرساد بری طرح چیخ اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرسی سے اچھلنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اس کے کندھوں کو بڑی سختی سے دبا رکھا تھا جبکہ جانکی نے قریب بیٹھ کر اس کی ٹانگ گرفت میں لے رکھی تھی۔ ہپ لیونگ نے ایک اور جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز ابھری۔ پرساد اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے مچلا تھا۔ اگر میں نے اسے دبوچ نہ رکھا ہوتا تو وہ یقیناً کرسی سے گر پڑتا۔ اس نے چیخ روکنے کے لیے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔

"بس..... بس..... کام ہوگیا۔ اب تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی ڈیئر۔ بس..... اب میں پٹی لپیٹ دوں گی۔ تمہیں آرام مل جائے گا۔" ہپ لیونگ اس کے پیر پر مالش کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ مالش کرنے کے بعد اس نے پیر پر اسکریپ بینڈیج لپیٹ دی اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگی "اب تمہیں صرف آرام کی ضرورت ہے۔ پیر کو زیادہ حرکت مت دینا۔"

ہپ لیونگ کے کہنے پر میں پرساد کو گود میں اٹھا کر ایک کمرے میں لے آیا اور بستر پر لٹا دیا۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنے آپ پر توجہ دی تھی۔ لڑائی کے دوران میں میرے جبڑے پر گھونسے لگنے سے ایک دانت ہل گیا تھا جس میں تکلیف ہو رہی تھی۔ میں نے ماؤتھ

چند کلیاں کیں مگر ظاہر ہے ماؤتھ واش سے درد کم نہیں ہوا تھا۔

جانکی دیوی کی حالت مجھ سے زیادہ ابتر تھی۔ دارا نے اسے پکڑ کر نہ صرف بُری طرح رگیدا تھا بلکہ جسم کے دوسرے گھونسے بھی مارے تھے۔ اس کا دائیں طرف کا جبڑا سوجا جسم کے بعض حصوں میں درد بھی ہو رہا تھا۔ گھر میں چین تھا اور ...ہم کوئی چیز نہیں تھی۔ جانکی نے ایک کاغذ پر کچھ گولیوں کے ...لکھ دیے اور ہپ لیونگ ایک میڈیکل اسٹور سے وہ گولیاں لے آئی۔

ہپ لیونگ نے کافی بنالی جس کی اس وقت ہم سب ہی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ہم پرساد والے کمرے میں بیٹھے کافی کی چسکیاں لیتے اور باتیں کرتے رہے اور اس وقت ہی جانکی دیوی نے ہپ لیونگ کو میرے بارے میں بتایا کہ میں کون ہوں اور دارا ...دشمن کیوں ہو رہا ہے۔

باتوں کے دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ پرساد اونگھنے لگا جانکی نے اسے ایک خواب آور گولی بھی دے دی تھی جس ...اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ ہم اٹھ کر کمرے میں ...گئے۔

"اس آدمی کو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ آشرم میں آتے دیکھا ہے" ہپ لیونگ کہہ رہی تھی "بہت سے لوگوں نے محسوس کیا تھا ...دارا کا رویہ کچھ مختلف ہے۔ دوسروں کے سامنے تو وہ سوامی کے ...احترام سے پیش آتا لیکن اس نے کبھی سوامی کے ہاتھ نہیں ...چومے تھے۔ اس کے سامنے کبھی نہیں جھکا تھا اور ایک مرتبہ تو میں نے آشرم کی عمارت کے اندر اسے سوامی کے ساتھ بڑی بدتمیزی سے بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ہندی یا اردو میں بات کر رہے تھے۔ میں نہیں سمجھ سکی تھی لیکن یہ اندازہ بہرحال لگالیا تھا کہ سوامی رگوناتھ کسی وجہ سے اس سے دبا ہوا ہے۔ پہلے سوامی کے ...خاص چیلے جو اس کے باڈی گارڈ تھے' اس کے آس پاس موجود رہتے تھے لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ غائب ہوتے گئے اور ان کی جگہ دارا کے آدمیوں نے لے لی۔ ایک روز آشرم کے پچھلی طرف ...جھاڑیوں میں سوامی کے ایک باڈی گارڈ کی لاش ملی تو آشرم میں ...خوف و ہراس سا پھیل گیا۔ میری طرح بعض اور لوگوں کا بھی خیال ...تھا کہ اس باڈی گارڈ کو دارا نے مروا دیا ہے اور غائب ہونے والے ...دوسرے باڈی گارڈز کو بھی وہ مروا چکا ہے جن کی لاشیں غائب کردی ...گئیں۔ سب لوگ سمجھ رہے تھے کہ اندر ہی اندر کوئی گڑبڑ ضرور ہے ...مگر سوامی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ معمول ...کے مطابق بھاشن (خطبہ) دیتا اور لوگوں سے نذرانے وصول کرتا۔ ...یہ تبدیلی ضرور دیکھنے میں آئی تھی کہ جب وہ اپنے چیلوں کو ...ملتا' دارا اس کے سر پر ضرور موجود ہوتا۔ سوامی کو ملنے ...والے تمام نذرانے بھی دارا کے آدمی ہی جمع کرلیتے تھے۔" وہ چند

لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "سوامی کے تمام چیلے اسے گرو اور نجات دہندہ مانتے تھے۔ وہ اس کے پیر چاٹتے تھے لیکن جب سے دارا وہاں آیا تھا' چیلوں میں کچھ بے چینی سی پھیل گئی تھی۔ وہ سوامی کے معاملات میں مداخلت کرنے لگا تھا اور دوسروں کے ساتھ بھی اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ بعض لوگوں کے ساتھ تو وہ اس طرح پیش آتا جیسے وہ اس کے زرخرید غلام ہوں۔

"چند روز پہلے تم لوگوں نے اخبار میں ڈول تائی نام کی ایک عورت کی خودکشی کی خبر پڑھی ہوگی۔ ڈول تائی ایک بہت بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھی اور وہ بھی سوامی رگوناتھ کے عقیدت مندوں میں شامل تھی۔ ایک روز رگوناتھ نے اسے خاص طور پر اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اس وقت وہاں دارا بھی موجود تھا۔ ڈول تائی جب واپس گئی تو بہت غصے میں تھی۔ اس سے اگلے روز رات کو کمپاؤنڈ میں ایک بڑی اسکرین پر ایک فلم دکھائی گئی۔ وہ فلم ڈول تائی کے بارے میں تھی جس میں اسے ایک اور آدمی کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس سے اگلے روز اخباروں میں ڈول تائی کی خودکشی کی خبر چھپی تھی۔

"ڈول تائی کی اس فلم کو دیکھ کر سوامی کے چیلوں میں کچھ بے چینی سی پھیل گئی۔ بعض لوگوں نے سوامی کے سامنے احتجاج کیا تو انہیں بری طرح لتاڑ دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد آشرم میں آنے والوں کی تعداد کم ہونے لگی اور پھر لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں رہا کہ سوامی مکمل طور پر دارا کے قبضے میں تھا۔ وہ وہی کرتا جو دارا کہتا۔ دارا نے آشرم میں آنے والے بعض بڑے لوگوں کی وڈیو فلمیں بنالی تھیں جن سے وہ انہیں بلیک میل کرکے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا۔ یہ بلیک میلنگ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب ہی لوگ جانتے تھے لیکن کوئی اس کے خلاف کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس حمام میں سب ہی ننگے تھے۔"

میں خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا۔ مجھے یاد آگیا کہ آشرم کے ایک کمرے میں ٹی وی پر میں نے ایسا ہی ایک سنسنی خیز منظر دیکھا تھا۔ وہ کوئی سیاست داں تھا جس کی فلم بنائی جارہی تھی تاکہ بعد میں اسے بلیک میل کیا جاسکے۔ اب مجھے صورت حال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ سوامی رگوناتھ کا یہ آشرم عیاشی اور بدکاری کا اڈا تھا۔ روحانی تعلیمات کے پرچار کی آڑ میں وہ نہ صرف لوگوں کو گمراہ کر رہا تھا بلکہ انہیں بلیک میل کرکے دولت بھی سمیٹ رہا تھا۔ بڑے بڑے معزز لوگ اس کے حلقے میں شامل تھے اور یہی وجہ تھی کہ سوامی کے خلاف کبھی کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوسکی تھی۔ سوامی رگوناتھ بڑے منظم طریقے سے یہ کام کر رہا تھا۔ اس نے بلیک میلنگ کی ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔ لوگ خاموشی سے بلیک میل ہو رہے تھے لیکن دارا نے آتے ہی ہنگامہ کھڑا کردیا تھا۔ اس نے لوگوں کو دوسروں کے سامنے بے نقاب کرنا شروع کردیا تھا جس

سے لوگوں میں بے چینی پھیلنے لگی تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں لوگوں کی تجوریاں خالی کردینا چاہتا تھا لیکن اس بات کو بھول گیا تھا کہ اس کا شدید ردِّعمل بھی ہوسکتا ہے۔

سوامی رگوناتھ کے آشرم میں پناہ لے کر دارا شاید یہ سمجھنے لگا تھا کہ وہ محفوظ ترین پناہ گاہ میں آگیا ہے اور اب کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسے شاید یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ہر نہلے پر دہلا بھی ہوتا ہے اور میں اب اس پر دہلا ثابت ہو رہا تھا۔

میں .... وجدان علی۔ ایک معصوم اور بے سہارا لڑکا جو اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا تھا۔ جو دارا کا نام سنتے ہی خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا تھا۔ اب مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہوگیا تھا کہ اپنے اس بدترین دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکوں اور دارا کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ زبردست ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے خوف سے بھاگتا رہوں یہاں تک کہ تھکن سے چور ہو کر گر پڑوں اور وہ بڑے آرام سے میری گردن مروڑ دے لیکن میں تھک کر گرا نہیں تھا بلکہ اس کی توقعات کے برعکس مڑ کر اس پر حملہ آور ہوا تھا۔ مہاراج نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ میں اس کے مقابلے میں اپنے پیروں پر کھڑا ہوسکوں۔

دارا نے میرے خلاف کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے تھے۔ میں اس کے ایک جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ مجھے ختم کرنے کے لیے اس نے کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن میرا وہ اب تک کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ میں بقول شخصے ’اس کے لیے سانپ کے گلے میں چھچھوندر بن گیا تھا جسے نہ وہ نگل سکتا تھا اور نہ اگل سکتا تھا۔ اب وہ اگر میرا پیچھا چھوڑ بھی دیتا تو میں اسے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔

وہ خونی بھیڑیا تھا۔ مجھے اس سے اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا بدلہ تو لینا ہی تھا لیکن دوسرے واقعات نے میرے انتقام کی آگ کو کچھ اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ وہ منشیات کا زہر پھیلا کر آنے والی نسلوں کو مفلوج کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اسے روکنا تھا۔ اب تک کتنے بے گناہوں کو اس نے موت کی نیند سلایا تھا۔ مجھے ان کا بھی انتقام لینا تھا۔ ماسٹر پھو‘ کوشلیا‘ شائی وان‘ پامیلا اور وہ معصوم بچہ جسے اس نے یرغمال بنا کر بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں نے اس بچے کو دیکھا نہیں تھا لیکن نجانے کیوں اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے سینے میں ایک ہُوک سی اٹھتی تھی۔

دارا سمجھ گیا تھا کہ اب میں اس کی راہ پر لگ گیا تھا۔ وہ سوامی رگوناتھ کے آشرم میں پناہ گزیں ہوگیا تھا لیکن میں نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ یہاں اپنے آپ کو بہت محفوظ سمجھتا تھا لیکن میں نے اسے یہاں بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی اپنی حرکتوں کی وجہ سے سوامی کے چیلے بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور پھر وہ سب کچھ ہوا تھا جس کی توقع نہ اسے تھی نہ مجھے۔

سوامی کا آشرم جل کر خاکستر ہوگیا تھا لیکن دارا کو وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ دارا کو سوامی رگوناتھ جیسے شخص پر قابو پانے کا موقع کیسے مل گیا تھا۔ وہ تو خود کائیاں آدمی تھا۔ بڑے بڑے لوگوں کو اس نے اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ کیا اس کا کوئی ایسا راز دارا کے قبضے میں آگیا تھا جس کا انکشاف اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ ایسا کیا راز ہوسکتا تھا اور اب تو سوال یہ تھا کہ سوامی رگوناتھ زندہ بچا بھی تھا یا اپنے آشرم کی آگ میں جل مرا تھا۔

”اب تو بہرحال سب کچھ ختم ہوگیا۔“ میں نے ہپ لیونگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”لوگوں کے خلاف بلیک میلنگ کے تمام ثبوت آشرم کی آگ میں جل کر راکھ ہوچکے ہوں گے۔ دارا اگرچہ بھاگ گیا ہے لیکن وہ پھر سامنے آئے گا۔ تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہماری اور اس کی جنگ ہے لیکن اگر کوئی ایسی بات....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ہپ لیونگ میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی ”بقول تمہارے‘ سب کچھ آشرم کی آگ میں جل کر راکھ ہوچکا ہے تو میرے لیے ڈرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔“

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ہپ لیونگ بھی سوامی رگوناتھ کے حلقے میں شامل تھی اور سوامی کا شمار ایسے لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جو دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ ان کے لیے دولت اور صرف دولت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اس نے یہ سارا ڈراما ہی اس لیے شروع کیا تھا۔ روحانی تعلیمات کی آڑ میں بدکاری اور عیاشی کے اس اڈے میں وہ سب کچھ ہوتا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ اس نے آشرم میں آنے والے ہر مرد عورت کا کوئی نہ کوئی راز ضرور اپنے قبضے میں رکھا ہوگا تاکہ ان کی بنیاد پر لوگوں کو بلیک میل کرکے دولت سمیٹی جاسکے۔ ہپ لیونگ کا بھی کوئی راز تھا جس کے ضائع ہوجانے پر اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا اور نجانے اب کتنے لوگ سکھ کا سانس لیں گے۔

”تم اس چکر میں کیسے پھنس گئیں؟“ جانکی دیوی نے پوچھا۔

”بدقسمتی۔“ ہپ لیونگ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”شہر میں میرے تین مساج پارلرز چل رہے ہیں۔ تینوں پارلر بڑے ہوٹلوں میں ہیں۔ روزانہ ہزاروں کی آمدنی ہے۔ ایک روز میرے دفتر ہی میں مسز ڈول تائی سے روحانیت کے موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ وہ میری پرانی کسٹمر تھی۔ مجھے بھی روحانیت سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی۔ میں نے اس موضوع پر کچھ کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کر رکھا تھا۔ مسز ڈول تائی نے مجھے روحانیت کے بارے میں جاننے کے لیے سوامی کے آشرم جانے کا مشورہ دیا بلکہ اس سے اگلے روز وہ مجھے خود ہی وہاں لے گئی اور سوامی سے میرا تعارف کرایا۔ اس کے اندازِ گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ ڈول تائی سوامی کے اندرونی

حلقے میں شامل ہے۔ سوامی رگوناتھ سے ہونے والی اس پہلی ملاقات سے میں بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اس نے مجھے چند عورتوں اور مردوں پر مشتمل ایک گروہ میں شامل کردیا۔ میں باقاعدگی سے وہاں جانے لگی۔ اس کے لیے مجھے روزانہ کچھ نہ کچھ نذرانہ پیش کرنا پڑتا۔ یہ نذرانہ اس وقت پیش کیا جاتا جب سوامی بھاشن ختم کرتا۔

”تقریباً دو مہینوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ رگوناتھ تو روحانیت کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ اس کے اپنے ہی نظریات تھے۔ جن کا وہ پرچار کر رہا تھا اور ان نظریات سے تم لوگ بھی واقف ہوچکے ہو۔ بہرحال‘ وہ باتیں مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ شروع میں تو جب میں مردوں اور عورتوں کو آزادانہ طور پر ناشائستہ حرکتیں کرتے دیکھتی تو مجھے بہت بُرا لگتا تھا لیکن بعد میں ‘میں خود بھی اس رنگ میں رنگتی چلی گئی۔ سوامی کے بھاشن‘ اس کے نظریات‘ ہیجان خیز باتیں‘ ہیجان خیز موسیقی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں بھی وہاں ایک دوسرے کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سب کے چہرے ہڈ میں چھپے ہوتے تھے۔ کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ کسی کو پتا نہیں ہوتا تھا کہ کون کس کے ساتھ ہے۔

”میں بھی اس چکر میں پھنس گئی۔ یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ سوامی رگوناتھ کا مقصد ہی وہ مادر پدر آزادی تھا جس کی اجازت کوئی معاشرہ نہیں دے سکتا۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ اس حقیقت کو سمجھ گئے تھے لیکن کوئی بھی وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔

”اور پھر ایک رات سوامی رگوناتھ نے مجھے اپنے کمرے میں بُلالیا۔ رگوناتھ کی بات کوئی بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس کا ہر حکم مانا جاتا تھا۔ اس نے مجھے جو حکم دیا‘ وہ میں بھی نہیں ٹال سکی۔ مجھے ایک کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ایک ایسا آدمی موجود تھا جسے میں بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ایک بہت بڑا سرکاری آفیسر تھا اور پھر دوسرے روز بھی مجھے آشرم کے اندر بلا لیا گیا۔ اس مرتبہ سوامی کا ایک خاص چیلا مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور مجھے ٹی وی پر ایک ویڈیو فلم دکھائی۔ میں کانپ کر رہ گئی۔ پچھلی رات میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا‘ وہ سب کچھ اس فلم میں موجود تھا۔ فلم دکھانے کے بعد مجھ سے ایک بڑی رقم کا مطالبہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ہی دھمکی بھی دی گئی۔

”میں نے خاموشی سے وہ مطالبہ پورا کردیا اور پھر ہر دو ہفتے بعد مجھ سے اتنی ہی رقم کا مطالبہ کیا جاتا رہا۔ دوسری طرف وہ اس شخص کو بھی بلیک میل کر رہے تھے جو میرے ساتھ تھا۔ اس سے زیادہ بڑی رقمیں اینٹھی جا رہی تھیں۔ وہ لوگ شکار کی حیثیت کے مطابق مطالبہ کرتے تھے جسے خاموشی سے پورا کردیا جاتا تھا۔

”میں نے ایک روز مسز ڈول تائی سے بات کی تو انکشاف ہوا کہ وہ بھی اس جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ وہ حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھی۔ اس سے تو بڑی بڑی رقمیں وصول کی جا رہی تھیں اور پھر ایک روز اس نے رقم دینے سے انکار کردیا اور اس کے ساتھ ہی سوامی کو یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ وہ اس کے خلاف کارروائی کرے گی اور پھر اسی رات آشرم کے کمپاؤنڈ میں ایک بڑی اسکرین پر مسز ڈول تائی کی وہ فلم دکھا دی گئی اور اسی رات مسز ڈول تائی نے خودکشی کرلی۔ اس نے کوئی نہ کوئی خط ضرور چھوڑا ہوگا لیکن پولیس کو وہ خط نہیں مل سکا ہوگا۔ کمپاؤنڈ میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں مسز ڈول تائی کی اس فلم کی نمائش کا مقصد دوسروں کو وارننگ دینا تھا کہ اگر کسی کے ذہن میں بغاوت کا خیال ہو تو وہ اسے بھول جائے۔

”اور پھر دارا نے وہاں آکر لوگوں میں بے چینی پھیلا دی۔ وہ کھل کر دھمکیاں دیتا اور لوگوں کو ہراساں کرتا اور آج جو کچھ بھی ہوا‘ وہ جس طرح میرے لیے باعثِ اطمینان ثابت ہوا ہے کل آشرم میں آتش زدگی کی خبر پڑھ کر دوسرے لوگ بھی اطمینان کا سانس لیں گے۔“

”کیا تمہارے شوہر نے وہاں جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟“ جانکی دیوی نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”اگر میرا شوہر ہوتا تو شاید میں اس طرف کا رخ بھی نہ کرتی۔“ ہپ لیونگ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا ”دو سال پہلے میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا۔“

میں خاموشی سے اس کی باتیں سُن رہا تھا۔ تھائی وانگ مجھے سوامی رگوناتھ کے آشرم کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی لیکن ہپ لیونگ نے جو انکشافات کیے تھے وہ بہت سنسنی خیز تھے۔ میں نے ڈاکٹر جانکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کا تعلق زندگی کے ایک معزز شعبے سے تھا۔ معاشرے میں اس کی عزت تھی لیکن میرے کہنے پر وہ بھیڑیوں کے اس بھٹ میں جانے کو تیار ہوگئی تھی اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ صحیح سلامت وہاں سے نکل آئی تھی۔ اگر اسے کچھ ہوجاتا تو شاید میں اپنے آپ کو معاف نہ کرپاتا۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت رات کا ایک بجنے والا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ گانگ اور اس کے ساتھی مہاراج کے پاس... پہنچ چکے ہوں گے۔ ہمیں تو ان سے پہلے وہاں پہنچنا چاہیے تھا لیکن ہم اطمینان سے یہاں بیٹھے تھے اور مجھے یقین تھا کہ مہاراج پریشان ہو رہے ہوں گے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف اسٹینڈ پر ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔

”کیا میں فون استعمال کرسکتا ہوں؟“ میں نے ہپ لیونگ سے پوچھا۔

”ضرور۔ کیوں نہیں۔“ ہپ لیونگ مجھ سے پہلے اٹھ گئی اور ٹیلی فون اٹھا کر میرے قریب صوفے پر رکھ دیا۔ اس کا تار خاصا لمبا تھا۔

میں نے ریسیور اٹھا کر واٹ ٹریمنٹ کا وہ نمبر ملایا جس پر مہاراج سے بات ہو سکتی تھی۔ کال فوراً ہی ریسیو کر لی گئی لیکن وہ آواز مہاراج کی نہیں تھی۔

"میں وجدان بول رہا ہوں۔ مہاراج سے بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ.... وجدان.... میں گانگ ہوں۔ کہاں غائب ہو گئے۔ تمہیں تو ہم سے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"ہمیں ایک ہمدرد خاتون مل گئی تھی جو ہمیں اپنے گھر لے آئی۔" میں نے جواب دیا "ویسے پرساد کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔"

"ایک منٹ۔ مہاراج سے بات کرو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ تقریباً ایک منٹ خاموشی رہی پھر مہاراج کی آواز سنائی دی۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور پھر میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے فون رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟" جانکی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"مہاراج نے حکم دیا ہے کہ ہم فوراً اس کے پاس پہنچ جائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مگر۔ پرساد سو رہا ہے۔ اگر اسے اٹھا کر لے جایا گیا تو اس کی تکلیف بڑھ جائے گی۔" یہ بات ہپ لیونگ نے کہی تھی۔

"اگر کوئی خطرہ نہ ہو تو ہم اسے یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔ کل دن میں کسی وقت گانگ کو بھیج کر اسے بلوا لیں گے۔ ویسے کل تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"میں تو کم از کم ایک ہفتے تک یہاں سے باہر نہیں نکلوں گی۔" ہپ لیونگ نے جواب دیا "اور میرے خیال میں پرساد کو یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ویسے بھی اسے دو چار دن آرام کی ضرورت ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "ہم تمہاری گاڑی لے جا رہے ہیں۔ صبح گانگ واپس پہنچا دے گا۔"

میں نے پرساد والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ خواب آور دوا کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہا تھا۔

گاڑی کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ چابی بھی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے ابھی تک ڈرائیونگ نہیں سیکھی تھی اس لیے ڈرائیونگ سیٹ ڈاکٹر جانکی کو ہی سنبھالنی پڑی۔ میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھنے لگا تو میری نظریں ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے دو پستولوں کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک جانکی کا پستول تھا اور دوسرا دارا کا تھا جو جانکی نے سڑک پر سے اٹھا لیا تھا۔ میں نے دارا والا پستول اٹھا کر ہپ لیونگ کی طرف بڑھا دیا۔

"رکھ لو۔ شاید کسی وقت اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

ہپ لیونگ نے مسکراتے ہوئے وہ پستول لے لیا۔ جانکی گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر چکی تھی۔ ہپ لیونگ نے گیٹ کھول دیا اور جانکی گاڑی کو گیٹ سے نکال کر باہر لے آئی۔

ہمیں واٹ ٹریمنٹ پہنچنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ ہمیں فوراً ہی اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں نویتا اور تھائی وانگ موجود تھیں۔ تھائی وانگ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہی تھی جیسے یقین کر لینا چاہتی ہو کہ میری کوئی ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی۔

"مہاراج بہت غصے میں ہیں۔ وہ...." تھائی وانگ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن دروازے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ مہاراج ماسٹر ہوچن اور گانگ کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں بو (جھک کر تعظیم دینا۔ خصوصاً مارشل آرٹس کا سلام) کیا اور مودبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔

مہاراج چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے تفصیل سننا چاہتا ہوں۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ غصے میں ہوتے تو ان کا لہجہ مختلف ہوتا۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ میں نے مہاراج کو وہ باتیں بھی بتا دیں جو ہپ لیونگ سے معلوم ہوئی تھیں۔

"یہ تو سب جانتے تھے کہ سوامی رگوناتھ کا آشرم عیاشی اور بدکاری کا اڈا ہے۔ وہ ایسے نظریات کا پرچار کر رہا ہے جو معاشرے کو تباہ کر سکتے ہیں۔ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ حکومت کے بعض بڑے بڑے عہدے دار اس کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہیں۔ میں نے شاید غلط کہہ دیا۔ وہ اس کے جال میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بلیک میل کر رہا تھا اس لیے اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا تھا اور دارا نے اس کی کسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنے جال میں پھنسا لیا تھا اور آشرم کا سارا انتظام ایک طرح سے اس نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ لوگوں کو کھل کر دھمکیاں دے رہا تھا۔ آپ نے مسز ڈول تائی نامی کسی عورت کے بارے میں سنا ہوگا جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھی۔ وہ بھی اس کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی تھی۔ دارا نے آشرم کے کمپاؤنڈ میں سیکڑوں لوگوں کو اس کی عریاں فلم دکھائی تھی اور اگلے روز مسز ڈول تائی نے خودکشی کر لی تھی۔ لوگوں میں دارا کے خلاف اشتعال پھیل رہا تھا۔ آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کسی دل جلے نے آشرم کی عمارت کو آگ لگا دی اور وہ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔"

"اور یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہوا۔" مہاراج نے کہا۔

"شاید۔" میں نے سر ہلا دیا "سوامی رگوناتھ اس وقت تہ خانے میں تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا یا جل مرا لیکن دارا بھاگ نکلا۔"

"مجھے خوشی ہے کہ تمہاری وجہ سے بدکاری کا وہ اڈا ختم ہو گیا جس کے لیے لوگ عرصے سے شور مچا رہے تھے لیکن حکام کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی اور اس کی وجہ میں پہلے بھی سمجھتا تھا اور اب اس کی تصدیق بھی ہو گئی ہے۔" مہاراج چند لمحوں کو خاموش ہوئے پھر بولے "بدکاری کا ابھی ایک اڈا ختم ہوا ہے۔ ابھی بہت سی برائیاں ہیں جن کا خاتمہ کرنا ہے۔ میں نے تمہیں اس لیے اڈاپٹ کیا تھا کہ تمہیں ان برائیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر سکوں۔ تم خود ان برائیوں کا شکار ہو چکے ہو۔ اس لیے تم اس بات کا اندازہ زیادہ بہتر طور پر لگا سکتے ہو کہ کوئی برائی کسی دوسرے کی زندگی کو کس طرح متاثر کر سکتی ہے۔" وہ خاموش ہو کر تھائی وانگ وغیرہ کی طرف دیکھنے لگا "تم میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جن کو بروئے کار لا کر تم بدکاری کا مقابلہ کر سکتے ہو لیکن ابھی تمہارے اندر کی ان صلاحیتوں کو مزید ابھارنے کی ضرورت ہے اور اندر کی ان صلاحیتوں کو اس فن سے ابھارا جا سکتا ہے جو میں تمہیں سکھا رہا ہوں۔ مارشل آرٹ صرف ہاتھ پیر چلانے کا نام نہیں' اس میں ذہن بھی پوری طرح ملوث ہوتا ہے۔ تمہاری ٹریننگ ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ ابھی تو بڑی تپسیا کی ضرورت ہے تمہیں۔ ابھی تو تمہارا ابتدائی مرحلہ بھی مکمل نہیں ہوا لیکن اس مرحلے میں بھی تم نے جو کچھ کیا ہے' وہ قابلِ تعریف ہے۔ میں تمہیں چشمِ تصور سے بہت اوپر دیکھ رہا ہوں اور تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں ان جیسی ساتھی ملی ہیں۔ جوان اور حسین عورتیں' عام طور پر تم جیسے نوجوانوں کو گناہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن ان سے تمہیں سچی اور بے لوث محبت ملی ہے۔ یہ تمہیں کتنا چاہتی ہیں میں اس کا اندازہ لگا چکا ہوں۔ ان کے دلوں میں تمہارے لیے کسی بھی طرح کا کھوٹ نہیں پیار ہی پیار ہے۔ سچا اور کھرا پیار.... اور تمہارا وہ دوست رامن پرساد۔" مہاراج ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ میں نے تھائی وانگ اور ڈاکٹر جانکی دیوی کی طرف دیکھا۔ مہاراج کی اس تعریف سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے "کیا ہوا اسے۔ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی؟" مہاراج نے اپنی بات مکمل کر دی۔

"اس کے ٹخنے میں موچ آ گئی تھی۔" میں نے جواب دیا "ہپ لیونگ نے جوڑ بٹھا کر ڈریسنگ کر دی تھی۔ وہ اس وقت پُرسکون نیند سو رہا تھا اس لیے میں نے اسے جگانا اور ساتھ لانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"ٹھیک ہے۔ گانگ صبح جا کر اسے دیکھ آئے گا اور اس کا بھی پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ ویسے...." مہاراج نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "کیا نام ہے اس عورت کا۔ ہپ لیونگ.... ہاں۔ ہپ لیونگ.... اس سے تمہارا تعلق کتنا پرانا ہے۔ چند گھنٹوں کا؟ وہ تمہارا ساتھ دینے پر تیار کیوں ہو گئی۔ تم لوگوں کو اپنے گھر میں پناہ کیوں دی۔ اس نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ اگر تمہارے اندر کی سچائی کو پہچان لیا تھا۔ اس جیسے لوگ سچائی کا ساتھ دینے کے لیے خطرات کی پروا نہیں کرتے۔ تمہاری نیت میں فتور ہوتا۔ تم میں برائی ہوتی۔ سچائی کا فقدان ہوتا تو تمہیں یہ محبتیں اور چاہتیں نہ ملتیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اپنے اندر کی اسپرٹ کو بیدار رکھو۔ کیپ اِٹ اَپ۔ ویسے تم اپی چی (انسان کے وجود میں پائی جانے والی ایک پوشیدہ و نادیدہ پُراسرار قوت جس کے بل بوتے پر محیر العقول کارنامے سرانجام دیے جا سکتے ہیں) کی ٹریننگ کب شروع کر رہے ہو؟" مہاراج نے کہا۔

"جب آپ حکم کریں مہاراج۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ دو چار دن بعد میں خود تمہاری ٹریننگ شروع کروں گا۔" مہاراج نے کہا پھر محبت بھری نظروں سے تھائی وغیرہ کی طرف دیکھا اور رخصت ہو گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ماسٹر ہوچن نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں آنکھ مار کر مسکرا دیا۔

ان کے جاتے ہی تھائی وانگ نے دوڑ کر دروازہ بند کر دیا اور مڑ کر چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی نظروں کا مطلب سمجھ سکتا' وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میری پیشانی اور گالوں پر اس نے بوسوں کی بارش کر دی تھی۔ میں گڑبڑا کر پیچھے ہٹتا ہوا پشت کے بل بیڈ پر گر گیا۔ تھائی وانگ بھی میرے اوپر گری تھی۔ اس نے مجھے چھوڑا نہیں۔ میرے چہرے پر بوسے ثبت کرتی رہی اور ڈاکٹر جانکی دیوی اور نویتا ایک طرف کھڑی قہقہے لگاتی رہیں۔

"اوہ.... ارے.... تھائی۔ پاگل ہو گئی ہو کیا؟" میں اس کے بوجھ تلے دبا چیخ رہا تھا۔

"ہاں میں واقعی پاگل ہو گئی ہوں۔" تھائی نے سر اٹھا کر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "سنا نہیں تم نے۔ کیا کہا تھا مہاراج نے؟ مارشل آرٹ کی دنیا کا سب سے عظیم آدمی تمہاری کتنی تعریف کر رہا تھا۔ اگر مہاراج کا خیال نہ ہوتا تو میں اسی وقت تمہیں دبوچ لیتی۔"

"اچھا۔ اب تو چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

تھائی وانگ نے مجھے چھوڑ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مہاراج نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں واقعی خوش قسمت تھا کہ مجھے تھائی وانگ اور ڈاکٹر جانکی دیوی جیسی محبت کرنے والی خواتین ملی تھیں۔ ان کی محبت کھری تھی۔ یہ مجھے میلی آنکھ سے نہیں دیکھتی تھیں۔ میں عرصے سے تھائی وانگ کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش یا حرکت نہیں کی تھی جس سے میں کوئی غلط مطلب اخذ کرتا۔ یہ اس کی محبت کی سچائی ہی تھی کہ مہاراج سے میری تعریف سن کر جانکی اور نویتا کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ سے

لپٹ گئی تھی۔

میں بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جانکی دیوی اور نویتا بھی کرسیوں پر بیٹھ چکی تھیں۔ اگرچہ رات کے ڈھائی بج چکے تھے لیکن نیند ہم میں سے کسی کو نہیں آرہی تھی۔ آج کے واقعے کے بعد تو مجھے اور جانکی دیوی کو نیند نہیں آنی چاہیے تھی۔ ہم جتنی دیر آشرم میں رہے تھے' موت سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ اگر وہاں پر موجود تین چار سو لوگ ہنگامہ نہ کھڑا کردیتے تو ہمارے لیے وہاں سے نکلنا مشکل ہوجاتا۔ وہ تو ہمیں یہاں آکر پتا چلا کہ مجھے اور پرساد کو آشرم میں جانے کی اجازت دینے کے بعد مہاراج نے گانگ اور اس کے ساتھ دو لڑکوں کو بھی وہاں بھیج دیا تھا تاکہ اگر ہم کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو وہ ہماری مدد کرسکیں لیکن وہاں ہنگامہ ہوجانے کی وجہ سے وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرسکے تھے اور ویسے بھی وہاں سب لوگ ہڈ پہنے ہوئے تھے۔ ہمارے بھی چہرے چھپے ہوئے تھے۔ شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ آشرم سے نکلتے وقت ہم نے ہڈ اتار پھینکے تھے اور دیوار پھلانگ کر باہر آگئے تھے۔ گانگ وغیرہ نے ہمیں اس وقت دیکھا تھا جب ہم ہپ لیونگ کی کار میں وہاں سے نکل رہے تھے اور پھر دارا کو بھی ایک کار میں وہاں سے نکلتے دیکھ کر انہیں خطرے کا احساس ہوا تھا۔

مجھے جانکی دیوی پر حیرت ہوئی تھی۔ دھان پان سی یہ عورت اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر دارا جیسے بدمعاش سے بھڑ گئی تھی اور اسے آخر وقت تک روکے رکھا تھا۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ دارا وہاں سے فرار ہو کر کہاں گیا ہوگا؟" تھائی وانگ کی آواز سن کر میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔

"پیڈرو کے پاس جانے کے سوا اور کہاں جاسکتا ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور پھر میں خود ہی اپنی جگہ سے اچھل پڑا "ہاں۔ وہیں گیا ہوگا۔ اس کے سوا وہ اور کہیں نہیں جاسکتا۔ وہی اس کی آخری امید ہے۔"

"کاش! میں اسے دیکھ سکتی۔" تھائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اس کی حالت قابلِ دید ہوگی۔ وہ اپنی بوٹیاں نوچ رہا ہوگا۔"

"فکر مت کرو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم اسے اس حالت میں ضرور دیکھوگی۔"

"کاش! وہ دن جلدی آجائے۔" تھائی وانگ نے کہا۔

"تم یہاں بیٹھی اس دن کا انتظار کرتی رہو۔ میں تو سونے جارہی ہوں۔ سر میں بہت شدت کا درد ہورہا ہے۔" ڈاکٹر جانکی دیوی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے سر میں درد تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ دارا نے اسے بالوں سے پکڑ کر خوب گھسیٹا تھا۔ اس کا اوپر کا ہونٹ بھی سوجا ہوا تھا۔

"اوہ۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا کہ تم لوگ ایک بہت بڑا معرکہ سر کرکے آئے ہو۔" تھائی وانگ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایسا کرو' تم اور نویتا ساتھ والے کمرے میں جاکر سوجاؤ۔ میں ابھی وجدان سے کچھ باتیں کروں گی۔"

"اچھی طرح چیک کرلینا۔ کہیں ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی اس کی۔" جانکی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "صرف جبڑا سوجا ہوا ہے۔ شاید غلطی سے ان میں سے کسی کا ہاتھ لگ گیا تھا۔"

جانکی اور نویتا دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ تھائی وانگ نے اٹھ کر دروازہ بند کردیا اور میرے سامنے آکر ایک بار پھر گہری نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی جو مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہے ہو؟" وہ بولی۔

"نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "صرف جبڑے پر ایک ہاتھ پڑ گیا تھا اس کے سوا مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

"آؤ۔ یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔" تھائی نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ اس وقت واقعی مجھے تھکن سی محسوس ہورہی تھی۔ غنودگی سی طاری ہورہی تھی۔ تھائی وانگ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اور نجانے میرا دل کیوں چاہنے لگا کہ میں اس کی گود میں سر رکھ کر سوجاؤں۔

اور پھر میں اپنی اس خواہش پر قابو نہ پاسکا۔ میں نے آگے جھک کر اپنا سر تھائی وانگ کی گود میں رکھ دیا اور ٹانگیں بیڈ پر پھیلالیں۔ تھائی نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میں عجیب سا سکون محسوس کرنے لگا۔ تھائی وانگ کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کررہی تھی لیکن میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور پھر میں سوگیا۔

آنکھ کھلی تو کھڑکی سے آنے والی دھوپ کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں بہت گہری نیند سویا تھا۔ آنکھ کھلنے پر چند سیکنڈ تک تو میں سمجھ نہیں سکا کہ کہاں ہوں۔ آہستہ آہستہ حواس بحال ہوئے تو مجھے سب کچھ یاد آگیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چونک گیا۔ میرا سر تھائی وانگ کی گود میں رکھا تھا۔ وہ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے سو رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا۔

یہ کیسی عورت تھی جو رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی کہ میرا سر اس کی گود سے ہٹ جائے گا یا میری نیند خراب ہوگی۔ میرے دل میں عجیب سا احساس جاگ اٹھا۔ کئی بار ایسا ہوا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو میرے لیے تکلیف میں ڈالا تھا لیکن میں اس کی محبت کو ابھی تک کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ مجھے بہت چاہتی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو ایک لمحے کو بھی مجھے اپنے سے الگ نہ ہونے دیتی۔ یہ بھی اس کی چاہت کا ایک انداز تھا کہ میرا سر اپنی گود میں رکھے رات بھر بیٹھی جاگتی رہی تھی اور میں گہری نیند سوتا رہا تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹایا اور

جیسے ہی اپنا سر اس کی گود سے اٹھانا چاہا' وہ بڑبڑا سی گئی اور میرے سر کو دوبارہ گود میں رکھ لیا۔ اس کا ہاتھ ایک بار پھر میرے سینے پر ٹک گیا۔ یہ حرکت اس سے نیند میں سرزد ہوئی تھی۔

"تھائی....." میں نے اس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے ہولے سے پکارا۔

اس نے ایک دم آنکھیں کھول دیں "اوہ۔ تم جاگ گئے۔ سوجاؤ۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔"

"رات تو گزر گئی۔ دن نکلا ہوا ہے۔ وہ دیکھو۔ دھوپ کمرے میں آرہی ہے۔" میں نے آہستگی سے اٹھتے ہوئے کہا "تم رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی ہو۔ سوئی کیوں نہیں؟"

"سو تو رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"تھائی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں "تم مجھے کیا سمجھتی ہو؟"

"اس سوال کا جواب تو میں بھی نہیں جانتی۔" تھائی نے جواب دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی' دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے پاتونگ کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ واٹ (WAT) کی وہی نوجوان اور حسین راہبہ تھی جس سے سب سے پہلے میری ملاقات ہوئی تھی۔

"ہیلو نٹشل ماسٹر۔" وہ مسکرائی "دس بج رہے ہیں۔ تم لوگ ناشتا نہیں کروگے؟"

"نٹشل ماسٹر!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یس۔" پاتونگ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ "مہاراج کا حکم ہے کہ آئندہ تمہیں اسی نام سے پکارا جائے۔ بہرحال' تم لوگ دس پندرہ منٹ میں کھانے کے کمرے میں آجاؤ۔"

پاتونگ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے مڑ کر کمرے میں دیکھا۔ تھائی وانگ بیڈ پر موجود نہیں تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اور پھر تقریباً بیس منٹ بعد ہم سب کھانے کے کمرے میں موجود تھے۔ وہاں پانچ چھ بھکشو بھی ایک میز کے گرد بیٹھے ناشتا کررہے تھے۔ پاتونگ نے ہمارے سامنے ناشتا لاکر رکھ دیا اور خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔

وہ بھکشو کچھ دیر بعد پلیٹیں صاف کرکے ڈکار لیتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں ان بھکشوؤں کی خوراک جانتا تھا۔ انہوں نے ڈٹ کر کھایا ہوگا اور دوپہر کو اس سے بھی زیادہ ڈٹ کر کھائیں گے۔ یہ بھکشو لوگ صبح اور دوپہر ہی کو کھانا کھاتے تھے۔ رات کا کھانا یہ لوگ نہیں کھاتے تھے۔ بدھ مذہب کا کوئی شخص اگر بھکشو بننا چاہتا تو اسے چند شرائط کی پابندی کرنی پڑتی تھی جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کوئی ایسی چیز نہیں کھائیں گے جس سے پیٹ بھرتا ہو لیکن میں نے بہت سے بھکشوؤں کو رات کو بھی خوب ڈٹ کر کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب پہلی ٹریننگ کے لیے مجھے پہاڑی والے واٹ (بدھا کی عبادت گاہ) میں بھیجا گیا تھا تو وہاں میں نے تمام بھکشوؤں کو رات کا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور جنگل والے کیمپ میں بھی سارے ہی بھکشو کھانا کھاتے تھے۔

ناشتا کرنے کے بعد ہم نے کافی بھی وہیں بیٹھ کر پی تھی۔

"یہاں کوئی اخبار ملے گا یا باہر سے منگوانا پڑے گا؟" میں نے پاتونگ سے پوچھا۔

"تم لوگ اپنے کمرے میں چلو۔ میں لے کر آتی ہوں۔" پاتونگ نے جواب دیا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر تھائی والے کمرے میں آگئے۔ تقریباً دس منٹ بعد پاتونگ اخبار لے کر آگئی۔ اخبار تھائی زبان کا تھا۔ یہ زبان میں بولنے اور سمجھنے تو لگا تھا لیکن پڑھنا بالکل نہیں جانتا تھا۔ اخبار کے پہلے ہی صفحے پر تصویریں دیکھ کر میں اخبار کی ہیڈ لائن کا متن سمجھ گیا۔ ایک تصویر جلتے ہوئے آشرم کی تھی۔ کچھ تصویریں جلی ہوئی گاڑیوں کی تھیں اور تین تصویریں لاشوں کی تھیں۔ ایک مرد اور دو عورتوں کی لاشیں تھیں جن کے چہرے پہچانے نہیں جارہے تھے۔ میں نے اخبار پڑھ کر تھائی وانگ کو دے دیا۔

"پڑھ کر بتاؤ۔ کیا لکھا ہے۔"

تھائی وانگ نے اخبار اپنے سامنے پھیلالیا۔ ڈاکٹر جانکی اور نویتا بھی اس پر جھکی ہوئی تھیں۔ اخبار کی ہیڈ لائن تو تھی ہی آشرم کی آتش زدگی کے بارے میں' صفحۂ اول پر اور بھی چھوٹی بڑی لاتعداد خبریں اس حوالے سے تھیں۔

"ہوں....." تھائی وانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اخبار اس کے ہاتھ سے نویتا نے لے لیا تھا۔

"اس ہنگامے میں تین افراد ہلاک اور کئی زخمی ہوئے ہیں۔ یہ تینوں آشرم سے باہر نکلنے کی کوشش میں کچلے گئے تھے۔ ان میں ایک مرد اور دو عورتیں شامل ہیں۔ زخمی ہونے والوں میں دو کو گولیاں لگی تھیں جبکہ کچھ دھکم پیل میں زخمی ہوئے۔ آشرم میں لگنے والی آگ پر رات گئے تک قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ خیال ہے کہ کچھ لوگ آگ میں جل کر بھی ہلاک ہوئے ہوں گے۔" تھائی وانگ رکے بغیر کہے جارہی تھی "آشرم کے باہر کچھ گاڑیوں کو بھی نذرِ آتش کردیا گیا۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق آشرم میں یہ ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب سوامی رگوناتھ کے چند گرگوں نے وہاں آئے ہوئے لوگوں کے چہروں سے ہڈ نوچنے شروع کیے۔ انہیں شاید کچھ خاص لوگوں کی تلاش تھی جن کے بارے میں سوامی رگوناتھ بار بار اعلان کررہا تھا کہ کچھ جرائم پیشہ لوگ آشرم میں گھس آئے ہیں۔ جو یہاں کا پُرسکون ماحول برباد کررہے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ پچھلے چند روز سے ایک اور آدمی آشرم پر قابض تھا اور سوامی رگوناتھ اس کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ اسے نہ تو کوئی شخص نام سے جانتا ہے اور نہ چہرے سے پہچانتا ہے۔

وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا چہرہ ہمیشہ ہڈ میں چھپائے رہتا تھا۔ اس کے گرگے بھی اپنے چہرے ہڈ میں چھپائے رہتے تھے۔ آشرم میں ہنگامے اور آتش زدگی کی اطلاع ملتے ہی پولیس اور دیگر اعلیٰ حکام موقع پر پہنچ گئے تھے۔ اعلیٰ سطح پر تحقیقات کا حکم دے دیا گیا ہے۔ عوام نے اس واقعے پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ بعض سیاست دانوں کے بیانات بھی اخبار میں چھپے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی حکومت کو سوامی رگوناتھ کی ناپسندیدہ سرگرمیوں سے آگاہ کرتے رہے ہیں لیکن عیاش حکمرانوں نے کبھی اس کا نوٹس نہیں لیا جس کا نتیجہ آج اس ہنگامے کی صورت میں نکلا۔"

"اور سوامی رگوناتھ کے بارے میں کوئی اطلاع؟" میں نے تھائی کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لاپتا ہے۔" تھائی نے جواب دیا "لوگوں کے کہنے کے مطابق وہ بھاشن ختم کرکے آشرم کی عمارت کے اندر چلا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ہنگامہ شروع ہونے سے پہلے عمارت کے اندر سے شور اور گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ سوامی رگوناتھ کے بارے میں فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ بھی اس آگ میں جل کر مر گیا ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ بہرحال' اسے تلاش کیا جارہا ہے۔ اعلیٰ حکام نے یقین دلایا ہے کہ اس واقعے کی غیر جانب دارانہ تحقیق کی جائے گی اور اس کے ذمّے داروں کو سخت ترین سزا دی جائے گی۔" وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئی پھر حکمرانوں کو بے نقط سنانے لگی "راشی' بے ضمیر.... جب ہر طرف سے سوامی اور اس کے آشرم کے خلاف آوازیں اٹھائی جارہی تھیں تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی تھی۔ اب معاملہ ہاتھ سے نکل گیا ہے اور کئی لوگ مارے گئے ہیں تو انہیں قانون یاد آرہا ہے۔"

تھائی وانگ دیر تک بڑبڑاتی رہی اور میں اس صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے دارا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ یقیناً پیڈرو ہی کے پاس چلا گیا ہوگا۔ چند روز تک تو وہ دبکا رہے گا اور اس کے بعد ہی کوئی کارروائی کرے گا۔ میں اگرچہ پوری طرح اس کے خلاف سرگرم نہیں ہوا تھا لیکن اِکّادُکّا جو کارروائیاں کی تھیں ان سے بھی اسے خاصا نقصان ہوا تھا۔

سوامی رگوناتھ کا آشرم تو سونے کی کان تھا۔ نجانے کس طرح اس نے رگوناتھ کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ وہ اس آشرم سے کروڑوں بھات کما سکتا تھا اور یہ مستقل آمدنی تھی۔ کبھی ختم نہ ہونے والی۔ سوامی رگوناتھ کی طرح وہ بھی میانہ روی سے کام لیتا تو لوگ خاموشی سے بلیک میل ہوتے رہتے لیکن وہ شاید ایک ہی مرتبہ ان کی تجوریاں خالی کروالینا چاہتا تھا جس سے لوگ اندر ہی اندر اس کے خلاف ہوتے جارہے تھے اور پھر میں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میں درحقیقت سوامی رگوناتھ یا اس کے آشرم کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں تو صرف دارا کے چکر میں وہاں گیا تھا۔ صرف دارا کو وہاں سے نکالنا چاہتا تھا لیکن لوگ پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے۔ انہیں موقع مل گیا اور اس طرح آشرم کی کہانی ختم ہوگئی۔

ہم لوگ اس صورتِ حال پر تبصرہ کررہے تھے کہ گانگ بھی آگیا۔ وہ صبح ہی ہپ لیونگ کی گاڑی لے کر چلا گیا تھا۔ صبح جانے سے پہلے اس نے جانکی دیوی کو جگا کر اس سے ہپ لیونگ کے گھر کا پتا سمجھ لیا تھا۔

"وہاں سب ٹھیک ہے لٹل ماسٹر۔" گانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہپ لیونگ کا فی الحال چند روز تک گھر سے باہر نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ پرساد کا پوری طرح خیال رکھے ہوئے ہے۔ وہاں اگرچہ انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن مہاراج کے حکم پر میں نے دو لڑکوں کو وہاں چھوڑ دیا ہے۔ ایک مکان کے اندر رہے گا اور دوسرا دور رہ کر نگرانی کرے گا تاکہ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو اس کی اطلاع دے سکے۔ ویسے وہ بنگلا بالکل محفوظ ہے۔ وہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

"تھینک یو گانگ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

گانگ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلا گیا۔ ہمیں فی الحال کوئی کام نہیں تھا اس لیے باتوں میں وقت گزارتے رہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر میں سو گیا اور جب آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ تھائی وانگ نے بتایا کہ تقریباً آدھا گھنٹا پہلے پرساد کا فون آیا تھا۔ اس نے اپنا نمبر لکھوا دیا ہے۔ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔

میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر تھائی کا بتایا ہوا نمبر ملایا۔ کال ہپ لیونگ نے ریسیو کی تھی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے ریسیور پرساد کو دے دیا۔

"ہیلو پرساد۔ کیسے ہو۔ تمہارے پیر کی تکلیف کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں باس۔" پرساد نے جواب دیا "ایک اہم اطلاع دینی تھی۔"

"کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو کبھی سوتے میں خواب نہیں دیکھا' جاگتے میں کیا دیکھوں گا باس۔" پرساد نے کہا "میں نے اپنے ایک بندے کو فون کیا تھا۔ یہ اطلاع مجھے اسی نے دی ہے۔"

"کیسی اطلاع؟" میں نے پوچھا۔

"دارا' پیڈرو کے پاس پہنچ چکا ہے اور انہیں شبہ ہے کہ ہم چائنا ٹاؤن والے اس فلیٹ میں چھپے ہوئے ہیں جو میں نے کرائے پر لیا تھا۔ ان کے آدمی آج رات وہاں ریڈ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔" پرساد نے کہا۔

"بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے کہا "وہ فلیٹ چھوڑے ہوئے تو کئی روز ہوچکے ہیں۔ انہیں یہ شبہ کیسے ہوا کہ ہم وہاں جاسکتے ہیں؟"

"وہ فلیٹ ہے تو ابھی تک میرے ہی نام پر۔ ہوسکتا ہے انہیں کسی طرح یہ شبہ ہوگیا ہو۔" پرساد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اگر وہ لوگ اس فلیٹ پر ریڈ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے لیکن....." میں خاموش ہوگیا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال اُبھرا تھا "وہ لوگ اس فلیٹ پر ریڈ کا جھانسا دے کر کوئی اور کارروائی تو نہیں کرنا چاہتے؟"

"ہوسکتا ہے۔" پرساد نے کہا "جس جگہ میں موجود ہوں اس کا انہیں پتا نہیں۔ مہاراج کے جمنازیم پر حملہ کرکے وہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کریں گے اور واٹ ٹریمٹ کا رخ کرنے کی وہ ہمت نہیں کرسکتے۔ ہوسکتا ہے ان کے ذہن میں کوئی اور منصوبہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "تم نے اپنے آدمی کو ہپ لیونگ کا نمبر تو نہیں دیا؟"

"نہیں باس۔ میں ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتا۔" پرساد نے جواب دیا۔

"ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد تم دوبارہ اس آدمی کو فون کرکے معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ ان کا اصل منصوبہ کیا ہے اور ویسے بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے اطلاع دینا۔"

"یس باس۔" دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور کمرے میں واپس آکر تھائی وانگ وغیرہ کو پرساد کے فون کے بارے میں بتانے لگا۔ میرے خیال میں مہاراج اور ماسٹر ہوچن کو بھی یہ اطلاع دینا ضروری تھا۔ گانگ چند لڑکوں کے ساتھ آج کل اسی بدھ عبادت گاہ ہی میں رہ رہا تھا۔ میں نے اسے بلا کر صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

"ٹھیک ہے لٹل ماسٹر۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں مہاراج اور ماسٹر ہوچن کو اطلاع کردیتا ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو۔"

میں نے اگرچہ مہاراج اور ماسٹر ہوچن کو اطلاع بھیج دی تھی لیکن میرے دل میں ایک خلش تھی۔ ذہن میں ایک کھٹک سی تھی۔ نجانے میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے کو تیار کیوں نہیں ہورہا تھا۔ مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہورہا تھا اور وہ گڑبڑ کیا ہوسکتی تھی۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

رات نو بجے کے قریب پرساد کا فون آگیا۔

"میرے مخبر کو یہی بات معلوم ہوئی تھی جو وہ پہلے ہی بتا چکا ہے۔" اس نے کہا۔

"لیکن پرساد۔" میں نے کہا "یہ بات میرے حلق سے نہیں اُتر رہی۔"

"تو پھر خاموش بیٹھے رہو باس۔ اپنے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔" پرساد نے جواب دیا۔

میں کچھ دیر اور فون پر پرساد سے باتیں کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا۔ پرساد سے اس اطلاع کی تصدیق ہوجانے کے بعد میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے اگرچہ یہ مشورہ دیا تھا کہ میں خاموش بیٹھا رہوں اور اپنے ذہن کو الجھانے کی کوشش نہ کروں لیکن میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔

تھائی وانگ اور جانکی دیوی بھی میرے اس خیال سے متفق تھیں کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور دارا وغیرہ ہمیں دھوکے میں رکھ کر کوئی اور کارروائی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ وہ کیا کارروائی کریں گے۔

"اوہ!" میں ایک دم اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال آیا تھا "تھائی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہے جب میں اور تم ریجنٹ اندرا ہوٹل گئے تھے تو انہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" تھائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اس واقعے کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ انہوں نے ماسٹر پھو کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

"اور اس کے دو دن بعد انہوں نے تمہارے بنگلے پر حملہ کردیا تھا اور ہم بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگ سکے تھے۔ انہوں نے بنگلے کو آگ لگا دی تھی اور تمہیں معلوم ہے تمہارے بنگلے کا پتا انہوں نے کیسے لگایا تھا؟"

"میری کار ریجنٹ اندرا ہوٹل میں رہ گئی تھی اور انہوں نے کار کے رجسٹریشن نمبر سے میرے گھر کا پتا معلوم کرلیا تھا اور..... اور..... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"گزشتہ رات ہم ہپ لیونگ کی کار میں تھے۔" میں نے کہا۔ "دارا نے راستے میں ہماری کار روک کر حملہ کیا تھا۔ جانکی اور دارا کار کے سامنے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہورہے تھے۔ دارا بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے ہپ لیونگ کی کار کا نمبر دیکھ لیا ہوگا اور....." میں جملہ مکمل نہیں کرسکا۔ بدترین خدشات میرے ذہن میں سر ابھارنے لگے اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

"تمہارا مطلب ہے دارا نے ہپ لیونگ کی کار کا نمبر نوٹ کرلیا ہوگا اور....."

"ہاں ہاں..... اس شیطان سے کچھ بعید نہیں۔ ایک منٹ میں ابھی آتا ہوں۔" میں یہ کہتے ہوئے فون والے کمرے کی طرف دوڑ گیا۔

یہاں آتے ہی میں نے فون کا ریسیور اٹھایا اور ہپ لیونگ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کال تیسری گھنٹی پر ریسیو کی گئی تھی۔ آواز ہپ لیونگ کی تھی۔

"ہیلو ہپ۔" میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا "پرساد کو ریسیور دو۔"

"ایک منٹ ہولڈ کرو۔" جواب ملا اور خاموشی چھاگئی پھر ٹھیک ایک منٹ بعد ہی پرساد کی آواز سنائی دی تھی۔

"یس باس۔ کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پرساد۔ تم جس حالت میں بھی ہو ہپ لیونگ کو لے کر وہاں سے نکل لو۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے باس۔ تم بہت گھبرائے ہوئے ہو؟" پرساد نے پوچھا۔

"دارا کی چال کو میں سمجھ گیا ہوں پرساد۔" میں نے کہا "مجھے شبہ ہے کہ اس نے ہپ لیونگ کی کار کے رجسٹریشن نمبر کے ذریعے اس بنگلے کا پتا چلالیا ہے اور مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ وہ آج رات کہیں اور نہیں بلکہ اسی بنگلے پر ریڈ کرے گا۔ تم ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے نکلو اور واٹ ٹریمٹ پہنچ جاؤ۔ مہاراج کے دو آدمی تم لوگوں کی حفاظت کے لیے وہاں چھوڑے گئے تھے۔ وہ کہاں ہیں؟"

"ایک تو گلی کے موڑ پر ہے اور دوسرا بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔" پرساد نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ فوراً وہاں سے نکلو اور ان دونوں کو بھی وہاں سے ہٹا دو۔" میں نے کہا۔

"تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے باس۔" پرساد نے جواب دیا "ٹھیک ہے۔ ہم چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔"

میں نے فون رکھ دیا اور دوبارہ اسی کمرے میں آگیا۔ میں نے تھائی وانگ اور جانکی دیوی کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار بھی کردیا تھا۔

پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ پرساد اور ہپ لیونگ کو بنگلے سے نکلنے اور یہاں تک پہنچنے میں چالیس پینتالیس منٹ ضرور لگیں گے۔ پرساد کو خبردار کرکے مجھے مطمئن ہوجانا چاہیے تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی اور پھر گانگ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا گانگ؟" میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی تھی۔

"گڑ بڑ ہوگئی باس۔" گانگ نے جواب دیا "ہمارے ایک لڑکے نے فون پر اطلاع دی ہے کہ پیڈرو کے آدمی ہپ لیونگ کے بنگلے میں گھسنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مہاراج نے سوکھم وٹ تھرٹی فرسٹی پر واقع اپنے ایک شاگرد ہوتو کو فون کردیا ہے۔ وہ لوگ وہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ ہم بھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا "ٹھہرو۔ میں بھی چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور ٹیلی فون والے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ پھر ہپ لیونگ کے بنگلے کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے ٹیلی فون کال ریسیو نہیں کی جارہی تھی۔

کبھی بیل بجتی ہوئی سنائی دیتی اور کبھی انگیج کی ٹون سنائی دینے لگتی۔ میں نے ریسیور ریخ دیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ٹیلی فون کی لائن کاٹ دی گئی تھی۔

میں دروازے کی طرف مڑا تو تھائی اور جانکی دیوی وہاں کھڑی تھیں۔ جانکی نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول میری طرف بڑھا دیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہپ لیونگ کے گھر پر حملے کی اطلاع ملنے کے بعد میں یہاں رک نہیں سکوں گا اس لیے وہ اپنے کمرے سے پستول نکال لائی تھی۔ میں نے پستول لے کر جیب میں ڈال لیا اور گانگ کے ساتھ داٹ کے عقبی گیٹ کی طرف بھاگنے لگا۔

گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف سیاہ رنگ کی وین کھڑی تھی جس میں چار آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس چینی ساختہ اے۔ کے فور سیون آٹومیٹک رائفل تھی۔ وین کا انجن اسٹارٹ تھا اور انہیں شاید ہمارا ہی انتظار تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی وین حرکت میں آگئی اور گیٹ سے نکل کر تیز رفتاری سے راما فور روڈ پر دوڑنے لگی۔ یہ سڑک بالکل سیدھی چلی گئی تھی۔

ابھی رات کے دس بھی نہیں بجے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک تھا۔ وین کے ڈرائیور کو ایسی پُرہجوم سڑکوں پر گاڑی چلانے کی خاصی مہارت تھی۔ اس وقت بھی وہ رفتار کم کیے بغیر بڑی مہارت کا ثبوت دے رہا تھا۔ دو جگہ وہ سگنل توڑتا ہوا نکل گیا تھا۔ کھلونگ ٹوئی ڈسٹرکٹ میں سوئے ایک سو تینتیس سے ذرا آگے اس نے وین سوکھم وٹ تھرٹی سکس پر موڑلی اور مین سوکھم وٹ روڈ کراس کرتے ہوئے سوکھم وٹ تھرٹی سکس پر آگئے۔ اب راستہ میری سمجھ میں آگیا تھا۔

وین جیسے ہی تھانگ لو روڈ پر مڑی، فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہوتو کے آدمی ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے اور پیڈرو کے آدمیوں سے ان کا مقابلہ شروع ہوچکا تھا۔

میں ایک لڑکے کے ساتھ گلی کے موڑ پر اتر گیا اور عقبی گلی کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں بنگلے کے پچھلی طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ عقبی گلی سے وہ بنگلا تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ دیوار تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ میں اپنے ساتھی کا سہارا لے کر دیوار پر چڑھا اور پھر اسے بھی ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول بھی ہاتھ میں لے لیا تھا۔

دیوار پر چڑھتے ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ لڑائی بنگلے کے اندر نہیں بلکہ دوسری طرف سامنے والی گلی میں ہورہی تھی۔ میں دیوار سے کود کر عقبی برآمدے میں پہنچ گیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے کی ہول پر پستول رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ لاک ٹوٹ گیا۔ میں نے ہینڈل کو جھٹکا دے کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہوگیا۔ میرا ساتھی بھی میرے ساتھ ہی اندر داخل ہوا تھا۔ وہ مجھے رکنے کا

اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا لیکن میں اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔

تمام کمروں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ہال نما کمرے میں الٹا ہوا فرنیچر بتا رہا تھا کہ یہاں اچھی خاصی دھینگا مشتی ہوئی تھی۔ میں پرساد والے کمرے کی طرف دوڑا اور جیسے ہی کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا، میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ پرساد کمرے میں موجود نہیں تھا۔ بستر کی چادر کے علاوہ دو تین جگہوں پر خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ ہر چیز الٹی ہوئی نظر آرہی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر میں اس طرف لپکا مگر باتھ روم خالی تھا۔

"پرساد..... ہپ لیونگ....." میں نے کمرے کے دروازے پر آکر پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

میرے ساتھ آنے والا دوسرا لڑکا بھی کمروں میں جھانکتا پھر رہا تھا۔ میں سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو ہپ لیونگ کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ وہ باتھ روم کے دروازے کے قریب فرش پر پڑی تھی اور اس کے پیٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زخم پر تھا۔

"لیونگ..... لیونگ..... آنکھیں کھولو۔ میں ہوں وجدان....." میں اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔

ہپ لیونگ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کررہی تھی۔

"وہ..... وہ لوگ..... اسے لے..... گئے۔" اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے تھرتھراتی ہوئی سی آواز نکلی "مم..... مم..... میں نے اسے بچانے کی..... کوشش کی تھی..... مگر....." وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہوگئی تھیں۔

میں اسے اٹھا کر ہال نما کمرے میں لے آیا اور ایک صوفے پر لٹا دیا۔ اس نے پیٹ کے زخم پر ہاتھ رکھا ہوا تھا لیکن خون رس رہا تھا۔ میرا دوسرا ساتھی برآمدے والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا اور پھر اس کی چیخ سن کر میں بھی دوڑتا ہوا برآمدے میں آگیا۔ گانگ کا بھیجا ہوا محافظ لڑکا ہپ لیونگ کی کار کے قریب زمین پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر کئی جگہوں سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔

فائرنگ کی آوازیں اب گلی میں دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ہوتو کے آدمی پیڈرو کے آدمیوں کا پیچھا کررہے تھے۔

"باہر نکلو اور ان کو اندر بلاؤ۔" میں نے اپنے ساتھی سے چیخ کر کہا۔

وہ گیٹ سے نکل کر چیخنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی دو آدمی اندر آگئے اور پھر کچھ دیر بعد گانگ بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"وہ لوگ پرساد کو اٹھا کر لے گئے گانگ۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "تمہارا یہ آدمی اور ہپ لیونگ شدید زخمی ہیں۔"

گانگ نے اپنے آدمیوں سے چیخ کر کچھ کہا۔ ان میں سے ایک باہر دوڑ گیا۔ دو منٹ بعد وین گیٹ کے سامنے آکر رکی۔ ہپ لیونگ اور دوسرے زخمی کو اٹھا کر وین میں ڈال دیا گیا۔ گانگ نے دو اور آدمیوں کو اشارہ کیا اور خود اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے وین میں بیٹھ کر ہپ لیونگ کا سر اپنے گھٹنے پر رکھ لیا۔ وہ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم تمہیں اسپتال لے جارہے ہیں۔ تم بچ جاؤ گی۔"

ہپ لیونگ کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ آگئی۔ گانگ وین کو حرکت میں لے آیا تھا اور پھر ٹھیک اسی وقت کسی طرف سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ گانگ وین کو اوپر والی گلی میں گھما کر تھانگ لو روڈ پر لے آیا اور اس کی رفتار بڑھا دی۔ اس سڑک پر تقریباً ایک میل آگے بنگلہ دیش کے سفارت خانے کے قریب ایک بہت بڑا اسپتال تھا اور وہاں تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اسپتال کی انتظامیہ نے کیس لینے سے انکار کردیا۔ پرائیویٹ اسپتال اس قسم کے کیس نہیں لیتے تھے جن میں کسی بھی قسم کی قانونی کارروائی کا احتمال ہو۔

"اگر تم لوگوں نے فوری طور پر انہیں ٹریٹ منٹ نہ دیا تو مہاراج کے آدمی اس اسپتال کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔" گانگ نے چیخ کر کہا۔ اس کی یہ دھمکی کام کرگئی اور دونوں زخمیوں کو فوری طور پر آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔

گانگ استقبالیہ کاؤنٹر پر آگیا اور ٹیلی فون پر مہاراج کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ گانگ نے مجھے اشارہ کردیا۔ میں لابی میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ گانگ پولیس پارٹی سے نمٹنے کی کوشش کررہا تھا۔ پولیس آفیسر اسے دباؤ میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ کبھی وہ چیخنے لگتا اور کبھی گانگ۔ پولیس آفیسر کچھ زیادہ ہی اکھڑ قسم کا تھا۔ اس نے گانگ کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے ایک طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگا مگر گانگ اڑ گیا۔ دو پولیس والے جلدی سے آگے بڑھے۔ ایک پولیس والے نے گانگ کو گھونسا مارنا چاہا مگر گانگ نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔

"سنو آفیسر!" وہ پولیس آفیسر کی طرف دیکھ کر چیخا "تم اپنے اختیارات سے تجاوز کررہے ہو۔ کوئی جرم ثابت ہونے سے پہلے تمہیں کسی پر ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارے خلاف اپنا قانونی حق استعمال کروں گا۔" اس نے ایک جھٹکے سے دوسرے پولیس والے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

پولیس آفیسر کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ وہ سڑک چھاپ غنڈوں سے ایسی باتیں سننے کا عادی نہیں تھا اور دن میں نجانے

اسے اس قسم کی کتنی دھمکیاں دی جاتی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی کارروائی کرتا' ماسٹر ہوچن دو آدمیوں کے ساتھ اسپتال کے مرکزی شیشے والے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ ماسٹر ہوچن کا حلیہ تو شریفانہ تھا۔ نیلی جینز' سفید ٹی شرٹ' پیروں میں جوگرز اور سر کے بال بھی سلیقے سے آراستہ تھے جبکہ اس کے دونوں ساتھی اپنے لباس اور شکل ہی سے چھٹے ہوئے لگتے تھے۔

ماسٹر ہوچن کو دیکھتے ہی پولیس آفیسر نے گانگ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ماسٹر ہوچن جیسے ہی قریب پہنچا' اس نے آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ گانگ جو کچھ اسے بتانے کی کوشش کرتا رہا تھا' اس پر شاید پولیس آفیسر کو یقین نہیں آیا تھا لیکن اب ماسٹر ہوچن کو دیکھ کر نہ صرف اس نے گانگ کی باتوں کا یقین کرلیا تھا بلکہ بار بار اس سے اپنے رویے کی معذرت بھی کررہا تھا۔ اس وقت میں بھی اٹھ کر قریب آگیا اور ان کی باتوں میں شامل ہوگیا اور پھر میں پولیس آفیسر کو تفصیل بتانے لگا کہ ہپ لیونگ کے مکان پر پیڈرو کے آدمیوں کا حملہ گزشتہ رات سوامی رگوناتھ کے آشرم والے واقعے کی ایک کڑی ہے۔

"ہپ لیونگ نے گزشتہ رات آشرم میں ہنگامے کے بعد ہمارے دو آدمیوں کو وہاں سے شہر آنے میں اپنی کار میں لفٹ دی تھی۔" اب ماسٹر ہوچن بتا رہا تھا۔ وہ میرا نام گول کرگیا تھا۔ "ہنگامے کے دوران میں وہاں سے بھاگنے کی کوشش میں ایک آدمی کے پیر میں موچ آگئی تھی۔ ہپ لیونگ اسے اپنے گھر لے آئی تھی جبکہ دوسرا آدمی اپنے گھر چلا گیا تھا۔ کل رات آشرم میں پیڈرو کے آدمی بھی موجود تھے اور وہ سارا ہنگامہ دراصل انہوں نے ہی کھڑا کیا تھا۔ ان کے کسی آدمی نے ہمارے آدمیوں کو ہپ لیونگ کے ساتھ کار میں آتے دیکھ لیا تھا۔ تم جانتے ہو کہ پیڈرو نے زیرِ زمین دنیا میں مہاراج کے ایک خاص شاگرد وجدان کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی ہے۔ دو ملین بھات۔ وہ ہر قیمت پر اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہے۔ اسے شاید یہ اطلاع دی گئی تھی کہ وجدان ہپ لیونگ کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ آج انہوں نے اس کے مکان پر حملہ کردیا جس میں ہپ لیونگ اور ہمارا ایک آدمی زخمی ہوگیا اور وہ لوگ ہمارے اس آدمی کو اٹھا کر لے گئے جسے ہپ لیونگ کل رات اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔"

"تین آدمی پیڈرو کے بھی زخمی ہوئے ہیں۔ انہیں دوسرے اسپتال بھجوا دیا گیا ہے۔" آفیسر نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "وجدان نام کا وہ شخص پولیس کے لیے بھی ایک مسئلہ بنتا جارہا ہے لیکن پولیس ابھی تک اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کرسکی۔ جبکہ پیڈرو کا ایک دوست..... کئی سنگین الزامات میں پولیس کو مطلوب ہے لیکن ٹائیگر اور پیڈرو کی وجہ سے پولیس آج تک ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکی۔ بہرحال اس کیس کے حوالے سے کچھ قانونی کارروائی تو کرنی ہی پڑے گی۔"

"ضرور' کیوں نہیں۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ قانون سے ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔ تم اپنی کارروائی کرسکتے ہو۔"

ماسٹر ہوچن نے مجھے اور گانگ کو وہاں سے بھیج دیا اور خود پولیس آفیسر کو ساتھ لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

تھائی وانگ اور جانکی دیوی کو اس واقعے کا بہت صدمہ پہنچا تھا۔ ہپ لیونگ کو مجھ سے ہمدردی کرنے کی سزا ملی تھی اور تھائی وانگ بھی مجھ سے ہمدردی کی سزا اب تک بھگت رہی تھی۔ اس کا سب کچھ تباہ ہوگیا تھا۔ آزادی سلب ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ وہ بھی خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ جان جانے کا خوف کہیں ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتا تھا لیکن اسے شاید کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ اسے اگر کوئی فکر تھی تو صرف میری۔ وہ میرے لیے اب بھی ہر وقت پریشان رہتی تھی کہ کہیں مجھے کچھ نہ ہوجائے۔ جانکی دیوی کو بھی ہپ لیونگ کے ساتھ اس زیادتی کا بڑا دکھ ہوا تھا۔ وہ ایک رات اس کے ساتھ گزار چکی تھی۔ اس کی باتیں سن چکی تھی۔ چند گھنٹوں میں ان دونوں میں کچھ انڈر اسٹینڈنگ بھی ہوگئی تھی۔

میں نے ہپ لیونگ کو اسپتال پہنچایا تھا۔ وہ آخری وقت تک ہوش میں تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بچ جائے گی۔ اس کی فکر تو تھی ہی لیکن سب سے زیادہ پریشانی رامن پرساد کی تھی۔ وہ لوگ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اگر اس کا پیر زخمی نہ ہوتا تو وہ ان کے ہاتھ نہ لگتا لیکن اب پتا نہیں وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔

پرساد کے لیے صرف میں ہی نہیں ڈاکٹر جانکی' تھائی وانگ اور نویتا بھی پریشان تھیں۔ ہم چاروں کا تعلق مختلف مذاہب' مختلف معاشروں اور مختلف طبقات سے تھا لیکن ہم سب ایک فیملی کی طرح تھے۔ ایک دوسرے کو سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے تڑپ رکھتے تھے اور اب پرساد کے لیے ہمارے دلوں میں وہ تڑپ جاگ اٹھی تھی۔

ہم میں سے کوئی بھی اس رات نہیں سوسکا تھا۔

صبح گانگ سے اطلاع ملی کہ رات کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا جانے والا ان کا ساتھی جانبر نہیں ہوسکا تھا البتہ ہپ لیونگ بچ گئی تھی۔ اس پر خنجر سے وار کیا گیا تھا جو زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اسپتال میں اس کی حفاظت کے لیے نہ صرف پولیس کے دو آدمی موجود تھے بلکہ ماسٹر کے دو آدمی بھی وہاں ڈیوٹی دے رہے تھے۔

رات بھر جاگتے رہنے کے باوجود دن میں بھی مجھے نیند نہیں آسکی۔ میں صرف اور صرف پرساد کے بارے میں سوچتا رہا۔ پرساد سے میری ملاقات محض اتفاق سے ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی جسے میں نے ایک وقت کا کھانا کھلایا تھا اور وہ کھانا ہماری دوستی کی بنیاد بن گیا تھا۔ اس میں وفا اور ایثار کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا ۔راس کی وفا نے اس کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔

مہاراج بھی پرساد کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ مہاراج سے

اگرچہ پرساد کا صرف ایک ہی مرتبہ آمنا سامنا ہوا تھا لیکن میں تو انہیں اکثر اس کے بارے میں بتاتا رہتا تھا اور وہ بھی پرساد کے بارے میں یہ سمجھ چکے تھے کہ یہ مخلص سچائی کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہے اور ایسے آدمیوں کو مہاراج نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ کئی آدمی پرساد کی تلاش میں لگا دیے گئے تھے۔

تین دن گزر گئے۔ پرساد کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اگر اسے مار دیا گیا ہوتا تو اب تک اس کی لاش کہیں نہ کہیں مل چکی ہوتی اور میرے خیال میں پیڈرو اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر مارنا ہوتا تو ہپ لیونگ کے بنگلے پر حملے کے دوران میں ہی اسے مار دیا گیا ہوتا لیکن وہ اسے زندہ اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس نے یقیناً مزاحمت کی ہوگی اور ہوسکتا ہے وہ زخمی بھی ہوا ہو کیونکہ اس کے کمرے میں بیڈ کی چادر کے علاوہ دو تین اور جگہوں پر بھی خون کے دھبے نظر آئے تھے۔

پیڈرو اپنے پیش رو ٹائیگر سے قدرے مختلف ثابت ہوا تھا۔ ٹائیگر نے میری تلاش میں جہاں بھی کوئی کارروائی کی تھی وہاں تباہی مچادی تھی۔ کئی لوگوں کو قتل کیا تھا اور املاک کو آگ لگا کر راکھ کر ڈالا تھا پھر ایک اور موقع پر مجھے شائی وان کے ساتھ ایک مکان میں زندہ جلا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن پیڈرو اس سے کسی قدر مختلف ثابت ہوا تھا۔ میرے خلاف یہ اس کی پہلی کارروائی تھی۔ اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ میں ہپ لیونگ کے بنگلے میں موجود ہوں۔ اگر وہ چاہتا تو بنگلے کو گھیر کر آگ لگا سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ میں تو اس کے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا البتہ اس کے آدمی پرساد کو اٹھا کر لے گئے تھے اور مجھے شبہ تھا کہ پرساد کو یرغمال بنا کر مجھے گھیرنے کی کوشش کی جائے گی۔ میرا خیال تھا کہ پرساد کی آڑ میں کوئی ایسی چال چلی جائے گی جس سے مجھے پھانسنے کی کوشش کی جاسکے یا اسے اذیتیں دے کر میرے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ پرساد کے جسم کا اگر ریشہ ریشہ بھی الگ کردیا جائے تو وہ میرے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔

تین دن گزر گئے تھے اور پرساد کے بارے میں اطلاع نہیں تھی اور پھر اس شام جب نویتا نے پرساد کی تلاش کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کیں تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم پرساد کے ساتھ کئی مرتبہ مختلف جگہوں پر جاچکی ہو۔ اگر تمہیں پہچان لیا گیا تو تمہاری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس دوران میں اور بھی بہت سی لڑکیاں پرساد کے ساتھ دیکھی گئی تھیں۔ ظاہر ہے وہ سب کو اس کی ساتھی نہیں سمجھ سکتے اور پھر میں اکیلی نہیں ہوں گی۔ میرے ساتھ جانکی دیوی بھی ہوگی ہے...۔" نویتا نے جواب دیا۔

"کیا.....؟" میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔ یہ پروگرام ہم دونوں نے بنایا ہے۔" قریب کھڑی ہوئی جانکی دیوی نے کہا "مجھے کوئی نہیں جانتا کہ میں تمہاری ساتھی ہوں۔ اس رات آشرم سے واپسی پر دارا سے مڈھ بھیڑ ضرور ہوگئی تھی لیکن صورتِ حال ایسی تھی کہ اس نے میرا چہرہ یاد نہیں رکھا ہوگا۔ میرا خیال ہے اگر میں اور نویتا کلبوں میں گھومتی پھریں تو ہم پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا اور ویسے بھی دارا اس طرح سرِعام نہیں پھر رہا ہوگا کہ ہمیں دیکھ لے۔"

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ دارا تو کہیں چھپ کر بیٹھا ہوگا۔ جانکی دیوی اب تک پس منظر ہی میں رہی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ میری دوست ہے۔ اس رات دارا سے مڈھ بھیڑ ضرور ہوئی تھی لیکن وہاں اندھیرا تھا۔ دارا نے اس کا چہرہ ٹھیک طرح سے نہیں دیکھا ہوگا۔ ہوسکتا ہے وہ اسے دوبارہ دیکھے تو نہ پہچان سکے لیکن میں دارا کو سمجھ چکا تھا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رسک لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ کہاں جاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"ارون فریا روڈ پر واقع چاؤ فریا پیراڈائز ریسٹورنٹ۔" نویتا نے جواب دیا "اس ریسٹورنٹ کے ساتھ ایک میوزک ہال بھی ہے۔ میں پرساد کے ساتھ دو تین مرتبہ وہاں جاچکی ہوں۔ کم از کم دو مرتبہ میں نے پیڈرو کو یہاں دیکھا ہے۔ دریائے چاؤ فریا کے ساحل پر واقع یہ ریسٹورنٹ عیاشی اور جوئے کا بہت بڑا اڈا ہے۔ پیڈرو کے چند خاص آدمی یہاں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہاں سے پرساد کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکے۔ یوں تو یہ ریسٹورنٹ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے لیکن رات آٹھ بجے سے دو بجے تک یہاں خوب ہنگامہ رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور پھر مجھے ایک اور بات یاد آگئی "ہم نے ٹاکسن روڈ والی کوٹھی اس خوف سے چھوڑی تھی کہ اس کا سراغ نہ لگالیا جائے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ وہاں تک نہیں پہنچ سکے اور میں سوچ رہا ہوں کہ ہم ایک بار پھر وہاں منتقل ہوجائیں۔ میں اس سلسلے میں آج مہاراج سے بات کروں گا۔ یہاں تو ہم بالکل محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"ہاں۔ یہاں واقعی الجھن سی محسوس ہورہی ہے۔" تھائی وانگ نے کہا۔

چھ بجے کے قریب نویتا اور ڈاکٹر جانکی دیوی وہاں سے رخصت ہوگئیں۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ پہلے وہ جانکی کے گھر جائیں گی اور وہاں سے تیار ہو کر نکلیں گی۔ ان کے جانے کے فوراً ہی بعد میں مہاراج کے پاس پہنچ گیا اور انہیں بڑی مشکل سے اس بات پر آمادہ کرسکا تھا کہ ہم ٹاکسن روڈ والے بنگلے میں منتقل ہوجائیں۔ میں نے مہاراج سے وعدہ کرلیا تھا کہ جیسے ہی کوئی خطرہ محسوس ہوگا ہم وہاں سے نکل جائیں گے۔ مہاراج نے ایک آدمی ہمارے ساتھ کردیا۔

اس شخص کا نام سکمدر تھا۔ سکمدر کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دراز قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ بازوؤں کے مسل اُبھرے ہوئے تھے جس سے اس کی جسمانی قوت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ اس کا تعلق مہاراج کے کسی جمنازیم سے نہیں تھا۔ شکل و صورت اور لباس سے بھی وہ کچھ شریف ہی لگتا تھا اس لیے اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی اسے مہاراج کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔

مہاراج سے اجازت ملتے ہی ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ گانگ عبادت گاہ میں استعمال ہونے والی ایک گاڑی پر گلی کے موڑ پر اتار کر واپس چلا گیا تھا۔ ہم بہت محتاط انداز میں چلتے ہوئے جانگی والے بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔

پورچ میں وہ کار بھی کھڑی تھی جو پرساد نے ایک رینٹل ایجنسی سے کرائے پر لے رکھی تھی اور بنگلے کے اندر بھی صورتِ حال معمول کے مطابق نظر آتی تھی۔ چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی اور اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ہمارے بعد یہاں کسی نے مداخلت نہیں کی تھی جس کا مطلب تھا کہ یہ بنگلا ان کی نظروں سے محفوظ ہی رہا تھا۔

میں نے سکمدر کو ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے بازار بھیج دیا اور تھائی کے ساتھ مل کر صفائی وغیرہ کرنے لگا۔ کچن میں بھی برتنوں پر دھول جمی ہوئی تھی جنہیں تھائی نے دھو کر رکھ دیا۔ اس نے فریج بھی آن کردیا تھا۔ میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر دیکھا۔ اس میں ٹون موجود تھی۔ میں نے ڈاکٹر جانگی کے گھر کا نمبر ملایا۔ تیسری گھنٹی پر کال ریسیو کرلی گئی لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

"ہیلو جانگی۔" میں نے کہا "وجدان بول رہا ہوں۔"

"اوہ۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا" دوسری طرف سے جانگی کی آواز سنائی دی۔

"ہم تمہارے بنگلے میں آگئے ہیں۔ تم لوگ واپسی پر واٹ ٹریمنٹ جانے کے بجائے یہیں پر آجانا۔ ویسے تم لوگ کب نکلو گی؟" میں نے پوچھا۔

"نو بجے کے قریب۔" جانگی نے جواب دیا۔

"اوکے۔ رات کو ملاقات ہوگی۔" میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کردیا۔

"وہ دونوں نو بجے کے قریب وہاں سے نکلیں گی۔ میرا خیال ہے ہم بھی دس بجے یہاں سے نکل جائیں۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔" تھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے "اس لیے تم واٹ سے بھاگے ہو۔"

"ہاں۔ وہاں رہ کر ہم کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ یہاں کم از کم نقل و حرکت کے لیے تو آزاد ہوں گے۔" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سکمدر مطلوبہ چیزیں لے آیا تھا۔ تھائی کچن میں گھس کر کافی بنانے لگی اور میں ایک میلا کپڑا لے کر باہر آگیا اور کار صاف کرنے لگا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ یہ کار کرائے پر حاصل کی گئی تھی۔ پرساد نے کئی روز سے کرائے کی ادائیگی کے لیے ایجنسی والوں سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے انہوں نے پرساد کے دیے ہوئے ایڈریس پر رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو اور پتا چل گیا ہو کہ وہ ایڈریس جعلی تھا اور ایجنسی نے پولیس میں رپورٹ لکھوا رکھی ہو یا ممکن ہے فران نوک روڈ والے مکان سے پیڈرو کے آدمیوں کو اس کار کے بارے میں پتا چل گیا ہو اور وہ لوگ بھی اس کی تلاش میں ہوں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کار کی نمبر پلیٹیں اتار دیں۔ بغیر نمبر پلیٹ کے کوئی گاڑی سڑکوں پر لانا اگرچہ جرم تھا لیکن اس شہر میں لاقانونیت کے ساتھ کرپشن بھی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں کسی پولیس والے کی جیب میں سو پچاس بھات ڈال کر اسے آنکھیں بند کرنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔

کافی پینے کے بعد کچھ دیر ہمیں تیاری میں لگ گئی۔ میں نے ہر ممکن حد تک اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں کمرے سے نکلا تو سکمدر الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا پھر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"کامیاب کوشش ہے۔ فوری طور پر شناخت نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے کہا۔

اور پھر تقریباً اسی وقت تھائی وانگ بھی اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر میں بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ سکمدر کی آنکھوں میں تو عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ تھائی وانگ ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ اس نے جو لباس پہنا تھا اس سے اس کے بدن کے خدوخال بہت نمایاں ہوگئے تھے۔ اس نے بہت عرصے بعد اس قسم کا لباس پہنا تھا اور سکمدر کو للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے پا کر مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تھائی کلب میں بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہے گی اور یہ بات ہمارے لیے خطرناک بھی ہوسکتی تھی لیکن بہرحال خطرے میں تو ہم کود ہی رہے تھے۔

میں نے اپنے لباس میں خنجر چھپالیا تھا اور پستول تھائی کے حوالے کردیا تھا جسے اس نے اپنے پرس میں رکھ لیا۔

کار کا انجن بڑی مشکل سے اسٹارٹ ہوا۔ ٹینکی میں پیٹرول بھی کم تھا۔ گلی سے نکل کر پرچا تھپک روڈ پر واقع ایک پیٹرول پمپ سے ٹینکی فل کروائی اور پھر واٹ کیلایا اور واٹ ارون کے سامنے سے ہوتے ہوئے کار تھائی نے اس پرائیویٹ روڈ پر موڑ دی جو دریا کے کنارے پر واقع چاؤ فریا پیراڈائز ریسٹورنٹ تک چلی گئی تھی۔

دریا کے کنارے پر دور تک بہت بڑا ایریا گھیرا گیا تھا۔ وسیع و عریض باغ تھا جس میں وہ خوب صورت دو منزلہ عمارت تھی۔ اس مرکزی عمارت کے علاوہ چھوٹی چھوٹی اور بھی عمارتیں تھیں ایک طرف وسیع پارکنگ ایریا تھا جہاں بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔

تھائی نے کار ایک مناسب جگہ پر روک کر انجن بند کردیا اور ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔

ہم درختوں کے بیچ میں بجری والی روش پر چلتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف نکل گئے۔ وہ علاقہ پرستان کا منظر پیش کررہا تھا۔ ہم دوسری روش پر مڑ گئے۔ عمارت کے وسیع و عریض برآمدے میں داخل ہوئے تو دربان نے ہمیں دیکھ کر شیشے والا دروازہ کھول دیا۔ ہم دروازے میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ اندر سے آنے والا ایک آدمی تھائی وانگ سے ٹکرا گیا۔ وہ شاید بہت عجلت میں تھا۔ تھائی سے ٹکرا کر وہ بھی لڑکھڑایا اور تھائی بھی لڑکھڑا گئی تھی اور پھر وہ دونوں چکنے فرش پر پھسلتے ہوئے دھم سے نیچے گر گئے۔ سفید سوٹ میں ملبوس وہ شخص بڑی پھرتی سے اٹھ گیا اور معذرت کرتے ہوئے تھائی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں چیختے ہوئے اس کی طرف بڑھا اور پھر رک گیا۔ میری نظریں اس شخص کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

وہ چی فانگ تھا!

چی فانگ نے میری طرف دیکھا اور پھر "سوری مسٹر" کہتے ہوئے تھائی کی طرف متوجہ ہوگیا اور اسے سہارا دینے کے لیے پھر ہاتھ آگے بڑھا دیا "سوری میڈم۔ میں جلدی میں تھا۔ تمہیں دیکھ نہیں سکا۔ چوٹ تو نہیں لگی؟"

"نہیں۔" تھائی نے ... یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ چی فانگ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے پورے بدن میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ یہ ہمارا بدترین دشمن تھا اور ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس طرح ایک دوسرے کے آمنے سامنے اور اتنا قریب آجائیں گے۔

چی فانگ نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا اور معذرت کرتا ہوا تیزی سے برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"یہ بدتمیز کون تھا؟" میں نے دربان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لوگوں کو ایسی جگہوں پر اٹھنے بیٹھنے کی تمیز نہیں رہی۔ سب آداب بھول گئے ہیں۔"

"یہ مسٹر چی فانگ ہیں سر۔" دربان نے جواب دیا "ماسٹر پیڈرو کے دستِ راست سمجھے جاتے ہیں۔"

"اور یہ ماسٹر پیڈرو کون ہے؟ کوئی بہت بڑا مارشل آرٹسٹ!" میں نے دربان کو گھورا۔

"حیرت ہے آپ ماسٹر پیڈرو کو نہیں جانتے۔" دربان نے کہا "اسے بنکاک کا سب سے طاقت ور آدمی سمجھا جاتا ہے۔ شہر کے بڑے بڑے غنڈے اور بدمعاش اس کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اور پولیس کے اعلیٰ افسران اس کا نام سن کر ہی کانپنے لگتے ہیں۔"

"اوہ۔ تم کہنا چاہتے ہو کہ پیڈرو کوئی بہت بڑا بدمعاش ہے۔" میں نے کہا "کیا یہ ریسٹورنٹ اس کی ملکیت ہے؟"

"اس کی ملکیت تو نہیں لیکن اس جیسے تمام بڑے ریسٹورنٹ، ہوٹل اور نائٹ کلب اس کے کنٹرول میں ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر کوئی ہوٹل یا نائٹ کلب اپنا کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا۔"

"لیکن میں نے تو سنا تھا کہ ٹائیگر کو زیرِ زمین دنیا کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ٹائیگر تو اپنے ایک دشمن کے ہاتھوں مارا گیا سر۔ اب سارا نظام پیڈرو نے سنبھال رکھا ہے۔" دربان نے جواب دیا۔

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی اور شخص ہے جو ان سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ اس دربان سے کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی تھی۔

"نہلے پر دہلا تو ضرور ہوتا ہے سر۔" دربان نے جواب دیا "پیڈرو کو ٹائیگر کی موت کا بہت دکھ ہے۔ اس نے ٹائیگر کے قاتل کو پکڑنے کے لیے دو ملین بھات کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔"

"دو ملین بھات۔" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "اگر تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہو تو مجھے بتا دینا۔ ہم انعام کی رقم آپس میں بانٹ لیں گے۔"

"اپنی ایسی قسمت کہاں سر۔" دربان مسکرا دیا "وہ تو سنا ہے چھلاوہ ہے۔ ماسٹر پیڈرو کا پورا گینگ اس کی تلاش میں ہے لیکن آج تک وہ اس پر قابو نہیں پا سکے۔ البتہ وہ پُراسرار شخص ہر چند روز بعد انہیں کوئی نہ کوئی ایسی چپت لگا دیتا ہے جس سے انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ ابھی چند روز پہلے اس نے آشرم تباہ کردیا تھا جس سے انہیں کروڑوں بھات کا نقصان اٹھانا پڑا۔"

"وہ آشرم تو سوامی رگوناتھ کا تھا۔ روحانیت کا مرکز۔ اس سے ان کا کیا تعلق؟" میں نے پوچھا۔

"پیڈرو کا ایک پارٹنر ہے دارا۔" دربان نے جواب دیا "وہ پاکستانی ہے۔ سنگاپور سے بھاگ کر آیا ہوا ہے۔ آشرم کا انتظام اس نے سنبھال رکھا تھا۔"

"دارا ..... ہاں یہ نام تو سنا ہے۔ وہ تو بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ کیا وہ بھی یہاں آتا ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں سب لوگ آتے ہیں سر۔" دربان نے جواب دیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ہی اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

میں نے مڑ کر دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے برآمدے کے سامنے ذرا آگے کوئی شخص بڑی تیزی سے درخت کی آڑ میں چھپ گیا ہو۔ میں اس کے لباس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا تھا۔ اس طرف موٹے تنوں والے کئی درخت تھے جن کے پیچھے آسانی سے چھپا جاسکتا تھا۔

"اوکے مسٹر!" میں نے جیب سے دو تین نوٹ نکال کر دربان کی مٹھی میں دبا دیے "ہم یہاں آتے رہیں گے اور تم سے ملاقات

ہوتی رہے گی۔"

دربان نے دروازہ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ درختوں میں چھپنے والا وہ آدمی کون تھا۔ کیا اسے ہم پر کوئی شبہ ہو گیا تھا؟

اس ریسٹورنٹ کا نام اگر پیراڈائز رکھا گیا تھا تو غلط نہیں تھا۔ یہ واقعی عیاش لوگوں کی جنت تھا۔ یہاں عیاشی کا ہر سامان موجود تھا۔ نیم عریاں حسین و جوان لڑکیاں' شراب' جوا' رقص اور کیا چیز نہیں تھی جس کی ایک عیاش آدمی خواہش کر سکتا تھا۔

میں تھائی کے ساتھ ٹہلتا ہوا اس ہال میں آگیا جہاں اسٹیج پر ایک نیم عریاں رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ نیم عریاں لباس میں نوخیز حسین ویٹرلیس لڑکیاں میزوں کے گرد چکرا رہی تھیں۔ ہم دونوں بھی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ تھائی نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک ویٹرلیس کو کافی کا آرڈر دے دیا۔

میں متجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جانکی دیوی یا نویتا اب تک نظر نہیں آئی تھیں حالانکہ وہ نو بجے یہاں پہنچنے والی تھیں اور اب تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ یا تو کسی وجہ سے ابھی تک پہنچی نہیں تھیں یا ریسٹورنٹ کے کسی دوسرے حصے میں تھیں جہاں ہم ابھی تک نہیں گئے تھے۔

کافی پیتے ہوئے بھی میں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ تھائی وانگ کی نظریں بھی ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔

گیارہ بج گئے۔ اب مجھے پریشانی ہونے لگی تھی۔ ہال میں اب کسی میز پر کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد ایک چینی رقاصہ کا خاص پروگرام پیش کیا جانے والا تھا اور لوگ وہ رقص دیکھنے کے لیے ریسٹورنٹ کے دوسرے حصوں سے اٹھ اٹھ کر اس ہال میں آ رہے تھے۔

"ان دونوں میں سے کوئی بھی ابھی تک نظر نہیں آئی۔" تھائی وانگ نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟"

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی شبہ ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا "تم یہیں بیٹھو۔ میں فون کر کے معلوم کرتا ہوں کہ وہ گھر سے نکلی بھی ہیں یا کسی وجہ سے ان کا پروگرام کینسل ہو گیا ہے۔"

میں ہال سے نکل کر اس لابی میں آگیا جہاں پبلک ٹیلی فون بوتھ لگے ہوئے تھے۔ چار بوتھ تھے اور چاروں میں اس وقت کوئی نہ کوئی موجود تھا۔ میں ایک طرف رک کر انتظار کرنے لگا اور پھر میں اس آدمی کو دیکھ کر چونک گیا جو میرے پیچھے ہی ہال سے باہر نکلا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا' وہ تیزی سے مڑ کر ایک دروازے میں غائب ہو گیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور دروازے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔ دوسری طرف ایک راہداری تھی لیکن وہ شخص نظر نہیں آیا۔ میں واپس مڑ گیا۔

ایک بوتھ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر نکلی۔ وہ مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہوئی دوسری طرف مڑ گئی۔ میں نے بوتھ میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھا کر سلاٹ میں سکے ڈالے اور جانکی دیوی کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے لائن کاٹ کر دوبارہ نمبر ملائے۔ نتیجہ اس مرتبہ بھی صفر ہی نکلا۔ ریسیور ہک پر ٹانگتے ہی سلاٹ میں ڈالے ہوئے سکے کھڑکھڑاہٹ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ نچلے خانے سے باہر آ گئے۔ میں نے سکے اٹھا کر جیب میں ڈالے اور باہر آ گیا۔

اسٹیج پر چینی رقاصہ کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ وہ چین کے ایک لوک رقص کے روایتی لباس میں تھی۔ اس خوب صورت سلکی لباس نے اس کا پورا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھوں اور چہرے کے سوا جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہ شریفانہ لباس اس کے جسم سے الگ ہونا شروع ہو جائے گا۔ لوگ اتنے پیسے خرچ کر کے کپڑے کے تھان میں لپٹی ہوئی کسی گڑیا کو دیکھنے کے لیے تو ایسی جگہوں پر نہیں آتے تھے۔

"وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں۔" میں نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے تھائی کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی "اب مجھے بھی کسی گڑبڑ کا شبہ ہو رہا ہے۔"

ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ اسٹیج کی طرف متوجہ تھے۔ ویٹرلیس لڑکیاں اب بھی میزوں کے گرد چکرا رہی تھیں۔ ہماری میز پر کافی کے خالی مگ ابھی تک پڑے ہوئے تھے اور پھر وہ ویٹرلیس مگ اٹھانے کے لیے آئی۔ اس نے خالی مگ ٹرے میں رکھے اور شیشے کی خوب صورت طشتری میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں بل رکھا ہوا تھا۔ دو مگ کافی کا بل اتنا تھا کہ درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں چار آدمی بڑھیا قسم کا کھانا پیٹ بھر کر کھا سکتے تھے۔ میں نے وہ بل اٹھایا تو اس کے نیچے ایک اور کاغذ بھی رکھا ہوا تھا جس پر تھائی زبان میں کوئی مختصر سی تحریر تھی۔ میں نے ویٹرلیس کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکرا کر آنکھ دبا دی۔ میں نے بل کے ساتھ ہی وہ کاغذ بھی اٹھا لیا۔ میں نے ایک معقول ٹپ بل کی رقم میں شامل کر کے طشتری میں رکھ دی۔ بل بھی اس کے ساتھ تھا لیکن وہ کاغذ میری مٹھی میں رہ گیا تھا۔

ویٹرلیس کے جانے کے بعد میں نے میز کے نیچے ہاتھ کر کے وہ کاغذ تھائی وانگ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ سر جھکا کر بڑبڑانے والے انداز میں اس تحریر کو پڑھنے لگی۔

"مسٹر وجدان..... اپنے دوست رامن پرساد کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہو تو ریور سائڈ پر پام کے درختوں کے جھنڈ میں آ جاؤ۔"

تھائی نے کاغذ مروڑ کر مٹھی میں چھپا لیا اور میری طرف دیکھنے لگی۔

"نیچے کوئی نام نہیں لکھا۔ کون ہو سکتا ہے؟" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"کوئی ایسا شخص جو ہمیں پہچان چکا ہے اور میرا نام بھی جانتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا خیال ہے؟" تھائی نے پوچھا۔

"دیکھنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"اگر کوئی دھوکا ہوا تو؟" تھائی کے لہجے میں تشویش تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ جو کوئی بھی ہے ہمارا ہمدرد ہے۔" میں نے کہا "اگر مخالف پارٹی کا کوئی آدمی ہوتا تو اس طرح خفیہ طور پر پیغام بھیج کر باہر نہ بلایا جاتا بلکہ یہیں پر ہمیں گولیوں سے بھون دیا جاتا۔ وہ جو کوئی بھی ہے' سامنے اس لیے نہیں آیا کہ خود بھی نظروں میں نہ آجائے۔ وہ جانتا ہے کہ چی فانگ بھی یہاں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یا دارا بھی موجود ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے' اپنے آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھ کر ہمیں پرساد کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہے۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" تھائی وانگ نے مجھ سے پہلے ہی سیٹ چھوڑ دی۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ظاہر ہے میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ ہم دونوں اس ہال سے نکل کر راہداری میں ہوتے ہوئے لابی میں آگئے۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ دربان وہ نہیں تھا جس سے اندر داخل ہوتے وقت میں نے کچھ گپ شپ کی تھی۔

وسیع و عریض برآمدے سے نکل کر میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک روش پر مڑ گیا۔ تھائی بھی میرے ساتھ تھی اور محتاط نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ ہم گھوم کر دریا کی طرف آگئے۔ یہاں کی دنیا بھی نرالی ہی تھی۔ ایک طرف دریا کے کنارے پر جیٹی بنی ہوئی تھی جہاں دریا کی سیر کے لیے مخصوص ساخت کی کشتیاں موجود تھیں۔ جیٹی کا علاقہ تیز روشنی میں نہایا ہوا تھا جبکہ اس سے آگے کا ماحول نیم تاریک تھا اور دور تک میزیں و کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور غالباً کوئی بھی میز خالی نہیں تھی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے تھائی کو اشارہ کیا اور بائیں طرف مڑ گیا۔ تقریباً پچاس گز آگے دریا کے کنارے سے ذرا ہٹ کر پام کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس طرف تاریکی تھی۔ میں مڑ کر اس طرف چلنے لگا۔ تھائی میرے ساتھ تھی۔ اس نے اپنے پرس سے پستول نکال لیا تھا۔

میں درختوں کے نیچے رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ صورت حال بڑی عجیب سی تھی۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا جا رہا۔ ایسا تو نہیں کہ ہمیں پہچان لیا گیا ہو اور ہال میں لوگوں کی موجودگی میں کچھ کرنے کے بجائے دھوکے سے یہاں بلا لیا گیا تھا یا تو اس تاریکی میں ہمیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا یا حراست میں لینے کی کوشش کی جائے گی۔ میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے سرگوشیانہ آواز ابھری۔

"مسٹر وجدان۔ دائیں طرف آجاؤ۔ میں یہاں موجود ہوں۔"

"تم آگے جاؤ۔ میں یہیں کھڑی ہوں تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو۔۔۔۔"

تھائی وانگ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑی ہو گئی۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور اس طرف چلنے لگا جہاں سے آواز سنائی دی تھی اور پھر وہ آدمی میرے سامنے آگیا۔

"ڈرو نہیں مسٹر وجدان۔ میں تمہارا دوست ہوں۔" اس نے سرگوشی میں کہا "میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب تم ہال میں داخل ہوئے تھے۔"

"کون ہو تم؟ مجھے کیسے پہچانا اور پرساد کے بارے میں کیا بتانا چاہتے ہو؟" میں نے بھی سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں پرساد کا دوست پاتھم ہوں۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے۔ میں نے تمہیں ایک دو مرتبہ اس کے ساتھ دیکھا بھی تھا اس لیے حلیہ بدلا ہوا ہونے کے باوجود میں نے تمہیں پہچان لیا۔"

"وہ کیسے؟" میرے لہجے میں تجسس تھا۔

"تمہارے دائیں کان کی لو پر پیچھے کی طرف سیاہ رنگ کا ایک تل ہے۔" پاتھم نے جواب دیا "تم جب ہال میں آکر بیٹھے تھے تو میں ساتھ والی میز پر موجود تھا۔ مجھے تم پر اور تمہاری ساتھی پر شبہ ہوا تھا اور پھر اتفاق سے تمہارے کان کا تل میری نظروں میں آگیا۔ جب تم ہال سے اٹھ کر باہر گئے تھے تو میں بھی تمہارے پیچھے ہی تھا۔ تم ٹیلی فون بوتھ کے سامنے کھڑے تھے۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن پیڈرو کا ایک آدمی اس طرف آگیا اور مجھے وہاں سے ہٹنا پڑا۔ میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا تھا کہ چی فانگ یہاں موجود ہے اور اسے تم پر شبہ ہو گیا ہے۔ یہاں تو شاید تمہارے خلاف کچھ نہ کیا جائے لیکن جیسے ہی باہر نکلو گے' تمہیں گھیرنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہاں کوئی کارروائی کر کے وہ آشرم والے واقعے کو دہرانا نہیں چاہتے۔"

"پرساد کہاں ہے؟" میں نے پوچھا "اور کس حال میں ہے؟"

ہمیں اس طرح اطمینان سے باتیں کرتے دیکھ کر تھائی وانگ بھی وہاں آگئی تھی۔

"پرساد دارا کے قبضے میں ہے۔" پاتھم نے جواب دیا "وہ اس کے ذریعے تمہیں مہاراج کی پناہ گاہ سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ پرساد نے ابھی تک زبان نہیں کھولی اور مجھے یقین ہے وہ جان تو دے دے گا مگر تمہارے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہونے دے گا۔ اگر تم اسے بچانا چاہتے ہو تو تمہیں تھوڑی بہت قربانی دینی ہو گی۔"

"میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"شورانی واحد ہستی ہے جو یہ جانتی ہے کہ پرساد کو کہاں رکھا گیا ہے۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"شورانی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ہندو عورت ہے۔ بہت حسین۔ منٹوں میں کسی بھی مرد کو اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور کر سکتی ہے۔" پاتھم نے جواب دیا "بہت لالچی عورت ہے۔ صرف دولت مند مردوں پر ہی ہاتھ ڈالتی ہے اور یہ مرد بھی اسے اپنے ساتھ رکھنے پر فخر محسوس کرتے ہیں لیکن دس پندرہ دن سے زیادہ کسی کو اپنے قریب نہیں ٹکنے دیتی۔ اسے نچوڑ کر چھوڑ دیتی ہے اور پھر کسی دوسرے کو پھانس لیتی ہے۔ بلکہ مرد خود ہی اس کے جال میں پھنسنے کے لیے اپنی باری کے انتظار میں رہتے ہیں۔"

"یہ شورانی وہ تو نہیں جو کچھ عرصے پہلے سلیوم روڈ پر ہالی ڈے ان کراؤن پلازا ہوٹل کے سامنے والی بلڈنگ میں مساج پارلر چلایا کرتی تھی؟" تھائی وانگ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہی ہے۔" پاتھم نے جواب دیا "سات آٹھ مہینے پہلے اس نے مساج پارلر فروخت کر دیا تھا۔ ان دنوں شہر کے ایک بہت بڑے جوہری سے اس کے تعلقات استوار ہو گئے تھے اور اس جوہری کو پسند نہیں تھا کہ اس کی محبوبہ مساج پارلر چلائے۔ اس نے شورانی کو شہر کے مہنگے ترین رہائشی علاقے میں ایک بنگلا بھی خرید کر دیا تھا لیکن دو مہینے بعد ہی شورانی نے اس جوہری کو ہری جھنڈی دکھا دی۔ اس جوہری کو شورانی سے کچھ ملا یا نہیں' یہ الگ مسئلہ ہے لیکن شورانی نے اس کی چند روزہ دوستی سے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں موو (MOVE) کرنے لگی تھی اور جوہری سے کہیں زیادہ دولت مند لوگوں سے اس کے تعلقات ہو گئے تھے۔ شورانی ان لوگوں سے دولت سمیٹتی رہی اور بالآخر دارا سے ٹکرا گئی۔ آج کل وہ اس کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ دارا پیڈرو کا آدمی ہے اس لیے کوئی بھی شخص اب شورانی کے قریب جانے کی کوشش نہیں کرتا۔ عام خیال یہ ہے کہ شورانی اب خود دارا کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔ وہ اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکے گی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شورانی کو معلوم ہوا ہے کہ پرساد کو کہاں رکھا گیا ہے۔" پاتھم نے جواب دیا "اگر کوشش کی جائے تو اسے توڑا جا سکتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے پیسے کا لالچ دے کر؟"

"وہ چھوٹی موٹی رقم کے لالچ میں آنے والی نہیں۔ البتہ دو ملین بھات کے چکر میں آکر وہ نہ صرف پرساد کے بارے میں بتا سکتی ہے بلکہ اس سے دارا کے بارے میں بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک منصوبہ ہے میرے ذہن میں۔" پاتھم نے کہا اور پھر اپنا منصوبہ بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا "اس طرح نہ صرف پرساد کی جان بچائی جا سکتی ہے بلکہ دارا اور پیڈرو کے بہت سے راز بھی معلوم کیے جا سکتے ہیں۔"

"تمہاری بات سمجھ میں تو آتی ہے لیکن اس منصوبے پر عمل ایک دو دن بعد ہی ہو سکتا ہے۔ پلاننگ کرنی پڑے گی۔ اس وقت ہمیں جو پریشانی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری دو دوست یہاں آئی تھیں۔ وہ دکھائی نہیں دے رہیں۔ ان میں ایک کو تو شاید تم نے پرساد کے ساتھ بھی دیکھا ہو گا۔"

"وہ نویتا۔" پاتھم جلدی سے بولا "میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک اور خوب صورت عورت بھی تھی لیکن وہ تم لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی کے ساتھ یہاں سے چلی گئی تھیں۔ وہ شاید نویتا کا دوست تھا۔"

"اوہ۔" میں چونک گیا "کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟"

"وہ قدرے بھاری بھرکم اور ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔" پاتھم نے کہا اور پھر اس نے جو حلیہ بتایا اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ شانگ تھا جو اس رات کو سارو روڈ والے بنگلے میں دارا اور ٹائیگر سے ہیروئن کے بزنس کے سلسلے میں کوئی ڈیل کرنے آیا تھا۔ بے چاری پامیلا اسی رات دارا کے ہاتھوں ماری گئی تھی اور ٹائیگر ہمارے قابو میں آگیا تھا۔ مجھے ان دونوں کی خیریت خطرے میں نظر آنے لگی۔

"تم مجھے اپنا فون نمبر دو۔ میں کل کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

پاتھم نے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دے دیا۔

"یہ میرے ورکشاپ کا فون نمبر ہے۔ میری رہائش بھی ورکشاپ کے عقبی حصے میں ہے۔" اس نے کہا "لیکن اب تم لوگ جانے کے لیے گیٹ والا راستہ استعمال نہیں کرو گے۔ چی فانگ کو تم پر شبہ ہو گیا تھا۔ جس دربان سے تم نے باتیں کی تھیں اسے بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا ہے۔ چی فانگ نے اس سے معلوم کر لیا ہو گا کہ تم نے اس سے کیا باتیں کی تھیں۔ اس کا شبہ یقین میں بدل گیا ہو گا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ وہ یہاں کچھ نہیں کریں گے۔ البتہ باہر نکلتے ہی تمہیں گھیر لیا جائے گا۔ میں نے یہاں سے تمہاری واپسی کے لیے ایک اور بندوبست کر رکھا ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم درختوں میں اس کے پیچھے چلتے ہوئے دریا کے کنارے پر پہنچ گئے۔ اس طرف روشنی کا انتظام نہیں تھا لیکن جیٹی پر جلنے والے بلبوں کی مدھم سی روشنی یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ کنارے کے ساتھ ہی ایک چھوٹی موٹر بوٹ کھڑی تھی جس پر چار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ بوٹ کی رسی کنارے پر لگے ہوئے ایک آہنی ہک سے

بندھی ہوئی تھی۔

"بیٹھو۔" پاتھم نے رسی کھولتے ہوئے کہا "کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہم واٹ ارون کے قریب بوٹ چھوڑ دیں گے۔ وہ محفوظ علاقہ ہے۔ وہاں سے کنارے پر جا کر تم لوگ کسی بھی طرف جا سکتے ہو۔"

میرے ذہن میں ایک لمحے کو پھر یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ہمیں کسی جال میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کی جا رہی۔ خشکی پر تو ہم اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ اِدھر اُدھر نکل سکتے تھے لیکن اگر دریا میں گھیر لیے گئے تو ہمارے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں رہے گا لیکن میں نے اس خدشے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پاتھم نے پرساد کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائی تھیں جو صرف اس کا دوست ہی جان سکتا تھا۔ میں نے پہلے تھائی وانگ کو سہارا دے کر کشتی میں بیٹھنے میں مدد دی اور پھر خود بھی سوار ہو گیا۔ پاتھم بھی رسی سمیٹ کر سب سے پیچھے والی سیٹ پر انجن کے قریب بیٹھ گیا اور بٹن دبا کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ انجن کی آواز اگرچہ بہت ہلکی تھی لیکن سناٹے میں دور تک سنی جا سکتی تھی۔

بوٹ حرکت میں آ کر پہلے دریا کی گہرائی کی طرف بڑھی پھر دائیں طرف مڑ گئی۔ دریا کے دونوں کناروں پر بلند عمارتوں پر لگے ہوئے نیون سائنز کی روشنیاں پانی میں جھلملا رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی ایک اور آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے آواز آئی تھی اور پھر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ جیٹی کے آس پاس بادبان والی تین کشتیاں کھڑی تھیں اور ایک موٹر بوٹ ان کے گرد گھومتی ہوئی آگے نکل رہی تھی۔ وہاں تیز روشنیاں تھیں۔ موٹر بوٹ پر بیٹھا ہوا آدمی صاف نظر آ رہا تھا۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس کا چہرہ اگرچہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن سفید سوٹ دیکھ کر مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔

"پاتھم!" میں نے کہا "وہ بوٹ ہماری طرف آ رہی ہے اور اس میں سوار وہ شخص....."

"چی فانگ ہے۔" پاتھم نے میرا جملہ مکمل کر دیا۔ اس نے بھی اس بوٹ کو دیکھ لیا تھا "تم فکر مت کرو باس۔ وہ ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

پاتھم نے تھروٹل کھینچ لیا۔ بوٹ کو ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ دریا کی لہروں پر اچھلنے لگی۔ تھائی نے بڑی مضبوطی سے سیٹ کے کناروں کو پکڑ رکھا تھا۔

وہ بوٹ بڑی تیزی سے ہمارے قریب آ رہی تھی۔ پاتھم نے بھی رفتار بڑھا دی تھی لیکن صاف لگ رہا تھا کہ ہماری بوٹ کی رفتار دوسری بوٹ سے زیادہ تیز نہیں تھی کیونکہ بیچ کا فاصلہ بڑی تیزی سے سمٹ رہا تھا۔

واٹ ارون زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر ہم کنارے پر چلتے ہوئے پیدل بھی آتے تو دس منٹ میں وہاں تک پہنچ سکتے تھے۔ پاتھم نے بوٹ کا رخ کنارے کی طرف موڑ دیا۔ واٹ ارون سے پہلے کنارے پر تاریکی تھی۔ وہ جگہ خالی تھی اور پاتھم کشتی کو اسی کنارے پر لگانا چاہتا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ دوسری بوٹ بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر ہمارا راستہ کاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کشتی بڑی تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ تھائی وانگ نے پرس میں سے پستول نکال لیا۔ وہ سیٹ پر ذرا سا مڑ کر بیٹھ گئی۔ دوسری بوٹ بالکل سامنے آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تھائی نے گولی چلا دی۔ ٹھیک اسی لمحے ہماری بوٹ بڑی تیزی سے بائیں طرف مڑی۔ پاتھم نے بڑی پھرتی سے بوٹ کو گھمایا تھا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو دونوں کشتیوں میں تصادم ہو جاتا۔ تھائی کی چلائی ہوئی گولی کا حشر تو نجانے کیا ہوا تھا لیکن بوٹ کو جھٹکا لگنے سے تھائی بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش میں پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر گیا۔

پاتھم نے بڑی تیزی سے بوٹ کا رخ موڑا تھا۔ ہم ابھی کنارے سے چند گز دور ہی تھے کہ چی فانگ کی بوٹ ہماری بوٹ سے ٹکراتی ہوئی دریا کے کنارے پر چڑھ گئی۔ ہماری بوٹ پانی میں لٹو کی طرح گھوم گئی اور پھر کنارے پر چڑھ کر دور تک کچی زمین پر گھسٹتی چلی گئی۔ تھائی وانگ بُری طرح چیخ رہی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ ٹکر لگنے کے بعد یا کنارے پر چڑھ کر ہماری کشتی الٹی نہیں تھی۔ تھائی اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکی تھی۔ کشتی رکتے ہی وہ جھٹکا لگنے سے اچھل کر باہر گری۔ میں نے جلدی سے سہارا دے کر تھائی کو اٹھایا اور دوسری بوٹ کی طرف دوڑا۔

چی فانگ کی کشتی ایک چھوٹی دیوار سے ٹکرا کر رکی تھی۔ وہ چھلانگ لگا کر باہر آ گیا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پَر تولنے لگا۔ میں بھی اس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے موقع تلاش کرنے لگے اور پھر پہل چی فانگ ہی نے کی تھی۔ اس نے فرنٹ کک لگانے کی کوشش کی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی کلائی سے اس کی کک روک لی اور اس کے ساتھ ہی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر رائٹ فرنٹ کک لگانے کی کوشش کی مگر بالکل میری طرح چی فانگ نے بھی میرا یہ حملہ ناکام بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اچھل کر پوری قوت سے راؤنڈ ہاؤس کک لگا دی۔

راؤنڈ ہاؤس کک موئے تھائی کی بڑی خطرناک کک کہلاتی ہے۔ اس سے عام طور پر حریف کی گردن یا سر کو نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن چی فانگ کی کک میرے بائیں کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑا گیا۔ اس نے لیفٹ کک لگائی لیکن میں نے اس کا یہ وار روک لیا اور بڑی تیزی سے گھوم کر اس کے سینے پر اسپن کک لگا دی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے ایک اور اسپن کک لگائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

مارشل آرٹ میں کوئی بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ عام طور پر دباؤ میں رہنے والا اور پٹتے ہوئے حریف اچانک کوئی ایسی چال بھی چل سکتا ہے جس سے بازی پلٹ سکتی ہے۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ چی فانگ زمین پر گر گیا تھا اور مجھے توقع تھی کہ ایک دو ضرب کھانے کے بعد وہ ہتھیار ڈال دے گا لیکن میں نے جیسے ہی کک لگانا چاہی، اس نے بڑی پھرتی سے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں ایک پیر پر لہرا گیا اور دوسرے ہی لمحے اچھل کر پشت کے بل گرا۔

میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی لیکن چی فانگ مجھ سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ ہم ایک بار پھر ایک دوسرے کے ارادوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے اور پھر اچانک ہی چی فانگ نے لیفٹ پنچ لگانے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی تیزی سے بائیں ہاتھ سے اس کی کلائی کو گرفت میں لے لیا اور اس کے ساتھ ہی نہ صرف اس کے منہ پر رائٹ پنچ رسید کر دیا بلکہ سیدھے پیر سے اس کی بائیں ران کے اندر کی طرف کک بھی لگا دی۔

چی فانگ بلبلا اٹھا لیکن وہ کوئی اناڑی نہیں تھا کہ شکست تسلیم کر لیتا۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ بڑی تیزی سے نیچے بیٹھتا چلا گیا اور اس طرح میں اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل پیچھے کی طرف گرا لیکن میں نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ چی فانگ بھی سنبھل چکا تھا۔ اس مرتبہ اس کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔

اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ایک پیر پر گھوم کر اسپن کک لگانا چاہی مگر میں بڑی پھرتی سے اس کا یہ وار بچا گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے مجھے یہ احساس ہو گیا کہ اسپن کک اس نے مجھے چکما دینے کے لیے لگائی تھی۔ اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، اس کی تھرسٹ کک (پاؤں کے نیچے کی ایسی ٹھوکر جو مقابل کو دھکیلنے کے لیے رسید کی جاتی ہے۔ یہ پش کک بھی کہلاتی ہے۔ اگر اپنے ٹارگٹ پر بیٹھ جائے تو خاصی مہلک ثابت ہوتی ہے) میری ٹانگ کے پچھلی طرف گھٹنے کے جوڑ پر لگی اور میں لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا اور چی فانگ کو موقع دیے بغیر اس مرتبہ میں نے حملے میں پہل کر دی۔ میں نے راؤنڈ ہاؤس کک لگانے کے لیے اپنی دائیں ٹانگ کو مخصوص انداز میں حرکت دی تھی۔ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ وہی ہوتا ہے جو حریف کے جسم کے مختلف اعضا کی حرکات سے یہ اندازہ لگا لے کہ وہ کون سا وار کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ چی فانگ بہت اچھا مارشل آرٹسٹ تھا۔ اس نے میرے ارادے کو سمجھ لیا تھا لیکن اس سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ میں اس کی گردن یا سر پر کک لگاؤں گا۔ اس نے اپنا سر بچانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے کک اس کے کولھے پر لگائی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میری دوسری کک اس کے بائیں کندھے اور کہنی کے درمیان بازو پر پڑی۔ وہ بلبلا گیا اور میری تیسری کک اس کی گردن پر پڑی تھی۔ وہ قلابازی کھاتا ہوا نیچے گرا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا اور اس نے اب تک بڑی مہارت سے میرا مقابلہ کیا تھا لیکن اس مرتبہ وہ کھلی بدمعاشی پر اتر آیا تھا۔ اس نے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ یہ اس کی شکست خوردگی کا ثبوت تھا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ مارشل آرٹ سے وہ مجھے زیر نہیں کر سکتا... اسی لیے اس نے خنجر نکال لیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ خنجر سے حملہ کرتا، میں نے بائیں ٹانگ کو جھکائی دے کر دائیں پیر سے اس کی کہنی پر ٹھوکر رسید کر دی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ پنچ اور ککس سے اس پر تابڑتوڑ حملے کرتا رہا اور پھر تھائی وانگ کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔

"وجدان! ہوشیار۔ ایک موٹر بوٹ اسی طرف آ رہی ہے۔"

اور پھر میں نے پہلی مرتبہ دریا کی طرف دیکھا۔ انجن کی آواز فضا میں گونج رہی تھی اور وہ موٹر بوٹ بڑی تیزی سے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔ اس پر کم از کم تین آدمی نظر آ رہے تھے۔

پہلے میرا ارادہ یہ تھا کہ چی فانگ کو کسی طرح قابو کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ اس نے بھی موٹر بوٹ کو دیکھ لیا تھا اور سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا اور پے در پے اس پر حملے کرتا رہا۔

میں ایک مرتبہ پوری قوت سے اچھلا۔ اس مرتبہ میری اپ جاگی فرنٹ ہائی کک چی فانگ کی پیشانی پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا اور پھر اس نے حرکت نہیں کی۔ میں تیزی سے تھائی وانگ کی طرف دوڑا۔

میں حیران تھا کہ پاتھم نے اب تک ہماری لڑائی میں مداخلت کیوں نہیں کی تھی۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ کشتی کی ایک سیٹ ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ایک ٹانگ سیٹ کے نیچے پھنسی ہوئی تھی جسے وہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

بوٹ کنارے کے قریب پہنچ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر سیٹ کو جھٹکا دے کر اکھاڑ دیا۔ پاتھم اچھل کر کشتی سے باہر آ گیا۔

"تم نکل جاؤ یہاں سے۔ میں کل کسی وقت فون پر تم سے رابطہ کروں گا۔" میں نے پاتھم سے کہا اور تھائی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

کنارے کی طرف آنے والی موٹر بوٹ سے پستول یا ریوالور سے فائرنگ شروع کر دی گئی تھی۔ پاتھم تاریکی میں ایک طرف بھاگ گیا تھا۔ میں بھی تھائی کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا۔ کنارے سے

تقریباً پچاس گز آگے کسی عمارت کی تعمیر شروع ہوئی تھی۔ ابھی صرف دیواریں اٹھائی جارہی تھیں۔ شاید یہاں بھی کوئی نائٹ کلب بننے والا تھا۔ آنے والی بوٹ سے مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں تھائی کا ہاتھ پکڑے دیواروں کی آڑ لیتا ہوا دوڑتا رہا۔

سڑک پر پہنچتے ہی بائیں طرف سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ تھائی سڑک کے بیچ میں پہنچ کر کار کو رکنے کا اشارہ کرنے لگی۔ میں تاریکی میں دُبک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پتلون کا پائنچہ اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔

کار رک گئی۔ اس میں ایک ہی آدمی تھا۔ تھائی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا کار کے قریب پہنچ گیا اور خنجر کی نوک اس شخص کی گردن پر رکھ دی۔

"انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آؤ۔" میں نے غرا کر کہا۔

وہ دبلا پتلا سا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ میں نے باہر سے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اس شخص کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔

"اس طرف بھاگ جاؤ۔ شور مت مچانا اور مڑ کر مت دیکھنا۔" میں نے سڑک پر پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں لگائی تھی۔

ٹھیک اسی لمحے دریا کی طرف سے آنے والے راستے پر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ جو کوئی بھی تھے انہوں نے بوٹ سے اتر کر چی فانگ کو پڑے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ان میں سے کوئی فائرنگ کرتا ہوا ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

"اسٹیئرنگ سنبھالو تھائی۔ ہری اَپ!" میں نے چیخ کر کہا اور کار کے سامنے سے گھوم کر پسنجرز سائڈ والے دروازے کی طرف آگیا۔

تھائی اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔ انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ گاڑی کو گیئر میں ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن کار اپنی جگہ سے ہلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز اب قریب آگئی تھی۔ میری آنکھوں میں تشویش ابھر آئی اور پھر اچانک کار کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں سیٹ پر اچھل کر رہ گیا۔ کار بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح آگے بڑھی تھی۔ اس سے پہلے کہ لہراتی ہوئی کار سڑک سے اتر جاتی، تھائی وانگ نے اسے سنبھال لیا۔

کار واٹ ارون کے سامنے سے گزر کر وانگ ڈوم روڈ پر آگئی اور پھر وہاں سے پرچا تھیک روڈ کے چوراہے تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"کار کو کہاں چھوڑا جائے؟" تھائی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کار کو یہاں چھوڑنا مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "وہ لوگ پہلے بھی ان اطراف میں ہمیں تلاش کرتے رہے ہیں۔ وہ شخص یقیناً پولیس کو کار چھن جانے کی اطلاع دے گا اور پھر کار کو یہاں دیکھ کر وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ ہم آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ کار کو گھر تک لے چلو۔ سکھدر سے کہیں گے وہ اسے کہیں ٹھکانے لگا آئے۔"

بات تھائی کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے اگلی سڑک پر کار دائیں طرف موڑ دی اور پھر جانکی والے بنگلے تک پہنچنے میں ہمیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اس وقت ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ میرا خیال تھا کہ شاید جانکی اور نویتا یہاں پہنچ چکی ہوں گی لیکن نہ تو وہ یہاں آئی تھیں اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ میں نے سب سے پہلے سکھدر کو کار کو ٹھکانے لگانے کے لیے روانہ کردیا۔

"اس کار کو یہاں سے کافی دور بلکہ دریا کے پار دوسری طرف کسی سڑک پر چھوڑ دینا اور وہاں سے سیدھے جمنازیم چلے جانا۔ ماسٹر ہوچن کے پاس۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا "میں ماسٹر ہوچن سے فون پر بات کرلیتا ہوں۔ کسی گاڑی کا بندوبست کرنا ہے جو بہت ضروری ہے۔"

سکھدر نے میری بات سن کر سر ہلا دیا اور پھر تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں اس وقت بھی عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

سکھدر کے جانے کے بعد ہم اندر آگئے۔ میں نے سب سے پہلے ماسٹر ہوچن کو فون کیا۔ وہ موجود نہیں تھا لیکن اتفاق سے گانگ سے بات ہوگئی۔

"سنو گانگ۔" میں نے کہا "مجھے کسی گاڑی کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر گزارہ نہیں ہوسکتا۔ سکھدر وہاں آرہا ہے اگر ممکن ہو تو اسی وقت کسی گاڑی کا بندوبست کردو۔"

"اپنا فون نمبر بتاؤ۔ چند منٹ بعد میں تمہیں اطلاع دیتا ہوں کہ فوری طور پر کسی گاڑی کا بندوبست ہوسکتا ہے یا نہیں۔" گانگ نے کہا۔

اس بنگلے کو چھوڑنے سے پہلے میں نے یہ پناہ گاہ خفیہ ہی رکھی تھی۔ ماسٹر ہوچن نے کئی مرتبہ اصرار کیا تھا مگر میں نے اسے بھی یہاں کا فون نمبر نہیں بتایا تھا لیکن اب مہاراج کے کہنے پر ایک آدمی سکھدر یہاں پہنچ چکا تھا اس لیے اب یہاں کا فون نمبر بھی بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے ٹیلی فون نمبر گانگ کو بتادیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔" گانگ نے کہا۔

میں نے فون کا کریڈل ٹیپ کرکے جانکی دیوی کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی۔ کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میری آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔ وہ دونوں یقیناً کسی مصیبت میں پھنس گئی تھیں۔

تھائی کچھ دیر تک کھڑی میری طرف دیکھتی رہی اور پھر کمرے

میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد وہ لباس تبدیل کرکے کمرے سے باہر نکلی۔

"میں کافی بنانے جارہی ہوں۔ تمہارے کپڑے تو بہت خراب ہو رہے ہیں۔ بدل لو۔" وہ یہ کہتے ہوئے کچن میں گھس گئی۔

چی فانگ سے فائٹ میں میرے کپڑے واقعی بہت خراب ہوگئے تھے۔ میں اٹھ کر کمرے میں چلا گیا۔ تھائی وانگ نے جو کپڑے اتارے تھے، وہ بیڈ پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال لیے۔

چند منٹ بعد میں باہر نکلا تو تھائی کافی بنا چکی تھی۔ ہم ہال میں بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ قریب ہی ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے پرساد اور جانکی وغیرہ کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اب مجھے جانکی اور نویتا کی زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ پاتھم نے اس شخص کا جو حلیہ بتایا تھا، وہ سو فی صد شانگ کا تھا۔ شانگ ہی نویتا کو دھوکے سے چیانگ رائے سے لے کر آیا تھا لیکن پہلی ہی رات ہم نے اس بنگلے پر چھاپا مار دیا تھا۔ شانگ اور دارا تو بھاگ نکلے تھے مگر ٹائیگر ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا اور نویتا بھی ہمارے قبضے میں آگئی تھی۔ شانگ چیانگ رائے واپس چلا گیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے وہ ایک دو روز پہلے واپس آگیا ہو اور آج اتفاق سے پیراڈائز ریسٹورنٹ میں نویتا سے آمنا سامنا ہوگیا۔ پاتھم نے بتایا تھا کہ نویتا یا جانکی کے چہرے پر کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ وہ دوستانہ ماحول میں باتیں کرتے رہے تھے اور شانگ کے ساتھ جاتے ہوئے بھی ان کے چہروں پر کوئی غیر معمولی تاثرات نہیں تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا کہ انہیں ان کی مرضی کے خلاف لے جایا جارہا ہے۔

میرے ذہن میں ایک اور خیال آرہا تھا۔ ہوسکتا ہے نویتا نے اس رات کے بارے میں شانگ کو کوئی فرضی داستان سنا دی ہو۔ مثلاً یہ کہ انہیں بھی بنگلے سے بھاگنے کا موقع مل گیا تھا یا اسے بے قصور سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ تھائی وانگ قریب تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اچھل پڑی۔

"اے جانکی۔ تم دونوں کہاں غائب ہو۔ ہم پریشان ہو رہے ہیں۔ ہاں.... ہاں۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ چی فانگ.... اوہ.... تمہیں کیسے پتا چلا۔ ایک منٹ.... لو وجدان سے بات کرو۔" اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو جانکی۔ کہاں ہو تم.... ہاں.... مجھے پتا چل گیا تھا کہ تم لوگ شانگ کے ساتھ گئی ہو اور مجھے یہی پریشانی ہو رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے وجدان۔ میری بات توجہ سے سنو۔" جانکی دیوی نے کہا "پیراڈائز ریسٹورنٹ میں اچانک ہی شانگ اور دارا سے آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم دونوں کی کیا حالت ہوئی تھی لیکن تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ دارا مجھے نہیں پہچان سکا تھا اور نویتا سے بھی انہوں نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ نویتا نے انہیں فرضی کہانی سنا دی تھی کہ اس رات وہ بھی موقع پاکر بنگلے سے بھاگ نکلی تھی۔ شانگ اور دارا نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ بنگلے سے فرار ہوتے وقت وہ اسے ساتھ نہیں لے جاسکے تھے۔"

"انہیں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" جانکی نے جواب دیا "ان دونوں نے ہمیں ریسٹورنٹ میں بڑا پُرتکلف کھانا بھی کھلایا تھا اور پھر دارا تو شورانی کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔ تم شورانی کو نہیں جانتے۔ تھائی جانتی ہوگی۔ دارا کے جانے کے بعد ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے رہے اور پھر شانگ ہمیں اپنے ساتھ لے آیا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ مال مفت سمجھ کر ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے نویتا کو اشارہ کردیا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔ دراصل میں پرساد کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھی اور ان کے ساتھ رہ کر ہی کچھ معلوم ہوسکتا تھا اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ شانگ ہمیں جس بنگلے میں لے کر آیا ہے وہاں پرساد بھی موجود ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے نکلا "کیسا ہے وہ.... ٹھیک تو ہے نا؟"

"تمہارے بارے میں معلوم کرنے کے لیے اس پر کچھ تشدد تو کیا گیا ہے لیکن بہرحال اس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں۔" جانکی نے جواب دیا۔

"بنگلے کا پتا بتاؤ۔ وہاں کتنے آدمی ہیں۔ میں پہنچتا [illegible]" میں نے کہا۔

"ابھی بتاتی ہوں لیکن اس سے پہلے ایک اور بات بتانا چاہتی ہوں۔" جانکی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "تقریباً آدھا گھنٹے پہلے دارا بھی یہاں آیا تھا۔ وہ آیا تو کسی اور نیت سے تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے ایک فون کال ملی۔ اسے کوئی اہم اطلاع دی گئی تھی جس سے وہ پریشان ہوگیا تھا۔"

"اور کیا تمہیں اندازہ ہوا کہ وہ اہم اطلاع کیا ہوسکتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"فون بند کرنے کے بعد وہ شانگ کو بتا رہا تھا کہ تم تھائی وانگ کے ساتھ پیراڈائز ریسٹورنٹ میں آئے تھے جہاں چی فانگ نے تمہیں پہچان لیا۔ تم لوگوں نے موٹر بوٹ کے ذریعے دریا کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی۔ چی فانگ نے تمہارا پیچھا کیا اور تم اسے زخمی کرکے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ چی فانگ کی کہنی کے قریب سے بازو کی ہڈی کریک ہوگئی ہے۔ وہ اس وقت ایک پرائیویٹ اسپتال میں پڑا ہے۔ دارا شاید وہیں گیا ہے۔ اس وقت بنگلے میں شانگ کے علاوہ صرف ایک آدمی ہے۔ نویتا نے شانگ کو کمرے میں بند کرکے باتوں میں لگا رکھا ہے۔ دوسرا آدمی باہر

برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے اور میں موقع پاکر فون پر تم سے بات کررہی ہوں۔ تھائی کو فون دو۔ میں اسے پتا سمجھاتی ہوں۔"

میں نے ریسیور تھائی کو دے دیا۔ وہ چند منٹ جانکی سے باتیں کرتی رہی پھر فون بند کردیا اور اس بنگلے کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ بنگلا دریا کے دوسری طرف تھنگ ماہاک ڈسٹرکٹ میں ایکسپریس وے کے قریب سوئے یودی پر واقع تھا۔

میں نے ریسیور اٹھالیا اور ماسٹر ہوچن کا نمبر ملانے لگا۔ کال گانگ نے ہی ریسیو کی تھی۔

"ماسٹر ہوچن واٹ ٹریمٹ میں مہاراج کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ آج ہی رات گاڑی کا بندوبست ہوجائے گا۔" اس نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

"گاڑی پر لعنت بھیجو۔ تم اپنا ٹک ٹک لے کر فوراً یہاں چلے آؤ۔ سکھدر کو بھی لے آؤ۔ وقت بہت کم ہے۔ جلدی کرو۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے لٹل ماسٹر۔" گانگ نے کہا "بہت بدحواس ہو؟"

"پرساد کا پتا چل گیا ہے۔ جانکی دیوی اور نویتا بھی وہاں پھنسی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"او کے باس۔ میں آرہا ہوں۔" گانگ نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ گانگ کو چائنا ٹاؤن سے یہاں تک پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی۔

اور پھر پندرہ منٹ بعد گیٹ کے سامنے ٹک ٹک رکنے کی آواز سنائی دی۔ گیٹ تھائی وانگ نے کھولا تھا۔ گانگ اور سکھدر اندر آگئے۔ تھائی بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اور گانگ نے اسے منع کردیا۔ گانگ نے اس سے سوئے یودی کے بنگلے کا پتا سمجھ لیا اور ہم تینوں گیٹ سے باہر نکل کر ٹک ٹک میں بیٹھ گئے۔ گانگ بڑی تیز رفتاری سے ٹک ٹک چلا رہا تھا۔ کنگ ٹاکسن کے مجسمے والے چوراہے سے آگے نکل کر وہ وانگ ونگ یائے ریلوے اسٹیشن کے دوسری طرف بھی ٹاکسن روڈ ہی تھا۔ ٹک ٹک بڑی تیز رفتاری سے اس سڑک پر دوڑتا رہا اور پھر ایک چوراہے سے پھسک روڈ پر مڑگیا۔ کرونگ تھیپ برج سے دریا پار کرکے ہم تھنگ ماہاک ڈسٹرکٹ میں داخل ہوچکے تھے اور پھر سوئے یودی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

گانگ نے ٹک ٹک کی رفتار کم کردی۔ میں اور سکھدر پچھلی سیٹ پر بیٹھے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔ جلد ہی ہم نے وہ بنگلا بھی تلاش کرلیا۔ ٹک ٹک گلی کے موڑ پر چھوڑ دیا گیا۔ ہم تینوں چند لمحے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہے پھر سکھدر کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ وہ ٹک ٹک کے پاس رک کر گلی میں بنگلے کے گیٹ پر نگاہ رکھ سکتا تھا اور کسی ہنگامی صورتِ حال میں ہمیں سگنل دے دیتا۔

مجھے اور گانگ کو بنگلے کی عقبی دیوار سے اندر کودنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ میرے پاس خنجر تھا اور گانگ کے ہاتھ میں پستول۔ ویسے اس کے پاس ایک خنجر بھی موجود تھا جسے اس نے لباس میں چھپا رکھا تھا۔

ہمیں عقبی دروازہ کھلا ہوا ملا تھا لیکن ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے دارا کے آدمی نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس نے مزاحمت کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہم چاہتے تو اسے آسانی سے موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن بلاوجہ کسی کے خون سے ہاتھ رنگنا ہمارا مقصد نہیں تھا۔ گانگ نے اسے باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ میں جانکی کو آواز دیتا ہوا ایک طرف دوڑا اور جیسے ہی ایک کمرے کا دروازہ کھولا، ٹھٹک کر رک گیا۔

شانگ نے بیڈ پر نویتا کو دبوچ رکھا تھا۔ نویتا کے بدن پر لباس برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مزاحمت کررہی تھی۔ نویتا کے ساتھ شانگ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ وہ نویتا کو چھوڑ کر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف لپکا۔ اس نے دراز کھولی ہی تھی کہ میں نے اس کے کولھے پر زوردار کک رسید کردی۔ وہ سامنے آئینے سے ٹکرا گیا۔ اس کے سر کی ٹکر سے آئینہ چکنا چور ہوگیا۔ اس کی پیشانی سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے اس کے پہلو پر ایک اور کک لگا کر اسے ایک طرف گرا دیا اور میز کی دراز میں رکھا ہوا پستول اٹھالیا۔

"نویتا۔ باہر نکلو۔ جلدی۔" میں نے چیخ کر کہا۔ وہ اپنا بلاؤز اٹھا کر پہننے کی کوشش کرتے ہوئے کمرے سے باہر دوڑ گئی "اور تم ادھر باتھ روم میں۔" میں نے شانگ کو اشارہ کیا "اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو کھوپڑی میں سوراخ کردوں گا۔"

شانگ کو باتھ روم میں بند کرکے میں تیزی سے باہر آگیا۔ گانگ، پرساد کو کندھے پر اٹھائے ایک کمرے سے باہر نکل رہا تھا جانکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ گانگ کا پستول جانکی کے ہاتھ میں تھا۔ ہم ہال سے ہوتے ہوئے برآمدے میں آگئے۔ میں نے باہر آکر بنگلے کا بیرونی گیٹ کھول دیا۔ پہلے جھانک کر باہر دیکھا پھر گانگ اور جانکی کو اشارہ کردیا۔

اور پھر جیسے ہی ہم گیٹ سے نکل کر گلی میں پہنچے بائیں طرف سے ایک کار گلی میں داخل ہوئی۔ ہم ہیڈلائٹس کی روشنی میں نہا گئے۔ کار کی رفتار کم تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے زور سے اچھلی اور بریک کی تیز چرچراہٹ کی آواز سے ہم سے چند گز کے فاصلے پر رک گئی۔

کار کے دونوں طرف کے دروازے کھلے۔ دو آدمی باہر نکلے۔ پچھلی سیٹ پر ایک عورت بھی موجود تھی۔ وہ کار ہی میں بیٹھی رہی۔ وہ دونوں آدمی آگے بڑھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے اور ان میں ایک دارا تھا اور دوسرا پیڈرو!

میری جان کے گاہک.... میرے بدترین دشمن۔ دنیا کے سفاک ترین انسان نما بھیڑیے.... مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔

صورتِ حال بڑی خوف ناک تھی۔

موت ہمارے سامنے کھڑی تھی اور بچاؤ کا کوئی راستہ فی الحال نظر نہیں آرہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہماری زندگی کی آخری گھڑیاں آن پہنچی ہوں۔ وہ سانس جو ہم لے رہے تھے، آخری سانس تھے۔ ان دونوں کی انگلیوں کی معمولی سی حرکت ہماری زندگیوں کا خاتمہ کردینے والی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس قسم کی نازک صورتِ حال سے دوچار نہیں پایا تھا۔ میرے بائیں طرف گانگ نے زخمی پرساد کو اپنے بائیں کندھے پر لاد رکھا تھا۔ اس کی دوسری طرف جانکی دیوی کھڑی تھی۔ میرے دائیں طرف نویتا تھی۔ اس نے پتلون کٹ پاجامہ پہن رکھا تھا اور بلاؤز وہ پہنتے ہوئے میرے ساتھ باہر بھاگی تھی۔ وہ بلاؤز کے نچلے دو بٹن بند کرپائی تھی۔

دارا اور پیڈرو باری باری ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ پیڈرو کا اور میرا پہلی مرتبہ آمنا سامنا ہوا تھا۔ میرے ساتھ اگرچہ گانگ بھی تھا مگر پیڈرو کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ہم دونوں میں وجدان کون ہے۔ اس نے پستول والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ پستول کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔

"نہیں پیڈرو۔" دارا نے میری طرف سے نظریں ہٹائے بغیر کہا "اسے اگر اس طرح ماردیا تو ہمارا انتقام تو پورا ہوجائے گا لیکن بہت بڑی دولت بھی ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے گی۔"

"کیسی دولت؟" پیڈرو نے پوچھا۔

"اس کے باپ نے ہمارا پانچ کروڑ روپے کا سونا غائب کردیا تھا۔" دارا نے کہا "آج اس بات کو کئی سال گزر گئے ہیں۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں سونے کی قیمت میں تین چار گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ آج وہ سونا پندرہ بیس کروڑ روپے کا ضرور ہوگا۔ اس کا مطلب ہے تیس پینتیس لاکھ امریکی ڈالر۔ یہ حساب میں نے اپنے ملک کی کرنسی سے لگایا ہے۔ تمہاری کرنسی کے حساب سے کچھ کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ اس کے باپ نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھا تھا کہ وہ سونا اس نے کہاں چھپایا تھا۔ اس کا باپ مرگیا۔ وہ ڈائری اس کے ایک سرپرست کے ہاتھ لگ گئی جو وہ سنگاپور سے فرار ہوتے وقت ساتھ لے آیا تھا۔ اس کا سرپرست یہاں بنکاک میں میرے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم نے ہوٹل میں اس کے سامان کی تلاشی لی تھی لیکن وہ ڈائری نہیں ملی جس کا مطلب ہے کہ وہ ڈائری یا تو اس کے سرپرست نے کہیں چھپائی تھی جس کا اسے علم ہے... یا اس نے کہیں چھپا رکھی ہے۔ اب تم میری بات سمجھ گئے ہوگے کہ اس کی جان سے زیادہ قیمتی وہ ڈائری ہے جسے میں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔" پیڈرو بولا "پھر تو یہ واقعی ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔"

میں دارا کے منہ سے اپنے ابو کی ڈائری کی بات سن کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس ڈائری کا راز میرے اور چاچا پرتاب سنگھ کے علاوہ صرف ایک اور شخص کو معلوم تھا اور وہ تھا خشونت سنگھ۔ سنگاپور میں جب آخری بار ہم پر حملہ ہوا تھا تو ہم خشونت سنگھ کے مکان میں تھے۔ وہاں سے فرار ہوتے وقت چاچا پرتاب سنگھ نے وہ ڈائری خشونت سنگھ کو دے دی تھی کہ یہ کاکے کی (میری) امانت ہے وہ اسے سنبھال کر رکھے اور اب مجھے حیرت ہورہی تھی کہ دارا کو اس ڈائری کے بارے میں کیسے پتا چلا تھا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ مجھے مروانا کیوں نہیں چاہتا تھا۔ میں کچھ عرصے سے یہی سنتا آرہا تھا کہ دارا مجھے زندہ پکڑنا چاہتا ہے۔

اس وقت صورتِ حال بڑی سنگین تھی۔ ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ دارا مجھے زندہ پکڑنا چاہتا تھا اور پیڈرو، ٹائیگر کی موت کا انتقام لینے کے لیے مجھے گولیوں سے بھون ڈالنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا بھی تھا مگر دارا نے پندرہ بیس کروڑ روپے یا تیس پینتیس لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کا شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی رقم تھی اور میں جان چکا تھا کہ دارا اور پیڈرو جیسے لوگوں کا دین دھرم ہی دولت ہوتا ہے اور وہ دولت کے لیے اپنی ماں بہنوں کو بھی سرِعام نیلام کردینے کو عار نہیں سمجھتے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ تیس پینتیس لاکھ ڈالر کا ذکر سن کر پیڈرو کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے تھے اور ان کی باتوں میں جو وقت گزرا تھا اس سے مجھے بھی سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے اپنے خوف پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا۔

میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ گانگ، پرساد کو اٹھائے ہوئے تھا۔ اس حالت میں وہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ نویتا بلاؤز کے لگے ہوئے بٹن بھی کھول چکی تھی۔ دارا نے......

اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ "میں نے تمہیں پیراڈائز ریسٹورنٹ میں اس عورت کے ساتھ دیکھا تھا تو سمجھ گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔" اس نے نویتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس عورت" سے مراد جانکی تھی۔

"میں نے اس کتیا کو بھی پہچان لیا تھا۔ اس رات وجدان کے ساتھ یہی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی عورت کا ہاتھ میری گردن تک پہنچا تھا۔ اس رات یہ میرے ہاتھوں سے بچ گئی تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اگر میں ریسٹورنٹ میں ظاہر کردیتا کہ اسے پہچان گیا ہوں تو گڑبڑ ہوجاتی۔ تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ تم دونوں کے ذریعے ہی اپنے اصل شکار تک پہنچ سکتا ہوں۔ اس کی طرف سے تو میں بالکل ہی انجان بن گیا اور پھر

میں نے تمہاری یہ بات بھی بلا چوں و چرا تسلیم کرلی کہ جس رات ان لوگوں نے کوسا روڈ والے بنگلے پر ریڈ کیا تھا اس رات تمہیں بھی ہماری طرح بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔ تمہارے ساتھ زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔ تمہیں خوف زدہ ہو کر بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن میں نے تمہیں کئی مرتبہ پرساد کے ساتھ دیکھا۔ میں نے خیال نہیں کیا۔ یہی سمجھتا رہا کہ تم نے کسی کو اپنا ساتھی بنالیا ہے۔ اس وقت میں پرساد پر بھی زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا لیکن اس عورت کے ساتھ دیکھ کر ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے تم دونوں کو شانگ کے ساتھ اس بنگلے میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہاں پرساد کو بھی دیکھ لو اور اپنا انجام بھی سوچ سکو۔ میرا پروگرام کچھ اور تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج کی رات تم دونوں کے ساتھ گزاری جائے گی اور اس دوران میں تم سے اس عورت سے وجدان کے بارے میں بھی پوچھ لیا جائے گا لیکن اسی دوران میں یہ اطلاع ملی کہ ہم لوگوں کے جانے کے بعد یہ وجدان بھی اپنی اس تھائی محبوبہ کے ساتھ پیراڈائز پہنچ گیا تھا اور چی فانگ نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ملنگ ایک ہڈی تڑوا بیٹھا۔ میں نے اسپتال جانے سے پہلے شانگ اور اپنے آدمی کو سمجھا دیا تھا کہ وہ تم دونوں کا خیال رکھیں اور کسی قسم کا شبہ نہ ہونے دیں لیکن وہ دونوں حرام زادے چھپے نکلے اور اب میں یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہوں کہ تم میں سے کسی کو ٹیلی فون کرنے کا موقع مل گیا ہو گا اور یہ سپاہی تم لوگوں کو چھڑوانے کے لیے یہاں پہنچ گیا لیکن..... ہر مرتبہ اس کی قسمت ساتھ نہیں دے گی۔ میں اسے ماروں گا نہیں لیکن اب یہ واپس نہیں جاسکے گا۔ تم میں سے کوئی بھی نہیں جاسکے گا۔"

"تم نے اب تک جو بھی اندازے قائم کیے وہ بالکل درست ہیں دارا ..... اور میں اس کی داد دیتا ہوں لیکن....." میں نے کہا۔ "اب تک کا ریکارڈ یہ ثابت کرتا ہے کہ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے اور اب بھی کچھ نہیں کرسکو گے۔"

دارا کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دوسرے موڑ سے ایک ٹک ٹک گلی میں داخل ہوا۔ دارا اور پیڈرو دونوں اپنی گاڑی کے آگے کھڑے تھے جبکہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

"تم میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔" دارا کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی "ایسے کھڑے رہو جیسے ہم سب دوست ہیں۔ ٹک ٹک میں سوار لوگوں کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی نے کوئی حرکت کی تو بے دریغ گولی ماردوں گا۔" اس نے پیڈرو کو بھی اشارہ کردیا۔

ان دونوں نے پستول والے ہاتھ نیچے کرلیے۔ میں نے گردن گھما کر ٹک ٹک کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ گانگ کا ٹک ٹک تھا جسے سکھدر چلا رہا تھا۔ ٹک ٹک کو آتے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سیدھا نکل جائے گا۔ رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔

ٹک ٹک لمحہ بہ لمحہ قریب آرہا تھا۔ دارا ٹک ٹک کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ پیڈرو کی توجہ ہماری طرف تھی۔ فاصلہ کم ہو رہا تھا اور پھر ٹک ٹک جیسے ہی قریب پہنچا' اس کی آواز ایک دم بدل گئی۔ انجن اچانک ہی شیر کی طرح دہاڑا اور ٹک ٹک بڑی تیزی سے اچھل کر اس طرف بڑھا جہاں دارا اور پیڈرو کھڑے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ دونوں صورتِ حال کو سمجھ سکتے ٹک ٹک پہلے دارا سے ٹکرایا اور پھر پیڈرو سے۔ دارا اچھل کر پیچھے گرا تھا اور اس کے منہ سے گندی گالی نکل گئی تھی جبکہ پیڈرو بھی بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹک ٹک سے ٹکرا کر پیچھے گرا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کا ٹریگر دبا دیا تھا یا ٹریگر غیر ارادی طور پر دب گیا تھا۔

گولی نوبتا کے سر سے صرف دو انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

ٹک ٹک کار سے ٹکرا کر رک گیا اور سکھدر نے بڑی تیزی سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کے بعد وہ دارا کی طرف لپکا جبکہ میں نے پیڈرو پر چھلانگ لگا دی تھی۔

پستول ابھی تک پیڈرو کے ہاتھ میں تھا۔ میرے پیر کی بھرپور ٹھوکر پیڈرو کے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کار کے نیچے چلا گیا۔ میں نے دوسری ٹھوکر مارنی چاہی تو پیڈرو نے بڑی پھرتی سے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کار سے ٹکرا گیا۔

پیڈرو بہت پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں اس کے داؤ کو نہیں سمجھ سکا اور اس کی گرفت میں آگیا۔ وہ یقیناً ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا اور انسانی جسم کے پریشر پوائنٹس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے پیٹ کے قریب پہلوؤں کے گوشت کو اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ اس کی انگلیاں میرے دونوں گردوں کو دبا رہی تھیں۔

یہ بلاشبہ خطرناک داؤ تھا۔ اس سے میرا خاتمہ بھی ہو سکتا تھا۔ میرے دونوں بازو بے جان سے ہو کر پہلوؤں میں لٹک گئے اور چہرے پر کرب کے آثار ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے نیچے جھکنا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے گردوں پر اس کی انگلیوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ضرب لگائی۔ ضرب اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھی لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں نے پوری قوت استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے چھڑا لیا۔ وہ ایک بار پھر حملہ آور ہوا لیکن میں نے اپنے آپ کو

اور پھر اچانک ہی میں اپنی جگہ سے اچھلا۔ وہ میرے اس داؤ ...گیا تھا مگر دفاع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

...نے ہوا میں اچھل کر اپنے دونوں پیر قینچی کی طرح اس کی ...لپیٹے اور بائیں طرف جھکا۔ نیچے گرتے ہوئے میرے ...ہاتھ زمین پر ٹکے۔ پیڈرو بھی میرے ساتھ ہی گرا تھا۔ اس ...اس کی گردن بھی ٹوٹ سکتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو ...زمین پر گرتے ہی میں نے اس کی گردن چھوڑ دی تھی اور ...بڑی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دوسری طرف سکھدر' دارا سے نمٹ رہا تھا۔ دارا کوئی ...آرٹسٹ نہیں تھا جبکہ سکھدر مہاراج کے جمنازیم کا بہت ...فائٹر تھا۔ وہ دارا پر مکّوں اور پنچز کی بارش کیے ہوئے

...گانگ زخمی پرساد کو ٹک ٹک کی پچھلی سیٹ پر لٹا رہا تھا۔ جانگی ...ایک طرف وحشت زدہ سے انداز میں کھڑی تھیں۔

"گانگ۔ تم ان تینوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔" میں نے

...گانگ شاید کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔ وہ پرساد کو سیٹ پر لٹا کر ...عورت کی طرف لپکا جو کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر وہاں ...نکلنا چاہتی تھی۔ وہ شورانی تھی۔ اگر گانگ اس کی طرف ...نہ ہوتا تو شاید وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی لیکن گانگ ...نے دو تین قدم سے زیادہ آگے نہیں جانے دیا۔ گانگ نے ...بالوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹتا ہوا پیچھے لے آیا۔ اس کے ساتھ ...اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔ اس نے شورانی کا ...پیچھے کی طرف جھکا کر خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"رک جاؤ پیڈرو' ورنہ میں اس عورت کا گلا کاٹ دوں گا۔" ...چیخا۔

شورانی بُری طرح چیخ رہی تھی۔

"کاٹ دو۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔" پیڈرو نے چیختے ہوئے ...طرف چھلانگ لگا دی۔

...اس مرتبہ میں غفلت میں مار کھا گیا۔ اس کی راؤنڈ ہاؤس کک ...بائیں بازو پر کندھے اور کہنی کے درمیانی حصے پر لگی۔ مجھے ...بازو کی ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا۔ ...نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسری کک لگانے کی ...کی۔ اس مرتبہ اس نے لیفٹ کک لگائی تھی۔ گویا وہ میرا ...بازو بھی بیکار کرنا چاہتا تھا۔ میں اس قسم کے حربوں سے بخوبی ...تھا اور اس مرتبہ میں نے اسے اس کے مقصد میں کامیاب ...نہیں ہونے دیا۔ اس کا وار میں نے دائیں ہاتھ پر روکا اور ایک لمحے ...کیے بغیر لیفٹ سائیڈ کک لگا دی۔ پیڈرو اچھل کر گرا۔

...دوسری طرف دارا' سکھدر سے پٹ رہا تھا لیکن پھر اس نے ...اچانک گانگ پر حملہ کردیا۔ گانگ لڑکھڑا گیا۔ اس نے شورانی کو بھی گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ پیچھے گری۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ خنجر شورانی کے حلق پر نہیں چل گیا تھا۔ دائیں طرف گردن پر معمولی سا کٹ لگا تھا اور وہ بُری طرح چیخ اٹھی تھی۔ گانگ نے اسے اپنے اوپر سے ایک طرف اچھال دیا اور خود بھی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شورانی زمین پر پڑی چیختی رہی۔

"گانگ!" میں ایک بار پھر چیخا "اسے چھوڑ دو اور تم ان تینوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

اس مرتبہ گانگ نے میری بات نہیں ٹالی۔ وہ ٹک ٹک کی طرف لپکا۔ جانگی اور نوبتا پہلے ہی سیٹ پر پرساد کے ساتھ بیٹھ چکی تھیں۔ جانگی نے پرساد کو اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔ گانگ نے ٹک ٹک اسٹارٹ کیا اور دوسرے ہی لمحے ٹک ٹک شور مچاتا ہوا تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گیا۔

دارا شاید ہمت ہار بیٹھا تھا۔ وہ اب صرف اپنا دفاع کر رہا تھا لیکن بالآخر اس نے اپنی بھلائی اسی میں سمجھی کہ اپنی کھال بچالے اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے گلی میں ایک طرف دوڑ لگا دی۔

میں بھی اب اس پوزیشن میں نہیں رہا تھا کہ زیادہ دیر تک پیڈرو جیسے مارشل آرٹسٹ کا مقابلہ کرسکوں۔ وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا اور حربی فن کا ماہر بھی۔ وہ صرف موئے تھائی ہی نہیں مارشل آرٹس کے اور بھی بہت سے اسٹائل جانتا تھا اور وہ میرے خلاف ہر حربہ استعمال کرتا رہا تھا۔ یہ میری ذہانت اور ہمت تھی کہ میں اب تک نہ صرف اپنا دفاع کرتا رہا تھا بلکہ اس پر کئی کارگر حملے بھی کیے تھے لیکن میں سمجھتا تھا کہ اب وہ مجھ پر حاوی ہو رہا تھا۔

دارا جیسے ہی وہاں سے بھاگا' سکھدر ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت پیڈرو مجھ پر حملہ کرنے کے لیے اچھلا تھا۔ وہ غالباً مجھے فلائنگ کک لگانا چاہتا تھا لیکن سکھدر پوری قوت سے ہوا میں اچھلا۔ اس کی فلائنگ کک پیڈرو کے پہلو میں لگی۔ وہ میری طرف آنے کے بجائے چیختا ہوا دوسری طرف گرا۔

"ٹل ماسٹر۔ بھاگو۔" سکھدر چیختا ہوا دارا کی کار کی طرف لپکا۔

کار کے آگے والے دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے اور میرے خیال میں اب وہاں سے نکل لینا ہی مناسب تھا۔ دارا تو بھاگ چکا تھا۔ پیڈرو سے لڑتے رہنا اپنی انرجی ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے بھی کار کی طرف دوڑ لگا دی۔

سکھدر انجن اسٹارٹ کرچکا تھا۔ میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہی دروازہ بند کردیا۔ سکھدر نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔ سڑک پر پڑی ہوئی شورانی ٹائر کے نیچے آتے آتے بچی تھی۔

پیڈرو اٹھ کر کار کے پیچھے دوڑا اور پھر اس نے بڑی پھرتی سے نیچے جھک کر سڑک پر پڑا ہوا پستول اٹھایا اور کار پر فائرنگ شروع کردی۔ ایک گولی ڈکی پر لگی اور دوسری گولی بائیں طرف کی بیک لائٹ پر۔ تیسری گولی کو کار تک پہنچنے کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ اسی

لیے سکندر نے کار کو بڑی تیزی سے بائیں طرف کو گلی میں موڑ دیا تھا۔

کار بڑی شاندار تھی اور اس کا انجن بھی بہترین حالت میں تھا۔ سکندر کار کو سوئے یودی سے نکال کر سوئے پھرامائے کی طرف لے آیا اور پھر مختلف گلیوں میں ہوتے ہوئے ہم نیو روڈ پر آ گئے۔ سکندر کا خیال تھا کہ ہمیں واٹ ٹریمٹ کی طرف نکل جانا چاہیے کیونکہ وہاں کا فاصلہ کم تھا لیکن میں نے اسے جانگی کے بنگلے کی طرف چلنے کی ہدایت کی کیونکہ گانگ وغیرہ وہیں گئے تھے۔

اس وقت تین بج رہے تھے۔ رات کا آخری پہر تھا۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ کسی سڑک پر اکا دکا گاڑی نظر آ جاتی تھی۔ سڑکیں خالی ہونے کی وجہ سے سکندر بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

دریا کا پل پار کر کے ہم کرونگ تھان بوری روڈ پر آ گئے لیکن اس سڑک پر تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرتے ہی میں چونک گیا۔ کچھ آگے سڑک کے کنارے پر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ تین پولیس والے سڑک پر کھڑے تھے۔ ایک نے ذرا آگے بڑھ کر کار کو رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سکندر کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

"پریشان مت ہو لسٹل ماسٹر۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ "ان لوگوں سے نمٹنا مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے۔"

اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور پھر کار ان پولیس والوں کے قریب رک گئی۔

"کیا بات ہے آفیسر۔ ہم سے کوئی غلطی ہو گئی؟" سکندر نے پوچھا۔

"لائسنس اور گاڑی کے پیپرز؟" پولیس آفیسر نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔

سکندر نے بڑے مطمئن انداز میں ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کا خانہ کھولا۔ خوش قسمتی سے اس میں کار کے کاغذات موجود تھے۔ سکندر نے بک نکال کر آفیسر کی طرف بڑھا دی۔ آفیسر نے بک کھول کر دیکھی اور پھر ڈرائیونگ لائسنس طلب کیا۔

"سوری آفیسر۔" سکندر نے جواب دیا "ایک ایمرجنسی میں گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ ڈرائیونگ لائسنس جیب میں رکھنا بھول گیا۔"

"تم دونوں نیچے آ جاؤ۔" پولیس آفیسر نے سکندر اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سکندر نے میری طرف دیکھ کر آنکھ کا گوشہ دبا دیا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر ہی تھا۔ دوسرا ہاتھ اس نے دروازے کے ہینڈل پر رکھ کر دروازہ کھولا اور پھر اسے اس زور سے جھٹکا دیا کہ دروازے کے ساتھ کھڑا ہوا پولیس آفیسر اپنے آپ کو نہ بچا سکا۔ دروازہ بڑے زور سے اس سے ٹکرایا تھا۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا اور پھر دوہرا ہو گیا۔ سکندر نے کلچ پلیٹ پر سے پیر ہٹا لیا۔ انجن گیئر میں تھا۔ کار ایک زور دار جھٹکے سے اچھل کر آگے بڑھی۔ سکندر نے ایکسی لیریٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا۔ کار بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح دوڑ رہی تھی۔

سکندر نے کار چاروئن تھورن روڈ پر موڑی۔ پولیس کی کار بھی ہمارے تعاقب میں اسی طرف مڑی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ پولیس کار سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ ایک گولی کار کی دائیں طرف والی بیک لائٹ پر لگی اور وہ بتی بھی ٹوٹ گئی۔ سکندر نے کار کو بڑی تیزی سے لات یا روڈ پر موڑ لیا۔ یہ سڑک سیدھی ناکسن اسٹیچو والے چوراہے اور اس کے ساتھ وانگ ونگ یائے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی گئی تھی۔

ناکسن اسٹیچو والے چوراہے اور اس کے قریب ریلوے اسٹیشن کے آس پاس پولیس کی کوئی نہ کوئی گاڑی ہر وقت موجود رہتی تھی اور ہمیں ڈر یہ تھا کہ اگر ہمارے تعاقب میں آنے والی کار کے ریڈیو ٹرانس میٹر پر ہمارے بارے میں رپورٹ نشر کر دی تو اس چوک یا ریلوے اسٹیشن کے آس پاس ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جائے گی جبکہ ہمیں پولیس کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیے تھا۔

کار ناکسن روڈ پار کرتی ہوئی ایک اور چھوٹی سڑک پر نکل آئی۔ یہ سڑک آگے جا کر ریلوے لائن سے گزرتی ہوئی دوسری طرف تھوریٹ تھائی روڈ سے جا ملتی تھی۔ سکندر نے کار ریلوے لائن کے قریب روک لی۔ پھاٹک بند تھا۔ شاید کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ ہم کار سے اتر کر ریلوے لائن کی طرف دوڑے اور پھاٹک سے گزر کر تھوریٹ تھائی روڈ پر آ گئے اور رکے بغیر دائیں طرف دوڑتے چلے گئے۔

ایک طویل چکر کاٹ کر ہم ناکسن اسٹیچو والے چوراہے پر پہنچ گئے۔ اس وقت پونے چار کا وقت تھا۔ ریلوے اسٹیشن قریب ہونے کی وجہ سے یہاں خاصی چہل پہل تھی۔ چند چھوٹے ریسٹورنٹ بھی کھلے ہوئے تھے۔ یہاں پولیس کی سرگرمی بھی دیکھنے میں آئی۔ ایک جگہ پر پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی چھتوں پر لگے ہوئے فلیشر جل بجھ رہے تھے۔ ان پولیس والوں کو یقیناً ہمارے بارے میں اطلاع مل چکی تھی اور شاید ہماری ہی تلاش ہو رہی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

آتش فشاں

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بناسکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں۔ بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

اس ٹمٹماتے چراغ کا احوال جو اچانک ہی آندھیوں کی زد پر آگیا تھا

یہ وہ علاقہ تھا جہاں چرسی موالی قسم کے لوگ بھرے رہتے تھے۔ ٹاکسن اسٹیچو والے چوک کے چبوترے پر بھی تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ نشے کے عادی بے گھر موالی دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے پر لدے ہوئے سو رہے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس وقت بھی کوئی نہ کوئی نشہ کرنے میں مصروف تھے۔

میں اور سکھدر چوراہا پار کرکے دوسری سڑک پر آگئے۔ وہاں ایک پولیس والا کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سرسری سے انداز میں ہماری طرف دیکھا اور پھر دائیں طرف سے آنے والی ایک سفید کار کی طرف متوجہ ہوگیا اور سڑک کے بیچ میں آکر کار کو رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ ہم دونوں قریب سے گزرتے ہوئے سڑک پار کرکے ایک سائڈ اسٹریٹ میں داخل ہوگئے اور پھر مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم اس گلی میں پہنچ گئے جہاں جانگی کا بنگلا تھا۔

گلی میں سناٹا تھا۔ ہمارے قدموں کی آواز بھی اس سناٹے میں دور تک گونج رہی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے چل رہے تھے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اب تک ایک دوسرے سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جانگی والے بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ بنگلے کے اندر روشنی تھی لیکن برآمدے والی بتی بجھی ہوئی تھی۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبا کر گیٹ کے اوپر سے اندر جھانکا تو مجھے تاریک برآمدے میں ایک ہیولا سا متحرک دکھائی دیا اور پھر وہ ہیولا برآمدے سے نکل کر تیزی سے گیٹ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے چال سے پہچان لیا۔ وہ تھائی وانگ تھی۔ گیٹ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہوگئے۔ تھائی نے گیٹ بند کردیا اور میرا بازو پکڑ لیا۔

"میں ٹھیک ہوں تھائی۔" میں نے سرگوشی کی اور اس کے ساتھ ہی میں نے تھائی کے منہ سے نکلنے والا گہرا سانس بھی سنا تھا۔

ہم اندر آگئے۔ گانگ اور نویتا ہال میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پرساد اور جانگی مجھے نظر نہیں آئے۔

"پرساد کہاں ہے؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"اس کمرے میں۔" گانگ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے اشارہ کیا۔

اور پھر وہ میرے ساتھ ہی اس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ پرساد بیڈ پر پڑا تھا۔ اس کے جسم پر لباس نام کی صرف ایک انڈرویئر تھی۔ اس کا برہنہ جسم دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ وہ کئی دن تک دارا اور پیڈرو جیسے دنیا کے سفاک ترین انسان نما بھیڑیوں کی قید میں رہا تھا۔ انہوں نے اسے مہمان بنا کر نہیں رکھا تھا۔ میرے بارے میں پوچھنے کے لیے اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں بتا دیتا تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی لیکن تشدد کے یہ نشان ظاہر کرتے تھے کہ اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کے پیٹ، سینے اور بازوؤں پر جلنے کے بے شمار نشان تھے۔ لگتا تھا جیسے

دہکتی ہوئی سلاخ سے اس کے جسم کو داغا گیا ہو۔ اس کا پیر بھی خطرناک حد تک سوجا ہوا تھا۔

پرساد ہوش میں تھا اور جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ آگئی۔ میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر آگے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کردیا۔

"میں تمہارا انتقام لوں گا پرساد۔" میں نے سرگوشی کی "جس نے بھی تمہیں اس حالت کو پہنچایا ہے اس کے جسم پر اتنے نشانات لگاؤں گا کہ گنے بھی نہیں جاسکیں گے۔ مجھے بتاؤ کون تھا وہ.... دارا یا....؟" میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"پیڈرو۔" پرساد نے کمزور سی آواز میں جواب دیا "اس کا خیال ہے کہ ہم دونوں نے مل کر ٹائیگر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں مجھ سے پوچھتا رہا اور الیکٹرک سولڈرنگ آئرن (کاویہ) سے میرے جسم کو داغتا رہا لیکن میری زبان کھلوانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔"

"پیڈرو...." میرے حلق سے غرّاہٹ سی نکلی "کاش! میں اسے زندہ نہ چھوڑتا۔"

"پیڈرو سے یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات نہیں تھی۔" میرے قریب کھڑے ہوئے گانگ نے کہا "بہت جلد ہمارا اور اس کا پھر آمنا سامنا ہوگا اور اس مرتبہ وہ زندہ بچ کر نہیں جائے گا۔"

"ابھی نہیں۔" پرساد نے کہا "مجھے ٹھیک ہوجانے دو۔ اپنا انتقام میں اس سے خود لوں گا۔"

پرساد کی اس بات پر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا تھا۔

"گانگ۔" قریب کھڑی ہوئی جانکی نے کہا "اب تم جاؤ۔ تمہیں واپسی میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔"

"کہاں جارہا ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے کچھ دوائیں لکھ کر دی ہیں۔" جانکی نے کہا "یوں تو یہ دوائیں کسی بھی اسپتال سے مل سکتی ہیں لیکن اس وقت اسپتال والے کسی قسم کا شبہ کرسکتے ہیں۔ مشن اسپتال کا ڈرگ اسٹور میری ایک دوست کی ملکیت ہے۔ وہاں اس سے کوئی بازپرس نہیں کی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔" گانگ کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ جانکی بتا رہی تھی کہ یہاں آکر جب اس نے پرساد کو بیڈ پر لٹایا تو اس کی قمیص کے کھلے ہوئے گریبان سے اس کے سینے پر داغے جانے کے ایک دو نشان دیکھ کر جب اس نے قمیص ہٹائی تو سینے اور پیٹ پر ایسے بے شمار داغ نظر آئے۔ اس نے قمیص اتار دی اور پھر انکشاف ہوا کہ پورا جسم اسی طرح داغا گیا تھا۔ جانکی کے خیال میں زخم زیادہ گہرے نہیں تھے لیکن انہیں ٹھیک ہونے میں چند روز تو ضرور لگتے۔

"اس کے پیر کا کیا ہوگا۔ یہ تو بہت زیادہ سوج گیا ہے۔" میں نے پرساد کے پھولے ہوئے پیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھائی وانگ بہت تجربہ کار مساجر ہے۔" جانکی نے کہا "وہ صبح اس کے پیر کا علاج بھی شروع کردے گی۔"

میں کچھ دیر وہاں کھڑا پرساد سے باتیں کرتا رہا اور پھر کمرے سے باہر آگیا۔ نویتا اسی طرح صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور سکھدر سامنے والے صوفے پر بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔

سکھدر جب مہاراج کے حکم پر یہاں آیا تھا تو میں نے اسی روز محسوس کرلیا تھا کہ وہ تھائی کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا تھا اور اب وہ نویتا کو بھی ایسی ہی کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سکھدر پر اور معاملات میں تو اعتماد کیا جاسکتا تھا مگر عورت کے معاملے میں وہ بھروسے کے قابل نہیں تھا۔

تھائی وانگ کچن میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ٹرے میں کافی کے مگ اٹھائے ہوئے لے آئی۔ اس نے ایک ایک مگ ہم تینوں کو دیا۔ اپنا مگ سینٹر ٹیبل پر رکھا اور دو مگ لے کر پرساد والے کمرے میں چلی گئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہ جانکی کے ساتھ واپس آگئی۔ ایک مگ جانکی کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ٹرے میں رکھا ہوا تھا۔

"پرساد سوگیا ہے۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ شاید تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر اسے تسلی ہوگئی اور وہ سوگیا۔"

وہ دونوں بھی ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تھائی کو ابھی تک انہوں نے شاید کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ منتظر تھی کہ میں اس واقعے کی تفصیل بتاؤں۔ میں نے اسے زیادہ انتظار کرانا مناسب نہیں سمجھا اور اسے سارے واقعات تفصیل سے بتانے لگا۔

"اگر مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ پیڈرو نے پرساد کی یہ حالت کی ہے تو میں اسے کبھی بھی زندہ نہ چھوڑتا۔" میں نے آخر میں کہا "لیکن بہرحال' اب سب سے پہلے اسی سے نمٹنا ہے۔ جب تک اس سے پرساد پر تشدد کا بدلہ نہیں لے لوں گا کسی اور کام پر توجہ نہیں دوں گا۔"

جانکی اور نویتا خاموش بیٹھی ہوئی تھیں اور میں دیکھ رہا تھا کہ سکھدر گھورتی ہوئی نظروں سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی ختم کرچکا تو میں نے اسے حکم دیا کہ وہ برآمدے کے ساتھ دائیں طرف والے کمرے میں جا کر بیٹھ جائے۔ اس کمرے کا

ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا اور وہاں سے گیٹ پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ سکھدر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

"نویتا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ایک خوفناک تجربے سے گزری ہو۔ جاؤ۔ تم اپنے کمرے میں جاکر سوجاؤ۔"

"جاتی ہوں۔" نویتا نے کہا "لیکن وہ پرساد...."

"وہ ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "گانگ تھوڑی دیر میں آجائے ہوگا۔ اس کے زخموں پر دوا لگا دی جائے گی تو وہ دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہوجائے گا۔"

مجھے نویتا کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب فیملی ممبروں کی طرح تھے۔ دلوں میں ایک دوسرے سے لگاؤ تھا لیکن نویتا کی یہ حالت دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان دونوں میں کوئی جذباتی لگاؤ بھی پیدا ہوچکا تھا۔ وہ کئی روز سے اکٹھے گھوم پھر رہے تھے۔ اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ تو برآمد ہونا ہی تھا۔

پانچ بجے کے قریب گانگ ڈاکٹر جانکی کی لکھی ہوئی دوائیں لے کر آگیا۔ دواؤں کے ساتھ وہ ایک خبر یہ بھی لایا تھا کہ اب پورے شہر میں ہماری تلاش ہو رہی تھی۔ گاڑیوں کو روک کر چیک کیا جارہا تھا۔ پولیس نے صرف مجھے اور سکھ... کو دیکھا تھا۔ میرا اور سکھدر کا حلیہ ریڈیو ٹرانس میٹر کے ذریعے نشر کردیا گیا تھا اور شہر بھر کی پولیس ہمیں تلاش کر رہی تھی۔

میں پولیس سے کسی قسم کا پنگا نہیں لینا چاہتا تھا لیکن یہ اتفاق تھا کہ ہم پولیس کی نظروں میں آگئے تھے۔ اس پر پولیس آفیسر کو ہم پر شبہ غالباً گاڑی کے کاغذات کی وجہ سے ہوا تھا اور پھر سکھدر کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں تھا۔ اگر ہم گاڑی سے اتر جاتے تو شاید سکھدر کسی طرح معاملات پٹا لیتا لیکن یہ امکان بھی تھا کہ پولیس آفیسر کی جرح سے معاملہ کچھ اور گمبھیر ہوجاتا اور ہم پھنس جاتے۔ بہرحال اب جو صورتِ حال تھی وہ کوئی زیادہ قابلِ تعریف نہیں تھی۔ اب ہمیں پولیس سے بھی بچنا تھا۔

جانکی' گانگ کے ساتھ پرساد والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ نویتا بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ تھائی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ پیڈرو سے لڑائی کے دوران میں' میں زمین پر بھی لوٹا تھا۔ کپڑے گرد آلود تھے اور بال بھی الجھے ہوئے تھے۔ تھائی حسب معمول مجھے ٹٹول کر دیکھنے لگی کہ کوئی ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی۔ اس نے جیسے ہی میرے بائیں بازو پر ہاتھ رکھا' میرے منہ سے سسکاری نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" تھائی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"پیڈرو کی کک لگی تھی۔ معمولی سی تکلیف ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"معمولی سی تکلیف ہوتی تو تم اس طرح نہ کراہتے۔" تھائی

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

احساس کمتری

اسباب تدارک علاج

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ

- احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
- کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔

قیمت 25 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

نے مجھے گھورا "اٹھو۔ چلو میرے ساتھ۔"

اس نے مجھے دوسرے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے آئی اور میری قمیص اتار دی۔ سب سے پہلے اس نے میرے بازو کا معائنہ کیا۔ بازو سوج گیا تھا۔ وہ اسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ اس کے انگوٹھے کے دباؤ سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی اور میرے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں نکل رہی تھیں۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا اور باقی جسم کا معائنہ کرنے لگی۔ وہ جسم کے ہر حصے کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔

"یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے بازو پر کریم مَل دوں۔" اس نے مجھے پکڑ کر بیڈ کی پٹی پر بٹھا دیا اور الماری میں سے کریم کی ڈبیا نکال لائی۔

وہ مٹیالے رنگ کی کریم میرے مجروح بازو پر مَلنے لگی۔ اس نے اگرچہ ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا مگر میرے منہ سے سسکاریاں نکل رہی تھیں۔

"اندر سے گوشت پھٹ گیا ہے۔ اب تمہیں دو چار روز اس بازو کو آرام دینا ہوگا۔" تھائی نے کریم کی ڈبیا بند کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ ہاتھ دھونے کے لیے باتھ روم میں چلی گئی۔

میں قمیص پہنے بغیر بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ اب مجھے بازو میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکا سا درد تھا جو بے چین کیے ہوئے تھا۔ تھائی باتھ روم سے نکلی تو اس نے چادر میرے اوپر ڈال دی اور اس بازو کو ڈھکے رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں آنکھ بند کیے صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ ایک رات میں دو معرکے ہوئے تھے اور دونوں مرتبہ میں موت کے جبڑوں سے نکلا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں دونوں مرتبہ بالادست ہی رہا تھا۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ سے فرار کے بعد دریا کے کنارے چی فانگ سے ہونے والی جھڑپ میں بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ خبر یہ تھی کہ میں نے چی فانگ کی کوئی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ اسپتال میں پڑا تھا۔

دوسری جھڑپ دارا اور پیڈرو سے ہوئی تھی۔ دارا بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھاگ نکلا تھا۔ شاید میں پہلے بھی کسی موقع پر اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں کہ دارا جیسے یہ بدمعاشوں کی اصل قوت ان کے گرگوں میں ہوتی ہے۔ وہ خود لڑنے کے بجائے اپنے مہروں سے کام لیتے ہیں اور جب خود دشمنوں میں گھر جاتے ہیں تو فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ ون ٹو ون مقابلے میں اگر حریف حاوی ہو جائے تو بھی مقابلہ کرنے کے بجائے دُم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تیسرا موقع تھا کہ میں نے دارا کو اس طرح راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ البتہ پیڈرو دلیر آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے آخر تک مقابلہ کیا تھا۔ اگر میں اور سکھدر وہاں سے راہِ فرار اختیار نہ کرتے تو پیڈرو زندگی کے آخری لمحوں تک مقابلہ جاری رکھتا۔ وہ یا تو مجھے ختم کر دیتا یا خود ختم ہو جاتا۔ اس کے لڑنے کے انداز سے بھی مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کسی موقع پر بھی میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں تھا اور میں نے یہ بات بھی محسوس کر لی تھی کہ میں زیادہ دیر تک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس کا گیم (مارشل آرٹ) مجھ سے بہت زیادہ سپیریئر تھا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے ابھی کچھ اور پریکٹس کی ضرورت تھی لیکن میرے پاس پریکٹس کے لیے وقت نہیں تھا۔ مجھے تو جلد سے جلد انتقام لینا تھا۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ تھائی کمرے میں نہیں تھی۔ میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ تھائی اور جانگی دیوی ہال میں صوفوں پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھیں۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا راہداری میں آ گیا۔ پرساد والے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ نویتا کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی۔ اس کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ پرساد جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔ میں بیڈ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا پھر نویتا کی طرف دیکھتا ہوا باہر آ گیا۔ پہلے تو میں نے یہ سوچا تھا کہ اسے اٹھا کر دوسرے کمرے میں بھیج دوں تاکہ وہ بستر پر آرام سے سو جائے لیکن اس طرح اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی اس لیے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر باہر آ گیا۔

میرا بایاں بازو اکڑا ہوا تھا۔ ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا تھا لیکن بہرحال یہ تکلیف تو مجھے برداشت کرنی تھی۔ میں اس وقت چائے یا کافی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ تھائی کو یا جانگی کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور کچن میں آ کر میں خود ہی کافی بنانے لگا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ کافی کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی مجھے یوں لگا جیسے آنتوں میں لاوا انڈیل دیا گیا ہو۔ خالی پیٹ بلیک کافی نے میری آنتوں میں انگارے سے بھر دیے تھے۔ میں ابھی کافی پی رہا تھا کہ تھائی کمرے میں داخل ہوئی۔ مجھے کافی پیتے دیکھ کر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"بڑے خود غرض ہو تم؟" اس نے مجھے گھورا "اکیلے ہی اکیلے کافی اڑا رہے ہو۔"

"تم لوگ تو سو رہے تھے۔" میں نے جواب دیا "بہرحال' آج میں تم لوگوں کو کافی بنا کر پلاؤں گا۔"

تھائی نے میرے ہاتھ سے مگ لے لیا۔ چند گھونٹ بھرے اور مگ میری طرف بڑھا دیا۔

"تم تو کافی بھی بہت مزے کی بنا لیتے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ بنائی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب تم جا کر کچن سنبھالو۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" تھائی یہ کہتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔

میں کچن میں آ گیا اور الیکٹرک ہیٹر پر کافی کے لیے پانی چڑھا کر

اپنے مگ سے کافی کی چسکیاں بھی لیتا رہا۔

جانگی اور نویتا بھی اٹھ گئی تھیں۔ میں نے سب کے لیے کافی بنالی تھی۔ سکھدر بھی اندر آ گیا تھا۔ نویتا دو مگ لے کر پرساد والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ ہم ہال میں بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے گزشتہ رات کے واقعات پر تبصرے کرنے لگے۔ جانگی اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔

چار بجے کے قریب دوپہر کا کھانا کھایا گیا اور پھر تھائی اپنا سامان لے کر پرساد کے کمرے میں آ گئی۔ پرساد کا رنگ فق ہو گیا۔ تھائی نے اس کے پیر کو ہاتھ لگایا تو وہ سسک کر اٹھ بیٹھا۔ تھائی نے پروا کیے بغیر اس کے پیر کو ہلا جلا کر دیکھا۔

"ٹخنے کا جوڑ محفوظ ہے۔" وہ بولی "دو چار دن ہلکی مالش سے یہ سوجن ختم ہو جائے گی۔" اور پھر واقعی اس نے مالش کرتے ہوئے ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا۔

ہم پھر ہال میں آ گئے۔ فی الحال ہمارے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت صورتِ حال ایسی نہیں تھی کہ ہم پہلے کی طرح نائٹ کلبوں یا ریستورانوں میں گھوم پھر سکیں۔ میرے تمام ساتھی دشمنوں کی نظروں میں آ چکے تھے۔ نویتا' ڈاکٹر جانگی اور گانگ۔ پرساد ویسے ہی اس قابل نہیں تھا کہ چند روز تک بستر سے اٹھ سکے۔

مجھے زیادہ افسوس اس بات کا بھی تھا کہ نویتا اور ڈاکٹر جانگی دشمنوں کی نظروں میں آ گئی تھیں۔ گزشتہ رات ان دونوں کو بڑی خوب صورتی سے جال میں پھانسنے کی کوشش کی گئی تھی اور اگر عین وقت پر دارا کو چی فانگ کے میرے ہاتھوں زخمی ہونے کی اطلاع نہ ملتی تو گزشتہ رات ان کے ساتھ نہ صرف "ڈراما" ہو چکا ہوتا بلکہ میرے بارے میں پوچھنے کے لیے انہیں تشدد کا نشانہ بھی بنایا جاتا۔

بنکاک میں شانگ کی موجودگی نے بھی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پہلی مرتبہ کوسا روڈ والے بنگلے میں زخمی ہونے کے بعد وہ چیانگ رائے بھاگ گیا تھا۔ اس کے دوبارہ بنکاک آنے کا مطلب یہ تھا کہ ان میں ابھی تک کوئی ڈیل چل رہی تھی اور ظاہر ہے یہ ڈیل ہیروئن کے حوالے سے ہی ہو سکتی تھی۔ گزشتہ رات جب ہم پرساد کو چھڑانے کے لیے اس بنگلے پر پہنچے تھے تو شانگ نویتا کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا اور میں نے اسے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ شانگ اور اس کے دوسرے ساتھی کو جسے ہم نے باندھ دیا تھا' پیڈرو ہی نے نجات دلائی ہوگی کیونکہ دارا تو وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ دارا کہاں گیا تھا لیکن فی الحال میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ معلوم کر سکوں' دارا اور پیڈرو کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے۔ ماسٹر کے آدمیوں کو اب میں زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور نام ابھرا۔ پاتھم۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے پرساد کی دوستی کا دعویٰ کرتے ہوئے رات کو پیراڈائز ریسٹورنٹ سے فرار ہونے میں ہماری مدد کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ پاتھم نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔ وہ کارڈ میں نے جینز کی پچھلی جیب میں رکھا تھا اور اس وقت وہ جینز میرے جسم پر نہیں تھی۔ میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ پتلون دروازے کے پیچھے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

پتلون کی جیب میں کچھ کرنسی نوٹوں کے ساتھ پاتھم کا وہ کارڈ بھی موجود تھا۔ میں کارڈ لے کر پرساد والے کمرے میں آ گیا۔ نویتا اور جانگی بھی وہاں موجود تھیں۔

"تم پاتھم نام کے کسی آدمی کو جانتے ہو؟" میں نے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے پرساد کی طرف دیکھا۔

"پاتھم....!" پرساد کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

"تم اسے کیسے جانتے ہو باس؟"

"میری بات کا جواب دو۔" میں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اس سے تمہاری دوستی کب سے ہے اور وہ کیسا آدمی ہے؟"

"وہ ہیرو ہے باس' ہیرو۔" پرساد نے جواب دیا "پتایا میں ہم دونوں نے ایک ہی استاد سے موٹر مکینک کا کام سیکھا تھا۔ میں تو بیچ میں بھاگ گیا تھا لیکن اس نے اپنا کام جاری رکھا۔ ایک سال کے بعد جب میں دوبارہ استاد کے پاس گیا تو پتا چلا کہ پاتھم بنکاک جا چکا ہے۔ جب میں کام کی تلاش کے سلسلے میں یہاں آیا تھا تو اسے بھی تلاش کرتا رہا تھا لیکن اس کا پتا نہیں چلا اور پھر چند روز پہلے اتفاقاً اس سے سوکھم وٹ روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں ملاقات ہو گئی تھی۔ سوکھم وٹ روڈ ایک ایسا علاقہ ہے جہاں باہر سے آنے والے ہر شخص سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ اس وقت نویتا بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے باس۔ دوستی کے لیے اپنی جان دے دینے والا۔ اس کے بعد بھی ایک دو مرتبہ ہماری ملاقات ہوئی تھی لیکن تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"کل رات اگر وہ پیراڈائز ریسٹورنٹ میں موجود نہ ہوتا تو شاید میں اور تھائی وہاں سے زندہ نہ نکل سکتے۔ دریا کے راستے ریسٹورنٹ سے فرار ہونے میں اس نے ہماری مدد کی تھی۔" میں نے کہا اور پھر اسے اس سارے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"وہ یاروں کا یار ہے باس۔" پرساد نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ میں نہیں تھا تو میرا دوست پاتھم تمہارے کام آ گیا۔"

"ہاں۔ میں واقعی اس کا بہت شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن کیا اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"بھروسا!" پرساد نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم جانتے ہو باس کہ پیڈرو نے تمہارے لیے دو ملین بھات کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ پاتھم تمہیں اور تھائی کو پہچان چکا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو بڑے اطمینان سے تم دونوں کو اس کے حوالے کر کے انعام کی خطیر رقم حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے دولت پر دوستی کو ترجیح دی۔

اس نے میری دوستی کا حق ادا کیا اور تمہیں نہ صرف خطرے سے آگاہ کیا بلکہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر تم دونوں کو وہاں سے نکلنے میں مدد بھی دی۔"

"اس کا مطلب ہے اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل باس۔" پرساد بولا "میں نے تو سوچا تھا کہ کسی دن تم سے اس کا ذکر کروں گا لیکن بیچ میں معاملہ گڑبڑ ہوگیا۔ مجھے ٹھیک ہولینے دو۔ میں اسے تمہارے پاس لے کر آؤں گا۔"

"تمہارے ٹھیک ہونے میں ابھی کئی روز لگیں گے اور میں اتنا طویل انتظار نہیں کرسکتا۔ تم ابھی اس سے بات کرو۔" میں نے کہا۔

"ابھی!" پرساد نے حیرت سے میری طرف دیکھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے باس؟"

"میرے پاس اس کا فون نمبر ہے۔" میں نے اسے پاتھم کا کارڈ دکھایا "یہ کارڈ اس نے کل رات مجھے دیا تھا۔ میں ابھی نمبر ملاتا ہوں۔" میں نے نویتا کو اشارہ کیا۔ وہ ہال سے ٹیلی فون اٹھا لائی۔ اس نے پلگ دیوار میں لگے ہوئے ساکٹ میں لگا کر فون میرے سامنے بیڈ پر رکھ دیا۔

میں نے ریسیور اٹھالیا اور کارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے نمبر ملانے لگا۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے اور میرے خیال میں پاتھم کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ جیسے ہی ریسیور پر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی، میں نے ریسیور پرساد کی طرف بڑھا دیا۔

دوسری طرف سے کال ریسیو ہونے پر اس نے ایک منٹ کسی سے بات کی اور پھر خاموش ہوگیا۔ یہ خاموشی بھی ایک منٹ سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے کال شاید کسی اور نے ریسیو کی تھی اور اب وہ پاتھم سے بات کررہا تھا۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا "گزشتہ رات تم نے باس اور اس کی دوست کی مدد کرکے ان پر نہیں مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر تمہارے اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کروں گا۔ ہاں ہاں... نہیں۔ گزشتہ رات ہی باس مجھے ان کی قید سے چھڑا لایا تھا۔ ہاں ہاں.... باس بھی تم سے ملنا چاہتا ہے۔ ایک منٹ ہولڈ رکھو۔" اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ملاقات کہاں ہوگی باس؟"

"اسے یہیں بلالو۔ پتا سمجھا دو اسے۔" میں نے کہا "اس سے یہ بھی پوچھ لو کہ وہ کس وقت یہاں پہنچے گا۔"

پرساد نے ماؤتھ پیس پر سے ہاتھ ہٹالیا اور پاتھم سے بات کرنے لگا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ ساڑھے نو بجے تک یہاں پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں یہ کہہ کر کمرے سے باہر آگیا۔

اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ میں اپنے کمرے میں آگیا اور بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ میری وجہ سے کتنے لوگ اس خونیں کھیل میں INVOLVE ہوچکے تھے۔ بنیادی طور پر ان میں سے کسی کا بھی اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے پناہ تو مہاراج نے دی تھی۔ اس نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکوں۔ یہ لوگ تو محض ہمدردی اور سچائی کی خاطر میرا ساتھ دے رہے تھے اور انہوں نے اپنا سب کچھ برباد کرلیا تھا۔ نویتا اور ڈاکٹر جانکی بھی دشمنوں کی نظروں میں آچکی تھیں۔ جانکی کو انہوں نے ابھی صرف چہرے سے ہی پہچانا تھا کہ وہ میرا ساتھ دے رہی ہے لیکن جب انہیں پتا چلے گا کہ وہ کون ہے تو وہ اسے بھی ہر ممکن طریقے سے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے جیسے انہوں نے تھائی کا بنگلا جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔

اور اب پاتھم.... پرساد کا دوست.... جو ایک مکینک تھا اور شاید ایک ورکشاپ کا مالک بھی۔ میں نے وہ ورکشاپ نہیں دیکھا تھا لیکن گزشتہ رات پاتھم کو پیراڈائز میں دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے اس ورکشاپ سے نہایت معقول آمدنی ہوتی ہوگی۔ پیراڈائز جیسی جگہوں پر صرف وہی لوگ جاسکتے ہیں جن کی آمدنی معقول بلکہ نہایت معقول ہو۔ پاتھم میرا ساتھ دینے پر آمادہ تھا۔ اگر پیڈرو یا دارا کو اس کے بارے میں پتا چل گیا تو... میں اس سے آگے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے پہلے گلی میں کسی گاڑی کے رکنے کی اور پھر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں برآمدے میں آگیا۔ سکھدر نے جاکر گیٹ کھولا۔ ہم اسے پاتھم کے بارے میں بتانا بھول گئے تھے۔ پاتھم شاید اس سے پرساد کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور سکھدر بڑے کرخت لہجے میں بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی پرساد نہیں رہتا۔

پاتھم نے گیٹ کے اوپر سے مجھے برآمدے میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لی اور سکھدر کو آواز دے کر کہا کہ وہ اسے اندر لے آئے۔

تین منٹ بعد پاتھم ہمارے ساتھ پرساد والے کمرے میں موجود تھا۔ پرساد کی حالت دیکھ کر وہ اس قدر جذباتی ہوگیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر اسی وقت انکشاف ہوا کہ وہ دونوں آپس میں دور کے رشتے دار بھی تھے۔

"تم نے پرساد کو ان درندوں سے بچا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے باس۔" پاتھم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نے مجھے بے مول خرید لیا ہے۔ پرساد نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید اب میں پرساد کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گا لیکن....."

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا پاتھم۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "پرساد میرا دوست ہے۔ میں نے تو صرف دوستی کا رشتہ نبھایا ہے۔ پرساد نے کئی مرتبہ اپنی جان کی بازی لگا کر میری جان بچائی تھی۔ اس مرتبہ میں اور میرے یہ دوست اس کے کام

آگئے۔"

پاتھم دیر تک کچھ نہیں بول سکا۔ وہ باری باری سب کی طرف دیکھتا رہا۔ نویتا کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ نویتا کو کئی مرتبہ پرساد کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔

پاتھم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ بھی پرساد کی طرح وفادار اور جان کی بازی لگا دینے والا ہے۔ اس کی ایک مثال میں گزشتہ رات بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے اور تھائی کو وہاں سے بھاگنے میں مدد دی تھی۔ اگر وہ پکڑا جاتا یا گزشتہ رات دشمنوں کی نظروں میں آچکا ہوتا تو اب تک شاید وہ زندہ نہ ہوتا۔

"مجھے بتاؤ باس۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے کیا کرنا ہے۔ تم مجھے حکم دو تو میں پیڈرو کے تمام اڈوں کو آگ لگا کر راکھ کر ڈالوں۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے کہا "ابھی تمہیں پیڈرو کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں۔ یہ سوچنا ہے کہ اسے کس طرح گھیرا جاسکتا ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دارا تو حسبِ معمول دو چار روز غائب رہے گا لیکن ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دارا اور شانگ کے درمیان کس قسم کی ڈیل ہوئی ہے یا ہونے والی ہے۔ میں تمہیں یہ بتادوں کہ دارا، چی فانگ اور کم کے ساتھ مل کر منشیات کی اسمگلنگ کا سینڈیکیٹ قائم کرنا چاہتا تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ میرا باپ اس کے راستے کی رکاوٹ بنے گا۔ اس نے میرے باپ اور میری ماں کو قتل کردیا اور اب میں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ دارا کو اس کے اس گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے سنگاپور میں اس کے سینڈیکیٹ کو ابتدائی مرحلے میں ہی اکھاڑ پھینکا تھا۔ یہ درست ہے کہ ہم دو چار آدمی پوری دنیا سے اس برائی کو ختم نہیں کرسکتے لیکن اسے ختم کرنے میں اپنا کردار تو ادا کرسکتے ہیں۔ یہ تھائی وانگ۔" میں نے تھائی کی طرف اشارہ کیا "میرا ساتھ دینے کے چکر میں اپنا سب کچھ تباہ کرچکی ہے۔ اس کے بنگلے کو جلا کر راکھ کردیا گیا۔ یہ جانکی دیوی ایک معزز پیشے سے وابستہ ہے۔ اس نے اپنے آپ کو داؤ پر لگا رکھا ہے اور یہ نویتا۔ اسے مجھ سے کیا لالچ ہوسکتا ہے۔ یہ اگر چاہتی تو پہلے ہی روز چیانگ رائے واپس چلی جاتی اور اطمینان اور سکون کی زندگی گزارتی لیکن اب یہ بھی چاروں طرف سے خطرات میں گھر چکی ہے۔ ان سب کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی ہیں لیکن یہ لوگ خوف زدہ نہیں ہیں۔ پرساد کی حالت تم دیکھ رہے ہو۔ یہ سب کچھ کس لیے ہوا۔ تائیگر دارا یا پیڈرو سے تو اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ یہ میری وجہ سے اس معاملے میں کودا اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اپنا یہ حشر ہونے کے بعد تو اسے چاہیے تھا کہ میری طرف سے منہ پھیر لیتا اور کہیں اور جاکر محفوظ زندگی گزارتا لیکن اس کے ارادے اب بھی وہی ہیں جو پہلے روز تھے۔ میں یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ میرا ساتھ دوگے تو تمہارے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ میں تمہیں سوچنے کا موقع دینا چاہتا ہوں۔" میں خاموش ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"سوچنے کا موقع تو نکل چکا۔" پاتھم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر کوئی سوچنے والی بات ہوتی تو کل رات تمہیں چی فانگ کے خطرے سے آگاہ نہ کرتا اور تم دونوں کو وہاں سے نکلنے میں مدد نہ دیتا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "اب تم بتاؤ۔ تمہارے خیال میں پیڈرو کو کیسے گھیرا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلے میں پیڈرو سے اس لیے بھی نمٹنا چاہتا ہوں کہ اس طرح دارا کا زور ٹوٹ جائے گا۔"

"پیڈرو کو گھیرنے کا ایک بہت آسان طریقہ ہے۔" پاتھم نے کہا "اس کی ایک محبوبہ ہے۔ لی وان۔ بہت حسین، بڑے غضب کی چیز ہے۔ اگر اسے اپنے قابو میں کرلیا جائے تو پیڈرو بلا چون وچرا ہتھیار ڈال دے گا۔"

"نہیں۔" میں نے فوراً ہی انکار کردیا "اس میں شبہ نہیں کہ وہ لوگ ایسی حرکتیں کرچکے ہیں لیکن میں ان تک پہنچنے کے لیے کسی عورت پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تمہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ پیڈرو کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھو۔ اس کے معمولات کو چیک کرو اور یہ پتا چلاؤ کہ وہ اپنا زیادہ وقت کہاں گزارتا ہے۔ اس کے بعد ہم کوئی کارروائی کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" پاتھم نے کہا "میں یہ کام آج ہی سے شروع کردیتا ہوں۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ یہاں سے بہت قریب ہے۔ میں سیدھا وہیں جاؤں گا اور اگر پیڈرو وہاں نہ ہوا تو یہ پتا چل جائے گا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔"

"یہاں کا فون نمبر ذہن نشین کرلو۔ کوئی غیر معمولی بات ہو تو فوراً اطلاع دے دینا۔ ایک بات اور....." میں نے کہا "مجھے ایک گاڑی بھی چاہیے۔"

"گاڑی مل جائے گی۔ باہر کھڑی ہے۔" پاتھم نے جواب دیا "یہ گاڑی دراصل ایک کمپنی کی تھی جو ایک حادثے کے بعد میرے ورکشاپ پہنچ گئی۔ لمبا خرچا تھا۔ گاڑی کئی مہینوں سے میرے ورکشاپ میں کھڑی رہی۔ اس دوران میں وہ کمپنی بھی ختم ہوگئی۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اس گاڑی کو ٹھیک کرلیا۔ اس کا رجسٹریشن اب بھی اس کمپنی ہی کے نام پر ہے۔ تم لوگ اسے آزادی سے استعمال کرسکتے ہو۔ یہ چابی سنبھال لو۔ میں یہ گاڑی یہیں چھوڑ جاؤں گا۔" اس نے جیب سے ایک کی رِنگ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس میں تین چابیاں تھیں۔ ایک اگنیشن کی، ایک دروازے کی اور ایک ڈکی کی۔

ساڑھے دس بجے کے قریب پاتھم چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد

میں نے محسوس کیا کہ پرسا پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ جانکی نے اسے پینے کی جو دوا دی تھی' اس میں نیند کا بھی اثر تھا اور وہ دوا پینے کے بعد سو جایا کرتا تھا۔ ہم اس کے کمرے سے اٹھ کر ہال میں آ گئے۔ ابھی وہاں بیٹھے ہوئے دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تھائی وانگ نے ریسیور اٹھالیا۔ کچھ دیر وہ "لیس لیس" کرتی رہی پھر ایک دم اچھل پڑی۔

"کیا....؟" اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے مخاطب کی بات کا یقین نہ آیا ہو "یہ کب کی بات ہے۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟" وہ کچھ دیر ریسیور سے کان لگائے رہی پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا "گانگ کے پاس ایک دلچسپ اطلاع ہے۔"

"لیس گانگ۔" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ایک اہم اطلاع ہے باس۔" گانگ نے کہا "آج شام چھ بجے کے قریب شورانی نے دارا پر قاتلانہ حملہ کرکے اسے شدید زخمی کردیا ہے۔ دارا روپوش ہوگیا ہے اور شورانی کو پولیس نے حراست میں لے لیا ہے۔"

"کیا تم اس واقعے کی تفصیل بتانا پسند کروگے گانگ؟" میں نے کہا۔

"دارا کل رات تمہارے ساتھ ہونے والی جھڑپ میں فرار ہونے کے بعد علی بابا پہنچ گیا تھا۔ یہ بہت بڑا انڈین ریسٹورنٹ ہے اور یہاں خاص خاص لوگوں کے لیے رہائش کا بندوبست ہے۔ اس ریسٹورنٹ کی مالک سیتا نام کی ایک ہندو عورت ہے۔ اس نے بنکاک' پتایا اور پیانگ رائے میں بھی اس نام سے ریسٹورنٹ کھول رکھے ہیں۔ ان ریستورانوں میں غیر ملکی مہمانوں کو ہندوستانی عورتیں بھی سپلائی کی جاتی ہیں۔ دارا نے کسی طرح سیتا کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً یہاں آتا رہتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کا خفیہ ٹھکانا تھا جس کا اس کے ساتھیوں کو علم نہیں تھا۔ کل رات بھی وہ بھاگ کر یہیں آیا تھا۔ آج شام اس نے فون کرکے شورانی کو یہاں بلالیا۔ شورانی کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کمرے سے شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے وہ لڑ رہے ہوں پھر فائر کی آواز سنائی دی۔ دو گولیاں چلی تھیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دارا کمرے سے نکل کر دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ ریسٹورنٹ کی عمارت کی عقبی سمت گیا تھا۔ اس کے بائیں بازو اور ایک ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ شورانی بھی کمرے سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ریسٹورنٹ کی عمارت کی عقبی سمت سے بھی فائر کی آواز سنائی دی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شورانی دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ وہ شاید سامنے والے گیٹ سے باہر جانا چاہتی تھی جہاں سڑک پر اس کی کار کھڑی تھی لیکن ٹھیک اسی لمحے دو پولیس والے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے شورانی پر ریوالور تان لیے۔ شورانی نے مزاحمت کیے بغیر اپنے آپ کو ان کے حوالے کردیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ آج رات ہی کسی وقت پولیس کے شکنجے سے چھوٹ جائے گی۔ اس کے چاہنے والے بہت ہیں اور ان کی پہنچ بھی بہت اوپر تک ہے۔"

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"ایک ویٹرلیس سے جو مہاراج کے جمنازیم سے بلیک بیلٹ حاصل کرچکی ہے۔" گانگ نے جواب دیا۔

"تم نے یہ بھی معلوم کرلیا ہوگا کہ شورانی نے دارا پر گولی کیوں چلائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"لیس باس۔" گانگ نے جواب دیا "شورانی کو اس بات پر غصہ تھا کہ دارا کل رات اسے زخمی حالت میں دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ کیوں گیا تھا۔ پولیس والوں کے سامنے بھی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ وہ دارا کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ دارا اس کے چالیس لاکھ بھات کھا گیا ہے۔ وہ اس سے ایک ایک بھات وصول کرلے گی۔ وہ بڑی خطرناک عورت ہے باس۔ اس نے بنکاک کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو اپنی انگلیوں پر نچا رکھا ہے۔ بہت حسین ہے اور وہ اپنے حسن و شباب سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔"

"تم اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"پولیس اسٹیشن کے سامنے ایک ریسٹورنٹ ہے۔ وہیں پر پبلک ٹیلی فون بوتھ سے بول رہا ہوں۔ پولیس اسٹیشن میں اس وقت بڑی رونق ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے معزز اور باعزت لوگ شورانی کی مدد کے لیے آنا شروع ہوگئے ہیں۔ ابھی دو آدمی آئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو تو میں جانتا ہوں۔ وہ شہر کا بہت بڑا جوہری ہے۔ ابھی اور لوگ بھی آئیں گے۔ میں نے کہا تھا نا کہ شورانی بہت اونچی شے ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ قرعۂ فال کس کے نام نکلتا ہے اور کون خوش نصیب اسے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہوتا ہے۔"

"کیا تمہارے خیال میں پولیس اسے چھوڑ دے گی؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے بڑے لوگ اس کی سفارش بن کر آئیں گے تو پولیس کو اسے چھوڑنا ہی پڑے گا۔ ویسے ہمارا قانون بڑا عجیب ہے۔ بڑی لچک ہے اس میں۔ یہ بظاہر اقدامِ قتل کا کیس ہے لیکن جس شخص پر قاتلانہ حملہ کیا گیا وہ موجود نہیں ہے۔ پولیس اپنے طور پر اقدامِ قتل کا کیس درج کرسکتی ہے لیکن اتنے معززین کے ہوتے ہوئے یہ کیس درج نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے گانگ۔" میں نے کہا "وہاں کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہو۔ کوئی اور اہم بات معلوم ہو تو مجھے بتانا۔"

"ضرور اطلاع دوں گا نٹل ماسٹر۔" گانگ نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور تھائی وغیرہ کو گانگ سے ہونے

والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں نے کہا۔

"یہ ہمارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ دارا خود ہی اپنے دوستوں سے محروم ہو رہا ہے۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے تعلقات استوار کرنے کے چکر میں وہ چی فانگ اور کم کو بھی نظر انداز کر رہا ہے اور مجھے یقین ہے وہ پیڈرو کو بھی دھوکا دے گا۔ پیڈرو کل رات مجھے گولی مار دیتا مگر دارا نے تیس پینتیس لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کا لالچ دے کر اسے ڈانواں ڈول کردیا اور میرا خیال ہے اب ان دونوں میں بھی کھٹ پٹ ہونے والی ہے اور اس کھٹ پٹ کا فائدہ ہم اٹھائیں گے۔"

"شورانی بہت حرافہ عورت ہے۔" تھائی وانگ نے کہا "اس کے بارے میں تمہیں پاتھم نے بتایا تھا اور میں نے بھی۔ اگر وہ پولیس کے چنگل سے نکل آئی تو واقعی دارا کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

"لیکن کیا اس طرح وہ پیڈرو سے ٹکر نہیں لے لے گی؟" میں نے کہا "دارا پیڈرو کا پارٹنر ہے۔ گولڈن ٹرائی اینگل والا منصوبہ ٹائیگر اور دارا نے بنایا تھا۔ ٹائیگر تو اپنے انجام کو پہنچ چکا۔ پیڈرو اس کا جانشین ہے۔ کیا وہ اس منصوبے سے دست کش ہو جائے گا جبکہ دارا نے اسے تیس پینتیس لاکھ ڈالر مالیت سونے کا لالچ بھی دیا ہے۔ اگرچہ دارا اس سونے تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا لیکن اس نے بہرحال پیڈرو کو اس جال میں پھنسا تو لیا ہے اور میرا خیال ہے' پیڈرو بھی ہرگز یہ نہیں چاہے گا کہ دارا کو کوئی نقصان پہنچے۔ وہ ہر قیمت پر اس کی حفاظت کرے گا۔"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ کیا صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ ہمیں تو صرف انتظار کرنا ہے۔" یہ بات جانکی نے کہی تھی۔

اس وقت سوا گیارہ بج رہے تھے۔ نویتا جماہیاں لیتی ہوئی اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ ڈاکٹر جانکی بھی اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس مرتبہ ریسیور میں نے ہی اٹھایا تھا۔ ہیلو کے جواب میں گانگ کی آواز سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یقیناً کوئی اہم بات تھی۔

"گانگ بول رہا ہوں نٹل ماسٹر۔"

"لیس گانگ۔ کوئی خاص بات؟" میں نے پوچھا۔

"بہت ہی خاص بات ہے۔" گانگ نے کہا "شورانی کو گولیوں سے چھلنی کردیا گیا ہے باس۔"

"کیا....؟" میں اچھل پڑا "تفصیل بتاؤ۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" میں نے کہا اور سامنے بیٹھی ہوئی جانکی اور تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے اس طرح اچھلنے پر ان دونوں کے چہروں پر بھی تجسس کے آثار ابھر آئے تھے۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ پر سفید رنگ کا وہ بٹن دبا دیا جس سے سیٹ میں لگے ہوئے اسپیکر کا سسٹم آن ہوگیا۔ اب اس فون پر ہونے والی دونوں طرف کی گفتگو کمرے میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی سن سکتے تھے۔

"یہ صرف پندرہ منٹ پہلے کی بات ہے باس۔" ٹیلی فون کے اسپیکر پر گانگ کی آواز ابھری "پہلے جب میں نے تمہیں فون کیا تھا' اس کے بعد شہر کے تین اور معززین شورانی کی سفارش بن کر پولیس اسٹیشن آئے تھے۔ شورانی کی اہمیت کا اندازہ تم اس بات سے بھی لگا سکتے ہو کہ ان لوگوں کو آدھی رات کے وقت خود پولیس اسٹیشن آنا پڑا۔ حالانکہ ٹیلی فون پر بھی ان کی بات نہیں ٹالی جاسکتی تھی۔ بہرحال پندرہ منٹ پہلے وہ لوگ ایک ایک کرکے تھانے سے چلے گئے۔ آخر میں شورانی اس جوہری کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے باہر نکلی جس کا ذکر میں پہلے بھی کرچکا ہوں۔ شورانی کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی اور وہ جوہری بھی یوں گردن تانے چل رہا تھا جیسے اس نے بہت بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ وہ دونوں پولیس اسٹیشن سے نکل کر گیٹ سے چند گز آگے جوہری کی کار کی طرف بڑھ گئے۔ ریسٹورنٹ کے سامنے کھڑے ہوئے بہت سے لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے اور پھر لوگوں نے وہ خوف ناک اور دل ہلا دینے والا منظر بھی دیکھا۔" گانگ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "شورانی اور وہ جوہری کار میں بیٹھے ہی تھے کہ پیچھے سے آنے والی سیاہ رنگ کی کار ان کے قریب آکر رک گئی۔ سیاہ رنگ کی اس کار سے دو آدمی اترے۔ ان دونوں کے چہروں پر نقاب تھے اور ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں۔ انہوں نے اپنی کار سے اترتے ہی جوہری کی کار پر فائر کھول دیا۔ حملہ آوروں نے شورانی اور جوہری پر پورے میگزین خالی کردیے اور اپنی کار میں بیٹھ کر فرار ہوگئے۔ یہ ساری کارروائی ایک منٹ میں مکمل ہوگئی تھی۔ ایک لمحے کو تو لوگ کچھ نہیں سمجھ سکے۔ مجھ پر بھی سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی اور جب ہوش آیا تو سب سے پہلے دوسروں کی طرح میں بھی دوڑ کر جوہری کی کار کے قریب پہنچا تھا۔ کار تو چھلنی ہوئی ہی تھی' وہ دونوں بھی چھلنی ہوگئے تھے۔ شورانی کے جسم میں تو اتنے سوراخ ہوئے تھے کہ انہیں گننا بھی شاید ممکن نہ ہو۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "تمہارے خیال میں حملہ آور کون ہوسکتے ہیں؟"

"پیڈرو کے آدمی۔" گانگ نے بلا جھجک جواب دیا "شورانی نے علی بابا ریسٹورنٹ میں کھل کر دھمکیاں دی تھیں کہ وہ دارا کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ اس نے پیڈرو کو بھی گالیاں دی تھیں۔ پیڈرو اپنے کسی دشمن کو زندہ نہیں چھوڑتا اور ویسے بھی دارا آج کل اس کا دستِ راست بنا ہوا ہے۔ وہ دونوں آج کل کسی بہت بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ پیڈرو کس طرح برداشت کرسکتا ہے کہ دارا کو کوئی نقصان پہنچے۔"

گانگ نے وہی بات کہی تھی جس پر ہم کچھ دیر پہلے تبصرہ کر رہے تھے۔

"پولیس کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا "کیا پولیس بھی یہ

سمجھتی ہے کہ قاتلوں کا تعلق پیڈرو کے گروپ سے ہے؟"

"پولیس نے ابھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔" گانگ نے جواب دیا "ابھی تو ان دونوں کی لاشیں کار میں پڑی ہیں۔ پولیس اس علاقے کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ بڑی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ افسرانِ اعلیٰ کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ کچھ ہی دیر میں شہر کی ناکا بندی کر کے تمام سڑکوں پر چیکنگ شروع ہو جائے گی۔"

"کیا پولیس ان لوگوں کو پکڑ سکے گی؟" میں نے پوچھا۔

"ناممکن باس۔" گانگ نے جواب دیا "حملہ آوروں نے جس طرح یہ کارروائی کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تربیت یافتہ تھے۔ ایسی کارروائیاں بڑی پلاننگ سے کی جاتی ہیں۔ پولیس اب ان لوگوں کی گرد کو بھی نہیں پا سکے گی۔ اب تک تو وہ لوگ اپنے محفوظ ٹھکانوں تک پہنچ چکے ہوں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ پولیس اس دہرے قتل کا الزام دارا اور پیڈرو پر لگانے میں دیر نہیں لگائے گی۔"

"ٹھیک ہے گانگ۔" میں نے کہا "اگر تمہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے تو مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اگر کوئی پرابلم ہو تو اس علاقے سے نکل جاؤ۔"

"یس باس۔" گانگ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور جانکی اور تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے بھی ساری باتیں سنی تھیں لیکن کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے خاموش بیٹھی میری شکل دیکھتی رہیں۔

مجھے شورانی یا اس کے عاشق جوہری کے قتل کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ ایک رات پہلے ہی تو میں نے اس کے بارے میں سنا تھا۔ سب سے پہلے پاتھم نے بتایا تھا کہ وہ ایک مساجر تھی۔ بے پناہ حسین اور جوان تھی اور اس نے اپنے حسن و شباب سے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور بڑے بڑے لوگوں کو اپنے حسن کے جال میں پھانس کر دولت سمیٹنا شروع کر دی تھی۔ دولت مندوں میں وہ جوہری اس کا پہلا شکار تھا جس نے اسے بہت شان دار بنگلا بھی خرید کر دیا تھا۔ اسی دوران میں شورانی کے دوسرے لوگوں سے بھی تعلقات ہو گئے تھے اور اس نے جوہری کو ٹھینگا دکھا دیا تھا اور اب وہی جوہری اس کے ساتھ جہنم کے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ شورانی اور دارا میں اس حد تک ان بن ہو گئی ہے کہ شورانی اسے موت کے گھاٹ اتارنے پر تیار ہو گئی تھی، میں نے ایک منصوبہ بھی بنا لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں شورانی کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کروں گا اور اس طرح دارا اور پیڈرو کے خلاف ایک نیا محاذ بن جائے گا لیکن شورانی کے قتل سے میرا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔

گانگ نے بتایا تھا کہ علی بابا ریسٹورنٹ میں دارا کو کم از کم دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک بازو میں اور ایک ٹانگ میں۔ وہ وہاں سے بھاگ کر سیدھا پیڈرو کے پاس ہی پہنچا ہو گا۔ اس صورتِ حال نے پیڈرو کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہو گا۔ شورانی کے بارے میں وہ بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شورانی نے چلا چلا کر جو دھمکیاں دی تھیں، وہ محض دھمکیاں نہیں ہوں گی۔ ان دھمکیوں پر عمل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس کے لیے ایک اشارہ ہی کر دینا کافی ہو گا۔ پیڈرو نے ان دھمکیوں سے صرف دارا کے لیے ہی نہیں اپنے لیے بھی خطرہ محسوس کیا ہو گا۔ وہ دارا کے ساتھ مل کر کسی بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا اور ویسے بھی دارا نے اسے تیس پینتیس لاکھ ڈالر مالیت کے سونے کی امید دلائی تھی۔ وہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ دارا اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس نے دارا کو شورانی کی کسی ممکنہ انتقامی کارروائی سے بچانے کے لیے شورانی کو ہی ٹھکانے لگا دیا تھا۔ شورانی کو قتل کرنے کے لیے وہ کسی اور وقت اور جگہ کا انتخاب بھی کر سکتا تھا لیکن پولیس اسٹیشن کے سامنے اس نے یہ کارروائی اس لیے کی تھی کہ شاید وہ پولیس کو بھی یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے خلاف کوئی کارروائی برداشت نہیں کرے گا۔

"میرا خیال تھا کہ ہم شورانی کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں گے۔" میں نے تھائی اور جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن سارا معاملہ ہی گڑبڑ ہو گیا۔"

"شورانی کا انجام تو یہی ہونا تھا۔" تھائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "وہ بہت لالچی عورت تھی۔ اگر وہ عقل مند ہوتی تو اس جوہری کے ساتھ رہ کر ساری زندگی آرام و سکون سے گزار سکتی تھی لیکن لالچ اور حرص نے بالآخر اسے بھیانک انجام تک پہنچا دیا۔"

"شورانی بہت دنوں سے دارا کے ساتھ تھی۔ دارا اس کے گھر بھی آتا رہا ہو گا اور میرا خیال ہے کہ اس کے گھر سے بھی دارا کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔" جانکی نے کہا۔

"اس وقت شورانی کے گھر کا رخ کرنا خطرناک ہو گا۔" میں نے کہا "ایک طرف پولیس نے مکان کی نگرانی شروع کر دی ہو گی اور دوسری طرف پیڈرو اور دارا بھی اسی تاک میں ہوں گے۔ نہیں جانکی۔ فی الحال ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ خاموش بیٹھے صورتِ حال کا جائزہ لیتے رہیں۔"

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے بائیں بازو میں اب بھی تکلیف تھی۔ تھائی اگرچہ صبح و شام اپنی مخصوص دوا سے میرے بازو کی مالش کیا کرتی تھی لیکن یہ بات بھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی تکلیف فوری طور پر رفع نہیں ہو جاتی۔ اس میں دو چار دن تو لگتے ہی ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد تھائی بھی کمرے میں آ گئی۔ جانکی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ تھائی نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند

کر کے بولٹ چڑھایا تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ رات کو سوتے وقت اگرچہ دروازہ بند کر دیا جاتا تھا لیکن بولٹ کبھی نہیں چڑھایا جاتا تھا اور آج جب میں نے تھائی کو دیکھا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔

تھائی کے چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی تو میں صبح ہی سے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کی سرخی اس بات کی علامت تھی کہ تھائی کی پیٹھ کھجلانے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری شامت آنے والی تھی۔

تھائی نے کھڑکیوں کے سامنے پردے بھی کھینچ دیے اور میرے پاس آ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس نے پشت پر سے قمیص اوپر کھینچ لی۔

"ذرا میری پیٹھ کھجا دو۔ بہت جلن سی ہو رہی ہے۔"

مجھے تھائی کے ساتھ رہتے ہوئے عرصہ ہو چکا تھا۔ اسے میں نے بالکل برہنہ حالت میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے مجھ سے کبھی حجاب نہیں رکھا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ میرے سامنے ہی کھڑے ہو کر کپڑے بدلنے لگتی لیکن تھائی کے بارے میں میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں کبھی میل نہیں آیا تھا۔ تھائی میرے ساتھ سویا کرتی تھی۔ وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا کرتی تھی لیکن میں نے کبھی اسے آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا تھا اور اس روز مہاراج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں واقعی بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے جانکی اور تھائی جیسی عورتیں ملی تھیں جن کی نظروں میں میل نہیں جن کی نیتوں میں فتور نہیں جن کے دلوں میں ہوس نہیں ہے۔

جانکی سے بھی اگرچہ بڑی حد تک بے تکلفی تھی لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا تھا کہ اسے پرکھنے کا موقع ملتا۔ البتہ آشرم والی وہ رات مجھے اب بھی یاد تھی جب جانکی نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور میرے رخساروں پر بوسے دینے لگی تھی۔ وہ سب کچھ ماحول اور ضرورت کے تحت ہوا تھا۔ اس میں کسی سفلی ارادے کو دخل نہیں تھا۔ ویسے میں جانکی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہے۔

تھائی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اکثر اسے اس سے بھی عجیب تر حالت میں دیکھا تھا لیکن کبھی کوئی ایسی بات ذہن میں نہیں آئی تھی مگر اس وقت اس کا سرخی مائل گداز بدن دیکھ کر نجانے کیوں مجھے اپنے سینے میں گدگدی سی محسوس ہونے لگی۔ میرا دایاں ہاتھ غیر ارادی طور پر حرکت میں آ گیا اور میں آہستہ آہستہ اس کی گداز پیٹھ کو سہلانے لگا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ریشم پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔

"ناخنوں سے کھجاؤ اور ذرا زور سے....." تھائی نے کہا۔

لیکن شاید اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی یا میں اس کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ سہلاتا رہا۔ تھائی چند لمحے تو اسی پوزیشن میں آگے کو جھکی بیٹھی رہی پھر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"کیا بات ہے وجدان۔ کیا ہو رہا ہے تمہیں؟"

"اوہ.... کچھ نہیں۔" میں چونک گیا۔ بلکہ یوں لگا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہوں "کچھ نہیں.... کچھ نہیں۔"

میں واقعی گڑبڑا گیا تھا اور پھر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے میں نے ناخنوں سے اس کی گداز جلد کو نوچنا شروع کر دیا۔ تھائی کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں نکلنے لگیں۔ میرا ہاتھ تیزی سے اس کی جلد کو نوچتا رہا۔ اس کے جسم پر میرے ناخنوں سے لمبی لمبی خراشیں سی پڑ گئیں اور پھر میں نے محسوس کیا کہ تھائی کے منہ سے سسکاریوں کے بجائے کراہیں خارج ہونے لگی تھیں۔ تھائی نے ایک بار پھر گردن گھما کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا بھی تھا لیکن میرا ہاتھ نہیں رکا۔ تھائی ایک دم بیڈ پر اوندھی ہو گئی۔ میرا ہاتھ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میرے ناخنوں سے اس کے جسم پر لمبی لمبی خراشیں پڑ گئی تھیں جن سے خون بھی رسنے لگا تھا۔ میری انگلیاں بھی خون آلود تھیں۔

میں ایک جھٹکے سے بیڈ سے نیچے اتر گیا اور دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گیا اور ہال میں رکنے کے بجائے برآمدے والا دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ چند سیکنڈ برآمدے میں کھڑا رہا اور پھر لان میں آ گیا۔ وہاں بانس کی کھپچیوں کی ایک میز اور چند گارڈن چیئرز پڑی ہوئی تھیں۔ میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور دونوں پیر سامنے میز پر پھیلا لیے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا سے میرے دماغ کی تپش کم ہونے لگی اور میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ میرے حواس آہستہ آہستہ بحال ہو رہے تھے۔ میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورنے لگا۔ برآمدے کے ساتھ والے کمرے کی بتی جل رہی تھی اور اندر کرسی پر بیٹھا ہوا سکندر میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر بھیگی ہوئی گھاس پر ٹہلنے لگا۔ میرے حواس اب پوری طرح بحال ہو چکے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ نہ تو تھائی میرے لیے اجنبی تھی نہ ہی اس کا بدن۔ میں بیسیوں مرتبہ اسے اپنے سامنے بے لباس دیکھ چکا تھا۔ اس سے لپٹ کر سویا تھا۔ کبھی میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا لیکن آج یکایک مجھ پر وحشت کیوں طاری ہو گئی تھی؟ میرا ذہن پراگندہ نہیں تھا۔ کوئی شیطانی خیال نہیں تھا لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا تھا۔

میں دیر تک بھیگی ہوئی گھاس پر ٹہلتا رہا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ شاید رات کا آخری پہر تھا۔ گرتی ہوئی شبنم سے میری قمیص بھیگ گئی تھی۔ دماغ اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا جیسے برف جم گئی ہو۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کرکے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے ذہن میں سکندر کا خیال ابھرا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ بھی مجھے دیکھ کر باہر آگیا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو چونک گیا۔ وہ تھائی وانگ تھی۔

"شبنم پڑ رہی ہے۔ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ چلو۔ اندر آجاؤ۔"

میں کچھ کہے بغیر اٹھ گیا۔ باہر ٹھنڈ میں بیٹھے رہنے سے میرے بازو میں درد شروع ہوگیا تھا۔ تھائی مجھے کمرے میں لے آئی۔ میں نے سامنے لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ تھائی نے پھر دروازہ بند کردیا۔ میری شرٹ بالکل بھیگی ہوئی تھی۔ تھائی نے بچوں کی طرح مجھے اپنے سامنے کھڑے کرکے میری قمیص اتار دی اور الماری سے دوسری قمیص نکال کر پہنائی اور پینٹ باتھ روم میں لے جاکر ٹانگ دی۔

"تمہاری یہ پینٹ بھی بھیگی ہوئی ہے۔ جاؤ۔ بدل کر آؤ۔" اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے باتھ روم میں جاکر پینٹ تبدیل کی اور باہر آگیا۔ تھائی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار ہوکر اس سے لپٹ گیا۔ میرے منہ سے سسکی نکل گئی تھی۔

تھائی مجھے لے کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں اب بھی تھائی سے لپٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنا چہرہ تھائی کے سینے میں چھپالیا۔ تھائی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہورہی تھی اور پھر میں گہری نیند سو گیا۔

○☆○

صورتِ حال سنگین سے سنگین تر ہوتی جارہی تھی۔ دارا روپوش تھا۔ شاید کسی پناہ گاہ میں دبکا اپنا علاج کرا رہا ہوگا۔ پیڈرو نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ میرا ساتھی ہونے کے شک میں وہ اب تک کئی لوگوں کی ہڈیاں توڑ کر انہیں اپاہج بنا چکا تھا۔ اس کے آدمی بڑی سرگرمی سے مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

پیڈرو اپنے آپ کو زیرِ زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس شہر کا کوئی بڑے سے بڑا بدمعاش بھی اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتا تھا' اونچی آواز میں بات نہیں کرسکتا تھا۔ چہ جائیکہ کوئی اس کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جائے اور اسے للکارے۔ اس کی حالت اس شیر جیسی تھی جس کے منہ سے اس کا شکار چھین لیا گیا ہو اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میں پرساد کو اس کے بنگلے سے اٹھا لایا تھا۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کا مقابلہ بھی کیا تھا اور اسے ایک دو ایسی چوٹیں بھی لگائی تھیں جنہیں وہ اب تک سہلا رہا ہوگا۔

میرا بازو ٹھیک ہو چکا تھا۔ میں باہر نکلنا چاہتا تھا مگر تھائی مجھے اس کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی باہر نکلنا مناسب نہیں تھا۔ پرساد کے زخم بھی مندمل ہو چکے تھے لیکن ابھی وہ بھی اس قابل نہیں تھا کہ دارا یا پیڈرو کے غنڈوں کا مقابلہ کرسکے۔ کانگ وقتاً فوقتاً مجھے باہر کی اطلاعات فراہم کرتا رہتا تھا لیکن وہ بھی پیڈرو کے اندرونی حلقوں میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔

پھر ایک روز کانگ نے مجھے جو اطلاع دی وہ بڑی تشویش ناک تھی۔ اس رات کانگ اور جانگ وغیرہ تو زخمی پرساد کو ٹک ٹک میں لے کر گئے تھے جبکہ میں اور سکندر پیڈرو کی کار پر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ راستے میں ہمیں پولیس نے روکا تھا اور ہم پولیس کو بھی نچا دے کر بھاگ نکلے تھے۔ پولیس اگرچہ اس رات سے ہماری تلاش میں تھی لیکن انہیں ہمارے بارے میں ٹھیک سے معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ ہم کون ہیں۔ وہ پولیس آفیسر سکندر سے ہی باتیں کرتا رہا تھا اور اب کانگ کی طرف سے اطلاع یہ تھی کہ اس پولیس آفیسر نے سکندر کو ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے شناخت کرلیا تھا۔ وہ تقریباً تین سال پہلے ایک قتل کرکے بھاگا تھا۔ پولیس ریکارڈ میں اس کی تصویر موجود تھی اور پولیس آفیسر نے اسے تصویر سے ہی پہچانا تھا۔ ہم جس گاڑی میں فرار ہوئے تھے' وہ پیڈرو کی ملکیت تھی۔ بعد میں وہ گاڑی پولیس کو تھوریٹ تھائی روڈ پر ریلوے لائن کے قریب کھڑی مل گئی تھی۔ اس سے اگلے ہی روز تو شورانی کو پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہوئے گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔ پولیس نے یہ بھی معلوم کرلیا تھا کہ شورانی کے قتل سے ایک رات پہلے سوئے یودی پر کوئی ہنگامہ ہوا تھا جس میں شورانی زخمی ہوگئی تھی۔ اس ساری صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس رات جو دو آدمی پیڈرو کی گاڑی لے کر بھاگے تھے انہوں نے ہی اگلے دن شورانی کو قتل کردیا تھا' انہیں ان دو آدمیوں کی تلاش تھی جو اس رات پولیس کو دھوکا دے کر بھاگے تھے۔ یہ صورتِ حال خاصی تشویش ناک تھی۔ اگر سکندر پکڑا گیا تو معاملہ گڑبڑ ہوسکتا تھا۔

"تمہیں پولیس نے شناخت کرلیا ہے سکندر۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری تصویر پولیس ریکارڈ میں موجود ہے۔ اب تمہیں تلاش کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

"تین سال میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی پولیس والے نے مجھے شناخت کیا ہے۔ حالانکہ میں ان تین برسوں کے دوران میں پولیس والوں کے آس پاس پھرتا رہا ہوں لیکن بہرحال' کل صبح جب وہ پولیس آفیسر مجھے اپنے سامنے بھی دیکھے گا تو.... شناخت نہیں کرسکے گا۔"

"وہ کیسے....؟" میں نے پوچھا۔

"تین سال پہلے مجھے بال بڑھانے اور داڑھی رکھنے کا شوق ہوا تھا لیکن میری محبوبہ کو میرا یہ شوق پسند نہیں آیا۔ اس بات پر

ایک روز ہم دونوں میں جھگڑا ہوا اور میں نے اس کا گلا کاٹ دیا۔ اس کے بعد میں چند ہفتوں کے لیے بنکاک سے باہر چلا گیا تھا اور جب واپس آیا تو میں نے سر کے بال بھی منڈوا دیے تھے اور داڑھی بھی صاف کردی تھی۔ اس کے بعد میں آزادی سے شہر میں گھومتا رہا۔ کوئی مجھے شناخت نہیں کرسکا۔ کئی مرتبہ ان پولیس والوں سے بھی آمنا سامنا ہوا جو قتل کے اس کیس کی تفتیش کرتے رہے تھے لیکن وہ بھی مجھے نہیں پہچان سکے۔ چند مہینے پہلے میں مہاراج کے پاس آگیا۔ مجھے پھر شوق ہوا اور میں نے داڑھی رکھ لی اور بال بڑھا لیے۔ میں زیادہ تر واٹ ڈوسٹ میں رہا تھا اور باہر نکلنے کا موقع بھی بہت کم ملتا تھا پھر مہاراج نے مجھے واٹ ٹریکٹ بلالیا اور تمہارے ساتھ بھیج دیا۔ میرا خیال تھا پولیس مجھے بھول چکی ہوگی۔"

"پولیس کسی کو نہیں بھولتی۔ وہ تو اپنے مطلوب کو قبر سے بھی نکال لیتی ہے۔" میں نے کہا "بہرحال' اب چونکہ تم نظروں میں آچکے ہو اس لیے تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"اطمینان رکھو لٹل ماسٹر۔" سکندر نے کہا "اب پولیس مجھے نہیں پہچان سکے گی۔"

سکندر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دوسرے دن صبح جب وہ میرے سامنے آیا تو میں بھی اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ داڑھی کے ساتھ اس نے باریک مونچھیں بھی صاف کروی تھیں اور سر کے بال بھی غائب تھے۔

وہ کئی روز سے میرے ساتھ تھا اور اس روز پہلی مرتبہ میں نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ عام تھائی باشندے پست قامت یا درمیانے قد کے ہوتے ہیں لیکن سکندر کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ کسرتی بدن اور بازوؤں کے مسل ابھرے ہوئے۔ اس کا چہرہ بھی قدرے بھاری تھا۔ ٹھوڑی پر بائیں طرف جبڑے تک پرانے زخم کا تقریباً تین انچ لمبا نشان تھا۔ زخم کا یہ نشان اب تک داڑھی میں چھپا رہا تھا۔ اس کی یہ ہیئت دیکھ کر کوئی بھی شریف آدمی اس کے قریب آنا پسند نہ کرتا۔

"گڈ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اب واقعی تمہیں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔"

"بتاؤ۔ اب مجھے کیا کرنا ہے لٹل ماسٹر۔" سکندر نے کہا۔

"تم پاٹھم کے پاس چلے جاؤ۔ وہ اس وقت اپنے ورکشاپ میں ہوگا۔ اس سے کہو' مجھے شام چھ بجے فون کرلے۔" میں نے کہا۔

"تم اس سے یہ بات فون پر بھی کہہ سکتے ہو لٹل ماسٹر لیکن میں سمجھ گیا تم مجھے وہاں کیوں بھیجنا چاہتے ہو۔" سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تھائی نے اسے کچھ چیزیں لانے کے لیے بھی کہہ دیا۔ سکندر' پاٹھم والی گاڑی لے کر چلا گیا۔ پاٹھم اس روز یہ گاڑی یہاں چھوڑ گیا تھا لیکن آج اسے پہلی مرتبہ استعمال کے لیے باہر نکالا گیا تھا۔

پاٹھم کا ورکشاپ شہر کے شمال میں واقع بس ٹرمینل کے قریب تھا۔ پورے شہر سے گزر کر وہاں تک جانا پڑتا۔ میں نے سکندر کو وہاں بھیجا ہی اس لیے تھا کہ اس حلیے میں وہ کسی کی نظروں میں آسکتا ہے یا نہیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور میں نے ہی اٹھایا۔

"میں پاٹھم بول رہا ہوں باس۔" میرے ہیلو کے جواب میں آواز سنائی دی "میرے پاس تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی آیا ہے جس نے مجھے تمہارا پیغام دیا ہے۔ ایک تو مجھے اس پیغام پر حیرت ہو رہی ہے اور دوسرے وہ آدمی وہ نہیں جو وہ اپنے آپ کو بتا رہا ہے۔"

"اسے میں نے اس لیے بھیجا تھا کہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہیں۔" میں نے جواب دیا "وہ سکندر ہی ہے اور تمہاری ہی گاڑی لے کر آیا ہے۔"

"گاڑی تو میں نے دیکھ لی تھی۔" پاٹھم نے کہا "سکندر کو اس روز میں نے ایک ہی مرتبہ تمہارے گھر پر دیکھا تھا۔ داڑھی' مونچھیں اور بڑے بڑے بال لیکن اب...."

"وہ سکندر ہی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "مزید تسلی کرنا چاہتے ہو تو اس سے میری بات کرا دو اور اسے واپس بھیج دو۔"

"ہولڈ کرو۔ میں اسے بلاتا ہوں۔" پاٹھم نے کہا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسیور پر سکندر کی آواز سنائی دی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ واپسی پر شہر میں گھومتا پھرتا ہوا آئے پھر میں نے پاٹھم سے بات کی اور فون بند کردیا۔

یہ میرے لیے بڑی خوش آئند بات تھی کہ سکندر کو بدلے ہوئے حلیے میں وہ شخص بھی نہیں پہچان سکا تھا جس نے صرف تین چار روز پہلے اسے دیکھا تھا۔

سکندر دوپہر دو بجے کے قریب واپس آیا۔ اس نے تین شاپنگ بیگ تھائی کے حوالے کردیے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں حیرت ہوگی باس۔ آج دوپہر کا کھانا میں نے اس پولیس آفیسر کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا جس نے اس رات ہمیں روکا تھا۔"

"کیا....؟" میں اچھل پڑا "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں باس۔" سکندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ اتفاق سے جس ٹیبل پر مجھے جگہ ملی وہاں وہ پولیس آفیسر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ یونی فارم میں نہیں تھا۔ اس کا ایک دوست بھی اس کے ساتھ تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے ہم نے دو تین مرتبہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ اگر اس نے مجھے پہچان

لیا ہوتا تو وہیں پر مجھے دھر لیتا لیکن اس نے تو شاید سوچا بھی نہیں ہوگا کہ جس شخص کی اسے تلاش ہے وہ اس کے ساتھ میز پر بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔"

"بہت بڑا رسک لیا تھا تم نے۔" میں نے اسے گھورا "اگر تم دھر لیے جاتے تو ہمارا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔"

"رسک تو لینا ہی تھا باس۔" سکھدر نے جواب دیا "بہرحال یہ اطمینان تو ہوگیا کہ اب نہ تو پولیس مجھے شناخت کر سکتی ہے اور نہ ہی پیڈرو کے آدمی۔"

"چلو۔ یہ اطمینان تو ہوگیا۔" میں نے کہا۔

سکھدر باتیں تو مجھ سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں اِدھر اُدھر گردش کر رہی تھیں۔ اتفاق سے اس وقت ہال میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تھائی کچن میں تھی۔ نویتا پرساد کے پاس تھی اور جانگی اپنے کمرے میں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ سکھدر کی نظریں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ مایوس ہو کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

تین بجے کے قریب تھائی نے میز پر کھانا لگا دیا۔ جانگی، نویتا اور پرساد بھی وہیں آگئے۔ پرساد کی حالت اب کافی بہتر تھی۔ سکھدر کو بھی کھانے کے لیے کہا گیا لیکن اس نے منع کر دیا۔ وہ تو کھانا کسی ریسٹورنٹ سے کھا کر آیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد تھائی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ نویتا بھی پرساد کے ساتھ کمرے میں چلی گئی تھی۔ جانگی میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ میں نے پہلی مرتبہ یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ جانگی جب میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آتی تھی۔

ٹھیک چھ بجے پاتھم کا فون آگیا۔

"یس باس۔ کیا حکم ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پیڈرو یا دارا میں سے کسی کا پتا چلا۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دارا تو کسی بل میں گھسا ہوا ہے۔ پیڈرو پولیس سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو متحرک رکھے ہوئے ہے۔ ویسے آج کل وہ سیام اسکوائر پر واقع سن شائن کلب میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک چھوٹا سا کیسینو ہے جہاں بڑے پیمانے پر جوا ہوتا ہے۔ سنا ہے کوئی باہر کا آدمی یہاں سے کبھی جیت کر نہیں گیا۔ وہاں حسین اور نو عمر لڑکیاں ہیں جو بازی پلٹنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پیڈرو کو زیادہ آمدنی ایسے ہی اڈوں سے ہوتی ہے اس لیے وہ ان اڈوں کا دورہ کرتا رہتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ آج رات بھی وہاں آئے گا۔" میں نے کہا۔

"اسے آنا چاہیے۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم نو بجے سن شائن پہنچ جاؤ۔ سکھدر بھی وہاں ہوگا مگر تم دونوں ایک دوسرے سے شناسائی ظاہر نہیں کرو گے اور اب میری بات توجہ سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے سمجھانے لگا۔

میں نے فون بند کر دیا اور پھر سات بجے کے قریب میں نے سکھدر کو بھی سب کچھ سمجھا کر سن شائن بھیج دیا۔

رات دس بجے کے قریب ہم کھانا کھا رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ جانگی نے اٹھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آگیا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔ دوسری طرف پاتھم تھا جو تیز تیز لہجے میں کچھ بتا رہا تھا۔

"پاتھم میں وجدان بول رہا ہوں۔ شروع سے بتاؤ کیا بات ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

"بہت گڑبڑ ہو گئی ہے باس۔" پاتھم نے کہا "آدھا گھنٹا پہلے پیڈرو کا چھوٹا بھائی سامی کیسینو میں داخل ہوا تھا۔ اس کے پیچھے ہی میں نے مہاراج کے ایک آدمی گانگ کو بھی اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اوپر والے ہال کی طرف چلا گیا۔"

"گانگ کو تم جانتے ہو؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"بہت اچھی طرح۔ وہ ٹک ٹک چلاتا ہے۔" پاتھم نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "گانگ کے اوپر جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اوپر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد گانگ کی لاش سیڑھیوں پر لڑھکتی ہوئی نیچے آگئی۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک پیشانی میں اور دو سینے پر۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔"

"کیا....؟" میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے "کیا وہ گانگ ہی ہے؟"

"یس باس۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ دو سال پہلے میں نے جمنازیم میں اس سے موئے تھائی کی ٹریننگ بھی لی تھی۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"سکھدر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زینے پر گانگ کی لاش گرنے کے بعد وہ اوپر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔" پاتھم نے کہا "فائرنگ سے کیسینو میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلے۔ چند منٹ میں ہی سناٹا چھا گیا۔ پورا بازار بند ہو چکا ہے۔ کیسینو والی عمارت سے ملحق سیام شاپنگ سینٹر کے تمام گیٹ بھی بند کر دیے گئے ہیں۔ پولیس ابھی تک نہیں پہنچی۔ گانگ کی لاش اندر ہی پڑی ہے۔"

"تم کہاں سے بول رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سیام اسکوائر سے آگے راما دون روڈ کے چوراہے پر ایک پبلک فون بوتھ ہے۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"تم وہیں آس پاس انتظار کرو۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور کریڈل ٹیپ کر کے ماسٹر ہوچن کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ کال، ماسٹر کے ایک شاگرد نے ریسیو کی تھی۔

جمنازیم میں گانگ کے قتل کی اطلاع پہنچ گئی تھی اور ماسٹر ہوچن اپنے چند آدمیوں کے ساتھ سیام اسکوائر کی طرف جا چکا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ تھائی اور جانگی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور جب میں نے انہیں بتایا کہ گانگ کو قتل کر دیا گیا ہے تو ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔

"میں سیام اسکوائر جا رہا ہوں۔ ماسٹر ہوچن بھی وہاں پہنچ چکا ہوگا۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" تھائی یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔

"نہیں تھائی۔ ہو سکتا ہے وہاں مزید کوئی گڑبڑ ہو۔ میں اکیلا ہی جاؤں گا۔" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ ایسی نازک اور سنگین صورتِ حال میں تھائی مجھے اکیلے نہیں جانے دے گی۔ اس کی وجہ سے اگرچہ مجھے کچھ الجھن پیش آسکتی تھی لیکن میں اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

میں نے خنجر والا اسٹریپ اپنی دائیں پنڈلی پر باندھ لیا اور جوتے پہننے لگا۔ جب میں تیار ہو کر اٹھا تو وہ مجھ سے پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ اس نے پستول اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ہم دونوں کمرے سے نکل آئے۔ جانگی گیٹ تک ہمیں چھوڑنے آئی تھی۔ ہم جیسے ہی باہر نکلے، اس نے گیٹ بند کر دیا۔

میں اور تھائی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ناکسن روڈ والے چوراہے پر آگئے۔ جہاں سے ہمیں فوراً ہی ٹیکسی مل گئی۔ ہم جس انداز میں ٹیکسی میں بیٹھے، ڈرائیور سمجھ گیا کہ ہم جلدی میں ہیں۔ اس نے ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ میں نے اسے سیام اسکوائر چلنے کا کہہ دیا تھا۔ مزید کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہاں پہنچے تھے۔ پولیس نے اس علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہماری ٹیکسی کو بھی راما دون روڈ والے چوراہے پر روک لیا گیا۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور نیچے اتر گیا۔ تھائی بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئی تھی۔ چوراہے پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ پولیس انہیں سیام اسکوائر کی طرف جانے سے روک رہی تھی۔ پولیس کو پتا چل گیا تھا کہ مہاراج کا ایک آدمی مارا گیا ہے اس لیے صورتِ حال کو مزید بگڑنے سے روکنے کے لیے کچھ اقدامات کیے گئے تھے۔

لوگوں کے ہجوم میں پاتھم موجود تھا۔ وہ ہمارے پاس آگیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ مہاراج کے آدمی ابھی نہیں پہنچے تھے اور پھر ٹھیک اسی وقت دو چھوٹے پک اپ ٹرک وہاں پہنچ گئے۔ ان دونوں میں مہاراج کے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ اگلے ٹرک پر ماسٹر ہوچن کھڑا تھا۔ پولیس نے دونوں ٹرکوں کو روک لیا۔ میں نے تھائی کو پاتھم کے پاس رکنے کو کہا اور دوڑ کر اگلے ٹرک پر سوار ہو گیا۔ ماسٹر ہوچن نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ چیخ چیخ کر پولیس والوں سے بحث کر رہا تھا لیکن پولیس والے راستہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈوں سے ٹرک کو پیچھے لے جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

ماسٹر ہوچن ٹرک سے نیچے کود گیا اور پھر اس نے دونوں ٹرکوں کے ڈرائیوروں سے چیخ کر ٹرک آگے لے جانے کو کہا۔ ٹرک ایک جھٹکے سے حرکت میں آئے۔ پولیس والے اچھل کر ایک طرف ہٹ گئے۔ ماسٹر ہوچن دوڑ کر ٹرک کے پائیدان پر سوار ہو گیا۔ پولیس والے بھی ٹرک کے پیچھے بھاگے۔

سیام اسکوائر سے ملحق بلڈنگ کے سامنے بھی پولیس والے کھڑے تھے۔ ٹرک رکتے ہی لڑکے کود کر نیچے اتر آئے۔ کسی کے ہاتھ میں ہاکی تھی، کسی کے پاس تلوار، کوئی خنجر بدست تھا اور کچھ لڑکوں کے پاس ریوالور یا پستول وغیرہ بھی تھے۔ پولیس پارٹی کے انچارج انسپکٹر نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو ماسٹر ہوچن چیخ کر بولا۔

"آفیسر۔ ہم پولیس سے نہیں الجھنا چاہتے۔ ہم اپنے آدمی کی لاش لینے آئے ہیں۔ اگر ہمیں روکنے کی کوشش کی گئی تو ہم زبردستی کریں گے اور پورے شہر کی پولیس بھی ہمیں نہیں روک سکے گی۔"

پولیس آفیسر ماسٹر ہوچن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ مہاراج کی طاقت سے بھی واقف تھا لیکن اسے اپنی ڈیوٹی بھی دینی تھی۔ اس نے برائے نام مزاحمت کی۔ لڑکے پولیس والوں کو دھکے دیتے ہوئے کیسینو کی عمارت میں داخل ہو گئے۔ میں بھی ماسٹر ہوچن کے ساتھ عمارت میں گھس گیا۔

گانگ کی لاش اوپر والے ہال کو جانے والے زینے کے قریب فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ خون سے تر تھا۔ ایک گولی پیشانی میں اور دو سینے میں لگی تھیں۔ لاش کے قریب قالین پر خون جما ہوا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ میں لاش پر جھک گیا۔ دو آنسو میری آنکھوں سے نکل کر لاش پر گرے۔

ماسٹر ہوچن اور بہت سے لڑکے لاش کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ کچھ لڑکے اوپر چلے گئے تھے۔ چند منٹ بعد ہی اوپر سے توڑ پھوڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نیچے کھڑے ہوئے لڑکوں نے بھی کارروائی شروع کر دی۔ فرنیچر اور رولٹ (جوا کھیلنے کے لیے استعمال ہونے والی مشین ROULETTE) مشینیں وغیرہ توڑی جانے لگیں۔ چند پولیس والے بھی اندر گھس آئے تھے جو ان لڑکوں کو توڑ پھوڑ سے روکنے کی کوشش کرنے لگے لیکن لڑکے

بپھرے ہوئے تھے۔ بعض لڑکوں کی پولیس والوں سے ہاتھا پائی بھی ہو رہی تھی۔ ماسٹر ہوچن اور میں نے گانگ کی لاش اٹھائی اور باہر کی طرف لپکے۔ اس وقت چند اور پولیس والے اندر گھس رہے تھے۔

لاش کو ایک پک اپ ٹرک کے فرش پر لٹا دیا گیا۔ پولیس آفیسر چیخ چیخ کر ماسٹر ہوچن سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے لڑکوں کو تخریب کاری سے روکے بصورتِ دیگر اسے بھی کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔ ماسٹر ہوچن نے ہونٹوں میں انگلیاں دبا کر سیٹی بجائی۔ عمارت میں موجود لڑکے دوڑتے اور چیختے چلاتے ہوئے باہر آگئے اور ٹرکوں پر چڑھنے لگے۔ میں بھی ایک ٹرک پر لٹک گیا۔ ماسٹر ہوچن بھی اسی ٹرک پر تھا۔ دونوں ٹرک حرکت میں آگئے۔ موڑ پر پہنچ کر میں نے ماسٹر ہوچن کو اشارہ کیا اور ٹرک سے اتر گیا۔ تھائی اور پاتھم سامنے ہی کھڑے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے قریب پہنچ گیا۔

"تمہاری گاڑی کہاں ہے؟" میں نے پاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سیام اسکوائر سے آگے وٹن چیٹ روڈ کی طرف سے شور سنائی دیا۔ سرخ رنگ کا ایک پک اپ ٹرک اور تین کاریں اس گلی سے سیام اسکوائر کی طرف مڑی تھیں۔ ان میں پیڈرو کے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ پولیس والے ان غنڈوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے تھائی اور پاتھم کو اشارہ کیا۔ پاتھم نے تھائی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ایک طرف کھینچنے لگا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس جگہ پر بہت ہجوم تھا لیکن اب لوگ اِدھر اُدھر کھسکنے لگے تھے۔

ہم پھایا تھائی روڈ پر ہوٹل ایشیا کی طرف جا رہے تھے۔ چند گز کا فاصلہ طے کر کے پاتھم ایک تنگ سی گلی میں مڑ گیا اور پھر کچھ دور کھڑی ہوئی پیلے رنگ کی ایک ٹیکسی کے قریب رک گیا۔ اس نے تھائی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جیب سے چابی نکال کر ٹیکسی کا دروازہ کھولنے لگا۔

ٹیکسی جس وقت حرکت میں آئی' اس وقت سیام اسکوائر کی طرف سے پہلی گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ تک فضا پر سکوت سا طاری رہا اور پھر یوں لگا جیسے وہاں محاذ کھل گیا ہو۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ پیڈرو کے غنڈے پولیس والوں سے بھڑ گئے تھے۔

وہ تنگ سی گلی تھی جس کے دونوں طرف اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ کار اس گلی سے نکل کر کشادہ سڑک پر آگئی۔ تقریباً ایک فرلانگ آگے نہر کا پل تھا اور اس سے آگے یہ سڑک ہوٹل ایشیا کے سامنے سے گزرتی ہوئی نیو پھیت بوری روڈ سے جا ملتی تھی۔

"کہاں جانا ہے باس؟" پاتھم نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"واٹ ٹریمٹ۔ وہ لوگ وہیں گئے ہوں گے۔" میں نے جواب دیا "لیکن ہم شاید مخالف سمت میں نکل آئے ہیں۔" میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم سوئے پھایا نیک سے ہوتے ہوئے بنتھا روڈ کی طرف نکل جائیں گے۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"یہ ٹیکسی کس کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مرمت کے لیے آئی ہوئی تھی۔ کوئی اور گاڑی تھی نہیں۔ میں نے سوچا چلو اس سے کام نکال لو۔" پاتھم نے جواب دیا۔

ہماری ٹیکسی ابھی نہر کے پل سے چند گز دور ہی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک کار تیزی سے آگے نکل گئی اور پھر عین پل کے اوپر وہ کار سڑک پر اس طرح آڑی ترچھی ہو کر رک گئی کہ راستہ بند ہو گیا۔ پاتھم نے پوری قوت سے بریک لگا دیا۔ ٹیکسی بریک کی تیز... چرچراہٹ کے ساتھ لہراتی ہوئی پل کی ریلنگ سے ٹکرا کر رک گئی۔

اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال سمجھ سکتا' دوسری کار سے دو آدمی اتر آئے۔ ان دونوں کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ انہوں نے ایک طرف سے مجھے اور دوسری طرف سے تھائی کو رائفلوں کی زد پر لے لیا۔

"تم دونوں خاموشی سے نیچے اتر آؤ۔ اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔" ایک نے غرا کر کہا۔

میں نے تھائی کی طرف دیکھا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ تھائی بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی تھی۔ وہ دونوں ہمیں اپنی کار کے قریب لے آئے۔ ان میں سے ایک نے ہم دونوں کے لباس تھپتھپا کر دیکھے اور تھائی کی پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا۔ میرا لباس بھی اس نے پتلون کی جیبوں تک ہی تھپتھپایا تھا۔ اگر وہ ذرا نیچے تک کی تلاشی لیتا تو میرا خنجر بھی مجھ سے جدا ہو چکا ہوتا مگر پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر محفوظ ہی رہا تھا۔

پاتھم پر انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اسے ٹیکسی ڈرائیور ہی سمجھے تھے اور ظاہر ہے کسی ٹیکسی ڈرائیور سے انہیں کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ پاتھم بھی اپنی سیٹ پر سہما ہوا سا بیٹھا رہا تھا۔

ہمیں اس کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ایک آدمی میرے ساتھ دروازے کی طرف بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل اس طرح رکھی تھی کہ اس کی نال میری پسلیوں میں چبھ رہی تھی۔ دوسرا آدمی تھائی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے پاتھم کی طرف دیکھا اور رائفل تان کر ٹریگر دبا دیا۔ ٹریگر دباتے ہوئے اس نے رائفل کی نال ذرا نیچے کی طرف جھکا لی تھی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ تھائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس آدمی کو پاتھم پر رائفل تانتے دیکھ کر میں نے بھی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پاتھم کی چیخ کے بجائے دھماکے کی

آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے گولی پاتھم پر نہیں ٹیکسی کے اگلے ٹائر پر چلائی تھی اور ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔

کار کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کار کا رخ سیدھا کر کے اسے ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ کار تیزی سے سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ میں اور تھائی ان دونوں آدمیوں کے بیچ میں دبے بیٹھے تھے۔ ایک رائفل میری پسلیوں سے لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف تھائی بھی رائفل کی زد میں تھی۔ ہم دونوں کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ صورتِ حال اگرچہ ہمارے لیے بے حد سنگین تھی لیکن میں ان لوگوں کی حماقت پر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ پاتھم کو انہوں نے ٹیکسی ڈرائیور سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور میں مطمئن بھی تھا کہ پاتھم ہمارا سراغ لگا لے گا۔

کار وکٹر مونومنٹ سے ڈن ڈانگ روڈ پر مڑ گئی اور ایکسپریس وے عبور کرتی ہوئی اسوک روڈ پر آگئی اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کشادہ گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے موڑ پر سوئے تلاد نام کا بورڈ میں نے دیکھ لیا تھا۔ کار ایک شان دار کوٹھی کے سامنے رک گئی۔ گیٹ کھلا اور کار اندر داخل ہو گئی۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں اغوا کرنے والوں کا تعلق پیڈرو یا دارا کے گروہ سے ہوگا اور ظاہر ہے ان کے سوا ہمارا کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ ہمیں کار سے اتار کر دھکے دیتے ہوئے اندر لے آیا گیا اور پھر جیسے ہی ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے سامنے تخت پر بیٹھے ہوئے' ایک شخص کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ سوامی رگوناتھ تھا۔

وہ تخت پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی مہاراجا اپنی راج دھانی کے سنگھاسن پر براجمان ہو۔ اسے دیکھ کر میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس رات آشرم میں' میں نے اسے دور ہی سے دیکھا تھا لیکن آج میرے اور اس کے درمیان صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا۔

سوامی رگوناتھ کو آشرم میں دیکھ کر میں نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دنیا کا بدہیئت ترین آدمی تھا اور اب تو اس کی ہیئت کچھ اور بھی بھیانک ہو گئی تھی۔ چہرے پر دائیں طرف رخسار کا گوشت جل گیا تھا جس سے اس کی آنکھ بھی کھنچی کھنچی سی لگ رہی تھی۔ سر کے بال بھی سامنے سے جل چکے تھے۔ کھوپڑی کے پیچھے کی طرف جو بال بچے تھے' ان کی اس نے چٹیا سی بنالی تھی۔ ہندو پنڈتوں اور سادھوؤں میں عام طور پر گنجے سر پر اس قسم کی چوٹیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس کا بایاں بازو بھی کندھے کے قریب سے جلا ہوا تھا اور ایک ٹانگ پر بھی جلنے کا نشان نظر آرہا تھا۔ آشرم میں آتش زدگی والے واقعے کے بعد سے اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا گیا تھا۔ عام خیال تھا کہ وہ بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ اخبارات نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"مجھے پہچانا بالک!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی سرخ آنکھیں حلقوں میں سے ابلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"تمہیں پہچاننے کے لیے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔ تم جیسے شیطان تو پہلی ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم اس آگ سے کیسے بچ گئے تھے!" میں نے کہا۔

"شیطان کبھی نہیں مرتا اور بھلا آگ شیطان کو کیسے جلا سکتی ہے۔" رگوناتھ نے کہا "اس رات اور اس کے بعد یہاں جو کچھ بھی ہوا اس کے پیش نظر مجھے یہ شہر تو کیا' یہ ملک ہی چھوڑ کر بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن میں اس شخص کو نرک میں پہنچائے بغیر یہاں سے کیسے جا سکتا تھا جس نے میرے سنسار کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا۔ میں تو بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھا مورکھ۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہیں ڈھونڈا ہے۔ اب میں تم سے اپنی بربادی کا انتقام لے سکوں گا۔"

"یہ بھول ہے تمہاری رگوناتھ۔" میں نے کہا "تمہارے آدمی ایک ایسی غلطی کر چکے ہیں جس کا انجام تمہارے حق میں بہت بھیانک ہوگا۔ پہلے تو تم بچ گئے تھے لیکن اب نہیں بچ سکو گے۔"

"میرے ان چیلوں نے تمہیں یہاں لانے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے تلاش تو تمہاری تھی لیکن تمہارے ساتھ یہ ناری..... اسے میں بونس سمجھوں گا۔ میں تو بہت دنوں سے کسی حسین عورت کو دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ میرے چیلوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میں ان سے بہت خوش ہوں۔"

"جس شخص کو یہ ٹیکسی ڈرائیور سمجھ کر چھوڑ آئے ہیں' وہ میرا ساتھی ہے۔ جو کسی بھی وقت یہاں آسکتا ہے اور پھر تم لوگوں کو بھاگنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔" میں نے کہا۔

رگوناتھ ایک لمحے کو چونکا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا پھر ایک خوف ناک قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"شاید تم مجھے بہکانے کی کوشش کر رہے ہو لیکن میں کسی جھانسے میں نہیں آؤں گا۔ آج یہاں ایسا کوئی چمتکار نہیں ہوگا۔ تمہیں بچانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ تمہیں تو میں ایسی بھیانک سزا دوں گا کہ دیکھنے والے بھی تھرا اٹھیں گے۔ تمہارے جسم کے ٹکڑے پورے شہر میں پھیلا دیے جائیں گے جنہیں سمیٹنا بھی مشکل ہو جائے گا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور ہاتھی کی طرح جھولتا ہوا میری طرف بڑھا "دارا بے وقوف ہے۔ کم عقل اور بزدل بھی۔ اپنے ساتھ اتنی شکتی ہونے کے باوجود وہ اب تک تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا لیکن میری شکتی دیکھی تم نے؟ کتنی آسانی سے تم میرے قبضے میں آگئے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب تمہیں مجھ سے نہیں بچا سکے گی۔ پہلے میں تمہارے کان کاٹوں گا پھر ناک پھر ہونٹ۔ اس کے بعد ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں کی باری آئے گی۔ میں ایک ایک انگلی کاٹوں گا جس طرح قسائی بکرے کا ماس کاٹتا ہے۔ بڑا مزہ آئے گا لیکن پہلے میں اس ناری کا گھونٹ تو بھر لوں۔

بڑے، دنوں سے پیاسا ہوں۔ آج میری پیاس بھی بجھ جائے گی۔" وہ تھائی کی طرف مڑ گیا۔

تھائی کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ جب سے وہ میرے ساتھ تھی، ہم بڑے بڑے کٹھن مراحل سے گزرے تھے۔ ہم نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا لیکن یہ صورتِ حال بڑی خوف ناک تھی۔ دو آدمی ہم پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ کچھ کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ کم از کم مجھے گولیوں سے بھون دیتے۔

"یہ تو واقعی بہت سُندر ہے۔" رگوناتھ دو انگلیوں سے تھائی کی ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے بولا۔ تھائی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"اسے ہاتھ مت لگانا راکھشس۔" میں چیخا۔

"ہاں، میں راکھشس ہوں اور کسی راکھشس کو برے کام سے نہیں روکا جا سکتا۔" رگوناتھ نے کہا اور ایک بار پھر تھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

تھائی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ رگوناتھ نے اچانک ہی اس کی قمیص پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ قمیص پھٹ گئی۔ تھائی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو ایک گن مین نے رائفل کی نال میرے پہلو سے لگا دی۔

"اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔" وہ غرایا۔

میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ رگوناتھ نے تھائی کی پھٹی ہوئی قمیص کھینچ کر اس کے جسم سے الگ کر دی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مکروہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ تھائی پیچھے ہٹتی ہوئی دیوار سے جا لگی تھی۔ رگوناتھ آگے بڑھا اور تھائی کو دبوچ لیا۔ تھائی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی اور اسی جدوجہد میں اس نے رگوناتھ کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ رگوناتھ بلبلا اٹھا اور تھائی کو اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کا موقع مل گیا۔ رگوناتھ پھر اس کی طرف لپکا۔

میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر گن مین نے رائفل سے میرے پہلو میں کچوکا دیا۔ میں بے بس ہو کر رہ گیا۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ غصے کی شدت سے دانت بھی اس طرح بھینچ گئے تھے کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا تھا۔

تھائی اپنے آپ کو بچانے کے لیے کمرے میں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی اور رگوناتھ دونوں ہاتھ پھیلائے اس طرح بار بار اس کی طرف لپک رہا تھا جیسے مرغی پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دونوں گن مین قہقہے لگا رہے تھے اور میرا خون کھول رہا تھا۔

بالآخر تھائی رگوناتھ کی گرفت میں آ گئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو سامنے کھڑے ہوئے گن مین نے رائفل کی نال جھکا کر ٹریگر دبا دیا۔ کمرا "تڑتڑاہٹ" کی آواز سے گونج اٹھا۔ کئی گولیاں میرے پیروں کے قریب فرش پر لگی تھیں۔ میں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اب اگر کوئی حرکت کی تو گولیاں تمہارے جسم میں لگیں گی۔" گن مین غرایا۔

میں غصے میں کانپ رہا تھا۔ تھائی کی چیخیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میری قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو قریب کھڑے ہوئے گن مین نے میرے کولہے پر اس زور سے لات ماری کہ میں لڑکھڑا کر رگوناتھ کے قریب فرش پر گرا۔ میری دائیں ٹانگ مڑ گئی تھی۔ رگوناتھ کسی خوں خوار بھیڑیے کی طرح تھائی کو بھنبھوڑ رہا تھا اور تھائی چیخ رہی تھی۔

فرش سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میری نظر اپنی مڑی ہوئی ٹانگ پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ میں نے اس طرح پنڈلی پر ہاتھ رکھ لیا جیسے ٹانگ سیدھی کرنا چاہتا ہوں اور پھر بڑی صفائی سے میں نے پتلون کے پائنچے میں ہاتھ ڈال کر پنڈلی پر فیتے سے بندھا ہوا خنجر کھینچ لیا۔

خنجر ہاتھ میں آتے ہی میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اچھل کر رگوناتھ کی پشت پر پہنچ گیا اور بائیں بازو سے اس کی گردن پر نیک لاک لگا کر خنجر اس کے نرخرے پر رکھ دیا۔

"اب اگر تم میں سے کسی نے حرکت کی تو اس کا گلا کاٹ دوں گا۔" میں چیخا "تم دونوں اپنی رائفلیں پھینک دو۔"

یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ وہ دونوں گن مین کچھ بھی نہیں سمجھ سکے تھے۔ انہیں شاید اس کی توقع بھی نہیں تھی کہ دو رائفلوں کی زد پر ہونے کے باوجود میں کوئی ایسی خطرناک حرکت کروں گا لیکن رگوناتھ کو میری گرفت میں دیکھ کر وہ دونوں بدحواس ہو گئے۔ ایک نے تو رائفل کا رخ میری کھوپڑی کی طرف کر دیا تھا۔

"ان سے کہو ہتھیار پھینک دیں ورنہ میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔" میں رگوناتھ کے کان کے قریب چیخا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خنجر کی نوک سے اس کے سینے پر تقریباً چار انچ لمبی لکیر کھینچ دی اور خنجر کی دھار دوبارہ اس کے نرخرے پر رکھ دی۔ سینے پر اس کی موٹی کھال پر صرف خراش آئی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ بُری طرح چیخنے لگا۔

"میں تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔ ان سے کہو ہتھیار پھینک دیں۔" میں ایک بار پھر چیخا۔

"پھینک دو۔ پھینک دو۔۔۔۔ بندوقیں پھینک دو۔" رگوناتھ کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

انہوں نے رائفلیں پھینک دیں۔

"تم دونوں اس دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ دونوں ہاتھ سر سے اوپر دیوار پر ہونے چاہئیں لیکن اس سے پہلے تم اپنی قمیص اتار کر اس طرف پھینک دو۔ جلدی کرو۔" میں نے کہا۔

میں نے قمیص اتارنے کے لیے لمبے قد والے کو آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔

میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو برہنہ سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔ لمبے قد والے نے قمیص اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ وہ دونوں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ دیوار پر ٹکا دیے تھے۔ میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ اس نے اس آدمی کی قمیص اٹھا کر پہن لی اور دونوں رائفلیں اٹھا لیں۔ ایک رائفل اس نے کندھے پر لٹکا لی تھی اور دوسری دونوں ہاتھوں میں سنبھال لی تھی۔

"اب کہاں گئی تمہاری شکتی رگوناتھ؟" میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم یہ مت سمجھو کہ یہاں سے بچ کر جا سکو گے۔" رگوناتھ نے کہا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے خنجر اس کے گلے سے ہٹا لیا تھا۔ اسے مچلتے دیکھ کر میں نے خنجر کی نوک اس کے دائیں بازو کے مسل پر کھینچ دی۔ اس مرتبہ میں نے پوری قوت استعمال کی تھی۔ تقریباً نصف انچ گہرے اور پانچ انچ لمبے گھاؤ نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ بُری طرح مچل رہا تھا۔ میں نے بایاں بازو اب بھی اس کی گردن میں لپیٹا ہوا تھا۔ میرے بازو کی تکلیف ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ قوت آزمائی سے بازو میں درد شروع ہو گیا تھا۔

سوامی رگوناتھ گینڈے کی طرح طاقت ور تھا۔ اپنے بازو پر گھاؤ کی تکلیف سے وہ بری طرح اچھل رہا تھا اور ایک مرتبہ جب وہ آگے کو جھکا تو میں اس کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل آگے کو جا گرا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا کمرا "تڑتڑاہٹ" کی آواز سے گونج اٹھا۔

رگوناتھ مجھے گرفت میں لینے کے لیے لپکا تھا مگر تھائی نے فائر کھول دیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر کئی گولیاں لگیں اور وہ فرش پر مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کا طوفان امڈ رہا تھا۔

"میں چاہوں تو تمہارا پورا جسم گولیوں سے چھلنی کر دوں۔" تھائی کے لہجے میں بھی بے پناہ نفرت تھی "لیکن موت کے گھاٹ اتار دینا کوئی سزا نہیں۔ سزا تو ایسی ہو جسے آدمی زندگی بھر یاد رکھے اور میں تمہیں ایسی ہی سزا دوں گی۔" اس نے ایک بار پھر رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ اس مرتبہ گولیوں نے رگوناتھ کا دایاں بازو چھلنی کر دیا "تم مرو گے نہیں۔" وہ غرائی "تمہارے یہ غلیظ ہاتھ آئندہ کسی عورت کو نہیں چھو سکیں گے۔" اس نے دوسرا برسٹ رگوناتھ کے بائیں بازو پر مارا۔

رگوناتھ کی چیخوں سے کمرا گونج رہا تھا۔ اس کے دونوں بازوؤں اور دونوں ٹانگوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ فرش پر بچھا ہوا قالین اس کے خون سے تر ہو رہا تھا۔

اس وسیع و عریض کمرے میں، تقریباً آدھے گھنٹے سے ہنگامہ جاری تھا۔ پہلے تھائی چیختی رہی تھی، د اس گن مین نے میرے پیروں کے قریب رائفل کا برسٹ مارا تھا۔ ان دونوں گن مینوں کے قہقہے گونجتے رہے تھے پھر تھائی نے رائفل کے تین برسٹ چلائے تھے اور اب رگوناتھ کی چیخیں گونج رہی تھیں لیکن باہر سے کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق باہر کم از کم دو آدمی موجود تھے۔ ایک وہ جو ہمارے ساتھ کار ڈرائیو کر کے یہاں لایا تھا اور دوسرا وہ جس نے گیٹ کھولا تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی دروازے سے جھانک کر صورتِ حال معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگ غالباً مطمئن تھے کہ میں اور تھائی نہتے تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے یا پھر یہ کمرا ساؤنڈ پروف تھا اور اندر کی کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو میرے دوسرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کمرے میں کوئی روشن دان یا کھڑکی وغیرہ نہیں تھی صرف وہی ایک دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے اور وہ دروازہ بند تھا۔

وہ دونوں آدمی اب بھی دیوار پر ہاتھ ٹکائے کھڑے تھے لیکن وہ دونوں پیچھے مڑ کر دیکھ رہے تھے۔ سوامی رگوناتھ کا حشر دیکھ کر ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ میرا اشارہ پا کر وہ دونوں سیدھے ہو گئے۔

"تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے، دارا کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"وہ پیڈرو کے پاس ہے۔" یہ جواب اس شخص نے دیا تھا جس کی شرٹ اب تھائی نے پہن رکھی تھی "سوامی جی اپنی تباہی کا ذمے دار اسی کو سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلے سارے معاملات ٹھیک ٹھاک چل رہے تھے۔ وہ لوگوں کو دھمکیاں دینے لگا تھا اور انہیں کھل کر بلیک میل کرنے لگا تھا۔ وہ تو شاید سوامی جی کو بھی بلیک میل کر رہا تھا۔ کیونکہ سوامی جی بلاچون و چرا اس کی ہر بات مانتے تھے۔ آشرم میں بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ کسی نے کبھی سوامی جی سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی لیکن دارا تو سوامی جی کو گالیاں بھی دیتا تھا تو وہ خاموش رہتے تھے اور پھر اس رات تم لوگوں نے وہاں ہنگامہ کر دیا۔ سوامی جی کا خیال تھا کہ نہ دارا وہاں آتا اور نہ تم لوگ وہاں آ کر ہنگامہ کرتے۔ ہم سوامی جی کو بڑی مشکل سے وہاں سے نکال لانے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ کئی روز تک تو ہم لوگ وہاں سے آگے بہت دور قدیم شہر کے کھنڈروں میں پڑے رہے اور پھر ہم یہاں آ گئے۔ ہم شہر میں تمہیں اور دارا کو تلاش کرتے رہے۔ دارا کو تو پیڈرو نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ اور آج اتفاق سے ہم نے تمہیں اس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ دیکھ لیا اور پھر تم لوگوں پر قابو پانے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔"

"اور اب تم لوگ ہمارے قابو میں ہو۔" میں نے کہا "اب تم

دونوں ایک بار پھر اس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ ہم یہ دروازہ باہر سے بند کردیں گے۔ بعد میں تمہارے ساتھی تمہیں اس قید سے نجات دلادیں گے۔"

میں نے تھائی سے ایک رائفل لے لی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں اس دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ کمرے کے اندر سے پستول کے سنگل شاٹ کی آواز سنائی دی اور پھر دوسرے ہی لمحے تھائی کی رائفل شعلے اگلنے لگی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہی آدمی ڈھیر ہو چکا تھا جس کے بدن پر قمیص نہیں تھی۔ اس کے بدن پر کئی جگہوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھائی کا پستول تھا۔ ہم سے غلطی یہ ہوئی کہ ان کی تلاشی نہیں لی تھی اور موقع پا کر اس نے تھائی پر گولی چلا دی تھی۔ تھائی تو بچ گئی تھی لیکن وہ خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

دوسرا آدمی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ تھائی نے دوڑ کر مرنے والے کے ہاتھ سے اپنا پستول جھپٹا اور دروازے کی طرف بھاگی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس مرتبہ فائرنگ کی آواز باہر بھی سنائی دی تھی۔ ایک آدمی ہال کی طرف سے دوڑتا ہوا راہداری کے سامنے آگیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے کار ڈرائیو کے فرائض انجام دیے تھے۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے اس کے پیروں کے قریب زمین پر برسٹ مارا۔ وہ چیختا ہوا اچھل پڑا۔ پستول پھینک دیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

تھائی نے کمرے سے باہر آکر دروازہ بند کرکے کنڈا لگا دیا اور ہم دونوں اس آدمی کو رائفلوں کی زد میں لے کر ہال میں آگئے۔

"تمہارا وہ ساتھی کہاں ہے جس نے گیٹ کھولا تھا۔" میں نے رائفل کی نال اس شخص کے سینے کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"وہ ہمارے آنے کے تھوڑی دیر بعد چلا گیا تھا۔ یہاں اب میرے سوا اور کوئی نہیں ہے اور وہ لوگ....." وہ راہداری کی طرف دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا اس کا اشارہ کس طرف تھا۔

"ایک مرچکا ہے۔ دوسرا زندہ ہے اور تمہارا سوامی بے ہوش پڑا ہے۔ ہمارے جانے کے بعد اسپتال پہنچا دینا۔ وہ مرے گا نہیں لیکن اسے ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ گاڑی کی چابی کہاں ہے؟" میں نے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی نظر آرہی تھی۔

"چابی گاڑی ہی میں لگی ہوئی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"چلو۔ باہر کا گیٹ کھولو۔" میں نے حکم دیا۔

وہ بلا چون و چرا ہمارے آگے چل پڑا۔ ہم اب جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ آخری مرتبہ میں نے راہداری میں اس شخص کے پیروں کے قریب فائرنگ کی تھی اور فائرنگ کی آواز دور تک سنی گئی ہوگی۔

تھائی گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں رائفل سنبھالے گیٹ کے قریب آگیا تھا تاکہ وہ شخص کوئی شرارت نہ کرسکے۔ تھائی گاڑی کو ریورس گیئر میں گیٹ سے نکال کر گلی میں لے آئی۔ میں جلدی سے پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور تھائی نے گاڑی کا رخ سیدھا کرکے اسے تیزی سے دوڑا دیا۔

ہم واٹ ٹریمٹ پہنچے تو وہاں سے پتا چلا کہ سب لوگ چائنا ٹاؤن والے جمنازیم میں ہیں۔ مہاراج بھی وہیں گئے ہیں۔ یہ بدھ عبادت گاہ بھی چائنا ٹاؤن ہی کے علاقے میں تھی اور جمنازیم وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

اس وقت اگرچہ رات کا ایک بج چکا تھا۔ اس کے باوجود جمنازیم والی گلی میں بڑا ہجوم لگا ہوا تھا۔ گانگ کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی تھی اور پورے شہر سے مہاراج کے کیمپ سے تعلق رکھنے والے لوگ وہاں جمع ہو رہے تھے۔ گاڑی کو جمنازیم کے گیٹ تک لے جانا ممکن نہیں تھا۔ ہم نے گاڑی ایک طرف روک لی اور رائفلیں اٹھا کر پیدل ہی آگے چلنے لگے۔ لوگ ہمیں خود بخود راستہ دیتے جا رہے تھے۔

ماسٹر ہوچن ہمیں دیکھ کر اچھل پڑا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے ہمارے اغوا کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ مجھے فوراً ہی مہاراج کے پاس لے گیا۔ مہاراج بھی مجھے دیکھ کر چونک گئے۔ میں نے مہاراج کو بو (مارشل آرٹس میں تعظیم دینا) کیا اور دونوں ہاتھ پہلوؤں میں لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی رائفل میں نے تھائی کو دے دی تھی۔

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں کو شکست دے کر آئے ہو۔ کون تھے وہ لوگ؟" مہاراج نے پوچھا۔

"سوامی رگوناتھ کے آدمی تھے۔" میں نے جواب دیا "وہ لوگ ہمیں سوئے تلاد کے ایک عالی شان بنگلے میں لے گئے تھے جہاں سوامی رگوناتھ بھی موجود تھا۔ وہ مجھے اپنے آشرم کی تباہی اور اپنی بربادی کا ذمے دار سمجھتا تھا اور مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ میرے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے تھائی پر دست درازی کی۔ اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس دوران میں مجھے موقع مل گیا۔ تھائی نے رگوناتھ کی ٹانگیں اور بازو چھلنی کردیے لیکن جب ہم وہاں سے نکلے تو وہ اس وقت تک زندہ تھا۔ تاہم ہم ایک لاش بھی وہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔"

"تمہارے اغوا کی اطلاع ملتے ہی تین چار پارٹیاں تم لوگوں کی تلاش میں روانہ ہوگئی تھیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اس کار کا نمبر بتا دیا تھا جس میں تم لوگوں کو اغوا کرکے لے جایا گیا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ کار کئی روز تک سڑکوں پر نظر نہیں آئے گی۔" مہاراج نے کہا۔

"وہ کار اس وقت ہمارے قبضے میں ہے مہاراج۔" میں نے کہا۔

"وہاں سے نکلنے کے لیے ہمیں یہی ایک سواری مل سکی تھی۔ وہ کار گلی کے موڑ پر کھڑی ہے۔"

"اوہ۔" مہاراج کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے پھر ماسٹر ہوچن کو اشارہ کیا۔ ماسٹر ہوچن نے ایک اور لڑکے کو اشارہ کردیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

"مجھے گانگ کی موت کا افسوس ہے مہاراج۔" میں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ اسے پیڈرو کے بھائی سامی نے قتل کیا ہے۔ میں جب تک سامی کو تڑپا تڑپا کر نہیں ماروں گا' مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"یہاں پر موجود ہر لڑکے نے یہی عہد کیا ہے کہ وہ گانگ کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لے گا لیکن تمہیں کس نے بتایا کہ گانگ کو سامی نے قتل کیا ہے؟" مہاراج نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اسی ٹیکسی ڈرائیور نے۔" میں نے جواب دیا "وہ ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہے مہاراج' وہ دراصل رامن پرساد کا دوست ہے۔ اسی کی طرح قابلِ اعتماد اور وفادار۔ وہ میرے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ دارا اور پیڈرو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے سن شائن کیسینو گیا تھا۔ اس نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی اور میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ بکمدر بھی وہاں گیا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی اطلاع نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ تمہارے بنگلے پر پہنچ چکا ہے۔ اب تم بھی جاؤ اور اپنا خیال رکھو۔ تمہارے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" مہاراج نے کہا۔

"گانگ کی آخری رسومات مہاراج ....." میں نے کہا "میں اس کی آخری رسومات میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری طرف سے پھول چڑھا دیے جائیں گے۔" مہاراج نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ مہاراج اب نہیں چاہتے تھے کہ میں زیادہ دیر وہاں رکوں۔ انہوں نے ماسٹر ہوچن کو اشارہ بھی کردیا تھا۔ ماسٹر ہوچن نے میرے بازو کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میں نے مہاراج کو بو کیا اور تھائی کو اشارہ کرتا ہوا ماسٹر ہوچن کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

جمنازیم کے اندر اور باہر گلی میں جمع لڑکوں میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی ایسی چیز تھی جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔

گلی کے موڑ پر وہ کار موجود نہیں تھی۔ ماسٹر ہوچن ہمیں لے کر پچھلی گلی میں آگیا۔ وہاں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں اور کئی لڑکے بھی موجود تھے۔ ماسٹر ہوچن نے ایک لڑکے کو بلا کر کچھ کہا اور میری طرف مڑ کر بولا۔

"دو تین دن تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم لوگ اپنے بنگلے سے باہر نہیں نکلو گے۔ تمہیں خبریں ملتی رہیں گی۔"

میں نے ماسٹر ہوچن کو بو کیا اور اس لڑکے کے ساتھ ایک وین میں بیٹھ گیا۔ چار اور لڑکے بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے تھے۔ وین حرکت میں آئی اور گلی سے نکل کر مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

وین نے پھرا پوک کلاڈ برج سے دریا پار کیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر یہ سڑک میموریل برج والی سڑک سے مل گئی۔ یہاں دراصل دریا پر دو پل تھے جو اس کنارے سے انگریزی کے حرف "وی" کی شکل میں دوسرے کنارے پر مختلف سمتوں کی طرف جانے والی سڑکوں سے مل جاتے تھے۔

ہمیں ٹاکسن اسکوائر کی طرف نہیں جانا پڑا اور پھر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وین ایک گلی میں داخل ہو کر ڈاکٹر جانکی والے بنگلے کے سامنے ہی رکی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ ہماری منزل یہ بنگلا ہی ہے؟" میں نے وین ڈرائیو کرنے والے لڑکے سے پوچھا۔

"مہاراج نے تمہاری حفاظت کا بہت معقول بندوبست کر رکھا ہے لٹل ماسٹر۔" لڑکے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہمارے کیمپ کی ایک مخصوص پارٹی کا کوئی نہ کوئی لڑکا چوبیس گھنٹے بنگلے کے آس پاس موجود رہتا ہے۔"

یہ میرے لیے واقعی ایک دلچسپ انکشاف تھا۔

بنگلے کا گیٹ سکھدر نے کھولا تھا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ہماری آواز سن کر پرساد نوتا اور جانکی بھی برآمدے میں آگئے تھے۔ ہمارے ہاتھوں میں رائفلیں دیکھ کر ان تینوں کے چہروں پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"تم لوگوں کے اغوا کی خبر سن کر تو ہم پریشان ہوگئے تھے۔" جانکی نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ہوچن نے خیریت کی اطلاع دی تو ہمیں سکون ملا۔"

"اوہ۔" میں نے کہا "تم لوگوں کو ہماری واپسی کی خبر مل گئی تھی اسی لیے اطمینان سے کھڑے ہو۔"

"واہ۔" جانکی نے اٹھلا کر کہا "اتنی دیر تک جو سولی پر ٹنگے رہے وہ کسی شمار میں ہی نہیں۔ یہ پرساد تو تم لوگوں کی تلاش میں نکل رہا تھا ہم نے بڑی مشکل سے اسے روکا تھا۔"

"اچھا۔ ہم سب سے پہلے تو کافی پینا پسند کریں گے۔ اس کے بعد کوئی اور بات ہوگی۔" میں نے ہال میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ رائفل میں نے دیوار کے ساتھ ٹکا دی تھی۔

تھائی وہاں رکے بغیر اپنے کمرے میں گھس گئی۔ وہ تقریباً بیس منٹ بعد باہر نکلی۔ اس نے نہا کر کپڑے بدل لیے تھے۔ جب سے رگوناتھ نے اس کے بدن کو چھوا تھا' وہ ایک عجیب سی گھن محسوس کرتی رہی تھی۔ اس بنگلے سے واٹ ٹریمٹ کی طرف جاتے ہوئے وہ راستے میں کئی بار اس کراہت کا اظہار کرچکی تھی۔

اس دوران میں جانکی کافی بنا کر لے آئی اور تھائی وانگ انہیں اغوا اور وہاں سے فرار کی تفصیل بتانے لگی۔ اس وقت سکندر بھی ہمارے پاس موجود تھا اور وہ بڑی توجہ سے باتیں سن رہا تھا۔ تھائی نے جب رگوناتھ کی دست درازی کا ذکر کیا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت رگوناتھ کہیں سامنے ہوتا تو سکندر اس کی گردن مروڑ دیتا۔

"وہ راکھشس ابھی زندہ ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ شاید وہ اپنے آشرم کی آگ میں جل کر راکھ ہوگیا ہوگا۔" جانکی تھائی کے خاموش ہونے پر بولی۔

"ایسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔" تھائی نے جواب دیا "وہ زندہ تو اب بھی رہے گا لیکن اب وہ کسی عورت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"

اور اس کی تفصیل میں نے بتائی تھی کہ رگوناتھ اب کسی عورت کو ہاتھ کیوں نہیں لگا سکے گا۔

"اوہ۔" جانکی بولی "تو گویا تم میں اتنا حوصلہ پیدا ہوگیا ہے کہ کسی کو خاک و خون میں لوٹا سکو؟"

"میں بزدل کب تھی؟" تھائی نے اسے گھورا۔

"ہاں۔ یہ بات تو درست ہے کہ اگر تم بزدل ہوتیں تو آج زندہ بھی نہ ہوتیں۔" جانکی نے کہا۔

نوینا اور پرساد بھی خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ جب تھائی اور جانکی کی نوک جھوک ختم ہوگئی تو پرساد نے سکندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سکندر کے پاس ایک دلچسپ اطلاع ہے۔ میرا خیال ہے اگر ہم کل کسی طرح اس کی تصدیق کرلیں تو پرسوں یا اس سے اگلے روز ایکشن کرسکتے ہیں۔"

"اور وہ اطلاع شاید یہ ہے کہ گانگ کو پیڈرو کے بھائی سوامی نے قتل کیا ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے سکندر کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" سکندر نے اثبات میں سرہلایا "سن شائن کیسینو میں داخل ہونے کے چند منٹ بعد میں نے پیڈرو کے چھوٹے بھائی کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے دو منٹ بعد گانگ بھی کیسینو میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اوپر والے ہال میں چلا گیا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں کسی ہنگامے کا منتظر تھا اور اپنے آپ کو صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار کرلیا تھا۔ تقریباً تین منٹ بعد اوپر والے ہال سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد کوئی شخص سیڑھیوں پر لڑھکتا ہوا نیچے آن گرا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں زینے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ زینے سے گرنے والے شخص کا چہرہ دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ وہ گانگ تھا۔ اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک پیشانی پر اور دو سینے پر۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں نے فوراً ہی زینے کی طرف چھلانگ لگادی اور اوپر والے ہال میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی رولٹ مشینیں وغیرہ لگی ہوئی تھیں لیکن اس وقت وہاں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ عورتیں بری طرح چیخ رہی تھیں۔ کچھ لوگ زیریں ہال کی طرف دوڑنے لگے اور کچھ عقبی زینے کی طرف۔

"اس ہال کے ایک حصے میں کیسینو کا دفتر بھی ہے۔ میں نے سامی کو دفتر والی راہداری کی طرف بھاگتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گانگ کو اسی نے قتل کیا تھا۔ میں سامی کے پیچھے لپکا لیکن اس دوران میں وہ منیجر کے دفتر میں گھس چکا تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کرلیا تھا۔ میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا اور بالآخر میں نے کندھے سے ٹکریں مار کر دروازہ توڑ دیا لیکن کمرا خالی تھا۔ دوسری طرف ایک اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اس طرف لپکا۔

"وہ تنگ سا زینہ تھا۔ میں سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا عقبی گلی میں پہنچ گیا۔ سامی تقریباً پچاس گز آگے ایک کار میں بیٹھ رہا تھا۔ میں کار کی طرف دوڑا لیکن وہ کار بڑی تیزی سے وہاں سے روانہ ہوچکی تھی۔ میری کار دوسری طرف کھڑی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اپنی کار تک پہنچ گیا اور جب میں کار ڈرائیو کرتے ہوئے اوپر سے گھوم کر مین روڈ پر آیا تو سامی کی کار غائب ہوچکی تھی۔ مجھے بہرحال اندازہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔ میں نے اپنی کار سوکھم واٹ روڈ کی طرف دوڑا دی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ سامی کی کار سوکھم وٹ سوئے ٹوئنٹی سکس پر واقع کلب ٹوئنٹی سکس کے پارکنگ لاٹ پر موجود تھی۔ میں اپنی کار سے اتر کر کلب میں داخل ہوگیا۔ وہاں صورت حال معمول کے مطابق تھی۔ لوگ انجوائے کررہے تھے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد وہاں کھلبلی سی مچ گئی۔ پیڈرو کے گرگے اِدھر اُدھر پوزیشن سنبھال رہے تھے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ پیڈرو بھی وہیں پر موجود تھا۔ سامی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا اور پیڈرو نے کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے انتظامات شروع کردیے تھے۔

"میں تقریباً ایک گھنٹا وہاں رہا اور پھر مجھے پتا چلا کہ سامی کو پچھلے دروازے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نے کلب کے باہر ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے مہاراج کو فون کیا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں گانگ کے قتل کی اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے وقوعے سے دور ہی رہنے کے لیے کہا گیا تھا۔ میں نے یہاں فون کیا تو پتا چلا کہ تم بھی میڈم تھائی کے ساتھ سن شائن کیسینو کی طرف جاچکے ہو۔ میں نے کیسینو کی طرف دوڑ لگادی اور پھر تمہیں ماسٹر ہوچن کے ساتھ دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا۔ بعد میں، میں نے تم دونوں کو پاتھم کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اب تم

لوگ واپس گھر ہی جاؤ گے۔ میں ایک مرتبہ پھر کلب ٹوئنٹی سکس پہنچ گیا لیکن وہاں کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ میں تقریباً ایک گھنٹا وہاں رہا پھر واپس آگیا۔ یہاں آکر پتا چلا کہ تم دونوں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ پاتھم نے میڈم جانکی کو فون پر تم لوگوں کے اغوا کی اطلاع دی تھی۔ میں نے مہاراج کو فون کیا۔ انہیں بھی پاتھم ہی سے تمہارے اغوا کی اطلاع مل گئی تھی۔ مہاراج نے بتایا کہ تین پارٹیاں تمہاری تلاش میں نکل چکی ہیں اور مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں بنگلے پر ہی رہوں۔ ہوسکتا ہے کسی وقت میری ضرورت پڑ جائے۔ تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ماسٹر ہوچن نے فون پر بتا دیا تھا کہ تم واپس آگئے ہو اور تھوڑی دیر میں بنگلے پر پہنچنے والے ہو۔"

"تمہارے خیال میں سامی کہاں جاسکتا ہے؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"یہ معلوم کرنا پڑے گا۔" سکندر نے جواب دیا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ میں پاتھم کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی پھر میں نے فون کا ریسیور اٹھا کر اس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے فون بند کردیا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گانگ ہم سب کا دوست تھا۔ اس کے قتل سے ہم سب کو گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ مجھ سے تو اس کی کچھ زیادہ ہی قربت تھی۔ ہم کئی معرکوں میں ساتھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ باربار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

وہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ صبح پانچ بجے کے قریب میں بڑی آہستگی سے بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ ہال میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں چونک گیا۔ جانکی دیوی صوفے پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کی ساڑی ٹانگوں پر سے اوپر کھسکی ہوئی تھی۔ پلو بھی نیچے گرا ہوا تھا، اس کا پیٹ اور سینہ بھی برہنہ ہو رہا تھا۔ میں صوفے کے قریب رک گیا اور جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

میری کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ سینے میں گدگدی سی اٹھی جو پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ سانس کی رفتار تیز ہوگئی اور کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ میں کبھی جانکی کے حسین چہرے کو دیکھتا، کبھی اس کے سینے کو اور کبھی میری نظریں اس کے پیٹ اور ٹانگوں پر رینگنے لگتیں۔ میرا دل چاہنے لگا کہ میں آگے بڑھ کر اس کے بدن کو چھولوں۔

شاید میں اپنے اس ارادے پر عمل بھی کرڈالتا کہ یکایک جانکی کسمسائی۔ اس نے کروٹ لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ آگئی۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے والا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

باہر کی ٹھنڈی اور خنک فضا میں شبنم آلود گھاس پر ٹہلتے ہوئے بھی میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ میں باربار دونوں ہتھیلیوں سے کنپٹیاں سہلا رہا تھا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔ پچھلے چند روز سے میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے میرے اندر کوئی ہلچل سی مچ رہی ہو۔ کوئی طوفان سر اٹھانے کی کوشش کررہا ہو۔ ایسے موقع پر میری سانس بے قابو ہوجاتی۔ کنپٹیاں سلگنے لگتیں اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتیں اور پھر ایک میٹھا سا درد میرے پورے جسم میں پھیلتا چلا جاتا۔

تھائی وانگ، جانکی اور نوینا کو کئی مرتبہ میں نے ایسی حالت میں دیکھا تھا لیکن میرے سینے میں کوئی امنگ نہیں مچلی تھی۔ سانس بے قابو نہیں ہوئی تھی۔ سینے میں ایسا میٹھا میٹھا سا درد نہیں جاگا تھا لیکن چند روز سے یہ تبدیلی میرے لیے پریشان کن تھی۔

میں دیر تک لان میں ٹہلتا رہا۔ اس دوران میں، میں نے جانکی کے کمرے کی بتی جلتے ہوئے دیکھی۔ وہ ہال سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ باہر گلی میں لوگوں کی آمدورفت شروع ہوچکی تھی۔ ایک دو گاڑیوں کے گزرنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں لان سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا سکندر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندر داخل ہوکر دروازہ بولٹ کردیا۔ راہداری کی طرف بڑھتے ہوئے میری نظریں بے اختیار ہال کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ صوفہ خالی تھا جہاں ایک گھنٹا پہلے میں نے جانکی کو سوئے ہوئے دیکھا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آگیا۔ تھائی گہری نیند سو رہی تھی۔ میں بیڈ کے بجائے سیٹی پر لیٹ گیا اور پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگی تھی۔

میں سوکر اٹھا تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ میں صبح ناشتا کیے بغیر سوگیا تھا اور اب بھوک سے پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی اور میرا خیال ہے میری آنکھ بھی بھوک ہی کی وجہ سے کھلی تھی۔ سر بھی بوجھل سا ہو رہا تھا۔ میں باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے اگرچہ میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا لیکن پیٹ میں اینٹھن اپنی جگہ پر موجود تھی۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو کھانے کی اشتہا آمیز خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ جانکی اور نوینا میز پر کھانا لگا رہی تھیں۔ تھائی کچن میں تھی۔ ہال میں ایک صوفے پر پرساد اور پاتھم بیٹھے باتیں کررہے تھے۔

"تم کہاں غائب تھے۔ کل رات میں نے فون بھی کیا تھا۔" میں نے پاٹھم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور صوفے کے بجائے ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"صبح میں نے فون کیا تھا تو تم سو رہے تھے۔" پاٹھم نے جواب دیا۔

میں نے کچن کی طرف دیکھا۔ اس مرتبہ جانگی کے ساتھ تھائی بھی باہر آگئی تھی اور پھر سب لوگ ڈائننگ میز کے گرد جمع ہوگئے۔ سکھدر کو بھی بلا لیا گیا۔

"کل رات۔" پاٹھم نے بات شروع کرتے ہوئے کہا "میں تم لوگوں کے بارے میں خاصا پریشان تھا لیکن ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے جب پتا چل گیا کہ تم لوگ واپس آگئے ہو تو میں کلب ٹونٹی سکس کی طرف چلا گیا۔ اس وقت تک بھاگ دوڑ سے مجھے پتا چل گیا تھا کہ پیڈرو کلب ٹونٹی سکس میں ہی ہے اور مجھے یقین تھا کہ سای بھی وہیں پہنچا ہوگا۔

"اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے گاڑی پارکنگ میں روکی ہی تھی کہ پارکنگ کی عقبی سمت سے ایک کار نکلتی ہوئی نظر آئی۔ اس طرف اگرچہ روشنی ہلکی تھی لیکن میں نے کار کی پسنجرز سیٹ پر سای کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ پچھلی سیٹ پر دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے اور میرا خیال ہے وہ اس کے باڈی گارڈز تھے۔

"میں نے اپنی گاڑی دوبارہ پارکنگ سے نکال لی اور ان کا تعاقب شروع کردیا۔ میرے پاس چونکہ ٹیکسی تھی اس لیے انہیں کوئی شبہ نہیں ہوسکا تھا۔ ایک موقع پر میں اپنی ٹیکسی اس کار کے برابر سے آگے نکال لے گیا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو پہچان لیا اور پھر اپنی گاڑی کو سائڈ پر لیتا چلا گیا اور انہیں آگے نکل جانے کا موقع دے دیا۔

"نیران گرینڈ ہوٹل والے چوراہے پر ایک حادثہ ہوا تھا جس کی وجہ سے روڈ بلاک ہو رہی تھی۔ سای کی گاڑی تو نکل گئی لیکن میری گاڑی پھنس گئی۔ کئی منٹ بعد جب مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع ملا تو سای کی گاڑی غائب ہوچکی تھی۔ میں نے مختلف سڑکوں پر اسے تلاش کیا لیکن کوئی سراغ نہیں ملا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ سوای رگوناتھ کے آشرم والی سڑک پر گئے ہوں گے۔"

"لیکن وہ آشرم تو جل کر راکھ ہوچکا ہے اور وہاں اب کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس طرف کا کچھ علاقہ پہاڑیوں پر مشتمل ہے اور ان پہاڑیوں میں ایسے غار ہیں جنہیں پناہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ پیڈرو نے اپنے بھائی کو کسی ایسی ہی محفوظ جگہ پر بھیج دیا ہے جس کے بارے میں کسی کو شبہ نہ ہوسکے۔" پاٹھم نے بتایا۔

"لیکن ان پہاڑیوں میں کسی کو تلاش کرلینا آسان نہیں ہے۔" سکھدر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "وہ علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ وہاں لاتعداد غار ہیں اور بعض غار تو ایسے ہیں جن کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر ہم انہیں پہاڑیوں میں تلاش کرنے کی کوشش بھی کریں تو کامیاب نہیں ہوسکتے۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم ان کی نظروں میں آجائیں۔ اس طرح وہ تو ہمیں آسانی سے ختم کردیں گے لیکن ہم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"سکھدر ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا "اس طرح بھٹکنے سے بہتر ہے کہ پہلے ان کا صحیح ٹھکانا معلوم کیا جائے۔ تم نے کہا تھا کہ تم نے سای کے ڈرائیور کو پہچان لیا تھا۔ اگر وہ ہماری گرفت میں آجائے تو اس سے سای کی خفیہ پناہ گاہ کا پتا معلوم کیا جاسکتا ہے۔"

"وہ میری ورکشاپ کے قریب ہی ایک اور ورکشاپ میں دو تین مرتبہ اپنی گاڑی ٹھیک کرانے کے لیے آچکا ہے۔ اب یہ تو پتا چل گیا ہے کہ اس کا تعلق پیڈرو کے گروہ سے ہے۔ میں ایک دو روز میں اس کا پتا چلالوں گا اور پھر اس سے زبان کھلوانا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"تم اسے تلاش کرلو۔ اس کی زبان میں کھلوالوں گا۔" سکھدر نے کہا۔

"میں ایک دو دن میں اسے تلاش کرلوں گا۔" پاٹھم نے کہا۔

"ماسٹر ہوچن کی طرف سے کوئی اطلاع؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے تھائی اور جانگی کی طرف دیکھا۔

"ماسٹر ہوچن کا فون آیا تھا۔" تھائی نے جواب دیا "کانگ کی آخری رسومات آج صبح دس بجے انجام دی جاچکی ہیں۔ لوگ ہنگامہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مہاراج نے بڑی مشکل سے انہیں روکا تھا۔ وہ کوئی ہنگامہ نہیں چاہتے۔ وہ صرف اس شخص کو سزا دینا چاہتے ہیں جو کانگ کے قتل کا ذمے دار ہے۔"

"میرا خیال ہے مہاراج ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد بھی ہم دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چھ بجے کے قریب پاٹھم جانے لگا تو سکھدر بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

"باس۔" پرساد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "جانگی دیوی کے علاج، نویتا کی دیکھ بھال اور تم دونوں کی دعاؤں سے اب میں بالکل ٹھیک ہوگیا ہوں اور میرا خیال ہے اب میں مفت کی روٹیاں توڑ رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "اور اب وقت آگیا ہے کہ مجھے تمہاری ضرورت پڑسکتی ہے لیکن اب تم اکیلے باہر نہیں نکل سکتے۔"

"نکل سکتا ہوں باس۔" پرساد نے جواب دیا "اتنے دن گھر میں قید ہوکر بیٹھا رہا ہوں تو وہ میری مجبوری تھی لیکن اب چھپ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں آج رات ہی باہر نکلوں گا اور ان تمام جگہوں کا

چکر لگا کر آؤں گا جہاں جہاں پیڈرو سے سامنا ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے اور تم مجھے جانے سے نہیں روکو گے۔"

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ میں پرساد کو نہیں روک سکتا تھا۔ روکنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ چھپ کر بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سوائے وقت ضائع کرنے کے۔ میں نے بھی یہ طے کرلیا تھا کہ ضرورت پڑی تو میں بھی باہر ضرور نکلوں گا۔

رات آٹھ بجے کے قریب پرساد چلا گیا۔ اس وقت تھائی اور نویتا لان میں بیٹھی ہوئی تھیں اور جانگی اندر ہی مختلف کاموں میں مصروف تھی۔ وہ کبھی کچن میں جاتی، کبھی اپنے کمرے میں اور کبھی میرے کمرے میں۔ اس دوران میں وہ کئی مرتبہ میرے سامنے سے گزری تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نظریں کچھ بدلی بدلی سی تھیں۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آجاتی۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بھی بے پروا نظر آرہی تھی۔ اس کی ساڑی کا پلو نیچے لٹک رہا تھا اور اس نے ایک مرتبہ بھی اسے درست کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جب تھائی اور نویتا اندر آگئیں تو جانگی نے ساڑی کا پلو کندھے پر ڈال لیا تھا۔

تین دن گزر گئے۔ حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گویا ایک جمود سا طاری تھا۔ پیڈرو کے کیمپ میں بھی خاموشی تھی اور مہاراج کے کیمپ میں بھی لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ دونوں طرف اندر ہی اندر کوئی کھچڑی ضرور پک رہی تھی اور یہ خاموشی اپنے اندر کوئی ایسا زبردست طوفان چھپائے ہوئے تھی جو کسی وقت اچانک ہی پھٹ پڑے گا۔

چوتھے روز ایک معمولی سا ہنگامہ ہوا۔ ماسٹر ہوچن کے لڑکوں اور پیڈرو کے غنڈوں میں تصادم ہوگیا تھا۔ دونوں طرف کے دو دو، تین تین آدمی زخمی ہوئے تھے۔ پولیس اسٹیشن وہاں سے قریب ہی تھا۔ پولیس ہنگامے کی اطلاع ملتے ہی پہنچ گئی تھی۔ دونوں طرف کے لوگ بھاگ گئے تھے۔ اس طرح ہنگامہ زیادہ نہیں بڑھ سکا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

اور پھر اسی رات گیارہ بجے کے قریب پاٹھم نے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ اس نے مطلوبہ ڈرائیور کا پتا چلالیا ہے اور میں فوراً "وائی ایم سی اے" بلڈنگ کے سامنے پہنچ جاؤں۔ یہ اطلاع ملتے ہی میں تیار ہوگیا۔ اس وقت سکھدر بھی گھر پر موجود تھا۔ میں نے اسے بھی تیار ہونے کو کہا اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ تھائی نے میرے ساتھ جانے کے لیے ضد نہیں کی تھی اور پھر اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔ وہ بار بار اپنی پیٹھ کھجا رہی تھی۔

میں نے اپنا خنجر بھی پنڈلی سے باندھ لیا تھا اور تھائی کا پستول بھی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ پرساد بھی اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ تھائی اور جانگی نے رائفلیں تیار کرکے رکھ لیں تاکہ ہماری عدم موجودگی میں کوئی گڑبڑ ہو تو وہ اپنا دفاع کرسکیں۔

پاٹھم والی گاڑی موجود تھی۔ سکھدر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے بڑی شدت سے احساس ہوا تھا کہ مجھے ڈرائیونگ سیکھ لینی چاہیے۔ میں اس معاملے میں دوسروں کا محتاج تھا۔

وراچک روڈ پر "وائی ایم سی اے" تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ عمارت سے ذرا آگے ایک گلی کے موڑ پر ٹیکسی کے قریب ہی پاٹھم بھی موجود تھا۔ سکھدر نے ٹیکسی کے قریب ہی گاڑی روک لی۔ اس نے انجن بند کردیا اور ہم دونوں نیچے اتر آئے۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پاٹھم کا سامنا ہوتے ہی پوچھا۔

"وہ اس طرف ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں ہے۔" پاٹھم نے گلی کی طرف اشارہ کیا "وہ گاڑی گیراج میں بند کرکے آیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی ڈیوٹی ختم ہوچکی ہے اور وہ رات کو اس فلیٹ میں ہی رہے گا۔ اس کا نام تھونگ ہے اور وہ فلیٹ میں اکیلا ہی ہے۔"

ہم تینوں گلی میں چل پڑے اور چند گز کے بعد دائیں طرف مڑ گئے۔ یہ تقریباً بیس فٹ چوڑی سڑک تھی۔ ایک طرف پارک تھا اور دوسری طرف ایک دوسرے سے ملی ہوئی بلند و بالا رہائشی عمارتیں تھیں۔ پاٹھم تیسری عمارت کے گیٹ میں گھس گیا۔ عمارت بہت پرانی تھی۔ لوہے کے جنگلے والا گیٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں تھا۔ کافی کشادہ لابی تھی۔ ایک دیوار پر لاتعداد لیٹر بکس لگے ہوئے تھے۔ ہر لیٹر بکس پر متعلقہ فلیٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا اور ہر بکس کے ساتھ کال بیل کا بٹن بھی لگا ہوا تھا۔

سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی سی تھیں۔ لابی اور سیڑھیوں پر بکھری ہوئی گندگی اور کوڑے سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ نہ تو اس عمارت کی مناسب دیکھ بھال ہوتی تھی اور نہ ہی مکینوں کو صفائی وغیرہ سے کوئی دلچسپی تھی۔ صرف لابی میں ایک بلب روشن تھا جبکہ سیڑھیوں پر تاریکی تھی۔

پاٹھم تیسری منزل کی راہداری میں مڑ گیا۔ راہداری کے آخری سرے پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ وہ ایک دروازے کے سامنے رک گیا۔ میں نے پاٹھم اور سکھدر کو اشارہ کیا۔ وہ دائیں بائیں دیوار کے ساتھ چپک گئے۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ایک منٹ کے انتظار کے بعد میں نے دوبارہ دستک دی۔ اس مرتبہ اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو تھونگ۔ تمہارے لیے پیڈرو کا ایک پیغام ہے۔" میں نے کہا۔

اندر سے کچھ بڑبڑانے کی آواز سنائی دی پھر بولٹ ہٹایا گیا اور دروازہ ایک بالشت کے قریب کھل گیا۔ کمرے میں بلب جل رہا

تھا۔ اس کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ درمیانے قد کے بھاری بھرکم تھونگ نامی اس شخص نے جسم کے نچلے حصے پر تولیا لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ لباس نام کی کوئی چیز اس کے جسم پر نہیں تھی۔ تھونگ کی نظریں میرے چہرے پر تھیں اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے غالباً مجھے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا اور وہ مجھے پہچان گیا تھا۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر میں نے پیر پھنسا دیا۔

"کک.... کون ہو تم اور.... یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ ہکلایا۔

"تم سے ملنے۔" میں نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے چہرے پر ہتھیلی سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑا گیا۔ پاتھم اور سکھدر بھی اندر آ گئے۔ پاتھم نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"یہاں اور کون ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ اس کے جسم پر صرف تولیا اور دائیں گال پر لپ اسٹک سے بنا ہوا ہونٹوں کا نشان دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ اندر اس کے علاوہ اور کون ہے اور وہ کیا کر رہا تھا۔

"کک.... کک.... کوئی نہیں.... اندر کوئی نہیں ہے۔ تم.... تم یہاں کیوں آئے ہو؟" وہ خوف سے ہولے ہولے کانپنے لگا۔

"تھونگ.... تم وہاں کیا کر رہے ہو۔ باہر کون ہے؟" اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

میں نے تھونگ کے منہ پر زوردار گھونسا مار دیا۔ وہ چیخ کر گرا۔ اٹھتے ہوئے وہ ایک ہاتھ سے تولیا سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے ہونٹ پونچھ رہا تھا جہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی اٹھا' میں نے ایک زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دائیں طرف کے ایک دروازے میں گرا اور میں جیسے ہی آگے بڑھا' میری نظر اس لڑکی پر پڑی جو بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ پہلے تھونگ کو اندر کی طرف گرتے اور پھر مجھے دروازے میں دیکھ کر اس لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بدحواسی میں بیڈ کے قریب کرسی پر پڑے ہوئے اپنے لباس کی طرف لپکی لیکن سکھدر نے بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہو کر اسے دبوچ لیا۔ لڑکی کے منہ سے نکلنے والی چیخ ادھوری رہ گئی۔ سکھدر نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا لیا تھا۔

"اسے چھوڑ دو اور اگر یہ دوبارہ چیخنے کی کوشش کرے تو بے شک اس کا گلا گھونٹ دینا۔" میں نے سکھدر سے کہا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "لباس پہن کر خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ جاؤ۔ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو یہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

سکھدر نے لڑکی کو چھوڑ دیا۔ وہ خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ اس نے الٹا سیدھا لباس پہنا اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اب بھی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"تم بھی کپڑے پہنو۔" میں نے تھونگ کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

تھونگ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تولیا اس کے جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ وہ بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب فرش پر پڑی ہوئی پتلون اٹھا کر پہننے لگا۔ دراصل میں اس لڑکی کی موجودگی میں تھونگ سے سامی کے بارے میں کچھ پوچھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی میں لڑکی کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔

"بس۔ یہ پتلون ہی کافی ہے۔ تمہیں مزید لباس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا اور پھر سکھدر کی طرف متوجہ ہو گیا "اس لڑکی کے ہاتھ پیر باندھ کر یہاں ڈال دو۔ صبح کوئی نہ کوئی فلیٹ میں آ کر اسے کھول دے گا۔"

سکھدر نے حکم کی تعمیل میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا اور تھونگ کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ پاتھم نے باہر کا دروازہ کھول کر راہداری میں جھانکا اور ہمیں اشارہ کر دیا۔ ہم فلیٹ سے باہر آ گئے۔ پاتھم نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔

پاتھم کے ورکشاپ تک پہنچنے میں بھی ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پاتھم کی ٹیکسی آگے تھی اور میں دوسری گاڑی میں تھونگ کو پستول کی زد میں لیے بیٹھا تھا جبکہ سکھدر ڈرائیو کر رہا تھا۔

تھونگ کو ہم ورکشاپ کے پچھلے حصے میں ایک کمرے میں لے آئے۔ یہاں مدھم روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ کمرے میں گاڑیوں کے ناکارہ پرزے بکھرے ہوئے تھے۔

"ہم تم سے صرف ایک بات پوچھنے کے لیے یہاں لائے ہیں۔" میں نے تھونگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پستول جیب میں رکھ کر پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا "پیڈرو کا بھائی سامی کہاں ہے؟"

"مم.... میں نہیں جانتا...." تھونگ ہکلایا "میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تم اسے چار دن پہلے رات کے وقت کہیں چھوڑ کر آئے تھے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "کہاں لے کر گئے تھے اسے۔ کہاں چھپا ہوا ہے وہ؟"

"مم۔ مجھے نہیں معلوم...." خوف کی شدت سے اس کے منہ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے خنجر کی نوک سے اس کے سینے پر ایک لمبی سی لکیر کھینچ دی۔ وہ چیخنے لگا تو سکھدر نے جلدی سے اس کا منہ دبا دیا۔

"میں تمہارے جسم پر اس طرح سرخ لکیروں کا جال بنا دوں گا۔ تمہارا سارا خون بہہ جائے گا اور تم ختم ہو جاؤ گے۔" میں نے ایک اور لکیر کھینچ دی۔

وہ بری طرح مچلنے لگا۔ میرے اشارے پر سکھدر نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"مم۔ میں نہیں جانتا.... پپ.... پیڈرو مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" تھونگ نے کہا۔

"زندہ تو تمہیں میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے سکھدر کو اشارہ کیا اور اس مرتبہ میں نے تھونگ کے پیٹ پر ایک گہری لکیر کھینچی تھی۔ وہ بری طرح تڑپا۔ میں نے دو تین لکیریں اور کھینچ دیں۔ وہ ٹانگیں جھٹک رہا تھا اور اس کے پیروں کی رگڑ سے مٹی اڑ رہی تھی۔ مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔ میری نظروں کے سامنے گانگ کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ تھونگ پر رحم کر کے میں گانگ کے قاتل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سکھدر نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا لیکن اس مرتبہ بھی اس کا جواب وہی تھا۔ میرے ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھ کر سکھدر نے ایک بار پھر اس کا منہ دبا دیا اور اس مرتبہ میں نے اس کے دونوں بازوؤں پر سرخ لکیروں کے جال بنا دیے۔ اگر اس کا منہ بند نہ ہوتا تو اس کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی ہوتیں۔ تھوڑی دیر بعد سکھدر نے پھر اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"اب میں آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔" میں نے تھونگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب اگر تم نے جواب نہ دیا تو یہ خنجر تمہارے نرخرے پر چلے گا۔"

"بب.... بتاتا ہوں۔" اس کے منہ سے آواز بڑی مشکل سے نکل رہی تھی۔ "س.... سس.... سامی قدیم شہر کے.... کھنڈروں میں.... وا.... واٹ.... چیانگ.... سین کے.... تہ خانے میں.... چھپا ہوا ہے...."

"اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دو.... دو...." اس نے جواب دیا۔

میں نے سکھدر کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر تھونگ کا منہ دبا دیا اور میں نے بڑی بے رحمی سے خنجر کی دھار اس کے نرخرے پر پھیر دی اور ہاتھ اس وقت تک نہیں روکا جب تک اس کی شہ رگ کٹ نہیں گئی۔

سکھدر نے اسے چھوڑ دیا۔ تھونگ کچے فرش پر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے عجیب سی خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اس کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم نے تھونگ کی لاش کلب ٹوئنٹی سکس کی عقبی گلی میں پھینک دی۔ پاتھم ہمارے ساتھ تھا۔ وہ اپنی ٹیکسی ورکشاپ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

ہم جب بنگلے پر پہنچے تو ڈھائی بج رہے تھے۔

"کیا ہوا.... کچھ معلوم ہوا؟" تھائی نے پوچھا۔

"ہاں۔ سامی کا پتا چل گیا ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا اور تفصیل بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

اس رات میں اپنے آپ میں ایک عجیب سنسنی کی سی کیفیت محسوس کرتا رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے کئی قتل ہوتے دیکھے تھے۔ خون میں لت پت کئی لاشیں دیکھی تھیں۔ پہلے میں ان لاشوں کو دیکھ کر ڈر جایا کرتا تھا۔ کسی کو قتل ہوتے دیکھ کر میرے اوپر عجیب سی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی اور پھر ایک مرتبہ میں نے پامیلا کو دارا کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے خوب صورت جسم پر خنجر چلاتے ہوئے کتنا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس وقت تو پامیلا کو خون میں لت پت تڑپتے ہوئے دیکھ کر میں کانپ اٹھا تھا لیکن آج مجھے کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ تھونگ کے جسم پر خنجر کی نوک سے لکیریں کھینچتے ہوئے مجھے عجیب سا مزہ محسوس ہو تا رہا تھا۔ میں رات بھر عجیب سی کیفیت میں مبتلا رہا۔ کبھی پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگتیں اور کبھی میرا دماغ بالکل سن ہو جاتا۔

پاتھم اور سکھدر صبح ناشتا کرتے ہی نکل گئے تھے۔ پاتھم کو تو اپنے ورکشاپ کا وہ کمرا صاف کرنا تھا جہاں تھونگ کو ذبح کیا گیا تھا اور سکھدر کو تھونگ کے قتل کا ردِ عمل معلوم کرنا تھا۔

چھٹی کا دن تھا۔ شہر کے ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں رات دیر تک ہنگامے جاری رہتے تھے اور سنڈے نائٹ کو تو کلبوں سے لوگوں کی واپسی رات کو آخری پہر ہی ہوا کرتی تھی۔ سکھدر تین گھنٹے بعد واپس آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تھونگ کی لاش صبح چار بجے کے قریب مل گئی تھی۔ اس کے قتل کا انکشاف ہوتے ہی اس علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ کلب ٹوئنٹی سکس اور آس پاس کے ہوٹلوں سے نکلنے والے لوگ بڑی عجلت میں وہاں سے چلے گئے تھے۔

پیڈرو بھی اس وقت کلب میں موجود تھا۔ وہ زخمی ناگ کی طرح پھنکارتا پھر رہا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دینے کے بجائے تھونگ کی لاش غائب کروا دی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ اس نے کھل کر کہا تھا کہ وہ تھونگ کے قاتل کو معاف نہیں کرے گا۔

اور پھر سہ پہر تین بجے کے قریب پاتھم بھی آ گیا اور ہم پیڈرو کے بھائی سامی کو گھیرنے کا پروگرام بنانے لگے۔

قدیم شہر ایوتھایا کے کھنڈرات بنکاک کے مشرق میں چھہتر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھے۔ یہ شہر چار سو سال تک سیام (تھائی لینڈ) کا دارالحکومت رہا تھا۔ ان چار صدیوں میں اس شہر نے بڑے عروج و زوال دیکھے تھے۔ برما کے حکمران اس شہر پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ آور ہوتے رہے تھے۔ ایوتھایا نے ہر مرتبہ ڈٹ کر برمی حملہ آوروں کا مقابلہ کیا تھا لیکن بالآخر ۱۷۶۷ء میں برمی حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اس خوب صورت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ایوتھایا کی تباہی کے بعد شہنشاہ ٹاکسن نے دریائے چاؤ فریا کے مغربی کنارے پر واقع تھان بوری نامی گاؤں کو اپنا دارالحکومت

بنالیا اور اپنی بکھری ہوئی قوت مجتمع کر کے نہ صرف برمیوں کو ایوتھایا سے مار بھگایا بلکہ لاؤس اور کمبوڈیا کے بہت سے علاقے... اپنی سلطنت میں شامل کرلیے تھے لیکن صرف پندرہ سال بعد شہنشاہ ٹاکسن کا انتقال ہوتے ہی اس کے سب سے قریبی دوست اور فوج کے جنرل چاؤ نے ملک پر قبضہ کرلیا اور دارالحکومت کو دریائے چاؤ فریا کے دوسرے کنارے پر منتقل کردیا۔ اس علاقے کو پہلے کرونگ تھیپ اور پھر بنکاک کا نام دیا گیا جو ترقی کرتا ہوا دریا کے دونوں طرف میلوں دور تک پھیل چکا ہے۔

قدیم شہر ایوتھایا کے میلوں دور تک پھیلے ہوئے کھنڈرات آج بھی اپنے اندر ماضی کی عظمتوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔ بنکاک آنے والے غیر ملکی سیاح اور آثارِ قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ یہ کھنڈرات دیکھنے کے لیے ضرور جاتے ہیں۔

چھٹی کے روز وہاں کچھ زیادہ رونق ہوتی تھی اور میرا خیال تھا کہ ہم بھی شام سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں اور پھر موقع ملتے ہی واٹ چیانگ سین والے کھنڈر کے تہ خانے پر ہلہ بول دیں۔

"مناسب خیال ہے۔" پاتھم نے کہا "میں نے وہ کھنڈرات دیکھے ہوئے ہیں۔ ہم کسی دشواری کے بغیر واٹ چیانگ سین تک پہنچ جائیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

پرساد بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا لیکن میں نے اسے منع کردیا۔ ایک آدمی کا یہاں خواتین کے پاس رہنا ضروری تھا۔ اپنی "پرابلم" ہونے کے باوجود تھائی بھی ساتھ جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اسے سختی سے منع کردیا۔ اگر وہاں عین وقت پر اس کی پیٹھ کھجلانے لگی تو میں اسے سنبھالتا... یا صورتِ حال کا مقابلہ کرتا۔

"کھنڈرات کی سیر کو جانے والے ٹورسٹوں کی پارٹیوں میں کوئی نہ کوئی عورت ضرور شامل ہوتی ہے۔" قریب کھڑی ہوئی جانگی نے کہا "میرا خیال ہے اگر میں ساتھ جانا چاہوں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں کوئی پرابلم کری ایٹ نہیں کروں گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ میری وجہ سے کوئی آسانی پیدا ہو جائے۔"

چند لمحوں تک میں سوچتا رہا۔ اگر سامی کو پھانسنے کے لیے چارے کی ضرورت پڑ جائے.... تو ایسی صورت میں جانگی اس جیسے عیاش شخص کے لیے بہترین چارا ثابت ہو سکتی تھی۔ جانگی اپنے کمرے میں گھس گئی اور چند منٹ میں تیار ہو کر آگئی۔ میں اسے دیکھ کر پلک جھپکنا بھول گیا۔ وہ نیلے رنگ کی مختصر سی نیکر اور سلیولیس بلاؤز میں تھی۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر سر کے اوپر جوڑا بنالیا تھا۔ ہلکے سے میک اپ سے اس کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا تھا۔ دائیں کندھے پر گلابی کپڑے کا ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ میں نے ہوٹلوں، نائٹ کلبوں میں اور سڑکوں پر گھومتے ہوئے غیر ملکی سیاحوں کو دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی حسین اور جوان عورت ضرور ہوتی تھی۔ وہ لوگ تھیلے کندھوں پر لٹکائے دنیا بھر کی سیاحت کرتے پھرتے تھے اور ان کے اخراجات وہی خوب صورت عورت پورے کرتی تھی جسے عام طور پر "بیرر چیک" کہا جاتا تھا کہ جب چاہا کیش کروالیا۔

میں نے بھی اپنے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرلی تھی اور روانگی سے پہلے ہم نے تھائی وغیرہ کو بتا دیا تھا کہ ہم رات کھنڈروں ہی میں رہیں گے اس لیے ہم نے کھانے پینے کا کچھ سامان بھی گاڑی میں رکھ لیا تھا۔

ہمیں زیادہ وقت شہر سے نکلنے میں لگا تھا۔ قدیم شہر ایوتھایا کی طرف جانے والی سڑک پر اِکّا دُکّا گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہم پاتھم کی ٹیکسی میں تھے۔ وہ ڈرائیو کررہا تھا۔ سکھدر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور میں جانگی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس ٹیکسی کی وجہ سے ہم پر کسی قسم کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہم جب قدیم شہر پہنچے تو سوا چھ بج رہے تھے۔ میلوں دور تک کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے اور ان کھنڈرات کو دیکھ کر ماضی میں اس شہر کی خوب صورتی اور عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس شہر نے خوب ترقی کی تھی لیکن بالآخر اس کا عروج بھی زوال کی پستیوں میں کھو گیا۔

پاتھم نے ٹیکسی بینگ پائن پیلس سے ذرا آگے لے جا کر روک لی۔ اس محل کے کھنڈرات کئی ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے تھے اور غالباً یہ اس تباہ شدہ شہر کی واحد عمارت تھی جو اب بھی کسی حد تک اپنی شان و شوکت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ بینگ پائن پیلس دراصل کئی چھوٹی بڑی عمارتوں پر مشتمل تھا اور یہ عمارتیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس محل کے قریب ہی ایک اور عمارت میں بینگ سائی آرٹ گیلری بھی قائم تھی اور زیادہ تر سیاحوں کی توجہ اسی محل اور آرٹ گیلری پر مرکوز تھی۔ اس طرف کھانے پینے کی اشیا کے کچھ اسٹال وغیرہ بھی تھے۔

ہم لوگ ٹیکسی سے اتر کر بینگ پائن پیلس کے سامنے سے گزرتے ہوئے پچھلی طرف چلے گئے۔ کشادہ گلیوں اور سڑکوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اونچے نیچے ٹیلوں پر یہ شہر بڑے سلیقے سے آباد کیا گیا تھا۔

پاتھم آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ ایک ماہر گائیڈ کی طرح ہمیں ان کھنڈرات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آس پاس کچھ اور سیاح بھی گھوم رہے تھے۔ جانگی میرے ساتھ تھی اور قریب سے گزرنے والے لوگ مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

پاتھم ایک ٹیلے پر رک گیا۔ آس پاس کے علاقے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کی آبادی گنجان تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کے کھنڈر چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔

"وہ واٹ چیانگ سین کے کھنڈر ہیں۔" پاتھم نے ایک طرف

اشارہ کیا۔

وہاں سے تقریباً نصف میل دور نشیب میں مندروں سے ملتی جلتی دو بہت بڑی عمارتوں کے کھنڈر نظر آرہے تھے۔ دونوں عمارتیں ایک دوسرے سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھیں۔ ان میں سے ایک عمارت بڑی تھی۔ اس کی بلندی سو فٹ سے کم کسی طرح نہیں ہو سکتی تھی اور وہ وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ دوسری عمارت بلندی میں اس سے پندرہ بیس فٹ کم تھی۔ اس عمارت نے بھی بہت لمبا چوڑا رقبہ گھیر رکھا تھا۔ ان کے آس پاس اور بھی چھوٹی چھوٹی بہت سی عمارتیں تھیں جو مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھیں۔ ان دونوں بڑی عمارتوں کے سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک بہت بڑا چبوترا تھا جس کے اوپر قبر نما ایک اور کشادہ چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کسی زمانے میں اس اوپر والے چبوترے پر کوئی مجسمہ نصب رہا ہوگا۔

واٹ چیانگ سین کے وہ کھنڈرات ہم سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھے اور رخصت ہوتی ہوئی دھوپ براہِ راست ان کھنڈروں پر پڑ رہی تھی۔ پانچ چھ سیاحوں پر مشتمل ایک پارٹی ان کھنڈروں سے نکل کر ہماری طرف آرہی تھی۔ ان میں دو عورتیں تھیں۔ ایک نے تو جانگی کی طرح مختصر سی نیکر اور بغیر آستین کی دھاری دار ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا بھی تھا جبکہ دوسری عورت نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ مردوں کے حلیے بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ ان کے ساتھ ایک گائیڈ بھی تھا۔ ہمارے قریب پہنچ کر وہ تھوڑی دیر کو رکے اور پھر آگے بڑھ گئے۔

ہم چیانگ سین کے کھنڈروں میں پہنچ گئے۔ ان کھنڈروں کو دیکھ کر اس عبادت گاہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہم بڑی عمارت میں داخل ہو گئے۔ ایک بہت وسیع و عریض ہال تھا جس کے وسط میں تقریباً آٹھ فٹ اونچا ایک وسیع چبوترا بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترا بھی ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ ہال کے اطراف میں کئی راہداریاں اور کمرے تھے۔ کمروں کے دروازے اور چوکھٹیں غائب تھیں۔ دیواریں ادھڑی ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں سے اینٹیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں۔

تھونگ نے بتایا تھا کہ سامی اور اس کے ساتھی اس واٹ (WAT یعنی بدھ عبادت گاہ) کے نیچے تہ خانے میں چھپے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ یہ تہ خانہ بہت پہلے سے استعمال میں تھا۔ میں نے واٹ ٹرینٹ کا تہ خانہ دیکھا تھا۔ کسی اجنبی کے لیے اس قسم کے تہ خانوں کا سراغ لگانا آسان نہیں ہوتا۔

ہم سب اِدھر اُدھر پھیل کر تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے لگے۔ یہ بھی اندازہ لگانا دشوار تھا کہ تہ خانے کا راستہ اسی عمارت میں تھا یا دوسری عمارت میں۔ ہم فرش اور دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھتے رہے۔ دوسری عمارت میں بھی جا کر دیکھا لیکن اس طرح راستہ تلاش کرلینا آسان نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ تہ خانے میں موجود سامی اور اس کے ساتھیوں کو ہماری موجودگی کا پتا چل گیا تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔

"ایک طریقہ ہے۔" جانگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم مختلف جگہوں پر چھپ کر انتظار کریں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ رات کو کسی نہ کسی وقت باہر ضرور نکلیں گے اور اس وقت...."

"میرا خیال ہے یہی مناسب رہے گا۔" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فیصلہ سنا دیا۔

ہم واٹ کی عمارت سے باہر آگئے اور واپس جانے والے راستے پر کھنڈروں کی آڑ میں چلتے ہوئے مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ پاتھم مغرب کی طرف چلا گیا تھا اور سکھدر دوسری طرف نکل گیا۔ پاتھم کے پاس اپنا پستول موجود تھا۔ رائفل میں نے سکھدر کو دے دی تھی۔ تھائی والا پستول جانگی کے تھیلے میں تھا جبکہ میری پنڈلی سے خنجر بندھا ہوا تھا۔

میں اور جانگی واٹ کی پچھلی طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک اور عمارت کے کھنڈر میں آگئے۔ یہاں سے ہم واٹ کے کھنڈروں پر پوری طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔

یہ عمارت بھی پگوڈا قسم کی تھی جس کی چھت غائب تھی اور دیواریں بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ ایک بہت بڑا ہال تھا اور اس کے اطراف میں کمرے بھی تھے۔ ہم ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں سے ہم تو چاروں طرف نگاہ رکھ سکتے تھے لیکن ہمیں کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ سناٹے میں جھینگروں کی آوازیں بڑا خوف ناک تاثر دے رہی تھیں۔ ایسی جگہوں پر سانپوں، بچھوؤں اور زہریلے کیڑے مکوڑوں کا بھی اندیشہ رہتا تھا۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ چاند بھی نکل آیا تھا۔ مدھم سی چاندنی میں کھنڈرات کا منظر دل دہلا دینے والا تھا۔ اچانک ہی ایک طرف سے کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ جانگی بھی میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ وہ بھی اِدھر اُدھر گھور رہی تھی اور پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس طرف دیکھتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ شاید کوئی کتا تھا یا اسی قدو قامت کا کوئی اور جانور تھا جو واٹ والے کھنڈروں سے نکل کر دائیں طرف جا رہا تھا۔

میں ایک بار پھر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل رہی ہو۔ میں سمجھا شاید مجھے چکر آرہا ہے۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن زمین تیزی سے میرے پیروں کے نیچے سے نکل رہی تھی اور میں نیچے ہی نیچے دھنستا جا رہا تھا۔ میں نے جانگی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بھی میرے ساتھ زمین میں دھنسنے لگی۔

ہم دونوں بڑی تیزی سے کسی ڈھلان پر لڑھک رہے تھے۔

جانگی میرے ساتھ لپٹ گئی تھی۔ مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھر بھی ہمارے ساتھ لڑھک رہے تھے اور بالآخر ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ میں نے اپنے آپ کو جانگی کی گرفت سے چھڑایا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جانگی ایک بار پھر میرے ساتھ لپٹ گئی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہم اس پگوڈا کے کھنڈر کے تہ خانے میں پہنچ گئے تھے لیکن حیرت کی بات تھی کہ مجھے گھٹن کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ کسی طرف سے تازہ ہوا میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ہمارے گرنے سے جو خلا سا بن گیا تھا وہاں سے آسمان پر تارے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ خلا کوئی پندرہ فٹ اونچا تھا اور اس تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

"یہ تہ خانہ ہے۔ یہاں سے کسی اور طرف نکلنے کا راستہ بھی ہوگا۔ آؤ۔ اس طرف دیکھتے ہیں۔" میں نے جانگی کا ہاتھ پکڑ لیا اور ٹٹول ٹٹول کر ایک طرف قدم اٹھانے لگا۔ جانگی میرے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی۔

میں نے ایک ہاتھ سے جانگی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولتا ہوا چل رہا تھا۔ تقریباً پچیس منٹ کے بعد دیوار بائیں طرف مڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی میں چونک گیا۔ سامنے ہی ایک تنگ سے خلا سے بہت مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا، کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ آگے مٹی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے جانگی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جھک کر دونوں ہاتھ ٹکاتے ہوئے مٹی کے اس ڈھیر پر چڑھنے لگا۔ جانگی میرے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔

وہ کوئی دیوار تھی جس سے چند اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں اور باہر چاند کی مدھم سی روشنی اس خلا سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس خلا سے جھانک کر دیکھا تو چونک گیا۔ چیانگ سین عبادت گاہ کے کھنڈر کسی اور زاویے سے ہمارے سامنے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ پگوڈا کے تہ خانے میں گرنے کے بعد بھی ہم بھٹکے نہیں تھے۔ جانگی بھی اسی خلا سے باہر دیکھ رہی تھی۔

دیوار کی پانچ چھ اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں اور وہ خلا اتنا بڑا نہیں تھا کہ میں یا جانگی اس میں سے گزر سکتے۔ میں خلا میں ہاتھ ڈال کر اینٹیں اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیوار بہت موٹی تھی اور اینٹیں بہت مضبوطی سے جمی ہوئی تھیں۔ جانگی بھی میرے ساتھ اینٹیں اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ہم ایک اینٹ بھی نہیں اکھاڑ سکے۔

میں نے کوشش ترک کر دی اور مٹی کے ڈھیر پر پشت کے بل لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میرے خیال میں یہاں سے بھی واٹ پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی لیکن ہمارے لیے ضروری تھا کہ ایمرجنسی کے وقت باہر نکلنے کے لیے راستہ تیار رکھیں۔

میں مٹی کے ڈھیر پر پشت کے بل لیٹا ہوا تھا اور جانگی ایک بار پھر کوئی اینٹ اکھاڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک اینٹ پر سے اس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ جھٹکا کھا کر میرے اوپر گری۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تھا اور اس کی گرم گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔

میں جانگی کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ پوری طرح میرے اوپر لد گئی اور پھر میں اس کے تپتے ہوئے ہونٹوں کا لمس اپنے ہونٹوں پر محسوس کرنے لگا۔ میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ میرے حواس میرا ساتھ چھوڑ دیتے، میں نے جانگی کو اپنے اوپر سے دھکیل دیا۔ وہ مٹی کے ڈھیر پر لڑھکتی چلی گئی۔ نیچے گرتے ہوئے میرا پیر اس کی گرفت میں آ گیا اور میں بھی مٹی کے اس ڈھیر پر لڑھکنے لگا۔

ہم دوبارہ مٹی کے ڈھیر کے اوپر آ گئے۔ میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس رات جب میں نے جانگی کو صوفے پر سوتے دیکھا تھا تو اس وقت بھی میں نے اپنے اندر کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کی تھی اور اب تو معاملہ اس سے ایک قدم آگے کا تھا لیکن میں لڑکھڑانے سے پہلے ہی سنبھل گیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا کہ جانگی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"وجدان! وہ دیکھو۔ میرا خیال ہے، ہم نے سامی کی خفیہ پناہ گاہ کا سراغ لگا لیا ہے۔" جانگی کے لہجے میں عجیب سی سنسنی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جانگی نے خلا سے ہاتھ باہر نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"وہ دیکھو۔ واٹ کی بڑی عمارت کے چبوترے میں نیچے کی طرف روشنی نظر آ رہی ہے۔"

میں غور سے اس طرف دیکھنے لگا۔ واٹ کی وہ عمارت ایک بہت وسیع و عریض چبوترے پر تعمیر کی گئی تھی یا عمارت بنانے کے بعد اس کے چاروں طرف یہ چبوترا تعمیر کیا گیا تھا۔ زمین سے اس چبوترے کی بلندی تقریباً چھ فٹ تھی۔ چبوترے کے دائیں کونے کی طرف نیچے روشنی کی پانچ چھ انچ لمبی ایک متوازی لکیری نظر آ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے، چاند کی روشنی میں کوئی چیز چمک رہی ہے۔ شاید کوئی شیشہ وغیرہ ہو۔" میں نے سرگوشی کی۔

"شیشے کی چمک ایسی نہیں ہوتی۔" جانگی نے کہا "وہ بلب کی یا پیٹرومیکس کی روشنی ہے۔ اس چبوترے کے نیچے تہ خانہ ہے۔ اب ہمیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن پہلے یہ اینٹیں اکھاڑو۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ تو بناؤ۔"

میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور دیوار کی ایک اینٹ اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس اینٹ پر میں پہلے بھی زور آزمائی کر چکا تھا۔ بڑی مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔ اس واٹ کی تعمیر میں نجانے کون سا مسالا استعمال کیا گیا تھا کہ تقریباً چھ سو سال گزرنے کے بعد بھی اینٹیں اپنی جگہ پر جمی ہوئی تھیں۔

میں اینٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور آزمائی کرنے لگا۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ اینٹ آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ میں اسے جھٹکے دیتا رہا اور بالآخر ایک زوردار جھٹکا دیتے ہی وہ اینٹ اپنی جگہ سے اکھڑ گئی اور میں اپنی جھونک میں پیچھے گر کر جانگی سے ٹکرا گیا جو میرے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

ایک اینٹ اکھڑ جانے کے بعد کوئی مشکل نہیں رہی تھی۔ باقی اینٹیں آسانی سے اکھڑتی چلی گئیں۔ جانگی بھی میری مدد کر رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کی لگاتار کوشش کے بعد ہم اس خلا کو اتنا کشادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکتا تھا۔

پہلے جانگی اس ٹوٹی ہوئی دیوار سے باہر نکلی اور پھر میں بھی باہر آ گیا۔ چاند ہمارے دائیں طرف بہت نیچے جھک گیا تھا اور اس کی روشنی چبوترے پر نہیں پڑ رہی تھی جبکہ چبوترے میں روشنی کی وہ پتلی سی متوازی لکیر بدستور نظر آ رہی تھی۔

جانگی نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں اس کے چہرے کے تاثرات بڑے عجیب سے تھے۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"وجدان۔" اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی "ابھی تھوڑی دیر پہلے جو کچھ ہوا اُس کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

"بہت دنوں سے شاید تم کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھیں جانگی لیکن بہرحال۔" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا "جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

میں چبوترے کی طرف دیکھنے لگا۔ جانگی کا خیال ٹھیک ہی لگتا تھا۔ اس واٹ کے نیچے تہ خانہ تھا۔ جس میں غالباً پیٹرومیکس جل رہا تھا اور اس کی روشنی چبوترے کی اس دراڑ میں سے نظر آ رہی تھی "تمہارا پستول کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

جانگی نے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں سے پستول نکال لیا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے اپنے پاس ہی رکھو اور آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلتی رہو۔ کوئی آواز پیدا نہ ہو۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں دبے قدموں چلنے لگے۔ واٹ کی عمارت والا وہ چبوترا تقریباً پچاس گز آگے تھا۔ میرے پیروں سے ایک پتھر ٹکرا کر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ سناٹے میں پتھر کے لڑھکنے کی آواز بھی دور تک سنی جا سکتی تھی۔ میں مزید احتیاط سے چلنے لگا۔

چبوترے کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ جانگی پستول ہاتھ میں پکڑے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ چبوترے میں نصف انچ چوڑی اور آٹھ دس انچ لمبی وہ متوازی دراڑ زمین کی سطح سے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی تھی۔ میں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور اس دراڑ سے اندر جھانکنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔

جانگی کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ واٹ کے اس چبوترے کے نیچے تہ خانہ ہی تھا۔ بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ وسط میں فرش پر پیٹرومیکس جل رہا تھا۔ اس کی دوسری طرف کرسی پر بیٹھا ایک آدمی اونگھ رہا تھا۔ اس کا سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ گود میں رائفل رکھی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ رائفل پر تھے۔ اس شخص کا رخ دائیں طرف والی دیوار کی طرف تھا۔ گرد آلود فرش پر اس دیوار تک قدموں کے نشان تھے۔ لگتا تھا جیسے اس جگہ کو دیوار تک آنے جانے کے لیے راستے کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ قدموں کے نشان پورے ہال میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔

دائیں طرف ایک کمرا تھا۔ اس کمرے کا دروازہ اور چوکھٹ تو نہیں تھی لیکن قدموں کے نشان وہاں تک بھی تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کمرے میں بھی کوئی موجود تھا۔ تھونگ کے کہنے کے مطابق سامی کے ساتھ دو محافظ تھے۔ ایک تو میری نظروں کے سامنے تھا البتہ سامی اور دوسرا محافظ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ دونوں کمرے میں تھے۔

اچانک کرسی پر اونگھتا ہوا وہ محافظ ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے کسی بات کا شبہ ہو گیا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ میں رائفل سنبھالی اور کمرے کے دروازے پر رک کر اندر جھانکنے لگا پھر اس سے آگے ایک راہداری میں مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا مگر اس کی واپسی میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ اس دیوار کے قریب جا کر رک گیا جہاں تک قدموں کے نشان تھے۔ اس نے دیوار کے ایک حصے پر ہاتھ رکھ کر ٹٹولا یا دباؤ ڈالا تو دائیں طرف تین فٹ کے فاصلے پر دیوار کا ایک حصہ شق ہو گیا۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ شق ہونے والی اس دیوار کی دوسری طرف اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر سیڑھیوں پر دیکھا اور پھر دیوار کے اس حصے کو دوبارہ دبا دیا۔ دیوار کے دونوں حصے آپس میں مل گئے۔

میں سیدھا ہو گیا۔ جانگی بھی اس وقت چبوترے کی اس دراڑ سے آنکھ لگائے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی سیدھی ہو گئی۔

"راستہ اس دیوار میں ہے۔" جانگی نے سرگوشی کی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سیدھا ہو کر چبوترے کے اوپر واٹ کی عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ دراصل میں یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ تہ خانے میں سیڑھیوں کا راستہ عمارت کے کس حصے میں ہو سکتا تھا اور پھر میں نے دوبارہ چبوترے کی اس دراڑ سے جھانک کر دیکھا۔ تہ خانے میں وہ محافظ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید کمرے میں یا راہداری میں چلا گیا تھا۔

میں نے سیدھا ہو کر جانکی کو اشارہ کیا اور ہم وہاں سے دور ہٹتے چلے گئے اور پھر ایک طویل چکر کاٹ کر واٹ کے سامنے والے رخ پر آگئے۔ میں واٹ کے مرکزی دروازے کی طرف جانا چاہتا تھا مگر جانکی نے مجھے روک لیا۔

"اکیلے اندر جانا درست نہیں ہے۔" اس نے سرگوشی کی "ان کے پاس آٹومیٹک رائفلیں ہیں اور ہمارے پاس صرف یہ پستول۔" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی طرف اشارہ کیا "بہتر ہے کہ ہم سکھدر اور پاتھم کو بھی بلالیں۔"

جانکی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر اس طرف چل پڑا جہاں پہلے میں نے پاتھم کو جاتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ پر بیٹھا ہوگا جہاں سے واٹ پر نگاہ رکھ سکے۔ میں واٹ کے سامنے کھلی جگہ پر کھڑے ہو کر ایسی حرکتیں کرنے لگا کہ پاتھم میری طرف متوجہ ہو سکے۔

چاند کی مدھم روشنی میں کھلی جگہ پر میں بڑی آسانی سے کسی کی نظروں میں آسکتا تھا اور پھر میری یہ کوشش رائگاں نہیں گئی تھی۔ چند منٹ بعد ہی پاتھم اور سکھدر مختلف سمتوں سے نکل کر وہاں آگئے۔

"ہم نے تہ خانہ دریافت کرلیا ہے۔ اب صرف راستہ تلاش کرنا ہے۔" میں نے سرگوشی میں ان دونوں کو بتایا اور پھر تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں میں نے واٹ کی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تہ خانے کا راستہ اس طرف ہونا چاہیے۔"

ہم لوگ چبوترے پر چڑھ کر واٹ کے مرکزی دروازے میں داخل ہوگئے۔ سامنے ہال تھا جو ہم دن کی روشنی میں بھی دیکھ چکے تھے۔ ہال کے چاروں طرف کمرے تھے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا مرکزی دروازے کی دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ بہت وسیع کمرا تھا۔ سامنے ہی دیوار کے ساتھ ایک چبوترا تھا۔ اس کی چوڑائی اور موٹائی دو دو فٹ رہی ہوگی۔ بلندی میں یہ چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔

"میرے خیال میں تہ خانے کا راستہ اسی کمرے میں ہونا چاہیے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

پاتھم نے ٹارچ روشن کرلی۔ ہم تقریباً پندرہ منٹ تک ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھتے رہے مگر کوئی مشتبہ جگہ نظر نہیں آئی۔ میرے خیال میں جو کچھ بھی تھا اس کا تعلق اس چبوترے ہی میں ہوسکتا تھا۔ اس چبوترے پر کسی زمانے میں مہاتما بدھ کا کوئی مجسمہ رکھا رہتا ہوگا لیکن اب تو وہ محض ایک چبوترا تھا۔ پچھلی دیوار اور اس چبوترے کے درمیان تقریباً چھ انچ کا خلا تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں اس خلا کے اندر جھانکنے لگا اور پھر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس خلا میں دیوار کے ساتھ ایک کنڈا سا لگا ہوا تھا۔ میں نے پاتھم کو اشارہ کیا۔ وہ اس خلا میں ہاتھ ڈال کر اس آہنی کنڈے کو حرکت دینے لگا۔

نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ چبوترے کی دائیں طرف دیوار کا ایک حصہ شق ہونے لگا۔ سکھدر رائفل تان کر کھڑا ہوگیا۔ ہم تینوں حفظ ماتقدم کے طور پر چبوترے کی آڑ میں ہوگئے۔

سکھدر کا اشارہ پاکر ہم سامنے آگئے۔ دیوار میں پیدا ہونے والے اس خلا میں نیچے جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر دیوار نے راستہ بند کر رکھا تھا۔ میں نے گھوم کر چبوترے کی طرف دیکھا۔ اصل میکنزم تو دیوار ہی میں تھا اور راستہ چھپانے کے لیے سامنے چبوترا بنا دیا گیا تھا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس چبوترے کے پیچھے کوئی راز پوشیدہ ہوگا۔ طویل عرصے سے یہاں سیاحوں کی آمدورفت بھی تھی۔ سیاح عام طور پر سرسری سی نگاہوں سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ کوئی ایسی باتوں پر توجہ نہیں دیتا۔ پیڈرو کے کسی آدمی نے یہ راز دریافت کرلیا تھا اور وہ کھنڈروں میں اس تہ خانے کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کررہے تھے اور ہوسکتا ہے یہاں کئی اور دھندے بھی ہوتے ہوں۔ ایسی جگہوں پر تو منشیات کا بزنس بھی ہوتا تھا۔

جانکی کو چبوترے کے قریب روک دیا گیا اور ہم تینوں بہت احتیاط سے سیڑھیوں پر اترنے لگے۔ آگے سکھدر تھا۔ اس کے پاس رائفل تھی۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے پاتھم۔ میں نے اپنا خنجر نکال لیا تھا اور پاتھم کے ہاتھ میں پستول۔

میں ٹارچ کی روشنی میں دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ قدرے ابھری ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ رکھ کر اس جگہ کو دبایا تو دیوار میں اوپر سے نیچے ایک لکیری بن گئی جو لحہ بہ لحہ کشادہ ہوتی چلی گئی۔ پاتھم اور سکھدر جلدی سے دیوار کے ساتھ دائیں بائیں ہوگئے۔ دیوار شق ہوتی چلی گئی۔ میں نے ٹارچ بجھادی تھی اور خنجر ہاتھ میں لیے تیار کھڑا تھا۔

وہ خلا ایک عام دروازے کے برابر تھا۔ دوسری طرف سے قدموں کی آواز سن کر ہم سب محتاط ہوگئے۔ اندر سے آنے والی روشنی سیڑھیوں تک پہنچ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد قدموں کی وہ آہٹ رک گئی اور ایک آدمی گردن نکال کر سیڑھیوں پر جھانکنے لگا۔ سکھدر نے بڑی تیزی سے سامنے آکر رائفل کا بٹ اس کے منہ پر ماردیا۔

یہ وہی محافظ تھا جسے میں نے چبوترے کی دراڑ سے تہ خانے میں دیکھا تھا۔ منہ پر ضرب لگتے ہی وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گرگئی تھی۔

وہ شخص زمین پر گرتے ہی سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی رائفل کی طرف لپکا لیکن اسی لمحے سکھدر نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ تہ خانہ فائرنگ اور اس شخص کی چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس شخص کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوگیا تھا اور زخموں سے بہنے والا خون فرش پر جمی ہوئی گرد پر پھیلنے لگا تھا۔

میں فرش پر گری ہوئی رائفل اٹھا کر راہداری کی طرف لپکا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سکھدر کو اس کمرے کی طرف اشارہ کردیا تھا۔

راہداری خاصی طویل تھی لیکن مجھے زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ دائیں طرف والے کمرے سے ایک آدمی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی گولی چلا دی۔ میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی ٹانگ کو اس طرح حرکت دی تھی کہ میرے پیر کی ٹھوکر اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگرا اور پھر وہ شخص میری رائفل کی زد میں تھا۔

ٹھیک اسی لمحے دوسری طرف سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ پورا برسٹ مارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کسی آدمی کے چیخنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں اپنے شکار کو رائفل کی زد پر لے کر ہال میں آگیا۔ وہ پیڈرو کا چھوٹا بھائی سامی تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ قدرے دراز قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ گلے میں سونے کی ایک موٹی سی چین تھی جس کے لاکٹ میں جڑا ہوا ہیرا پیٹرومیکس کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اس کا سامنے کا ایک دانت بھی سونے کا تھا۔ اس کے جسم پر صرف پاجامہ تھا جو غالباً بڑی عجلت میں پہنا گیا تھا۔

سامی کا چہرہ خوف سے پیلا ہو رہا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ہال میں پڑی ہوئی اپنے دونوں محافظوں کی لاشوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے سامی کو سکھدر اور پاتھم کے حوالے کردیا اور گھوم پھر کر تہ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ راہداری میں سامی والے کمرے میں شاندار بیڈ لگا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک میز پر شراب کی بوتلیں اور سگریٹ کے پیکٹ رکھے ہوئے تھے اور پھر بیڈ پر زنانہ کپڑے دیکھ کر میں چونک گیا۔

میں محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں پچھلی طرف ایک اور راستہ تھا میں نے اس طرف جھانک کر دیکھا مگر تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا اور پھر ایک آواز سن کر میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے سسکی بھری ہو۔ میں نے پلنگ کے نیچے جھانکا اور ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

"تم جو کوئی بھی ہو' باہر آجاؤ... ورنہ بیڈ کے نیچے فائرنگ کردوں گا۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔

چند سیکنڈ بعد ہی ایک جوان اور خوب صورت لڑکی بیڈ کے نیچے سے نکل آئی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کپڑے پہنو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس لڑکی کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بڑی حسین تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے کپڑے پہنے اور میں اسے کمرے سے باہر لے آیا۔ ہال کا منظر دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

پاتھم نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامی کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تھے۔ اس لڑکی اور سامی کو رائفلوں کی زد پر لے کر ہم تہ خانے کے باہر آگئے۔ تہ خانے کا راستہ بند کردیا گیا۔ جانکی چبوترے کی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔

ہمیں اپنی گاڑی تک پہنچنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگا تھا۔ سیاحوں کی سہولت کے لیے بیگ پائن پیلس کے قریب کھانے پینے کی چیزوں کے کچھ اسٹال تھے۔ چند اسٹال سوئیرز کے بھی تھے اور محکمۂ سیاحت کا ایک مختصر سا دفتر بھی تھا جہاں سے سیاحوں کی رہنمائی اور انہیں اس قدیم شہر کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی تھیں لیکن رات کے آخری پہر وہاں سناٹا تھا۔ ہماری ٹیکسی کے علاوہ دو کاریں اور بھی وہاں کھڑی تھیں۔ سکھدر تو پاتھم کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سامی اور اس لڑکی کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر اس کی ایک طرف میں اور دوسری طرف جانکی بیٹھ گئی۔

ٹیکسی کھنڈروں سے نکل کر تیز رفتاری سے بنکاک کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا گیا تھا۔ جب ہم شہری حدود میں داخل ہوئے تو دن طلوع ہونے والا تھا۔ اس لڑکی کو سوکھم وٹ سکسٹی ٹو اور ایکسپریس وے کے انٹرسیکشن پر گاڑی سے اتار دیا گیا۔ وہ بے چاری خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاید اسے بھی ان دو محافظوں کی طرح مار دیا جائے گا جن کی لاشیں وہ واٹ چیانگ سین کے تہ خانے میں دیکھ چکی تھی۔

ہم ایکسپریس وے' راما فور روڈ اور سائی فریا روڈ سے ہوتے ہوئے دریا پار کرکے جانکی والے بنگلے میں پہنچ گئے۔ کال بیل کے جواب میں گیٹ پرساد نے کھولا تھا۔ گاڑی میں ہمارے ساتھ سامی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

سامی کو ایک خالی کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے نہ صرف پیر بھی باندھ دیے گئے بلکہ منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا تاکہ وہ شور نہ مچا سکے۔ اس کے علاوہ اس کے ہونٹوں پر ٹیپ بھی چپکا دیا۔ جب میں اس کمرے سے باہر نکلا تو ہال میں تھائی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ جانکی بھی اس کے قریب کھڑی تھی۔ تھائی نے مجھے اندر آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اب وہ گھورتی ہوئی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی جانکی کو دیکھ رہی تھی۔ میرے اور جانکی کے حلیے بڑے ابتر تھے۔ پگوڈا کے تہ خانے میں مٹی کے ڈھیر پر لوٹ پلٹ نے ہم دونوں کے حلیے بگاڑ دیے تھے۔

"یہ۔ تم دونوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جیسے مٹی میں لوٹتے رہے ہو۔" تھائی نے یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر ہم دونوں کو گھورا۔

"سامی چیانگ سین واٹ کے کھنڈروں میں روپوش تھا اور ہم چاروں طرف سے اس کھنڈر کی نگرانی کررہے تھے۔" مجھ سے پہلے جانکی بول پڑی تھی "ہم دونوں ایک جگہ مٹی کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے

تھے۔ ڈھیر کی مٹی سرکی تو ہم بھی لڑھکتے چلے گئے۔"

میں نے جانکی کی طرف دیکھا اور میری نظریں خود بخود جھک گئیں جبکہ جانکی مسکرا رہی تھی۔

میں اپنے کمرے میں آکر باتھ روم میں گھس گیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا تو میرا حلیہ واقعی بہت برا ہو رہا تھا۔ بال بھی مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ میں نے نہا کر کپڑے تبدیل کیے اور باہر آگیا۔

پاٹھم ناشتا کرکے چلا گیا۔ میں اور پرساد اس کمرے میں آگئے جہاں سامی کو قید کیا گیا تھا۔ میں نے خنجر نکال لیا اور سامی کے ہونٹوں سے ٹیپ اتار دیا۔

"اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو بلا دریغ تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔" میں نے سامی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم نے میرے بہترین دوست گانگ کو سن شائن کیسینو میں گولیاں مار کر ہلاک کردیا تھا۔ تم شاید یہ سمجھتے تھے کہ کوئی تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ پیڈرو کی وجہ سے کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ پیڈرو نے تمہیں چھپانے کے لیے شہر سے کتنا دور بھیج دیا تھا لیکن چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ہم نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔ اب تم مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر ہو۔ تمہیں گانگ کے قتل کی سزا تو ملے گی ہی لیکن اس سے پہلے تم میرے ایک دو سوالوں کے جواب دو گے۔ انکار کی صورت میں تمہاری موت کہیں زیادہ اذیت ناک ہوگی۔ دارا کہاں ہے؟"

"میں نہیں جانتا دارا کہاں ہے۔" سامی نے جواب دیا "میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑ دو۔ پیڈرو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ... نکالے گا۔"

"پیڈرو بزدل ہے۔" میں نے کہا "اگر وہ مرد ہوتا تو چھپ کر نہ بیٹھتا۔ وہ اب تک اپنے سے کمزور، کمتر اور بے گناہ لوگوں کو ظلم کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ اس ظلم کی بنا پر وہ انڈر ورلڈ کا بے تاج بادشاہ بن گیا ہے لیکن اب بہت جلد میں اسے سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کردوں گا۔ پیڈرو کو تو میں تلاش کر ہی لوں گا لیکن تم اگر اپنی موت کو آسان بنانا چاہتے ہو تو دارا کا پتا بتاؤ۔ وہ کہاں چھپا ہوا ہے؟"

"میں نہیں جانتا۔" سامی نے جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا پرساد نے اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ سامی چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا تھا۔ پرساد نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے سامی کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر تھپڑوں کی بارش کردی پھر اس نے میرے ہاتھ سے خنجر لے لیا۔

"تمہارے بھائی نے میرے اوپر جو تشدد کیا تھا اس کے نشانات ہمیشہ کے لیے میرے جسم پر ثبت ہوگئے ہیں۔ میرا داغ دار جسم مجھے وہ رات یاد دلاتا رہے گا۔ میں نے تو وہ تشدد برداشت کرلیا تھا مگر تم برداشت نہیں کرسکو گے۔ باس کی بات کا جواب دو ورنہ تمہارا یہ بازو یہاں سے کاٹ دوں گا۔" اس نے خنجر سامی کے دائیں بازو اور کندھے کے جوڑ پر رکھ دیا۔

سامی نے پھر بھی زبان نہیں کھولی تو اس نے خنجر کو ذرا سی حرکت دی۔ کھال کٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی سامی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پرساد نے خنجر ہٹا کر بائیں ہاتھ سے زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔

"اگر اب تمہارے منہ سے آواز نکلی تو گلا ہی کاٹ دوں گا۔" پرساد بھیڑیے کی طرح غرایا "بتاؤ۔ دارا کہاں ہے؟"

"بب۔ بتاتا ہوں۔" سامی ہکلایا۔

وہ واقعی بزدل نکلا تھا۔ چند جاندار ہاتھ پڑے تھے اور وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوگیا تھا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس مرتبہ میں نے پوچھا۔

"کنچن بوری میں۔" سامی نے جواب دیا "دریائے کوائے پر بنے ہوئے تاریخی پل سے دریا کے بہاؤ کی طرف ٹھیک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے پر ایک چھوٹا سا پگوڈا ہے۔ اس پگوڈا کی عقبی سمت میں تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر پہاڑیوں میں ایک بہت بڑا بنگلا نما کاٹیج ہے۔ دارا وہیں ہے۔ اس کے ساتھ شانگ بھی ہے۔"

"شانگ، پیڈرو اور دارا میں کیا ڈیل ہوئی ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ان میں ابھی تک کوئی بات فائنل نہیں ہوئی۔" سامی نے جواب دیا "تین دن پہلے انہیں ڈیل فائنل کرنے کے لیے چیانگ رائے جانا تھا لیکن دارا کے زخمی ہونے کی وجہ سے یہ پروگرام ملتوی.... ہوگیا۔ اس کے بعد کوئی نئی تاریخ طے نہیں ہوئی۔"

"ڈیل کیا ہے۔ وہ لوگ کیا منصوبہ بنا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"منصوبہ دارا نے بنایا تھا۔" سامی نے جواب دیا "اس نے ٹائیگر کے ساتھ ہیروئن کی اسمگلنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ شانگ کے ذریعے دس ہزار امریکی ڈالر ایڈوانس دیے جاچکے ہیں۔ ان دونوں میں طے یہ ہوا تھا کہ سرمایہ ٹائیگر لگائے گا اور باقی سارا کام دارا کرے گا۔ ٹائیگر کے تمہارے ہاتھوں قتل کے بعد پیڈرو نے اس منصوبے کو جاری رکھا۔ وہ فائنل ڈیل کے لیے گولڈن ٹرائی اینگل جانے والے تھے مگر یہاں بھی تمہاری وجہ سے گڑبڑ ہوگئی۔ اب تم نے مجھے اغوا کیا ہے۔ پیڈرو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"زندہ چھوڑنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوگا جب وہ مجھے پکڑ لے گا۔ بہرحال۔" میں نے کہا "تمہارے بارے میں رات کو فیصلہ کیا جائے گا۔ تمہارا منہ بند نہیں کیا جائے گا لیکن اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہوگا۔ پرساد!" میں نے اٹھ کر پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے ناشتا کرادو۔"

پرساد نے وہاں سے ہٹتے ہوئے بھی سامی کو ایک زوردار گھونسا رسید کردیا تھا۔

میرا وہ دن بڑی بے چینی میں گزرا تھا۔ رات آٹھ بجے کے قریب پاٹھم بھی آگیا۔ اس کے پاس بڑی دلچسپ خبریں تھیں۔ پیڈرو کو آج صبح دس بجے کے قریب سامی کے اغوا کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ لڑکی جسے ہم نے رات کو چھوڑ دیا تھا، پیڈرو کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس نے پیڈرو کو محافظوں کے قتل اور سامی کے اغوا کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے پیڈرو کو ہم سب کے حلیے بتائے تھے اور پیڈرو نے مجھے پہچان لیا تھا۔ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

رات دس بجے کے قریب میں نے فیصلہ کرلیا کہ سامی کا کیا کرنا ہے۔ پرساد کو خود پیڈرو نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور گانگ کو سامی نے قتل کیا تھا۔ میں گانگ کی موت کو نہیں بھول سکتا تھا۔

میں ٹیلی فون اٹھا کر سامی والے کمرے میں آگیا۔ پرساد بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے ساکٹ میں ٹیلی فون کا پلگ لگا کر سامی کی طرف دیکھا۔

"پیڈرو اس وقت کہاں ملے گا۔ نمبر بتاؤ؟" میں نے کہا۔

سامی نے ایک نمبر بتایا۔ پیڈرو وہاں نہیں تھا پھر سامی کا بتایا ہوا دوسرا اور پھر تیسرا نمبر بھی ٹرائی کیا گیا مگر کسی نمبر پر پیڈرو سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ بالآخر چوتھے نمبر پر اس سے بات ہوگئی۔

"تم اپنے بھائی کے لیے پریشان ہو رہے ہو۔ وہ ابھی تک تو محفوظ ہے لیکن...."

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا وجدان۔" پیڈرو نے غراتے ہوئے میری بات کاٹ دی "کسی میں آج تک یہ ہمت نہیں ہوسکی کہ پیڈرو کا راستہ کاٹ سکے۔ اگر سامی کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہارے ٹکڑے کردوں گا۔"

"تمہاری یہ حسرت پوری نہیں ہوسکے گی۔" میں نے جواب دیا "لو۔ پہلے سامی سے بات کرلو۔ تاکہ تمہیں یقین ہوجائے کہ وہ میرے ہی قبضے میں ہے اور ابھی تک زندہ ہے۔"

میں نے فون کا ریسیور سامی کے کان سے لگا دیا۔

"پیڈرو۔ مجھے بچالو پیڈرو۔" سامی نے ماؤتھ پیس میں کہا "ان کا اگر کوئی مطالبہ ہے تو وہ مان لو۔ مجھے بچالو پیڈرو۔ پلیز...."

میں نے ریسیور اس سے دور ہٹا لیا۔

"تمہیں یقین آگیا پیڈرو۔" میں نے کہا۔

"کیا چاہتے ہو؟" پیڈرو بولا۔

"گانگ.... مجھے گانگ چاہیے جسے سامی نے قتل کردیا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" پیڈرو چیخا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم گانگ کو نہیں لوٹا سکتے لیکن میں تمہارا بھائی تمہیں لوٹا دوں گا۔ آج رات ایک اور دو بجے کے درمیان تمہارا بھائی تمہیں مل جائے گا۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور فون کا پلگ نکال لیا۔

مقناطیسیت

اس کتاب کی مطالعے سے اپنی شخصیت کی مقناطیسی قوت کو اجاگر کریں اور کامیاب زندگی گزاریں

قیمت 25 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ

خط و کتابت کا پتہ

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

سامی کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے۔ اسے شاید یہ امید ہو رہی تھی کہ میں اسے چھوڑ دوں گا۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میں اور پرساد ایک بار پھر سامی والے کمرے میں موجود تھے۔ ہال میں پاتھم نے ٹی وی فل آواز سے کھول دیا تھا۔ اسٹار اسپورٹس پر کرکٹ کے کسی میچ کی ریکارڈنگ دکھائی جا رہی تھی۔ تماشائیوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پرساد سامی کو گھسیٹتا ہوا باتھ روم میں لے گیا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور باتھ روم کے دروازے پر آگیا۔ سامی باتھ روم کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا اور پھر میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی۔

"میرے دوست گانگ کے نام پر!"

میں نے یہ کہتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ پہلی گولی اس کی پیشانی میں لگی اور باقی دو گولیاں سینے پر۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے امید تھی کہ ٹی وی کے شور کی وجہ سے گولیوں کی آواز باہر کہیں نہیں سنی گئی ہوگی۔

ایک بجے کے قریب سامی کی لاش کو بوری میں بند کر کے کار کی ڈکی میں ڈال دیا گیا۔ کار میں میرے ساتھ پرساد اور پاتھم بھی تھے۔ پاتھم نے تو ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔ میں اور پرساد پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ہم سامی کی لاش کو جاؤ فرپا پیراڈائز ریسٹورنٹ کے آس پاس کسی جگہ پر ڈال دیں گے تاکہ وہ کلب میں آنے جانے والے لوگوں میں سے کسی کی نظروں میں آجائے اور پیڈرو کو بھی اس کی اطلاع مل جائے۔

کار سڑک پر متوسط رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ پاتھم نے کار وانگ ڈنگ روڈ پر موڑ لی۔ وہاں سے کچھ آگے ہمیں ارون امارند روڈ کی طرف مڑ جانا تھا۔

کار وانگ ڈنگ روڈ پر مڑ رہی تھی کہ اچانک ہی ارون امارند روڈ کی طرف سے ایک تیز رفتار کار آتی ہوئی دکھائی دی۔ ہماری کار سڑک کے وسط میں تھی اور مخالف سمت سے آنے والی کار بھی سڑک کے وسط میں آ رہی تھی۔ پاتھم نے اپنی کار کو سائڈ میں لیتے ہوئے پوری قوت سے بریک لگا دیے۔ دوسری کار کے ڈرائیور نے بھی بریک لگائے تھے لیکن وہ کار ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ لہراتی ہوئی ہماری کار سے ٹکرا گئی۔

تصادم اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھا لیکن سنسنی خیزبات یہ تھی کہ وہ پولیس کی کار تھی۔ چھت پر فلیشر چمک رہا تھا۔

تصادم ہوتے ہی تین پولیس والے کار سے اتر کر بڑی تیزی سے ہماری کار کی طرف بڑھے تھے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور میں گردن گھما کر پرساد کی طرف دیکھنے لگا۔ ان تینوں پولیس والوں نے ہماری کار کو گھیر لیا تھا۔

میرا دماغ سُن ہو گیا۔ ایک لمحے کو تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے حواسِ خمسہ میرا ساتھ چھوڑ گئے ہوں۔ میں پتھر کے بے جان بت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا اس پولیس والے کی طرف دیکھ رہا تھا جو کار کے میری طرف والے دروازے سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے بیلٹ ہولسٹر میں ریوالور تھا اور اس کا سیدھا ہاتھ ریوالور کے دستے پر پہنچ چکا تھا۔

اپنے ہاتھ کی پشت پر چبھن سی محسوس کر کے میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے پرساد نے میرے ہاتھ پر چٹکی کاٹی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور گردن گھما کر دوسرے پولیس والے کی طرف دیکھنے لگا جو پرساد کی طرف کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ریوالور کے دستے پر تھا جبکہ تیسرا پولیس والا ڈرائیونگ سائڈ ونڈو پر جھکے ہوئے تیز لہجے میں پاتھم سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میرا ذہن اس وقت بھی ماؤف تھا۔ اب میں اگرچہ تھائی زبان بہت اچھی طرح سمجھ اور بول لیتا تھا لیکن اس وقت میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا کہ وہ پولیس والا پاتھم سے کیا کہہ رہا تھا۔ تاہم اس کے چہرے کے تاثرات اور لہجے کی تیزی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پاتھم کو سرزنش کر رہا تھا۔ جواب میں پاتھم نے کچھ کہا تو اس پولیس والے نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکال لیا اور بائیں ہاتھ سے ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول دیا۔

صورتِ حال خاصی سنگین تھی۔ وہ حادثہ بہت معمولی تھا۔ پولیس کار کا دائیں طرف کا ہیڈ لیمپ ٹوٹا تھا جبکہ ہماری کار کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ پاتھم اگر ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی کار کو سائڈ میں لیتے ہوئے بریک نہ لگاتا تو حادثہ سنگین ہو سکتا تھا۔ اس معمولی ٹکر میں بھی قصور پولیس کار کے ڈرائیور ہی کا تھا مگر یہ پولیس والے الٹا ہم پر ہی چڑھ دوڑے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید پولیس والے کبھی کوئی غلطی نہیں کرتے۔ وہ اپنا گناہ ہم پر تھوپنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہمارے لیے صورتِ حال اس طرح سنگین ہو گئی تھی کہ ہماری کار کی ڈکی میں ایک عدد لاش موجود تھی۔ پیڈرو کے بھائی سامی کی لاش جس کی تلاش میں اس کے آدمی پورے شہر میں باؤلے کتوں کی طرح پھر رہے تھے اور ستم ظریفی تو یہ تھی کہ پیراڈائز ریسٹورنٹ وہاں سے صرف ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور یہ ریسٹورنٹ پیڈرو کے چند اہم ترین اڈوں میں سے ایک تھا۔ اگر پیڈرو کا کوئی آدمی اس طرف آنکلتا تو مجھے یا پرساد کو شناخت کرنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہ آتی۔

اس سے پہلے کہ وہ پولیس والا پاتھم کے گریبان پر ہاتھ ڈالتا، پاتھم خود ہی کار سے اتر آیا۔ وہ اس پولیس والے کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ قصور خود اس کا ہے لیکن وہ پولیس والا اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں بھی کار کا دروازہ کھول کر

نیچے اتر آیا۔ میری طرف کھڑے ہوئے پولیس والے نے بھی ریوالور نکال لیا۔ میں کار کے اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سائڈ پر پاتھم اور اس پولیس والے کے قریب پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے پرساد بھی اتر آیا۔ وہ بھی اس پولیس والے کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ غلطی اسی کی تھی لیکن اس کے باوجود ہم ان کی گاڑی کا نقصان پورا کرنے کو تیار ہیں مگر وہ پولیس والا بقول شخصے 'پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا جبکہ دوسرے پولیس والے خاموش کھڑے تھے البتہ انہوں نے اپنے ریوالور تیار رکھے تھے تاکہ اگر ہم کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کریں تو ہمیں سبق سکھا سکیں۔

وہ ضدی پولیس والا غالباً اس پارٹی کا انچارج تھا۔ اس نے غالباً یہ مان لیا تھا کہ غلطی اسی کی تھی لیکن وہ ہر صورت میں ہمیں کسی چکر میں پھنسانا چاہتا تھا۔

"پولیس والوں کے ساتھ منہ ماری کر کے تم لوگ اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا رہے ہو۔" وہ پاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔ "اور میں تم لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔ اے جیکی۔" اس نے اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا "تلاشی لو ان کی گاڑی کی اور ہر جگہ چیک کرو۔ ان کی گاڑی میں یقیناً کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہوگی جو انہیں سلاخوں کے پیچھے بند کرانے میں مددگار ثابت ہو سکے۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ میں نے کن انکھیوں سے پرساد اور پاتھم کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر بھی عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ جیکی نامی وہ پولیس والا پچھلے دروازے میں جھک کر گاڑی کی پچھلی سیٹ اور اس کے نیچے فٹ میٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ ضدی پولیس والا خود بھی گاڑی کو چیک کرنے کے لیے ڈرائیونگ سیٹ کے کھلے ہوئے دروازے کے اندر جھکنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب آگیا اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا۔ اس کے منہ سے شراب کی ہلکی سی بو آ رہی تھی۔

"آفیسر!" میں نے اسے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ اس وقت میرے لہجے میں کسی قدر درشتی تھی "تم شراب کے نشے میں ہو اور تم جانتے ہو شراب پی کر گاڑی چلانا سنگین جرم ہے اور تم تو ویسے بھی ڈیوٹی پر ہو۔ اس طرح تمہارا جرم مزید سنگین ہو جاتا ہے۔ تم نے شراب کے نشے میں گاڑی چلاتے ہوئے ہماری گاڑی کو ٹکر ماری اور الٹا ہمیں پریشان کر رہے ہو۔ ہم تمہارے خلاف رپورٹ کریں گے اور تم جانتے ہو اس طرح نہ صرف تمہاری نوکری ختم ہو جائے گی بلکہ تمہیں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑے گی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوا "تم اس بات کی گواہی دو گے کہ یہ ڈیوٹی پر شراب پی کر گاڑی چلا رہا تھا اور اس نے ہماری گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔"

ان دونوں کے چہرے دھواں ہو گئے۔ وہ ہوش و حواس میں تھے اور بات کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں پہلے آپس میں تیز لہجے میں باتیں کرتے رہے پھر اپنے ضدی ساتھی کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور اسے صورت حال سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی باتوں میں تلخی صاف محسوس ہو رہی تھی پھر جیکی نامی پولیس والا ہمارے قریب آگیا۔

"سوری سر!" وہ پاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہمارا ساتھی آفیسر اپنی اس غیر ذمے دارانہ حرکت پر نادم ہے۔ آپ کو جو زحمت ہوئی اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں اور پلیز۔ اس واقعے کو بھول جائیے۔"

"اور ہمارا جو نقصان ہوا ہے۔" اس مرتبہ پاتھم اکڑ گیا "یہ دیکھو۔ ہماری گاڑی کا فینڈر ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی مرمت کے پیسے کون دے گا؟"

"میں آپ کا نقصان پورا کر دوں گا سر۔" جیکی نے پتلون کی جیب سے والٹ نکالا اور چند نوٹ نکال کر پاتھم کی مٹھی میں دبا دیے۔

پاتھم نے نوٹ گنے پھر گاڑی کے فینڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اتنی رقم میں تو کوئی ڈینٹر اس کی مرمت نہیں کرے گا....."

اب مجھے پاتھم پر غصہ آ رہا تھا۔ ایک مصیبت ٹل رہی تھی لیکن وہ خود اسے گلے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیکی والٹ (WALLET) میں سے کچھ اور نوٹ نکالنے لگا۔ میں نے پاتھم کا ہاتھ پکڑ کر اسے گاڑی کی طرف کھینچا۔

"اب رہنے بھی دو۔ اس کی جیب خالی کراؤ گے کیا؟" میں نے پاتھم کو گھورتے ہوئے کہا۔ یہاں کھڑے کھڑے خاصا وقت گزر گیا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کوئی تیسری پارٹی اس طرف نہ آنکلے۔ اس طرح ہم پھر مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔

پاتھم نے جیکی نامی پولیس والے سے نوٹ لے کر پتلون کی جیب میں ٹھونسے اور اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ میں اور پرساد بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پاتھم گاڑی کو چند گز پیچھے ہٹا لے گیا اور پھر اسے پولیس کار کے قریب سے نکالتا ہوا آگے لے جانے لگا۔ وہ تینوں پولیس والے وہاں کھڑے حسرت بھری نظروں سے ہماری گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ انہوں نے ہماری گاڑی کا نمبر ضرور دیکھ لیا ہوگا اور یہ بات ہمارے لیے آگے چل کر خطرناک ہو سکتی تھی۔

پاتھم نے وہاں سے نکلتے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ اب وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگلے موڑ سے پہلے ہی اس نے کار کی رفتار کم کر دی اور پھر اسے اس سڑک پر موڑ دیا جو دریا کے کنارے پر واقع ریسٹورنٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ سڑک کافی کشادہ تھی۔ اس کے دونوں طرف پھولوں کی کیاریاں اور ان کے ساتھ ساتھ پام کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ سامنے ہی

پیراڈائز ریسٹورنٹ کا گیٹ نظر آرہا تھا۔

"کیا کررہے ہو تم۔ کہاں جارہے ہو؟" پرساد نے پاتھم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہم لاش کو ایسی جگہ چھوڑیں گے جہاں سے ان لوگوں کی نظروں میں تو آجائے۔" پاتھم نے جواب دیا اور گاڑی کو گیٹ میں لے جاکر پارکنگ ایریا کی طرف موڑ دیا۔

اس وقت اگرچہ دو بجنے والے تھے لیکن پارکنگ میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں جس کا مطلب تھا کہ ریسٹورنٹ کی رونق میں ابھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں سامنے کے رخ پر جگہ نہیں تھی۔ پاتھم گاڑی کو پچھلی طرف لے گیا اور ایک خالی جگہ پر روک دیا۔

پاتھم کی یہ حرکت خودکشی کے مترادف تھی۔ ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ سامی کی لاش کو ریسٹورنٹ والی سڑک کے آس پاس کسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں وہ کسی کی نظروں میں آجائے گی۔ ہم صرف یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ہم بزدل نہیں ہیں لیکن پاتھم کچھ زیادہ ہی فری ہوگیا تھا۔ وہ گاڑی کو ریسٹورنٹ کے پارکنگ لاٹ پر لے آیا تھا۔ یہ ریسٹورنٹ پیڈرو کے چند بڑے اڈوں میں سے ایک تھا۔ وہ خود نہیں تو اس کے آدمی تو ہروقت یہاں موجود رہتے ہوں گے۔ اس کے کچھ آدمی مجھے بھی پہچانتے تھے اور پرساد کو بھی۔ اگر ہمیں دیکھ لیا جاتا تو وہ لوگ ہمیں یہاں سے زندہ واپس نہیں جانے دیتے۔ میں بزدل نہیں تھا لیکن بے موقع بہادری کا مظاہرہ ہماری زندگیوں کا خاتمہ کرسکتا تھا یا ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا جبکہ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ پیڈرو اس وقت پاگل ہوا پھر رہا تھا اور اس کے بھائی کی لاش ہماری کار کی ڈکی میں رکھی ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال میں کوئی فاترالعقل شخص ہی جان بوجھ کر اس قسم کی کوئی حرکت کرسکتا تھا۔

"پرساد۔" پاتھم نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا "تم باس کے ساتھ مل کر بوری کو ڈکی میں سے نکالو اور اسے اس نیلی کار کے قریب ڈال دو۔ یہ مسز تھاٹ کی کار ہے۔ ایک دو مرتبہ میرے ورکشاپ میں مرمت کے لیے آچکی ہے۔ تین بجے کے لگ بھگ لوگ واپس جانا شروع ہوں گے تو یہ بوری ان کی نظروں میں آجائے گی۔"

میں اور پرساد کار سے اتر آئے۔ پاتھم نے اندر سے ایک بٹن دبا کر ڈکی کا لاک کھول دیا۔ میں جیسے ہی پچھلی طرف ڈکی کے قریب پہنچا تو چونک گیا۔ ڈکی کے ایک کونے سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ہمیں یہاں کھڑے ہوئے زیادہ سے زیادہ دو منٹ ہوئے تھے لیکن اتنی سی دیر میں ہی ڈکی کے نیچے پختہ فرش پر تقریباً تین انچ چوڑا خون کا ایک تالاب سا بن گیا تھا جو ڈکی سے گرنے والے خون کے ہر قطرے کے ساتھ پھیل رہا تھا۔

سامی کو تقریباً تین گھنٹے پہلے گولی ماری گئی تھی اور اس کی لاش دو گھنٹوں تک باتھ روم میں پڑی رہی تھی لیکن وہ صحت مند آدمی تھا اور گولیاں لگنے کے تین گھنٹوں بعد بھی اس کی لاش سے خون ٹپک رہا تھا۔

اچانک ایک اور خیال ذہن میں آتے ہی میں کانپ اٹھا۔ پولیس کار سے تصادم کے بعد ہم دس بارہ منٹ تک وہاں کھڑے رہے تھے اور یقیناً وہاں بھی خون ٹپکا ہوگا۔ جس انداز سے خون ٹپک رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس جگہ سڑک پر خون کا کتنا بڑا تالاب بن گیا ہوگا اور اگر ان پولیس والوں نے وہ خون دیکھ لیا ہوگا تو اس سے قطع نظر کہ ان کا ایک ساتھی ڈیوٹی پر اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے شراب نوشی کے جرم کا مرتکب ہوا تھا، وہ ہماری تلاش شروع کردیں گے۔

پرساد نے بھی ڈکی سے ٹپکتا ہوا خون دیکھ لیا تھا اور پھر اس نے جیسے ہی ڈکی کا ڈھکنا اوپر اٹھایا، ہم دونوں چونک گئے۔ ڈکی میں بچھا ہوا میٹ خون سے تر ہو رہا تھا۔

"بوری اٹھاؤ اور یہ میٹ بھی اٹھا کر نیچے ڈال دو۔" میں نے بوری کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

پرساد نے بھی بوری کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک کار گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔

"یہ پیڈرو کی کار ہے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سفید رنگ کی وہ لمبی سی کار پارکنگ لاٹ کی طرف آنے کے بجائے ریسٹورنٹ کی مرکزی عمارت کے پورچ میں رک گئی۔ کار سے تین آدمی اترے تھے۔ ان میں ایک پیڈرو تھا اور دو اس کے محافظ۔ ان دونوں کے پاس آٹو میٹک رائفلیں تھیں۔ پیڈرو کی کار رکتے ہی عمارت کے اندر سے دو تین آدمی اور بھی برآمدے میں آگئے تھے۔ پیڈرو بپھرا ہوا تھا۔ وہ ان لوگوں سے تیز تیز لہجے میں باتیں کررہا تھا۔

پیڈرو کو دیکھ کر پرساد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔

"اپنے حواس قابو میں رکھو پرساد۔" میں نے سرگوشی کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ جذبات میں آکر وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر گزرے جو ہم سب کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔

ہم دونوں نیچے جھک گئے تھے۔ کاروں کی آڑ کی وجہ سے وہ لوگ تو ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن ہم انہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ چند منٹ وہیں کھڑے رہے پھر اندر چلے گئے۔

"بوری نکالو۔ جلدی۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔" میں نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

ہم دونوں محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بوری کو اٹھا کر باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ سامی کی لاش خاصی وزنی تھی۔ بوری نکالتے ہوئے پرساد کی گرفت چھوٹ

گئی اور لاش "دھپ" کی آواز سے نیچے پختہ فرش پر گری۔ ہم دونوں نے بوری کو گھسیٹ کر مسز تھاٹ کی نیلی کار کے قریب پہنچا دیا۔ پرساد نے ڈکی کے فرش پر پڑا ہوا ربر میٹ بھی اٹھا کر بوری کے قریب ڈال دیا۔ اس نے اگرچہ میٹ اٹھانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا تھا لیکن میٹ پر جمع ہونے والا خون فرش پر پھیل گیا تھا۔

ہم دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پاتھم نے کار کا انجن بند کر رکھا تھا اور اب اس نے جیسے ہی انجن اسٹارٹ کیا، ایک اور کار گیٹ میں داخل ہوئی اور اس کار کی چھت پر نیلی اور سرخ روشنی چمکتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ اس پولیس کار کا ایک ہیڈلیمپ ٹوٹا ہوا تھا اور یہ وہی کار تھی جس سے ہماری کار کی ٹکر ہوئی تھی۔

پاتھم نے انجن بند کردیا اور ہماری طرف گھوم گیا۔

"گڑبڑ ہوگئی باس۔" اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا "کیا ضرورت تھی یہاں آنے کی۔ اب ہم باہر بھی نہیں نکل سکتے۔ پولیس کار گیٹ کے قریب ہی رکی ہے۔"

"ہمیں باہر نکلنے سے تو کوئی طاقت نہیں روک سکتی البتہ اب اس کار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ایک پولیس والا کار سے اُتر کر اندر جارہا ہے۔" میں نے کہا "راستے میں بھی خون ٹپکتا رہا ہے اور وہ لوگ یقیناً سڑک پر خون کے دھبے دیکھتے ہوئے اس طرف آئے ہیں۔ وہ پارکنگ میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو چیک کریں گے اور پھر..... بہرحال، اب اترو اس کار سے۔"

ہم تینوں کار سے اُتر آئے۔ کھڑے ہونے کی حماقت نہیں کرسکتے تھے۔ جھک کر چلتے ہوئے پارکنگ کے پچھلی طرف جانے لگے جہاں چند گز آگے گنجان درخت تھے اور ان کے پیچھے باؤنڈری وال تھی۔

ہم ابھی درختوں میں پہنچے ہی تھے کہ وہ پولیس والا عمارت سے باہر آگیا۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ان میں ایک ریسٹورنٹ کا اسسٹنٹ منیجر تھا۔ ان کا رخ پارکنگ لاٹ کی طرف تھا۔ پولیس کار کے قریب کھڑے ہوئے دوسرے پولیس والے بھی اب پارکنگ کی طرف آرہے تھے۔

درختوں کے پیچھے باؤنڈری وال تقریباً دس فٹ اونچی اور بالکل سپاٹ تھی۔ اس پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ ہم درختوں کی آڑ میں چلتے رہے۔ ہمیں کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں سے دیوار پر چڑھ سکیں۔

اور پھر میری توقع کے عین مطابق پولیس والوں نے پارکنگ میں وہ کار بھی تلاش کرلی اور بوری بھی۔ میں ایک درخت کے پیچھے رک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ ایک پولیس والا جھکا ہوا تھا۔ غالباً بوری کھول رہا تھا پھر دوسرا پولیس والا بھی جھک گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد میں نے اسسٹنٹ منیجر کو بھی جھکتے ہوئے دیکھا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے اسسٹنٹ منیجر چیختا ہوا برآمدے کی طرف دوڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ لاش بوری سے نکال کر شناخت کرلی گئی تھی اور اسسٹنٹ منیجر پیڈرو کو اطلاع دینے کے لیے دوڑا تھا۔

اب یہاں رک کر ایک بھی لمحہ ضائع کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے پاتھم اور پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے اور بالآخر ایک درخت کے قریب رک گئے۔ اس درخت کی دو موٹی شاخیں دیوار کے اوپر سے باہر کی طرف چلی گئی تھیں۔

"اس درخت پر چڑھ کر دیوار کے باہر کود جاؤ۔ جلدی کرو۔" میری آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

پہلے پرساد درخت پر چڑھا۔ اس کے بعد پاتھم اور جب میں درخت پر چڑھ رہا تھا تو ٹھیک اسی وقت پیڈرو اور کئی افراد برآمدے والے دروازے سے نکل کر پارکنگ کی طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے۔

اور پھر وہاں اچھا خاصا ہنگامہ مچ گیا۔ سامی کی لاش ملنے کی اطلاع ریسٹورنٹ کے اندر پہنچ چکی تھی اور سب ہی جانتے تھے کہ سامی پیڈرو کا بھائی تھا۔ پیڈرو کے بھائی کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لوگ وہاں سے بھاگنے کی سوچ رہے تھے لیکن پولیس والوں نے کسی کو بھی پارکنگ لاٹ کی طرف نہیں جانے دیا۔ ایک پولیس والا گیٹ کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"کوئی بھی شخص گیٹ سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قاتلوں کو ہم پہچانتے ہیں۔ ان کے سوا کسی اور سے کوئی بازپرس نہیں کی جائے گی۔ آپ لوگ شانت رہیے۔ تھوڑی دیر بعد آپ لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔"

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ جاؤ فریا پیراڈائز ریسٹورنٹ عام ریستورانوں سے بہت مختلف تھا۔ یہ بہت بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور بہت بڑے باغ کے ساتھ تین چار عمارتوں پر مشتمل تھا جو ایک دوسرے سے الگ اور فاصلے پر تھیں لیکن سامی کے قتل اور لاش کی دریافت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ کیسینو، کلب اور ریستوران کی تمام عمارتیں خالی ہوچکی تھیں اور لوگ باہر جمع ہورہے تھے۔ پریشانی اور خوف ہر چہرے سے مترشح تھا۔

میں درخت کے تنے پر چڑھ کر اس موٹی شاخ پر پہنچ گیا جو دیوار کے اوپر سے ہوتی ہوئی باہر کی طرف چلی گئی تھی۔ پاتھم مجھ سے آگے، ابھی اس شاخ پر ہی تھا۔ میں چند فٹ آگے بڑھا تو ہم دونوں کے بوجھ سے شاخ جھکنے لگی۔ مجھے معلوم نہیں وہ کون سا درخت تھا مگر یہ اندازہ فوراً ہی ہوگیا کہ اس کی لکڑی کچی تھی۔ ہم

دونوں کے بوجھ سے شاخ نہ صرف جھکتی چلی گئی بلکہ چرچراہٹ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی تھی۔

شاخ بدستور جھکتی جا رہی تھی۔ چھوٹی شاخیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں جن سے اچھی خاصی آواز پیدا ہو رہی تھی اور اس آواز نے پارکنگ میں کھڑے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔

"اے۔ کون ہے اوھر۔ دیکھو کون ہے؟" ایک آدمی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وہ لوگ کار لے کر چند منٹ پہلے ہی یہاں آئے ہوں گے۔" یہ ایک پولیس والے کی آواز تھی "جیکی۔ دیکھو۔ وہی لوگ ہوں گے جو بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ شاخ دیوار سے تقریباً تین فٹ اوپر تھی جو جھک کر دیوار پر ٹک گئی تھی۔ پاتھم دیوار پر ٹک گیا تھا۔ اس نے مجھے بھی ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

"باہر چھلانگ لگا دو۔" میں نے سرگوشی کی "ایک لمحے کی تاخیر بھی ہماری موت کا باعث بن سکتی ہے۔" پرساد ہم سے پہلے ہی باہر پہنچ چکا تھا۔

پاتھم دیوار کے ساتھ باہر کی طرف لٹک گیا اور دوسرے ہی لمحے دھپ کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ دوسری طرف کچی زمین تھی۔ میں نیچے کودتے ہی سنبھل گیا۔

یہ تقریباً چالیس پچاس فٹ چوڑا کچا راستہ تھا جہاں خود رو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے آگے کسی اور عمارت کی باؤنڈری وال تھی۔ یہ کچا راستہ ایک طرف تو سڑک تک چلا گیا تھا اور دوسری طرف دریا کے کنارے تک۔

ریسٹورنٹ کی طرف سے شور سنائی دے رہا تھا۔ ہم نے دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے پتلون کی جیب سے تھائی وانگ کا دیا ہوا پستول نکال لیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں اسے فوری طور پر استعمال کیا جاسکے۔

صورتِ حال بڑی خوفناک تھی۔ پولیس والوں نے پیڈرو کو بتا دیا تھا کہ ہماری کار چند منٹ پہلے ہی یہاں آئی تھی۔ اس نے دیوار کے قریب درخت کی شاخ کے ٹوٹنے کی آواز بھی سُن لی تھی اور ممکن ہے ہمارے کودنے کی آوازیں بھی سن لی ہوں۔ اسے یقین ہوگا کہ ہم زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ اپنے آدمیوں کے ذریعے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لے گا۔ بات اب صرف پیڈرو کی نہیں تھی۔ پولیس بھی بیچ میں کود پڑی تھی۔ پولیس والے کار کے ریڈیو پر اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دیں گے اور چند منٹ کے اندر اندر اس علاقے کو گھیرے میں لے لیا جائے گا۔

دریا کے کنارے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ دائیں طرف تو پیراڈائز ریسٹورنٹ ہی کا حصہ تھا۔ البتہ بائیں طرف سناٹا تھا لیکن میرے خیال میں اس طرف سے بھی ہمارے بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا اور جب میں نے پرساد اور پاتھم کو اپنے اس خیال سے آگاہ کیا تو وہ دونوں اچھل پڑے۔

"موت کے منہ میں چھلانگ لگانے کی سوچ رہے ہو؟" پرساد نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"اس میں اگرچہ رسک تو ہے لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ہم محفوظ رہیں گے۔" میں نے کہا "یہ ایک نفسیاتی چال بھی ہے اور ایسے حربے عام طور پر کامیاب رہتے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں اس علاقے کو دور دور تک گھیر لیں گے۔ پولیس بھی ان کے ساتھ ہماری تلاش میں شامل ہو جائے گی۔ تمام راستوں کی ناکا بندی کردی جائے گی۔ ہوسکتا ہے آس پاس کی عمارتوں کی تلاشی بھی لی جائے لیکن یہ بات ان کے ذہن میں کبھی نہیں آئے گی کہ ہم ان کے آس پاس ہی موجود ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" پاتھم بولا "تو پھر دیر مت کرو۔ ہمارے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ میرا خیال ہے ان کے ایک دو آدمی دیوار سے کود چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اس طرف آسکتے ہیں۔"

اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ پانچ چھ آدمی تھے۔ کچھ مخالف سمت میں دوڑ رہے تھے اور کچھ آوازیں قریب آرہی تھیں۔

ہم جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے دائیں طرف چلنے لگے۔ پیراڈائز ریسٹورنٹ کی باؤنڈری وال دریا کے کنارے سے دس بارہ فٹ پہلے ختم ہوگئی تھی۔ اس سے آگے دریا کے کنارے تک تاروں کا جنگلا لگا ہوا تھا۔ تار خاردار نہیں تھے۔ اگرچہ قریب قریب تھے لیکن کچھ تار ڈھیلے ہو رہے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے بھی لوگ اس جنگلے سے گزرتے رہے ہیں۔

میں نے پہلے جھانک کر دوسری طرف دیکھا اور پھر جھک کر جنگلے میں سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ میرے پیچھے ہی پاتھم اور پرساد بھی آگئے۔ تقریباً پچاس گز آگے وہ بیٹھک تھی جہاں تیز روشنی ہو رہی تھی لیکن اس وقت وہاں سناٹا تھا اور کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ایک رات پاتھم نے مجھے اور تھائی کو فرار ہونے میں مدد دی تھی۔

دوسری طرف بھی سناٹا تھا۔ غالباً سب لوگ پارکنگ ایریا کی طرف جمع تھے۔ پاتھم نے اشارہ کیا اور ہم ان درختوں کے نیچے پہنچ گئے جہاں اس سے میری اور تھائی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

"اوپر رہائشی کمرے ہیں۔" پاتھم نے ریسٹورنٹ کی مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی "تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ راستہ صاف ہوا تو میں بلی کی آواز

نکال کر سگنل دوں گا۔ تم لوگ چلے آنا۔"

وہ ہمیں چھوڑ کر دبے قدموں چلتا ہوا عمارت کے عقبی دروازے میں داخل ہوگیا۔ یہ دروازہ ملازمین کی آمدورفت کے لیے مخصوص تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اوپر جانے کے لیے تنگ سا زینہ تھا۔ اس رات پاتھم کا پیغام ملنے کے بعد میں اور تھائی بھی اسی دروازے سے باہر آئے تھے۔

ہم دونوں دم سادھے درختوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور پرساد نے بھی پستول نکال لیا تھا۔ ہم یہاں آ تو گئے تھے لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم واقعی موت کے حصار میں آگئے تھے۔ اگر پیڈرو وغیرہ کو پتا چل جائے کہ ہم یہاں موجود ہیں تو ہمارے یہاں سے زندہ واپس چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پارکنگ والی طرف سے اب بھی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً اس ریسٹورنٹ میں موجود ہر شخص اس طرف چلا گیا تھا۔

تقریباً پانچ منٹ گزر گئے اور پھر بلی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے پرساد کو اشارہ کیا اور ہم دونوں درختوں سے نکل کر دبے قدموں چلتے ہوئے اس دروازے میں داخل ہوگئے۔ یہ تنگ سی راہداری تھی جس کا اختتام ڈائننگ ہال پر ہوتا تھا۔ وہاں اگرچہ روشنی تھی لیکن ہال میں کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی اوپر جانے کے لیے تنگ سی سیڑھیاں تھیں۔ پاتھم انہی سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ ہم اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔

اوپر کشادہ راہداری تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دونوں طرف کمرے تھے۔ یہاں کی رہائش کسی طرح بھی فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھی۔

"آخری کمرا خالی ہے اور میرا خیال ہے' وہی کمرا ہمارے لیے محفوظ اور مناسب رہے گا۔" پاتھم نے سرگوشی کی۔

ہم چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر یورپین عورت تھی جس نے شب خوابی کا باریک سا لباس پہن رکھا تھا۔ بال الجھے ہوئے اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ میرے خیال میں اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور وہ خاصی حسین عورت تھی۔ اس وقت رات کا آخری پہر تھا۔ تین بجنے والے تھے اور میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ عورت اس وقت کمرے سے باہر کیوں نکلی تھی۔

ہمارے ہاتھوں میں پستول دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں اور شاید اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا تھا لیکن پرساد بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس نے ایک ہاتھ سے عورت کا منہ دبا دیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔

برصغیر کے نامور گلوکاروں کے سدا بہار گیتوں کا
نوٹیشن
اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف "دُھن" بھی ہر ساز پر بجائی جاسکتی ہے
سُر سنگیت
موسیقی کے حوالے سے
ابجدِ موسیقی
کے بعد ایچ اقبال کی دوسری کتاب
صفحات 200 سے زائد
قیمت 200 روپے
ڈاک خرچ 25 روپے
سفید کاغذ مجلد اور دلکش سرورق
موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تحفہ!
اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 رمضان چیمبرز ڈلوریا اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200
فون: 5802552-5895313
فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

"کوئی گڑبڑ کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔" پرساد غرایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس عورت کو دھکیلتا ہوا دروازے کے اندر لے گیا۔

میں اور پاتھم بھی اندر گھس گئے۔ پاتھم نے آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔ میں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ شان دار صوفہ سیٹ تھا اور ہر وہ چیز موجود تھی جو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ہونی چاہیے تھی۔ سامنے کارنس پر مہاتما بدھ کا لکڑی کا ایک چھ انچ اونچا مجسمہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی کارنس پر کچھ کارڈز رکھے ہوئے تھے۔ یہ کارڈز کمرے کے دروازے پر لگانے کے لیے تھے۔ پاتھم نے "DO NOT DISTURB" کا کارڈ اٹھایا اور دروازہ کھول کر اسے باہر کے ہینڈل پر لٹکا کر دروازہ پھر بند کردیا۔

اس نشست گاہ سے آگے بیڈ روم تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور اس دروازے سے جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بیڈ روم خالی تھا۔ بیڈ پر بچھی ہوئی چادر پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور اوڑھنے والی چادر بھی بکھری ہوئی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر اشارہ کیا۔ پاتھم اور پرساد اس عورت کو لے کر اندر آگئے۔ پرساد نے ابھی تک اس کا منہ دبایا ہوا تھا۔

"میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا رہا ہوں۔ اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو بھیجا اڑا دوں گا۔" پرساد کے حلق سے غراہٹ سی نکلی اور پھر اس نے عورت کو چھوڑ دیا۔

اس عورت کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں میں دہشت سی بھری ہوئی تھی اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"ڈرو نہیں۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔" میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھا دیا "اکیلی ہو یا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"اکے.... لی.... ہوں۔" اس عورت کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی اور پھر اس نے ایک ہاتھ سے اپنا منہ دبا لیا۔ اسے شاید ڈر تھا کہ اس کے منہ سے چیخ نکل جائے گی۔

پاتھم اس دوران میں باتھ روم چیک کرچکا تھا۔ میں بھی کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بہت شان دار کمرا تھا۔ ایک طرف سے آوازیں سن کر میں چونک سا گیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی کے سامنے نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پردے کا کونا ذرا سا سرکایا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ کھڑکی عمارت کے سامنے کے رخ پر تھی اور یہاں سے مرکزی گیٹ اور پارکنگ ایریا صاف نظر آرہا تھا۔ پارکنگ لاٹ کے سامنے کچھ درخت حائل تھے تاہم وہاں لوگوں کی سرگرمیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے پردہ چھوڑ دیا۔ اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ شور کی آواز سن کر اس عورت کی آنکھ کھل گئی ہوگی اور اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا ہوگا اور شاید پھر صورت حال معلوم کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تھی کہ ہمارے ہاتھ لگ گئی اور اب یقیناً پچھتا رہی ہوگی کہ وہ کمرے سے باہر کیوں نکلی تھی۔

"ہم ڈاکو یا لٹیرے نہیں ہیں۔" میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آرام سے بیٹھو۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" میں نے کرسی پر پڑا ہوا نائٹ گاؤن اٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔ باریک نائٹی میں وہ تقریباً عریاں نظر آرہی تھی اور پھر خوف سے اس پر کپکپی سی طاری تھی "یہ پہن لو۔" میں نے کہا "ہم صرف چند گھنٹے یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ ہنگامہ ختم ہوجائے تو ہم چلے جائیں گے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کروگی تو تمہیں ہم سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن اگر شور مچانے یا کوئی اور چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

"تت.... تم لوگ کون ہو اور.... یہ ہنگامہ کیسا ہے؟" اس عورت نے گاؤن پہنتے ہوئے خوف زدہ سی آواز میں پوچھا۔

"اس ریسٹورنٹ پر بدمعاشوں کا قبضہ ہے اور یہاں ایک قتل ہوگیا ہے۔" میں نے جواب دیا "ہمارا تعلق چونکہ مخالف گروہ سے ہے اس لیے ہمیں شبہ تھا کہ ہمیں اس واقعے میں لپیٹنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم اپنے آپ کو بچانے کے لیے اوپر آگئے تھے۔ اتفاق سے تم ہمارے ہاتھ لگ گئیں۔ یقین کرو ہم بہت شریف آدمی ہیں۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ جیسے ہی باہر کا ہنگامہ ختم ہوگا، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔"

میری باتوں سے اس عورت کو کچھ حوصلہ ملا اور وہ بتدریج اپنی کیفیت پر قابو پاتی چلی گئی۔

"یہ ریسٹورنٹ تو پیڈرو کی نگرانی میں ہے۔ یہاں کون ہنگامہ کرسکتا ہے؟" اس عورت نے کہا۔ اس بات سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ یہاں کے بارے میں کچھ معلومات بھی رکھتی ہے "ویسے سنا ہے کہ کسی نے اس کے چھوٹے بھائی کو اغوا کر رکھا ہے۔" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

"پیڈرو ہی سب سے بڑا بدمعاش ہے۔" میں نے کہا "اس کے بھائی نے مخالف گروہ کے ایک آدمی کو قتل کردیا تھا۔ مقتول کے ساتھیوں نے پیڈرو کے بھائی کو اغوا کرکے قتل کردیا اور اس کی لاش یہاں لاکر پارکنگ میں پھینک دی۔ اتفاق سے پیڈرو بھی یہاں پہنچ گیا اور یہ سارا ہنگامہ اسی لاش کا ہے۔"

"اوہ۔" وہ عورت چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی "پیڈرو بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ تو پورے شہر میں قیامت برپا کردے گا۔"

"اس شہر میں اس سے بھی زیادہ خطرناک لوگ موجود ہیں جو خون کا بدلہ خون کے قائل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیڈرو اپنے بھائی کے قتل پر خاموش نہیں بیٹھے گا مگر وہ گھاٹے میں رہے گا۔ اس کے مخالفین اب خاموش بیٹھنے والے نہیں ہیں۔"

اسی لمحے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ میں نے پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ اس عورت کو پستول کی زد پر لے کر سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ایک بار پھر کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ کمرے میں اگرچہ نائٹ بلب جل رہا تھا اور باہر سے ہمارے چہرے واضح طور پر نہیں دیکھے جاسکتے تھے لیکن میں کھڑکی کا پردہ پوری طرح ہٹا کر کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

پولیس کی تین گاڑیاں گیٹ میں داخل ہو کر رکیں اور کئی پولیس والے نیچے اتر کر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ کچھ دیر بعد دو گاڑیاں اور آگئیں۔ ان گاڑیوں میں پولیس کے دو بڑے افسران آئے تھے اور پھر کچھ ہی دیر بعد پیڈرو کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دینے لگی۔

"اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میرے بھائی کے قاتلوں کو گرفتار نہ کیا گیا تو میں اس شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔" وہ ایک پولیس آفیسر کو دھمکی دے رہا تھا "میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ سامی کو کس نے اغوا کیا ہے لیکن تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا۔ تم لوگ مہاراج سے ڈرتے ہو۔ تم لوگ میرے بھائی کو نہیں بچا سکے اور اس کے قاتل پر بھی ہاتھ نہیں ڈال سکو گے۔ اب میں خود....."

وہ خاموش ہوگیا یا اسے خاموش کرا دیا گیا۔ پولیس نے پورا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ اس دوران میں ایک ایمبولینس بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ چند منٹ بعد لوگوں کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ تینوں پولیس والے جن کی گاڑی سے ہمارا تصادم ہوا تھا گیٹ کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ باہر جانے والی ہر گاڑی کو چیک کررہے تھے۔ ہر شخص کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔

بالآخر پورا کمپاؤنڈ خالی ہوگیا۔ اب صرف پولیس والے اور ریسٹورنٹ کے ملازمین رہ گئے تھے۔ پیڈرو بپھرا ہوا سا پھر رہا تھا۔ پولیس اپنی کارروائی مکمل کرچکی تھی اور اب لاش اٹھانے کی تیاری کی جارہی تھی۔

ساڑھے چار بجے کے قریب لاش ایمبولینس پر بھجوادی گئی اور پولیس بھی رخصت ہوگئی۔ پیڈرو بھی اپنے محافظوں کے ساتھ اپنی کار میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد سناٹا چھا گیا۔ پارکنگ لاٹ پر اب بھی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں دو کاریں تھیں اور ایک اسٹیشن ویگن۔ یہ غالباً وہ گاڑیاں تھیں جو ریسٹورنٹ کے ملازمین کے استعمال میں رہتی تھیں۔

"کیا خیال ہے باس۔" پرساد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب چلا جائے یا کچھ اور انتظار کیا جائے؟"

"ابھی یہاں سے نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "پیڈرو کے آدمی پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم دن کی روشنی پھیلنے کے بعد یہاں سے نکلیں گے۔"

پرساد کی بات سن کر وہ عورت ضرور خوش ہوئی ہوگی لیکن میرے جواب سے اس کے چہرے پر ایک بار پھر مایوسی چھا گئی۔ پاتھم نشست گاہ میں جا کر ایک صوفے پر لیٹ گیا۔ میں پرساد کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ عورت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے حواس پر پوری طرح قابو پاچکی تھی۔ اب تک اگرچہ ہم نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا لیکن اسے مطمئن نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے تاثرات اب بھی تھے۔ تین خطرناک آدمی ہاتھوں میں پستول لیے ایک تنہا عورت کے کمرے میں موجود تھے پھر وہ مطمئن کس طرح ہوسکتی تھی۔

اس عورت کا نام تھریسا تھا۔ وہ نسلاً انگریز لیکن ہانگ کانگ کی رہنے والی تھی۔ اس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ ادویات تیار کرنے والی لندن کی ایک بین الاقوامی کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر اگرچہ ہانگ کانگ میں تھا مگر ایسٹ ایشیا اور ساؤتھ ایشیا کے کئی ممالک اس کے حلقے میں شامل تھے اور وہ ان ممالک کے دوروں پر جاتی رہتی تھی۔ دو دن پہلے بنکاک آئی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ بنکاک آتی رہتی تھی اور ہمیشہ پیراڈائز میں قیام کرتی تھی اور یہیں سے اس نے ٹائیگر اور پیڈرو کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔

تھریسا سے باتیں کرتے ہوئے میں محسوس کررہا تھا کہ اسے نیند آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں لیکن ہماری موجودگی میں وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میں بار بار تھائی اور جانگی وغیرہ کے بارے میں سوچنے لگتا۔ میں نے تھائی سے کہا تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے لیکن ہمیں گھر سے نکلے ہوئے کئی گھنٹے ہوچکے تھے۔ ہم انہیں کوئی اطلاع بھی نہیں دے سکے تھے۔ وہ یقیناً پریشان ہوں گی۔

رات بیت گئی۔ باہر دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد کھڑکی کے پردے پر دھوپ بھی نظر آنے لگی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن پیراڈائز کے کمپاؤنڈ میں سناٹا تھا۔ ایسی جگہوں پر دن کے وقت تو سناٹا ہی رہتا ہے البتہ راتیں جاگتی ہیں۔

آٹھ بجے کے قریب میں نے پاتھم اور پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"میڈم تھریسا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تمہیں تھوڑی سی زحمت کرنی ہوگی۔"

"کیا مطلب! کیسی زحمت؟" اس کی سرخ آنکھوں میں خوف کے ہلکے سے تاثرات ابھر آئے۔

"ہم تمہیں اس کمرے میں چھوڑ کر جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔" میں نے کہا "تمہیں ہمارے ساتھ باہر سڑک تک جانا

ہو گا۔"

اس کا خوف زدہ ہونا فطری بات تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہم اسے یرغمال بنا کر اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں لیکن میں نے اسے یقین دلا دیا کہ ہم اسے صرف سڑک تک لے جائیں گے۔

اس کے آدھے گھنٹے بعد ہم کمرے سے نکل آئے۔ اتفاق سے اس وقت راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ زینے پر ایک عورت اور ایک مرد سے آمنا سامنا ہوا۔ وہ نیچے سے اوپر آ رہے تھے لیکن ہم پر توجہ دیے بغیر قریب سے گزر گئے۔

تھریسا میرے اور پرساد کے بیچ میں تھی۔ ہم دونوں کے ہاتھ جیبوں میں رکھے ہوئے پستولوں پر تھے۔ پاکھم ہم سے دو قدم آگے تھا۔ لابی میں دو عورتیں اور ایک مرد بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی یورپین تھے اور غالباً یہاں قیام پذیر تھے۔ وہ مرد تھریسا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ جواب میں تھریسا کے ہونٹوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

لابی میں واقع استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک خوب صورت تھائی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تھریسا کی طرف دیکھ کر مسکرا دی لیکن ہماری شکلیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی لیکن ہم اس کی طرف توجہ دیے بغیر تھریسا کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازے سے باہر آ گئے۔

باہر والا گیٹ بند تھا۔ لوہے کے جنگلے کا بنا ہوا خوب صورت گیٹ تھا۔ بند ہونے کے بعد پیدل آمد و رفت کے لیے اطراف میں راستے موجود تھے۔ باہر نکل کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گیٹ کے جنگلے پر ایک گتا لٹکا ہوا تھا جس پر "CLOSED" لکھا ہوا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سامی کے سوگ میں آج یہ ریسٹورنٹ بند کروا دیا گیا تھا۔

تھریسا اب بھی ہمارے بیچ میں چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب خوف کے تاثرات بڑھ گئے تھے۔ ہم چند ہی قدم چلے تھے کہ عقب سے آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ اسی لمحے پاکھم کی آواز سنائی دی۔

"باس۔ ہوشیار۔ وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تین آدمی تھے جو برآمدے سے نکل کر ہماری طرف دوڑے آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں سمورائی تلوار تھی، دوسرے کے ہاتھ میں خنجر اور تیسرے کے ہاتھ میں پستول تھا۔ مجھے ایک دم استقبالیہ کاؤنٹر والی لڑکی کا چہرہ یاد آ گیا۔ تھریسا کے ساتھ ہمیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی تھی۔ یقیناً اس نے اندر جا کر ان لوگوں کو ہمارے بارے میں بتایا ہو گا۔

میں نے تھریسا کا بازو پکڑ لیا اور سڑک کی طرف دوڑنے لگا۔ سڑک وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ پرساد اور پاکھم ہم سے پیچھے تھے۔ میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ سمورائی تلوار والا سب سے آگے تھا۔ وہ تلوار لہراتے ہوئے حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

ہمارے اور اس کے درمیان تقریباً چالیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس دوران میں اس کے دوسرے ساتھی بھی گیٹ سے باہر آ گئے تھے۔ پستول والے نے فائر کر دیا۔

پاکھم اور پرساد دوڑ کر درختوں کی آڑ میں چلے گئے۔ میں تھریسا کا ہاتھ پکڑے راستے کے عین بیچ میں دوڑ رہا تھا۔ فائر کی آواز سے تھریسا چیخ اٹھی تھی۔ وہ ہیل والی سینڈل پہنے ہوئے تھی۔ اس کی ایک سینڈل مڑ گئی۔ وہ لڑکھڑا گئی۔ اگر میں اسے سنبھال نہ لیتا تو یقیناً گر پڑتی۔

ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی ہم پر چلائی گئی تھی لیکن ہم دونوں بچ گئے۔ میں نے تھریسا کا ہاتھ پکڑ کر راستے کے کنارے پام کے درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ ٹھیک اسی لمحے ایک اور فائر ہوا اور اس کے ساتھ ہی تھریسا کے حلق سے خوف ناک چیخ نکلی۔ گولی اس کی گردن میں لگی تھی۔ وہ لہرا گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک درخت کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحے یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور اس کے ساتھ ہی دو بھیانک چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ اس دوران میں، میں بھی جیب سے اپنا پستول نکال چکا تھا لیکن اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

پاکھم اور پرساد کی فائرنگ سے دو حملہ آور ڈھیر ہو چکے تھے۔ ایک تو وہ تھا جس نے پستول سے ہم پر فائرنگ کی تھی اور دوسرا سمورائی تلوار والا تھا۔ تلوار اس کی لاش کے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ تیسرا آدمی چیختا ہوا واپس بھاگ گیا تھا۔ پرساد نے اس پر بھی دو گولیاں چلائی تھیں مگر وہ بچ نکلا تھا۔ میں نے تھریسا کی طرف دیکھا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ اس کی گردن سے بہنے والا خون کیاری کی مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

پرساد اور پاکھم دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے اور پھر ہم تینوں نے سڑک کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ایک کار سڑک سے اس طرف مڑتی ہوئی نظر آئی۔ کار کی رفتار بہت کم تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کار میں اور کوئی نہیں تھا۔ پاکھم ایک دم کار کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر عورت نے ایک دم کار روک لی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔

"کک..... کون ہو تم لوگ.....؟" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"انجن چلتا چھوڑ دو اور نیچے اتر آؤ۔" پاکھم اسے پستول کی زد پر لیتے ہوئے غرایا "جلدی کرو۔ نیچے اترو۔"

عورت دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ پاکھم بڑی پھرتی سے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس دوران میں، میں اور پرساد بھی پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکے تھے۔ پاکھم نے ایک زوردار جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

وہ کار ہم نے بنکاک نوئے ریلوے اسٹیشن کے قریب چھوڑ دی۔ وہاں سے ایک ٹک ٹک پر بیٹھ کر کلاڈ روڈ سے دریا پار کر کے اگلے

چوراہے پر ٹک ٹک چھوڑ دیا اور ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر میموریل برج سے ذرا پہلے کنگ راما ون اسٹیچو والے چوراہے پر اتر گئے۔ وہاں "سی تھری" روٹ کی بس مل گئی جس نے ہمیں کنگ ٹاکسن اسٹیچو والے چوراہے پر پہنچا دیا۔ اگر ہم پیراڈائز سے سیدھا اس طرف آتے تو زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں پہنچ سکتے تھے لیکن کئی میل کا یہ طویل چکر اس لیے کاٹا تھا کہ ہمارا سراغ نہ لگایا جا سکے۔ کنگ ٹاکسن والے چوراہے سے پیدل چلتے ہوئے ہم جانکی والے بنگلے پر پہنچے تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی تھائی اور جانکی نے ہمیں آڑے ہاتھوں لیا۔

میں بڑی مشکل سے ان دونوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ میرے خیال میں ان کا غصہ بجا تھا۔ گزشتہ رات جب ہم سامی کی لاش لے کر نکلے تھے تو میں نے یہ کہا تھا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک واپس آ جائیں گے۔ ہمارا پروگرام یہی تھا کہ بوری میں بند لاش کو پیراڈائز کے آس پاس کہیں پھینک کر واپس آ جائیں گے لیکن پاکھم کی حماقت کی وجہ سے نہ صرف کار ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی بلکہ ہم خود بھی مصیبت میں پھنس گئے تھے اور بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچا کر وہاں سے نکلے تھے۔

"یہاں ہماری جان سولی پر ٹنگی رہی۔" میرے خاموش ہونے پر تھائی نے کہا "صبح پانچ بجے سُکھمدر تم لوگوں کی تلاش میں نکلا تھا۔ چھ بجے اس نے فون پر اطلاع دی کہ پیراڈائز کے پارکنگ میں جب سامی کی لاش دریافت ہوئی تو اس وقت پیڈرو بھی وہاں موجود تھا۔ تم لوگ اگرچہ بروقت وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن پیڈرو کے آدمی پورے شہر میں تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں نے فوراً ہی ماسٹر ہوچن کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ ماسٹر کے کئی آدمی بھی اب تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے ہیں لیکن تم لوگ تھے کہاں؟"

"پیراڈائز ریسٹورنٹ کے ایک کمرے میں۔ ہم صبح آٹھ بجے تک وہاں رہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا.....؟" تھائی اچھل پڑی۔

"ہم جس صورتِ حال سے دوچار تھے اس کے پیشِ نظر محفوظ ترین جگہ وہی تھی۔" میں نے کہا "اگر ہم کسی اور طرف نکلنے کی کوشش کرتے تو شاید ہم میں سے کوئی ایک پکڑا جاتا یا نقصان اٹھاتا۔ یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہاں سے فرار ہونے کے بعد ہم دوبارہ اسی عمارت میں آ گئے ہوں گے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے پورا واقعہ بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا "ہم صبح آٹھ بجے وہاں سے نکلے تو ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا جس میں تھریسا نام کی وہ عورت ماری گئی جس کے کمرے میں ہم نے پناہ لی تھی۔"

"ماسٹر ہوچن کو اپنی آمد کی اطلاع دے دو۔ وہ پریشان ہو گا۔" جانکی نے میری بات ختم ہونے پر کہا۔

میں نے قریب رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر ماسٹر ہوچن کا نمبر ملایا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔

"مجھے اطلاع مل چکی ہے کہ تم تینوں خیریت سے پہنچ گئے ہو لیکن رات ایک بجے کے بعد سے اب تک جو کچھ بھی ہوا اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔ پیڈرو کے بارے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ سامی کی لاش ملنے کے بعد اس نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا ہے، اس کا بھی مجھے پتا چل گیا ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگ کہاں تھے؟"

"سب سے پہلے تو مجھے یہ بتائیے کہ آپ کو ہماری واپسی کی اطلاع کیسے ملی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کئی آدمی صبح چھ بجے سے تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے تھے جو ہر آدھے گھنٹے بعد مجھے صورتِ حال سے آگاہ کر رہے تھے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "ساڑھے دس بجے کے قریب میرے ایک آدمی نے تم لوگوں کو کنگ راما ون اسٹیچو والے چوراہے پر بس میں سوار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی اسی بس میں سوار ہو گیا اور تم لوگوں کے خیریت سے گھر پہنچ جانے کے بعد اس نے مجھے فون پر اطلاع دے دی۔ اب تم اپنی رام کہانی سناؤ۔"

میں اسے بتانے لگا کہ پیڈرو کے آدمیوں سے بچنے کے لیے ہم نے کہاں پناہ لی تھی۔

"اس میں شبہ نہیں کہ تم نے بہت ذہانت کا ثبوت دیا لیکن یہ بہت بڑا رسک تھا۔ اگر انہیں شبہ بھی ہو جاتا کہ تم لوگ پیراڈائز کی حدود میں موجود ہو تو تم لوگ زندہ وہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ماسٹر۔ ویسے اب مجھے خطرات سے کھیلتے ہوئے مزہ آنے لگا ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "رات کو تو میں پیڈرو کی حالت دیکھ چکا ہوں۔ اس کے بعد کا مجھے علم نہیں۔ اب کیا صورتِ حال ہے!"

"ابھی تک تو خاموشی ہے۔ دو بجے سامی کی آخری رسومات ہونے والی ہیں۔ جو کچھ بھی ہونا ہے اس کے بعد ہی ہو گا۔ ویسے پیڈرو کے حلقے میں تمام ہوٹل، نائٹ کلب اور کیسینو سامی کے سوگ میں بند ہیں۔ دو بجے کے بعد ہنگاموں کی توقع ہے۔ تم تینوں کسی صورت بھی دو تین دن تک باہر نہیں نکلو گے۔ پیڈرو کے علاوہ پولیس بھی تم لوگوں کی تلاش میں ہے۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر۔ ہم محتاط رہیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے پھر میں نے فون بند کر دیا۔ نویتا اس دوران میں کافی بنا کر لے آئی۔ گرم اور تلخ کافی کا پہلا گھونٹ بھرتے ہی مجھے یوں لگا جیسے سینے میں آگ سی بھر گئی ہو۔ اس وقت دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ ناشتا تو کیا، ابھی تک پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں بھرا تھا۔ خالی پیٹ تلخ کافی نے سینے اور پیٹ میں شدید جلن پیدا کر دی تھی۔

"اگر تم گاڑی پیراڈائز نہ لے جاتے تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔"

میں نے پاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب نہ صرف ہمیں اس گاڑی سے ہاتھ دھونے پڑے بلکہ پولیس اس گاڑی کے ذریعے تمہارے ورکشاپ تک پہنچ جائے گی۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ پولیس سے پہلے پیڈرو کے آدمی وہاں پہنچیں گے۔"

"گاڑی کی تم فکر مت کرو باس۔" پاتھم نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ندامت بھی تھی "میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ گاڑی کسی کمپنی کی ملکیت تھی۔ جو ایک حادثے کے بعد ورکشاپ لائی گئی تھی۔ یہ گاڑی کئی مہینوں تک ورکشاپ میں پڑی رہی۔ اس دوران وہ کمپنی بھی بند ہو گئی۔ میں نے اس گاڑی کو مرمت کر کے استعمال کے قابل بنا لیا۔ تقریباً دو سال سے تو اسے چلا رہا ہوں۔ کبھی چیکنگ کی زد میں بھی نہیں آئی اور مزید یہ بتاؤں کہ اس گاڑی کی نمبر پلیٹس بھی اصلی نہیں ہیں۔ اب اس گاڑی کے بارے میں تحقیقات ضرور کی جائیں گی لیکن پولیس یا پیڈرو کے آدمی کسی طرح بھی میرے ورکشاپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ نمبر پلیٹس کے ذریعے وہ نجانے کہاں پہنچیں۔ اگر چیسز اور انجن نمبر سے چیک کیا گیا تو شاید وہ اس کمپنی کے ایڈریس تک پہنچ جائیں مگر وہاں کے لوگ بھی اس بات کو بھول گئے ہوں گے کہ وہاں کوئی اس نام کی کمپنی ہوا کرتی تھی۔ وہ اس گاڑی کے ذریعے تو ہمارا سراغ نہیں لگا سکتے البتہ یہ افسوس ضرور ہے کہ ایک سہولت ختم ہو گئی لیکن اس کے لیے بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی اور گاڑی کا بندوبست کر لوں گا۔"

"ہمیں بہرحال محتاط تو رہنا پڑے گا۔" میں نے کہا اور پھر تھائی وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے تم میں سے کسی کو احساس نہیں ہے کہ ہم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ اس کافی نے تو پیٹ کی آگ کچھ اور بھی بھڑکا دی ہے۔"

"غیر ذمے داری کی تھوڑی بہت سزا تو ملنی چاہیے نا۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم تو رات بھر انتظار کی سولی پر ٹنگے رہے اور تم لوگ تھوڑی دیر تک بھوک برداشت نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تمہارے رحم و کرم پر ہیں' جو چاہو سزا دو۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک ایک کپ چائے کے علاوہ ہم لوگوں نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا پیا۔" جانکی نے کہا "بہرحال' کھانا تیار کرنے میں تو دیر لگے گی لیکن ابھی کچھ نہ کچھ تو مل ہی جائے گا جس سے انتظار کا حوصلہ پیدا ہو۔"

وہ مسکراتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ نویتا بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ پرساد اور پاتھم برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں چلے گئے اور میں وہیں بیٹھا تھائی سے باتیں کرنے لگا۔ تھائی کرید کرید کر مجھ سے سب کچھ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

چار بجے جب ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے تو سکھدر بھی آگیا۔ وہ دوپہر ایک بجے ماسٹر ہوچن کے پاس پہنچ گیا تھا اور اسے وہاں سے ہماری باخیریت واپسی کی اطلاع مل گئی تھی اور اب وہ شہر کے حالات کا جائزہ لیتا ہوا آیا تھا۔

"بہت گڑبڑ ہے۔" اس نے کہا "سامی کی تدفین کے فوراً ہی بعد ان لوگوں نے ہنگامہ شروع کر دیا تھا۔ پولیس نے ہنگامے پر قابو پانے کی کوشش کی مگر پیڈرو کے آدمی تو طے کر کے آئے تھے کہ کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ انہوں نے توڑ پھوڑ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ جنازے کے جلوس کے راستے میں تمام دکانیں بند تھیں مگر ان لوگوں نے دکانوں کے شٹر توڑ دیے اور سامان لوٹ لیا۔ ہنگامہ اب شہر کے بہت سے علاقوں میں پھیل چکا ہے اور میرا خیال ہے پولیس کے لیے فوری طور پر اس پر قابو پانا آسان نہیں ہوگا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "پیڈرو انڈر ورلڈ کا کنگ ہے۔ اس کے بھائی کا قتل کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ تمام شرپسند اور غنڈا عناصر اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔"

"اس قسم کے لوگوں کو تو موقع ملنا چاہیے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "لیکن میں تم لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ پیڈرو کی یہ بادشاہت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔ وہ انہی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگے گا جو آج اس کے نام سے تھر تھر کانپنے لگتے ہیں۔ بہرحال' کیا تم بتا سکتے ہو کہ پیڈرو اس وقت کہاں ہوگا؟" میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اسے پیراڈائز ہی میں ہونا چاہیے۔" سکھدر نے جواب دیا۔ "صبح جب تم لوگ ایک عورت کو یرغمال بنا کر نکلے تھے تو اس وقت بھی ہنگامے میں تین افراد مارے گئے تھے۔ ایک وہ عورت جو پیڈرو کے آدمیوں کے ہاتھوں مری تھی اور دو پیڈرو کے آدمی جو تم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پیڈرو اس واقعے کی اطلاع ملنے کے تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ اس بات پر بھی بھڑک اٹھا تھا کہ تم لوگ رات بھر وہاں رہے اور کسی کو پتا نہیں چل سکا۔ اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو مارا پیٹا بھی تھا کہ وہ لوگ اتنے غیر محتاط اور بے پروا کیوں ہو گئے ہیں۔ ان واقعات کی تفتیش کے لیے پولیس کے بعض افسران بار بار وہاں جا رہے ہیں اور میرا خیال ہے' سامی کی تدفین کے بعد پیڈرو بھی وہیں گیا ہوگا۔"

"میں سمجھ رہی ہوں کہ تم پیڈرو کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔" تھائی گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس وقت اسے فون کر کے مزید طیش دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ہنگامے ختم ہو لینے دو۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

میں واقعی پیڈرو کو فون کرنا چاہتا تھا لیکن تھائی کے کہنے پر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور پاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا ورکشاپ بند ہوگا یا کسی اور نے کھولا ہوگا؟"

"میرے ایک اسسٹنٹ کے پاس بھی چابیاں موجود ہیں۔ میں جب موجود نہیں ہوتا تو وہی ورکشاپ کھولتا ہے۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"اسے فون کر کے بتا دو کہ تم اس وقت شہر سے باہر ہو اور دو تین دن تک واپس نہیں آؤ گے۔ باتوں ہی باتوں میں اس سے یہ بھی معلوم کرو کہ صورتِ حال کیا ہے۔" میں نے کہا۔

پاتھم نے فون کا ریسیور اٹھا کر ورکشاپ کا نمبر ملایا۔ اس کا اسسٹنٹ شاید کسی کام میں مصروف تھا۔ کال چار گھنٹیوں کے بعد ریسیو کی گئی تھی۔ پاتھم تقریباً دس منٹ تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنے اسسٹنٹ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ گزشتہ رات وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے سارا بوری آگیا ہے۔ اس کی واپسی دو چار روز بعد ہوگی۔ اس دوران میں وہ ورکشاپ کی ذمے داریاں سنبھالے رکھے پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ کوئی وہاں مجھے یا اس گاڑی کے بارے میں پوچھنے نہیں آیا اور میرا خیال ہے وہاں کوئی پہنچے گا بھی نہیں۔ ہمیں کسی خوف کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہیے۔"

ہم شام تک لاؤنج ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھائی نے کچھ چیزیں منگوانے کے لیے سکھدر کو بازار بھیج دیا تھا۔ وہی ایک ایسا آدمی تھا جو فی الحال محفوظ تھا۔ ہم میں سے کوئی اور تو باہر نکل نہیں سکتا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب ماسٹر ہوچن کا فون آگیا۔ اس نے ایک بار پھر ہمیں خبردار کیا تھا کہ گھر سے باہر نہ نکلیں کیونکہ ہنگامے پھیل گئے تھے۔ ان ہنگاموں میں اب تک ایک آدمی پولیس کا اور دو آدمی پیڈرو کے مارے گئے تھے۔ پولیس کمشنر نے فورس کو حکم دے دیا تھا کہ وہ شرپسندوں کو دیکھتے ہی گولی مار دے۔

اور پھر رات گیارہ بجے ماسٹر ہوچن ہی نے ایک اور دلچسپ خبر سنائی۔ پولیس کی بھاری نفری نے پیراڈائز کو گھیرے میں لے کر پیڈرو کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ دریا کے راستے فرار ہو گیا۔ البتہ اس کے کئی قریبی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس ہنگامے میں ایک آدمی پیراڈائز میں بھی پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

رات گیارہ بجے تک اسی قسم کی مزید خبریں ملتی رہیں۔ ہم سب اسی صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے تھے کہ فائرنگ کی آوازیں سن کر اچھل پڑے۔ فائرنگ کی یہ آوازیں ٹاکسن اسکوائر کی طرف سے سنائی دی تھیں۔ سکھدر صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے باہر چلا گیا لیکن اس کی واپسی جلدی ہو گئی تھی۔

"ٹاکسن اسکوائر اور وانگ ونگ پائے ریلوے اسٹیشن کے سامنے دو بسوں کو آگ لگا دی گئی ہے۔ اسکوائر پر کئی دکانوں کو بھی لوٹ لیا گیا ہے۔ پولیس اور شرپسندوں میں زبردست مقابلہ ہو رہا ہے۔" سکھدر نے بتایا۔

"اس کا اندازہ یہاں تک پہنچنے والی آوازوں سے بھی ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بھی ذرا محتاط رہیں۔ ہماری یہ گلی ٹاکسن اسکوائر سے زیادہ دور تو نہیں۔ پولیس سے نمٹنے کے بعد شرپسند ان گلیوں ہی کا رخ کریں گے۔"

ہمارے پاس سامی کے محافظوں سے چھینی ہوئی دو آٹومیٹک رائفلیں اور تین پستول تھے۔ سکھدر ایک آٹومیٹک رائفل لے کر برآمدے میں بیٹھ گیا اور دوسری رائفل پاتھم نے سنبھال لی تھی۔ وہ چھت پر چلا گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ چھت سے گلی کے دونوں طرف خاصی دور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ اس گلی میں تمام ہی بنگلوں کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ اسکوائر کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ تھا مگر حالات کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ آس پاس کے علاقوں کے لوگ بتیاں بجھا کر گھروں میں بند ہو گئے تھے۔

میں پاتھم کو چھت پر چھوڑ کر نیچے آگیا۔ ایک پستول پرساد کے پاس تھا۔ پاتھم والا پستول میں نے لے لیا تھا جو جانکی کے حوالے کر دیا گیا۔ تیسرا پستول میرے پاس تھا۔

فضا مسلسل فائرنگ کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہاں کوئی محاذ کھل گیا ہو لیکن پھر بتدریج ان آوازوں میں کمی آتی گئی اور بالآخر ایک بجے کے قریب سناٹا چھا گیا۔ فضا میں بارود کی بُو کے ساتھ آنسو گیس کی آمیزش بھی تھی جس سے آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔

ڈیڑھ بجے کے قریب تھائی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نویتا پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ میں' جانکی اور پرساد ہال میں بیٹھے رہے پھر پرساد بھی اٹھ کر باہر برآمدے میں سکھدر کے پاس چلا گیا۔ میں اور جانکی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

تین بج گئے۔ جانکی بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی تھی۔ وہ پچھلی رات جاگتی رہی تھی۔ جاگتے تو ہم بھی رہے تھے لیکن اس وقت بھی ہمارے لیے جاگنا ہماری مجبوری تھی۔ جانکی کو صوفے پر اونگھتے چھوڑ کر میں باہر آگیا۔ سکھدر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پرساد بھی برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں برآمدے سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ پاتھم بھی منڈیر کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا احساسِ ذمے داری دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ حالانکہ سب ہی رات بھر جاگتے رہے تھے۔ کوئی اور ہوتا تو شاید یہ صورتِ حال دیکھنے میں نہ آتی۔

میں نے نیچے آکر تھائی اور نویتا کے کمروں میں جھانکا۔ وہ دونوں گہری نیند سو رہی تھیں۔ میں دوبارہ لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جانکی سامنے والے صوفے پر آڑھی ترچھی پڑی ہوئی تھی۔ سانس کی آمد و رفت سے اس کے سینے کا زیر و بم میرے سینے میں ارتعاش سا پیدا کر رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا لیں۔ میرے قویٰ بھی اب مضمحل سے ہونے لگے تھے۔ آنکھوں

میں شدید جلن ہو رہی تھی اور پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ میں جاگتے رہنے کی کوشش کر رہا تھا اور نیند مجھے پچھاڑنے کی کوشش میں تھی۔

میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں کہ قریب پڑے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں اس طرح اچھلا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ سناٹے میں ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ جانکی بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اس نے صوفے پر پڑا ہوا پستول فوراً ہی ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ شاید سمجھی تھی کہ کسی نے مکان پر حملہ کردیا ہے لیکن پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی اور وہ متوحش نظروں سے ٹیلی فون کی طرف دیکھنے لگی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی دو مرتبہ بج چکی تھی۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا لیکن خود کچھ بولنے کے بجائے دوسری طرف سے کسی کے بولنے کا انتظار کرنے لگا اور میرا یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ صرف ایک سیکنڈ بعد ماسٹر ہوچن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو وجدان۔ میں ماسٹر ہوچن بول رہا ہوں۔"

"یس ماسٹر۔ خیریت؟" میں نے پوچھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ اس وقت ساڑھے تین بجے تھے اور مجھے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"خیریت ہوتی تو اس وقت تمہیں فون نہ کرتا۔" ماسٹر ہوچن کی آواز سنائی دی "تم لوگ اپنی ضروری چیزیں سمیٹو اور وہ بنگلا چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وین تم لوگوں کو لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔"

"معاملہ کیا ہے ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"پیڈرو کے آدمیوں نے مہاراج کے جمنازیم پر حملہ کردیا تھا۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "یہ تقریباً دو گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت جمنازیم میں موجود نہیں تھا۔ جتنے بھی لڑکے وہاں موجود تھے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن پیڈرو کے آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ آتشیں اسلحے سے لیس تھے۔ ہمارا ایک لڑکا مارا گیا ہے اور تین زخمی ہوئے ہیں۔ میں اطلاع ملتے ہی کچھ اور لڑکوں کو لے کر یہاں پہنچ گیا۔ پیڈرو کے آدمی میرے پہنچنے سے پہلے بھاگ چکے تھے اور وہ تم کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تم ان چند لڑکوں میں سے ایک ہے جو تمہاری موجودہ پناہ گاہ سے واقف ہیں۔ تم بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہے لیکن پیڈرو تشدد کے ایسے طریقوں سے واقف ہے کہ پتھر بھی بول اٹھتے ہیں۔ ممکن ہے تم....."

"میں سمجھ گیا ماسٹر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ تم لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "تیار رہو۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر وین پہنچ جائے گی۔"

"او کے ماسٹر۔ ہم تیار ہیں۔" میں نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

میں ریسیور رکھ کر جیسے ہی گھوما، میری نظریں تھائی اور نویتا پر پڑ گئیں۔

وہ دونوں اگرچہ گہری نیند سو رہی تھیں لیکن فون کی گھنٹی کی آواز نے انہیں بھی جگا دیا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میری نیند کافور ہو چکی تھی۔

"پیڈرو کے آدمی مہاراج کے جمنازیم پر حملہ کرکے تم نامی ایک لڑکے کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ تم ہماری اس پناہ گاہ سے واقف ہے۔ ماسٹر ہوچن کو اندیشہ ہے کہ وہ تشدد سے زبان نہ کھول دے۔ اس لیے ہمیں یہ بنگلا چھوڑ دینے کو کہا گیا ہے۔ ایک گھنٹے میں وین یہاں پہنچنے والی ہے۔ تم لوگ اپنی ضروری چیزیں سمیٹ لو اور روانگی کے لیے تیار ہوجاؤ۔" میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جانکی بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازہ کھول کر برآمدے میں آگیا۔ سکندر کو چھت پر بھیج دیا کہ وہ پاتھم کو بلا لائے اور پھر پرساد کو بھی اندر بلا لیا۔ دو منٹ بعد سکندر اور پاتھم بھی اندر آگئے۔ میں نے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کردیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں آگیا جہاں تھائی کچھ ضروری چیزیں اور میرے اور اپنے کپڑے کینوس کے ایک بڑے بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔

جانکی اور نویتا بھی اپنی ضروری چیزیں سمیٹنے میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اور پرساد گھوم پھر کر کمروں کا جائزہ لینے لگے۔ ہم لوگ کئی مہینوں سے اس بنگلے میں رہ رہے تھے اور یہاں اپنی موجودگی کے نشان مٹانا آسان نہیں تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگر تم نے پیڈرو کو ہماری اس پناہ گاہ کے بارے میں بتا بھی دیا تو سراغ مٹانا یا نہ مٹانا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

سیاہ وین ایک گھنٹے سے بھی پہلے پہنچ گئی۔ ہم تیار ہی تھے۔ سکندر نے گیٹ پر جا کر اطمینان کرلیا کہ وہ ماسٹر ہوچن ہی کے آدمی تھے۔ اس کا اشارہ پا کر ہم باہر آگئے۔ جانکی نے تمام بتیاں بجھا کر دروازے لاک کردیے۔ وین میں بیٹھنے سے پہلے اس نے باہر کا گیٹ بھی مقفل کردیا اور چابیوں کا گچھا بیگ میں ڈال لیا۔

ہم سات آدمی تھے۔ دو گن مین پہلے ہی سے وین میں موجود تھے۔ وین گلیوں سے نکل کر جیسے ہی ٹاکسن اسکوائر پر پہنچی، دائیں طرف کھڑی ہوئی پولیس کی ایک کھلی جیپ ہمارے تعاقب میں لگ گئی۔ جیپ کے پچھلے حصے میں آمنے سامنے کی سیٹوں پر تین تین مسلح پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔ میں نے اپنے ساتھ وین میں بیٹھے ہوئے ایک گن مین کو پولیس جیپ کی طرف متوجہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"وہ ہمارے ہی آدمی ہیں ٹل ماسٹر۔" گن مین نے جواب دیا

"رات ایک ڈیڑھ بجے تک پورا شہر ہنگاموں کی زد میں رہا ہے۔ پولیس ہر طرف گشت کر رہی ہے۔ گاڑیوں کو جگہ جگہ روک کر چیک کیا جا رہا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں تم لوگوں کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کا یہی ایک محفوظ طریقہ تھا۔ ہمارے ساتھ ساتھ پولیس کی اس جیپ کی موجودگی سے کوئی اور پولیس پارٹی وین کو چیک کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

"کیا وہ واقعی پولیس کے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس مرتبہ گن مین نے مختصر سا جواب دیا۔

میں باہر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ سڑک کے عین وسط میں ایک جلی ہوئی بس کھڑی تھی۔ چوراہے کے دوسری طرف پولیس کا ایک ٹرک کھڑا تھا اور متعدد مسلح پولیس والے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک پر لاتعداد پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دو تین گھنٹے پہلے یہاں کیا ہوا ہوگا۔

وین ٹاکسن اسکوائر اور وانگ ونگ ریلوے اسٹیشن کو کراس کرتی ہوئی ٹاکسن روڈ پر آگئی اور کچھ فاصلہ طے کرکے بائیں طرف مڑ گئی۔ کرونگ تھیپ برج سے دریا پار کرکے وین ایک بار پھر بائیں طرف نیو روڈ پر مڑ گئی۔ پولیس کی جیپ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ کرونگ تھیپ برج پر ایک پولیس پارٹی نے ہماری وین کو روکا تھا لیکن ہمارے ساتھ آنے والی جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے انسپکٹر کی وردی میں ملبوس ایک آدمی نے ان پولیس والوں سے سخت لہجے میں کوئی بات کی اور اس کے فوراً ہی بعد ہماری وین کو آگے جانے کا اشارہ کردیا گیا تھا۔

نیو روڈ سے وین ایک تنگ سی سڑک پر مڑ گئی۔ یہ سڑک دریا تک چلی گئی تھی۔ اس کے دونوں طرف بنگلے نما رہائشی عمارتیں تھیں۔ سڑک کے اختتام پر دریا کے کنارے ایک خوب صورت بدھ عبادت گاہ بنی ہوئی تھی۔ اس عبادت گاہ کا کچھ حصہ کنارے پر تھا اور کچھ دریا کے اندر ستونوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔ وین عبادت گاہ کے مرکزی گیٹ کے سامنے سے دائیں طرف مڑ گئی اور تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرکے سڑک پر لگے ہوئے بیریئر کے سامنے رک گئی۔ اس بیریئر کے ساتھ ہی ایک طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن میں سے ایک پر "بکنگ" لکھا ہوا تھا۔

یہ بوٹ لینڈنگ تھی۔ دریائے چاؤ فریا پر جگہ جگہ اس قسم کی بوٹ لینڈنگ بنی ہوئی تھیں۔ دریا میں چلنے والی بوٹس اور لانچیں کچھ تو پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت تھیں اور کچھ ہاربر اتھارٹی کی نگرانی میں چلتی تھیں۔

ہم وین سے اتر آئے۔ پولیس کی وردی میں ملبوس آدمی وہیں رک گئے اور ہم اپنے ساتھ وین میں آنے والے دو گن مینوں کے ساتھ بیریئر (جنگلا ..... BARRIER) کے دوسری طرف آگئے۔ آگے ایک پختہ پلیٹ فارم سا بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک جیٹی تھی جو ذرا سی دریا کے اندر کو نکلی ہوئی تھی۔ جیٹی سے ایک کشتی لگی ہوئی تھی جس پر تقریباً بیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ دو آدمی پہلے ہی سے کشتی پر موجود تھے۔ ہمارے ساتھ وہ دونوں گن مین بھی کشتی پر سوار ہوگئے اور کشتی حرکت میں آگئی۔

رات کے آخری پہر کی خاموشی میں چپوؤں کی شڑپ شڑپ کی آواز بڑا پُراسرار تاثر دے رہی تھی۔ تقریباً تیس گز کا فاصلہ طے کرکے کشتی دریا میں لنگر انداز ایک لانچ کے قریب رک گئی۔ کشتی رکتے ہی اوپر سے کچھ پوچھا گیا اور پھر جواب ملنے پر اوپر سے رسی کی ایک سیڑھی لٹکا دی گئی۔ یہ سیڑھی خطرناک نہیں تھی۔ اس پر قدمچوں کی طرح لکڑی کے تختے لگے ہوئے تھے۔ پہلے تھائی، جانکی اور نویتا کو اوپر بھیجا گیا اور پھر ہم بھی باری باری اوپر آگئے۔ ہمارے بیگ گن مینوں نے اوپر پہنچائے تھے اور پھر لانچ پر ایک آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ ماسٹر ہوچن تھا۔

"یہ لانچ تم لوگوں کے لیے محفوظ ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔ "جب تک حالات سکون پذیر نہیں ہوجاتے، تم لوگ یہیں رہو گے۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا۔"

یہ مسافروں کو سیر کرانے والی لانچ تھی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ پچاس مسافر بیٹھ سکتے تھے۔ عرشے پر سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کیپٹن کا کیبن تھا اور اس کے ساتھ دو کیبن اور تھے۔ تین چار کیبن نیچے بھی بنے ہوئے تھے۔ کیپٹن کے علاوہ لانچ پر عملے کے چار آدمی تھے۔

ماسٹر ہوچن کچھ دیر ہمارے پاس رہا پھر کشتی پر بیٹھ کر واپس چلا گیا۔ وہ دونوں گن مین لانچ پر ہی رہ گئے تھے۔ ماسٹر ہوچن کے جانے کے بعد ہم یہ طے کرنے لگے کہ کس کو کہاں سونا ہے۔ نیچے والا ایک کیبن جانکی اور نویتا کو دے دیا گیا۔ دوسرے کیبن پر تھائی نے قبضہ کرلیا۔ میں، پرساد وغیرہ اوپر آگئے۔ اوپر بھی دو کیبن تھے اور عرشے پر سیٹیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس لانچ میں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔

رات کا آخری پہر گزر رہا تھا۔ نیند ایک بار پھر غالب آنے لگی تھی۔ محافظوں کی موجودگی میں اب ہمیں جاگنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پرساد اور سکندر وغیرہ اوپر والے کیبنوں میں گھس کر سو گئے اور میں نیچے تھائی والے کیبن میں آگیا۔ اس کیبن میں دو آرام دہ برتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک برتھ پر تھائی سو رہی تھی۔ میں دوسرے برتھ پر لیٹ گیا۔ نیند کے بوجھ سے میری پلکیں جھکی جا رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

○☆○

تین دن گزر گئے۔ ہم لانچ کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ لانچ زیادہ تر دریا میں تیرتی رہتی تھی۔ کبھی کچھ دیر کے لیے کسی ایسی جگہ لنگر انداز ہوجاتی کہ دوسروں کو شبہ نہ ہوسکے۔ ان تین دنوں کے دوران میں یہ لانچ کناروں سے دور ہی رہی تھی اور ان تین دنوں میں اس لانچ نے اپنی لینڈنگ سے سانگھی بوٹ لینڈنگ تک

درجنوں چکر لگا لیے تھے۔ ان دونوں بوٹ لینڈنگز کے درمیان کئی میل کا فاصلہ تھا اور دریا انگریزی کے حرف ایس (S) کی طرح بل کھاتا ہوا پھیلا ہوا تھا۔

دریا سے دونوں کناروں پر آباد شہر کا نظارہ بڑا دلکش تھا۔ شام کے بعد جب دونوں کناروں پر عمارتوں کی روشنیاں جگمگا اٹھتیں تو یہ نظارہ کچھ اور بھی دل فریب ہو جاتا۔

دن کے وقت تو ہم اپنے کیبنوں تک ہی محدود رہتے البتہ رات کو عرشے پر آجاتے۔ ان تین دنوں کے دوران میں ماسٹر ہوچن نے صرف ایک مرتبہ ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق صورتِ حال بتدریج نارمل ہو رہی تھی۔

لانچ پر ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا۔ لانچ کا ایک ملازم کک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ تھائی کھانوں کے علاوہ وہ انڈین اور یورپین کھانے بھی بہت اچھے بنا لیتا تھا۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو ہم فلوٹنگ مارکیٹ سے خرید لیتے۔ بنکاک کی فلوٹنگ مارکیٹ بھی ایک دلچسپ جگہ تھی۔ یہاں کشتیوں پر دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ ان دکانوں پر ہر چیز دستیاب تھی۔ لوگ بھی کشتیوں پر بیٹھ کر ہی خریداری کرتے تھے۔ گاہکوں میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں یا ان لوگوں کی تھی جو تھائی لینڈ کے دوسرے شہروں سے آتے تھے۔ اس طرح کشتیوں پر بیٹھ کر خریداری بھی ہو جاتی اور تفریح بھی۔

وہ چوتھا دن تھا۔ تھائی وغیرہ اکتا گئی تھیں۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی تھیں لیکن ہماری مجبوری یہ تھی کہ ماسٹر ہوچن سے کلیئرنس ملے بغیر ہم لانچ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہمیں تو ابھی تک یہ بھی پتا نہیں چلا تھا کہ جانکی والا بنگلا اب بھی محفوظ تھا یا تم نے پیڈرو کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ ٹیلی فون پر ماسٹر ہوچن اور مہاراج سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ لانچ اس وقت فلوٹنگ مارکیٹ کے علاقے میں لنگر انداز تھی۔ میں اور تھائی عرشے کی ریلنگ پر جھکے دریا کی پُرسکون سطح پر ہلکورے لیتی ہوئی کشتیوں کو دیکھ رہے تھے اور کشتیوں پر سجی ہوئی ان دکانوں کے بارے میں تبصرے بھی کر رہے تھے۔ تھائی بات کرتے کرتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات اور آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "کیا بات ہے۔ تم اس طرح سہم کیوں گئی ہو؟"

"ایک دم سے مڑ کر مت دیکھنا۔" تھائی نے کہا "دائیں طرف سرخ رنگ کی ربر بوٹ پر بیٹھا ہوا آدمی..... اسے میں نے ٹائیگر کے ساتھ دیکھا تھا۔ اندرا ریجنٹ ہوٹل میں۔ مجھے شبہ ہے اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور ہماری نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے نیلی ڈینم کی شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس طرح مڑ کر دیکھنا کہ اسے شبہ نہ ہو۔"

میں تھائی سے باتیں کرتا رہا اور پھر غیر محسوس انداز میں گردن گھما کر اس طرف دیکھنے لگا اور پھر اس شخص کو دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ اس چہرے کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اندرا ریجنٹ ہوٹل کے سامنے ماسٹر چو کو اپنی گرفت میں لیا تھا اور چی فانگ نے خنجروں کے وار کر کے ماسٹر کو قتل کر دیا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ وہی ہے۔ اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر مت ہونے دو کہ ہم نے اسے دیکھ لیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس نے محض اتفاق سے ہمیں لانچ پر دیکھ لیا ہے اور ہماری نگرانی کر رہا ہے کہ کہاں پر اتریں گے۔ اگر اس نے واپس جا کر بتا دیا تو....."

"یہ واپس نہیں جا سکے گا۔" میں نے جواب دیا۔ اسی دوران میں جانکی بھی وہاں آگئی۔ اسے ہم نے اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور پھر جانکی اور تھائی کو باتیں کرتے چھوڑ کر میں وہاں سے ہٹ گیا۔

یہ تو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ اس لانچ کے ساتھ چار چھوٹی لائف سیونگ بوٹس بھی تھیں۔ اس دریا میں اگرچہ لانچ کو کسی خطرناک حادثے کا اندیشہ نہیں تھا لیکن قانونی خانہ پری تو کرنی ہی تھی۔ دو بوٹس لانچ کے ایک طرف لگی ہوئی تھیں اور دو دوسری طرف۔

میں نے پرساد کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے لانچ کے کیپٹن کو بلا لیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس کے آدمی لانچ کے دوسری طرف کی ایک بوٹ دریا میں اتار رہے تھے۔ بوٹ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ اس میں آٹھ دس آدمی ہی آ سکتے تھے۔ میں، پرساد اور سکندر رسی کی سیڑھی سے کشتی میں آگئے۔ سکندر نے چپو سنبھال لیے اور کشتی کو آہستہ آہستہ کھینے لگا۔ لانچ کے اس طرف کوئی اور کشتی نہیں تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ کناروں پر عمارتوں کی بتیاں جل گئی تھیں لیکن اس جگہ اندھیارا سا تھا۔

کشتی لانچ کے اوپر سے ایک لمبا چکر لگاتی ہوئی دوسری طرف آگئی۔ دکانوں والی کشتیوں پر بھی اب بتیاں جل گئی تھیں۔ کسی کشتی پر جنریٹر سے بلب اور ٹیوب لائٹس روشن تھیں اور کسی پر کاربائیڈ اور پیٹرومیکس لیمپ جل رہے تھے۔ خریداروں کی کئی کشتیاں بھی موجود تھیں۔ سرخ رنگ کی وہ بوٹ تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

سکندر نے کشتی روک لی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں اس شخص پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ ہم اس انتظار میں رہے کہ وہ اپنی کشتی وہاں سے ہٹائے تو ہم اس پر ہاتھ ڈالیں۔

دس منٹ گزر گئے اور پھر سرخ رنگ کی وہ بوٹ حرکت میں آگئی۔ اس شخص نے چپو چلاتے ہوئے ایک بار پھر لانچ کی طرف دیکھا تھا۔ دوسری کشتیوں سے تقریباً بیس گز دور جانے کے بعد

کشتی رک گئی اور کچھ ہی دیر بعد میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ واکی ٹاکی پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میں نے سکندر کو اشارہ کیا۔ وہ بڑی تیزی سے چپو چلاتے ہوئے کشتی کو کھینے لگا۔

سرخ کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص نے ہماری کشتی کو اپنی طرف آتے دیکھا تھا لیکن چونکہ اندھیرے میں وہ ہماری شکلیں نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے اس نے ہماری کشتی پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہماری کشتی اس کے برابر پہنچ گئی۔ تب وہ شخص اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔ اس نے واکی ٹاکی چھوڑ کر جیب سے شاید پستول وغیرہ نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اور پرساد چھلانگ لگا کر اس کی کشتی پر پہنچ گئے اور اسے حرکت کرنے کا موقع دیے بغیر دبوچ لیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اپنا خنجر نکال لیا تھا۔

"کس سے بات کر رہے تھے واکی ٹاکی پر؟" میں نے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

"تم لوگ اب بچ نہیں سکو گے۔" اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا "پیڈرو کے آدمی جلد ہی تمہاری لانچ کو تلاش کر لیں گے اور پھر تم لوگوں کو سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"اسے لانچ پر لے چلو باس۔" پرساد نے کہا "وہیں چل کر اس سے سب کچھ پوچھیں گے۔"

اپنی کشتی پر منتقل کرتے ہوئے اس شخص نے دریا میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی لیکن پرساد نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ پر دو تین بھرپور تھپڑ بھی رسید کر دیے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔

سکندر کشتی کو کھیتا ہوا لانچ کے دوسری طرف لے آیا۔ اس شخص کو رسی کی سیڑھی کے ذریعے لانچ تک پہنچانے میں بھی خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ ہم اسے نیچے کے ایک کیبن میں لے آئے۔ میری ہدایت پر کیپٹن نے لنگر اٹھا دیا تھا اور لانچ حرکت میں آگئی تھی۔

میں اور پرساد اس شخص سے پوچھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس نے واکی ٹاکی پر پیڈرو یا اس کے آدمیوں کو ہمارے بارے میں کیا بتایا تھا لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ اب ہم بچ کر نہیں جا سکیں گے۔ میں نے اور پرساد نے اس کی اچھی خاصی ٹھکائی بھی کر ڈالی تھی لیکن وہ بہت سخت جان ثابت ہوا تھا اور میں جانتا تھا کہ ایسے لوگ آسانی سے زبان نہیں کھولتے۔ میں نے خنجر کی نوک سے اس کے دائیں رخسار پر ایک لمبا چرکہ لگا دیا۔ اس کا چہرہ خون سے تر ہو گیا لیکن وہ اب بھی زبان کھولنے کو تیار نہیں تھا۔ اس دوران میں ہمارا ایک گن مین دوڑتا ہوا کیبن میں پہنچ گیا۔

"ماسٹر ہوچن کا فون ہے۔ اس نے فوراً ہمیں یہ لانچ چھوڑ دینے کو کہا ہے۔ تم خود اس سے بات کر لو۔ وہ لائن پر ہے۔" گن مین نے چیختے ہوئے کہا۔

میں نے کیبن کے فرش پر پڑے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کی وجہ سے ہماری یہ پناہ گاہ بھی ہم سے چھن رہی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا خنجر اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے حلق سے بڑی بھیانک چیخ نکلی تھی۔ میں نے خنجر اس کے سینے سے نکال لیا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کی ڈینم کی شرٹ سے خنجر صاف کیا اور اسے تڑپتا ہوا چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔ پرساد بھی میرے ساتھ ہی دوڑا تھا۔

ٹیلی فون کیپٹن کے کیبن میں تھا۔ کیپٹن فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"یس ماسٹر" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"پیڈرو کو کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ تم لوگ "جل پری" نامی اس لانچ پر ہو۔ وہ اس وقت پیراڈائز ریسٹورنٹ میں موجود ہے اور اس کے آدمی خطرناک اسلحے سے لیس ہو کر جل پری کی تلاش میں نکلنے والے ہیں۔ دو موٹر بوٹس پیراڈائز کی جیٹی پر تیار کھڑی ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق ان کے پاس راکٹ بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ تم لوگوں کو پکڑنے کی کوشش کرنے کے بجائے لانچ کو راکٹوں سے اڑا دیں۔ اس لیے تم لوگ فوراً وہ لانچ چھوڑ دو۔"

"یس ماسٹر" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جس شخص نے پیڈرو کو لانچ پر ہماری موجودگی کے بارے میں اطلاع دی تھی' اسے ہم نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔"

"اوہ..... کون تھا وہ۔ کیا لانچ کے عملے کا کوئی غدار؟" ماسٹر نے چونک کر پوچھا۔

"نو ماسٹر۔" میں نے کہا اور اسے اس شخص کے بارے میں بتانے لگا پھر بولا "لیکن ہم کہاں جائیں گے؟ واٹ ٹریمنٹ یا کسی اور جگہ؟"

"جانکی کے بنگلے پر۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "وہ لوگ تم سے تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے تھے اور ویسے بھی تقریباً دو گھنٹے بعد میرے آدمیوں نے تم کو ان کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ اس طرح وہ بنگلا اب بھی محفوظ ہے۔ ویسے تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟"

"فلوٹنگ مارکیٹ کے قریب۔" میں نے جواب دیا۔

"پیراڈائز وہاں سے کافی دور ہے۔ انہیں جل پری تلاش کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ تم لوگ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور کنارے پر پہنچ کر جس طرح بھی ممکن ہو' اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاؤ۔" ماسٹر نے کہا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ پیڈرو کو ہمارے بارے میں اطلاع مل گئی ہے اور اس کے آدمی ہماری تلاش میں نکلنے والے ہیں؟" میں نے آخری سوال کیا۔

"تمہارے لیے ہمارا پورا نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ تفصیل

بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔ اس وقت تم لوگ وہاں سے نکل لو۔ وش یو گڈ لک۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور اس کے ساتھ ہی لائن منقطع ہوگئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کیپٹن اس وقت کیبن میں نہیں تھا۔ جب میں باہر نکلا تو کیپٹن اپنے آدمیوں سے لائف بوٹس اتروا رہا تھا۔ سکھدر اور پاتھم وغیرہ بھی ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ تھائی وغیرہ اپنے بیگ اٹھائے تیار کھڑی تھیں۔

میرے کہنے پر صرف ایک ہی لائف بوٹ اتاری گئی کیونکہ ایک تو پہلے ہی نیچے موجود تھی۔ پہلے تھائی وغیرہ کو اتارا گیا پھر ہم لوگ نیچے اتر آئے۔ ہم ایک کشتی میں تھے۔ کیپٹن کے آدمی دوسری کشتی پر سوار ہوگئے۔ کیپٹن ابھی اوپر ہی تھا۔ اس نے لنگر اٹھا دیا اور لانچ کا رخ موڑ کر اسے حرکت میں لے آیا اور اس کے بعد رسی کی سیڑھی پر لٹک کر اپنی کشتی میں کود گیا۔ لانچ رفتہ رفتہ ہم سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

کیپٹن نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اپنی کشتی کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ ہماری کشتی کے چپو پاتھم اور سکھدر نے سنبھال رکھے تھے اور اس کشتی کا رخ دوسرے کنارے کی طرف تھا۔ ہمارے دونوں گن مین پوزیشن لیے بیٹھے تھے اور ان کی نظریں سرچ لائٹس کی طرح دریا کی سطح پر بھٹک رہی تھیں۔

ہماری کشتی بنکاک نوئے بوٹ لینڈنگ سے ابھی دور تھی کہ فضا میں موٹر بوٹ کے انجن کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے بھی گردن گھما کر دیکھا۔ دریا کے وسط میں دو موٹر بوٹس بڑی تیزی سے اس طرف آ رہی تھیں۔ لانچ دریا کی پُرسکون سطح پر تیرتی ہوئی فلوٹنگ مارکیٹ سے کافی آگے نکل چکی تھی۔ وہ دونوں بوٹس لانچ کے قریب پہنچ گئیں۔ انہوں نے لانچ کے گرد ایک چکر لگایا۔ وہ شاید یہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ یہی ان کی مطلوبہ لانچ تھی پھر دونوں بوٹس لانچ سے کافی فاصلے پر آگئیں اور پھر اچانک ہی فضا زوردار دھماکوں سے گونج اٹھی۔

دونوں بوٹس سے دو دو راکٹ برسائے گئے جو سب کے سب ٹھیک نشانے پر لگے۔ لانچ زوردار دھماکے سے پھٹی۔ اس کے پرخچے اڑ گئے۔ جلتے ہوئے ٹکڑے چاروں طرف پھیل گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دریا میں آگ لگ گئی ہو۔

دونوں موٹر بوٹس چند لمحے وہاں رکیں اور پھر تیز رفتاری سے اسی طرف چلی گئیں جس طرف سے آئی تھیں۔

ہماری کشتی بنکاک نوئے بوٹ لینڈنگ پر پہنچ گئی۔ بوٹ لینڈنگ پر لوگ جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ سب لوگ شور مچاتے ہوئے دریا کے وسط میں جلتی ہوئی لانچ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہماری طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ہم نے بھی اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کشتی کو جیٹی پر چھوڑ کر اوپر آگئے۔ کشتی پر بھی جل پری کا نام لکھا ہوا تھا۔ اگر کسی نے وہ نام دیکھا بھی ہوگا تو توجہ نہیں دی ہوگی۔ کسی کو کیا پتا کہ دریا میں تباہ ہونے والی وہ لانچ جل پری تھی۔

ہم بوٹ لینڈنگ سے نکل کر باہر آگئے۔ راکٹوں کی فائرنگ اور لانچ کے تباہ ہونے کا دھماکا دور تک دکھائی اور سنائی دیا تھا اور لوگ صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے دریا کی طرف دوڑ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا فائدہ ہم نے اٹھایا۔

بنکاک نوئے ریلوے اسٹیشن وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں گن مین ہمارے ساتھ ہی جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں زبردستی رخصت کر دیا۔ ایک ٹیکسی پر پرساد، پاتھم، نویتا اور سکھدر سوار ہوگئے اور دوسری ٹیکسی پر میں، تھائی اور جانگی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ٹیکسیاں ہم نے دور ہی چھوڑ دیں اور مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے بنگلے پر پہنچ گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"بھئی میں تو کافی بنانے جا رہی ہوں۔ دماغ گھوم رہا ہے۔ ویسے تم میں سے کون کون کافی پیئے گا؟" جانگی نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔

سب ہی نے اثبات میں سر ہلا دیے تھے۔ جانگی کے ساتھ نویتا بھی کچن میں چلی گئی تھی۔ میں اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آگیا اور ریسیور اٹھا کر پیراڈائز کا نمبر ملانے لگا۔ کال فوراً ہی ریسیو کرلی گئی اور آپریٹر کی سریلی آواز سنائی دی۔

"جاؤ فریا پیراڈائز۔"

"مسٹر پیڈرو سے بات کرنی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ اس وقت یہاں موجود ہے۔" میں نے کہا۔

"کون صاحب بات کریں گے؟" آپریٹر نے پوچھا۔

"میں اس کا ایک پرانا دوست ہوں۔ اسے میری کال کی توقع تو نہیں ہوگی لیکن مجھ سے بات کرکے وہ بہت خوش ہوگا۔" میں نے کہا۔

آپریٹر نے مجھے ہولڈ کرنے کو کہا اور پھر تقریباً ایک منٹ بعد پیڈرو کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو۔ کون؟"

"اگر میں اپنا نام بتا دوں تو تم سب لوگوں کی موجودگی میں اپنے بال نوچنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "لیکن تم نام بتائے بغیر بھی سمجھ جاؤ گے کہ میں کون ہوں۔ تمہارے آدمیوں کا نشانہ واقعی بہت اچھا ہے۔ انہوں نے راکٹوں سے جل پری کے پرخچے اڑا دیے لیکن تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ اس لانچ میں تمہارا ہی ایک آدمی موجود تھا۔ وہی جس نے تمہیں لانچ پر ہماری موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ لانچ کے ساتھ اس کی لاش کے ٹکڑے بھی دریا میں تیر رہے ہوں گے لیکن تمہیں شاید...."

"تت.... تت.... تم...." پیڈرو کی آواز حلق سے اٹک اٹک کر نکل رہی تھی "تت.... تم زندہ ہو۔" اس مرتبہ وہ دہاڑا "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"یہ گھسا پٹا جملہ تم کئی بار کہہ چکے ہو پیڈرو لیکن آج تک میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔" میں نے کہا "میں نے تمہیں اپنے زندہ ہونے کی اطلاع اس لیے دی ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان زندگی اور موت کا یہ دلچسپ کھیل جاری رہے۔ بہت جلد تم سے ملاقات ہوگی۔"

میں نے فون بند کردیا۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ رہا تھا کہ پیڈرو کس طرح اپنے بال نوچ رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے ماسٹر ہوچن کو بھی اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی۔

"گڈ۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "میں رات کو کسی وقت آؤں گا اور پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔"

"ہمارے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان لیتے آنا ماسٹر۔ ہمارے پاس یہاں کچھ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ لیتا آؤں گا۔" ماسٹر نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

جانگی کافی بنا کر لے آئی تھی۔ ہم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے صورتِ حال پر تبصرہ کرنے لگے۔ اس مرتبہ بھی ہم بال بال بچ گئے تھے۔ اگر ہم لانچ میں ہوتے تو اس وقت ہمارے ٹوٹے پھوٹے اعضا بھی دریا میں تیر رہے ہوتے۔ جانگی وغیرہ کے چہروں پر تو اب بھی خوف کے تاثرات موجود تھے۔

دس بجے کے قریب ماسٹر ہوچن آگیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ ماسٹر ہوچن پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری یہ پناہ گاہ بہت پہلے سے اس کے علم میں تھی اور وہ ہماری حفاظت کے خیال سے چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی بھی کروا رہا تھا۔

ماسٹر ہوچن جس گاڑی پر آیا تھا، اسے گیٹ کے اندر لے آیا گیا تھا۔ کار کی ڈکی میں اور پچھلی سیٹ پر کھانے پینے کی چیزیں بھری ہوئی تھیں جن میں تازہ پھل، سبزیاں، سربند خوراک کے ڈبے اور کولڈ ڈرنکس کے کئی ڈبے بھی شامل تھے۔ سکھدر اور دوسرا آدمی مل کر کار سے وہ سامان اتارنے لگے جبکہ ہم ماسٹر کے ساتھ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر مہاراج کے جمنازیم پر پیڈرو کے آدمیوں کے حملے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"میں اس وقت مہاراج کے پاس تھا۔" وہ کہہ رہا تھا "جمنازیم میں پانچ چھ لڑکے تھے۔ مہاراج ان ہنگاموں میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے زیادہ لڑکوں کو جمنازیم میں جمع بھی نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ اس رات پیڈرو کے تقریباً دو درجن آدمیوں نے جمنازیم میں داخل ہو کر توڑ پھوڑ شروع کردی۔ انہیں روکنے کی کوشش کی گئی تو انہوں نے ہمارے لڑکوں پر فائر کھول دیا جس سے ایک لڑکا تو گولی لگنے سے موقع پر ہی چل بسا اور تین زخمی ہوئے۔ ان زخمیوں میں سے ایک نے کسی طرح ٹیلی فون تک پہنچ کر مجھے اطلاع کردی۔ میں کچھ اور لڑکوں کو لے کر وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ حملہ آور نگم کو اٹھا کر فرار ہو چکے ہیں۔

"مجھے اندازہ تھا وہ کہاں گئے ہوں گے۔ میں نے چند لڑکوں کو ساتھ لے کر پیڈرو کے ایک ٹھکانے پر حملہ کردیا۔ نگم کو وہیں لے جایا گیا تھا اور پیڈرو کو اس کے بارے میں خبر کردی گئی تھی لیکن ہم پیڈرو کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی نگم کو چھڑا لائے۔"

"لیکن ماسٹر۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ پیڈرو کو لانچ پر ہماری موجودگی کی اطلاع مل چکی ہے اور اس کے آدمی لانچ پر حملہ کرنے والے ہیں۔" میں نے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔

"مہاراج تمہاری طرف سے کبھی ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوتے۔" ماسٹر ہوچن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "انہوں نے تمہاری حفاظت کے لیے ایک مکمل نیٹ ورک قائم کر رکھا ہے۔ ہر اس جگہ پر مہاراج کا ایک آدمی موجود ہے جہاں سے تمہارے حوالے سے کسی سازش کی اطلاع مل سکتی ہو۔ ہمارا ایک آدمی پیراڈائز میں بھی موجود ہے۔ اس نے مجھے فون پر اطلاع دی تھی کہ پیڈرو کو اس کے کسی مخبر نے خبر دی ہے کہ تم لوگ جل پری پر موجود ہو اور یہ کہ اس کے کچھ آدمی اس لانچ کو تباہ کرنے کے لیے موٹر بوٹس پر روانہ ہونے والے ہیں۔ میں نے یہ اطلاع ملتے ہی تمہیں لانچ پر فون کردیا۔"

"اور یہ اطلاع ہمیں بروقت مل گئی تھی ورنہ اس لانچ کے ساتھ ہمارے بھی ٹکڑے ہو چکے ہوتے۔" میں نے جواب دیا "اور اتفاق سے ہم نے پیڈرو کے اس مخبر کو بھی پکڑ لیا تھا جس نے پیڈرو کو ہمارے بارے میں اطلاع دی تھی۔ اگر وہ چند منٹ پہلے ہماری نظروں میں آجاتا تو اسے پیڈرو کو اطلاع دینے کا موقع نہ ملتا۔"

"بات دراصل یہ ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "مہاراج تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے ہیں۔ پیڈرو تو ایک بہت معمولی سا بدمعاش ہے۔ وہ جب چاہیں اسے مچھر کی طرح چٹکی میں مسل سکتے ہیں۔ وہ تمہیں اس کے ساتھ الجھا کر تمہاری توانائی ضائع نہیں کرنا چاہتے لیکن وہ تمہیں روک بھی نہیں رہے۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہیں اس ٹائپ کے لوگوں سے نمٹنے کا کچھ تجربہ بھی ہوتا رہے۔"

"مہاراج مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وقت آنے پر بتا دیا جائے گا لیکن...."

"لیکن کیا....؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ماسٹر کی طرف دیکھا۔

"سامی کے قتل کے بعد جو صورتِ حال سامنے آئی ہے اس سے اندیشہ ہے کہ تم پیڈرو ہی کے چکر میں الجھ کر نہ رہ جاؤ۔ اس لیے مہاراج چاہتے ہیں کہ تمہیں چند روز کے لیے باہر بھیج دیا جائے۔" ماسٹر نے کہا۔

"کہاں....؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

"کیوں نہ ہمیں کنچن بوری بھیج دیا جائے۔" میرے قریب بیٹھا ہوا پرساد بول پڑا "بڑی اچھی جگہ ہے۔ آج کل تو وہاں کا موسم بھی بہت اچھا ہے۔ وہاں ہم کچھ ریسٹ کرسکتے ہیں۔"

"کنچن بوری۔" ماسٹر ہوچن بڑبڑایا "وہاں واقعی تم لوگوں کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ بہرحال، میں مہاراج سے بات کروں گا۔ اگر انہوں نے کنچن بوری کے نام پر اتفاق کیا تو دو چار دن بعد تم لوگوں کو وہیں بھیج دیا جائے گا۔ بصورت دیگر تم لوگ وہاں جاؤ گے جہاں مہاراج چاہیں گے۔"

ہم ہال میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ جانگی اور تھائی کچن میں کھانا تیار کررہی تھیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کھانا میز پر لگا دیا۔

ماسٹر ہوچن نے کھانا کھانے کے بعد کافی بھی ہمارے ساتھ ہی پی تھی اور بالآخر جب وہ رخصت ہوا تو رات کا ایک بج چکا تھا۔

"تم نے کنچن بوری کا نام کیوں لیا تھا؟" ماسٹر ہوچن کے جانے کے بعد میں نے پرساد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تم بھی تو وہاں جانا چاہتے ہو باس۔" پرساد مسکرایا "ہمارے اصل شکار تو وہیں ہیں۔"

"اگر مہاراج یا ماسٹر ہوچن کو شبہ بھی ہوگیا کہ دارا اور کم وغیرہ کنچن بوری میں ہیں تو وہ ہمیں اس طرف جانے کی اجازت ہرگز نہیں دیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم لوگوں کا سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" جانگی نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ڈیڑھ بج رہا ہے۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔"

"ہاں واقعی اب سو جانا چاہیے۔" میں نے بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اب اگرچہ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن ہم پہرے داری کے نظام کو نظرانداز نہیں کرسکتے تھے۔ طے یہ ہوا کہ پرساد اور پاتھم صبح پانچ بجے تک ڈیوٹی دیں گے۔ اس کے بعد میں اور سکھدر جاگ جائیں گے۔ یہ طے ہوتے ہی ہم لوگ اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

O☆O

تین چار دن اور گزر گئے۔ یوں تو حالات پرسکون تھے لیکن پیڈرو اب بھی سانڈ کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ مجھے ماسٹر ہوچن سے اس کے بارے میں اطلاعات مل رہی تھیں۔ سکھدر بھی باہر کے ایک دو چکر لگا لیتا تھا۔ وہ بھی اکثر دلچسپ خبریں لے کر آتا تھا۔ پیڈرو میری تلاش میں تھا۔ اس کے آدمی شکاری کتوں کی طرح پورے شہر میں میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

چوتھے روز پاتھم ایک دلچسپ خبر لے کر آیا کہ پولیس نے تھریسا کے قتل کے الزام میں اب باقاعدہ مقدمہ درج کرلیا تھا اور پیڈرو کو بھی ایک ملزم نامزد کردیا گیا تھا۔ اس روز ہم پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک آدمی زندہ بچ کر بھاگ نکلا تھا اور اب پولیس نے اسے اسی کیس میں گرفتار کرلیا تھا جبکہ پیڈرو کے دو آدمیوں کے قتل کے الزام میں نامعلوم افراد کے خلاف اور سامی کے قتل کے الزام میں بھی نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا لیا تھا۔

پولیس نے ابھی تک پیڈرو پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ شہر میں ہونے والے ہنگاموں توڑ پھوڑ اور قتل و غارت کے الزام میں بھی اگرچہ پیڈرو کے خلاف مقدمہ درج ہوچکا تھا۔ ان مقدمات میں بھی پیڈرو کے گروہ کے کئی لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا لیکن وہ سب چھوٹی مچھلیاں تھیں جبکہ مگرمچھ پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں پولیس مصلحت سے کام لے رہی تھی۔ پیڈرو کوئی معمولی غنڈا تو نہیں تھا۔ وہ زیرِ زمین دنیا کا بادشاہ تھا۔ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود اس کے تعلقات بھی اوپر تک تھے اور اس پولیس فی الحال اس پر ہاتھ ڈالنے کے سلسلے میں ہچکچا رہی تھی۔ دوسری طرف پیڈرو نے یہ بھی شور مچا رکھا تھا کہ اس نے سامی کے اغوا اور قتل کے حوالے سے پولیس کو میرا نام دیا تھا مگر پولیس نے ایف آئی آر میں میرا نام شامل کرنے کے بجائے نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کیا تھا۔

اسی شام ماسٹر ہوچن سے فون پر بات ہوئی۔ اس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ مہاراج کی مہربانی سے کسی رپورٹ میں میرا نام نہیں آسکا۔

"اور ہاں۔ جس مقصد کے لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے وہ یہ ہے کہ صبح تم لوگ کنچن بوری کے لیے روانہ ہورہے ہو۔" ماسٹر ہوچن کہہ رہا تھا "صبح چھ بجے گاڑی تم لوگوں کو لینے کے لیے پہنچ جائے گی جو تم لوگوں کو بس اسٹیشن پر پہنچا دے گی۔ میرے دو آدمی عام مسافروں کے بھیس میں اس بس میں موجود ہوں گے جو ناکھن پاتھن تک تم لوگوں کے ساتھ جائیں گے۔ اگر انہوں نے کوئی گڑبڑ محسوس کی تو کنچن بوری تک چلے جائیں گے اور وہاں بھی تم لوگوں کے آس پاس ہی رہیں گے اور اگر صورتِ حال معمول کے مطابق ہوئی تو وہ ناکھن پاتھن سے واپس آجائیں گے۔ اس کے بعد اپنا خیال تم لوگ خود رکھو گے۔"

"سمجھ گیا ماسٹر۔" میں نے کہا۔

"کنچن بوری بس اسٹیشن پر پرسی نام کا ایک آدمی تم لوگوں کے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس کے دائیں رخسار پر انگوٹھے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبا ہے۔ وہ میرا شاگرد ہے اور تم لوگوں کی رہائش کا بندوبست بھی وہی کرے گا اور کوئی بھی ضرورت ہو تو تم لوگ بلا تکلف اس سے کہہ سکتے ہو۔ او کے! ٹھیک چھ بجے گاڑی تمہارے دروازے پر پہنچ جائے گی۔"

"یس ماسٹر۔" میں نے کہا اور پھر دوسری طرف سے فون بند ہونے کے بعد میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

ماسٹر ہوچن کے اس فون کے بعد ہم دیر تک پروگرام بناتے رہے۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں یہ اندازہ لگالیا تھا کہ نوتا ہمارے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں یہ طے ہوا کہ اسے

صبح واٹ ڑیمٹ بھیج دیا جائے گا یا میں خود ماسٹر ہوچن سے بات کرلوں گا۔ وہ اسے چند روز کے لیے چیانگ رائے بھجوا دے گا۔ سکھدر کو ہم ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تھے۔ اس لیے اسے بتا دیا گیا کہ وہ صبح مہاراج کے پاس واپس چلا جائے۔ میرا تو خیال تھا کہ پاتھم کو بھی ساتھ نہ لے جایا جائے لیکن وہ ہمارے ساتھ جانے پر بضد تھا۔

تھائی اور جانگی رات کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی روانگی کی تیاری کرنے لگیں۔ اس مرتبہ کوئی افراتفری نہیں تھی۔ خاصا وقت تھا۔ وہ اطمینان سے اپنی چیزیں پیک کرتی رہیں۔ بعض ایسی چیزیں الماریوں میں مقفل کردی گئیں جو ہم ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔ ان میں سامی کے محافظوں سے چھینی ہوئی رائفلیں بھی شامل تھیں۔

ہم رات کو تقریباً دو بجے تک جاگتے رہے تھے لیکن صبح پانچ بجے تھائی نہ صرف خود اٹھ گئی بلکہ اس نے ہم سب کو بھی جگا دیا اور خود کچن میں گھس کر ناشتا تیار کرنے لگی۔

پونے چھ بجے کے قریب میں نے ماسٹر ہوچن سے فون پر بات کرتے ہوئے اسے نوتا کے بارے میں بتا دیا کہ اسے آج یا کل چیانگ رائے بھجوا دیا جائے۔

ٹھیک چھ بجے وہی سیاہ وین پہنچ گئی جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ہمارے استعمال میں آچکی تھی۔ جانگی نے احتیاط سے بنگلے کے تمام دروازے لاک کردیے اور ہم وین میں سوار ہوگئے۔ وین میں وہی دو گن مین بھی بیٹھے ہوئے تھے جو لانچ میں قیام کے دوران میں ہمارے ساتھ تھے۔ ان میں سے ایک نے ائرکنڈیشنڈ بس کے ٹکٹ ہمارے حوالے کردیے۔ بس پر سیٹیں کل ہی بک کروالی گئی تھیں۔ سکھدر اور نوتا کے ٹکٹ بھی تھے جو میں نے اسے واپس کردیے۔

بس پونے سات بجے روانہ ہونے والی تھی۔ ہم روانگی سے صرف پانچ منٹ پہلے پہنچے تھے اور پھر ٹھیک پونے سات بجے بس حرکت میں آگئی۔ روانگی سے پہلے میں نے نوتا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ شاید اسے ہمارے ساتھ نہ جانے کا افسوس ہورہا تھا۔

بس شہر کے مضافاتی علاقوں سے نکل کر شمال مغرب کی طرف جانے والی ہائی وے تین سو تئیس پر آگئی۔ چار لین کی یہ کشادہ ہائی وے بہت شان دار تھی۔ ہائی وے کے دونوں طرف تا حدِ نگاہ سبزہ ہی سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔ دھان کے کھیت تھے۔ سڑک کے قریب کھیتوں میں کئی جگہوں پر تنکوں کی چوڑے چھجے والی ٹوپیاں پہنے کسان کام کرتے نظر آرہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

کنچن بوری بنکاک سے ایک سو انتیس کلومیٹر کے فاصلے پر برما کی سرحد پر واقع ہے۔ کنچن بوری کے لیے اگرچہ ٹرین سروس بھی موجود ہے لیکن میرے خیال میں جو مزہ بس وغیرہ سے سفر کرنے میں ہے وہ ٹرین کے سفر میں نہیں۔

بس میں پاتھم ہم سے الگ بیٹھا تھا۔ ایک سیٹ پر جانگی اور پرساد بیٹھے ہوئے تھے اور ان سے پیچھے والی سیٹ پر میں اور تھائی۔ سکھدر اور نوتا کے ٹکٹ واپس کردیے گئے تھے۔ ان کی سیٹیں دو یورپین ٹورسٹ لیڈیز کو دے دی گئی تھیں۔ بس کی تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں اور میں مسافروں کو گھورتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ دو آدمی کون ہوسکتے تھے جو ہماری حفاظت کے لیے اس بس میں سفر کررہے تھے۔ لیکن مجھے ایسا کوئی شخص نظر نہیں آیا جس پر اس قسم کا گمان ہوسکے۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بس ناکھن پاتھن کی حدود میں داخل ہوگئی۔ یہ شہر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صاف ستھری کشادہ سڑکیں، خوب صورت عمارتیں۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ سڑکوں پر رونق نظر آرہی تھی۔ بازار پوری طرح کھل چکے تھے۔ ہر طرف زندگی رواں دواں دکھائی دے رہی تھی۔

بس اپنے اسٹیشن پر رکی تو مختلف سیٹوں سے دو نوجوان اٹھ گئے۔ ان کے پاس سامان نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان میں ایک آگے والی سیٹ سے اٹھا تھا اور دوسرا پیچھے والی سیٹ سے۔ تھائی باشندوں کی عمروں کا اندازہ لگانا کافی دشوار ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں ان میں کوئی بھی بیس سے کم اور تیئس سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ان میں سے ایک نے بس کے آگے والے دروازے سے اترتے ہوئے میری طرف دیکھا بھی تھا۔ یہاں صرف وہی دو مسافر اترے تھے اس لیے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہی دو ہمارے محافظ تھے۔ اگر وہ کوئی گڑبڑ محسوس کرتے تو آگے تک ہمارے ساتھ ہی جاتے لیکن وہ یہاں اتر گئے تھے جس کا مطلب تھا کہ انہیں بس میں کوئی ایسا مشتبہ شخص نظر نہیں آیا تھا جس سے ہمیں کوئی خطرہ ہوسکتا۔

بس وہاں صرف پانچ منٹ رکی تھی۔ خالی ہونے والی سیٹوں پر دو نئے مسافر بیٹھ چکے تھے۔ میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ وہ دونوں نوجوان اس وقت تک قریب ہی کھڑے رہے تھے جب تک بس وہاں سے روانہ نہیں ہوگئی تھی۔

میدانی علاقہ آہستہ آہستہ ختم ہورہا تھا۔ اس سے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہورہا تھا۔ سڑک بدستور بلندی کی طرف جارہی تھی۔ میں مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ مجھے سرسبز پہاڑی مناظر بہت اچھے لگ رہے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس سفر سے پوری طرح لطف اندوز ہورہا تھا۔ پہلی مرتبہ اس طرح آزادی سے سفر کرنے کا موقع ملا تھا اور میں بار بار اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی تھائی کو بھی اطراف میں پھیلے ہوئے خوب صورت قدرتی مناظر کی طرف متوجہ کررہا تھا۔ مجھے خوش دیکھ کر تھائی بھی خوش ہورہی تھی۔

بس اب پہاڑوں کے بیچ میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر سفر کر رہی تھی۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ تھے۔ بعض موڑ تو اتنے خطرناک تھے کہ ڈرائیور کی ذرا سی غفلت مسافروں کی اندوہناک موت کا باعث بن سکتی تھی۔

کنچن بوری واقعی خوب صورت شہر تھا۔ چاروں طرف سبزہ اور پھول۔ تازہ اور خوشگوار ہوا سے فضا مہک رہی تھی۔

شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی بس سوا دس بجے کے قریب ٹرمینل پر رکی تو مسافر سیٹیں چھوڑنے لگے۔ ہم اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے۔ تمام مسافروں کے اترنے کے بعد ہی ہم نے اپنی سیٹیں چھوڑی تھیں۔

بس سے اترتے ہی میں نے پرسی نامی ایک شخص کو پہچان لیا۔ اگر ماسٹر ہوچن اس کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہ بھی بتاتا تو میں اسے پہچان لیتا۔ میں بنکاک میں مہاراج کے جمنازیم میں اسے دیکھ چکا تھا۔ اس کے دائیں رخسار پر انگوٹھے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبا قدرتی تھا اور یہ سیاہ دھبا ہی اس کی سب سے بڑی شناخت تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا اور سب سے پہلے اس نے مجھے بو کیا۔ جواب میں' میں نے بھی اسے بو (مارشل آرٹس میں جھک کر تعظیم دینا) کیا اور پھر ہم نے بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ اس نے تھائی' جانگی اور پرساد سے بھی ہاتھ ملایا۔ پاتھم دور ہی رہا تھا۔ دراصل ہمارا پہلے ہی سے یہ منصوبہ تھا کہ پاتھم ہم سے الگ اور دور رہے گا۔ ایسا ہم نے احتیاطاً کیا تھا تاکہ اگر ہم سب کسی مصیبت میں پھنس جائیں تو وہ الگ رہ کر ہماری مدد کر سکے۔

بس ٹرمینل کے باہر پبلک پارکنگ ایریا میں پرسی کی اسٹیشن ویگن موجود تھی۔ وین میں بیٹھتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ پاتھم ایک ٹک ٹک میں بیٹھ رہا تھا۔

کنچن بوری سیاحت کا مرکز اور بڑا خوب صورت شہر ہے۔ پرسی اسٹیشن ویگن چلاتے ہوئے ہمیں اس شہر کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔ یہ خوب صورت شہر گیارہ ایم فوز (ڈسٹرکٹ) میں تقسیم ہے جن میں سے پانچ ایم فوز حسین قدرتی مناظر اور تاریخی اہمیت کے حوالے سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز تھے۔

اسٹیشن ویگن ایم فو موانگ کنچن بوری کے علاقے میں درختوں میں ڈھکے ہوئے ایک خوب صورت کاٹیج کے سامنے رک گئی۔ میں نیچے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار کاٹیج اور تھے۔ آس پاس سبزے سے ڈھکی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن کے پیچھے کی پہاڑیاں بتدریج بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ پرسی نے ہماری رہائش کے لیے اس کاٹیج کا انتظام خاص طور پر کیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ یہ بڑی خوب صورت جگہ تھی لیکن سیکیورٹی کے نقطۂ نگاہ سے قطعی مناسب نہیں تھی۔

یہاں تو ہمیں نہایت آسانی سے چاروں طرف سے گھیرا جا سکتا تھا۔

پرسی بتا رہا تھا کہ ریور کوائے کا وہ تاریخی پل بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے جو جاپانیوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں بنایا تھا۔ جاپانی فوج کی نگرانی میں تعمیر ہونے والے اس پل نے ہزاروں جنگی قیدیوں کی جانوں کی بھینٹ لی تھی۔ اتحادی فوجیوں کے ہزاروں جنگی قیدیوں کو اس پل کی تعمیر پر لگایا گیا تھا جن میں کچھ تعمیر کے دوران میں پل سے گر کر ہلاک ہوئے۔ کچھ جاپانی فوجیوں کے ظلم و تشدد کا شکار ہوئے اور بہت سے کاہلی دکھانے والے قیدیوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا۔ پل پر سے گزرنے والی ریلوے لائن کو آج بھی "ڈیتھ ریلوے" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ریلوے اسٹیشن کے ایک طرف وہ تاریخی قبرستان ہے جہاں پل کی تعمیر کے دوران ہلاک ہونے والے یا گولیوں سے اڑا دیے جانے والے ۶۹۸۲ جنگی قیدیوں کو دفن کیا گیا تھا۔ دوسرا تاریخی قبرستان چونگ کائی میں ہے جہاں پونے دو ہزار جنگی قیدیوں کی قبریں ہیں۔

میں بڑی دلچسپی سے پرسی کی باتیں سن رہا تھا۔ بالآخر ہم اندر آ گئے۔ یہ کاٹیج چار کمروں پر مشتمل تھا۔ تین بیڈ رومز تھے اور ایک سٹنگ روم۔ اندر داخل ہونے کے بعد انکشاف ہوا کہ یہاں ایک ادھیڑ عمر ملازمہ بھی موجود تھی جو کچن میں ہمارے لیے ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔

پرسی نے بھی ہمارے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد جب وہ واپس جانے لگا تو اس نے اسٹیشن ویگن کی چابی میرے حوالے کر دی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ ہم سیر و تفریح کے لیے یہاں آئے ہیں اور ہمیں گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔

"یہ گاڑی صرف شہر کی سڑکوں پر چلانے کے لیے ہے۔ پہاڑوں میں تفریحی مقامات پر جانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ کل میں دوسری گاڑی کا بندوبست کروں گا اور....." اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا "جب بھی میری ضرورت ہو' فون کر دینا۔ اس کارڈ پر میرے جمنازیم کا بھی نمبر ہے اور گھر کا بھی۔"

"کیا اس کاٹیج میں ٹیلی فون بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ تم نے شاید دیکھا نہیں۔ لونگ روم میں صوفے کے ساتھ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا ہے۔" اس نے بتایا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ہم تو ایک لمبا چکر لگا کر آئے ہیں لیکن بازار جانے کے لیے پیدل کا راستہ یہاں سے بہت قریب ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

پرسی کے جانے کے بعد ہم برآمدے میں بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دوسرا کاٹیج وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ دوسرے کاٹیج بھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ ایک کاٹیج کے برآمدے میں کرسیوں پر ایک یورپی مرد اور دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تمام کاٹیج کا طرزِ تعمیر ایک ہی جیسا تھا اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کاٹیج کسی ایک ہی شخص یا کمپنی کی ملکیت تھے جو سیاحوں کو کرائے پر دیے جاتے تھے۔

"ہمارے لیے یہ کاٹیج بالکل مناسب نہیں ہے۔" میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں کسی اور کاٹیج کا بندوبست کرنا پڑے گا جو محفوظ ہو۔ یہاں تو ہم آسانی سے گھیرے میں آ سکتے ہیں۔"

"میرا ایک دوست بھی کنچن بوری میں رہتا ہے۔ اسے تلاش کروں گا۔ اگر اس سے ملاقات ہو گئی تو شاید وہ کوئی بندوبست کر سکے۔" پرساد نے جواب دیا۔

دارا یا چی فانگ کے بارے میں ہم نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ ہمیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہاں ہم انہی سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے آئے تھے لیکن ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ ہم اطمینان سے بہت سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا چاہتے تھے۔

رات کو ہم نے صرف ڈھائی تین گھنٹوں کی نیند لی تھی اور اب میں کچھ سستی اور تھکن سی محسوس کرنے لگا تھا۔ دوسروں کے چہروں پر بھی کچھ ایسے ہی آثار نظر آ رہے تھے۔ پچھلے چند روز ہمارے لیے بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے تھے اور میرے خیال میں کم از کم آج کا دن اس پُرسکون جگہ پر آرام کر لینا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر ایک بیڈ روم میں آ گیا اور جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔

تین بجے دوپہر کے کھانے کے بعد ہم گھومنے کے لیے نکل گئے۔ ہم نے گاڑی ایک بہت بڑے شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ پر چھوڑ دی اور پیدل ہی گھومنے لگے۔ دارا' کم اور چی فانگ اس شہر میں موجود تھے۔ دارا اور چی فانگ اگرچہ زخمی تھے لیکن کم یا اس کے کسی آدمی سے آمنا سامنا ہونے کا امکان تھا اس لیے شہر کی سیر و تفریح کے لیے بھی ہم نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا۔ میں اور تھائی الگ تھے اور جانگی پرساد کے ساتھ ہم سے الگ تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھی۔ اس طرح دو پارٹیوں میں بٹنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر ایک پارٹی نظروں میں آ جائے تو دوسری محفوظ رہے اور پھر پاتھم بھی تھا جو ہم سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ وہ بس سے اترتے ہی کسی دوسری جگہ پر چلا گیا تھا اور ابھی تک اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ بازار میں گھومتے پھرتے کہیں نہ کہیں مل جائے گا۔

پانچ بجے کے قریب میں اور تھائی ایک کافی ہاؤس میں گھس گئے۔ ان دو گھنٹوں کے دوران میں تھائی نے کچھ شاپنگ بھی کر لی تھی۔ ہم کافی کی چسکیاں لے رہے تھے کہ ایک فربہ اندام آدمی کو کافی ہاؤس میں داخل ہوتے دیکھ کر تھائی چونک سی گئی۔ اس شخص کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ تھائی باشندہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ تھا۔ وہ کافی ہاؤس میں داخل ہونے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا جو اس وقت خالی پڑا ہوا تھا۔ تھائی بڑی توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس شخص نے ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھایا اور جیب سے سکے نکال کر سلاٹ میں ڈالنے کے بعد نمبر ملانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے ہک کو دبایا تو سکے نیچے والے خانے سے باہر آ گئے۔ اس نے دو تین مرتبہ کوشش کی مگر غالباً فون خراب تھا۔ کال نہیں ہو سکی۔

"کیا بات ہے۔ تم اس شخص کو دیکھ کر چونک سی گئی تھیں۔ یہ کون ہے؟" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔ ہم جس میز پر بیٹھے ہوئے تھے وہ کاؤنٹر کے بالکل ساتھ تھی لیکن کاؤنٹر کے ہمارے سامنے والے حصے پر ٹافی' چیونگ گم' چاکلیٹ اور اس قسم کی چیزوں سے بھرے ہوئے جار رکھے ہوئے تھے اور کاؤنٹر کے سامنے کھڑا ہوا شخص ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"یہ شخص سرجن ہے اور بنکاک کا رہنے والا ہے۔" تھائی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اسے زیرِ زمین دنیا کا ڈاکٹر بھی کہا جاتا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ آپس کے لڑائی جھگڑوں یا پولیس مقابلوں میں زخمی ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ علاج کے لیے کسی اسپتال کا رخ نہیں کر سکتے۔ اس جیسے ڈاکٹر ہی بھاری رقم کے لالچ میں ان کا چوری چھپے علاج کرتے ہیں۔"

"تم یہ سب کچھ کیسے جانتی ہو؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بنکاک کی جس گلی میں میرا ایک مساج پارلر تھا اسی گلی میں اس کا کلینک بھی تھا۔" تھائی نے بتایا "یہ بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔ اس زمانے میں ایک دو مرتبہ پولیس نے اس کے کلینک پر چھاپے بھی مارے تھے لیکن یہ ہر مرتبہ بچتا رہا تھا اور بالآخر یہ وہاں سے کلینک فروخت کر کے کہیں اور چلا گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تمہیں یاد ہے' سای نے بتایا تھا کہ دو ماہر ڈاکٹر بھی دارا اور چی فانگ کے علاج کے لیے ان کے ساتھ موجود ہیں۔ کیا یہ ان دونوں میں سے ایک نہیں ہو سکتا۔ یہ پیسے کے لالچ میں کہیں بھی جا سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "اس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں کی تلاش کے لیے زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ اس کا پیچھا کر کے ہم آسانی سے ان کے ٹھکانے پر پہنچ سکتے ہیں۔"

وہ شخص اب بھی بار بار سلاٹ میں سکے ڈال کر نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں ریسیور ہک پر لٹکا دیا اور بوتھ سے نکل کر کاؤنٹر کے سامنے آ گیا۔

"وہ ٹیلی فون خراب ہے۔ مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے پلیز....." اس نے کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں کہا۔

کاؤنٹرمین نے ٹیلی فون سیٹ اس کی طرف سرکا دیا۔ میں اپنے سامنے رکھے ہوئے شیشے کے مرتبانوں کی آڑ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ قریب سے اس کا چہرہ کسی بل ڈاگ کی طرح کا لگ رہا تھا۔ وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ملا رہا تھا۔

"او.... یس باس.... میں ڈاکٹر فان بول رہا ہوں۔" وہ لائن ملنے پر بولا "تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے...." وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے ڈاکٹر جانگی کو یہاں دیکھا ہے.... ہاں ہاں۔ وہ کنچن بوری میں ہے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی ہے۔ نہیں باس۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ یہ وہی آدمی ہے جسے پیڈرو نے سولڈرنگ آئرن سے داغا تھا۔ یس.... یس باس۔ میں محتاط رہوں گا۔ تم فکر مت کرو باس۔ وہ مجھے جانتے ہی نہیں تو مجھ پر شبہ کیسے کریں گے۔ میں ان کے ٹھکانے کا پتا لگا کر واپس آجاؤں گا۔" وہ خاموش ہو کر کچھ دیر دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر "یس باس" کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

میں اور تھائی ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ تھائی کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔ اس موٹے کا نام ڈاکٹر فان تھا اور اس کے بارے میں تھائی کا شبہ درست نکلا تھا۔ اس نے جانگی اور پرساد کو دیکھ کر پہچان لیا تھا اور فون پر دارا یا کم کو خبر کر دی تھی اور غالباً اسے جانگی اور پرساد کی نگرانی کر کے ان کا ٹھکانا معلوم کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

جانگی اور پرساد کہاں تھے؟ وہ دونوں ہم سے زیادہ دور نہیں تھے اور میرا اندازہ تھا کہ ہمیں کافی ہاؤس میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بھی کسی ریسٹورنٹ یا کافی ہاؤس میں چلے گئے تھے اور ڈاکٹر فان نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

ڈاکٹر فان کافی ہاؤس سے باہر جا چکا تھا۔

"اسے اب واپس نہیں جانا چاہیے تھائی۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "اگر یہ واپس چلا گیا تو ہمارے لیے یہاں ایک دن بھی نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

ہم نے بھی فوراً ہی کرسیاں چھوڑ دیں۔ میں نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا اور باہر ہم آ گئے۔

ڈاکٹر فان دائیں طرف فٹ پاتھ پر کھڑا سڑک کے دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی سڑک کے دوسری طرف دیکھا تو بات میری سمجھ میں آ گئی۔ سامنے بھی ایک کافی ہاؤس تھا۔ میں اور تھائی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند گز آگے ایک نیوز اسٹینڈ کے قریب رک گئے۔

"میرا خیال ہے وہ مجھے اور تمہیں نہیں جانتا۔ ورنہ ہمیں دیکھ کر چونک جاتا۔" میں نے نیوز اسٹینڈ سے ایک میگزین اٹھاتے ہوئے تھائی کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی کی۔

"میرا خیال ہے جانگی اور پرساد سامنے والے کافی ہاؤس میں ہیں۔" تھائی نے بھی سرگوشی میں کہا "تم یہیں رکو۔ میں جا کر ا[illegible] صورتِ حال سے آگاہ کر دیتی ہوں۔ اس کے بعد ہی اس شخص کو گھیرنے کی کوشش کریں گے۔"

"ان سے کہو وہ پندرہ منٹ بعد کافی ہاؤس سے نکل کر ا[illegible] شاپنگ سینٹر کی طرف چلتے رہیں جس کے سامنے والے پارک[illegible] لاٹ پر ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ یہ یقیناً ان کے پیچھے جائے گا او[illegible] اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔" میں نے کہا۔

تھائی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سڑک پار کر کے دوسری طرف گئی۔ میں بھی محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے اند[illegible] تھا کہ دارا کا کوئی ایسا آدمی اس طرف نہ آجائے جو ہمیں پہچ[illegible] ہو۔

تھائی سامنے والے کافی ہاؤس کے سامنے رک کر اس طر[illegible] اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے اسے کسی کی تلاش ہو پھر وہ کافی ہاؤس [illegible] اندر گھس گئی لیکن اس کی واپسی میں تین منٹ سے زیادہ نہیں [illegible] تھے۔

"میں نے انہیں سمجھا دیا ہے۔" اس نے میرے ہاتھ سے میگزین لیتے ہوئے سرگوشی کی "وہ دونوں ٹھیک پندرہ منٹ بعد کا[illegible] ہاؤس سے نکل جائیں گے۔"

وہ کھڑے کھڑے میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ انگریز[illegible] زبان میں بنکاک سے شائع ہونے والے اس میگزین میں مختلف موضوعات پر مضامین کے علاوہ عریاں تصاویر اور اشتہارات بھ[illegible] تھے اور پھر ایک رنگین اشتہار دیکھ کر وہ چونک سی گئی۔ یہ کنچ[illegible] بوری کے کسی مساج پارلر کا اشتہار تھا اور اس کے ساتھ ایک حسین لڑکی کی نیم عریاں تصویر بھی تھی۔

"اوہ! یہ تو لیزا ہے۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"لیزا کون؟" میں نے پوچھا۔

"میری دوست۔" تھائی نے کہا "یہ کچھ عرصہ پہلے بنکاک میں تھی۔ اس نے مساج کا کام مجھ سے ہی سیکھا تھا پھر اپنا پارلر کھول لیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ پارلر بیچ کر کہیں چلی گئی تھی۔ اس نے کنچن بوری میں مساج پارلر کھول رکھا ہے۔ یہ ہمارے کام آ سکتی ہے۔" اس نے اسٹال والے کو میگزین کی قیمت ادا کر دی اور میگزین شاپنگ بیگ میں ڈال لیا۔

"وہ لوگ کافی ہاؤس سے نکل رہے ہیں۔" میں نے پرساد اور جانگی کو سامنے والے کافی ہاؤس سے نکلتے دیکھ کر سرگوشی کی۔

وہ دونوں کافی ہاؤس سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر بائیں طرف مڑ گئے تھے۔ جانگی کے ہاتھ میں بھی ایک شاپنگ بیگ تھا اور پرساد نے جوتے کے ڈبے کے برابر ایک ڈبا اٹھا رکھا تھا۔

ڈاکٹر فان بھی ہمارے قریب سے گزر کر اس طرف چلنے لگا۔ کسی کا تعاقب یا نگرانی کرنے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ جانگی اور پرساد کو اگر بتا نہ دیا جاتا تو انہیں شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کی

نگرانی کی جا رہی ہے۔ وہ سڑک کے ایک طرف تھے اور نگرانی کرنے والا سڑک کے دوسری طرف ان کے متوازی چل رہا تھا۔

جانگی اور پرساد راستے میں کئی جگہ تھوڑی دیر کے لیے رکے تھے۔ ان کی وجہ سے ڈاکٹر فان کو اور پھر ہمیں بھی رکنا پڑا تھا۔ بالآخر وہ دونوں شاپنگ سینٹر کے سامنے والے اس پارکنگ لاٹ کے قریب پہنچ گئے جہاں ہماری اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔

ڈاکٹر فان کو ابھی تک شبہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس کی بھی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ ایک جگہ کھڑا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس وقت سوا چھ بج رہے تھے۔ سورج بلند پہاڑوں کے پیچھے جھک رہا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں سورج عام طور پر جلدی غروب ہو جاتا ہے۔ اسٹریٹ لائٹیں اور دکانوں کی بتیاں جل گئی تھیں۔ اس شاپنگ سینٹر میں اور اس کے سامنے بڑی رونق تھی۔ زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی جو خریداری کر رہے تھے۔ لوگوں کے اس ہجوم میں ایک آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔

وہ پاتھم تھا جو ایک دکان کے سامنے کھڑا پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس طرف سے گزرتے ہوئے اس نے ہماری گاڑی دیکھ لی تھی اور وہیں کھڑا ہماری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اور تھائی ٹہلتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گئے۔

"ہیلو باس۔ میں نے پارکنگ میں وہ گاڑی...."

"میں سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہمارے بائیں طرف فٹ پاتھ کے کنارے پر ایک موٹا سا آدمی کھڑا ہے۔ نیلے سوٹ والا اس کے ہاتھ میں پیلے اور سرخ رنگوں والا شاپنگ بیگ ہے۔ اسے لے کر پارکنگ میں گاڑی کے پاس پہنچ جاؤ۔ کسی کو شبہ نہ ہونے پائے کہ تم اسے زبردستی لے جا رہے ہو۔"

"کون ہے وہ؟" پاتھم نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دارا اور چی فانگ کا معالج ڈاکٹر فان۔" میں نے جواب دیا "اس نے جانگی اور پرساد کو پہچان لیا ہے اور ٹیلی فون پر دارا وغیرہ کو اطلاع بھی دے دی ہے اور اب یہ ان دونوں کا پیچھا کر کے ہمارا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا باس۔" پاتھم نے کہا "تم فکر مت کرو۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

میں تھائی کو اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کر کے ہم دونوں پارکنگ لاٹ میں آ گئے۔ جانگی اور پرساد بھی اسٹیشن ویگن کے قریب پہنچ چکے تھے۔ چابی پرساد ہی کے پاس تھی۔ میں نے دور ہی رک کر اشارہ کیا اور وہ گاڑی کا تالا کھولنے لگا۔ میں نے مڑ کر دوسری طرف دیکھا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ پاتھم ڈاکٹر فان کو لے کر آ رہا تھا۔ پاتھم ڈاکٹر فان کے بالکل ساتھ مل کر چل رہا تھا اس کا دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔ ڈاکٹر فان کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

پرساد ڈرائیونگ سیٹ پر اور جانگی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ پاتھم نے اسٹیشن ویگن کا پچھلا دروازہ کھولا اور ڈاکٹر فان کو اندر دھکا دے دیا۔ ڈاکٹر فان کے منہ سے کراہ سی نکل گئی تھی۔ ان کے اندر بیٹھتے ہی میں اور تھائی بھی اندر گھس گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ہمیں دیکھ کر ڈاکٹر فان کا چہرہ خوف سے اس طرح پیلا پڑ گیا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ وہ راستے میں ہمیں دو تین مرتبہ دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت اسے ہم پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا اور اب ہمیں دیکھ کر اس پر دہشت سی طاری ہو گئی تھی۔

"کک.... کون ہو تم لوگ؟" وہ باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہکلایا "تم لوگ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے ہو اور یہ ایک سنگین جرم ہے۔"

"ہمیں معلوم ہے کہ ہم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"مم.... میں ایک معزز ڈاکٹر ہوں۔" وہ پھر ہکلایا۔ اب پاتھم کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس پر ہلکی سی کپکپی بھی طاری ہو رہی تھی۔ "میرے پاس زیادہ رقم نہیں ہے۔ اگر تم لوگ...."

"ہمیں تمہاری رقم کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اب تم خاموشی سے بیٹھے رہو اور اگر تم نے کوئی... گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو یہ شخص تمہیں بلا دریغ گولی مار دے گا۔ اسے گولیاں چلانے کا بہت شوق ہے۔" میں نے پاتھم کی طرف اشارہ کیا۔

"رقم کی ضرورت نہیں تو پھر مجھے اس طرح اغوا کر کے کیوں لے جا رہے ہو؟" ڈاکٹر فان اب باقاعدہ کانپنے لگا تھا۔

"اس لیے کہ تم ڈاکٹر جانگی اور پرساد کا پیچھا کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔ "کسی کا تعاقب کرنا بھی ایک جرم ہے اور پھر تم نے دارا اور چی فانگ کو بھی ان کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ ایسی صورت میں ہم تمہیں کس طرح چھوڑ سکتے تھے۔"

"مم.... میں کسی جانگی یا دارا کو نہیں جانتا۔" ڈاکٹر فان کا چہرہ کچھ اور سفید پڑ گیا۔

"اب خاموش بیٹھے رہو۔ زبان کھولی تو دل میں سوراخ کر دوں گا۔" پاتھم نے غراتے ہوئے پستول کی نال اس کے پہلو سے لگا دی۔

اس دوران میں اسٹیشن ویگن پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ یہ سیاحت کا سیزن تھا۔ شہر کی ہر سڑک پر رونق اور چہل پہل تھی۔ اسٹیشن ویگن مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی اس راستے پر آ گئی جو پہاڑیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اپنے کاٹیج میں پہنچ گئے۔ دور کے ایک کاٹیج میں روشنی نظر آ رہی تھی جبکہ باقی کاٹیج تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر فان نے یہ اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی

کہ اس نے جی فانگ کو جانگی اور پرساد کے بارے میں اطلاع دی تھی اور اس کی ہدایت پر وہ ان کا تعاقب کرکے ان کے ٹھکانے کا پتا چلانا چاہتا تھا۔ اگر وہ یہ اعتراف نہ بھی کرتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ میں اپنے کانوں سے اس کی باتیں سن چکا تھا۔

ڈاکٹر فان نے صرف میرا نام سن رکھا تھا۔ مجھے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگر کبھی دیکھا ہوتا تو اس طرح آسانی سے ہمارے جال میں نہ پھنس جاتا لیکن اب اسے پتا چل گیا تھا کہ میں کون ہوں۔ میرے بارے میں جانتے ہی اس کی حالت غیر ہوگئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی وقت بے ہوش ہوکر گر پڑے گا۔

میں دیر تک اس سے دارا اور جی فانگ وغیرہ کے بارے میں پوچھتا رہا۔

"اگر برج کی طرف سے جائیں تو راستہ خاصا طویل ہے۔" وہ بتا رہا تھا "لیکن پہاڑیوں کے اندر کا راستہ ایک میل سے زیادہ نہیں ہے۔"

گیارہ بجے کے قریب میں اور پرساد ڈاکٹر فان کو لے کر کاٹیج سے نکل آئے۔ ہمارے ساتھ پاتھم بھی تھا لیکن وہ کئی گز پیچھے تھا۔ ڈاکٹر فان چلتے ہوئے بار بار لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ اب اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے اور ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بار بار زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اگر اسے معاف کردیا جائے تو وہ اسی وقت یہ شہر چھوڑ کر چلا جائے گا لیکن ہم کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھے۔ ڈاکٹر فان جیسے آدمیوں پر کسی بھی طرح بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پہاڑیوں میں راستہ خاصا دشوار تھا۔ تاریکی کی وجہ سے بھی چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ڈاکٹر فان نے ایک مرتبہ پھر رک کر میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور گھگیا کر معافی مانگنے لگا۔ پرساد نے اسے زوردار ٹھوکر رسید کردی۔

"خاموشی سے چلتے رہو ورنہ وقت سے پہلے ہی تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔" اس نے غراتے ہوئے ایک اور ٹھوکر ماری۔

کچھ آگے چلنے کے بعد صاف راستہ مل گیا۔ یہی وہ اصل راستہ تھا جو پہاڑیوں سے شہر کی طرف چلا گیا تھا۔ اس راستے پر تقریباً نصف میل چلنے کے بعد ڈاکٹر فان ایک پگڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ اس طرح ہم ایک چٹان پر پہنچ گئے۔ اس چٹان کے دوسری طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک اور مسطح چٹان تھی جس پر قریب قریب دو مختصر عمارتیں بنی ہوئی تھیں اور ان کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آرہی تھی۔ ایک تنگ سی پگڈنڈی دوسری چٹان تک چلی گئی تھی۔ اس طرف درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ڈاکٹر فان ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔

"وہ... وہ سامنے..." وہ ہکلاتے ہوئے بولا "دو کاٹیج ہیں۔ وہ دونوں کاٹیج دارا اور اس کے ساتھیوں کے استعمال میں ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اچانک ہی میرے قدموں پر گر پڑا "پلیز! مجھے چھوڑ دو۔ میں انہیں تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

"یہ کام تو تم پہلے ہی کرچکے ہو۔" میں نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "تم نے انہیں جانگی اور پرساد کے بارے میں اطلاع دی تھی اور وہ لوگ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ صورتِ حال کا اندازہ نہ لگا سکیں۔ وہ فوراً ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ میں بھی کنچن بوری میں موجود ہوں اور ممکن ہے یہ اطلاع ملنے کے بعد انہوں نے شہر میں میری تلاش شروع کردی ہو۔ تم نے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں اور تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

میں نے پرساد کو اشارہ کیا۔ وہ ڈاکٹر فان کو گھسیٹتا ہوا چٹان کے دوسرے کنارے پر لے گیا۔ اس طرف عمودی ڈھلان تھی جو سا... سترفٹ نیچے تک چلی گئی تھی۔

"تمہیں ایک شرط پر معاف کیا جاسکتا ہے۔" پرساد نے کہا۔

"میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔" ڈاکٹر فان جلدی سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں امید کی کرن ابھر آئی تھی۔

"اس راستے سے اتر کر اس کاٹیج تک جاؤ اور دارا کو بتادو کہ وجدان نے اس کے ٹھکانے کا پتا چلالیا ہے اور وہ بہت جلد ان سے دو دو ہاتھ کرنے والا ہے۔"

"م م... میں جاتا ہوں... ابھی جاتا ہوں۔" ڈاکٹر فان جلدی سے بولا۔

وہ عمودی راستہ بہت خطرناک تھا۔ ذرا سی غلطی موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ اگر وہ مرنے سے بچ بھی گیا تو ایک دو ہڈیاں ٹوٹ ہی سکتی تھیں مگر ڈاکٹر فان نے اس شرط کو غنیمت سمجھا تھا۔ اس نے ڈھلان پر پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ پرساد نے اس کا نام لے کر پکارا۔ ڈاکٹر فان نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور عین اسی لمحے پرساد کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے شعلہ اگلا۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی خاموش فضا میں ڈاکٹر فان کی چیخ بھی گونج اٹھی تھی۔ میں پرساد کے نشانے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ تاریکی کے باوجود گولی ڈاکٹر کی پیشانی میں لگی تھی۔ وہ نیچے گرا اور عمودی ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔

وہ کاٹیج وہاں سے سو گز سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سناٹے میں فائر کی آواز وہاں ضرور سنی گئی ہوگی۔

"چلو باس۔" پرساد نے پستول جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "آج رات میں نہیں تو صبح انہیں ڈاکٹر فان کی لاش مل جائے گی اور لاش ہمارا پیغام دارا تک پہنچا دے گی۔"

ہم دونوں چٹان سے اترنے لگے۔ مجھے ڈاکٹر فان کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ ہماری نظروں میں نہ آتا تو دارا وغیرہ کو ہمارے ٹھکانے کے بارے میں بتا دیتا اور وہ ہمیں زندہ نہ چھوڑتے۔ ڈاکٹر فان سے تو ہم نے نجات حاصل کرلی تھی لیکن دارا اور اس کے ساتھیوں کو یہ خبر بہرحال مل چکی تھی کہ ہم کنچن بوری میں ... میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر فان سے ہمیں یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ دارا کا زخم تو ٹھیک ہوچکا تھا البتہ جی فانگ کی پسلی میں اب بھی تکلیف تھی اور وہ زیادہ نقل و حرکت نہیں کرسکتا تھا اور ان لوگوں کا ارادہ ابھی چند روز اور یہاں رہنے کا تھا۔

کچھ ہی دور پاتھم ہمیں مل گیا۔

"تم لوگ جاؤ باس۔" اس نے کہا "میں اس فائر کے بعد ان لوگوں کا ری ایکشن دیکھنا چاہتا ہوں اور اب میں تمہاری طرف واپس نہیں آؤں گا۔ صبح ملاقات ہوگی لیکن اگر کوئی ایمرجنسی ہوگئی تو میں رابطہ کرلوں گا۔ میں نے تمہارا فون نمبر نوٹ کرلیا ہے۔"

"اپنا خیال رکھنا۔ وش یو گڈ لک!" میں نے کہا۔

پاتھم چٹانوں کی طرف چلا گیا اور میں اور پرساد اپنے کاٹیج کی طرف چلنے لگے۔

○☆○

لیزا واقعی بڑے کام کی عورت ثابت ہوئی تھی۔ صبح گیارہ بجے کے قریب تھائی نے اسے فون کیا تھا اور وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے کاٹیج میں پہنچ گئی تھی۔ گزشتہ رات میں نے میگزین میں اس کی تصویر دیکھی تھی لیکن اس وقت اسے اپنے سامنے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ اپنی تصویر سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ دراز قامت، گداز جسم اور غزالی آنکھیں۔ اس کی چال بھی ہرنی جیسی تھی۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا جس سے اس کے جسم کے مختلف اعضا نمایاں ہورہے تھے۔ وہ بڑی گرم جوشی سے تھائی سے ملی تھی اور اتفاق کی بات یہ تھی کہ وہ جانگی کو بھی جانتی تھی۔

لیزا کی داستان بڑی دلچسپ تھی۔ کئی سال پہلے بنکاک میں تھائی سے مساج کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد اس نے شہر کے ایک پوش علاقے میں اپنا مساج پارلر کھول لیا تھا۔ اس کے حسن و شباب کی وجہ سے پارلر خوب چل نکلا تھا۔ اپنی مدد کے لیے اس نے چند اور حسین لڑکیاں بھی رکھ لی تھیں۔

لیزا کے مساج پارلر میں آنے والے گاہکوں کی زیادہ تعداد اس علاقے کے رئیس زادوں کی تھی۔ ہر نوجوان لیزا ہی سے مساج کروانا چاہتا تھا۔ بعض تو دن میں دو دو مرتبہ آتے تھے۔ بہت سے بگڑے ہوئے رئیس زادے تو ایسے تھے جو لیزا کو صرف اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتے تھے اور اس کے لیے منہ مانگی فیس ادا کرنے کو تیار تھے لیکن لیزا اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ دولت مند نوجوانوں میں جذبۂ رقابت بڑھ رہا تھا اور پھر ان میں لیزا کے لیے لڑائیاں بھی شروع ہوگئیں۔

وہ علاقہ زیرِ زمین دنیا کے بے تاج بادشاہ تائیگر کے زیر اثر تھا۔ تائیگر کے آدمی اس علاقے میں دکانوں اور کاروباری لوگوں سے بھتا وصول کرتے رہتے تھے۔ تقریباً ایک سال بعد لیزا بھی ان کی نظروں میں آگئی۔ دو مرتبہ تو تائیگر کے آدمی بھتا لینے آئے تھے۔ تیسری مرتبہ تائیگر خود پہنچ گیا۔ وہ اپنے آدمیوں سے اس کے حسن و شباب کی تعریف سن کر آیا تھا۔ وہ لیزا کے حسن و شباب سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے لیزا کو پیشکش کی کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ لیزا نے اس وقت تو اسے ٹال دیا اور پھر چند روز بعد اس نے چوری چھپے اپنا مساج پارلر فروخت کردیا اور چیانگ مائے چلی گئی۔ وہ تقریباً ڈیڑھ سال وہاں رہی۔ وہاں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال پیش آئی تو لیزا وہاں سے بھی بھاگ نکلی اور برما پہنچ گئی۔ دو سال پہلے وہ برما سے واپس آگئی اور اس مرتبہ اس نے کنچن بوری میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں مساج پارلر کھولنے کے لیے اسے ایک بڑے ہوٹل کے قریب بنگلا مل گیا۔ اس کا کاروبار خوب چل نکلا۔ یہاں بھی اپنے حسن کی وجہ سے اسے چھوٹے موٹے مسائل پیش آتے رہتے تھے لیکن اب اس میں اتنا حوصلہ پیدا ہوچکا تھا کہ ایسے مسائل کا سامنا کرسکے۔ وہ خوب کما رہی تھی۔ اس نے ریور کوائے برج سے تقریباً نصف میل آگے ایک خوب صورت کاٹیج بھی خرید لیا تھا جسے وہ صرف اپنے کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرتی تھی۔ بعض لوگ مساج کرانے کے لیے تنہائی اور پُرسکون جگہ چاہتے تھے اور لیزا انہیں اس کاٹیج میں لے کر آتی تھی۔ ایسے گاہکوں سے وہ مساج کی فیس کے علاوہ کاٹیج کا کرایہ بھی وصول کرلیتی تھی۔

تھائی نے اسے اپنے پرابلم سے آگاہ کیا تو لیزا کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنا وہ کاٹیج ہمارے حوالے کرنے کو تیار ہوگئی۔

"تم چاہو تو آج شام کو وہ کاٹیج دیکھ لو۔" اس نے کہا "میں ضرورت کی چیزیں وہاں پہنچا دوں گی۔ کل صبح تم لوگ وہاں منتقل ہوجانا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم شام کو تمہارے ساتھ چلیں گے۔" تھائی نے کہا۔

"ساتھ نہیں۔" لیزا نے جواب دیا "میں ٹھیک سات بجے وہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم لوگ وہاں آجانا۔ کاٹیج تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ تم لوگ آسانی سے پہنچ جاؤ گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر پتا سمجھانے لگی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم پہنچ جائیں گے۔" اس مرتبہ تھائی کے بجائے میں نے جواب دیا۔

لیزا کچھ دیر اور وہاں رکنے کے بعد چلی گئی۔

"تم نے لیزا کو یہاں بلا تو لیا تھا لیکن کیا اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟" میں نے لیزا کے جانے کے بعد تھائی سے پوچھا۔

"اگر مجھے اعتماد نہ ہوتا تو اسے یہاں بلانا تو دور کی بات ہے، میں اسے کنچن بوری میں اپنی موجودگی کی ہوا بھی نہ لگنے دیتی۔" تھائی نے جواب دیا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم چھ بجے شام نکل جائیں گے لیکن دوپہر کو اچانک ہی تھائی کو بخار ہوگیا۔ بخار کے ساتھ ہی وہ سردی سے کپکپانے لگی۔ کاٹیج میں تین چار کمبل تھے جو سب کے سب اس

کے اوپر ڈال دیے گئے لیکن اس کے باوجود وہ سردی سے ٹھٹھرتی رہی۔

"ملیریا ہوگیا ہے۔" جانکی نے اسے دیکھ کر بتایا "دوا منگوانی ہوگی لیکن....."

"تم لکھ کر دے دو۔ میں جاکر لے آتا ہوں۔" میں بیچ میں بول پڑا۔

"تم کیسے جاؤ گے۔" جانکی نے کہا "صبح فون پر پاکھم نے بتایا بھی تھا۔ دارا کے آدمی ہم سب کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی ان کی نظروں میں آگیا تو سب مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ اگر لیزا کو فون پر دواؤں کے نام لکھوا دیے جائیں تو وہ پہنچا دے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے میز پر پڑا ہوا میگزین اٹھاتے ہوئے کہا "اشتہار میں اس کا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ تم فون کرکے اسے بتا دینا۔" میں نے میگزین کھول کر اشتہار والا صفحہ اس کے سامنے کردیا۔

جانکی نے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا۔ کال کسی اور نے ریسیو کی تھی لیکن ایک منٹ بعد لیزا لائن پر آگئی۔ جانکی نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے دواؤں کے نام بتا دیے اور یہ بھی تاکید کردی کہ وہ کسی اور کو بھیجنے کے بجائے دوائیں لے کر خود آئے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد لیزا مطلوبہ دوائیں لے کر آگئی۔ جانکی نے پہلی خوراک اپنے ہاتھ سے تھائی کو کھلا دی۔

"ٹھیک ہو جاؤ گی۔" وہ تھائی کو تسلی دیتے ہوئے بولی۔

میں نے تھائی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخار واقعی بہت تیز تھا۔ پیشانی انگارے کی طرح تپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی سُرخی بھر گئی تھی۔

لیزا سے بنا ہوا آج شام کا پروگرام منسوخ کردیا گیا۔

"اب ہم دو تین دن تک تو یہیں رہیں گے۔" میں نے لیزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے ہوسکتا ہے کہ اس دوران میں کسی وقت جاکر میں تمہارا وہ کاٹیج دیکھ آؤں۔"

"جب بھی جانا چاہو' مجھے فون کردینا۔" لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا اور تھوڑی دیر بعد رخصت ہوگئی۔

پرساد برآمدے میں تھا اور میں اور جانکی' تھائی والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد تھائی سوگئی تو ہم دونوں بھی اٹھ کر برآمدے میں آگئے اور وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

ملیریا کا بخار ایک دن میں پیچھا نہیں چھوڑتا۔ تھائی کو بھی تین چار دن بعد ہی بخار سے مکمل طور پر نجات مل سکی تھی لیکن بخار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کمزوری کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں تھی کہ ہم کہیں آجاسکتے۔ تھائی کی وجہ سے ہم بھی کہیں نہیں نکلے تھے۔ اسی دوران میں لیزا بھی باقاعدگی سے چکر لگاتی رہی تھی اور

پرسی بھی آتا رہا تھا۔ کاٹیج میں آنے کے تیسرے دن اس نے ہم ایک کار دے دی تھی اور اسٹیشن ویگن لے گیا تھا۔ اس نے ہمار ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا۔ کاٹیج کی ملازمہ بھی ہر صبح ناشتا دینے کے بعد ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے مارکیٹ چلی جاتی تھی۔

ہم میں پاکھم ہی ایک ایسا آدمی تھا جسے دارا اور اس کے ساتھی نہیں پہچان سکتے تھے اور وہ آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا اس سے ہمیں رپورٹ ملتی رہتی تھی۔ دارا کے آدمی اب بھی ہر تلاش کررہے تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس روز میں اور پرساد برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ پاکھم آگیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

"کیا ہوا پاکھم۔ تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" پرساد نے پوچھا۔

"دارا کے آدمی پرسی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔" پاکھم نے جواب دیا "وہ چونکہ مہاراج کے کیمپ کا آدمی ہے اس لیے انہیں شبہ ہے کہ وہ ہمارے بارے میں جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اس پر تشدد کرکے ہمارے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کریں۔"

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ بڑی تشویش ناک خبر تھی۔

"ایک اور پریشان کن خبر یہ ہے کہ دارا اور اس کے ساتھی اپنا ٹھکانا بدل چکے ہیں۔ میں آج گھومتا ہوا اس طرف نکل گیا تو وہ دونوں کاٹیج خالی پڑے ہیں۔ کل تک وہ لوگ وہیں تھے۔ میرا خیال ہے' رات کو کسی وقت کاٹیج خالی کرکے گئے ہیں۔"

"یہ اور بھی زیادہ تشویش ناک خبر ہے۔" میں نے کہا "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرسی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ زبان کھول دے۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہوگا کہ ہم یہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ اصل معاملے سے تو ہم نے اسے آگاہ ہی نہیں کیا تھا۔"

"وہ مہاراج کا آدمی ہے باس۔" پرساد نے کہا "اور مہاراج کے آدمیوں کا تجربہ ہمیں ہوچکا ہے۔ پرسی کو میں جانتا تو نہیں لیکن مجھے اس پر پورا بھروسا ہے۔ جس طرح اسے اٹھایا گیا ہے' اس سے وہ معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی جان دے دے گا لیکن تمہارے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔"

"کیا تمہارے خیال میں ماسٹر ہوچن کو اس صورتِ حال سے آگاہ کردینا چاہیے۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری ان کی طرف دیکھا۔

"سوچ لو باس۔" پرساد نے کہا "اگر ماسٹر ہوچن کو پتا چل گیا کہ ہم دارا وغیرہ کے چکر میں یہاں آئے تھے تو وہ ناراض ہوگا۔"

"پرسی کو کس وقت اٹھایا گیا تھا؟" میں نے پاکھم سے پوچھا۔

"آج صبح پانچ بجے کے قریب۔" پاکھم نے جواب دیا "میں دس بجے اس کے جمنازیم کی طرف گیا تھا۔ وہیں سے پتا چلا تھا۔"

"ہوسکتا ہے وہ دارا کے آدمی نہ ہوں' کوئی اور ہوں' مطلب ہے اس کا کوئی ذاتی معاملہ ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں باس۔" پاکھم نے جواب دیا "وہ صبح سویرے اپنے ایک شاگرد کے ساتھ جمنازیم میں ایکسرسائز کررہا تھا کہ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ پہلے پرسی سے تمہارے اور جانکی دیوی کے بارے میں پوچھتے رہے۔ پرسی لاعلمی کا اظہار کرتا رہا پھر وہ دونوں آدمی اسلحے کے زور پر اسے گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔"

"اس کا مطلب ہے پرسی کو اغوا کیے ہوئے تیرہ گھنٹے ہوچکے ہیں۔" میں نے برآمدے والے کھلے ہوئے دروازے سے اندر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے "ظاہر ہے انہوں نے اسے مہمان بنا کر نہیں رکھا ہوگا۔ اس سے پوچھ گچھ کی گئی ہوگی۔ تشدد بھی کیا گیا ہوگا۔ اگر وہ ہمارے بارے میں بتا دیتا تو دارا کے آدمی یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ بہرحال' ہمیں آج کی رات محتاط رہنا پڑے گا اور میرے خیال میں کل ہمیں یہ ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔"

"جیسا تم مناسب سمجھو باس۔" پاکھم نے کہا "ویسے میں آج رات یہیں رہوں گا۔ تم لوگوں کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

رات کے کھانے کے بعد ہم نے پہرے داری کی ڈیوٹیاں بانٹ لیں۔ طے یہ ہوا کہ رات ایک بجے تک پاکھم ڈیوٹی دے گا۔ ایک سے تین بجے تک پرساد اور تین بجے سے صبح تک میری ڈیوٹی ہوگی۔

رات کے کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی تو جانکی نے ریسیور اٹھالیا۔ اس کا خیال تھا کہ لیزا کا فون ہوگا لیکن نجانے میرے ذہن میں یہ خیال کیوں آیا کہ یہ پرسی کی کال ہوگی۔ ہوسکتا ہے وہ ان کی قید سے بھاگ نکلا ہو اور ہمیں خبردار کرنے کے لیے فون کیا ہو لیکن جانکی نے جب ماسٹر ہوچن کا نام لیا تو میں اچھل پڑا اور لپک کر جانکی کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا۔

"یس ماسٹر۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا "آپ کو شاید یہاں کے بارے میں اطلاع مل چکی ہے۔"

"ہاں۔ میں وہاں کے حالات سے پہلے بھی باخبر تھا اور اب بھی سب کچھ میرے علم میں ہے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "مجھے پرسی کے اغوا کی اطلاع مل چکی ہے لیکن مطمئن رہو۔ وہ مرجائے گا مگر تم لوگوں کے بارے میں زبان نہیں کھولے گا۔ پرسی کے آدمی اسے تلاش کررہے ہیں۔ وہ جلد ہی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"مجھے افسوس ہے ماسٹر۔" میں نے کہا "یہ سب کچھ میری وجہ سے....."

"ایک منٹ!" ماسٹر نے مجھے ٹوک دیا "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم دارا اور اس کے ساتھیوں کی کنچن بوری میں موجودگی سے لاعلم تھے۔ ہمیں معلوم ہوچکا تھا کہ وہ لوگ کنچن بوری میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہم دارا' چی فانگ اور کم کو ان کے بل سے نکالنا چاہتے تھے اور اس کے لیے تمہیں وہاں بھیجنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ تمہیں کہیں بھیجنے کی بات ہوئی تو تم نے بھی کنچن بوری ہی کا نام لیا۔ تمہاری اس خواہش سے ہمیں پتا چل گیا کہ تم بھی واقف ہو کہ دارا وغیرہ کنچن بوری میں ہیں۔ اس لیے مہاراج نے تمہیں وہاں جانے کی اجازت دے دی لیکن اس سے پہلے تمہاری حفاظت کے انتظامات کرلیے گئے تھے لیکن تم نے وہاں جاتے ہی کارروائی شروع کردی اور ان کے ایک آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جس سے وہ لوگ ہوشیار ہوگئے۔"

"وہ ڈاکٹر فان تھا باس۔" میں نے جواب دیا "اس نے جانکی اور پرساد کو بازار میں دیکھ لیا تھا اور دارا کو ٹیلی فون پر ان کے بارے میں اطلاع دے دی تھی۔ وہ ان دونوں کی نگرانی کررہا تھا۔ اگر وہ واپس چلا جاتا تو دارا کو ہمارے ٹھکانے کا پتا چل جاتا۔ اس لیے ڈاکٹر فان کو ٹھکانے لگانا پڑا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ لوگ پرسی پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"پرسی کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "اس کے آدمی اسے ڈھونڈ نکالیں گے۔ تم لوگ اپنا خیال رکھنا۔"

"یس ماسٹر۔" میں نے جواب دیا اور دوسری طرف سے لائن منقطع ہونے پر میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

اس وقت ماسٹر سے بات کرتے ہوئے مجھے پسینہ آگیا تھا۔ میں اپنا جھوٹ پکڑے جانے پر بڑی شرمندگی محسوس کررہا تھا۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ماسٹر اور مہاراج کو [illegible] پروگرام سے لاعلم رکھا تھا۔ اصل بات ان سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ میرے استاد تھے اور اب اصلیت کھل جانے پر میں شرمندگی سے اپنے آپ میں کٹا جارہا تھا اور یہ شرمندگی ہی تھی کہ فون بند کرنے کے بعد دیر تک میں اپنے ساتھیوں سے بھی بات نہیں کرسکا تھا۔

"کیا ہوا؟" جانکی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا "ماسٹر ہوچن نے کیا ایسی بات کہہ دی۔ تم چپ کیوں ہوگئے؟"

"ماسٹر ہوچن اور مہاراج کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دارا اور اس کے ساتھی یہاں موجود ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں نے انہیں لاعلم رکھ کر بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔"

"اوہ!" تھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا "اسی لیے میں نے کہا تھا کہ انہیں اصل بات بتا دی جائے۔"

"جو ہونا تھا ہوچکا۔" میں نے کہا "ماسٹر ہوچن کو پرسی کے اغوا کا علم ہوچکا ہے۔ بقول اس کے' ہمارے لیے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پرسی ہمارے بارے میں اپنی زبان نہیں کھولے گا۔"

"اس کے باوجود ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔" پرساد نے کہا۔

پاکھم اپنی ڈیوٹی دینے کے لیے پہلے ہی باہر جاچکا تھا۔ ایک بجے

تک تو ہم لونگ روم ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر پرساد باہر چلا گیا اور پا تھم اندر آ گیا۔

"تم سو جاؤ باس۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کوئی ایسی خطرناک صورتِ حال تو ہے نہیں۔ میں تھوڑی نیند لے لیتا ہوں اور تین بجے اٹھ جاؤں گا۔ تم اپنی نیند کیوں خراب کرتے ہو۔ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔"

"پا تھم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سب کو رات کالی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" جانکی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اور پھر تھائی بھی مجھے اشارہ کرتی ہوئی اٹھ گئی۔ جانکی اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں تھائی کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔ تھائی تو بستر پر لیٹ گئی اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ ماسٹر ہوچن اور مہاراج میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی اور کنچن پوری آنے کے لیے اصل بات ان سے چھپائی تھی جبکہ وہ سب کچھ پہلے سے جانتے تھے۔

میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ صبح چھ بجے مجھے تھائی نے جگایا اور بستر پر لٹا دیا۔ دوسری مرتبہ میری آنکھ نو بجے کے قریب کھلی تھی۔ ہم دس بجے تک ناشتے سے فارغ ہوئے تو لیزا آ گئی۔

"میں ایک ضروری کام سے بان پونگ جا رہی ہوں۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا "ہو سکتا ہے کل شام تک واپسی نہ ہو سکے اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اس وقت میرے ساتھ چل کر وہ کاٹیج دیکھ لے تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں تم لوگ فوری طور پر وہاں شفٹ ہو سکو۔"

"میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ہم آج ہی وہاں شفٹ ہو جائیں۔" میں نے کہا۔

"میں بھی چلوں گی۔" جانکی نے کہا۔

تھائی بھی جانا چاہتی تھی مگر میں نے اسے روک دیا۔ اس میں ابھی کمزوری باقی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تھکن سے اسے بخار نہ ہو جائے۔

لیزا اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں اور جانکی، پرسی والی گاڑی میں اور ظاہر ہے اسٹیئرنگ جانکی نے ہی سنبھالا تھا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی ریلوے اسٹیشن کے قریب سے ہوتی ہوئی ڈیتھ ریلوے کے تاریخی پل کی طرف مڑ گئیں۔ پل ریلوے لائن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس پر سے گزرنے والی ڈیتھ ریلوے اسٹیشن کچھ آگے جا کر برما کی سرحد میں داخل ہو جاتی تھی۔

لیزا کی گاڑی برج کے قریب سے دائیں طرف مڑ گئی اور وار میوزیم کے سامنے سے ہوتی ہوئی کچھ آگے جا کر ایک اور ذیلی سڑک پر مڑ گئی۔ جانکی گاڑی چلاتی رہی اور میں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس ذیلی سڑک پر دونوں طرف درختوں کی بہتات تھی جن کے پیچھے کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ ہر کاٹیج کا راستہ الگ تھا اور ہر راستے پر پرائیویٹ کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ لیزا کی گاڑی بھی ایک ایسے راستے پر مڑ گئی جس پر بجری بچھی ہوئی تھی۔ راستے پر بھی پرائیویٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی کاٹیج کا نمبر بھی لکھا ہوا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف درخت اور ان کے پیچھے دور دور تک گنجان جھاڑیاں تھیں جن پر رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس راستے کے اختتام پر تار کے جنگلے والا گیٹ لگا ہوا تھا۔ لیزا نے گاڑی روک کر گیٹ کھولا اور پھر گاڑی کو اندر لے گئی۔

گیٹ سے تقریباً پچاس گز آگے چٹان کے دامن میں پتھریلے چبوترے پر وہ خوب صورت کاٹیج بنا ہوا تھا۔ کاٹیج تعمیر کرنے کے لیے چٹان کا کچھ حصہ کاٹ کر جگہ ہموار کی گئی تھی۔ کاٹیج کے آگے بھی وسیع چبوترا تھا۔

لیزا کار سے اتر کر کسی کو آوازیں دینے لگی۔ دو منٹ بعد ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی درختوں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے کچھ کہے بغیر جیب سے چابیاں نکال کر کاٹیج کے دروازے کھول دیے۔

تین بیڈ روم اور ایک لونگ روم تھا۔ تمام کمرے ضروری فرنیچر سے آراستہ تھے۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے اور دیواروں پر خوب صورت فریموں میں حسین عورتوں کی نیم عریاں تصویریں آویزاں تھیں۔ ان میں دو تصویریں تو لیزا کی تھیں۔ میں نے میگزین کے اشتہار میں اس کی تصویر دیکھی تھی لیکن یہ تصویریں تو اس سے بھی زیادہ عریاں اور توبہ شکن تھیں۔

لیزا ہمیں کاٹیج کے کمرے دکھاتی رہی۔ پچھلی طرف کچن بھی تھا جس میں ضروری برتن وغیرہ موجود تھے۔ کاٹیج سے تقریباً بیس گز آگے ایک چٹان کی دس بارہ فٹ کی بلندی سے ایک چھوٹا سا آبشار گر رہا تھا۔ نیچے ایک چھوٹی سی جھیل بن گئی تھی جس میں جمع ہونے والا پانی ایک چھوٹی سی ندی کی صورت میں نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔

تقریباً دو ایکڑ کا علاقہ خاردار تاروں سے گھرا ہوا تھا اور یہ سارا علاقہ کاٹیج کی حدود میں شامل تھا۔

"یہ سکھم ہے۔" لیزا نے کاٹیج کی طرف واپس آتے ہوئے ادھیڑ عمر ملازم کی طرف اشارہ کیا "تم لوگوں کو مارکیٹ سے کوئی چیز منگوانی ہو تو اس سے کہہ دینا۔ یہ جا کر لے آئے گا۔"

"ایسا کرو۔" جانکی نے کہا "اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ ہماری گاڑی لے جائے گا۔ جاتے ہوئے تم خود ہی تھائی سے کہہ دو کہ وہ لوگ اس کے ساتھ یہاں آ جائیں۔"

"ٹھیک ہے.... تو پھر میں چلتی ہوں۔" لیزا نے کہا۔

جانکی نے گاڑی کی چابی سکھم کو دے دی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے باہر کے گیٹ کا کنڈا لگا دیا اور دوبارہ کاٹیج میں آ گیا۔ ہم نے ایک بار پھر کمروں کو گھوم پھر کر دیکھا اور کاٹیج سے نکل کر آبشار

کے قریب آ گئے۔ جانکی چھوٹی سی جھیل کے کنارے پر بیٹھ گئی اور جوتے اتار کر پیر پانی میں لٹکا لیے۔ اوپر سے گرنے والی پانی کی چادر سے اڑنے والے چھینٹے ہلکی پھوار کی طرح ہمارے اوپر پڑ رہے تھے اور پانی کی یہ پھوار بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ میں نے بھی جوتے اتار دیے اور جانکی کے قریب ہی پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے جانکی کی طرف دیکھا تو مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ جانکی نے فلیپر پہن رکھا تھا اور وہ دونوں پائنچے آہستہ آہستہ اوپر اٹھا رہی تھی۔ گھٹنوں سے اوپر تک اس کی ٹانگیں برہنہ ہو چکی تھیں اور وہ پائنچوں کو مزید اوپر کھینچ رہی تھی۔

میرا سانس بے ربط ہونے لگا۔ میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا لیں لیکن اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ جانکی بھی کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"موسم خوشگوار ہونے کے باوجود یہاں کتنی گھٹن ہو رہی ہے۔ اگر اس ٹھنڈے پانی میں ایک غوطہ لگا لیا جائے تو گرمی سے نجات مل جائے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے بلاؤز کے بٹن کھولنا شروع کر دیے۔ اس کے ارادے خاصے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ پورے بدن میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں لاوا کھولنے لگا ہو۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے کاٹیج کی طرف جانے لگا۔ مجھے اپنے عقب میں جانکی کا کھنکھناتا ہوا قہقہہ سنائی دیا لیکن میں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں جانکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب مجھے اسی حوالے سے پچھلی کچھ باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں کئی مرتبہ جانکی کے ساتھ اس سے ملتی جلتی صورتِ حال سے دوچار ہو چکا تھا اور اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ وہ محض اتفاقات نہیں تھے۔ جانکی دانستہ طور پر ایسی حرکتیں کرتی رہی تھی۔ مجھے قدیم شہر کے کھنڈروں کا وہ واقعہ بھی یاد آ گیا جب جانکی میرے اوپر گری تھی اور وہ اتفاق نہیں تھا اور آج.... آج تو شک والی کوئی بات ہی نہیں رہی تھی۔ اب میں اس کے ارادوں کو سمجھ گیا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ جانکی نے کاٹیج کے ملازم سکھم کو لیزا کے ساتھ کیوں بھیج دیا تھا۔ وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔

جانکی بے حد حسین تھی، جوان تھی اور وہ مجھے اچھی بھی لگتی تھی لیکن میں اپنے آپ کو اس کی خواہشات کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ بربادی کے راستے پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس راستے پر پہلا قدم اٹھانے کے بعد واپسی مشکل ہو جائے گی۔

میں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد متعین کر لیا تھا۔ ایک راستے کا انتخاب کر لیا تھا۔ وہ راستہ اگرچہ خطرناک اور دشوار ضرور تھا مگر میں اس سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ماں باپ کی لاشوں پر کھڑے ہو کر قسم کھائی تھی کہ ان کے خون کا بدلہ لوں گا۔ اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا جس کی وجہ سے نہ صرف ان کی زندگیوں کے چراغ گل ہوئے تھے بلکہ اور بھی درجنوں بے گناہ مارے گئے تھے اور مارے جا رہے تھے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے میں دربدر پھر رہا تھا اور چاروں طرف سے خطرناک دشمنوں سے گھرا ہوا تھا اور میری معمولی سی لغزش مجھے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

میں آنکھیں بند کیے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ اپنے کندھوں پر ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ گردن گھما کر دیکھا۔ جانکی کرسی کی پشت پر کھڑی تھی اور قدرے آگے کو جھک کر دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھنا چاہا مگر جانکی نے کندھوں پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر مجھے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

"مجھے معاف کر دو وجدان۔" وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔ "پتا نہیں تمہیں دیکھ کر بعض اوقات مجھے کیا ہو جاتا ہے اور میں کوشش کے باوجود اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکتی۔ بس اب غصہ تھوک دو۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔"

"یہ تم پہلے بھی کہہ چکی ہو۔" میں نے جواب دیا "تم جانتی ہو ہم کس قسم کے حالات سے دوچار ہیں۔ ہماری جان کے دشمن گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ ہماری کوئی معمولی سی غلطی یا غفلت ہمیں تباہی کے غار میں دھکیل سکتی ہے۔ میں جس راستے پر چل رہا ہوں، چلنے دو۔ جس مقصد کے لیے میں لڑ رہا ہوں اس کے لیے تم نے بھی اپنا سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔ اس قربانی کو اس طرح ضائع کرنے کی کوشش مت کرو جانکی۔ جب تک میں وہ مقصد حاصل نہ کر لوں، اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔ ہمیں اس برائی کو جڑ سے اکھاڑنا ہے جو ہزاروں بے گناہوں کی موت کا باعث بن رہی ہے۔ اس دنیا کو ان لوگوں کے بوجھ سے نجات دلانی ہے جو چند سکوں کی خاطر دوسروں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔ ان کے خون میں زہر پھیلا رہے ہیں۔ تم بھی تو اسی مقصد کے حصول کے لیے میرا ساتھ دے رہی ہو پھر یہ سب کچھ کیوں؟ اور ویسے بھی میں تمہیں...."

"ماں یا بہن سمجھتا ہوں۔" جانکی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "میرا تم سے جو رشتہ ہے اسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ محبت اور دوستی کا رشتہ تو بڑا ہی پوتر ہوتا ہے۔ اس میں ایسی خرافات کی گنجائش کہاں؟"

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" جانکی کی آواز میں عجیب سی سرخوشی تھی۔ وہ کچھ اور آگے جھک گئی اور اپنا رخسار میرے رخسار

پر رگڑنے لگی "میرے لیے اب یہی بہت ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

اس وقت جانکی کے رخسار کا لمس مجھے بُرا نہیں لگا۔ نہ ہی میرے خون کی گردش تیز ہوئی اور نہ ہی میں نے اپنے جسم کے کسی حصے میں سنسناہٹ محسوس کی۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور وہ میری کرسی کے پیچھے سے گھوم کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی اور اس وقت وہ مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ بلاؤز پہن چکی تھی لیکن اوپر کے دو بٹن اب بھی کھلے ہوئے تھے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بٹن بند کر لیے۔

جانکی نے خود ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ہم ایک بار پھر اس کاٹیج کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بجری والے راستے پر گاڑی کو آتے دیکھ کر میں نے آگے جا کر گیٹ کھول دیا۔

○☆○

یہ کاٹیج سب کو پسند آیا تھا۔ سیکیورٹی کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ ہماری منشا کے مطابق تھا۔

تھائی نے ایک ایسے کمرے پر قبضہ کر لیا تھا جس کی ایک کھڑکی پچھلی طرف تھی اور ایک سامنے کی طرف۔ یہاں آنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی اس نے ایک لمبی چوڑی لسٹ تیار کر کے سکھم کو تھما دی تھی۔ سکھم لسٹ اور رقم لے کر سامان لینے کے لیے مارکیٹ چلا گیا۔ تھائی دوسرے کاٹیج سے کچھ سامان بھی لے آئی تھی جس میں چائے اور کافی وغیرہ کی چیزیں شامل تھیں۔ یہ چیزیں کچن میں رکھوا دی گئی تھیں۔ تھائی خود کافی بنانا چاہتی تھی لیکن جانکی نے اسے روک دیا اور خود کچن میں گھس گئی۔

کافی پینے کے بعد پاتھم چلا گیا۔ اس نے یہاں کا فون نمبر ذہن نشین کر لیا تھا تاکہ اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو ہمیں اطلاع دے سکے۔ ہم کاٹیج کے سامنے والے چبوترے پر کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ یہ جگہ اس حد تک محفوظ تھی کہ ہم دور دور تک کسی کی نظروں میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔

میں کچھ دیر بعد اٹھ کر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ میں رات کو دیر تک جاگا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی سو گیا اور جب میری آنکھ کھلی تو تھائی کو اپنے ساتھ بستر پر دیکھ کر میں اٹھ گیا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔ جانکی سکھم کے ساتھ کچن میں کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اشتہا آمیز خوشبو سے میری بھوک چمک اٹھی۔ اس وقت دو بج رہے تھے اور جانکی نے بتایا کہ کھانا تیار ہونے میں ابھی کچھ دیر لگے گی۔ میں برآمدے میں آ کر پرساد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہمارے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا سوائے باتوں کے۔ یہاں جس مقصد کے لیے آئے تھے وہ فی الحال پورا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ جانکی اور پرساد پہلے ہی روز دارا کے ایک آدمی کی نظروں میں آ گئے تھے۔ ڈاکٹر فان کو اگرچہ ہم نے ٹھکانے لگا دیا تھا لیکن وہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ اس کا قصہ بھی ہم نے ہی تمام کیا ہے۔ وہ یقیناً ہمیں تلاش کرتے رہے ہوں گے لیکن ہم تک تو نہ پہنچ سکے۔ البتہ پرسی پر انہیں شبہ ہو گیا اور وہ اسے اٹھا کر لے گئے۔ پرسی کے بارے میں ابھی تک مزید کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اگرچہ ماسٹر ہوچن نے بھی یہی کہا تھا کہ پرسی قابلِ اعتماد اور مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ وہ مر جائے گا لیکن ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔ مجھے ماسٹر پر پورا بھروسا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس کاٹیج میں مطمئن نہیں تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں منتقل ہو گیا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ہم یہاں پکنک منانے آئے ہیں۔ پاتھم کے کہنے کے مطابق پرسی کو اغوا کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا ٹھکانا بھی بدل لیا تھا اور اب ہمیں ان لوگوں کو تلاش کرنا تھا لیکن کنچن بوری جیسے شہر میں انہیں تلاش کر لینا آسان نہیں تھا۔ اگر شہر میں ہوتے تو کسی طرح ان کا سراغ لگایا جا سکتا تھا مگر شہر کے اطراف میں پہاڑیوں پر لاتعداد کاٹیج اور گیسٹ ہاؤسز بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں انہیں تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔

میں اور پرساد اس وقت اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ پرساد کا خیال تھا کہ تھائی کو ایک دو دن اور آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس کے بعد ہم ان کی تلاش شروع کر دیں گے۔

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات کو بھی ہم دیر تک جاگتے رہے۔ پاتھم نہ تو واپس آیا تھا اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی لیکن میں اس کے لیے زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ذہین آدمی تھا اور اپنی حفاظت کرنا جانتا تھا اور دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں کنچن بوری میں دارا اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا تھا۔

رات دو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ اس وقت میں اور پرساد لونگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ جانکی اور تھائی اپنے اپنے کمروں میں سو رہی تھیں۔ ٹیلی فون کی گھنٹی دوسری مرتبہ بجی۔ میں نے اور پرساد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا مگر کچھ بولنے کے بجائے دوسری طرف سے کسی آواز کا منتظر رہا۔

"ہیلو۔ میں پاتھم بول رہا ہوں۔"

"ہیلو پاتھم!" میں اس کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی بات ہوگی جو اس نے اس وقت فون کیا ہے "کیا بات ہے پاتھم۔ خیریت.... تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل خیریت ہے باس۔ ایک شکار ہاتھ لگ گیا ہے لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اسے کاٹیج تک لا سکوں۔" پاتھم نے کہا۔

"وہ! کون ہے وہ اور تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"چونگ کائی کے قریب پرانے جنگی قبرستان میں۔" پاتھم نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ کیا یہاں قبرستان میں بھی ٹیلی فون لگے ہوئے ہیں۔" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں باس۔ میں قبرستان کے قریب سڑک پر ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے بات کر رہا ہوں۔ اس شکار کو میں نے باندھ کر قبروں میں ڈال رکھا ہے۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے لیکن اگر اس شکار کو کاٹیج تک لے آیا جائے تو ہمارے بہت سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں۔"

"لوکیشن بتاؤ۔" میں نے کہا۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر پاتھم پتا سمجھانے لگا۔ میں ریسیور رکھ کر مڑا تو تھائی اور جانکی کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"کھیل شروع ہونے والا ہے۔" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پاتھم نے غالباً دارا کے کسی آدمی کو پکڑ رکھا ہے۔ ہم اسے لینے کے لیے جا رہے ہیں۔ تم لوگ محتاط رہنا۔ یہ پستول اپنے پاس رکھ لو۔" میں نے جیب سے پستول نکال کر تھائی کی طرف بڑھا دیا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد ہماری گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پرساد نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پرساد کو میں نے پاتھم کا بتایا ہوا پتا سمجھا دیا تھا۔ سڑکوں پر اِکا دُکا گاڑیوں کے سوا کوئی ٹریفک نہیں تھا۔

چونگ کائی کے قبرستان تک پہنچنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ قبرستان کے سامنے کی طرف کچھ کاٹیج وغیرہ تھے لیکن اس وقت ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ پرساد نے کار قبرستان کے مرکزی گیٹ سے ذرا آگے نکال کر روک لی۔

یہ وہ قبرستان تھا جہاں دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں دریائے کوائے پر پل کی تعمیر کے موقع پر جاپانی فوجیوں کے ہاتھوں لاتعداد اتحادی جنگی قیدی ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں سے سترہ سو کے لگ بھگ لاشوں کو اس علاقے میں گڑھے کھود کر دبا دیا گیا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد اسے باقاعدہ قبرستان کی شکل دے کر اس کے اطراف میں باؤنڈری وال تعمیر کر دی گئی تھی۔ پچیس تیس سال تک تو اس قبرستان کی مناسب دیکھ بھال ہوتی رہی پھر بے پروائی برتی جانے لگی۔ چار دیواری کئی جگہوں سے مسمار ہو گئی تھی اور کئی قبریں بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی ایک ہیولا تاریکی سے نکل کر ہماری طرف آ گیا۔ وہ پاتھم تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک آٹومیٹک رائفل بھی تھی۔

"پرساد۔ تم میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے کہا۔

پرساد کے ساتھ میں بھی کار سے اتر گیا۔ ہم تینوں قبرستان کے ٹوٹے ہوئے گیٹ میں داخل ہو گئے۔ وہاں گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ پاتھم چند گز کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ رک گیا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی قبر تھی جس کے اندر ایک آدمی پڑا ہوا تھا۔ پرساد اور پاتھم نے مل کر اسے قبر سے باہر نکالا۔

اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ منہ میں کپڑے کا گولا ٹھنسا ہوا تھا اور دونوں پیر بھی بندھے ہوئے تھے۔ پاتھم نے اس کے پیر کھول دیے اور اسے دھکا دیتے ہوئے غرایا۔

"چلو۔ تمہارے حساب کتاب کا وقت بھی آن پہنچا ہے۔ اگر کسی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو تمہاری ہی رائفل کی گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔"

وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

کار کی پچھلی سیٹ پر وہ میرے اور پاتھم کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا اور پرساد نے حسبِ معمول اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا۔ اگر قبرستان کے سامنے والے کاٹیج کے پچھلی طرف پہاڑیوں میں کار کا راستہ ہوتا تو ہم صرف پانچ منٹ میں اپنے پہلے والے کاٹیج تک پہنچ سکتے تھے لیکن پہاڑیوں میں پیدل چلنے کے لیے تو پگڈنڈیاں تھیں مگر کار وغیرہ کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم جس راستے سے آئے تھے اس راستے سے ہوتے ہوئے اپنے کاٹیج میں پہنچ گئے۔ راستے میں خاموشی ہی رہی تھی۔ پاتھم نے بھی ابھی تک زبان نہیں کھولی تھی کہ یہ شخص کون ہے اور اسے کہاں سے پکڑا ہے۔

کاٹیج کے لونگ روم میں پہنچ کر اس شخص کے منہ سے کپڑا نکال دیا گیا۔ وہ متوحش نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ یہ کون ہے اور کہاں سے تمہارے ہاتھ لگا؟" میں نے پاتھم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"باس۔" پاتھم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آج دن میں ہم نے وہ کاٹیج چھوڑ دیا تھا۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو آج رات مارے گئے ہوتے۔"

"تفصیل بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"رات دس بجے کے قریب میں پرسی کے جمنازیم چلا گیا تھا۔" پاتھم کہنے لگا "وہاں اس کے بہت سے شاگرد جمع تھے جو پرسی کے اب تک نہ ملنے پر پریشان تھے۔ یہ شخص بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے وہاں شاید کسی لڑکے سے کوئی بات کی تھی پھر باہر آ کر یہ پبلک ٹیلی فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔ بوتھ کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور میں قریب ہی موجود تھا۔ میں نے اس کا صرف ایک جملہ سنا تھا "لٹل ماسٹر کے ٹھکانے کا پتا چل گیا ہے" اس کے بعد میں نے اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ غائب ہو گیا۔

"مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے جمنازیم ہی سے کسی طرح اس کاٹیج کا پتا معلوم کرلیا تھا جس کا بندوبست پرسی نے کیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ لوگ آج ہی رات اس کاٹیج پر ہلا بول دیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ تم لوگوں کو اطلاع دے سکتا۔ میں اس کاٹیج کے پاس پہنچ گیا اور ایک جگہ چھپ کر ان لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔

"میرا اندازہ درست نکلا۔ رات گیارہ بجے کے قریب ان لوگوں نے کاٹیج پر حملہ کردیا۔ یہ لوگ تقریباً آدھے گھنٹے تک چاروں طرف سے کاٹیج پر گولیاں برساتے رہے اور پھر دروازے توڑ کر کاٹیج میں گھس گئے مگر انہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی۔

"قریب کے کسی کاٹیج سے غالباً فون پر پولیس کو فائرنگ کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فضا میں سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھی تو کار میں بیٹھ کر فرار ہوگئے مگر یہ کسی طرح رہ گیا اور پھر یہ اندرونی پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلا۔ میں نے بھی اس کا پیچھا شروع کردیا۔ چونکہ کائی کی پہاڑیوں میں پہنچ کر شاید اسے اپنے تعاقب کا احساس ہوگیا۔

"اس طرف لاتعداد کاٹیج اور پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز ہیں اور میرا خیال ہے دارا وغیرہ بھی اسی طرف کسی کاٹیج میں پناہ لیے ہوئے ہیں لیکن اپنے تعاقب کا احساس ہونے کے بعد اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اگر یہ چاہتا تو مجھے کسی بھی وقت چکمادے کر غائب ہوسکتا تھا لیکن یہ تو شاید مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ اسے غالباً یہ شبہ ہوگیا تھا کہ میں تم لوگوں کا ساتھی ہوں۔ اگر میں ان کے قبضے میں آجاؤں تو میرے ذریعے تمہارے ٹھکانے کا پتا چلایا جاسکتا ہے۔

"تقریباً ڈیڑھ گھنٹے پہلے یہ چونگ، کائی کے جنگلی قبرستان کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے مجھ پر قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن خود میرے قابو میں آگیا۔ یہ دارا کے محافظوں میں سے ایک ہے لیکن بہت ہی بے وقوف اور بزدل۔ آٹومیٹک گن ہونے کے باوجود یہ اپنی حفاظت تو کر نہیں سکا۔ دوسروں کی حفاظت کیا کرے گا۔"

"پرساد۔" میں نے کہا "اس سے پوچھو وہ لوگ کہاں ہیں اور پرسی کے ساتھ انہوں نے کیا کیا ہے؟"

پرساد تو پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ فوراً ہی حرکت میں آگیا۔ میں پاہم کی اس بات سے اتفاق نہیں کرسکا کہ دارا کا یہ محافظ بے وقوف اور بزدل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو فوراً ہی زبان کھول دیتا لیکن گدھوں کی طرح دھنائی ہونے کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کی ناک اور ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ پرساد نے اس کا سامنے والا ایک دانت بھی توڑ دیا لیکن اس کے باوجود اس نے زبان نہیں کھولی۔

"یہ ایسے نہیں بتائے گا باس۔" پرساد نے کہا "میرے پاس ایک طریقہ ہے۔ یہ چند منٹ میں زبان کھول دے گا۔"

پرساد نے اس شخص کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور دھکے دیتا ہوا باہر لے گیا۔ میں اور پاہم بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ پرساد... شخص کو پکڑ کر آبشار کے قریب لے آیا اور دھکا دے کر جھیل کے کنارے پر گرادیا اور اس کی پشت پر سوار ہو کر... ہاتھوں سے اس کے بال جکڑ لیے اور سر کو پانی میں ڈبو دیا۔ چند... سیکنڈ بعد وہ شخص مچلنے لگا۔ پرساد نے اس کا سر پانی سے باہر... لیا۔

"اب بھی زبان کھولو گے یا نہیں؟" پرساد غرایا۔

"نن..... نہیں....." اس شخص کے منہ سے بمشکل نکلا تھا۔

پرساد نے اس کا سر پھر پانی میں ڈبو دیا اور پھر وہ یہ حرکت بار... دہراتا رہا۔ وہ ہر مرتبہ اس سے ایک ہی سوال کرتا اور اس شخص کا... جواب نفی میں ہوتا۔ آخری مرتبہ پرساد نے اس کا سر پانی میں... تو اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اس کا جسم بے حس و حرکت نہیں ہوگیا۔

وہ ختم ہوچکا تھا۔ پرساد نے اسے ٹانگوں سے گھسیٹ کر ایک... طرف ڈال دیا۔

"تم تو کہتے تھے یہ بہت بے وقوف اور بزدل ہے۔" میں... پاہم کو گھورا "یہ تو ایسا سخت جان نکلا کہ زبان کھولے بغیر مرگیا۔"

"مجھے حیرت ہے باس۔" پاہم بولا "لیکن یہ اس طرح آسا... سے میرے قابو میں کیسے آگیا تھا۔"

"اب اس لاش کو کہیں دور لے جا کر پھینک دو۔" میں... اس طرح کہا جیسے وہ کوئی انسانی لاش نہیں گندگی کا ڈھیر ہو۔

اور حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو میں گندگی اور غلاظت... ڈھیر ہی سمجھتا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے بے گناہوں کی زندگیوں... سے کھیل رہے تھے، ان کے وجود کو اسی طرح مٹا دینا چاہتے تھا۔

پاہم لاش کو گاڑی میں ڈال کر لے گیا۔ میں تو تھائی کے ساتھ... اپنے کمرے میں آگیا اور پرساد اور جانکی لونگ روم میں بیٹھ کر باتیں... کرنے لگے۔ مجھے نہیں معلوم پاہم اس لاش کو پھینک کر کب... تھا اور کب واپس چلا گیا تھا۔ میں تو بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا... تھا۔

○☆○

میری آنکھ صبح دس بجے کے قریب کھلی تھی اور سب سے پہلے جو خبر سننے کو ملی وہ یہ تھی کہ پرسی کو قتل کردیا گیا تھا۔ اس کی لاش آج صبح سویرے واٹ تائی کے گیٹ کے قریب سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی۔

"باس۔" پرساد نے کہا "میرا خیال ہے اب ہمارے لیے اس طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا ممکن نہیں ہے۔ تم مجھے اجازت دو تو میں آج باہر نکل کر انہیں تلاش کرنے کی کوشش کروں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "اب واقعی ہم خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ پاہم کہاں ہے؟"

"پرسی کے جمنازیم میں۔" پرساد نے جواب دیا "وہاں بہت سے لوگ جمع ہیں۔ پرسی کی لاش دریافت ہونے کی اطلاع اس نے دی تھی۔ پورے شہر میں پرسی کے شاگرد سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور سنا ہے کہ وہ پرسی کے جنازے کے ساتھ جلوس نکالنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ میں بھی اس جلوس میں شریک ہونا چاہتا ہوں اور مجھے شبہ ہے کہ دارا کا کوئی نہ کوئی آدمی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ضرور آئے گا۔"

"اور تمہارے خیال میں مجھے گھر بیٹھے رہنا چاہیے۔" میں نے اسے گھورا۔

"ہاں۔ کم از کم آج کا دن۔" پرساد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر کوئی خاص بات ہوئی تو میں تمہیں فون کردوں گا اور پھر تم بھی میدان میں اتر سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔ تم گاڑی لے جاؤ۔"

"نہیں۔ میں یہاں سے پیدل ہی نکلوں گا۔ سڑک پر پہنچ کر مجھے کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔" پرساد نے جواب دیا۔

دس منٹ بعد پرساد چلا گیا۔ اب میرے ساتھ جانکی اور تھائی رہ گئی تھیں۔ لیزا کے ملازم سکمر کو ہم نے پہلے ہی روز شام کو چھٹی دے دی تھی۔ میں کاٹیج سے نکل کر ایک درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھ گیا اور صورتِ حال کے بارے میں سوچنے لگا۔ ہمارے یہاں آنے کے بعد تین قتل ہوچکے تھے۔ ایک ہمارے گروپ کا آدمی مارا گیا تھا اور دو ان کے لیکن ہم اب بھی وہیں کھڑے تھے جہاں سے چلے تھے۔ کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ نہ ہم دارا وغیرہ کے ٹھکانے کا پتا چلا سکے تھے اور نہ ہی وہ ہمارا سراغ لگا پائے تھے اور یہ دونوں طرف کی خاموشی مجھے بری طرح کھل رہی تھی۔ میں آرام سے بیٹھنے والا آدمی تو نہیں تھا لیکن دس دن سے زیادہ ہوچکے تھے اور میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ لیکن اب مجھے امید تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ پرساد باہر نکل گیا تھا۔ یا تو وہ ان کی نظروں میں آئے گا یا دارا کا کوئی آدمی سامنے آجائے گا اور اس طرح کھیل شروع ہونے کی توقع تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال اُبھر آیا۔ کیا ماسٹر ہوچن کو پرسی کے قتل کی خبر مل چکی ہوگی؟ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی بڑی بات ہوجائے اور ماسٹر ہوچن کو اس کی اطلاع نہ ہو۔ اسے تو یہ بھی اطلاع مل چکی ہوگی کہ گزشتہ رات ہمارے دوسرے کاٹیج پر حملہ کیا گیا تھا۔ اس نے یقیناً اس کاٹیج کے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی ہوگی اور وہ پریشان بھی ہوا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی میں اٹھ کر کاٹیج میں آگیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر بنکاک میں ماسٹر ہوچن کا نمبر ملانے لگا۔ کال، ماسٹر کے ایک شاگرد نے ریسیو کی تھی۔ ماسٹر جمنازیم میں موجود نہیں تھا لیکن اسے پرسی کے بارے میں اطلاع مل چکی تھی اور وہ آج شام سے پہلے کنچن بوری پہنچنے والا ہے۔

"صبح سویرے تمہارے کاٹیج پر حملے کی اطلاع بھی ملی تھی مسٹر ماسٹر۔" دوسری طرف سے کہا گیا "ماسٹر تمہارے لیے زیادہ پریشان ہے۔"

"ماسٹر کو بتا دینا ہم محفوظ ہیں۔ ہم حملہ ہونے سے چند گھنٹے پہلے اس کاٹیج سے نکل چکے تھے۔" میں نے جواب دیا اور اپنا فون نمبر لکھوا کر فون بند کردیا۔

میں فون بند کرکے جانکی اور تھائی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن وہ دونوں کاٹیج میں نہیں تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کہاں چلی گئیں حالانکہ جب میں اندر آیا تھا تو تھائی کو اپنے کمرے میں جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب دونوں غائب تھیں۔ میں کاٹیج سے باہر آگیا اور پھر نقرئی قہقہوں کی آوازیں سن کر چونک گیا۔ یہ آوازیں آبشار کی طرف سے آرہی تھیں۔ میں چبوترے سے اتر کر ٹہلتا ہوا اس طرف پہنچ گیا۔

اور پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ دونوں آبشار والی چھوٹی سی جھیل میں ایک دوسرے کو پانی میں غوطے دینے کی کوشش کرتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا۔

"آؤ۔ تم بھی آجاؤ۔" جانکی نے میری طرف پانی کے چھینٹے اڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے غوطے کھانے کا شوق نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

جانکی کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

میں کاٹیج میں آگیا۔ کچن میں گھس کر کافی بنائی اور کاٹیج کے سامنے والے چبوترے پر کرسی پر بیٹھ کر آبشار کی طرف دیکھتے ہوئے کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

جانکی اور تھائی ایک گھنٹے بعد واپس آئی تھیں۔

دو بجے دوپہر پرساد کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ سیکڑوں لوگ پرسی کے جمنازیم کے سامنے جمع ہوچکے ہیں۔ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پولیس کی بھاری نفری بھی موجود ہے۔ شام سات بجے کے قریب ماسٹر ہوچن یہاں پہنچنے والا ہے۔ تدفین اس کے آنے کے بعد ہی ہوگی۔

"پاہم بھی یہاں موجود ہے لیکن ابھی تک ہمیں کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا۔" پرساد نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم دونوں وہیں رہو اور حالات پر نگاہ رکھو۔ ماسٹر ہوچن پہنچ جائے تو مجھے فون کردینا۔" میں نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بنکاک سے ماسٹر ہوچن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ساڑھے چھ اور سات کے درمیان کنچن بوری پہنچ جائے گا اور یہاں آنے کے بعد دوبارہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔

پانچ بجے کے قریب لیزا آگئی۔ وہ تقریباً آدھا گھنٹا وہاں رہی اور جب وہ واپس جانے لگی تو جانکی بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"اس کے لیے تم لوگ پریشان مت ہونا۔" لیزا نے مسکراتے ہوئے کہا "صبح میں اسے صحیح سلامت یہاں پہنچا دوں گی۔"

تھائی اور میں کاٹیج میں اکیلے رہ گئے تھے۔ ہم کاٹیج کے سامنے چبوترے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے اور جب اندھیرا پھیلنے لگا تو اندر آگئے۔ میں نے دروازہ بند کردیا اور ہم دونوں تھائی والے کمرے میں آگئے۔ تھائی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگئی اور میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

باہر اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا۔ خاموشی میں چاروں طرف سے آتی ہوئی جھینگروں اور دیگر حشرات الارض کی آوازیں بڑا پُراسرار تاثر دے رہی تھیں۔ ہم دونوں باتیں کرتے کرتے خاموش ہوجاتے تو یہ آوازیں کچھ اور واضح ہوجاتیں۔

اچانک ایک آواز سن کر میں چونک سا گیا۔ وہ خشک پتوں کے چرچرانے کی آواز تھی۔ غالباً تھائی نے بھی یہ آواز سنی تھی۔ وہ بھی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"شاید باہر کوئی ہے۔" وہ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے بھی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر اندھیرا تھا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ جانکی کی واپسی کی توقع نہیں تھی۔ وہ ایک گھنٹا پہلے ہی تو گئی تھی۔ پاتھم یا پرساد میں سے بھی کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ شاید کوئی کتا وغیرہ ہو۔ آج صبح بھی دو کتے اس طرف آگئے تھے۔

"شاید کوئی کتا وغیرہ ہو۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا اور اسی وقت برآمدے کے سامنے والے چبوترے پر قدموں کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں نے لونگ روم میں رکھی ہوئی وہ رائفل اٹھالی جو پاتھم یہیں چھوڑ گیا تھا۔ پہلے میں نے دروازے کے اوپر والے شیشے سے جھانک کر دیکھا اور پھر بولٹ گرا کر دروازہ کھول دیا اور باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی نظر نہیں آیا اور نہ ہی اب کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں اندر آگیا اور برآمدے والا دروازہ بولٹ کرکے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ کچن کا ایک دروازہ پچھلی طرف بھی کھلتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ دروازہ کھلا ہوا اور کوئی کتا وغیرہ اندر گھس آیا تو گڑبڑ ہوجائے گی۔

کچن میں اندھیرا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کے اندر کی طرف دیوار پر لگا ہوا سوئچ آن کردیا اور پھر بٹن دباتے ہی یوں لگا جیسے میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو۔ سر پر لگنے والی وہ ضرب بہت زوردار تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا کہ جبڑے پر ایک اور زوردار ضرب لگی۔ میرے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس مرتبہ رائفل بھی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا ایک کرسی سے ٹکرایا اور سنبھلنے نہ پانے سے پہلے ہی منہ پر ایک اور ضرب لگی۔ یوں لگا تھا جیسے ہتھوڑے سے وار کیا گیا ہو۔ میں جس کرسی سے ٹکرایا تھا وہ الٹ گئی تھی اور میں لڑکھڑاتا ہوا مزید پیچھے ہٹ گیا تھا۔ کرسی کی آواز شاید تھائی نے سن لی تھی۔

"کون ہے وجدان.... کیا ہوا؟"

تھائی کی آواز بھی مجھے کنوئیں کی گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن یہ آواز میرے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ میں ہوش میں آگیا۔ سر اور چہرے پر لگنے والی ضربوں سے میرا دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور پھر مجھے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ دو آدمی تھے۔ ایک کے ہاتھ میں خم دار پھل والا خنجر تھا، دوسرا خالی ہاتھ تھا اور میرے سر اور چہرے پر ضربیں اسی نے لگائی تھیں اور اس وقت بھی وہ مجھ پر حملہ کرنے کی تیاری کررہا تھا لیکن اس مرتبہ وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔

میں نے اس کا وار بائیں ہاتھ کی کلائی پر روکا اور دایاں گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔ اسے شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے ہٹا اور میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے پیٹ پر سائڈ کک جمادی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس کا دوسرا ساتھی خنجر لہراتا ہوا میری طرف لپکا لیکن اسے قریب آنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے ذرا سا اچھلا اور میری فرنٹ کک اس کے پیٹ پر لگی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا وہ خود بھی بلبلاتا ہوا دوہرا ہوگیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گھٹنے سے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

ان کی چیخوں کی آواز سن کر تھائی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر اس کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی۔ تھائی کو آگے بڑھتے دیکھ کر میں بھی چیخ اٹھا۔

"وہیں رک جاؤ تھائی۔ آگے مت آنا۔"

اس دوران میں پہلا حملہ آور سنبھل چکا تھا۔ وہ حملہ آور ہوا تو میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹتے ہوئے راؤنڈ ہاؤس کک کے انداز میں ٹانگ چلادی۔ یہ کک اس کے پیٹ پر لگی اور وہ دوہرا ہوکر آگے کی طرف جھکا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے بڑی تیزی سے گھوم کر اس کے شولڈر بلیڈ پر چوپ رسید کردی۔ کھڑی ہتھیلی کا یہ وار عام طور پر بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ ہڈی توڑ دیتا ہے لیکن یہ اس شخص کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت نیچے کی طرف جھک رہا تھا اس لیے ضرب پوری طرح نہیں لگی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے منہ سے اس طرح بھیانک چیخ نکلی تھی جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہو۔ وہ ایک صوفے سے ٹکرایا اور صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔

دوسرا حملہ آور مجھ پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میرے گھٹنے کے پچھلے حصے پر لگی اور میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ وہ شخص میرے اوپر آرہا تھا مگر میں نے بڑی پھرتی سے دونوں ٹانگیں اوپر اٹھادیں اور دونوں پیروں سے اس کی گردن پر قینچی لگا دی۔ وہ نیک لاک چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے آہستہ آہستہ دائیں طرف جھکتے ہوئے ٹانگوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ "بھد" سے نیچے گرا۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

ان کی لڑائی کے انداز سے میں سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ مارشل آرٹسٹ نہیں ہیں اور محض اسٹریٹ فائٹر ہیں۔ اسٹریٹ فائٹنگ میں کسی قاعدے کلیے اور داؤ پیچ کا خیال نہیں رکھا جاتا بلکہ ہر وہ حربہ استعمال کیا جاتا ہے جس سے حریف کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے لیکن جب مقابلہ مجھ جیسے کسی مارشل آرٹسٹ سے ہو تو اسٹریٹ فائٹر نقصان ہی میں رہتے ہیں۔

میرا دوسرا حریف اٹھ چکا تھا۔ اس نے پیچھے سے میرے اوپر چھلانگ لگادی اور میری گردن کو بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ پہلے میں نے اس کا بازو پکڑ کر گردن چھڑانے کی کوشش کی پھر تیزی سے نیچے جھک گیا۔ میرا حریف اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں نے سنبھل کر ان دونوں کو ٹھوکروں پر رکھ لیا لیکن پھر اسی لمحے تھائی کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ تھائی دارا کی گرفت میں تھی۔ دارا نے پشت کی طرف سے ایک ہاتھ سے تھائی کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا جس کا چمکتا ہوا بلیڈ تھائی کی شہ رگ کو چھو رہا تھا۔

دارا کے ساتھ کم بھی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"تمہاری بہادری اور خوش قسمتی میں واقعی کوئی شبہ نہیں لیکن خوش قسمتی ہر دفعہ ساتھ نہیں دیتی۔" دارا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ان دونوں کو چھوڑ دو ورنہ تمہاری اس چہیتی کا گلا کاٹ دوں گا۔"

میں ان دونوں آدمیوں کو چھوڑ کر الگ ہوگیا اور الجھی ہوئی نظروں سے دارا اور کم کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ دونوں کاٹیج کے اندر کس طرح داخل ہوئے تھے جبکہ برآمدے والا دروازہ بند تھا پھر بات میری سمجھ میں آگئی۔ ہمارے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہ دونوں اسی راستے سے اندر آئے تھے۔ اب ان کی چال بھی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ دارا نے ان دونوں آدمیوں کو کاٹیج کے عقبی دروازے سے بھیجا تھا اور جب میں ان دونوں سے الجھ گیا تھا تو وہ بڑے اطمینان سے کھڑکی کے راستے اندر آگیا اور تھائی کو گرفت میں لے لیا۔

"تم بہت بچتے رہے ہو۔" دارا میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "قسمت قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیتی رہی ہے۔ مہاراج کے سائے نے تمہیں اب تک ہم سے بچائے رکھا۔ لیکن یہاں نہ تو مہاراج کا سایہ ہے اور نہ ہی قسمت تمہارا ساتھ دے گی۔ اب موقع مل گیا ہے کہ ہم تم سے اپنا حساب برابر کرسکیں۔ تم میرے ہاتھ سے زندہ تو نہیں بچو گے لیکن تمہیں اس وقت تک مرنے بھی نہیں دیا جائے گا جب تک میں تم سے اپنا حساب برابر نہ کرلوں اور تم سے تمہارے باپ کی وہ ڈائری حاصل نہ کرلوں جس میں برسوں پہلے چھپائے گئے سونے کا راز پوشیدہ ہے۔ تم یقیناً اس ڈائری کے وجود سے انکار کرو گے لیکن میں تم سے وہ ڈائری نکلوا لوں گا۔"

میں دارا کی بات سنتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں کسی موقع کی تلاش میں تھا مگر صورتِ حال خاصی سنگین تھی۔ کم کے ہاتھ میں پستول تھا اور دارا کا خنجر تھائی کی شہ رگ کو چھو رہا تھا۔ اس کی ذرا سی حرکت تھائی کا گلا کاٹ سکتی تھی۔

اچانک ہی پیچھے کھڑے ہوئے ان دونوں آدمیوں نے مجھ پر حملہ کردیا جو مجھ سے پٹ چکے تھے۔ اس مرتبہ میں اپنا دفاع نہیں کرسکا۔ میں لڑکھڑا کر گرا تو ان دونوں نے مجھ پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ان کی ٹھوکروں سے محفوظ نہیں تھا۔ ایک مرتبہ موقع پاکر میں نے ان میں سے ایک کو تو الٹ دیا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل کر دوبارہ حملہ آور ہوا تھا۔

میری ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

"رک جاؤ۔" دارا کی گونج دار آواز سنائی دی۔

وہ دونوں مشینی انداز میں رک گئے۔

ماهنامه پاکیزہ کا مقبول ترین سلسلہ

نامید سلطانہ اختر کے طلسماتی قلم کا ایک شاہکار معاشرتی ناول

بہتے پانی پہ مکاں

بابل کی گلیوں سے پیا کے آنگن سدھارنے والی ایک خوش نصیب کی داستان

مقبول ٹی وی سیریل

آنچ

کی کہانی اس کتاب پر مبنی ہے

قیمت 100 روپے ڈاک خرچ 23 روپے

وہ خود اپنی نہیں رہی مگر دوسروں کو اپنا لیا

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

"کسی کو سزا دینے کا صرف یہی طریقہ نہیں ہے کہ اسے مارا پیٹا جائے۔" دارا ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "سزا دینے کے اور بھی تو بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی نظروں کے سامنے اس کی محبوبہ کو بے آبرو کیا جائے۔ اس طرح اس کی آدھی موت تو واقعی ہو ہی جائے گی۔"

میں کانپ اٹھا۔ دارا کی سوچ بہت خوفناک تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ اس پر عمل کرنے سے بھی نہیں ہچکچائے گا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی تو ان دونوں غنڈوں نے پیچھے سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔

دارا نے تھائی کو دھکا دے کر سامنے والے صوفے پر گرا دیا۔ تھائی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کم!" دارا نے کہا "میں اپنے آپ کو گندہ نہیں کرنا چاہتا۔ تم اسے گندہ کر دو۔"

"میں نہیں۔ تم جاؤ۔" کم نے ان دونوں افراد میں سے ایک کو اشارہ کیا جنہوں نے مجھے گرفت میں لے رکھا تھا۔

"کسی نے تائی کو ہاتھ لگایا تو میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں دارا کی طرف دیکھ کر چیخا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

انہوں نے زبردستی مجھے ایک کرسی سے باندھ دیا۔ کم پستول میری کنپٹی سے لگائے کھڑا تھا۔ دوسرے آدمی نے میرے کندھوں پر دباؤ ڈال رکھا تھا تاکہ میں کوئی بھی حرکت نہ کر سکوں۔ دارا خنجر کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے مسکرا رہا تھا اور وہ غنڈا تھائی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تھائی نے صوفے سے چھلانگ لگا دی لیکن اس غنڈے نے اسے دبوچ لیا۔ تھائی اپنے آپ کو چھڑا کر ایک طرف دوڑی تو دارا نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ تھائی چیخ کر لڑکھڑا گئی۔ اس غنڈے نے پھر اسے دبوچ لیا۔ تھائی چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ غنڈا اس سے کہیں طاقتور تھا۔

تھائی کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ وہ نیم برہنہ ہو رہی تھی۔ ایک بار پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ صوفے پر گری۔ غنڈے نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی۔ صوفہ الٹ گیا اور وہ دونوں اس کے پچھلی طرف جا گرے۔

صوفے کے پیچھے تھائی کی چیخیں گونجتی رہیں اور میری رگوں میں خون اچھلتا رہا اور پھر دارا کے وحشیانہ قہقہے بھی تھائی کی چیخوں کے ساتھ کاٹیج میں گونجنے لگے۔ میرے دماغ کی نسیں پھٹی جا رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں تھائی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔

تھائی کی چیخیں تھیں یا پگھلا ہوا سیسا جو میرے کانوں کے پردوں کو چیرتا ہوا دماغ کی نسوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پھیلتا جا رہا تھا اور پھر اچانک ہی خاموشی چھا گئی۔ گمبھیر سناٹا۔ تھائی نے چیخنا بند کر دیا تھا یا میرے کان بند ہو گئے تھے لیکن نہیں۔ میرے کان بند نہیں ہوئے تھے۔ تھائی ہی خاموش ہو گئی تھی۔ البتہ جھینگروں کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔

تھائی نے میرے لیے اپنی آخری متاع بھی لٹا دی تھی۔ اپنی عزت کو ان شیطانوں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے عرصہ پہلے ایک ایسے بے سہارا بچے کو یعنی مجھے پناہ دی تھی جو اپنی جان بچانے کے لیے ان خونی بھیڑیوں سے چھپتا پھر رہا تھا۔ تھائی کی یہ نیکی ہی اس کا سب سے بڑا جرم بن گئی تھی۔ اس کا گھر جلا کر راکھ کر دیا گیا تھا۔ اسے بار بار موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مجھے ان شیطانوں سے بچانے کے لیے اس نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر وہ دربدر ہونے پر مجبور ہو گئی تھی۔ عزت اب تک بچی ہوئی تھی۔ سو وہ بھی چھن گئی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دارا میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی سفاک مسکراہٹ تھی۔ میری نظریں الٹے ہوئے صوفے کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے پیچھے کوئی حرکت نہیں تھی البتہ تھائی کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"جب کوئی بہت تیز دوڑنے کی کوشش کرتا ہے تو منہ کے بل گرتا ہے۔" دارا کی آواز سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کو مخصوص انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہہ رہا تھا "تم بھی بہت تیز دوڑنے لگے تھے۔ ٹھوکر تو لگنی ہی تھی۔ تم بڑی مشکل سے میرے ہاتھ لگے ہو۔ ابھی میرا انتقام شروع ہوا ہے۔ یہ پہلا جھٹکا تھا۔ میں تمہارے چہرے سے اندازہ لگا رہا ہوں کہ تم نے تھائی کی رسوائی کا کتنا اثر لیا ہے۔ ابھی تو ایسے بہت سے مرحلے آئیں گے۔ تمہیں ایسے بہت سے جھٹکے لگیں گے مگر تم ان جھٹکوں سے مرو گے نہیں۔ تمہیں تو میں اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ آہستہ آہستہ.... دھیرے دھیرے.... میں تمہیں زندہ رکھ کر تمہاری بوٹیاں تمہارے سامنے کتوں کو کھلاؤں گا۔"

"مجھے باندھ کر بہادری دکھا رہے ہو۔" میں دارا کی طرف دیکھ کر غرایا "تم تو ہیجڑوں سے بھی گئے گزرے ہو۔ میں تمہیں ایک بہادر دشمن سمجھتا تھا مگر تم تو بہت بزدل نکلے۔ میرے ہاتھ کھول دو تو میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں کتنی مردانگی ہے۔"

"تمہیں ایسا موقع ضرور دیا جائے گا لیکن اس وقت میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" دارا نے بے غیرتی سے مسکراتے ہوئے کہا "اور ہاں' یہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں کہ ہم نے تمہاری اس پناہ گاہ کا پتا کیسے لگایا؟"

میں نے دارا سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اب مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔ مجھے خاموش پا کر وہ خود ہی کہنے لگا۔

"تمہارا ٹھکانا معلوم کرنے کے لیے ہم نے پرسی کو اغوا کیا تھا لیکن وہ بڑا ہی سخت جان نکلا۔ میرے آدمیوں نے اس کے آدھے جسم کی کھال اتار لی۔ ہڈیاں تک توڑ ڈالیں لیکن اس نے زبان نہیں کھولی اور پھر یہ تو محض اتفاق تھا کہ اس کے جمنازیم میں میرے آدمی کی موجودگی میں پرسی کے ایک خاص شاگرد کی زبان سے نکل گیا کہ تم کہاں چھپے ہوئے ہو لیکن کل رات جب ہم نے اس کاٹیج پر ریڈ کیا تو وہاں کچھ نہیں تھا۔ تم میری توقع سے زیادہ چالاک نکلے اور ہمارے حملے سے پہلے ہی وہ کاٹیج چھوڑ گئے۔ مجھے زیادہ افسوس اس بات کا ہوا کہ کل رات ہی ہمارا ایک آدمی بھی تمہارے ہاتھ لگ گیا اور آج صبح اس کی لاش بھی مل گئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "دراصل مجھے اپنے اس آدمی کا بھی کوئی افسوس نہیں تھا۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ تم میرے ہاتھ آتے آتے رہ گئے لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ آج صبح میں پولیس کی وردی پہن کر اس طرف نکل گیا اور گزشتہ رات کی فائرنگ اور کاٹیج کی آتش زدگی کے بارے میں تفتیش کے بہانے دوسرے کاٹیجز میں رہنے والوں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ایک کاٹیج میں رہائش پذیر ایک بوڑھے یورپی آدمی سے پتا چلا کہ لیزا نامی ایک مساج بھی یہاں آتی رہی ہے۔ وہ دو تین مرتبہ اس کے پارلر میں مساج کروا چکا ہے۔ یہ بوڑھے مرد بھی عجیب ہوتے ہیں۔ قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہوں تب بھی حسین عورتوں کو دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ لیزا تم لوگوں کے کاٹیج میں آئی تو بوڑھے یورپین نے اسے پہچان لیا تھا۔

"میں نے لیزا کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ وہ بان پونگ گئی ہوئی ہے۔ میں نے ایک آدمی اس کے پارلر کی نگرانی پر مقرر کر دیا۔ لیزا دوپہر کے بعد بان پونگ سے واپس آگئی اور جب وہ دوبارہ اپنے پارلر سے نکلی تو میرے آدمی نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ اس قدر ہوشیاری سے پیچھا کر رہا تھا کہ لیزا کو شبہ تک نہیں ہو سکا۔

"لیزا اسی کاٹیج میں آئی تھی۔ میرا آدمی اپنی گاڑی آگے لے گیا اور ایک جگہ رک کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا اور جب لیزا واپس گئی تو اس کے ساتھ جانگی بھی تھی۔ اپنے آدمی کی رپورٹ سے میں سمجھ گیا کہ تم لوگ یہاں ہو اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا' تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ ادھر شہر میں پرسی کا جنازہ اٹھ رہا ہو گا۔ ادھر تمہاری چہیتی تھائی کی عزت کا جنازہ اٹھ گیا۔ اب جانگی کی باری آئے گی۔ اس کا حشر بھی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہی ہو گا۔ بہت عیش کر لیے تم نے ان دونوں حسیناؤں کے ساتھ۔ اب دوسروں کو بھی تو کچھ موقع ملنا چاہیے۔" دارا خاموش ہو کر بے غیرتی سے مسکرانے لگا۔

"کاش! میرے ہاتھ کھلے ہوتے۔" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا "اس خنجر سے میں تمہاری گندی زبان کاٹ کر پھینک دیتا۔"

"تمہیں بہادری دکھانے کا موقع ضرور دوں گا مگر وقت آنے پر۔" دارا نے جواب دیا "اس وقت دیکھا جائے گا کہ کون کس کی زبان کاٹتا ہے۔"

"باس! تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔" کم نے دارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کے ساتھیوں میں سے کوئی واپس آگیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ماسٹر ہوچن بھی کنچن بوری پہنچ چکا ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ اپنے کچھ آدمی اس کی حفاظت کے لیے یہاں بھیج دے۔"

"ہوچن' پرسی کو گڑھے میں اتارنے کے بعد ہی کسی اور طرف توجہ دے گا۔ ویسے میں تمہاری اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ وہ اپنے کچھ آدمی یہاں بھیج سکتا ہے لہٰذا مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔" دارا نے کہا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اسے کرسی سے کھول دو مگر ہاتھ پشت پر بندھے رہنے دو۔"

دارا کے دونوں گرگے محتاط انداز میں وہ رسی کھولنے لگے جس سے مجھے کرسی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ میرے ہاتھ الگ سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ کرسی والی رسی کھول دینے کے بعد ان دونوں بدمعاشوں نے دونوں طرف سے میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے کرسی سے اٹھا دیا۔ دارا میرے سامنے کھڑا تھا۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی دارا کے خنجر والے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ میرا یہ وار دارا کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں ایسی کوئی حرکت کروں گا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ سمجھ سکتا' میں نے اچھل کر دارا کو فرنٹ کک رسید کر دی۔ دوسری کک قریب کھڑے ہوئے کم کے پہلو میں لگی تھی۔ وہ دونوں کراہتے ہوئے گرے تھے۔ میں ایک لمحہ توقف کیے بغیر ان دونوں غنڈوں کی طرف گھوم گیا۔ پہلی اسپن کک ایک کے جبڑے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ دوسری کک دوسرے غنڈے کے پیٹ پر لگی۔ وہ چیختا ہوا دہرا ہو گیا۔

یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا تھا کہ چند لمحوں کے لیے تو ان میں سے کوئی بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اگر میرے ہاتھ بھی کھلے ہوتے تو ان میں سے ایک آدھ میرے ہاتھوں ضرور مارا جاتا۔

تھائی کے ساتھ میرے سامنے جو کچھ ہوا تھا اس سے میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس وقت تو میں اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا لیکن اب مجھے موقع مل گیا تھا کہ انہیں تھوڑی بہت سزا دے سکوں۔ میں غصے میں پاگل ہوا جا رہا تھا۔ انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان پر لاتیں برساتا رہا لیکن کم پر آخری کک لگانے کی کوشش کرتے ہوئے میرا پیر کرسی کے قریب پڑی ہوئی رسی میں الجھ

گیا۔ میں لڑکھڑایا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ممکن ہے، میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتا لیکن دارا کسی ارنے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی مگر اس کے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر لگی۔ میں پشت کے بل کافی ٹیبل پر گرا اور الٹی قلابازی کھاتا ہوا پیچھے الٹ گیا اور پھر مجھے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا۔ دارا کے پیر کی ٹھوکر میرے سر پر لگی اور میرا دماغ جھنجھنا اٹھا اور پھر وہ چاروں خونی بھیڑیوں کی طرح مجھ پر پل پڑے۔ ان کی لاتیں اور گھونسے میرے جسم کے ہر حصے کی خبر لے رہے تھے۔ میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میرے ہونٹوں اور ناک سے خون کی دھاریں بہہ نکلیں۔

"مارو اس حرام زادے کو۔" دارا کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اتنا مارو کہ یہ آئندہ کسی پر ہاتھ اٹھانا بھول جائے۔"

مجھے دارا کی طرف دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ شکاری کتے کی طرح ہانپ رہا تھا اور پھر دارا کی پشت پر تھائی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ تھائی کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ وہ صوفے کے پیچھے سے نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لٹھ نما ڈنڈا تھا اور وہ دارا پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہی تھی۔

وہ شاید دارا کی چھٹی حس تھی جس نے اسے خطرے سے آگاہ کردیا۔ وہ بڑی تیزی سے گھوم گیا۔ تھائی دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے لٹھ کو دارا کے سر پر وار کرنے کے لیے حرکت میں لاچکی تھی۔ دارا نے بائیں ہاتھ سے لٹھ کو گرفت میں لے لیا اور دائیں ہاتھ کا گھونسا تھائی کی کنپٹی پر رسید کردیا۔ تھائی کے منہ سے خوف ناک چیخ نکلی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتی ہوئی ڈھیر ہوگئی۔

"بس کرو۔" دارا اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا "اسے باہر گاڑی تک لے چلو اور اگر بھاگنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولیاں برسا دینا اس پر۔"

ان دونوں غنڈوں نے مجھے پکڑ کر اٹھایا اور مجھے دھکے دیتے ہوئے کاٹیج کے برآمدے والے دروازے کی طرف لے چلے۔ ان میں سے ایک نے وہ رائفل بھی اٹھالی تھی جو دراصل انہی کے ایک ساتھی کی تھی جسے پاکھم گزشتہ رات پکڑ کر لایا تھا اور پرساد نے اسے پانی میں غوطے دے دے کر ہلاک کردیا تھا۔

"اور اس کا کیا کرنا ہے باس؟" کم نے قالین پر بے ہوش پڑی ہوئی تھائی کی طرف اشارہ کیا۔ کم خود بھی ہانپ رہا تھا۔

"اسے یہیں پڑے رہنے دو۔" دارا نے جواب دیا "ہوچن جلد یا بدیر یہاں پہنچ جائے گا۔ تھائی کو دیکھ کر اسے ہمارا پیغام مل جائے گا۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوجائے گی باس؟" کم نے کہا۔

"یہ جو کچھ بھی ہوا ہے اسے تم پکنک سمجھ رہے ہو کیا؟" دارا نے اسے گھورا "اب نکلو یہاں سے۔ وقت ضائع مت کرو۔"

کاٹیج سے باہر آکر وہ مجھے دھکے دیتے ہوئے بیرونی گیٹ کی طرف لے چلے۔ درختوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ تھی۔ ایک آدمی نے رائفل کی نال میری پشت سے لگا رکھی تھی تاکہ اگر میں بھاگنے کی کوشش کروں تو مجھے گولیوں سے بھون دیا جائے۔ ویسے بھاگنے کا خیال اب تک میرے دل میں نہیں آیا تھا۔ اگر میں بھاگنے کی کوشش کرتا تو ممکن ہے، تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتا لیکن اس کا نتیجہ تھائی کے حق میں خطرناک ہوسکتا تھا۔ یہ لوگ تھائی کو زندہ چھوڑ آئے تھے۔ میرے فرار کے بعد یہ لوگ واپس جاکر تھائی کو اذیتیں دے دے کر ختم کردیتے۔ میں تھائی کو ان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ تھائی کے زندہ رہنے کی صورت میں ایک امید بھی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ دارا نے تھائی کو ساتھ نہ لاکر یا اسے زندہ چھوڑ کر زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی تھی۔ کوئی عورت اس طرح رسوا ہونے کے بعد اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اس سے پہلے جو کچھ بھی ہوتا رہا تھا، اسے تھائی میری وجہ سے جیسے تیسے برداشت کرتی رہی تھی لیکن اس واقعے کے بعد تو وہ بپھری ہوئی شیرنی بن جائے گی۔

ماسٹر ہوچن کنچن بوری پہنچ چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ پری کی آخری رسومات سے فارغ ہوتے ہی وہ گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے تک یا شاید اس سے پہلے ہی ہمارے کاٹیج پہنچ جائے گا یا ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس وقت تک تھائی ہوش میں آچکی ہوگی۔ وہ ماسٹر ہوچن کو سب کچھ بتا دے گی۔ تھائی نے بھی دارا کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے جانکی اور لیزا کے بارے میں بھی ایسے ہی گندے خیالات کا اظہار کیا تھا اور میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ تھائی ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے جانکی اور لیزا ہی کو خبردار کرے گی۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا ان کے آگے آگے چلتا رہا۔ راستے میں بچھی ہوئی بجری پیروں کے نیچے دب کر چرچراہٹ کی سی آواز پیدا کررہی تھی۔ میں اب تک اگرچہ بڑی شرافت سے ان کے آگے آگے چلتا رہا تھا مگر دارا کے وہ دونوں گرگے مجھے بار بار دھکے دے رہے تھے۔ کبھی کوئی میرے کولھوں پر ٹھوکریں رسید کردیتا۔ اس طرح میں کئی مرتبہ گرتے گرتے بچا تھا۔ پکڑے جانے سے پہلے میں نے ان دونوں کی ٹھیک ٹھاک دھنائی کی تھی اور اب وہ اس کا بدلہ لے رہے تھے۔

کاٹیج کی حدود سے نکل کر ہم اس راستے پر آگئے جو ایک طرف تو سڑک تک چلا گیا تھا اور دوسری طرف آگے پہاڑیوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے سڑک کی طرف لے جائیں گے مگر دارا نے مجھے مخالف سمت میں مڑنے کا حکم دیا۔ یہ راستہ بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا اور تقریباً پچاس گز آگے سڑک

سے ہٹ کر درختوں کے نیچے تاریکی میں ایک کار کھڑی تھی۔
اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ ہمیں ان کی آمد کا پتا نہیں چل سکا تھا۔ وہ کار کو دور چھوڑ کر محتاط انداز میں پیدل کیوں چلتے ہوئے کاٹیج تک پہنچے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ سڑک کی طرف سے آنے والے اس پختہ راستے کے دونوں طرف کاٹیجز تھے اور ہر کاٹیج کی طرف جانے والے راستے پر پرائیویٹ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف گنجان درخت بھی تھے۔ بعض جگہ پر تو دو طرف کے درختوں کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ کاٹیجز کا یہ سلسلہ آگے بھی جاری تھا۔

ابھی تو شاید ساڑھے سات ہی بجے تھے۔ کسی بھی وقت کوئی گاڑی اس طرف آسکتی تھی اس لیے کاٹیج والے راستے سے نکل کر اس کشادہ اور پختہ راستے پر آتے ہی ان کی رفتار تیز ہوگئی تھی اور مجھے بھی دھکے دے دے کر تیز چلنے پر مجبور کیا جارہا تھا۔

درختوں کے نیچے کھڑی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچ کر کم نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر دوسرے دروازوں کے لاک ناب بھی ہٹا دیے۔ مجھے دھکا دے کر پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ دونوں غنڈے میرے دائیں بائیں اس طرح بیٹھ گئے کہ میں ان کے بیچ میں دب کر رہ گیا۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے مجھے بیٹھنے میں بھی تکلیف ہورہی تھی اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کوئی گڑبڑ کرسکوں مگر میرے بائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے رائفل کی نال میرے پہلو سے لگا رکھی تھی۔ دارا آگے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار حرکت میں آکر پختہ راستے پر آگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کار کو گھما کر سڑک کی طرف لے جائیں گے اور وہاں سے کسی راستے کا تعین کریں گے لیکن میرے اندازے کے برعکس کار مخالف سمت میں چل پڑی تھی۔

آگے بھی اس پختہ راستے کے دونوں طرف کاٹیجز کے پرائیویٹ راستے تھے اور یہ سڑک بدستور بلندی کی طرف جارہی تھی۔ تقریباً نصف میل آگے کاٹیجز کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب پختہ سڑک بھی ختم ہوگئی تھی۔ آگے پتھریلا راستہ تھا جو اب نشیب کی طرف چلا گیا تھا۔

پہاڑیوں میں بل کھاتا ہوا یہ اونچا نیچا راستہ خاصا دشوار تھا۔ کہیں تو یہ اس قدر خطرناک ہوگیا تھا کہ معمولی سی غفلت بھی موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ پہاڑیوں میں اس طرح کے اور بھی کئی راستے تھے جو دن کے وقت سیاح ٹریکنگ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان راستوں پر تو بعض اوقات دن کے وقت بھی چلنا مشکل ہوتا تھا چہ جائیکہ رات کو گاڑی چلائی جائے لیکن کم جس

تحریر اور شخصیت

ان کے لئے ایک نادر کتاب جو اپنی شخصیت کو اُبھارنے، سنوارنے اور نکھارنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

قیمت 25 روپے + ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

انداز سے کار چلا رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سارے راستے اس کے دیکھے بھالے ہوئے تھے اور وہ صرف انہی راستوں پر جا رہا تھا جن پر کار چل سکتی تھی۔

ان پہاڑیوں پر سبزے اور درختوں کی بہتات تھی۔ سامنے پڑنے والی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کار کسی سرنگ سے گزر رہی ہو۔ بعض جگہوں پر راستہ بہت ہی ناہموار تھا۔ کار اچھلتی تو میرے پہلو سے لگی ہوئی رائفل کی نال چبھنے لگتی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر کسی زوردار جھٹکے سے ٹریگر دب گیا تو میرا کام تمام ہو جائے گا۔

تقریباً چالیس منٹ تک کار ان پہاڑیوں میں اچھلتی ہوئی چلتی رہی اور پھر ایک جگہ پر رک گئی۔ سامنے دو راستے پینتالیس ڈگری کا زاویہ بناتے ہوئے دو مختلف سمتوں میں جا رہے تھے اور کم شاید بھول گیا تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ دارا بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور بالآخر آپس میں مشورہ کرنے کے بعد کم نے کار دائیں طرف والے راستے پر موڑ دی۔

آدھا گھنٹا مزید گزر گیا اور بالآخر کہیں کہیں روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ ان پہاڑیوں میں واقع کاٹیجز کی روشنیاں تھیں۔ چند منٹ بعد کار ایک کاٹیج کے سامنے رک گئی۔ دوسرے کاٹیج وہاں سے خاصے فاصلے پر تھے۔

وہ لوگ مجھے کار سے اتار کر دھکے دیتے ہوئے اس کاٹیج کے اندر لے آئے اور ایک کرسی پر بٹھا کر مجھے رسی سے اس طرح جکڑ دیا گیا کہ میں معمولی سی حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی۔ رات کے وقت پہاڑیوں میں اندازہ لگانا دشوار تھا۔ اگر مجھے چھوڑ بھی دیا جاتا تو میں اس راستے سے واپس اپنے کاٹیج تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سامنے والی دیوار پر تھائی ہندسوں والی گھڑی آویزاں تھی جس کی سوئیاں دس بج کر پانچ منٹ کا وقت بتا رہی تھیں۔ وہ لوگ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا تھا۔ کھڑکیاں پہلے سے بند تھیں۔ میں کبھی کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا اور کبھی گھڑی کو گھورنے لگتا۔ پونے گیارہ بج رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے مجھے اس کمرے میں بند کر کے وہ لوگ کہیں اور چلے گئے ہیں یا مجھے بھول گئے ہیں لیکن پھر ان کی باتوں کی آواز سنائی دی۔

میں صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ ماسٹر ہوچن وغیرہ کو میرے اغوا کا پتا چل چکا ہوگا اور انہوں نے میری تلاش شروع کر دی ہوگی۔ میرے ذہن میں صرف ایک سوال تھا۔ کیا وہ لوگ مجھے تلاش کر لیں گے؟

بارہ بجے کے قریب دروازہ کھلا۔ کم اور دارا کے ساتھ چی فانگ بھی اندر داخل ہوا۔ ایک گن مین دروازے کے باہر رک گیا تھا اور دوسرا اندر آ گیا تھا۔ دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

دنیا کے تین سفاک ترین آدمی میرے سامنے تھے۔ ان تینوں نے میری آنکھوں کے سامنے میرے ماں باپ کو بڑی بے دردی سے قتل کیا تھا۔ اس کے بعد بھی درجنوں بے گناہ افراد ان کے ہاتھوں موت کا شکار ہوئے تھے اور اب میں ان کے رحم و کرم پر تھا۔ مجھے ان سے کسی ہمدردی یا رحم کی توقع نہیں تھی۔ اگر میں ان کے ہاتھوں مارا جاتا تو مجھے افسوس ہوتا کہ میں اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لیے بغیر ختم ہو جاتا لیکن پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

کچھ عرصے پہلے تک دارا مجھے ہر قیمت پر قتل کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں اس کے جرم کا واحد چشم دید گواہ تھا۔ مجھ پر بار بار قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو مجھے ان سے بچاتا رہا تھا لیکن جب سنگاپور کی زمین میرے لیے تنگ ہو گئی تو جام پرتاب سنگھ مجھے ان سے بچانے کے لیے پہلے کوالالمپور اور پھر بنکاک لے آیا۔ وہ مجھے ان کے شر سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا اور اس کے لیے اس نے اپنی جان بھی دے دی تھی لیکن مرنے سے پہلے اس نے مجھے اس جگہ پہنچا دیا تھا جہاں وہ پہنچانا چاہتا تھا۔

میں مہاراج کی پناہ میں آ گیا اور دارا نے بنکاک کے بدنام ترین بدمعاش ٹائیگر سے گٹھ جوڑ کر کے یہاں بھی میرے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ ٹائیگر میرے ہاتھوں مارا گیا تو پیڈرو آگے آ گیا۔ ان ہنگاموں میں پیڈرو کا بھائی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو گیا اور پیڈرو میرا بدترین دشمن بن گیا۔ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا پیڈرو کو ایک موقع مل گیا تھا مگر اس وقت میں دارا ہی کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ دارا کو کسی طرح میرے ڈیڈی کی اس ڈائری کے بارے میں معلوم ہو گیا جس میں کروڑوں روپے مالیت کے سونے کا راز پوشیدہ تھا اور دارا مجھے مارنے سے پہلے وہ ڈائری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیڈرو بھی لالچ میں آ گیا اور اس طرح مجھے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

تمام واقعات فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ میں اب تک دارا کو بہت نقصان پہنچا چکا تھا۔ وہ ہیروئن کی اسمگلنگ کا سینڈیکیٹ بنانے کے لیے سنگاپور آیا تھا لیکن میں نے اسے ٹکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اپنی جان بچانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ میں نے سنگاپور میں اس کا سینڈیکیٹ کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ میری وجہ سے اسے نہ صرف کروڑوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا بلکہ اس کا ایک کزن جمال بھی لمبی مدت کے لیے جیل چلا گیا تھا اور اب دارا بنکاک میں پہلے ٹائیگر اور اس کے مرنے کے بعد پیڈرو کے ذریعے ہیروئن کی اسمگلنگ کا نیا ریکٹ بنانے کے لیے گولڈن ٹرائی اینگل سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری وجہ سے اس کی ہر کوشش اب تک ناکام ہوتی رہی تھی۔

میں اس کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا تھا اور وہ مجھے ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن اس دوران میں اسے کسی طرح میرے ڈیڈی کی ڈائری کا پتا چل گیا اور وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اپنے نقصان کی تلافی کے لیے وہ ڈائری حاصل کرنا چاہتا تھا اور اب وہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گا جب تک مجھ سے ڈائری حاصل نہ کر لے اور اس مقصد کے لیے وہ لوگ مجھے جس طرح تشدد کا نشانہ بنائیں گے اس کا مجھے اندازہ تھا۔ وہ میرے بدترین دشمن تھے۔ دارا میرے ہاتھوں بہت نقصان اٹھا چکا تھا۔ چی فانگ تو میرے ہاتھوں اس بُری طرح پٹا تھا کہ اس کی ایک پسلی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ابھی تک علاج کروا رہا تھا۔ ان سے مجھے کسی نرمی کی توقع نہیں تھی۔

وہ تینوں میرے سامنے کھڑے تھے اور میں باری باری ان کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ یہ کہنا بھی مبالغہ ہوگا کہ میرے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ زندگی تو ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ جسم کے کسی حصے میں لگنے والا معمولی سا زخم بھی بے چین کر دیتا ہے اور یہ تینوں تو میرے بدترین دشمن اور سفاک ترین انسان تھے۔ دارا جیسے شخص سے یہ بھی بعید نہیں تھا کہ وہ واقعی میری بوٹیاں کاٹ کر میری نظروں کے سامنے کتوں کو کھلا دے۔

چی فانگ میرے سامنے کھڑا تھا۔ سفاکی اور بے رحمی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی اور میرا خیال تھا کہ اپنی پٹائی کا بدلہ لینے کے لیے مجھ پر پہل وہی کرے گا۔ میرا یہ اندازہ درست نکلا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس نے اچانک ہی میری پنڈلی پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی تھی۔ میں سسکاری بھر کر رہ گیا۔

"بالآخر پکڑے ہی گئے۔" چی فانگ کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہیں بچانے کے لیے کون آتا ہے۔"

"میں تو تم لوگوں کو بہت بہادر سمجھتا تھا مگر تم لوگ تو بہت بزدل نکلے۔" میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے ہاتھ پیر باندھ کر مردانگی کے جوہر دکھا رہے ہو۔ میری یہ بندشیں کھول دو پھر دیکھو تمہاری باقی پسلیاں بھی نہ توڑ دوں تو...."

"اگر کوئی اور ہوتا تو تمہاری باتوں سے اشتعال میں آ کر تمہیں کھول بھی دیتا لیکن ہم یہ حماقت نہیں کر سکتے۔ ہم جانتے ہیں تم کتنے خطرناک ہو۔" چی فانگ نے کہا۔

"بزدل۔" میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

چی فانگ ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے میرے چہرے پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ میرے ہونٹوں سے ایک بار پھر خون بہہ نکلا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا دایاں جبڑا اپنی جگہ سے ہل گیا ہو۔

"ہاتھ ذرا ہلکا رکھو چی فانگ۔" قریب کھڑے ہوئے دارا نے کہا "اس سے پہلے اس کے باپ کی ڈائری کے بارے میں پوچھنا ہے۔ اس کے بعد تم اس کے ساتھ جو چاہو کر لینا۔"

چی فانگ مجھے ایک اور گھونسا رسید کرنے کے بعد پیچھے ہٹ گیا۔ دارا نے کم اور دوسرے آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں مجھے کھولنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی اور حربہ استعمال کرنے جا رہے تھے۔

مجھے کرسی سے اٹھا کر بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ میرے ہاتھ کمر سے کھول کر بیڈ کی پشت پر پائپ سے باندھ دیے گئے تھے اور پیر بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر باندھ دیے گئے۔ میں نے اپنے آپ کو آنے والے اذیت ناک لمحوں کے لیے تیار کر لیا۔ دارا درخت سے توڑی ہوئی ایک شاخ لے کر میرے پیروں کی طرف کھڑا ہو گیا۔ یہ شاخ تقریباً ایک انچ موٹی اور بید کی طرح لچک دار تھی۔

"تم اب تک مجھے جو نقصان پہنچا چکے ہو اس کا اندازہ تمہیں بھی ہے۔ ہمارے جو بندے مارے گئے وہ اس کے علاوہ ہیں لیکن میں یہ سب کچھ بھولنے کو تیار ہوں بشرطیکہ تم اپنے باپ کی ڈائری میرے حوالے کر دو۔" دارا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"وہ ڈائری تمہیں نہیں مل سکتی اس لیے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو وجدان۔" دارا بولا "وہ ڈائری تمہاری جان بچا سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ڈائری مل جانے کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں پاکستان واپس چلا جاؤں گا اور تم یہاں مہاراج کے پاس رہ کر عیش کرتے رہنا۔ پیڈرو وغیرہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ وہ تم سے ڈرنے لگا ہے۔ اگر ہم تینوں اس کے ساتھ نہ ہوتے تو وہ مہاراج جیسے آدمی سے پنگا لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد اس کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں اپنا گرو تسلیم کر لے لیکن یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ تم وہ ڈائری میرے حوالے کر دو اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ تمہیں بچانے کے لیے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ تھائی نے ماسٹر ہوچن کو بتا دیا ہو گا کہ ہم تمہیں اٹھا کر لے گئے ہیں لیکن وہ زندگی بھر ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد بھی تمہارا جواب انکار میں ہوا تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"تمہیں ایک منٹ انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر لو۔" میں نے جواب دیا۔

دارا چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی میرے سیدھے پیر کے تلوے پر اس زور سے ماری کہ میں تڑپ اٹھا۔ دارا پر جنون سا طاری ہو رہا تھا۔ وہ میرے دونوں پیروں کے تلووں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں چیخنے لگا۔

اسی دوران میں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ دارا کا ہاتھ رک گیا۔ وہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس چھڑی سے میں نہ صرف تمہارے پیروں کی بلکہ پورے جسم کی کھال ادھیڑ ڈالوں گا اور تم سے ڈائری حاصل کر کے ہی رہوں گا۔" اس کی آواز بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔ وہ کم کی طرف گھوم گیا "کم! دیکھو شاید شانگ وغیرہ آگئے ہیں۔ اگر وہ ان لڑکیوں کو لے آئے ہیں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔"

کم سرہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی اور اس کے پیچھے جانگی اور لیزا کو دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ان دونوں کو موٹے شانگ اور ایک دوسرے آدمی نے پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ جانگی اور لیزا کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔ دونوں کے بال بکھرے ہوئے تھے اور لیزا کے چہرے پر دو تین خراشیں بھی نظر آرہی تھیں جبکہ موٹے شانگ کی گردن اور چہرے پر بھی خراشیں نظر آرہی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ جانگی وغیرہ آسانی سے ان کے قبضے میں نہیں آئی تھیں۔

جانگی اور لیزا کو دیکھ کر میری روح تک کانپ اٹھی تھی۔ میں فوراً ہی تھائی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ ہوش میں نہیں آئی تھی؟ کیا ماسٹر ہوچن وہاں نہیں پہنچا تھا؟ پرساد اور پاکم نے بھی کاٹیج کی خبر نہیں لی تھی اور پھر اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ تھائی زندہ تھی یا.... اس سے آگے سوچتے ہوئے میرا دل کانپنے لگا۔ تھائی کی کنپٹی پر لگنے والا دارا کا وہ گھونسا بہت زوردار تھا۔ جس سے وہ تیورا کر گری تھی۔ ہو سکتا ہے وہ گھونسا جان لیوا ثابت ہوا ہو۔

میرے دماغ میں اس وقت آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ تھائی نے کاٹیج میں دارا کی ساری باتیں سنی تھیں۔ دارا نے اس کے سامنے ہی جانگی اور لیزا کے بارے میں بڑے گندے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اگر تھائی زندہ تھی اور ماسٹر ہوچن یا پرساد وغیرہ میں سے کسی نے اس سے رابطہ کیا تھا تو اس نے جانگی وغیرہ کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟

مجھے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس کے برعکس یہ خوفناک حقیقت میرے سامنے تھی کہ جانگی اور لیزا بھی ان کے قبضے میں آگئی تھیں اور ان کے بارے میں بھی دارا کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ اب اس کی یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کا کام کس طرح آسان ہو جائے گا۔

"ہاں تو مسٹر وجدان!" دارا میری طرف متوجہ ہو گیا "اپنی ایک چہیتی کا حشر تم اپنے کاٹیج میں دیکھ چکے ہو۔ اب ان کی باری ہے۔ اگر تم انہیں بچانا چاہتے ہو تو ڈائری کا پتا بتا دو۔ تمہارا انکار ان دونوں کی اذیت ناک موت کا باعث بھی بن سکتا ہے۔"

اس کے چہرے کی خباثت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچائے گا۔ تھائی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

جانگی اور لیزا مجھے دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی تھیں۔ انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ لیزا ان لوگوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی لیکن جانگی تو ان کی بربریت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا نے جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب کیا ہے۔ اس نے تھائی کا حشر نہیں دیکھا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ تھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے تو شاید اس موقع پر وہ اپنی زبان بند رکھنا ہی پسند کرتی۔

"وجدان! ہماری پروا مت کرو۔" وہ چیخی "تم اپنی زبان مت کھولنا۔ تمہارے لیے اگر میری جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔"

"عاشق ہو تو ایسی۔" دارا نے قہقہہ لگایا "بڑا شوق ہے اپنی جان دینے کا لیکن ہم تمہاری جان نہیں لیں گے۔ جان نکل گئی تو قصہ ختم۔ جسم بیکار ہو گیا۔ ہم تو تمہاری جان سے بھی زیادہ قیمتی چیز لینے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ تمہیں جب یہ پتا چلے گا کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو تم اپنے کہے ہوئے الفاظ پر پچھتاؤ گی۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا یہیں پر ہوگا۔ سب کے سامنے اس کے سامنے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا "تمہیں اس کے لیے اپنی جان دینے کا زیادہ شوق ہے نا۔ چلو پہلے تمہاری باری ہی سہی۔ مسٹر شانگ!" وہ موٹے شانگ کی طرف مڑ گیا "تم کئی بار اس کے حسن و شباب کا ذکر کر چکے ہو۔ آج موقع ہے۔ اپنی حسرت پوری کرلو۔"

اب جانگی کو بھی احساس ہو گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ وہ شانگ کی طرف دیکھنے لگی جس نے کوٹ اتار کر ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا تھا اور باچھیں نکالے جانگی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جانگی خوف زدہ سے انداز میں پیچھے ہٹنے لگی مگر چی فانگ نے اسے پہلے سے دونوں بانہوں سے گرفت میں لے لیا۔

شانگ جانگی کے سامنے رک گیا۔ اس نے جانگی کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر ایک زوردار جھٹکا دیا۔ جانگی کا بلاؤز پھٹ گیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے چھناکے کی زوردار آواز سنائی دی۔ عقبی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا تھا۔ شیشے کے کچھ ٹکڑے میرے اوپر بھی گرے تھے۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی کھڑکی سے ایک غراتی ہوئی آواز بھی سنائی دی تھی۔

"تم سب لوگ میری رائفل کی زد پر ہو۔ اگر کسی نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو گولیوں سے بھون ڈالوں گا۔ سب لوگ اپنے ہاتھ اٹھالو۔"

کم کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑکی کی طرف فائر کر دیا۔ ایک اور شیشہ ٹوٹا۔ اس کے ساتھ ہی کم اور دارا وغیرہ نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ ان کے گن مین نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے آٹومیٹک رائفل سے کھڑکی کی طرف ایک برسٹ مارا اور پھر رائفل کا رخ

چھت کی طرف کر کے گولیاں برسا دیں۔ بلب ٹوٹ گیا اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

وہ لوگ پاگلوں کی طرح دروازے کی طرف دوڑے تھے۔ اسی دوران میں لیزا کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ان کے راستے میں تھی اور ان میں سے کسی سے ٹکرا کر گری تھی۔ بھاگ دوڑ اب اس کمرے کے باہر تھی اور پھر فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔

باہر فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور کمرے کی تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک چھناکے سے ایک اور شیشہ ٹوٹا۔ اس کے فوراً ہی بعد کوئی میرے اوپر گر گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کا انداز ایسا تھا جیسے مجھے اپنے جسم کی آڑ میں لے کر بچانا چاہتا ہو۔ وہ جانگی یا لیزا میں سے کوئی تھی۔ ان کے سوا تیسرا کوئی ایسا نہیں تھا جو اس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچانے کی کوشش کرتا۔

"ارے۔ کون ہے۔ میرے اوپر سے ہٹو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں ہوں' لیزا۔" میرے کان میں سرگوشی سنائی دی "دارا اور اس کے ساتھی اس طرف فائرنگ کر رہے ہیں۔ سامنے والی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ چکے ہیں اور گولیاں دیوار پر لگ رہی ہیں۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ لیزا سے میری ملاقات محض چند روزہ تھی۔ زیادہ بے تکلفی بھی نہیں تھی لیکن مجھے بچانے کے لیے اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ میں جس بیڈ پر بندھا ہوا تھا وہ دروازے کے عین سامنے تھا اور دروازے سے آنے والی کوئی سیدھی گولی میرے اوپر اوندھی پڑی ہوئی لیزا کا خاتمہ بھی کر سکتی تھی۔

"جانگی۔ کہاں ہو تم؟" میں نے گردن گھما کر تاریکی میں گھورتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں ہوں۔" جانگی کی آواز دائیں طرف سے سنائی دی پھر وہ میرے قریب آگئی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ لیزا مجھے بچانے کے لیے میرے اوپر لیٹ گئی ہے "لیزا۔ اس پلنگ کو گھسیٹ کر سائڈ میں لے چلو۔" جانگی نے جلدی سے کہا۔

لیزا میرے اوپر سے اٹھ گئی اور پھر ان دونوں نے بیڈ کو گھسیٹ کر بائیں طرف والی دیوار کے قریب کر دیا۔ اب ہم فائرنگ کی زد میں آنے سے محفوظ ہو گئے تھے۔

پندرہ بیس منٹ تک فائرنگ ہوتی رہی اور پھر بتدریج خاموشی چھاتی چلی گئی۔ چند منٹ گزر گئے۔ گمبھیر سناٹے میں جھینگروں کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں اور پھر جھینگروں کی ان آوازوں میں خشک پتوں کے چرمرانے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ کوئی محتاط انداز میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا اور زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتے پیروں کے نیچے آکر چرمرا رہے تھے۔

"باس!" یہ آواز سن کر میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ پرساد کی آواز پہچاننے میں ہم میں سے کسی نے کوئی غلطی نہیں کی تھی

"باس۔ کہاں ہو تم!"

"ہم یہاں ہیں پرساد۔ اس کمرے میں۔" جانگی چیختی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔

چند منٹ بعد ہی پرساد دروازے کے سامنے آگیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ کمرے کے باہر برآمدے کا بلب بھی فائرنگ کی زد میں آکر ٹوٹ چکا تھا۔ پرساد جانگی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور پھر اس نے ٹارچ جلالی۔

"تم ٹھیک تو ہو نا باس!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ویسے میری ناک اور ہونٹوں سے بہنے والے خون نے اسے بہت کچھ بتا دیا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں پہلے بیڈ کی پشت پر پائپ سے بندھے ہوئے میرے ہاتھ کھولے گئے پھر پرساد میرے پیر کھولنے لگا اور آخر میں مجھے سہارا دے کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

"تم ٹھیک ہو نا باس۔ زیادہ گڑبڑ تو نہیں؟" وہ بولا۔

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا لیکن جب میں نے بیڈ سے اترنے کے لیے پیر زمین پر رکھے تو میرے ہونٹوں سے کراہ سی نکل گئی۔

"کیا ہوا باس؟" پرساد نے پوچھا۔

"پیروں میں تکلیف ہے۔ اس کم بخت دارا نے...."

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پرساد نیچے بیٹھ چکا تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں میرے پیروں کے تلووں کو دیکھا تو ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"دارا ایک مرتبہ میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کے دونوں پیر کاٹ کر اپاہج بنا دوں گا۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔ اس نے ٹارچ لیزا کے ہاتھ میں تھما دی اور مجھے گود میں اٹھالیا۔

دوسرے کمرے میں آکر اس نے مجھے ایک بیڈ پر بٹھا دیا اور ایک بار پھر میرے پیروں کا معائنہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ میں نے ٹانگیں موڑ کر پیروں کی طرف دیکھا۔ تلووں کی کھال نہیں پھٹی تھی البتہ سرخ دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ اگر شانگ وغیرہ جانگی اور لیزا کو لے کر نہ پہنچ جاتے تو میرے پیروں پر چھڑی سے ضربیں لگتی رہتیں اور پھر یقیناً کھال بھی پھٹ جاتی۔ اس وقت بھی شدید تکلیف ہو رہی تھی جسے میں ضبط کیے ہوئے تھا۔

"ماسٹر کہاں ہے؟" میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ لوگ ان کے تعاقب میں گئے ہیں۔" پرساد نے جواب دیا۔

پرساد کا ساتھی دروازے کے باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ چند منٹ بعد ہی اس نے اندر کی طرف جھانکتے ہوئے بتایا کہ کچھ لوگ

آرہے ہیں۔ پرساد رائفل اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ بھی بند کردیا تھا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی لیکن دروازہ بند ہوجانے سے برآمدے میں تاریکی ہوگئی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں اور پھر پرساد نے دروازہ کھول دیا۔ ماسٹر ہوچن اور پاتھم اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے جو باہر ہی رک گئے تھے۔ ماسٹر ہوچن جانگی کا پھٹا ہوا بلاؤز اور لیزا کی حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

"مجھے افسوس ہے ہمیں آنے میں دیر ہوگئی جس سے تم دونوں کو یہ تکلیف اٹھانی پڑی۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہوگیا "تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تمہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔"

"ابھی ابتدا ہوئی تھی۔" میں اپنے پیروں کی طرف اشارہ کرکے مسکرایا "آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں اور جانگی اور لیزا کو بھی یہاں لایا گیا ہے؟"

"میں رات آٹھ بجے پرساد اور پاتھم کے ساتھ تم لوگوں سے ملنے کے لیے لیزا والے کاٹیج میں پہنچا تھا۔" ماسٹر ہوچن کہہ رہا تھا "وہاں کی صورتِ حال دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ میرے آنے سے پہلے وہاں کیا ہوچکا تھا۔ تھائی بے ہوش پڑی تھی۔ وہاں دو تین جگہوں پر خون کے دھبے بھی نظر آئے تھے۔ تھائی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے میں تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔ تھائی نے ہوش میں آنے کے بعد جو کچھ بھی بتایا وہ میرے لیے خاصا تشویش ناک تھا لیکن جانگی اور لیزا کے بارے میں دارا کے عزائم جان کر مجھے کسی قدر اطمینان ہوا کہ امید کی ایک موہوم سی کرن ابھی باقی ہے۔

"میں نے جانگی اور لیزا کو نہیں بتایا بلکہ لیزا کے مکان کی نگرانی شروع کرا دی۔ میرا ایک آدمی لیزا کے بنگلے کے قریب چھپا بیٹھا تھا اور ہم دور ایک کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اندیشہ یہ بھی تھا کہ وہ لوگ آج رات لیزا کی کوٹھی کی طرف نہ آئیں۔ ایسی صورت میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہوسکتا تھا۔ وہ رات بھر تمہیں تشدد کا نشانہ بناتے اور یہ بھی ممکن تھا ختم ہی کردیتے لیکن ہمارے لیے انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمارے پاس ان کا کوئی سراغ بھی نہیں تھا۔ یہی ایک موہوم سی امید تھی۔ میں دارا کی فطرت سے بھی کسی حد تک واقف ہوچکا ہوں۔ وہ نہایت گھٹیا ذہنیت کا مالک ہے۔ تمہارے سامنے اس نے تھائی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اس کی ذہنی پستی کا ثبوت ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آج ہی رات جانگی اور لیزا کو بھی اٹھوانے کی کوشش کرے گا تاکہ ان کے ذریعے بھی تم پر دباؤ ڈال سکے۔

"تھائی نے بتایا تھا کہ وہ تم سے کوئی ڈائری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس بات سے بھی مجھے امید تھی کہ ڈائری کا پتا معلوم کرنے کے لیے وہ تمہیں اس قدر زیادہ تشدد کا نشانہ نہیں بنائے گا جس سے تمہاری جان خطرے میں پڑجائے۔

"ہمارا انتظار طول بھی کھینچ سکتا تھا لیکن مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے کے قریب ایک کار لیزا کے بنگلے کے سامنے رکی۔ گلی اس وقت سنسان تھی۔ کار سے دو آدمی اترے۔ ایک آدمی دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ اس نے گیٹ کھول دیا اور دوسرا آدمی جو ذرا بھاری بھرکم تھا اس کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد اندر سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھاگئی۔

"بنگلے کے قریب چھپا ہوا میرا آدمی فوراً ہی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ چند منٹ بعد دارا کے آدمی لیزا اور جانگی کو لے کر بنگلے سے باہر نکلے اور انہیں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اپنے درمیان بٹھالیا۔ اسٹیئرنگ کے سامنے ایک تیسرا آدمی بھی موجود تھا۔ ان کے بیٹھتے ہی کار حرکت میں آگئی۔

"ان کا تعاقب کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ انہیں تعاقب کا شبہ نہ ہوجائے۔ میں نے اپنی گاڑی کی تمام بتیاں بجھا رکھی تھیں۔ ان کی گاڑی کی ٹیل لائٹ کے سہارے تعاقب کررہا تھا۔ تاریکی میں ناہموار راستوں پر یہ کام خاصا دشوار تھا لیکن مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔

"ان کی گاڑی ایک تنگ سے راستے پر مڑگئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کس طرف جارہے ہیں۔ وہاں سے نصف میل آگے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر چار پانچ کاٹیج ہیں اور ان سے آگے گاڑی کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنی کار ایک چٹان کے پیچھے روک لی اور چٹان پر چڑھ کر ان کی گاڑی کو دیکھنے لگا۔ وہ گاڑی بالآخر ایک جگہ پر رک گئی۔ ہم نے چٹان سے اتر کر تیزی سے راستہ طے کرتے ہوئے اس کاٹیج کو گھیر لیا اور مجھے افسوس ہے، ہمیں کچھ دیر ہوگئی جس سے انہیں جانگی پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا۔"

"نہیں۔ آپ لوگ عین وقت پر پہنچ گئے۔ اگر چند منٹ کی مزید تاخیر ہوتی تو صورتِ حال کچھ سنگین ہوسکتی تھی۔" میں نے کہا پھر تھائی کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"وہ اب محفوظ جگہ پر ہے اور تمہارے بارے میں پریشان ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "یہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ میں اسے بتا دوں کہ اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس کمرے کے ایک کونے میں ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ ماسٹر ہوچن نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ نمبر ملائے اور چند منٹ تک کسی سے بات کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

"کیا تم چل سکتے ہو؟" ماسٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں ماسٹر۔" میرے بجائے پرساد بول پڑا "میں اسے گود میں اٹھا کر گاڑی تک لے چلوں گا۔"

"تو اٹھاؤ اسے۔ اب ہمیں یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ وہ لوگ ہمارے اچانک حملے سے بدحواس ہوکر یہاں سے بھاگ تو گئے ہیں لیکن عین ممکن ہے وہ پلٹ کر دوبارہ ہم پر حملہ کردیں۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

پرساد نے مجھے گود میں اٹھالیا۔ باہر تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک تو وہ جس پر ماسٹر ہوچن اور پرساد وغیرہ آئے تھے۔ دو گاڑیاں دارا اور اس کے ساتھیوں کی تھیں۔ مجھے، جانگی اور لیزا کو ماسٹر ہوچن کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ایک گن مین آگے ماسٹر کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ پرساد وغیرہ نے دارا والی اس گاڑی پر قبضہ کرلیا تھا جس پر وہ مجھے کاٹیج سے اغوا کرکے لائے تھے۔

"وہ سب لوگ اس طرف کی پہاڑیوں میں بھاگے تھے۔" ماسٹر ہوچن نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ممکن ہے وہ اس طرف سے گھوم کر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کریں اس لیے کسی گاڑی کی کوئی بتی نہ جلائی جائے۔ اگلی چٹان کے قریب ہم بائیں طرف نکل جائیں گے۔"

گاڑیاں اسٹارٹ ہوکر آگے پیچھے حرکت میں آگئیں۔ ہماری گاڑی آگے تھی اور پرساد والی گاڑی تقریباً بیس گز پیچھے۔ گہری تاریکی میں دشوار اور ناہموار راستے پر بغیر روشنی کے گاڑی چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ماسٹر ہوچن کا یہ اندیشہ بے بنیاد نکلا کہ واپسی پر ہم پر حملہ بھی ہوسکتا ہے۔ دارا اور اس کے ساتھی ماسٹر ہوچن کے حملے سے اس طرح بدحواس ہوکر بھاگے تھے کہ انہیں اپنا ہوش تک نہیں رہا ہوگا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو واپسی پر ہمیں گھیر سکتے تھے۔ وہ اگر تاریکی میں چٹانوں سے ہم پر فائرنگ کردیتے تو ہمیں اچھا خاصا نقصان پہنچ سکتا تھا لیکن ہم بغیر کسی روک ٹوک کے پہاڑیوں سے نکل کر شہری حدود میں داخل ہوگئے۔

اس وقت رات کے دو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر سناٹا تھا۔ نائٹ کلب اور کیسینو وغیرہ بھی عام طور پر ایک بجے بند ہوجاتے تھے۔ دونوں گاڑیاں مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی رہائشی علاقے کی ایک کشادہ گلی میں داخل ہوکر ایک بنگلے کے سامنے رک گئیں۔ میرے دائیں طرف بیٹھی ہوئی لیزا اچھل پڑی۔ میرے لیے یہ انکشاف خاصا دلچسپ تھا کہ ماسٹر ہوچن ہمیں لیزا کے بنگلے پر لے آیا تھا۔

"یہ جگہ تم لوگوں کے لیے سب سے زیادہ محفوظ ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ تم لوگ یہاں آگئے ہو۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "تم لوگ یہاں اتر جاؤ۔ پرساد میرے دو آدمیوں کے ساتھ یہاں رہے گا اور پاتھم میرے ساتھ جائے گا۔"

پچھلی گاڑی بھی رک چکی تھی۔ پرساد اتر کر نیچے آگیا۔ اس نے ماسٹر کی بات سنی اور لیزا کی طرف دیکھنے لگا۔ لیزا دروازہ کھول کر نیچے اتر آئی تو پرساد نے جھک کر مجھے گود میں اٹھالیا۔ دوسری طرف سے جانگی بھی اتر چکی تھی۔

ماسٹر نے پاتھم کو بُلا کر کچھ ہدایات دیں اور گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ پاتھم نے دوسری گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ اب وہ اس گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ دونوں گن مین اور پرساد تو وہیں رہ گئے تھے۔

مجھے ہال نما کمرے کے ایک صوفے پر لٹا دیا گیا۔ لیزا اور جانگی فوراً ہی ایک کمرے میں گھس گئیں۔ چند منٹ بعد وہ کپڑے بدل کر باہر آگئیں۔ لیزا کے اشارے پر پرساد نے مجھے صوفے سے اٹھا کر ایک بیڈ روم میں آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔

بھاگ دوڑ اور جوش و خروش میں، میں اپنی تکلیف کو کسی حد تک بھولا رہا تھا لیکن اب بے چین ہونے لگا۔ لیزا دوسرے کمرے سے پلاسٹک کی چوڑے منہ والی ایک بوتل لے آئی تھی جس میں ہرے رنگ کی کریم بھری ہوئی تھی۔ وہ میرے پیروں کے تلووں پر اس کریم کی لپائی کرنے لگی۔ وہ راستے میں ماسٹر سے میرے پیروں ہی کے بارے میں باتیں کرتی رہی تھی۔ اس نے اس کریم کا نام بھی لیا تھا اور ماسٹر نے اسے یہی کہا تھا کہ وہ اس کریم کا لیپ کردے۔ صبح وہ ڈاکٹر کو لے آئے گا۔

یہ کریم جڑی بوٹیوں کا مرکب تھی۔ اس میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ میرے پیروں کی شدید جلن بتدریج کم ہونے لگی اور میں پُرسکون ٹھنڈک سی محسوس کرنے لگا۔

"صبح ڈاکٹر آئے گا تو میں اس سے بات کروں گی۔" لیزا بوتل کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے بولی "اگر دو چار دن یہ کریم لگائی جائے تو تمہیں اس سے آرام مل سکتا ہے پھر شاید ڈاکٹر کے علاج کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔"

وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ ماسٹر ہوچن کے گن مین باہر برآمدے ہی میں بیٹھ گئے تھے۔ پرساد کچھ دیر کے لیے باہر گیا۔ دونوں گن مینوں کے ساتھ گھوم پھر کر سیکیورٹی کے پوائنٹ آف ویو سے کوٹھی کا اندر باہر سے جائزہ لیا اور دوبارہ میرے کمرے میں آگیا۔

چند منٹ بعد لیزا ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ آدھے گھنٹے سے کہاں غائب تھی۔ ٹرے میں کافی کے چار مگ تھے۔ گن مینوں کو وہ کافی دے آئی تھی۔

"رات کے دو بج رہے تھے لیکن اس وقت کافی کی شدید طلب محسوس ہورہی تھی۔" لیزا نے کہتے ہوئے ایک ایک مگ جانگی اور پرساد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک خود اٹھالیا اور ٹرے میری گود میں رکھ دی۔ ہم سب اس وقت واقعی کافی جیسی کسی چیز کی بڑی شدت سے طلب محسوس کررہے تھے۔

کافی کی چسکیوں کے ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔

"ہم سات بجے کے قریب پرسی کی آخری رسومات سے فارغ

ہوئے تھے۔" پرساد بتا رہا تھا "تدفین کے بعد کچھ لڑکوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ماسٹر ہوچن نے انہیں سختی سے روک دیا۔ میں اور پاٹھم لوگوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ کوئی ایسا مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا تھا جسے دارا کا ساتھی سمجھا جا سکتا۔

"پرسی کے جمنازیم واپس پہنچ کر ماسٹر ہوچن کے کہنے پر میں نے کاٹیج فون کیا لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بار بار فون کرنے پر بھی کال ریسیو نہیں ہوئی تو ہمیں پریشانی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ شاید خون خرابا ہو گیا ہوگا لیکن ماسٹر ہوچن مزید انتظار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ پاٹھم اور میں ماسٹر کے ساتھ کاٹیج کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر جو صورتِ حال سامنے آئی وہ بڑی خوفناک تھی۔ تھائی کو ہوش میں لانے کے بعد پتا چلا کہ تمہیں دارا اور کم وغیرہ اٹھا کر لے گئے ہیں اور پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ماسٹر ہوچن تمہیں بتا چکا ہے۔"

ماسٹر ہوچن نے واقعی بڑی دانش مندی کا مظاہرہ کیا تھا جو اس نے لیزا کے مکان کی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ اگر تھائی سے معلوم ہونے کے بعد لیزا اور جانکی کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا تو صورتِ حال زیادہ خطرناک ہو سکتی تھی۔ لیزا اور جانکی کی نگرانی بہت سود مند ثابت ہوئی تھی۔ اس طرح ماسٹر ہوچن وغیرہ بروقت وہاں پہنچ گئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاید میری آخری رات ہوتی یا کم از کم اتنا تو ضرور ہوتا کہ دارا مجھے مفلوج کر کے پھینک دیتا۔

ہم صبح چار بجے تک باتیں کرتے رہے۔ لیزا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پرساد بھی اٹھ کر گن مینوں کے پاس چلا گیا۔ جانکی میرے پاس بیٹھی رہی۔ وہ بار بار میری حالت پر افسوس کا اظہار کر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے مجھ سے زیادہ اسے تکلیف ہو رہی ہو۔ لیزا اور پرساد کے جانے کے بعد جانکی کو موقع مل گیا تھا۔ وہ بار بار میری پیشانی اور رخساروں پر بوسے دے رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے اپنے اندر سمیٹ لیتی۔

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے غور سے دیکھنے لگی پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں وجدان کہ دارا سے تمہارا بدلہ ضرور لوں گی۔ اس موذی کو کسی صورت میں بھی معاف نہیں کروں گی۔"

"وہ واقعی بہت موذی ہے۔" میں نے کہا۔

جانکی جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ جانکی نے مجھے سیدھا لٹا دیا۔ کریم لگانے سے پیروں کی تکلیف حیرت انگیز حد تک کم ہو گئی تھی۔

صبح نو بجے کے قریب میں بیدار ہوا تو تھائی میرے بیڈ کے پاس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ صبح چھ بجے ہی یہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"مجھے افسوس ہے تھائی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کل جو کچھ بھی ہوا اس کے لیے میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

"بھول جاؤ اب اس بات کو۔" تھائی نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا "یہ زخم مجھے لگا ہے۔ اس کا انتقام بھی میں ہی لوں گی۔"

میں نے بات کو مزید آگے بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس تذکرے پر وہ کچھ شرمسار سی ہو رہی تھی اور بات کرتے ہوئے مجھ سے نظریں بھی چرا رہی تھی۔ لیزا کے آجانے کی وجہ سے بھی میں نے موضوع بدل دیا تھا۔

دس بجے کے قریب ماسٹر ہوچن ڈاکٹر کو لے کر آیا۔ اس وقت تک لیزا میرے پیروں پر وہ کریم لگا چکی تھی۔ ڈاکٹر یہیں کا رہنے والا تھا۔ وہ ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں جانتا تھا جن سے یہ کریم تیار کی گئی تھی۔

"بہترین علاج یہی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "میرے علاج کی ضرورت نہیں۔ دن میں دو مرتبہ یہی کریم لگائی جائے تو زیادہ سے زیادہ تین دن میں پیر بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد ماسٹر ہوچن نے بتایا کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کی تلاش شروع کر دی گئی ہے۔ پرسی کے سیکڑوں شاگرد کنچن بوری کی نواحی پہاڑیوں میں پھیل گئے ہیں۔ وہ ان پہاڑیوں کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ وہ لوگ دو تین دن میں دارا اور اس کے ساتھیوں کو کھوج نکالیں گے۔ کنچن بوری سے باہر جانے والے تمام راستوں کی نگرانی بھی شروع کر دی گئی تھی۔ ان کے بچ نکلنے کے امکانات بہت کم تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مہاراج کے آدمی میری وجہ سے پہلے بھی دارا کی تلاش میں رہے تھے لیکن اس وقت دارا سے زیادہ وہ ٹائیگر وغیرہ سے نمٹنے کے چکر میں تھے لیکن مجھے حیرت تھی کہ اب اتنی شدومد سے اس کی تلاش کیوں ہو رہی ہے۔ ہمارے کنچن بوری آنے کے بعد فون پر بات کرتے ہوئے بھی ماسٹر ہوچن نے کہا تھا کہ مجھے یہاں بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دارا کو اس کے بل سے باہر نکالنا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی گمبھیر تھا۔

دو تین دن گزر گئے۔ لیزا کے مرہم سے میرے پیر بڑی حد تک ٹھیک ہو گئے تھے۔ میں قالین پر آہستہ آہستہ چلنے بھی لگا تھا لیکن مجھے ایک دو روز مزید آرام کی ضرورت تھی۔ میں اس دوران میں حالات سے بھی بے خبر نہیں رہا تھا۔ باہر کی تمام خبریں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ ماسٹر ہوچن نے جو مین ہنٹ شروع کیا تھا وہ ابھی جاری تھا۔ اخبارات بھی ان واقعات کے بارے میں مسلسل خبریں چھاپ رہے تھے۔ پرسی کے قتل اور شہر کے نواح میں واقع کاٹیجز میں فائرنگ، آتش زدگی اور قتل و غارت کے بارے میں خبریں نمایاں طور پر چھاپی جا رہی تھیں۔ اخبارات میں میرا نام بھی آرہا تھا اور پیڈرو کا بھی۔ اخبارات اعلیٰ حکام کو کڑی تنقید کا نشانہ بنا

رہے تھے کہ اگر صورتِ حال پر قابو نہ پایا گیا تو بنکاک کی طرح اس پُرسکون شہر کا امن بھی تباہ ہو جائے گا۔ ہزاروں کی تعداد میں آئے ہوئے غیر ملکی سیاح واپس چلے جائیں گے اور اس چھوٹے سے شہر کی معیشت تباہ ہو جائے گی کیونکہ یہاں کے لوگوں کی آمدنی کا زیادہ انحصار سیاحوں کی آمد پر تھا اور یہ سیاحت کا سیزن تھا۔

ان ہنگاموں نے واقعی بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ پہاڑیوں میں کاٹیجز ایسی جگہوں پر تھے جہاں پولیس کی طرف سے حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ایسی کسی اطلاع پر پولیس پہنچ تو جاتی تھی لیکن بہت دیر میں۔ جن علاقوں میں ہمارے اور دارا کی پارٹی کے درمیان ہنگامے ہوئے تھے ان علاقوں میں بہت سے سیاح کاٹیج چھوڑ کر شہر میں ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں منتقل ہو رہے تھے۔

تین دن اور گزر گئے۔ پہاڑیوں میں مین ہنٹ (انسانوں کا شکار) جاری تھا مگر دارا اور اس کے ساتھیوں کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ماسٹر ہوچن کے آدمیوں نے شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کر رکھی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ دارا اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی شہر چھوڑ کر نہیں گیا مگر اس رپورٹ پر اعتماد اس طرح بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ پہاڑیوں میں ایسے بے شمار راستے موجود تھے جہاں سے کسی کی نظروں میں آئے بغیر سفر کیا جا سکتا تھا اور ظاہر ہے ایسے تمام راستوں کی نگرانی نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس رات ایک دلچسپ اطلاع ملی۔ پرسی کے تین لڑکوں نے سوپھن بوری کی طرف جانے والے راستے پر ایک مشتبہ آدمی کو پکڑا تھا۔ اس آدمی کا جو حلیہ بتایا گیا وہ شانگ سے ملتا جلتا تھا۔ یہ اطلاع مجھے ماسٹر ہوچن نے ٹیلی فون پر دی تھی اور وہ اسی طرف جانے والا تھا۔ میں نے ساتھ جانے کی ضد کی تو وہ بولا۔

"تمہارے پیر ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے۔ تم ان پہاڑی راستوں پر چل نہیں سکو گے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ماسٹر۔ مجھے چلنے پھرنے میں کوئی دقت نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم فانگ کے ساتھ آجاؤ۔ میں پرسی کے جمنازیم میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کر دیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ کپڑے بدلنے کے لیے میں نے کمرے کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ ہلکی سی دستک سن کر دروازہ ذرا سا کھولا اور جھانک کر باہر دیکھا۔ تھائی دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

"ایک منٹ تھائی۔" میں نے کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

کپڑے بدل کر دروازہ کھولا تو تھائی اندر گھس آئی۔

"لیزا نے بتایا ہے کہ تم فون پر ماسٹر ہوچن سے بات کر رہے تھے اور کہیں جانے والے ہو؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں تھائی۔" میں نے جواب دیا "ماسٹر کے آدمیوں نے سوپھن بوری کی طرف جانے والے کسی راستے پر ایک آدمی کو روک رکھا ہے۔ اس کا جو حلیہ بتایا گیا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ شانگ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ماسٹر ہوچن یا اس کے آدمی تو اسے نہیں پہچانتے۔ اس کی شناخت کے لیے میری ضرورت ہوگی اس لیے میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"پرساد کو بھیج دو۔ وہ اسے پہچانتا ہے۔" تھائی نے کہا۔

"نہیں تھائی۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "اس رات تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد تم میرے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ اس رات اگرچہ شانگ ان کے ساتھ نہیں تھا لیکن ان خوں خوار بھیڑیوں کے گروہ میں وہ بھی تو شامل ہے۔ ان لوگوں کو میں اپنے ہاتھوں سے سزا دوں گا۔ ایک ایک کی گردن مروڑ دوں گا۔ مجھے اس وقت مت روکو تھائی۔"

تھائی خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

میں نے جوگرز پہن لیے اور تھائی کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آگیا۔ جوگرز کی وجہ سے میں اپنے بائیں پیر میں ہلکا سا کھنچاؤ محسوس کر رہا تھا مگر یہ کوئی ایسی تکلیف نہیں تھی جسے نظرانداز نہ کیا جا سکتا۔

میں نے فانگ نامی گن مین کو ساتھ لیا اور ہم جانکی کی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ روانگی سے پہلے میں نے پرساد کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ پرسی کے جمنازیم میں بیس پچیس لڑکے جمع تھے۔ گیٹ کے سامنے ایک بغیر ہڈ کی جیپ بھی تیار کھڑی تھی۔ ماسٹر ہوچن نے فانگ کو ایک اور لڑکے کے ساتھ لیزا کی کوٹھی پر بھیج دیا اور مجھے اشارہ کرتا ہوا جیپ پر سوار ہو گیا۔ ماسٹر ہوچن خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جیپ کی پچھلی سیٹیں آمنے سامنے تھیں۔ دو لڑکے ایک سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں ایک اور لڑکے کے ساتھ سامنے والی سیٹ پر۔ اس کے فوراً ہی بعد جیپ حرکت میں آگئی۔

شہر کی بارونق سڑکوں سے ہوتے ہوئے جیپ ایمفو سائی ساوٹ کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ یہ علاقہ کنچن بوری کی چند بہترین تفریح گاہوں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں تین نیشنل پارکس تھے اور کئی چھوٹے بڑے آبشار بھی تھے۔ اسی علاقے میں تھام لوٹ کے تاریخی غار بھی تھے۔ یہ لاتعداد چھوٹے بڑے غار تھے جو پہاڑیوں میں وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے...... دن کے وقت تو اس علاقے میں سیاحوں کی آمدورفت رہتی تھی لیکن اس وقت سناٹا تھا۔ تاریکی میں دور کہیں کوئی روشنی نظر آجاتی۔ سائی نیشنل پارک کے قریب سے ایک پختہ سڑک دائیں طرف کو مڑ گئی تھی جو آگے جا کر سوپھن بوری کی طرف جانے والی ہائی وے سے مل جاتی تھی۔

اس ہائی وے پر چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ ایک پتھریلے راستے پر مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں لڑکے اٹھ گئے۔ انہوں نے سیٹ اٹھا کر نیچے بنے ہوئے لمبے سے بکس میں سے آٹومیٹک رائفلیں نکال کر آپس میں بانٹ لیں اور دوبارہ سیٹ درست کر کے بیٹھ گئے۔ ایک رائفل میرے حصے میں بھی آئی تھی۔

سامنے ایک جگہ روشنی نظر آرہی تھی۔ قریب پہنچنے پر انکشاف ہوا کہ وہ کسی کاشت کار کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ فضا میں مہک سی رچی ہوئی تھی جو اطراف میں دھان کی فصل کی موجودگی کی اطلاع دے رہی تھی۔ جیپ اس مکان کے سامنے رک گئی۔

ماسٹر ہوچن کے ساتھ ہی سب لڑکے چھلانگیں لگا کر جیپ سے اُتر گئے۔ جیپ کی آواز سن کر دو لڑکے مکان سے بھی باہر آگئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ ماسٹر نے باقی لڑکوں کو باہر ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا۔ میں اور ماسٹر مکان کے اندر داخل ہوگئے۔

ایک کمرے میں کرسیوں پر دو آدمی بندھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو شانگ ہی تھا اور دوسرے کو دیکھ کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ یہ دارا کا وہی گرگا تھا جس نے کاٹیج میں تھائی پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ دُھواں ہوگیا۔

"تم نے تو ایک آدمی کے بارے میں اطلاع دی تھی۔ یہ دوسرا کون ہے؟" ماسٹر ہوچن نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا۔

"یہ دراصل تین آدمی تھے۔" لڑکے نے بتایا "یہ موٹا تو اسی وقت ہمارے قابو آگیا تھا جبکہ باقی دو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ بعد میں یہ بھی پکڑا گیا۔ البتہ تیسرا نکل جانے میں کامیاب ہوگیا۔"

"اسے کھول کر میرے حوالے کردو۔" میں نے کرسی پر بندھے ہوئے دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"جانتے ہو اسے؟" ماسٹر ہوچن نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اسی نے اس رات تھائی کے ساتھ دست درازی کی تھی اور میں نے قسم کھائی تھی کہ یہ جب بھی مجھے ملے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے کہا۔

ماسٹر ہوچن نے اپنے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے کرسی پر بندھے ہوئے غنڈے کی رسیاں کھول دیں۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"تم تو بہت بہادر آدمی ہو۔ بدن پر رعشہ کیوں طاری ہو رہا ہے۔" میں نے اسے گھورا اور اسے کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر ہی اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے اپنی رائفل ماسٹر ہوچن کو تھما دی اور اس غنڈے پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کردی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اس کی پٹائی میں بالکل مزہ نہیں آرہا تھا۔ بس میں اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"میں تمہیں اتنا بزدل بھی نہیں سمجھتا تھا۔" میں نے ہاتھ روک کر کہا "اس رات اپنے ساتھیوں کی موجودگی میں تم نے مجھ پر چند بڑے اچھے داؤ آزمائے تھے۔ اب میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ اگر تم مجھے دو ہاتھ بھی لگا دو تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ ان میں سے کوئی بھی مداخلت نہیں کرے گا اور نہ ہی تمہیں کوئی روکے گا۔"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آئی۔ اس نے ماسٹر اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی مجھ پر حملہ کردیا۔ میں غافل نہیں تھا۔ میں نے اس کا وار بائیں کلائی پر روکا اور دائیں ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی سے اس کے منہ پر وار کیا۔ ضرب اس کی ناک پر لگی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا رہا تھا۔ اس کی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر بڑی تیزی سے گھوم کر سائڈ کک لگا دی۔ وہ چیخ کر نیچے گرا۔

"اٹھو......" میں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کیا لیکن میں نے اس کی کلائی پکڑ کر پوری قوت سے مروڑ دی۔ وہ کراہتا ہوا گھوم گیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ بازو میری گرفت میں تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے بازو کو گرفت میں لیے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کے جوڑ پر کھڑی ہتھیلی کا وار کردیا۔ اس وار سے میں چھ انچ موٹی ٹھوس کنکریٹ کی سلیب توڑ دیا کرتا تھا۔ وہ تو گوشت و پوست کا آدمی تھا۔ کڑک کی آواز کے ساتھ اس کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ ایک بار پھر بلبلا اٹھا۔ میں نے اس کے کولھے پر کک لگاتے ہوئے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل گرا۔

ماسٹر ہوچن اور دوسرے لڑکے دلچسپ نظروں سے یہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ میرا حریف چند لمحے زمین پر پڑا رہا پھر کراہتا ہوا اٹھ گیا۔ اس کا دایاں بازو پہلو میں جھول گیا تھا اور چہرے پر بے پناہ کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ شاید اس پر جنون طاری ہوگیا تھا۔ وہ لٹکے ہوئے بازو کی پروا کیے بغیر الٹے ہاتھ سے اور پاؤں کی ٹھوکروں سے حملے کررہا تھا لیکن ایک تو وہ مارشل آرٹسٹ نہیں تھا۔ اسٹریٹ فائٹر تھا اور اسٹریٹ فائٹنگ میں کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہوتا۔ دوسرے اس لڑائی میں دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے مگر اس پر جنون سا طاری ہوگیا تھا اور جنون میں ہوش و حواس کام نہیں کرتے۔

کرسی پر بندھا ہوا شانگ بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ خوف

سے اس کا چہرہ بھی پیلا ہو رہا تھا۔ میں اپنے حریف کو پیٹتا ہوا مکان سے باہر لے آیا۔ میں نے اسے ایک اور کک لگائی تو وہ ایک بار پھر منہ کے بل گر گیا۔

"وہ درخت دیکھ رہے ہو؟" میں نے تقریباً دس گز دور ایک درخت کی طرف اشارہ کیا "زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے اور تم تو اس وقت زندگی کے لیے نجانے کیسی کیسی دعائیں مانگ رہے ہوگے۔ اگر تم دوڑتے ہوئے اس درخت تک پہنچ جاؤ تو تمہیں زندگی مل سکتی ہے۔ اب اٹھ کر جتنا تیز دوڑ سکتے ہو، دوڑ کر اس درخت تک پہنچ جاؤ۔"

وہ چند لمحے زمین پر پڑا رہا پھر اٹھ کر میری طرف دیکھا۔ اس وقت وہ مجھ سے دو گز کے فاصلے پر تھا اور پھر اچانک ہی وہ درخت کی طرف دوڑ پڑا۔

اس نے ابھی آدھا راستہ طے کیا تھا کہ میں نے قریب کھڑے ہوئے لڑکے سے رائفل جھپٹ لی اور فائر کھول دیا۔ تاریک اور خاموش فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ فائرنگ کی آواز میں اس شخص کی آخری چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں نے پورا برسٹ مارا تھا اور اس کا جسم چھلنی ہوگیا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور رائفل اسی لڑکے کو تھما کر مکان کے اندر واپس آگیا۔

کرسی پر بندھے ہوئے شانگ کے چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے وہ اپنے ساتھی کا انجام سمجھ چکا تھا اور شاید اسے اپنا انجام بھی سامنے نظر آرہا تھا۔

شانگ سے اب تک کئی مرتبہ آمنا سامنا ہوچکا تھا۔ وہ کئی مرتبہ پٹا تھا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا تھا لیکن آج اس کے بھاگنے کا کوئی چانس نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ آج اس کی خیر نہیں۔

ماسٹر ہوچن کے خیال میں دارا وغیرہ بھی اسی نواح میں کسی جگہ چھپے ہوئے تھے اور شاید انہیں بھی پتا چل گیا تھا کہ تمام راستوں کی نگرانی کی جارہی ہے اسی لیے کہیں دُبکے بیٹھے تھے لیکن جب شانگ سے پوچھ گچھ شروع ہوئی تو وہ کوئی اور ہی کہانی سنانے لگا۔

"دارا، کم اور چی فانگ دو دن پہلے سونگ بھائی کی طرف نکل گئے تھے۔ وہ اب تک بنکاک پہنچ چکے ہوں گے۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکتے اور تم تو دارا کے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتے۔ میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ وہ لوگ کہاں ہیں؟" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ مت سمجھنا کہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی رعایت برتی جائے گی۔ تمہارے ایک ساتھی کی لاش باہر پڑی ہے۔ اگر تم نے زبان نہ کھولی تو تمہارا بھی یہی حشر ہوگا اور تمہاری لاش کو بھی کتے اور بھیڑیے کھا جائیں گے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ لوگ یہاں سے جا چکے ہیں۔" شانگ نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور ماسٹر ہوچن کی طرف دیکھنے لگا۔

"ماسٹر! تم شاید اس کے بارے میں پوری طرح نہیں جانتے۔ یہ وہ آدمی ہے جس کے ذریعے دارا گولڈن ٹرائی اینگل سے رابطہ بڑھانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کا منصوبہ شاید گولڈن ٹرائی اینگل سے وسیع پیمانے پر ہیروئن کی اسمگلنگ کا ہے۔ پیڈرو تو دارا کے کہنے پر دس ہزار ڈالر اس منصوبے کے ابتدائی مرحلے پر بطور ایڈوانس خرچ بھی کر چکا ہے لیکن ابھی ان کی بات فائنل نہیں ہوسکی۔"

"اوں۔" ماسٹر ہوچن کے منہ سے بے اختیار نکلا "اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے ہیروئن کی اسمگلنگ کے علاوہ ان لوگوں کا ایک اور بھی منصوبہ ہے جو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے اسی لیے میں دارا کو اس کے بل سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ اب یہ میرے دو سوالوں کے جواب دے گا۔ ایک تو یہ کہ دارا کہاں چھپا ہوا ہے اور نمبر دو، اس دوسرے منصوبے میں اور کون کون لوگ شامل ہیں؟"

"مم.... میں کسی دوسرے منصوبے کے بارے میں نہیں جانتا۔" شانگ کے چہرے پر وحشت سی پھیل گئی "میں صرف مڈل مین ہوں۔ دارا کو گولڈن ٹرائی اینگل لے جا کر جنرل کھوراٹ سے ملوانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے معاوضہ دیا گیا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ انہوں نے ہیروئن کی اسمگلنگ کا کوئی منصوبہ بنا رکھا ہے۔"

ماسٹر ہوچن نے اچانک ہی اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ شانگ کراہ اٹھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی دھار بہہ نکلی تھی۔

"میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔" ماسٹر ہوچن غرایا "ہیروئن کی ڈیل کے علاوہ دوسرے منصوبے میں کون کون لوگ شامل ہیں؟"

"مم... میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" شانگ کا لہجہ رو دینے والا تھا "میں بہت نچلی سطح کا آدمی ہوں۔ میں نے تو آج تک جنرل کھوراٹ کو بھی نہیں دیکھا۔ مجھے میرے باس سے حکم ملا تھا کہ دارا سے رابطہ کروں اور اسے گولڈن ٹرائی اینگل لے جاؤں جہاں جنرل کھوراٹ سے اس کی ملاقات کروائی جائے گی۔"

"تمہارا باس کون ہے؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"فانگ پھن۔" شانگ نے جواب دیا "اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ جنرل کھوراٹ تک اس کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اسے بھی کسی اور کے توسط سے یہ حکم ملا ہوگا۔"

"تم اب تک دارا کو گولڈن ٹرائی اینگل لے کر کیوں نہیں گئے حالانکہ تمہیں بنکاک آئے ہوئے دو تین مہینے ہوچکے ہیں؟"

ماسٹر نے پوچھا۔

"دارا کی اپنی کچھ مصروفیات ہیں۔" شانگ نے کہا "یہاں تمہارے اس ٹل ماسٹر نے اسے الجھا رکھا ہے۔ دارا نہیں چاہتا کہ یہ اس کا پیچھا کرتے ہوئے گولڈن ٹرائی اینگل تک پہنچ جائے۔ پہلے وہ اس سے نمٹنا چاہتا ہے۔ پیڈرو تو اسے بہت پہلے ختم کرچکا ہوتا مگر دارا کو اب کسی ڈائری کی تلاش ہے جس میں لاکھوں امریکی ڈالر مالیت سونے کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ پہلے اس سے ڈائری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد اسے ختم کردیا جائے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "چند روز پہلے یہ ہماری گرفت میں آگیا تھا۔ اس کی زبان کھلوانے کا بھی بندوبست کرلیا گیا تھا لیکن عین وقت پر تمہاری مداخلت سے یہ ایک بار پھر بچ گیا۔"

"کیا تم لوگ اسے ایسا ہی تر نوالہ سمجھتے ہو جسے آسانی سے نگلا جاسکے؟" ماسٹر ہوچن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو وہ لوگ اپنے منصوبے پر عمل شروع کرچکے ہوتے۔ پیڈرو تو سب سے پہلے اسے ختم کرنا چاہتا تھا لیکن دارا نے بیچ میں اس ڈائری کا شوشہ چھوڑ دیا اور جب پیڈرو کو یہ پتا چلے گا کہ یہ مکمل طور پر دارا کے قبضے میں آنے کے بعد نکل چکا ہے تو پیڈرو پاگل ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے اسی بات پر دارا سے اس کا جھگڑا بھی ہوجائے۔ پیڈرو اب کسی قیمت پر اسے معاف نہیں کرے گا۔ اس نے نہ صرف پیڈرو کے دوست ٹائیگر کو بلکہ اس کے بھائی سامی کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سامی کے قتل کے بعد سے تو وہ پاگل ہوا پھر رہا ہے۔"

"یہ تو تم اعتراف کرتے ہو کہ یہ خطرناک آدمی ہے۔" ماسٹر ہوچن نے مسکراتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "اگر تمہیں اسی کے حوالے کردیا جائے تو کیسا رہے؟"

"نہیں۔ میں اس جیسے سفاک آدمی کے ہاتھوں مرنا پسند نہیں کروں گا۔" شانگ نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اور خوف ابھر آیا تھا۔

"تو پھر۔ یہ بتا دو' دارا اور اس کے ساتھی کہاں چھپے ہوئے ہیں؟" ماسٹر ہوچن نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"مم.... میں بتا چکا ہوں کہ وہ تینوں دو تین دن پہلے سونگ پھانی کی طرف نکل گئے تھے۔" شانگ نے جواب دیا۔

"ٹل ماسٹر۔" ماسٹر ہوچن میری طرف مڑ گیا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت دیر سے بے چین ہو رہے ہو۔ اب تمہیں میری طرف سے اجازت ہے۔"

میں دو قدم آگے بڑھ آیا۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

شانگ کے سامنے پہنچ کر میں نے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھول دی اور انگلیوں کو حرکت دیتے ہوئے شانگ کی طرف دیکھنے لگا اور پھر جیسے ہی میں نے ہاتھ اوپر اٹھایا' وہ چیخ اٹھا۔

"بب.... بتاتا ہوں۔ رک جاؤ۔"

میرا ہاتھ یکایک انداز میں رک گیا۔

"گڈ۔" ماسٹر ہوچن بولا "اب جلدی سے زبان کھول دو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"وہ تینوں ہائی کھامن آبشار کے قریب ایک بڑے فیملی کاٹیج میں چھپے ہوئے ہیں۔" شانگ بتانے لگا "اس کاٹیج میں دو جوان لڑکیوں' ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھے مرد پر مشتمل یورپین فیملی رہائش پذیر ہے۔ یہ کاٹیج انہوں نے بیس دن کے لیے کرائے پر لے رکھا ہے۔ دارا وغیرہ نے اس یورپین فیملی کو یرغمال بنالیا ہے۔ ویسے ان یورپین لوگوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن انہیں جب بھی باہر جانا ہوتا ہے' دارا اور اس کے ساتھی ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کو اپنے قبضے میں رکھتے ہیں اور انہیں دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر ان کے بارے میں کسی کو بتایا گیا تو اس لڑکی کو قتل کردیا جائے گا جو ان کے قبضے میں ہوگی۔ دارا وغیرہ یہ بھی جانتے ہیں کہ چاروں طرف ان کی تلاش ہو رہی ہے۔ جیسے ہی تلاش کا یہ سلسلہ ختم ہوگا' وہ لوگ وہاں سے نکل جائیں گے۔"

"تم وہاں سے کیسے نکل آئے۔ کیا تمہیں پکڑے جانے کا خوف نہیں تھا؟" ماسٹر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کل صبح دارا نے اس کاٹیج کے فون سے چیانگ رائے میں میرے باس فانگ چھن سے بات کی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ مجھے کسی طرح وہاں سے نکال دیا جائے کیونکہ مجھے کسی کام سے گولڈن ٹرائی اینگل بھیجا جانے والا ہے۔" شانگ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "دارا نے آج شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مجھے اپنے دو آدمیوں کے ساتھ رخصت کردیا۔ ہم کاٹیج میں رہائش پذیر یورپین باشندوں کی گاڑی لے آئے تھے لیکن یہاں سے تقریباً دو میل دور گاڑی کا پیٹرول ختم ہوگیا۔ میرے ساتھ دونوں گن مینوں کا بھی یہی خیال تھا کہ ہم اس طرف سے شارٹ کٹ کرکے نکلیں تو دریا پار کرکے کسی اور محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے لیکن ہمیں کیا پتا تھا کہ تمہارے آدمی قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ ہم جیسے ہی اس طرف آئے' انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک آدمی تو بھاگ جانے میں کامیاب ہوگیا لیکن ہم دھر لیے گئے۔"

"وہ کاٹیج کہاں پر واقع ہے؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"آبشار کے شمال کی طرف تقریباً نصف میل کے فاصلے پر۔" شانگ نے جواب دیا "وہ ایک بڑا فیملی کاٹیج ہے اور اس پر سترہ نمبر لکھا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور اپنے دو لڑکوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں لڑکے شانگ کو کھول کر باہر لے جانے لگے تو وہ مزاحمت کرتے ہوئے چیخنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ پہلے وہ چیخ چیخ کر معافی مانگتا رہا پھر مغلظات بکنے لگا۔ وہ دونوں لڑکے اسے گھسیٹتے ہوئے مکان سے باہر لے گئے اور کچھ ہی دیر بعد فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ شانگ اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

○☆○

دریائے کھوئے نوئے جسے عام طور پر چھوٹا "کوائے ریور" بھی کہا جاتا ہے' ایمفو سیوک سے ہوتا ہوا ایمفو سائی ساوٹ کی طرف بہتا ہے۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اس کے راستے میں لاتعداد چھوٹے بڑے آبشار ہیں جو ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے لیے دلچسپ تفریح فراہم کرتے ہیں۔ مقامی باشندوں نے اس دریا کے آس پاس خصوصاً آبشاروں کے قریب ہٹ اور کاٹیج وغیرہ بنا رکھے ہیں جو سیاحت کے سیزن میں غیر ملکی سیاحوں کو کرائے پر دے دیے جاتے ہیں۔

ہائی کھامن آبشار تک پہنچنے کے لیے دو راستے ہیں۔ سڑک اور دریا۔ کشتیوں کی آمد و رفت شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی بند ہوجاتی ہے جبکہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد اس طرف آنے والی بسیں بھی بند ہوجاتی ہیں۔ دن کے وقت دریائی راستہ عام طور پر چالیس منٹ میں طے ہوجاتا ہے۔ رات کے وقت لوگ کشتیوں پر سفر نہیں کرتے لیکن بعض مہم جو لوگ تاریکی یا میں رات کے وقت بھی یہ خطرہ مول لے لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ فاصلہ طے کرنے میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹا ضرور لگ جاتا ہے۔

اس کشتی میں میرے علاوہ چار آدمی اور تھے۔ ماسٹر ہوچن اور اس کے ساتھ تین گن مین۔ گزشتہ رات شانگ نے بتایا تھا کہ دارا وغیرہ آبشار سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر سترہ نمبر کاٹیج میں چھپے ہوئے ہیں۔ ماسٹر ہوچن نے اپنا ایک آدمی آج صبح سویرے ہی اس طرف بھیج دیا تھا جو دن بھر نگرانی کرنے کے بعد شام کو واپس لوٹا تھا۔ اس کی رپورٹ نے شانگ کے بیان کی تصدیق کردی تھی۔ انہوں نے چار افراد پر مشتمل یورپین فیملی کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ان میں سے کسی نے خود تو کبھی کاٹیج کے باہر جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا البتہ ان یورپین باشندوں کو باہر آتے جاتے دیکھا گیا تھا لیکن وہ بھی تمام افراد اکٹھے باہر کبھی نہیں گئے تھے۔ ان کے ساتھ کبھی ایک لڑکی کاٹیج میں رہ جاتی اور کبھی دوسری جس کا مطلب تھا کہ دونوں میں سے کسی ایک لڑکی کو یرغمال بنا کر رکھا جاتا تھا جبکہ دوسرے لوگوں کو باہر آنے جانے کی اجازت تھی۔

ماسٹر ہوچن کے آدمی کی رپورٹ کے مطابق وہ فرانسیسی تھے اور ہر وقت خوف زدہ سے رہتے تھے۔ کوئی اور ان کے خوف زدہ ہونے کی وجہ سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو لیکن ہم جانتے تھے کہ وہ خطرناک قاتلوں کے شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ ان کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتے تھے کہ کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ان کی معمولی سی غلطی ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

ماسٹر کا جو آدمی دن بھر اس علاقے کی نگرانی کرتا رہا تھا وہ بھی اس وقت ہمارے ساتھ کشتی پر سوار تھا۔ اسے کاٹیج کی نشان دہی کے لیے ساتھ لے لیا گیا تھا۔ کشتی دریا کے بہاؤ کے رخ پر بہہ رہی تھی اس لیے اسے کھینے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

رات کی تاریکی میں اس دریا میں کشتی رانی خاصا خطرناک کام تھا۔ وہ دونوں آدمی جو چپو سنبھالے ہوئے تھے' بڑی احتیاط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس احتیاط کی وجہ سے ہی ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اپنا سفر مکمل کرسکے تھے۔ کشتی کو لینڈنگ پر چھوڑ کر ہم اپنے مخبر کی رہنمائی میں پہاڑی راستوں پر چلنے لگے۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کاٹیج تھے اور تقریباً ہر کاٹیج میں روشنی نظر آرہی تھی۔ اس علاقے میں سیاحوں کی سہولت کے لیے دو تین ریسٹورنٹ بھی تھے اور تینوں ریستورانوں میں اس وقت خاصی رونق نظر آرہی تھی۔

سب سے آگے ہمارا مخبر تھا۔ اس کے پیچھے ایک گن مین پھر میں اور ماسٹر ہوچن اور سب سے پیچھے ایک اور گن مین تھا۔ ماسٹر کے تینوں آدمیوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ میرے اور ماسٹر کے پاس پستول تھے۔ میری پنڈلی سے خنجر بھی بندھا ہوا تھا۔ ہم ایک ریسٹورنٹ کی پچھلی طرف سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئے لیکن ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ فائرنگ کی آواز سن کر چونک گئے۔

"فائرنگ کی آوازیں اسی طرف سے آرہی ہیں۔" ہمارے مخبر نے چیخ کر کہا۔

فائرنگ کی آوازوں سے یوں لگتا تھا جیسے دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہو۔ میں اور ماسٹر ہوچن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے لیکن تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رک جانا پڑا۔

وہ کاٹیج اب ہماری نظروں کے سامنے تھے۔ باہر دو اطراف سے کاٹیج پر فائرنگ کی جارہی تھی اور کاٹیج کی طرف سے بھی فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمارا آگے جانا بے کار تھا۔ ہم وہیں درختوں کی آڑ میں رک گئے۔

فائرنگ کے ساتھ عورتوں کی چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پھر یوں لگا جیسے فائرنگ کی آوازیں کاٹیج کی پچھلی طرف دور ہوتی جارہی ہوں۔ یہ آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئیں۔ کچھ دیر تک اِکا دُکا آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر وہ بھی بند

ہو گئیں۔

ہم کچھ دیر درختوں ہی میں کھڑے رہے اور پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے ایک بار پھر رک گئے۔ وہاں سے وہ کاٹیج صاف نظر آرہا تھا۔ برآمدے میں جلنے والے بلب کی روشنی میں پولیس کی وردیوں میں دو آدمی دکھائی دیے تو ساری بات سمجھ میں آگئی۔

"تم لوگ واپس جاؤ اور کشتی پر ہمارا انتظار کرو۔" ماسٹر ہوچن نے اپنے تینوں آدمیوں کو حکم دیا۔

یہ جگہ چونکہ آبشار سے کافی دور تھی اس لیے یہاں کاٹیج بھی زیادہ نہیں تھے۔ دوسرے کاٹیجز میں رہائش پذیر لوگ اب آہستہ آہستہ اپنے کمروں سے باہر نکل رہے تھے۔ وہ سب اسی طرف دیکھ رہے تھے لیکن آگے جانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

میں اور ماسٹر ہوچن اس کاٹیج کے سامنے پہنچ گئے۔ تقریباً ڈیڑھ درجن پولیس والوں نے اس کاٹیج کو گھیر رکھا تھا۔ اندر سے عورتوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم مزید آگے بڑھے تو دو پولیس والوں نے ہمیں رائفلوں کی زد پر لیتے ہوئے رک جانے کا حکم دیا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک کانسٹیبل رائفل جھکاتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔ اس نے رائفل زمین پر رکھ کر ماسٹر کو بو (BOW) مارشل آرٹس کا مروجہ سلام یا تعظیم دینے کا انداز) کیا پھر رائفل اٹھا کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

"سوری ماسٹر! لیکن مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔"

وہ کانسٹیبل ماسٹر ہوچن کا شاگرد تھا۔ تقریباً تین سال پہلے اس نے بنکاک میں ماسٹر ہوچن ہی سے موئے تھائی کی تربیت حاصل کی تھی اور پھر یہاں آکر پولیس میں بھرتی ہو گیا تھا۔

"ہم شام سے کچھ پہلے تفریح کے لیے یہاں آئے تھے۔ کچھ اور دوست مل گئے۔ ان سے گپ شپ میں دیر ہو گئی۔ کشتی پر واپس جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ کیا قصہ ہے؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"انسپکٹر سوچان کو خفیہ طور پر اطلاع ملی تھی کہ کچھ مسلح لوگوں نے اس کاٹیج میں ایک فرانسیسی فیملی کو یرغمال بنا رکھا ہے۔" کانسٹیبل نے بتایا "ہم نے بڑی احتیاط سے اس کاٹیج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا۔ فائرنگ شروع کر دی۔ جواب میں انسپکٹر سوچان نے بھی فائرنگ کا حکم دے دیا۔"

"انسپکٹر سوچان کون؟" ماسٹر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ بھی پانچ سال پہلے بنکاک میں ماسٹر چوپھانگ سے ٹریننگ لے چکا ہے۔ مسٹر ری کے جنازے پر اس نے آپ سے ملاقات بھی کی تھی۔" کانسٹیبل نے بتایا۔

"ذہن میں نہیں آرہا۔ چہرہ دیکھوں گا تو پہچان لوں گا۔" ماسٹر نے کہا۔

"میں انسپکٹر کو اطلاع دیتا ہوں۔" کانسٹیبل تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کاٹیج میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد انسپکٹر سوچان بھی اس کے ساتھ باہر آگیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ماسٹر ہوچن نے اسے پہچان لیا۔ اس نے پہلے ماسٹر کو بو کیا اور پھر آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے ماسٹر اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

ماسٹر نے انسپکٹر سوچان سے اس ریڈ کے بارے میں استفسار کیا اور پھر وہ ہمیں اندر لے گیا۔ صورتِ حال نہایت افسوسناک تھی۔ ایک کمرے میں اس فیملی کے سربراہ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ تھی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ ایک گردن پر اور ایک سینے پر۔ زخموں سے بہنے والا خون فرش پر پھیل رہا تھا۔ اس کے قریب ہی دو عورتیں بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ ایک کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ یہ اس مقتول بوڑھے کی بیوی بلکہ اب بیوہ تھی۔ دوسری ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی تھی جس کی عمر کا اندازہ چوبیس پچیس کے لگ بھگ لگایا جا سکتا تھا۔ بے حد حسین تھی وہ۔ اس نے فیروزی کلر کا منی اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ان دونوں کی حالت خاصی ابتر تھی۔ لگتا تھا جیسے رو رو کر اپنے آپ کو ختم کر لیں گی۔

ان کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔ میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شانگ نے بتایا تھا کہ یہ فیملی چار افراد پر مشتمل تھی۔ میاں بیوی اور دو جوان لڑکیاں لیکن دوسری لڑکی نظر نہیں آرہی تھی۔ انسپکٹر سوچان ماسٹر کو اس ریڈ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تمہاری اطلاع کے مطابق وہ تین آدمی تھے جنہوں نے اس فیملی کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ہم نے ریڈ کی منصوبہ بندی تو بڑی احتیاط سے کی تھی لیکن انہیں شاید پہلے ہی سے شبہ ہو گیا تھا اور وہ مقابلے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔"

انسپکٹر سوچان جس طرح اس واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا چغد تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں تین خطرناک مسلح آدمی موجود ہیں اور وہ اس طرح دوڑا تھا جیسے وہ لوگ پولیس کو دیکھتے ہی ہتھیار پھینک کر باہر آجائیں گے اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں گے۔

"اس بوڑھے کے سوا کوئی اور جانی نقصان تو نہیں ہوا؟" ماسٹر نے پوچھا۔ اس کے ذہن میں بھی وہی بات تھی جو میں سوچ رہا تھا۔ وہ دوسری لڑکی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن ایسا کوئی سوال براہِ راست نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ گفتگو تھائی زبان میں ہو رہی تھی تاکہ وہ عورتیں نہ سمجھ سکیں۔

"وہ لوگ ایک جوان لڑکی کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔" انسپکٹر سوچان نے جواب دیا "ہمارے نصف درجن آدمی ان کے تعاقب میں ہیں۔ امید ہے اس لڑکی کو بازیاب کرا لیا جائے گا۔"

میں انسپکٹر سوچان کی اس سادگی پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے تو اب اس لڑکی کی زندگی بھی خطرے میں نظر آرہی تھی۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹا وہاں کھڑے رہے۔ انسپکٹر نے ماسٹر کو بتایا تھا کہ اس نے پولیس ہیڈ کوارٹر کو فون پر اطلاع دے دی ہے۔ کچھ دیر میں پولیس کی مزید نفری اور ایمبولینس پہنچنے والی ہے۔ ہمارے لیے وہاں رک کر وقت ضائع کرنا بے کار تھا۔ انسپکٹر سوچان نے ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیا تھا اور اس کی حماقت کی وجہ سے دارا اور اس کے ساتھی ایک بار پھر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

"ایک منٹ ماسٹر۔" کاٹیج سے باہر آکر انسپکٹر نے ہمیں روک لیا "کیا یہ وہی نوجوان نہیں جس کی وجہ سے کنچن بوری میں کئی روز سے یہ ہنگامے ہو رہے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا اور ماسٹر کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "اس وقت یہاں آپ دونوں کی موجودگی مجھے شبہات میں مبتلا کر رہی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق پیڈرو کے آدمی بھی کنچن بوری میں موجود ہیں اور آج صبح سونگ چھائی کی طرف جانے والے راستے سے ہٹ کر ایک خالی فارم ہاؤس کے قریب دو آدمیوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں بھی ملی ہیں اور ان میں سے ایک لاش چیانگ رائے کے فانگ پھن کے آدمی کی ہے۔ فانگ پھن کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ طوفان اٹھا دے گا۔"

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان دونوں کو ہم نے قتل کیا ہے اور یہاں بھی ہمارا تعلق اس کاٹیج سے کچھ ہو سکتا ہے؟" ماسٹر نے اسے گھورا۔

"بالکل نہیں ماسٹر۔" انسپکٹر سوچان نے کہا "یہاں کئی روز سے اس قسم کے ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ماسٹر ری بھی غالباً اسی چکر میں مارا جا چکا ہے۔ ان ہنگاموں کے حوالے سے اخبارات برملا تمہارے اس لٹل ماسٹر، پیڈرو اور اس کے ایک آدمی دارا کا نام لے رہے ہیں۔ آج صبح فانگ پھن کی لاش ملنے کے بعد پولیس کے افسرانِ اعلیٰ کی ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ میں تو اس میٹنگ میں شریک نہیں تھا لیکن کارروائی سے بے خبر نہیں ہوں۔"

ماسٹر ہوچن کچھ بولنے کے بجائے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ انسپکٹر نے کہا۔

"لٹل ماسٹر کے خلاف ان ہنگاموں میں ملوث ہونے کا اگرچہ کوئی ٹھوس ثبوت ابھی تک نہیں ملا لیکن میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا ہے کہ ماسٹر ری کے جمنازیم اور اخبارات کے ذریعے لٹل ماسٹر کو یہ وارننگ دی جائے کہ وہ مزید کوئی ہنگامہ کیے بغیر کنچن بوری سے نکل جائے۔ بصورت دیگر اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کر دیے جائیں اس لیے میری یہ درخواست ہے کہ لٹل ماسٹر کنچن بوری سے چلا جائے کیونکہ اب معاملہ بہت اوپر تک پہنچ چکا ہے۔"

"او کے۔" ماسٹر ہوچن گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "میں تمہاری بات پر غور کروں گا انسپکٹر۔"

"انسپکٹر نہیں ماسٹر، سوچان۔" انسپکٹر جلدی سے بولا۔

"تھینک یو سوچان۔" ماسٹر نے یہ کہتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور ہم وہاں سے رخصت ہو گئے۔

تینوں آدمی کشتی میں ہمارے منتظر تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی کشتی کی رسی کھول دی گئی اور دو لڑکے چپو چلانے لگے۔

راستے میں ماسٹر ہوچن اور میرے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ کنچن بوری کی لینڈنگ پر ہم کشتی سے اتر کر اس کار میں سوار ہو گئے جو وہاں چھوڑ گئے تھے۔ ان تینوں لڑکوں کو ری کے جمنازیم پر چھوڑ کر ہم لیزا والی کوٹھی میں آگئے۔

دارا وغیرہ ہمارے ہاتھ سے نکل گئے تھے لیکن ہمارے لیے صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں مہاراج سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ آپس میں مشورہ کرنے کے بعد ماسٹر فون پر مہاراج سے باتیں کرنے لگا۔ تقریباً پانچ منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔

"مہاراج کا کہنا ہے کہ پولیس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تین دن وہاں رہیں۔ اس دوران میں دارا اور اس کے ساتھیوں کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہیں اور پھر بنکاک واپس چلے جائیں۔" ماسٹر نے کہا۔

"او کے ماسٹر۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

ماسٹر ہوچن چلا گیا اور میں پرساد اور جانکی وغیرہ کو کاٹیج پر پولیس کے ریڈ اور دارا وغیرہ کے فرار کی تفصیل بتا کر انسپکٹر سوچان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔

"ہمیں پولیس سے الجھنے کی واقعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میرے خاموش ہونے پر جانکی نے کہا "میرا خیال ہے اب دارا وغیرہ بھی یہاں نہیں نکلیں گے کیونکہ پولیس ان کے پیچھے لگ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آج رات ہی یہاں سے نکل جائیں۔"

"بہرحال، ہمیں تین دن یہاں گزارنے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اور موضوع تھا بھی نہیں۔

صبح اخبارات سنسنی خیز خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہیڈ لائن ہائی کھامین آبشار کے قریب اس کاٹیج پر پولیس کے چھاپے کے حوالے سے تھی۔ بوڑھے فرانسیسی کی لاش، اس کی بیوی اور بیٹی کی تصویریں بھی تھیں۔ اخبارات نے انسپکٹر سوچان کا یہ بیان بھی نمایاں طور پر شائع کیا تھا کہ کاٹیج میں اس فرانسیسی فیملی کو یرغمال

بتانے والے بنکاک کے بہت بڑے بدمعاش پیڈرو کے آدمی تھے۔ اس نے اپنے بیان میں دارا کا نام بھی لیا تھا اور بوڑھے فرانسیسی کے قتل اور اس کی بیٹی کے اغوا کی ذمّے داری بھی دارا پر ہی ڈال دی تھی۔

کاٹیج پر بھونڈے انداز میں چھاپا مار کر انسپکٹر سوچان نے اگرچہ نہایت حماقت کا ثبوت دیا تھا لیکن وہاں میری اور ماسٹر ہوچن کی موجودگی سے اس نے دارا کے حوالے سے جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ سو فی صد درست تھا۔

اخبارات کے صفحۂ اول پر اسی حوالے سے چھوٹی چھوٹی کئی سنسنی خیز خبریں تھیں جن میں ایک خبر یہ بھی تھی کہ پولیس کے درجنوں جوان رات بھر ان پہاڑیوں میں میلوں دور تک فرار ہونے والوں کو تلاش کرتے رہے لیکن نہ تو ان کا کوئی سراغ ملا تھا اور نہ ہی اس فرانسیسی لڑکی کا کچھ پتا چلا تھا جسے یرغمال بنا کر وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اخبارات نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید اس لڑکی کو بھی ختم کردیا جائے۔

تمام اخبارات کے صفحۂ اول پر میرے نام وہ نوٹس بھی چھپا تھا جس میں مجھے تین دن کے اندر اندر شہر سے چلے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

دوپہر کو اغوا شدہ فرانسیسی لڑکی کے بارے میں بھی میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی۔ کنچن بوری سے شام کو شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد چار تھی اور یہ چاروں اخبار عام طور پر بارہ بجے مارکیٹ میں آجایا کرتے تھے۔ ان چاروں اخبارات کی ہیڈ لائن ایک ہی تھی۔ کاٹیج سے اغوا کی جانے والی لڑکی کو قتل کردیا گیا تھا۔ اس کی لاش کنچن بوری سے میلوں دور بان پونگ سے بھی آگے پھوتھا رام کی طرف جانے والی سڑک کے قریب دھان کے کھیتوں میں ملی تھی۔ اس لاش کی اطلاع صبح چھ بجے کے قریب ایک کاشت کار نے مقامی پولیس کو دی تھی اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اس امر کی تصدیق ہوگئی تھی کہ یہ اسی فرانسیسی لڑکی کی لاش تھی جسے تین خطرناک مجرم کاٹیج سے اغوا کرکے فرار ہوئے تھے اور پولیس مجرموں اور اس لڑکی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ اخبارات کی اطلاع کے مطابق لڑکی کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس پر متعدد مجرمانہ حملے بھی کیے گئے تھے۔

اس خبر سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ دارا اور اس کے دونوں ساتھی رات ہی کو کنچن بوری کی حدود سے نکل گئے تھے۔ جہاں سے لاش ملی تھی وہ جگہ کنچن بوری سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلے پر تھی اور ظاہر ہے وہ لوگ رات ہی رات میں اتنا طویل فاصلہ پیدل طے نہیں کرسکتے تھے جس کا مطلب تھا کہ ان کے پاس سواری کا انتظام تھا۔ انہوں نے یا تو پہلے ہی سے کوئی گاڑی پہاڑیوں میں کہیں چھپا رکھی تھی یا کوئی گاڑی کسی سے چھینی گئی تھی۔ بہرحال، اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ دارا اور اس کے ساتھی اب کنچن بوری میں نہیں تھے۔ انہوں نے ... اختیار کیا تھا اسے دیکھتے ہوئے مجھے یہ اندازہ لگانے میں ... پیش نہیں آئی کہ وہ لوگ بان پونگ سے ہوتے ہوئے راج ... اور وہاں سے طویل چکر کاٹتے ہوئے بنکاک کی طرف نکل ... اور اب تک یقیناً کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ چکے ہوں گے۔

اب ہمارے لیے کنچن بوری میں پڑے رہنا واقعی ... میں نے ماسٹر ہوچن کو فون کیا تاکہ اسے صورتِ حال بتا کر ... پروگرام بنایا جاسکے۔ ماسٹر ہوچن نے بھی دوپہر کے اخبار ... لیے تھے۔

"ابھی نہیں۔" اس نے میری بات سننے کے بعد کہا ... رات ہی بنکاک میں فرانسیسی سفارت خانے کو ان واقعہ ... اطلاع مل گئی تھی۔ بعض سفارت کار صبح سویرے ہی کنچن ... پہنچ گئے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد صبح دس بجے انہیں اس ... لاش کے بارے میں اطلاع ملی تھی۔ فرانسیسی سفارت کار ... برہم ہیں۔ مقامی پولیس اپنی کارکردگی دکھانے میں مصروف ... اگرچہ یہ شواہد مل گئے ہیں کہ دارا وغیرہ کنچن بوری کی حدو... موجود نہیں ہیں لیکن پولیس نے شہر سے باہر جانے والے ... راستوں کی ناکا بندی کر رکھی ہے۔ بڑی سخت چیکنگ ہو رہی ... پولیس کو شبہ ہے کہ دارا وغیرہ اکیلے نہیں ہوں گے انہوں نے ... مقامی غنڈوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہوں گی اور پولیس کو ... ایسے ہی آدمیوں کی تلاش ہے۔ شہر میں بھی چیکنگ ہو رہی ہے ... مشتبہ افراد کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی جارہی ہے ... صورتِ حال میں تمہارے لیے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ بہتر یہ ... کہ ایک دو دن آرام کرلو۔ چیکنگ کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ہم ... سے نکل چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر۔ اب آرام ہی کیا جائے گا۔" میں نے ... کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

اور ظاہر ہے ہمارے پاس آرام کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ... تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد لیزا تیار ہو کر اپنے مساج پارلر چلی ... گئی۔ دو دن سے وہ بھی ہمارے ساتھ مکان میں بند رہی تھی۔ دارا ... اور اس کے دو تین ساتھیوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ہمارا لیزا سے ... کوئی تعلق ہے۔ شانگ اور اس کے دو ساتھی مارے گئے تھے ... دارا وغیرہ فرار ہوگئے تھے اور میرے خیال میں لیزا کو اب کوئی خطرہ ... نہیں تھا اس لیے وہ میرے مشورے پر ہی اپنے مساج پارلر جانے ... آمادہ ہوئی تھی۔ اس کے مساج پارلر پر اگرچہ کام کرنے والی اور ... لڑکیاں بھی تھیں اور لیزا نے فون پر ان سے رابطہ بھی رکھا ہوا ... لیکن اس کی عدم موجودگی سے اس کے بزنس پر اچھا خاصا اثر پڑ ... تھا اس لیے آج وہ میرے کہنے پر چلی گئی تھی۔

شام آٹھ بجے کے قریب ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی ... پولیس نے پاٹھم کو شک کی بنا پر حراست میں لے لیا تھا۔ پاٹھم ...

سے الگ ہی تھا اور ایک گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھا۔ اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ پولیس مشتبہ افراد کو چیک کرتی پھر رہی ہے۔ پولیس کو اطلاع ملی تھی کہ بنکاک سے تعلق رکھنے والا سوکھٹ نام کا ایک شخص اس گیسٹ ہاؤس میں موجود ہے۔ سوکھٹ کرائے کا قاتل تھا۔ وہ کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس کی بھاری نفری نے شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اس گیسٹ ہاؤس کو گھیرے میں لے لیا۔ سوکھٹ تو پولیس کو نہیں ملا البتہ پولیس نے تین آدمیوں کو مشتبہ قرار دے کر پوچھ گچھ کے لیے حراست میں لے لیا تھا اور ان تینوں میں پاٹھم بھی تھا۔

یہ اطلاع مجھے لیزا نے فون پر دی تھی۔ وہ گیسٹ ہاؤس اس کے مساج پارلر کے قریب ہی تھا۔ لیزا کو معلوم نہیں تھا کہ پاٹھم وہاں ٹھہرا ہوا ہے لیکن جب پولیس نے چھاپا مارا تو آس پاس کے لوگ صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے وہاں جمع ہوگئے تھے۔ لیزا بھی اپنے پارلر سے باہر آگئی تھی۔ اس نے پاٹھم کو دیکھا تھا۔ دو پولیس والے اسے اور ایک اور آدمی کو مارتے پیٹتے ہوئے پولیس کی گاڑی میں دھکیل رہے تھے۔ لیزا اس وقت تو آگے نہیں بڑھی لیکن پولیس کے جانے کے بعد وہ گیسٹ ہاؤس پہنچ گئی۔ گیسٹ ہاؤس کی مالکہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ وہ لیزا کو اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ لیزا گیسٹ ہاؤس میں مقیم گاہکوں کے مساج کے لیے یہاں آتی رہتی تھی۔ یہاں سے لیزا کی تصدیق ہوگئی کہ وہ پاٹھم ہی تھا جسے پولیس مشتبہ قرار دے کر لے گئی تھی۔ لیزا نے اپنے مساج پارلر واپس پہنچ کر مجھے فون پر اطلاع دے دی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ پاٹھم ہی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتی۔" لیزا نے جواب دیا "وہ پاٹھم ہی ہے۔ اس نے اپنے ہی نام سے اس گیسٹ ہاؤس میں کمرا ایک کروا رکھا ہے۔"

"یہ تو بڑی تشویش ناک خبر ہے۔" میں نے کہا "بہرحال، میں ماسٹر ہوچن کو اطلاع دیتا ہوں۔"

"تمہارا کہیں جانے کا پروگرام تو نہیں؟" لیزا نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں کہاں جاسکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آجاؤں گی۔" لیزا نے کہا۔

میں نے فون بند کردیا۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ ریسیور اٹھایا اور پرنس کے جمنازیم کا نمبر ملانے لگا۔ ماسٹر ہوچن وہیں تھا۔ رابطہ ہونے پر میں نے اسے پاٹھم کے بارے میں آگاہ کردیا۔

"پولیس کچھ زیادہ ہی سرگرم نظر آرہی ہے۔ بہرحال، میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا اور فون بند کردیا۔

میں پاٹھم کے لیے پریشان تھا۔ پولیس کے ہتھکنڈوں سے کون واقف نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ اسے زبان کھولنے پر مجبور کردے۔ میرا خیال تھا کہ پاٹھم کے سلسلے میں ماسٹر، انسپکٹر سوچان سے کسی قسم کی مدد لینے کی کوشش کرے گا لیکن گزشتہ رات کاٹیج میں انسپکٹر سوچان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ماسٹر ہوچن کا احترام تو کرتا تھا لیکن اسے اپنی منصبی ذمّے داریوں کا بھی احساس تھا۔ اس نے اگرچہ یہ مشورہ دے دیا تھا کہ ہم پہلی فرصت میں یہ شہر چھوڑ کر چلے جائیں لیکن میں اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اسے مجھے گرفتار کرنا پڑا تو وہ بلا جھجک میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دے گا۔

پاٹھم کے لیے تھائی اور جانگی بھی پریشان تھیں۔ ظاہر ہے وہ ہمارا وفادار ساتھی تھا اور ہمارے لیے کئی مرتبہ جان کی بازی لگا چکا تھا۔ اسے اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جاسکتا تھا لیکن ابھی یہ دیکھنا باقی تھا کہ پولیس اس کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے۔ ممکن ہے پوچھ گچھ کے بعد اسے چھوڑ دیا جائے اور اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ پوچھ گچھ کے دوران میں ہی پولیس کو کوئی ایسی بات معلوم ہوجائے جس سے معاملہ الجھ جائے۔ بعض اوقات کوئی بہت معمولی سی بات بھی پولیس کو معنی خیز نتائج اخذ کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔

وہ رات گزر گئی۔ ماسٹر ہوچن کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی اور نہ ہی کسی اور ذریعے سے پاٹھم کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکا تھا۔ صبح سات بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ٹیلی فون ہال میں رکھا ہوا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا تو لیزا مجھ سے پہلے وہاں پہنچ کر فون کا ریسیور اٹھا چکی تھی۔ فون پر ایک دو جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ماسٹر ہوچن کی کال ہے۔"

"یس ماسٹر۔" میں نے ریسیور لیتے ہی ماؤتھ پیس میں کہا "پاٹھم کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"ہاں لیکن معاملہ کافی گمبھیر ہوگیا ہے لٹل ماسٹر۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

"کیا مطلب!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ذرا تفصیل سے بتائیے ماسٹر۔"

"جس گاڑی میں تم لوگوں نے سامی کی لاش پھینکی تھی وہ کس کی تھی؟" ماسٹر نے پوچھا۔

"وہ کسی کمپنی کی گاڑی تھی۔" میں نے کہا اور اس گاڑی کے بارے میں تفصیل بتانے لگا "پاٹھم نے بتایا تھا کہ وہ کمپنی عرصہ پہلے ختم ہوچکی ہے۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی بدلی ہوئی ہے اور اب اس گاڑی کے ذریعے یہ پتا نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ کس کے استعمال میں تھی لیکن معاملہ کیا ہے ماسٹر۔ اس گاڑی کا یہاں کیا ذکر؟"

"میں نے کہا تھا نا کہ یہاں کی پولیس بہت تیزی سے کام کر رہی ہے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "پولیس نے پاٹھم کو محض پوچھ گچھ کے لیے گیسٹ ہاؤس سے اٹھایا تھا۔ پاٹھم نے اپنے

بارے میں بتا دیا کہ وہ موٹر مکینک ہے اور سیرو تفریح کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے اپنے ورکشاپ کا پتا بھی بتا دیا تھا۔ تفتیشی آفیسر نے اس کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے بنکاک میں اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کو فون کیا۔ وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہاں اس کے خلاف کوئی کیس وغیرہ تو نہیں لیکن وہاں سے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا گیا کہ پاتھم نام کا موٹر مکینک پولیس کو ایک ایسی کار کی تفتیش کے سلسلے میں مطلوب ہے جس میں پیڈرو کے بھائی سامی کی لاش پھینکی گئی تھی۔" ماسٹر ہوچن چند لمحوں کو خاموش ہوا پھربات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں نے کہا تھا ناکہ پولیس بعض اوقات کسی بہت معمولی سی بات سے بھی بڑے بڑے نتائج اخذ کرلیتی ہے۔ بنکاک پولیس نے بڑی محنت سے اس گاڑی کے بارے میں معلوم کرلیا تھا کہ وہ دراصل کس کی ملکیت تھی اور ان دنوں کس کے استعمال میں تھی۔ بنکاک پولیس نے... سرسری سے انداز میں پاتھم کے اسسٹنٹ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا تاکہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہوسکے۔ اسسٹنٹ نے بتایا کہ پاتھم سیرو تفریح کے لیے دوستوں کے ساتھ شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ بنکاک پولیس ورکشاپ کی نگرانی کررہی ہے تاکہ پاتھم کے واپس آتے ہی اسے بے خبری میں گرفت میں لے لیا جائے اور میرا خیال ہے کہ پاتھم جب سے یہاں آیا ہے اس نے اپنے اسسٹنٹ سے بھی فون پر رابطہ نہیں کیا۔ ورنہ اسے پولیس انکوائری کے بارے میں پتا چل جاتا۔"

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور پورے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ پاتھم اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس گاڑی کے بارے میں معلوم نہیں کیا جاسکتا اور اس حقیقت کو اس وقت میں بھی بھول گیا تھا کہ پولیس جب دیانت داری سے کام کرتی ہے تو گڑے مُردے بھی اکھاڑ لیتی ہے اور پھر وہ معاملہ تو پیڈرو کے بھائی کے قتل کا تھا جس کی وجہ سے بنکاک میں شدید ہنگامے ہوئے تھے اور کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ بنکاک پولیس نے سامی کے قتل کے الزام میں نامعلوم قاتلوں کے خلاف رپورٹ درج کی تھی اور مہاراج کی وجہ سے ایف آئی آر میں میرا نام نہیں آیا تھا لیکن اب معاملہ ایک نیا رخ اختیار کرگیا تھا۔ میرے اور پاتھم کے درمیان تعلق تلاش کرنے میں پولیس کو اب زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔

"ماسٹر۔" بالآخر میں نے کہا "معاملہ واقعی بہت گمبھیر ہوگیا ہے۔ اگر پاتھم اس کیس میں پھنس گیا تو مزید گڑبڑ ہوگی۔ پاتھم کو اس طرح بے یارومددگار نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" ماسٹر نے کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پاتھم کے بارے میں ہم بالکل نہیں جانتے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"اس گاڑی سے پاتھم کے تعلق کے انکشاف کے بعد پاتھم کو کسی خفیہ مقام پر منتقل کردیا گیا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس گاڑی سے پیڈرو کے بھائی کی لاش ملی تھی اور پیڈرو تک یہ خبر پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ پاتھم پکڑا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ یہاں پہنچ جائے۔ پولیس کو یہ بھی شبہ ہے کہ سامی تمہارے ہاتھوں قتل ہوا تھا اور جب لاش پیراڈائز کے کمپاؤنڈ میں ڈالی گئی تھی تو اس وقت تم بھی اس گاڑی میں موجود تھے اور یہاں کی پولیس جانتی ہے کہ تم اس وقت کنچن بوری میں ہو، اس لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر پاتھم کو کسی خفیہ مقام پر منتقل کردیا گیا ہے جہاں اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی اور اس کے بعد اسے بنکاک پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔"

"لیکن ماسٹر۔ کیا پاتھم کو بے یارومددگار چھوڑا جاسکتا ہے؟" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "تفتیش کے دوران میں اگر پولیس نے پاتھم سے تمہارا تعلق قائم کرلیا تو مہاراج کا وہ منصوبہ متاثر ہونے کا خطرہ بڑھ جائے گا جس کے لیے تمہیں تیار کیا جارہا ہے۔"

"کیسا منصوبہ؟" میں چونک گیا۔

"ابھی نہیں۔" ماسٹر کی آواز سنائی دی "یہ بات شاید قبل از وقت میرے منہ سے نکل گئی ہے لیکن وقت آنے پر تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ بہرحال، تم پریشان مت ہو۔ میں آج ہی معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ پاتھم کو کہاں رکھا گیا ہے۔"

"مجھے ضرور اطلاع دینا ماسٹر۔" میں نے کہا "پاتھم نے میرے لیے کبھی اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اوکے۔ میں تمہیں بتا دوں گا۔" ماسٹر نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور مڑ کر دیکھا تو لیزا کے ساتھ جانگی بھی کھڑی تھی۔ میری باتوں سے جانگی سمجھ گئی تھی کہ صورتِ حال خاصی سنگین ہے۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

"اب کیا کرنا ہے؟" جانگی نے پوچھا۔

"سب سے پہلے تو یہ معلوم کرنا ہے کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے اور پھر اس کے بعد ہی کچھ کیا جائے گا۔" میں نے جواب دیا اور لیزا کی طرف دیکھتے ہوئے چائے کی فرمائش کردی۔ لیزا وہاں سے چلی گئی تو میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا "بنکاک پولیس اس گاڑی کے ذریعے پاتھم کے ورکشاپ تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں کی پولیس نے بھی پاتھم کے بارے میں تصدیق کرنے کے لیے بنکاک پولیس کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ بنکاک میں پاتھم کے ورکشاپ کی نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ جیسے ہی واپس پہنچے گا اسے گرفتار کرلیا جائے گا لیکن....."

"معاملہ یہیں پر گڑبڑ ہوگیا۔" جانگی نے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں۔" میں نے کہا "اس معاملے کو آگے بڑھنے سے روکنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ پاتھم کو پولیس کی تحویل سے نکالا جائے۔"

"ہاں۔ یہ بہت ضروری ہے۔" جانگی نے کہا اور تھائی کی طرف دیکھنے لگی جو اپنے کمرے سے نکل کر آنکھیں ملتی ہوئی آرہی تھی۔

اس سے پہلے کہ تھائی کچھ پوچھتی، میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ لیزا چائے لے کر آرہی تھی۔ لیزا، تھائی کے لیے بھی چائے بنا کرلے آئی تھی۔ چائے پینے کے دوران میں پاتھم ہی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ لیزا اگرچہ قابلِ اعتماد تھی۔ ہم نے اس پر مکمل بھروسا کیا تھا اور اس نے ابھی تک ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی تھی لیکن میں اسے ساری باتوں سے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔

شام سات بجے کے قریب ماسٹر ہوچن خود ہی پہنچ گیا۔

"پاتھم کا پتا چلالیا ہے۔" اس نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی کہا "اسے سوئے تھانگ پر واقع ایک بنگلے میں رکھا گیا ہے۔ یہ بنگلا بظاہر ایک ریٹائرڈ پروفیسر کی رہائش گاہ ہے لیکن درحقیقت اسپیشل پولیس کے استعمال میں رہتا ہے۔ یہاں ایسے لوگوں سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے جو نہایت سنگین اور اہم معاملات میں ملوث ہوں۔ اسے تم ٹارچر سیل بھی کہہ سکتے ہو۔ یہاں ایذا رسانی کے جدید ترین آلات موجود ہیں۔ یہ اسپیشل پولیس والے تشدد کے ایسے ایسے طریقوں سے واقف ہیں کہ پتھر بھی بولنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔"

"آپ کو یہ باتیں....."

"پری کے ایک شاگرد سے معلوم ہوئی ہیں۔" ماسٹر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اس کا ایک کزن اسپیشل پولیس میں ہے۔ اس نے سب کچھ اسی سے معلوم کیا ہے۔"

"اور وہاں حفاظتی انتظامات؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں چار آدمی ہیں۔" ماسٹر نے جواب دیا "وہ چاروں مستقل اس بنگلے پر ڈیوٹی دیتے ہیں۔ آج ایک پانچواں آدمی بھی وہاں موجود ہے جو پاتھم سے پوچھ گچھ کررہا ہے۔ یہ اسپیشل پولیس کے انٹیروگیشن سیل کا ایک انسپکٹر ہے جسے نہایت سفاک اور ظالم سمجھا جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پاتھم کی زندگی کو خطرہ ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسے لوگوں کو مارا نہیں جاتا۔" ماسٹر نے بتایا "پوچھ گچھ کے دوران میں ان پر تشدد تو کیا جاتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ انہیں کوئی ظاہری چوٹ نہ لگے اور وہ اپنی زبان بھی بند نہ کریں۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں نے وہ بنگلا دیکھ لیا ہے اور میرا ارادہ ہے کہ آج ہی رات اس بنگلے پر ریڈ کردیا جائے۔"

"نہیں ماسٹر۔" میں نے کہا "اب آپ اس معاملے میں ملوث نہیں ہوں گے۔ اگر ریڈ کے دوران میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو آپ نظروں میں آجائیں گے۔ اس طرح گڑبڑ ہوجائے گی اور بات براہِ راست مہاراج پر آئے گی۔"

"تو پھر۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" ماسٹر نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ مجھے وہ بنگلا دکھا دیں اور خود اس معاملے سے الگ رہیں۔" میں نے جواب دیا "اگر آپ کو مجھ پر بھروسا ہے تو یہ کارروائی مجھے کرنے دیں ماسٹر۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ اس کارروائی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔"

ماسٹر چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

"چلو۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔"

ہم دونوں باہر آگئے۔ جہاں ماسٹر ہوچن کی گاڑی کھڑی تھی اور پچھلی سیٹ پر دو گن مین بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے ساتھ پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی شہر کے مشرقی نواح میں ایک کنگ ایمفو، سب ڈسٹرکٹ کے علاقے میں آگئی۔ یہ سو فی صد رہائشی علاقہ تھا تاہم کہیں کہیں دکانیں موجود تھیں۔ اونچی نیچی سڑکیں کافی کشادہ تھیں۔ سڑکوں کے دونوں طرف بنگلے تھے۔ ایک مارکیٹ کے قریب سے گزرتے ہوئے ماسٹر نے کار بائیں طرف ایک سڑک پر گھمائی اور تقریباً دو سو گز آگے جاکر اس نے کار بائیں طرف ہی ایک کشادہ گلی میں موڑلی اور اس کے ساتھ ہی اندر کی بتی بھی بجھا دی اور کار کی رفتار کم کردی۔

گلی کے دونوں طرف کشادہ بنگلے تھے لیکن بنگلوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی وجہ سے بہت سی جگہ چھٹی ہوئی تھی۔ ان سرسبز ٹیلوں پر پھولوں کے پودے تھے اور غالباً اس علاقے کو خوب صورت بنانے کے لیے ایسی جگہیں دانستہ چھوڑی گئی تھیں اور ان کی وجہ سے بنگلوں کے درمیان بھی فاصلہ حائل ہوگیا تھا۔

ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ گلی میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ بعض بنگلوں کے سامنے گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ماسٹر ہوچن نے کار کی رفتار بہت کم کررکھی تھی۔

"یہ ہے وہ بنگلا۔" اس نے سر سے بائیں طرف اشارہ کیا۔

اس بنگلے کے دونوں طرف سرسبز ٹیلے تھے۔ بنگلے کی عمارت مین گیٹ سے تقریباً پچاس گز پیچھے ہٹ کر تھی لیکن گیٹ کے اندر کی طرف بالکل ساتھ ایک کمرا بھی نظر آرہا تھا۔ وہ غالباً چوکی دار کا کمرا تھا جسے دوسرے الفاظ میں گارڈ روم بھی کہا جاسکتا تھا۔ پچھلی طرف سے بھی بنگلے کی دیوار ایک اونچے ٹیلے سے ملی ہوئی تھی۔

میں اس بنگلے کی طرف دیکھتا رہا اور کار آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ تقریباً بیس گز آگے کارنر پر ایک بنگلا تھا پھر یہ گلی دوسری گلی سے مل جاتی تھی۔ دونوں گلیوں کے اتصال نے یہاں انگریزی کے حرف "ٹی" کی شکل اختیار کرلی تھی۔ ماسٹر ہوچن نے کار بائیں طرف موڑلی اور چکر کاٹتے ہوئے ہم اس بنگلے کی پچھلی طرف والی گلی میں نکل آئے۔ اس طرف بھی بنگلوں کی صورت حال اسی طرح تھی۔ درمیان.... سرسبز ٹیلے تھے اور ان ٹیلوں پر سے ہوتے ہوئے بڑی آسانی سے مطلوبہ بنگلے تک پہنچا جاسکتا تھا۔ ٹیلوں پر پھولوں کے پودوں کے علاوہ ایسے درخت بھی تھے جن کی شاخیں تراش دی گئی تھیں۔ کسی درخت کو چھتری کی شکل دے دی گئی تھی اور کوئی گیند کی طرح بالکل گول کٹا ہوا تھا لیکن کسی بھی درخت کی بلندی پانچ چھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

ہم ایک طویل چکر کاٹتے ہوئے لیزا کے بنگلے پر واپس آگئے۔

"کیا پروگرام ہے۔ تمہارے ذہن میں کیا منصوبہ ہے؟" ماسٹر نے اندر آنے کے بعد پوچھا۔

"اس علاقے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں دولت مندوں کی رہائش ہے اور وہاں رات کو جلد ہی سناٹا چھا جاتا ہوگا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے' رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان کروں گا۔" میں نے کہا اور اس بنگلے کی لوکیشن کو دیکھ کر میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس کے بارے میں آگاہ کرنے لگا۔

"کیا یہ خطرناک نہیں ہوگا۔" ماسٹر نے کہا "وہاں کم از کم پانچ آدمی ہوں گے اور تم صرف دو۔ میرا مطلب ہے صرف تم اور پرساد...."

"خطرے کو نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا لیکن زیادہ آدمیوں کو ساتھ لے جانے سے گڑبڑ ہوسکتی ہے۔" میں نے جواب دیا "ویسے میں نے جو منصوبہ بنایا ہے' اس میں ناکامی کا اندیشہ صرف ایک فی صد ہے۔"

"اوکے۔ وش یو گڈ لک! اپنا خیال رکھنا۔" ماسٹر نے کہا اور کچھ ہی دیر بعد وہ رخصت ہوگیا۔

اس رات ہم نے کھانا جلدی کھالیا۔ میں نے لیزا کی کار کی لائسنس پلیٹیں اتار دیں اور پھر ہم ہال میں بیٹھ کر منصوبے کی جزئیات طے کرنے لگے۔ تھائی اور جانگی کو اس منصوبے میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔ انہیں میں نے ساری سچویشن سمجھادی اور اس حوالے سے انہیں مختلف ہدایات دینے لگا۔

تھائی وانگ اور جانگی دیوی کو دیکھ کر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ بجلیاں جس آشیانے پر گریں گی اسے چشم زدن میں جلا کر راکھ کرڈالیں گی۔ ان کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس وقت تو وہ دونوں واقعی قیامت ڈھا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو قیامت بنانے میں تمام تر صلاحیتیں صرف کردی تھیں۔

ہم برآمدے میں پہنچے تو ڈیوٹی دینے والے دونوں گن مین انہیں دیکھ کر پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ میں پینجرز سیٹ پر بیٹھ گیا اور پرساد نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

کار مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ میں پرساد کو راستہ بتا رہا تھا۔ ماسٹر ہوچن کے ساتھ جاتے ہوئے میں نے ان راستوں کا ایک ایک موڑ ذہن نشین کرلیا تھا اس لیے مجھے راستے کی نشان دہی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

میں نے کار بنگلوں والی سڑکوں کے "ٹی" والے موڑ پر روکی اور ہاتھ کے اشارے سے تھائی اور جانگی کو اس بنگلے کے بارے میں بتانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک بار پھر وہ ہدایات دیں جن کے مطابق انہیں کام کرنا تھا۔

ان دونوں کو وہاں اتار کر ہم کار آگے لے گئے اور پچھلی سڑک پر جاکر کار سڑک کے کنارے پر روک دی اور ہم دونوں نیچے آگئے۔ ہم چند لمحے وہاں کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر ٹیلے پر چڑھ کر اس بنگلے کی پشت کی طرف بڑھنے لگے جو ہمارا ہدف تھا۔ رات کے وقت اس علاقے میں سناٹا تھا اور ہمارے دیکھ لیے جانے کی توقع نہیں تھی لیکن ہم احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ٹیلے پر کٹی اور ترشی ہوئی شاخوں والے درختوں کی آڑ لے کر ہم آگے بڑھتے رہے۔

پرساد نے پستول نکال لیا تھا۔ میرے پاس بھی اگرچہ پستول موجود تھا لیکن اس وقت میں نے خنجر کو ترجیح دی تھی۔ ہم محتاط انداز میں چلتے ہوئے بنگلے کی عقبی دیوار کے قریب رک گئے۔ میں نے ذرا سا اوپر ہو کر دیوار کے دوسری طرف دیکھا۔ بنگلے کے کسی عقبی کمرے کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی۔ بنگلے کے سامنے کے رخ پر بھی کوئی بلب جل رہا تھا جس کی مدھم سی روشنی دائیں طرف پام کے درختوں تک بھی پہنچ رہی تھی۔

میں نے تھائی اور جانگی کو پندرہ منٹ کا وقت دیا تھا۔ ان کا سگنل ملنے کے بعد ہی ہم اگلا قدم اٹھاتے۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہورہا تھا۔ یہ بھی اندیشہ اپنی جگہ بہرحال موجود تھا کہ اگر ان لوگوں کو جانگی اور تھائی پر کسی قسم کا شبہ ہوگیا تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔

پندرہ منٹ گزر گئے۔ تھائی یا جانگی کی طرف سے سگنل نہیں ملا۔ اب گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ میری بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔

پانچ منٹ اور گزر گئے۔ میرے خیال میں مزید انتظار فضول ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے پرساد کو اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔ نیچے کچی زمین تھی۔ ہم

ہونے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی تھی اور یہ آواز اندر والوں کو شبہات میں مبتلا کرسکتی تھی۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر پام درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا اور بالآخر ایک ستون کے پیچھے رک گیا۔ اسی لمحے دھب کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ پرساد بھی دیوار سے کود چکا تھا۔ میں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا اور پھر درختوں کی آڑ سے نکل کر عمارت کی دیوار کے قریب پہنچ گیا۔ اس طرف پہلو کے کمروں کی کھڑکیاں تھیں مگر ہر کھڑکی تاریک تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر آہستہ آہستہ سرکنے لگا اور دوسرے سرے پر رک کر دوسری طرف جھانکنے لگا۔

گیٹ اور اس کے ساتھ واقع گارڈ روم یہاں سے صاف نظر آرہا تھا۔ گارڈ روم میں بتی جل رہی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن کمرا خالی تھا۔ کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

میری پریشانی اب بڑھ رہی تھی۔ تقریباً پچیس منٹ ہوچکے تھے۔ میں موڑ گھوم کر آگے بڑھ گیا۔ دائیں طرف تقریباً دس گز کے فاصلے پر بہت بڑا برآمدہ تھا۔ وہاں دو بڑے بڑے ستون تھے جنہوں نے برآمدے کی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ میں آہستہ آہستہ برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ برآمدے کا فرش تقریباً دو فٹ اونچا تھا۔ کنارے پر گملے رکھے ہوئے تھے اور ستونوں پر بھی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں برآمدے پر چڑھ کر ستون کی آڑ میں کھڑا ہوگیا اور بند دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک کھڑکی بھی تھی۔ اندر اگرچہ روشنی تھی مگر کھڑکی میں لگے ہوئے ٹنٹیڈ گلاس کی وجہ سے اندر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گارڈ روم کے اندر اور کمپاؤنڈ میں کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ جانگی وغیرہ بھی اندر تھیں یا انہیں اندر لے جایا جاچکا تھا اور انہیں سگنل دینے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

میں آگے بڑھنے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ ایک گملا میرے پیر سے ٹکرا کر نیچے گر کر ٹوٹ گیا۔ گملا ٹوٹنے کی آواز سناٹے میں دور تک پھیل گئی تھی۔ میں ستون کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا اور میری توقع کے عین مطابق چند سیکنڈ بعد برآمدے والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلنے سے برآمدے میں بھی کچھ حصے پر روشنی پھیل گئی تھی۔ اپنے آپ کو اس شخص کی نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے میں نے اپنی جگہ سے معمولی سی حرکت کی تو میرا پیر ایک اور گملے سے ٹکرا گیا۔ وہ گملا گرا تو نہیں البتہ اپنی جگہ سے ہل کر رہ گیا تھا۔ وہ شخص بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا اور ستون کے قریب سے گزر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہی موقع تھا جب میں نے بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ آہٹ پاکر وہ شخص بھی مڑنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبالیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔

"کوئی حرکت کی تو گردن کاٹ دوں گا۔" میرے حلق سے سانپ کی سی پھنکار نکلی۔

میں اس کا منہ دبائے اور خنجر کی زد پر رکھے اسے برآمدے سے اتار کر نیچے لے آیا اور دیوار کی آڑ میں پہنچ کر اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس طرح کوئی عام آدمی بھی کسی کی گردن کو زوردار جھٹکا دے تو گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے لیکن میں نے جو جھٹکا دیا تھا اس میں طاقت کم اور ٹیکنیک زیادہ استعمال ہوئی تھی۔ کڑک کی آواز کے ساتھ گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ شخص مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے بڑی سختی سے اس کا منہ دبائے رکھا تاکہ کوئی آواز نہ نکل سکے۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اس کی گردن کو ایک اور جھٹکا دیا۔ کڑک کی ایک اور آواز ابھری۔

وہ شخص میری بانہوں میں مچل رہا تھا۔ بالآخر وہ بے حس و حرکت ہوکر بانہوں میں جھول گیا۔ میں اسے گھسیٹ کر مزید آگے لے گیا اور دیوار کے ساتھ ڈال دیا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا دوبارہ برآمدے میں آگیا۔ میں چند لمحے ستون کے پیچھے کھڑا رہا۔ دروازہ کھلا ہوا ہونے کی وجہ سے اب مجھے تھائی یا جانگی کی دبی دبی ہنسی کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں دبے قدموں آگے بڑھا اور دروازے سے اندر جھانکنے لگا۔

اندر کا منظر میری توقع کے عین مطابق تھا۔ وہ دو آدمی تھے۔ ایک نے جانگی کو دبوچ رکھا تھا اور دوسرے نے تھائی کو۔ وہ دونوں مالِ غنیمت سمجھ کر ان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ تھائی اور جانگی دبی دبی ہنسی کے ساتھ کچھ کہتے ہوئے انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ میں نے تھائی اور جانگی کو پندرہ منٹ کا وقت دیا تھا لیکن یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جس مقصد کے لیے انہیں بھیجا گیا تھا اس کے لیے پندرہ منٹ بہت کم تھے۔

ماسٹر کی اطلاع کے مطابق یہاں پانچ آدمی ہونے چاہییں تھے۔ ایک میرے ہاتھوں مارا گیا تھا' دو سامنے ہال میں تھے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے باقی دو کے علاوہ پاتھم کی بھی تلاش تھی۔ ممکن ہے وہ کسی اور کمرے میں ہوں یا کوئی تہ خانہ ہو جہاں پاتھم کو تشدد کا نشانہ بنایا جارہا ہو۔

سامنے دیکھتے ہوئے اچانک میں چونک گیا۔ ہال کے دوسری طرف بالکل سامنے والی کھڑکی کا ایک پٹ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ میں بڑی گہری نظروں سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کا پٹ چھ سات انچ کے قریب کھل گیا اور اس کے دوسری طرف پرساد کا چہرہ دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

کھڑکی کا پٹ پوری طرح کھل گیا۔ پرساد اب آہستہ آہستہ باہر سے چوکھٹ پر چڑھ رہا تھا۔ میں بھی ذرا آگے بڑھ گیا۔ پرساد نے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا اٹھا دیا اور محتاط انداز میں

کھڑکی سے اُترنے لگا۔

وہ دونوں آدمی تھائی اور جانکی میں اس قدر مگن تھے کہ انہیں نہ تو اپنے ایک ساتھی کی عدم موجودگی کا احساس ہوسکا اور نہ ہی میری اور پرساد کی موجودگی کا۔

کھڑکی سے اترتے ہوئے پرساد کی نظریں ان دونوں پر تھیں۔ اس نے ایک پیر قریب پڑی ہوئی کرسی پر رکھا لیکن پیر ٹھیک طرح نہیں پڑا تھا۔ کرسی الٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پرساد بھی اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ وہ بھی کرسی کے ساتھ ہی نیچے گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی تھی۔

آواز سن کر وہ دونوں آدمی چونک گئے۔ انہوں نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر اپنے اپنے مالِ غنیمت کو چھوڑ کر پرساد کی طرف لپکے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا ان میں سے ایک آدمی کے اوپر جا گرا اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے قالین پر گر گیا۔ اس اچانک افتاد پر وہ آدمی بُری طرح بدحواس ہوگیا لیکن فوراً ہی سنبھل کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

چھلانگ لگاتے ہوئے خنجر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا لیکن میں نے اس شخص کی گردن گرفت میں لے لی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے تھا' دوسرا کھوپڑی پر۔ میں اس کی گردن کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ وہ میرے دونوں ہاتھ پکڑے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرے جبڑے بھنچ گئے اور میں اس کی گردن مروڑنے کے لیے پوری قوت استعمال کرنے لگا۔ اس کھیل کا ایک ہی اصول ہوتا ہے۔ حریف کی جان لے لو یا اپنی جان دے دو۔ درمیان کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ میں اپنی جان نہیں گنوانا چاہتا تھا' حریف کو بے جان کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالآخر اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کڑک کی آواز ابھری اور گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مجھ پر جنون سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دو اور جھٹکے دیے اور اسے تڑپتا چھوڑ کر اٹھ گیا اور لپک کر اپنا خنجر اٹھا لیا۔

پرساد دوسرے آدمی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں اس طرف بڑھا اور پھر فائر کی آواز سن کر رک گیا۔ پرساد کے پستول کی گولی نے اس آدمی کے سینے میں سوراخ کردیا تھا۔ پرساد اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ گیا۔ خون کے کچھ چھینٹے پرساد کی شرٹ پر بھی پڑے تھے۔

جانکی اور تھائی اٹھ کر لباس درست کر رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پاتھم اور دوسرے دو محافظوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانکی شاید میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔ وہ ایک راہداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخی۔

"اِدھر۔ اس طرف ایک کمرے میں تہ خانے کا راستہ ہے۔ پاتھم وہیں ہے۔"

میں خنجر ہاتھ میں لیے راہداری کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت ایک آدمی ایک کمرے کے دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ان لوگوں نے شاید فائر کی آواز سن لی تھی۔ یہ شخص غالباً صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے باہر آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فائر کردیا۔ میں اسی وقت نیچے جھک گیا تھا مگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو اس کی چلائی ہوئی گولی میری زندگی کا خاتمہ کرسکتی تھی۔

اس شخص نے میرے پیچھے پرساد کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اسے دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ وہ تیزی سے مڑ کر کمرے میں گھس گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔ جب میں نے دروازے میں قدم رکھا تو وہ شخص کمرے کے آخری سرے پر تہ خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اسے ٹریگر دبانے کا موقع نہیں مل سکا۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل کر پرندے کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا اس کے حلق میں ترازو ہوگیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ سیڑھیوں پر گرا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

میں نے بڑی پھرتی سے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ اس دوران میں پرساد بھی کمرے میں داخل ہوچکا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا مجھ سے پہلے تہ خانے کی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی دوڑ لگا دی۔

بہت بڑا تہ خانہ تھا' جسے جدید ترین عقوبت خانہ کہا جاسکتا تھا۔ دیواروں پر ایسے آلات ٹنگے ہوئے تھے جو اذیت دینے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ الماریوں میں بھی اذیت رسانی کے جدید ترین آلات سجے ہوئے تھے۔ دو دیواروں میں آہنی ہک لگے ہوئے تھے جن کے ساتھ آہنی زنجیریں بھی منسلک تھیں۔ چھت پر بھی کئی جگہوں پر اس قسم کے ہک نظر آرہے تھے۔

پاتھم ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر اور پیر کرسی کے پایوں سے چرمی بیلٹوں کی مدد سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر چمڑے کی ایک عجیب قسم کی ٹوپی رکھی ہوئی تھی جس سے اس کی کنپٹیاں اور کان بھی ڈھکے ہوئے تھے۔ اس ٹوپی کے پچھلے حصے میں بجلی کے دو تار تھے جو کرسی کے ایک حصے سے جڑے ہوئے تھے۔ کرسی کی پچھلی طرف سے نکلنے والا ایک تار دیوار کے پلگ میں لگا ہوا تھا۔ پاتھم کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا۔

کرسی کے قریب ہی ایک دراز قامت بھاری بھرکم آدمی کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ دیوار کے سوئچ پر تھا۔ وہ اسپیشل پولیس کا وہ انسپکٹر تھا جسے پاتھم سے پوچھ گچھ کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ پاتھم کو بجلی کے جھٹکے دے کر تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی انسپکٹر نے دیوار پر لگا ہوا سوئچ آن کردیا اور

قریب ہی میز پر رکھے ہوئے ریوالور کی طرف لپکا۔

کمرا پاتھم کی چیخوں سے گونج رہا تھا۔ اس کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں۔ میرا دل دہل گیا۔ اس کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں نے اور پرساد نے بیک وقت ہی اپنی اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی تھی۔ پرساد تو انسپکٹر کے اوپر جا گرا تھا اور میں نے کرسی کے پیچھے پہنچ کر نہ صرف سوئچ آف کردیا بلکہ پلگ بھی نکال دیا۔ پاتھم کے جسم کو جھٹکے لگنا بند ہوگئے۔ چیخیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ اس کا سر ایک بار پھر سینے پر جھک گیا۔ میں نے اس کے سر سے وہ عجیب و غریب چرمی ٹوپی اتار دی۔ اس کے اندر آہنی پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ میں وہ ٹوپی ایک طرف پھینک کر اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگا۔

"پاتھم.... پاتھم.... ہوش میں آؤ پاتھم.... میری آواز سن رہے ہو؟" میں اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

پاتھم نے سر اٹھا کر بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا سر پھر جھک گیا۔ میں اسے سنبھالنے اور ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

پرساد انسپکٹر سے نمٹنے میں مصروف تھا۔ وہ انسپکٹر کسی پہلوان کی طرح خاصا طاقت ور تھا۔ اس کے برعکس پرساد دُبلا پتلا لیکن اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ پرساد نے میرے ساتھ رہتے ہوئے لڑائی کے داؤ پیچ سیکھ لیے تھے اور وہ اپنے حریف کے خلاف یہ داؤ پیچ بہت خوبی سے استعمال کر رہا تھا لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ انسپکٹر اس کے قابو میں نہیں آئے گا۔ میں نے پاتھم کو کرسی سے اٹھا کر ایک میز پر لٹا دیا اور انسپکٹر کی تواضع کرنے میں پرساد کی مدد کرنے لگا۔ انسپکٹر بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اس کھیل میں بیچ کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ "مار دو یا مر جاؤ" کے اصول کو سمجھتا تھا لیکن اس کی پوزیشن بڑی آک ورڈ (نازک) تھی۔

چند منٹ بعد ہی وہ ہماری گرفت میں آچکا تھا۔ ہم نے انسپکٹر کو اسی کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پیر چرمی فیتوں سے باندھ دیے۔ اس نے مزاحمت تو بہت کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے اس کے سر پر آہنی پلیٹوں والی چرمی ٹوپی بھی پہنا دی اور کرسی سے منسلک تار کا پلگ دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا۔ انسپکٹر کے چہرے پر بے پناہ خوف اُبھر آیا تھا۔

"تم نے تشدد کا یہ برقی حربہ بہت سے لوگوں پر آزمایا ہوگا۔ اس سے لوگ زبان تو کھول دیتے ہیں لیکن تمہیں یہ پتا نہیں ہوگا کہ انسانی جسم پر برقی جھٹکوں کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں....." میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج تمہیں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ لوگ اس طرح زبان کھولنے پر مجبور کیوں ہوجاتے ہیں۔"

میں نے سوئچ آن کردیا۔ کمرا انسپکٹر کی خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔ میں نے سوئچ آف کردیا۔ انسپکٹر کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔

"اب پتا چلا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"مم.... مجھے چھوڑ دو۔" انسپکٹر چیخا "تم جو کچھ کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"گڈ۔" میں مسکرا دیا "ایک بہت معمولی سے جھٹکے سے ساری بات تمہاری سمجھ میں آگئی لیکن میں تم سے کوئی کام نہیں لینا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم یہاں آرام کرو۔"

میں نے پرساد کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ اس نے فرش پر پڑا ہوا اپنا پستول اٹھا لیا اور پاتھم کو کندھے پر لاد لیا۔

میں نے سوئچ آن کردیا اور پرساد کے پیچھے سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ انسپکٹر کی خوفناک چیخیں تہ خانے میں گونج رہی تھیں۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے میں رک گیا۔ وہاں اس شخص کی لاش پڑی تھی جو میرے خنجر کا شکار ہوا تھا۔ خنجر اس کے حلق میں پیوست تھا۔ شہ رگ کٹ گئی تھی اور خون اب بھی سیڑھیوں پر پھیل رہا تھا۔ میں نے خنجر کو دستے سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ خون آلود بلیڈ اس کے لباس سے صاف کیا اور تہ خانے سے باہر آگیا۔

تھائی اور جانکی ابھی تک ہال میں کھڑی تھیں۔ پرساد پاتھم کو کندھے پر لادے کھڑا تھا پھر اس نے پاتھم کو ایک صوفے پر ڈال دیا۔

"تم لوگ یہیں رکو باس۔ میں گاڑی کو گیٹ کی طرف لے آتا ہوں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی کرنا ہے' جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

پرساد دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ پولیس سائرن کی آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ اس بنگلے سے چیخوں کی آوازیں بھی گونجی تھیں اور دو تین فائر بھی ہوئے تھے اور میرا خیال تھا' قریب کے کسی بنگلے میں رہنے والے کسی شخص نے یہ آوازیں سن کر پولیس کو فون کردیا تھا۔

میں نے مڑ کر راہداری کی طرف دیکھا۔ تہ خانے سے اب انسپکٹر کی چیخوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ بجلی کے جھٹکوں نے نہ صرف اس کی زبان خاموش کردی تھی بلکہ اس کی رگوں میں خون کو بھی جلا ڈالا ہوگا۔

پرساد نے بڑی پھرتی سے جھک کر پاتھم کو کندھے پر لاد لیا۔

"جلدی کرو باس۔ ہم پچھلی طرف سے ہی جائیں گے۔" اس نے کہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پاتھم کو سنبھال رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔

ہم دروازے سے نکل کر برآمدے میں آگئے۔ پرساد اب بھی ہم سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جانکی' تھائی اور آخر میں' میں تھا۔ میں نے اپنا پستول تھائی کو دے دیا تھا۔

ہم بنگلے کے عقبی لان کی طرف دوڑ رہے تھے۔ پولیس سائرن کی آواز قریب آتی جارہی تھی لیکن پھر اچانک فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ سائرن کی آواز بند ہوگئی البتہ فائرنگ کی آوازیں بڑھتی گئیں۔ لگتا تھا جیسے پولیس کسی اور پارٹی سے بھڑ گئی تھی۔

پاتھم بے ہوش تھا۔ اسے دیوار کی دوسری طرف پہنچانے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی پھر میں نے باری باری تھائی اور جانگی کو بھی دیوار پر کھینچ لیا۔ پرساد نے ایک بار پھر بے ہوش پاتھم کو کندھے پر لاد لیا تھا۔ ہم تاریکی میں اس ٹیلے پر دوڑنے لگے جس کی دوسری طرف ہماری کار کھڑی تھی۔

پاتھم کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا گیا اور جانگی و تھائی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ پرساد میرے بیٹھنے سے پہلے ہی اسٹیئرنگ سنبھال چکا تھا۔

فائرنگ کی آوازوں میں اب شدت آگئی تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ پولیس کسی اور پارٹی سے بھڑ گئی تھی جس کا فائدہ ہمیں پہنچا تھا۔ اگر پولیس کو راستے میں یہ رکاوٹ پیش نہ آتی تو ہمیں اس طرح آسانی سے اس بنگلے سے فرار ہونے کا موقع نہ مل سکتا۔

پرساد کار کو مخالف سمت میں لے گیا تھا۔ اس وقت سڑکوں پر اگرچہ سناٹا تھا لیکن پرساد کار کو ایسے راستوں پر لے جارہا تھا جہاں پولیس کی کسی گشتی پارٹی سے آمنا سامنا ہونے کا خطرہ کم سے کم ہو۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم کسی رکاوٹ کے بغیر لیزا کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ پاتھم کو فوراً ہی ایک کمرے میں لے جاکر بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ وہ بجلی کے جھٹکوں سے بے ہوش ہوا تھا۔ اتنا میں جانتا تھا کہ جو شخص بجلی کے جھٹکے یا کرنٹ لگنے سے بے ہوش ہوا ہو' اسے ہوش میں لانے کے لیے منہ میں پانی ٹپکانا یا پانی کے چھینٹے دینا خطرناک ہوتا ہے۔ لیزا تھائی کے کہنے پر پانی کا گلاس لے آئی تھی لیکن میں نے اسے روک دیا اور پانی کو پاتھم سے دور ہی رکھا گیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے ہوش میں کس طرح لایا جائے۔ زیادہ لمبی بے ہوشی بھی اس کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔

میں فون کا ریسیور اٹھا کر ماسٹر ہوچن کا نمبر ملانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جاگ رہا ہوگا اور میری طرف سے کسی رپورٹ کا منتظر ہوگا۔ کال پہلی ہی گھنٹی پر ریسیو کرلی گئی۔

"کامیابی مبارک ہو تشل ماسٹر۔" ماسٹر ہوچن نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم کامیاب لوٹے ہیں؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔" ماسٹر نے جواب دیا "میرے آدمی آس پاس موجود تھے۔ اگر وہ پولیس کو نہ الجھا لیتے تو تم لوگوں کو وہاں سے نکلنے میں کچھ دشواری پیش آسکتی تھی۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تو وہ ماسٹر ہوچن کے آدمی تھے جنہوں نے پولیس کو الجھالیا تھا اور ہمیں آسانی سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے ماسٹر ہوچن کو پاتھم کے بارے میں بتایا تو اس نے مشورہ دیا کہ اس کے ساتھ کوئی حرکت نہ کی جائے۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی ہوش میں آجائے گا۔

ماسٹر ہوچن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ ہوش میں آگیا مگر وہ ہماری کسی بات کا جواب دینے کے بجائے ہونقوں کی طرح ہمارے چہروں کو تکتا رہا۔ لگتا تھا جیسے اس کی سماعت اور گویائی کی قوتیں سلب ہوچکی ہوں۔ اس وقت بھی اس پر دہشت سی طاری تھی جس کے تاثرات اس کے چہرے پر ابھر آرہے تھے لیکن چند منٹ بعد اس کے چہرے کے تاثرات بدلنے لگے۔ میرا اندیشہ غلط نکلا۔ بجلی کے جھٹکوں نے اسے تکلیف تو پہنچائی تھی لیکن وقتی طور پر حواس زائل ہونے کے سوا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور اب اس کے حواس بھی بحال ہورہے تھے جس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

پرساد پاتھم والے کمرے میں رہ گیا۔ جانگی اور لیزا اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں تھائی کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ تھائی اب بھی اسی لباس میں تھی اور میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ لباس بڑا شرمناک تھا لیکن جس مقصد کے لیے ہم جانگی اور تھائی کو ساتھ لے کر گئے تھے اس کے لیے ایسا لباس پہننا بہت ضروری تھا۔ اس لباس نے ان کے حسن و شباب کو نمایاں کیا تھا اور بنگلے کے محافظ اپنے فرائض اور ذمے داریاں بھول کر بڑی آسانی سے ان کے جال میں پھنس گئے تھے۔

تھائی نے باتھ روم میں جاکر لباس تبدیل کرلیا۔ اب اس نے گلابی رنگ کی نائٹی پہن لی تھی اور میرے خیال میں اس کا شب خوابی کا یہ لباس بھی خاصا خطرناک تھا۔ میں بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے ہم میں طے ہوا تھا کہ چند منٹ میں تم ہمیں سگنل دو گی لیکن سگنل نہیں ملا تو مجھے پریشانی ہونے لگی اور......"

"ان کم بختوں نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا تھا۔" تھائی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "ہم نے گیٹ کھٹکھٹایا تو ایک آدمی باہر آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم سیر و تفریح کے لیے یہاں آئے ہیں اس علاقے میں واقع ایک بنگلے میں رہائش پذیر ہیں۔ اس وقت فلم دیکھ کر واپس آرہے ہیں لیکن اپنا بنگلا بھول گئے ہیں۔ اگر وہ ہمیں اجازت دے تو ہم یہاں سے فون کرلیں۔ وہ شخص چند لمحے ہمیں دیکھتا رہا پھر اس نے اندر سے اپنے ایک ساتھی کو بلالیا۔ آپس میں سرگوشیوں میں کوئی بات کی اور وہ ہمیں اندر لے گئے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازہ بند کردیا۔ ہم نے بظاہر خوف زدہ

ہونے کی اداکاری کی لیکن جب انہوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کی تو ہم نے کوئی مزاحمت بھی نہیں کی۔ اسی دوران میں ان کا ایک اور ساتھی بھی کہیں سے آگیا۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس عمارت میں کوئی تہ خانہ بھی ہے اور پاتھم اسی تہ خانے میں ہے اور کسی معاملے میں اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کی جارہی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "ہم انہیں موقع دے رہے تھے۔ حوصلہ افزائی پاکر ان کی دست درازیاں بڑھتی گئیں اور اس طرح مجھے یا جانگی کو کوئی سگنل دینے کا موقع نہیں مل سکا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ دیر ہوجانے کی صورت میں تم لوگ اندر ضرور آؤ گے اور پھر باہر کسی چیز کے گرنے کی آواز سن کر میں سمجھ گئی کہ تم میں سے کوئی اس طرف پہنچ چکا ہے۔ ایک آدمی باہر چلا گیا تھا۔ میں پوری توجہ باہر کی طرف مبذول رکھے ہوئے تھی۔ میں نے کچھ آوازیں سنی تھیں پھر یوں لگا جیسے کسی کو گھسیٹا جارہا ہو۔ ان دونوں آدمیوں میں سے کوئی بھی ان آوازوں پر توجہ نہیں دے سکا۔ ان کی ساری توجہ تو ہماری طرف تھی۔ لگتا تھا جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ انہیں کسی عورت کے اتنا قریب ہونے کا موقع ملا ہو اور وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہے تھے پھر جب میں نے تمہیں برآمدے والے دروازے سے جھانکتے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ باہر وہ آوازیں کیسی تھیں۔"

"اگر ہم اندر داخل نہ ہوتے تو جانتی ہو وہ لوگ تم دونوں کا کیا حشر کرتے؟" میں نے تھائی کے خاموش ہونے پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج رات صورتِ حال وہ نہیں تھی جو اس رات کاٹیج میں پیش آئی تھی۔" تھائی نے جواب دیا۔

میں چند لمحے خاموش رہا پھر ہم پاتھم کے حوالے سے پیدا ہونے والی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ بنکاک میں اس گاڑی کے ذریعے پولیس کا پاتھم کے ورکشاپ تک پہنچ جانا واقعی خطرناک تھا اور پھر یہاں کی پولیس کو بھی یہ تصدیق ہوگئی تھی کہ پاتھم وہی ہے جو بنکاک پولیس کو پیڈرو کے بھائی کے قتل کے الزام میں مطلوب ہے۔ پاتھم نے یہاں پولیس کے تشدد کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔ پولیس ابھی تک یہ معلوم نہیں کرسکی تھی کہ پاتھم سے میرا کوئی تعلق ہے لیکن میں سمجھتا تھا کہ پولیس اتنی بے وقوف بھی نہیں۔ اس محکمے میں بھی بڑے بڑے ذہین دماغ موجود ہیں۔ وہ دو جمع دو کا نتیجہ اخذ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے اور پھر آج یہاں جو کچھ ہوا تھا وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم پاتھم کو پولیس کے خفیہ عقوبت خانے سے نکال لائے تھے اور پانچ پولیس والے ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے جن میں اسپیشل پولیس کا ایک انسپکٹر بھی تھا۔

مقامی پولیس یہ بھی جانتی تھی کہ میں اور ماسٹر ہوچن ابھی کنچن پوری ہی میں موجود ہیں۔ مقامی پولیس اگرچہ پاتھم اور ہمارے درمیان کوئی تعلق تلاش نہیں کرسکی تھی لیکن بنکاک پولیس سے تفصیلات حاصل ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے کہ اس کارروائی میں ہمارا ہاتھ ہوسکتا ہے۔

آج کے اس ہنگامے میں پانچ آدمی مارے گئے تھے۔ ایک پرساد کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بنا تھا اور چار میرے ہاتھوں ختم ہوئے تھے۔ میرے ہاتھوں کسی کا مارا جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بعض اوقات مجھے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ میں اتنا ظالم کیوں ہوگیا تھا۔ میرے اندر اتنی سفاکی کیوں آگئی تھی۔ کسی کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے مجھ پر ایسا جنون کیوں طاری ہوجاتا تھا؟ اس کی وجہ تلاش کرنے کے لیے شاید زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے ماں باپ کو میری نظروں کے سامنے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور پھر چاچا پرتاب سنگھ کو گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ قدم قدم پر مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کئی بے گناہوں کو میرے سامنے بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان تمام عوامل نے میرے دل میں شدید نفرت پیدا کردی تھی۔ میں ہر اس شخص کو مار دینا چاہتا تھا جو میری جان لینے کے ارادے سے میری طرف بڑھتا ہوا نظر آئے اور پھر میں نے یہ بھی سیکھ لیا تھا کہ اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بعض اوقات دوسروں کی زندگیوں کے چراغ گل کرنا پڑتے ہیں۔ راستہ بنانے کے لیے دوسروں کی لاشوں پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کے اس کھیل کا اصول بڑا سیدھا سادہ تھا۔ دشمن کو ختم کردو یا اس کے ہاتھوں خود ختم ہوجاؤ۔ بیچ کا کوئی راستہ نہیں ہے اور یہ بھی سیدھی سی بات ہے کہ زندگی ہر شخص کو پیاری ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی بچانے کے لیے دوسرے کا گلا کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں بھی ایسی ہی سنگین نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ میرے بدترین دشمن میری تاک میں تھے۔ وہ قدم قدم پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی بار بار کوشش کی گئی تھی اور میں اپنے بچاؤ کے لیے دوسروں کو موت کے گھاٹ اتارتا رہا تھا۔ دشمن کے لیے رحم کا جذبہ میرے دل سے ختم ہوگیا تھا۔ دوسری طرف میں ان لوگوں کے لیے اپنی جان دینے کو تیار تھا جو مجھے چاہتے تھے۔ تھائی' جانگی' پرساد اور پاتھم کی مثالیں موجود ہیں۔ تھائی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کو میں نے گولیوں سے چھلنی کردیا تھا۔ پاتھم کو تشدد کا نشانہ بنانے والے چار آدمی آج ہی میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوچکے تھے۔ پانچواں پرساد کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا رہا اور رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی۔ تھائی سوچکی تھی لیکن میری آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ مختلف سوچوں نے گویا میرے دماغ کا گھیراؤ کر رکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر تھائی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر خاموشی سے کمرے سے

باہر نکل آیا۔ سامنے ہی جائی اور لیزا کا کمرا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر نیلگوں روشنی والا نائٹ بلب جل رہا تھا۔ میں نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ جائی اور لیزا ایک دوسرے سے لپٹی گہری نیند سو رہی تھیں۔ جائی کے جسم پر اب بھی وہی لباس تھا۔

پورے گھر میں خاموشی طاری تھی۔ ہال میں بلب جل رہا تھا۔ برآمدے میں البتہ تاریکی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ والی کھڑکی کے شیشے میں سے جھانک کر دیکھا تو برآمدے میں ایک طرف بہت ہلکی چنگاری سی چمکتی نظر آئی۔ میں نے کھڑکی کھول دی اور گردن نکال کر باہر دیکھنے لگا۔ ماسٹر ہوچن کے فراہم کردہ وہ دونوں گن مین برآمدے میں آلتی پالتی مارے بیٹھے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ برآمدے کی بتی انہوں نے ہی بجھا رکھی تھی۔ مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

"خیریت ہے ٹنل ماسٹر!" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ اٹھ کر باہر آ گیا۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد میں کچن میں کافی بنا رہا تھا۔

میں نے دونوں گن مینوں کو بھی کافی کا ایک ایک کپ دیا اور خود بھی کھڑکی میں کھڑا کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں ان سے باتیں کرتا رہا اور پھر کھڑکی بند کر کے ہال میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس وقت اچانک ہی میرے ذہن میں ماسٹر ہوچن کی کہی ہوئی کچھ باتیں ابھر آئیں۔

یہ بات تو میں کئی بار سن چکا تھا کہ مہاراج مجھ سے کوئی اہم کام لینا چاہتا ہے۔ جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا تھا اور اب ماسٹر ہوچن نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی۔ اس رات ویران فارم ہاؤس میں ماسٹر ہوچن نے شانگ سے کسی دوسرے منصوبے کے بارے میں کئی سوال کیے تھے جن کے وہ جواب نہیں دے سکا تھا اور ماسٹر نے اس کی بات کا یقین کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ کسی بڑے منصوبے پر نچلی سطح کے لوگوں سے کام تو لیا جاتا ہے لیکن انہیں اصل بات سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔

بعد میں، میں نے ماسٹر ہوچن سے اس دوسرے منصوبے کے بارے میں دریافت کیا تو ماسٹر ہوچن ٹال گیا تھا اور کہا تھا کہ مناسب وقت پر مجھے اس سے آگاہ کر دیا جائے گا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ وہ منصوبہ کیا تھا؟ کیا یہ وہی کام تھا جس کے لیے مجھے تیار کیا جا رہا تھا اور کیا یہ تیاری اس طرح ہو رہی تھی کہ مجھے قتل و غارت گری میں ماہر بنا دیا جائے۔

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بعض اوقات میں یہ بھی سوچنے لگتا جیسے قتل و غارت کے سوا میری زندگی کا کوئی مقصد نہ رہ گیا ہو۔ میں مہاراج کا بے حد شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے دارا جیسے لوگوں سے بچا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے زندہ رہ سکوں لیکن کبھی میں یہ بھی سوچنے لگتا کہ مہاراج نے مجھے کس راستے پر ڈال دیا تھا اور اب اگر میں چاہتا بھی تو اس راستے سے واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔ واپس لوٹ کر میں جاتا بھی کہاں؟

مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہی سب سوچتے ہوئے میں صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

○☆○

صورت حال سنگین ہی نہیں، بڑی خوفناک ہو گئی تھی۔

اسپیشل پولیس کے ایک انسپکٹر سمیت پانچ پولیس اہلکاروں کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس روز تمام اخبارات تاخیر سے شائع ہوئے تھے اور ہر اخبار کی ہیڈ لائن یہی تھی۔

اخبارات کے مطابق کاٹیج میں فرانسیسی سیاح کے قتل اور اس کی بیٹی کے اغوا اور قتل کے بعد چیکنگ اور چھاپوں کے دوران میں پاتھم نامی ایک شخص کو حراست میں لیا گیا تھا جس سے پوچھ گچھ کے دوران میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ بنکاک پولیس کو بھی پیڈرو کے بھائی سامی کے قتل کیس میں مطلوب ہے۔ مقامی پولیس نے پاتھم نامی اس شخص کو اسپیشل پولیس کے انویسٹی گیشن اسکواڈ کے حوالے کر دیا تھا اور اسے بڑی رازداری سے خفیہ مقام پر منتقل کر کے اس سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی کہ گزشتہ رات نامعلوم افراد نے اس بنگلے پر حملہ کر کے نہ صرف پاتھم نامی اس شخص کو رہا کروا لیا بلکہ اسپیشل پولیس کے ایک انسپکٹر سمیت پانچ پولیس اہلکاروں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس بنگلے میں فائرنگ کی اطلاع ملنے پر پولیس کی ایک گشتی پارٹی اس طرف پہنچ گئی لیکن بنگلے تک پہنچنے سے پہلے ہی پولیس پارٹی کا بعض مسلح لوگوں سے تصادم ہو گیا۔ آدھے گھنٹے تک فائرنگ کے تبادلے کے بعد مسلح افراد دریا کی طرف فرار ہو گئے۔ خیال ہے کہ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے بنگلے میں پولیس اہلکاروں کو ہلاک کر کے پاتھم نامی اس شخص کو رہا کرایا تھا۔

بنگلے میں پانچ پولیس اہلکاروں کی ہلاکت کی اطلاع ملتے ہی پورے شہر کی پولیس کو ریڈ الرٹ کر دیا گیا اور شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کے علاوہ رات ہی رات میں درجنوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے کر ان سے پوچھ گچھ کی جا رہی تھی۔

پولیس کے ایک ترجمان کے حوالے سے شائع ہونے والی ایک خبر میں اس شک کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ حملہ آوروں میں کوئی عورت بھی شامل تھی اور غالباً یہ سب کچھ بڑی پلاننگ سے کیا گیا تھا۔ پولیس ترجمان کے مطابق وہ کوئی حسین عورت تھی جو پہلے بنگلے میں داخل ہوئی تھی اور اس نے اپنے ساتھیوں کے لیے راستہ ہموار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ بنگلے کے ہال کمرے میں ایک صوفے پر سونے کی ایک انگوٹھی ملی تھی جس میں قیمتی ہیرا جڑا

ہوا ہے۔ ایسی انگوٹھیاں عام طور پر خواتین ہی پہنتی ہیں جس سے اس شک کو تقویت ملتی ہے کہ پاتھم کو چھڑانے اور پولیس اہلکاروں کو ہلاک کرنے والوں میں کوئی حسین عورت بھی شامل تھی۔ پولیس معاملہ ابھی تک حل نہیں کر سکی تھی کہ یہ انگوٹھی وہاں کس طرح گر گئی تھی۔

بعض اخبارات نے ڈھکے چھپے الفاظ میں میرا اور ماسٹر ہوچن کا نام بھی لیا تھا اور اس شک کا اظہار کیا تھا کہ اس سنگ دلانہ کارروائی میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا یا دونوں کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

جب میں یہ اخبار پڑھ رہا تھا اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ تھائی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ لیزا تھوڑی دیر پہلے بیدار ہوئی تھی اور کچن میں چائے بنا رہی تھی جبکہ جائی ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر تھائی کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ تھائی کی ایک کلائی میں سونے کا ایک کڑا تو تھا لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ اس کی کسی انگلی میں، میں نے کبھی کوئی انگوٹھی بھی دیکھی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" تھائی نے پوچھا۔

"کل رات تمہاری انگلی میں کوئی انگوٹھی بھی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم نے کبھی میری کسی انگلی میں کوئی انگوٹھی دیکھی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا "لیکن تمہیں کوئی انگوٹھی کیسے یاد آ گئی؟"

"اخبار میں لکھا ہے کہ اس بنگلے میں پولیس کو ہیرے کے جڑاؤ والی ایک طلائی انگوٹھی بھی ملی ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ کسی عورت ہی کی ہو سکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔" تھائی چونک گئی "تم جانتے ہو میں نے کبھی کوئی انگوٹھی نہیں پہنی لیکن میرا خیال ہے جائی انگوٹھی پہنتی ہے۔"

"تم یہ اخبار دیکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں اخبار تھائی کے سامنے رکھ کر اٹھ گیا۔

جائی بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ ایک تو اس کا لباس تھا ہی کچھ ایسا اور پھر اس طرح لیٹنے کی وجہ سے اپنی جگہ سے کھسکا ہوا بھی تھا۔ کھڑکی کے پردے سے چھن کر آنے والی روشنی سے کمرے میں مدھم سا اجالا ہو رہا تھا۔ جائی کروٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چہرے کے سامنے بستر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ سر کے نیچے تھا۔ جو ہاتھ سامنے تھا اس کی کسی انگلی میں انگوٹھی نہیں تھی۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ کر بڑی آہستگی سے سر کے نیچے سے کھینچنا چاہا تو جائی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے خمار آلود نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اس طرح میری موجودگی کو نہ جانے کیا سمجھی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ میں اس پر کسی قدر جھکا ہوا تھا۔ جھٹکا لگنے سے اس کے اوپر گر گیا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا اور میرے رخساروں پر بوسے دینے لگی۔

"ارے۔ یہ کیا کر رہی ہو۔ دروازہ کھلا ہے کوئی آ جائے گا۔" میں نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تو دروازہ بند کر دو۔ کھلا کیوں چھوڑ دیا تم نے۔ ویسے بھی اس وقت سب لوگ سو رہے ہیں۔ آدھی رات کو کون یہاں....."

"جائی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ آدھی رات کا وقت نہیں۔ صبح کے نو بج چکے ہیں اور تم یہاں میری موجودگی کا غلط مطلب نہ لو؟"

"تو پھر کیوں آئے ہو؟ اس طرح میرے اوپر کیوں جھکے ہوئے تھے؟" جائی نے کہا۔ اس کے لہجے میں اب نیند کا خمار تھا۔

"تمہاری انگوٹھی کہاں ہے؟" میں نے کہا "ہیرے کی انگوٹھی جو کل تم نے پہنی ہوئی تھی۔ میں تمہاری انگلیوں میں وہ انگوٹھی ہی دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"انگوٹھی!" اس نے باری باری دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی طرف دیکھا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور بستر پر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگی۔ اس نے تکیہ بھی اٹھا کر دیکھ لیا "وہ انگوٹھی میری انگلی میں ذرا ڈھیلی تھی۔ ہو سکتا ہے سوتے میں بستر پر گر گئی ہو اور لیزا نے اٹھا کر کہیں رکھ دی ہو۔ میں ابھی اس سے پوچھتی ہوں۔"

"لیزا سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "وہ انگوٹھی پولیس کے قبضے میں ہے۔"

"کیا....؟" جائی اچھل پڑی۔

"حواس بحال کر کے باہر آؤ تو میں تمہیں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور اسے حیران و پریشان چھوڑ کر کمرے سے نکل آیا۔

میں ہال میں پہنچا تو لیزا بھی تھائی کے پاس بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ سامنے کافی ٹیبل پر چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کپ اٹھا لیا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔ تھائی نے بھی اخبار چھوڑ کر ایک کپ اٹھا لیا۔

"پرسادا ابھی نہیں اٹھا؟" میں نے پوچھا۔

"اٹھ گیا ہے۔ میں اسے اور پاتھم کو کمرے ہی میں چائے دے آئی ہوں۔" لیزا نے جواب دیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی جائی بھی کمرے سے نکل کر آ گئی۔ وہ اب بھی کچھ بدحواس ہو رہی تھی۔ اس نے آتے ہی ایک کپ اٹھا لیا۔ میرے قریب بیٹھ کر چند چسکیاں لیں اور پھر کپ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

"کیا کہہ رہے تھے تم۔ میری انگوٹھی پولیس کے پاس کیسے پہنچی؟"

"اخبار میں لکھا ہے کہ پولیس کو اس بنگلے سے ہیرے کی ایک طلائی انگوٹھی بھی ملی ہے جو زنانہ ساخت کی ہے اور ظاہر ہے وہ انگوٹھی تمہاری ہی ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

جانگی چند لمحے خاموش رہی پھر بولی "وہ انگوٹھی میری انگلی میں کسی قدر ڈھیلی تھی۔ گزشتہ رات اس راکھشس کے ساتھ ہاتھا پائی میں انگلی سے نکل کر گر گئی ہوگی لیکن میرے خیال میں اس انگوٹھی سے کوئی سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔"

"پاتھم نے بھی یہی کہا تھا کہ اس کی گاڑی کے ذریعے کوئی سراغ نہیں لگایا جاسکتا لیکن ہوا یہ کہ پولیس اس گاڑی کے ذریعے سراغ لگاتی ہوئی پاتھم کے ورکشاپ تک پہنچ گئی۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "یہ تو اچھا ہی ہوا کہ پاتھم یہاں پکڑا گیا تھا۔ اگر وہ بنکاک میں پولیس کی گرفت میں آجاتا تو نہ صرف یہ کہ ہم اسے چھڑا نہیں سکتے تھے بلکہ ہمارے لیے بہت سے مسئلے بھی پیدا ہوسکتے تھے۔ مسئلے تو اب بھی پیدا ہوں گے لیکن...."

"لیکن اس انگوٹھی کے ذریعے کوئی سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔" جانگی نے میری بات کاٹ دی "وہ انگوٹھی میں نے کئی سال پہلے بنکاک میں پرل سینٹر سے خریدی تھی۔ اگر آرڈر پر بنوائی ہوتی تو شاید وہ گاہک کو یاد رکھتے لیکن یہ انگوٹھی تو شوکیس میں سجی ہوئی تھی جو میں نے خریدلی اور ویسے بھی پولیس کے لیے یہ معلوم کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگا کہ یہ انگوٹھی کب اور کہاں سے خریدی گئی تھی۔"

"پولیس کو اتنا بے وقوف مت سمجھو۔" میں نے کہا "یہ پولیس والے تو گڑے مُردے بھی اکھاڑ لیتے ہیں۔ ہمیں پولیس کی صلاحیتوں کا غلط اندازہ لگا کر اپنے آپ کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے۔"

جانگی اب واقعی پریشان دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ اس حقیقت سے پہلے ہی واقف ہوچکی تھی کہ پولیس نے پاتھم کی اس گاڑی کے ذریعے اس کا پتا چلالیا تھا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ کوئی اس کا سراغ نہیں لگا سکتا تھا اور اب وہ اپنی اس حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کی سزا بھگت رہا تھا۔

"خود اعتمادی اچھی بات ہے۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی انسان کو ڈبو دیتی ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟" جانگی کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔

"فوری طور پر تو کچھ ہوگا نہیں۔" میں نے کہا "جب ہوگا تب دیکھا جائے گا اور ویسے بھی اب تم منظرِ عام پر تو ہو نہیں۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ماسٹر ہوچن کا فون آگیا۔ کال لیزا نے ریسیو کی تھی۔ اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"تم نے آج کے اخبارات دیکھ لیے ہوں گے؟" ماسٹر نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

"ہاں، ابھی ابھی میں اخبارات کا مطالعہ ہی کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اخبارات میں ایک خبر جو نہیں چھپی وہ یہ ہے کہ رات کو بنگلے میں جس شخص کو گولی لگی تھی وہ زندہ بچ گیا ہے۔ اس کی حالت اگرچہ بڑی تشویش ناک ہے مگر ڈاکٹر اسے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس بات کو بہت خفیہ رکھا جارہا ہے تاکہ مجرم ہوشیار نہ ہوجائیں یا اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

"یہ تو واقعی تشویش ناک خبر ہے۔" میں نے کہا "اس کی زندگی ہماری موت کا باعث بن سکتی ہے۔ مجھے اور پرساد کو تو شاید وہ شناخت نہ کرسکے لیکن تھائی اور جانگی ہمارے بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے تقریباً بیتیس منٹ تک ان کے ساتھ رہی تھیں۔ زندہ بچ جانے والا جو بھی ہے وہ جانگی اور تھائی کو شناخت کرسکتا ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کے حلیے بھی بتا دیے تو انہیں آسانی سے تلاش کرلیا جائے گا۔"

"ایک دوسری خبر یہ ہے کہ پولیس کی بھاری نفری کچھ دیر پہلے بنکاک سے یہاں پہنچ چکی ہے۔ پورے شہر کی اس طرح ناکا بندی کردی گئی ہے کہ بلی کا بچہ بھی نظروں میں آئے بغیر باہر نہیں جاسکتا۔ اس کے علاوہ شہر بھر میں جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے ہیں۔ اب تک سیکڑوں افراد کو حراست میں لیا جاچکا ہے جن سے پوچھ گچھ کی جارہی ہے۔ پولیس میں بھی کسی کالی بھیڑ کو تلاش کیا جارہا ہے کیونکہ پاتھم کو نہایت خفیہ طور پر اس بنگلے میں منتقل کیا گیا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کو یہ بھی شبہ ہے کہ پولیس کے اندر ہی سے کسی نے مجرموں کو اس بنگلے کی نشان دہی کردی ہو۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"تم لوگ اس بنگلے تک محدود رہو۔ باہر جھانک کر بھی مت دیکھنا اور لیزا سے کہو کہ وہ اپنی معمول کی سرگرمیاں جاری رکھے۔ اس کے معمولات میں بے قاعدگی بھی اسے شک کی زد میں لاسکتی ہے۔" ماسٹر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ظاہر ہے ہم یہاں محدود ہو کر نہیں رہ سکتے۔ میں کوشش کروں گا کہ ایک آدھ دن میں ہم یہاں سے نکل جائیں۔ ویسے اب تم لوگ پری کے جمنازیم والے نمبر پر فون مت کرنا۔ ہوسکتا ہے وہ فون ٹیپ کیا جارہا ہو۔"

"آپ کہاں سے بول رہے ہیں ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس وقت پبلک بوتھ سے بات کر رہا ہوں۔ کوئی اہم بات ہوئی تو دوبارہ فون کروں گا۔ وش یو گڈ لک!" ماسٹر ہوچن نے یہ کہتے ہوئے فون رکھ دیا۔

میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔ تھائی اور جانگی وغیرہ نے فون پر اگرچہ صرف میری ہی باتیں سنی تھیں لیکن میرے منہ سے نکلنے والے الفاظ اور چہرے کے تاثرات سے انہوں نے گڑبڑ کا اندازہ لگالیا تھا اور پھر میں نے انہیں ماسٹر سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا۔ ان کے چہروں پر تشویش کے تاثرات ابھر آئے۔

"اگر وہ زندہ بچ گیا تو ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔" جانگی نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "کاش!

مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اسے کس اسپتال میں رکھا گیا ہے تو میں اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہی اسے زہر کا انجکشن لگا کر ختم کردیتی۔"

میں نے چونک کر جانگی کی طرف دیکھا اور پھر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جانگی ڈاکٹر ہے۔ اگر یہ پتا چل جاتا کہ اس شخص کو کہاں رکھا گیا ہے تو اس قسم کا رسک لیا جاسکتا تھا لیکن اب میں ماسٹر کو فون کرکے بھی یہ معلوم نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے لیزا کو بھی ماسٹر کی ہدایت سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ ناشتا کرکے اپنے مساج پارلر جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کی گاڑی سے اتاری گئی لائسنس پلیٹیں رات کو واپس آنے کے بعد دوبارہ لگا دی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد لیزا چلی گئی اور ہم پھر اس صورتِ حال پر گفتگو کرنے لگے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ پرساد اب تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ اس نے اپنا اور پاتھم کا ناشتا بھی کمرے ہی میں منگوالیا تھا۔ میں اٹھ کر ان کے کمرے میں آگیا۔ پرساد پلنگ کے قریب کوچ پر سو رہا تھا البتہ پاتھم جاگ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا لیکن چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں ابھرے۔ اس کی نظروں میں بھی اجنبیت تھی۔ پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا۔ جب میں نے آگے بڑھ کر شیک ہینڈ کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا ہاتھ تو آگے بڑھا دیا لیکن نظروں میں اجنبیت بدستور تھی اور چہرہ بھی تاثرات سے عاری تھا۔

"ہیلو۔ کیسے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں....؟ کیا ہوا ہے مجھے....؟ تم کون ہو اور یہ کون ہے؟" پاتھم نے جواب دیا۔

اگر میرے اوپر آسمان ٹوٹ پڑتا تو شاید مجھے اتنا دکھ اور صدمہ نہ ہوتا جتنا پاتھم کے اس جواب سے ہوا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی تھی۔ میں گہری نظروں سے پاتھم کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ دور دور تک ایسے تاثرات نہیں تھے جن سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا کہ اس نے میرے ساتھ کسی قسم کا مذاق کیا ہوگا۔ اس کی نظروں میں میرے لیے شناسائی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

ہماری آواز سن کر پرساد اٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ رات کا باقی حصہ بھی اس نے جاگ کر ہی گزارا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"سنا تم نے۔" میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پاتھم میرے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے 'تم کون ہو؟'"

"پاتھم مذاق نہیں کر رہا باس۔ وہ تو مجھے بھی نہیں پہچانتا۔ مجھ سے بھی بار بار یہی سوال کر رہا ہے کہ میں کون ہوں۔ وہ.... وہ واقعی...." پرساد مجھ سے لپٹ کر رونے لگا۔

میری عجیب سی کیفیت تھی۔ دماغ ایک دم سُن ہوگیا تھا جیسے برف جم گئی ہو۔ میرا ہاتھ اگرچہ پرساد کے کندھے پر تھا مگر میری نظریں پاتھم کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

پرساد صبح سے اب تک کمرے سے کیوں نہیں نکلا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے شاید سوچا ہوگا کہ مجھے یہ خبر کیسے سنائے گا اور اب وہ مجھ سے لپٹ کر رو رہا تھا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر جانگی اور تھائی بھی آگئیں۔ ان دونوں نے پہلے پاتھم کی طرف دیکھا تھا پھر جانگی ہی نے سوال کرنے میں پہل کی۔

"کیا ہوا، پرساد کیوں رو رہا ہے؟"

میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر انہیں پاتھم کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ دونوں سکتے میں آگئیں اور اس طرح بے حس و حرکت کھڑی رہ گئیں جیسے پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہوگئی ہوں اور پھر تھائی ہی نے پہلے زبان کھولی تھی۔

"یہ.... یہ کیسے ہوگیا؟" اس کے لہجے میں ہکلاہٹ تھی۔

"تشدد۔" میں نے جواب دیا "اس کے دماغ کو بجلی کے جھٹکے لگائے گئے تھے اور کوئی ایسی نس متاثر ہوئی ہے جس سے شاید یہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔ یہی شکر ہے کہ ہم اسے بروقت وہاں سے نکال لائے۔ ورنہ ہوتا یہ کہ وہ لوگ اس سے ہمارے بارے میں یا سامی کے قتل کے حوالے سے سوال پوچھتے رہتے۔ یہ انکار کرتا یا لاعلمی کا اظہار کرتا، اس پر تشدد جاری رکھا جاتا اور اس طرح یہ ختم ہوجاتا۔"

"کتنے بے رحم ہوتے ہیں یہ پولیس والے۔" تھائی بڑبڑائی۔

"میرا خیال ہے جانگی کچھ بتا سکے گی کہ اس کی کیفیت کیا ہے۔" میں نے کہا۔

جانگی میرے کہنے سے پہلے ہی آگے بڑھ کر پاتھم کا معائنہ کرنے لگی تھی۔ اس نے پاتھم کی آنکھوں کے پپوٹے بھی پلٹ کر دیکھے اور اس سے چند سوالات بھی کیے۔ پاتھم عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے جانگی کا ہاتھ پکڑلیا۔ کچھ دیر ہاتھ کی پشت سہلاتا رہا پھر اسے ہونٹوں سے لگا کر چوم لیا۔

"یہاں ایسا انتظام تو نہیں ہے کہ ٹھیک سے معائنہ کیا جاسکے۔" جانگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ کیفیت وقتی بھی ہوسکتی ہے اور مستقبل بھی لیکن فوری طور پر ایک چانس لیا جاسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک انجکشن دینا پڑے گا۔" جانگی نے کہا "ہوسکتا ہے اس سے کچھ فرق پڑ جائے۔"

جانگی نے ایک کاغذ پر انجکشن کا نام لکھ دیا۔ میں نے ایک گن مین کو وہ پرچہ اور پیسے دے کر مارکیٹ بھیج دیا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک لوٹ کر آیا۔ وہ سرنج اور انجکشن لے آیا تھا۔ جانگی جب انجکشن تیار کر رہی تھی تو اسے دیکھ کر پاتھم کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور جب جانگی اس کی قمیص کی آستین اوپر اٹھا رہی تھی

تو وہ دہشت زدہ سے لہجے میں بولا۔
"یہ سوئی مجھے کیوں لگا رہی ہو۔ مجھے کیا ہوا ہے؟"
"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" جانگی نے کہا "یہ انجکشن لگے گا تو ٹھیک ہو جاؤ گے۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے اور تم کام کیا کرتے ہو؟"
"مجھے نہیں معلوم مگر تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟" پاتھم بولا۔
"میں تمہاری دوست ہوں۔ جانگی..... اور یہ بھی تمہارے دوست ہیں۔" جانگی نے کہا اور اسے ہمارے نام بھی بتانے لگی۔
"اتنے سارے اور اتنے اچھے اچھے دوست۔" پاتھم یہ کہتے ہوئے باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا اور آخر میں اس کی نظریں ایک بار پھر جانگی کے چہرے پر جم گئی تھیں۔
"اچھا۔ اب تم مٹھی بند کرلو۔ ذرا سختی سے۔" جانگی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے بھی اشارہ کردیا۔ میں نے کہنی سے ذرا اوپر پاتھم کا بازو دبا دیا۔ اس طرح جانگی کو اس کے بازو پر مطلوبہ نس تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس نے سوئی نس میں پیوست کی تو پاتھم کے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔
انجکشن لگنے کے پندرہ منٹ بعد پاتھم پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ ہم لوگ اس کے کمرے سے نکل کر ہال میں آ گئے البتہ پرساد وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔
"یادداشت واپس لانے کے لیے بجلی کے جھٹکے لگانا ضروری ہے۔" جانگی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "لیکن سب سے پہلے یہ..... دیکھنا ہوگا کہ پاتھم مزید جھٹکے برداشت کرسکتا ہے یا نہیں۔ یہاں کوئی ایسی سہولت موجود نہیں۔ یہ سب کچھ کسی کلینک یا اسپتال ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔"
"کسی اسپتال یا کلینک کا رخ کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔" میں نے کہا۔
"یہی تو پرابلم ہے۔" جانگی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "فی الحال ہم اس کے لیے دعا ہی کرسکتے ہیں۔ ایک بات بہرحال طے ہے کہ اگر اس کی یادداشت بحال ہو بھی گئی تو یہ نارمل زندگی نہیں گزار سکے گا۔"
"ہاں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی اندیشہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔
اب ہمارے پاس گفتگو کے لیے صرف یہی ایک موضوع تھا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فوری طور پر اس کے لیے کیا کیا جائے۔ ہم اسے کسی کلینک یا اسپتال نہیں لے جا سکتے تھے۔ نہ ہی کسی ڈاکٹر کو یہاں بلایا جا سکتا تھا۔
دو بجے کے قریب لیزا بھی آ گئی۔ وہ کھانے پینے کا بہت سا سامان لے کر آئی تھی۔ اسے جب پاتھم کے بارے میں بتایا گیا تو کچھ دیر کے لیے وہ بھی سکتے میں آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خبریں بھی لائی تھی۔ اس کی اطلاع کے مطابق پورا شہر پولیس اسٹیٹ بنا ہوا تھا۔ چھاپے، پکڑ دھکڑ، جگہ جگہ گاڑیوں کی چیکنگ، لوگوں کو روک کر پوچھ گچھ..... لوگ پریشان ہو گئے تھے۔ غیر ملکی اور ملک کے دوسرے حصوں سے آنے والے سیاح خوف زدہ ہو کر شہر چھوڑ رہے تھے اور اس میں بھی انہیں بڑی پریشانیاں اور دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ معاملہ صرف پانچ پولیس (پانچواں پولیس والا جو مرنے سے بچ گیا تھا اس کے بارے میں رازداری برتی جا رہی تھی۔ ظاہر یہی کیا جا رہا تھا کہ پانچوں پولیس والے ہلاک ہو چکے تھے) والوں کے قتل کا ہی نہیں تھا۔ دو فرانسیسی سیاح یعنی ایک بوڑھا اور اس کی بیٹی بھی مارے گئے تھے۔ فرانسیسی سفارت خانے نے تھائی حکومت پر شدید دباؤ ڈال رکھا تھا۔ شانگ کے قتل سے ڈرگ مافیا بھی حکومت کو مسلسل دھمکیاں دے رہی تھی۔ چاروں طرف سے پڑنے والے اسی دباؤ کی وجہ سے حکومت کی مشینری پوری طرح حرکت میں آ گئی تھی اور پولیس غالباً پہلی مرتبہ اس قدر فعال ہوئی تھی۔
لیزا نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانے کو طبیعت کسی کی بھی نہیں چاہ رہی تھی لیکن روح اور جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے پیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالنا ضروری تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سب ہی بے دلی سے کھانا کھا رہے تھے۔ اسی دوران میں ماسٹر ہوچن کا فون آ گیا۔ وہ اس وقت بھی کسی پبلک بوتھ سے بات کر رہا تھا۔ میں نے جب اسے پاتھم کے بارے میں بتایا تو وہ بھی پریشان ہو گیا۔
"یہ تو واقعی بڑی تشویش ناک خبر ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "لیکن بہرحال، میں نے تم لوگوں کے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ آج کا دن گزار لو اور پھر رات کے آخری پہر تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ گے۔"
"لیکن..... پاتھم... کیا اسے ساتھ لے جانا ممکن ہوگا۔ اس کی تلاش میں تو پورے شہر کی ناکا بندی کی گئی ہے۔" میں نے کہا۔
"پاتھم کی آڑ میں ہی ہم لوگ یہاں سے نکلیں گے اور اب کچھ اور آسانی ہو جائے گی۔" ماسٹر ہوچن نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "میں آج رات کسی وقت آؤں گا اور ہم پروگرام فائنل کریں گے۔"
"اور اس کے بارے میں کیا خبر ہے ماسٹر؟" میں نے اشارتاً پوچھ لیا۔ میرا مطلب اس پولیس والے سے تھا جو زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا تھا۔
"وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آ سکا اور میرے آدمی کی اطلاع کے مطابق اس کے ہوش میں آنے کا امکان بھی نہیں کیونکہ جب اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا اس وقت تک اس کا بہت زیادہ خون ضائع ہو چکا تھا۔ اس کے جسم سے ابھی گولی بھی نہیں نکالی گئی۔ ڈاکٹر اس کے بارے میں مایوسی کا اظہار کر چکے ہیں۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ماسٹر۔ میں رات کو آپ کا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔
ہمارا وہ پورا دن بڑی بوریت میں گزرا۔ ماسٹر ہوچن رات آٹھ بجے کے قریب آیا تھا۔ اس نے کنچن بوری سے نکلنے کا جو منصوبہ بتایا، وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔
"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "پولیس کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں اور میری اطلاع کے مطابق بنکاک سے چند سراغ رساں بھی منگوائے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، مشکلات بڑھتی جائیں گی۔"
"کیا اس طرح نکلنا آسان ہوگا؟" میں نے کہا "قدم قدم پر چیکنگ ہو رہی ہے، ہم سے کاغذات طلب کیے جائیں گے اور پھر۔"
"میں نے سارا بندوبست کرلیا ہے۔" ماسٹر ہوچن نے میری بات کاٹی "رات دس بجے کے بعد تم لوگ یہاں سے منتقل ہو جاؤ گے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ پاتھم کو سب سے آخر میں میرے آدمی یہاں سے لے جائیں گے۔ تم لوگوں کے حلیے بھی اس طرح تبدیل کردیے جائیں گے کہ شناخت نہ کیا جا سکے۔ بہرحال، اب میں چلتا ہوں۔ ٹھیک دس بجے ایک گاڑی تم لوگوں کو لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔ پہلے تم، تھائی اور جانگی یہاں سے نکلو گے۔ دوسرے پھیرے میں پرساد اور پاتھم کو لے جایا جائے گا۔"
"اور لیزا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"وہ یہیں رہے گی۔ اسے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ویسے اگر وہ چاہے تو بعد میں بنکاک آ سکتی ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
ماسٹر ہوچن کے جانے کے بعد ہم بھی وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کرنے لگے۔ جانگی اور تھائی نے اپنی ساری چیزیں سمیٹ کر بیگ پیک کرلیے اور پھر ٹھیک دس بجے ماسٹر ہوچن کی بھیجی ہوئی گاڑی پہنچ گئی۔ ہم لوگ لیزا سے رخصت ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔
ہماری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ کلینک تھا۔ گاڑی مین روڈ پر آئے بغیر ہی گلیوں میں ہوتی ہوئی وہاں پہنچی تھی۔ ہمیں کلینک کے پچھلے دروازے سے اوپر کی منزل پر واقع ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔
گیارہ بجے کے بعد پاتھم اور پرساد بھی پہنچ گئے۔ پاتھم کو نیچے ہی کسی کمرے میں رکھا گیا تھا البتہ پرساد کو ہمارے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں کھانا بھی اسی کمرے میں سرو کیا گیا تھا۔
اس کمرے میں دو اسپرنگ والے بیڈ اور تین چار کرسیاں تھیں۔ کھڑکیوں کے سامنے ہرے رنگ کے دبیز پردے لٹکے ہوئے تھے۔ کمرا کافی کشادہ تھا۔
رات ڈیڑھ بجے کے قریب دو ادھیڑ عمر عورتیں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں میڈیکل کٹ جیسے بیگ تھے۔ ان دونوں نے آتے ہی اپنا کام شروع کردیا۔ وہ اپنے کام میں خاصی ماہر تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں نے اٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ میرا چہرہ بالکل بدل گیا تھا۔ یہ اندازہ لگانا بھی دشوار تھا کہ چہرے پر کسی قسم کا میک اپ کیا گیا ہے۔ دوسروں کے حلیے بھی کچھ ایسے ہی تبدیل ہوئے تھے کہ انہیں شناخت کرنا آسان نہیں رہا تھا۔
پانچ بجے کے قریب ایک عورت ہمارے لیے کافی لے آئی۔ ہم رات بھر کے جاگے ہوئے تھے اور اس وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کر رہے تھے۔ کافی ختم ہونے کے بعد ہمیں نیچے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ تابوت کے ڈھکنے پر تقریباً ایک مربع فٹ شیشہ لگا ہوا تھا جس سے تابوت کے اندر دیکھا جا سکتا تھا اور اس شیشے کے اندر دیکھتے ہی میں چونک گیا۔
ایک آدمی نے جو غالباً ڈاکٹر تھا، تابوت کا ڈھکنا اٹھا دیا۔ تھائی وغیرہ بھی اچھل پڑے۔ ایک لمحے کو تو میرا دماغ سنسنا اٹھا تھا۔ پاتھم کا چہرہ لاش ہی کی طرح زرد تھا۔ کفن میں لپٹا ہوا پاتھم لاش ہی لگ رہا تھا۔
ڈاکٹر نے ایک فائل میری طرف بڑھا دی۔
"اس میں تمام کاغذات موجود ہیں۔" اس نے کہا "مارکھم نامی یہ شخص بیس روز پہلے اس کلینک میں داخل کرایا گیا تھا۔ اسے نمونیا تھا۔ یہاں اس کا علاج ہوتا رہا مگر یہ جانبر نہ ہو سکا اور گزشتہ رات اس کا انتقال ہو گیا۔ اس فائل میں مریض کو دیے جانے والے ٹریٹ منٹس کی تمام رپورٹس موجود ہیں اور یہ پولیس کے کاغذات ہیں۔ ڈیڈ باڈی کو شہر سے باہر لے جانے کے لیے پولیس کا اجازت نامہ ہونا ضروری ہوتا ہے بہتر ہے کہ تم ایک مرتبہ اس فائل کو دیکھ لو تاکہ بعد میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"
میں فائل کھول کر کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ فائل ہر لحاظ سے مکمل تھی۔
"پولیس کے یہ کاغذات....."
"اصلی ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا "تمام کاغذات اصلی ہیں سوائے ڈیڈ باڈی کے۔ مجھے امید ہے راستے میں تم لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ مسٹر پاتھم کو ایسا انجکشن دیا گیا ہے کہ کم از کم چھ گھنٹوں تک یہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا رہے گا۔ چھ گھنٹے کے بعد انجکشن کا اثر زائل ہونا شروع ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ بنکاک پہنچتے ہی اسے مادام جیری کے کلینک پہنچا دیا جائے۔ یہ خط اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔ یہ خط پڑھتے ہی مادام جیری سمجھ جائے گی اور یہ خط کسی اور کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔" اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا جو میں نے بڑی احتیاط سے جینز کی ہپ پاکٹ میں رکھ لیا۔
اس دوران میں جانگی نے فائل میرے ہاتھ سے لے لی تھی

اور وہ سرسری سے انداز میں کاغذات کو دیکھ رہی تھی۔

"جانگی بھی ڈاکٹر ہے۔" میں نے اس ڈاکٹر سے جانگی کا تعارف کرایا۔

"گڈ۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ یہ صورتِ حال کو آسانی سے سنبھال سکیں گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

تقریباً اسی وقت چار آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور ڈاکٹر کا اشارہ پاکر تابوت کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ بھی کلینک سے باہر نکلے تو سامنے ہی ایک بڑی ایمبولینس کھڑی تھی۔ تابوت ایمبولینس کے فرش پر رکھا جاچکا تھا۔ اس کے دائیں بائیں لمبی سیٹیں تھیں۔ میں تھائی کے ساتھ ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر جانگی اور پرساد بیٹھ چکے تھے۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ کلینک کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔

جس وقت ایمبولینس حرکت میں آئی اس وقت دن کی روشنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ ایمبولینس شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہائی وے ۳۲۳ کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں پولیس نے ہمیں دو جگہ روکا تھا لیکن تابوت دیکھ کر ہمیں فوراً ہی جانے کی اجازت دے دی گئی۔ البتہ شہر کی نواحی چوکی پر جہاں سے بنکاک کی طرف جانے والی ہائی وے ۳۲۳ شروع ہوتی تھی وہاں چیکنگ سخت تھی۔ پولیس کی بھاری نفری نے سڑک اس طرح بلاک کر رکھی تھی کہ ان کی اجازت کے بغیر وہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

یہاں ہم لوگوں کو ایمبولینس سے نیچے اتار لیا گیا۔ ایک آفیسر نے ایمبولینس میں داخل ہو کر تابوت کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھا اور پھر نیچے اتر آیا۔ دوسرا آفیسر کاغذات چیک کر رہا تھا اور ہم سوگوار سے ایک طرف کھڑے تھے۔ کاغذات چیک کرنے کے بعد اس آفیسر نے ہم سے کچھ سوالات بھی کیے۔ تھائی نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے بتایا کہ ہم لوگ تفریح کے لیے یہاں آئے تھے لیکن دوسرے ہی روز ہمارا یہ کزن بیمار ہوگیا۔ اسے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرا دیا گیا لیکن گزشتہ رات اس کا انتقال ہوگیا۔

تقریباً چالیس منٹ گزر گئے۔ دل کو دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ کسی بھی لمحے کوئی بات ہوسکتی تھی۔ اگر ایسا کوئی مرحلہ آتا تو ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ایک آفیسر فائل لے کر دفتر کے اندر چلا گیا تھا اور دیر اسی کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ وہ غالباً ٹیلی فون پر متعلقہ پولیس اسٹیشن سے اس امر کی تصدیق کر رہا تھا کہ وہاں سے جاری کیے گئے کاغذات درست بھی ہیں یا نہیں اور پھر اس نے باہر آکر دوسرے آفیسر کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے فائل جانگی کی طرف بڑھا دی اور اس کے ساتھ ہی ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ اس آفیسر نے اس تاخیر پر ہم سے معذرت بھی کی تھی اور ہمارے کزن کی موت پر افسوس کا اظہار بھی۔

کنچن بوری سے تقریباً پینتالیس میل دور ناکھن پاتھن کی چوکی پر بھی اسی طرح چیکنگ ہوئی۔ انہوں نے بھی کنچن بوری ٹیلی فون کرکے پولیس اسٹیشن سے کاغذات کی تصدیق کی تھی اور اس کے بعد ہی ہمیں آگے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔

اور بالآخر ہم بنکاک پہنچ گئے۔ شہر کے نواح میں داخل ہوتے ہی ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم موت کے جبڑوں سے نکل کر آئے تھے۔ چیکنگ کے دوران میں اگر کسی جگہ بھی کسی کو یہ شبہ ہوجاتا کہ تابوت میں لاش نہیں ایک زندہ آدمی ہے تو ہمیں وہاں سے زندہ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔

شہر کے شمالی بس ٹرمنل سے آگے نکل کر مورائے گارڈن ہوٹل کے قریب میں نے ایمبولینس رکوالی۔

"تم ایمبولینس کے ساتھ مادام جیری کے کلینک چلے جاؤ۔" میں نے پرساد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پاتھم کو کلینک پہنچا کر اطمینان کرلینے کے بعد تم جانگی کے بنگلے پر آجانا۔ کلینک میں چونکہ ہماری ضرورت نہیں ہوگی اس لیے ہم یہاں سے ٹیکسی وغیرہ پر پہنچ جاتے ہیں اور یہ خط مادام جیری کو دے دینا۔" میں نے پتلون کی جیب سے ڈاکٹر کا دیا ہوا لفافہ نکال کر پرساد کے ہاتھ میں دے دیا۔

"جب تک اسے ہوش نہیں آئے گا میں وہیں رہوں گا۔" پرساد نے لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں ایمبولینس سے اتر آئے۔ اس وقت صبح کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ساڑھے پانچ بجے کنچن بوری کے کلینک سے روانہ ہوئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن راستے میں دو جگہ چیکنگ میں زیادہ وقت لگا تھا۔

اس وقت مجھے بڑی شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ تھائی اور جانگی کی بھی غالباً ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوگیا۔ یہ ایک اچھا معیاری اور پُرسکون ریسٹورنٹ تھا اور اس وقت رش بھی نہیں تھا۔ ہم نے کارنر کی ایک میز پر قبضہ کرلیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد تھائی ایک نو عمر ویٹریس کو ناشتے کا آرڈر دے رہی تھی اور جب ناشتا میز پر لگا تو ہم تینوں اس طرح اس پر ٹوٹ پڑے جیسے کئی روز سے کھانے کی شکل نہ دیکھی ہو۔

○☆○

میں واٹ ٹریمٹ کے ایک کمرے میں مہاراج کے سامنے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ ماسٹر ہوچن کے علاوہ ایک اور شخص بھی تھا جسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا شخص بڑی پُروقار شخصیت کا مالک تھا۔ چہرے پر سنجیدگی اور لہجے میں بردباری تھی۔ اس کی گفتگو اور شخصیت سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق ہمارے طبقے سے نہیں تھا۔ اس کا لباس بھی یہ تصدیق کر رہا تھا کہ وہ اعلیٰ سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے۔

ہم دوپہر بارہ بجے کے قریب جانگی کے بنگلے پر پہنچے تھے۔ دو گھنٹے

صفائی میں لگ گئے تھے اور پھر میں اپنے کمرے میں بستر پر گر کر سویا تو شام سات بجے سے پہلے آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کے بعد ہی حواس بحال ہوئے تھے۔

جانگی نے بتایا کہ چھ بجے کے قریب پرساد کا فون آیا تھا۔ پاتھم ہوش میں آچکا تھا لیکن اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا اس لیے پرساد نے بھی فی الحال وہیں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پاتھم کے لیے ایک الگ کمرے کا بندوبست کردیا گیا تھا جس میں اٹینڈنٹ کے لیے بھی ایک بیڈ لگا دیا گیا تھا۔

جانگی نے لیزا کو بھی ٹیلی فون پر اپنے بہ عافیت بنکاک پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ یہاں پہنچ کر نجانے کیوں مجھے عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ جس طرح کوئی شخص دن بھر بھاگ دوڑ کے بعد اپنے گھر پہنچ کر سکھ کا سانس لیتا ہے اسی طرح ہم نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ میرا گھر تو کوئی بھی نہیں تھا مگر جانگی کے اس بنگلے کے در و دیوار سے انس ہوگیا تھا اور یہاں آنے کے بعد مجھے ہمیشہ گھر جیسا سکون ہی ملا تھا۔

صبح جب ہم ریسٹورنٹ سے ناشتا کرکے نکلے تھے تو ہم ایک مارکیٹ میں گھس گئے تھے جہاں سے جانگی اور تھائی نے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی بہت سی چیزیں خریدلی تھیں۔ اس طرح ہم تقریباً بارہ بجے کے قریب گھر پہنچے تھے۔

رات آٹھ بجے کے قریب ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ماسٹر ہوچن کا فون آگیا۔

"کنچن بوری میں تم نے پوچھا تھا کہ مہاراج تم سے کیا اہم کام لینا چاہتے ہیں اور میں نے بات کو ٹال دیا تھا کہ وقت آنے پر بتا دیا جائے گا۔" ماسٹر ہوچن نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں ایک اہم ذمے داری سونپی جائے۔ مہاراج آج رات تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا مہاراج یہاں آئیں گے؟"

"نہیں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "رات بارہ بجے کے بعد کسی وقت میرے دو آدمی تمہارے بنگلے پر پہنچ جائیں گے۔ تم ان کے ساتھ چلے آنا۔ اکیلے....."

"تھائی اور جانگی اکیلی رہیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ دیر میں سکھدر وہاں پہنچنے ہی والا ہوگا۔ وہ پہلے کی طرح ڈیوٹی دے گا۔ اس کی موجودگی میں کسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔" ماسٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے ماسٹر۔" میں نے کہا "دارا وغیرہ کے بارے میں کوئی اطلاع ملی؟"

"ہاں۔ تمہیں ساری تفصیل بعد میں بتا دی جائے گی۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

میں نے اسے پاتھم کے بارے میں بتایا تو ماسٹر نے کہا۔

"تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پاتھم اب مہاراج کی ذمے داری ہے اور تم جانتے ہو مہاراج اپنے وفاداروں کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ پاتھم کا علاج کرایا جائے گا اور اس کی ہر ممکن دیکھ بھال کی جائے گی۔"

مزید چند جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کردیا گیا۔ میں تھائی اور جانگی کو ماسٹر ہوچن سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگا۔ ان دونوں کی طرح میں بھی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ اہم ذمے داری کیا ہوسکتی ہے جو مہاراج مجھے سونپنے والے ہیں۔

نو بجے کے قریب سکھدر پہنچ گیا اور اس نے آتے ہی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ جانگی نے اسے الماری سے ایک آٹومیٹک رائفل نکال کر دے دی تھی اور دوسری رائفل اپنے پاس رکھ لی تھی۔

ماسٹر کے آدمی رات ایک بجے کے قریب وہاں پہنچے تھے۔ جانگی اور تھائی بھی اس وقت جاگ رہی تھی۔ میرے رخصت ہوتے ہی جانگی نے برآمدے والا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ سکھدر باہر والے گیٹ تک میرے ساتھ آیا تھا۔

اور اب میں مہاراج کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جہاں ماسٹر ہوچن اور پُروقار شخصیت کا مالک وہ شخص بھی بیٹھا ہوا تھا جو گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"تمہیں شاید اس ملک کی سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ ہو لیکن اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمارے ہاں آئینی بادشاہت ہے۔" مہاراج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا "تھائی لینڈ کی تاریخ بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔ یہ علاقہ ہمیشہ ہی سے بیرونی حملہ آوروں کے لیے کشش کا باعث رہا ہے لیکن اس خطے نے بڑی جرأت سے اپنی سلامتی کا دفاع کیا۔ اگرچہ کئی مواقع ایسے بھی آئے کہ بیرونی حملہ آوروں نے دارالحکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر اس سرزمین نے اپنا وجود نہیں کھویا اور کسی حملہ آور طاقت کو یہاں قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ تھائی لینڈ نے ہمیشہ اپنی آزادی برقرار رکھی جبکہ آس پاس کی ریاستیں بیرونی حملہ آوروں کی کالونیاں بن کر رہ گئیں۔" مہاراج خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں بڑی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پہلے میں نے کبھی اس موضوع پر سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھے اس سے کیا غرض ہوسکتی تھی کہ تھائی لینڈ ماضی میں کن کٹھن مراحل سے گزر چکا ہے۔ میں پہلی مرتبہ ایسی باتیں سن رہا تھا اور مجھے ان میں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ مہاراج بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"۱۲۳۸ء میں دو قبائلی سرداروں کھون بانگ اور کھون پھا مانگ نے کھمیرز کو بھگا کر یہاں باقاعدہ حکومت کی بنیاد رکھی اور سوکھو تھائی شہر کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس خاندان کا آخری حکمران شہنشاہ تاکسن تھا۔ اس وقت ایوتھایا اس ملک کا دارالحکومت تھا۔ کنگ تاکسن کے انتقال کے بعد فوج کے ایک

جنرل تاکسن فریا نے حکومت سنبھال لی۔ حکمران خاندان میں آپس کی بغاوتوں کی وجہ سے برما کو حملہ آور ہونے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے ایوتھایا کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کے کئی سال بعد جنرل فریا نے حکومت سنبھالتے ہی دریا چاؤ فریا کے کنارے پر آباد.... تھان بوری نامی قصبے کو اپنا دارالحکومت بنالیا۔ ۱۷۸۲ء میں چکری خاندان کے پہلے حکمران کنگ یودھا یودتا نے عنانِ حکومت سنبھالی اور راما ون کے نام سے مشہور ہوا۔ راماون نے دارالحکومت دریائے فریا کے دوسرے.......... کنارے کرونگ تھیپ نامی قصبے میں منتقل کردیا۔ (موجودہ بنکاک کو پرانے وقتوں میں کرونگ تھیپ کہا جاتا تھا)

"حقیقت یہ ہے کہ چکری خاندان کے دور میں تھائی لینڈ نے زندگی کے ہر شعبے میں بے پناہ ترقی کی اور آج یہ خطہ ایشیا کا پانچواں ٹائیگر کہلاتا ہے۔ حکمران چکری خاندان کا ہر حکمران راما کے نام سے متعارف ہوا۔ آج اس چکری خاندان کا نواں شہنشاہ یعنی راما نائن برسرِ اقتدار ہے۔ شہنشاہ بھومی بول ایڈل یا دیو راما نائن نے ۱۹۳۶ء میں اقتدار سنبھالا تھا۔

"۱۹۳۲ء میں راما ہشتم کے دور میں فوج کے چند افسروں نے ایک پُرامن انقلاب کے ذریعے اقتدار پارلیمنٹ کے حوالے کردیا اور شہنشاہ کو آئینی حیثیت دے دی گئی۔ گویا ۱۹۳۲ء سے آج تک یہاں آئینی بادشاہت چل رہی ہے۔ اس وقت یہ خطہ سیام کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا لیکن ۱۹۳۹ء میں اس کا نام تھائی لینڈ رکھ دیا گیا اور آج یہ ملک پوری دنیا میں اسی نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔

"چکری خاندان کئی سو سال سے اس خطے پر حکومت کررہا ہے۔ تھائی لینڈ کی موجودہ ترقی اسی خاندان کی بدولت ہے۔ موجودہ شہنشاہ راما نائن طویل عرصے سے برسرِ اقتدار ہے۔ راما نائن نے بھی تھائی لینڈ کی خوش حالی اور ترقی کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ لوگ اس شہنشاہ کو بہت چاہتے ہیں۔ پرستش کرتے ہیں ان کی، لیکن شورشیں، بغاوتیں اور سازشیں ہر دور میں ہوتی رہی ہیں اور آج بھی ایک ایسا وقت آگیا ہے کہ بعض ناپسندیدہ عناصر شہنشاہ کے خلاف گھناؤنی سازشوں میں مصروف ہیں۔ کچھ اندر ہی کے لوگ ہیں جو شہنشاہ کو اقتدار سے محروم کرکے قوم و وطن کے لیے ان کی طویل ... خدمات اور عزت کو خاک میں ملا دینا چاہتے ہیں۔ ہم شہنشاہ کے وفادار ہیں اور ایسے موقعوں پر وفادار ہی اپنے آقاؤں کے کام آتے ہیں۔ اس قوم پر شہنشاہ کے اتنے احسانات ہیں کہ ہم ان کا حساب بھی نہیں کرسکتے لیکن اگر چاہیں تو اس وقت اپنی وفاداری ثابت کرسکتے ہیں۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں مہاراج؟" میں نے مہاراج کے خاموش ہونے پر کہا "اگر آپ حکم دیں تو میں اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کرسکتا ہوں۔"

"یہ رتنا کوسن ہیں۔ شہنشاہ کے کزن۔" مہاراج نے قریب بیٹھے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا "رتنا کوسن نے کئی سال پہلے مجھے آگاہ کیا تھا کہ شہنشاہ کے خلاف ایک خوفناک سازش جنم لے رہی ہے لیکن اس کا ابھی تک سراغ نہیں مل رہا۔ انہی دنوں تم میرے پاس آئے تھے اور میں نے تمہارے اندر چھپے ہوئے اس آدمی کو دیکھ لیا تھا جو وقت آنے پر پہاڑ سے بھی ٹکرا سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے مخصوص انداز میں تمہاری تربیت شروع کی تھی۔ آج میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جانے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ تم نے جس طرح پیڈرو، دارا اور اس کے آدمیوں کو انگلیوں پر نچا رکھا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ پیڈرو اور دارا جیسے غنڈوں سے میرے آدمی بھی نمٹ سکتے تھے لیکن میں تمہیں ان سے بھڑنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ تمہارا حوصلہ دیکھنا چاہتا تھا اور اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ وہ کام صرف تم اور تم ہی کرسکتے ہو۔ کسی اور میں اتنا حوصلہ نہیں ہوسکتا۔"

"آپ حکم کیجیے مہاراج۔" میں نے کہا۔

"رتنا کوسن حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔" مہاراج نے کہا "یہ اگر چاہے تو اپنے ذرائع سے بھی کام لے سکتا ہے لیکن رتنا کوسن بعض وجوہ کی بنا پر فی الحال خود سامنے نہیں آنا چاہتا۔ اس نے بہرحال یہ پتا چلالیا ہے کہ شہنشاہ کے خلاف اس سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جنرل کھوراٹ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جنرل کھوراٹ پہلے بھی شہنشاہ کے خلاف ایک سازش میں ملوث رہ چکا ہے۔ وہ فرار ہوکر گولڈن ٹرائی اینگل چلا گیا تھا۔ اس کے چند وفادار بھی اس کے ساتھ گئے تھے۔ وہاں اس نے پوست کی کاشت شروع کردی جس سے افیون، مارفیا، ہیروئن اور ان ہی جیسی دیگر مہلک منشیات تیار کرکے اسمگل کرنے لگا۔ جرائم پیشہ لوگ برما، لاؤس اور تھائی لینڈ سے فرار ہوکر اس کے گروہ میں شامل ہوتے گئے۔ آج جنرل کھوراٹ گولڈن ٹرائی اینگل کی بہت بڑی قوت ہے۔ اس کے پاس جدید ترین ہتھیار، میزائل اور طیارہ شکن توپیں بھی موجود ہیں۔ ماضی میں ایک دو مرتبہ اس کے علاقے پر بمباری کی گئی تھی لیکن اپنے ہی طیاروں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ گولڈن ٹرائی اینگل مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں ہے۔ بلاشبہ وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ وہ پوری دنیا کو ہیروئن اور دیگر منشیات سپلائی کرتا تھا۔ پوری دنیا میں اس کے تعلقات ہیں۔ یہاں بھی اس کے کارندے موجود ہیں جو بڑے پیمانے پر زہر پھیلا رہے ہیں۔ پیڈرو جیسے لوگ بھی اس کے کارندوں میں شامل ہیں۔

"رتنا کوسن کی اطلاع کے مطابق شہنشاہ کے خلاف سازش کرنے والوں نے جنرل کھوراٹ کو کسی حد تک اپنا ساتھ دینے پر آمادہ کرلیا ہے۔ چند روز بعد سازشی سرغنہ کے نمائندے گولڈن ٹرائی اینگل میں جنرل کھوراٹ سے ملاقات کرنے والے ہیں اور اس ملاقات میں معاہدے کی تفصیلات طے کی جائیں گی اور ظاہر

ہے جنرل کھوراٹ زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ حکومت کا کوئی آدمی گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ یہ کام تم کرسکتے ہو۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ اس سازش کا اصل سرغنہ کون ہے اور ان میں اور جنرل کھوراٹ میں کیا معاہدہ ہوتا ہے۔" مہاراج چند لمحوں کو خاموش ہوئے پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے "میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں قدم رکھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور موت بھی بڑی اذیت ناک ... کوئی اجنبی اس علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا اور میں تمہیں یہ بھی بتادوں کہ تمہارا ازلی دشمن دارا اور پیڈرو بھی اسی طرف جاچکے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دولت کے لیے اپنی ماں کو بھی بیچ سکتے ہیں۔ سازشی گروہ نے نہایت خفیہ طور پر ان کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ یہ لوگ سازشی سرغنہ کے نمائندوں کو تحفظ فراہم کریں گے اور اس کے علاوہ .... فانگ چن بھی چیانگ رائے میں موجود ہے۔ اسے یہ پتا چل گیا ہے کہ اس کا آدمی شانگ تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ گویا یہ سمجھ لو کہ تمہارے چاروں طرف موت ہوگی۔ ایسی صورت میں، میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں۔ تم چاہو تو انکار کرسکتے ہو۔ میں تمہیں دو دن کا وقت دوں گا۔ اس دوران میں تم اچھی طرح سوچ لو۔"

"سوچا تو وہاں جاتا ہے مہاراج جہاں کوئی چوائس ہو۔" میں نے جواب دیا "یہاں تو ایک ہی راستہ .... سچائی کا راستہ ہے اور اس راستے پر چلنا مجھے آپ ہی نے سکھایا ہے۔ میں اس سے منہ کیسے موڑ سکتا ہوں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔"

رتنا کوسن نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میری بات سن کر مہاراج کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" مہاراج نے کہا "اب تم رتنا کوسن کے ساتھ چلے جاؤ۔ یہ تمہیں تفصیل سے سب کچھ سمجھادے گا۔"

میں مہاراج سے رخصت ہوکر رتنا کوسن کے ساتھ شہر کے شمالی علاقے میں واقع ایک بنگلے میں آگیا اور پھر رات کا باقی حصہ جاگتے ہوئے ہی گزرا تھا۔ رتنا کوسن نے ساری باتیں بڑی تفصیل سے سمجھائی تھیں اور جنرل کھوراٹ کی کچھ پرانی تصویریں بھی دکھائی تھیں تاکہ میں اسے آسانی سے شناخت کرسکوں۔

میں پورا دن اسی بنگلے میں رہا۔ اس دوران میں وہاں چار آدمی اور بھی آئے تھے۔ وہ بھی ہماری گفتگو میں شریک رہے تھے۔ وہ چاروں بھی حکومت کے بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

"ٹھیک ہے مسٹر وجدان۔" بالآخر رتنا کوسن نے کہا "ہز ہائی نس سے منظوری کے بعد تمہیں مطلع کردیا جائے گا۔ ویسے میرے خیال میں تمہیں تیار رہنا چاہیے۔ کسی بھی وقت گرین سگنل مل سکتا ہے۔"

اور پھر جس رازداری سے مجھے اس بنگلے تک لے جایا گیا تھا۔ اس طرح آدھی رات کے وقت مجھے دوبارہ مہاراج کے پاس پہنچا دیا گیا۔

مہاراج کے آدمیوں نے جب مجھے جانکی کے بنگلے کے سامنے گاڑی سے اتارا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ جانکی اور تھائی سو رہی تھیں۔ میری آواز سن کر اٹھ گئیں۔ اس وقت کوئی بات کرنے کا موقع نہیں تھا۔

رات کا باقی حصہ بھی میں نے جاگ کر اور سوچتے ہوئے گزارہ تھا۔ اب مجھے اپنی اہمیت کا اندازہ بھی ہوگیا تھا۔ مہاراج کے پاس ایسے درجنوں آدمی ہوں گے جن سے یہ کام لیا جاسکتا ہے لیکن مہاراج نے میرا انتخاب کیا تھا اور اس کے لیے خاص طور پر میری تربیت کی گئی تھی۔ شہنشاہ کے خلاف یہ سازش بہت پرانی تھی لیکن شاید اب وہ وقت آگیا تھا کہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاتا۔

ناکام ہونا چھوڑیئے
کامیاب ہونا سیکھئے
کامیابی
زندگی میں کامیاب ہونے کے رہنما اصول اور طریقے
قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ
خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
kitabiat1970@yahoo.com

ایسے منصوبوں میں اگرچہ رازداری پہلی شرط ہوتی ہے لیکن تھائی اور جانکی تو ایسی ہستیاں تھیں جن سے کوئی بات چھپانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ان میں سے ایک میری خاطر اپنی عزت تک قربان کرچکی تھی اور دوسری بھی بڑی سے بڑی قربانی دینے کو ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ ان پر بھروسا نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہوتا۔

صبح ناشتے پر میں نے انہیں سب کچھ بتادیا۔

"بہت ہی خطرناک اسائن منٹ ہے۔" جانکی نے کہا "اس میں ہم سب کی جانیں بھی جاسکتی ہیں لیکن میں اپنی حد تک یہ کہہ سکتی ہوں کہ سچائی کے لیے اپنی جان لٹانے سے دریغ نہیں کروں گی۔"

"اور کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں گی۔" تھائی نے اسے گھورا۔

وہ دونوں جانتی تھیں کہ اس مشن کے دوران میں قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی ہوگی لیکن وہ دونوں جان کی یہ بازی لگانے کو تیار تھیں۔ اس رات میں نے پرساد کو بھی بلالیا اور ساری بات اس کے سامنے رکھ دی۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں باس لیکن یا تھم...."

"اس کی تم فکر مت کرو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "مہاراج کے آدمی اس کا خیال رکھیں گے۔"

ہم نے اپنی تیاری مکمل کرلی۔ تین دن بعد مہاراج کے توسط سے ہمیں رتنا کوسن کی طرف سے گرین سگنل مل گیا۔

دوسرے دن جانکی اور پرساد چیانگ رائے چلے گئے۔ اس کے اگلے دن میں اور تھائی بھی چیانگ رائے جانے کے لیے جہاز پر سوار ہوگئے۔

بنکاک سے 785 کلومیٹر دور تھائی لینڈ کے انتہائی شمال میں برما اور لاؤس کی سرحدوں کے قریب واقع چیانگ رائے جانے کے لیے اگرچہ ٹرین اور بسوں کی سہولت بھی موجود تھی لیکن اس طرح سفر بہت طویل ہوجاتا تھا جب کہ ہوائی جہاز سے صرف ایک گھنٹا پچیس منٹ میں یہ فاصلہ طے کیا جاسکتا ہے۔

نویتا چیانگ رائے میں موجود تھی۔ ہیڈ رو کے چھوٹے بھائی سای کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد ہم نے نویتا کو چیانگ رائے بھیج دیا تھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ جانکی اور پرساد ایک دن پہلے اس کے پاس پہنچ گئے ہوں گے۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں اور تھائی کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے اور نویتا وغیرہ سے بعد میں رابطہ کیا جائے گا۔

وہ بڑی روشن اور چمکیلی صبح تھی۔ ائرپورٹ پر بھی ہمیں ایک گیسٹ ہاؤس کا ایجنٹ مل گیا۔ اس طرح سپرہائی وے روڈ سے ذرا ہٹ کر مائے کاک ریور کے ساتھ ہی مان وانگ کم نامی گیسٹ ہاؤس میں کمرا حاصل کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

وہ دن ہم نے گیسٹ ہاؤس میں ہی گزارہ۔ شام چھ بجے کے قریب میں نے نویتا کو فون کیا تو کال اسی نے ریسیو کی تھی۔

"یس لٹل ماسٹر۔" وہ میری آواز سنتے ہی بولی "وہ دونوں بھی موجود ہیں اور ہم آپ کا انتظار کررہے ہیں۔"

"مجھے اپنا ایڈریس سمجھاؤ۔ ہم چند منٹ میں یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔" میں نے کہا اور توجہ سے دوسری طرف کی آواز سننے لگا۔

اس کے تقریباً دس منٹ بعد میں اور تھائی ایک ٹیکسی میں سوار ان کی طرف جارہے تھے۔

ٹورسٹ پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت سے ذرا آگے پرانی طرز کے کچھ ولاز بنے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے خوب صورت کاٹیج نما یہ مکان ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے۔ درمیان کی خالی جگہوں پر سرسبز لان بنے ہوئے تھے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا مگر مطلوبہ ولا تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دو مرتبہ بیل بجانے کے بعد بھی اندر سے جواب نہیں ملا تو میں نے الجھی ہوئی نظروں سے تھائی کی طرف دیکھا اور پھر دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ میں نے نویتا کا نام لے کر پکارا لیکن اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا تو ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔

ولا میں اندھیرا تھا۔ پندرہ منٹ پہلے نویتا سے فون پر میری بات ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ جانکی اور پرساد بھی یہاں موجود ہیں لیکن اب کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

دروازے کی دوسری طرف راہداری تھی۔ میں نے دیوار پر ٹٹول کر سوئچ آن کردیا۔ راہداری روشن ہوگئی۔ میں نے ایک بار پھر نویتا کو پکارا لیکن اس مرتبہ بھی جواب نہیں ملا۔ میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دروازے میں داخل ہوکر دیوار ٹٹولنے لگا۔

میرا ہاتھ سوئچ بورڈ سے ٹکرایا۔ میں نے ایک سوئچ دبا دیا۔ کچھ نہیں ہوا، دوسرا سوئچ دبایا تو کمرے میں روشنی بھر گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

سامنے ہی بیڈ پر نویتا خون میں لت پت پڑی تھی۔ ایک خنجر اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست تھا۔ زخم سے ابھی تک خون بہہ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے مڑ کر تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے پناہ وحشت تھی اور چیخ روکنے کے لیے اس نے دائیں ہاتھ سے منہ کو سختی سے دبا رکھا تھا۔

میں نے ایک بار پھر نویتا کی طرف دیکھا۔ اس کے سینے پر بہت ہلکا سا زیروبم بتا رہا تھا کہ اس میں ابھی جان باقی تھی۔ میں لپک کر بیڈ کے قریب پہنچ گیا اور جھک کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"نویتا.... نویتا....!" میں جھک کر مدھم لہجے میں نویتا کو پکارنے لگا "آنکھیں کھولو نویتا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ کون تھے وہ لوگ؟ جانکی اور پرساد کہاں ہیں؟ نویتا.... آنکھیں کھولو نویتا...."

میں ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا لیکن نہ تو نویتا نے آنکھیں کھولیں اور نہ ہی اس کے ہونٹوں یا جسم کے کسی اور حصے میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ تھائی بھی بیڈ کی دوسری طرف نویتا پر جھکی ہوئی تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے ہولے ہولے نویتا کے گال تھپتھپانے لگا "نویتا.... آنکھیں کھولو۔ دیکھو ہم آگئے ہیں۔ یہ سب کیسے ہوا نویتا....؟"

اس مرتبہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ نویتا کے پپوٹوں میں بہت معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

"یہ کیا ہوا نویتا۔ کون تھے وہ لوگ.... جانکی اور پرساد کہاں ہیں؟" میں نے اس پر کچھ اور جھکتے ہوئے اپنے سوال دہرائے۔

نویتا کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اف! کتنی ویرانی تھی ان آنکھوں میں۔ اس کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ میں نے کچھ اور جھک کر کان اس کے ہونٹوں کے قریب کردیا۔ سرسراہٹ کی سی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر حلق سے نکلنے والی سرسراہٹ جیسی آواز الفاظ کا روپ نہیں دھار پا رہی تھی۔

"نویتا...." میں نے ایک بار پھر اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔ کوشش کرو تاکہ الفاظ تمہارے ہونٹوں تک آسکیں۔"

نویتا کے ہونٹ بدستور پھڑپھڑا رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کان اس کے ہونٹوں کے بہت قریب کردیا۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ اس کی سرسراتی ہوئی آواز الفاظ کا روپ دھارنے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اپنی پوری توجہ اس آواز پر مرکوز کردی۔

"چچ.... چی.... چی.... فا...."

"چی فانگ! تم یہی کہنا چاہتی ہو نا؟" میں نے اپنا چہرہ قدرے اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں سے ایسا لگا جیسے وہ میرے الفاظ کی تائید کررہی ہو "جانکی اور پرساد کہاں ہیں۔ تم نے فون پر بتایا تھا کہ وہ دونوں بھی یہیں ہیں۔ کیا وہ...."

یکایک مجھے اپنی آواز حلق میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نویتا کی آنکھوں کی روشنی معدوم ہوچکی تھی۔ پتلیاں ساکت ہوگئی تھیں اور وہاں اب دھندلاہٹ سی نظر آرہی تھی۔

"نویتا.... نویتا...." میں گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔

بیڈ کی دوسری طرف کھڑی ہوئی تھائی حقیقت کی تہ کو پہنچ چکی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے گلوگرفتہ سی آواز نکلی۔

"اب وہ تمہاری آواز نہیں سن سکتی۔ وہ ہم سے بہت دور جاچکی ہے۔"

میں نے اپنا جھکا ہوا چہرہ اٹھا کر تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والے آنسو رخساروں پر دھار کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ وہ نویتا کی حالت دیکھ کر غالباً شروع ہی سے رو رہی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سیدھا کردیا اور پھر ایک ہاتھ سے نویتا کی آنکھیں بند کردیں۔

تھائی نے غلط نہیں کہا تھا۔ نویتا اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور سیدھا ہوکر دیکھنے لگا۔ بستر کی چادر کا بہت بڑا حصہ خون سے تر ہو رہا تھا اور خون غالباً چادر کے نیچے میٹرس میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کے سینے میں خنجر پیوست ہوئے نجانے کتنی دیر ہوچکی تھی اور پتا نہیں وہ کب سے جاں کنی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ خنجر اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر پیوست تھا اور اتنا زیادہ خون بہہ جانے کے بعد اتنی دیر تک زندہ رہ جانا ہی بڑی حیرت کی بات تھی۔

"چی فانگ!" میرے ہونٹوں سے بھنچی بھنچی سی آواز نکلی۔ اس کے ساتھ ہی میری مٹھیاں بھی بھنچ گئیں۔ میں پلکیں جھپکے بغیر نویتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے دم توڑا تھا اور میں کچھ نہیں کرسکا تھا۔ مجھے اس کی موت کا بے حد دکھ پہنچا تھا۔ میرے حواس مختل ہورہے تھے۔ نویتا نے مرنے سے پہلے چی فانگ کا نام بتا دیا تھا۔ اگر چی فانگ اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی گردن مروڑ دیتا۔

نویتا ایک رقاصہ تھی۔ وہ دولت اور شہرت کی تمنا لے کر بنکاک آئی تھی۔ وہ سپر اسٹار بننا چاہتی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے لانے والا کون تھا۔ شانگ اسے اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اسی دوران میں ہم شانگ اور ٹائیگر سے ٹکرا گئے اور جب نویتا کو معلوم ہوا کہ وہ کس طرح دھوکے کا شکار ہوئی تھی تو وہ شانگ وغیرہ کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ آن ملی تھی۔ اسے خوف تھا کہ شانگ وغیرہ اسے قتل کردیں گے۔

شروع میں وہ اپنی جان ہی کے خوف سے ہمارے قریب رہی تھی لیکن بعد میں وہ ہم میں سے ایک ہوگئی۔ میری خاطر اس نے کئی مرتبہ اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی اور بالآخر آج اس نے اپنی جان دے دی۔ ہم سب کو اس سے اُنس ہوگیا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ ایک دوسرے کے لیے تڑپ اٹھتے تھے۔ میرے خیال میں نویتا کی موت ہمارے لیے ایک ایسا نقصان تھی جس کی آسانی سے تلافی نہیں ہوسکتی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ تھائی نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"اوہ!" میں جیسے ہوش میں آگیا "میں چی فانگ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "جب میں نے نویتا کو فون کیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ جانکی اور پرساد بھی یہاں موجود ہیں لیکن اب ان کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ دونوں بھی ان کے ہاتھ نہ لگ گئے ہوں۔"

تھائی نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں بھی تشویش نمایاں تھی۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر کاٹیج کے دوسرے کمروں کو چیک کرنے لگا۔

یہ کاٹیج زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دو بیڈ روم تھے اور ایک ڈرائنگ روم۔ ایک بیڈ روم میں نویتا کی لاش تھی۔ دوسرے بیڈ روم میں بھی آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ یہ بیڈ روم شاید نویتا نے اپنے مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا لیکن اس کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کئی روز سے اس بستر پر کوئی سویا نہیں تھا۔

پورے کاٹیج میں جانکی اور پرساد کا سراغ نہیں ملا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھار رہے تھے۔ میں نے نویتا کو شام چھ بجے فون کیا تھا۔ اس کے دس منٹ بعد ہی میں تھائی کے ساتھ روانہ ہوگیا تھا۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگا ہوگا۔ پہاڑی علاقوں میں سورج جلدی غروب ہوجاتا ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اب یہ صورتِ حال میرے سامنے تھی۔ چھ بجے جانکی اور پرساد وہاں موجود تھے۔ نویتا نے انہیں بتادیا ہوگا کہ ہم آرہے ہیں اس لیے یہ سوچنا محال تھا کہ ہمارا فون ملنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے چلے گئے ہوں گے اور ان کے جانے کے بعد چی فانگ یہاں آیا ہوگا جس نے نویتا کو قتل کردیا۔ چی فانگ اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ دارا اور کم بھی ہوں گے۔ انہیں کسی طرح چیانگ رائے میں جانکی اور پرساد کی موجودگی کا پتا چل گیا ہوگا یا ممکن ہے انہیں صرف نویتا کے بارے میں پتا چلا ہو اور وہ لوگ اس سے پچھلا حساب چکانے کے لیے یہاں پہنچ گئے ہوں اور اتفاق سے اس وقت جانکی اور پرساد بھی یہاں موجود تھے۔ انہوں نے نویتا کو تو موت کے گھاٹ اتار دیا اور جانکی اور پرساد کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔

یہ سب مفروضات تھے۔ ان میں سے کوئی بھی بات ہوسکتی تھی لیکن یہ طے تھا کہ جو کچھ بھی ہوا تھا' پچھلے آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہوا تھا۔

میں کاٹیج کی تلاشی لیتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ پولیس سائرن کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ سائرن کی آواز اچانک ہی اور بہت قریب سے سنائی دی تھی۔ لگتا تھا جیسے پولیس کی گاڑی نے کاٹیج کے عین سامنے پہنچ کر سائرن بجایا ہو۔

تھائی کی آنکھوں میں بھی وحشت سی ابھر آئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور تیزی سے اس کمرے سے باہر آگئے۔ جب ہم نویتا والے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچے تو باہر کسی گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

"اس طرف۔" تھائی نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ "ادھر پچھلی طرف بھی ایک دروازہ ہے۔"

میں نے ایک نظر بیڈ پر پڑی ہوئی نویتا کی لاش کی طرف دیکھا اور تھائی کے ساتھ تیزی سے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں عقبی دروازے کا بولٹ ہٹا رہا تھا کہ کال بیل کی آواز گونج اٹھی۔ پولیس نے روایتی حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے دروازہ کھلا ہونے کے باوجود براہِ راست اندر داخل ہونے کے بجائے کال بیل بجانا ضروری سمجھا تھا۔ جرائم پیشہ لوگ پولیس کی ایسی ہی حماقتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس وقت ہم نے بھی اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور عقبی دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔

اس طرف تاریکی تھی۔ کاٹیج کی پچھلی طرف بھی کشادہ لان تھا جسے پودوں کی باڑ نے گھیر رکھا تھا۔ تین چار گنجان پتوں والے اونچے درخت بھی تھے جن کی وجہ سے تاریکی کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نویتا کے کاٹیج سے دور ہوتے چلے گئے اور بالآخر دس منٹ بعد ایک سڑک پر پہنچ گئے جہاں ہمیں فوراً ہی ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں نے تھائی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو کلاک ٹاور چلنے کو کہہ دیا۔ ہم دونوں کا انداز اس وقت ایسا تھا جیسے گھر سے محض تفریح کے لیے نکلے ہوں۔

چند منٹ بعد ہماری ٹیکسی اس راستے سے گزری جس طرف نویتا کا کاٹیج تھا۔ وہاں پولیس کی تین گاڑیاں نظر آرہی تھیں اور آس پاس کئی لوگ جمع ہوچکے تھے۔ ڈرائیور نے پولیس کی گاڑیوں اور وہاں جمع لوگوں کی طرف دیکھا لیکن رکے بغیر ٹیکسی آگے نکال لے گیا۔

کلاک ٹاور شہر کا وسطی اور بہت بارونق علاقہ تھا۔ کاروباری علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں دن کے وقت بھی بڑی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی اور رات کو بھی دیر تک چہل پہل رہتی تھی۔ تمام بڑی تجارتی کمپنیوں کے دفاتر اور بینک اسی علاقے میں واقع تھے۔ بینک دوپہر کے وقت اور دفاتر شام پانچ بجے بند ہوجاتے تھے جبکہ شاپنگ سینٹرز اور ریسٹورنٹس وغیرہ رات کو دیر تک کھلے رہتے تھے۔ ڈسکو اور نائٹ کلب تو رات کے آخری پہر تک کھلے رہتے تھے۔

وہ شام کا ابتدائی حصہ تھا۔ تمام شاپنگ سینٹر کھلے ہوئے تھے۔ پورا علاقہ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی جیٹ یارڈ روڈ کے کارنر پر رکوائی۔ میٹر دیکھ کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور تھائی کو اشارہ کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔

ہم دونوں اس وقت تک وہاں کھڑے رہے جب تک ٹیکسی

حرکت میں آکر دور نہیں چلی گئی۔

"یہاں کیوں آگئے۔ اپنے گیسٹ ہاؤس کی طرف کیوں نہیں گئے؟" تھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہاں سے سیدھا اپنے گیسٹ ہاؤس کی طرف جانا مناسب نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا "اگر ٹیکسی ڈرائیور کو کسی قسم کا شبہ ہوجاتا تو بعد میں وہ ہمارے ٹھکانے کی نشاندہی کرسکتا تھا۔"

"ہاں۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی لیکن اب کیا پروگرام ہے۔ کیا گیسٹ ہاؤس جانا مناسب ہوگا۔ ایسا تو نہیں کہ ہمارا گیسٹ ہاؤس بھی ان کی نظروں میں آگیا ہو؟" تھائی نے کہا۔

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "اگر ہمارا ٹھکانا ان کی نظروں میں آگیا ہوتا تو وہ پہلا وار ہم پر ہی کرتے۔" میں چند لمحے خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر بولا "نویتا تو اپنی جان سے گئی لیکن اس وقت مجھے سب سے زیادہ پریشانی جانکی اور پرساد کی طرف سے ہے۔ وہ نجانے کہاں ہیں۔ محفوظ ہیں یا دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔"

"کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم مزید پریشان ہونے سے پہلے 'وائی ایم سی اے' گیسٹ ہاؤس سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرلیں۔ جب وہ بنکاک سے روانہ ہوئے تھے تو یہی طے ہوا تھا کہ وہ وائی ایم سی اے میں ہی قیام کریں گے۔ ہمارے آنے کے بعد کوئی اور بندوبست کیا جائے گا۔" تھائی نے کہا۔

"مجھے وہاں ان کے ملنے کی توقع نہیں لیکن بہرحال معلوم کرلینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے پبلک ٹیلی فون بوتھ نظر آرہا تھا۔ ہم دونوں اس طرف چل پڑے۔ وہ دراصل ساتھ ساتھ لگے ہوئے دو ٹیلی فون بوتھ تھے اور اس وقت دونوں مصروف تھے۔ ایک میں تو کوئی جوان عورت تھی جو فون پر بات کرتے ہوئے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے تحاشا میک اپ تھپا ہوا تھا۔ وہ جس طرح اطمینان سے بات کررہی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ فی الحال ریسیور سے الگ ہونے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوسرے بوتھ میں ایک دراز قامت آدمی تھا جس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

ہم دونوں سامنے کھڑے ہوگئے۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ آدمی بوتھ سے نکلا تو میں اور تھائی اندر داخل ہوگئے۔ ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ ہی دیوار میں لگے ہوئے ایک شیلف پر ایک مختصر سی ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی رکھی ہوئی تھی جس میں چیانگ رائے کے اہم مقامات کے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ تھائی ڈائریکٹری کھول کر وائی ایم سی اے کا نمبر تلاش کرنے لگی۔ اسے مایوسی نہیں ہوئی لیکن وائی ایم سی اے کے نام سے کئی نمبر تھے۔ پہلا نمبر وائی ایم سی اے گولڈن ٹرائی اینگل انٹرنیشنل ہاؤس کا تھا جو ائرپورٹ کی طرف واقع تھا۔ یہاں جانکی اور پرساد کی موجودگی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ فائیو اسٹار ہوٹل تھا اور دوسری بات یہ کہ شہر سے باہر تھا۔ ایک نمبر وائی ایم سی اے سینٹر کا تھا۔ اور بھی کئی نمبر تھے۔ ان میں ایک گیسٹ ہاؤس کا نمبر بھی تھا۔

تھائی نے ریسیور اٹھا کر گیسٹ ہاؤس کا نمبر ملایا لیکن بڑی مایوسی ہوئی۔ اس گیسٹ ہاؤس میں جانکی اور پرساد کے نام سے یا ان دونوں کے ملتے جلتے حلیوں کے افراد نہیں ٹھہرے تھے۔ کل کی تاریخ میں بنکاک سے آنے والی ایک ادھیڑ عمر عورت اپنی چھ سالہ بچی کے ساتھ وہاں آکر ٹھہری تھی اور ظاہر ہے وہ جانکی نہیں ہوسکتی تھی۔

ہم فون بوتھ سے باہر آگئے۔ اس وقت میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے چوراہے پر رک گئے۔ چوراہے کے وسط میں بہت بڑا کلاک ٹاور تھا جس کے چاروں طرف بڑے بڑے گھڑیال لگے ہوئے تھے اور اس وقت آٹھ بج کر بیس منٹ ہورہے تھے۔

چوراہے پر بڑی رونق تھی۔ یہاں بھی سیاحت کا سیزن تھا۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے اور غیر ملکی سیاح بڑی تعداد میں سڑکوں پر گھومتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ مقامی باشندے بھی ٹہل رہے تھے۔ کچھ تو ایسے تھے جو کسی نہ کسی کام سے بازار میں آئے تھے اور کچھ محض آنکھیں سینکنے کے لیے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ انہی لوگوں میں چور اچکے' اٹھائی گیرے اور رہزن بھی تھے جو شکار کی تلاش میں تھے۔

"چلو۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے ہیں۔" تھائی نے ایک کافی شاپ کی طرف اشارہ کیا "دماغ گھوم رہا ہے۔ ایک کپ کافی پینے کو دل چاہ رہا ہے۔"

دماغ تو میرا بھی گھوم رہا تھا اور واقعی اس وقت کافی کی شدید طلب ہورہی تھی۔ وہ کافی ہاؤس قدرے پُرسکون تھا۔ ہم کارنر کی ایک میز پر بیٹھ گئے۔ ویٹریس فوراً ہی ہمارے سر پر پہنچ گئی۔ تھائی نے بلیک کافی کا آرڈر دے دیا۔ چند منٹ بعد ہی ویٹریس کافی لے کر آگئی۔ اس لڑکی کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ رنگت اگرچہ سانولی تھی لیکن چہرے کے نقوش اور جسم کی ساخت میں بے پناہ کشش تھی۔ اس نے کافی ہاؤس کا مخصوص ڈریس پہن رکھا تھا اور لباس ایسا تھا کہ نظریں بے اختیار اس کی طرف کھنچی چلی جاتی تھیں۔ میرے سامنے کافی کا کپ رکھتے ہوئے وہ کسی قدر جھک گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی تھی۔

"کچھ اور تو نہیں چاہیے سر؟" اس سے پہلے ہی تھائی بول پڑی۔ "اور کچھ نہیں چاہیے۔ چل بھاگ یہاں سے۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی کیونکہ اس نے ویٹریس کی حرکت نوٹ کرلی تھی۔

ویٹریس نے مسکرا کر تھائی کی طرف دیکھا اور خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔ ہم جس میز پر بیٹھے تھے اس کے ساتھ ہی بہت

بڑا شیشہ لگا ہوا تھا جس سے باہر کا منظر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں اور تھائی مسلسل باہر ہی دیکھ رہے تھے۔ ایک موقع پر جبکہ میں تھائی کی طرف جھک کر کوئی بات کر رہا تھا، تھائی نے میرا ہاتھ دبا کر آنکھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا تو اچھل پڑا۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔

وہ رنگولی تھی۔

رنگولی کے بارے میں مختصراً کچھ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ ایک رقاصہ تھی اور ٹائیگر کی منظورِ نظر اور چہیتی سمجھی جاتی تھی۔ جن دنوں ٹائیگر سے میری ٹسل چل رہی تھی ان دنوں رنگولی کو اکثر ٹائیگر کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ وہ کلب ٹونٹی سکس اور اس جیسے بڑے کلبوں میں پروگرام کرتی تھی۔ یہ پروگرام اسے ٹائیگر کی وجہ سے ملتے تھے اور معاوضہ بھی دوسری اے کلاس رقاصاؤں سے زیادہ ملتا تھا لیکن ٹائیگر کی میرے ہاتھوں موت سے تقریباً دو مہینے پہلے ٹائیگر سے اس کی اَن بَن ہو گئی تھی۔ اس رات وہ پیرا ڈائز میوزک ہال' ڈسکو تھک میں پروگرام کرنے والی تھی۔ وہ اسٹیج پر جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کا پروگرام شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی تھے کہ ٹائیگر ڈریسنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہ رنگولی کو اپنے ساتھ کہیں اور لے جانا چاہتا تھا مگر رنگولی نے انکار کر دیا۔ ٹائیگر اپنے کسی مطیع سے انکار سننے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اپنے دوستوں کو بھی زر خرید غلام سمجھتا تھا۔ رنگولی تو اس کی وجہ سے عیش کر رہی تھی۔ اس کے انکار پر ٹائیگر بھڑک اٹھا۔ رنگولی بھی برداشت نہیں کر سکی۔ اس نے پہلی مرتبہ ٹائیگر کے سامنے زبان کھولی جس کا نتیجہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا کہ ٹائیگر نے کلب کے ڈریسنگ روم ہی میں اسے دھنک کر رکھ دیا۔ رنگولی کی چیخوں کی آواز سن کر کلب کا منیجر اور دوسرے بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ رنگولی کو بڑی مشکل سے ٹائیگر کے پنجے سے چھڑایا گیا لیکن اس وقت تک ٹائیگر اس کی ٹھیک ٹھاک مرمت کر چکا تھا۔ اس کا بائیں طرف کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا اور ٹھوکروں اور گھونسوں سے اسے کچھ اندرونی چوٹیں بھی آئی تھیں۔

رنگولی کو کم از کم ایک ہفتہ اسپتال میں گزارنا پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی بنکاک میں رقاصہ کی حیثیت سے اس کا کیریئر بھی ختم ہو گیا تھا۔ اسپتال سے چھٹی ملنے پر جب وہ اپنے فلیٹ پر پہنچی تو وہاں کوئی اور حسینہ قابض تھی جس کے ساتھ دو خطرناک صورتوں والے غنڈے بھی موجود تھے۔ رنگولی کو نہ تو فلیٹ میں داخل ہونے دیا گیا اور نہ ہی اسے اپنی ذاتی استعمال کی چیزیں اٹھانے کی اجازت دی گئی۔

شہر کے پوش علاقے میں یہ شاندار فلیٹ ٹائیگر ہی نے اسے لے کر دیا تھا۔ اس کا سامان بھی بہت قیمتی تھا اور بہت سی قیمتی چیزیں تو رنگولی نے اپنے پیسوں سے خریدی تھیں لیکن اسے یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں اٹھانے دیا گیا۔

شہر کی نمبر ون رقاصہ چشمِ زدن میں قلاش ہو گئی تھی۔ وہ بڑے بڑے لوگ جو اس کے ایک اشارے پر اس کے قدموں پر دولت کے ڈھیر لگانے کو تیار رہتے تھے، اس کے سائے سے بھی دور بھاگنے لگے وہ سب جانتے تھے کہ ٹائیگر اس سے ناراض ہو گیا ہے اور کوئی بھی شخص رنگولی کی مدد کر کے ٹائیگر جیسے خطرناک آدمی کی دشمنی مول لینا پسند نہیں کر سکتا تھا۔

دو تین روز تک رنگولی دربدر پھرتی رہی اور بالآخر اسے شہر کے سب سے گھٹیا علاقے میں واقع ایک گھٹیا سے نائٹ کلب میں پروگرام مل گیا۔ اس نائٹ کلب میں نچلے طبقے کے لوگ ہی آتے تھے جن میں زیادہ تعداد غنڈوں اور بدمعاشوں کی ہوتی تھی۔ کوئی رقاصہ یہاں چند روز سے زیادہ نہیں ٹکتی تھی۔ رقص کے دوران میں بعض لوگ اسٹیج پر آجاتے اور رقاصہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتے۔ یہاں لڑکیوں کی باکسنگ بھی ہوتی تھی اور ان پروگراموں میں بھی ہلڑ بازی ہوتی رہتی تھی۔

اس نائٹ کلب میں رنگولی کا پہلے دن کا پروگرام اس کے لیے بڑا سنسنی خیز تجربہ ثابت ہوا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت دو آدمی اسٹیج پر چڑھ آئے تھے اور اسے اٹھا کر ہال میں لے گئے تھے۔ وہ میزوں کے درمیان چکراتی رہی۔ کوئی اسے چٹکی کاٹتا، کوئی بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا اور کوئی اسے گرفت میں لے کر کس کرنے کی کوشش کرتا۔

رنگولی یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ یہ اس کی مجبوری تھی۔ برداشت نہ کرتی تو دو وقت کی روٹی کے لیے پیسے کہاں سے ملتے۔

اگلی شب وہ پھر اسی کلب میں آئی تھی۔ لڑکیوں کی باکسنگ کا پروگرام ختم ہوا تو گیارہ بجے کے قریب ایک اور رقاصہ پہلے اسٹیج پر اور پھر میزوں کے درمیان تھرکتے ہوئے اپنے جسم کی نمائش کرنے لگی۔ اس کے بعد رنگولی کی باری تھی اور جب اس کا پروگرام شروع ہوا تو ہلڑ بازی شروع ہو گئی۔ مختلف جگہوں پر بیٹھے ہوئے چند غنڈوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہو رہا ہو۔ میزیں اور کرسیاں الٹی جانے لگیں۔ کچھ تماشائیوں نے ان غنڈوں کو روکنا چاہا تو اچھا خاصا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ مار پیٹ میں فرنیچر اور کراکری ٹوٹنے کی آوازیں نمایاں طور پر سنائی دے رہی تھیں۔ چند غنڈے اسٹیج پر آگئے۔ اسٹیج کے پردے پھاڑ دیے گئے۔ رنگولی نے خوف زدہ ہو کر بھاگنا چاہا تو کئی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ ہال میں ہنگامہ زوروں پر تھا۔ توڑ پھوڑ ہو رہی تھی اور پھر اچانک تاریکی چھا گئی۔ اس کے ساتھ ہی رنگولی کی خوفناک چیخ بھی سنائی دی تھی اور پھر وہ چیختی چلی گئی۔ تاریکی میں کسی نے رنگولی پر تیزاب پھینک دیا تھا۔

یہ سب کچھ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہوا تھا۔ جب کلب کا مین سوئچ آف کیا گیا تو اندھیرا ہوتے ہی کسی نے رنگولی پر تیزاب سے بھری ہوئی بوتل انڈیل دی تھی۔ تیزاب چہرے کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکا تھا۔ ٹھوڑی دائیں طرف سے ذرا جھلسی تھی البتہ سینے کا کچھ حصہ اور پیٹ بری طرح جھلسا تھا۔ اس واقعے کے بعد بھی رنگولی کو کئی روز اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔

اسپتال سے نکل کر رنگولی ایک بار پھر در در کی ٹھوکریں کھانے لگی۔ یہ شہر جہاں اس نے بہت عرصے تک لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی تھی، اس کے لیے اجنبی بن گیا تھا۔ وہ لوگ جو اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھ کر ہی ٹھنڈے سانس بھرا کرتے تھے اب اس کے سائے سے بھی ڈرنے لگے تھے۔ لوگ ٹائیگر سے ڈرتے تھے۔ اس نائٹ کلب کا حشر وہ دیکھ چکے تھے اس لیے اب کوئی بھی رنگولی کو منہ لگانے کو تیار نہیں تھا۔

رنگولی کو ایک وقت کی روٹی کے بھی لالے پڑ گئے۔ اس کی حالت بھکاریوں سے بھی بدتر ہو گئی تھی۔ وہ اس شہر سے نکلنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس تو ایک وقت کی روٹی کھانے کے لیے پیسے نہیں تھے، کہیں جانے کے لیے کرایہ کہاں سے لاتی؟

اور پھر ایک روز رنگولی کی ملاقات کھوناٹ نامی ایک ادھیڑ عمر آدمی سے ہو گئی۔ وہ بہت بھدا اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ اسٹیٹ بروکر تھا۔ کاروبار اچھا ہوتا تو عیش کرتا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتا۔ بڑھیا شراب پیتا، کوئی نہ کوئی حسین کال گرل بھی اس کی بغل میں ہوتی۔ کاروبار مندا ہوتا تو ٹھرا پینے کے لیے بھی لوگوں سے چند بھات ادھار مانگتا نظر آتا۔ ویسے عمومی طور پر وہ مندی ہی کا شکار رہتا تھا۔ تقریباً دو سال پہلے اس کے مالی حالات بہت اچھے تھے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں آنا جانا تھا۔ انہی دنوں اس نے کئی مرتبہ رنگولی کو پرفارم کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کا دل مچلا کرتا تھا لیکن رنگولی اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔

اور پھر اس رات کھوناٹ نے رنگولی کو ایک تھرڈ کلاس ریسٹورنٹ میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے دیکھا تو فوراً پہچان لیا۔ اسے رنگولی کی یہ حالت دیکھ کر حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ بے تکلفی سے رنگولی کی میز پر بیٹھ گیا۔ ان دنوں کھوناٹ کی مالی حالت بھی بہت دگرگوں تھی۔ بس اسی قسم کے ریسٹورانوں میں آمدورفت تھی جہاں کم سے کم پیسوں میں پیٹ بھرا جا سکے۔

دو سال پہلے وہ بڑے بڑے نائٹ کلبوں میں رنگولی کو دور ہی سے دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھرا کرتا تھا لیکن اس وقت اس سے بے تکلف ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے رنگولی کے چہرے میں صرف ایک تبدیلی دیکھی تھی۔ ٹھوڑی پر گہری براؤن رنگت کا وہ داغ جو تیزاب کی وجہ سے پڑا تھا اور حقیقت تو یہ تھی کہ وہ داغ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

کھوناٹ نے رنگولی کو اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تو رنگولی نے بلا جھجک اس پیشکش کو قبول کر لیا اور کھوناٹ کے ساتھ اس کے

ذاتی ہپناٹزم

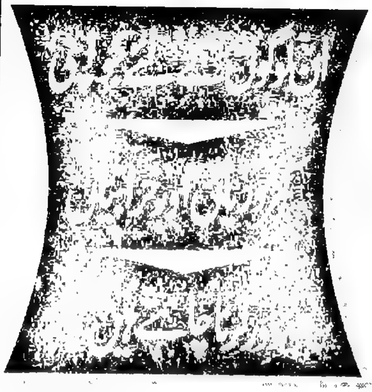

قیمت 25 روپے ❖ ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات

kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

فلیٹ میں آگئی۔

رنگولی تقریباً ایک ہفتہ کھوناٹ کے فلیٹ میں رہی۔ اس دوران میں کھوناٹ نے اسے بری طرح پامال کیا تھا۔ وہ بار بار اسے اپنے بے ہنگم، بھدے اور گندے جسم کے بوجھ تلے روندتا رہا اور رنگولی خاموشی سے برداشت کرتی رہی۔

اسی دوران میں ایک روز رنگولی کو کھوناٹ ہی سے یہ اطلاع ملی کہ ٹائیگر میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس کے تین دن بعد رنگولی کو کھوناٹ کے فلیٹ سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس روز کھوناٹ کی جیب میں ڈھائی ہزار بھات کی رقم موجود تھی۔ رنگولی کو پتا نہیں تھا کہ یہ رقم اس نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ اس نے کھوناٹ کی کن پٹیاں سہلا کر کسی طرح اسے بے ہوش کردیا اور اس کی جیب سے رقم اڑا کر بھاگ نکلی۔

پیڈرو، ٹائیگر کی جانشینی اختیار کرچکا تھا۔ وہ مجھ سے ٹائیگر کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے پاگل ہوا پھر رہا تھا۔ رنگولی کسی طرح پیڈرو تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ ٹائیگر کی موت کے بعد پیڈرو اسے معاف کردے گا اور اسے ایک بار پھر اچھی زندگی گزارنے کا موقع مل جائے گا مگر پیڈرو نے اسے مزید ذلیل کرکے نکال دیا تھا اور رنگولی نے قسم کھائی تھی کہ اگر کبھی موقع ملا تو وہ ان بدمعاشوں سے اپنی بربادی کا انتقام ضرور لے گی۔

اور یہ وہی رنگولی تھی جو طویل عرصے کے بعد یہاں چیانگ رائے میں نظر آئی تھی۔ مجھے رنگولی کے بارے میں یہ ساری باتیں نویتا نے اس وقت بتائی تھیں جب وہ اور پرساد بنکاک میں پیڈرو اور دارا وغیرہ کی سرگرمیوں کا پتا چلانے کے لیے بڑے بڑے ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں گھومتے رہتے تھے۔ میں نے ان دنوں ایک مرتبہ سوچا بھی تھا کہ رنگولی سے رابطہ کرکے اسے پیڈرو کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اتفاق سے رنگولی بنکاک سے غائب ہوچکی تھی۔

رنگولی اس وقت کافی ہاؤس کے سامنے فٹ پاتھ کے کنارے پر کھڑی تھی۔ اسے شاید یہ سڑک پار کرنی تھی اور وہ ٹریفک رکنے کا انتظار کررہی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر تھائی نے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر باہر چلی گئی۔

اس وقت ٹریفک رک گیا تھا۔ رنگولی نے فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر دوسرا قدم رکھا ہی تھا کہ تھائی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ رنگولی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، تھائی اسے ہاتھ سے پکڑ کر دوبارہ فٹ پاتھ پر لے آئی۔ رنگولی سے باتیں کرتے ہوئے اس نے میری طرف اشارہ بھی کیا تھا۔ میں گہری نظروں سے رنگولی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے درمیان اگرچہ تقریباً آٹھ فٹ کا فاصلہ تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ رنگولی کی آنکھوں کی الجھن بتدریج رفع ہورہی تھی اور پھر وہ تھائی کے ساتھ چلتی ہوئی کافی ہاؤس کے دروازے میں داخل ہوگئی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اب رنگولی کے چہرے پر مکمل سکون و اطمینان تھا۔ وہ مجھے پہچان چکی تھی۔

چند جملوں کے تبادلے ہی سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ پیڈرو وغیرہ کے حوالے سے رنگولی کا دل اب بھی شدید نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی بنکاک میں اسے صرف ایک یا دو مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر گہرا براؤن داغ بدنما نہیں لگ رہا تھا۔ اس وقت اس نے پیلے رنگ کی ٹی شرٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی جس کے تنگ سے پائنچے پنڈلیوں سے اوپر ٹانگوں سے چپکے ہوئے تھے۔

تھائی نے ویٹرس کو اشارہ کرکے اس کے لیے بھی کافی منگوائی تھی۔

"ٹائیگر نے تمہارے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی تھی۔" تھائی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "ہمیں جب پتا چلا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ ہم نے تم سے رابطہ کرنا چاہا تو تم بنکاک چھوڑ چکی تھیں۔"

"تمہارے ہاتھوں ٹائیگر کی موت کے بعد میں نے سکھ کا سانس لیا تھا۔" رنگولی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا کہ ٹائیگر کی موت کے بعد پیڈرو میرے اور ٹائیگر کے جھگڑے کو بھول کر مجھے معاف کردے گا لیکن اس نے بھی مجھے بہت ذلیل کیا۔ اس کے بعد ہی میں نے بنکاک چھوڑ دیا تھا اور میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر زندگی میں کبھی موقع ملا تو ان بدمعاشوں سے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ ضرور لوں گی لیکن لگتا ہے میں ان کے خلاف کبھی کچھ نہیں کرسکوں گی۔"

"تم بہت کچھ کرسکتی ہو رنگولی۔" تھائی نے کہا "لیکن ایسی باتیں یہاں نہیں ہوسکتیں۔ تم ہمیں اپنا ایڈریس بتاؤ۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"میری رہائش سامٹ روڈ سے کچھ آگے مسجد کے قریب ہے۔ یہ....."

"مسجد!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ یہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ زیادہ تر رہائشی علاقہ ہے مگر تم لوگ شاید آسانی سے وہاں نہ پہنچ سکو۔ میں اپنا فون نمبر لکھ دیتی ہوں۔ مجھے فون کرکے اپنی لوکیشن بتا دینا۔ میں تم لوگوں کو لے جاؤں گی۔" رنگولی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "یاد آیا۔ تمہارا ایک دوست بھی تو یہاں آیا ہوا ہے۔ میں نے کل رات بھی اسے دیکھا تھا اور آج بھی۔ اس کے ساتھ بنکاک کی ہندو لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں آرہا۔"

"اوہ!" میں چونک گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ پرساد اور جانکی کی بات کررہی تھی "آج تم نے انہیں کب دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں تم لوگوں سے ملاقات سے بیس پچیس منٹ پہلے۔" رنگولی نے جواب دیا "وہ دونوں ایک ٹیکسی میں مائے فابرج کی طرف جارہے تھے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ دونوں وہی تھے؟" اس مرتبہ تھائی نے پوچھا۔

"میں تمہارے اس دوست کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ کیا نام ہے اس کا.... پرساد۔ وہ نویتا کے ساتھ بنکاک کے نائٹ کلبوں میں گھومتا رہتا تھا۔ نویتا تو بہت دنوں سے یہاں ہے۔ میں کئی مرتبہ اس سے مل بھی چکی ہوں اور وہ لیڈی ڈاکٹر اس سے تو میں بنکاک میں ایک مرتبہ علاج بھی کروا چکی ہوں لیکن یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ٹائیگر سے میری دوستی نہیں ہوئی تھی۔" رنگولی نے بتایا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی طمانیت سی آگئی۔ جانکی اور پرساد خیریت سے تھے۔ ہمارے ذہنوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

"لیکن میرے خیال میں تم لوگوں کو اس طرح بے پروائی سے نہیں گھومنا چاہیے۔" رنگولی نے کہا "دو تین دن پہلے میں یہاں چی فانگ کو بھی دیکھ چکی ہوں۔ اس کے ساتھ دوسرے ساتھی بھی ہوں گے۔ وہ لوگ تمہارے بدترین دشمن ہیں اور اب بھی پیڈرو کے لیے کام کررہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے رنگولی۔" میں نے کہا "تمہارا فون نمبر تھائی نے نوٹ کرلیا ہے۔ ہم جلد ہی تم سے رابطہ کریں گے۔"

"میں رات گیارہ بجے کے بعد گھر پر ہی ملوں گی۔" رنگولی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی "تم لوگ آؤ تو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔"

رنگولی چلی گئی اور ہم ایک بار پھر جانکی اور پرساد کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑی اطلاع تھی کہ وہ دونوں خیریت سے تھے۔ اب صرف یہ پتا لگانا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہم بھی کافی ہاؤس سے نکل آئے۔ اس وقت ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ہماری رہائش مائے کوک ریور کے قریب سنگھا کلائے روڈ پر واقع ایک گیسٹ ہاؤس میں تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ کلاک ٹاور سے سنگھا کلائے روڈ کا فاصلہ کتنا تھا۔ رنگولی نے بتایا تھا کہ اس نے جانکی اور پرساد کو ایک ٹیکسی میں سوار مائے فابرج کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ برج بھی ظاہر ہے دریا پر ہی ہوگا اور مائے کوک ریور اتنا طویل تھا کہ میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ برج کس علاقے میں ہوگا اور پھر یہ اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ لوگ اس علاقے میں کہاں گئے تھے۔

ہم کلاک ٹاور سے چلتے ہوئے رتانا روڈ پر گھوم گئے۔ یہاں کچھ اچھے ریسٹورنٹس بھی تھے۔ تھائی ایک جگہ رک گئی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کیوں نا کھانا کھالیا جائے۔" اس نے ایک باربی کیو اسٹال کی طرف اشارہ کیا۔

اشتہا آمیز خوشبو سے میری بھی بھوک چمک اٹھی تھی۔ باربی کیو اسٹینڈ وغیرہ فٹ پاتھ کو گھیر کر لگائے گئے تھے جس سے پیدل چلنے والوں کو خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ان کے ساتھ ہی فٹ پاتھ ہی پر میزیں اور کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ لوگ بیٹھے ہوئے لذتِ کام و دہن میں مشغول تھے۔

ان باربی کیو اسٹالز کے پیچھے شاپس بھی تھیں جو زیادہ بڑی نہیں تھیں لیکن ان میں بھی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ باہر بیٹھنا ہمارے لیے مناسب نہیں تھا۔ ہم ایک دکان میں آگئے۔ یہاں بھی ویٹر لڑکیاں ہی تھیں۔ میں نے ویٹرس کو فش اور چکن روسٹ کا آرڈر دے دیا۔

سوا دس بجے کے قریب ہم کھانا کھا کر وہاں سے نکلے تھے۔ کچھ دور تک پیدل چلنے کے بعد ہم ایک ٹک ٹک میں سوار ہوگئے اور ڈرائیور کو گیسٹ ہاؤس کا پتا بتا دیا۔

اپنی منزل تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ گیسٹ ہاؤس کے برآمدے ہی میں مختصر سا دفتر بنا ہوا تھا۔ اس وقت ایک ادھیڑ عمر عورت آفس ٹیبل کے پیچھے کرسی پر بیٹھی ٹیلی فون پر بات کررہی تھی۔ ہمیں اندر آتے دیکھ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے کبھی تھائی اور کبھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں کے انداز سے میں کھٹکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم نے اس عورت کی نظروں پر غور کیا تھا۔" تھائی نے کمرے میں پہنچ کر کہا "لگتا ہے جیسے اسے ہم پر کسی قسم کا شبہ ہو۔"

"ہاں۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگا تھا۔" میں نے جواب دیا اور بیڈ پر رکھے ہوئے بیگ کو دیکھتے ہی چونک گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شام چھ بجے یہاں سے نکلنے سے پہلے تھائی نے یہ بیگ کرسی پر رکھا تھا اور اس کی زپ بھی بند کی تھی لیکن اب بیگ نہ صرف بیڈ پر رکھا ہوا تھا بلکہ اس کی زپ بھی کھلی ہوئی تھی۔

تھائی نے بھی یہ بات فوراً ہی محسوس کرلی تھی۔

"اوہ۔" وہ جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ اس نے بڑی عجلت میں بیگ کو چیک کیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہمارے بیگ کی تلاشی لی گئی ہے۔"

"کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ کوئی چیز کم نہیں ہے لیکن تلاشی لینے کا مطلب ہے کہ یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے۔" تھائی نے کہا۔

میں چند لمحے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ برآمدے والے دفتر میں بیٹھی ہوئی وہ ادھیڑ عمر عورت اس وقت بھی فون پر بات کررہی تھی۔ میں نے اس کا ایک جملہ سُن لیا۔

"وہ آگئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے....."

مجھے اچانک ہی سامنے دیکھ کر اس نے جلدی سے فون بند کردیا۔ اس کا چہرہ بھی یک لخت متغیر ہوگیا تھا۔ میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر آگے نکل گیا۔ میں نے اس پر یہ ظاہر ہی نہیں ہونے

دیا تھا کہ میں نے اس کی بات سن لی تھی۔

میں گیسٹ ہاؤس سے نکل کر بائیں طرف مڑ گیا اور تقریباً پچاس گز آگے جا کر ایک ٹیلی فون بوتھ میں داخل ہو گیا۔ شام چھ بجے نوبتا کو بھی میں نے یہیں سے فون کیا تھا۔ اندر داخل ہو کر میں نے ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔ رنگولی نے اپنا جو فون نمبر تھائی کو لکھ کر دیا تھا وہ میں نے بھی ایک نظر دیکھا تھا اور مجھے یاد ہو گیا تھا۔ میں نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اچانک مجھے رنگولی کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رات گیارہ بجے کے بعد گھر پر ملے گی۔ میں نے ریسیور ہک پر لٹکا دیا اور بوتھ سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گیسٹ ہاؤس کی طرف چلنے لگا۔

دس منٹ بعد میں اور تھائی کمرے سے نکل کر آفس والی ٹیبل کے سامنے کھڑے تھے۔ تھائی نے بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔

"ہمیں وائی ایم سی اے ہوسٹل میں کمرا مل گیا ہے۔ اس لیے ہم جا رہے ہیں۔" میں نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس عورت کے چہرے کے تاثرات بدل گئے جیسے اسے بڑی مایوسی ہوئی ہو۔

"اگر تم لوگ چیک آؤٹ ہونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن حساب تو صبح ہی ہو سکتا ہے۔ کیشئر صبح آئے گی۔" اس عورت نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں صبح آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

اس ادھیڑ عمر عورت نے رجسٹر کھول لیا۔ میں نے کمرا نمبر والے خانے میں چیک آؤٹ ہونے کا وقت لکھا اور دستخط کر دیے۔ میں نے ایک ہفتے کا ایڈوانس کرایہ دیا تھا اور باقی رقم ملنے کی اب کوئی توقع نہیں تھی۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ادھیڑ عمر عورت فون کا ریسیور اٹھائے پھر کوئی نمبر ملا رہی تھی۔

گیسٹ ہاؤس سے نکلتے ہی ٹک ٹک مل گیا۔ میں نے ڈرائیور کو کلاک ٹاور چلنے کے لیے کہہ دیا۔ فوری طور پر یہی ایک نام میرے ذہن میں آ سکا تھا۔

کلاک ٹاور کے چوراہے پر ٹک ٹک سے اتر کر ہم پیدل ایک طرف چلنے لگے۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور کو سہامٹ روڈ چلنے کو کہا۔۔۔ رنگولی نے بتایا تھا کہ اس طرف کوئی بہت بڑی مسجد ہے جس کے قریب ہی اس کا مکان ہے۔

سہامٹ روڈ پر ایک مارکیٹ کے قریب میں نے ٹیکسی رکوالی۔ نیچے اتر کر ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ہم ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ ہم باہر سے گزرنے والوں کی نظروں میں نہیں آ سکتے تھے۔ اس وقت ریسٹورنٹ میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ ویٹر کو میں نے چائے کے لیے کہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ بڑی ہی بدذائقہ چائے تھی۔ میں نے ایک گھونٹ بھرنے کے بعد کپ میز پر رکھ دیا اور اس کے بعد اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

"اچانک ہی گیسٹ ہاؤس چھوڑنے کی کوئی خاص وجہ ہو گی لیکن تم نے ابھی تک کچھ بتایا نہیں۔" تھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی ایک گھونٹ بھرنے کے بعد کپ میز پر رکھ دیا تھا۔ چائے اسے بھی پسند نہیں آئی تھی۔

"ان لوگوں کو شاید ہمارے ٹھکانے کا پتا چل گیا تھا اور گیسٹ ہاؤس کی وہ ادھیڑ عمر عورت ہمیں پھنسانے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔" میں نے کہا اور پھر تفصیل سے اسے ساری بات بتانے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں ان میں سے کوئی گیسٹ ہاؤس آیا تھا اور ہمارے کمرے اور بیگ کی تلاشی بھی اسی نے لی تھی۔" تھائی نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ ان کا کوئی آدمی گیسٹ ہاؤس کی نگرانی کر رہا ہو۔" تھائی نے کہا۔

"شاید یہیں پر ان سے غلطی ہو گئی تھی۔" میں نے کہا "یہ خیال میرے ذہن میں بھی تھا اسی لیے پہلے میں نے کلاک ٹاور کا رخ کیا تھا۔ اس کے بعد اس طرف آئے ہیں۔ میں نے تعاقب کا خیال رکھا تھا۔ کسی مشتبہ شخص یا گاڑی کو اپنے تعاقب میں نہیں دیکھا۔"

"تم نے غالباً رنگولی کے ہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیا اس پر اس حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے؟" تھائی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔" میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی "میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ وہ پیڈرو وغیرہ سے شدید نفرت کرتی ہے اور ان لوگوں سے اپنی ذلت و بربادی کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ ہم اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور میرا خیال ہے اس کے ذریعے ہمیں جانکی اور پرساد کی تلاش میں بھی مدد ملے گی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" تھائی نے کہا "عورت جب انتقام کی آگ میں جلتی ہے تو بالکل اندھی ہو جاتی ہے اور پھر کچھ بھی کر سکتی ہے۔"

"سوا گیارہ بج رہے ہیں۔" میں نے کاؤنٹر کے اوپر دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "رنگولی نے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے کے بعد گھر پر ہی ملے گی۔ تم یہیں بیٹھو۔ میں باہر پبلک بوتھ سے فون کر کے آتا ہوں۔"

میں اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ چند گز آگے دائیں

طرف پبلک بوتھ تھا اور اس وقت خالی ہی تھا۔ میں نے اندر داخل ہو کر ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھایا اور مطلوبہ سکے ڈال کر نمبر ملانے لگا۔ دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی گئی۔ تقریباً تین گھنٹے پہلے رنگولی سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی آواز بھی پہلی مرتبہ سنی تھی اور اس وقت فون پر اس کی آواز شناخت کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ رنگولی نے بھی میری آواز پہچان لی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں اصل موضوع پر آ گیا۔

"ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے رنگولی۔"

"یس ٹل ماسٹر!" وہ بولی "چند گھنٹے پہلے اگرچہ ہم زندگی میں پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملے تھے لیکن میں تم سے بے حد متاثر ہوئی ہوں۔ کہو، میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ ہمیں وقتی طور پر کسی ایسی جگہ کی ضرورت ہے جہاں ہم دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رہ سکیں۔ میں نے سوچا کہ شاید تم ایسا کوئی بندوبست کر سکو۔" میں نے کہا۔

"کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔" رنگولی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "اپنے گیسٹ ہاؤس کا نام بتاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں تم لوگوں کو لینے کے لیے پہنچ جاؤں گی۔"

"ہم گیسٹ ہاؤس چھوڑ چکے ہیں۔" میں نے جواب دیا اور بوتھ کے شیشے سے باہر ریسٹورنٹ کے سائن بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مسجد سے ذرا آگے مارکیٹ کے باہر کی طرف ایک ریسٹورنٹ ہے۔ ہم اس وقت یہاں موجود ہیں۔" میں نے ریسٹورنٹ کا نام بھی بتا دیا۔

"اوہ۔" رنگولی نے کہا "مارکیٹ میرے گھر سے زیادہ دور نہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور بوتھ سے باہر آ گیا۔

"کیا ہوا؟" تھائی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔

"وہ پانچ منٹ میں یہاں پہنچ رہی ہے۔" میں نے جواب دیا اور ویٹر کو بلا کر چائے کا بل ادا کر دیا۔ دونوں کپ ویسے ہی بھرے ہوئے رکھے تھے۔ ویٹر نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے کپ اٹھا لینے کا اشارہ کیا۔

سات آٹھ منٹ بعد نیلے رنگ کی ایک کار ریسٹورنٹ کے سامنے رکی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر رنگولی کو دیکھ لیا۔ وہ متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے تھائی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ ہمیں دیکھ کر رنگولی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ہمیں کار کی طرف آتے دیکھ کر اس نے پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔

"ویلکم!" رنگولی نے مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ہم چند روز تمہارے پاس رہیں گے۔ ہماری وجہ سے تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہو گی رنگولی؟" میں نے اپنی سیٹ پر قدرے آگے جھکتے ہوئے کہا۔

"بالکل نہیں باس۔" رنگولی نے جواب دیا "تم لوگوں کے ہوتے ہوئے مجھے کیا پرابلم پیش آ سکتی ہے۔"

"تھینک یو رنگولی۔" میں نے کہا۔

کار ایک بار اسی مسجد کے سامنے سے گزری۔ تھائی لینڈ میں پہلی مرتبہ میں نے کوئی مسجد دیکھی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت خوب صورت مسجد تھی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ چیانگ رائے میں تھائی مسلمانوں کے علاوہ بڑی تعداد میں چینی اور برمی مسلمان بھی آباد تھے۔ انڈین اور پاکستانی مسلمان بھی ایک معقول تعداد میں یہاں رہائش پذیر تھے۔ ان میں کچھ بزنس سے وابستہ تھے اور کچھ ملازمت پیشہ تھے۔ یہ مسجد ان تمام مسلمانوں نے مل کر بنائی تھی۔ یوں تو پانچوں نمازوں کے وقت یہاں نمازیوں کی ایک معقول تعداد ہوتی تھی لیکن جمعے کی نماز کے وقت تو شہر کے دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمان بھی یہاں جمع ہوتے تھے۔

کار مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی ایک کشادہ گلی میں رک گئی۔ رنگولی نے کار کا انجن چلتا چھوڑ دیا اور نیچے اتر کر گیٹ کھول دیا اور دوبارہ کار میں بیٹھ گئی۔

بنگلا بہت بڑا نہیں تھا۔ گیٹ کے اندر اتنی جگہ تھی کہ آگے پیچھے دو کاریں کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ ایک طرف مختصر سا لش گرین لان بھی تھا۔ برآمدے کی بتی جل رہی تھی جس کی روشنی میں لان کے بعض پودوں کے پتے چمکتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

رنگولی ہمیں اندر لے گئی۔ تین بیڈ رومز تھے۔ ایک ڈرائنگ روم اور مختصر سا لاؤنج بھی تھا۔ تھائی نے بیگ کندھے سے اتار کر لاؤنج میں ایک صوفے پر رکھ دیا۔ رنگولی ہمیں گھوم پھر کر مکان دکھاتی رہی۔ دو کمروں میں تو بیڈز وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ تیسرا بالکل خالی تھا۔ ڈرائنگ روم اور لاؤنج کا فرنیچر بھی اوسط درجے کا تھا جس سے رنگولی کی مالی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ آخر میں ہم لاؤنج میں آ گئے۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔" رنگولی کہتے ہوئے کچن میں گھس گئی۔

کافی تیار کرنے میں اسے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ایک ایک کپ اس نے ہمارے سامنے رکھ دیا اور تیسرا خود سنبھال کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

رنگولی اگرچہ ہمارے یہاں آنے کی وجہ اور صورتِ حال کو کسی حد تک سمجھ رہی تھی لیکن وہ شاید منتظر تھی کہ ہم خود کوئی بات شروع کریں۔

"تم نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ ہم گیسٹ ہاؤس چھوڑ کر یہاں کیوں آئے ہیں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے رنگولی کی طرف دیکھا۔

"لیس ماسٹر۔" رنگولی نے کہا "کلاک ٹاور والے ریسٹورنٹ میں باتوں کے دوران میں ہی میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ تم لوگوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "چند روز پہلے میں نے یہاں چی فانگ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایک روز نویتا سے ملاقات ہوئی تو وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دی تھی۔ کل پرساد اور جانکی نظر آئے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں کوئی گڑبڑ شروع ہونے والی ہے اور آج جب تم لوگوں سے ملاقات ہوئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ....."

"گڑبڑ شروع ہو چکی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوہ۔" رنگولی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جانکی اور پرساد کل یہاں آگئے تھے۔ ہم آج صبح پہنچے ہیں۔ شام چھ بجے میں نے نویتا کو فون کیا تو وہ دونوں بھی وہاں موجود تھے اور آدھے گھنٹے بعد جب ہم وہاں پہنچے تو....." میں کہتے کہتے رک گیا۔

"تو کیا ہوا ماسٹر؟" رنگولی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"نویتا کو قتل کردیا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا....؟" رنگولی اچھل پڑی۔

میں اسے تفصیل بتانے لگا۔ میں آخر میں بتا رہا تھا "نویتا میں کچھ جان باقی تھی۔ مرنے سے پہلے اس نے چی فانگ کا نام بتادیا تھا لیکن جانکی اور پرساد کے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے ہی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ مجھے شبہ تھا کہ جانکی اور پرساد بھی چی فانگ وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ ہم نویتا کے مکان کو چیک کررہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔ ہم بڑی مشکل میں وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوسکے تھے اور اتفاق سے کلاک ٹاور پر تم سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ تم نے بتایا تھا کہ تم نے ہم سے ملاقات سے پہلے جانکی اور پرساد کو دیکھا تھا۔ یہ کس وقت کی بات ہے؟"

"تقریباً ساڑھے سات بجے۔" رنگولی نے جواب دیا "میں اس وقت منگرائے مھارٹ کیمپ کی طرف سے آرہی تھی۔ ان کی ٹیکسی میرے بالکل سامنے سے گزری تھی اور اب مجھے خیال آرہا ہے کہ وہ دونوں کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ ٹیکسی کا پیچھا کرکے ان سے ملاقات کروں لیکن مجھے کلاک ٹاور کی طرف ایک بہت ضروری کام تھا۔ میں نے سوچا یہ شہر زیادہ بڑا تو نہیں ہے۔ ایک دو روز میں کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جائے گی۔"

"اب میں پوری طرح مطمئن ہوں کہ وہ دونوں محفوظ ہیں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن تم سے ملاقات کے بعد جب ہم گیسٹ ہاؤس پہنچے تو یہ انکشاف ہوا کہ کمرے میں ہمارے بیگ کی تلاشی لی گئی تھی اور پھر کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی عورت پر بھی شبہ ہوگیا تھا۔ وہ فون پر کسی کو بتا رہی تھی کہ ہم دونوں آگئے ہیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے وہ گیسٹ ہاؤس چھوڑ دیا۔"

"بہت اچھا کیا ماسٹر۔" رنگولی نے کہا "یہاں فی الحال تم لوگوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی وقت ایسی صورت حال ہوئی بھی تو رنگولی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تم لوگوں کے مل جانے سے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ میں ان لوگوں سے اپنی بربادی کا انتقام لے سکوں۔ اب شاید مجھے موقع مل جائے۔"

"تمہیں ایسا موقع ضرور ملے گا۔" میں نے کہا "لیکن ٹائیگر سے تمہارا جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"ہمارے جھگڑے کی وجہ بھی اس کا ایک اوباش دوست دارا تھا۔" رنگولی نے بتایا "میں اس رات کلب میں پروگرام پیش کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی تھی کہ ٹائیگر آگیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں وہ رات اس کے دوست دارا کے ساتھ بسر کروں۔ میں نے انکار کردیا جس پر وہ بھڑ گیا اور میری پٹائی شروع کردی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر اپنی درد بھری آپ بیتی سنانے لگی۔ آخر میں وہ کہہ رہی تھی "ٹائیگر کی مخالفت کی وجہ سے مجھے کہیں کام نہیں مل رہا تھا۔ میں نانِ شبینہ تک کو محتاج ہوگئی اور پھر ایک نہایت ہی گھٹیا سے کلب میں مجھے پروگرام مل گیا لیکن دوسرے ہی روز ٹائیگر کے غنڈوں نے ہنگامہ کردیا اور کلب میں توڑ پھوڑ شروع کردی۔ اسی دوران میں مین سوئچ آف کردیا گیا اور اندھیرے میں کسی نے میرے اوپر تیزاب کی بوتل انڈیل دی۔ ٹائیگر نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ میرا حسن غارت کرکے مجھے سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کردینا چاہتا تھا اور ان دنوں میری حالت واقعی بھکاریوں سے بھی بدتر ہوگئی تھی۔ ایک شرابی مجھے سہارا نہ دیتا تو میں واقعی بھیک مانگنے پر مجبور ہوجاتی۔ وہ شرابی بھی مالِ غنیمت سمجھ کر پورے ایک ہفتے تک مجھے روندتا رہا اور بالآخر ایک روز مجھے وہاں سے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس دوران میں ایک روز مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ ٹائیگر تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس کی موت کی خبر سن کر مجھے جس قدر خوشی ہوئی، تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔

"میں بنکاک سے نکل کر شہر بہ شہر پھرتی رہی اور بالآخر کچھ عرصہ پہلے یہاں آگئی۔ یہ شہر میرے لیے اجنبی تھا۔ یہاں کے لوگ اجنبی تھے لیکن یہاں کے لوگوں سے مجھے ہمدردی ملی۔ مجھے رم کاک ریسٹورنٹ میں رقص کا پروگرام مل گیا جہاں میری ملاقات ایک قبائلی سردار سے ہوگئی۔ اس نے مجھے ایک اور بڑے ہوٹل میں پروگرام دلا دیے۔ وہ میری مالی مدد بھی کرتا رہا۔ میں نے یہ مکان کرائے پر لے لیا۔ میری زندگی میں کسی قدر ٹھہراؤ آگیا تھا لیکن چند روز پہلے چی فانگ کو دیکھا تو میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کوئی گڑبڑ شروع ہونے والی ہے اور اس وقت تم نے میرے بدترین خدشات کی تصدیق کردی ہے۔ نویتا بہت اچھی لڑکی تھی۔ مجھے اس کی موت کا بے حد دکھ ہوا ہے۔"

"تم ٹائیگر جیسے بدی کے نمائندوں کی آلۂ کار بنی رہی ہو۔ تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا اس کے بعد تمہاری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اپنی توہین اور بربادی کا انتقام اپنی جگہ۔ لیکن تمہیں تو اپنے اندر یہ جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ برائی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کروگی۔"

رنگولی خاموش بیٹھی میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ہر لحہ تبدیل ہورہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میری باتیں اس کے دل پر اثر انداز ہورہی تھیں۔ میں خاموش ہوا تو وہ فوراً ہی بول پڑی۔

"تمہاری باتوں سے واقعی میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں ان لوگوں سے واقعی صرف اور صرف اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہتی تھی لیکن میں اکیلی تھی۔ کمزور تھی۔ اپنے اندر حوصلہ نہیں پا رہی تھی۔ حوصلہ ہوتا تو ان لوگوں کو چیانگ رائے میں دیکھنے کے بعد کچھ نہ کچھ کر گزری ہوتی۔ میں ایسا نہیں کرسکی لیکن تمہاری باتوں نے میرے اندر ہلچل سی مچادی ہے۔ اب میں نہ تو اپنے آپ کو اکیلی سمجھتی ہوں اور نہ کمزور۔ میرے اندر ایک نیا جذبہ پیدا ہوا ہے۔ ایک نیا حوصلہ ملا ہے مجھے۔ اب تو میں کسی بڑی سے بڑی قوت سے بھی ٹکرانے کی ہمت رکھتی ہوں۔ بولو۔ مجھے کیا کرنا ہے ماسٹر؟" وہ خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی اور چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

"گڈ۔" میں نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "جذبے اور حوصلے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی جائے۔ ہر معاملے میں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "یہ تو ہمیں پتا چل گیا ہے کہ نویتا کو چی فانگ اور اس کے ساتھیوں نے قتل کیا ہے اور تمہارے بیان کے مطابق قتل کی اس واردات کے تقریباً ایک گھنٹے بعد تم نے جانکی اور پرساد کو بھی دیکھا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ دونوں محفوظ ہیں۔ اب سب سے پہلے ہمیں جانکی اور پرساد کا سراغ لگانا ہے اور اس کے بعد دارا اور چی فانگ وغیرہ کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنی ہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ یقیناً تمہیں جانتے ہوں گے۔"

"بہت اچھی طرح۔" رنگولی نے جواب دیا "مجھ پر وہ قیامت دارا ہی کی وجہ سے ٹوٹی تھی۔ ہوسکتا ہے دارا کے دل میں اب بھی میرے لیے خواہش ہو۔"

"ایسے لوگوں کی ہوس کبھی نہیں مٹتی۔" میں نے کہا "میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں .. لیکن دارا وغیرہ کے گرد کوئی جال بچھانے سے پہلے ہمیں جانکی اور پرساد کو تلاش کرنا ہے۔ ان لوگوں کے مل جانے کے بعد ہی ہم کوئی اور منصوبہ بنائیں گے۔ ویسے آج کل تم کیا کررہی ہو؟"

"میں ہفتے میں چار پروگرام کرتی ہوں۔ ایک رم کاک ریسٹورنٹ کے میوزیکل ہال میں اور تین دوسرے کلبوں میں جن میں گولڈن ٹرائی اینگل نائٹ کلب بھی شامل ہے۔ یہاں میرا پروگرام سنڈے نائٹ کو ہوتا ہے۔"

"وہ آدمی کون ہے جس نے تمہیں کسی نائٹ کلب میں پروگرام دلائے تھے۔ ابھی تم نے بتایا تھا نا کہ....."

"تھالوب۔" رنگولی نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ تھائی لینڈ اور برما کی سرحد پر آباد کیرن قبیلے کے سردار کا بیٹا ہے۔ یہ قبیلہ صدیوں سے سرحدی قصبے مائے سائے اور اس کے قرب و جوار کی پہاڑیوں میں آباد ہے۔ تھائی لینڈ کا یہ شمالی خطہ زیادہ تر پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ راستے نہایت دشوار گزار اور خطرناک ہیں۔ پہاڑیوں میں درجنوں قبیلے آباد ہیں جن میں میو، یاؤ، کیرن، ایکو، لاہو اور لیو قبیلے قابلِ ذکر ہیں۔ کیرن اور میو قبیلوں کو سب سے زیادہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو چھوٹی چھوٹی قبائلی بستیاں ان خطرناک پہاڑیوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن بعض قبیلوں نے کسی نہ کسی ایک مقام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بھی بنا رکھا ہے۔ مائے سائے کیرن قبیلے کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ عرصہ پہلے یہ چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی ہوا کرتی تھی لیکن اب اسے ایک ترقی یافتہ قصبے کا درجہ حاصل ہے۔ یوں تو ان پہاڑیوں میں آباد بیشتر قبیلے جدید تہذیب سے قطعی ناآشنا ہیں۔ بہت سے قبیلے تو ایسے ہیں جو اب بھی غاروں اور پتھر کے دور کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن بعض قبیلے ایسے ہیں جو جدید تہذیب اور علم کی روشنی سے بہرہ ور ہورہے ہیں۔ کیرن قبیلے کا شمار بھی ایسے ہی ترقی یافتہ قبیلوں میں ہوتا ہے۔ اس قبیلے کی ترقی میں موجودہ سردار نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ تھالوب اس سردار کا اکلوتا بیٹا ہے جس نے چیانگ مائے یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور گزشتہ دو تین برسوں سے چیانگ رائے میں رہائش پذیر ہے۔ یہاں بعض کاروباری کمپنیوں میں اس کے باپ کے شیئرز ہیں۔ وہ ان کمپنیوں کے کاروبار کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ سننے میں تو یہ بھی آیا ہے کہ گولڈن ٹرائی اینگل ہوٹل اور نائٹ کلب میں بھی اس کا شیئر ہے۔ لیکن اس کی تصدیق نہیں ہوئی اور میں نے کبھی اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔

مفرور
6 حصے (مکمل)
قیمت فی حصہ -/60 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے

”تھالوب بہت شریف النفس اور ہمدرد انسان ہے۔ اس سے میری ملاقات رم کاک نائٹ کلب میں ہوئی تھی۔ اسی کی وجہ سے مجھے گولڈن ٹرائی اینگل اور بعض دوسرے کلبوں میں پروگرام ملے۔ میرا خیال ہے وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے لیکن آج تک وہ دل کی بات زبان پر نہیں لایا۔ اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا لیکن اس کی شرافت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہو کہ اس نے آج تک مجھے چھوا بھی نہیں۔ ہم ہفتے میں صرف ایک مرتبہ اکٹھے بیٹھ کر کافی یا چائے پیتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں اور ہماری چند منٹ کی یہ ملاقات گولڈن ٹرائی اینگل کلب میں ہوئی ہے جب وہاں میرا پروگرام ہوتا ہے۔“

”کیا تھالوب پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟“ میں نے رنگولی کے خاموش ہونے پر اس کی طرف دیکھا ”اور کیا کسی آڑے وقت پر وہ ہمارے کام آسکتا ہے؟“

یہ باتیں میں کسی خاص وجہ سے پوچھ رہا تھا۔ اب تک میں مہاراج اور ماسٹر ہوچن کی انگلی پکڑ کر چلتا رہا تھا۔ قدم قدم پر مجھے ان کی رہنمائی حاصل رہی تھی لیکن اب مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، اپنے طور پر کرنا تھا۔ ایسے ذرائع تلاش کرنا تھے جن سے مجھے آگے بڑھنے میں مدد مل سکے۔ چیانگ رائے میں مجھے نوپتا سے بڑی مدد مل سکتی تھی لیکن اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اتفاق سے رنگولی سے ملاقات ہوگئی تھی۔ رنگولی قابلِ اعتماد تھی۔ وہ ان لوگوں سے اپنی بربادی کا انتقام لینا چاہتی تھی جو میرے بھی دشمن تھے۔ انتقام کا یہ جذبہ ہی اسے میرے اتنا قریب لے آیا تھا کہ ہم اس طرح بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ رنگولی کے توسط سے میں کچھ ایسے لوگوں سے بھی رابطے کرنا چاہتا تھا جن پر بھروسا کیا جاسکے اور ضرورت کے وقت وہ میرے کام آسکیں۔ اسی حوالے سے تھالوب کے نام میں مجھے بڑی کشش محسوس ہوئی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ تھالوب پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔“ رنگولی کہہ رہی تھی ”مائے سائے گولڈن ٹرائی اینگل کے بالکل ساتھ واقع ہے اور یہ وہ خطہ ہے جہاں دنیا میں سب سے زیادہ پوست کی کاشت ہوتی ہے۔ ان پہاڑیوں میں آباد قبیلے بھی پوست کاشت کرتے ہیں جس سے افیون تیار کرکے فروخت کردی جاتی ہے اور افیون ہی سے مارفین اور ہیروئن جیسی تمام خطرناک ڈرگس تیار ہوتی ہیں۔ کیرن قبیلے کے لوگ بھی پہلے پوست کاشت کرتے تھے لیکن قبیلے کا سردار، تھالوب کا باپ نوعمری ہی میں پوست کے خوب صورت اور خوش رنگ پھول میں چھپے ہوئے زہر کی تباہ کاریوں سے آگاہ ہوچکا تھا۔ اس نے نوعمری ہی سے اپنے قبیلے میں پوست کی کاشت کی مخالفت شروع کردی اور آج اس قبیلے کی حدود میں پوست کے بجائے مکئی، لیچی اور اسٹرابیری جیسی چیزوں کی کاشت کی جاتی ہے۔

”تھالوب کو بھی پوست اور اس سے تیار ہونے والی منشیات سے شدید نفرت ہے۔ اسے ان لوگوں سے بھی شدید نفرت ہے جو منشیات کا گھناؤنا کاروبار کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے میں کہہ رہی ہوں کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ ہمارا ساتھ دینے سے انکار نہیں کرے گا۔ ویسے اگر تم چاہو تو میں اس سے تمہاری ملاقات کرا سکتی ہوں۔“

”کیا وہ یہاں بھی آتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ اس نے آج تک اس گھر میں قدم نہیں رکھا۔ ہماری ہفتہ وار ملاقات کلب ہی میں ہوتی ہے۔“ رنگولی نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں اس سے ضرور ملوں گا لیکن اس سے پہلے جانگی اور پرساد کو تلاش کرنا ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم فکر مت کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک آدھ دن میں کہیں نہ کہیں نظر آجائیں گے۔“ رنگولی نے کہا۔

یہ ساری گفتگو میرے اور رنگولی کے بیچ ہو رہی تھی اور تھائی خاموش ہی بیٹھی رہی تھی اور اب تو وہ جماہیاں لینے لگی تھی۔ میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

”تھائی کو نیند آرہی ہے۔“ رنگولی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ”میں اچھی میزبان ثابت نہیں ہوئی۔ تم لوگوں کے آرام کا خیال ہی نہیں کیا۔ آؤ۔ میں تم لوگوں کو کمرا دکھا دوں۔“

رنگولی کے ساتھ ہی ہم دونوں بھی اٹھ گئے۔ تھائی نے بیگ بھی اٹھا لیا تھا۔ رنگولی ہمیں دوسرے بیڈ روم میں لے گئی۔

”میں نے سنا ہے کہ تم دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ یہاں بھی کمرے میں ایک ہی بیڈ ہے۔“ رنگولی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور بستر کی چادر اٹھا کر جھاڑنے لگی۔

میں نے اور تھائی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولا۔ رنگولی بستر درست کرکے شب بخیر کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ تھائی نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا اور بیگ میں سے اپنا شب خوابی کا لباس نکال کر ملحق باتھ روم میں گھس گئی۔ میں نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ کپڑے بدلنے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ جوتے اتار کر بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ چند منٹ بعد تھائی باتھ روم سے نکل آئی اور خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھیں بند ہوگئیں اور ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے۔ مجھے اس کے بعد بھی دیر تک نیند نہیں آسکی۔ میں بستر پر نیم دراز نوپتا کے بارے میں سوچتا رہا۔

نوپتا ان دنوں یہاں آئی تھی جب ہم کنچن پوری گئے تھے۔ گویا کئی ہفتے گزر چکے تھے۔ یہاں غالباً وہ دوبارہ سیٹ ہونے کی کوشش کررہی تھی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہی تھی۔ اس کا اپنا شہر تھا۔ زندگی کا بیشتر حصہ یہیں پر گزرا تھا۔ یہاں اس کے بہت سے جاننے والے موجود تھے۔ ان لوگوں سے بھی اسے مدد ملی ہوگی۔ اسے یہاں سیٹ ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ کاٹیج میں موجود فرنیچر اور دیگر ساز و سامان سے تو یہی تاثر ملتا تھا۔

دارا وغیرہ چند روز پہلے یہاں آئے تھے۔ دارا اور چی فانگ اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ پچھلے ایک دو دنوں کے دوران میں ہی نوپتا ان کی نظروں میں آئی ہوگی۔ وہ اس کے کاٹیج پر پہنچ گئے تھے۔ وہاں جانگی اور پرساد بھی موجود تھے۔ ممکن ہے ان لوگوں سے بھی تصادم ہوا ہو لیکن وہ دونوں بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور نوپتا چی فانگ وغیرہ کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ بہرحال، اصل صورتِ حال پرساد سے ملاقات کے بعد ہی معلوم ہوسکتی تھی۔

اس وقت صبح کے سوا چار بج رہے تھے۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ میری بھی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میں نیند میں بھی بے چین رہا۔ بار بار میری آنکھ کھلتی رہی۔ صبح سات بجے کے بعد تو مجھے نیند ہی نہیں آسکی۔ رات بھر جاگنے سے آنکھوں میں جلن اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ اس وقت مجھے چائے یا کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ میں کچن میں جاکر کافی بنانے کے لیے مطلوبہ چیزیں تلاش کرنے لگا لیکن مجھے نہ تو کافی کا ڈبا ملا اور نہ ہی چائے کی پتی۔ میں کچن سے نکل کر رنگولی کے کمرے کی طرف آگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر رنگولی جاگ گئی ہو تو اسے کافی بنانے کے لیے کہہ دوں۔

کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا، ٹھٹک کر رک گیا۔ رنگولی سو رہی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں فوراً ہی کمرے سے باہر آگیا اور دروازہ آہستگی سے بند کردیا اور ایک بار پھر کچن میں آکر سامان کی تلاشی لینے لگا اور بالآخر کافی کا ڈبا مل گیا، یہ ڈبا پہلے بھی دو مرتبہ میری نظروں میں آیا تھا لیکن اس پر لیبل کسی اور چیز کا تھا جس کی وجہ سے میں اسے نظرانداز کرتا رہا۔

میں نے پانی ہیٹر پر رکھ دیا۔ ابھی پانی پوری طرح نہیں کھولا تھا کہ اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو رنگولی دروازے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کے جسم پر گھٹنوں سے اوپر تک کا ہلکا سا شب خوابی کا لباس تھا۔

”مجھے جگا دیا ہوتا۔ میں تمہیں کافی بنا دیتی۔“ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے کمرے میں گیا تھا۔ تم سو رہی تھیں اور میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ میں یہ کہتے ہوئے اس سلیب کے سامنے سے ہٹ گیا جس پر ہیٹر رکھا ہوا تھا۔

”تم میرے کمرے میں آئے تھے؟“ رنگولی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں جواب دیے بغیر کچن سے نکل کر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد رنگولی کافی کے دو کپ لے کر آگئی۔ ایک اس نے میرے سامنے کافی ٹیبل پر رکھ دیا اور دوسرا خود لے کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھنے کا انداز بھی بہت عجیب سا تھا۔ میری نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں اور میں اپنے آپ میں کچھ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

”میں عام طور پر دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتی۔“ رنگولی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”آج رات اگرچہ سوئی بھی دیر سے تھی۔ نیند میں بھی بے چینی سی رہی اور اس وقت آنکھ بھی جلدی کھل گئی۔ کچن میں برتنوں کی آواز سن کر....“

”رنگولی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم ڈھنگ کا کوئی لباس پہن لو تاکہ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرسکیں۔“

رنگولی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ غالباً مجھے دنیا کا احمق ترین آدمی سمجھی تھی جو جان بوجھ کر حسین نظاروں سے محروم ہونا چاہتا تھا لیکن بہرحال وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور چند منٹ بعد لباس تبدیل کرکے آگئی۔ اس مرتبہ وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی تو اس کا انداز بھی کسی حد تک مہذبانہ تھا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر رات کی باتیں ہی دہرائی جارہی تھیں۔ کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔

دس بجے کے قریب تھائی بیدار ہوئی تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ناشتا بھی کرلیا گیا اور اس کے بعد رنگولی باہر جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

”شہر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، کسی کو تلاش کرلینا بڑا مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے رنگولی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہوسکتا ہے پورا دن شہر میں گھومنے کے بعد بھی تمہیں ان کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔“

”کل تم سے ملاقات سے پہلے میں نے انہیں ٹیکسی پر مائے فا برج کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ رنگولی نے کہا ”یہ انسانی فطرت ہے کہ جب وہ کسی خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے تو اپنی پناہ گاہ کی طرف ہی دوڑتا ہے۔ مائے فا برج کی طرف جانے کا مطلب یہ ہے ان کا ٹھکانا بھی اسی طرف کہیں ہوگا۔ دریا کی دوسری طرف ہندوؤں کے کچھ گھر آباد ہیں۔ ایک چھوٹا سا مندر بھی ہے۔ میں اپنی تلاش وہیں سے شروع کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ اسی علاقے سے ان کا پتا چل جائے گا۔“

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "تمہارے ہاں اخبار نہیں آتا۔ اگر زحمت نہ ہو تو مارکیٹ سے کوئی اخبار لا کر دے جانا۔"

رنگولی اپنی گاڑی پر چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے تھائی کو کچن کے بارے میں سمجھا دیا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اخبار بھی دے گئی تھی۔ اخبار کے صفحۂ اول پر نمایاں سرخی کے ساتھ نویتا کے قتل کی خبر چھپی تھی۔ اس کی لاش کے علاوہ باکس میں اس کا ایک پورٹریٹ بھی تھا۔ یہ تصویر گزشتہ رات میں نے کاٹیج کے ایک کمرے میں کارنس پر فریم میں لگی دیکھی تھی۔

اخبار کی اطلاع کے مطابق نویتا کنٹری کلب میں رقاصہ تھی۔ وہ کافی عرصہ غائب رہنے کے بعد چند ہفتے پہلے چیانگ رائے واپس آئی تھی اور اسے کنٹری کلب ہی میں کام مل گیا۔ گزشتہ رات بھی کلب میں اس کا پروگرام تھا لیکن اس نے شام ہی کو ٹیلی فون پر کلب کی انتظامیہ کو مطلع کردیا تھا کہ بنکاک سے اس کے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں اس لیے آج وہ کلب نہیں آئے گی۔

پولیس کے ذرائع کے مطابق کسی گمنام شخص نے اطلاع دی تھی کہ اس کاٹیج میں ایک عورت کو قتل کردیا گیا ہے۔ پولیس عام طور پر گمنام کالز پر کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ لیکن چند منٹ بعد اسی گمنام شخص نے پولیس کو دوبارہ فون کیا تو ایک پٹرولنگ کار اس طرف روانہ کردی گئی اور اس طرح نویتا کے قتل کا انکشاف ہوا۔ اسے سینے میں خنجر مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ابھی تک نہ تو قتل کی وجہ معلوم ہو سکی تھی اور نہ ہی قاتل یا قاتلوں کا سراغ ملا تھا۔ پولیس کو مقتولہ کے ان مہمانوں کی بھی تلاش تھی جن کے بارے میں نویتا نے کنٹری کلب کو بھی اطلاع دی تھی۔

نویتا کے بارے میں چھوٹی چھوٹی خبروں کی صورت میں اور بھی بہت کچھ لکھا تھا۔ کنٹری کلب کے منیجر کے حوالے سے بتایا گیا تھا کہ نویتا کچھ عرصہ پہلے کلب کی ملازمت چھوڑ کر بہتر مستقبل کی تلاش میں شانگ نامی ایک شخص کے ساتھ بنکاک چلی گئی تھی جہاں ٹائیگر اور پیڈرو جیسے بدمعاشوں کے حوالے سے ہنگاموں میں بھی الجھی رہی اور بالآخر چند ہفتے پہلے چیانگ رائے واپس آگئی۔ چند روز پہلے شانگ نامی اس شخص کو تنگچن بوری میں گولیوں سے چھلنی کردیا گیا جو نویتا کو چیانگ رائے سے بنکاک لے گیا تھا۔ شانگ ڈرگ مافیا کے ایک بہت بڑے ریکٹ کا سرگرم رکن تھا۔ باکس میں ایک اور چھوٹی سی خبر یہ تھی کہ بنکاک میں قیام کے دوران میں نویتا، مہاراج اور وجدان کے پاس بھی رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور باکس "پُراسرار شخصیت" کے عنوان سے میرے بارے میں بھی مختصر سا چھپا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی تحریر بڑے تضادات کی حامل تھی۔ ایک طرف مجھے فرشتہ ثابت کیا گیا تھا جو برائیوں کے خلاف برسرپیکار تھا اور دوسری طرف مجھے دنیا کا خطرناک ترین آدمی ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اخبار میں چی فانگ یا دارا وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا تھا۔ البتہ ان "پُراسرار" مہمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ پولیس سے رابطہ کریں تاکہ قاتل کا سراغ لگانے میں مدد مل سکے۔

میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھائی میرے چہرے پر تاثرات کے اتار چڑھاؤ سے کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا اور خود وہاں سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

واپس آیا تو تھائی اخبار کی خبروں پر تبصرے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔

"اس میں شبہ نہیں کہ اخبار نے رات ہی رات میں یہ مواد جمع کرنے کے لیے بڑی محنت کی ہے لیکن ان خبروں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک عام آدمی کے لیے نتیجہ اخذ کرنا واقعی بہت مشکل ہے لیکن ہم تم سب کچھ جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اصل قاتل کون ہے۔ ہمیں ان باتوں میں الجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ بعض باتیں ایسی ہیں جن کی تردید نہیں کی جاسکتی۔"

"مثلاً؟" تھائی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"مثلاً یہ کہ نویتا بنکاک میں ہونے والے کچھ ہنگاموں میں ملوث رہی ہے اور وہ مہاراج اور میرے ساتھ بھی رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی تردید تو واقعی نہیں کی جاسکتی لیکن تمہاری باتوں سے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔" تھائی بولی۔

"وہ کیا....!" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہ گمنام کال کے ذریعے پولیس کو نویتا کے قاتل کے بارے میں اطلاع دے دی جائے۔ پولیس ان کے پیچھے لگ جائے گی اور ہمیں بھی ان سے نمٹنے میں آسانی رہے گی۔ جب چاروں طرف سے گھر جائیں گے تو یقیناً بدحواس ہو جائیں گے۔" تھائی نے کہا۔

"تمہاری بات کسی حد تک درست ہے لیکن پہلے جانکی اور پرساد کو تلاش کرلیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے خبری میں مارے جائیں۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر ہم دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ ظاہر ہے ہمارے پاس کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ دو بجے کے قریب تھائی کچن میں چلی گئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد خشک گوشت کے قتلے اور ڈبل روٹی کے پیس بنا لائی۔ اس کے ساتھ اس نے کافی بھی بنالی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد تھائی تو وہیں بیٹھی رہی اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس وقت غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں

مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا ہوں گا۔ تھائی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میری آنکھوں میں شدید جلن اور دماغ میں جھنجھناہٹ سی ہورہی تھی۔

"رنگولی کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔" تھائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رنگولی گھر میں نہیں ہے۔ ہمیں کال ریسیو کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بجتے رہنے دو۔" میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے رنگولی ہی فون کررہی ہو اور کوئی اہم اطلاع دینا چاہتی ہو۔" تھائی نے کہا۔

رنگولی نے اگرچہ جانے سے پہلے فون کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی کہ کوئی کال ریسیو کی جائے یا نہیں لیکن ممکن ہے کال رنگولی ہی کی ہو اور وہ کوئی اہم اطلاع دینا چاہتی ہو۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے سے نکل آیا۔

ٹیلی فون رنگولی کے بیڈ کے قریب سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر ریسیور اٹھالیا کہ اگر کال رنگولی کے لیے ہوئی تو "رانگ نمبر" کہہ کر فون بند کردوں گا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔ ہیلو کے جواب میں رنگولی کی آواز سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

"ماسٹر میں رنگولی بول رہی ہوں۔" وہ کہہ رہی تھی "جانکی اور پرساد کا پتا چل گیا ہے لیکن تمہارے لیے ایک اور اہم اطلاع بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔ ان دونوں کے مل جانے پر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

"چی فانگ کو پولیس نے نویتا کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا ہے۔"

"کیا...؟" میں اچھل پڑا۔

"یہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔" رنگولی نے جواب دیا "میں ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔ جانکی اور پرساد بالکل محفوظ ہیں۔ ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں لے کر آٹھ بجے تک پہنچ جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور تھائی کو جانکی اور پرساد کے مل جانے اور چی فانگ کی گرفتاری کے بارے میں بتانے لگا۔ تھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔

O☆O

وہ گھنٹے بڑے صبر آزما ثابت ہوئے تھے۔ میں بار بار دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتا اور کبھی برآمدے میں آکر باہر سڑک پر دیکھنے لگتا۔ تھائی کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔

آٹھ بج چکے تھے اور پھر وقت گزارنا مشکل ہوگیا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔ بالآخر ساڑھے آٹھ بجے رنگولی کی کار گیٹ کے سامنے رکی۔ اس وقت میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ بتی نہیں جلائی تھی۔ کار رکتے ہی میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر گیٹ کھول دیا۔ رنگولی گاڑی اندر لے آئی۔ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر جانکی اور پچھلی سیٹ پر پرساد بیٹھا ہوا تھا۔

جانکی کار سے اتر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر تھائی کی طرف دوڑی جو برآمدے والے دروازے سے باہر آرہی تھی۔ پرساد بھی کار سے اتر کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ہمارا یہ ملاپ دیکھ کر رنگولی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے یہ منظر دیکھ کر بہ آسانی اندازہ لگالیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔

رنگولی کھانے پینے کا بہت سا سامان بھی لائی تھی۔ پرساد اور رنگولی کار سے سامان اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو ہم بھی اندر آگئے۔

جانکی اور پرساد کی داستان بڑی دلچسپ تھی۔ بنکاک سے یہاں آکر وہ دونوں "وائی ایم سی اے" ہوسٹل ہی میں ٹھہرے تھے لیکن دو گھنٹے بعد ہی وہ چی فانگ کی نظروں میں آگئے جس کی وجہ سے انہیں ہوسٹل چھوڑ دینا پڑا۔ مائے کوک ریور کے اس پار چیانگ رائے تھارن روڈ کے قریب ہی ہندوؤں کی مختصر سی آبادی تھی۔ جانکی دیوی کی ایک جاننے والی ہندو نرس گلاب دیوی بھی یہاں رہائش پذیر تھی۔ وہ عرصہ پہلے بنکاک کے ایک سرکاری اسپتال میں جانکی کے پاس کام کیا کرتی تھی۔ تقریباً پانچ سال پہلے اس کا تبادلہ چیانگ رائے کے سرکاری اسپتال میں کردیا گیا تھا۔ یہاں آنے کے بعد بھی خطوط اور کبھی ٹیلی فون کے ذریعے جانکی سے اس کا رابطہ رہا تھا۔

وائی ایم سی اے ہاسٹل سے نکل کر جانکی اس کے ہاں گئی تھی۔ گلاب دیوی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ اپنے کوارٹر میں اکیلی ہی رہا کرتی تھی اسی لیے پرساد کو بھی وہاں رہنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

"اسی رات ہم نویتا سے ملنے کنٹری کلب گئے تھے۔" جانکی بتا رہی تھی "ہم ذرا جلدی پہنچ گئے تھے تاکہ نویتا کا پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی اس سے گپ شپ ہوسکے۔ نویتا ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ہم نے جب اسے بتایا کہ تم لوگ بھی کل یہاں آرہے ہو تو اس کی خوشی دوچند ہوگئی تھی۔ ہم ڈائننگ ہال کی ایک میز پر بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ میں نے وہاں اسی کم بخت چی فانگ کو دیکھ لیا۔ میرا خیال تھا اس نے ہمیں نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس وقت اس کا دھیان دوسری طرف تھا۔ میں نے نویتا کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور ہم دونوں کلب سے نکل گئے۔

"ہم نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارا تعاقب نہ کیا جارہا ہو کوئی مشکوک شخص بھی ہمیں اپنے پیچھے نظر نہیں آیا۔ میں نے نویتا سے وعدہ کیا تھا کہ دوسرے دن شام کو ہم اس کے گھر آئیں گے۔ دوسرے روز روانگی سے پہلے میں نے فون پر اس کے کاٹیج کا پتا اچھی طرح سمجھ لیا۔

"وہاں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد تمہارا فون آگیا۔" جانکی نے میری طرف دیکھا "تمہاری فون کال کے تھوڑی ہی دیر بعد نویتا کو ایک فون کال اور ملی۔ پتا نہیں وہ کس کی کال تھی اور اس سے کیا کہا گیا تھا کہ نویتا ایک دم بدحواس سی ہوگئی۔ اس نے کہا کہ ہم فوراً وہاں سے چلے جائیں۔ میں نے پوچھنے کی کوشش کی کہ کس کا فون تھا لیکن اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے چلے جائیں۔ وہ بعد میں ہم سے رابطہ کرلے گی۔

"ہم کاٹیج سے نکل گئے لیکن میرے دل میں شبہ جڑ پکڑ چکا تھا۔ کہیں جانے کے بجائے ہم کچھ دور اندھیرے میں گنجان درختوں کے پیچھے چھپ گئے۔ اس کے صرف دس منٹ بعد ایک کار کاٹیج کے سامنے آکر رکی۔ کار سے دارا، کم اور جی فانگ کو اترتے دیکھ کر میں اچھل پڑی۔ انہوں نے بیل بجا کر دروازہ کھلوایا اور وہ تینوں نویتا کو دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے۔ پرساد نے ان کے پیچھے کاٹیج میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے بڑی مشکل سے اسے روکے رکھا تھا۔ صرف سات آٹھ منٹ بعد دارا وغیرہ واپس چلے گئے اور اس کے کچھ دیر بعد جب ہم دونوں کاٹیج میں داخل ہوئے تو بیڈ روم کا منظر دیکھ کر میں کانپ اٹھی۔ نویتا کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر خنجر پیوست تھا اور خون بستر کی چادر کو تر کر رہا تھا۔

"نویتا کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ اسے فوری طبی امداد بھی فراہم نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں بری طرح بدحواس ہوگئی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ تم لوگ بھی وہاں آنے والے ہو۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ وہ لوگ واپس نہ آجائیں۔ پرساد وہاں رک کر انتظار کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس قدر بدحواس ہوگئی تھی کہ اسے ساتھ لے کر وہاں سے بھاگ نکلی۔

"مائے فابرج کے قریب ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پرساد نے ایک پبلک ٹیلی فون بوتھ سے پولیس کو اطلاع دے دی کہ اس کاٹیج میں ایک قتل ہوگیا ہے۔ پرساد کا خیال تھا کہ قتل کے نام پر پولیس فوراً وہاں پہنچ جائے گی اور ہوسکتا ہے نویتا کو بچالیا جائے۔

"ہم ٹک ٹک پر بیٹھ کر وہاں سے تھائرن روڈ (سرکلر روڈ) پہنچے۔ ایک اور ٹیلی فون بوتھ سے پرساد نے پولیس کو دوبارہ وہی اطلاع دی اور اس کے بعد ہم گلاب دیوی کے کوارٹر میں آگئے۔

"میں رات بھر نہیں سوسکی۔ نویتا کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا۔ صبح اخبار میں نویتا کے قتل کی خبر پڑھی تو میری حالت کچھ اور غیر ہوگئی۔ پورا دن اسی کیفیت میں گزر گیا۔ صبح میں نے چائے کا صرف ایک کپ پیا تھا۔ پرساد بھی بری طرح پریشان ہورہا تھا۔

"چار بجے کے قریب میں کسی کو کچھ بتائے بغیر باہر نکلی۔ میں نے پولیس کو یہ اطلاع دینے کا فیصلہ کرلیا تھا کہ نویتا کے قاتل کون ہیں۔ اتفاق سے مجھے کوئی ٹیلی فون بوتھ نظر نہیں آیا اور میں گلاب دیوی کے کوارٹر سے بہت دور رم کاک ریسٹورنٹ تک پہنچ گئی۔ ریسٹورنٹ کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا شاپنگ سینٹر بھی ہے۔ مجھے ایک ٹیلی فون بوتھ نظر آگیا۔ اس طرف جاتے ہوئے میری نظریں ایک چھوٹے سے شراب خانے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

"سامنے ہی ایک میز پر جی فانگ ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ اسے اس طرح اطمینان سے شراب پیتے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ میں اندر جا کر اس کا گلا گھونٹ دوں لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"جی فانگ نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بوتھ میں داخل ہو کر پولیس کا ایمرجنسی نمبر ون ناٹن ون ملایا اور نام بتائے بغیر اطلاع دی کہ نویتا کا قاتل اس وقت مذکورہ شراب خانے میں موجود ہے۔ میں نے شراب خانے کا نام اور جی فانگ کا مکمل حلیہ بھی بتا دیا تھا تاکہ پولیس آسانی سے اسے شناخت کرسکے۔

"میں بوتھ سے نکل کر ایک طرف آڑ میں کھڑی ہوگئی۔ میں نے سوچا تھا کہ جی فانگ اگر شراب خانے سے نکلے تو چھپ کر اس کا پیچھا کروں گی۔ ویسے مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ جلد وہاں سے اٹھے گا۔

"پندرہ منٹ بعد پولیس کی دو کاریں شراب خانے کے سامنے آکر رکیں۔ جی فانگ نے پولیس کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن پولیس نے اسے دھرلیا۔ جی فانگ کی گرفتاری سے مجھے دلی سکون ملا تھا۔ بڑی طمانیت سی محسوس ہوئی تھی۔

"پولیس جی فانگ کو لے کر چلی گئی۔ میں اس کے بعد بھی کچھ دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور جب میں واپس جارہی تھی تو راستے میں رنگولی مل گئی۔

"اس نے مجھے تمہارے اور تھائی کے بارے میں بتایا۔ پہلے تو مجھے اس پر شبہ ہوا لیکن اس نے تمہارے اور تھائی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں کہ مجھے اس پر اعتماد کرنا پڑا۔ میں اسے دیوی کے کوارٹر میں لے آئی۔ پرساد اکیلا ہی تھا اور بہت پریشان ہورہا تھا۔ میں نے اسے جی فانگ کی گرفتاری کا بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ رنگولی ہمیں وہاں انتظار کرنے کا کہہ کر چلی گئی تھی۔ اس کی واپسی تقریباً دو گھنٹے بعد ہوئی تھی اور پھر ہم اس کے ساتھ یہاں آگئے۔"

جانکی خاموش ہوگئی۔ جانکی اور پرساد کے چہروں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ پچھلے چوبیس گھنٹے انہوں نے کس اذیت میں گزارے ہوں گے۔

"تم نے انہیں تلاش کرکے واقعی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے" میں نے رنگولی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے بھی غالباً کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہوگی؟"

"ہاں۔ اسی لیے دیر بھی ہوگئی۔" رنگولی نے جواب دیا "جی فانگ کو تو پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔ اسے پولیس کے شکنجے سے چھڑانے کی کوششیں شروع ہوچکی ہیں۔ میں نے فانگ چن کو بھی پولیس ہیڈ کوارٹر میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"فانگ چن!" میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔" رنگولی نے اثبات میں سرہلایا "وہ ڈرگ مافیا کا ایجنٹ ہے۔ سنا ہے جنرل کھوراث سے بھی اس کے تعلقات ہیں۔ بہت طاقتور ہے ان کا گروہ اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ جی فانگ کو رات تھانے میں نہیں رہنے دیں گے بلکہ عین ممکن ہے کہ اب تک وہ لوگ اسے لے جا بھی چکے ہوں۔"

"ہوں۔" میں نے ہنکارا بھرا "ابھی زیادہ وقت نہیں ہوا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے کہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔"

"میں معلوم کرلوں گی لیکن پہلے کھانا کھالوں۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آنتیں جھلس رہی ہیں۔ میں کچھ چیزیں لے کر آئی ہوں۔ ابھی میز پر لگاتی ہوں۔" رنگولی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

اور پھر پندرہ منٹ کے اندر اندر رنگولی اور تھائی نے مل کر میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانے کے بعد رنگولی نے لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر دس بجے کے قریب اپنی کار پر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد ہم لاؤنج ہی میں بیٹھے موجودہ صورت حال اور نویتا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ جانکی کو نویتا کی موت کا بہت زیادہ دکھ ہوا تھا۔

رنگولی کی واپسی رات ایک بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ ہم سب اس کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔

"وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔" رنگولی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا "فانگ چن دس بجے کے قریب جی فانگ کو چھڑا کر لے گیا۔ اس کے لیے اسے خطیر رقم بھی خرچ کرنی پڑی تھی۔ میری اطلاع کے مطابق جی فانگ کو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شہر سے باہر کسی خفیہ جگہ پر بھیج دیا گیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں پولیس دوبارہ بھی اس پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ انہیں اس عورت کی بھی تلاش ہے جس نے پولیس کو شراب خانے میں جی فانگ کی موجودگی کی اطلاع دی تھی اور میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ ان کا شبہ تم پر ہے۔" اس نے خاموش ہو کر جانکی کی طرف دیکھا۔

جانکی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی "اب میں نہیں ڈرتی۔ میرا ہیرو آگیا ہے۔" اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

"ایک اور بات!" رنگولی نے اپنی بات کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے کہا "میں نے دارا اور کم کے ٹھکانے کا بھی پتا..... کیا ہے۔ وہ دونوں راج یوتھا روڈ کے قریب ایک عالی شان بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"یہ کہاں پر ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یوں سمجھو کہ ہم اس وقت شہر کے مشرقی حصے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ راج یوتھا روڈ شہر کے انتہائی مغرب میں واقع ہے۔ اس طرف رہائشی علاقہ ہے۔ وہاں سے یہ روڈ آگے مضافاتی علاقوں کی طرف نکل جاتی ہے۔" رنگولی نے بتایا۔

"تم تو واقعی بڑے کام کی ثابت ہوئی ہو رنگولی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر دارا سے تمہارا آمنا سامنا ہوجائے تو وہ تم پر کوئی شبہ نہیں کرے گا؟"

"اس کی وجہ سے ٹائیگر سے میری ان بن ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ رات گزارنا چاہتا تھا مگر اس جھگڑے کی وجہ سے اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی تھی۔ میں ٹائیگر کے عتاب کے باعث در در کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اس دوران میں دارا سے کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا تھا لیکن ہوسکتا ہے اب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے سینے میں دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے اور وہ پچھلی باتوں کو بھول کر میرے قریب آنے کی کوشش کرے۔ ویسے بھی ٹائیگر تو اب اس دنیا میں رہا نہیں جس کا اسے کچھ خیال ہو۔ ٹائیگر کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے یہ بھی اندازہ لگالیا تھا کہ دارا نہایت خود غرض، لالچی اور کم ظرف قسم کا آدمی ہے۔ وہ دوستی کی قدروں کو نہیں سمجھتا۔ ضرورت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنا سکتا ہے۔"

"دارا کے بارے میں تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے۔" میں نے رنگولی کے خاموش ہونے پر کہا "تمہیں اس طرح دارا کے قریب جانا ہے کہ اسے تم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہوسکے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ چیانگ رائے میں کسی بڑے آدمی سے ملنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ملاقات نہایت خفیہ ہوگی لیکن تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ ملاقات کب اور کہاں ہونے والی ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ اگر دارا کو تم پر کسی قسم کا شبہ بھی ہوگیا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گی۔"

"اگر میری زندگی کسی کام آجائے تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔" رنگولی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں بھرپور عزم تھا۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم کل سے ہی اس مشن پر کام شروع کردو لیکن کیا اب ہمارا یہاں رہنا ٹھیک ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" رنگولی نے جواب دیا "میں

اسے یہاں گھر تو نہیں لے کر آؤں گی۔ ویسے یہ اطمینان رکھو۔ اسے کبھی یہ شبہ بھی نہیں ہوسکے گا کہ میرا تم لوگوں سے کوئی تعلق ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "اب اگر تم لوگ مناسب سمجھو تو تھوڑی سی نیند لے لی جائے؟"

"ہاں۔ نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔" جانگی جماہی لینے لگی۔

میرے اور تھائی کے پاس کمرا تو تھا ہی۔ جانگی رنگولی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی اور پرساد لاؤنج ہی میں صوفے پر لیٹ گیا۔

اگلے روز رنگولی نے اپنے مشن پر کام شروع کردیا۔ دو دن گزر گئے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بڑی محنت کررہی تھی۔ دارا سے اس کا رابطہ دوسرے دن ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ بڑی حوصلہ افزا تھی۔ رنگولی کے کہنے کے مطابق دارا سے اس کی ملاقات راج یوتھا روڈ پر واقع تھیما ان ہوٹل کے بار روم میں ہوئی تھی۔ دارا وہاں پہلے ہی سے موجود تھا اور رنگولی اس سے کچھ فاصلے پر اس طرح بیٹھ گئی تھی جیسے دارا کو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دارا نے اسے دیکھنے کے بعد خود ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔

یہ پہلی ملاقات زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔ دارا اس سے نہ صرف اظہارِ ہمدردی کرتا رہا بلکہ اس نے ٹائیگر کے خلاف بھی کچھ باتیں کی تھیں۔ ایک گھنٹے کی اس ملاقات میں دارا کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے محض اتفاق ہی سمجھ رہا تھا اور اس نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اب بھی رنگولی کو اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے۔

اس سے اگلے روز رنگولی نے اس کے بنگلے پر کچھ وقت گزارہ اور بہت سی کام کی باتیں معلوم کرلیں۔

"چی فانگ کو چیانگ سائین بھیج دیا گیا ہے اور چار دن بعد دارا اور لم بھی وہاں جانے والے ہیں۔ وہاں کسی اہم شخصیت سے ان کی ملاقات کا پروگرام ہے۔ اس کے بعد ان کا پروگرام مائے سائے جانے کا ہے جہاں سے یہ لوگ گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہوں گے۔"

"چیانگ سائین یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"انسٹھ کلومیٹر۔" رنگولی نے جواب دیا "بڑا خوب صورت علاقہ ہے۔ یہاں مہاتما بدھ کے دو قدیم واٹ اور ایک بہت بڑا میوزیم بھی ہے جہاں گیارھویں اور بارھویں صدی کے نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ اس قصبے سے صرف نو کلومیٹر آگے گولڈن ٹرائی اینگل ہے۔"

"اوہ!" میں چونک گیا "فانگ پھن کہاں ہے؟"

"وہ بھی کل صبح چیانگ سائین جارہا ہے۔" رنگولی نے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے، تم ہمارے اس مشن میں اہم کردار ا... ہو۔ میں اس سلسلے میں تم سے بعد میں بات کروں گا لیکن ... قبائلی سردار زادے تھالوب سے میری ملاقات کرا سکتی ہو... نے کہا۔

"اگر تم چاہو تو یہ ملاقات آج بھی ہو سکتی ہے۔" رنگو... جواب دیا "آج بدھ کی شب ہے۔ میرا کنٹری کلب میں پرو... لیکن میں یہ پروگرام چھوڑ سکتی ہوں۔ اگر تم کہو تو میں اب... کرکے اس سے ملاقات طے کرلوں۔"

"ہاں۔ کوشش کرو۔ اگر یہ ملاقات آج ہی ہو جائے... ہے۔" میں نے کہا۔

رنگولی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ٹیلی فون وہیں ... تقریباً دس منٹ بعد واپس آئی۔

"اس وقت گیارہ بجے ہیں۔ تھالوب سے ہماری ملا... ساڑھے گیارہ بجے لٹل ڈک ہوٹل میں ہوگی۔ وہ جگہ یہاں... زیادہ دور نہیں ہے۔ تم تیار ہو جاؤ تو ہم چلیں۔ کوئی اور بھی... جائے گا؟" رنگولی نے یہ کہتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طر... دیکھا۔

"نہیں۔ میں تمہارے ساتھ اکیلا ہی جاؤں گا۔" میں یہ... ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

سوا گیارہ بجے میں اور رنگولی گھر سے رخصت ہوگئے۔ ... مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی سانون روڈ پر آگئی اور کافی لمبا را... طے کرنے کے بعد وانگ چائے کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ... یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بنکاک کی طرح چیانگ رائے شہر... بھی کئی نہریں ہیں۔ دریائے مائے کوک شہر کے گرد دائرے... صورت میں پھیلا ہوا ہے اور نہریں اس دریا سے نکلتی ہیں۔ او... اور ان نہروں سے بھی خوب فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ سپرہائی وے ... کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ سڑک شمال میں ائرپورٹ ... طرف سے شروع ہوتی ہے اور شہر سے گزر کر جنوبی علاقے ... انگریزی کے حرف "یو" کی شکل اختیار کرتی ہوئی واپس اسی طر... چلی جاتی ہے۔

سپرہائی وے پر سری بورن اسپتال کے قریب کار بائیں طر... مڑگئی۔ لٹل ڈک ہوٹل اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کا ... سائن دور ہی سے نظر آرہا تھا۔

رنگولی نے کار ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر روک لی۔ اس وقت ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ گھر سے نکل کر یہاں تک کا فاص... پورے پندرہ منٹ میں طے ہوا تھا۔ رنگولی کار سے اتر کر ادھر اُد... دیکھنے لگی۔

"تھالوب آچکا ہے۔ اس کی جیپ کھڑی ہے۔ وہ دائیں طر... سرخ رنگ کی فور وہیل ڈرائیو۔" رنگولی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

لٹل ڈک فائیو اسٹار تو نہیں لیکن بہت شان دار ہوٹل تھا۔ اس کے سامنے کچھ فاصلے پر نہر تھی اور ہوٹل کی طرف سے وہاں بھی گاہکوں کے لیے مناسب بندوبست کیا گیا تھا۔ دوسرے بڑے ہوٹلوں کی طرح لٹل ڈک میں بھی گاہکوں کے لیے پرائیویٹ سروس رومز تھے اور رنگولی کو غالباً معلوم ہوگا کہ تھالوب کہاں ملے گا کیونکہ ڈائننگ ہال یا بار روم کی طرف جانے کے بجائے وہ ایک راہداری میں مڑ گئی تھی۔ ایک دروازے کے سامنے رک کر اس نے ہلکی سی دستک دی اور جواب کا انتظار کیے بغیر دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں ایک کافی ٹیبل سائز کی میز پر آمنے سامنے دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو سانولی رنگت کی دراز قامت لڑکی تھی۔ سانولی رنگت سے قطع نظر اس کے چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ دوسرا ایک آدمی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دراز قامت گوری چٹی رنگت اور پرکشش نقوش۔ وہ خوب رو اور قابلِ رشک صحت کا مالک تھا۔ جنسِ مخالف کے لیے اس میں بڑی کشش تھی۔ وہ تھالوب تھا۔

وسیع کمرا بہت شان دار طریقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ جس کے دو حصے تھے..... ایک حصہ بیڈ روم کا منظر پیش کرتا تھا اور دوسرا نصف حصہ ڈرائنگ روم کا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور فرنیچر بھی بڑا شان دار تھا۔

ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ تھالوب نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر اپنے قبائلی رواج کے مطابق میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ بھی دیا تھا۔ غالباً رنگولی اسے فون پر میرے بارے میں تھوڑا بہت بتا چکی تھی۔

ہم دونوں میز کے گرد دوسری کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تھالوب نے اپنی زبان میں ساتھی لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی اور دروازہ بند کردیا۔ اس لڑکی کے جانے کے بعد ہی رنگولی نے میرا تفصیلی تعارف کرایا۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ماسٹر۔" تھالوب نے گرم جوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کچھ عرصہ پہلے میں بنکاک گیا تھا۔ مہاراج سے بھی ملا تھا۔ ان دنوں ساہی کے قتل کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ مہاراج نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا لیکن تم سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ آج تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔"

میں نے بھی اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ ہم ابھی یہ ابتدائی گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلا اور وہی لڑکی ایک نو عمر ویٹرس کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ویٹرس ایک سروس ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آئی تھی جس پر بڑھیا شراب کی دو بوتلیں، گلاس، برف کی ٹکڑیوں سے بھرا ہوا باؤل (پیالہ) سوڈے کی بوتل اور کھانے پینے کے لوازمات تھے۔

ویٹرس نے بڑے سلیقے سے یہ ساری چیزیں میز پر لگا دیں۔ لگتا تھا کہ تھالوب نے ہماری تواضع کے لیے یہ انتظام پہلے ہی سے کر رکھا تھا لیکن ظاہر ہے میں شراب نہیں پیتا تھا۔ ویٹرس جب واپس جانے لگی تو میں نے خود ہی اسے روک لیا۔

"میرے لیے ایک کپ کافی۔"

تھالوب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ندامت سی اُبھر آئی۔ اس نے ویٹرس سے اسپریسو کافی کے لیے کہا اور پھر دوسری لڑکی سے کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں باہر چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد ویٹرس کافی سرو کرگئی۔ دوسری لڑکی دوبارہ نہیں آئی۔ تھالوب نے اپنے اور رنگولی کے لیے شراب بنائی۔ میں کافی کی چسکیاں لیتا رہا اور وہ دونوں شراب کے سپ لیتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ تھالوب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک محبِ وطن شخص ہے اور شہنشاہ بھومی بول اور وطن کی سلامتی کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ اندازہ لگانے کے بعد میں جلد ہی اصل موضوع پر آگیا۔

"پیڈرو کے کچھ غیر ملکی دوست یہاں ہیروئن کا ایک نیا ریکٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہیں اور ہماری ایک دوست نویتا بھی گزشتہ رات ان کے ہاتھوں ماری جاچکی ہے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ لوگ چند روز میں جنرل کھوراٹ یا اس کے کسی خاص نمائندے سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں میں کوئی معاملہ طے نہ ہونے پائے۔ ہیروئن کی تباہ کاریوں سے تم واقف ہو۔ اس وقت پوری دنیا اس لعنت کی لپیٹ میں ہے۔ نوجوان نسل تباہ ہو رہی ہے۔ اب تو اسکول کے بچوں تک کو اس نشے کا عادی بنایا جارہا ہے۔ ہم پوری دنیا میں تو ہیروئن کی سپلائی کو نہیں روک سکتے لیکن کسی نئے ریکٹ کے لیے مشکلات تو پیدا کرسکتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہیروئن کی تیاری اور سپلائی کا سب سے بڑا مرکز گولڈن ٹرائی اینگل ہے۔ جنرل کھوراٹ اس خطے کا بے تاج حکمران ہے۔ اس کی طاقت کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا۔ ہیروئن کی سپلائی کے اس کے اپنے ذرائع ہیں جن میں آج تک کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکی۔ میں کوئی بڑا دعویٰ تو نہیں کرسکتا لیکن یہ کوشش ضرور کی جاسکتی ہے کہ ایسا کوئی نیا ریکٹ قائم نہ ہونے دیا جائے اور اس نئے گروہ کا قلع قمع کردیا جائے جو یہاں قدم جمانے کی کوشش کررہا ہے۔"

میں نے تھالوب کو شہنشاہ کے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں بتانا فی الحال مناسب نہیں سمجھا تھا۔ رنگولی مجھے بتا چکی تھی کہ اسے منشیات کی کاشت اور اس کا بزنس کرنے والوں سے شدید نفرت تھی اس لیے میں نے اپنی گفتگو کا محور بھی منشیات ہی کو

بنایا تھا۔ یہ ایک طرح سے گویا اس کی دکھتی ہوئی رگ تھی جس پر میں نے انگلی رکھ دی تھی۔

"ہیروئن.... ہیروئن.... ہیروئن۔" تھالوب کے لہجے میں شدید جھنجلاہٹ تھی "میرا بس نہیں چلتا کہ منشیات کی کاشت اور کاروبار کرنے والوں کو پھانسی پر لٹکا دوں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "منشیات کی روک تھام کے لیے ہر ملک نے قانون بنا رکھے ہیں۔ یہ گھناؤنا کاروبار کرنے والوں کے خلاف کارروائی کے لیے اسپیشل اسکواڈ اور فورسز بھی قائم کر رکھی ہیں جن پر کروڑوں ڈالر خرچ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لعنت ایڈز کی طرح پھیل رہی ہے۔ کوئی روک تھام نہیں ہو رہی اس کی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی سب سے بڑی وجہ ہر ملک کے قانون میں لچک اور کرپشن ہے۔ ڈرگ مافیا کی طاقت کا اندازہ میں لگا سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہر ملک کی حکومت پوری قوت کے ساتھ قانون پر عمل درآمد کی کوشش کرے تو منشیات کا کاروبار کرنے والوں کو دنیا کے کسی کونے میں پناہ نہ ملے اور یہ برائی جڑ سے ہی ختم ہو جائے لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والوں ہی میں بعض ایسے بے ضمیر اور بدکردار لوگ موجود ہیں جو ذاتی مفاد کے لیے موت کے ان بیوپاریوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ اپنے ملک کی مثال دوں گا۔ یہاں بھی منشیات کی روک تھام کے لیے الگ سے ایک محکمہ قائم ہے جس کے لیے ہر سال کروڑوں ڈالر کے فنڈز مخصوص کیے جاتے ہیں۔ اس محکمے کے ملازمین کو بے پناہ سہولتیں بھی حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں ڈرگ مافیا کے خلاف کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

"سیاست میں بھی ڈرگ مافیا کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ آج ہر ملک میں بہت سے سیاست داں ایسے ہیں جو منشیات ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ لوگ ڈرگ مافیا کے ایجنٹ ہیں بلکہ ان کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔ یہ سیاست داں' اپنے ملک اور قوم کے لیے نہیں ڈرگ مافیا کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سب ہی لوگ کرپٹ ہیں۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں لیکن یا تو وہ بے بس ہیں۔ انہیں ہاتھ پیر ہلانے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اگر کوئی ہمت کرتا بھی ہے تو اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ چند ہفتے پہلے یہاں چیانگ رائے میں ایک ایسے جج کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا تھا جس نے ایک منشیات فروش کو جرم ثابت ہو جانے پر موت کی سزا سنائی تھی۔ جرم کرنے والے کو تو اس کے ساتھی پولیس کسٹڈی سے چھڑا کر لے گئے اور اس کے خلاف فیصلہ سنانے والے جج اور دو گواہوں کو عدالت کے احاطے ہی میں گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ جب صورتِ حال ایسی ہو تو موت کے اس بیوپار پر کیسے قابو پایا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ لوگ قابلِ تعریف ہیں جو ان حالات میں بھی جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ بہر حال' کم از کم اس معاملے میں' میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ بتاؤ' مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

اس میں شبہ نہیں کہ میں تھالوب کی باتوں سے بہت متاثر تھا۔ رنگولی مجھے بتا چکی تھی کہ اس کے باپ نے اپنے علاقے میں پوست کی کاشت کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اب اس علاقے میں کوئی بھی شخص پوست کی کاشت نہیں کرتا تھا۔ اس معاملے میں تھالوب بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ یہ بات بھی مجھے رنگولی ہی نے بتائی تھی کہ دور دراز کے رہنے والے ایک کاشت کار نے پہاڑوں میں پوست کی فصل اگا دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تھالوب تک یہ خبر نہیں پہنچ سکے گی مگر ایسی باتیں چھپی تو نہیں رہتیں۔ چیانگ رائے میں تھالوب کو کسی نے پوست کاشت کے بارے میں اطلاع دے دی۔ تھالوب اپنے سارے کام چھوڑ کر اگلے ہی روز چند آدمیوں کو لے کر پہاڑوں میں پہنچ گیا اور نہ صرف پوست کی کھڑی فصل تباہ کر دی بلکہ اس کاشت کار کا مکان بھی جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ اس کاشت کار کو دی جانے والی سزا کی یہ خبر پورے علاقے میں پھیل گئی اور پھر کسی کاشت کار میں پوست کاشت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

"فی الحال تو تمہیں کچھ نہیں کرنا۔" میں نے تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس گروہ کا ایک آدمی چی فانگ جو نویتا کے قتل میں ملوث ہے' یہاں سے فرار ہو کر چیانگ سائین پہنچ گیا ہے۔ اس کے باقی ساتھی بھی تین چار روز بعد اسی طرف جانے والے ہیں۔ میں ان لوگوں کے جانے سے پہلے خود وہاں جا کر چی فانگ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس وقت تمہاری نہیں بلکہ تمہارے کسی ایسے آدمی کی ضرورت پڑے گی جو اس علاقے میں میری رہنمائی کر سکے اور چی فانگ کو تلاش کرنے میں مدد کر سکے۔"

"جتنے آدمی چاہو تمہیں مل سکتے ہیں۔ ویسے چیانگ سائین جیسے علاقے میں کسی اجنبی کو تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہو گا۔ تم کب جانا چاہتے ہو؟" تھالوب نے پوچھا۔

"کل کسی بھی وقت۔" میں نے جواب دیا۔

"کل صبح نو بجے میرا ایک آدمی گاڑی لے کر رنگولی کے دروازے پر پہنچ جائے گا۔ تم لوگ تیار رہنا۔" تھالوب نے کہا۔

"کیا وہ آدمی بھروسے کا ہو گا۔ میرا مطلب ہے...."

"ہم قبائلی لوگ ہیں۔ دھوکا' فریب اور مکاری ہماری سرشت میں شامل نہیں۔ یوں تو قبیلے کا ہر شخص سردار کے حکم پر جان دینے کو بھی فخر سمجھتا ہے لیکن جو شخص تمہارے ساتھ جائے گا' میرا خاص آدمی ہے۔ تم اس پر مکمل بھروسا کر سکتے ہو اور اس سے جو کام چاہو لے سکتے ہو۔ وہ چون و چرا نہیں کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل صبح نو بجے تیار ملوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ تھالوب کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اسے ملکی اور بین الاقوامی سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ اس موضوع پر روانی سے بولتا رہا اور میں بیچ بیچ میں "ہوں ہاں" کرتا رہا۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ظاہر ہے میں نہ تو کوئی بحث کر سکتا تھا اور نہ ہی ان باتوں میں اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔

جب ہم جانے کے لیے اٹھے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ تھالوب بار بار ندامت کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ میری کوئی خدمت نہیں کر سکا۔

ہوٹل کے نائٹ کلب کے پروگرام دو بجے تک ہی ہوتے تھے اور اس وقت لوگ واپس جا رہے تھے۔ وہ لڑکی نجانے کہاں سے آ کر ہمارے ساتھ شامل ہو گئی تھی جسے شروع میں تھالوب کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ تھالوب نے پہلے ہمیں رنگولی کی کار کے پاس چھوڑا اور پھر اسی لڑکی کے ساتھ اپنی جیپ کی طرف چلا گیا۔

رنگولی نے وہاں بیٹھے بیٹھے تین پیگ پیے تھے اور مجھے شبہ تھا کہ اگر وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے بہک گئی تو ہم تینوں کا انجام بہت خطرناک ہو گا لیکن رنگولی پوری طرح اپنے حواس میں تھی۔ اس کے بارے میں میرے خدشات بے بنیاد نکلے۔

میرا خیال تھا کہ پرساد وغیرہ سو گئے ہوں گے لیکن وہ سب جاگ رہے تھے۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے تک لاؤنج میں بیٹھے پروگرام بناتے رہے۔ میں نے رنگولی کو راستے میں بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ میری عدم موجودگی میں اسے کیا کرنا ہے۔ تھالوب نے مجھے بتا دیا تھا کہ چیانگ سائین میں مجھے کہاں ٹھہرنا ہے۔ اس نے وہاں کا فون نمبر بھی ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا تھا۔ میں نے وہ کاغذ تھائی کی طرف بڑھا دیا اور رنگولی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس دوران میں اگر کوئی غیر معمولی بات ہو تو اس نمبر پر مجھے اطلاع دے دینا اور جب دارا وغیرہ یہاں سے روانہ ہو جائیں تو تم لوگ بھی چیانگ سائین پہنچ جانا۔"

"کیا تم اکیلے ہی جاؤ گے؟" تھائی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ کل سے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں تمہیں ساتھ لے جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ چی فانگ کو تلاش کرنے میں اچھی خاصی بھاگ دوڑ کرنی پڑے گی جبکہ دو تین دن یہاں رہ کر تمہیں آرام کرنے کا موقع مل جائے گا۔"

"میں بالکل فٹ ہوں۔ بھاگ دوڑ میں تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔" جانگی جلدی سے بول پڑی۔

"ٹھیک ہے۔ جانگی تمہارے ساتھ جائے گی۔" تھائی نے کہا۔

جانگی کے ہونٹوں پر تو خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی لیکن میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں جانگی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ مجھے زیر کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی لیکن میں ہر مرتبہ طرح دے گیا تھا۔ ہر ایسے موقع پر وہ وعدہ تو کر لیتی تھی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گی مگر وہ اپنا وعدہ بھول جاتی تھی۔

صبح ٹھیک نو بجے گاڑی پہنچ گئی۔ وہ نیلے رنگ کی لینڈ کروزر فور وہیل ڈرائیو جیپ تھی۔ میں نے اور جانگی نے اپنے کپڑے ایک الگ بیگ میں رکھ لیے تھے۔ ہم دونوں تھائی وغیرہ سے رخصت ہو کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت میں نے تھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔ اگر اسے یہ شبہ بھی ہو گا کہ جانگی میرے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہے تو وہ جانگی کو ہرگز میرے ساتھ نہ جانے دیتی۔

ڈرائیور کا نام وانگ ڈن تھا۔ وہ درمیانے قد کا صحت مند آدمی تھا۔ عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے بھی میری طرح ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔

چیانگ سائین اگرچہ صرف انسٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا مگر راستہ پُرپیچ اور نہایت دشوار گزار ہونے کی وجہ سے یہ فاصلہ تقریباً ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ راستے میں ہم چند منٹ کے لیے ایک آبشار کے قریب رکے بھی تھے۔

قصبہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سڑکیں کشادہ' صاف ستھری اور عمارتیں جدید طرزِ تعمیر کی حامل تھیں۔ بہت سی عمارتیں ایسی بھی تھیں جن سے مقامی تہذیب کا اظہار ہوتا تھا۔ سیاحت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں چند اچھے ہوٹل بھی تھے۔ گیسٹ ہاؤسز اور ہٹس تو بے شمار تھے۔ ہٹس زیادہ تر قصبے کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔

ہماری جیپ میوزیم کے سامنے سے ہوتی ہوئی شمال کی طرف جانے والی ایک سڑک پر مڑ گئی اور کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک ذیلی راستے پر آ گئی جو بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ تقریباً پانچ سو گز آگے پہاڑی پر ایک کاٹیج نما مکان تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف وسیع رقبہ خاردار تاروں سے گھرا ہوا تھا۔ مکان کے برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جیپ کو آتے دیکھا تو دوڑ کر گیٹ کھول دیا۔ وہ آدمی لباس اور حلیے ہی سے قبائلی لگتا تھا۔ جیپ مکان کے برآمدے کے سامنے رک گئی۔

جیپ سے اتر کر میں کچھ دیر چاروں طرف دیکھتا رہا۔ سامنے خوب صورت لان تھا اور اطراف میں بہت وسیع رقبہ گھرا ہوا تھا۔ پھل دار درختوں کی بہتات تھی۔ قرب و جوار میں کوئی اور مکان یا کاٹیج نظر نہیں آ رہا تھا۔

وانگ ڈن ہمیں اندر لے آیا اور کاٹیج دکھانے لگا۔ باہر سے یہ مکان چھوٹا لگتا تھا۔ لیکن اس میں پانچ بیڈ رومز کے علاوہ وسیع ڈرائنگ روم اور ہال بھی تھا۔ پورا مکان مکمل طور پر آراستہ تھا۔ ہر کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ جانگی ایک کمرے میں بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ سفر اگرچہ زیادہ طویل نہیں تھا لیکن وہ تھک گئی

تھی۔

"یہ لوما ہے۔" وانگ ڈن نے ادھیڑ عمر قبائلی کی طرف اشارہ کیا "تھائی' بری اور انگریزی زبانیں سمجھتا ہے۔ تھائی اور یورپین کھانے بھی بہت اچھے بناتا ہے لیکن تم لوگوں کے لیے دوپہر کا کھانا ہوٹل سے آئے گا۔ میں ابھی مارکیٹ جارہا ہوں' جو کھانا ہو بتا دیں۔"

"چائنیز کھانے مل جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔ وانگ ڈن نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے دو تین ایسے چائنیز کھانوں کے نام بتادیے جو ہم آسانی سے کھاسکتے تھے۔

وانگ ڈن کے جانے کے بعد میں نے لوما سے کافی کی فرمائش کی اور برآمدے کے سامنے درخت کے نیچے ایک گارڈن چیئر پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جانگی بھی وہاں آگئی اور چند منٹ بعد لوما بھی کافی بناکر لے آیا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے دو بجے کھایا۔ وانگ ڈن کا خیال تھا کہ ہمیں گھر میں بیٹھے رہنے کے بجائے سیرو تفریح کرنی چاہیے لیکن اسے کیا معلوم کہ یہاں ہم سیرو تفریح کے لیے نہیں آئے تھے۔ جب تک ہمارا مشن پورا نہ ہوجاتا' ہمارے لیے لوگوں سے دور رہنا ہی بہتر تھا۔ میرے انکار پر وانگ ڈن نے اصرار نہیں کیا۔ البتہ میں نے چی فانگ کا حلیہ بتاکر اس کی تلاش کی ہدایت کردی۔

"اس شخص کا حلیہ بالکل واضح ہے۔ اسے آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن اس بات کا خیال رہے کہ اسے شبہ نہ ہونے پائے کہ اسے تلاش کیا جارہا ہے۔ اگر تم چاہو تو اس کام کے لیے اپنے بھروسے کے کچھ آدمیوں سے مدد لے سکتے ہو لیکن شرط وہی ہے۔ چی فانگ کو شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ بہت چالاک ہے۔ اگر اسے شبہ بھی ہوگیا تو پھر وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"آپ مطمئن رہیے ماسٹر!" وانگ ڈن نے کہا "اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ اس کے گرد کوئی جال بچھایا جارہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں۔" میں نے سرہلا دیا۔

وانگ ڈن وہاں سے رخصت ہوا تو سودا وغیرہ لینے کے لیے لوما بھی اس کے ساتھ ہی چلاگیا تھا۔ میں اور جانگی اکیلے رہ گئے۔ اس وقت ہم ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جانگی باتیں کرتے کرتے اونگھ گئی اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ دارا وغیرہ کے آنے سے پہلے چی فانگ ہاتھ آجائے تو اس سے بہت ہی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

لوما پانچ بجے کے قریب واپس آگیا تھا۔ چھ بجے کے قریب اس نے ہمیں کافی بناکر دے دی اور کچن میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ آٹھ بجے کے قریب وانگ ڈن بھی آگیا۔ اس کی رپورٹ کسی طرح بھی امید افزا نہیں تھی۔ شہر میں واقع بیشتر ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کو چیک کرلیا گیا تھا۔ چی فانگ کے حلیے کے کسی آدمی کا سراغ نہیں ملا تھا۔

"میں نے بھروسے کے کچھ آدمی اس کی تلاش پر لگا دیے ہیں۔" وانگ ڈن کہہ رہا تھا "کل صبح سویرے ہی شہر کے نواحی علاقوں میں واقع گیسٹ ہاؤسز اور ہٹس میں اس کی تلاش شروع کردی جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ کل شام تک اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ پتا چل جائے گا۔"

اس رات کھانے کے بعد میں نے فون پر تھائی اور برساو کو صورت حال سے آگاہ کردیا۔ رنگولی سے بھی بات ہوئی تھی۔ وہاں کی صورت حال بھی نارمل ہی تھی۔

دس بجے کے قریب وانگ ڈن نے چینی ساختہ اے۔ کے سب مشین گن میرے سامنے رکھ دی۔ مجھے نہیں معلوم یہ آٹومیٹک رائفل اس نے کہاں سے نکالی تھی۔

"یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے لیکن احتیاطاً اسے اپنے پاس رکھ لو۔ یہ لوڈڈ ہے۔" اس نے کہا۔

میں رائفل اٹھا کر دیکھنے لگا اور پھر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ میرا خیال تھا کہ وانگ ڈن اور لوما بھی کاٹیج کے اندر ہی کسی کمرے میں سوئیں گے لیکن وانگ ڈن نے بتایا کہ وہ سردار کے اس کاٹیج کے اندر کسی کمرے میں سونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ کاٹیج کے پچھلی طرف کوارٹر ہیں۔ وہ دونوں وہاں سوئیں گے۔

"اگر رات کو کوئی مسئلہ ہو تو یہ بٹن دبا دیجیے۔" لوما نے کچن کے دروازے کے قریب دیوار پر لگے ہوئے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا "بیل میرے کوارٹر میں ہے۔ بیل بجتے ہی میں حاضر ہوجاؤں گا۔"

وہ دونوں کاٹیج سے باہر چلے گئے۔ میں نے اٹھ کر دروازے اندر سے لاک کردیے اور مختلف کمروں میں جھانکنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں اور جانگی الگ الگ کمروں میں سوئیں گے مگر جانگی اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

"میں اس سنسان کاٹیج میں الگ کمرے میں نہیں سوسکتی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" جانگی نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم بیڈ پر سوجاؤ۔ میں اس کوچ پر لیٹ جاتا ہوں۔" میں نے کہا اور جانگی کے جواب کا انتظار کیے بغیر کوچ پر لیٹ گیا۔

میرے حساب سے وہ رات خیریت سے گزر گئی۔ رات کو چونکہ جلدی سوگئے تھے اس لیے صبح آنکھ بھی جلدی کھل گئی۔ جانگی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں بھرپور نیند سویا تھا اور اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا اور فریش محسوس کررہا تھا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے ذہن پر طاری نیند کا تھوڑا بہت خمار بھی جاتا رہا۔

جب میں کمرے سے نکلا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ جانگی برآمدے میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی وہیں آگیا اور اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے اور بڑی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی مجھے وہاں بیٹھے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ لوما نے کچن کی طرف سے برآمد ہوکر چائے کا کپ میرے ہاتھ میں تھمادیا۔

"چائے پی لو پھر میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔" جانگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ناشتا' تم تیار کروگی!" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں۔ آج میں ناشتا بناؤں گی۔ کھاؤ گے تو انگلیاں چاٹتے رہ جاؤ گے۔ میں نے ضرورت کی چیزیں صبح سویرے ہی منگوالی تھیں۔" جانگی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"وانگ ڈن کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ مجھے وہ جیپ بھی نظر نہیں آرہی تھی جو رات کو برآمدے میں کھڑی کی گئی تھی۔

"وہ تو میرا خیال ہے صبح چھ بجے ہی چلاگیا تھا... چی فانگ کو تلاش کرنے۔" جانگی نے جواب دیا "ویسے یہ قبائلی لوگ بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ جس کام کا بیڑا اٹھالیتے ہیں اسے کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے۔ جب تک چی فانگ کا پتا نہیں چل جائے گا وانگ ڈن اس وقت تک نہ خود چین سے بیٹھے گا نہ دوسروں کو بیٹھنے دے گا۔"

میں نے کپ خالی کرکے سامنے پڑی ہوئی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔ جانگی کپ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی کچن میں جاکر دیکھوں' وہ کیا کررہی ہے لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ میں اس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کچن کی طرف سے اشتہا انگیز خوشبو آنے لگی جیسے کچھ تلا جارہا ہو۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد لوما مجھے اندر بلا کرلے گیا۔

میز پر ناشتا لگا ہوا تھا۔ پوریاں' آلو کی بھجیا اور چنے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میری بھوک ایک دم چمک اٹھی۔ جانگی پہلے بھی کھانا بناتی رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا لیکن آج کا ناشتا تو بہت ہی لذیذ تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ سنگاپور میں چھٹی والے روز ڈیڈی بھی بازار سے یہ ناشتا لایا کرتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک پاکستانی کی مٹھائی کی دکان تھی۔ صبح کے وقت وہ حلوا پوری بنایا کرتا تھا۔ اس کے گاہک بہت دور دور سے آیا کرتے تھے۔

بچپن کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ میں جیسے ماضی میں کھو گیا تھا۔

"ارے۔" جانگی نے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلایا "کہاں کھوگئے۔ ناشتا پسند نہیں آیا کیا؟"

"اوہ!" میں چونک گیا "کچھ نہیں۔ کچھ پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔ ویسے یہ ناشتا بہت مزے دار ہے۔ بہت عرصے بعد ایسی چیزیں کھارہا ہوں۔"

ناشتے کے بعد بھی ہم دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر اٹھ کر باہر آگئے۔ آسمان پر بادل کچھ اور گہرے ہوگئے تھے۔ ہوا میں بھی کسی قدر تیزی آگئی تھی۔ میں کاٹیج کے اوپر سے گھومتا ہوا پچھلی طرف چلاگیا۔ کئی ایکڑ رقبہ خاردار تاروں میں گھرا ہوا تھا جس میں پھل دار درخت لگے ہوئے تھے۔ جانگی بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ درختوں سے ذرا ہٹ کر دو دو تین تین فٹ اونچے لاتعداد پودے لگے ہوئے تھے جن پر سرخ رنگ کے پھل لگے ہوئے تھے۔ دور سے وہ مرچوں کے پودے لگ رہے تھے لیکن قریب پہنچ کر پتا چلا کہ وہ اسٹرابیری کے پودے تھے جو پھل سے لدے ہوئے تھے۔ جانگی اسٹرابیری توڑ کر کھانے لگی۔

ہم دور تک نکل گئے۔ اچانک ہی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ میں واپس جانا چاہتا تھا لیکن جانگی شرارت کے موڈ میں تھی' بوندا باندی نے اچانک ہی تیز بارش کی صورت اختیار کرلی۔ میں گنجان درختوں کے نیچے کھڑا تھا جبکہ وہ کھلی جگہ... پر کھڑی بارش میں بھیگتی رہی۔ اس نے بھی جینز کے اوپر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جو بارش میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ جانگی ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ سجائے میری طرف بڑھی تو میں کاٹیج کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی قہقہے لگاتے ہوئے میرے پیچھے دوڑ لگادی۔ میں نے کاٹیج کے برآمدے میں پہنچ کر ہی دم لیا تھا۔ تیز بارش میں میرے کپڑے بھی بھیگ گئے تھے اور جانگی کے لباس سے تو پانی نچڑ رہا تھا۔ وہ برآمدے کے سامنے لان میں کھڑی بارش کے مزے لیتی رہی اور مجھے ترغیب دیتی رہی۔

بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسی طرح اچانک ہی ختم ہوگئی۔ پہاڑی علاقوں میں کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بارش بند ہونے کے بعد کچھ دیر تک آسمان پر گرج چمک ہوتی رہی اور پھر بادل چھٹ گئے اور تیز دھوپ چمکنے لگی۔ مزید آدھے گھنٹے بعد آسمان اس طرح صاف ہوگیا جیسے وہاں کبھی بادلوں کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

"ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کپڑے بدل لو۔ اگر سردی لگ گئی تو بیمار پڑجاؤ گی۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر بیمار پڑگئی تو کیا تم میری تیمارداری نہیں کروگے؟" جانگی مسکرائی۔

"بہت شوق ہے بیمار پڑنے کا؟" میں نے اسے گھورا۔

"صرف تمہاری تیمارداری کی خاطر۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔

"باتیں بنانے کے بجائے اندر جاکر کپڑے بدلو۔" میں نے کہا۔

جانگی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر اندر چلی گئی۔ میں برآمدے ہی میں بیٹھا رہا۔

پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ وانگ ڈن نہ تو خود واپس آیا تھا

اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ چیانگ رائے سے رنگولی یا تھائی کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ ہمارا یہ کاٹیج خاصی بلندی پر واقع تھا وہاں سے شہر کے بعض علاقوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ چھوٹا سا شہر سرحد کے قریب واقع تھا۔ عام طور پر دور دراز کے علاقوں پر زیادہ توجہ نہیں دی جاتی لیکن سیاحت کا مرکز ہونے کی وجہ سے یہاں بھی وہ تمام سہولتیں موجود تھیں جو کسی بڑے ترقی یافتہ شہر میں ہوسکتی ہیں۔ شہر کی کئی عمارتوں پر بڑے بڑے رنگ برنگے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔

میں اس وقت جانگی کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وانگ ڈن کی دی ہوئی آٹومیٹک رائفل بھی میرے قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔ دو روشنیاں کاٹیج کی طرف آتے ہوئے دیکھ کر میں نے رائفل اٹھا کر گود میں رکھ لی۔ وہ کسی گاڑی کی ہیڈلائٹس تھیں۔ وہ وانگ ڈن کی جیپ بھی ہوسکتی تھی لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی فضا میں ہارن کی آواز گونج اٹھی۔ لوما کاٹیج سے نکل کر گیٹ کی طرف دوڑ گیا۔

وہ وانگ ڈن تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس کا پورا دن بھاگ دوڑ میں گزرا ہے۔

"ہم نے تمہارے شکار کو تلاش کرلیا ہے ماسٹر۔" اس نے میرے قریب آتے ہی کہا "تمہارے بتائے ہوئے حلیے سے اس کو شناخت کرنا زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا اور پھر اس کے ساتھ فانگ پھن کی موجودگی سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی کہ تمہارا مطلوبہ آدمی وہی ہے۔"

"گڈ۔" میں اچھل پڑا "کیا تم فانگ پھن کو جانتے ہو؟"

"اسے کون نہیں جانتا۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "وہ سین ٹونگ کا آدمی ہے اور سین ٹونگ جنرل کھوراٹ کا دست راست سمجھا جاتا ہے۔ تھائی لینڈ میں گولڈن ٹرائی اینگل کے معاملات سین ٹونگ ہی ڈیل کرتا ہے۔"

"لیکن سنا ہے کہ وہ تو گولڈن ٹرائی اینگل ہی میں رہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ درست ہے۔" وانگ ڈن نے اثبات میں سرہلایا "لیکن کوئی اہم معاملہ ہو تو وہ خود بھی ادھر آجاتا ہے۔ عام طور پر فانگ پھن جیسے لوگ ہی معاملات نمٹاتے رہتے ہیں۔"

"بہرحال، وہ لوگ کہاں ہیں۔ میرا مطلب ہے چی فانگ اور فانگ پھن؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مین روڈ کی دوسری طرف تقریباً تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ہٹ میں۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "میرے آدمی چاروں طرف اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ تقریباً پانچ بجے کے قریب میرے ایک آدمی نے فانگ پھن کو اس طرف جاتے دیکھا تو نجانے اسے کیوں شبہ ہوگیا۔ اس نے فانگ پھن کا تعاقب شروع کردیا اور درختوں میں گھرے ہوئے اس ہٹ تک پہنچ گیا جہاں اس نے فانگ کو دیکھ لیا۔ میرا آدمی تقریباً ایک گھنٹے تک درختوں میں ان کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ ان دونوں کے علاوہ وہاں گن مین بھی ہے۔ مجھے تقریباً آدھا گھنٹا پہلے اطلاع ملی ہے۔ آدمی اب بھی دور سے اس ہٹ کی نگرانی کررہا ہے۔"

"کیا ہم وہاں جاسکتے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارا مطلب ہے اس وقت؟" وانگ ڈن نے کہا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد خود ہی بولا "اس وقت جانا مناسب نہیں ہے۔ شام کا ابتدائی حصہ ہے۔ وہ لوگ ہوشیار ہوں گے۔ اگر ریڈ کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت مناسب رہے گا۔"

وانگ ڈن کی بات معقول تھی اس لیے میں نے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم نے کھانا کھالیا۔ اس کے تقریباً دس منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وانگ ڈن ہی نے ریسیو کی تھی۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک قبائلی زبان میں بات کرتا رہا تھا جس کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"کوئی خاص بات؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے اسی آدمی کا فون تھا جو ہٹ کی نگرانی کررہا ہے۔" وانگ ڈن نے کہا۔ اس نے کن انکھیوں سے جانگی کی طرف دیکھا پھر قدرے دھیمے لہجے میں بولا "آدھا گھنٹا پہلے شہر میں ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک تین عورتوں کو لے کر وہاں پہنچا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے پہلے ہی سے رات کا کوئی پروگرام بنا رکھا تھا۔"

"گڈ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اس سے ہمارے کام میں آسانی ہوجائے گی۔ وہ غفلت میں ہوں گے اور ہم انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیں گے اور میرا خیال ہے کہ آدھی رات کا انتظار کرنے کے بجائے ہمیں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں روانہ ہوجانا چاہیے۔ اس وقت محفل عروج پر ہوگی اور رنگ میں بھنگ ڈالنے کا یہ بہترین موقع ہوگا۔"

"اب میں تم سے اختلاف نہیں کروں گا۔ ہم دس بجے یہاں سے نکلیں گے۔" وانگ ڈن نے کہا "میرا ایک آدمی پہلے ہی وہاں موجود ہے۔ میں فون کرکے تین چار اور آدمی تیار کرلیتا ہوں۔"

"اتنے آدمیوں کی ضرورت نہیں۔ ایک وہاں موجود ہے ایک اور بلالو۔ دو ہم ہیں۔ میرا خیال ہے ہم چار کافی ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی ماسٹر مگر فانگ پھن بہت خطرناک آدمی

ہے۔" وانگ ڈن بولا۔

"پرواہ مت کرو کہ کون کتنا خطرناک ہے۔ زیادہ آدمیوں کو لے جانا مناسب نہیں ہے۔ بہرحال، ہم دس بجے یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر۔" وانگ ڈن نے اثبات میں سرہلا دیا۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو جانگی بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن میں نے سختی سے منع کردیا۔ میں نے باتھ روم میں جاکر کپڑے تبدیل کیے اور اپنا خنجر بھی پنڈلی سے باندھ لیا۔ جب میں ہال میں آیا تو وانگ ڈن وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ برآمدے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

اور پھر ٹھیک دس بجے ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے وانگ ڈن نے ایک بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا جسے میں نے جینز کی جیب میں رکھ لیا۔ جیپ کاٹیج کی حدود سے سڑک پر آگئی اور تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک عمارت کے سامنے رک گئی۔ یہ شاید کوئی مارکیٹ وغیرہ تھی جو بند ہوچکی تھی۔ صرف کارنر کی ایک دکان کھلی ہوئی تھی۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ایک آدمی عمارت کی دوسری طرف سے نکل کر جیپ کی طرف آگیا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور جیپ حرکت میں آگئی۔

چہرے کے نقوش سے وہ شخص بھی قبائلی ہی لگتا تھا لیکن اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ مین روڈ پر تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد وانگ ڈن نے جیپ کو ایک تنگ سی ذیلی سڑک پر اتار دیا۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ کوئی دوسری جیپ یا کار ہی قریب سے گزر سکتی تھی۔ کسی بڑی گاڑی کے گزرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چٹانیں تھیں جن پر اگے ہوئے درختوں کی شاخیں سڑک کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ دائیں بائیں کی پہاڑیوں سے مختلف مقامات پر تین اور تنگ سے راستے اس سڑک سے آن ملے تھے۔ یہ دراصل پیدل گھومنے والوں کے لیے ٹریک تھے جو پہاڑیوں میں اندر دور تک چلے گئے تھے۔

تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وانگ ڈن نے جیپ کی بتیاں بجھا دیں اور اس کے ساتھ ہی رفتار بھی کم کردی۔ گہری تاریکی میں ایسے دشوار راستے پر گاڑی چلانا نہایت خطرناک تھا مگر وانگ ڈن بڑے محتاط انداز میں بہت ہلکی رفتار سے جیپ چلاتا رہا اور پھر اس نے جیپ بائیں طرف ایک ایسے ہی راستے پر موڑ لی۔ دوسری سڑک سیدھی چلی گئی تھی۔

اس راستے پر تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرکے اس نے جیپ روک لی اور انجن بند کردیا۔ ہم تینوں جیپ سے اتر آئے اور ایک چٹان پر چڑھنے لگے۔ وہ چٹان زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس کی دوسری طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر درختوں سے روشنی چھنتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"وہ روشنی ہماری منزل ہے۔" وانگ ڈن نے اشارہ کیا "ہم اگر دوسری سڑک پر چلتے رہتے تو ہٹ کے سامنے والے رخ پر نکلتے لیکن اس وقت ہم ہٹ کے عقبی رخ پر ہیں۔"

ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے اور پھر چٹان سے اترنے لگے۔ تاریکی میں چلنا بہت مشکل ہورہا تھا۔ صبح کی بارش کی وجہ سے کہیں کہیں پھسلن بھی ہورہی تھی۔ نشیب میں آنے کے بعد ہم دوسری چٹان پر چڑھنے لگے۔ یہ چٹان بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔ اوپر سے مسطح تھی جہاں وہ ہٹ بنا ہوا تھا۔ سامنے کے رخ پر تو کاٹیج تک آنے کے لیے باقاعدہ راستہ بنا ہوا تھا۔ کار بھی وہاں تک آسکتی تھی۔ عقبی سمت میں چٹان کو کاٹ کر سیڑھیاں سی بنالی گئی تھیں لیکن ہم ان سیڑھیوں کے بجائے دوسرے راستے سے اوپر جارہے تھے جو خاصا دشوار گزار تھا۔ وانگ ڈن سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے میں اور آخر میں وہ قبائلی تھا۔ گنجان پودوں کی وجہ سے چٹان پر چڑھنا کچھ اور بھی مشکل ہورہا تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ پودوں کی سرسراہٹ کی آواز سن نہ لی جائے۔

وانگ ڈن ایک جگہ پر رک گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گہری تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ گنجان درختوں کی وجہ سے ہٹ کی روشنی بھی ہماری نظروں سے مکمل طور پر اوجھل تھی۔ وانگ ڈن اشارہ کرتا ہوا دائیں طرف بڑھنے لگا۔

ہٹ کی روشنی اب نظر آرہی تھی۔ اس طرف دو کمروں کی کھڑکیاں تھیں اور دونوں میں روشنی ہورہی تھی۔

"تمہارا وہ آدمی کہاں ہے جو ہٹ کی نگرانی کررہا تھا؟" میں نے وانگ ڈن کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ابھی معلوم کرتا ہوں۔" وانگ ڈن نے کہا اور چند منٹ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد منہ سے ایک عجیب سی آواز نکالی۔

یہ آواز لومڑی سے ملتے جلتے ایک جانور کی تھی جو ان پہاڑیوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دائیں طرف سے ویسی ہی آواز سنائی دی۔ وانگ ڈن نے منہ سے ایک بار پھر وہ آواز نکالی اور اپنے ساتھی کی طرف مڑ کر سرگوشی میں کچھ کہنے لگا۔ اس شخص نے اثبات میں سرہلایا اور دبے قدموں بائیں طرف چلتا ہوا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

میں اور وانگ ڈن کچھ دیر تک وہاں کھڑے سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے مشورہ کرتے رہے پھر یہ طے ہوا کہ وانگ ڈن اوپر سے چکر کاٹ کر کاٹیج کے سامنے والے رخ کی طرف چلا جائے اور گن مین کو قابو کرنے کی کوشش کرے جو یقیناً اسی طرف ہوگا۔ میں نے کاٹیج کی عقبی سمت سے کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وانگ ڈن کے جانے کے دو منٹ بعد میں بھی دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ ان دونوں کمروں کی کھڑکیاں اب صاف نظر آرہی تھیں۔ کھڑکیوں کے اندر کی طرف ہلکے نیلے رنگ کے باریک ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا اور ایک

کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گیا اور اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر دو سائے متحرک نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ اس لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ مرد چی فانگ تھا یا کوئی اور۔

اچانک بھاری قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر تیزی سے چلتا ہوا پودوں کے پیچھے دبک گیا۔ اس کے ٹھیک ایک سیکنڈ بعد ایک دراز قامت آدمی کاٹیج کی دوسری طرف سے گھوم کر سامنے آگیا۔ وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو کھڑکی سے آنے والی مدھم سی روشنی میں اس کے کندھے پر رائفل بھی نظر آگئی۔ وہ محافظ تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اسے کسی بات کا شبہ ہوا تھا یا ویسے ہی چکر لگاتا ہوا آیا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد اس کے اس طرف آنے کی وجہ معلوم ہوگئی۔ وہ ایک کھڑکی کے سامنے رک کر اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیابی ہوئی تھی، مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دوسری طرف سے ہوتا ہوا کاٹیج کے سامنے کی طرف چلا گیا۔

میں نے ایک منٹ اور انتظار کیا اور پھر اپنی کمین گاہ سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا اس مرتبہ دوسری کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یہاں بھی کچھ ویسی ہی صورت حال تھی۔ میں ابھی کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ کاٹیج کے سامنے کی طرف سے دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لگتا تھا جیسے دو آدمی آپس میں بھڑ گئے ہوں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد فائر کی آواز سنائی دی۔

ان آوازوں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وانگ ڈن اور محافظ کا ٹکراؤ ہوگیا تھا لیکن وہ رائفل کے نہیں پستول یا ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی کاٹیج کے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ دوسری طرف جاکر وانگ ڈن کی مدد کروں لیکن پھر میں نے دوسرے طریقے سے اس صورت حال کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔

پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دستے کی ضرب سے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا اور بڑی پھرتی سے اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھول دی اور اس کے ساتھ ہی پردے کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکے سے کھینچ دیا۔

کمرے میں ایک جوان عورت اور ایک آدمی تھا۔ عورت کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مرد بھی بے لباس تھا جو بڑی عجلت میں پتلون پہننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے باہر فائر ہوا تھا اور اب میں نے کھڑکی توڑ دی تھی۔ عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ بھی کرسی پر پڑے ہوئے کپڑوں کی طرف دوڑی تھی۔

فانگ پھن کو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ فانگ پھن ہی تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور میز پر پڑے ہوئے ریوالور کی طرف لپکا۔ میں نے پستول والا ہاتھ آگے بڑھا کر فائر کردیا۔ گولی فانگ پھن کے پیروں کے قریب قالین پر لگی اور وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھ گیا۔

"اوہ تم!" فانگ پھن نے مجھے پہچان لیا "تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے کر آئی ہے۔"

"یہ تو آنے والے لمحات ہی بتائیں گے کہ موت کس کی آئی ہے۔" میں نے کہا اور کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر اچانک ہی چھلانگ لگا دی۔

فانگ پھن نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ وہ غالباً مجھے ہاتھوں پر روکنا چاہتا تھا لیکن میرا چھلانگ لگانے کا انداز کچھ مختلف تھا۔ میں نے بائیں ٹانگ اندر کی طرف موڑ رکھی تھی جبکہ دائیں ٹانگ بالکل سیدھی آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ میں نے چھلانگ پوری قوت سے لگائی تھی۔ فانگ پھن کسی صورت میں بھی مجھے نہیں روک سکتا تھا۔ میری فلائنگ کک پوری قوت سے اس کے کندھے پر لگی۔ اس کے منہ سے "اونہہ" کی سی آواز نکلی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا اس لڑکی سے ٹکرا گیا جو کپڑے پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے خوف زدہ سی چیخ نکلی اور وہ دونوں صوفے پر گرے اور صوفہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔

فانگ پھن کو کک لگاتے ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا اور شیشے کے ٹاپ والی اس میز پر گرا جو کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ میز پر شراب کی بوتلیں اور دو گلاس بھی رکھے ہوئے تھے۔

چھناکے کی آواز سے میز کا شیشہ ٹوٹ گیا اور میں میز کے اندر اس طرح گرا کہ میری ٹانگیں اوپر تھیں اور سر بھی شیشہ ٹوٹنے کے بعد میز کے اندرونی کنارے سے ٹکرایا تھا۔ ایک لمحے کو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ غفلت کا نتیجہ صرف موت ہی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔

شراب کی ایک بوتل میری گود میں گری تھی جس میں سے بہنے والی شراب آگے سے میری جینز کو تر کر رہی تھی۔ شراب کی بو نتھنوں میں گھسی جارہی تھی۔ میں نے بوتل اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور ٹوٹی ہوئی میز سے باہر نکل آیا۔ بائیں کہنی کے قریب شیشہ لگنے سے کھال کٹ گئی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ کولھے پر بھی چوٹ لگی تھی لیکن یہ تکالیف قابل برداشت تھیں۔

پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ میں پستول اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ فانگ پھن گرے ہوئے صوفے کے پیچھے سے نکل آیا۔ میں پستول کا خیال چھوڑ کر سیدھا ہو رہا تھا کہ فانگ پھن نے چھلانگ لگا دی۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کے

باوجود اس کی کک میرے بائیں بازو پر لگی اور میں کھڑے کھڑے پکڑا گیا۔

فانگ پھن نے جس انداز سے کک لگائی تھی اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ مارشل آرٹس کا ماہر تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے میں مزہ تو آتا لیکن مجھے محتاط رہنے کی ضرورت بھی تھی۔

باہر سے تو اٹھا پٹخ کی آواز سنائی دے ہی رہی تھی لیکن دوسرے کمرے سے بھی کسی عورت کے چیخنے اور دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً وانگ ڈن کا کوئی آدمی وہاں پہنچ گیا تھا۔

فانگ پھن میرے سامنے اسٹانس میں کھڑا تھا۔ جبکہ صوفے کے پیچھے تھر تھر کانپتی ہوئی وہ عورت ایک بار پھر لباس پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ فانگ پھن نے جھانسا دے کر سائیڈ کک لگانے کی کوشش کی جسے میں نے کلائی پر روکا اور پھر وہ پے در پے سائیڈ ککس لگاتا رہا۔ میں نے اس کی ہر کک کلائیوں پر روکی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس نے مجھے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور یہ بڑی اچھی ٹیکنیک تھی کہ حریف کو اس طرح الجھائے رکھا جائے اور موقع پاتے ہی کاری ضرب لگا دی جائے۔ میں اس ٹیکنیک کو سمجھ گیا تھا۔ میں اسے کوئی زوردار حملہ کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسا موقع تلاش کرتا، مجھے ایک موقع مل گیا۔ میں دونوں پیروں پر اچھلا۔ اس کا خیال تھا کہ میں فلائنگ کک لگانے جارہا ہوں لیکن میں نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر ایک پیر زمین پر ٹکا دیا اور دوسرے پیر سے زوردار راؤنڈ ہاؤس کک لگا دی۔ اس کا بایاں بازو اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ میری کک اس کی بغل میں لگی۔ وہ اس طرح اچھلا جیسے فٹ بال کو کک لگائی گئی ہو۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک اور فرنٹ کک لگا دی۔ یہ کک اس کی ناف سے ذرا نیچے لگی تھی۔ وہ بلبلا اٹھا۔

اسی دوران میں وہ لڑکی پاجامہ پہن چکی تھی۔ بلاؤز الٹا سیدھا پہنتے ہوئے وہ باہر کی طرف دوڑی۔ اس لڑکی سے مجھے کوئی پرخاش نہیں تھی لیکن اس کا باہر نکلنا میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں اچھل کر اس کے راستے میں آگیا۔ وہ ڈر کر چیختی ہوئی بیڈ پر جاگری۔

باہر سے ایک بار پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ یہ رائفل کا فائر تھا اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ میں ایک لمحے کو اس طرف متوجہ ہوا تھا اور میری اس غفلت سے فانگ پھن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ یہ بریکنگ ٹیکنیک کا اسٹرائیک تھا۔ اس سے چھ انچ موٹی کنکریٹ کی سلیب توڑی جاسکتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اس کے ہاتھ کو نیچے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا تھا۔ اس کا چوپ میرے کندھے پر لگا تو ضرور لیکن ضرب زیادہ شدید ثابت نہیں ہوئی تھی۔ میں اگر نیچے نہ جھکتا تو میرے کندھے کی ہڈی ٹوٹ سکتی تھی۔ نیچے بیٹھتے ہی میں نے دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکالیں اور ایک ٹانگ آگے پھیلا کر پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ یہ ایک خطرناک سوئپ کک تھی۔ اگر میرا پیر فانگ پھن کی ٹانگ کو چھو جاتا تو وہ پشت کے بل گرتا لیکن وہ اپنی جگہ سے اچھل گیا تھا۔ میں نے اسی طرح تین بار سوئپ مار کر اسے گرانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بہت پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ ہر مرتبہ بچتا رہا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور فرنٹ کک لگانے کی کوشش کی جسے فانگ پھن نے کلائی پر روکا اور اس کے ساتھ ہی گھوم کر بیک کک لگا دی۔ ضرب میرے سینے پر لگی اور میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

فانگ پھن واقعی مارشل آرٹسٹ تھا۔ اس کے ساتھ مقابلے میں مزہ آرہا تھا اور میرے خیال میں وہ پہلا شخص تھا جو نہ صرف دلیری سے میرا مقابلہ کر رہا تھا بلکہ بہترین ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے چند کامیاب وار بھی کیے تھے لیکن اسے مزید موقع دینا میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

فانگ پھن دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس نے فلائنگ کک لگانے کے لیے چھلانگ لگائی تھی۔ میں اس کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ ہوا میں الٹی قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل بھد سے الٹے پڑے صوفے پر گرا۔

فلائنگ کک سے اس طرح بچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ہزار میں کوئی ایک مارشل آرٹسٹ ہی اپنا دفاع کرسکتا ہے۔ میں نے فلائنگ کک سے بچنے کی یہ ٹیکنیک اپنی ٹریننگ کے ابتدائی دنوں میں جنگل والے کیمپ میں ماسٹر ہانگ سو سے سیکھی تھی اور اپنے دفاع کے لیے کئی مرتبہ اسے استعمال کرچکا تھا۔

فانگ پھن صوفے سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا اور اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ بالآخر اسے بھی سنبھلنے کا موقع مل گیا لیکن اس مرتبہ میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔

باہر سے اب ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے غدر مچ گیا ہو۔ دو عورتوں کی خوف زدہ چیخوں کے علاوہ اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کسی دوسرے کمرے میں موجود چی فانگ کو میرے ساتھیوں پر قابو پانے کا موقع نہ مل جائے۔ اس طرح بازی پلٹ سکتی تھی اس لیے میں اب جلد سے جلد فانگ پھن سے معاملہ طے کرلینا چاہتا تھا۔

فانگ پھن سے لڑائی میں اس مرتبہ میں اس لڑکی کو بھول گیا تھا جو بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس دوران میں اس لڑکی کو موقع مل گیا۔ وہ بیڈ سے اٹھی اور جھپٹ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل سے فانگ پھن کا

ریوالور اٹھا کر فائر کردیا۔ اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن گولی میرے سر سے چند انچ اوپر سے گزر گئی۔ میں بڑی تیزی سے پلٹا اور ہوا میں اڑتا ہوا بیڈ پر جا گرا۔ اس لڑکی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میرا ایک ہاتھ اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑا تھا۔ جھٹکا لگتے ہی ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میرا ہاتھ دوسری مرتبہ حرکت میں آیا۔ لڑکی کے منہ پر پڑنے والا تھپڑ اس قدر زور دار تھا کہ وہ ذبح ہوتی ہوئی بکری کی طرح بلبلا اٹھی۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔

میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فانگ پھن نے چھلانگ لگا دی۔ میں اس کے نیچے دب گیا۔ اتنی دیر کی لڑائی کے دوران میں وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا اور اب وہ مارشل آرٹس کے قواعد و ضوابط اور تمام ٹیکنیکس کو بھول کر اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ لیا اور انگوٹھوں سے میرا نرخرا دبانے لگا۔

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی کلائیوں پر جما دیے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے جنون ٹپک رہا تھا۔

اس لڑکی کی ٹانگیں میرے کندھوں کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور وہ بھی اپنے آپ کو میرے نیچے سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنی ٹانگوں کو کھینچا تو مجھے بھی ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرے گلے پر فانگ پھن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹا دیے۔ اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس کے سینے سے لگا دیں اور بازوؤں کی قوت سے اسے اوپر اٹھانے کے ساتھ ساتھ میں نے دونوں پیر بھی سمیٹ کر اس کے پیٹ پر جما دیے اور اس طرح میں اسے سیدھا اوپر کی طرف اٹھاتا چلا گیا۔

میں نے فانگ پھن کو اپنے جسم سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھا لیا اور پھر پوری قوت سے اسے اچھال دیا۔ وہ ہوا میں تیرتا ہوا ٹوٹی ہوئی میز پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی خوفناک چیخ بھی کمرے میں گونج گئی تھی۔

اپنے آپ کو فانگ پھن کی گرفت سے چھڑانے اور اسے اچھالنے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا۔ اس کی چیخ سنتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔

کمرے کے وسط میں پڑی ہوئی ٹیبل کا شیشہ میرے گرنے کی وجہ سے پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ فانگ پھن پیٹ کے بل اس میز پر گرا تھا۔ اس کے بوجھ سے میز کا چوکھٹا ایک طرف سے ٹوٹ گیا اور سامنے کی طرف چوکھٹے میں پھنسا ہوا نوکدار شیشہ اس کے حلقوم میں پیوست ہوگیا اور خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ فانگ پھن بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے اس طرح تڑپنے سے شیشے کی دھار نے اس کے نرخرے کو کچھ اور بھی ادھیڑ ڈالا۔

میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ میں نے جھک کر فانگ پھن کو کندھوں سے پکڑ لیا اور پیچھے کھینچنے لگا مگر اس کا جسم میز کے ٹوٹے ہوئے چوکھٹے میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

لڑکی چیختی ہوئی دروازے کی طرف دوڑی۔ میں نے فانگ پھن کو چھوڑ دیا اور لڑکی کے پیچھے لپکا۔ دروازے کے قریب میں نے اسے پکڑ لیا لیکن وہ مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا۔

لڑکی باہر نکلتے ہی کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ میں بھی اس چیز سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا تھا۔

وہ اس گن مین کی لاش تھی جسے میں نے کاٹیج کے عقب میں کھڑکی کے قریب دیکھا تھا۔ وہ غالباً وانگ ژن کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

برآمدے کی دائیں طرف کچھ فاصلے پر دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں اس طرف لپکا۔ برآمدے کے بلب کی مدھم سی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ چی فانگ اور ایک اور آدمی وانگ ژن کی ٹھکائی کر رہے تھے۔ بری طرح پٹنے کے باوجود وانگ ژن ان کی گرفت میں نہیں آرہا تھا۔

میں دوڑتا ہوا قریب پہنچ کر فضا میں اچھلا۔ میں چی فانگ پر فلائنگ کک لگانا چاہتا تھا۔ چی فانگ نے میرے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ بھی فضا میں اچھل گیا۔ ہم دونوں نے بیک وقت فلائنگ کک لگائی تھی جس کے نتیجے میں ہم دونوں کے پیر آپس میں ٹکرا گئے اور دونوں ہی جھٹکا کھا کر ایک دوسرے سے دور جا گرے۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، چی فانگ نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا مگر وہ تاریکی میں درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگیا۔ میں اس کے قدموں کی آواز پر اس کے پیچھے دوڑتا رہا اور پھر اس کے قدموں کی آواز بھی معدوم ہوگئی۔ میں تاریکی میں کھڑا ادھر ادھر گھورتا رہا لیکن نہ ہی چی فانگ کے قدموں کی آواز سنائی دی اور نہ ہی وہ نظر آیا۔

اور پھر کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے اس طرف دوڑ لگا دی۔ میں اس مسطح جگہ پر پہنچ گیا جہاں دو کاریں کھڑی تھیں۔ ایک کار کی ... ہیڈ لائٹس روشن ہوگئیں۔ وہ بڑی تیزی سے میری طرف لپکی۔ میں اگر اچھل کر ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو کچلا جاتا۔ کار چکر کاٹتی ہوئی نشیب کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی اور بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح دوڑتی ہوئی دور ہوتی چلی گئی۔ میں اس کی عقبی سرخ بتیاں دیکھتا رہ گیا۔ قریب ہی دوسری کار کھڑی تھی لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ ڈرائیونگ نہیں جانتا تھا۔ میں گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ چی فانگ ایک بار پھر میرے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔

میں کاٹیج کی طرف آگیا جہاں وانگ ژن دوسرے شخص کی پٹائی کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے دو چار ٹھوکریں رسید کردیں اور اسے گھسیٹتے ہوئے کاٹیج کے برآمدے میں لے آئے۔

ایک کمرے میں نیم عریاں لباس میں دو جوان اور خوب صورت لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ خوف سے ان کے چہرے بالکل سفید ہو رہے تھے۔ وہ تیسری لڑکی نظر نہیں آئی جو فانگ پھن والے کمرے سے بھاگی تھی۔ میں اس کمرے سے باہر آگیا۔ وانگ ژن برآمدے میں اس شخص کو رسی سے باندھ رہا تھا۔

”وہ تیسری لڑکی کہاں گئی اور تمہارے دونوں ساتھی کہاں ہیں؟“ میں نے وانگ ژن سے پوچھا۔

”میرا ایک آدمی تو اس لڑکی کے پیچھے گیا ہے جو اس طرف بھاگی ہے۔“ اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور پھر بولا ”اور میرا دوسرا آدمی....“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے ایک کمرے میں گھس گیا۔

کمرے میں ابتری کا سماں تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں اچھی خاصی دھینگا مشتی ہوئی تھی اور دائیں طرف وانگ ژن کے اس آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی جو شہر سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی گئی تھی۔

”یہ شخص چی فانگ کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکا تھا اور....“

وانگ ژن جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ باہر سے ایک خوفناک نسوانی چیخ سنائی دی جو بتدریج سناٹے میں ڈوبتی چلی گئی۔

دو منٹ بعد وانگ ژن کا آدمی بھی واپس آگیا۔ اس نے وانگ ژن سے قبائلی زبان میں کچھ کہا اور وانگ ژن مجھے اس کا مطلب سمجھانے لگا۔

”وہ لڑکی جو یہاں سے بھاگی تھی اس طرف گہرے کھڈ میں گر گئی ہے۔ وہ چیخ اسی کی تھی۔ میرا خیال ہے وہ زندہ نہیں بچی ہوگی۔“

صورت حال بڑی سنگین تھی۔ یہاں تین لاشیں پڑی تھیں۔ ایک فانگ پھن کی دوسری ان کے گن مین کی اور تیسری وانگ ژن کے ساتھی کی۔ ایک آدمی اور دو عورتیں زندہ تھے۔ یہ طوائفیں تھیں جنہیں چی فانگ وغیرہ کا دل بہلانے کے لیے لایا گیا تھا۔ انہیں لانے والا وہی آدمی تھا جو برآمدے میں بندھا ہوا تھا۔ تیسری لڑکی جان بچانے کے لیے بھاگ گئی تھی اور تاریکی میں کسی کھڈ میں گر کر غالباً وہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

وانگ ژن نے ان دونوں لڑکیوں کو بھی باندھ کر کمرے میں ڈال دیا جبکہ اس آدمی کو برآمدے میں پڑا رہنے دیا گیا۔ وانگ ژن نے اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کر اس کار میں ڈال دی جو کاٹیج کے سامنے کھڑی تھی۔

اپنی جیپ کے قریب پہنچ کر لاش کو جیپ میں ڈال دیا گیا۔ وانگ ژن اس کار کو چلاتا ہوا بلندی پر لے گیا۔ دوسری طرف گہرا کھڈ تھا۔ اس نے کار سے چھلانگ لگا دی۔ کار چٹان کی دوسری طرف لڑھکتی چلی گئی اور پھر زوردار دھماکا سنائی دیا۔

ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ وانگ ژن نے جیپ کا رخ موڑا۔ ہیڈ لائٹس روشن کیں اور اسے تیز رفتاری سے مین روڈ کی طرف دوڑا دیا۔

○☆○

وانگ ژن مجھے مین روڈ پر چھوڑنے کے بعد اپنے ساتھی کی لاش رات ہی کو شہر سے کئی میل دور ایک چھوٹی سی قبائلی بستی کی طرف لے گیا تھا۔ تھالوب کا قبیلہ کیرن اگرچہ برمی سرحد کے قریب مائے سائے نامی قصبے اور اس کے اطراف میں آباد تھا لیکن اس قبیلے کے کئی چھوٹے چھوٹے گروہ مختلف علاقوں میں بھی پھیلے ہوئے تھے۔ چیانگ سائیں میں بھی کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں اور چی فانگ کے ہاتھوں مرنے والے کا تعلق چند گھروں پر مشتمل ایسی ہی ایک چھوٹی سی بستی سے تھا۔ وانگ ژن کی اپنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ لڑائی میں اس کی بھی خوب پٹائی ہوئی تھی لیکن وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا کہ فانگ پھن کے گروہ کے آدمی یا پولیس ہمارے کاٹیج کی طرف متوجہ ہو سکے اس لیے وہ مجھے مین روڈ پر ہی اتار کر جیپ کو سیدھا نواحی علاقے کی طرف نکال لے گیا تھا۔

حالت تو میری بھی اچھی نہیں تھی۔ فانگ پھن ہم پلہ دشمن ثابت ہوا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ اس میں طاقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ اس طاقت کو استعمال کرنا بھی جانتا تھا۔ اس سے مقابلے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا تھا اگر ٹوٹی ہوئی میز پر گرنے سے شیشہ اس کے حلق میں نہ بھی پیوست ہوتا تو میں اسے پچھاڑ دیتا۔ کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس پر تھکن اور جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی اور جب لڑائی میں کسی پر تھکن اور جھنجلاہٹ سوار ہو جائے تو وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہیں رکھ سکتا۔

میرا اصل ٹارگٹ تو چی فانگ تھا لیکن اتفاق سے وہاں فانگ پھن بھی موجود تھا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہاتھ آجاتا تو میں اس سے بہت سی معلومات حاصل کر سکتا تھا لیکن چی فانگ حسب عادت جان بچا کر فرار ہوگیا تھا اور فانگ پھن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ میں اس حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف تھا کہ فانگ پھن کی موت کا انکشاف ہوتے ہی یہاں ایک طوفان

اٹھ کھڑا ہوگا۔ فانگ پھن گولڈن ٹرائی اینگل کے بے تاج بادشاہ جنرل کھوراٹ کا آدمی تھا۔ ان کا ایک اور آدمی شانگ پہلے ہی میرے ہاتھوں مارا جاچکا تھا اور اب میرے ہی ہاتھوں فانگ پھن کی موت پر وہ لوگ خاموش نہیں بیٹھیں گے اور جب بازی بہت بڑی ہو تو کسی کے خاموش رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

لڑائی کے دوران میں شیشے کے ٹاپ والی میز پر گرنے سے میرے بائیں بازو پر کہنی کے قریب سے کھال کٹ گئی تھی۔ اس وقت گرم جوشی میں تو کچھ زیادہ احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب تکلیف بڑھ گئی تھی۔ زخم اگرچہ بہت معمولی سا تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ چھوٹے زخم زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔ کندھے کی ہڈی میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

میری یہ حالت دیکھ کر لوما فوراً ہی میڈیکل کٹ نکال لایا تھا۔ جانگی نے میری شرٹ اتار دی۔ پہلے گرم پانی سے کہنی کا زخم صاف کرکے ڈریسنگ کردی اور پھر پیالے سے رنگ کی ایک کریم سے میرے کندھے پر مالش کرنے لگی۔ لوما نے بتایا تھا کہ یہ کریم جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی ہے اور اندرونی چوٹوں کے لیے اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

جانگی میرے کندھے پر مالش کررہی تھی اور مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ تھائی نے بھی کئی مرتبہ اس طرح میری مالش کی تھی لیکن میں نے کبھی ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی لیکن جانگی کے گداز ہاتھوں کا لمس میرے پورے بدن میں سنسنی سی پھیلا رہا تھا۔ دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ جانگی نے بھی شاید میری اس کیفیت کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی پھیلنے لگی۔ کندھے پر مالش کرتے ہوئے وہ میرے اوپر جھکی جارہی تھی پھر مجھے اپنی گردن پر دائیں طرف انگارا سا چھوتا ہوا محسوس ہوا۔

جانگی کے سلگتے ہوئے ہونٹ میری گردن کو چھو رہے تھے۔ میں ایک دم جیسے ہوش میں آگیا اور ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔ جانگی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔

"اگر میرے کندھے کی مالش ہوچکی ہو تو میں شرٹ پہن لوں؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"پہن لو۔" یہ کہتے ہوئے جانگی کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔

میں نے شرٹ پہنی اور کندھے کو آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ لوما نے شاید صورت حال کا کسی حد تک اندازہ لگالیا تھا اس لیے وہ سب مشین گن سنبھالے ایک کرسی پر چوکس بیٹھا ہوا تھا۔ کسی گڑبڑ کا شبہ مجھے بھی تھا۔ وانگ ڈن، تھالوب کا آدمی تھا اور تھالوب اس علاقے کی معروف شخصیت تھا۔ لوگ نہ صرف ایسی شخصیات کو اچھی طرح جانتے ہیں بلکہ ان کے خاص ملازمین کو بھی جانتے اور پہچانتے ہیں۔ فانگ پھن بھی وانگ ڈن کو جانتا ہوگا لیکن فانگ پھن ختم ہو چکا تھا۔ فانگ یہ نہیں جانتا تھا۔ محافظ بھی مارا گیا تھا لیکن دو طوائفیں اور ایک آدمی کو ہم نے باندھ کر وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے وانگ ڈن ہی نے بتایا تھا کہ وہ آدمی ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک ہے جو عیاش لوگوں کو لڑکیوں کی سپلائی کا مکروہ دھندا بھی کرتا ہے۔ وہ شخص یقیناً وانگ ڈن کو پہچانتا ہوگا اور ہوسکتا ہے ان لڑکیوں میں سے بھی کوئی اسے جانتی ہو۔ ایسی صورت میں یہ راز فاش ہوسکتا تھا کہ حملہ آوروں میں وانگ ڈن بھی تھا اور اس طرح یہ کاٹیج پولیس یا فانگ پھن کے آدمیوں کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا لیکن مجھے یہ اطمینان تھا کہ کم از کم رات میں کچھ نہیں ہوگا۔ جو کچھ بھی ہونا ہے صبح ہی ہوگا لیکن احتیاط کا دامن بہرحال ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔ دن چڑھنے سے ذرا پہلے میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔ مجھے نہ تو جانگی نے جگایا اور نہ ہی لوما نے۔ میں بے خبر سوتا رہا اور پھر کسی قسم کی غراہٹ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔

وہ دراصل وانگ ڈن کی جیپ کے انجن کی آواز تھی جو ابھی ابھی کاٹیج کے سامنے آکر رکی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ دن کے گیارہ بجنے والے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وانگ ڈن اندر داخل ہوا۔ میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ بائیں بازو کو حرکت دیتے ہوئے کندھے میں معمولی سی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں ہال میں واپس آیا تو وانگ ڈن کرسی پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ لوما نے چائے کا ایک کپ میرے سامنے بھی رکھ دیا۔ جانگی اس وقت کمرے میں تھی۔

وانگ ڈن بتا رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش لے کر رات کے آخری پہر قبائلی بستی میں پہنچ گیا تھا۔ صبح سویرے اس کی تدفین بھی ہوگئی۔ اس کے بعد بھی اسے کچھ دیر وہاں رکنا پڑا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں قبائلی شخص کی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور اس کے بعد وانگ ڈن اصل موضوع پر آگیا۔

"میں صبح نو بجے شہر پہنچ گیا تھا اور اس وقت تمہارے لیے دو اہم خبریں ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا "پہلی خبر تو یہ ہے کہ فانگ پھن کے قتل کی خبر نے پورے شہر میں خوف و ہراس پھیلا دیا ہے۔ کاٹیج سے پولیس کو اس کے گن مین اور اس آدمی کی لاش بھی ملی ہے جسے ہم نے باندھ کر برآمدے میں ڈال دیا تھا۔ کاٹیج سے کچھ دور ایک گہرے کھڈ سے اس لڑکی کی لاش بھی مل گئی جو جان بچانے کے لیے بھاگی تھی لیکن وہ دو لڑکیاں غائب ہیں جنہیں باندھ کر کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔"

میرے لیے یہ اطلاع واقعی حیران کن تھی۔ وہ لڑکیاں کہاں غائب ہوگئیں اور اس آدمی کو کس نے ہلاک کیا تھا۔

"جس آدمی کو ہم نے باندھ کر ڈالا تھا وہ خوف اور سردی سے ٹھٹھر کر مرا ہے۔ اسے اچھی خاصی مار بھی لگائی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے کوئی اندرونی چوٹ بھی اس کی موت کا باعث بنی ہو۔ اس کی لاش تو ویسے ہی بندھی ہوئی ملی ہے لیکن مجھے حیرت ہے، وہ دونوں لڑکیاں کہاں غائب ہوگئیں۔"

"ہوسکتا ہے کسی لڑکی کو باندھنے میں رسی کی کوئی گرہ ڈھیلی رہ گئی ہو اور وہ اپنی بندشیں کھولنے میں کامیاب ہوگئی ہو اور اس نے دوسری لڑکی کو بھی کھول دیا ہو۔" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" وانگ ڈن بولا "لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ وہ غائب کہاں ہوگئیں۔ مجھے شبہ ہے کہ یا تو صبح سویرے وہاں کوئی آیا تھا جو ان عورتوں کو چھڑا کر لے گیا یا پھر تمہاری بات درست ہوسکتی ہے کہ انہوں نے کسی طرح اپنی بندشیں کھول لی تھیں اور جان کے خوف سے کہیں روپوش ہوگئی ہیں۔ پولیس کو اس کاٹیج میں خواتین کے لباس کے کچھ حصے بھی ملے ہیں جس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ رات کو یہاں خواتین کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ ان میں یا تو آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا یا باہر سے کوئی اس کاٹیج پر حملہ آور ہوا۔ بہرحال، پولیس بھی ان عورتوں کی تلاش میں ہے۔ پولیس نے اس کاٹیج اور اس کے آس پاس کے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "فانگ پھن گولڈن ٹرائی اینگل کے حوالے سے اس علاقے میں بہت بڑا نام ہے۔ علاقے کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وہ کون تھا۔ اس کے قتل کی اطلاع صبح ہی شہر پہنچ گئی تھی اور پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ شہر کی بیشتر دکانیں بند ہیں کیونکہ لوگ جانتے ہیں کہ سین فونگ اور جنرل کھوراٹ اس قتل پر خاموش نہیں بیٹھیں گے اور ہنگامہ ضرور ہوگا۔"

"اور دوسری خبر؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چی فانگ گزشتہ رات جس کار میں فرار ہوا تھا وہ شمال میں گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے والی سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک کھڈ میں پڑی ہوئی ملی ہے۔" وانگ ڈن نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "گزشتہ رات میں اپنے دوسرے آدمی کو شہر میں ہی چھوڑ گیا تھا اور اسے ہدایت کردی تھی کہ دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے کر چی فانگ کو تلاش کریں۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف فرار ہونے کی کوشش کرے گا اس لیے میں نے اپنے آدمیوں کو اس طرف زیادہ توجہ دینے کی ہدایت کی تھی۔"

"وہ گاڑی کسی اور کی بھی ہوسکتی ہے۔" میں نے پوچھا "یہ کیسے یقین کرلیا گیا کہ وہ چی فانگ ہی کی گاڑی تھی؟"

"وہ گاڑی دراصل فانگ پھن کی ہے اور سب ہی لوگ اسے پہچانتے ہیں۔" وانگ ڈن نے کہا "اس گاڑی کا کھڈ میں گرنا کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ کار اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہوچکی ہے لیکن کار کے اندر یا اس کے آس پاس کہیں بھی خون کے دھبے یا ایسے نشان نہیں ملے جس سے ثابت ہو کہ کار میں کوئی موجود تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا ہے کہ ہمیں یا پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے کار کو کھڈ میں دھکیل دیا گیا تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ چی فانگ اس کار کو کھڈ میں دھکیل کر گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف فرار ہوچکا ہے۔ ویسے یہ بدنام زمانہ سنہری تکون یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف نو کلو میٹر!" وانگ ڈن نے جواب دیا "یہاں سے تقریباً چار کلو میٹر آگے ایک دوراہا ہے جہاں سے ایک راستہ گولڈن ٹرائی اینگل اور دوسرا مائے سائے کی طرف جاتا ہے۔ اس دوراہے سے مائے سائے بھی تقریباً اتنا ہی ہے جتنا گولڈن ٹرائی اینگل۔ ویسے اوپر جاکر مائے سائے کی سرحد بھی سنہری تکون سے ملتی ہے اور اس طرف کا سارا علاقہ سردار تھالوب کی راجدھانی میں شامل ہے۔ اس کے قبیلے کے لوگ چھوٹی چھوٹی بستیوں کی صورت میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔"

"تو تمہارے خیال میں چی فانگ کسی جگہ سے بھی گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہوسکتا ہے۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "یہ بڑا خطرناک علاقہ ہے۔ جنرل کھوراٹ کے آدمیوں نے جگہ جگہ خفیہ ٹھکانے بنا رکھے ہیں جہاں سے وہ ان راستوں کی نگرانی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح اکیلے سنہری تکون میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والوں کو گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ ان کے اپنے آدمیوں کی آمدورفت کے لیے چند خفیہ راستے مخصوص ہیں اور ان راستوں کی بھی نگرانی ہوتی ہے۔ کوئی اجنبی ان خفیہ راستوں کو تلاش نہیں کرسکتا۔"

"ایسی صورت حال میں ایک شبہ ذہن میں ابھرتا ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "ہوسکتا ہے چیانگ سائیں سے آگے ان کا کوئی خفیہ ٹھکانا بھی ہو جس کے بارے میں فانگ پھن نے چی فانگ کو بتایا ہو اور چی فانگ اسی طرف گیا ہو۔"

"مجھے بھی یہی شبہ ہے۔" وانگ ڈن نے کہا "بہرحال، میرے آدمی تلاش میں ہیں۔ جیسے ہی پتا چلا وہ فوراً اطلاع دیں گے۔"

"تمہارے خیال میں فانگ پھن کے قتل کی خبر گولڈن ٹرائی اینگل پہنچ گئی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً۔" وانگ ڈن نے کہا "لیکن ابھی تک اس طرف سے کسی ردعمل کا اشارہ نہیں ملا۔ تاہم یہاں کی پولیس بڑی سرگرم نظر آرہی ہے۔"

"تم پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا؟" میں نے پوچھا "تھالوب کے ساتھ ہونے کی وجہ سے تم ایسے آدمی ہو جسے اس مختصر سے شہر کا ہر شخص جانتا ہوگا۔ وہ دو عورتیں جو کسی طرح وہاں سے فرار ہو چکی ہیں تمہیں شناخت کر سکتی ہیں۔"

"وہ ایک ہی رات میں اتنا خون خرابا دیکھ چکی ہیں کہ اگر مجھے پہچانتی بھی ہیں تو اپنی جان کے خوف سے زبان نہیں کھولیں گی۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہیں آئیں گی۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں اب تک یہاں سے بہت دور کسی قبائلی بستی میں پناہ لے چکی ہوں۔ ان پہاڑوں میں قبائلیوں کی چھوٹی چھوٹی لاتعداد بستیاں ہیں اور ان بستیوں میں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں ہوگا اور پھر کسی قبائلی بستی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے۔" وانگ ڈن اٹھ کر کھڑا ہو گیا "میں اب چلتا ہوں۔ کوئی اہم بات معلوم ہوئی تو فون کردوں گا۔"

وانگ ڈن چلا گیا۔

اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میرے ہاتھوں فانگ پھن کے قتل کے بعد صورت حال بہت زیادہ سنگین ہو سکتی تھی۔ فانگ پھن اگرچہ نچلی سطح کا آدمی تھا لیکن وہ اپنے گروہ کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ شہنشاہ کے خلاف سازش کے حوالے سے جو اعلیٰ سطح کی خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی اس کے لیے بھی یہ شخص نہایت اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ شانگ کے ذریعے دارا وغیرہ سے رابطہ کرنے والا بھی یہی شخص تھا اور یہی ان لوگوں کو اس خفیہ مقام پر لے جانے والا تھا جہاں میٹنگ ہونے والی تھی لیکن وہ میرے ہاتھوں بلکہ ٹوٹی ہوئی میز کے خوف ناک جبڑوں میں پھنس کر مارا گیا تھا۔ اس کی موت سے ان کے منصوبے میں گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ اس سے پہلے شانگ بھی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس طرح میں ان کے لیے موسٹ وانٹیڈ آدمی بن گیا تھا۔ اب ان کی تمام تر توجہ میری طرف ہوگی اور میری تلاش میں وہ زمین کو تہ و بالا کر دیں گے۔

وانگ ڈن کے جانے کے بعد جانگی بھی اپنے کمرے سے آگئی تھی اور ہم دونوں دیر تک اس صورت حال پر بحث کرتے رہے۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد جانگی نے ایک بار پھر میرے کندھے پر اس کریم سے مالش کر دی۔ وہ کریم واقعی اکسیر تھی۔ پہلی مرتبہ کے استعمال کے بعد ہی میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔

وانگ ڈن واپس آیا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ اس نے ہمارے ساتھ ہی کھانا کھایا اور اس دوران میں دن بھر کی رپورٹ بھی دیتا رہا۔

"فانگ پھن کے قتل پر ابھی گولڈن ٹرائی اینگل سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا لیکن یہاں پولیس نے کئی بے گناہوں کو گرفتار کر لیا ہے اور ان پر تشدد کر کے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔" وہ بتا رہا تھا "ان دو لڑکیوں کو بھی میرے آدمیوں نے شہر سے تقریباً آٹھ کلو میٹر دور لاہو قبیلے کی ایک چھوٹی سی بستی میں تلاش کر لیا ہے۔ لاہو ہمارا حلیف قبیلہ ہے۔ ان سے اگرچہ کسی قسم کا خطرہ نہیں لیکن ان دونوں لڑکیوں کو اپنے قبیلے کی ایک بستی کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے جہاں وہ زیادہ محفوظ رہیں گی۔" وہ چند لمحوں خاموش ہوا پھر بولا "جب میرے آدمی اس بستی میں پہنچے تو دونوں لڑکیاں ایک جھونپڑے میں گم صم سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ انہوں نے بستی والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئی ہیں اور ان پر کیا بیتی تھی؟ ان کی بازیابی کی اطلاع ملتے ہی میں نے انہیں اپنے قبیلے کی ایک بستی کی طرف بھجوا دیا۔ اب وہ کسی کو کچھ نہیں بتا سکیں گی کہ گزشتہ رات وہ کہاں تھیں اور کیا ہوا تھا۔"

"اور چی فانگ کا کچھ پتا چلا؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"یہی ایک اہم خبر ہے جو میں تمہیں سب سے آخر میں بتانا چاہتا تھا۔" وانگ ڈن نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے آدمیوں نے اس کا بھی سراغ لگا لیا ہے۔ وہ یہاں سے تقریباً چھ کلو میٹر دور گھنے جنگل میں ایک کاٹیج میں چھپا ہوا ہے۔ یہ کاٹیج بھی سینڈیکیٹ ہی کا ہے اور ظاہر ہے فانگ پھن ہی نے اس کے بارے میں چی فانگ کو بتایا ہوگا یا ممکن ہے وہ کسی وقت اسے وہاں لے بھی گیا ہو۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ چی فانگ نے ہمیں یا پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے مائے سائے کی طرف جانے والے راستے پر گاڑی کھڈ میں دھکیل دی تھی تاکہ ہم اسے مائے سائے کی طرف تلاش کرتے رہیں جبکہ وہ پہاڑیوں اور جنگل میں طویل چکر کاٹتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔"

"تو پھر کیا پروگرام ہے!" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس وقت جانا مناسب نہیں۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "گاڑی سڑک پر چھوڑنے کے بعد کم از کم دو کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔ راستہ بہت خطرناک ہے۔ تاریکی میں نہ صرف بھٹکنے کا اندیشہ ہے بلکہ کوئی حادثہ بھی پیش آسکتا ہے اس لیے ہم صبح سویرے یہاں سے نکلیں گے۔"

"چی فانگ کے علاوہ وہاں اور کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک!" وانگ ڈن نے جواب دیا "وہ اس ہٹ کا نگران ہے اور اکیلا ہی وہاں رہتا ہے۔"

کھانے کے بعد وانگ ڈن کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا پھر سونے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ وہ جاتے ہوئے لوما کو کچھ ہدایات دے گیا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب لوما بھی چلا گیا۔ جانگی نے دروازہ اندر سے لاک کر دیا اور کھڑکیوں کے سامنے پردے برابر کرنے لگی۔

میں نے ٹیلی فون اپنے قریب رکھ لیا اور ریسیور اٹھا کر چیانگ رائے میں رنگولی کا نمبر ملانے لگا۔ کال فوراً ہی ریسیو کرلی گئی۔ وہ تھائی کی آواز تھی۔ شاید وہ میرے فون کی منتظر ہی بیٹھی تھی۔ میری آواز سنتے ہی اس نے سب سے پہلے میری اور جانگی کی خیریت دریافت کی پھر بولی۔

"سنا ہے وہاں بہت ہنگامہ ہو رہا ہے۔"

"ابھی تو نہیں لیکن آج کل میں زبردست قسم کا ہنگامہ ہونے ہی والا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن یہاں تو یہ خبر گردش کر رہی ہے کہ فانگ پھن تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔" تھائی نے کہا۔

"ہاں۔ یہ درست ہے۔ گزشتہ رات فانگ پھن میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو گیا اور چی فانگ ایک بار پھر جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس کا سراغ لگا لیا گیا ہے۔ شاید کل اس کا بھی بندوبست ہو جائے۔" میں نے جواب دیا اور گزشتہ رات کے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں پوچھا "وہاں کی کیا خبر ہے۔ فانگ پھن کے قتل کی خبر سن کر دارا وغیرہ کا کیا ردعمل ہے۔"

"دارا بری طرح بھڑکا ہوا ہے۔" تھائی نے جواب دیا "رنگولی نے دوپہر کو بتایا تھا کہ یہ خبر ملتے ہی دارا بھڑک اٹھا تھا اور اس نے قسم کھائی ہے کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ مجھے تو زیادہ تفصیل معلوم نہیں لیکن رنگولی اس سلسلے میں بہت کام کر رہی ہے۔"

"میری بات کراؤ رنگولی سے۔" میں نے کہا۔

"وہ اس وقت گھر پر نہیں ہے۔ ایک بجے کے لگ بھگ آئے گی تو میں بات کرا دوں گی۔" تھائی نے جواب دیا پھر بولی "میں تمہیں بہت مس کر رہی ہوں۔"

میں نے تھائی کی اس بات پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے دوسرا ہی دن تھا اور وہ اداس ہو گئی تھی۔ ویسے یہ حقیقت تھی کہ میں بھی بڑی شدت سے اس کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ جب سے ہم ملے تھے، غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ ہم ایک دوسرے سے اس طرح جدا ہوئے تھے۔

جانگی نے بھی تھائی اور پرساد سے بات کی اور فون بند کر دیا۔

میں فون اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا اور اس کا پلگ اس کمرے کے ساکٹ میں لگا دیا۔ گزشتہ رات کی طرح آج بھی میں کوچ پر لیٹ گیا اور بیڈ جانگی کے لیے چھوڑ دیا۔ کوچ اتنا کشادہ تھا کہ اس پر بھی دو آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔ جانگی جب کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ہاتھ میں کریم کی بوتل تھی۔

"لاؤ تمہارے کندھے پر ایک بار اور مالش کر دوں۔ اس کریم سے تمہیں بہت فائدہ ہوا ہے۔" وہ میرے قریب کوچ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"فائدہ تو ہوا ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے شرٹ اتار دی۔

جانگی میرے کندھے پر کریم کی مالش کرنے لگی۔ اس کے ہاتھ کے لمس میں عجیب سا گداز تھا۔ مجھ پر ایک بار پھر وہی مسحور کن سی کیفیت طاری ہونے لگی لیکن اس وقت میں فوراً ہی سنبھل گیا۔ جانگی کندھے کے بجائے میرے بازو کے مسل کو سہلا رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا اور شرٹ پہن لی۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے، تمہیں نیند آرہی ہے۔ سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی اور ہاتھ دھو کر واپس آگئی۔ بیڈ پر لیٹنے کے بجائے وہ میرے قریب ہی کوچ پر بیٹھ گئی۔

جانگی طویل عرصے سے ہمارے ساتھ تھی۔ میں نے آج تک اس میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی تھی کہ اس کے کردار پر انگلی اٹھائی جا سکے لیکن نجانے کیا بات تھی کہ وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی اور میں ہر موقع پر اس سے بچنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

مجھے رنگولی کی کال کا انتظار تھا۔ جانگی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے کچھ پرانے واقعات سناتی رہی۔

تھائی نے کہا تھا کہ رنگولی ڈیڑھ بجے کے لگ بھگ گھر واپس آئے گی۔ میں نے دو بجے تک انتظار کر کے خود فون کیا۔ رنگولی اس وقت تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ شاید کسی کلب میں اس کا پروگرام ہو اور وہ ابھی تک گھر نہ پہنچی ہو۔

جانگی کوچ پر آڑی ترچھی لیٹی اونگھنے لگی تھی۔ میں آرام سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گیا اور کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ فون کی گھنٹی کی آواز سے کھلی تھی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ میں شاید غفلت کی نیند سو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس دوران میں رنگولی کا فون آیا ہو اور میری آنکھ نہ کھلی ہو۔ گھنٹی کی آواز سن کر جانگی بھی جاگ گئی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ میری سماعت سے ٹکرانے والی آواز تھائی کی تھی۔

"رنگولی ابھی تک گھر واپس نہیں آئی وجدان۔" اس نے کہا "میری پوری رات جاگتے ہوئے پریشانی میں گزری ہے۔"

اس صورت حال پر میں بھی چونک گیا لیکن تھائی کو تسلی دیتے ہوئے بولا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہو سکتا ہے کلب میں ڈانس کے بعد کوئی اور پروگرام بن گیا ہو۔"

"ایسی صورت میں وہ فون پر اطلاع دے سکتی تھی لیکن۔۔۔"

"ہو سکتا ہے اسے فون کرنے کا بھی موقع نہ ملا ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم جانتی ہو ہمارا واسطہ دارا جیسے خطرناک لوگوں سے ہے۔ ہو سکتا ہے معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ رات دارا کے پاس رہ گئی ہو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے تھائی کو تسلی دی اور فون بند کر دیا۔

رنگولی کے لیے میں خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے دارا

پر اس کا راز کھل گیا ہو اور دارا نے اس سے ہمارے بارے میں پوچھنے کی کوشش میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو یا ممکن ہے وہ رات کو واقعی دارا کے ساتھ ہو اور اسے تھائی وغیرہ کو فون کرنے کا موقع نہ مل سکا ہو.... اور بھی کئی باتیں ہو سکتی تھیں۔

جانگی بھی رنگولی کے بارے میں سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ ہم دونوں اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے کہ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

وہ لوما تھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

"تم تیار ہو جاؤ ماسٹر۔ میں ناشتا بنا دیتا ہوں۔ وانگ ڈن تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ناشتا کرتے ہی نکل جانا ہے۔" لوما نے کہا اور کچن کی طرف چلا گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو جانگی بھی میرے قریب ہی کھڑی تھی۔

"میں بھی چلوں گی تم لوگوں کے ساتھ۔" جانگی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں گھس گئی۔

اس وقت سات بج رہے تھے۔ جانگی آدھے گھنٹے بعد تیار ہو کر باہر آئی تھی۔ اس نے اس وقت بھی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ اسی وقت وانگ ڈن بھی برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہوا اور بڑی گہری نظروں سے جانگی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں انہیں چھوڑ کر کمرے میں گھس گیا۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے گھر سے نکلے تھے۔ وانگ ڈن نے جانگی کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنا پستول جانگی کو دے دیا جسے اس نے کمر پر پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا۔ میرے پاس اپنا خنجر موجود تھا جو چری فیتے سے پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ وانگ ڈن نے چینی ساختہ آٹومیٹک رائفل بھی جیپ میں رکھ لی تھی اور فانگ پھن کا وہ ریوالور بھی رکھ لیا تھا جو گزشتہ رات ہم نے اس کاٹیج سے اٹھا لیا تھا۔

شمال کی طرف جانے والی مین روڈ پر تقریباً چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وانگ ڈن نے جیپ سڑک سے اتار کر ایک چٹان کے پیچھے درختوں کے نیچے روک کر انجن بند کر دیا اور ہم نیچے اتر آئے۔

یہی سڑک آگے سیدھی گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف چلی گئی تھی۔ بدنام زمانہ سنہری تکون دیکھنے کے لیے غیر ملکی سیاحوں کی گاڑیاں بھی اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے دیکھی جا سکتی تھیں۔

وانگ ڈن نے رائفل کندھے پر لٹکالی اور ریوالور مجھے دے دیا۔ میں نے بھی ریوالور جانگی کی طرح کمر پر پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا اور ہم سڑک سے اتر کر پہاڑیوں کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگے۔

تنگ سی پگڈنڈی گھنی جھاڑیوں سے گھری ہوئی تھی۔ قد آدم پودوں میں راستہ بنانا دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ مزید دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ وانگ ڈن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ رات کی تاریکی میں تو ایسے راستے پر سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

جنگل اس طرف گھنا اور گنجان تھا کہ سورج کی کرنیں زمین تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے جانگی کو کئی مرتبہ ٹھوکر لگی تھی اور اب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔ وانگ ڈن ہم سے آگے تھا۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ ان پہاڑوں میں ایسے ایسے راستے ہیں کہ سرحد پار غیر قانونی آمد و رفت کو روکنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔

"اس کاٹیج تک پہنچنے کا ایک آسان راستہ بھی ہے جس پر کار بھی چل سکتی ہے۔" وانگ ڈن بتا رہا تھا "لیکن اس طرف سے جانا خطرناک ہوتا۔ ہم کسی کی بھی نظروں میں آ سکتے تھے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ کاٹیج سے روانگی سے پہلے آٹھ بجے کے قریب میں نے ایک بار پھر تھائی کو فون کیا تھا۔ رنگولی اس وقت تک بھی گھر نہیں پہنچی تھی اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی اطلاع ملی تھی۔ میں نے وانگ ڈن سے سردار تھالوب کا چیانگ رائے کا فون نمبر پوچھ کر تھائی کو بتا دیا تھا کہ وہ میرے حوالے سے اس سے بات کرے۔ تھالوب ان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

ہم تقریباً دو گھنٹوں تک اس گنجان پہاڑی جنگل میں چلتے رہے۔ میں نے کئی مرتبہ جانگی کی طرف دیکھا تھا اور وہ ہر مرتبہ مسکرا کر یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ تھکی بالکل نہیں حالانکہ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

بالآخر ہم ایک اونچی جگہ پر رک گئے۔ وہاں سے نشیب میں ایک خوب صورت کاٹیج کا ایک حصہ نظر آ رہا تھا جبکہ اس کا بیشتر حصہ گھنے درختوں میں چھپا ہوا تھا۔

اب ہم بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم تینوں نے اپنا اپنا اسلحہ ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ گنجان اور قد آدم پودوں کی وجہ سے ہم کاٹیج میں موجود کسی شخص کی نظروں میں تو نہیں آ سکتے تھے لیکن چلنے سے پودوں کی سرسراہٹ ہمارا راز کھول سکتی تھی اس لیے ہم بہت محتاط ہو کر چل رہے تھے۔

کاٹیج کے تقریباً بیس گز قریب پہنچ کر ہم ایک بار پھر رک گئے۔ میں محتاط نظروں سے کاٹیج کی طرف دیکھنے لگا۔ کاٹیج کے سامنے کا رخ ہماری طرف تھا۔ برآمدے میں دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر چند ہی منٹ بعد میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

چی فانگ ایک اور آدمی کے ساتھ اندر سے نکل کر برآمدے میں آ گیا۔ وہ آدمی غالباً اس کاٹیج کا نگران تھا۔ چی فانگ کے اشارے پر اس نے دونوں کرسیاں اٹھا کر کھلی جگہ گھاس پر رکھ دیں اور وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ چی فانگ نے دوسرے آدمی کی کسی بات پر بڑا زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

وانگ ڈن نے میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ ہم دونوں چند قدم بہت محتاط انداز میں چلتے رہے پھر پودوں سے نکل کر دوڑتے ہوئے ان دونوں کے سروں پر پہنچ گئے۔ چی فانگ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا لیکن میں نے اسے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دونوں ہمارے اسلحے کی زد پر تھے۔

"اب تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں چی فانگ!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کا رخ اس کے سینے کی طرف تھا "میں نے کہا تھا ناکہ دنیا کے آخری سرے تک تمہارا پیچھا کروں گا۔ آج تم قابو آ ہی گئے لیکن میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ تم سے تو بڑا لمبا چوڑا حساب کرنا ہے۔ میں تمہیں سسکا سسکا کر ماروں گا۔ تمہارے بعد تم اور دارا کی باری آئے گی۔"

"اپنے ہتھیار پھینک دو وجدان!" یہ گونجتی ہوئی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ دارا کی آواز کو میں کس طرح بھول سکتا تھا۔ میں تیزی سے آواز کی سمت گھوم گیا۔ دارا نے جانگی کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال جانگی کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ جانگی کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار تھے۔ ہم جانگی کو پودوں میں چھوڑ کر آئے تھے تاکہ وہ کسی ایمرجنسی میں ہمیں تحفظ فراہم کر سکے لیکن وہ خود ہی شکار ہو گئی تھی۔ یہاں دارا کی موجودگی بھی میرے لیے شدید حیرت کا باعث بنی تھی۔

"ریوالور پھینک دو اور اپنے اس آدمی سے بھی کہو کہ رائفل پھینک دے۔" دارا کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی "اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر کی تو اس لیڈی ڈاکٹر کا بھیجا تو اڑا ہی دوں گا۔ تم دونوں بھی چاروں طرف سے گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔ یقین نہیں آتا تو اپنے اطراف میں دیکھ لو۔"

اور پھر میں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ ایک طرف کم تھا جو اونچے پودوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ دوسری طرف ایک اور آدمی سامنے آ گیا تھا۔ وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور جو ہستی کاٹیج کے اندر سے نکل کر برآمدے میں آئی تھی اسے دیکھ کر تو میرا دماغ گھوم گیا تھا۔

وہ رنگولی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ اور ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفل تھی جس کا رخ میری طرف تھا۔

میں نے وانگ ڈن کو اشارہ کیا۔ اس نے رائفل نیچے پھینک دی۔ میں نے بھی ریوالور نیچے پھینک دیا اور ٹھیک اسی وقت چی فانگ نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر میری کنپٹی پر گھونسا مار دیا۔ ضرب اس قدر شدید تھی کہ میرا دماغ جھنجنا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔

میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گرنے سے بچا سکا تھا لیکن اب ہم مکمل طور پر اس دشمن کے رحم و کرم پر تھے جو میرے خون کا پیاسا تھا اور اس سے رحم کی توقع بالکل نہیں کی جا سکتی تھی۔

موت..... بھیانک موت مجھے اپنے چاروں طرف ناچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ موت کے ہرکارے ہی تھے جو ہمیں اسلحے کی زد میں لیے ہوئے تھے۔ ان کی انگلیوں کی معمولی سی حرکت ہماری زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی تھی۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کے بال اب بھی دارا کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے اور پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔

وانگ ڈن میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف بالکل نہیں تھا۔ اس کے برعکس آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ غالباً کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن ہم ایسی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہماری کوئی معمولی سی حرکت ہمارے جسموں کو چھلنی کر سکتی تھی۔

میرے اور دارا کے بیچ بلی چوہے کا یہ کھیل عرصے سے جاری

باخبری

لاشعور میں دبے ہوئے خوف
احساسات اور محرکات کو بے نقاب
کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
kitabiat1970@yahoo.com

تھا۔ کبھی وہ جال میں پھنستا اور کبھی میں اور یہ عجیب بات تھی کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی ابھی تک مکمل طور پر اپنے حریف کی گرفت میں نہیں آیا تھا لیکن اس وقت صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ ہم مکمل طور پر ان کے نرغے میں تھے اور فرار یا بچاؤ کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس کے باوجود میں مایوس نہیں تھا۔

مجھے سب سے زیادہ دھچکا رنگولی نے پہنچایا تھا۔ اسے رائفل تانے دیکھ کر میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ اس پر بھروسا کرکے میں نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ کس مہارت اور چالاکی سے اس نے میری ہمدردیاں حاصل کی تھیں۔ ہم میں سے کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی لمبا کھیل، کھیل رہی ہے۔

وہ پیشہ ور رقاصہ تھی۔ طوائف .... شہرت اور دولت اس کی زندگی کا اوّلین مقصد تھا۔ اس نے ٹائیگر کے ساتھ رہ کر پُرتعیش زندگی گزاری تھی پھر ٹائیگر سے اس کی ان بن ہوگئی اور وہ دردر کی ٹھوکریں کھانے لگی۔ ٹائیگر کی موت کے بعد اس نے پیڈرو کو شیشے میں اتارنے کی کوشش کی تھی مگر پیڈرو نے بھی اسے دھتکار دیا تھا اور وہ دربدر ہوتی ہوئی چیانگ رائے پہنچ گئی تھی جہاں اسے کلبوں میں کام مل گیا تھا اور اسی دوران میں اس کی ملاقات تھالوب سے ہوگئی۔ تھالوب ایک شریف آدمی تھا۔ رنگولی اسے سیڑھی بنا کر اوپر جانا چاہتی تھی لیکن اس کے ذریعے مقصد حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار تھا۔ تھالوب اسے اپنی سفارش سے بڑے نائٹ کلبوں میں پروگرام دلوا سکتا تھا لیکن جو عیش اس نے ٹائیگر کے ساتھ رہ کر کیے تھے یا پیڈرو کے ساتھ ہوسکتے تھے وہ تھالوب کے ساتھ نہیں ہوسکتے تھے اور پھر اس دوران میں وہ ہم سے ٹکرا گئی۔

رنگولی اچھی طرح جانتی تھی کہ میں پیڈرو اور دارا وغیرہ کے لیے سب سے زیادہ مطلوب ہوں۔ وہ ایک بار پھر پیڈرو کے گینگ میں آنا چاہتی تھی تاکہ پہلے کی طرح عیش و عشرت کی زندگی گزار سکے۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ مجھے پیڈرو یا دارا کے حوالے کرکے وہ ان کا اعتماد حاصل کرسکتی تھی اور اس کے سارے پچھلے گناہ معاف ہوسکتے تھے۔

اس نے بڑی خوبصورتی اور مہارت سے ہمارا اعتماد حاصل کیا۔ دوسری طرف اس نے دارا سے ملاقات کرکے ہمارے بارے میں بتا دیا اور ہمیں پھانسنے کے لیے جال تیار کیا جانے لگا۔ میں واقعی بے وقوف بن گیا تھا اور بڑی آسانی سے ان کے بچھائے ہوئے اس جال میں پھنس گیا تھا۔

گزشتہ رات میں نے بار بار ٹیلی فون پر چیانگ رائے میں تھائی وغیرہ سے رابطہ کیا تھا۔ آخری مرتبہ ہماری بات صبح آٹھ بجے کے قریب ہوئی تھی اور اس وقت بھی یہی پتا چلا تھا کہ رنگولی رات بھر گھر نہیں آئی تھی اور اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ فانگ پھن کے میرے ہاتھوں مارے جانے کی اطلاع کل چیانگ رائے بھی پہنچ گئی تھی۔ دارا کو چی فانگ کی فکر ہوئی ہوگی اور وہ رات ہی رات کو یہاں پہنچ گیا تھا۔ رنگولی بھی اس کے ساتھ تھی جو پوری طرح میرے خلاف اس سازش میں شریک تھی۔ اب مجھے تھائی اور پرساد کی بھی فکر ہورہی تھی۔ وہ دونوں چیانگ رائے میں تھے اور ہوسکتا ہے اب تک ان کے خلاف بھی کوئی کارروائی ہوچکی ہو۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ جانگی کی چیخ سن کر چونک گیا۔ دارا اس کے بالوں کو جھٹکے دیتا اور دھکے دیتا ہوا پودوں سے نکل کر آگے آرہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے جانگی کو اس زور کا دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی منہ کے بل گری۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ گھاس پر گری تھی اور اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی لیکن اس کا ہاتھ گھاس میں پڑے ہوئے ایک پتھر پر پڑگیا۔

پتھر زیادہ بڑا نہیں تھا اور جانگی اسے انگلیوں کی گرفت میں لینے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے اور میرے خیال میں وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہی تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا، اس نے پھرتی سے لوٹ لگائی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر پوری قوت سے دارا کی طرف اچھال دیا۔

دارا اس صورتِ حال کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اسے توقع بھی نہیں تھی کہ جانگی ایسی کوئی حرکت کرسکتی ہے۔ پیپر ویٹ کے برابر نکیلا پتھر اس کی پیشانی پر لگا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

پیشانی سے خون بہہ نکلا تھا۔ دارا کے منہ سے بدبو دار گٹر کی طرح گندی گالیوں کا طوفان ابل پڑا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے جانگی کی طرف دیکھا اور پھر اچانک ہی پستول والا ہاتھ اٹھا کر پے در پے ٹریگر دباتا چلا گیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ تین گولیاں چلیں اور اس کے ساتھ ہی جانگی کی خوفناک چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ دارا کی غراہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا خیال تھا کہ جانگی خون میں لت پت گھاس پر لوٹ رہی ہوگی لیکن وہ منظر میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ جانگی دبیز گھاس پر پشت کے بل پڑی تھی اور دارا اس کے قریب کھڑا تھا۔

"یہ گولیاں تمہارے جسم میں سوراخ بھی کرسکتی تھیں۔" دارا کسی بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے کہہ رہا تھا "لیکن میں تمہیں ایسی سزا نہیں دوں گا کہ تم ضائع ہوجاؤ۔ تمہارا یہ خوب صورت بدن اس لیے نہیں ہے کہ اس میں گولیوں سے سوراخ کیے جائیں۔ یہ تو کھیلنے کے لیے ہے۔ پہلے میں اس سے کھیلوں گا۔ اپنی پیاس بجھاؤں گا اور پھر اپنے ہاتھوں سے اس خوب صورت جسم کے ٹکڑے کروں گا۔ بڑے پیار سے.... آہستہ.... آہستہ۔" اس نے جانگی کی ٹانگ پر ٹھوکر ماری اور کہا "تم اسے میری رحم دلی مت سمجھنا کہ میں نے اس وقت تمہیں کچھ نہیں کہا۔ میرا انتقام لینے کا طریقہ ذرا مختلف ہے۔ میں نے کنچن بوری کے ہٹ میں تھائی کو رسوا کرکے اس کا ایک نمونہ پیش کیا تھا۔ اس وقت میں نے دوسرے آدمیوں کو موقع دیا تھا مگر اب تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کرنا ہوگا میں خود کروں گا اور تمہارے اس ہیرو کے سامنے...."

میرے جبڑے بھنچ گئے۔ میں نے دارا کی طرف بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ فضا "تڑتڑاہٹ" کی آواز سے گونج اٹھی۔ کئی گولیاں میرے پیروں کے قریب گھاس میں لگی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ گولیاں برآمدے میں کھڑی ہوئی رنگولی نے چلائی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

"تم آگے نہیں بڑھوگے ہیرو۔" رنگولی نے رائفل کو حرکت دیتے ہوئے کہا "کوئی حرکت کیے بغیر اپنی جگہ پر کھڑے رہو اور جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہو۔"

میں دانت پیس کر رہ گیا۔

دارا نے اس آدمی کو قریب بلالیا جو دوسری طرف پستول لیے کھڑا تھا۔ وہ آدمی ہمارے لیے اجنبی تھا۔ دارا نے اسے اشارہ کیا۔ اس شخص نے پستول جیب میں رکھ کر خنجر نکال لیا اور آہستہ آہستہ جانگی کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اس انداز میں آگے بڑھتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اس سے پہلے جانگی کے چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار تو نظر آئے تھے لیکن وہ خوف زدہ بالکل نہیں تھی مگر اب اس خنجر بدست آدمی کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

وہ شخص اس کے سامنے رک گیا۔ اس کے خنجر کی نوک آہستہ آہستہ جانگی کے سینے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جانگی کا چہرہ پیلا پڑگیا۔ اس نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن ٹھیک اسی لمحے اس شخص نے خنجر کی نوک اس کی وی شیپ گلے والی ٹی شرٹ کے گریبان پر رکھ کر نیچے کی طرف زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی ٹی شرٹ نیچے تک چرتی چلی گئی اور اس کے جسم کے سامنے کا حصہ برہنہ ہوگیا۔ ٹی شرٹ، اوپن شرٹ کی طرح کھل گئی تھی۔ جانگی نے دو قدم پیچھے ہٹ کر دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے۔

"شرما کیوں رہی ہو۔ ان میں کوئی غیر تو نہیں۔ یہ سب اپنے ہی ہیں۔ ان سے کیا شرمانا۔" دارا نے یہ کہتے ہوئے قہقہہ لگایا اور پھر پیشانی پر رسنے والا خون صاف کرنے لگا۔ زخم زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن قہقہہ لگانے سے شاید تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اس کے تاثرات بگڑ گئے۔ دوسرے ہی لمحے وہ جانگی کے سامنے کھڑے ہوئے آدمی کی طرف دیکھتے ہوئے دہاڑا۔

"تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ اپنا کام جاری رکھو۔"

وہ شخص خنجر سنبھالے ایک بار پھر جانگی کی طرف بڑھا۔ اس بار اس کے خنجر کی نوک کا رخ جانگی کی جینز کی طرف تھا۔ میں کانپ اٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

"دارا!" میں مٹھیاں بھینچتے ہوئے چیخا "تم بہت گھٹیا اور ذلیل آدمی ہو۔ تمہاری دشمنی مجھ سے ہے۔ میں تمہارے سامنے ہوں۔ جو کچھ کرنا ہے، میرے ساتھ کرو۔ مجھ سے اپنا انتقام لو۔ عورتوں کی اس طرح توہین کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"تم سے انتقام لینے کے لیے ضروری نہیں کہ تمہارے جسم پر ہی چھریاں چلائی جائیں۔" دارا نے کہا "تم سے انتقام لینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جانگی کو...."

"بند کرو یہ بکواس!" میں نے چیختے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"اے۔ تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اپنا کام جاری رکھو۔" دارا نے میرے چیخنے کی پروا کیے بغیر اپنے آدمی کو حکم دیا۔

کم اور چی فانگ اس وقت کچھ زیادہ محتاط ہوگئے تھے۔ انہیں شاید یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ میں کسی شدید ردِعمل کا اظہار کروں گا۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر خنجر کی نوک جانگی کی پینٹ کے بیلٹ پر رکھ دی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ کو حرکت دیتا، فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ سب ہی لوگ اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ یہ فائر بھی رنگولی ہی نے کیا تھا اور گولی اس شخص کے پیروں کے قریب زمین میں دھنس گئی تھی جو خنجر سے جانگی کی پینٹ کا بیلٹ کاٹنا چاہتا تھا۔ وہ شخص اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ "بس مسٹر دارا۔" رنگولی نے چیخ کر کہا "بہت ہوچکا یہ کھیل۔ کوئی عورت کسی دوسری عورت کی ایسی توہین برداشت نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی میں تمہیں بہت ڈھیل دے چکی ہوں۔ تمہارا کھیل ختم ہوچکا۔ پستول پھینک دو اور اپنے آدمیوں سے بھی کہو، ہتھیار پھینک دیں۔"

"کیا بکواس کررہی ہو رنگولی۔" دارا چیخا "یہ زہریلا سانپ بڑی مشکل سے ہمارے ہاتھ آیا ہے۔ تم اسے بھاگ نکلنے کا موقع دے رہی ہو۔"

"زہریلا سانپ وہ نہیں، تم ہو۔" رنگولی نے جواب دیا "جتنا زہر تم میں بھرا ہوا ہے اتنا شاید دنیا کے کسی سانپ میں نہ ہو۔ یہ تو ان لوگوں کی غلطی تھی کہ تمہیں اب تک زندہ چھوڑے رکھا۔ تم جیسے سانپ کا تو فوراً ہی سر کچل دینا چاہیے۔"

"اوہ! تو تم بھی...."

"ہاں۔" رنگولی نے اس کی بات کاٹ دی "میں چیانگ رائے میں تم سے ملی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ تم مجھے پسند آگئے تھے۔ تم ہی وہ شخص ہو جس کی وجہ سے ٹائیگر نے میرا جینا حرام کردیا تھا۔ تمہاری وجہ سے مجھے وہ ذلت اور رسوائی اٹھانی پڑی تھی۔ میں نے جس طرح سسک سسک کر زندگی کے وہ دن گزارے ہیں انہیں میں کیسے بھلا سکتی ہوں۔ میں تو تم لوگوں سے انتقام لینے کے لیے موقع کی تلاش میں تھی اور پھر یہ میری خوش

چند روز پہلے میری ملاقات وجدان سے ہوگئی۔ اس روز تمہارا یہ کرگا نوبتا کو قتل کرچکا تھا۔" اس نے چی فانگ کی طرف اشارہ کیا "نوبتا بے گناہ تھی۔ اس کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ سچائی کے راستے پر وجدان کا ساتھ دے رہی تھی لیکن تم لوگ تو نجانے کتنے بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو۔ گزشتہ روز فانگ چن کی موت کی خبر سن کر اگر تم یہاں آنے کا پروگرام نہ بھی بناتے تو میں تم لوگوں کو یہاں لے کر آتی کیونکہ تم لوگوں کی موت کے لیے اس سے بہتر اور کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر میکانگ بہتا ہے۔ تمہاری لاشیں میکانگ کی پُرشور لہروں میں پھینک دی جائیں گی۔ اس دریا کی مچھلیوں کو کبھی کبھار ہی ایسی خوراک ملتی ہے۔" میں حیرت سے رنگولی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے چند منٹ پہلے اس کے بارے میں جو کچھ بھی سوچا تھا اب مجھے اس پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ شروع ہی سے ہماری طرف تھی اور چیانگ رائے سے ان کے ساتھ آئی بھی اسی لیے تھی کہ کسی آڑے وقت میں ہماری مدد کرسکے۔ گزشتہ رات اس نے تھائی کو فون بھی اسی لیے نہیں کیا تھا کہ ان لوگوں کو شبہ نہ ہو جائے۔ اس نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کہ ان کی طرف داری کرتے ہوئے ہم پر رائفل تان لی تھی۔ ہوسکتا ہے اس کا یہ ڈراما کچھ دیر اور چلتا لیکن جانگی کی توہین وہ برداشت نہیں کرسکی تھی اور کھل کر سامنے آگئی تھی۔

جانگی کے سامنے کھڑے ہوئے آدمی نے خنجر پھینک دیا تھا اور وہ اس سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن اس کا سیدھا ہاتھ غیر محسوس انداز میں پتلون کی جیب کی طرف رینگ رہا تھا جس سے پستول کا دستہ جھانک رہا تھا اور پھر اس نے بڑی پھرتی سے پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ اسے پستول استعمال کرنے کا موقع ملتا، رنگولی کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔ وہ منہ سے آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔ کھوپڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ خون کے چھینٹے اور بھیجا دور تک بکھر گیا تھا۔

"کسی اور نے بہادری دکھانے کی حماقت کی تو اس کا بھی یہی انجام ہوگا۔" رنگولی نے چیخ کر کہا "ہتھیار پھینک دو! سب لوگ "دیکھو رنگولی۔" دارا چیخا "تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ تمہارے ساتھ زیادتی ٹائیگر نے کی تھی اور میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ اب بھی وقت ہے۔ ہمارا ساتھ دو۔"

"بند کرو یہ بکواس اور پستول پھینک دو۔" رنگولی چیخی "اور تم لوگ بھی اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔" اس نے چی فانگ وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

وانگ ژن تو پہلے ہی کسی ایکشن کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے کم پر چھلانگ لگا دی اور ایک ہی جھپٹے میں نہ صرف اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا بلکہ اس کے جبڑے پر ایک گھونسا بھی رسید کردیا تھا۔

فانگ کا میرا خیال ہے، یہ وانگ ژن کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اسے کم از کم ان لوگوں کے ہتھیار پھینکنے کا انتظار کرنا چاہیے تھا لیکن جلد بازی میں غلطی کر بیٹھا تھا اور اس غلطی کا فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا تھا۔

دارا اور چی فانگ نے اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے مختلف اطراف میں چھلانگیں لگا دیں۔ چی فانگ کی چلائی ہوئی ایک گولی میرے سر سے صرف چند انچ کے فاصلے سے گزری تھی۔ چی فانگ کے پیچھے ہی اس شخص نے بھی چھلانگ لگائی تھی جسے سب سے پہلے چی فانگ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔

وہ ابھی پودوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ رنگولی نے فائر کھول دیا۔ چی فانگ تو قدِ آدم گنجان پودوں میں غائب ہوگیا تھا مگر اس کے پیچھے چھلانگ لگانے والا دوسرا آدمی رنگولی کی رائفل سے نکلی ہوئی گولیوں سے چھلنی ہوگیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپتا ہوا ڈھلان پر لڑھک کر پودوں میں اٹک گیا۔ اس کے جسم سے خون کی کئی دھاریں بہ نکلی تھیں۔

رنگولی برآمدے سے نکل کر دوڑتی ہوئی اس جگہ پہنچ گئی اور ایک پتھر پر کھڑی ہو کر ڈھلان پر دیکھنے لگی۔ اسی وقت میں بھی اس کے قریب پہنچا تھا۔ ڈھلان پر تقریباً دو سو گز نیچے چی فانگ کی ایک جھلک نظر آئی۔ رنگولی نے فائر کھول دیا لیکن اسی لمحے چی فانگ پودوں میں غائب ہوچکا تھا۔

میں مڑ کر تیزی سے لان کے دوسرے کنارے کی طرف لپکا جہاں وانگ ژن اور کم ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ کم چینی نژاد تھا اور بہترین مارشل آرٹسٹ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ وانگ ژن کے قابو میں نہیں آسکے گا لیکن وانگ ژن اسے بُری طرح رگید رہا تھا۔ میں دو قدم دور ہی رک گیا۔

ایک مرتبہ کم کو موقع مل گیا۔ اس نے وانگ ژن کو پیروں پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔ وانگ ژن اس کے سر کے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل پیچھے کی طرف گرا۔ کم بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ وانگ ژن پر حملہ کرے گا لیکن اس نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔

کم کو راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ کم نے مجھے دیکھ لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا دفاع کرسکتا یا میری زد سے نکل پاتا، میں نے دونوں ٹانگیں قینچی کی طرح اس کی گردن پر لپیٹ دیں اور اسے لیے ہوئے زمین پر گرا۔

میں تو زمین پر گرتے ہی سنبھل گیا مگر کم کو سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں نے اٹھتے ہی کم پر ٹھوکروں کی بارش کردی لیکن ایک موقع پر کم نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں اچھل کر پشت کے بل گرا لیکن کم کو پھر بھی بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس مرتبہ وانگ ژن نے اسے چھاپ لیا تھا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔

اس سے پہلے بھی میں بتا چکا ہوں کہ کم کبھی کبھار ہیروئن استعمال کرنے کا عادی تھا۔ زہر تو زہر ہی ہوتا ہے۔ خواہ تھوڑی مقدار میں استعمال کیا جائے یا زیادہ مقدار میں، اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ ہیروئن کے کبھی کبھار استعمال نے کم کو اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ وہ زیادہ دیر تاب نہ لا سکا اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔ وانگ ژن نے اسے جیکٹ سے پکڑ کر اٹھایا اور دھکے دیتا ہوا برآمدے کی طرف لے جانے لگا۔ میں نے مڑ کر رنگولی اور جانگی کی طرف دیکھا۔ رنگولی نے رائفل کندھے پر لٹکالی تھی اور جانگی کی پھٹی ہوئی ٹی شرٹ کے دونوں کنارے پکڑ کر ان میں بکل لگا دی تھی۔ یہ بکل اس کے اپنے ہی لباس میں کہیں لگی ہوئی تھی جسے وہ اس وقت کام میں لا رہی تھی۔

ہم لوگ برآمدے میں سامنے پڑی ہوئی کرسیوں کی طرف آگئے۔ وانگ ژن نے کم کو دھکا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور کاٹیج کے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد ہی وہ ایک رسی تلاش کر لایا۔ اس نے کم کے ہاتھ پیر باندھ دیے۔

میں ان سب کو وہیں چھوڑ کر رنگولی کے ساتھ کاٹیج کے اندر آگیا۔ چار کمرے تھے۔ ایک نشست گاہ کے طور پر آراستہ تھا اور باقی بیڈ رومز تھے۔ وانگ ژن مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ یہ کاٹیج عام طور پر خالی ہی رہتا ہے البتہ کبھی کبھار گولڈن ٹرائی اینگل سے آنے والے ایجنٹ یہاں دو چار روز کے لیے رہائش اختیار کرلیتے ہیں۔

یہاں پر ٹیلی فون بھی تھا اور ایک کمرے میں ایک موٹر بیٹری سائز کا بکس دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس پر دو تین ڈائل لگے ہوئے تھے اور ریڈیو انٹینا کی طرح ایک تار بھی تھا۔ ایک ڈائل میں ایک ننھا سا سرخ نقطہ روشن تھا۔

یہ ریڈیو ٹرانس میٹر تھا۔ مقامی طور پر تو رابطے کے لیے یہ لوگ ٹیلی فون ہی استعمال کرتے تھے لیکن سرحد پار ٹیلی فون سے رابطہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے یہ ٹرانس میٹر تھا اور ظاہر ہے اس سے گولڈن ٹرائی اینگل ہی سے رابطہ کیا جاتا ہوگا۔

میرے خیال میں ہمارے لیے یہ ٹرانس میٹر بیکار تھا لیکن رنگولی کی بات سن کر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

"ویسے تو وہ لوگ بہت چالاک ہیں لیکن اگر ہم اس ٹرانس میٹر کو اپنے ساتھ لے جائیں اور اس کاٹیج کو آگ لگا دیں تو وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ٹرانس میٹر بھی جل چکا ہے۔ ہوسکتا ہے بعد میں کسی وقت یہ ٹرانس میٹر ہمارے کام آجائے۔"

رنگولی کی بات معقول تھی۔ اسی وقت وانگ ژن بھی اندر داخل ہوا۔ اس نے بھی رنگولی کی تائید کی اور پھر اس نے خود ہی آگے بڑھ کر ٹرانس میٹر اٹھالیا۔ میں نے گھوم پھر کر پورے کاٹیج کا جائزہ لیا لیکن اور کوئی کام کی چیز نظر نہیں آئی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہیے۔" وانگ ژن نے کہا "وہ دونوں یہاں سے بھاگ چکے ہیں۔ ان کا فرار ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے اور ویسے بھی فائرنگ کی آواز ان پہاڑوں میں دور تک سنی گئی ہوگی۔ ان لوگوں کے اور بھی خفیہ اڈے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کا کوئی ساتھی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف آنکلے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اب واقعی ہمیں چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

ہم کاٹیج سے باہر آگئے۔ ٹرانس میٹر کے ساتھ دو انچ چوڑا ایک بیلٹ بھی لگا ہوا تھا۔ وانگ ژن نے اس بیلٹ کی مدد سے ٹرانس میٹر کو کندھے پر لٹکالیا اور کم کے پیروں کی رسیاں کھول دیں۔ ہاتھ پشت پر ہی بندھے رہنے دیے تھے۔

جانگی کی حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہو رہی تھی۔ دارا نے اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر خوب جھنجوڑا تھا۔ اسے خاصی تکلیف ہو رہی تھی اور وہ بار بار سر کو سہلا رہی تھی۔ میں نے پستول جانگی کے ہاتھ میں تھما دیا اور کم کی نگرانی اس کے سپرد کردی۔

"اگر راستے میں یہ کسی وقت بھاگنے کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی چلا دینا۔" جانگی کو یہ ہدایت دیتے ہوئے میرے لہجے میں سرد مہری تھی۔

رائفل رنگولی کے پاس تھی۔ وانگ ژن کے پاس بھی اپنی رائفل تھی۔ اس نے پستول مجھے دے دیا کیونکہ میرا ریوالور چی فانگ لے بھاگا تھا۔ میں اسی طرف بڑھنا چاہتا تھا جس طرف سے ہم لوگ آئے تھے لیکن وانگ ژن نے روک دیا۔

"وہ راستہ اختیار کرنا اب خطرناک ہوگا۔" اس نے کہا۔

زندگی زنداں کے لیے ایک زمانہ گردیدہ کی غم ناک سرگزشت
ان کے لیے جن کے سینے دھواں دیتے ہیں
آنسو وآہ وداں امنگوں اور حوصلوں کی داستان
عبرت اثر حیرت انگیز و ناقابلِ فراموش
ربابہ سلطان خانم کی آپ بیتی جگ بیتی
اس جوان رعنا کے زندگی کا، وہ یہ مختلف تھا۔
دل فگاروں کے لیے سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
بازی گر
وہ تحریر جو دلوں کی دھڑکن ہے
کتابی شکل میں چار حصے شائع ہوچکے ہیں
قیمت فی حصہ -/60 روپے: ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
یہ رعایت حاصل کرنے کے لیے رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیے

"انہیں معلوم ہے کہ ہم اسی طرف سے آئے تھے۔ ممکن ہے وہ لوگ راستے میں کہیں گھات لگائے بیٹھے ہوں۔"

اور پھر ہم نے راستہ بدل دیا۔ یہ راستہ نہ صرف قدرے طویل بلکہ زیادہ دشوار بھی تھا۔ جانگی بڑی مہارت سے کم کو پستول کی زد پر لیے کسی جانور کی طرح ہانک رہی تھی۔ وہ ذرا رکتا تو جانگی اس کے کولھوں پر لات رسید کردیتی۔

میں، رنگولی اور وانگ ڈن اپنا اپنا اسلحہ سنبھالے محتاط انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ٹیک کا یہ جنگل بہت گنجان تھا۔ صندل کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ان درختوں کی وجہ سے فضا میں مہک سی رچی ہوئی تھی۔ مہاتما بدھ کے ماننے والوں میں صندل کو بہت مقدس لکڑی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے بھی اس قیمتی لکڑی کی تجارت سے تھائی لینڈ کثیر زرِ مبادلہ کما رہا تھا۔ ان درختوں کے نیچے دبیز گھاس اور قدِ آدم جھاڑیاں تھیں جن میں راستہ بنا کر چلنا خاصا مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ چی فانگ اور دارا وغیرہ کہیں ان گنجان جھاڑیوں میں گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں۔ ان کا حملہ ہمارے لیے بہت خطرناک ہو سکتا تھا لیکن مجھے ان کی طرف سے کسی ایسے ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ اب تک کے تجربات تو یہی بتاتے تھے کہ کسی جھڑپ میں شکست کے آثار نظر آتے ہی دارا دُم دبا کر بھاگ نکلتا تھا اور اس نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کاٹیج سے روانہ ہونے سے پہلے وانگ ڈن نے نشست گاہ والے کمرے کے فرنیچر پر کیروسین آئل چھڑک کر آگ لگا دی تھی اور میں بار بار مڑ کر یہی دیکھ رہا تھا کہ ابھی تک آگ کیوں نہیں پھیلی تھی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے رہے۔ راستہ خاصا طویل ہو گیا تھا۔ ایک جگہ ہمیں رک جانا پڑا۔ ہمارے سامنے تقریباً چھ فٹ چوڑی پہاڑی ندی تھی جس کے چٹانی کنارے بالکل عمودی تھے۔ ندی بہت گہری تھی اور پانی کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ہم ندی کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف کسی ایسی جگہ کی تلاش میں چلتے رہے جہاں سے ندی آسانی سے پار کی جا سکے لیکن ہم جیسے جیسے اوپر چلتے گئے، ندی کا پاٹ مزید چوڑا ہوتا گیا۔

ایک جگہ ندی کا پانی کنارے سے تقریباً ایک فٹ نیچے تھا۔ رنگولی اور جانگی بُری طرح تھک گئی تھیں۔ رنگولی نے اپنی رائفل زمین پر رکھ دی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چلو میں پانی پینے لگی۔

ہم سب کو پیاس لگ رہی تھی۔ ہم نے بھی پانی پیا۔

"اور شاید تمہیں بھی پیاس لگ رہی ہے؟" رنگولی نے کم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاتھ کھول دو اس کے۔" وانگ ڈن نے کہا "یہ بھی پانی پی لے۔"

رنگولی نے کم کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔ اس کی کلائیوں پر رسّی کے نشان پڑ گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا کلائیوں کو سہلاتا رہا اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر چلو میں پانی پینے لگا۔ ایک دو گھونٹ پینے کے بعد وہ رک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ رنگولی کی رائفل اب بھی زمین پر پڑی تھی۔ رنگولی نے جلدی سے آگے بڑھ کر رائفل اٹھالی۔ کم کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پھر پانی لینے کے لیے نیچے جھکا اور پھر وہ کچھ ہو گیا جس کی ہم میں سے کسی کو توقع نہیں تھی۔

کم نیچے جھکتا چلا گیا اور پھر اچانک ہی وہ قلابازی کھاتا ہوا پانی میں گر گیا۔ "چھپاک" کی آواز میرے حواس پر بجلی بن کر گری۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کم کا ندی میں گرنا اتفاق نہیں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر چھلانگ لگائی تھی۔ اسے ایک موقع مل گیا تھا اور اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔

"اسے پکڑو۔۔۔ اسے۔۔۔ روکو۔۔۔۔" میں بے اختیار چیخ اٹھا۔

رنگولی نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ندی میں رائفل کا پورا برسٹ مار دیا۔ پانی بہت گہرا اور بہت تیز تھا۔ اگر رنگولی کا یہ خیال تھا کہ کم اس کی گولیوں کا نشانہ بن گیا ہو گا تو وہ غلطی پر تھی۔

میں اور وانگ ڈن ندی کے بہاؤ کی طرف دوڑنے لگے۔ ہمارا خیال تھا کہ کم سانس لینے کے لیے کہیں نہ کہیں سر پانی سے باہر نکالے گا لیکن تقریباً سو گز تک ندی کے کنارے پر دوڑنے کے باوجود وہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ کئی جگہوں پر جھاڑیاں پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ پانی سے سر ابھار کر ان جھاڑیوں ہی میں کہیں چھپا ہوا ہو گا لیکن کم اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس طرح کی کوئی حماقت کر کے دوبارہ ہمارے ہاتھ آجاتا۔

رنگولی اور جانگی بھی دوڑتی ہوئی ہمارے قریب پہنچ گئی تھیں۔

ہم سب ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کم کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بے سود۔ وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اگر اس میں درخت کا تنا بھی پھینک دیا جاتا تو چند منٹ میں وہ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا۔

"تقریباً نصف میل آگے جا کر یہ ندی آبشار کی صورت میں تقریباً ڈیڑھ سو فٹ گہرائی میں گرتی ہے۔" وانگ ڈن کہہ رہا تھا "اگر کم کو راستے میں کسی جگہ ندی سے نکلنے کا موقع نہیں ملا تو اس کا خاتمہ اسی آبشار پر ہو گا۔ ویسے مجھے افسوس ہے، اسے میری وجہ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اگر میں اس کے ہاتھ کھولنے کا مشورہ نہ دیتا تو یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔"

"اب افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا "اگر وہ زندہ بچ نکلا تو اس سے ہمارا آمنا سامنا پھر ہو گا۔"

اسی وقت مجھے لکڑی کے جلنے کی بو کا احساس ہوا۔ میں نتھنے سکوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کسی قدر بلندی پر درختوں میں سے سیاہ دھوئیں کا بادل اٹھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ کاٹیج آگ کی لپیٹ میں آچکا

تھا۔ ہم بہاؤ کی طرف ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور بالآخر ایک جگہ ہمیں ندی پار کرنے کی جگہ مل گئی۔ اس جگہ ندی کا پاٹ تقریباً پانچ فٹ چوڑا تھا اور وہاں ایک کٹے ہوئے درخت کا تنا رکھا ہوا تھا۔ جو پل کا کام دے رہا تھا۔

ہم ندی پار کر کے جھاڑیوں میں چلتے رہے۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ کاٹیج سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل اب بہت دور تک پھیل گئے تھے۔

مزید آدھے گھنٹے بعد ہم سڑک پر پہنچ گئے۔ گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف گاڑیوں پر سیاحوں کی آمدورفت جاری تھی۔ سب لوگ اسی طرف دیکھ رہے تھے جس طرف سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

سڑک کے دوسری طرف چٹان کی آڑ میں درختوں کے نیچے ہماری گاڑی محفوظ تھی۔ گاڑی پر واپس جاتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ کاٹیج سے اٹھنے والے شعلے اب بہت اوپر تک پہنچ رہے تھے۔ وانگ ڈن نے گاڑی روک لی۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک اور خیال اُبھرا۔

"جنگل کی آگ بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پھیل جائے تو اس پر قابو پانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ آگ نہیں پھیلے گی۔" وانگ ڈن نے کہا "اگر درخت سوکھے ہوئے ہوں تو آگ کے پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اس علاقے میں سبزہ ہی سبزہ ہے۔ دور دور تک کوئی سوکھا ہوا درخت نظر نہیں آتا۔"

میں ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کان پھاڑ دینے والا ایک دھماکا ہوا۔ دھماکا اس قدر زوردار تھا کہ سڑک پر کھڑی ہوئی ہماری جیپ بھی ہل کر رہ گئی۔ میری نظریں بے اختیار کاٹیج کی طرف اٹھ گئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ کاٹیج کی چھت، دیواریں اور پتھر آگ کے شعلوں کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

وانگ ڈن نے سنبھل کر جیپ کو تیزی سے سڑک پر دوڑا دیا۔ میں بار بار مڑ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے دھماکے کے بعد پے در پے اور بھی دھماکے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی ہو۔ رنگولی اور جانگی بھی بار بار اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر عجیب سا خوف ابھر آیا تھا۔

وانگ ڈن جیپ کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ قصبے سے گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے والی سیاحوں کی گاڑیاں سڑک پر رک رہی تھیں اور سب لوگ اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض گاڑیوں کو میں نے یوٹرن لے کر واپس مڑتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ لوگ شاید آگے جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

وانگ ڈن نے جیپ اپنے کاٹیج کی طرف جانے والے راستے پر موڑلی اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم کاٹیج میں موجود تھے۔ جانگی جیپ سے اترتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے بدل کر آگئی۔ اس کے بال اسی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے لوما سے پانی منگوا کر ڈسپرین کی دو گولیاں کھائیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ رنگولی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔

لوما عقل مند آدمی تھا۔ ہم سب کی حالت دیکھ کر اسے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ ہم کس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ وہ ہمارے لیے کافی بنا کر لے آیا اور اس وقت ہم واقعی بڑی شدت سے کافی کی طلب محسوس کر رہے تھے۔

کافی پینے کے بعد وانگ ڈن نے اپنا حلیہ درست کیا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے، میں شام سے پہلے واپس نہ آسکوں۔ تم لوگ پریشان مت ہونا۔"

"اگر تم کہیں دیکھ لیے گئے تو؟" میں نے خدشے کا اظہار کیا۔

"مجھے کون پہچانتا ہے؟" وانگ ڈن نے جواب دیا "جو مجھے پہچانتے ہیں وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں گے۔"

وانگ ڈن چلا گیا۔ میں نے لوما سے اپنے لیے اور کافی بنوالی۔

لوما کافی لے کر آیا تو اس نے پہلی مرتبہ ان دھماکوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اسے کچھ بتا کر میں مزید سوالات کی الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔

"میرے لیے کوئی فون تو نہیں آیا تھا؟" میں نے لوما کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں بالکل بھول گیا تھا باس۔" لوما ندامت کا اظہار کرتے ہوئے بولا "دو مرتبہ چیانگ رائے سے فون آچکا ہے۔"

میں نے گھور کر لوما کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آگیا اور ریسیور اٹھا کر چیانگ رائے میں رنگولی کے مکان کا نمبر ملانے لگا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے کریڈل ٹیپ کر کے ری ڈائل کا بٹن دبا دیا۔

اس مرتبہ بھی گھنٹی بجتی رہی۔ اُدھر سے کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی اور اِدھر میری پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔ کال ریسیو نہ ہونے کا مطلب تو یہ تھا کہ تھائی یا پرساد گھر پر نہیں تھے لیکن وہ کہاں جا سکتے تھے۔ رنگولی نے میری کیفیت کو تاڑ لیا اور میرے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"کال ریسیو نہیں ہو رہی۔" میں نے جواب دیا "یا تو تمہارا فون خراب ہے یا تھائی اور پرساد۔۔۔۔"

"لاؤ۔ مجھے دو۔ میں ملاتی ہوں۔" رنگولی نے ریسیور میرے

ہاتھ سے لے لیا اور نمبر ملانے لگی لیکن نتیجہ اس مرتبہ بھی صفر ہی نکلا۔ کئی مرتبہ ٹرائی کرنے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کوئی گڑبڑ نہ ہوگئی ہو!" وہ میری طرف دیکھ کر بڑبڑائی "ایک منٹ۔ میں تھالوب کو فون کرتی ہوں۔ اس سے پتا چل جائے گا کہ کیا معاملہ ہے۔" اس نے دوبارہ نمبر ملانے کے لیے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے لپک کر رنگولی سے پہلے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف سے تھائی کی آواز سنتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

"کہاں غائب تھیں تم۔ میں پندرہ منٹ سے ٹرائی کررہا ہوں؟" میں نے کہا۔

"ہم نے تقریباً ایک گھنٹا پہلے رنگولی کا مکان چھوڑ دیا تھا۔" تھائی نے جواب دیا "آخری مرتبہ تمہیں وہیں سے فون کیا تھا۔ اس کے بعد موقع ہی نہیں ملا۔"

"اوہ!" میں نے کہا "اس وقت کہاں ہو تم۔ رنگولی کا مکان کیوں چھوڑا؟"

"اس وقت ہم تھالوب کے ایک مکان میں ہیں۔" تھائی نے جواب دیا "ہم پیڈرو کے آدمیوں کی نظروں میں آگئے تھے جس کی وجہ سے ہمیں رنگولی کا مکان چھوڑنا پڑا۔"

"پیڈرو کے آدمی؟" میرے لہجے میں تشویش تھی۔

"بنکاک میں بہت گڑبڑ ہوگئی ہے وجدان۔" تھائی نے کہا۔ "پاکھم کو پیڈرو کے آدمیوں نے اسپتال سے اغوا کرلیا ہے۔ پیڈرو اور ماسٹر ہوچن کے آدمیوں میں آج کل خوب ٹھنی ہوئی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اعلیٰ سرکاری آفیسر بھی پیڈرو کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ماسٹر ہوچن کے تین آدمیوں کو پولیس گرفتار کرچکی ہے۔ پیڈرو کو تمہاری تلاش ہے۔ تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی پاکھم کو اسپتال سے اغوا کیا گیا ہے۔"

"لیکن پاکھم....."

"اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہوچکی تھی۔" تھائی نے میری بات کاٹ دی "کل شام کو پرساد نے اپنے کسی جاننے والے کو فون کیا تھا۔ یہ ساری باتیں اسی سے معلوم ہوئی تھیں۔ اس کی اطلاع کے مطابق پیڈرو آج کسی وقت چیانگ رائے پہنچنے والا ہے۔ اسے شاید کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ تم یہاں ہو۔ اس مرتبہ وہ پوری قوت سے تم پر وار کرنا چاہتا ہے تاکہ تمہارا قصہ ختم کردیا جائے اور میرا خیال ہے، چیانگ رائے کے بعض اعلیٰ پولیس افسران بھی اس معاملے میں اس کا ساتھ دیں گے۔"

"لیکن تم لوگوں نے رنگولی کا مکان کیوں چھوڑا؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میں نے بتایا ہے ناکہ ہم پیڈرو کے آدمیوں کی نظروں میں آگئے تھے۔" تھائی نے جواب دیا "آج صبح سویرے میں ناشتے کے لیے کچھ سامان لینے مارکیٹ گئی تھی۔ وہاں وانگ سائی سے سامنا ہوگیا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا مگر ایسا انداز اختیار کرلیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو لیکن میں محتاط ہوگئی تھی۔ اس نے میرا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں اسے چکما دینے میں کامیاب ہوگئی۔ میں نے دو مرتبہ تمہیں فون کیا مگر تم گھر پر نہیں تھے پھر میں نے تھالوب کو فون کرکے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ وہ ہمیں رنگولی کے مکان سے نکال لایا۔ اس وقت اگرچہ ہم محفوظ ہیں لیکن مجھے یقین ہے پیڈرو کے آدمی پورے شہر میں ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔"

"تھالوب کہاں ہے؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"وہ اس وقت اپنے دفتر میں ہوگا۔ میں تمہیں اس کا نمبر دیتی ہوں۔ تم اس سے بات کرلو۔" تھائی نے کہا۔

میں نے تھائی کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کرلیا اور اسے محتاط رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے فون بند کردیا اور جانکی اور رنگولی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ پیڈرو کو اب کچھ سرکاری حمایت حاصل ہوگئی ہے۔" جانکی نے کہا "لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ چند روز پہلے تک جو شخص پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھا اسے اب قانون کا تحفظ حاصل ہوگیا ہے۔ گویا اسے قتل و غارت کا لائسنس دے دیا گیا ہے۔ پیڈرو جیسے لوگوں کو جب اس قسم کا "فری ہینڈ" ملتا ہے تو وہ قیامت بن جاتے ہیں۔"

"سیاست بہت گندی چیز ہے۔" میں نے کہا "بعض اوقات اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو بھی گلے لگالیا جاتا ہے۔ مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں مگر یہاں کے معاملات خاصے گمبھیر ہیں۔ ایک بہت ہی خوفناک سازش کا لاوا اندر ہی اندر کھول رہا ہے اور یہ ساری سرگرمیاں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ دارا اور پیڈرو جیسے لوگ ملک کے اس دور دراز علاقے میں جمع ہورہے ہیں۔ یہ لوگ محض تفریح کے لیے یہاں نہیں آئے۔ انہیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں اس لیے وہ اپنے اصل کام سے پہلے مجھے ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں گے تاکہ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور ہمارے لیے تشویش کی بات یہ ہے کہ اب پیڈرو جیسے لوگوں کو یہاں پولیس کے بعض افسروں کی حمایت بھی حاصل ہوگی۔"

"تھالوب اس علاقے کا سردار ہے۔" رنگولی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ پولیس اس سے پنگا لینے کی کوشش نہیں کرے گی۔"

"بہرحال دیکھنا یہ ہے کہ حالات اب کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میرے خیال میں تھائی اور پرساد کو اب چیانگ رائے میں تنہا چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تم تھالوب سے بات کرو۔ اگر وہ ان دونوں کو آج کسی طرح یہاں

بھجوادے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔"

رنگولی نے کچھ کہے بغیر فون کا ریسیور اٹھالیا اور نمبر ملانے لگی۔ اس نے وہی نمبر ملایا تھا جو تھائی نے مجھے نوٹ کروایا تھا لیکن تھالوب اس نمبر پر موجود نہیں تھا۔ اس نے کوئی دوسرا نمبر ملایا اور پھر تیسری جگہ تھالوب سے رابطہ ہوسکا تھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک اس سے بات کرتی رہی پھر ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"وہ دونوں آج شام کو یہاں پہنچ جائیں گے۔"

ہم لوگ اس وقت تک ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر باہر لان میں آگیا۔ رنگولی بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ جانکی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی دھوپ چمکنے لگتی۔ میں ایک جگہ بیٹھنے کے بجائے اِدھر اُدھر گھومنے لگا اور بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے چاروں طرف بہت دور تک کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔

پہاڑیوں میں ایک جگہ دھوئیں کے سیاہ بادل اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ وہ جگہ اگرچہ یہاں سے میلوں دور تھی لیکن دھوئیں کے بادل دیکھ کر لگتا تھا جیسے پہاڑیوں میں کہیں قریب ہی آگ لگی ہو۔ میں دیر تک اس طرف دیکھتا رہا اور پھر لان میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رنگولی پہلے ہی سے وہاں موجود تھی۔

وانگ ڈن کے شام سے پہلے آنے کی توقع نہیں تھی۔ میں کاٹیج میں دھماکے کے بعد صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔ میں نے بنکاک میں بھی عمارتوں کو جلتے ہوئے دیکھا تھا لیکن ایسے دھماکے نہیں سنے تھے لیکن یہاں تو ایسے لگا تھا جیسے بارود کے ذخیرے میں آگ لگ گئی ہو۔

ہمیں واپس آئے ہوئے دو گھنٹے ہوچکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ لوما کو صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے شہر کی طرف بھیج دوں لیکن ٹھیک اسی لمحے لوما برآمدے والے دروازے میں نمودار ہوا۔

"آپ کے لیے فون ہے ماسٹر۔" اس نے برآمدے ہی سے آواز لگائی۔

میں اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہال میں آگیا اور میز پر الگ رکھا ہوا فون کا ریسیور اٹھالیا۔ وہ وانگ ڈن کی کال تھی۔

"تمہارے لیے بڑی دلچسپ اطلاع ہے باس۔" وانگ ڈن نے کہا "اس کاٹیج کے تہ خانے میں بڑی تعداد میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا جو آگ لگنے کے بعد دھماکے سے اڑ گیا۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا "کیا اتنی سی دیر میں یہ معلوم کرلیا گیا ہے کہ کاٹیج کے تہ خانے میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا؟"

"دھماکے شہر میں بھی سنے گئے تھے۔ کاٹیج سے اٹھتا ہوا دھواں تو اب بھی نظر آرہا ہے۔" وانگ ڈن کہہ رہا تھا "دھماکے ہوتے ہی پولیس کی ایک پارٹی پہاڑیوں کی طرف روانہ ہوگئی تھی اور اب تو تین گھنٹے ہوچکے ہیں۔ پولیس اگرچہ ابھی تک اس کاٹیج کے قریب نہیں جاسکی لیکن انہیں صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ انہوں نے موبائل فون پر ہیڈکوارٹر کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ ہیڈکوارٹر کی پولیس نے بڑی تیزی سے اپنا کام دکھایا اور یہ معلوم کرلیا کہ وہ کاٹیج کس کا تھا۔ دو ایسے آدمی گرفتار کیے جاچکے ہیں جن کا تعلق اسی کاٹیج سے ہے۔ ان میں سے ایک نے یہ انکشاف کیا ہے کہ کاٹیج کے تہ خانے میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا جو ایک دو روز میں سرحد پار گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف اسمگل کیا جانے والا تھا۔"

"تمہیں یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں سردار تھالوب کا آدمی ہوں اور ہر جگہ میرے تھوڑے بہت تعلقات ہیں۔" وانگ ڈن کہہ رہا تھا "میں ایک انسپکٹر سے دوستی کی آڑ میں پولیس ہیڈکوارٹر پہنچ گیا تھا۔ یہ ساری معلومات مجھے وہیں سے حاصل ہوئی ہیں۔ پولیس بہت سرگرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دھماکوں کے حوالے سے کچھ اور سنسنی خیز انکشافات بھی ہونے والے ہیں۔"

"تم کب تک واپس آؤگے؟" میں نے پوچھا۔

"شام تک۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی محتاط رہنا۔"

کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد میں نے فون بند کردیا۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ دھماکے بارود ہی کے تھے۔ ہم نے چی فانگ کو پکڑنے کے لیے اس کاٹیج پر ریڈ کیا تھا۔ ہمیں اپنے اس مقصد میں تو کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن انجانے میں ہم انہیں بہت بڑا نقصان پہنچاچکے تھے۔

وانگ ڈن شام سے پہلے ہی واپس آگیا۔ اس کے پاس بڑی سنسنی خیز خبریں تھیں۔ کاٹیج کے تہ خانے میں اسٹور کیا جانے والا کروڑوں ڈالر مالیت کا اسلحہ گولڈن ٹرائی اینگل اسمگل کیا جانے والا تھا۔ جنرل کھوراٹ نے گولڈن ٹرائی اینگل میں اپنی فوج بنا رکھی تھی جو جدید ترین ہتھیاروں سے لیس تھی اور یہ ہتھیار دوسرے ممالک سے اسمگل کیے جاتے تھے۔ یہ سنہری تکون تھائی لینڈ، برما اور لاؤس کی سرحدوں میں گھری ہوئی تھی اور تینوں ممالک کی انتظامیہ میں ایسے کرپٹ لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اپنا ضمیر بیچ کر جنرل کھوراٹ کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کررہے تھے۔ اسلحہ اور ہر قسم کا گولہ بارود جنرل کھوراٹ کی اہم ترین ضرورت تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ گولہ بارود کی ترسیل میں کبھی کسی قسم کی رکاوٹ پیدا ہوئی ہو اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا کروڑوں ڈالر مالیت کا گولہ بارود تباہ ہوگیا۔

"گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی کھلبلی سی مچ گئی ہے۔" وانگ

ڈن کہہ رہا تھا "جنرل کھوراٹ بہت بھنّایا ہوا ہے۔ اس نے تمہاری گرفتاری کے لیے پانچ لاکھ امریکی ڈالر کے انعام کا اعلان کردیا ہے۔ وہ ہر صورت میں تمہیں زندہ پکڑنا چاہتا ہے۔ تمہارے ہاتھوں اب تک اس کے نہ صرف کئی آدمی مارے جاچکے ہیں بلکہ گولہ بارود کی تباہی نے اس کا دماغ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس نے تمہیں اپنا دشمن نمبر ایک قرار دے دیا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "جنرل کھوراٹ کے اعلان نے یہاں بھی کھلبلی مچادی ہے لیکن کسی شخص کو تمہاری گرفتاری سے دلچسپی نہیں۔ لوگ خوف زدہ ہیں۔ انہیں اندیشہ ہے کہ یہاں کوئی ایسی جنگ نہ چھڑ جائے جس میں بے گناہ افراد مارے جائیں۔"

"یہاں کی انتظامیہ کا کیا ردِ عمل ہے اور کیا جنرل کھوراٹ اتنا طاقت ور ہے کہ تھائی لینڈ کے خلاف اعلانِ جنگ کردے؟" میں نے پوچھا۔

"جنرل کھوراٹ طاقت ور ضرور ہے۔ اس کی اپنی فوج بھی ہے جس کے پاس جدید ترین ہتھیار ہیں لیکن وہ کسی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کی حماقت نہیں کرے گا۔ البتہ وہ گوریلا جنگ شروع کرسکتا ہے۔ اس کے فوجی گوریلا جنگ کے ماہر ہیں۔ سرحد کے آس پاس کی بستیوں میں چھاپا مار کارروائیاں کرکے وہ اپنے پڑوس کی کسی بھی حکومت کو اپنے مطالبات ماننے پر مجبور کرسکتا ہے اور جہاں تک مقامی انتظامیہ کا سوال ہے تو آدھے سے زیادہ آفیسر کرپٹ ہیں۔ اس کا اندازہ تم اس بات سے بھی لگا سکتے ہو کہ کاٹیج میں دھماکوں کے بعد شہر سے جن دو آدمیوں کو گرفتار کیا گیا تھا، انہوں نے اگرچہ کچھ سنسنی خیز انکشافات کیے تھے مگر آج دوپہر انہیں نہ صرف رہا کردیا گیا بلکہ دریائے میکانگ عبور کرنے کے لیے ایک کشتی بھی مہیا کردی گئی۔"

"عام لوگوں کے کیا تاثرات ہیں؟" میں نے پوچھا "کیا انہیں یہ اعتراض نہیں کہ جنرل کھوراٹ نے اس علاقے میں اپنے اڈے بنا رکھے ہیں؟"

"کسی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کس نے کہاں اڈے بنا رکھے ہیں۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "عام تھائی باشندے بہت سیدھے سادے اور محنت کش ہیں۔ وہ صرف دو وقت کی روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ کون کیا کررہا ہے۔ اس شہر کے باشندوں کی آمدنی کا دارومدار سیاحت پر ہے اور یہ سیاحت کا سیزن ہے۔ آج دوپہر کے بعد انتظامیہ نے گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے والے راستے بند کردیے ہیں۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل چکی ہے کہ اس کاٹیج میں جنرل کھوراٹ کے گولہ بارود کا ذخیرہ تھا جو مکمل طور پر تباہ ہوچکا ہے اور جنرل کھوراٹ کی طرف سے کسی ممکنہ کارروائی کے پیشِ نظر اندرونِ ملک اور غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح واپس جارہے ہیں جس سے یہاں کے لوگوں کا کاروبار متاثر ہورہا ہے۔ دو چار دن یہی صورتِ حال رہی تو یہ شہر سیاحوں سے خالی ہوجائے گا۔ اس لحاظ سے یہاں کے کاروباری لوگ تم سے خوش نہیں ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ عوام کی طرف سے بھی میرے خلاف کوئی ایسا شدید ردِ عمل ہوسکتا ہے جو میرے لیے کسی خطرے کا باعث....."

"نہیں۔" وانگ ڈن نے میری بات کاٹ دی "عوام کی طرف سے کوئی ایسا شدید ردِ عمل نہیں ہوگا لیکن انتظامیہ تمہارے خلاف سرگرم ہوسکتی ہے۔ ہوسکتا ہے پولیس تمہاری تلاش شروع کردے۔"

"تو پھر شاید ایسی صورت میں ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے" میں نے کہا۔

"بالکل نہیں۔" وانگ ڈن نے کہا "یہ تمہارے لیے محفوظ ترین جگہ ہے۔ اگر پولیس کو پتا چل بھی گیا کہ تم یہاں ہو تو وہ اس طرف کا رخ کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ تھالوب کا باپ اس سرحدی علاقے میں پھیلے ہوئے سب سے بڑے قبیلے کا سردار ہے۔ بڑا سردار اب گوشہ نشین ہوچکا ہے۔ تمام باگ ڈور تھالوب کے ہاتھ میں ہے۔ تھائی حکومت یہ بھی جانتی ہے کہ سرحدوں پر آباد قبائل ملک کے محافظوں کا کام دیتے ہیں۔ ان کی ناراضگی مول نہیں لی جاسکتی۔ کسی سردار کے خلاف کارروائی کرنے کا مطلب ہوگا کہ اس کے قبیلے کو بغاوت پر اکسایا جائے اور پھر بغاوت کسی ایک قبیلے کی نہیں ہوگی۔ تمام قبائلی ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ کسی بھی ملک میں قبائلی بغاوت سب سے زیادہ خوفناک سمجھی جاتی ہے۔ مخصوص جغرافیائی حالات کی بنا پر فوج بھی قبائلیوں کے خلاف مؤثر کارروائی نہیں کرسکتی۔ زیادہ نقصان فوج ہی کا ہوتا ہے اور پھر کیرن قبیلہ!" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اس قبیلے نے تو اس علاقے کی ترقی میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ بڑے سردار نے یہاں پوست کی کاشت ختم کرائی۔ اس کی دیکھا دیکھی اب دوسرے قبائل بھی پوست کی کاشت بتدریج کم کرتے چلے جارہے ہیں۔ سردار تھالوب پڑھا لکھا اور محبِ وطن آدمی ہے۔ وہ مہینے میں دو مرتبہ یہاں آتا ہے اور کبھی بھی کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ وہ ان پہاڑوں میں میلوں اندر تک چلا جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف وہ قبائلیوں کے حالات سے باخبر رہتا ہے بلکہ وہ انہیں یہ ترغیب بھی دیتا رہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ رقبے پر کارآمد فصلیں اگائیں اور پوست کی کاشت کا رقبہ بتدریج کم کرتے چلے جائیں۔ قبائلیوں کے علاوہ حکومتی مشینری کے ارکان بھی سردار تھالوب کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لیے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ پولیس اس کے کاٹیج پر چڑھ دوڑے گی۔ کوئی مصدقہ اطلاع ملنے کے بعد بھی پولیس کو یہاں آنے سے پہلے سیکڑوں بار سوچنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے لیکن....." میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "وانگ کی کارروائی سے اندازہ ہوگیا ہے کہ یہاں جنرل کھوراٹ کے ایک دو نہیں بلکہ بہت سے ایجنٹ موجود ہیں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ تم یہاں ہو تو وہ لوگ ہلا بول دیں گے۔"

"ہمیں ان کی طرف سے کسی ممکنہ کارروائی کا قبل از وقت پتا چل جائے گا۔" وانگ ڈن نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے شہر میں سب کچھ جاننے کے بعد سب سے پہلے یہی بندوبست کیا تھا۔ اس کاٹیج کے چاروں طرف کم از کم بیس محافظ موجود ہیں جو کسی بھی قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کو تیار ہیں۔"

"لیکن مجھے تو کاٹیج کے آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آیا!" میں نے کہا۔

"ہر شخص کاٹیج سے کم از کم سو گز کے فاصلے پر ہے اور پودوں میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ بالکل قریب سے گزرنے والا بھی کوئی شخص اسے نہیں دیکھ سکتا۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "لیکن کسی مشتبہ شخص کو علاقے میں دیکھتے ہی مخصوص سگنل کے ذریعے سب کو اس کی اطلاع ہوجائے گی۔"

میں غیر ارادی طور پر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا لیکن ظاہر ہے مجھے وانگ ڈن کا کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وانگ ڈن قریب تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا اور پھر فون پر بات کرتے ہوئے وہ ایک دم مؤدب ہوگیا۔ وہ قبائلی زبان میں بات کررہا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ شاید اس کے کسی آدمی کا فون ہوگا جو کوئی اہم اطلاع دے رہا تھا لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ چیانگ رائے سے تھالوب کی کال تھی۔

"تمہارے دونوں ساتھی چیانگ رائے سے روانہ ہوچکے ہیں۔" وہ فون کا ریسیور رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "انہیں چیانگ رائے سے نکلے ہوئے ایک گھنٹا ہوچکا ہے اور میرا خیال ہے انہیں یہاں پہنچنے میں مزید ایک گھنٹا لگے گا۔ تمہیں معلوم ہی ہے، راستہ کتنا پُرپیچ اور خطرناک ہے۔ اتنا وقت تو لگ ہی جائے گا۔"

"کیا وہ اکیلے ہیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"سردار تھالوب نے ان کی حفاظت کے لیے تین گن مین بھی ساتھ بھیجے ہیں۔" وانگ ڈن نے جواب دیا۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ تھائی اور پرساد ساڑھے نو بجے سے پہلے یہاں نہیں پہنچیں گے۔

نو بجے لوما نے میز پر کھانا لگادیا۔ ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ لوما اسی طرف کھڑا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔ ڈیڑھ دو منٹ تک بات کی پھر وانگ ڈن کو اشارہ کیا۔ لوما کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلانے لگی۔

وانگ ڈن اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس چلا گیا اور لوما کے ہاتھ سے ریسیور لے کر بات کرنے لگا۔ وہ قبائلی زبان میں بات کررہا تھا جس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن ایک دو منٹ بعد اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اب وہ چیخ چیخ کر فون پر بات کررہا تھا پھر اس نے ریسیور پٹخ دیا اور تیز لہجے میں لوما سے کچھ کہنے لگا۔ بات ختم کرکے وہ میز کی طرف آنے کے بجائے باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ شاید اس کاٹیج پر حملہ ہونے والا تھا اور وانگ ڈن کے کسی آدمی نے پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ رنگولی اور جانکی بھی متوحش نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے کھانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر وانگ ڈن کے پیچھے دوڑا۔

وانگ ڈن اس دوران میں لان کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے جنگل کی طرف رخ کرکے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر منہ پر رکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ غالباً کسی ایسے جانور کی آواز تھی جو اسی نواح میں پایا جاتا تھا۔ اس نے تین چار مرتبہ اس آواز کو دہرایا۔ جواب میں مختلف اطراف سے ایسی ہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

وانگ ڈن واپس مڑا ہی تھا کہ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"او۔ باس تم....."

"کیا بات ہے وانگ؟" میں نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا "اس کاٹیج پر پولیس ریڈ کرنے والی ہے یا جنرل کھوراٹ کے آدمی حملہ کرنے والے ہیں؟"

"اگر ایسی کوئی اطلاع ہوتی تو میں اتنا بدحواس نہ ہوتا۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔ شاید تم....." وہ خاموش ہوگیا۔

"خاموش کیوں ہوگئے۔ بتاؤ نا کیا بات ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھتی جارہی تھی۔

"چیانگ رائے سے آنے والی ہماری جیپ پر حملہ کردیا گیا ہے اور....."

"کیا.....؟" میں اچھل پڑا۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں ہتھوڑے برسنے لگے "کہاں حملہ ہوا ہے۔ کیا وہ لوگ.....؟"

"تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔" وانگ ڈن نے کہا "چیانگ رائے سے آنے والی سڑک پر اس قصبے کی پہلی چیک پوسٹ سے نصف میل دور جیپ پر دو اطراف سے شدید فائرنگ کی گئی۔ حملہ آور فرار ہوچکے ہیں۔ چیک پوسٹ کے محافظ فائرنگ کی آواز سن کر اس طرف گئے تھے۔ انہوں نے ہماری جیپ پہچان لی اس لیے مجھے

فون کردیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو وانگ۔" میں تقریباً چیخ اٹھا۔

وانگ ژن کے جواب دینے سے پہلے ہی پانچ چھ آدمی تاریکی سے نکل کر ہماری طرف آگئے۔ وہ سب قبائلی تھے۔ ان کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور ہر ایک کے سینے پر دونوں طرف سے کراس کرتے ہوئے گولیوں سے بھرے ہوئے بیلٹ تھے۔ وانگ ژن نے تیز لہجے میں ان سے کچھ کہا اور وہ دوڑتے ہوئے کاٹیج کے اطراف میں پھیل گئے۔ وانگ ژن بھی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں سن کر رنگولی اور جانکی بھی کھانا چھوڑ کر برآمدے میں آگئی تھیں۔ ان کے قریب ہی لوما بھی رائفل لیے کھڑا تھا۔ وانگ ژن نے اس کے ہاتھ سے رائفل لی اور جیپ کی طرف بڑھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا وانگ۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے باس۔" وانگ ژن نے کہا۔ "وہاں پولیس پہنچ چکی ہوگی۔ اگرچہ یہاں کا کوئی پولیس والا تمہیں پہچانتا نہیں ہے لیکن تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر وہ ٹھٹک جائیں گے۔"

"جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا "وہ لوگ نجانے کس حال میں ہوں گے اور میں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا۔"

وانگ ژن نے میری طرف دیکھا پھر رائفل میرے ہاتھ میں تھما دی اور چیخ کر لوما سے کچھ کہا۔ لوما کاٹیج کی طرف دوڑ گیا۔ رنگولی اور جانکی دوڑتی ہوئی ہمارے قریب آگئیں۔ انہیں کسی گڑبڑ کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ان دونوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھار کردی۔

"ہائی وے پر جھڑپ کی اطلاع ملی ہے۔ ہم وہیں جارہے ہیں۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں یہ کہتے ہوئے جیپ کی طرف بڑھ گیا۔

لوما دوسری رائفل لے آیا تھا۔ وانگ ژن نے رائفل سنبھالی اور جیپ کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا اور پھر اس نے جیپ اس تیزی سے گھمائی تھی کہ ٹائروں کے نیچے سلپ ہونے والی بجری مشین گن سے نکلی ہوئی گولیوں کی طرح چاروں طرف اڑنے لگی۔

وانگ ژن خطرناک حد تک تیز رفتاری سے جیپ چلا رہا تھا۔ مین روڈ پر پہنچ کر تو اس نے رفتار اور بھی بڑھا دی۔ سڑکوں پر اس وقت ٹریفک تھا۔ کئی مرتبہ حادثہ ہوتے ہوتے بچا تھا لیکن اس نے رفتار کم نہیں کی۔

قصبے سے نکل کر چیانگ رائے کی طرف جانے والی ہائی وے پر پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے وہ جیپ کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کررہا ہو۔

چیک پوسٹ پر اسے جیپ روکنی پڑی تھی۔ چیک پوسٹ پر محافظ اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس وقت وہاں صرف دو تھے۔ وانگ ژن ان سے تیز لہجے میں بات کرنے لگا۔ ان میں سے ایک نے جلدی سے آگے بڑھ کر بیریئر اٹھا دیا اور وانگ ژن نے جیپ ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ جائے واردات پر پہنچنے میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وانگ ژن نے زور سے بریک لگائے تھے کہ فضا ٹائروں کی چرچراہٹ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔

وہ ایک بند جیپ تھی جو سڑک سے ہٹ کر آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ چیک پوسٹ کے دو محافظ رائفلیں لیے جیپ کے قریب کھڑے تھے۔ میں اور وانگ ژن اپنی جیپ سے اتر کر اس جیپ کی طرف دوڑے۔ وانگ ژن نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس جلتی رہنے دی تھیں اور اس کی روشنی میں دوسری جیپ کو دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ جیپ چاروں طرف سے چھلنی ہوچکی تھی۔ تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ جیپ کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر اس طرح گرا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں اندر تھیں اور سر باہر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ چہرے اور سینے پر کئی گولیاں لگی تھیں۔ خون آلود چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر گن مین تھا۔ اس کا جسم بھی چھلنی تھا۔ وہ آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکا ہوا تھا۔ رائفل اس کے پیروں کے قریب پڑی تھی۔

پیچھے کا دروازہ کھولتے ہی مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شریانوں میں خون جیسے اچھلنے لگا۔ میں نے بہت لاشیں دیکھی تھیں۔ کئی لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ انہیں اپنے سامنے تڑپتے اور دم توڑتے ہوئے دیکھا مگر ایسا روح فرسا منظر آج تک میری نظروں سے نہیں گزرا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔

جیپ کے پچھلے حصے میں چار لاشیں نیچے اوپر پڑی ہوئی تھیں۔ دو گن مین تھے۔ ایک کا چھلنی جسم آدھا سیٹ پر تھا اور آدھا نیچے۔ اس کے نیچے دوسرا گن مین دبا ہوا تھا اور اس کے نیچے پرساد۔ جس کی ایک ٹانگ نیچے تھی اور دوسرا پیر سیٹ پر ٹکا ہوا تھا اور سب سے نیچے تھائی تھی جس کی صرف ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ دونوں گن مینوں کے جسم چھلنی تھے۔ پرساد کے جسم پر بھی کئی سوراخ نظر آرہے تھے۔ تھائی ان سب کے نیچے دبی ہوئی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اسے کتنی گولیاں لگی تھیں۔

میں نے وانگ ژن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ اپنے قریب کھڑے ہوئے محافظ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ تھائی زبان میں باتیں کررہے تھے اس لیے میں بھی سمجھ رہا تھا۔

"فائر کی آواز سنتے ہی ہم تین آدمی جیپ پر اس طرف

"محافظ کہہ رہا تھا "یہاں یہ صورتِ حال دیکھی تو ایک محافظ کو بھیج دیا تاکہ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی جاسکے۔ ہم دونوں یہیں رک گئے۔ میرا خیال ہے کہ حملہ آور یہاں سڑک کے دونوں طرف گھات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ جیپ جیسے ہی یہاں پہنچی، دونوں طرف سے بیک وقت فائرنگ شروع کردی۔ جیپ میں موجود کسی گن مین کو جوابی کارروائی کا موقع نہیں مل سکا ہوگا۔ مجھے حیرت ہے کہ گولیاں لگنے کے بعد ڈرائیور نے جیپ روک کیسے لی تھی۔"

"شاید فائر کی آواز سنتے ہی اس نے بریک دبا دیا تھا اور اس کے بعد اس کا جسم چھلنی ہوگیا۔" وانگ ژن نے کہا۔

ہم اطلاع ملنے پر شہر کی دوسری طرف سے یہاں آگئے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ پولیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی حالانکہ پولیس ہیڈ کوارٹر شہر کے تقریباً وسط میں تھا۔ میں یہی بات سوچتا ہوا ایک بار پھر جیپ کے پچھلے حصے کی طرف چلا گیا اور سڑک پر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

سڑک کافی کشادہ تھی۔ اس کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرح اٹھان تھی اور یہ ٹیلے سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ تقریباً دس گز پیچھے ان ٹیلوں میں ایک کٹاؤ سا تھا۔ میں اس کٹاؤ تک چلا گیا۔ یہ ایک غیر ہموار پتھریلا راستہ تھا جس پر ایک کار یا جیپ آسانی سے چل سکتی تھی۔

وانگ ژن کی جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی اور پھر اس کٹاؤ کے قریب پڑی ہوئی کوئی چیز چمکتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ چیز اٹھالی۔

وہ اے کے فائیو سیون چینی رائفل کا ایک خالی کارتوس تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس جگہ گولیوں کے لاتعداد خول بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ حملہ آوروں نے یہیں پر گھات لگا کر جیپ پر فائرنگ کی ہوگی۔ جلد ہی مجھے سڑک کی دوسری طرف بھی ایسی ہی جگہ نظر آگئی۔ وہاں بھی گولیوں کے لاتعداد خول بکھرے ہوئے تھے اور اس طرف بھی ایک تنگ سا راستہ تھا جو ڈھلان کی طرف چلا گیا تھا۔ میں پھر پہلی جگہ پر آگیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ حملہ آور اسی راستے سے کار یا جیپ پر فرار ہوئے تھے۔

میں دوبارہ جیپ کے قریب آگیا اور اس میں نیچے اوپر پڑی ہوئی لاشوں کو دیکھنے لگا۔ ان لاشوں سے خون اتنا زیادہ بہہ چکا تھا کہ جیپ کے فرش سے ٹپک کر سڑک پر بھی جم رہا تھا۔

تھائی اور پرساد کی موت کا جتنا مجھے دکھ پہنچا تھا وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ تھائی میری محسنہ تھی۔ میں وہ وقت نہیں بھلا سکتا جب بنکاک کے ایک بازار میں موت کے فرشتوں سے بچنے کے لیے میں اس کی کار میں چھپ گیا تھا اور وہ مجھے اپنے گھر لے گئی تھی۔ مجھے پناہ دے کر اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ بلکہ سب کچھ لٹا دیا تھا اور وہ جس بے بسی کی موت مری تھی اس پر میرا دل رو رہا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے اور نیچے اوپر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں بری طرح چونک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے تھائی کے ایک پیر میں حرکت ہوئی ہو۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا لیکن نہیں، یہ میرا وہم نہیں تھا۔ تھائی کے ایک پیر میں واقعی بہت آہستہ آہستہ حرکت ہورہی تھی۔ میں نے وانگ ژن کو آواز دی اور جیپ پر چڑھ گیا۔

ہم دونوں نے دونوں محافظوں اور پرساد کی لاشوں کو اٹھا کر سیٹوں پر ڈال دیا۔ تھائی فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا لباس اور چہرہ خون سے تر تھا۔ میں نے تھائی کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے دل کی دھڑکن محسوس ہورہی تھی۔

"تھائی.... تھائی.... آنکھیں کھولو...." میں اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے اسے پکارنے لگا۔

میں نے وانگ ژن کی مدد سے تھائی کو جیپ سے نکال کر سڑک کے کنارے گھاس پر لٹا دیا۔ میں تھائی کے جسم کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اس کا لباس اگرچہ خون سے تر تھا لیکن جسم پر بظاہر کوئی زخم نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس کی ٹی شرٹ اوپر تک اٹھا کر پیٹ وغیرہ کو بھی دیکھا اور پھر اسے پلٹ دیا۔ اس کی پشت پر بھی کوئی زخم نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ سیدھا کردیا۔

دونوں محافظ بھی اس وقت ہمارے قریب ہی کھڑے تھے۔ میں نے وانگ ژن کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"تھائی زندہ ہے۔ اسے کوئی گولی بھی نہیں لگی لیکن اس کا پولیس کے ہاتھ لگنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اسے یہاں سے لے جانے کا بندوبست کرو۔"

بات وانگ ژن کی سمجھ میں آگئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور چیخ چیخ کر محافظوں سے کچھ کہنے لگا پھر میں نے اور وانگ ژن نے تھائی کو اٹھا کر وانگ ژن کی جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔ تھائی کے لباس سے اب بھی خون ٹپک رہا تھا۔ اس جیپ کی سیٹیں بھی آمنے سامنے تھیں۔ تھائی کو سیٹوں کے درمیان فرش پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں اس کے قریب سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وانگ ژن نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے ایک بار پھر محافظوں سے چیخ کر کچھ کہا اور جیپ کو تیز رفتاری سے شہر کی طرف دوڑا دیا۔

چیک پوسٹ کے پاس صرف ایک منٹ کو جیپ روکنا پڑی تھی۔ وانگ ژن کو دیکھتے ہی ایک محافظ نے بیریئر اٹھا دیا تھا۔ دوسرا محافظ وانگ ژن سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وانگ ژن نے تیز تیز لہجے میں کچھ کہا اور جیپ آگے بڑھا دی۔

"پولیس ابھی تک نہیں پہنچی حالانکہ انہیں اسی وقت اطلاع دے دی گئی ہوگی۔" میں نے وانگ ژن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔" وانگ

ڈن نے جواب دیا "تمہاری دوست کو اسپتال لے کر چلیں یا ....؟"
"کاٹیج!" میں نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی "تھائی زخمی نہیں ہے۔ اسے اسپتال لے جانا مناسب نہیں ہے۔ کاٹیج ہی لے چلو۔"

شہر کی سڑکوں پر اب زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ وانگ ڈن کو تیز رفتاری سے جیپ چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

کاٹیج پہنچے تو تھائی اس وقت تک بھی ہوش میں نہیں آئی تھی۔ جیپ رکتے ہی رنگولی اور جانکی بھی اندر سے نکل کر برآمدے میں آگئی تھیں۔ میں نے اور وانگ ڈن نے تھائی کو اٹھا کر جیپ سے نکالا تو تھائی کو خون میں لت پت دیکھ کر جانکی اور رنگولی کے منہ سے چیخیں نکل گئی تھیں۔

تھائی کو ہال میں لے جا کر قالین پر لٹا دیا گیا۔ رنگولی اور جانکی کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"کک.... کیا ہوا اسے۔ پرساد کہاں ہے؟" جانکی نے چیخ کر پوچھا۔

"تھائی بالکل ٹھیک ہے لیکن پرساد...." میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

جانکی چیخ اٹھی۔ وہ تھائی سے لپٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرے اشارے پر رنگولی اسے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

وانگ ڈن فون پر بات کر رہا تھا اور میں ایک بار پھر تھائی کو لوٹ پلٹ کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے واقعی کوئی گولی نہیں لگی تھی اور یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی اور پھر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

اس جیپ کی پچھلی سیٹیں بھی آمنے سامنے تھیں۔ پہلی گولی چلتے ہی ڈرائیور نے بدحواس ہو کر بریک لگایا ہوگا تو تھائی جھٹکا لگنے سے سیٹ سے نیچے گر گئی ہوگی اور پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اسی دوران میں جیپ پر گولیوں کی بوچھار ہوگئی اور پرساد اور دونوں محافظ چھلنی ہو کر تھائی کے اوپر گرے اور وہ ان کے نیچے دب گئی اور شاید خوف کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

وانگ ڈن ٹیلی فون بند کر چکا تھا اور اب وہ لوما سے باتیں کر رہا تھا۔ میں بھی اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔

"میں نے سردار تھالوب کو اطلاع دے دی ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "سردار تین چار گھنٹوں میں یہاں پہنچ جائے گا۔ میں ہائی وے پر جا رہا ہوں۔ تم تھائی کو دیکھو۔ اگر اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہو تو...."

"وہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ صرف خوف اور صدمے سے بے ہوش ہوئی ہے۔ رنگولی اور جانکی اسے ہوش میں لے آئیں گی۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"نہیں باس۔" وانگ ڈن نے کہا "پولیس وہاں پہنچ چکی ہوگی اور اب تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے معاف کردینا باس۔ اس وقت تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔"

میں سر جھٹک کر رہ گیا۔ وانگ ڈن کے جانے کے بعد دوبارہ ہال میں آگیا۔ رنگولی ایک گیلے کپڑے سے تھائی کا چہرہ، گردن وغیرہ صاف کر رہی تھی۔ ہم اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے۔

تقریباً بیس منٹ بعد تھائی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ جانکی نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا اور رنگولی نے پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ تھائی نے ایک گھونٹ پینے کے بعد گلاس ہٹا دیا۔ اسی وقت لوما ایک پیالہ لے کر آگیا۔ اس میں بنفشی رنگ کا شربت تھا۔

"یہ شربت میڈم کو پلا دو باس۔ چند منٹ میں ٹھیک ہوجائے گی۔" اس نے پیالہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

شربت سے صندل جیسی خوشبو اٹھ رہی تھی اور شاید ذائقہ بھی بہت اچھا تھا اسی لیے تھائی نے پی بھی لیا۔ لوما نے بتایا، صندل میں کچھ اور جڑی بوٹیوں کے رس کی آمیزش سے یہ شربت تیار کیا جاتا ہے۔ جو فرحت بخش ہونے کے ساتھ نہایت مقوی ہے۔ تھائی کے لیے شربت کے چند گھونٹ واقعی اکسیر ثابت ہوئے۔ چند منٹ بعد ہی اس کے حواس بحال ہونے لگے لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔

"جانکی۔" میں نے کہا "اسے باتھ روم میں لے جاؤ اور نہلا کر کپڑے تبدیل کرا دو۔"

جانکی اور رنگولی، تھائی کو سہارا دے کر کمرے میں لے گئیں۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد باہر آئی تھیں۔ تھائی کی آنکھوں میں اب بھی وحشت بھری ہوئی تھی اور خوف تو جیسے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ہماری شکلیں دیکھتی رہی۔

لوما نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے کافی بنالی۔ ہم اس وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کر رہے تھے۔ کافی پینے کے بعد تھائی نے میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جانکی قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے تھائی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

وہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ جانکی اور رنگولی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پائے ہوئے تھا۔

رو لینے سے تھائی کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہوگیا۔ اور اب وہ بات کرنے کے قابل ہوگئی تھی۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا تھائی۔ کیا وہ لوگ شروع ہی سے تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" تھائی نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کو ہمارے آنے کی اطلاع تھی اور وہ لوگ پہلے ہی سے گھات لگائے بیٹھے تھے۔"

"نہیں کیسے پتا چلا کہ تم لوگ آرہے ہو؟" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چیانگ رائے میں وانگ سائی نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ تھالوب نے ہمیں مائے کوک دریا کے کنارے ایک مکان میں منتقل کردیا تھا اور ہماری حفاظت کا بھی معقول بندوبست کردیا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وانگ سائی یا اس کے آدمی مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہیں وہاں سے ہماری روانگی کا بھی پتا چل گیا تھا اور انہوں نے یہاں ہمارے بارے میں دارا وغیرہ کو فون پر اطلاع دے دی۔ ہم پر فائرنگ سے تقریباً پندرہ منٹ پہلے پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار نے ہمیں اوور ٹیک کیا تھا۔ اس کار میں ڈرائیور کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور وہ ڈرائیور وانگ سائی تھا۔ وہ کار خطرناک حد تک تیز رفتاری سے آگے نکل کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نے محافظوں کو وانگ سائی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ محتاط تو ہوگئے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ وہ اکیلا تھا اور ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی حماقت نہیں کرے گا۔

"اور پھر جب ہم اس جگہ پر پہنچے تو اچانک ہی فائرنگ شروع ہوگئی۔" تھائی رک رک کر بتا رہی تھی "پہلی گولی اگلے ٹائر پر لگی تھی۔ ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔ جیپ بری طرح لہرا گئی۔ ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگا دیا۔ زوردار جھٹکا لگنے سے میں سیٹ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور سیٹوں کے درمیان فرش پر محافظوں کے پیروں میں گر گئی۔

"اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتی، سڑک کے دونوں طرف سے شدید فائرنگ شروع ہوگئی۔ میرا خیال ہے، فائرنگ سب مشین گنوں سے کی جارہی تھی۔ ایک تسلسل کے ساتھ دونوں طرف سے جیپ پر گولیاں برسائی جارہی تھیں۔ فائرنگ اور چیخوں کی آوازوں کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی اور پھر شاید پرساد چیختا ہوا میرے اوپر گرا تھا۔ اسے پتا نہیں کتنی گولیاں لگی تھیں۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون مجھے بھی تر کرنے لگا۔ میں اسے اپنے اوپر سے ہٹانا چاہتی تھی کہ دونوں گن مین بھی چیختے ہوئے میرے اوپر ڈھیر ہوگئے۔ میں ان تینوں کے نیچے پوری طرح دب گئی تھی۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے گن مین اور ڈرائیور کی چیخیں بھی سنی تھیں۔

"فائرنگ تقریباً پانچ منٹ تک ہوتی رہی اور پھر یکایک خاموشی چھا گئی۔ گمبیر سناٹا.... مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میں زندہ کسی قبر میں دفن ہوگئی ہوں۔ میرے اوپر تین لاشوں کا بوجھ تھا اور میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر اپنے اوپر سے وہ بوجھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگی لیکن پھر اچانک دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن کر میں نے اپنی یہ کوشش ترک کردی اور سانس بھی روک لیا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھرا تھا کہ حملہ آوروں نے سب کو ختم کردیا ہے۔ مجھے زندہ پا کر وہ مجھے بھی چھلنی کردیں گے۔ میں ان لاشوں کے نیچے بے حس و حرکت پڑی رہی۔

"قدموں کی وہ آوازیں جیپ کے قریب رک گئیں۔ وہ کئی آدمی تھے۔ ان میں سے شاید دو جیپ کے اوپر سے گھوم کر پچھلی طرف آگئے تھے پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا گیا۔

"میں جن لاشوں کے نیچے دبی ہوئی تھی ان میں سب سے اوپر والے محافظ کے جسم میں شاید زندگی کی رمق باقی تھی۔ غالباً اس کے جسم کے کسی حصے میں کوئی حرکت پیدا ہوئی تھی کیونکہ اسی وقت باہر سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی "یہ ابھی زندہ ہے۔ ختم کردو اسے۔" پھر میرے سر کے عین اوپر گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ اگر رائفل کی نال کا رخ ذرا نیچے کی طرف ہوتا تو گولیاں مجھے بھی چاٹ جاتیں۔ یہ سب کچھ چند منٹ میں ہوگیا اور اس قدر اچانک ہوا تھا کہ ہمارے محافظ کو اپنی جگہ سے حرکت کرنے کا موقع تک نہیں مل سکا تھا اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں اور کسی کار کا انجن اسٹارٹ ہونے اور اس کے روانہ ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت تک میرے حواس ساتھ چھوڑتے جارہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیلتی چلی گئی لیکن وہ آواز جس نے چیخ کر کہا تھا "یہ ابھی زندہ ہے۔ ختم کردو اسے" میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ وہ آواز تو اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"

"کون تھا وہ۔ کس کی آواز تھی وہ؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"دارا۔" تھائی نے جواب دیا "وہ دارا کی آواز تھی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔"

میں اچھل پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کاٹیج سے فرار کے بعد دارا نے کوئی اور ٹھکانا تلاش کرلیا تھا اور وہاں سے چیانگ رائے والوں سے بھی رابطہ کیا ہوگا اور وانگ سائی نے اسے تھائی اور پرساد کے بارے میں بتایا ہوگا۔

تھائی کا یہ خیال بالکل درست تھا کہ چیانگ رائے میں ان کی مسلسل نگرانی کی جارہی تھی اور جب تھائی اور پرساد محافظوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوئے تھے تو وانگ سائی سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں چیانگ سائین آرہے ہیں۔ اس نے فون پر دارا کو ان کی روانگی کی اطلاع دے دی۔ ان میں یقیناً یہ طے ہوگیا تھا کہ دارا اور اس کے ساتھی سڑک پر کسی جگہ گھات لگا کر بیٹھیں گے۔

دارا کو اطلاع دینے کے بعد وانگ سائی نے بھی تھائی کی جیپ کا تعاقب شروع کردیا اور پھر ان سے آگے نکل کر طے شدہ جگہ پر گھات لگائے بیٹھے دارا اور اس کے ساتھیوں کو بتا دیا کہ اس کے بعد جو جیپ آئے گی وہی ان کا ٹارگٹ ہوگی۔

دارا اور اس کی پارٹی کو میں پچھلے کئی روز سے پے در پے نقصان پہنچا رہا تھا اور ظاہر ہے، وہ میرے یا میرے ساتھیوں کے خلاف کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنا اس کے لیے ذرا مشکل تھا۔ آج صبح تو میں اس کے قابو میں آگیا تھا لیکن

رنگولی کی وجہ سے نہ صرف میں اور جانکی وغیرہ بچ گئے بلکہ دارا وغیرہ کو اپنی جانیں بچا کر بھاگنا پڑا۔ کم ہمارے ہاتھ لگ گیا تھا لیکن بعد میں وہ بھی حیرت انگیز طور پر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ کم فرار ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو سکا تھا یا کہیں اور پناہ لیے ہوئے تھا۔ بہرحال' دارا کو تھائی اور پرساد پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ پرساد تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا لیکن تھائی کی ابھی زندگی باقی تھی۔ وہ بچ گئی۔

میرے خیال میں دارا نے اس جیپ پر حملہ کرکے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ وہ جیپ اس علاقے کے سب سے بڑے قبیلے کیرن کے سردار کی تھی۔ تھائی اور پرساد اس کے مہمانوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ پرساد کے علاوہ اس کے تین گن مین اور ڈرائیور بھی مارا گیا تھا۔ تھالوب ایک بااثر سردار تھا۔ اس کی جیپ پر حملہ' اس کے چار آدمیوں اور ایک مہمان کی ہلاکت کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ وانگ ڈن نے سردار تھالوب کو اس واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور وہ چیانگ رائے میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر یہاں آنے کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔

پرساد کی اندوہناک موت کا ہم سب کو افسوس تھا۔ تھائی کی حالت بھی بہت بُری تھی۔ اس نے صرف پرساد کو ہی نہیں' چار اور آدمیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے گولیوں سے چھلنی ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ زندگی کے خوفناک ترین تجربے سے گزری تھی اور اس کا اثر اب بھی اس کے ذہن پر تھا۔ کسی وقت بات کرتے کرتے وہ یک دم چونک جاتی یا اپنی جگہ سے اچھل پڑتی۔

میرے خیال میں تھائی کو سکون کی ضرورت تھی اور نیند اس کے لیے بہترین مددگار ثابت ہو سکتی تھی لیکن وہ صوفے پر بیٹھی متوحش نظروں سے کبھی ہمیں اور کبھی اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ میں نے لوما سے کسی ایسی چیز کے بارے میں دریافت کیا جس سے تھائی کو نیند آسکے۔

"افیون۔" لوما نے کہا "اسے تھوڑی سی افیون کھلا دی جائے۔ وہ آرام سے سوجائے گی۔"

لوما کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ افیون بھی لوما ہی نے فراہم کی تھی۔ تھائی کو اگرچہ بہت کم مقدار میں افیون دی گئی تھی مگر اس کے کڑوے ذائقے سے تھائی کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے مگر اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد تھائی پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے جانکی کو اشارہ کیا۔ وہ اسے اٹھا کر کمرے میں لے گئی۔

اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے مگر وانگ ڈن کی طرف سے ابھی تک کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ سردار تھالوب پہنچ چکا ہوگا لیکن میرے خیال میں وہ پولیس یا انتظامیہ کے دیگر حکام کے ساتھ اس قدر مصروف ہوں گے کہ انہیں ہمیں فون کرنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں نے اٹھ کر کمرے میں جھانکا۔ تھائی گہری نیند سو چکی تھی اور جانکی اسی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر دراز تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

پرساد کی موت نے ہم سب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہمارے ساتھی ایک ایک کرکے بچھڑ رہے تھے۔ پہلے کانگ ان کے ہاتھوں مارا گیا پھر پاتھم ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا اور پیڈرو کے آدمیوں نے اسے اسپتال سے اغوا کرلیا تھا۔ اب اس کی زندگی کی بھی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی پھر نوچا' خون خوار بھیڑیوں کی درندگی کا شکار ہوئی اور اب پرساد۔ ان پے درپے صدمات نے جانکی اور تھائی پر زیادہ اثر کیا تھا۔ اثر مجھ پر بھی ہوا تھا لیکن میں رو کر اس کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

جانکی نے میری طرف دیکھا.... مگر میں کوئی بات کیے بغیر دروازے سے ہی لوٹ آیا اور ہال میں رکنے کے بجائے باہر آکر لان میں بیٹھ گیا۔ برآمدے کا بلب بجھا ہوا تھا۔ باہر تاریکی تھی۔ میں نے کاٹیج کے اطراف میں کئی سایوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ وہ قبائلی گارڈ تھے جو وانگ ڈن کاٹیج کی حفاظت کے لیے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ قبائلی محافظ ان کے علاوہ تھے جو کاٹیج سے دور جنگل میں پھیلے ہوئے تھے۔

مجھے اس وقت عجیب سی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر لان میں ٹہلنے لگا۔ میں چشمِ تصور سے بار بار وہ منظر دیکھنے لگتا۔ تباہ حال جیپ اور اس میں پڑی ہوئی گولیوں سے چھلنی لاشیں۔ جیپ اور ان لاشوں کو دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ فائرنگ کس قدر شدید تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ تھائی واقعی خوش قسمت تھی جسے معمولی سا گزند بھی نہیں پہنچا تھا۔

اور پھر دارا کا خیال میرے ذہن میں اُبھر آیا۔ عجیب بات تھی کہ وہ جب بھی میرے ہاتھ آیا' بچ نکلا تھا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے ہمیشہ دوسروں کو آگے کیا تھا۔ اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اب کسی خاص حکمتِ عملی کی ضرورت تھی۔

میں دارا کے بارے میں سوچتا ہوا ماضی میں چلا گیا۔ بات میرے ماں باپ کے قتل سے شروع ہوئی تھی۔ اس وقت میں بچ گیا تھا اور دارا جیسے دشمن سے جان بچانے کے لیے چھپتا پھرا تھا۔ مہاراج نے مجھے اس قابل بنا دیا کہ میں اپنے دشمن کا مقابلہ کرسکوں۔ اگرچہ میں نے بہت عرصے سے دارا کو کہیں نکلنے نہیں دیا تھا۔ اس کے کئی بندے میرے ہاتھوں مارے گئے تھے لیکن اسے ان آدمیوں کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ اس کے اپنے آدمی نہیں تھے۔ بھاڑے کے ٹٹو تھے۔ اس کی نظروں میں انسان اور کتے کا مرجانا ایک برابر تھا لیکن میں دارا نہیں تھا۔ مجھے اپنے آدمیوں سے اُنس تھا' پیار تھا اور دارا کی وجہ سے میرے تین دوست اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

میرے دل میں شروع ہی سے دارا کے خلاف انتقام کا جذبہ تھا لیکن اب انتقام کے ساتھ ایک مقصد بھی شامل ہوگیا تھا۔ شہنشاہ کے خلاف ایک بہت خوفناک سازش ہو رہی تھی جس میں حکومت کے کچھ لوگ بھی شریک تھے۔ اس سازش کو کامیاب بنانے کے لیے دارا اور پیڈرو جیسے لوگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس علاقے میں کسی جگہ کوئی ایسی خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی جس میں تھائی حکومت کے سازشی افسروں کے علاوہ جنرل کھوراٹ کی شمولیت بھی متوقع تھی اور مہاراج نے مجھے یہ ذمے داری سونپی تھی کہ میں نہ صرف اس میٹنگ میں طے پانے والے منصوبے کا پتا چلاؤں بلکہ حکومت کے ان سازشی عناصر کو بھی بے نقاب کردوں۔

لیکن یہاں آکر معاملہ کچھ مختلف نوعیت اختیار کرگیا تھا۔ ثانگ سمیت جنرل کھوراٹ کے نہ صرف چار پانچ آدمی میرے ہاتھوں مارے جاچکے تھے بلکہ اس کا اسلحے کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تباہ ہوگیا تھا اور جنرل کھوراٹ نے ایک طرف تھائی حکومت کو دھمکی دی تھی اور دوسری طرف میری گرفتاری کے لیے پانچ لاکھ امریکی ڈالر کے انعام کا اعلان بھی کردیا تھا۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں جب تک زندہ ہوں' ان کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا اور اسی دوران دارا وہ کارروائی کر گزرا تھا جس سے پرساد کی موت کی صورت میں مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا لیکن مجھے یہ نقصان بہر صورت برداشت کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس سازش کو بھی ناکام بنانا تھا جس کے لیے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ اس رات بنکاک کے واٹ ٹریمٹ میں مہاراج اور شہنشاہ کے کزن رتنا کوسن کے ساتھ ہونے والی میٹنگ میں ان دونوں نے مجھے واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اس مشن کے دوران میں مجھے ان لوگوں کی طرف سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا' اپنے طور پر کرنا ہوگا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ چیانگ رائے میں پہلے رنگولی اور پھر اس کے توسط سے سردار تھالوب جیسے شخص سے ملاقات ہوگئی تھی۔ میں نے اگرچہ تھالوب کو اپنے اصل مشن کے بارے میں نہیں بتایا تھا لیکن ہیروئن کی تجارت کے حوالے سے میرے نظریات سے وہ سو فیصد متفق تھا اور اس نے مجھے ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی جس کے نتیجے میں ہم پچھلے تین چار روز سے اس کاٹیج میں موجود تھے اور اس کا معتمد خاص وانگ ڈن میرے ساتھ پوری طرح ان سرگرمیوں میں ملوث ہوگیا تھا اور آج دارا کی اس خوفناک کارروائی کے بعد تو مجھے یقین ہوگیا تھا کہ جب میں تھالوب کو اپنے اصل مشن کے بارے میں بتاؤں گا تو وہ پوری طرح میرا ساتھ دے گا۔ وہ ایک محبِ وطن آدمی تھا اور شہنشاہ کا خیر خواہ بھی۔

میں صبح چار بجے تک لان میں بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اندر آگیا۔

رنگولی صوفے پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل کے قریب کرسی پر لوما بھی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ اٹھ گیا۔

"دروازہ بند کردو۔ میں سونے جا رہا ہوں۔" میں لوما سے یہ کہتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل پڑا لیکن دروازے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ تھائی اور جانکی بیڈ پر سوئی ہوئی تھیں۔ میں اس کمرے میں آگیا جہاں رنگولی اور جانکی سویا کرتی تھیں۔

بیڈ پر لیٹنے کے بعد بھی میں بہت دیر تک موجودہ صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اس بات کی بھی تشویش تھی کہ وانگ ڈن نے کوئی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔

میری آنکھ صبح آٹھ بجے مختلف آوازیں سن کر کھلی تھی۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے لگا۔ جب میں کمرے سے باہر نکلا تو وانگ ڈن کے ساتھ رنگولی اور جانکی بھی بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ میرے کرسی پر بیٹھنے کے چند منٹ بعد ہی لوما نے میرے سامنے بھی چائے کا کپ رکھ دیا۔ باہر سے بھی آوازیں آرہی تھیں۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ لان میں گھاس پر سات آٹھ مسلح قبائلی بیٹھے ہوئے تھے۔ وانگ ڈن کی جیپ کے پیچھے دو چھوٹے پک اپ ٹرک بھی کھڑے تھے۔ میں مڑ کر سوالیہ نگاہوں سے وانگ ڈن کی طرف دیکھنے لگا۔

"محافظ ہیں۔" وانگ ڈن نے میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا "سردار تھالوب کی جیپ پر فائرنگ اور اس کے بندوں کے مارے جانے کی اطلاع صبح سویرے آس پاس کی قبائلی بستیوں میں پھیل گئی تھی۔ اس وقت شہر میں سیکڑوں مسلح قبائلی موجود ہیں جو تھالوب کے ایک اشارے کے منتظر ہیں مگر سردار تھالوب اس معاملے کو کوئی سیاسی ایشو نہیں بنانا چاہتا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اس واقعے کی خبر رات ہی کو بنکاک بھی پہنچ گئی تھی اور اب سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے چند اعلیٰ سرکاری حکام بھی ہیلی کاپٹر سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انہیں اندیشہ تھا کہ سردار تھالوب حکومت کے لیے کوئی مسئلہ نہ کھڑا کردے کیونکہ حکومت قبائلی بغاوت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ آج دس بجے ان اعلیٰ حکام کی سردار تھالوب سے میٹنگ ہے۔ سردار نے تمہیں بھی بُلایا ہے۔"

"مجھے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ سردار تھالوب کے خیال میں اس میٹنگ میں تمہاری شرکت بھی ضروری ہے۔ ہم ساڑھے نو بجے یہاں سے چلیں گے۔" وانگ ڈن نے کہا۔

"رات کو کیا ہوا۔ کچھ پتا چلا کہ حملہ آور کون تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وانگ ڈن نے نفی میں سرہلایا "پولیس کی کئی

پارٹیاں رات ہی کو حملہ آوروں کی تلاش میں روانہ ہوگئی تھیں۔ شہر کے آس پاس کی بستیوں کو بھی چیک کیا جارہا ہے لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"پولیس حملہ آوروں کا سراغ نہیں لگا سکی لیکن مجھے پتا چل گیا ہے کہ وہ کون لوگ تھے؟"

"کیا واقعی؟" وانگ ڈن نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "کون تھے وہ لوگ؟"

"دارا اور اس کے ساتھی۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" وانگ ڈن اچھل پڑا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ تھائی اس حملے میں زندہ بچ گئی تھی اور ہم اسے یہاں لے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

"اوہ۔" وانگ ڈن کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "اسے تو واقعی میں بھول ہی گیا تھا۔ کیسی ہے وہ؟"

"ٹھیک ہے۔ اس وقت سو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر جیپ پر حملے کے حوالے سے اسے وہ سب کچھ بتانے لگا جو تھائی مجھے بتا چکی تھی۔

"کیا تھائی کو یقین ہے کہ وہ دارا ہی کی آواز تھی؟" میرے خاموش ہونے پر وانگ ڈن نے پوچھا۔

"بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں زندگی بھر نہیں بھلایا جاسکتا۔ کسی کا کہا ہوا کوئی جملہ، کوئی چہرہ یا کوئی آواز۔" میں نے جواب دیا "کچھ ہی عرصہ پہلے کنچن بوری میں تھائی ایک ایسی ٹریجڈی سے دوچار ہو چکی ہے جس کی تمام تر ذمے داری دارا پر عائد ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تھائی کا گھر جلانے میں بھی دارا ہی کا ہاتھ تھا۔ کئی برسوں سے دارا سے آنکھ مچولی ہو رہی ہے۔ قدم قدم پر اس کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکراتی رہی ہے۔ میں یا تھائی یا میرے ساتھیوں میں سے کوئی اور اس آواز کو کیسے بھول سکتا ہے۔ وہ یقیناً دارا ہی تھا جس نے اپنے ساتھیوں کو جمع کرکے جیپ پر حملہ کیا تھا اور اسے تھائی اور پرساد کی آمد کی اطلاع دینے والا وانگ سائی تھا۔ جس کے بارے میں، میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت بھی شہر میں آزادی سے گھوم رہا ہوگا۔"

"وانگ سائی کون؟" وانگ ڈن نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"پیڈرو کا ایک گرگا۔" میں نے جواب دیا "ایک آدھ مرتبہ بنکاک میں اس سے بھی ٹکراؤ ہو چکا ہے لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی مگر اب لگتا ہے کہ اسے ایک خاص مہرے کے طور پر آگے بڑھایا جارہا ہے۔"

"حملہ آور کوئی بھی ہو، بچ کر نہیں جاسکے گا اور وانگ سائی کو بھی تلاش کرلیا جائے گا۔ بہرحال، تم تیار ہو جاؤ۔ سردار تھالوب انتظار کر رہا ہوگا۔" وانگ ڈن نے کہا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ تھائی اس وقت بھی سو رہی تھی۔ میں باتھ روم میں گھس گیا اور پندرہ منٹ بعد جب میں باہر نکلا تو تھائی جاگ چکی تھی اور بستر پر لیٹی ویران ویران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ میں بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور تھائی سے باتیں کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں ہال میں پہنچا تو لوبا میز پر ناشتہ لگا رہا تھا۔ میں نے جانگی کو تھائی کے بارے میں بتا دیا اور وانگ ڈن کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔

ٹھیک ساڑھے نو بجے ہم کاٹیج سے نکل رہے تھے۔ میں وانگ ڈن کے ساتھ جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دو گن مین پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ ایک پک اپ جیپ کے آگے تھی اور ایک پیچھے۔ ان دونوں گاڑیوں میں قبائلی محافظ تھے جو بڑے چوکس نظر آ رہے تھے۔

سارا شہر بند تھا۔ کہیں بھی کوئی دکان کھلی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ سردار تھالوب کے آدمیوں کی ہلاکت کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پورے شہر میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ کسی ممکنہ ہنگامے کے پیشِ نظر لوگوں نے اپنا کاروبار بند رکھا تھا۔ شہر کی مختلف سڑکوں پر مسلح قبائلی ٹولیوں کی صورت میں نظر آرہے تھے۔ یہ آس پاس کی بستیوں کے رہنے والے قبائلی تھے جو تھالوب کی جیپ پر حملے کی خبر سن کر شہر میں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ ان میں نہ صرف کیرن بلکہ دوسرے قبائل کے لوگ بھی شامل تھے اور قبائلیوں کے اس اجتماع نے بھی لوگوں پر خوف و ہراس طاری کردیا تھا۔

ہماری جیپ ایک کشادہ سڑک پر واقع ایک کوٹھی کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ کوٹھی کے سامنے سڑک پر سیکڑوں مسلح قبائلی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ آنے والے محافظوں کی دونوں گاڑیاں بھی گیٹ کے باہر سڑک پر ہی رک گئی تھیں۔

کاٹیج کی طرح اس کوٹھی کے گرد بھی وسیع رقبہ خاردار تاروں میں گھرا ہوا تھا۔ کوٹھی بہت شان دار تھی۔ ہم جیپ سے اتر کر جیسے ہی برآمدے میں پہنچے، سردار تھالوب باہر آگیا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے بڑے احترام سے اندر لے گیا۔

ڈرائنگ روم میں دو آدمی اور بھی تھے۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ تعارف کی رسم کے بعد ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔ وانگ ڈن صوفے کے قریب کھڑا رہا تھا۔

میں نے اور تھالوب نے مناسب الفاظ میں ایک دوسرے سے تعزیت کا اظہار کیا۔ تھالوب کو اس بات پر شرمندگی تھی کہ اس کے آدمی مہمانوں کی حفاظت نہیں کرسکے تھے اور خود بھی موت کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔

"اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔" میں نے کہا "ان پر گھات لگا کر حملہ کیا گیا تھا۔ اگر فوج کا دستہ بھی ہوتا تو شاید اس کا بھی یہی حشر ہوتا۔"

"حملہ آور جو کوئی بھی ہیں بچ کر نہیں جاسکیں گے۔" سردار

تھالوب نے کہا۔ "پولیس پارٹیاں اگرچہ ان کی تلاش میں ہیں لیکن میرے آدمی بھی چاروں طرف پھیل چکے ہیں۔ اس قسم کی چھاپا مار کارروائیاں کرنے والے عام طور پر آس پاس کی پہاڑیوں میں روپوش ہوجاتے ہیں اور کسی نہ کسی قبائلی بستی میں انہیں پناہ مل جاتی ہے لیکن ان لوگوں کو کسی بستی میں بھی پناہ نہیں مل سکے گی۔"

"میرا خیال ہے، انہیں کسی بستی میں پناہ لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق جنرل کھوراٹ نے بھی ان پہاڑیوں اور جنگلوں میں بہت سے خفیہ اڈے بنا رکھے ہیں۔ انہیں کہیں بھی پناہ مل سکتی ہے اس لیے کہ حملہ آوروں کا تعلق اسی گروپ سے ہے۔"

"کیا یہ بات محض اندازے کی بنا پر کہہ رہے ہو یا۔۔۔؟"

"میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "حملہ آوروں کو دارا لیڈ کر رہا تھا۔ اسے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ تھائی اور پرساد تمہاری جیپ میں یہاں آرہے ہیں۔ وہ گھات لگائے بیٹھے تھے اور جیسے ہی جیپ وہاں پہنچی، اس پر سڑک کے دونوں طرف سے گولیوں کی بارش کردی گئی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تھائی کی فراہم کردہ اطلاعات کی روشنی میں اسے بتانے لگا کہ جیپ پر حملہ کس طرح ہوا تھا۔

سردار تھالوب نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا پھر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ ہم دارا، پیڈرو اور جنرل کھوراٹ کے حوالے سے گفتگو کرتے رہے۔ میں باتوں ہی باتوں میں تھالوب کو تولنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے اصل مشن کے بارے میں آگاہ کرنا مناسب ہوگا کہ نہیں۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وانگ ڈن نے جلدی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔ ایک دو منٹ تک کسی سے بات کی اور پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر سردار تھالوب سے کچھ کہنے لگا۔ اس نے تھالوب سے اپنی زبان میں بات کی تھی۔ تھالوب نے بھی کچھ جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس دوران میں وانگ ڈن نے فون پر کچھ کہہ کر ریسیور رکھ دیا تھا۔

"باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت میٹنگ میں ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔"

"کیا میرا میٹنگ میں جانا ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں۔" تھالوب نے جواب دیا۔

اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے حالانکہ میٹنگ کے لیے گیارہ بجے کا وقت مقرر تھا۔ وہ دونوں آدمی بھی ہمارے ساتھ تھے۔ پورٹیکو میں تھالوب کی سلور کلر کی شان دار مرسیڈیز کار بھی کھڑی تھی۔ میں اور وہ دونوں آدمی تھالوب کے ساتھ اس کار میں بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ تھالوب نے سنبھال لیا تھا۔ وانگ ڈن اپنی جیپ میں سوار ہوگیا تھا۔

میٹنگ پولیس چیف کے دفتر میں تھی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ میٹنگ روم میں ناٹے قد والے پولیس چیف بنکاک سے آئے ہوئے اعلیٰ حکام اور مقامی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدے داروں کے علاوہ شہر کے چند معززین بھی شامل تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ تھالوب کی جیپ پر حملہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا۔

ہم اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہی تھے کہ پیڈرو کو دو آدمیوں کے ساتھ میٹنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ تھالوب نے بھی اسے دیکھ لیا اور میٹنگ شروع ہونے سے پہلے مطالبہ کیا کہ پیڈرو اور اس کے ساتھیوں کو میٹنگ روم سے نکال دیا جائے۔ بصورتِ دیگر وہ خود واک آؤٹ کرجائے گا اور اس کے بعد کی صورتِ حال کی ذمّے داری انتظامیہ پر ہوگی۔

عجیب صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی۔ پولیس چیف اور بنکاک سے آیا ہوا ایک افسرِ اعلیٰ پیڈرو کی حمایت کر رہا تھا لیکن سردار تھالوب نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر پیڈرو جیسے مجرم اس میٹنگ میں شریک ہوں گے تو وہ یہاں نہیں بیٹھے گا۔ بالآخر پیڈرو اور اس کے آدمیوں کو رخصت کردیا گیا۔ باہر جاتے ہوئے پیڈرو نے تھالوب اور میری طرف بڑی خوں خوار نظروں سے دیکھا تھا۔

اس میٹنگ کا مقصد سردار تھالوب کا غصہ ٹھنڈا کرنا اور کسی ممکنہ ہنگامے سے بچنے کے لیے کوئی سمجھوتا کرنا تھا۔ سردار تھالوب اس علاقے کا ایک بااثر آدمی تھا اور اسی لیے بعض اعلیٰ حکام بھی بنکاک سے یہاں پہنچ گئے تھے۔

بڑی دیر تک گرما گرم بحث ہوتی رہی۔ سردار تھالوب کا مطالبہ تھا کہ نہ صرف مرنے والوں کا معاوضہ دیا جائے بلکہ حملہ آوروں کو بھی گرفتار کرکے اس کے حوالے کیا جائے۔ اس نے دارا، کم، چی فانگ اور پیڈرو کے نام بھی دیے تھے اور میٹنگ روم میں پیڈرو کی آمد کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے بڑے وثوق سے یہ بات کہی تھی کہ پولیس چیف حملہ آوروں سے بخوبی واقف ہے۔

پولیس چیف اس الزام پر بھڑک اٹھا تھا لیکن اس سے پہلے کہ صورتِ حال بگڑ جاتی، بنکاک سے آیا ہوا ایک افسرِ اعلیٰ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر نجانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں لیکن یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

بات کرتے ہوئے اس نے گردن بائیں طرف گھمائی تو اس کے کان سے ذرا نیچے دائیں جبڑے پر انگوٹھے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبّا دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

اس رات بنکاک میں واٹ ٹریمٹ میں میٹنگ کے بعد شہنشاہ کا کزن رتنا کوسن مجھے اپنے ساتھ ایک بنگلے میں لے گیا تھا جہاں شہنشاہ کے خلاف ہونے والی اسی سازش کے بارے میں بریف کرتے ہوئے مجھے کچھ ایسے لوگوں کی تصویریں بھی دکھائی گئی تھیں

جن کے بارے میں شبہ تھا کہ ان میں سے کوئی اس سازش میں شریک ہوسکتا ہے۔۔۔انھی میں آنگ سانگ نامی اس شخص کی بھی تین تصویریں تھیں۔ ایک سامنے سے کھینچی ہوئی اور دو سائیڈ پوز۔ ایک تصویر میں اس کی دائیں طرف کان کے نیچے جبڑے پر انگوٹھے کے ناخن کے برابر سیاہ دھبا تھا۔

اور اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ وہ وزارتِ داخلہ کا سیکریٹری آنگ سانگ تھا۔

O☆O

اس میٹنگ میں سیکریٹری وزارتِ داخلہ آنگ سانگ نے سردار تھالوب سے مطالبہ کیا تھا کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو پولیس کے حوالے کردیا جائے مگر تھالوب نے صاف انکار کردیا۔

"ماسٹروجدان اور اس کے ساتھی میرے مہمان ہیں اور تم جانتے ہو کہ ہم قبائلی مہمانوں کا کس قدر احترام کرسکتے ہیں۔ ہم ان کے لیے اپنی جان تو دے سکتے ہیں مگر ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کرسکتے۔" سردار تھالوب نے کہا "ماسٹروجدان اور اس کے ساتھی قانون شکن نہیں ہیں۔ اب تک انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے، اپنے دفاع میں کیا ہے۔ اپنی جان بچانے کا حق ہر ایک کو حاصل ہے اور پھر ان کے خلاف پورے ملک میں کہیں بھی ایسی کوئی باقاعدہ رپورٹ درج نہیں ہے جس کی بنا پر انہیں قانون کی گرفت میں لینے کی کوشش کی جائے۔"

"سردار تھالوب۔" پولیس چیف نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "کل صبح جنرل کھوراٹ کے ایک کاٹیج کو آگ لگا کر راکھ کردیا گیا جس میں اس کا کروڑوں ڈالر مالیت کا اسلحہ بھی تباہ ہوگیا اور تم جانتے ہو ہم اس سرحد تک جنرل کھوراٹ جیسے شخص سے پنگے بازی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔"

"جنرل کھوراٹ۔" تھالوب غرایا "اسے تم جیسے لوگ ہی یہاں قدم جمانے کے مواقع فراہم کررہے ہیں۔ اسے یہاں اپنے اڈے بنانے کی اجازت کس نے دی۔ کیا یہاں گولہ بارود جمع کرنے کے لیے اس نے تھائی حکومت سے اجازت لی تھی۔ یہ گولہ بارود قانون کے محافظوں کی نظروں میں آئے بغیر یہاں تک کیسے پہنچا؟ اور پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس ہٹ کی تباہی میں میرے مہمانوں کا ہاتھ ہے؟"

"اس سے ایک رات پہلے ایک کاٹیج میں فانگ پھن اور اس کے دو ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔" پولیس چیف نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "فانگ پھن، جنرل کھوراٹ کا آدمی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ۔۔۔"

"تم جانتے ہو کہ وہ جنرل کھوراٹ کے آدمی تھے اور یہاں ان کی آمدورفت غیر قانونی تھی لیکن تم نے ان کے خلاف اب تک کوئی کارروائی کیوں نہیں کی تھی حالانکہ یہ تمہارا فرض تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ تم نے بدنامِ زمانہ تھرڈ ریٹ غنڈے پیڈرو کو اس میٹنگ میں مدعو کرلیا جو یہاں جنرل کھوراٹ کے ایجنٹ کی حیثیت سے ہمارے ملک میں منشیات کا زہر پھیلا رہا ہے۔ … میں اس کے خلاف نہایت سنگین نوعیت کے مقدمات درج ہیں۔ چند روز پہلے تک وہ قانون کو موسٹ وانٹیڈ آدمی تھا۔ اسے سلاخوں کے پیچھے بند ہونا چاہیے تھا لیکن مجھے حیرت ہے کہ یکایک اس قدر اہم کیوں ہوگیا کہ اسے اس اہم میٹنگ میں بلالیا گیا۔" سردار تھالوب چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اس میٹنگ ہال میں مجھے کچھ ایسے چہرے بھی نظر آرہے ہیں جو کبھی بھی شہنشاہ یا تھائی حکومت سے مخلص نہیں رہے۔ مجھے کسی سازش کی بو آرہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اب تک جو بھی واقعات رونما ہوئے ہیں وہ اس سازش کا حصہ ہیں۔ میری جیپ پر فائرنگ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے لیکن میں آپ سب لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس خطے میں جب تک ایک بھی کیرن قبائلی زندہ ہے، شہنشاہ یا تھائی حکومت کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ صرف کیرن ہی نہیں یہاں پر یاؤ، اکو، لاہو اور لیو جیسے وفادار اور بہادر قبیلے بھی آباد ہیں۔ ان قبائلیوں نے ماضی میں ہمیشہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں اور وہ آئندہ بھی کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔" سردار تھالوب ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ باری باری ان کے چہروں کو دیکھتا رہا پھر بولا "اس وقت شہر کی سڑکوں پر جمع ہزاروں مسلح قبائلی میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں لیکن میں یہاں کی پولیس اور انتظامیہ کے لیے مسئلے پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میرا صرف ایک مطالبہ ہے۔ حملہ آوروں اور قاتلوں کو چھتیس گھنٹوں کے اندر اندر گرفتار کیا جائے۔ میں نے ان میں سے کچھ نام بھی پولیس چیف کو دے دیے ہیں۔ ان میں دارا وہ شخص ہے جس نے پہلے ٹائیگر اور اب پیڈرو جیسے لوگوں کو اپنے مہرے بنا کر اس ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے اور اب میرے خیال میں اسے کچھ بد دیانت اور بے ضمیر سرکاری افسروں کی بھی حمایت حاصل ہوگئی ہے۔ میں نے ان کی گرفتاری کے لیے چھتیس گھنٹوں کی مہلت دی ہے۔ میں دی ہوئی اس مہلت کے آخری سیکنڈ تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد میرے آدمی انہیں خود تلاش کریں گے اور اگر کوئی ناخوشگوار واقعہ ہوا تو اس کی ذمے داری انتظامیہ پر ہوگی۔"

سردار تھالوب کی تقریر کے دوران میں، میں وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ تھالوب نے جب شہنشاہ کے خلاف کسی سازش کی بات کی تھی تو آنگ سانگ اور ایکی مائی کے چہروں کے رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوگئے تھے۔ ایکی مائی بھی حکومت کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھی اور آنگ سانگ وغیرہ کے ساتھ بنکاک سے آئی تھی۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر سے کم

از کم دس سال چھوٹی لگتی تھی۔ وہ بے حد حسین عورت تھی اور اسے دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

پولیس چیف کی حالت تو قابلِ دید تھی۔ سردار تھالوب نے اعلیٰ افسران کی موجودگی میں اس پر سنگین نوعیت کے الزام لگائے تھے اور وہ آئیں بائیں شائیں کرکے رہ گیا تھا۔

یہ میٹنگ تین گھنٹوں ... تک جاری رہنے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تھی۔ اعلیٰ حکام بنکاک سے اس لیے آئے تھے کہ یہ ایک بڑے قبائلی سردار کا معاملہ تھا۔ سرحدوں پر آباد قبائل چھوٹی چھوٹی باتوں پر بغاوت کر دینے کے عادی تھے اور قبائلیوں کی بغاوت کسی بیرونی حملے سے زیادہ خطرناک ہوتی تھی۔ ان علاقوں کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے بالآخر حکومت ہی کو گھٹنے ٹیکنے پڑتے تھے اور یہ معاملہ تو ایک بڑے قبیلے کا تھا اور حکومت جانتی تھی کہ اگر کوئی گڑبڑ شروع ہوئی تو اس خطے میں آباد دوسرے چھوٹے قبائل بھی کیرن کا ساتھ دیں گے اس لیے سردار تھالوب کی جیپ پر حملے کی اطلاع ملتے ہی اعلیٰ حکام بنکاک سے یہاں پہنچ گئے تھے۔

اسے اتفاق کہا جائے یا باقاعدہ پلاننگ کہ بنکاک سے آنے والے حکام میں وزارتِ داخلہ کا سیکریٹری آنگ سانگ بھی شامل تھا جس پر شہنشاہ کے خلاف سازش میں شریک ہونے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس جگہ سازشیوں کی' جنرل کھوراٹ یا اس کے کسی خاص نمائندے سے خفیہ میٹنگ ہونے والی تھی اور پیڈرو اور دارا وغیرہ جیسے خطرناک آدمیوں کی آمد بھی اسی سلسلے میں تھی۔

ہو سکتا ہے' آنگ سانگ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے باقاعدہ پلاننگ کے تحت حکام کے وفد کے ساتھ یہاں آیا ہو کہ اس آڑ میں اس خفیہ میٹنگ میں بھی شریک ہو جائے گا لیکن سردار تھالوب کے ساتھ مقامی انتظامیہ کی اس میٹنگ میں سردار تھالوب کی تقریر نے اسے یقیناً پریشان کر دیا تھا۔

تھالوب کی' شہنشاہ کے خلاف سازش والی بات نے مجھے بھی چونکا دیا تھا۔ اس نے کچھ اور چہروں کا بھی حوالہ دیا تھا۔ ان لوگوں پر تھالوب کی باتوں کا جو اثر ہونا تھا وہ تو ہوا لیکن میرے لیے تھالوب کی یہ باتیں تائیدِ غیبی ثابت ہوئی تھیں۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سردار تھالوب شہنشاہ کا حامی اور محبِ وطن تھا اور میں اپنے مشن کے بارے میں کھل کر اس سے بات کر سکتا تھا۔

واپسی پر سردار تھالوب نے مرسیڈیز اپنی کوٹھی کے گیٹ میں لے جانے کے بجائے سڑک پر روک لی۔ اس کے دونوں آدمی وہاں اتر گئے اور تھالوب نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس مرتبہ سفر کا اختتام ہمارے کاٹیج پر ہوا تھا۔

اندر آکر سردار تھالوب نے سب سے پہلے تھائی سے ملاقات کی۔ اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے تھائی سے گزشتہ رات والے افسوسناک واقعے کی تفصیلات بھی معلوم کی تھیں۔

سردار تھالوب رنگولی سے بھی اسی طرح ملا تھا جس طرح اس نے تھائی اور جانگی سے ملاقات کی تھی لیکن یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ رنگولی کو سامنے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

جانگی وغیرہ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ سردار تھالوب کا پہلے ہی یہاں آنے کا پروگرام تھا اور وانگ ڈن نے فون پر لوما کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایات دے دی تھی۔ کھانا تیار تھا۔

کھانے کے بعد میں سردار تھالوب کے ساتھ ایک الگ کمرے میں بیٹھ گیا اور اسے اپنے اصل مشن کے بارے میں بتانے لگا۔

"تو میرا شبہ درست تھا۔" وہ میرے خاموش ہونے پر بولا "میں کئی ہفتوں سے چیانگ رائے میں اور یہاں کچھ پُراسرار سرگرمیاں محسوس کر رہا ہوں۔ تین ہفتے پہلے میں نے ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کو چیانگ رائے میں جنرل کھوراٹ کے ایک خاص آدمی سین فوتنگ سے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اس رات گولڈن ٹرائی اینگل ہوٹل میں ایک بہت بڑی پارٹی تھی اور اس پارٹی میں بنکاک سے تعلق رکھنے والے اس سرکاری آفیسر کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ سرکاری آفیسر ایک حسین لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سین فوتنگ بھی ان کی میز پر آگیا۔ وہ لڑکی اٹھ کر کسی دوسری میز پر چلی گئی تھی۔ سین فوتنگ اور اس سرکاری آفیسر میں دیر تک سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ وہ لڑکی دوبارہ ان کی میز پر آگئی اور پھر پارٹی ختم ہونے سے پہلے ہی وہ لڑکی سرکاری آفیسر کو لے کر ہال سے باہر چلی گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے ان دونوں کو پارکنگ میں کھڑی ایک کار میں بیٹھتے دیکھا۔ کار کا انجن اسٹارٹ ہونے سے پہلے ہی سین فوتنگ بھی کسی طرف سے نمودار ہوا اور کار میں بیٹھ گیا اور اس کے بعد کار روانہ ہو گئی۔ اس وقت میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آئی تھی۔ کرپشن تو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ شاید ہیروئن کی اسمگلنگ کے حوالے سے جنرل کھوراٹ کی طرف سے اس سرکاری آفیسر کو کوئی رشوت پیش کی گئی تھی۔

"اس کے ایک ہفتے بعد میں نے اسی سرکاری آفیسر کو یہاں بھی دیکھا اور پھر کچھ اور لوگ بھی پُراسرار سرگرمیوں میں مصروف نظر آئے۔ اس وقت میرے ذہن میں شبہ پیدا ہوا تھا کہ شہنشاہ یا حکومت کے خلاف کسی سازش کے تانے بانے تو نہیں بُنے جا رہے؟ اور آج کی میٹنگ میں بھی میں نے اس سرکاری آفیسر کو دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر ہی میرے ذہن میں کسی سازش کا خیال آیا تھا اور اب تم نے آنگ سانگ کے بارے میں بتایا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میرے شبہات درست نکلے لیکن تم فکر مت کرو۔ جب تک میرے قبیلے کا ایک فرد بھی زندہ ہے یہاں شہنشاہ کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

"ہمیں ان لوگوں پر نگاہ رکھنی ہو گی۔" میں نے کہا "آنگ سانگ کی یہاں آمد خالی از علت نہیں ہو سکتی لیکن میں نے نوٹ کیا تھا کہ تمہاری باتوں کے دوران میں وہ چونک سا گیا تھا۔ اب وہ لوگ یقیناً محتاط ہو جائیں گے لیکن مجھے شبہ ہے کہ ہماری توجہ کسی اور طرف ہٹا کر وہ لوگ اپنا کام کر گزریں گے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ بہرحال' اب میں چلتا ہوں۔ کوئی خاص بات ہو گی تو میں تمہیں خبر کر دوں گا۔"

سردار تھالوب چلا گیا۔ وانگ ڈن یہیں رہ گیا تھا۔

اور پھر اسی رات سردار تھالوب کا فون آگیا۔ اس وقت گیارہ بجنے والے تھے۔ اس نے بتایا کہ آنگ سانگ' اکی مائی اور ان کا وہ ساتھی جسے تھالوب نے سین فوتنگ سے ملاقاتیں کرتے دیکھا تھا' شام سے کچھ دیر بعد اس کے پاس آئے تھے اور بقول آنگ سانگ انہوں نے پیڈرو کو حراست میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن دوپہر کو میٹنگ ہال سے جانے کے بعد وہ روپوش ہو گیا تھا۔ آنگ سانگ نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مانگی ہے اور یہ وعدہ لیا ہے کہ میں اس دوران میں اپنے قبائلیوں کو قابو میں رکھوں گا اور کوئی ایسا ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہونے دوں گا جس سے امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جائے۔

"ایک اور خاص بات" تھالوب کہہ رہا تھا "آنگ سانگ نے فوری طور پر پولیس چیف کو معطل کر کے حراست میں لے لیا ہے۔ میں نے اس پر جو الزامات لگائے تھے ان کی بھی تحقیقات ہوں گی۔ الزامات ثابت ہو جانے کی صورت میں اسے لمبی مدت کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں جانتا ہوں یہ سب کچھ دکھاوے کے لیے ہے تاکہ میں مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر واقعی شہنشاہ کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے تو پولیس چیف بھی اس میں شریک ہو گا۔"

"صد فیصد یہی بات ہے" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "پولیس چیف نے جب پیڈرو کی حمایت کی تھی تو مجھے اسی وقت اس پر شبہ ہو گیا تھا۔ صرف پولیس چیف ہی نہیں' میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پیڈرو کو آنگ سانگ جیسے اعلیٰ حکام کی بھی آشیرباد حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس طرح آزادی سے دندناتا ہوا نظر نہ آتا۔ اب وہ روپوش ہو گیا ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ لوگ اس کے ٹھکانے سے واقف ہیں۔"

"میں تم سے اتفاق کرتا ہوں" تھالوب نے جواب دیا "میں انہیں ایک ہفتے کی مہلت دے چکا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس دوران میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔ میرے آدمی حرکت میں آگئے ہیں۔ وہ ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں گے۔ اس کے ساتھ ہی پیڈرو کی تلاش بھی شروع کر دی ہے۔"

"ان میں سے کسی کا ملنا بہت ضروری ہے" میں نے کہا۔

"فکر مت کرو۔ ہمیں جلد ہی کامیابی حاصل ہو گی اور ہاں۔" سردار تھالوب نے رک کر کہا "میں نے اپنے قبیلے والوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ لوگ اپنی اپنی بستیوں کو واپس چلے جائیں۔ اب چونکہ ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے اس لیے میں اپنے قبیلے کو اس میں ملوث نہیں کرنا چاہتا لیکن اگر ضرورت پڑی تو وہ لوگ چند منٹ کے نوٹس پر واپس بھی آسکتے ہیں۔ ایک بات اور.... تم لوگ اگر چاہو تو شہر میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہو۔ میرے محافظ ہر وقت تمہارے آس پاس رہیں گے۔"

"تھینک یو تھالوب" میں نے جواب دیا اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا۔

تھالوب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ درپردہ کوئی بہت اونچا کھیل' کھیلا جا رہا تھا اور اس کھیل میں کچھ ایسے کھلاڑی بھی شامل تھے جن کے ناموں کا انکشاف طوفان اٹھا سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب ہم پہلی مرتبہ گھومنے کی نیت سے شہر میں نکلے۔ کل کی طرح آج مجھے سڑکوں پر مسلح قبائلیوں کی ٹولیاں نظر نہیں آئیں۔ بازار بھی کھلے ہوئے تھے اور چہل پہل بھی تھی لیکن غیر ملکی سیاحوں کی تعداد بہت کم تھی۔

میں جیپ میں وانگ ڈن کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹوں پر تھائی' جانگی اور رنگولی کے ساتھ دو گن مین تھے۔ محافظوں کی ایک گاڑی ہمارے آگے تھی اور ایک پیچھے۔

وانگ ڈن نے شاید پہلے ہی سے پروگرام طے کر رکھا تھا کہ ہمیں کہاں کہاں جانا ہے۔ محافظوں کی اگلی گاڑی ایک ایسی سڑک پر مڑ گئی تھی جو بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔

یہ تقریباً پانچ سو فٹ اونچی پہاڑی تھی جو اوپر سے بالکل ہموار تھی اور یہاں بہت خوبصورت دو تین ریسٹورنٹس بنے ہوئے تھے جن کے سامنے کھلی جگہ تھی اور چٹان کے کنارے پر آہنی پائپوں کا حفاظتی جنگلا لگا ہوا تھا اور اس سے آگے عمودی ڈھلان تھی۔ نشیب میں بہت دور دریائے کھام ریور نظر آ رہا تھا۔ یہی دریا آگے جا کر دریائے میکانگ سے مل جاتا تھا جہاں سے گولڈن ٹرائی اینگل کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

بڑا خوبصورت منظر تھا۔ کھلی جگہ پر رنگین بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ناؤنوش میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ حفاظتی جنگلے کے قریب کھڑے نشیب میں پھیلے ہوئے ساگوان کے جنگل اور اس سے آگے دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے دریا کا دلفریب منظر دیکھ رہے تھے۔

ہم لوگ جیپ سے اُتر کر پارکنگ سے دور حفاظتی جنگلے کے پاس اس کی چھتری کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ محافظ پارکنگ میں اپنی گاڑیوں ہی میں بیٹھے رہ گئے تھے۔ وانگ ڈن ہمیں یہاں فرائی فش کھلانے کے لیے لایا تھا۔ چند منٹ بعد ہی ایک خوبصورت ویٹریس آرڈر لینے کے لیے پہنچ گئی۔ اس کی رنگت اگرچہ کسی قدر سانولی تھی لیکن چہرے کے نقوش بہت پُرکشش تھے۔ وانگ ڈن نے نہ صرف ہم سب کے لیے بلکہ محافظوں کے لیے بھی فرائی فش کا آرڈر دے دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہماری باری آسکی تھی۔ مچھلی واقعی بے حد لذیذ تھی۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ مچھلی کا آخری ٹکڑا اس کے منہ میں تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے تھے اور آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ میں سمجھا... شاید اس کے حلق میں کانٹا اٹک گیا ہے۔

"وہ۔ وہ اس طرف...." تھائی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ اونچی نہیں تھی" وانگ سائی۔ سرخ شرٹ والا۔ ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہے۔"

میں نے گردن گھما کر تھائی کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ ہم سے تقریباً پچاس گز دور حفاظتی ریلنگ کے آخری سرے پر ایک شخص کھڑا نشیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دراز قامت صحت مند آدمی تھا۔ اس نے سرخ شرٹ اور سفید پینٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر گولف کیپ تھی۔ اس کا چہرہ مجھے سائڈ سے نظر آرہا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

"چیانگ رائے میں یہی ہماری نگرانی کررہا تھا اور جب ہم روانہ ہوئے تھے تو ہماری جیپ کا تعاقب بھی اسی نے کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی وہاں آکر کھڑا ہوا ہے" تھائی نے کہا۔

ہمارے اور اس کے درمیان اگرچہ درجنوں میزیں حائل تھیں، لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ لیکن جس طرح تھائی نے اسے دیکھا تھا وہ بھی ہمیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم نے کرسیاں اس طرح موڑلیں کہ اگر وہ اس طرف دیکھے بھی تو اس کی نظر ہمارے چہروں پر نہ پڑ سکے۔

وانگ سائی کا انداز ایسا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ اس نے ایک دو مرتبہ اس طرف بھی دیکھا تھا لیکن ہم اس کی نظروں سے محفوظ ہی رہے تھے۔ میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

• "یہاں میں اس پر ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ کیا تمہارے محافظوں میں کوئی ایسا ہے جو اس کا تعاقب کرکے اس کے ٹھکانے کا پتا چلا سکے؟"

"محافظ صرف گولی چلانا جانتے ہیں۔ کسی میں اتنی عقل نہیں کہ اس کی نگرانی کرسکے۔ لیکن میں اس کا بندوبست کرتا ہوں" وانگ ڈن نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس ویٹریس کو اشارے سے بلالیا جس نے ہمیں سرو کیا تھا۔

"یس مسٹر وانگ!" ویٹریس نے مسکرا کر پوچھا۔ نام سے پکارنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ وانگ ڈن کو جانتی تھی۔

وانگ ڈن نے جیب سے پانچ ہزار بھات کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمادیا اور آنکھ سے وانگ سائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔

"اس ریڈ شرٹ والے کے قریب رہ کر اس کی نگرانی کرکے اس کے ٹھکانے کا پتا چلانا ہے۔ اس کے لیے تم کچھ بھی کرسکتی ہو لیکن اسے شبہ نہ ہونے پائے کہ تمہارا اصل مقصد کیا ہے۔ وہ کہیں چلا نہ جائے۔ دو تین منٹ کے اندر اندر تمہیں اس کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ جاؤ۔ بل کی فکر مت کرو۔ یہ پانچ ہزار بھات تمہارے ہیں۔ میں کاٹیج والے نمبر پر تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔"

اس لڑکی کا نام مائے سا تھا۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اس نے ذرا سی گردن گھما کر وانگ سائی کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئی۔

مائے سا کی واپسی میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اسے دیکھ کر ایک لمحے کو تو میں پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ اس نے ریسٹورنٹ کا ڈریس اتار کر اپنا لباس پہن لیا تھا اور چہرے کا میک اپ بھی درست کرلیا تھا۔ منی اسکرٹ اور منی بلاؤز میں وہ قیامت ہی لگ رہی تھی۔ کندھے پر لومڑی کی کھال کا پرس بھی لٹکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند منٹ پہلے وہ ویٹریس کی حیثیت سے گاہکوں کو سرو کررہی تھی۔ وہ حفاظتی ریلنگ کی طرف جارہی تھی اور اکیلے بیٹھے ہوئے مرد اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

مائے سا، وانگ سائی سے تقریباً پندرہ گز دور ریلنگ کے قریب اس جگہ کھڑی ہوگئی جہاں چند عورتیں اور مرد پہلے ہی کھڑے تھے۔ اس نے ایک عورت کو باتوں میں بھی الجھالیا تھا۔ وہ انہی کی ساتھی لگ رہی تھی۔ وہ لوگ نشیب میں دیکھتے اور باتیں کرتے ہوئے آگے کی طرف سرکتے جارہے تھے یا مائے سا انہیں سرکنے پر مجبور کررہی تھی۔ بالآخر وہ لوگ ریلنگ کے قریب سے ہٹ گئے۔ مائے سا وہاں اکیلی رہ گئی تھی۔ وانگ سائی سے اس کا فیصلہ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ ریلنگ کے پائپ پر دونوں بازو ٹکائے دریا کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر میں نے وانگ سائی کو ریلنگ کے ساتھ ساتھ اس کی طرف سرکتے ہوئے دیکھا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کررہے تھے۔ میں دل ہی دل میں مائے سا کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

دس منٹ گزر گئے۔ ان دونوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ان میں پرانی شناسائی ہو۔ وانگ سائی اس سے چپک کر کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ریلنگ کے پائپ پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس نے مائے سا کی کمر میں حائل کررکھا تھا۔

وانگ سائی اس سے باتیں کرتے ہوئے ہر منٹ بعد مڑ کر اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیتا تھا۔ میں بڑی گہری نظروں سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ اسے واقعی کسی کا انتظار تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نیلے رنگ کی ایک کار پارکنگ میں آکر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر عورت کے سوا اس کار میں کوئی نہیں تھا۔ عمر چالیس سے اوپر ہونے کے باوجود وہ خاصی حسین تھی۔ وہ کار میں بیٹھی اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر اتر کر نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی ریلنگ کے قریب چلی گئی۔

وانگ سائی نے بھی اس عورت کو دیکھ لیا تھا۔ وہ مائے سا کے ساتھ ریلنگ کے ساتھ سرکتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس عورت نے کوئی چیز وانگ سائی کے ہاتھ میں اس طرح تھمائی تھی کہ شاید قریب کھڑے ہوئے لوگ بھی نہ دیکھ سکے ہوں گے لیکن ہم چونکہ شروع ہی سے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اس لیے یہ حرکت ہماری نظروں میں آگئی۔ وہ شاید کوئی کاغذ تھا جسے وانگ سائی نے پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا تھا۔ اس کے بعد وہ عورت وہاں سے سرکتی ہوئی دوسرے لوگوں کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے بعد وانگ سائی زیادہ دیر وہاں نہیں رکا تھا۔ وہ پارکنگ کی طرف واپس آرہا تھا تو مائے سا بھی اس کے ساتھ تھی۔

اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر وہاں نہیں رکے تھے۔

مائے سا کی اب تک کی کارکردگی نہایت عمدہ رہی تھی۔ وہ وانگ سائی سے اس طرح ملی تھی کہ اسے شبہ تک نہیں ہوسکا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وانگ سائی خود اس کے قریب آیا تھا اور اب مائے سا اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ پہلا مرحلہ تو بڑی خوش اسلوبی سے طے ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کیا صورتِ حال پیش آئے گی اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

مائے سا کا تعلق بھی کیرن قبیلے سے تھا۔ وہ برما کی سرحد پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے کی رہنے والی تھی لیکن کئی سال پہلے چیانگ سائین آگئی تھی۔ ایک خوشحال گھرانے میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے حصولِ تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کردیا تھا۔ اس میں بچپن ہی سے بڑی کشش تھی۔ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی، اس کے جسم کے نشیب و فراز بھی نمایاں ہوتے گئے اور پھر جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی وہ اپنے ادھیڑ عمر آقا کی ہوس کا شکار ہوگئی۔ اس وقت اس کی عمر چودہ سال تھی۔ دوسری مرتبہ اس ہوس پرست بوڑھے نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو وہ اسے زخمی کرکے گھر سے بھاگ نکلی۔

وہ کئی روز تک اپنی ایک دوست کے گھر میں پڑی رہی لیکن یہاں بھی وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتی تھی۔ ایک روز اس کی دوست کے باپ نے شراب کے نشے میں اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ مائے سا بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہوسکی تھی۔

مائے سا دربدر کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا تھا کہ اپنے گاؤں واپس چلی جائے لیکن اب گاؤں میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ ماں باپ عرصہ پہلے اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ ایک خالہ تھی جو برما چلی گئی تھی۔ اس بستی میں اب اس کا کوئی قریبی رشتے دار بھی نہیں تھا اور پھر وہاں روزگار کا مسئلہ بھی تھا۔ وہاں کے کھیتوں کے سوا اور کہیں کام نہیں مل سکتا تھا۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں جلنا نہیں چاہتی تھی۔ یہاں شہر میں رہتے ہوئے تو اسے کئی کام مل سکتے تھے۔ وہ اچھے مستقبل کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی اور وقت گزارتی رہی۔

اب مائے سا کی عمر اکیس سال تھی۔ وہ بے حد حسین اور بھرپور جوان لڑکی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں کام مل جاتا لیکن لوگوں کی نظریں اس کے کام سے زیادہ اس کے حسن و شباب پر ہوتیں۔ وہ کئی مرتبہ دھوکے میں آکر لوگوں کی ہوس کا شکار ہوئی تھی اور اب وہ سمجھ گئی تھی کہ زندگی اسی طرح گزاری جاسکتی ہے۔ درخشاں مستقبل ایک عذاب کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اور پھر ایک روز اس کی ملاقات وانگ ڈن سے ہوگئی۔ وانگ ڈن نے بھی ایک مرتبہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھولیے تھے۔ اس کے بعد بھی کسی نہ کسی ریسٹورنٹ میں ان کا آمنا سامنا ہو ہی جاتا تھا۔ مائے سا جان چکی تھی کہ وانگ ڈن سردار تھالوب کا خاص آدمی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کی مالی مدد بھی کرتا رہتا تھا۔ تقریباً چھ ہفتے پہلے اس ریسٹورنٹ میں ملازمت بھی اسے وانگ ڈن ہی نے دلوائی تھی۔ یہاں نہ صرف تنخواہ معقول تھی بلکہ اوپر کی آمدنی بھی اچھی خاصی تھی۔

ہم لوگ جس ٹیبل پر بیٹھے تھے وہ مائے سا کی سروس میں نہیں تھی لیکن وانگ ڈن کو دیکھ کر وہ اس طرف آگئی تھی اور جب وانگ ڈن نے اسے وانگ سائی کی نگرانی کے لیے کہا تو وہ انکار نہیں کرسکی تھی۔

ریسٹورنٹ سے اٹھ کر بازار کا ایک چکر لگاتے ہوئے ہم کاٹیج واپس آگئے۔ اس وقت تک مائے سا کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

چار بج گئے۔ اب مجھے مائے سا کی طرف سے پریشانی ہونے لگی تھی۔ اگر اس کا راز فاش ہوگیا تو وہ زندہ نہیں بچے گی۔ پیڈرو جیسے سفاک لوگوں سے کسی بھلائی کی توقع نہیں تھی۔

سردار تھالوب اگرچہ اپنی شہر والی کوٹھی میں موجود تھا مگر اس نے وانگ ڈن کی خدمات ہمارے لیے وقف کردی تھیں اور وہ صبح سے ہمارے ساتھ ہی تھا اور اب تو اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے

اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا" وانگ ڈن نے کہا "ویسے تو مائے سا ذہین اور ہوشیار لڑکی ہے۔ اس نے دنیا کی اونچ نیچ دیکھی ہے لیکن اگر کسی چال میں آگئی ہو تو کچھ کہا نہیں جاسکتا۔"

ہماری پریشانی بڑھتی جارہی تھی اور پھر چھ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو وانگ ڈن نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ وہ مائے سا کی ہی کال تھی۔ وانگ ڈن نے اس کی آواز سنتے ہی ٹیلی فون کا ساؤنڈ سسٹم والا بٹن بھی دبا دیا تھا۔ اس طرح دوسری طرف سے بات کرنے والے کی آواز کمرے میں موجود دوسرے لوگ بھی سن سکتے تھے۔

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے مسٹر وانگ" مائے سا کہہ رہی تھی...... "وانگ سائی شراب لینے کے لیے باہر گیا ہے اور میں موقع پاکر تمہیں فون کررہی ہوں۔"

"ہم تو پریشان ہورہے تھے۔ اسے تم پر کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟" وانگ ڈن نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی شبہ نہیں ہوا" مائے سا نے جواب دیا "وہ مجھے مال مفت سمجھ کر اپنے فلیٹ پر لے آیا تھا اور اس وقت سے اب تک اس نے ایک لمحے کو بھی مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔"

"سوری ڈیئر۔ میری وجہ سے تمہیں یہ زحمت اٹھانی پڑی" وانگ ڈن نے کہا۔

"میں اس زحمت کی عادی ہوچکی ہوں" مائے سا نے جواب دیا۔

"اس دوران میں اس سے کوئی ملنے آیا تھا یا اس نے کسی سے رابطہ کیا ہو؟" وانگ ڈن نے پوچھا۔

"یہاں آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے کسی کو فون کیا تھا اور اس کے ایک گھنٹے بعد ایک آدمی آیا تھا۔ وانگ سائی نے اسے ایک کاغذ دیا تھا اور یہ کاغذ وانگ سائی کو ایک عورت نے بڑی رازداری سے اس وقت دیا تھا جب ہم ریسٹورنٹ کے سامنے ریلنگ کے قریب کھڑے تھے۔"

"ہم نے دیکھ لیا تھا" وانگ ڈن نے جواب دیا۔

"اس آدمی کے بعد یہاں کوئی نہیں آیا۔ البتہ ایک فون آیا تھا اور وانگ سائی نے فون کرنے والے کو مسٹر دارا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ فون پر سرگوشیوں میں باتیں کررہا تھا اس لیے میں مزید کچھ نہیں سن سکی۔ اس وقت وہ شراب لینے کے لیے باہر گیا ہے اور لگتا ہے کہ اس کے بعد رات بھر اس کا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور نہ ہی وہ مجھے جانے کی اجازت دے گا۔ ظاہر ہے، مفت میں ہاتھ آئی ہوئی چیز کو آسانی سے کون چھوڑتا ہے۔"

"تم اس وقت کہاں ہو۔ میرا مطلب ہے یہ مکان کہاں ہے جہاں سے تم بول رہی ہو!" وانگ ڈن نے پوچھا۔

"یہ مکان نہیں فلیٹ ہے" مائے سا نے جواب دیا "کولوئی روڈ پر روما‌ئی ولا نام کی ایک بلڈنگ ہے۔ یہ فلیٹ اس بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ہے۔ نمبر تو میں نہیں دیکھ سکی لیکن لفٹ سے نکلتے ہی سامنے والی راہداری میں بائیں طرف کا آخری فلیٹ ہے۔ اس راہداری میں چھ فلیٹ ہیں، تین ایک طرف، تین دوسری طرف۔ یہ بائیں طرف کا آخری کارنر والا فلیٹ ہے۔ سمجھ گئے نا....؟"

اس سے پہلے کہ وانگ ڈن کوئی جواب دیتا، فون پر ایسی آواز سنائی دی جیسے کال بیل بجائی گئی ہو۔

"وہ آگیا ہے۔ میں فون بند کررہی ہوں" مائے سا کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

وانگ ڈن نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا پروگرام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اسے اٹھانا ہے۔ آج ہی رات" میں نے جواب دیا "مائے سا کی رپورٹ سے یہ تصدیق ہوگئی ہے کہ دارا وغیرہ سے اس کا رابطہ ہے۔ ہم اس سے ان کا ٹھکانا معلوم کرسکتے ہیں۔"

"وہ آج رات فلیٹ پر ہی رہے گا۔ ہم رات کو کسی بھی وقت ریڈ کردیں گے" وانگ ڈن نے جواب دیا۔

"رومائی ولا۔ معلوم ہے یہ بلڈنگ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری زندگی اسی شہر میں گزری ہے" وانگ ڈن نے جواب دیا "میں ایک ایک عمارت کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ کب بنی.... کس کی ملکیت ہے اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ رومائی ولا نام کی یہ بلڈنگ پولیس چیف کی ملکیت ہے جو اس کی بیوی کے نام پر ہے۔ رومائی اس کی بیوی کا نام ہے۔"

"اوہ" میں واقعی چونک گیا "اس طرح میری اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ پولیس چیف ان لوگوں کی پشت پناہی کررہا ہے۔"

"ظاہر ہے" وانگ ڈن نے جواب دیا "سیاحت کے سیزن میں تو یہاں ایک چارپائی کی جگہ حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے چہ جائیکہ وانگ سائی کو فلیٹ مل گیا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ دوسرے لوگوں کے ٹھکانے کا بندوبست بھی پولیس چیف ہی نے کیا ہوگا۔"

"آج رات پتا چل جائے گا کہ دارا کا ٹھکانا کہاں ہے اور اس کا بندوبست کس نے کیا تھا" میں نے کہا۔

رات گیارہ بجے میں اور وانگ ڈن کاٹیج سے نکلے۔ ہمارے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ میرے پاس حسبِ معمول پتلون کے پائنچے کے نیچے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر اور جیب میں پستول تھا۔ وانگ ڈن کے پاس بھی پستول تھا لیکن اس نے آٹومیٹک رائفل جیپ میں رکھ لی تھی۔

کولوئی روڈ شہر کے مغرب کی طرف تھی۔ سیاحت کے سیزن میں رات بارہ ایک بجے تک شہر کی سڑکوں پر رونق رہتی تھی لیکن

پچھلے دنوں پے در پے پیش آنے والے واقعات کی وجہ سے شہر کی رونق اجڑ گئی تھی۔ بیشتر سیاح واپس جاچکے تھے اور جو اس شہر میں موجود تھے وہ رات آٹھ نو بجے ہی اپنے ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز تک محدود ہوجاتے تھے۔ اس وقت تو بیشتر شاپنگ سینٹرز بھی بند تھے البتہ ریسٹورنٹ اور نائٹ کلب وغیرہ کھلے ہوئے تھے۔ شہر اگرچہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن نائٹ کلبوں کی تعداد پچاس سے بھی زیادہ تھی۔

کئی سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد وانگ ڈن نے جیپ ایک کشادہ سڑک کے کارنر پر واقع چھ منزلہ عمارت کے ساتھ گلی میں موڑ کر تقریباً پچاس گز آگے روک لی۔ اس عمارت کا مرکزی دروازہ سڑک کی طرف تھا۔ البتہ پچھلی گلی میں بھی ایک دروازہ تھا جو زیادہ استعمال نہیں ہوتا تھا۔

اس عمارت کی پچھلی طرف کوئی بڑی عمارت نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے کاٹیجز تھے۔ انہی میں دو تین گیسٹ ہاؤس بھی تھے۔ بعض کاٹیج اور گیسٹ ہاؤسز میں روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

جیپ سے اتر کر وانگ ڈن نے دروازے لاک کردیے اور مجھے اشارہ کرتا ہوا عمارت کے عقب میں تنگ سی گلی میں داخل ہوگیا۔ عمارت کے سامنے والے دروازے پر چوکیدار موجود تھا اس لیے اس طرف سے جانا مناسب نہیں سمجھا گیا تھا۔

عقبی گلی میں دوسری طرف چھوٹے چھوٹے کاٹیج تھے جن میں سے بیشتر تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وانگ ڈن اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا عمارت کے عقبی دروازے پر رک گیا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، پہلے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر دیکھا پھر گچھے میں لگی ہوئی چابیاں ایک ایک کرکے آزمانے لگا۔ ساتویں چابی نے کام کر دکھایا۔ کلک کی ہلکی سی آواز اُبھری اور تالا کھل گیا۔

"اب دعا کرو، اندر سے کوئی بولٹ نہ لگا ہوا ہو" وانگ ڈن نے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

وہ ہینڈل کو آہستہ آہستہ گھما رہا تھا۔ دروازہ اندر سے بولٹ نہیں تھا۔ وہ آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہوکر اس نے آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔

یہ ایک تنگ سی راہداری تھی جس کے آخری سرے پر بلب روشن تھا۔ وہاں سے یہ راہداری بائیں سمت لابی کی طرف مڑ گئی تھی۔ اس طرف لفٹ بھی تھی اور اوپر جانے کے لیے کشادہ زینہ بھی لیکن ایک تنگ سا زینہ اس راہداری میں اس دروازے سے ذرا ہی آگے تھا جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔

ہم دبے قدموں سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے اور چوتھی منزل پر پہنچ کر ہم سانس لینے کو ذرا رک گئے اور پھر اس راہداری میں مڑ گئے جس میں لفٹ تھی۔ اس لفٹ کے آگے اس عمارت میں رہائش پذیر عام لوگوں کی آمدورفت کے لیے کشادہ زینہ بھی تھا۔

ہم لفٹ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ "کھٹ" سے لفٹ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت اور ایک مرد باہر نکلے۔ وہ دونوں غیرملکی سیاح تھا۔ غالباً کسی ہوٹل یا نائٹ کلب سے واپس آئے تھے۔ ہم انہیں لفٹ سے برآمد ہوتے دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے اور وہ ہمیں دیکھ کر چونک سے گئے تھے۔

"ہیلو....." میں اس عورت کی طرف دیکھ کر مسکرادیا۔

"ہیلو۔" وہ عورت بھی مسکرادی۔

دروازہ بند ہوچکا تھا اور لفٹ نیچے جارہی تھی۔ اس عورت کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی جب کہ اس کا ساتھی چالیس کے لگ بھگ تھا۔ وہ دونوں اس راہداری میں چلتے ہوئے دائیں طرف دوسرے دروازے کے سامنے رک گئے۔ عورت نے اپنے بیگ میں سے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور دونوں اندر داخل ہوگئے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس عورت نے ایک بار پھر مسکرا کر ہماری طرف دیکھا تھا۔

میں اور وانگ ڈن آگے بڑھتے رہے۔ بائیں طرف آخری دروازے کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ راہداری کے اختتام پر سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں تین فٹ اونچی منڈیر تھی۔ اس کھلی جگہ سے باہر دور تک کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ تاریکی میں کہیں کہیں چمکتی ہوئی روشنیاں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔

وانگ ڈن نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اندر بجنے والی بیل کی آواز ایسی تھی جیسے چڑیا چہچہا رہی ہو۔ دو مرتبہ گھنٹی بجانے کے بعد اندر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"کون ہے!"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر وانگ ڈن کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دروازے کی طرف رخ کرکے سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"میں ہوں چی فانگ۔ دروازہ کھولو وانگ سائی۔" میں نے چی فانگ کے لہجے کی نقل اتارنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور اس میں کامیاب بھی رہا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے اندر سے بولٹ ہٹائے جانے کی آواز سنائی دی اور پھر دروازہ کھل گیا۔

"چی فانگ تم اس....."

وانگ سائی میرا چہرہ دیکھ کر جملہ مکمل نہیں کرسکا۔ اس کا چہرہ دھواں ہوگیا اور اس نے بڑی پھرتی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے کندھے سے دروازے کو زوردار دھکا دیا اور اندر داخل ہوتے ہی اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وانگ سائی لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے کراہ خارج ہوگئی تھی۔

وانگ ڈن نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کردیا۔ وانگ سائی جسم کے نچلے حصے پر چادر لپیٹے ہوئے تھا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کیا کررہا ہوگا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تھرتھر کانپنے لگا۔

میرے پہلے ہی گھونسے نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں برتی جائے گی۔

"لڑکی کہاں ہے؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"اس.... کمرے میں....." وہ اشارہ کرتے ہوئے ہکلایا "میں نے اس کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کی۔ وہ اپنی مرضی سے آئی تھی۔"

"چلو۔ تم بھی اسی طرف چلو۔" میں نے اسے دھکا دیا۔

جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو مائے سا کپڑے پہن رہی تھی۔ کال بیل کی آواز سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ وانگ سائی کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔

وانگ سائی کے کپڑے بھی ایک کرسی پر پڑے ہوئے تھے۔ اس کرسی پر اس کا بغلی ہولسٹر بھی ٹنگا ہوا تھا جس سے پستول کا دستہ جھانک رہا تھا۔ وانگ سائی نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کرسی کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ وانگ ژن مجھ سے پہلے ہی حرکت میں آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اگرچہ پستول موجود تھا لیکن اس نے گولی چلانے کے بجائے اپنی ٹانگ کو حرکت دی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر وانگ سائی کی پنڈلی پر لگی اور وہ چیختا ہوا دائیں طرف پڑی ہوئی کرسی پر گرا۔ اس کا منہ کرسی کے پائے پر لگا اور ہونٹوں سے خون بہہ نکلا۔

وانگ ژن نے آگے بڑھ کر اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وانگ سائی کے جسم پر لپٹی ہوئی چادر اتر گئی۔ وہ کمرے میں لوٹ رہا تھا۔ ہر ٹھوکر پر وہ بلبلا اٹھتا۔

مائے سا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ اپنے دوسرے کپڑے اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

"م.... میں سچ کہتا ہوں کہ میں اس لڑکی کو زبردستی یہاں نہیں لایا تھا۔ وہ.... وہ خود...."

"اس لڑکی کو ہم نے تمہارے ساتھ بھیجا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "جب تم پہاڑی والے اس ریسٹورنٹ میں آئے تھے تو ہم بھی وہاں موجود تھے اور اس لڑکی کو ہم نے ہی تمہارے پیچھے لگایا تھا تاکہ تمہارا ٹھکانا معلوم کیا جا سکے۔ شام کو جب تم شراب لینے گئے تھے تو مائے سا نے فون پر ہمیں اس فلیٹ کا پتا سمجھا دیا تھا اس لیے ہم بڑی آسانی سے یہاں پہنچ گئے لیکن اب تم یہ مت کہنا کہ مجھے نہیں جانتے اور یہ کہ اس وقت تمہارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے وغیرہ وغیرہ...."

"اگر مجھے کچھ ہو گیا تو پیڈرو تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔" وانگ سائی نے کہا "بلڈنگ کے چوکیدار نے تم لوگوں کو یہاں آتے ہوئے ضرور دیکھا ہو گا۔ وہ...."

"چوکیدار کے فرشتوں کو بھی۔۔ معلوم نہیں کہ ہم اس وقت یہاں موجود ہیں۔" میں نے کہا "تم پانچ منٹ کے اندر اندر کپڑے پہن لو تو ہم یہاں سے چلیں۔ یہاں تو گھٹن ہو رہی ہے۔ شراب کی بو پھیلی ہوئی ہے۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔ ہم کسی اور جگہ پر چل کر بات کریں گے جہاں کا ماحول بھی خوشگوار ہو۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ حالانکہ میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔" وانگ سائی نے کہا۔

"تمہاری وجہ سے صرف دو دن پہلے ہمارے پانچ آدمیوں کو نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور تم پوچھتے ہو کہ ہم تم سے کیا چاہتے ہیں؟" وانگ ژن نے کہا۔

"م.... میں نے کچھ نہیں کیا۔" وانگ سائی بولا۔ وہ ایک بار پھر کانپنے لگا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے اور سینے پر تین چار گھونسے رسید کر دیے۔

"تم چیانگ رائے میں تھائی اور پرساد کی نگرانی کرتے رہے ہو۔ تم نے ہی دارا کو ان کی روانگی کی اطلاع دی تھی اور تم نے ہی ہائی وے پر گھات لگائے بیٹھے دارا اور اس کے ساتھیوں کو بتایا تھا کہ تھائی وغیرہ پچھلی گاڑی میں آ رہے ہیں۔ تمہاری وجہ سے پانچ آدمی پلک جھپکنے کی دیر میں چھلنی ہو گئے اور تم کہتے ہو کہ تم نے کیا کیا ہے؟"

"یہ.... یہ غلط ہے۔" وہ ہکلایا "م.... میں نے چیانگ رائے میں تھائی کو دیکھا ضرور تھا لیکن اس کی نگرانی نہیں کی، نہ ہی کسی کو ان کے بارے میں اطلاع دی۔ اگر ان کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔"

میں نے اس کے جبڑے پر ایک اور گھونسا رسید کیا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس نے جب خون تھوکا تو اس میں اس کا ایک دانت بھی موجود تھا۔

"تھائی زندہ ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اس نے چیانگ رائے میں تمہاری سرگرمیاں نوٹ کی تھیں اور جب وہ لوگ چیانگ سائین کے لیے روانہ ہوئے تو تم نے نہ صرف فون پر دارا کو ان کے بارے میں بتا دیا بلکہ ان کا تعاقب بھی کیا اور پھر آگے نکل کر دارا وغیرہ کو بتا دیا جو سڑک پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔"

"تھ.... تھائی زندہ ہے...." وانگ سائی کا چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔

"ہاں۔ تھائی زندہ ہے اور اس نے حملہ آوروں میں دارا کو پہچان بھی لیا تھا۔" میں نے کہا "دارا اور اس کے ساتھی روپوش ہیں۔ اتفاق سے آج تم نظر آ گئے۔ اب تم بتاؤ گے کہ دارا کہاں چھپا ہوا ہے اور ابھی تو تم سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ وہ عورت کون تھی جس نے تمہیں ایک کاغذ دیا تھا اور وہ کاغذ تم نے کہاں پہنچایا ہے لیکن.... یہ باتیں یہاں نہیں ہوں گی۔ کپڑے پہن لو۔ اب میں تمہیں صرف تین منٹ دے سکتا ہوں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی پر ٹنگے ہوئے اس کے بغلی ہولسٹر سے پستول کھینچ لیا۔

کپڑے پہنتے ہوئے بھی وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکالا۔ مائے سا باہر والے کمرے میں موجود تھی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی اور اب اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی تھی۔ وانگ ژن نے بھی وانگ سائی کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ میں نے باہر کا دروازہ کھول کر راہداری میں جھانکا اور پھر باہر نکل آیا۔

راہداری سنسان تھی۔ میں آگے تھا۔ میرے پیچھے وانگ سائی اور وانگ ژن تھے۔ وانگ ژن نے پستول کی نال وانگ سائی کی کمر سے لگا رکھی تھی۔ مائے سا سب سے پیچھے تھی۔

میں چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ سامنے والی رو میں دوسرے فلیٹ کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا۔ وہی یورپین عورت جھانک رہی تھی جسے میں نے ایک دوسرے آدمی کے ساتھ لفٹ سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دی لیکن میرے پیچھے وانگ سائی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر خوف اور آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ تجسس پسند عورت تھی اور جب سے ہم وانگ سائی کے فلیٹ میں داخل ہوئے تھے، غالباً اسی وقت سے وہ اپنے فلیٹ کے دروازے میں کھڑی تھی۔

ہم وانگ سائی کو عمارت کے عقبی دروازے سے باہر لے آئے اور پھر گلی کے موڑ پر کھڑی جیپ تک پہنچنے میں بھی ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

وانگ سائی کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر مائے سا اور میں بیٹھ گئے جبکہ وانگ ژن نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

جیپ کولائی روڈ سے ہوتی ہوئی سام لان روڈ پر مڑ گئی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اس سڑک پر ایک نائٹ کلب سے کچھ لوگ نکل رہے تھے۔ وانگ سائی نے اچانک ہی اچھل کر مائے سا کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے چیخنا شروع کر دیا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے پیر پر گولی چلا دی۔ مائے سا بھی چیخ اٹھی۔ بہرحال، وہ وانگ سائی کی گرفت سے نکل گئی۔ میں نے وانگ سائی کو سیٹ پر گرا لیا اور پستول کے دستے سے اس کے چہرے، سر اور سینے پر ضربیں لگانے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ میں نے پستول کی نال اس کے سینے پر رکھ دی۔

"اب اگر تمہارے منہ سے آواز نکلی تو پستول کی ساری گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔" میرے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی۔

وانگ سائی کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے اسے سیٹ سے اٹھنے نہیں دیا لیکن گردن گھما کر پیچھے ضرور دیکھا تھا۔ نائٹ کلب کے سامنے کھڑے ہوئے لوگ ہماری جیپ ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہاں ایک دو گاڑیاں اور ٹیکسیاں بھی کھڑی تھیں لیکن کسی نے ہمارے پیچھے آنے کی حماقت نہیں کی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ آس پاس پولیس کی کوئی گاڑی موجود نہیں تھی ورنہ ہمارے لیے پریشانی ہو جاتی۔

جب ہم کاٹیج پہنچے تو ایک بجنے والا تھا۔ وانگ سائی کے پیر سے بہنے والے خون سے جیپ کے فرش کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی تاریکی میں چھپے ہوئے تین چار قبائلی محافظ ہمارے قریب آ گئے۔

"اسے پیچھے کوارٹر میں لے جاؤ۔" وانگ ژن نے قیدی کو ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا "اگر یہ کوئی حرکت کرے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو اڑا دینا اسے۔" پیر زخمی ہونے کی وجہ سے وانگ سائی کے لیے کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ محافظ اسے گھسیٹتے ہوئے کاٹیج کی پچھلی طرف لے گئے۔ وانگ ژن نے ایک اور محافظ کو جیپ کے فرش پر پھیلا ہوا خون صاف کرنے کو کہا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ تھائی وغیرہ جاگ رہی تھیں۔ آوازیں سن کر وہ بھی برآمدے میں آ گئی تھیں۔

"وانگ سائی کو ہم لے آئے ہیں۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ابھی تھوڑی دیر میں اس سے معلوم کرتے ہیں کہ دارا وغیرہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"میرا خیال ہے، ایک کپ کافی ہو جائے اس کے بعد اس کا پوسٹ مارٹم کریں گے۔" وانگ ژن نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

مائے سا بھی ہمارے ساتھ اندر آ گئی۔ رنگولی اور جانکی اسے لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں اور تھائی نے مجھ پر سوالات کی بارش کر دی۔

لوما ہمیں دیکھتے ہی کچن میں گھس گیا تھا اور چند ہی منٹ بعد وہ ہم سب کے لیے کافی بنا کر لے آیا۔

کافی پینے کے بعد بھی ہم چند منٹ وہاں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے پھر میں اور وانگ ژن کاٹیج سے نکل کر پچھلی طرف آ گئے۔ وہاں ایک طرف وانگ ژن اور لوما کے لیے کوارٹرز تھے اور دوسری جانب گاڑیوں کے لیے پختہ گیراج بنے ہوئے تھے۔ ان گیراج کی تعداد تین تھی جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک گیراج کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وانگ سائی گندے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اس کے بائیں پیر سے خون اب بھی رس رہا تھا۔ وانگ ژن لوہے کی ایک فولڈنگ کرسی کھول کر دروازے کے قریب بیٹھ گیا۔

"یہ تمہارا شکار ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "جو کچھ پوچھنا ہے، تم ہی پوچھو۔ میں آرام سے یہاں بیٹھ کر تماشا دیکھوں گا۔"

کچھ خوف اور کچھ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ مُردوں کی طرح سفید ہو رہا تھا۔

"شرافت سے کچھ اگلو گے یا تمہاری زبان کھلوانے کے لیے مجھے اپنے ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینی پڑے گی؟" میں نے یہ کہتے ہوئے ایک طرف پڑا ہوا چمڑے کا ایک ٹکڑا اٹھالیا۔ یہ دراصل پرانے ٹائر کا ٹکڑا تھا جو تقریباً دو انچ چوڑا اور دو ڈھائی فٹ لمبا تھا۔

"مم.... مجھے نہیں معلوم وہ لوگ کہاں ہیں؟" وانگ سائی ہکلایا۔ خوف سے اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"وہ عورت کون تھی جس نے صبح تمہیں ایک کاغذ دیا تھا اور وہ کاغذ تم نے کہاں پہنچایا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"وہ.... وہ.... عورت۔" وانگ سائی رک رک کر بولا "وہ میری دوست ہے۔ ہماری ملاقات ایک دن پہلے ہی ہوئی تھی۔ صبح وہ مجھ سے ہی ملنے وہاں آئی تھی لیکن مائے سا کو میرے ساتھ دیکھ کر اس نے چپکے سے مجھے وہ خط دے دیا اور واپس چلی گئی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے مگر شاید زبان سے نہیں کہنا چاہتی تھی اس لیے پہلے ہی سے ایسا خط لکھ کر لے آئی تھی۔"

"تو وہ لو لیٹر تھا؟" میں نے اسے گھورا اور پھر میرا ہاتھ حرکت میں آگیا۔

ٹائر کا وہ ٹکڑا چابک کی طرح اس کے سینے پر پڑا اور وہ بلبلا اٹھا۔ میرا ہاتھ رکا نہیں۔ میں اس پر ہنٹر کی طرح وار کرتا رہا۔ پشت سے اس کی قمیص پھٹ گئی اور کئی جگہوں سے خون رسنے لگا۔ وانگ سائی کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں۔

"اس ویرانے میں تمہاری چیخیں کوئی نہیں سنے گا۔ جتنا چیخنا چاہو، چیخ لو۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "میں تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کردوں گا لیکن اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک تم یہ نہیں بتاؤ گے کہ اس خط میں کس کے لیے کیا پیغام تھا اور دارا اور چی فانگ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"مم.... میں کچھ نہیں جانتا۔" وانگ سائی نے جواب دیا۔

میرا ہاتھ ایک بار پھر حرکت میں آگیا۔ اتنی مار اگر پتھر پر لگائی جاتی تو وہ بھی ٹوٹ کر بکھر جاتا لیکن وہ بڑا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس کی ضد سے مجھ پر بھی جنون سا طاری ہوگیا۔ میں اس پر کوڑے برساتا رہا اور وہ چیختا ہوا گندے فرش پر لوٹتا رہا۔ اس کے جسم سے رسنے والے خون سے فرش پر بھی دھبے پڑ رہے تھے۔

میں نے ٹائر کا وہ ٹکڑا ایک طرف پھینک دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گیراج کے آخری حصے میں ایک میز پڑی ہوئی تھی جس پر اوزار وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ڈرل مشین بھی تھی۔ میں نے لپک کر ڈرل مشین اٹھائی اور اس پر لپٹا ہوا تار کھولنے لگا۔ وانگ ڈن اب تک واقعی تماشائی بنا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈرل مشین اٹھاتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

میں نے ڈرل مشین کے تار کا پلگ گیراج کی دیوار میں نصب سوئچ بورڈ کے ایک ساکٹ میں لگا دیا اور اس کے ساتھ والا سوئچ آن کرکے ڈرل مشین کا بٹن دبایا۔ ڈرل مشین کے آگے پنسل جتنی موٹی تین انچ لمبی بٹ لگی ہوئی تھی۔

"اسے سیدھا لٹا دو اور اس طرح گرفت میں لے لو کہ ہلنے نہ پائے۔" میں نے قبائلی محافظوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وانگ سائی کے ہاتھ اب بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے میرے اشارے پر ایک محافظ نے اس کے ہاتھ کھول دیے اور اسے فرش پر چت لٹا کر دونوں بازو اور ٹانگیں اطراف میں پھیلا دیں۔ اس کے بازوؤں اور ٹانگوں پر ایک ایک محافظ کھڑا ہوگیا۔ اب وانگ سائی حرکت نہیں کرسکتا تھا۔

گولی اس کے بائیں پیر میں لگی تھی۔ میں اس کی دائیں ٹانگ کے قریب بیٹھ گیا اور ڈرل مشین کی بٹ اس کی ران پر رکھ دی اور بٹن دبا کر ڈرل مشین پر ہاتھ کا دباؤ ڈال دیا۔ تین انچ لمبی بٹ گوشت میں سوراخ کرتی ہوئی اندر تک گھس گئی۔

باریک قیمے کی طرح گوشت کے ذرے اور خون کے چھینٹے میرے چہرے اور کپڑوں پر بھی پڑے۔ وانگ سائی کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بہت ہی خوفناک تھیں۔ وہ مچلنے کی کوشش کررہا تھا لیکن محافظوں نے اسے پوری طرح دبا رکھا تھا۔ میں نے چند سیکنڈ ڈرل مشین کو دبائے رکھا اور پھر اسے باہر کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی قبائلی محافظوں کو اشارہ کردیا۔ وہ وانگ سائی کو چھوڑ کر الگ ہٹ گئے۔ وانگ سائی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح فرش پر تڑپنے لگا۔ اس کی ٹانگ سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ وہ واقعی بہت سخت جان تھا۔ اتنی اذیت اٹھانے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

وانگ ڈن اور قبائلی محافظ وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وانگ ڈن تو بہت ہی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے شاید توقع نہیں تھی کہ میں اس قدر سفاکی کا مظاہرہ کروں گا۔

مجھ پر اب بھی جنون سوار تھا۔ دو روز پہلے میں نے ہائی وے پر جو منظر دیکھا تھا وہ اب بھی میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ گولیوں سے چھلنی پانچ لاشیں۔ انہیں اس قدر بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارنے والے دارا اور اس کے ساتھی تھے۔ ان کا سراغ لگانے کے لیے تو میں کچھ بھی کرسکتا تھا۔

"اب بھی زبان کھولنے کو تیار ہو یا نہیں۔" میں نے وانگ سائی پر جھکتے ہوئے کہا "میں تمہارے جسم میں اس ڈرل مشین سے اتنے سوراخ کروں گا کہ انہیں گننا مشکل ہوجائے گا۔ آخری سوراخ تمہارے دل میں ہوگا۔ اس جگہ۔" میں نے ڈرل مشین پر لگی ہوئی بٹ اس کے سینے پر ٹھیک دل کے مقام پر رکھ دی۔

"ب.... بتاتا ہوں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر چیخ پڑا "مم.... میں مر رہا ہوں۔ میرا خون بہہ رہا ہے.... مم.... مجھے پانی دو۔"

"ابھی تم نہیں مرو گے۔" میں نے کہا اور محافظوں کو اشارہ کیا۔

وانگ سائی کو دیوار سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا۔ ایک محافظ اسے پانی پلانے لگا۔ میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی عجیب سے تاثرات تھے اور میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تمہارا یہ روپ دیکھ کر تو مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔" وانگ ڈن نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس قدر...."

"بے رحم ہوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "مجھے یہ راستہ انہی لوگوں نے دکھایا ہے وانگ ڈن۔ میں وہ وقت کبھی نہیں بھول سکتا جب میری آنکھوں کے سامنے میرے ماں باپ کو خنجروں کے وار کرکے اس سے بھی زیادہ بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ بات وہیں ختم ہوجاتی تو آج میرے ہاتھوں میں پستول نہ ہوتا مگر دارا تو مجھے بھی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال نہیں کیے لیکن میں بچتا رہا اور چھپتا رہا۔ انہوں نے مجھے ایک لمحے کو بھی سکھ کا سانس نہیں لینے دیا۔ اب میں انہیں چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ اس رات جیپ میں اپنے آدمیوں کی گولیوں سے چھلنی لاشیں تو تم نے بھی دیکھی تھیں۔ کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر رحم کیا جائے یا ترس کھایا جائے؟"

وانگ ڈن لاجواب ہوگیا تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اسے اب تک یہ معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ میں اتنا سفاک اور بے رحم کیوں بن گیا تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ ہیروئن کے بزنس کا کوئی چکر ہے لیکن اگر بات صرف ہیروئن کی بھی ہوتی تو موت کے یہ ہرکارے اس قابل نہیں تھے کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی جاتی۔ ہیروئن کا زہر یہ پوری دنیا میں پھیلا رہے تھے۔ نوجوان نسل تباہ ہو رہی تھی۔ اسکول کے نو عمر بچوں کو بھی اس کا عادی بنایا جا رہا تھا۔ یہ لوگ رحم کے مستحق کس طرح ہوسکتے تھے؟

میں وانگ سائی کی طرف متوجہ ہوگیا جو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ زخموں سے خون اب بھی رس رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ٹھوکر ماری تو اس نے چیختے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

"دارا کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ.... وہ کھالائی کے ایک کاٹیج میں ہیں۔" اس نے رک رک کر جواب دیا "اس کے ساتھ چی فانگ اور کم کے علاوہ تین آدمی اور بھی ہیں۔"

"کم!" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "تو وہ بھی ان کے پاس پہنچ گیا...."

"تم لوگوں سے جان بچانے کے لیے اس نے تیز رو ندی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور پھر اس نے کسی جگہ سے فون پر پولیس چیف سے رابطہ کیا تھا۔ پولیس چیف نے ہی اسے ایک کاٹیج کا پتا بتا کر وہاں پہنچنے کو کہا تھا۔ دارا اور چی فانگ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس وقت میں بھی وہیں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر بعد چیف بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ دارا وغیرہ نے اسے بتایا کہ تم لوگ کس طرح وہاں پہنچے تھے اور کس طرح رنگولی کی غداری کی وجہ سے ان لوگوں کو وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔ اس دوران میں کاٹیج میں آگ لگ چکی تھی۔ دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے اور پھر دھماکے ہونا شروع ہوگئے۔ پولیس چیف نے ہم سب کو کاٹیج سے باہر نکلنے سے سختی سے منع کردیا اور خود واپس چلا گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "مجھے دراصل چیانگ رائے میں تھائی وغیرہ کی نگرانی کی ذمّے داری سونپی گئی تھی اور میں اسی رات وہ ذمّے داری کسی اور آدمی کے سپرد کرکے ایک ضروری کام سے یہاں آیا تھا۔ اس وقت دارا وغیرہ اسی کاٹیج میں تھے جہاں تم لوگوں نے حملہ کیا تھا لیکن چیف نے مجھے ان لوگوں سے نہیں ملنے دیا تھا اس لیے مجھے الگ کاٹیج میں رکھا گیا لیکن اس ہنگامے کے بعد دارا وغیرہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ پولیس چیف کے جانے کے بعد دارا نے ایک اور منصوبہ بنایا اور مجھے اسی وقت چیانگ رائے واپس بھیج دیا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ میں چیانگ رائے میں کچھ مقامی غنڈوں کی مدد سے تھائی اور پرساد کو ختم کردوں۔ اس طرح وہ تمہاری قوت کو کم کرنا چاہتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ اس رات اس مکان پر حملہ کردیا جائے گا جہاں تھائی اور پرساد نے پناہ لے رکھی تھی لیکن شام کے کچھ ہی دیر بعد جب میں نے تھائی اور پرساد کو مسلح محافظوں کے ساتھ جیپ پر نکلتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ یہاں آ رہے ہیں۔ میں نے ٹیلی فون پر دارا کو اطلاع دے دی اور پھر انہیں راستے ہی میں موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ دارا ہی نے بنایا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ لوگ کس جگہ پر گھات لگا کر بیٹھیں گے۔ میں نے تھائی کی جیپ کا تعاقب شروع کردیا تھا اور پھر ان سے آگے نکل کر دارا وغیرہ کو بتا دیا۔"

"پولیس چیف بھی اس منصوبے میں شریک تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وانگ سائی نے جواب دیا "چیف کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سپرد جو بھی کام کیا گیا تھا وہ اسے خاموشی سے کرنا چاہتا تھا مگر دارا اس کے کنٹرول میں نہیں تھا۔ دارا آج تک کسی

کے کنٹرول میں بھی نہیں رہا۔ پہلے ٹائیگر نے اور پھر پیڈرو نے بھی اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ بہت خود سر تھا۔ وہی کرتا جو اس کے من میں ہوتا اور یہ حقیقت ہے کہ ہنگامے بڑھانے میں دارا ہی کا ہاتھ ہے۔ اگر دارا نہ ہوتا تو ٹائیگر اور پیڈرو اس قسم کے ہنگامے کبھی نہ کرتے۔ وہ خون ریزی سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ وہ تو بس بنکاک کے نائٹ کلبوں میں داداگیری کرکے جگا ٹیکس وصول کرتے تھے یا پھر ہیروئن کا محدود بزنس تھا مگر دارا نے آکر سب کچھ بدل ڈالا۔"

"یہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ ایک خاص موقع پر چند لوگوں کی حفاظت کرنی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ دارا اندر ہی اندر کوئی اور چکر بھی چلا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ٹائیگر وغیرہ محدود پیمانے پر ہیروئن فروخت کرتے تھے اور یہ بزنس بھی بنکاک کے ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں تک ہی محدود تھا مگر دارا نے اسے بڑے پیمانے پر ہیروئن کی اسمگلنگ پر آمادہ کرلیا اور اس سلسلے میں جنرل کھوراٹ سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ بظاہر جنرل کھوراٹ کے نمائندوں سے بات چیت چل رہی تھی لیکن مجھے شبہ ہے کہ دارا کا جنرل کھوراٹ سے براہِ راست رابطہ ہوچکا ہے اور اس نے پیڈرو وغیرہ کو اس سے بے خبر رکھا ہے۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ پولیس چیف کو کوئی خاص کام سونپا گیا تھا جسے وہ خاموشی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ خاص کام کیا ہے اور کس نے اسے وہ کام سونپا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وانگ سائی نے جواب دیا "لیکن اسے بنکاک کے ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کی آشیرباد حاصل ہے مگر اسی دوران میں جیپ پر فائرنگ والا واقعہ پیش آیا جس میں سردار تھالوب کے آدمی مارے گئے۔ حکومت کو اندیشہ تھا کہ اس واقعے کو بنیاد بنا کر کیرن قبیلہ بغاوت نہ کردے۔ سردار تھالوب کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے بظاہر چیف کو معطل کردیا گیا ہے مگر اس کی پُراسرار سرگرمیاں اب بھی جاری ہیں۔"

"وہ عورت کون تھی اور کس کے لیے کیا پیغام لے کر آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ پولیس آفس میں کام کرتی ہے۔" وانگ سائی نے جواب دیا "چیف یہ چاہتا تھا کہ ہم سب لوگ اس کاٹیج تک محدود رہیں لیکن دارا کو اس پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے چیف کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے مجھے شہر بھیج دیا۔ اس کے اصرار پر ہی چیف نے اپنی بلڈنگ کا وہ فلیٹ خالی کرکے مجھے دے دیا تھا۔ مجھ سے پہلے اس فلیٹ میں دو غیر ملکی سیاح ٹھہرے ہوئے تھے جنہیں کسی ہوٹل میں منتقل کردیا گیا تھا۔ دارا نے پولیس چیف کو باور کرایا تھا کہ مجھے صرف سردار تھالوب اور اس کے آدمیوں کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے یہاں چھوڑا گیا ہے۔ دارا بہت چالاک آدمی ہے۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ اتنی جلدی لوگوں کو اپنے لیے کام کرنے پر آمادہ کیسے کرلیتا ہے۔ وہ عورت پولیس آفس میں ملازم ہے لیکن دارا کے لیے کام کررہی ہے اور چیف کی سرگرمیوں کے بارے میں اسے رپورٹ دیتی رہتی ہے۔ اس لفافے میں بند وہ بھی کوئی ایسی ہی رپورٹ تھی جو میں نے ایک اور آدمی کے ذریعے دارا کو بھجوادی تھی۔"

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا۔ وانگ سائی نے یہ تو اعتراف کرلیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی ہے لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں نے وانگ ڈن کی طرف دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا بڑی دلچسپی سے یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ یہ ساری باتیں اس کے لیے سنسنی خیز انکشافات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ تو یہی سمجھتا رہا تھا کہ معاملہ ہیروئن کی اسمگلنگ کا ہے لیکن یہ نت نئے سنسنی خیز انکشافات سن کر اس کے چہرے پر بھی سنسنی سی پھیل گئی تھی۔

میں وانگ سائی سے بہت کچھ پوچھ چکا تھا اور میرے خیال میں کوئی اور اہم بات نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ وانگ سائی کا چہرہ خوف کی شدت سے کچھ اور بھی سفید ہوگیا۔ اسے بولنے کا موقع دیے بغیر میں نے پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کیا...... اور ٹریگر دباتا چلا گیا۔ اس کے لیے ایک ہی گولی کافی تھی جو اس کے سینے پر ٹھیک دل کے مقام پر لگی تھی لیکن میں نے اس کے سینے میں تین گولیاں اتار دی تھیں۔

"اس کی لاش اٹھا کر پیچھے ندی میں پھینک دو اور یہ فرش دھو کر صاف کردو۔ یہاں کوئی نشان باقی نہیں رہنا چاہیے۔" وانگ ڈن نے قبائلی محافظوں کو حکم دیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہم دونوں گیراج سے نکل کر کاٹیج کی طرف جانے لگے۔

○☆○

سردار تھالوب صبح ناشتے کی میز پر ہمارے ساتھ موجود تھا۔ وانگ ڈن نے صبح سویرے ہی ٹیلی فون پر اسے رات والے واقعے کی اطلاع دے دی تھی اور وہ اس صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کے لیے خود ہی یہاں چلا آیا تھا۔

وانگ ڈن کا خیال تھا کہ آج رات اس کاٹیج پر چھاپا مار دیا جائے جہاں دارا وغیرہ چھپے ہوئے ہیں۔ میرے اصل دشمن تو دارا اور چی فانگ وغیرہ ہی تھے لیکن اس وقت جو مسئلہ درپیش تھا وہ ذاتی دشمنی سے زیادہ اہم تھا۔ ہمیں شہنشاہ کے خلاف سازش کا سراغ لگانا تھا اس لیے میں نے بڑی شدت سے وانگ ڈن کی اس تجویز کی مخالفت کی۔

"یہ مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "وہ دوبارہ بھاگ گئے یا ہمارے ہاتھ بھی آگئے تو ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمیں تو شہنشاہ کے خلاف سازش کا سراغ لگانا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ

ہم اور ہنگامے میں الجھنے کے بجائے خاموشی سے اپنا کام کرتے رہیں۔"

"وانگ سائی کے غائب ہونے سے وہ لوگ ہوشیار ہوگئے ہوں گے اور ہوسکتا ہے وہ لوگ خود ہی کوئی ہنگامہ شروع کردیں۔" وانگ ڈن نے کہا۔

"ایسی صورت میں ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ فی الحال ہمیں خاموش ہی رہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"وجدان ٹھیک کہتا ہے۔" تھالوب نے کہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ویسے تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ کوئی تجویز؟"

"ایک تجویز ہے میرے ذہن میں۔" میں نے کہا "پولیس آفس میں موجود عورت جو دارا کو اطلاعات فراہم کررہی ہے۔ ہماری مدد بھی کرسکتی ہے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" تھالوب میری بات سن کر اچھل پڑا۔ "وہ دارا کے لیے کام کررہی ہے۔ ہمارے لیے کیسے......"

"اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے مسٹر تھالوب۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ ہمارے لیے بھی کام کرے گی۔"

"وہی تو جاننا چاہتا ہوں، کیسے؟" اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر اپنی تجویز کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔

"اس مشن میں آپ کا کوئی آدمی استعمال نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح آپ کا نام بھی آئے گا اور پھر کوئی گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔ آپ لوگوں کو صرف اتنا کرنا ہے کہ اس کے بارے میں مجھے کچھ معلومات فراہم کردی جائیں۔ آج شام سے پہلے پہلے.... اور ایک ایسی گاڑی جسے آپ کی گاڑی کی حیثیت سے شناخت نہ کیا جاسکے۔"

"ٹھیک ہے۔" تھالوب نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "آج شام تک تمہیں مطلوبہ معلومات مل جائیں گی اور گاڑی بھی۔"

اس کے بعد بھی ہم میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور گیارہ بجے کے قریب تھالوب واپس چلا گیا۔ مائے سا ابھی یہیں تھی۔ اسے میں نے نہیں جانے دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وانگ سائی کی گمشدگی کے حوالے سے کوئی ہنگامہ ضرور ہوگا۔ اس عورت نے مائے سا کو وانگ سائی کے ساتھ دیکھا تھا اور ظاہر ہے اس کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ وہ کون ہے؟ اسے تلاش بھی کیا جائے گا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مائے سا کو کوئی نقصان پہنچے اس لیے میں نے اسے دو تین دن تک کاٹیج ہی میں روک لیا تھا۔ البتہ تھالوب کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں نے تازہ ترین صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اسے شہر بھیج دیا تھا۔

تھالوب دو گھنٹوں بعد واپس آیا تھا۔ وانگ سائی کے حوالے سے شہر میں خاموشی تھی۔ البتہ رومائی ولا کے چوکیدار نے یہ انکشاف کیا تھا کہ اس بلڈنگ میں رہنے والا ایک کرائے دار گزشتہ رات پُراسرار طور پر لاپتا ہوگیا ہے اور ایک آدمی اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے دو تین مرتبہ آچکا ہے۔ بلڈنگ کے چوکی دار نے وانگ سائی کے ساتھ آنے والی کسی لڑکی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور وہ یورپین عورت جس نے گزشتہ رات مجھے اور وانگ ڈن کو بلڈنگ میں دیکھا تھا اور پھر ہمیں وانگ سائی اور مائے سا کے ساتھ اس کے فلیٹ سے نکلتے ہوئے بھی دیکھا تھا، اس نے بھی اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھی تھی۔ غیر ملکی سیاح عام طور پر ایسے معاملات سے دور ہی رہتے ہیں جن میں ان کی اپنی گردن پھنسنے کا اندیشہ ہو۔

پولیس آفس میں البتہ کچھ ہلچل نظر آئی تھی۔ چیف اگرچہ معطل ہوچکا تھا لیکن اسے بھی سادہ لباس میں پولیس آفس میں دیکھا گیا تھا۔

شام چھ بجے تھالوب کا ایک آدمی کار لے کر آگیا۔ بنکاک کی لائسنس پلیٹ والی وہ کار دیکھنے میں اگرچہ پرانی سی لگتی تھی لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ چیانگ سائین میں کوئی مقامی وہیکل رجسٹریشن آفس نہیں تھا۔ یہاں کی گاڑیوں کی رجسٹریشن بھی چیانگ رائے ہی میں ہوتی تھی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تھالوب کا فون آگیا۔ اس سے پولیس آفس میں کام کرنے والی اس عورت کے بارے میں خاصی معلومات مل گئیں۔ اس کا نام رنگ سنت تھا اس کی رہائش بنگنا روڈ پر واقع ایک شان دار کاٹیج میں تھی۔ اس کی ایک جوان بیٹی بھی تھی جو چیانگ مائے یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھی اور ان دنوں یہاں آئی ہوئی تھی۔ صبح میں نے سردار تھالوب سے کہا تھا کہ میں اس مشن میں اس کے آدمیوں کو استعمال نہیں کروں گا لیکن اس وقت مجھے ان کی ضرورت پڑگئی تھی۔

میں اور تھائی شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی دیر بعد تھالوب کی بھیجی ہوئی کار میں کاٹیج سے روانہ ہوگئے۔ ظاہر ہے، ڈرائیونگ تھائی ہی کررہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم محافظوں کے بغیر اکیلے باہر نکلے تھے۔ کسی ناگہانی صورتِ حال کا سامنا بھی ہوسکتا تھا اس لیے میں خاصا محتاط تھا۔ پستول میرے پاس بھی تھا اور تھائی کے پاس بھی۔

میں نے وانگ ڈن سے شہر کے راستے سمجھ لیے تھے اور ٹورسٹ میپ بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا تاکہ کوئی راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

ہم نے کار بنگنا روڈ پر کھڑی کردی اور رنگ سنت کے کاٹیج کے آس پاس تقریباً ایک گھنٹے تک گھومتے رہے۔ کاٹیج واقعی بہت شان دار تھا۔ یہاں کے پولیس والے بہت دولت مند تھے۔ رنگ سنت ایک معمولی سے عہدے پر فائز تھی لیکن یہ کاٹیج دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔

کالج کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ایک چھوٹا سا شراب خانہ تھا جس کے ساتھ کافی ہاؤس بھی تھا۔ ہم اس کافی ہاؤس میں ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں سے کالج پر بھی نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ایک کار کالج کے سامنے آکر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا جبکہ ساتھ والی سیٹ پر جو لڑکی بیٹھی ہوئی تھی اس کے لیے میرے ذہن میں فوری طور پر قیامت ہی کا نام ابھرا تھا۔ وہ واقعی قیامت تھی۔ عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ جب وہ کار سے اتری تو اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے مختصر سی شارٹ اور بغیر آستین کی بنیان ٹائپ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

کار آگے نکل گئی۔ لڑکی کے بیل بجانے پر دروازہ رنگ سنت ہی نے کھولا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لڑکی رنگ سنت کی بیٹی تھی۔ ان دونوں میں بڑی شباہت تھی۔

اگلے روز شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میں اور تھائی پھر اس علاقے میں موجود تھے۔ آج ہمارا پروگرام کچھ اور تھا۔ کار بھی ہم نے کالج کی پچھلی گلی میں کھڑی کی تھی۔ کالج میں اندھیرا تھا۔ مجھے اور تھائی کو پچھلے دروازے سے کالج میں داخل ہونے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ہم دونوں بڑے اطمینان سے ہال میں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ اگرچہ گہرا اندھیرا تھا لیکن بتی جلانے کی کوشش ہم میں سے کسی نے نہیں کی تھی۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً بیس منٹ بعد سامنے کا گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی پھر قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس آواز سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی عورت تھی۔ قدموں کی آواز برآمدے میں رک گئی اور پھر دروازے کے تالے میں چابی گھمائے جانے کی آواز سنائی دی۔ کالج میں آنے والا کوئی بھی ہوتا' اسے برآمدے والا دروازہ کھول کر سب سے پہلے ہال ہی میں آنا ہوتا۔ سوئچ بورڈ بھی برآمدے والے دروازے کے قریب ہی تھا۔

دروازہ کھلنے کے چند سیکنڈ بعد چٹ کی ہلکی سی آواز ابھری اور کمرا روشنی سے بھر گیا۔ ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں لیکن فوراً ہی صورتِ حال نارمل ہوگئی اور میں اس عورت کی طرف دیکھنے لگا جو سوئچ بورڈ کے پاس کھڑی تھی۔ وہ رنگ سنت تھی۔

روشنی ہونے کے بعد رنگ سنت صرف ایک قدم آگے بڑھ سکی تھی اور پھر اس طرح بے حس و حرکت کھڑی رہ گئی تھی جیسے زمین نے اس کے پیر پکڑ لیے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اشارہ کیا تو اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"ہم کوئی ہنگامہ نہیں کرنا چاہتے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم اپنے حواس پر قابو پا کر یہاں بیٹھ جاؤ تو ہم اطمینان سے بات کرسکتے ہیں۔"

رنگ سنت کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ متوحش نگاہوں سے کبھی ہم دونوں کی طرف اور کبھی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ تھائی نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور اس میں سے لیڈی آٹو میٹک پستول نکال کر بیگ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کک۔ کون ہو تم لوگ اور میری بیٹی کہاں ہے؟" اس کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔ وہ ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ ہم نے رنگ سنت کی بیٹی کو نہایت ہی خفیہ طور پر اغوا کرلیا تھا۔

"تمہاری بیٹی خیریت سے ہے اور مجھے تم پہچاننے سے انکار نہیں کرسکتیں کیونکہ اس روز پولیس چیف کے دفتر میں ہونے والی میٹنگ میں تم بھی موجود تھیں اور تم نے مجھے اچھی طرح دیکھا تھا۔ بیٹھ جاؤ.... ڈرو نہیں۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" میں نے پستول سے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

رنگ سنت کی ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ وہ سامنے والے صوفے پر گر سی گئی۔

"سونیا کہاں ہے؟" اس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری بیٹی بالکل خیریت سے ہے۔ اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کروگی تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن اگر تم نے انکار کیا تو...." میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ایک منٹ۔ پہلے اطمینان کرلو کہ تمہاری بیٹی اب تک خیریت سے ہے۔" میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ سازو سامان بے حد قیمتی تھا۔ دائیں طرف خوب صورت اسٹینڈ پر ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر وہیں کھڑے کھڑے کالج کا نمبر ملایا۔ کال وانگ ڈن نے ریسیو کی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے ریسیور رنگ سنت کی بیٹی سونیا کو دے دیا۔ میں نے فون اٹھا کر سینٹر ٹیبل پر رکھا اور ریسیور رنگ سنت کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے فون پر چند جملے کہے پھر میں نے فون کا کریڈل دبا دیا اور اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر رکھ دیا۔ میں رنگ سنت کو صرف یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں ہے۔

"کک.... کیا چاہتے ہو تم؟" رنگ سنت نے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تعاون!" میں نے کہا "تعاون کی صورت میں تمہاری بیٹی بھی خیریت سے رہے گی اور تمہیں معقول معاوضہ بھی دیا جائے گا۔" میں چند لمحے خاموشی سے اس کے چہرے کو تکتا رہا پھر بولا "تم دارا کو پولیس چیف کی سرگرمیوں سے آگاہ کررہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تعاون کرو۔"

"یہ غلط ہے۔ میں کسی دارا کو نہیں جانتی۔" اس نے جواب دیا۔

"جھوٹ بول کر اپنے لیے مشکلات پیدا کروگی۔" میں نے کہا "دو دن پہلے ریور ویو ریسٹورنٹ کے سامنے تم نے وانگ سائی کو

ایک لفافہ دیا تھا۔ وانگ سائی نے بھی سب کچھ اگل دیا ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"اوہ!" رنگ سنت کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اور پھر شاید اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کرلیا تھا "وانگ سائی کہاں ہے۔ دارا کے آدمی اسے تلاش کررہے ہیں۔"

"وہ ایسی جگہ پہنچ چکا ہے جہاں اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" رنگ سنت کے چہرے پر خوف کے سائے گہرے ہوگئے۔

"اطمینان رکھو۔ تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم ہمارے ساتھ تعاون کروگی تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

"مم.... مگر...." وہ ہکلائی "اگر دارا کو پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ لوگ بہت سفاک اور بے رحم ہیں۔"

"میں تم سے دارا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کروں گا۔ وہ روپوش ہونے کے باوجود ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ میں اسے جب چاہوں' چوہے کی طرح پکڑ سکتا ہوں۔"

"پھر کیا چاہتے ہو؟" رنگ سنت بولی۔

"حکومت کے بعض اعلیٰ عہدے دار یہاں آئے ہوئے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وہ بظاہر سردار تھالوب کی جیپ پر فائرنگ اور اس کے آدمیوں کے مارے جانے کی اطلاع پا کر یہاں آئے ہیں تاکہ سردار تھالوب کو کسی ممکنہ کارروائی سے روکا جاسکے لیکن.... میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں کی آمد کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔"

"میں سمجھی نہیں؟" اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"تم سب کچھ جانتی ہو اور سمجھ رہی ہو۔" میں نے کہا "تم پولیس چیف کے دفتر میں ہو اور پولیس چیف اس معاملے میں پوری طرح ملوث ہے۔ معطل کیے جانے کے باوجود وہ پُراسرار سرگرمیوں میں مصروف ہے اور تم اس کی سرگرمیوں سے پوری طرح واقف ہو۔"

"مم.... میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ رک رک کر بولی۔

"دیکھو رنگ سنت۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔ وہ جوان بھی ہے اور بہت حسین بھی۔ میں نے اس کی سلامتی کا وعدہ کیا ہے مگر یہ وعدہ اسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے جب تم ہمارے ساتھ تعاون کروگی۔ بصورتِ دیگر میں اپنے وعدے کا پابند نہیں رہوں گا۔"

"میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔" اس کی آواز رو دینے والی تھی "تک.... کیا.... چاہتے ہو تم....؟"

"سنا ہے بنکاک سے آنے والے اعلیٰ افسران گولڈن ٹرائی اینگل کی کسی شخصیت سے کوئی خفیہ میٹنگ کرنے والے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون لوگ شریک ہوں گے۔ تم چونکہ چیف کے بہت قریب ہو۔ وہ تم پر اعتماد بھی کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پیسے کے لالچ میں تم اسے بھی دھوکا دے رہی ہو لیکن اب تو معاملہ تمہاری بیٹی کا ہے۔ اگر مطلوبہ معلومات دے دو تو سونیا کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کوئی خفیہ میٹنگ ہونے والی ہے۔" رنگ سنت نے جواب دیا "لیکن یہ ابھی طے نہیں ہوا کہ میٹنگ کب اور کہاں ہوگی اور اس میں کون کون شریک ہوگا۔ چیف نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میں اس کے لیے کام کرتی رہوں تو وہ بہت جلد مجھے کسی بڑے عہدے پر پہنچا دے گا۔"

"تم اس کے لیے کام کرتی رہو۔" میں نے کہا "تم بہت ذہین عورت ہو۔ اسے شبہ نہیں ہونے دوگی کہ تم کسی اور کے لیے بھی کام کررہی ہو اور کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تمہاری بیٹی اغوا ہوچکی ہے۔ کوئی اس کی غیر حاضری کے بارے میں پوچھے تو تم کہہ سکتی ہو کہ وہ سیرو تفریح کے لیے دوستوں کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔ تمہاری بیٹی دن میں تین مرتبہ تم سے فون پر رابطہ کرے گی۔ اس کی آواز صرف تمہارے دفتر کی آپریٹر سنے گی۔ اس کے بعد کی گفتگو مجھ سے ہوگی۔ اس سلسلے میں جب بھی کوئی بات ہو' تم مجھے اطلاع دوگی اور میرا خیال ہے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میری اطلاع کے مطابق میٹنگ ایک دو روز میں ہونے والی ہے۔ اس دوران میں تمہاری بیٹی ہماری مہمان رہے گی۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ تمہارے اطمینان کے لیے یہی کافی ہوگا کہ تم دن میں دو تین مرتبہ اس کی آواز سن لیا کروگی اور اگر تم نے اس ٹیلی فون نمبر کے بارے میں معلوم کرکے کسی بھی ذریعے سے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہمارا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر تمہیں اپنی بیٹی کی لاش ہی ملے گی۔"

"نہیں نہیں۔ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گی۔" رنگ سنت جلدی سے بولی۔

"ویسے کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو جسے اس روز ریور ویو ریسٹورنٹ کے سامنے وانگ سائی کے ساتھ دیکھا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" رنگ سنت نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

رنگ سنت کے اس جواب سے میں مطمئن ہوگیا۔ میں نے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ رنگ سنت نے دارا وغیرہ کو مائے سا کے بارے میں کچھ بتایا نہ ہو لیکن یہ جواب میرے اطمینان کے لیے کافی تھا۔ مائے سا کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

یہاں میری آمد کا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ معاملہ طے ہوجانے کے بعد میں اور تھائی جانے کے لیے اٹھ گئے۔ تھائی نے رنگ سنت

کا پستول بھی اس کے حوالے کردیا تھا۔ ہم اس کاٹیج میں پچھلے دروازے سے چوروں کی طرح داخل ہوئے تھے۔ ہماری واپسی بھی اگرچہ پچھلے دروازے سے ہی ہوئی تھی مگر رنگ سنت ہمیں رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئی تھی۔

○☆○

دو دن گزر گئے۔ شہر میں نہ صرف سکون تھا بلکہ اس کی رونق میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ چیانگ رائے کی طرف سے غیر ملکی سیاحوں کی آمد پھر شروع ہوگئی تھی۔ چیانگ سائین آنے والے غیر ملکی سیاحوں کو سب سے زیادہ دلچسپی گولڈن ٹرائی اینگل سے تھی۔ یہاں آنے والا ہر شخص وہ بدنام زمانہ خطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئن تیار ہوتی تھی اور پوری دنیا کو یہاں سے یہ زہر سپلائی کیا جاتا تھا۔ ایسے علاقوں کی معیشت کا دارومدار ہی سیاحت پر تھا۔ جس علاقے میں کوئی غیر معمولی دلچسپی نہ ہو' سیاح ادھر کا رخ نہیں کرتے اس لیے دو دن بند رکھنے کے بعد گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے والی سڑک بھی کھول دی گئی تھی۔

تیسرے دن شام کو رنگ سنت کے گھر والے نمبر پر فون کیا تو ایک دلچسپ اطلاع میری منتظر تھی۔ لائن حسب معمول سونیا ہی نے ملائی تھی۔ صرف دو جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے اس سے ریسیور لے لیا۔

"لیس رنگ سنت۔" میں نے کہا "کوئی پیش رفت ہوئی یا نہیں؟"

"تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے لیکن میں فون پر بات نہیں کرسکتی۔" رنگ سنت نے کہا "تم ایک گھنٹے بعد مجھے میوزیم کے پچھلے گیٹ کے قریب ملو۔ میں تفصیل سے تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔"

"میوزیم کا گیٹ۔" میں نے کہا "اس وقت سات بجے ہیں اور میوزیم میں لوگوں کی آمدورفت....."

"چھ بجے میوزیم بند ہوجاتا ہے۔" رنگ سنت نے میری بات کاٹ دی۔ "آج ویسے بھی پیر کا دن ہے۔ پیر اور منگل کو میوزیم بند رہتا ہے۔ اس وقت سات بج رہے ہیں۔ میوزیم کی عقبی سڑک پر سناٹا ہوگا۔ میں تمہیں گیٹ کے قریب ہی ملوں گی۔"

"کوئی چال تو نہیں چل رہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میری بیٹی تمہارے قبضے میں ہے۔ میں تمہیں دھوکا کیسے دے سکتی ہوں۔ میں ایک گھنٹے تک وہاں پہنچ جاؤں گی۔" رنگ سنت نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور تھائی وغیرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وانگ ڈن اس وقت موجود نہیں تھا۔ ہم نے آپس میں مشورہ کیا اور بالآخر میں نے اور رنگولی نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ہم پونے آٹھ بجے کاٹیج سے نکلے۔ رنگولی کار ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے اس میوزیم کے بارے میں بتا رہی تھی جس میں گیارھویں اور بارھویں صدی کے چیانگ سائین بادشاہت دور کے نوادرات کے علاوہ بدھ کے قدیم تاریخی مجسمے بھی رکھے ہوئے تھے۔

میوزیم کی عقبی سڑک پر سناٹا تھا۔ اس سڑک کی ایک طرف میوزیم اور دوسری طرف پارک تھا جو اس وقت سنسان پڑا تھا۔ کوئی اکادکا گاڑی اس سڑک پر سے گزر جاتی۔

رنگولی نے گاڑی گیٹ سے دور ہی روک لی۔ میں نے پستول جیب سے نکال لیا۔ چند منٹ بعد ہی میوزیم کے گیٹ کی طرف سے ایک ہیولا سا آتا ہوا دکھائی دیا۔

وہ رنگ سنت تھی۔ میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہم دونوں کار سے اتر آئے۔ رنگ سنت ہمیں لے کر پارک میں آگئی۔ ہم ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

"پرسوں رات کو وہ میٹنگ ہونے والی ہے۔" رنگ سنت نے میرے بولنے کا انتظار کیے بغیر کہا "اس کے لیے گولڈن ٹرائی اینگل روڈ پر ہی ایک ایسے کاٹیج کا انتخاب کیا گیا ہے جو عرصے سے خالی پڑا ہے۔ چیف نے مجھے یہ ذمّے داری سونپی ہے کہ اس کاٹیج میں ضروری فرنیچر اور کھانے پینے کی اشیا پہنچا دوں۔"

"اوہ۔" میرے لیے یہ اطلاع واقعی بڑی اہم تھی۔

"میٹنگ کب ہورہی ہے؟ اور اس میں کون کون شریک ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"بدھ کی رات۔ یعنی پرسوں رات کو۔" رنگ سنت نے جواب دیا "پرسوں شام سے پہلے پہلے مجھے تمام انتظامات مکمل کرلینے ہیں۔ کل تو میں فرنیچر وغیرہ وہاں پہنچاؤں گی اور کھانے پینے کی اشیا پرسوں دوپہر سے پہلے پہلے پہنچادوں گی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "یہاں سے وزارتِ داخلہ کا سیکریٹری آنگ سانگ اور ایکی مائی کے علاوہ پولیس چیف ہوگا جبکہ دوسری طرف سے جنرل کھوراٹ کا خاص آدمی سین تونگ اور اس کے ساتھ دو مسلح محافظ ہوں گے۔ دارا' چی فانگ' کم اور پیڈرو پرسوں دوپہر کو وہاں پہنچ جائیں گے تاکہ اس علاقے کا جائزہ لے سکیں۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہوں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تقریباً ایک درجن آدمی ہوں گے اور سب کے سب انتہائی خطرناک!" میں نے کہا۔

"ہاں اور ان کی خدمت کے لیے چار پانچ لڑکیاں اس کے علاوہ ہوں گی۔" رنگ سنت نے کہا۔

"وہ لڑکیاں کون ہوں گی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے ذہن میں ایک اور خیال کلبلانے لگا تھا۔

"ان کا انتخاب بھی میری ذمّے داری ہے لیکن میں نے ابھی ان کے بارے میں کچھ سوچا نہیں ہے لیکن ظاہر ہے وہ لڑکیاں...."

"میں سمجھ سکتا ہوں وہ کس قسم کی ہوں گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ایک لڑکی تم ہمارے گروپ کی بھی اس اسکواڈ میں

شامل کرسکتی ہو؟"

"کیا مطلب!" رنگ سنت اچھل پڑی اور گردن گھما کر رنگولی کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ نہیں۔" میں نے کہا "وہ لڑکی تم دیکھ چکی ہو۔ وہی جو اس روز وانگ سائی کے ساتھ تھی۔ بہت حسین اور جوان ہے۔ ان لوگوں کو مایوسی نہیں ہوگی۔"

"اگر ان لوگوں کو شبہ ہوگیا تو مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔" رنگ سنت نے کہا۔ اس کا چہرہ دھواں ہوگیا تھا۔

"کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔ میں کل شام کو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اسے اچھی طرح دیکھ لینا اور اس سے پروگرام طے کرلینا۔" میں نے کہا۔

"اور میری بیٹی کب واپس آئے گی؟" رنگ سنت نے پوچھا۔

"اس میٹنگ کے اگلے روز وہ صحیح سلامت تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔" میں نے بینچ سے اٹھتے ہوئے کہا "یہ بات ذہن میں رکھنا۔ مائے سا ہر صورت میں تمہارے اس اسکواڈ میں شامل ہونی چاہیے۔"

ہم رنگ سنت کو بینچ پر بیٹھا چھوڑ کر پارک سے باہر آگئے۔ مائے سا کو ان لڑکیوں کے اسکواڈ میں شامل کرنے کا خیال اچانک ہی میرے ذہن میں آیا تھا اور ابھی مجھے نہ صرف مائے سا کو اس پر آمادہ کرنا تھا بلکہ تھالوب سے بھی بات کرنی تھی۔ رنگ سنت ہی نے بتایا تھا کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کو بڑی سختی سے ان کے کاٹیج تک محدود کردیا گیا تھا' اسی لیے فی الحال ان سے کسی تصادم کا اندیشہ نہیں تھا۔ پولیس' سردار تھالوب کی وجہ سے ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اس وقت کسی ایسے ہنگامے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے جس سے ان کا پروگرام متاثر ہو اس لیے ہم آزادی سے شہر میں گھوم پھر سکتے تھے۔

ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر فرائی فش کھائی' کافی پی اور تھائی وغیرہ کے لیے بھی فرائی فش پیک کروالی۔

کاٹیج پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں مائے سا کو لے کر لان میں آگیا اور مدھم لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس پر یہ حقیقت بھی واضح کردی تھی کہ اس میں اس کی جان کا بھی خطرہ ہے۔ اگر انہیں شبہ ہوگیا تو وہ زندہ نہیں بچے گی۔ پہلے تو وہ ہچکچائی پھر اس نے آمادگی ظاہر کردی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں ہال کے ایک کونے میں بیٹھا فون پر سردار تھالوب سے باتیں کررہا تھا۔

○☆○

رات کے دس بجے تھے۔ اگرچہ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں مگر آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے فضا اس قدر تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ہماری تعداد چھ تھی۔ میں' سردار تھالوب' وانگ ڈن اور میری ساتھی تینوں جاں باز خواتین۔ تھائی' جانکی اور رنگولی۔ سردار تھالوب کا خیال تھا کہ اس مہم پر تین چار جنگ جُو قبائلیوں کو بھی ساتھ لے لیا جائے گا۔ اس نے خواتین کے ساتھ جانے کی مخالفت کی تھی لیکن وہ تینوں نہیں مانی تھیں اس لیے قبائلیوں کے بجائے ان تینوں ہی کو ساتھ لینا پڑا تھا۔ ویسے کچھ قبائلی بھی تھے جنہوں نے دور سے کاٹیج کی طرف آنے والے راستوں کی ناکا بندی کررکھی تھی۔

مائے سا کی آمادگی کے بعد ہم نے اس منصوبے کی تیاری بڑی تیزی سے کی تھی۔ سردار تھالوب اس رات چیانگ رائے چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی بھی رات ہی رات میں ہوئی تھی۔ وہ کچھ ایسی چیزیں لے کر آیا تھا جن کی اس مہم میں اشد ضرورت تھی۔ مائے سا کے لیے مخصوص تراش کا ایک لباس جس کے اسکرٹ کی بیلٹ میں لگے ہوئے دو بٹنوں میں بہت چھوٹے لیکن نہایت طاقت ور ڈکٹا فون لگے ہوئے تھے۔ ایک ڈکٹا فون رنگ سنت کو بھی دیا گیا تھا جو اسے اس کمرے میں کسی جگہ لگانا تھا جہاں میٹنگ ہونے والی تھی۔ میٹنگ میں ہونے والی گفتگو ان تینوں ڈکٹا فونز کے ذریعے ہمارے کاٹیج میں موجود ٹیپ ریکارڈرز پر الگ الگ ریکارڈ ہونی تھی۔ وہاں ایک ایسے آدمی کو بٹھا دیا گیا تھا جو اس کام میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ وانگ ڈن' سردار تھالوب اور میرے کانوں پر بھی ہیڈ فونز لگے ہوئے تھے۔ اس طرح ہم بھی وہ گفتگو سن سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کے لیے ہم تینوں کے پاس واکی ٹاکی بھی تھے۔

ہمارا ساتھ دے کر سردار تھالوب نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی پوری طرح واقف تھا کہ اگر ہمارا مشن ناکام اور ان کی سازش کامیاب ہوگئی تو اس کا پورا قبیلہ زیرِ عتاب آجائے گا لیکن تھالوب نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ محبِ وطن آدمی تھا اور ملک کی سلامتی کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا۔

ہم جانتے تھے کہ ہمارا مقابلہ بہت ہی خطرناک دشمنوں سے تھا۔ ان کی تعداد بھی ہم سے زیادہ تھی لیکن میری طرح سردار تھالوب بھی اس بات سے متفق تھا کہ پلاننگ درست ہو تو تین آدمی بھی انہیں شکست دینے کے لیے کافی تھے۔

ہم نو بجے اپنے کاٹیج سے روانہ ہوئے تھے اور طویل چکر کاٹتے ہوئے اس کاٹیج کے نواح میں پہنچ گئے تھے۔ قدِ آدم جھاڑیاں اور پودے ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہورہے تھے۔ ہم سب کے پاس سب مشین گنیں تھیں۔ گولیوں سے بھرے ہوئے بیلٹ بھی ہمارے سینوں پر سجے ہوئے تھے۔ اس ایمونیشن سے ہم رات بھر ان کا مقابلہ کرسکتے تھے۔

ایک خاص مقام پر پہنچ کر ہم تین پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے۔ میرے ساتھ تھائی تھی۔ رنگولی' وانگ ڈن کے ساتھ اور جانکی سردار تھالوب کے ساتھ تھی۔ ہم تین اطراف سے کاٹیج کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ چوتھی سمت

وہ راستہ تھا جو کاٹیج سے سڑک کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طرف سردار تھالوب کے قبائلی محافظ موجود تھے۔

میں اور تھائی بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی ہمیں موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ ہم ایک جگہ رک گئے۔ تقریباً سو گز آگے درختوں میں روشنی نظر آرہی تھی۔ وہ کاٹیج کی کوئی کھڑکی تھی۔ میں نے واکی ٹاکی پر تھالوب اور وانگ ژن سے رابطہ کیا۔ وہ بھی اپنی اپنی سمت سے اتنے ہی فاصلے پر پہنچ چکے تھے اور کاٹیج کی روشنی دیکھ سکتے تھے۔ ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر دم سادھے پڑے رہے۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آگیا جس کا ہمیں انتظار تھا۔ میرے کانوں پر لگے ہوئے ہیڈ فونز پر مختلف آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں ان میں سے صرف ایک آواز پہچان سکا تھا اور وہ آواز وزارتِ داخلہ کے سیکریٹری آنگ سانگ کی تھی۔ اگر میں نے پولیس آفس کی میٹنگ میں اسے بولتے ہوئے نہ سنا ہوتا تو اس وقت اس کی آواز نہ پہچان سکتا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے پولیس چیف کی آواز بھی پہچان لی اور پھر ایلی مائی کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

ان کی میٹنگ شروع ہوگئی تھی اور جو باتیں ہو رہی تھیں انہیں سن کر میں کانپ اٹھا۔ ایک بھاری آواز غالباً جنرل کھوراٹ کے نمائندے سین فونگ کی تھی۔ وہ شہنشاہ کے خلاف سازش میں ان لوگوں کا ساتھ دینے کے لیے اپنی شرائط پیش کر رہا تھا۔

میں نے واکی ٹاکی پر سردار تھالوب سے رابطہ کیا۔

"یہ باتیں تم سن رہے ہو؟" میں نے کہا۔

"سن رہا ہوں لیکن یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔" سردار تھالوب نے جواب دیا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہیڈ فون پر سین فونگ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اے لڑکی۔ ادھر آؤ۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"مائے سا۔ میرا نام مائے سا ہے سر۔" یہ دوسری آواز سن کر میں اچھل پڑا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سین فونگ کو مائے سا پر شبہ ہوگیا تھا۔ وہ مائے سا سے مختلف سوالات کرتا رہا پھر کسی اور کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی تلاشی لینے کا حکم دیا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر سین فونگ کی آواز سنائی دی۔

"اپنے کپڑے اتار دو مس مائے سا۔"

مائے سا نے شاید کپڑے اتار دیے تھے۔ وہ ڈکٹا فون نہایت طاقت ور تھے۔ میرے ہیڈ فونز پر کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سین فونگ کپڑوں کو چیک کر رہا تھا۔ چند منٹ بعد اس کی آواز سنائی دی۔

"یہ بٹن تو بہت خوب صورت ہیں اور ان میں لگے ہوئے ڈکٹا فون۔۔۔ تم کس کے لیے کام کر رہی ہو۔۔۔ میں تین تک گنوں گا اور اس کے بعد۔۔۔"

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سین فونگ نے گنتی شروع کردی تھی اور پھر تین کہنے کے فوراً ہی بعد فائر اور مائے سا کی چیخ سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سین فونگ کی آواز بھی سنائی دی۔

"جنٹلمین! آج کی میٹنگ کینسل۔ ہم ایک دو روز بعد دوبارہ کسی اور جگہ پر ملاقات کریں گے۔ اب یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔"

"تھالوب!" میں نے واکی ٹاکی پر کہا "وہ لوگ جا رہے ہیں۔"

"اٹیک!" تھالوب کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی "ان میں سے کسی کو بچ کر نہیں جانا چاہیے۔"

میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹ کر آگے بڑھنے لگے اور پھر اچانک ہی فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ مجھے شاید دیکھ لیا گیا تھا یا جھاڑیوں میں حرکت محسوس کرکے گولی چلا دی گئی تھی۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی فائر کھول دیا۔

اور پھر یوں لگا جیسے جہنم کا دہانہ کھل گیا ہو۔ میرے ساتھی چاروں طرف سے فائرنگ کر رہے تھے اور کاٹیج سے بھی بڑی شدید فائرنگ ہو رہی تھی۔ تھائی مجھ سے فاصلے پر تھی اور میں فائرنگ کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے تک دونوں طرف سے بڑی شدید فائرنگ ہوتی رہی۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ جانگی کہاں ہے اور میرے دوسرے ساتھی کس طرف ہیں۔ میں فائرنگ کرتا ہوا کاٹیج کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک محافظ کو کمرے کے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تو سب مشین گن کا رخ اس کی طرف کرکے فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہوگئیں اور وہ لہراتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

اور پھر اسی لمحے مجھے کاٹیج کے بائیں طرف سے تھائی کی چیخ سنائی دی۔ میں تیزی سے اس طرف دوڑا لیکن نہ مجھے تھائی نظر آئی اور نہ ہی اس کی آواز سنائی دی تھی۔

دوسری طرف سے فائرنگ دم توڑنے لگی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مجھے واکی ٹاکی پر سردار تھالوب کی آواز سنائی دی اور پھر ہم نے چاروں طرف سے کاٹیج پر ہلّا بول دیا۔

وہ لوگ فرار ہوچکے تھے لیکن کئی لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ تین محافظوں کی لاشیں تھیں۔ تین لڑکیاں جن میں مائے سا کی لاش بھی تھی۔ وہ بالکل برہنہ تھی اور اس کی پیشانی میں سوراخ تھا۔ محافظ کی چھلنی لاش بھی ایک کمرے کے دروازے میں پڑی ہوئی تھی۔

ہر طرف خون پھیلا ہوا تھا اور گولیوں کے لاتعداد خول بکھرے ہوئے تھے۔ اگر آمنے سامنے مقابلہ ہوتا تو شاید ان کی جگہ ہماری

لاشیں پڑی ہوتیں لیکن ہمیں یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ ہم نے کاٹیج کو گھیرے میں لے کر حملہ کیا تھا اور وہ لوگ ہماری رائفلوں کی زد پر تھے۔

میرے تمام ساتھی محفوظ رہے تھے۔ اچانک مجھے تھائی کا خیال آیا۔ وہ ان میں موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کی چیخ کی آواز سنی تھی۔

میں تھائی کو آوازیں دیتا ہوا اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ تھالوب وغیرہ بھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ کاٹیج سے کچھ فاصلے پر پولیس چیف اور رنگ سنت کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

ہم نے دور دور تک دیکھ لیا لیکن تھائی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ اگر وہ گولی لگنے سے زخمی ہوجاتی یا مرچکی ہوتی تو کہیں نہ کہیں مل جاتی لیکن لگتا تھا جیسے اسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان نے اچک لیا ہو۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ سردار تھالوب کا خیال تھا کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ صبح آکر اسے تلاش کیا جائے گا لیکن میں یہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے، تھائی زخمی ہوکر کسی جگہ بے ہوش پڑی ہو۔ میں اسے ہر صورت۔۔۔ تلاش کرنا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ میں اس وقت کاٹیج کے دروازے کے سامنے ہی تھا کہ اندر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرا خیال تھا کہ سین فونگ یا انہی لوگوں میں سے کسی کے لیے فون ہوگا۔ جانگی اس وقت میرے قریب کھڑی تھی۔ میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور اندر جاکر فون کا ریسیور اٹھالیا لیکن بولا کچھ نہیں مگر چند سیکنڈ بعد ہی ریسیور پر دارا کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم لوگ اب تک وہیں موجود ہوگے۔ تم جو کوئی بھی ہو، اپنے اس حرام زادے لٹل ماسٹر سے کہہ دو کہ اس کی جیتی تھائی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ جنگل میں اسے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"دارا تم۔۔۔" میں چیخا "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"اوہیرو۔۔۔" دارا کی آواز سنائی دی "تم آج کی بازی جیت کر بھی ہار گئے۔ تمہاری تھائی میرے قبضے میں ہے۔ اب تم میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاؤ گے۔ کیسی رہی۔ آہاہا۔۔۔"

دارا قہقہے لگا رہا تھا اور اس کی آواز پگھلے ہوئے سیسے کی طرح میرے کانوں کو چیرتی ہوئی دماغ میں گھسی جارہی تھی۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں دھم سے ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ رگوں میں خون جیسے شوریدہ سر لہروں کی طرح اچھل رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ دماغ کی نسیں نہ پھٹ جائیں۔ فون کا ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامتا ہوا قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دارا کے خوفناک قہقہوں کی آواز اب بھی میرے دماغ میں گونج رہی تھی۔

سردار تھالوب وغیرہ اس وقت بھی باہر ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جانگی کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے مجھے اس طرح سر پکڑ کر بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا اور وہ دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوکر میرے قریب آگئی۔

"کیا ہوا وجدان۔۔۔ کس کا فون تھا؟" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجوڑ دیا اور پھر لپک کر فون کا ریسیور پکڑ لیا جو اسٹینڈ سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ شاید دوسری طرف سے لائن منقطع ہوچکی تھی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوگئی "کس کا فون تھا وجدان۔۔۔؟"

"دارا۔" میں نے سر اٹھاتے ہوئے جواب دیا "تھائی اس وقت دارا کے قبضے میں ہے۔"

"کیا۔۔۔!" جانگی چیخی۔

جانگی اس قدر زور سے چیخی تھی کہ باہر کھڑے ہوئے تھالوب وغیرہ بھی مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں آگئے۔

"کیا ہوا۔ تم کیوں چیخی تھیں جانگی۔" سردار تھالوب نے اسے گھورا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا "تمہیں کیا ہوا وجدان۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"وہ لوگ تھائی کو اٹھا کر لے گئے ہیں اور تھائی اس وقت دارا جیسے درندے کے قبضے میں ہے۔" جانگی نے بتایا۔

"کیا۔۔۔!" تھالوب اچھل پڑا "تمہیں کیسے پتا چلا؟ ہم تو اسے۔۔۔"

"کچھ دیر پہلے فون کی گھنٹی بجی تھی۔" اس مرتبہ جانگی کے بجائے میں نے جواب دیا "میں سمجھا تھا کہ سین فونگ وغیرہ میں سے کسی کی کال ہوگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تھائی اس کے قبضے میں ہے اور اب وہ مجھے اپنے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردے گا۔"

"اوہ۔" سردار تھالوب کے منہ سے بے اختیار نکلا "کہیں وہ بلف تو نہیں کر رہا؟"

"نہیں۔ وہ اس معاملے میں بلف نہیں کرسکتا۔" میں نے جواب دیا "ہم تھائی کو دور دور تک تلاش کرچکے ہیں۔ اگر وہ زخمی ہوکر کہیں بے ہوش بھی پڑی ہوتی تو اب تک اسے ہوش آچکا ہوتا اور ہماری آواز سن کر جواب ضرور دیتی۔ اس کا مطلب ہے دارا جھوٹ نہیں بول رہا۔ یہاں سے بھاگتے ہوئے تھائی ان کے ہاتھ لگ گئی ہوگی اور اب وہ تھائی کے ذریعے ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"لیکن ہم اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

تھالوب نے کہا "اسے تھائی کو چھوڑنا ہوگا' بغیر کوئی نقصان پہنچائے۔"

"تم دارا کو نہیں جانتے۔" میں نے کہا "وہ نہایت بے ضمیر اور دنیا کا گھٹیا ترین آدمی ہے۔ انسان کے روپ میں بھیڑیا۔ وہ تھائی کو پہلے بھی نقصان پہنچا چکا ہے اور اب بھی کسی ایسی حرکت سے باز نہیں آئے گا۔"

"تم فکر مت کرو۔" سردار تھالوب نے کہا "اب اگر تھائی کو کوئی نقصان پہنچا تو میں دارا کا وہ حشر کروں گا کہ آئندہ وہ ایسی کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔"

رنگولی اور وانگ ژن خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے تھے اور پھر رنگولی نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

"اب یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں واپس جاکر اطمینان اور سکون سے کوئی پلاننگ کرنی ہوگی۔"

"رنگولی ٹھیک کہتی ہے ماسٹر۔" سردار تھالوب نے کہا اور آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "مجھے تھائی سے تمہاری جذباتی وابستگی کا بہت پہلے اندازہ ہوگیا تھا لیکن اس طرح مایوس ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں جانتا ہوں تم ایک بہادر لڑکے ہو اور بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا جانے کا بھی حوصلہ رکھتے ہو۔ ویسے میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تھائی کو کوئی نقصان پہنچا تو دارا کو پاگل کتوں سے نچوا دوں گا۔"

ہم کمرے سے باہر آگئے اور پھر اچانک وانگ ژن کی بات نے ہم سب کو چونکا دیا۔

"پہلے ہم نے جس کانیج کو آگ لگائی تھی اس میں گولہ بارود بھرا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کانیج کے نیچے بھی کوئی تہ خانہ ہو جس میں...."

وانگ ژن کی بات میں خاصا وزن تھا۔ ہم ایک بار پھر کانیج کے اندر آگئے اور گھوم پھر کر تلاشی لینے لگے۔ ایک کمرے سے....

تین چائنیز آٹومیٹک رائفلیں اور کئی بھرے ہوئے میگزین تو برآمد ہوئے مگر کسی تہ خانے کا سراغ نہیں ملا۔ فرش اور دیواروں کے ایک ایک انچ حصے کو ٹھوک بجا کر دیکھا گیا مگر کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جہاں تہ خانے کے راستے کا شبہ ہوتا۔

مزید وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم نے واپسی کا فیصلہ کرلیا۔ تینوں چائنیز رائفلوں اور بھرے ہوئے میگزین پر قبضہ کرلیا گیا تھا۔ واپس جاتے ہوئے میں مائے سا کی لاش کے قریب رک گیا۔

گولی اس کی پیشانی پر ماری گئی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ خون سے تر تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ پیشانی کے زخم سے بہنے والا خون ایک آنکھ اور آدھے چہرے پر پھیل کر جم گیا تھا۔ گردن اور اس کے نیچے فرش پر بھی خون جما ہوا تھا جس کی رنگت سیاہ پڑ چلی تھی۔ جبکہ باقی آدھا چہرہ بالکل صاف تھا۔ اس کی ایک آنکھ پوری طرح کھلی ہوئی تھی۔ بے پناہ خوف اور کرب کے تاثرات اس کی آنکھ میں اور چہرے پر جیسے جم کر رہ گئے تھے۔

وہ بالکل برہنہ تھی۔ اس کا لباس قریب ہی فرش پر پڑا ہوا... میں نے وہ لباس اٹھالیا۔ بلاؤز اور اسکرٹ کی بیلٹ سے... غائب تھے جن میں ڈکٹا فون لگائے گئے تھے اور ظاہر ہے یہ... فونگ نے ہی نکالے ہوں گے۔ مجھے مائے سا کی موت کا... افسوس ہوا تھا۔

جب ہم کانیج سے روانہ ہوئے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو... اور جب ہم اپنے کانیج پہنچے تو سورج طلوع ہوچکا تھا۔ نرم... دھوپ پھیل رہی تھی۔

ہم سب ہال کمرے میں آگئے۔ ہم نے اگرچہ رات جا... اور بڑی سنگین صورتِ حال سے دوچار ہو کر گزاری تھی... تھکن کے آثار مجھے کسی کے چہرے پر نظر نہیں آرہے تھے... اور رنگولی پر مجھے زیادہ حیرت ہورہی تھی۔ وہ خواتین تھیں... کو عام طور پر صنفِ نازک سمجھا جاتا ہے اور اس میں کوئی... نہیں کہ مرد کے مقابلے میں عورت کہیں زیادہ نازک اندام... ہے اور اس سے کڑی محنت اور مشقت کی توقع نہیں رکھی جاتی... لیکن میں نے بہت سی ایسی عورتیں بھی دیکھی ہیں جو مردوں سے... زیادہ محنت کرتی ہیں اور رنگولی' جانکی اور تھائی کے حوالے سے... کچھ اور کہہ رہا تھا۔ یہ بڑی سخت جان اور دلیر ثابت ہوئی تھیں... اب تک تو انہوں نے بڑی کڑی سے کڑی صورتِ حال کا مقابلہ... بڑی حوصلہ مندی سے کیا تھا۔

دوسری طرف لوما بھی بہت ذمے دار اور فرض شناس قسم... آدمی ثابت ہوا تھا۔ ایسے ہر موقع پر وہ تاڑ لیا کرتا تھا کہ ہمیں کس... چیز کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ اس وقت بھی اس نے ہماری ضرورت... کا اندازہ لگالیا تھا اور چند منٹ بعد ہی اس نے گرم گرم کافی ہمارے... سامنے رکھ دی۔

چائے یا کافی اس وقت ہماری اہم ترین ضرورت تھی اور اس... میں شبہ نہیں کہ کافی بہت خوش ذائقہ اور لذیذ تھی لیکن میرا ذہن... تھائی میں الجھا ہوا تھا اور میں اس کافی سے پوری طرح لطف اندوز... نہیں ہوپا رہا تھا۔

"لوما۔" سردار تھالوب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے... "جوجی کہاں ہے۔ بلاؤ اسے۔"

"جوجی' وانگ ژن کے کوارٹر میں ہے۔ میں ابھی اسے بلا... ہوں باس۔" لوما کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

جوجی وہ وائرلیس آپریٹر تھا جسے ڈکٹا فون پر ہونے والی گفتگو... ریکارڈ کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔

چند منٹ بعد ہی جوجی آگیا۔ وہ ادھیڑ عمر دبلا پتلا سا تو... اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ شاید اسے سوتے میں سے جگا... گیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹیپ ریکارڈر تھا اور دوسرے میں... آڈیو کیسٹ۔

"تم نے کچھ کام بھی کیا یا سوگئے تھے؟" سردار تھالوب نے ...سے گھورا۔

"ان کی ساری گفتگو ریکارڈ کرلی ہے سردار۔" جوجی نے ...جواب دیا "جب اس لڑکی کے لباس میں ڈکٹا فون کا راز فاش ہوگیا تھا ...اور اس کے بعد فائرنگ شروع ہوگئی تھی تو ریکارڈر اس کے بعد بھی ...بہت دیر تک آن رہا تھا۔ اس کے بعد تو صرف فائرنگ اور چیخنے کی ...آوازیں ہی ریکارڈ ہوتی رہیں۔ میں ابھی آپ کو ٹیپ سناتا ہوں۔"

جوجی نے ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھ کر اس کا پلگ دیوار کے ...ساکٹ میں لگا دیا اور کیسٹ لگا کر پلے کا بٹن دبا دیا۔ چند لحوں تک ...سرسراہٹ کی آواز سنائی دیتی رہی پھر رنگ سنت کی آواز سنائی ...دی۔ وہ مائے سا اور غالباً دوسری لڑکیوں کو بھی مخاطب کرتے ہوئے ...انہیں ہدایات دے رہی تھی کہ انہیں مہمانوں کو کس طرح خوش ...کرنا ہے۔

"یہ عام لوگ نہیں ہیں۔" رنگ سنت کہہ رہی تھی "جو چند ...باتوں پر تم لوگوں کو نہلا دیں گے۔ یہ بہت ہی خاص قسم کے لوگ ...ہیں اسی لیے تم لوگوں کا انتخاب بھی خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اگر وہ ...لوگ تمہاری خدمات سے خوش ہوگئے تو تم سب کی قسمت بدل ...جائے گی....."

اس کے بعد خاموشی چھا جاتی.... کبھی مختلف آوازیں سنائی ...دینے لگتیں اور بالآخر وہ گفتگو بھی سامنے آگئی جس کا انتظار تھا۔ ...مین تونگ' آنگ سانگ' ایکی مائی' پولیس چیف اور دوسرے لوگوں ...کی آوازیں صاف طور پر پہچانی جارہی تھیں۔ ان کی گفتگو سے یہ ...بات واضح ہوگئی تھی کہ شہنشاہ کے خلاف سازش طے پا چکی ہے اور ...ہر شخص اس سازش کی کامیابی کی صورت میں اپنے حصے.... اور ...مراعات کا تعین کر رہا تھا۔ البتہ یہ بات ابھی تک سامنے نہیں آئی ...تھی کہ اس سازش پر عمل کب اور کس طرح کیا جائے گا۔ کیونکہ ...اس دوران میں ڈکٹا فون کا راز کھل گیا تھا اور آگے گفتگو ختم ہوگئی ...تھی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد شدید فائرنگ اور چیخوں کی آوازیں ...سنائی دینے لگی تھیں۔

سردار تھالوب کے اشارے پر جوجی نے ٹیپ ریکارڈر بند ...کر دیا۔

"میرا خیال ہے اس سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ ...ٹیپ کافی ہے۔ اس میں ان چند بڑے لوگوں کے نام بھی آگئے ہیں جو ...اس سازش میں شریک ہیں۔ حکومت انہیں حراست میں لے کر ...سب کچھ معلوم کرسکتی ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ تمہارے ملک میں عدالت اس ٹیپ کو ...ثبوت کے طور پر تسلیم کرے گی یا نہیں لیکن....."

"میرا خیال ہے یہ کیس فوری طور پر تو عدالت میں نہیں جائے ...گا۔" سردار تھالوب نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اس میں ان ...تمام لوگوں کی اپنی آوازیں شامل ہیں جو اس سازش کے تانے بانے میں شامل ہیں۔ سب سے پہلے تو انہیں حراست میں لیا جائے گا اور اس کے بعد ہی بات آگے بڑھے گی۔ عدالت میں کیس جانا تو بہت بعد کی بات ہے اور یہ بات بھی وثوق سے نہیں کہی جاسکتی کہ یہ کیس عدالت میں جائے گا یا سازشیوں کو فوری طور پر فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

"تو پھر کیا خیال ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بات تو اب بالکل صاف ہے۔" سردار تھالوب نے کہا "مہاراج کو فون پر صورتِ حال سے آگاہ کردو۔ زیادہ تاخیر مناسب نہیں ہوگی۔ مہاراج' شہنشاہ کے کزن رتنا کوسن کو بتا دیں گے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے اسی پر عمل کیا جائے گا۔"

"یہی مناسب ہوگا۔" میں نے جواب دیا "تاخیر واقعی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ میں ابھی مہاراج کو فون کرتا ہوں۔"

سردار تھالوب نے وانگ ژن کو اشارہ کیا کہ فون اسٹینڈ سے اٹھا کر ہمارے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا جائے۔ وانگ ژن نے آگے بڑھ کر فون اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ریسیور اٹھالیا اور پھر فون پر بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ وہ قبائلی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا لیکن چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کوئی اہم خبر ہے۔ اس نے اپنے مخاطب سے کچھ کہا اور پھر فون اٹھا کر سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور قبائلی زبان ہی میں کچھ کہتے ہوئے ریسیور سردار تھالوب کی طرف بڑھا دیا۔

سردار تھالوب بھی تقریباً پانچ منٹ تک بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرے ایک آدمی کا فون تھا جنہیں رات کو اس کانیج کی ناکا بندی پر لگا رکھا تھا۔ انہوں نے ایک عورت کو زخمی حالت میں جنگل سے پکڑا ہے لیکن وہ اسے یہاں نہیں لا سکتے کیونکہ پولیس اس علاقے میں چاروں طرف پھیل چکی ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس زخمی عورت کو تو وہ وہاں سے تقریباً چھ کلو میٹر دور چند گھروں پر مشتمل ایک بستی میں لے گئے ہیں اور یہ آدمی گولڈن ٹرائی اینگل روڈ پر لگے ہوئے ایک فون بوتھ سے بات کر رہا تھا۔"

"انہوں نے معلوم نہیں کیا' وہ عورت کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنا نام نہیں بتایا البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ وہ ایک سرکاری آفیسر ہے۔ اگر... اسے حفاظت اور رازداری سے شہر پہنچا دیا جائے تو وہ ان قبائلیوں کو منہ مانگا انعام دے گی۔"

"ایکی مائی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تمہارا اندازہ درست ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ ایکی مائی ہی ہو۔" سردار تھالوب نے کہا "رات کو اس کاٹیج میں رنگ سنت بھی موجود تھی جو ماری گئی۔ ہو سکتا ہے کوئی اور مقامی خاتون آفیسر بھی ہو۔ ان دو طوائفوں میں سے بھی کوئی ہو سکتی ہے جو رات کو بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے قبائلیوں پر رعب جھاڑنے کے لیے وہ اپنے آپ کو سرکاری آفیسر بتا رہی ہو۔ بہرحال میں اس بستی میں جا رہا ہوں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا سردار۔" میں نے کہا۔

سردار تھالوب چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے لیکن اس سے پہلے مہاراج کو صورتِ حال سے آگاہ کر دو۔"

میں نے فون کا ریسیور اٹھایا اور بنکاک کا کوڈ نمبر ملا کر واٹ ٹریمٹ کا نمبر ملانے لگا۔

کال ریسیو ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن مہاراج اس وقت خانقاہ میں موجود نہیں تھے۔ میں نے جمنازیم کا نمبر ملایا۔ وہاں بھی نہ تو مہاراج تھے اور نہ ہی ماسٹر ہوچن۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور سردار تھالوب کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ واپس آ کر فون کر لیں گے۔ اس دوران میں یہ بھی پتا چل جائے گا کہ پکڑی جانے والی عورت کون ہے۔" تھالوب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ سردار تھالوب نے وانگ ڈن کو وہیں رکنے کے لیے کہہ دیا تھا لیکن وہ باہر جیپ تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس نے دو آٹومیٹک رائفلیں اور دو فاضل میگزین جیپ میں رکھ دیے تھے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں ایک بار پھر گولڈن ٹرائی اینگل روڈ کی طرف جانا پڑے گا لیکن جیپ اس طرف جانے کے بجائے دائیں طرف مڑ گئی۔

"اس طرف...."

"گولڈن ٹرائی اینگل روڈ پر اس وقت پولیس کی بھرمار ہوگی۔" سردار تھالوب نے میری بات کاٹ دی "ہمیں پولیس سے کوئی خطرہ تو نہیں لیکن میں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔ یہ راستہ...." اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا "اگرچہ خاصا طویل ہے لیکن محفوظ ہے۔ اس طرف اگر کوئی ہمیں دیکھ لے گا تو کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکے گا۔"

میں خاموشی سے سامنے دیکھنے لگا اور پھر اچانک پولیس سائرن اور ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر چونک گیا۔ یہ آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا نا کہ گولڈن ٹرائی اینگل روڈ پر پولیس کی بھرمار ہے۔" سردار تھالوب نے کہا "یہ آوازیں اسی طرف سے آ رہی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پولیس کو بہت دیر سے اطلاع ملی ہے۔" میں نے کہا۔

"فائرنگ کی آوازیں تو رات ہی کو سن لی گئی ہوں گی مگر ایسے حالات میں پولیس تو کیا فوج کے گوریلے بھی جنگل کا رخ کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔" تھالوب چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "رات کو جو لوگ فرار ہو گئے تھے ہو سکتا ہے ان میں سے کسی نے صبح پولیس کو اطلاع دی ہو۔"

"سین فونگ' دارا یا آنگ سانگ سے تو ایسی توقع نہیں کی جا سکتی۔" میں نے کہا۔

"ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔" تھالوب نے جواب دیا "ہو سکتا ہے پولیس کو یہ اطلاع آنگ سانگ ہی نے دی ہو۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے آپ کو پھنسانے کی کوشش کرے گا۔" میں نے کہا۔

"آنگ سانگ بیورو کریٹ ہے اور بیورو کریٹ سیاست دانوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر پولیس کو اطلاع واقعی اس نے دی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کی ایک بھونڈی کوشش کی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آنگ سانگ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہے۔" تھالوب نے کہا "ایسے بڑے آفیسر جب کسی علاقے کے دورے پر جاتے ہیں تو مقامی آفیسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے رشوت پیش کرتے ہیں۔ آنگ سانگ کہہ سکتا ہے کہ پولیس چیف نے ان کے لیے پکنک کا پروگرام بنایا تھا۔ ایسے پروگراموں میں خوب صورت لڑکیاں ضرور شامل ہوتی ہیں۔ اب کہانی کچھ یوں ہوگی کہ وہ لوگ اس کاٹیج میں پکنک منا رہے تھے کہ رات کو ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا جس میں پولیس چیف اور چند اور لوگ مارے گئے۔"

"لیکن کیا اس طرح وہ اپنی گردن نہیں پھنسا لے گا؟" میں نے کہا۔

"اسے پتا چل گیا تھا کہ مائے سا کے لباس میں ڈکٹا فون چھپے ہوئے تھے اور ان کی باتیں کہیں سنی جا رہی ہوں گی۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ان کی باتیں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ ایسے لوگ بعض اوقات اپنی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی سے بھی دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ اتنا تو ضرور جانتا ہوگا کہ سازش والی بات سامنے آئے گی۔ وہ صاف انکار کر دے گا کیونکہ اس کے خیال میں ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہوگا اور میری یہ بات بھی لکھ لو کہ وہ سارا الزام مجھ پر یعنی کیرن قبیلے کے سردار کے سر تھوپنے کی کوشش کرے گا اور وہ اس واقعے کو جواز بنانے کی کوشش کرے گا

میں نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں میرے پانچ آدمی مارے گئے۔"

سردار تھالوب کی باتوں میں خاصا وزن تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور دور کی سوچ رہا تھا اور میں آنگ سانگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر پولیس کو رات والے واقعے کی اطلاع واقعی اسی نے دی تھی تو وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق کہلانے کا مستحق تھا۔

جیپ پکی سڑک سے اتر کر ایک پتھریلے راستے پر مڑ گئی۔ یہ راستہ بل کھاتا ہوا مسلسل نشیب کی طرف جا رہا تھا۔ بعض مقامات پر خطرناک موڑ تھے اور ذرا سی بے پروائی موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

جیپ سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے راستے کے نشیب و فراز پر جھٹکے کھاتی ہوئی چلتی رہی اور پھر اچانک میں چونک گیا۔ ونڈ اسکرین پر پانی کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگی تھیں۔ میں نے ذرا آگے جھک کر اوپر دیکھا آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔ معشوق کے مزاج کی طرح یہاں کے موسم کا بھی کوئی بھروسا نہیں تھا۔ جب ہم کاٹیج سے نکلے تھے تو آسمان صاف تھا اور تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ اس پہاڑی راستے کو دونوں طرف سے بلند اور گنجان درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا اور یہ پتا ہی نہیں چل سکا تھا کہ مطلع کب ابر آلود ہوا تھا۔

بارش آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ پہاڑوں میں تیز بارش خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس پتھریلے راستے پر پانی بہنا شروع ہو گیا تھا۔ سردار تھالوب نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔

پختہ سڑک سے اترنے کے بعد ہم تقریباً بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور صحیح اندازہ نہیں تھا کہ مزید کتنا سفر کرنا ہوگا۔ ایک کلومیٹر فاصلہ اور طے ہوا ہوگا کہ سامنے دو آدمیوں کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ درختوں سے نکل کر اچانک ہی بیچ راستے میں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ میں نے بھی پھرتی سے اپنے پیروں کے قریب پڑی ہوئی رائفل اٹھا لی۔ سردار تھالوب میری طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ اس نے جیپ کی رفتار مزید کم کر دی اور بالآخر ان دونوں آدمیوں کے قریب پہنچ کر جیپ رک گئی۔ سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمی سردار تھالوب والی سائڈ پر آ گئے۔ ان کی رائفلیں نیچے کو جھکی ہوئی تھیں۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ سردار تھالوب کے آدمی تھے۔

سردار تھالوب نے اپنی طرف کا شیشہ گرا دیا اور ان سے باتیں کرنے لگا۔ ان دونوں کا انداز بہت ہی مؤدبانہ تھا اور پھر سردار تھالوب جیپ کو اس راستے سے اتار کر درختوں میں لے گیا اور کچھ آگے لے جا کر روک دیا اور انجن بند کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

سگریٹ نوشی چھوڑیے
جینا شروع کیجیے
قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
تمباکو نوشی اور دیگر بری عادات سے چھٹکارا حاصل کیجیے۔
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں
مکتبہ نفسیات
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

"پولیس اس بستی میں پہنچ چکی ہے مگر یہ لوگ پولیس کی آمد سے پہلے ہی اس زخمی عورت کو بستی سے نکال کر اس طرف ایک پہاڑی غار میں لے آئے تھے۔ وہاں تک جیپ کا راستہ نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں یہاں سے پیدل ہی آگے جانا ہوگا۔"

"کوئی گڑ بڑ تو نہیں سردار۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ان لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ تم اس طرف سے آرہے ہو؟"

"بستی کی طرف آمدورفت کے تین راستے ہیں۔" سردار تھالوب نے بتایا "اور تینوں راستوں پر قبیلے کے آدمی کھڑے ہیں۔ تاکہ بستی تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اطلاع دے دی جائے۔"

میں قبائلیوں کے اس انتظام پر اش اش کر اٹھا۔ وہ قبائلی جنہیں جاہل اور اجڈ سمجھا جاتا تھا' بہت ذہین ثابت ہوئے تھے۔

میں بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ رائفل میں نے کندھے پر لٹکالی تھی۔ سردار جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک قبائلی سے کچھ کہہ رہا تھا مگر وہ مسلسل انکار کررہا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ سردار اسے بارش سے بچنے کے لیے جیپ میں بیٹھ جانے کو کہہ رہا تھا لیکن وہ اس لیے انکار کررہا تھا کہ سردار کی جگہ پر بیٹھنے کو بہت بڑی گستاخی سمجھتا تھا۔ اس نے درختوں کے نیچے کھڑے رہ کر جیپ کی حفاظت کی ذمے داری قبول کرلی تھی۔ قبیلے والوں کے دل میں اپنے سردار کا یہ احترام میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میرا تو کسی قبیلے سے واسطہ ہی پہلی مرتبہ پڑا تھا لیکن چند روز سے میں جو کچھ دیکھ رہا تھا' اس سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ تمام قبائلی اپنے سرداروں کا اسی طرح احترام کرتے ہیں اور ان کے لیے اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار رہتے ہیں۔

دوسرا قبائلی ہماری رہنمائی کے لیے آگے آگے چل پڑا تھا۔ میری طرح سردار تھالوب نے بھی رائفل کندھے پر لٹکا رکھی تھی۔ بتدریج بلندی کی طرف جاتا ہوا راستہ خاصا دشوار گزار تھا۔ میرے پیروں میں جوگرز تھے اور بھیگے ہوئے پتھروں پر بار بار پھسل رہے تھے۔

بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی' اسی طرح اچانک ہی بند بھی ہوگئی۔ بادل بھی پلٹ کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔ کبھی دھوپ چمکنے لگتی اور کبھی سورج بادل کے کسی ٹکڑے کے پیچھے چھپ جاتا۔ بارش بند ہونے کے باوجود پانی جھرنوں کی طرح پہاڑیوں سے بہہ رہا تھا۔

تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمارا راہبر ایک چٹان کے پیچھے غائب ہوگیا۔ ہم اس طرف مڑے تو میں ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ دو قبائلی اس چٹان کے پیچھے درختوں سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ تیسرا قبائلی ایک درخت کے اوپر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ گنجان پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ ہم اسے نہیں دیکھ سکے تھے مگر اس نے ہمیں آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اس پہلی چٹان کے پیچھے تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایک اور اونچی چٹان تھی جس میں زمین سے تقریباً پانچ فٹ کی بلندی پر ایک غار کا تنگ سا دہانہ نظر آرہا تھا اور ایک رائفل بردار قبائلی وہاں بھی کھڑا تھا۔ دونوں چٹانوں کی درمیانی جگہ پر ساگوان کے درخت تھے اور دبیز گھاس اور جھاڑیوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔

یہ غار محفوظ ترین جگہ تھی۔ درختوں اور سامنے والی چٹان کی وجہ سے دور سے اس غار کو دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

ہم ایک پتھر پر چڑھ کر غار کے سامنے پہنچ گئے۔ دہانہ اگرچہ تنگ سا تھا مگر اندر سے یہ غار کافی کشادہ تھا اور اندر دو تین مشعلیں جل رہی تھیں۔ ان شعلوں میں غالباً کسی جانور کی چربی استعمال کی گئی تھی۔ ایک ناگوار سی بو کا احساس ہو رہا تھا۔

غار میں ذرا آگے ایک عورت زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے نیلے رنگ کا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا اور وہ کچھ اس طرح آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی کہ اس کا اسکرٹ اوپر تک سمٹ گیا تھا اور اس کی ایک ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا اوپر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ٹانگ پر لگا ہوا خون واضح طور پر نظر آرہا تھا۔

میں اور سردار تھالوب اس عورت کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ ہمارے قدموں کی آواز سن کر بھی اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ سردار تھالوب نے اپنے ساتھ آنے والے قبائلی کو اشارہ کیا۔ وہ اس عورت کے سر کی طرف سے گھوم کر سامنے کی طرف چلا گیا۔ پہلے اس نے کھڑے کھڑے ایک دو آوازیں دیں پھر جھک کر بیٹھ گیا۔ رائفل ایک ہاتھ میں اس نے پکڑے رکھی اور دوسرا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ اس کے ساتھ وہ اسے آوازیں بھی دے رہا تھا مگر عورت کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ قبائلی' سردار کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ کچھ ہوگیا جس کی ہم میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی۔

اس عورت نے بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ اس کی لات سامنے اکڑوں بیٹھے ہوئے قبائلی کے منہ پر لگی۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا لیکن اس کی رائفل اس عورت کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

قبائلی پشت کے بل پیچھے گرا تھا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ پوری طرح سنبھل سکتا' اس عورت کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رائفل سے تڑ تڑ کئی گولیاں نکلیں اور قبائلی کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ غار گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور قبائلی کی چیخوں سے گونج اٹھا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ ہمیں کچھ سمجھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور جب سمجھے تو وقت گزر چکا تھا۔ اس عورت نے

پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اور سردار تھالوب کو رائفل ... لے لیا تھا۔

اس عورت کا چہرہ اب ہمارے سامنے تھا اور اسے دیکھ کر ہم چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ وہ ایکی مائی تھی۔

"اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر پھینک دو۔" ایکی مائی کے ... سے بلی جیسی غراہٹ نکلی۔ وہ بہت حسین عورت تھی لیکن اس ... اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی نظر آرہی تھی۔

میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں نے اپنی اپنی رائفلیں کندھوں سے اتار کر پھینک دیں۔

فائرنگ اور قبائلی کے چیخنے کی آواز سن کر باہر کھڑے ہوئے دو قبائلی غار کے دہانے پر آگئے تھے اور یہ منظر ان کے لیے بڑا حیرت انگیز تھا۔ ان کا ایک ساتھی غار کے فرش پر مرا پڑا تھا اور قیدی عورت نے ان کے سردار کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے رائفل سیدھی کرلی لیکن سردار تھالوب ایک دم چیخ اٹھا۔

"گولی مت چلانا۔"

سردار کا حکم سن کر دونوں قبائلیوں نے رائفلیں جھکالیں اور پھر ایکی مائی کے حکم پر انہیں بھی رائفلیں زمین پر پھینک دینی پڑیں۔

ایک قبائلی ہمارے ساتھ آیا تھا اور چار پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے ایک مارا گیا تھا۔ دو نہتے کردیے گئے تھے اور دو باہر تھے۔ ان میں سے ایک درخت پر چڑھا ہوا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب بھی وہ درخت پر ہی ہوگا۔

"تم اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کررہی ہو ایکی مائی۔" سردار تھالوب نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے ایک اشارے پر میرے یہ آدمی اب بھی تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتے ہیں لیکن میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا۔ تمہاری لاش ہمارے لیے کسی کام کی نہیں ہوگی۔ تمہارا زندہ رہنا ہی ہمارے لیے اہم ہے۔"

"میں زندہ رہوں گی مگر قیدی بن کر نہیں۔" ایکی مائی نے جواب دیا "اس غار سے باہر نکلو اور باہر جو تمہارے آدمی موجود ہیں ان سے کہو کہ اگر انہوں نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو تم دونوں کو چھلنی کردوں گی۔ چلو۔ آگے بڑھو۔" اس نے رائفل سے اشارہ کیا۔

میں اندازہ لگا رہا تھا کہ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے ایکی مائی ... سے کھڑے ہونا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے دوسری ٹانگ پر ... بوجھ ڈال رکھا تھا۔ ہم اس کے اشارے پر الٹے قدموں پیچھے ... ہٹنے لگے۔ دونوں قبائلی اب بھی غار کے دہانے کے قریب کھڑے ...

پیچھے ہٹتے ہوئے میرا پیر ایک پتھر پر رپٹ گیا۔ میں لڑکھڑا کر ... کے بل گرا۔ سردار تھالوب نے جھک کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

"تم سیدھے کھڑے رہو مسٹر تھالوب۔" ایکی مائی اسے رائفل کی زد پر لیتے ہوئے چیخی اور پھر میری طرف دیکھ کر غرائی "شرافت سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گی۔ تمہیں تو بہرحال زندہ چھوڑنا نہیں ہے۔ سارے فساد کی جڑ تو تم ہی ہو۔ تم ٹانگ نہ اڑاتے تو اب تک ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ تمہیں تو ہر حال میں مرنا ہے۔ تمہاری وجہ سے ہم بہت نقصان اٹھا چکے ہیں لیکن ہم اپنے اس منصوبے کو ناکام نہیں ہونے دیں گے۔"

بات تو وہ مجھ سے کررہی تھی لیکن رائفل اس نے تھالوب پر تان رکھی تھی۔ میں چونکہ زمین پر گرا ہوا تھا اس لیے شاید اسے میری طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا اور میں اس کی اسی حماقت پر دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں نے ایکی مائی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنے آپ کو اس طرح حرکت دی جیسے اٹھنا چاہ رہا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں زمین پر پڑے پڑے لٹو کی طرح گھوم گیا۔ میرے ایک پیر کی ٹھوکر ایکی مائی کی زخمی ٹانگ پر پنڈلی کی ہڈی پر لگی۔ وہ چیختی ہوئی... لڑکھڑائی اور پشت کے بل گری۔ پہلے اس کے دونوں ہاتھ رائفل پر تھے لیکن گرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ رائفل سے ہٹ گیا تھا۔ رائفل اب بھی دوسرے ہاتھ میں تھی۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل کو ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیا لیکن اس سے پہلے کہ اسے رائفل سیدھی کرنے کا موقع ملتا' میں سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اس کے اوپر جاگرا اور رائفل پر ہاتھ ڈال کر اس کا رخ اوپر کی طرف کردیا۔

ایکی مائی کی انگلی نے ٹریگر دبا دیا۔ غار ایک بار پھر تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ گولیاں غار کی چھت پر لگیں۔ اگر رائفل کا رخ تبدیل ہونے میں ایک پل کی بھی تاخیر ہوجاتی تو سامنے کھڑا ہوا سردار تھالوب چھلنی ہوچکا ہوتا۔

میں ایکی مائی کے سینے پر سوار تھا... میں نے اس کی کلائی پر اس طرح دباؤ ڈالا کہ رائفل جھکتی ہوئی زمین پر جا لگی اور اس کا رخ دیوار کی طرف ہوگیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے رائفل کو دبائے رکھا اور دوسرا ہاتھ اس کے گلے پر جما دیا۔ میرا انگوٹھا ایکی مائی کے نرخرے پر تھا۔ معمولی سے دباؤ سے ہی اس کی مزاحمت نے دم توڑ دیا۔ رائفل پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے رائفل اس کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دی اور ایکی مائی کو چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

ایکی مائی دونوں ہاتھوں سے گلا سہلانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ زخمی ٹانگ پٹخ رہی تھی۔ میں نے اس ٹانگ پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کردی۔

"سردار تھالوب نے ٹھیک کہا تھا کہ تم اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کررہی ہو۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "سردار کے آدمیوں نے تمہارے زخم کی مرہم پٹی کی۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی

اور اس کا صلہ تم نے یہ دیا کہ نہ صرف ان کے ایک ساتھی کو مار ڈالا بلکہ ان کے سردار کو بھی ہینڈز اپ کروا دیا اور اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ تم شاید ان قبائلیوں کو نہیں جانتی۔ یہ اپنی جان تو دے سکتے ہیں لیکن اپنے سردار کی توہین برداشت نہیں کرسکتے۔ تم ان کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت دیکھ رہی ہو؟" میں نے غار کے دہانے پر کھڑے ہوئے قبائلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان دونوں نے اپنی رائفلیں اٹھا کر ایکی مائی پر تان لی تھیں "وہ تم سے اپنے ساتھی کے قتل اور سردار کی توہین کا بدلہ لینے کو بے چین ہو رہے ہیں لیکن میں انہیں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ تمہیں جان سے مار ڈالیں۔ البتہ انہیں اتنا موقع ضرور دیا جائے گا کہ وہ اپنے انتقام کی تھوڑی سی پیاس بجھالیں۔ تمہارے اس خوب صورت جسم سے....."

میں نے خاموش ہو کر سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"سردار تھالوب۔" میں نے آنکھ کا گوشہ دباتے ہوئے کہا "ہم دونوں باہر چلتے ہیں اور تم اپنے چاروں آدمیوں کو اندر بھیج دو تھوڑی دیر کے لیے۔ تاکہ وہ....."

ایکی مائی وحشت زدہ سی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی غار کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہٹے کٹے دونوں قبائلیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"شولو۔" سردار نے ان میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے تھائی زبان میں کہا تاکہ ایکی مائی بھی سمجھ لے "باہر سے اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی بلا لو۔ ہم تمہیں ایک گھنٹے کا وقت دے رہے ہیں اور اس ایک گھنٹے میں تم لوگوں نے کس طرح اس کی مزاج پرسی کرنی ہے۔ یہ تم لوگ اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے ان وحشیوں کے رحم و کرم پر مت چھوڑو۔ یہ مجھے مار ڈالیں گے۔ رحم کرو مجھ پر....." ایکی مائی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی "معاف کردو مجھے۔ تم جو کہو گے میں کروں گی مگر مجھے ان وحشیوں کے حوالے نہ کرو۔"

سردار تھالوب نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے آدمیوں سے قبائلی زبان میں کچھ کہا۔ وہ دونوں وہیں رک گئے۔

"چلو۔ اس وقت معاف کیا تمہیں لیکن تم سزا سے بچ نہیں سکو گی۔" میں نے اپنی رائفل اٹھاتے ہوئے کہا "اب اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ جلدی سے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

ایکی مائی کی ٹانگ پر بندھی ہوئی پٹی سرخ ہو رہی تھی۔ زخم سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی لیکن پھر لڑکھڑا کر گر گئی اور بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اس دوران میں ایک قبائلی نے زمین پر پڑی ہوئی دونوں رائفلیں اٹھالی تھیں۔ سردار کی رائفل اس نے بڑے احترام سے اس کی خدمت میں پیش کردی۔ دوسری رائفل اس نے اپنے کندھے پر لٹکالی۔

"تم اٹھ کر چلو گی یا گھسیٹ کر لے جایا جائے۔" میں نے ایکی مائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مم..... میں..... کھڑی نہیں..... ہو سکتی۔ مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" ایکی مائی نے کہا۔ وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی۔ اس نے زخمی ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔

میں نے تھالوب کی طرف دیکھا۔ وہ قبائلی زبان میں اپنے آدمیوں سے باتیں کرنے لگا پھر وہ قبائلی جو ہمیں غار تک لایا تھا آگے بڑھا۔ اس نے اپنی رائفل میرے حوالے کردی اور ایکی مائی کے قریب جا کر رک گیا۔ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر جھک کر بڑی پھرتی سے ایکی مائی کو اٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔ ایکی مائی چیخ اٹھی تھی۔ شولو نامی اس قبائلی نے ایکی مائی کو بڑی بے دردی سے بوری کی طرح اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔

ہم غار سے باہر آگئے۔ دوسرے قبائلیوں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ اپنے ساتھی کی لاش بستی میں لے جائیں اور اس کی آخری رسومات کا بندوبست کریں۔

شولو' ایکی مائی کو بوری ہی کی طرح کندھے پر لادے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا۔ ایکی مائی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ کسی وقت ٹانگ کو زور کا جھٹکا لگتا تو وہ چیخ اٹھتی۔

جیپ تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگ گئے۔ جیپ کا قبائلی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا سگار کی شکل سے ملتا جلتا سگریٹ پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے سگریٹ پھینک دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

سردار تھالوب نے قریب پہنچ کر جیپ کے دروازے کھول دیے۔ شولو نے ایکی مائی کو پچھلی سیٹ پر اس طرح پٹخا تھا کہ وہ بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔ میں بھی جیپ کے پچھلے حصے میں ایکی مائی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رائفل اپنی گود میں رکھ لی۔ میرا ایک ہاتھ رائفل پر ہی تھا۔

سردار تھالوب نے اسٹیرنگ..... کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو ریورس گیئر میں درختوں سے نکال کر پتھریلے راستے پر لے آیا۔ اس نے دونوں قبائلیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جیپ کو پتھریلے راستے پر ڈال دیا۔

واپسی پر کوئی غیر معمولی یا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب ہم کاٹیج پہنچے تو دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ ایکی مائی کو جیپ سے نکال کر ہال کمرے کے قالین پر ڈال دیا گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات نمایاں تھے اور وہ متوحش نظروں سے رنگلی' جانکی اور وانگ ڈن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وانگ ڈن سے معلوم کرو کہ اگر فرسٹ ایڈ کا کوئی سامان ہو تو اس کے زخم کی ڈریسنگ کردو۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں ہر چیز موجود ہے۔ میں ابھی میڈیسن باکس لے کر آتا ہوں۔" وانگ ڈن کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد ہی وہ اپنے کوارٹر سے میڈیسن باکس لے آیا۔ جانکی ایکی مائی کے قریب بیٹھ گئی اور اس کی ٹانگ پر لپٹی ہوئی پٹی کھولنے لگی۔ یہ کوئی باقاعدہ ڈریسنگ نہیں تھی۔ چادر یا کسی ایسے ہی کپڑے کا ٹکڑا پھاڑ کر باندھ دیا گیا تھا۔ خون کے ساتھ اس پٹی پر ہرے سے رنگ کا کوئی گاڑھا سا مادہ بھی جما ہوا تھا۔ جانکی اسی خون آلود کپڑے سے زخم اور اس کے آس پاس کی جگہ کو صاف کرنے لگی۔ اسی دوران میں وانگ ڈن دوڑ کر کاٹن کا رول بھی لے آیا تھا۔ جانکی روئی کے ٹکڑے اسپرٹ میں بھگو کر اس کا زخم صاف کرتی رہی۔ ایکی مائی نے دانت بھینچ رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

"یہ زخم کیسے آیا۔ گولی لگی تھی؟" جانکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" ایکی مائی نے کراہتے ہوئے جواب دیا "میں دوڑتے ہوئے اونچی جگہ سے گری تھی اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی تھی۔ نیچے ایک درخت کا سوکھا ہوا تنا پڑا تھا جس سے تقریباً ڈیڑھ انچ لمبا کانٹے کی طرح نوک دار لکڑی کا ایک ٹکڑا باہر کو نکلا ہوا تھا جو میری ٹانگ میں پیوست ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹانگ کو الگ کھینچا تھا۔ زخم سے بے تحاشا خون بہنے لگا تھا۔ میں نے اپنا اسکارف زخم پر باندھ لیا لیکن خون بند نہیں ہوا اور اگر وہ لوگ نہ ملتے تو شاید خون زیادہ بہہ جانے سے میں وہاں جنگل میں پڑے پڑے ہی ختم ہو جاتی۔"

جانکی اس کے زخم کو دبا دبا کر دیکھتی رہی۔ اسے شبہ تھا کہ اگر کوئی پھانس اندر رہ گئی ہو تو خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ لکڑی کا بہت معمولی سا ریشہ بھی پھول کر زخم کو بگاڑ سکتا تھا۔ وہ زخم کو دباتی تو ایکی مائی کراہ اٹھتی۔ کئی مرتبہ چیخ دبانے کے لیے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

جانکی نے اطمینان کرلیا تھا کہ زخم کے اندر کوئی پھانس نہیں تھی۔ اس نے دوا لگا کر پٹی باندھ دی۔ خون زیادہ بہہ جانے اور تکلیف سے ایکی مائی کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور اس میں پکڑے جانے کے خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔

ایکی مائی کو قالین سے اٹھا کر ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ میں اور سردار تھالوب کمرے میں تھے۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا تو ایکی مائی کے چہرے پر خوف کے تاثرات کچھ اور گہرے ہو گئے۔

"اب تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں ایکی مائی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "یا تو تم خود بخود زبان کھول دو یا مجھے تمہاری زبان کھلوانی پڑے گی۔"

"کک..... کیا جاننا چاہتے ہو؟" ایکی مائی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اس سازش میں اور کون کون شریک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کون سی سازش..... میں..... میں کسی سازش کے بارے میں نہیں جانتی۔" وہ رک رک کر بولی۔

میں نے جیب سے پستول نکال کر نال کی طرف سے پکڑ لیا اور اس کی ٹانگ پر زخم کے قریب دستے سے ہلکی سی ضرب لگائی۔ ایکی مائی چیخ اٹھی۔

"اس غار میں تم نے کہا تھا کہ اگر میں بیچ میں ٹانگ نہ اڑاتا تو تم لوگوں کا منصوبہ اب تک کامیاب ہو چکا ہوتا اور یہاں تم کہہ رہی ہو کہ کسی سازش کے بارے میں نہیں جانتیں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرے سامنے تم جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ اس کاٹیج میں ہونے والی تم لوگوں کی ساری گفتگو ہم ریکارڈ کر چکے ہیں۔ سین فونگ کو اگر مائے سا پر شبہ نہ ہو جاتا تو تم لوگوں کی میٹنگ جاری رہتی اور اس کے بعد کی گفتگو بھی ہم ریکارڈ کرلیتے۔"

"مائے سا کون؟" ایکی مائی نے کہا "میں اس نام کی کسی عورت کو نہیں جانتی۔"

"وہ لڑکی جسے سین فونگ نے کاٹیج میں گولی مار دی تھی۔ میں ایک اور بات تمہیں بتا دوں۔ میری دوست تھائی اس وقت دارا کے قبضے میں ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ میرے غضب کو ہوا دینے کے بجائے خود ہی زبان کھول دو اور جو کچھ پوچھوں اس کا جواب دیتی رہو۔ بصورتِ دیگر تمہارے اس خوب صورت جسم کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ....."

"کک..... کیا جاننا چاہتے ہو؟" ایکی مائی نے کہا۔ خوف سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مم..... مجھے نہیں معلوم۔" ایکی مائی نے جواب دیا "وہ جنگل میں کسی کاٹیج میں ٹھہرے ہوئے تھے جس کے بارے میں پولیس چیف اور رنگ منت کے سوا ہم میں سے کسی کو معلوم نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ میں معلوم کرلوں گا۔ اب شہنشاہ کے خلاف اس سازش کے بارے میں بتاؤ۔ اس میں کون کون لوگ شریک ہیں اور اصل منصوبہ کیا ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"ایک منٹ۔" سردار تھالوب نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد وہ ٹیپ ریکارڈر لے آیا جسے اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر دیوار کے ساکٹ میں پلگ لگا دیا۔

"ہاں۔ اب شروع ہو جاؤ۔" تھالوب نے ریکارڈنگ والا بٹن پُش کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایکی مائی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"میں زیادہ کچھ نہیں جانتی۔" ایکی مائی نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم اس سازش میں اور کون کون لوگ شریک ہیں۔ مجھے تو آنگ سانگ نے یہ لالچ دیا تھا کہ یہ منصوبہ کامیاب ہونے کے بعد مجھے نہ صرف کسی وزارت کا سیکریٹری بنا دیا جائے گا بلکہ پتایا بیچ پر میری پسند کی جگہ مجھے الاٹ کر دی جائے گی اور عالی شان ہوٹل کی تعمیر کے لیے تمام اخراجات بھی دیے جائیں گے۔"

"ہم ان لوگوں کے نام جاننا چاہتے ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔" یہ سوال سردار تھالوب نے کیا تھا "حکومت کے علاوہ فوج کے کچھ افسران بھی اس میں شریک ہوں گے۔ ان کے نام بتاؤ۔"

"میں تفصیل سے کچھ نہیں جانتی۔" ایکی مائی نے جواب دیا "ویسے میرا خیال ہے اس سازش میں فوج کا کوئی آفیسر ملوث نہیں ہے۔"

"اس قسم کی کوئی سازش فوج کو ملائے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔" سردار تھالوب نے اسے گھورا۔

"ہو سکتا ہے۔" ایکی مائی نے کہا "لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔"

"اس سازش میں جنرل کھوراٹ کا کیا کردار ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"سازش کی بنیاد دراصل جنرل کھوراٹ ہی نے رکھی تھی۔" ایکی مائی نے جواب دیا "پچھلے چند برسوں کے دوران میں تھائی لینڈ میں منشیات کی اسمگلنگ پر پابندیوں اور سختی کی وجہ سے جنرل کھوراٹ کو کافی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ لاؤس اور برما کی سرحدوں پر اندرونی بغاوتوں کی وجہ سے ان ملکوں کی فوجیں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ سرحدیں جنرل کھوراٹ کے لیے بالکل غیر محفوظ ہو چکی ہیں۔ اس کی نظریں تھائی لینڈ پر ہیں لیکن پچھلے چند برسوں کے دوران میں اسے یہاں بھی کچھ مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس لیے یہ منصوبہ اس نے بنایا تھا۔ تھائی لینڈ میں شہنشاہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے وہ اپنی پسند کے آدمی لانا چاہتا ہے۔ اس کے عوض اس کا صرف ایک مطالبہ ہے۔"

"وہ کیا....؟" میں نے پوچھا۔

"تھائی لینڈ اور گولڈن ٹرائی اینگل کی سرحد پر کنٹرول کے علاوہ وہ تھائی لینڈ میں کسٹمز اور نارکوٹکس کے محکمے مکمل طور پر اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے۔" ایکی مائی نے کہا۔

میں اور سردار تھالوب سوالات کرتے رہے اور ایکی مائی جواب دیتی رہی اور یہ ساری گفتگو ریکارڈ ہوتی رہی۔ تھالوب کی طرح میرا بھی خیال یہ تھا کہ ایکی مائی اب بھی بہت کچھ چھپا رہی ہے۔

"ٹھیک ہے ایکی مائی۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "جو باتیں ہم تم سے معلوم نہیں کر سکے وہ حکومت کے اہلکار معلوم کر لیں گے۔ اور تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ سرکاری اہلکار کسی کی زبان کھلوانے کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کرتے ہیں۔"

ایکی مائی کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کا انجام کیا ہو گا' یہ کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔ شہنشاہ کے خلاف سازش سب سے گھناؤنا اور سنگین ترین جرم سمجھا جاتا تھا اور اس کی سزا موت سے کم نہیں ہو سکتی تھی اور عین ممکن ہے ان لوگوں کو اپنی صفائی کا موقع دیے بغیر فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے۔

ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ دروازہ کھلا رہنے دیا گیا تھا۔ اس وقت سوا دو بج رہے تھے۔ صبح ایک کپ کافی کے سوا ہم نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا۔ لوما کھانا تیار کر چکا تھا۔

"تم اپنا کھانا لے کر ایکی مائی کے کمرے میں چلی جاؤ اور اسے بھی کچھ کھلا دو۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور سونیا کہاں ہے؟"

"وہ کمرے میں بیڈ پر پڑی ہوئی ہے۔" جانگی نے جواب دیا "وہ سمجھتی ہے کہ شاید ہم جرائم پیشہ ہیں اور اس کے ذریعے اس کی ماں کو بلیک میل کر کے کوئی کام نکلوانا چاہتے ہیں۔"

"اسے رنگ سنت کے بارے میں بتایا تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا گیا۔ اور یہ خبر بھی اسے تم ہی بتاؤ گے کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" اس مرتبہ رنگولی نے جواب دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے لے کر آؤ۔ ہم اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔" میں نے کہا۔

اور پھر چند منٹ بعد ہم سب میز کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ سونیا کے چہرے پر بے پناہ اداسی تھی۔

کھانے کے بعد میں سونیا کو لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں اسے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس میں حب الوطنی کا کچھ مادّہ ہے یا وہ بھی اپنی ماں کی طرح کرپشن اور ہر طرح کی ناجائز آمدنی پر یقین رکھتی ہے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ماں کی غیر قانونی سرگرمیوں سے قطعی لاعلم ہے۔ وہ اپنی ماں کو دیوی کا درجہ دیتی ہے جس نے بڑی محنت سے اسے پروان چڑھایا اور اسے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کرنے کے لیے شب و روز کڑی محنت کرتی ہے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ماں کسی قسم کی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ خود محب وطن لڑکی تھی۔ اسے اپنے ملک سے اور اپنے شہنشاہ سے محبت تھی۔ وہ اس بات پر یقین رکھتی تھی کہ تھائی لینڈ کی ترقی اور خوش حالی شہنشاہ کی عوام سے دلچسپی کی مرہونِ منت تھی۔ منشیات

کے حوالے سے بھی اس کے خیالات بڑے واضح تھے۔ اس کا خیال تھا کہ منشیات پیدا کرنے والوں اور فروخت کرنے والوں کو گولیوں سے بھون دینا چاہیے۔ یہ لوگ انسان نہیں موت کے ہرکارے ہیں جو دنیا بھر میں نوجوان اور نو عمر نسل کو تباہ کر رہے ہیں۔

"مگر تم مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟" سونیا نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری۔۔ طرف دیکھا۔

"اس لیے کہ تمہارے وطن اور شہنشاہ کو اس وقت تم جیسے وفاداروں کی ضرورت ہے۔" میں نے جواب دیا "جو شہنشاہ اور ملک کی سلامتی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" سونیا بولی "کیا شہنشاہ یا اس ملک پر کوئی آفت آنے والی ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔" میں نے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے کہا "اگر تم سے یہ کہا جائے کہ تمہاری ماں کے دل میں وطن کی وہ محبت نہیں جو ہونی چاہیے تو تم کیا کہو گی؟"

"بکواس۔" سونیا نے جواب دیا "میری ماں ایک محبِ وطن عورت ہے۔ اس نے ساری زندگی پولیس کے محکمے میں رہ کر اس ملک کی خدمت کرتے ہوئے گزاری ہے۔ اس کی وطن پرستی پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

"تمہاری ماں کی تنخواہ بہت معمولی تھی۔ کیا تمہارے خیال میں اس معمولی تنخواہ میں اتنی جائداد بنائی جا سکتی ہے۔ اس طرح شاہانہ انداز میں زندگی گزاری جا سکتی ہے؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" سونیا نے مجھے گھورا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میری ماں رشوت لیتی ہے یا غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔"

"ہاں سونیا۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ بکواس ہے یہ۔" سونیا چیخی "میری ماں ایک شریف عورت ہے۔ اس نے محنت کر کے دولت کمائی ہے۔ جرائم پیشہ تم لوگ ہو۔ مجھے یرغمال بنا کر میری ماں سے کچھ ناجائز کام کروانا چاہتے ہو۔"

"سونیا۔" میں نے بدستور پُرسکون لہجے میں کہا "مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ تمہاری ماں تمہاری طرح محب وطن نہیں تھی۔ اسے شہنشاہ یا اس ملک سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اسے صرف اور صرف دولت کی چاہت تھی۔ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھی۔ وہ ایسے لوگوں کی آلۂ کار بن گئی تھی جو اس ملک اور شہنشاہ کے خلاف بہت خوفناک سازش میں ملوث ہیں۔"

"تم میری ماں کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کر رہے ہو۔ کیا...."

"ہاں۔ یہ سچ ہے۔ تمہاری ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" میں نے کہا۔

سونیا چند لمحے دہشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رنگولی اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے قریب آ گئی اور سونیا کو بانہوں میں لے کر اسے تسلی دلاسا دینے لگی۔

"نہیں.... نہیں.... میری ماں ایسی نہیں ہو سکتی۔" سونیا روتے ہوئے کہہ رہی تھی "اس پر الزام ہے۔ اس کی کردار کشی کی جا رہی ہے۔"

"حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے لیکن اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "دولت کی ہوس تو بڑے بڑوں کو جھکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تمہاری ماں کمزور تھی۔ دولت کے لالچ نے اسے جھکنے پر مجبور کر دیا اور وہ سازشیوں کا آلۂ کار بن گئی۔ آؤ.... میں تمہیں ایک ایسی ہستی سے ملواتا ہوں جو میری بات کی تصدیق کر دے گی۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہیں ایک ریکارڈ شدہ گفتگو سنوانا چاہتا ہوں۔ ان آوازوں میں تم اپنی ماں کی آواز پہچان لو گی۔" میں نے اٹھ کر پرانا کیسٹ لگا کر ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ یہ کانچ میں ہونے والی میٹنگ کا ٹیپ تھا۔ اس میں کم از کم تین جگہوں پر رنگ سنت کی آواز موجود تھی۔ میں ریکارڈر بند کر کے سونیا کو ایکی مائی والے کمرے میں لے گیا۔ جانگی اس وقت بھی ایکی مائی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ ایکی مائی ہے۔ حکومت کی ایک اعلیٰ آفیسر۔ یہ بھی شہنشاہ کے خلاف اس گھناؤنی سازش میں شریک ہے۔ یہ تمہیں بتائے گی کہ تمہاری ماں کا اس سازش میں کیا کردار تھا۔" میں نے خاموش ہو کر ایکی مائی کی طرف دیکھا "ایکی مائی۔ بتاؤ اسے رنگ سنت کی اصلیت کیا تھی اور جب اسے گولی لگی تو وہ کہاں تھی اور کیا کر رہی تھی۔"

"رنگ سنت' سین فونگ کے ساتھ میٹنگ میں ہمارے ساتھ تھی۔ میٹنگ کے سارے انتظامات اسی نے کیے تھے اور جب کانچ پر حملہ ہوا تو رنگ سنت نے دوسری لڑکیوں کے ساتھ وہاں سے جان بچا کر بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر دارا نے اسے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر رنگ سنت یا کوئی اور لڑکی تم لوگوں کے ہاتھ لگ گئی تو میٹنگ کا سارا راز فاش کر دے گی۔"

میں چونک گیا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا کہ رنگ سنت دارا کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ میں تو یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ ہم میں سے کسی کی گولیوں کا شکار ہوئی تھی۔

سونیا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ ٹیپ شدہ آواز اور ایکی مائی کی باتیں سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی ماں کے بارے میں جو کچھ بھی کہا تھا' وہ غلط نہیں تھا۔

جانگی سونیا کو کمرے سے باہر لے آئی۔ رنگولی بھی اس کے پاس آ گئی اور پھر میرے اشارے پر وہ دونوں اسے باہر تازہ ہوا میں لے گئیں۔ میں نے سردار تھالوب کو بتا دیا کہ رنگ سنت ہم میں سے کسی کی گولی کا نشانہ نہیں بنی تھی بلکہ اسے دارا نے مارا تھا۔

ایکی مائی کے اس انکشاف سے ہمارا کام آسان ہوگیا تھا۔ سونیا یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اس کی ماں کو ہم نے مارا تھا۔

"میرا خیال ہے اب مہاراج کو صورتِ حال سے آگاہ کردینا چاہیے۔" میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سردار تھالوب نے جواب دینے کے بجائے ٹیلی فون اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور بنکاک کا نمبر ملانے لگا۔ اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کال مہاراج ہی نے ریسیو کی تھی۔ دو تین منٹ رسمی جملوں کے تبادلے میں گزر گئے۔ پھر میں مہاراج کو بیتے ہوئے تمام واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں' میں کہہ رہا تھا۔

"اگر سردار تھالوب میرا ساتھ نہ دیتا تو ہم اس مشن میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمارے پاس ایسی بہت سی شہادتیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوجائے گا کہ شہنشاہ کے خلاف اس سازش کے تانے بانے کب اور کیسے بُنے گئے۔ آنگ سانگ اگرچہ فرار ہوگیا ہے لیکن ایکی مائی میرے قبضے میں ہے۔ اس سے ان تمام لوگوں کے نام معلوم کیے جاسکتے ہیں جو اس سازش میں شریک ہیں۔"

"میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں وجدان۔" مہاراج نے کہا۔ "تمہیں ایکی مائی اور وہ کیسٹ لے کر فوراً بنکاک آنا ہوگا۔ میں رتنا کوسن سے بات کرتا ہوں۔ وہ تمہارے لیے ایک خصوصی طیارہ چیانگ رائے بھیج دے گا۔ خصوصی جہاز دو ڈھائی گھنٹوں میں چیانگ رائے ائرپورٹ پر پہنچ جائے گا۔"

"میں بنکاک نہیں آسکتا مہاراج۔" میں نے جواب دیا "تھائی' دارا کے قبضے میں ہے۔ اس کی جان کو خطرہ ہے۔ مجھے نہ صرف تھائی کو اس کے شکنجے سے چھڑوانا ہے بلکہ آنگ سانگ اور سین فونگ وغیرہ کو بھی تلاش کرنا ہے اس کے علاوہ اور ایسے بہت سے کام ہیں جن کے لیے یہاں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔ ایکی مائی اور کیسٹ منگوانے کے لیے آپ کو کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔"

"فی الحال کسی اور پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔" مہاراج نے جواب دیا "اپنا فون نمبر دو۔ میں تھوڑی دیر بعد تم سے بات کروں گا۔"

میں نے مہاراج کو فون نمبر لکھوا دیا اور پھر فون کا ریسیور سردار تھالوب کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک مہاراج سے بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا۔

سونیا وغیرہ باہر ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم بھی باہر آگئے۔ آسمان پر ایک بار پھر بادل چھا گئے تھے۔ سونیا اب بھی رو رہی تھی اور رنگولی اور جانکی اسے دلاسے دے رہی تھیں۔ میں اور سردار تھالوب بھی قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"سونیا۔" سردار تھالوب نے اپنی کرسی پر قدرے آگے جھکتے ہوئے کہا "اب تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ لوگ کیسے وطن فروش اور کتنے بے ضمیر ہیں۔ انہوں نے محض اس لیے تمہاری ماں کو گولی ماردی کہ پکڑے جانے کی صورت میں وہ ان کا راز فاش نہ کردے۔ اس سے سمجھ سکتی ہو کہ انہیں صرف اور صرف اپنا مفاد عزیز ہے۔ کسی دوسرے کی زندگی کی انہیں قطعی پروا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے وطن کے خلاف سازشیں کرسکتے ہیں' انہیں دوسروں کی زندگیوں کی کیا پروا ہوسکتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تمہاری ماں لالچ میں آگئی تھی۔ اس سے غلطی سرزد ہوگئی اور یہ غلطی اس کے نام پر بدنما دھبا بن گئی ہے۔ تم اپنی ماں کے نام سے اس داغ کو دھو سکتی ہو۔ تم محبِ وطن ہو۔ وقت پڑنے پر تم شہنشاہ اور وطن کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہو۔"

"میں.... میں اپنی ماں کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" سونیا مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی "شہنشاہ اور اپنے وطن کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ میں انہیں تلاش کروں گی اور چن چن کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دوں گی۔ مجھے بتاؤ وہ کون لوگ ہیں اور یہ دارا کون ہے جس نے میری ماں کو گولی ماری تھی۔"

"دارا ایک خوں خوار درندے کا نام ہے۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "وہ اب تک درجنوں بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ چند روز پہلے میرے پانچ آدمی بھی اس کی درندگی کا شکار ہوچکے ہیں۔ گزشتہ رات وہ ہماری ایک ساتھی کو اٹھا کر لے گیا ہے لیکن ہم اسے تلاش کرلیں گے۔ وہ ہر مرتبہ بچتا رہا ہے لیکن اس مرتبہ وہ ہمارا گھیرا توڑ کر نہیں جاسکے گا۔ آج کی رات.... آج رات اس کی قسمت کا فیصلہ ہوجائے گا۔"

سونیا کبھی میری طرف اور کبھی سردار تھالوب کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ ہولے ہولے ہچکیاں لے رہی تھی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو لینے سے اس کے دل کا غبار نکل گیا تھا لیکن ماں کی موت کا صدمہ آسانی سے نہیں بھلایا جاسکتا تھا۔

ہم میں سے کوئی بھی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے شہر کی طرف نہیں گیا تھا۔ سردار تھالوب نے وانگ ڈن کو کچھ ہدایات دیتے ہوئے شہر بھیج دیا۔ ہم ابھی لان ہی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ لوما نے برآمدے میں نمودار ہو کر بتایا کہ بنکاک سے میرے لیے کال آئی ہے۔ میں اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر آگیا۔ سردار تھالوب بھی میرے پیچھے ہی آگیا تھا۔

وہ مہاراج کا فون تھا۔ میں نے تعظیمی جملے ادا کیے اور پھر مہاراج بھی جلد ہی اصل موضوع پر آگئے۔

"وجدان۔" مہاراج کہہ رہے تھے "رتنا کوسن تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں ذرا تفصیل سے سب کچھ بتادو۔"

چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسیور پر رتنا کوسن کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو ینگ مین! کیسے ہو؟"

"بالکل ٹھیک ہوں باس۔ آپ نے مہاراج سے خوش خبری تو سن لی ہوگی۔"

"ہاں۔ میں تمہاری کارکردگی سے بہت خوش ہوں۔ تم نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ حکومت تمہاری خدمات کو فراموش نہیں کرے گی۔ بہرحال' میں تم سے تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رتنا کوسن کو شروع سے سب کچھ بتانے لگا۔ میں نے اس مشن کی کامیابی میں سردار تھالوب کا بہت مناسب الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔

"مہاراج نے بتایا تھا کہ دارا نے تمہاری ایک ساتھی کو قبضے میں لے رکھا ہے۔" میرے .... خاموش ہونے پر رتنا کوسن نے کہا۔

"یس باس۔" میں نے جواب دیا "اگر یہاں کی صورتِ حال ایسی نہ ہوتی تو ایکی مائی کو لے کر میں خود بنکاک پہنچ جاتا۔ اب آپ کو فوری طور پر کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ تاخیر خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔"

"میں آج رات کسی وقت تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔" رتنا کوسن نے جواب دیا "ہماری آمد بالکل خفیہ ہوگی۔ کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ اب تم کھل کر اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہو۔ میں چیانگ رائے میں پولیس کے انسپکٹر جنرل کو فون کردیتا ہوں۔ اگر اس کی مدد کی ضرورت محسوس کرو تو اسے فون کردینا۔ وہ تم سے ہر قسم کا تعاون کرے گا۔"

"یس باس۔" میں نے جواب دیا پھر میں نے مہاراج سے کچھ رسمی باتیں کیں اور فون بند کردیا۔

"رتنا کوسن آج رات کسی وقت یہاں پہنچنے والا ہے۔" میں نے ریسیور رکھ کر تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھالوب کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

رنگولی اب بھی سونیا کے پاس باہر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ جانکی کمرے میں ایکی مائی کے پاس چلی گئی تھی۔ میں اور تھالوب ہال کمرے ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

پانچ بجے کے قریب وانگ ڈن واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے مطابق شہر میں ہنگامی صورتِ حال تھی۔ پولیس چیف اور رنگ مت کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ جنرل پرات کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔ کاٹیج سے تین لڑکیوں کی لاشیں بھی ملی تھیں۔ ان میں ایک مائے سا کی لاش تھی اور دوسری دونوں کو بھی شناخت کرلیا گیا تھا۔ وہ سوسائٹی گرلز تھیں اور انہیں چیانگ رائے سے خاص طور پر لایا گیا تھا۔

ایک دلچسپ اطلاع یہ بھی تھی کہ سین فونگ اور آنگ سانگ بھی زخمی ہوئے تھے۔ سین فونگ تو رات ہی کو گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف نکل گیا تھا اور آنگ سانگ شہر ہی میں کہیں روپوش تھا۔

"اسپتال میں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے وانگ ڈن کی طرف دیکھا۔

"وہ اسپتال میں نہیں ہے باس۔" وانگ ڈن نے جواب دیا "شہر میں چند ایک پرائیویٹ کلینک ہیں۔ میں نے تمام جگہوں پر چیک کرلیا ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن ظاہر ہے۔ وہ زخمی ہے اور اسے علاج بھی کروانا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی کاٹیج میں چھپا کسی ڈاکٹر سے پرائیویٹ طور پر علاج کروا رہا ہو۔"

"اسے ہر صورت میں تلاش کرنا ہوگا۔" میں نے کہا "ممکن ہے وہ کھالائی والے کاٹیج میں دارا وغیرہ کے ساتھ ہو۔ تم تیاری کرلو۔ ہم شام کا اندھیرا پھیلنے کے فوراً بعد اس کاٹیج پر ریڈ کریں گے۔ تھائی بھی وہیں ہوگی ہمیں ہر صورت میں دارا کو بھی اس کے شکنجے سے نکالنا ہے۔"

"میں تیار ہوں باس۔" وانگ ڈن نے کہا "اور کون کون جائے گا؟"

"ان کی تعداد نصف درجن سے کم نہیں ہوگی۔ اگر پلاننگ سے حملہ کیا جائے تو ہم چار ہی کافی ہوں گے۔ میرے اور تمہارے علاوہ دو آدمی اور ہوں گے۔ ان کا بندوبست تم کرلو۔"

"ایک تو میں ہوں۔ چوتھے آدمی کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔" قریب بیٹھے ہوئے سردار تھالوب نے کہا۔

میں مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ سردار تھالوب اس معاملے میں پیچھے نہیں رہے گا۔

"اور میں بھی تو ہوں۔ مجھے کیوں بھول رہے ہو؟" جانکی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اور پھر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جانکی اس معاملے میں کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔

وانگ ڈن صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک بار پھر شہر چلا گیا۔ اس مرتبہ اس کی واپسی سات بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

"سین فونگ نے سرحد پار نہیں کی۔" اس نے بتایا "اسے دو گولیاں لگی ہیں۔ ایک ٹانگ میں اور ایک بازو میں۔ وہ شہر ہی میں موجود ہے اور ڈاکٹر چانگ سے اپنا علاج کروا رہا ہے۔"

"اوہ!" میں اچھل پڑا "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"اتفاق سے۔" وانگ ڈن مسکرایا "اور میں نے اس کی تصدیق کرلی ہے۔ وہ روبائی ولا کے عقب میں واقع ایک کاٹیج میں مقیم ہے۔ میں اس طرف کا بھی چکر لگا آیا ہوں۔ چوتھی گلی کے کارنر والا کاٹیج ہے اور یہ کاٹیج بھی پولیس چیف کی ملکیت ہے۔"

"اسے ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے ہمیں دارا اور آنگ سانگ کی خبر لینی ہے اور میرے خیال میں اب ہمیں روانہ ہوجانا چاہیے۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور پھر دس منٹ بعد ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اسٹیئرنگ

وانگ ڈن نے سنبھال رکھا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر سردار تھالوب بیٹھا تھا۔ میں اور جانگی جیپ کی پچھلی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے پاس لوڈڈ رائفلیں تھیں اور فاضل میگزین بھی موجود تھے۔

اس روز وانگ سائی سے ہم نے کھالائی کے علاقے میں واقع اس کاٹیج کا پتا معلوم کرلیا تھا جہاں دارا اور اس کے ساتھی چھپے ہوئے تھے اور بعد میں رنگ سنت سے بھی اس کی تصدیق ہوگئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ دارا وغیرہ کے علاوہ آنگ سانگ بھی وہیں ہوگا۔

کھالائی تک پہنچنے کا آسان راستہ تو یہ تھا کہ ہم گولڈن ٹرائی اینگل روڈ کی طرف نکلتے اور وہاں سے کھالائی کا رخ کرتے لیکن گولڈن ٹرائی اینگل روڈ پر پولیس کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ اس طرف چیکنگ کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لیے وانگ ڈن نے شہر سے نکلتے ہی جیپ پہاڑوں میں ایک کچے اور غیر ہموار راستے پر موڑلی تھی اور کچھ آگے جانے کے بعد اس نے ہیڈ لیمپس بھی بجھا دیے تھے۔

ناہموار پُرپیچ پہاڑی راستے پر روشنی کے بغیر گاڑی چلانا کافی خطرناک تھا لیکن وانگ ڈن بہت احتیاط سے ڈرائیو کررہا تھا۔ تقریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وانگ ڈن نے جیپ روک لی اور ہم نیچے اتر آئے۔ وانگ ڈن نے جیپ کے دروازے لاک کردیے اور ہم اپنی رائفلیں سنبھالے ایک قطار میں ایک تنگ سے راستے پر چلنے لگے۔ راستہ بتدریج بلندی کی طرف جارہا تھا۔ سب سے آگے وانگ ڈن تھا۔ اس کے پیچھے میں پھر جانگی اور آخر میں سردار تھالوب تھا۔

نصف کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم رک گئے۔ سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں ایک کاٹیج کی کھڑکی سے روشنی جھلکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

میں اور جانگی ایک طرف ہولیے اور وانگ ڈن اور تھالوب مختلف سمتوں سے اس کاٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ میں آگے تھا اور جانگی مجھ سے دو قدم پیچھے۔ راستہ خاصا دشوار تھا۔ تاریکی میں چلنا کچھ اور بھی مشکل ہورہا تھا۔ ہم بہت محتاط انداز میں قدم اٹھا رہے تھے۔

کاٹیج سے تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ہم رک گئے۔ جانگی میرے دائیں طرف تھی۔ میں نے جانگی کو اشارہ کیا اور خود قدرے دائیں طرف ہٹ کر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ میرا رخ اس کھڑکی کی طرف تھا جہاں روشنی ہورہی تھی۔

کمرے کے اندر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا نظر آیا۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد دوسرے کمرے کی بتی جلی اور تھوڑی دیر بعد بجھ گئی۔ وہ سایہ ایک بار پھر پہلے کمرے میں نظر آیا اور پھر ایک طرف ہٹ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

میں کچھ اور آگے بڑھ کر رک گیا اور کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر کی طرف پردہ لٹکا ہوا تھا اس لیے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میری اطلاع کے مطابق اس کاٹیج میں پانچ چھ آدمیوں کو ہونا چاہیے تھا اور جہاں اتنے لوگ موجود ہوں وہاں ایسی خاموشی معنی خیز تھی۔

میں کاٹیج کی عقبی سمت میں تھا۔ اچانک سامنے کی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی سردار تھالوب کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"خبردار! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔"

میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور جانگی کو اشارہ کیا اور ہم پوزیشن لے کر بیٹھ گئے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی ادھر آنے کی کوشش کرے گا مگر کوئی افراتفری نہیں مچی۔ کوئی شور نہیں اٹھا۔ میں نے جانگی کو اشارہ کیا اور دوڑتا ہوا کاٹیج کے سامنے والے رخ پر پہنچ گیا۔ وانگ ڈن برآمدے کے ستون کی آڑ... میں پوزیشن لیے کھڑا تھا۔ پہلے تو اس نے ہمیں للکارا لیکن میری آواز سن کر سامنے آگیا۔ میں دوڑتا ہوا اس کمرے میں آگیا جس میں روشنی ہورہی تھی۔ سردار تھالوب ایک بوڑھے آدمی کو رائفل کی زد پر لیے کھڑا تھا اور وہ بوڑھا خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

اور پھر یہ انکشاف ہمارے لیے خاصا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ وہ بوڑھا اس کاٹیج کا چوکی دار تھا اور دارا وغیرہ آج صبح سویرے ہی کاٹیج خالی کرگئے تھے۔ بوڑھے کی باتوں سے پتا چل گیا کہ آنگ سانگ بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی۔ میں نے آنگ سانگ کا جو حلیہ بتایا بوڑھے نے اس کی تصدیق کردی تھی۔

"ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور وہ بھی زخمی تھی۔" بوڑھے نے بتایا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ بوڑھے نے اس کا جو حلیہ بتایا تھا اس سے تصدیق ہوگئی تھی کہ وہ تھائی تھی۔ بوڑھے کے کے مطابق اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔

"یہ لوگ کہاں گئے ہیں؟" میں نے بوڑھے چوکیدار سے پوچھا۔

"مجھے.... پتا نہیں۔" بوڑھے نے جواب دیا "میں آج تو اپنے گھر پر تھا۔ مالک نے حکم دیا کہ میں کاٹیج چلا جاؤں اور جب میں یہاں آیا تو کاٹیج خالی تھا۔"

"اس کاٹیج کا مالک کون ہے؟ کہاں رہتا ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"پریرے۔ مسٹر پریرے اس کاٹیج کا مالک ہے۔ شہر کا پریرے ہوٹل اسی کا ہے اور پریرے ہاؤس بھی اسی کی ملکیت ہے۔ وہ اس بلڈنگ کے پنٹ ہاؤس میں رہتا ہے۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ "میرا خیال ہے ہمیں پریرے سے ان کے بارے میں پتا چل سکے گا۔ اس لیے اب ہمیں یہاں رک کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" تھالوب نے کہا اور پھر چوکیدار کی طرف متوجہ ہوگیا "تم کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ ہم یہاں آئے تھے۔ ورنہ زمین میں گاڑ دیے جاؤ گے۔ جانتے ہو نا مجھے؟"

"جی.... جانتا ہوں سردار۔" بوڑھا ہکلایا "میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ آپ لوگ یہاں آئے تھے۔"

"کیوں نہ یہاں کی تلاشی لے لی جائے۔ شاید کوئی ایسا سراغ مل جائے جس سے یہ پتا چل سکے کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔" میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیکار ہے۔" سردار تھالوب نے کہا "یہ بوڑھا دوپہر سے یہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے صفائی وغیرہ کی ہوگی۔ میرا خیال ہے یہاں سے ہمیں کوئی سراغ نہیں ملے گا۔ گھبراؤ نہیں۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "دارا تھائی کو اس وقت تک کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا جب تک وہ تمہارے سامنے کوئی مطالبہ نہیں رکھتا اور تم اسے رد نہیں کردیتے۔ ہم بہت جلد ان کا سراغ لگالیں گے۔ ہوسکتا ہے آج ہی رات.... آؤ۔ اب چلیں۔"

سردار تھالوب نے ایک بار پھر بوڑھے چوکیدار کو اپنی زبان بند رکھنے کی تنبیہہ کی اور ہم واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔ سردار تھالوب اور میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ مجھے پریرے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

پریرے ایک ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا۔ اس نے ساری زندگی اسی قصبے میں گزاری تھی۔ چیانگ سائین اور آس پاس کی بستیوں میں رہنے والے ایک ایک شخص کو جانتا تھا۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث بھی رہا تھا لیکن ہر وقت پکڑے جانے کا خوف لگا رہتا تھا۔ قانون سے بچنے کے لیے اس نے قانون کا سہارا لیا اور پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہوگیا۔ پولیس کی وردی پہن لینے کے بعد اسے آزادی اور دیدہ دلیری سے منشیات کے اسمگلروں کے لیے کام کرنے لگا۔ صرف ایک پریرے پر ہی کیا منحصر۔ اس محکمے کا ہر فرد ہی منشیات کا ایجنٹ بنا ہوا تھا۔ گولڈن ٹرائی اینگل واقعی سنہری زمین تھی جہاں سونا پیدا ہوتا تھا' یہاں سے دنیا بھر کو منشیات سپلائی کی جاتی تھی۔ یہ ایک ایسی بہتی گنگا تھی جس میں ہر بے ضمیر اور بددیانت ہاتھ دھونے کی کوشش کررہا تھا۔

پریرے چالاک آدمی تھا۔ ایک طرف وہ منشیات کے اسمگلروں کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کررہا تھا اور دوسری طرف نچلے پیمانے پر منشیات کا دھندا کرنے والوں کو پکڑ کر قانون کے حوالے بھی کرتا رہا۔ اس کی یہ کارکردگی اسے اوپر جانے کے لیے نیک نامی دیتی رہی اور معمولی کانسٹیبل بھرتی ہونے والا پریرے اٹھارہ سال بعد پولیس چیف کے عہدے پر پہنچ گیا۔

پریرے اس عہدے پر سات سال رہا۔ پولیس میں بھرتی ہونے کے بعد ان پچیس برسوں میں اس نے بے حساب دولت بنائی تھی۔ پریرے ہوٹل شہر کا دوسرے نمبر پر سب سے بڑا ہوٹل تھا جس کا ایک حصہ نائٹ کلب اور جوئے خانے پر مشتمل تھا۔ پریرے ہاؤس چھ منزلہ عالی شان بلڈنگ تھی جس میں رہائشی فلیٹ تھے۔ اس بلڈنگ کے پنٹ ہاؤس میں پریرے کی اپنی رہائش تھی۔ پنٹ ہاؤس کی نہ صرف لفٹ الگ تھی بلکہ عقبی گیٹ سے لفٹ تک جانے کا ایک راستہ بھی الگ تھا۔

ہوٹل اور پریرے ہاؤس کے علاوہ پریرے نے اور بھی بڑی لمبی چوڑی جائداد بنائی تھی۔ شہر کے نواح میں خوب صورت مقامات پر اس کے کئی کاٹیج تھے جو بارہ مہینے کرائے پر اٹھے رہتے تھے۔ سیاحت کے سیزن کے علاوہ بھی گولڈن ٹرائی اینگل کے نام کی کشش لوگوں کو اس طرف کھینچ لاتی تھی۔ شہر میں بھی پریرے کے کاٹیج نما پانچ چھ بنگلے تھے جو مستقل طور پر کرائے پر اٹھے رہتے تھے۔

پریرے کی بیوی کا عرصہ پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ اس نے اس کی بھی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ اس کی ضرورت تو ویسے ہی پوری ہوجاتی تھی۔ ہر رات کوئی نہ کوئی حسین عورت اس کے بستر پر موجود ہوتی جسے صبح رخصت کردیا جاتا۔ کوئی عورت بہت زیادہ پسند آجاتی تو وہ کئی روز تک اس کے ساتھ نظر آتی اور پھر اس کی جگہ کوئی اور عورت لے لیتی۔ ایسی عورتوں کے ہوتے ہوئے پریرے نے پیروں میں مستقل زنجیر ڈالنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔

"یہی وہ بے ضمیر لوگ ہیں جو چند ٹکوں کے لیے اپنے ملک سے غداری کرکے دشمنوں کے اندر آنے کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اگر اپنی ماں کی اچھی قیمت ملے تو یہ اس کا بھی سودا کردیتے ہیں۔" آخر میں سردار تھالوب کہہ رہا تھا "اگر یہاں کی پولیس فرض شناس ہوتی تو جنرل کھورات جیسے لوگوں کو بھی اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے ہماری زمین استعمال کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو سردار۔" میں نے کہا "دشمن سینہ چاک کردے تو زیادہ دکھ نہیں ہوتا لیکن اگر زخم اپنوں سے لگے تو کلیجا پھٹ جاتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچ گئے۔ پہلے کی طرح وانگ ڈن نے اسٹیئرنگ سنبھالا' سردار تھالوب پسنجرز سیٹ پر اور میں جانگی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر آگیا۔ جیپ جنگل میں کچے راستے پر دوڑنے لگی۔ اب وانگ ڈن نے ہیڈ لیمپس روشن کرلیے تھے۔

ہمارا آج کا یہ مشن بری طرح ناکام رہا تھا۔ جس کا مجھے بے حد افسوس تھا۔ تھائی اب بھی دارا کے قبضے میں تھی اور وہ لوگ اسے لے کر وہاں سے غائب ہوگئے تھے۔ دارا وغیرہ کو شاید شبہ ہوگیا تھا

کہ ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے اور اس نے فوراً ہی وہ جگہ چھوڑ دی تھی لیکن میرے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ اسے یہ شبہ کیسے ہوا ہوگا؟ کیا گزشتہ رات میٹنگ کے دوران میں رنگ سنت نے دارا کو بتایا ہوگا نہیں وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں تھی۔ وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

ہم نے وانگ سائی کو اس کے فلیٹ سے اٹھالیا تھا اور دارا کا پتا معلوم کرنے کے بعد اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وانگ سائی دارا کا آدمی تھا جسے پولیس چیف کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے شہر میں چھوڑا گیا تھا۔ دارا سے اس کا رابطہ رہتا تھا اور وانگ سائی کو اٹھالینے کے بعد یہ رابطہ ختم ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے بعد میں دارا نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہو اور گزشتہ رات جب میٹنگ کے دوران میں مائے سا کے لباس میں لگے ہوئے بٹنوں میں ڈکٹا فونز کا انکشاف ہوا تھا تو دارا کو شبہ ہوگیا ہوگا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ جو شخص اس خفیہ میٹنگ میں اپنی ایجنٹ کو بھیج سکتا ہے۔ وہ اس کے ٹھکانے کا پتا بھی چلا سکتا ہے اس لیے وہ آج صبح سویرے ہی اس کاٹیج سے فرار ہوگئے تھے۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور جیپ جنگل سے نکل کر پختہ سڑک پر آگئی۔ جیپ ایک دوسرے راستے سے شہری حدود میں داخل ہوئی تھی اور پھر جیپ جیسے ہی کولوئی روڈ پر پہنچی' سردار تھالوب نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیپ کو رومائی ولا کے ساتھ والی سڑک پر موڑلو۔ ذرا سین فونگ کی مزاج پرسی بھی کرتے چلیں۔ کیا خیال ہے ماسٹر۔" اس نے مڑکر میری طرف دیکھا۔

"مناسب خیال ہے۔" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "اسے کم از کم یہ تو پتا چل جائے گا کہ ہم اس کی طرف سے بے خبر نہیں ہیں۔"

وانگ ڈن نے جیپ کی رفتار کم کردی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ گزشتہ کئی روز سے شہر کے نواح میں ہونے والی قتل و غارت نے شہر کی رونق بھی اجاڑ دی تھی۔ لوگ سرِ شام ہی گھروں میں بند ہوجاتے اور آٹھ نو بجے تک تو شہر کی بیشتر دکانیں بھی بند ہوجاتیں۔ اِکا دُکا ریسٹورنٹس ہی کھلے رہتے تھے۔

اس وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ کولوئی روڈ تو بالکل سنسان پڑی تھی۔ وانگ ڈن نے جیپ ردمائی ولا کے ساتھ والی سڑک پر موڑدی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ سڑک کے دونوں طرف متعدد گلیاں تھیں جن میں خوب صورت کاٹیج اور بنگلے تھے۔ ان گلیوں میں بھی سناٹا تھا۔

وانگ ڈن نے آج دن میں ہی معلوم کرلیا تھا کہ سین فونگ کہاں چھپا ہوا ہے۔ اس نے ایک جگہ جیپ روک کر انجن بند کردیا۔

"تم جیپ میں بیٹھی رہو مگر ہوشیار رہنا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو۔"

سردار تھالوب نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ہم [illegible] اتر آئے۔

جیپ تیسری گلی کے موڑ پر روکی گئی تھی جبکہ وہ کاٹیج [illegible] کے موڑ پر تھا۔ ہم بہت محتاط انداز میں اس کاٹیج کے قریب [illegible] گئے۔ کاٹیج کے اندر اگرچہ بتی جل رہی تھی مگر کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ سردار تھالوب نے وانگ ڈن کو گلی کے موڑ پر ہی روک دیا اور میں اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ بنگلے کی دیوار کے قریب پہنچ کر ہم رک گئے۔

میں نے تھالوب کی طرف دیکھا۔ رائفل کندھے پر لٹکائی اور اچک کر دیوار پر چڑھ گیا۔ دوسری طرف کودنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد سردار تھالوب بھی دیوار پر چڑھ کر اندر آچکا تھا۔

ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اندر کتنے آدمی ہوسکتے ہیں۔ میں نے سردار تھالوب کو دائیں طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف چلنے لگا۔ دونوں طرف چند فٹ چوڑے گلیارے تھے جو پچھلے آنگن سے جا ملتے تھے۔ براہِ راست برآمدے والے دروازے کا رخ کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا اسی لیے ہم [illegible] اطراف کی کھڑکیوں سے جائزہ لے لینا چاہتے تھے کہ اندر کتنے [illegible] ہوسکتے تھے۔

میں بائیں طرف والے گلیارے میں داخل ہوکر ایک کھڑکی کے سامنے رک گیا۔ کھڑکی کے دوسری طرف مدھم سی روشنی تھی۔ یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ یہ روشنی کسی اور طرف سے اس کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی مگر اندر کی طرف [illegible] پردہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے گرل میں ہاتھ ڈال کر پردہ آہستگی سے ایک طرف ہٹایا تو اس کے ساتھ ہی اچھل پڑا۔

یہ ہال کمرا تھا جس میں راہداری میں جلنے والے بلب کی روشنی پہنچ رہی تھی اور اسی روشنی میں نظر آنے والا وہ منظر بہت ہی خوفناک تھا۔

وہ لاش صوفے پر اس طرح پڑی تھی کہ اس کی دونوں ٹانگیں صوفے پر تھیں اور جسم کا باقی حصہ نیچے قالین پر تھا۔ وہ مرد کی لاش تھی اور اس کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی۔ سینے پر بھی زخم کے متعدد نشان تھے اور بہنے والا خون پورے جسم کو اور نیچے قالین کو تر کر رہا تھا۔

میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر تیزی سے برآمدے کی طرف لپکا اور ٹھیک اسی لمحے سردار تھالوب بھی اسی طرف آگیا۔

"کوئی گڑبڑ ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرو۔" سردار تھالوب نے کہا۔

ہم دونوں برآمدے میں آگئے۔ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے گھمایا۔ دروازہ لاک نہیں تھا۔ ہینڈل گھماتے ہی آہستگی سے کھلتا چلا گیا۔

میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا اور ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔ سب سے پہلے ہم ہال میں آئے تھے۔

مقتول کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ خاصا صحت مند آدمی تھا اور اسے کسی تیز دھار آلے سے قتل کیا گیا تھا۔ میں وہ لاش دیکھ رہا تھا اور سردار تھالوب راہداری میں داخل ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں بھی اس کی آواز سن کر تیزی سے اسی طرف لپکا۔

اس بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی اور بستر پر سین فونگ کی لاش پڑی تھی۔ اس کی بھی شہ رگ کاٹ دی گئی تھی اور ایک خنجر دستے تک سینے میں پیوست تھا۔ اس کا جسم اور بستر کی چادر خون سے تر ہورہی تھی۔ اس کی بائیں ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور یہ غالباً وہ زخم تھا جو گزشتہ رات کاٹیج پر حملے کے دوران میں گولی لگنے سے آیا تھا۔ ایک بازو پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن اب اسے ہر تکلیف سے نجات مل چکی تھی۔

سین فونگ کے کٹے ہوئے گلے سے اب بھی خون بہہ رہا تھا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے قتل کیے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی شدید الجھن تھی۔ میری طرح شاید وہ بھی سوچ رہا تھا کہ سین فونگ کا قاتل کون ہوسکتا ہے۔ میرا دھیان دارا کی طرف گیا تھا۔ وہ نہایت گھٹیا آدمی تھا اور اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ اس نے تو ایسے ایسے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا جنہوں نے کئی مواقع پر اپنی جان پر کھیل کر اس کی جان بچائی تھی۔ کسی کا احسان ماننا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اسے صرف اور صرف اپنا مفاد عزیز تھا اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ سین فونگ تو بڑی توپ چیز تھی۔ اسے موت کے گھاٹ اتار کر وہ بڑے فائدے حاصل کرسکتا تھا۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا کہ وہ سین فونگ کے قتل کا الزام مجھ پر یا سردار تھالوب پر عائد کرکے جنرل کھوراٹ کا قرب حاصل کرسکتا تھا۔

اچانک کاٹیج میں کسی طرف سے ہلکی سی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی رائفل کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالے گوش بر آواز تھا۔ وہ ہلکی سی آہٹ یقیناً اس نے بھی سنی تھی۔

وہ آہٹ دوبارہ سنائی دی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سردار تھالوب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دبے قدموں کمرے سے نکل کر راہداری میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ ہلکی سی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں فرش پر بچھے ہوئے قالین پر بہت محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چلنے لگا۔ رائفل کو میں نے دونوں ہاتھوں میں اس طرح سنبھال رکھا تھا کہ وقت پڑنے پر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے استعمال کیا جاسکے۔ اس معمولی سی آہٹ سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ

قاتل ایک ہی تھا اور اب تک کاٹیج ہی میں موجود تھا۔

راہداری کے موڑ پر پہنچ کر میں رک گیا۔ پیچھے مڑکر دیکھا۔ سردار تھالوب بھی کمرے سے نکل کر راہداری میں آچکا تھا۔ میں آگے کی راہداری میں دائیں طرف مڑگیا۔ اس طرف اندھیرا تھا اور وہ آہٹ بھی اس طرف سے سنائی دی تھی۔ میں دبے قدموں آگے بڑھنے لگا اور بالآخر ایک دروازے کے قریب رک گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے ایسی خوشبو آرہی تھی جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کچن تھا۔ راہداری کچن سے آگے بائیں طرف گھوم گئی تھی۔

میں رائفل تھامے دیوار سے چپکا کھڑا رہا اور پھر بڑی احتیاط سے آگے بڑھ کر کچن میں جھانکا۔ اندر تاریکی تھی۔ کسی کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا' میں اندر داخل ہوگیا اور اندھیرے میں سامنے رکھے ہوئے اسٹول سے ٹکرا گیا۔

سناٹے میں اسٹول کے گرنے کی آواز بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ اسٹول لڑھکنے کی آواز کے ساتھ ایک اور آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی دروازے کا بولٹ گرایا گیا ہو اور یہ آواز کچن کے پچھلی طرف سے سنائی دی تھی۔

میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور میں تیزی سے کچن سے نکل کر اس کے پیچھے والی راہداری میں مڑگیا۔ یہ مختصر سی راہداری تھی اور اس طرف عقبی سمت کھلنے والا دروازہ تھا اور میں نے ایک ہیولے کو بڑی تیزی سے اسی دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چھلانگ لگا دی اور جب دروازے پر پہنچا تو وہ ہیولا عقبی صحن کی بیرونی دیوار کی طرف دوڑ رہا تھا۔

"اے۔ رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔" میں چیخا۔

مگر وہ ہیولا رکا نہیں۔ میں نے گولی چلانے کی محض دھمکی دی تھی۔ فائر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ خاموشی میں فائر کی آواز دور دور تک سنی جاسکتی تھی اور یہ صورتِ حال ہمارے مفاد میں نہ ہوتی۔

میں نے ایک لمحے کو سوچا اور دروازے سے نکل کر اس ہیولے پر چھلانگ لگا دی۔ وہ اس وقت بیرونی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ وہ ہیولا دھڑام سے دیوار کے ساتھ کیاری میں گرا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اسے چھاپ لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ سن کر میں اچھل پڑا۔

وہ نسوانی چیخ تھی۔

وہ ہیولا اگرچہ میرے شکنجے میں تھا لیکن اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بھرپور مزاحمت کررہا تھا۔ میں اس کی پشت پر تھا اور اسے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اس کے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ نرم اور گداز جسم... میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

وہ کوئی عورت ہی تھی جو اب بھی اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔

میں نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا اور اس کے منہ پر دو چار بھرپور طمانچے جڑ دیے۔ اس کے منہ سے صرف ایک مرتبہ ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔

"تم واقعی بہت بہادر ہو۔" میں نے ایک اور طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا "تم نے دو آدمیوں کو جس بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے' اس پر میں تمہیں داد ضرور دوں گا لیکن مجھے افسوس ہے کہ اب تم یہاں سے بھاگنے میں کامیاب نہیں ہوسکو گی۔" میں نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور دوسرے ہاتھ سے قریب پڑی ہوئی اپنی رائفل اٹھالی "اب خاموشی سے اندر چلو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ایسی بہادر عورت کون ہے جس نے سین فونگ جیسے آدمی کی شہ رگ ادھیڑ ڈالی ہے اور دیکھو' اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو بے دریغ گولی ماردوں گا۔" میں نے رائفل کی نال اس کے پہلو سے لگادی۔

سردار تھالوب بھی آوازیں سن کر اس طرف آگیا تھا اور رائفل تانے دروازے میں کھڑا تھا۔ ہمیں آگے آتے دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میں اس عورت کو رائفل کی زد پر لیے اندر داخل ہوا اور ہم ہال کمرے میں آگئے اور پھر روشنی میں پہنچتے ہی میں اچھل پڑا۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی شدید حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں ایک بار پھر مڑ کر اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ رنگ سنت کی بیٹی سونیا تھی!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

جب ہم دارا کے کاٹیج پر ریڈ کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو سونیا سردار تھالوب کے کاٹیج میں تھی جہاں اس کی نگرانی کے لیے رنگولی اور لوما موجود تھے۔ اس کے علاوہ کاٹیج کی حفاظت کے لیے دونوں قیدی اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود سونیا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اگر وہ کہیں غائب ہوجاتی تو ایک مختلف بات ہوتی۔ یہ سوچا جاسکتا تھا کہ اسے ہم پر اعتماد نہیں تھا اور وہ بھاگ کر کہیں اور چلی گئی تھی لیکن جو صورتِ حال ہمارے سامنے تھی' وہ نہایت حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین سی تھی۔ دو ہٹے کٹے آدمیوں کو قتل کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور ایک عورت کے حوالے سے تو یہ بات ناقابلِ یقین سی لگتی تھی لیکن جو حقیقت ہمارے سامنے تھی اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔

میں نے سونیا کی طرف دیکھا۔ اس کا لباس خون آلود تھا۔ ہاتھوں اور جسم کے مختلف حصوں پر بھی خون کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ سردار تھالوب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر وہ سونیا کا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور باتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ منہ ہاتھ دھولو۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔"

میں بھی دروازے میں کھڑا سونیا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باتھ روم سے باہر نکل آئی۔

یہاں رکنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ ہم سونیا کو لے کر باہر آگئے۔ گلی میں ایک طرف تاریکی میں چھپا ہوا وانگ ڈن بھی سامنے آگیا۔ ہمارے ساتھ سونیا کو دیکھ کر اس نے بھی شدید حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"یہ.... یہ یہاں...."

"وقت ضائع مت کرو۔ جلدی سے جیپ تک پہنچو۔" سردار تھالوب نے اس کی بات کاٹ دی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچ گئے۔ وانگ ڈن اور تھالوب تو آگے بیٹھ گئے اور میں سونیا کو لے کر پچھلی طرف آگیا۔ جانگی بھی سونیا کو دیکھ کر پلکیں جھپکنے لگی۔

سونیا اب تک خاموش تھی۔ اس نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی' کبھی جانگی کی طرف اور کبھی سردار تھالوب کی طرف دیکھنے لگتی۔ جیپ حرکت میں آگئی تھی اور سردار تھالوب' وانگ ڈن سے کہہ رہا تھا کہ جیپ کو شہر والے بنگلے کی طرف لے چلے۔

"کاٹیج کی طرف کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سونیا کو فی الحال وہاں لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔" سردار تھالوب نے کہا "یہ چند روز میرے شہر والے بنگلے ہی میں رہے گی۔"

"سونیا۔" میں نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ وہ سامنے والی سیٹ پر جانگی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی "تم کاٹیج سے کیسے نکلی تھیں اور یہ سب کیا ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے...."

"میں ان سب کو ختم کردوں گی۔" سونیا نے دانت کچکچاتے ہوئے جواب دیا "انہوں نے پہلے میری ماں کو غداری پر مجبور کیا پھر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں انہیں چن چن کر ختم کردوں گی۔ کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میری ماں غدار نہیں تھی۔ یہ لوگ غدار ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی جو میرے وطن کا سودا کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں نے اس زمین پر جنم لیا ہے اور اس پر کسی کے ناپاک قدم نہیں پڑنے دوں گی۔ میری ماں.... یہ دھرتی بھی میری ماں ہے۔ میں اس کی ناموس پر حرف نہیں آنے دوں گی اور یہ ثابت کردوں گی کہ میری ماں غدار نہیں تھی۔ اسے مجبور کیا گیا تھا۔"

سردار تھالوب بھی اپنی سیٹ پر پیچھے کی طرف مڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آج دوپہر میں نے

حب الوطنی کے حوالے سے سونیا سے جو باتیں کی تھیں' ان کا اثر ہوا تھا اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے سین فونگ جیسے آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دوسرا آدمی غالباً اس کا محافظ تھا۔

"تم کاٹیج سے نکل کر یہاں تک کیسے آئی تھیں۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ سین فونگ اس بنگلے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آج شام میں نے تم لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔" سونیا نے کہا "وانگ ڈن نے تم لوگوں کو بتایا تھا کہ سین فونگ کہاں چھپا ہوا ہے۔ میں جب تمہارے کاٹیج سے نکل رہی تھی تو ایک قبائلی محافظ نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے بتایا کہ تھوڑی دور تک ٹہلنے جارہی ہوں جلدی واپس آجاؤں گی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں سردار تھالوب کی مہمان ہوں اور مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے اس لیے وہ میرے راستے سے ہٹ گیا اور میں اطمینان سے باہر آگئی اور پھر یہ بنگلا تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔"

"لیکن۔ وہ دونوں ہٹے کٹے تھے۔ تم سے کہیں زیادہ طاقت ور۔" سردار تھالوب نے کہا "چلو یہ مان لیا کہ سین فونگ زخمی تھا لیکن وہ دوسرا آدمی' جو شاید اس کا محافظ تھا' تم نے اس کے گلے پر اتنی آسانی سے چھری کیسے چلادی؟ کیا تمہیں اس پر حملہ کرتے ہوئے ڈر نہیں لگا تھا؟"

"عورت جب کسی سے انتقام لینے کے لیے نکلتی ہے تو اس کے دل میں یہ خوف بالکل نہیں ہوتا کہ اس کا دشمن کتنا قد آور اور اس سے کتنا زیادہ طاقت ور ہوگا۔ وہ نتائج سے بے نیاز اور انتقام میں اندھی ہو کر اپنے دشمن پر حملہ آور ہوتی ہے۔" سونیا نے جواب دیا۔

"لیکن تم اندر کیسے داخل ہوئی تھیں؟" تھالوب نے پوچھا۔

"عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے اور ان جیسے مرد تو عورت کو دیکھ کر ویسے ہی بے قابو ہونے لگتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر مسکراتے ہوئے بولی "اور جب بات مجھ جیسی جوان اور حسین لڑکی کی ہو تو کسی اوباش مرد کا پتا تو ویسے ہی پانی ہوجاتا ہے۔ وہ بھی مجھے دیکھتے ہی ریشہ خطمی ہوگیا تھا۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "میں اپنی ایک فرضی دوست کی تلاش میں ساتھ والے کاٹیج کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی کہ سین فونگ کا وہ محافظ اپنے کاٹیج سے باہر آگیا۔ وہ شاید کہیں جارہا تھا لیکن مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں دوسرے کاٹیج کے سامنے سے ہٹ کر اس کے قریب آگئی اور اپنی فرضی دوست کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں اس کے سامنے بالکل مسکین بن گئی تھی اور اسے بتایا کہ میں چیانگ کھونگ سے آئی ہوں۔ میری دوست نے اس علاقے کے کسی بنگلے کا پتا بتایا تھا اور بدقسمتی سے وہ کاغذ مجھ سے کہیں کھوگیا ہے۔ میں اسے تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ رات کہاں گزاروں گی۔ اس شہر میں تو میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے۔" سونیا ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ اس نے چند لمبے لمبے سانس لیے پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں نے اس کی ہوس میں ڈوبی ہوئی نظروں کو تاڑ لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بہت شریف ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ رات کو پتے کے بغیر کسی کو تلاش کرلینا آسان نہیں ہوگا اور پھر میں غلط لوگوں کے ہاتھ بھی لگ سکتی ہوں۔ اس نے پیشکش کی کہ اگر میں چاہوں تو رات اس کاٹیج میں گزار سکتی ہوں۔ یہاں اس کا باس ہے جو زخمی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی پیشکش قبول کرلی۔

"اندر آنے کے تھوڑی دیر بعد میں نے تصدیق کرلی کہ اس کا زخمی باس سین فونگ ہی ہے۔ سین فونگ کا محافظ ٹوٹو کچھ زیادہ ہی بے چین ہورہا تھا۔ اس کی بے چینی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اسے شراب پلانا شروع کردی اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے حواسوں سے باہر ہوگیا۔

"مجھے کچن میں ایک خنجر مل گیا تھا جو میں نے صوفے کے کشن کے نیچے چھپا دیا اور جب ٹوٹو بے قابو ہوگیا تو میں نے خنجر اس کی شہ رگ پر پھیر دیا۔ وہ چیخا اور تڑپا۔ میں نے اس کے پیٹ اور سینے پر متعدد وار کیے۔ اس کا گلا پوری طرح نہیں کٹا تھا۔ میں نے ایک بار پھر شہ رگ پر خنجر چلا دیا۔ اس کا نرخرا پوری طرح کٹ گیا۔ وہ قالین پر تڑپنے لگا۔ وہ آخری مرتبہ اس طرح اچھلا تھا کہ اس کے دونوں پیر صوفے پر ٹک گئے اور جسم کا باقی حصہ قالین پر پڑا رہا اور پھر وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

"راہداری والے کمرے سے سین فونگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ٹوٹو کو پکار رہا تھا۔ میں خون آلود خنجر لیے اس کمرے میں پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر سین فونگ نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے دھکا دے کر بیڈ پر گرادیا۔ وہ تکیے کے نیچے سے پستول نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"مجھ پر اس وقت جنون سا طاری ہورہا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی۔ یہ میری ماں کے قاتل اور میرے وطن کے دشمن ہیں۔ میں نے اس کے سینے پر بھرپور وار کیا۔ وہ چیخ کر پشت کے بل گرا اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ خنجر کے ایک ہی وار سے اس کا نرخرا ادھیڑ ڈالا اور پھر خنجر اس کے سینے میں پیوست کردیا۔

"میں دور کھڑی اسے بیڈ پر تڑپتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر دھپ کی آواز سن کر چونک گئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید ان کا کوئی تیسرا ساتھی آگیا ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا ہو یا کال بیل بجائی ہو جو میں نے نہیں سنی اور پھر وہ دیوار پھاند کر اندر آگیا ہو۔

"میں سین فونگ کے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف دوڑی۔ مجھے کاٹیج کے دونوں طرف دبے قدموں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔

میں تاریک کچن میں دبکی رہی پھر تم دونوں اندر داخل ہوئے اور جب ہال سے نکل کر سین ٹونگ والے کمرے کی طرف گئے تو میں کچن سے نکل کر پچھلی راہداری میں آگئی اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی لیکن بولٹ بہت ٹائٹ تھا اور جب بولٹ کھلا اور میں جیسے ہی باہر نکلی تو تم نے مجھے دبوچ لیا۔" اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"شکر کرو میرا ہاتھ تمہاری گردن پر نہیں پڑا تھا ورنہ تمہارا دم نکل چکا ہوتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے اگر ہمارے بجائے کوئی اور ہوتا تو جانتی ہو تمہارا انجام کیا ہوتا؟"

"میں اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر یہاں آئی تھی۔" سونیا نے جواب دیا "لیکن دوسرے شیطانوں کا انجام بھی میرے ہی ہاتھوں ہونا ہے اس لیے قدرت نے میری مدد کے لیے تم لوگوں کو بھیج دیا۔"

"تم جانتی ہو سین ٹونگ جنرل کھوراٹ کا خاص آدمی تھا۔ صبح تک اسے سین ٹونگ کے قتل کا پتا چل جائے گا۔ اس کے بعد جو طوفان اٹھے گا' اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتیں۔" سردار تھالوب نے کہا۔

"کاش! میرے ہاتھ جنرل کھوراٹ کی گردن تک پہنچ سکیں۔" سونیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اس کا حشر تو ان سے بھی برا ہوگا۔"

میں نے مڑ کر سامنے دیکھا۔ جیپ بنگنا روڈ سے ہوتی ہوئی اس سڑک پر گھوم گئی جس طرف سردار تھالوب کا بنگلا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہم بنگلے کے سامنے پہنچ گئے۔ گارڈ نے فوراً ہی بنگلے کا گیٹ کھول دیا۔ جیپ جیسے ہی اندر داخل ہوئی' سامنے سرخ رنگ کی ایک کار کھڑی دیکھ کر سردار تھالوب چونک گیا۔

"یہ کس کی گاڑی ہے؟" اس نے وانگ ڈن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پہلی مرتبہ دیکھی ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی مہمان آیا ہو۔" وانگ ڈن نے سرخ رنگ کی اس گاڑی کے پیچھے جیپ کو روکتے ہوئے کہا۔

ٹھیک اسی وقت ایک قبائلی محافظ دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"کون آیا ہے۔ یہ کس کی گاڑی ہے؟" سردار تھالوب نے پوچھا۔

"بنکاک سے مہمان آئے ہیں۔" محافظ نے جواب دیا "مہاراج.... ہاں مہاراج نام بتایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ آپ کے مہمان ہیں۔"

"اوہ۔" سردار تھالوب چونک گیا۔

مہاراج کا نام سن کر میں بھی اچھل پڑا اور پھر ہم جیپ سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی طرف چل پڑے۔

مہاراج اور رتنا کوسن ہال کمرے میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو آدمی اور تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ چاروں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے مہاراج کے سامنے رک کر موئے تھائی کی روایتی تعظیم دی۔ مارشل آرٹ کی تعظیم کا یہ انداز ایک طرح کے تھائی رقص سے ملتا جلتا ہے۔ عام طور پر یہ طریقہ کار قدرے طویل ہوتا ہے لیکن بیشتر اوقات اسے مختصر کردیا جاتا ہے۔ یہ روایتی رقص ختم کرکے میں نے مہاراج کو اور پھر رتنا کوسن اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی بو کیا۔ مہاراج نے آگے بڑھ کر مجھے لپٹالیا اور میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

"یہ سردار تھالوب ہیں۔" میں نے ان سب کا تعارف کرایا۔

سردار تھالوب نے بڑی گرم جوشی سے ان سب سے ہاتھ ملایا۔ وہ اگرچہ خود بہت بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ اپنے آپ میں شہنشاہ تھا لیکن شہنشاہ کے کزن رتنا کوسن کو اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہورہا تھا۔

مہاراج بھکشوؤں والے لباس میں تھے۔ گیروے رنگ کی ایک چادر جو ساڑی کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ دس پندرہ منٹ رسمی گفتگو میں نکل گئے پھر ہم لوگ جلد ہی اصل موضوع پر آگئے۔

"ہم لوگ ایک خصوصی طیارے سے چیانگ رائے پہنچے تھے۔" مہاراج بتا رہے تھے "وہاں سے کار کے ذریعے یہاں آگئے۔ سردار تھالوب کا یہ بنگلا تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہماری آمد کا علم صرف دو چار لوگوں کو ہے۔ چیانگ رائے یا یہاں کی انتظامیہ ہمارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ ہم آج رات ہی واپس چلے جائیں گے اس لیے رتنا کوسن کی بھی یہ خواہش ہے کہ وقت ضائع کیے بغیر ہمیں تمام تفصیلات سے آگاہ کردیا جائے۔"

مہاراج کے خاموش ہونے پر میں نے اور سردار تھالوب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بنکاک سے روانگی سے لے کر اب تک پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا۔

"سردار تھالوب نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مجھے ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اس سازش کو بے نقاب کرنے میں بہت دشواریاں پیش آتیں۔"

"ہمیں سردار تھالوب جیسے لوگوں پر فخر ہے۔" رتنا کوسن نے کہا "اس سرحدی علاقے میں منشیات کی پیداوار کے خاتمے کے لیے سردار تھالوب جو کردار ادا کررہے ہیں' وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور اب اس سازش کو بے نقاب کرنے میں ہمارا ساتھ دے کر انہوں نے صرف شہنشاہ پر ہی نہیں پوری تھائی قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں شہنشاہ سے خاص طور پر سردار تھالوب کا ذکر کروں گا۔ شہنشاہ ان کی خدمات کا اعتراف...."

"یور ہائی نیس!" سردار تھالوب نے بڑے مؤدبانہ انداز میں

رتنا کوسن کی بات کاٹی "میں نے جو کچھ بھی کیا ہے' وہ کسی صلے یا معاوضے کے لیے نہیں کیا۔ ہر محبِ وطن شہری کی طرح مجھے بھی شہنشاہ اور اس سرزمین سے محبت ہے اور اس محبت میں ہم جان کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے لیکن...." سردار چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "لیکن میرے خیال میں یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے یور ہائی نیس۔ اس سے پہلے کہ سازشی عناصر کوئی اور قدم اٹھائیں ہمیں کارروائی شروع کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" رتنا کوسن نے کہا "ایکی مائی اور وہ کیسٹ کہاں ہیں؟"

"اس کے لیے آپ کو دوسری جگہ جانے کی زحمت کرنی پڑے گی یور ہائی نیس۔" سردار تھالوب نے کہا۔

"تو چلو۔ اب ہمارے پاس واقعی زیادہ وقت نہیں ہے۔" رتنا کوسن نے کہا۔

ہم سب کاٹیج سے باہر آگئے۔ سونیا برآمدے کے سامنے ہی لان میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"یور ہائی نیس۔" سردار تھالوب نے سونیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ لڑکی جس کی ماں کو غداری پر مجبور کیا گیا تھا۔ وہ ان غداروں ہی کے ہاتھوں ماری گئی اور اس لڑکی نے اپنی ماں کے نام سے غداری کا دھبا مٹانے کے لیے جنرل کھوراٹ کے اہم ترین آدمی سین ٹونگ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس لڑکی کا شمار ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو شہنشاہ اور وطن کی ناموس کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔"

سونیا اس دوران میں اٹھ کر ہمارے قریب آگئی تھی۔ رتنا کوسن گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ سونیا کے لباس پر اب بھی خون کے دھبے موجود تھے اور پھر رتنا کوسن نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

پہلے سردار تھالوب کا خیال تھا کہ سونیا کو چند روز کے لیے اس بنگلے میں چھوڑ دیا جائے گا لیکن اب ہم اسے بھی اپنے ساتھ کاٹیج لے جارہے تھے۔

مہاراج ہماری جیپ میں آگئے تھے اور سردار تھالوب' رتنا کوسن والی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ ہماری جیپ آگے تھی۔ اس کے پیچھے رتنا کوسن والی سرخ کار اور سب سے پیچھے ایک کھلی گاڑی میں سردار تھالوب کے مسلح قبائلی محافظ بھرے ہوئے تھے۔

ہمیں کاٹیج پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جانکی مہاراج کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی اور پھر وہ سارے آداب کو نظرانداز کرتے ہوئے مہاراج سے لپٹ گئی اور فرطِ جذبات سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ مہاراج اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دلاسا دیتے رہے۔

رتنا کوسن کو سب سے پہلے کاٹیج میں ہونے والی میٹنگ کی گفتگو پر مشتمل کیسٹ سنایا گیا پھر وہ کیسٹ سنایا گیا جو ایکی مائی اور ہماری گفتگو پر مشتمل تھا۔ رتنا کوسن اور اس کے دونوں ساتھیوں کے چہروں کے تاثرات ہر لحہ بدل رہے تھے۔ رتنا کوسن کے وہ دونوں ساتھی حکومت کے اعلیٰ عہدے دار تھے۔ آخر میں... انہیں لے کر ہم اس کمرے میں آگئے جہاں ایکی مائی بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ رتنا کوسن کو دیکھ کر ایکی مائی کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

رتنا کوسن اور وہ دونوں آدمی تقریباً آدھے گھنٹے تک ایکی مائی سے سوالات کرتے رہے۔ اس کاٹیج میں رتنا کوسن کو دیکھ کر ایکی مائی سمجھ گئی تھی کہ اب اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس نے رعایت کے وعدے پر وہ سب کچھ اگل دیا جو ہمیں بتانے سے انکار کرتی رہی تھی۔ اس نے اس سازش میں شریک کئی بڑے نام بھی بتائے تھے اور ان میں شاہی محل کے کچھ لوگ بھی شامل تھے۔

ہال کمرے میں آکر رتنا کوسن نے ٹیلی فون اپنے سامنے رکھ لیا اور تقریباً چالیس منٹ تک بنکاک میں مختلف لوگوں کو فون کرتا رہا اور ریسیور رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"سردار تھالوب!" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں آپ کی میزبانی کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اب سے تھوڑی دیر بعد بنکاک میں کارروائی شروع ہوجائے گی۔ صبح سے پہلے پہلے میرا وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔ یہ سارے معاملات طے ہوجائیں تو ہماری آپ سے ملاقات ہوگی۔"

"آپ ہمیں ہمیشہ شہنشاہ اور اس سرزمین کا وفادار پائیں گے لیکن یور ہائی نیس' میزبانی کا تو آپ نے ہمیں موقع ہی نہیں دیا۔" سردار تھالوب نے کہا۔

"آپ کی عدم موجودگی میں ہم آپ کے بنگلے پر بہت لذیذ کھانا کھا چکے ہیں۔" رتنا کوسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک کپ کافی ..... ہماری طرف سے۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "لوما بہت خوش ذائقہ کافی بناتا ہے۔ آپ ہونٹ چاٹتے رہ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر ہوجائے ایک کپ۔" رتنا کوسن کہتے ہوئے پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

لوما کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ شاہی خاندان کے ایک معزز ترین فرد کو کافی بنا کر پلانا اس کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔

میں مہاراج کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ مہاراج میری اس کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ وہ بار بار میری تعریف کررہے تھے۔ تاہم تھائی کے لیے وہ بھی پریشان تھے۔

"مجھے امید ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تم اسے بھی بازیاب کرالو گے۔" مہاراج کہہ رہے تھے "اس کے بعد بھی تمہیں چند روز یہاں رہنا ہوگا۔ جنرل کھوراٹ کے کئی آدمی مارے گئے ہیں۔ سین ٹونگ تو اس کا اہم ترین آدمی تھا۔ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ ارا وغیرہ بھی یہیں ہیں اور آنگ سانگ بھی ابھی تک

روپوش ہے۔ ان لوگوں سے تم ہی کو نمٹنا ہے۔ بنکاک میں آج ہی رات سے ہنگامے شروع ہونے والے ہیں۔ ان پر قابو پانے میں دو چار دن لگ جائیں گے۔ اس کے بعد تمہیں واپس بلالیا جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے میں واپس نہ آسکوں مہاراج۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا "میرے ماں باپ کے قاتل ابھی زندہ ہیں۔ تھائی ابھی تک ان کے قبضے میں ہے۔ میں جب تک انہیں کیفرِ کردار تک نہ پہنچادوں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"یہ معاملہ ختم ہوجائے تو تمہیں بھی فری ہینڈ دے دیا جائے گا۔" مہاراج نے کہا "حکومت کی ساری مشینری بھی تمہارے ساتھ ہوگی اور پھر وہ لوگ بچ کر نہیں جاسکیں گے۔"

اس دوران میں لوما نے کافی سرو کرنا شروع کردی۔ میں جانتا تھا کہ مہاراج شام کے بعد کچھ نہیں کھاتے پیتے تھے لیکن میرے اصرار پر انہوں نے اس وقت کافی پینا قبول کرلیا۔

کافی واقعی بہت خوش ذائقہ تھی۔ رتنا کوسن اور مہاراج وغیرہ نے تعریف کی تو لوما خوشی سے جھوم اٹھا۔

اس دوران میں سردار تھالوب نے فون کرکے مسلح محافظوں کی ایک اور گاڑی منگوالی تھی۔ رات دو بجے کے قریب مہاراج اور رتنا کوسن رخصت ہوگئے۔ محافظوں کی ایک گاڑی آگے تھی۔ اس کے پیچھے مہاراج اور رتنا کوسن کی کار اور پیچھے مسلح محافظوں کی دوسری گاڑی۔ رتنا کوسن کا ایک ساتھی محافظوں کی اگلی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور کار میں پچھلی سیٹ پر رتنا کوسن کے دوسرے ساتھی اور مہاراج کے درمیان زخمی ایکی مائی کو بٹھادیا گیا تھا۔

محافظوں کو چیانگ رائے تک ان لوگوں کے ساتھ جانا تھا۔ رتنا کوسن کی آمد کو اگرچہ خفیہ رکھا گیا تھا لیکن بعض اوقات ٹاپ سیکریٹ معاملات دوسروں کی نظروں میں آجاتے ہیں اور جب معاملہ اتنی بڑی سازش کا ہو تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ نجانے سردار تھالوب کو یہ شبہ کیوں تھا کہ نہایت رازداری کے باوجود رتنا کوسن کی آمد بھی راز میں نہیں رہی ہوگی اس لیے اس نے اپنے مسلح محافظ چیانگ رائے تک ان کے ساتھ کردیے تھے۔

"اب کیا خیال ہے۔" ان کے جانے کے بعد سردار تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "پریرے کی گردن ناپی جائے۔ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ دارا لوگ کہاں ہیں؟"

"ہاں۔ چلو۔" میں کہتے ہوئے اٹھ گیا "زیادہ تاخیر تھائی کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔"

اس مشن پر بھی ہم چاروں تھے۔ میں' سردار تھالوب' جانگی اور وانگ ڈن۔ سردار تھالوب بہت بڑے قبیلے کا سردار تھا لیکن وہ ایک معمولی آدمی کی طرح میرے ساتھ کام کررہا تھا۔ اسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ ان سرگرمیوں میں اس کی جان بھی جاسکتی ہے۔ وہ واقعی بہت عظیم آدمی تھا۔

تھنگ چاؤ روڈ پر واقع پریرے ہاؤس تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ جیپ اس چھ منزلہ عمارت سے چند گز دور ہی رک گئی۔ میں نے جانگی کو اشارہ کیا۔ وہ جیپ سے اتر کر عمارت کے مرکزی دروازے کی طرف چلنے لگی۔

پریرے ہاؤس کا آہنی سلاخوں والا گیٹ بند تھا۔ جانگی گیٹ کے قریب رک کر چوکیدار کو آوازیں دینے لگی۔ چند منٹ بعد ہی گیٹ کے دوسری طرف چوکیدار دکھائی دیا۔ ہماری جیپ بلڈنگ کے سامنے والے رخ پر ذرا آگے کھڑی تھی۔ جیپ کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہم تو گیٹ پر چوکیدار کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ ہمیں جیپ میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جانگی چوکیدار سے باتیں کرتے ہوئے ہاتھ سے دائیں طرف کچھ اشارے بھی کررہی تھی۔ چوکیدار نے سلاخوں ہی سے اس طرف دیکھنے کی کوشش کی پھر گیٹ کھول دیا اور جانگی کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے گیٹ بند بھی کردیا۔

میں جیپ کے شیشے سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ گیٹ کے اندر ایک بہت کشادہ لابی تھی۔ چوکیدار جانگی کو لے کر دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہوگیا تھا۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد جانگی اس کمرے سے نکل کر گیٹ پر نمودار ہوئی۔ اس کا بلاؤز پھٹا ہوا تھا اور ایک طرف برہنہ سینے پر دو تین خراشیں نظر آرہی تھیں جیسے ناخنوں سے نوچنے کی کوشش کی گئی ہو۔

میں اور سردار تھالوب جیپ سے اتر کر گیٹ کی طرف لپکے۔ جانگی گیٹ کا تالا کھول رہی تھی اور پھر گیٹ کھلتے ہی ہم اندر داخل ہوگئے۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے اس کے سینے پر خراشوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اس حرامی کو گریبان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا تھا۔" جانگی نے کہا "بہرحال تم لوگ جاؤ۔ اگر وہ ہوش میں آبھی گیا تو میں اسے سنبھال لوں گی۔"

جانگی گیٹ بند کرکے اس کمرے میں گھس گئی اور ہم دونوں اس لفٹ کی طرف لپکے جو صرف پنٹ ہاؤس کے لیے مخصوص تھی۔

لفٹ کا دروازہ بند تھا۔ سردار تھالوب نے بٹن دبا دیا لیکن دروازہ نہیں کھلا اور نہ ہی دروازے کے اوپر ہندسوں والی پلیٹ روشن ہوئی جس کا مطلب تھا کہ لفٹ اوپر تھی اور لاک کردی گئی تھی۔ ہم دوسری لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ یہ لفٹ گراؤنڈ فلور پر تھی۔ بٹن دباتے ہی دروازہ کھل گیا۔ ہم اندر داخل ہوگئے۔ دروازہ بند ہوتے ہی تھالوب نے چھ کے ہندسے والا بٹن دبا دیا۔ رائفلیں ہم نے جیپ میں ہی چھوڑ دی تھیں۔ میرے پاس خنجر

تھا جو پتلون کے پائنچے کے اندر پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ہپ پاکٹ میں پستول بھی موجود تھا اور سردار تھالوب کے پاس بھی پستول تھا اور میرا خیال تھا کہ ہمیں اس کے سوا کسی اور ہتھیار کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

لفٹ چھٹی منزل پر رکی تو ہم باہر نکل آئے۔ راہداری سنسان تھی۔ رات کا آخری پہر تھا اور فلیٹوں کے مکین خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ ہم دبے قدموں چلتے ہوئے اوپر جانے والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔ زینے کا اوپر والا دروازہ لاک تھا۔ سردار تھالوب چند لمحے ہینڈل پر زور آزمائی کرتا رہا پھر اس نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اس میں تین چابیوں کے علاوہ بغیر دندانے کا ایک چپٹا سا تار بھی تھا۔ وہ تار کو کی ہول میں داخل کرکے مخصوص انداز میں حرکت دینے لگا۔ مایوسی نہیں ہوئی۔ ایک منٹ کے اندر اندر کلک کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور تالا کھل گیا۔ تھالوب نے ہینڈل گھما کر آہستگی سے دروازہ کھول دیا۔

دوسری طرف دروازے کے آگے ایک کشادہ سا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے پوری چھت کھلی ہوئی تھی لیکن اس چھت کو مہارت سے استعمال میں لایا گیا تھا۔ چھت پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑا خوب صورت روف گارڈن بنا ہوا تھا۔ جس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین مرکری ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ لان کی گھاس بہت دبیز تھی۔ یہاں پھولوں کے وہ پودے لگائے گئے تھے جن کی جڑیں زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے اطراف میں پھیل جاتی ہیں۔ لان میں ایک طرف آرام دہ گارڈن چیئرز اور ان کے ساتھ بانس کی کھپچیوں کی ایک کافی ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس روف گارڈن پر بلاشبہ لاکھوں بھات خرچ کیے گئے تھے۔

پریرے ہاؤس شہر کی دوسری سب سے اونچی عمارت تھی اور یہاں سے پورے شہر اور اس کے اطراف میں دور دور تک کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ چھت کے دائیں سرے پر ایک مختصر سا سرونٹ کوارٹر تھا جس کی صرف ایک کھڑکی سے مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے سردار تھالوب کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا سرونٹ کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا دراز قامت آدمی بیڈ پر سو رہا تھا۔ میں نے سرونٹ کوارٹر کے دروازے کا باہر سے کنڈا لگادیا اور سردار تھالوب کے پاس واپس آگیا۔

بائیں طرف پنٹ ہاؤس تھا۔ باہر سے دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس پر بے دریغ رقم خرچ کی گئی تھی۔ مرکزی دروازے کے سامنے ایک خوب صورت برآمدہ تھا جس کی چھت پر ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ دو تین کمروں کی کھڑکیوں میں بھی روشنی نظر آرہی تھی۔

ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ پریرے اکیلا ہوگا یا اس کے کوئی مہمان بھی موجود ہوں گے لیکن سردار تھالوب نے پریرے کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا' اس سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنی عیاشی میں کسی کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا ہوگا۔ اس کے ساتھ کوئی حسین عورت تو ضرور ہوگی لیکن کسی دوسرے آدمی کی موجودگی کا امکان نہیں تھا لیکن سردار تھالوب کی طرح میں نے بھی احتیاطاً پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔

برآمدے والا دروازہ لاک نہیں تھا۔ یہاں کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا اور شاید اسی لیے دروازے کو لاک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ ہم دروازہ کھول کر اندر آگئے۔ ایک کشادہ لابی تھی جس سے ایک راستہ لفٹ کی طرف جاتا تھا اور دوسرا مرکزی ہال کی طرف۔ ہال میں اگرچہ کوئی بتی نہیں جل رہی تھی لیکن کسی اور طرف سے وہاں روشنی پہنچ رہی تھی۔ ہال میں پہنچ کر ہم ایک لمحے کو رکے۔ میں نے سردار تھالوب کو بائیں طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود بائیں طرف مڑ گیا۔

ایک کمرے کا دروازہ آدھے کے قریب کھلا ہوا تھا۔ اندر بتی جل رہی تھی۔ میں نے جھانک کر اندر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ سانس ایک دم بے ربط ہوگیا تھا۔ اپنی کیفیت پر قابو پانے کے بعد میں دروازے میں جھانکنے لگا۔

کمرا کافی کشادہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ مخملی کور والے چار پانچ بھاری کشن اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ ایک طرف پورٹ ایبل آئس باکس اور اس کے قریب شراب کی کئی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ تین چار خالی بوتلیں اور گلاس اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور کمرے کے وسط میں قالین پر سب سے زیادہ خوفناک منظر یہ تھا کہ درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی پڑا ہوا تھا۔ اس کی توند غبارے کی طرح پھول پچک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت جس نے اپنا سر آدمی کے کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ ان دونوں کی آنکھیں بند تھیں لیکن لڑکی کے جسم پر اس آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں متحرک تھیں۔ اس کے ہونٹ بھی حرکت کررہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اسی دوران میں تھالوب بھی دبے قدموں چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور اندر کی طرف اشارہ کیا۔ سردار تھالوب نے اندر جھانکا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

میں نے پستول جیب میں ڈال کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا' سردار تھالوب نے دروازے پر زوردار ٹھوکر ماری۔ دروازہ دھڑ کی آواز سے پوری طرح کھل گیا۔

پریرے اور وہ لڑکی گڑبڑا کر اٹھ گئے۔ ہمیں دیکھ کر اس لڑکی

کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ بدحواس ہو کر کمرے کے ایک کونے میں پڑے ہوئے اپنے کپڑوں کی طرف لپکی لیکن وہاں تک نہیں پہنچ سکی۔ سردار تھالوب کے پیر کی ٹھوکر کھا کر وہ چیختی ہوئی پیچھے الٹ گئی تھی۔

پریرے نے بھی ایک طرف لوٹ لگا دی تھی لیکن اسے میرے پیر کی ٹھوکر نے روک دیا۔ ٹھوکر اس کے شانے پر لگی تھی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ پیچھے الٹ کر دیوار سے ٹکرایا۔

"کک.... کون ہو تم....؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہکلایا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا "تم یہاں آ تو گئے ہو لیکن واپس نہیں جاسکو گے۔"

"جس طرح ہمیں یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکا اسی طرح واپس جانے سے بھی کوئی نہیں روک سکے گا۔" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر سردار تھالوب کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

"تھا.... تھالوب تم...." اس کے منہ سے آواز بمشکل نکل رہی تھی "مجھے نہیں معلوم تھا کہ کیرن قبیلے کے سردار نے ڈاکا زنی بھی شروع کر دی ہے لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں گھر میں زیادہ رقم نہیں رکھتا اس لیے تمہیں بڑی مایوسی ہوگی۔"

سردار تھالوب نے آگے بڑھ کر اسے دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں۔

"تم جیسے لوگوں کے پاس ہو بھی کیا سکتا ہے۔" سردار تھالوب نے کہا "میں تمہیں صرف دو منٹ دے رہا ہوں۔ کپڑے پہن لو اور تم بھی۔" آخری الفاظ اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے جو ایک طرف بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے جھپٹ کر اپنے کپڑے اٹھا لیے۔ پریرے کے کپڑے میرے قریب پڑے ہوئے تھے جو میں نے پیر سے اس کی طرف اچھال دیے۔

"دیکھو پریرے!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے جانتے نہیں لیکن میرا نام ضرور سنا ہوگا۔ میں وہ شخص ہوں جو اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ تم سے میری کوئی دشمنی تو نہیں ہے لیکن ایسا کرنے میں کوئی دیر بھی نہیں لگتی۔ میں تم سے صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک جواب دے دو تو ہم جس طرح خاموشی سے یہاں آئے تھے اسی طرح خاموشی سے واپس چلے جائیں گے لیکن اگر تم اپنی کسی ضد پر قائم رہے تو میرا یہ خنجر بہت دنوں سے پیاسا ہے۔ میں اس کی پیاس اس طرح بجھاؤں گا کہ وقفے وقفے سے تمہارے جسم کی بوٹیاں کاٹ کر پھینکتا رہوں گا۔ اور...."

"اچھا بول لیتے ہو۔" پریرے نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن تمہارا اب تک جن لوگوں سے واسطہ پڑا ہے' وہ یقیناً بزدل تھے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ تم جیسے سیکڑوں مجرموں کو سلاخوں کے پیچھے بند کرا چکا ہوں۔ پولیس سے ریٹائر ہو جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے ہاتھ پیروں کو زنگ لگ گیا ہے۔ تم جیسے تھرڈ ریٹ غنڈوں کی گردن تو میں اب بھی مروڑ سکتا ہوں۔ میں ان لوگوں کی طرح بزدل نہیں کہ میرے ہاتھ تمہاری گردن تک نہیں پہنچ سکیں۔"

"وہ لوگ واقعی بزدل ہیں۔" میں نے کہا "اگر بزدل نہ ہوتے تو اس طرح چھپتے نہ پھرتے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ اس وقت کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن نہیں بتاؤں گا۔" پریرے نے جواب دیا "اگر تم جیسے غنڈوں سے ڈرنے والا ہوتا تو پولیس چیف کے عہدے تک نہ پہنچتا۔"

"مجھے معلوم ہے تم پولیس چیف کے عہدے تک کس طرح پہنچے تھے لیکن...." میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا "لیکن اگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں چھپے ہوئے ہیں تو میں تمہیں کچھ اوزار اوپر پہنچا دوں گا۔"

"کوشش کر دیکھو۔" پریرے کا لہجہ طیش دلانے والا تھا۔

"سردار تھالوب۔ آپ ہمارے بیچ میں نہیں آئیں گے" میں نے اپنا خنجر تھالوب کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر میں جیسے ہی آگے بڑھا' پریرے حیرت انگیز پھرتی سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس نے مجھے فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں بھی تو غافل نہیں تھا۔ میں نہ صرف تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا بلکہ اس کی ٹانگ پکڑ کر ہوا ہی میں زوردار جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ اس کی اس ایک حرکت سے میں سمجھ گیا کہ وہ مارشل آرٹس میں بھی مہارت رکھتا ہے اور اس میں اب بھی اتنا دم خم ہے کہ مجھ جیسے شخص کو چیلنج کر سکے۔

وہ ابھی سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے لیفٹ کک مارنے کے لیے پیر اٹھایا۔ پریرے نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ سے میری کک کو روکا اور میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی سے کام لیتے ہوئے پوری قوت سے رائٹ کک لگا دی۔ ضرب اس کے پہلو میں گردے کی جگہ پر لگی۔ وہ بری طرح بلبلا اٹھا اور پھر میں نے اسپن کک لگائی۔ میرا پیر وزنی ہتھوڑے کی طرح اس کے منہ پر لگا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا میری راؤنڈ ہاؤس کک اس کی گردن پر لگی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ موئے تھائی کی راؤنڈ ہاؤس کک مارشل آرٹس کے تمام اسٹائلز میں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ پوری قوت سے لگے تو حریف کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے لیکن میں نے زیادہ طاقت استعمال نہیں کی تھی۔ یہ کک پوری قوت سے لگتی تو اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی

تھی۔

پریرے قالین پر پڑا چیخ رہا تھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے مجھے للکار کر غلطی کی تھی۔ وہ یقیناً بہت اچھا مارشل آرٹسٹ رہا ہوگا لیکن شراب اور عورت نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ میں نے سردار تھالوب کے ہاتھ سے اپنا خنجر لے لیا اور اس کی نوک پریرے کے پیٹ پر رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں پتا چل گیا ہے کہ تم کتنے پانی میں ہو اس لیے ضد پر قائم رہنا تمہارے لیے نقصان دہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں بتا دو۔"

"میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" پریرے نے کہا۔

"آج صبح تک وہ تمہارے ہی ایک کاٹیج میں تھے۔" میں نے کہا "یقیناً اس وقت بھی وہ تمہارے ہی کسی کاٹیج میں چھپے ہوئے ہیں۔ بہتر ہے ان کا پتا بتا دو۔"

"نہیں۔" پریرے نے جواب دیا۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور خنجر کی نوک سے اس کے پیٹ پر تقریباً دو انچ لمبا زخم لگا دیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلانے لگا۔ زخم سے بہنے والا خون اس کے پیٹ اور نیچے قالین کو تر کرنے لگا۔

"تم بھول رہے ہو کہ ہم اس وقت چھ منزلہ عمارت کی چھت پر ہیں۔ اگر تم لاؤڈ اسپیکر بھی لگا لو تو تمہاری چیخیں کہیں بھی نہیں سنی جاسکیں گی۔ میں تمہارے جسم پر چرکے لگاتا رہوں گا۔ اس وقت تک جب تک تم زبان نہیں کھولتے۔"

"نہیں!" پریرے چیخا "تم چاہو تو مجھے مار ڈالو۔ کل.... صرف کل کا دن۔ اس کے بعد تم بھی زندہ نہیں رہو گے۔ جنرل کھوراث کے آدمی تمہیں اور وحشی قبیلے کے اس سردار کو کل شام سے پہلے پہلے جہنم میں پہنچا دیں گے۔"

میں نے اس کے پیٹ پر ایک اور چرکا لگا دیا۔ وہ قالین پر تڑپنے لگا۔ میں نے گردن گھما کر اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سردار تھالوب بھی خاموش کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو پریرے۔" میں اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا "تم نے زندگی بھر بے ایمانی کر کے یہ دولت جمع کی ہے۔ اگر ابھی میرے ہاتھوں مارے گئے تو کیا فائدہ اس دولت کا۔ تمہاری صحت بتا رہی ہے کہ اگر کوئی سنگین حادثہ پیش نہ آئے تو مزید کئی سال زندہ رہ سکتے ہو۔ یعنی کئی سال تک عیاشی کر سکتے ہو۔ بہتر ہے کہ اس وقت مرنے کو ترجیح مت دو اور اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔ اگر تم دارا وغیرہ کے بارے میں بتا دو تو...."

"نہیں بتاؤں گا۔" پریرے نے جواب دیا "تم مجھے مار نہیں سکتے کیونکہ ان کے بارے میں صرف اور صرف میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔"

"میں تمہیں ماروں گا نہیں۔ زندہ رکھوں گا مگر اس طرح کہ تم مرنے کی دعا مانگو گے اور تمہیں موت نہیں آئے گی۔" میں نے کہتے ہوئے اس مرتبہ اس کے بازو پر چرکا لگا دیا۔ وہ ایک بار پھر بلبلا اٹھا۔

"پریرے کو چھوڑ کر الگ ہٹ جاؤ ماسٹر!"

دروازے کی طرف سے یہ نسوانی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ وہ آواز بلی کی غراہٹ جیسی تھی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ایک دراز قامت خوب صورت لڑکی تھی۔ منی اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ بال بکھرے ہوئے اور میک اپ بگڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اعشاریہ تین آٹھ کا وزنی ریوالور تھا جس سے اس نے مجھے اور سردار تھالوب کو زد میں لے رکھا تھا۔

قالین پر پڑے ہوئے پریرے نے زخمی ہونے کے باوجود زوردار قہقہہ لگایا اور بڑی پھرتی سے میرے ہاتھ سے خنجر چھین لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر حملہ بھی کر دیا۔ اگر میں تیزی سے ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو خنجر میرے سینے میں پیوست ہو جاتا۔

"پستول پھینک دو سردار تھالوب!" لڑکی نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ سردار تھالوب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے آنکھ کا گوشہ دبا دیا۔ سردار تھالوب نے پستول پھینک دیا۔

"میں نے تم لوگوں کو برآمدے میں دیکھ لیا تھا اور اسی وقت مجھے گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔" لڑکی نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے شراب ضرور پی تھی لیکن حواس نہیں کھوئے تھے۔ کسی گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی میں یہاں سے نکل کر دوسرے کمرے کے باتھ روم میں گھس گئی تھی اور سردار تھالوب جب تم اس کمرے میں آئے تھے تو میں نے باتھ روم کے دروازے کی جھری سے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ تمہارے کمرے سے نکلنے کے بعد میں کافی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ میرا خیال تھا کہ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں گی اور نیچے جا کر بلڈنگ کے چوکیدار کو بتا دوں گی۔ وہ پولیس کو اطلاع دے دے گا لیکن پھر بیڈ پر تکیے کے نیچے رکھا ہوا یہ ریوالور دیکھ کر میں نے بھاگنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ پریرے اور مایا کو کسی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ جانا بزدلی ہوتی اس لیے میں نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے افسوس ہے مسٹر پریرے۔" اس نے پریرے کی طرف دیکھا "مجھے کچھ دیر ہوگئی اور تمہیں یہ زخم کھانے پڑے۔"

"میں ان زخموں سے ٹپکنے والے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لوں گا اس حرامی سے۔" پریرے میری طرف دیکھ کر غرایا۔

"تم واقعی بہت بہادر ہو بے بی۔" میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا "لیکن یہ ریوالور پھینک دو۔ میں

وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"تم زندہ بچو گے تو مجھے کچھ کہو گے نا۔" لڑکی نے جواب دیا اور پھر پریرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "مسٹر پریرے۔ تین دن پہلے جب میں دارا کے پاس تھی تو اس نے بتایا تھا کہ یہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس نے بنکاک میں پیڈرو کے گروہ کو نچا کر رکھا تھا۔ پیڈرو کا بھائی سامی اور ٹائیگر اسی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ یہ بہت سفاک آدمی ہے۔ اس کی موت بھی ایسی ہی ہونی چاہیے کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے اور یہ تھالوب..." وہ سردار تھالوب کی طرف دیکھنے لگی "یہاں تھالوب قتل و غارت میں اس کا پورا پورا ساتھ دے رہا ہے۔ سین فونگ کے کئی آدمی ان کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اگر تھالوب اس کا ساتھ نہ دیتا تو یہ حرامی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مارا جاتا کسی کے ہاتھوں۔ تھالوب کی سرداری اب ختم ہو چکی۔ اس کی زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ سردار تھالوب۔" اس نے آخری الفاظ تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔ اس نے ریوالور کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

پریرے اگرچہ زخمی تھا لیکن وہ خنجر والا ہاتھ آگے کو نکالے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں کن انکھیوں سے کبھی پریرے کی طرف دیکھتا اور کبھی اس لڑکی کی طرف۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہپ پاکٹ سے پستول نکال کر فائر کر دیا۔

بیک وقت دو فائر ہوئے تھے۔ میرے پستول سے نکلنے والی گولی اس لڑکی کے سینے میں لگی جو تھالوب پر گولی چلانے والی تھی۔ اس کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی، وہ لڑکھڑائی اور اس کے ساتھ ہی اس کی انگلی سے ٹریگر دب گیا۔ ریوالور سے نکلی ہوئی گولی سردار تھالوب سے چند فٹ دور کھڑی ہوئی دوسری لڑکی کے سر میں لگی اور وہ بھی چیختی ہوئی ڈھیر ہو گئی۔

پریرے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔ خوف و وحشت سے اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بے قابو ہو کر مجھ پر حملہ کر دے گا لیکن میرا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دوسرے ہی لمحے پریرے نے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

میں بھی اس کے پیچھے ہی لپکا۔ پریرے باہر نکل گیا تھا اور زینے کے دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک ہی خیال ابھرا اگر وہ زینے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ یہی سوچتے ہوئے میں نے فائر کر دیا۔ گولی پریرے کے پیروں کے قریب لگی۔ وہ مڑ کر چھت کے دوسرے سرے پر واقع سرونٹ کوارٹر کی طرف دوڑنے لگا۔ ساتھ ہی وہ چیخ بھی رہا تھا۔ میں نے اس کے پیروں میں ایک اور فائر کر دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گھاس پر گرا۔

میں اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ سرونٹ کوارٹر کا دروازہ اندر سے دھڑ دھڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پریرے کا ملازم فائرنگ اور اس کے چیخنے کی آوازوں سے جاگ گیا تھا اور چیختے ہوئے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑا رہا تھا۔ اگر گلی میں کسی مکان کا دروازہ اس طرح دھڑ دھڑایا جاتا تو پورا محلہ جاگ چکا ہوتا لیکن چھ منزلہ عمارت کی چھت پر ہونے والا یہ شور کون سن سکتا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا۔ لوگ سو رہے تھے۔ اگر کسی نے فائرنگ کی آواز سنی بھی ہوگی تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوگا کہ آواز کس طرف سے آئی تھی۔

پریرے واقعی بہت سخت جان تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہادر بھی تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور میرے ہاتھ میں پستول ہونے کے باوجود اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اگر چاہتا تھا تو پستول کی گولی اس کے سینے میں اتار سکتا تھا لیکن میں اسے اس وقت تک نہیں مارنا چاہتا تھا جب تک اس سے دارا وغیرہ کا ٹھکانا معلوم نہ کر لیتا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی خنجر والی کلائی پکڑ لی۔ پستول اپنی ہپ پاکٹ میں ٹھونسا اور سیدھے ہاتھ سے اس کی بغل میں گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چیختا ہوا تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ میں نے دوسرا گھونسا اس کے کندھے کے قریب بازو کے جوڑ پر مارا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی کلائی اب بھی میرے بائیں ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی کلائی پر جما دیا اور اس کے بازو کو مروڑتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ وہ الٹ کر پشت کے بل گرا۔

چند فٹ دور لان میں جلنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی میں اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ دو لڑکیوں کی موت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا اور شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

"اب بھی زبان کھولو گے یا نہیں؟" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ چھت کے کنارے کی تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی منڈیر کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ مجھ سے دو تین گز آگے تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے گھاس پر سلپ لگا کر اپنی ایک ٹانگ آگے کر دی۔ اس کا ایک پیر میری ٹانگ میں الجھ گیا۔ وہ لڑکھڑایا۔ سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھڑاتا ہوا منڈیر کے دوسری طرف گرا۔

مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ پریرے کی چیخ نے میرے حواس پر بجلی سی گرا دی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پھر تیزی سے منڈیر کی طرف لپکا۔

پریرے گرا نہیں تھا۔ اتفاق سے اس کے دونوں ہاتھ منڈیر پر جم گئے تھے۔ وہ باہر کی طرف لٹکا ہوا تھا۔ میں نے منڈیر کے قریب جھک کر باہر کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ نیچے سڑک پر کھڑی ہوئی وہ تین کاریں کھلونوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ کھمبوں پر جلنے والے بلبوں کی روشنی بھی مدھم سی نظر آرہی تھی۔

میں نے تیزی سے منڈیر کے قریب بیٹھ کر پریرے کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ اب اس کی آنکھوں میں موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں جب اس کے جسم پر خنجر کی نوک سے چرکے لگا رہا تھا تو اسے یقین تھا کہ میں اسے جان سے نہیں ماروں گا لیکن اب اسے اپنی موت یقینی نظر آرہی تھی۔

"مجھے بچالو۔ خدا کے لیے مجھے بچالو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے گھگیایا۔

"بدھ کے پیروکار تو کسی خدا کو نہیں مانتے۔ تمہیں خدا کیسے یاد آگیا۔" میں نے کہا۔

"م... میں بدھ کا پیروکار نہیں۔ کرائسٹ کا ماننے والا ہوں اور خدا پر یقین رکھتا ہوں۔ تم مسلمان ہو۔ تم بھی خدا کو مانتے ہو۔ مجھے بچالو۔ میں اپنی ساری دولت تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھے بچالو۔"

"حیرت ہے۔" میں نے کہا "جو دولت جمع کرنے کے لیے تم نے اپنا ضمیر اور ایمان تک بیچ ڈالا۔ لوگوں پر ظلم کیے۔ کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ بھی اتارا۔ مزید دولت حاصل کرنے کے لیے وطن فروشوں کا ساتھ بھی دے رہے ہو۔ اس دولت سے تم اتنی آسانی سے دستبردار ہو رہے ہو؟"

"جان سے زیادہ قیمتی کوئی چیز نہیں۔ مجھے بچالو۔ میں اپنی ساری دولت تمہیں دے دوں گا اور تم جو کہو گے میں کروں گا۔" اس کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف یہ بتا دو کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں ہیں؟" میں نے کہا۔

"بتاؤں گا۔ بتا دوں گا۔ پہلے مجھے اوپر اٹھاؤ۔"

"نہیں۔ پہلے دارا کا ٹھکانا بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ تھانگ سینگ میں ہیں۔ مائے کھام ریور کے کنارے۔ کاٹیج نمبر ٹوئنٹی نائن... وہ... وہ میرا ہی کاٹیج ہے۔ دیکھو۔ دیکھو... میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب اوپر اٹھاؤ مجھے۔"

"اور آنگ سانگ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ... وہ بھی ان کے ساتھ ہے۔" پریرے نے جواب دیا "اب... اب مجھے اوپر اٹھاؤ۔"

"میرے ہاتھوں میں پسینہ آرہا ہے۔ تمہارے بازو پھسل رہے ہیں۔ میری گرفت کمزور پڑ رہی ہے۔ سوری مسٹر پریرے۔ میں تمہیں اوپر نہیں کھینچ سکتا۔" میں نے کہتے ہوئے اس کی دونوں کلائیاں چھوڑ دیں۔

پریرے کی آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو دیر تک خاموش فضا میں گونجتی رہی اور پھر بعد کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کسی گہرے کنوئیں میں پتھر پھینکا گیا ہو۔

ایسے آدمی کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اتنی بلندی سے گرنے کے بعد اس کے جسم کے کتنے ٹکڑے ہوئے تھے۔ میں چند سیکنڈ منڈیر کے قریب بیٹھا رہا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے اٹھ گیا۔

سردار تھالوب چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

میں نے اپنا خنجر اٹھا کر گھاس سے رگڑ کر صاف کیا اور اسے پتلون کے نیچے پنڈلی کے ہولسٹر میں اڑس لیا۔ سرونٹ کوارٹر کا دروازہ اب بھی دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا اور پینٹ ہاؤس میں آگئے۔

"میرا خیال ہے تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں جو معلوم کرنا تھا وہ پتا چل گیا ہے اس لیے اب چلنا چاہیے۔" میں نے کہا اور جھانک کر اس کمرے میں دیکھنے لگا جہاں دونوں لڑکیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

ہم دونوں لفٹ کے قریب آگئے۔ دائیں طرف پینل پر تین چار پش بٹن لگے ہوئے تھے۔ سب سے اوپر لاک میں چابی لگی ہوئی تھی۔ سردار تھالوب نے چابی گھما دی۔ لاک کھلتے ہی پاور بھی آن ہو گئی اور دروازہ بھی کھل گیا۔ ہم دونوں اندر آگئے اور سردار تھالوب نے گراؤنڈ فلور والا بٹن دبا دیا۔

لفٹ خاصی تیز رفتار تھی۔ نیچے پہنچنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ لفٹ سے باہر نکلتے ہی میری نظر لابی میں چوکیدار والے کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اندر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے تیزی سے جھک کر خنجر نکالا اور کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

پیر کی ٹھوکر سے دروازہ پوری طرح کھول دیا اور اندر کا منظر دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ جانگی بیڈ پر پڑی تھی اور ہٹا کٹا گینڈا نما چوکیدار اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے جانگی کا گلا دبوچ رکھا تھا۔ جانگی کے دونوں ہاتھ اس کی کلائیوں پر تھے۔ وہ اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ٹانگیں بھی بری طرح پٹخ رہی تھی۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ کا پنچ چوکیدار کی کھوپڑی پر رسید کر دیا لیکن اس ضرب کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا ضرور لیکن جانگی کے گلے پر اس کی

گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی بلکہ وہ گلا گھونٹنے کے لیے اور زیادہ طاقت استعمال کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر جنون کے سے تاثرات تھے۔ میں اگر چاہتا تو نہایت آسانی سے اس کی پشت میں خنجر اتار سکتا تھا لیکن میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بے گناہ تھا اور میں نے آج تک کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے گے لیکن اس وقت جانگی کو بھی اس سے چھڑانا ضروری تھا۔ میں نے خنجر بائیں ہاتھ میں پکڑلیا اور دائیں ہاتھ سے ایک زوردار چوپ چوکیدار کے کندھے پر رسید کردیا۔

یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ وہ بلبلا کر پیچھے الٹ گیا۔ میں نے ایک زوردار گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کردیا۔ اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکلی اور بیڈ سے لڑھک کر فرش پر جاگرا اور اس کے ساتھ ہی بے حس و حرکت ہوگیا۔ کنپٹی پر لگنے والے گھونسے نے اسے انٹا غفیل کردیا تھا۔

جانگی بیڈ پر پڑی اپنا گلا سہلا رہی تھی۔ اس کا بلاؤز بالکل پھٹ گیا تھا۔ سینے، گردن اور کندھوں پر بے شمار خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ باہر نکلتے ہوئے جانگی نے دروازے کے قریب چھوٹی میز پر پڑا ہوا چابیوں کا گچھا اٹھالیا۔

سردار تھالوب باہر کھڑا تھا۔ اس نے کمرے میں نہ آکر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ چوکیدار اسے ایک نظر دیکھتے ہی پہچان لیتا اور بعد میں اس کے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں۔

جانگی نے گیٹ کا تالا کھول دیا۔ ہم تینوں باہر آگئے اور گیٹ کھلا چھوڑ کر بلڈنگ سے کچھ آگے سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی جیپ کی طرف دوڑے۔

وانگ ڈن نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہمارے قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کردیا اور ہمارے بیٹھتے ہی جیپ حرکت میں آگئی۔

جب ہم کاٹیج کے گیٹ میں داخل ہوئے تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور دن کا ہلکا سا اُجالا پھیلنے لگا تھا۔

قبائلی محافظ کاٹیج کے چاروں طرف موجود تھے۔ برآمدے کا دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی جانگی اپنے کمرے میں دوڑ گئی۔ لوما قالین پر پڑا سو رہا تھا۔ ہماری آوازیں سن کر وہ اندر گیا۔ سردار تھالوب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وانگ ڈن صوفے پر گر گیا تھا۔ اسے بھی بری طرح نیند آرہی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

میں نے ایک کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے دوسرے کپڑے اٹھائے اور باتھ روم میں گھس گیا۔ نہانے سے بڑا سکون ملا تھا۔ میں کپڑے بدل کر باہر نکلا تو جانگی کو کمرے میں کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں جینز اور سفید ٹی شرٹ اٹھا رکھی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"میرے کمرے میں رنگولی اور سونیا سو رہی ہیں۔ بیڈ پر تیسرے فرد کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں یہاں آگئی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے پینٹ اور ٹی شرٹ کرسی کی پشت پر رکھ دی اور باتھ روم میں گھس گئی۔

مجھے اپنی خیریت خطرے میں نظر آنے لگی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر آگیا اور پھر اسی آہستگی سے دروازہ بند کرکے ہال میں آگیا۔ لوما اور وانگ ڈن سو چکے تھے۔ میں دوسرے صوفے پر لیٹ گیا۔

باہر دن طلوع ہوچکا تھا۔ کھڑکیوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک گزری رات کے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

میں جب بیدار ہوا تو دوپہر ہورہی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ رنگولی اور سونیا سامنے والے صوفے پر بیٹھی باتیں کررہی تھیں۔ جانگی غالباً کمرے میں سو رہی تھی۔ وانگ ڈن نظر نہیں آیا اور میرا خیال تھا کہ سردار تھالوب بھی اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا۔ میں انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سونیا اور رنگولی نے میری طرف دیکھا اور پھر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔

"کیا بات ہے۔ یہ کیا گپ چپ ہورہی ہے؟" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے سردار تھالوب کا پیغام ہے کہ جب تک وہ فون پر کوئی اطلاع نہ دے تم اس کاٹیج سے باہر نہیں نکلو گے۔" رنگولی نے کہا۔

"کیا مطلب.... تھالوب کہاں ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"سردار تھالوب اور وانگ ڈن صبح سات بجے چیانگ رائے چلے گئے ہیں۔" رنگولی نے بتایا۔

"کیا....؟" میں اچھل پڑا "مجھے بتائے بغیر۔ کوئی خاص بات؟"

"گزشتہ رات چیانگ رائے سے چند کلو میٹر پہلے مہاراج اور رتنا کوسن کی گاڑی پر حملہ ہوا تھا۔ مہاراج اور رتنا کوسن زخمی ہوئے ہیں جبکہ سردار تھالوب کے تین قبائلی محافظ مارے گئے ہیں اور چار زخمی ہوئے ہیں۔"

"اوہ!" مجھے اپنے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا "وہ لوگ کہاں ہیں۔ چیانگ رائے میں؟"

"مہاراج اور رتنا کوسن کی حالت تشویش ناک نہیں تھی۔ انہیں مرہم پٹی کرکے فارغ کردیا گیا تھا اور وہ رات کے پچھلے پہر جہاز پر بنکاک چلے گئے تھے۔ زخمی قبائلی محافظ چیانگ رائے کے اسپتال میں ہیں۔ لاشیں بھی وہیں ہیں۔"

"یہ اطلاع کب ملی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"صبح ساڑھے چھ بجے۔" رنگولی نے بتایا "تم اس وقت سوچکے

تھے اس لیے سردار نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

"حملہ آور کون تھے۔ کچھ پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"فون پر زیادہ تفصیل نہیں بتائی گئی تھی۔ ویسے حملہ آوروں کے بھی دو آدمی مارے گئے ہیں۔" رنگولی نے جواب دیا "سردار کا فون آئے گا تو تفصیل معلوم ہوجائے گی۔"

اس دوران میں لوما نے چائے کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ سردار تھالوب نے گزشتہ رات مہاراج اور رتنا کوسن کے ساتھ محافظوں کی دو گاڑیاں بھیج کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے بھی میری طرح کسی ایسی کارروائی کا شبہ ہوگا۔ اگر محافظ نہ ہوتے تو ان میں سے کسی کا بھی بچنا مشکل ہوتا۔

مجھے مہاراج کی فکر تھی۔ ان کی عمر ستّر سے اوپر تھی۔ اس عمر میں زخمی ہونا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں چائے کا کپ اٹھا کر ٹیلی فون کے قریب آگیا اور ریسیور اٹھا کر بنکاک کا نمبر ملانے لگا۔ کال ریسیو ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال واٹ ٹریمٹ کے مہتمم بھکشو تھوتھانگ نے ریسیو کی تھی۔

"مہاراج بالکل خیریت سے ہیں۔" اس نے میرے پوچھنے پر بتایا "ان کی پنڈلی میں گولی لگی تھی۔ ابتدائی طبّی امداد تو چیانگ رائے ہی میں دے دی گئی تھی۔ یہاں انہیں اسپتال میں داخل کروایا گیا ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہونا۔ اچھا ہے اس بہانے مہاراج دو تین دن آرام کرلیں گے۔ یہ بندہ تو آرام سے بیٹھتا ہی نہیں۔ اِدھر سے اُدھر بھاگا پھرتا ہے۔"

"اور رتنا کوسن کیسے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے بازو میں گولی لگی تھی لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ انہیں اسپتال میں تازہ ڈریسنگ کرکے فارغ کردیا گیا تھا۔ تم اپنا نمبر دے دو میں کسی وقت مہاراج سے فون کروا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے تم بہت بے چین ہورہے ہوگے لیکن پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہے۔"

"سیاسی صورتِ حال کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا لیکن صورتِ حال کنٹرول میں ہے۔" بھکشو تھوتھانگ نے جواب دیا۔

میں نے یہاں کا نمبر دے کر فون بند کردیا۔ ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ وہ چیانگ رائے سے سردار تھالوب کی کال تھی۔

"کیا معاملہ تھا سردار۔ اب کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے اس کی آواز سنتے ہی پوچھا۔

"اب صورتِ حال قابو میں ہے مگر ہمارا اچھا خاصا نقصان ہوچکا ہے۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "میرے تین بندے ہلاک ہوچکے ہیں۔ چار زخمی ہیں جن میں سے ایک کی حالت تشویش ناک ہے مگر مقامِ شکر ہے کہ مہاراج اور رتنا کوسن وغیرہ کا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ مہاراج اور رتنا کوسن کو گولیاں لگی تھیں مگر زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔"

"میری بنکاک میں واٹ ٹریمٹ کے مہتمم سے بات ہوئی تھی۔ وہ دونوں اگرچہ بخیریت ہیں مگر وہاں کی سیاسی صورت حال کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ یہاں کی صورتِ حال کیا ہے۔ حملہ آور کون تھے۔ کچھ پتا چلا؟"

"حملہ آوروں کے بھی دو آدمی مارے گئے ہیں۔ اگرچہ کچھ گرفتاریاں ہوئی ہیں مگر بات ابھی تک واضح نہیں ہوسکی لیکن ایک بات طے ہے کہ سازشی ٹولے کو کسی طرح رتنا کوسن کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ انہیں یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ ایکی مائی گرفت میں آگئی ہے اور اسے بنکاک لے جایا جارہا ہے لیکن.... یہ حملہ براہِ راست شہنشاہ پر وار سمجھا جائے گا۔ رتنا کوسن شہنشاہ کا کزن ہے اور حکومت میں نہایت اہم ذمے داریاں نبھا رہا ہے۔ حکومت کی مشینری پوری طرح حرکت میں آگئی ہے۔ ادھر بنکاک میں سیاسی حلقوں میں زبردست کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ کل رات رتنا کوسن نے ہمارے کاٹیج سے بنکاک میں کئی لوگوں کو فون کیے تھے۔ بنکاک میں رات تین بجے کے بعد سے گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو۔۔ ہنوز جاری ہے۔ کچھ بڑی مچھلیاں بھی پکڑی گئی ہیں اور کچھ لوگ روپوش ہوگئے ہیں۔ سازش کو پوری طرح ناکام بنا دیا گیا ہے اور صورتِ حال مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے۔"

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا سردار تھالوب؟" میں نے پوچھا۔

"میرا ایک کزن پارلیمنٹ کا ممبر ہے۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "تھوڑی دیر پہلے بنکاک میں فون پر میری اس سے بات ہوئی تھی۔ یہ ساری تفصیل اسی نے مجھے بتائی ہے۔"

"میرے لیے کیا ہدایت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم اس سارے سیٹ اپ کے مرکزی کردار ہو۔" سردار تھالوب نے کہا "سب لوگ جان چکے ہیں کہ شہنشاہ کے خلاف اس سازش کو ناکام بنانے میں تم نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس سارے ہنگامے میں سب سے زیادہ نقصان جنرل کھورات کو اٹھانا پڑا ہے۔ جانی بھی اور مالی بھی۔ زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ رات کو پریرے بھی وارننگ دے چکا تھا کہ تمہیں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ختم کردیا جائے گا اس لیے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ صبح یہاں آنے سے پہلے میں نے کچھ اور آدمی کاٹیج کے اطراف میں دور دور تک پھیلا دیے تھے۔ ویسے میں خود بھی شام سے پہلے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بعد ہی کوئی پروگرام بنائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔" میں نے جواب دیا

اور چند اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا۔

میں رنگولی اور سونیا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ اس دوران میں جانکی بھی آ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شاید نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں نے اور جانکی نے اکٹھے ہی بیٹھ کر ناشتا کیا۔ ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا سوائے باتوں کے۔

میں کاٹیج سے نکل کر باہر آ گیا۔ آسمان پر پھر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا میں قدرے خنکی تھی جو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

میں لان میں ایک کرسی پر بیٹھا پہاڑوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اسی دوران میں جانکی بھی وہاں آ گئی۔

"صبح تم کمرے سے کیوں بھاگ گئے تھے؟" اس نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تاکہ تم آرام سے سو سکو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے تم....."

"سونیا آ رہی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے برآمدے کی طرف اشارہ کیا۔ جانکی بھی مڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔

سونیا بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا' اس کی آنکھوں میں اداسی بہت واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ اس سارے ہنگامے میں اور سین تونگ کے قتل کے بعد بھی کہیں سونیا کا نام نہیں آیا تھا۔ وہ اگر چاہتی تو اطمینان سے اپنے گھر میں رہ سکتی تھی لیکن اس نے اپنے گھر جانے کے بجائے ہمارے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی بلکہ ایک موقع پر تو اس نے واشگاف لفظوں میں کہہ دیا تھا۔

"مجھے اس گھر یا اس کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اب تو میں نے اپنا مرنا جینا تم لوگوں کے ساتھ طے کر لیا ہے۔ یہ بات بھی اب میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں' اصل مزہ تو دوسروں کے لیے جینے میں ہے۔ تم لوگ بھی تو دوسروں کے لیے جی رہے ہو۔ موت کے سوداگروں کے ساتھ جنگ کو میں نے بھی اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ہے اور ابھی تو میں نے اپنی ماں کے قتل کا بدلہ بھی لینا ہے۔ دارا میرا اور تمہارا مشترکہ دشمن ہے۔ اس سے انتقام لینے کے لیے میں بھی تمہارے شانہ بشانہ چلوں گی۔ کسی بھی موقع پر تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔"

"سین تونگ کو جس طرح تم نے انجام تک پہنچایا ہے' اس سے مجھے تمہارے بارے میں اندازہ ہو گیا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر مرتبہ کامیابی تمہارے قدم چومتی رہے۔" میں نے کہا۔

"کامیابی اور ناکامی' فتح و شکست کھیل کا ایک حصہ ہے۔" سونیا نے جواب دیا "میں جانتی ہوں کسی موقع پر ناکامی کی صورت میں زندگی سے محروم ہو سکتی ہوں لیکن اب زندگی کی پروا کسے ہے۔"

سونیا اس موضوع پر جب بھی بات کرتی' اس کے لہجے میں ایک عزم ہوتا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر اداسی دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی تھی۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا پھر ارادہ بدل دیا۔ سونیا کی اداسی کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس کی ماں کو مرے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ نہ تو اس نے آخری مرتبہ اپنی ماں کا چہرہ دیکھا تھا اور نہ ہی اپنی ماں کی آخری رسومات میں شریک ہوئی تھی اور ظاہر ہے ایسی صورت میں اس کا اداس ہونا ہی چاہیے تھا۔

ہم میں سے کوئی بھی صبح سے [illegible] شہر کی طرف نہیں گیا تھا۔ وانگ ڈن یہاں [illegible] معلوم کر لیتا۔ میرا یا جانکی وغیرہ کا باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ سردار تھالوب نے بھی خاص طور پر ہمیں باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔ البتہ لوما ایک ایسا شخص تھا جس سے یہ کام لیا جا سکتا تھا۔

میرے کہنے پر لوما فوراً ہی تیار ہو گیا اور جب سونیا کو پتا چلا تو وہ بھی تیار ہو گئی۔

"تمہیں کوئی خطرہ تو نہیں؟" میں نے پوچھا "پرسوں رات تم نے سین تونگ اور اس کے محافظ کو ان کے کاٹیج میں گھس کر قتل کیا تھا۔ کسی نے تمہیں اس گلی میں یا کاٹیج کے آس پاس دیکھا تو نہیں تھا؟"

"بالکل نہیں۔" سونیا نے جواب دیا "مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔"

"شہر کے بہت سے لوگ جانتے ہوں گے کہ تم رنگ سنت کی بیٹی ہو۔ کوئی نہ کوئی پہچان لے گا۔ ایسی صورت میں کسی گڑبڑ کا اندیشہ تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر کوئی پہچان بھی لے گا تو کیا ہو گا۔ میں کسی معاملے میں ملوث تو نہیں۔" سونیا نے جواب دیا "اور اتفاق سے اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تو اطمینان رکھو۔ تم لوگوں کی وجہ سے اب میرا اتنا حوصلہ بڑھ گیا ہے کہ ہر قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کر سکتی ہوں اور یہ بھی تسلی رکھو کہ میری وجہ سے تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

میں خاموشی سے سونیا کے چہرے کو دیکھتا رہا۔

سونیا اور لوما کی واپسی تقریباً دو گھنٹوں بعد ہوئی تھی۔ بڑی دلچسپ خبریں تھیں۔ چیانگ رائے سے پولیس کی بھاری نفری یہاں پہنچ گئی تھی اور رتنا کوسن پر حملے کے حوالے سے یہاں کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی تھیں اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔

سین تونگ کی لاش اس کے آدمی گزشتہ رات اسپتال سے لے گئے تھے جسے رات ہی رات گولڈن ٹرائی اینگل پہنچا دیا گیا تھا۔ پریرے اور اس کے پنٹ ہاؤس میں دو لڑکیوں کے قتل نے بھی شہر میں اچھا خاصا خوف و ہراس پھیلا دیا تھا۔ پولیس نے پریرے ہاؤس کے چوکیدار کو حراست میں لے لیا تھا جس نے جانکی کے بارے میں بیان دیا تھا کہ کس طرح وہ دھوکے سے بلڈنگ میں داخل ہوئی تھی

اور کمرے میں لے جا کر اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے جانکی پر قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت اسی کا ایک ساتھی کمرے میں گھس آیا تھا جس نے سر پر ضرب لگا کر اسے دوبارہ بے ہوش کر دیا۔ وہ ظاہر ہے جانکی کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن اس نے جو حلیہ بتایا تھا' اس سے بھی جانکی کو شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔ چھت پر سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے... ملازم نے بھی بیان دیا تھا کہ پنٹ ہاؤس میں فائرنگ اور چیخوں کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے اپنے کوارٹر سے باہر نکلنا چاہا تھا مگر کسی نے دروازے کو باہر سے بند کر رکھا تھا۔

پہلے اسے ڈکیتی کی واردات سمجھا گیا لیکن پنٹ ہاؤس سے کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ کسی چیز کو چھیڑا تک نہیں گیا تھا۔ پریرے کی خواب گاہ کی الماری میں لاکھوں بھات کی نقد رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قیمتی چیزیں تھیں مگر ہر چیز جوں کی توں تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ جو لوگ بھی تھے' پریرے کو قتل کرنے کی نیت سے ہی بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے اور اس کے لیے انہوں نے بڑی پلاننگ کی تھی۔ پریرے کی لاش پر زخموں کے نشان تھے۔ جس سے پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ پہلے اس پر خنجر کے وار کر کے قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن شاید وہ اپنے آپ کو چھڑا کر پنٹ ہاؤس سے باہر نکل گیا تھا اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں وہ چھت سے گر گیا تھا یا اسے گرا دیا گیا تھا۔ بہرحال پولیس نے شہر کے دو بدنام غنڈوں کو اس کے قتل کے شبے میں گرفتار بھی کر لیا تھا۔

سونیا کے کہنے کے مطابق شہر میں سناٹا تھا۔ غیر ملکی سیاح اور سیر و تفریح کے لیے دوسرے شہروں سے آئے ہوئے لوگ واپس جا رہے تھے۔ شہر کی رونق اجڑ گئی تھی۔ کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ قتل و غارت نے اس شہر کا سکون برباد کر دیا تھا۔ لوگوں کے خیال میں اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔

میں دیر تک اس صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ دارا وغیرہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور مجھے سب سے زیادہ پریشانی تھائی کی تھی۔ وہ زخمی بھی تھی اور نجانے ان درندوں نے اس کا کیا حشر کیا ہو گا۔

شام پانچ بجے کے قریب بنکاک سے مہاراج کی کال آ گئی۔ میں نے سب سے پہلے خود ان کے بارے میں پوچھا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں وجدان۔" مہاراج نے جواب دیا "گولی پنڈلی کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ معمولی زخم ہے۔ دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اور دیگر حالات کیا ہیں مہاراج؟" میں نے پوچھا۔

"صورتِ حال کنٹرول میں ہے۔ سازش میں شریک تمام بڑے لوگوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔ کچھ لوگ روپوش ہو گئے ہیں لیکن وہ بھی جلد ہی گرفت میں آ جائیں گے۔" مہاراج نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے "رتنا کوسن نے تمہارا نام شہنشاہ تک پہنچا دیا ہے۔ وہ تم سے بہت خوش ہیں اور کسی مناسب موقع پر تمہیں ملاقات کا شرف بھی بخشیں گے اور تم بتاؤ۔ تھائی کا کچھ پتا چلا؟"

"گزشتہ رات میں نے دارا کے ٹھکانے کا پتا لگا لیا تھا لیکن صبح سویرے ہی چیانگ رائے میں آپ لوگوں پر حملے کی اطلاع ملتے ہی سردار تھالوب چیانگ رائے چلا گیا تھا۔ اس نے میرے لیے پیغام چھوڑا تھا کہ اس کی واپسی تک میں کاٹیج سے باہر نہ نکلوں۔ ویسے یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ جنرل کھورات کا معتمدِ خاص سونیا کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے اور سین تونگ کے آدمی اس کی لاش کو گولڈن ٹرائی اینگل لے گئے ہیں اور گزشتہ رات یہاں کا ایک سابق پولیس چیف بھی میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔ وہ بھی اس سازش میں شریک تھا اور دارا وغیرہ کو بھی اسی نے پناہ دے رکھی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ جنرل کھورات کے آدمی یہاں آنے والے ہیں۔"

"لیکن شاید اب وہ چیانگ سائین میں کوئی کارروائی نہ کر سکیں۔" مہاراج نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر پہلے رتنا کوسن سے میری بات ہوئی تھی۔ پولیس کی بھاری نفری چیانگ سائین بھیجی جا چکی ہے۔ دیگر انتظامی امور سنبھالنے کے لیے۔ کچھ آدمی چیانگ رائے اور بنکاک سے بھی بھیجے گئے ہیں۔ ایک آدھ دن میں وہاں کے حالات بھی کنٹرول میں آ جائیں گے لیکن بہرحال' تم اپنا خیال رکھنا۔ تمہارا واسطہ نہایت مکار اور گھٹیا قسم کے دشمن سے ہے جو کسی بھی وقت وار کر سکتا ہے اور تھائی کی تلاش جاری رکھو۔"

مہاراج سے تقریباً آدھا گھنٹا باتیں ہوتی رہیں اور پھر فون بند کر دیا گیا۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ سردار تھالوب اور وانگ ڈن بھی پہنچ گئے۔ وہ دونوں بھی ہمارے پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے پہلی مرتبہ تھالوب کے چہرے پر تھکن کے آثار دیکھے تھے۔ لوما نے فوراً ہی ان کے سامنے چائے رکھ دی۔

"گیم جب اتنا بڑا ہو تو سو طرح کے خدشات ہوتے ہیں۔" تھوڑی دیر بعد سردار تھالوب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گی اسی لیے میں نے مہاراج اور رتنا کوسن کی حفاظت کے لیے محافظوں کی دو گاڑیاں بھیج دی تھیں۔ میرا شبہ درست نکلا۔ چیانگ رائے سے چند کلومیٹر پہلے ان پر حملہ ہوا لیکن قسمت اچھی تھی وہ لوگ بچ گئے۔"

"میرا خیال ہے وہ لوگ ایکی مائی کو ختم کرنا چاہتے ہوں گے۔" اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" سردار تھالوب نے کہا "لیکن ظاہر

ہے رات کے اندھیرے میں حملہ کرنے کا مقصد صرف ایکی مائی کو قتل کرنا نہیں تھا۔ اگر مہاراج یا رتنا کوسن میں سے کوئی مارا جاتا تو میرا خیال ہے اس ملک میں قیامت ہی آجاتی۔ بہرحال، بلا ٹل گئی اور پورے ملک میں صورتِ حال اب مکمل طور پر حکومت کے کنٹرول میں ہے۔"

"اور تمہارے تین آدمی....."

"چار۔" سردار تھالوب نے میری بات کاٹ دی "چوتھا آدمی بھی چل بسا لیکن مجھے خوشی ہے کہ میرے قبیلے کے لوگوں کی قربانی رائگاں نہیں گئی۔ ہم وہ لوگ ہیں جو شہنشاہ اور اس سرزمین کی سلامتی کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ ہم ہمیشہ ہر آزمائش میں پورے اترے ہیں۔ ہمیں اپنے اس کردار پر فخر ہے۔ میرے قبیلے کے لوگ آج سوگ نہیں جشن منا رہے ہیں کہ ان کے چند آدمیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرکے شہنشاہ اور ملک کو ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہونے سے بچالیا۔"

سردار تھالوب کے جذبات قابلِ قدر تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہر ملک میں اس جیسے محبِ وطن موجود ہوں تو دشمن ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا لیکن دنیا میں دارا، پیڈرو اور آنگ سانگ جیسے بے ضمیر لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی جو نہ صرف خود اپنے ملک کے لیے مسائل پیدا کرتے تھے بلکہ اغیار کو بھی اپنے ملک کی جڑیں کاٹنے کی دعوت دیتے تھے۔

سردار تھالوب رات کا کھانا کھا کر اپنے شہر والے بنگلے میں چلا گیا تھا۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ پہلے مائے کھام ریور کے کنارے واقع اس کاٹیج کی نگرانی کرکے تسلی کرلی جائے کہ دارا وغیرہ وہاں موجود ہیں یا نہیں۔ دارا بہت چالاک تھا۔ ہوسکتا ہے پریرے کے قتل سے وہ یہ سمجھ گیا ہو کہ یہ ہمارا کارنامہ ہوسکتا ہے اور ہم نے اس سے کاٹیج کے بارے میں معلوم کرلیا ہوگا اور انہوں نے اپنا ٹھکانا تبدیل کرلیا ہو۔

سردار تھالوب نے وانگ ڈن کو ہدایت کردی تھی کہ وہ صبح سویرے ہی دو تین آدمیوں کو تھانگ سینگ کی طرف بھیج دے تاکہ ان لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکیں۔

تھانگ سینگ وہاں سے تقریباً دس کلو میٹر دور لاؤس کی سرحد کے قریب واقع تھا۔ اس جگہ دریائے میکانگ بھی مائے کھام ریور سے اس طرح ملتا تھا کہ انگریزی کے حرف Y کی شکل اختیار کرگیا تھا اور انہی دریاؤں کی درمیانی تکون میں گولڈن ٹرائی اینگل کا علاقہ واقع تھا۔ دونوں دریا ایک طرف لاؤس اور دوسری طرف برما کی سرحد سے جا ملتے تھے۔ گویا یہ دونوں دریا تینوں ممالک کے درمیان سرحدوں کا کام دیتے تھے۔

وہ رات بڑی بے چینی میں گزری تھی۔ صبح دیر تک میں بستر پر پڑا رہا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ سردار تھالوب ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہ شہر میں کچھ اور کاموں میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد وانگ ڈن بھی چلا گیا۔

پانچ بجے کے قریب دو قبائلی لان میں آکر بیٹھ گئے۔ لوا نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ یہ وہی دونوں قبائلی ہیں جنہیں آج صبح سویرے تھانگ سینگ بھیجا گیا تھا۔ میں نے ان سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن وہ جواب دینے سے گریز کرتے رہے۔ ساڑھے چھ بجے کے قریب سردار تھالوب واپس آیا تو وہ لوگ فرفر بولنے لگے۔

"میرا شبہ درست نکلا۔" سردار تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ لوگ دو پارٹیوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ ایک پارٹی تو اسی کاٹیج میں مقیم ہے جس کا پتا پریرے نے بتایا تھا۔ دوسری پارٹی وہاں سے تقریباً پانچ کلو میٹر آگے دریا کے ساتھ ایک اور کاٹیج میں منتقل ہوگئی ہے اور اتفاق سے دونوں پارٹیوں میں ایک ایک عورت شامل ہے۔ میرے یہ آدمی چونکہ دارا وغیرہ میں سے کسی کو نہیں پہچانتے اس لیے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ دارا اور تھائی کس کاٹیج میں ہیں۔ البتہ انہوں نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ دونوں پارٹیوں میں دو دو آدمی اور ایک ایک عورت شامل ہے۔"

"ہمیں یہ تو پتا چل گیا تھا کہ تھائی زخمی ہے۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ اس کے بازو پر یقیناً پٹی وغیرہ بندھی ہوگی۔ ان سے معلوم کرو کہ زخمی عورت کس پارٹی میں ہے۔" میں نے کہا۔

سردار تھالوب ایک بار پھر اپنے آدمیوں سے بات کرنے لگا۔ دو منٹ بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"جن دو عورتوں کو انہوں نے دیکھا ہے، ان میں کوئی بھی زخمی نہیں ہے۔ میں نے انہیں تھائی کا حلیہ بتایا ہے اور ان کے کہنے کے مطابق ان دونوں میں سے کوئی بھی اس حلیے سے ملتی جلتی نہیں ہے۔"

"چار آدمی دو عورتیں۔" میں بڑبڑایا "لیکن اگر آنگ سانگ بھی ان کے ساتھ ہے تو ان کی تعداد پانچ ہونی چاہیے۔ دارا، پیڈرو، کم، جی فانگ اور آنگ سانگ لیکن یہ چار آدمی ہیں۔"

"ہوسکتا ہے پانچواں آدمی ان کی نظروں میں نہ آیا ہو۔" سردار تھالوب نے کہا "بہرحال، ہم صبح سویرے اس کاٹیج پر ریڈ کریں گے جس کا پتا پریرے نے بتایا تھا۔"

"رات کو کیوں نہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم رات کو دو ڈھائی بجے یہاں سے نکلیں گے۔" سردار تھالوب نے کہا "یہ دونوں آدمی رہنمائی کے لیے ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ہمیں تقریباً چار کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہوگا اس لیے ان تینوں میں سے کوئی ہمارے ساتھ نہیں جائے گی۔" اس نے رنگولی، جانگی اور سونیا کی طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں کمزور سمجھتے ہو سردار تھالوب!" سونیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں اپنی ماں کے قاتل کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں ہمارے ساتھ ضرور جاؤں گی۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو اس کی ذمے داری تم لوگوں پر نہیں ہوگی۔"

"سونیا ٹھیک کہتی ہے۔" جانگی نے کہا "ہم نہ تو کمزور ہیں اور نہ ہی بزدل اس لیے ہم پیچھے نہیں رہ سکتیں۔"

سردار تھالوب نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

"جس ملک کی عورتوں میں اس قدر حوصلہ ہو، کیا وہ ملک کسی سازش کا شکار ہوسکتا ہے؟"

سردار تھالوب کی اس بات پر میں نے بھی مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد سردار تھالوب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے جانگی وغیرہ سے بھی کہا کہ وہ تھوڑی سی نیند لے لیں۔ وہ تینوں ایک ہی کمرے میں چلی گئیں۔ اور میں بھی ایک صوفے پر لیٹ گیا لیکن ظاہر ہے نیند کیسے آتی۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس وقت تک سکون کی نیند سو سکتا ہو جب تک اپنے دشمنوں کو ٹھکانے نہ لگالے۔ میں اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے دارا کے پیچھے تھا۔ سونیا اپنی ماں کے قاتلوں کو جہنم واصل کرنا چاہتی تھی اور سردار تھالوب وطن دشمنوں کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ اس کے کئی آدمی بھی ان کے ہاتھوں مارے جاچکے تھے۔ ایسی صورت میں نیند کیسے آسکتی تھی۔

دو بجے کے قریب سردار تھالوب اپنے کمرے سے نکل آیا۔ میں تو جاگ ہی رہا تھا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد جانگی وغیرہ بھی تیار ہو کر کمرے سے باہر آگئیں۔ ان تینوں نے جینز اور ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ سونیا نے جانگی سے کپڑے لے کر پہنے تھے جو اس کے جسم پر بالکل فٹ آئے تھے۔

لوا بھی جاگ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی کافی تیار کرکے ہمارے سامنے رکھ دی۔ کافی پینے کے بعد پونے تین بجے کے قریب ہم اپنے ٹھکانے سے روانہ ہوگئے۔ سردار تھالوب، وانگ ڈن کے ساتھ آگے بیٹھا تھا اور وہ دونوں قبائلی ہمارے ساتھ پیچھے بیٹھے تھے۔

شہر کی حدود سے نکل کر جیپ پہاڑیوں میں کچے راستے پر اتر گئی۔ یہ راستہ خاصا ناہموار اور خطرناک تھا۔ بری طرح دھچکے لگ رہے تھے۔

چار بجے کے قریب وانگ ڈن نے جیپ روک لی۔ آگے جیپ کا راستہ نہیں تھا۔ ہم سب نیچے اتر آئے۔ آگے پیدل جانے کے لیے ایک ٹریک سا بنا ہوا تھا۔ ان دو قبائلیوں کی رہنمائی میں ہم کچھ دور تک اس ٹریک پر چلتے رہے اور پھر دوسری طرف مڑ گئے کیونکہ ان کے خیال میں اگر ہم ٹریک پر چلتے رہتے تو فاصلہ بڑھ جاتا۔ یہ راستہ خاصا خطرناک تھا۔ ہم ایک قطار میں چلتے رہے۔ پانچ بجنے کے قریب فضا اچانک ہی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ ہم بڑی پھرتی سے پتھروں کی آڑ میں ہوگئے۔

میں ایک پتھر کے پیچھے بیٹھا محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت رات کا اندھیرا رخصت ہورہا تھا اور بہت ہلکا سا اجالا پھیلنا شروع ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دارا وغیرہ نے بھی پچھلے تجربات سے سبق سیکھا ہوگا۔ رات کو کاٹیج میں بے خبر سونے کے بجائے انہوں نے بھی پہرے داری کا نظام قائم کرلیا ہوگا اور اس وقت جو کوئی بھی پہرا دے رہا ہوگا اس نے ہمیں دیکھ لیا ہوگا۔

گولیوں کی آواز چاروں طرف گونجتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ فائرنگ کس طرف سے ہوئی تھی۔ ایک برسٹ مارا گیا تھا۔ اس کی بازگشت دیر تک سناٹوں میں سنائی دیتی رہی اور پھر خاموشی چھاگئی۔ میں پتھروں کی آڑ لیتا ہوا سردار تھالوب کے قریب آگیا جو سونیا کے ساتھ ایک تناور درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔

"فائرنگ کس طرف سے ہوئی تھی سردار؟" میں نے اس کے قریب دوسرے درخت کی آڑ میں کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے یہ فائرنگ ہم پر نہیں کی گئی۔" سردار تھالوب نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا "بازگشت سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ فائرنگ ہوئی کس طرف سے تھی۔"

سردار تھالوب نے ابھی بات پوری کی ہی تھی کہ پہاڑ ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھے۔ اس مرتبہ بھی یوں لگا جیسے پورا برسٹ مارا گیا ہو۔ آواز دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہی پھر خاموشی چھاگئی۔

"وہ کاٹیج اب یہاں سے کتنی دور ہے؟" سردار تھالوب نے ایک قبائلی کو قریب بلا کر پوچھا۔

"اس چٹان کے دوسری طرف۔" قبائلی نے نشیب کی طرف اشارہ کیا۔ سردار تھالوب کچھ دیر تک اس طرف دیکھتا رہا پھر اشارہ کرتا ہوا ایک ناہموار راستے پر اترنے لگا۔

اس چٹان تک پہنچنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ سامنے نشیب میں بہت دور دریا مائے کھام بہہ رہا تھا۔ مدھم سے اجالے میں دریا کا پانی سُرمئی لکیر کی طرح نظر آرہا تھا۔

"وہ اس طرف۔" ایک قبائلی نے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا "وہ کاٹیج درختوں کے اس جھنڈ کے دوسری طرف ہے۔"

ہم ڈھلان پر اترنے لگے۔ کاٹیج تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ کاٹیج کا سامنے کا رخ دوسری طرف تھا جبکہ ہم عقبی رخ سے آئے تھے۔ ہم اگرچہ آڑ میں تھے مگر وہ کاٹیج پوری طرح ہماری نظروں میں تھا لیکن وہاں کسی قسم کی نقل و حرکت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"تم لوگ یہیں رکو۔ میں آگے جاکر دیکھتا ہوں۔" میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں درختوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں اس طرح تھام رکھا تھا کہ وقت پڑنے پر فوری طور

پر استعمال کیا جا سکے۔

کاٹیج کے عقب میں پہنچ کر میں رک گیا اور کسی قسم کی آہٹ لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ میں نے محتاط انداز میں ایک کھڑکی سے جھانکا۔ اندر بتی جل رہی تھی۔ ایک طرف بیڈ بچھا ہوا تھا جس کی چادر کمٹی ہوئی تھی اور شراب کی ایک خالی بوتل اور دو گلاس اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ بیڈ کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ایک آٹومیٹک رائفل بھی استادہ تھی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کسی قسم کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

میں کاٹیج کے اوپر سے گھوم کر سامنے کی طرف آ گیا اور رائفل سنبھالے محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ برآمدے میں پہنچ کر میں ایک بار پھر رک گیا۔ اس وقت بھی کوئی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کاٹیج کا برآمدے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا اور بڑی پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔

رائفل سنبھالے دیوار کے ساتھ چپک کر میں محتاط انداز میں آگے بڑھتا رہا اور پھر جیسے ہی ہال کمرے کے سامنے پہنچا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس وقت فائرنگ کہاں ہوئی تھی۔

ہال کمرے میں فرش پر آنگ سانگ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسے غالباً رائفل کا پورا برسٹ مارا گیا تھا۔ جسم چھلنی ہو چکا تھا اور زخموں سے بہنے والا خون فرش پر پھیل کر جم رہا تھا۔

میں نے کاٹیج کے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ کسی ذی روح کا نشان تو نہیں ملا البتہ افراتفری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے کچھ لوگوں کی آپس میں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال سے میں نے ایک اور نتیجہ اخذ کیا تھا۔ کسی وجہ سے ان لوگوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔

میں کاٹیج سے باہر آ گیا اور آواز دے کر تھالوب وغیرہ کو بلا لیا، یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر وہ لوگ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

”یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہاں آنگ سانگ کے ساتھ کون تھا لیکن یہ طے ہے کہ وہ جو کوئی بھی تھا، دوسرے کاٹیج کی طرف بھی گیا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

میں اور تھالوب برآمدے میں آ گئے۔ وانگ ڈن اور دونوں قبائلی اِدھر اُدھر نکل گئے تھے اور پھر ایک قبائلی کی چیخ سن کر ہم اس طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ قبائلی تقریباً ڈیڑھ سو گز دور نشیب میں کھڑا چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔

”کیا کہہ رہا ہے یہ؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے تھالوب کی طرف دیکھا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“ تھالوب کہتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف چل پڑا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے ہی دوڑ لگا دی۔ تقریباً ڈیڑھ... نشیب میں پہنچ کر میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔ جھاڑیوں میں... کی لاش پڑی تھی۔ اس کی دونوں ٹانگیں گولیوں سے چھلنی... جبکہ جسم کے اوپر والے حصے پر کوئی زخم نظر نہیں آ رہا تھا۔

”یہ زندہ ہے۔“ سردار تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اوہ!“ میں چونک گیا اور جھک کر پیڈرو کو دیکھنے لگا اور... کی گردن پر ایک نس کو ٹٹولنے لگا۔ اس میں زندگی کے آثار... تھے۔ دوسرا قبائلی اور وانگ ڈن بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔

”پیڈرو..... پیڈرو.....“ میں اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے... پکارنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد پیڈرو نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

”اسے کاٹیج میں لے چلو۔“ میں نے وانگ ڈن کو اشارہ کیا۔

وانگ ڈن کے اشارے پر دونوں قبائلیوں نے پیڈرو کو اٹھا... سے اٹھا لیا اور کاٹیج کے ایک کمرے میں لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے اور حلق میں چند قطرے ٹپکانے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”پیڈرو۔ یہ سب کیا ہوا۔ کون تھا وہ؟“ میں نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”چچ..... چی..... فا..... نگ.....“ اس کی آواز بڑی مشکل سے حلق سے نکل رہی تھی ”وہ..... وہ غدار..... نکلے..... آنگ سانگ کو..... بھی مار..... دیا۔“

”دارا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دہ..... دوسرے کاٹیج میں.....“ پیڈرو نے جواب دیا ”ہم... میرے ساتھ..... دھوکا..... کیا..... وہ جنرل..... کھورات سے... گئے ہیں اور آج..... گولڈن ٹرائی..... اینگل چلے..... جائیں گے۔“

”تھائی بھی اُن کے قبضے میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں..... اس کی حالت..... اچھی..... نہیں ہے۔“ پیڈرو نے جواب دیا۔

”یہاں اور کون تھا؟“

”ایک..... ایک لڑکی..... چی فانگ..... اسے ساتھ لے گئے...“ پیڈرو نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”مجھے..... ہم... دو..... گگ..... گولی مار دو..... اس اذیت..... سے نجات دلا دو...“

میں پیڈرو سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا... پھر رائفل کا رخ اس کے سینے کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ اسے... اذیت سے نجات دلانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ اسے نہ تو ہم ساتھ لے جا سکتے تھے اور نہ ہی اس حالت میں چھوڑ سکتے تھے کہ وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکا تڑپتا رہے۔

جب ہم کاٹیج سے باہر نکلے تو سورج طلوع ہونے میں اگرچہ دیر... لیکن دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔

”دوسرا کاٹیج یہاں سے کتنی دور ہے سردار؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً پانچ کلو میٹر۔“ سردار نے جواب دیا۔

”ہم فوراً اسی طرف جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا ”انہیں ... آمد کی توقع نہیں ہو گی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل سکیں یا ... نکل جائیں۔ ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔“

میری کیفیت دیکھ کر سردار تھالوب میرے پروگرام سے ... نہیں کر سکا۔ ویسے پیڈرو سے تو وہ بھی سن چکا تھا کہ دارا ... کسی وقت گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے کا منصوبہ بنا رہا ... اگر وہ نکل جانے میں کامیاب ہو گئے تو صورتِ حال ہمارے ... بہت گمبھیر ہو جائے گی۔ ہمیں ہر صورت میں انہیں سرحد پار ... نے سے روکنا تھا۔

پانچ کلو میٹر کا فاصلہ ہم نے ایک گھنٹے میں طے کیا تھا۔ رنگولی ... اور جانگی بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ اونچے نیچے راستوں پر ہم ... انہیں ایک منٹ بھی رکنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

اور بالآخر ہم رک گئے۔ وہ کاٹیج ہم سے تقریباً دو سو گز کے ... ٹیلے پر تھا اور اس کاٹیج کے سامنے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ... دریائے ماے کھام بہہ رہا تھا۔ اس جگہ دریا کا پاٹ تقریباً پانچ سو میٹر ... چوڑا تھا اور اس کے دوسری طرف گولڈن ٹرائی اینگل کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر گھنا جنگل تھا جس میں ... پوری فوج آسانی سے چھپ سکتی تھی۔

پہاڑیاں اچانک فائر کی آواز سے گونج اٹھیں اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ایک قبائلی محافظ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ کاٹیج کی طرف سے چلائی جانے والی گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔

ہم فوراً ہی اِدھر اُدھر بکھر گئے اور درختوں اور پتھروں کی آڑ... لے کر فائرنگ کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ہم آگے بڑھنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ دوسری طرف سے بھی بڑی شدید فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔

ہمارا اور کاٹیج کا درمیانی فاصلہ صرف سو گز کے قریب رہ گیا ... اچانک ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ دوسری طرف سے ... دو آدمی جگہ بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ خیال آتے ... پتھروں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دائیں طرف دوڑ ... میرا رخ دریا کی طرف تھا اور پھر ایک جگہ ٹھٹک کر میں رک ... تھا جو کسی کو کندھے پر لادے بڑی تیزی سے دوڑتا ہوا دریا ... پتھروں کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی ... نے تھائی کو کندھے پر لاد رکھا تھا۔ پیڈرو بھی بتا چکا تھا کہ ... کی حالت اچھی نہیں تھی۔ دارا یقیناً اسے بھی اپنے ساتھ ... گولڈن ٹرائی اینگل لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

... اس طرف دوڑنے لگا جس طرف کم گیا تھا لیکن میں چند گز سے زیادہ آگے نہیں جا سکا۔ بائیں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی تھی۔ لاتعداد گولیاں میرے آگے پیچھے گری تھیں۔ میں نے فوراً ہی ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔

گولیاں اب بھی برس رہی تھیں۔ پتھر ٹوٹ ٹوٹ کر چاروں طرف اڑ رہے تھے۔ میں نے پتھر کی آڑ سے جھانکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ بہت شدید فائرنگ ہو رہی تھی اور اس فائرنگ کا مقصد غالباً یہی تھا کہ مجھے روکے رکھا جائے۔

اور پھر ایک مرتبہ موقع ملتے ہی میں نے دوسری طرف چھلانگ لگا دی اور اس وقت میں نے وانگ ڈن کو کاٹیج کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا، وہ فائرنگ کرتا ہوا بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا لیکن وہ بیس پچیس گز سے آگے نہیں جا سکا۔ چیختے ہوئے لڑکھڑا کر گرا اور ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے اس کے جسم پر کئی گولیاں لگتے دیکھی تھیں۔

دوسری طرف سے فائرنگ کے ساتھ اب دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور پھر میں نے سردار تھالوب، اس کے قبائلی محافظ اور رنگولی وغیرہ کو اس طرف دوڑتے ہوئے دیکھا۔ میں بھی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا اور ان کی طرف دوڑنے لگا۔

وانگ ڈن کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ اس کی لاش ڈھلان پر جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے اب فائرنگ کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں اور پھر اچانک میں ایک آواز سن کر اچھل پڑا۔

وہ موٹر بوٹ کے انجن کی آواز تھی۔ میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھا اور پھر دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔ پتھروں کی آڑ سے نکل کر میں جیسے ہی سامنے آیا، دریا کی طرف سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے ایک پتھر کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور آڑ لے کر فائرنگ کرنے لگا۔

وہ موٹر بوٹ بڑی تیز رفتاری سے کنارے سے دور ہٹتی جا رہی تھی۔ چی فانگ بوٹ میں کھڑا آٹومیٹک رائفل سے میری طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر دوسرے پتھر کے قریب چلا گیا اور دوسری طرف سے گولیوں کی پروا کیے بغیر کشتی پر فائرنگ کرنے لگا لیکن..... وہ تیز رفتار موٹر بوٹ فائرنگ کی رینج سے نکل چکی تھی۔

میری رائفل خالی ہو گئی اور میں وہاں کھڑا لمحہ بہ لمحہ دور جاتی ہوئی موٹر بوٹ کو دیکھتا رہ گیا۔

دریا کا بہاؤ بہت تیز تھا اور وہ موٹر بوٹ بہاؤ کے رخ پر بہت تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی اور میں بے حس و حرکت کھڑا بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا اور پھر اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس کر کے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ سردار

تھالوب تھا جو میرے کندھے پر ہاتھ رکھے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"وہ نکل گئے۔ ان کے لیے کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ آؤ اب واپس چلیں یہاں وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" تھالوب کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے اپنی خالی رائفل نیچے پھینک دی اور سردار تھالوب سے اس کی رائفل چھین کر پتھروں پر چھلانگیں لگاتا ہوا دریا کی طرف دوڑا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کوئی چھوٹا سا گھاٹ ہوگا اور کوئی اور کشتی ضرور ہونی چاہیے۔ اگر مجھے کوئی کشتی مل جاتی تو میں ان لوگوں کا تعاقب کرسکتا تھا۔

مجھے اس طرح بھاگتے دیکھ کر تھالوب وغیرہ بھی میرے پیچھے لپکے۔

چھوٹی چھوٹی چٹانوں کی وجہ سے دریا میں کٹاؤ سے بنے ہوئے تھے۔ میں کسی کشتی کی تلاش میں ان چٹانوں پر اِدھر اُدھر دوڑتا رہا۔ میں نے دونوں طرف دور دور تک دیکھ لیا لیکن مجھے بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کوئی کشتی نہیں تھی۔ میں ایک چٹان پر کھڑے ہو کر پھر دریا کی طرف دیکھنے لگا۔ دارا کی موٹر بوٹ اب بہت دور جا چکی تھی۔

تھالوب اور جانگی وغیرہ بھی میرے قریب پہنچ گئے۔

"مجھے معلوم ہے تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔" تھالوب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "انہوں نے خاص طور پر پہلے ہی سے اس موٹر بوٹ کا انتظام کر رکھا تھا۔ فرار ان کے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ فی الحال ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ کشتیوں کا گھاٹ یہاں سے تقریباً دو میل دور ہے۔ کوئی کشتی حاصل کرنے کے لیے ہمیں وہاں جانا پڑے گا لیکن گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اور۔۔۔"

"ہم تو پہلے ہی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہیں تھالوب۔ موت سے کون ڈرتا ہے۔ میں گولڈن ٹرائی اینگل میں ضرور داخل ہوں گا۔ تھائی کو ان درندوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔"

"لیکن اس کے لیے ہمیں باقاعدہ پلاننگ کرنی پڑے گی۔" سردار تھالوب نے کہا "گولڈن ٹرائی اینگل اجنبیوں کے لیے موت کا حصار ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔"

میں چند لمحے دریا کی طرف دیکھتا رہا۔ دارا والی کشتی اب نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ویرانی اور چہرے پر بے حد ملال تھا۔ اسے دکھ ہونا ہی چاہیے تھا۔ تھائی اس کی بہت پرانی اور گہری دوست تھی۔ تھائی ہی کی دوستی میں اس نے اپنا گھر بار لٹا دیا تھا اور جان ہتھیلی پر لیے پھر رہی تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر تھی۔ معاشرے میں اس کا ایک مقام تھا۔ اسے عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن سب کچھ اس سے چھن چکا تھا۔ اب تو میری طرح اس کی پیشانی پر بھی دہشت گرد کا لیبل لگ چکا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہم ایک نیک مقصد کے لیے لڑ رہے تھے۔ بدی کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ امن پسند اور وطن پرست قوتیں ہمارے ساتھ تھیں۔ مہاراج وانگ زند یائے ہمارے ساتھ تھے۔ ہمیں شہنشاہ کی آشیرباد حاصل تھی۔ ہم نے اس سرزمین اور شہنشاہ کے خلاف ایک بہت ہی بھیانک سازش کو ناکام بنایا تھا۔ جس کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ اگر وہ سازش کامیاب ہوجاتی تو اس وقت اس ملک میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہوتیں لیکن ہم نے اس خوفناک سازش کو ناکام بنا کر ملک میں خون خرابے کو روک لیا تھا مگر بعض حلقے ایسے بھی تھے جو ہمیں دہشت گرد قرار دے رہے تھے۔

تھائی کا جرم بھی صرف یہ تھا کہ اس نے ایک بے گناہ اور معصوم بچے کو پناہ دی تھی اور سچائی کا ساتھ دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اس کا گھر جلا دیا گیا۔ اس کا کاروبار تباہ ہوگیا اور وہ عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر میرے ساتھ دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوگئی۔ موت نے اس کا بھی تعاقب شروع کردیا اور طویل عرصے کی آنکھ مچولی کے بعد بالآخر وہ ان خونی بھیڑیوں کے ہاتھ لگ گئی اور مجھے اسے ہر صورت میں بچانا تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا تھالوب وغیرہ کے ساتھ چلتا رہا اور بالآخر ہم اس جگہ رک گئے جہاں جھاڑیوں میں وانگ ڈن کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ پورا برسٹ مارا گیا تھا۔ وانگ ڈن کی لاش دیکھ کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ کیا حق اور سچائی کا ساتھ دینے والے شخص کا یہی انجام ہوتا ہے؟ یہ سوال میرے دماغ میں بگولے کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میں جب سے چیانگ رائے آیا تھا وانگ ڈن نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ کئی بار جان کی بازی لگائی تھی اور بالآخر بدی کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔

جانگی، رنگولی اور سونیا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ سردار تھالوب کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے ہوئے تھا۔

ہم وانگ ڈن کی لاش اٹھا کر کاٹیج میں لے آئے۔ سردار تھالوب اور اس کا قبائلی ساتھی دوسرے قبائلی کی لاش اٹھانے کے لیے چلے گئے جسے سب سے پہلے گولی لگی تھی۔ میں کچھ دیر برآمدے میں وانگ ڈن کی لاش کے قریب کھڑا رہا پھر کاٹیج کے دروازے میں داخل ہوگیا۔

ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ بائیں طرف دیوار کے قریب فرش پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اسے غالباً کسی تیز دھار آلے سے وار کرکے ہلاک کیا گیا تھا۔ سینے اور پیٹ پر زخموں کے کئی نشان تھے جن سے بہنے والا خون جم کر سیاہ رنگت اختیار کر چکا تھا۔ میں قریب پہنچ کر لاش کا جائزہ لینے لگا۔ وہ چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔

ایک نسوانی چیخ سن کر میں اچھل پڑا۔ چیخ کی یہ آواز دوسرے کمرے سے آئی تھی۔ میں مڑ کر تیزی سے اس طرف دوڑا۔ جانگی اور رنگولی بھی باہر سے دوڑتی ہوئی آرہی تھیں لیکن اس کمرے میں پہلے میں ہی داخل ہوا تھا۔

سونیا دروازے سے چند قدم اندر کی طرف کھڑی پھٹی پھٹی سی نظروں سے باتھ روم کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کی جگہ پر پہنچا تو باتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے میں بھی اچھل پڑا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

وہ ایک لڑکی کی لاش تھی۔ عمر چوبیس پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ زندگی میں یقیناً بہت حسین رہی ہوگی لیکن اب اس کا حسن خون کی طرح نچڑ چکا تھا۔ وہ نیم عریاں تھی۔ اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی تھا۔ سردار تھالوب کے جاسوس قبائلیوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے دارا اور چی فانگ وغیرہ کے ساتھ دو عورتوں کو دیکھا تھا۔ جن میں ایک کو تو میں نے دارا کے ساتھ موٹر بوٹ میں دیکھ لیا تھا اور دوسری یہ تھی جسے کسی وجہ سے بے دردی سے گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا تھا۔ ان لوگوں کا منصوبہ گولڈن ٹرائی اینگل جانے کا تھا اور ہوسکتا ہے اس لڑکی نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا ہو۔ بظاہر وہ لوگ یہاں اسے زندہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

میں دروازے کے سامنے سے ہٹا تو سونیا وغیرہ بھی قریب آچکی تھیں۔

"سونیا۔" میں اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "ہمارے ساتھ رہتے ہوئے دو چار دن میں تم کئی لاشیں دیکھ چکی ہو۔ سین تونگ کو تو تم نے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیا تھا نہایت بہیمانہ طریقے سے۔ یہاں ایسی کیا بات تھی کہ تم اس زور سے چیخی تھیں؟"

"یہ۔۔۔ یہ لی وانگ ہے۔" سونیا نے کپکپاتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"لی وانگ۔" میں چونک گیا "یہ کون تھی۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"لی وانگ ہائی اسکول تک میری کلاس فیلو تھی۔" سونیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "بہت غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے پاس اکثر فیس کی ادائیگی اور کتابیں خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ہم چند دوست اس کی مدد کرتے رہتے تھے۔ لی وانگ مجھ سے زیادہ اٹیچ تھی۔ وہ اکثر میرے گھر میں آتی رہتی تھی۔ اس کی زیادہ مدد بھی میں ہی کرتی تھی۔ بہت اچھی لڑکی تھی۔ ممی بھی اسے پسند کرتی تھیں۔ میں تو ذاتی طور پر اپنے جیب خرچ سے اس کی مدد کرتی ہی رہتی تھی، ممی بھی اسے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں خرید کر دیتی رہتی تھیں۔"

"اس کے ماں باپ نہیں تھے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تھے۔ بلکہ ماں تو اب بھی زندہ ہے۔ دو مہینے پہلے اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور باپ۔۔۔۔ ڈکیتی کی ایک واردات میں دو سال پہلے پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "اس کا باپ شرابی تھا۔ کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا۔ ماں مزدوری کرکے گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔ لی وانگ بھی حصولِ تعلیم کے ساتھ چھوٹے موٹے کام کرکے تھوڑی بہت رقم کما لیتی تھی لیکن ماں بیٹی کی ساری کمائی شرابی باپ چھین لیتا۔ شراب نوشی کے ساتھ اسے جوا کھیلنے کی بھی عادت تھی اور پھر ایک روز اسی شرابی باپ نے اپنی معصوم بیٹی کو بھی داؤ پر لگا دیا اور ہار گیا۔ ماں کو جب پتا چلا تو وہ چیخ اٹھی۔ لی وانگ کو جوئے کی بازی میں جیتنے والا جواری بہت بڑا بدمعاش تھا۔ وہ لی وانگ کو لینے کے لیے پہنچا تو ماں نے صاف انکار کردیا۔ وہ بدمعاش دھمکی دے کر چلا گیا کہ اگر کل تک لی وانگ کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا۔

"لی وانگ کی ماں اسے لے کر گھر سے بھاگ گئی۔ وہ تقریباً پندرہ دن تک چیانگ تھونگ میں اپنے ایک رشتے دار کے ہاں چھپی رہی لیکن بالآخر وہ بدمعاش وہاں بھی پہنچ گئے اور لی وانگ کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔

"چھ مہینے تک لی وانگ کا کچھ پتا نہیں چلا اور پھر جب وہ سامنے آئی تو پتا چلا کہ وہ کم از کم نصف درجن لوگوں کے ہاتھوں بک چکی ہے۔ اس دوران میں اس کا جو حشر ہوا ہوگا تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔

"لی وانگ کا باپ پہلے تو شراب کا نشہ اور جوئے کی لت

پوری کرنے کے لیے بیوی اور بیٹی کی کمائی چھین لیا کرتا تھا لیکن بیٹی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور بیوی بیمار پڑ گئی تھی۔ وہ اس کے کسی کام کی نہیں رہی تھی۔ لی وانگ کا باپ اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے چوریاں کرنے لگا۔ آخری مرتبہ اس نے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر ایک ہوٹل میں ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ ان تینوں کے پاس نقلی پستول تھے۔ وہ جیسے ہی واردات کر کے ہوٹل سے نکلے پولیس ان کے پیچھے لگ گئی اور وہ تینوں پولیس کے ہاتھوں مارے گئے۔

"لی وانگ سے میری آخری ملاقات تقریباً ایک سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں چیانگ رائے کے ایک دولت مند شخص کے پاس رہ رہی تھی اور وہاں سے ملنے یہاں آئی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اس راستے پر چل نکلی ہے جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں اور اب....."

سونیا بات کرتے کرتے رک گئی اور باتھ روم میں پڑی ہوئی لی وانگ کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "وہ اگرچہ غلط راستے پر چل نکلی تھی لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا یہ انجام ہو گا۔"

"برے کام کا انجام تو برا ہی ہوتا ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"لیکن اس میں لی وانگ کا کیا قصور تھا۔" سونیا بولی "وہ تو بہت اچھی لڑکی تھی۔ اسے تعلیم سے عشق تھا۔ اس کے باپ کے جرم کی سزا اسے کیوں ملی؟"

"یہی تو المیہ ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "مظلوم اور بے گناہ نجانے کب تک اس ستم کا شکار ہوتے رہیں گے۔"

برآمدے کی طرف سے قدموں اور باتوں کی آواز سن کر میں باہر آ گیا۔ سردار تھالوب اور قبائلی دوسری لاش لے آئے تھے اور اسے بھی برآمدے میں وانگ ژن کی لاش کے قریب رکھ دیا گیا تھا۔

میں اور تھالوب کاٹیج کے اطراف میں دور تک گھومتے رہے۔ ایک طرف ایسا راستہ تھا جہاں سے گاڑی آ سکتی تھی اور وہاں کچی زمین پر ٹائروں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے۔ جس سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ دارا وغیرہ کو کوئی گاڑی اس کاٹیج میں چھوڑ کر واپس چلی گئی تھی۔ ہم دونوں کاٹیج میں واپس آ گئے۔

"میں اسے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔" تھالوب نے اپنے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ لاشیں لے جانے کے لیے ہمیں گاڑی کی ضرورت پڑے گی۔ واپسی کے لیے ہمیں طویل چکر کاٹنا پڑے گا۔ دو ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے۔ تم لوگ....."

"ہماری فکر مت کرو تھالوب۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم جاؤ۔ یہاں اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر کوئی بات ہوئی بھی تو نمٹ لیں گے۔"

کچھ دیر بعد سردار تھالوب اور اس کا ساتھی چلے گئے۔ میں سونیا وغیرہ کے ساتھ درختوں کے نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔

لی وانگ کی تو شناخت ہو گئی تھی لیکن دوسرے آدمی کی لاش کو ہم میں سے کوئی بھی شناخت نہیں کر سکا تھا۔ اب ہمیں اس کے بارے میں زیادہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

میں نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا، نو بج رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے کبھی اندھیرا سا ہو جاتا اور کبھی تیز دھوپ چمکنے لگتی۔

بارہ بج گئے۔ تھالوب کو گئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ابھی واپسی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم لوگ رات ڈھائی بجے کے قریب اپنے کاٹیج سے روانہ ہوئے تھے تو کافی کا ایک ایک کپ پیا تھا اور اب سب کو بھوک لگ رہی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں۔ شاید کاٹیج میں کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔" جانگی کہتے ہوئے اٹھ کر اندر چلی گئی۔ رنگولی بھی اس کے پیچھے ہی تھی۔

سونیا میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں دو تین دنوں سے یہ بات خاص طور سے نوٹ کر رہا تھا کہ سونیا مجھ سے زیادہ اٹیچ ہو رہی تھی۔ اس کا زیادہ وقت میرے قریب رہ کر ہی گزرتا۔ اس کی وجہ میرے ذہن میں یہ آئی تھی کہ میں نے اس سے زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

چند منٹ بعد ہی رنگولی اور جانگی مہربند خوراک کے پانچ چھ ڈبے اٹھائے کاٹیج سے باہر آ گئیں۔

"کچن میں اتنی خوراک موجود ہے کہ ہم ایک ہفتے تک کھا سکتے ہیں۔" رنگولی نے ٹن گھاس پر رکھتے ہوئے کہا۔

ان تمام ڈبوں میں تلا ہوا چکن تھا۔ رنگولی کچن سے کانٹے بھی لے آئی تھی۔ اس نے ایک ایک ڈبا کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ یہ تلا ہوا مرغی کا گوشت بڑا لذیذ تھا۔ اگر گرم کر کے کھایا جاتا تو کچھ اور مزے کا ہوتا لیکن گرم کرنے کا خیال کسے تھا۔ بھوک سے جان نکل جا رہی تھی۔ ہم سب مزے لے لے کر مرغی کی روسٹڈ رانیں ادھیڑتے رہے۔

ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ دور دور تک سردار تھالوب کی مدد کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم نے جہاں جیپ چھوڑی تھی وہ جگہ یہاں سے کم از کم سات کلومیٹر ضرور رہی ہوں۔ پیدل وہاں تک جانا اور پھر طویل چکر کاٹ کر راستہ تلاش کر کے اس طرف آنا، اس میں اگرچہ خاصا وقت لگ سکتا تھا لیکن چار گھنٹے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات جنم لے رہے تھے۔ انہیں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا؟

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فضا میں "گرر گرر" کی ہلکی سی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔ جو اگرچہ کو بجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی لیکن لحہ بہ لحہ واضح ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے جانگی وغیرہ کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی اپنی رائفلیں لے کر درختوں کی آڑ میں چلی گئیں اور میں بھی اس ڈھلان پر آ گیا جس طرف سے کسی گاڑی کے آنے کی توقع ہو سکتی تھی۔ میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی پولیس یا کسی اور کی بھی ہو سکتی تھی لیکن میرے خدشات بے بنیاد نکلے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد سردار تھالوب کی جیپ سامنے آ گئی۔

کاٹیج بلندی پر تھا۔ جیپ عمودی ڈھلان کے نیچے ہی رک گئی اور سردار تھالوب اور دوسرا قبائلی جیپ سے اتر کر اوپر آنے لگے۔ میں بھی آڑ سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"میرا خیال تھا ہم جلدی واپس آ جائیں گے۔" سردار تھالوب نے میرے قریب پہنچتے ہوئے کہا "مگر یہ راستہ خاصا طویل ہے اور دشوار بھی۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے درختوں کے نیچے گھاس پر آ گئے۔ رنگولی نے فوراً ہی چکن کے دو ڈبے کھول کر ان کی طرف بڑھا دیے۔

"آپ لوگوں کو بھی یقیناً بھوک لگ رہی ہو گی۔" وہ بولی "یہ کھا لیں تو پھر چلیں۔"

"یہ کھانا کہاں سے مل گیا؟" تھالوب نے پوچھا۔

"کچن بھرا ہوا ہے۔" رنگولی نے جواب دیا "ان بدبختوں نے ہفتے بھر کا سامان جمع کر رکھا ہے۔"

سردار تھالوب اور قبائلی گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگے اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم لاشیں اٹھا کر جیپ کے پچھلے حصے میں رکھ رہے تھے۔ سونیا، لی وانگ کی لاش بھی اٹھوانا چاہتی تھی مگر تھالوب نے منع کر دیا۔

"ان دو لاشوں کو پولیس اٹھائے گی۔" وہ سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہاں جاتے ہی میں پولیس کو فون کر دوں گا۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ان لوگوں کے خلاف حکومت کے ہاتھ کچھ اور مضبوط ہوں گے۔ حکومت اپنی عوام کو بتا سکے گی کہ سازشی کس طرح قتل و غارت کرتے پھر رہے ہیں۔"

بات سونیا کی سمجھ میں آ گئی تھی اس لیے اس نے اصرار نہیں کیا۔

واپسی پر ہمیں ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ وانگ ژن اور قبائلی محافظ کی آخری رسومات بڑی خاموشی سے ادا کی گئیں اور انہیں کاٹیج کے عقب میں تقریباً دو سو گز دور دفن کر دیا گیا۔ اس وقت تھالوب بھی اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکا تھا۔

شام کے چھ بج رہے تھے۔ تھالوب صبح آنے کا وعدہ کر کے اپنے شہر والے بنگلے پر چلا گیا۔ میں کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دماغ اس وقت بری طرح چکرایا ہوا تھا۔ وہ لوگ تھائی کو گولڈن ٹرائی اینگل لے گئے تھے اور سردار تھالوب کے کہنے کے مطابق گولڈن ٹرائی اینگل موت کا حصار تھا اور کوئی اجنبی اس میں داخل نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب میری ممی اور ڈیڈی کو قتل کیا گیا تھا تو میں نے اس روز عہد کیا تھا کہ قاتلوں کا دنیا کے آخری کونے تک پیچھا کروں گا اور انہیں کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔ دارا اور اس کے دونوں ساتھی اگرچہ میری پہنچ سے دور نکل گئے تھے لیکن میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ ان کا پیچھا نہیں چھوڑنا اور پھر تھائی بھی ان کے قبضے میں تھی۔ تھائی کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ میں اپنی زندگی کے لیے اس کا ممنون تھا۔ برسوں پہلے اگر وہ مجھے اپنی کار میں نہ بٹھاتی اور مجھے پناہ نہ دیتی تو میں ان بھیڑیوں کے ہاتھوں اسی روز مارا گیا ہوتا۔ یہ تھائی ہی تھی جس نے مجھے ان سے بچایا تھا اور میری وجہ سے اس کا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگاتے ہوئے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا اور اب میں اسے ان درندوں کے رحم و کرم پر کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

صدیوں کا بیٹا
5 حصے (مکمل)
قیمت فی حصہ روپے
ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سونیا کمرے میں داخل ہو کر بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ میرے اور تھائی کے بارے میں جانکی اسے سب کچھ بتا چکی تھی۔ وہ میرے پاس بیٹھی ہمدردی کا اظہار کرتی رہی اور حقیقت یہ ہے کہ میری اس کی باتوں سے بڑی ڈھارس بندھی تھی۔

"میں آج رات تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔" سونیا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بالآخر اسے گھر کی یاد آ ہی گئی تھی۔

"مجھے غلط مت سمجھنا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "کچھ ضروری چیزیں ہیں جو میں گھر سے لینا چاہتی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا "اس وقت تو باہر نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔ رات نو بجے کے بعد چلیں گے۔"

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ جانکی اور رنگولی بھی آگئیں اور پھر باتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔

کھانا کھانے کے بعد رات نو بجے کے بجائے دس بجے کے قریب میں اور سونیا کاٹیج سے نکلے تو جانکی بڑی عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر ہم پیدل ہی ایک طرف چلتے رہے۔ سونیا کا مکان وہاں سے تقریباً پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ شہر میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ ہم ایسی سڑکوں پر چل رہے تھے جہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی وقت سامنے سے کوئی گاڑی آجاتی تو ہیڈ لیمپس کی روشنی سے بچنے کے لیے ہم رخ بدل لیتے کیونکہ یہ اندیشہ تھا کہ مجھے یا سونیا کو پہچان نہ لیا جائے۔ جس رات پہاڑی کاٹیج پر ہمارے حملے کے دوران میں سابق پولیس چیف اور سونیا کی ماں رنگ سنت ماری گئی تھی، اس کے بعد اکثر یہ باتیں سننے میں آتی رہی تھیں کہ رنگ سنت کی بیٹی سونیا پُراسرار طور پر غائب ہوگئی ہے۔

سڑکوں پر چکرانے کی وجہ سے فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس طرح ہم تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے۔ مکان کے سامنے کے رخ سے اندر داخل ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ گلی کے موڑ کے سامنے وہ کافی شاپ اور چھوٹا سا شراب خانہ تھا جہاں بیٹھ کر پہلی مرتبہ میں نے اس کاٹیج کی نگرانی کی تھی۔ وہ کافی شاپ اور شراب خانہ کھلا ہوا تھا اور سونیا نہیں چاہتی تھی کہ کوئی اسے اپنے کاٹیج میں چوروں کی طرح داخل ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ ہم ایک طویل چکر کاٹ کر پچھلی گلی میں آگئے۔

اس گلی میں سناٹا تھا۔ سونیا اپنے کاٹیج کے عقبی دروازے کے قریب رک گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے اس دیوار پر چڑھنے میں مدد دو۔"

میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر پیالہ سا بنالیا۔ سونیا میرے ہاتھوں پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ گئی اور پھر دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف کودنے میں اسے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ صحن میں کودنے کے بعد اس نے عقبی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بڑی آہستگی سے بند کردیا۔

کاٹیج مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سونیا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دبے قدموں ایک طرف چلنے لگی۔ کاٹیج کے دائیں طرف ایک گلیارہ سا تھا جس سے سامنے والے رخ تک پہنچا جاسکتا تھا۔ وہ ایک جگہ رک گئی اور تاریکی میں دیوار کو ٹٹولنے لگی پھر چھن کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ کوئی چیز نیچے پختہ فرش پر گری تھی۔

وہ چابیوں کا گچھا تھا۔ سونیا نے جھک کر فرش ٹٹولتے ہوئے چابیوں کا وہ گچھا اٹھالیا اور سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"چابیوں کا ایک سیٹ اس دیوار کے ایک طاقچے میں چھپا کر رکھا رہتا ہے تاکہ مجھ سے یا ممی سے اپنی چابیاں کہیں کھو جائیں تو ان چابیوں سے کام لیا جاسکے۔"

ہم پھر کاٹیج کی عقبی سمت میں آگئے۔ سونیا برآمدے والے دروازے سے داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس نے ٹٹول کر ایک چابی منتخب کی اور عقبی دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند بھی کردیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف چلنے لگی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

ایک کمرے میں داخل ہو کر سونیا نے دروازہ بند کردیا اور دروازے کے قریب ہی دیوار ٹٹولتے ہوئے ایک سوئچ آن کردیا۔ کمرے میں نائٹ بلب کی ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی۔ اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ تیز روشنی کا بلب جلایا جاتا تو کھڑکی کے سامنے پردہ کھنچا ہونے کے باوجود روشنی باہر سے دیکھی جاسکتی تھی۔ اسے یقیناً یہ اندازہ تھا کہ کون سا سوئچ دبانے سے کون سا بلب جلے گا۔ کمرے کی کھڑکی کشادہ برآمدے کی طرف کھلتی تھی۔ پردہ ایک طرف سے چند انچ کے قریب ہٹا ہوا تھا۔ سونیا نے جلدی سے آگے بڑھ کر پردہ برابر کردیا۔

میں کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ بیڈ روم تھا۔ سونیا

آگے بڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کی تلاشی لینے لگی لیکن ابتدا میں مطلوبہ چیز نہیں مل سکی تھی۔ بالآخر اس نے ایک پرس سے ایک چابی نکال لی اور دائیں طرف دیوار کے ساتھ کھڑی سفید الماری کھولنے لگی۔

الماری میں کپڑے اور مختلف چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ کپڑے اٹھا اٹھا کر کچھ تلاش کرتی رہی اور بالآخر سب سے نچلے خانے میں مطلوبہ چیز مل گئی۔ وہ براؤن جلد والی ایک ڈائری تھی۔

"یہ ممی کی ڈائری ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی "ممی باقاعدگی سے ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ اس ڈائری سے پتا چل جائے گا کہ ممی کو اس سازش میں ملوث کیا گیا تھا۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں اپنے کمرے سے کچھ کپڑے لینا چاہتی ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

اپنے بیڈ روم میں آکر اس نے نائٹ بلب جلا دیا۔ اس کمرے کی کھڑکی سامنے یا عقبی رخ پر نہیں بلکہ سائڈ میں گلیارے کی طرف تھی۔ پردہ ہٹا ہوا تھا لیکن سونیا نے اسے برابر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چند لمحے نائٹ بلب کی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر آگے بڑھ کر الماری کے اوپر رکھا ہوا بیگ اتار کر بیڈ پر رکھ دیا۔ ماں کی ڈائری میرے حوالے کردی اور الماری کھول کر اس میں سے کپڑے نکال نکال کر بیڈ پر پھینکنے لگی۔

"ہیلو.....!"

دروازے کی طرف سے یہ آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے اور پھر مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دروازے میں ایک پولیس والا کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کا رخ ہماری طرف تھا۔ نیلگوں روشنی کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ غالباً وہ بھی ہمارے چہروں کو صاف طور پر نہیں دیکھ پارہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہمیں ریوالور کی زد پر لیے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے دیوار ٹٹول کر ایک سوئچ دبا دیا۔ چٹ کی ہلکی سی آواز سے کمرے میں روشنی بھر گئی۔ ایک دم تیز روشنی سے لمحے بھر کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

"اوہ..... مس سونیا تم؟" پولیس والے کے لہجے میں حیرت تھی "میں تو سمجھا تھا شاید چور ہوں گے جنہیں آج میں نے رنگے ہاتھوں پکڑ ہی لیا۔ یہ چور کئی دن سے کوئی واردات کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ہی ہو گے۔ آج بہرحال دھر لیے گئے لیکن اپنے ہی گھر میں چوروں کی طرح گھسنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میں تو آج پہلی مرتبہ یہاں آئی ہوں آفیسر۔" سونیا نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "چوروں کی طرح کیوں۔ میرے پاس چابیاں موجود ہیں۔ یہ میرا گھر ہے مجھے چوروں کی طرح اندر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مگر سامنے والے دروازے پر تو تالا لگا ہوا تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے کھولا ہے۔" کانسٹیبل نے جواب دیا "کچھ دیر پہلے برآمدے کی ایک کھڑکی میں مجھے ایک طرف نیلی روشنی نظر آئی تھی لیکن پھر شاید پردہ برابر کردیا گیا تھا لیکن چند منٹ پہلے پہلو کی کھڑکی سے بھی ہلکی روشنی نظر آئی تو میں سمجھ گیا کہ یہ وہی چور ہوں گے جو یہاں کوئی واردات کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس لیے میں بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر اندر آگیا۔"

"تم نے کمرے میں روشنی کہاں سے دیکھی اور تمہارے پاس چابیاں کہاں سے آئیں؟" سونیا نے پوچھا۔

"میں کافی شاپ میں بیٹھا ہوا تھا۔" کانسٹیبل نے جواب دیا "بات دراصل یہ ہے کہ چوروں کو جب معلوم ہوجائے کہ کسی مکان کے مکین کہیں گئے ہوئے ہیں تو وہ اس گھر کا صفایا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں اور یہاں کے بارے میں تو سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ رنگ سنت قتل ہوچکی ہے اور اس کی بیٹی لاپتا ہے جسے پولیس بھی تلاش کررہی ہے اس لیے پچھلے دو تین دن سے یہاں واردات کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ رات کو اس مکان کی نگرانی پر میری ڈیوٹی ہوتی ہے اور مجھے مکان کی چابیاں بھی دے دی گئیں تاکہ اگر کوئی پچھلے دروازے سے اندر گھسے تو میں سامنے سے اندر داخل ہو کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کی کوشش کروں۔"

"بائی دا وے پولیس کو میری تلاش کیوں ہے آفیسر؟" سونیا نے پوچھا۔

"پولیس کے نئے چیف کا خیال ہے کہ اپنی ماں کی طرح تم بھی باغیوں سے ملی ہوئی ہو اور سازش کا راز فاش ہوجانے کے بعد پکڑے جانے کے خوف سے روپوش ہوگئی ہو۔ پولیس چیف تم سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اسی سازش کے حوالے سے قتل و غارت اب بھی جاری ہے۔ پولیس چیف سب سے پہلے تو تم سے یہ معلوم کرنا چاہے گا کہ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں اور یہ....." اس نے ریوالور سے اشارہ کیا "پولیس کو معلوم ہوا ہے کہ ان سازشیوں میں کوئی انڈین یا پاکستانی بھی شامل ہے اور یہ غالباً وہی ہے۔"

"نہیں آفیسر" سونیا نے جواب دیا "میرا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی میری ماں غدار تھی۔ اسے پھنسایا گیا تھا۔ اگر میرا اس سازش سے کوئی تعلق ہوتا تو میں اس طرح بے دھڑک اپنے گھر میں نہ آتی اور یہ....."

میں نے سونیا کو آنکھ سے اشارہ کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

"ٹھیک ہے مس سونیا۔" کانسٹیبل بولا "یہ ساری باتیں تم نے پولیس چیف کو بتانا۔ وہ تم سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر اس کی نظریں بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون پر ٹک گئیں۔ یہ فون کا ایکس ٹینشن سیٹ تھا "چیف اس وقت گھر پر ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ سونے کی تیاری کر رہا ہو لیکن جب اسے پتا چلے گا کہ میں نے تمہیں یہاں روک رکھا ہے تو بہت خوش ہوگا اور سارے کام چھوڑ کر بھاگا آئے گا یہاں اور تم دونوں سنو۔ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بلا دریغ گولی مار دوں گا۔"

وہ محتاط انداز میں بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے دیدے سرچ لائٹ کی طرح گھوم رہے تھے۔ کبھی وہ میری طرف دیکھتا اور کبھی سونیا کی طرف۔ دیدوں کے ساتھ اس کے ریوالور کی نال بھی حرکت کر رہی تھی۔

بیڈ سائڈ ٹیبل تک پہنچنے کے لیے اسے میرے قریب سے گزرنا تھا۔ اس نے ریوالور کو حرکت دیتے ہوئے مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور کانسٹیبل نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا، میری ایک ٹانگ اور ڈائری والا ہاتھ بیک وقت حرکت میں آگیا۔

ڈائری اس کے ریوالور والے ہاتھ پر لگی اور میرے پیر کی ٹھوکر اس کی پنڈلی پر۔ ڈائری لگنے سے اس کی انگلی کو جھٹکا لگا اور ریوالور کا ٹریگر دب گیا۔ گولی الماری کے اوپر چھت کے قریب دیوار میں لگی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ پنڈلی پر میرے پیر کی ٹھوکر سے وہ چیخ اٹھا اور ایک پیر پر ناچنے لگا۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

میں نے ڈائری بیڈ پر پھینک دی اور کانسٹیبل پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی ریوالور والی کلائی پکڑ کر مروڑ دی۔ ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ ریوالور کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ گولی قالین پر لگی۔ میں نے اس کی کلائی مروڑتے ہوئے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ٹھوکر بھی لگا دی تھی۔ وہ بلبلاتا ہوا دہرا ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ میں نے گھٹنے کی ایک اور ٹھوکر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر لگائی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس مرتبہ وہ سیدھا ہو گیا تھا۔

"سونیا۔" میں چیخا "یہ ڈائری اٹھا لو اور جو چیزیں لینی ہیں بیگ میں ٹھونسو۔ جلدی کرو۔"

میں نے کانسٹیبل کو دبوچ کر قالین پر گرا لیا اور اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ دوسری طرف قالین پر پڑا ہوا ریوالور میری دسترس میں تھا۔ میں اگر چاہتا تو ریوالور اٹھا کر گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست کر دیتا لیکن میں کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچے ہوئے تھا پھر میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر ڈال دیا۔

شاید میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ انسانی جسم میں کم از کم چالیس ایسے پریشر پوائنٹس ہوتے ہیں جن پر ہلکی سی ضرب یا دباؤ بھی اسے بے بس کر دیتا ہے۔ اگر ضرب زوردار لگے تو اس کی زندگی کا چراغ گل بھی ہو سکتا ہے۔

میں کان کے پیچھے گردن پر اس کی ایک نس کو انگوٹھے سے مسل رہا تھا۔ تیس سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اگلے دس سیکنڈ میں وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔

میں نے کانسٹیبل کو چھوڑ کر سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ ڈائری بیگ میں رکھ چکی تھی اور کپڑے جلدی جلدی بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔

اس کاٹیج میں دو گولیاں چلی تھیں۔ کانسٹیبل مار کھا کر چیخا بھی تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ گولیوں کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک سنی گئی ہوں گی۔ اس سے پہلے وہ کانسٹیبل سامنے والے کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کئی روز سے یہاں رات کی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت باتونی اور ڈینگیں مارنے والا تھا۔ اس نے کافی ہاؤس والوں کو یقیناً یہ بتایا ہوگا کہ وہ اس کاٹیج کی نگرانی کر رہا ہے۔ کافی ہاؤس والوں میں سے کسی نے اسے کاٹیج میں آتے ہوئے بھی دیکھا ہوگا۔ گولیوں کی آواز سن کر اگر کسی نے پولیس اسٹیشن میں فون کر دیا ہو تو پولیس پہنچنے ہی والی ہوگی۔

میں نے سونیا کو اشارہ کیا۔ اس نے آخری کپڑا بیگ میں ٹھونس کر زپ بند کی اور بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف لپکی۔ میں نے بھی کمرے سے نکلتے ہوئے اپنی ہپ پاکٹ سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

ابھی ہم راہداری ہی میں تھے کہ دور کہیں سے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی اور پولیس حسب دستور بینڈ بجاتے ہوئے آرہی تھی۔

ہم عقبی دروازے کی طرف لپکے۔ ہال کمرے سے گزرتے ہوئے میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ کرسی الٹ گئی۔ میرے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی۔ میرے منہ سے کراہ سی خارج ہوئی اور میں لنگڑاتا ہوا سونیا کے پیچھے عقبی دروازے کی طرف لپکا۔

گلی میں نکل کر سونیا نے دروازے میں باہر سے بولٹ لگا دیا۔ ہم دونوں تیزی سے گلی میں ایک طرف چلنے لگے۔ تقریباً پچاس گز آگے جا کر ہم دوسری گلی میں مڑ گئے اور تقریباً اس وقت پولیس کی گاڑی غالباً سونیا کے مکان کے سامنے رکی تھی کیونکہ اس وقت سائرن بھی بند ہو گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ پولیس کو بنگلے میں داخل ہونے اور صورت حال کو سمجھنے میں پانچ سات منٹ ضرور لگیں گے اور اس دوران میں ہم زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتے تھے۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگا۔ سونیا نے بیگ گلے میں ڈال لیا تھا اور ایک ہاتھ سے اس کا اسٹریپ تھام رکھا تھا۔

ہم گلیوں سے نکل کر سڑک پر آگئے اور اسی وقت ہم ایک گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں نہا گئے۔ بائیں طرف سے آنے والی اس گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ہم مڑ کر تیزی سے دوڑنے لگے۔ میرے خیال میں وہ پولیس کی گاڑی تھی۔ ہم چند قدم سے زیادہ دور نہیں جا سکے تھے۔ وہ گاڑی بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب رکی۔ ہم دونوں ہیڈ لیمپس کی روشنی کی زد میں تھے۔ تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

سونیا کے کاٹیج سے نکل کر گلی میں آتے ہی میں نے پستول جینز کی ہپ پاکٹ میں رکھ لیا تھا اور اب ہم جس نوع کی صورت حال سے دوچار تھے، اس میں پستول کا استعمال خطرناک ہو سکتا تھا۔ میری ایک گولی کے جواب میں کسی آٹو میٹک رائفل کا پورا برسٹ ہمارے جسموں کو چھلنی کر سکتا تھا لیکن اس کے باوجود میرا ایک ہاتھ غیر محسوس انداز میں مڑ کر ہپ پاکٹ کی طرف جا رہا تھا۔

نجانے کیا بات تھی کہ میرے ذہن کے کسی عمیق ترین گوشے میں یہ خیال سر ابھارنے کی کوشش کر رہا تھا کہ صورت حال وہ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ مجھے جلد بازی کا مظاہرہ کر کے کوئی غلط قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

"آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ گاڑی میں بیٹھو۔ جلدی کرو۔"

یہ آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ ہپ پاکٹ کی طرف جاتا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ صورت حال واقعی وہ نہیں تھی جو میں سمجھ رہا تھا۔ یہ پولیس کی گاڑی نہیں تھی۔ پولیس کی گاڑی کی چھت پر تو فلیشر ہوتے ہیں لیکن اس گاڑی کی چھت پر فلیشر نہیں تھے اور یہ آواز بھی کسی پولیس والے کی نہیں، سردار تھالوب کی تھی۔

اسی وقت پولیس سائرن کی آواز سنائی دی اور میں جیسے ہوش میں آگیا۔ پیچھے بہت دور پولیس کی گاڑی سائڈ اسٹریٹ سے نکل کر مین روڈ پر آرہی تھی۔ اس گاڑی پر نیلی اور سرخ روشنی کے فلیشر دور ہی سے نظر آرہے تھے۔

"گاڑی میں بیٹھو۔ سوچ کیا رہے ہو۔ جلدی کرو۔"

سردار تھالوب کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ سونیا کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں تیزی سے کار کے پچھلے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر پہلے سونیا کو اندر دھکیلا پھر خود اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ پولیس کی گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ سردار تھالوب نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے دو تین پش بٹن دبا دیے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے تو پہلے ہی بند تھے لیکن اب سیاہ رنگ کی اسکرینز بھی اوپر آگئی تھیں۔ ایسی ہی ایک اسکرین سے پچھلی ونڈ اسکرین بھی تاریک ہو گئی تھی۔

سردار تھالوب نے کار کچھ آگے جا کر بائیں طرف ایک اور سڑک پر موڑ دی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس کے چند ہی سیکنڈ بعد پولیس کی گاڑی بھی تیزی سے اس طرف مڑی اور نہایت تیز رفتاری سے ہماری کار سے آگے نکل کر بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ سڑک کے بیچ میں رک گئی۔ سردار تھالوب نے بھی پھرتی سے بریک لگا دیا۔ کار پولیس کی گاڑی سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ اس دوران میں پولیس وین سے تین مسلح پولیس والے اتر چکے تھے۔ ان میں ایک انسپکٹر بھی تھا۔ جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جبکہ دونوں کانسٹیبلوں نے ہماری کار کی طرف رائفلیں تان لی تھیں۔

سردار تھالوب نے بٹن دبا کر اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔

"کیا بات ہے انسپکٹر۔" وہ کار کے سامنے کھڑے ہوئے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بارعب لہجے میں بولا "اس طرح میرا تعاقب کرنے اور کار روکنے کا کیا مطلب؟"

انسپکٹر سامنے سے ہٹ کر کار کی ڈرائیونگ سائڈ پر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور ایکشن کے لیے تیار تھا مگر سردار تھالوب کی صورت دیکھتے ہی وہ ایک دم سیدھا ہو گیا۔

"سردار تھالوب۔۔۔" اس کے منہ سے نکلا "سوری سردار۔۔۔"

"قصہ کیا ہے؟" سردار تھالوب نے پوچھا۔

"ڈاکو ایک کالج میں گھس گئے تھے۔ ہمارے ایک کانسٹیبل نے مداخلت کر کے پکڑنا چاہا تو وہ اسے بے ہوش کر کے فرار ہو گئے۔ ہم انہی کو تلاش کر رہے ہیں۔" انسپکٹر نے بتایا۔

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟ کیا تمہارے خیال میں وہ ابھی اس علاقے میں موجود ہوں گے؟" تھالوب نے کہا۔

"صرف چند منٹ پہلے کی بات ہے سردار۔ وہ لوگ ابھی اس علاقے سے باہر نہیں جا سکے ہوں گے۔ سوری سردار۔ آپ کو زحمت ہوئی۔" انسپکٹر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں انسپکٹر۔ انہیں تلاش کرو۔" سردار تھالوب نے کہتے ہوئے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

انسپکٹر اور دونوں کانسٹیبل دوڑ کر وین میں بیٹھ گئے اور وین مڑ کر تیزی سے واپس چلی گئی۔ سردار تھالوب نے بھی گاڑی آگے بڑھا دی۔ تھالوب سے باتیں کرتے ہوئے انسپکٹر نے کار کے اندر جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ وہ اگر جھانک لیتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔ مجھے تو وہ نہیں جانتا ہو گا لیکن سونیا کو پہچان لیتا کہ وہ رنگ سنت کی بیٹی ہے۔ فی الوقت تو وہ سونیا کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا لیکن بعد میں جب وہ کانسٹیبل ہوش میں آ کر سونیا کے بارے میں بتاتا تو انسپکٹر کو یقیناً سردار تھالوب پر بھی شبہ ہوتا۔

کار ایک اور سڑک پر مڑ گئی تھی۔ سردار تھالوب نے ابھی تک کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے ہی زبان کھولنی پڑی۔

"تم اس وقت اس طرف کیسے آ گئے تھے؟" میں نے اپنی سیٹ پر آگے جھکتے ہوئے سردار تھالوب کو مخاطب کیا "یہ محض اتفاق تھا یا۔۔۔"

"یہ اتفاق نہیں ہے۔" سردار تھالوب نے میری بات کاٹ دی "کچھ دیر پہلے میں نے کاٹیج فون کیا تھا۔ رنگولی نے بتایا کہ تم سونیا کے ساتھ اس کے کالج کی طرف گئے ہوئے ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ رنگ سنت کے کالج کی نگرانی ہو رہی ہے۔ یہ سوچ کر کہ تم لوگ کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ' میں نے اس طرف دوڑ لگا دی اور جب میں اس طرف پہنچا تو کالج کے سامنے پولیس کی وین دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا لیکن مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ کالج میں داخل ہونے والے ڈاکو فرار ہو گئے ہیں۔ میں نے فوراً ہی گلیوں اور سڑکوں پر تم لوگوں کی تلاش شروع کر دی اور بروقت تم تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر مجھ سے پہلے وہ پولیس وین تم لوگوں تک پہنچ جاتی تو معاملہ گمبھیر ہو سکتا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم سے یہ حماقت کیسے سرزد ہوئی؟"

"میں اسے واقعی حماقت ہی کہوں گا۔" میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا "رنگ سنت ایک بڑی سازش میں ملوث تھی۔ مجھے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ اس کے کالج کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔"

"اور شہر میں یہ افواہیں بھی گردش کر رہی ہیں کہ رنگ سنت کی بیٹی سونیا بھی اس سازش میں شریک تھی جو پکڑے جانے کے خوف سے روپوش ہو چکی ہے۔ ایسی باتیں تم نے بھی سنی تھیں۔ اگر سونیا کالج میں پکڑی جاتی تو گڑبڑ ہو سکتی تھی۔" سردار تھالوب نے کہا۔

"لیکن ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ سونیا اس سازش میں شریک نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"ثابت تو بعد میں کیا جاتا لیکن اس وقت تک پولیس سونیا کا جو حشر کر چکی ہوتی تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔" سردار تھالوب نے کہا "اس کانسٹیبل نے سونیا کو پہچان لیا تھا جسے بعد میں تم لوگوں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ بتائے گا کہ چوروں کی طرح کالج میں داخل ہونے والی سونیا تھی تو اس پر کیے جانے والے شبے کو تقویت ملے گی۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" میں نے سر ہلایا "لیکن حالات ہمیشہ تو ایسے نہیں رہیں گے۔ یہ حقیقت تو سامنے آ ہی جائے گی کہ سونیا بے گناہ ہے۔"

"اب یہی تو دیکھنا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔" سردار تھالوب نے کہا۔

کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی کاٹیج والی سڑک پر آ گئی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بجنے والے تھے۔ سردار تھالوب ہمیں چھوڑ کر فوراً ہی واپس چلا گیا تھا۔

سونیا راستے بھر خاموش رہی تھی۔ کاٹیج میں آنے کے بعد بھی تھالوب کی موجودگی میں اس نے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کے چہرے سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے سردار کی ڈانٹ کا خاصا اثر لیا تھا۔

"تمہیں شاید تھالوب کی باتیں بری لگی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" سونیا نے جواب دیا "سردار نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ہمیں ایسی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو بات سردار پر آ جاتی۔"

"آئندہ ہم احتیاط کریں گے۔" میں نے کہا "غلطی میری تھی۔ مجھے ہی سوچنا چاہیے تھا کہ اس طرف جانا مناسب ہو گا یا نہیں۔ بہرحال' بھول جاؤ اب اس بات کو۔" میں نے کہتے ہوئے ہلکے سے اس کا گال تھپتھپا دیا۔

سونیا نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر وہ بیگ اٹھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جانکی سامنے والے صوفے پر بیٹھی مجھے گھور رہی تھی۔ سونیا کا گال تھپتھپانا شاید اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

"بڑے مہربان ہو رہے ہو اس پر؟" جانکی کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"سونیا اچھی لڑکی ہے۔ معصوم اور۔۔۔"

"وہ یقیناً اچھی لڑکی ہے۔" جانکی نے میری بات کاٹ دی "مجھ سے زیادہ حسین اور جوان ہے اور اس کی معصومیت۔۔۔ میں دو چار دن سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ ہروقت تمہارے ساتھ چپکی رہتی ہے۔"

"غلط مت سمجھو جانکی۔" میں نے اسے گھورا "تم جانتی ہو چند روز پہلے ہی اس کی ماں کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اس پر غداری کا الزام تھا جبکہ سونیا محب وطن لڑکی ہے۔ وہ اپنی ماں کی پیشانی سے غداری کا داغ مٹانا چاہتی ہے اور وہ سین فونگ جیسے شخص کو بے رحمی سے قتل کر چکی ہے۔ اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ تم سب لوگ اس سے اپنائیت اور ہمدردی کا اظہار کر رہے ہو لیکن اس کا جھکاؤ اگر میری طرف زیادہ ہے تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے۔ تم بلاوجہ اس پر شبہ کر رہی ہو جبکہ میرے بارے میں بھی تم اچھی طرح جانتی ہو۔"

"ہاں جانتی ہوں۔" جانکی نے گہرا سانس لیا "لیکن نجانے مجھے یہ ڈر کیوں ہے کہ یہ لڑکی پتھر میں جونک لگانے میں کامیاب ہو جائے گی۔"

"وہم ہے تمہارا۔" میں نے کہا "ڈیڑھ بجنے والا ہے۔ جاؤ اب جا کر سو جاؤ۔"

"اور تم۔۔۔؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں یہیں صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

جانکی مجھے گھورتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ میں صوفے کے کشن کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ میرا دھیان ایک بار پھر تھائی کی طرف چلا گیا۔ وہ نجانے کس حال میں ہو گی اور اس پر کیا ظلم ہو رہا ہو گا۔

تین بجے کے قریب جب مجھ پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی تو اپنے قریب آہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں اور پھر سونیا کو قریب کھڑے دیکھ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے۔ نیند نہیں آ رہی کیا؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ۔۔۔ یہ دیکھو۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی "میں کہتی تھی نا کہ میری ماں بے گناہ ہے۔ وہ اپنی خوشی سے ملک کے خلاف کسی سازش میں شریک نہیں ہوئی ہو گی۔ لو۔ یہ دیکھو۔۔۔ ممی نے اس میں سب کچھ لکھا ہے۔ پڑھ لو اس ڈائری کو۔" وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور ڈائری میرے ہاتھ میں تھما دی۔

میں اس ڈائری کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ سونیا نے میرے ہاتھوں میں ڈائری کھول دی اور اوراق پلٹتے ہوئے ایک جگہ رک گئی اور انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"اسے پڑھو۔ یہ میری ممی کی تحریر ہے۔ اس سے تمہیں پتا چل جائے گا کہ ممی کو کس طرح پھنسایا گیا تھا۔"

مجھے تھائی زبان کے ہندسوں کی تو شناخت تھی لیکن کوئی تحریر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس صفحے پر چھ مہینے پہلے کی تاریخ درج تھی۔

"سونیا۔" میں نے کہا "یہ تحریر تھائی زبان میں ہے اور میں تھائی زبان نہیں پڑھ سکتا۔"

سونیا نے چونک کر میری طرف دیکھا "میں پڑھ کر سناتی ہوں۔" اس نے کہا اور وہ ڈائری میرے ہاتھ سے لے کر وہ تحریر پڑھنے لگی۔

وہ تحریر واقعی چونکا دینے والی تھی۔ رنگ سنت کی اس تحریر کے مطابق چھ مہینے پہلے پولیس چیف نے اسے اعتماد میں لے کر شہنشاہ کے خلاف ہونے والی سازش کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور اسے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ اس سازش میں شریک لوگ بہت طاقت ور ہیں۔ درحقیقت شہنشاہ کے خلاف اس سازش کے تانے بانے کئی برسوں سے بُنے جا رہے تھے اور ان دنوں گولڈن ٹرائی اینگل کے جنرل کھوراٹ سے رابطے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ تاکہ اسے بھی اس سازش میں شریک کر لیا جائے۔ جنرل کھوراٹ کو سازش میں شریک کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر سازش

ناکام ہوجائے تو سازشی گولڈن ٹرائی اینگل میں پناہ حاصل کرسکیں اور وہاں سے شہنشاہ کے خلاف ایک باقاعدہ تحریک شروع کردی جائے۔

پولیس چیف نے رنگ سنت کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے ان لوگوں کے لیے کام نہ کیا تو نہ صرف اس کی بیٹی کو اغوا کرکے گولڈن ٹرائی اینگل پہنچا دیا جائے گا بلکہ خود اسے بھی قتل کردیا جائے گا۔ دوسری طرف سازش کی کامیابی کی صورت میں اسے ایک بڑے عہدے کا لالچ دیا گیا تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہورہی تھی۔ کوئی بھی شریف آدمی خوشی سے کسی برائی کی طرف مائل نہیں ہوتا بلکہ اسے مجبور کیا جاتا ہے۔ بلیک میل کیا جاتا ہے۔ رنگ سنت کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ اپنی خوشی سے سازش میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ اسے مجبور کیا گیا تھا۔

سونیا ڈائری کے اگلے صفحات پڑھتی رہی۔ اس سازش کے حوالے سے مختلف تاریخوں میں اندراجات تھے اور کچھ ایسے نام بھی تھے جو حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔

ڈائری میں کالج میں ہونے والی خفیہ میٹنگ سے ایک روز پہلے تک کی یادداشتیں درج تھیں۔ آخری صفحے پر اس میٹنگ میں شریک ہونے والوں کے نام اور رنگ سنت کی ذمے داریاں بھی درج تھیں۔

"میں نہ کہتی تھی کہ میری ماں بے گناہ ہے۔" وہ ڈائری بند کرتے ہوئے بولی "یہ ڈائری میری ماں کی بے گناہی کا ثبوت ہے۔"

"اور میرا خیال ہے تم یہ ڈائری لینے کے لیے ہی اپنے کالج گئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" سونیا نے کہا "مجھے معلوم تھا میری ممی باقاعدگی سے ڈائری لکھتی ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس سازش کے بارے میں بھی اس نے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہوگا۔ اب میں مطمئن ہوں۔ میری ماں غدار نہیں تھی۔ اسے غداری کے لیے مجبور کیا گیا تھا اور اب تو ان لوگوں سے میری نفرت کئی گنا بڑھ گئی ہے جو میری ماں کی موت کے ذمے دار ہیں۔ وہ لوگ گولڈن ٹرائی اینگل تو کیا جہنم میں بھی پناہ حاصل کرلیں تو میں ان کا پیچھا نہیں چھوڑوں گی۔ مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک ان کی بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو نہ ڈال دوں۔"

میں بڑی گہری نظروں سے سونیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ محسوس کرکے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہ جانکی تھی جو بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی اس طرف آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس وقت سونیا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے میرے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کر جانکی ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور گہری ہوگئی۔

"تو یہ بات ہے۔" وہ باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے اردو میں بولی "اس لیے تم یہاں لیٹنے پر بضد تھے۔ اگر پہلے سے کوئی پروگرام طے تھا تو کمرے میں چلے جاتے۔ میں یہاں صوفے پر سوجاتی۔"

"جانکی!" میرے حلق سے غراہٹ سی نکلی "کوئی بات کرنے سے پہلے تمہیں سوچنا چاہیے کہ کیا کہہ رہی ہو۔ یہ یہ دیکھ رہی ہو۔" میں نے سونیا کے ہاتھ سے ڈائری جھپٹ کر جانکی کو دکھائی "یہ اس کی ماں کی ڈائری ہے جس کے لیے یہ آج اپنے کالج گئی تھی۔ اسے شروع سے ہی یقین تھا کہ اس کی ماں بے گناہ ہے۔ اسے سازش میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔ پہلے یہ اپنے کمرے میں بیٹھی خود یہ ڈائری پڑھتی رہی اور پھر میرے پاس آگئی۔ یہ مجھے ڈائری میں لکھی ہوئی اپنی ماں کی یادداشتیں سنا رہی تھی۔ اور تم..... تمہارے دماغ میں صرف ایک ہی بات گھسی ہوئی ہے۔ نجانے تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟"

میرے تیور دیکھ کر جانکی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"سوری وجدان۔" وہ آگے بڑھ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی "میں خود نہیں سمجھ پائی کہ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں۔ بہرحال کیا ہے اس ڈائری میں؟"

"لو۔ خود ہی پڑھ لو۔" میں نے ڈائری اس کی طرف بڑھا دی۔

سونیا اگرچہ اردو نہیں سمجھتی تھی لیکن ہمارے لب ولہجے اور چہروں کے تاثرات سے وہ سمجھ گئی تھی کہ ہمارے درمیان تلخ کلامی اسی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ سرک کر مجھ سے کچھ دور ہٹ گئی۔

جانکی ڈائری کے وہ صفحات پڑھ رہی تھی جو میں نے کھول کر اس کے سامنے کیے تھے۔ تقریباً دس منٹ بعد کچھ اقتباسات پڑھنے کے بعد اس نے ڈائری بند کردی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ڈائری پڑھنے کے بعد تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ صورتِ حال وہ نہیں جو ہم یا دوسرے لوگ سمجھتے ہیں۔ ایسی دھمکیاں دے کر تو کسی سے کوئی بھی کام کروایا جاسکتا ہے۔ بہرحال اب کیا ارادہ ہے؟"

"یہ ڈائری میں صبح تھالوب کے حوالے کردوں گا اور مہاراج سے بھی اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تاکہ تحقیقات کرنے کے بعد رنگ سنت کے بارے میں صحیح فیصلہ کیا جاسکے۔ اس ڈائری میں کچھ ایسے نام بھی ہیں جن سے رنگ سنت کی اس تحریر کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ ویسے میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں کہ اس قسم کی دھمکیاں دے کر کسی سے کوئی بھی کام کروایا جاسکتا ہے۔ بہرحال، مجھے بڑے زور کی نیند آرہی ہے۔ تم سونیا کو ساتھ لے کر اس کے کمرے میں چلی جاؤ۔ اسے اس وقت ہماری ہمدردیوں کی ضرورت ہے۔ میں اپنے کمرے میں جاکر سو رہا ہوں۔" میں کہتے ہوئے اٹھ گیا اور وہ ڈائری بھی جانکی کے ہاتھ سے لے لی۔

اپنے کمرے میں آکر ڈائری میں نے تکیے کے نیچے رکھ لی اور اس نئی صورتِ حال کے بارے میں سوچتا ہوا لیٹ گیا۔ میں زیادہ دیر تک آنکھیں کھلی نہیں رکھ سکا۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

سردار تھالوب صبح نو بجے ہی پہنچ گیا تھا۔ مجھے بھی جگا دیا گیا۔ نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے میری آنکھوں میں شدید جلن ہورہی تھی۔ دماغ میں بھی غبار سا بھرا ہوا تھا۔ تاہم ٹھنڈے پانی سے غسل کرکے میں اپنے آپ کو قدرے بہتر محسوس کرنے لگا۔

ناشتے میں سردار تھالوب بھی میرے ساتھ شریک تھا۔ میں نے رنگ سنت کی ڈائری کی بات چھیڑ دی۔ وہ بڑی توجہ سے میری باتیں سنتا رہا۔ میں نے وہ ڈائری بھی اپنے کمرے سے لاکر اس کے سامنے رکھ دی تھی۔ میری بات ختم ہوئی تو وہ ڈائری کھول کر کہیں کہیں سے رنگ سنت کی تحریر پڑھنے لگا۔

"کیا چاہتے ہو؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس ڈائری کا کیا کیا جائے؟"

"میں جانکی کے ساتھ آج ہی کسی نہ کسی طرح گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ میں مہاراج سے بھی فون پر بات کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد تم یہ ڈائری کسی ایسے ذمے دار شخص کے حوالے کردو جو اسے رتنا کوسن یا حکومت کی کسی اور ذمے دار شخصیت تک بحفاظت پہنچا سکے۔ اگر تحقیقات سے ثابت ہوجائے کہ رنگ سنت کی یہ تحریر درست ہے اور وہ واقعی بے گناہ تھی تو مجھے خوشی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔" تھالوب بولا "جس طرح ہم نے رنگ سنت کی بیٹی کو اپنے قبضے میں لے کر اس سے کالج میں ہونے والی خفیہ میٹنگ کا پروگرام اور دوسری بہت سی باتیں معلوم کرلی تھیں اسی طرح رنگ سنت کو دھمکی دے کر کام کرنے کے لیے مجبور کردیا گیا ہوگا۔ بہرحال اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں کروں گا لیکن..... کیا تمہارے لیے گولڈن ٹرائی اینگل جانا ضروری ہے؟" اس نے خاموش ہو کر میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"بات یہ ہے سردار تھالوب۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے اپنے ماں باپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا ہے۔ میں وہ منظر کس طرح بھول سکتا ہوں جب میری ماں کو خنجروں کے پے در پے وار کرکے نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور میرے باپ کا پیٹ اور سینہ چاک کردیا گیا تھا۔ ان کی چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہیں تو میری روح تک کانپ اٹھتی ہے اور پھر چاچا پرتاب سنگھ۔ اسے بھی میری نظروں کے سامنے گولیوں سے چھلنی کردیا گیا۔ اس نے اپنی جان دے کر مجھے بچالیا۔

"بات اگرچہ پرانی ہوچکی ہے لیکن سینے میں انتقام کا لاوا پک رہا ہو تو کوئی بھی بات پرانی نہیں ہوتی۔ میری روح پر لگائے جانے والے برسوں پرانے یہ زخم آج بھی ہرے ہیں اور یہ گھاؤ اس وقت تک مندمل نہیں ہوں گے جب تک میرے اندر کا آتش فشاں پھٹ کر ان لوگوں کو بھسم نہیں کر ڈالے گا۔" میں خاموش ہوگیا۔ تھالوب میرے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے بات جاری رکھی "تم اندازہ لگا چکے ہو کہ وہ کتنے سفاک اور بے رحم ہیں۔ کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ کیا ایسے لوگوں کو معاف کیا جاسکتا ہے؟"

"میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔" سردار تھالوب نے کہا "ایسے لوگوں کو معاف کردینا واقعی انسانیت پر ظلم ہوگا لیکن گولڈن ٹرائی اینگل....."

"میں اُن کے پیچھے جہنم تک جانے کو تیار ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔

"میری تم سے صرف ایک درخواست ہے سردار۔ رنگ سنت کے بارے میں تحقیقات کروانا اور سونیا کا خیال رکھنا۔ اسے اپنی سرپرستی میں لے لینا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے صحیح راستہ مل جائے تو....."

"میرا راستہ صرف اور صرف گولڈن ٹرائی اینگل کی

طرف جاتا ہے۔"

اپنے عقب میں سونیا کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔

"ماسٹر۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "یہ الفاظ تو میں نے کہے تھے کہ میں اپنی ماں کے قاتلوں کی تلاش میں گولڈن ٹرائی اینگل تو کیا جہنم تک جانے کو تیار ہوں اور میں نے اپنا فیصلہ بدلا نہیں ہے۔ وارا وغیرہ صرف تمہارے ماں باپ اور میری ماں ہی کے قاتل نہیں ہیں۔ وہ صرف ہمارے نہیں انسانیت کے بھی مجرم ہیں اور میں نے انہیں عبرت ناک سزا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے تو میں اکیلی ہی اس جہنم میں کود پڑوں گی۔"

میں اور سردار تھالوب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"آؤ۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔" سردار تھالوب نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

سونیا کرسی پر بیٹھ گئی تو لوما نے فوراً ہی اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔

سردار تھالوب اور میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سونیا کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ اسی دوران میں رنگولی اور جانگی بھی آگئی تھیں۔ وہ بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی رہیں مگر سونیا پر کسی کی بات کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی بس ایک ہی ضد تھی کہ ہمارے ساتھ جائے گی۔

"ٹھیک ہے۔" بالآخر میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اگر تمہیں کچھ ہوگیا تو مجھے افسوس ہوگا۔" میں سردار تھالوب کی طرف متوجہ ہوگیا "ہمارے جانے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر بعد ہم چلتے ہیں۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "اس علاقے کا جائزہ لے کر تم خود ہی فیصلہ کرلینا کہ کیا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔"

اور پھر اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں، جانگی اور سردار تھالوب اس کی جیپ پر سوار گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جارہے تھے۔ سونیا کو اس لیے کاٹیج ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا کہ گزشتہ رات اس کانسٹیبل نے ہوش میں آنے کے بعد بتا دیا تھا کہ چوروں کی طرح اپنے کاٹیج میں گھسنے والی سونیا تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کا حلیہ وہ ٹھیک سے نہیں بتا سکا تھا۔ پولیس نے رات ہی کو سونیا کی تلاش شروع کردی تھی اور اب بھی اسے پورے شہر اور نواحی علاقوں میں تلاش کیا جارہا تھا اس لیے اس وقت سونیا کا ہمارے ساتھ جانا مناسب نہیں تھا۔ رنگولی کو بھی سونیا کی وجہ سے کاٹیج میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ہم دریائے مائے کھام پر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں سیاحوں کے لیے ایک بہت بڑی تفریح گاہ بھی بنی ہوئی تھی۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ دریائے میکانگ اور دریائے مائے کھام اس علاقے میں اس طرح ملتے ہیں کہ انگریزی کے حرف Y کی شکل بن جاتی ہے اور اس حرف کے دائیں طرف کی اوپر سے نیچے کی طرف آتی ہوئی لکیر دریائے میکانگ ہے جو تھائی لینڈ اور لاؤس کے درمیان سرحد کا کام دیتا ہے جبکہ دوسری طرف مائے کھام ریور تھائی لینڈ کی حدود میں ٹرائبل سینٹر کی طرف جاکر دو تین شاخوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کے مقام اتصال سے جو تکون بنتی ہے وہی دراصل گولڈن ٹرائی اینگل ہے۔ جو آگے جاکر کشادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک طرف برما اور دوسری طرف لاؤس کے کچھ سرحدی علاقے بھی اس تکون میں شامل ہوجاتے ہیں۔

مقامی انتظامیہ نے سیاحوں کی سہولت کے لیے دریائے مائے کھام کے کنارے پر ایک بہت بڑی تفریح گاہ بنا دی تھی۔ یہاں کئی اچھے ریسٹورنٹ اور کاٹیجز بھی تھے۔ سیاح یہاں آکر دریا کے دوسرے کنارے سے شروع ہونے والے گولڈن ٹرائی اینگل کے علاقے کو دیکھتے اور تصویریں کھینچتے اور اس بات پر فخر محسوس کرتے کہ انہوں نے گولڈن ٹرائی اینگل نام کے اس خطے کی جھلک دیکھی ہے جہاں سے دنیا بھر کو ہیروئن اور دیگر منشیات کا زہر سپلائی کیا جاتا ہے۔

دو تین دن سے حالات چونکہ کچھ بہتر تھے اس لیے یہاں بھی کچھ رونق تھی۔ اندرون ملک اور غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے سامنے گولڈن ٹرائی اینگل کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ لوگ ریستورانوں کے سامنے وسیع و عریض چبوتروں اور ٹیرس پر بیٹھے دوربینوں سے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ یہاں دریا کے کنارے پر دو تین گھاٹ بھی تھے جہاں دریا کی سیر کے لیے موٹر بوٹس دستیاب تھیں۔

یہاں دریا کا پاٹ ایک ہزار میٹر سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ دریا خاصا گہرا اور بہاؤ بہت تیز تھا۔ بہاؤ کی طرف تقریباً پانچ کلومیٹر آگے جاکر یہ دریا میکانگ ریور سے ملتا تھا۔

میں جانگی اور سردار تھالوب جیپ سے اتر کر اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ ہمارا انداز ایسا تھا جیسے ہم سردار کے مہمان ہوں اور وہ ہمیں سیر کرانے کے لیے یہاں لایا ہو۔

ایک آدمی سردار تھالوب کو دیکھ کر تیزی سے ہماری طرف لپکا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ کا مالک تھا اور اس نے سردار تھالوب کو پہچان لیا۔ وہ بڑے مؤدبانہ انداز میں سردار سے ملا اور پھر ہمیں اپنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ اندر بیٹھنے کے بجائے ہم نے باہر ٹیرس پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ ہوٹل کا مالک ایک ویٹریس کے ساتھ مشروبات لے کر آگیا۔ وہ سردار تھالوب کو اپنا مہمان بنا کر بہت خوش ہو رہا تھا۔ مالک ریسٹورنٹ کے اندر چلا گیا تو سردار تھالوب سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ سامنے پہاڑیاں اور گھنا جنگل ہے۔ یہاں جنرل کھوراٹ کے آدمی چوبیس گھنٹے چھپے پہرا دیتے رہتے ہیں۔ یہاں سے گولڈن ٹرائی اینگل کی زمین پر قدم رکھنا ممکن نہیں۔ البتہ....." وہ خاموش ہوکر اس کشتی کی طرف دیکھنے لگا جو سیاحوں سے بھری ہوئی تھی۔

وہ بڑی کشتی تھی۔ اس میں انجن بھی لگا ہوا تھا اور رنگ برنگے بادبان بھی تھے۔ کشتی میں تقریباً بیس افراد سوار تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں کیمرے تھے۔ کچھ لوگ آنکھوں سے دوربینیں لگائے ہوئے تھے۔ دو جوان عورتیں ایسی تھیں جن کے پاس مووی کیمرے تھے۔ وہ گولڈن ٹرائی اینگل کی مووی بنا رہی تھیں۔ کوئی کشتی والا عام طور پر دریا کی نصف چوڑائی عبور نہیں کرتا مگر اس کشتی پر سوار سیاح شاید بوٹ مین کو دوسرے کنارے کے زیادہ سے زیادہ قریب جانے پر مجبور کر رہے تھے تاکہ گولڈن ٹرائی اینگل کا زیادہ قریب سے نظارہ کرسکیں اور واضح تصویریں کھینچ سکیں۔

لیکن وہ کشتی جیسے ہی دریا کی نصف چوڑائی سے ذرا سی آگے بڑھی، دوسرے کنارے پر گھنے جنگل سے فائرنگ ہونے لگی۔ لائٹ مشین گن سے فائرنگ کی جارہی تھی۔ کوئی فائرنگ کرنے والا نظر نہیں آرہا تھا۔ لگتا تھا جیسے درختوں کی شاخوں نے گولیاں اگلنی شروع کردی ہوں۔

گولیاں کشتی کے آس پاس دریا کے پانی میں گر رہی تھیں۔ کشتی میں موجود عورتیں اور بچے چیخنے چلانے لگے اور پھر کشتی کا رخ تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ وہ مختصر سا چکر کاٹتی ہوئی بہاؤ کی سمت جارہی تھی۔ اب وہ دریا کی نصف چوڑائی سے اِدھر آگئی تھی۔ جنگل سے فائرنگ بند ہوگئی۔

"یہ کشتی والوں کے لیے وارننگ تھی۔" سردار تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر کشتی مزید آگے بڑھتی تو گولیاں پانی کے بجائے کشتی میں بھرے ہوئے لوگوں کو نشانہ بناتیں۔"

"کیا چوبیس گھنٹے....."

"ہاں۔ چوبیس گھنٹے۔" سردار تھالوب نے مجھے بات پوری کرنے کا موقع دیے بغیر کہا "جنرل کھوراٹ کے محافظ چوبیس گھنٹے دریا کی نگرانی کرتے ہیں۔ وہ رات کی تاریکی میں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ کئی طالع آزماؤں نے رات کی تاریکی میں بھی دریا پار کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس جگہ سے دریا پار کرکے گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔"

"وہاں تک پہنچنے کا کوئی راستہ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے سردار تھالوب کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" تھالوب نے اثبات میں سر ہلایا "راستہ اگرچہ وہ بھی خطرناک ہے مگر ایک فیصد کامیابی کا امکان ہے۔"

"میں یہ رسک لینے کو تیار ہوں۔" میں نے کہا۔

"تو پھر آؤ۔ میں تمہیں وہ جگہ دکھاتا ہوں۔" سردار کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

میں نے اور جانگی نے بھی کرسیاں چھوڑ دیں۔ ہم پارکنگ ایریا میں آگئے۔ میرا خیال تھا کہ تھالوب ہمیں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ کسی جگہ لے جائے گا لیکن جب اس نے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کہاں جارہے ہو؟"

"بیٹھو۔ پتا چل جائے گا۔" سردار نے کہا۔

ہم جیپ میں بیٹھ گئے۔ سردار تھالوب نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ جیپ پارکنگ ایریا سے نکل کر شہر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ میں اب بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ ہمیں کہاں لے جارہا ہے۔ تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ سڑک سے ہٹ کر بائیں طرف ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ یہ راستہ نہایت پُرپیچ اور خطرناک تھا۔ دونوں طرف گنجان جھاڑیاں تھیں جس سے راستہ تنگ اور تنگ ہوگیا تھا۔ اوپر سے درختوں کی شاخیں بھی نیچے تک جھکی ہوئی تھیں جو جیپ سے ٹکرا رہی تھیں۔ بعض جگہ تو درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں اور جھاڑیاں اس طرح چھپی ہوئی تھیں جیسے راستہ بند ہو مگر سردار تھالوب جیپ کو آگے بڑھاتا لے گیا۔

تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے اس نے جیپ روک لی اور ہم نیچے اتر آئے اور تھالوب کے پیچھے چلتے رہے۔ یہاں پیدل چلنے کا بھی کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ہم درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں اور گنجان جھاڑیوں میں راستہ

بناتے ہوئے چلتے رہے اور پھر ایک جگہ رک گئے۔ تھالوب اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہو۔

وہ ہم سے تقریباً دس فٹ آگے تھا۔ میری طرف گھومتے ہوئے اس نے اچانک ہی پستول نکال لیا۔ پستول کا رخ میری کھوپڑی کی طرف تھا۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی میں سوراخ ہوجائے گا۔" تھالوب کے منہ سے سانپ جیسی پھنکار نکلی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوفناک سی مسکراہٹ تھی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں ہزاروں خیالات اور وسوسے آئے تھے۔ تو یہ تھا سردار تھالوب کا اصل روپ۔ شاید وہ بھی جنرل کھوراٹ کا ایجنٹ تھا۔ اب تک اس نے میرے ساتھ جو کچھ بھی کیا تھا، وہ سب ڈھونگ تھا اور جب میں نے گولڈن ٹرائی اینگل جانے کا فیصلہ کرلیا تو اس نے بھی مجھے ختم کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس ویرانے میں مجھے اور جانگی کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تو ہمارے بارے میں کس کو پتا چلے گا۔ موت کو اتنا قریب دیکھ کر میرا جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا۔ میری جینز کی ہپ پاکٹ میں بھی پستول موجود تھا۔ اگر میں پستول نکالنے کی کوشش بھی کرتا تو میرا ہاتھ جیب تک پہنچنے سے پہلے ہی تھالوب مجھے گولی ماردیتا۔

میں نے آہستگی سے گردن گھما کر جانگی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چار فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ خوف سے اس کا چہرہ بھی دھواں ہورہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ واضح طور پر نظر آرہی تھی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی میں سوراخ ہوجائے گا۔"

سردار تھالوب ایک بار پھر سانپ کی طرح پھنکارا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔

فائر کی آواز گونجی۔ میں سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ یہ شاید تنبیہی فائر تھا۔ تھالوب نے پستول والا ہاتھ نیچے جھکالیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

"پیچھے مڑکر دیکھو۔"

میں تیزی سے پیچھے گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میرے پیچھے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر درخت کی جھکی ہوئی ایک موٹی شاخ پر سبز رنگ کا ایک تقریباً چار فٹ لمبا سانپ لٹکا ہوا تھا۔ اس کا سر تھالوب کی گولی نے اڑا دیا تھا۔ سانپ کی دُم درخت کی شاخ سے بل کھا کر لپٹی ہوئی تھی اور باقی جسم بھی اینٹھتا ہوا سا ہوا میں بل کھا رہا تھا اور پھر شاخ سے اس کی دُم کے بل کھلنے لگے اور وہ بھد کی آواز سے زمین پر گرا۔

"یہ سانپ اگر تمہیں ڈس لیتا تو تم ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں ختم ہوجاتے۔ اس کا زہر سائنائڈ سے بھی زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔" سردار تھالوب اس سانپ کے بارے میں بتا رہا تھا "یہ خطرناک سانپ اس علاقے میں بہت کم پایا جاتا ہے لیکن جب یہ اپنے شکار کو دیکھ لیتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔ یہ ہوا میں اڑتا بھی ہے۔ زمین سے پانچ چھ فٹ اونچی اور تقریباً پندرہ فٹ لمبی چھلانگ لگاتا ہے۔ یہ تم پر حملہ کرنے کی تیاری کر ہی رہا تھا۔ اگر میں نہ دیکھ لیتا تو تم اس وقت ہم سے بہت دور جاچکے ہوتے۔"

تھالوب بولتا رہا اور میں سوچتا رہا۔ چند سیکنڈ پہلے میرے ذہن میں اس کے بارے میں جو خیالات آئے تھے، ان پر اب مجھے شرمندگی ہورہی تھی۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات تھے۔

ہم ایک بار پھر چل پڑے اور ایک بار پھر رک گئے۔ پانی کی لہروں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم دریا کے کنارے پر جھاڑیوں میں بیٹھے سامنے دیکھ رہے تھے۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں دونوں دریا انگریزی کے حرف Y کے نقطۂ اتصال پر ایک دوسرے سے ملتے تھے اور یہیں سے تکون بن کر آگے کو پھیلتی چلی گئی تھی۔

بہت خوب صورت منظر تھا۔ دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے ہوئے دونوں دریاؤں کے بیچ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا سبزہ بڑا حسین منظر پیش کررہا تھا۔

یہاں دونوں دریاؤں کے ملنے کی وجہ سے پاٹ بہت زیادہ چوڑا ہوگیا تھا۔ بائیں طرف دریائے مائے کھام تھا اور دائیں طرف میکانگ جس کے دوسری طرف لاؤس کی سرحد تھی۔ زیریں علاقے کی طرف یہ دریا لاؤس اور تھائی لینڈ کے درمیان سرحدی لکیر بناتا چلا گیا تھا۔

"وہ چھوٹا سا جزیرہ دیکھ رہے ہو۔" سردار تھالوب نے میکانگ کے وسط میں ابھرے ہوئے ایک ٹاپو نما ابھار کی طرف اشارہ کیا۔ میں گردن گھما کر اس طرف دیکھنے لگا۔ اسے جزیرہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ جس کی لمبائی چوڑائی دو ڈھائی سو گز سے زیادہ نہیں تھی۔ وہاں قد آدم جھاڑیاں اور گنجان

درخت نظر آرہے تھے "اس جزیرے سے گولڈن ٹرائی اینگل تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے لیکن اصل مسئلہ اس جزیرے تک پہنچنے کا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے جزیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تو اس جزیرے تک پہنچنا بہت آسان لگ رہا ہے۔"

"یہ تمہاری بھول ہے۔" سردار تھالوب مسکرایا "میکانگ کے دوسرے کنارے پر لاؤس کے فوجی گشت کرتے رہتے ہیں۔ اس جزیرے کی طرف جانے والوں کو دیکھتے ہی گولی ماردی جاتی ہے۔"

"اور اگر اس طرف سے دریا پار کرنے کی کوشش کی جائے تو؟" میں نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

"ناممکن۔" تھالوب نے جواب دیا "جنرل کھوراٹ تھائی سرحد پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اس طرف اس کے مسلح آدمی موجود رہتے ہیں جبکہ لاؤس کی طرف سے اسے کوئی خطرہ نہیں۔ اس طرف گشت کا بھی زیادہ انتظام نہیں ہے۔ اس لیے میرے خیال میں اس جزیرے کی طرف سے ہی کوشش کی جانی چاہیے۔ اس طرف سے کامیابی کا ایک فی صد امکان ہوسکتا ہے۔"

میں دیر تک اس چھوٹے سے جزیرے کی طرف دیکھتا رہا۔

"ہوسکتا ہے اس جزیرے پر بھی لاؤس کے فوجی یا جنرل کھوراٹ کے آدمی موجود ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "یہ جزیرہ دریا کے عین وسط میں ہے۔ کسی ملک کی سرحد میں شامل نہیں ہے۔ تھائی اور لاؤس کی حکومتوں میں یہ معاہدہ ہے کہ ان میں سے کسی ملک کے فوجی اس جزیرے کو کسی بھی قسم کے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ جنرل کھوراٹ سے اگرچہ اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں لیکن وہ بھی اس معاہدے پر عمل کررہا ہے البتہ کبھی کبھار اس کے آدمی اس جزیرے پر آجاتے ہیں۔"

میں ایک بار پھر جزیرے کی طرف دیکھتے ہوئے نظروں ہی نظروں میں فاصلہ ناپنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے اس جزیرے کا فاصلہ ہزار میٹر سے کم نہیں تھا اور وہاں سے گولڈن ٹرائی اینگل والا کنارہ پانچ چھ سو میٹر کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ میں دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا پھر تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس جزیرے تک پہنچنے کے لیے ظاہر ہے کشتی کی ضرورت ہوگی اور کشتی کا بندوبست کیسے ہوگا؟"

"کشتی کا بندوبست ہوجائے گا۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "لیکن میرا مشورہ ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔ اپنے فیصلے پر نظرِثانی کرلو۔"

"میں فیصلہ کرچکا ہوں سردار۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا "دنیا کی کوئی طاقت میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آؤ۔ اب واپس چلیں۔" سردار تھالوب نے کہا۔ ہم جھاڑیوں سے نکل کر واپسی کے راستے پر چلنے لگے اور مجھے حیرت ہوئی کہ جیپ تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

پہاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر آکر تھالوب نے جیپ کا رخ شہر کی طرف موڑ دیا۔

سردار تھالوب بھی تقریباً ایک گھنٹے تک ہمارے ساتھ کاٹیج میں رہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا "مجھے تم لوگوں کے لیے کشتی اور کچھ دوسری چیزوں کا بندوبست کرنا ہے۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔"

تھالوب چلا گیا۔ اس وقت رنگولی بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ اب ہم تینوں اس کاٹیج میں رہ گئے تھے۔ میں اور جانگی ایک بار پھر سونیا کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ بھی میری طرح ارادے کی پکی تھی۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھی کہ ہمارے ساتھ ضرور جائے گی۔ اگر ہم اسے ساتھ نہ لے گئے تو وہ اکیلی ہی گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونے کی کوشش کرے گی خواہ اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ سونیا کی اس ضد کے سامنے مجھے ایک بار پھر ہتھیار ڈالنا پڑے۔

ہم نے کل رات دریا پار کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تھالوب نے کہا تھا کہ اس دوران میں وہ ہماری روانگی کے تمام انتظامات مکمل کرلے گا۔ میں مہاراج کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ مہاراج ہی نے مجھے اس قابل بنایا تھا کہ آج میرے دشمن مجھ سے چھپتے پھر رہے تھے اور مہاراج ہی نے میرے اندر اتنی خوداعتمادی پیدا کی تھی کہ میں اپنے طور پر بڑے سے بڑا فیصلہ کرسکتا تھا۔ مہاراج نے مجھے جو مشن سونپا تھا، میں اس میں سرخ رو ہوا تھا۔ اب میرے پاس صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اپنے ماں باپ کے قاتلوں سے انتقام۔ گولڈن ٹرائی اینگل تو ایسی جگہ تھی جہاں ہماری ہی طرح کے انسان بستے تھے۔ میں تو دارا اور چی فانگ کے تعاقب میں

جہنم تک جانے کو تیار تھا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ مہاراج میرے اس فیصلے کی مخالفت نہیں کریں گے اور پھر مجھے مہاراج سے رنگ سنت کی ڈائری کے حوالے سے بھی بات کرنی تھی۔ اگر تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہوجائے کہ رنگ سنت واقعی بے گناہ تھی تو سونیا کے دل سے بہت بڑا بوجھ ہٹ جائے گا۔

میں ٹیلی فون کے قریب آکر بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر بنکاک میں وات ٹریمنٹ کا نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اتفاق سے کال خود مہاراج ہی نے ریسیو کی تھی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں فوراً ہی اصل موضوع پر آگیا اور مہاراج کو سونیا، رنگ سنت اور اس کی ڈائری کے بارے میں بتانے لگا۔

"اس ڈائری میں کچھ ایسے نام موجود ہیں جن سے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرکے رنگ سنت کی تحریر کی تصدیق یا تردید ہوسکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ ڈائری میں نے سردار تھالوب کے حوالے کردی ہے۔ وہ دو چار دن میں بنکاک آکر آپ سے ملاقات کرے گا اور ڈائری آپ کے حوالے کردے گا۔"

"اور تم کیوں نہیں آرہے۔" مہاراج نے کہا "تمہارا مشن مکمل ہوچکا ہے۔ وہاں اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ یہاں بنکاک میں تمہارا انتظار ہورہا ہے۔"

"مہاراج وہ.... دارا اور اس کے ساتھی گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف فرار ہوگئے ہیں۔" میں یہ بات بمشکل کہہ سکا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" مہاراج نے پوچھا۔

"مہاراج آپ جانتے ہیں دارا اور اس کے ساتھیوں نے میرے ماں باپ کو قتل کیا تھا اور چاچا پرتاب سنگھ کو بھی آپ کی عبادت گاہ میں گولیوں سے چھلنی کردیا تھا۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہتا تھا۔ آپ نے مجھے بچایا اور پناہ دی۔ میں نے آپ کے سامنے بھی قسم کھائی تھی کہ ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور ایسے لوگوں کو زندہ چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔ یہ لوگ لاتعداد بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ انہوں نے بنکاک میں جو قتل و غارت مچائی تھی اس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہاں بھی یہ لوگ کئی روز تک آگ اور خون کا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔ دارا نے تو ان لوگوں کو بھی نہیں بخشا جو اس کی خاطر جان ہتھیلی پر لیے پھرتے رہے ہیں۔ دارا نے پیڈرو کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے دشمن ہیں مہاراج۔ برا آدمی کبھی برائی سے باز نہیں آتا۔ ان کی سازش اگرچہ ناکام ہوچکی ہے لیکن یہ ایسے ہی کسی اور منصوبے پر کام شروع کردیں گے۔ ہیروئن کی اسمگلنگ کا منصوبہ تو پہلے ہی ہے۔ دنیا بھر میں یہ زہر پھیلایا جارہا ہے۔ ان جیسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم اس برائی کا مکمل طور پر خاتمہ تو نہیں کرسکتے لیکن دارا جیسے کچھ لوگوں کو تو روک سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ختم ہوجانا چاہیے ایسے لوگوں کو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" مہاراج نے کہا "لیکن گولڈن ٹرائی اینگل خوں خوار بھیڑیوں کا بھٹ ہے۔ وہاں جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔"

"میں نے آپ سے تربیت حاصل کی ہے مہاراج۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ مجھے آپ کے آشیرباد چاہیے اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ تھائی ان خوں خوار بھیڑیوں کے قبضے میں ہے اور اسے بے یارو مددگار نہیں چھوڑا جاسکتا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سن۔" مہاراج نے کہا "تم کب جارہے ہو؟"

"کل رات۔" میں نے جواب دیا اور مہاراج کو یہ بھی بتا دیا کہ جانکی بھی میرے ساتھ جارہی ہے۔ سونیا کا ذکر میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" مہاراج نے جواب دیا اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کردیا۔

میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید مہاراج اس کی اجازت نہ دیں لیکن وہ میرے جذبات سے واقف تھے اور میں نے جس لب و لہجے میں بات کی تھی، اس سے بھی شاید انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ میں کوئی نصیحت ماننے کو تیار نہیں ہوں گا اس لیے انہوں نے مجھے اجازت دے دی تھی۔

میں تو جانکی کو بھی ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا لیکن تھائی کا یہاں سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ دارا وغیرہ فرار ہوچکے تھے۔ پیڈرو بھی مارا گیا تھا لیکن پیڈرو کا گروہ تو موجود تھا۔ اس گروہ کے بہت سے لوگ جانکی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور ویسے بھی میرا خیال تھا کہ اگر میں جانکی کو ساتھ لے جانے سے انکار کردیتا تو وہ کبھی بھی نہ مانتی۔ جانکی کو بہرحال میرے ساتھ جانا تھا لیکن مجھے سونیا کا افسوس ہورہا تھا۔ ہم پکنک پر نہیں جارہے تھے۔ وہاں قدم قدم پر موت ہماری منتظر ہوگی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سنہری تکون کی زمین پر قدم رکھتے ہی ہمیں گولیوں سے بھون دیا جائے لیکن سونیا اس آگ میں کودنے کو تیار تھی۔ میری طرح وہ بھی انتقام کی آگ میں جل رہی تھی اور اسے روکنا ممکن نہیں تھا۔

وہ دن گزر گیا اور پھر رات کے تاریک سائے پر پھیلانے لگے۔ رات میرے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتی تھی۔ اس رات دو بجے تک تو جانکی اور سونیا بھی جاگتی رہی تھیں اور پھر اپنے کمروں میں جانے کے بجائے وہیں قالین پر لیٹ کر سوگئیں اور میں صوفے پر نیم دراز سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کو گھورتا رہا جس کی سوئیاں غیر محسوس انداز میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھیں لیکن کونسی منزل! یہ تو ایک دائرے میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ ان کی کوئی منزل نہیں اور شاید گھڑی کی ان سوئیوں کی طرح میری بھی کوئی منزل نہیں تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کے قتل کے انتقام کو زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی مقصد نظر نہیں آتا تھا نہ ہی کوئی منزل دکھائی دیتی تھی۔ قتل و غارت، خون خرابا! کیا یہی انسانی زندگی کا مقصد ہے؟ میں نے تو اب تک یہی کچھ دیکھا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کے قتل کے بعد تو مجھے ہر طرف گولیاں ہی برستی نظر آئی تھیں۔ خون ہی خون دکھائی دیا تھا۔ ہر طرف انسانی خون ہی بہتا ہوا دیکھا تھا میں نے۔ میرے ہاتھ بھی خون سے رنگے ہوئے تھے لیکن.... میں نے تو ان لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے جو انسانیت کے دشمن تھے۔ بے گناہ کیوں مارے جارہے تھے؟

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا سر دکھنے لگا۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر قالین پر سوئی ہوئی جانکی اور سونیا کو دیکھتا رہا پھر اٹھ کر دبے قدموں چلتا ہوا کچن میں گھس گیا۔ کم سے کم آواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کافی بنائی اور کپ لے کر خاموشی سے باہر آکر لان میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورتے ہوئے کافی کی چسکیاں لینے لگا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ برآمدے کی طرف سے آہٹ سن کر چونک گیا۔ گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ جانکی برآمدے میں کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور پھر وہ برآمدے سے نکل کر میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے۔ نیند نہیں آرہی؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ ذہن اپ سیٹ ہورہا ہے۔" میں نے جواب دیا "سوچ سوچ کر سر دکھنے لگا تھا۔ میں نے اٹھ کر کافی بنالی۔"

"مجھے جگا دیتے۔ میں بنا دیتی کافی۔" جانکی نے کہا۔

"اگر تم بھی پینا چاہو تو بنالو۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ موڈ نہیں ہورہا۔" جانکی نے جواب دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ہم گولڈن ٹرائی اینگل کے حوالے سے باتیں کرنے لگے کہ وہاں ہمیں کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔" جانکی نے کہا "جنرل کھوراٹ کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ چکے ہیں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہاں ہمیں سنگین ترین صورت حال کا سامنا ہوگا اور شاید وہ ہماری زندگی کا کٹھن ترین دور ہوگا۔ قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی ہوگی۔ اگر ہم وہاں چند روز بھی زندہ رہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔ مجھے تو یہ بھی اندیشہ ہے کہ کشتی سے اتر کر دریا کے کنارے پر قدم رکھتے ہی ہمیں گولیوں سے چھلنی کردیا جائے گا۔"

"یہی سب کچھ میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ان حالات کے پیش نظر کیا تم اپنے لیے وہاں جانا مناسب سمجھتی ہو؟ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم یہیں رہ جاؤ۔ سردار تھالوب کے پاس۔ اگر تم رک جاؤ تو سونیا کو بھی روکا جاسکتا ہے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" جانکی کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہیں موت کے اس حصار میں اکیلے جانے دوں گی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "میں، تم اور تھائی۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ مرنے جینے کا عہد کیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے وعدہ کیا تھا کہ سچائی کے لیے لڑتے ہوئے جان دے دیں گے لیکن ہمارے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ اب ہمارے راستے الگ کیسے ہوسکتے ہیں۔ ہاں البتہ اگر تم تھائی کو بھول کر اپنا پروگرام بدل دو تو میں بھی بنکاک واپس جانے کو تیار ہوں۔ اگر بنکاک میں ہمارے لیے اب بھی خطرہ ہو تو ہم یہیں اور چلے جائیں گے اور آرام سے زندگی گزار دیں گے۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" تھائی کا نام لے کر جانکی نے میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی "میں تھائی کو کیسے بھول

سکتا ہوں۔ آج میں زندہ ہوں تو تھائی کی وجہ سے۔ میں تو اسے بھول جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"تو پھر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تھائی کو بھول جاؤں گی یا تمہیں اکیلے موت کے منہ میں جانے دوں گی۔" جانگی نے مسکراتے ہوئے کہا "بس۔ اب اس موضوع کو یہیں ختم کر دو۔ آج کے بعد میں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔"

میں لاجواب ہو کر رہ گیا۔

رات کے آخری پہر تک ہم لان ہی میں بیٹھے رہے۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی جب ہم لان سے اٹھ کر کاٹیج کے اندر آ گئے۔ سونیا قالین پر آڑی ترچھی پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتا ہوا صوفے پر لیٹ گیا اور جانگی' سونیا کے قریب ہی قالین پر لیٹ گئی۔ میرا ذہن اگرچہ اب بھی الجھا ہوا تھا لیکن اس مرتبہ سونے کے لیے مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔

میری آنکھ دوپہر بارہ بجے کے قریب کھلی۔ سونیا اور جانگی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔

سردار تھالوب دو بجے کے قریب آیا تھا۔ وہ ہمارے لیے کچھ ایسی چیزیں لے کر آیا تھا جو اس مہم میں ہمارے کام آ سکتی تھیں۔ ہاتھی دانت کے دستے والا ایک خوب صورت خنجر جس کے ایک طرف تیز دھار تھی اور دوسری طرف درانتی کی طرح باریک دندانے بنے ہوئے تھے' اس نے سونیا کی طرف بڑھا دیا۔

"میری تو خواہش تھی کہ تم یہیں رہو لیکن تم بضد ہو تو ہم تمہیں روک نہیں سکتے۔ بہرحال' یہ خنجر میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔ کام آئے گا۔"

سونیا کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ کچھ دیر تک خنجر کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر متشکرانہ نگاہوں سے تھالوب کی طرف دیکھنے لگی۔ سردار تھالوب نے ایسا ہی ایک خنجر جانگی کو بھی دیا تھا مگر اس کا دستہ ہاتھی دانت کا نہیں' آبنوس کی لکڑی کا تھا۔

سونیا اور جانگی نے فوراً ہی تیاری شروع کر دی۔ رنگولی ان کی مدد کر رہی تھی۔ ان دونوں نے اپنے اپنے بیگ میں دو تین جوڑے کپڑوں کے رکھ لیے تھے اور کچھ وہ چیزیں جو تھالوب لے کر آیا تھا۔ ان میں مہر بند خوراک کے کچھ ڈبے بھی تھے۔ اگر ہم زندہ رہے تو یہ خوراک کم از کم ایک ہفتے ہمارا ساتھ دے سکتی تھی۔

سردار تھالوب اور میں ہال کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور سردار تھالوب کہہ رہا تھا۔

"کشتی کا بندوبست ہو گیا ہے۔ آج شام تک کشتی اسی جگہ پہنچ جائے گی جہاں ہم کل گئے تھے۔ میرا ایک آدمی تم لوگوں کے ساتھ جائے گا۔ وہ تم لوگوں کو دریا کے گولڈن ٹرائی اینگل والے کنارے پر اتار کر اس جزیرے پر واپس آ جائے گا اور چوبیس گھنٹے وہاں رکے گا۔ اس دوران میں اگر تم لوگ محسوس کرو کہ آگے نہیں جا سکتے تو اسے سگنل دے دینا۔ وہ تم لوگوں کو واپس لے آئے گا۔"

"اس زمین پر قدم رکھنے کے بعد تو واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ فیصلہ تو تم اس زمین پر قدم رکھنے کے بعد کرو گے۔ بہرحال' اگر محسوس کرو کہ ہوا کا رخ تمہارے ساتھ نہیں ہے تو ایسی صورت میں میرا مشورہ ہے کہ....."

"نہیں سردار۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اب میں کوئی مشورہ نہیں سنوں گا البتہ کچھ باتیں جاننا چاہتا ہوں جن سے مجھے آگے چل کر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔"

"مثلاً؟" سردار تھالوب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"جنرل کھوراٹ کون ہے۔ اس نے اس علاقے پر کیسے قبضہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جنرل کھوراٹ۔" تھالوب نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "وہ خود ساختہ جنرل ہے۔ برسوں پہلے وہ چینی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ جیسے تیسے کر کے سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے تک تو پہنچ گیا لیکن اس سے آگے نہیں جا سکا۔ وہ اپنے حلقے میں بہت بدتمیز آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اپنے سے سینئر افسروں کے ساتھ بھی بدتمیزی سے باز نہیں آتا تھا۔ حکم عدولی' ڈسپلن کی خلاف ورزی پر اسے کئی بار سزا ہوئی تھی پھر ایک مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ وہ ایک خفیہ تنظیم ٹرایاڈ TRIAD کا سرگرم رکن ہے۔ یہ تنظیم ان دنوں حکومت کے خلاف سرگرم تھی۔ کھوراٹ نے ایک مختصر سا گروہ بنا لیا تھا اور فوج میں بدنظمی پھیلا رہا تھا۔ یہ انکشاف ہوتے ہی کھوراٹ کو حراست میں لے لیا گیا۔ فوج کے قوانین کے مطابق اس پر مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا لیکن وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے فوج کی حراست سے بھاگ نکلا۔ اس کے گروہ میں پندرہ سولہ آدمی تھے۔ کھوراٹ ان کا سرغنہ تھا۔ پکڑے جانے کے خوف سے وہ بھاگتے رہے۔ ان کا رخ کینٹن کی طرف تھا جہاں سے وہ ہانگ کانگ جانا چاہتے

تھے۔ ہانگ کانگ برطانیہ کے زیرِ اثر تھا اور کھوراٹ سمجھتا تھا کہ اسے صرف ہانگ کانگ ہی میں پناہ مل سکتی تھی لیکن اسے کینٹن ہی میں پتا چل گیا کہ ہانگ کانگ میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنا رخ بدل دیا اور نان ننگ کی طرف بڑھنے لگے۔ کھوراٹ نے اب ویت نام میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا تھا مگر اس طرف بھی رکاوٹیں تھیں۔

"کھوراٹ اور اس کے ساتھیوں کے پاس جو تھوڑی بہت رقم بچی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ ان کے پاس ایک وقت کی خوراک خریدنے کے لیے پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ خوراک کے حصول اور دیگر ضروریات کے لیے انہوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ وہ جس بستی میں بھی جاتے ایک دو آدمیوں کو قتل کر کے دہشت پھیلا دیتے اور لوٹ مار کر آگے نکل جاتے۔

"اسی دوران میں کچھ اور جرائم پیشہ لوگ بھی اس کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ لٹیروں اور قاتلوں کا یہ خطرناک گروہ لوٹ مار کرتا اور راستے میں چھوٹی چھوٹی بستیاں اجاڑتا ہوا چیلی کے قریب دریائے میکانگ کے کنارے پر پہنچ گیا۔ یہ دریا چین کے برف پوش پہاڑوں سے شروع ہو کر چین ہی کے وسیع و عریض علاقے کو سیراب کرتا ہوا چیلی کے قریب برما کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر سیام اور لاؤس کی سرحدوں کو چھوتا ہوا کمبوڈیا کا سفر کرتے ہوئے جنوبی بحیرہ چین میں جا گرتا ہے۔

"کھوراٹ اور اس کے تقریباً چالیس مسلح آدمی ایک بڑی بادبانی کشتی پر سوار تھے۔ یہ کشتی دریائے میکانگ میں بہتی ہوئی برما کی سرحد سے نکل کر تھائی لینڈ کی سرحد میں داخل ہوئی۔ یہاں کھوراٹ نے اپنا سفر ختم کر دیا۔

"دو دریاؤں کے بیچ میں سیکڑوں مربع میل پر مشتمل یہ تکونی زرخیز خطہ کھوراٹ کو پسند آ گیا۔ اس خطے میں تین چار چھوٹے چھوٹے قبائل آباد تھے۔ جو تھوڑی بہت کھیتی باڑی سے اپنی گزر اوقات کر رہے تھے۔ کھوراٹ اور اس کے مسلح ساتھیوں نے ان قبائلیوں کو برما کی طرف بھگا دیا۔ جنہوں نے مزاحمت کی کوشش کی انہیں بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

"اس علاقے میں پوست کے پودے دیکھ کر کھوراٹ نے ایک اور منصوبہ بنایا۔ پوست کی کاشت کے لیے یہ علاقہ تو بہت زرخیز تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے پوست کی باقاعدہ کاشت شروع کر دی۔ کچھ علاقے میں اپنی ضرورت کے لیے سبزیاں' پھل اور اناج بھی پیدا کیا جانے لگا۔

"وہ افیون کا دور تھا۔ کھوراٹ پوست کی پیداوار سے افیون تیار کر کے برما' چین کے سرحدی علاقوں' لاؤس اور تھائی لینڈ میں بڑی مقدار میں افیون سپلائی کرنے لگا۔ دو طرف دریا ہونے کی وجہ سے یہ تکونی خطہ ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ کھوراٹ نے اپنے گروہ پر مکمل کنٹرول کر رکھا تھا۔ دو چار نے بعض معاملات میں سر اٹھانے کی کوشش کی تو کھوراٹ نے بڑی بے رحمی سے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا تاکہ دوسرے سر اٹھانے کی جرأت نہ کر سکیں۔

"کھوراٹ ہر وقت مسلح اور فوجی وردی میں رہتا۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ جنرل کا اضافہ کر لیا۔ اس کی شہرت آہستہ آہستہ آس پاس کے علاقوں میں پھیلنے لگی۔ لاؤس' تھائی لینڈ' برما اور چین کے جرائم پیشہ لوگ فرار ہو کر اس طرف کا رخ کرنے لگے۔ جنرل کھوراٹ انہیں خوش آمدید کہتا۔ اس طرح اس کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے ان ممالک سے کچھ ایسے ماہرین کو بھی لالچ دے کر بلا لیا جو بنیادی طور پر مجرمانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ اس طرح افیون کے علاوہ حشیش' مارفین اور دوسری منشیات بھی تیار ہونے لگیں جو بڑی مقدار میں سرحدی علاقوں اور دنیا کے مختلف ممالک کو اسمگل کی جانے لگیں۔ یہاں پوست نہیں سونا پیدا ہوتا تھا اور اسی لیے اس علاقے کو گولڈن ٹرائی اینگل کا نام دے دیا گیا۔

"آس پاس کی حکومتوں کو جب جنرل کھوراٹ کی سرگرمیوں کا پتا چلا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ جنرل کھوراٹ بہت بڑی طاقت بن چکا تھا۔ اس نے پوری فوج جمع کر لی تھی جس کے پاس جدید ترین اسلحہ اور گولا بارود موجود تھا۔ گولڈن ٹرائی اینگل آج ایک چھوٹی سی ایسی سلطنت ہے جس کا جنرل کھوراٹ بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کی فوج میں حسین اور جوان لڑکیاں بھی شامل ہیں۔ جو اس سنہری تکون میں ڈیوٹی دینے کے علاوہ ہیروئن اور دیگر منشیات کی سپلائی اور سودے بازی کے سلسلے میں مختلف ممالک کے چکر لگاتی رہتی ہیں۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں ایک باقاعدہ ہوائی اڈا ہے۔ جنرل کھوراٹ کے اپنے دو تین جہاز ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلی ہوئی منشیات کی تنظیموں کے ہوائی جہاز بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔

"گولڈن ٹرائی اینگل میں ہیروئن اور دیگر منشیات تیار کرنے کی کئی فیکٹریاں ہیں۔ جن میں ہر وقت مال تیار ہوتا رہتا ہے اور جنرل کھوراٹ کے منشیات کے ماہرین ان منشیات کو زیادہ سے زیادہ نشہ آور بنانے کے لیے ریسرچ میں مصروف

رہتے ہیں۔

"جنرل کھوراٹ ٹریاڈ TRIAD کا سربراہ ہے جس کا صدر دفتر ہانگ کانگ میں ہے۔ دنیا بھر میں منشیات کی سب سے بڑی منڈی بھی ہانگ کانگ ہی ہے۔ جنرل کھوراٹ گولڈن ٹرائی اینگل سے بہت کم باہر نکلتا ہے لیکن مہینے میں ایک مرتبہ وہ ہانگ کانگ کا چکر ضرور لگاتا ہے اور کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ کب آیا اور کب واپس چلا گیا۔"

سردار تھالوب خاموش ہوگیا۔ میں بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنی باتوں میں دو تین مرتبہ TRIAD کا نام لیا تھا۔ یہ نام میں نے ایک دو مرتبہ بنکاک میں بھی سنا تھا لیکن اب پہلی مرتبہ انکشاف ہوا تھا کہ یہ کوئی تنظیم ہے۔

"یہ ٹریاڈ TRIAD کس قسم کی تنظیم ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے تھالوب کی طرف دیکھا۔

"ٹریاڈ۔" تھالوب نے ایک بار پھر گہرا سانس لیا "تم نے امریکی ڈرگ مافیا کا نام سنا ہوگا۔ ٹریاڈ اس سے بھی زیادہ خوفناک تنظیم ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ٹریاڈ دراصل چینی قوم پرستوں کی تنظیم تھی جو ۱۷۶۴ء میں معرضِ وجود میں آئی تھی۔

"اس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس تنظیم کی بنیاد پانچ بدھ راہبوں نے چنگ کے شہنشاہ کانگ سی سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے رکھی تھی۔ شہنشاہ کانگ سی کے دور میں ریاست سیلو SILU کے گورنر نے بغاوت کردی اور شہنشاہ کا تختہ الٹ دینے کی دھمکی دی تو شہنشاہ نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے اپنے حیفوں اور ہمدردوں سے مدد طلب کرلی۔

سابق شاہی منگ خاندان سے تعلق رکھنے والے چینگ کوان نامی ایک شخص نے شہنشاہ کانگ سی کی یہ اپیل سنی تو وہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگیا۔ چینگ دنیا کو تیاگ کر راہب بن گیا تھا اور ان دنوں شاؤلن ٹمپل میں باکسنگ کی تربیت حاصل کررہا تھا۔ صدیوں پرانی اس عبادت گاہ میں بدھ بھکشوؤں اور راہبوں کو باکسنگ اور مارشل آرٹ کے مختلف حربی فن سکھائے جاتے تھے تاکہ سفر کے دوران میں لٹیروں اور رہزنوں کا مقابلہ کرسکیں۔

"چینگ کوان اپنے ایک سو اٹھائیس راہب ساتھیوں کو لے کر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ یہ تمام راہب باکسنگ اور دیگر حربی فنون کے ماہر تھے۔ ہر ایک میں خالی ہاتھ ہونے کے باوجود کئی کئی مسلح حریفوں سے مقابلے کی صلاحیت موجود تھی۔

"چینگ کوان اور اس کے ساتھی اس جرأت، بہادری اور دانش مندی سے لڑے کہ سیلو کا گورنر شہر کا محاصرہ اٹھا کر ناکام و نامراد واپس چلا گیا۔ شہنشاہ کانگ سی، چینگ کوان اور اس کے ساتھیوں کی بہادری اور خدمات سے بہت خوش ہوا۔ اس نے چینگ اور اس کے ساتھیوں کو اعزازات سے نوازتے ہوئے حکومت میں کلیدی عہدوں کی پیشکش کی لیکن چینگ اور اس کے ساتھیوں کو عہدوں یا جاہ و حشم کی ہوس نہیں تھی۔ وہ شہنشاہ کا شکریہ ادا کرکے شاؤلن عبادت گاہ واپس چلے گئے۔

"شہنشاہ نے چینگ اور اس کے ساتھیوں کو جو عزت بخشی تھی، وہ حکومت کے بعض عہدے داروں سے برداشت نہیں ہوسکی۔ دو وزیر تو حسد و رقابت کی آگ میں اس طرح جل رہے تھے کہ انہوں نے ان راہبوں کے خلاف شہنشاہ کے کان بھرنا شروع کردیے۔ انہوں نے شہنشاہ کو باور کرا دیا کہ سرکاری عہدے ٹھکرا کر ان راہبوں کا واپس چلے جانا بے معنی نہیں ہے۔ انہوں نے شہنشاہ کی کمزوریوں کا اندازہ لگالیا ہے۔ اب وہ تیاری کرکے پہلے جنوب میں بغاوت کریں گے اور پھر دارالحکومت پر حملہ آور ہوں گے۔ اپنے وزیروں کی باتوں سے متاثر ہوکر شہنشاہ کانگ سی نے شاؤلن عبادت گاہ کو تباہ کردینے اور چینگ کوان اور اس کے ساتھیوں کے قتل کا حکم جاری کردیا۔

"شہنشاہ کے ایک فوجی دستے نے شاؤلن ٹمپل کو گھیرے میں لے کر آگ لگا دی۔ عبادت گاہ کے اندر عبادت میں مصروف ایک سو دس راہب جل کر راکھ ہوگئے۔ آٹھ راہبوں کی ایک ٹولی نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی مگر ان میں سے تین شہنشاہ کے فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے جبکہ پانچ راہب کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

"شاؤلن ٹمپل سے فرار ہونے والے پانچوں راہب ایک دریا کے کنارے پر پہنچ گئے جہاں انہیں لوبان سلگانے والا، تین ٹانگوں والا ایک ایسا برتن ملا جس پر "چنگ کا تختہ الٹ دو۔ منگ سلطنت بحال کرو" کے الفاظ کندہ تھے۔ ان پانچوں راہبوں نے اس "نعرے" کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ ایک فوجی دستہ ان کے تعاقب میں تھا۔ وہ اس سے بچنے کے لیے ایک کشتی پر دریا پار کرکے دوسری طرف پہنچ گئے۔ چند کوس آگے ایک اور دریا ان کے راستے میں حائل تھا۔ یہاں بھی ایک فوجی دستہ پہرا دے رہا تھا لیکن جس طرح غیبی طور پر پہلے

دریا کے کنارے پر ایک کشتی مل گئی تھی اسی طرح انہیں یہاں بھی غیبی امداد مل گئی اور وہ محافظوں کی نظروں میں آئے بغیر پل کے قریب سے پتھروں پر چلتے ہوئے دریا پار کرکے دوسری طرف پہنچ گئے اور طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ریاست فوکین کے ایک چھوٹے سے شہر پہنچ گئے۔ یہیں پر انہوں نے ٹریاڈ تنظیم کی بنیاد رکھی اور "چنگ سلطنت کا تختہ الٹنے اور منگ سلطنت کی بحالی" کے مشن پر کام شروع کردیا۔

"ان کا مشن کامیابی سے جاری تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ٹریاڈ تنظیم میں شامل ہورہے تھے۔ چنگ شہنشاہ کے خلاف غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ پورے صوبۂ فوکین پر قبضہ کرنے کے بعد پانچ راہبوں نے اپنی تیار کردہ فوج کے ساتھ چنگ پر حملہ کردیا لیکن سرکاری فوجوں کے ہاتھوں ہزاروں لوگ مارے گئے۔

"بغاوت ناکام ہونے کے بعد پانچوں راہب ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئے تاکہ لوگوں کو چنگ شہنشاہ کے خلاف بھڑکا کر اس قسم کی بغاوتیں کروائی جائیں اور شہنشاہ کا تختہ الٹ دیا جائے۔"

سردار تھالوب خاموش ہوگیا۔ اس نے اشارے سے لوما کو کافی یا چائے لانے کے لیے کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"ٹریاڈ تنظیم کا سفر جاری رہا۔ یہ سو فی صد قوم پرستوں کی تنظیم تھی جو مختلف ادوار میں ظالم اور سفاک حکمرانوں کے خلاف برسرپیکار رہی۔ ہر خفیہ تنظیم کی طرح ٹریاڈ کے بھی اپنے کچھ اصول تھے۔ ہر ممبر کو تنظیم کے وضع کردہ چھتیس اصولوں پر پابند رہنے کا حلف اٹھانا ہوتا تھا۔ تنظیم سے غداری کی سزا موت تھی۔

"یہ تنظیم کئی گروپوں میں منقسم تھی۔ ہر گروپ اپنے اپنے علاقے میں سرگرم تھا لیکن کسی نہ کسی طرح یہ کسی نہ کسی ایک مرکز کے تحت متحد بھی تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں بیرونی ممالک میں بھی اس تنظیم کی لاتعداد برانچیں قائم ہوچکی تھیں۔

"ڈاکٹر سن یات سین بھی ٹریاڈ کا ایک سرگرم رکن تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اس نے چین میں عوامی جمہوریہ کے قیام کی جدوجہد شروع کی تو بیرونی ممالک میں تنظیم کی برانچوں نے دل کھول کر فنڈز فراہم کیے اور پھر چین میں شہنشاہیت کے خاتمے اور عوامی جمہوریہ کے قیام کے بعد ٹریاڈ تنظیم کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی تنظیم کی رکن سازی میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ تنظیم اس قدر طاقتور بن گئی کہ اسے پریشر گروپ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اعلیٰ سرکاری آفیسرز بھی اس کا ممبر بننے میں ہی اپنی عافیت سمجھنے لگے۔ بڑے بڑے صنعت کار اور تاجر بھی اپنے تحفظات کے لیے ٹریاڈ کے سائے میں آگئے۔

"اس طرح کی کسی تنظیم کو سیاسی پشت پناہی اور قوت مل جائے تو اس کے لیے اپنے اصل مقصد سے ہٹ کر جرائم کی طرف مائل ہونا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ ٹریاڈ کے پاس طاقت بھی تھی اور سیاسی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ اس کی سرگرمیوں کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ کاروباری لوگوں سے تحفظ فراہم کرنے کے نام پر بھتے، ڈکیتیاں، دہشت گردی اور قتل و غارت کی وارداتوں میں ٹریاڈ کا نام آنے لگا۔ ری پبلکن انقلاب کے بعد تو ٹریاڈ کے بعض دھڑے مست ہاتھی کی طرح بے قابو ہوگئے تھے۔ ان دھڑوں سے وابستہ لوگ کھلے عام سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے لگے۔ قانون ان کے سامنے بے بس ہوکر رہ گیا تھا۔ ٹریاڈ کا ہر دھڑا اپنی جگہ خود مختار اور پوری طرح جرائم میں ملوث ہوکر رہ گیا تھا۔ ان کی مرکزیت ختم ہوگئی تھی۔ ان کے سامنے لوٹ مار اور قتل و غارت کے سوا کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں کوئی بڑا سیاسی مقصد ہی انہیں ایک مرکز پر لاسکتا تھا۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۶ء کے درمیانی عرصے میں ہانگ کانگ میں اینٹی کمیونسٹ کاز کے نام پر ٹریاڈ کے ان دھڑوں کو متحد کرنے کی متعدد کوششیں کی گئیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے اس تنظیم کے لوگ جرائم کے راستے پر اس قدر آگے نکل چکے تھے کہ ان کی واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔

"ہانگ کانگ ٹریاڈ کی جرائم پیشہ ذیلی تنظیموں کا گڑھ بن چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں یہاں ٹریاڈ کے سات بڑے گروپ تھے جنہوں نے مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے علاقے بانٹ رکھے تھے۔ ان گروپوں کی برانچیں بھی تھیں جو علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں اور انہیں اپنے اپنے ہیڈ کوارٹر سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ بعض گروپ ٹریڈ یونین، رفاہی و سماجی اداروں اور اسپورٹس کلبوں کی آڑ میں اپنی مجرمانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔

"یہ چین کا بدترین اقتصادی دور تھا۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ روزگار کے مسائل بھی بڑھ رہے تھے۔ ایک عام آدمی کو ایک وقت کی روٹی کمانے کے لیے کڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ روزگار کا حصول ایک سنگین مسئلہ

بن گیا تھا۔ ایک طرف عوام نان شبینہ تک کو محتاج تھے تو دوسری طرف سرکاری ملازمین کرپشن کی دلدل میں دھنس گئے تھے۔ وہ اپنے فرائض منصبی کو پس پشت ڈال کر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے لگے۔ زندگی کے عام شعبوں میں بھی کرپشن پھیلنے لگی۔

"صورت حال جب ایسی ہو تو جرائم پیشہ لوگوں کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے چین کے بڑے بڑے شہروں اور خصوصاً ہانگ کانگ میں نئی جرائم پیشہ تنظیمیں جنم لینے لگیں اور پرانی تنظیمیں اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے ان نئی تنظیموں کا راستہ روکنے کی کوشش کرنے لگیں۔ ایک دوسرے کے علاقے میں مداخلت کے نتیجے میں خونی تصادم روز مرہ کا معمول بن گئے۔ تریاڈ کے بعض گروپ اب بھی پاور میں تھے۔ یہ گروپ لوگوں کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی زندگیوں، املاک اور کاروبار کے تحفظ کے لیے ان کے ممبر بنیں اور بھتا ادا کریں۔ انکار کی صورت میں ان کا کاروبار تباہ کردیا جاتا، املاک کو نذر آتش کردیا جاتا اور بعض لوگوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

"ہانگ کانگ میں جرائم میں سب سے زیادہ اضافہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ ۱۹۴۱ء سے پہلے ہانگ کانگ کی آٹھ یا نو فیصد آبادی تریاڈ سے وابستہ تھی۔ ۱۹۵۸ء میں یہ وابستگی پندرہ فی صد سے بھی بڑھ گئی۔

"تریاڈ کے بعض گروپ متحد ہو کر پہلے سے زیادہ طاقت ور ہو گئے تھے۔ طوائفوں کے بزنس، جوئے، منشیات فروشی اور جرائم کے دیگر تمام شعبوں پر ان کی اجارہ داری قائم ہوگئی۔ چین کے اندرونی شہروں کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی عجیب کساد بازاری کا دور تھا۔ جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جاپانی فوجیں اگرچہ واپس جا چکی تھیں مگر چین میں کمیونسٹوں اور قوم پرستوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ بالآخر ۱۹۴۹ء میں کمیونسٹوں نے قوم پرستوں کو عملی طور پر سمندر میں دھکیل دیا۔ قوم پرست مہاجروں کے قافلے ہانگ کانگ کا رخ کرنے لگے۔ ان میں جرائم پیشہ بھی تھے اور جو جرائم پیشہ نہیں تھے، وہ بھی ایک وقت کی روٹی کے لیے جرائم کا ارتکاب کرنے لگے۔

"افراتفری کے اس دور میں ہانگ کانگ میں ریڈ پانگ اور گرین پانگ نام کی دو اور تنظیمیں سامنے آئیں۔ ریڈ پانگ نے تو اپنی توجہ لیبر یونین، عورتوں کے کاروبار، جوئے اور منشیات کی فروخت تک محدود رکھی لیکن گرین پانگ ہشت پا کی طرح ہر طرف پھیل رہی تھی۔ بہت مختصر سے عرصے میں اس کے ممبروں کی تعداد اسی ہزار سے تجاوز کرگئی۔ گرین پانگ کے ممبروں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور مجرمانہ سرگرمیاں دوسری جرائم پیشہ تنظیموں خصوصاً تریاڈ گروپس کے لیے کھلی دھمکی تھی۔ گرین پانگ ان کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ تریاڈ نے بھی اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے اپنے ممبروں کی تعداد بڑھانا شروع کردی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرین پانگ اور تریاڈ میں ٹسل شروع ہوگئی۔ آئے دن چھوٹے موٹے تصادم ہونے لگے اور بالآخر ۱۹۵۶ء میں وہ طوفان پھٹ پڑا جس کا لوگوں کو ایک عرصے سے خوف تھا۔ تریاڈ اور گرین پانگ کے خونی تصادم میں سیکڑوں لوگ مارے گئے۔ جزیرے کی پولیس بے بس تماشائی بنی رہی۔

"اس خونی تصادم میں فتح بالآخر تریاڈ ہی کی ہوئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ طاقت ور بن گئے۔ اس کے مظالم اور جرائم کا دائرہ کچھ اور وسیع ہوگیا۔ ہر شخص ان سے خوف زدہ تھا۔ کوئی بھی شخص بھتا دیے بغیر کوئی معمولی سا کاروبار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایک اسٹریٹ ہاکر کو بھی فٹ پاتھ پر اپنا ٹھیا لگانے کے لیے چند فٹ جگہ کا کرایہ دینا پڑتا تھا اور اپنے سامان وغیرہ کی حفاظت کے لیے الگ بھتا دینا پڑتا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں تریاڈ کے غنڈے اس کا سامان تہس نہس کردیتے اور اس کی جگہ کسی اور کو دے دی جاتی۔ صرف اسٹریٹ ہاکروں سے تریاڈ کو روزانہ دو ہزار امریکی ڈالرز کی آمدنی ہو رہی تھی۔ جوتے پالش کرنے والے لڑکوں، طوائفوں، ہوٹلوں میں ڈانس کرنے والی لڑکیوں، ریسٹورنٹس، تھیٹر اور اسپورٹس کلبوں کے فروخت ہونے والے ٹکٹوں پر جگا ٹیکس کی آمدنی الگ تھی۔ تاہم تریاڈ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ منشیات فروشی، جوئے، جرائم پیشہ لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا، رکشا ٹیکسی ڈرائیوروں اور عام مزدوروں سے بھتے کی وصولیابی کی صورت میں تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ہانگ کانگ کی آبادی تیس لاکھ تھی اور ایک محتاط اندازے کے مطابق اس آبادی سے بھتوں کی صورت میں تریاڈ کی آمدنی ستر لاکھ امریکی ڈالر سے زیادہ تھی۔ تشدد اور دہشت گردی اس آمدنی کے حصول کے لیے تریاڈ کا مؤثر ترین ہتھیار تھی۔

"جنرل کھوراٹ ان دنوں گولڈن ٹرائی اینگل میں قدم جما رہا تھا۔ اس دوران میں وہ وقتاً فوقتاً ہانگ کانگ کے چکر لگاتا اور گہری نظروں سے حالات کا مشاہدہ کرتا رہا۔ کئی سال بعد جب وہ گولڈن ٹرائی اینگل میں اپنی جڑیں مضبوط کرچکا تو اس نے ہانگ کانگ میں تریاڈ کے چند گروپوں کو متحد کیا اور خود ان کا سربراہ بن گیا۔ ہانگ کانگ میں اگرچہ اس وقت اور

بھی بہت سے جرائم پیشہ گروہ سرگرم ہیں مگر تریاڈ کو سب سے زیادہ طاقت ور گروہ سمجھا جاتا ہے۔ ہانگ کانگ منشیات کی دنیا میں سب سے بڑی منڈی ہے اور یہاں اڑتالیس فی صد منشیات گولڈن ٹرائی اینگل سے آتی ہیں۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے تم جنرل کھوراٹ کی طاقت کا اندازہ لگا سکتے ہو۔" سردار تھالوب خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

سردار تھالوب کی باتوں نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے دماغ میں تیز سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں بنکاک میں دیکھ چکا تھا کہ منشیات فروشوں کے مختلف گروہ کسی ایک اڈے پر قبضہ جمانے کے لیے کس طرح آپس میں برسرِپیکار رہتے تھے۔ خون کی ندیاں بہادی جاتی تھیں اور یہ سب کچھ صرف اور صرف دولت کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے۔ اخلاق' شرافت' رواداری اور دوسری انسانی قدریں دم توڑ چکی ہیں۔ اہمیت صرف دولت کی رہ گئی ہے اور اس کے لیے دوسروں کو بڑی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

لوما بہت دیر پہلے ہمارے سامنے کافی رکھ گیا تھا لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے بھی کپ نہیں اٹھایا تھا۔ نتیجتاً کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ سردار تھالوب کے اشارے پر لوما نے دونوں کپ اٹھا لیے اور تھوڑی دیر بعد تازہ کافی بنا کر لے آیا۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بھی ہم جنرل کھوراٹ اور تریاڈ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ پانچ بجے کے قریب سردار تھالوب اٹھ گیا۔

"میں نو بجے تک آجاؤں گا۔ تم لوگ تیار رہنا۔ ہم کھانا کھاتے ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔" تھالوب کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

رنگولی اس کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ تینوں کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں' میں اٹھ کر لان میں آ گیا۔

سردار تھالوب ٹھیک نو بجے واپس آ گیا تھا۔ اس کے آتے ہی لوما نے میز پر کھانا لگا دیا۔

کھانے کے بعد کافی بھی پی گئی اور پھر دس بجے کے قریب ہم لوما سے رخصت ہو کر جیپ میں بیٹھ گئے۔ ہمیں رخصت کرتے وقت لوما کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پچھلے چند روز کے دوران میں مجھے بھی اس سے کچھ انس سا ہو گیا تھا۔

جیپ کاٹیج کے گیٹ سے نکل کر گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جانے والی سڑک کے بجائے دوسری طرف مڑ گئی۔ دریا تک پہنچنے کے لیے اس مرتبہ سردار تھالوب نے ایک نئے راستے کا انتخاب کیا تھا جو اگرچہ خاصا طویل مگر محفوظ تھا۔

جیپ پہاڑوں میں ایک جگہ چھوڑ دینی پڑی اور ہمیں تقریباً دو کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا۔ اگر سردار تھالوب کے پاس ٹارچ نہ ہوتی تو گہری تاریکی میں اس خطرناک پہاڑی راستے پر چار قدم چلنا بھی ممکن نہ ہوتا۔ ٹارچ بھی چھوٹی تھی۔ اس کی روشنی کا مختصر سا دائرہ ہمارے قدموں کے سامنے زمین پر پڑ رہا تھا اور پھر ایک جگہ تھالوب نے ٹارچ بھی بجھا دی' اس سے آگے تقریباً دو سو گز کا فاصلہ ہمیں تاریکی میں ہی طے کرنا پڑا تھا۔ پہلے ہم چھوٹی چھوٹی چٹانوں پر چڑھتے رہے پھر نشیب میں اترنے لگے۔ چٹانوں سے لہروں کے ٹکرانے کی آواز سے اندازہ ہو گیا کہ ہم دریا کے کنارے پر پہنچ چکے ہیں۔

سردار تھالوب ایک جگہ کھڑا چند لمحوں تک تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورتا رہا پھر اس کے منہ سے کسی جانور کی عجیب سی آواز نکلی۔ چند سیکنڈ سناٹا رہا اور پھر بائیں طرف تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایسی ہی ایک آواز ابھری۔ سردار کے ساتھ میں نے بھی اس طرف دیکھا۔ مجھے ایک لمحے کو ایسا لگا تھا جیسے اس طرف کوئی جگنو سا چمک کر غائب ہو گیا ہو۔

ہم اس طرف چلنے لگے۔ تاریکی میں پتھروں پر چلنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ رنگولی اور جانکی نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام رکھے تھے جبکہ سردار تھالوب ہم سب سے آگے تھا۔

ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے نسبتاً ہموار جگہ پر چھ سات آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ قبائلی تھے۔ تھالوب ایک قبائلی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے جواب دیتے ہوئے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بھی سردار تھالوب کے ساتھ اس قبائلی کے ساتھ چلتا ہوا نیچے آ گیا۔

یہاں اونچی جھاڑیاں دریا کے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دریا کے کنارے پر بعض درختوں کی شاخیں بھی پانی پر جھکی ہوئی تھیں اور ان جھاڑیوں کی آڑ میں پانی میں ایک کشتی کھڑی تھی۔ اس کشتی میں کم از کم چھ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کشتی میں انجن فٹ تھا اور اس میں کچھ سامان بھی رکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ کشتی تفریح گاہ والے گھاٹ کی طرف سے لائی گئی ہوگی لیکن جب سردار تھالوب نے یہ بتایا کہ قبائلی وہ وزنی کشتی ان دشوار گزار پہاڑیوں میں اپنے کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔

"کشتی میں آٹومیٹک رائفلیں اور اتنا ایمونیشن موجود

ہے کہ تم لوگ آسانی سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے جا سکو۔" سردار تھالوب بتا رہا تھا اور پھر اس نے ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا "یہ آدمی تم لوگوں کے ساتھ جائے گا اور گولڈن ٹرائی اینگل والے کنارے پر اتار کر اڑتالیس گھنٹوں تک دریا کے وسط والے جزیرے پر تمہارا انتظار کرے گا۔"

میں نے کشتی میں اتر کر دیکھا۔ اس میں تین آٹومیٹک رائفلوں کے ساتھ بھرے ہوئے کئی میگزین بھی موجود تھے اور پھر اپنے بازو پر پانی کے چھینٹے محسوس کر کے میں چونک گیا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان پر گہرے بادل تو صبح ہی سے تھے اور اس وقت ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

"اچھا شگون ہے۔" سردار تھالوب نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس طرف اگر گولڈن ٹرائی اینگل کے محافظ گشت پر بھی ہوئے تو بارش سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ میں دبک جائیں گے اور تم لوگوں کو کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کا موقع مل جائے گا۔ اب زیادہ دیر مناسب نہیں ہوگی۔ تم لوگ روانہ ہو جاؤ۔"

میں کشتی سے باہر آ کر سردار تھالوب سے بغل گیر ہو گیا۔

"تمہاری صحبت کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا تھالوب۔ زندہ رہا تو پھر کبھی نہ کبھی ملاقات ضرور ہوگی۔" میں نے کہا۔

سردار تھالوب نے میرے گال پر بوسہ دیا اور زیرِ لب کچھ بڑبڑانے لگا۔ شاید وہ کوئی دعا پڑھ رہا تھا۔ رنگولی' جانکی اور سونیا سے الوداعی ملاقات کرنے کے بعد مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے بھی میرے گال پر بوسے دیے اور پھر ہم کشتی پر سوار ہو گئے۔

تھالوب کے آدمی نے کشتی پر اپنی سیٹ سنبھال لی اور بٹن دبا کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ انجن کی آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔

کشتی حرکت میں آ گئی اور جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر دریا کے کھلے پانی کی طرف بڑھنے لگی۔ سونیا' جانکی اور میں تھالوب اور رنگولی کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔

میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا اور یہ احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا کہ ہم زندگی سے دور اور موت کے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔

○☆○

بارش کی بوندیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔

گہری تاریکی میں دریا کے وسط میں وہ چھوٹا سا جزیرہ ایک سیاہ دھبے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کشتی آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہی تھی۔ میں کشتی کے کنارے کے ساتھ لگا بیٹھا گہری نظروں سے کبھی اس جزیرے کی طرف اور کبھی دریا کے اس تاریک کنارے کی طرف دیکھنے لگتا جہاں سے گولڈن ٹرائی اینگل کی سرحد شروع ہوتی تھی۔

میرے ہاتھ میں بھی رائفل تھی اور جانکی اور سونیا نے بھی رائفلیں سنبھال رکھی تھیں۔ وہ دونوں اس طرح پوزیشن لیے بیٹھی تھیں کہ کسی ہنگامی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

کشتی تقریباً پانچ منٹ میں اس جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔ قبائلی کشتی کو کنارے کے بالکل قریب لے گیا تاکہ دور سے نظر نہ آسکے۔ اسی وقت بارش بند ہو گئی۔ قبائلی نے کشتی کا انجن بند کر دیا تھا۔ وہ گہری نظروں سے دریا کے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ موقع ہے باس۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "نکل چلیں؟"

"ہاں چلو۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

انجن اسٹارٹ ہوا اور کشتی حرکت میں آ گئی۔ سونیا اور جانکی بھی سامنے کے رخ پر پوزیشن لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ میں نے رائفل کی نال کشتی کے کنارے پر ٹکا رکھی تھی اور انگلی ٹریگر پر تھی جبکہ نظریں سامنے تاریکی میں بھٹک رہی تھیں۔

بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ اس وقت موٹی بوندوں کے بجائے بالکل ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں کنارے پر درختوں کے تاریک ہیولوں کی طرف دیکھتے ہوئے کسی بھی قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ درختوں کے ہیولے لمحہ بہ لمحہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔

کنارے سے بیس پچیس گز دور قبائلی نے انجن بند کر دیا۔ کشتی کنارے کی طرف بڑھتی رہی۔ اس کی رفتار خود بخود کم ہوتی چلی گئی تھی اور بالآخر کشتی کنارے پر جھکی ہوئی جھاڑیوں میں پہنچ کر رک گئی۔

قبائلی نے تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ دائیں طرف دس بارہ فٹ فاصلے پر ایک بڑا سا پتھر تھا جس پر چڑھ کر کنارے پر پہنچا جا سکتا تھا۔ قبائلی نے کشتی میں پڑی ہوئی ایک رسّی اٹھا لی جس کے سرے پر ایک آہنی آنکڑا بندھا ہوا تھا۔ اس نے وہ آنکڑا پتھر کی طرف اچھال دیا۔ کھناک کی آواز ابھری' آنکڑا پتھر کے دوسری طرف گرا تھا۔ قبائلی رسّی کو کھینچنے لگا۔ آنکڑا پتھر میں اٹک گیا تھا۔ رسّی ٹائٹ ہوئی تو کشتی آہستہ آہستہ پتھر کی طرف رینگنے لگی اور بالآخر پتھر کے ساتھ ٹک کر

رک گئی۔

کچھ دیر تک ہم بے حس و حرکت کشتی میں بیٹھے رہے۔ میں کسی قسم کی آہٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر تیز ہوا میں جھاڑیوں کی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے سونیا اور جانکی کو اشارہ کیا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے بیگ اسٹریپ کی مدد سے پشت پر لاد لیے۔ انہوں نے کچھ فاضل میگزین بھی اپنے اپنے بیگ میں ٹھونس لیے تھے۔ دو دو میگزین پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیے تھے۔ میں نے بھی دو فاضل میگزین اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیے اور کشتی سے نکل کر پتھر پر آگیا۔ اس وقت میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ یہ موت کی وادی میں میرا پہلا قدم تھا۔ میں نے جانکی اور سونیا کو بھی سہارا دے کر پتھر پر کھینچ لیا اور قبائلی کی طرف ہاتھ ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آنکڑے والی رسّی اٹھا کر کشتی میں ڈال دی تھی۔

انجن اسٹارٹ ہوا اور کشتی حرکت میں آکر تیزی سے دریا کے کھلے پانی کی طرف تیرنے لگی۔ میں کشتی کی طرف دیکھتا رہا جو بالآخر دور ہو کر تاریکی میں مدغم ہو گئی۔

پھوار بدستور پڑ رہی تھی۔ ہم تینوں رائفلیں سنبھالے بے حس و حرکت اس پتھر پر بیٹھے رہے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ہماری آمد کا کسی کو پتا نہیں چل سکا تو میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تاریکی میں اِدھر اُدھر گھورنے لگا۔ اس سے آگے ایک اور پتھر تھا جو کنارے سے ملا ہوا تھا۔ ہم تینوں اس پتھر پر آگئے اور پھر کنارے پر قدم رکھنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا تھا۔

جھاڑیاں کنارے کے اوپر کافی دور تک چلی گئی تھیں۔ ہم تینوں کمانڈوز کی طرح قطار میں چلتے ہوئے ان جھاڑیوں میں کافی دور تک چلے گئے۔ اس سے آگے جھاڑیاں اگرچہ کم ہوتی چلی گئی تھیں لیکن اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ہم رکے بغیر چلتے رہے۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی اور میں دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے عام حالات میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ محافظوں کا گشت رہتا ہو لیکن اس وقت ہلکی بارش ہمارے لیے پناہ بن گئی تھی۔

ہم کنارے سے تقریباً پانچ سو گز اندر آچکے تھے۔ ہمیں واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا جیسے بتدریج بلندی کی طرف جا رہے ہوں۔ سونیا میرے پیچھے تھی اور وہ ہانپنے لگی تھی۔

ہم نے چند ہی گز کا مزید فاصلہ طے کیا تھا کہ دائیں طرف نشیب میں بہت دور روشنی چمکتی دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ روشنی متحرک تھی جو چند سیکنڈ نظر آئی پھر غائب ہو گئی اور ایک منٹ بعد دوبارہ دکھائی دی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی گاڑی تھی جو ناہموار آڑے ترچھے راستے پر دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اسی طرف آرہی تھی۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ کیا ان لوگوں کو پتا چل گیا ہے؟ اور کیا وہ گاڑی ہماری ہی تلاش میں اس طرف آرہی ہے۔ سونیا اور جانکی نے بھی گاڑی کی روشنی دیکھ لی تھی۔

"ہاں وہ۔۔۔" سونیا نے سرگوشی میں غالباً اس گاڑی کے بارے میں کچھ کہنا چاہا تھا مگر آواز اس کے حلق میں اٹک گئی تھی۔

"میں نے دیکھ لیا ہے۔" میں نے کہا اور متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر سونیا اور جانکی کو اشارہ کرتا ہوا تیزی سے ایک درخت کی طرف لپکا جس کے اطراف میں گنجان اور قد آدم جھاڑیاں تھیں۔ ایسی جگہوں پر سانپ بچھو یا دیگر زہریلے کیڑے مکوڑوں کا خوف رہتا ہے لیکن جب اس سے زیادہ خوفناک موت سامنے ہو تو زہریلے کیڑے مکوڑوں کی پروا کون کرتا ہے۔

ہم تینوں جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تیار تھیں اور نظریں اس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیوں پر تھیں۔ وہ روشنیاں کبھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور کبھی سامنے آجاتیں۔ ان روشنیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب ہمارے اور اس گاڑی کے بیچ کوئی ایسی رکاوٹ نہیں تھی البتہ جھاڑیاں اور درخت تھے لیکن روشنی مسلسل ہماری نگاہوں میں تھی۔

وہ گاڑی دریا کی طرف نشیب میں ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ ایک مرتبہ وہ ذرا سا گھومی تو تیز روشنی ٹھیک ان جھاڑیوں پر پڑی جہاں ہم چھپے ہوئے تھے لیکن ایک لمحے بعد ہی روشنی کا رخ بدل گیا۔

وہ ایک کھلی جیپ تھی جس کی چھت پر بھی ایک چھوٹا بلب جل رہا تھا اور اس بلب کی روشنی میں چھت پر نصب مشین گن صاف نظر آرہی تھی۔ ایک آدمی دونوں ہاتھ مشین گن پر رکھے چوکس کھڑا تھا اور تین آدمی آٹومیٹک رائفلیں لیے جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

یہ محافظوں کی گشتی جیپ تھی جو دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ گشت کر رہی تھی۔ وہ جیپ ہم سے تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزر گئی۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

"اگر یہ جیپ بیس پچیس منٹ پہلے آجاتی تو؟" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔

"جب ایسا ہوتا تو اس وقت سوچا جاتا۔" میں نے جواب دیا "مگر فی الحال خطرہ ٹل گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم تھوڑی دیر اور یہاں رکیں گے۔"

میں اب بھی اس جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کی دور ہوتی ہوئی عقبی سرخ بتیاں کبھی نگاہوں میں آجاتیں اور کبھی غائب ہو جاتیں اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد وہ روشنیاں بالکل غائب ہو گئیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ جیپ واپس ضرور آئے گی اور اس سے پہلے ہمیں یہاں سے کچھ دور نکل جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں بھی کھڑی ہو چکی تھیں۔ ہم جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے بلندی کی طرف چلنے لگے۔ تقریباً سو گز آگے جا کر ڈھلان شروع ہو گئی۔ اب اگرچہ پھوار بھی بند ہو چکی تھی لیکن ڈھلان پر پھسلن تھی اور چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ میں خود کئی مرتبہ گرتے گرتے بچا تھا۔

ہم دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے۔ جانکی اور سونیا تھک گئی تھیں اور بری طرح ہانپ رہی تھیں۔

"اب ایک قدم بھی نہیں چلا جاتا۔" جانکی نے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کوئی جگہ تلاش کرو جہاں کچھ دیر ستایا جا سکے۔"

"وہ آگے چٹانیں نظر آرہی ہیں۔ وہاں شاید کوئی جگہ مل جائے۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ چٹانیں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھیں۔ سونیا اور جانکی جیسے تیسے وہاں تک پہنچ گئیں۔ یہ پہاڑیاں کانٹے دار جھاڑیوں اور اونچے درختوں سے لدی ہوئی تھیں۔ میں آگے بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ مجھے ان پہاڑیوں میں تنگ سی کھوہ نظر آئی۔ یہ دراڑ اس قدر تنگ تھی کہ ایک آدمی بمشکل گھسٹ کر گزر سکتا تھا۔

میں اس تنگ سی دراڑ میں گھستا چلا گیا۔ سونیا اور جانکی بھی میرے پیچھے ہی آرہی تھیں۔ تقریباً پندرہ فٹ آگے جا کر دراڑ کچھ کشادہ ہو گئی اور پھر میں اچانک ہی کھلی جگہ پر نکل آیا۔

تقریباً سو مربع فٹ جگہ تھی اور اس کے اطراف میں بلند عمودی چٹانیں تھیں جن کے اوپر فلک بوس درختوں نے سایہ کیا ہوا تھا۔ اس جگہ آمد و رفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا یعنی وہ دراڑ جس سے ہم گزر کر آئے تھے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بہت اوپر درختوں کی جھومتی ہوئی شاخیں اور ان سے اوپر بادلوں سے ڈھکا ہوا تاریک آسمان تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی بہت گہرے کنوئیں کی تہ میں کھڑے ہوں۔

پیروں کے نیچے زمین گیلی تھی۔ کسی کسی جگہ پانی بھی کھڑا تھا۔ اندھیرے میں اس جگہ کا ٹھیک سے جائزہ نہیں لیا جا سکتا تھا لیکن سونیا نے میری یہ مشکل حل کر دی۔

"میرے پاس ٹارچ موجود ہے۔ بیگ میں رکھی ہوئی ہے۔ میں ابھی نکالتی ہوں۔" سونیا نے کہتے ہوئے اپنی رائفل جانکی کو تھما دی اور بیگ کندھے سے اتار کر زپ کھولی اور اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دو سیل والی ایک ٹارچ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دی۔

میرے خیال میں یہاں اگرچہ کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں نے ٹارچ جلانے سے پہلے احتیاطاً چٹانوں پر اوپر کی طرف دیکھ لیا تھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے ٹارچ جلالی اور اس کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بائیں طرف تیس پینتیس فٹ کے فاصلے پر ایسی ہی ایک اور دراڑ نظر آئی جو نسبتاً کشادہ تھی۔ میں اس کے اندر گھستا چلا گیا۔ آٹھ دس فٹ آگے جا کر یہ دراڑ بائیں طرف مڑ گئی اور اس طرف ایک مختصر سا غار دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ غار بمشکل دس فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا ہو گا لیکن ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔ غار کا فرش اگرچہ ناہموار تھا مگر صاف تھا۔ کونے میں تین پتھر چولہے کی طرح رکھے ہوئے تھے جن کے بیچ میں راکھ پڑی ہوئی تھی اور اوپر غار کی دیوار اور چھت کالی ہو رہی تھی۔

یہ یقیناً کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جسے خفیہ کہا جا سکتا۔ جنرل کھوراٹ کے آدمی اپنے اس خطے کی ایک ایک انچ زمین سے واقف ہوں گے اور پتھروں کا یہ چولہا اور اس میں پڑی ہوئی راکھ یہ ثابت کر رہی تھی کہ یہ غار پہلے بھی کسی کی رہائش کے لیے استعمال ہو چکا تھا۔ میں نے جھک کر چولہے میں پڑے ہوئے کوئلوں اور راکھ کو دیکھا۔ ان پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی جس سے مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ یہ غار بہت عرصہ پہلے استعمال کیا گیا تھا۔ فرش پر بھی دھول جمی ہوئی تھی۔

باہر آکر میں نے سونیا اور جانکی کو اس غار میں بٹھایا اور ٹارچ کی روشنی میں دوسری اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف چٹان کا ایک حصہ سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔

اس سائبان کے نیچے اتنی جگہ تھی کہ چار پانچ آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔

اطراف میں چٹانیں بالکل عمودی اور چکنی تھیں۔ بالکل کسی گہرے کنوئیں کی طرح۔ چٹانی سائبان کے نیچے کی جگہ بھی اگرچہ ہمارے لیے محفوظ تھی لیکن ہم نے غار کے اندر بیٹھنے کو ترجیح دی اور کشادہ دراڑ میں سے ہوتے ہوئے غار میں آگئے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں ایک مرتبہ پھر غار کا جائزہ لیا اور دہانے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ باہر سے اس کنواں نما جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے میرا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ یہاں آمدورفت کا صرف ایک ہی راستہ تھا لیکن وہ تنگ سی دراڑ جس سے ہم اندر آئے تھے۔ یہاں ہم محفوظ تو تھے لیکن اگر کسی کو یہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہو جاتا تو ہمارے فرار ہونے کا... کوئی راستہ نہ ہوتا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جانکی اور سونیا بھی سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکی تھیں۔ بارش کی وجہ سے میرے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ قمیص بدن سے چپکی ہوئی تھی اور عجیب سی الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے قمیص اتار کر دہانے کے قریب ہی ایک پتھر پر ڈال دی اور ٹارچ بجھا کر رائفل کے قریب ہی رکھ لی۔ ٹارچ جلائے رکھنا مناسب نہیں تھا۔ بعد میں بھی اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سیل ختم ہو جاتے تو ٹارچ ہمارے لیے بیکار ہو جاتی۔

پہاڑی راستوں پر پیدل سفر کرنا بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ کشتی سے اترنے کے بعد ہم نے اگرچہ زیادہ سے زیادہ چار میل کا فاصلہ طے کیا تھا لیکن تھکن سے میری ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ سونیا اور جانکی کی حالت تو شاید مجھ سے بھی بری تھی۔ ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر جانکی کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ سونیا اب بھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے شاید بیگ میں سے کوئی کپڑا نکال کر نیچے بچھا لیا تھا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ مجھے کچھ دیر بعد بھی سنائی دیتی رہی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم میں سے کم از کم ایک فرد جاگتا رہتا لیکن تھکن تو ہم تینوں پر سوار تھی۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ سونیا میرے بعد کتنی دیر تک جاگتی رہی تھی۔

میری آنکھ کھلی تو دن کی مدھم سی روشنی غار کے دہانے اور کچھ اندر تک پہنچ رہی تھی۔ میرے دماغ میں اب بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا۔ دراڑ کے باہر کی روشنی دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ آسمان بادلوں سے صاف ہو گیا تھا اور سورج نکلا ہوا تھا۔

دھوپ اگرچہ اس کنوئیں تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر اوپر درختوں کی شاخوں پر دھوپ کی چمک صاف نظر آرہی تھی۔

میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دیکھا تو ایک گڑھے میں پانی نظر آگیا۔ ایک چٹان کی طرف سے تھوڑا تھوڑا پانی آکر اس گڑھے میں جمع ہو رہا تھا اور دوسری طرف سے بہہ رہا تھا۔ میں نے چند گھونٹ پیے، منہ ہاتھ دھویا اور اندر آگیا۔

تھوڑی دیر بعد جانکی بھی منہ ہاتھ دھو کر آگئی اور سونیا نے اپنے بیگ میں سے ایک ٹن نکال لیا۔ کٹر سے ڈھکنا کاٹا اور ڈبا سامنے رکھ دیا۔ چکن کے تلے ہوئے نمکین بریسٹ پیس تھے۔ یہی ہمارا ناشتا تھا اور یہی کھانا بھی۔ ہمارے پاس خوراک زیادہ نہیں تھی اور ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک کوئی اور بندوبست نہ ہو جائے اس خوراک کو احتیاط سے استعمال کریں گے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم غار سے باہر آگئے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ درختوں کی شاخوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ میں رائفل سنبھالے اس تنگ سی دراڑ میں داخل ہو گیا جس سے گزشتہ رات ہم اندر آئے تھے۔ دراڑ سے باہر نکل کر میں نے جیسے ہی سامنے دیکھا، مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سامنے تاحدِ نگاہ ہر طرف آتشی گلابی رنگ بکھرا ہوا تھا۔ وہ دراصل پوست کی فصل تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے جنہوں نے تاحدِ نگاہ زمین پر شفق کا رنگ بکھیر دیا تھا۔ دنیا کا حسین ترین پھول جس میں خوفناک زہر بھرا ہوا تھا۔

سونیا اور جانکی بھی دراڑ سے باہر آگئی تھیں اور وہ دونوں بھی یہ حسین منظر دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی تھیں۔ رات کی تاریکی میں ہم جنہیں جھاڑیاں سمجھتے رہے تھے وہ دراصل یہی پوست کے پودے تھے۔

"ارے۔ وہ دیکھو" جانکی نے بائیں طرف اشارہ کیا۔ بہت دور ایک پہاڑی کے عقب سے دھوئیں کی ایک لکیر اٹھ رہی تھی "کہیں آگ لگی ہے یا....."

"آگ نہیں لگی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میرا خیال ہے اس طرف کوئی بستی ہے اور ہمیں اس طرف کا رخ کرنا چاہیے۔"

ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے۔ سونیا اور جانکی غار میں سے اپنے بیگ اٹھا لائیں اور ہم نشیب میں اترنے لگے۔ دن کے وقت سفر کرنا اگرچہ خطرناک ہو سکتا تھا لیکن ہمیں خطرہ تو بہرحال مول لینا ہی تھا۔ پوست کے پودے اتنے اونچے تھے کہ ہم آسانی سے چھپ کر چل سکتے تھے۔ بعض جگہوں پر

پودوں کی اونچائی کچھ کم تھی۔ وہاں ہمیں محتاط رہنا پڑتا تھا۔

فضا میں عجیب مسحور کن سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

پوست کے پودوں میں ابھی صرف پھول آئے تھے۔ ان کے بیج ڈوڈے بننا شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں نے کئی پودوں اور پھولوں کو چھو کر دیکھا تھا۔ کتنے خوش رنگ اور حسین پھول تھے مگر کتنے زہریلے۔ انہی سے وہ دوائیں بھی بنتی تھیں جو انسانی زندگی بچانے کے کام آتی تھیں اور افیون، مارفین اور ہیروئن جیسے زہر بھی تیار ہوتے تھے جو دنیا بھر میں نوجوان نسل کو تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

ہم پوست کے کھیتوں میں تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہے۔ سر پر سورج چمک رہا تھا۔ اگرچہ ہوا بھی چل رہی تھی مگر تیز دھوپ کی وجہ سے کھیتوں میں حبس کی سی کیفیت تھی۔ ہم پسینے میں تر ہو رہے تھے۔ گردن پر پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے کیچوے رینگ رہے ہوں۔ پیاس سے حلق بھی خشک ہونے لگا تھا۔ ہم سے بڑی حماقت ہوئی تھی۔ اس مہم کے لیے اور تو سارے انتظام کر لیے گئے تھے مگر پانی ساتھ لانے کا بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ ہم ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں چلتے رہے۔ مجھے یقین تھا کہ ان کھیتوں ہی میں کہیں نہ کہیں پانی ضرور مل جائے گا۔

یہ دراصل باقاعدہ کھیت نہیں تھا۔ نشیب و فراز پر مشتمل پتھریلا علاقہ تھا جس میں ہل چلا کر بیج ڈال دیا گیا تھا۔ اس قسم کے علاقے پوست کی پیداوار کے لیے مثالی ہوتے ہیں۔ اس فصل کو زیادہ پانی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی تھی لیکن یہاں تو پانی کی بھی کمی نہیں تھی۔ اس فصل کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ پوست کی کاشت کے لیے یہ دنیا کا زرخیز ترین خطہ تھا۔

وہ پہاڑی ابھی بہت دور تھی جس کے پیچھے سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا گیا تھا لیکن کھیتوں میں تھوڑا اور فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں وہ چیز نظر آگئی تھی جس کی ہمیں تلاش تھی۔

وہ پتھروں میں ایک چھوٹا سا چشمہ تھا۔ دو تین فٹ لمبا چوڑا اور ایک فٹ گہرا تالاب سا تھا جس کے اندر سے شفاف پانی پھوٹ رہا تھا۔ تالاب میں جمع ہونے والا یہ پانی ایک نالی کی صورت میں مخالف سمت میں بہہ رہا تھا۔ یہ چشمہ قدرتی تھا مگر وہ نالی انسانی ہاتھوں کی بنائی ہوئی تھی۔ جو ایک فٹ سے زیادہ گہری اور دو فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔

ہم نے اپنا سامان ایک طرف رکھ دیا۔ میں نے پہلے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور پھر دونوں ہاتھوں کا پیالہ سا بنا کر پانی پینے لگا۔ پانی ٹھنڈا اور شیریں تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی نعمت جس کے بغیر انسانی حیات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ دیر ستانے کے بعد ہم آگے روانہ ہوئے۔ ہمارا رخ انہی پہاڑیوں کی طرف تھا۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ میں متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ تو وہ لوگ پٹرولنگ کرتے رہتے تھے لیکن اندرونی علاقے میں شاید اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی اور پوست کی فصل بھی ایسی تھی کہ دوسری فصلوں کی طرح اس کی زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی اور شاید اسی لیے ہمیں کوئی آدمی نظر بھی نہیں آیا تھا۔

وہ پہاڑیاں بظاہر قریب نظر آئی تھیں لیکن درحقیقت بہت دور تھیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ ہم سہ پہر کے قریب وہاں پہنچ پائے تھے۔

پہاڑیوں کے دامن میں، میں کھیت سے باہر نکلا ہی تھا کہ تیزی سے مڑ کر دوبارہ پودوں میں گھس گیا اور سونیا اور جانکی کو بھی پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں بیٹھ گئے۔

میں گھٹنوں کے بل رینگتا ہوا ایک بار پھر ذرا آگے نکل گیا اور پودوں میں جگہ بنا کر باہر دیکھنے لگا۔ تقریباً سو گز آگے پہاڑی کے دامن میں وہ کاٹیج میری نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کاٹیج کے سامنے کھلی جگہ پر دو آدمی بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ دونوں نے کمانڈو قسم کی فوجی وردیاں پہن رکھی تھیں اور دونوں کے کندھوں پر رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔

سونیا اور جانکی بھی رینگتی ہوئی میرے قریب آگئیں اور سامنے دیکھنے لگیں۔ کچھ ہی دیر بعد ایسے ہی گوریلا ڈریس میں ایک تیسرا آدمی کاٹیج کے دروازے سے برآمد ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں کافی یا چائے کے مگ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے پر بھی آٹومیٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے ٹرے زمین پر رکھ دی اور ایک مگ اٹھا کر ان دونوں سے ذرا فاصلے پر ایک پتھر پر بیٹھ کر چسکیاں لینے لگا۔

"یہ.... یہ تو کوئی لڑکی ہے...."

جانکی کی آواز سن کر پہلے میں نے اس کی طرف دیکھا پھر پتھر پر بیٹھے ہوئے اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جس کے بارے میں جانکی نے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ جانکی نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی لڑکی تھی۔

"اس طرف سے گھومتے ہوئے پہاڑی پر چلے جائیں۔"

جانگی نے سرگوشی میں بات کرتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سرہلا دیا ”یہ کاٹیج غالباً ان کی کوئی پوسٹ ہے اور یہ تینوں یہاں ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ دارا اور اس کے ساتھی کہاں ہیں۔ اور یہ معلومات ہمیں انہی لوگوں سے حاصل ہو سکتی ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ جانگی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی ”ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ تم جا کر ان سے معلوم کر آؤ پھر ہم آگے چلیں گے۔“

میں نے گھور کر جانگی کی طرف دیکھا۔

”ہمیں شام ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“ میں نے مدھم لہجے میں کہا ”اندھیرا ہونے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھا سکیں گے۔ اس وقت تک ہمیں یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے علاوہ یہاں اور کون کون ہے۔“

جانگی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے ایک بار پھر سامنے دیکھا۔ کاٹیج کے سامنے وہ تینوں بیٹھے چائے یا کافی پی رہے تھے۔ شام ہونے میں کم از کم ایک گھنٹا باقی تھا اور اس وقت تک ہمیں یہیں بیٹھنا تھا۔ ہماری کوئی حرکت یہاں ہماری موجودگی کا راز کھول سکتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سونیا اور جانگی کو اشارہ کرتے ہوئے پیچھے کی طرف رینگنے لگا۔ ہم تقریباً پانچ فٹ مزید پیچھے آ گئے۔

وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سورج جیسے افق پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ غروب ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ کاٹیج کی طرف سے باتوں اور کبھی کبھی قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ نسوانی قہقہے بھی سنائی دیے تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس لڑکی کی آواز بہت سُریلی تھی۔

سورج غروب ہونے میں اب چند ہی منٹ باقی تھے اور پھر اچانک کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ گاڑی غالباً کاٹیج کے سامنے آ کر رکی تھی۔ میں نے سونیا اور جانگی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور بڑی احتیاط سے رینگتا ہوا کھیت کے کنارے کے قریب پہنچ گیا اور پودوں میں راستہ بنا کر کاٹیج کی طرف دیکھنے لگا۔

جیپ میں تین آدمی تھے۔ چھت پر ہلکی مشین گن نصب تھی۔ ایک آدمی جیپ سے اتر کر کاٹیج کی طرف چلا گیا۔ اس کے کندھے پر سب مشین گن اور ایک ہاتھ میں ٹفن تھا۔ وہ ٹفن لے کر کاٹیج کے اندر چلا گیا جبکہ وہاں پہلے سے موجود وہ لڑکی اور دونوں آدمی جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ حرکت میں آ گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈیوٹی تبدیل ہوئی تھی۔ وہ تینوں چلے گئے تھے اور رات بھر کی ڈیوٹی کے لیے صرف ایک آدمی کو چھوڑا گیا تھا۔ میں جیپ کی طرف دیکھنے لگا جو کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر چلتی ہوئی بہت دور پہاڑی کی طرف گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میں کاٹیج کی طرف دیکھتا رہا۔ کاٹیج کے ایک کمرے میں اب بتی جل گئی تھی۔ چند منٹ بعد کمانڈو ڈریس میں ملبوس وہ آدمی کمرے سے باہر آ گیا۔ ٹفن وہ کمرے ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ کچھ دیر تک وہ کھڑے کھڑے کش لگاتا رہا پھر برآمدے سے نکل کر اس پتھر پر بیٹھ گیا جہاں اس لڑکی نے بیٹھ کر چائے یا کافی پی تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کا سُرمئی دھندلکا اندھیرے میں تبدیل ہونے لگا۔ میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا کاٹیج کی طرف دیکھتا رہا پھر سونیا اور جانگی کے قریب آ گیا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ جانگی نے کہا ”وہ اکیلا ہے اور ایک آدمی پر قابو پانے میں ہمیں آسانی رہے گی۔“

”لیکن ہمیں تھوڑا اور انتظار کرنا پڑے گا تاکہ اندھیرا اور گہرا ہو جائے۔“ میں نے جواب دیا۔

ہم مزید ایک گھنٹا پودوں میں دبکے رہے اور پھر رینگتے ہوئے ایک بار پھر کھیت کے کنارے پر پہنچ گئے۔ وہ محافظ اب برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، اس نے ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے آنے والی روشنی میں محافظ کی سب مشین گن بھی اس کے قریب ہی برآمدے کے فرش پر پڑی نظر آ رہی تھی۔ محافظ کا رخ اس طرف تھا جس طرف شام سے پہلے وہ جیپ گئی تھی۔

میں چند لمحے صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ کھیت سے باہر دائیں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ہم ان پتھروں کی آڑ لے کر مختصر سا چکر کاٹتے ہوئے کاٹیج تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے جانگی اور سونیا کو اشارہ کیا اور کھیت سے باہر نکل کر سینے کے بل رینگتا ہوا پہلے پتھر کی طرف بڑھنے لگا جو وہاں سے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔

پتھر کی آڑ میں پہنچ کر میں نے جانگی اور سونیا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں بھی رینگتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئیں۔

ہم اسی طرح رینگتے ہوئے پانچویں پتھر کے پیچھے پہنچ گئے۔ کاٹیج کا فاصلہ بھی کم ہو گیا تھا۔ میں نے سرگوشی میں سونیا کو اس مرتبہ وہیں رکنے کو کہا اور جانگی کو اشارہ کرتا ہوا آگے رینگنے لگا۔

جانگی کو بھی ایک جگہ چھوڑ دیا اور میں خود آگے بڑھتا چلا گیا اور بالآخر اس پتھر کے پیچھے رک گیا جہاں سے کاٹیج کا فاصلہ پندرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن کاٹیج کا برآمدہ اب میرے بالکل سامنے نہیں، بائیں جانب تھا جبکہ میری پشت پر پہاڑی کا دامن تھا جو ڈھلان کی صورت میں بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔

میں گہری نظروں سے برآمدے میں بیٹھے ہوئے محافظ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے اسے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن رائفل استعمال کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس ویرانے میں فائر کی آواز دور تک پھیل جاتی اور قرب و جوار میں کسی دوسری چوکی کے محافظ متوجہ ہو سکتے تھے جبکہ میں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہتا تھا کہ محافظ کو بھی گولی چلانے کا موقع نہ مل سکے۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا محافظ کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور پتلون کے پائنچے کے نیچے پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے دائیں طرف اچھال دیا۔

وہ پتھر ڈھائی تین سو گرام وزنی تھا۔ کھٹاک کی آواز سے گرا اور چھوٹے چھوٹے کچھ اور پتھر لڑھکنے لگے۔

محافظ اپنی سب مشین گن اٹھا کر بڑی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور چھلانگ لگا کر برآمدے سے باہر آ گیا۔

”کون ہے... اُدھر کون ہے؟“ وہ چینی زبان میں چیخا۔ اس کی آواز سن کر میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

میں اپنی جگہ پر سینے کے بل بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ محافظ دو تین قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں رائفل تانے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک اور چھوٹا پتھر اٹھا کر اپنے دائیں طرف اچھال دیا۔

”اے... کون ہے؟“ محافظ پھر چیخا۔ اس کی آواز سن کر میرے کانوں میں ایک بار پھر سیٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔

اس مرتبہ محافظ رائفل تانے تقریباً دوڑتا ہوا آگے بڑھا اور جیسے ہی وہ سامنے پہنچا میں نے پتھر کی آڑ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔

محافظ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی اور میں اسے اپنے ساتھ لیتا ہوا پتھروں پر جا گرا۔

یہ حملہ اس کے لیے یقیناً غیر متوقع رہا ہو گا لیکن اسے حواس پر قابو پانے میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے آپ کو میرے شکنجے سے چھڑانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ وہ پوری طرح میرے نیچے دبا ہوا تھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس کی آواز سن کر میرے کانوں میں سیٹیاں کیوں بجی تھیں، وہ مرد نہیں عورت تھی۔

میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔

”اب اگر تم نے بہادری دکھانے کی کوشش کی تو گردن کاٹ دوں گا۔“ میں نے غراتے ہوئے تھائی زبان میں کہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تھائی زبان بھی سمجھتی ہو گی۔

اس کی مزاحمت ختم ہو گئی تو میں اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ خنجر کی نوک اس کی گردن سے لگائے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی شرٹ کا کالر پکڑ کر اٹھا دیا اور پھر اسی وقت جانگی اور سونیا بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئیں۔ ان دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔

”جانگی۔“ میں نے کہا ”یہ سب مشین گن اٹھا لو اور اس پتھر کے پیچھے میری رائفل بھی پڑی ہے۔ میں اسے کاٹیج میں لے کر جا رہا ہوں۔ تم لوگ بھی اس طرف آ جاؤ۔“

میں اس محافظ لڑکی کو دھکیلتا ہوا کاٹیج کی طرف چلنے لگا۔ جانگی زمین پر پڑی ہوئی اس کی سب مشین گن اٹھا رہی تھی جبکہ سونیا اس پتھر کی طرف لپکی تھی جس طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔

ہم کاٹیج میں آ گئے۔ سونیا باہر ہی تاریکی میں رک گئی تھی تاکہ اگر کوئی اس طرف آ نکلے تو ہمیں بروقت آگاہ کر سکے۔

کمرے میں آ کر میں نے اس محافظ عورت کے سر سے ٹوپی اتار دی۔ ٹوپی میں سمٹے ہوئے بال کندھوں پر بکھر گئے۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ خاصی حسین تھی مگر خوف سے اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات کچھ بگڑ گئے تھے۔

”مم... مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہونے میں کامیاب کیسے ہو گئے۔“ اس نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے تھائی زبان میں کہا۔ میں نے چونکہ اس سے تھائی میں بات کی تھی اور شاید اس لیے اس نے بھی اسی زبان میں بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا ”لیکن تم لوگ جو کوئی بھی ہو، زندہ بچ کر نہیں جا سکو گے۔ بہتر

ہے اپنے آپ کو سرنڈر کردو۔ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ کچھ رعایت برتی جائے اور تم لوگوں کو زندہ سلامت یہاں سے واپس جانے کا موقع مل جائے۔"

"ہم جانتے ہیں کہ یہاں قدم قدم پر موت گھات لگائے بیٹھی ہے لیکن ہم نے اپنے آپ کو سرنڈر کرنے کے لیے موت کی اس وادی میں قدم نہیں رکھا۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ہم ٹورسٹ بھی نہیں جو بھول کر اس طرف آ گئے ہیں۔ ہمیں کچھ لوگوں کی تلاش ہے جو تھائی لینڈ سے بھاگ کر یہاں آئے ہیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں؟"

"اوہ!" وہ چونک سی گئی "اگر تم ان کی تلاش میں آئے ہو تو پھر تو تم لوگوں نے اپنے آپ کو موت کی وادی میں دھکیل دیا ہے۔ وہ جنرل کھوراٹ کے مہمان ہیں۔ یہاں تو تم ان کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتے چہ جائیکہ ان تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ مجھے قابو میں کر کے تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ موت تم لوگوں کا مقدر بن چکی ہے۔ اس سرزمین پر ممکن ہے آج کی رات تو تاریکی میں چھپ کر گزار لو لیکن صبح چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

"یہ سوچنا ہمارا دردِ سر ہے کہ ہم کتنے گھنٹے زندہ رہتے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم صرف اتنا بتا دو کہ کھوراٹ کے مہمان اس وقت کہاں ہیں؟"

"اس پہاڑی کے دوسری طرف بستی میں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "وہ تقریباً ایک ہفتہ اس بستی میں رہیں گے اور پھر انہیں جنرل کھوراٹ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔"

"اور جنرل کھوراٹ کہاں پایا جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً تیس میل دور اپنے ہیڈ کوارٹر میں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

وہ میری باتوں کا جواب بڑے پُرسکون لہجے میں دے رہی تھی۔ اسے شاید یہ یقین تھا کہ ہم چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے اور ان معلومات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔

"یہاں کتنے محافظ ڈیوٹی دیتے ہیں اور تمہاری ڈیوٹی کب تک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پورے ٹرائی اینگل میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس قسم کی چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔ ہر چوکی پر چوبیس گھنٹے ایک آدمی موجود ہوتا ہے لیکن دونوں طرف دریا کے کنارے پر چوکیوں میں تین چار محافظ موجود رہتے ہیں۔"

"لیکن شام کو یہاں تین محافظ تھے۔" میں نے کہا۔

"دو قریبی چوکیوں سے آ گئے تھے۔" لڑکی نے جواب دیا "اب میں رات بھر یہاں اکیلی رہوں گی۔ صبح سات بجے دوسرا محافظ آئے گا تو میری ڈیوٹی ختم ہو جائے گی۔"

"لیکن جگہ جگہ محافظوں کی ڈیوٹی کیوں؟ کیا چوری یا کسی بات کا خطرہ ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"یہ حفاظتی انتظامات پوست کی فصل کے دنوں میں ہوتے ہیں کیونکہ ان دنوں لاؤس اور تھائی لینڈ کی طرف سے مسلح مہم جو یہاں گھس آتے ہیں اور فصل برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پچھلے تین سال سے یہ حفاظتی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت سے کچھ سکون ہے لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم لوگ یہاں تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہو گئے۔"

"اس لیے کہ ہم موت سے نہیں ڈرتے۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "میں تمہارے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا لیکن اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تمہارا گلا کاٹنے میں کوئی ہچکچاہٹ بھی محسوس نہیں کروں گا۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ جب تک ہم یہاں ہیں، تم شرافت کا ثبوت دو گی۔"

میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی رسی تلاش کرے۔ جانکی کمرے میں دیکھتے ہوئے باہر نکل گئی۔ یہ کاٹیج دو کمروں پر مشتمل تھا اور جانکی غالباً دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

سونیا نے محافظ لڑکی کو اپنی رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ میں نے خنجر اس کی گردن سے ہٹا لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں ایک طرف دیوار کے ساتھ تین فٹ اونچا ایک چھوٹا سا چبوترا بنا ہوا تھا جس پر ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔ لڑکی نے پوچھنے پر بتایا کہ تمام چوکیوں میں ٹیلی فون موجود ہیں۔ جنرل کھوراٹ نے ٹرائی اینگل میں اپنا مواصلاتی نظام قائم کر رکھا ہے اور ایک بجلی گھر بھی ہے جہاں سے پورے ٹرائی اینگل کو بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ بیرونی دنیا سے رابطے کے لیے نہایت طاقت ور ٹرانسمٹر استعمال کیے جاتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد جانکی رسی کا ایک گچھا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے محافظ لڑکی کے ہاتھ پیر باندھ کر فرش پر ڈال دیا۔ اس لڑکی کی زندگی اگرچہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی لیکن فی الحال میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہم تینوں برآمدے میں آ گئے۔ اس محافظ لڑکی نے بتایا تھا کہ پانچ چھ سو فٹ بلند اس پہاڑی کے پیچھے وہ بستی ہے جہاں تھائی لینڈ سے آنے والے جنرل کھوراٹ کے مہمانوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ میں نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنا لیا۔

"اس لڑکی کے کہنے کے مطابق صبح سات بجے سے پہلے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم دونوں یہیں رکو۔ میں پہاڑی پر جا کر دوسری طرف اس بستی کا جائزہ لے کر آتا ہوں اور پھر صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر ہمیں بستی کے آس پاس کوئی چھپنے کی جگہ مل جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"میں تمہیں اکیلے تو جانے نہیں دوں گی۔" جانکی جلدی سے بولی "یہاں صبح تک کوئی نہیں آئے گا۔ اس لیے یہاں صرف ایک ہی فرد کی موجودگی کافی ہے یا تو سونیا کو اپنے ساتھ لے جاؤ یا میں تمہارے ساتھ چلوں بلکہ بہتر ہو گا کہ تم سونیا ہی کو ساتھ لے جاؤ۔ میں اکیلی یہاں رہوں گی۔"

"ڈر تو نہیں لگے گا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں کمرے کی بتی بجھا کر وہاں پتھروں کے پاس اندھیرے میں بیٹھ جاؤں گی۔ تم میری فکر مت کرو۔" جانکی نے جواب دیا۔

پانچ منٹ بعد ہم کاٹیج کے پیچھے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ جانکی بھی کمرے کی بتی بجھا کر کچھ دور ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔

اندھیرے میں پہاڑی پر چڑھنا خاصا مشکل کام تھا۔ بار بار پتھروں سے ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے ساتھ مجھے سونیا کو بھی سہارا دینا پڑا۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے وہ بری طرح ہانپنے لگی تھی۔ نصف بلندی طے کر کے ہم رک گئے۔ سونیا ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ دس منٹ بعد ہم پھر آگے روانہ ہو گئے۔

وہ پہاڑی پانچ چھ سو نہیں ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند تھی۔ اوپر فلک بوس درخت تھے جو تیز ہوا سے جھوم رہے تھے۔ ہوا کے شاخوں سے ٹکرانے سے "سائیں سائیں" کی جو آوازیں پیدا ہو رہی تھیں ان سے دل پر خوف سا طاری ہو رہا تھا۔

چوٹی پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ میرا سانس بھی پھول گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں سے دوسری طرف کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

نشیب میں بہت دور کچھ بکھری ہوئی روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ رات کے وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ہمارے اور ان روشنیوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا لیکن میرے اندازے کے مطابق وہ ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں دو میل سے کم فاصلے پر کسی طرح نہیں ہو سکتی تھیں۔

میں سونیا کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان پر نیچے اترنے لگا۔ ابھی ہم نے تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ فضا فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھی۔ آواز چاروں طرف بازگشت سی پیدا کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ فائرنگ کس طرف ہوئی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں جانکی کا خیال ابھرا اور اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے بستی کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور سونیا کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

کچھ دیر تک فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں پھر سناٹا چھا گیا۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر میں نیچے دیکھنے لگا مگر تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ سونیا کو تقریباً گھسیٹتا ہوا اوپر لایا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

"تم یہیں رکو۔ میں نیچے جا کر دیکھتا ہوں۔" میں نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے شبہ ہے کہ فائرنگ اس کاٹیج میں یا آس پاس ہوئی تھی۔ جانکی کسی مصیبت میں نہ پھنس گئی ہو۔"

"میں اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی۔ تمہارے ساتھ چلوں گی۔" سونیا نے کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ شاید خوف زدہ تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ دوسرا ہاتھ سونیا نے پکڑ رکھا تھا۔ میں ڈھلان پر تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ سونیا میرے ساتھ گھسٹتی ہوئی سی چلی آ رہی تھی۔ اچانک اسے کسی پتھر سے ٹھوکر لگی۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی۔ میں بڑی تیزی سے اس کی طرف لپکا اور اگر بروقت اسے نہ پکڑ لیتا تو وہ کھڈ میں گر جاتی۔ کھڈ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گرنے سے اس کی موت تو واقع نہیں ہو سکتی تھی لیکن ایک آدھ ہڈی ضرور ٹوٹ جاتی اور یہ نقصان زیادہ خطرناک ہوتا۔

میں نے سہارا دے کر سونیا کو اٹھا دیا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ اس کی رائفل کہیں گر گئی تھی۔ میں نے رائفل تلاش کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دی اور اسے

دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ وہ لنگڑا رہی تھی۔ گھٹنے اور کولھے کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی۔

ایک جگہ میں رک گیا۔ تقریباً دو سو گز نیچے تاریکی میں کاٹیج کا ہیولا سا نظر آرہا تھا لیکن آس پاس کسی قسم کی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے سونیا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ وہ بھی سنبھل سنبھل کر میرے ساتھ ساتھ چلی آرہی تھی۔

کاٹیج کا ہیولا اب واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ فاصلہ پچیس تیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ میں چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔ ایک پتھر میرے پیر سے ٹکرایا اور پُرشور آواز سے ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا اس پتھر کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اور پتھر بھی لڑھک رہے تھے۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑ کر بڑی پھرتی سے زمین پر گر گیا تھا۔

چند لمحے گزر گئے لیکن کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ ایک بار پھر گمبھیر سناٹا چھا گیا تھا۔ میں کچھ دیر تک اپنی جگہ پر پڑا رہا پھر سونیا کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور اٹھ کر ڈھلان پر اترنے لگا۔

کاٹیج اب صرف دس گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ہم ایک بڑے پتھر کی آڑ میں دبک گئے۔ میں گہری نظروں سے کاٹیج اور اس کے آس پاس دیکھتا رہا لیکن نہ تو کوئی نقل و حرکت محسوس ہوئی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔ گہری تاریکی اور گمبھیر سناٹا تھا۔

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو جانکی کاٹیج کی بتی بجھا کر کچھ دور تاریکی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت بھی گہری تاریکی تھی اور کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں خیال آیا کہ شاید وہ فائرنگ یہاں نہیں ہوئی تھی۔ کہیں اور ہوئی ہوگی۔ اگر فائرنگ یہاں ہوئی ہوتی تو جانکی کے پکڑے جانے یا مارے جانے کی صورت میں بھی کاٹیج کے اندر یا اس کے آس پاس کسی نہ کسی قسم کی سرگرمی ضرور دکھائی دیتی۔ مسلسل خاموشی سے میرا یہ شبہ یقین میں بدلتا گیا کہ فائرنگ یہاں نہیں ہوئی تھی۔

جانکی کو اتنی جلدی ہماری واپسی کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ اس نے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنی ہوگی اور وہ تاریکی میں کہیں گھات لگائے بیٹھی ہوگی۔ میں مزید کچھ دیر تک اِدھر اُدھر تاریکی میں گھورتا رہا پھر سرگوشیانہ لہجے میں جانکی کو پکارنے لگا۔

"جانکی۔۔۔ جانکی۔۔۔ کہاں ہو تم۔۔۔؟"

میری یہ سرگوشیانہ آواز بھی سناٹے میں دور تک پہنچ چلی گئی مگر دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے قدرے بلند آواز میں پکارا۔ اس مرتبہ بھی جواب میں خاموشی ہی رہی۔

"کہیں سو نہ گئی ہو۔" سونیا نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "اور پھر ہم اسے سونے کے لیے تو یہاں چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔"

"تھکن نے ہم سب کو نڈھال کر رکھا ہے۔ نیند تو پھانسی کے تختے پر بھی آجاتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بھی بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی ہو۔" سونیا نے کہا۔

اس کی بات میں کچھ وزن تھا۔ ہم سارا دن اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر چلتے رہے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لیے پوست کے کھیت میں بیٹھے رہے تھے لیکن یہ وقت بھی ٹینشن میں گزرا تھا۔ جس سے اعصاب میں کچھ اور تناؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔ محافظ لڑکی کاٹیج کے اندر بندھی ہوئی پڑی تھی۔ جانکی کو یہ اطمینان بھی ہوگا کہ کوئی دوسرا محافظ صبح سے پہلے اس طرف نہیں آئے گا اور عین ممکن ہے وہ کسی جگہ بیٹھے بیٹھے اونگھ گئی ہو۔

میں نے سونیا کو اشارہ کیا اور ہم دونوں اٹھ کر محتاط انداز میں کاٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ہم دونوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔

کاٹیج کے سامنے پہنچ کر میں نے ایک بار پھر جانکی کو پکارا مگر اس مرتبہ بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اب میرا سکون رخصت ہونے لگا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات اور وسوسے سر ابھارنے لگے۔

برآمدے میں قدم رکھتے ہی کسی چیز کو میرے پیر سے ٹھوکر لگی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ رائفل تھی۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہ رائفل جانکی کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی لیکن وہ اپنی رائفل اس طرح برآمدے میں پھینک کر کہاں جاسکتی تھی۔

کاٹیج کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں اس کمرے میں داخل ہوگیا جہاں محافظ لڑکی کو باندھ کر ڈالا گیا تھا۔ میں نے بائیں طرف دیوار ٹٹول کر سوئچ آن کردیا۔

کمرے میں روشنی پھیل گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا

اچھل کر حلق میں آگیا۔ کمرے میں ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

سونیا بھی کمرے میں آگئی تھی۔ ہر طرف پھیلا ہوا خون دیکھ کر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بھی وحشت زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی بکرے کی شہ رگ پر چھری چلا کر چھوڑ دیا گیا ہو اور وہ تڑپتا ہوا پورے کمرے میں لوٹتا رہا ہو۔ دو طرف کی دیواروں پر بھی خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔

اس محافظ لڑکی کو باندھ کر اسی کمرے میں ڈالا گیا تھا لیکن اب وہ غائب تھی۔ اسے جس رسی سے باندھا گیا تھا' وہ ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور اس پر بھی خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ جانکی کا بیگ جو اس نے دیوار کے ساتھ چبوترے پر رکھا تھا' غائب تھا۔ برآمدے میں دروازے کے عین سامنے پڑی ہوئی رائفل جانکی ہی کی تھی۔

دائیں طرف فرش پر کوئی چیز چمکتی دیکھ کر سونیا اس طرف بڑھ گئی اور جھک کر وہ چیز اٹھالی۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ جانکی کا خنجر تھا اور یہ وہی خنجر تھا جو تھالوب نے اسے دیا تھا۔ قریب ہی جانکی کا ہیئر کلپ بھی پڑا ہوا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جانکی کا انجام کیا ہوا ہوگا۔ کمرے کے کونے میں پڑی ہوئی رسی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ محافظ لڑکی نے کسی طرح اپنی بندشیں کھول لی ہوں گی اور پھر اس میں اور جانکی میں معرکہ ہوا ہوگا جس میں جانکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس کا خنجر ہیئر کلپ اور برآمدے میں پڑی ہوئی رائفل تو یہی کہانی سنا رہی تھی لیکن جانکی کی لاش کہاں گئی؟ اور پھر چبوترے پر پڑے ہوئے ٹیلی فون پر نظر پڑتے ہی ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ محافظ لڑکی نے ٹیلی فون کرکے کسی دوسری پوسٹ سے اپنے ساتھیوں کو بلالیا ہوگا اور وہ جانکی کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ پہاڑی پر ...نے کا پروگرام میں نے اس لڑکی کے سامنے ہی بنایا تھا۔ ...نے اپنے ساتھیوں کو ضرور بتایا ہوگا کہ ہم واپس آئیں ...

یہ خیال آتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے ...وہ لوگ کسی بھی وقت واپس آسکتے تھے۔ میں ابھی یہ ...سوچ ہی رہا تھا کہ خاموش فضا اچانک ہی فائر کی آواز ...گونج اٹھی۔ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے آنے ...والی زناٹے کی آواز سے میرے سر کے چند انچ اوپر سے ...گئی۔ میں نے سونیا کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے سوئچ

بورڈ والی دیوار کی طرف چھلانگ لگادی اور بڑی پھرتی سے سوئچ آف کردیا۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ لوگ شاید ابھی پہنچے تھے۔ اگر پہلے سے کہیں آس پاس موجود ہوتے تو ہمیں کاٹیج میں داخل ہونے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ پہلی گولی چلنے کے بعد باہر سے شدید فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ گولیاں فرش پر اور سامنے دیوار پر لگ رہی تھیں۔ میں دروازے کے ایک طرف تھا اور سونیا دوسری طرف۔ برستی ہوئی گولیوں میں نہ وہ میری طرف آسکتی تھی اور نہ میں اس کی طرف جاسکتا تھا۔ ہم فائرنگ کا جواب بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے لیے دروازے کے سامنے آنا پڑتا اور دروازے کے سامنے آنے کا مطلب تھا کہ اپنے جسم کو چھلنی بنوالیا جائے۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا کمرے کی تاریکی میں گھورنے لگا۔ اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ جس طرف سونیا تھی اس طرف دیوار میں ایک کھڑکی بھی تھی جو غالباً کاٹیج کے پچھلی طرف کھلتی تھی۔

"سونیا۔" میں نے سرگوشی کی "تمہاری طرف دیوار میں ایک کھڑکی ہے۔ اگر اسے کھول کر باہر نکل سکو تو ہم اس آفت سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں۔"

"کوشش کرتی ہوں۔" سونیا نے جواب دیا۔

باہر سے اب بھی فائرنگ ہورہی تھی۔ میں نے بھی ذرا سا آگے رینگ کر اپنی رائفل کی نال کا رخ دروازے کی طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑاتی ہوئی کئی گولیاں باہر کی کھلی فضا میں گونج پیدا کرتی چلی گئیں لیکن ظاہر ہے یہ گولیاں حملہ آوروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں۔

باہر سے ہونے والی فائرنگ سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حملہ آوروں کی تعداد دو تھی اور مجھے ڈر تھا کہ ان کے مزید ساتھی نہ پہنچ جائیں اس لیے میں کسی ایسی صورتِ حال سے پہلے ہی سونیا کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

گولیوں کے شور میں چرچراہٹ کی ہلکی سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ سونیا نے کھڑکی کھول لی تھی۔

"میں باہر نکل رہی ہوں۔" مجھے سونیا کی آواز سنائی دی "کوشش کرتی ہوں کہ ان کی توجہ بٹا سکوں تاکہ تمہیں بھی نکلنے کا موقع مل سکے۔"

میں اس طرف دیکھنے لگا۔ مجھے کھلی ہوئی کھڑکی میں سونیا کا ہیولا سا دکھائی دیا اور پھر وہ آہستگی سے باہر کود گئی۔

ٹھیک ایک منٹ بعد کاٹیج کے دائیں طرف سے فائرنگ

کی آواز سنائی دینے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سونیا کاٹیج کے اوپر سے گھوم کر اس طرف چلی گئی تھی اور اس نے حملہ آوروں پر فائر کھول دیا تھا۔

نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ دروازے کی طرف فائرنگ بند ہوگئی۔ فائرنگ کا رخ بدلتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھلا اور دوڑ کر کھڑکی پر چڑھ گیا اور پھر تیس سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں میں سونیا کے پاس پہنچ چکا تھا لیکن میں وہاں رکا نہیں۔ پتھروں کی آڑ لیتا ہوا کاٹیج سے کچھ دور چلا گیا اور اس طرف سے حملہ آوروں پر فائر کھول دیا۔

مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ پہلا برسٹ مارتے ہی گولیوں کی آواز کے ساتھ ایک انسانی چیخ بھی فضا میں گونج اٹھی تھی۔ ان دونوں حملہ آوروں میں سے ایک یا تو ختم ہو گیا تھا یا زخمی ہو کر گرا تھا کیونکہ جس جگہ سے چیخ سنائی دی تھی' وہاں سے فائرنگ بند ہوگئی تھی لیکن دوسرے نے تابڑ توڑ فائرنگ جاری رکھی تھی۔

میں دوڑتا ہوا ایک بار پھر سونیا کے قریب آ گیا اور حملہ آور کی طرف ایک بھرپور برسٹ مار دیا۔ دوسری طرف سے فائرنگ رک گئی۔ حملہ آور یا تو دبک گیا تھا یا اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"سونیا تم......"

میں کہتے کہتے رک گیا۔ میری نظر دائیں طرف متحرک روشنیوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ کوئی گاڑی تھی جو ناہموار راستے پر اچھلتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔

"اب ہم یہاں نہیں رک سکتے سونیا۔" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا "اس سے پہلے کہ اس گاڑی پر آنے والے محافظ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

میں نے سامنے کی طرف ایک اور برسٹ مار دیا اور سونیا کا ہاتھ پکڑ کر کاٹیج کے پچھلی طرف دوڑ لگا دی۔ اس طرف پگڈنڈی کی طرح ایک کٹاؤ سا تھا جو پہاڑی پر اوپر تک چلا گیا تھا۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑے اس کٹاؤ میں اوپر کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

تقریباً پچاس گز تک یہ کٹاؤ بالکل سیدھا چلا گیا تھا پھر دائیں طرف مڑ گیا۔ میرے خیال میں یہ قدرتی کٹاؤ بارشوں کے پانی کی وجہ سے بن گیا تھا جسے عام حالات میں پگڈنڈی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ موڑ پر گھومنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جیپ کاٹیج کے قریب رک چکی تھی اور پانچ چھ محافظ نیچے اتر کر ادھر ادھر دوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جیپ کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں ان سب کے ہاتھوں میں سب مشین گنیں نظر آ رہی تھیں۔

اچانک سونیا کا پیر رپٹ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ کئی چھوٹے چھوٹے پتھر اس کے پیروں سے نکل کر ڈھلان پر لڑھک رہے تھے۔

سونیا کی چیخ اور پتھروں کے لڑھکنے کی آوازوں سے اس پگڈنڈی پر ہماری موجودگی سے آگاہ ہوگئے اور پھر دوسرے ہی لمحے روشنی کی لاتعداد لکیریں ہماری طرف لپکتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ گولیاں ہمارے آس پاس گرنے لگیں۔

میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ کر اوپر گھسیٹ لیا اور کٹاؤ کا موڑ گھوم کر دوڑنے لگے۔ یہ کٹاؤ کسی تنگ سے درے کی طرح تھا۔ دونوں طرف دیواریں سی اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کٹاؤ میں ہم اگرچہ گولیوں سے محفوظ تھے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ وہ لوگ پہاڑی پر چڑھ کر ہمیں آگے سے گھیرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس لیے میں جلد از جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے میں ہم دوسری مرتبہ اس پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ سونیا بری طرح ہانپ رہی تھی لیکن وہ میرے ساتھ دوڑتی رہی۔ جب موت تعاقب میں لگی ہو تو رکنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہمارے تعاقب میں پہاڑی پر چڑھتے ہوئے محافظ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اور میرے خیال میں وہ اپنا ایمونیشن ضائع ہی کر رہے تھے کیونکہ جس طرف فائرنگ ہو رہی تھی ہم وہاں سے بہت دور تھے۔

ایک جگہ پر ہم اس دراڑ نما پگڈنڈی سے نکل آئے اور بائیں طرف مڑ کر درختوں کی طرف دوڑنے لگے۔ سونیا اب بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اگر میں نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ رکھا ہوتا تو وہ بہت پہلے گر چکی ہوتی لیکن اب اس کی ہمت بالکل جواب دے گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑائی اور میں کوشش کے باوجود اسے نہ سنبھال سکا۔ وہ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر زمین پر جھکتی چلی گئی۔

میرا بھی سانس پھول گیا تھا۔ میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہمارا تعاقب کرنے والے بہت دور رہ گئے تھے اور میرے خیال میں چند منٹ یہاں رک کر ستا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے سونیا کی طرف دیکھا۔ وہ دو زانو بیٹھی آگے کو جھکی ہوئی تھی دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا رکھے تھے۔ اس کے منہ سے کف بہ

رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

تین چار منٹ گزر گئے۔ سونیا اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی اور پھر اچانک نشیب میں پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ایک دم رائفل اٹھا لی اور تاریکی میں گھورنے لگا۔ تقریباً سو گز نیچے جھاڑیوں میں دو ہیولے سے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرا اندیشہ درست نکلا تھا۔ وہ ہمارے تعاقب میں تو تھے ہی' آگے سے بھی گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"سونیا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "وہ لوگ اس طرف سے بھی آ رہے ہیں۔ آگے روانگی کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

سونیا نے بھی رائفل اٹھا لی۔ پتھروں کے لڑھکنے کی آواز اس نے بھی سن لی تھی اور غالباً ان ہیولوں کو دیکھ بھی لیا تھا۔ اس نے جیسے ہی رائفل سیدھی کی' میں نے اسے روک دیا۔

"گولیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نمٹ لیتا ہوں ان سے۔"

وہ دونوں ہیولے جھاڑیوں میں تھے اور جیسے ہی ذرا اوپر آئے میں نے فائر کھول دیا۔ کئی گولیاں سنسناتی ہوئی ان کی طرف لپکیں۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی خوفناک چیخیں بھی سنائی دی تھیں اور وہ دونوں ہیولے ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے۔

سونیا اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ فائرنگ سے دوسرے محافظوں کو یہ نشان دہی ہوگئی تھی کہ ہم کہاں ہیں اس لیے میں وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ تاریکی میں اس طرح دوڑنے سے کوئی خوفناک حادثہ بھی پیش آ سکتا تھا مگر حادثات کی پروا کسے تھی۔

ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ نشیب میں ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم اس طرف ڈھلان پر اترنے لگے۔ ہمارا تعاقب کرنے والے محافظ یقیناً یہ سوچیں گے کہ ہم آبادی کی طرف جانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ وہ ہمیں دوسرے نواح میں تلاش کرتے رہیں گے۔

وہ آبادی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بیس بائیس گھر یا بنگلے تھے اور روشنیوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ گھر ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے اور انہی میں سے کسی ایک میں دارا وغیرہ بھی موجود تھے اور یقیناً تھائی بھی ان کی قید میں تھی۔

یہ پہاڑیاں سخت چٹانوں پر مشتمل نہیں تھیں۔ بھربھری زمین تھی اور کہیں بڑے بڑے پتھر تھے۔ یہاں جھاڑیوں کی بھی بہتات تھی۔ ہم کسی حادثے سے بے نیاز بڑی تیزی سے نیچے جا رہے تھے۔ میں نے اب بھی سونیا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا لیکن ایک جگہ میرا پیر رپٹ گیا۔ سنبھلنے کی کوشش میں سونیا کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ بھی لڑکھڑا کر گری اور بڑی تیزی سے ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی۔ میں سنبھل کر اس کی طرف لپکا اور بروقت اسے پکڑ لیا۔ اگر تھوڑی دیر ہو جاتی تو وہ آگے پڑے ہوئے پتھر سے ٹکرا جاتی۔

پہاڑی کی چوٹی پر سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ تین چار ہیولے حرکت کرتے ہوئے نظر آئے۔ میں سونیا کے ساتھ پتھر کے قریب دبک کر بیٹھ گیا۔ ہماری معمولی سی حرکت انہیں ہماری طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ وہ سائے دوسری طرف چلے گئے۔ انہوں نے شاید سوچ لیا تھا کہ ہم بستی کا رخ نہیں کر سکتے۔

ہم چند منٹ اپنی جگہ پر بیٹھے رہے پھر مطلع صاف پا کر ڈھلان پر اترنے لگے۔ اس مرتبہ ہم ذرا محتاط ہو گئے تھے۔

ہمارا رخ ان روشنیوں کے دائیں طرف تھا۔ جہاں الگ تھلگ صرف بلب کی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور وہ روشنی اب ہم سے تقریباً دو سو گز دور تھی۔ ہم اس کے دائیں طرف بڑھتے رہے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے' جھاڑیاں اور درخت گنجان ہوتے جا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں انہی درختوں میں چھپنے کی کوئی جگہ مل جائے تو ہم کچھ دیر وہاں رک کر اپنے اگلے اقدام کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے۔

بالآخر ہمیں ایک ایسی جگہ مل گئی اور وہ جگہ بھی محض اتفاق سے ملی تھی۔ ہم گنجان جھاڑیوں کے ساتھ چل رہے تھے کہ سونیا کا پیر پھسل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور وہ جھاڑیوں میں لڑھکتی ہوئی دوسری طرف ڈھلان میں جا گری۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔

یہ تقریباً آٹھ فٹ گہری اور کشادہ سی کھائی تھی۔ ہمارے ایک طرف پہاڑی کی عمودی بلند دیوار سی تھی اور دوسری طرف آٹھ فٹ اونچی وہ جگہ۔ جہاں سے ہم نیچے آئے تھے۔ ہم اس کھائی سے باہر نکلنے کے بجائے اس کے اندر ہی اندر چلتے رہے۔

بائیں طرف والی بلندی ٹیلے کی طرح بتدریج ڈھلان اختیار کرتی ہوئی زمین کی سطح کے برابر آ گئی تھی۔ وہاں سے اب بستی کی روشنیاں پھر صاف نظر آنے لگی تھیں۔ دائیں

طرف پہاڑی کے ساتھ ساتھ گھنی شاخوں والے گنجان درخت تھے اور انہی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے وہ تنگ سا غار تھا جو اتفاق سے ہماری نظروں میں آگیا تھا۔ درخت زیادہ اونچے نہیں تھے۔ ان کی گھنی شاخیں اس طرح ایک دوسرے میں الجھی اور پھیلی ہوئی تھیں کہ غار کا دہانہ مکمل طور پر چھپ گیا تھا۔

غار میں داخل ہو کر سونیا نے کندھے سے بیگ اتار کر ٹارچ نکال لی اور میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے صرف ایک سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کی اور جائزہ لیتے ہی سونیا کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نے دیکھ لیا تھا کہ چند گز آگے وہ غار دائیں طرف مڑ گیا تھا۔

میں دیوار ٹٹولتا ہوا اس طرف مڑ گیا اور چند قدم آگے بڑھ کر ٹارچ جلالی۔ اب باہر سے روشنی دیکھے جانے کا خطرہ نہیں تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ لمبائی تقریباً دس فٹ اور چوڑائی کہیں سے چھ فٹ اور کہیں سے آٹھ اور نو فٹ بھی تھی۔ چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں ہاتھ اٹھا کر اسے آسانی سے چھو سکتا تھا۔ فرش پر کنکریٹ پتھر وغیرہ نہیں تھے البتہ دھول جمی ہوئی تھی۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ غار کبھی استعمال میں رہا ہو گا لیکن فرش پر جمی ہوئی دھول بتا رہی تھی کہ کافی عرصے سے یہاں کوئی نہیں آیا تھا۔

سونیا نے بیگ فرش پر رکھ دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹانگیں پسار لی تھیں۔ میں بھی اس کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم بستی کے اتنا قریب کسی جگہ پناہ لیے ہوئے ہوں گے۔ میں نے ایک بار پھر ٹارچ کی روشنی میں غار کا جائزہ لیا۔ یہاں زہریلے کیڑے مکوڑوں کا بھی کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر کیڑے مکوڑے ہوتے تو فرش پر بچھی ہوئی دھول پر آڑی ترچھی لکیریں سی ضرور ہوتیں۔

اس بھاگ دوڑ نے ہمیں بری طرح تھکا دیا تھا اور یہ تو ابھی ابتدا تھی۔ ابھی تو کھیل شروع ہوا تھا۔ یہ ابتدائی راؤنڈ تھا اور میری دیرینہ ساتھی جانکی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ حالات و شواہد تو یہی بتاتے تھے کہ اسے ختم کر دیا گیا تھا لیکن نجانے کیوں، مجھے اس کی موت کا یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔

آدھا گھنٹا گزر گیا۔ غار کے باہر والے دہانے کی طرف سے حشرات الارض کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، اس کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔

"سونیا۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "تمہیں بھوک لگ رہی ہو گی۔ چاہو تو بیگ میں سے کچھ نکال کر کھا لو۔"

"نہیں۔ بالکل دل نہیں چاہ رہا۔" سونیا نے جواب دیا "میں تو جانکی کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہوں۔ مجھے بھی اس کے ساتھ کاٹیج میں رہ جانا چاہیے تھا لیکن نجانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا۔"

"دل تو میرا بھی نہیں مان رہا لیکن برآمدے میں پڑی ہوئی جانکی کی رائفل، کمرے میں بکھرا ہوا خون اور جانکی کا کلپ۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہو گیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرا اندازہ ہے کہ اس محافظ لڑکی نے کسی طرح رسی کھول لی ہو گی اور جانکی نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی تو خود اس کی گرفت میں آ گئی۔ وہ محافظ لڑکی تربیت یافتہ ہو گی جبکہ جانکی میں اس طرح دو بدو لڑنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ بے چاری مار کھا گئی۔"

سونیا گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ کچھ دیر تک ہم خاموش بیٹھے رہے پھر میں اپنی رائفل اٹھا کر غار کے باہر والے دہانے کے قریب آ گیا۔ دہانے کے سامنے گنجان شاخوں والے درخت تھے۔ جنہوں نے غار کے دہانے کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے درختوں کی شاخوں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ بستی کے کسی کاٹیج کی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے رائفل کی نال سے شاخیں ایک طرف ہٹا کر تھوڑا سا خلا پیدا کیا تو وہ بکھری ہوئی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ قریب ترین روشنی غار سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ اور یہ غالباً اسی کاٹیج کی روشنی تھی جو دوسروں سے بہت الگ تھلگ تھا اور جسے میں نے شروع ہی سے نگاہ میں رکھا تھا۔ میں چند لمحے شاخوں سے باہر جھانکتا رہا پھر واپس آ گیا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا۔ یہ غار ہمارے لیے سب سے محفوظ جگہ تھی۔ میں واپس آ کر سرگوشیوں میں سونیا کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ تھکن سے میرا بدن چور ہو رہا ہے۔ مجھ سے اب بیٹھا نہیں جا رہا۔ میں سو رہی ہوں۔" سونیا نے کہا اور دیوار سے ذرا ہٹ کر لیٹ گئی اور جب اس نے اپنا سر میری گود میں رکھا تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی۔

سونیا لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میں اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور پھر میرا ہاتھ بے اختیار حرکت میں آ گیا اور میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

سرور اور سنسنی کی ملی جلی سی کیفیت تھی جس نے مجھے

پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں کتنی دیر تک اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا تھا۔ سونیا کسمسائی اور اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے ہاتھ پر اس کے ہاتھ کا ہلکا سا بوجھ محسوس کیا۔ اس نے میرا ہاتھ سر سے ہٹا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سانس رکنے لگا اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سینے میں آگ سی بھر گئی تھی۔ میں اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہتا تھا لیکن نیت میں ارادے کو دخل نہیں تھا۔

سونیا نے میری گود سے سر ہٹا لیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے پکڑ کر گرا دیا اور پھر میں اپنے حواس کھو بیٹھا۔

طوفان گزر گیا تو میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ وہ سب کچھ ہو گیا تھا جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ عجیب سے جذبات کا تلاطم خیز سیلاب تھا جو مجھے تنکے کی طرح بہا لے گیا تھا۔ جانکی بھی مجھے کسی ایسے ہی طوفان میں دھکیلنے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن جو کام وہ برسوں میں نہیں کر سکی تھی وہ کام سونیا پہلا موقع ملتے ہی کر گزری تھی۔ مجھے اپنے کردار پر بڑا فخر تھا۔ جانکی کی ہر کوشش ناکام رہی تھی۔ تھائی کئی مرتبہ میرے سامنے بے لباس ہوئی تھی۔ کئی اور لڑکیاں میرے کردار کی چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کر چکی تھیں مگر انہیں مایوسی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا اور سونیا نے مجھے چاروں خانے چت کر دیا تھا۔ میری انا کا بھرم ٹوٹ گیا تھا۔ اگرچہ اس میں میری نیت اور میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا لیکن پھر بھی میں اپنے آپ کو بے قصور اور بے گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ سونیا نے جب میری گود میں سر رکھا تھا تو مجھے اسی وقت مزاحمت کرنی چاہیے تھی لیکن وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور میرے دماغ میں آندھیاں سی چلتی رہیں پھر نجانے کب میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

سونیا نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ غار میں تاریکی تھی۔ میرے خیال میں اب بھی رات ہی تھی لیکن سونیا نے ٹارچ جلا کر میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی تو میں چونک گیا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں نے غار سے نکل کر درختوں کی شاخوں سے جھانکا تو وادی میں تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ رات کو روشنیاں دیکھ کر میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ دور دور تک بکھرے ہوئے کاٹیجز کی تعداد بائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ قریب ترین کاٹیج وہی تھا جس کے بارے میں، میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ چند ایک کے علاوہ تمام کاٹیج یہاں سے نظر آ رہے تھے اور وہ مذکورہ کاٹیج تو میری نظروں کے بالکل سامنے تھا۔ اس کا فرنٹ دوسری طرف تھا اور عقبی حصہ ہماری طرف۔

میں دیر تک اس طرف دیکھتا رہا پھر واپس آ گیا۔ سونیا بیگ میں سے ایک ڈبا نکال کر کھول چکی تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں ہم نے کھانا کھایا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس اندرونی غار سے نکل کر باہر والے غار کے دہانے کے قریب بیٹھ گئے۔ باہر اگرچہ تیز دھوپ تھی لیکن غار کے سامنے گنجان درختوں کی وجہ سے اندر اندھیرا سا تھا۔

سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے ایک موقع پر سونیا نے اشارتاً رات والے واقعے کا ذکر بھی کیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی لیکن میں نے کچھ کہنے کے بجائے منہ پھیر لیا تھا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد درختوں کی شاخیں ہٹا کر باہر بھی جھانک لیتا تھا اور پھر ایک مرتبہ میں چونک گیا۔ ایک عورت بچے کو گود میں لیے اس کاٹیج کے عقب میں سبزیوں کی کیاری میں گھوم رہی تھی۔ اس بچے کی عمر چھ مہینے سے زیادہ نہیں تھی۔

اس کے دو گھنٹوں بعد میں نے کمانڈو ڈریس میں ایک آدمی کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ سہ پہر پانچ بجے تک وہ دونوں کئی مرتبہ وہاں نظر آئے تھے۔ ہمیں سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں میاں بیوی تھے اور ان کے سوا کاٹیج میں اور کوئی نہیں تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور سونیا اس غار سے نکل آئے۔ میں نے جو منصوبہ بنایا تھا، اس میں ناکامی کی صورت میں اذیت ناک موت ہی ہمارے حصے میں آتی لیکن کامیابی کی صورت میں ہم دارا اور اس کے ساتھیوں پر بھی ہاتھ ڈال سکتے تھے۔

کاٹیج کے سامنے والے رخ پر بتی جل رہی تھی جبکہ پچھلی طرف اندھیرا تھا۔ ہم رائفلیں سنبھالے دبے قدموں آگے بڑھتے رہے۔ کاٹیج کے عقب میں پہنچ کر ہم رک گئے۔ ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ عورت اور مرد بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان میں بچہ بیٹھا ہوا تھا اور وہ دونوں بچے سے کھیل رہے تھے۔ میں نے سونیا کو اشارہ کیا۔ وہ عقبی دروازے کے قریب پہنچ گئی اور ہولے ہولے دستک دینے لگی۔

بیڈ پر لیٹے ہوئے اس آدمی نے چونک کر بیوی کی طرف

دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں الجھن سی تھی۔ اس آدمی نے بیڈ سے اٹھ کر دائیں طرف والی دیوار پر کپڑوں کے ساتھ ٹنگے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور اس کمرے سے نکل کر دوسری طرف چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد عقبی دروازے پر اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔" سونیا نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔

اس آدمی نے پتا نہیں کیا سمجھ کر دروازہ کھول دیا اور پھر روشنی میں سونیا کو دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ اس نے ریوالور والے ہاتھ کو حرکت دینے کی کوشش کی مگر میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر رائفل کی نال اس کی کھوپڑی سے لگا دی۔

"حرکت مت کرنا' کھوپڑی اڑا دوں گا۔" میرے حلق سے غراہٹ نکلی۔ وہ آدمی بری طرح بد حواس ہو گیا۔ سونیا نے بڑے اطمینان سے اس کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا اور ہم دونوں اسے دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔ سونیا نے دروازہ بند کر دیا۔

جب ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے تو وہ عورت بھی ہمیں دیکھ کر اچھل پڑی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا گئے۔ اس نے جلدی سے بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

"ہم تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔" میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں ایک دو روز کے لیے یہاں پناہ چاہیے۔ اگر تعاون کرو گے تو محفوظ رہو گے۔ بصورتِ دیگر...." میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ۔" اس آدمی کے منہ سے بے اختیار نکلا "تم دونوں شاید اسی عورت کے ساتھی ہو جو پہاڑی کے دوسری طرف کاٹیج میں ہمارے ایک گارڈ کو قتل کر کے فرار ہوئی ہے لیکن تم لوگ بچ نہیں سکو گے۔ پورے ٹرائی اینگل میں تم لوگوں کی تلاش ہو رہی ہے۔"

میں اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔ وہ یقیناً جانکی کی بات کر رہا تھا۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا تھا کہ جانکی زندہ ہے اور اس کاٹیج میں محافظ لڑکی کو قتل کر کے بھاگ گئی تھی۔ کمرے کے فرش پر بکھرا ہوا خون اس کا نہیں تھا لیکن اس کی رائفل' خنجر اور ہیئر کلپ.... بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں اس آدمی سے سوالات کرتا رہا لیکن وہ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ محافظ لڑکی نے فون پر بستی کے کنٹرول روم کو اطلاع دی تھی کہ تین افراد نے اسے قیدی بنا لیا ہے جن میں ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ ایک عورت اور ایک آدمی تو کہیں چلے گئے ہیں اور تیسری عورت کاٹیج کی نگرانی کر رہی ہے اور وہ خود موقع پا کر کنٹرول روم کو اطلاع دے رہی ہے۔ اس آدمی کے کہنے کے مطابق جب قریبی پوسٹ سے دو محافظ وہاں پہنچے تو کاٹیج کی نگرانی کرنے والی عورت محافظ لڑکی کو قتل کر کے فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ محافظوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہو گئی اور محافظ دیر تک اندھیرے میں گولیاں چلاتے رہے اور بالآخر محافظ لڑکی کی برہنہ لاش لے کر واپس آ گئے۔ بعد میں مزید محافظوں کو وہاں بھیجا گیا۔ وہ ٹھیک وقت پر وہاں پہنچے تھے۔ مفرور عورت کے دوسرے دو ساتھی وہاں موجود تھے لیکن زبردست مقابلے کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جانکی زندہ ہے لیکن یہ پریشانی لاحق ہو گئی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔

یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ مرد کا تعلق برما سے تھا اور عورت چینی تھی۔ ان دونوں کا ماضی سنگین جرائم کی گندگی سے آلودہ تھا۔ قانون سے بچنے کی کوشش میں یہ اپنے اپنے ملک میں جنرل کھوراٹ کے ایجنٹوں کے ہاتھ لگ گئے جنہوں نے انہیں یہاں بھیج دیا۔ انہیں بڑے سبز باغ دکھائے گئے تھے مگر یہاں آ کر یہ زندگی بھر کے لیے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔

گولڈن ٹرائی اینگل میں ایک ساتھ ڈیوٹی دیتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور دو سال پہلے شادی کر لی۔ شادی کی کوئی مذہبی رسم ادا نہیں ہوئی تھی۔ دو چار ساتھیوں کی موجودگی میں انہوں نے ایک دوسرے کو میاں بیوی کی حیثیت سے قبول کر لیا تھا۔ ٹرائی اینگل میں ایسی شادیوں کی کئی اور مثالیں بھی موجود تھیں۔

اس آدمی کا نام بوما اور عمر چالیس کے لگ بھگ تھی جبکہ عورت کی عمر تیس بتیس سال اور نام ہوفا تھا۔ وہ خاصی حسین عورت تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ بیوی اور بچے کو میری رائفل کی زد پر دیکھ کر بوما ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

وہ رات ہم نے جس طرح گزاری تھی' میں ہی جانتا ہوں۔ ان دونوں کی طرف سے خطرہ تو بہرحال تھا۔ اسی لیے میں اور سونیا رات کو باری باری جاگ کر ان کی نگرانی کرتے رہے تھے۔

ہوفا نے بچے کی وجہ سے لمبی رخصت لے رکھی تھی لیکن بوما کو بہرحال صبح ڈیوٹی پر جانا تھا۔

"اگر میں ڈیوٹی پر نہیں گیا تو میرے ساتھیوں کو شبہ ہو جائے گا اور کوئی نہ کوئی معلوم کرنے کے لیے اس طرف ضرور آئے گا۔ ایسی صورت میں...."

"تم ڈیوٹی پر ضرور جاؤ گے۔" میں نے کہا "لیکن اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو ان دونوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔" میں نے ہوفا اور بچے کی طرف اشارہ کیا "اور تم ہمارا ایک کام بھی کرو گے۔ تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ تھائی لینڈ سے آنے والے جنرل کھوراٹ کے مہمان کس کاٹیج میں مقیم ہیں۔ ان کی تعداد کیا ہے اور یہ کہ ان کے ساتھ تھائی نام کی عورت کس حال میں ہے۔"

بوما نے اثبات میں سر ہلایا اور بیوی اور بچے کی طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ دن بھی ہم نے بڑی اذیت میں گزارا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ بوما نے اگر ہمارے بارے میں بتا دیا تو ہمیں اس کاٹیج میں گھیر کر چوہوں کی طرح ختم کر دیا جائے گا لیکن بوما کو واقعی بیوی اور بچے سے محبت تھی۔

وہ شام چھ بجے کے قریب واپس آیا۔ اس سے حاصل ہونے والی اطلاعات بڑی تشویش ناک تھیں۔ دارا' کم اور پی فانگ کے ساتھ ایک جوان اور حسین عورت بھی تھی جسے انہوں نے عیاشی کے لیے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے تھائی لینڈ ہی سے لے کر آئے تھے۔ تھائی کے بارے میں بوما نے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ ہر وقت پڑی رہتی ہے۔ دوسری تشویش ناک اطلاع یہ تھی کہ ہمیں گولڈن ٹرائی اینگل میں دور دور تک تلاش کیا جا رہا تھا۔ دونوں طرف دریاؤں کی مکمل طور پر ناکا بندی کر دی گئی تھی تاکہ ہم فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں۔ جنرل کھوراٹ کو بھی اس سارے ہنگامے کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ فون پر بستی میں اپنے نائب کو ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اس کی ہدایت پر دارا وغیرہ کی حفاظت کے انتظامات بھی کر دیے گئے تھے۔

بوما کے کاٹیج میں ہمیں پناہ لیے ہوئے تیسرا دن تھا۔ کسی کو شبہ نہیں ہوا' کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جن لوگوں کو تلاش کیا جا رہا ہے وہ انہی کے گھر میں گھسے بیٹھے ہیں۔

بوما اور ہوفا سے ہمیں اور بھی بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ اس بستی کے دوسری طرف ہیروئن اور دیگر منشیات تیار کرنے کی دو فیکٹریاں تھیں۔ ٹرائی اینگل میں ایسی کئی فیکٹریاں تھیں جن میں ہیروئن اور مارفین وغیرہ تیار ہوتی تھی۔

وہ چوتھا روز تھا۔ شام چھ بجے کے قریب بوما واپس آیا تو اس کی چال میں لنگڑاہٹ تھی اور چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ اس کی پنڈلی پر کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا تھا۔ پنڈلی کا وہ حصہ سیاہ پڑ چکا تھا اور ٹانگ سوجتی جا رہی تھی۔ درد کی لہریں اسے بے چین کیے دے رہی تھیں۔ چہرے پر کرب نمایاں تھا۔

"اس کا صرف ایک علاج ہے۔" ہوفا نے ایک بوٹی کا نام لیتے ہوئے کہا "اس کا رس متاثرہ حصے پر لگا دیا جائے تو زہر کا اثر ختم ہو جائے گا بصورتِ دیگر زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا اور یہ زندہ نہیں بچے گا۔"

ہوفا کے لہجے اور چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شوہر کے لیے کتنی پریشان تھی۔

"یہ بوٹی کہاں سے ملے گی؟" میں نے پوچھا۔

"کاٹیج کے پچھواڑے تھوڑے ہی فاصلے پر مل جائے گی۔ اگر تم اجازت دو تو میں جا کر تلاش کروں؟" ہوفا نے کہا۔

"چلو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے سونیا کو محتاط رہنے کا اشارہ کیا اور ہوفا کے ساتھ کاٹیج کے عقبی دروازے سے باہر آ گیا۔ میں نے اسے رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔

کاٹیج کے عقب میں سبزیوں والی کھیتی سے نکل کر ہم تیس پینتیس گز اور آگے نکل گئے۔ ہوفا درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں اپنی مطلوبہ بوٹی تلاش کر رہی تھی۔ وہ جھک کر چل رہی تھی اور مختلف بوٹیوں کے پتوں کو چھو چھو کر دیکھ رہی تھی۔

"مل گئی۔" وہ پُرجوش لہجے میں بولی اور بیٹھ کر اس بوٹی کی پتیاں توڑنے لگی۔

میں قریب کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر عقب میں آہٹ سن کر میں نے پیچھے مڑنا چاہا تو ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"خبردار! اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے۔ رائفل پھینک دو۔"

اس غراہٹ کے ساتھ ہی ایک رائفل کی نال میری پشت سے لگ گئی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی اور پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

میں نے اپنی رائفل پھینک دی اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

میرے جسم میں پیدا ہونے والی سنسنی کسی خوف کا نتیجہ نہیں تھی۔ رائفل کی نال اگرچہ میری پشت سے لگی ہوئی تھی اور میں نے اپنی رائفل پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر بھی اٹھالیے تھے لیکن میرے دل میں خوف بالکل نہیں تھا۔ اپنے عقب میں آہٹ سن کر اور پشت پر رائفل کی نال کا دباؤ محسوس کر کے جو خوف دل میں پیدا ہوا تھا' وہ اس غراہٹ کو سن کر ختم ہو گیا تھا۔ میں نے ہوفا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی تھی اور اس نے بھی دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھالیے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں پودے سے توڑی ہوئی پتیاں موجود تھیں۔

"اب تم دونوں میری طرف گھوم جاؤ۔ اگر کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔" میرے عقب میں وہ غراتی ہوئی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"چاہت کے دعوے کرنے کے بعد گولیوں سے بھون دینے کی دھمکی دے رہی ہو۔" میں اردو میں یہ الفاظ کہتے ہوئے آہستگی سے پیچھے گھوم گیا۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔" وہ جانکی تھی۔ اس کے حلق سے آواز رک رک کر نکل رہی تھی۔ وہ چند لمحے تاریکی میں مجھے گھورتی رہی پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل اب بھی موجود تھی اور میں نے اپنے دونوں ہاتھ بدستور اوپر اٹھا رکھے تھے "بھگوان کا شکر ہے تم زندہ ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم بے خبری میں ان کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہو۔"

"کاٹیج کی حالت دیکھ کر میں نے بھی تم پر فاتحہ پڑھ لی تھی۔" میں نے جواب دیا اور ہاتھ نیچے گرا کر اس کی پشت تھپتھپانے لگا۔ وہ بڑی سختی سے میرے سینے سے لپٹی ہوئی تھی جس سے اس کے جوش اور مجھ سے وابستگی کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

"سونیا کہاں ہے۔ کیا وہ بھی۔۔۔"

"زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔" میں نے اس کی بات پوری کر دی اور گردن گھما کر ہوفا کی طرف دیکھنے لگا جو ہم سے تین چار قدم کے فاصلے پر کھڑی حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ ہماری گفتگو کا تو وہ ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکی ہوگی لیکن یہ صورتِ حال دیکھ کر وہ جان گئی ہوگی کہ جانکی بھی ہماری ساتھی ہے۔

ہوفا کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ جانکی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میری رائفل ہوفا کے قریب زمین پر پڑی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو میری رائفل اٹھا کر ہم دونوں کو بے بس کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی وجہ بھی میں سمجھ رہا تھا۔ اس کا بچہ اور شوہر ہمارے قبضے میں تھے اور شوہر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے وہ پتیاں اس وقت زیادہ ضروری تھیں جو وہ جھاڑی سے توڑ رہی تھی۔

اچانک کاٹیج کی طرف سے بچے کے رونے کی آواز سن کر ہوفا اچھل پڑی۔ میں نے بھی جانکی کو اپنے آپ سے الگ کر کے زمین سے اپنی رائفل اٹھالی۔

"ہوفا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مزید پتیوں کی ضرورت ہو تو جلدی سے توڑ لو۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے اور تمہارا بچہ بھی رو رہا ہے۔"

ہوفا ایک بار پھر جھک کر جھاڑی سے جلدی جلدی پتیاں توڑنے لگی۔ وہ بار بار کاٹیج کی طرف مڑ کر بھی دیکھ رہی تھی۔ بچے کے مسلسل رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"یہ عورت کون ہے اور تم لوگ۔۔۔"

"یہاں نہیں۔" میں نے جانکی کی بات کاٹ دی۔ وہ ہمارے بارے میں جاننا چاہتی تھی اور میں بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن یہاں کھڑے رہ کر باتیں کرنا مناسب نہیں تھا۔ بچہ رو رہا تھا۔ اس کی آواز کہیں اور بھی سنی جاسکتی تھی اور عین ممکن ہے اس بکھری ہوئی بستی کا کوئی آدمی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف آنکلتا اور پھر ہوفا کے شوہر بوما کی حالت خراب تھی۔ اسے فوری طور پر ان پتیوں کی ضرورت تھی جن کی تلاش میں ہوفا اس طرف آئی تھی۔

"بس کافی ہیں۔" ہوفا سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں پتیاں بھر رکھی تھیں۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی کاٹیج کی طرف چلنے لگی۔

میں اور جانکی بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑے۔ ابھی ہم آدھے ہی راستے میں تھے کہ بچے کے رونے کی آواز بند ہو گئی لیکن ہوفا کی رفتار میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ہم سے دو تین قدم آگے تھی لیکن جب وہ کاٹیج کے دروازے کے سامنے پہنچی تو ہم اس کے برابر پہنچ چکے تھے۔

میں بھی ہوفا کے ساتھ ہی دروازے میں داخل ہوا تھا اور جانکی کو دروازہ بولٹ کر دینے کی ہدایت دیتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا اور جب میں ہوفا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو وہ دلچسپ منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ سی آگئی۔

سونیا نے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ معصوم اس کے سینے سے لپٹا اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے بار بار اس کے سینے پر منہ مار رہا تھا مگر اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ اسے نہیں مل رہی تھی۔ سونیا کی رائفل ایک کرسی پر پڑی تھی اور بیڈ پر پڑا ہوا بوما تکلیف میں ہونے کے باوجود دلچسپ نظروں سے سونیا اور اس کی گود میں بچے کو دیکھ رہا تھا۔

ہوفا نے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی پتیاں میز پر رکھ دیں اور کبھی شوہر اور کبھی سونیا کے سینے سے لپٹے ہوئے بچے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ شاید کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ پہلے کس پر توجہ دے اور پھر اس نے شوہر پر توجہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بچہ خاموش تھا۔ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو گئی تھی۔

وہ میز پر پڑی ہوئی پتیاں سمیٹنے لگی۔ اس نے اپنے شوہر سے کچھ کہا اور کمرے سے نکل کر کچن کی طرف چلی گئی اور اس وقت دوسرے دروازے سے جانکی اندر داخل ہوئی۔ جانکی کو دیکھ کر سونیا اچھل پڑی۔ جانکی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کے گالوں پر کس کیا اور ایک دوسرے کو زندہ دیکھ کر اپنی اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔

وہ بچہ اب بھی سونیا کے سینے پر منہ مار رہا تھا۔ اسے شاید بھوک لگی تھی لیکن اس معصوم کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ ان تلوں میں ابھی تیل نہیں تھا۔ وہ مایوس ہو کر ایک بار پھر رونے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ہی ہوفا کمرے میں آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلیٹ میں دُھلی ہوئی پتیاں رکھی ہوئی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں سفید سرامک کا چکنا اور چمکتا ہوا ہاون دستہ تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اب تیز ہو گئی تھی۔

"ہمیں بتاؤ کیا کرنا ہے ان پتیوں کا۔" میں نے ہوفا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم بچے کو سنبھالو۔ اسے شاید بھوک لگ رہی ہے۔"

ہوفا نے پتیوں والی پلیٹ اور ہاون دستہ میز پر رکھ دیا اور سونیا کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ان پتیوں کو کوٹ کر رس نکالنا ہے اور بس۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔"

اس نے تشکرانہ نگاہوں سے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے بچے کو اس سے لے لیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔

یہاں کی صورتِ حال ابھی تک جانکی کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی اور شاید اس نے بیڈ پر پڑے ہوئے بوما کو بھی پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے قریب پہنچ گئی۔

"ارے۔ یہ کون ہے۔ کیا ہوا اسے؟" اس نے بوما کی سوجی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے۔" میں نے جواب دیا "ہوفا کہتی ہے کہ ان پتیوں کا رس نکال کر دیا جائے تو زہر کا اثر زائل ہو سکتا ہے بصورتِ دیگر پورے جسم میں پھیل جائے گا اور اس کی زندگی کا چراغ بجھ جائے گا۔ ہم وہ پتیاں تلاش کرنے ہی باہر گئے تھے کہ ڈرامائی انداز میں تم سے ملاقات ہو گئی۔"

جانکی ڈاکٹر تھی۔ ایسی چیزوں کا علاج بھی جانتی تھی۔ اس نے دو تین چیزوں کا نام لے کر ہوفا سے پوچھا کہ ان میں کوئی چیز گھر میں موجود ہے یا نہیں۔ ہوفا نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ان پتیوں کو پیستی ہوں۔" جانکی نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور پتیوں والی پلیٹ اور ہاون دستہ لے کر فرش پر بیٹھ گئی "ان جڑی بوٹیوں کی تاثیر میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کا مشاہدہ ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ سردار تھالوب والے کاٹیج میں لوما نے۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی اور ہاون میں پتیاں ڈال کر دستے سے ہولے ہولے کوٹنے لگی۔

جانکی نے اگرچہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن میں نے نوٹ کر لیا تھا کہ سردار تھالوب کا نام سن کر بوما کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ جانکی کھرل میں پتیاں کوٹتی رہی۔ ہوفا بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ کبھی وہ ہماری طرف دیکھتی اور کبھی بچے کو۔ بچے کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آتے۔ ایسے میں اس کے چہرے پر ممتا کا نور سا بکھر جاتا اور جب وہ ہماری طرف دیکھتی تو آنکھوں میں خوف سا جھلکنے لگتا۔ میں اور سونیا خاموش کھڑے تھے۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی لیکن اس کی نال فرش کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ ایسی صورتِ حال میں ان دونوں میاں بیوی کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

بوما بار بار اپنی ٹانگ کو جھٹک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات بڑھتے جا رہے تھے لیکن میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ جب وہ ہم تینوں میں سے کسی کی طرف دیکھتا تو اس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات کے باوجود آنکھوں میں چمک سی ابھر آتی تھی۔

جانکی پتیوں کو کوٹ چکی تھی۔ اس نے کھرل میں جمع پتیوں کا رس پلیٹ میں انڈیل دیا۔ کھرل میں اب کٹی ہوئی پتیوں کا پیسٹ سا رہ گیا تھا۔

ہوفا کی گود میں بچے کا پیٹ بھر گیا تھا اور وہ سو گیا تھا۔ ہوفا نے اپنا بلاؤز درست کرلیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ بچے کو لٹانے کے لیے شاید جگہ تلاش کر رہی تھی۔ بیڈ پر بوما پڑا ہوا تھا۔ سونیا اس کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر بچے کو لے لیا۔ ہوفا نے ایک بار پھر تشکرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئی۔ سونیا اس کرسی پر بیٹھ گئی اور بچے کو گود میں لٹالیا۔ اس کا ایک بازو بچے کی گردن کے نیچے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ بچے کے گھنے گولڈن بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس وقت میں نے سونیا کے چہرے پر بھی کچھ عجیب سے تاثرات دیکھے تھے۔

ہوفا تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار والی نوک دار چھری تھی۔ وہ پلنگ پر چڑھ گئی اور بوما کی ٹانگ کو ٹٹولنے لگی۔

میں بھی پلنگ کے قریب پہنچ گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہوفا کیا کرنے جا رہی ہے۔ میں نے بوما کی ٹانگ کو پکڑلیا۔ ہوفا نے پنڈلی پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے شوہر سے کچھ پوچھا۔ بوما نے اثبات میں سرہلا دیا۔ ہوفا نے انگلی ہٹالی۔ اس جگہ پیپرپن کے سر کے برابر ننھا سا سرخ دھبا تھا جبکہ آس پاس کی جلد نیلی ہو رہی تھی۔

ہوفا نے چھری کی تیز نوک اس سرخ دھبے پر رکھ کر تقریباً آدھا انچ لمبا چیرہ لگا دیا۔ دوسرا چیرہ اس نے کراس کی صورت میں لگایا تھا۔ پنڈلی کے زخم سے سیاہی مائل گاڑھا سا خون بہہ نکلا۔ بوما ٹانگ کو جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے مضبوطی سے دبا رکھا تھا۔ اس نے تکلیف ضبط کرنے کے لیے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔

ہوفا زخم کے آس پاس کی جگہ کو انگوٹھے سے دباتی رہی اور سیاہی مائل گاڑھا خون رستا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے ایک کپڑے سے زخم صاف کیا اور پتیوں کا رس قطرہ قطرہ کرکے زخم پر ڈالتی رہی۔ کچھ ہی دیر بعد زخم سے بہنے والے خون کی مقدار کم ہونے لگی۔ ہوفا نے پتیوں کا پیسٹ اس کے زخم پر رکھ دیا اور بچا ہوا رس اس کی ٹانگ پر ملنے لگی۔ زخم پر پٹی باندھ کر اس نے بوما کی طرف دیکھا۔ اس نے اب بھی دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے اس کی ٹانگ چھوڑ دی۔ اب وہ پیر نہیں جھٹک رہا تھا۔ ہوفا ہاون دستہ اور پلیٹ لے کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس دوران میں کچن میں سے برتنوں وغیرہ کی آوازیں آتی رہی تھیں اس لیے میں بھی اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا تھا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی تو دیر سے اس کی واپسی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں چائے کے پانچ مگ رکھے ہوئے تھے۔ ان چار دنوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ از خود چائے بنا کر لائی تھی۔ اس سے پہلے چائے، کھانا یا کوئی اور چیز طلب کرنے کے لیے اسے حکم دینا پڑتا تھا۔

میں نے اور جانکی نے ٹرے میں سے ایک ایک مگ اٹھالیا۔ سونیا کا مگ اس نے کرسی کے قریب میز پر رکھ دیا تھا اور دوسرے دونوں مگ بھی قریب ہی رکھ کر خالی ٹرے دیوار کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کردی تھی۔ اس نے مڑکر بوما سے کچھ کہا۔ بوما نے اثبات میں سرہلا دیا۔

میں بوما کی طرف دیکھ رہا تھا اور یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ اس کے چہرے پر کرب کے آثار کچھ کم ہوگئے تھے۔ ہوفا بیڈ پر چڑھ گئی اور بوما کو سہارا دے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور نیچے اتر کر چائے کا ایک مگ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر سونیا کی طرف مڑکر دونوں ہاتھ بڑھاتے ہوئے بچے کو لینے کے لیے جھکی تو سونیا نے مسکراتے ہوئے تھائی زبان میں کہا۔

"اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ اچھا لگ رہا ہے۔ بہت پیارا بچہ ہے۔"

ہوفا چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"بوما کو اب کوئی خطرہ نہیں۔ اگر تم لوگ یہاں نہ ہوتے تو آج مجھ پر قیامت گزر چکی ہوتی۔ میرے پاس تم لوگوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔"

"اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہمارا فرض تھا۔" میں نے جواب میں کہا "ویسے تم لوگوں سے ہماری دشمنی تو نہیں۔ ہمارے اصل دشمن تو وہ لوگ ہیں جن کا تعاقب کرتے ہوئے ہم موت کی اس وادی میں چلے آئے ہیں۔ ویسے شکریہ تو ہمیں تم لوگوں کا ادا کرنا چاہیے۔ مرضی کے خلاف اور جان کے خوف سے ہی سہی، تم لوگوں نے ہمیں پناہ تو دے رکھی ہے۔ اگر ہمیں اس کاٹیج میں پناہ نہ ملتی

تو موت کی اس وادی میں ہمیں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ہو سکتا ہے کہ اب تک ہم میں سے کوئی ایک یا سب ہی مارے جا چکے ہوتے۔ ہم نے بوما کو بچانے میں تمہاری تھوڑی سی مدد کرکے کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا۔"

"میرا خیال ہے یہ تمہاری وہی ساتھی ہے جس نے پہاڑی کے دوسری طرف والے پوسٹ کاٹیج میں ہماری ایک محافظ لڑکی کو قتل کردیا تھا؟" ہوفا نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ وہی ہے۔ ہم اسے مردہ سمجھ چکے تھے۔ وہاں ہماری عدم موجودگی میں کیا صورتِ حال پیش آئی تھی اور یہ چار دن تک کہاں چھپی رہی؟ یہ ابھی اس سے معلوم کرنا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چائے کی چسکیاں بھی لے رہے تھے۔ ہوفا بار بار کبھی سونیا کی گود میں سوتے ہوئے بچے کو اور کبھی سونیا کے چہرے کو دیکھنے لگتی۔

بوما کی حالت اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب پہلے کی طرح تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ دونوں ٹانگیں اس نے آگے کو پھیلا رکھی تھیں۔ جنگلی جڑی بوٹیوں کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں۔ بعض بوٹیاں تو خطرناک زہر کے لیے بھی تریاق کا اثر رکھتی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ جب میں بنکاک میں زخمی ہوا تھا تو تھائی نے جڑی بوٹیوں ہی سے تیار کردہ کوئی کریم میرے زخم پر لگائی تھی جس سے مجھے فوراً ہی فائدہ ہوا تھا۔ تھائی خود بھی وہ کریم استعمال کرتی تھی۔ میں نے خود کئی مرتبہ اس کے بدن پر کوڑے برسانے کے بعد زخموں پر وہ کریم لگائی تھی اور اس کے زخم دو چار دن میں ہی ٹھیک ہوجاتے تھے اور اب ایک اور مثال ہمارے سامنے تھی۔ ہوفا نے کہا تھا کہ اگر فوراً ہی مخصوص بوٹی کی پتیوں کا رس زہریلے کیڑے کے کاٹے کی جگہ پر نہ لگایا گیا تو بوما چند گھنٹوں کے اندر اندر ختم ہوجائے گا۔ میں نے اس وقت بوما کی حالت بھی دیکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ بچے گا نہیں لیکن زخم پر پتیوں کا رس ٹپکانے اور ان کا پیسٹ لگانے کے بعد آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ زندگی کا مزہ اٹھا رہا تھا۔

"کیا میں تم سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟" بوما نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ دیر پہلے تمہاری اس ساتھی نے سردار تھالوب کا نام لیا تھا۔ تم لوگ جنرل کھوراٹ کے مہمانوں کا تعاقب کرتے ہوئے تھائی لینڈ سے آئے ہو۔ سردار تھالوب بھی تھائی لینڈ کا رہنے والا ہے بلکہ اس کا قبیلہ تو سرحد کے ساتھ ساتھ وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ تم لوگ سردار تھالوب کو کیسے جانتے ہو اور جہاں تک میرا خیال ہے تم دونوں کا تعلق تھائی لینڈ سے بھی نہیں ہے۔" اس کا اشارہ جانکی اور میری طرف تھا۔

"جنرل کھوراٹ کے مہمانوں کو جانتے ہو، وہ کون لوگ ہیں؟" میں نے الٹا اس سے سوال کردیا۔

"نہیں۔" بوما نے نفی میں سرہلا دیا "ہم تو معمولی کارندے ہیں ہمیں صرف اپنی ڈیوٹی سے سروکار ہوتا ہے۔ زیادہ باتیں ہم نہیں جانتے اور ہمیں ایسی باتیں بتائی بھی نہیں جاتیں۔ ویسے پچھلے دنوں یہ سننے میں آیا تھا کہ چیانگ سائین میں جنرل کھوراٹ کے آدمیوں اور سردار تھالوب میں کچھ جھڑپیں ہوئی تھیں جن میں جنرل کھوراٹ کا ایک خاص آدمی سین تونگ بھی مارا گیا تھا اور یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ دارا نامی کوئی شخص تھائی لینڈ میں جنرل کھوراٹ کے مفادات کے لیے کام کر رہا ہے۔ دارا وہی شخص ہے جو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے چیانگ سائین میں جنرل کھوراٹ کے کئی آدمیوں کو سردار تھالوب کے ہاتھوں مرنے سے بچالیا تھا۔ سردار تھالوب سے اسے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوا تو جنرل کھوراٹ نے اسے ٹرائی اینگل میں آنے کی اجازت دے دی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "یہاں سردار تھالوب کے ساتھ ایک اور نام بھی لیا جا رہا ہے۔ عجیب سا نام ہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں آرہا لیکن سنا ہے کہ وہ دارا کا ہم وطن ہے اور دارا کے خون کا پیاسا ہے۔ دارا دراصل سردار تھالوب سے نہیں اس کے خوف سے بھاگ کر یہاں آیا ہے۔"

"تم نے ٹھیک سنا ہے۔" میں نے جواب دیا "سب سے پہلے تو میں یہ وضاحت کردوں کہ جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کو مروانے میں دارا ہی کا ہاتھ ہے۔ اس کے ہاتھ کئی بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ سردار تھالوب تو اسے جانتا بھی نہیں تھا اس لیے اس سے دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سردار تھالوب سے دشمنی کی ابتدا دارا ہی نے کی تھی۔ اس رات سردار تھالوب کے آدمی اس کے مہمانوں کو چیانگ رائے سے لے کر چیانگ سائین آ رہے تھے کہ دارا اور اس کے آدمیوں نے راستے میں ان کی گاڑی

پر حملہ کردیا اور سردار تھالوب کے پانچ آدمی اس حملے میں مارے گئے۔ ایسی صورت میں سردار تھالوب کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔" میں ایک بار پھر خاموش ہو کر بوما اور ہوفا کے چہروں کو تکنے لگا۔ ہم نے چار دن سے انہیں اپنا قیدی بنا رکھا تھا۔ اس دوران میں اگر انہیں موقع ملتا تو ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے سے نہ چوکتے۔ اب ہم نے ان کی ذرا سی مدد کی تھی تو وہ ہمارے بے حد شکر گزار اور احسان مند نظر آرہے تھے اور میں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اتفاق سے سردار تھالوب اور دارا کا تذکرہ نکل آیا تھا۔ دارا نے اپنے آپ کو مظلوم اور مجھے اور سردار تھالوب کو انتہائی ظالم اور بے رحم بتایا ہوگا۔ جنرل کھوراٹ کو بھی اس قسم کی اطلاعات دی ہوں گی کہ وہ دارا کا ہمدرد اور میرا اور تھالوب کا دشمن بن جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جنرل کھوراٹ کے کئی آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے لیکن میرے خیال میں اس وقت دارا کے مظالم کی مختصری داستان سنا کر بوما اور ہوفا کے دلوں میں اپنے لیے نرم گوشہ پیدا کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ میری باتیں ان پر اثر انداز ہونے لگی تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بات وہیں پر ختم نہیں ہوگئی۔ دارا اور اس کے ساتھی بے گناہوں کا قتلِ عام کرتے رہے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کو آگے کر کے مرواتا رہا۔ وہ انسان نہیں خونی بھیڑیا ہے۔ اس کا دامن لاتعداد بے گناہوں کے خون سے تر ہے۔ وہ سونیا کی ماں کا قاتل ہے۔ اس نے میرے ماں باپ کو میری نظروں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ جانگی ایک معزز ڈاکٹر تھی۔ یہ آج میرے ساتھ ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ تھائی کا گھر جلا دیا گیا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مجھے پناہ دی تھی۔ ہاں میں ہی وہ شخص ہوں جو دارا کے خون کا پیاسا ہے۔ اگر مجھ پر ظلم نہ ہوا ہوتا تو آج میں ڈاکٹر ہوتا' انجینیئر یا سائنس داں ہوتا لیکن آج میں قاتل ہوں' خونی ہوں اور اس کا ذمے دار صرف اور صرف دارا ہے اور میں دارا کا تعاقب دنیا کے آخری سرے تک کروں گا۔"

ان دونوں کے چہروں پر گویا سناٹا سا تھا۔ عجیب سے تاثرات تھے جنہیں میں کوئی نام نہیں دے سکتا لیکن ایک بات طے تھی کہ وہ پوری طرح میری باتوں کے سحر میں آگئے تھے۔ چند لمحے خاموشی رہی اور پھر بوما ہی نے لب کشائی کی۔

"تو تم سردار تھالوب کے وہی دوست ہو جو ——"

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "سردار تھالوب سے میری دوستی اگرچہ چند ہفتوں سے زیادہ پرانی نہیں لیکن وہ ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔"

"میں نے سردار تھالوب کو دیکھا نہیں لیکن یہاں اور برما میں بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں بھی اس کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اپنی خوش قسمتی پر رشک آنے لگا۔ اب ہمارے لیے راستہ خود بخود ہموار ہو رہا تھا۔

"میں برما کے سرحدی شہر ٹانگیل کا رہنے والا ہوں۔" بوما کہہ رہا تھا "کیرن قبیلے کا بنیادی تعلق دراصل برما ہی سے ہے۔ تقریباً دو سو سال پہلے اس قبیلے کچھ لوگ برما سے ہجرت کر کے تھائی لینڈ کی سرحد پر آباد ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ دور تک پھیلتے چلے گئے۔ آج کیرن قبیلے کو تھائی لینڈ کے اس شمالی خطے کا سب سے بڑا اور طاقت ور قبیلہ سمجھا جاتا ہے۔

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگرچہ برما سے کیرن قبیلے کے کچھ اور لوگ بھی بڑی تعداد میں تھائی لینڈ کا رخ کرتے رہے لیکن کیرن آج بھی بڑی تعداد میں برما کے سرحدی علاقوں میں آباد ہیں اور میرا تعلق بھی اس قبیلے کے ایک معزز گھرانے سے ہے۔۔۔ بلکہ تھا۔"

"کیرن قبیلے کے لوگ تو بڑے محنتی' جفاکش اور رزقِ حلال کے خوگر ہیں لیکن تم۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میرے حساب سے لوہا پوری طرح گرم ہوچکا تھا اور میں اسے اپنے ڈھب پر لانے کے لیے ہلکی ہلکی چوٹیں لگا رہا تھا۔ زیادہ زور دار ضرب نقصان دہ بھی ہوسکتی تھی۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" بوما نے ہلکے سے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا "جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میرا تعلق برما کے سرحدی شہر ٹانگیل سے ہے۔ یہ شہر زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن یہاں زندہ رہنے کے تمام مواقع میسر ہیں۔ میرا باپ شہر کا ایک معزز بزنس مین تھا۔ میں نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ میرا باپ مجھے بھی ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا لیکن بائیس سال کی عمر میں مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوگی جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ ایک نظر ہوفا کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "مجھے ایک لڑکی سے عشق ہوگیا۔ کیٹی ایک پولیس آفیسر کی بیٹی تھی۔ ہم میں بے تکلفی بڑھتی گئی اور پھر ایک روز میں نے اس کی مرضی کے خلاف وہ سب کچھ کر ڈالا جو مجھے نہیں کرنا

چاہیے تھا۔ کیٹی نے اپنے گھر والوں کو بتا دیا۔ اس کا باپ میرے خون کا پیاسا ہوگیا۔ ممکن ہے مفاہمت کا کوئی راستہ نکل آتا اور معاملہ رفع دفع ہوجاتا لیکن میں اس قدر خوف زدہ تھا کہ گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

"چند روز تک شہر سے کئی میل دور ایک خانقاہ میں چھپا رہا۔ میں نے بھکشوؤں کو یہ باور کرا دیا تھا کہ بے یار و مددگار اور بے سہارا ہوں۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہوں لیکن ایک روز دو پولیس والے میری تلاش میں اس طرف آ نکلے۔ میں پولیس والوں کو دیکھ کر جنگل میں چھپ گیا تھا۔ پولیس والے نجانے ان بھکشوؤں سے میرے بارے میں کیا پوچھتے رہے۔ ان کے واپس چلے جانے کے بعد میں خانقاہ میں واپس آیا تو بھکشو مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ انہیں مجھ پر شبہ ہوگیا تھا۔ مجھے اب وہاں بھی خطرہ محسوس ہونے لگا اور پھر اس سے اگلے روز میں ان بھکشوؤں کے سامان سے رقم چوری کرکے وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

"میں کہیں بھی ٹک کر نہیں بیٹھ سکا۔ کسی پولیس والے کو اپنے آس پاس دیکھ کر میری روح فنا ہوجاتی۔ رنگون میں البتہ مجھے کئی سال رہنے کا موقع ملا۔ میں اپنے ہم عمر جرائم پیشہ لڑکوں کے ایک گروہ میں شامل ہوگیا تھا۔ ہم دکانوں سے چیزیں چُراتے' رہزنی کی وارداتیں کرتے اور جو کچھ بھی ملتا آپس میں بانٹ لیتے۔

"ایک روز ہم تین لڑکے شہر کے ایک دولت مند شخص کے گھر میں گھس گئے۔ اس مکان پر ہماری کئی دنوں سے نظر تھی۔ ایک لڑکا کئی روز سے مکان کی نگرانی کرکے گھر والوں کے معمولات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس نگرانی سے ہمیں پتا چل گیا کہ اس گھر میں صرف تین افراد رہائش پذیر تھے۔ وہ دولت مند شخص' اس کی بیوی اور ان کی نو عمر بیٹی۔ ایک ملازمہ تھی جو رات نو بجے کے بعد چھٹی کرکے چلی جاتی تھی۔

"اور پھر ایک رات ہم تین لڑکوں نے اس مکان پر ہلّہ بول دیا۔ وہاں سے بڑی رقم ملنے کی توقع تھی اور میرا خیال تھا کہ میں اپنا حصہ لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا لیکن انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔

"مکان کے اندر اندھیرے میں' میں ایک کرسی سے ٹکرا گیا۔ کرسی الٹ گئی۔ آہٹ سے گھر والوں کی آنکھ کھل گئی۔ دولت مند شخص کی بیوی نے ہمیں دیکھ کر شور مچا دیا۔ میرے ایک ساتھی نے اسے دبوچ لیا۔ پہلے دھمکا کر اسے خاموش کرانے کی کوشش کی اور پھر اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ وہ دولت مند شخص اور اس کی بیٹی بھی شور کی آواز سن کر جاگ گئے تھے۔ انہوں نے بھی شور مچا دیا۔ ہم تینوں وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

"صبح پتا چلا کہ اس دولت مند شخص کی بیوی مرگئی تھی۔ میرا اگرچہ اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن پکڑے جانے کے خوف سے وہ شہر چھوڑ دیا اور ایک بار پھر مختلف قصبوں اور شہروں میں بھٹکتا ہوا منڈالے پہنچ گیا۔

"جو شخص ایک مرتبہ بھٹک جائے اس کا راہِ راست پر آنا مشکل ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ کوشش بھی کرے تو بعض عناصر اس کا راستہ روک لیتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی تھی جس کی اگر مجھے سزا مل جاتی تو برائی کے راستے پر میرے قدم رک جاتے مگر میں سزا سے بچنے کے لیے بھاگ نکلا تھا۔ مجھے ایسے لوگ تو بہت ملے جو برائی کے راستے پر میری حوصلہ افزائی کرتے رہے لیکن ایک بھی شخص ایسا نہیں ملا جو مجھے اس راستے پر چلنے سے روکتا۔ میں جرائم کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

"منڈالے میں ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوگئی جس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ تریاڈ کا رکن ہے۔ تریاڈ بہت ہی خطرناک تنظیم ہے۔ ساؤتھ ایشیا کے بیشتر ممالک میں اس کا ہولڈ ہے۔ برما میں بھی تمام جرائم اسی تنظیم کی سرپرستی میں ہوتے ہیں۔ منشیات کے دھندے' عورتوں کی جسم فروشی' جوا' بھتے وصول کرنا۔ یہ تمام جرائم یہی تنظیم کراتی ہے اور پولیس ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔

"گومل نامی وہ آدمی اپنے علاقے میں منشیات کے دھندے کی نگرانی کرتا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ کام کرتا رہا۔ کئی سال گزر گئے۔ اس عرصے کے دوران میں' میں کئی مرتبہ پکڑا گیا تھا لیکن مجھے یاد ہے میں کبھی بھی دو تین گھنٹوں سے زیادہ کسی تھانے میں نہیں رہا تھا۔ جیل جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیس کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ اس سے پہلے ہی معاملہ طے ہوجاتا تھا اور مجھے تھانے ہی سے عزت و احترام کے ساتھ رخصت کردیا جاتا تھا۔

"میں منڈالے میں اس گروہ کے اندر بڑی اہمیت اختیار کرگیا تھا۔ میں نہ صرف اس کاروبار کی اونچ نیچ سے بہت اچھی طرح واقف ہوچکا تھا بلکہ گروہ کے بہت سے راز بھی جان چکا تھا۔

"اور پھر ایک روز دو آدمی میرے ہاتھوں مارے گئے۔ ان میں ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ پولیس کے محکمے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ پولیس کی سرپرستی کے بغیر جرائم نہیں پنپ سکتے۔ منڈالے کی پولیس اور دیگر متعلقہ محکمے بھی جرائم میں پوری طرح ملوث تھے۔ بھاری رشوت اور بھتے پولیس کو شہر میں ہونے والے جرائم کی طرف سے آنکھیں بند کرلینے پر مجبور کردیتے تھے لیکن یہ معاملہ دو آدمیوں کے قتل کا تھا اور ان میں ایک پولیس آفیسر بھی تھا۔ اپنے ایک ساتھی کے قتل پر پولیس کس طرح خاموش رہ سکتی تھی۔ گومل اور ترياڈ کے دوسرے مقامی عہدے داروں نے پولیس کے اعلیٰ افسران سے مل کر معاملے کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن پولیس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ مجھے ان کے حوالے کردیا جائے۔

"مجھے پولیس کے حوالے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میرے پاس ترياڈ کے بہت سے راز تھے جو پولیس تشدد کرکے اگلوا سکتی تھی۔ گومل نے مجھے منڈالے سے نکال کر یہاں بھیج دیا۔" بوما خاموش ہوگیا۔ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بولا "مجھے یہاں تین سال ہوچکے ہیں۔ منڈالے میں' میں ان کے لیے اہم آدمی تھا لیکن یہاں لگتا ہے مجھے فراموش کردیا گیا ہے۔ مجھے عام آدمیوں کی طرح یہاں گارڈ کی ڈیوٹی دے دی گئی ہے۔ بہت سی باتیں ہم جیسے لوگوں سے چھپائی جاتی ہیں۔ کچھ باتیں اِدھر اُدھر سے معلوم ہوجاتی ہیں۔ ویسے کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ ہم جیسے لوگ اہم معاملات سے بے خبر ہی رہیں۔ اب دارا کا معاملہ ہے۔ مجھے یہی معلوم ہوا تھا کہ اس نے تھائی لینڈ میں سردار تھالوب کے خلاف جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کی مدد کی تھی اور جنرل کھوراٹ نے تھالوب اور تمہارے انتقام سے بچنے کے لیے اسے یہاں پناہ لینے کی اجازت دے دی۔ دارا اور اس کے ساتھیوں کی حیثیت جنرل کھوراٹ کے مہمانوں کی ہے۔ یہاں ان کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔"

"بات صرف اتنی سی نہیں ہے۔ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "دارا شہنشاہ کے خلاف ایک سازش میں بھی ملوث ہے۔ اگر مجھے تھالوب جیسے دوستوں کی مدد حاصل نہ ہوتی تو اس سازش کے نتائج بہت بھیانک ہوسکتے تھے۔ بہرحال' جب بات شروع ہوئی تھی تو تم تھالوب کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے تھے؟"

"میں نے تھالوب کو دیکھا نہیں لیکن اس کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ اس نے تھائی لینڈ میں اپنے قبیلے کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ یہاں اس کے بارے میں بہت غلط تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ کاش! میں اس کے لیے کچھ کرسکتا؟"

"تم بہت کچھ کرسکتے ہو بوما۔" میں نے کہا۔

"یہاں میں قیدی ہوں۔" بوما نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "ایک ایسا قیدی جو آزادی سے گھوم پھر سکتا ہے لیکن ٹرائی اینگل کی حدود سے باہر نہیں جاسکتا۔"

"تم قیدی ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کرسکتے ہو۔" میں نے کہا۔ اپنی کامیابی پر میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ بوما اب مکمل طور پر سرنڈر ہوچکا تھا "دیکھو بوما۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "مجھے دیکھو۔ ان لڑکیوں کو دیکھو۔ ہم نے برائی کے خاتمے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں اور۔۔۔"

"خوش قسمت ہو تم کہ تمہیں شروع ہی میں ایسے آدمی مل گئے تھے جنہوں نے تمہیں غلط راستے پر چلنے سے روک دیا تھا اور تمہارے دل میں بدی کے خاتمے کی لگن پیدا کردی تھی۔ میرے ساتھ ایسا ہوا ہوتا تو۔۔۔"

"اب بھی وقت نہیں گزرا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ درست ہے کہ ہم دو چار آدمی دنیا بھر سے برائی کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں کرسکتے لیکن بدی کے اس تناور درخت کی چند شاخیں کاٹ کر اسے مزید پھیلنے سے تو روک سکتے ہیں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "یہ گولڈن ٹرائی اینگل ایسی جگہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو منشیات سپلائی کی جاتی ہیں۔ تم منڈالے میں یہ دھندا کرچکے ہو۔ تم نے وہاں اس کے اثرات دیکھے ہوں گے۔ اس وقت تمہیں شاید اس کا احساس نہ ہوا ہو لیکن اب سوچو تو تمہیں احساس ہوجائے گا کہ منشیات کا یہ زہر کس طرح دنیا بھر میں نوجوان نسل کو مفلوج کررہا ہے۔ انہیں تباہی کے دہانے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ دارا کوئی عام قسم کا غنڈا یا بدمعاش نہیں ہے۔ اس کا اصل مقصد ایک بہت بڑا ڈرگ ریکٹ قائم کرنا ہے اور وہ بہت عرصے سے جنرل کھوراٹ سے رابطے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے ایسے کئی آدمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جو اس کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کررہے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ جنرل کھوراٹ کو بھی ایسے ہی بے رحم اور سفاک آدمیوں کی تلاش رہتی ہوگی جو اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کرسکیں۔ اب دارا یہاں تک پہنچ چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی معاملہ طے ہو ہمیں دارا کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"کاش تم سے بہت عرصہ پہلے ملاقات ہوئی ہوتی۔" بوما نے کہتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا "میں تمہاری طرف دوستی

کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ اب تم مجھے پہلے سے بہت مختلف پاؤ گے۔"

میں نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ ہماری بہت بڑی فتح تھی۔ ہم نے دشمن کے گھر میں گھس کر اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ جو کام طاقت سے نہیں ہو سکتا تھا' وہ باتوں نے کر دکھایا تھا۔ میں اس زہریلے کیڑے کو بھی دعائیں دے رہا تھا جس نے بوما کو کاٹا تھا اگر وہ زہریلا کیڑا اسے نہ کاٹتا تو انہیں ہماری مدد کی ضرورت بھی نہ پڑتی لیکن ہمارے ایک چھوٹے سے احسان نے ان دونوں میاں بیوی کو ہمارا بے دام غلام بنا دیا تھا اور وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگر دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہم نے ان کے کاٹیج میں پناہ لے رکھی ہے تو ہمارے ساتھ انہیں بھی گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔

ہوفا نے بھی اٹھ کر ہم تینوں سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک ابھر آئی تھی۔

اس واقعے کی ابتدا شام کو ہوئی تھی اور اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

"اب تم لوگ ہمارے معزز مہمان اور دوست ہو۔" ہوفا نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ میں پہلے کچھ کھانے کا بندوبست کر لوں۔"

اس نے سونیا کی گود میں سوئے ہوئے بچے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے چینی زبان میں بوما سے کچھ کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ جانگی بھی اٹھ کر اس کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ میں اور بوما ایک بار پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔

کھانا تقریباً ایک گھنٹے میں تیار ہو سکا تھا۔ ہوفا نے کھانا لگانے کے بعد بچے کو سونیا کی گود سے لے کر بوما کے قریب پلنگ پر لٹا دیا تھا۔

کھانے کے بعد بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہم تینوں کے سونے کے لیے ہوفا نے دوسرے کمرے میں بندوبست کر دیا تھا اور وہ بندوبست یہ تھا کہ کمرے کے فرش پر ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ اس کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

اب مجھے بوما یا ہوفا کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم تینوں اطمینان سے اس کمرے میں آ کر دری پر بیٹھ گئے اور اس وقت میں نے پہلی بار یہ بات نوٹ کی کہ جانگی کے پاس کوئی عام رائفل نہیں' سب مشین گن تھی۔ اس کی اپنی رائفل تو میں نے کاٹیج کے برآمدے میں پڑی ہوئی دیکھی تھی اور جانگی کے جسم پر اس کا اپنا لباس بھی نہیں تھا۔ وہ ٹرائی اینگل کے محافظوں والا کمانڈو ڈریس پہنے ہوئے تھی اور اتفاق تھا کہ بوما کی دیکھ بھال اور باتوں میں اب تک ان تبدیلیوں پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔

"ہاں۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری طرف اتر ہی رہے تھے کہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ واپس آئے تو کمرے میں خون بکھرا ہوا دیکھا۔ وہ محافظ لڑکی بھی غائب تھی اور تم بھی۔ تمہاری رائفل برآمدے میں پڑی تھی۔ کمرے کے اندر تمہارا خنجر اور ہیئر کلپ بھی مل گیا۔ میں تو تم پر فاتحہ پڑھ چکا تھا۔ اب تم بتاؤ کہ ہماری عدم موجودگی میں اس کاٹیج میں کیا ہوا تھا اور تم زندہ کیسے بچیں؟"

"موت نے مجھے دبوچنے کی پوری کوشش کی تھی مگر میں اس بار بھی اسے چکما دینے میں کامیاب ہو گئی۔" جانگی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تم لوگوں کے جانے کے بعد کچھ دیر تک تو میں کاٹیج کے باہر پتھر پر ہی بیٹھی رہی پھر میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی قریبی پوسٹ کا کوئی اور محافظ اس طرف نکل آیا تو اپنے لباس کی وجہ سے میں فوراً ہی اس کی نظروں میں آجاؤں گی۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس محافظ لڑکی کے ساتھ کپڑے تبدیل کر لینے چاہئیں۔ میرے جسم پر کمانڈو ڈریس ہوگا تو فوری طور پر مجھ پر شبہ نہیں کیا جا سکے گا اور مجھے کچھ نہ کچھ کرنے کا موقع مل جائے گا۔

"میں نے کمرے میں داخل ہو کر اس لڑکی کو بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اس کی رسیاں کھول دیں اور کپڑے اتارنے کو کہا اور پھر اپنے کپڑے بھی اتار دیے۔

"وہ موقع کی تلاش میں تھی لیکن میں نے خنجر ہاتھ میں لے رکھا تھا لیکن کپڑے پہنتے ہی اسے موقع مل گیا اور اس نے گھوم کر میری کنپٹی پر اس زور کا گھونسا مارا کہ میں چکرا کر گر پڑی۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی۔ میں شاید ایک ڈیڑھ منٹ کے لیے اپنے حواس سے بیگانہ ہوئی تھی۔ مجھے فرش پر بے حس و حرکت دیکھ کر وہ [illegible] میں بے ہوش ہو گئی ہوں۔ میرے حواس بحال ہوئے تو وہ ٹیلی فون پر کسی کو ہمارے بارے میں بتا رہی تھی۔ میرا خنجر قریب ہی پڑا تھا۔ میں خنجر اٹھانا ہی چاہتی تھی کہ لڑکی نے مجھے دیکھ لیا اور فون کا ریسیور رکھ کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

"وہ کم بخت بہت طاقت ور تھی اور یقیناً اسے لڑائی کی ٹریننگ بھی دی گئی تھی۔ وہ مجھے بری طرح رگیدتی رہی۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرے بال جکڑ رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے میرے پیٹ اور سینے پر گھونسے مار رہی تھی۔

"بالآخر مجھے بھی موقع مل ہی گیا۔ میں اسے رگیدتے ہوئے دیوار تک لے گئی۔ اس وقت وہ میرے نیچے دبی ہوئی تھی اور قریب ہی فرش پر میرا خنجر بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر اس کے سینے پر وار کیا اور چیخ اٹھی اور پھر مجھ پر جیسے جنون سا طاری ہو گیا۔ میں خنجر سے اس کے سینے اور پیٹ پر پے در پے وار کرتی رہی۔ میرے ذہن میں صرف ایک بات تھی۔ اگر میں اس کے قابو میں آجاتی تو وہ میرا بھی یہی حشر کرتی اور پھر اس نے ہمارے بارے میں کسی دوسری جگہ اطلاع دے کر ہماری سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

"میں اسے چھوڑ کر اٹھ گئی۔ وہ تڑپتی ہوئی فرش پر ادھر اُدھر لڑھک رہی تھی۔ میں نے اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر لادا۔ اس کی سب مشین گن اٹھائی اور کاٹیج سے نکل کر سامنے کھیتوں کی طرف دوڑ لگا دی۔" جانگی خاموش ہو کر باری باری ہماری طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "تم لوگوں کو گئے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ پہلے میں نے بھی سوچا تھا کہ پہاڑی پر چڑھ جاؤں لیکن پھر اس کا موقع نہیں ملا کیونکہ اسی وقت ایک جیپ کاٹیج کے سامنے آکر رکی تھی۔ وہ دو آدمی تھے۔ کاٹیج کے اندر آکر انہوں نے صورتِ حال دیکھی تو باہر نکل کر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے اور پھر اس لڑکی کی لاش جیپ میں ڈال کر بھاگ گئے۔ ہو سکتا ہے اس وقت تک اس لڑکی میں کچھ سانس باقی ہوں اور وہ اس لیے اسے لے کر بھاگ گئے ہوں کہ شاید اسے بچایا جا سکے۔

"مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ جلد ہی واپس آئیں گے اور پھر میری تلاش شروع کر دیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے میں دور نکل جانا چاہتی تھی۔ میں پوست کے کھیتوں میں دوڑتی رہی۔

"اور پھر یہ چار دن جس طرح گزرے' میں ہی جانتی ہوں۔ اس دوران میں' میں نے کئی محافظوں کو شکاری کتوں کی طرح ہر طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ مجھے اور تم دونوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے اور آج رات کے آخری پہر مجھے درختوں کے پیچھے پوشیدہ ایک غار مل گیا۔ میں نے سارا دن اس غار میں گزارا۔ یہ کاٹیج قریب ترین تھا۔ میں نے دن میں ایک دو مرتبہ ہوفا کو باہر نکلتے دیکھا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد کوئی قدم ضرور اٹھاؤں گی اور پھر میں نے تمہیں اور ہوفا کو کاٹیج کے عقبی دروازے سے نکل کر جنگل کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔ اندھیرے کی وجہ سے میں تمہیں پہچان نہیں سکی تھی۔ تم ویسے ہو تو بہت خطرناک لیکن شکر ہے میری وارننگ کے جواب میں تم نے کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔" وہ مسکرا کر میری طرف دیکھنے لگی۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر میں اسے اپنی روداد سنانے لگا۔ آخر میں میں نے کہا تھا۔

"یہ اتفاق ہی کہہ لو کہ ہم نے بھی اسی غار میں پناہ لی تھی اور کارروائی کے لیے اس کاٹیج ہی کو تاڑا تھا۔ ہم نے ہوفا اور بچے کو یرغمال بنا لیا اور بوما کو باہر آنے جانے کی آزادی دے دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو اس کی بیوی اور بچے میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔ آج ہمیں یہاں چوتھا دن تھا۔ بوما کو زہریلے کیڑے کے کاٹنے کا جو حادثہ پیش آیا تو اس کے بعد ساری صورتِ حال ہی تبدیل ہو گئی اور جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔"

"میں دیکھ رہی ہوں کہ تم نے انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کیا یہ خطرناک نہیں؟" جانگی نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "میں کسی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے وہ ہمیں دھوکا نہیں دیں گے بلکہ ہمارے لیے بہت ہی کار آمد ثابت ہوں گے۔ ہم ان کے ذریعے دارا وغیرہ کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"

"اگر کوئی دھوکا ہوا تو ہم میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا۔" جانگی نے کہا۔

"خطرات میں تو ہم ویسے ہی گھرے ہوئے ہیں۔ جو بھی صورتِ حال ہوگی' اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔"

میں اور جانگی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں سونیا خاموشی سے لیٹی رہی تھی۔ میں نے ایک موقع پر اسے مخاطب کیا تو جواب نہیں ملا۔ وہ سو چکی تھی۔ یہاں چار دن ہم نے بڑی ٹینشن میں گزارے تھے۔ بوما اور ہوفا کی نگرانی کے لیے کبھی میں جاگتا اور کبھی سونیا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ وہ اعصابی تناؤ ختم ہو گیا تھا جس نے چار دن سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سکون ملتے ہی سونیا سو گئی تھی۔

جانکی بھی جماہیاں لینے لگی۔ وہ بھی اعصاب شکن حالات سے گزری تھی۔ اب اس کی آنکھیں بھی بند ہونے لگیں اور پھر میں بھی اس سے کچھ دور ہٹ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

بچے کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور اس کے ساتھ ہی میں چونک گیا۔ سونیا میرے بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ حالانکہ رات کو وہ مجھ سے دور تھی۔ پتا نہیں وہ کس وقت اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکالا اور اٹھ کر دروازہ ذرا سا کھول دیا۔

دن کا اُجالا پھیل رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے سے بچے کے رونے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ کھول دیا۔ بوما پلنگ پر سو رہا تھا اور ہوفا بچے کے ساتھ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر تھی۔ بچے کے رونے کی آواز سے وہ جاگ گئی تھی اور ایک طرف سے اپنے بلاؤز کو اوپر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی دروازہ کھولتے دیکھا تھا مگر میں آگے نہیں بڑھا اور آہستگی سے دروازہ بھیڑ کر واپس آگیا۔ بچے کے رونے کی آواز بند ہوگئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ اس وقت شاید سات بجنے والے تھے کہ ہمارے کمرے کا دروازہ کھلا۔

"چائے پیو گے؟" ہوفا نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مل جائے تو بڑی اچھی بات ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔ پچھلے کئی دنوں سے ہم بیڈ ٹی جیسی عیاشی کو بھول گئے تھے اور آج ہوفا کو خود ہی خیال آگیا تھا۔ میں نے جانکی اور سونیا کو بھی جگا دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوفا چائے لے کر آگئی۔ وہ بھی ہمارے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد دوسرے کمرے سے بچے کی قلقاریوں کی آواز سنائی دی۔ ہوفا نے اٹھنا چاہا مگر سونیا اس سے پہلے ہی اٹھ کر دروازے تک پہنچ چکی تھی۔ چند منٹ بعد وہ بچے کو لے آئی اور اسے گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ بچہ مسکرا کر اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ سونیا نے اپنا چہرہ جھکا لیا۔ بچہ کبھی اس کی ناک کو پکڑتا اور کبھی ٹھوڑی کو اور بالآخر سونیا کے بال اس کی مٹھی میں آگئے۔ وہ بالوں کو کھینچتے ہوئے قلقاریاں بھر رہا تھا۔ ہوفا حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ معصوم سا بچہ کتنی جلدی سونیا سے مانوس ہوگیا تھا۔

"میں نو بجے کے قریب بوما کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں گی۔ اسے دو تین روز آرام کی ضرورت ہے اور اس کے لیے بستی کے کمانڈر اور ڈاکٹر کو اطلاع دینا ضروری ہے۔" ہوفا میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کوئی ڈاکٹر بھی ہے؟" میرے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

"ڑائی اینگل میں ایسی کئی بستیاں ہیں اور ہر بستی میں ایک ڈاکٹر موجود ہے کیونکہ یہاں سانپ اور زہریلے کیڑے مکوڑے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ویسے بھی چھوٹے موٹے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ جنرل کھوراٹ اپنے آدمیوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ انہیں بہترین خوراک اور علاج معالجے کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کی تفریح کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ہر بستی میں ایک بہت شان دار ریکریشن ہال بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ ڈاکٹر کے پاس چلے جانا اور اس بچے کے بارے میں پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔" سونیا نے کہا۔

"بچے کو ساتھ لے جانا ضروری ہے۔" ہوفا نے کہا "سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ ہم بچے کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑتے۔ اتنے چھوٹے بچے کو اکیلا چھوڑا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر آج بچہ ہمارے ساتھ نہ ہوا تو کسی کو شبہ ہوسکتا ہے۔"

ہوفا کی بات میں وزن تھا۔ بچہ ساتھ نہ ہونے کی صورت میں کسی قسم کا شبہ کیا جاسکتا تھا۔

"تم لوگوں میں سے کسی کے دل میں شاید کوئی شبہ ہو۔" ہوفا نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن ہم دوستی کا ہاتھ ملا چکے ہیں۔ ہم اپنی بات نبھانے کے لیے جان تو دے دیں گے مگر تم لوگوں کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کریں گے۔"

"اگر کوئی شبہ ہوتا تو رات کو ہم اطمینان سے نہ سو جاتے۔" میں نے کہا "لیکن تم لوگوں کو میرا ایک کام بھی کرنا ہوگا۔ وہ میں جانے سے پہلے بتا دوں گا۔"

ہوفا چائے کے خالی مگ لے کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں دوسرے کمرے میں بوما کے پاس آگیا۔ رات کو اس کی ٹانگ بہت سوج گئی تھی لیکن اس وقت سوجن آدھی رہ گئی تھی۔

"اس کا بہترین علاج تو یہ بوٹی ہی ہے لیکن ڈاکٹر کے پاس جانا ضروری ہے۔ اگر کمانڈر کو اطلاع نہ دی گئی اور میں ڈیوٹی کے وقت کنٹرول روم نہ گیا تو میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ادھر آجائے گا۔" بوما نے کہا۔

"میں نے تم لوگوں کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں

کیا۔" میں نے کہا "تمہیں ہمارے لیے کچھ کام بھی کرنا ہوگا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

ناشتے کے بعد پونے نو بجے کے قریب وہ کاٹیج سے نکل گئے۔ ہوفا نے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ اس نے بچے کو تنکوں کی ایک مخصوص باسکٹ میں ڈال کر اسٹریپ کی مدد سے باسکٹ کو پشت پر ڈال لیا تھا۔ ہم کھڑکی میں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ درختوں کی آڑ میں ہو کر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا اور پردہ برابر کردیا۔ میں سونیا اور جانکی کے چہروں پر واضح طور پر بے چینی کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔

"اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو؟" جانکی نے خدشے کا اظہار کیا۔

"میرا خیال ہے ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے جواب دیا "اگر دھوکا ہوا اور ہمیں گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ہم آخری لمحوں تک لڑیں گے اور چار چھ کو مار کر ہی مریں گے۔"

ہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانک لیتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی اور میں سوچ رہا تھا کہ ان پر بھروسا کرکے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ لیکن بہرحال، اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرلیا تھا۔

لیکن ہمارے خدشات بے بنیاد نکلے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ہوفا اکیلی واپس آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ اس وقت اس نے بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔

"مجھے تو کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہوفا اکیلی آرہی ہے۔ بوما شاید ٹانگ میں تکلیف کی وجہ سے وہاں رہ گیا ہے اور ہوسکتا ہے کچھ دیر بعد اس کاٹیج کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" میں نے کہا "اگر ایسا کوئی منصوبہ ہوتا تو ہوفا اپنے بچے کو ساتھ لے کر نہ آتی۔ کوئی ماں باپ اپنے بچے کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔"

ہوفا قریب آتی جارہی تھی اور پھر وہ برآمدے میں پہنچ گئی۔ اس نے شاید مجھے کھڑکی میں دیکھ لیا تھا کیونکہ اس طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ دروازہ کھول کر اندر آگئی۔

"بوما کہاں ہے؟" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"گھبراؤ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ بچہ اس کی گود میں سو رہا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر بچے کو آہستگی سے پلنگ پر لٹا دیا اور مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی "کنٹرول روم میں تم ہی لوگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ تم لوگوں کے ہاتھوں ان کے چار آدمی مارے جاچکے ہیں اور وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح تم لوگوں کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ دریائی کناروں کے ساتھ ساتھ گشت میں اضافے کے علاوہ دریاؤں میں بھی کشتیوں پر پیٹرولنگ شروع کردی گئی ہے اور ڑائی اینگل کا چپا چپا چھانا جارہا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "پہلے جنرل کھوراٹ سے اس بات کو چھپایا جارہا تھا لیکن اب اسے پتا چل گیا ہے۔ اس نے بستی کے کمانڈر کو چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی ہے کہ تم لوگوں کو زندہ یا مردہ کسی بھی حالت میں اس کے سامنے پیش کیا جائے۔"

"اور دارا وغیرہ کے بارے میں کیا معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"سنا ہے کہ وہ بہت خوف زدہ ہیں۔" ہوفا نے جواب دیا "وہ جلد سے جلد جنرل کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر پہنچنا چاہتے ہیں لیکن جنرل کھوراٹ نے انہیں چند روز اور یہیں رکنے کو کہا ہے۔ جنرل کھوراٹ کسی اہم کام میں مصروف ہے ورنہ ایسی سنگین صورتِ حال میں وہ خود یہاں دوڑا آتا۔ بوما اس لیے وہاں رک گیا ہے کہ وہ دارا وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرکے آئے گا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں کھانا تیار کرلوں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

"پہلے پیٹ کا خیال نہیں تھا لیکن اب بھوک لگنے لگی ہے۔ چلو۔ میں بھی تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" جانکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں کچن میں چلی گئیں۔ میں اور سونیا وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سونیا کے چہرے اور آنکھوں میں تشویش نمایاں تھی۔

"اگر انہیں شبہ ہوگیا کہ ہم اس کاٹیج میں چھپے ہوئے ہیں تو؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رات کو بوما بتا رہا تھا کہ محافظوں کو ہر دو چار مہینوں بعد اِدھر اُدھر تبدیل کردیا جاتا ہے لیکن یہ دونوں میاں بیوی تین سال سے یہاں ہیں۔ گویا دونوں اس بستی کے سب سے قابلِ اعتماد ہیں۔ اگر کاٹیجز کی تلاشی شروع کی بھی گئی تو ان کے کاٹیج پر شبہ نہیں کیا جائے گا۔ ویسے میرے خیال میں اس کی نوبت نہیں آئے گی۔"

چند منٹ بعد سونیا بھی اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور میں اکیلا بیٹھا صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ جنرل کھوراٹ نے

مقامی کمانڈر کو چوبیس گھنٹوں کی مہلت دی تھی اور میرے خیال میں اگلے چوبیس گھنٹے ہمارے لیے بھی بہت اہم تھے۔ ویسے یہ اطلاع میرے لیے خوش آئند تھی کہ دارا اور اس کے ساتھیوں کو اگلے چند روز کے لیے اور یہیں رکنے کو کہا گیا تھا۔ اب مجھے بوما کا انتظار تھا۔ اس کے آنے پر ہی دارا وغیرہ کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔

دوپہر کا کھانا ہم نے تین بجے کے قریب کھایا تھا۔ بوما کی واپسی چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ لنگڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

وہ اندر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کچھ دیر ستانے کا موقع دیا اور پھر اس پر سوالات کی بوچھار کردی۔

"دھیرج۔۔۔ دھیرج۔۔۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگا "تم لوگوں کی تلاش کے حوالے سے سرگرمیوں کے بارے میں تو ہوفا نے بتا دیا ہوگا۔ میں دارا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں رپورٹ دوں گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "تم تو کہتے تھے کہ دارا بہت ظالم اور سفاک آدمی ہے لیکن وہ تو بہت بزدل نکلا۔"

"ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔" میں نے کہا "وہ ظلم و ستم جو کچھ بھی کرتا ہے' دوسروں کے بل بوتے پر کرتا ہے لیکن جب اپنے سر پر پڑتی ہے تو پاتو خارش زدہ کتے کی طرح دُم دبا کر بھاگ نکلتا ہے یا قدموں پر گر کر رحم کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ بہرحال تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"چار محافظوں کے قتل اور تم لوگوں کے فرار نے دارا پر دہشت سی طاری کر رکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم شیروں کی کچھار میں گھس کر قتل و غارت کرسکتے ہو تو وہ کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم کسی بھی وقت اس کی گردن ناپ سکتے ہو اسی لیے وہ جلد سے جلد جنرل کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر پہنچ جانا چاہتا ہے جو اس کے خیال میں سب سے محفوظ جگہ ہے لیکن جنرل کھوراٹ نے اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے اسے مزید چند روز یہیں رکنے کو کہہ دیا ہے۔"

"پہلے تم نے بتایا تھا کہ دارا کے ساتھ دو آدمی اور ایک خوب صورت لڑکی ہے اور اس لڑکی کا حلیہ تھائی سے مختلف ہے۔ وہ لڑکی۔۔۔ مجھے یاد ہے چیانگ سائمین میں دریا کے کنارے والے کاٹیج میں ان کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کو ان میں سے کسی نے مار ڈالا تھا اور دوسری کو وہ اپنے ساتھ لے آئے تھے لیکن تھائی۔۔۔ وہ بھی ان کے ساتھ تھی۔"

"تھائی اب بھی ان کے ساتھ ہے۔" بوما نے کہا "میں نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ ان کے ساتھ ایک اور عورت بھی ہے۔ میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا لیکن سنا ہے کہ وہ بیمار ہے اور کاٹیج سے باہر نہیں نکلتی۔"

مجھے یاد آگیا۔ بوما نے پہلے بھی بتایا تھا کہ دارا وغیرہ کے ساتھ دو عورتیں ہیں جن میں ایک بیمار ہے۔ میں جانتا تھا جس رات جھڑپ میں تھائی دارا کے ہاتھ لگی تھی وہ زخمی تھی اور پریرے نے بتایا تھا کہ اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ علاج نہ ہونے کی وجہ سے اس کا زخم بگڑ گیا ہوگا۔

"وہ کس کاٹیج میں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کنٹرول روم سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر جو کاٹیج ہے' وہ لوگ اسی میں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن تم نے تو اس طرف کا علاقہ دیکھا ہی نہیں۔ تمہیں کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔" بوما نے کہا۔

"میں وہ علاقہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کیا۔۔۔؟" بوما اچھل پڑا۔

"اس کے لیے ہمیں محافظوں کے ڈریس درکار ہوں گے اور میرا خیال ہے تم یہ بندوبست کرسکتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"کپڑوں کا تو بندوبست ہوجائے گا لیکن۔۔۔"

"اس طرف جانا خطرناک ہوگا۔ یہی کہنا چاہتے ہونا؟" میں نے اس کا جملہ مکمل کردیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ یہاں تک آگئے ہیں تو ہم اس کاٹیج میں چھپ کر تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ جب تک باہر نہیں نکلیں گے ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ اگلے چوبیس گھنٹے خطرناک ہوسکتے ہیں مگر اس کے بعد۔۔۔ میں اس کے بعد اپنی کارروائی شروع کرنا چاہتا ہوں۔ تم کپڑوں کا بندوبست کب تک کرسکتے ہو؟"

"کل تک ہوجائے گا۔" بوما نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "مجھے چھٹی نہیں دی گئی صرف آج کا دن ریسٹ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ کل سے مجھے ڈیوٹی پر جانا ہوگا۔ کمانڈر کا کہنا ہے کہ مداخلت کاروں کی تلاش کے لیے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں اگر بھاگ دوڑ نہیں کرسکتا تو کنٹرول روم میں تو بیٹھ کر ڈیوٹی دے سکتا ہوں۔"

"اور میرا خیال ہے یہ اچھی بات ہے۔" میں نے کہا

"اس طرح ان لوگوں کی سرگرمیوں کا پتا چلتا رہے گا۔" پھر کہا۔ "ہمیں چوبیس گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جاسکے گا۔"

میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ میرے دماغ پر عجیب سا بوجھ اور اعصاب میں تناؤ سا تھا۔ میں دری پر لیٹ گیا اور سونیا والا بیگ اٹھا کر تکیے کی طرح سر کے نیچے رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں سوچکا تھا۔

جانکی نے رات کے کھانے کے وقت مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ مجھ پر نجانے کیوں اتنی تھکن سوار ہوگئی تھی۔ کھانے کے فوراً ہی بعد میں دوبارہ سوگیا اور اس کے بعد میری آنکھ صبح دس بجے ہی کھلی تھی۔ اس سے پہلے کسی نے مجھے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بوما نو بجے سے پہلے ہی جاچکا تھا۔ دوپہر دو بجے کے قریب میں کمرے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ہوفا تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ آہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ہوفا کے ساتھ سونیا اور جانکی بھی تھی۔ ان کے چہروں پر تشویش کے تاثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔

"دروازہ بند کرلو۔ تم لوگ اس کمرے سے باہر مت نکلنا۔ پھانگ اس طرف آرہا ہے۔ مجھے اس کی نیت کچھ اچھی نہیں لگتی۔" ہوفا نے کہا۔

"پھانگ کون؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اسے یہاں آئے ہوئے صرف پندرہ دن ہوئے ہیں لیکن پانچ چھ لڑکیوں کو پامال کرچکا ہے۔ ایک مرتبہ مجھ پر بھی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنے آپ کو بچا گئی۔ میں چونکہ ڈیوٹی پر نہیں جاتی اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ مجھے بھول گیا ہے لیکن کل بوما کے ساتھ گئی تو موقع پا کر مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ بڑا حرامی آدمی ہے۔ بوما ڈیوٹی پر ہے پھانگ سمجھ گیا ہوگا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ وہ اس طرف آرہا ہے۔ اس کی نیت اچھی نہیں لگتی۔ میں اسے ٹالنے کی کوشش کروں گی۔ تم لوگ اپنے کمرے کا دروازہ بند رکھنا۔"

میں نے دوسرے کمرے کی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا۔ پھانگ اس وقت تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ درمیانے قد و قامت کا صحت مند آدمی تھا۔ کمانڈو ڈریس پر بیلٹ میں اڑسا ہوا ریوالور بھی صاف نظر آرہا تھا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اسی طرف آرہا تھا۔

"اسے اپنے کمرے میں لے آنا۔ آج اس سے بھی تمہیں نجات مل جائے گی۔" میں نے ہوفا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کھڑکی کا پردہ برابر کرکے دوسرے کمرے میں واپس آگیا۔

سونیا اور جانکی اپنی اپنی رائفلیں لیے کھڑی تھیں۔ میں نے بھی اپنی رائفل اٹھالی اور ہم دروازہ بھیڑ کر دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ چپک کر کھڑے ہوگئے۔

تقریباً تین منٹ بعد دستک کی آواز ابھری۔ ہوفا نے دروازہ کھول دیا وہ شاید پھانگ کو باہر روک کر ہی بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ زبردستی دروازہ کھول کر اندر آگیا۔

"خیریت مسٹر پھانگ۔" ہوفا کی آواز سنائی دی "تمہارے تیور کچھ۔۔۔"

"میرے تیوروں کی بات مت کرو۔" پھانگ نے اس کی بات کاٹ دی "کل تمہیں دیکھنے کے بعد تو میرے حواس بھی قابو میں نہیں رہے۔ میں ہی سمجھ سکتا ہوں کہ یہ چوبیس گھنٹے میں نے کس طرح گزارے ہیں۔ پچھلی مرتبہ تو تم مجھے چکما دے گئی تھیں مگر آج۔۔۔ میں تم سے اپنی پیاس بجھا کر ہی واپس جاؤں گا۔"

"مسٹر پھانگ۔" ہوفا نے کہا "تم جانتے ہو میں شادی شدہ ہوں' ایک بچے کی ماں ہوں۔ اگر بوما یا کسی اور کو پتا چل گیا تو ان کی نظروں میں میری کیا عزت رہے گی؟"

"میں ہر کام بہت احتیاط سے کرنے کا عادی ہوں۔" پھانگ نے جواب دیا "کسی کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں کہ میں اس طرف آیا ہوں۔ کوئی نہیں جان سکے گا کہ۔۔۔"

"لیکن مسٹر پھانگ۔۔۔" ہوفا بول اٹھی۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اپنے آپ کو بچانا بھی چاہتی ہو اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کررہی ہو۔

"او۔۔۔ کم آن ہوفا۔" پھانگ نے کہا اور پھر کچھ اور آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں نے جانکی اور سونیا کی طرف دیکھا اور درمیانی دروازے میں آدھے انچ کے قریب جھری پیدا کرکے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ پھانگ نے ہوفا کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ اسے کس کرنے کی کوشش کررہا تھا اور ہوفا برائے نام مزاحمت کررہی تھی۔ پھانگ نے اسے پشت کے بل پلنگ پر گرا دیا۔

ہوفا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پلنگ پر سویا ہوا بچہ ہڑبڑا کر جاگ گیا اور رونے لگا۔ پھانگ نے ہوفا کے بلاؤز پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ ہوفا کا سینہ برہنہ ہوگیا۔

میں نے اپنی رائفل سونیا کو تھمادی اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے میں آگیا۔ پھانگ' ہوفا پر جھکا ہوا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں

دبے قدموں چلتا ہوا قریب پہنچ گیا اور پھانگ کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

اس پہلی دستک کا پھانگ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے دوبارہ قدرے سخت ہاتھ سے کندھا تھپتھپایا تو اس نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ ابھی تک ہوفا کو گرفت میں لیے ہوئے تھے لیکن میری شکل دیکھتے ہی وہ بری طرح اچھلا جیسے بجلی کا زوردار جھٹکا لگا ہو۔ سیدھا ہوتے ہوئے اس کا سیدھا ہاتھ بڑی تیزی سے پتلون کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے ریوالور کی طرف بڑھا تھا لیکن ریوالور اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔

"کون ہو تم۔۔۔؟" پھانگ میری طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔

ہوفا نے بتایا تھا کہ پھانگ کو اس بستی میں آئے ہوئے پندرہ دن ہوئے تھے اور ظاہر ہے وہ یہاں پر تعینات تمام محافظوں کو ابھی پوری طرح نہیں پہچانتا ہوگا۔ مجھے بھی وہ اپنے ہی قبیل کا کوئی آدمی سمجھتا تھا جو اس کی طرح بوما کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ہوفا کے حسن و شباب سے فیض یاب ہونے کے لیے یہاں آگیا تھا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے جو کچھ کہا' اس سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی تھی۔

"دیکھو مسٹر!" وہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم جو کوئی بھی ہو ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ ابھی تو۔۔۔"

"میں وہ نہیں مسٹر پھانگ جو تم سمجھ رہے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تو پھر۔۔۔ کون ہو تم؟" اس نے مجھے گھورا۔

"میں وہ ہوں جس کی تم لوگوں کو تلاش ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"کک۔۔۔ کیا۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔؟" وہ ہکلایا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

"وہی۔ جس کی تم لوگوں کو تلاش ہے۔" اس مرتبہ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی "اب تک تم لوگوں کے چار آدمی میرے اور میرے ساتھیوں کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں اور اب اس تعداد میں ایک اور اضافہ ہوگا اس کے بارے میں کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تمہاری لاش اس طرح غائب کردی جائے گی کہ اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا۔"

"اوہ۔" پھانگ کے منہ سے بے اختیار نکلا "تو ان غداروں نے تمہیں اپنے کاٹیج میں پناہ دے رکھی تھی۔ اس لیے تم لوگوں کو اب تک تلاش نہیں کیا جاسکا لیکن اب نہ تو تم لوگ بچ سکو گے اور نہ یہ غدار۔" اس نے گردن گھما کر ہوفا کی طرف دیکھا۔

ہوفا ابھی تک پلنگ پر اسی طرح پڑی ہوئی تھی کہ اس کی ٹانگیں نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر پڑا ہوا بچہ مسلسل رو رہا تھا۔

"ہوفا۔ تمہارا بچہ رو رہا ہے۔ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہوفا ایک ہاتھ سے اپنے پھٹے ہوئے بلاؤز کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس نے بچے کو اٹھا کر سینے سے لگالیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت پھانگ نے بھی پہلی مرتبہ اس طرف دیکھا تھا۔ دروازے میں جانگی اور سونیا کو رائفلیں تانے کھڑے دیکھ کر اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ خوف کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"ہاں تو مسٹر پھانگ۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ہوفا کو لوٹ کا مال سمجھ کر یہاں چلے آئے تھے۔ پچھلے پندرہ دنوں میں یہاں آکر تم نے جو کچھ بھی کیا ہے' وہ سب مجھے معلوم ہوچکا ہے۔ تم شاید دنیا کی ہر عورت پر اپنا حق سمجھتے ہو اور میرا خیال ہے کہ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ کر بھی تمہارے شہوانی جذبات اس طرح بھڑک اٹھتے ہوں گے۔ برے سے برے آدمی میں بھی شرافت اور انسانیت کا تھوڑا بہت مادہ ضرور ہوتا ہے مگر لگتا ہے یہ دونوں چیزیں تو کبھی تمہارے قریب سے بھی نہیں گزریں۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تمہیں ان حرکتوں کی سزا دے دی جائے تاکہ آئندہ شریف عورتیں تمہارے شر سے محفوظ رہیں۔"

"تم خوش فہمی میں مبتلا ہو۔" پھانگ نے کہا "تم لوگ بچ کر نہیں جاسکو گے۔ بہتر ہے۔ اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔"

"ضرور۔" میں نے کہتے ہوئے اس کا ریوالور ایک طرف پھینک دیا۔

وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ میں واقعی سرنڈر ہو رہا ہوں اور وہ فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھانے کے لیے آگے بڑھا بھی تھا لیکن اسی وقت میں کھڑے کھڑے ایک پیر پر گھوم گیا۔ میری دوسری ٹانگ پچھتریا اسی درجے کا زاویہ بناتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔ میں کھڑے کھڑے جس قوت سے گھوما تھا' اس سے کہیں زیادہ قوت سے اسپن کک اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی اور وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

مرسکوں گی۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ مجھے ہیروئن سے ادھ موا کرکے کسی طرح تم تک پہنچا دیا جائے۔ وہ صبح شام مجھے انجکشن دیتا تھا پھر اس نے ایک وقت انجکشن دینا بند کردیا اور جب پہلے انجکشن کا اثر زائل ہوجاتا تو میری عجیب حالت ہوجاتی۔ جسم ٹوٹنے لگتا۔ میں اپنے بال نوچنے لگتی اور پھر میں دانتوں سے اپنے آپ کو بھنبوڑنے لگتی۔ دارا قریب کھڑا میری بے بسی کا تماشا دیکھتا رہتا۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی۔ اس کے قدموں پر گرجاتی کہ وہ مجھے انجکشن لگادے۔ وہ کھڑا قہقہے لگاتا رہتا اور جب میری حالت بہت زیادہ بگڑ جاتی تو مجھے انجکشن لگادیا جاتا۔

"جب ہم یہاں آئے تو ڈاکٹر نے میرے زخم کا علاج شروع کردیا۔" اس نے دوسرے بازو پر گولی کے زخم کی طرف اشارہ کیا "لیکن تین چار دن بعد دارا نے اسے علاج سے روک دیا۔ میرا زخم بہرحال کسی حد تک مندمل ہوچکا ہے لیکن ہیروئن کی اذیت۔۔۔ بری طرح تڑپایا ہے اس شیطان نے مجھے۔۔۔"

"وہ شیطان بھی اسی طرح تمہارے سامنے تڑپے گا۔" میں نے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔

گیارہ بجے کے قریب ہوفا واپس آگئی۔ اس کی گود میں دیکھتے ہوئے سونیا کو دیکھ کر ہمکنے لگا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ چند ہی روز ابھی تو ہیں بچہ سونیا سے اس قدر مانوس ہوگیا تھا۔ سونیا نے بچے کو لے لیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

ہوفا نے بلاؤز کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر تقریباً تین انچ لمبی ایک شیشی اور ایک سرنج نکال کر جانگی کے حوالے کردی۔

"یہ لیکوئیڈ ہیروئن ہے۔" ہوفا نے مسکراتے ہوئے بتایا "ڈاکٹر کے کمرے سے چرا کرلائی ہوں۔"

"اور کیا خبریں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بڑی گرما گرم خبریں ہیں۔" ہوفا نے جواب دیا "تمہاری رات کی کارروائی سے دارا بری طرح بدحواس ہورہا ہے۔ وہ کمانڈر کو مجبور کررہا ہے کہ انہیں آج شام سے پہلے پہلے جنرل کھوراٹ کے ہیڈکوارٹر بھیج دیا جائے یا ٹیلی فون پر جنرل کھوراٹ سے اس کی بات کرائی جائے۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا اور جلد سے جلد یہاں سے نکلنا چاہتا ہے۔"

"وہ کہیں بھی چلا جائے میرے انتقام سے نہیں بچ سکے گا۔" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

"اور اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی ہے کہ پھانگ غدار ہے اور اسی نے تم لوگوں کو کہیں پناہ دے رکھی ہے۔" ہوفا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا۔۔۔؟" اس کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا۔

"کاٹیج کے ایک کمرے سے انہیں پھانگ کا والٹ ملا ہے جس میں اس کا شناختی کارڈ بھی موجود ہے۔" ہوفا نے بتایا "یہ والٹ ملنے کے بعد انہیں اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ گزشتہ رات اس کاٹیج پر کارروائی میں پھانگ بھی تمہارے ساتھ تھا۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

کل جب میں نے پھانگ کا ڈریس پہنا تھا تو شرٹ کی جیب میں اس کا والٹ بھی موجود تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ والٹ نکال کر گھر پر ہی کہیں رکھ دیا جائے لیکن پھر میں نے اسے جیب میں ہی رہنے دیا تھا اور اب مجھے خیال آرہا تھا کہ جب میں تھائی کو کندھے پر لادنے کے لیے جھکا تھا تو کوئی چیز شرٹ کی جیب سے نکل کرگری تھی لیکن اتنا موقع نہیں تھا کہ میں اس پر توجہ دے سکتا۔ کاٹیج کے باہر فائرنگ ہورہی تھی اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تھائی کو اٹھا کر بھاگا تھا۔

اور اب اس والٹ کے حوالے سے ایک نئی کہانی سامنے آئی تھی اور میرے خیال میں یہ ہمارے حق میں بہتر ہی تھا۔ وہ لوگ پھانگ کو تلاش کرتے رہیں گے اور بوما اور ہوفا پر کسی کو شبہ نہیں ہوگا۔

ہوفا کے کہنے کے مطابق پھانگ اور ہماری تلاش بستی کے دوسری طرف ہی ہورہی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا کریڈٹ بھی ہوفا ہی کو جاتا تھا۔ اس نے مجھے اور جانگی کو تو وہاں سے اس طرف دوڑا دیا تھا اور خود فائرنگ کرتے ہوئے مخالف سمت میں بھاگی تھی۔ انہوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ تعاقب کرنے والے تو اسی طرف بڑھتے چلے گئے تھے اور ہوفا ایک طویل چکر کاٹ کر اپنے کاٹیج کی طرف آگئی تھی۔

جانگی، تھائی پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ اس نے کھانا پینا تو بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہیروئن کے بکثرت استعمال سے اس کی بھوک مرچکی تھی۔ وہ پورا دن خیریت سے گزر گیا مگر شام ہوتے ہوتے وہ بے چین سی ہونے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ جانگی نے اسے انجکشن دے دیا مگر مقدار بہت کم رکھی تھی۔

چھ بجے کے قریب بوما واپس آگیا۔ اس کی اطلاع کے مطابق ٹرائی اینگل کے دوسری طرف دریا کی ناکا بندی کردی گئی تھی کہ ہمارے فرار کی کوشش کو ناکام بنایا جاسکے۔ مزید یہ

کہ اگر آج شام کا اندھیرا پھیلنے تک ہم لوگوں کا کوئی سراغ نہ ملا تو کل صبح ہماری تلاش کے لیے ہیلی کوپٹر استعمال کیا جائے گا اور توقع یہ تھی کہ کل صبح جنرل کھوراٹ بھی اپنے سارے کام چھوڑ کر یہاں پہنچ جائے گا۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہم لوگوں نے ان کے گھر میں گھس کر تھائی کو چھڑالیا تھا اور چی فانگ کی ساتھی لڑکی بھی میرے ہاتھوں ماری گئی تھی۔

بوما، جانگی کی بتائی ہوئی چیزوں میں سے ایک دو چیزیں کسی طرح چرا کرلے آیا تھا۔ ان میں ایک اہم ترین چیز وہ دوا تھی جو تھائی کے زخموں پر لگانا ضروری تھی۔ ورنہ اس کے زخم بگڑ جاتے اور دونوں ہاتھ بیکار ہوجاتے۔

باہر کے حالات بہت مخدوش ہوگئے تھے۔ ہمارے لیے کاٹیج سے باہر جھانکنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگلے دن صبح سویرے ہی ایک ہیلی کوپٹر فضا میں پرواز کرنے لگا تھا۔ اس ہیلی کوپٹر کو ایک مرتبہ تو میں نے بھی اوپر سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس میں پائلٹ کے علاوہ دو آدمی تھے جو کوپٹر میں دونوں طرف لائٹ مشین گنوں کے ساتھ مستعد بیٹھے ہوئے تھے۔

اس روز دوپہر کے وقت جنرل کھوراٹ بھی پہنچ گیا تھا۔ وہ اگرچہ صرف ایک گھنٹا یہاں رکا تھا مگر اس ایک گھنٹے میں اس نے جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا، اس نے اس یونٹ کے کارکنوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کئی کارکنوں کو دوسرے علاقوں میں بھیج دیا گیا تھا۔ اور ان کی جگہ دوسرے علاقوں سے کچھ نئے۔۔۔ کارکن یہاں طلب کرلیے گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ دارا، جنرل کھوراٹ کے ساتھ چلا گیا ہوگا لیکن کھوراٹ نے اسے مزید دو چار دن یہیں رکنے کو کہا تھا۔ اس کی تفصیلات شام کو بوما نے بتائی تھیں۔ اس کے کہنے کے مطابق جنرل کھوراٹ کے پاس کچھ غیر ملکی مہمان آئے ہوئے تھے اور وہ ان سے کچھ کاروباری معاملات میں مصروف تھا۔ ان کے جانے کے بعد وہ انہیں وہاں بلالے گا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم دوبارہ ٹرائی کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مشکل ہے۔" بوما نے جواب دیا "کل رات محض اتفاق تھا کہ دارا اور کم، کمانڈر کے کاٹیج میں رک گئے تھے۔ آج صبح انہیں کمانڈر کے ساتھ والے کاٹیج میں منتقل کردیا گیا ہے اور چار محافظ تعینات کردیے گئے ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "کمانڈر کا خیال ہے کہ آپ بیمار عورت کو ساتھ لے کر زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ لوگ قرب و جوار کی پہاڑیوں پر توجہ دیے ہوئے ہیں۔ اس طرف کی پہاڑیوں میں لاتعداد غار ہیں اور کمانڈر سمجھتا ہے کہ پھانگ تم لوگوں کے ساتھ کسی غار ہی میں چھپا ہوا ہے۔"

"اچھا ہے۔ وہ لوگ اسی طرف مصروف رہیں۔" میں نے کہا۔

دو دن اور گزر گئے اور ان دو دنوں کے دوران میں ہیلی کوپٹر دن کے وقت مسلسل فضا میں پرواز کرتا رہا تھا۔ میرے خیال میں انہوں نے چپا چپا چھان مارا تھا لیکن انہیں مایوسی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔

"یہاں ہیروئن تیار کرنے کی دو لیبارٹریاں بھی تو ہیں۔" تیسرے روز میں نے بوما سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم کسی لیبارٹری کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی سوچ رہے ہو تو یہ خیال ذہن سے نکال دو۔" بوما نے کہا "جس روز پھانگ کے غائب ہونے کا پتا چلا تھا اسی روز دونوں لیبارٹریوں پر سخت پہرا لگا دیا گیا تھا۔ اس طرف جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔"

"ہم ان وردیوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔" میں نے کہا "ویسے بھی کچھ نئے گارڈ یہاں بلائے گئے ہیں۔ وہ سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح تو نہیں پہچانتے ہوں گے۔ اگر رات کے وقت یہ وردیاں پہن کر کسی لیبارٹری میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے تو میرا خیال ہے کہ۔۔۔"

"تم موت کے منہ میں جانے کی بات کررہے ہو۔" بوما نے میری بات کاٹ دی۔

"موت تو ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔" میں نے کہا "ہم اگر ایک قدم اور آگے بڑھ جائیں گے تو میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہیں صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ کسی ایک لیبارٹری پر محافظوں کی تعداد کتنی ہے اور ان کی ڈیوٹیاں کب تبدیل ہوتی ہیں۔ یہ ساری تفصیلات معلوم ہوجائیں تو ہمیں کچھ آسانی ہوجائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" بوما نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا "میں کل یہ ساری معلومات حاصل کرلوں گا۔ میرا خیال ہے دو نمبر والی لیبارٹری مناسب رہے گی۔ وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"کس طرف ہے اور کتنے فاصلے پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً ایک میل شمال کی طرف تین چار

چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں اور لیبارٹری ان کے دامن میں ہے۔" بوما نے جواب دیا۔

اسی رات میں جانگی اور سونیا سے بھی اس منصوبے پر بات کرتا رہا۔ انہوں نے بھی میری مخالفت کی تھی۔

"ہم تو پہلے ہی موت کے اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔" جانگی نے کہا "اب تک ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے دارا کے خلاف کیا ہے۔ جنرل کھوراٹ کے خلاف ہم نے براہِ راست کچھ نہیں کیا۔ اس کے چند آدمی اگر مارے گئے ہیں تو دارا کی وجہ سے لیکن لیبارٹری میں کسی قسم کی کارروائی جنرل کھوراٹ سے براہِ راست دشمنی مول لینے کے مترادف ہوگی۔ اس لیے۔۔۔"

"دشمنی۔" میں نے جانگی کی بات کاٹ دی "اتنا کچھ ہونے کے بعد اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ جنرل کھوراٹ تھائی لینڈ میں شہنشاہ کے خلاف براہِ راست سازش میں ملوث رہا ہے۔ تھائی لینڈ میں دارا کو بھی اس کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ جس کی بنا پر دارا قتل وغارت کرتا رہا اور اب جنرل کھوراٹ ہی اسے یہاں پناہ دیے ہوئے ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی تم یہ سمجھتی ہو کہ جنرل کھوراٹ سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ اس کے کئی آدمی اب تک ہمارے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں لیکن اس کی نظروں میں انسانی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان اور کتے کا مرجانا اس کے لیے ایک برابر ہے لیکن۔۔۔ وہ اپنا مالی نقصان برداشت نہیں کرسکے گا۔"

"میں سمجھی نہیں؟" جانگی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہم ایک یا دو لیبارٹریاں تباہ کرکے دنیا کو پوری طرح ہیروئن کی لعنت سے نجات نہیں دلا سکتے لیکن۔۔۔ جنرل کھوراٹ یہ "نقصان" برداشت نہیں کرسکے گا۔ یہ نقصان چونکہ دارا کی حمایت کی وجہ سے ہوگا اور ہوسکتا ہے وہ اس حمایت سے دستبردار ہوکر دارا کو ٹرائی اینگل سے نکال دے۔"

"یہ ہے نکتے کی بات۔" جانگی نے کہا "تمہارا مطلب ہے وہ دارا کو گولڈن ٹرائی اینگل سے نکال دے گا تو ہم بھی۔۔۔"

"تم ٹھیک سمجھیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے اور پھر دارا اور اس کے ساتھیوں کی گردن ناپنا آسان ہوگا۔"

"مگر تھائی۔" جانگی بولی "کیا اسے ساتھ لے کر ہم خطرناک اور کٹھن سفر کرسکیں گے؟"

"یہ اس وقت دیکھا جائے گا۔ بہرحال، پہلے تو ہمیں دیکھنا ہے کہ ہم لیبارٹری والے پروگرام پر عمل کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

سونیا ہماری گفتگو کے دوران میں خاموش ہی رہی تھی۔

اگلے روز بوما کی رپورٹ خاصی امید افزا تھی۔ ہم سے قریب والی لیبارٹری میں چار محافظ دن میں اور چار محافظ رات میں ڈیوٹی دیتے تھے۔ ڈیوٹیاں صبح آٹھ بجے اور رات آٹھ بجے تبدیل ہوتی تھیں۔ رات کی ڈیوٹی دینے والے محافظ سوا سات بجے کے قریب کنٹرول روم سے نکلتے تھے۔ کنٹرول روم سے لیبارٹری کا فاصلہ ایک میل کے لگ بھگ تھا اور وہ آٹھ بجے تک وہاں پہنچ جاتے تھے۔

میں نے اس رات ایکشن لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ سونیا اور جانگی ڈریس تبدیل کرکے فوراً ہی تیار ہوگئیں۔ بوما بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا تھا۔ اس کی مدد کے بغیر ہم اس منصوبے پر عمل نہیں کرسکتے تھے۔

کاٹیج کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم درختوں میں تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ ہم وہ راستہ روک کر کھڑے ہوجائیں جہاں سے کنٹرول روم سے آنے والے محافظوں کو گزرنا تھا۔

بوما کی ٹانگ میں معمولی سی تکلیف تھی لیکن وہ ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس راستے پر پہنچ گئے اور ایک مناسب جگہ دیکھ کر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند منٹ بعد ہی باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے جانگی کو اشارہ کیا۔ وہ گھات سے نکل کر راستے کے بیچ میں آگئی اور کراہتے اور۔۔۔ لڑکھڑاتے ہوئے چلنے لگی۔ صرف ایک منٹ بعد کنٹرول روم کی طرف سے آنے والے محافظ اس کے قریب پہنچ گئے۔

"اے۔ خبردار۔ اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ کون ہو تم؟" ایک محافظ کی بارعب آواز سنائی دی۔ شاید ان چاروں نے جانگی کو رائفلوں کی زد پر لے لیا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ دسمبر 2002ء میں شائع ہوگا

تش فشاں

آتش فشاں

راوی: وجدان علی

تحریر: اقبال کاظمی

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقتور بنا سکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں۔ بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

اس ٹمٹماتے چراغ کا احوال جو اچانک ہی آندھیوں کی زد پہ آ گیا تھا

"مم... میں گارڈ ہوں۔" جانگی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے دہری ہو رہی تھی "اس طرف ان جھاڑیوں کے پیچھے چانگ زخمی حالت میں پڑا ہے۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے بھی زخمی کردیا ہے۔ اسے... اسے پکڑو... جنرل کھوراٹ سے انعام لینا چاہتے ہو تو جلدی... پکڑلو اسے..." جانگی بہت شاندار اداکاری کررہی تھی۔

"کہاں ہے وہ... اس کے ساتھ اور کون ہے؟" ایک محافظ نے پوچھا۔

"اکیلا ہے۔ میں نے اسے زخمی کردیا ہے۔ وہ بھاگ نہیں سکتا۔ میرے ساتھ آؤ۔ جلدی..."

ان محافظوں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ جانگی کو کہاں زخم لگا ہے اور وہ اس وقت یہاں کیا کرنے آئی تھی۔ چانگ کو گرفتار کرکے انہیں جنرل کھوراٹ کے سامنے سرخرو ہونے کا موقع مل سکتا تھا۔ انعام کی بھی توقع تھی اور وہ لوگ یہ موقع کھونا نہیں چاہتے تھے۔

جانگی انہیں ڈھلان پر لے آئی۔ میں سونیا اور بوما کے ساتھ جھاڑیوں میں تیار بیٹھا تھا۔ ہم تینوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ہمارے پاس اگرچہ آٹومیٹک رائفلیں بھی موجود تھیں لیکن اس وقت ہم نے خنجروں سے کام لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ چاروں محافظ جیسے ہی جھاڑیوں سے آگے نکلے، ہم

تینوں نے بیک وقت چھلانگیں لگا دیں۔ تین محافظوں کو تو ہم تینوں نے چھاپ لیا تھا اور چوتھے کو جانکی نے گرفت میں لے لیا۔

محافظوں کے لیے یہ صورتِ حال بالکل غیر متوقع تھی۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئیں اور وہ ڈھلان پر ہمارے ساتھ لڑھکتے چلے گئے۔

ان پر قابو پانا آسان ثابت نہیں ہوا تھا۔ تین کے تو ہم نے گلے ادھیڑ دیے لیکن چوتھا زخمی ہو کر سونیا کی گرفت سے بھاگ نکلا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر میں نے اسے جالیا۔ وہ دوڑتے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا لیکن اسے زمین پر گراتے ہی میں نے اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔ میں نے اس کے لباس سے اپنا خنجر صاف کیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دوڑا۔

"کیا رہا؟" جانکی نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"اگر بچ کر نکل جاتا تو غضب ہو جاتا۔" میں نے جواب دیا "اب جلدی کرو۔ اس کے چیخنے کی آواز سناٹے میں دور دور تک گئی ہوگی۔"

میں نے جانکی کے ہاتھ سے اپنی رائفل لے لی اور ہم تیز تیز قدموں سے لیبارٹری کی طرف جانے لگے۔

لیبارٹری تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ لیبارٹری کی عمارت ایک خوب صورت بنگلے کی طرح تھی۔ جس کے سامنے گیٹ پر تیز روشنی کا بلب جل رہا تھا اور عمارت کے اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔ ان چاروں محافظوں کو ہم نے دور ہی سے گیٹ کے سامنے کھڑے دیکھ لیا تھا۔ شاید ہمیں چند منٹ کی دیر ہو گئی تھی اور وہ محافظ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے درمیان فاصلہ تیس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ بوما نے میری طرف جھک کر سرگوشی کی اور ایک طرف ڈھلان پر اترتا چلا گیا۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ان محافظوں میں تین لڑکیاں تھیں اور مرد صرف ایک تھا۔ ہم جیسے ہی قریب پہنچے، مرد نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ تین منٹ لیٹ ہو۔ تمہارا چوتھا ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ۔" سونیا نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "اس طرف رک گیا ہے۔"

"تم لوگوں کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔" اس شخص نے دوبارہ کہا۔ اسے شاید کسی قسم کا شبہ ہو رہا تھا۔

"حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔" اس مرتبہ بھی سونیا ہی نے جواب دیا "بیشتر لوگوں کو اِدھر سے اُدھر کیا جا رہا ہے۔ تیس آدمیوں کا گروپ آج دوپہر ہیڈ کوارٹر سے پہنچا تھا۔ ہم بھی اسی گروپ میں شامل تھے اگر تمہیں کسی قسم کا شبہ ہو رہا ہے تو ٹیلی فون پر کنٹرول روم سے ہمارے بارے میں تصدیق کر سکتے ہو۔"

"شبے کی بات نہیں ہے۔" اس شخص نے جواب دیا "بہرحال، تم لوگ اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ ہم جا رہے ہیں۔ ہم سب کو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ چاروں اپنی اپنی رائفلیں کندھوں پر لٹکائے بستی کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑے۔ میں انہیں جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ نجانے مجھے بار بار یہ خیال کیوں آ رہا تھا کہ وہ ہمارے بارے میں مشکوک ہو چکا تھا۔ یہاں سے ٹیلی فون پر اس نے تصدیق کرنے کی کوشش اس لیے نہیں کی تھی کہ ہم ہوشیار ہو جاتے لیکن مجھے یقین تھا کہ کنٹرول روم پہنچتے ہی وہ ہمارے بارے میں تصدیق کرے گا۔

ان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد بوما بھی تاریکی سے نکل کر آ گیا۔ وہ پیشاب کرنے کے بہانے اس لیے ہم سے الگ ہو گیا تھا کہ پہچان نہ لیا جائے۔

ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ہم سونیا کو گیٹ پر چھوڑ کر اندر آ گئے۔ چند منٹ ہم نے عمارت کا باہر سے جائزہ لینے میں گزار دیے۔ بوما بتا رہا تھا کہ ٹرائی اینگل میں واقع متعدد لیبارٹریوں میں ہفتے میں پانچ دن کام ہوتا ہے۔ ہر لیبارٹری اپنے علاقے میں پیدا ہونے والی فصل سے افیون، مارفیا اور ہیروئن تیار کرتی ہے۔ ہیروئن مارفین سے تیار کی جاتی ہے۔ پچھلے سیزن کی مارفین ابھی اتنی مقدار میں موجود تھی کہ پوست کی تازہ فصل تیار ہونے تک وہی مارفین ہیروئن کی تیاری کے لیے استعمال ہوتی رہے گی۔

ہم عمارت کے اندر آ گئے۔ مرکزی ہال میں داخل ہوتے ہی میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مرکری کی سفید دودھیا روشنی میں کئی جدید ترین مشینیں اور آلات نصب تھے۔ یہ وہ مشینیں تھیں جن سے مارفین سے ہیروئن اور دیگر منشیات تیار کی جا رہی تھیں۔

وہ چار آدمی تھے جو سفید لیب کوٹ پہنے ہوئے مختلف مشینوں کے پاس کھڑے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ میں نے بوما کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ جانکی کو دائیں طرف بھیج دیا اور خود بائیں طرف بڑھ گیا۔

دو ڈاکٹروں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ پہلے تو خیال نہیں کیا

پھر ان میں سے ایک چونک گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دوسرے ساتھی کے قریب پہنچ گیا اور اس کے کان میں سرگوشی کرکے آگے بڑھ گیا اور پھر ان میں سے ایک آدمی جیسے ہی دیوار میں لگے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا، بوما نے فائر کردیا۔ وہ آدمی چیخ کر نیچے گرا۔ اس کے ہاتھ میں گولی لگی تھی۔ وہ شخص الارم کا بٹن دبانے جا رہا تھا۔ بٹن دبتے ہی کنٹرول روم میں الارم بجنے لگتے اور لاتعداد محافظ اس طرف دوڑ پڑتے۔

"تم چاروں ایک طرف جمع ہو جاؤ۔ اس میز کے پاس۔ جلدی کرو۔" بوما نے چیختے ہوئے دیوار کے قریب پڑی ہوئی میز کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چاروں میز کے قریب جمع ہو گئے۔ انہوں نے خود بخود ہاتھ سر سے بلند کر لیے تھے۔

"ہتھیار پھینک دو بوما۔ ورنہ میں اس لڑکی کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

یہ آواز سن کر میں نے تیزی سے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ سفید لیب کوٹ والا ایک آدمی جانکی کی کنپٹی سے ریوالور لگائے کھڑا تھا۔ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں نے بوما کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی رائفل پھینک دی۔

"تم تو چھپے رستم نکلے بوما۔" وہ شخص بوما کی طرف دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا "سب لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ان لوگوں کو پھانگ نے پناہ دے رکھی ہے اور اس رات دارا والے کانیج پر حملے میں وہ بھی شریک تھا۔ کانیج کے ایک کمرے سے ملنے والا پھانگ کا والٹ تو کم از کم اس شبے کی تصدیق کرتا تھا لیکن اب پتا چلا کہ ہم اس بے چارے کو بلاوجہ ہی موردِ الزام ٹھہراتے رہے۔ اب یہ بات میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پھانگ کو تم لوگوں نے قتل کرکے اس کی لاش غائب کردی ہے اور سب لوگ یہی سمجھتے رہے کہ وہ غداری کرکے مداخلت کاروں سے مل گیا ہے اور اس نے ان لوگوں کو پناہ دے رکھی ہے لیکن غدار وہ نہیں تم ہو۔ تم نے انہیں اپنے کانیج میں پناہ دے رکھی ہے اور اس لیے ان لوگوں کو اب تک تلاش نہیں کیا جا سکا۔ میں بتاتا ہوں، یہ سب کچھ کس طرح ہوا ہوگا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"میری سمجھ میں بات کچھ اس طرح آتی ہے کہ وہ دوسری لڑکیوں ہی طرح تمہاری بیوی سے بھی دل بہلانا چاہتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی نیت سے تمہارے کانیج کی طرف گیا ہو اور وہاں ان لوگوں سے سامنا ہو گیا ہو۔ اس کی زندگی ان لوگوں کے لیے بلکہ تم لوگوں کے لیے موت کا پیغام بن سکتی تھی اسی لیے انہوں نے پھانگ کو قتل کرکے لاش غائب کردی اور مجھے یقین ہے کہ وہ لاش تمہارے کانیج کے آس پاس ہی کسی جگہ دفن کی گئی ہوگی۔ اسے تلاش کر لیا جائے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی کہ تم نے جنرل کھوراٹ سے غداری کیوں کی۔ انہوں نے تمہیں ایسا کیا لالچ دیا تھا کہ تم یہ انتہائی خطرناک قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے؟"

"میں نے جنرل کھوراٹ سے غداری نہیں کی ڈاکٹر کروک۔" بوما نے جواب دیا "جنرل کھوراٹ سے انہیں بھی کوئی دشمنی نہیں۔ یہ تو دارا اور اس کے ساتھیوں کے تعاقب میں یہاں آئے تھے۔ دارا ان کے ماں باپ کا قاتل ہے۔ اس نے درجنوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ دنیا کا سفاک ترین آدمی ہے۔ آدمی نہیں خونی بھیڑیا ہے۔ اس کی سفاکی کا مظاہرہ تم دیکھ چکے ہو۔ وہ ان کی ایک دوست تھائی کو اٹھا لایا تھا جو زخمی تھی۔ تم نے اس کا علاج شروع کیا تو دو تین دن بعد دارا نے تمہیں علاج سے روک دیا۔ اس نے تھائی کو ہیروئن کا عادی بنا دیا اور پھر وہ اپنے حیوانی جذبات کی تسکین کے لیے اسے تڑپاتا رہا۔

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی
فلسطین کی جنگ آزادی میں شامل ایک پاکستانی جاں باز کی ناقابلِ فراموش جدوجہد
علی یاور خان کی سرگزشت
مجاهد
قیمت فی حصہ 60 روپے ❋ ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلی کیشنز

ہے؟ وہ ایک بے بس اور کمزور عورت پر ظلم کرکے خوش ہو رہا ہے لیکن وجدان کا نام سنتے ہی خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ وہ اس کے نام ہی سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ محافظوں کی موجودگی کے باوجود اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ کیا ایسے شخص کو زندہ رہنے کا حق ہے؟ میں نے صرف دارا اور اس کے ساتھیوں کے خلاف ان کا ساتھ دیا۔ میں نے جنرل کھوراٹ سے غداری نہیں کی۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ لوگ دارا سے اپنا انتقام لے کر واپس چلے جائیں گے تو میں پہلے کی طرح یہاں جنرل کھوراٹ کے لیے خدمات انجام دیتا رہوں گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ہاں۔ پھانگ کے قتل کی ذمے داری میں قبول کرتا ہوں۔ تم خود ہی اعتراف کرچکے ہو کہ وہ میری بیوی سے دل بہلانا چاہتا تھا اور اس روز وہ اسی نیت سے میری عدم موجودگی میں میرے کاٹیج میں گیا تھا لیکن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ تمہارا یہ خیال بالکل درست ہے اس کی لاش میرے کاٹیج کے پچھلی طرف درختوں کے نیچے دفن ہے اور جس رات دارا کے کاٹیج پر حملہ کیا گیا تھا' وجدان نے پھانگ کا ڈریس پہن رکھا تھا اور اس کی جیب سے پھانگ کا والٹ وہاں گر گیا تھا اور اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ پھانگ غدار ہے اور ان لوگوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری طرف کسی کا شبہ نہیں گیا۔"

"لیکن اب ہر بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔" ڈاکٹر کروک نے کہا "اگر تم نے جنرل کھوراٹ سے غداری نہیں کی تو ان لوگوں کو ساتھ لے کر یہاں آنے کا مقصد؟ اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں ڈیوٹی پر آنے والے محافظوں کو بھی تم لوگوں نے قتل کردیا ہے۔"

"میں تمہارے اس یقین کو نہیں جھٹلاؤں گا۔" بوما نے کہا "یہاں آنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ لیبارٹری تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں اگرچہ برما میں' تریاڈ میں رہتے ہوئے جنرل کھوراٹ کے ایجنٹ کی حیثیت سے ہیروئن فروخت کرتا رہا ہوں لیکن ان کی دوست تھائی کو دیکھنے سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہیروئن کے اثرات کتنے تباہ کن ہوتے ہیں۔ صرف ایک یا دو لیبارٹریوں کو تباہ کرکے ہم پوری دنیا میں ہیروئن کی سپلائی کو نہیں روک سکتے لیکن۔۔۔ اس میں اپنا تھوڑا بہت کردار تو ادا کرسکتے ہیں۔"

"اور تم سمجھتے ہو کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے؟" ڈاکٹر کروک نے اسے گھورا "تم اکیلے نہیں ہو۔ تمہاری ایک عدد حسین اور جوان بیوی ہے۔ ایک پیارا سا بچہ ہے۔ تم نے ان کے بارے میں نہیں سوچا۔ یہ تو موت کی وادی ہے تم لوگ یہاں سے زندہ کیسے نکل سکو گے اور ایک بات اور بتا دوں۔ اس روز تمہاری بیوی بچے کے بیمار ہونے کا بہانہ کرکے میرے دفتر میں آئی تھی تو لیکوئیڈ ہیروئن کی شیشی اور ایک سرنج چرا کر لے گئی تھی۔ میں نے اس وقت توجہ نہیں دی تھی لیکن اب بات سمجھ میں آرہی ہے کہ وہ ہیروئن اس عورت کے لیے چرائی گئی تھی جسے تم لوگ دارا کے کاٹیج سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اگر پہلے یہ بات میرے ذہن میں آئی ہوتی تو معاملہ کب کا ختم ہوچکا ہوتا۔"

اس کی باتوں سے اب مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکٹر کروک نامی یہ شخص ہی بستی والے کلینک میں بیٹھتا تھا۔ ہم جب ہال میں داخل ہوئے تھے تو صرف ان چار ڈاکٹروں کو دیکھ سکے تھے جو ہمارے سامنے تھے۔ ڈاکٹر کروک اس وقت غالباً کسی مشین کے پیچھے تھا جو ہمیں نظر نہیں آسکا تھا اور اس نے موقع ملتے ہی جانگی کو ریوالور کی زد پر لے لیا تھا اور اس کی کھوپڑی اڑا دینے کی دھمکی دے کر ہمیں بھی نہتا کردیا تھا۔

"ڈاکٹر سائن!" کروک ان چاروں میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "الارم کا بٹن دبا دو اور ان کی رائفلیں اٹھالو۔"

ایک آدمی نے سوئچ بورڈ پر سرخ رنگ کا ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی سوئچ بورڈ پر لگا ہوا سرخ رنگ کا ایک بلب روشن ہوگیا۔

"کنٹرول روم میں بجنے والے الارم سے ان لوگوں کو اطلاع مل گئی ہے کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہے۔" ڈاکٹر کروک نے کہا "درجنوں محافظ چند منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے اور تم لوگوں کی کہانی ختم ہوجائے گی۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں' میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ سونیا باہر گیٹ پر تھی۔ اسے اندر کی صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ اسے تو پتا اس وقت چلے گا جب درجنوں محافظ سر پر پہنچ چکے ہوں گے اور وہ کچھ نہیں کرسکے گی۔

دو آدمی ہماری رائفلیں اٹھانے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے اور بوما نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے' ہال فائر کی آواز سے گونج اٹھا اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کروک چیختا ہوا پیچھے کی طرف گرا۔ جانگی بڑی تیزی سے اچھل کر ایک طرف ہٹ گئی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سونیا دروازے کے قریب ایک مشین کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس کا نشانہ اتنا شاندار تھا کہ گولی ڈاکٹر کروک کی گردن میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

میں نے اور بوما نے بیک وقت رائفلوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔ رائفلیں قبضے میں آتے ہی ہم نے ان چاروں پر فائر کھول دیا۔ وہ چیختے ہوئے فرش پر گرے۔ ان کے سفید لباس سرخ ہونے لگے۔ جانگی نے بھی رائفل اٹھالی تھی۔ ڈاکٹر کروک کی گردن میں گولی لگی تھی۔ اس کے زندہ بچنے کا اگرچہ کوئی امکان نہیں تھا لیکن جانگی نے کئی گولیاں اس کے سینے میں اتار دیں۔

ہم نے بھی اطمینان کرلیا کہ ان چاروں میں سے کوئی زندہ نہیں بچا تھا اور پھر ہم چاروں نے اپنی رائفلوں کے رخ ان جدید ترین مشینوں کی طرف موڑ دیے جن سے ہیروئن تیار کی جاتی تھی۔

تمام مشینیں ناکارہ کرکے میں نے دیوار پر الیکٹرک پینل پر ایک برسٹ مار دیا۔ الیکٹرک پینل سے پہلے نیلی شعاعیں اور چنگاریاں پھوٹیں اور پھر شعلے اٹھنے لگے۔ یہ بجلی کی آگ تھی جو چند منٹ کے اندر اندر ساری عمارت کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔ میں نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور دروازے کی طرف دوڑا۔ بوما وغیرہ نے بھی میرے پیچھے دوڑ لگادی۔

بستی کی طرف بہت دور سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ غالباً کئی محافظ تھے جو فائرنگ کرتے ہوئے اسی طرف دوڑے آرہے تھے۔

"اس طرف۔ جلدی کرو۔" بوما ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔ ہم لیبارٹری کی عمارت کے پیچھے مڑ کر مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔

لیبارٹری کے عقب میں واقع پہاڑی ڈھائی تین سو فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ ہمارے کاٹیج کی طرف جانے والا راستہ اگرچہ دائیں طرف تھا لیکن ہم اس پہاڑی پر چڑھتے چلے گئے۔ بوما سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے جانگی اور سب سے آخر میں' میں نے سونیا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

وہ پہاڑی کسی ٹیلے کی طرح تھی۔ ہموار لیکن قد آدم جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات تھی۔ چوٹی پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ سونیا بری طرح ہانپ رہی تھی۔

لیبارٹری میں ایک دو جگہوں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ جو اس امر کا اشارہ دے رہے تھے کہ چند ہی منٹ میں پوری عمارت شعلوں کی لپیٹ میں آنے والی تھی۔ میں بستی سے آنے والے راستے کی طرف دیکھنے لگا۔ فائرنگ کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں اور لیبارٹری سے دو ڈھائی سو گز دور رہ کر شعلے سے چمکتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ محافظ اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے دوڑے آرہے تھے۔

بوما نے اپنی رائفل کا رخ آسمان کی طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ لاتعداد گولیاں روشنی کی لکیریں سی بناتی ہوئی اوپر کی طرف چلی گئیں اور پھر اسی وقت لیبارٹری میں زوردار دھماکا ہوا۔

"شاید کیمیکل کا کوئی ڈرم پھٹا ہے۔" بوما نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا "لیبارٹری میں ایسے کیمیکل کے لاتعداد ڈرم موجود ہیں جو ہیروئن کی تیاری میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہاں لاتعداد دھماکے ہوں گے۔ چند منٹ بعد یہ عمارت بھی تنکوں کی طرح اڑ جائے گی۔ بہتر ہے اب ہم۔۔۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی یکے بعد دیگرے تین اور دھماکے ہوئے اور لیبارٹری کی عمارت میں آگ پھیلتی چلی گئی۔

ہم دوسری طرف ڈھلان پر اترنے لگے۔ میں نے اس وقت بھی سونیا کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر بھی ہم دوڑتے رہے۔ اب مسلسل دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور دھماکوں کے بیچ میں وہ آواز بھی سنائی دینے لگی جس کے ہم منتظر تھے۔

وہ فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ پہاڑی کی چوٹی پر چھ سات انسانی ہیولے نظر آرہے تھے۔ پہاڑی کے دوسری طرف جلتی ہوئی لیبارٹری سے اٹھنے والے شعلوں کی روشنی کے پس منظر میں وہ ہیولے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ہم انہیں نظر تو نہیں آرہے تھے لیکن وہ اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

ہم ایک برساتی نالے کے کنارے پر پہنچ گئے۔ یہ نالا پانچ چھ فٹ گہرا اور دس بارہ فٹ چوڑا تھا لیکن پانی اس کے بیچ میں دو ڈھائی فٹ چوڑی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ ہم اس نالے میں اتر گئے اور بوما کی رہنمائی میں تیزی سے ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

اس بل کھاتے ہوئے برساتی نالے میں تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرکے ہم باہر آگئے۔ بوما نے ایک اونچی جگہ پر پہنچ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور ہم نے ایک بار پھر ایک طرف دوڑ لگادی۔ لیبارٹری کی طرف سے اب بھی دھماکے سنائی دے

رہے تھے اور پہاڑیوں کے عقب میں روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔

جانکی اور سونیا کی بری حالت ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ میں سونیا کا ہاتھ پکڑے اسے کھینچتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ بوما نے جانکی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور وہ بھی اسے گھسیٹ رہا تھا۔

وہ دونوں لڑکھڑا رہی تھیں۔ ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ سونیا اور جانکی زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کے سانس بری طرح پھولے ہوئے تھے اور منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ ہم اس وقت تک لیبارٹری سے تقریباً ڈھائی میل دور نکل آئے تھے اور اس کے مخالف سمت بہت دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لوگ ہمیں دوسری طرف تلاش کر رہے تھے۔

"ہم لوگ ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔" بوما نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تھوڑی ہی دیر میں گارڈز حشرات الارض کی طرح چاروں طرف پھیل جائیں گے اور اس سے پہلے پہلے ہمیں اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہیے۔" سونیا اور جانکی بھی کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھیں۔ ہم ایک بار پھر دوڑنے لگے اور بالآخر ایک طویل چکر کاٹ کر ہم اپنے کاٹیج کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئے۔ اس وقت فضا میں ہیلی کوپٹر کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

ہم بالکل مخالف سمت سے کاٹیج کی طرف آئے تھے اور جب کاٹیج سے کچھ دور رہ گئے تو میں نے گردن گھما کر لیبارٹری کی طرف دیکھا۔ اس طرف اب بھی روشنی نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ لیبارٹری میں اب بھی آگ بھڑک رہی تھی۔

کاٹیج سے چند گز کے فاصلے پر پہنچ کر میں ٹھٹک گیا اور پھر بوما وغیرہ نے بھی اس سائے کو دیکھ لیا جو کاٹیج کے سامنے والے دروازے سے نکل کر لڑکھڑاتا ہوا بستی کی طرف جا رہا تھا۔ کاٹیج سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ارے۔ یہ تو تھائی ہے۔"

جانکی کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ اس طرف روشنی تھی۔ اگر تھائی کسی کی نظروں میں آ گئی تو قیامت ہی آ جائے گی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے تھائی کی طرف دوڑ لگا دی۔

تھائی تقریباً تیس گز دور نکل چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ دوڑنے لگی۔ میں نے لپک کر تھائی کو گرفت میں لینا چاہا تو وہ... لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ میں بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور تھائی کے اوپر گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو سنبھال کر تھائی کو کندھے پر لادا اور کاٹیج کی طرف دوڑنے لگا۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے تھائی کو دری پر لٹا دیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر ہانپنے لگا۔ ہوفا بھی دوسرے کمرے سے آ گئی تھی۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا رکھا تھا جو بری طرح رو رہا تھا۔

"تم نے خیال نہیں کیا۔ یہ باہر نکل گئی تھی۔" بوما نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر ہم بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو یہ آگے چلی جاتی اور ہم سب پر قیامت ٹوٹ پڑتی۔"

ہوفا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی تھی۔

"مجھے پتا نہیں چلا۔" وہ بولی "بچہ رو رہا تھا۔ میں اسے سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے..."

"خیریت گزری کہ ہم بروقت یہاں پہنچ گئے اور اسے دیکھ لیا تھا۔" میں نے ہوفا کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور تھائی کی طرف دیکھنے لگا۔

تھائی کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ شام کو جانکی نے اسے بہت کم مقدار میں ہیروئن دی تھی۔ اسے اس بری طرح سے ہیروئن کا عادی بنایا گیا تھا کہ دی جانے والی وہ معمولی سی مقدار اونٹ کے منہ میں زیرہ ثابت ہوئی تھی۔ میں نے جانکی کو اشارہ کیا۔ اس نے ہیروئن کی معمولی سی مقدار انجکشن کے ذریعے تھائی کے جسم میں داخل کر دی۔ خون میں یہ زہر شامل ہوتے ہی تھائی پُرسکون ہوتی چلی گئی۔

اس وقت دس بج رہے تھے۔ جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو شام کے سات بجنے والے تھے۔ گویا تین گھنٹے گزر چکے تھے اور ان تین گھنٹوں میں ہم نے وہ کارنامہ انجام دے ڈالا تھا جس کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جنرل کھوراٹ کی ہیروئن تیار کرنے والی ایک فیکٹری تباہ کر دی گئی تھی۔ اس سے ہیروئن کی سپلائی میں زیادہ فرق نہیں پڑے گا لیکن جنرل کھوراٹ کا کروڑوں ڈالر کا نقصان ہو چکا تھا۔ جدید ترین مشینری جل کر راکھ ہو چکی تھی۔

یہ لیبارٹری تباہ کر کے ہم نے جنرل کھوراٹ سے براہِ راست ٹکر لے لی تھی۔ جس سے ہمارے لیے خطرات بڑھ گئے تھے۔

"میں نے ڈاکٹر کروک کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ تمہارے کنٹرول سینٹر میں مریضوں کو دیکھتا ہے لیکن وہ لیبارٹری میں کیسے پہنچ گیا؟" میں نے بوما کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔

"وہ بھی ہیروئن تیار کرنے کا ماہر ہے۔" بوما نے جواب دیا "کبھی کبھی لیبارٹری میں بھی چلا جاتا ہے۔ اس نے جب جانکی کو گن پوائنٹ پر لے کر ہمارے ہتھیار پھنکوا دیے تھے تو میں سمجھ گیا تھا کہ ہماری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ میں بالکل نا امید ہو گیا تھا لیکن سونیا نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن اس نے بہت بڑا رسک لیا تھا اگر نشانہ خطا ہو جاتا اور..."

"تو کیا ہوتا۔" جانکی نے اس کی بات کاٹ دی "اس کی چلائی ہوئی گولی ڈاکٹر کروک کے بجائے میری کھوپڑی اڑا دیتی۔"

"میں نے کالج میں شوٹنگ کے مقابلوں میں ہمیشہ پہلا انعام حاصل کیا تھا۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا "پانچ سال تک میرا ریکارڈ کوئی نہیں توڑ سکا۔ میں نے ڈاکٹر کروک کا نشانہ لیا تو مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا۔"

"لیکن۔ تمہیں تو گیٹ پر ڈیوٹی سونپی گئی تھی۔ اندر کیسے آ گئیں؟" میں نے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ طے ہوا تھا کہ تم لوگ گولی چلائے بغیر لیبارٹری کے اندر موجود لوگوں پر قابو پانے کی کوشش کرو گے لیکن جب گولی چلی تو میرا چونک جانا فطری بات تھی۔ میں خاموشی سے اندر داخل ہو گئی اور پھر جو صورتِ حال نظر آئی وہ خاصی تشویش ناک تھی۔ میں ایک مشین کے پیچھے چھپ گئی اور ڈاکٹر کروک کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اگرچہ نشانے سے چند انچ نیچے لگی لیکن بہرحال مقصد پورا ہو گیا۔" سونیا نے کہا۔

ہوفا کی گود میں بچہ اب بھی رو رہا تھا۔ سونیا نے اٹھ کر بچے کو لے لیا اور حیرت کی بات یہ ہوئی کہ بچہ اس کی گود میں آتے ہی چپ ہو گیا تھا۔ ہوفا اسے گھورتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دھماکے کی آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ وہ دھماکا دراصل دروازے کی آواز تھی جو زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہر چہرے پر خوف نمایاں تھا۔ دروازے پر جیسے ہتھوڑے برسائے جا رہے تھے۔

"تم لوگ اسی کمرے میں رہو۔ دروازہ بند کر لو۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں سگنل دے دوں گا۔" بوما کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

ہوفا بھی بچے کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور بیچ کا دروازہ بند کر دیا۔ میں نے جانکی کی مدد سے تھائی کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ لٹا دیا اور ہم تینوں رائفلیں لے کر دروازے کے دائیں بائیں دیوار سے چپک گئے۔ میں نے کمرے کی بتی بھی بجھا دی تھی۔

بوما اپنے کمرے کا دوسرا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ میں سانس روکے کھڑا باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر انہوں نے ہمارا پتا لگا لیا ہے تو یقیناً اس کاٹیج کو بھی گھیرے میں لے لیا ہو گا۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں میں نے براہِ راست ایکشن لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ہم اپنے آپ کو آسانی سے ان کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔

"کیا بات ہے شونگ۔ قیامت آ گئی ہے جو اس طرح دروازہ دھڑ دھڑا رہے ہو؟" باہر سے بوما کی آواز سنائی دی۔

"قیامت ہی آ گئی ہے۔ تمہیں فوری طور پر کنٹرول روم میں طلب کیا گیا ہے۔" دوسری آواز سنائی دی۔

"قیامت!" بوما بولا "یہ دھماکے کیسے تھے؟ کیا ہوا؟"

"دو نمبر والی لیبارٹری تباہ کر دی گئی ہے۔ جنرل کھوراٹ بھی ہیڈ کوارٹر سے یہاں پہنچ گیا ہے۔ تمام گارڈز کو کنٹرول روم میں طلب کیا گیا ہے۔ تم فوراً وہاں پہنچ جاؤ۔ میں شوما کی طرف جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم چلو۔ میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔" بوما نے جواب دیا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ہم پر آنے والی قیامت ایک بار پھر ٹل گئی تھی۔

جس طرح دروازہ دھڑ دھڑایا گیا تھا اس سے نہ صرف ہمارے پسینے چھوٹ گئے تھے بلکہ ہوفا کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں لیکن باہر ہونے والی گفتگو سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کمرے کی بتی جلا کر بیچ کا دروازہ کھول دیا۔ ہوفا بھی رائفل سنبھالے اپنے کمرے کے دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی باہر سے بوما اور شونگ کی گفتگو سن لی تھی اور اس کے چہرے کی رنگت بھی لوٹ آئی تھی۔ اس نے رائفل ایک طرف رکھ دی اور کمرے کے ایک کونے میں دری پر سوئے ہوئے بچے کو آرام سے اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ یہ بات ہم سب ہی جانتے تھے کہ اگر کوئی گڑبڑ ہوتی تو ہم سب کو ہی مارے جانا تھا لیکن جس طرح ہم نے

تھائی کو دروازے کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف لٹایا تھا اسی طرح ہوفا نے بھی اپنے بچے کو دروازے کے سامنے سے ہٹا کر ایک طرف لٹا دیا تھا تاکہ گڑبڑ کی صورت میں فوری طور پر کسی گولی کا نشانہ نہ بن جائے اور اسے زندگی کے چند لمحے اور مل جائیں۔

بوما دروازہ بند کرکے اندر آگیا اور شونگ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔ میں خاموشی سے سنتا رہا حالانکہ یہ ساری باتیں ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔

"ٹرائی اینگل پر واقعی قیامت آگئی ہے۔" بوما کہہ رہا تھا "ماضی میں برما لاؤس اور تھائی لینڈ کی طرف سے بھی حملے ہوتے رہے ہیں لیکن اتنا نقصان کبھی نہیں ہوا۔ لیبارٹری کی تباہی کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ جنرل کھوراٹ بھی اطلاع ملتے ہی یہاں پہنچ گیا ہے۔"

مجھے یاد آگیا کہ جب ہم کاٹیج کی طرف آرہے تھے تو ہم نے فضا میں ہیلی کوپٹر کی آواز سنی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ شاید کوپٹر کے ذریعے بھی ہماری تلاش شروع کردی گئی ہے لیکن کوپٹر کی وہ آواز تھوڑی دیر بعد ہی غائب ہوگئی اور اب یہ انکشاف میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ اس کوپٹر پر جنرل کھوراٹ یہاں آیا تھا۔

بوما پندرہ منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر کنٹرول روم کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ ہمارے ساتھ زندگی کے ایک نہایت سنسنی خیز تجربے سے گزرا تھا۔ تین گھنٹوں کی مسلسل بھاگ دوڑ سے نہ صرف بری طرح تھکا ہوا تھا بلکہ ذہنی تناؤ کا شکار بھی ہوگا اور ممکن ہے کنٹرول روم کے بلاوے سے اعصابی کشیدگی میں اضافہ بھی ہوگیا ہو لیکن وہاں جانا ضروری تھا۔ اگر کوئی بہانہ بنا کر انکار کردیتا تو اس پر کسی قسم کا شبہ بھی ہوسکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ خیریت گزرے۔

بوما کی واپسی دو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ وہ بڑی سنسنی خیز خبریں لے کر آیا تھا۔ جنرل کھوراٹ پاگل ہو رہا تھا۔ ٹرائی اینگل کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اس طرح کوئی لیبارٹری تباہ کی گئی تھی۔ جنرل کھوراٹ نے نہ صرف یہاں کے کمانڈر کو گولی سے اڑا دیا تھا بلکہ لیبارٹری سے ڈیوٹی ختم کرکے واپس جانے والے چاروں محافظوں کو، جن میں ایک مرد اور تین لڑکیاں شامل تھیں، فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کردیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ ڈیوٹی پر آنے والے نئے محافظوں پر شبہ ہونے کے باوجود انہوں نے واپس آکر کنٹرول روم کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ لیبارٹری میں دھماکے شروع ہونے کے بعد ان محافظوں کی پارٹی کے انچارج نے کمانڈر کو ہمارے بارے میں اپنے شبہے سے آگاہ کیا تھا اور ہمارے حلیئے بھی بتائے تھے۔ بعد میں دارا نے ان حلیوں سے مجھے اور جانکی کو شناخت کیا تھا۔ ہمارا چوتھا ساتھی جو واپس جانے والے محافظوں کی نظروں میں نہیں آیا تھا، اس کے بارے میں فرض کرلیا گیا تھا کہ وہ پھانگ تھا جو پہچان لیے جانے کے ڈر سے سامنے نہیں آیا تھا۔ جنرل کھوراٹ کو اس صورت حال کا علم ہوا تو اس نے کمانڈر اور ان چاروں محافظوں کو ختم کردیا تھا۔

سب سے دلچسپ خبر یہ تھی کہ جنرل کھوراٹ اور دارا میں ایک زوردار جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جنرل کھوراٹ نے اس تباہی کا ذمے دار دارا کو قرار دیا تھا جبکہ دارا اس کے آدمیوں کو ذمے دار ٹھہرا رہا تھا جو تھائی کو چیانگ سائین سے اٹھا کر یہاں لے آئے تھے اور میں تھائی کو چھڑانے کے لیے ان کے تعاقب میں یہاں پہنچ گیا تھا۔

بوما نے اس بات پر بھی حیرت کا اظہار کیا تھا کہ جنرل کھوراٹ نے دارا کی باتیں کیسے برداشت کرلی تھیں اور اسے گولی سے اڑا کیوں نہیں دیا تھا۔

"تم دارا کو نہیں جانتے۔" میں نے بوما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ دنیا کا عیار ترین آدمی ہے۔ جنرل کھوراٹ کے چند بہت ہی خاص آدمی تھائی لینڈ میں اس کے ساتھ رہے ہیں۔ اس نے یقیناً کوئی ایسی راہ تلاش کرلی ہے کہ جنرل کھوراٹ جیسا شخص بھی اس کی توہین نہ کرسکے۔ بہرحال یہ بتاؤ سب لوگوں کو کنٹرول روم میں کیوں طلب کیا گیا تھا؟"

"تم لوگوں کی تلاش کے لیے کچھ نئے پروگرام بنائے گئے ہیں۔" بوما نے جواب دیا "دوسرے علاقوں سے بھی سو سے زیادہ آدمیوں کو طلب کرلیا گیا ہے جن میں کچھ تو پہنچ گئے ہیں اور کچھ صبح ہونے سے پہلے پہلے پہنچ جائیں گے۔ کچھ پارٹیوں نے تلاش شروع کردی ہے اور کچھ پارٹیاں صبح روانہ ہوں گی۔ گھیرے کی صورت میں بیس پچیس میل تک کے علاقے کو چھان مارا جائے گا۔ ویسے جنرل کا خیال ہے کہ لیبارٹری کی تباہی کے بعد تم لوگ یہاں نہیں رکو گے بلکہ فرار کا راستہ تلاش کرو گے۔ اس لیے دونوں طرف کے دریاؤں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ کسی بھی مشتبہ شخص کو، خواہ وہ گارڈ کی وردی میں ہو، دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔"

"اور تم۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف

دیکھا "کیا تمہیں بھی کسی پارٹی میں شامل کیا گیا ہے؟"

"نہیں۔" بوما نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مجھے اس بات کا کچھ اندازہ تھا اس لیے میں نے کنٹرول روم پہنچنے سے پہلے ہی لنگڑانا شروع کردیا تھا۔ جس شخص کو نیا کمانڈر بنایا گیا ہے وہ۔۔میری ٹانگ کی تکلیف سے واقف ہے اس لیے میری ڈیوٹی کنٹرول روم میں ہی رکھی گئی ہے۔"

"گڈ!" میں بھی مسکرا دیا "دارا کے بارے میں کوئی اور بات؟"

"فی الحال کچھ نہیں۔" بوما نے جواب دیا "میرا خیال ہے جنرل کھوراٹ ایک دو دن یہیں رہے گا۔ اس کے بعد ہی دارا کے بارے میں بھی کچھ پتا چل سکے گا کہ اس کا کیا پروگرام بنتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اس دوران میں ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ تم لوگ تو کاٹیج سے باہر جھانک بھی نہیں سکو گے۔" بوما نے جواب دیا۔

اس کے بعد بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے پھر بوما اور ہوفا اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ سونیا اور جانکی دری پر لیٹی سونے کی تیاری کررہی تھیں اور میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ غنیمت تھا کہ ان میں سے کسی کے ذہن میں ابھی تک یہ خیال نہیں آیا تھا کہ ہم کسی کاٹیج میں بھی ہوسکتے ہیں۔ اب تک یہی سمجھا جارہا تھا کہ پھانگ ہمیں کسی خفیہ جگہ پر پناہ دیے ہوئے ہے لیکن میرا خیال تھا کہ ایک دو دن مزید تلاش کے بعد بھی انہیں ہمارا سراغ نہیں ملے گا تو شاید کسی کے ذہن میں یہ بات بھی آجائے اور علاقے میں واقع کاٹیجز کی چیکنگ بھی شروع ہوجائے۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس کوئی متبادل جگہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ ہم بھاگ کھڑے ہوتے اور گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔

کسی ہنگامی صورتِ حال میں ہم بھاگ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش بھی کرسکتے تھے لیکن سب سے بڑا مسئلہ تھائی کا تھا۔ ظاہر ہے ہم اسے چھوڑ کر نہیں جاسکتے تھے۔ تھائی اس قابل نہیں تھی کہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی چند قدم چل سکتی۔ پچھلے تین چار دن سے اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اس کے لیے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی اور یہاں ایسی کوئی سہولت موجود نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ ہیروئن کی مقدار کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جارہی تھی جس سے ابھی معمولی سا فرق بھی نہیں پڑا تھا۔

جنرل کھوراٹ تین دن یہاں رکا رہا تھا اور یہ تین دن ہم نے بڑی اذیت میں گزارے تھے۔ بوما سے ہر روز شام کو ہمیں رپورٹ مل جاتی تھی۔ دن کے وقت ہوفا بھی بچے کو ساتھ لے کر اس طرف کا چکر لگا آتی تھی۔ کچھ معلومات اس سے بھی حاصل ہوجاتی تھیں۔

جنرل کھوراٹ واپس چلا گیا۔ ہماری تلاش کا معاملہ بھی کچھ سرد پڑ گیا تھا۔ دوسرے علاقوں سے منگوائے ہوئے بیشتر گارڈز واپس بھیج دیے گئے تھے لیکن ان کی اچھی خاصی تعداد اب بھی یہاں موجود تھی۔ اس عرصے میں ہماری طرف سے چونکہ کوئی سرگرمی سامنے نہیں آئی تھی اس لیے فرض کرلیا گیا تھا کہ ہم لوگ کسی نہ کسی طرح ٹرائی اینگل سے فرار ہوچکے ہیں۔ دو دن پہلے آدھی رات کے بعد دریائے میکانگ میں ایک کشتی بھی دیکھی گئی تھی جس پر فائرنگ کی گئی اور وہ کشتی تیزی سے لاؤس کے ساحل کی طرف بھاگ گئی تھی اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ ہم اس کشتی پر فرار ہوگئے ہیں۔

جنرل کھوراٹ واپس جاچکا تھا اور دارا اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں یہ پروگرام بنا تھا کہ دو دن بعد وہ بھی جنرل کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔

یہ اطلاع میرے لیے خاصی اہم تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر دارا جنرل کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا تو ہماری پہنچ سے باہر ہوجائے گا۔ ہمیں اس سے پہلے ہی اس کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا اور جب میں نے بوما سے بات کی تو وہ بولا۔

"یہ تو طے ہے کہ جلد یا بدیر ہمارا راز فاش ہوجائے گا۔ اس لیے میں نے بھی یہ پروگرام بنایا ہے کہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔"

"تمہارے ذہن میں کوئی پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جس روز دارا وغیرہ روانہ ہوں گے اس رات ایک کشتی خورونوش کا سامان لے کر آئے گی۔ یہ سامان ہر دوسرے دن لاؤس سے آتا ہے۔ ایک کشتی آج آئے گی اور اگلی دو دن بعد۔ اگر ہم کوشش کریں تو اس کشتی پر قبضہ کرسکتے ہیں۔"

"گڈ!" میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "بندرگاہ۔۔میرا مطلب ہے وہ گھاٹ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں پر ان کشتیوں کی آمدورفت ہوتی ہے؟"

"یہاں سے گیارہ میل دور میکانگ کے ساحل پر وہ گھاٹ اگرچہ ہمارے لیے خاصا خطرناک ہوسکتا ہے لیکن کوشش کی جاسکتی ہے۔" بوما نے کہا "وہاں سامان رکھنے کے

لیے بہت بڑا شیڈ بنا ہوا ہے۔ ایک بھاری مشین گن بھی نصب ہے۔ چھ گارڈ مستقل طور پر وہیں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس رات کشتی سامان لے کر آتی ہے دو تین محافظوں کا مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ یہ وہ محافظ ہوتے ہیں جو کشتی کے ساتھ آتے ہیں اور جو ٹرک سامان اٹھانے کے لیے آتا ہے کم از کم دو آدمی اس پر بھی ہوتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں کم از کم ایک درجن آدمیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا "کشتی عام طور پر کس وقت آتی ہے؟"

"رات کے آخری پہر۔ دو اور چار بجے کے درمیان۔" بوما نے جواب دیا۔ "لیکن پہلے ہمیں دارا وغیرہ کا پروگرام معلوم کرنا پڑے گا۔ اگر وہ دن کے وقت گئے تو ہم ان کا پیچھا نہیں کرسکیں گے۔ البتہ رات کو....."

"لیکن ہم ان کا پیچھا کیسے کریں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تھائی تو اس قابل نہیں کہ چند قدم بھی چل سکے۔ گیارہ میل۔ یہ فاصلہ کیسے طے ہوگا؟"

"میں اس کا بھی بندوبست کرلوں گا۔" بوما نے کہا "لیکن پہلے دارا وغیرہ کا پروگرام معلوم ہونا ضروری ہے۔"

اس کے بعد ایک دن اور گزر گیا۔ اگلے دن شام کو بوما نے ہمیں بتا دیا کہ ہم اپنی تیاری مکمل کرلیں۔ ہوفا نے بھی اپنا بیگ پیک کرنا شروع کردیا تھا۔ اس نے بیگ میں زیادہ تر بچے کے کپڑے اور دوسری چیزیں رکھی تھیں۔ فیڈر اور دودھ کے دو ٹن اس نے سب سے پہلے بیگ میں رکھے تھے۔

اس سے اگلے روز شام کو بوما واپس آیا تو اس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔

"دارا اور اس کے ساتھی آج رات گیارہ بجے روانہ ہورہے ہیں۔" اس نے بتایا "روانگی کے لیے رات کا وقت رازداری کے خیال سے رکھا گیا ہے۔ وہ ایک بڑی جیپ پر ہوں گے جس میں ان کی حفاظت کے لیے چار محافظ بھی ہوں گے۔"

"ہم لوگ کس وقت روانہ ہوں گے اور بندوبست کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے بندوبست کرلیا ہے۔" بوما نے جواب دیا "میں نے ایک جیپ تاڑلی ہے۔ میں آٹھ بجے یہاں سے چلا جاؤں گا اور ساڑھے دس بجے جیپ لے کر آجاؤں گا۔ تم لوگ تیار رہنا۔ ہم فوراً ہی روانہ ہوجائیں گے۔ یہاں سے تقریباً پانچ میل آگے نکل کر ہم ان کا انتظار کریں گے۔"

بوما خاموش ہوگیا لیکن یہ خاموشی چند سیکنڈ سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوسکی۔ ہم ایک بار پھر اپنے اس منصوبے کی تفصیلات کا جائزہ لے رہے تھے جس پر ہم سب کی زندگیوں کا دارومدار تھا۔

بوما جاچکا تھا۔ ہم نے اپنی تیاری مکمل کرلی تھی۔ میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ گولڈن ٹرائی اینگل۔ دنیا کی خطرناک ترین جگہ۔ جہاں سے پوری دنیا میں موت بانٹی جاتی تھی۔ جنرل کھوراٹ۔ ایک جنونی اور پاگل کتا تھا جسے چین کی فوج بھی پٹا نہیں ڈال سکی تھی۔ وہ اس سرزمین کا حکمران تھا۔ یہ وہ خطہ تھا جس کی زمین جنرل کھوراٹ اور اس کے ہم پیشہ لوگوں کے لیے تو سونا اگلتی تھی مگر دوسروں کے لیے یہاں موت اگتی تھی۔ کوئی اجنبی آج تک موت کی اس وادی میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کرسکا تھا اور ہم اس خونی اژدھے کے جبڑوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

آج شاید اس سرزمین پر ہمارا آخری معرکہ ہوتا اور کسی قسم کی پیش گوئی کرنا ممکن نہیں تھا۔ دارا ہمارے ہاتھوں مارا جاتا یا ہم زہر اگلنے والی اس زمین کے لیے کھاد بن جاتے۔

میں نے کئی مرتبہ ہوفا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے بھی اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ وہ جرائم پیشہ عورت تھی۔ طویل عرصے تک قانون سے آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی اور پھر قانون سے تحفظ کا لالچ دے کر اسے یہاں پہنچا دیا گیا۔ وہ چار سال سے یہاں تھی۔ یہ ایک ایسی جیل تھی جہاں اگرچہ ہر قسم کی آزادی حاصل تھی لیکن یہاں سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے کسی طرح سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کی تھی، جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ ہر شخص یہاں سے نکلنا بھی چاہتا تھا اور جنرل کھوراٹ کا وفادار بھی تھا۔

یہاں آنے والے ہر شخص کو فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ جنرل کھوراٹ نے یہاں جدید ترین اسلحہ جمع کر رکھا تھا اور کئی مرتبہ یہ گولہ بارود استعمال بھی ہوا تھا۔

پچھلے چار برسوں کے دوران میں ہوفا ٹرائی اینگل کی مختلف پوسٹوں پر تعینات رہی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف یہاں کے محافظ تھے بلکہ پوست کی کاشت اور منشیات کی تیاری کا کام بھی انہی لوگوں سے لیا جاتا تھا۔ یہاں انہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ کھوراٹ انہیں ضرورت کی ہر چیز مہیا کرتا تھا۔ مردوں کا دل بہلانے کے لیے عورتیں موجود تھیں۔

ہوفا بھی دو سال تک مختلف مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنی رہی تھی پھر دو سال پہلے اس نے بوما سے شادی کرلی۔ وہ دونوں یہاں سے نکلنا چاہتے تھے۔ کئی مرتبہ منصوبے بنائے تھے لیکن فرار کی کوشش کرنے والے دوسرے لوگوں کا انجام دیکھ کر وہ کبھی بھی اپنے کسی منصوبے پر عمل کرنے کی ہمت نہیں کرسکے تھے۔ زندگی بہت عزیز تھی۔ یہاں وہ زندہ تو تھے۔

اور پھر وجدان یہاں آگیا۔ بوما، وجدان، سونیا اور جانکی کی ہمت اور حوصلے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا جو انجام کی پروا کیے بغیر موت کے کنوئیں میں کود گئے تھے۔ بوما اور ہوفا نے بھی اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سرزمین پر جنرل کھوراٹ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا مگر وجدان وغیرہ کی وجہ سے بوما اور ہوفا میں اتنا حوصلہ پیدا ہوچکا تھا کہ وہ نتائج کی پروا کیے بغیر ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوگئے تھے۔

ہوفا اپنے بچے کو سینے سے لگائے کھڑی تھی۔ اس کے دوسرے کندھے پر آٹومیٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ ان کے پاس اتنا ایمونیشن موجود تھا کہ وہ کئی گھنٹوں تک مقابلہ کرسکتے تھے۔

بوما نے دس بجے واپس آنے کو کہا تھا لیکن اب سوا دس بج چکے تھے۔ میری بے چینی بڑھ رہی تھی "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی؟" میں بار بار سوچ رہا تھا۔ ہم نے اپنے آپ کو کسی بھی قسم کی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ لمحات صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ گھڑی کی سوئیوں کی رفتار سست ہوگئی تھی لیکن ہمارے دلوں کی دھڑکنیں خطرناک حد تک تیز ہورہی تھیں۔

دس بج کر پینتیس منٹ پر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر ہم سب ہی چونک گئے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکا۔ وہ جیپ تھی جس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں اور وہ پتھریلے میدان میں اچھلتی ہوئی تیز رفتاری سے کاٹیج کی طرف آرہی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ بوما ہی ہوتا۔ اس جیپ میں ہماری موت کا سامان بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے جانکی وغیرہ کو اشارہ کیا اور ہم کسی بھی ناگہانی صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

جیپ کاٹیج کے سامنے رک گئی اور بوما جیپ سے اتر کر دوڑتا ہوا کاٹیج کے برآمدے کی طرف بڑھا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔

"جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" بوما اندر آتے ہی بولا۔

ہم تو تیار ہی تھے۔ سونیا نے اپنے بیگ کے ساتھ ہوفا کا بیگ بھی اٹھالیا۔ میں نے تھائی کو کندھے پر لادا اور تیزی سے باہر آگیا۔

جیپ کی پیچھے والی سیٹیں آمنے سامنے تھیں جن کے درمیان خالی جگہ تھی۔ سونیا اور تھائی کو آگے ڈرائیونگ سیٹ کی پشت کے قریب ان سیٹوں پر آمنے سامنے بٹھا دیا گیا۔ سونیا اور جانکی رائفلیں سنبھالے پچھلے کنارے پر آمنے سامنے بیٹھ گئیں۔ بوما نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بوما کی سب مشین اس کی سیٹ کے قریب رکھی ہوئی تھی۔

جیپ حرکت میں آکر پتھریلے میدان میں ایک طرف دوڑنے لگی۔ بوما نے ہیڈ لیمپس نہیں جلائے تھے۔ جیپ ایک طویل چکر کاٹتی ہوئی اندرونی حصے کی طرف جانے والی سڑک پر آگئی۔ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی۔ پتھریلا راستہ تھا جس کے دونوں طرف پوست کے کھیت تھے۔ یہی سڑک جنرل کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف چلی گئی تھی جو وہاں سے تقریباً تیس میل آگے تھا۔

آسمان پر بادل تھے جس سے اندھیرا کچھ اور گہرا ہوگیا تھا۔ بوما نے اب بھی ہیڈ لیمپس روشن نہیں کیے تھے اور جیپ اس پتھریلے راستے پر اچھلتی ہوئی جارہی تھی۔

تقریباً پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بوما نے جیپ کی رفتار کم کردی۔ وہ تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر اس نے جیپ کو دائیں طرف پوست کے کھیتوں میں ایک اور تنگ سے راستے پر موڑلیا۔ یہ راستہ بتدریج بلندی کی طرف جارہا تھا۔ پچاس گز کا فاصلہ طے کرکے اس نے جیپ روک کر انجن بند کردیا اور نیچے اُتر آیا۔

ہوفا اور تھائی کو جیپ میں ہی چھوڑ دیا گیا۔ تھائی اس وقت حواس میں تھی۔ انہیں کچھ ہدایات دینے کے بعد ہم سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ سونیا اور جانکی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم چاروں ڈھلان پر پوزیشن سنبھال کر بیٹھ گئے۔

"وہ لوگ ٹھیک گیارہ بجے روانہ ہوں گے۔" بوما نے کہا "چند منٹ یہاں تک آنے میں لگیں گے۔ یہاں سے ہم انہیں آسانی سے نشانہ بنا سکیں گے۔"

ہمیں تقریباً دس منٹ انتظار کرنا پڑا تھا پھر بائیں طرف سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ وہ دارا لوگوں کی جیپ تھی۔ انجن کی آواز فضا میں چاروں طرف گونجتی ہوئی سی محسوس ہورہی تھی۔ ہماری

نظریں اچھلتی ہوئی روشنیوں پر جمی ہوئی تھیں اور پھر وہ جیپ جیسے ہی ہمارے سامنے پہنچی بوما نے فائر کھول دیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ کوئی گولی ٹائر پر لگی تھی اور ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جیپ لڑکھڑاتی ہوئی سڑک کے دوسری طرف پوست کے کھیتوں میں گھس گئی تھی اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی جوابی فائرنگ ہونے لگی۔

بوما سے تھوڑی سی غلطی ہوگئی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن گولیاں ذرا نیچے لگی تھیں۔ جیپ کا ایک ٹائر اگرچہ برسٹ ہوگیا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ دارا اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کا کچھ نہیں بگڑ سکا ہوگا۔

جیپ الٹ جاتی تو ہمارا کام آسان ہوجاتا مگر ٹائر برسٹ ہونے کے بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھیت میں گھس کر رک گئی تھی اور ان لوگوں نے یقیناً جیپ سے اتر کر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ بوما نے بتایا تھا کہ ان کے ساتھ چار محافظ ہوں گے مگر فائرنگ سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ دارا، کم اور چی فانگ بھی مسلح تھے اور وہ بھی فائرنگ کرنے میں شریک تھے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا کچھ آگے نکل گیا۔ دو سائے پودوں میں ایک طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے تو میں نے فائر کھول دیا۔ وہ دونوں محافظ تھے جو چیختے ہوئے ڈھیر ہوگئے۔ میں دوڑتا ہوا کچھ اور آگے نکل گیا۔ ٹیلے پر سے بوما اور جانکی وغیرہ بھی فائرنگ کررہی تھیں۔

فائرنگ کا سلسلہ تقریباً پانچ منٹ تک جاری رہا اور پھر میں اچانک ہی اپنے عقب میں فائرنگ کی آواز سن کر چونک گیا۔ ہمارے حریفوں میں سے کسی کو اس طرف جانے کا موقع مل گیا تھا اور اس نے ہماری جیپ پر فائرنگ شروع کردی تھی۔ میں چیختا ہوا اس طرف دوڑا۔ جانکی بھی میرے پیچھے ہی لپکی تھی۔ ہماری جیپ پر سے ہوفا نے بھی فائرنگ کا جواب دینا شروع کردیا تھا اور پھر ایک چیخ کی آواز سن کر میں رک گیا۔ جیپ پر حملہ کرنے والا محافظ ہوفا کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔

اور پھر میری نظروں نے ایک اور خوفناک منظر دیکھا۔ تھائی جیپ سے اتر کر ہوفا کے بچے کو سینے سے چمٹائے ایک طرف دوڑ رہی تھی۔ جیپ پر حملہ ہونے کے بعد وہ اپنے آپ کو اور بچے کو بچانے کے لیے دوڑی تھی مگر اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ غلط تھا۔ وہ بدحواسی میں اس طرف دوڑ رہی تھی جس طرف دارا اور اس کے ساتھی گھات لگائے ہوئے تھے۔

"تھائی۔ رک جاؤ۔" میں چیختا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔

لیکن تھائی نے میری آواز نہیں سنی اور وہ دوڑتی چلی گئی۔ اس کے سینے سے لپٹا ہوا بچہ بُری طرح رو رہا تھا۔ سونیا بھی تھائی کو دیکھ کر اس طرف دوڑ پڑی تھی اور پھر سامنے سے فائرنگ کا رخ بدل گیا۔ اب گولیوں کا رخ تھائی کی طرف تھا۔ تھائی مڑ کر دوسری طرف دوڑنے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے فضا اس کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ لاتعداد گولیاں اس کی پشت اور ٹانگوں میں پیوست ہوگئیں اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل گری۔ بچہ اس کے نیچے دب گیا تھا۔

سونیا نے مخالف سمت میں فائر کھول دیا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اس جگہ پر پہنچ گیا جہاں تھائی گری تھی۔ وہ پودوں میں منہ کے بل پڑی تھی۔ بچہ اس کے نیچے دبا رو رہا تھا۔ اس دوران میں ہوفا بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

میں نے تھائی کو سہارا دے کر سیدھا کردیا۔ ہوفا نے جلدی سے بچے کو اٹھالیا۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔ تھائی کا جسم گولیوں سے چھلنی ہوچکا تھا لیکن اس میں کچھ سانس ابھی باقی تھے۔ میں نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"تھائی۔۔۔ تھائی۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔" میں اس کا گال تھپتھپانے لگا۔

تھائی نے آنکھیں کھول دیں "وج۔۔۔ وجدا۔۔۔ ن۔۔۔" اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے "اپ۔۔۔ اپ۔۔۔ نا۔۔۔ خیال۔۔۔ رکھنا۔۔۔"

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔ ہونٹ خاموش ہوگئے اور آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ کئی سال پہلے اس نے بنکاک میں.... دارا جیسے خونی بھیڑیوں سے بچا کر مجھے نئی زندگی دی تھی اور آج اس نے میری گود میں دم توڑ دیا تھا۔

میں چیخ اٹھا۔ قریب بیٹھی ہوئی ہوفا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے تھائی کا سر آہستگی سے زمین پر ٹکا دیا اور رائفل تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت بائیں طرف بہت دور کسی گاڑی کی روشنیاں دکھائی دیں۔ میرے خیال میں وہ بھی محافظوں کی جیپ ہوگی۔ میں اس جیپ کی پروا کیے بغیر رائفل اٹھائے اس طرف دوڑا جس طرف سے تھائی پر فائرنگ کی گئی تھی۔

میں اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا سڑک پار کرکے سامنے والے کھیت میں گھس گیا۔ وہاں کھڑی ہوئی جیپ کے ہیڈ لیمپس ابھی تک روشن تھے اور اسی روشنی میں دو سائے کھیتوں میں بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ ان میں ایک کم تھا اور دوسرا دارا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ دارا آگے تھا اور کم پیچھے۔ میں نے اسے باڑ پر رکھ لیا۔ کم لڑکھڑا کر گرا۔ اس کے جسم میں اتنے سوراخ ہوگئے تھے کہ گننا مشکل ہوجاتا۔ دارا کافی آگے نکل چکا تھا اور پھر نیچے گر کر غائب ہوگیا۔ میں دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا۔ سامنے ایک گہرا کھڈ تھا۔ دارا گولی کھا کر اسی کھڈ میں گرا تھا۔ میں اس کے پیچھے کھڈ میں چھلانگ لگانا چاہتا تھا کہ آنے والی جیپ سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ وہ جیپ اگرچہ ابھی کافی دور تھی لیکن فائر کھول کر انہوں نے شریکِ جنگ ہونے کا اعلان کردیا تھا اور وہ جیپ کسی بھی لمحے ہمارے سر پر پہنچ سکتی تھی۔

"وجدان۔ بھاگو۔ اپنی جیپ کی طرف۔ جلدی۔"

بوما کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا۔ دوسرے ہی لمحے مڑ کر تیزی سے دوڑتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا جہاں تھائی کی لاش پڑی تھی۔

"تم لوگ جیپ تک پہنچو۔ میں انہیں روکتا ہوں۔" بوما چیخا۔

میں تھائی کی لاش کو کندھے پر اٹھا کر اپنی جیپ کی طرف دوڑنے لگا۔ ہوفا، سونیا اور جانکی پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ہوفا نے بچے کو سونیا کے حوالے کرکے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کردیا۔ میں نے تھائی کی لاش کو سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا اور رائفل سنبھال کر واپس دوڑا۔

بوما ایک جگہ پودوں میں پوزیشن لیے بیٹھا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور آگے آتی ہوئی جیپ کی طرف دیکھنے لگا جو ابھی تقریباً دو سو گز دور تھی۔

پہلی جیپ کے تین محافظ مارے جاچکے تھے۔ کم میرے ہاتھوں ختم ہوگیا تھا۔ دارا گولی کھا کر کھڈ میں گرا تھا جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ زندہ ہے یا ختم ہوگیا تھا۔ چی فانگ کہیں چھپ گیا تھا اور زندہ بچ جانے والا چوتھا محافظ اِکا دُکا فائر کررہا تھا جبکہ ہم نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

وہ جیپ سڑک پر ہمارے عین سامنے رک گئی۔ فاصلہ پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔ اس جیپ میں کئی محافظ تھے جو جیپ رکتے ہی چھلانگ لگا کر اُتر آئے تھے۔ دو تین محافظ کھیت میں کھڑی ہوئی اس جیپ کی طرف دوڑے جس کے ہیڈ لیمپس اب بھی روشن تھے۔

"کیا خیال ہے بوما؟" میں نے سرگوشی کی۔

"ہمیں اس جیپ کے صرف ٹائر بیکار کرنے ہیں تاکہ یہ ہمارا پیچھا نہ کرسکیں۔" بوما نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "اگر ان میں سے کوئی ہماری کسی گولی کا نشانہ بن جاتا ہے تو اس کی قسمت۔ میں اگلے پہیے کو نشانہ بناؤں گا اور تم پچھلے کو۔ ریڈی۔۔۔ ون۔ ٹو۔ تھری۔۔۔!"

ہم دونوں نے بیک وقت فائر کھول دیا۔ دو دھماکوں کے ساتھ دو چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ سڑک پر سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی لیکن ہم پودوں میں دوڑتے ہوئے اپنی جیپ کے قریب پہنچ گئے۔ ہوفا جیپ کو حرکت میں لا چکی تھی۔ ہم دوڑتے ہوئے جیپ کے پچھلے حصے پر سوار ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی جیپ کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ پتھریلے راستے پر اچھلتی ہوئی تیزی سے دوڑنے لگی۔

یہ راستہ نسبتاً تنگ اور غیر ہموار تھا۔ تاریکی میں ایسے راستے پر تیز رفتاری سے گاڑی چلانا خطرناک ہوسکتا تھا لیکن ہوفا نہ صرف ماہر ڈرائیور ثابت ہوئی تھی بلکہ یہ راستہ بھی دیکھا بھالا تھا اور وہ نشیب و فراز سے واقف تھی اس لیے کسی حادثے کے بغیر سفر جاری رکھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں سیٹوں کے درمیان جانکی کی لاش کے پاس بیٹھا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ تھائی کے ساتھ رہتے ہوئے کئی سال گزر گئے تھے لیکن آج تک یہ فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ میرے اور اس کے بیچ استوار رشتے کو کیا نام دیا جائے اور اب مجھے بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ میرا تو سب کچھ وہی تھی۔ محبوبہ۔ ماں۔ باپ۔ میرے لیے تو سب کچھ وہی تھی جو اب نہیں رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنے اندر وہی کرب اور دکھ محسوس کرنے لگا جو ماں باپ کی موت کے وقت میرے اندر جاگے تھے۔

میرا سر جھکا ہوا تھا۔ جانکی میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ تھائی کی موت کا صدمہ اس کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہورہا تھا۔

بوما نے مجھے پکڑ کر سیٹ پر بٹھالیا۔

"ہمت سے کام لو میرے دوست۔" وہ میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا "تھائی نے ایک نیک مقصد کے لیے جان دی ہے۔ وہ کئی سال سے تمہارے ساتھ بدی کے خلاف برسرپیکار تھی، وہ مری نہیں۔ ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی اور میرا یہ بیٹا۔" اس نے سونیا کی گود میں بچے کی طرف اشارہ

کیا "تھائی نے اپنی جان دے کر اسے بچالیا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بچہ بڑا ہو کر تھائی کے مشن کو جاری رکھے گا۔ ہم کہیں بھی ہوں لیکن جب تک ہم زندہ ہیں تھائی کے مشن کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔"

بوما کی باتیں میرے لیے بڑی حوصلہ افزا ثابت ہوئی تھیں۔ میں اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

"ہم کس طرف جارہے ہیں؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مشرقی گھاٹ پر۔" بوما نے جواب دیا "جو تقریباً تیرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اب دعا یہ کرنی چاہیے کہ ہمارے بارے میں پہلے سے وہاں کوئی اطلاع نہ پہنچ چکی ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ویسے ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری منزل کے بارے میں صحیح اندازہ نہ لگاسکیں۔"

"کیوں۔ وہ لوگ گھاڑ ہیں کیا۔ تم نے بتایا تھا کہ یہ راستہ میکانگ کے گھاٹ کی طرف جاتا ہے۔ انہیں اندازہ لگانے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کچھ آگے جاکر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو تین راستے نکلتے ہیں ۔" بوما نے بتایا "ایک راستہ کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتا ہے۔ ایک ہماری بستی کی طرف اور ایک راستہ جنوب کی طرف بھی جاتا ہے۔ میکانگ کے گھاٹ کا وہ اس لیے نہیں سوچ سکیں گے کہ وہاں مشین گن نصب ہے۔ جنرل کھوراٹ کے ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والے راستے کا خیال بھی وہ مسترد کردیں گے۔ جنوبی راستہ رہ جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے آگے سے اسے بلاک کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ظاہر ہے ہمیں اس طرف نہیں جانا۔ ہم تو میکانگ کے گھاٹ کی طرف جارہے ہیں نا۔ ویسے راستے میں ہمیں ایک اور بندوبست بھی کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا...؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"راستے میں بتاؤں گا۔" بوما نے جواب دیا۔

تقریباً چھ میل کا فاصلہ طے ہوجانے کے بعد بوما نے جیپ رکوالی۔ یہاں سے ایک کشادہ راستہ مشرق میں دریائے میکانگ کے گھاٹ کی طرف جارہا تھا۔ اس سڑک کے کنارے پر بجلی کے کھمبوں کی قطار تھی۔ اوپر بجلی کے تار تھے اور نیچے ٹیلی فون کا تار تھا۔ ٹیلی فون کے تار کے لیے الگ کھمبے لگانے کے بجائے بجلی کے کھمبوں ہی سے کام لیا گیا تھا۔

بوما جیپ سے اُتر کر کسی بندر کی طرح کھمبے پر چڑھ گیا۔ ٹانگوں اور ایک ہاتھ سے اس نے کھمبے کو لپیٹ میں لے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر نکال کر ٹیلی فون کا تار کاٹ دیا اور نیچے آگیا۔

"اب کم از کم ٹیلی فون کے ذریعے گھاٹ سے رابطہ قائم نہیں ہوسکتا۔" وہ جیپ میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

جیپ ایک بار پھر حرکت میں آگئی۔ سڑک ٹیلا نما پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی جارہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پوست کے کھیت تھے۔ اگر یہ کہا جاتا تھا کہ گولڈن ٹرائی اینگل سے دنیا بھر کو ہیروئن اور دیگر منشیات سپلائی کی جاتی تھیں تو یہ غلط نہیں تھا۔ سیکڑوں مربع میل پر مشتمل اس علاقے میں پوست ہی تو کاشت کیا جاتا تھا۔ یہاں ہیروئن تیار کرنے کی کئی فیکٹریاں تھیں جو بارہ مہینے کام میں مصروف رہتی تھیں۔

ایک ٹیلا نما پہاڑی کا موڑ گھومتے ہی ہوفا نے جیپ روک لی۔ اس نے انجن چلتا چھوڑ دیا اور نیچے اتر آئی۔ سامنے نشیب میں کافی فاصلے پر چند روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

"وہ میکانگ کا گھاٹ ہے۔" بوما نے ان روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر چلا گیا۔ میں بھی اس کے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور جیپ حرکت میں آگئی۔ اب بوما نے جیپ کے ہیڈ لیمپس بھی روشن کرلیے تھے۔

ان روشنیوں تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگ گئے۔ اس وقت ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا شیڈ نظر آرہا تھا جہاں چار پانچ بلب جل رہے تھے۔ ایک طرف ایک بڑا کاٹیج تھا۔ اس کے سامنے بھی تیز روشنی والا بلب جل رہا تھا۔

بوما نے جیپ اس کاٹیج سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر روک لی اور اسی وقت دو مسلح محافظ کسی طرف سے نکل کر سامنے آگئے۔ بوما نے انجن بند کردیا اور نیچے اتر کر ان محافظوں کی طرف چلنے لگا۔

"ہیلو بوما۔" ایک محافظ نے اسے دیکھ کر حیرت کا مظاہرہ کیا "تم اس وقت یہاں...؟"

"اوہ۔" بوما نے باری باری دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ میں بھی جیپ سے اتر کر ان کے قریب آگیا تھا۔ ہم دونوں کی رائفلیں جیپ میں ہی تھیں۔ یہ منصوبہ ہم نے راستے ہی میں بنالیا تھا کہ محافظوں پر کس طرح قابو پایا جائے گا "اس کا مطلب ہے تم لوگوں کو اطلاع نہیں ملی؟" بوما نے

باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسی اطلاع؟" ان میں سے ایک نے سوالیہ نگاہوں سے بوما کی طرف دیکھا۔ وہ اس گھاٹ کا انچارج تھا۔

"میرا بچہ بیمار ہے اور یونٹ کے ڈاکٹر نے اس کے علاج سے معذوری ظاہر کردی ہے۔" بوما نے جواب دیا "ہم اسے لاؤس لے کر جارہے ہیں۔ آج کشتی آنے والی ہے نا؟ جنرل کھوراٹ نے ہمیں جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن لگتا ہے تمہیں ابھی تک ہمارے بارے میں اطلاع نہیں ملی لیکن تم اگر چاہو تو ٹیلی فون پر تصدیق کرسکتے ہو۔"

"تصدیق تو کرنی ہی پڑے گی مگر یہ کون ہے اور جیپ پر دوسرے لوگ کون ہیں؟" انچارج نے کہتے ہوئے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہیں معلوم ہے ہمارے علاقے میں ایک لیبارٹری تباہ کردی گئی ہے۔ جنرل کھوراٹ خود بھی آیا ہوا تھا۔ وہ بہت برہم ہے۔ اس نے ہماری یونٹ کے بہت سے گارڈز کو تبدیل کردیا ہے۔ یہ لوگ بھی ہیڈ کوارٹر سے آئے ہوئے ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا "اس کے ساتھ دو لیڈیز گارڈ ہیں۔ یہ لوگ مجھے چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔"

"میں ان لیڈیز گارڈز سے بھی ملنا چاہوں گا۔" انچارج نے کہا۔ لڑکیوں کا نام سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

"یہ لوگ رات یہیں رہیں گے۔" بوما نے کہا "تم پہلے فون کرلو پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔"

انچارج سرہلاتا ہوا کاٹیج کی طرف چل پڑا۔ دوسرا گارڈ بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ میں اور بوما بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کاٹیج میں داخل ہوکر بوما نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کردیا۔ انچارج نے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا پھر کریڈل ٹیپ کرنے لگا۔

"کیا گڑبڑ ہے۔ لائن ڈیڈ ہورہی ہے۔" وہ میز کے پیچھے جھک کر فون کے تاروں کو جھٹکے دینے لگا۔

میں نے اور بوما نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے خنجر نکالے اور چیتے کی طرح ان پر جھپٹ پڑے۔ انچارج کو بوما نے سنبھال لیا تھا اور دوسرے محافظ کو میں نے۔ میں نے اس محافظ کو پشت کی طرف سے دبوچا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر ٹھیک دل کے مقام پر سینے میں پیوست کردیا تھا۔ محافظ بری طرح تڑپ رہا تھا لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہوگیا۔ اسے آہستگی سے زمین پر ڈال کر میں نے اس کے سینے میں پیوست خنجر نکال کر اس کے لباس سے صاف کیا۔ بوما بھی اپنے شکار سے نمٹ چکا تھا۔

ہم دونوں باہر آگئے۔ بوما نے کمرے سے نکلنے سے پہلے بتی بجھادی تھی اور پھر دروازہ بھی باہر سے بند کردیا۔

سونیا اور جانکی بھی جیپ سے اتر آئی تھیں۔ ہم لوگ شیڈ کے دوسری طرف آگئے۔ وہاں دو گارڈ کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے۔ انہوں نے جیپ کی آواز سنی ہوگی اور پھر انچارج سے ہماری باتوں کی آواز بھی سنی ہوگی لیکن اپنی جگہ سے اٹھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید آدھی رات کے وقت جیپ کی آمد.... ان کے لیے غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر کنکریٹ کے ایک چبوترے پر بھاری مشین گن رکھی ہوئی تھی۔ اس میں گولیوں کا بیلٹ بھی لگا ہوا تھا۔ مشین گن کا رخ دریا کی طرف تھا۔ چبوترے پر ایک شیڈ بھی بنا ہوا تھا۔

ان دو محافظوں میں سے بھی ایک بوما کا شناسا نکلا لیکن ان میں سے کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہوا۔

بوما نے باتوں ہی باتوں میں ان سے اگلوالیا کہ ان کے دو ساتھی کاٹیج کے پچھلے کمرے میں سورہے ہیں۔ بوما نے سونیا اور جانکی کو اشارہ کردیا۔ وہ کاٹیج کی طرف چلی گئیں۔

شیڈ میں بیٹھے ہوئے ان دونوں محافظوں پر قابو پانے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی لیکن ہم نے ان کا خون نہیں بہایا۔ ان کے ہاتھ پشت پر باندھ کر دریا میں پھینک دیا کہ مچھلیوں کا کچھ بھلا ہوجائے گا۔

اور پھر اچانک فائر کی آواز سن کر ہم اچھل پڑے۔ ہم دونوں ہی بیک وقت کاٹیج کی طرف دوڑے تھے اور پھر یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ کاٹیج کے اس کمرے میں ایک محافظ کو تو جانکی اور سونیا نے ٹھکانے لگادیا تھا اور دوسرا بھاگ نکلا تھا اور فائرنگ اسی نے کی تھی۔

"وجدان۔" بوما نے کہا "تم گھاٹ پر پہنچو۔ وہاں کوئی نہ کوئی کشتی ضرور موجود ہوگی۔ میں ان لوگوں کو لے کر آتا ہوں۔"

میں شیڈ کے دوسری طرف گھاٹ کی طرف دوڑتا چلاگیا۔ بوما کا خیال درست نکلا۔ دریا کے کنارے پر کنکریٹ کے پلیٹ فارم کے ساتھ ایک کشتی موجود تھی جس میں کم از کم آٹھ آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ میں کشتی کے بارے میں اطمینان کرکے واپس دوڑا لیکن یکایک مشین گن والے چبوترے کی طرف مڑگیا۔ وہ بھاری مشین گن دریا میں لڑھکانے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں ایک بار پھر جیپ کی طرف دوڑا اور پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے ٹیلوں پر کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ وہ یقیناً محافظوں کی جیپ تھی جو تیزی سے اس طرف آرہی تھی۔ فاصلہ تین فرلانگ سے زیادہ نہیں تھا۔

دائیں طرف سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بوما زندہ بچ جانے والے محافظ کو فائرنگ کے زور پر دوڑاتا ہوا دور تک لے گیا تھا پھر اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔

"تم لوگ گھاٹ کی طرف چلو۔ جلدی کرو۔" میں نے سونیا وغیرہ سے کہا۔

ہوفا نے بچے کو گود میں اٹھالیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے اپنا بیگ پکڑلیا تھا۔ سونیا اور جانگی نے بھی اپنے بیگ اور رائفلیں اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں جیپ کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا اور تھائی کی لاش کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھائی کو جب میں دارا والے کاٹیج سے اٹھا کر لایا تھا تو بہت ہلکی پھلکی سی تھی لیکن بے جان ہو کر اس کا وزن بڑھ گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اس لاش کو اٹھا سکا تھا۔ اس دوران میں بوما بھی میرے قریب پہنچ گیا۔

"بھاگو۔ جلدی کرو۔" وہ چیخا۔

میں نے شیڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔ بوما میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جیپ تیزی سے فاصلہ سمیٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

سونیا نہ صرف کشتی کے چبوترے سے بندھی ہوئی رسی کھول چکی تھی بلکہ اس نے بچے کو سونیا کے حوالے کرکے انجن بھی اسٹارٹ کردیا تھا۔ کشتی ہولے ہولے ہل رہی تھی جس وجہ سے تھائی کی لاش کو کشتی میں ڈالنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

جیپ کی آواز اب واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میرے فوراً ہی بعد بوما نے بھی کشتی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ جیپ کے رکنے کی آواز سنائی دیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے کشتی کا انجن بند ہوگیا۔

"یہ کیا ہوا۔ انجن اسٹارٹ کرو۔" بوما چیخا۔

ہوفا نے ایک دو مرتبہ بٹن دبایا۔ انجن کھانس کر رہ گیا۔ میں اور جانگی رائفلیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ بوما نے ہوفا کو کندھے سے پکڑ کر انجن کے سامنے سے ہٹا دیا۔ ہوفا نے اس کی رائفل پکڑ کر ہمارے ساتھ پوزیشن لے لی۔

بوما نے دو مرتبہ اسٹارٹر دبایا لیکن ہر مرتبہ انجن کھانس کر رہ گیا۔ ہماری عجیب حالت ہورہی تھی۔ تیز اور ٹھنڈی ہوا کے باوجود میری قمیص پسینے سے بھیگنے لگی۔ محافظ جیپ سے اتر چکے تھے۔ وہ جیپ یقیناً ہماری جیپ کے پاس رکی تھی اور گھاٹ سے اس جگہ کا فاصلہ ڈیڑھ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ دوڑتے ہوئے محافظوں کے قدموں کی آواز میرے دل اور دماغ پر دھمک سی پیدا کررہی تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور دوڑتے ہوئے قدموں کی وہ آوازیں اس سے بھی زیادہ تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھیں۔ موت اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ہماری طرف بڑھ رہی تھی اور بیچ کا فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جارہا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی وہ آوازیں رک گئیں جو موت کا پیغام لے کر ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ فضا پر ایک دم سناٹا چھا گیا اور یہ سکوت موت سے بھی زیادہ خوفناک تھا۔

میری بے چینی بڑھنے لگی۔ میری انگلی رائفل کے ٹریگر پر تھی اور نظریں کسی ایک مرکز پر ٹکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ انہیں موت کے ان ہرکاروں کی تلاش تھی جو اچانک ہی کسی جگہ رک گئے تھے یا شاید گھات لگا کر آواز پیدا کیے بغیر ہم پر جھپٹنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ گردن گھما کر بوما کی طرف دیکھا۔ وہ انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر بوٹ کا انجن ہر مرتبہ کھانس کر رہ جاتا۔ جانگی اور ہوفا بھی اپنی رائفلیں سنبھالے کسی ایکشن کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں ایک بار پھر شیڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں لکڑی کی کچھ خالی پیٹیاں بے ترتیبی سے بکھری ہوئی تھیں لیکن ان پیٹیوں کے آس پاس کوئی تحریک نظر نہیں آئی۔

بوما کی بڑبڑاہٹ سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹارٹر سے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش ترک کرکے نائیلون کی وہ ڈوری اپنے ہاتھ پر لپیٹ رہا تھا جسے کھینچ کر موٹر کے پنکھے کو حرکت میں لایا جاسکتا تھا۔ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے ڈوری کو اپنی طرف کھینچا۔ اس طرح پہلی ہی کوشش میں انجن اسٹارٹ ہوگیا اور پھر ٹھیک اسی لمحے میں نے اوپر شیڈ میں لکڑی کی ایک پیٹی کو بہت آہستگی سے آگے سرکتے ہوئے دیکھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ لوگ پیٹیوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کررہے تھے۔

"فائر۔۔۔!"

میں چیخا اور اس کے ساتھ ہی ٹریگر دبا دیا۔ جانگی اور ہوفا کی رائفلیں بھی گولیاں اگلنے لگیں۔

"چارج!" پلیٹ فارم کی طرف سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

چار محافظ لکڑی کی ان خالی پیٹیوں کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئے اور سب مشین گنوں سے فائر کرتے ہوئے ہماری طرف دوڑے۔

ہمارے اور پیٹیوں کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ ہمیں یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ ہماری کشتی اندھیرے میں تھی جبکہ شیڈ میں بلب جل رہے تھے اور وہ سب روشنی میں تھے۔ وہ چار گن مین تھے جو ہماری طرف دوڑے تھے مگر ان میں سے دو کو تو چند قدم آگے بڑھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ چیختے ہوئے وہیں ڈھیر ہوگئے۔ دوسروں نے اپنے ساتھیوں کا یہ انجام دیکھا تو وہ پناہ کی تلاش میں دائیں بائیں دوڑے۔

بوما کو کشتی کا رخ موڑنے میں ایک سیکنڈ لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے کشتی مینڈک کی طرح اچھل کر آگے بڑھی۔ کئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی تھیں یا آس پاس پانی میں گر رہی تھیں۔ ان دو محافظوں کے مارے جانے کے بعد شیڈ کی طرف سے ایک لمحے کو فائرنگ رک گئی تھی لیکن اس چبوترے کی طرف سے بدستور فائرنگ ہورہی تھی جس پر کچھ دیر پہلے تک بھاری مشین گن نصب تھی۔ اس طرف دو محافظ تھے جو غالباً مشین گن پر قبضہ کرنے کے لیے ہی اس طرف پہنچے تھے لیکن مشین گن وہاں نہ پاکر انہوں نے اپنی رائفلوں سے فائر کھول دیا تھا۔

بوما نے عقل مندی یہ کی تھی کہ کشتی کو کھلے دریا میں لانے کے بجائے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑاتا رہا۔ اس طرح اسے اونچی جھاڑیوں کی آڑ مل گئی تھی اور ہم ان کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ محض ہماری فائرنگ اور بوٹ کے انجن کی آواز پر فائرنگ کررہے تھے اور ان کا ایمونیشن ضائع ہی جارہا تھا۔

ہم کنارے کے ساتھ ساتھ گھاٹ سے کافی دور نکل گئے تھے۔ ہم نے فائرنگ روک دی تھی لیکن ہماری انگلیاں اب بھی اپنی اپنی رائفلوں کے ٹریگر پر تھیں۔

سونیا اب تک بچے کو گود میں سمیٹے اوندھی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اب وہ بھی سیدھی ہوئی۔ بچہ بُری طرح رو رہا تھا۔ سونیا نے ہوفا سے رائفل لے کر بچے کو اس کے حوالے کردیا۔ ہوفا ذرا پیچھے ہٹ کر کشتی کے کنارے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ایک طرف سے بلاؤز اوپر کھینچنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد بچے کا رونا بند ہوگیا۔

گھاٹ کی طرف سے بھی فائرنگ بند ہوگئی تھی۔ بوما کشتی کو اب بھی کنارے کے قریب ہی رکھے ہوئے تھا۔ میں گھوم کر بوما کی طرف دیکھنے لگا۔

"کشتی میں تیل کتنا ہے۔ یہ ہمیں کہاں تک پہنچا سکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ٹینک بھرا ہوا ہے۔" بوما نے ڈائل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ دراصل پٹرولنگ بوٹ ہے۔ تیل کا ٹینک ہر وقت فل رکھا جاتا ہے اور تم کشتی کے اطراف میں اوپر لگے ہوئے راڈ دیکھ رہے ہو۔ ان کے ساتھ لائٹ مشین گنیں فٹ کردی جاتی ہیں۔"

"یہ ہمیں کہاں تک پہنچا سکتی ہے؟" میں نے اپنے سوال کا دوسرا حصہ دہرایا۔

مارشل آرٹ

کراٹے

ابتدا سے بلیک بیلٹ
تک کی مشقیں

اردو میں پہلی بار کراٹے سکھانے
کی ایک مکمل اور آسان کتاب

قیمت 40 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
منی آرڈر ارسال کریں

Email: kitabiat1970@yahoo.com

"ٹینک فل ہے۔ چالیس پچاس میل تک تو نکل ہی جائیں گے۔" بوما نے جواب دیا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر یکایک خاموش ہوگیا اور ایک ہاتھ کان کے قریب رکھ کر ایسا انداز اختیار کرلیا جیسے کچھ سننے کی کوشش کررہا ہو۔

"کیا ہوا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ آواز سن رہے ہو۔" وہ بڑبڑایا۔

میں نے بھی ایک ہاتھ کان کے قریب رکھ لیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ بوما نے غلط نہیں کہا تھا۔ فضا میں گھرر گھرر کی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن بہت دور کی آواز تھی۔ بوما نے بوٹ کا انجن بند کردیا۔ خاموشی ہوتے ہی وہ آواز کچھ واضح ہوگئی۔ ہم جس طرف سے آرہے تھے تیز ہوا کا رخ بھی اسی طرف سے تھا۔ گویا وہ آواز ہوا کے دوش پر ہمارا تعاقب کررہی تھی۔

"جانتے ہو یہ آواز کیسی ہے؟" بوما نے کہتے ہوئے بوٹ کے انجن کا اسٹارٹر دبا دیا۔ اس مرتبہ پہلی ہی کوشش میں انجن اسٹارٹ ہوگیا۔

"کسی گاڑی کے انجن کی آواز ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ لوگ ہمارا پیچھا کررہے ہیں۔" بوما کے لہجے میں تشویش تھی "دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ سڑک ہے جہاں محافظوں کی گاڑیاں پٹرولنگ کرتی ہیں۔ وہ اس سڑک پر ہمارے پیچھے آرہے ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں جلد سے جلد یہاں سے دور نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پٹرولنگ گاڑیوں پر وائرلیس بھی ہوتے ہیں۔ جن کا رابطہ براہ راست ہیڈ کوارٹر سے ہوتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اگر انہوں نے وائرلیس پر اطلاع دے دی ہو تو سامنے سے کوئی اور پٹرولنگ گاڑیاں نہ آجائیں یا آگے کسی گھاٹ سے کوئی پٹرولنگ بوٹ نہ دریا میں آجائے۔"

"لیکن۔۔۔ یہ گاڑی تو ڑائی اینگل کے اندرونی حصے کی طرف سے آئی تھی جس طرف سے ہم آئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس پر وائرلیس نہ ہو اور ابھی تک ہمارے بارے میں کسی اور جگہ اطلاع نہ دی گئی ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" بوما نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا "اگر ہم اس پٹرولنگ جیپ سے بچ کر نکل بھی گئے تو یہ لوگ کسی دوسری جگہ پہنچ کر ہمارے بارے میں اطلاع دے دیں گے اور اس وقت ہمیں گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ہمارے لیے بچ نکلنا مشکل ہوجائے گا اس لیے کیوں نہ اس جیپ کا قصہ ہی ختم کردیا جائے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" بوما نے مجھے گھورا۔

"کشتی کسی ایسی جگہ روکو جہاں سے ہم آسانی سے کنارے پر پہنچ سکیں۔" میں نے کہا "ہم سڑک پر چھپ کر جیپ کا انتظار کریں گے اور۔۔۔"

"سمجھ گیا۔" بوما نے میری بات کاٹ دی "وہ سوچ بھی نہیں سکیں گے کہ انہیں اس طرح روکا جاسکتا ہے۔ ہمارے بارے میں تو وہ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ فرار ہورہے ہیں اور کہیں رکنے کی حماقت نہیں کرسکتے۔"

"سمجھ دار آدمی ہو۔" میں مسکرا دیا "اب جلدی سے کوئی ایسی جگہ تلاش کرلو۔"

بوما کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ گیپ دیکھ کر بوما نے انجن بند کردیا۔ اس دوران میں کشتی کچھ آگے نکل چکی تھی۔ وہ کشتی کو گھما کر اسی گیپ میں لے آیا اور رسی کے ساتھ بندھا ہوا کنڈا درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ میں پھنسا دیا۔

"جانکی۔ سونیا۔۔۔" میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم دونوں یہیں بیٹھو۔ ضروری نہیں کہ ہر محاذ پر ہمیں کامیابی ملتی رہے۔ بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔ تم لوگ پیچھے رہ کر ہماری مدد کرسکتی ہو۔"

میں اور بوما اپنی جگہوں سے اٹھ گئے۔ ہوفا نے فوراً ہی بوما کی سیٹ سنبھال لی تھی۔ بچہ سوگیا تھا اور اس کی گود میں تھا۔

جھاڑیوں کے درمیان وہ ایک تنگ سا راستہ تھا جو کنارے پر اوپر تک چلا گیا تھا۔ راستے پر پھسلن ہورہی تھی مگر ہم درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔

فضا میں گاڑی کے انجن کی آواز نمایاں ہوگئی تھی مگر ابھی تک وہ گاڑی بہت دور تھی۔ سڑک دریا کے کنارے سے تقریباً پچیس تیس فٹ آگے تھی۔ میں اور بوما ایک دوسرے سے بیس گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں بیٹھ گئے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

دو منٹ بعد گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی دکھائی دی۔ فاصلہ دو سو گز سے کم نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ پر پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں روشنی پر جمی ہوئی تھیں۔ جیپ کی رفتار خاصی تیز تھی اور روشنیاں اوپر نیچے اچھل رہی تھیں۔ فاصلہ تیزی سے کم ہورہا تھا۔

بوما مجھ سے تقریباً بیس گز پہلے تھا۔ جیپ جیسے ہی اس کے سامنے پہنچی، اس نے فائر کھول دیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز کے ساتھ دو انسانی چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔

جیپ پر سوار محافظوں کو اس قسم کی کسی صورت حال کی توقع بالکل نہیں تھی۔ دو محافظ بوما کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ دوسرے شاید صورت حال کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ جیپ تیزی سے آگے آرہی تھی اور پھر وہ جیسے ہی میرے سامنے پہنچی، میں نے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ رائفل سے نکلنے والی لاتعداد گولیوں میں سے ایک نے ڈرائیور کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ وہ ایک طرف لڑھک گیا اور تیز رفتار جیپ شتر بے مہار کی طرح پتھریلے راستے پر لہراتی ہوئی دریا کی طرف مڑ گئی اور گنجان جھاڑیوں کو کچلتی ہوئی قلابازی کھا کر دریا میں جاگری۔ جیپ کے جھاڑیوں میں گھسنے سے پہلے ایک آدمی چیختا ہوا گرا بھی تھا مگر ہم اسے دیکھنے کے لیے رکے نہیں تھے۔

ہم اس ڈھلان راستے پر پھسلتے ہوئے کشتی میں پہنچ گئے۔ بوما نے درخت کی شاخ میں پھنسا ہوا رسی کا آنکڑا کھینچ لیا۔ اس دوران میں ہوفا بڑی پھرتی سے اٹھ کر دوسری جگہ پر چلی گئی تھی۔ بوما نے انجن اسٹارٹ کیا اور کشتی کا رخ بدل کر اسے حرکت میں لے آیا۔

جیپ ہم سے تقریباً تیس گز آگے دریا میں گری تھی اور ابھی تک پوری طرح ڈوبی نہیں تھی۔ ایک محافظ شاید زندہ بچ گیا تھا اور وہ ڈوبتی ہوئی جیپ سے آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر پانی میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اسے شاید تیرنا نہیں آتا تھا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ بوما کشتی کو اس کے قریب سے نکال لے گیا۔

اس کے بعد بھی دریا کے وسط میں آنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بوما نے کشتی کو کنارے کے قریب ہی رکھا تھا۔

دس منٹ بعد ہی ایک اور آواز نے ہم سب کو بری طرح چونکا دیا۔ وہ ہیلی کاپٹر کے پروں کی آواز تھی۔ ہم سب اوپر دیکھنے لگے لیکن کاپٹر نظر نہیں آیا۔ بوما نے کشتی کو کچھ اور کنارے کی طرف لے لیا۔ دو منٹ بعد کاپٹر خشکی کی طرف سے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور ہمارے اوپر سے ہوتا ہوا دریا کی گہرائی کی طرف چلا گیا۔

ہم کاپٹر کو دور جاتے ہوئے دیکھنے لگے۔ کاپٹر ایک طویل چکر کاٹ کر واپس آرہا تھا۔ ہوفا بچے کو گود میں لے کر اس کے اوپر اوندھ گئی تھی تاکہ اگر کاپٹر سے گولیاں چلائی جائیں تو بچہ محفوظ رہے۔ بوما نے کشتی کا کنٹرول سنبھال رکھا تھا۔ میں جانکی اور سونیا رائفلوں کا رخ اوپر کیے تیار بیٹھے تھے۔

کاپٹر سے شاید ہمیں دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ اس کا رخ اب سیدھا ہماری طرف ہی تھا۔ بوما کی نظریں کاپٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ کاپٹر نے جیسے ہی جھکنا شروع کیا بوما نے بڑی تیزی سے وہیل گھما دیا۔ کشتی ایک دم مڑی اور تیزی سے کھلے پانی کی طرف نکلتی چلی گئی۔ اس وقت کشتی الٹتے الٹتے بچی تھی۔

بوما کی اس خطرناک حکمت عملی نے ہم سب کو بچالیا تھا کیونکہ جیسے ہی کشتی مڑی تھی، اس وقت کاپٹر سے گولیوں کی بارش شروع ہوگئی تھی اور گولیاں پانی کی سطح کو چیرتی ہوئی دریا کی تہ میں چلی گئیں۔

کاپٹر کافی آگے جاکر اوپر اٹھا اور واپس آنے کے لیے فضا میں چکر کاٹنے لگا۔ بوما نے بھی کشتی کو بڑی پھرتی سے کنارے کی طرف گھمالیا۔ اس مرتبہ وہ کشتی کو پانی پر جھکی ہوئی درختوں کی شاخوں تک لے گیا تھا۔

ہیلی کاپٹر مڑ کر گولیاں برسائے بغیر خشکی کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ شاید کشتی کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ بوما نے کشتی کچھ اور آگے لے جاکر انجن بند کردیا۔

کاپٹر واپس آرہا تھا اور اس مرتبہ اس کے نیچے سرچ لائٹ جل رہی تھی۔ تیز روشنی کے دائرے نے خاصے وسیع علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ہم نے ابھی تک فائرنگ کا جواب نہیں دیا تھا جس سے شاید کاپٹر والے یہ سمجھے ہوں کہ ہمارے پاس ایمونیشن ختم ہوچکا ہے۔

کاپٹر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ اس مرتبہ وہ واپس مڑا تو کافی نیچے تھا۔ وہ لوگ دریا کے اندر کی طرف کنارے کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے ہمیں تلاش کررہے تھے۔ ہماری کشتی جھاڑیوں کے اندر اور درختوں کی شاخوں کے بالکل نیچے تھی۔ ہم دم سادھے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے۔

"وہ رہے۔ ان جھاڑیوں میں۔" کاپٹر سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی "واپس موڑو۔ جلدی کرو۔"

کاپٹر ہم سے چند گز آگے نکل چکا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً ہی ایک خیال ابھرا "ابھی یا پھر کبھی نہیں۔" میں نے چیختے ہوئے فائر کھول دیا۔ سونیا اور جانکی نے بھی رائفلوں کے دہانے کھول دیے۔ بوما بھی رائفل سنبھال چکا تھا۔ چار آٹو میٹک رائفلیں بیک وقت چنگھاڑ رہی تھیں۔ روشنی کی لکیریں برقی کوندوں کی طرح ہیلی کاپٹر کا پیچھا کررہی تھیں اور پھر نجانے ہم میں سے کس کی گولی کاپٹر کے فیول ٹینک میں لگی۔

زوردار دھماکا ہوا۔ ہیلی کاپٹر کے پرخچے اڑ گئے۔ آگ کا

ت بڑا کولہ ہوا میں تیرتا ہوا دریا کے وسط میں جاگرا۔

بوما نے رائفل چھوڑ کر کشتی کا کنٹرول وہیل سنبھال لیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کشتی کو حرکت میں لے آیا۔ کشتی کنارے کے قریب رہ کر تیزی سے لہروں پر اچھلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔

کئی میل تک ہم کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ اس دوران میں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آئی تھی۔ نہ تو کسی کشتی نے ہمارا تعاقب کیا تھا اور نہ ہی کسی اور ہیلی کاپٹر نے۔ بوما اب کشتی کو دریا کے وسط میں گہرے پانی میں لے آیا تھا اور اس کی رفتار بھی بڑھا دی۔ وہ گہری نظروں سے تاریکی میں ادھر ادھر دیکھ بھی رہا تھا اور پھر اچانک ہی اس نے "ہرّے" کا اتنا زوردار نعرہ لگایا تھا کہ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا۔ جانگی وغیرہ بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

"کیا ہوا بوما۔۔۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم موت کی وادی سے نکل آئے ہیں۔" بوما نے جواب دیا "ڈینجر زون بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ وہ پہاڑی چوٹی دیکھ رہے ہو؟" اس نے بائیں طرف اشارہ کیا جہاں بہت دور تاریکی میں لپٹی ہوئی ایک بلند پہاڑی چوٹی نظر آرہی تھی "وہ ماؤنٹ سالوین ہے۔" بوما کہہ رہا تھا "برما کا سب سے بلند پہاڑی سلسلہ جو میلوں دور تک چلا گیا ہے۔ اب ہمیں گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن مجھے اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ جنرل کھوراٹ نے ہمارا پیچھا کیسے چھوڑ دیا تھا۔ ہم نے اس کا جتنا نقصان کیا تھا' اس کے پیش نظر تو اسے دنیا کے آخری سرے تک ہمارا تعاقب کرنا چاہیے تھا لیکن ہیلی کاپٹر کی تباہی کے بعد ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

کشتی اب پھر کنارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی رہی تھی۔ میکانگ اس خطے کا سب سے بڑا دریا تھا جو تبت کی برف پوش چوٹیوں سے شروع ہو کر سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا خلیج سیام میں جاگرتا تھا۔ یہ دریا کئی ملکوں کے درمیان سرحد کا کام بھی دیتا تھا۔ پہلے لاؤس اور تھائی لینڈ' پھر لاؤس اور گولڈن ٹرائی اینگل اور اب ہم لاؤس اور برما کی سرحدوں کے درمیان اس دریا میں سفر کر رہے تھے۔

تھائی کی لاش کشتی کے فرش پر رکھی ہوئی تھی۔ بوما اس وقت اس لاش ہی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کی بات غلط نہیں تھی۔ ہم تھائی کی لاش کو ساتھ ساتھ لے کر نہیں پھر سکتے تھے۔

بوما نے کشتی کا انجن بند کر دیا۔ کچھ دور جا کر کشتی رک گئی۔ ہوفا نے اپنے بیگ میں سے ایک چادر نکال کر بوما کی طرف بڑھا دی۔ میں نے اور بوما نے تھائی کی لاش کو چادر میں لپیٹ کر اس طرح گرہیں لگا دیں کہ چادر کھل نہ سکے اور پھر ہم دونوں نے لاش اٹھا کر بڑی آہستگی سے پانی میں اتار دی۔

کچھ دیر تک سفید چادر پانی کی سطح پر نظر آتی رہی پھر آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہوتی چلی گئی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ ماں باپ کے بعد چاچا پرتاب سنگھ نے مجھے سہارا دیا تھا۔ وہ نہ رہا تھا تو تھائی آگے آ گئی۔ اس نے مجھے ایک نئی زندگی دی اور بالآخر آج وہ عزیز ہستی بھی مجھ سے بچھڑ گئی۔

ہر کوئی اپنے اپنے انداز میں تھائی کے لیے دعا مانگ رہا تھا۔ مجھے ہچکیاں بھرتے دیکھ کر جانگی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بوما بھی میرا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔

ہم تقریباً پندرہ منٹ تک وہاں رکے رہے۔ بوما نے بوٹ کا انجن اسٹارٹ کر دیا اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔

رات بیت گئی۔ پو پھٹ رہی تھی۔ دریا کے کنارے پر جنگل اور پہاڑیاں اب واضح ہونے لگی تھیں۔ بوما متجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا مزید سفر کرنے کے بعد وہ کشتی کو برما کی سرحد والی سائڈ پر بالکل کنارے پر لے آیا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔ وہ کشتی کو ان چٹانوں کے اندر ایک تنگ سی کھاڑی میں لیتا چلا گیا۔

یہ کھاڑی آگے جا کر مزید تنگ ہو گئی تھی۔ جسے دونوں طرف سے جھکے ہوئے گنجان درختوں نے اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ فضا سے اس کھاڑی کی موجودگی کا پتا نہیں چل سکتا تھا۔

"ہم ٹھیک جگہ پہنچ گئے۔" بوما نے کہتے ہوئے انجن بند کر دیا۔ کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی اور بالآخر رک گئی۔ بوما نے رسی کا آنکڑا ایک درخت کی جھکی ہوئی موٹی شاخ سے لپیٹ کر پھنسا دیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں سے آگے برما کا ایک سرحدی قصبہ ہے۔

کینگ لاپ۔" بوما نے جواب دیا "ایک دو روز اس قصبے میں رکنے کے بعد ہم ریاست شان سے ہوتے ہوئے منڈالے اور وہاں سے آسام کی طرف نکل جائیں گے۔"

"آسام۔۔۔؟ یہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آسام پہلے ایک آزاد ریاست ہوا کرتی تھی لیکن پھر طاقت کے بل بوتے پر ہندوستان نے اس پر قبضہ کر لیا۔ آسام کے باشندوں نے آج تک اس تسلط کو تسلیم نہیں کیا۔ یہاں ہندوستان کے خلاف آزادی کی تحریکیں چلتی رہتی ہیں۔ ناگا قبائل نے تو روز اول ہی سے اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ یہ واحد تحریک ہے جو چالیس سال گزرنے کے بعد آج بھی پوری شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ کچھ خطے پر ان کا قبضہ ہے جسے ناگا لینڈ کا نام دیا گیا ہے۔ ناگا لینڈ کی مسلح مزاحمتی تحریک نے ہندوستان کو ناکوں چنے چبوا رکھے ہیں۔"

"تو تم آسام میں کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے کچھ عرصہ آسام میں رہنے کے بعد ہم ہندوستان کے میدانی علاقوں کی طرف نکل جائیں۔" بوما نے جواب دیا "تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ تم لوگ اگر چاہو تو کوائی ریور کے راستے تھائی لینڈ کا رخ کر سکتے ہو۔ وہ راستہ تمہارے لیے بالکل محفوظ رہے گا۔"

"نہیں دوست۔" میں نے جواب دیا "اب میری منزل نہ ہندوستان ہے اور نہ تھائی لینڈ۔"

"کیا مطلب؟" بوما نے مجھے گھورا "تو پھر کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"شاؤلن ٹمپل۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "سنا ہے وہاں مارشل آرٹس کے بڑے بڑے نامی گرامی ماسٹر موجود ہیں۔ میں اس فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔"

شاؤلن ٹمپل کے بارے میں' میں نے بنکاک میں بہت کچھ سنا تھا۔ شاؤلن ٹمپل مارشل آرٹ سے لگاؤ رکھنے والے ہر شخص کا خواب تھا۔ مہاراج نے بھی کچھ عرصہ وہاں گزارا تھا۔ وہ مجھے شاؤلن ٹمپل بھیجنا چاہتے تھے لیکن میں دارا کے چکر میں کچھ ایسا الجھا تھا کہ اس کے علاوہ ہر بات ذہن سے نکل گئی تھی۔

کم کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے چھلنی کر دیا تھا۔ چی فانگ بھاگ نکلا تھا اور دارا کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گولی کھا کر کھڈ میں گرنے کے بعد وہ ختم ہو گیا تھا یا زندہ بچ گیا تھا۔ ویسے میرے خیال میں دارا جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔ اگر وہ زندہ بچ گیا تھا تو اس سے کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ضرور ہو گا۔

"شاؤلن ٹمپل۔" بوما نے حیرت سے میری طرف دیکھا "لیکن وہاں پہنچنا آسان نہیں ہو گا۔"

"اگر من میں لگن ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہیں روکوں گا نہیں۔" بوما نے جواب دیا "لیکن یہ ایک لمبا سفر ہے۔ بہتر ہے اس کٹھن سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ایک دو دن ہمارے ساتھ کینگ لاپ میں آرام کر لو۔ اس کے بعد روانہ ہو جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارا یہ مشورہ مان سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

کشتی اس کھاڑی میں چھوڑ دی گئی اور ہم پہاڑیوں میں تنگ اور دشوار گزار راستوں پر چلنے لگے۔ یہ سرحدی علاقہ تھا یہاں سیکیورٹی فورسز سے آمنا سامنا ہونے کا اندیشہ تھا لیکن بوما کے کہنے کے مطابق اس قسم کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس علاقے کے قبائلی بھی برما کی حکومت سے برسرپیکار تھے۔ یہاں کسی قبائلی گوریلا دستے سے آمنا سامنا تو ہو سکتا تھا لیکن حکومت کی سیکیورٹی فورسز سے تصادم کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

کینگ لاپ کوئی قصبہ نہیں' چالیس پچاس گھروں پر مشتمل ایک قبائلی بستی تھی۔ ان لوگوں کا تعلق شان قبیلے سے تھا۔ یہ برما کا سب سے بڑا قبیلہ تھا اور یہی ان علاقوں میں حکومت سے برسرپیکار تھی۔

یہ قبائلی جنگجو ہی نہیں بڑے مہمان نواز بھی تھے۔ پہلے تو ہمیں گھیرے میں لے لیا گیا اور بعد میں جب پتا چلا کہ ہم گولڈن ٹرائی اینگل سے فرار ہو کر آئے ہیں تو انہوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

قبیلے کے سردار کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں تھی لیکن اس کی صحت قابل رشک تھی۔ اس نے ہمارے لیے ایک بڑا جھونپڑا خالی کروا دیا اور ہماری خاطر مدارات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اس وقت دھوپ نکل آئی تھی۔ ہم بری طرح تھکے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ کھا پی کر سو جائیں لیکن سردار باتوں کے موڈ میں تھا۔ وہ ایک ہی نشست میں ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم کر لینا چاہتا تھا۔

بوما خود برما کا رہنے والا تھا۔ وہ سردار سے باتیں کرتا رہا اور میں چٹائی پر لیٹ کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ جانگی وغیرہ سو رہی تھیں بوما جھونپڑے میں نہیں تھا۔ میں کچھ دیر تک چٹائی پر لیٹا

رہا اور پھر اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔ سامنے ہی درختوں کے نیچے ایک چبوترے پر کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں بوما بھی تھا اور قبیلے کا سردار بھی۔ مجھے جھونپڑے سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے۔

"آؤ۔ یہیں آجاؤ۔" بوما نے اشارہ کیا۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا چبوترے کے پاس پہنچ گیا۔ میرے لیے جگہ بنا دی گئی اور میں سردار کے قریب بیٹھ گیا اور بیٹھنے کے بعد ہی احساس ہوا کہ وہاں مرد ہی نہیں چار پانچ عورتیں بھی تھیں اور ان عورتوں کے جسموں پر لباس برائے نام ہی تھا۔

اس قبیلے کے لوگ بڑے مہمان نواز ثابت ہوئے تھے۔ ہماری خدمت خاطر میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ یہ اگرچہ غریب لوگ تھے لیکن ہمارے آرام و طعام کا بہت خیال رکھے ہوئے تھے۔ ان کی معیشت کا دارومدار کھیتی باڑی پر تھا۔ یہ پہاڑوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے میدانوں کا سینہ چیر کر اناج پیدا کرتے۔ چاول ان کی بڑی فصل تھی۔ جو اناج ضرورت سے زیادہ ہوتا' وہ قریبی شہر میں جا کر بیچ دیتے جس سے ملنے والی رقم سے زندگی کی دیگر ضروریات کا سامان خرید لیا جاتا۔

اس قبیلے میں رہتے ہوئے چار دن ہو گئے۔ اس دوران میں ئیں عجیب مصیبت میں گرفتار رہا۔ آبنوسی رنگت کی ننگ دھڑنگ عورتیں میرے اردگرد گھومتی رہتیں اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتیں۔ میں اپنی کوئی تعریف نہیں کر رہا' میں تھا ہی کچھ ایسا۔ پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب قد' گوری چٹی رنگت اور کسرتی جسم۔ دو تین عورتیں تو ایسی بھی تھیں جو میرے قریب آ کر میرے بازوؤں کے مسلز اور سینے کو ٹٹول کر دیکھتیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھنے میں آتی تھی۔

ایسے ہی ایک دو مواقع پر جانکی نے بھی دیکھ لیا تھا۔ یہ صورت حال یقیناً اسے پسند نہیں تھی۔ وہ ان عورتوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن مجھے یہ کہتی رہتی کہ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اس روز بھی شام کو اس نے مجھ سے یہ بات کہی تو میں گھور کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہمیں سے تمہاری کیا مراد ہے؟؟"

"میں اور تم۔ یعنی ہم دونوں۔" جانکی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "کیا سمجھتے ہو۔ میں تمہیں تنہا چھوڑ دوں گی؟؟"

"میری تو کوئی منزل نہیں ہے جانکی۔" میں نے کہا "تم نے میرا بہت ساتھ دیا۔ اپنا سب کچھ برباد کر لیا۔ اب تم شاید تھائی لینڈ جانا تو پسند نہ کرو لیکن ایک مرتبہ تم نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں بھی تمہارے بہت سے رشتے دار موجود ہیں۔ تم اگر چاہو تو بوما وغیرہ کے ساتھ جا سکتی ہو۔ یہ لوگ بھی تو اسی طرف جا رہے ہیں۔"

"بہت خوب۔" جانکی کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی "تمہارا کام ہو گیا تو اب مجھ سے جان چھڑا لینا چاہتے ہو لیکن ایک بات یاد رکھو۔ تھائی کی طرح مجھے موت ہی تم سے جدا کر سکے گی۔"

"تم نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے جانکی۔ میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن میں اب تم لوگوں کو مزید آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ یہ ایک بہترین موقع ہے۔ تم اپنے لیے ایک پرسکون راستے کا انتخاب کر سکتی ہو۔ اگر تم نے میرے ساتھ جانے کی ضد کی تو سونیا بھی۔۔۔"

"سونیا کی تم فکر مت کرو۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ دی "وہ بوما اور ہوفا کے ساتھ جا رہی ہے۔ دراصل اس کے ذہن میں یہ بات میں نے ہی بٹھائی تھی کہ ہمارے ساتھ رہ کر وہ اپنی زندگی برباد نہ کرے۔ وہ اپنی ماں کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی تھی سو وہ لے چکی۔ اس کا انتقام پورا ہو گیا۔ ہمارے ساتھ مارے مارے پھرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ ہوفا کے ساتھ ہندوستان چلی جائے۔ وہاں اسے آسانی سے سیٹ ہونے کا موقع مل جائے گا۔ ویسے بھی وہ ہوفا کے بچے سے بہت مانوس ہو چکی ہے اور وہ اس سے الگ نہیں ہونا چاہتی۔"

"اور اس نے تمہاری بات مان لی؟" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسے نہ مانتی۔" جانکی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی "ہمارے ساتھ رہتی تو کباب میں ہڈی بنی رہتی۔"

"کیا بکواس ہے۔ تم۔۔۔"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔" جانکی نے جلدی سے میری بات کاٹ دی "کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تو ایسے ہی محاورتاً کہہ دیا تھا۔ شاید اس موقع پر مجھے کچھ اور کہنا چاہیے تھا۔"

"تم نے وہی کہہ دیا جو تمہارے دل میں تھا لیکن تم جانتی ہو۔۔۔"

"ہاں بھئی۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" اس نے ایک بار پھر میری بات کاٹی "کوئی عورت بھی اپنی عزت کی اس طرح حفاظت نہیں کرتی ہوگی جس طرح تم۔۔۔"

وہ بکواس کرتی رہی لیکن میں اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ نجانے کیوں میری نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ میرے ذہن میں سونیا کا خیال ابھر آیا تھا۔ غار میں ہماری وہ آخری رات۔۔۔ جب سونیا نے میرا بھرم توڑ دیا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔ میری بات بری لگی کیا؟" جانکی نے کہا۔

"اوہ نہیں۔" میرے خیالات منتشر ہو گئے "نجانے کیوں اس وقت تھائی کا خیال آگیا تھا۔" میں نے بات ٹالنے کے لیے جھوٹ بولا۔

"تھائی۔" جانکی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "اسے تو ہم زندگی بھر نہیں بھول سکیں گے۔"

تھائی کے تذکرے سے ہم دونوں اداس ہو گئے تھے۔ جانکی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ تھائی کو ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔

اس رات ہم سردار کے جھونپڑے میں تھے۔ یہ اس بستی کا سب سے بڑا جھونپڑا تھا۔ سردار نے ہمیں خاص طور پر رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں قبیلے کا کوئی اور فرد شریک نہیں تھا سوائے سردار کے اپنے گھر والوں کے اور سردار کے گھر والوں میں اس کی تین عدد بیویاں اور چار بیٹیاں شامل تھیں۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ایک بھائی تھا جو عمر میں اس سے دس سال چھوٹا تھا اور سردار کے مرنے کے بعد قبیلے کی سرداری کا دعوے دار تھا۔ بہ الفاظ دیگر اسے ولی عہد کہا جا سکتا تھا لیکن اس دعوت میں وہ ولی عہد بھی شریک نہیں تھا۔

اور پھر اس دعوت میں ہی یہ طے ہوا تھا کہ بوما' ہوفا اور سونیا صبح سویرے منڈالے کے لیے روانہ ہو جائیں گے جہاں سے وہ آسام کی سرحد کی طرف نکل جائیں گے۔

کھانے کے بعد ہم دیر تک سردار کے جھونپڑے میں بیٹھے رہے۔ مجھے وہاں الجھن اس لیے بھی ہو رہی تھی کہ سردار کی تیسری اور نوجوان بیوی مجھ سے چپکی بیٹھی تھی۔ اس کے اس طرح بیٹھنے پر اگرچہ کسی اور کو اعتراض نہیں ہوا تھا مگر جانکی بار بار مجھے گھور رہی تھی۔

میں اپنے جھونپڑے میں آیا تو جانکی بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ اس بستی میں بیکاری نے بھی مجھے تھکا دیا تھا۔ چٹائی پر لیٹتے ہی سو گیا۔

صبح چھ بجے ہمیں جگا دیا گیا۔ بوما وغیرہ روانگی کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ ہم بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ملے۔ سونیا بھی مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

"میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "وہ چند لمحات تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اپنے آپ سے الگ کیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ اپنا خیال رکھنا اور ان دونوں کے ساتھ ہی رہنا۔ مجھے یقین ہے تمہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا موقع مل جائے گا۔"

سونیا کو چھوڑ کر میں بوما کی طرف متوجہ ہو گیا "چار سال پہلے تم منڈالے ہی سے بھاگے تھے۔ وہاں کی پولیس تمہیں ابھی تک نہیں بھولی ہوگی۔ ہو سکتا ہے جنرل کھوراٹ نے بھی وہاں اپنے ترپاڈ کے ایجنٹوں کو تمہارے بارے میں اطلاع دے دی ہو۔ تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔"

"سب کچھ میرے ذہن میں ہے۔" بوما نے جواب دیا "ہم منڈالے جانے کے بجائے موگوک کی طرف نکل جائیں گے اور وہاں سے اچھال کا رخ کریں گے۔ اس کے بعد ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

ہم بستی سے نکل کر تقریباً نصف میل دور تک ان کے ساتھ گئے۔ سردار نے اپنے قبیلے کے دو آدمی ان کے ساتھ کر دیے تھے۔ جو آسام کی سرحد تک ان کے ساتھ جاتے۔

بوما وغیرہ کے جانے کے بعد میں اس بستی میں کچھ اور وحشت سی محسوس کرنے لگا۔ میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ قبیلے کی چند جوان عورتیں خوں خوار بلیوں کی طرح مجھے گھورتی رہتی تھیں۔ انہیں میں نے اکثر اپنے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ ان کی کسی ممکنہ کارروائی سے بچنے کے لیے میں ہر وقت جانکی کے ساتھ چپکا رہتا۔

ہمیں دو دن اور یہاں رہنا پڑا اور وقت کاٹنا میرے لیے محال ہو گیا تھا۔ جانکی کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ہم دونوں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے لیکن سردار کی مرضی کے بغیر جانا ممکن نہیں تھا۔ پچھلی رات ہم نے چوری چھپے بھاگنے کا پروگرام بھی بنایا تھا لیکن یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ اگر پکڑے گئے تو نجانے یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ اب تو ہمیں اپنا مہمان بنائے ہوئے تھے۔ بھاگنے کی کوشش کی صورت میں یہ کوئی غلط مطلب بھی اخذ کر سکتے تھے اور پھر ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے۔ پہاڑوں میں بھٹکتے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اگلے روز میں نے خود سردار سے بات کی اور اس سے

رخصت ہونے کی اجازت مانگی۔ سردار تو چند روز اور ہمیں اپنا مہمان بنائے رکھنا چاہتا تھا لیکن میرے اصرار پر اس نے اگلے روز صبح ہمیں جانے کی اجازت دے دی۔

اور پھر اسی رات وہ ہوا جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد سردار ہمارے جھونپڑے میں آ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو لڑکیاں مشروبات لے آئیں۔ یہ مشروب ہم روزانہ ہی پیتے رہے تھے۔ لیکن آج اس کا ذائقہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ بڑی مسحور کن مہک تھی اس میں۔

مشروب پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ نشہ سا چھا رہا تھا لیکن یہ نشہ ایسا نہیں تھا کہ میں مدہوش ہو جاتا۔ اس کے برعکس میرے اندر عجیب سی توانائی پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ دماغ میں ہونے والی سنسناہٹ نے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کر ڈالی تھیں۔ میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ اس نے چٹائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں نے اپنے قریب کھڑی ہوئی لڑکی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں گر گئی۔ سردار اٹھ کر باہر چلا گیا اور اس کے فوراً ہی بعد پانچ چھ لڑکیاں غول بیابانی کی طرح شور مچاتی ہوئی جھونپڑے میں داخل ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے وہ سب مجھ سے لپٹ گئی ہوں۔ میرے ہاتھ بھی حرکت میں تھے۔ میں کبھی ایک کو اپنی طرف کھینچتا کبھی دوسری کو۔

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ میں ہوش میں ہوتے ہوئے بھی مدہوش تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا تھا۔ البتہ صبح جب میری آنکھ کھلی تو دماغ پر چھایا ہوا غبار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ جانکی کو اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر میں ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم پر لباس نہیں تھا۔ جانکی بڑی خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری نظریں جھک گئیں۔

"یہ کپڑے پہن کر باہر آ جاؤ۔ سردار نے کہا ہے کہ ہم ایک گھنٹے بعد یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔" جانکی نے قریب چٹائی پر پڑے ہوئے کپڑے میری طرف پھینکے اور اٹھ کر چلی گئی۔

میں اٹھ کر جلدی جلدی لباس پہننے لگا اور اس وقت میری نظر جھونپڑے کی دیوار کے قریب سوئی ہوئی ایک بے لباس عورت پر پڑی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں لباس پہن کر باہر آ گیا۔ سامنے ہی پانچ چھ عورتوں کے ساتھ جانکی بھی کھڑی تھی۔ ان عورتوں کے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور جانکی کی آنکھوں میں گویا خون اترا تھا۔ وہ میرا بازو پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی سردار کے جھونپڑے میں لے گئی۔

ہم نے ناشتا کیا اور سردار کے ساتھ باہر آ گئے۔ دو ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھے۔ جانکی نے بیگ کے اس دونوں کندھوں میں ڈال کر پشت پر لاد لیا اور اپنی رائفل اٹھا لی۔ میں نے بھی اپنی رائفل اٹھا کر کندھے پر لٹکا لی۔ دونوں آدمیوں نے تھیلوں میں کھانے پینے کا سامان اٹھا تھا۔ ایک تھیلے میں شاید کپڑے وغیرہ تھے۔

"یہ دونوں آدمی سرحد کے اس پار میکانگ تمہارے ساتھ جائیں گے۔" سردار نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس سے آگے تمہاری صوابدید پر منحصر ہے کہ تم لوگ اپنا سفر کس طرح جاری رکھتے ہو۔ ا تھیلے میں کچھ چیزیں ہیں۔" اس نے ایک قبائلی کے کندھے سے لٹکے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کیا "یہ چیزیں دریائے میکا پار کرنے کے بعد تمہارے کام آئیں گی۔"

سردار نے بڑی گرم جوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا۔ خیال تھا کہ آس پاس کھڑے ہوئے مرد اور عورتیں معانقہ کرنے کے لیے آگے آئیں گے مگر خیریت گزری۔ میں سے کوئی بھی آگے نہیں آیا تھا۔ البتہ ان عورتوں ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جنہوں نے گزشتہ رات مجھے "کھسوٹا" تھا۔

ہم بستی سے نکل کر درختوں میں ایک کشادہ پگڈنڈ چلنے لگے۔ دونوں قبائلی آگے تھے، میں اور جانکی ان کے پیچھے چل رہے تھے۔ جانکی کا تھوبڑا پھولا ہوا تھا۔ وہ مجھ کوئی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ ناراض ہے اور ناراضگی کی وجہ بھی واضح تھی۔ میں نے فی الحال خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

ہم دوپہر تک رکے بغیر چلتے رہے۔ مسلسل بلندی طرف چلتے ہوئے ہمارے سانس پھول گئے۔ جانکی کچھ ز ہی تھک گئی تھی۔ ایک مرتبہ وہ پتھروں پر پھسل کر لڑکھڑا میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کچھ کہے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے ساتھ چلتی رہی۔

وہ دونوں قبائلی ہم سے تقریباً بیس گز آگے تھے۔ انہ نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا لیکن ایک م گرتے ہوئے جانکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تو وہ رک پیچھے دیکھنے لگے۔ میں جانکی کا ہاتھ پکڑے کھینچتا ہوا ان۔ قریب پہنچ گیا۔ جانکی بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ ان میں۔

ایک قبائلی ادھر ادھر دیکھنے لگا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے شان زبان میں کچھ کہا۔ اس کی زبان تو میرے پلے نہیں پڑی لیکن مفہوم سمجھ گیا۔

ہم لوگ ساگوان کے درختوں کے نیچے آگئے۔ جانکی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ٹانگیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد ایک قبائلی نے ہمارے سامنے کھانا رکھ دیا۔ تلا ہوا خشک گوشت اور موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ ہم کئی گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے تھے۔ صبح کا کھایا پیا ہضم ہو چکا تھا۔ اس وقت بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

شکم سیر ہوتے ہی سستی طاری ہونے لگی۔ جانکی تو باقاعدہ اونگھنے لگی تھی۔ ہمیں یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ وہ دونوں قبائلی اپنے بیگ سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان دونوں کے پاس تھری ناٹ تھری کی پرانی رائفلیں تھیں۔ آج کے دور میں جہاں ذاتی حفاظت کے لیے بھی جدید ترین اسلحہ استعمال ہو رہا تھا۔ وہاں ان فرسودہ رائفلوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی لیکن بہرحال ان سے بھی گولی نکلتی تھی جو کسی انسان یا جانور کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

میں نے جانکی کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ ہم میں ابھی تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں تو اپنی جگہ شرمندہ تھا اور اس ندامت میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن جانکی سخت ناراض تھی۔ شاید وہ یہ سمجھتی تھی کہ گزشتہ رات جو کچھ بھی ہوا تھا' اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔

ہم بدستور بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ درخت اب کچھ کم ہوتے جا رہے تھے۔ سنگلاخ چٹانیں تھیں جو دھوپ سے تپ رہی تھیں۔ پسینے سے میرا لباس تر ہو رہا تھا۔ گردن اور پشت پر کینچوے سے رینگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ جانکی کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ وہ بار بار بے بس نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن زبان سے ایک لفظ بھی نہیں بولی۔ میں بھی اس کا ہاتھ پکڑے خاموشی سے اسے کھینچتا رہا۔

وہ قبائلی بڑے سخت جان تھے۔ لگتا تھا یہ کٹھن سفر ان پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہم سے آگے آگے چلتے رہے۔ البتہ اب وہ کبھی کبھی پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتے تھے۔

سورج پہاڑوں کے پیچھے غائب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب کہیں پڑاؤ ڈال دیا جائے گا لیکن وہ قبائلی چلتے رہے۔ ان میں ایک تو شان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں سمجھتا تھا البتہ دوسرا چینی اور تھائی بھی ملی جلی بول لیتا تھا۔ میں نے اسے رکنے کو کہا تو وہ آگے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہاں نہیں۔ کچھ آگے جا کر رکیں گے۔ وہاں ایک مناسب جگہ ہے۔"

اور اس کا "کچھ آگے" تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ثابت ہوا تھا۔ اس وقت اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ چٹانوں کے درمیان گھری ہوئی وہ ہموار جگہ تھی۔ جانکی نے بیگ زمین پر رکھا اور اسے تکیہ بنا کر لیٹ گئی۔ وہ واقعی بہت تھک چکی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

کھانے میں وہی تلا ہوا خشک گوشت اور موٹی موٹی روٹیاں' جو اس وقت تک سوکھ کر بھربھری سی ہو چکی تھیں۔ شدید بھوک میں یہ کھانا بھی کسی مرغن غذا سے زیادہ لذیذ ثابت ہوا۔

دونوں قبائلی ہم سے کافی دور جا کر بیٹھ گئے تھے۔ جانکی میرے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی۔

"جانکی۔" میری آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی "ناراض ہو؟"

"نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں۔" جانکی کے لہجے میں طنز تھا "میرے سامنے تو بڑے پارسا بنتے ہو اور گزشتہ رات تم نے جو کچھ کیا اس پر تو مجھے خوش ہونا بھی چاہیے۔"

"تم سمجھتی ہو کہ وہ سب کچھ میری مرضی سے ہوا تھا۔" میں نے کہا "یقین کرو جانکی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔"

"دھوکا تو میرے ساتھ کیا گیا تھا۔" جانکی بولی "مجھے مشروب میں کوئی نشہ آور چیز پلا کر بے ہوش کر دیا گیا اور تم رات بھر ان کالی بھجنگ چڑیلوں کے ساتھ گلچھرے اڑاتے رہے۔"

"یہ غلط ہے۔" میں نے جواب دیا "میرے مشروب میں بھی کوئی ایسی چیز شامل تھی جس سے میں بے ہوش تو نہیں ہوا مگر دماغ میں سنسناہٹ ہوتی رہی۔ میری سوچنے سمجھنے کی قوت سلب ہو کر رہ گئی تھی اور میں ان عورتوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنا رہا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ایک سازش تھی اور اس سازش میں قبیلے کا سردار بھی شریک تھا۔"

"کیا...؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں جانکی۔" میں نے جواب دیا "میں دو دن سے دیکھ رہا تھا کہ پانچ چھ لڑکیاں جیسے میری تاک میں رہتی تھیں۔ سردار بھی یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اس نے ان لڑکیوں کو کبھی منع نہیں کیا۔ اور گزشتہ رات تم نے بھی دیکھا تھا کہ ان لڑکیوں نے سردار کی موجودگی میں ہم دونوں کو مشروب پلائے تھے اور پھر سردار جھونپڑے سے باہر چلا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کچھ بھی ہوا سردار کی مرضی سے ہوا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "مجھے حیرت ہے یہ کس قسم کے لوگ ہیں۔ گزشتہ رات ان لڑکیوں میں سردار کی بیٹی بھی شامل تھی۔"

"ہو سکتا ہے یہ بھی میزبانی کا ایک انداز ہو۔" جانکی نے کہا۔

"یہ اچھی میزبانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیا "اپنی عزت دوسروں کے قدموں میں ڈال دینا۔ بڑی عجیب بات ہے۔"

"اپنی اپنی رسمیں ہوتی ہیں۔" جانکی بولی۔

"بہرحال' کچھ بھی ہو۔ اب تو ہم انہیں بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔" میں نے کہا "مجھے خوشی تو اس بات کی ہے کہ تم نے زبان تو کھولی۔ صبح سے منہ پھلائے ہوئے تھیں۔"

"غلط فہمی تھی جو دُور ہو گئی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔" جانکی نے کہتے ہوئے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔

"دیکھو دیکھو۔" میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا "اب تم خوش فہمی میں مبتلا ہو رہی ہو۔"

جانکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بیگ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

وہ رات بڑی مشکل سے گزری تھی۔ دن میں دھوپ سے سنگلاخ چٹانیں تپ جانے سے گرمی ہو گئی تھی اور رات کو تیز اور ٹھنڈی ہوا نے سونے نہیں دیا تھا۔ جانکی اگرچہ سو گئی تھی لیکن بار بار وہ بھی اٹھتی رہی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہمارے چاروں طرف چٹانیں تھیں جن سے ہوا کسی قدر رکی ہوئی تھی۔ اگر ہم کھلی جگہ پر ہوتے تو ٹھٹھر کر ختم ہو جاتے۔

صبح دھوپ نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بلند پہاڑوں میں آڑھے ترچھے راستوں پر سفر کرنا آسان نہیں ہوتا اور یہ تو کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہیں تھا۔

دوپہر کے لگ بھگ ہم رک گئے۔ آگے بہت ہی خطرناک راستہ تھا۔ ایک طرف بلند عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ اور عمودی چٹان کے ساتھ وہ راستہ چار فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ ہوا بھی بہت تیز تھی۔ کوئی معمولی سی لغزش موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

اس پل صراط کو دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میرے پوچھنے پر اس قبائلی نے بتایا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے یا تو ہم ایک میل پیچھے جا کر وہ راستہ اختیار کرتے جو تقریباً چار ہزار فٹ کی بلندی تک چلا گیا تھا لیکن اس کے دوسری طرف اترنے کے لیے ہمیں اس سے زیادہ خطرناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس قبائلی نے بتایا کہ شان قبیلے کے لوگ چین کی سرحد پار کرنے کے لیے عام طور پر یہی راستہ استعمال کرتے ہیں۔

"سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک گھنٹا یہاں آرام کرنے کے بعد ہم یہ راستہ پار کر کے چلتے رہیں تو شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے سرحد پر پہنچ سکتے ہیں۔" قبائلی نے بتایا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس پل صراط نما راستے پر ہم زندگی کی سرحد ہی پار کر جائیں۔" یہ جملہ جانکی نے کہا تھا۔

"ممکن ہے لیکن ہمارے سامنے صرف یہی ایک راستہ ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ خودکشی کی کوشش کرنی ہی پڑے گی۔"

"مجبوری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم نے وہیں پر پڑاؤ ڈال لیا۔ ایک قبائلی نے ہمارے سامنے کھانا بھی لگا دیا تھا۔

"بھئی میرا تو کچھ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا۔" جانکی نے کہا "اس راستے کو دیکھ دیکھ کر ہی میرے سینے میں ہول سے اُٹھ رہے ہیں۔"

"کھا لو۔ شاید یہ ہماری زندگی کا آخری کھانا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ بات اگرچہ میں نے مذاق میں کہی تھی لیکن جانکی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میرے مجبور کرنے پر اس نے چند لقمے کھا لیے تھے۔

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں رکے رہے اور پھر اس پل صراط پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہماری رائفلیں ان دونوں محافظوں نے لے کر اپنے کندھوں پر لٹکا لی تھیں۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان رائفلوں کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی نہ ہو۔

سب سے آگے وہ محافظ تھا جو ہماری زبان تھوڑی بہت

سمجھتا تھا۔ اس کے تقریباً دس فٹ پیچھے میں' میرے ساتھ جانکی اور اس سے دس پندرہ فٹ پیچھے دوسرا قبائلی تھا۔

تیز ہوا ہمیں آگے کو دھکے دے رہی تھی۔ ہم عمودی چٹان کے ساتھ چپکے ہوئے چل رہے تھے۔ چٹان پر جابجا پتھر اُبھرے ہوئے تھے اور ہم ان پتھروں پر ہاتھ جماتے ہوئے بہت آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ہماری پشت کھڈ کی طرف تھی اور ہم اس طرف دیکھنے سے گریز کررہے تھے۔

"آنکھیں بند رکھو اور چٹان کے ساتھ ساتھ چلتی رہو۔ پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔" میں نے جانکی کو ہدایت کردی۔

ہم قدم بقدم آگے بڑھتے رہے۔ ہوا بہت تیز تھی۔ اگر ہم نے چٹان کے ابھرے ہوئے پتھروں کا سہارا نہ لے رکھا ہوتا تو تیز ہوا ہمیں اٹھا کر پٹخ دیتی۔

پُل صراط نما یہ راستہ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ طویل تھا۔ ہم تقریباً سو فٹ کا فاصلہ طے کرچکے تھے اور پھر میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہونے لگا۔ آگے تقریباً دس فٹ کا راستہ ایسا تھا جس کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ مجھے جانکی کی بات یاد آگئی۔ ہم واقعی خودکشی کی کوشش کررہے تھے۔ تین فٹ چوڑی کارنس پر سفر کرنا واقعی موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ہوا کا کوئی تیز جھونکا ہمارے قدم اکھاڑ سکتا تھا اور اس جگہ قدم اکھڑنے کا مطلب تھا اذیت ناک موت۔

میں چٹان سے چپکا کھڑا تھا۔ جانکی نے بھی ایک ہاتھ چٹان کے ایک پتھر پر جما رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا بازو گرفت میں لے رکھا تھا۔

میں اپنے آگے والے اس قبائلی کو دیکھتا رہا جو چٹان سے چپکا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اس پل صراط سے گزر گیا تو میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔

"آہستہ آہستہ میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو۔ آنکھیں مت کھولنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ویسے یہ راستہ اتنا زیادہ خطرناک بھی نہیں ہے۔ بس خوف کو دل سے نکال دو اور چٹان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہو۔"

"نہیں۔ میں آگے نہیں جاسکتی۔" جانکی کے منہ سے خوف زدہ سی آواز نکلی۔ خوف سے اس کے ہونٹ بالکل سفید ہورہے تھے۔

"ہمت سے کام لو جانکی۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی "ہمارے سامنے صرف یہی ایک راستہ ہے۔ اب تو ہم واپس بھی نہیں جاسکتے۔ آؤ۔ میرے ساتھ ساتھ آؤ۔ آنکھیں بند رکھو اور چٹان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہو۔"

میں جانکی کا حوصلہ تو بڑھا رہا تھا لیکن میری اپنی ہمت جواب دے رہی تھی۔ میں نے اس خوفناک راستے کا جائزہ لیا۔ چٹان کے ساتھ ساتھ تو راستہ تقریباً ہموار تھا۔ زیادہ اونچ نیچ نہیں تھی۔ دو چار جگہوں پر چھوٹے چھوٹے پتھر اُبھرے ہوئے تھے۔ البتہ کھڈ والے کنارے کی طرف کچھ ناہموار پتھر نظر آرہے تھے۔ ان میں کچھ پتھر ایسے بھی تھے کہ کسی پر پاؤں پڑتا تو وہ اپنی جگہ سے اکھڑ سکتا تھا۔

میں نے قدم آگے بڑھا دیا۔ ایک ہاتھ سے میں نے چٹان میں ابھرے ہوئے پتھروں کا سہارا لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے جانکی کی شرٹ پکڑلی تھی تاکہ اسے حوصلہ رہے لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کا پیر پھسلتا تو دونوں ہی موت کے منہ میں پہنچ جاتے۔

ہم ایک ایک انچ کرکے آگے بڑھتے رہے۔ ہوا بُری طرح ہمیں دھکیل رہی تھی۔ جانکی نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

چھ فٹ کا یہ راستہ میلوں پر محیط ہوگیا تھا لیکن بالآخر ہم نے یہ پل صراط عبور کرلیا۔ اس سے آگے کا راستہ تقریباً چھ فٹ چوڑا تھا۔ جانکی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

میں اس قبائلی کی طرف دیکھ رہا تھا جو ہمارے بعد آرہا تھا۔ وہ تقریبا نصف راستہ طے کرچکا تھا۔ ہوا تیز تو تھی ہی لیکن اس نے اچانک ہی جھکڑ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ مجھے دھکا سا لگا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کر بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ جانکی نے بھی اس جھکڑ کو محسوس کیا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور میری بانہوں کو سختی سے پکڑلیا۔ دوسرا قبائلی بھی میرے قریب ہی بیٹھ چکا تھا اور وہ چیخ چیخ کر اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

دوسرا قبائلی دونوں ہاتھ چٹان پر جمائے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور پھر وہ رک گیا۔ اس کے کندھے پر لٹکی ہوئی رائفل کی نال ایک پتھر کے ساتھ اٹک گئی۔ وہ کندھے کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے کر رائفل کی نال ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے ہوا کے ایک زوردار جھونکے نے اسے اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ ایک جھٹکے سے رائفل کی نال بھی اس جگہ سے ہٹ گئی۔ وہ قبائلی لڑکھڑا گیا۔

میرے قریب بیٹھا ہوا قبائلی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔

تیز ہوا نے اس قبائلی کے قدم اکھاڑ دیے تھے۔ وہ چٹان پر ہاتھ جمانے کی کوشش کررہا تھا لیکن چٹان سے ٹکرانے والی ہوا نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس کا پیر کنارے کے ایک پتھر پر پڑا۔ پتھر اکھڑ گیا۔ نیچے گرتے ہوئے اس نے ایک پتھر پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی لیکن وہ پتھر بھی اکھڑ گیا اور پھر وہ اچانک ہی میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہی۔

جانکی چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ گرنے والے قبائلی کی چیخ دم توڑ گئی اور پھر یوں لگا جیسے اچانک ہی سناٹا چھا گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ دوسرا قبائلی ذرا سا آگے جھکا کھڈ میں جھانک رہا تھا۔ میں نے جانکی کو اپنے آپ سے الگ کیا اور کسی چوپائے کی طرح آگے بڑھ کر نیچے جھانکنے لگا۔ سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں قبائلی کی لاش کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

ہم چند منٹ وہاں بیٹھے رہے۔ میرے اعصاب میں تناؤ سا پیدا ہوگیا تھا۔ اس حادثے نے ہم سب کو افسردہ کردیا تھا۔ قبائلی پر اپنے ساتھی کی اندوہناک موت کا زیادہ اثر ہوا تھا لیکن ظاہر ہے ہم اس کے سوگ میں وہاں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔

وہ راستہ اگرچہ آگے بتدریج کشادہ ہوتا چلا گیا تھا لیکن میں اور جانکی اب بھی چٹان کے ساتھ چپکے ہوئے سے چل رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے' ہوا کی تندی میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ سامنے سے ہوا کے جھکڑ ہمیں پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ہم اس وقت دراصل ایک درّے میں سے گزر رہے تھے۔ اور اس درّے میں ہوا کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔

تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرکے ہم اس درّے میں سے باہر آگئے اور ہوا کی تیزی میں بھی کمی آگئی۔ آگے مسلسل ڈھلان تھی۔ جانکی میرے ساتھ چپکی ہوئی چل رہی تھی اور پھر ایک جگہ رک کر میں نے پیچھے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ قبائلی دُور دور تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ قبائلی کہاں گیا؟" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیچھے رہ گیا ہوگا۔ یہاں رک کر انتظار کرلیتے ہیں۔" جانکی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا اور ایک پتھر کے سائے میں بیٹھ گئی۔

میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ گزر گئے۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ مگر اس قبائلی کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دیا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ کہاں رہ گیا وہ۔۔۔" میں کہتے ہوئے اٹھ کر واپس چلنے لگا۔

میں اس درّے کے دہانے تک آگیا لیکن وہ قبائلی کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ میں اس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن میں اس کے سردار کا نام لے کر پکارنے لگا۔ میرا خیال تھا وہ جہاں بھی ہوگا میری آواز سن کر آجائے گا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ نہ تو وہ قبائلی کہیں نظر آیا اور نہ ہی کہیں سے جواب ملا۔ میری آواز پہاڑوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی۔ یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں کسی حادثے کے بارے میں سوچا جاسکتا تھا۔ البتہ ایک دو جگہوں پر دائیں بائیں تنگ سے راستے تھے۔ اگر وہ ان میں سے کسی راستے پر نکل گیا تھا تو میری آواز تو اس تک ضرور پہنچی ہوگی۔ اسے جواب تو دینا چاہیے تھا۔

میں جانکی کے پاس واپس آگیا۔ وہ پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ میں نے ایک دو آوازیں دیں۔ تب بھی اس کی آنکھ نہیں کھلی تو میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

"کک۔۔۔ کیا ہوا؟" اس نے بدحواس سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

"وہ قبائلی کہیں غائب ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" جانکی ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی "وہ ہمیں ان پہاڑوں میں چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہے۔"

"درّے سے باہر آنے تک تو وہ ہمارے ساتھ تھا۔ ڈھلان کی وجہ سے ہم تیز چلنے لگے تھے اور وہ پیچھے رہ گیا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ واپس نہ چلا گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"اگر واقعی ایسا ہوا تو۔۔۔" جانکی کسی انجانے خوف کی وجہ سے جملہ پورا نہیں کرسکی۔

"بہرحال' انتظار کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ چٹانوں میں اِدھر اُدھر نکل گیا ہو اور میری آواز بھی اس تک نہ پہنچی ہو۔ میرا خیال ہے راستہ تو یہی ہے۔ اسے اس طرف آنا چاہیے۔" میں بھی جانکی کے قریب بیٹھ گیا۔

"اگر وہ نہ آیا تو۔۔۔" جانکی بولی "ہم نہ تو راستے کے بارے میں کچھ جانتے ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی چیز ہے۔ میرا مطلب ہے کھانے کا سامان اور رائفل بھی اسی کے پاس ہے۔ اگر وہ واقعی واپس چلا گیا ہے تو۔۔۔"

"ہم ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے اور بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیں گے۔ یہی کہنا چاہتی ہو نا۔" میں نے کہا۔

"کتنی بے بسی کی موت ہوگی۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم نے قدم قدم پر موت سے پنجہ لڑایا ہے۔ موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکی لیکن ان پہاڑوں میں۔ ایسی بے بسی کی موت۔ نہیں نہیں۔ میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتی وجدان۔" وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

میں اس کا کندھا تھپتھپانے لگا "یہاں بھی موت کو مایوسی ہوگی۔" میں نے کہا "ہم تھوڑی دیر اس کا انتظار کرتے ہیں پھر خود ہی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ تمہیں یاد ہے اس نے کہا تھا کہ اگر ہم رکے بغیر چلتے رہیں تو شام تک چین کی سرحد پر پہنچ جائیں گے۔ یہ راستہ مسلسل نشیب کی طرف جا رہا ہے۔ ہوسکتا ہے آگے کوئی بستی مل جائے۔ بات ہمت اور حوصلے کی ہے۔ اگر ہم حوصلہ ہار گئے تو زندگی ہار جائیں گے۔"

جانکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مجھ سے لپٹی خاموش بیٹھی رہی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں رکے۔ میں وقفے وقفے سے اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتا' کبھی قبائلی کو پکارنے لگتا لیکن مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا اور بالآخر ہم اٹھ کر ان اونچے پہاڑوں میں نامعلوم منزل کی تلاش میں چل پڑے۔

یہ ایک کشادہ پگڈنڈی سی تھی اور لگتا تھا یہ راستہ باقاعدگی سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوگئی کہ ایک جگہ چٹان کے قریب راکھ' کوئلے اور جلی ہوئی لکڑیاں دکھائی دیں۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں کسی پارٹی نے پڑاؤ ڈالا ہوگا۔

ایک چٹان کے گرد گھوم کر ہم رک گئے۔ سامنے نشیب میں بہت دور ایک سرسبز وادی نظر آرہی تھی۔ اس سے ذرا پہلے ایک چمکتی ہوئی لکیر بھی دکھائی دی اور میرے خیال میں وہ کوئی دریا تھا جس کا پانی دھوپ میں چمک رہا تھا۔

جانکی بُری طرح تھک گئی تھی۔ اس کے دل میں یہ خوف بھی جاگزیں تھا کہ ان پہاڑوں میں ہم راستہ کیسے تلاش کریں گے۔ نشیب میں پھیلی ہوئی وہ وادی دیکھ کر کچھ تسلی تو ہوئی تھی لیکن یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہاں سے ہمیں منزل کا کوئی نشان مل جائے گا۔

جانکی ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کم از کم ایک گھنٹا باقی تھا اور میں چاہتا تھا کہ... شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ہم اس دریا تک پہنچ جائیں لیکن جانکی کی وجہ سے کچھ دیر وہاں رکنا پڑا۔

آدھا گھنٹا مزید چلنے کے بعد ہمیں پھر رک جانا پڑا۔ سورج غروب ہوچکا تھا اور پہاڑوں میں اندھیرا بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا اور وہ وادی ابھی ہم سے بہت دور تھی۔ اندھیرے میں پرپیچ اور نشیب و فراز والے راستے پر اترنا خطرے سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے ہم نے وہیں رکنے کا فیصلہ کرلیا اور میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بالآخر چٹانوں میں ایک کھوہ سی نظر آگئی۔ یہ کھوہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن دو تین آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں پہلے بھی لوگ ٹھہرتے رہے ہیں۔

جانکی نے بیگ کندھے سے اتار کر ایک طرف پھینک دیا اور کھوہ کے دہانے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اس کے قریب جگہ سنبھال لی اور اب تک کی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ میں بار بار اسی قبائلی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اچانک ہی غائب ہوگیا تھا۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ وہ راستہ بھٹک کر کسی اور طرف نکل گیا تھا یا واقعی واپس چلا گیا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا تھا' اس کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا تھا۔ ہم بھوکے پیاسے ان سنگلاخ چٹانوں میں مارے مارے پھر رہے تھے۔

وہ پل صراط نما راستہ پار کرنے سے پہلے دوپہر بارہ بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا تھا۔ جانکی نے تو صرف چند لقمے ہی لیے تھے۔ اس کے بعد ہم مسلسل پہاڑیوں پر چڑھتے اترتے رہے تھے۔ سب کچھ ہضم ہوچکا تھا اور مجھے بھوک لگ رہی تھی لیکن میں اس کا تذکرہ اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جانکی کو بھی یہ احساس ہوجاتا کہ وہ بھوکی ہے لیکن میری خاموشی اس مسئلے کا حل ثابت نہیں ہوئی کیونکہ کچھ ہی دیر بعد جانکی کی کراہتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"وجدان۔۔۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن صبر اور برداشت کے سوا ہم کچھ نہیں کرسکتے۔"

جانکی گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

وقت گزرتا رہا۔ سناٹے میں ہوا کی سائیں سائیں دل پر ہیبت سی طاری کر رہی تھی۔ جانکی نے میرے کندھے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں سی خارج ہو رہی تھیں۔ اس کی وجہ وہ شدید تھکن تھی جس نے اسے نڈھال کر رکھا تھا۔ میرا اور جانکی کا ساتھ کئی برسوں سے تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس نے کٹھن سے

کٹھن حالات کا مقابلہ بڑی مردانگی سے کیا تھا۔ وہ بڑی دلیر اور حوصلہ مند عورت تھی۔ اس نے کئی مرتبہ موت کو شکست دی تھی لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔ بھوک' پیاس اور بے بسی۔ ہمارا مقابلہ ایسی چیزوں سے تھا جنہیں صبر و برداشت سے ہی شکست دی جاسکتی تھی۔

وہ رات بڑی طویل ہوگئی تھی۔ زمین کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ تاریکی جیسے چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھورنے لگتا۔

اور پھر اچانک میں چونک گیا۔ میں کھوہ کے دہانے کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ پانی کے چند چھینٹے میرے بازو اور چہرے پر پڑے تھے۔ میں نے اپنا ہاتھ باہر کی طرف پھیلا دیا۔ بارش ہو رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بارش تیز ہوگئی۔ بوچھاڑ کا رخ اسی طرف تھا۔ میں پانی میں بھیگنے لگا۔ جانکی پر بھی پانی کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔ وہ بھی جاگ گئی۔ ہم کھوہ میں اور اندر کی طرف چلے گئے۔

"اگر پانی اندر آگیا تو کیا ہوگا؟" جانکی نے خوف زدہ سے لہجے میں کہا۔

"اس کا دہانہ زمین سے کافی اونچا ہے اور ویسے بھی سامنے ڈھلان ہے۔ ایسی جگہوں پر پانی نہیں رکتا۔ تم سو جاؤ۔ نیند میں ہی کچھ وقت کٹ جائے گا۔" میں نے کہا۔

جانکی نے زمین پر لیٹ کر میری گود میں سر رکھ لیا لیکن وہ بار بار اٹھ جاتی۔ بارش کا خوف' بھوک اور تھکن اسے بے چین کیے ہوئے تھی لیکن بالآخر وہ سو گئی۔

میں باہر تاریکی میں گھورتا رہا۔ بارش نے طوفانی شکل اختیار کرلی تھی۔ تیز ہوا سے بارش کا شور دل پر خوف سا طاری کر رہا تھا۔ اسی کھوہ کے سامنے ڈھلان پر بارش کا پانی منہ زور ندی کی طرح بہہ رہا تھا۔

تقریباً دو گھنٹوں تک موسلا دھار بارش جاری رہی اور پھر اس کا زور ٹوٹ گیا۔ میں اس کھوہ کے سامنے بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا جس کی روانی اور تندی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی' اگر یہ ندی اسی طرح بہتی رہی تو ہمارا اس کھوہ سے نکلنا مشکل ہوجائے گا۔

میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ یہ مسلسل جاگتے رہنے کا نتیجہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر نیند نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ جانکی کھوہ کے دہانے پر بیٹھی باہر دیکھ رہی تھی۔ سامنے والی ڈھلان پر پانی اب بھی بہہ رہا تھا لیکن بہت کم اور ہلکا۔

"اب نکلو یہاں سے وجدان۔" جانکی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہمیں کوئی دوسری جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں کچھ کھانے کو مل سکے۔"

اور پھر چند منٹ بعد ہم اس کھوہ سے نکل آئے۔ اس مرتبہ بیگ میں نے اپنے کندھے پر لاد لیا تھا۔ ہم اس ڈھلوان راستے پر چلتے رہے۔ تقریباً دو گھنٹے بعد جانکی نے لڑکھڑانا شروع کردیا۔ میں اسے سہارا دے کر کھینچتا رہا اور پھر جیسے ہی ہم ایک چٹان پر سے گھوم کر دوسری طرف آئے۔ میں چونک گیا۔ نشیب میں بہت دور ایک جگہ سے دھوئیں کی لکیر سی اٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"جانکی۔ وہ دیکھو۔" میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا "وہ دھواں یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہاں کوئی بستی ہے۔ ہمت سے کام لو۔ فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔"

جانکی نے اس طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

"بہت دور ہے۔ شاید کئی میل دور۔" وہ کراہی "مجھ سے اب ایک قدم نہیں چلا جا رہا۔ بھوک اور تھکن سے۔۔۔"

"ہمت سے کام لو جانکی۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "تم تو بڑی حوصلہ مند ہو۔ بڑی بڑی مصیبتوں کا مقابلہ کیا ہے تم نے۔ یہ بھوک کیا چیز ہے۔ میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔ کٹھن ترین مرحلہ تو گزر گیا۔ وہ جگہ اگرچہ دور ہے مگر ایک امید تو پیدا ہوئی ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم یوں کرتے ہیں۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "کچھ دیر یہاں بیٹھ کر آرام کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد ہم رکے بغیر چلتے رہیں گے۔"

ہم دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ جانکی نڈھال ہو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے جب ہم بنکاک میں اور چیانگ سائین میں تھے تو کھانے میں ذرا سی تاخیر ہوجاتی تو وہ چیخ اٹھتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ وہ دنیا کا ہر ستم برداشت کرسکتی ہے لیکن بھوک اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور اب تو چوبیس گھنٹوں سے زیادہ گزر چکے تھے اور وہ ان چوبیس گھنٹوں میں ہی برسوں کی بیمار نظر آنے لگی تھی۔ چہرے پر زردی' آنکھوں میں ویرانی اور ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔

پندرہ بیس منٹ آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے۔ رات کی دھواں دھار بارش کی وجہ سے پہاڑیوں میں کئی چھوٹے چھوٹے ندی نالے معرض وجود میں آ گئے تھے۔ ان کی وجہ سے کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ بعض نالے تو ہم پھلانگ لیتے اور بعض اتنے چوڑے تھے کہ انہیں پار کرنے کے لیے مناسب جگہ کی تلاش میں لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم نشیب میں پہنچ گئے اور پھر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ جس جگہ سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تھا' وہ جگہ اب بھی ہم سے میلوں دور تھی اور ایک بہت بڑے نالے نے ہمارا راستہ روک رکھا تھا۔ اس نالے کا پاٹ چالیس پچاس فٹ سے کم نہیں تھا۔ یہ غالباً وہی نالا تھا جسے پہاڑی چوٹی پر سے میں دریا سمجھا تھا۔

پانی بہت گہرا اور بہت تیز تھا اور ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے نالا پار کیا جا سکتا۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"اب کیا ہو گا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

"آؤ۔ اس طرف چلتے ہیں۔ شاید کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سے یہ نالا عبور کیا جا سکے۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم بہاؤ کے مخالف سمت میں چلتے رہے۔ آگے درختوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ ڈھائی تین سو گز کا فاصلہ طے کر کے ہم رک گئے۔ کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی تھی۔ جانکی درختوں کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ پیٹ پکڑے دہری ہوئی جا رہی تھی۔ میں اس کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ پر نگاہ پڑتے ہی میں اچھل پڑا۔ اس درخت پر آڑو کی طرح کے زرد رنگت کے پھل لگے ہوئے تھے۔

"جانکی وہ دیکھو۔" میں نے درخت کی جھکی ہوئی شاخ کی طرف اشارہ کیا "وہ پھل۔ شاید ہماری بھوک کا بندوبست ہو جائے۔"

میں نے اچھل کر اس شاخ کو پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور ایک پھل توڑ کر چکھا تو اس میں ہلکی سی ترشی تھی مگر پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کھایا جا سکتا تھا' میں نے تین چار پھل توڑ لیے اور جانکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

"لو۔ اسے چکھ کر دیکھو۔" میں نے ایک پھل اس کی طرف بڑھا دیا۔

جانکی نے وہ پھل میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگی۔ وہ پھل خوش ذائقہ نہیں تھا تو برا بھی نہیں تھا۔ اگر یہ پھل کڑوا بھی ہوتا تو شاید تب بھی نہ چھوڑتے۔

ہم نے ان پھلوں سے پیٹ تو بھر لیا لیکن اس کا نتیجہ آدھے گھنٹے بعد ظاہر ہونا شروع ہوا۔ میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا۔ جانکی بھی پیٹ پکڑے ہوئے تھی۔ یہ شاید اس پھل کا اثر تھا یا خالی پیٹ زیادہ کھا لینے کی وجہ سے درد شروع ہو گیا تھا مگر یہ درد قابل برداشت تھا۔

دائیں طرف جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی سن کر میں چونک گیا اور پھر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ دو خرگوش تھے اور ان کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جانکی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پتلون کا پائنچا اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔ اس وقت ایک خرگوش نے ہماری طرف دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر ہمیں بے ضرر سمجھ کر گھاس پر منہ مارنے لگا۔

میں خنجر والا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا اور اچانک ہی خنجر میرے ہاتھ سے نکلا اور اس خرگوش کی طرف لپکا جس نے کچھ دیر پہلے ہماری طرف دیکھا تھا۔ خطرہ بھانپتے ہی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن خنجر اس کے جسم میں ترازو ہو گیا۔ دوسرا خرگوش جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میں دوڑ کر جھاڑیوں میں پہنچ گیا۔ خنجر اس خرگوش کے آر پار ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر تکبیر پڑھتے ہوئے اس کی شہ رگ پر دھار پھیر دی۔ خرگوش نے آخری دو تین جھٹکے لیے اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں اسے ٹانگ سے پکڑ کر جھلاتا ہوا واپس آ گیا اور جانکی کے قریب ہی گھاس پر رکھ دیا۔

"یہ ذرا ٹھنڈا ہو جائے تو اس کی کھال اتارتا ہوں۔ اس دوران میں کچھ لکڑیاں جمع کر لوں۔" میں نے کہا اور ادھر ادھر گھوم کر خشک جھاڑیاں جمع کرنے لگا۔

گزشتہ رات کی بارش سے سوکھی ہوئی جھاڑیاں بھی بھیگی ہوئی تھیں لیکن بہرحال کوشش کر کے انہیں جلایا جا سکتا تھا۔ جانکی کے بیگ میں ایک لائٹر موجود تھا جو اس وقت ہمارے کام آ گیا۔

جانکی جھاڑیوں کو آگ لگانے کی کوشش کرنے لگی اور میں خرگوش کی کھال اتارنے لگا۔ کھال اتار کر میں نے آلائش نکال کر ایک طرف پھینک دیں اور گوشت کے ٹکڑے کیے بغیر اسے دریا کے پانی سے دھو لیا۔

جھاڑیوں کی شاخیں بھیگی ہوئی تھیں۔ جانکی بڑی مشکل سے آگ جلانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ دھوئیں سے اس کی ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔

خرگوش بھونے جانے کے دوران میں گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکراتی رہی اور بالآخر ہمارا کھانا تیار ہو گیا۔ بغیر نمک مسالے کے خرگوش کا بھنا ہوا گوشت اس قدر لذیذ تھا کہ بس مزہ ہی آ گیا۔ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے پہلے میں نے اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔ جانکی بھی مسکرا رہی تھی۔

اگرچہ ہم نے پہلے پیٹ بھر کر وہ ترش پھل کھائے تھے لیکن ہماری بھوک خرگوش کا گوشت کھانے کے بعد ہی مٹی تھی اور ترش پھل کھانے سے پیٹ میں جو درد شروع ہوا تھا وہ بھی حیرت انگیز طور پر ختم ہو گیا۔

اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سورج غروب ہو جاتا اور اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے یا تو ہمیں نالا پار کرنے کا راستہ تلاش کرنا تھا یا پناہ کی کوئی جگہ جہاں رات گزاری جا سکتی۔

ہم درختوں سے نکل کر واپس اسی جگہ آ گئے جہاں پہاڑی سے اترے تھے۔ یہاں پتھروں میں ایسی جگہ موجود تھی کہ ہم بیٹھ کر رات گزار سکتے تھے۔

سورج غروب ہونے کے بعد تاریکی بتدریج بڑھتی گئی۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس وقت اگرچہ آسمان بالکل صاف تھا لیکن پہاڑی علاقوں کے موسم کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ بادل نہ چھا جائیں۔ بارش ہو جانے کی صورت میں ہمارے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔

پیٹ بھر جانے کے بعد جانکی بھی اس وقت کچھ چہک رہی تھی لیکن یہ خوف بدستور ..... دامن گیر تھا کہ اگر وہ دریا نما نالا پار کرنے کا راستہ نہ ملا تو کیا ہو گا؟

"کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہو گا۔" میں نے کہا "ویسے بھی اب ہمیں کیا پریشانی ہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے خرگوش اس علاقے میں بکثرت مل جائیں گے۔ جب تک کوئی راستہ نہ ملے گا ہم انہیں شکار کر کے کھاتے رہیں گے۔"

"عجیب بات ہے۔" جانکی بولی "دنیا جدید ترین دور سے گزر رہی ہے اور ہم۔ لگتا ہے پتھروں کے دور میں لوٹ آئے ہوں جب انسان جانوروں کا شکار کر کے پیٹ بھرتا تھا اور غاروں میں رہتا تھا۔"

"ساری جدت طرازیاں شہروں اور بڑی بستیوں تک محدود ہیں۔" میں نے کہا "ان ترقی یافتہ آبادیوں سے دور پہاڑوں اور جنگلوں میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو دنیا کی نئی روشنی اور جدید تہذیب سے قطعی ناآشنا ہیں۔ ان کا اپنا معاشرہ ہی ان کے لیے سب کچھ ہے۔ اس کی مثال تم دیکھ چکی ہو۔ ہم تقریباً ایک ہفتہ اس بستی میں رہے ہیں۔ وہاں کی ننگ دھڑنگ عورتیں اور ان کا ماحول۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ بھی جدید ترین ٹیکنالوجی کے دور میں رہ رہے ہیں حالانکہ ان کے اور ترقی یافتہ مہذب بستیوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔"

"ان کی تو بات ہی مت کرو۔" جانکی کے لہجے میں تلخی تھی "میں نے وہاں جو کچھ بھی دیکھا تھا' اس سے تو لگتا ہے کہ ان لوگوں کی غیرت ہی مر چکی ہے۔ انہیں بے حیائی اور بے شرمی کا کوئی احساس ہی نہیں۔"

"بات غیرت اور احساس کی نہیں ہے جانکی۔" میں نے کہا "مہذب بستیوں میں کوئی غیر مرد کسی عورت کی طرف میلی نظروں سے بھی دیکھ لے تو خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں لیکن یہ لوگ اس احساس سے عاری ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہی نہیں کہ رشتوں کا تقدس کیا ہوتا ہے۔ افریقہ' جنوبی امریکا اور دنیا میں بہت سے ایسے خطے اب بھی موجود ہیں جہاں تہذیب کی روشنی نہیں پہنچی۔ لوگ جہالت کی تاریکی میں رہ رہے ہیں۔ وہ لوگ تو لباس نام کی کسی چیز سے بھی واقف نہیں ہیں۔ تہذیب اور رشتوں کے تقدس کو کیا سمجھیں گے۔"

"ہاں۔ یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔" جانکی نے گہرا سانس بھرا۔

"تو پھر یہ طے ہو گیا ناکہ اس رات میرا کوئی قصور نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"اب بند کرو یہ بکواس۔" جانکی نے میرے بازو پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا۔ میں سی کر کے رہ گیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی۔ حشرات الارض کی آوازوں اور تیز ہوا کی سائیں سائیں دل پر خوف سا طاری کر رہی تھیں۔ میں بار بار آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جانکی نے گزشتہ رات کی طرح اس وقت بھی میری گود میں سر رکھ لیا تھا۔ میرے دل میں ایک انجانا سا خوف تھا لیکن رات خیریت سے گزر گئی۔ نہ موسم کے تیور بدلے اور نہ ہی جانکی کی ذہنی رو بہکی۔

صبح ہوتے ہی سب سے پہلے میں نے ادھر ادھر گھوم کر دو خرگوش شکار کیے اور سوکھی ہوئی جھاڑیاں جمع کرنے لگا۔

تگڑا ناشتا کر کے ہم پھر اپنی مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔

اس بار ہم نالے کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ دوپہر ہوگئی مگر ہمیں نالا پار کرنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا۔ جانکی تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئی۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں ذرا اور آگے جا کر دیکھتا ہوں۔ اگر کوئی راستہ مل گیا تو واپس آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں۔۔۔ یہاں اکیلی۔۔۔" جانکی کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

"یہاں ویرانے میں کس بات کا خطرہ ہے۔" میں نے کہا "کسی انسان کا تو دور دور تک نام و نشان نہیں اور خرگوش کے سوا ایسا کوئی جانور بھی نظر نہیں آیا جس سے کوئی خطرہ محسوس ہو۔ ویسے تمہارا پستول کہاں ہے؟"

"بیگ میں رکھا ہے۔" جانکی نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں یہاں بیٹھتی ہوں مگر واپس آ جانا۔ ایسا نہ ہو اس قبائلی کی طرح تم بھی غائب ہو جاؤ۔" وہ بیگ میں سے پستول نکال کر چیک کرنے لگی۔

میں نے بھی جیب سے پستول نکال کر اسے چیک کر کے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور نالے کے کنارے پر بہاؤ کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً دو فرلانگ کے بعد وہ تیز رو نالا پہاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ میں کچھ دور تک آگے چلا اور پھر رک گیا۔ آگے راستہ خاصا خطرناک تھا۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر مڑ کر واپس چل پڑا۔

مجھے آنے جانے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا اور میں اس جگہ پہنچا تو جانکی غائب تھی۔ میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اسے دیکھتا رہا۔ آوازیں بھی دیں مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا!

میں پاگلوں کی طرح چاروں طرف دوڑتا اور جانکی کو پکارتا رہا لیکن کسی طرف سے جواب نہیں ملا۔ جانکی اس طرح غائب ہوئی تھی جیسے زمین نگل گئی ہو یا آسمان نے اچک لیا ہو۔

ہم تین دن سے ان پہاڑوں میں بھٹک رہے تھے۔ اس دوران میں نہ تو کسی انسان کا نام و نشان نظر آیا تھا اور نہ ہی کوئی خطرناک جانور دکھائی دیا تھا جس کے بارے میں کوئی شبہ کیا جا سکتا تو پھر جانکی کہاں غائب ہو گئی۔ جانکی کے پاس تو پستول بھی موجود تھا۔ کسی گڑبڑ کی صورت میں وہ فائر بھی کر سکتی تھی لیکن وہ تو خاموشی سے غائب ہو گئی تھی۔ جیسے اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان پہاڑوں میں کہاں جا سکتی ہے؟

میں ایک پتھر پر بیٹھ کر کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اس اچانک صورت حال نے مجھے بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔

اور پھر اچانک ہی فائر کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میں چھلانگ لگا کر اپنی جگہ سے کئی گز دور ایک پتھر کی آڑ میں جا گرا تھا۔ میرا خیال تھا وہ گولی کسی طرف سے مجھ پر ہی چلائی گئی تھی۔ میں نے پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا اور کتنی دیر تک اپنی جگہ بے حس و حرکت پڑا یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ گولی کس طرف سے چلی تھی۔

ایک منٹ گزر گیا لیکن کسی طرف سے نہ کوئی آہٹ سنائی دی اور نہ ہی کوئی نقل و حرکت محسوس ہوئی تھی۔ میں محتاط انداز میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا ہوا ایک اور پتھر کے پیچھے چلا گیا اور پھر اسی لمحے پہاڑیاں ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھیں۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ فائر کہیں دور سے ہوا تھا لیکن آواز ایسی تھی جیسے قریب ہی سے گولی چلائی گئی ہو۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پتھروں کی آڑ سے نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ دُور دُور تک کسی ذی روح کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

دل میں طرح طرح کے وسوسے آ رہے تھے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ ممکن ہے ہماری طرح کوئی اور بھی پہاڑوں میں اس طرف آ نکلا ہو۔ اس نے جانکی کو اکیلے بیٹھے دیکھا تو اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گیا۔ ہو سکتا ہے وہ اکیلا نہ ہو، ان کی تعداد دو یا اس سے زیادہ ہو اور اس وقت جانکی کو مدافعت کا موقع نہ ملا ہو لیکن اب موقع پا کر وہ ان کے شکنجے سے بھاگ نکلی تھی اور اپنے دفاع میں گولیاں چلائی تھیں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ گولی کس طرف سے چلی تھی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ سکا۔ میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک فائر کر دیا۔

میرے ایک فائر کے جواب میں پہاڑیاں تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھیں۔ آٹومیٹک رائفل کا پورا برسٹ چلایا گیا تھا۔

اس فائرنگ سے مجھے سمت کا اندازہ ہو گیا تھا لیکن یہ سوچ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا کہ جانکی واقعی کسی مصیبت میں پھنس چکی ہے۔ اس کے پاس پستول تھا۔ پہلے دو فائر پستول ہی کے تھے لیکن یہ فائرنگ آٹومیٹک

رائفل سے کی گئی تھی۔ جس سے میرے خدشات کی تصدیق ہو رہی تھی۔

یہ فائرنگ اسی طرف ہوئی تھی جہاں وہ نالا پہاڑیوں میں داخل ہوتا تھا۔ میں بے تحاشا اس طرف دوڑ پڑا اور پھر ایک چھوٹی سی چٹان پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ایک اور فائر ہوا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی لیکن یہ گولی مجھ پر نہیں چلائی گئی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

وہ پہاڑی چوٹی تقریباً ایک ہزار فٹ بلند تھی اور جانکی اس چوٹی پر کھڑی سرخ رنگ کا کوئی کپڑا ہلا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی کھڑا تھا جس نے قبائلی لباس پہن رکھا تھا۔

میں چند لمحے اسی طرف دیکھتا رہا پھر اس چٹان سے اتر کر پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا اور میں خاصا محتاط تھا۔ جانکی بظاہر ٹھیک نظر آ رہی تھی لیکن یہ کوئی دھوکا بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے مجھے پھانسنے کے لیے جانکی کو اس طرح سامنے لایا گیا ہو۔

میں محتاط انداز میں پہاڑی پر چڑھتا رہا۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کی نظروں میں کم سے کم آؤں۔ مجھے جب موقع ملتا میں اوپر دیکھ لیتا۔ جانکی اس آدمی کے ساتھ اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

کسی پہاڑی پر بالکل سیدھا چڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے پتھروں کی وجہ سے مجھے کئی مرتبہ طویل چکر کاٹنے پڑے تھے۔ ایک جگہ رُک کر میں نے پھر اوپر دیکھا۔ اب جانکی کے ساتھ دوسرا آدمی بھی صاف نظر آ رہا تھا، اس کا چہرہ دیکھ کر میرے منہ سے ایک بار پھر گہرا سانس نکل گیا۔ وہ وہی قبائلی تھا جو دو دن پہلے غائب ہو گیا تھا۔

ہمارے درمیان تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ قبائلی تو وہیں کھڑا رہا اور جانکی دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئی اور پھر اسی لمحے میں نے دو اور آدمیوں کو پچھلی طرف سے پہاڑی پر چڑھتے ہوئے دیکھا تو چونک گیا۔ میں نے ایک دم پستول والا ہاتھ سیدھا کر لیا تھا۔

"گولی مت چلانا۔" جانکی نے دور ہی سے چیخ کر کہا "یہ ہمارے ساتھی ہیں۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ جانکی کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں سرخ رنگ کی ٹی شرٹ تھی جو اس نے بیگ میں سے نکالی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے۔ تم وہاں سے کیوں غائب ہو گئی تھیں اور۔۔۔ اور یہ کیسے ملا۔ وہ دونوں آدمی کون ہیں؟" میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے تھے۔

"دھیرج۔۔۔" جانکی مسکرائی "سانس لے لو۔ اس طرف آ جاؤ۔ درختوں کے سائے میں۔ آرام سے بیٹھ کر بتاتی ہوں۔"

ہم پہاڑی کے دوسری طرف آ گئے۔ جہاں درختوں کا ایک جھنڈ سا تھا۔ وہ دونوں آدمی دلچسپ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جبکہ اس قبائلی کے چہرے پر ندامت کے تاثرات تھے۔

میں ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تیز تیز سانس لیتا رہا۔ جانکی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور وہ تینوں آدمی بھی ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے تھے۔

"یہ کیا قصہ ہے؟" میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔

"تمہارے جانے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان تینوں کو اچانک ہی اپنے سامنے دیکھ کر میں بدحواس سی ہو گئی تھی۔" جانکی بتانے لگی "پھر اپنے اس گائیڈ کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ یہ لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف نکل آئے تھے۔ میں نے جب انہیں بتایا کہ تم نالا پار کرنے کے لیے راستے کی تلاش میں اس طرف گئے ہوئے ہو تو انہوں نے کہا تم یقیناً اسی جگہ پہنچو گے جہاں یہ مجھے لے جانا چاہتے تھے۔" وہ چند لمحے خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "وہ نالا پار کرنے کا راستہ انہی پہاڑیوں میں ہے۔ نالے کے ساتھ ساتھ جاتے تو بقول ان کے ہم وہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ اس طرف سے آگے جانے کا راستہ نہیں تھا اس لیے ہم پہاڑیوں کے اوپر سے نکل گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم آگے جا کر تمہیں تلاش کر لیں گے لیکن تم ہمیں نہیں ملے۔ کافی دیر گزر گئی۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر واپس جا کر تم نے مجھے وہاں نہ پایا تو یقیناً پریشان ہو گے اس لیے اپنی موجودگی سے آگاہ کرنے کے لیے میں نے وقفے وقفے سے فائر کیے۔ جواب میں تمہاری طرف سے بھی فائر ہوا تو مجھے تسلی ہوئی۔"

"تمہیں وہاں نہ پا کر تو میرا دماغ گھوم گیا تھا۔" میں نے کہا "لیکن یہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟" میں نے اس قبائلی کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔" جانکی نے کہا "اسے اپنے ساتھی کے مرنے کا دکھ تھا اور اس بات کا بھی افسوس تھا کہ اس کی لاش کو جانور کھا جائیں گے اور یہ اسے جانوروں کی خوراک بننے سے بچانا چاہتا تھا۔ اگر ہم سے کچھ کہتا تو شاید ہم سیکڑوں فٹ گہرے اس کھڈ میں اترنے سے

انکار کردیتے۔ یہ سوچ کر وہ خاموشی سے واپس چلا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے نہ پاکر ہم کسی جگہ رک کر اس کا انتظار کریں گے لیکن ہم اصل راستے سے آگے بہت آگے نکل گئے تھے اور ہمیں بہت دیر بعد اس کی عدم موجودگی کا خیال آیا تھا۔

"یہ اپنے ساتھی کی لاش کو پتھروں سے ڈھانپ کر واپس آیا اور ہم تک پہنچنے کے لیے دوڑتا رہا۔ اس درّے سے نکلنے کے بعد ہم تو سیدھے آگئے تھے جبکہ اصل راستہ دائیں طرف تھا۔ بہرحال' یہ اس راستے پر بہت آگے نکل گیا اس لیے تمہاری آوازیں اس تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ وہ خود بھی ہمیں تلاش کرتا رہا۔ اس دوران میں شام ہوگئی اور یہ کہیں رکنے کے بجائے اس طرف سے نالا پار کرکے دوسری طرف جنگل میں واقع اس بستی میں پہنچ گیا۔ وہ بستی بھی یہاں سے تقریباً پانچ میل دور ہے۔ آج وہ بستی کے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر ہماری تلاش میں اس طرف آگیا اور اس مرتبہ عقل مندی یہ کی کہ یہ لوگ اس درّے کے دہانے پر پہنچ گئے اور وہاں سے اندازہ لگایا کہ ہم کس طرف گئے ہوں گے۔ اس طرح یہ لوگ مجھ تک پہنچ گئے۔ اگر یہ لوگ ہمیں تلاش نہ کرپاتے تو شاید ہم زندگی بھر ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے اور کسی آبادی تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش نہ کرپاتے۔"

"تمہیں وہاں نہ پاکر میری تو جان نکل گئی تھی۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ بہرحال' وہ راستہ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"میں ابھی وہاں تک نہیں پہنچی لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" جانگی کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہمیں اٹھتے دیکھ کر وہ قبائلی اور اس کے دونوں ساتھی بھی اٹھ گئے۔ وہ دونوں بھی قبائلی ہی تھے لیکن ان کا تعلق برما سے نہیں چین کے کسی سرحدی قبیلے سے تھا۔ ان کے نہ صرف لباس بلکہ چہروں کے نقوش بھی مختلف تھے۔ ان کے پاس لمبی لمبی لاٹھیاں تھیں جن کے ایک سرے پر لمبے لمبے سوئے لگے ہوئے تھے۔ یہ انکشاف بعد میں ہوا کہ یہی ان کے دفاعی ہتھیار تھے اور انہی سے وہ جنگلی جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ میری رائفل قبائلی کے پاس تھی۔

جانگی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر ہم زندگی بھر ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہتے تو بھی وہ راستہ تلاش نہ کرپاتے۔ جو وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔

ہم چٹانوں میں ایک تنگ سے راستے پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے، ہمارا ساتھی قبائلی تھا۔ اس کے پیچھے میں اور جانگی اور آخر میں دوسرے دونوں آدمی تھے۔

آگے جاکر وہ تنگ سا راستہ بھی بند ہوگیا۔ … چٹانیں تھیں۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تشویش تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ ہمیں ان خطرناک عمودی چٹانوں پر چڑھنا پڑے گا لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہمارا ساتھی قبائلی ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے جاکر … ہوگیا۔

میں اس پتھر کے پیچھے پہنچا تو عمودی چٹان میں نیچے سے اوپر تک ایک تنگ سی دراڑ نظر آئی۔ لگتا تھا جیسے کبھی یہ ایک ہی چٹان رہی ہوگی لیکن شاید کسی زلزلے کی وجہ سے ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ دونوں چٹانوں کے درمیان ڈھائی تین فٹ کا خلا تھا۔

قبائلی اس تنگ سی دراڑ میں داخل ہوکر آگے … رہا۔ میں اور جانگی بھی اس کے پیچھے ہی دراڑ میں گھس … ہم دونوں آڑے ہوکر چل رہے تھے۔ جانگی میرے پیچھے … اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

میں نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا تو سینے میں سانس … ہوا محسوس ہونے لگا۔ دونوں چٹانیں اوپر سے ایک دوسرے سے ملتی ہوئی سی محسوس ہورہی تھیں۔ روشنی کی ایک … سی لکیر تھی جو دور تک چلی گئی تھی۔

یہ دراڑ تقریباً پچاس گز طویل ثابت ہوئی۔ اس کے اختتام پر ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ آگے ڈھلان تھی اور ڈھلان کے اختتام پر وہ نالا تھا جو پہاڑیوں میں گھومتا … ہمارے سامنے سے گزر رہا تھا۔

یہاں نالے کا پاٹ دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں … کنارے بالکل عمودی تھے۔ پانی کی رفتار بہت تیز … یہاں گہرائی بھی یقیناً بہت زیادہ تھی۔ درختوں کے دو تنے ایک دوسرے سے ملا کر نالے پر رکھے ہوئے تھے … کام دے رہے تھے۔ ان دونوں تنوں کو ملا کر بھی ان کی چوڑائی تین فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

ہمارا ساتھی قبائلی تو بڑے اطمینان سے اس … ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر … اور ایک ہاتھ جانگی کی طرف بڑھا دیا۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ چلتی رہو۔"

"نہیں۔ تم جاؤ۔ میں خود ہی آؤں گی۔" جانگی …

وہ بھی دو قدم آگے بڑھی اور پھر بیٹھ گئی۔ … چلنے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر پیر پھسل گیا تو نالے کی تند … اپنے ساتھ بہا کر لے جاتیں۔ جانگی نے محفوظ طریقہ …

کیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے کسی چوپائے کی طرح آگے بڑھتی رہی اور بالآخر دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔

جنگل میں وہ بستی آٹھ میل سے بھی زیادہ دور تھی۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے میں وہاں پہنچے تھے۔ چھ سات جھونپڑے تھے۔ اس بستی میں رہنے والوں کی تعداد پچیس چھبیس افراد پر مشتمل تھی جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ یہ لوگ چینی ہی تھے۔ ان کی زبان خاصی بگڑی ہوئی تھی۔ میں اگرچہ مینڈرین زبان اچھی طرح سمجھتا اور بول بھی سکتا تھا لیکن مینڈرین مہذب لوگوں کی شستہ اور سلیس زبان تھی۔ اس میں بڑی شگفتگی تھی جبکہ اس بستی کے لوگ جو زبان بولتے تھے اسے چین کی ٹکسال زبان کہا جاسکتا تھا۔ بگڑے ہوئے لہجے کی بگڑی ہوئی زبان۔

یہ میلوں دور تک پھیلا ہوا صاگوان کا جنگل تھا۔ فرنیچر کے لیے یہ دنیا کی بہترین لکڑی سمجھی جاتی تھی۔ اس جنگل میں اس جیسی چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں تھیں۔ یہ لوگ درخت کاٹ کر لکڑی جمع کرتے تھے۔ مہینے میں ایک مرتبہ ٹرک آتے جو کٹی ہوئی لکڑیاں ایک بڑی بستی میں پہنچا دیتے جہاں آرا مشینیں لگی ہوئی تھیں وہاں ان تنوں کو ضرورت کے مطابق مختلف سائز میں کاٹا جاتا اور ٹرکوں پر لاد کر کن منگ روانہ کردیا جاتا۔

اس بستی میں بھی ہمیں دو دن رہنا پڑا۔ ہمارے قبائلی ساتھی نے بتایا تھا کہ وہ پہاڑی نالا پار کرنے کے بعد چین کی سرحد میں داخل ہوگئے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس وقت ہم چین کی سرحد میں سات آٹھ میل اندر تھے اور ہم مزید اندرونی علاقے کی طرف جارہے تھے۔

ہم صبح سات بجے اس بستی سے روانہ ہوئے تھے۔ کئی میل تک گھنے جنگل میں سفر جاری رہا پھر جنگل بتدریج چھدرا ہوتا چلا گیا۔ اس سے آگے پہاڑی سلسلہ تھا لیکن یہ پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان پہاڑیوں پر درخت تو اکا دکا ہی تھے لیکن جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ بعض مقامات پر یہ جھاڑیاں ہمارے قد سے بھی اونچی تھیں۔

بری قبائلی کے علاوہ وہ دونوں چینی بھی ہمارے ساتھ تھے جو پہاڑوں میں ہماری تلاش میں آئے تھے۔ وہ دونوں ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ان کی وجہ سے ہمیں بھی تیز چلنا پڑ رہا تھا۔

دوپہر کے قریب درختوں کے ایک جھنڈ میں پڑاؤ ڈال دیا گیا تھا۔ قریب ہی ایک چشمہ بھی تھا۔ چینی بستی والوں نے ہمارے لیے کھانا دے دیا تھا۔ جو ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ جو کھانا بچ گیا وہ رات کے لیے سنبھال کر رکھ دیا گیا۔

ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد ہم پھر چل پڑے اور کہیں رکے بغیر سفر کرتے ہوئے شام سے ذرا پہلے دریائے میکانگ پر پہنچ گئے۔ یہ دریا تبت سے اوپر تھانگلا ماؤنٹین نام پہاڑی سلسلے میں کہیں سے بہنا شروع ہوتا تھا اور جنوبی چین کے سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتے ہوئے برما' تھائی لینڈ' لاؤس اور کمبوڈیا کے علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ساؤتھ چائنا سی میں جاکر گرتا تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک دریا کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور پھر ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں چینی ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ بستی بھی چند جھونپڑوں پر مشتمل تھی۔ ہمارے چینی قبائلی ساتھی تقریباً ایک گھنٹے تک سردار کے جھونپڑے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ان کی بگڑی ہوئی زبان تو میری سمجھ میں نہ آسکی لیکن یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ ان میں ہمارے ہی حوالے سے کوئی بحث ہورہی تھی۔ اس بحث کے دوران میں بوڑھا سردار بار بار ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

بالآخر ان کی بحث ختم ہوگئی۔ بری قبائلی وہاں سے اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ کچھ دیر تک بڑی گہری نظروں سے جانگی کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے جانگی کو اس طرح گھورتے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا بات ہے۔ کس بات پر بحث ہورہی تھی۔" میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں سے چند میل آگے میکانگ کے کنارے پر ہی چیلی نام کا شہر ہے۔" قبائلی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ جگہ اگرچہ سرحد سے میلوں دور ہے لیکن غیر قانونی طور پر لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے والے عام طور پر ایسی ہی چھوٹی چھوٹی بستیوں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تلاش میں پولیس بھی ان بستیوں کے چکر لگاتی رہتی ہے اور دریا میں بھی پیٹرولنگ ہوتی رہتی ہے۔ یہ دریا پار کرکے ہی چین کے اندرونی علاقوں تک پہنچا جاسکتا ہے اس لیے پولیس کی زیادہ توجہ اس دریا اور اس کے کنارے پر آباد چھوٹی چھوٹی بستیوں پر رہتی ہے۔ کسی بستی سے جب کوئی آدمی پکڑا جاتا ہے تو اس کے ساتھ بستی والوں کی بھی شامت آجاتی ہے اس لیے بستی کا سردار تم لوگوں کو رات یہاں رکھنے کو تیار نہیں البتہ وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ آدھی رات کے بعد تم لوگوں کو کشتی پر دریا پار کرا دیا جائے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"آگے تم لوگ اس حلیے اور اس لباس میں سفر نہیں کر سکو گے۔" اس نے جواب دیا "ہمارے سردار نے تم لوگوں کے لیے کچھ چیزیں دی تھیں جو اب اگلے سفر میں تمہارے کام آئیں گی۔" وہ اپنا تھیلا کھولنے لگا۔ مجھے یاد آگیا کہ بری بستی کے سردار نے روانہ ہوتے وقت مجھ سے کوئی ایسی بات کہی تھی۔ اس نے تھیلے میں سے ایک اور تھیلا نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس میں زرد رنگ کی چادریں اور کچھ اور چیزیں تھیں "اب تم لوگ بھکشوؤں کے روپ میں سفر کرو گے۔ ان ممالک میں بھکشوؤں کا ہی ایک ایسا طبقہ ہے جسے کچھ سہولتیں اور مراعات حاصل ہیں۔ یہ سیلانیوں کی طرح ملکوں ملکوں گھومتے رہتے ہیں۔ انہیں پاسپورٹ اور ویزے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سے کچھ پوچھا بھی نہیں جاتا اور یہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد سمجھے جاتے ہیں۔ اپنے ان حلیوں میں تو تم لوگ دریا پار کرتے ہی پکڑے جاؤ گے مگر بھکشو بن کر آزادی سے سفر کرتے رہو گے لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟" میں نے ایک بار پھر اسے گھورا۔

وہ خاموش ہو کر ایک بار پھر جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس دوران میں سردار نے آواز دے کر ایک عورت کو جھونپڑے میں بلا لیا۔ اس سے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ عورت نے بھی جانکی کی طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"کیا مسئلہ ہے اور تم اس طرح جانکی کو گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"تمہاری اس ساتھی کے بال کاٹنے پڑیں گے اور اسے لباس بھی اس طرح پہننا پڑے گا کہ اس کا جسم نمایاں نہ ہو سکے۔" قبائلی نے جواب دیا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ جانکی کو بار بار اس طرح گھور کر کیوں دیکھ رہا تھا۔ اس کا مطلب بھی میری سمجھ میں آگیا تھا۔ بدھ مذہب میں عورتیں بھکشو نہیں بن سکتیں اور اگر ہمیں آزادی سے سفر جاری رکھنا تھا تو حلیہ بدلنا ضروری تھا۔ جانکی کے بال تو کٹ سکتے تھے لیکن اس کا جسم۔۔۔ وہ کم بخت جسم کے بالائی حصے سے کچھ ایسی صحت مند تھی کہ اس کی یہ صحت مندی پہلے بھی مسئلہ بنتی رہی تھی اور اب بھی مسئلہ بن سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے کن انکھیوں سے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

قبائلی اٹھ کر سردار اور اپنے ساتھیوں کے پاس چلا

رات کا کھانا ہم نے سردار کے جھونپڑے ہی میں

تھا۔ اس سے پہلے میں جانکی کو سمجھا رہا تھا کہ اسے اپنے کی قربانی دینی ہوگی۔ جانکی کو اپنے لمبے بالوں پر بڑا فخر بنکاک میں تو وہ اپنے بال کھلے رکھتی تھی جو اس کی کمر تک جھولتے رہتے تھے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ کٹوانے پر کبھی بھی آمادہ نہ ہوتی لیکن یہ ایک ایسی مجبوری تھی کہ وہ انکار نہ کر سکی۔

کھانے کے بعد وہ عورت، جسے پہلے سردار نے بلایا قبائلی کا دیا ہوا تھیلا اور جانکی کو لے کر کسی دوسرے جھونپڑے میں چلی گئی اور ایک گھنٹے بعد جب جانکی میرے سامنے آئی تو میں بمشکل اپنا قہقہہ ضبط کر سکا تھا۔ اس گنجی ہو جانے سے اس کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ زرد رنگ لباس، بلکہ چادر اس طرح اس کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی نسوانیت کے نشان بڑی حد تک دب گئے تھے۔

مجھے ہنستے دیکھ کر جانکی روہانسی سی ہو گئی۔ وہ عورت واپس لے آئی تھی۔

میں نے بھی اپنے قبائلی گائیڈ سے بال کٹوا لیے اور رنگ کی وہ چادر لپیٹ لی۔ مجھے بھکشوؤں کی طرح چادر لپیٹنے کا اچھا خاصا تجربہ تھا۔ مہاراج کے پاس رہتے ہوئے میں طویل عرصے تک یہ لباس استعمال کیا تھا۔ قبائلی نے کچھ وہ تھیلا بھی میرے حوالے کر دیا تھا جس میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جو سفر میں کسی وقت ہمارے کام آ سکتی تھیں۔

رات ایک بجے کے قریب ہم روانگی کے لیے ہو گئے۔ قبائلی گائیڈ نے میری رائفل میری طرف بڑھا میں چونک گیا۔

"کسی بھکشو کے پاس اس قسم کا خطرناک اسلحہ نہیں چاہیے۔" میں نے کہا "یہ رائفل تم میری طرف سے سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں گی۔"

قبائلی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ چائنا کی رائفل بہت قیمتی تھی۔ اگلے سفر کے دوران میں اس رائفل موجودگی ہمارے لیے مصیبت بن سکتی تھی اس لیے اس سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اپنی حفاظت میرے اور جانکی کے پاس پستول موجود تھے جو ہم نے لباس میں چھپا لیے تھے۔ میرے پاس پنڈلی پر چمڑے سے بندھا ہوا خنجر بھی تھا۔

وہ بادبانی کشتی تھی جو ماہی گیری کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ پہاڑی علاقوں میں میکانگ کی روانی میں تندی تھی لیکن یہ میدانی علاقہ تھا۔ یہاں دریا بڑا پر سکون تھا اسی لیے یہاں ماہی گیری بھی ہوتی تھی۔ مچھیرے عام طور پر آدھی رات کے بعد ہی نکلتے تھے۔ دریا میں اور کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں جو مختلف سمتوں میں رواں تھیں۔

ہماری کشتی پر ہمارے علاوہ پانچ آدمی اور تھے جن میں اس بستی کا سردار بھی تھا۔ اس جگہ دریا کا پاٹ ہزار میٹر سے کم نہیں تھا۔ گہرائی بھی زیادہ تھی کشتی ہلکی رفتار سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھتی رہی۔

دوسرے کنارے پر بھی گھاٹ سا بنا ہوا تھا۔ کشتی اس گھاٹ کے ساتھ رک گئی۔ ہمارے ساتھ سردار بھی کشتی سے اتر آیا۔ وہ کچھ دُور تک ہمارے ساتھ چلتا رہا پھر ایک جگہ رک گیا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہاں کئی میل تک کوئی باقاعدہ آبادی نہیں ہے لیکن اس طرف تقریباً ایک میل آگے ایک اسٹوپا ہے جہاں تم لوگ رات بسر کر سکتے ہو۔ اس سے تقریباً بیس میل آگے نُوون نامی گاؤں ہے۔ وہاں سے آگے جانے کے لیے تم لوگوں کو کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔"

میں نے سردار کا شکریہ ادا کیا۔ سردار نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دریا کی طرف چل پڑا۔ میں اور جانکی اسے اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ اپنی کشتی پر نہیں پہنچ گیا تھا اور پھر کشتی جیسے ہی حرکت میں آئی ہم بھی مڑ کر اس راستے پر چل دیے جس طرف سردار نے اشارہ کیا تھا۔

جھاڑیوں سے اٹا ہوا پتھریلا میدان تھا اور وہ راستہ بھی غیر ہموار تھا۔ جانکی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ ہم دونوں اس راستے پر چلتے رہے۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہمیں بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔

وہ اسٹوپا واقعی ایک میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ صرف اسٹوپا ہی نہیں تھا اس سے چند گز آگے ایک مختصر سی عمارت بھی تھی جو تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

اسٹوپا۔ خاص طرزِ تعمیر کی حامل اس عمارت کو بارہ دری کہنا ہی مناسب ہوگا۔ چھتری نما گول چھت جسے وسط سے ایک بڑے اور اطراف سے چار چھوٹے ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ نیچے، زمین کی سطح سے دو فٹ بلند اور بہت کشادہ چبوترا تھا۔ اگرچہ کنکریٹ کے تین چار بینچ بھی رکھے ہوئے تھے مگر وہ سب ٹوٹے ہوئے تھے۔ فرش بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔

جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال پر کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ چین، جاپان، برما اور تھائی لینڈ وغیرہ میں لاتعداد اسٹوپا اور پگوڈا نما عمارتیں موجود ہیں۔ یہ عمارتیں ویرانوں میں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ایسی عمارتیں حکومت یا مخیر حضرات تعمیر کروا کر بھول جاتے ہیں اور یہ ان بھکشوؤں کے آرام کے کام آتی ہیں جو سیلانیوں کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔

وہ مختصر سی عمارت اسٹوپا سے پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ میں اور جانکی اسی طرف بڑھ گئے۔ مختصر سا برآمدہ تھا اور دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں کے دروازے اور چوکھٹیں غائب تھیں۔ میں نے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں سے جانکی والا لائٹر نکال لیا۔ پہلے میں ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اندر قدم رکھتے ہی ناگوار بو کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ لائٹر کی روشنی میں وہ کمرا کسی بیت الخلا کا منظر پیش کر رہا تھا۔

دوسرے کمرے کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ ہم دوبارہ اسٹوپا میں آ گئے اور ایک ایسے بینچ پر بیٹھ گئے جو زیادہ ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ اس وقت تین بجنے والے تھے۔ جانکی نے میرے کندھے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ تو جلد ہی سو گئی مگر میں جاگتا رہا اور تاریکی میں گھورتا رہا لیکن میں بھی زیادہ دیر تک نیند کا مقابلہ نہیں کر سکا اور میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر سویا ہوں گا لیکن پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سورج پوری آب و تاب کے ساتھ میری آنکھوں کے عین سامنے چمک رہا ہو۔ ایک لمحے کو تو کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی۔ میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ میں پلکیں جھپک جھپک کر سامنے تیز روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر اچانک ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ میری آنکھوں کے سامنے سورج نہیں چمک رہا تھا بلکہ وہ ٹارچ کی تیز روشنی تھی جس نے میرے چہرے کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔

جانکی کا سر اس وقت میری گود میں تھا۔ اس کے سینے پر سے چادر سرکی ہوئی تھی۔ مجھے فوراً ہی ایک اور احساس ہوا۔ میں نے جانکی کو کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک لمحے کو تو وہ بھی بدحواس سی رہی پھر اس نے بھی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ٹارچ کے عقب سے ایک غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ زبان اگرچہ چینی ہی تھی مگر قابل فہم تھی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ کون ہو تم لوگ؟"

"ہمارے لباس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہم کون ہیں؟" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔" اس آواز نے جواب دیا "تم لوگ وہ نہیں جو نظر آرہے ہو۔ یہ عورت ہے اور کوئی عورت بھکشو نہیں ہوسکتی۔"

جانکی نے جلدی سے چادر سے اپنا سینہ ڈھانپنے کی کوشش کی مگر اس کا راز تو اسی وقت کھل گیا تھا جب وہ میری گود میں سر رکھے سو رہی تھی اور ٹارچ کی روشنی نے ہم دونوں کو حلقے میں لے رکھا تھا۔

"یہ درست ہے کہ عورت بھکشو نہیں ہوسکتی لیکن یہ عورت مصیبت کی ماری ہوئی ہے۔ ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے اس نے یہ روپ دھار لیا ہے لیکن تم۔۔۔"

"تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔" اس نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دوسرا ہاتھ روشنی میں آگیا۔ اس ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر ٹارچ کی روشنی میں چمک رہا تھا "میرے ساتھی چند منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ہم بہت دنوں سے ایک عورت کی ضرورت محسوس کررہے تھے لیکن تم فی الحال اپنا تھیلا میرے حوالے کردو۔"

"ہمارے پاس دولت نہیں ہے۔ ہم تو غریب لوگ ہیں۔۔۔"

"تھیلا مجھے دے دو۔" وہ غرایا۔

میں نے گلے میں لٹکا ہوا تھیلا اتار کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں خنجر اور ظاہر ہے وہ تھیلا ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا۔

"تھیلا اس طرف پھینک دو۔" اس نے خنجر والے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میرا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ تھیلا اس کے خنجر والے ہاتھ پر لگا۔ تھیلے میں کچھ چیزیں تھیں اور ان کا دو کلو کے لگ بھگ وزن تھا۔ تھیلا اس شخص کی کلائی سے ذرا پیچھے لگا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تاریکی میں جا گرا۔ وہ شخص بھی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی۔

میں نے اسے گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے پہلو میں زوردار سائیڈ کک رسید کردی۔ وہ بلبلاتا ہوا نیچے گرا۔ ٹارچ بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر گر گئی تھی۔ میں نے ایک اور کک لگا دی۔ وہ پیچھے لڑھک گیا لیکن اس مرتبہ وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کے ساتھ ہی اس نے ٹانگ چلا دی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میری پنڈلی کی ہڈی پر لگی۔ میں لڑکھڑا گیا اور جیسے ہی نیچے جھکا اس کی دوسری ٹھوکر میری ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ یہ ٹھوکر اگرچہ زیادہ زوردار نہیں تھی مگر میرا جبڑا ہل کر رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ عام لٹیرا رہزن قسم کا آدمی ہوگا لیکن جس طرح اس نے وہ وار کیے تھے، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ مارشل آرٹس کے داؤ پیچ بھی جانتا ہے۔ میری ذرا سی غفلت مجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ میں نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اور پیروں کی پوزیشن لے کر مخصوص اسٹانس بنا لیا۔ میں نے لیفٹ کک لگائی جسے اس نے ہاتھ سے روکا۔ میں نے دوبارہ لیفٹ کک لگانے کے لیے پیر اوپر اٹھایا۔ اس نے کک روکنے کے لیے پھر ہاتھ کو حرکت دی لیکن میرا لیفٹ کک لگانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں پوری قوت سے دائیں پیر پر اچھلا اور اس کے ساتھ ہی ہوا میں گھوم گیا۔ یہ اسپن کک کا خطرناک حملہ تھا جس سے بچنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ میری کک اس کے بائیں کندھے کے جوڑ پر لگی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر چبوترے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ شاید سمجھ گیا تھا کہ میں بھی مارشل آرٹ کے کچھ داؤ پیچ جانتا ہوں اس لیے اس نے راہ فرار ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

میں نے بھی سنبھل کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ جان چکا تھا کہ جانکی بھکشو نہیں عورت ہے اور یہ راز جان لینے کے بعد اس کا بھاگ جانا خطرناک ہوسکتا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس قدم آگے تھا اور دائیں طرف مڑتا ہوا جھاڑیوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔ میں دور ہی سے اس پر چھلانگ لگانے کی سوچ رہا تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شخص چیختا ہوا منہ کے بل گرا۔ میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔

جانکی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے ہاتھ میں پستول۔ گولی اس نے چلائی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور آگے بڑھ کر اس شخص کو دیکھنے لگا۔ وہ جھاڑیوں میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔ گولی اس کی پشت پر بائیں طرف لگی تھی اور میرا خیال تھا کہ گولی گوشت کو چیرتی ہوئی اس کے دل تک پہنچ گئی تھی ورنہ وہ اتنی جلدی بے حس و حرکت نہ ہوجاتا۔

"اگر یہ بھاگ جاتا تو ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہوسکتی تھی۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس

کے لہجے میں کسی قدر جھجک سی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ میں اس کی اس حرکت پر ناراضگی کا اظہار کروں گا۔

"بہت اچھا کیا تم نے۔ میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں بھی اس کا یہی حشر کرتا۔" میں نے کہا "بہرحال، اب فوراً ہی یہ جگہ چھوڑ دینی ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ اس کے ساتھی چند منٹ بعد یہاں پہنچنے والے ہیں اور تم اپنا خیال رکھو۔ کہیں اور ایسی کوئی مصیبت کھڑی نہ ہوجائے۔"

"تم اسے مصیبت کہتے ہو۔" جانکی نے مجھے گھورا "یہی تو عورت کا حسن ہے اور پھر یہ میرے بس میں تو نہیں۔"

"بہت بے شرمی کی باتیں کرنے لگی ہو۔" میں نے بھی اسے گھورا "عورت کا حسن ہی اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ اس لیے۔۔۔"

"کاش!" جانکی نے گہرا سانس لیا "مار دھاڑ کے علاوہ تمہارے دل میں کچھ اور بھی ہوتا۔"

"اب نکل چلو یہاں سے۔" میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں دوبارہ چبوترے پر آگئے۔ ٹارچ کی روشنی میں، میں نے اپنا تھیلا تلاش کیا۔ ایک طرف خنجر بھی پڑا ہوا نظر آگیا لیکن میں نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ٹارچ بجھا کر میں نے تھیلے میں ڈال لی تھی۔ یہ ہمارے کام کی چیز تھی۔

ہم اسٹوپا سے نکل کر جھاڑیوں میں پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ سردار نے اشارے سے بتایا تھا کہ اس اسٹوپا سے آگے کا راستہ ہمیں پودن نامی گاؤں تک پہنچا دے گا۔ یہ چونکہ ایک باقاعدہ پگڈنڈی تھی اس لیے میرا خیال تھا کہ یہی راستہ ہمیں اس گاؤں تک لے جائے گا۔ ہم دونوں تیز تیز چلتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم رک گئے۔ جانکی کی سانس پھول گئی تھی۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے چند منٹ سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ کچھ آوازیں سن کر چونک گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے گھوڑے دوڑتے ہوئے اس طرف آرہے ہوں۔ میں جانکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا جھاڑیوں میں لے گیا۔

آوازیں ہمارے قریب آتی جارہی تھیں۔ میں نے جھاڑیوں میں سے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چار گھڑ سوار تھے۔ جو ہمارے سامنے سے گزر گئے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ چاروں اس آدمی کے ساتھی تھے جسے ہم ٹھکانے لگا آئے تھے اور میرے خیال میں یہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ یہ چار ڈاکو تو گھڑ سوار تھے اور وہ آدمی پیدل تھا جو اپنے ساتھیوں سے پہلے وہاں پہنچ گیا ہوگا۔

وہ گھڑ سوار جیسے ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے ہم بھی جھاڑیوں سے نکل آئے اور تیز رفتاری سے پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا مگر ہم رکے بغیر چلتے رہے لیکن بالآخر جانکی کی ہمت جواب دے گئی۔ میں رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چاروں طرف پگڈنڈی سے ہٹ کر چند درخت نظر آرہے تھے۔ ہم جھاڑیوں میں ہوتے ہوئے ان درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔

سورج طلوع ہوچکا تھا لیکن آسمان پر بادلوں کی وجہ سے دھوپ نہیں پھیلی تھی۔ تھوڑی دیر مزید آرام کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ اب تک ہم نے کتنا فاصلہ طے کیا تھا اور پودن نامی وہ گاؤں ابھی کتنی دور تھا۔

ڈھائی تین گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ آگے ایک دم ڈھلان شروع ہوگئی تھی اور نشیب میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آرہا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خوشگوار مہک رچی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ نشیب میں دھان کے کھیت تھے اور فضا میں وہ مہک بھی دھان کی تھی۔

ہم ڈھلان پر اترتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں پہنچ گئے۔ کھیتوں میں ہمیں زیادہ نہیں چلنا پڑا۔ دائیں طرف کھیتوں میں کشادہ راستے پر ایک گھوڑا گاڑی آتے دیکھ کر ہم رک گئے۔ وہ دراصل ایک چھکڑا تھا جس کے آگے خچر جتا ہوا تھا۔ چھکڑے پر مویشیوں کے لیے چارا لدا ہوا تھا۔ اوپر آگے کی طرف ایک کاشتکار بیٹھا ہوا تھا جس نے خچر کی لگام تھام رکھی تھی۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا پتلون نما جامہ اور بغیر آستین کی جیکٹ تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کا سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ سر پر تنکوں کا بنا چوڑے چھجے کا ہیٹ تھا۔ اس کاشتکار کا برہنہ سینہ دیکھ کر جانکی اپنے سینے پر چادر درست کرنے لگی۔

چھکڑے پر پیچھے چارے کے گٹھوں پر نو دس سال کی عمر کا ایک بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی چوڑے چھجے کا ہیٹ تھا۔ میں نے راستے کے بیچ میں کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ میں ایسا نہ بھی کرتا تو وہ کاشتکار چھکڑا روک لیتا۔

چھکڑا رکتے ہی کاشتکار چھلانگ لگا کر نیچے اتر آیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر باری باری ہماری طرف دیکھا۔ اس نے کچھ کہا بھی تھا لیکن میں مطلب نہیں سمجھ سکا۔ البتہ میں نے پودن کا

نام لے دیا تھا۔ کاشتکار نے ہمیں چھکڑے پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

میں نے پہلے جانگی کو چھکڑے پر سوار ہونے میں مدد دی پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ اس دوران میں کاشتکار بھی اپنی جگہ پر آ چکا تھا۔ اس نے لگام کو جھٹکا دیا۔ خچر چل پڑا۔

پون دو ڈھائی میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ گاؤں ڈیڑھ پونے دو سو گھروں پر مشتمل تھا لیکن وہ چھکڑا گاؤں میں داخل ہونے کے بجائے دائیں طرف مڑ گیا اور ایک طویل چکر کاٹ کر گاؤں کے دوسری طرف ایک...... خانقاہ کے سامنے رک گیا۔

کاشتکار عقل مند آدمی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی بھکشو کو کس جگہ پہنچانا چاہیے۔

چھکڑا چلا گیا۔ میں مڑ کر خانقاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بیرونی دیواروں پر جمی ہوئی کائی سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ عمارت خاصی قدیم ہے اور اس کی دیکھ بھال پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

عمارت کے سامنے تقریباً تین فٹ اونچا کشادہ چبوترا تھا۔ ہم چبوترے پر پہنچے ہی تھے کہ دو بھکشو مرکزی دروازے سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ دونوں بڑی خشمگیں نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ صاف ظاہر تھا کہ انہیں ہماری آمد پسند نہیں آئی تھی۔

"کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟" ایک نے آگے بڑھتے ہوئے کرخت لہجے میں پوچھا۔ یہ جملہ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا تھا۔ وہ ہمارے چہرے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ ہم چینی نہیں ہیں اور شاید چینی زبان بھی نہیں سمجھتے ہوں گے۔

"ہمیں یہ تو یاد نہیں رہا کہ ہم کہاں سے چلے تھے اور کہاں کہاں سے گزرے ہیں۔ لیکن ہماری منزل ابھی دور ہے۔" میں نے جواب دیا "ویسے ایک بھکشو سے یہ سوال پوچھنا بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جانا ہے۔ بھکشو تو سیلانی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اگر کوئی منزل......"

"میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن ایک بات یاد رکھو۔ یہ واٹ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔ تمہیں زیادہ دنوں تک رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"پریشان مت ہو سنگھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بھکشو ایک دوسرے کو ہمیشہ سنگھی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اس کے ترش رویے اور کھری کھری باتوں سے میں سمجھ گیا تھا کہ یہاں ان کا حلوے مانڈے کا کام چل رہا تھا اور وہ اس میں کسی کی شراکت برداشت نہیں کر سکتے تھے "ہم تو لمبے راستے کے مسافر ہیں۔ آج کا دن آرام کرنے کے لیے رک گئے ہیں۔ رات یہاں گزار کر اگلے روز صبح سویرے ہی یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا۔" اس نے گھورتے ہوئے کہا "یہاں کے لوگوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرو گے۔ آؤ۔ میں تم لوگوں کو کمرا دکھا دوں جہاں تم لوگوں کو رات بسر کرنی ہے۔"

وہ بھکشو تو مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور اس دوران میں' میں نے محسوس کیا تھا کہ دوسرا بھکشو عجیب سی نظروں سے جانگی کو گھور رہا تھا۔

ہم ان دونوں کے ساتھ عمارت کے مرکزی دروازے میں داخل ہو گئے۔ سامنے ایک ہال تھا جو زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چار فٹ اونچے کنکریٹ کے ایک چبوترے پر مہاتما بدھ کا ایک بہت بڑا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔

ایک راستہ اس ہال کے دائیں طرف تھا اور ایک بائیں طرف۔ وہ دونوں بھکشو بائیں طرف والے راستے سے ہوتے ہوئے ہمیں ایک کمرے میں لے آئے۔

"تم لوگ اس کمرے میں رہو گے اور یہ بات ذہن میں رہے کہ آج کا دن اور رات گزارنے کے بعد کل صبح سویرے تم لوگ یہاں سے رخصت ہو جاؤ گے۔ سمجھے؟"

"سمجھ گئے سنگھی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے کا فرش گرد آلود تھا۔ اس کے پچھلی طرف بھی ایک کھڑکی اور ایک دروازہ تھا۔ میں نے وہ کھڑکی بھی کھول دی اور دروازہ بھی۔ عمارت کے پچھلی طرف تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر ایک ندی بہہ رہی تھی اور اس کے پرلی طرف کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ فضا میں دھان کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ہم اس دروازے سے باہر آ کر گھاس پر بیٹھ گئے۔

آسمان پر اب بھی بادل تھے لیکن ٹکڑوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔ سورج کبھی کسی ابر پارے کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی تیز دھوپ چمکنے لگتی۔ یہ دھوپ چھاؤں کا منظر بڑا خوشگوار لگ رہا تھا۔

میرے خیال میں اس وقت دوپہر بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ ہم نے رات کو ماہی گیروں کی بستی میں کھانا کھایا تھا۔ سردار نے ہمیں تھوڑی سی تلی ہوئی مچھلی دے دی تھی جو ابھی تک ہم نے نہیں کھائی تھی۔ اس وقت مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

میں نے تھیلا کندھے سے اتار لیا اور کاغذ میں لپٹی ہوئی مچھلی نکال لی۔ کاغذ میں نے گھاس پر پھیلا دیا۔ مچھلی اتنی تھی کہ ہم کفایت سے کام لیتے تو دو وقت کھا سکتے تھے لیکن اس وقت بڑے زور کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں وہ ساری مچھلی چٹ کر گئے۔ پانی پینے کے لیے وہ ندی موجود تھی۔

پانی پی کر ہم ندی کے کنارے پر ہی بیٹھ گئے لیکن ہم سے زیادہ دیر نہیں بیٹھا جا سکا۔ رات میں نے جاگ کر گزاری تھی اور پیدل چلتے رہنے سے تھکن بھی ہو گئی تھی۔ مجھے نیند کے جھونکے آ رہے تھے۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔

جانگی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور ٹانگیں گرد آلود فرش پر پھیلا لیں۔ میں نے اندرونی دروازہ کھول کر دیکھا۔ اس وقت کچھ لوگ خانقاہ کے مرکزی ہال میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ مجسمے کے ساتھ چبوترے پر نذرانے میں چڑھائی جانے والی کئی چیزیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک بھکشو مجسمے کے قریب کھڑا تھا اور دوسرا شاید باہر تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔ جانگی سو چکی تھی۔ میں نے باہر والا دروازہ بھی بند کر دیا۔ کھڑکی آدھی کے قریب کھلی رہنے دی اور جانگی کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

دن کا باقی حصہ سوتے ہوئے ہی گزر گیا تھا۔ جانگی مجھ سے پہلے جاگ چکی تھی۔ اس نے باہر کا دروازہ کھول دیا تھا۔ باہر اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے اندر کا دروازہ کھول کر ہال میں جھانکا۔ ہال کا مرکزی دروازہ بند تھا اور چھت پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ مہاتما بدھ کے مجسمے والا چبوترا اب صاف تھا۔ وہاں اب کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دونوں بھکشو سب کچھ سمیٹ کر لے گئے تھے۔ گاؤں دیہاتوں میں خانقاہوں پر اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی اس لیے وہ بھکشو نہیں چاہتے تھے کہ ہم یہاں زیادہ دن رہیں۔ وہ اپنی آمدنی میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں نے وہ دروازہ بند کر دیا اور کمرے کی دیواریں ٹٹولنے لگا۔ ایک جگہ سوئچ بورڈ تو مل گیا۔ جس پر دو سوئچ لگے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری دونوں سوئچ آن کر دیے لیکن بتی نہیں جلی یا تو بلب فیوز تھا یا سرے سے بلب تھا ہی نہیں۔

ہم کچھ دیر دروازے کے سامنے بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ہمیں طویل چکر کاٹ کر گاؤں کی طرف آنا پڑا تھا۔ پہلی گلی میں داخل ہوتے ہی کتوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا تھا لیکن کتے دور ہی سے بے دلی سے بھونکتے رہے۔ قریب کوئی نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکنے کی رسم پوری کر رہے تھے اور میرے خیال میں بھکشو ان کے لیے کوئی نئی یا نادیدہ مخلوق نہیں تھی جس کے لیے سنجیدگی سے بھونک کر اپنی توانائی ضائع کرتے لہٰذا بے دلی سے بھونکنے کی رسم پوری کرنے کے بعد یہ کتے پسپا ہو گئے۔

گاؤں کا ایک ہی بازار تھا۔ چند دکانیں تھیں۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی لیکن زیادہ رونق نہیں تھی۔ گاؤں دیہاتوں میں تو لوگ جلد ہی سو جاتے ہیں۔

ایک دکان پر لگی ہوئی گھڑی ساڑھے نو بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ہم بازار میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے لیکن کسی نے ہماری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو لے لو۔" جانگی نے مٹھائی کی ایک چھوٹی سی دکان دیکھ کر کہا۔

"تم شاید بھول گئی ہو کہ بھکشو دوپہر کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ضروری نہیں کہ تمام بھکشو اپنے آپ کو اس کا پابند سمجھتے ہوں۔" جانگی نے کہا "بنکاک میں تم دیکھ ہی چکے ہو۔ واٹ ٹرےمٹ میں تو باقاعدہ رات کا کھانا ہوا کرتا تھا اور بھی کئی مرتبہ میں نے بھکشوؤں کو ہر وقت کھاتے پیتے دیکھا ہے۔ وہ زمانے گزر گئے جب پنڈت' پادری' مولوی اور بھکشو قسم کے لوگ مذہبی روایات و رسوم پر سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ تمام مذاہب میں زیادہ برائیاں ایسے ہی لوگوں کی پیدا کردہ ہیں۔ تم کچھ لے لو۔ اگر کوئی کچھ کہے تو کہہ دینا صبح کے لیے لیا ہے۔"

ماہی گیروں کی بستی کے سردار نے ازراہ کرم مجھے چینی کرنسی میں کچھ رقم دے دی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے چند نوٹ نکالے اور دکان کے سامنے آ گیا۔ جانگی وہیں کھڑی رہی تھی۔

مٹھائی کی اس چھوٹی سی دکان میں کوئی شوکیس وغیرہ نہیں تھا۔ تمام چیزیں کھلی پڑی تھیں۔ میں ایک ایک چیز کو دیکھتا رہا۔ ایک طشت میں رکھی ہوئی جلیبی قسم کی چیز ہی میری سمجھ میں آ سکی تھی۔ میں نے دکان دار کی طرف نوٹ بڑھاتے ہوئے اس طشت کی طرف اشارہ کیا۔

دکان دار ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس نے تین چار جلیبیاں کاغذ میں لپیٹ کر میری طرف بڑھا دیں لیکن نوٹ میرے ہاتھ سے نہیں لیے۔ میں نے اشارے سے اسے

سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ قیمت لے لے اور کچھ جلیبیاں اور دے دے۔ اس نے کاغذ میں چند جلیبیاں اور ڈال دیں مگر قیمت نہیں لی۔ میں نے شرافت اسی میں سمجھی کہ وہ خیرات لے کر وہاں سے ہٹ جاؤں۔

ایک اور دکان سے بیک کی ہوئی موٹی سی ایک روٹی مل گئی۔ ہم نے اسی پر اکتفا کیا اور گاؤں کی گلیوں میں گھومتے ہوئے واپس آ گئے۔

ہم نے کمرے کے باہر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا اور دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہم چونکہ دن بھر سوتے رہے تھے اس لیے اس وقت نیند ہماری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

بانہوں اور چہرے پر ہلکے سے چھینٹے محسوس کرکے میں نے اوپر دیکھا۔ ہلکی سی پھوار شروع ہو گئی تھی۔ ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔ دروازہ ہم نے کھلا ہی چھوڑ دیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی لیکن ہماری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا اور پھر اچانک ایک آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ کسی عورت کے چیخنے کی آواز تھی۔ میں اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکنے لگا۔ ہلکی ہلکی پھوار بدستور جاری تھی لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ نہ ہی وہ آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں اپنی جگہ پر واپس آ گیا۔

"تم نے وہ آواز سنی تھی؟" میں نے جانگی کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں۔ کسی عورت کی گھٹی گھٹی سی چیخ تھی۔" جانگی نے جواب دیا۔

تقریباً دو منٹ بعد کسی عورت کے چیخنے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ہم دونوں اچھل پڑے۔ یہ آواز باہر سے نہیں خانقاہ کے اندر کی طرف سے آئی تھی۔ آدھی رات کے وقت خانقاہ میں کسی عورت کا کیا کام؟ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا اور اٹھ کر بڑی آہستگی سے اندر والا دروازہ کھول کر ہال میں جھانکنے لگا۔ ہال میں سناٹا تھا۔ میرے ذہن میں جو شبہ پیدا ہوا تھا' وہ تقویت اختیار کرتا جا رہا تھا اور پھر اسی لمحے ہال کے دوسری طرف سے ایک اور آواز سنائی دی جیسے کوئی دروازہ دھڑ سے بند ہوا ہو۔

"لگتا ہے۔ اس طرف کوئی گڑ بڑ ہے۔" جانگی کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آ گئی تھی۔

"عورت کے چیخنے کی آواز بھی اسی طرف سے سنائی دی۔ آؤ دیکھتے ہیں۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

ہم دونوں کمرے سے نکل کر ہال میں آ گئے۔ میں نے بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر دیا اور دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ جانگی بھی میرے پیچھے ہی تھی۔ ہمارا رخ بدھ کے مجسمے والے چبوترے کی طرف تھا۔ سامنے سے جانے کے بجائے میں چبوترے کے پیچھے نکل گیا تھا۔

ہال کے دوسری طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ آگے جا کر یہ راہداری انگریزی کے حرف ٹی کی طرح دائیں بائیں مڑ گئی تھی۔ دائیں طرف سے ایک آواز سن کر میں اس طرف مڑ گیا۔ راہداری میں تاریکی تھی لیکن ایک دروازے کے نیچے جھری سے مدھم سی روشنی جھلک رہی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچ گیا اور جھک کر کی ہول سے آنکھ لگا دی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ دونوں ننگ دھڑنگ بھکشو ایک عورت کو دبوچے ہوئے تھے۔ عورت کے جسم پر بھی لباس برائے نام ہی تھا۔ اس کا منہ بندھا ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لڑکی کی لات ایک بھکشو کے سینے پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے ہٹا لیکن جب سنبھلا تو اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ خنجر دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔

میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا اور جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکالنے لگا۔ اس دوران میں جانگی نے کی ہول سے آنکھ لگا دی لیکن وہ بھی ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اسی لمحے مجھے اندر سے غراہٹ جیسی آواز سنائی دی۔ میں نے کی ہول سے دیکھا۔ خنجر اس لڑکی کے سینے میں پیوست تھا۔ وہ تڑپ رہی تھی مگر دوسرے بھکشو نے اسے مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ لڑکی یقیناً چیخ بھی رہی ہو گی مگر منہ پر بندھی ہوئی پٹی کی وجہ سے اس کی آواز حلق ہی میں گھٹ رہی تھی۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے راہداری کی طرف کھینچتی چلی گئی۔

"ہمیں اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے دوسری راہداری میں پہنچ کر سرگوشی کی۔ "ہم نے صبح یہاں سے چلے جانا ہے۔ اس وقت ہم نے کوئی مداخلت کی تو گڑ بڑ بھی ہو سکتی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ واپس چلو۔"

میرے خیال میں جانگی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہمیں اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے آئی تھی۔ ہماری مداخلت سے معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں بھی جانگی کا راز کھل جاتا اور ہمارے ہی لیے کوئی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

اپنے کمرے میں آ کر ہم نے خانقاہ کی طرف والا دروازہ بند کر دیا اور باہر والا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ بنکاک میں ہندو پنڈتوں اور بدھ بھکشوؤں کے بارے میں ایسی بہت سی باتیں سنی تھیں لیکن اس کا عملی مظاہرہ آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"اسی لیے یہ دونوں بھکشو یہاں ہماری آمد پر خوش نہیں تھے۔" میں نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "انہیں اندیشہ تھا کہ ہماری وجہ سے ان کا یہ راز نہ کھل جائے۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔" جانگی نے کہا "ایسے ہی لوگوں نے تو دھرم کو بدنام کر رکھا ہے۔ وہ لڑکی اپنی مرضی سے ان کے پاس آئی ہوئی ہے۔ اگر ہم مداخلت کرتے تو عین ممکن ہے ہمیں ہی کسی معاملے میں پھنسا دیا جاتا اور پھر ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ میں مرد نہیں عورت ہوں۔"

"اس لیے تو میں تمہاری بات مان کر واپس آ گیا ہوں۔ بہرحال' ہمیں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جانا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

قدموں کی ہلکی سی آہٹ سن کر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ آواز ہمارے کمرے کی طرف ہی آ رہی تھی اور پھر دروازے کے سامنے رک گئی۔ اس دروازے کو اندر سے کنڈا نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ ایسے ہی بھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ بعد آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ دروازہ بند تھا۔ وہ ان دونوں بھکشوؤں میں سے کوئی ایک تھا جو غالباً ہمیں دیکھنے کے لیے آیا تھا اور مطمئن ہو کر واپس چلا گیا تھا۔

ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جانگی اطمینان سے سو گئی اور میں دیر تک ان بھکشوؤں کے گھناؤنے کردار کے بارے میں سوچتا رہا۔

صبح ہوتے ہی ہم خانقاہ سے نکل آئے۔ گاؤں کے بازار میں پہنچ کر ہمیں پتا چلا کہ یانگ نامی ایک کاشتکار اپنی ٹریکٹر ٹرالی پر کچھ سامان لے کر مینگ ژو جانے والا ہے۔ مینگ ژو وہاں سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھا۔ جہاں سے ہمیں کن منگ کے لیے کوئی سواری مل سکتی تھی۔

ہم فوراً ہی کاشتکار یانگ کے گھر پہنچ گئے۔ وہ اپنی ٹرالی پر سامان لاد رہا تھا۔ اس نے ہماری بات توجہ سے سنی اور ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد اس کا روانگی کا پروگرام تھا۔ میں جانگی کو وہیں چھوڑ کر بازار کی طرف نکل گیا اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں خرید کر لے آیا۔ کچھ ناشتا کیا اور کچھ چیزیں سنبھال کر تھیلے میں رکھ لیں۔

روانگی سے دس منٹ پہلے دو افراد اور پہنچ گئے۔ ان میں ایک عورت تھی اور دوسرا مرد۔ عورت کی عمر بائیس تیئس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے چین کا روایتی دیہی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر تنکوں کا چوڑے چھجے والا ہیٹ تھا۔ مرد کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی پتلون اور نیلی اور سفید دھاریوں والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر ماؤ کیپ تھی۔ اس کے پاس ایک عدد سفری بیگ بھی تھا۔ ان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ بھی اس ٹرالی پر ہمارے ساتھ جائیں گے۔ اس آدمی کا نام چانگ ہو تھا۔ وہ کن منگ کا رہنے والا تھا اور یہاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے آیا ہوا تھا اور اب واپس جا رہا تھا۔ لوزو نامی اس خوب صورت عورت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ اس گاؤں کی رہنے والی تھی اور کسی کام سے مینگ ژو جا رہی تھی۔ شام کو یانگ کے ساتھ ہی اس کا واپس آنے کا پروگرام تھا۔

یانگ نے ٹرالی پر سامان اس طرح لادا تھا کہ ہمارے بیٹھنے کی جگہ بھی بن گئی تھی۔ میں اور چانگ ہو ایک طرف بیٹھے تھے اور جانگی اور لوزو ہم سے ذرا ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

کچے راستے پر ٹرالی کو دھچکے لگ رہے تھے۔ بعض جگہوں پر تو ٹرالی اس طرح اچھلتی کہ ہم ایک دوسرے کے اوپر گر پڑتے۔ اس طرف کسی بس کی آمدورفت نہیں تھی۔ لوگ مینگ ژو تک اسی طرح سفر کرتے تھے۔ مینگ ژو' کن منگ جانے والی ہائی وے پر ایک بڑا قصبہ تھا۔ یہی ہائی وے جنوب میں مختلف چھوٹے بڑے شہروں کو ملاتی ہوئی ویت نام کے مرکزی شہر ہنوئی تک چلی گئی تھی۔

جانگی بھی میری طرح رات دیر تک جاگتی رہی تھی۔ سفر کے دوران میں وہ اونگھ رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ جھٹکا لگنے سے لوزو پر گری تھی۔ پہلے تو لوزو کے چہرے پر ناگوار سے تاثرات ابھرتے رہے پھر ایک موقع پر میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی۔ جانگی اس وقت لوزو کے اوپر ہوئی تھی اور لوزو نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی تھی اور اسی وقت میں نے اس کی آنکھوں میں وہ عجیب سی چمک ابھرتی ہوئی دیکھی تھی۔

پانگ نے ایک چھوٹی سی بستی کے سامنے ٹرالی روک لی۔ اس وقت ہم تقریباً تیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ چانگ ہو اور لوزو نیچے اتر گئے۔ جانگی اٹھ کر میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اسی وقت میری نظر چانگ ہو اور لوزو کی طرف اٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں سڑک پر کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ لوزو نے آنکھوں سے ہماری طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد پانگ ٹریکٹر پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا تو لوزو اور چانگ ہو بھی اوپر آگئے۔ جانگی چونکہ میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی تھی اس لیے چانگ ہو کو لوزو کے ساتھ بیٹھنا پڑا تھا۔ میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ چانگ ہو بار بار کن انکھیوں سے جانگی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دس بجے کے قریب ہم مینگ ژو پہنچ گئے۔ لوزو تو ہم سے ہاتھ ملا کر مسکراتے ہوئے چلی گئی تھی اور چانگ ہو ہمارے قریب ہی کھڑا رہا۔ ہمیں کن منگ جانے والی بس کا انتظار تھا اور چانگ ہو کو بھی کن منگ ہی جانا تھا۔ میں نے قریب ہی ایک دکان سے کچھ چیزیں خرید لی تھیں جو ہم سڑک پر کھڑے ہی کھاتے رہے۔ چانگ ہو نے ایک دو مرتبہ ہم سے باتوں میں بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میری حوصلہ شکنی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد بس آئی تو میں جانگی کو لے کر جلدی سے سوار ہو گیا۔ چانگ ہو نے بھی سوار ہونے کی کوشش کی تھی مگر کنڈیکٹر نے اسے نیچے اتار دیا۔ بس میں صرف دو ہی سیٹیں خالی تھیں جن پر ہم بیٹھ چکے تھے۔ چانگ ہو کے چہرے پر مایوسی چھا گئی تھی۔ وہ ہماری طرف دیکھتا ہوا بس سے اتر گیا۔ بس فوراً ہی چل پڑی۔

"چانگ ہو کو ہم پر شبہ ہو گیا ہے۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "ٹرالی میں تم بار بار اونگھ رہی تھیں اور ایک دو مرتبہ لوزو پر گری بھی تھیں۔ اس دوران میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم مرد نہیں عورت ہو اور جب راستے میں ٹرالی رکی تھی اور وہ دونوں نیچے اترے تھے تو لوزو نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ راستے بھر مسلسل تمہیں ہی گھورتا رہا تھا۔"

"مجھے بھی لوزو پر کچھ شبہ ہوا تھا کہ وہ میری اصلیت جان چکی ہے۔" جانگی نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "ایک مرتبہ میں اونگھتے ہوئے اس پر گری تھی تو وہ میرا جسم ٹٹول رہی تھی۔"

"وہ دوسری بس پر آئے گا۔" میں نے کہا "خدا کرے دوسری بس دیر سے آئے اور ہمیں اس سے پہلے کن منگ پہنچنے کا موقع مل جائے۔ سنا ہے کن منگ بڑا شہر ہے۔ اگر ہم دس منٹ پہلے بھی پہنچ گئے تو ہمیں غائب ہونے کا موقع مل جائے گا۔"

اسی دوران میں کنڈیکٹر ہمارے قریب آ گیا۔ میں نے تھیلے میں سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے ان میں سے دو نوٹ واپس کر دیے اور ٹکٹ کے ساتھ تین چھوٹے نوٹ اور کچھ ریزگاری بھی واپس کی تھی۔

"دوسری بس کتنی دیر میں آئے گی۔" میں نے چینی زبان میں رک رک کر کنڈیکٹر سے پوچھا۔

"ایک گھنٹے بعد۔" کنڈیکٹر نے جواب دیا اور دروازے کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کن منگ تقریباً ڈھائی سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس وقت ایک بجنے والا تھا اور شام سات آٹھ بجے سے پہلے وہاں پہنچنے کی توقع نہیں تھی۔

بس ائر کنڈیشنڈ تھی۔ جانگی کھڑکی کے شیشے سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگی مجھے بھی نیند کے جھونکے آنے لگے۔

ہم سات بجے کے قریب کن منگ پہنچے تھے۔ کئی لاکھ آبادی پر مشتمل یہ ایک بڑا شہر تھا۔ بلند و بالا عمارتیں، جگمگاتی ہوئی روشنیاں اور انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ چین میں کسی اور چیز کی کمی ہو تو ہو مگر انسانوں کی کمی نہیں تھی۔

بس جیسے ہی اپنے اسٹیشن پر رکی، میں جانگی کا ہاتھ پکڑ کر سب سے پہلے نیچے اتر آیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اجنبی شہر اور اجنبی راستے۔ ظاہر ہے ہم کسی خاص راستے کا تعین نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے جانگی کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف کھینچتا چلا گیا۔ میں کم سے کم وقت میں بس اسٹیشن سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔ ہمارے اس طرح چلنے سے کچھ لوگوں کو دھکے بھی لگے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت تو گرتے گرتے بچی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر تیز لہجے میں چیخ رہی تھی لیکن ہم اس کی بات کا مطلب سمجھنے کے لیے وہاں رکے نہیں تھے۔

چند منٹ کے اندر اندر ہم وہاں سے تقریباً دو میل دور نکل گئے۔ ابھی شام ہوئی تھی۔ ہر طرف رونق تھی اور رونق ایسی کہ چلنے کو راستہ نہیں مل رہا تھا۔ مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں ہم کسی خوف کے بغیر اطمینان سے رات گزار سکیں اور ظاہر ہے ایسی محفوظ جگہ کوئی خانقاہ ہی ہو سکتی تھی۔ ہمیں ایک کشادہ شاہراہ پر ایک بہت بڑی خانقاہ نظر

آئی تھی لیکن میں نے خود ہی وہاں جانے سے گریز کیا تھا۔

ہم شہر کے زیریں علاقے میں آ گئے۔ یہاں کی آبادی شہر کے دوسرے علاقوں سے زیادہ گنجان تھی۔ ہم پوچھتے ہوئے چلتے رہے اور بالآخر ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گئے۔ اسی گلی میں کچھ آگے جا کر ایک خانقاہ تھی۔

گلی میں خانقاہ کا گیٹ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن گیٹ کے اندر بہت کشادہ صحن تھا اور اس سے آگے خانقاہ کی اصل عمارت تھی۔ اس وقت اگرچہ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے مگر زائرین کی آمدورفت جاری تھی۔ چھوٹے علاقوں میں خانقاہیں عام طور پر شام ہونے سے پہلے ہی بند ہو جاتی تھیں مگر بڑے شہروں میں ان کے دروازے رات نو بجے تک کھلے رہتے تھے۔

خانقاہ کے وسیع صحن میں بھکشو ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جانگی کو ساتھ لیے ایک طرف بڑھتا رہا اور بالآخر ایک جگہ رک کر کسی مناسب جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں ایک عورت اور ایک مرد ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ عورت نے سال بھر کی عمر کے ایک بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔ مرد کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا جس میں کچھ پیکٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے تھیلے میں سے دو پیکٹ نکال کر ایک جانگی کو دے دیا اور ایک میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

ان دونوں کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ لباس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ زیادہ پیسے والے نہیں تھے۔ بچے نے سر اپنی ماں کے سینے سے ٹکا رکھا تھا۔ اس کے چہرے ہی سے لگ رہا تھا کہ وہ بیمار ہے اور شاید یہ دونوں میاں بیوی اس بچے کے لیے کوئی منت ماننے کے لیے یہاں آئے تھے اور خیرات بانٹ رہے تھے۔

ہم ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے اپنا پیکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں بیسن کی بنی ہوئی کوئی چیز تھی۔ ہم دونوں سر جھکا کر وہ کھانے لگے۔ جانگی والا پیکٹ میں نے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔

نو بجے خانقاہ کا گیٹ زائرین کے لیے بند کر دیا گیا۔ وسیع صحن میں بہت سے بھکشو موجود تھے۔ ہم اپنی جگہ پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ مختلف سمتوں سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بعض بھکشو تو بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ میں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اور پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بھکشو میرے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں نے گردن گھمائی تو جانگی کے ساتھ بھی ایک بھکشو بیٹھا ہوا نظر آیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہی تو کوئی سخت چیز میرے پہلو میں چبھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی سی غراہٹ سنائی دی۔

"کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہارے پہلو میں سوراخ ہو جائے گا۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بھکشو نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی بے بسی کے تاثرات تھے۔ وہ دوسرا بھکشو اس پر تقریباً جھکا ہوا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کئی بھکشو فرش پر سو رہے تھے۔ گیٹ کے اندر کی طرف ایک بلب جل رہا تھا جس کی مدھم سی روشنی چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔

"کون ہو تم لوگ اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟" میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بھکشو کی طرف دیکھتے ہوئے چینی زبان میں رک رک کر کہا۔

"تم دونوں اٹھ کر خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو۔ اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔" اس بھکشو نے غراتے ہوئے کہا۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔ میں اگر چاہتا تو یہاں ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا لیکن مسئلہ جانگی کا تھا۔ اگر یہاں بھکشوؤں کو پتا چل جاتا کہ جانگی مرد نہیں عورت ہے تو وہ لوگ ہمیں مارنے پر تل جاتے۔ ہماری بات کوئی نہ سنتا کہ یہ سوانگ محض تحفظ کے لیے بھرا گیا ہے۔ یہ تصور کر لیا جاتا کہ یہ بھیس اپنا کر ہم کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہم دونوں اٹھ کر گیٹ کی طرف چلنے لگے۔ وہ دونوں بھکشو ہمارے دائیں بائیں تھے اور انہوں نے ہمیں پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ میرا تھیلا بھی ایک بھکشو نے لے لیا تھا۔

خانقاہ کے سامنے والی گلی اس وقت سنسان تھی۔ ہم ان دونوں کے بیچ میں چلتے رہے۔ گلی کے موڑ پر ایک بند وین کھڑی تھی۔ ہم جیسے ہی قریب پہنچے وین کا سلائڈنگ ڈور کھل گیا۔

"چلو۔ اندر بیٹھو۔" میرے ساتھ والے بھکشو نے مجھے دھکا دیا۔

میں وین میں بیٹھ گیا۔ میرے سامنے جانگی اور اس کے ساتھ ایک بھکشو بیٹھ گیا تھا۔ دوسرا بھکشو دوسری طرف سے آ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ ہم ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گئے تھے اور پستول ایک بار پھر ہمارے پہلوؤں سے لگ گئے تھے۔ اسٹیئرنگ کے سامنے ایک آدمی پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے فوراً ہی انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس نے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں بری طرح چونک گیا۔

وہ چانگ ہو تھا۔ اس نے بڑی جلدی ہمیں تلاش کر لیا تھا۔

وین شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ بیشتر سڑکیں سنسان تھیں لیکن شہر کے بعض علاقے ایسے بھی تھے جہاں اس وقت بھی رونق ہو رہی تھی۔

ہمارا سفر خاموشی سے جاری رہا۔ نہ ان میں سے کسی نے زبان کھولی تھی اور نہ ہی میں نے کچھ کہا تھا۔ وین شہر سے نکل کر نواحی علاقے میں آ گئی اور بالآخر ایک کاٹیج کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ چانگ ہو نے وین سے اتر کر گیٹ کھولا اور دوبارہ وین میں آ گیا۔

گیٹ میں داخل ہو کر وین کاٹیج کے برآمدے کے سامنے رکی۔ ہم دونوں کو نیچے اتار لیا گیا۔ ان دونوں بھکشوؤں نے اب بھی ہمیں پستولوں کی زد پر لے رکھا تھا۔ چانگ ہو باہر کا گیٹ بند کر کے واپس آ گیا اور برآمدے والے دروازے کا تالا کھولنے لگا۔

کاٹیج سازوسامان سے آراستہ تھا۔ ہال کمرے میں فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواروں کے قریب صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے شیشے کے ٹاپ والی سینٹر ٹیبل بھی رکھی ہوئی تھی۔ سامان کے باوجود جگہ کافی کشادہ تھی۔

اندر آنے کے بعد ان دونوں بھکشوؤں نے اپنے جسموں پر لپٹی ہوئی پیلی چادریں اتار دی تھیں۔ نیچے انہوں نے پتلونیں اور ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔

"مسٹر چانگ۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ناگوار سے لہجے میں کہا "تم ہمیں یہاں کیوں لائے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کسی کو اغوا کرنا جرم ہے۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے پاس دولت ہوگی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہم بھکشو لوگ ہیں۔ ہمارے پاس دولت کا کیا کام۔ ہم سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"تو پھر تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم کتنی بڑی دولت اپنے ساتھ لیے پھر رہے ہو۔" چانگ ہو کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آ گئی پھر وہ جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ چادر اتار دو۔ میں تمہارے ساتھی کو دکھانا چاہتا ہوں کہ وہ کون سی دولت اپنے ساتھ لیے پھر رہا ہے۔"

جانگی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ چانگ ہو نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے جانگی کی چادر پکڑ کر کھینچ دی۔ جانگی مزاحمت کرنے لگی لیکن چادر اس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ چادر کے نیچے اس نے مختصر سا بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

"دیکھ لیا مسٹر بھکشو۔" چانگ ہو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ دولت ہماری ہے۔ پہلے ہم اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور جب دل بھر جائے گا تو تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس طرح بھیس بدل کر اپنی اصلیت چھپانا جرم ہے۔ تم لوگ غالباً انڈین ہو۔ تم لوگوں کو جاسوسی کے الزام میں موت کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں مسٹر چانگ۔ ہم انڈین نہیں تھائی ہیں۔ یہ بھیس۔۔۔"

"مجھے ٹریکٹر ٹرالی پر سفر کے دوران میں ہی اس کی اصلیت کا پتا چل گیا تھا۔" چانگ ہو نے میری بات کاٹ کر جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کا انکشاف لوزو نے کیا تھا اور میں نے اسی وقت تم لوگوں کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ مجھے مینگ ژو سے اس بس میں جگہ نہیں مل سکی تھی۔ میں نے فون پر اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے دی کہ وہ تم لوگوں کی نگرانی کریں اور یہ پتا چلائیں کہ تم لوگ کہاں جاتے ہو۔ میرے یہ دونوں ساتھی بس پہنچنے سے پہلے ہی اسٹیشن پر موجود تھے۔ ان لوگوں نے تمہاری نگرانی شروع کر دی اور جب تم لوگ اس خانقاہ میں ٹک گئے تو یہ سمجھ گئے کہ اب تم لوگ رات وہیں رہو گے اور پھر تم نے دیکھ لیا کہ تم لوگوں کو وہاں سے اٹھانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر باری باری ہم دونوں کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب بہتر یہی ہے کہ تم لوگ اپنے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتا دو۔ تم لوگ کون ہو اور بھیس بدل کر یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے جواب دیا "ہم شاؤلن ٹمپل جا رہے ہیں۔ مارشل آرٹس کی ٹریننگ حاصل

کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے سوا ہمارا کوئی مقصد نہیں ہے۔"

"لیکن تم لوگ یہاں آکر بہت بری طرح پھنس چکے ہو۔" چانگ ہو نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "پچھلی رات تم لوگوں نے پوون کی خانقاہ میں قیام کیا تھا۔ صبح سویرے ایک کاشتکار کو خانقاہ کے قریب کھیتوں میں گاؤں کی ایک لڑکی کی لاش پڑی ہوئی ملی تھی۔ اسے خنجروں سے وار کرکے قتل کیا گیا تھا۔ جب تم لوگ ہمارے ساتھ چانگ کی ٹریکٹر ٹرالی پر روانہ ہوئے تو بات اس وقت تک پھیلی نہیں تھی۔ اگر بات پھیل جاتی تو تم لوگ گاؤں سے نکل نہیں سکتے تھے۔ اب بھی صورت حال کچھ یوں ہے کہ اگر میں یہاں کی پولیس کو اس لڑکی کے قتل کے بارے میں بتا کر تم دونوں کو ان کے حوالے کردوں تو تم اس کا انجام سمجھ سکتے ہو۔ کسی غیر ملکی پر قتل کا الزام عائد کرنا مقامی پولیس کے لیے مشکل نہیں ہوتا اور پھر تم لوگ تو ویسے بھی خاصے مشکوک ہو۔ بڑی آسانی سے۔۔۔"

"اس لڑکی کو ہم نے قتل نہیں کیا۔" جانکی جلدی سے بول پڑی "ہم رات کو اس خانقاہ میں ٹھہرے ضرور تھے لیکن اس قسم کے کسی واقعے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"یہ ٹھیک کہتی ہے۔" میں نے کہا "آدھی رات کے بعد ہم نے کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنی تھی اور جب ہم معلوم کرنے کے لیے خانقاہ کے دوسرے حصے میں پہنچے تو وہ لڑکی ان بھکشوؤں کے کمرے میں تھی۔ انہوں نے ہی اسے قتل کیا تھا۔ وہ لوگ لڑکی کو زبردستی خانقاہ میں لے کر آئے تھے اور اس کی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ لڑکی کی مزاحمت پر اسے قتل کردیا گیا۔"

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔" چانگ ہو بولا "لیکن وہ بھکشو پانچ سال سے اس خانقاہ میں ہیں۔ ان دونوں کے بدمعاش ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کن منگ کے رہنے والے ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے جرائم میں کئی مرتبہ سزا بھگت چکے ہیں اور پھر پانچ سال پہلے بھکشوؤں کے بھیس میں انہوں نے اس خانقاہ پر قبضہ کرلیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "کچھ عرصہ پہلے میں اپنی بہن سے ملنے کے لیے پوون گیا تو ان سے بھی سامنا ہوگیا۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئے تھے لیکن میں نے ان سے معاملہ طے کرلیا۔ میں ہر چھ مہینے بعد وہاں جاتا ہوں اور وہ میرا منہ بند رکھنے کے لیے ایک معقول رقم اور کچھ قیمتی تحائف دے دیتے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ وہ دونوں بدمعاش ہیں اور خوب عیش کررہے ہیں لیکن انہوں نے گاؤں والوں پر اپنا اعتماد قائم کر رکھا ہے۔ پچھلے پانچ برسوں کے دوران میں ایسی تین وارداتیں اور بھی ہوچکی ہیں لیکن ان دونوں پر کبھی شبہ نہیں کیا گیا اور اب تم لوگ بڑی آسانی سے اس کیس میں پھنس سکتے ہو۔"

"لیکن ہمارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" جانکی نے کہا۔

"میں کب کہتا ہوں کہ وہ قتل تم لوگوں نے کیا ہے۔" چانگ ہو بولا "چلو میں تم لوگوں کو پولیس کے حوالے نہیں کروں گا۔ تم دونوں اس قتل کے چشم دید گواہ ہو۔ اگر ان دونوں بھکشوؤں کو تمہارے بارے میں اطلاع مل جائے تو وہ سر کے بل یہاں دوڑے آئیں گے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تم دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔"

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کنجی حسینہ کو تین چار دن کے لیے ہمارے حوالے کردو۔" اس نے جانکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم نہ صرف اپنی زبان بند رکھیں گے بلکہ تمہاری کچھ مدد بھی کردیں گے۔"

میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میرے پاس پستول بھی تھا اور خنجر بھی۔ جانکی نے بھی اسکرٹ میں پستول چھپا رکھا تھا لیکن چانگ ہو کے دونوں ساتھی دائیں بائیں سے ہمیں اپنے پستولوں کی زد میں لیے ہوئے تھے۔ ہماری کوئی کوشش ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ یہ تو میں اس طرف آتے ہوئے دیکھ چکا تھا کہ کاٹیج یا بنگلے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ رات کا آخری پہر تھا۔ لوگ گہری نیند میں ہوں گے۔ گولی چلے گی بھی تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ میں نے ایک بار پھر جانکی کی طرف دیکھا اور آنکھ کا گوشہ دبا دیا۔

"ٹھیک ہے مسٹر چانگ۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہوگا؟"

"تمہیں میری زبان پر بھروسا کرنا ہوگا۔" چانگ ہو کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آگئی "ویسے تم عقل مند ہو۔ تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔"

"تم نے تین چار دن کی بات کی ہے۔ اس دوران میں۔۔۔"

"اس دوران میں تم لوگ یہیں رہو گے۔ میرے اس کاٹیج میں۔" چانگ نے میری بات کاٹ دی "یہاں تم لوگوں کا ہر قسم کا خیال رکھا جائے گا لیکن اگر اس دوران میں کوئی

گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو۔۔۔"

"تمہیں ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی مگر اس کے بعد تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا اور اب میرا خیال ہے کہ ماحول میں کچھ تبدیلی آنی چاہیے۔ میرا مطلب ہے یہ پستول۔۔۔" میں نے خاموش ہو کر باری باری دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا۔

چانگ ہو نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پستول اپنی جیبوں میں ڈال لیے اور ہم سے قدرے دور ہٹ گئے۔ چانگ ہو خود اعتمادی کا شکار ہوگیا تھا۔ میرے شکست خوردہ لہجے سے بھی اس نے غالباً یہ نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ اب ہماری طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ اس نے شاید یہ بھی سوچا ہوگا کہ میں اکیلا ان تینوں کا کیا مقابلہ کرسکوں گا اور یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے ہمارے لباس کی تلاشی نہیں لی تھی۔ البتہ میرا تھیلا اپنے قبضے میں کرلیا تھا جس میں کوئی خاص چیز نہیں تھی اور وہ تھیلا بھی وین میں ہی پڑا ہوا تھا۔

"چلو ڈیئر۔" چانگ ہو نے جانکی کی کمر کے گرد بازو حمائل کردیا۔ اسے یہ یقین ہوچکا تھا کہ اب کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔" جانکی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں غصہ بھی تھا اور بے بسی بھی "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے خود غرض ثابت ہوگے۔ تم قابل اعتماد نہیں ہو۔ آئندہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔"

چانگ ہو اسے تقریباً دھکیلتا ہوا۔۔۔ ایک طرف لے جانے لگا لیکن چوتھے ہی قدم پر جانکی نے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسادی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی تھی۔

چانگ ہو کے دونوں آدمی ایک طرف کھڑے تھے۔ انہیں صورت حال کا اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا اسی لیے وہ دونوں میری طرف لپکے۔ میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح ہوا میں اچھلا۔

ہوا میں اچھلنے کے بعد میں نے دونوں ٹانگوں سے کام لیا تھا۔ ڈبل فلائنگ کک دونوں کے سینوں پر لگی اور وہ دونوں چیختے ہوئے ڈھیر ہوگئے لیکن ان میں سے ایک حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر اسٹریٹ کک ماری' وہ پیٹ پکڑتا ہوا دہرا ہوگیا۔ دوپیر زمین پر ٹکنے سے پہلے ہی میں ایک بار پھر اچھلا اس مرتبہ میرے دوسرے پیر کی کک اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ وہ زمین سے دو فٹ اوپر اچھلا اور چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

اس کا دوسرا ساتھی اٹھ کر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میں نے موقع دیے بغیر اس کے پہلو پر سائڈ کک لگادی۔ وہ چیخ اٹھا اور سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پر سویپ کک لگائی۔ انگوٹھے کی طرف سے میرے پیر کا بلیڈ اس کی پنڈلی کے پچھلی طرف لگا تھا۔ وہ بکرے کی طرح بلبلاتا ہوا اچھل کر نیچے گرا اور دونوں ہاتھوں سے پنڈلی پکڑ کر قالین پر لوٹنے لگا۔ اس کی پنڈلی کا گوشت اندر سے پھٹ گیا تھا۔

پہلا آدمی اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے پلٹ کر اس کے کندھے پر پوری قوت سے چوب رسید کردیا۔ مجھ پر اس وقت جنون کی سی کیفیت طاری تھی۔ اور یہ چوب پوری قوت سے رسید کیا تھا۔ اس کی چیخ کے ساتھ ہی کڑک کی آواز بھی ابھری تھی۔ اس کے کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح قالین پر لوٹنے لگا۔

جانکی کی چیخ سن کر میں تیزی سے اس طرف مڑا۔ جانکی چانگ ہو کی گرفت میں آچکی تھی۔ وہ جانکی کا گلا دبانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے لپک کر چانگ ہو کو ٹانگوں سے پکڑلیا اور اسے اوپر اٹھاتا چلا گیا۔

میں نے اسے بالکل الٹا کردیا تھا لیکن جانکی کا گلا اب بھی اس کی گرفت میں تھا۔ میں نے اس کے پیٹ پر گھٹنے سے ٹھوکر ماری۔ اس نے جانکی کا گلا چھوڑ دیا۔ جانکی سیدھی ہو کر اپنا گلا سہلانے لگی۔ میں چانگ ہو کو ابھی تک ٹانگوں سے پکڑے الٹا لٹکائے ہوئے تھا۔ جانکی نے اس کے پیٹ میں زوردار ٹھوکر ماردی۔

ان دونوں میں سے ایک آدمی اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ وہی تھا جس کی ٹانگ پر ضرب لگی۔ اس کا وہ پیر زمین پر نہیں لگ رہا تھا اور پھر اسے جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ میں نے چانگ ہو کو چھوڑ دیا۔ اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پشت کے بل گرا۔ جانکی نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی تھی۔

میں تیزی سے دوسرے آدمی کی طرف لپکا۔ وہ جیب سے پستول نکال چکا تھا لیکن میرے پیر کی ٹھوکر سے پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور صوفے کے پیچھے جا گرا۔ میری دوسری کک اس کی کنپٹی پر لگی تھی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلاتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

میں ایک لمحے کو غافل ہوا تھا۔ جس سے فائدہ اٹھا کر

دوسرے آدمی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں اس کی گرفت میں تو آ گیا تھا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو اس سے چھڑایا اور اس کی گردن بازو کی لپیٹ میں لے لی۔

میرے اس نیک لاک سے گردن چھڑا لینا ممکن ہی نہیں تھا اور جب مجھ پر جنون طاری ہو تو کسی کے بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ وہ کتے تھے جو راہ گیروں پر بھونک کر ان کی منزل کھوٹی کرتے تھے اور انہیں اس کی سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ میں نے بازو کو زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز ابھری۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ قالین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ جانے کے بعد اس کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو گیا جو کھوپڑی کو دونوں ہاتھوں میں تھامے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن بازو کی لپیٹ میں لے لی اور اس کا بھی وہی حشر کر کے پھینک دیا۔

جانکی اب بھی چانگ ہو پر ٹھوکریں برسا رہی تھی۔ اس کی ایک ٹھوکر چانگ ہو کی ٹانگوں کے بیچ میں لگی اور وہ نیچے گر کر لوٹنے لگا۔

"ختم کر دو اسے جانکی۔" میں نے کہا "ان میں سے کسی کا زندہ بچ جانا ہماری موت بن جائے گا۔ دو کو میں نے ٹھکانے لگا دیا ہے۔ تیسرے کو تم ختم کر دو۔"

جانکی نے اسے ایک اور ٹھوکر ماری اور پھر اس کی نظر صوفے کے پیچھے پڑے ہوئے پستول پر پڑ گئی۔ اس نے لپک کر پستول اٹھا لیا اور نال اس کے سینے پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی اور وہ تڑپنے لگا۔

جانکی نے ایک کپڑا اٹھا کر پستول پر اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور پستول چانگ ہو کے سیدھے ہاتھ میں دبا دیا جو اب بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔

"اپنی وہ چادر اٹھاؤ اور بھاگو یہاں سے۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ان تینوں کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔

جانکی کے چہرے پر اس وقت بے پناہ درندگی تھی لیکن میری آواز سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بتدریج معمول پر آتے چلے گئے۔ اس نے لپک کر اپنی زرد رنگ کی وہ چادر اٹھائی اور ہم دونوں تیزی سے دروازے سے نکل گئے۔ جانکی برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی وین دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"تم باہر کا گیٹ کھولو۔ میں وین باہر نکالتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"وین!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہم کچھ دور جا کر وین چھوڑ دیں گے۔ یہاں سے نکلنا بہت ضروری ہے۔" جانکی نے وین کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میں بیرونی گیٹ کی طرف لپکا اور کنڈا ہٹا کر آہستگی سے گیٹ کھول دیا۔ یہ کوئی باقاعدہ گلی نہیں تھی۔ کاٹیج ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ لوگ اپنے گھروں میں گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ کسی کو پتا بھی نہیں چل سکا تھا کہ چانگ ہو کے کاٹیج میں کیا ہو گیا تھا۔

جانکی وین اسٹارٹ کر کے باہر لے آئی۔ میں نے گیٹ بند کر دیا اور دوڑ کر وین میں بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے پچھلی سیٹ پر رکھا ہوا اپنا تھیلا اٹھایا تھا۔ میں نے جانکی کی چادر بھی تھیلے ہی میں ٹھونس لی تھی۔

جانکی کو وہ راستہ یاد تھا جس طرف سے ہمیں لایا گیا تھا۔ وہ انہی راستوں پر وین کو دوڑاتی رہی اور پھر شہری حدود شروع ہوتے ہی سامنے بہت دور سڑک پر ایک گاڑی آتے دیکھ کر ہم دونوں چونک گئے۔ وہ پولیس کی گاڑی تھی چھت پر نیلی اور سرخ بتیاں فلیش کر رہی تھیں۔ جانکی نے بڑی پھرتی سے وین دائیں طرف ایک سڑک پر موڑ لی اور اس کے ساتھ ہی رفتار بھی بڑھا دی۔

وین مختلف چھوٹی سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ پولیس کی وہ پٹرولنگ کار کسی اور طرف نکل گئی تھی۔ جانکی نے وین ایک سنسان جگہ پر روک لی اور انجن بند کر کے نیچے اتر گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

"آگے وین پر جانا مناسب نہیں ہو گا۔" جانکی نے کہا "لاؤ۔ وہ چادر مجھے دو۔"

میں نے تھیلے میں سے زرد رنگ کی وہ... لمبی سی چادر جانکی کو دے دی۔ ہم درختوں کے پیچھے کچھ اور تاریکی میں چلے گئے۔ جانکی نے وہ چادر لپیٹ لی اور ہم سڑک کے کنارے تاریکی میں چلنے لگے۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ میل دور نکل آنے کے بعد ہم ایک پارک میں گھس گئے۔ کنکریٹ کے ایک بینچ پر کوئی آدمی سو رہا تھا۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہم نے کئی آدمیوں کو پارک میں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔ کن منگ لاکھوں کی آبادی پر مشتمل ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں بھی دوسرے بڑے شہروں کی طرح بیروزگاری اور رہائش جیسے مسائل موجود تھے۔ یہ غالباً وہ لوگ تھے جو دن میں مزدوری کرتے تھے یا روزگار کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے اور

رات کو پارکوں اور ایسی ہی جگہوں پر سو جاتے تھے۔ ان میں کتنے ہی ایسے ہوں گے جنہیں رات کو پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوا ہو گا۔ ایک خالی بینچ دیکھ کر ہم بیٹھ گئے۔

"اس وقت تم نے واقعی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "اگر یہ ترکیب استعمال نہ کرتے تو ہم پھنس جاتے۔"

"اس کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "اگر ہم اپنی ضد پر اڑے رہتے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ یا تو مجھے باندھ کر ڈال دیتے یا کسی کمرے میں بند کر دیتے اور اس کے بعد جو جو کچھ بھی ہوتا تم اس کا تصور کر سکتی ہو۔"

"میرا دل تو اب بھی کانپ رہا ہے۔" جانکی نے کہتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "ان تین چار آدمیوں کا قتل تو بلاوجہ ہی ہمارے کھاتے میں ڈال دیا گیا۔" میں نے کہا "میں تو چاہتا تھا کہ ہم مزید کچھ کیے بغیر شاؤلن ٹمپل پہنچ جائیں مگر سب سے پہلے اس اسٹویا میں اس ڈاکو نے ہمیں اپنی جان لینے پر مجبور کیا اور پھر یہ چانگ ہو بیچ میں ٹپک پڑا۔ اگر ان میں سے کسی کو بھی زندہ چھوڑ دیا جاتا تو وہ ہماری موت کا پیغام بن جاتا۔"

"کیا شاؤلن ٹمپل میں بھی مجھے اس حلیے میں رہنا پڑے گا۔" جانکی نے کہا۔

"وہاں کی صورت حال شاید مختلف ہو۔" میں نے کہا "شاؤلن ٹمپل خانقاہ تو برائے نام ہی رہ گئی ہے۔ وہ مارشل آرٹ کا بہت بڑا مرکز بن گئی ہے۔ مارشل آرٹس کے شیدائی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے دنیا بھر سے وہاں آتے ہیں۔ وہاں بڑے بڑے ماسٹر موجود ہیں۔ مہاراج نے بھی کچھ عرصہ وہیں سے تربیت حاصل کی ہے اور وہاں لڑکیاں بھی آتی ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ وہاں تمہیں اس چادر سے نجات مل جائے گی۔"

رات کا آخری پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اچانک ایک طرف سے باتوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر اس طرف دیکھا۔ دور کسی پول پر بلب جل رہا تھا اور اس کی مدھم سی روشنی میں دو آدمی پارک میں داخل ہوتے نظر آئے۔ وہ دونوں پولیس کی وردی میں تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی جسے اس نے پارک میں داخل ہونے کے بعد جلا لیا تھا۔

وہ ٹارچ کی روشنی میں مختلف جگہوں پر سوئے ہوئے لوگوں کو دیکھتے آ رہے تھے۔ ایک دو کو انہوں نے ہلکی ٹھوکریں بھی ماری تھیں۔

"میری گود میں سر رکھ کر اوندھی ہو جاؤ۔ تمہارا چہرہ بھی انہیں نظر نہیں آنا چاہیے۔" میں نے جانکی کے کان میں سرگوشی کی۔

"ان لوگوں کو ہماری تلاش تو نہیں۔" جانکی کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

"پاگل مت بنو۔" میں نے کہا "ابھی تک تو کسی کو پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ اس بنگلے میں کیا ہوا ہے اور پھر ہمیں کس نے دیکھا تھا۔ وہ لوگ اسی طرف آ رہے ہیں۔ اوندھ جاؤ۔ ٹارچ کی روشنی پڑنے پر بھی کسی رد عمل کا اظہار مت کرنا۔"

جانکی نے اوندھ کر اپنا چہرہ میری گود میں چھپا لیا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی پشت پر رکھ دیا اور سر کو پیچھے جھکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک منٹ بعد وہ دونوں پولیس والے ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں جیسے گہری نیند سو رہا ہوں۔ ان دونوں نے آپس میں کوئی بات کی اور پھر وہاں سے آگے چل پڑے۔ میں نے آنکھوں میں معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا۔ وہ دونوں پولیس والے دائیں طرف ایک اور بینچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

وہ پولیس والے تقریباً بیس منٹ تک پارک میں گھومتے رہے اور پھر دوسری طرف سے باہر نکل گئے۔ میں نے جانکی کا کندھا دبا دیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"نیند آ رہی تھی۔ تم نے اٹھا دیا۔ کتنا سکون مل رہا تھا۔" جانکی نے مدھم لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں خمار تھا۔

"اچھا۔ سو جاؤ۔ رات کا تھوڑا ہی حصہ باقی ہے۔ میں بھی کچھ اونگھ لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

جانکی نے دوبارہ سر میری گود میں رکھ لیا اور میں نے بھی سر بینچ کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی۔ میں کبھی آنکھیں کھول دیتا اور کبھی اونگھنے لگتا۔

صبح کی روشنی پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ آس پاس کی عمارتوں میں رہنے والے لوگ ہوا خوری اور جوگنگ میں آنے لگے۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور نوعمر بچے بھی۔ پارک میں سوئے ہوئے بے گھر لوگ اٹھ اٹھ کر جا رہے تھے۔ میں اور جانکی وہیں بیٹھے لوگوں کو جوگنگ کرتے

ہوئے دیکھتے رہے۔
دھوپ نکل آئی۔ پارک میں لوگوں کی تعداد کچھ کم ہونے لگی۔ پارک کے گیٹ سے ذرا ہٹ کر نلکا تھا۔ ہم نے وہاں جاکر منہ ہاتھ دھویا اور دوبارہ ایک ایسی بینچ پر بیٹھ گئے جہاں قرب وجوار میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے تھیلے میں سے وہ تینوں پرس نکال لیے جو چانگ ہو اور اس کے ساتھیوں کی جیبوں میں سے نکالے تھے۔ ان تینوں میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میں نے رقم تو تھیلے میں ڈال لی اور محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ تینوں پرس پودوں کے پیچھے پھینک دیے اور جانکی کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔
بدھ بھکشو عام طور پر بھیک مانگ کر کھانا کھاتے ہیں۔ وہ بھیک مانگنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ البتہ کچھ بھکشو ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو قیمتاً چیزیں خریدتے ہیں۔ ہم نے قیمت ادا کرکے کھانا خریدا اور کھاتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلتے رہے۔
ہم لوگوں سے راستہ پوچھتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے بعد بس اسٹیشن پہنچ گئے۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ شاؤلن ٹمپل کے لیے یہاں سے کوئی بس نہیں جاتی البتہ ایک گھنٹے بعد ہمیں وی یانگ کے لیے بس مل جائے گی وہاں سے ہم ہونان جاسکیں گے جہاں سے شاؤلن ٹمپل جانا آسان ہوگا۔
میں نے ٹکٹ لے لیے اور ہم ایک کونے میں پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو عورتیں بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان۔ ان کی باتیں سن کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کسی قتل کی بات کررہی تھیں۔ ادھیڑ عمر عورت کہہ رہی تھی۔
"وہ انسان نہیں درندہ تھا۔ پہلے اپنے دوستوں کو گردنیں توڑ کر قتل کردیا اور پھر پستول سے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کرلی۔"
"اچھا ہوا وہ خود بھی مرگیا۔" جوان عورت نے کہا "لیکن نجانے مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ چانگ نے نہ تو اپنے دوستوں کو مارا ہے اور نہ ہی خودکشی کی ہے۔ ایسے بے غیرت لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔ مجھے تو شبہ ہے کہ ان تینوں کو کسی اور نے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو ان سے زیادہ طاقت ور تھا جس نے ان کی گردنیں تنکوں کی طرح توڑ ڈالیں۔"
"کس کی بات کررہی ہو مس؟" میں نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی جوان عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کہیں کوئی قتل ہوگیا ہے؟"
"ہمارے علاقے میں تین بدمعاش مارے گئے ہیں۔"
اس عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "پولیس کا خیال ہے کہ ان میں سے ایک نے پہلے اپنے دو ساتھیوں کو قتل کیا اور پھر خودکشی کرلی۔ اچھا ہوا۔ وہ تینوں مرگئے۔ انہوں نے تو پورے شہر میں طوفان اٹھا رکھا تھا۔ پولیس بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ چانگ ہو اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ وہ جس لڑکی کو چاہتے اٹھا کر لے جاتے۔ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ لوگ ڈرتے تھے اس سے۔ اچھا ہوا مرگیا کم بخت۔"
"لوگ لارڈ بدھا کا شانتی کا پیغام بھول گئے ہیں۔ خرابیاں تو پیدا ہوں گی۔" میں نے کہا۔
ان عورتوں کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ بھی اسی علاقے کی رہنے والی تھیں جہاں تہرے قتل کی یہ واردات ہوئی تھی۔ جوان عورت خاصی حسین تھی اس کی باتوں سے میں نے یہ بھی اندازہ لگالیا کہ وہ بھی چانگ کے ہاتھوں چوٹ کھا چکی ہے۔
قتل کی اس واردات کا انکشاف صبح سات بجے ہوا تھا جب چانگ ہو کا ایک اور گرگا اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس نے پولیس کو اطلاع دے دی اور پولیس نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ رات کو چانگ کا اپنے آدمیوں سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ ان میں زوردار قسم کی لڑائی ہوئی۔ وہ دونوں چانگ کے ہاتھوں مارے گئے اور چانگ نے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کرلی۔
لیکن میرے خیال میں پولیس اتنی بے وقوف نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا ہو لیکن اصل بات تو انکوائری کے بعد ہی سامنے آئے گی کہ چانگ ہو نے خودکشی نہیں کی تھی' اسے بھی قتل کیا گیا تھا لیکن بہرحال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ پولیس اس کیس کو کس طرح ہینڈل کرتی ہے۔ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ہم اس کاٹیج میں آتے جاتے کسی کی نظروں میں نہیں آئے تھے اور کچھ دیر بعد ہم یہ شہر چھوڑ دینے والے تھے۔
وہ دونوں عورتیں بھی وی یانگ جارہی تھیں اور انہوں نے بھی اپنے ٹکٹ لے لیے تھے۔ ادھیڑ عمر عورت قریبی اسٹال سے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے آئی تھی اور اس میں ہمارا حصہ بھی تھا۔ میں تو ان عورتوں سے باتیں کرتا رہا لیکن جانکی خاموش ہی رہی تھی۔
بس اسٹیشن پر بڑا رش تھا۔ لگتا تھا شہر کی ساری آبادی نے کہیں نہ کہیں جانے کا پروگرام بنالیا ہو۔ ائرپورٹ اور ریلوے اسٹیشن پر بھی یقیناً یہی صورت حال ہوگی۔
ہماری بس کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم بھی اپنی جگہ سے

اٹھ گئے۔ بس ائر کنڈیشنڈ اور بڑی آرام دہ تھی۔ دو دو مسافروں کی سیٹیں تھیں اور درمیان میں کشادہ جگہ تھی۔ ہماری سیٹ کے دائیں طرف ان عورتوں کی سیٹ تھی۔ جانکی کو میں نے کھڑکی کی طرف بٹھایا تھا تاکہ وہ دوسروں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔
میرا خیال تھا کہ ہم شام سے پہلے پہلے وی یانگ پہنچ جائیں گے مگر یہ سفر بڑا طویل اور تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ رات دس بجے سے پہلے ہم اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکے تھے۔
وی یانگ بھی ایک بڑا شہر تھا۔ بس سے اتر کر جب میں نے اپنی ہم سفر ادھیڑ عمر عورت سے کسی خانقاہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کردی۔ میں نے جانکی کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پاکر یہ پیشکش قبول کرلی۔
ادھیڑ عمر عورت کا نام یاشی اور جوان عورت کا نام کویو میشی تھا۔ اس کی عمر چھبیس ستائیس سال رہی ہوگی۔ ان کی رہائش شہر کے پوش علاقے میں واقع ایک خوب صورت بنگلے میں تھی جہاں ایک خوب صورت لڑکی اور ایک بوڑھا پہلے ہی سے موجود تھے۔ اس لڑکی کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور وہ کویو میشی سے زیادہ حسین تھی جبکہ اس بوڑھے کی عمر ساٹھ سال سے کم نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپکتی تھی۔
وہ خبیث بوڑھا کویو میشی کا چچا تھا۔ وہ اس بات پر سخت برہم تھا کہ وہ لوگ ہمیں اپنے ساتھ کیوں لے کر آئی تھیں۔ اس کا انکشاف تو بعد میں ہوا کہ کویو میشی کا چچا عورتوں کا دھندا کرتا تھا۔ وہ شہر کے بڑے لوگوں کو شراب اور عورتیں سپلائی کرتا تھا اور اس کی جوان اور خوب صورت بیٹی بھی' اس کی آمدنی کا ذریعہ تھی لیکن ہماری وجہ سے کم از کم ایک رات کے لیے اس کا کاروبار ٹھپ ہوگیا تھا۔ ظاہر ہے کسی بھکشو کی موجودگی میں کوئی شخص ایسا گندا کام نہیں کرسکتا تھا۔
کویو میشی اور یاشی کے بارے میں بھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ کن منگ میں ان کا بھی یہی دھندا تھا اور چانگ ہو سے بھی ان کا کچھ تعلق رہا تھا۔ چانگ ہو اور اس کے ساتھیوں کے قتل پر انہیں یہ خوف دامن گیر ہوگیا تھا کہ پولیس انہیں پریشان کرے گی اس لیے وہ دونوں وقت ضائع کیے بغیر وہاں سے بھاگ نکلی تھیں۔
ہمیں کسی کے دھندے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہم نے رات وہاں گزاری اور صبح ہوتے ہی یاشی اور کویو میشی کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے رخصت ہوگئے۔ یاشی نے ازراہِ ہمدردی یا بھکشوؤں سے عقیدت کی بنا پر ہمیں کھانے کا کچھ سامان اور کچھ رقم بھی دے دی تھی۔
وی یانگ سے بارگنگ بھی پورے دن کا سفر ثابت ہوا تھا۔ بارگنگ میں جب ہم بس سے اترے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ رہائش کے لیے جگہ تلاش کرنے میں ہمیں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ یہاں اگرچہ تین بڑی خانقاہیں تھیں لیکن ان تینوں خانقاہوں کے گیٹ شام ہونے سے پہلے ہی بند ہوچکے تھے۔
شہر میں گھومتے ہوئے ہمیں ایک اور آوارہ گرد بھکشو مل گیا۔ وہ ہٹا کٹا آدمی تھا۔ عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ بھی ہماری طرح گنجا ہی تھا۔ تنگ سی پیشانی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ مضبوط ہاتھ پیر۔ وہ اگر چاہتا تو محنت کرکے رزق حلال کما سکتا تھا لیکن وہ بھکشو بن گیا تھا کہ اس طرح محنت کیے بغیر پیٹ بھرنے کو مل جاتا تھا۔
ہکسیان نام کا وہ بھکشو بھی ہماری طرح رات گزارنے کے لیے جگہ کی تلاش میں تھا۔ وہ آوارہ گرد بھکشو ہر اس جگہ جاچکا تھا جہاں بدھ کے ماننے والے آباد تھے۔ وہ ہندوستان میں بھی کئی مہینے گزار چکا تھا۔ تھوڑی بہت ہندی بھی سمجھتا تھا۔ چینی' برمی اور تھائی زبانیں بھی بول لیتا تھا۔
"میں کئی سال پہلے یہاں آیا تھا۔" ہکسیان بتا رہا تھا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ شہر کے باہر دریا کے کنارے پر ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے۔ ہمیں وہاں رات گزارنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ تم لوگ بھی وہیں چلو۔"
ظاہر ہے ہمیں تو رات گزارنے کے لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ ہم شہر سے نکل کر دریا پر واقع اس خانقاہ میں پہنچ گئے۔ خانقاہ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ عمارت کا ایک حصہ دریا کے اندر ایک پختہ چبوترے تک چلا گیا تھا۔ پانچ چھ بھکشو پہلے ہی سے موجود تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو قریہ قریہ گھومتے رہتے تھے اور ہماری طرح رات گزارنے کے لیے یہاں آگئے تھے۔
دریا کی طرف چبوترے پر ایک بہت بڑا شیڈ بنا ہوا تھا۔ تین بھکشو اس شیڈ کے نیچے بیٹھے کچھ کھا رہے تھے۔ بھکشو بننے کے لیے بہت سی شرائط کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جن میں ایک اہم شرط یہ بھی تھی کہ کوئی بھکشو دوپہر کے بعد کسی قسم کی کوئی چیز نہیں کھائے گا۔ یعنی صبح سے دوپہر تک تو کچھ بھی کھایا جاسکتا تھا۔ دوپہر سے اگلی صبح تک کھانے کی ممانعت تھی لیکن میں نے اکثر بھکشوؤں کو دیکھا تھا کہ وہ دوپہر کے بعد اور رات کو

بھی کھاتے پیتے رہتے تھے۔

ہم تینوں بھی شیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ میں نے بھی اپنا تھیلا کھول کر باشی کی دی ہوئی کھانے کی چیزیں نکال لیں۔ ہکسیان بھی ہمارے ساتھ کھانے لگا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی سناٹا سا چھا گیا۔ وہ تینوں بھکشو سو چکے تھے۔ جانکی بھی اونگھنے لگی۔ ہکسیان مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھے ہندوستان کے قصے سنا رہا تھا۔ ہندو پنڈتوں اور یوگیوں کے بارے میں اس کے قصے واقعی بڑے دلچسپ تھے۔ اس کی باتیں سن کر میرے دل میں بھی ہندوستان دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہونے لگا۔ پاکستان تو مجھے جانا ہی تھا۔ لاہور میری جائے پیدائش تھی اور میرے ماں باپ کے دشمنوں نے انہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ مجھے دشمنوں سے بچانا چاہتے تھے۔ میرا مستقبل محفوظ بنانا چاہتے تھے لیکن دشمن ان کے پیچھے سنگاپور بھی پہنچ گئے تھے۔ میرے باپ کا اصل دشمن تو چوہدری نوازش علی ہی تھا جس نے انہیں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور مجھے اس سے انتقام لینا تھا۔ دارا کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ تھا اور کہیں نہ کہیں میرا اور اس کا آمنا سامنا ضرور ہوگا۔

پاکستان جانے سے پہلے میرے لیے شاؤلن ٹمپل جانا ضروری تھا۔ اگرچہ مہاراج کی تربیت نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ دارا، کم اور چی فانگ جیسے لوگ مجھ سے ڈر کر بھاگتے رہے تھے لیکن شاؤلن ٹمپل میں تربیت کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہاں بڑے بڑے ماسٹر موجود تھے۔ میں ان سے بہت کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔ مہاراج نے میرے اندر لاوا ابھارا تھا اور میں شاؤلن ٹمپل کے ماسٹروں سے سیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لاوا آتش فشاں کیسے بنتا ہے۔

ہکسیان سے ہندوستان کی باتیں سن کر میں نے فیصلہ کرلیا کہ جب پاکستان جاؤں گا تو ہندوستان بھی ضرور جاؤں گا۔

ہکسیان کی باتیں کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آرہی تھیں۔ میں بھی یہ سوچ کر ہوں ہاں کرتا رہا کہ کچھ وقت کٹ رہا تھا کیونکہ مجھے نیند تو ویسے بھی نہیں آرہی تھی۔

یہاں مچھروں کی بہتات تھی جو بڑی بے رحمی سے ہمارا خون چوس رہے تھے۔ مچھروں ہی کے کاٹنے سے جانکی بھی اٹھ گئی اور خاموشی سے ہماری باتیں سننے لگی۔

ہکسیان نے اپنے تھیلے میں سے کاغذ کا ایک لفافہ نکال لیا۔

"یہ مٹھائی میں نے آج شام کو خریدی تھی۔" اس نے لفافہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا "لو کھاؤ۔ بڑے مزے کی ہے۔"

وہ برفی قسم کی کوئی چیز تھی۔ میں نے ایک ٹکڑا [illegible] دے دیا اور ایک خود کھانے لگا۔ ہکسیان دوسرے تھیلے سے کوئی اور چیز نکال کر کھانے لگا تھا۔

ہم نے برفی کا صرف ایک ایک ٹکڑا ہی کھایا تھا۔ ہکسیان نے دوبارہ اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ باتوں کا [illegible] ایک بار پھر چل نکلا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھیں [illegible] ہونے لگیں۔ بڑے زور کی نیند آرہی تھی۔ میں سر کو جھٹک رہا تھا لیکن کچھ ہی دیر بعد میں اتنا غافل ہوگیا۔

صبح سات بجے جانکی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ سر منوں بھاری ہو رہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی [illegible] تھی۔

"وہ... وہ بھاگ گیا۔" جانکی کہہ رہی تھی "اٹھو۔ تلاش کرو۔"

"کون بھاگ گیا؟" میں نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ہکسیان... بھاگ گیا وہ..." جانکی نے کہا۔

"بھاگ گیا ہے تو جانے دو۔ میں اسے کیوں [illegible] کروں۔" میں نے کہا۔

"وہ ہمارا تھیلا بھی لے گیا۔" جانکی بولی۔

"کیا..." میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

کونے میں ایک بھکشو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ [illegible] ساتھی چھ بجے سے پہلے ہی چلا گیا تھا اور سرمئی رنگ کا [illegible] کا تھیلا بھی اسی کے پاس تھا۔

"وہ ابھی شہر میں ہی ہوگا۔ چلو۔ اسے تلاش کریں۔" جانکی نے کہا۔

میں نے فوراً ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ شہر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹا لگ گیا۔ ہم مختلف سڑکوں پر اسے تلاش [illegible] رہے۔ بس اسٹیشن پر مختلف لوگوں سے پوچھنے پر معلوم [illegible] اس حلیے کا بھکشو ساڑھے چھ بجے تیانگ ژو کی طرف [illegible] والی بس پر سوار ہوا تھا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس وقت [illegible] آٹھ بج رہے تھے۔ وہ بس میلوں دور جاچکی ہوگی اور [illegible] پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ اس کا پیچھا کرسکتے۔ ہمارے [illegible] جو کچھ بھی تھا اس تھیلے ہی میں تھا۔ اب ہمارے پاس [illegible] کوڑی تک نہیں تھی۔

پودون نائی اس چھوٹے سے گاؤں میں جانکی کے [illegible] میں ایک دکان پر مٹھائی خریدنے گیا تھا تو دکان داروں نے قیمت لیے بغیر مجھے تھوڑی سی مٹھائی دے دی تھی۔ گویا بھکشو کی حیثیت سے وہ پہلا موقع تھا جب مجھے بھیک ملی تھی۔

ایک بھکشو کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ بھیک مانگ کر پیٹ بھرے۔ چین اگرچہ کمیونسٹ ملک تھا لیکن ان علاقوں میں بدھ کے ماننے والوں کی بھی اکثریت تھی۔ کسی دکان پر بدھ کا کوئی مجسمہ آراستہ دیکھ کر ہم سمجھ جاتے کہ دکان کا مالک بدھ کا پیرو کار ہے۔ ہم فوراً ہی اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے۔

تین دن ہم باگرنگ میں بھیک مانگتے رہے۔ تھیلے میں ہمارے پاس اچھی خاصی رقم تھی اور ہم بسوں میں سفر کرکے دو تین دن میں بڑے آرام سے شاؤلن ٹمپل پہنچ سکتے تھے مگر تھیلا چھن جانے کے بعد شاؤلن ٹمپل ہم سے بہت دور ہوگیا تھا۔

چوتھے دن یوشووانگ کی طرف جانے والے ایک مال بردار ٹرک میں لفٹ مل گئی۔

ہمارا سفر رات آٹھ بجے شروع ہوا تھا اور ڈرائیور کے کہنے کے مطابق ہمیں صبح چھ بجے یوشووانگ پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر اس کا معاون بیٹھا ہوا تھا۔ میرے اور جانکی کے لیے ٹرک میں لدے ہوئے سامان میں تھوڑی سی جگہ بنادی گئی تھی۔

صبح چار بجے کے قریب ٹرک خراب ہوگیا۔ میں اس وقت سو رہا تھا۔ ڈرائیور اور اس کے معاون کی آوازیں سن کر میں نیچے اتر آیا۔ ہیلپر اس وقت ٹرک کے نیچے لیٹا ٹارچ کی روشنی میں ٹرک کے نقصان زدہ حصے کا معائنہ کررہا تھا پھر وہ باہر نکل آیا اور ڈرائیور سے کچھ باتیں کرتا رہا اور پھر ٹرک کے پچھلے حصے پر چڑھ گیا۔ میں نیچے کھڑا ڈرائیور سے ٹرک کی خرابی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اوپر سے ہیلپر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میرے اور جانکی کے لیے ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر جگہ بنائی گئی تھی۔ وہیں ٹول بکس بھی بنا ہوا تھا۔ ہیلپر کو ٹول بکس کھولنا تھا اور وہ جانکی کو وہاں سے اٹھا رہا تھا۔ جانکی کی ہلکی سی چیخ سن کر میں چونک گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے جانکی کو ٹرک سے اترتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پیچھے ہی ہیلپر نے بھی چھلانگ لگادی تھی۔ وہ تیز تیز لہجے میں ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

ڈرائیور اور ہیلپر آپس میں تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اس دوران وہ دونوں بار بار جانکی کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں ایسی زبان بول رہے تھے کہ ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا مگر ان کی نظروں اور انداز گفتگو سے میں ان کا پروگرام سمجھ گیا تھا۔

ہیلپر نے اچانک ہی جیب سے چاقو نکال لیا۔ ڈرائیور نے جانکی کی طرف قدم بڑھایا تھا۔ ان کا منصوبہ شاید یہ تھا کہ ہیلپر مجھے چاقو کی زد پر لیے رکھے گا اور ڈرائیور جانکی کو دبوچ لے گا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا۔

مجھے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ڈرائیور اور ہیلپر اپنی اپنی جگہوں پر رک گئے۔ میں نے انہیں ڈرانے کے لیے ہوائی فائر کردیا اور ایک ہاتھ سے جانکی کا بازو پکڑ کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

پندرہ بیس گز دور ہٹ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کھیتوں میں دوڑ لگا دی۔ جانکی بھی میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں ٹرک کے قریب کھڑے تھے۔ کسی نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہم کھیتوں میں بہت دور تک دوڑتے رہے۔ ایک جگہ رک کر سانس درست کیا اور پھر تیز تیز چلنے لگے۔ ڈرائیور نے بتایا تھا کہ صبح چھ بجے کے قریب یوشووانگ پہنچ جائیں گے۔ دو گھنٹے پہلے ٹرک خراب ہوگیا تھا۔ اگر ہم سڑک کے متوازی کھیتوں میں چلتے رہیں تو تین چار گھنٹوں میں یوشو وانگ پہنچ سکتے تھے۔

لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ ہم کھیتوں میں راستہ بھٹک کر سڑک سے بہت دور نکل گئے تھے۔

دن کی روشنی پھیل گئی۔ سورج نکل آیا۔ دھوپ تیز ہورہی تھی۔ دھان کے کھیتوں میں کہیں کہیں کسان کام کرتے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن ہم ان سے دور رہ کر چلتے رہے۔ دوپہر کے قریب بہت دور ایک چھوٹی سی عمارت دکھائی دی۔ آس پاس کوئی بستی نہیں تھی۔

جانکی تھک گئی تھی۔ تیز دھوپ اور پودوں سے پیدا ہونے والے حبس سے گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ لباس پسینے سے تر ہونے لگے تھے۔ جانکی رکنا چاہتی تھی لیکن میں اسے گھسیٹتا رہا۔

کھیتوں میں وہ اکلوتی عمارت اب زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ اس کے اردگرد کچھ درخت بھی تھے۔ ہم ایک جگہ رک کر دیر تک اس عمارت کا جائزہ لیتے رہے۔ وہاں کسی ذی روح کا نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ دراصل ایک چھوٹی سی ویران خانقاہ تھی۔ مرکزی ہال میں ایک چبوترے پر مہاتما بدھ کا بت بڑا مجسمہ تھا جو ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ عمارت کی کھڑکیاں اور دروازے غائب تھے۔ مرکزی ہال کے علاوہ پچھلی طرف دو کمرے تھے۔ دونوں کمروں میں گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی البتہ مرکزی ہال کا فرش صاف ستھرا تھا۔ شاید آس پاس کھیتوں میں کام کرنے والے چینی کاشتکار کچھ دیر سستانے کے لیے یہاں بیٹھ جاتے ہوں گے۔ برآمدہ بھی صاف ستھرا تھا۔

ہم برآمدے ہی میں بیٹھ گئے۔ اسی طرف آتے ہوئے میں نے کھیتوں میں جن کسانوں کو کام کرتے دیکھا تھا وہ نیلے لباس میں تھے جس کا مطلب تھا کہ ان کا تعلق ایک ہی کمیونٹی سے تھا۔ ظاہر ہے وہ کمیونسٹ تھے اور اسی لیے یہ خانقاہ کھنڈر میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہو سکتا ہے جب یہ خانقاہ تعمیر کی گئی ہو۔ اس وقت آس پاس بدھ کے پیروکاروں کی اکثریت ہو لیکن وقت بدل گیا تھا۔

میں جانکی کو برآمدے ہی میں بیٹھا چھوڑ کر عمارت کے پچھلی طرف چلا گیا۔ اس طرف شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی اور میرے لیے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ ندی کے آس پاس تربوز کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں بڑے بڑے تربوز بھی لگے ہوئے تھے۔ میں نے جانکی کو بھی بلا لیا۔ پہلے سیر ہو کر پانی پیا پھر ایک بڑا سا تربوز توڑ کر دوبارہ برآمدے میں آ گئے اور میں خنجر نکال کر تربوز کاٹنے لگا۔

وہ پورا دن اور اگلی رات ہم نے وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارا پیٹ بھرنے کا بندوبست ہو گیا تھا۔ ہم کئی روز یہاں رہ سکتے تھے۔

جانکی کے چہرے پر مایوسی تھی۔ وہ کوئی بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ البتہ میں باتوں سے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا رہا۔

شام ہو چکی تھی۔ اندھیرے کی سیاہ چادر نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہم دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے رہے۔ شام ہوتے ہی ٹھنڈک سی ہو گئی تھی اور اب خنکی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے وجدان۔" جانکی کہتے ہوئے میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"باہر ہوا چل رہی ہے۔ چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔ سردی سے بچے رہیں گے۔" میں نے کہا اور ہم دونوں اٹھ کر اندر آ گئے۔

مرکزی ہال میں ٹٹولتے ہوئے ہم مجسمے والے چبوترے کے پاس پہنچ گئے۔ میرا خیال تھا چبوترے سے ٹیک لگا رہیں گے۔

"رک جاؤ۔ میں اپنی چادر کھول کر فرش ہوں۔ آرام سے لیٹ کر سو جائیں گے۔" جانکی نے

"مگر۔۔۔"

"اس ویرانے میں کون آ کر ہمیں دیکھے گا۔" میری بات کاٹ دی۔ کپڑے کی سرسراہٹ سنائی نے چادر کے دو کونے میرے ہاتھ میں دے دیے ٹٹول کر چبوترے کے ساتھ چادر بچھا دی اور چبوتر ساتھ ٹیک لگا کر ٹانگیں پسار لیں۔

مجھے جلد ہی نیند آ گئی۔ اندازہ نہیں کتنی دیر سو اپنے سینے پر بوجھ محسوس کر کے میری آنکھ کھل گئی۔ ٹٹول کر دیکھا۔ وہ جانکی تھی جو مجھ سے لپٹی ہوئی تھی او جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اسے یقیناً سردی لگ تھی، فرش پر بچھی ہوئی چادر ساڑی کی طرح خاصی میں نے فالتو چادر سمیٹ کر اس کے اوپر ڈال دی۔ اپنے آپ کو جانکی سے الگ کرنا چاہا تھا لیکن اس نے سے مجھے گرفت میں لے رکھا تھا۔

میری آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ میں پھر اور پھر کمر پر لگنے والی ٹھوکر سے میری آنکھ کھ جانکی میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ وہ نیند میں تھی۔ شاید نیند میں اس نے ہاتھ مارا ہو گا لیکن اگلی ٹھوکر زیادہ زوردار تھی۔ اس مرتبہ میں نے آنکھیں پوری کھول دیں اور سر اٹھا کر دیکھا۔ میری نیند کافور ہو گئی اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ پانچ چھ آدمی تھے جنھوں نے ہمیں گھیرے رکھا تھا۔ ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی دو کے ہاتھ تلواریں اور باقی ترشول سے ملتے جلتے ہتھیار لیے ہو اور ان تمام ہتھیاروں کا رخ ہماری طرف تھا۔

میرے سنبھلنے سے پہلے تیسری ٹھوکر میری کر چکی تھی۔ میں اب بھی جانکی کی بانہوں کی گرفت میں نے اس کی گرفت چھڑانے کے لیے جیسے ہی اس پر ہاتھ رکھا، میں چونک گیا۔ جانکی کو تیز بخار ہو رہا تھا۔

میرے دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی نے پھر ٹھوکر مارنا چاہی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے ہاتھ اس کی ٹھوکر کو روک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گرفت سے چھٹکارا حاصل کر کے اٹھنے کی کوشش لیکن اس شخص نے غراتے ہوئے تلواروں کی نوک

سینے پر رکھ دی۔ دوسروں نے بھی اپنے ہتھیار سیدھے کر لیے۔ ایک نے تو ترشول نما ہتھیار سے جانکی کو بھی زد میں لے لیا تھا۔ وہ دراصل ترشول نہیں تھا۔ ایک لمبے سے ڈنڈے کے آگے تین آہنی شاخوں والا ہتھیار سا لگا ہوا تھا۔ یہ دراصل بھوسا یا گھاس وغیرہ جمع کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

جسم پر لگنے والی تین ٹھوکروں اور ان ہتھیار بند لوگوں کی موجودگی سے میرا دماغ بالکل صاف ہو چکا تھا۔ اس وقت میں دونوں کہنیاں فرش پر ٹکائے ذرا سا اوپر کو اٹھا ہوا تھا اور تلوار کی نوک میرے سینے پر تھی۔ وہی شخص چیخ چیخ کر کچھ کہہ بھی رہا تھا۔ وہ اگرچہ چینی زبان ہی بول رہا تھا مگر ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں اسی طرح پڑے پڑے ان لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ باہر اگرچہ دھوپ چمک رہی تھی لیکن کمرے کے اندر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ بغور جائزہ لینے کے بعد پتا چلا کہ ان کی تعداد پانچ تھی۔ جن میں تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں تلوار تھی جو اس نے میرے سینے سے لگا رکھی تھی۔ دوسرے کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ تیسرے نے ترشول سے جانکی کو زد میں لے رکھا تھا۔ ایک عورت کے ہاتھ میں تلوار اور دوسری کے ہاتھ میں ترشول تھا۔

میں نے گردن گھما کر جانکی کی طرف دیکھا جو اب بھی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ وہ یا تو گہری نیند میں تھی یا بدہوشی میں۔ اسے صورت حال کی سنگینی کا کچھ احساس نہیں تھا۔

تلوار والے نے ایک بار پھر چیخ کر کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار کی نوک سے میرے سینے پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈالا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ لوگ اتنے غصے میں کیوں تھے۔ رات کو سوتے میں چادر ہٹ گئی تھی اور میرے بدن پر صرف نیکر تھی۔ جانکی نے تو سونے سے پہلے ہی اپنی چادر فرش پر بچھا لی تھی۔ اس کے جسم پر مختصر سا بلاؤز اور نیکر نما اسکرٹ تھا جو اس وقت اوپر تک سمٹا ہوا تھا۔ وہ جس طرح مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اس سے کوئی بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔

"تم اپنی یہ تلوار ہٹاؤ تو میں اٹھ سکوں گا۔" میں نے اس چینی کی طرف دیکھتے ہوئے رک رک کر کہا جس نے تلوار کی نوک میرے سینے سے لگا رکھی تھی۔

میں نے بھی چینی زبان استعمال کی تھی اور یہ الفاظ رک رک کر کہے تھے اور شاید وہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی، اس نے تلوار میرے سینے سے ہٹا لی۔ جانکی کا ایک ہاتھ اب بھی میرے سینے پر تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ ہٹایا اور سامنے کھڑی ہوئی تلوار بردار عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ شاید کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میری اس ساتھی عورت کو تیز بخار ہے اور اسے سردی بھی لگ رہی ہے۔ یہ ہوش میں نہیں ہے اس لیے مجھ سے لپٹی ہوئی ہے۔ تم خود اسے چھو کر دیکھ لو۔"

میرا اب تک کا یہ تجربہ تھا کہ عورتیں زیادہ نرم دل ہوتی ہیں۔ ان میں ہمدردی اور شفقت کا جذبہ بھی ہوتا ہے۔ کسی کا دکھ جان کر ان کا دل جلدی پسیج جاتا ہے اسی لیے میں نے یہ الفاظ ایک عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے اور میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ وہ چند لمحے الجھی ہوئی نظروں سے مجھے اور جانکی کو دیکھتی رہی پھر اپنے ساتھ کھڑی ہوئی دوسری عورت کی طرف دیکھا۔ اس نے مدھم لہجے میں کچھ کہا تو تلوار بدست عورت دو قدم آگے بڑھ کر جانکی پر جھک گئی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے بایاں ہاتھ جانکی کی پیشانی پر رکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگی جس نے مجھے تلوار کی زد پر لے رکھا تھا۔ اس شخص نے بھی تیز لہجے میں کوئی جواب دیا پھر دوسری عورت سے کچھ کہا۔ اس نے بھی جانکی کو چھو کر دیکھا اور پھر باری باری وہ سب جانکی کے بدن کو چھو کر دیکھنے لگے۔ پہلے تو وہ لوگ یہی سمجھتے رہے تھے کہ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی وجہ سے جانکی خوف سے کانپ رہی ہے اور جان بوجھ کر نہیں اٹھ رہی تھی لیکن اب بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

ان کے ہتھیار نیچے جھک گئے۔ ان کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ تلوار والے چینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے اس مرتبہ رک رک کر بات کی تو اس کا مفہوم سمجھتے

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں
بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات
روشنی کے مینار
قیمت 150/- روپے
ڈاک خرچ 25/- روپے
مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر1

ہوئے میری نظریں بے اختیار اپنی دائیں پنڈلی کی طرف اٹھ گئیں۔ پنڈلی پر چمڑے کے فیتے سے بندھا ہوا خنجر صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس طرح میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ ان کے سامنے میرا مزاحمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ نیکر کے اندر اڑسا ہوا پستول ان کی نظروں میں نہیں آسکا تھا۔ میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ اس کا پستول بلاؤز کے اندر تھا اور وہ بھی ابھی تک ان کی نظروں سے محفوظ تھا۔

"اگر اجازت دو تو میں اٹھ کر اپنا لباس درست کرلوں۔" میں نے اسی چینی کی طرف دیکھا جس کے بارے میں' میں یہ اندازہ قائم کرچکا تھا کہ وہ اس پارٹی کا سربراہ ہے۔ اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔ میں پھرتی سے اٹھ گیا اور پہلی چادر اپنے جسم پر لپیٹنے لگا پھر میں جانکی پر جھک گیا۔

جانکی اب بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کے منہ سے کراہیں سی خارج ہورہی تھیں۔ میں فرش پر بچھی ہوئی چادر اٹھا کر اس کے جسم پر لپیٹنے لگا اور اس دوران میں بڑی ہوشیاری سے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالا اور اپنی چادر میں چھپالیا۔

"کیا تم میری کچھ مدد کروگی؟" میں نے تلوار والی عورت کی طرف دیکھا۔

وہ آگے بڑھ آئی اور جانکی کے بدن پر چادر لپیٹنے میں میری مدد کرنے لگی۔ جانکی کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اسے ملیریا ہوگیا تھا اور فوری طور پر اس کا علاج ضروری تھا۔ اسے تھر تھر کانپتے دیکھ کر ایک آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر اس پر ڈال دیا لیکن اس کی کپکپاہٹ کم نہیں ہوئی۔

اس پارٹی کے سربراہ کا نام ہوکیانگ تھا لیکن وہ بڑے بگڑے ہوئے لہجے میں چینی زبان بول رہا تھا۔ وہ کسان تھے۔ ہوکیانگ نے رک رک کر بتایا کہ صبح سویرے ان کا ایک ساتھی اس طرف آنکلا تھا۔ اس نے ہم دونوں کو ساتھ لیٹے ہوئے دیکھا تو دوسروں کو اطلاع کردی۔ وہ ہمیں جاسوس سمجھ رہے تھے۔ چین کی حدود میں نظر آنے والے ہر اجنبی کو جاسوس سمجھ لیا جاتا تھا اور جو شخص ایک مرتبہ جاسوسی کے الزام میں پکڑا جاتا پھر زندگی بھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔

"ہم جاسوس نہیں ہیں۔" میں نے اس کی بات سن کر کہا "ہم بدھ کے پیروکار ہیں' بھکشو۔ ہم مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے شاؤلن ٹمپل جارہے تھے لیکن راستے میں ایک ٹریجڈی کی وجہ سے ہمیں راستہ بدلنا پڑا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر انہیں بتانے لگا کہ ایک مال بردار ٹرک پر یوشو وانگ کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں ٹرک خراب ہوگیا اور اسی دوران میں ٹرک کے ڈرائیور اور اس کے ہیلپر کو کسی طرح پتا چل گیا کہ میرا ساتھی مرد نہیں عورت ہے۔ ان کی نیت میں فتور آگیا لیکن ہم کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلے اور کھیتوں میں بھٹکتے ہوئے اس طرف آگئے۔

"ہم رات گزارنے کے لیے یہاں رک گئے تھے۔" میں نے کہا "ہمارا خیال تھا کہ صبح ہوتے ہی یوشو وانگ کی طرف روانہ ہوجائیں گے لیکن میری یہ ساتھی۔۔۔" میں جملہ مکمل کیے بغیر خاموش ہوکر جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم لوگ ہندوستانی ہو؟" ہوکیانگ نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"نہیں ہم تھائی ہیں۔" میں نے جواب دیا "بنکاک سے برما اور وہاں سے بھٹکتے ہوئے اس طرف آئے ہیں۔" اب مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ انڈین خاصے بدنام ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہندوستانی دوست بن کر بھی پشت میں چھری گھونپنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن چین سے انڈیا کی روایتی دشمنی سے تو میں واقف تھا۔ پُرامن حالات میں بھی انڈیا کے جاسوس چین کی حدود میں اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہوں گے اس لیے کسی ہندوستانی پر جاسوس ہونے کا شبہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ کن منگ میں چانگ ہونے بھی ہمیں یہی دھمکی دی تھی کہ اگر جانکی کو اس کے حوالے نہ کیا گیا تو وہ ہمیں جاسوسی کے الزام میں پولیس کے حوالے کردے گا اور یہاں بھی ان کسانوں نے سب سے پہلے ہم سے یہی سوال کیا تھا۔

ہوکیانگ اور اس کے ساتھی آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔ دونوں عورتیں بھی اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ مجھے جانکی کی فکر ہورہی تھی۔ اسے فوری طور پر علاج کی ضرورت تھی۔ تاخیر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔

ان کی بحث طول پکڑتی جارہی تھی۔ بالآخر مجھے مداخلت کرنی پڑی۔

"میری ساتھی کو علاج کی ضرورت ہے۔ اگر دیر ہوگئی تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔ یہ مر بھی سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ہوکیانگ نے کہا "فی الحال ہم تم لوگوں کو اپنی بستی میں لے جارہے ہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جائے گا۔ کیا تمہاری ساتھی چل سکتی ہے؟"

"میں اسے کندھے پر اٹھالوں گا۔" میں نے کہتے ہوئے جانکی کی طرف دیکھا پھر ہوکیانگ سے پوچھا "بستی کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔" ہوکیانگ نے جواب دیا۔

میں نے جانکی کو کندھے پر لادلیا اور ہم اس اُجڑی ہوئی عبادت گاہ سے باہر آگئے۔ دھوپ خاصی تیز اور چبھتی ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق نو بجے کا وقت تھا۔ عبادت گاہ کے پچھلی طرف ایک جگہ سے ندی پار کی اور کھیتوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ سب سے آگے ہوکیانگ۔ اس کے پیچھے ایک آدمی' پھر ایک عورت اور اس کے پیچھے میں تھا۔ میرے پیچھے دوسری عورت اور آخر میں وہ آدمی تھا جس نے بارہ بور کی بندوق اٹھا رکھی تھی۔

دھان کے کھیتوں میں پگڈنڈی پر دھوپ میں چلتے ہوئے میں پسینے میں شرابور ہورہا تھا۔ تیز دھوپ کی وجہ سے کھیتوں میں اٹھنے والے بخارات نے گھٹن اور حبس سا پیدا کر رکھا تھا۔ اگر جانکی میرے کندھے پر نہ ہوتی تو مجھے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔

ہوکیانگ نے کہا تھا کہ ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے لیکن اتنی دیر چلنے کے بعد بھی کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں رک گیا اور جانکی کو پگڈنڈی پر بٹھا کر خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا اور اپنا سانس درست کرنے لگا۔ جانکی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ ہوکیانگ وغیرہ بھی رک گئے تھے۔

بندوق والا شخص ان میں سب سے زیادہ صحت مند اور قدرے دراز قامت تھا۔ اس نے اپنی بندوق دوسرے ساتھی کو تھمادی اور جھک کر جانکی کو اٹھانے لگا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

چند منٹ وہاں بیٹھنے کے بعد میں نے جانکی کو دوبارہ کندھے پر اٹھالیا اور ان کے ساتھ چلنے لگا۔ کھیتوں میں مزید بیس پچیس منٹ چلنے کے بعد کسی قدر نشیب میں وہ مختصر سی بستی دکھائی دینے لگی۔

دور ہی سے دیکھا جاسکتا تھا کہ وہ کچے۔۔۔ مکان تھے اور ان کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک دو گھروں سے دھواں بھی اٹھتا ہوا نظر آرہا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو تین عورتیں اور ایک آدمی اور تین چار بچے بستی سے باہر آگئے۔ وہ سب حیرت سے کبھی مجھے دیکھتے اور کبھی میرے کندھے پر لدی ہوئی جانکی کو۔

ہوکیانگ ہمیں ایک مکان میں لے گیا۔ جانکی کو لکڑی کے ایک تختے پر لٹا دیا گیا جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ اس مکان میں ایک دھان پان سی عورت پہلے ہی سے موجود تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ دبلی پتلی سی' بہت گوری رنگت' چہرے کے نقوش بہت دلکش۔ وہ بالکل گڑیا لگ رہی تھی۔

وہ ہوکیانگ کی بیوی ہوکیدو تھی۔ ہوکیانگ نے تیز تیز لہجے میں اس سے کچھ کہا۔ ہوکیدو کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ وہ چند لمحے جانکی کی طرف دیکھتی رہی جو بالکل ٹانگیں سمیٹے گٹھڑی سی بنی پڑی تھی۔

ہوکیدو تیزی سے کمرے سے نکل گئی اور چند ہی منٹ بعد دو تین کمبل لے آئی جو اس نے سب کے سب جانکی پر ڈال دیے اور دوبارہ کمرے سے نکل گئی۔ کمرے میں چار پانچ افراد اور بھی تھے۔ ہوکیانگ نے ان سب کو کمرے سے نکال دیا اور مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی باہر نکل گیا۔

میں دیوار کے قریب پڑی ہوئی لکڑی کی ایک سیدھی پشت والی کرسی تخت کے قریب گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ کرسی کی ساری چولیں ڈھیلی تھیں میرے بیٹھتے ہی وہ چرچرا کر جھولنے لگی۔ کرسی کا یہ احتجاج دیکھ کر مجھے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔

بھاری کمبلوں کے نیچے دبی ہوئی جانکی اب بھی کپکپا رہی تھی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوکیدو ایک پیالی میں کوئی گرم گرم چیز لے آئی۔ اس نے پیالی میرے ہاتھ میں تھمادی اور اشارے سے سمجھانے لگی کہ یہ جانکی کو پلا دیا جائے۔ وہ قہوہ یا جوشاندہ قسم کی کوئی چیز تھی جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں نے پیالی قریب ہی ایک خستہ حال چھوٹی میز پر رکھ دی اور کرسی سے اٹھ کر جانکی کے چہرے سے کمبل ہٹادیے۔

"جانکی۔" میں نے ہولے سے اسے مخاطب کیا "گرم گرم قہوہ پی لو۔ تمہیں کچھ سکون ملے گا۔"

جانکی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ بخار کی شدت سے اس کی آنکھیں بھی بالکل سرخ ہورہی تھیں۔ میں نے اسے سہارا دے کر دیوار کے ساتھ بٹھا دیا اور پیالی اٹھا کر اپنے ہاتھ سے اسے قہوہ پلانے لگا۔ ہوکیدو قریب کھڑی دیکھتی رہی۔ قہوہ پلانے کے بعد میں نے جانکی کو دوبارہ لٹا دیا۔

یہ تو میں سمجھ چکا تھا کہ یہ ملیریا کا حملہ تھا اور میرے لیے تشویش ناک بات یہ تھی کہ اگر اس کا علاج نہ ہوسکا تو اس کی

حالت بگڑ جائے گی اور میرے خیال میں اسے فی الحال طبی امداد ملنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ دس بارہ گھروں کی اس بستی میں ڈاکٹر کی موجودگی یا کسی مناسب طبی سہولت کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھارنے لگے۔ کیا جانکی بھی تھائی کی طرح میرا ساتھ چھوڑ جائے گی؟

پندرہ بیس منٹ اور گزر گئے اور پھر ہوکیانگ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ میرے خیال میں اس عورت کی عمر پچھتر سال سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ کمر کمان کی طرح دہری ہو رہی تھی۔ چہرے پر مکڑیوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ سر پر تھوڑے بہت جو بال رہ گئے تھے وہ برف کی طرح سفید ہو رہے تھے۔ آنکھوں پر موٹے عدسوں کی عینک تھی جس کی دونوں ڈنڈیاں غائب تھیں اور ناک پر عینک کو سہارا دینے کے لیے کانوں پر دھاگے لپٹے ہوئے تھے۔ اس کے کندھے پر میلا سا ایک تھیلا بھی تھا۔

میں اسے دیکھ کر اٹھ گیا۔ ہوکیانگ نے اسے سہارا دے کر کرسی پر بٹھا دیا۔ میں نے قصے کہانیوں میں افریقہ کے وچ ڈاکٹروں کے بارے میں پڑھا تھا اور میرے خیال میں یہ بوڑھی عورت بھی ایسی ہی کوئی چیز تھی جسے جانکی کے علاج کے لیے بلایا گیا تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس بوڑھی عورت نے میری طرف دیکھا۔ میں اندازہ ہی لگا سکا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی پھر اس نے ہوکیانگ سے کچھ کہا۔ ہوکیانگ نے مجھے اس کی بات سمجھائی اور میں نے تخت کے قریب بیٹھ کر جانکی کے چہرے سے کمبل ہٹا دیا اور اس کا ایک ہاتھ باہر نکال دیا۔

بوڑھی عورت نے پہلے جانکی کی پیشانی کو چھو کر دیکھا پھر اس کی نبض دیکھی اور پھر تھیلی کھولتے ہوئے ہوکیانگ سے کچھ کہنے لگی۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ملیریا ہے۔ دو چار روز میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" ہوکیانگ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے تھیلے میں سے دو چھوٹی ڈبیاں نکال لی تھیں۔ اس نے پھر ہوکیانگ سے کچھ کہا، ہوکیانگ نے چھوٹی میز قریب سرکا لی اور دونوں ڈبیاں میز پر رکھ کر کھول دیں۔ ایک میں مٹیالے سے رنگ کا کوئی سفوف تھا اور دوسری ڈبیا میں معجون قسم کی کوئی چیز۔ بڑھیا کے کہنے پر اس نے سفوف کی تین پڑیاں بنا لیں۔ ہر پڑیا میں چٹکی بھر سفوف تھا۔

بڑھیا کے کہنے پر ایک پڑیا جانکی کو کھلا دی گئی اور تھوڑا سا معجون چٹا دیا گیا۔ بڑھیا تقریباً بیس منٹ وہاں بیٹھی ہوکیانگ سے باتیں کرتی رہی۔ میں کبھی بڑھیا کی طرف دیکھتا اور کبھی جانکی کی طرف جس کے چہرے سے کمبل ہٹا ہوا تھا۔ چند منٹ پہلے تک تو یوں لگتا تھا جیسے کمبلوں کے نیچے بھونچال سا آیا ہوا ہو لیکن اب جانکی کی کپکپاہٹ بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی اور بالآخر وہ پرسکون ہو گئی اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے اوپر سے کمبل ہٹانے لگی۔

بڑھیا نے ایک بار پھر آگے جھک کر اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کا ہاتھ کمبل کے اندر تک رینگ گیا اور پھر وہ بڑھیا کچھ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اس نے اپنا تھیلا کندھے پر ڈال لیا تھا۔ دو پڑیاں اور معجون کی ڈبیا میز پر ہی چھوڑ دی گئی تھی۔ ہوکیانگ بڑھیا کو سہارا دے کر باہر لے گیا۔

میں نے جانکی کی پیشانی اور کلائی کو چھو کر دیکھا۔ وہ سفوف یا معجون بڑی حیرت انگیز دوا ثابت ہوئی تھی۔ بخار اتر گیا تھا۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ چند منٹ بعد ہوکیدو ایک اور عورت کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ یہ وہی عورت تھی جو عبادت گاہ سے ہمارے ساتھ آئی تھی اور میں نے عبادت گاہ میں سب سے پہلے اس سے بات کی تھی۔ اس کا نام فوشون تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی تھی۔ ہوکیدو نے ایک ہاتھ میں کپڑا اور تولیا اٹھا رکھا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے باہر نکلتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

مکان کے آنگن میں کچھ لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں، مرد بھی اور بچے بھی۔ ایک آدمی اور دو عورتوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھتے ہوئے گردن کو ذرا سا خم دیا تھا۔ میں نے بھی انہیں آشیرباد دینے والے انداز میں سیدھا ہاتھ اوپر اٹھا دیا تھا۔ میں اس وقت ایک بھکشو تھا اور مجھے وہی کچھ کرنا تھا جو ایک بھکشو کو کرنا چاہیے تھا۔

اس صورت حال سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس بستی کی فضا ہمارے حق میں تھی اور فی الحال ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ہوکیدو اور فوشون نے جانکی کے کپڑے بدل دیے تھے۔ اس کی پیلی چادر بلاؤز اور اسکرٹ، جو پسینے میں تر ہو چکا تھا، دھو کر سوکھنے کے لیے رسی پر ڈال دیے گئے جانکی کو جو لباس پہنایا گیا تھا، وہ پھول دار پاجامہ اور چولی پر مشتمل تھا۔ جب میں دوبارہ کمرے میں آیا تو وہ بالکل چت لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا ہوا تھا مجھے۔ یہ لوگ کون ہیں؟" اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

میں کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ ظاہر ہے اسے بدہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اب تک اس پر کیا بیت چکی ہے۔

"اگر یہ لوگ اس ویران عبادت گاہ میں نہ پہنچتے تو اس وقت تمہارے ہونٹوں پر زندگی کی مسکراہٹ نہ ہوتی۔" میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا "اس میں شبہ نہیں کہ یہ کمیونسٹ ہیں۔ انہیں ہم پر انڈیا کے جاسوس ہونے کا شبہ بھی ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ شبہ اب بھی برقرار ہو لیکن ان کا رویہ ہمارے ساتھ ہمدردانہ ہے۔ ابھی فی الحال کسی سے بات نہیں ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں ہمارے لیے کیا لے کر آتا ہے۔"

"جو کچھ تم بتا رہے، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ اچھے لوگ ہیں اور یہاں ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔" جانکی نے کہا۔

میں نے وہ سارا دن جانکی کے پاس بیٹھ کر ہی گزارا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اسے سفوف کی ایک پڑیا اور کھلا دی گئی اور تھوڑا سا معجون بھی چٹا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں بستی کے لوگ بھی ہمیں دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ لگتا تھا جیسے ہم کوئی عجوبہ ہیں۔ بچوں کی نظروں میں زیادہ تجسس تھا۔ وہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس بستی کے لوگوں نے برسوں بعد کسی بھکشو کو دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے بچوں کے لیے تو میں واقعی ایک عجوبہ تھا۔

یہ لوگ کمیونسٹ تھے انہیں بدھ مذہب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کوئی عورت بھکشو نہیں بن سکتی اس لیے اس لحاظ سے ہم پر کوئی شبہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں ہم سے کچھ پوچھا گیا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بھکشو دوپہر کے بعد کچھ نہیں کھاتے اس لیے ہمیں رات کا کھانا بھی دیا گیا تھا۔ ہوکیدو نے مرغی کا شوربے والا سالن بنایا تھا۔ ہوکیانگ بھی کھانے میں ہمارے ساتھ شریک تھا۔

اس نے بتایا کہ دھان کے کھیتوں میں واقع وہ عبادت گاہ تو تقریباً پچاس سال پہلے ہی ویران ہو گئی تھی اور اس بستی میں آخری بھکشو کو تیس سال پہلے دیکھا گیا تھا۔

ہوکیانگ کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس بوڑھی عورت کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ اس بستی کی معمر ترین عورت تھی۔ اس کا کوئی عزیز نہیں تھا لیکن بستی کے لوگ اسے عزیز رکھتے تھے۔ وہ ہر چھ مہینے بعد وانگ سی کے جنگلوں میں چلی جاتی جہاں سے جڑی بوٹیاں تلاش کر کے لے آتی اور ان سے دوائیں تیار کر کے بستی والوں کا علاج معالجہ کرتی۔ بستی والوں کو اس کا بڑا سہارا تھا۔ قریب ترین بڑا قصبہ بھی یہاں سے ساٹھ میل کے فاصلے پر تھا لیکن علاج کے لیے انہیں وہاں نہیں جانا پڑتا تھا۔ بڑھیا کی تیار کردہ دواؤں میں ہی اس قدر تاثیر تھی کہ بیمار اس کے علاج سے صحت یاب ہو جاتے تھے۔

رات کے کھانے کے بعد ہوکیانگ مجھے بستی کے ایک اور مکان میں لے گیا جس کے بڑے سے ہال کمرے میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے۔ وہ شاید یہ اطمینان کر لینا چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح ان کے لیے نقصان دہ تو ثابت نہیں ہو سکتے۔

انہی کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ یوشو وانگ وہاں سے تقریباً نوے میل کے فاصلے پر تھا۔ میری باتوں سے وہ لوگ بہرحال مطمئن ہو گئے تھے۔ مجھے بتا دیا گیا کہ میری ساتھی جب ٹھیک ہو جائے گی تو ہمیں یہاں سے رخصت کر دیا جائے گا۔

رات کو جانکی کو پھر تیز بخار ہو گیا۔ ہوکیانگ کے مشورے سے سفوف کی تیسری پڑیا بھی اسے کھلا دی گئی۔ میں رات بھر جانکی کے سرہانے بیٹھا رہا۔ صبح پانچ بجے کے قریب بخار ٹوٹا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر دن کی روشنی پھیلتے ہی ہوکیانگ اس بڑھیا کو بلا لایا۔ اس نے وہی دوا جاری رکھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ جانکی کا بخار ختم ہو چکا تھا مگر اس میں کمزوری اس قدر ہو گئی تھی کہ وہ سہارے کے بغیر چل بھی نہیں سکتی تھی۔ ایسی صورت میں سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس چھوٹی سی بستی میں قیام کے دوران میں یوں تو ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن منگ شوئی نامی ایک شخص کی طرف سے مجھے کچھ تشویش ہو رہی تھی۔ وہ لمبا تڑنگا شخص شکل صورت ہی سے چھٹا ہوا لگتا تھا اور پچھلے چند روز کے دوران میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جانکی کی مزاج پرسی کے بہانے دن میں کئی کئی بار اس گھر کے چکر لگاتا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ جانکی کے چکر میں ہے لیکن مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ دراصل ہوکیدو کو پٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور میں نے یہ بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہوکیدو اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اسے منگ شوئی کو ڈانٹتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

میں صبح سویرے کھلی فضا میں بیٹھ کر یوگا کی مشق کیا کرتا تھا۔ اس روز بھی پانچ بجے کے قریب میں اپنے کمرے سے نکلا۔ یہی وقت تھا جب بستی کے کاشتکار کھیتوں پر کام کرنے کے لیے نکلا کرتے تھے۔ ہوکیانگ بھی کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔ ہوکیدو بھی اس کے ساتھ جایا کرتی تھی لیکن ہماری وجہ سے وہ کئی روز سے گھر پر رہ رہی تھی۔

میں مکان کے اوپر سے گھوم کر پچھلی طرف کھلی جگہ پر آگیا۔ یہاں ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا۔ میں اسٹائس بنا کر اسی چبوترے پر بیٹھ گیا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں اٹھ گیا۔ واپس جانے کے لیے میں جیسے ہی ہوکیدو کے مکان کے ایک کمرے کی عقبی کھڑکی کے قریب سے گزرا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ کمرے سے کچھ دھینگا مشتی جیسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ کھڑکی بند تھی لیکن ایک باریک سی جھری سے مجھے اندر جھانکنے کا موقع مل گیا اور دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ دو سائے آپس میں گتھم گتھا نظر آرہے تھے۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اوپر سے گھوم کر مکان میں آگیا۔ ہوکیدو کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور جانکی ہوکیدو کو آوازیں دیتی ہوئی دروازے کو تھپتھپا رہی تھی۔

"کیا بات ہے جانکی۔ اندر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے دھینگا مشتی ہو رہی ہو۔ میں آواز سن کر ہی یہاں آئی ہوں مگر دروازہ اندر سے بند ہے۔" جانکی نے کہا۔

"ہوکیدو۔ دروازہ کھولو۔ کیا ہو رہا ہے، اندر کون ہے؟" میں نے دروازہ دھڑدھڑاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

اس دوران میں دو ادھیڑ عمر عورتیں بھی آگئی تھیں۔ ان دونوں کے سروں پر تنکوں سے بنے ہوئے چوڑے چھجے والے ہیٹ تھے اور وہ کھیتوں پر جانے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکلی تھیں مگر شاید جانکی کی مزاج پرسی کے لیے اس طرف آگئی تھیں۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" ایک عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اندر کوئی گڑبڑ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اندر سے اٹھا پٹخ کی آوازیں سن کر وہ دونوں عورتیں بھی چونک گئیں۔ میں نے ان عورتوں کی طرف دیکھا اور پھر گھوم کر دروازے پر کندھے سے زوردار ٹکر ماری۔ دروازہ پہلی ہی ٹکر میں جھول گیا۔

اندر کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا۔ منگ شوئی اور ہوکیدو ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ہوکیدو کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ منگ شوئی نے ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دروازہ ٹوٹتے ہی وہ پہلے ہماری طرف گھوما پھر ہوکیدو کو چھوڑ کر بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیب سے پستول نکال لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پستول والا ہاتھ سیدھا کرتا میں اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

میرے پیر کی ٹھوکر اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ وہ ایک لمحے کو بدحواس ہوا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں غافل تو نہیں تھا۔ اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ بلبلاتا ہوا کمرے میں ناچنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں محض بھکشو ہوں لیکن میرے دو چار ہاتھوں نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے۔

منگ شوئی نے موقع پاتے ہی دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ وہ دروازے میں کھڑی ہوئی ایک عورت سے ٹکرایا۔ وہ چیختے ہوئے نیچے گری۔ جبکہ منگ شوئی نے سنبھل کر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی لپکا لیکن وہ باہر گلی میں جا چکا تھا۔

میں واپس آگیا۔ تین چار عورتیں کمرے میں جمع ہو چکی تھیں۔ ہوکیدو پلنگ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سینے اور گردن پر خراشیں نظر آرہی تھیں۔ جانکی نے اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

بستی کی بیشتر عورتیں اور مرد کھیتوں پر گئے ہوئے تھے جو لوگ بستی میں تھے وہ شور سن کر جمع ہو گئے تھے۔ میں نے کمرے میں ایک طرف پڑا ہوا منگ شوئی کا پستول اٹھا لیا اور کمرے سے باہر آگیا۔

آدھے گھنٹے میں ہوکیانگ اور چھ سات دوسرے کسان اطلاع پا کر کھیتوں سے آگئے۔ وہ سب بہت غصے میں تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد منگ شوئی کی تلاش شروع ہو گئی۔ ہر جگہ دیکھ لیا گیا لیکن منگ شوئی بستی میں نہیں تھا اور پھر ایک بچے نے بتایا کہ اس نے منگ شوئی کو بستی سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کچھ لوگ اس کی تلاش میں بچے کی بتائی ہوئی سمت میں کھیتوں میں نکل گئے۔

دوپہر تک منگ شوئی کی تلاش جاری رہی لیکن وہ غائب ہو چکا تھا۔ ہوکیانگ میرا بہت شکر گزار تھا کہ میں نے اس کی

بیوی کی عزت بچالی تھی۔ میں نے منگ شوئی کا پستول ہوکیانگ کے حوالے کر دیا تھا۔

اس واقعے کے بعد بستی والوں کی نظروں میں ہماری عزت بڑھ گئی تھی۔ بستی کے سب ہی لوگ شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس آتے رہے۔ منگ شوئی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تقریباً آٹھ مہینے پہلے یہاں آیا تھا اور اس دوران میں اس نے دو تین مرتبہ ایسی حرکتیں کی تھیں۔ ایک مرتبہ تو وہ پٹتے پٹتے رہ گیا تھا۔ اسے وارننگ دی گئی تھی کہ آئندہ ایسی کوئی حرکت کی تو بستی سے نکال دیا جائے گا۔

گزشتہ تین مہینوں کے دوران میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ وہ پھر کوئی ایسی حرکت کرنے والا ہے۔ وہ ہوکیدو اور ایک اور عورت کو اکثر گھور گھور کر دیکھا کرتا تھا۔ وہ ہوکیانگ کے گھر کبھی نہیں آیا تھا لیکن جانکی اور میری وجہ سے اسے موقع مل گیا۔ وہ جانکی کی مزاج پرسی اور مجھ سے ملنے کے بہانے یہاں آنے لگا اور اس دوران میں شاید وہ موقع کی تلاش میں رہا تھا۔

ہوکیانگ کھیتوں پر چلا گیا تھا اور میں مکان کے پچھلی طرف چبوترے پر آگیا جہاں یوگا کی مشق کیا کرتا تھا۔ منگ شوئی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا ہو گا جانکی سو رہی ہو گی۔ وہ ویسے بھی بیمار عورت تھی اس کی طرف سے مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اسے بستی چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔

ہم چار دن مزید اس بستی میں رہے۔ اچھی خوراک اور آرام کی وجہ سے جانکی اب پہلے سے کافی بہتر ہو گئی تھی۔

"اب آگے چلنے کا موڈ ہے یا....."

"بہت آرام ہو چکا بھئی۔" جانکی نے میری بات کاٹ دی "میں تو بستر پر لیٹے لیٹے اکتا گئی ہوں۔ اب تو یہاں سے نکل ہی جانا چاہیے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس رات میں نے ہوکیانگ سے بھی بات کر لی تھی۔ یہ طے ہوا کہ صبح سویرے ہمیں چھکڑے پر لویانگ پہنچا دیا جائے گا۔ یہ گاؤں اس بستی سے اٹھارہ میل دور ہائی وے کے کنارے پر واقع تھا۔ وہاں سے ہمیں یوشوانگ کے لیے بس مل جائے گی۔

صبح رخصت ہونے سے پہلے ہوکیدو نے کپڑے کا ایک تھیلا میرے ہاتھ میں تھما دیا جس میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں۔ جانکی پیلی چادر لپیٹ کر ایک بار پھر بھکشو بن گئی تھی۔ بستی کے باہر چھکڑے کے قریب بہت سے لوگ جمع تھے۔ اس چھکڑے کے پہیے کسی موٹر کے تھے جس وجہ سے یہ زیادہ اونچا نہیں تھا۔ آگے ایک خچر جتا ہوا تھا۔ کوچوان کی سیٹ نسبتاً اونچی تھی جبکہ پچھلا حصہ کسی قدر نیچے تھا۔ جس میں پیال بچھی ہوئی تھی۔ دور دراز کے علاقوں میں مال برداری اور آمد و رفت کے لیے اسی قسم کی سواریاں تھیں۔ ہم سب لوگوں سے رخصت ہو کر چھکڑے میں بچھی ہوئی پیال پر بیٹھ گئے اور کوچوان نے خچر کو ہانک دیا۔ ادھیڑ عمر کوچوان بھی خچر کی طرح مریل اور دبلا پتلا سا تھا۔ اس نے سر پر چوڑے چھجے والا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ جانکی اور میں نے بھی اسی قسم کے ہیٹ اوڑھ رکھے تھے جو ہمیں بستی والوں نے دیے تھے۔ بستی کے دوسرے لوگوں نے بھی ہمیں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں دی تھیں جن سے میرا تھیلا بھر گیا تھا۔ یہ چیزیں ایسی تھیں جو کئی دنوں تک خراب نہیں ہو سکتی تھیں اور ہم انہیں اطمینان سے استعمال کر سکتے تھے۔

چھکڑا کھیتوں کے درمیان کچے راستوں پر اچھلتا ہوا جا رہا تھا۔ اچھے خاصے جھٹکے لگ رہے تھے۔ دھوپ جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی گرمی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا، چھجوں والے ہیٹ اس وقت ہمارے کام آرہے تھے۔ چھکڑا جس رفتار سے چل رہا تھا، اس سے مجھے لگ رہا تھا کہ ہم اٹھارہ میل کا فاصلہ دو گھنٹوں سے پہلے طے نہیں کر سکیں گے۔ کوچوان تو چابک سے خچر کی خوب پٹائی کر رہا تھا لیکن اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم دھان کے کھیتوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے۔ یہ راستہ کسی قدر ہموار تھا اور اس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔ راستے سے تقریباً پچاس فٹ ہٹ کر ایک چوڑی نہر بہہ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کوچوان کے قریب اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا اور رک رک کر بولتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا کہ ہمیں ابھی اور کتنا فاصلہ طے کرنا ہو گا۔

"تقریباً آدھے گھنٹے کا راستہ باقی ہے۔" کوچوان نے جواب دیا اور جیب سے بیڑی کی طرح کا ایک لمبا سا چرٹ نکال کر سلگانے لگا۔ اس کی بو بڑی ناگوار سی تھی۔ میں دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا۔

تقریباً دس منٹ تک اس راستے پر چلتے رہنے کے بعد چھکڑا دائیں طرف مڑ گیا۔ آگے نہر کا پل تھا اور اس سے آگے جنگل سا تھا۔ وہ راستہ اسی جنگل میں سے گزرتا تھا۔ نہر

تقریباً چالیس فٹ چوڑی تھی۔ ابھی پل کا آدھا فاصلہ طے ہوا تھا کہ چھکڑا رک گیا۔ کوچوان نے پیچھے مڑ کر کچھ کہا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ گردن پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

تین آدمی پل پر راستہ روکے کھڑے تھے۔ ان میں دو کے پاس رائفلیں تھیں اور تیسرے کے پاس ریوالور۔ درمیان میں قد آور آدمی کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ منگ شوئی تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ انہیں دیکھتے ہی نہ صرف کوچوان نے چھکڑا روک لیا تھا بلکہ لگام چھوڑ کر دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا دیئے تھے۔

دو آدمی فوراً ہی چھکڑے کے دائیں بائیں آگئے تھے۔ ان دونوں نے مجھے اور جانگی کو رائفلوں کی زد میں لے لیا جبکہ منگ شوئی نے کوچوان کو گریبان سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔

کوچوان... خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"منگ شوئی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" وہ گھگیا رہا تھا۔

"میں تم پر اپنی گولی ضائع نہیں کروں گا لیکن ظاہر ہے تمہیں زندہ بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔" منگ شوئی نے کہا اور اسے ایک ہی ہاتھ سے گریبان سے پکڑ کر زمین سے تقریباً دو فٹ اوپر اٹھالیا۔ کوچوان اس کی منت سماجت کررہا تھا لیکن منگ شوئی نے اسے مزید اوپر اٹھا کر ایک جھٹکے سے نہر کی طرف اچھال دیا۔

کوچوان کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ اس کے پیر پل کی ریلنگ سے ٹکرائے اور وہ قلابازی کھاتا ہوا نہر میں جاگرا۔ پل کے نیچے پلرز کے قریب پانی میں بھنور سے بن رہے تھے۔ کوچوان ایسے ہی ایک بھنور میں گر کر پانی کی تہ میں غائب ہوچکا تھا۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ وہ تو پہلے ہی بیمار رہ چکی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ خوف سے بالکل سفید ہورہا تھا۔ ہم چھکڑے کے دونوں طرف سے رائفلوں کی زد پر تھے۔ میرے پاس اگرچہ دو پستول موجود تھے لیکن اس وقت کوئی حرکت کرنا خودکشی کرنے کے مترادف تھا۔

منگ شوئی نے چیخ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ ان میں سے ایک چھکڑے پر پچھلی طرف سوار ہوگیا۔ دوسرا کوچوان کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے رائفل اپنے سامنے پائدان کے قریب کھڑی کرکے لگام سنبھال لی۔ منگ شوئی بھی اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا اور اس نے مجھے رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ چھکڑا حرکت میں آگیا۔

"منگ شوئی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ایک غلطی کرچکے ہو جس کے نتیجے میں تمہیں بستی سے فرار ہونا پڑا۔ اب تم دوسری غلطی کررہے ہو۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہوگے۔"

"اس کا نتیجہ صرف تمہاری موت کی صورت میں نکلے گا۔" منگ شوئی نے غراتے ہوئے جواب دیا "تم دونوں کی مداخلت کی وجہ سے مجھے نہ صرف ان لوگوں کے سامنے ذلیل ہونا پڑا بلکہ بستی بھی چھوڑنی پڑی۔"

"ہماری مداخلت سے تو تمہیں بھاگنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔ اگر پکڑے جاتے تو وہ لوگ تمہیں قتل کردیتے۔" میں نے کہا۔

"وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔" منگ شوئی نے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ ہوکیدو لوگوں کو بتا دیتی کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟ نہیں مسٹر بھکشو۔ میں آٹھ مہینوں سے اس بستی میں رہ رہا تھا۔ بستی کی عورتیں اپنے مردوں کو کچھ نہیں بتاتیں۔ ہوکیدو بھی اپنی زبان بند رکھتی۔ ان آٹھ مہینوں کے دوران میں کئی عورتیں میری قوت کا مظاہرہ دیکھ چکی ہیں۔ کسی نے آج تک زبان نہیں کھولی' ہوکیدو بھی خاموش رہتی لیکن تمہاری وجہ سے مجھے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ تمہیں تو ظاہر ہے میں زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن تمہاری یہ ساتھی۔ اسے تو میں کئی دنوں تک زندہ رکھوں گا۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے منگ شوئی۔" میں نے جواب دیا "میری موجودگی میں تم نے ایک عورت کی عزت لوٹنے کی کوشش کی اور بچ کر بھاگ نکلے اور پھر میری نظروں کے سامنے ایک بے گناہ کو اٹھا کر نہر میں پھینک دیا۔ دونوں جرائم نہایت سنگین ہیں اور ہم ان دونوں جرائم کے چشم دید گواہ ہیں لیکن ہم بھکشو لوگ ہیں۔ ان دنیاوی بکھیڑوں میں نہیں الجھنا چاہتے۔ تم ہماری منزل کھوٹی مت کرو۔ ہمیں اپنے راستے پر جانے دو۔ ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔"

"تم تو سب کچھ بھول جاؤ گے مگر میں بستی والوں کے سامنے اس ذلت کو کیسے بھول سکوں گا جس کے ذمے دار تم دونوں ہو۔" منگ شوئی نے کہا "تمہارے بارے میں تو فیصلہ کرلیا ہے کہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا اور تمہاری ساتھی کو بھی اس قابل نہیں چھوڑوں گا کہ یہ کسی کے سامنے اپنی زبان کھول سکے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ کون کیا کرتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔"

"پوچھو۔ میں سمجھا دوں گا تمہیں۔" منگ شوئی نے کہا۔

"تم لوگ یہاں اس طرح ہمارا راستہ روکے کھڑے تھے جیسے تمہیں پہلے سے معلوم ہو کہ ہم اس طرف سے گزریں گے۔" میں نے کہا۔

"اس بستی میں کم از کم دو آدمی اب بھی ایسے ہیں جو میرے ہمدرد ہیں۔ وہ دونوں ہمیشہ میری سرگرمیوں میں شریک رہے ہیں۔" منگ شوئی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "کل رات تم نے ہوکیانگ کو بتا دیا کہ صبح بستی سے جانا چاہتے ہو۔ ہوکیانگ نے رات ہی کو کمیونٹی ہال میں سب کو بتا دیا کہ تم صبح روانہ ہونا چاہتے ہو۔ یہ پروگرام وہیں پر طے ہوا تھا کہ تم لوگوں کو چھکڑے پر لوبانگ چھوڑ دیا جائے گا۔ مجھے رات ہی کو یہ اطلاع مل گئی تھی اور میں صبح سے یہاں تم لوگوں کے انتظار میں کھڑا تھا۔"

"تم ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں۔" منگ شوئی نے جواب دیا "اسی جنگل میں تھوڑا ہی آگے ایک محفوظ جگہ ہے جہاں کسی کی مداخلت کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔"

میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کی پیلاہٹ تھی۔ ہم رائفلوں کی زد میں بیٹھے تھے۔ منگ شوئی نے ہمیں اپنے منصوبے سے بھی آگاہ کردیا تھا۔ بظاہر ہے ایسی صورت میں مطمئن کیسے ہوسکتے تھے۔

خچر گاڑی پل سے دو فرلانگ آگے جاکر جنگل میں بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ اس طرف کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ درخت زیادہ گنجان نہیں تھے۔ خچر گاڑی ان کے بیچ میں گھومتی ہوئی جارہی تھی۔

جانگی میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی چادر میں ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا اور غیر محسوس انداز میں ہاتھ کو حرکت دیتا ہوا جانگی کی چادر میں داخل کردیا اور پستول جانگی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اگر اسے مجھ سے الگ کردیا جاتا تو وہ کم از کم اپنا دفاع تو کرسکے گی۔

خچر گاڑی تقریباً آدھے گھنٹے تک جنگل میں چلتی رہی اور بالآخر ایک کھنڈر نما چھوٹی سی عمارت کے سامنے رک گئی۔ یہ بھی غالباً کوئی بدھ عبادت گاہ تھی جو کھنڈروں میں تبدیل ہورہی تھی۔

منگ شوئی اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا اور اس کے دونوں ساتھی گاڑی سے نیچے اتر گئے اور رائفلوں کی زد پر لے کر ہمیں بھی نیچے اتار لیا۔

"یہ تمہارے گرد بدھ کی عبادت گاہ ہے۔" منگ شوئی نے گاڑی سے اتر کر مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا "یہاں تو اب بدھ کا مجسمہ بھی نہیں رہا لیکن تمہیں موت کے گھاٹ اتار کر اس چبوترے پر اس طرح بٹھا دیا جائے گا کہ برسوں بعد اگر کوئی بھکشو اس طرف آنکلا تو تمہارا ڈھانچا دیکھ کر حیران ضرور ہوگا۔"

"دیکھو منگ۔" میں نے کہا۔ میرا لہجہ اب بھی پرسکون تھا "تم بہت بڑی غلطی کررہے ہو۔ ایک جرم کو چھپانے کے لیے کئی جرم کرنا پڑتے ہیں۔ تم راستے سے بھٹک رہے ہو۔ اب بھی وقت ہے' ہمیں یہاں سے جانے دو۔ ہم سب کچھ بھول جائیں گے۔"

"اندر چلو۔ ابھی میں تمہاری زبان بند کرتا ہوں۔" منگ شوئی نے مجھے ایک اور دھکا دیا۔

مرکزی ہال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ سامنے ہی ایک ٹوٹا پھوٹا چبوترا تھا۔ ہال کے بائیں طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ وہ ہمیں دھکے دیتے ہوئے اس راہداری میں لے گئے۔ اس راہداری کے اختتام پر آمنے سامنے دو کمرے تھے۔ دروازہ کسی کمرے کا نہیں تھا۔

منگ شوئی جانگی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دائیں طرف والے کمرے میں لے گیا جبکہ اس کے دونوں ساتھی مجھے رائفلوں کی زد پر لے کر دوسرے کمرے میں داخل ہوگئے اور مجھے دائیں طرف والی دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا۔ ہم جس جگہ کھڑے تھے وہاں سے دوسرے کمرے میں نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دوسرے کمرے سے کچھ ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جانگی اور منگ شوئی میں کچھ کھینچا تانی ہورہی تھی پھر جانگی کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ اس کے فوراً ہی بعد منگ شوئی کا زوردار قہقہہ سنائی دیا۔

میں دیوار کے قریب کھڑا تھا۔ میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

جانگی کی ایک دو دبی دبی سی چیخیں اور سنائی دیں اور پھر منگ شوئی کی دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ چیختے ہوئے گالیاں بک رہا تھا پھر جانگی کی ایک اور چیخ سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد فائر کی آواز گونج اٹھی۔ میرا دل اچھل کر حلق

میں آگیا۔ میرے سامنے کھڑے ہوئے دونوں آدمی بھی اچھل پڑے۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان میں سے ایک بڑی تیزی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔

اب میرے سامنے جو آدمی کھڑا رہ گیا تھا' اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ ایک لمحے کو بھی میری طرف سے غافل نہیں ہوا تھا لیکن ٹھیک ایک منٹ بعد دوسرے کمرے سے اپنے ساتھی کی چیخ سن کر اس نے ایک لمحے کو دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو دنیا کا سب سے بڑا احمق کہلاتا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ میں دونوں ٹانگیں جوڑ کر ہوا میں اچھلا تھا لیکن اس کے قریب پہنچتے ہی میرے دونوں پیر الگ ہو گئے۔ میرا ایک پیر اس شخص کے منہ پر لگا اور دوسرا پیر اس کے ریوالور والے ہاتھ پر لگا تھا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلاتا ہوا پچھلی دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ ریوالور بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا گرا تھا۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس طرف جا کر ریوالور اٹھاتا۔ اس سے زیادہ پھرتی سے میں نے اپنا پستول نکال لیا اور سنبھلتے ہی دوسرے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

منگ شوئی کا دوسرا ساتھی کمرے کے وسط میں سامنے ہی کھڑا تھا۔ اس نے فرش پر پڑی ہوئی جانکی کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا لیکن وہ بہت پھرتیلا اور حاضر دماغ ثابت ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی دیکھ لیا تھا کہ کمرے میں داخل ہونے والا اس کا ساتھی نہیں کوئی اور تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنا رخ بدلا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی چھلانگ لگا چکا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہوئے میں نے بڑے زور سے یل (YELL) بھی کیا تھا۔ حریف پر حملہ آور ہوتے ہوئے چنگھاڑتی ہوئی آواز حریف پر دہشت طاری کر دیتی ہے۔ اس مرتبہ بھی میرے چنگھاڑنے کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ وہ آدمی بد حواس ہو گیا۔ میں اس کے اوپر گرا تو اس کی رائفل کی نال میرے بازو کے نیچے سے ہوتی ہوئی پیچھے نکل گئی تھی۔ اس شخص نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ رائفل سے نکلنے والی گولی سامنے والی دیوار پر لگی تھی۔

میں اس شخص کے اوپر گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل کر پستول کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں ٹھونس دی۔ اس نے ایک بار پھر رائفل کا ٹریگر دبا دیا تھا۔ گولی اس مرتبہ بھی دیوار پر لگی تھی۔

"رائفل چھوڑ دو۔" میں غرایا "ورنہ پستول کی گولی تمہارے تالو کو چیرتی ہوئی کھوپڑی کے پار ہو جائے گی۔"

اس نے رائفل چھوڑ دی۔ پستول کی نال اس[...] میں ٹھنسی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بول نہیں سکتا تھا [...] و دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں اس کی دلی کیفیت [...] کر رہی تھیں۔

اسی دوران میں اپنے عقب میں پستول کے فا[...] سن کر میں نے تیزی سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرا [...] میں فلائنگ کک لگا کر دوسرے کمرے میں چھوڑ آیا [...] کمرے سے صرف دو قدم آگے ایک ہاتھ سینے پر ر[...] کھڑے لہرا رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ریوا[...] اس دم ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ اس کی مو[...] پرخچے اڑ گئے تھے۔

میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ جا[...] کے بل فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں [...] تھا۔ میری طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف [...] مسکراہٹ آگئی۔

میں اپنے حریف کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پستول [...] کے منہ سے نکال لیا لیکن اپنا ایک پیر اس کی گردن [...] اسے دبائے رکھا۔

جانکی بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی چادر ا[...] پڑی تھی اور بلاؤز پھٹا ہوا تھا۔ اس کے چند قدم کے [...] منگ شوئی کی لاش پڑی تھی اس کے سینے سے بہنے [...] فرش پر بچھی ہوئی پیال پر بہہ رہا تھا۔

جانکی نے پستول پھٹے ہوئے بلاؤز کے اندر ٹھونس [...] چادر اٹھا کر بدن پر لپیٹنے لگی۔ میں اب بھی اس شخص [...] پر پیر رکھے کھڑا تھا۔

"اسے ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے کیا۔ ختم [...] بھی۔" جانکی نے کہا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ [...] تھی۔

میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اپنے دو ساتھیوں کا ا[...] کر وہ شخص خوف سے ادھ موا ہو رہا تھا۔ دہشت سے [...] آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف [...] پھر گھگھیاتا ہوا میرے سامنے سجدے میں گر گیا۔ م[...] اور پیچھے ہٹ گیا اور اس کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر [...] دیا۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر پیچھے گرا اور پانی سے [...] مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی کھوپڑی سے خون [...] چاروں طرف اڑ رہے تھے۔

ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رکے اور کمرے سے نکل [...]

[...] پستول اور رائفلیں بھی لاشوں کے قریب ہی چھوڑ دی گئی تھیں۔

باہر نکلتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ لاشوں کے معاملے میں میرا کھاتا خاصا طویل ہوتا جا رہا تھا۔ بعض ایسے لوگ بھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے جنہیں میں مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن اگر انہیں زندہ چھوڑ دیا جاتا تو میری اپنی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اب یہی مثال آپ کے سامنے ہے۔ منگ شوئی کو میں نے اور جانکی نے ایک عورت کے ساتھ زیادتی سے روکنے کی کوشش کی تھی اور اس نے ہمیں ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ یقیناً مجھے ختم کر دیتا اور پھر جانکی کی موت بھی بڑی دردناک ہوتی۔ جو لوگ دوسروں پر رحم کرنا نہیں جانتے وہ بھی کسی ہمدردی اور رحم کے مستحق نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کا دھرتی سے اٹھ جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

خچر گاڑی اس کھنڈر نما عبادت گاہ سے چند گز دور درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ وہ خچر واقعی بڑا بھلا مانس تھا جس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ جانکی چھکڑے کے پچھلے حصے میں بیٹھ گئی اور میں نے کوچوان کی [...] سیٹ سنبھال کر لگام تھام لی۔ اسی لمحے مجھے وہ کوچوان یاد آگیا جسے بڑی بے دردی سے نہر کی تیز لہروں میں پھینک دیا گیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ زندہ بچا ہوگا۔ وہ تو ڈوبنے سے پہلے خوف سے ہی مر گیا ہوگا۔

میں نے خچر کو ہانکتے ہوئے گاڑی کا رخ موڑ دیا اور ایک بار پیچھے مڑ کر عبادت گاہ کی طرف دیکھا۔ ایسی ویران عبادت گاہیں ہی ڈاکوؤں اور منگ شوئی جیسے لوگوں کا مسکن بنتی ہیں۔

جنگل میں پہیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ میں خچر کو اس راستے پر چلاتا رہا اور بالآخر نہر کی طرف سے آنے والے راستے پر بائیں طرف موڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی راستہ ہمیں لوپانگ لے جائے گا۔

یہ جنگل ویران تھا۔ جاتے یا واپس آتے ہوئے ہمیں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا اس لیے میں مطمئن تھا کہ غالباً کئی دنوں تک منگ شوئی اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کا راز فاش نہیں ہو سکے گا۔ اگر کسی وقت لاشیں کسی کو مل بھی گئیں تو کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکے گا کہ ان کا قاتل کون ہے۔

خچر اپنی مرضی سے چل رہا تھا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ سامنے راستے پر ایک آدمی کو پڑے دیکھ کر میں نے خچر کی لگام کھینچ لی۔ گاڑی رک گئی۔

"کیا ہوا؟" جانکی نے پوچھا۔

"راستے میں کوئی آدمی پڑا ہوا ہے۔" میں نے اشارہ کیا اور محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک خیال ابھرا تھا۔ ہو سکتا ہے ڈاکو آس پاس درختوں میں کہیں چھپے ہوئے ہوں۔ ان کا ایک ساتھی راستے میں اس طرح پڑ گیا کہ ہمیں مجبوراً خچر گاڑی روکنی پڑے۔ میں نے فلموں میں ایسے بہت سے سین دیکھے تھے۔

میں نے جانکی کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خچر گاڑی سے اتر کر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی میں دائیں بائیں دیکھ بھی رہا تھا کہ ڈاکو کس طرف سے برآمد ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی نیکر میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا تھا اور میرا دوسرا ہاتھ چادر کے اندر ہی تھا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے کے نیچے تھا دوسرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ دہری تھی اور دوسری بالکل سیدھی۔ میں نے دو قدم دور ہی رک کر بڑے محتاط انداز میں جھک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اچھل کر سیدھا ہو گیا۔

یہ ہمارا وہی کوچوان تھا جسے منگ شوئی نے نہر میں پھینک دیا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے سیدھا کیا۔ اسے کوئی زخم وغیرہ نہیں لگا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔

میں نے اسے اٹھا کر راستے سے ہٹ کر گھاس پر لٹا دیا۔ وہ کسی طرح نہر میں ڈوبنے سے بچ گیا تھا اور باہر نکل کر لوپانگ کی طرف جا رہا ہوگا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اس کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے۔ میں نے جانکی کو بھی بلا لیا اور ہم دونوں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔

وہ تقریباً دس منٹ بعد ہوش میں آسکا تھا۔ کچھ دیر تک تو اس پر بد حواسی سی طاری رہی۔ وہ ویران سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اس کے حواس آہستہ آہستہ بحال ہونے لگے۔ اسے زندہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

"وہ... وہ کہاں ہیں؟" اس نے خوف زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"وہ لوگ بھاگ گئے۔ اب کبھی نہیں آئیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم تقریباً آدھا گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ پانی میں غوطے کھاتا ہوا تقریباً سو گز دور کنارے کی جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے باہر نکلا۔ پہلے نہر کے کنارے پر بیٹھا رہا پھر لوپانگ کی طرف جانا چاہتا تھا کہ اس پر انجانا سا

خوف طاری ہوا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

میرے خیال میں کوچوان کو لویانگ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے وہ وہاں کسی سے کوئی ایسی بات کر دیتا جس سے ہم بھی پھنس جاتے اس لیے ہم نے اسے وہیں سے واپس بھیج دینا مناسب سمجھا۔ ہمارا تھیلا چھکڑے ہی میں پڑا تھا۔ میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں نکال کر اسے دے دیں۔ اس نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر لگام سنبھالی اور خچر کو موڑ کر اس پر چابک برسانے لگا۔

لویانگ دو میل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سڑک کے دونوں طرف یہ ایسی ہی دیہی آبادی تھی جس کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔ مکان زیادہ تر کچے تھے۔ اِکّا دُکّا دو منزلہ اور پختہ عمارتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف دکانیں تھیں۔

یہ خاصا مصروف ہائی وے تھا۔ بسوں اور مال بردار ٹرکوں کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ پرائیویٹ گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

اس وقت دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ ہم صبح سات بجے اس بستی سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر راستے میں منگ شوئی والی اُفتاد نہ پڑتی تو ہم کہیں سے کہیں پہنچ چکے ہوتے۔

کئی بسیں آئیں اور رُکے بغیر گزر گئیں اور پھر جیسے ہی ایک بس رُکی ہم تیزی سے اس طرف لپکے۔ دو آدمی اور بھی ہمارے ساتھ اس طرف دوڑے تھے۔ بس سے اترنے والے مسافروں کی تعداد تین تھی۔ ہمارے ساتھ دوسرے دو آدمی تو بس میں سوار ہو گئے مگر کنڈیکٹر نے ہمیں روک دیا اور بس آگے روانہ ہو گئی۔

تین چار مرتبہ ہمارے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ دو بسیں تو ایسی تھیں جن میں کئی کئی سیٹیں خالی تھیں مگر کنڈیکٹروں نے ہمیں سوار نہیں ہونے دیا تھا۔ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک آدمی بہت دیر سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی سائیکل پر غالباً منجن قسم کی کوئی پروڈکٹ بیچ رہا تھا۔ سائیکل کے آگے ٹوکری بنی ہوئی تھی اور ہینڈل پر ایک چھوٹا سا بورڈ بھی لگا ہوا تھا جس پر چینی زبان میں کوئی لمبی چوڑی تحریر درج تھی۔

پانچویں بس کے کنڈیکٹر نے بھی ہمیں دھتکار دیا تو وہ آدمی ہمارے قریب آ گیا۔ ہمارے چہروں سے اتنا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم چینی نہیں ہیں۔ وہ ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے جیب سے یوآن (چینی کرنسی) کا ایک نوٹ نکال کر ہمیں دکھایا اور اشاروں میں کچھ بتانے لگا۔ اشاروں کی زبان میری سمجھ میں آ گئی۔

ہم بھکشو تھے جو عام طور پر بھیک مانگ کر ہی گزا... ہیں۔ وہ بسوں اور ٹرینوں میں سفر بھی بغیر ٹکٹ ہی کر... ہمیں مفت خورہ سمجھ کر کوئی کنڈیکٹر ہمیں بس میں بٹھ... تیار نہیں تھا۔ بستی والوں نے کھانے پینے کی چیزوں... ہمیں کچھ رقم بھی جمع کر کے دی تھی جو تھیلے ہی میں ر... تھی۔ میں نے چند نوٹ نکال لیے اور بس کا انتظار کر...

انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ چند منٹ... ایک بس وہاں آ کر رکی۔ میں اور جانگی تیزی سے بس... لپکے۔ ایک ادھیڑ عمر عورت اس سے اُتر رہی تھی۔ ا... بعد ہم جیسے ہی آگے بڑھے اندر کھڑے ہوئے کنڈ... ہمیں بھکاریوں کی طرح جھڑک دیا۔ میں نے جلدی سے... میں پکڑے ہوئے نوٹ آگے کر دیے۔ نوٹ دیکھ کر ا... چہرے کے تاثرات بدل گئے اور ہونٹوں پر خفیف... مسکراہٹ بھی آ گئی۔ اس نے راستے سے ہٹتے ہوئے... اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پہلے جانگی کو بس میں... ہونے کا موقع دیا اور پھر خود اوپر چڑھ گیا۔ آخر میں ... سیٹیں خالی تھیں۔ دو سیٹوں والی ایک برتھ پر ہم نے... کر لیا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں یوشونگ وانگ پہنچ گئے... زیادہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن آبادی بے تحاشا تھی۔ ... سے اترتے ہی ہم نے شاؤلن ٹیمپل جانے کے لیے بس... بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ مگر... چینی زبان میں رُک رُک کر بات کرتا تھا لیکن یہاں کے... کی زبان میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر ایک... آدمی ہماری مدد پر آمادہ ہو گیا۔ وہ ہمیں پکڑ کر ایک ا... کے پاس لے گیا جو لنگڑی لولی انگریزی بھی سمجھتا تھا۔... بتایا کہ اس وقت یہاں سے ہمیں ڈانگ کو کے لیے... سکتی ہے۔ وہاں رات گزارنے کے بعد صبح شاؤیانگ... کے لیے بس مل جائے گی۔ اگر ہم چاہیں تو یہیں... گزار لیں۔ صبح چھ اور سات بجے کے درمیان یہاں سے... شاؤیانگ کے لیے بسیں روانہ ہوتی ہیں لیکن ہم نے... رات بسر کرنے کے بجائے اپنا سفر جاری رکھنا مناسب...

اس شخص کی باتوں سے مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ... تک چین کے صوبوں ہونان اور گیژو میں سفر کرتے ر... اور اس وقت ہم صوبہ ہونان میں ہیں۔ اس طرف... وانگ اس صوبے کا پہلا بڑا شہر ہے۔ شاؤلن ٹیمپل... تاریخی عبادت گاہ بھی اسی صوبے میں واقع ہے۔ شاؤیانگ پہنچنے کے بعد ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

تین بجے کے قریب ہمیں ڈانگ کو جانے کے لیے بس میں جگہ مل گئی۔ جس نے شام سات بجے کے قریب ہمیں ڈانگ کو پہنچا دیا۔ میرا خیال تھا کہ ڈانگ کو بڑا شہر ہو گا لیکن یہ درمیانے درجے کا قصبہ تھا اور دیہی رنگ نمایاں تھا۔ یہ قصبہ شاؤلن ٹیمپل کے راستے پر تھا۔ اس طرف بدھ بھکشو آتے رہتے تھے۔ یہاں معقول تعداد میں بدھ کے پیروکار آباد تھے اور دو چھوٹی عبادت گاہیں بھی تھیں۔ ایک عبادت گاہ دریا کے کنارے پر تھی۔ ہمیں اس طرف کا راستہ بتا دیا گیا۔

صبح والے واقعے کا تھوڑا بہت اثر اب بھی جانگی کے ذہن پر تھا اور پھر دن بھر کے سفر نے اسے کچھ نڈھال سا کر دیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اسے پھر بخار نہ ہو جائے۔ اس طرح ہمارے لیے پریشانیوں میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

ہم ابھی عبادت گاہ سے دور ہی تھے کہ جانگی نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"وہ دیکھو۔ اس طرف۔ یہ وہی بھکشو ہے جو باگونگ میں ہمیں لوٹ کر بھاگ گیا تھا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ ہکسیان ہی تھا وہی آوارہ گرد بھکشو جس نے باگونگ کی عبادت گاہ میں نشہ آور مٹھائی کھلا کر ہمیں بے ہوش کر دیا تھا اور ہمارا تھیلا لے کر غائب ہو گیا تھا اور ہمیں باگونگ میں تین چار دن بھیک مانگنی پڑی تھی۔

ہکسیان کے علاوہ ہمیں بازار میں کچھ اور بھکشو بھی نظر آئے تھے اس لیے میرا فیصلہ تھا کہ اگر ہم ہکسیان کا تعاقب کرتے ہیں تو اسے شبہ نہیں ہو گا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے جانگی کو سمجھا دیا اور ہم نے تقریباً بیس گز کے فاصلے سے ہکسیان کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں سڑک کے ایک طرف تھا اور جانگی دوسری طرف چلی گئی تھی۔ ابھی شام ہوئی تھی۔ چین کی آبادی نے تو مجھے حیران کر دیا تھا۔ آپ جہاں بھی نکل جائیں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آئے گا۔ ڈانگ کو کے اس بازار کی صورت حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہ تھی...... کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میں اپنے اور ہکسیان کے بیچ زیادہ فاصلہ اس لیے بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا کہ اس رش میں اس کے گم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ہکسیان اس بازار سے ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ اس طرف زیادہ دکانیں نہیں تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اس عبادت گاہ کی طرف ہی جا رہا تھا جس کا پتا ہمیں بتایا گیا تھا۔ ہم بھی اس کے پیچھے لگے رہے۔ اس کی گردن ناپنے کے لیے مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

جانگی بھی اس وقت میرے ساتھ ہی چل رہی تھی۔ ہکسیان ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ دکانیں وغیرہ نہیں تھیں البتہ لاتعداد بچے کھیلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آگے دریا کی موجودگی کی خبر دے رہے تھے۔

رہائشی علاقے کی یہ سڑک آگے جا کر اسٹرینڈ روڈ سے مل گئی تھی۔ دریا کے کنارے بند پر واقع یہ سڑک بھی بارونق تھی۔ دریا اور سڑک کے درمیان ایک کشادہ پارک تھا جو دائیں بائیں دُور تک چلا گیا۔ پارک میں چہل پہل تھی۔ ایک طرف شاید کشتیوں کا گھاٹ تھا۔ وہاں زیادہ رونق نظر آ رہی تھی۔

ہکسیان دائیں طرف چلتا رہا۔ وہ عبادت گاہ شاید اسی طرف تھی۔ سڑک کے ساتھ پارک اب ختم ہو گیا تھا۔ سڑک کی ڈھلان سے ذرا آگے دریا تھا۔ میں نے جانگی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہکسیان کے قریب پہنچ گئے۔ اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سن کر ہکسیان نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسٹریٹ لائٹ وہاں سے بہت دور تھی۔ اس جگہ کسی قدر تاریکی تھی۔ اپنے سامنے دو بھکشوؤں کو دیکھ کر وہ یقیناً بہت خوش ہوا ہو گا۔

"تم لوگوں کو یقیناً رہائش کے لیے کسی جگہ کی تلاش ہے۔" وہ بولا "اس طرف ایک عبادت گاہ ہے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

ہکسیان کے پیچھے آتے ہوئے میں نے اپنی پنڈلی کے فیتے سے خنجر نکال لیا تھا۔ کھیتوں والی اجڑی ہوئی عبادت گاہ میں یہ خنجر ہوکیانگ نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا جو بعد میں مجھے واپس کر دیا گیا تھا۔

میں نے خنجر کی نوک ہکسیان کے پہلو سے لگا دی۔

"ہمیں رہائش کے لیے جگہ کی تلاش تو تھی ہکسیان لیکن اتفاق سے تم مل گئے۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی۔"

"کک... کون ہو تم...؟" میری زبان سے اپنا نام سن کر ہکسیان اچھل پڑا۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم ہمیں بالکل نہیں جانتے۔" میں

نے کہا "ہمیں بھول گئے ہو تو کوئی بات نہیں۔ باگونگ کی عبادت گاہ تو تمہیں یاد ہوگی۔ جہاں چند روز پہلے تم ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے تھے۔ آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ یہ خنجر تمہارے پہلو میں پیوست ہو جائے گا۔" میں نے بات کرتے ہوئے خنجر سے ذرا سا دباؤ بھی ڈال دیا تھا۔

"مم۔۔۔ میں نے پہچان لیا ہے۔" وہ ہکلایا "مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ میں معافی مانگتا ہوں اور تمہاری چیزیں واپس کرنے کو تیار ہوں۔ دیکھو۔۔۔ ہم تو سنگی ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کا خیال رکھنا چاہیے۔ مجھے اپنی غلطی۔۔۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔" میں نے کہا "بھکشو ہو کر لوگوں کو لوٹتے ہو۔ دوسروں کو بھی بدنام کرتے ہو۔ چلو۔ اس طرف۔ ابھی تمہاری خبر لیتا ہوں۔" میں نے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

اس وقت ایک کار ہمارے قریب سے گزری۔ ہم تینوں کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آ گئے تھے۔ کار والوں نے ہمیں دیکھا بھی ہوگا تو توجہ نہیں دی ہوگی۔

ہکسیان بار بار معافی مانگ رہا تھا۔ وہ ہماری لوٹی ہوئی رقم واپس کرنے کو تیار تھا۔ میں اسے دھکے دیتا ہوا دریا کے کنارے کی طرف لے گیا۔ اب میں نے خنجر والا ہاتھ بھی چادر سے باہر نکال لیا تھا اور خنجر کی نوک اس کی پشت سے لگا دی تھی۔ دریا کے کنارے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ جانکی نے اس کے ہاتھ سے تھیلا لے لیا اور اس کی تلاشی لینے لگی۔ تھیلے میں اور چیزیں تو بھری ہوئی تھیں مگر رقم نہیں تھی۔

"اس کی جامہ تلاشی لو۔" میں نے جانکی سے کہا اور پھر ہکسیان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "چادر اوپر سے کھول دو۔"

"مم۔۔۔ میں نے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا۔" وہ ہکلایا۔

"کوئی بات نہیں۔ یہاں ہمارے سوا تمہیں دیکھنے والا اور کوئی نہیں ہے۔" میں نے کہتے ہوئے جانکی کو اشارہ کیا۔

جانکی نے آگے بڑھ کر اس کی چادر ہٹانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ ہکسیان اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے چادر میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جانکی کو گرفت میں لے لیا تھا۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ تمہارے ساتھی کو گولی مار دوں گا۔" اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

ہکسیان کی اس حرکت نے مجھے چونکا دیا۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے خنجر اور پستول چھپا کر رکھے ہوئے تھے اور ہکسیان تو جرائم پیشہ آدمی تھا۔ مجھے پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا کہ اس کے پاس ایسی کوئی چیز ضرور ہوگی۔

جانکی کی پشت پر پہنچ کر اس نے پستول کی نال اس کی کھوپڑی سے لگا دی اور اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے لیے دوسرا بازو اس کے سینے پر لپیٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چونکی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

"تو یہ بات ہے۔" وہ جانکی کے سینے کو ٹٹولتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا "تم بھکشو نہیں ہو۔ کسی خطرناک ارادے سے یہ بھیس اپنا رکھا ہے۔ کسی بھکشو کی زندگی میں عورت کا کوئی دخل نہیں ہوتا لیکن میں جانتا ہوں۔ بھکشو بھی انسان ہیں۔ ان کے سینوں میں بھی دل ہے اور وہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے اِدھر اُدھر منہ مارتے رہتے ہیں لیکن کسی بھکشو نے مستقل طور پر کسی عورت کو اپنے ساتھ کبھی نہیں رکھا اور تم اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہو لیکن آج یہ میرے کام آئے گی۔ تم اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ میں اسے گولی مار دوں گا۔"

جانکی کسمسا رہی تھی۔ ہکسیان جانکی کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا اُلٹے قدموں سڑک کی طرف چلنے لگا۔ میں بھی چند قدم کے فاصلے پر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں چاہتا تو پستول بھی نکال سکتا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہکسیان نے جانکی کو اپنی ڈھال بنا رکھا تھا۔

وہ جانکی کو اُلٹے قدموں تقریباً گھسیٹتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا اور ٹھیک اسی لمحے ایک تیز رفتار کار سڑک پر نمودار ہوئی۔ ہکسیان اور جانکی اس کی روشنی کی زد میں آ گئے۔ جانکی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دم نیچے جھک گئی تھی۔

ہکسیان بھی جانکی کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا سڑک پر گرا۔ جانکی نے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ہکسیان نے گولی چلا دی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی سناٹے میں جانکی کی چیخ بھی گونجی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ وہ تیز رفتار کار سر پر پہنچ چکی تھی۔ بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز فضا میں گونج گئی۔ جانکی کار سے ٹکرا کر سڑک پر گری۔ کار بھی رک گئی۔

میں تیزی سے آگے دوڑا۔ ہکسیان اس صورت حال سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا سڑک کے دوسری طرف تاریکی میں غائب ہو گیا۔

میں ہوا میں اُڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ جانکی کار کے آگے سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے جھک کر جانکی کو دیکھنے

لگا۔ اسی وقت کار کا ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھلا اور ایک عورت نیچے اتر کر تیزی سے ہمارے قریب پہنچ گئی۔ میں جانکی کو سڑک سے اٹھا کر اس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھے اسے ٹٹول رہا تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میرے خیال میں جانکی کو گولی لگی تھی اور وہ کار سے بھی ٹکرائی تھی۔

"جانکی۔۔۔ جانکی۔۔۔" میں اسے ہلاتے ہوئے چیخا۔

"میں ٹھیک ہوں وجدان۔" جانکی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

کار سے اترنے والی چینی عورت نے جانکی پر جھکتے ہوئے چینی زبان میں کچھ کہا لیکن میں پوری طرح اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔

"ڈو یو اسپیک انگلش۔" میں نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں تھوڑی بہت انگلش بول اور سمجھ سکتی ہوں۔" اس عورت نے جواب دیا "ہاں۔" یہ بھکشو میری گاڑی سے ٹکرایا تھا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ اچانک سامنے آ گیا تھا مگر میں تمہاری ہیلپ کرنے کو تیار ہوں۔ اسے میری گاڑی میں ڈالو تاکہ اسپتال پہنچا دیا جائے۔ اس کے علاج کے تمام اخراجات میں دوں گی اور۔۔۔ اور ہرجانہ بھی۔"

میرا خیال ہے گاڑی کی تیز رفتاری کی وجہ سے اس عورت نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی لیکن اس نے دوسرے بھکشو کو سڑک سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن قرب و جوار میں موجود دوسرے لوگوں نے فائر کی آواز ضرور سنی ہوگی اور پھر سناٹے میں گاڑی کے بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز بھی دُور تک سنی گئی ہوگی۔ گاڑی کے ہیڈ لیمپس جل رہے تھے۔ گاڑی کو کھڑے دیکھ کر بھی لوگ صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف دوڑے آئیں گے اس لیے میں بھی جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

میں نے جانکی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس عورت نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور جانکی کو سیٹ پر ڈالنے میں میری مدد کرنے لگی۔ دوسری طرف کے دروازے سے اترتے ہوئے اس نے الجھی ہوئی نظروں سے پہلے جانکی اور پھر میری طرف دیکھا تھا۔

اس نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا اور گاڑی حرکت میں آ گئی۔ میں نے جانکی کو بانہوں سے پکڑ کر سیٹ پر اس طرح بٹھا دیا کہ وہ نیم دراز سی ہو گئی۔ یہ عورت جانکی کو اسپتال لے جانا چاہتی تھی لیکن میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ راستے میں کسی جگہ اتر جاؤں گا۔

تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کر کے گاڑی دائیں طرف ایک سڑک پر مڑ گئی لیکن تھوڑی ہی دور جا کر رُک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کی نظریں سامنے لگے ہوئے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے پر مرکوز تھیں پھر وہ بیٹھے بیٹھے کسی قدر پیچھے کی طرف گھوم گئی اور جانکی کی طرف دیکھنے لگی۔ میری نظریں بھی جانکی کی طرف اٹھ گئیں اور میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ چادر جانکی کے سینے پر سے ہٹی ہوئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ عورت رُک رُک کر بولی "کوئی عورت تو بھکشو نہیں ہوتی لیکن۔۔۔"

"کوئی پراسرار معاملہ نہیں ہے میڈم۔" میں نے جواب دیا "یہ عورت بھکشو نہیں۔ میں بھی بھکشو نہیں ہوں۔ ہم نے اپنے دشمنوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے یہ بھیس بدل رکھا ہے۔ میری بات پر یقین کرو پلیز۔ ہم کوئی خطرناک لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو خود چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میری ساتھی کو زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہیں اتار دو پلیز!"

اس نے ایک بار پھر جانکی کی طرف دیکھا اور پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ کار کے اندر جلنے والے بلب کی مدھم روشنی میں بھی میں نے اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ لی تھی۔

"ہوں۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی "پھر تو تم لوگوں کے پاس رہنے کو بھی جگہ نہیں ہوگی۔" وہ کار کو گیئر میں ڈالتے ہوئے بولی۔

"ہم رات گزارنے کے لیے عبادت گاہ کی تلاش میں اس طرف جا رہے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ آدمی کون تھا جو وہاں سے بھاگا تھا۔" اس نے کار کو ریورس میں لیتے ہوئے پوچھا "تمہارا ساتھی یا۔۔۔"

"وہ ہمارے دشمنوں کا ایجنٹ تھا۔" میں نے جواب میں کہا۔ میرے خیال میں اس وقت جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہیں تھا "ہم آج شام ہی یہاں پہنچے تھے۔ اس نے ہمیں تلاش کر لیا اور اس وقت وہ میری ساتھی کو پستول کی زد پر لے کر جا رہا تھا کہ میری ساتھی نے اسے دھکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اس شخص نے گولی چلا دی۔ میری ساتھی بدحواس ہو کر سڑک پر گر رہی تھی کہ تمہاری گاڑی سے ٹکرا

گئی۔ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین ہو تو ہمیں یہاں اتار دو۔ ہم کسی محفوظ جگہ پر چلے جائیں گے۔"

"مجھے تمہاری سچ بیانی پر کوئی شبہ نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔ گاڑی ریورس میں چلتی ہوئی اسی سڑک پر پہنچ چکی تھی جس سے ہم اس ذیلی سڑک پر مڑے تھے۔ اس نے گاڑی کا رخ اسی طرف موڑ دیا جس طرف سے ہم آئے تھے "اگر تمہارے دشمن کے ایجنٹ نے تمہیں تلاش کرلیا ہے اور نوبت فائرنگ تک پہنچ چکی ہے تو پھر ڈانگ کو میں تمہیں کوئی جائے پناہ نہیں مل سکتی۔ میں نے تمہاری بات پر یقین کرلیا ہے۔ تمہارے لہجے میں سچائی کی جھلک نمایاں ہے۔ مجھے صرف ایک بات بتا دو۔ تم انڈین تو نہیں ہو؟"

"نہیں۔ ہم تھائی ہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن کیا انڈین ہونا جرم ہے؟"

"چین کی حدود میں اسے جرم ہی سمجھا جاتا ہے۔" اس عورت نے جواب دیا "چین اور ہندوستان کی دشمنی بہت پرانی ہے۔ کئی بار سرحدوں پر جھڑپیں ہو چکی ہیں۔ انڈیا اس خطے کی سپرپاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں پر قبضہ کرتا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے گوا کو ہڑپ کیا اور پھر سکم اور بھوٹان کو نگل لیا۔ برما کے صوبے آسام پر بھی اس کا قبضہ ہے اور دوسری طرف پاکستان کے ایک علاقے کشمیر پر قابض ہونے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں علاقوں میں انڈیا کے خلاف پچاس سال سے مزاحمت ہو رہی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں ریاستوں میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "انڈیا نے ماضی میں چین کے کچھ علاقوں پر بھی قدم جمانے کی کوشش کی تھی لیکن اسے ایسی مار لگی کہ وہ آج تک اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ انڈیا چونکہ اس خطے کی سپرپاور بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اس لیے اپنے پڑوسی ممالک کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس نے چین میں اپنے لاتعداد جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ بعض پکڑے بھی جاتے ہیں لیکن بعض کسی نہ کسی طرح اپنی خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں اس لیے ہندوستانیوں کو سب سے زیادہ شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔"

مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں جنہیں میں غور سے سن رہا تھا۔ ہندوستان کے وسعت پسندانہ عزائم کے بارے میں تو مجھے بوما نے بھی بتایا تھا۔ وہی بوما جو گولڈن ٹرائی اینگل سے میرے ساتھ فرار ہوا تھا۔

ہندوؤں کے بارے میں مجھے بھی کچھ تلخ تجربات ہو چکے تھے۔ سب سے پہلا تجربہ بنکاک میں جانکی کی ملازمہ ہندو آوارہ گرد نواتے راجو کے حوالے سے ہوا تھا جس نے مجھے اور تھائی کو پھنسانے کی کوشش کی تھی اور ہم بڑی مشکل سے جانکی کے مکان سے فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ دوسرا تجربہ سوامی رگھوناتھ کے حوالے سے ہوا تھا۔ جس نے بنکاک کے نواح میں آشرم کی آڑ میں عیاشی کا بہت بڑا اڈا بنا رکھا تھا اور وہ یہاں آنے والوں کو بلیک میل کرکے ان سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ راجو اور رگھوناتھ دونوں ہی تھائی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ دوسری طرف جانکی دیوی تھی جس نے میری خاطر اپنا سب کچھ تج دیا تھا اور اپنی عزت اور جان کو داؤ پر لگائے میرے ساتھ ماری ماری پھر رہی تھی۔

پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔ میں بارہ چودہ سال کی عمر تک سنگاپور میں رہا تھا۔ وہاں بھی ہندوستانی کثیر تعداد میں آباد تھے۔ وہاں بھی میں نے کچھ ایسی ملی جلی باتیں ہی دیکھی تھیں لیکن اس زمانے میں مجھے اتنا شعور نہیں تھا۔ میں نے ایسی باتیں کبھی سوچی ہی نہیں تھیں اور اب آہستہ آہستہ ان باتوں کا مفہوم سمجھ میں آرہا تھا۔

میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی اور چادر بھی درست کرلی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کسی قسم کی تکلیف محسوس کر رہی ہے۔

"کیا بات ہے۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے جانکی سے جان بوجھ کر انگریزی میں بات کی تاکہ وہ عورت بھی مطلب سمجھ سکے۔

"کار سے ٹکرانے سے کندھے پر چوٹ لگی تھی۔ تکلیف ہو رہی ہے۔" جانکی نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

"تھوڑی دیر اور تکلیف برداشت کرلو۔" اس عورت نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا "میں جہاں تم لوگوں کو لے جا رہی ہوں وہاں پہنچ کر تم لوگ اپنی ساری تکلیفیں بھول جاؤ گے۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سامنے سڑک پر ہجوم دیکھ کر خاموش ہوگیا۔ اس عورت نے بھی کار کی رفتار کم کرلی۔ میرے خیال میں یہ وہی جگہ تھی جہاں جانکی کی اس کار سے ٹکر ہوئی تھی۔

کار ہجوم کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ سڑک کے کنارے

پولیس کی گاڑی بھی کھڑی تھی اور دو پولیس والے وہاں پر موجود لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد بیس بائیس تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

"ہیلو آفیسر۔" ہماری ساتھی عورت نے ایک پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا معاملہ ہے۔ کوئی ایکسیڈنٹ؟"

"اوہ مادام کاراشان۔" پولیس آفیسر اسے دیکھ کر بولا "یہاں کوئی ایکسیڈنٹ ضرور ہوا تھا لیکن سڑک پر ٹائر گھسٹنے کے ان نشانات کے سوا اور کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ تاہم اس پارک میں موجود لوگوں نے یہاں فائر کی آواز بھی سنی تھی لیکن بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"ہوسکتا ہے ایکسیڈنٹ زیادہ سنگین نہ ہو اور وہ جو کوئی بھی تھے پولیس کو اطلاع دیے بغیر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہوں۔" مادام کاراشان نے کہا۔

"ہوسکتا ہے لیکن وہ فائر......"

"تم اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہو آفیسر۔ میری مدد کی کوئی ضرورت ہو تو؟" مادام کاراشان بولی۔

"تھینک یو مادام!" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ مادام سے باتیں کرتے ہوئے اس نے کم از کم دو مرتبہ ہماری طرف دیکھا تھا لیکن ہمارے بارے میں مادام سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

مادام کار کو حرکت میں لے آئی۔ اس صورت حال سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پارک میں موجود لوگوں نے فائر کی آواز سن کر پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔

"تم نے مجھے جو بات بتائی تھی اس پر میں نے کوئی شبہ نہیں کیا تھا۔" مادام کاراشان نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری سچائی کا ایک ثبوت تو مل گیا کہ تم میں سے کسی پر فائر کیا گیا تھا۔ میرے دل میں جو شبہات تھے وہ بھی اب ختم ہوگئے ہیں۔"

"شکریہ مادام کاراشان۔" میں نے جواب دیا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔" مادام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

کار اس سڑک پر سیدھی دوڑتی رہی۔ سڑک کے ساتھ پارک ختم ہوگیا تھا اور اب دریا کے کنارے پر کہیں کہیں بہت وسیع و عریض کوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔

میرے دل میں بھی اس عورت کے بارے میں جو شبہات تھے وہ اب ختم ہوگئے تھے لیکن یہ ذہنی الجھن ضرور تھی کہ صرف میری باتوں پر یقین کرکے یہ ہماری مدد کرنے پر آمادہ کیوں ہوگئی ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر کیمونو قسم کا پھول دار ریشمی لباس بہت قیمتی تھا۔ ائرکنڈیشنڈ یہ کار بھی بہت شان دار اور قیمتی تھی۔ اس پولیس آفیسر نے جس طرح اس سے بات کی تھی، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ اس شہر میں ایک معزز حیثیت کی مالک ہے۔

دریا کے کنارے پر بنگلے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ شہر کے رئیسوں کے بنگلے تھے۔ دریا میں کچھ بادبانی کشتیاں بھی موجود تھیں جن پر جلتی ہوئی رنگ برنگی بتیاں دور ہی سے دکھائی دے رہی تھیں۔

اس سڑک پر تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار کی رفتار کم ہوئی اور وہ دریا کی ڈھلان پر بجری کی ایک سڑک پر مڑ گئی۔ تقریباً بیس گز آگے لوہے کی سلاخوں والا ایک گیٹ لگا ہوا تھا جس کے دونوں طرف اونچی دیوار نے وسیع و عریض رقبہ گھیر رکھا تھا۔

مادام کاراشان نے دور ہی سے ہارن بجا دیا۔ قریب پہنچنے تک گیٹ کھل گیا اور مادام کار کو اندر لیتی چلی گئی۔ اندر بھی بجری کی سڑک تھی جس کے دونوں طرف اونچے سایہ دار درخت تھے۔ اوپر سے ان کی شاخیں آپس میں ملی ہوئی تھیں اور ایک سرنگ سی بن گئی تھی۔

کار پورچ میں رک گئی۔ انجن بند ہونے سے پہلے ہی ایک ادھیڑ عمر عورت دروازے سے نکل کر برآمدے میں آگئی۔ اس نے پنڈلیوں تک لمبا پھول دار فراک پہن رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ بالوں میں ہلکی سی سفیدی نظر آرہی تھی۔ ہمیں مادام کاراشان کے ساتھ اترتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

ہم کاراشان کے ساتھ اندر آگئے۔ بہت وسیع و عریض ہال تھا۔ دبیز قالین اور شان دار فرنیچر آراستہ تھا اور ہال کے ایک کونے میں مہاگنی کے خوب صورت اسٹینڈ پر مہاتما بدھ کا کانسی کا مجسمہ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کاراشان بدھ کی پیروکار تھی۔

"تم نے بتایا تھا کہ تم لوگ بھکشو نہیں ہو۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو اس وقت کچھ کھانے پینے پر بھی اعتراض نہیں ہوگا۔" مادام کاراشان نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر اس ادھیڑ عمر عورت کی طرف رخ کرکے کچھ ہدایات دیں اور دوبارہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے ہوتمن سے کھانے کے لیے کہہ دیا ہے۔ تم لوگ اتنی دیر میں اپنے حلیے درست کرلو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گئی۔ جانگی بار بار اپنا بایاں کندھا دبا رہی تھی۔ کندھے پر چوٹ لگنے کے بعد وہ ائر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھی رہی تھی جس سے اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ یہ بنگلا بھی ائر کنڈیشنڈ ہی تھا مگر ائر کنڈیشنڈ بند تھے اور پنکھے چل رہے تھے۔

اس کمرے میں دو دیواروں کے ساتھ شیشوں کے سلائڈنگ ڈور والے وارڈ روب بنے ہوئے تھے۔ ہر وارڈ روب میں لاتعداد قیمتی ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظر جانگی کی طرف دیکھا پھر ایک ڈریس نکال لیا اور جانگی کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک دروازے کی طرف اشارہ کردیا۔

جانگی نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہ باتھ روم تھا۔ جانگی کاراشان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ کاراشان مجھے لے کر اس کمرے سے باہر آگئی اور دروازہ بند کردیا۔ وہ مجھے ایک اور کمرے میں لے آئی۔

یہ ایک بہت کشادہ اور شان دار بیڈ روم تھا۔ ڈریسنگ روم کے وارڈ روب میں مردانہ ملبوسات ٹنگے ہوئے تھے۔

"یہ باتھ روم ہے۔" کاراشان ڈریسنگ روم سے آگے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "نہانے کے بعد ان میں سے جو لباس پسند آئے پہن لینا۔ میں اپنے کمرے میں یا ہال میں ملوں گی۔"

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے دروازہ بند کردیا اور وارڈ روب کا جائزہ لینے لگا۔ تھری پیس سوٹ بھی تھے۔ چین کے روایتی لباس بھی اور اوپن شرٹس اور پتلونیں بھی۔ ایک طرف جینز اور ٹی شرٹس بھی ٹنگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ٹی شرٹ اور جینز نکال لی۔ جسم پر لپٹی ہوئی چادر اتار کر جینز کو پہن کر چیک کیا۔ لمبائی میں وہ میرے ٹخنوں تک تھی البتہ کمر سے کسی قدر ڈھیلی تھی۔ وارڈ روب میں کئی بیلٹ بھی ٹنگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک بیلٹ بھی نکال لیا۔

مجھے کئی دنوں بعد نہانے کا موقع ملا تھا۔ گرم پانی سے میں دیر تک نہاتا رہا اور جب نہا کر نکلا تو اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کررہا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے بھی کئی روز بعد پہننے کا موقع ملا تھا۔ اپنے کپڑے باتھ روم میں ہی چھوڑ دیے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

ٹھیک اسی وقت مادام کاراشان بھی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے چوڑے پائنچوں والا پھول دار پاجامہ اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس کے نیچے صرف دو بٹن لگے ہوئے تھے اور اوپر گلے تک کا حصہ کھلا تھا۔ شرٹ کے نیچے سینے پر تین چار انچ چوڑی پٹی سی لپٹی ہوئی تھی۔ یہ منظر کسی زاہد صد سالہ پر بھی لرزہ طاری کردینے کے لیے کافی تھا۔ میرا سانس بھی بے ربط ہونے لگا تھا۔ اس کے بال کتھئی رنگت کے تھے جسے اس نے گول جوڑے کی شکل میں سر پر سمیٹ رکھا تھا۔

میں نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا بلکہ اس وقت تو قیامت ہی لگ رہی تھی۔ میرے اندازے سے اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو مسٹر بھکشو؟"

"چارمنگ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرا دی اور قریب آکر دونوں ہاتھ میرے بازوؤں کے مسلز پر رکھ دیے۔ مجھے لگا جیسے وہ میرے مسلز میں انگلیاں گاڑنے کی کوشش کررہی تھی لیکن میرے مسلز پتھر کی طرح سخت تھے جن میں جونک بھی نہیں لگ سکتی تھی "ویری اسمارٹ!" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "بھکشو کے لباس میں تو تم کچھ عجیب سے لگ رہے تھے۔"

عین اسی وقت جانگی بھی دروازہ کھول کر کمرے سے نکل آئی۔ کاراشان کا حلیہ اور اس کے ہاتھ میری بانہوں پر دیکھ کر اس کی بھویں تن گئیں۔ کاراشان بھی شاید سمجھ گئی۔ اس نے ہاتھ ہٹا لیے۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس نے میکسی نما لمبا فراک پہن رکھا تھا۔ گریبان اس کا بھی خاصا فراخ تھا۔

"یہی لباس اس وقت مجھے اچھا لگا۔ آرام دہ ہے۔" جانگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "صبح میں دوسرے کپڑے پہن لوں گی۔ وارڈ روب میں پینٹ اور شرٹس وغیرہ بھی ہیں لیکن رات کے لیے مجھے یہی لباس اچھا لگا۔"

جانگی نے یہ بات اردو میں کی تھی اس لیے کاراشان کچھ نہیں سمجھ سکی۔ اسی دوران میں ہال کی طرف سے ایک عورت کی آواز سنائی دی جسے کاراشان نے کھانا تیار کرنے کے لیے کہا تھا۔

"آؤ۔ کھانا تیار ہوگیا ہے۔" کاراشان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم ہال کمرے سے گزر کر ڈائننگ روم میں آگئے۔ یہ بھی خاصا کشادہ کمرا تھا لیکن عام ڈائننگ رومز سے قطعی مختلف۔ یہاں نہ تو ڈائننگ ٹیبل تھی اور نہ ہی کرسیاں۔ کمرے کے وسط میں فرش سے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی گول میز تھی۔ یہ دراصل دہری میز تھی۔ درمیان کا گول حصہ ریوالونگ تھا جس پر کھانے کی ڈشیں اور باؤل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ اس میز کا بیرونی حصہ ساکت تھا۔ جس پر پلیٹیں، چمچے، کانٹے اور چوب اسٹکس رکھی ہوئی تھیں۔ میز کے اطراف میں فوم کے کشن پڑے ہوئے تھے۔ کاراشان ایک کشن پر ٹانگیں نیچے کی طرف موڑ کر مخصوص انداز میں بیٹھ گئی۔ میں نے بھی اسی طرح دو زانو ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا اور بالآخر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ جانگی بھی آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔

میز کے وسطی ریوالونگ حصے پر کئی کھانے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ اس عورت نے پون گھنٹے کے اندر اندر اتنے سارے کھانے کیسے تیار کرلیے تھے۔ چکن چوپ سوئے، فرائیڈ رائس، چکن چاؤلن، سویٹ اینڈ ساور، فرائیڈ پران، فرائیڈ بینز اور نجانے کیا کیا تھا۔

میں نے ایک پلیٹ میں فرائیڈ رائس اور چکن چاؤلن نکال لیا۔ جانگی نے فرائیڈ رائس کے ساتھ چکن چوپ سوئے پسند کیا تھا کیونکہ اس میں چکن کے ساتھ سبزی بھی تھی۔

کھانا بے حد خوش ذائقہ اور لذیذ تھا۔ کئی روز بعد ایسا کھانا کھانے کو ملا تھا۔ فرائیڈ پران بھی بہت مزے دار تھے۔ میں اور جانگی کسی لحاظ و مروت کے بغیر کھانے پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

"یہ ہم پر اتنی مہربان کیوں ہوگئی ہے؟" جانگی نے کھانے کے دوران میں میری طرف دیکھتے ہوئے اردو میں کہا "بھکشوؤں سے تو لوگ دور بھاگتے ہیں اور یہ ہمیں اپنے محل نما بنگلے میں لے آئی ہے۔"

"اس لیے کہ ہم بھکشو نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا "ویسے ہال میں اس مجسمے کو دیکھ کر تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہ بدھ کی پیروکار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسے ہم پر ترس آگیا ہو۔"

"مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔" جانگی بولی "جس طرح کا اس نے لباس پہن لیا ہے اور جس طرح یہ تمہارے بازو ٹٹول رہی تھی۔ اس سے تو میں کچھ اور سوچنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔"

"مجھے بھی اپنی عزت خطرے میں نظر آرہی ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "مجھے محتاط رہنا پڑے گا۔"

"شان دار گاڑی، عالی شان بنگلا اور قیمتی ساز و سامان دیکھ کر لگتا ہے کہ اس کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔"

"ہمیں اس کی دولت سے کیا لینا۔ ایک آدھ دن یہاں رہیں گے اور پھر اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرکے چلے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"مجھے شبہ ہے۔" جانگی بولی "ہم آسانی سے یہاں سے نہیں جاسکیں گے۔"

"تم لوگ کیا باتیں کررہے ہو؟" کاراشان نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"میری دوست کھانے کی تعریف کررہی ہے۔" میں نے جواب دیا "بہت مختصر وقت میں بہت لذیذ کھانا تیار کیا ہے۔"

"ہوتمن کھانے بنانے کی ماہر ہے۔" کاراشان مسکرائی۔

کھانے کے بعد ہم ہال میں آگئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہوتمن نے چھوٹی چھوٹی خوب صورت پیالیوں میں ہمارے سامنے قہوہ رکھ دیا۔ قہوہ بھی بہت خوش ذائقہ تھا۔

ہمیں یہاں آئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہوچکے تھے۔ اس دوران میں ہوتمن کے علاوہ صرف ایک اور عورت نظر آئی تھی۔ گویا اتنے بڑے بنگلے میں صرف وہی تین عورتیں تھیں۔ میں نے جس بیڈ روم میں جا کر کپڑے بدلے تھے وہ کسی مرد کا تھا لیکن ابھی تک کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔

کاراشان ہماری کہانی جاننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ ہمارے دشمن کون تھے، ہمارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے اور یہ کہ ہم کہاں جانے کا قصد رکھتے ہیں۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اپنے دشمنوں کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا دی اور بتایا کہ ہم مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے شاؤلن ٹیمپل جا رہے ہیں۔ چونکہ ہمارے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہیں اس لیے ہم نے بھکشوؤں کا بھیس اپنا رکھا تھا۔ بھکشوؤں کو سیلانی سمجھ کر ان سے کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی جاتی اور وہ آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں لیکن چونکہ کوئی عورت بھکشو نہیں ہوسکتی اس لیے جانگی کی وجہ سے ہمیں کچھ دشواریاں بھی پیش آتی رہی ہیں۔ ایک موقع پر جانگی کا راز فاش ہوگیا تھا۔ کن منگ میں کچھ غنڈوں نے جانگی کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے ایک غنڈے کی پٹائی کردی۔ اس کا بازو توڑ

دیا تھا۔ اس وقت سے وہ لوگ ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ایک ساتھی نے شام کو پھر جانکی کو پستول کی زد پر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عین وقت پر کاراشان کی گاڑی اس طرف آجانے سے فائرنگ کرتا ہوا بھاگ گیا اور جانکی اس کی کار سے ٹکرا کر گر گئی۔

اس دوران میں کاراشان باری باری ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب وہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" کاراشان نے میرے خاموش ہونے پر کہا "تم لوگ دو چار دن یہاں رہو۔ اس کے بعد میں خود تم لوگوں کو شاؤلن ٹیمپل پہنچا دوں گی لیکن اس دوران میں تم لوگ احتیاطاً اس بنگلے کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلو گے۔ میں اس بھکشو کا بھی انتظام کردوں گی۔ اسے دم دبا کر یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

میں نے اور جانکی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر میرے ہی سوال کے جواب میں کاراشان اپنے بارے میں بتانے لگی۔

اس کا تعلق شنگھائی کے متوسط گھرانے سے تھا۔ اس نے ایک اکیڈمی میں داخلہ لے لیا اور پچیس سال کی عمر میں کیبرے ڈانسر بن گئی۔ شروع میں وہ شنگھائی کے درمیانے درجے کے ہوٹلوں میں پروگرام کرتی رہی پھر اسے بڑے ہوٹلوں میں پروگرام ملنے لگے۔

سیان چانگ سے اس کی ملاقات ایک ہوٹل ہی میں ہوئی تھی۔ سیان چانگ اس علاقے میں چائے کے باغات کا مالک تھا۔ اس کا شمار صوبہ ہونان کے چند کروڑ پتیوں میں کیا جاسکتا تھا۔ اس وقت وہ عمر میں کاراشان سے تقریباً تیس سال بڑا تھا لیکن چند ملاقاتوں کے بعد ہی وہ سیان چانگ سے شادی پر آمادہ ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ چند مہینے شنگھائی ہی میں رہی پھر سیان چانگ اسے ڈانگ کو لے آیا۔

سیان چانگ نہ صرف عمر میں اس سے تیس سال بڑا تھا بلکہ شکل وصورت میں بھی وہ بہت ہی گیا گزرا تھا۔ بھاری بھرکم اور بھدا و بے ڈول جسم، کوتاہ گردن، پھولے ہوئے گال اور ہاتھی کی طرح چھوٹی آنکھیں۔ اگر اس کے پاس بے حساب دولت نہ ہوتی تو کوئی عورت اسے اپنے قریب نہ پھٹکنے دیتی لیکن دولت ہر عیب چھپالیتی ہے۔ کاراشان بھی اس کی دولت پر ہی مرمٹی تھی۔

ڈانگ کو میں دو سال بڑے سکون سے گزرے تھے۔ وہ شہزادیوں جیسی زندگی بسر کررہی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام تھا۔ سوسائٹی میں بھی اسے ایک معزز مقام حاصل تھا لیکن دو سال بعد کاراشان کا سکون برباد ہونے لگا۔

سیان چانگ کاروبار کے سلسلے میں مختلف شہروں میں جاتا رہتا تھا اور پھر یہ انکشاف کاراشان کے لیے بڑا ... اور تکلیف دہ ثابت ہوا تھا کہ سیان چانگ نے مختلف شہروں میں داشتائیں پال رکھی تھیں۔

ان کے تعلقات میں ایک رخنہ سا آگیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان خلیج گہری ہوتی ... گئی۔ ان میں کئی بار ان باتوں پر جھگڑا بھی ہوا تھا۔ ان ... آخری لڑائی بہت زوردار تھی۔

یہ تقریباً چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ کاراشان کو پتا چلا ... سیان چانگ، فان کنگ میں رہنے والی ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کاراشان ایک روز فان کنگ پہنچ گئی۔ یانگ کو نامی وہ عورت ایک عالی شان فلیٹ میں رہائش پذیر تھی۔ یہ فلیٹ اسے سیان چانگ ہی نے لے کر دیا ہوا تھا اور ... کے تمام اخراجات وہی اٹھا رہا تھا۔

کاراشان کرائے کے دو غنڈے ساتھ لے کر گئی تھی۔ غنڈوں نے تو یانگ کو پر ہاتھ نہیں اٹھایا البتہ اس کی ہر چیز توڑ پھوڑ کر رکھ دی۔ دوسری طرف کاراشان نے یانگ کو ... دھنک کر رکھ دیا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے سیان چانگ سے شادی کا خیال دل سے نہ نکالا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

سیان چانگ ان دنوں ہانگ کانگ گیا ہوا تھا۔ وہ ایک ہفتے بعد لوٹا تو غصے میں بھرا ہوا تھا۔ یانگ کو نے اسے ہانگ کانگ ہی میں فون پر اطلاع دے دی تھی کہ اس پر کیا بیت چکی ہے۔ وہ ہانگ کانگ سے پہلے فان کنگ گیا تھا جہاں یانگ کو نے کاراشان کے خلاف پولیس میں باقاعدہ رپورٹ لکھوا رکھی تھی۔ سیان چانگ نے ایک بڑی رقم خرچ کرکے وہ رپورٹ ختم کرادی اور ڈانگ کو چلا آیا جہاں کاراشان سے زوردار معرکہ ہوا۔ اس نے کاراشان کو طلاق کی دھمکی ... دی تھی لیکن اس دھمکی پر وہ عمل اس لیے نہیں کرسکا تھا ... طلاق کی صورت میں اسے اپنی آدھی جائداد سے کاراشان کے حق میں دستبردار ہونا پڑتا۔ کاراشان نے یہی عقل مندی کی تھی کہ شادی کے وقت کچھ شرائط لکھوالی تھیں۔ جن سے اسے کچھ تحفظ مل گیا تھا۔

ایک ہفتہ ڈانگ کو میں رہنے کے بعد سیان چانگ پھر ... کاروباری دورے پر چلا گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ ... مہینے پہلے کاراشان کو اطلاع ملی کہ سیان چانگ نے یانگ ... سے شادی کرلی ہے اور وہ دونوں ساتھ رہ رہے ہیں۔

کاراشان تلملا کر رہ گئی لیکن ظاہر ہے وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ البتہ وہ اس کانٹے کو راستے سے ہٹانے کا موقع تلاش کررہی تھی جس نے اس کی زندگی میں زہر بھر دیا تھا لیکن اسے کوئی ایسا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس دوران میں وہ ایک مرتبہ شنگھائی بھی گئی تھی جہاں اس نے ایک نامی گرامی غنڈے کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی تھی۔ وہ غنڈا جانتا تھا کہ کاراشان کیبرے ڈانسر رہ چکی ہے اور اب کروڑ پتی ہے۔ اس نے صرف دو مطالبے کیے تھے۔ ایک شرط یہ تھی کہ وہ اس کے ساتھ ایک رات گزارنا چاہتا تھا اور دوسرا مطالبہ اتنی زیادہ رقم کا تھا جو کاراشان کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ وہ رقم بھی پوری ایڈوانس مانگ رہا تھا۔

کاراشان کے ساتھ رات گزارنے کا مطالبہ کوئی نیا نہیں تھا۔ کیبرے ڈانسر کی حیثیت سے بڑے ہوٹلوں میں پروگرام حاصل کرنے کے لیے اس نے بہت سے لوگوں کے ایسے مطالبے پورے کیے تھے۔ اس غنڈے کا مطالبہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ رات گزارنے کے بعد خطیر رقم وصول کرکے بھی وہ اس کا کام کرنے سے انکار کردیتا۔ ایسی صورت میں وہ اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے ڈانگ کو واپس چلی آئی۔

جانکی اور میں بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ہوتین اپنے سارے کام ختم کرکے سامنے آکر کھڑی ہوگئی تو ان کی باتوں کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ اس نے کاراشان سے کچھ کہا۔ جواب میں کاراشان نے بھی کچھ کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"ہوتین سونے کے لیے جارہی ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "آؤ ذرا دریا کی سیر کر آئیں۔ چاندنی رات میں دریا کی سیر کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

میں نے جانکی کو اشارہ کیا اور ہم دونوں بھی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بنگلے کے عقبی دروازے سے نکل کر ہم کھلی جگہ پر آگئے۔ اس طرف کنکریٹ کا بہت وسیع و عریض چبوترا بنا ہوا تھا جو زمین کی سطح سے تقریباً پانچ فٹ اونچا تھا۔ چبوترے پر ماربل کے بڑے بڑے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ آگے نیچے اترنے کے لیے سیڑھیاں تھیں۔ اس طرف تین چار مونولائٹیں جل رہی تھیں۔ جن کی روشنی میں چبوترے کے آگے کا کچھ حصہ بھی نظر آرہا تھا۔

ہم سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آگئے۔ آگے ایک ریتیلی زمین تھی اور تقریباً سو گز آگے دریا تھا۔ جس طرح بنگلے کے سامنے کے رخ پر پختہ دیواریں تھیں اسی طرح پچھلی طرف بھی دائیں بائیں اونچی دیواریں تھیں۔ البتہ سامنے دریا کے کنارے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک تقریباً پندرہ فٹ اونچا آہنی جنگلا لگا ہوا تھا۔ خاردار تاریں اتنی گنجان تھیں کہ بلی کا بچہ بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ درمیان میں بوٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔

ہم ریت پر چلتے ہوئے بوٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ کاراشان نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوکر بتی جلا دی۔ روشنی ہوتے ہی میں آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گیا۔

بوٹ ہاؤس خاصا بڑا تھا اور اس میں دریائی پانی، کائی اور مچھلیوں کی مخصوص بو سمائی ہوئی تھی۔ بوٹ ہاؤس کے دونوں اطراف میں لکڑی کے تختوں سے چار چار فٹ چوڑے پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ فارم کے ساتھ ایک چھوٹی موٹر بوٹ بندھی ہوئی تھی۔ جس میں صرف تین افراد بیٹھ سکتے تھے۔ ایک بوٹ کے انجن کے ساتھ والی سیٹ پر اور دو سامنے دوسری سیٹ پر۔ دوسرے پلیٹ فارم کے ساتھ ایک اور بڑی کشتی آہنی ہک سے بندھی ہوئی تھی۔ یہ بہت شان دار کشتی تھی۔ اسے لانچ تو نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس میں لانچ کی طرح ایک مختصر سا کیبن بنا ہوا تھا جس کی چھت پر بھی صوفہ نما لمبی سی سیٹ بنی ہوئی تھی۔ اس سے آگے ذرا سائڈ میں کنٹرول وہیل اور سوئچ پینل وغیرہ بنے ہوئے تھے۔

"اس کشتی پر کبھی میں اور سیان چانگ چاندنی راتوں میں دریا کی سیر کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔" کاراشان نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن لگتا ہے کہ ایسا موقع اب کبھی نہیں آئے گا کہ ہم دونوں اکٹھے اس کشتی پر بیٹھ سکیں۔"

اس نے بوٹ ہاؤس کا دریا کی طرف والا گیٹ کھول دیا۔ پہلے ہمیں اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور پھر پلیٹ فارم کے ہک کے ساتھ بندھی ہوئی رسی کھول کر خود بھی اوپر آگئی۔ کنٹرول وہیل کے قریب ہی ایک کیبنٹ میں سے ایک کپڑا نکال کر اس نے وہیل اور سوئچ بورڈ صاف کیا اور پھر صوفہ نما سیٹ جھاڑنے لگی جس پر سرخ مخملی کشن رکھے ہوئے تھے۔ اس نے کپڑا دوبارہ اس کیبنٹ میں ڈال دیا اور وہیل کے سامنے کھڑی ہوکر انجن اسٹارٹ کرنے لگی۔ ہم صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔

فیول بتانے والے ڈائل کی سوئی بتا رہی تھی کہ ٹینک بھرا ہوا تھا لیکن کئی ہفتوں سے کشتی استعمال نہیں ہوئی تھی اس لیے انجن تیسری کوشش پر اسٹارٹ ہوسکا تھا۔

کشتی بوٹ ہاؤس سے نکل کر دریا میں آگئی اور وسط کی طرف بڑھنے لگی۔ انجن کی پھٹ پھٹ کی بہت ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر کہیں کہیں مکان نما کاٹیج بنے ہوئے تھے۔ جبکہ اس کنارے پر جہاں سے ہم روانہ ہوئے تھے' تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنگلے بنے ہوئے تھے جن کی روشنیاں دریا کے پانی میں لہروں کے ساتھ جھلملا رہی تھیں۔ بہاؤ کے مخالف سمت بہت دور گھاٹ پر بہت سی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ دریا میں بھی کہیں کہیں کچھ رنگ برنگی روشنیاں تیرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

چاند کی چودھویں شب تھی اور لوگ چاندنی رات میں دریا کی سیر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ہماری کشتی بہاؤ کے رخ پر جارہی تھی۔ میں اور جانکی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کاراشان کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ کچھ ہی دیر بعد سامنے سے تیرتی ہوئی روشنیاں دکھائی دیں۔ وہ کوئی کشتی تھی جو مخالف سمت سے آرہی تھی۔ کاراشان نے اپنی کشتی کے آگے والی بتیاں جلا دیں۔ کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی طرح تیز روشنی دریا کی لہروں پر مچلنے لگی۔

سامنے سے آنے والی کشتی ہمارے قریب سے گزر گئی۔ وہ بادبانی کشتی تھی جس میں پندرہ سولہ افراد تھے۔ ان میں کئی لوگوں نے ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلائے تھے۔ میں نے بھی بے اختیار ہاتھ ہلا دیا۔

کشتی ہلکی رفتار سے چلتی ہوئی تقریباً دو میل آگے نکل گئی۔ اس جگہ دریا خم کھاتا ہوا بائیں طرف گھوم رہا تھا۔ بائیں کنارے پر ماہی گیروں کی چھوٹی سی بستی تھی جہاں کچھ روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کاراشان نے وہاں سے کشتی موڑنا شروع کردی اور اس طرح ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔

ہماری کشتی اپنے بنگلے کے قریب سے اور گھاٹ کے سامنے سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس طرف ہم کافی دور نکل آئے۔

"وہ عبادت گاہ ہے۔" کاراشان نے دریا کے کنارے پر ایک جگہ روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عبادت گاہ کی عمارت دریا کے اندر تک تھی اور میرا خیال ہے کہ ہم شام کو اسی عبادت گاہ کی طرف آرہے تھے کہ راستے میں ہکسیان سے ٹکراؤ ہوگیا اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہکسیان اس وقت اسی عبادت گاہ میں ہوگا یا اس نے کوئی اور محفوظ جگہ تلاش کرلی ہوگی۔

اس عبادت گاہ سے کافی آگے نکل جانے کے بعد کشتی واپس مڑی تھی اور جب کشتی دوبارہ بوٹ ہاؤس میں داخل ہوئی تو تین بجنے والے تھے۔

بوٹ ہاؤس سے باہر آکر لگتا تھا کاراشان چبوترے پر بیٹھ کر کچھ باتوں کے موڈ میں تھی لیکن ہم بری طرح تھکے ہوئے تھے۔

چبوترے والے دروازے سے اندر داخل ہو کر کاراشان نے دروازہ لاک کردیا اور ہم دونوں کو الگ الگ کمرے دکھا دیے۔ مجھے وہی کمرا ملا تھا جہاں شام کو میں نے کپڑے بدلے تھے اور یہ یقیناً کاراشان کے شوہر سیان چانگ کا بیڈ روم تھا۔

میں کچھ دیر جانکی والے کمرے میں بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آکر بستر پر گر گیا۔ کئی روز بعد نرم و گداز بستر پر لیٹنا نصیب ہوا تھا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور کچھ ہی دیر بعد میں کاراشان کے بارے میں سوچتا ہوا نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

باتوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی ساڑھے آٹھ کا وقت بتا رہی تھی۔ میں غور سے وہ آوازیں سننے لگا۔ ان میں ایک کاراشان کی آواز تھی اور دوسری کسی مرد کی۔ میرے ذہن میں شبہات سر ابھارنے لگے۔ میں بیڈ سے اٹھ کر دبے قدموں کمرے سے باہر آگیا۔

راہداری میں بھی دبیز قالین بچھا ہوا تھا اس لیے چلنے سے ہلکی سی آواز بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ویسے بھی میں ننگے پیر تھا۔ جانکی کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

آوازیں ہال کی طرف سے آرہی تھیں۔ میں راہداری کے آخری سرے پر رک گیا اور جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ صوفے پر جو آدمی بیٹھا ہوا تھا' اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے جسم پر پولیس کی وردی تھی۔ اس کے دائیں طرف والے صوفے پر شب خوابی کے لباس میں کاراشان بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اگر گردن گھماتی تو مجھے دیکھ سکتی تھی۔

جلدی سے نیچے بیٹھ گیا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھارنے لگے۔ اگر کاراشان نے ہمیں پکڑوانے کے لیے اس پولیس آفیسر کو بلوایا تھا تو ہمارے بچنے کا کوئی چانس نہیں تھا لیکن پھر یہ خیال میں نے جھٹک دیا۔ اگر اسے پکڑوانا ہوتا تو کاراشان کو بڑے مواقع ملے تھے۔

جب وہ ٹکر کے بعد جانکی کو اسپتال لے جارہی تھی تو اس نے دیکھ لیا تھا کہ جانکی مرد نہیں عورت تھی اور پھر میں نے بھی اعتراف کرلیا تھا کہ ہم بھکشو نہیں ہیں۔ اپنے گھر کی طرف آتے ہوئے راستے میں وہ پولیس والوں کے پاس رکی بھی تھی جہاں سڑک پر کار کے ٹائروں کے گھسٹنے کے نشانات تھے۔ وہ اگر چاہتی تو ہمیں اسی وقت پولیس کے حوالے کردیتی۔ اس کے برعکس اس نے گھر لا کر ہماری بڑی خاطر مدارات کی تھی اور دریا کی سیر کے بعد جب ہم اپنے کمروں میں سو رہے تھے تو وہ اس وقت پولیس کو بلا کر ہمیں ان کے حوالے کرسکتی تھی۔ میں اپنی جگہ پر دبک کر ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ پولیس آفیسر کہہ رہا تھا۔

"بات یہ ہے مادام کہ آپ کے وہاں سے آنے کے بعد میں نے اپنی تفتیش جاری رکھی تھی اور پارک میں موجود کچھ لوگوں نے بتایا تھا کہ تین بھکشوؤں کو دریا والی عبادت گاہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ان میں ایک آگے تھا اور دو اس سے ذرا پیچھے۔" وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"پارک میں موجود لوگوں کا بیان ہے کہ فائر کی آواز تقریباً اسی جگہ سے سنائی دی تھی جہاں کار کے ٹائروں کے گھسٹنے کے نشانات پائے گئے تھے۔ میں نے آپ کی کار میں دو بھکشوؤں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں اسی وقت آپ کی طرف آنا چاہتا تھا لیکن ہماری کار کے ریڈیو پر اطلاع ملی کہ وہاں سے تقریباً دو میل دور ایک آدمی کو قتل کردیا گیا ہے۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا اور گولی چلانے والا ایک بھکشو تھا۔ ہمیں فوراً جائے واردات پر پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔

"وہاں تحقیقات میں خاصی دیر ہوگئی۔ میں آپ کی کار میں دو بھکشوؤں کو بھول گیا تھا اور جب خیال آیا تو اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے اس وقت یہاں آنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بدھ کی پیروکار ہیں اور اس شہر میں آنے والے بھکشوؤں کی مدد و اعانت کرتی رہتی ہیں۔ بعض بھکشوؤں کو تو آپ اپنے ہاں کئی کئی روز تک ٹھہرا بھی لیتی ہیں۔ اگر وہ دونوں بھکشو اس وقت یہاں موجود ہیں تو میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ قتل ہکسیان نے ہی کیا ہوگا۔ وہ جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے اس آدمی کو لوٹنے کی کوشش کی ہو اور مزاحمت کرنے پر ہکسیان نے اس پر گولی چلا دی۔

"سوری آفیسر۔" کاراشان کی آواز سنائی دی "ان دونوں بھکشوؤں کو میں نے کچھ رقم دے کر شہر والی عبادت گاہ کی طرف جانے والی سڑک کے موڑ پر اتار دیا تھا۔"

"میں نے وہاں بھی معلوم کرلیا تھا لیکن اتفاق ہے کہ گزشتہ شام سات بجے عبادت گاہ کا گیٹ بند ہونے کے بعد کوئی بھکشو وہاں نہیں آیا۔" آفیسر نے کہا۔

"ہوسکتا ہے وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں۔ کوئی سرائے وغیرہ۔" کاراشان نے کہا۔

"میں چیک کرچکا ہوں مگر کوئی سراغ نہیں ملا۔" آفیسر بولا۔

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو بھکشوؤں کی آپ کو تلاش کیوں ہے۔ جبکہ قتل کی وہ واردات وہاں سے دو میل دور مخالف سمت میں ہوئی تھی؟" کاراشان نے پوچھا۔

"پارک والی سڑک پر تین بھکشوؤں کو آگے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔" پولیس آفیسر نے کہا "ہوسکتا ہے وہ تینوں ایک دوسرے کو جانتے ہوں اور وہ دونوں قاتل بھکشو کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔"

"سوری آفیسر" کاراشان کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی "میں ان بھکشوؤں کو نہیں جانتی اور اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتی۔"

پولیس آفیسر بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی ٹوپی اٹھا کر سر پر جمائی اور کاراشان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت ہوگیا۔ مادام کاراشان بھی برآمدے کے دروازے تک رخصت کرنے کے لیے اس کے ساتھ گئی تھی۔ میں تیزی سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا اور کاراشان کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ واقعی ہماری ہمدرد تھی۔ اس نے ہمیں چھپا کر ایک طرح سے پولیس کو بھی اپنا دشمن بنالیا تھا۔ بعد میں جب کسی وقت پولیس کو پتا چلے گا کہ ہمیں مادام کاراشان نے پناہ دے رکھی تھی اور پولیس آفیسر کے سامنے غلط بیانی سے کام لیا تھا تو نجانے پولیس اس کے ساتھ کیا سلوک کرے لیکن یہ بات میرے لیے اب تک الجھن بنی ہوئی تھی کہ کاراشان نے ہمیں پناہ کیوں دی تھی اور ہماری طرف داری کیوں کر رہی تھی۔

کاراشان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں نے

آنکھیں بند کرلیں اور ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا۔

"میں جانتی ہوں تم جاگ رہے ہو۔ یہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔" کاراشان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "میں نے تمہیں راہداری میں دیکھ لیا تھا۔ وہ پولیس آفیسر جاچکا ہے۔ آنکھیں کھول دو۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اپنے کمرے میں ہوں۔ تم وہیں آجاؤ۔" کاراشان نے کہا اور مڑ کر دروازے سے باہر نکل گئی۔

میں چند لمحے بستر پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

پندرہ منٹ بعد میں کاراشان کے بیڈ روم میں موجود تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر کافی کے دو کپ رکھے ہوئے تھے جن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کاراشان بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا اور میری نظریں اس کی طرف اٹھتے ہوئے جھجک رہی تھیں۔

"یہ تو تم جان گئے ہو کہ وہ پولیس آفیسر یہاں تم لوگوں کی تلاش میں آیا تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔" کاراشان نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یس مادام!" میں نے جواب دیا "میں نہیں سمجھ سکا کہ ہماری وجہ سے تم اپنے آپ کو مصیبت میں کیوں ڈال رہی ہو۔ اگر پولیس کو پتا چل گیا کہ ہم نے یہاں پناہ لے رکھی ہے تو تم پر بلاوجہ شک کیا جائے گا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم کوئی جرائم پیشہ تو نہیں ہیں کہ پولیس سے اس طرح چھپتے پھریں۔ پولیس والے ہم سے صرف اس بھکشو کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں جس نے بازار میں کسی کو قتل کردیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اور جانگی کو پولیس کے سامنے پیش ہوجانا چاہیے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" مادام نے کہا "لیکن جب پولیس کو پتا چلے گا کہ جانگی مرد نہیں عورت ہے اور تم لوگ بھکشو نہیں ہو تو پولیس قتل کی اس واردات کو بھول جائے گی اور تم دونوں سے پوچھ گچھ شروع ہوجائے گی۔ یہاں ہر اجنبی کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کسی پر بھی جاسوسی کا الزام بڑی آسانی سے لگایا جاسکتا ہے۔ تم لوگ ایک مرتبہ پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو زندہ یا مردہ کسی صورت بھی یہاں سے نہیں نکل سکو گے۔"

کاراشان نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ کم بخت ہلسیان کی وجہ سے اچھی خاصی الجھن پیدا ہوگئی تھی اور ظاہر ہے جب تک معاملہ سرد نہ پڑجاتا ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔

"اب صورت حال یہ ہے۔" کاراشان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "فی الحال تم لوگوں کے لیے باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔ یہاں بنگلے میں رہتے ہوئے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ حالات جیسے ہی پرسکون ہوں میں خود تم لوگوں کو یہاں سے نکال دوں گی۔"

"اگر تمہارے ملازمین میں سے کسی نے ہمارے بارے میں بتادیا تو؟" میں نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔" کاراشان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میرے بنگلے پر کوئی مرد ملازم نہیں ہے۔ ہوتین کے علاوہ دو عورتیں اور ہیں۔ ایک گھر کے کام کاج کے لیے اور دوسری سیکیورٹی گارڈ۔ وہ ریڈ آرمی کی ریٹائرڈ آفیسر ہے گیٹ کی ڈیوٹی سنبھالنے کے علاوہ باغبانی اور اس قسم کے دوسرے کام بھی وہی انجام دیتی ہے۔ گزشتہ شام جب میں تم لوگوں کو لے کر یہاں آئی تھی تو میں نے اسی وقت ان تینوں کو سمجھا دیا تھا۔ مجھ سے ملاقات سے پہلے اس پولیس آفیسر نے یقیناً میری سیکیورٹی گارڈ اور ہوتین وغیرہ سے بھی پوچھا ہوگا لیکن انہوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔"

"ہمیں کب تک یہاں رہنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"جب تک یہ معاملہ سرد نہیں پڑجاتا۔" کاراشان نے جواب دیا "اور میرا خیال ہے اس میں دو چار دن لگیں گے۔ اس کے بعد تم لوگوں کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہوگی۔"

میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ چند لمحے کاراشان کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ دوسری عورت، جسے کل شام میں نے صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا، ہال میں فرنیچر کی صفائی کررہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرادی تھی۔ میں اس پر توجہ دیے بغیر جانگی کے کمرے میں آگیا۔

اس وقت دس بجنے والے تھے جانگی ابھی تک سورہی تھی۔ میں بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور جانگی کو جگانے کے لیے دھیمے لہجے میں ایک دو مرتبہ اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"ارے۔ تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہارے کمرے میں تو ابھی آیا ہوں لیکن میں جلدی

جاگ گیا تھا۔ یہاں کچھ گڑبڑ کے آثار نظر آرہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا؟ کیسی گڑبڑ؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"پولیس ہماری تلاش میں یہاں آئی تھی۔" میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا "یہ کم بخت ہلسیان ہمارے لیے مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے ہم کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

"ایسی صورت میں تو ہمیں پہلی فرصت میں یہ شہر چھوڑ دینا چاہیے۔"

"لیکن کاراشان کے خیال میں ہمیں چند روز تک اس بنگلے سے باہر قدم بھی نہیں رکھنا چاہیے۔" میں نے کہا "ہمارے معاملے میں اس نے اگرچہ پولیس کو غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔ اس غلط بیانی کی وجہ سے وہ خود بھی کسی الجھن میں مبتلا ہوسکتی ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر ہماری مدد کیوں کررہی ہے۔" جانگی نے کہا "اگر ہمارا تعلق بدھ مت سے ہوتا تو یہ سمجھا جاسکتا کہ۔۔۔"

"مجھے بھی اس پر کسی قسم کا شبہ ہونے لگا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "بہرحال اب صورت حال یہ ہے کہ ایک دو دن تک ہم یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔ پولیس کا معاملہ ٹھنڈا پڑجانے کے بعد بھی اس نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تو پھر کچھ سوچا جائے گا۔ تم اٹھ کر تیار ہوجاؤ۔ ناشتا کرنے کے بعد کچھ سوچیں گے۔ معدہ خالی ہو تو دماغ بھی کچھ سوچنے سے انکار کردیتا ہے۔"

جانگی مجھ سے پہلے بیڈ سے اتر کر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن میں جلدی سے اٹھ گیا۔

"مجھے باہر جانے دو۔" میں دروازے کی طرف بڑھا۔

جانگی دروازہ بند کرتے کرتے رک گئی اور پھر میں جیسے ہی باہر نکلا اس نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔

اپنے کمرے میں آکر میں باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے کسل مندی بڑی حد تک دور ہوگئی۔ کل رات میں نے اپنے پرانے کپڑے غسل خانے ہی میں چھوڑ دیے تھے لیکن اب وہ کپڑے یہاں نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید ہوتین یا دوسری ملازمہ نے اٹھا کر کہیں ڈال دیے تھے۔

میں اس وقت بھی کاراشان ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ہم پر اتنی مہربان کیوں تھی؟ اور پھر یہ بات بھی مجھے بڑی عجیب لگی تھی کہ اس بنگلے میں کسی مرد کا وجود نہیں تھا۔ سیکیورٹی گارڈ بھی ایک عورت ہی تھی۔ کاراشان کا شوہر چھ مہینوں سے الگ رہ رہا تھا۔ گھر میں کوئی مرد موجود نہ ہو تو عورت عدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔ دولت مند عورت کے لیے تو خطرات اور بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن کاراشان نے کسی مرد کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس نے عورتوں پر ہی بھروسا کیا تھا۔ اس کی سیکیورٹی گارڈ بھی عورت ہی تھی۔

میں جب کمرے سے باہر نکلا تو جانگی اور کاراشان ہال میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کاراشان نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو کل شام ہم نے اس کے جسم پر دیکھا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم ڈائننگ روم میں اس گول میز کے گرد بیٹھے ناشتا کررہے تھے۔ ناشتے کے دوران میں ہی کاراشان نے بتایا کہ ناشتے کے بعد وہ ایک ضروری کام سے چلی جائے گی۔ ہمیں یہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہم بنگلے کے اندر اور لان میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں البتہ ہم باہر نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ہم بلاتکلف ہوتین سے کہہ دیں۔

کاراشان چلی گئی۔ ہم دیر تک لان میں گھومتے رہے۔ بہت سرسبز لان تھا۔ وسط میں ایک خوب صورت فوارہ بھی تھا جس کے اطراف میں بیٹھنے کے لیے سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ گیٹ سے پورچ تک آنے والی بجری کی روش کے دونوں طرف درخت تھے جن کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ بیرونی چار دیواری خاصی اونچی تھی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف بھی قطار میں درخت لگے ہوئے تھے لیکن ان درختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی نہیں تھیں۔ بالکل سیدھے اوپر تک چلے گئے تھے۔

گیٹ کے ساتھ کیبن کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی محافظ عورت کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ درمیانے قد کی صحت مند عورت تھی اور چہرے سے بڑی خرانٹ لگ رہی تھی۔ اس کی گود میں آٹومیٹک رائفل رکھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ رائفل پر تھا۔ ہم قریب سے گزرے تو وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرادی تھی۔

ہم لان میں گھومنے کے بعد اندر آگئے اور گھوم پھر کر تمام کمرے دیکھنے لگے۔ کام کرنے والی دوسری عورت تو نظر نہیں آئی تھی البتہ ایک دو مرتبہ ہوتین سے آمنا سامنا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں کسی بھی کمرے میں جانے سے روکنے یا

ٹوکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آخر میں ہم جانکی والے کمرے میں آ گئے۔

باتوں کے لیے ہمارے پاس صرف دو ہی موضوع تھے۔ کاراشان اور ہلکسیان۔ ہلکسیان کی وجہ سے ہم مصیبت میں پھنسے تھے اور کاراشان ہمیں اس مصیبت سے نکالنا چاہتی تھی۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کاراشان ہماری مدد کیوں کرنا چاہتی ہے؟ میرا اب تک کا تجربہ یہ تھا کہ کسی مطلب کے بغیر کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اکیلے ہی کھایا تھا۔ کاراشان واپس نہیں آئی تھی۔ کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ ذہن پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی اور پھر نجانے کب میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو پانچ بج چکے تھے۔ جانکی میرے بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں باہر آ کر لان میں فوارے کے سامنے بیٹھ گئے۔ فوارے کا پانی کئی فٹ اوپر تک اچھل رہا تھا اور اس کی پھوار چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

کاراشان ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کچھ دیر بعد ہوتین نے آ کر پوچھا کہ ہم کافی اندر بیٹھ کر پئیں گے یا یہیں لے آئے۔ جانکی نے اسے کافی یہیں پر لانے کو کہہ دیا۔

ہوتین نے بانس کی کھپچیوں کی ایک چھوٹی میز ہمارے سامنے رکھ دی اور تھوڑی دیر بعد کافی بھی لے آئی۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی ہم دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ ہوتین نے لان کی بتیاں جلا دی تھیں۔ ایک مرتبہ ہوتین اس طرف سے گزری تو میں نے اس سے کاراشان کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر چلی گئی ہے۔ واپسی رات کو دیر سے ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے وہ رات کو واپس ہی نہ آئے۔

نجانے کیوں میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھارنے لگے۔

"یہ ہمیں کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش تو نہیں کر رہی؟" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم سے اس کی کیا دشمنی ہے۔" جانکی نے کہا "کسی چکر میں پھنسانا ہوتا تو ہمیں پہلے ہی پولیس کے حوالے کر چکی ہوتی۔ دولت مند عورت ہے۔ ایسے لوگوں کی مصروفیات بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑ گیا ہو۔ ہمیں اس پر شبہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"لیکن نجانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا۔" میں نے کہا۔

"وہم ہے تمہارا۔" جانکی نے جواب دیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے جانکی غیر ارادی طور پر کاراشان کے کمرے میں گھس گئی۔ یہاں بیڈ کے عین سامنے والی دیوار کے قریب ایک خوب صورت ٹرالی پر ٹی وی سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ٹرالی کے نچلے خانے میں وی سی آر بھی تھا اور اس کے ساتھ والے خانے میں ویڈیو کیسٹس رکھے ہوئے تھے۔ جانکی چند لمحے ٹی وی کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے پاور کا بٹن دبا دیا اور ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبانے لگی۔ تمام چینلز پر چینی پروگرام تھے۔ کوئی بھی غیر ملکی چینل نہیں تھا۔

جانکی نے ایک کیسٹ نکال کر وی سی آر پر لگا دیا۔ میں اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ چینی فلم تھی مگر بہت بے ہودہ قسم کی۔ جانکی بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور اسکرین پر جب بھی کوئی اس قسم کا منظر آتا وہ مجھے چٹکیاں کاٹنے لگتی۔ میں ہر مرتبہ اسے گھور کر رہ جاتا۔ ایک مرتبہ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ بیڈ سے نیچے گر گئی۔

قریب ہی ڈریسنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ جانکی قالین پر بیٹھے بیٹھے ڈریسنگ کی درازیں کھول کر دیکھنے لگی۔ اس سے یہ حرکت غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی تھی مقصد تلاشی لینا نہیں تھا۔ سب سے نیچے والی دراز میں گتے کا ایک ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ڈبا دراز سے نکال کر کھول لیا اور پھر اس کے قہقہوں کی آواز سن کر میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔ ڈبے پر نظر پڑتے ہی میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

جانکی پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ڈبا چھین کر دراز میں رکھا اور دھڑ سے دراز بند کر دی۔ اس وقت ٹی وی اسکرین پر بھی بڑا خوفناک قسم کا منظر آ رہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے بیڈ سے اٹھ گیا اور ٹی وی بند کر دیا اور جانکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔ جبکہ جانکی بدستور قہقہے لگا رہی تھی۔

جانکی کے کمرے میں آ کر میں نے اسے بیڈ پر گرا دیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے کاراشان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ اسے کسی مرد کی ضرورت کیوں نہیں تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کاراشان اپنے انہی گندے مقاصد کی تکمیل کے لیے تو مجھے یہاں لے کر نہیں آئی؟ یقیناً ایسی ہی بات ہوگی۔ میں نے صبح اس پولیس آفیسر کی باتیں بھی سنی تھیں۔ کاراشان اکثر آوارہ گرد بھکشوؤں کو کئی کئی روز تک اپنے گھر میں رکھتی رہی ہے۔ لوگوں کو بظاہر یہی تاثر ملتا تھا کہ وہ ان کی مالی مدد کرتی ہے مگر اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ کسی بھکشو کو عورت کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن بھکشو بھی آخر انسان ہی ہوتے ہیں۔ کسی مرد کے لیے بہکنا مشکل نہیں ہوتا اور جب کاراشان جیسی حسینہ انہیں دعوت گناہ دے تو کسی مرد کے لیے نفس پر قابو پانا آسان نہیں ہوتا ہوگا۔ مقامی لوگوں کو کاراشان شاید اسی لیے قریب نہ آنے دیتی ہو کہ اس میں بدنامی کا خدشہ تھا۔ بھکشو تو دو چار روز رہ کر چلے جاتے ہیں۔ ان کی طرف سے بدنامی کا کوئی ڈر نہیں تھا اور ہمیں بھی شاید وہ اسی لیے لائی تھی۔ پہلے تو وہ جانکی کو بھی مرد ہی سمجھی تھی پھر جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ عورت ہے تو وہ ہمیں راستے میں اتارنے کے بجائے یہاں لے آئی تھی۔ اس نے مجھ سے اپنی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ یہاں آنے کے بعد جب میں نے نہا کر کپڑے بدلے تھے تو وہ میرے بازوؤں کے مسلز ٹٹولنے لگی تھی اور مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا اور اب عریاں قسم کی فلمیں اور ڈریسنگ کی دراز میں وہ ڈبا دیکھ کر مجھے اس کی نیت کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جانکی آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی۔ مجھے اس وقت جانکی کی نیت میں بھی فتور نظر آ رہا تھا لیکن وہ شرافت سے بیٹھی رہی۔

ہم دیر تک کاراشان کے کردار پر باتیں کرتے رہے۔

● گزشتہ رات کاراشان نے ہمیں اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اب مجھے اس پر بھی شبہ ہو رہا تھا۔ جو عورتیں اس طرح غلط راستے پر نکل جاتی ہوں وہ مردوں کے قابل نہیں رہتیں۔ انہیں مردوں سے تسکین نہیں ملتی۔ ہو سکتا ہے کاراشان کا اپنے شوہر سے بھی کچھ اسی قسم کا جھگڑا شروع ہو گیا ہو اور اس نے دوسری شادی کر لی۔ جانکی نے بھی میری طرح کچھ اسی قسم کا نظریہ قائم کیا تھا۔

ڈیڑھ بج گیا۔ کاراشان کے اس وقت آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی۔ میں نے جانکی کو زبردستی اس کے کمرے میں بھیج دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈاکٹر جی ایم ناز کی
شہرۂ آفاق کتاب
ازدواجی نفسیات
قیمت 40 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
❖ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل
❖ منگنی اور آئیڈیل
❖ ازدواجی ہم آہنگی
❖ ازدواجی زندگی کا جنسی پہلو
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
پیشگی منی آرڈر ارسال کریں
خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ اس وقت سات بجے تھے۔ میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ ہال میں ہوتین سے پتا چلا کہ کاراشان صبح پانچ بجے واپس آئی تھی اور آتے ہی سو گئی تھی۔ میں ہوتین سے کافی کا کپ لے کر لان میں آ گیا۔

تقریباً تین گھنٹوں بعد کاراشان سے آمنا سامنا ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور چہرے پر عجیب سے تاثرات محسوس کیے تھے۔ میں اس کی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا مگر اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید اسے پتا چل گیا تھا کہ گزشتہ رات ہم نے اس کی ڈریسنگ ٹیبل میں وہ ڈبا دیکھ لیا تھا۔ وہ فلم کیسٹ تو رات کو ہم نے وی سی آر ہی میں لگا چھوڑ دیا تھا۔ اس قسم کا راز فاش ہو جانے پر تو اس کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت ہونی چاہیے تھی لیکن اس کے چہرے پر تو عجیب سے تاثرات تھے جس سے میرے اندر بے چینی سی بھر گئی تھی اور میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلانے لگی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا تھا اور اس وقت بھی مجھے یقین تھا کہ بہت جلد کوئی گڑبڑ ہونے والی ہے۔

"کل تو تم دن بھر اور پھر رات بھی غائب رہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس بھکشو والے معاملے کا کیا ہوا؟"

"کل دوپہر کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے شہر سے باہر جانا پڑ گیا تھا۔" کاراشان نے جواب دیا "بھکشو والا معاملہ ابھی جوں کا توں ہے۔ پولیس نہ تو قاتل بھکشو کو گرفتار کر سکی ہے اور نہ ہی دوسرے دو بھکشوؤں کا کوئی سراغ ملا ہے۔ پولیس کی تحقیقات ابھی جاری ہے۔ گرد بیٹھنے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا لیکن تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تم لوگ بالکل محفوظ ہو۔"

جانگی گیارہ بجے کے قریب سو کر اٹھی تھی۔ بارہ بجے کے قریب کاراشان گاڑی پر باہر چلی گئی۔ اس کی واپسی چار بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس وقت بھی میں نے اس کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی تھی۔

اس رات کھانے کے بعد ہم کاراشان کے ساتھ ہال کمرے ہی میں بیٹھے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کاراشان کی فرمائش پر ہوتین نے ہمیں کافی بنا کر دی اور سونے کے لیے کوٹھی کے پہلو میں واقع اپنے سرونٹ کوارٹر میں چلی گئی۔

کافی پینے کے بعد ہم زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھے۔ جانگی کو بڑے زور کی نیند آ رہی تھی اور میں بھی دماغ میں کچھ بوجھل پن سا محسوس کر رہا تھا۔ جانگی اکیلی سونے کو تیار نہیں تھی۔ وہ میرے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں نے ٹیوب لائٹ بجھا کر نائٹ بلب روشن کر دیا اور بیڈ کے کنارے پر لیٹ گیا۔ میں رات کے وقت جانگی سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس روز وہ کاراشان کے پراسرار رویے سے کچھ ڈری سی گئی تھی اور میرے ساتھ سونے پر بضد تھی۔ میں نے اپنے اور اس کے درمیان کم از کم دو بالشت کا فاصلہ رکھا تھا۔ جانگی چند منٹ باتیں کرتی رہی اور پھر سو گئی۔

اور پھر یکایک مجھے یوں لگا جیسے وہ خواب نہیں سب کچھ حقیقت تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے لیکن حقیقت سے فرار میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے جسم پر لباس نہیں تھا اور وہ حسینہ مجھے دبوچے ہوئے تھی۔ میں اسے پیچھے دھکیلنے لگا۔ میرے خیال میں وہ جانگی تھی جو موقع پا کر یہ گندی حرکت کر گزری تھی لیکن یہ خوفناک انکشاف میرے لیے بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ وہ جانگی نہیں کاراشان تھی۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا دیا اور خود بھی پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کاراشان بیڈ پر پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ نیلگوں روشنی میں اس کا چہرہ اس وقت مجھے کسی چڑیل سے بھی زیادہ بھیانک اور گھناؤنا لگ رہا تھا۔

"کل رات تمہارے بیڈ روم میں وہ چیزیں دیکھ کر تمہارے گھناؤنے کردار کا پتا چل گیا تھا۔" میں نے اٹھ کر کپڑے پہنتے ہوئے کہا "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ہمیں کل دن میں ہی یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔"

"تم ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو پاتے۔" کاراشان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر تم زبردستی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے تو میری گارڈ یا تو تم لوگوں کو پولیس کے حوالے کر دیتی یا گولی سے اڑا دیتی۔"

"تمہارا گھناؤنا مقصد پورا ہو چکا ہے۔" میں نے کہا "بہتر ہے کہ دن کی روشنی پھیلتے ہی ہمیں یہاں سے چلے جانے دو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ جانگی کہاں ہے؟" میرا خیال تھا کہ اس نے جانگی کو نیند کی حالت میں ہی اٹھا کر دوسرے کمرے میں لٹا دیا تھا اور مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ جانگی اتنی گہری نیند سو گئی تھی کہ اس طرح اٹھا کر لے جائے جانے پر اس کی آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔

"جانگی جہاں بھی ہے محفوظ ہے۔ تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" کاراشان نے جواب دیا۔

میں اس کے الفاظ پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

جانگی اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ میں نے کاراشان کے بیڈ روم میں جھانکا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی اور پھر میں نے تمام کمرے دیکھ ڈالے۔ جانگی کہیں بھی نہیں تھی۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ آج دن میں میری چھٹی حس بار بار جس گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی، وہ شروع ہو چکی تھی۔

میں دوبارہ اس کمرے میں آ گیا۔ کاراشان اب بھی اسی طرح بستر پر بے لباس پڑی تھی۔ جانگی کے اس طرح غائب کر دیے جانے پر مجھے اپنے غصے پر قابو نہیں رہا تھا۔ کاراشان کو مسکراتے دیکھ کر میرا پارا کچھ اور بھی چڑھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑا اور جھٹکے سے اٹھا دیا۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر جم گیا تھا۔

"بتاؤ جانگی کہاں ہے ورنہ میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔" میں اس کی گردن پر انگلیاں گاڑتے ہوئے غرایا۔

"م۔ مجھے چھوڑ دو۔" اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی "اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم خود بھی نقصان اٹھاؤ گے اور جانگی بھی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی۔"

میں نے ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کی گردن چھوڑ دی۔

"بتاؤ جانگی کہاں ہے۔" میں اسے گھورتے ہوئے بولا "اگر اسے کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"جانگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی "البتہ اگر تم نے اپنے غصے پر قابو نہ پایا تو تم خود نقصان اٹھاؤ گے۔ بہتر ہو گا کہ اطمینان سے بیٹھ کر بات کی جائے۔ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی معاملے میں مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے اور اس نے جانگی کو بھی یرغمال بنا لیا تھا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آ رہی تھی کہ یہ منصوبہ پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ جانگی کی کافی میں کوئی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی جسے پیتے ہی اسے نیند آنے لگی تھی اور وہ بستر پر لیٹتے ہی سو گئی تھی بلکہ بے ہوش ہو گئی تھی اور میں بھی اس قدر گہری نیند سویا تھا کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چل سکا کہ اسے کب بستر سے اٹھایا گیا تھا اور میرے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا اسے میں خواب سمجھتا رہا۔

مجھے کاراشان کے کردار کا تو پتا چل گیا تھا۔ وہ مجھ سے اپنی جنسی بھوک مٹانا چاہتی تھی۔ ہمیں یہی کہتی رہی تھی کہ پولیس کو دو بھکشوؤں کی تلاش ہے اس لیے ہمارے لیے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ گویا یہ ہمارے لیے دھمکی تھی لیکن اب اس نے جانگی کو بھی غائب کر دیا تھا۔ اس طرح وہ اپنی گرفت مضبوط کرنا چاہتی تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ اس کوٹھی کے نیچے کوئی تہ خانہ موجود ہے جہاں جانگی کو غائب کیا گیا تھا۔

"کپڑے پہنو۔" میں نے اسے گھورا "ہم ہال کمرے میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

اس نے کرسی پر پڑا ہوا شب خوابی کا لباس اٹھا کر پہن لیا اور کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے بیڈ کا میٹرس اٹھا کر اس کے نیچے چھپایا ہوا خنجر نکال کر قمیص کے نیچے پتلون میں اڑس لیا۔ پستول میں نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں میں نے پہلے ہی روز یہاں چھپا دی تھیں۔ جانگی کا پستول بھی اس کے بیڈ کے میٹرس کے نیچے چھپا ہوا تھا۔

میں ہال کمرے میں پہنچا تو کاراشان کچن میں داخل ہو چکی تھی۔ میں صوفوں کے درمیان قالین پر ٹہلنے لگا۔

کاراشان تقریباً پندرہ منٹ بعد کچن سے باہر نکلی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں کافی کے کپ اٹھا رکھے تھے۔ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس نے دونوں کپ شیشے کے ٹاپ والی سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے۔

"میرا خیال ہے تم بھی اس وقت کافی کی طلب محسوس کر رہے ہو گے۔" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "بیٹھ جاؤ۔ اس طرح کب تک زمین کا سینہ کوٹتے رہو گے۔"

"میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ تمہارا گلا گھونٹ دوں۔" میں اسے گھورتا ہوا اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا "تم لوگوں کے سامنے بہت نیک اور پارسا بنتی ہو۔ بھکشوؤں کی مدد کرتی ہو۔ انہیں اپنے گھر میں ٹھہرا کر ان کی خاطر مدارات کرتی ہو۔ لوگ تمہاری تعریفیں کرتے ہوں گے۔ کتنی مہربان اور ہمدرد ہو تم لیکن میں نے تمہاری اصلیت جان لی ہے۔ تم نہایت گھٹیا اور نیچ عورت ہو۔ تم ہمدردی کے جذبے کے تحت نہیں، اپنے سفلی جذبات کی تسکین کے لیے بھکشوؤں کو گھر پر لے کر آتی ہو۔ اپنی ہوس کی آگ بجھانے کے لیے انہیں راستے سے بھٹکاتی ہو۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔"

"شیطان میں نہیں۔" کاراشان نے بے غیرتی سے مسکراتے ہوئے کہا "شیطان تو ان لوگوں کے اندر چھپا ہوتا

ہے جو مذہب کا لبادہ اوڑھ کر پارسا بنے ہوئے ہیں۔ یہ بھکشو بدھ کے پیرو کار ہیں۔ بدھ کے پیرو کاروں کے لیے تزکیہ نفس پہلی شرط ہے اور بھکشوؤں پر تو اس مذہب کے حوالے سے بہت سی شرائط اور پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ چوری نہیں کرے گا۔ جھوٹ نہیں بولے گا۔ کوئی نشہ آور چیز استعمال نہیں کرے گا۔ زنا نہیں کرے گا۔ رقص و سرور کی محفلوں میں شریک نہیں ہوگا۔ خوشبو استعمال نہیں کرے گا۔ بیٹھنے کے لیے گدا یا آرام دہ سیٹ استعمال نہیں کرے گا اور کسی سے سونا چاندی قبول نہیں کرے گا۔ مگر۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "کیا تم نے کوئی ایسا بھکشو دیکھا ہے جو ان شرائط پر پورا اترتا ہو۔ پیلی چادر اوڑھ لینے سے کوئی راہب نہیں بن جاتا۔ یہ لبادہ تو انہوں نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ ان میں ہر وہ برائی موجود ہے جس کی گوتم بدھ نے ممانعت کی تھی۔ جھوٹ یہ بولتے ہیں' چوریاں یہ کرتے ہیں۔ شراب اور ہر نشہ آور چیز یہ استعمال کرتے ہیں۔ کوئی عورت مل جائے تو بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ وہ کون سا گناہ ہے جو یہ لوگ نہیں کرتے۔" کاراشان کے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی "تم پہلے مرد ہو جسے میں نے اپنے سامنے نظریں جھکائے ہوئے دیکھا ہے اور یہ بھکشو۔۔۔ میں اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے انہیں یہاں لے کر آتی ہوں۔ مجھے زبان سے کچھ نہیں کہنا پڑتا۔ نہ ہی اشاروں کنایوں سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مجھے اپنے جسم سے صرف ذرا سا لباس سرکانا پڑتا ہے اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ یہ دیکھو۔۔۔" اس نے اپنی میکسی اتار دی "میرے جسم پر یہ ان کے ناخنوں اور دانتوں کے نشان ہیں۔ کیا تم انہیں راہب اور کسی ایسے شخص کا نام دے سکتے ہو جو کسی مذہب کا سچا پیرو کار ہو۔"

اس کی ٹانگوں' پیٹ اور سینے پر ایسے نشان نظر آرہے تھے جیسے دانتوں اور ناخنوں سے نوچا گیا تھا۔

"یہ انسان نہیں وحشی ہیں۔ انہوں نے صرف پیلی چادر اوڑھ رکھی ہے' یہ لوگ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور یہاں آنے والوں کو میں یہ موقع فراہم کرتی تھی۔ اس رات تم دونوں کو سڑک پر دیکھ کر بھی میرے دل میں ایسا ہی خیال آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہارے ساتھی کی اسپتال سے مرہم پٹی کروا کر تم دونوں کو خدمت کے بہانے اپنے گھر لے آؤں گی لیکن راستے میں یہ انکشاف بڑا دلچسپ ثابت ہوا کہ میری کار سے ٹکرانے والا تمہارا ساتھی مرد نہیں عورت ہے۔ بہرحال میں تم لوگوں کو یہاں لے... پھر تم نے بھی یہ اعتراف کر لیا کہ تم بھکشو نہیں ہو... تھا کہ تم لوگوں نے کسی خاص مقصد کے لیے بھیس... ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ چینی... جاسوس ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ تم لوگ تو... اس شبے کی زد میں آسکتے تھے۔ میں نے تم لوگوں... اپنے مقاصد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ ایک... لمحوں کو خاموش ہو کر کافی کی چسکیاں لیتی رہی پھر بات... رکھتے ہوئے کہنے لگی "پہلا مقصد تو یہی تھا یعنی تم جیسے... صورت اور بھرپور جوان سے اپنی ہوس کی پیاس بجھا... جب میں نے تمہیں اپنی طرف سے آنکھیں چرا... دیکھا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ حالانکہ میں ایسی چیز... مجھے دیکھ کر عبادت گاہ کی طرف جانے والے بھکشو... بھی ڈانواں ڈول ہو جائے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ شاید... ساتھی کی وجہ سے مجھ سے کترا رہے ہو لیکن اب میں... سے کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری ساتھی بھی تمہارے... ترس گئی ہوگی۔" وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں... بھی وہی مسکراہٹ تھی جو مجھے اس وقت بڑی مکروہ... تھی۔

اس کی بکواس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تم... جانگی کی فکر تھی۔ جسے اس نے کہیں غائب کر دیا تھا... پر غمال بنا کر مجھ سے کوئی گھناؤنے مقاصد حاصل کرنا... تھی۔ اس نے کافی کی آخری چسکی لے کر خالی کپ میز... دیا۔ میں نے ابھی تک اپنے کپ کو چھوا تک نہیں تھا...

"میں نے تمہیں اپنے شوہر کے بارے میں بتایا تھا..." میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے تم سے یا تمہارے شوہر سے کوئی دلچسپی... ہے۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "میں جانگی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کہاں ہے وہ؟"

"میں نے کہا نا کہ تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خیریت سے ہے۔" کاراشان نے... تمہیں اپنے شوہر سیان چانگ کے بارے میں بتا رہی... نے دوسری شادی کر لی ہے۔ ایک سال پہلے سیان چانگ... جو وصیت تیار کی تھی اس کے مطابق اس کی ساری... اور جائداد کی واحد وارث میں ہوں لیکن اب مجھے... کہ اس نے اپنے وکیل سے نئی وصیت تیار کرنے کو... جس میں مجھے ہر چیز سے محروم کر دیا جائے گا اور اس... بیوی کو واحد قانونی وارث قرار دیا جائے گا۔"

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

"مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر

"کیا یہ کافی نہیں کہ تمہیں آدھی جائداد مل جائے" میں نے کہا "اس بنگلے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تمہیں بھی کئی ملین کا حصہ ملے گا۔"

"آدھے حصے کی شرط طلاق کی صورت میں ہے۔" کاراشان نے جواب دیا "اگر وہ مجھے طلاق نہیں دیتا اور وصیت میں مجھے ہر چیز سے محروم کر دیتا ہے تو اس کے مرنے کے بعد مجھے ایک یوآن بھی نہیں ملے گا۔ مجھے سیان چانگ کی دوسری شادی سے کوئی غرض نہیں۔ وہ دس شادیاں اور بھی کرلے تو مجھے پروا نہیں ہوگی۔ مجھے صرف اس کی دولت چاہیے اور یہ میں ہر صورت میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے میری زندگی برباد کی ہے۔ میں اسے بھی نہیں چھوڑوں گی۔"

"تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔ دولت' عیش و عشرت کا ہر سامان تو موجود ہے تمہارے پاس۔"

"میں اتنی بدچلن اور بدکردار نہیں تھی۔" کاراشان نے کہا "کیبرے ڈانسر ہونے کے باوجود میں نے اپنے آپ کو سجا کر رکھا تھا۔ کوئی میرے کردار پر انگلی اٹھانے کی جرات نہیں کر سکتا تھا لیکن سیان چانگ سے شادی کے بعد میرے کردار کی بربادی شروع ہوئی۔ اس کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔ یوں تو وہ خاصا صحت مند نظر آتا ہے مگر اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے۔ اپنی تسکین کے لیے میرے ساتھ غیر فطری اور مصنوعی طریقے اس نے اختیار کیے تھے جس سے میں غلط راستوں پر نکل گئی۔ مجھے اس طرح برباد کرنے کے بعد اب وہ مجھے اپنی وراثت سے بھی محروم کرنا چاہتا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"یہ تم دونوں کا جھگڑا ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق؟" میں نے اسے گھورا۔

"سیان چانگ کے قانونی مشیر کے دفتر کا ایک کلرک میرا ہمدرد ہے۔" کاراشان نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اس نے مجھے بتایا تھا کہ سیان چانگ نے وکیل کو نئی وصیت تیار کرنے کو کہا ہے اور اس نئی وصیت کے مطابق مجھے ہر چیز سے محروم کر دیا جائے گا لیکن اگر نئی وصیت تیار ہونے سے پہلے ہی سیان چانگ اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو پرانی وصیت کے مطابق اس کی قانونی وارث میں ہی ہوں گی۔"

نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"تم سیان چانگ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔" کاراشان نے اس طرح پرسکون لہجے میں کہا جیسے میز پر پڑا ہوا گلاس اٹھانے کو کہہ رہی ہو۔

میں اچھل پڑا۔ میرے بدترین خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے شرٹ کے نیچے سے خنجر نکال لیا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

"میں کسی بے گناہ کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا لیکن اگر تم نے جانگی کا پتا نہیں بتایا تو یہ خنجر تمہارے دل میں اتار دوں گا۔ بتاؤ جانگی کہاں ہے؟"

"میں نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی۔" کاراشان کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے آپ کو خنجر کی زد میں پا کر بھی اس کے چہرے پر خوف کے معمولی سے تاثرات بھی نہیں ابھرے تھے "تم میرے سینے میں خنجر اتارنے کا شوق پورا کر سکتے ہو لیکن اس طرح نقصان تمہارا ہی ہوگا اور جانگی بھی نہیں ملے گی۔ البتہ میری بات مان لو تو تم فائدے ہی میں رہو گے۔ میرے خیال میں تین قتل کرنے کے بعد چوتھا قتل کرنے میں تمہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہیے۔"

"تین قتل!" میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا "کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتی ہو تم؟"

"کل دوپہر پولیس آفیسر سے باتوں کے دوران میں پتا چلا کہ یہاں سے ساٹھ ستر میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب جنگل میں واقع ایک بہت پرانی عبادت گاہ میں تین آدمیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ پولیس کو دو بھکشوؤں پر قتل کا شبہ ہے۔" کاراشان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگی "مجھے تجسس ہوا اور میں صورت حال معلوم کرنے کے لیے خود اس قصبے تک چلی گئی اور پھر معلومات حاصل کرتے ہوئے میں اس چھوٹی سی بستی میں بھی پہنچ گئی جہاں دو ایسے بھکشوؤں نے چند روز قیام کیا تھا جن میں ایک عورت بھی تھی۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"اس بستی میں ہماری ملاقات ہوکیانگ اور ہوکیدو سے بھی ہوئی تھی جن کے گھر میں تم دونوں نے قیام کیا تھا۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "تم دونوں نے منگ شوئی کے ہاتھوں ہوکیدو کو رسوا ہونے سے بھی بچایا تھا جس پر بستی کے سب لوگ تم دونوں کے شکر گزار تھے۔

"اور جب تم لوگوں کو ایک خچر گاڑی پر وہاں سے روانہ کیا گیا تو راستے میں منگ شوئی اور اس کے دو ساتھیوں نے تم

لوگوں کو گھیر لیا اور بوڑھے کو نہر میں پھینک کر تم دونوں کو جنگل میں واقع ایک پرانی عبادت گاہ میں لے گئے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی؟" وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی "جس بوڑھے کو جوان کو نہر میں پھینکا گیا تھا وہ بچ گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح نہر سے نکل آیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد تم لوگوں نے اسے سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے پایا۔ تم لوگ اسے ہوش میں لائے اور اسے خچر گاڑی پر بستی واپس بھیج دیا۔"

کاراشان یہ ساری تفصیل اس طرح بتا رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ مجھے اپنے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری شرٹ پسینے سے تر ہونے لگی۔ وہ میرے چہرے پر نظریں جمائے بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کل صبح جنگل کی اس عبادت گاہ سے تین آدمیوں کی لاشیں ملی ہیں جن میں ایک لاش منگ شوئی کی ہے اور دو اس کے ساتھیوں کی۔ پولیس کو ان دو بھکشوؤں کی تلاش ہے جو اس روز قصبے کے اسٹاپ سے ڈانگ کو آنے والی بس میں سوار ہوئے تھے۔ پولیس ابھی اس چھوٹی سی بستی تک نہیں پہنچی۔ یہ کہانی صرف میں جانتی ہوں کہ وہ دونوں بھکشو کون تھے۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ تم کون سا راستہ اختیار کرتے ہو۔ میری بات مان لینے کی صورت میں تم فائدے میں رہو گے۔ میرا کام ہو جانے کے بعد تم لوگ جہاں چاہو گے، بحفاظت پہنچا دیے جاؤ گے لیکن اگر تم کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر کے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرو گے تو اس شہر سے بھی باہر نہیں جا سکو گے۔"

میرا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ میرا خنجر والا ہاتھ نیچے جھک گیا۔ کاراشان اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی "ہو سکتا ہے اس سے پہلے بھی کچھ لوگ تمہارے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر چکے ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ کسی کو قتل کرنا تمہارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایک اور آدمی کو ٹھکانے لگا دینے سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمام تحفظات فراہم کرنے کے علاوہ تمہیں منہ مانگا معاوضہ بھی ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ میری زبان بھی جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ ہونٹ سل گئے تھے۔ منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو گیا تھا اور ... کر کانٹے کی طرح تالو میں چبھ رہی تھی۔

کاراشان نے کچھ اور میری طرف جھکتے ... باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ اس کے ساتھ ... ہوش میں آ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ اپنی گردن ... اور کمر سے پکڑ کر اچھال دیا۔ وہ ہوا میں اڑتی ہوئی ... فٹ دور سامنے والے صوفے پر گری اور صوفہ ... دوسری طرف الٹ گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل ...

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کارا... اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کولہا اور ... ہاتھ سے کندھا سہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ... سی بھر گئی تھی۔ اسے یقیناً اس بات پر حیرت تھی کہ ... بیٹھے بیٹھے اسے اتنی دور کس طرح اچھال دیا تھا۔

وہ چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑی رہی پھر میرے قریب ... اس نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے اور مسلز میں ... گاڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے تمہاری طاقت کا اندازہ ہو چکا ہے۔ تم ... سے بڑی آسانی سے کسی سانڈ کی گردن بھی مروڑ سکتے ...

"اس وقت تو میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہاری ... مروڑ دوں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ جھٹکتے ... جواب دیا "اگر جانکی کو کوئی نقصان پہنچا تو میں تمہیں ... نہیں چھوڑوں گا۔"

"جانکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" اس کے ... ایک بار پھر مسکراہٹ آ گئی "میں سمجھتی ہوں کہ اس ... کچھ اپ سیٹ ہو رہے ہو۔ کوئی بات ڈھنگ سے نہیں ... سکو گے۔ اب تم آرام کرو۔ ہم صبح بات کریں گے۔" ... لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم نے کافی نہیں پی ... ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اگر کہو تو میں تازہ کافی بنا دوں؟"

میں اس وقت واقعی کافی کی طلب محسوس کر ... زبان کو حرکت دینے کے بجائے میں نے اثبات میں ... وہ سینٹر ٹیبل پر پڑے ہوئے کپ اٹھا کر کچن کی طرف ... میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ صبح کے ... والے تھے۔ اس وقت جس قسم کی صورت حال سے ... تھا، نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ... آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کاراشان ہمیں اپنے ... آئی تھی تو میں اسے بہت ہمدرد اور نیک دل خاتون ... لیکن وہ بڑی حرافہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کی عیاری ... کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ اس نے ... کم از کم ... میل دور اس چھوٹی سی بستی تک پہنچ کر ہمارے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں بلکہ میرے گرد ایک ایسا جال بھی بن دیا تھا جس سے نکلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اسے قتل کر کے بڑی آسانی سے یہاں سے فرار ہو سکتا تھا لیکن مجھے جانکی کی فکر تھی جسے اس نے کہیں غائب کر دیا تھا۔

وہ پندرہ بیس منٹ بعد کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے کپ میرے سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ خود بھی شاید بیٹھنا چاہتی تھی لیکن میں تنہائی چاہتا تھا اور فی الحال اس کی بکواس نہیں سننا چاہتا تھا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں کپ اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ چند گھونٹ بھرنے کے بعد میرے دماغ کی سنسناہٹ بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔

اس میں شبہ نہیں کہ کاراشان نے بڑی چالاکی سے میرے گرد جال بنا تھا۔ میری جلد بازی یا جذباتیت صورت حال کو مزید بگاڑ سکتی تھی۔ اس معاملے پر ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی ضرورت تھی۔ ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔ جاسوسی کا الزام نہ سہی لیکن منگ شوئی اور اس کے دو ساتھیوں کے قتل آسانی سے ثابت کیے جا سکتے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کسی اجنبی ملک میں اگر کسی کو چوری کے معمولی سے جرم میں بھی پکڑ لیا جائے تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔

عجیب صورت حال تھی۔ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ میری زندگی ٹکڑوں میں بسر ہو رہی تھی۔ میں نے دارا، ٹائیگر، پیڈرو اور جنرل کھوراٹ تک کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے لیکن اس حسین ناگن نے مجھے اس طرح جکڑا تھا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ میں چونکا تو اس وقت جب ہوتین کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس وقت صبح کے سات بجنے والے تھے۔ ہوتین بڑی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا اور بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ خنجر میں نے دوبارہ میٹرس کے نیچے چھپا دیا تھا۔ فی الحال اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میری آنکھوں میں شدید جلن تھی۔ دماغ میں ایک بار پھر سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور جانکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہو گی۔

میں شاید سو گیا تھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ دماغ میں اب بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے کچھ سکون سا ملا۔

جب میں ہال کمرے میں آیا تو کاراشان پہلے سے وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر وہی رات والا شب خوابی کا لباس تھا۔ سفید شیفون جیسے باریک کپڑے سے اس کا جسم جھلک رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور اٹھ کر سائڈ ٹیبل کے قریب جا کر بیٹھ گئی جہاں ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا۔ کچھ دیر چینی زبان میں بات کرتی رہی پھر فون اٹھا کر میرے قریب آ گئی۔

"لو۔ جانکی سے بات کر لو۔ تاکہ تمہیں تسلی ہو جائے کہ وہ خیریت سے ہے۔" اس نے کہتے ہوئے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس سے ریسیور لے کر کان سے لگا لیا۔ اس کے ساتھ ہی جانکی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو وجدان ۔۔۔ تم کہاں ہو ۔۔۔ یہ سب کیا ہے ۔۔۔؟"

"تم کیسی ہو جانکی۔ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بیدار ہوئی ہوں۔ رات کو شاید کافی میں بے ہوشی کی دوا ملائی گئی تھی۔ کیا کاراشان ۔۔۔"

"ہاں جانکی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "جسے ہم بہت معصوم اور بھولی بھالی سمجھتے تھے۔ وہ بڑی خطرناک عورت نکلی، اس نے یہ سب کچھ بڑی پلاننگ کے تحت کیا ہے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ منگ شوئی اور اس کے دو ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس نے تمہیں بے ہوش کر کے کہیں اور پہنچا دیا اور مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔"

"کیا چاہتی ہے وہ۔ ہمارے پاس کیا ہے جس کے لیے یہ تمہیں بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔" جانکی نے کہا۔

"اسے شبہ ہے کہ اس کا شوہر ایک نئی وصیت لکھنے والا ہے جس میں اسے ہر چیز سے محروم کر دیا جائے گا۔ کاراشان اس نئی وصیت پر دستخط ہونے سے پہلے اپنے شوہر کو میرے ہاتھوں قتل کروانا چاہتی ہے تاکہ پرانی وصیت کے مطابق

کاراشان ہی اس کی واحد قانونی وارث قرار پائے۔"
"اوہ…!" جانکی کی آواز سنائی دی "تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"
"اگر تمہیں یرغمال نہ بنایا جاتا تو میرا فیصلہ کچھ اور ہوتا لیکن اب مجھے سوچنا پڑے گا۔ انکار کی صورت میں اس نے ہم دونوں کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی ہے اور تم جانتی ہو ہمارے خلاف منگ شوئی اور اس کے ساتھیوں کا قتل ثابت کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"
"اوہ!" جانکی صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔
"تم کہاں ہو۔ میرا مطلب ہے کسی تہ خانے میں یا…"
"نہیں۔ یہ پہاڑیوں میں کوئی مکان ہے۔" جانکی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "سرسبز پہاڑیاں ہیں۔ مکان کے پچھلی طرف ایک جھرنا بھی بہہ رہا ہے۔ کھڑکی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی ہیں۔"
"تمہاری حفاظت کے لیے کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"آدمی نہیں دو عورتیں ہیں لیکن آدمیوں سے زیادہ خطرناک۔ دونوں مسلح ہیں اور بڑی خرانٹ ہیں۔" جانکی نے جواب دیا۔
میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر قریب کھڑی ہوئی کاراشان نے ریسیور میرے ہاتھ سے لے کر فون بند کردیا۔
"اب تو تمہیں اطمینان ہوگیا ناکہ جانکی محفوظ ہے اور اس کی عزت کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "آؤ۔ باقی باتیں ہم ناشتے کے دوران میں کرلیں گے۔"
ہم ڈائننگ روم میں آگئے۔ گول میز پر ناشتا لگا ہوا تھا۔ جانکی سے بات ہوجانے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہوگیا تھا۔ اس لیے میں نے ناشتے کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا۔
"تو گویا تم میرا کام کرنے کو تیار ہو؟" کاراشان نے میری طرف دیکھا۔
"لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ کام ہوجانے کے بعد تم ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروگی؟" میں نے کہا۔
"تمہیں میری زبان پر بھروسا کرنا پڑے گا۔" کاراشان نے کہا "میں اگر چاہتی تو یہ کام کسی اور شخص سے بھی لے سکتی تھی۔ یہاں کرائے کے قاتل حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ میں جس شخص سے بھی یہ کام لوں گی وہ بعد میں مجھے بلیک میل کرنے لگے گا۔ جبکہ تم سے مجھے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔
"میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش اپنی سوتن سے انتقام لینا اور شوہر کی ساری دولت اور جائداد پر قبضہ کرنا ہے۔ اس کے بعد تو میرا اور کوئی کام نہیں رہ جائے گا۔ مگر تم دونوں کو بڑے احترام سے رخصت کردوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے اور تمہیں میرے وعدے پر یقین کرنا ہوگا۔"
"تم نے بتایا تھا کہ تمہارا شوہر فان کنگ میں ہے۔ کیا تمہارے خیال میں میں کسی رکاوٹ کے بغیر آسانی سے وہاں تک پہنچ سکوں گا؟" میں نے کہا۔
"سیان چانگ کو قتل کرنے کے لیے تمہیں فان کنگ جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم چاہو تو یہ کام آج ہی رات کرسکتے ہو۔"
"کیا وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے اس شہر میں؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں۔" کاراشان نے نفی میں سر ہلایا۔
"دریا کے دوسری طرف تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر چائے کے باغات ہیں۔ سیان چانگ آج کل وہیں آیا ہوا ہے۔ وہ تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہے گا۔ وہ ایسی جگہ ہے کہ تم آسانی سے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتے ہو لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ سیان چانگ کو واقعی قتل کیا جاچکا ہے۔"
"تم میرے ساتھ چلو۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔
"نہیں۔ اگر میں آس پاس کہیں دیکھ لی گئی تو مجھ پر شبہ کیا جائے گا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ حاشی تمہارے ساتھ چلی جائے۔"
"حاشی کون؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
"میری گارڈ۔" کاراشان نے جواب دیا "ٹھیک ہے۔ حاشی ہی تمہارے ساتھ جائے گی۔ تم لوگ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی یہاں سے روانہ ہوجاؤ۔ اگر کام جلدی ہوگیا تو آدھی رات سے پہلے واپس بھی آسکتے ہو۔"
"کیا تمہارا شوہر انگریزی زبان سمجھتا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"کیوں۔ کیا اس سے گپ شپ کا ارادہ ہے۔" اس نے مجھے گھورا۔
"میں اسے دور سے گولی نہیں ماروں گا۔" میں نے جواب دیا "میں اس سے کسی بھی بہانے براہ راست ملاقات کروں گا اور بہلا پھسلا کر ایسی جگہ پر لے آؤں گا جہاں حاشی

چھپی ہوئی ہوگی۔ میں حاشی کے سامنے اسے موت کے گھاٹ اتاروں گا تاکہ تمہارے بھی دل میں کوئی شبہ نہ رہے۔"
ناشتے کے بعد کاراشان نے حاشی کو بلالیا اور میں اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے کاراشان سے سیان چانگ کے بارے میں کچھ ضروری معلومات حاصل کرلی تھیں تاکہ اسے شناخت کرنے میں پریشانی نہ ہو۔
اور پھر اس شام اندھیرا پھیلتے ہی میں حاشی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگیا۔ ہم میں طے ہوا تھا کہ میرے جانے کے بعد کاراشان، جانکی کو بنگلے پر لے آئے گی اور میں اپنے مشن سے جیسے ہی واپس لوٹوں گا جانکی کو لے کر یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔
یہ ایک بند وین تھی۔ حاشی نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ روانگی سے تھوڑی دیر پہلے حاشی کو میں نے پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ اس کی عمر اگرچہ چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن کاراشان سے زیادہ زوردار قسم کی عورت تھی۔ اس وقت اس نے نیلی جینز اور اسی رنگ کی اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ صحت مند عورت تھی اور جسمانی طور پر اس میں کاراشان کے مقابلے میں سیکس اپیل زیادہ تھی۔
سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ دریا کا پُل پار کرتے ہی وین کی رفتار تیز ہوگئی۔
وہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ دونوں طرف ٹیلا نما چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن پر سبزہ تو نظر آرہا تھا لیکن میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس قسم کے پودے یا درخت تھے۔ یہ تو حاشی نے بتایا تھا کہ یہ چائے کے باغات تھے جو ان ٹیلا نما پہاڑیوں میں میلوں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔
ایک گھنٹے تک اس سڑک پر چلتے رہنے کے بعد حاشی نے وین کی رفتار کم کرلی اور پھر اسے بائیں طرف ایک پتھریلے راستے پر موڑ دیا۔ اس طرف ٹیلے زیادہ بلند نہیں تھے۔ ایک وادی تھی جو دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دن کا وقت ہوتا تو میرے لیے یہ نظارہ قابل دید ہوتا لیکن رات کے اندھیرے میں پودوں کے ہیولوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔
"یہاں سے سیان چانگ کے چائے کے باغات شروع ہوجاتے ہیں۔" حاشی نے دائیں بائیں اشارہ کرتے ہوئے بتایا "یہ باغات میلوں دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ ان باغات کا دورہ کرنے کے لیے گاڑی میں ڈیڑھ گھنٹا لگ جاتا ہے۔"
تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے وین ایک اور راستے پر موڑ لی۔ دونوں طرف چار پانچ فٹ اونچے چائے کے پودے تھے۔ وین تقریباً دس منٹ تک ان پودوں کے درمیان چلتی رہی اور بالآخر ایک جگہ رک گئی۔ حاشی نے انجن بند کردیا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی وین سے اتر آیا تھا۔ تقریباً پانچ منٹ تک ہم دونوں پودوں میں چلتے ہوئے ایک ٹیلے پر پہنچ گئے۔ دوسری طرف نشیب میں تقریباً دو سو گز دور کچھ روشنیاں نظر آرہی تھیں۔
"وہ روشنیاں دیکھ رہے ہو۔" حاشی اشارہ کرتے ہوئے بولی "وہاں سپروائزر کا مرکزی دفتر، چائے کی پتیاں بریو کرنے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری اور سیان چانگ کا رہائشی کاٹیج ہے۔ اس کے ساتھ ہی ٹیلے کے دوسری طرف مزدوروں کے پانچ چھ ہٹس ہیں جو یہاں سے نظر نہیں آرہے۔ دائیں طرف سب سے الگ تھلگ روشنی سیان چانگ کے کاٹیج کی ہے۔ کھڑکیوں میں بھی روشنی نظر آرہی ہے۔ سیان چانگ اس وقت اپنے کاٹیج ہی میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے سپروائزر کے علاوہ کچھ مزدور بھی اس کے ساتھ موجود ہوں۔ تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ معمولی سی غلطی تمہاری موت کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ دائیں طرف کی اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے تم کاٹیج کے عقب میں پہنچ جاؤ گے۔"
حاشی یہ سب کچھ اس طرح بتا رہی تھی جیسے یہاں کا چپا چپا اس کا دیکھا ہوا ہو اور میرے خیال میں اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ کاراشان کے ساتھ یہاں آتی رہتی تھی۔
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "تم یہیں رکو گی۔ میں سیان چانگ کو لے کر یہیں آؤں گا اور تمہارے سامنے اس کی زندگی کا چراغ گل کروں گا تاکہ تم اپنی مالکہ کو یقین دلا سکو کہ اس کا راستہ صاف ہوچکا ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں یہاں انتظار کروں گی لیکن تم اسے یہاں تک کیسے لاؤ گے؟"
"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" میں نے جواب دیا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ میں چائے کے پودوں کے درمیان تنگ سی راہداریوں میں چلتا ہوا نشیب میں اترنے لگا۔ اس کاٹیج تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا قریب پہنچ گیا اور ایک کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا، وہ کمرا خالی تھا۔ میں دوسری کھڑکی کے سامنے آگیا اور اندر جھانکتے ہی میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔
اس کمرے میں ایک آدمی اور دو عورتیں تھیں۔ وہ

دونوں جوان عورتیں نیم عریاں لباس میں تھیں اور اس آدمی کو پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ سیان چانگ تھا۔ درمیانے قد کا بھدے جسم کا مالک۔ چہرہ بلڈاگ سے ملتا جلتا تھا۔ جبڑوں کے نیچے گوشت لٹکا ہوا تھا۔ شکل و صورت بھی بس یونہی سی تھی۔ اگر اس کا تعلق عام طبقے سے ہوتا تو کوئی عورت اس کے قریب پھٹکنا بھی پسند نہ کرتی لیکن وہ دولت مند آدمی تھا۔ دولت کی طرح اسے حسین عورتوں کی بھی کمی نہیں تھی۔

میں چند لمحے کھڑکی کے قریب کھڑا رہا پھر اوپر سے گھوم کر سامنے کے رُخ پر آگیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن تیسرا قدم اٹھاتے ہی اپنی پشت پر ایک خوفناک قسم کی غراہٹ سن کر میں اچھل پڑا۔

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھالو ورنہ چھلنی کردوں گا۔"

یہ الفاظ چینی زبان میں کہے گئے تھے۔ اس غراتے ہوئے لہجے میں یہ الفاظ دنیا کی کسی بھی زبان میں کہے گئے ہوتے تو ان کا مفہوم سمجھ میں آسکتا تھا کیونکہ اس غراہٹ کے ساتھ ہی کسی رائفل کی نال بھی میری پشت سے ٹک گئی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے۔ پستول میرے ہاتھ میں ہی تھا اور پھر پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے میرے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ یہ اس نے بہت بڑی حماقت کی تھی۔ اگر وہ پستول پھینک دینے کو کہتا تو دوسری بات تھی۔ پستول پر قبضہ کرکے اس نے اپنی گردن پھنسوالی تھی۔

پستول اس نے نال کی طرف سے پکڑا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے رائفل میری پشت سے لگا رکھی تھی اور ظاہر ہے انگلی ٹریگر پر نہیں ہوگی۔ اس وقت وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ فوری طور پر پستول یا رائفل کا ٹریگر دبا سکتا اور میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

میں بڑی تیزی سے نیچے جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی پیر کی ایڑی سے اس کی پنڈلی پر ٹھوکر رسید کردی۔ وہ شخص اس جوابی کارروائی کے لیے تیار نہیں تھا۔ پنڈلی کی ہڈی پر ٹھوکر لگنے سے وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے سنبھلتے ہی اس کے گھٹنے کے پیچھے ہلکا سا چوپ ماردیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چیختا ہوا نیچے گرا۔

میرا پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا اور رائفل پر قبضہ کرنے میں' میں نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے جھک کر پستول اٹھایا اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس شخص کو میں نے رائفل کی زد پر لے رکھا تھا جو اب بھی زمین پر گرا ہوا تھا۔

اس شخص کے چیخنے کی آواز سن کر دو آدمی اور دوڑتے ہوئے اس طرف پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں خالی ہاتھ تھے۔ ا... ساتھی کی چیخ سن کر وہ کچھ بھی سمجھے ہوں لیکن اس صورت حال کی توقع ہرگز نہیں رہی ہوگی۔

"چلو۔ تم بھی اٹھ کر ان کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ۔" ... نے نیچے گرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"تم جو کوئی بھی ہو یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے" اس شخص نے اٹھتے ہوئے کہا "بہتر ہے رائفل پھینک دو او... اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔"

"بکواس مت کرو اور مجھے اپنے باس کے کمرے میں ... چلو۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور پھر خود ہی ان تینوں ... ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

سیان چانگ کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے رائفل سے اشارہ کیا۔ وہ تینوں دروازہ کھولتے ہوئے ہچکچا رہے تھے۔ میں نے پیر کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا اور ان تینوں کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

اس طرح دھڑ سے دروازہ کھلنے پر اندر موجود دونوں عورتیں چیخ اٹھیں اور پھر میرے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر ان کے چہرے خوف سے پیلے پڑگئے اور ایک دوسری سے لپٹ ... خوف زدہ سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ سیان چانگ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ شراب کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی خوف ابھر آیا تھا۔

"یہ۔ یہ سب کیا ہے۔ کون ہو تم۔؟" وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ وہ کبھی میری طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی اپنے ان تینوں آدمیوں کی طرف جنہیں میں نے کمرے کے ایک کونے میں کھڑا کردیا تھا۔

"میں تمہارے لیے اجنبی ضرور ہوں مسٹر سیان چانگ لیکن دشمن نہیں۔ تمہارا دوست ہوں۔" میں نے کہا "... وقت میں بہت بڑا خطرہ مول لے کر یہاں آیا ہوں۔ بات تمہارے فائدے کی ہے۔ کیا ہم تنہائی میں گفتگو کرسکتے ہیں؟"

"دوست اس طرح اسلحہ لے کر نہیں آتے۔" سیان چانگ نے کہا۔ میں نے انگریزی میں بات کی تھی اور اس نے جواب بھی انگریزی ہی میں دیا تھا۔

میں نے رائفل اس کے سامنے میز پر رکھ دی اور ... قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

"اگر تم ان لوگوں کو باہر بھیج دو تو ہم اطمینان سے بات کرسکتے ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سیان چانگ کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اپنے آدمیوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ جس شخص سے میں نے رائفل چھینی تھی' اس نے تیز لہجے میں کچھ کہا۔ جواب میں سیان چانگ کا لہجہ ایسا تھا جیسے اسے ڈانٹ رہا ہو۔ وہ تینوں باہر جانے لگے تو میں نے رائفل کی طرف اشارہ کیا۔ اس شخص نے رائفل اٹھالی اور ان تینوں کے ساتھ دونوں عورتیں بھی باہر نکل گئیں۔ وہ اب بھی سہمی ہوئی تھیں۔

میں بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیان چانگ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" اس نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر دھیمے لہجے میں اسے اپنی آمد کا مقصد بتانے لگا۔

"کیا ضمانت ہے کہ تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کرو گے۔" وہ میرے خاموش ہونے پر بولا۔

"اگر میں نے تمہیں قتل کرنا ہوتا تو یہ کام یہاں بھی بڑے اطمینان سے کرسکتا تھا۔" میں نے جواب دیا "تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ میں تمہارے آدمیوں کو کس طرح بے بس کرچکا تھا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میری دوست کی زندگی خطرے میں ہے۔ کاراشان کو یقین دلانے کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں حاشی کے سامنے قتل کیا جائے۔"

سیان چانگ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

ہم دونوں باہر آگئے۔ برآمدے کے سامنے اب پانچ چھ آدمی نظر آرہے تھے ان میں سپروائزر بھی تھا۔ وہ دونوں عورتیں برآمدے میں ایک طرف سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔ سیان چانگ نے سپروائزر سے کچھ کہا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔

"اگر تم لوگ مائنڈ نہ کرو تو میں ایک فائر کردوں۔" میں نے جیب سے پستول نکالتے ہوئے کہا اور ہاتھ اونچا کرکے ایک ہوائی فائر کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے سیان چانگ کے گن مین کو اشارہ کردیا۔ اس نے بھی رائفل سے ایک ہوائی برسٹ ماردیا تھا۔

میں اور سیان چانگ کانیج کے پچھلی طرف نکل کر چائے کے پودوں میں پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ ہم دھیمے لہجے میں باتیں کررہے تھے۔

مقررہ جگہ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ حاشی کس جگہ چھپی ہوگی۔ یہ اندازہ لگاتے ہی میں نے چیختے ہوئے سیان چانگ کو دبوچ لیا۔

"تمہاری زندگی کے دن پورے ہوچکے ہیں سیان چانگ۔" میں چیخا "اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں بچاسکتی۔"

جواب میں سیان چانگ بھی چیخا تھا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ ہم دونوں کے منہ سے غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ حاشی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہوگی اور پھر سیان چانگ کے حلق سے نکلنے والی وہ چیخ بہت بھیانک تھی۔ میں اسے چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

پودوں کی سرسراہٹ سن کر میں ایک دم پیچھے مڑا۔ حاشی کسی چوپائے کی طرح رینگتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے آرہی تھی۔

"کیا ہوا؟" اس کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ختم ہوگیا۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں نے اس کی گردن مروڑ دی ہے۔ تم بھی تسلی کرلو۔"

حاشی آگے آگئی اور جھک کر سیان چانگ کو دیکھنے لگی۔ تقریباً ایک منٹ تک اس کا معائنہ کرتی رہی۔ گردن کو بھی ہلا جلا کر دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ میری طرف گھومی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ پستول کا رخ میری طرف تھا۔

"تمہارا کام ختم ہوگیا مسٹر ادر اب تمہیں بھی ختم ہوجانا ہے۔" اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

حاشی کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ اس قسم کی کسی بھی صورت حال کے لیے میں پہلے ہی سے تیار تھا۔ آج صبح جب کاراشان نے کہا تھا کہ وہ کسی مقامی غنڈے سے بھی اپنے شوہر کو قتل کرواسکتی ہے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ وہ بعد میں اسے بلیک میل کرتا رہے گا اس لیے وہ یہ کام مجھ سے لینا چاہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں منگ شوئی اور اس کے دو ساتھیوں کے قتل میں ملوث تھا اور پولیس کے پاس نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے یہاں سے چلے جانا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ کاراشان کسی قسم کا کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوگی۔ میں کسی بھی وقت اس کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ وہ مجھے کیسے زندہ چھوڑ سکتی تھی۔

"یہ۔ یہ کیا کررہی ہو تم؟" میں ہکلا کر رہ گیا۔

"مجھے مادام کا یہی حکم تھا کہ سیان چانگ کے قتل کے

بعد تمہیں بھی ٹھکانے لگا دیا جائے۔ وہ تمہیں زندہ رکھ کر اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔" حاشی نے کہا "تمہاری زندگی اتنی ہی تھی۔ اب تم بھی مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

اس نے پستول والا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھایا۔ اس کی انگلی یقیناً ٹریگر پر ہوگی لیکن اس سے پہلے کہ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالتی میں حرکت میں آگیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں نے مکمل طور پر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی بلکہ میری اپ چاگی کک اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا پودوں میں کہیں جا گرا۔

اپ چاگی فرنٹ کک چاپا باکسنگ میں کک لگانے کا ایک انداز ہے۔ کھڑے کھڑے ایک ٹانگ کو سامنے کی طرف نیچے سے اوپر اس طرح حرکت دی جاتی ہے کہ پیر کی نو حریف یا اوبجیکٹ کو نشانہ بناتی ہے۔ میرے پیر کی ٹو حاشی کے ہاتھ کے نچلے حصے پر لگی تھی۔ جس سے اس کا ہاتھ اوپر کی طرف اٹھتا چلا گیا تھا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

حاشی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس کے اس حملے کے لیے میں تیار نہیں تھا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ حاشی میرے اوپر تھی۔ وہ مجھے پودوں میں رگیدتی ہوئی دور لے گئی۔

کاراشان نے مجھے بتایا تھا کہ حاشی ریڈ آرمی میں رہ چکی ہے۔ ہتھیاروں کے استعمال کے علاوہ وہ خالی ہاتھ لڑائی کے فن میں بھی ماہر ہوگی۔ اس نے جس طرح میرے اوپر چھلانگ لگائی تھی اور مجھے رگیدا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا۔ کہنے کو تو وہ عورت تھی مگر اس کے ہاتھ پیر مردوں کی طرح مضبوط اور طاقت ور تھے۔

وہ میرے سینے پر سوار تھی اور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبوچ رکھا تھا۔ میرے نرخرے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بلی جیسی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پہلے میں اس کی گرفت چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی گرفت آہنی شکنجے کی طرح مضبوط تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی کلائیوں پر جما دیے اور دونوں پیر اس کی ٹانگوں میں پھنسا کر اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔

میری یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ وہ میرے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتے ہوئے پیچھے گری۔ میں ایک ہاتھ سے سینہ سہلاتے ہوئے اٹھنے لگا۔ وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلی ثابت ہوئی۔ وہ نہ صرف مجھ سے پہلے سنبھل گئی بلکہ اس کے پیر کی زوردار ٹھوکر نے میری پسلیوں کو بھی سہلا دیا۔ میں کراہتا ہوا دوبارہ اٹھنے کی کوشش میں ایک اور ٹھوکر میرے بائیں کندھے پر لگی لیکن میں نے اسے تیسری ٹھوکر مارنے کا موقع نہیں دیا۔

حاشی کا وار روک کر میں نے اس کے پہلو پر زوردار سائیڈ کک لگا دی۔ وہ کراہتی ہوئی دہری ہو گئی۔ میری دوسری کک اس کے سینے پر اس طرح لگی کہ وہ چیختی ہوئی الٹ کر پیچھے گری۔ اس مرتبہ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر جیب سے پستول نکال لیا اور جھک کر اس کی نال حاشی کی کھوپڑی سے لگا دی۔

"اب اگر تم نے کوئی حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔ کھڑی ہو جاؤ اٹھ کر۔" میں نے غرا کر اسے حکم دیا۔

حاشی کراہتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ سہلا رہی تھی۔ کک شاید کچھ زیادہ ہی زوردار لگ گئی تھی۔ میں نہ تو اسے جان سے مارنا چاہتا تھا اور نہ ہی زیادہ نقصان پہنچانا چاہتا تھا لیکن اس نے جس طرح بہادری دکھانے کی کوشش کی تھی اسے تھوڑی بہت سزا دینا بھی ضروری ہو گیا تھا۔

ہم دونوں لڑتے ہوئے اس جگہ سے کافی دور نکل آئے تھے جہاں میں نے سیان چانگ کو ڈھیر کیا تھا۔

حاشی سینہ سہلاتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی۔ میں اس کی پشت پر تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے جیسے ہی نیچے جھکا اس نے پوری قوت سے دونوں کہنیاں میرے پیٹ میں مار دیں۔ میرے منہ سے اوغ کی آواز نکلی۔ میں ایک بار اور دہرا ہو گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس دوران میں حاشی نے بھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے موقع نہیں دیا اور اس مرتبہ دو چار کراری قسم کی ٹھوکریں رسید کر دیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت جان دار قسم کی عورت تھی۔ اس کا حوصلہ بھی قابل تعریف تھا۔ وہ آسانی سے ہتھیار ڈالنے والی نہیں تھی لیکن میں نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

اسی دوران میں تقریباً سو گز دور کسی جگہ فائر کی آواز سنائی دی۔

"تمہارے باپ سیان چانگ کی تلاش میں اس طرف آ رہے ہیں۔" میں نے زمین پر پڑی ہوئی حاشی کو ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "اگر وہ اس طرف آ گئے تو ہم دونوں

چھلنی کر دیں گے۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ گولیوں سے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر یہاں سے نکل چلیں۔"

بات حاشی کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ بڑی پھرتی سے اٹھ گئی۔ اس مرتبہ اس نے میرے ساتھ کوئی پنگا لینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تیزی سے ایک طرف چلنے لگی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

وین کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ پہلے میں اندر داخل ہو کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور پھر حاشی نے اسٹیئرنگ سنبھال کر انجن اسٹارٹ کر دیا اور پودوں میں یو ٹرن لیتے ہوئے وین کو واپسی کے لیے موڑ دیا۔

چائے کے باغات سے نکل کر سڑک پر آتے ہی حاشی نے وین کی رفتار بڑھا دی۔ اس کے منہ سے وقفے وقفے سے کراہیں بھی خارج ہو رہی تھیں اور وہ بار بار سیٹ پر پہلو بدل رہی تھی۔ اسے کئی روز تک اپنے جسم کی سکائی کرنی پڑے گی۔

میں جانکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کاراشان نے مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو مجھے شبہ تھا کہ وہ جانکی کو بھی بنگلے پر نہیں لائی ہوگی۔ اگر ایسا ہوا تو میرے لیے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ جانکی کی بازیابی بہت ضروری تھی اس کے بغیر تو میں یہاں سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم جب بنگلے کے گیٹ پر پہنچے تو دس بجنے والے تھے۔ وین کے ہارن کے جواب میں گیٹ کاراشان نے کھولا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اسے حاشی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔

وین جیسے ہی گیٹ کے اندر داخل ہوئی میں پسنجرز سیٹ پر آ گیا اور دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت کاراشان گیٹ بند کر رہی تھی۔ میں نے دوڑ کر ایک ہاتھ سے اسے گرفت میں لے لیا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول اس کی کنپٹی سے لگا دیا۔ کاراشان بری طرح بوکھلا گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

"مجھے ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو وعدہ خلافی کرتے ہیں۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "تم نے مجھے بھی مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن میں بچ کر آ گیا ہوں۔ جانکی کہاں ہے؟"

"وہ... وہ یہیں ہے۔" کاراشان ہکلائی "تت... تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کوئی وعدہ خلافی نہیں کی۔"

"ذرا حاشی کی طرف دیکھ لو جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے حاشی کی طرف اشارہ کیا جو چند گز دور وین سے اتر رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے سینہ سہلا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔

حاشی کی حالت دیکھ کر کاراشان اچھل پڑی۔

"میں نے وعدے کے مطابق اس کے سامنے تمہارے شوہر کی گردن مروڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور پھر حاشی نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اب یہ بے چاری کئی روز تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گی۔ جانکی کہاں ہے۔ جلدی بتاؤ ورنہ تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ یہیں ہے۔ ابھی بلاتی ہوں۔" کاراشان نے کہا اور چند گز دور کھڑی ہوئی ہوتین کو اشارہ کیا۔

ہوتین بنگلے کے اندر دوڑ گئی۔ چند منٹ بعد وہ جانکی کو لے کر واپس آ گئی۔ جانکی کو دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جانکی دوڑ کر میرے قریب پہنچ گئی۔

"بھگوان کا شکر ہے تم زندہ ہو۔" جانکی نے کہا "اس کتیا کا منصوبہ بہت خطرناک تھا۔ یہ لوگ مجھے تقریباً ایک گھنٹا پہلے پہاڑی والے کاٹیج سے واپس لے آئے تھے اور اس نے کہا تھا کہ تمہیں وہیں ختم کر دیا جائے گا اور مجھے ہاتھ پیر باندھ کر دریا میں پھینک دیا جائے گا۔ اسے حاشی کی واپسی کا انتظار تھا کہ صورت حال کے مطابق اگلا قدم اٹھایا جائے۔ اب یہاں ایک منٹ رکنا بھی حماقت ہوگی۔ بھاگ چلو یہاں سے۔"

"تم وین اسٹارٹ کر کے اس طرف لے آؤ جانکی۔" میں نے کہا اور حاشی کی طرف دیکھنے لگا جو گھاس پر لیٹی ہوئی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

جانکی وین کی طرف دوڑ گئی اور پھر ایک منٹ بعد ہی وہ وین اسٹارٹ کر کے گیٹ کے قریب لے آئی۔ میں نے کاراشان کو پسنجرز سیٹ پر دھکیل دیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"ہوتین وغیرہ سے کہہ دو کہ اگر انہوں نے فون پر پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو تم زندہ نہیں بچو گی۔" میں نے کاراشان کے پہلو میں پستول کی نال گاڑتے ہوئے کہا۔

کاراشان نے چیخ کر ہوتین وغیرہ کو ہدایت کر دی کہ وہ کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ میرے اشارے پر جانکی نے وین آگے بڑھا دی۔

سڑک پر تقریباً پچاس گز آگے سنسان جگہ پر میں نے وین رکوا لی اور کاراشان کو لے کر نیچے اتر آیا۔

"اگر تم نے اس وین کے بارے میں پولیس کو اطلاع دی تو ہمارے ساتھ تم بھی پھنسو گی۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ گھر جا کر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ ممکن ہو تو جاگتی آنکھوں سے کوئی اچھا سا خواب دیکھنا شروع کردو۔ آنے والا وقت تمہارے لیے بہت کچھ لے کر آرہا ہے۔" میں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور اچھل کر وین میں بیٹھ گیا۔

جانگی فوراً ہی وین کو حرکت میں لے آئی تھی۔ میں جانگی کو راستہ بتاتا رہا اور وہ گاڑی سڑکوں پر دوڑاتی رہی۔ بالآخر ہم دریا کا پل پار کرکے پہاڑیوں کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

"اس طرف کہاں۔ کوئی ٹھکانا ذہن میں ہے کیا؟" جانگی نے پوچھا۔

"اس طرف چائے کے باغات ہیں۔ سیان چانگ اپنے کانیج میں ہمارا انتظار کررہا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب!" جانگی کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گئے اور وین سڑک پر لہرانے لگی لیکن اس نے فوراً ہی قابو پالیا "سیان چانگ یعنی کاراشان کا شوہر۔ جسے تم قتل کر آئے ہو؟"

"میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ وہ اس وقت اپنے چائے کے باغ میں بیٹھا ہمارا انتظار کررہا ہے۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے بتانے لگا "میں نے حاشی کو دور ہی چھوڑ دیا تھا اور پھر کانیج میں جا کر سیان چانگ سے ملاقات کرکے اسے کاراشان کی سازش سے آگاہ کردیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہم بھی مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے ایک ڈراما کرنے پر آمادہ کرلیا اور اسے اس جگہ لے آیا جہاں حاشی پودوں میں چھپی ہوئی تھی۔ منصوبے کے مطابق میں اور سیان چانگ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے اور وہ بڑی شرافت سے "ڈھیر" ہوگیا۔ حاشی نے اسے ہلا جلا کر دیکھ لیا کہ وہ واقعی مرچکا ہے۔ یہ اطمینان ہوجانے کے بعد حاشی نے میرے اوپر پستول تان لیا اور غرا کر کہنے لگی کہ کاراشان نے اسے مجھے قتل کردینے کا حکم دیا تھا لیکن میں اتنا شریف آدمی بھی نہیں ہوں کہ ایک عورت کے ہاتھوں مارا جاتا لیکن یہ اعتراف ضرور کردوں گا کہ حاشی بڑی مشکل عورت ثابت ہوئی تھی۔ میں نے اس پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

"میری اور حاشی کی لڑائی سیان چانگ کی "لاش" کے آس پاس ہی ہوتی رہی لیکن مجال ہے جو اس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت پیدا ہوئی ہو۔ وہ تو غضب کا اداکار ثابت ہوا۔ واقعی مُردوں کی طرح اپنی جگہ پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ بہرحال پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم اس کے کانیج جا رہے ہیں۔ وہ ایک دو دن میں ہماری آگے روانگی کا بندوبست کردے گا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے واقعی اس کی گردن مروڑ دی ہو؟" جانگی نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے تو اس کی گردن کو ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا۔ بس اس کے کان میں سرگوشی کی تھی کہ اب وہ میرے ہاتھوں قتل ہوجائے۔ وہ بڑے بھیانک انداز میں چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا تھا۔"

"اور اگر یہاں بھی ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو؟" جانگی بولی "کاراشان بھی بڑی ہمدردی جتلا کر ہمیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"

"ایسے خدشات تو ہمیشہ ساتھ رہیں گے لیکن میرا خیال ہے کہ سیان چانگ ہمارے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا۔ میں اس کی باتوں سے اندازہ لگا چکا ہوں کہ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ کاراشان ہی بدکردار اور بدمعاش عورت ہے۔ وہ اس کی جائداد پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔" میں نے کہا۔

جانگی خاموش رہی۔ وین تیز رفتاری سے ویران اور سنسان سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ میں ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سامنے سڑک پر دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے جانگی کو وین کی رفتار ہلکی کرنے کو کہا۔ کچھ ہی آگے جانے کے بعد مجھے وہ موڑ نظر آگیا۔

"گاڑی بائیں طرف موڑ لو اور رفتار ہلکی رکھو۔ آگے راستہ ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے آگے موڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وین چائے کے باغات میں آڑھے ترچھے راستوں پر اچھلتی ہوئی چلتی رہی۔ تقریباً چالیس منٹ بعد نشیب میں ایک جگہ روشنیاں دکھائی دینے لگیں اور مزید پانچ منٹ بعد وین کانیج کے سامنے رک گئی۔ تین چار مسلح آدمیوں نے وین کو گھیر لیا۔ جانگی نے انجن بند کردیا۔ پہلے میں نیچے اترا اور پھر جانگی بھی اتر آئی۔

سیان چانگ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ گیا۔ وہ دونوں عورتیں اب بھی اس کے کمرے میں موجود تھیں۔ سیان چانگ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

"اگر میں حاشی کی زبان سے سب کچھ نہ سن لیتا تو شاید مجھے تمہاری بات کا یقین نہ آتا۔" وہ کہہ رہا تھا "تم نے مجھے بہت بڑی تباہی سے بچالیا۔ میری زندگی بچالی۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا۔"

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا "ہم خود اس عورت کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ میں کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ اگر میں تمہیں قتل بھی کردیتا تو پھر بھی اس کی سازش کا شکار ہو جاتا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تمہارے قتل کے بعد وہ ہمیں بھی ٹھکانے لگانے کی کوشش کرے گی۔ میرا یہ شبہ درست نکلا۔ اگر میں محتاط نہ ہوتا تو حاشی مجھے موت کے گھاٹ اتار چکی ہوتی۔ بہرحال اب تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔"

"میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" سیان چانگ نے کہا "رات یہاں آرام کرو اس کے بعد جب چاہو گے میں تمہاری روانگی کا بندوبست کردوں گا۔"

"ہم کل ہی یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" سیان چانگ نے کہا اور پھر سپروائزر کو بلا کر ہدایات دینے لگا کہ دوسرے کانیج میں ہماری رہائش کا بندوبست کردیا جائے اور ہمارے کھانے پینے کا بھی انتظام کیا جائے۔

سپروائزر وہاں سے تقریباً بیس گز دور ایک اور ہٹ میں لے آیا۔ اسی ہٹ میں ایک کمرا تو سپروائزر کے تصرف میں تھا دوسرے میں ہمارے لیے شب بسری کا انتظام کردیا گیا۔ ہمیں کمرے میں چھوڑ کر سپروائزر ہمارے لیے کھانے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب ہم کھانا کھا رہے تھے تو دو گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ گاڑیوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتی گئی۔

کھانے کے بعد جانگی تو جلد ہی سو گئی لیکن مجھے نیند نہیں آسکی تھی۔ شدید تھکن ہونے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اس کمرے میں اسپرنگ والا صرف ایک ہی بیڈ تھا جس پر جانگی سو رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور جب بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی تو میں کرسی سے اٹھ کر جانگی کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا اور بالآخر میری آنکھیں بھی نیند کے بوجھ سے بند ہونے لگیں۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر آگیا۔ گاڑی سیان چانگ کے کانیج کے سامنے رکی تھی۔ سیان چانگ اور تین اور آدمی گاڑی سے اُترے۔ سیان چانگ تو اپنے کانیج میں چلا گیا اور وہ تینوں آدمی اس ٹیلے کی طرف چلے گئے جس کے دوسری طرف مزدوروں کے ہٹس تھے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ وین مجھے نظر نہیں آئی تھی جس پر ہم یہاں آئے تھے۔

میں دوبارہ کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کے بعد دیر تک مجھے نیند نہیں آسکی تھی۔ میں سیان چانگ کے بارے میں سوچتا رہا کہ وہ کہاں گیا تھا۔

صبح سات بجے کے قریب ایک بار پھر میری آنکھ کھل گئی۔ جانگی بھی جاگ گئی تھی اور پھر کسی گاڑی کی آواز سن کر میں کمرے سے باہر آگیا اور دروازے کے قریب ہی رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ سب لوگ شاید اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ کاشتکار کسان وغیرہ سورج نکلنے سے پہلے ہی اپنا کام شروع کردیتے ہیں۔

گاڑی کی آواز اب بہت قریب سے سنائی دے رہی تھی اور پھر اچانک ہی ایک گاڑی سیان چانگ والے کانیج کے پچھلی طرف سے گھوم کر سامنے آگئی۔

وہ پولیس کی گاڑی تھی۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے ذرا سی گردن گھما کر جانگی کو پولیس کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ بستر سے اٹھ کر دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی ہوگئی۔

گاڑی سیان چانگ کے کانیج سے ذرا آگے آکر رکی۔ چار پولیس والے نیچے اترے۔ دو وہیں کھڑے رہے اور دو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف آنے لگے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی اور دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ دونوں پولیس والے بڑی تیزی سے میرے قریب آرہے تھے اور مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

دونوں پولیس والے میرے سامنے دو قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے تیز لہجے میں کچھ کہا مگر ایک بھی لفظ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ کچھ کہا مگر اس بار بھی کچھ نہ سمجھ پایا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ پولیس والے نے رائفل والے ہاتھ سے گاڑی کی طرف اشارہ کیا جہاں دوسرے دو پولیس والے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا مگر آس پاس کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ سیان چانگ رات کو کئی گھنٹوں کے لیے یہاں سے غائب رہا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے شہر جا کر کاراشان سے ملاقات کی ہو اور کاراشان نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہو۔ کاراشان آخر اس کی بیوی تھی۔ ایسے رشتے آسانی سے تو نہیں ٹوٹتے البتہ سیان چانگ نے مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا پروگرام بنالیا ہو۔ میں ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ میں اور جانکی بھکشوؤں کا بھیس بدل کر دھوکا دے رہے تھے اور پھر ہم پر تین آدمیوں کے قتل کا الزام تھا۔ یہ لوگ ہماری باتوں پر یقین کیوں کرنے لگے؟

میں جیسے جیسے سوچتا گیا' میرا ذہن الجھتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری بے چینی بھی بڑھتی رہی۔ اگر ہم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو بچنے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور یہاں سے فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا اگر ہماری طرف سے ایسی کوئی کوشش ہوتی تو یہ لوگ ہمیں گولیوں سے چھلنی کردیں گے۔

ہم گاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ گاڑی کے قریب کھڑے ہوئے پولیس والوں میں سے ایک نچلے درجے کا آفیسر تھا۔ جس پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اسی تیز لہجے میں کچھ کہا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس کی گرفت میں تھا۔

آفیسر کی بھنویں تن گئیں۔ وہ چند لمحے میری طرف گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے بھی اسی لب ولہجے میں کچھ کہا۔ میں صرف ایک لفظ سمجھ سکا۔ سیان چانگ۔

"کیا بات ہے؟ مجھے کیوں پکڑا ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟ کس کی تلاش ہے تمہیں۔" میں نے مینڈرین زبان میں رک رک کر کئی سوال کرڈالے۔

آفیسر کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ اس نے اپنے ماتحت سے کچھ کہا' اس نے جلدی سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ آفیسر میری طرف دیکھتے ہوئے مینڈرین میں بولا۔

"ہم مسٹر سیان چانگ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا یہ ماتحت تم سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا "کیا معاملہ ہے۔ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" میں مزید اطمینان کرلینا چاہتا تھا۔

"رات کو مسٹر سیان چانگ کی شہر والی کوٹھی میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ کوٹھی کی آگ پر ابھی تک پوری طرح قابو نہیں پایا جاسکا لیکن اس کی مسز اور دو ملازم عورتوں کو نکال لیا گیا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ مسز سیان چانگ کا آدھا جسم تو جل کر راکھ ہو چکا ہے۔"

مجھے کلیجا منہ کو آتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ آندھیاں سی چلنے لگیں۔ ایک لمحے کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور ہونقوں کی طرح آفیسر کی طرف دیکھنے لگا۔

"مسٹر سیان چانگ کو اس افسوس ناک واقعے کی اطلاع دینا ضروری ہے۔ وہ کہاں ہے؟" آفیسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں جیسے ہوش میں آگیا۔ انہیں وہیں رکنے کا کہہ کر میں سیان چانگ کے کاٹیج کی طرف دوڑ گیا۔ اس کے کاٹیج کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ دستک دی تو دروازہ کھلا۔ وہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک تھی جنہیں میں نے گزشتہ رات سیان چانگ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور سرخ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔

"سیان چانگ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں اسے دھکا دیتے ہوئے اندر آگیا۔ کنگ سائز ڈبل بیڈ پر دوسری عورت آڑھی ترچھی سو رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سیان چانگ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ اس عورت نے باہر پولیس کو دیکھ لیا تھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دروازہ بند کردیا۔

"میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ وہ شاید پچھلی طرف گیا ہے۔" میں نے پولیس آفیسر سے کہا اور اس ٹیلے کی طرف چلنے لگا جس کے دوسری طرف مزدوروں کے ہٹس تھے۔ میں ٹیلے پر پہنچا ہی تھا کہ دوسری طرف سے سپروائزر دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے مسٹر۔ تم بہت گھبرائے ہوئے ہو" سپروائزر نے کہا اور پھر پولیس کو دیکھ کر چونک گیا "اوہ! یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"شہر میں مسٹر سیان چانگ کی کوٹھی میں آگ لگ گئی۔ مسز سیان چانگ جل کر مر گئی ہیں۔ یہ لوگ ماسٹر کو اطلاع دینے آئے ہیں۔"

"اوہ!" سپروائزر کا چہرہ بھی دھواں ہوگیا "تم ان کے پاس چلو۔ میں ماسٹر کو لے کر آتا ہوں۔" وہ واپس مڑ گیا۔

میں دوبارہ پولیس والوں کے پاس آگیا اور آفیسر سے پوچھنے لگا کہ آگ کیسے لگی تھی۔

"یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" آفیسر نے کہا۔

"لیکن ہمارے آفیسرز کا خیال ہے کہ آگ شارٹ سرکٹ سے لگی تھی جو اچانک ہی بھڑک اٹھی اور ان تینوں عورتوں کو باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا۔" وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا "لیکن تخریب کاری کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسٹر اور مسز سیان چانگ کاروباری لوگ ہیں۔ ان کے کچھ دوست ہیں تو دشمن بھی ہوسکتے ہیں۔ لوگ جانتے ہیں کہ مسٹر سیان چانگ شہر میں موجود نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ آگ ان کے کسی دشمن نے لگائی ہو۔ بہرحال تحقیقات کے بعد ہی اصل بات سامنے آئے گی۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سیان چانگ' سپروائزر اور دو تین اور آدمیوں کو ٹیلے کی طرف سے آتے دیکھ کر خاموش ہوگیا۔

سیان چانگ کو اپنے سامنے دیکھ کر تینوں پولیس والے اور آفیسر بھی مؤدب ہوگیا۔ آفیسر دھیمے لہجے میں اسے کوٹھی میں لگنے والی آگ کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت سیان چانگ کا چہرہ بھی دھواں ہو رہا تھا۔

سیان چانگ اپنے کیبن میں چلا گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس بھی آگیا۔ اس نے پولیس والوں سے کچھ کہا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سیان چانگ اور سپروائزر کاٹیج کے پچھلی طرف چلے گئے۔ جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ دو تین آدمیوں کے ساتھ میں بھی ان کے ساتھ ہی اس طرف آگیا تھا۔

گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے سیان چانگ نے ایک ادھیڑ عمر عورت کو سپروائزر کی ذمے داریاں سونپ دیں اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہوسکتا ہے مجھے آج کا سارا دن اور رات بھی شہر ہی میں رہنا پڑے۔ تم لوگ آرام سے یہاں رہو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں واپس آجاؤں تو تم لوگوں کی روانگی کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے آنے کے بعد ہی ہم کہیں جاسکیں گے۔" میں نے کہا۔

پولیس کی گاڑی آگے نکل چکی تھی۔ سیان چانگ کی گاڑی بھی اس کے پیچھے ہی روانہ ہوگئی۔

میں ان مزدوروں کے ساتھ واپس آگیا۔ جس عورت کو سپروائزر کی ذمے داری سونپی گئی تھی' اس کا نام کوبانا تھا۔ اس نے چوڑے پائنچے والا پاجامہ اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر تنکوں والا چوڑے چھجے کا ہیٹ تھا۔

"ہم نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔ کچھ کھانے کو مل جائے گا؟" میں نے کوبانا کو روک کر کہا۔

"یہاں تو کچھ نہیں ملے گا۔ اس ٹیلے کے دوسری طرف بستی میں آجاؤ۔ میں بندوبست کردیتی ہوں۔" کوبانا کہتے ہوئے سیان چانگ والے کاٹیج کی طرف مڑ گئی اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔

میں اپنے ہٹ کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن اس میں ذرا سی جھری تھی اور مجھے یقین تھا کہ جانکی دروازے کے دوسری طرف کھڑی اس جھری میں سے باہر کی صورت حال کا جائزہ لے رہی ہوگی۔ میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

جانکی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔

"خطرہ ٹل گیا ہے۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بات وہ نہیں تھی جو ہم سمجھے تھے۔ معاملہ کچھ اور نکلا۔ پستول کو چھپالو۔ فی الحال ہمیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"کیا معاملہ تھا؟" مجھے مطمئن پاکر جانکی کے چہرے پر بھی طمانیت سی آگئی۔ اس نے پستول اپنے لباس کے اندر چھپالیا "پولیس یہاں کیوں آئی تھی اور میرا خیال ہے سیان چانگ ان کے ساتھ گیا ہے۔"

"سنو گی تو اچھل پڑو گی۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جانکی میرے سامنے اسپرنگ والے بیڈ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی "کل رات تک ہم جس کوٹھی میں تھے گزشتہ رات اس میں پراسرار طور پر آگ لگ گئی۔ کاراشان اور اس کے ساتھ دو عورتیں بھی اسی آگ میں جل کر راکھ ہوگئیں۔"

"کیا؟" جانکی واقعی اچھل پڑی۔

"یہ درست ہے۔" میں نے کہا "پولیس والے سیان چانگ کو اطلاع دینے اور اسے ساتھ لے جانے کے لیے یہاں آئے تھے۔"

"آگ کیسے لگی؟" جانکی نے پوچھا۔

"پولیس آفیسر کے کہنے کے مطابق آگ لگنے کی وجہ بجلی کا شارٹ سرکٹ ہوسکتا ہے۔ بعد میں تحقیقات ہوں گی لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ آگ لگنے کی اصل وجہ کبھی نہیں جان سکیں گے۔"

"کیوں؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اس کمرے میں آنے کے بعد تم تو جلدی سو گئی تھیں لیکن میں جاگتا رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ تھکن کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آدھی رات کے قریب سیان چانگ کچھ آدمیوں کے ساتھ یہاں سے گیا تھا۔ وہ ہماری وین بھی لے گئے تھے۔ جو اس وقت موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ صبح ہونے سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے لوٹے تھے۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ آگ سیان چانگ نے لگائی ہوگی؟" جانکی بولی۔

"معاملہ سیان چانگ کی زندگی اور جائداد کا تھا۔" میں نے کہا "کاراشان سیان چانگ کی دوسری شادی سے خوف زدہ تھی۔ اسے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ سیان چانگ دوسری وصیت تیار کروا رہا ہے جس میں کاراشان کو ہر چیز سے محروم کردیا جائے گا۔ وہ وصیت پر دستخط ہونے سے پہلے سیان چانگ کو قتل کروا دینا چاہتی تھی تاکہ پرانی وصیت کے مطابق وہ خود واحد اور قانونی وارث قرار پائے۔ سیان چانگ کو قتل کرانے کے لیے اس نے مجھے بلیک میل کیا۔ اس کی تفصیل میں تمہیں بتا چکا ہوں اور جب سیان چانگ کو ہمارے ذریعے کاراشان کی سازش کا پتا چلا تو اس نے کاراشان ہی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا اور اس نے اس فیصلے پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی اور میرے خیال میں یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہوا۔"

"وہ کیسے؟" جانکی نے پوچھا۔

"یہاں کی پولیس کو جنگل میں منگ شوئی اور اس کے ساتھیوں کے قتل کی اطلاع تو مل چکی تھی اور وہ مشتبہ بھکشوؤں کی تلاش میں بھی تھے لیکن کاراشان پولیس سے زیادہ چالاک نکلی اور وہ ہوکیانگ کی بستی تک پہنچ گئی اور ہمارے بارے میں سب کچھ معلوم کرلیا۔ انہی انہی معلومات کے بل بوتے پر وہ ہمیں بلیک میل کر رہی تھی لیکن ہمارا یہ راز بھی اس کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہوچکا ہے۔ اب ہمیں کم از کم وہ پریشانی تو نہیں رہی۔"

"اور اگر سیان چانگ نے کوئی اور حرکت کر ڈالی تو؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔" میں نے وثوق بھرے لہجے میں جواب دیا "مگر مجھے تو اس وقت بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ ناشتے کے لیے ہمیں ٹیلے کے دوسری طرف بستی میں جانا پڑے گا۔"

"چلو۔ بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔" جانکی کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

کاٹیج کے باہر ایک درخت کے نیچے پانی سے بھرا ... رکھا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے اس ڈرم سے پانی سے ... دھوئے۔ اس وقت وہ دونوں عورتیں بھی سیان چانگ ... کاٹیج سے نکل کر اس طرف آتی ہوئی دکھائی دیں ... ان دونوں نے کھلے پائنچے کے پاجامے اور سلیو لیس ... پہن رکھی تھیں۔ قریب پہنچ کر وہ دونوں ہماری طرف ... مسکرا دیں۔ وہ بھی مزدوروں کی بستی کی طرف جا رہی ... ہم بھی ان کے ساتھ ہی ہولیے۔

تیس پینتیس مزدور ایک درخت کے نیچے بیٹھے ... کر رہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی ... چانگ کی کوٹھی میں آتش زدگی اور کاراشان کی ہلاکت ... سب تک پہنچ گئی تھی اور اس وقت وہ اپنا سارا کام ... اپنے اپنے انداز میں اسی خبر پر تبصرے کر رہے تھے۔

کوبانا ہمیں ایک ہٹ میں لے گئی۔ وہ دونوں ... بھی ہمارے ساتھ ہی تھیں۔ ہٹ میں ایک میز پر ناشتہ ... منتظر تھا۔ تندور کی بیک کی ہوئی موٹی سی روٹی اور ... ہوا گوشت۔ جس میں مسالا برائے نام ہی تھا۔

ناشتے کے فوراً ہی بعد ہم اپنے کاٹیج میں واپس آ...

وہ دن گزر گیا اور پھر رات بھی گزر گئی۔ سیان ... واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ اگلے روز دوپہر کے وقت پر ... واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ماسٹر کو دو تین دن مزید ... پڑے گا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی تمام مزدور کام ... واپس آ گئے تھے۔ انہوں نے سپروائزر کو گھیر لیا اور کوٹھی ... آتش زدگی کے بارے میں پوچھنے لگے۔

دو دن اور گزر گئے۔ شہر سے آنے والے آدمی ... کہ سیان چانگ کو شہر میں چند روز لگیں گے۔ ہم پریشان نہ ... ہوں۔ آرام سے یہاں رہیں۔

ان تین چار دنوں کے دوران میں چیکو اور میکوشی ... ان دونوں عورتوں سے جانکی کی دوستی ہو گئی تھی۔ ان ... میں سے کسی کی عمر بھی تیس سے زیادہ نہیں تھی اور ان کے ... حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ دونوں شہر ... کی رہنے والی تھیں اور سیان چانگ اپنا دل بہلانے ... انہیں خاص طور پر یہاں لے کر آیا ہوا تھا۔

جانکی اب تک تو میکسی نما وہی لباس پہنتی رہی ... اس نے کاراشان کے بنگلے میں پہنا تھا مگر چیکو نے ... ایک پینٹ اور شرٹ دے دی تھی۔ وہ دونوں قد و قامت ... تقریباً ایک جیسی تھیں اس لیے جانکی کو یہ کپڑے تقریباً فٹ آ گئے تھے۔

یہاں سخت بوریت تھی۔ میں سپروائزر کے ساتھ گھومتا رہتا اور جانکی سر پر چوڑے چھجے کا ہیٹ جمائے پشت پر مخصوص طرز کی بنی ہوئی لمبی سی تنکوں والی ٹوکری لگائے دوسرے مزدوروں کے ساتھ باغ میں چائے کی پتیاں چنتی رہتی۔

دس دن گزر گئے۔ اس دوران میں سیان چانگ ایک مرتبہ خود بھی آیا تھا لیکن صرف ایک دو گھنٹوں کے لیے۔ اس نے بھی مجھے تسلی دی تھی کہ ہم پریشان نہ ہوں۔ جیسے ہی شہر کے معاملات سے فارغ ہوگا وہ یہاں آکر ہماری روانگی کا بندوبست کردے گا۔ کوٹھی میں آتشزدگی کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اس آگ میں تین عورتیں جل مری تھیں جن میں ایک اس کی بیوی تھی۔ وہ دولت مند آدمی تھا اور اس چھوٹے سے شہر میں ایک معزز مقام رکھتا تھا۔ شہر کے لوگ اس واقعے پر اظہار افسوس اور اس کی بیوی کی تعزیت کے لیے اس کے پاس آ رہے تھے۔ اس کے علاوہ آتشزدگی سے کچھ قانونی الجھنیں بھی پیدا ہوگئی تھیں جنہیں سلجھانا بہت ضروری تھا۔

سیان چانگ گیارھویں دن واپس آیا تو اس کی گاڑی کے پیچھے سیاہ رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن بھی تھی جس میں دو آدمی تھے۔

وہ رات بھی ہمیں وہیں گزارنی پڑی اور پھر صبح سویرے ہی سیان چانگ نے ہمیں رخصت کردیا۔ چیکو اور میکوشی بھی اسی وین میں ہمارے ساتھ جا رہی تھیں۔ سیان چانگ نے مجھے ایک بڑی رقم دی تھی جو میں نے یہ سوچ کر قبول کرلی کہ کام آئے گی۔ اب ہم بھکشوؤں کے بھیس میں نہیں تھے اور سیان چانگ کے کہنے کے مطابق ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"میرے یہ دونوں آدمی شاؤیانگ تک تمہارے ساتھ جائیں گے۔" سیان چانگ نے کہا تھا "راستے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو یہ سنبھال لیں گے۔ شاؤیانگ سے آگے چیکو تمہاری مدد کرے گی۔"

ہم سورج نکلنے سے پہلے ہی روانہ ہوگئے۔ شاؤیانگ کی طرف جانے والی ہائی وے تک پہنچنے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ پہلے ہم ڈانگ کو جاتے اور وہاں سے ہائی وے کی طرف نکلتے لیکن ڈرائیور نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس خطے میں چھوٹے بڑے دریاؤں کی بہتات تھی۔ ان کے نام کچھ اس قدر مشکل تھے کہ کم از کم میرے لیے انہیں یاد رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہماری وین ایک دریا کے ساتھ ساتھ گاؤشانا ای قصبے کی طرف دوڑتی رہی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم گاؤشا پہنچے اور وہاں سے دوسری سڑک پر مڑ گئے۔ مزید ایک گھنٹا سفر کرنے کے بعد ہم مین ہائی وے پر پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہاں سے شاؤیانگ تقریباً سات گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے اور میرے اندازے کے مطابق ہمیں چار پانچ بجے تک شاؤیانگ پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ہائی وے پر بسوں، مال بردار ٹرکوں اور پرائیویٹ گاڑیوں کی آمدورفت تھی لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی اس لیے ڈرائیور کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

اس علاقے میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جن کے دامن میں چائے کے باغات تھے لیکن تین گھنٹے بعد ہم نے سبزے کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اب ہمارے چاروں طرف بنجر اور ویران پہاڑیاں تھیں۔ بعض پہاڑیاں تو بہت بلند تھیں۔

ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر اس کا ساتھی مویانگ بیٹھا ہوا تھا۔ میں جانکی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر اور چیکو اور میکوشی ہم سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی سچی کہانیاں
شیطان صفت
سبز قدم
دست انتقام
اسیر ہوس
قانونی پیچیدگیاں عدالتی کارروائی کے اہم موڑ و نکات۔ زن زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات
جرم و سزا کی وہ کہانیاں جو انسانی حرص و ہوس کا آئینہ ہیں
قیمت فی کتاب -/60 روپے ڈاک خرچ فی کتاب -/23 روپے
چاروں کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ -/29 روپے
کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں
کتابیات پبلی کیشنز
kitabiat1970@yahoo.com

ایک بجے کے قریب وین ایک چھوٹے سے اسٹاپ پر رک گئی۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ چند دکانیں اور دو تین ریسٹورنٹس تھے۔ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے یہ اطلاع ملی کہ تقریباً تیس میل آگے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے ہائی وے پر لوٹ مار مچا رکھی ہے اور اس وقت آگے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں تقریباً دو گھنٹے وہاں رکنا پڑا اور جب مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی میں سوار لوگوں سے اطلاع ملی کہ راستہ صاف ہے تو ہم فوراً ہی روانہ ہوگئے۔

تقریباً ایک گھنٹا ہائی وے پر سفر کرنے کے بعد سامنے سڑک پر بڑے بڑے پتھر دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روک لی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ اس کے ساتھی نے جیب سے پستول نکال لیا اور وہ دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

سڑک پر پتھر دیکھ کر میرا بھی ماتھا ٹھنکا تھا۔ شاہراہوں پر عام طور پر اس طرح روڈ بلاک کرکے لوٹ مار کی وارداتیں کی جاتی تھیں۔ میں نے بھی پستول نکال لیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دونوں طرف بنجر اور ویران پہاڑیاں تھیں۔ کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

ڈرائیور اور مویانگ کچھ دیر تک تیز لہجے میں آپس میں مشورہ کرتے رہے اور بالآخر ڈرائیور نے وین سڑک سے اتار کر پہاڑیوں میں ایک تنگ سے راستے پر موڑ لی۔

"دو ڈھائی میل ان پہاڑیوں میں چلتے رہنے کے بعد ہم دوبارہ ہائی وے پر نکل آئیں گے۔" ڈرائیور نے بتایا "لیکن تم لوگ سیٹوں سے نیچے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ہوسکتا ہے...."

پہاڑیوں میں گونجتی ہوئی فائر کی آواز سے اس کا جملہ مکمل نہ ہوسکا۔ ڈرائیور کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور وہ اسٹیئرنگ کے ساتھ دروازے کی طرف لڑھک گیا۔ اس کی پیشانی سے خون کا فوارہ بہہ نکلا تھا۔ سامنے کسی جگہ سے چلائی جانے والی گولی ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی اس کی کھوپڑی میں گھس گئی تھی۔

جانگی، چیکو اور میکوشی چیخ اٹھیں۔ وین بے قابو ہو کر ایک چٹان سے ٹکرا گئی۔ میرا سر بڑے زور سے اگلی سیٹ سے ٹکرایا اور میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل پاتا، فضا ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس مرتبہ گولیاں گاڑی کے مختلف حصوں پر لگی تھیں۔ دو ٹائر بھی دھماکوں سے پھٹ گئے تھے۔ مویانگ نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے اندھا دھند فائرنگ کرنے لگا اور پھر اس کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی۔ وہ لہراتا ہوا نیچے گرا اور بے حس و حرکت ہوگیا۔

"سیٹوں کے نیچے دبکی رہو۔ اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے چینی زبان میں چیخ کر چیکو اور میکوشی سے کہا اور جانگی کو بھی سیٹ پر دبائے رکھا۔

میرے پاس پستول موجود تھا مگر مقابلے کی کوشش کرنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے اور ان لوگوں کو چیلنج کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔

تقریباً دو منٹ خاموشی میں گزر گئے اور پھر بائیں طرف سے ایک دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ہمیں وین سے اترنے کا حکم دیا جارہا تھا اور ساتھ ہی یہ وارننگ بھی دی گئی تھی کہ اگر ہم میں سے کسی نے غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو اسے گولیوں سے چھلنی کردیا جائے گا۔

"حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" میں کہتے ہوئے سیدھا ہوگیا۔

چیکو اور میکوشی کے چہرے بالکل زرد ہو رہے تھے۔ وہ دونوں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

میں نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ دروازہ کھول کر اور دونوں ہاتھ اٹھا کر نیچے اتر آیا۔ میرے پیچھے جانگی اور پھر چیکو اور میکوشی بھی اتر آئیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی مختلف سمتوں سے پانچ آدمی سامنے آگئے۔ ان کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور ہم ان رائفلوں کی زد پر تھے۔

وہ لوگ آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھتے رہے اور جیسے ہی قریب پہنچے ان میں ایک آدمی کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ ہلکسیان تھا۔ جرائم پیشہ بھکشو۔ جس کی وجہ سے چین میں ہمارے لیے مصیبتوں کا دور شروع ہوا تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ یہ صورت حال مزید آگے چلے گی۔

ہلکسیان کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی اور میرے دماغ میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔

ہلکسیان نے جانگی کی طرف دیکھا اور مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک کر رائفل کا رخ میرے سینے کی طرف کرلیا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہلکسیان کی انگلی کی معمولی سی حرکت کسی بھی وقت میری زندگی کا خاتمہ کرسکتی تھی۔

"نہیں۔" ہلکسیان نے رائفل نیچے جھکالی "میری تم سے ایسی کوئی دشمنی تو نہیں کہ تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی ضرورت پیش آئے۔ معمولی سا جھگڑا تھا ہم دونوں کا۔ اگر تم اس تھیلے اور اس میں موجود چند ہزار یوآن کی رقم کو بھول جاتے تو بات آئی گئی ہوجاتی۔ مگر...." وہ چند لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مگر مجھے ڈانگ کو دیکھ کر تو تم نے مجھے خنجر کی نوک پر رکھ لیا تھا۔ اپنے آپ کو خطرے میں دیکھ کر مجھے مجبوراً پستول نکالنا پڑا تھا۔ میں اس وقت تم دونوں کو ایک ایسی جگہ پر لے جانا چاہتا تھا جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہوتا اور ہم اطمینان سے بیٹھ کر یہ جھگڑا طے کرلیتے مگر برا ہوا اس گاڑی کا جو عین وقت پر اس طرف آگئی تھی۔ تمہارے ساتھی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے مجھے مجبوراً گولی چلانی پڑی۔ تمہارا یہ ساتھی میری گولی سے تو بچ گیا مگر کار سے ٹکرا گیا۔ یہ خوش قسمت ہے کہ کار سے ٹکرانے کے بعد بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا اور میں بدقسمت ثابت ہوا کہ تم لوگوں سے بچ نکلنے کے بعد مجھے ایک اور شکاری نے گھیرنے کی کوشش کی۔"

"شکاری!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "لیکن میری اطلاع کے مطابق وہاں سے تقریباً دو میل دور تم نے کسی آدمی کو لوٹنے کی کوشش کی تھی اور مزاحمت کرنے پر تم اسے قتل کرکے بھاگ گئے تھے۔"

"قتل کی حد تک تمہاری اطلاع درست ہے مگر اس کا پس منظر تمہیں معلوم نہیں، میں بتاتا ہوں۔" ہلکسیان نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "وہاں سے بھاگنے کے بعد میں ایک نیم تاریک گلی میں جارہا تھا کہ ایک آدمی نے اچانک ہی تاریکی سے نکل کر خنجر کی نوک میرے پہلو سے لگا دی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم نے مجھے خنجر کی زد پر لیا تھا۔ بعض لوگ بھکشوؤں کے بارے میں اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ان کے پاس بڑی دولت ہوتی ہے۔ بھیک مانگ کر پیٹ بھر لیتے ہیں اور جو نقد رقم لوگوں سے ملتی ہے، اسے جان سے لگائے رکھتے ہیں۔ میرے بارے میں بھی اس شخص کا یہی خیال تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میرے کندھے سے لٹکا ہوا تھیلا یوآن کے نوٹوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ رہزن تھا مگر اسے شکار کی شناخت نہیں تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شکاری خود شکار کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بہرحال۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر گہرا سانس لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں تو پکڑے جانے کے خوف سے پولیس سے چھپتا رہا اور تمہارے بارے میں سنا کہ تم لوگ اس دولت مند عورت کی کوٹھی میں عیش کر رہے ہو جس کی کار سے تمہارا یہ ساتھی ٹکرائی تھی۔ میرے لیے کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ کوئی عبادت گاہ اور نہ کسی سرائے کا رخ کرسکتا تھا۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اس بھکشو کو تلاش کر رہی تھی جس کے ہاتھوں ایک شریف شہری مارا گیا تھا۔

"اگر اس رات مجھے یہ شریف آدمی نہ مل جاتا تو میں آہنی سلاخوں کے پیچھے بند ہوچکا ہوتا۔" اس نے دائیں طرف کھڑے ہوئے پستہ قامت... اور بھاری بھرکم چینی کی طرف اشارہ کیا "یہ چو آن ہے۔ ڈاکوؤں کے اس چھوٹے سے گروہ کا سردار۔ محض اتفاق سے ہی ہمارا آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کو ایک قاتل بھکشو کی تلاش ہے۔ اس نے جس طرح مجھ سے سوالات کیے تھے، اس سے مجھے شبہ ہوگیا کہ یہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں وہی بھکشو ہوں جو پولیس کو مطلوب ہے۔ یہ مجھے اپنے ساتھ دریا کے پار پہاڑیوں میں لے گیا جہاں ان دنوں انہوں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ویسے ان کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔ یہ شہروں میں وارداتیں نہیں کرتے۔ شاہراہوں پر سفر کرنے والے مسافروں کو لوٹتے ہیں اور ٹھکانے کیا، علاقے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے اپنے گروہ میں شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے فوراً ہی قبول کرلیا۔ ویسے بھی میں زندگی کی یکسانیت سے اکتا چکا تھا۔ بھیک مانگ کر کھانا، لوگوں کو دھوکا دے کر لوٹنا اور عبادت گاہوں میں راتیں بسر کرنا۔ کوئی مزہ نہیں رہا تھا اس زندگی میں۔ زیادہ رقم بھی نہیں ملتی تھی جبکہ اس نئی زندگی میں ایکشن ہے، ہنگامہ ہے، تھرل ہے۔ جب ہم ہائی وے پر کسی گاڑی کو روکتے ہیں تو اس میں سوار لوگ ہمیں دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگتے ہیں اور اگر کوئی بہادری دکھانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے جسم میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹا سا رنگین سوراخ کردیا جاتا ہے۔ جسے دیکھ کر دوسرے لوگ ہمارے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں اور گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے کے علاوہ اپنا سب کچھ ہمارے قدموں میں ڈھیر کردیتے ہیں۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ کتنا تھرل ہے اس زندگی میں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ پکڑے جانے کا بھی خوف نہیں۔ کسی ہائی وے پر دور دور تک پولیس کا نام و نشان نہیں ہوتا اور جب کسی قصبے کی پولیس کو اطلاع ملتی ہے تو ہم جائے واردات سے میلوں دور پہنچ چکے ہوتے ہیں۔"

میں خاموش کھڑا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے

اس نے یہیں کھڑے کھڑے اپنے کارناموں کی تفصیل بتانے کا پروگرام بنا رکھا ہو۔ اس کی باتیں سن کر چیکو اور میکوشی کے چہروں پر زردی کچھ اور گہری ہوگئی تھی جیسے ہلدی لیپ دی گئی ہو۔ جانگی عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کچھ دن پہلے ہم نے ڈانگ کو کے دوسری طرف کچھ وارداتیں کیں پھر اس طرف آگئے۔ ایک واردات ہم نے کل ڈانگ کو سے چند میل کے فاصلے پر کی تھی اور ایک واردات تم لوگوں کے آنے سے... چند گھنٹے پہلے کرچکے ہیں لیکن مزہ نہیں آیا۔ ہم نے سوچا تھا کہ آخری واردات کرکے شاؤ یانگ کی طرف نکل جائیں گے۔ چو آن کا کہنا ہے کہ شاؤ یانگ اور ہنگ یانگ کی درمیانی شاہراہ پر بڑا مال ملتا ہے۔ ہنگ یانگ میں ائرپورٹ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے دولت مند لوگ اس شاہراہ پر سفر کرتے ہیں۔ بڑا مال ہے وہاں۔ اس طرف تو ہم وقت ہی ضائع کرتے رہے۔

"تم لوگوں کے آنے سے پہلے ہم نے جو واردات کی تھی اس میں بھی کچھ زیادہ نہیں ملا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اس وقت بھی ہمیں مایوسی ہی ہوگی لیکن دنیا کی سب سے قیمتی دولت اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔" اس نے خاموش ہو کر پہلے جانگی اور پھر چیکو اور میکوشی کی طرف دیکھا۔

"یہ سردار چو آن بڑا عقل مند آدمی ہے۔" وہ بولتا رہا "لوگوں کو لوٹنے کے لیے بڑے بڑے نفسیاتی حربے استعمال کرتا ہے۔ شاہراہ بلاک کی تھی تو اسے یقین تھا کہ اس طرف جو بھی گاڑی آئے گی' روڈ بلاک دیکھ کر اسی کچے راستے پر نکلنے کی کوشش کرے گی یا واپسی کا راستہ اختیار کرے گی۔ اگر تمہارا ڈرائیور عقل مند ہوتا تو سڑک پر سے ایک آدھ پتھر ہٹا کر راستہ بناتا اور سیدھا نکل جاتا لیکن وہ اس راستے پر نکل آیا جہاں ہم تیار بیٹھے تھے۔ پہلا وار ہم کرتے ہیں تاکہ دوسرے وحشت زدہ ہوجائیں اور انہیں کچھ سوچنے کا موقع بھی نہ ملے۔ ویسے یہ بات میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی کہ یہاں تم سے آمنا سامنا ہوجائے گا۔ ڈرو نہیں۔ میری تمہاری ایسی دشمنی بھی نہیں ہے کہ تمہاری جان لینے کی کوشش کروں۔ دراصل میں اور میرے ساتھی کئی روز سے اس نعمت کے لیے ترسے ہوئے ہیں۔" اس نے جانگی وغیرہ کی طرف اشارہ کیا "ان پہاڑوں میں اندر جاکر کہیں ایک آدھ روز آرام کریں گے اور پھر ہمارے اور تمہارے راستے الگ الگ ہوجائیں گے۔ تم لوگ [illegible] جانے ــــ لیے

آزاد ہوگے۔"

ممکن ہے ہلمسیان رکے بغیر کچھ اور بھی بولتا رہتا مگر سردار چو آن کی وجہ سے اسے اپنی زبان کو بریک لگانا پڑا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"سردار چو آن کا خیال ہے کہ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ ہماری وین انہی پہاڑیوں میں ذرا آگے کھڑی ہے۔ تم لوگوں کو زیادہ نہیں چلنا پڑے گا لیکن ـــ پہلے اپنا خنجر میرے حوالے کردو۔"

میں نے جھک کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکالا اور خاموشی سے اس کے حوالے کردیا۔ یہ غنیمت ہے کہ اسے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میرے اور جانگی کے پاس پستول بھی ہوسکتے ہیں۔ اس نے ہمیں رائفل کی زد پر لے کر ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی اپنے دو ساتھیوں کو بھی اشارہ کردیا۔

وہ دونوں بڑی تیزی سے وین کی طرف بڑھے۔ ایک تو ڈرائیور اور مویانگ کی لاشوں کے لباس کی تلاشی لینے لگا اور دوسرا وین میں گھس گیا تھا۔ دو منٹ بعد وہ چیکو اور میکوشی کا سوٹ کیس لے کر باہر آگیا۔ سوٹ کیس زمین پر رکھ کر اس نے ایک جھٹکے سے تالا توڑ دیا اور ڈھکنا اٹھا کر تلاشی لینے لگا۔ وہ کپڑے اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتا رہا۔ کپڑوں کے نیچے نوٹوں کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ہی جیولری باکس بھی تھا۔ اس نے نوٹوں کے بنڈل اور جیولری باکس اٹھا کر سردار چو آن کے حوالے کردیے اور سوٹ کیس کو زوردار ٹھوکر مار کر دور اچھال دیا۔ سردار نے جیولری باکس اور نوٹوں کے بنڈل کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے میں رکھتے ہوئے کچھ کہا تو وہی شخص چیکو اور میکوشی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ان دونوں کے گلوں میں طلائی لاکٹ تھے۔ اس نے دونوں لاکٹ کھینچ لیے۔ ان دونوں نے اپنی اپنی انگلیوں سے انگوٹھیاں اتار کر خود ہی لٹیرے کے حوالے کردیں۔ ان دونوں سے فارغ ہو کر وہ جانگی کی طرف متوجہ ہوگیا مگر یہاں اسے مایوسی ہوئی۔ جانگی کے جسم پر کوئی زیور نہیں تھا۔ اس نے لاکٹ اور انگوٹھیاں بھی سردار کے حوالے کردیں۔ اس دوران میں دوسرا آدمی بھی لاشوں کے لباس کی تلاشی لے چکا تھا۔ اس نے بھی ان کی جیبوں سے برآمد ہونے والی رقم سردار کے حوالے کردی اور پھر ہمارا مارچ شروع ہوگیا۔

دو آدمی ہم سے بیس گز آگے تیز تیز چل رہے تھے۔ سردار اور ہلمسیان ہم سے تین چار قدم پیچھے تھے۔ ان کا پانچواں ساتھی سب سے پیچھے تھا۔

ہلمسیان نے تو پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ البتہ

ان ڈاکوؤں کے لباس بالکل مختلف تھے۔ جسم کے زیریں حصے پر جو کچھ پہن رکھا تھا' اسے پاجامہ یا پتلون نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اس قسم کے نزاؤزر ریس کے گھوڑوں کے جوکیوں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ گھٹنوں کے اوپر سے کسی قدر پھولا ہوا اور پنڈلیوں کے قریب پائنچے ٹانگ سے بالکل چپکے ہوئے۔ سائڈ میں تقریباً چھ انچ لمبی زپ لگی ہوئی تھی جس سے پائنچوں کو پھولا جاسکتا تھا۔ اوپر پوری آستین والی جیکٹیں تھیں۔ سروں پر عجیب سی ٹوپیاں جنہیں بوقتِ ضرورت نیچے کھینچ کر چہرہ بھی چھپایا جاسکتا تھا۔ ہر شخص کے سینے پر کراس کرتے ہوئے بیلٹ تھے جن میں رائفلوں کی گولیاں بھری ہوئی تھیں۔

تقریباً بیس منٹ بعد ہم رک گئے۔ دائیں طرف سڑک سے ذرا ہٹ کر دو چٹانوں کے درمیان ایک کشادہ کٹاؤ میں ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی جس کے چاروں طرف ایسی رنگ برنگی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس ویگن کا تعلق کسی سرکس سے ہے۔

ہم چاروں کو ایک سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ سردار ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس سے پچھلی سیٹ پر ہلمسیان ایک آدمی کے ساتھ بیٹھ گیا اور پانچواں آدمی ہماری سیٹ کے پیچھے فرش پر بیٹھ گیا تھا جہاں تیل کے تین گیلن اور کچھ اور چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

وین اس کٹاؤ سے نکل کر پتھریلے راستے پر دوڑنے لگی۔ تقریباً تین گھنٹوں تک وین رکے بغیر چلتی رہی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ ڈرائیور نے ہیڈ لیمپس روشن کرلیے۔ اس کے بعد بھی وین اس ویرانے میں تقریباً ایک گھنٹے تک چلتی رہی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ انہیں کسی خاص ٹھکانے پر پہنچنا تھا اور بالآخر وین پہاڑیوں میں ایک اور تنگ سے راستے پر مڑگئی۔ چٹانوں میں دو تین چکر کاٹنے کے بعد وین رک گئی اور ہمیں نیچے اتار کر رائفلوں کی زد پر لے لیا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ ان چٹانوں میں چلنے کے بعد ہم ایک غار میں داخل ہوگئے۔

غار کافی کشادہ تھا اور غالباً اکثر استعمال میں رہتا تھا۔ ایک آدمی نے ٹارچ روشن کرکے وہاں پر پہلے سے موجود مشعلیں جلالیں۔ غار کے فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف پتھروں سے بنا ہوا چولھا اور اس کے پاس لکڑیوں کا ڈھیر بھی لگا ہوا تھا۔

ہمیں ایک دیوار کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ایک ڈاکو نے ہم سے چند گز دور بیٹھ کر ہم پر رائفل تان لی۔ سردار سامنے والی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے آدمیوں کو مختلف احکامات جاری کرنے لگا۔ یہ لوگ وین کی چھت سے پانی کا بیس گیلن والا ایک کین' ایک پتیلی' ایک کیتلی اور ایک تھیلا بھی اٹھا لائے تھے۔ جس میں چاولوں کے علاوہ کچھ برتن بھی موجود تھے۔

چولھے میں آگ جلالی گئی اور چاول پکانے کی تیاری شروع کردی گئی۔ ہلمسیان سردار کے قریب بیٹھا کھسر پھسر کررہا تھا۔

چاول اُبالتے وقت تھوڑا سا نمک بھی ڈال دیا گیا تھا۔ آدھے گھنٹے میں چاول تیار ہوگئے جو اس وقت کی خوراک تھی۔

ڈاکوؤں کا یہ گروہ اس قسم کا سارا سامان ساتھ لے کر چلتا تھا اور انہوں نے جگہ جگہ ایسے خفیہ ٹھکانے بھی بنا رکھے تھے جہاں تھوڑے بہت انتظامات پہلے ہی سے موجود تھے۔

کھانا کھانے کے بعد سردار نے آج دن بھر کی لوٹ کا مال اپنے سامنے ڈھیر کرلیا۔ ایک گھنٹے تک حساب ہوتا رہا اور پھر اس مال کی تقسیم شروع ہوگئی۔ ہر ڈاکو اپنے حصے کی رقم اپنی جیکٹ کے اندر کی خفیہ جیبوں میں چھپانے لگا۔ ہلمسیان کے حصے میں اچھی خاصی رقم آئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لاکٹ پر بھی قبضہ کرلیا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس نے مختصر سے عرصے کے اندر اس گروہ میں اپنے لیے اچھی خاصی جگہ بنالی تھی۔

غار کا دہانہ اگرچہ تنگ تھا لیکن اندر سے کافی کشادہ تھا۔ دائیں طرف ایک کشادہ کٹاؤ تھا جو اندر کی طرف لمبائی میں بھی چھ سات فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ پچھلے حصے میں ایک جگہ تقریباً تین فٹ اوپر ایک اور تنگ سا دہانہ تھا۔ جہاں سے بیک وقت ایک آدمی ہی اندر داخل ہوسکتا تھا لیکن لگتا تھا اندر سے وہ غار بھی کافی کشادہ ہوگا۔ کیونکہ کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک آدمی مشعل لے کر اس دہانے میں چلا گیا تھا اور اندر کافی دیر تک اس کے قدموں کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ وہ آدمی مشعل اوپر والے غار میں چھوڑ کر ہی واپس آگیا تھا۔

سردار چو آن اور ہلمسیان بدستور سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ میں کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور میں نے نوٹ کیا تھا کہ دو آدمی چیکو وغیرہ کو گھور رہے تھے۔ انہیں اس طرح گھورتے دیکھ کر میرے ذہن میں جو اندیشہ ابھرا تھا' وہ غلط نہیں تھا۔ ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔ وہ چند لمحے تینوں عورتوں کو گھورتا رہا اور

پھر میکوشی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔ میکوشی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ میں سمجھ گیا اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگرچہ میں اس کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا مگر خاموش بھی نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ وہ شخص قہقہے لگاتے ہوئے میکوشی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا میکوشی چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے آدمی بھی قہقہے لگانے لگے۔

میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس شخص کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔ وہ شخص میکوشی کا ہاتھ چھوڑ کر چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک ڈاکو نے میرے اوپر رائفل تان لی اسی لمحے ہلکسیان چیخ اٹھا۔ جواب میں رائفل بردار بھی کچھ بھونکا تھا۔ سردار نے بھی چیخ کر کچھ کہا تو اس شخص نے بڑی پھرتی سے رائفل کو نال کی طرف سے پکڑ لیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا اس نے رائفل کے بٹ سے دو تین وار کر دیے۔ ایک ضرب میرے شانے پر لگی اور دو تین ضربیں کمر پر۔ ہلکسیان تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس شخص کو پکڑ کر گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا۔

صورتِ حال خاصی کشیدہ ہو گئی تھی۔ ہر ڈاکو نے رائفل تان لی تھی۔ میں جانکی کے قریب زمین پر گرا ہوا تھا۔ میں نے جس شخص کو گھونسا مارا تھا' وہ چند لمحے خوں خوار سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر جیکٹ کی آستین سے ہونٹ پونچھتا ہوا آگے بڑھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کچھ کہا اور دوبارہ میکوشی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"یہ کہہ رہا ہے کہ پہلے تو اس لڑکی کو الگ لے جانا چاہتا تھا لیکن اب جو کچھ بھی کرے گا تم لوگوں کے سامنے کرے گا۔ واہ! کیا منظر ہوگا۔" ہلکسیان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور قہقہے لگانے لگا۔

وہ آدمی میکوشی کو گھسیٹتا ہوا غار کے کٹاؤ میں لے گیا۔ میکوشی چیختے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی لیکن اس شخص نے دو تین منٹ کے اندر اندر اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ میکوشی نے اس کے بازو پر دانت گاڑ دیے۔ اس شخص نے زوردار جھٹکا دیا تو میکوشی اس کٹاؤ کے باہر دوسرے آدمی کے قریب گری۔

میں اپنی جگہ پر پڑا بے بسی سے میکوشی کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے دیکھا کہ قریب ہی دیوار پر لگی ہوئی مشعل کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قریب بیٹھے ہوئے شخص کی رائفل جھپٹ لی اور اس کا رخ کٹاؤ میں کھڑے ہوئے آدمی کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔

غار فائر کے ساتھ اس آدمی کی چیخ سے بھی گونج اٹھا تھا۔ گولی اس شخص کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر لگی اور وہ ڈھیر ہو گیا۔

ایک لمحے کو سناٹا سا چھا گیا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا۔ غار ایک بار پھر فائر اور چیخ کی آواز سے گونج اٹھا۔ یہ چیخ میکوشی کی تھی۔ دائیں طرف بیٹھے ہوئے ڈاکو نے اس کی کھوپڑی اڑا دی تھی۔

میں پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جانکی اور چیکو مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آنکھوں میں دہشت سی ابھر آئی تھی۔

غار میں چند لمحے سکوت سا رہا اور پھر دو آدمی اچانک ہم پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے ہم تینوں کی [illegible] کرتے رہے۔ جانکی اور چیکو کی چیخیں غار میں گونج رہی تھیں اور پھر سردار کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ان دونوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ سردار نے پھر چیخ کر کچھ کہا اور ہم تینوں کو [illegible] والے غار میں دھکیل دیا گیا۔

یہ غار نیچے والے غار سے زیادہ کشادہ تھا لیکن اس کی زمین ہموار نہیں تھی۔ کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے اور کہیں چار پانچ چھ انچ اوپر پتھر ابھرے ہوئے تھے۔ اگر زمین ہموار ہوتی تو یہ غار زیادہ محفوظ ہوتا۔

نیچے والے غار سے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ سب چیخ چیخ کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ہلکسیان کی آواز بھی شامل تھی۔ میں غور سے وہ آوازیں سننے لگا۔ سب چیخ چیخ کر بول رہے تھے۔ ان کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ڈاکو ہلکسیان کو اپنے ساتھی کی موت کا ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ جو ہمیں یہاں لے کر آیا تھا۔ ان کے خیال میں ہم سب کو وہیں ختم کر دینا چاہیے تھا۔

ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ جھگڑا بڑھے گا۔ ہلکسیان اس گروہ کا آدمی نہیں تھا۔ نیا نیا ان کے گروہ میں شامل ہوا تھا اور میرے اندازے کے مطابق وہ ان سب پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اب اس کی وجہ سے ان کا ایک آدمی بھی مارا گیا تھا۔

اس قسم کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ ہمارے پاس دو پستول تھے۔ ایک میرے پاس اور ایک جانکی کے پاس۔ میرے پستول میں چار گولیاں تھیں' اگر جانکی کا پستول بھرا ہوا بھی ہو تو کل دس گولیاں ہوتی تھیں۔ یہ غار ہمارے لیے محفوظ تھا۔ ہم تنگ سے دہانے سے فائرنگ کر سکتے تھے لیکن وہ چار آدمی تھے۔ ہماری طرف سے پہلا فائر ہوتے ہی ہوشیار ہو جاتے۔ ہو سکتا ہے ہمارے ہاتھوں ان میں سے ایک آدھ مارا بھی جاتا لیکن ہم بھی یہاں سے زندہ نہیں نکل سکتے تھے۔

میں مقابلے کا خیال ذہن سے نکال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چٹان کے کافی اندر ہونے کے باوجود اس غار میں گھٹن کا احساس نہیں تھا۔ کسی طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔

دہانے کے قریب ہی دیوار پر مشعل لگی ہوئی تھی۔ اس سے ذرا ہٹ کر چیکو دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ مشعل کی روشنی میں اس کا چہرہ کچھ اور بھی زرد ہو رہا تھا۔ میکوشی کی موت نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا اور شاید اپنی موت بھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس کے بدن پر کپکپاہٹ واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ جانکی اگرچہ بیسیوں مرتبہ اس قسم کی خوفناک صورتِ حال سے دوچار ہو چکی تھی لیکن اس وقت اس کے چہرے پر بھی خوف کے ہلکے سے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری نظریں غار کے آخر میں ایک تنگ سی دراڑ پر جم گئیں۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس دراڑ کے قریب پہنچ گیا۔ اس طرف سے تازہ ہوا آ رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ دراڑ کسی کھلی جگہ پر کھلتی تھی۔

"جانکی!" میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی میں کہا "اس تنگ سی دراڑ سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہو سکتا ہے اس غار سے باہر نکلنے کا موقع نکل جائے۔"

"اگر اس دراڑ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہوتا تو یہ لوگ ہمیں یہاں بند نہ کرتے۔" جانکی نے جواب دیا "یہ لوگ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں اور انہیں اس دراڑ کے بارے میں بھی معلوم ہوگا۔"

"لیکن ہو سکتا ہے انہوں نے اس حوالے سے کبھی توجہ نہ دی ہو۔ ہمیں ایک کوشش تو کرنی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"اگر یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔" جانکی نے کہا۔

میں نے دہانے کے قریب آڑ میں کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے کی کوشش کی۔ ان میں کوئی نظر تو نہیں آیا تاہم ان لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں جانکی اور چیکو کو اشارہ کرتا ہوا دراڑ کی طرف بڑھ گیا۔

دراڑ خاصی تنگ تھی۔ میں دیواروں کے ساتھ گھسٹتا ہوا بڑی مشکل سے اندر داخل ہو سکا تھا۔ میرے پیچھے چیکو اور اس کے پیچھے جانکی تھی۔

تقریباً بیس گز تک ہم اسی طرح دراڑ... کے ساتھ گھسٹتے ہوئے چلتے رہے۔ آگے جا کر بائیں طرف مڑتے ہی دراڑ کچھ کشادہ ہو گئی تھی۔ میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک جگہ رک گیا۔

ہم ایک موڑ گھوم کر اچانک ہی کھلی جگہ پر نکل آئے تھے۔ میں کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر بڑے بڑے پتھروں کا سہارا لیتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ چیکو اور جانکی بھی میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ ہم تو ایسی کٹھنائیوں کے عادی ہو چکے تھے مگر چیکو کی زندگی میں شاید اس قسم کا یہ پہلا موقع تھا۔ چٹانوں سے اترتے ہوئے اس کے منہ سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

تقریباً دس منٹ بعد ہم چٹان سے اتر آئے اور پھر اچانک ہی فائرنگ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آوازیں چٹان کے دوسری طرف سے آئی تھیں لیکن چاروں طرف گونجتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

چیکو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم پتھروں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے ایک طرف دوڑنے لگے۔ ایک بہت بڑے چٹان نما پتھر کے اوپر سے گھومتے ہی چیکو لڑکھڑا کر گر گئی۔ میں اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"اے۔ وہ دیکھو۔ اس طرف۔"

جانکی کی چیختی ہوئی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ہم سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر وین کھڑی تھی۔ دوسری طرف فائرنگ کی آوازوں میں بھی اب شدت آ گئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ڈاکوؤں میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور وہ آپس ہی میں لڑ پڑے تھے۔ یہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ ہلکسیان کو سردار کی حمایت حاصل تھی۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں ایک طرف ہوں اور دوسرے دو ڈاکو بغاوت کر کے ان سے الگ ہو گئے ہوں اور ان دونوں پارٹیوں میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہو اور مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی وین کی طرف آنے ہی والا ہوگا۔

"جانکی۔" میں چیخا "جلدی کرو۔ وین تک پہنچو۔ اگر ان میں سے کوئی وین تک آ گیا تو ہم یہاں سے نہیں نکل سکیں

گے۔"

جانکی وین کی طرف دوڑی۔ میں نے چیکو کو کندھے پر لادا اور وین کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔

وین کے دروازے لاک نہیں تھے۔ اس ویرانے میں دروازے لاک کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں قریب پہنچا تو جانکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر چیکو کو پسنجرز سیٹ پر ڈال دیا اور خود بھی اندر گھس گیا۔

فائرنگ کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ جانکی انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کررہی تھی مگر انجن اسٹارٹ ہو کر نہیں دے رہا تھا اور بالآخر پانچویں کوشش پر انجن اسٹارٹ ہوا۔ آگے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ جانکی یوٹرن لیتے ہوئے وین کو واپس گھمانے لگی اور پھر اسی وقت ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"چوآن۔ بھاگو۔ وہ وین لے جارہے ہیں۔"

یہ ہکسیان کی آواز تھی۔

"ہری اپ جانکی۔" میں چیخا۔

جانکی نے کلچ پلیٹ پر سے پیر ہٹالیا۔ وین مینڈک کی طرح اچھل کر آگے بڑھی اسی لمحے چٹانیں ایک بار پھر تڑ تڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھیں۔ اس مرتبہ وین پر فائرنگ کی گئی تھی۔ کئی گولیاں وین کے پچھلے حصے پر کسی جگہ لگیں۔ جانکی نے ایکسی لریٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا۔ وین پتھریلے راستے پر اچھلتی ہوئی دوڑنے لگی اور پھر چٹان کے ساتھ موڑ گھومتے ہی ہم گولیوں کی زد سے محفوظ ہوگئے۔

یہ تنگ سا راستہ تھا۔ تاریکی میں تیز رفتاری کسی خوفناک حادثے کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ جانکی نے ہیڈ لیمپس روشن کرلیے اور اس خطرناک راستے پر وین کو اسی تیز رفتاری سے دوڑاتی رہی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہم کشادہ راستے پر پہنچ گئے۔ جانکی نے وین روک لی۔

"اب مجھے یاد نہیں کہ ہم لوگ کس طرف سے آئے تھے۔" جانکی کہتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے لگی۔

"دائیں طرف موڑلو۔ میرا خیال ہے ہم اسی طرف سے آئے تھے۔" میں نے کہا۔

جانکی نے وین اس طرف موڑلی اور رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ میں دروازے کے ساتھ ٹکا ہوا تھا اور چیکو میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ اس طرح تھر تھر کانپ رہی تھی جیسے جاڑے سے بخار آگیا ہو۔ اس کے دانت بھی بج رہے تھے۔

یہ خوف کی انتہا تھی۔ پہلے اس نے ہمارے ساتھ ڈانگ... سے آنے والے ڈرائیور اور اس کے ساتھی کو ڈاکوؤں... گولیوں سے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر غار میں میکوشی... آنکھوں کے سامنے تڑپتے اور جان دیتے ہوئے دیکھا تھا... میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے والی لڑکی کے لیے تو... صورتِ حال بہت ہی خوفناک تھی۔

میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹالیا اور اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ہم خطرے سے نکل آئے ہیں چیکو۔ اب ڈرنے... ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ سراسر زیادتی ہے وجدان۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری موجودگی میں تم اسے اپنے سینے سے... رہے ہو اور..."

"اور تم جل کر کباب ہوئی جارہی ہو۔" میں نے اس... بات کاٹتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"جلتی ہے میری جوتی۔" جانکی نے تڑ سے جواب... "اب دیکھوں گی میں، تم میرے سامنے کس طرح مزاحمت کرتے ہو۔"

"ایسا موقع نہیں آئے گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

جانکی مجھے گھور کر رہ گئی اور پھر سامنے دیکھنے لگی۔

وین تقریباً ایک گھنٹے تک دوڑتی رہی۔ اس دوران... چیکو بھی بڑی حد تک اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ میں کوشش... کررہا تھا کہ گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں بات... لیکن ظاہر ہے اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چیکو... میکوشی کو یاد کرکے رونے لگی اور پھر باتوں میں یہ پتا چلا کہ... دونوں آپس میں کزنز تھیں۔ میکوشی اس سے دو سال بڑی... تھی۔ وہ دونوں کلب ڈانسرز تھیں۔ اس پیشے میں رہتے ہوئے... عورتوں کے لیے اپنے آپ کو بچائے رکھنا بڑا مشکل... ہے۔ یہ دونوں بھی سیان چانگ جیسے دولت مندوں کا... بہلانے کا کھلونا بن گئیں۔ کسی مرد کے بستر کی زینت بننا... دونوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بکاؤ ضرور... لیکن لوٹ کا مال نہیں تھیں۔ ڈاکوؤں نے تو انہیں لوٹ... مال ہی سمجھا تھا اور میکوشی نے مزاحمت کرتے ہوئے... جان دے دی تھی۔

ہمیں ان پہاڑیوں میں سفر کرتے ہوئے تین گھنٹے ہو... تھے۔ جس وقت ڈاکو ہمیں ہائی وے سے ...لے کر روانہ ہو... تو شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ تقریباً چار گھنٹوں کے سفر... اس غار تک پہنچے تھے۔ تقریباً دو گھنٹے غار میں گزارے...

اور اب سفر کرتے ہوئے تین گھنٹے ہوچکے تھے اور یہ رات کا آخری پہر تھا۔

"ہم غلط راستے پر تو نہیں نکل آئے؟" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت جلدی خیال آگیا تمہیں۔" میں نے کہا "اب واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ اسی راستے پر چلتی رہو۔ کہیں نہ کہیں تو پہنچ ہی جائیں گے۔"

"اور اگر پہاڑیوں ہی میں بھٹکتے رہے تو؟" جانکی بولی۔

"دیکھا جائے گا۔" میں نے کندھے اچکا دیے۔

آدھا گھنٹا مزید چلنے کے بعد وین کے انجن سے عجیب وغریب سی آوازیں نکلنے لگیں۔ جانکی نے وین روک لی۔ سب سے پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ ٹینکی میں پیٹرول ختم ہوچکا تھا۔ اس کی زیادہ پریشانی اس لیے نہیں تھی کہ تیل کے کین بھرے ہوئے رکھے تھے۔ لیکن انجن کی آوازوں نے پریشان ضرور کردیا تھا۔ اگر اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی تو ہم یقیناً ان ویران پہاڑوں میں بھٹکتے رہیں گے۔

چیکو میرے کندھے پر سر رکھے سوگئی تھی۔ میں نے اسے جگا دیا اور ہم لوگ وین سے اتر آئے۔ وین میں بیٹھے بیٹھے ٹانگیں بھی جیسے جڑ گئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر تک ٹہلتا رہا اور پھر جانکی کے قریب ہی پتھر پر بیٹھ گیا۔ جانکی کا خیال تھا کہ وین پہلے بھی چار گھنٹے چلتی رہی تھی اور اب بھی تین گھنٹوں سے تسلسل دوڑ رہی تھی۔ شاید انجن گرم ہوجانے کی وجہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد انجن پہلی ہی کوشش میں اسٹارٹ ہوگیا لیکن اس مرتبہ ہم زیادہ دور نہیں جاسکے تھے۔ پہاڑیاں ختم ہوگئی تھیں لیکن ان پہاڑیوں کے ختم ہوتے ہی زوردار دھماکا ہوا اور وین لڑکھڑانے لگی۔

چیکو اچھل کر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ اس دھماکے سے میں بھی بدحواس ہوگیا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ دھماکے کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی تھی۔ وین کا آگے کا ایک ٹائر برسٹ ہوگیا تھا۔ جانکی نے وین روک لی اور ہم نیچے اتر آئے۔

اس وقت صبح کا ملگجا سا اجالا پھیلنے لگا تھا اور سامنے بہت دور نشیب میں سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی اس لیے اندازہ لگانا دشوار تھا کہ وہ کوئی جنگل تھا یا کھیت وغیرہ تھے۔

وین کے پچھلے حصے میں ٹول بکس تو موجود تھا مگر فاضل ٹائر نظر نہیں آرہا تھا۔ میں دروازے کے پائدان پر پیر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ چھت پر فاضل ٹائر بھی رکھا ہوا تھا جسے میں نے کھینچ کر نیچے پھینک دیا لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ بھی پنکچر تھا اور ہمارے لیے بیکار تھا۔

یہاں تک پہنچ کر یہ بات تو ہم جان گئے تھے کہ غار سے فرار ہونے کے بعد ہم نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا کیونکہ جس ہائی وے پر ہم سفر کرتے رہے تھے وہاں دور دور تک سبزے کا نام و نشان تک نہیں تھا اور یہاں ہمارے سامنے نشیب میں سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔

دن کی روشنی پھیلتی جارہی تھی۔ ہم تینوں پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے اپنی اپنی سوچوں میں غرق تھے۔ میں چیکو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔ وہ ایسے حالات کی عادی نہیں تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آگیا جب برما کی سرحدی بستی سے نکلنے کے بعد میں اور جانکی تین دن تک پہاڑوں میں بھٹکتے رہے تھے اور پھر اس کے کئی روز بعد دو دن تک لوگوں کی نظروں سے چھپتے ہوئے دھان کے کھیتوں میں بھوکے پیاسے بھٹکتے رہے تھے بالآخر ایک ٹوٹی پھوٹی عبادت گاہ میں پناہ مل گئی تھی۔ جہاں ہم رات کو تربوز کھا کر سوئے تھے اور صبح ہمیں ہوکیانگ اور اس کے ساتھیوں نے گھیر لیا تھا۔ ہم تو کئی برسوں سے اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ کئی مرتبہ موت کے جبڑوں میں پھنسے تھے اور اب ہم ایسی مشکلوں کے عادی ہوگئے تھے لیکن چیکو کے لیے یہ ایک تکلیف دہ صورتِ حال تھی۔

چیکو اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی اور پھر اچانک ہی وہ چیخ اٹھی۔ میں نے اور جانکی نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا۔ وہ چیخنے والے انداز میں کچھ کہتے ہوئے ایک طرف اشارہ کررہی تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئے اور پھر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

نشیب میں تاحدِ نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور بہت اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار جگہوں سے دھوئیں کی لکیریں سی اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی چھوٹی سی بستی تھی۔

وین میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہم ساتھ لے جاسکتے۔ ہمارا اثاثہ دو پستول تھے جن میں ایک میرے پاس تھا اور دوسرا جانکی کے پاس۔ چیکو بالکل خالی ہاتھ تھی۔ وہ سیان چانگ سے جو کچھ کما کر لائی تھی ڈاکوؤں کے قبضے میں جاچکا تھا۔ اندوہناک یادوں کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

ہم فوراً ہی نشیب میں اترنے لگے۔ دور دور تک زرد رنگ کی کانٹے دار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن میں چلنا

مشکل ہو رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد دھان کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے مزید ایک گھنٹے بعد ہم بستی میں پہنچ سکے تھے۔

دس بارہ گھروں پر مشتمل بہت مختصر سی بستی تھی۔ کسانوں نے ہمیں گھیر لیا۔ چیکو نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی اور ہم بھٹکتے ہوئے اس طرف آ نکلے ہیں۔ اس نے پہاڑوں کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی ڈاکوؤں کی بات کی تھی جس سے میں سمجھ گیا کہ وہ اصل بات کو چھپانا چاہتی ہے اس لیے میں نے بھی اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھی۔

ہمیں اس چھوٹی سی بستی میں کھانے کو بھی مل گیا اور آرام کرنے کا موقع بھی۔ اس بستی کا سربراہ ساٹھ سالہ ایک بوڑھا تھا۔ جس کی شکل ویت نام کے انقلابی لیڈر ہوچی منہ سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہاں سے دس میل دور لانگ ہوئی نامی قصبہ ہے جہاں سے پچاس میل آگے شاؤ یانگ کا بڑا شہر ہے۔

اس بوڑھے کا مشورہ تھا کہ ہم آج کا دن اور رات اس بستی میں رہیں اور کل صبح چلے جائیں لیکن ہم رکنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے بوڑھے سے اصرار کیا کہ وہ ہمیں لانگ ہوئی کی طرف جانے والا راستہ بتا دے۔

"ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "اگر تم لوگ آج کا دن رک جاتے تو کل صبح میں تمہیں خچر گاڑی پر بھیج دیتا لیکن بہرحال دس میل کا فاصلہ تم جیسے نوجوان کے لیے زیادہ بھی نہیں ہے۔"

ہم لوگ بستی سے باہر آ گئے۔ دو عورتیں اور کچھ بچے بھی ہمارے ساتھ تھے۔

"یہ راستہ سیدھا لانگ ہوئی کی طرف جاتا ہے۔" بوڑھے نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آگے بھی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ممکن ہے وہاں سے تمہیں کوئی سواری مل جائے۔"

ہم اس بوڑھے، عورتوں اور بچوں کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہم تازہ دم ہو چکے تھے۔ پیٹ بھی بھر چکا تھا۔ اس لیے ہمارے چلنے کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس وقت دس بجے کا وقت ہو گا۔ تیز دھوپ چمک رہی تھی لیکن غنیمت تھا کہ اس کشادہ راستے کے دونوں طرف درخت تھے جن کے سائے میں ہم چل رہے تھے۔

چیکو میرے اور جانگی کے درمیان چل رہی تھی۔ جانگی نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

"تم نے اس بوڑھے کو اصل بات کیوں نہیں بتائی تھی۔" میں نے چیکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم ان کمیونسٹوں کو نہیں جانتے۔" چیکو نے جواب دیا "اگر میں انہیں بتا دیتی کہ ہم ڈاکوؤں کی قید سے فرار ہوئے ہیں اور تین قتل بھی ہو چکے ہیں تو یہ لوگ ہمیں بستی سے نکلنے بھی نہ دیتے۔ ہمیں کسی نہ کسی بہانے یا زبردستی روک لیتے اور لانگ ہوئی سے پولیس کو بلوا کر ہمیں ان کے حوالے کر دیتے اور پھر تم لوگ یہاں کی پولیس سے بھی واقف نہیں ہو۔ ایک بہت معمولی سے جرم میں بھی کسی کو پکڑ لیا جائے تو اسے جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"لیکن شاؤ یانگ پہنچ کر تو تمہیں پولیس کو سب کچھ بتانا پڑے گا۔" میں نے کہا "سیان چانگ کے دو آدمی مارے گئے ہیں۔ میکوشی ختم ہو چکی ہے۔ یہ ساری باتیں پولیس کے علم میں لانی ہوں گی۔ چلو۔ پولیس کو نہ سہی۔ گھر پہنچو گی تو تم سے میکوشی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کیا بتاؤ گی۔ کیسے چھپاؤ گی اتنی بڑی بات کو؟"

"میرا گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" چیکو نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں اچھل پڑا۔

"گھر جانے کا مطلب یہ ہو گا کہ میں ایسی مصیبتوں میں پھنس جاؤں گی جن سے زندگی بھر چھٹکارا نہیں پا سکوں گی۔" چیکو نے کہا۔

"تو پھر کہاں جاؤ گی؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم لوگوں کے ساتھ۔" چیکو نے اطمینان سے جواب دیا "تم لوگ شاؤلن ٹیمپل جا رہے ہو۔ میرے لیے محفوظ ترین جگہ وہی ہے۔"

میں نے معنی خیز نظروں سے جانگی کی طرف دیکھا۔

"ہم تو اس لیے سامنے نہیں آنا چاہتے کہ ہم غیر قانونی طور پر چین میں داخل ہوئے ہیں۔" میں نے کہا "لیکن تم یہاں کی رہنے والی ہو۔ اس طرح غائب ہو جانے پر تم پر شبہ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے ہمیں اور تمہیں ہی ان واقعات کا ذمے دار قرار دیا جائے اور ہماری تلاش شروع ہو جائے۔ ایسی صورت میں ہمیں پولیس سے کہیں پناہ مل سکے گی؟"

"چینی پولیس میں بھی سب فرشتے نہیں ہیں۔" چیکو نے جواب دیا "دنیا کے کسی بھی ملک کی پولیس ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتی۔ یہ لوگ صرف کمزوروں کو دباتے ہیں۔ قانون کی تمام پابندیاں شریف لوگوں کے لیے ہیں، جرائم پیشہ اور طاقت ور لوگ تو ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ اگر کوئی قتل کرنے کے بعد بھی پولیس کے ہاتھ نہ آنا چاہے تو پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سیان چانگ کی مثال تمہارے سامنے ہے۔"

"سیان چانگ!" میں چونک گیا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔" حالانکہ میں اس کا مطلب بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اس کی شہر والی کوٹھی میں آگ اتفاقیہ طور پر لگی ہو گی۔" چیکو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "جس روز تم دونوں چائے کے باغ والے کاٹیج میں آئے تھے اس رات سیان چانگ چار پانچ آدمیوں کو لے کر شہر چلا گیا تھا۔ ان کی واپسی رات کے آخری پہر ہوئی تھی اور صبح اطلاع ملی تھی کہ اس کی کوٹھی اور اس کی بیوی کاراشان آگ میں جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔"

"اوہ!" میں نے کہا "تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ کیا تمہارے خیال میں کوٹھی کو آگ سیان چانگ نے لگائی تھی اور اپنی بیوی کو اسی نے قتل کیا ہے؟"

"اور کون ہو سکتا ہے۔" چیکو بولی "ان دولت مندوں کے کھیل بھی بہت نرالے ہوتے ہیں۔ یہ کھلونوں سے نہیں لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔ میں سیان چانگ کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ کاراشان سے شادی کر کے پچھتا رہا تھا۔ کاراشان نے اسے بری طرح اپنی سازشوں کے جال میں پھنسا رکھا تھا۔ بہت چھوٹے گھرانے کی لڑکی کو جب دولت ملی تو وہ اپنی اوقات بھول گئی۔ وہ سیان چانگ کی ساری دولت پر قبضہ کرنا چاہتی تھی اور یہ قبضہ سیان چانگ کی موت کی صورت میں ہی ہو سکتا تھا۔ وہ دو مرتبہ پہلے بھی اسے مروانے کی کوشش کر چکی ہے، سیان چانگ نے اپنی وصیت تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کاراشان کو کسی طرح اس کا پتا چل گیا اور اس نے سیان چانگ کو قتل کرنے کے لیے تمہیں بھیج دیا اور شاید اس وقت سیان چانگ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے اسی رات شہر جا کر کاراشان کو اس طرح ختم کر دیا کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکا کہ آگ محض اتفاقیہ لگی تھی یا لگائی گئی تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "سب جانتے ہیں سیان چانگ نے فان کنگ میں دوسری شادی کر لی تھی اور کاراشان سے اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔ ایسے حالات میں شوہر یا بیوی میں سے کوئی اس طرح پُراسرار طور پر ہلاک ہو جائے تو پہلا شبہ زندہ بچ جانے والے فریق پر کیا جاتا ہے۔ کاراشان کی موت کے بعد سیان چانگ پر شبہ کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ جائے واردات سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ صرف پچاس میل کا فاصلہ جو ایک سوا گھنٹے میں طے ہو سکتا ہے۔ اصولی طور پر سب سے پہلے اس پر شبہ ہونا چاہیے تھا لیکن دولت تو بڑے بڑے راز چھپا لیتی ہے۔ سیان چانگ تقریباً دس دن شہر میں رہا تھا اور اس دوران میں اس نے پولیس سے تمام معاملات طے کر لیے تھے۔"

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"میں تین سال سے سیان چانگ کی خدمت کر رہی ہوں۔" چیکو نے جواب دیا "ہم جیسی عورتیں تو سیان چانگ جیسے مردوں کے دلوں کے اندر بھی جھانک لیتی ہیں۔ وہ جو بات اپنی بیویوں کو نہیں بتانا چاہتے ہم اگلوا لیتی ہیں۔ کوٹھی کی آتش زدگی اور کاراشان کی ہلاکت کے بارے میں سب کچھ میں نے اسی رات اگلوا لیا تھا جب وہ شہر سے واپس آیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پولیس نے سیان چانگ پر کسی قسم کا شبہ ظاہر نہیں کیا بلکہ اس کے کہنے پر آتش زدگی اور کاراشان کے قتل کی رپورٹ ایک نامعلوم عورت اور مرد کے بارے میں لکھی گئی ہے۔ جو پچھلے کئی روز سے چوری چھپے اس کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"کیا۔۔۔؟" میں اچھل پڑا۔ جانگی نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔

"میں نے کہا تھا ناکہ دولت مندوں کے کھیل بڑے نرالے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کھلونوں سے نہیں انسانی زندگیوں سے کھیلتے ہیں۔" چیکو نے کہا "اسے تم لوگوں سے ایسی ہمدردی نہیں تھی کہ اتنے روز تک مہمان رکھا اور دو آدمیوں کے ساتھ اپنی گاڑی پر رخصت کیا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر نامعلوم عورت اور مرد کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی اور جب کبھی ضرورت پڑے گی۔ وہ دونوں نامعلوم 'معلوم' ہو جائیں گے۔"

مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں سیان چانگ کو بہت شریف آدمی سمجھا تھا لیکن چیکو نے اس کی شرافت کا بھرم کھول دیا تھا لیکن بہرحال اتنی شرافت کا ثبوت اس نے ضرور دیا تھا کہ رپورٹ ہمارے ناموں سے نہیں لکھوائی تھی اور ہمیں پولیس کے حوالے نہیں کیا تھا۔

"اگر ہمارے ساتھ راستے میں یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاؤ یانگ پہنچ کر ہمارے اور تمہارے راستے الگ ہو جاتے اور اس کے بعد مجھے یاد بھی نہ رہتا کہ تم کون ہو۔ لیکن۔۔۔" وہ چند

لمحوں کو خاموش ہوگئی پھر بولی "اس غار میں جو کچھ بھی ہوا، میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ میکوشی کو بچانے کے لیے تم جس طرح لپکے تھے اور تمہاری جس طرح پٹائی ہوئی تھی اور اس کے بعد جس طرح تم لوگوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ وہاں سے نکالا ہے وہ بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ تم میری زندگی میں آنے والے پہلے شخص ہو جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے اور اس لیے میں نے تمہارے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے کہ وقت پڑنے پر تم لوگوں کی مدد کر سکوں۔"

"ہماری مدد کیسے کر سکو گی؟" میں نے پوچھا۔

"سیان چانگ نے اس وقت تو قانون کو فریب دے دیا ہے مگر میں جانتی ہوں کہ جلد یا بدیر یہ معاملہ سر ضرور اٹھائے گا۔ اس وقت پولیس سیان چانگ کو تنگ کرے گی تو وہ بڑے اطمینان سے تم دونوں کو پولیس کے حوالے کر دے گا۔ سیان چانگ اور پولیس کے مُرتشی افسروں کے لیے تمہارے خلاف جرم ثابت کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ اس وقت میں تمہارے کام آؤں گی۔ میں یہ بتاؤں گی کہ کوٹھی کو آگ کس نے لگائی تھی اور کاراشان کا قاتل کون ہے۔"

"لیکن اگر ہمارے ساتھ تمہیں بھی دھر لیا گیا تو؟" میں نے کہا۔

"اب اگر میں پولیس کے چکر میں پھنس گئی تو میرے لیے چھٹکارا پانا مشکل ہو جائے گا اور میں تم لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گی لیکن تم لوگوں کے ساتھ رہ کر میں تمہارے کام ضرور آؤں گی۔ سیان چانگ یا کوئی اور سوچ بھی نہیں سکے گا کہ میں بھی شاؤلن ٹیمپل میں موجود ہوں۔" چیکو نے کہا۔

ہمیں چلتے چلتے تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ درختوں کے سائے میں ہونے کے باوجود میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ چیکو اور جانگی کی شرٹس بھی بھیگ کر جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں ہم آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ چیکو پیدل چلنے کی عادی بھی نہیں تھی۔ وہ تھک گئی تھی۔ سامنے بہت دور کسی آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میرا خیال تھا ہم وہاں کچھ دیر کو رک جائیں گے مگر تھوڑا ہی آگے ایک چھوٹی سی ندی دیکھ کر چیکو کے ساتھ جانگی بھی پسر گئی۔

ہم تینوں ندی کنارے پر بیٹھ گئے۔ بالکل صاف و شفاف پانی تھا۔ پہلے پیاس بجھائی اور پھر میں منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

پندرہ بیس منٹ رکنے کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے اور آدھے گھنٹے میں اس بستی تک پہنچ گئے۔ ہم بستی میں رستے چلتے رہے۔ بستی سے نکل کر لانگ ہوئی کی طرف جانے ایک خچر گاڑی پر ہمیں لفٹ مل گئی۔ جس نے ہمیں ... گھنٹے میں لانگ ہوئی پہنچا دیا۔

لانگ ہوئی خاصا بڑا قصبہ تھا۔ اس کی آبادی پچاس ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔ تنگ سی گلیاں، بازار۔ دکانوں کے آگے سامان کے انبار، ہاکروں کے خوانچے اور ٹھیلے۔ لانگ ہوئی بھی دنیا کے کسی بھی چھوٹے شہر یا قصبے سے مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف آبادی کا تھا۔ یہاں آبادی کی اس قدر کثرت تھی کہ راستہ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تم ہمیں کہاں لے جا رہی ہو چیکو؟" میں نے پوچھا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ ہمیں شاؤیانگ جانا ہے اور ہمارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔" چیکو نے جواب دیا۔ "ہمارے پاس اتنی رقم تو ہونی چاہیے کہ ہم شاؤیانگ تک بس کا کرایہ ادا کر سکیں اور میں اسی کا بندوبست کرنے جا رہی ہوں۔"

ایک اور بازار میں گھوم کر چیکو نے ہمیں ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بٹھا دیا۔ میلے کچیلے لباس میں ایک نوعمر ویٹر لڑکے کو ہمارے لیے چائے کا کہہ کر باہر چلی گئی۔

ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا وہاں انتظار کرنا پڑا۔ وہ جب واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا اور نسبتاً دراز قامت..... آدمی بھی تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چند بال ٹھوڑی پر اور چند دائیں بائیں گلوں پر۔ کانوں میں چوڑیوں کے سائز کی چاندی کی بالیاں تھیں۔ بائیں ہاتھ میں چاندی کا کڑا۔ لباس بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کا تعلق تیسری جنس سے ہو۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ چانگ تو ہے۔" چیکو نے اس کا تعارف کرایا "لانگ ہوئی کا ایک معزز اور معتبر بزنس مین اور میرا بڑا اچھا دوست....."

میں نے شیک ہینڈ کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر وہ ہاتھ ملانے کے بجائے ایک مرتبہ میرے سامنے اور دوسری مرتبہ جانگی کے سامنے جھک گیا۔

چیکو کے کہنے پر ہم نے سیٹیں چھوڑ دیں۔ ہمارا چائے کا بل چانگ تو نے ادا کیا اور ہم باہر آ گئے۔ کئی تنگ و گنجان آبادی والے بازاروں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے ہم بالآخر ایک کشادہ سڑک پر آ گئے جہاں ایک طرف چانگ تو کی کار کھڑی تھی۔ اس کار کا اصل رنگ تو نجانے کیا رہا ہوگا

اس وقت اس پر برش سے سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ آگے اور پیچھے والے بمپرز پر لاتعداد ڈینٹ تھے۔ ہم دل ہی دل میں دعائیں مانگتے ہوئے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جبکہ چیکو آگے پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی اور چانگ تو نے اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ کھٹارا نظر آنے کے باوجود کار کا انجن بہترین حالت میں تھا۔ پہلی مرتبہ اسٹارٹر دباتے ہی انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ کار چلنے کے بعد یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اس میں ہارن نہیں تھا بلکہ ڈرائیونگ سائڈ پر باہر کی طرف بھونپو لگا ہوا تھا جسے چانگ تو بار بار بجا رہا تھا۔

پُرہجوم بازاروں سے نکل کر کار نواحی علاقے میں آ گئی اور بالآخر ایک چھوٹے سے کاٹیج نما بنگلے کے سامنے رک گئی۔

تین چار کمروں پر مشتمل یہ کاٹیج اندر سے بہت شاندار تھا۔ ایک عدد ادھیڑ عمر ملازمہ کے سوا یہاں کوئی نہیں تھا۔ چانگ تو نے غالباً اسے پہلے ہی فون پر ہدایات دے دی تھیں اور وہ کچن میں مصروف تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہمیں کھانا مل گیا۔ چین میں چکن، جھینگے اور مچھلی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔ ان کی روزمرہ کی خوراک میں دوسری چیزیں بھی زیادہ تر ایسی تھیں جن کی تاثیر گرم تھی اور چین کی بے حساب آبادی کی اصل وجہ بھی غالباً ان کی یہ خوراک ہی تھی۔

کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد چانگ تو چلا گیا اور ہم تینوں نشست گاہ میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ چیکو مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی کہ چانگ تو اس کا بہت پرانا عاشق ہے جو کئی سال پہلے نائٹ کلبوں میں اس کے پروگرام دیکھنے کے لیے شاؤیانگ آیا کرتا تھا۔

اب تک ہم قدم قدم پر لوگوں کے مکروہ فریب کا شکار ہوتے رہے تھے۔ ہر شخص نے ہمدرد بن کر ہمیں اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی اور ظاہر ہے چانگ تو کے بارے میں بھی اسی قسم کے خدشات جنم لے رہے تھے۔

"ہم شاؤیانگ کب جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"کل صبح۔" چیکو نے جواب دیا "ایک بات کی وضاحت کرتی چلوں کہ یہاں دو شاؤیانگ ہیں۔ ایک تو بہت بڑا شہر ہے جس کی آبادی بیس لاکھ سے بھی اوپر ہے۔ دوسرا شاؤیانگ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کی آبادی چند ہزار سے زیادہ نہیں۔ شاؤلن ٹیمپل اسی چھوٹے قصبے سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر کہنے لگی "شاؤلن شہر یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں جانے کے لیے کسی بھی وقت بس مل سکتی ہے۔ شاؤیانگ قصبہ جنوب کی طرف تقریباً چالیس میل دور ہے۔ وہ راستہ ٹھیک نہیں ہے۔ دونوں شاؤیانگ کے درمیان ساٹھ میل کا فاصلہ ہے۔ اس لیے ہم یہاں سے سیدھے شاؤیانگ قصبے کی طرف جائیں گے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی پھر بولی "میں نے چانگ تو سے کچھ رقم مانگی تھی۔ اس نے یہ رقم صبح دینے کا وعدہ کیا ہے اس لیے ہمیں رات کو یہاں رکنا پڑے گا۔" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

میں نے اور جانگی نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چیکو نے بتایا تھا کہ چانگ تو اس کا پرانا چاہنے والا ہے اور ظاہر ہے کسی حسین عورت کا چاہنے والا مطلب کے بغیر رقم نہیں دے سکتا تھا۔

ہم دن بھر اس بنگلے میں بند رہے۔ بڑی مشکل سے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ منزل سے تھوڑی ہی دور رہ گئے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس موقع پر کوئی گڑبڑ ہو جائے۔

چانگ تو نے کچھ اپنا پروگرام بنا رکھا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چیکو کو تھیٹر لے گیا۔ اخلاقاً اس نے ہم سے بھی پوچھا تھا مگر ہماری طرف سے انکار ہو گیا اور شاید وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ ہم ساتھ جانے سے انکار کر دیں۔

ان دونوں کی واپسی تقریباً ایک بجے کے قریب ہوئی تھی۔ جانگی تو سو گئی تھی لیکن میں جاگ رہا تھا۔ چیکو نے ہمارے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور پھر غائب ہو گئی۔

○☆○

ہم صبح آٹھ بجے ہی روانگی کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ ناشتے کے بعد چانگ تو نے میرے سامنے ہی چیکو کو کچھ کرنسی نوٹ دیے تھے جو اس نے مسکراتے ہوئے شرٹ کے نیچے گریبان میں ٹھونس لیے تھے۔

بس بہت ہی کھٹارا سی تھی۔ مسافر بکریوں کی طرح بھرے ہوئے تھے اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ ایک مسافر کے ساتھ ایک عدد بکری اور ایک عورت کے پاس دو مرغیاں بھی تھیں۔

جانگی اور چیکو ایک سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں، مجھے جو سیٹ ملی اس پر کھڑکی کی طرف ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ سیٹ کا زیادہ حصہ تو اسی نے گھیر رکھا تھا۔ میں تو بس کنارے پر ٹکا ہوا تھا۔

چالیس میل کا فاصلہ چار سو میل سے کم ثابت نہیں ہوا تھا اور یہ فاصلہ ساڑھے تین گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔ ایک تو

سڑک کچی تھی اور پھر چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں تھیں۔ بس ہر بستی میں رک رہی تھی۔ ہر اسٹاپ پر کتنی دیر تک رکی رہتی۔ ایک اسٹاپ پر تو ڈرائیور ہی غائب ہوگیا تھا۔ اسے آدھے گھنٹے بعد بستی کے ایک جھونپڑے سے ڈھونڈ نکالا گیا جہاں وہ ایک بہت موٹی عورت سے عشق لڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ راستے میں دو مرتبہ بس خراب بھی ہوئی تھی۔ تیسری مرتبہ شاؤیانگ سے دو میل دور بس کی کمانی ٹوٹ گئی اور یہ دو میل کا فاصلہ مسافروں کو پیدل طے کرنا پڑا تھا۔

شاؤیانگ زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ اس کی آبادی بھی چھ سات ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ وہی پرانے طرز کے تنگ سے بازار اور گلیاں اور بے تحاشا آبادی۔ یہاں لاتعداد بھکشو بھی نظر آرہے تھے۔ کچھ عجیب وغریب حلیوں کے لوگ بھی دکھائی دیے تھے۔ بعض کے حلیے تو ایسے تھے جنہیں بلا تکلف تھرڈ ریٹ سڑک چھاپ غنڈے قرار دیا جاسکتا تھا۔

ہم اس قصبے میں زیادہ دیر نہیں رکے۔ ہماری اصل منزل یہاں سے چھ سات میل آگے پہاڑیوں میں تھی۔ دو بھکشو بھی اسی طرف جارہے تھے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئے۔ اِکادُکا اور لوگ بھی آتے جاتے دکھائی دیے تھے۔

شاؤلن ٹیمپل تک جانے کے لیے ایک کشادہ سڑک بھی تھی لیکن وہ پہاڑیوں میں چکر کاٹتی ہوئی جاتی تھی جس سے فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں بھکشو ہمیں ایک اور راستے سے لے جارہے تھے۔ پہاڑیوں میں تنگ سی پگڈنڈی تھی اس کے علاوہ اور بھی ایسے بہت سے راستے تھے جن سے پیدل چلنے والوں کے لیے فاصلہ کم ہوجاتا تھا۔

پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے بالآخر ہم دوسری طرف آگئے۔ مجھے سامنے وہ منزل دکھائی دے رہی تھی جس تک پہنچنے کے لیے اتنے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔

سامنے دوسری پہاڑی کے دامن میں وہ تاریخی اور قدیم عبادت گاہ تھی جس نے ایک طرف چین کی سیاست میں نہ صرف اہم کردار ادا کیا تھا بلکہ دوسری طرف یہ عبادت گاہ صدیوں سے مارشل آرٹ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ۱۶۷۴ء میں اس عبادت گاہ سے چنگ کوان نامی ایک راہب نے چی انگ بادشاہت کے شہنشاہ کے خلاف تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اسی چنگ کوان نے اس سے کچھ عرصہ پہلے چی انگ شہنشاہ کے خلاف صوبہ سیلو کی بغاوت کو کچل دیا تھا۔ چنگ کوان شہنشاہ کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ شہنشاہ نے اسے اپنی حکومت میں ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی لیکن چنگ کوان کوئی عہدہ لینے سے معذرت کرکے اپنے ساتھیوں کو لے کر شاؤلن ٹیمپل واپس آگیا۔ جہاں عبادت و ریاضت کے علاوہ باکسنگ کی پریکٹس بھی ہوتی تھی۔

شہنشاہ کے بعض مصاحب اور حکومت کے عہدے دار چنگ کوان کی عزت افزائی سے جلنے لگے تھے۔ انہوں نے شہنشاہ کے کان بھرنا شروع کردیے کہ چنگ کوان شہنشاہ کی کمزوریوں کا اندازہ لگا چکا ہے۔ وہ عبادت کرنے عبادت گاہ واپس نہیں گیا بلکہ جنگ کی تیاری کرنے گیا ہے۔ وہ موقع پاتے ہی حملہ کردے گا اور شہنشاہ کو قتل کرکے حکومت پر قبضہ کرلے گا۔

شہنشاہ نے فوراً ہی چنگ کوان کے قتل کا حکم جاری کردیا۔ ایک فوجی دستے نے شاؤلن عبادت گاہ کو گھیرے میں لے کر آگ لگا دی۔ چنگ کوان کے ایک سو اٹھائیس ساتھیوں میں سے ایک سو دس اس آگ میں جل کر راکھ ہوگئے۔ اٹھارہ راہب عبادت گاہ کے ایک دور افتادہ گوشے میں عبادت وریاضت میں مصروف تھے۔ صرف پانچ راہب زندہ بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ ان میں چنگ کوان بھی تھا۔ وہ پانچوں دشمنوں سے بچتے بچاتے، مصائب جھیلتے ہوئے کئی روز بعد ملحقہ صوبہ شان تنگ کے شہر فوکین پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جہاں چی انگ سلطنت کا تختہ الٹنے کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کردیا گیا۔

وقت کا دھارا بہتا رہا۔ بدلنے والی ہر حکومت کے ساتھ شاؤلن عبادت گاہ پر بھی اِدبار نازل ہوتے رہے لیکن اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صدیوں پہلے بھی شاؤلن ٹیمپل کو مارشل آرٹ کے حوالے سے امتیازی حیثیت حاصل تھی اور آج بھی اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ شاؤلن ٹیمپل کی یاترا دنیا کے ہر مارشل آرٹسٹ کا خواب ہے مگر بہت کم لوگ یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوپاتے ہیں۔ کچھ تو سیاسی مصلحتوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور کچھ یہاں پہنچ جانے کے بعد تربیتی سختیاں برداشت نہیں کرپاتے اور ابتدائی مرحلے میں ہی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں لیکن میں بھاگنے کے ارادے سے نہیں آیا تھا۔

عبادت گاہ ایک بہت بڑی چٹان کے دامن میں تھی۔ چٹان کو کاٹ کر بھی بڑے بڑے ہال اور کمرے بنائے گئے تھے جو اس عبادت گاہ میں شامل تھے۔ اس قسم کے کمرے عام طور پر عبادت اور ریاضت کے لیے مخصوص تھے۔ زمانہ قدیم میں جو بُدھ راہب گیان اور نروان کی تلاش میں یہاں آیا کرتے تھے۔ وہ انہی تاریک کمروں میں بیٹھ کر ریاضت کیا

کرتے تھے لیکن اب یہاں حربی فن کی ریاضت ہوا کرتی تھی۔ عبادت کے لیے آنے والے راہب کونوں کھدروں میں چھپے رہتے تھے۔

عبادت گاہ کے سامنے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا جس کا پاٹ اگرچہ زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن گہرائی بہت زیادہ تھی۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ دریا کے دوسری طرف زیادہ خطرناک اور نکیلی چٹانیں تھیں جن میں لاتعداد غار تھے۔ کچھ غار تو قدرتی تھے اور کچھ انسانی ہاتھوں سے بنائے گئے تھے۔ یہ تمام غار آباد تھے۔ عبادت گاہ کے اطراف کی پہاڑیوں میں بھی چھوٹے بڑے لاتعداد غار تھے جن پر مختلف لوگوں کا قبضہ تھا۔ قرب و جوار میں چند عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ کئی جمنازیم تھے جو مختلف ماسٹرز کے نام سے منسوب تھے۔

یہ ایک چھوٹا سا شہر تھا جہاں مختلف ممالک اور مختلف قومیتوں کے لوگ نظر آرہے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ معقول چہرہ کوئی بھی نہیں تھا۔ سب جنگ جو اور لڑاکا تھے۔ بعض کے حلیے تو اتنے عجیب تھے کہ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کیا یہ بھی اپنے آپ کو انسان ہی سمجھتے ہیں۔

ماسٹر ہنگ پائی کو تلاش کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے کئی لوگوں سے دریافت کیا لیکن کوئی بھی کچھ نہ بتاسکا۔

"ماسٹر ہنگ پائی کون ہے؟" جانکی نے پوچھا "یہ تو مجھے کوئی گمنام سا لگتا ہے۔ کسی ایسے ماسٹر کو تلاش کرو جو کچھ شہرت تو رکھتا ہو۔"

"ماسٹر ہنگ پائی مہاراج کا استاد ہے۔" میں نے جواب دیا "یہ نام مجھے خود مہاراج نے بتایا تھا۔ انہوں نے جو کچھ سیکھا، اسی سے سیکھا اس لیے میں ماسٹر ہنگ پائی کو تلاش کررہا ہوں۔"

"اوہ!" جانکی کے منہ سے نکلا "مہاراج کی عمر ستر کے لگ بھگ ہے بلکہ اب تو زیادہ ہی ہوگی۔ ان کے استاد کی عمر کیا ہوگی۔ وہ زندہ بھی ہے یا اس دنیا سے رخصت ہوچکا ہے۔"

"معلوم ہوجائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

سہ پہر ہوگئی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد سے ہم نے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا اور جانکی حسبِ معمول مجھے بار بار یاد دلا رہی تھی کہ اسے بھوک لگ رہی ہے کوئی ایسی جگہ تلاش کی جائے جہاں کچھ کھایا پیا جاسکے۔ اور بالآخر ہمیں ایک ایسی جگہ مل ہی گئی جہاں پیٹ بھرنے کے علاوہ ہم کچھ دیر آرام بھی کرسکتے تھے۔

ایک بہت بڑے شیڈ کے نیچے میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ جہاں کھانے پینے کی ہر مروجہ چیز دستیاب تھی۔ میز کرسیوں سے ذرا فاصلے پر اس شیڈ کے نیچے پیال قسم کی کوئی چیز بھی بچھی ہوئی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جانکی اور چیکو اس پیال پر لیٹ گئیں۔ میں بھی ان کے قریب آکر بیٹھ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک لڑکی اور دو آدمی اور بھی ہمارے قریب آکر بیٹھ گئے۔ میں نے اس آدمی سے بھی ماسٹر ہنگ پائی کے بارے میں دریافت کیا لیکن اس نے نفی میں سرہلا دیا۔

"میں دو سال سے یہاں ہوں لیکن یہ نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔" اسی شخص نے کہا "اسے تلاش کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہاں جتنے بھی جمنازیم ہیں باری باری سب میں جاکر پوچھتے رہو۔ ہوسکتا ہے اس طرح تمہیں اس کا کوئی پتا چل جائے۔"

یہاں چھوٹے بڑے لاتعداد جمنازیم تھے اور اس طرح کسی کو تلاش کرنا آسان نہیں تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اب مجھے پریشانی ہونے لگی تھی، یا تو میں نام بھول گیا تھا اور یا جانکی کی بات ہی درست ہوسکتی تھی کہ وہ اس دنیا سے رخصت نہ ہوگیا ہو۔

رات کو ہمیں ایک سرائے میں کمرا مل گیا۔ یہ کمرا آٹھ بائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ فرش پر مصنوعی ریشے کا ایک پرانا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ کثرتِ استعمال سے نہ صرف اس کا رنگ اڑ چکا تھا بلکہ جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ اس کمرے کا کرایہ ہم سے ایڈوانس لے لیا گیا تھا۔

اس ادھڑے ہوئے قالین پر ہم دیر تک لیٹے باتیں کرتے رہے۔ چار گھنٹے کا اس کھٹارا سی بس کا اذیت ناک سفر اور پھر دن بھر گھومتے رہنے سے میں بھی تھک گیا تھا۔ چیکو کی تو آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں۔ دس بجے کے قریب جانکی نے دروازہ بند کرکے بولٹ چڑھا دیا اور پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد نیند سے میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

اور پھر دھڑ دھڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ یوں لگا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ چیکو اور جانکی بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواس سی ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ اسی لمحے دروازہ ایک بار پھر زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چیختی ہوئی ایک آواز بھی سنائی دی تھی۔ لگتا تھا جیسے

مزید تاخیر ہوئی تو دروازہ توڑ دیا جائے گا۔

میں نے چیکو اور جانکی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر دروازے کا بولٹ ہٹا دیا۔ دروازے کو باہر سے زور سے دھکا دیا گیا تھا۔ اگر میں پھرتی سے ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو اس کی زد میں آکر میرے چہرے کا نقشہ بگڑ چکا ہوتا۔

دروازہ کھلتے ہی دو آدمی اندر گھس آئے۔ ان میں ایک قدرے دراز قامت تھا۔ گٹھا ہوا جسم اور گنجا سر۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دوسرے کی عمر بیس بائیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ درمیانے قدو قامت کا آدمی تھا۔ بال اس قدر لمبے تھے کہ اس نے گردن پر چٹیا بنا رکھی تھی۔ اس کی دائیں کلائی پر براؤن چمڑے کا بینڈ تھا جس پر ڈرائنگ پن جیسی کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی جینز اور نیلی بنیان پہن رکھی تھی۔ جبکہ دوسرے آدمی نے ٹائٹ پائنچوں والی پینٹ پر بغیر آستین کی ڈینم کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کی زپ سامنے سے کھلی ہوئی تھی۔ اس کا سینہ ریچھ کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں یورپین تھے اور اپنے ان حلیوں سے سڑک چھاپ غنڈے ہی لگتے تھے۔

”ہیلو۔۔۔؟“ گنجے نے باری باری ہم سب کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں ان کے اس طرح کمرے میں گھس آنے پر کچھ کہتا سرائے کا منیجر بھی اندر داخل ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر بھاری بھرکم چینی تھا۔ توند مٹکے کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ تنگ سی پیشانی اور آنکھیں چھوٹی تھیں۔ پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا تھا تو اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ وہ بہت تنگ نظر، کینہ فطرت اور لالچی قسم کا آدمی ہے۔

”یہ دونوں بھی اسی کمرے میں رہیں گے۔“ مٹکے جیسی توند والے چینی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر تم نے ہم سے کمرے کا کرایہ لیا ہے۔ ہم کسی اور کو اس کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔“ میں نے کہا۔

”تم نے پورے کمرے کا نہیں سونے کی جگہ کا کرایہ دیا ہے۔“ چینی نے غرا کر جواب دیا ”تم لوگ اس طرف پڑے رہو یہ لوگ یہاں سو جائیں گے۔“

میں نے چیکو اور جانکی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں الجھن سی تیر رہی تھی۔

”جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔“ جانکی نے اردو میں کہا ”ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ کل ہم کوئی اور ٹھکانا تلاش کرلیں گے۔“

میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ موٹا چینی مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ وہ دونوں یورپین سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر وہ آپس میں باتیں کرتے رہے پھر انہیں شاید ہماری موجودگی کا خیال آگیا۔ گنجا اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے قریب آگیا۔

”تم لوگ بھی شاید ہماری طرح یہاں نئے آئے ہو۔“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر جانکی اور چیکو کو گھورنے لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اسے ٹالنا چاہتا تھا مگر وہ باتوں پر تلا ہوا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی قریب آ گیا تھا۔ وہ باتیں تو مجھ سے کر رہے تھے مگر ان کی نظریں بار بار جانکی اور چیکو کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

”مجھے تو یہ دونوں حرام کے جنے لگتے ہیں۔“ جانکی نے اردو میں کہا ”اس طرح گھور رہے ہیں جیسے نظروں ہی نظروں میں کھا جائیں گے۔“

”اگر انہوں نے کوئی نازیبا حرکت کی تو انہیں زندگی بھر پچھتانا پڑے گا۔“ میں نے بھی اردو میں جواب دیا۔

وہ دونوں بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں بازاری پن اور انداز لوفرانہ تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کر رہے تھے جو خواتین کے سامنے زبان سے نہیں نکالے جاتے۔ ان گندے اور بیہودہ الفاظ کے علاوہ انہوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ البتہ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ گنجا بار بار جانکی کو گھور رہا تھا۔

وہ گنجا جرمن تھا اور دوسرا برطانوی۔ دونوں چار دن پہلے یہاں آئے تھے۔ وہ کنگ فو کی تربیت حاصل کرنا چاہتے تھے مگر انہیں ابھی تک اپنی پسند کا کوئی ماسٹر نہیں ملا تھا اور نہ ہی رہنے کے لیے کسی مستقل ٹھکانے کا بندوبست ہوا تھا۔

ان دونوں کی ملاقات یہاں آنے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دن بھر مختلف جمنازیمز میں پھرتے رہتے۔ اور رات کو اسی طرح کہیں نہ کہیں پڑے رہتے۔ اس وقت بھی وہ ایک جمنازیم سے آئے تھے جہاں باؤٹ ہو رہے تھے۔

اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ جانکی اور چیکو میرے قریب آڑی ترچھی لیٹ گئیں۔ میں بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑا سکا تھا۔ وہ دونوں اٹھ کر اپنی جگہوں پر چلے گئے پھر گنجے نے اٹھ کر بتی بجھا دی اور جب وہ دروازہ... بند کرنے لگا تو میں نے اسے منع کر دیا۔ اندھیرے میں مجھے اس کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔

کھڑکی اور دروازے سے مدھم سی روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ دونوں کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میری نیند غائب ہو گئی تھی۔ ان دو غنڈوں کی موجودگی میں بھلا کیسے سو سکتا تھا۔ ان کی نظروں سے میں نے ان کی نیتوں کو بھی تاڑ لیا تھا اس لیے اب نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مگر نیند پر قابو پانا کسی کے بس کی بات تو نہیں۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے قریب ہی دو افراد آپس میں گتھم گتھا ہو رہے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی دبی دبی سی کوئی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ کھڑکی سے آنے والی مدھم سی روشنی میں وہ منظر میرے لیے بہت ہی خوفناک تھا۔ ان دونوں غنڈوں نے جانکی یا چیکو کو دبوچ رکھا تھا۔ ایک نے اس کا منہ بھی دبا رکھا تھا جس سے اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ میرے بائیں طرف چیکو گہری نیند سو رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ جانکی تھی جسے ان دونوں نے دبوچ رکھا تھا۔ گنجا جانکی کے سینے پر سوار تھا اور دوسرے نے اس کے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر گرفت میں لے رکھے تھے۔

میں نے آہستہ آہستہ اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں، سانس اندر کی طرف کھینچا، دونوں ہتھیلیاں فرش پر ٹکائیں اور کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرا ایک پیر جانکی کے سینے پر سوار گنجے کے سر پر اور دوسرا اس کے کندھے سے ذرا نیچے لگا تھا۔ وہ غلیظ گالی بکتا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ میں بھی پہلو کے بل گرا تھا مگر بڑی پھرتی سے اٹھ گیا۔ ساتھ ہی میں نے پیر گھما دیا۔ میری ٹھوکر لمبے بالوں والے کے پہلو میں لگی اور وہ بلبلاتا ہوا دوسری طرف ڈھیر ہو گیا۔

جانکی ان کے شکنجے سے آزاد ہو گئی تھی۔ اس کی شرٹ اگرچہ پھٹ چکی تھی لیکن وہ برہنگی کی پروا کیے بغیر لمبے بالوں والے پر بل پڑی۔ اس دوران میں چیکو بھی جاگ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ نہ سمجھ سکی اور جب صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوا تو ہر قسم کا خوف ذہن سے نکال کر لمبے بالوں والے پر ٹوٹ پڑی۔ اس نے اس غنڈے کے لمبے بال دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر زور زور سے جھٹکے دینا شروع کر دیے اور جانکی اس کے پیٹ اور سینے پر لاتیں مارنے لگی۔

گنجا بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا گٹر ابل رہا تھا۔ اور پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے نکال کر کراٹے کا مخصوص اسٹانس بنا لیا اور پھر اچانک ہی اس نے میرے منہ پر پنچ مارنے کی کوشش کی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کا وار روک کر دائیں ہاتھ سے اس کی بغل میں زوردار پنچ رسید کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرے دونوں پیروں نے اس کی گردن پر نیک لاک لگا دیا۔ میرا سر اس وقت نیچے کی طرف تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر پیروں کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ اس کا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔

میں نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ گنجا بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے موقع نہیں دیا اور ایک زوردار کک اس کی کھوپڑی پر رسید کر دی۔ وہ بلبلاتا ہوا پھر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ جسمانی لحاظ سے وہ مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ اٹھ کر مارشل آرٹ کا کوئی داؤ استعمال کرنے کے بجائے مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کرے گا اور اگر میں ایک مرتبہ اس کی گرفت میں آگیا تو اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا اور اس اصول پر عمل کر رہا تھا کہ طاقت کم اور ٹیکنیک زیادہ استعمال کرو۔

دوسری طرف چیکو اور جانکی نے لمبے بالوں والے کو سنبھال رکھا تھا۔ کمرے میں بہت مدھم روشنی کے باوجود میں نے اس کے منہ سے خون بہتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور مجھے حیرت تھی کہ وہ کس قدر اطمینان سے دو عورتوں سے پٹ رہا تھا۔ وہ مارشل آرٹس خصوصاً کنگ فو کی اعلیٰ ٹیکنیک سیکھنے کے لیے یہاں آئے تھے اور ظاہر ہے انہوں نے اپنے اپنے شہروں میں بھی کچھ سیکھا ہوگا۔ کم سے کم بلیک بیلٹ تو ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے وہاں ٹریننگ سینٹر کھول رکھے ہوں اور اپنے ناموں کے ساتھ ڈان کی ڈگریوں کا بھی اضافہ کر رکھا ہو لیکن یہاں وہ اس قدر اطمینان سے پٹ رہے تھے جیسے بہت شریف زادے ہوں اور لڑائی بھڑائی سے واقف نہ ہوں۔

گنجے کا ایک داؤ چل گیا۔ اس کی کک میری پسلیوں پر لگی

تھی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ میں تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ گنجے کی دوسری کک میری ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ میں پیچھے گرا۔ گنجے نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی مگر میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی بڑی پھرتی سے اٹھ کر اس کی پشت پر سوار ہو گیا۔ میرا رخ اس کی ٹانگوں کی طرف تھا۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کو گرفت میں لے لیا اور پوری قوت سے پیچھے کی طرف موڑنے لگا۔

یہ فری اسٹائل ریسلنگ کا بوسٹن کریب تھا۔ گنجے کا پیٹ اور سینہ فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ سر کو ذرا سا اوپر اٹھا لیا تھا اور دونوں ہاتھ فرش پر پٹخ رہا تھا اگر وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ میں بھی زیادہ زور نہیں لگا رہا تھا۔ میرا مقصد اسے ختم کرنا نہیں تھا۔

آپ ضرور حیران ہوں گے کہ مارشل آرٹ میں بوسٹن کریب کہاں سے آ گیا۔ تو یہ بتا تا چلوں کہ یہ کوئی مارشل آرٹ کی فائٹ بھی نہیں تھی۔ شروع میں جس طرح گنجے نے اسٹانس بنایا تھا' اس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت بڑا مارشل آرٹسٹ ہے مگر میرے ایک دو ہاتھ کھانے کے بعد ہی وہ غنڈا گردی اور اسٹریٹ فائٹ پر اتر آیا تھا اور مجھے بھی ایسے داؤ پیچ استعمال کرنا پڑے تھے جو مارشل آرٹس کے مسلمہ اصولوں کے خلاف تھے۔

میں نے ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر اس کی ٹانگیں چھوڑ دیں اور اس کی پشت سے اتر گیا۔ وہ کچھ دیر تک فرش پر ہاتھ پٹختا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اس پر حملہ نہیں کیا۔

اور پھر ٹھیک اسی وقت دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں نے بولٹ ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہی موٹا چینی اور تین چار اور آدمی کھڑے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گنجا اب بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے باہر لے جا کر پھینک دیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد جانگی اور چیکو لمبے بالوں والے کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے باہر لے آئیں اور بھوسے کی بوری کی طرح پٹخ کر ہاتھ جھاڑنے لگیں۔

موٹا چینی اور دوسرے لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"یہ.... یہ کیا ہے۔ کیا کیا ہے تم لوگوں نے ان کے ساتھ۔" موٹا چینی ہکلایا۔

"ان سے پوچھو انہوں نے میری دوست کے ساتھ کیا کیا ہے۔" میں نے جانگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ جانگی کی شرٹ بالکل پھٹ چکی تھی۔ اس نے کے سامنے بھی اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش نہیں نے اضافی رقم لے کر ان دونوں کو ہمارے کمرے گزارنے کی اجازت دی تھی لیکن انہوں نے اس کی انہیں تھوڑی بہت سزا تو ملنی ہی چاہیے

اس دوران میں گنجا کسی طرح اٹھ کر لڑکھڑا کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔ لمبے بھی اٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے' بانہوں اور گردن کے نشان تھے اور یہ جانگی اور چیکو کے ناخنوں کا

گنجا چینی ان دونوں پر برس پڑا۔ وہ چینی زبان میں کیا کیا بکتا رہا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر لمبے بالوں باہر کی طرف دھکا بھی دیا تھا۔ ان دونوں نے مڑ کر نظروں سے میری طرف دیکھا اور خطرناک نتائج دیتے ہوئے چلے گئے۔

جانگی اور چیکو کمرے میں آ چکی تھیں۔ میں نے بتی جلائی اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ جانگی کی دونوں کندھوں سے پھٹی تھی اور سامنے اوپن شرٹ کھل گئی تھی۔ اس نے دونوں کنارے پکڑ کر ذرا گرہ لگا لی۔ شرٹ اب کھلے گلے کا مختصر سا بلاؤز بن

ہم دیر تک بیٹھے اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رات کے آخری پہر ہم سو گئے۔

صبح دس بجے کے قریب دروازہ دھڑ دھڑانے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول اس سرائے کا مالک موٹا چینی تھا۔ اس نے بتایا کمرے کا کرایہ پورا ہو چکا ہے اس لیے اب ہمیں یہ رخصت ہو جانا چاہیے۔ اگر ہم اگلی رات بھی یہاں چاہتے ہوں تو کرایہ ایڈوانس ادا کر دیں لیکن دوبارہ آنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے ایک گھنٹے ضروریات سے فارغ ہو کر اس سرائے سے نکل رہے مجھے یقین تھا کہ آج میں ماسٹر ہینگ پائی کو تلاش گا۔ اس کا طریقہ بھی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ پہلے اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ ہو سکتا ہے ماسٹر اپنے پروفیشن سے ریٹائر ہو چکا ہو اور نوجوان نسل بارے میں کچھ نہ جانتی ہو۔ مجھے کسی بوڑھے سے بارے میں پوچھنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہو سکے گا ہینگ پائی اپنے پیشے سے ریٹائر ہوا ہے یا اس دنیا ہی ہو چکا ہے۔

سب سے پہلے ہم نے ایک جگہ پر ڈٹ کر ناشتا ہمیں ایسے بوڑھے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جس سے یہ معلوم کیا جا سکے۔ ایسا بوڑھا ہمیں تقریباً ایک گھنٹے بعد مل گیا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ میری پوری بات خواہ اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو لیکن ماسٹر ہینگ پائی کے نام سے وہ سمجھ گیا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اس نے دریا کے اس پار پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

"منگ شول جمنازیم چلے جاؤ۔ وہاں سے تمہیں پتا چل جائے گا کہ ماسٹر ہینگ پائی سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔"

ہم دریا پر آ گئے۔ دریا پار کرنے کا صرف ایک ہی ذریعہ تھا' رسوں کا پل۔ جس کے نچلے حصے میں لکڑی کے تختے لگے ہوئے تھے۔ جہاں یہ پل بنایا گیا تھا وہاں دریا کا پاٹ ڈیڑھ سو فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ پل دیکھ کر جانگی اور چیکو کی جان نکل گئی تھی لیکن ہمیں بہرحال' دوسری طرف جانے کے لیے اس پل پر سے گزرنا تھا۔

پل ہوا سے ہل رہا تھا۔ جانگی اور چیکو سائڈوں کے رسے پکڑ کر چل رہی تھیں۔ ایک مرتبہ پل ذرا زور سے ہلا تو چیکو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

دریا کے دوسری طرف منگ شول جمنازیم تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ پہاڑیوں میں غاروں کے قریب لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک بہت بڑا جمنازیم تھا جسے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں ایکسرسائز کے لیے کچھ مشینیں تھیں۔ دوسرے حصے میں باکسنگ کا رنگ' اور ایک حصے میں مارشل آرٹس کی فائٹ کے لیے گول دائرے کی صورت میں رنگ بنا ہوا تھا۔ باقی حصے بھی ایسے ہی مختلف کاموں کے لیے مخصوص تھے۔ ہر حصے میں کچھ نہ کچھ لوگ ضرور نظر آئے تھے۔

یہاں ہماری ملاقات ماسٹر لیشی یان سے ہوئی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ دراز قامت' گٹھا ہوا جسم اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ وہ ہمیں اپنے دفتر میں لے گیا جہاں ایک پرانی سی آفس ٹیبل اور اس کے سامنے لکڑی کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر شیشے کی الماریوں میں مارشل آرٹس میں استعمال ہونے والی مختلف چیزیں' ٹرافیاں اور ہتھیار سجے ہوئے تھے۔

ماسٹر لیشی یان پہلے تو یہی سمجھتا رہا کہ ہم اس کی اکیڈمی میں داخلہ لینے کے لیے آئے ہیں۔ اس نے مختلف سوالات کرتے ہوئے مجھ سے کاغذات طلب کیے۔ کاغذات سے مراد پاسپورٹ' چین کی وزارتِ داخلہ کا این او سی اور دیگر دستاویزات تھیں۔ تب میں نے بتایا کہ میں ماسٹر ہینگ پائی سے ملنا چاہتا ہوں تو وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا اور جب میں نے مہاراج کا نام لیا تو وہ اچھل پڑا۔

"تمہاری مراد مہاراج وانگ ونگ یائے سے ہے۔ میرا مطلب ہے تم بنکاک سے آئے ہو؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا "میں اس لیے ماسٹر ہینگ پائی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر میرے ساتھ بیٹھی ہوئی چیکو اور جانگی کی طرف دیکھنے لگا "یہ دونوں بھی تمہارے ساتھ بنکاک سے آئی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جانگی تو میرے ساتھ بنکاک سے آئی ہے اور چیکو کا تعلق چین ہی سے ہے۔" میں نے جواب دیا "ڈانگ کو سے آتے ہوئے ڈاکوؤں نے ہماری وین پر حملہ کر دیا تھا جس میں دو آدمی اور اس کی کزن ماری گئی۔ ڈاکو سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ہم بڑی مشکل سے ان کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو سکے تھے۔ اگر یہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو ہم یہاں تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو پاتے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "چیکو ایک معروف رقاصہ ہے۔ ڈاکو اسے پہچانتے ہیں۔ یہ ان کے خوف سے اپنے گھر جانے کو تیار نہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ڈاکو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اس لیے یہ ہمارے ساتھ آ گئی۔"

ماسٹر لیشی یان اب بھی باری باری گہری نظروں سے ہم تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار جانگی کے پھٹے ہوئے لباس کی طرف اٹھ رہی تھیں پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اگر میں غلط نہیں سمجھ رہا تو گزشتہ رات یوہان کی سرائے میں ان دو یورپین لڑکوں سے تمہارا ہی جھگڑا ہوا تھا۔"

اس مرتبہ چونکنے کی باری میری تھی "تمہیں کیسے پتا چلا ماسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بڑی چھوٹی جگہ ہے۔" ماسٹر لیشی یان نے جواب دیا "یہاں کوئی بات کسی سے چھپی نہیں رہ سکتی۔ یوں سمجھ لو کہ کوئی معمولی سی بات بھی ہو تو اسے پر لگ جاتے ہیں۔"

"غلطی انہی کی تھی ماسٹر۔" میں نے کہا اور اسے تفصیل بتانے لگا "انہوں نے جانگی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ان دونوں کو اپنے بازوؤں پر بڑا ناز تھا مگر شاید آج

کے بعد وہ کوئی ایسی حرکت کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔"

"یہ یورپین بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔" ماسٹر لیشی یان نے کہا "یہ لوگ اپنے شہروں میں بھی بدمعاشیاں کرتے ہیں اور یہاں آکر بھی ایسی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ یہاں کسی نام نہاد اکیڈمی سے سرٹیفکیٹ حاصل کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور اپنے شہروں میں شاؤلن ٹیمپل کا رعب جھاڑتے ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "شاؤلن ٹیمپل پتھروں کی بنی ہوئی عمارت کا نام نہیں۔ یہ تو ایک اکیڈمی ہے۔ مارشل آرٹ کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ لوگ دور دراز سے اس فن کی تربیت حاصل کرنے آتے ہیں۔ برسوں یہاں پڑے رہتے ہیں۔ ماسٹرز کی مار سہتے ہیں۔ دکھ اٹھاتے ہیں تب کہیں فن کے اس سمندر سے ایک قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوپاتے ہیں لیکن یہ یورپین باشندے یہاں آتے ہیں۔ مہینہ دو مہینے رہ کر چلے جاتے ہیں اور اپنے شہروں میں جاکر پہلے سے بڑے بدمعاش بن جاتے ہیں۔ اغوا، ڈکیتیاں، قتل و غارت، منشیات فروشی اور ایسے ہی گھناؤنے کاروبار یا تو یہ خود کرتے ہیں یا ایسے کاروبار میں ملوث لوگوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف دولت کمانا ہوتا ہے۔ کسی بھی طریقے سے۔ یہ فن دولت کمانے کے لیے نہیں ہے۔ نہ ہی بدمعاشی اور غنڈا گردی کے فروغ کے لیے ہے۔ یہ آرٹ تو اخلاقی قدروں کا محافظ ہے۔ برائیوں کے سامنے بند باندھنے کے لیے ہے لیکن یہ جان کر دکھ ہوتا ہے کہ یورپ میں اس فن کو برائیوں کے فروغ کے لیے استعمال کیا جارہا ہے لیکن بہرحال۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "تم لوگ بیٹھو۔ میں ماسٹر ہنگ پائی سے بات کرتا ہوں۔"

وہ دفتر سے نکل کر شیڈ سے باہر چلا گیا۔ ہم اسے دفتر کی کھڑکی سے دیکھتے رہے۔ وہ سامنے والی چٹان پر چڑھ کر ایک غار میں داخل ہوگیا۔ غار کے دہانے پر پتھر اس طرح چنے ہوئے تھے کہ ایک خوب صورت محراب سی بن گئی تھی۔ اس میں لکڑی کے تختوں کا دروازہ بھی لگا ہوا تھا۔ لیشی یان اس دروازے میں غائب ہوگیا۔

ماسٹر لیشی یان کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ ہمیں اس چٹان والی محراب میں لے گیا۔ اندر سے یہ غار بہت بڑا تھا اور مختلف حصوں میں تقسیم تھا۔ ماسٹر لیشی یان ہمیں ایک بہت بڑے کمرے میں لے گیا۔ جہاں ایک چبوترے پر گوتم بدھ کا مجسمہ "فاسٹنگ بدھا" رکھا ہوا تھا۔ پتھر کا یہ مجسمہ بڑی نفاست سے تراشا گیا تھا۔ فاقہ زدہ بدھ کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پسلیاں نمایاں طور پر [illegible] تھیں۔ مجسمے کے سامنے ایک خوب صورت [illegible] سلگ رہا تھا۔ جس کی بھینی بھینی خوشبو پورے [illegible] ہوئی تھی۔

بدھا والے چبوترے کے سامنے ذرا با[illegible] چوکی پر ایک آدمی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ [illegible] بھکشوؤں والی پیلی چادر تھی۔ کمر بالکل سیدھی اور [illegible] کے چھلکے کی طرح صاف تھا جو ٹیوب لائٹ کی [illegible] چمک رہا تھا۔ میرا خیال تھا وہ کوئی جوان آدمی [illegible] طرح بالکل سیدھا بیٹھا ہوا ہے۔ ماسٹر لیشی نے [illegible] سرگوشی میں کچھ کہا اور جب پتھر کی چوکی پر بیٹھا [illegible] ہماری طرف گھوما تو میں اچھل پڑا۔ اس کے چہرے [illegible] کا جالا سا بنا ہوا تھا اگر میں کوشش بھی کرتا تو [illegible] گن سکتا تھا۔

وہ ماسٹر ہنگ پائی تھا۔

میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر [illegible] کے درمیان ہوگی مگر وہ جس طرح سیدھا بیٹھا ہوا [illegible] مجھے شدید حیرت ہورہی تھی۔ سامنے سے اس کا [illegible] تھا اور گوتم بدھ کی طرح اس کی پسلیاں بھی نمایاں [illegible] آرہی تھیں۔

میں نے فوراً ہی اسے بو کیا تھا۔ ماسٹر لیشی یان [illegible] کے سامنے دونوں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا۔ [illegible] پائی نے سیدھا ہاتھ آشیرباد دینے والے انداز میں [illegible] لیشی یان نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کے [illegible] بوڑھے کے سامنے دو زانو... ہو کر بیٹھ گیا۔ جانگی [illegible] ہمارے پیچھے دو قدم کے فاصلے پر بیٹھ گئی تھیں۔

ماسٹر ہنگ پائی کی آنکھیں میرے چہرے پر [illegible] عجیب سی مقناطیسی کشش تھی ان نظروں میں [illegible] کے باوجود اپنی نظریں نہیں ہٹا سکا۔ میرے پور[illegible] چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور ریڑھ کی ہڈی میں [illegible] ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ مجھے کئی سال پہلے کا وہ [illegible] جب بنکاک میں ماسٹر ہوچن عبادت گاہ کے تہ خا[illegible] ایک ایسے ہی پُراسرار بوڑھے کے سامنے لے [illegible] وقت بھی میری کچھ ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں [illegible] تھے۔ ایک لمحے کو ماسٹر ہنگ پائی کی آنکھوں میں [illegible] مہری نظر آئی۔ میں جھرجھری لے کر رہ گیا مگر میری [illegible] کے چہرے سے نہیں ہٹیں۔ ماسٹر کی آنکھوں میں [illegible]

[illegible] کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ [illegible] تی اور پھر اس نے ایک بار پھر آشیرباد دینے والے انداز میں ہاتھ اٹھا دیا۔

"کہاں رہ گئے تھے۔ تمہیں تو ڈھائی مہینے پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔" ماسٹر ہنگ پائی نے کہا۔

بڑی جاندار آواز تھی اگر وہ پردے کے پیچھے بیٹھا بول رہا ہوتا تو یہ یقین کرنا مشکل ہوتا کہ یہ کسی اسی نوے سالہ بوڑھے کی آواز تھی لیکن اس کی بات سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں یہاں آرہا ہوں۔ میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر اسے راستے میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتانے لگا اور پھر یہ بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اسے میرے بارے میں کیسے پتا چلا۔

"جب تم تھائی لینڈ سے نکلے تھے تو وانگ ونگ یائے نے مجھے ٹیلی فون پر تمہارے بارے میں بتادیا تھا۔" ماسٹر ہنگ پائی نے کہا "مجھے بہت دنوں سے تمہارا انتظار تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے جس کے لیے وانگ ونگ یائے جیسا شخص اتنا بے تاب ہورہا ہے۔ اس کا انتخاب غلط نہیں۔ گزشتہ رات یوہان کی سرائے میں جو کچھ بھی ہوا اس کا بھی مجھے علم ہوچکا ہے۔ وہ دونوں یورپین چند روز پہلے یہاں آئے تھے اور غنڈا گردی کرتے پھر رہے تھے۔ تم نے جس طرح ان کا حلیہ بگاڑا ہے وہ اسی کے مستحق تھے۔"

"میری فائٹ صرف ایک کے ساتھ ہوئی تھی۔ دوسرے کو تو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کا حلیہ تو ان دونوں نے بگاڑا تھا۔" میں نے پیچھے بیٹھی ہوئی جانگی اور چیکو کی طرف اشارہ کیا۔

"وانگ ونگ یائے نے تمہیں سونا بنا دیا ہے۔ یہاں تپیا کی بھٹی سے تم کندن بن کر نکلو گے۔" ماسٹر ہنگ پائی نے کہا۔

اور اس کے بعد مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں اور پھر مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ ماسٹر ہنگ پائی کے بارے میں یہاں کے لوگ کیوں نہیں جانتے تھے۔ ہنگ پائی اس کا اصل نام تھا۔ جسے مہاراج اور اس کی عمر کے لوگ ہی جانتے تھے جبکہ یہاں وہ منگ شول کے نام سے جانا پہچانا جاتا تھا اور ہم ہنگ پائی کے نام سے پوچھتے رہے تھے اور بالآخر ہمیں ایک بوڑھے ہی نے اس کا پتا بتایا تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھے تھے۔ ماسٹر ہنگ پائی دیر تک لیشی یان کو ہمارے بارے میں ہدایات دیتا رہا اور پھر ہم اس کے ساتھ اس غار سے باہر آگئے۔

ماسٹر لیشی یان ہمیں ایک اور غار میں لے آیا۔ یہ غار زیادہ بڑا نہیں تھا اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں دو آدمی پہلے ہی سے رہ رہے تھے۔

"یہاں دو جاپانی شاگرد رہ رہے ہیں۔" ماسٹر لیشی یان نے کہا "انہیں دوسری جگہ شفٹ کردیا جائے گا۔ میرا خیال ہے یہ کمرا تم تینوں کے لیے کافی ہوگا۔"

"ہمیں صرف سونے کی جگہ چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ دن ہماری آزادی کا تھا۔ ماسٹر لیشی یان نے ہمیں اجازت دے دی کہ اگر ہم چاہیں تو آج کا دن گھوم پھر کر اس شہر سے واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔ اس نے فاکو کا کوچی نام کے ایک طالب علم کو ہمارا گائیڈ مقرر کردیا۔ کوچی کو دیکھ کر مجھے گانگ یاد آگیا۔ کوچی کی عمر تئیس چوبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ درمیانہ قد، چھریرا بدن، لمبے بال جنہیں وہ گردن پر چُٹیا کی طرح باندھ لیا کرتا تھا۔ وہ دو سال سے یہاں تھا۔ وہ جاپان کے ساحلی شہر کوبے کا رہنے والا تھا۔ جہاں کچھ عرصہ اس نے ایک سال تک کیوکشن کی تربیت حاصل کی لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھا پھر تائی کونڈو کیمپ میں چلا گیا۔ وہاں بھی مطمئن نہیں ہوا تو شاؤلن ٹیمپل آگیا جہاں ابتدا سے کنگ فو کی تربیت کا آغاز کیا۔ دو سال میں وہ بہت کچھ سیکھ چکا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ ابھی وہ ابتدائی مدارج میں ہے اور آگے چل کر اسے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

کوچی کی رہائش اسی غار میں تھی جو اب ہمیں دیا جانے والا تھا۔ اس کا سامان وہیں رکھا ہوا تھا۔ اس نے چیکو اور جانگی کو بھی دیکھا۔ عورتوں کا نیم عریاں لباس اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن جانگی کو دیکھ کر نجانے کیوں اس کی نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس نے پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر رکھے ہوئے اپنے سوٹ کیس میں سے ہلکے نیلے رنگ کی ایک ٹی شرٹ نکال کر جانگی کی طرف بڑھادی اور ایک طرف اشارہ کردیا۔ ایک طرف کمبل تان کر غار کا ایک چھوٹا سا حصہ الگ کردیا گیا تھا۔ جانگی نے مسکرا کر کوچی کی طرف دیکھا اور کمبل کے پچھلی طرف چلی گئی اور دو تین منٹ بعد شرٹ تبدیل کرکے باہر آگئی۔

چیکو ہمارے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی۔ وہ آرام کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر رات والے یورپین غنڈوں سے آمنا سامنا ہوگیا تو جھگڑا ہوگا۔ ہم نے بھی ساتھ چلنے کے لیے اس پر زور نہیں دیا۔

دریا پار کرکے ہم شہر میں آگئے۔ یہ واقعی ایک چھوٹا سا

شہر ہی تھا۔ کوچی ہمیں سب سے پہلے شاؤلن ٹیمپل لے گیا۔ بہت بڑی عبادت گاہ تھی۔ مرکزی ہال میں ایک بڑے چبوترے پر گوتم بُدھ کا بہت بڑا سنگی مجسمہ استادہ تھا۔

یہ عبادت گاہ کئی حصوں میں منقسم تھی۔ ایک دور افتادہ حصہ عبادت و ریاضت کے لیے مخصوص تھا۔ زمانۂ قدیم میں بُدھ کے پیروکار نروان کی تلاش میں دنیا کو تج کر یہاں آتے ہوں گے۔ اس زمانے میں یہ جگہ آبادی سے دور دراز اور الگ تھلگ سمجھی جاتی تھی۔ عبادت و ریاضت میں کسی مداخلت کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ راہب پوری یکسوئی سے ریاضت میں مصروف رہتے ہوں گے لیکن اب وہ صورتِ حال نہیں رہی تھی۔ اب تو یہ بڑی پُرہنگام جگہ تھی۔ عبادت گاہ کا کنٹرول بہرحال اب بھی بھکشوؤں کے پاس تھا۔

ہم تقریباً دو گھنٹے... تک عبادت گاہ کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے۔ ایک بھکشو بھی ہمارے ساتھ تھا جو کوچی کو جانتا تھا۔ وہ ہمیں عبادت گاہ کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔

عبادت گاہ سے نکل کر کوچی ہمیں مختلف جمنازیم میں گھماتا رہا۔ ہر جمنازیم میں رونق تھی۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ یہاں مارشل آرٹ کی تربیت حاصل کرنے والوں میں نوے فی صد تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ کوچی بتا رہا تھا کہ بعض لوگ تو دو تین مہینے رہ کر ہی واپس چلے جاتے تھے۔ ایسے لوگ کسی نام نہاد ماسٹر کو رقم دے کر سند حاصل کر لیتے تھے۔ جسے وہ اپنے شہروں میں جا کر استعمال کرتے تھے اور بعض لوگ کئی کئی سال تک یہاں تربیت حاصل کرتے تھے۔

"بدھ کی شام یہاں بڑی رونق ہوتی ہے۔" کوچی بتا رہا تھا "بدھ کی شام چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک ہر جمنازیم میں باؤٹ ہوتے ہیں جن میں زیر تربیت مارشل آرٹسٹوں کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مہینے میں ایک بار مرکزی جمنازیم میں چیلنج مقابلے ہوتے ہیں جو بڑے دلچسپ اور سنسنی خیز ہوتے ہیں۔ ان مقابلوں کے دوران میں بعض اوقات ناخوشگوار واقعات بھی پیش آتے ہیں اور ماسٹرز کو مداخلت کرنی پڑتی ہے۔"

ہم مختلف جمنازیمز میں گھومتے رہے۔ ایک جمنازیم سے باہر نکلتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے وہی لمبے بالوں والا نوجوان آ رہا تھا جو گزشتہ رات جانکی اور چیکو کے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔ جانکی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

لمبے بالوں والا وہ غنڈا جمنازیم میں جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس کے ہونٹ سوجے ہوئے تھے اور دائیں رخسار پر بھی نیلا سا دھبا نظر آ رہا تھا۔ رات کو میں اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ جانکی اور چیکو نے اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ وہ ہمارے سامنے رک کر خوں خوار نظروں سے باری باری مجھے اور جانکی کو گھورنے لگا۔ ایک سرسری نگاہ اس نے کوچی پر بھی ڈالی تھی۔

"ہیلو۔" جانکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر اشتعال دلانے والی مسکراہٹ تھی۔

اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ چند لمحے جانکی کو گھورتا رہا پھر میری طرف رخ کر کے ایک انگلی اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کل کی رات میں بھولا نہیں ہوں۔ ٹروڈر بھی ابھی اپنی چوٹیں سہلا رہا ہے لیکن وہ ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بھی کل رات کے واقعے کو ذہن میں رکھنا۔"

"ٹروڈر۔ اوہ۔" میں نے کہا "شاید تم اس گنجے کی بات کر رہے ہو۔ میں اسے بالکل نہیں بھولا لیکن تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہم تم لوگوں کو یہاں سے بھاگنے نہیں دیں گے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہم بھاگنے کے لیے یہاں نہیں آئے۔ تمہارا یہ ہونٹ ٹھیک ہو جائے تو ملاقات کرنا۔" میں نے کہا۔

"اور میں دعا کروں گی کہ اس وقت تک تمہارا کسی اور لڑکی سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔" جانکی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

وہ پیر پٹختا ہوا جمنازیم میں داخل ہو گیا۔

"یہ شاید ان دونوں میں سے ایک ہے جن کی گزشتہ رات تم نے پٹائی کی تھی۔" کوچی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے تو میں نے چھوا بھی نہیں تھا۔ اس کا حلیہ تو جانکی اور چیکو نے بگاڑا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کوچی ہمیں ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ہمیں پھر گھماتا رہا اور مختلف جمنازیم اور ماسٹرز کے بارے میں بتاتا رہا۔

شام سے ذرا پہلے ہم واپس آ گئے۔ اس مرتبہ رسّی کے پُل سے گزرتے ہوئے جانکی کو ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔

کوچی اور اس کے ساتھی کا سامان اس غار سے ہٹا دیا گیا تھا اور ہم تینوں کے لیے لکڑی کے تخت بچھا دیے گئے تھے۔ رات کو ماسٹر لیشی یان نے بتایا کہ صبح پانچ بجے ہمیں بیدار...

جائے گا۔

ان پہاڑیوں میں لاتعداد غار تھے جہاں مختلف ماسٹرز نے اپنے ٹھکانے اور جمنازیم بنا رکھے تھے۔ یہاں نہ صرف بجلی بلکہ ٹیلی فون کا نظام بھی موجود تھا۔ دن بھر آوارہ گردی کرتے ہوئے ہم تھک گئے تھے اس لیے رات کو جلدی سوگئے۔

اور پھر صبح ٹھیک پانچ بجے ماسٹر کیشی یان نے ہمیں جگا دیا۔ جانگی، چیکو کو جگانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ اٹھ کر نہیں دی۔ میں اور جانگی غار سے نکل کر ماسٹر کیشی یان کے ساتھ چل پڑے۔

ان غاروں کو دیکھ کر مجھے بچپن میں اسپین کے بارے میں دیکھی ہوئی ایک ڈاکومنٹری فلم یاد آگئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ شہروں میں تمام تر سہولتیں ہونے کے باوجود اسپین کے باشندے پہاڑی غاروں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ ان غاروں میں بھی انہیں تمام تر شہری سہولتیں حاصل تھیں۔ یہی صورتِ حال یہاں بھی تھی۔ ان پہاڑیوں کے غاروں میں بھی ایک پورا شہر آباد تھا۔

کیشی یان ایک پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ تنگ سی پگڈنڈی تھی۔ ابھی فضا میں اندھیارا سا تھا۔ راستہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ جانگی میرے آگے تھی۔ اسے ایک دو مرتبہ ٹھوکریں بھی لگی تھیں اور اسے میں نے گرنے سے سنبھالا تھا۔

یہ پہاڑی پانچ چھ سو فٹ بلند تھی۔ اوپر ایک ہموار سا میدان تھا اور ماسٹر ہنگ پائی ایک پتھر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم نے اسے بو کیا اور اس کا اشارہ پاکر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ پتھریلی زمین پر اس طرح دو زانو ہو کر بیٹھنا خاصا تکلیف دہ تھا لیکن ظاہر ہے ہم اپنی مرضی سے کسی اور طرح نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

"مجھے یقین ہے وانگ ونگ یائے نے تمہیں بہت کچھ سکھایا ہوگا۔ وہ کسی ایسے شخص کو یہاں میرے پاس نہیں بھیج سکتا جس کا دل خالی اور سینہ کھوکھلا ہو۔" ماسٹر ہنگ پائی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج میں تمہیں کچھ ابتدائی باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ جن سے تمہیں یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ مارشل آرٹ صرف لڑائی بھڑائی کا نام نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "مارشل آرٹسٹ جن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے وہ پانچ بنیادی اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں۔ خواہش، ارادہ، ایثار، عمل اور ڈسپلن۔

"اپنی ذات اور دنیا کے لیے یہ ایک خواہش ہے کہ ہم اسے بہتر دیکھنا چاہتے ہیں۔ زندگی ہم سے تقاضا کرتی ہے اس چیلنج سے عہدہ برا ہوں۔

"بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ "ذاتی دفاع" کا صرف جسمانی اور مدافعت کے عمل تک محدود ہے اپنے جسم کی حفاظت کیسے کی جائے اور اپنا دفاع کیسے کر ہے۔ یہ درست ہے کہ جسم آدمی کی شناخت اور پہچان ہے اور وہ جسم جس کی روح مرچکی ہو، اسے ہم نباتات درجہ تو دے سکتے ہیں آدمی نہیں کہہ سکتے۔ مارشل آرٹ طالب علم ابتدا ہی میں اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ دفاع کرتے ہوئے وہ دراصل روح کا دفاع کررہا ہوتا ہے جسم کو بہرحال نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

"جہاں تک ذاتی تحفظ کا تعلق ہے تو اس کا مفہوم کے لیے طالب علم کو اپنا گہرا اور مسلسل مشاہدہ کرنا چاہیے اور اپنی فطرت کا گہرا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ کتابوں، لیکچر اور خارجی ہدایات سے ایک طرح کی امداد اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے مگر ذات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے دل اور روح کو ٹٹولنا پڑتا ہے۔" ماسٹر ہنگ پائی خاموش ہو

میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دن کا پھیلنے لگا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سکون اور خامو تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ماسٹر ہنگ پائی دوبارہ لگا تو اس کی آواز روح کی گہرائیوں میں اترتی ہوئی محسو ہورہی تھی۔

"مارشل آرٹسٹ کو معلوم ہے کہ ذات کا سراغ آسان نہیں ہوتا۔" وہ کہہ رہا تھا "اور یہ کام ایک دن نہیں ہوجاتا۔ آدمی جب تک زندہ رہتا ہے، اسے تفکر و تد غور و خوض جیسے عمل سے مسلسل گزرنا پڑتا ہے۔ درحقیقت ذات کا یہ سفر اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک قائم رہتی ہے۔ اس کے لیے مشاہدہ، امتحان، یکسا ارتکاز ضروری ہوتا ہے۔ "ذات" کے اس سفر کے دو میں ایک مارشل آرٹسٹ پر جو کچھ منکشف ہوتا ہے اوقات حیران کن بھی ہوتا ہے اور وہ خوف زدہ کر بھی لیکن بہرحال اس کا انعام بھی ملتا ہے۔ بشرطیکہ اختیار کرنے کی جرأت کرلی جائے۔

"مارشل آرٹ کے طالب علم کے لیے بنیادی بات ہے کہ وہ ذات کو پہچانے، اس کا علم بہت سے سربستہ راز کو کھولتا ہے اور زندگی کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

"یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر مارشل آرٹ کا طالب علم روحانی پہلو کو اس قدر اہمیت دیتا ہے

روح کی بالیدگی کے لیے اتنے کڑے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے اور اتنی کٹھنائیوں اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو پھر اس کے جسمانی پہلو کو نظرانداز کیوں نہیں کردیا جاتا۔ جسم کا کیا کام ہے؟ وہ کہاں کام آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جسم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ جسم کے بغیر روح اپنے عمل کی قوتیں کھودیتی ہے۔ یہ روح کا ساتھی ہے اور روح اس کے ذریعے حکومت کرتی ہے۔ اس لیے جسم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم جسم کو واسطہ بنا کر معاشرے میں دوسروں سے رابطہ کرتے ہیں اور میل ملاپ بڑھاتے ہیں۔

"جہاں تک ذات کا تعلق ہے تو وہ منفرد اور تنہا ہوتی ہے۔ اس میں معاشرت پسندی ہوتی ہے۔ وہ تنظیم کا خیال رکھتی ہے۔ اس لیے ہر فرد کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ معاشرے میں اپنا مثبت کردار ادا کرے۔ خواہ انفرادی سطح پر ناکام ہی کیوں نہ ہو۔

"تاؤازم TACISM کا بانی (LAOTZE) لاؤزے کہتا ہے "سکون اور امن پسندی سے زندگی بسر کرو۔ نہ فطرت سے الجھو، نہ آپس میں لڑو۔ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو اپنی ذات سے نقصان نہ پہنچاؤ۔ اگر تم نے یہ صفات اپنی ذات میں پیدا کرلیں تو پھر دنیا کا کوئی شخص تم سے نہیں لڑے گا۔ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بدلے مہربانی کرو۔ جو لوگ تمہارے ساتھ اچھے ہوں ان کے ساتھ اچھے رہو اور جو تمہارے ساتھ دشمنی کریں ان کے ساتھ بھی اچھائی کرو۔ مخلص شخص کے ساتھ مخلص رہو اور جو تمہارے ساتھ مخلص نہ ہو، اس کے ساتھ بھی اخلاص برتو۔ نرم ترین شے، سخت ترین شے سے ٹکرانے کی طاقت رکھتی ہے۔ دنیا میں سب سے کمزور اور نرم چیز پانی ہے لیکن کسی سخت سے سخت اور مضبوط سے مضبوط چیز کے ساتھ ٹکر لینے والی اس سے زیادہ طاقت ور چیز کوئی اور نہیں ہوسکتی۔"

"مارشل آرٹ کا ماہر بھی کچھ ایسی ہی خاموش قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ کسی مہم جو اور مارشل آرٹ کے ماہر، دونوں میں یہ باطنی قوت یکساں طور پر موجود ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ پر بھروسا کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی اصلاح بھی خود ہی کرتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو۔ یہ باطنی قوت تمہیں دنیا کے ہر بڑے آدمی میں دکھائی دے گی۔ مثال کے طور پر سقراط کو لے لو۔ اسے معلوم تھا کہ اسے زہر پلایا جارہا ہے مگر اس نے یہ پیالہ بلا تذبذب پی لیا کیونکہ اس کا یہی عمل اس کی عمر بھر کی تعلیمات کو زندہ رکھنے والا تھا۔ ملٹن نے بینائی کھودی تھی لیکن اس معذوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے اپنی مشہور فلم "فردوسِ گم گشتہ" تخلیق کی تھی۔ بیتھوون (BEETHOVEN) بہرا ہوگیا تھا لیکن پھر بھی اس نے موسیقی کی دنیا کو نئے سُروں سے آشنا کردیا۔ نواں راگ اس کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔"

ماسٹر ہنگ پائی ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ دن کی روشنی کچھ اور نکھر آئی تھی۔ میں نے نہ تو جھکا ہوا سر اٹھایا اور نہ ہی اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ میرے دائیں بائیں جانگی اور ماسٹر کیشی یان بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے جسم بھی ساکت تھے اور سانسیں جیسے تھم گئی تھیں۔ ماسٹر ہنگ پائی کہہ رہا تھا۔

"بلاشبہ یہ وہ لوگ تھے جن کا جذبہ عظیم تھا اور جنہوں نے اپنی روح کی امنگ کو جسم کے تقاضوں کے ہم آہنگ کرکے فن پارے تخلیق کیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی خیال کیا کہ معاشرتی طور پر ان کی ذمے داریاں کیا ہیں اور انہیں یہ ذمے داریاں کس طرح سنبھالنی ہیں۔ دشواریوں اور مصیبتوں کے باوجود انہوں نے خندہ پیشانی سے اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ وہ روحانی طور پر مضبوط اور طاقت ور تھے۔

"مارشل آرٹسٹ بھی انہی معنوں میں روح اور جسم کی عظمت اور معاشرے کی مدافعت کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں۔ مارشل آرٹسٹ کسی "ذات" کے جسم کی روح کا دفاع کرتا ہے جو کہ معاشرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ مہم بازوں کی طرح کسی مارشل آرٹسٹ کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اپنے حریفوں سے بہتر طور پر ساز و سامان سے آراستہ ہو بلکہ سارا زور اس پر ہوتا ہے کہ کس کے اندر کتنی سکت ہے۔ کتنی روح ہے کہ اپنی ذات کی چمک دمک کو نمایاں کرسکے۔ انفرادی مہارت کا تمام تر دارومدار ان سوالوں کے جوابات میں پنہاں ہوتا ہے جو مسلسل سامنے رہتے ہیں۔ یعنی میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کیوں ہوں اور کہاں جارہا ہوں؟

"مارشل آرٹ سے مرتبے اور حیثیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا مگر آدمی کے خیالات بلند ہوجاتے ہیں اور اس کی جرأت اور حوصلے میں اضافہ ہوتا ہے۔

"ایک اچھا مارشل آرٹسٹ اپنی ان ہی خصوصیات میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ جبکہ طالب علم اپنے ماسٹر جیسا بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح دونوں ترقی کی منازل طے کرتے رہتے ہیں۔ جس سے ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

"ضروری نہیں کہ ایک کامیاب مارشل آرٹسٹ اپنے سے کم تر ساتھی کے مقابلے میں جسمانی اور ذہنی طور پر زیادہ

طاقت در ہو۔ درحقیقت کامیابی اور ناکامی کا انحصار ذات کے نظریے پر ہے یعنی یہ کہ اپنی ذات کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ میں کون ہوں؟ کیوں ہوں اور کس سمت میں جا رہا ہوں؟ جیسے سوالات کے متعلق جب وہ درست نظریہ اور جوابات رکھتا ہے تو ایک ماسٹر کی حیثیت سے اس کا رتبہ بلند ہوتا رہتا ہے لیکن اگر ان سوالات کے متعلق اس کے ذہن میں کوئی واضح نظریہ نہیں ہوتا یا اس کے جوابات بُزدلانہ نوعیت کے ہوتے ہیں تو اس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا ہے۔ جبکہ واضح نظریے کا حامل ماسٹر کامیابی کی سیڑھیاں طے کرتا چلا جاتا ہے۔

"زندگی کے دوسرے شعبوں میں آزمودہ کار اور پختہ لوگ نو آموز اور مبتدی لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ ذرا آہستہ کام کریں تیزی نہ دکھائیں۔ جبکہ ایک تجربہ کار مارشل آرٹسٹ اپنے شاگردوں کا حوصلہ بڑھاتا رہتا ہے۔ کسی بھی مرحلے پر ان کا جوش و خروش سرد نہیں پڑنے دیتا۔

"مارشل آرٹس کی پریکٹس زیادہ مشکل نہیں۔ اس کے سیکھنے والوں کو پابند رہنا پڑتا ہے اس لیے حد بندی بھی کرنی پڑتی ہے۔ جب وہ اس مرحلے سے مسلسل گزرتا رہتا ہے تو اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔"

ماسٹر ہنگ پائی ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس مرتبہ میں نے جھکا ہوا سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اب بھی بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کمر میں ذرا بھی خم نہیں تھا۔ اس کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ اس کی نظریں افق پر تیرتے ہوئے بادل کے ایک ٹکڑے پر مرکوز تھیں۔

"فطرت ہمیشہ سے ایک اچھی استاد رہی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "سمندر کی موجیں چٹانوں سے سر ٹکراتی اور جھاگ اڑاتی ہیں۔ سورج نہایت آب و تاب سے نکلتا اور پھر ڈوب جاتا ہے۔ موسم پابندی سے مقررہ وقت پر اپنا مزاج تبدیل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ موت اور زندگی کا ایک مسلسل چکر چلتا رہتا ہے۔ یہ سب کے سب کائنات کے مظاہرے ہی نہیں بلکہ فطرت کی قوت اور نمو کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

"زندگی کے دوسرے شعبوں میں نئی نئی ٹیکنیک کا زیادہ استعمال پسندیدہ عمل نہیں ہوتا مگر مارشل آرٹس کی دنیا میں ایسا نہیں۔ یہاں اس ہُنر کا ماہر ہمہ وقت کوشاں رہتا ہے کہ پرانے داؤ پیچوں کو نئی سمت اور نیا رخ دے سکے۔

"مارشل آرٹ کی پریکٹس آدمی سے مکمل کمٹ منٹ کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس میں مادی نشوونما بھی پنہاں ہے اور روحانی ترقی بھی۔ اس کے سامنے تھیوری اور ایکشن دونوں ہی رہتے ہیں اور یہ کام ایک پوری عمر کا متقاضی ہوتا ہے۔ مارشل آرٹس میں آدمی کی باطنی اور ظاہری دونوں نظر... سامنے رکھا جاتا ہے۔ فطرت سے "روح" کشید کی جا... اور اس سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ مارشل آرٹ فطرت کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔ الجھتا نہیں۔ فطری جوہر اور... صلاحیتوں پر ہی اس کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ قانونِ قدرت ہے کہ صرف موزوں ترین ہی زندہ رہتا ہے۔

"مارشل آرٹسٹ کسی ایک مقام پر مستقل نہیں رہتا۔ وہ اپنی مہارت کو بڑھانے کے لیے ہر لمحہ متحرک... مشغول رہتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں حریف بھی ہوتا ہے اور دوست بھی۔ وہ ذاتی نشوونما کے لیے کسی بھی قسم کی... سے دریغ نہیں کرتا۔

"جیت طاقت کا مظاہرہ نہیں ہوتی۔ یہ دراصل کامیابی کا نام ہے جو آدمی اپنے مشن کی تکمیل کی شکل میں... ہے۔ جیت حقیقتاً ایک تعمیری چیز ہے تخریبی نہیں۔ مارشل آرٹ کا ماہر وہی کچھ کرتا ہے جو عین فطرت کے مطابق ہے۔ مثلاً فطرت میں تغیر کا عنصر موجود ہے۔ مارشل آرٹ کا... کبھی جامد نہیں رہتا۔ وہ نہ تو باغی ہوتا ہے اور نہ لکیر کا فقیر۔ اس میں فکر کا مادہ تو ہوتا ہے لیکن خوف نہیں ہوتا۔ اختلاف تو کرتا ہے لیکن کسی کے ساتھ جھگڑا نہیں کرتا۔

"کسی آدمی میں صبر و تحمل، غور و فکر، استغراق و... جیسی خصوصیات فوراً اور اچانک نہیں ابھرتیں۔ مارشل آرٹ کا طالب علم انہیں پوری تندہی اور سرگرمی سے حاصل کرتا ہے۔ یہ ایک مشکل عمل ہوتا ہے اور اس لیے وہ قربانیاں دیتا ہے۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مارشل آرٹ کسی... نام ہے؟ اس کا جواب ہے 'نہیں'۔ درحقیقت یہ ہُنر جسم... روح کے اشتراک کا نام ہے۔ یہ اس لطیف توازن کا نام ہے جو خیال و عمل سے بنتا ہے۔ جب ایک ماہر جنگجو لڑتا ہے... بیٹھ کر سوچتا نہیں۔ وہ جنگ کے دوران میں خیال و عمل ہوتا... کیونکہ جسمانی مقابلے میں خیال کو عمل میں ڈالنے کا موقع... ہوتا ہے۔

"مارشل آرٹ کی فلاسفی کو عمل کی شکل میں دیکھا جائے تو پتا چلے گا کہ یہاں جسم کی تربیت ضروری ہوتی ہے... اگر جسم تربیت یافتہ نہ ہو تو دماغ کو عمل کے لیے اچھے... نہیں مل سکتے۔ اس لیے مارشل آرٹس میں جسم اور خیال... یکساں اہمیت دی جاتی ہے۔" ماسٹر ہنگ پائی ایک بار... خاموش ہوگیا۔

میں نے کن انکھیوں سے جانگی کی طرف دیکھا۔ مجھے یوگا کی پریکٹس تھی۔ میں اس پوزیشن میں بھی گھنٹوں بیٹھا رہ سکتا تھا مگر جانگی اس کی عادی نہیں تھی۔ وہ کچھ بے چینی سی محسوس کررہی تھی۔

"اب تک جو بحث ہوئی ہے، اس سے یہ بھی علم ہوجائے گا کہ آج کل عدم تحفظ کا احساس اس قدر بڑھ کیوں گیا ہے؟" ماسٹر ہنگ پائی کہہ رہا تھا "آج کے پُرہنگام دور میں آدمی ایسے حالات سے دوچار ہے جہاں اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے موزوں ذرائع نہیں رہے۔ اس کے پاس ایسے ساتھی بھی نہیں ہوتے کہ وہ ضرورت پڑنے پر مدد کے لیے ان کی سمت رجوع کرسکے۔

"ہمارے سماج میں تنزلی بڑی تیزی سے پیدا ہورہی ہے۔ دن دہاڑے لوگوں کو اغوا کیا جارہا ہے۔ قتل اور ڈکیتیاں ہورہی ہیں۔ پولیس کچھ بھی نہیں کرپاتی۔ دراصل پولیس کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں ہیں کہ پوری طرح حالات پر قابو پاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کی کارکردگی سے سخت بیزار ہیں۔ پولیس شہر کے شترِ بے مہار نوجوانوں کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہے۔ جرائم کی شرح بڑھ رہی ہے۔ ہر ذہن پر خوف طاری ہے۔ عالم یہ ہے کہ اصل مجرم تو آزادی سے دندناتے پھرتے ہیں اور خانہ پُری کے لیے پولیس اکثر بے گناہوں کو پکڑ لیتی ہے۔ اکثر جھوٹی گواہیوں پر بے گناہوں کو سزا بھی ہوجاتی ہے۔ یہ صورتِ حال اکثر اوقات ذمے دار لوگوں کے علم میں بھی ہوتی ہے لیکن وہ بھی چپ رہتے ہیں۔ مارشل آرٹ کی مقبولیت کا راز بھی اسی میں ہے اور اب یہ علم صرف لڑنے کا علم نہیں بلکہ خود حفاظتی کا علم بن گیا ہے۔ یہ علم آدمی کو اندرونی اور بیرونی، دونوں خطروں سے بچاتا ہے۔

"مارشل آرٹ صرف سماجی بہبود پر زور نہیں دیتا بلکہ یہ ذہن کی تکمیل سے بھی آشنا کرتا ہے اور اس کی ذات کو ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند بناتا ہے۔

"مارشل آرٹس کے طالب علموں کو اکثر اس پر تعجب بھی ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ پیر چلانے کی تربیت سے قبل مراقبے اور توازن کے فن پر دسترس حاصل کریں۔ توازن سے صرف یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جسمانی توازن سیکھا جائے بلکہ روحانی توازن پر توجہ دینی ہوتی ہے اور یہ توازن صرف ایک زرخیز ذہن ہی حاصل کرپاتا ہے۔ مارشل آرٹس میں توازن کا مطلب ہوتا ہے کہ آدمی نہ صرف مستحکم طور پر ... رہنا سیکھے بلکہ اسے ذہنی توازن بھی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس میں آدمی کو اپنے کردار کی خصوصیت کو اجاگر کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ سماج کے لیے ایک بہتر فرد بن کر ابھر سکے۔

"مارشل آرٹس کے طالب علموں کو بہرحال جو فن سکھایا جاتا ہے، وہ خود حفاظتی کا ایسا طریقہ ہوتا ہے جس میں ہتھیار استعمال نہیں ہوتے۔ طالب علم کو ذہن اور جسم کی ایسی یکجا قوتوں سے آشنا کرایا جاتا ہے کہ دونوں چیزیں اسے ہر قسم کے خطرات سے بچانے کا باعث بن جاتی ہیں اور جب اس پر حملہ ہوتا ہے تو اس کی یہی ذہنی اور جسمانی قوتیں ایک مہلک ہتھیار بن کر اس کا ساتھ دیتی ہیں۔ مارشل آرٹس کے طالب علم کے ہتھیار بازار سے نہیں خریدے جاسکتے۔ نہ ہی ان کے لیے لائسنس کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ یہ طالب علم کے اپنے اندر کا حصہ ہوتے ہیں اس لیے انہیں کہیں رکھنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی البتہ ان کے لیے ذہنی اور جسمانی تربیت ضرور درکار ہوتی ہے جس میں اسے مستقل مزاجی، تنظیم اور ارادے کا درس دیا جاتا ہے۔

"گویا مارشل آرٹ کسی کو اس وقت تک نہیں سکھایا جاسکتا جب تک وہ فرد خود کو اس کا مستحق نہ بنالے۔ ایک طرح سے اسے از سرِ نو معصوم بننا پڑتا ہے۔ اس کی پرانی عادات کو ختم کردیا جاتا ہے۔ اس کی "ذات" کی ابتدا صفر سے کرنی ہوتی ہے۔ یہ کام مارشل آرٹس کے اسکولوں میں انجام دیا جاتا ہے۔ ویسے اسکول تربیت ہیں لیکن صحیح معنوں میں یہ کام صرف ان اسکولوں میں ہوتا ہے جہاں DO کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اور سکھایا بھی جاتا ہے۔ یہ JANG DO بالکل کسی مشرقی MONASTERY کی طرح ہوتی ہے یعنی ایک مکمل عبادت گاہ۔ یہاں داخلے کی فیس کے طور پر آدمی سے مکمل طور پر ارتکاز، توجہ اور COMPASSION کی طلب کی جاتی ہے۔ وہ جنہیں صرف کسی SKILL سیکھنے کا شوق ہو تو انہیں SUL-JANG میں جانا چاہیے۔ -DO-JANG ان کے مطلب کے نہیں ہوتے۔

"DO — JANG میں داخلہ پانے والوں کو بے شک فخر کرنا چاہیے یہاں مارشل آرٹس کے لیے ذاتی قربانی سکھائی جاتی ہے۔ یہ ایک مقدس جگہ ہوتی ہے۔ DO — JANG میں داخل ہوتے وقت طالب علم اس کو جھک کر تعظیم دیتے ہیں۔ DO — JANG میں داخلے کے بعد طالب علم کو تین قسم کی قوتوں... پر عبور حاصل کرایا جاتا ہے۔ یہ تین قوتیں۔۔ OE — GONG (باطنی قوت) NEA — GONG (خارجی قوت) اور SHIM GONG یعنی روحانی قوت۔

"باطنی قوت سانسوں کی مشق سے حاصل کرائی جاتی ہے کیونکہ دنیا کے نوّے فی صد افراد صحیح طرح سانس لینا بھی

نہیں جانتے۔ اس وجہ سے ان کا وزن بڑھتا ہے اور وہ مختلف بیماریوں میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ سانس کی مشقوں کی دوبدو لڑائی میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی لیے طالب علم کو سب سے پہلے BREATH CONTROL سکھایا جاتا ہے۔

"بدقسمتی سے مارشل آرٹس کے طالب علم خواہاں رہتے ہیں کہ انہیں جلد سے جلد ٹیکنیکس سکھا دی جائیں۔ وہ اپنی اندرونی اور بیرونی قوتوں کو ابھارنے پر توجہ نہیں دیتے۔ خصوصاً اندرونی صحت گویا اچھے کردار کی مماثل شے ہوتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کے امتزاج پر مکمل عبور کے بغیر عمدگی سے لڑنا کبھی نہیں سیکھا جا سکتا۔

"استغراق کا عمل گویا ذہنی تربیت کا نام ہے۔ اس میں ذہن کو آزاد ایک نقطے پر مرکوز کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ایکشن زیادہ طاقت ور ہو جاتا ہے۔ بیرونی طاقت کے مظاہرے سے قبل باطنی قوت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ روحانی قوت یعنی SHIM GONG کے ذریعے ہم خود اپنے آپ کو بھی فتح کر سکتے ہیں۔ مارشل آرٹس میں روحانی قوت ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے آدمی لاشعوری اقدامات پر قادر ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے وہ اپنے حریف کی ہر حرکت کو بہ آسانی تاڑ لیتا ہے اور بروقت جوابی کارروائی کر سکتا ہے۔ میں روحانی قوت کے حوالے سے تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سناتا ہوں جس سے اس کا کچھ تصور تمہارے ذہن میں قائم ہو سکے گا۔"

ماسٹر ہنگ پائی ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ مشرقی افق پر بہت ہلکی سی سرخی نمودار ہونے لگی تھی اور اس سرخی کا عکس ماسٹر کے جھریوں بھرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ صبح کی طلوع ہوتی ہوئی سرخی مائل روشنی میں اس کا چہرہ بہت پُراسرار لگ رہا تھا۔

"دو بھکشو کہیں جا رہے تھے۔" ماسٹر ہنگ پائی کہہ رہا تھا "ایک دریا کے پاس ایک خوب صورت لڑکی نظر آئی جو دریا پار کرنا چاہتی تھی لیکن پانی قدرے گہرا تھا اور وہ اپنے لباس کو بھیگنے سے بچانا بھی چاہتی تھی۔ ان میں سے ایک بھکشو نے اس لڑکی کی مدد اس طرح کی کہ اسے اپنی پیٹھ پر لادا اور دریا کے دوسرے کنارے پر اتار دیا۔ دونوں بھکشو پھر اپنی راہ پر چل دیے۔ کچھ دور جا کر دوسرے بھکشو نے پہلے بھکشو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تمہاری یہ حرکت سراسر غیر اخلاقی تھی۔ تمہیں کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے تھا۔"

وہ بھکشو جس نے لڑکی کو اپنی پیٹھ پر لاد کر دریا پار کرایا تھا خاموشی سے چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے جواب دیا "میں نے تو اس لڑکی کو دریا کے کنارے پر ہی اتار دیا تھا لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ابھی تک اسے اپنے اوپر سوار کیے ہوئے ہو۔"

"دیکھا تم نے۔ یہ ہیں روحانی قوت کے معنی۔ روحانی قوت انسانی افعال کو نہایت گہرا بنیادی جواز فراہم کرتی ہے۔ با اقدار شخص جو کچھ کرتا ہے... منصفانہ جواز کے ساتھ کرتا ہے۔ یہ انسان کو مثبت رویے کی حامل بناتی ہے۔ اسی لیے مارشل آرٹس کے طالب علم بسا اوقات "سپر ہیومن" بھی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ وہ روحانی سطح پر نہایت مضبوط ہوتے ہیں اور اس وجہ سے وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔

"اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ مارشل آرٹس صرف ... پر مشتمل نہیں بلکہ ان کی اصل بنیاد DO پر ہے۔ یہ طریقہ صرف لڑائی کی کسی ٹیکنیک کو سیکھ لینے کا نام نہیں بلکہ ایک طریقۂ حیات ہے۔ جو لوگ صرف ٹیکنیکس کے چکر میں ہیں وہ حقیقتاً مارشل آرٹس نہیں سیکھ رہے ہوتے۔ مارشل آرٹ کوئی تفریحی شے نہیں ہے۔ یہ تو ضابطۂ حیات ہے۔ مارشل آرٹس کے شوقین اکثر حربی صلاحیتوں کا مظاہرہ ... اس کی طرف مائل ہوتے ہیں مگر مارشل آرٹ کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ ایسے افراد پیدا کیے جائیں جو لیڈرانہ شان رکھتے ہوں اور جن میں قیادت کی بھرپور صلاحیت موجود ہو۔ اس ضمن میں شرافت پر ازحد زور دیا جاتا ہے۔ ان میں سیلف کنٹرول بڑھایا جاتا ہے۔ ان کے اندر حُبّ الوطنی اور وفاداری کا جذبہ ابھارا جاتا ہے۔ آج کے ٹیکنیکی دور میں ہمارے اردگرد جو بدامنی پیدا ہو چکی ہے، اس میں ایسے اور پُروقار علم و فن کی جتنی ضرورت ہے، اسے تم سمجھ سکتے ہو۔

"یہ چیلنج کا دور ہے۔ یہاں روح کی بالیدگی کے بغیر کوئی مہم جُو سچا نہیں کہلا سکتا۔ ہمارا یہ دور ایسے اشخاص کی راہ دیکھ رہا ہے جو عظیم کہلانے کے مستحق ہوں۔ جو اپنے اثرات سے سوسائٹی کو ایک نوع کا نظم و ضبط اور خوب صورتی ... سکیں۔ جو اردگرد کی افراتفری کو دوبارہ ضابطوں کے دائرے میں لا سکیں اور یہ کام روح کی عظمتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ ... بڑا کام ہے۔ اس سے عہدہ برا ہونے کے لیے دنیا میں ... قوتوں کو پہچاننا بھی ہو گا اور ہمیں ماضی سے مثبت تجربات بھی ... کرنے ہوں گے۔ اگر ہم دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ... چاہتے ہیں تو پھر ہمیں یہ سب کچھ کرنا ہی ہو گا کیونکہ اس میں ہم سب کی سلامتی اور بقا کا راز مضمر ہے۔"

ماسٹر ہنگ پائی خاموش ہو گیا۔ مشرقی افق پر سرخی گہری ہو گئی تھی۔ ماسٹر کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ وہ یوگا کے انداز میں ... دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔ ... آنکھیں بند تھیں۔ شفق کی سرخی کا عکس اس کے چہرے کو عجیب پُراسرار سا تاثر دے رہا تھا۔

سورج پہاڑی کی اوٹ سے سر ابھارنے لگا۔ سورج کی ... کرنیں ماسٹر کے چہرے پر پڑتے ہی ماسٹر نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ... براہِ راست سورج کو دیکھ رہا تھا جیسے اس کی ساری روشنی اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔

○☆○

یہ ماسٹر ہنگ پائی کا پہلا لیکچر تھا جو خاصا طویل ثابت ہوا اور میں دیر تک سوچتا رہا کہ ایسی باتوں پر عمل کیا جائے تو یہ سارے لڑائی جھگڑے اور فساد ختم ہو جائیں۔ انسان اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جینا سیکھ جائے لیکن المیہ تو یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز تھا۔ پڑھا لکھا ہو یا جاہلِ مطلق اپنے معمولی سے فائدے کے لیے دوسروں کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

ماسٹر ہنگ پائی لیکچر دے کر جا چکا تھا اور ہم وہیں کھڑے چڑھتے سورج اور پھیلتی دھوپ کو دیکھتے رہے۔ میں تو یوگا کے آسن میں گھنٹوں ... بیٹھے رہنے کا عادی تھا لیکن جانکی کی حالت بہت ابتر ہو چکی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ اس کے گھٹنے جیسے جڑ گئے تھے۔ وہ دیر تک باری باری دونوں ٹانگوں کو آہستہ آہستہ جھٹکتی رہی تب کہیں چلنے کے قابل ہو سکی تھی۔

ان پہاڑیوں پر سبزہ زیادہ نہیں تھا۔ اِکّا دُکّا درخت تھے۔ ... کچھ دیر یہاں رکنا چاہتا تھا۔ ماسٹر لیشی یان بھی ماسٹر ہنگ پائی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میں اور جانکی کچھ دیر تک ایک درخت کے نیچے کھڑے رہے اور پھر ٹہلتے ہوئے چٹان کے دوسرے کنارے کی طرف آ گئے۔ اس طرف کی پہاڑیاں نیچی تھیں اور وہاں سے دریا بھی نظر آ رہا تھا۔ اس طرف دریا میں ... کشتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ میں نے جانکی کو اشارہ کیا اور ہم ... سی پگڈنڈی سے اترتے ہوئے واپس آ گئے۔

... بجنے والے تھے۔ چیکو ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ جانکی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک جاپانی نوجوان کوچی ہمارے لیے ناشتا لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ نو بجے جمنازیم میں کلاس شروع ہو جائے گی ... ہم وقت پر وہاں پہنچ جائیں۔

ہم دس منٹ پہلے ہی جمنازیم میں پہنچ گئے۔ لڑکوں کی تعداد ... کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ وہ سب بڑے ہال والے حصے میں جمع تھے۔ ٹھیک نو بجے ماسٹر لیشی یان پہنچ گیا۔ اس کا لیکچر خاصا طویل ثابت ہوا تھا۔ اس کے بعد ایکسرسائز شروع ہو گئی۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ ایک سیشن صبح چھ بجے ہو چکا تھا۔ وہ یوگا اور مراقبے کا سیشن تھا جس میں سانس پر قابو پانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ نو سے بارہ بجے تک لیکچر اور ایکسرسائز کا سیشن تھا۔ شام چھ سے نو بجے تک پریکٹیکل کلاسز ہوتی تھیں۔ کوچی کو ماسٹر لیشی یان کے نائب کی حیثیت حاصل تھی۔ تمام لڑکے اس کا احترام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ٹیمیں بنا دی جاتی تھیں۔ ہر ٹیم کا کیپٹن الگ سے مقرر کیا جاتا تھا۔

شام کی کلاسز میں اسٹوڈنٹس کی تعداد سو کے لگ بھگ ہو جاتی تھی۔ اس سیشن میں ایسے طالب علم بھی شامل ہو جاتے تھے جو صرف فائٹ ٹیکنیک سیکھنا چاہتے تھے۔ تھیوری سے انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ شام کے اس سیشن میں لڑکیاں بھی معقول تعداد میں شریک ہوتی تھیں۔ ان کا تعلق بھی مختلف ممالک سے تھا۔ ان میں کامنی نام کی ایک ہندوستانی لڑکی بھی تھی جس سے جانکی کی دوستی ہو گئی۔

جانکی میرے ساتھ باقاعدگی سے کلاسز اٹینڈ کر رہی تھی۔ پہلے اس نے کبھی مارشل آرٹ میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ اسے وحشیانہ کھیل سمجھتی تھی لیکن عرصے سے میرے ساتھ رہتے ہوئے وہ جان چکی تھی کہ ذاتی تحفظ کے لیے یہ فن سیکھنا بہت ضروری ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اس خواہش کا اظہار تو کیا تھا لیکن سنجیدگی کبھی اختیار نہیں کی تھی مگر اس روز صبح ماسٹر ہنگ پائی کا لیکچر سننے کے بعد وہ اس پر توجہ دینے لگی تھی۔ اس کے برعکس چیکو کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یا تو کمرے میں بیٹھی رہتی یا ہال میں دور بیٹھ کر ہمیں پریکٹس وغیرہ کرتے ہوئے دیکھتی رہتی۔

ہمارا صبح کا سیشن ماسٹر ہنگ پائی کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ میں اور جانکی صبح ساڑھے پانچ بجے پہاڑی پر پہنچ جاتے۔ جہاں ماسٹر ہنگ پائی پہلے سے موجود ہوتا۔ ایک مختصر سا لیکچر ہوتا پھر مراقبہ اور یوگا۔ اس کے بعد میں اور جانکی جوگنگ بھی کرتے تھے۔

دوپہر بارہ سے شام چھ بجے تک وقفہ ہوتا تھا مگر ماسٹر لیشی یان مجھے اور جانکی کو پانچ بجے ہی پکڑ لیتا اور ہماری کلاس شروع ہو جاتی۔ جانکی کو شروع میں تو خاصی مشکل پیش آئی تھی لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔

کئی روز گزر گئے۔ اس دوران میں ہم ایک مرتبہ بھی ٹیمپل کی طرف نہیں گئے تھے۔ کبھی کبھار کامنی رات کو

روک لیا۔ وہ اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر سامنے آئے تھے۔ دو کو تو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ یہ دونوں وہی تھے جو ہمارے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ لمبے بالوں والا انگریز نوجوان اور گنجا جرمن ٹروڈر۔ یہ نام دوسرے دن لمبے بالوں والے نے ہی بتایا تھا۔ ان کے ساتھ تیسرے آدمی نے سر پر کپڑا ڈال رکھا تھا جس سے اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بھی انہی کے قبیل کا کوئی ہوگا۔ وہ دراز قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ ہاتھوں پیروں کا بھی خاصا مضبوط تھا۔

"ہم تو بہت دنوں سے تمہیں تلاش کر رہے تھے۔" گنجے ٹروڈر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں پتا چل گیا تھا کہ تم منگ شول کیمپ میں چھپے ہوئے ہو۔ وہاں جانے کا ہم خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے لیکن یہ یقین تو تھا کہ تم اپنے بل سے باہر ضرور نکلو گے اور آج ہمیں اطلاع مل گئی کہ تم اس طرف کسی کے پاس آئے ہوئے ہو۔ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ اس رات تو ہم دھوکے میں مار کھا گئے تھے لیکن آج تم تینوں بچ کر نہیں جا سکو گے۔"

"میں بھی بہت دنوں سے تم دونوں کی تلاش میں تھا۔" تیسرے آدمی نے کہتے ہوئے اپنے سر پر سے کپڑا ہٹا دیا "مجھے بھی تم تینوں سے پرانا حساب چکانا ہے۔"

اس کا چہرہ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ ہکمیان تھا۔ ہکمیان سے جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو وہ بھی ایک بھکشو کے بھیس میں تھا اور میں اور جانکی بھی بھکشوؤں والا روپ دھارے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں رات گزارنے کے لیے دریا کے کنارے ایک عبادت گاہ میں لے گیا تھا جہاں میں نے اسے بتایا تھا کہ ہم شاؤلن ٹیمپل جا رہے ہیں اور وہ اسی رات ہمیں نشہ آور مٹھائی کھلا کر ہمارا سب کچھ لوٹ کر لے گیا تھا۔ اس کے بعد ہکمیان سے ہماری ملاقات ڈانگ کو میں ہوئی تھی۔ ہم نے اسے چھاپ لیا تھا لیکن وہ فائرنگ کرتا ہوا فرار ہوگیا تھا اور ہم کاراشان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ ہکمیان سے ہماری تیسری ملاقات راستے میں ہوئی تھی جب اس نے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر ہماری وین پر حملہ کر دیا تھا۔ اس حملے میں دو آدمی مارے گئے تھے اور ہمیں قیدی بنا لیا گیا تھا۔ اس کے بعد غار میں جو کچھ ہوا تھا اس کی تفصیل میں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور اب وہ یہاں ہمارے سامنے ان دونوں یورپی غنڈوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ غار میں ان ڈاکوؤں کو ختم کر کے بھاگ نکلا

تھا۔ اسے معلوم تھا کہ میں شاؤلن ٹیمپل کا رخ... لیے وہ بھی یہاں پہنچ گیا تھا اور یہاں آتے ہی ... مطلب کے آدمی مل گئے تھے اور اب وہ تینوں ہم... کھڑے تھے۔

چیکو انہیں دیکھ کر سہم گئی اور میرے ساتھ ... ہوگئی۔ جانکی کے چہرے پر بھی خوف کے سائے ابھ... لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔ ... ایسے حالات سے دو چار ہو چکی تھی اور میری طر... دل و دماغ سے بھی موت کا خوف نکل چکا تھا۔ اس ... امید تھی کہ وہ بھرپور انداز میں میرا ساتھ دے گی۔

ٹروڈر دو قدم آگے بڑھ آیا۔ پہلے روز کی طر... دونوں ہاتھ آگے نکال کر کراٹے کا اسٹانس بنایا ... مارنے کے انداز میں دائیں ہاتھ کو حرکت دی۔ ... وقوف نہیں تھا کہ اس کے جھانسے میں آجاتا۔ ... مہاراج کی نگرانی میں، میں نے ماسٹر ہوچن، ماسٹر ... دوسرے سینٹرز سے میں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ... تربیت تھی کہ چی فانگ جیسے مارشل آرٹسٹ میر... سے اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھے تھے۔ بنکاک، کنچن بوری ... مائی اور چیانگ رائے میں بھی مارشل آرٹ کا کوئی ... سامنے نہیں ٹک سکا تھا۔ میں اپنی اس تربیت کی ... گولڈن ٹرائی اینگل سے بھی زندہ بچ نکلا تھا اور ... سے میں یہاں ماسٹر ہنگ پائی اور لیشی یان سے تربیت ... تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی کے لیکچر ایک خاص انداز میں ... انداز ہو رہے تھے۔ میں ذہنی اور جسمانی قوتوں ... وقت کام لینا سیکھ گیا تھا۔ تربیت اگرچہ مختصر سہی مگر ... اس حریف سے دھوکا نہیں کھا سکتا تھا جو دماغ ... ہاتھوں پیروں سے کام لینے کا عادی تھا۔ میں سمجھ گیا ... حرکت اس نے مجھے دھوکا دینے کے لیے دی تھی ... اور خطرناک وار کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو اس کے پنچ سے بچالیا ... بڑی پھرتی سے کک لگانے کے لیے دائیں ٹانگ ... دی۔ میں اس کے کسی ایسے ہی وار کا منتظر تھا۔ ... سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بائیں ہاتھ ... کی کک بلاک کی اور دائیں ہاتھ سے اس کی ... گھٹنے سے چند انچ اوپر چوپ رسید کر دیا۔ وہ بلبلا ... ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔

اسی دوران میں ہکمیان نے مجھ پر حملہ کر دیا ... تان کر بالکل بازاری انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا ...

ختم ہونے کے بعد جانکی کے پاس رک جاتی۔ وہ مجھ ... بے تکلف ہوگئی تھی۔

... کامنی ہندوستان کے شہر پشکر کی رہنے والی تھی۔ صوبہ ... راجستھان میں واقع اس شہر کی اپنی ایک تاریخ تھی۔ کامنی ... اگرچہ ایک برہمن گھرانے سے تھا لیکن اس نے ... تک تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس نے تعلیم کے ... میں کراٹے کی تربیت بھی حاصل کرنا شروع کر دی تھی ... اس کا برہمن باپ یہ برداشت نہیں کر سکا کہ اس کی بیٹی ... کمتر ذات کے لڑکوں کے ساتھ اس قسم کی حرکتیں ... جسے اس کے خیال میں لڑائی بھڑائی کا نام ہی دیا ... جاتا تھا۔ باپ کی طرف سے لگائی جانے والی پابندیوں کی وجہ ... اس کا کراٹے کی تربیت کا سلسلہ بار بار ٹوٹتا رہا لیکن ... گریجویشن کرنے کے بعد اس نے پر پرزے نکالنا شروع ... کر دیے اور جے پور میں اپنے ماما کے ہاں رہائش کے دوران میں ... نے ایک کراٹے سینٹر سے بلیک بیلٹ تک ٹریننگ حاصل ... کی۔ یہ تائی کون ڈو اسٹائل تھا۔ ایک روز وہ ایک ایسے ... سینٹر میں چلی گئی جہاں کنگ فو کی ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس ... نے اس سینٹر میں داخلہ لے لیا لیکن اسے جلد ہی اندازہ ہوگیا ... کہ یہ سینٹر صرف پیسے بٹورنے کے لیے ہے۔ یہاں الٹے ... سیدھے ہاتھ پیر چلانے کے سوا کچھ نہیں سکھایا جاتا۔ یہاں ... سے چند مہینے ٹریننگ حاصل کرنے والے اسٹریٹ فائٹر ہی بن ... نکلتے تھے۔

کامنی نے مارشل آرٹس کے کئی اسٹائلز کے لٹریچر کا ... مطالعہ بھی کیا تھا۔ وہ کنگ فو سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی ... تھی۔ ہندوستان کے کئی بڑے شہروں میں کنگ فو کے کئی سینٹر ... تھے۔ وہ ہر جگہ گئی۔ بمبئی کا ایک سینٹر ٹریننگ کے لحاظ ... سے اسے پسند آیا مگر وہاں کا ماحول اسے پسند نہیں آیا اور ... اس نے شاؤلن ٹیمپل آنے کا فیصلہ کر لیا۔ برہمن باپ ... کو جب کامنی کے ارادوں کا پتا چلا تو اس نے ہنگامہ کر دیا۔ وہ ... اس کی شادی کی تیاریاں کر رہا تھا اور بیٹی مار پیٹ کی ٹریننگ ... لے رہی تھی۔ کامنی نے مکمل طور پر بغاوت کا اعلان کر دیا ... اور یہاں آگئی۔

وہ پچھلے ایک سال سے یہاں تھی۔ کئی سینٹرز گھومنے ... کے بعد ہی اس نے منگ شول میں داخلہ لے لیا۔ وہ بڑی ... محنت سے یہ فن حاصل کر رہی تھی۔

... کامنی عبادت گاہ کے قریب ہی ایک گیسٹ ہاؤس میں رہ ... رہی تھی۔ اس کے کمرے میں دو افراد اور بھی رہ رہے تھے۔ ... ایک یورپین لڑکا تھا اور ایک جاپانی۔ وہ دونوں کسی اور سینٹر

میں ٹریننگ لے رہے تھے۔

بعض اوقات تو کامنی رات کو دیر تک ہمارے پاس بیٹھی رہتی اور جب وہ واپس جانے لگتی تو میں اور جانکی بھی دریا کے پل تک اس کے ساتھ جاتے۔

ہفتے میں دو دن کلاس نہیں ہوتی تھی۔ اس روز ہم نے کامنی کے ہاں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اسے ایک دن پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی ہم کیمپ سے نکل گئے۔ ماسٹر لیشی یان نے ہمیں پہلے ہی محتاط رہنے کی وارننگ دے دی تھی کیونکہ یہاں ایک دوسرے کے کیمپوں کے لڑکوں پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے کیمپوں کی جاسوسی بھی کی جاتی تھی اور یہ جاننے کی کوشش کی جاتی تھی کہ اس کیمپ کے کس لڑکے یا لڑکی سے ماہانہ مقابلوں میں دوسروں کو خطرہ ہو سکتا ہے اسی لیے موقع پا کر اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی جاتی تھی تاکہ وہ مقابلے میں شریک ہی نہ ہو سکے۔

میں اب تک ایک مرتبہ بھی اپنے کیمپ سے باہر نہیں نکلا تھا لیکن کامنی، کوچی اور دوسرے لڑکوں سے مجھے پتا چلتا رہتا تھا کہ میرے بارے میں دوسرے کیمپوں میں کچھ باتیں گردش کرنے لگی تھیں۔ دو تین مرتبہ میں نے اپنے جمنازیم میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا تھا جو مجھے نگاہوں میں رکھے ہوئے تھے۔ جمنازیم میں کسی کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اکثر لوگ لڑکوں کو ٹریننگ کرتے دیکھنے کے لیے آتے رہتے تھے۔

وہ تین منزلہ عمارت تھی جس میں مرغی کے ڈربوں جیسے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کامنی کے ساتھ بھی دو اور افراد اس کمرے میں رہائش پذیر تھے اور وہ سب مل کر کرایہ ادا کرتے تھے۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان تینوں نے فرش پر اپنے اپنے بستر لگا رکھے تھے۔ کمرے سے ملحق ایک چھوٹا سا باتھ روم بھی تھا۔

ہم دیر تک وہاں بیٹھے کامنی اور ان دونوں لڑکوں سے باتیں کرتے رہے۔ کامنی اپنے بارے میں سب کچھ بتا رہی تھی۔ کئی روز کا ساتھ ہونے کی وجہ سے اس میں بے تکلفی اور اپنائیت سی آگئی تھی۔

ہم رات گیارہ بجے کے قریب وہاں سے نکلے۔ وہ چاندنی رات تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ راستے میں رک کر تھوڑی دیر دریا کا نظارہ کریں گے اور پھر کیمپ کی طرف لوٹ جائیں گے لیکن ایک موڑ گھومے ہی تھے کہ تین آدمیوں نے ہمارا راستہ

تیزی سے نیچے بیٹھ گیا اور اسے دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر اوپر اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل زمین پر گرا۔ ہکسیان پر یہ داؤ استعمال کرنے کے لیے میں بالکل نیچے بیٹھ گیا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹروڈر کو حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کی کک میرے بائیں کندھے پر لگی اور میں پیچھے الٹ گیا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اس نے دوسرا حملہ کردیا۔ یہ کک میری کھوپڑی پر لگی اور میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ ٹھوکر خاصی زوردار تھی۔ دماغ جھنجھنا اٹھا تھا۔ حواس بحال کرنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور ان چند سیکنڈوں میں مجھ پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

ٹروڈر کے ساتھ ہکسیان بھی میرے جسم پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے وائیں طرف دیکھا تو جانگی لمبے بالوں والے سے بھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کا مقابلہ برابر کا تھا اور مجھے خوشی ہوئی کہ جانگی ایک ایسے حریف کا مقابلہ کر رہی تھی جو تربیت یافتہ فائٹر تھا۔ جبکہ چیکو سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی چیخ رہی تھی۔

اس دوران میں میری پسلیوں پر ایک اور ٹھوکر پڑی اور میں پیچھے الٹ گیا لیکن ٹروڈر کا اگلا وار میں نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اپنے آپ کو اس حملے سے بچا کر میں اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔

ٹروڈر میرے سامنے تھا۔ اس کا بایاں پیر آگے کو نکلا ہوا تھا۔ ٹانگ میں اس طرح خم تھا کہ گھٹنا بھی ذرا سا آگے کو نکل گیا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا' بایاں پیر اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر رکھ کر... کھڑا ہوگیا اور سیدھی ٹانگ کو گھما کر راؤنڈ ہاؤس اسٹائل میں اس کی کھوپڑی پر کک رسید کردی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ میں اچھل کر ہوا میں گھوم گیا اور فلائنگ کک ہکسیان کے سینے پر رسید کردی جو مجھ پر حملے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ دونوں چیختے ہوئے گرے۔ میں بھی گرا تھا لیکن ان سے پہلے ہی اٹھ گیا اور لمبے بالوں والے پر حملہ آور ہوا جو جانگی پر ایک خطرناک کک لگانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میری کک اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ کے نیچے لگی اور وہ ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا گر گیا۔

چیکو کی چیخوں کی آواز سن کر کچھ لوگ مختلف سمتوں سے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ دو نوجوان لڑکوں نے آگے بڑھنا چاہا مگر ایک آدمی تیزی سے آگے بڑھ آیا۔ اس نے دونوں بانہیں اطراف میں پھیلا دیں اور چیخ کر سب… کردیا کہ کوئی آگے نہ بڑھے۔

جانگی نے لمبے بالوں والے کو اٹھنے کا موقع … وہ اس پر ٹھوکریں برسا رہی تھی۔ میرے مقابلے … تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ دونوں مجھ سے کہیں زیادہ … تھے مگر میں جانتا تھا کہ مارشل آرٹ کی فائٹ میں طاقت نہیں ٹیکنیک کرشمہ دکھاتی ہے۔ ہکسیان … آرٹسٹ نہیں تھا۔ اس کے لڑنے کے انداز … پن تھا۔ البتہ ٹروڈر اس سے زیادہ خطرناک تھا۔ وہ … استعمال کر رہا تھا اور ٹیکنیکس بھی لیکن وہ گرم … تھا۔ طاقت اور ٹیکنیکس کے استعمال میں سوچ … تھا۔ جبکہ میں اس کے حملہ آور ہونے سے پہلے … تھا کہ وہ کون سا داؤ استعمال کرنے والا ہے۔

ہمارے اردگرد چالیس پچاس افراد کا مجمع … کامنی بھی شور کی آوازیں سن کر آگئی تھی۔ اس … ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر اسے بھی روک دیا گیا۔

لوگوں کے چیخنے اور شور مچانے سے میں نے … کہ وہ سب میری فیور میں تھے۔ میں کوئی داؤ استعمال … لوگ واہ واہ کر اٹھتے۔

ہکسیان کی گردن پر لگنے والی میری راؤنڈ ہاؤس … تو سب نے ہی چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ … کک کھا کر گرا تو دوبارہ نہیں اٹھا۔ ٹروڈر بھی ہاتھ … بیٹھا تھا۔ میں اسے آخری کک مارتے مارتے رہ گیا … کر وہی کک لمبے بالوں والے کے کولہے پر جما دی … بال مٹھی میں جکڑے دوسرے ہاتھ سے اس کے … گھونسے لگا رہا تھا۔ یہ بالکل بازاری پن تھا۔ میری … وہ لڑکھڑا گیا۔ جانگی نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ … چھڑایا اور ایک بھرپور گھونسا اس کے جبڑے پر … دوسری طرف سے میری کک اس کے پیٹ پر پڑی … ہوا دُہرا ہوتا چلا گیا۔

وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر پڑے ہانپ رہے تھے … بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی … انہیں گھسیٹتے ہوئے وہاں سے دور لے جا کر پھینک … لوگوں نے مجھے اور جانگی کو گھیر لیا۔ کامنی دوڑتی … سے لپٹ گئی اور جو شخص ہجوم سے نکل کر سب … تک پہنچا تھا وہ کوچی تھا۔

کوچی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کے … مسکراہٹ تھی۔ اس نے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ … ہی ہمارے تعاقب میں رہا تھا۔ جب ہم کامنی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے تو اس وقت بھی وہ عمارت کے باہر کھڑا تھا اور جب ہکسیان وغیرہ نے ہمیں گھیرا تھا تو اس وقت بھی وہ ہم سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اس نے ہماری لڑائی میں مداخلت اس لیے نہیں کی کہ میں اکیلا ہی ان دونوں پر شروع ہی سے حاوی رہا تھا۔ جانگی بھی لمبے بالوں والے سے بخوبی نمٹ رہی تھی۔ کوچی کے کہنے کے مطابق اگر کوئی نازک مرحلہ آتا تو ضرور مداخلت کرتا مگر اس کا اسے موقع نہیں ملا۔

شاؤلن ٹیمپل کے لوگوں نے اب تک میرے بارے میں صرف باتیں سنی تھیں اور آج بہت سے لوگوں نے مجھے فائٹ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس وقت لاتعداد توصیفی جملے میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ کئی لوگ میرے کندھے تھپتھپا رہے تھے۔

کوچی مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچتا لے گیا۔ جانگی اور چیکو میرے ساتھ تھیں اور کامنی بھی ہمارے ساتھ آرہی تھی۔ ہمیں اپنے کیمپ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

جانگی کو کچھ اندرونی چوٹیں لگی تھیں۔ اس وقت تو جوش و خروش میں کچھ پتا نہیں چلا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا تکلیف کا احساس بھی اجاگر ہو رہا تھا۔ میں بھی اپنے کندھے میں تکلیف محسوس کر رہا تھا۔

کوچی ہمیں کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے ایک ڈبیا کامنی کو دیتے ہوئے کچھ کہا اور مجھے ساتھ لے کر سامنے والی چٹان پر ماسٹر لیشی یان کے کمرے (غار) میں آگیا۔ ہمیں اپنے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ لیشی یان کو اس واقعے کے بارے میں مختصر طور پر بتا چکا تھا اور اب وہ تفصیل سے سب کچھ بتا رہا تھا۔ ماسٹر لیشی یان غور سے اس کی باتیں سنتے ہوئے بار بار میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ کوچی خاموش ہوا تو ماسٹر لیشی یان نے مجھے قمیص اتارنے کا حکم دیا اور میں نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ وہ میرے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ اس کی انگلیاں بڑی سختی سے میرے جسم میں گڑ رہی تھیں اور جب اس کا ہاتھ میرے بائیں کندھے پر پہنچا تو میرے منہ سے سسکاری سی نکل گئی۔ وہ بار بار میرا کندھا دبانے لگا پھر اس نے کوچی سے کچھ کہا۔

کوچی فوراً ہی ایک ڈبیا اٹھا لایا اور انگلی سے اس میں بھرا ہوا پیسٹ نکال کر میرے کندھے پر مالش کرنے لگا۔ اس دوران ماسٹر لیشی یان مجھ سے مختلف سوالات پوچھتا رہا۔ کوچی بھی بیچ بیچ میں بول رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم اپنے کمرے (غار) میں آگئے۔ جانگی اپنے بستر پر اوندھی پڑی تھی اور کامنی اس کے کندھے پر مالش کر رہی تھی۔

کوچی باہر ہی رُک گیا تھا۔ مجھے بھی رکنا پڑا۔ چند منٹ بعد جانگی شرٹ پہن کر بیٹھ گئی تو ہم اندر آگئے۔ کوچی کچھ دیر تک جانگی سے باتیں کرتا رہا پھر چلا گیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کامنی چیکو کے ساتھ اس کے بستر پر لیٹ گئی تھی۔

صبح ٹھیک ساڑھے پانچ بجے میں اور جانگی پہاڑی پر پہنچ گئے جہاں ماسٹر ہنگ پائی پہلے سے موجود تھا۔ اسے شاید رات ہی کو لیشی یان نے اس واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ مجھ سے اور جانگی سے مختلف سوالات کرتا رہا اور پھر ایک زوردار قسم کا لیکچر بھی دے ڈالا۔

اس روز منگ شول جمنازیم میں بڑا رش تھا۔ گزشتہ رات والے ہنگامے کو میں نے ایک معمولی واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ایسے واقعات تو میرے ساتھ قدم قدم پر پیش آتے رہتے تھے لیکن یہاں اس واقعے کو بڑی اہمیت دی جا رہی تھی۔ تین آدمیوں کو ادھ موا کردینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ لوگ مجھے دیکھنے کے لیے آرہے تھے۔

میری شہرت چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ میں جس طرف سے گزرتا' لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا۔ دو چار دوسرے ماسٹرز نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ وہ مجھے اپنے کیمپ میں لینا چاہتے تھے اور اس کے لیے مجھے کچھ لالچ بھی دیے گئے تھے لیکن میں نے کسی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔

ان غنڈوں سے میری فائٹ کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ منگ شول جمنازیم میں داخلوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ دوسرے ماسٹر مجھے اپنے کیمپ میں کیوں لینا چاہتے تھے۔

ہر مہینے مرکزی جمنازیم میں چیلنج مقابلے ہوا کرتے تھے۔ وہ میرا پہلا مہینہ ہی تھا۔ بعض لوگ مجھے اس ٹورنامنٹ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں کی طرف سے لیشی یان پر دباؤ بھی پڑ رہا تھا کہ اس ٹورنامنٹ میں میرا نام بھیجا جائے لیکن لیشی یان کا ایک ہی جواب تھا "ابھی نہیں۔"

اس مہینے کوچی کا نام ٹورنامنٹ میں شامل تھا۔ وہ اپنی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا ہوا فائنل تک پہنچ گیا اور پھر اس نے فائنل بھی جیت لیا۔ دو سال کے عرصے میں کوچی نے چوتھی مرتبہ یہ ٹورنامنٹ جیتا تھا۔ فائنل والے روز لوگ مجھے

رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ میں کسی نمائشی مقابلے کے لیے ہی رنگ میں اتروں اوکی ناوا کے ایک فائٹر نے تو رنگ میں آکر مجھے چیلنج بھی کر دیا تھا لیکن میں اپنی جگہ پر کھڑا مسکراتا رہا۔

یہ اسی رات کی بات ہے۔ کوچی کا مقابلہ شروع ہونے والا تھا۔ ماسٹر لیشی یان' کوچی کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ جانکی نے میرا بازو پکڑ کر دبایا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"وہ سامنے اس آدمی کو دیکھ رہے ہو۔۔ مجھے کچھ مشکوک سا لگ رہا ہے۔" جانکی نے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ میں اس طرف دیکھنے لگا۔

رنگ کے دوسری طرف تماشائیوں میں کھڑا ہوا وہ آدمی ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد و قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے گلابی رنگ کی پینٹ اور نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے تھے۔ مجھے اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگا لیکن یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

"تمہیں شاید یاد نہیں آرہا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" جانکی نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔ "چیانگ رائے کے نواح میں جب ہم نے ایک کانیج پر حملہ کیا تھا تو یہ بھی پی فانگ اور سَم کے ساتھ تھا۔"

میں نے ایک بار پھر اس شخص کی طرف دیکھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر وہ دوسرے آدمیوں کی آڑ میں ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ ان کم بختوں کی شکلیں ایک دوسرے سے اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ آدمی آسانی سے دھوکا کھا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کی ٹھوڑی پر دائیں طرف وہ سیاہ دھبا مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" جانکی نے کہا "یہ جنرل کھوراٹ کا آدمی ہے۔ انہیں شاید کسی طرح یہ بھنک مل گئی کہ تم شاؤلن ٹیمپل میں ہو۔ یہ تمہیں تلاش کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔"

"یہ لوگ چیانگ رائے یا گولڈن ٹرائی اینگل میں تو ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکے۔ یہاں کیا کرلیں گے۔" میں نے جواب دیا "ہو سکتا ہے وہ ہماری تلاش میں یہاں نہ آیا ہو۔ اس کی آمد کا مقصد کچھ اور ہو۔"

"اس کے یہاں آنے کا مقصد کچھ بھی ہو۔ ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" جانکی نے کہا۔

جانکی کے خدشات بے بنیاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک مشتبہ آدمی ہماری نظروں میں آگیا تھا۔ ہمیں واقعی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

فائنل مقابلہ ختم ہونے کے بعد ایک ہڑبونگ سی مچ گئی تھی۔ کوچی کو ٹرافی ملتے ہی اس کے دوستوں نے اسے کندھوں پر اٹھا لیا تھا اور وہ لوگ ایک جلوس کی صورت میں جمنازیم سے باہر نکل آئے تھے۔ میں نے اس مشتبہ شخص کو بھی ہجوم کے ساتھ باہر آتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ جنرل کھوراٹ ہی کا آدمی ہے تو ہمارا پیچھا کرے گا لیکن جمنازیم سے باہر آتے ہی وہ غائب ہو گیا۔

یہ اس کے تین روز بعد کی بات ہے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ہمارے جمنازیم میں اسٹوڈنٹس کی اسپیرنگ ہو رہی تھی۔ کچھ تماشائی بھی موجود تھے۔ میری باری آئی تو تمام لڑکوں اور تماشائیوں نے بڑے پُرزور انداز میں تالیاں بجائی تھیں۔

اسپیرنگ دراصل مارشل آرٹ میں فائٹ کی ابتدائی مشق ہوتی ہے جس میں طالب علم کو حملے اور دفاع کی ٹیکنیک سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

میری اسپیرنگ صباح نامی ایک مصری لڑکے سے تھی۔ وہ ہمارے ویٹ کا بڑا پرمننٹ لڑکا تھا اور ڈیڑھ سال سے اس کیمپ میں پریکٹس کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ ٹورنامنٹ بھی جیت چکا تھا۔

دوسرے راؤنڈ میں اس نے مجھے ایک زوردار سائڈ کک لگائی تھی اور پھر چوب مارنے کے لیے میری طرف لپکا۔ میں نے چوب بلاک کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیا لیکن صباح حملہ آور ہونے کے بجائے اپنی جگہ پر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ چوب کے لیے اٹھا ہوا اس کا ہاتھ۔۔۔ گردن پر پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے کراہ سی نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

کوچی ریفری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ بھی صباح کی طرف لپکا۔ صباح بری طرح تڑپ رہا تھا۔ ہم سمجھے تھے اسے اچانک ہی پیٹ میں درد اٹھا ہے یا ایسی ہی کوئی تکلیف ہوئی ہے جسے وہ برداشت نہیں کر سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا تھا۔

اس کا سیدھا ہاتھ ابھی تک گردن پر تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹایا' میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کی گردن میں ایک سُوئی پیوست تھی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ بلو پائپ BLOW PIPE کے بارے میں' میں نے بہت کچھ سنا تھا۔ ایک دو فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ ایک مخصوص قسم کے پائپ یا نلکی میں زہر میں بجھی ہوئی سُوئی رکھ کر پھونک ماری جاتی ہے۔ سُوئی ہدف کے جسم

کے کسی بھی حصے میں پیوست ہو کر آناً فاناً اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ آج کل تو بلو پائپ میں بھی جدید ٹیکنیک استعمال کی جانے لگی ہے۔ اس کے اندر اسپرنگ وغیرہ استعمال ہونے لگے ہیں۔ پھونک مارنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ننھا سا بٹن دباتے ہی سُوئی پائپ سے نکل کر شکار کی طرف لپکتی ہے۔

کوچی نے بھی وہ سوئی دیکھ لی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ تماشائیوں میں کھڑا ہوا ایک آدمی ہماری طرف دیکھتا ہوا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اور آنکھوں میں وحشت سی تھی۔

ماسٹر لیشی یان اور کچھ دوسرے لڑکے بھی دوڑتے ہوئے رنگ میں پہنچ گئے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ حملہ مجھ پر کیا گیا تھا کیونکہ صرف ایک سیکنڈ پہلے میں اس جگہ پر تھا جہاں صباح کو سوئی لگی تھی۔ اگر میں اپنے آپ کو صباح کے چوب سے بچانے کے لیے پھرتی سے پیچھے نہ ہٹتا تو وہ زہریلی سوئی صباح کے بجائے میری گردن میں پیوست ہوتی۔

وہ آدمی اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر رنگ کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کو دھکیلتا ہوا اس کے پیچھے لپکا لیکن ایک اور آدمی سے ٹکرا کر گرا۔ وہ آدمی بھی میرے ساتھ ہی گرا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کیا اور اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑا۔

وہ آدمی دوڑتا ہوا تقریباً سو گز دور جا چکا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میرا خیال تھا وہ دریا کی طرف ہی جائے گا لیکن وہ پہاڑیوں میں ایک تنگ سے راستے پر مڑ گیا۔ ان پہاڑیوں میں ایسے کئی راستے تھے جن میں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی لیکن اس وقت وہ تنگ سا راستہ سنسان پڑا تھا البتہ اس آدمی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

دو تین پہاڑیوں کے گرد چکر لگانے کے بعد وہ بالآخر دریا کی طرف جانے والے راستے پر نکل آیا۔ وہ مجھ سے اب بھی تقریباً سو گز آگے تھا اور دریا کا رسّوں والا پُل بھی زیادہ دور نہیں تھا۔

میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ جب میں نے پُل پر قدم رکھا تو وہ مجھ سے صرف بیس گز آگے تھا۔ اس وقت سامنے سے بھی ایک آدمی پُل پر آرہا تھا۔ وہ پُل کے بالکل وسط میں چل رہا تھا۔

مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ مخالف سمت سے آنے والے نے اس بھاگتے ہوئے شخص کو روکنے کی کوشش کی تھی یا وہ دونوں محض اتفاقی سے ٹکرا گئے تھے لیکن اس ٹکر کا نتیجہ بڑا خطرناک نکلا تھا۔ مشتبہ شخص نہ صرف فوراً ہی سنبھل گیا تھا بلکہ اس نے دوسرے آدمی کو اٹھا کر دریا میں پھینک دیا تھا۔ دریا میں گرنے والے اس شخص کی چیخ بہت بھیانک تھی۔

وہ شخص اب پھر دوڑ رہا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان اب صرف دس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ رسّوں کا یہ پُل جھولے کی طرح جھول رہا تھا اور اس پر دوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ شخص پُل پار کر گیا تو اس کا ہاتھ آنا مشکل ہو جائے گا۔

"اب یا کبھی نہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے اپنی رفتار کچھ اور تیز کر دی اور پھر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے یل YELL کرتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ اس وقت ہم پُل کے وسط میں تھے۔ میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گرا اور اسے ساتھ لیتا ہوا پُل کے تختوں پر گر گیا۔ میں اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا دو چار فٹ آگے نکل گیا تھا اور وہ پیچھے رہ گیا تھا۔

وہ مجھ سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اور اٹھ کر اس نے میری کھوپڑی پر ٹھوکر مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کا یہ حملہ کامیاب نہیں ہونے دیا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے بائیں ہاتھ سے اس کی کک بلاک کی اور اس کے ساتھ ہی ایک زوردار جھٹکا بھی دے دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ میں بھی فوراً ہی اٹھ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے مجھے اس سے کوئی نمائشی مقابلہ نہیں کرنا تھا۔ وہ قاتل تھا اور اسے ہر صورت میں گرفت میں لینا تھا۔ اس نے تو مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اتفاق سے میں بچ گیا تھا اور میرا ساتھی موت کی زد میں آگیا تھا۔

وہ شخص جس طرح اچھل اچھل کر اسٹانس بدل رہا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا۔ وہ حملہ کرنے کے بجائے بڑی تیزی سے نیچے بیٹھ گیا اور سویپ کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کے جھکتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ میں بڑی پھرتی سے اچھل گیا۔ اس کی ٹانگیں آگے کو پھیلی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹکائے لٹو کی طرح گھوم رہا تھا

لیکن وہ مجھے سویپ نہیں کرسکا۔ آخری مرتبہ میں نے اوپر اچھلتے ہی اسے کک لگادی۔ وہ پیچھے الٹ گیا۔

اس مرتبہ بھی وہ پھرتی سے اٹھ گیا اور اس بار اس نے یکے بعد دیگرے دو مرتبہ اسپن کک لگانے کی کوشش کی لیکن میں دونوں بار اپنا بچاؤ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس نے فوراً اسٹانس بدل لیا۔ اس کے دونوں پیر اسٹریٹ الائنمنٹ میں تھے۔ یعنی ایک پیر آگے کو نکلا ہوا اور دوسرا پیچھے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے کون سی ٹیکنیک استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس پوزیشن پر حریف کو کک تو نہیں لگائی جاسکتی تھی البتہ حریف کے وار کا دفاع کیا جاسکتا تھا یا پھر وہ مجھے کوئی چکما دینے کے چکر میں تھا لیکن شاید اسے میرے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں ورنہ وہ ایسی حماقت نہ کرتا۔

میں نے پیچ کا جھانسا دیا اور اس کی آگے نکلی ہوئی ٹانگ پر شوان ریو کراٹے اسٹائل کی سلانٹ فرنٹ کک لگادی۔ یہ کک اوپر سے نیچے کی طرف ذرا ترچھی لگائی جاتی ہے۔ اگر یہ کک لگانے کا انداز نپا تلا ہو تو حریف کی ہڈی کے دو ٹکڑے ہونے میں دیر نہیں لگتی۔

میں اس کے گھٹنے پر کک لگانا چاہتا تھا لیکن یہ کک لگی اس کے گھٹنے سے چند انچ اوپر۔ اگر صحیح جگہ پر لگتی تو اس کا گھٹنا ٹوٹ جاتا اور وہ زندگی بھر چلنے کے قابل نہ رہتا لیکن یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کک چند انچ اوپر لگی تھی۔

وہ نیچے گرا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی کوئی نمائشی مقابلہ کرنے نہیں آیا تھا جو دیر تک داؤ پیچ آزماتا رہتا۔ اسے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس کی پہلی کوشش ناکام ہوگئی تھی اور میرے بجائے ایک بے گناہ موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اتفاق سے میں نے ہی اسے گھیرا تھا۔

"تمہاری قسمت اچھی تھی کہ بلو پائپ کے وار سے بچ گئے۔" اس کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "یہ خنجر بھی زہر میں بجھا ہوا ہے۔ اس کی نوک بھی تمہارے جسم کو چھوگئی تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے اور میں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم میرے پیچھے آگئے ہو۔ اب سمجھو تمہاری زندگی پوری ہوگئی۔" وہ خنجر کو مخصوص انداز میں حرکت دیتا ہوا آگے بڑھا۔

اس کی بات پر شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ مجھے قتل کرنے ہی آیا تھا۔ پہلے بلو پائپ سے حملہ کیا گیا۔ وہ سوئی بھی زہر میں بجھی ہوئی تھی اور اس خنجر کے بھی زہر میں بجھے ہوئے ہونے پر مجھے کوئی شبہ نہیں تھا۔

دو تین جھانسے دینے کے بعد اس نے وار کردیا۔ میں نے اس کی خنجر والی کلائی پکڑلی اور پوری قوت سے مروڑنے لگا۔ اس نے ایک اور حرکت کی۔ میری ٹانگ میں ٹانگ پھنسا کر زوردار جھٹکا دیا۔ اڑنگا لگنے سے میں پشت کے بل نیچے گرا۔ اس کی کلائی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اس نے فوراً ہی مجھ پر چھلانگ لگادی اور میرے سینے پر خنجر سے وار کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑلی۔

وہ خاصا ہٹا کٹا اور مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا لیکن کٹھن ترین حالات اور سخت ٹریننگ نے میری بانہوں میں بھی قوت بھردی تھی۔ میں اس وقت اپنا دفاع کرنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔

خنجر میرے چہرے سے صرف ایک انچ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ اس کی نوک کا بہت معمولی سا چرکا بھی میری زندگی کا خاتمہ کرسکتا تھا۔ چہرے اور خنجر کی نوک کے بیچ فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا۔ میرے بچنے کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ میں نے گھٹنا اس کی ٹانگوں میں رکھ کر زور سے جھٹکا دیا۔ نتیجہ کچھ خاطر خواہ نکلا۔ میرے سینے پر اس کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہوا۔ اب میں نے پیر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں پھنسا دیا اور اسے بتدریج اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ کلائی پر میں نے گرفت ڈھیلی نہیں کی تھی۔ خنجر میرے چہرے سے دور ہٹتا گیا اور پھر میں نے اپنی ٹانگ کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل گرا۔

میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ٹھنڈی ہوا کے باوجود میرا جسم پسینے میں شرابور ہورہا تھا۔ لکڑی کے تختوں اور رسّوں سے بنے ہوئے اس پُل پر بھی زلزلہ سا آیا ہوا تھا۔ اب کسی ایک جگہ قدم جما کر کھڑے رہنا مشکل ہورہا تھا۔

میرا دشمن بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ خنجر لہراتا ہوا بڑے خطرناک انداز میں آگے بڑھا اور حملہ کردیا۔ میں بڑی پھرتی سے جھکائی دے کر ایک طرف ہٹا۔ خنجر کی نوک میرے بائیں بازو پر آستین چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اگر ٹی شرٹ وغیرہ ہوتی تو میرے بازو کا گوشت کٹ جاتا مگر میں نے موٹے کپڑے کا مخصوص ڈریس پہن رکھا تھا جو خاصا ڈھیلا ڈھالا بھی تھا اور خنجر کی نوک اس لباس ہی کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

میں پُل کے رسّوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس وقت تو میری پیشانی بھی پسینے سے تر ہوگئی اور گردن پر بھی کیچوے سے رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔

اس شخص کے حلق سے کتّے کی طرح غراہٹیں خارج ہورہی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر حملہ کردیا۔ اس مرتبہ میں نے ہاتھوں سے اس کا وار بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ پُل کے رسّے کو پکڑ کر اپنی جگہ سے اچھلا۔ میری دونوں ٹانگیں بیک وقت مختلف انداز میں حرکت میں آئی تھیں۔ بائیں پیر کی ٹھوکر اس کے خنجر والے بازو کی کہنی پر نیچے کی طرف لگی جبکہ دائیں کک سیدھی اس کے منہ پر لگی۔

خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا دریا میں جاگرا۔ منہ پر لگنے والی کک سے وہ بری طرح چیخ اٹھا تھا... وہ بوکھلا کر گرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر دوبارہ حملہ کرے گا۔

اب کچھ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ہمارے کیمپ کی طرف سے تین چار آدمی دوڑتے ہوئے اس طرف آرہے تھے۔ وہ پل سے ابھی دور تھے۔ اس آدمی نے بھی پل کی طرف آتے ہوئے لوگوں کو دیکھ لیا۔ وہ اٹھ کر مخالف سمت میں بھاگ کھڑا ہوا لیکن میں نے اسے چند قدم سے زیادہ جانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے چھلانگ لگادی اور اسے ساتھ لیتا ہوا نیچے گرا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہورہے تھے۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ اب وہ اپنی جان چھڑانے کی کوشش کررہا تھا مگر میں نے اسے اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ اس کا کوئی بس نہیں چل رہا تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے پل کی ریلنگ سے ٹکرا گئے۔ پل کی ریلنگ اوپر نیچے موٹے موٹے تین رسّوں پر مشتمل تھی۔ ہر دو رسّوں کے درمیان ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ سب سے نیچے والے رسّے اور پل کے تختوں کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ تھا اور اس طرف نسبتاً کم موٹائی والے رسّوں کا جال سا بنا ہوا تھا اس لیے تختوں پر سے دریا میں گرنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔

جیسا کہ پہلے میں بتا چکا ہوں کہ میرا دشمن بہت پھرتیلا اور طاقت ور تھا۔ میں اگرچہ اسے قابو میں رکھنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا مگر وہ اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے میرے سینے پر دو تین ٹھوکریں ماریں اور ایک طرف چھلانگ لگادی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اس کا ایک پیر پکڑلیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ اس نے زوردار جھٹکا دے کر اپنا پیر چھڑا لیا اور اٹھ کر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ دو آدمیوں نے بیک وقت اس پر چھلانگ لگادی۔ وہ ایک بار پھر منہ کے بل گرا اور پھر اسے اٹھنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش ہورہی تھی۔

دو لڑکوں نے آگے بڑھ کر مجھے بھی اٹھادیا۔ میں رسّے کی ریلنگ سے ٹیک لگائے لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ وہ کم بخت سانڈ کی طرح طاقت ور تھا اور بہت اچھا مارشل آرٹسٹ بھی۔ وہ غالباً پہلا آدمی تھا جس سے میں اس طرح پٹا تھا لیکن مجھے اپنے پٹنے کا افسوس نہیں تھا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ ضائع ہورہا تھا۔

جن دو آدمیوں نے اس شخص کو گرفت میں لیا تھا، ان میں ایک تو کوچی تھا اور دوسرے کا نام میں نہیں جانتا تھا لیکن وہ تھا ہمارے ہی کیمپ کا۔ مجھے اٹھانے والوں کا تعلق بھی ہمارے ہی کیمپ سے تھا۔

کوچی وغیرہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے جارہے تھے۔ ساتھ چلنے والے دوسرے وقتاً فوقتاً ایک آدھ ہاتھ بھی لگا دیتے تھے۔ پل سے اتر کر دریا کے کنارے پر پہنچے تو وہاں کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے ہی کیمپ سے تھے اور کچھ کا تعلق آس پاس کے کیمپوں سے تھا۔ جو شور کی آواز سن کر آگئے تھے۔ اس طرح ہم جلوس کی صورت میں اپنے جمنازیم پہنچ گئے۔

جمنازیم میں ایک اور سنسنی خیز صورتِ حال ہماری منتظر تھی۔

صرف چند ہی لوگوں کو اندر آنے دیا گیا جبکہ باقی سب لوگوں کو باہر ہی روک دیا گیا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی بھی اس وقت جمنازیم میں موجود تھا اور وہ رنگ کے رنگین فرش پر پڑے ہوئے صباح پر جھکا ہوا تھا۔ صباح کو گردن میں جس جگہ وہ زہریلی سوئی چبھی تھی وہاں تقریباً نصف انچ چوڑا زخم تھا۔ جس پر ہرے رنگ کا کوئی پیسٹ لگا ہوا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی نے اس کی ایک کلائی تھام رکھی تھی۔ انگوٹھا نبض پر تھا۔ ماسٹر لیشی یان بھی قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر میرے قریب آگیا۔ میں نے صباح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولا۔

"بلو پائپ کی سوئیوں کے لیے عام طور پر سانپوں کا زہر استعمال کیا جاتا ہے۔ ماسٹر ہنگ پائی سانپوں کے زہر کا ماہر ہے۔ صباح کو زہر زائل کرنے کا انجکشن دیا جاچکا ہے اور یہ

گردن کے زخم پر جو پیسٹ دیکھ رہے ہو' یہ بھی خون میں سے زہر چوس رہا ہے۔ یہ پیسٹ دو مرتبہ تبدیل کیا جا چکا ہے۔ کچھ دیر میں یہ بھی سیاہ پڑ جائے گا تو اس کی جگہ دوسرا پیسٹ لگا دیا جائے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "شاؤلن ٹیمپل میں پہلے ہر ماسٹر اس قسم کے تیر بہ ہدف ٹوٹکے جانتا تھا لیکن اب اس سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ماسٹر ہنگ پائی کے علاوہ تین آدمی اور ہیں جو یہ فن جانتے ہیں۔ ایک ماسٹر ہو وانگ اور دو ٹیمپل کے راہب۔"

"یہ پیسٹ کس چیز کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جڑی بوٹیوں کا۔" لیشی یان نے جواب دیا "ان پہاڑیوں میں بہت سی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں مگر ان کی شناخت ہونی چاہیے۔"

"صباح بچ جائے گا نا؟" میں نے پوچھا۔

"بچ جانے کی امید تو پیدا ہو گئی ہے مگر اسے صحت یاب ہونے میں تین چار مہینے ضرور لگیں گے۔ خون سے زہر کا اثر مکمل طور پر زائل ہونے میں اتنا عرصہ تو لگے گا۔" ماسٹر لیشی یان نے جواب دیا۔

میں خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جانکی' کامنی اور چیکو میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ جمنازیم کے کچھ لڑکے اس شخص کو گھیرے کھڑے تھے جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔ میں مڑ کر جانکی سے باتیں کرنے لگا اور پھر شور کی آواز سن کر چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا۔ کوچی اور دو لڑکے اس شخص کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ کوچی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا وہ ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کی مٹھی بند تھی۔ کوچی ہاتھ کو اس کے منہ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ شخص ہاتھ اپنے منہ تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی مٹھی کھلی اور اس نے کوئی چیز منہ میں ڈال لی۔ اب کوچی اس کے گلے دبا رہا تھا۔ تاکہ اس چیز کو منہ سے نکال سکے مگر اس شخص نے بڑی سختی سے دانت بھینچ لیے تھے۔

اور پھر اس نے ایک دو جھٹکے لیے اور وہ ایک دم بے حس و حرکت ہو گیا۔ سائنائڈ کا ننھا سا کیپسول پیٹ میں جاتے ہی پھٹ گیا تھا اور اس کی ناک اور منہ سے خون کی دھاریں بہہ نکلی تھیں۔

○☆○

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔

میں اس وقت ماسٹر ہنگ پائی کے غار میں اس کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی اپنی مخصوص پتھر کی چوکی پر یوگا کے اسٹانس میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ ماسٹر ہنگ پائی نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ ہی اس کے لبوں کو حرکت ہوئی تھی۔ اس دوران میں گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس شخص نے سریع الاثر زہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کر لیا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل کی پولیس چوکی کو اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ پولیس جمنازیم کے لڑکوں کے بیانات لینے کے بعد اس شخص کی لاش اٹھا کر چلی گئی تھی۔ مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھا گیا تھا۔ ماسٹر کے حکم پر کیمپ کے کسی شاگرد کی زبان پر بھی میرا نام نہیں آیا تھا۔

صباح بچ گیا تھا۔ اسے دو گھنٹے بعد ایک اور انجکشن دیا گیا تھا اور پھر ماسٹر اس کے بارے میں لیشی یان کو ہدایات دیتا ہوا اپنی اس خلوت گاہ میں آ گیا تھا۔ چند منٹ پہلے مجھے ماسٹر کا پیغام ملا تھا۔ اس وقت بھی ماسٹر اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔ قدموں کی آہٹ پا کر اس نے میری طرف دیکھا' بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

دو منٹ اور گزر گئے اور پھر ماسٹر نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ نظریں میری آنکھوں کے راستے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہیں۔ میرے پورے بدن میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایک عجیب سرور تھا اس سنسنی میں بھی۔ ایک سحر۔ ایک نشہ جو ماسٹر کی نظروں سے میری آنکھوں کے راستے میرے پورے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اپنی نظریں ماسٹر کے چہرے سے نہیں ہٹا سکا۔ ہٹانا بھی نہیں چاہتا تھا مبادا اس سنسنی آمیز سرور سے محروم... ہو جاؤں جس نے میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

"وجدان!"

یہ کھنکتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں ایک جھرجھری سی لے کر رہ گیا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں ہوش میں آ گیا ہوں۔ ماسٹر کہہ رہا تھا۔

"وانگ ونگ یائے نے مجھے ٹیلی فون پر تمہارے بارے میں اطلاع دی تھی تو یہ بھی بتایا تھا کہ کچھ دشمن تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دشمن کون ہیں اور تمہیں کیوں مارنا چاہتے ہیں۔ تم نے بھی آج تک اس سلسلے میں زبان نہیں کھولی۔ کیا تمہیں ہم پر بھروسا نہیں؟"

"یہ آپ نے کیا کہہ دیا ماسٹر۔" میں تڑپ اٹھا "اگر بھروسا نہ ہوتا تو میں اس طرف کا رخ کبھی نہ کرتا۔"

"تو پھر تم نے اب تک زبان کیوں نہیں کھولی؟" ماسٹر نے کہا۔

"میں ہر جگہ اپنے دکھ کا افسانہ سنا کر اپنے آپ کو مظلوم ثابت نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا "یہاں مجھے آپ کی اتنی توجہ' اتنی محبت اور ہمدردی ملی ہے کہ میں نے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔"

"آدھا گھنٹا پہلے ٹیلی فون پر وانگ ونگ یائے سے میری بات ہوئی ہے۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے لیکن میں تمہاری داستان تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔" ماسٹر نے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہا پھر ماسٹر ہنگ پائی کو اپنی داستان سنانے لگا۔ آخر میں' میں کہہ رہا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ گولڈن ٹرائی اینگل سے فرار کے بعد انہوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے لیکن آج کا واقعہ۔ اس واقعے نے مجھے یاد دلا دیا ہے کہ میری جان کے دشمن مجھے بھولے نہیں ہیں۔"

"گویا تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ بلو پائپ کی زہریلی سوئی سے وہ حملہ صباح پر نہیں' تم پر کیا گیا تھا۔" ماسٹر نے کہا۔

"یس ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "میں نے حملہ آور کا پیچھا کر کے اسے پل پر پکڑ لیا تھا۔ جہاں اس نے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے مجھے بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھ پر حملہ کس کے ایما پر کیا تھا لیکن اس نے زہریلا کیپسول کھا کر خودکشی کر لی۔"

"اس خنجر کی نوک اگر تمہیں چبھ جاتی تو تم اگلا سانس نہ لے پاتے۔" ماسٹر نے کہتے ہوئے پتھر کی چوکی کے نیچے سے ایک خنجر نکال لیا۔

"مگر۔ یہ۔ یہ خنجر تو دریا میں گر گیا تھا۔" میں وہ خنجر دیکھ کر حیرت زدہ سا رہ گیا۔

"نہیں۔ یہ خنجر اس جگہ سے چند گز دور پل کے ایک رسے میں اٹکا ہوا تھا جہاں تمہاری فائٹ ہوئی تھی۔" ماسٹر نے بتایا "من شن ایک بڑا مارشل آرٹسٹ تھا۔ آج تک کوئی رنسٹ اسے چیلنج کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ جس نے اسے چیلنج کیا' وہ رنگ سے اسٹریچر پر ہی لے جایا گیا۔"

"آپ اسے جانتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے سب ہی جانتے ہیں۔" ماسٹر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "اس میں خرابی یہ تھی کہ وہ متلون مزاج تھا۔ کہیں ایک جگہ ٹکا نہیں تھا۔ اس کے دماغ میں بھی گرمی بھری ہوئی تھی۔ وہ تو اپنے ماسٹر کو بھی آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ اس کے بعد ہی سے وہ در در کی ٹھوکریں کھانے لگا تھا۔ کبھی ایک جمنازیم میں کبھی دوسرے میں۔ وہ ہمارے جمنازیم میں بھی اکثر آیا کرتا تھا لیکن رات کو شاید وہ تماشائیوں میں چھپ کر کھڑا تھا اس لیے کسی کی نظروں میں نہیں آ سکا۔ اس نے بلو پائپ سے نشانہ تمہیں ہی بنایا تھا مگر زد میں صباح آ گیا اور اگر تم من شن کو تاڑ نہ لیتے تو شاید وہ وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی نہ کرتا لیکن تم چیخ کر اس کی طرف لپکے تو وہ خطرہ محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑا ہوا اور پھر تم نے جس طرح اسے بے بس کر کے پکڑا وہ قابل تعریف ہے لیکن مجھے یہ افسوس رہے گا کہ وہ اس شخص کا نام بتائے بغیر ہی مر گیا جس نے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔"

"چند روز پہلے جانکی نے ایک مشتبہ آدمی کو دیکھا تھا۔" میں نے کہا اور پھر ماسٹر کو اس شخص کے بارے میں بتانے لگا "وہ خود سامنے نہیں آیا۔ مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے اس نے من شن کی خدمات حاصل کر لیں اور مجھے یقین ہے کہ دوبارہ بھی اسی قسم کی کوشش کی جائے گی۔"

"اب مجھے خیال رکھنا پڑے گا مگر تم۔۔۔" ماسٹر چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ میں تمہیں ذاتی دفاع کے حق سے محروم نہیں کرنا چاہتا لیکن دماغ کو ہمیشہ ٹھنڈا رکھو اور۔۔۔"

اور پھر ماسٹر ہنگ پائی کا لیکچر شروع ہو گیا جو ایک گھنٹے تک جاری رہا۔

اگلی صبح ایک اور سنسنی خیز انکشاف ہوا۔

میں اور جانکی حسب معمول ساڑھے پانچ بجے پہاڑی پر پہنچ گئے۔ ماسٹر ہنگ پائی بھی حسب معمول پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے پاس دو تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں تھیلوں کے منہ ڈوریوں سے بند تھے اور حرکت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان میں الگ الگ کوئی جانور بند ہیں۔

لیکچر ختم کرنے کے بعد ماسٹر ہنگ پائی نے بڑا تھیلا کھول لیا۔ اس میں بلی کی جسامت کا کوئی جانور تھا جو اس علاقے میں عام پایا جاتا تھا۔ ماسٹر اس جانور کو گود میں لیے کچھ دیر تک اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر قریب ہی پڑا ہوا وہ خنجر اٹھا لیا جس سے گزشتہ رات من شن نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

ماسٹر نے خنجر کی نوک اس جانور کے جسم پر رکھ کر ہلکا سا چرکہ لگایا۔ وہ جانور تڑپ کر ماسٹر کے ہاتھ سے نکلا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر زمین پر تڑپا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس جگہ چرکہ لگا تھا وہاں سے صرف دو تین قطرے ہی خون نکلا تھا جس کا مطلب تھا کہ چرکا بہت معمولی تھا لیکن خنجر کے زہر نے اسے آناً فاناً ختم کر دیا تھا۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا تھا۔ اسے رات ہی کو پتا چل گیا تھا کہ اس خنجر سے من شن نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور میں بھی یہ صورتِ حال دیکھ کر ایک لمحے کو کانپ کر رہ گیا تھا۔ گزشتہ رات اگر اس خنجر کی نوک بھی میرے جسم کو چھو جاتی تو میں اس وقت یہاں بیٹھا یہ سب کچھ نہ دیکھ رہا ہوتا۔

"یہ بہت چھوٹا سا جانور ہے۔" ماسٹر نے خنجر کی نوک اس جانور کے بالوں سے صاف کرتے ہوئے کہا "اگر اس خنجر کی نوک کسی صحت مند، ہٹے کٹے آدمی کے جسم کو بھی چھو جائے تو اسے بھی آخری سانس لینے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا۔" اس نے خنجر دائیں ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے بایاں ہاتھ آگے کو بڑھایا اور خنجر کی نوک کلائی کے قریب بازو پر پھیر دی۔

بازو پر تقریباً دو انچ لمبی لکیر بن گئی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں ماسٹر کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر ابھی تڑپنا شروع کر دے گا اور ایک منٹ کے اندر اندر ختم ہو جائے گا مگر ماسٹر کے چہرے پر طمانیت اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

جانگی بھی وحشت زدہ سی نظروں سے ماسٹر کے بازو کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں لگنے والے چرکے پر خون کے قطرے ابھر رہے تھے۔ ایک منٹ گزر گیا۔ دو منٹ۔۔۔ تین منٹ۔ ماسٹر اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں وحشت زدہ سی نظروں سے ماسٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا جبکہ چند منٹ پہلے میں زہر میں بجھے ہوئے اس خنجر کی کارکردگی دیکھ چکا تھا۔

ماسٹر ہنگ پائی نے زمین پر پڑا ہوا دوسرا تھیلا اٹھا لیا اور اس کے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھولنے لگا اور پھر اس تھیلے سے ایک سانپ کو برآمد ہوتے دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ زرد رنگ کا وہ سانپ تقریباً ڈیڑھ انچ موٹا اور ڈھائی فٹ لمبا تھا۔ زرد رنگ کی جلد پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے سیاہ دھبے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

ماسٹر نے اس سانپ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔

"یہ اس خطے کا سب سے خطرناک سانپ ہے۔" ... نے باری باری میری اور جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جس کو ڈس لیتا ہے اسے اگلا سانس لینے کا موقع بھی نہیں ... لیکن قدرت نے انسان کو بھی اتنی صلاحیتیں دی ہیں جن ... اسے اندازہ نہیں۔ اس کے اندر ہر قسم کی قوتِ مدافعت موجود ہے مگر وہ انہیں استعمال کرنا نہیں جانتا۔ قدرت نے انسان کے لیے ایسی جڑی بوٹیاں بھی پیدا کی ہیں جن ... موت کے علاوہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے مگر انسان ان ... چیزوں سے غافل ہو گیا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنی صلاحیتوں سے بھی محروم ہوتا جا رہا ہے۔"

ماسٹر بات کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کو آہستہ آہستہ ... اٹھا رہا تھا۔ سانپ کی دو شاخہ زبان بار بار لہراتی ہوئی ... آ رہی تھی۔ ماسٹر نے سانپ کا منہ اپنے گلے سے ذرا ... برہنہ سینے پر رکھ دیا اور اس کی گردن چھوڑ دی۔ گردن ... چھوٹتے ہی سانپ کا پھن پھیل گیا۔ اس کے منہ سے پھ... سی نکلی اور اس نے ماسٹر کے سینے پر منہ مار دیا۔

میرا خیال تھا کہ سانپ کے ڈستے ہی ماسٹر ہنگ پائی ... ہو جائے گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ماسٹر تو اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھا رہا البتہ سانپ اس طرح لہرانے لگا جیسے ... چڑھ گیا ہو اور پھر وہ ماسٹر کی گود میں گر گیا۔ اس کا زرد جسم ... سو بل کھا رہا تھا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ ماسٹر ... سانپ کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ میں نے ماسٹر کے سینے کی طرف دیکھا۔ جہاں سانپ نے کاٹا تھا وہاں خون کا ایک ... سا قطرہ چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"ابھی میں نے کہا تھا کہ قدرت نے انسان کو بے ... صلاحیتوں سے نوازا ہے۔" ماسٹر میری طرف دیکھتے ہوئے کہ رہا تھا "یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے یا انہیں ضائع کر دیتا ہے۔ میں نے اپنے ... یہ صلاحیت اجاگر کی ہے کہ دنیا کا کوئی زہر مجھ پر اثر نہیں کر سکتا۔ اس صلاحیت کو اجاگر کرنے میں چند جڑی بوٹیوں کے استعمال کے علاوہ مارشل آرٹ کو بھی بڑا دخل ... مارشل آرٹ پر عبور حاصل کیے بغیر کوئی صلاحیت حا... نہیں کی جا سکتی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جا... رکھتے ہوئے کہنے لگا "یہ فن بہت دلچسپ بھی ہے اور ... پُراسرار بھی اور یہ جگہ، شاؤلن ٹیمپل اس سے زیادہ ... پُراسرار... اس فن کو شاؤلن ٹیمپل نے جو ترقی دی ہے ... تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

"شاؤلن ٹیمپل کے بُدھ بھکشوؤں نے اس فن کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ زمانہ قدیم کے بُدھ بھکشو اس فن کے ذریعے اس قدر روحانی قوت حاصل کر چکے تھے کہ وہ ہاتھ کی ایک ضرب سے درجن بھر نیچے اوپر رکھی ہوئی اینٹیں توڑ دیتے۔ آنکھیں بند کر کے اڑتی چڑیا کا پر اس طرح نوچ لیتے کہ چڑیا کو اس کی خبر تک نہ ہوتی۔ پوری قوت سے کمان سے چھوڑے جانے والے تیر کو خالی ہاتھ پر روک لیتے۔ بُدھ بھکشو چی (CHI) سے حاصل ہونے والی قوت کے بل پر اپنے جسم کے کسی بھی حصے پر لگائی جانے والی ضرب کو برداشت کر لیتے۔ یہ چی کی قوت کا کمال تھا کہ شاؤلن ٹیمپل کے بدھ بھکشو ایک ہزار پاؤنڈ وزنی چیز بھی اس طرح اٹھا لیتے جیسے اس بوجھ کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو یا کسی اڑتے ہوئے پرندے کی پشت پر سوار ہو جاتے کہ پرندے کو اپنے اوپر لدے ہوئے بوجھ کا علم تک نہ ہو پاتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بدھ کے ان پیروکاروں نے یہ پُراسرار قوتیں کس طرح حاصل کیں؟ کیا یہ مارشل آرٹ کا کمال تھا یا اس میں کوئی اور روحانی قوت پوشیدہ تھی۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ یہ روحانی قوت چی تھی جو شاؤلن ٹیمپل کے ان بُدھ بھکشوؤں نے مارشل آرٹس کے ذریعے حاصل کی تھی۔

"آج کے دور میں صرف دو چار ہی ایسے ماسٹر موجود ہیں جن میں مارشل آرٹس کی یہ پُراسرار قوتیں موجود ہیں۔ وہ اس فن کو دوسروں کو منتقل کرنا چاہتے ہیں مگر کسی میں اتنا حوصلہ نہیں جو اتنی کٹھنائیاں برداشت کر سکے۔ تم۔۔۔" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا "بہت عرصے بعد تمہاری صورت میں مجھے وہ شخص نظر آ رہا ہے جو اپنے اندر حوصلہ رکھتا ہے اور اس کٹھن راستے پر چل سکتا ہے۔"

"میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا ماسٹر۔" میں نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ اپنے بارے میں ماسٹر ہنگ پائی کا یہ تبصرہ سن کر اپنے آپ میں ایک عجیب سی سنسنی کی سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔

ہمارا اس دن کا لیکچر ختم ہو گیا۔ پہاڑی سے اتر کر میں اور جانگی حسبِ معمول کچھ دیر تک پہاڑی راستوں پر جوگنگ کرتے رہے۔ جوگنگ اور دوڑ کو میں نے اپنی زندگی کا معمول بنا لیا تھا۔ اس سے اسٹیمنا برقرار رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ماسٹر کا لیکچر ختم ہونے کے بعد میں اور جانگی چالیس سے پینتالیس منٹ تک جوگنگ کرتے اور آخر میں دوڑ لگاتے۔ کہیں تو یہ فاصلہ دو میل کا ہوتا اور کہیں پانچ چھ میل کا۔ جانگی شروع شروع میں تو ہانپنے لگتی تھی مگر اب وہ اس کی

برصغیر کے نامور گلوکاروں کے سدا بہار گیتوں کا
نوٹیشن
اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف "دھن" بھی ہر ساز پر بجائی جا سکتی ہے
موسیقی کے حوالے سے
ابجدِ موسیقی
کے بعد ایچ اقبال کی دوسری کتاب
صفحات 200 سے زائد
قیمت 200 روپے
ڈاک خرچ 25 روپے
سفید کاغذ مجلد اور دلکش گردپوش
موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تحفہ!
اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 جہان محمد میموریل اسٹریٹ آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200
فون: 5802552-5895313
فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

عادی ہوگئی تھی۔

اس روز جمنازیم میں کلاس شروع ہوتے ہی لیشی یان کے لیے ماسٹر ینگ پائی کا بلاوا آگیا۔ وہ ماسٹر سے ملاقات کر کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو دیر تک گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے میرے بارے میں کچھ خاص ہدایات دی گئی تھیں۔

کلاس ختم ہونے کے بعد میں صباح کو دیکھنے کے لیے چلا گیا۔ وہ اپنے بستر پر بے سُدھ پڑا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر ہلکی سی نیلاہٹ تھی۔ گردن کے زخم پر بینڈیج لگی ہوئی تھی۔ اس کا سانس کبھی تیز ہوجاتا اور کبھی ہلکا۔ اس وقت کوچی بھی میرے ساتھ تھا۔ میں اس کی طرف مڑ گیا۔

"کیا کیفیت ہے اب؟" میں نے پوچھا۔

"زہر کا کچھ تھوڑا بہت اثر ہے مگر خطرے سے باہر ہے۔" کوچی نے جواب دیا "اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں تین چار مہینے لگ سکتے ہیں۔"

مجھے صباح کی حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔ بے چارہ بلاوجہ اس کرب میں مبتلا ہوگیا تھا۔

○☆○

میری شہرت اب چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ منگ شول کیمپ پہلے ہی خاصی شہرت رکھتا تھا لیکن میرے نام کے ساتھ اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر طرف میرے ہی چرچے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی بات تھی "منگ شول میں ایک نیا لڑکا آیا ہے جو بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر وہ ایسی ہی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا تو لوگ شاؤلن ٹیمپل کے ماسٹروں کو بھول جائیں گے اور صرف وجدان کا نام یاد رکھیں گے۔"

مجھے ایسی باتیں سن کر خوشی ضرور ہوتی تھی مگر تکبر یا غرور کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اب مختلف کیمپوں میں میری بھی اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ میں سب لوگوں سے بے تکلفی سے ملتا۔ ہر شخص میرا احترام کرنے لگا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جہاں میرے اتنے ڈھیر سارے دوست بن گئے تھے وہاں دشمنوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ ہلکسیان' ٹروڈر اور مجھ پر قاتلانہ حملہ کرانے والے جنرل کھوراٹ کے اس مشتبہ آدمی کے علاوہ کچھ پیشہ ور دشمن بھی پیدا ہوگئے تھے۔ جو مجھے زک پہنچانے کے لیے موقع کی تاک میں رہتے۔

قاتلانہ حملے والے واقعے کے بعد کئی روز سکون سے گزر گئے تھے۔ یہ بات ہر شخص تک پہنچ گئی تھی کہ میں نے اس رات من شن کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا اور پکڑے جانے کے بعد انتقام کے خوف سے اس نے زہریلا کیپسول کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس واقعے کے بعد کسی نے مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ماسٹر لیشی یان نے کئی آدمی اس مشتبہ شخص کی تلاش میں چھوڑ دیے تھے۔ جس کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ میرے اوپر قاتلانہ حملہ اس نے کروایا تھا۔ اس کا نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا مگر اس کا حلیہ سب کو بتا دیا گیا تھا۔ ٹھوڑی پر دائیں طرف چھوٹا سا سیاہ دھبا اس کی شناخت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہلکسیان کی تلاش بھی جاری تھی مگر وہ دونوں گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو چکے تھے۔ ٹروڈر اور اس کے لمبے بالوں والے ساتھی سے اکثر آمنا سامنا ہوتا تھا مگر وہ دونوں ہمیشہ آنکھیں چُرا کر گزر جاتے۔

کئی روز گزر گئے اور پھر ایک روز صبح سویرے ماسٹر لیشی یان مجھے اور جانگی کو لے کر پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ پہاڑیوں میں چکراتے ہوئے تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہم دریا کے کنارے ایک غار میں پہنچ گئے۔ یہ غار اندر سے بہت کشادہ تھا اور اس کے آخری حصے میں واقع ایک اور تنگ سے غار میں کچھ ایسی چیزیں رکھی ہوئی تھیں جو مارشل آرٹ کی ٹریننگ میں استعمال ہوتی تھیں۔ لیشی یان نے وہ چار چیزیں نکال لیں۔ ان میں مٹی کی بنی ہوئی ایک بھٹی بھی تھی جس کے اوپر پلیٹ فارم پر ریت کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس نے بھٹی میں لگے ہوئے برنر کو شعلہ دکھا دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ریت تپ گئی اور میری پریکٹس شروع ہوگئی۔ گرم ریت میں ہاتھوں کو دبائے رکھنا خاصا اذیت ناک تھا۔ یہ پریکٹس میں بنکاک کے نواح میں جنگل والے کیمپ میں بھی کر چکا تھا۔ اس کی ٹریننگ مجھے ماسٹر ہانگ سو نے دی تھی لیکن یہاں اس میں ذرا سی تبدیلی تھی۔ گرم ریت میں ہاتھ رکھنے کے بعد ریت سے بھرے ہوئے پیکٹوں پر پنچنگ کی پریکٹس بھی کرائی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی سیزرز ہینڈ ڈیفنس کی پریکٹس بھی کرائی جا رہی تھی۔

"یہ پریکٹس تمہارے ہاتھوں میں سختی پیدا کرنے کے لیے ہے۔" ماسٹر لیشی یان نے کہا "جب تم حریف کے حملے سے بچنے کے لیے سیزرز ہینڈ ڈیفنس کی ٹیکنیک استعمال کرو گے تو تمہاری کلائیوں میں دب کر حریف کے ہاتھ کی ہڈیاں چور چور ہو جائیں گی اور وہ زندگی بھر اپنا وہ ہاتھ استعمال نہیں کر سکے گا۔"

ماسٹر لیشی یان میرے سامنے کھڑا مجھے بتاتا رہا کہ سیزرز ہینڈ ڈیفنس ٹیکنیک کس طرح استعمال کی جاتی ہے۔ جانگی بھی میرے ساتھ یہ ٹیکنیک سیکھ رہی تھی لیکن اسے گرم ریت میں ہاتھ دبانے کو نہیں کہا گیا تھا۔

دوپہر تک ہماری یہ پریکٹس جاری رہی اور پھر ہم غار کے دہانے پر بیٹھ گئے۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

"بہت سے لوگ ہاتھ پیر چلانا تو سیکھ لیتے ہیں۔ وہ اچھے فائٹر بھی بن جاتے ہیں لیکن انہیں یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا سیکھ رہے ہیں۔" ماسٹر لیشی یان کہہ رہا تھا "المیہ تو یہ ہے کہ آج کے دور میں بہت سے ماسٹر بھی یہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے شاگردوں کو کیا سکھا رہے ہیں۔ وہ اسٹائل کے نام سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اس کا پس منظر نہیں جانتے۔ وہ صرف فائٹر بنا رہے ہیں' مارشل آرٹسٹ نہیں۔ ایک اچھا مارشل آرٹسٹ بننے کے لیے اس فن کے پس منظر اور تاریخ سے واقف ہونا بہت ضروری ہے تاکہ اسے اس کی روح کے مطابق سیکھا جائے۔ تم کنگ فو۔ووشو کی پریکٹس کر رہے ہو۔ آج میں تمہیں اس کا تھوڑا سا پس منظر سمجھانا چاہتا ہوں۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"آج لفظ کنگ فو کو مختلف معنی پہنائے جاتے ہیں لیکن اس کا اصل ترجمہ "بہتر طور پر سیکھا ہوا" ہے۔ جبکہ ووشو WU - SHU کے معنی مارشل آرٹس ہیں۔ اگر پورا نام KUNG FU WU SHU پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہوگا "بہتر طور پر سیکھا ہوا مارشل آرٹس۔" اس لیے کنگ فو کو فائٹنگ اسکلز یا کوئی اور معنی پہنانا درست نہیں ہے۔"

گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد میری پریکٹس پھر شروع ہوئی اور یہ سلسلہ سہ پہر تک جاری رہا۔ اپنے کیمپ کی طرف واپس جاتے ہوئے دو آدمیوں سے آمنا سامنا ہوگیا۔ عجیب سے حلیے تھے ان کے۔ میلے کچیلے کپڑے' بے تحاشا بڑھے ہوئے بال اور دونوں کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے نشہ کرنے کے عادی ہوں۔

اس غار میں پریکٹس کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ ایک روز دریا میں ایک کشتی پر چار آدمیوں کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میرے چونکنے کی وجہ ہلکسیان تھا جو ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ماسٹر لیشی یان کو اس کی طرف متوجہ کیا تو اس کی پیشانی پر بھی لکیریں سی ابھر آئیں۔

کشتی کنارے پر رک گئی تھی۔ دو آدمی نیچے اتر گئے اور کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ آگے چلی گئی۔ وہ دونوں آدمی اوپر آرہے تھے۔ ماسٹر لیشی یان نے جانگی کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں غار کے دہانے سے نکل کر نیچے اترنے لگے۔

ایک بڑے پتھر کی آڑ سے نکلتے ہی ان دونوں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ان دونوں کا تعلق مارشل آرٹ کے کسی ٹریننگ کیمپ سے ہی تھا لیکن حلیوں سے آوارہ گرد ہی لگتے تھے۔

ماسٹر لیشی یان ان سے سوالات کرتا رہا۔

باتیں کرتے ہوئے ان میں سے ایک نے اچانک ہی پستول نکال لیا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں خنجر نظر آنے لگا تھا۔ پستول کا رخ میری طرف تھا۔

ماسٹر لیشی یان گہری نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر اچانک ہی اس کی ٹانگ حرکت میں آئی۔ اس کا پیر پستول والے کے ہاتھ پر لگا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

میں نے خنجر والے پر حملہ کر دیا۔ اس نے بھی حملہ کیا تھا۔ میں پوری طرح دفاع نہیں کر سکا اور خنجر کی نوک میرے بائیں بازو پر کہنی سے ذرا اوپر گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی لیکن اس کے بعد میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ خنجر کی نوک نے میرے بازو کی کھال کو کاٹا تھا' زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اس لیے مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں نے اپنے حریف کو اٹھا کر پٹخ دیا۔

ماسٹر لیشی یان بھی اپنے حریف کی دُرگت بنا رہا تھا۔ میرے خیال میں ان دونوں نے ہم سے ٹکرا کر بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ میرے نام کی دھاک تو بیٹھی ہوئی تھی اور ماسٹر لیشی یان بھی نامی گرامی مارشل آرٹسٹ تھا۔ انہوں نے شاید پستول کے بل بوتے پر ہمیں زیر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پستول ہاتھ سے نکل جانے کے بعد خود ہی پٹ رہے تھے۔

ہم ان دونوں پر تقریباً قابو پا چکے تھے کہ یکایک جانگی کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔ میں نے اپنے حریف کی گردن بازو کی لپیٹ میں لے رکھی تھی۔ ایک زوردار جھٹکا اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ جانگی کی چیخ سن کر میں نے اوپر دیکھا تو میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔

غار کے دہانے پر ہلکسیان' جانگی کو گرفت میں لیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی دھار جانگی کے نرخرے کو چھو رہی تھی۔

"میرے آدمیوں کو چھوڑ دو۔" پچاس فٹ اوپر سے ہکسیان کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی "اگر ان میں سے کسی کو معمولی سا نقصان بھی پہنچا تو میں اس کا گلا کاٹ دوں گا۔"

میں کانپ اٹھا۔ صورتِ حال بڑی خطرناک تھی۔ جانگی مکمل طور پر ہکسیان کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے ہاتھ کی معمولی سی حرکت جانگی کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میں نے ماسٹر لیشی یان کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے حریف کا ہاتھ مروڑ کر اس کی پشت سے لگا رکھا تھا۔ ماسٹر کا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند تھا۔ شاید وہ اپنے حریف کی گردن یا کندھے پر چوٹ لگانا چاہتا تھا مگر جانگی کی چیخ سن کر اس کا ہاتھ ہوا ہی میں معلق رہ گیا تھا۔

میرے حریف کی گردن میرے بازو کی آہنی لپیٹ میں تھی۔ ایک زوردار جھٹکا اس کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا تھا لیکن یہ نئی صورتِ حال سامنے آتے ہی میرے بازو کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑنے لگی۔ میں نے ماسٹر لیشی یان کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے حریف کو آگے دھکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ منہ کے بل گرا۔ اس کا چہرہ ایک پتھر سے ٹکرایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

میری گرفت بدستور ڈھیلی ہو رہی تھی۔ میرا شکار بھی اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گرفت سخت کی اور ہلکا سا جھٹکا دے کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ بھی چیختا ہوا منہ کے بل گرا۔ وہ فوری طور پر نہیں اٹھ سکا تھا۔ وہیں بیٹھا گردن سہلاتا رہا۔ جبکہ اس کا دوسرا ساتھی بھی گھٹنوں کے بل بیٹھا اپنی پیشانی سے رسنے والا خون پونچھ رہا تھا۔ ان دونوں میں سے کسی نے بھی اٹھنے میں جلدی نہیں کی۔ انہیں شاید یہ اطمینان تھا کہ چونکہ جانگی ان کے گرو ہکسیان کے قبضے میں تھی اس لیے ہم کوئی حرکت نہیں کر سکیں گے۔

"تم دونوں میرے آدمیوں سے دور ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔" ہکسیان کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی "اگر کسی نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو یہ لڑکی زندہ نہیں بچے گی۔"

میں اور ماسٹر لیشی یان ان دونوں سے دور ہٹ کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ ہمارے پیچھے ایک چٹان تھی۔ اس طرح ہم عقب سے کسی ممکنہ حملے سے محفوظ ہو گئے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے درمیان بھی پانچ چھ گز کا فاصلہ رکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

ہکسیان نے جانگی کا ایک بازو مروڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اب جانگی کی شہ رگ سے ہٹ گیا تھا تاہم اس کی نوک گردن کو چھو رہی تھی۔ ہکسیان نے جانگی کو ہلکا سا دھکا دیتے ہوئے کچھ کہا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ سنائی نہیں دے سکا۔ مگر جانگی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

غار کے دہانے سے دریا کے کنارے تک ایک آڑی ترچھی ڈھلواں تنگ سی پگڈنڈی تھی۔ جانگی آگے تھی اور ہکسیان پیچھے۔ پشت سے لگا ہوا جانگی کا ہاتھ بدستور اس کی گرفت میں تھا۔ جانگی کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ خوف زدہ تھی۔ ظاہر ہے خنجر کی نوک شہ رگ سے لگی ہوئی ہو تو کسی بہادر آدمی کا بھی پتا پانی ہو سکتا ہے۔

وہ تقریباً آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ میں نے ان دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا جو ہمارے حریف بنے تھے۔ ماسٹر لیشی یان سے پٹنے والا شخص اِدھر اُدھر پتھروں میں اپنا پستول تلاش کر رہا تھا۔ جبکہ دوسرے کو بھی اپنے خنجر کی تلاش تھی جو میرے پیر کی ٹھوکر سے کہیں دور جا گرا تھا۔

میری نظریں دریا کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ کشتی چٹانوں کی آڑ سے نکل کر ایک بار پھر سامنے آ رہی تھی۔ اس میں اب صرف ایک ہی آدمی تھا جو آہستہ آہستہ چپّو چلا رہا تھا۔ جب ہم نے غار کے دہانے پر سے دیکھا تھا تو اس میں چار آدمی تھے۔ دو اس وقت کنارے پر اتر گئے تھے۔ اس سے آگے دریا میں ذرا سا گھماؤ تھا۔ آگے جا کر کسی چٹان کی آڑ میں ہکسیان بھی کشتی سے اتر گیا تھا۔ میں اور ماسٹر لیشی یان والی چٹان سے نیچے آ کر ان دونوں آدمیوں سے نمٹ رہے تھے اور اسی دوران میں ہکسیان چٹانوں کے اوپر سے ہوا غار کے دہانے پر پہنچ گیا تھا جہاں جانگی اس کے قابو میں آ گئی تھی اور اب وہ کشتی پھر سامنے آ گئی تھی لیکن کنارے سے تقریباً دس گز دور تھی۔

میں ایک بار پھر جانگی اور ہکسیان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ڈھلان پر آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے تھے اور پھر میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جو بالکل خلافِ توقع تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جانگی عورت ہونے کے ناتے مردوں کے مقابلے میں کمزور تھی۔ صنفِ نازک کو ہمیشہ نزاکتوں کا مجموعہ اور کمزور سمجھا جاتا ہے مگر تاریخ میں جا بجا ان عورتوں کے حوالے بھی موجود ہیں جنہوں نے مردوں کو ناکوں چنے چبوا دیے اور حکومتوں کے تختے الٹ دیے۔ میرے خیال میں عورت کمزور نہیں ہوتی۔ یہ صنف تو مردوں سے زیادہ باحوصلہ اور باہمت

ہے۔ ایک عام عورت بھی زندگی میں مردوں سے زیادہ دُکھ سہتی ہے مگر اس کی ہمت پست نہیں ہوتی۔ خود میرے سامنے ایسی کئی عورتیں موجود تھیں جنہوں نے بڑے حوصلے سے زندگی کی کٹھنائیوں کا مقابلہ کیا تھا اور پھر جانگی تو ان عام عورتوں سے مختلف بھی تھی۔ وہ کئی سال سے میرے ساتھ تھی اور قدم قدم پر خطرات کا سامنا کر رہی تھی۔ کئی مواقع تو ایسے بھی آئے تھے کہ اس نے اپنے سے زیادہ طاقت ور مردوں کو بھی دُم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ابھی چند ہی روز پہلے کی تو بات تھی کہ اس نے اور چیکو نے کم از کم دو مرتبہ لمبے بالوں والے اس غنڈے کی پٹائی کی تھی جو اپنے آپ کو ماسٹر سمجھنے لگا تھا۔ حالات نے جانگی کو سنگین سے سنگین تر صورتِ حال میں بھی ثابت قدم رہنے اور اس سے نمٹنے کا سلیقہ سکھا دیا تھا۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ صورتِ حال کتنی ہی نازک کیوں نہ ہو، جانگی نے اپنے ذہن کو ماؤف نہیں ہونے دیا تھا۔ بعض حالات میں تو اس نے ایسے فیصلے کیے تھے کہ میں خود بھی حیران رہ گیا تھا۔ اور اس کے ان جرأت مندانہ فیصلوں ہی کی بدولت ہم کئی مرتبہ ہاری ہوئی بازی جیتے تھے۔ اس وقت بھی اس نے ایک ایسی ہی حرکت کی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اندازے کی معمولی سی غلطی اس کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

ہموار زمین تک پہنچنے کے لیے دس بارہ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس جگہ پگڈنڈی میں ایک معمولی سا خم تھا۔ اس موڑ پر گھومتے ہوئے جانگی اچانک ہی بڑی تیزی سے نیچے بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے آزاد ہاتھ کو بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف گھمایا تھا۔

جانگی کے اس طرح اچانک بیٹھ جانے سے ہکسیان اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ جانگی کا ہاتھ بھی اس کی گرفت سے چھوٹ گیا۔ جانگی کے آزاد ہاتھ سے اس کی پنڈلی پر ضرب لگی تھی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس دوران میں جانگی نے نہایت جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کہنیوں کے بیک پشت سے بھی ایک ضرب لگا دی۔ ہکسیان جانگی کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل اس سے پانچ چھ فٹ آگے گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ہکسیان کی طرف دوڑ لگا دی اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ جبکہ ماسٹر لیشی یان نے اس شخص کی طرف چھلانگ لگا دی جو جھک کر زمین سے اپنا پستول اٹھا رہا تھا۔ ماسٹر لیشی یان کے دونوں پیر فلائنگ کک کے انداز میں اس کے پہلو پر لگے اور وہ چیختا ہوا دور تک قلابازیاں کھاتا ہوا چلا گیا۔ ماسٹر نے سنبھل کر دوسرے آدمی پر چھلانگ لگا دی اور اسے پتھروں پر رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔

جانگی ڈھلان کی پگڈنڈی پر بیٹھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس نے جو کرنا تھا وہ کر دیا تھا اور باقی کام ہم پر چھوڑ دیا تھا اور ہم اپنا کام کرنا اچھی طرح جانتے تھے۔

خنجر اب بھی ہکسیان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے خنجر والی کلائی گرفت میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اس کے اس بازو کے نیچے بغل میں زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا۔

میں نے دوسرا ہاتھ بھی ہکسیان کی کلائی پر جما دیا اور اپنا ایک گھٹنا کسی قدر اوپر اٹھا لیا۔ میں اس کی کہنی کو اپنے گھٹنے پر مارنا چاہتا تھا۔ اس طرح اس کی کہنی کا جوڑ نکل سکتا تھا مگر مجھے اس کا موقع نہیں ملا کیونکہ ہکسیان نے بڑی تیزی سے اپنی لات گھما دی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میری اس ٹانگ کے گھٹنے پر لگی جس پر میرا سارا بوجھ تھا۔

میری ٹانگ ایک دم دُہری ہو گئی اور میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ ہکسیان بھی میرے ساتھ ہی میرے اوپر گرا تھا۔ مگر اس کا خنجر والا بازو ابھی تک میری گرفت میں تھا۔

ہکسیان جسمانی لحاظ سے مجھ سے زیادہ طاقت ور تھا اگر وہ مجھ پر غلبہ پا لیتا تو میرا زندہ رہنا مشکل ہو جاتا مگر میں نے اس کو موقع نہیں دیا۔ وہ خنجر کو میرے گلے کی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ خنجر کو اپنے گلے سے دور رکھنے کی کوشش میں کامیاب رہتے ہوئے میں اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش بھی کرتا رہا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔

ہکسیان نے بھی میرے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اسے بازو سے پکڑ کر اپنے اوپر لادا اور دھوبی پاٹ کے انداز میں پٹخ دیا۔ وہ پشت کے بل پتھروں پر گرا۔ اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی تھی۔ اس مرتبہ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔

اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ایک لمحے کو دوسری طرف دیکھا، ماسٹر لیشی یان اپنے دونوں حریفوں سے خوب اچھی طرح نمٹ رہا تھا اور وہ کشتی اب تیزی سے کنارے کی طرف آ رہی تھی۔

میں نے گھوم کر ہکسیان پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ ایک مرتبہ اسے بھی موقع مل گیا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر زور

دار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میری کھوپڑی ایک بڑے پتھر سے ٹکرا گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اور پھر میں نے ہکسیان کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنا دفاع کر سکتا۔ وہ ابھی مجھ سے دور ہی تھا کہ اس کی چیخ سنائی دی۔

میں نے سر کو دو تین اور جھٹکے دیے۔ میری آنکھوں کے سامنے چھانے والی دُھند چھٹ گئی۔ ہکسیان میرے اوپر آنے کے بجائے قدرے بائیں طرف گرا۔ اس کے بائیں پہلو سے خون بہہ نکلا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر جانگی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔

مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ جانگی نے موقع ملتے ہی ہکسیان ہی کا خنجر اٹھا کر اس پر حملہ کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ہکسیان مجھے گرفت میں لے کر میری گردن مروڑ سکتا تھا۔

اس وقت پہلی بار میں نے جانگی کے چہرے پر بے پناہ درندگی کے آثار دیکھے تھے۔ وہ ہکسیان پر دوسرا حملہ کرنے کے لیے لپکی لیکن ہکسیان نے اٹھ کر دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔ جانگی اپنی ہی جھونک میں آگے جا گری تھی۔

وہ کشتی اب دریا کے کنارے سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ ہکسیان نے دوڑتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی اور کشتی کے قریب ہی پانی میں گرا۔ شڑاپ کی زوردار آواز ابھری۔ وہ گدلے پانی میں نیچے بیٹھتا چلا گیا اور پھر سطح پر ابھرتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے کشتی کا کنارہ پکڑ لیا۔ کشتی پر بیٹھے ہوئے شخص نے چپو چھوڑ کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ ہکسیان کشتی کے اندر ڈھیر سا ہو گیا۔ جبکہ دوسرے آدمی نے پھر چپو سنبھال لیے، وہ کشتی کو کنارے سے دور لے جانے لگا۔

میں پوری طرح اپنے حواس میں آ گیا تھا۔ میں سر جھٹکتا ہوا اٹھ گیا اور جانگی کو بھی سہارا دے کر اٹھا دیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے کی کرختگی غائب ہو گئی اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔

ماسٹر اپنے دونوں حریفوں کی خاطر خواہ تواضع کر رہا تھا اور پھر ہکسیان کو راہِ فرار اختیار کرتے دیکھ کر ان میں سے ایک نے موقع ملتے ہی دوڑ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کشتی سے چار پانچ فٹ پیچھے پانی میں گرا تھا اور بڑی تیزی سے ہاتھ مارتا ہوا کشتی کی طرف تیرنے لگا اور بالآخر اس نے کشتی کا کنارہ پکڑ لیا اور بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کشتی کے اندر گرانے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ ہکسیان یا دوسرے آدمی نے اسے کشتی پر کھینچنے میں کوئی مدد نہیں کی تھی۔

آخری حریف ماسٹر لیشی یان کا گھونسا کھا کر لڑکھڑاتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک گھونسا جڑ دیا۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر اس نے دریا کی طرف دوڑ لگا دی۔

کشتی اس دوران میں بہت دور جا چکی تھی۔ ایک بات تو طے تھی کہ ہکسیان وغیرہ اپنی جانیں بچا کر راہِ فرار اختیار کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے آخری ساتھی کو بچانے کے لیے کشتی واپس لائیں گے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ چند روز پہلے مجھے بلو پائپ کی زہریلی سوئی اور پھر زہریلے خنجر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں نے تعاقب کر کے حملہ آور من شن نامی شخص کو پکڑ لیا تھا مگر اس نے کچھ بتانے سے پہلے ہی زہریلا کیپسول کھا کر خودکشی کر لی تھی۔

من شن سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس سے تو میرا کبھی آمنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اوپر یہ حملہ کسی اور کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک نام ہکسیان کا تھا اور دوسرا وہ چہرہ تھا جس کی کئی روز پہلے جانگی نے نشان دہی کی تھی اور جانگی کے کہنے کے مطابق وہ جنرل کھوراٹ کا آدمی تھا اور آج پھر اس واقعے کو دُہرایا گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ ہکسیان مجھے اٹھا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اگر اس کا مقصد قتل کرنا ہوتا تو کشتی سے اتر کر کنارے پر آئے بغیر مجھے گولی ماری جا سکتی تھی لیکن جس طرح انہوں نے پلاننگ کی تھی اور جس طرح جانگی کو خنجر کی دھار پر رکھا گیا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے زندہ پکڑ کر کہیں اور لے جانا چاہتے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس روز مجھ پر بلو پائپ سے حملہ ہکسیان نے نہیں کرایا تھا۔ وہ چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا جس کی نشان دہی جانگی نے کی تھی۔

اور اس وقت اچانک ہی میرے ذہن میں خیال ابھرا تھا کہ ممکن ہے، ہکسیان کے ساتھ آنے والے اسے جانتے ہوں۔ دو آدمی ہکسیان کے ساتھ کشتی پر فرار ہو چکے تھے تیسرے نے میرے سامنے دریا میں چھلانگ لگائی تھی اور پھر اچانک چیخوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔

اس شخص نے ہم سے جان بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی لیکن وہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔ اب وہ مدد کے لیے چیخ رہا تھا۔ یہ پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں پانی کی لہریں نسبتاً تیز تھیں۔ وہ شخص لہروں کے ساتھ بہتا ہوا کبھی زیرِ آب چلا جاتا اور کبھی سطح پر ابھر کر چیخنے لگتا۔

میں نے ماسٹر لیشی یان اور جانگی کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے ہی لمحے دوڑتے ہوئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ وہ شخص لہروں کے ساتھ بہتا ہوا تقریباً بیس بائیس گز آگے جا چکا تھا اور میں اس سے پندرہ سولہ گز پیچھے تھا اور اس تک پہنچنے کے لیے پانی پر لمبے لمبے ہاتھ مار رہا تھا۔

بچپن میں، میں نے باقاعدہ پیراکی سیکھی تھی اور پھر زندگی کی اس دھوپ چھاؤں میں مجھے کئی مرتبہ دریاؤں اور نہروں میں تیرنے کا موقع ملا تھا اور میں ایک بہت اچھا پیراک بن گیا تھا۔

میں اس جگہ پہنچا جہاں اس شخص کو آخری بار دیکھا تھا لیکن وہ زیرِ آب جا چکا تھا۔ گدلے پانی میں نظر نہیں آ رہا تھا اور پھر مجھ سے دو گز کے فاصلے پر وہ پانی کی سطح پر نمودار ہوا تو میں تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

وہ بُری طرح بدحواس ہو رہا تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا، وہ میرے...... ساتھ لپٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔ وہ چیخ کر پیچھے ہٹا۔ پانی کی ایک لہر اُسے مجھ سے دور لے گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔

اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کا مقصد موقع سے فائدہ اٹھانا یا کسی قسم کا انتقام لینا نہیں تھا۔ کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانا ہو تو اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جانا چاہیے۔ بصورتِ دیگر وہ بدحواسی میں آپ کے ساتھ لپٹ کر آپ کو بھی لے ڈوبے گا۔

وہ ایک بار پھر پانی کی تہ میں بیٹھ رہا تھا مگر میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ بہاؤ کے مخالف سمت کسی دوسرے آدمی کو لے کر تیرنا خاصا مشکل کام تھا اور مجھے واقعی بہت دشواری پیش آ رہی تھی اور پھر میں نے ماسٹر لیشی یان کو دریا میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے غالباً میری مشکل کو سمجھ لیا تھا۔

ماسٹر لیشی یان نے ہم تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اس طرح ہم دونوں اس شخص کو بازوؤں میں پکڑ کر کنارے تک لانے میں کامیاب ہو گئے۔ کنارے پر کھڑی ہوئی جانگی نے اسے اوپر کھینچ لیا۔

ماسٹر لیشی یان نے اس شخص کو زمین پر اوندھا لٹا دیا اور اس پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس طرح غوطہ خوری کے دوران میں جو پانی اس کے پیٹ میں جا چکا تھا، وہ نکل گیا۔

وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن حواس بحال ہونے میں پندرہ بیس منٹ لگ گئے۔ ہم اسے اوپر غار میں لے گئے اور میں نے بالکل پولیس والے انداز میں اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

" ہکسیان کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی بات پوچھنے سے بہتر ہے کہ مجھے مار ڈالو۔" وہ شخص گہری سانس لیتے ہوئے بولا "اگر ہکسیان کو پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ مجھے اس طرح اذیتیں دے گا کہ میں مر بھی نہیں سکوں گا اور زندہ بھی نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے مار ڈالو۔ پلیز! مجھے مار ڈالو۔"

"اگر ہم نے تمہیں مارنا ہوتا تو دریا سے نہ نکالتے۔ تمہیں ڈوبنے دیتے اور ہم کنارے پر بیٹھے اطمینان سے تمہاری بے بسی کا تماشا دیکھتے رہتے۔" میں نے کہا "لیکن میں تمہیں ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ تم نے ہکسیان کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔ اس وقت بھی ہمارے رحم و کرم پر ہو لیکن وہ ہکسیان تمہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس نے اپنی جان تو بچا لی لیکن تمہیں موت کے جبڑوں میں چھوڑ دیا۔ کیا یہ تمہارے ساتھ زیادتی نہیں۔ تم اپنی زبان بند رکھ کر اس شخص کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو جسے تمہاری ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ کیا تم اس شخص پر بھروسا کر سکتے ہو؟"

"مجھے ہکسیان سے کوئی شکایت نہیں۔" اس شخص نے جواب دیا "میں نے جو کچھ بھی کیا، ہکسیان کے لیے نہیں، پیسوں کے لیے کیا تھا۔ اس نے مجھے ایک بڑی رقم دی تھی۔"

"اور مقصد کیا تھا؟ مجھے جان سے مار دیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تمہیں کڈنیپ کرنا چاہتا تھا۔" اس شخص نے جواب دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ مجھے ہکسیان کی پلاننگ سے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔

" ہکسیان سے میرا کچھ پرانا حساب کتاب چل رہا ہے۔ وہ کئی بار مجھ سے زک اٹھا چکا ہے۔ وہ مجھے قتل تو کر سکتا ہے لیکن کڈنیپ...! وہ مجھے اغوا کر کے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ کس کے لیے کام کر رہا ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"مم... میں کچھ نہیں بتاؤں..."

ماسٹر لیشی یان کے تھپڑ نے اسے جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چیختا ہوا بائیں طرف لڑھک گیا۔ ماسٹر لیشی یان نے یکے بعد دیگرے تین چار ٹھوکریں رسید کردیں۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ ماسٹر نے اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اس کے منہ سے ایک اور خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"تمہیں ڈوبنے سے اس لیے نہیں بچایا گیا تھا کہ ہم تمہاری مٹھی چاپی کریں گے۔" ماسٹر اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا "وجدان فطرتاً رحم دل ہے۔ یہ اپنی جان کے دشمنوں پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی ہچکچاتا ہے لیکن میں اس سے بہت مختلف ہوں۔ اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو میں تمہارے منہ میں ہاتھ ڈال کر زبان کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا۔ پہلے اپنا نام بتاؤ اور یہ بتاؤ کہ کس کیمپ سے تعلق رکھتے ہو۔ میں تمہیں صرف تیس سیکنڈ کا وقت دیتا ہوں۔ اس کے بعد میرا ہاتھ حرکت میں آجائے گا۔"

اس شخص کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ آنکھوں میں بے پناہ وحشت ابھر آئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ماسٹر نے جو کچھ کہا تھا، تیس سیکنڈ گزرنے کے بعد اس پر عمل بھی کر ڈالے گا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے فر فر بولنا شروع کردیا۔

اس کا نام موسا شارو تھا اور اس کا تعلق جس کیمپ سے تھا اس کا ماسٹر بھی خاصا بدنام تھا۔ اس جاپانی ماسٹر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ مارشل آرٹسٹوں کی نہیں، غنڈوں اور قاتلوں کی جماعت تیار کر رہا ہے۔ اسے عام طور پر ٹربل میکر کہا جاتا تھا۔ اس کے شاگرد ہر ایک سے پنگے بازی کرتے رہتے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ہمیشہ پٹتے ہی تھے لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے۔

موسا شارو بھی جاپانی ہی تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق تقریباً ایک ہفتہ پہلے ہکسیان نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہکسیان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ ہکسیان مجھے اغوا کرانا چاہتا تھا اور اس کے عوض اس نے ایک معقول رقم کی پیشکش کی تھی۔

"میں تمہارے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں جانتا تھا کہ تمہیں چھیڑنا اپنی شامت بلانے کے مترادف ہے۔ میں تمہارے ہاتھوں بعض دوسرے لوگوں کا حشر دیکھ چکا تھا لیکن ہکسیان نے جو منصوبہ بنایا تھا وہ خاصا جاندار تھا۔ ہکسیان نے یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ ہم چار ہوں گے اور تم صرف دو۔ اس لڑکی کو اس نے کسی شمار میں نہیں سمجھا تھا۔" اس نے جانگی کی طرف اشارہ کیا "ہکسیان کو معلوم تھا کہ تم تینوں روزانہ یہاں کسی قسم کی پریکٹس کے لیے آتے ہو۔ اس نے کئی روز تک تمہاری نگرانی کرائی تھی اور یہ اطمینان کرلیا تھا کہ تم تینوں کے سوا یہاں کوئی اور نہیں ہوتا۔

"اس کا پروگرام یہ تھا کہ ماسٹر لیشی یان اور اس لڑکی کو بے بس کرکے تمہیں کشتی پر ڈال کر لے جائیں گے۔ ہمیں یہ ایڈوانٹیج تھا کہ ہمارے پاس اسلحہ تھا اور تم خالی ہاتھ تھے مگر ہم بھول گئے تھے کہ تمہارا خالی ہاتھ ہونا زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

"ہکسیان کس کے لیے کام کر رہا ہے۔ وہ مجھے اغوا کرکے کہاں لے جانا چاہتا تھا؟" اس مرتبہ یہ سوال میں نے کیا تھا۔

موسا شارو کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ شاید کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سوال دُہرایا۔ اس نے اس مرتبہ بھی زبان بند رکھی۔ آنکھوں میں خوف کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے مگر بتانا نہیں چاہتا۔ میں نے اچانک ہی اس کے منہ پر سامنے ایک زوردار پنچ رسید کردیا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے گرا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر دوبارہ سیدھا کردیا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا تھا اور جب اس نے تھوکا تو خون کے ساتھ ایک دانت بھی باہر گرا تھا۔ اپنا دانت دیکھ کر وہ اور بھی زور زور سے چیخنے لگا۔

"ایک ایک کرکے تمہارے سارے دانت نکال دوں گا۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "بتاؤ۔ ہکسیان مجھے کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے؟"

میرا ہاتھ پھر فضا میں بلند ہوا۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چہرے کے سامنے کردیا۔

"بب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" وہ ہکلایا۔ منہ سے چلو بھر خون تھوکا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس کا نام میگا تیراڈ ہے اور وہ تھائی لینڈ کا رہنے والا ہے۔" اور پھر اس نے میگا تیراڈ کا جو حلیہ بتایا تو میں چونک گیا۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سرہلا کر میرے خیال کی تصدیق کردی۔ یہ وہی آدمی تھا جس کی نشان دہی چند روز پہلے جانگی ہی نے کی تھی اور میں اسے صرف ایک مرتبہ دیکھ سکا تھا۔

"وہ تو کوئی مارشل آرٹسٹ نہیں ہے۔ یہاں شاؤلن ٹیمپل میں کیا کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا مارشل آرٹ سے تعلق نہیں۔" موسا نے جواب دیا "میگا کے بارے میں ہکسیان نے کچھ اور بتایا تھا۔ اور میرا خیال ہے اس نے تم کو بھی بتایا ہوگا۔"

"کیا بتایا تھا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"ہکسیان نے بتایا تھا کہ میگا کا تعلق گولڈن ٹرائی اینگل سے ہے۔ وہ گولڈن ٹرائی اینگل کے بے تاج بادشاہ جنرل کھوراٹ کا خاص آدمی ہے اور تمہارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آیا ہے۔ تم جنرل کھوراٹ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر بھاگے ہوئے ہو۔ میگا تمہیں پکڑ کر واپس لے جانا چاہتا ہے۔ اگر ہم نے اس کا ساتھ دیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو وہ ہمیں بھی اپنے ساتھ گولڈن ٹرائی اینگل لے جائے گا۔"

"جانتے ہو گولڈن ٹرائی اینگل کیسی جگہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں لیکن سنا ہے کہ وہ علاقہ دنیا میں ہیروئن کی تیاری کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ وہاں صرف جنرل کھوراٹ کی حکمرانی ہے۔ وہاں بے پناہ دولت ہے اور۔۔۔"

"گولڈن ٹرائی اینگل ایک ایسا جہنم ہے جہاں جانے کے بعد کوئی واپس نہیں آسکتا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "وہاں تم جیسے لوگوں سے بیگار لی جاتی ہے۔ اور وہ آخری سانس تک زندگی کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ وہ موت کا ایک ایسا حصار ہے جہاں سے کوئی نکل نہیں سکتا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اور تم خوش ہو کہ تمہیں گولڈن ٹرائی اینگل جانے کا موقع مل رہا تھا۔"

"تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو وجدان۔" ماسٹر لیشی یان نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "یہ وہ لوگ ہیں جو چند ٹکوں کے لیے جہنم میں بھی کود سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔ اس لیے انہیں کوئی سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کرنا بیکار ہے۔ اس سے یہ پوچھو کہ اس رات مین شن نے کس کے کہنے پر تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔"

"میگا کے کہنے پر۔" موسا میرے پوچھنے سے پہلے ہی بول پڑا "میگا نے ہکسیان کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر ہم تمہیں پکڑنے میں کامیاب نہ ہوسکیں تو تمہیں مار ڈالا جائے۔"

بات اب واضح ہوگئی تھی۔ اس رات بھی مجھ پر قاتلانہ حملہ میگا تیراڈ کے کہنے پر کیا گیا تھا اور آج کی کارروائی بھی اس کے کہنے پر عمل میں آئی تھی۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ معلوم ہوچکا تھا۔ موسا اب ہمارے لیے بیکار تھا۔ میں نے ماسٹر لیشی یان کی طرف دیکھا۔ اور پھر ہم موسا کو دوبارہ دریا کے کنارے پر لے آئے۔ اس مرتبہ جانگی بھی ہمارے ساتھ تھی۔

موسا الجھی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں اور پھر اچانک ہی ماسٹر لیشی یان اور میں نے موسا کو بانہوں اور ٹانگوں سے پکڑ لیا اور اسے دریا کے بالکل کنارے پر لے آئے۔ چند سیکنڈ ہم اسے جھولے کی طرح جھلاتے رہے اور پھر اچھال کر دریا میں پھینک دیا۔

وہ کنارے سے تقریباً دس فٹ دور پانی میں گرا تھا۔ وہ ہاتھ پیر مارتے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا۔ پانی کی تیز لہریں اسے بہاتی ہوئی کنارے سے دور لے جارہی تھیں۔ میں نے کنارے پر بیٹھ کر پانی میں ہاتھ دھوئے۔ کچھ چھپکے منہ پر بھی مارے اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں ایک دم نارمل ہوگیا تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ماسٹر لیشی یان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں فطرتاً رحم دل واقع ہوا ہوں لیکن حالات و واقعات نے میرے اندر کچھ سختی بھی پیدا کردی تھی اور میں ان لوگوں کو تو زندہ چھوڑنے کو بالکل تیار نہیں تھا جو میرے وجود کو اس دنیا سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ موسا شارو کو دریا میں پھینک کر میں نے کوئی برا نہیں کیا تھا بلکہ دنیا کو ایک برائی سے نجات دلادی تھی۔ اگر میں ان کے ہاتھ لگ جاتا تو کیا یہ مجھے زندہ چھوڑ دیتے؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لڑائی کے آخری لمحوں میں جب میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا اور میں وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا تو ہکسیان نے فیصلہ کن انداز میں مجھ پر حملہ کیا تھا اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا تو وہ میری گردن مروڑ دیتا مگر عین وقت پر جانگی کی مداخلت نے مجھے بچالیا تھا۔ جانگی کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد ہکسیان بھاگ نکلا تھا۔

عام طور پر اس وقت تک ہم لوگ اپنی پریکٹس مکمل کرکے واپس چلے جایا کرتے تھے لیکن آج اس پھڈے کی وجہ سے خاصی دیر ہوگئی تھی۔ دوبارہ غار میں آکر ہم نے اپنا سامان سمیٹا اور واپس چل پڑے۔

اپنے کیمپ میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ماسٹر لیشی یان نے ماسٹر ہنگ پائی کو سب کچھ بتادیا اور یہ بھی بتادیا کہ اس رات بلو پائپ سے مجھ پر قاتلانہ حملہ کس کے کہنے پر کیا گیا تھا لیکن لیشی یان یہ بات گول کر گیا تھا کہ ہمارے ہاتھوں موسا کا

کیا انجام ہوا تھا۔

اس روز دوپہر کو ہم اپنے غار والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چیکو خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس کے لیے سب کچھ غیر معمولی تھا۔ اور وہ اس قسم کے حالات سے شاید گھبرا گئی تھی۔

"اگر تم چاہو تو واپس چلی جاؤ۔" میں نے چیکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں ماسٹر لیشی یان سے کہہ کر ایسا بندوبست کرا دوں گا کہ تمہیں بحفاظت ڈان کنگ یا جہاں تم کہو وہاں تمہیں پہنچا دیا جائے۔"

"نہیں۔" چیکو نے نفی میں سر ہلا دیا "میرا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس قسم کے حالات کی عادی نہیں ہوں نا اس لیے کچھ پریشان ہو گئی ہوں۔ رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤں گی۔"

اس شام کامنی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس سے یہ دلچسپ اطلاع ملی کہ ہکسیان کو ایک کار میں شاؤیانگ قصبے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ وہ شاید زخمی تھا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی اور بھی تھا۔

"تم نے خود اسے دیکھا تھا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" کامنی نے اثبات میں سر ہلایا "اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات تھے اور وہ جھک کر چل رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا۔"

"دوسرے آدمی کا حلیہ بتاؤ۔" میں نے کہا۔

اس نے جو حلیہ بتایا' وہ ان دونوں آدمیوں سے بالکل مختلف تھا جو کشتی پر اس کے ساتھ فرار ہوئے تھے۔ کامنی کو ابھی تک ہم نے صبح کے واقعات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ ماسٹر ہنگ پائی کے سوا ہم نے کسی اور سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ دراصل ہم اس واقعے کی تشہیر نہیں چاہتے تھے لیکن اب کامنی کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے جانگی کی طرف دیکھا اور پھر کامنی کو صبح کے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

" ہکسیان' جانگی کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "اگر جانگی اس پر خنجر سے حملہ نہ کرتی تو وہ میری گردن مروڑ دیتا۔ لیکن ایک ہی زخم کھانے کے بعد وہ بھاگ نکلا اور اب تمہارے کہنے کے مطابق اسے شاؤیانگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"یہاں کوئی ایسا اسپتال نہیں ہے۔ جہاں اس قسم کے زخموں کا علاج ہو سکے۔" کامنی نے کہا "ٹریننگ۔۔۔ میں اسٹوڈنٹس کو چوٹیں تو لگتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی۔۔۔ اور گھٹنوں کے جوڑ بھی ہل جاتے ہیں مگر ماسٹرز ان کا۔۔۔ علاج خود ہی کر لیتے ہیں۔ چاقو' خنجر وغیرہ سے زخم۔۔۔ بات ہے۔ یہاں ایسے علاج کے لیے مناسب سہولت۔۔۔ ہیں۔ شاؤیانگ ایک بڑا قصبہ ہے۔ ہو سکتا ہے۔۔۔ اپنے زخم کے علاج کے لیے وہاں گیا ہو۔"

"میں کچھ اور بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے۔۔۔ نے بتایا تھا کہ میگا شاؤیانگ میں رہائش پذیر ہے۔۔۔ کے توسط سے اس کی میگا سے ملاقات بھی شاؤیانگ۔۔۔ مکان میں ہوئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ہکسیان اس۔۔۔ گیا ہوگا مگر موسا اس مکان کا پتا نہیں بتا سکا تھا۔"

"اگر ہکسیان وہیں گیا ہے تو مکان کا پتا آسانی سے۔۔۔ جا سکتا ہے۔" کامنی نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

" ہکسیان جس کار پر گیا ہے وہ کرائے کی کار ہے۔" کامنی نے بتایا "ٹیکسی سمجھ لو۔ یہ کار شاؤلن ٹیمپل اور شاؤ یانگ کے درمیان چکر لگاتی رہتی ہے۔ میں بھی ایک مرتبہ شاؤیانگ جا چکی ہوں۔ ڈرائیور مورو تانگ سے۔۔۔ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ہکسیان کو کہاں چھوڑا تھا۔"

"او۔ گڈ۔ اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا "مورو۔۔۔ کہاں ملے گا۔ میرا مطلب ہے اس کی کار کہاں کھڑی ہوتی ہے؟"

"ماسٹر دوپن کے جمنازیم کے سامنے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ ہے۔" کامنی نے بتایا "مورو تانگ عام طور پر ریسٹورنٹ کے سامنے کار کھڑی کر کے ریسٹورنٹ میں یا آس پاس کہیں بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں۔۔۔ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔"

"کیا وہ ایک ہی کار ہے جو شاؤلن ٹیمپل اور شاؤ۔۔۔ کے درمیان ٹیکسی کے طور پر چلتی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" کامنی نے نفی میں سر ہلایا "شاؤ۔۔۔ یہاں تک کوئی پبلک ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔ اس۔۔۔ حال سے فائدہ اٹھا کر کچھ لوگوں نے اپنی پرائیویٹ کار کو ٹیکسی بنا لیا ہے۔ یہ باقاعدہ رجسٹرڈ ٹیکسیاں نہیں ہیں۔۔۔ سات کاریں ہیں جو مختلف جگہوں پر کھڑی ہوتی ہیں۔ مورو تانگ نے دوپن جمنازیم کے سامنے والے ریسٹورنٹ کو اس طرح سے اپنا اسٹینڈ بنا رکھا ہے۔"

ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

"ہوں۔۔۔ رات نو بجے ٹریننگ سیشن ختم ہونے کے بعد میں نے لیشی یان سے بات کی۔ وہ خود میرے ساتھ جانے کو تیار تھا مگر میں نے اس معاملے میں اسے ملوث کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں ماسٹر لیشی یان ایک بڑا نام تھا۔ مارشل آرٹس کے حلقوں میں اسے ایک معزز مقام حاصل تھا۔ میں اسے ان چھوٹی باتوں میں گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں اگر صرف کوچی میرے ساتھ ہو تو میرے لیے کافی ہوگا مگر ماسٹر لیشی یان نے کوچی کے علاوہ ایک اور لڑکا بھی میرے ساتھ کر دیا۔ یہ تھائی لینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کا شمار بھی ماسٹر کے چند بہترین شاگردوں میں ہوتا تھا۔

ہم کامنی کے ساتھ اپنے کیمپ سے روانہ ہوئے تو دس بجنے والے تھے۔ اس وقت بیشتر جمنازیمز کی کلاسز ختم ہو رہی تھیں جس وجہ سے سڑکوں پر خاصی رونق رہتی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد تک سارے ریسٹورنٹس بھی آباد رہتے تھے۔

ہم مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے ماسٹر دوپن کے جمنازیم کے سامنے آ گئے۔ جمنازیم بند ہو چکا تھا البتہ سامنے والے ریسٹورنٹ میں رونق تھی۔ مگر اس ریسٹورنٹ کے آس پاس کوئی کار کھڑی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ریسٹورنٹ کے سامنے پہنچ کر کامنی کو ہم نے رخصت کر دیا تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹا ہم ریسٹورنٹ کے باہر ایک بنچ پر بیٹھے رہے پھر کوچی نے اندر جا کر معلوم کیا تو پتا چلا کہ مورو تانگ کو آج دوپہر کے بعد سے نہیں دیکھا گیا۔

ہم نے ساڑھے گیارہ بجے تک وہاں کھڑے ہو کر انتظار کیا مگر مورو تانگ نظر نہیں آیا۔ مزید انتظار بیکار سمجھ کر ہم واپس آ گئے۔ مجھے اب مورو تانگ کے حوالے سے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔ اس کے بارے میں کامنی نے بھی بتایا تھا اور ریسٹورنٹ سے بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ ہر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد اس کی کار ریسٹورنٹ کے سامنے اپنے اسٹینڈ پر آ جاتی تھی مگر وہ دوپہر کے بعد سے غائب تھا اور کامنی نے بھی ہکسیان کو دوپہر کے لگ بھگ ہی اس کی کار میں دیکھا تھا۔

میں نے ماسٹر لیشی یان کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس کی آنکھوں میں بھی تشویش کی لہریں ابھر آئیں۔

"یہ تو سنجیدہ صورتِ حال ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا "کل تک انتظار کرنا ہوگا۔"

میں اپنے کمرے میں آیا تو جانگی اور چیکو سو چکی تھیں۔ میں بھی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

صبح حسبِ معمول ماسٹر ہنگ پائی کے ساتھ سیشن شروع ہوا۔ اس نے مجھے چی کی پریکٹس شروع کرا دی تھی۔ شروع میں تو جانگی بھی اس پریکٹس میں شریک رہی لیکن پھر اس نے ہمت ہار دی۔ چی کی پریکٹس واقعی بہت مشکل تھی۔ سارا کمال سانس کا تھا۔ بعض اوقات اتنی دیر تک سانس روکنا پڑتا کہ پھیپڑے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگتے لیکن میں نے بہرحال یہ پریکٹس جاری رکھی۔

صبح ماسٹر ہنگ پائی کے ساتھ اس سیشن کے لیے حسبِ معمول ہم اس غار میں چلے گئے جہاں میری "سیزرز ہینڈ" پریکٹس ہوا کرتی تھی۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم کیمپ میں پہنچے تو ایک نئی اطلاع ہماری منتظر تھی۔

یہ اطلاع لانے والا جمنازیم کا ایک شاگرد تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق آج صبح چھ بجے وہاں سے تقریباً چار میل آگے جہاں دریا پہاڑیوں سے نکل کر میدانی علاقے میں داخل ہوتا تھا' ماہی گیروں کو تین آدمیوں کی لاشیں ملی تھیں۔ ایک لاش دریا کے کنارے پر اور دو لاشیں دوسرے کنارے پر جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی ملی تھیں۔ ماہی گیروں کے خیال میں ان لوگوں کا تعلق شاؤلن ٹیمپل کے کسی کیمپ سے ہو سکتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے یہاں کی پولیس چوکی کو اس کی اطلاع دے دی تھی اور پولیس ان لاشوں کو اٹھا لائی تھی جو اب بھی پولیس چوکی میں رکھی ہوئی تھیں۔

میں اور ماسٹر لیشی یان فوراً ہی پولیس چوکی پہنچ گئے۔ ہمیں فوراً ہی لاشیں دیکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ ان میں ایک لاش تو اس آدمی کی تھی جسے ہم نے دریا میں پھینکا تھا۔ اور باقی دو لاشیں ان دو آدمیوں کی تھیں جو گزشتہ روز کشتی پر ہکسیان کے ساتھ فرار ہوئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ہکسیان نے ان دونوں آدمیوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے انہیں دریا میں پھینک دیا ہوگا۔ اور خود کنارے پر پہنچ کر مورو تانگ کی کار پر فرار ہو گیا۔ کامنی کے کہنے کے مطابق اس کے ساتھ کوئی اور آدمی بھی تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے ہکسیان نے دریا پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا۔ اب مجھے مورو تانگ کی زیادہ فکر ہونے لگی تھی۔

ماسٹر لیشی یان نے صبح ایک لڑکے کو مورو تانگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپ دی تھی۔ پہاڑی غار سے ہماری واپسی اگرچہ بارہ بجے کے قریب ہوئی تھی لیکن وہ لڑکا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

اس کی واپسی تقریباً دو بجے کے قریب ہوئی تھی۔ اس سے ملنے والی اطلاع بڑی سنسنی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ پہلے تو شاؤلن ٹیمپل ہی کے علاقے میں مورو تانگ کو تلاش کرتا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا اور پھر شاؤیانگ پہنچ گیا۔

مورو تانگ کی کار ایک سڑک پر کھڑی ہوئی مل گئی۔ شاؤیانگ میں بھی بہت سے لوگ مورو تانگ کو جانتے ہیں۔ پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی گاڑی کل شام سے وہاں کھڑی ہے لیکن کوئی بھی شخص یہ نہیں بتا سکا کہ وہ گاڑی کب وہاں چھوڑ کر گیا تھا۔

مورو تانگ کے بارے میں میرے وسوسے اب یقین میں بدلتے جا رہے تھے۔ ہکسیان کو بھی میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ نہایت کینہ پرور اور گھٹیا آدمی تھا۔ جو شخص ڈاکوؤں کے ایک منظم گروہ میں پھوٹ ڈال کر انہیں آپس میں لڑا کر مروا چکا ہو' اس کے بارے میں آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوگا۔ وہ جس طرح ہمارے پیچھے پڑا ہوا تھا اس سے بھی اس کی گندی فطرت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور پھر یہ محض اتفاق تھا کہ شاؤلن ٹیمپل پہنچتے ہی پہلے اس کی ملاقات ٹروڈر جیسے غنڈوں سے ہوئی اور پھر اسے میگا تیراؤ مل گیا۔

میں اسے اتفاق کہوں یا کچھ اور لیکن یہ کہاوت بالکل صادق آتی تھی کہ "کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ کبوتر با کبوتر باز با باز۔" مجھے زندگی میں اب تک جو بھی لوگ ملے تھے' وہ نہایت شریف' سچائی کا ساتھ دینے والے اور کھرے لوگ تھے۔ ان میں پرتاب سنگھ' مہاراج' تھائی وانگ' جانکی' چیکو وغیرہ قابل ذکر تھے اور اب مجھے ماسٹر بینگ پائی اور ماسٹر لیشی یان جیسے لوگوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے برعکس وارا کو اسی کے قماش کے لوگ ملتے رہے تھے۔ ٹائیگر' پیڈرو' چی فانگ جیسے بدفطرت' غنڈے اور بدمعاش اس کے حصے میں آئے تھے اور اب ہکسیان کا قصہ تھا۔ زندگی کے اس مرحلے میں مجھے چیکو جیسی لڑکی ملی تھی۔ جو طوائف تھی اور صرف دولت ہی کو زندگی کا مقصد سمجھتی تھی لیکن وہ اپنے گھر کو بھول کر محض اس لیے میرا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی تھی کہ اگر ڈانگ کو کار رئیس سیان چانگ اپنی بیوی۔ کاراشان کے قتل میں ہمیں پھنسانے کی کوشش کرے تو وہ ہمارا دفاع کر سکے۔ دوسری طرف ہکسیان کو میگا جیسا آدمی مل گیا تھا جو میری تلاش میں گولڈن ٹرائی اینگل سے یہاں تک آ گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہکسیان جرائم پیشہ تھا [illegible] کے بھیس میں دنیا بھر میں لوگوں کو لوٹتا پھر رہا تھا۔ [illegible] ہمارے ساتھ تصادم ہونے سے پہلے اس نے کسی جرم کا ارتکاب نہ کیا ہو اور محض لوٹ مار کی چھوٹی وارداتیں ہی کرتا رہا ہو لیکن اب اس کے ہاتھ خون سے رنگے جا چکے تھے۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونے سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ گویا وہ ایسا بھیڑیا بن گیا تھا جس کے منہ کو خون لگ گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ڈاکوؤں کے [illegible] ہمارے فرار کے بعد اس نے ڈاکوؤں کو آپس میں [illegible] کردیا ہوگا۔ جو ایک آدھ زندہ بچا ہوگا' اسے اس [illegible] موت کے گھاٹ اتار دیا ہوگا۔ یہاں اس نے دو [illegible] دریا میں پھینک دیا تھا جن کی لاشیں ماہی گیروں کو [illegible] اور مجھے یقین تھا کہ اس نے مورو تانگ کو بھی ختم [illegible] تاکہ وہ کسی کو شاؤیانگ میں اس کے ٹھکانے کے بارے [illegible] نہ بتا سکے اور میرے خیال میں ہکسیان آگے چل [illegible] لیے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے ماسٹر لیشی یان سے اپنے خدشات کا اظہار [illegible] وہ بولا۔

"تشویش تو مجھے بھی ہے۔ اس قسم کے لوگ [illegible] ٹیمپل آتے رہتے ہیں جو یہاں کا ماحول بگاڑنے [illegible] کرتے ہیں لیکن ان کا علاج ہو جاتا ہے۔ وہ جرمن [illegible] اس کا لمبے بالوں والا ساتھی... تم سے دو تین مرتبہ [illegible] بعد اب ان کا نام سنائی نہیں دے رہا لیکن۔" وہ [illegible] خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا" [illegible] کیس بالکل مختلف ہے۔ وہ دوسروں کی طرح [illegible] گردی کرنے نہیں آیا۔ اس کی سرگرمیاں تمہارے [illegible] ہیں اور ہمیں اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ مجھے [illegible] ہے کہ اس نے مورو تانگ کو قتل کر دیا ہوگا۔ میں [illegible] لڑکوں کو شاؤیانگ بھیج رہا ہوں تاکہ وہ مکمل معلومات کرکے آئیں۔"

دو لڑکوں کو اسی روز شام سے ذرا پہلے شاؤیانگ [illegible] گیا۔

اسی رات میں اور چیکو بھی کامنی کے ساتھ [illegible] جانکی اس روز کچھ زیادہ ہی تھک گئی تھی اس لیے ساتھ نہیں آئی تھی۔

شاؤلن ٹیمپل کے مین روڈ پر ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ ریسٹورنٹ دراصل [illegible] کے کنارے پر تھا۔ پارک زیادہ بڑا نہیں تھا اور

دونوں کونوں پر ایک ایک ریسٹورنٹ تھا۔ ہم جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے اس کی عمارت صرف دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک کمرا کچن پر مشتمل تھا اور دوسرا کمرا بڑا تھا جس میں صرف چار پانچ میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ البتہ عمارت کے سامنے دونوں طرف کشادہ فٹ پاتھ پر دور تک میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ کرسیاں پارک میں بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت خاصی رونق تھی۔ ہم تینوں ایک الگ تھلگ میز پر بیٹھ گئے۔ میں نے ویٹر کو بلا کر کافی کا آرڈر دے دیا۔ کافی پینے کے بعد بھی ہم دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر ہم وہاں سے اٹھنا ہی چاہتے تھے کہ کامنی سڑک کے دوسرے فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ سامنے جو آدمی جا رہا ہے۔" اس نے گردن سے اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا "یہ وہی ہے جسے اس روز میں نے ہکسیان کے ساتھ مورو تانگ کی کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے' یہ وہی آدمی ہے۔" میں بھی چونک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ نکلتے ہوئے قد کا صحت مند جسم کا آدمی تھا۔ اس نے جینز ------ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے تھے۔ گلے میں ایک لاکٹ بھی نظر آ رہا تھا۔ جو بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ سگریٹ کے کش لگاتا ہوا جا رہا تھا۔ اگر وہ لیمپ پوسٹ کے قریب سے نہ گزر رہا ہوتا تو میں اس کے چہرے کو اس طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دائیں کندھے سے کپڑے کا ایک تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ جس پر سفید جھالر لگی ہوئی تھی۔

"کامنی۔" میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "تم چیکو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"اکیلے اس کے پیچھے جاؤ گے تو اسے شبہ ہو جائے گا۔ اس لیے ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔" کامنی نے کہا۔

اس نے ٹھیک کہا تھا اس لیے میں نے ان دونوں کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہم تینوں سڑک پار کرکے دوسرے فٹ پاتھ پر پہنچے۔ وہ شخص ہم سے تقریباً بیس گز آگے جا چکا تھا۔ ہم نے رفتار تیز کر دی اور دس گز کا فاصلہ بیچ میں رکھ کر معمول کی رفتار سے چلنے لگے۔

سڑک پر کچھ اور لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی اس لیے اس شخص کو تعاقب کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔ اس سڑک پر دو تین جمنازیم تھے۔ ایک جمنازیم میں باؤکس ہو رہے تھے۔ شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس جمنازیم سے کچھ آگے جا کر وہ ایک اور سڑک پر مڑ گیا۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک کشادہ گلی میں مڑ گیا۔ اس مرتبہ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے تعاقب کا علم ہو گیا تھا یا اسی طرح مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے وہ اس امر کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ ہم واقعی اس کا پیچھا کر رہے ہیں کہ یہ محض اتفاق تھا۔

اور پھر وہ مختلف گلیوں میں گھومتا رہا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے اور ان گلیوں میں سناٹا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمارے تعاقب سے آگاہ ہو چکا تھا اور اب ان گلیوں میں گھوم کر ہمیں چکما دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک اور گلی میں مڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہم سے بچنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

میں نے چیکو اور کامنی کو اشارہ کیا اور خود بھی دوڑ لگا دی۔ اس گلی میں مڑتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ہم آبادی کے آخری سرے پر آن پہنچے تھے۔ یہ گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ اگر وہ ان پہاڑیوں میں داخل ہو گیا تو اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔

وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور جب وہ پہاڑیوں میں داخل ہو رہا تھا تو میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے دور ہی سے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔

نیچے چھوٹے چھوٹے پتھر تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پتھروں پر رگیدنے لگے۔ اس نے موقع پا کر مجھے دور اچھال دیا۔ میں پشت کے بل پتھروں پر گرا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرنے کے بجائے ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ جان بچا کر بھاگنا چاہتا تھا۔

میں نے بھی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی اور چند گز کے فاصلے پر اسے جا لیا۔ ہم ایک بار پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ اس مرتبہ میں نے اسے پیروں پر اچھال کر دور پھینک دیا اور پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

میں تو اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس کا انداز کچھ مختلف تھا جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ مارشل آرٹسٹ نہیں تھا۔ مجھے اس پر قابو پانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ کسی اناڑی کا کوئی وار اتنا مہلک ثابت ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھے مارشل آرٹسٹ کو بھی ڈھیر کر دیتا ہے اس لیے مجھے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

وہ چاندنی رات تھی اور ہم ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کیا۔ وہ تیزی سے جھکائی دے کر اپنے آپ کو میرے پنچ سے تو بچا گیا مگر میری لیفٹ سائڈ کک نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اسے ایک اور کک رسید کر دی۔ یہ کک اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر لگی اور وہ چیختا ہوا پشت کے بل ڈھیر ہو گیا۔

اسی لمحے مجھے پتھروں پر دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چیکو اور کامنی تھیں جو دوڑتی ہوئی پہاڑیوں میں پہنچ چکی تھیں مگر ہم اس وقت تک چٹانی پتھر کی آڑ میں تھے اس لیے وہ ہمیں نہیں دیکھ سکی تھیں اور شاید اسی لیے کامنی نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے حریف نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر میری پنڈلی پر ٹھوکر مار دی تھی۔ میں ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ پنڈلی کی ہڈی پر لگنے والی ٹھوکر نے میری جان نکال دی تھی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے اس شخص نے مجھ پر تابڑ توڑ حملے کر دیے۔ اس کے دو گھونسے میرے سینے پر لگے اور تیسرا جبڑے پر۔ میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔

وہ مارشل آرٹسٹ نہیں تھا مگر اس میں طاقت تھی اور اسٹریٹ فائٹنگ کے انداز میں ہاتھ پیر چلانا بھی جانتا تھا۔ اسے مزید ڈھیل دینا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے موقع پاتے ہی اس کی پنڈلی کے پچھلے حصے پر بڑے زور سے راؤنڈ ہاؤس کک لگائی۔ اس کک میں پیر کا اپر ٹارگٹ پر لگتا اگر کک ..... نپی تلی ہو تو خنجر کے وار سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

میری یہ کک اس کی پنڈلی کے پچھلی طرف گوشت پر لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا اپنی جگہ سے کئی فٹ اوپر اچھلا اور دھب سے نیچے گرا۔ اس نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ اس کا حملہ کرنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ کسی مینڈھے کی طرح میرے پیٹ میں سر سے ٹکر مارنے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے سائڈ میں ہو کر اس کی گردن اپنی بغل میں جکڑ لیا اور ایک ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ پٹ سے نیچے گرا۔

اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کھڑا ہوتے ہی وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا تھا اور دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنی ٹانگ کو پکڑ لیا جس پر میری کک لگی تھی۔ کک لگنے کے بعد اس نے جوش میں مجھ پر دوسرا حملہ تو کیا تھا مگر اب ٹانگ کی تکلیف سے بلبلا اٹھا تھا۔ یقیناً اندر سے گوشت پھٹ گیا تھا۔

اس وقت چیکو اور کامنی بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئیں۔ وہ ٹھٹک کر دور ہی رک گئی تھیں۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے میں شاید ایک سیکنڈ لگا ہو گا پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میرے قریب پہنچ گئیں۔

میں نے اپنی پتلون کا پائنچا اٹھا دیا اور پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔

"تمہارے ساتھ لڑائی میں تو کوئی مزہ نہیں آیا۔" میں نے خنجر اس شخص کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا "لیکن مجھے زندہ انسانوں کا گوشت کاٹنے میں جو مزہ آتا ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

"تت..... تم کون ہو؟" وہ شخص ہکلایا "میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو اور مجھے کیوں مارنا چاہتے ہو؟"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے مجھے جانتے ہی نہیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں تمہیں نہیں جانتا۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو۔" وہ بولا۔

"تو پھر بھاگے کیوں تھے؟" میں نے کہا۔

"میں سمجھا تھا تم لوگ رہزن ہو۔" اس نے کہتے ہوئے میرے قریب کھڑی ہوئی لڑکیوں کی طرف دیکھا "ان پہاڑیوں میں لڑکیاں بھی مردوں کے ساتھ مل کر رہزنی کی وارداتیں کرتی ہیں۔ میرے تھیلے میں رقم تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ تم لوگ مجھے لوٹنے کے لیے میرے پیچھے لگے ہو اس لیے میں اس طرف آ گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں تم لوگوں کو چکمہ دے کر ان پہاڑیوں کے پُرپیچ راستوں سے واپس چلا جاؤں گا۔ مم..... میرا تھیلا کہاں ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"یہ رہا تمہارا تھیلا۔ مجھے وہاں پڑا ہوا ملا تھا۔" چیکو نے اسے کپڑے کا تھیلا دکھاتے ہوئے ایک طرف کیا۔

"لاؤ۔ لاؤ۔ یہ مجھے دے دو۔ فار گاڈ سیک۔ اس میں میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"زندگی بھر کی نہیں، ایک رات کی کمائی کہو۔" کامنی نے تھیلے کی زپ کھولی۔ اس میں واقعی کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے "یہ جھوٹ بولتا ہے۔" کامنی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "کل میں نے اسی کو ہکسیان کے ساتھ مورو تانگ کی ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا اور کل ہی سے مورو تانگ لاپتا ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے اور قاتل یہی ہے۔ یہ رقم اس قتل کا معاوضہ ہو سکتی ہے۔ کوئی زندگی بھر کی کمائی اس طرح تھیلے میں لے کر نہیں پھر سکتا۔"

"نن..... نہیں نہیں۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" وہ چیخا۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بڑا بھیانک ہو گیا تھا۔

وہ جس طرح خوف سے چیخا تھا، میں ایک دم چونک گیا۔ اس کے تھیلے میں نوٹوں کی موجودگی نے بھی مجھے شبے میں مبتلا کر دیا تھا اور پھر اچانک ہی اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے اگلے ہی قدم پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے لپک کر خنجر کی نوک اس کے گلے پر رکھ دی۔

"اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو۔" میرے حلق سے غراہٹ نکلی "اگر تم نے زبان نہیں کھولی تو گلا ادھیڑ دوں گا۔"

"وہ۔ وہ..... ہکسیان..... اور میگا مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔

"یعنی تمہیں ان لوگوں کا خوف ہے جو یہاں نہیں ہیں اور اس خنجر کا کوئی خوف نہیں جس کی معمولی سی حرکت تمہاری زندگی کا خاتمہ کر سکتی ہے۔" میں نے کہا "سچ سچ بتا دو۔ اگر تم بے گناہ ہوئے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔"

"یہ ایسے نہیں بتائے گا۔" کامنی بولی "تم اس کی بوٹیاں کاٹنا شروع کرو۔ خود ہی زبان کھولے گا۔"

میں نے خنجر اس کے نرخرے سے ہٹا کر گردن پر رکھ دیا اور اس کی تیز دھار سے ہلکی سی خراش ڈال دی۔ وہ بلبلا اٹھا۔

"اب کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "زبان کھولتے ہو یا بوٹیاں کاٹنا شروع کر دوں۔"

"بب..... بتاتا ہوں۔" کہتے ہوئے اس کا ہاتھ بے اختیار گردن پر پہنچ گیا۔ کھال پر بہت معمولی سا کٹ لگنے سے خون رسنے لگا تھا۔ ہاتھ پر خون کی چپچپاہٹ محسوس کر کے وہ کانپ اٹھا "میں..... میں بالکل بے قصور ہوں۔ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔ مجھے پھنسایا گیا ہے۔"

اس شخص کے کہنے کے مطابق وہ میکانگ کا رہنے والا تھا اور روزگار کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا ہوا اس طرف آ نکلا۔ ایک ہفتہ پہلے جبکہ وہ تین وقت کے فاقے سے تھا اور بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا تو اس کی ملاقات ہکسیان سے ہو گئی۔ جس نے اسے کھانا کھلایا اور کام دلانے کا وعدہ بھی کیا۔

ہکسیان اسے شاؤیانگ لے گیا جہاں میگا تیراڑ نامی شخص سے اس کی ملاقات کرائی گئی۔ اس نے تھوڑی بہت مالی مدد کی اور کام دینے کا وعدہ کیا۔

"پھر ایک روز ہکسیان مجھے یہاں لے آیا۔" وہ کہہ رہا تھا "یہاں آ کر مجھے بتایا گیا کہ وہ چند دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر ایک آدمی کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔ اس آدمی کو اغوا کر کے یہاں لایا جائے گا اور یہاں سے میری نگرانی میں اسے کسی اور جگہ منتقل کیا جائے گا۔ میرا کام صرف یہ ہو گا کہ مغوی کو بے ہوش کر کے اپنے قابو میں رکھوں۔ وہ لوگ اسے گولڈن ٹرائی اینگل لے جانا چاہتے تھے۔ میرے لیے یہ پیشکش تھی کہ میں اگر چاہوں تو ان کے ساتھ گولڈن ٹرائی اینگل بھی جا سکتا ہوں یا چاہوں تو سرحد پر پہنچ کر مجھے میری خدمات کا معاوضہ دے کر فارغ کر دیا جائے گا۔

"میں جرائم پیشہ نہیں ہوں۔ نادانستگی میں کبھی کوئی چھوٹا موٹا جرم سرزد ہو گیا ہو تو کہہ نہیں سکتا لیکن دانستگی میں، میں نے کبھی کوئی معمولی سا جرم بھی نہیں کیا۔ میں اگرچہ سمجھ گیا تھا کہ ہکسیان اور میگا جرائم پیشہ ہیں۔ میں ان کے لیے کام نہیں کرنا چاہتا تھا مگر میری مجبوری یہ تھی کہ میں ان کا احسان مند تھا اور میرے پاس کوئی کام بھی نہیں تھا اس لیے میں نے ان کی پیشکش قبول کر لی۔ مجھے صرف ایک شخص کی نگرانی ہی تو کرنی تھی۔

" ہکسیان کل مجھے ایک مکان میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور بھی تھے۔ ہکسیان کی واپسی تین گھنٹوں بعد ہوئی۔ وہ اکیلا تھا اور زخمی بھی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ ہکسیان نے بتایا کہ اسے خنجر کا زخم لگا ہے اور یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ اسے شاؤیانگ جانا پڑے گا۔

" ہکسیان کے کہنے پر میں مورو تانگ کی ٹیکسی لے آیا اور اسے شاؤیانگ لے گیا۔ راستے میں مورو تانگ نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جن سے ہکسیان کچھ پریشان ہو گیا۔

"شاؤ یانگ میں میگا کے مکان پر پہنچ کر ہکسیان نے مورو تانگ کو بھی اندر بلا لیا۔ وہ دونوں مورو تانگ کو ایک الگ کمرے میں لے گئے۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد مجھے اس کمرے میں بلایا گیا تو فرش پر مورو تانگ کی لاش دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی۔ پہلے تو میں نے انکار کرنا چاہا مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں ان کے چنگل میں پھنس چکا ہوں۔ میں نے وہ لاش مورو تانگ ہی کی کار کی ڈکی میں ڈال دی اور اسے قصبے کی ایک سڑک پر چھوڑ کر واپس آگیا۔

"میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وہ لوگ مجھے تلاش کر لیں گے اور موت کے گھاٹ اتار دیں گے اس لیے میں نے ان سے جان چھڑانے کے لیے کوئی اور حکمتِ عملی اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔

"کل کی رات اور آج کا پورا دن میں نے انہی کے ساتھ شاؤ یانگ کے اسی مکان میں گزارا۔ اس دوران میں' میں نے انہیں قائل کر لیا کہ وہ لوگ مجھے وہاں سے جانے دیں...... میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی زبان بند رکھوں گا اور یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر کبھی میں نے زبان کھولنے کی کوشش کی بھی تو وہ مجھے مورو تانگ کے قتل میں پھنسا دیں گے۔

"میگا نے مجھے ایک خطیر رقم بھی دی اور کہا کہ میں رات ہی رات میں قصبے سے چلا جاؤں۔ میں شاؤ یانگ سے کسی اور طرف جانے کے بجائے یہاں چلا آیا۔ یہاں ہکسیان کے مکان میں میرا کچھ سامان پڑا ہوا تھا۔ وہ سامان اگرچہ زیادہ قیمتی نہیں ہے لیکن تم جانتے ہو کہ بعض چیزوں سے کچھ ایسا لگاؤ ہوتا ہے کہ انہیں چھوڑا نہیں جا سکتا۔

"یہاں ایک سڑک پر گھومتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میرا پیچھا کیا جا رہا ہے اور پھر میں نے تم لوگوں کو دیکھ لیا۔ میں سمجھا تھا کہ تم لوگ مجھے لوٹنا چاہتے ہو۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں سیدھا مکان پر جاؤں گا تو تم لوگ بھی پیچھے آجاؤ گے اور میں پھنس جاؤں گا۔

"جن دنوں میں یہاں ہکسیان کے پاس رہ رہا تھا تو ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔ میں نے یہ پہاڑیاں بھی دیکھی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہاں ایسے راستے بھی ہیں کہ تعاقب کرنے والے کو آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میں اس طرف آگیا تھا کہ تم لوگوں کو دھوکا دے کر اپنے مکان کی طرف چلا جاؤں گا مگر تم نے مجھے پکڑ لیا۔ میں سچ کہتا ہوں میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھے جانے دو پلیز! مجھے جانے دو۔ میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا اور کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ چاند کی مدھم سی روشنی میں اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔ اگرچہ خاصا جثے والا آدمی تھا مگر فطرتاً بزدل تھا۔

"یہ ایک قتل کا معاملہ ہے مسٹر۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ہکسیان کے ہاتھ تو پہلے ہی بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ میں یقین کر لیتا ہوں کہ تم بے گناہ ہو اور تمہیں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے مگر تم ہکسیان اور میگا کے خلاف بیان تو دے سکتے ہو۔"

"تت۔۔۔ تمہارا مطلب ہے پولیس۔" وہ ہکلا گیا "اگر ایک مرتبہ پولیس کے ہاتھ آگیا تو وہ مجھے کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ تم جانتے ہو پولیس والے کس طرح کام کرتے ہیں۔ اصل مجرم نہ ملے تو بے گناہوں کو پھانس لیا جاتا ہے۔ میگا اور ہکسیان بہت چالاک ہیں۔ وہ تو بھاگ جائیں گے اور میں۔۔۔ میں پھنس جاؤں گا۔"

"ہم فی الحال تمہیں پولیس کے پاس نہیں لے جائیں گے۔" میں نے کہا "ہم تمہیں ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں نہ تو پولیس تم تک پہنچ سکتی ہے اور نہ ہی میگا یا ہکسیان تمہارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں۔"

"میں نے چند روز میں ہی اندازہ لگا لیا ہے کہ میگا اور ہکسیان بہت حرامی ہیں۔ انہوں نے بڑے خطرناک قسم کے آدمی جمع کر رکھے ہیں۔ انہیں پتا چل گیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس شخص نے کہا۔

"انہیں تمہارے بارے میں کچھ پتا نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "ویسے کیا تم جانتے ہو کہ کل ہکسیان اور اس کے آدمیوں نے جس شخص کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی وہ کون ہے؟"

"نہیں۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔" میں نے کہا "لیکن کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے اور فرار ہوتے ہوئے ہکسیان نے اپنے ہی تین آدمیوں کو دریا میں پھینک کر ہلاک کر دیا۔"

"اوہ!" اس کے چہرے پر خوف کچھ اور گہرا ہو گیا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"تمہارا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ مجھے اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ میں نے خنجر اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے چمڑے کے نیفے میں اڑس لیا اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

ٹانگ پر لگنے والی کک کی وجہ سے اسے چلنے میں خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ ہر قدم پر اس کے منہ سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں مگر میں اسے سہارا دے کر چلاتا رہا۔

ہم پہاڑیوں سے نکل کر آبادی میں آگئے اور چند گلیاں گھومنے کے بعد ایک سڑک پر آگئے۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ تقریباً سناٹا تھا۔ پیچھے سے آنے والی ایک کار تیزی سے ہمارے قریب سے گزر گئی اور آگے جا کر دائیں طرف مڑ گئی۔

میں اس شخص کو بازو سے پکڑے سہارا دے کر چلا رہا تھا۔ وہ لنگڑا رہا تھا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے کک پوری قوت سے نہیں ماری تھی۔ اگر یہ کک پوری قوت سے لگتی تو اس کی ٹانگ کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی تھی۔

ہم اس وقت سڑک کے وسط میں تھے۔ سامنے سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی دی تھی۔ یہ کار اس سڑک سے مڑ کر سامنے آئی تھی جس سڑک پر پیچھے سے آنے والی کار مڑ کر گئی تھی۔

کار بھی سامنے سڑک کے عین بیچ میں آرہی تھی۔ اچانک چیکو کی چیخ سن کر میں چونک گیا۔

"وجدان بچو۔۔۔!"

میں نے سامنے دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سامنے سے آنے والی کار برق رفتاری سے ہمارے اوپر چڑھی چلی آرہی تھی۔ چیکو اور کامنی نے فٹ پاتھ کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اس شخص کو اپنے ساتھ کھینچنا چاہتا تھا مگر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

کار بالکل سر پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس شخص کو پکڑنے کی کوشش کی پھر مجھے اپنی جان بچانے کے لیے ایک طرف چھلانگ لگانی پڑی۔ میں اس جگہ سے کئی فٹ دور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکا ہوا اور چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے مڑ کر دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔

کار اس شخص کو کچلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ خون میں لت پت وہ شخص سڑک پر پڑا پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے بہنے والا خون چاروں طرف پھیل رہا تھا۔

تقریباً سو گز آگے جا کر وہ کار واپس مڑی۔ میں نے کامنی اور چیکو کے ساتھ ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ سڑک کے ساتھ ایک چھوٹا سا پارک تھا۔ جس کی دیوار تقریباً تین فٹ اونچی تھی۔ اسی وقت فضا تڑ تڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ اگر ہم تینوں دیوار کی آڑ میں نہ گر گئے ہوتے تو چھلنی ہو چکے ہوتے۔ کار گولیاں برساتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ہم تینوں اٹھ کر پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ایک طرف بھاگ نکلے۔

اب وہاں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کار اگرچہ لوٹ کر نہیں آئی تھی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے چیکو کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ کامنی بڑی حوصلہ مند ثابت ہوئی تھی۔ اس نے چیکو کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا۔

ہم مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے رسّوں والے پل پر آگئے۔ اس وقت سامنے سے بھی دو آدمی پل پر داخل ہوئے تھے۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ میں محتاط ہو گیا اور جیسے ہی وہ قریب پہنچے میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ کوچی اور تکوشی تھے۔ انہوں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے کیمپ سے نکلے تھے۔

"کیا ہوا۔ تم لوگ کہاں غائب تھے؟ اور یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟" کوچی نے میرا بازو پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں کھڑے کھڑے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیمپ میں چلو۔ تفصیل سے بتاؤں گا۔"

کوچی اور تکوشی نے دونوں طرف سے چیکو کو تھام لیا۔ میں اور کامنی الگ ہو کر چلنے لگے۔ وہ سمجھے کہ چیکو کو شاید کوئی چوٹ لگی ہے جس سے اس سے چلا نہیں جا رہا لیکن اب چیکو اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے دونوں طرف سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

کوچی اور تکوشی بھی ہمارے ساتھ ہی ہمارے کمرے میں آگئے۔ جانکی سو گئی تھی مگر ہماری آوازیں سن کر اٹھ گئی۔ اس نے کامنی کو دیکھا تو بے اختیار بول اٹھی۔

"ارے کامنی۔ تم گئی نہیں؟"

"میں جا کر واپس بھی آگئی۔" کامنی نے مسکراتے ہوئے کہا "تم تو شاید ہمارے جانے کے فوراً ہی بعد سو گئی تھیں۔

تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر تم واپس کیوں آگئیں؟" جانکی بولی۔

"ایک غیر معمولی واقعہ پیش آگیا تھا جس وجہ سے مجھے ان کے ساتھ واپس آنا پڑا۔" کامنی نے کہا اور پھر اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگی۔ کوچی اور نکوشی بھی توجہ سے سن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں، میں بھی کچھ لقمے دیتا جارہا تھا۔ کامنی کے خاموش ہونے پر کوچی بولا۔

"تم لوگوں کو دیر ہوگئی تو ہم پریشان ہورہے تھے۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی ماسٹر لیشی یان نے کہا تھا کہ کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد کسی کو کامنی کے فلیٹ پر بھیجا جائے۔ میں نکوشی کو بھیجنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم نے فوراً ہی دوڑ لگا دی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "صورتِ حال خاصی سنگین ہے اور میرا خیال ہے کہ ماسٹر لیشی یان کو آگاہ کردینا چاہیے۔"

"ماسٹر کو یہاں بلانا مناسب نہیں۔ چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں کوچی اور نکوشی کے ساتھ ماسٹر لیشی یان کے کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر سونے کے لیے لیٹ چکا ہوگا لیکن وہ ایک کرسی پر بیٹھا مطالعہ کررہا تھا۔ اس کی پشت پر لیمپ جل رہا تھا جس کی روشنی کتاب پر پڑ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر ماسٹر نے کتاب رکھ دی اور ٹیوب لائٹ روشن کردی۔ ہم تینوں نے ماسٹر کو بو کیا اور اس کے اشارے پر سامنے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

مجھے ایک بار پھر شروع سے سارا واقعہ دہرانا پڑا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے وہ فائرنگ ہمیں جان سے مارنے کے لیے نہیں کی گئی تھی۔ وہ ہمیں صرف ڈرانا چاہتے تھے تاکہ ہم وہاں سے بھاگ جائیں۔"

"تو گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ حملہ تم پر نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی نہ تو اس کار نے تمہیں کچلنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی فائرنگ تمہیں جان سے مارنے کے لیے کی گئی تھی؟"

"یس ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "کار جب سامنے سے آئی تو ہم پوری طرح اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھے۔ کار میں جو بھی لوگ تھے انہوں نے ہمارے چہرے واضح طور پر دیکھے ہوں گے اگر مجھے مارنا ہوتا تو کار میرے اوپر چڑھائی جاتی۔ مجھے کچلنے کی کوشش کی جاتی مگر ان کا مقصد شاید اس شخص کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ اس شخص نے مجھ سے ہاتھ چھڑا کر دوسری طرف چھلانگ لگادی تھی اور تیز رفتار کار بھی فوراً اس کی طرف مڑگئی تھی اور اسے کچلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہکسیان اور میگا کے آدمی تھے اور یقیناً مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ وہ شاید شروع سے رہ کر اس شخص کی نگرانی کررہے تھے اور جب دیکھا کہ اسے پکڑ کر کہیں لے جارہے ہیں تو انہوں نے اسے کار سے کچل کر ختم کردیا تاکہ وہ کسی کو کچھ بتا نہ سکے۔"

"اور تم پہلے ہی اس سے سب کچھ معلوم کرچکے تھے۔" ماسٹر بولا۔

"یس ماسٹر۔" میں نے کہا "موروتانگ کو ہکسیان اور میگا میں سے کسی نے مارا ہے۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "اس شخص کے کہنے کے مطابق کار میں شاؤیانگ کی طرف جاتے ہوئے موروتانگ نے کچھ ایسی باتیں کی تھیں جس سے ہکسیان پریشان ہوگیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ باتیں ایسی ہوں گی جن سے ہکسیان کو شبہ ہوگیا ہوگا کہ موروتانگ اس کے کسی راز سے واقف ہوچکا ہے اور اس نے شاؤیانگ میں ان کا ٹھکانا بھی دیکھ لیا تھا اس لیے موروتانگ کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔"

"اب صورتِ حال یہ ہے۔" ماسٹر لیشی یان چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم لوگوں نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ ہی تم لوگ اس آدمی سے ملے تھے جسے کار سے کچل کر ماردیا گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "یہ پولیس کیس ہے اور ماسٹر ہنگ پائی بھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کے کیمپ کا کوئی لڑکا کسی پولیس کیس میں ملوث ہو۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا پھر بولا "یہ ایک نہیں ڈُہرے قتل کی واردات ہے۔ تم لوگوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں نے جس لڑکے کو شاؤیانگ بھیجا تھا وہ بھی واپس آگیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ پولیس کو موروتانگ کی کار کی ڈکی سے اس کی لاش مل گئی ہے۔ شام تک تو پولیس شاؤیانگ ہی میں انکوائری کررہی تھی مگر مجھے یقین ہے کہ پولیس یہاں بھی پہنچ جائے گی اور میں نہیں چاہتا کہ اس کیمپ کا کوئی لڑکا اس کیس میں ملوث ہو۔"

"تو کیا۔۔۔ میگا اور ہکسیان کو بچ نکلنے کا موقع دیا جائے گا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" ماسٹر نے نفی میں سر ہلایا "وہ قانون کے علاوہ ہمارا بھی مجرم ہے۔ ان لوگوں نے تمہیں ایک مرتبہ بلوا کر زہریلی سوئی کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ دوسری مرتبہ تمہیں کڈنیپ کرنا چاہا۔ کوئی معمولی بات ہوتو اسے معاف کردینے یا نظرانداز کردینے میں کوئی حرج نہیں لیکن میگا اور ہکسیان کے جرائم بہت سنگین ہیں۔ یہ اس تنظیم کا اصول ہے کہ اپنے معاملات آپس ہی میں نمٹا لیے جاتے ہیں۔ پولیس کو زحمت نہیں دی جاتی۔ یہ بھی ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ اسے بھی ہم آپس ہی میں نمٹائیں گے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔ میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔

"ہم نے اس شخص سے میگا اور ہکسیان کا شاؤیانگ والا ٹھکانا تو معلوم کرلیا تھا نا۔" ماسٹر لیشی یان نے کہا "ہم کل کا دن صورتِ حال کا جائزہ لیں گے اگر میگا اور ہکسیان پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو پھر ہماری مجبوری ہوگی۔ ہم کچھ نہیں کرسکیں گے۔ بصورتِ دیگر ہم کل رات ہی اپنی کارروائی کریں گے۔"

"گڈ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ماسٹر لیشی یان مسکرا دیا۔ وہ میری اندرونی کیفیت کو سمجھ گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جب تک میں اپنے اوپر ہونے والے حملوں کا بدلہ نہ لے لوں گا، اس وقت تک مجھے چین نہیں آئے گا۔

اس کے بعد بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے اور جب میں واپس آیا تو ڈھائی بج چکے تھے۔ جانکی، کامنی اور چیکو ایک ہی بستر پر ایک دوسرے سے لپٹی سو رہی تھیں۔ میں اپنے بستر پر لیٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

اگلا دن معمول کے مطابق گزرا۔ البتہ صبح سویرے ہی یہ اطلاع مل گئی تھی کہ پولیس گزشتہ رات جائے واردات پر پہنچ گئی تھی جہاں اس شخص کو کار سے کچل کر ہلاک کیا گیا تھا۔

پولیس دن بھر کار کے اس حادثے اور فائرنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن پولیس سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں کرسکی کہ کار سے کچلا جانے والا شخص مارشل آرٹسٹ نہیں تھا۔ کسی کیمپ سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ متعدد لوگوں نے اس کی لاش دیکھی تھی مگر کوئی اسے شناخت نہیں کرسکا تھا۔ وہ یہاں کے لوگوں کے لیے اجنبی تھا۔

شام کو ماسٹر لیشی یان کو شاؤیانگ میں اپنے آدمی سے بھی رپورٹ مل گئی۔ موروتانگ کی موت کی تحقیقات میں بھی کوئی نمایاں پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔

موروتانگ کی جیب میں ایک معقول رقم موجود تھی جس سے پولیس اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ یہ کوئی ڈکیتی یا رہزنی کی واردات نہیں تھی بلکہ قتل کی وجہ کسی قسم کی ذاتی دشمنی ہوسکتی تھی لیکن پولیس قاتل یا قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی۔ اس طرح ہکسیان اور میگا کا نام بھی سننے میں نہیں آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں پولیس کی نگاہوں سے محفوظ تھے۔

رات آٹھ بجے تک ہم مزید اطلاعات کا انتظار کرتے رہے لیکن کوئی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہوسکی۔ جانکی اس روز دن بھر اپنے ہی کمرے میں موجود رہی تھی۔ شاید مسلسل محنت اور ریاضت کی وجہ سے اس پر تھکن طاری ہوگئی تھی اور اسے آرام کی ضرورت تھی۔

نو بجے کلاس ختم ہونے کے فوراً ہی بعد ہم کیمپ سے روانہ ہوگئے۔ ہم تین آدمی تھے۔ ماسٹر لیشی یان، کوچی اور میں۔ رستوں والا پل پار کرتے ہی ہم سڑک پر دائیں طرف مڑ گئے اور تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کرکے رک گئے۔ ماسٹر نے کوچی کو چابیوں کا ایک گچھا دے کر کچھ کہا۔ کوچی عمارت کے پچھلی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد ایک کار عمارت کے پیچھے سے نکلی اور ہمارے قریب آکر رک گئی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے کوچی بیٹھا ہوا تھا۔

یہ ماسٹر لیشی یان کی کار تھی۔ جسے کبھی کبھار ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ میں اور ماسٹر لیشی یان پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور کار حرکت میں آگئی۔

پہلی مرتبہ ہم شاؤیانگ سے یہاں تک پیدل آئے تھے۔ وہ راستہ ٹیلا نما پہاڑیوں کے بیچ میں سے گزرتا تھا مگر سڑک والا راستہ خاصا طویل ثابت ہوا تھا۔

ہمیں شاؤیانگ پہنچنے میں تیس پینتیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس وقت دس بجنے والے تھے اور قصبے کے بازاروں میں اچھی خاصی رونق تھی۔ کوچی کار کو پرہجوم سڑک سے گزارتا ہوا ایک کشادہ سڑک پر لے آیا جہاں دونوں طرف بنگلے تھے۔ اس نے ایک بنگلے کے سامنے کار روک کر ہارن بجایا۔ صرف ایک منٹ بعد گیٹ کھل گیا اور کوچی کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

گیٹ کھولنے والا ادھیڑ عمر ملازم تھا۔ برآمدے میں کار رکتے ہی سامنے والے دروازے سے ایک آدمی برآمد ہوا۔ وہ درمیانے قد کا صحت مند آدمی تھا، اس نے چینی لباس پہن رکھا تھا۔ ماسٹر لیشی یان جیسے ہی کار سے اترا، وہ شخص مارے تعظیم کے جھکتا ہوا گھٹنوں تک دُہرا ہوگیا۔

وہ چیانگ شاؤ تھا۔ اس علاقے کا ایک معزز بزنس مین اور ماسٹر لیشی یان کا پرانا شاگرد۔ اس نے مجھے بھی اسی طرح تکریم دی اور ہمیں بڑے احترام سے اندر لے گیا۔ عالی شان ڈرائنگ روم میں اس کی گڑیا جیسی حسین بیوی ہمارے استقبال کو موجود تھی۔ چیانگ شاؤ کی عمر اگرچہ پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی مگر اس کی بیوی حاشی کسی طرح بھی پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ میں نے عورتوں کے حسین ہونے کے حوالے سے لوگوں کو چینی گڑیا کی مثال دیتے ہوئے اکثر سنا تھا۔ حاشی واقعی بے حد حسین تھی۔ بالکل چینی گڑیا کی طرح۔

جس طرح انہوں نے ہمارا استقبال کیا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں ہمارے آنے کا پہلے سے علم تھا اور پھر اس کی تصدیق اس طرح بھی ہوگئی کہ چند ہی منٹ بعد تکوشی بھی نظر آگیا۔ وہ پہلے سے یہاں موجود تھا۔ وہ بو کر کے ماسٹر کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اپنی رپورٹ دینے لگا۔ ماسٹر لیشی یان بھی بیچ بیچ میں کچھ پوچھتا جارہا تھا۔

اس دوران میں ایک ملازمہ نے ہمارے سامنے سینٹر ٹیبل پر نازک سی بہت ہی خوب صورت پیالیوں میں سبز چائے سرو کردی تھی۔ ماسٹر کے اشارے پر تکوشی بھی سامنے ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور پھر چائے کی چسکیوں کے ساتھ ان دونوں میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ماسٹر لیشی یان میری طرف متوجہ ہوگیا۔

"میگا اور ہکسیان اپچ اسٹریٹ کے ایک بنگلے میں موجود ہیں۔" وہ کہہ رہا تھا "وہ بنگلا انجلا نامی ایک عورت کی ملکیت ہے جو اچھی شہرت نہیں رکھتی۔ بنگلے میں انجلا کے دو ملازم بھی موجود ہیں۔ ایک تو میری طرح ہٹا کٹا ہے اور دوسرا ادھیڑ عمر۔ بہرحال مقابلے کی توقع ہے۔"

"وہ بنگلا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً تین میل آگے۔ پہاڑی کے دامن میں۔" ماسٹر نے جواب دیا "وہ قصبے کی آخری آبادی ہے۔ وہاں زیادہ تر دولت مند لوگ ہی........ رہتے ہیں۔ قصبے کے دو تین اچھے رہائشی ہوٹل بھی اسی طرف ہیں۔"

"تو پھر ہمیں کس وقت روانہ ہونا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم ابھی روانہ ہورہے ہیں۔" ماسٹر نے جواب دیا۔

اور پھر چیانگ شاؤ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا مگر حاشی نے اسے منع کردیا اور خود جانے کو تیار ہوگئی۔ کیونکہ چیانگ شاؤ دمے کا مریض تھا۔ اس مرض کی وجہ سے ہی کئی سال پہلے اس نے مارشل آرٹ کی پریکٹس چھوڑ دی تھی لیکن ماسٹر لیشی یان سے تعلق ختم نہیں کیا تھا۔

حاشی ایک اندرونی کمرے میں چلی گئی۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے اپنا چینی لباس اتار کر جینز....... اور ہلکے آسمانی رنگ کی شرٹ پہن لی تھی۔ جو اسٹریچ ایبل میٹریل سے بنی ہوئی تھی اور اس کے جسم پر اس طرح فٹ تھی کہ تمام اتار چڑھاؤ نمایاں ہوگئے تھے۔ اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا تھا۔

ماسٹر لیشی یان والی کار وہیں چھوڑ دی گئی۔ حاشی نے بنگلے کے گیراج سے سبز رنگ کی اسٹیشن ویگن نکال لی تھی۔ اندھیرے میں اس کا رنگ سیاہ ہی لگ رہا تھا۔

حاشی اسٹیئرنگ کے سامنے تھی۔ ماسٹر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں تکوشی اور کوچی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر۔ اسٹیشن ویگن بنگلے سے نکل کر دائیں طرف مڑ گئی۔

گیارہ بج رہے تھے۔ سڑکوں پر اب بھی رونق تھی لیکن جس طرف ہم جارہے تھے اس طرف رونق بتدریج کم ہوتی جارہی تھی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں کوئی مارکیٹ یا دکان وغیرہ نہیں تھیں اس لیے اس طرف لوگوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ البتہ کبھی کبھار کوئی کھٹارا سی گاڑی قریب سے گزر جاتی۔ یہ بات میں نے پہلے بھی نوٹ کی تھی کہ عام چینیوں کے پاس زیادہ تر پرانی گاڑیاں ہی تھیں۔ نئی چم چماتی ہوئی گاڑیاں ان لوگوں کے پاس تھیں جن کے پاس بے حساب دولت تھی۔

جس طرف آخری مرتبہ اسٹیشن ویگن مڑی تھی اس سڑک پر تو بالکل سناٹا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف خاصے بڑے بڑے بنگلے تھے۔ ان بنگلوں کی عمارتیں خواہ چھوٹی رہی ہوں لیکن ان کے اردگرد کھلی جگہ بہت زیادہ تھی۔

حاشی کو کہیں بھی راستہ بتانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ انجلا کی رہائش گاہ کے بارے میں جانتی تھی۔ انجلا کے بارے میں بھی اس کی معلومات خاصی وسیع تھیں اور وہ راستے میں ہمیں بھی اس کے بارے میں بتاتی رہی تھی۔

اس سڑک پر مڑتے ہی حاشی نے ویگن کی رفتار کم کردی اور پھر ایک بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"یہ انجلا کا بنگلا ہے۔ اس کا دوسرا گیٹ پچھلی سڑک پر ہے۔ گیٹ عموماً بند رہتا ہے۔ آمدورفت اسی گیٹ سے ہوتی ہے۔"

میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ بنگلے کی عمارت تقریباً سو گز اندر کی طرف تھی۔ عمارت کے دائیں بائیں اور پچھلی طرف بھی تقریباً اتنی ہی لمبی چوڑی کھلی جگہ تھی۔ بنگلے کی ایک دو کھڑکیوں میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے قطع نظر چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ بنگلے کے گرد کوئی چار دیواری نہیں تھی بلکہ خاردار تاروں کا جنگلا تھا۔

حاشی نے ویگن بنگلے سے تقریباً تین سو گز آگے ایک پارک کے کنارے پر بہت بڑے درخت کے نیچے روک لی۔ اس درخت سے ذرا ہٹ کر پارک کے اندر کی طرف ایک چھوٹی سی مصنوعی پہاڑی بنی ہوئی تھی جس پر پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔

حاشی ویگن ہی میں بیٹھی رہی اور ہم چاروں نیچے اتر گئے۔ وہ بنگلا کارنر کا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک کشادہ سڑک تھی اور اس کے ساتھ پارک شروع ہو جاتا تھا۔

ماسٹر لیشی یان کچھ دیر تک بنگلے کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے اور کوچی کو پہلو کی طرف سے جانے کا اشارہ کیا اور خود تکوشی کے ساتھ بنگلے کے سامنے والے رخ کی طرف چل پڑا۔

میری طرح کوچی کے پاس بھی خنجر تھا مگر ہم دونوں میں سے کسی نے بھی خنجر ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔

خاردار تار..... کچھ ڈھیلے تھے۔ انہیں نیچے اوپر کھینچ کر اتنی جگہ بنالی گئی کہ ایک آدمی آسانی سے گزر سکے۔ پہلے میں اندر داخل ہوا اور پھر کوچی اندر آگیا۔

بہت وسیع و عریض جگہ تھی۔ یہاں خوب صورت لان بنایا جا سکتا تھا لیکن لگتا تھا اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ چاروں طرف خود رو جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ خشک ہو جانے والے پتے ہمارے پیروں کے نیچے آکر چٹخ رہے تھے۔ جن کی آواز سناٹے میں دور تک پھیل رہی تھی۔ میں اور کوچی بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہمارا رخ بنگلے کی عمارت کے پچھلی طرف تھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ جھاڑیوں کے چٹخنے کی آواز سے وہ لوگ ہوشیار نہ ہو جائیں۔

عمارت کے پچھلی طرف بھی ایک کشادہ برآمدہ تھا جس کی پچھلی طرف دوسری کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے کوچی کو برآمدے کے قریب رکنے کا اشارہ کیا اور خود دراز قدمی سے روشن کھڑکی کی طرف چلنے لگا۔ کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ایک مرد تھا اور ایک عورت۔ وہ تیز لہجے میں چینی زبان میں باتیں کر رہے تھے لیکن ایک بھی لفظ میرے پلے نہیں پڑا۔

میں نے کھڑکی میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اندر کی طرف نیلے رنگ کا دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ ایک کنارہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ میں نے اسی جگہ شیشے سے آنکھ لگا دی۔ کمرے کا کچھ حصہ میری نظروں کے سامنے آگیا۔

سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی وہ دراز قامت عورت خاصی حسین تھی۔ اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ میرے خیال میں رات کے اس پہر اسے یا تو شب خوابی کے لباس میں یا روایتی چینی لباس میں ہونا چاہیے تھا لیکن اس نے مختصر سا بلاؤز اور منی اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا جس سے چسکیاں لیتے ہوئے وہ سامنے بیٹھے ہوئے کسی آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اس شخص کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس عورت نے گلاس سامنے تپائی پر رکھ دیا اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھالیا۔ ایک سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے پیکٹ اور لائٹر میز پر رکھ دیا اور سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے باتیں کرتی رہی۔

میں ایک مرتبہ پھر اس چھوٹے سے خلا سے کمرے کے دوسرے حصے کا منظر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میری یہ کوشش تو کامیاب نہیں ہو سکی البتہ میرا ہاتھ بے خیالی میں شیشے سے ٹکرا گیا۔ کھٹ کی ہلکی سی آواز ہوئی اور میں بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ آواز اگرچہ بہت ہلکی تھی لیکن میرے خیال میں ان لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔ میں نیچے جھکتے ہی تیزی سے کھڑکی سے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ چپک گیا۔

میرا خیال درست نکلا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اندر کی طرف کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا گیا۔ کھڑکی کے سامنے زمین پر دور تک روشنی پھیل گئی۔ اور اس روشنی میں ایک سایہ بھی حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ میرا خیال ہے یہ وہی عورت تھی جو کھڑکی کے قریب آکر باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

پردہ ایک بار پھر برابر ہوگیا۔ میں چند لمحے اپنی جگہ پر دبکا رہا اور پھر محتاط انداز میں حرکت کرتا ہوا دوبارہ کھڑکی کے سامنے آگیا۔ اس مرتبہ اندر کی طرف وہ پردہ اسی طرح برابر کردیا گیا تھا کہ پہلے جو معمولی سا خلا تھا' وہ بھی غائب ہوگیا تھا۔ میں کسی اور جھری کی تلاش میں کھڑکی کے شیشوں کو

دیکھتا رہا۔

اسی دوران میں مجھے اپنے عقب میں قدموں کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی، میں نے توجہ نہیں دی۔ میرے خیال میں وہ کوچی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا لیکن اسی لمحے برآمدے کی طرف سے کوچی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"وجدان بچو۔۔۔"

چیخ سنتے ہی میں تیزی سے پیچھے گھوما لیکن مجھے بہت دیر ہوچکی تھی۔ سر پر لگنے والی ضرب سے میرا دماغ جھنجنا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچنے لگیں اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

زوردار چھناکے کی آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ ذہن پر چھانے والی دھند بدستور چھٹتی چلی گئی۔ میرے حواس بحال ہونے لگے۔ دماغ میں اگرچہ اب بھی دھماکے ہورہے تھے مگر تکلیف اب قابلِ برداشت تھی۔

چند سیکنڈ پہلے میں نے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنی تھی تو یہی سمجھا تھا کہ وہ کوچی ہوگا مگر وہ دراصل کوئی اور آدمی تھا جو بنگلے کے پہلو کے دروازے سے نکل کر آیا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی کوچی نے چیخ کر مجھے خبردار کیا تھا۔ میں نے جھکائی دے کر بچنے کی کوشش تو کی تھی مگر ڈنڈا میرے سر پر لگا تھا۔ جس سے میرے چودہ طبق روشن ہوگئے تھے۔ اس شخص نے دوسرا وار کرنے کی کوشش کی ہوگی مگر کوچی نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا اور اس مرتبہ ڈنڈا کھڑکی کے شیشے پر لگا تھا۔ جس سے شیشہ چکنا چور ہوگیا تھا اور چھناکے کی آواز سے میں بھی ہوش میں آگیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر سر جھٹکتے ہوئے بائیں طرف دیکھا۔ کوچی اور حملہ آور ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ وہ شخص کوچی کو رگید رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس شخص کا پیر پکڑ لیا اور اسے پیچھے کھینچنے لگا۔

اس شخص نے کوچی کو چھوڑ دیا اور سانپ کی طرح پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا گھونسا میرے سینے پر لگا تھا۔ میں نے اس کا پیر چھوڑ دیا اور لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شخص پھرتی سے اٹھ کر دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔

اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا اور جسم میں گینڈے کی طرح طاقت بھری ہوئی تھی۔ ماسٹر لیشی یان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس بنگلے میں موجود ایک آدمی اسی کی طرح ہٹا کٹا ہے اور میرا خیال ہے وہ مارشل آرٹ سے بھی واقف تھا۔ اس کا پہلا حملہ تو بازاری انداز کا تھا لیکن پھر وہ سنبھلا اور ایک منجھے ہوئے مارشل آرٹسٹ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے میری گردن پر چوپ لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کا یہ وار روک لیا اور ساتھ ہی اس کے پیٹ میں فرنٹ کک رسید کردی۔ وہ جھٹکے سے دہرا ہوا مگر فوراً سنبھل گیا۔

میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلتے ہوئے الٹی قلابازی کھائی۔ میرے دونوں پیر اس کی گردن پر لپٹ گئے۔ میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر پوری قوت سے ٹانگوں کو بائیں طرف جھٹکا دیا۔ وہ شخص پورے قد کے ساتھ بائیں طرف گرا۔ میں نے پھرتی سے اپنے پیر اس کی گردن سے ہٹالیے اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

اس دوران میں کوچی بھی سنبھل گیا تھا۔ اسی وقت اندر سے عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ماسٹر لیشی یان اور نکوشی دوسری طرف سے اندر پہنچ چکے تھے۔

"کوچی۔ تم اسے سنبھالو۔ میں اندر جارہا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا اور عمارت کے پہلو کی طرف دوڑ لگادی۔

اس طرف کوئی برآمدہ وغیرہ نہیں تھا مگر ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھ پر حملہ کرنے والا شخص اسی دروازے سے آیا تھا۔ سامنے ایک تاریک راہداری تھی۔ میں اندر داخل ہو کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ راہداری کے اگلے موڑ پر دوسری طرف سے آنے والا کوئی شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کوئی عورت تھی جو ٹکرا کر نیچے گری تھی۔ [illegible] لڑکھڑا گیا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر نیچے گری ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ وہ خوف کی شدت سے مسلسل چیخ رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دائیں طرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔

اس جوان اور خوب صورت عورت کو بے لباس [illegible] مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ [illegible] ہو رہا تھا۔ میں نے اس عورت کو اٹھا کر کمرے میں پھینک دیا اور دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا لگا دیا اور دوڑ گیا۔

اب میں اس کمرے کے دروازے پر کھڑا

کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ وہ عورت جسے میں نے باہر سے دیکھا تھا، ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ نکوشی ایک قدرے بھاری بھرکم آدمی سے گتھم گتھا تھا۔ کمرے کا فرنیچر الٹ پلٹ گیا تھا۔ وہ عورت نکوشی پر ڈنڈے سے حملہ کرنا چاہتی تھی مگر جب بھی وہ ڈنڈا اوپر اٹھاتی نکوشی کا اپنا ساتھی سامنے آجاتا۔ اس طرح اسے نکوشی پر حملہ کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ میری طرف گھوم گئی اور چیختی ہوئی مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے ڈنڈے کو ہاتھ پر روکا اور اسے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ دراز قد عورت جھٹکا کھا کر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ چیختی ہوئی ایک صوفے پر گری اور صوفے سمیت پیچھے الٹ گئی۔

نکوشی متوسط قد و قامت کا لڑکا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک تربیت یافتہ اور منجھا ہوا مارشل آرٹسٹ تھا لیکن اس کا حریف اس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اگر لڑائی مارشل آرٹ کے اصولوں اور قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتی تو نکوشی چند سیکنڈ میں ہی اپنے حریف کو زمین چاٹنے پر مجبور کرسکتا تھا لیکن وہ شخص مارشل آرٹ کے آداب کو نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بازاری انداز میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کررہا تھا اور نکوشی کو اپنے فن کی کوئی ٹیکنیک آزمانے کا موقع نہیں مل رہا تھا اور ایک موقع پر تو اس کی گردن حریف کی گرفت میں آگئی تھی۔

میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس شخص کے پہلو میں زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وہ شخص کراہ اٹھا مگر اس نے نکوشی کی گردن نہیں چھوڑی۔ میرا دوسرا پنچ اس کی کنپٹی پر لگا۔ اس مرتبہ وہ چیخ اٹھا۔ نکوشی کی گردن بھی اس کی گرفت سے آزاد ہوگئی اور پھر میں نے اس شخص کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ نکوشی ایک طرف بیٹھا اپنی گردن سہلا رہا تھا۔

کھڑکی کے باہر سے بھی اٹھا پٹخ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جس کا مطلب تھا کہ کوچی اپنے حریف سے نبرد آزما تھا۔

"نکوشی۔" میں چیخا "باہر جاؤ۔ کوچی کو دیکھو۔"

نکوشی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور اس نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میرا حریف اگرچہ جسمانی لحاظ سے مجھ سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا مگر میں اسے گرفت میں لے چکا تھا۔ اس میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ مگر وہ اپنی اس طاقت کو استعمال کرنے کے سلیقے سے واقف نہیں تھا۔ اگر وہ اپنے اندر چھپی ہوئی اس طاقت کو صحیح طور پر استعمال کرتا تو مجھ جیسے دو آدمیوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل سکتا تھا۔

اس دوران میں وہ عورت بھی سنبھل گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر ڈنڈا اٹھالیا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لپکی۔ اس وقت میں اپنے حریف کے اوپر تھا۔ میں اپنے حریف کو ساتھ لیتا ہوا بڑی پھرتی سے بائیں طرف لوٹ لگا گیا۔ اس طرح حریف میرے اوپر آگیا اور ڈنڈے کا وار اس کی کھوپڑی پر لگا۔ وہ چیختا ہوا میرے اوپر ڈھیر ہوگیا۔

وہ عورت ایک لمحے کو ساکت ہو کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت ابھر آئی تھی۔ میرے ہونٹوں پر طیش دلانے والی مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے سنبھل کر ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ ڈنڈا اس شخص کی پشت پر لگا۔ اسے شاید چوٹ کا احساس نہیں ہوا ہوگا کیونکہ سر پر لگنے والی چوٹ سے وہ پہلے ہی بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے ایک طرف دھکیل دیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس عورت پر جنون سا طاری ہوگیا۔ وہ پے در پے ڈنڈے سے مجھ پر حملے کرتی رہی اور میں اچھل اچھل کر اپنے آپ کو بچاتا رہا اور بالآخر میں نے ڈنڈے کو پکڑ کر اپنی طرف جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے اسے اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ وہ اپنے ہاتھوں کو بھی حرکت دینے کے قابل نہیں رہی تھی۔

وہ اس طرح میرے سینے سے لگی ہوئی تھی جیسے محبوب کو لپٹا رکھا ہو۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ چہرے پر خوف اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔

"جو عورتیں شراب پیتی ہوں، سگریٹ نوشی کرتی ہوں۔ وہ بستر پر مردوں کا دل تو بہلا سکتی ہیں لیکن وقت پڑنے پر اپنا دفاع نہیں کرسکتیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "عورت میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اتنی طاقت کہ وہ دنیا کو تہ و بالا کرسکتی ہے۔ مگر تم نے تو اپنے آپ کو ہی تباہ کر ڈالا۔"

میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر پیچھے کی طرف زوردار دھکا دیا۔ وہ شیشے کے ٹاپ والی سینٹر ٹیبل پر گری۔ چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی اس کی خوفناک چیخ بھی کمرے میں گونجی تھی۔ سینٹر ٹیبل کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ اندر دھنس گئی تھی۔ شیشہ ٹوٹنے سے اس کی دونوں ٹانگوں اور ایک بازو پر کٹ لگ گئے تھے جن سے خون رسنے لگا تھا مگر زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔

"تم یہاں آرام کرو۔ میں ذرا اپنے ساتھیوں کو دیکھ لوں۔" میں نے کہا اور کھڑکی کی طرف لپکا۔

اور پھر وہ منظر دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ایک آدمی پچھلی طرف جھاڑیوں میں بھاگا جارہا تھا۔ نکوشی اور کوچی اس کے پیچھے تھے اور پھر اسی لمحے اندر کسی کمرے سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دروازے کی طرف لپکا۔

دوسرے کمرے کا منظر خاصا دلچسپ تھا۔ ماسٹر لیشی یان دو حریفوں سے نبرد آزما تھا۔ وہ دونوں مارشل آرٹ کے ماہر تھے اور ماسٹر لیشی یان کو بھی شاید ان سے مقابلہ کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ کمرا خاصا وسیع و عریض تھا۔ اس لیے مقابلے کے لیے جگہ کی کمی بھی نہیں تھی۔ البتہ سارا فرنیچر الٹ پلٹ ہو رہا تھا۔

ماسٹر کے حریفوں میں سے ایک کو تو میں نے پہچان لیا۔ وہ میگا تیراڈ تھا اور دوسرا میرے لیے اجنبی تھا۔ جسے ماسٹر نے میرے سامنے اٹھا کر دیوار کے ساتھ پٹخ دیا تھا اور وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ البتہ میگا ماسٹر پر تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا اور ماسٹر بڑی خوب صورتی سے ان حملوں کا دفاع کر رہا تھا۔

دوسرا حریف اٹھ کر حملہ آور ہونے کے انداز میں ماسٹر کی طرف لپکا لیکن میں نے اسے قریب پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں کھڑے کھڑے طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور میری فلائنگ کک بھرپور انداز میں اس شخص کے سینے پر لگی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ میں نے اسے دوبارہ سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

اسی دوران میں ماسٹر لیشی یان مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ میگا کا ایک پنچ کھا کر اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر اپنے آپ کو میگا کے مقابلے کے لیے تیار کرتا' میگا نے دروازے کی طرف چھلانگ لگادی۔

ماسٹر لیشی یان اس کے پیچھے لپکا۔ میرے حریف نے بھی ایک زوردار چھلانگ لگادی اور کھڑکی توڑتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں کھڑکی کی طرف لپکا تو وہ شخص بہت تیزی سے ایک طرف دوڑا جارہا تھا۔ اس کے پیچھے جانا بیکار تھا۔ میں مڑ کر دروازے کی طرف لپکا۔

ماسٹر لیشی یان برآمدے میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"بھاگ گیا۔" ماسٹر نے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کے پیچھے جانا بیکار ہے۔ ہکسیان کو دیکھو۔ وہ اندر ہی ہے۔"

ہم دونوں دوڑتے ہوئے اندر آگئے۔ ماسٹر لیشی یان ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

"ارے۔ وہ یہیں تھا۔ کہاں بھاگ گیا۔" ماسٹر بولا۔

ہم کمرے سے باہر نکلنا ہی چاہتے تھے کہ بیڈ... آہٹ سن کر میں چونک گیا اور جب میں نے جھک کر... دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہکسیان... نیچے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر باہر... لیا۔

ہکسیان کے جسم پر صرف پتلون تھی۔ پٹی... بندھی ہوئی تھی۔ جو پہلو کی طرف خون سے سرخ... تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس روز جاگ... وار کاری ثابت ہوا تھا اور ہکسیان اس قابل نہیں... کہ اپنا دفاع کر سکتا یا بھاگ سکتا۔

ساتھ والے کمرے کا دروازہ بڑے زور زور... دھڑایا جارہا تھا اور ساتھ ہی کسی عورت کے چلانے... بھی سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ پہلو والے... سے یہاں داخل ہوتے ہی ایک عورت مجھ سے ٹکرا... جسے اٹھا کر میں نے ایک کمرے میں بند کردیا تھا۔

ہکسیان کو ماسٹر لیشی یان کے حوالے کیا اور تیزی... کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے کے سامنے پہنچ... دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ عورت جھٹکے سے پیچھے گر... نے اندر داخل ہو کر بتی جلادی اور اِدھر اُدھر دیکھ... میری نظریں اس عورت کے چہرے پر جم گئیں۔ ا... بیس ایکس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے چہرے... خوف تھا اور آنکھیں وحشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں... میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ وہ ہو... کانپ رہی تھی۔

"تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟" میں نے اسے گھو...

"دوسرے کمرے میں۔" اس نے ہکلا کر جو...

"م۔۔۔ میں ہکسیان والے کمرے میں تھی۔"

میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور ہکسیان وا... میں آگیا۔ ہکسیان بیڈ پر پڑا تھا اور ماسٹر لیشی یان... کھڑا کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھ... میں نے ایک کرسی پر پڑے ہوئے زنانہ کپڑے اٹھ... دوسرے کمرے میں پھینک کر واپس آگیا۔

ہکسیان کے جسم پر بندھی ہوئی پٹی پہلو پر خون... ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھا۔ میں نے جھک... بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔

"تمہارے سارے آدمی تو بھاگ گئے اور تمہ... گھنتال بھی جس کے کہنے پر تم نے مجھے مروانے کی...

تھی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اب میں تمہارا کیا حشر کروں گا۔ تم خود ہی سوچ سکتے ہو۔"

"یہاں نہیں وجدان۔" ماسٹر لیشی یان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اسے ہم ساتھ لے چلیں گے اور پھر اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔"

اسی وقت نسوانی چیخ کی آواز سن کر میں باہر کی طرف دوڑا۔ میں عقبی برآمدے میں پہنچا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ کوچی اور نکوشی اسی عورت کو پکڑ کر لا رہے تھے جسے میں نے دوسرے کمرے میں کپڑے لے جاکر دیے تھے۔ اس نے کپڑے پہننے کے بعد پچھلے دروازے سے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر اس طرف کوچی اور نکوشی موجود تھے جو اسے پکڑ لائے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

"چھوڑ دو اسے۔" میں نے کہا اور پھر اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہیں ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے چلے جائیں گے اور تم بھی آزاد ہوگی۔"

اس لڑکی کو کمرے ہی میں چھوڑ کر ہم باہر آگئے۔ ہکسیان ہمارے آگے تھا اور ماسٹر لیشی یان نے اسے کالر سے پکڑ رکھا تھا۔

میں اس کمرے میں آگیا جہاں وہ دراز قامت عورت اب بھی سینٹر ٹیبل کے اندر دھنسی ہوئی تھی۔ وہ اینجلا تھی۔ سینٹر ٹیبل کا شیشہ ٹوٹ جانے سے وہ فریم کے اندر اس طرح پھنسی تھی کہ خود سے نکل نہیں سکتی تھی اور شاید اس نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ کوئی حرکت کرنے کی صورت میں ٹوٹے ہوئے شیشے اس کے جسم کو مزید زخمی کرسکتے تھے۔ دوسرا آدمی ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ جس کے سر پر اینجلا ہی کا ڈنڈا لگا تھا۔

"مجھے نکالو۔ مجھے نکالو یہاں سے۔" وہ مجھے دیکھتے ہی چیخی "میرا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہو رہا ہے۔ خون بہہ رہا ہے۔ مجھے نکالو یہاں سے۔"

"میرا خیال ہے یہ جگہ تمہارے لیے بہترین ہے۔" میں نے کہا "کچھ دیر یہاں آرام کرو۔ اور جب تھک جاؤ تو کوشش کر کے نکل آنا۔"

"میں تم لوگوں کو چھوڑوں گی نہیں۔" وہ چیخی "مار ڈالوں گی تم لوگوں کو۔ تم لوگوں نے میرے گھر پر حملہ کیا ہے۔ تمہیں اس کا حساب دینا پڑے گا۔"

"شکر کرو ہم تمہیں زندہ چھوڑ کر جارہے ہیں۔" میں نے کہا "دوسری مرتبہ سامنے آؤ گی تو زندہ نہیں بچو گی۔ ان لوگوں سے دوستی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔" میں نے دروازے میں کھڑے ہو کر ہکسیان کی طرف اشارہ کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔

وہ لڑکی دوسرے کمرے میں تھی اور مجھے یقین تھا کہ ہمارے جانے کے بعد وہ اینجلا کو اس مصیبت سے نجات دلا دے گی۔ ہم ہکسیان کو لے کر بنگلے سے باہر آگئے۔

اسٹیشن ویگن درخت کے نیچے موجود تھی لیکن حاشی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ماسٹر لیشی یان نے اس کا نام لے کر آواز دی تو وہ پارک کے پودوں کی آڑ سے نکل کر سامنے آگئی۔

"سوری ماسٹر۔" وہ قریب آتے ہوئے بولی "اگر میں گاڑی ہی میں بیٹھی رہتی تو آپ لوگ مجھے ڈھونڈتے ہی رہ جاتے اور میں کہیں نظر نہ آتی۔"

"کیا مطلب؟" ماسٹر لیشی بولا۔

"تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی بنگلے سے نکل کر دوڑتا ہوا اس طرف آیا تھا۔ مجھے کچھ شبہ سا ہوا اور میں ویگن سے اتر کر پودوں میں چھپ گئی۔" حاشی ویگن کا دروازہ کھولتے ہوئے بتا رہی تھی "ویگن سے اترتے ہوئے میں نے اگنیشن سے چابی نکال لی تھی اور ڈیش بورڈ کے نیچے ایک تار بھی کھینچ دیا تھا۔ میرا شبہ درست نکلا۔ اس شخص نے ویگن میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تھی مگر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا تھا۔ وہ اُس طرف بھاگ گیا۔"

"اوہ! وہ یقیناً میگا ہوگا۔" میں نے کہا۔

ہم لوگ ویگن میں بیٹھ چکے تھے۔ حاشی اسٹیئرنگ کے نیچے جھکی وہ تار جوڑ رہی تھی جسے اس نے خود کھینچا تھا۔ پھر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کردیا۔

"کیا اینجلا پولیس کو اطلاع دے گی؟" میں نے ماسٹر لیشی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ماسٹر نے جواب دیا "وہ خود بھی ایک بدنام عورت ہے۔ پہلے سے پولیس کی لسٹ پر ہے۔ اس نے خطرناک مجرموں کو پناہ دے رکھی تھی۔ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دے کر وہ اپنی گردن نہیں پھنسوائے گی۔"

میں نے مڑ کر ہکسیان کی طرف دیکھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر کوچی اور نکوشی کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ویگن حرکت میں آچکی تھی۔ اس مرتبہ حاشی نے دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کا ایک بج چکا تھا مگر قصبے کے بعض علاقوں میں تھوڑی بہت رونق نظر آرہی تھی۔ ایسی جگہوں پر کسی تھیٹر یا نائٹ کلب کی وجہ سے اِکا دُکا ریسٹورنٹ بھی کھلے

ہوئے تھے۔

ایک موڑ گھومتے ہی حاشی کو ویگن کی رفتار کم کرنی پڑی۔ سامنے پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی۔ حاشی نے ماسٹر کی طرف دیکھا اور اس کا اشارہ پاکر ویگن روک لی۔

وہ چار پولیس والے تھے۔ تین رائفلیں تان کر کھڑے رہے اور چوتھا ویگن کی ڈرائیونگ سائڈ پر آگیا۔ اس نے پہلے حاشی کو دیکھا اور پھر محتاط انداز میں آگے جھک کر ویگن کے دوسرے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ماسٹر لیشی یان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا۔ اس نے بو کیا اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

"ماسٹر۔ اس وقت آپ شاؤیانگ میں؟"

"ایک ضروری کام سے آئے تھے۔" ماسٹر نے جواب دیا "کیا بات ہے۔ یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟"

"اسٹریٹ ایم کے ایک مکان میں ایک عورت کو قتل کر دیا گیا ہے۔ قاتل کی تلاش میں چیکنگ ہو رہی ہے۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ اس نے ایک بار پھر بو کیا اور اپنے ماتحتوں کو گاڑی کے سامنے سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔

وہ پولیس آفیسر بھی ماسٹر لیشی یان کا شاگرد رہ چکا تھا۔ ماسٹر کی موجودگی اس وقت کام آگئی تھی۔ اگر ماسٹر ہمارے ساتھ ویگن میں نہ ہوتا تو پولیس والے ہمیں ویگن سے اتار کر چیک کرتے اور ہکسیان کے پیٹ پر بندھی ہوئی خون آلود پٹی ہمیں پھنسا دیتی۔

حاشی کے بنگلے پر پہنچتے ہی ہکسیان کو ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ماسٹر نے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں ہکسیان کے علاوہ صرف میں اور ماسٹر تھے۔

"تم پہلے سے زخمی ہو۔" میں نے ہکسیان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم مزید تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دیتے رہو۔ بصورتِ دیگر۔۔۔"

"اس وقت تو میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔" ہکسیان کراہتے ہوئے بولا "لیکن یہ بات ذہن نشین کرلو کہ تمہاری موت کے پروانے پر دستخط ہو چکے ہیں۔ میگا تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"میگا سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے۔ پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ میگا سے تمہاری ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا اور پھر میرے ہر سوال کا جواب دیتا چلا گیا۔ ہکسیان کے کہنے کے مطابق میگا سے اس کی ملاقات شاؤیانگ ہی میں ہوئی تھی۔ میگا کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ہکسیان سے میری چپقلش چل رہی ہے اور وہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔

میگا نے اسے پیشکش کی تھی کہ اگر ہکسیان مجھے اغوا کر کے اس علاقے سے باہر نکال لے جانے میں اس کی مدد کرے تو اسے نہ صرف ایک خطیر رقم دی جائے گی بلکہ وہ چاہے تو اس کے ساتھ گولڈن ٹرائی اینگل بھی جا سکتا ہے۔

"میں نے من شن کو ایک بڑی رقم کا لالچ دے کر تمہیں اغوا کرنے کی ذمے داری سونپی تھی۔" ہکسیان نے کہا "من شن شاؤلن کا سب سے سینئر اور ماہر مارشل آرٹسٹ تھا۔ اسے آج تک کسی نے چیلنج نہیں کیا تھا مگر تم سے وہ خطرہ محسوس کرنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم اس کے مقابل آؤ گے اور وہ تم سے شکست کھا جائے گا۔ اس خوف نے اس کے دل میں تمہارے لیے نفرت پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے تمہارے اغوا کی ذمے داری سونپی تو اس نے بلو پائپ کے ذریعے تمہیں قتل کرنے کی کوشش کی مگر تمہارے بجائے کوئی اور لڑکا زہریلی سوئی کا شکار ہو گیا۔ فرار کی کوشش میں من شن تمہارے ہاتھ لگ گیا اور تم نے جس طرح اس کی پٹائی کی تھی۔ اس کا بھی مجھے پتا چل گیا تھا۔ اسے شاید یقین تھا کہ تم لوگ اسے تشدد کا نشانہ بناؤ گے اس لیے اس نے سائنائڈ کا کیپسول کھا کر خودکشی کر لی۔"

"اور مورو تانگ کو تم نے قتل کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مورو تانگ نے خود اپنی موت کو آواز دی تھی۔" ہکسیان نے جواب دیا "من شن سے میری ملاقات ایک ریسٹورنٹ میں ہوئی تھی اور ہم میں یہ ساری باتیں وہیں ہوئی تھیں۔ مورو تانگ وہاں کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اور اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔ اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولا تھا لیکن جب میں دریا پر تمہارے اغوا کی کوشش میں ناکام اور جانگی کے ہاتھوں زخمی ہو کر اس کی کار پر شاؤیانگ آ رہا تھا تو باتوں ہی باتوں میں اس نے بتا دیا کہ اس روز اس نے ریسٹورنٹ میں میری اور من شن کی باتیں سن لی تھیں۔ میں ایک دم چونک گیا۔ وہ میرے لیے خطرہ پیدا کر سکتا تھا۔ میں اسے اپنے ٹھکانے تک لے گیا جہاں میگا بھی موجود تھا اور پھر میگا سے مشورہ کرنے کے بعد میں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"میگا کا کوئی اور ٹھکانا؟" میں نے پوچھا "وہ اینجلا کے بنگلے سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے؟"

"مجھے اس کے کسی اور ٹھکانے کا علم نہیں ہے۔" ہکسیان نے جواب دیا۔

"اینجلا سے اس کا کیا تعلق ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"اینجلا ایک عورت ہے۔ اس کے پاس کوئی بھی شخص جا سکتا ہے۔" ہکسیان نے کہا "میگا نے اس سے طے کر لیا تھا کہ وہ جب تک اس کے پاس رہے گا کوئی اور مرد وہاں نہیں آئے گا۔"

"اس شخص کو کس نے مروایا تھا جو اس روز شاؤلن سے تمہارے ساتھ آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تاؤ۔" ہکسیان بولا "وہ بہت بزدل آدمی تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ اسے یہاں سے بھگا دیا جائے۔ مگر وہ کم بخت شاؤلن پہنچ گیا۔ میگا کے آدمی اس کی نگرانی کر رہے تھے۔ میگا نے اپنے آدمیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر وہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ تاؤ تقریباً ایک گھنٹے تک میگا کے آدمیوں کی نگاہوں سے اوجھل رہا تھا اور جب دوبارہ نظروں میں آیا تو اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور ایک آدمی بھی تھا۔ وہ خود لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میگا کے آدمیوں کو شبہ ہوا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ انہوں نے اسے کار سے کچل کر مار ڈالا اور ان لڑکیوں اور اس آدمی کو ڈرانے کے لیے واپس جاتے ہوئے ایک ہوائی برسٹ مار دیا۔"

"جانتے ہو وہ دو لڑکیاں اور ان کا ساتھی کون تھا؟" میں نے پوچھا۔ ہکسیان نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ میں تھا اور میرے ساتھ کامنی اور چیکو تھیں۔" میں نے کہا "کل کامنی نے تمہیں اور تاؤ کو مورو تانگ کی کار میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور آج ہم ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ کامنی نے تاؤ کو دیکھ لیا۔ ہمیں مورو تانگ کے قتل کا پتا چل چکا تھا، ہم تاؤ سے تمہارا اور میگا کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ تاؤ کو شبہ ہو گیا۔ اس نے پہاڑیوں کی طرف جا کر ہمیں چکما دینے کی کوشش کی مگر ہمارے قابو میں آگیا اور اس نے سب کچھ بتا دیا۔ اینجلا کے بنگلے کا پتا بھی اسی نے بتایا تھا لیکن وہ بے چارہ مارا گیا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تمہارے ہاتھوں اتنے بے گناہ مارے جا چکے ہیں کہ تمہیں کم از کم دس مرتبہ پھانسی کے پھندے پر لٹکانا پڑے گا۔"

"مم۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔" ہکسیان گھگیاتے ہوئے بولا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا اور آئندہ تمہارے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"تمہارے ساتھ کیا کرنا ہے؟ اس کا فیصلہ میں نہیں ماسٹر کریں گے۔" میں نے لیشی یان کی طرف اشارہ کیا۔

"پلیز! ماسٹر میں زخمی ہوں۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔" ہکسیان روتا ہوا ماسٹر لیشی یان کے قدموں میں گر گیا۔

ماسٹر نے اسے ٹھوکر مار کر پیچھے گرا دیا۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ بھی میری طرح کسی بے رحم اور ظالم کو معاف کرنے کا قائل نہیں تھا۔ میں پہلے بھی شاید ایک دو مرتبہ یہ بتا چکا ہوں کہ ظالم جب کسی پر ظلم کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے لیکن جب اپنی جان پر بنتی ہے تو خدا یاد آنے لگتا ہے اور رحم کی بھیک مانگنے لگتا ہے۔ حقیقتاً یہ لوگ بہت بزدل ہوتے ہیں، کسی کا ایک تھپڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے اور میرے خیال میں دھرتی کو ایسے لوگوں کے بوجھ سے ہلکا کر دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

ہکسیان کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے فرش پر ڈال دیا گیا اور جب ہم کمرے سے باہر آئے تو حاشی شب خوابی کے روایتی چینی لباس میں تھی۔ یہ لباس ڈھیلا ڈھالا تھا لیکن جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤن نما لباس کی آستینیں بھی بہت لمبی تھیں اور ہاتھ بھی چھپے ہوئے تھے۔ جب وہ ہمارے لیے چائے بنانے لگی تو اسے آستینیں اوپر تک اڑس لینا پڑی تھیں۔

ہم صبح چار بجے تک وہیں رہے اور پھر ہکسیان کے بارے میں چیانگ شاؤ اور حاشی کو ہدایات دے کر شاؤلن کے لیے روانہ ہو گئے۔

اپنے کیمپ میں پہنچ کر مجھے صرف آدھا گھنٹا آرام کرنے کا موقع مل سکا اور پھر میں تیار ہو کر ساڑھے پانچ بجے پہاڑی پر پہنچ گیا جہاں ماسٹر ہنگ پائی حسب معمول مجھ سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ میں نے اگرچہ جانگی کو آج بھی نہیں جگایا تھا لیکن میں خود اپنی پی کی پریکٹس میں کوئی ناغہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پریکٹس کے اختتام پر حسب معمول ماسٹر ہنگ پائی کچھ دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا اور پھر جب مشرق کی ایک پہاڑی چوٹی کی آڑ سے سورج نے سر ابھارا تو ماسٹر ہنگ پائی نے سورج کے سرخ گولے پر نظریں جما دیں اور مجھے وہاں سے اٹھنے کا موقع مل گیا اور میں جوگنگ کرتا ہوا وہاں سے دور نکل گیا۔

میں واپس آیا تو جانکی وغیرہ ناشتے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ جانکی نے ہی سب سے پہلے مجھ سے سوال کیا تھا کہ گزشتہ رات کیا ہوا تھا۔ میں انہیں تفصیل بتا تا رہا۔

مجھے سیزرز ہینڈ ڈیفنس کی پریکٹس کرتے ہوئے کئی ہفتے گزر گئے تھے۔ اس روز ماسٹر لیشی یان خود میرے مقابلے پر آگیا۔ وہ مجھ پر ایسے وار کر رہا تھا جنہیں میں نے سیزرز ہینڈ ڈیفنس ٹیکنیک سے روکنا تھا۔ شروع شروع میں تو مجھے کچھ ناکامی ہوئی لیکن مسلسل پریکٹس سے مجھے عملی تجربہ ہوتا گیا۔ ایک مرتبہ جب لیشی یان نے حملہ کیا تو اس کا ہاتھ نیچے آنے سے پہلے ہی میں نے بڑی پھرتی سے دونوں بازو اس طرح اپنے سامنے کرلیے کہ کلائیاں قینچی کے بلیڈز کی طرح ایک دوسرے کو کراس کرنے لگیں۔ ماسٹر کا بازو اس کی کلائی سے ذرا پیچھے اس کراس پر پڑا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیوں کی پشت کو آپس میں ملالیا۔ اس طرح ماسٹر کا بازو میرے کراس کے شکنجے میں پھنس گیا۔

”گڈ۔“ ماسٹر لیشی یان مسکرا دیا اور پھر اچانک وہ چیخا ”زور لگاؤ۔ دباؤ میرے بازو کو۔۔۔“

میری پوری قوت میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔ میری بند مٹھیوں کے جوڑ سفید ہونے لگے۔ ماسٹر لیسی یان کا بازو شکنجے کی طرح میری کلائیوں کے کراس میں پھنسا ہوا تھا۔

”تمہارا زور کندھوں میں نہیں۔ کہنی سے آگے انگلیوں کی پوروں تک ہونا چاہیے۔“ ماسٹر نے ایک بار پھر چیخ کر کہا ”گڈ۔۔۔ لیکن تمہاری کہنیوں کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ اسے روکو۔ ویری گڈ۔۔۔ اور اب دیکھو میں اپنا بازو کس طرح چھڑاتا ہوں۔“

ماسٹر چند لمحے زور آزمائی کرتا رہا اور پھر اس نے بل کرتے ہوئے اپنے بازو کو اس طرح جھٹکا دیا کہ وہ میرے شکنجے سے نکل گیا۔

”بہت خوب!“ ماسٹر نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ اور اپنی کلائی سہلانے لگا ”پریکٹس کی ضرورت ہے۔ چند روز کی پریکٹس سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ حریف کے بازو کی ہڈی توڑ سکو۔“

اور اس طرح میری پریکٹس جاری رہی۔ ماسٹر لیشی یان نے مجھے وہ ٹیکنیک بھی سکھادی کہ جب اپنا ہاتھ حریف کے شکنجے میں پھنس جائے تو اسے کس طرح آزاد کرایا جاسکتا ہے۔ تین چار ہفتوں کی مزید پریکٹس کے بعد میں اس ٹیکنیک میں مہارت حاصل کرچکا تھا۔

انہی دنوں ایک کیمپ کے سالانہ چیلنج مقابلوں کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ اس تقریب میں اس کیمپ کے کامیاب امیدواروں کو ڈگریاں بھی دی جانے والی تھیں۔ ہمارے کیمپ کو بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن پھر اچانک اس کیمپ کی تقریب ملتوی کردی گئی۔ اگرچہ اس التوا کی وجہ چھپانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ یہ انکشاف سب کے لیے نہایت سنسنی خیز ثابت ہوا کہ اس کیمپ کی دو لڑکیاں اور تین لڑکے ہیروئن استعمال کرنے لگے تھے۔ پانچوں اپنی ٹریننگ کے آخری ٹیسٹ میں حصہ لینے والے تھے۔ کامیابی پر انہیں ڈگریاں دی جاتیں اور وہ اپنے اپنے ملکوں کو روانہ ہو جاتے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شاؤلن میں پھیل گئی۔ اور پھر نئے نئے انکشاف ہونے لگے۔ ہر کیمپ کا کوئی نہ کوئی لڑکا یا لڑکی اس لعنت میں مبتلا پایا گیا تھا اور بدقسمتی سے ہمارے کیمپ کے دو لڑکے بھی اس کا شکار ہو گئے تھے۔

کسی بھی کھیل میں کوئی نشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ اسٹیمنا کو تباہ کردیتا ہے۔ میں نے کبھی کسی کو سگریٹ تک پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہیروئن کے نشے کے تباہ کن اثرات تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس زہر نے میری تھائی کو مجھ سے چھین لیا تھا۔

نشے کے عادی لڑکوں کو کیمپ سے نکال دینا کوئی حل نہیں تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جو یہ زہر ان کے خون میں پھیلا رہے تھے۔

ابتدائی پوچھ گچھ سے یہ بھی پتا چل گیا کہ کیمپوں میں ہیروئن کو متعارف ہوئے ڈیڑھ دو مہینے سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میرے ذہن میں میگا تیراؤ کا نام ابھر آیا۔ تقریباً [illegible] مہینے پہلے ہی اسے یہاں دیکھا گیا تھا۔ اس کا تعلق چونکہ [illegible] برنس سے تھا اسی لیے اس پر شبہ فطری بات تھی۔ وہ اس کے بعد اگرچہ یہاں نظر نہیں آیا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ خود ہی یہاں آکر پُڑیاں بانٹتا پھرے۔ یہ کام تو وہ کسی سے بھی لے سکتا تھا۔ میرے ذہن میں دو نام اور تھے۔ جرمن ٹروڈر اور اس کا لمبے بالوں والا برطانوی ساتھی جو دو مرتبہ ہمارے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ وہ دونوں اسی فطرت کے تھے کہ پیسے کے لیے اس قسم کا کوئی بھی کام کرسکتے تھے۔ انہیں بھی کئی روز سے شاؤلن میں نہیں دیکھا گیا تھا۔

میں نے ماسٹر لیشی یان سے اپنے شبہے کا اظہار کیا۔ پھر ہم نے خفیہ طور پر تحقیقات شروع کردی۔ کوچی میرے ساتھ تھا۔ ہم ہیروئن استعمال کرنے والوں سے پوچھتے کہ انہیں پُڑیاں کون سپلائی کرتا تھا مگر کوئی بھی نام بتانے کو تیار نہیں تھا۔ انہیں یا تو بُرے نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھیں یا یہ خوف تھا کہ اگر سپلائر پکڑا گیا تو وہ لوگ اس نشے سے محروم ہو جائیں گے۔

بالآخر کسی دوسرے کیمپ کی ایک لڑکی میرے ہاتھ لگ گئی۔ وہ تھائی لینڈ کی رہنے والی تھی اور اتفاق سے ماسٹر ہوچن سے مارشل آرٹ کی ابتدائی تربیت حاصل کرچکی تھی۔

میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو وہ چونک سی گئی۔ اس نے بنکاک میں میرا نام ضرور سنا تھا لیکن مجھے دیکھا کبھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں جھوٹ بول رہا ہوں لیکن ناموں اور واقعات کے حوالے کام کر گئے۔

”اگر میں نے ان کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ شانتی نامی اس لڑکی نے کہا ”وہ مجھے پُڑیا دینا بند کردیں گے۔“

”پُڑیا میں تمہیں دوں گا اور ڈرو نہیں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ تم بتاؤ وہ کون ہیں؟“ میں نے کہا ”اور یہ بات تمہیں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہیروئن تمہیں تباہ کردے گی۔ کھوکھلا کردے گی تمہیں اور تم کبھی مارشل آرٹسٹ نہیں بن سکو گی۔ یہ نشہ تم سے زندگی چھین لے گا اور تم ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاؤ گی۔“ میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا ”تم تو بنکاک کی رہنے والی ہو۔ وہاں تم نے قدم قدم پر ایسے اندوہناک مناظر دیکھے ہوں گے۔ چائنا ٹاؤن میں۔ ٹاکسن اسکوائر پر۔ گنجان آبادی کی ہر گلی کے موڑ پر تم نے ایسے لوگوں کو ضرور دیکھا ہوگا جو ہیروئن کی لعنت کا شکار ہو کر مفلوج ہو چکے ہیں۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہے۔ ان کی زندگی خود ان کے لیے بوجھ بن گئی ہے۔ ذی ہوش لوگ انہیں نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ انہیں ہمدردی کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔ ہمدردی تو ان سے ہوتی ہے جو زیادتی اور ظلم کا شکار ہوا ہو۔ اور جو شخص جان بوجھ کر آگ میں کود رہا ہو، اس سے ہمدردی کیسی؟ وہ سڑکوں پر پڑے بھیک کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں مگر انہیں بھیک بھی نہیں ملتی۔ کیا تم چاہتی ہو کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو؟ نہیں شانتی۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ”یہ ہاتھ بھیک مانگنے کے لیے نہیں ہیں۔ ان میں تو بڑی قوت ہے۔ دوسروں کو سہارا دینے کی بے پناہ طاقت ہے ان ہاتھوں میں۔ تم ان ہاتھوں کی طاقت کیوں ختم کرلینا چاہتی ہو۔ ہیروئن تمہارے ان ہاتھوں سے تمہارے پورے جسم سے زندگی نچوڑ لے گی۔ نہیں شانتی۔ تم تو بہت بڑی مارشل آرٹسٹ بننا چاہتی ہو۔ یہاں تک آنے کے لیے تم نے نجانے کتنی مصیبتیں برداشت کی ہوں گی۔ کتنے کٹھن مراحل سے گزری ہو گی لیکن چٹکی بھر پاؤڈر نے تمہیں ڈھیر کردیا۔ تمہارے جسم کی ساری شکتی نچوڑ کر رکھ دی۔ کیا تم ہار مان جاؤ گی۔ شکست کھا جاؤ گی۔ ایک بات یاد رکھو۔ کوئی سچا مارشل آرٹسٹ آسانی سے شکست نہیں کھاتا۔ وہ برائیوں کو فروغ نہیں دیتا نہ ہی ان کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنتا ہے۔ تم تو ایک سچی مارشل آرٹسٹ ہو۔ اس فن سے محبت ہی تمہیں اپنے گھر سے ہزاروں میل دور یہاں کھینچ لائی ہے۔ کیا تم سب کچھ ضائع کردو گی۔ اپنی ساری محنت پر پانی پھیر دو گی؟ نہیں شانتی۔ تم اپنے ساتھ ایسا نہیں ہونے دو گی۔ اس برائی کو روکنے میں ہماری مدد کرو۔ تم اکیلی نہیں ہو اور ابھی بہت سے لڑکے اور لڑکیاں اس لعنت کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ سب برباد ہو جائیں گے۔ انہیں بچانے میں ہماری مدد کرو۔ تم ان لوگوں کے بارے میں بتا دو جو یہ زہر پھیلا رہے ہیں اور یقین کرو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ویسے بھی یہ ابتدائی مرحلہ ہے۔ تمہارا علاج ہو جائے گا۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی اور مارشل آرٹ میں ضرور نام پیدا کرو گی۔“

شانتی سر جھکائے خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا شانتی۔“ میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”بتا دو ان کے نام۔ ہم آج ہی ان سے نمٹ لیں گے۔“

شانتی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ میں اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا اور پھر اس نے وہ نام بتا دیے۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میرا شبہ درست نکلا تھا۔ وہ جرمن ٹروڈر اور اس کا لمبے بالوں والا ساتھی مائیکل تھے۔

”مگر ان لوگوں کو تو بہت دنوں سے یہاں نہیں دیکھا گیا۔ وہ تم سے کیسے رابطہ کرتے ہیں؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”وہ دونوں شاؤیانگ میں رہ رہے ہیں۔“ شانتی نے بتایا ”ہر تیسرے روز یہاں آتے ہیں۔ انہوں نے گیغشو پارک کو اپنا اڈا بنا رکھا ہے۔ جہاں کافی شاپ ہے۔ وہ اس سے ذرا ہٹ کر درختوں کے نیچے ایک بینچ پر بیٹھے رہتے ہیں اور ضرورت مند وہاں جا کر ان سے پُڑیا لے لیتے ہیں۔“

”تین دن بعد۔“ میں بڑبڑایا ”وہ آخری مرتبہ کب آئے تھے اور اب کس روز آئیں گے؟“

"دو دن پہلے آئے تھے۔ اب وہ کل آئیں گے۔" شانتی نے جواب دیا "وہ رات آٹھ سے دس بجے تک وہاں بیٹھتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ لوگ ہیروئن کہاں سے لیتے ہیں؟"

"نہیں۔" شانتی نے نفی میں سرہلایا "مجھے نہیں معلوم۔"

"ٹھیک ہے شانتی۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "کل وہ یہاں آئیں گے تو واپس نہیں جاسکیں گے اور تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کہ مجھے ان کے بارے میں کس نے بتایا تھا۔ میں تمہارے ماسٹر سے بات کرتا ہوں۔ آج ہی تمہارا علاج شروع کردیا جائے گا اور تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔"

شانتی کی عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر اضمحلال واضح طور پر نظر آرہا تھا اور یہ پژمردگی ہیروئن کے استعمال کا نتیجہ تھی۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ بروقت پتا چل گیا تھا۔ اگر چند ہفتے مزید گزر جاتے تو وہ نچڑ کر رہ جاتی۔ میں جب رخصت ہونے لگا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"ایک بات تم بھی سچ سچ بتا دو۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "کیا تم وہی وجدان ہو جو۔۔۔"

"تمہیں اس میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں وہی وجدان ہوں جس نے بنکاک میں منشیات کے سب سے بڑے تاجر اور بدمعاش ٹائیگر کی گردن مروڑی تھی۔ پیڈرو بھی میرے ہی ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا۔ ویسے کیا تم ڈاکٹر جانکی دیوی کو جانتی ہو۔"

"ہاں ہاں۔ بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔" شانتی نے گردن ہلا دی "بنکاک میں اس کا نام بھی تمہارے نام کے ساتھ سنا جاتا تھا اور ایک اور عورت بھی تھی تمہارے ساتھ۔ ہاں یاد آیا۔ اس کا نام تھائی وانگ تھا۔"

"ہاں تھائی وانگ۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ جانتی ہو اس کی موت کیسے ہوئی تھی۔" میں چند لمحوں کو خاموش رہا پھر بولا "وہ میرے دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ کئی روز تک ان کی قید میں رہی۔ اس دوران میں اسے کثرت سے ہیروئن کے انجکشن دیے جاتے رہے اور جب میں نے اسے دشمنوں کی قید سے آزاد کرالیا تو اس کے بدن سے زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا گیا تھا۔ ہیروئن نے اسے موت کے تاریک غار میں دھکیل دیا۔ میں وہ لمحات کبھی نہیں بھول سکوں گا جب تھائی نے میری آغوش میں زندگی کا آخری سانس لیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے۔" شانتی نے کہا "اور ڈاکٹر جانکی دیوی۔۔۔؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"جانکی میرے ساتھ ہے۔ یہاں شاؤلن میں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہاں۔ ایک دو دن بعد میں تمہیں اس سے ملواؤں گا۔" میں نے کہا۔

میں دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور شانتی سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا اس کا دادا ہندو تھا۔ عرصہ پہلے روزگار کی تلاش میں تھائی لینڈ آیا تھا اور پھر یہیں آباد ہو گیا تھا۔ اس نے شادی بھی بنکاک کی ہندو برادری میں کی تھی۔ وہ کٹر ہندو تھا مگر اس کے بیٹے "شانتی کے باپ" نے بدھ مذہب اختیار کرلیا۔ اس طرح شانتی اور اس کے بہن بھائی بھی بدھ کے پیروکار تھے لیکن ہندو برادری سے بھی ان کے تعلقات استوار تھے۔ ڈاکٹر جانکی کو وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

"اب میں چلتا ہوں شانتی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "آج ہی سے تمہارا علاج شروع ہو جائے گا اور تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ آئندہ تم اس لعنت کے قریب نہیں جاؤ گی۔"

"ہاں میں وعدہ کرتی ہوں۔" شانتی نے سرہلادیا۔

میں نے واپس آکر ماسٹر لیشی یان کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور پھر ہم رات گئے تک شاؤلن کے دوسرے ماسٹروں سے رابطے کرتے رہے اور بالآخر سب لوگ ایک پروگرام پر متفق ہو گئے۔

شانتی سے طویل ملاقات کے بعد میرے تمام شبہات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ میگا تیراؤ ہی یہاں ہیروئن لے کر آیا تھا اور ٹروڈر اور مائیکل اس کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کے بارے میں، میں پہلے بھی تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ وہ کس قماش کے تھے۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا پھیلتے ہی کچھ لڑکے پارک میں اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے۔ ان کا تعلق شاؤلن کے مختلف کیمپوں سے تھا۔ ان کا پارک میں داخل ہونے اور بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے محض وقت گزارنے کے لیے آئے ہوں۔ دو لڑکے کافی شاپ میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے لاتعلق اور الگ الگ بیٹھے تھے۔ میں اندھیرے میں ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کوچی بھی موجود تھا۔

جس بنچ کی نشان دہی شانتی نے کی تھی، وہ کافی شاپ سے تقریباً پندرہ گز دور ایک درخت کے نیچے تھی اور وہاں

بنچ پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اندھیرے میں اگرچہ ان کے چہرے صاف نظر نہیں آرہے تھے مگر وہ ٹروڈر اور مائیکل نہیں تھے۔

شانتی نے بتایا تھا کہ وہ رات آٹھ سے دس بجے تک بیٹھتے تھے۔ اس وقت ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں آئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انہیں کوئی شبہ تو نہیں ہو گیا۔ ہم نے اس معاملے میں بڑی رازداری سے کام لیا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو پولیس کو ان کے بارے میں اطلاع دے سکتے تھے لیکن تمام ماسٹرز کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ان بدمعاشوں سے اپنے طور پر نمٹا جائے۔

پونے نو بجے کے قریب پارک کے باہر ایک کار آکر رکی۔ وہاں روشنی تھی۔ دو آدمی کار سے اتر کر پارک میں داخل ہوئے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس بنچ کی طرف چلنے لگے۔ ان دونوں کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ٹروڈر نے کندھے پر کپڑے کا ایک تھیلا لٹکا رکھا تھا۔

وہ دونوں اس بنچ پر آکر بیٹھ گئے۔ پہلے سے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

ان دونوں کے بنچ پر بیٹھنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دو لڑکے وقفے وقفے سے آکر ان کے قریب رکے۔ ہاتھ ملائے گئے اور لڑکے چلے گئے۔ یہ لڑکے ان کے گاہکوں میں سے تھے اور پہلے سے ان کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پروگرام کے مطابق پارک سے نکلتے ہی اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے ہمارے لڑکے انہیں پکڑ کر لے جاتے۔ ٹروڈر اور مائیکل کے گاہکوں میں شانتی ہی واحد ہستی تھی جسے ہمارے پروگرام کا علم تھا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے بھی خریدار بن کر آنا تھا اور مجھے اسی کا انتظار تھا۔

شانتی سوا نو بجے کے قریب پارک میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ سہمی سہمی اور خوف زدہ سی لگ رہی تھی۔ وہ جیسے ہی پارک میں داخل ہوئی، میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور غیر محسوس انداز میں بنچ کی طرف چلنے لگا۔

ٹروڈر نے ایک مرتبہ میری طرف دیکھا ضرور تھا مگر اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ میری شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ شانتی ان کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے پینٹ کی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ٹروڈر کی طرف بڑھا دیے۔ ٹروڈر نے نوٹ لے کر تھیلے میں ڈال لیے اور تھیلے ہی میں سے ایک پڑیا نکال کر شانتی کی طرف بڑھا دی۔ لمبے بالوں والا مائیکل بنچ پر بیٹھا خنجر کو انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس معاملے سے بالکل لاتعلق ہو۔

ٹھیک اسی وقت جب ٹروڈر، شانتی کو ہیروئن کی پڑیا دے رہا تھا میں ان کے سامنے پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مائیکل نے خنجر تان لیا۔

"اگر تم اپنی جان کی سلامتی چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ میرے سامنے خنجر لہراتے ہوئے غرایا "پہلے تو تم ہم سے بچتے رہے ہو لیکن آج تم نے بدمعاشی دکھانے کی کوشش کی تو زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔"

میں نے پہلے شانتی کو اشارہ کیا۔ وہ بدحواس ہو کر تیزی سے کافی شاپ کی طرف دوڑ گئی۔

"ہم تو بہت دنوں سے تمہاری تلاش میں تھے۔" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہ زہر تم ہی لوگ پھیلا رہے ہو۔ کوئی حرکت کرنے سے پہلے اپنے چاروں طرف دیکھ لو۔"

ان دونوں نے گھوم کر دیکھا۔ چاروں طرف سے کم از کم نصف درجن لڑکے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں بدحواس ہو گئے اور پھر اسی بدحواسی میں مائیکل نے خنجر سے مجھ پر حملہ کردیا۔ اس کا یہ حملہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی خنجر والی کلائی پکڑ لی اور دائیں ہاتھ سے اسی کے اس بازو کے نیچے بغل میں زوردار پنچ رسید کردیا۔ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ اس کے پیر زمین پر ٹکنے سے پہلے ہی میں نے اس کی ٹانگ پر ہلکی سی کک بھی رسید کردی۔

وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اسی دوران میں فائر کی آواز گونجی۔ ٹروڈر نے دوسرے لڑکوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر تھیلے میں سے پستول نکال کر ہوائی فائر کردیا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ان کی طرف آنے والے لڑکے خوف زدہ ہو کر بھاگ جائیں گے یا رک جائیں گے۔

ٹروڈر کا پستول والا ہاتھ ابھی تک اوپر تھا۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اچھلا اور پھر میری کک اس کی کہنی پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور کہیں اندھیرے میں گھاس پر گر گیا تھا۔ ٹروڈر کچھ اور بدحواس ہو گیا اور اسی بدحواسی میں اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں بڑی تیزی سے نیچے جھکا اور اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔ وہ چیختا ہوا گھاس پر گرا پھر اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر تین چار لڑکوں نے اسے گھیر لیا۔

میں مائیکل کی طرف گھوم گیا۔ اس دوران میں موقع پا کر وہ مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ اس مرتبہ میں اپنا دفاع نہیں کر سکا۔ اس کی فرنٹ ہائی کک میرے بائیں کندھے پر لگی۔ میں لڑکھڑا گیا مگر اپنے آپ کو گرنے سے بچا لیا۔ مائیکل نے دوسری کک لگائی جسے میں نے ہاتھ سے روکا' اس نے فوراً ہی سائڈ لیفٹ کک لگانے کی کوشش کی مگر اس مرتبہ بھی میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا اور پھر بازو کی ہڈی پر لگنے والی میرے ایک ہی چوپ نے اسے بلبلانے پر مجبور کر دیا۔ وہ ذرا سا ایک طرف جھکا میں نے اسے زوردار سائڈ کک لگا دی۔ وہ کراہ کر پلٹ گیا لیکن اس مرتبہ فوراً ہی سنبھل گیا۔

دوسری طرف ٹروڈر لڑکوں کے گھیرے میں آ چکا تھا۔ ٹروڈر کے بلبلانے کی آوازیں بتا رہی تھیں کہ لڑکے اس کی ٹھیک ٹھاک تواضع کر رہے تھے۔

میں ایک بار پھر مائیکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ہمارے گرد بھی چند لڑکے جمع ہو گئے تھے مگر انہوں نے مداخلت نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ مائیکل کے لیے میں ہی کافی رہوں گا۔

مائیکل نے میرے منہ پر پنچ مارنے کی کوشش کی مگر میں نے بڑی پھرتی سے ذرا سا سائڈ میں ہٹتے ہوئے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے آگے کی طرف ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے اس کے منہ پر زوردار رائٹ پنچ مار دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ٹانگوں کے بیچ میں لیفٹ فرنٹ کک بھی مار دی۔

اس دُہری تکلیف سے وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ میں نے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ کر آگے کی طرف زوردار جھٹکا دیا اور ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل گرا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ کچھ دیر تک اٹھنے کی ہمت نہیں کرے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن وہ چند گز سے زیادہ دور نہیں جا سکا۔ تین لڑکوں نے لپک کر اسے گھیر لیا تھا۔

اسی وقت کسی نے چیخ کر کہا "پولیس آ رہی ہے۔"

ایک سیکنڈ کے اندر اندر لڑکے ٹروڈر اور مائیکل کو لے کر وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ باقی لڑکے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ دو چار لڑکے کافی شاپ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ شانتی بھی وہاں بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور تقریباً اسی وقت دو پولیس والے وہاں پہنچ گئے۔ وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتے رہے پھر ایک میز کے قریب آ کر رک گئے اور وہاں بیٹھے ہوئے دو لڑکوں سے ہنگامے کے بارے میں پوچھنے لگے۔

"ہنگامہ۔" ایک لڑکے نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہو
کہا "ہم ایک گھنٹے سے یہاں بیٹھے ہیں۔ یہاں تو کوئی ہنگا
نہیں ہوا۔"

"مگر ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں دو آدمیوں کو مارا جا رہا ہے۔" پولیس والے نے کہا۔

"یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دوسرے لڑ بیٹھے ہیں۔ ان سے بھی پوچھ لو۔" اس لڑکے نے جواب

پولیس والے دوسروں سے پوچھتے رہے۔ ہر ایک کسی ہنگامے سے لاعلمی ظاہر کی۔ ایک پولیس والے شاپ کے مالک اور دو ملازموں سے بھی دریافت کیا۔ ان نے بھی لاعلمی میں سر ہلا دیے۔ پولیس والا بڑبڑاتے ہو اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

دوسرا پولیس والا اس بنچ کے آس پاس ٹہل رہا تھا کے قریب سارا ہنگامہ ہوا تھا اور پھر اسے وہ تھیلا لڑائی کے دوران میں ٹروڈر کے کندھے سے گر گیا تھا۔ کے ہاتھ میں تھیلا دیکھ کر میں چونک گیا۔ روشنی میں پولیس والے نے تھیلے کی تلاشی لی تو اس میں کرنسی نوٹ ہیروئن کی پڑیاں دیکھ کر وہ بھی اچھل پڑا اور تیز تیز قدم ہوا اپنے ساتھی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ دونوں کچھ دیر میں باتیں کرتے رہے اور دوبارہ اسی بنچ کے قریب پہنچ انہیں وہاں سے اور کچھ نہیں ملا۔ ٹروڈر کا پستول اور مائیکل خنجر پہلے ہی لڑکے وہاں سے اٹھا چکے تھے۔ اس تھیلے کا شاید کسی کو نہیں آیا تھا۔ پولیس والے اب اس تھیلے بارے میں لوگوں سے پوچھ رہے تھے لیکن ہر کوئی کندھے رہا تھا۔

دونوں پولیس والوں کے چہروں پر تشویش نمایاں تھی۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چوکی کی طرف چلے گئے۔

"آؤ۔ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" پولیس والوں کے جانے کے بعد میں نے شانتی کی طرف دیکھ کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

شانتی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اب بھی خوف تھی اور میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے ٹروڈر سے ملنے والی ہیروئن کی پڑیا مجھے دے دی جسے میں نے جیب میں ڈال لیا۔

شانتی کو اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر میں اس جگہ جہاں ٹروڈر اور مائیکل کو پہلے ہی پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ لڑکوں کے ساتھ کوچی بھی وہاں موجود تھا۔ یہ ایک چھو مکان تھا جو الگ تھلگ واقع تھا۔ ماسٹر لیشی یان اور

جز ماسٹرز بھی وہاں موجود تھے۔ لڑکوں کو اس کمرے سے کال دیا گیا اور ٹروڈر اور مائیکل سے پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔ شاؤلن میں ہیروئن کے پھیلاؤ کے حوالے سے میرا اندازہ بھی درست نکلا۔ اس کے پیچھے میگا ہی کا ہاتھ تھا۔ انہیں ہیروئن میگا ہی فراہم کر رہا تھا اور یہ دونوں اس کے لیے ففٹی ففٹی کے اصول پر کام کر رہے تھے۔ ان دونوں کو تو میں نے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا جب سرائے میں ہمارے کمرے میں انہوں نے جانکی اور چیکو کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی اور اب تو یہ دونوں مکمل طور پر کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو مارشل آرٹسٹ کہتے تھے اور اس فن کی اعلیٰ تربیت کے لیے یہاں آئے تھے مگر پہلے ہی روز اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قماش کے لوگ ہیں اور پھر موقع ملتے ہی انہوں نے میگا اور ہکسیان کے ساتھ مل کر ہیروئن کا دھندا شروع کر دیا تھا۔

یورپ والے یوں تو منشیات کی روک تھام کے حوالے سے بہت شور مچاتے ہیں۔ وہ بعض ایشیائی ممالک کو منشیات کے فروغ کا ذمے دار قرار دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا مذموم کاروبار انہی کے ممالک میں ہوتا ہے۔ ہیروئن استعمال کرنے والوں کی سب سے زیادہ تعداد بھی یورپ اور امریکا ہی میں ہے۔ نت نئے اور تباہ کن نشے متعارف کرانے کا سہرا بھی یورپ اور امریکا والوں کے سر ہی بندھتا ہے۔ مافیا کے بڑے بڑے ڈان اور اس قسم کی ساری تنظیمیں بھی یورپ اور امریکا ہی میں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہیروئن کے حوالے سے ایشیا کے تین چار ممالک خاصے بدنام ہیں مگر ان کے پیچھے بھی یورپ اور امریکا ہی کا ہاتھ ہے۔ چند سال پہلے ایشیا میں کوئی ہیروئن کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ یورپ اور امریکا والے ہی تھے جنہوں نے یہ بدترین لعنت یہاں متعارف کرائی۔

ٹروڈر اور مائیکل کو دوسروں کے حوالے کر کے ہم اپنے کیمپ میں واپس آ گئے۔

چند روز گزر گئے۔ جس طرح اس روز کے بعد میں نے ہکسیان کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں بھی اس رات کے بعد کچھ سنائی نہیں دیا۔

جانکی بھی اب فٹ ہو گئی تھی اور میرے ساتھ پریکٹس میں باقاعدہ حصہ لے رہی تھی۔ اسی دوران میں شانتی سے بھی اس کی کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ شانتی کا باقاعدہ علاج ہو رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح چاق و چوبند تو نہیں رہی تھی لیکن اس نے ہلکی ورزش شروع کر دی تھی اور بتدریج نارمل کی طرف لوٹ رہی تھی۔

کامنی کو شاؤلن آئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ یوں تو کوئی بھی فن سیکھنے کے لیے پوری زندگی بھی ناکافی ہوتی ہے مگر طے شدہ کورس کے مطابق جانکی اپنی تربیت مکمل کر چکی تھی اور ایک مہینے بعد ہمارے کیمپ کی سالانہ تقریب ہونے والی تھی۔ ٹورنامنٹ کی طرز پر مقابلوں کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں دوسرے کیمپوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ ہمارے کیمپ میں بھی بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں بھی ان مقابلوں میں حصہ لے رہا تھا۔ اپنے لڑکوں کے علاوہ دوسرے کیمپوں کے لڑکوں سے بھی میرے مقابلے ہوئے تھے۔ سیمی فائنل میں چار کیمپوں کے لڑکے آئے تھے۔ میں نے اپنے حریف کو بہت آسانی سے ناک آؤٹ کر کے فائنل کے لیے کوالیفائی کر لیا تھا۔ دلچسپی کی بات یہ تھی کہ میں نے اب تک جتنے بھی مقابلے جیتے تھے 'ناک آؤٹ' کی بنیاد پر ہی جیتے تھے۔

میرے مقابلے میں دوسری طرف سے فائنل میں آنے والے لڑکے کا تعلق ماسٹر مشی یانگ کے کیمپ سے تھا۔ وہ شاؤلن ٹیمپل کا بہترین مارشل آرٹسٹ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں شکست نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اپنی دو سالہ ٹریننگ کے دوران میں وہ کبھی کوئی مقابلہ نہیں ہارا تھا۔

ماہانہ مقابلوں میں وہ آٹھ مرتبہ چیمپئن رہ چکا تھا۔ باقی مقابلوں میں اس نے حصہ نہیں لیا تھا۔

ماسٹر ہینگ پائی کو شاؤلن ٹیمپل کا سب سے معزز اور سب سے قابلِ احترام استاد سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے تمام ماسٹر بھی اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ فائنل والے روز بھی شاؤلن کے تمام کیمپوں کے ماسٹرز کو مدعو کیا گیا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ اس روز ہمارے جمنازیم میں تل دھرنے تک کی جگہ نہیں تھی۔

پہلے چند چھوٹے نمائشی مقابلے ہوئے اور پھر ہمارے مقابلے کا اعلان ہوا۔ میرا حریف ہوشین قد میں مجھ سے دو تین انچ نکلتا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے بھی وہ مجھ سے زیادہ مضبوط اور زیادہ طاقت ور تھا مگر یہ مقابلہ جسمانی طاقت کے مظاہرے کا نہیں ٹیکنیکس کے استعمال کا تھا اور میں جانتا تھا کہ کامیابی اسی کے حصے میں آئے گی جو بہتر ٹیکنیک استعمال کرے گا۔

مقابلہ شروع ہوتے ہی حریف نے مجھ پر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیے۔ وہ چوپس، پنچس اور ککس کا بڑی بے رحمی سے استعمال کر رہا تھا۔ اس کی پھرتی بھی قابلِ تعریف تھی۔ میرے خیال میں اس کی اب تک کی کامیابیوں کا راز یہی تھا۔ اس

کی فائٹنگ ٹیکنیک یہی تھی کہ اپنے حریف کو شروع ہی سے دباؤ میں رکھا جائے۔ جبکہ میری فائٹنگ ٹیکنیک اس سے مختلف تھی۔ میں شروع میں دفاعی انداز اختیار کر کے اپنے حریف کو تھکاتا تھا اور پھر اس طرح حملہ آور ہوتا تھا کہ اسے سنبھلنے کا موقع نہ ملے۔ اس وقت بھی میں یہی ٹیکنیک اپنائے ہوئے تھا۔

یہ مقابلہ بارہ راؤنڈ کا تھا۔ پہلے راؤنڈ میں وہ دو پوائنٹس لے گیا۔ دوسرے راؤنڈ میں مجھے ایک پوائنٹ ملا۔

دسویں راؤنڈ میں ہم دونوں کے پوائنٹ برابر تھے۔ مقابلہ خاصا سنسنی خیز تھا۔ لوگ پوری طرح محظوظ ہو رہے تھے۔ رِنگ کے چاروں طرف کھڑے ہوئے کراٹے کاز چیخ چیخ کر ہمیں داد دے رہے تھے اور ہماری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

گیارھواں راؤنڈ شروع ہوتے ہی میں نے پوری شدت سے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ دو مرتبہ نیچے گرا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس قسم کے مقابلوں میں جب کسی ایک میں جنون آجائے تو اس کے حوصلے پست ہونے لگتے ہیں۔ وہ قواعد و ضوابط کو نظرانداز کر کے ہر جائز و ناجائز طریقے سے حریف کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے بھی اپنے حریف میں شکست کے آثار نظر آرہے تھے۔ جبکہ میرے ہونٹوں پر اشتعال دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک بار پھر سنبھل گیا۔ اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر اسٹانس بنالیا۔ میری نظر کبھی اس کے ہاتھوں پر جاتی اور کبھی پیروں پر اور پھر میرے ہونٹوں پر ایک بار پھر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے پیروں کا الائنمنٹ درست نہیں تھا۔ پیروں کی چوڑائی ہمیشہ کندھوں کی چوڑائی سے ڈیڑھ گنا رکھنی چاہیے اور جسم بالکل سیدھا تنا ہوا ہو۔ معمولی سا فرق ہمیشہ اپنے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ اگر جسم آگے کو یا پیچھے کو ذرا سا جھکا ہوا ہو تو نہ صرف اپنے دفاع بلکہ حملہ آور ہونے کی صلاحیت بھی کم ہوجاتی ہے اور میں نے اپنے حریف میں یہ خامی نوٹ کرلی تھی۔ وہ جیسے ہی پنچ مارنے کو حرکت میں آیا' میں بڑی پھرتی سے نیچے جھک گیا اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ وہ بھد کی آواز سے پشت کے بل گرا لیکن اس نے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔

اور اس مرتبہ شاید وہ اپنے حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ وہ ہر قیمت پر مجھے شکست دینا چاہتا تھا اور اس کے لیے اس نے فائٹنگ کا ہر اصول نظرانداز کر دیا تھا۔ ریفری بار بار چیخ کر اسے وارننگ دے رہا تھا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اور پھر اچانک اس نے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا اور ہاتھ سر سے بلند کر کے حملہ آور ہوا۔

لوگوں میں شور مچ گیا۔ ایک دو چیخیں بھی سنائی دیں لیکن میں خنجر دیکھ کر ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ میں پہلے کی طرح پُرسکون اور مطمئن تھا۔ اس کا ہاتھ جیسے ہی حرکت میں آیا' میں نے بڑی تیزی سے چہرے کے سامنے دونوں کلائیوں کا کراس بنالیا اور پھر اس کا بازو جیسے ہی کراس سے ٹکرایا میں نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو پشت سے ملالیا۔ یہ میرے بازوؤں کا آہنی شکنجہ تیار ہوگیا تھا اور میرے حریف کا بازو اس شکنجے میں پھنس گیا تھا۔

وہ اپنے بازو کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا مگر میرے شکنجے کی گرفت سخت سے سخت تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے دونوں پیروں کا الائنمنٹ بھی بالکل درست تھا۔ کھڑے ہونے کے اس انداز سے بھی مجھے اپنی اس سیزرز ہینڈ ڈیفنس ٹیکنیک میں بڑی مدد مل رہی تھی۔ یوں سمجھئے کہ پیروں کی قوت بھی پورے جسم میں سرایت کرتی ہوئی میرے بازوؤں کے اگلے حصوں میں سمٹ آئی تھی۔

میرا حریف اپنے بازو کو زور زور سے جھٹکے دیتا رہا مگر میں نہ تو اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی میری گرفت ڈھیلی پڑی بلکہ اس میں مزید سختی آتی گئی۔

حریف کی آنکھوں میں الجھن سی تیرنے لگی اور پھر یہ الجھن وحشت میں بدلتی گئی۔ اس کے چہرے پر بھی کرب کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔

تماشائی اب بالکل خاموش تھے۔ اس طرح سناٹا چھایا تھا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ سب مارشل آرٹسٹ تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے یہ سیزرز ہینڈ ڈیفنس تکنیک سیکھی ہوگی۔ مگر اس کا عملی مظاہرہ آج پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے اور وہ بھی اس انداز میں کہ میرا حریف مجھے قتل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی خنجر میرے سینے میں پیوست ہو سکتا تھا۔

میں نے پہلی مرتبہ پہل کرتے ہوئے اپنے بازوؤں کے شکنجے کو مزید کسا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ حریف کی مٹھی کھلتی چلی گئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے پیروں کے قریب لکڑی کے فرش میں نوک کے بل پیوست ہوگیا۔

تماشائیوں میں ایک مرتبہ شور مچا اور پھر پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔ حریف نے اپنا آزاد ہاتھ میرے بازوؤں پر مارا اور میری گرفت ڈھیلی کرانے کے لیے جھٹکے دینے لگا۔

میں نے ایک بار پھر بل کیا اور جسم کی پوری قوت ایک بار پھر بازوؤں کے شکنجے میں منتقل کردی۔ کڑک کی آواز ابھری جو لوگوں نے بھی سنی۔ یہ حریف کے بازو کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خوفناک چیخ بھی نکل گئی تھی۔ میں نے بائیں طرف جھکتے ہوئے زوردار جھٹکا دے کر اپنے ہاتھ کھول دیے۔

میرا حریف دائیں پہلو پر نیچے گرا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنا شکستہ بازو پکڑلیا اور فرش پر ایڑیاں رگڑنے لگا۔

لوگ شور مچا رہے تھے۔ میرے نام کے نعرے لگا رہے تھے۔ ریفری نے میرے حریف پر جھک کر گنتی شروع کردی مگر میرے حریف میں اب اتنی سکت نہیں تھی کہ اٹھ کر میرے سامنے کھڑا ہوسکتا۔ ریفری نے دس کہا اور سیدھے ہو کر میرا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

جمنازیم شور کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ رِنگ کے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگ دوڑ کر اندر آگئے۔ مجھ تک پہنچنے والا سب سے پہلا شخص کوچی تھا۔ اس نے مجھے کندھوں پر اٹھالیا۔ میرے دوست خوشی سے ناچ رہے تھے۔ میرے حریف کے حمایتی اسے اٹھا کر باہر لے گئے تھے۔

پورے رِنگ کا چکر لگانے کے بعد کوچی نے مجھے ماسٹر ہنگ پائی کے سامنے اتار دیا۔ ماسٹر ہنگ پائی اور دوسرے تمام ماسٹرز بھی کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے تمام ماسٹرز کو بو کیا۔ ماسٹر ہنگ پائی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے آشیرباد دی اور جب میں سیدھا ہوا تو ماسٹر لیشی یان نے مجھے گلے سے لگالیا۔ یہ اس کی محنت کا اعجاز تھا کہ آج مجھے ایک بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یہ شاؤلن ٹیمپل میں میری پہلی باقاعدہ فائٹ تھی جس میں 'میں سرخ رو ہوا تھا۔

اس ہنگامے کے بعد ہمارے کیمپ کے ان اسٹوڈنٹس میں ڈگریوں کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا جنہوں نے اس میچ میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ماسٹر ہنگ پائی اپنے ہاتھ سے ڈگریاں دے رہے تھے۔ سب خوش تھے۔ کامنی بھی بہت خوش تھی۔ اسے فورڈان کی ڈگری دی گئی تھی۔

کامنی اس رات واپس جانے کے بجائے ہمارے ہی پاس رہ گئی تھی۔ پہلے تو کوچی اور دو تین اور لڑکے بھی ہمارے پاس بیٹھے رہے۔ ایک بجے کے قریب وہ چلے گئے۔ ہم اس کے بعد بھی جاگتے رہے۔ آج رات تو سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کامنی کی خوشی قابلِ دید تھی۔ اس نے شاؤلن ٹیمپل کا جو خواب دیکھا تھا' آج اس کی تعبیر مل گئی تھی۔ دوسری طرف جانکی بھی میری کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ وہ بار بار مجھے اپنے ساتھ لپٹا رہی تھی اور میرا منہ چوم رہی تھی اور پھر یکایک مجھے تھائی یاد آگئی۔ وہ آج زندہ ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔ تھائی کی یاد آتے ہی میرے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی۔

چیکو بھی میری کامیابی پر بے پناہ خوش تھی۔ اس نے بھی ایک مرتبہ میرے گال پر بوسہ دیا اور پھر اٹھ کر والہانہ انداز میں رقص کرنے لگی۔ وہ بہت اچھی رقاصہ تھی۔ وہ دیر تک ناچ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتی رہی۔

ہم صبح چار بجے کے قریب سوئے تھے اور جب بیدار ہوئے تو باہر تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ کوچی کو دیکھ کر میں نے قدرے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے ہمیں جگایا نہیں کوچی۔"

"آج چھٹی ہے۔ جمنازیم بند ہے۔" کوچی نے جواب دیا "اور تم اپنی پریکٹس کے سلسلے میں پریشان مت ہو۔ ماسٹر ہنگ پائی نے کہا تھا کہ تمہیں سونے دیا جائے۔"

"اوہ۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دس بج رہے ہیں۔ تم لوگ جلدی سے تیار ہوجاؤ میں ناشتا لے کر آرہا ہوں۔" کوچی کہتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ناشتا کرکے کامنی چلی گئی۔ ناشتے کے دوران میں ہی اس نے اپنا ہندوستان واپسی کا پروگرام بتایا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ آج کا دن شاؤلن میں رہے گی۔ تیاری مکمل کرکے وہاں اپنے دوستوں سے ملے گی اور کل شاؤیانگ چلی جائے گی جہاں سے کن منگ روانہ ہوجائے گی اور وہاں سے ہندوستان کے لیے ہوائی جہاز پر سوار ہوجائے گی۔

ہم نے اس رات کامنی کے لیے ایک چھوٹی سی الوداعی پارٹی کا پروگرام بنالیا۔ اس پارٹی میں میرے اور جانکی کے علاوہ کوچی بھی شریک تھا اور اس پارٹی کا اہتمام شاؤلن کے ایک ریسٹورنٹ میں کیا گیا تھا اور پھر وہیں بیٹھے بیٹھے پروگرام بن گیا کہ کل ہم سب کامنی کو شاؤیانگ تک چھوڑنے جائیں گے۔

اگلے دن ہم شاؤیانگ پہنچ گئے۔ پروگرام کے مطابق کامنی کو وہ دن بھی وہیں گزارنا تھا۔ اسے اپنے عزیزوں کے لیے کچھ چھوٹے موٹے تحائف بھی خریدنے تھے۔ وہ ہمیں چیانگ شاؤ کے بنگلے پر لے گیا۔ حاشی بھی اس وقت گھر پر ہی موجود تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی ہمیں دیکھ کر بہت خوش

ہوئے انہوں نے کامنی کو مبارک باد دی اور پھر چیانگ شاؤ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا کہ میں اس روز تمہارا مقابلہ نہیں دیکھ سکا۔ سنا ہے بہت سنسنی خیز مقابلہ تھا۔ یہاں تو ہر طرف تمہارے ہی نام کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ کاش میں وہ مقابلہ دیکھ سکتا۔"

"وہ مقابلہ جیتنے میں میرا کوئی کمال نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا "یہ تو تم جیسے سچے اور کھرے دوستوں کی دعائیں ساتھ تھیں کہ میں اپنے سے زیادہ طاقت ور حریف کو شکست دینے میں کامیاب ہوسکا۔"

"دیکھا چیانگ شاؤ۔" حاشی شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس کو کہتے ہیں عظمت اور بڑائی۔ ایک تم ہو کہ بلیک بلٹ لے کر ہی اکڑتے پھر رہے ہو۔"

چیانگ شاؤ کھسیا کر رہ گیا۔ اس وقت ہم وسیع ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازمہ نے ہمارے سامنے چائے رکھ دی۔ میرا اس وقت چائے کا موڈ نہیں تھا... اتفاق سے میرا کپ بھی بھرا ہوا تھا۔ حاشی میز کے دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا کپ آدھا تھا۔ اس وقت میں نجانے یہ کیوں سوچنے لگا کہ کاش! وہ آدھا کپ میرے سامنے آجاتا۔

اتفاق سے میری نظریں حاشی کے سامنے رکھے ہوئے کپ پر ہی مرکوز تھیں۔ اچانک طشتری میں رکھا ہوا وہ کپ آہستہ آہستہ تھرتھرانے لگا اور پھر وہاں جو کچھ بھی ہوا' وہ سب کے لیے ہی حیرت انگیز تھا۔

وہ کپ ساسر سمیت سینٹر ٹیبل کے شیشے پر پھسلتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے آہستہ آہستہ میری طرف سرکا رہی ہو۔ میری نظریں اب بھی کپ پر مرکوز تھیں اور مجھے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے اس کپ کے علاوہ دنیا کی ہر چیز میری نظروں سے غائب ہوچکی ہو۔

وہ کپ میرے سامنے رکھے ہوئے کپ کے قریب آکر رک گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

وہ سب لوگ پھٹی پھٹی سی نظروں سے کبھی کپ کو اور کبھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ ایسا حیرت انگیز واقعہ انہوں نے یقیناً پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اپنا کپ حاشی کے سامنے سرکا دیا۔

"میں اتنی زیادہ چائے نہیں پی سکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وجدان۔" کامنی میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "تمہیں شاید احساس نہیں۔ جانتے ہو ابھی یہاں کیا ہوا ہے؟"

مجھے شاید واقعی احساس نہیں تھا اور جب جانکی نے اس کپ کے بارے میں بتایا تو میں خود بھی حیرت سے اچھل پڑا تھا۔ میں نے دل میں آدھا کپ چائے پینے کی خواہش کی تھی اور حاشی والا کپ میز پر خود بخود سرکتا ہوا میرے سامنے آگیا۔ اس وقت اگرچہ آخر تک میری نظریں کپ پر ہی مرکوز رہی تھیں لیکن مجھے اس کا قطعی احساس نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

چی۔۔۔! میرے ذہن میں خیال ابھرا اور میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی اور پورے جسم میں سنسنی سی پھیلتی چلی گئی۔ اگر چائے کا وہ کپ میری نظروں کے اشارے سے حرکت میں آیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میری محنت اور ریاضت بار آور ثابت ہو رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر نظریں حاشی کے سامنے رکھے ہوئے اس کپ پر مرکوز کردیں جو میں نے اس کی طرف سرکایا تھا۔

میں تصور کرتا رہا کہ میری آنکھوں سے مقناطیسی لہریں خارج ہو کر کپ سے ٹکرا رہی ہیں اور اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ مگر کپ نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگی۔ میں نے کپ پر سے نظریں ہٹالیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میرے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھالیا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ کپ کی اپنی جگہ سے حرکت کرنے والی کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی لیکن جانکی شاید معاملے کی تہ تک پہنچ چکی تھی۔ وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن بولی کچھ نہیں۔

دن کا بیشتر حصہ ہم نے شہر میں گھومتے ہوئے گزارا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں شاؤیانگ میں اس طرح آزادی سے گھوم پھر رہا تھا۔

وہ رات بھی ہم نے چیانگ شاؤ کے بنگلے پر گزاری۔ ایک مرتبہ موقع پاکر میں نے چیانگ شاؤ سے ہکسیان کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا مگر اس نے مسکرا کر بات ٹال دی تھی۔

اگلے روز صبح سویرے کامنی کو بس پر بٹھا کر ہم لوگ شاؤلن واپس آ گئے۔ اپنے کمرے میں آتے ہی جانکی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سرسری سی آواز میں بولی۔

"وجدان۔ چائے کی پیالی کا اپنی جگہ سے حرکت کرنا۔ کیا وہ۔۔۔"

"میں تو خود بھی نہیں سمجھ سکا۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "کچھ عجیب سی بات ہوئی تھی۔ میرے سامنے جو کپ رکھا گیا تھا' وہ لبالب بھرا ہوا تھا اور میرا چائے کا موڈ بھی نہیں تھا۔ جانکی کے سامنے رکھا جانے والا کپ آدھا تھا۔ اس کپ کو دیکھ کر بے اختیار میرے دل میں یہ خواہش ابھری تھی کہ کاش وہ آدھا کپ میرے سامنے آجاتا۔ اور پھر میں نے اس کپ کو اپنی جگہ سے حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کپ میرے سامنے کیسے آگیا۔"

"اس دوران میں تمہاری نظریں کپ پر مرکوز رہی تھیں؟" جانکی نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن۔۔۔"

"یہ چی کی پاور تھی۔" جانکی نے میری بات کاٹ دی "تمہارے دل میں اس کپ کو حاصل کرنے کی خواہش ابھری تھی۔ اس وقت چی کی قوت تمہاری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی اور وہ کپ تمہاری نظروں سے تمہاری طرف کھنچتا چلا آیا۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر۔۔۔"

"یقیناً ایسا ہی تھا۔" جانکی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی "تمہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ تمہاری محنت بار آور ثابت ہو رہی ہے۔"

"لیکن میں نے دوبارہ یہ کوشش کی تھی کہ نظروں کی قوت سے دوسرے کپ کو اپنی طرف کھینچ سکوں مگر کچھ نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا "ہو سکتا ہے پہلے کپ کا اپنی جگہ سے سرکنا محض اتفاق رہا ہے۔ وہ میز شیشے کی تھی۔ ہو سکتا ہے سا سر گیلی ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی گیلی پلیٹ یا ایسی کوئی چیز کسی چکنی سطح والی جگہ پر رکھی جائے تو اس کے نیچے ہوا بھر جاتی ہے جو اس چیز کو حرکت میں لے آتی ہے۔ ممکن ہے کل بھی ایسا ہی ہوا ہو۔"

"مانتی ہوں۔" جانکی نے کہا "ایسا ہو سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں وہ چیز اپنی جگہ سے ایک دو سینٹی میٹر کے فاصلے تک ہی حرکت کر سکتی ہے جبکہ وہ کپ میز پر پھسلتا ہوا تقریباً اٹھارہ انچ کا فاصلہ طے کر کے تمہارے سامنے پہنچ گیا تھا اور پھر اس کپ نے تمہاری طرف ہی حرکت کیوں کی۔ وہ کسی اور طرف کیوں نہیں پھسلا!" جانکی چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "کسی وہم کو دل میں جگہ مت دو۔ وہ محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ تمہاری چی کی قوت کا اعجاز تھا۔ تم نے وہ کپ حاصل کرنے کی خواہش کی۔ چی کی قوت تمہاری آنکھوں میں سمٹ آئی اور تمہاری نظروں نے اس کپ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ تمہیں خوش ہونا چاہیے۔ تمہاری محنت رنگ لا رہی ہے۔ اپنی پریکٹس جاری رکھو۔"

ہم دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ جکی خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔ اسے مارشل آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ چی کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتی تھی اور ظاہر ہے کوئی بات اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی اس لیے اس نے ہماری باتوں میں مداخلت بھی نہیں کی تھی۔

اس روز میں نے ماسٹر لیشی یان سے اس کا تذکرہ کیا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"خوش قسمت ہو۔" وہ بولا "بہت کم عرصے میں تم منزل کو چھونے لگے ہو اور یہ سب تمہاری سچائی' فن سے لگن اور محنت کا نتیجہ ہے۔ میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

اور پھر اگلے روز ماسٹر ہنگ پائی نے بھی اس کی تصدیق کر دی کہ میرے اندر چی کی قوت بیدار ہو رہی تھی۔ اس قوت کو کنٹرول میں کرنے کے لیے اب مجھے زیادہ محنت اور ریاضت کی ضرورت تھی۔

چند ہفتے اور گزر گئے۔ میری پریکٹس جاری رہی۔ اس دوران میں شاؤلن میں میرے باقاعدہ مقابلے بھی ہوتے رہے۔ مجھے ناقابلِ تسخیر قرار دے دیا گیا تھا۔ کوئی مارشل آرٹسٹ میرے سامنے ایک منٹ سے زیادہ نہیں ٹک سکا تھا۔

ایک روز اس طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا بلکہ میں اسے حادثہ ہی کہوں گا۔ شاؤلن میں ایک نیا جمنازیم بن رہا تھا۔ عمارت زیرِ تعمیر تھی میٹریل ناقص تھا یا کوئی اور وجہ تھی عمارت گر پڑی۔ کام کرنے والے مزدور ملبے کے نیچے دب گئے۔ چیخ و پکار کی آواز سن کر لوگ دوڑ پڑے اور ملبے تلے دبے ہوئے مزدوروں کو نکالنے لگے۔

میں بھی اس وقت جانکی کے ساتھ قریب ہی موجود تھا۔ ہم دونوں بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچے۔ عجیب روح فرسا منظر تھا۔ خون میں لت پت زخمی مزدوروں کو نکالا جا رہا تھا۔ دو مزدور ایک آہنی گارڈر کو ہٹانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گارڈر اوپر سیکڑوں من ملبا ہونے کی وجہ سے گارڈر نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کی۔

میں نے لوگوں کو ہٹا دیا اور جھک کر صرف ایک ہاتھ سے آہنی گارڈر کو اوپر اٹھانے لگا۔ گارڈر اوپر اٹھتا چلا گیا۔

نیچے دبے ہوئے دو مزدوروں میں سے ایک مر چکا تھا اور دوسرا شدید زخمی تھا۔ اگر وہ زندہ بچ بھی گیا تو زندگی بھر ہاتھ پیر ہلانے کے قابل نہیں تھا۔

میں اس وزنی گارڈر کو اب بھی ایک ہاتھ سے اٹھائے کھڑا تھا۔ مجھے قطعاً احساس ہی نہیں تھا کہ میں نے کوئی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ بس یوں لگ رہا تھا جیسے کسی درخت کی جھکی ہوئی پتلی سی شاخ کو اس کی جگہ سے ہٹا رکھا ہے۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جس آہنی گارڈر کو دس بارہ آدمی مل کر بھی حرکت نہیں دے سکے تھے' اسے میں نے بڑے اطمینان سے ایک ہاتھ سے کئی فٹ اوپر اٹھا دیا تھا۔

"وجدان۔" جانکی کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "مزدوروں کو نکال لیا گیا ہے۔ گارڈر چھوڑ دو۔"

میں نے گارڈر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ لوگ پھٹی پھٹی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جانکی مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی وہاں سے دور لے گئی۔ اور ایک جگہ رک کر بڑی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"اب اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم اپنے اندر مخفی چی کی اس پُراسرار قوت پر قابو پا چکے ہو۔ اور تم اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہو۔" جانکی کہہ رہی تھی "دنیا میں دو چار لوگ ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے اس فن میں اس قدر کمال حاصل کیا ہو۔ اس پُراسرار قوت سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کس طرح استعمال کرتے ہو۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں جانکی۔" میں نے کہا "اطمینان رکھو۔ میں اس قوت کا غلط استعمال نہیں کروں گا۔"

گری ہوئی عمارت کے قریب اب بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم وہاں سے بہت دور آ کر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ گرم گرم کافی اس وقت مجھے بہت اچھی لگ رہی تھی اور شاید میں اس کی طلب بھی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے ایک اور بات خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ پہلی مرتبہ چیانگ شاؤ کے گھر پر چائے کے کپ والا واقعہ پیش آیا تھا تو میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں اور میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے اور اس وقت مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ لاشعوری طور پر مجھ سے کیا حرکت سرزد ہوئی ہے لیکن آج وہ کیفیت نہیں تھی۔ میں ذہنی طور پر بالکل پُرسکون تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے' وہ لاشعوری طور پر نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے اس حقیقت کا پوری طرح ادراک تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔

اس رات میں دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ آج کے واقعے اور اندر کی اس مخفی اور پُراسرار قوت کے بارے میں سوچتا رہا جس پر میں قابو پا چکا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے اس کے لیے بڑی محنت کی تھی۔ بڑی ریاضت کی تھی۔ بڑے کٹھن مراحل سے گزرا تھا مگر میری اس کامیابی میں مہاراج' ماسٹر ہوچن' دوسرے انسٹرکٹرز ماسٹر لیشی یان اور سب سے زیادہ ماسٹر ہنگ پائی کا دخل تھا۔ ان سب کی توجہ اور محنت سے ہی میں اس مقام تک پہنچ سکا تھا۔

اس دوران میں دوسری طرف سے بھی غافل نہیں رہا تھا۔ کوچی میرا بہترین دوست بن گیا تھا اور اس کے ذریعے مجھے اِدھر اُدھر کی معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں۔ مائیکل اور ٹروڈر کا بندوبست کرنے کے بعد اگرچہ شاؤلن میں ہیروئن کی سپلائی رُک گئی تھی اور شانتی جس نے پانچ چھ ہفتوں تک ہیروئن استعمال کی تھی' وہ بھی علاج سے مکمل طور پر صحت یاب ہو کر معمولات کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی تھی۔

اور پھر ایک روز وہ بھی اپنا کورس مکمل کر کے تھائی لینڈ واپس چلی گئی۔ اس نے مجھے بنکاک کا ایڈریس بھی دیا تھا اور بہت اصرار کیا تھا کہ اگر میں بنکاک آؤں تو اس سے ضرور ملوں۔ ایسی ہی دعوت مجھے اور جانکی کو کامنی نے بھی دی تھی۔ اس نے جے پور میں اپنے ماما کا ایڈریس دیا تھا اور تاکید کی تھی کہ میں جب بھی ہندوستان آؤں' اس سے ضرور ملوں۔

جن دنوں ہم نے ہکسیان اور پھر بعد میں ٹروڈر اور مائیکل کو پکڑا تھا ان دنوں میگا غائب ہو گیا تھا۔ ان تینوں کی کہانی تو ختم ہو گئی تھی مگر میگا کے بارے میں ایک بار پھر کچھ باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔ کوچی کی اطلاع کے مطابق وہ شاؤ یانگ میں کسی جگہ موجود تھا اور اس نے کچھ لوگوں کو میرے پیچھے بھی لگا دیا تھا جو مجھے نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے۔

یوں تو شاؤلن میں میرے بہت سے دوست بن گئے تھے

مگر دشمنوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ہر وہ شخص میرا دشمن تھا جو میری کامیابیوں سے جلتا تھا یا مجھ سے شکست کھا چکا تھا۔ ان میں ہوشین کا نام سرفہرست تھا جو مقابلے میں مجھ سے اپنا بازو تڑوا بیٹھا تھا۔ اس کے بازو پر ابھی تک پلستر چڑھا ہوا تھا۔ اُس کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو کھیل کے میدان میں تو اترتے تھے مگر ان میں اسپورٹس مین اسپرٹ نہیں تھی۔ یہ صرف جیتنا چاہتے تھے۔ شکست تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ہار کو یہ اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتے تھے اور جیتنے والے کو اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگتے تھے اور اپنے اوچھے ہتھکنڈوں سے اسے نقصان پہنچانے کے لیے موقع کی تاک میں رہتے تھے۔

یہی سب کچھ اس روز بھی ہوا تھا۔ ہوشین بہت اچھا مارشل آرٹسٹ تھا' اس نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی۔ اس روز میرے ساتھ ہونے والا مقابلہ بھی بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس نے مجھے زیر کرنے کے لیے کچھ بہت عمدہ قسم کی ٹیکنیکس بھی استعمال کی تھیں لیکن پھر اس پر جنون طاری ہو گیا اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھا۔ اگر وہ خنجر سے حملہ کرنے کے بجائے ہوش و حواس میں رہ کر اپنی کوشش جاری رکھتا تو شاید پوائنٹس پر مجھے شکست دینے میں کامیاب بھی ہو جاتا لیکن وہ تو پہلے سے طے کر کے آیا تھا مجھے ہر حالت میں زیر کرنا ہے۔ دسویں راؤنڈ میں ہمارے پوائنٹس برابر ہو گئے تھے اور اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب میں اسے زیر کرلوں گا تو اس نے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا تھا۔

وہی ہوشین اب میرا سب سے بڑا دشمن تھا اور اب میگا ایک بار پھر میدان میں اتر آیا تھا۔ وہ اگرچہ خود پس منظر میں تھا مگر اس نے اپنے کچھ گرگے میرے پیچھے لگا دیے تھے۔ وہ مجھے ہر صورت میں گولڈن ٹرائی اینگل لے جانا چاہتا تھا۔

ماسٹر بینگ پائی بھی اس صورتِ حال سے آگاہ تھا۔ اس کی ہدایت پر ماسٹر لیسی یان نے میری حفاظت کا بندوبست اس طرح کر دیا تھا کہ دو تین لڑکے دور رہ کر میری نگرانی کرنے لگے تھے۔ کسی مشتبہ شخص کو میرے قریب دیکھ کر وہ منڈلاتے ہوئے میرے قریب آجاتے۔

انہی دنوں کچھ اور اسٹوڈنٹس نے ہمارے جمنازیم میں داخلہ لیا تھا۔ ان میں ہوشنگ نام کی ایک چینی لڑکی بھی تھی۔ اس کی عمر بائیس تیئیس کے لگ بھگ رہی ہوگی اور وہ فان کنگ کی رہنے والی تھی۔ دوسرے شہروں یا غیر ممالک سے آنے والے عام طور پر پیسے کے معاملے میں پریشان رہتے تھے۔ وہ ایک ایک پائی سوچ سمجھ کر خرچ کرتے تھے۔ خرچ بچانے کے لیے ایک ایک کمرے میں کئی کئی لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ لیکن ہوشنگ دولت مند باپ کی بیٹی تھی۔ اسے اخراجات کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ اس نے عبادت گاہ والی پہاڑی کے دامن میں ایک مختصر سا کاٹیج کرائے پر لے لیا تھا جہاں وہ اکیلی ہی رہتی تھی۔

ہوشنگ نے پہلے چیکو سے دوستی کی پھر جانگی سے تعلقات بڑھائے اور پھر مجھ سے بھی بے تکلف ہونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میں اس سے بات کرتے ہوئے ذرا ریزرو ہی رہتا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی بے تکلفانہ انداز میں بات چیت بھی نہیں کی تھی۔ وہ جانگی سے میرے بارے میں کرید کرید کر پوچھتی رہتی۔ میرا بہت احترام کرتی تھی۔ کبھی تو یوں لگتا جیسے وہ مجھ سے بہت مرعوب ہو اور کبھی اس طرح باتیں کرنے لگتی جیسے میں اس کا بہت پرانا اور بے تکلف دوست ہوں۔

ہوشنگ عام طور پر صبح کی کلاس میں آیا کرتی تھی لیکن پھر اس نے کلاس بدل لی اور شام کی کلاس میں آنے لگی۔ ایک روز کلاس ختم ہونے کے بعد وہ جانگی اور چیکو کے ساتھ ہمارے کمرے میں آگئی اور دیر تک باتیں کرتی رہی اور جب وہ واپس جانے لگی تو معلوم ہوا کہ شاؤلن سے آنے والے تمام لڑکے جا چکے تھے اور کوئی ایسا لڑکا نہیں تھا جو اسے اس کے کاٹیج تک پہنچا سکتا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ راستہ سنسان تھا۔ وہ اکیلے جاتے ہوئے کچھ گھبرا رہی تھی اس لیے میں اور جانگی اس کے ساتھ چل دیے۔

اس کا کاٹیج عبادت گاہ والی پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ دوسرا قریب ترین کاٹیج بھی وہاں سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ کاٹیج کے آس پاس درختوں کی بہتات تھی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ہوشنگ کیمپ سے اکیلی آتے ہوئے گھبرا رہی تھی اور یہاں سنسان جگہ پر اکیلی رہتی تھی۔

دو کمروں پر مشتمل کاٹیج ضرورت کی ہر چیز سے آراستہ تھا۔ ایک بیڈ روم تھا اور دوسرے کو سٹنگ روم کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ فرنیچر اور دیگر سامان دیکھ کر اس کی امارت کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ہوشنگ نے بتایا کہ اس نے یہ فرنیچر شاؤ یانگ سے منگوایا تھا جب اپنی ٹریننگ مکمل کر کے واپس جائے گی تو یہ فرنیچر یہیں چھوڑ جائے گی۔

خوش ذائقہ مشروب سے تواضع کیے بغیر اس نے ہمیں واپس نہیں آنے دیا تھا۔ واپسی پر میں اور جانگی اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہوشنگ' فان کنگ کے ایک

دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ محض شوقیہ طور پر سیکھ رہی تھی۔ بلیک بیلٹ اس نے فان کنگ ہی کے مارشل آرٹ کلب سے حاصل کیا تھا اور مزید تربیت کے لیے یہاں آگئی تھی۔ اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ کم از کم ایک سال یہاں رہنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ہوشنگ رفتہ رفتہ مجھ سے بھی بے تکلف ہوتی جا رہی تھی۔ کئی مرتبہ وہ رات کو ہمارے پاس ہی رہ گئی تھی اور کئی مرتبہ میں اور جانگی یا چیکو اسے کاٹیج تک چھوڑنے گئے تھے۔

اس رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ساڑھے دس بج چکے تھے۔ جانگی نے تو ہوشنگ کو رک جانے کو کہا تھا مگر وہ کاٹیج میں جانے پر بضد تھی۔ جانگی اور چیکو اس وقت کہیں جانے کے موڈ میں نہیں تھیں۔ مجبوراً مجھے ہی ہوشنگ کے ساتھ جانا پڑا۔

شاؤلن کے بعض علاقوں میں ابھی رونق تھی۔ ہوشنگ میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی۔ اس نے میرا ایک ہاتھ بھی تھام لیا تھا۔ میں نے کوئی خیال نہیں کیا اور اس کے ساتھ چلتا رہا اور پھر وہ ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ کے سامنے رک گئی۔

"ایک کپ کافی ہو جائے میری طرف سے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت میرا بھی کافی یا چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔ ہم فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

کافی پینے کے بعد جب ہم ریسٹورنٹ سے اٹھے تو ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہوشنگ اس بار بھی میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی اور اس نے میرا ہاتھ بھی تھام رکھا تھا۔ وہ ہاتھ کبھی سہلانے لگتی اور کبھی ہولے ہولے دبانے لگتی۔ پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا لیکن پھر میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ گردن گھما کر ہوشنگ کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

میرا خیال تھا کہ میں اسے کاٹیج کے دروازے پر ہی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ وہ بضد تھی کہ میں اندر چل کر تھوڑی دیر بیٹھوں۔ مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔

چند منٹ سٹنگ روم میں میرے سامنے بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر معذرت کرتی ہوئی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تین چار منٹ بعد اس کی آواز سن کر میں نے اُس کی طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ لباس اتار چکی تھی اور جسم پر ایک مختصر سا کپڑا لپیٹے دروازے میں اس طرح کھڑی تھی کہ "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" والی صورت تھی لیکن اس کا یہ انداز اور ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ بہت کچھ کہہ رہی تھی۔

"میں کپڑے بدلنے کی نیت سے اس کمرے میں آئی تھی۔ مگر میرا شب خوابی کا لباس تو وہ پڑا ہے' اس کرسی پر۔ پلیز! ذرا وہ لباس مجھے دے دو۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک کرسی کی پشت پر پڑی ہوئی شیفون کی نائٹی اٹھائی اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے سے دو قدم کے فاصلے پر رک کر نائٹی اس کی طرف بڑھا دی۔ نائٹی لیتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔ میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور صوفے پر بیٹھ کر بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

پانچ منٹ گزر گئے۔ ایک بار تو میرے دل میں آئی کہ اٹھ کر بغیر بتائے چلا جاؤں اور ممکن ہے میں اپنے اس ارادے پر عمل بھی کر ڈالتا لیکن ٹھیک اسی وقت وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک خوب صورت ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں رکھے ہوئے دو نازک سے گلاسوں میں مشروب بھرا ہوا تھا۔ ہلکے گولڈن کلر کا یہ وہی مشروب تھا جو پہلے بھی ہم کئی بار پی چکے تھے۔ میں یا جانگی وغیرہ جب بھی ہوشنگ کو چھوڑنے آتے' وہ اس مشروب سے ہماری تواضع ضرور کرتی تھی اور اس میں شبہ نہیں' بہت خوش ذائقہ تھا۔

ہوشنگ نے ٹرے چھوٹی سینٹر ٹیبل پر رکھ دی اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ میرے سامنے بیٹھی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ایک گلاس اٹھا کر آگے جھکتے ہوئے میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک دو سپ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ میرا بہت کڑا امتحان لے رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ میرے جذبات کو اشتعال دلانے کے لیے اور اس سے پہلے کہ میں اس کے داؤ میں آجاتا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے فوراً ہی وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہوشنگ کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے ایک بازو میری

کمر کے گرد حمائل کردیا اور دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔

"یہ گلاس خالی کیے بغیر تم نہیں جاسکتے ڈیئر۔" وہ میرا گلاس اٹھاتے ہوئے بولی "یہ ہماری روایت ہے کہ مہمان جب تک اپنا گلاس یا کپ خالی نہ کردے اسے گھر سے جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ لو آج میرے ہاتھ سے پی لو۔"

اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا اور خود بھی میرے اوپر جھک گئی۔ میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کنپٹیاں تپنے لگیں۔ چیکو بہت عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ وہ طوائف تھی۔ وہ بھی اکثر حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتی تھی۔ کئی مواقع بھی ملے تھے مگر ایسی حرکت اس نے کبھی نہیں کی تھی اور یہ ہوشنگ۔۔۔ اپنے آپ کو ایک شریف اور معزز گھرانے کی بتانے والی ہوشنگ پکے ہوئے پھل کی طرح میری آغوش میں گری جارہی تھی۔

وہ میرے اوپر جھکی جارہی تھی۔ میں اپنے سینے میں ہلچل سی محسوس کرنے لگا۔ سنسنی کی لہریں تھیں جو بجلی کے کرنٹ کی طرح میرے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے غٹاغٹ سارا مشروب پی لیا۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا اور پوری طرح میرے اوپر اوندھ گئی۔ وہ مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکے ہلکے قہقہے لگا رہی تھی۔

اچانک مجھے اپنے دماغ میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ یہ سنسناہٹ اس سنسناہٹ سے بہت مختلف تھی جو میں کچھ دیر پہلے تک محسوس کررہا تھا۔ میرے قویٰ ایک دم ڈھیلے پڑنے لگے۔ میں سمجھ گیا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا اور مشروب میں کوئی نشہ آور دوا ملائی گئی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ مشروب۔۔۔ اس میں کیا تھا۔۔۔؟" میں ہکلایا اور اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔

"آرام سے پڑے رہو۔" ہوشنگ بلی کی طرح غرائی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی ایک دم بدل گئے تھے "بہت بہادر بنتے تھے۔ ناقابل تسخیر سمجھتے تھے اپنے آپ کو۔ ایک ہی وار میں ڈھیر کردیا نا۔"

میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اس نے میرے سینے پر دباؤ ڈال رکھا تھا تاکہ میں اٹھ نہ سکوں۔ مجھے بے ہوش کرنے کے لیے مشروب میں جو بھی نشہ آور چیز ملائی گئی تھی، اس کا اثر ابھی شروع ہی ہوا تھا۔ میں اگر چاہتا بھی تو اپنے آپ کو اس کے زیر اثر آنے سے نہیں بچا سکتا تھا۔ لیکن اچانک میری آنکھوں کے سامنے روشنی کا ایک کوندا سا

لپک گیا۔ میں نے اپنے اندر کی مخفی اور پراسرار قوت دی اور پھر وہ ہوا جس کے لیے میں میں نے سوچا ہوگا۔

میں اپنے آپ کو مکمل طور پر ہوش و حواس میں کرنے لگا اور اگر میں چاہتا تو اس وقت ہوشنگ سے گرا کر اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا تھا لیکن میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں معلوم کہ اس نے میرے ساتھ یہ حرکت کیوں کی تھی۔ مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش کیوں کی تھی۔ وہ مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی یا کسی اور کے کہنے پر ایسا کیا تھا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھیں اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے اندر کی مخفی قوت کام شروع کردیا تھا۔ میں نے اپنا سانس روک لیا۔ دوسروں کے لیے بے ہوش ہوچکا تھا مگر میں اپنے مکمل طور پر ہوش میں تھا۔ میرے دماغ کی کھڑکیاں کھلی تھیں، میں ہر آواز سن سکتا تھا۔ ان آوازوں کو شناخت چشم تصور سے ان کی صورتیں بھی دیکھ سکتا تھا اور سب بڑی بات یہ کہ میں جب چاہتا "ہوش" میں آسکتا تھا۔

ہوشنگ مجھے چھوڑ کر الگ ہوگئی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر سرد مہری کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ چند میری طرف دیکھتی رہی پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے کپڑے لیے تھے اور ایک بیگ اٹھا رکھا تھا جو اس نے سامنے صوفے پر رکھ دیا۔ اس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا باہر والا دروازہ کھول کر پہلے اِدھر اُدھر جھانکا اور پھر طرح ایک ہاتھ کی دو انگلیاں ہونٹوں میں دبا کر سیٹی بجائی۔

ایک منٹ بعد کوئی گاڑی کاٹیج کے سامنے آ رکی۔ انجن کی آواز سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کوئی ویگن تھی۔ گاڑی کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور ہوشنگ کے ساتھ دو آدمی اندر آگئے۔ ان میں سے ایک کی آواز سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ میگا تیراڈ تھا۔

"میں نے اسے اتنی ڈوز دے دی ہے کہ یہ تو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ اس وقت تک یہاں سے کم سے کم ڈیڑھ سو میل دور جاچکے ہوگے۔" ہوشنگ نے کہا۔

"تم نے تو واقعی وہ کام کردکھایا جو دو سرداروں

میگا نے جواب دیا "یہ رہا تمہارا انعام۔ اب تم یہ جگہ چھوڑ دو۔ اگر تم پر شبہ ہوگیا تو۔۔۔"

"نہیں میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔" ہوشنگ نے بات پوری نہیں ہونے دی "وہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ مجھے چھوڑنے کے لیے آیا تھا۔ مزید ایک گھنٹے تک واپس نہ پہنچا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی یہاں پہنچ جائے گا۔ اور سب سے پہلے مجھ پر ہی شبہ کیا جائے گا اسی لیے میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے شاؤیانگ سے آگے کسی جگہ اتار دینا۔"

میگا اور اس کے ساتھی نے مجھے صوفے سے اٹھالیا اور مجھے باہر لے جاکر سامنے کھڑی ہوئی گاڑی میں ڈال دیا۔ دونوں جیسے ہی نیچے اترے، میں نے آنکھیں کھول کر صورت حال کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی ایمبولینس تھی۔ جس کے ایک سائڈ لمبائی کے رخ پر اسٹریچر نما سیٹ تھی جس پر مجھے ڈال دیا گیا تھا۔ سامنے بھی لمبی سیٹ تھی۔ ایک طرف گیس سلنڈر بھی رکھا ہوا تھا اور دیگر وہ تمام لوازمات موجود تھے جو ایک ایمبولینس میں ہونے ضروری ہوتے ہیں۔

ڈرائیونگ کیبن اور پچھلے حصے کے درمیان ایک کھڑکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ میگا اور اس کے ساتھی کے علاوہ صرف ہوشنگ کو بھی ان کے ساتھ کچھ دور تک جانا تھا۔ مجھے یہ بھی سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ لوگ مجھے مریض کی حیثیت سے مسلسل بے ہوش رکھ کر کہیں لے جانا چاہتے تھے۔

باہر سے مدھم لہجے میں باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں پھر کاٹیج کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے تھوڑی ہی بعد ایک آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہوشنگ اور میگا میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ کسی نے پچھلا دروازہ بند کردیا۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور گاڑی حرکت میں آگئی۔ وہ دونوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے دھیمے لہجے میں باتیں کررہے تھے۔

ساری صورت حال اب میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میگا نے بڑی لمبی منصوبہ بندی کی تھی۔ وہ یہ بات تو جان گیا تھا کہ میرے ہوش میں ہوتے ہوئے مجھ پر قابو پانا ممکن نہیں۔ اب تک ان کا ہر حربہ ناکام رہا تھا۔ اس کے بعد ہی اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔

پلاننگ کے مطابق ہوشنگ کو ہمارے جمنازیم میں داخلہ دلوایا گیا اور وہ چیکو اور جانکی سے دوستی کی آڑ میں مجھ سے قربت بڑھانے کی کوشش کرتی رہی۔ شروع میں تو اسے

میری سرد مہری کی وجہ سے ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ پلاننگ کے مطابق وہ جان بوجھ کر دیر تک کیمپ میں ہمارے پاس رہنے لگی۔ مقصد یہی تھا کہ ہم اسے کاٹیج تک چھوڑنے کے لیے جارہے تھے اور آج شاید وہ اپنے پروگرام کو فائنل ٹچ دے کر آئی تھی۔ اس نے گویا پہلے ہی سے یہ طے کرلیا تھا کہ آج وہ مجھے اکیلے ہی یہاں لے کر آئے گی اور اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں آکر وہ مجھے زیادہ سے زیادہ دیر تک روکنے کے لیے وہی ہتھکنڈے استعمال کرتی رہی جو ایک حسین عورت کسی مرد کو چت کرنے کے لیے کرسکتی ہے۔ مگر اس میں اسے ناکامی ہوئی اور جب میں اٹھ کر جانے لگا تو اس نے مجھے زبردستی روک لیا۔ وہ نیم برہنہ میرے سامنے آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں والہانہ انداز میں اس سے لپٹ جاؤں گا مگر اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی اور بالآخر اس نے آخری حربہ استعمال کیا اور نشہ آور مشروب کے ذریعے مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش کی مگر میں بروقت اس کی سازش سے آگاہ ہوگیا اور چی کی مدد سے اس کی سازش کو ناکام بنادیا اور اب میں اس ایمبولینس میں "بے ہوش" پڑا تھا اور وہ دونوں میرے سامنے بیٹھے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔ میگا ہوشنگ کی پلاننگ اور حوصلہ مندی کی تعریفیں کررہا تھا۔

میں اپنی سیٹ پر بے حس و حرکت پڑا جانکی وغیرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے ہوشنگ کو اس کے کاٹیج تک چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں واپس چلے جانا چاہیے تھا اور اب تقریباً ڈھائی گھنٹے ہوچکے تھے۔ یقیناً کسی کو میرے پیچھے بھیجا گیا ہوگا پھر اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ ماسٹر تینشی یان نے میری خفیہ نگرانی بھی تو شروع کرا رکھی تھی۔ ہوسکتا ہے نگرانی کرنے والوں نے مجھے اس طرح اغوا ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہو اور میرے پیچھے آرہے ہوں اور یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں میرے اغوا کا پتا ہی نہ چلا ہو۔ اس طرح جو کچھ بھی کرنا تھا، مجھے اکیلے ہی کرنا تھا اور اس کے لیے مجھے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

ایمبولینس شاؤلن کی حدود سے نکل چکی تھی اور اب شاؤیانگ کے قریب پہنچ رہی تھی۔ میگا نے کھڑکی پر جھک کر ڈرائیور کو ہدایت کردی تھی کہ وہ ایمبولینس کو قصبے میں لے جانے کے بجائے باہر والی سڑک سے شہر کے دوسری طرف نکال لے جائے اور پھر کچھ ہی دیر بعد شاؤیانگ بھی پیچھے رہ گیا۔

"پیچھے کوئی گاڑی آرہی ہے۔" ہوشنگ کی آواز سن کر

میں بھی چونک گیا اور آنکھ میں بہت معمولی سی جھری پیدا کر کے دیکھا تو ایمبولینس کے پچھلے دروازے کے شیشے سے پیچھے آنے والی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی اندر پہنچ رہی تھی۔

"ہوسکتا ہے یہ پیٹرولنگ پولیس کی گاڑی ہو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔ تم وہ کہانی مت بھولنا۔ دماغ پر چوٹ لگنے کی وجہ سے مریض کومے میں ہے اور ہم اسے شہر کے اسپتال میں لے جارہے ہیں۔" میگا نے کہا۔ جیب سے پستول نکال کر چیک کیا اور دوبارہ جیب میں رکھ لیا پھر کھڑکی پر جھک کر ڈرائیور سے بھی کچھ کہا۔

ہوشنگ اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی اور میرے منہ پر ماسک لگا دیا جس سے منسلک ربر کی نلکی سیلنڈر سے لگی ہوئی تھی لیکن اس نے سیلنڈر کا والو نہیں کھولا تھا۔ میرے منہ پر ماسک رکھ کر غالباً یہ تاثر دیا جانا مقصود تھا کہ مریض کو آکسیجن پر رکھا گیا ہے۔

پیچھے آنے والی گاڑی تیزی سے قریب آرہی تھی اور پھر وہ ہماری ایمبولینس کے برابر پہنچ کر آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے میگا کی چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے ڈرائیور سے کچھ کہا تھا۔ میں نے آنکھ میں جھری بنا کر دیکھا۔ میگا کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ کھڑکی کی طرف رخ کر کے غالباً دوسری گاڑی پر فائر کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت میں نے ہوش میں آجانا ہی مناسب سمجھا اور آنکھیں کھول دیں۔

اس وقت ہوشنگ اپنی سیٹ پر بیٹھی میری طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر یہ تاثرات کچھ اور نمایاں ہوگئے۔ میں نے ایک ہاتھ سے اپنے منہ پر سے ماسک ہٹا دیا۔ ہوشنگ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

ہوشنگ کی چیخ سن کر میگا تیزی سے میری طرف گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی وحشت سی ابھر آئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے دونوں ٹانگیں سمیٹ لیں اور بل کرتے ہوئے دونوں پیر فلائنگ کک کے انداز میں اس کے سینے پر دے مارے۔ وہ چیختا ہوا سیٹ پر الٹ گیا۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا تھا۔

میگا کے لیے یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ ہوشنگ نے اسے بتایا تھا کہ میں آٹھ دس گھنٹوں سے پہلے ہوش میں نہیں آؤں گا لیکن میں نہ صرف ہوش میں آگیا تھا بلکہ اس پر بھرپور انداز میں حملہ بھی کر دیا تھا۔

ہوشنگ بھی چیختی ہوئی ایک طرف گر گئی تھی۔ اس نے میگا کا گرا ہوا پستول اٹھانے کی کوشش کی مگر میری کک اس کے کندھے پر سامنے کی طرف لگی اور وہ پیچھے الٹ گئی۔

دوسری گاڑی ایمبولینس کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں دونوں گاڑیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ میگا نے اٹھ کر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک زوردار پنچ رسید کر دیا جو اس کی ناک پر لگا۔ وہ تلملا اٹھا۔ ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ سیٹوں کے درمیان تنگ سی جگہ میں پھنسا ہوا تھا اور آزادی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا اور مجھے اس پر یہ بالادستی حاصل تھی کہ میں آزاد تھا اور اپنی مرضی کے مطابق حرکت کر سکتا تھا۔

دونوں گاڑیاں سڑک سے اتر کر پتھریلے میدان میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ کئی مرتبہ ایسا لگا جیسے ایمبولینس الٹ جائے گی۔

میں سیٹوں میں پھنسے ہوئے میگا پر گھونسے برسا رہا تھا۔ اسی دوران میں ہوشنگ کو موقع مل گیا۔ وین کی سیٹ کے نیچے دو انچ گولائی والا ایک تین چار فٹ لمبا جستی پائپ رکھا ہوا تھا۔ ہوشنگ نے وہ پائپ اٹھا کر مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اگر میں بروقت ایک طرف نہ جھک جاتا تو میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ جاتے لیکن بہرحال پائپ کی ضرب میرے بائیں کندھے پر لگی تھی اور بڑے زور سے لگی تھی۔ میں نے ہوشنگ کو دوبارہ حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور پلٹ کر اس کے سینے پر زوردار پنچ رسید کر دیا۔ وہ خوفناک انداز میں چیختی ہوئی پیچھے الٹ گئی۔ میں نے اسے بھی اٹھا کر میگا پر پھینک دیا اور پچھلے دروازے کے قریب پڑا ہوا پستول اٹھا لیا اور ڈرائیونگ کیبن کی چھوٹی سی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ڈرائیور کو ایمبولینس روکنے کا حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ڈیش بورڈ پر ایک فائر بھی کر دیا۔ ایمبولینس لہرا گئی۔ لیکن پھر اس کی رفتار کم ہوتی چلی گئی اور کچھ دور جا کر رک گئی۔

دوسری کار اس سے چند گز آگے جا کر رک گئی تھی۔ ایمبولینس کے ڈرائیور نے گاڑی روکتے ہی نیچے اتر کر ایک طرف دوڑ لگا دی مگر کار سے اترنے والے ایک آدمی نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اس کی دھنائی کرنے لگا۔

میں نے دو اور آدمیوں کو کار سے اترتے ہوئے دیکھا۔ ان میں ایک کوچی تھا اور دوسرا بھی ہمارے ہی کیمپ کا سینئر اسٹوڈنٹ تھا۔

ہوشنگ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اس کی گدی پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ چیختی ہوئی ڈھیر ہوگئی۔ مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا تھا۔ ایسی بدکار اور سازشی ذہن رکھنے والی عورتیں کسی ہمدردی کی مستحق نہیں تھیں۔

میں نے پلٹ کر دروازے پر زوردار کک ماری۔ دروازہ کھل گیا اور جب میں باہر نکل رہا تھا تو اسی وقت کوچی اور اس کا دوست بھی دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

"وجدان۔ تم ٹھیک ہو؟" کوچی بولا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ انہیں باہر نکالو۔" میں نے ایمبولینس کے اندر اشارہ کیا۔

وہ دونوں ایمبولینس میں گھس گئے اور ان دونوں کو مارتے پیٹتے ہوئے باہر نکال لائے۔ ہوشنگ کو دیکھ کر کوچی کا بھی خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے دو چار ہاتھ بونس کے طور پر بھی لگا دیے۔ تیسرا آدمی ڈرائیور کو بھی مارتا پیٹتا ہوا لے آیا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ہم شاؤیانگ سے تقریباً تیس میل دور تھے۔ ہمارے چاروں طرف ہولناک سناٹا تھا۔ میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔

میگا تیراڈ پہلی مرتبہ اس طرح میرے ہاتھ لگا تھا اور میں اس سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت مشکل آدمی ثابت ہوا تھا لیکن اسے زبان تو بہرحال کھولنی پڑی تھی۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ بہت سنسنی خیز تھا۔

گولڈن ٹرائی اینگل کا جنرل کھوراٹ اس وقت میرا بدترین دشمن تھا۔ یوں تو دنیا کا ہر شریف آدمی موت کے اس سوداگر کا دشمن تھا۔ بہت سی حکومتوں نے بھی اس پر طرح طرح کی پابندی لگا رکھی تھی۔ مگر اس طرح اسے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکا تھا جس طرح میں نے اس کے گھر میں گھس کر نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی ایک لیبارٹری تباہ کر دی تھی۔ درجنوں کارندوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور فرار ہوتے ہوئے اس کا ایک ہیلی کاپٹر بھی تباہ کر دیا تھا۔ میں واحد شخص تھا جو اس کی راجدھانی میں گھس کر تباہی نازل کرتا ہوا زندہ سلامت وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس نے میری تلاش میں دنیا بھر میں اپنے آدمی پھیلا دیے تھے اور وہ مجھے ہر قیمت پر زندہ گولڈن ٹرائی اینگل واپس لانا چاہتا تھا۔ اس نے میرے لیے کوئی بہت ہی خاص سزا تجویز کر رکھی تھی۔

میگا نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ رکم تو گولڈن ٹرائی اینگل میں میرے ہی ہاتھوں مارا گیا تھا۔ دارا اور چی فانگ چند ہفتے سنہری تکون میں رہنے کے بعد خفیہ طور پر بنکاک واپس چلے گئے تھے۔ انہوں نے جنرل کھوراٹ سے وعدہ کیا

کیا

آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟
آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کے لیے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی طرح مشقیں نہیں کرنا پڑتیں؟

جدید اور سائنٹفک اصولوں پر مبنی حیرت انگیز کتاب

آپ کی شخصیت میں انوکھا نکھار پیدا کر دیگی
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

اس کتاب کا مطالعہ کیجیے
اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجیے!

قیمت 40 روپے * ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

مکتبہ نفسیات

تھا کہ وہ وہاں بزنس کو فروغ دے کر اس کے نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کریں گے۔

مزید بہت سی معلومات حاصل کرلینے کے بعد میں نے کوچی کے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ میگا کو دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ میگا کو زندہ چھوڑنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد ہی بھاگ دوڑ کی آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ میں کوچی کو وہیں چھوڑ کر دوڑتا ہوا اس طرف پہنچ گیا جہاں میگا کو لے جایا جارہا تھا اور پھر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ کوچی کا ساتھی زمین پر پڑا کراہ رہا تھا اور میگا کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بہت دور سنائی دے رہی تھی۔ اس کا داؤ چل گیا تھا اور وہ ہمارے آدمی کو زخمی کرکے بھاگ گیا تھا۔ اس ویرانے میں اس کا پیچھا کرنا بیکار تھا۔ میں اپنے ساتھی کو اٹھا کر واپس آگیا۔

اس کے تقریباً دس منٹ بعد ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ میں کوچی کے ساتھ کار میں تھا اور دوسرے دونوں لڑکے ایمبولینس میں۔ ہوشنگ اور ڈرائیور کو اس ویرانے میں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کی سزا یہی تھی کہ وہ اس ویرانے میں بھٹکتے رہیں۔ وہ دونوں دور تک ہماری گاڑیوں کے پیچھے بھاگے تھے اور پھر ہوشنگ گر پڑی تھی اور ڈرائیور بھی رک گیا تھا۔

جب ہم اپنے کیمپ میں واپس پہنچے تو رات ڈھل رہی تھی۔ جانکی جاگ رہی تھی۔ وہ میرے لیے پریشان تھی اور ساری رات اس نے اس پریشانی میں گزاری تھی۔

میں اپنے بستر پر گر گیا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گئی اور میں اسے گزرے ہوئے واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔

باتیں کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی۔ جانکی بھی میرے قریب ہی لیٹ کر سوگئی۔

دو ہفتے اور گزر گئے۔ ماسٹر ہنگ پائی نے میرے کچھ امتحان لیے اور مجھے کامیاب قرار دیا اور مجھے اجازت دے دی کہ میں جب چاہوں وہاں سے جاسکتا ہوں۔ میرے اعزاز میں ایک بہت بڑی تقریب کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جس میں شاؤلن ٹیمپل کے تمام ماسٹرز مدعو تھے۔ میں نے ان کے سامنے سینئر کرانیکاز کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔ مجھے ہر طرف سے مبارک بادیں ملتی رہیں۔

اس سے اگلے روز صبح سویرے میں اور جانکی پہاڑی پر ماسٹر ہنگ پائی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لیے ماسٹر ہنگ پائی کا آخری لیکچر تھا جو خاصا طویل ثابت ہوا۔

میرا خیال تھا کہ دوستوں سے ملنے کے لیے دو چار دن مزید وہاں رہوں گا۔ لیکن اس روز ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی۔ ڈانگ کوکی پولیس ہماری تلاش میں شاؤ یانگ پہنچ چکی تھی۔

چیکو کا یہ خیال درست ثابت ہوا تھا کہ ڈانگ کو میں کارا شان کی کوٹھی میں آتشزدگی اور اس کی موت کا راز ایک نہ ایک دن ضرور کھل جائے گا۔ اس وقت کاراشان کے شوہر سیان چانگ نے اگرچہ پولیس کو رشوت دے کر اس آتشزدگی کو ایک اتفاقی حادثہ بنوالیا تھا مگر چیکو نے کہا تھا کہ یہ معاملہ کبھی نہ کبھی ضرور اٹھے گا اور سیان چانگ اپنی جان بچانے کے لیے ہمیں پھنسانے کی کوشش کرے گا اور بالآخر اس نے ایسا ہی کیا تھا اور پولیس ہماری تلاش میں پہنچ گئی تھی۔ سیان چانگ کو معلوم تھا کہ میری اور جانکی کی منزل شاؤلن ٹیمپل تھی۔ اس نے پولیس کو ہمارے بارے میں یقیناً سب کچھ بتا دیا ہوگا۔

”میں نے ٹھیک کہا تھا نا۔“ چیکو نے کہا ”میں سیان چانگ کو بہت عرصے سے جانتی ہوں۔ وہ دولت مند آدمی ہے۔ اپنے آپ کو بچانے اور دوسروں کو پھنسانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اب ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہوگا۔“

میں نے ماسٹر لیشی یان کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ہمیں فوراً ہی شاؤ یانگ میں چیانگ شاؤ اور حاشی کے بنگلے پر پہنچا دیا۔ چیکو بھی ہمارے ساتھ تھی۔

وہ رات ہم نے وہیں گزاری اور اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں میاں بیوی ہمیں اپنی گاڑی پر لے کر روانہ ہوگئے۔

چھ گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد ہم گوئے لین پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑا شہر تھا۔ یہاں ائرپورٹ بھی تھا لیکن ظاہر ہے ہم ہوائی جہاز پر سفر نہیں کرسکتے تھے۔

یہاں ہم نے حاشی کے ایک کزن کے ہاں قیام کیا۔ ... دن یہاں رہے اور پھر حاشی کا کزن ہمیں اپنی گاڑی پر بٹھا کر لوژور کی طرف روانہ ہوگیا۔ ہم صبح نو بجے کے قریب گوئے لین سے روانہ ہوئے تھے۔ لوژور پہنچے تو چار بج چکے تھے۔ وہاں بھی ہمارا قیام حاشی کے کزن کے ایک دوست کے ہاں رہا۔ اس نے اگلے روز شام کو نانگ پہنچا دیا۔

ہماری واپسی کا یہ سفر زیادہ دلچسپ نہیں تھا سوائے اس کے کہ ہم پولیس سے چھپ کر سفر کر رہے تھے۔ اس لیے اس سفر کی تفصیلات بتا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ کوئی دلچسپ واقعہ پیش آتا تو اس کے بارے میں ضرور ... البتہ ان سطور کے ذریعے میں چیانگ شاؤ اور اس کی خوب صورت بیوی حاشی کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہوں گا کہ ان کے تعاون اور ان کے دوستوں کی مدد سے ہم چین کی سرحد تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکے تھے۔

شاؤلن ٹیمپل سے روانہ ہونے کے آٹھ دن بعد ہم نے بنگلا نامی ایک چھوٹے سے گاؤں سے چند میل آگے ایک جگہ سے سرحد پار کرلی۔ چیکو ہمارے ساتھ نہیں آئی تھی۔ اس نے نیک تمناؤں کے اظہار کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ہمیں رخصت کردیا۔

وہ شام کا وقت تھا۔ میں اور جانکی چھپتے چھپاتے۔ رات بھر سفر کرتے رہے۔ یہ پہاڑی علاقہ جنگلوں سے پٹا ہوا تھا۔ یہاں خوں خوار درندے بھی ہوسکتے تھے لیکن خوش قسمتی سے کسی درندے سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔

صبح کے وقت ہم چند گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوگئے اور تب یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ہم چین سے برما کی طرف نہیں، لاؤس کی سرحد میں داخل ہوگئے تھے۔

دنیا میں خدا کے نیک بندے اب بھی موجود ہیں۔ اس بستی میں بھی ہمیں ایسے کچھ لوگ مل گئے جنہوں نے ہماری آگے روانگی کا بندوبست کردیا۔ اس طرح ہم مزید تین دن سفر کی کٹھنائیاں اٹھانے کے بعد ہوئے سائی پہنچ گئے۔ لاؤس کا یہ شہر تھائی لینڈ کی سرحد کے قریب ہی واقع ہے۔ چین کی سرحد کے قریب کی بستی سے ہمارے ساتھ آنے والا آدمی ہمیں ایک بہت عالی شان کوٹھی میں لے گیا۔ جس کے مالک کے بارے میں پتا چلا کہ وہ بھی اس چھوٹی سی بستی ہی کا رہنے والا تھا جس نے شہر میں آکر تعلیم حاصل کی اور بزنس شروع کرکے بہت بڑا آدمی بن گیا۔ یہاں اس کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ اس کے تعلقات بھی بہت وسیع تھے۔ ہماری کہانی سننے کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ ہم دو چار دن اس کے مہمان رہیں، شاید وہ ہمیں سرحد پار کرانے کا بندوبست کردے گا۔

ہمارے لیے یہ اطلاع بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی کہ ہوئے سائی سے چند میل آگے سرحد کے دوسری طرف تھائی لینڈ کا وہ سرحدی قصبہ چیانگ سائین واقع ہے جس سے میری بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ سردار تھالوب کا شہر۔ جہاں سے ہم گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہوئے تھے۔

سرحد پر وہی دریائے میکانگ تھا جس میں داخل ہوکر ایک طرف ہم چیانگ سائین کی طرف جاسکتے تھے اور دوسری طرف تھوڑا ہی آگے گولڈن ٹرائی اینگل کا کنارہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر جنرل کھوراٹ کو یہ معلوم ہوجائے کہ ہم ہوئے سائی میں موجود ہیں تو اس کے لیے ہمیں گولڈن ٹرائی اینگل لے جانا کتنا آسان ہوگا۔

ہوئے سائی کے بزنس مین مسٹر کن منہ نے دوسرے روز کسی وجہ سے ہمیں اپنی کوٹھی سے ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل کردیا تھا جہاں ہماری دیکھ بھال اور کھانے وغیرہ کے بندوبست کے لیے ایک ادھیڑ عمر عورت بھی موجود تھی۔

اس شام آٹھ بجے کے قریب میں اور جانکی مکان سے نکل کر ٹہلتے ہوئے کچھ آگے بازار کی طرف نکل گئے۔ سڑک پار کرنے کے لیے ہم ایک جگہ رک گئے۔ اسی وقت ایک سرخ رنگ کی چم چماتی ہوئی خوب صورت کار ہمارے قریب آکر رکی۔ اسٹیرنگ کے سامنے باوردی شوفر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ پہلے ایک ادھیڑ عمر بھاری بھرکم آدمی نیچے اترا اور پھر ایک عورت کار سے برآمد ہوئی۔

اس عورت کو دیکھ کر میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بت بنی کھڑی پلک جھپکے بغیر کار سے اترنے والی عورت کو دیکھ رہی تھی۔

وہ تھائی وانگ تھی!

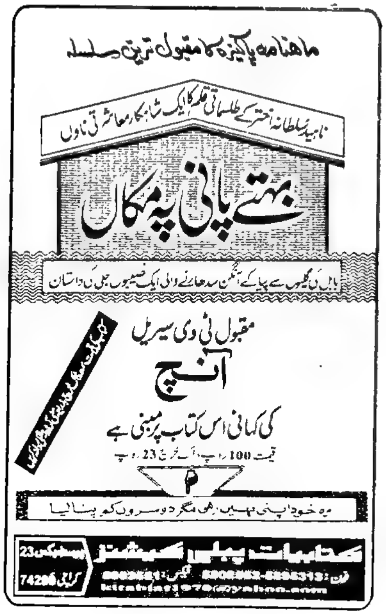

میں یہ بھول گیا تھا کہ تھائی مر چکی تھی اور تقریباً ایک سال پہلے میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے چادر میں لپیٹ کر دریائے میکانگ کی لہروں کے سپرد کیا تھا اور تیز رو' تند لہریں چشم زدن میں اسے اپنے ساتھ بہا کر مجھ سے دور لے گئی تھیں۔

لیکن میرے سامنے وہ حسین عورت۔ وہ تھائی ہی تھی۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں اس لیے تو میں بانہیں پھیلا کر والہانہ انداز میں اس کی طرف لپکا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ بھی دوڑ کر مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں لے گی۔ مجھے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لے گی اور میں اپنے وہ سارے دکھ بھول جاؤں گا جو میں نے اس عرصے میں اٹھائے تھے۔ مجھے پھر وہی گداز آغوش مل جائے گی جس میں ماما جیسی حدت اور محبوب کے پیار جیسی جولانی تھی۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں اس جیسے ان گنت خیالات آئے تھے۔ اس وقت میری بے تابی اور میرا اضطراب قابل دید تھا اور دیکھنے والوں نے یقیناً مجھے پاگل ہی سمجھا ہوگا مگر مجھے کسی کی پروا تھی۔ میں تو اپنی تھائی کو اپنی بانہوں میں لینے کے لیے لپک رہا تھا لیکن۔۔۔

مجھے اسی طرح والہانہ انداز میں اپنی طرف لپکتے دیکھ کر اس حسین عورت کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ پہلے تو وہ شاید یہ سمجھی ہو کہ میں کسی اور طرف بڑھ رہا ہوں لیکن مجھے اپنے بالکل سامنے پاکر وہ وحشت زدہ سی ہو کر بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی اور میں اپنی ہی جھونک میں کار سے ٹکرا گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کون ہو تم اور اس حرکت کا کیا مطلب ہے؟"

وہی آواز تھی۔ تھائی جب غصے میں بولتی تو اس کی آواز اسی طرح کپکپانے لگتی تھی۔ میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دل سینے کے بجائے حلق میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔

"میں۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ تھائی۔۔۔ وجدان۔۔۔ تمہارا وجو۔۔۔" ایک ایک لفظ میرے حلق سے اٹک اٹک کر نکل رہا تھا۔ اس ایک پل میں میرا حلق اس طرح خشک ہو گیا تھا۔ جیسے مٹھی بھر ریت بھر دی گئی ہو۔ زبان سوکھ کر کانٹے کی طرح تالو میں چبھنے لگی۔

"کون وجو۔۔۔؟" اس عورت کے حلق سے نکلنے والی آواز میں بھی اس مرتبہ بڑی کاٹ تھی "میں کسی وجو کو نہیں جانتی۔ نجانے کون ہو تم۔ شاید تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ گھر سے باہر نکلو تو حواس میں رہا کرو۔"

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے دل پر نشتر کی طرح چبھ رہا تھا۔ دماغ پر ایک بار پھر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میری تھائی مجھے پہچاننے سے انکار کردے؟ مگر وہ تھائی ہی تھی۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔

وہ اسی طرح جوان اور حسین تھی۔ جب میں شروع میں اس سے ملا تھا۔ چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں' جن میں اب اجنبیت اور سرد مہری تھی۔ سرخ گال اور بھرا بھرا گداز جسم۔ اس نے نیوی بلیو رنگ کا بلاؤز اور منی اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پر یہ لباس خوب بج رہا تھا۔ دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے چند انچ اوپر انگوٹھے کے ناخن کے برابر گلابی جلد سے قدرے گہری گلابی رنگت کا ایک نشان تھا۔ تھائی نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ یہ پیدائشی نشان ہے۔ نہیں نہیں۔ میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔ یہ تھائی ہی تھی لیکن وہ مجھ سے اس طرح اجنبی کیوں بن گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے اتنی سرد مہری کیوں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ اس کی یادداشت نہیں کھو گئی۔

وہ گولڈن ٹرائی اینگل میں کئی روز تک دارا وغیرہ کے قبضے میں رہی تھی۔ اسے کثرت سے ہیروئن استعمال کرائی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے ہیروئن کا اثر دماغ پر ہوا ہو اور اس کی یادداشت ختم ہو گئی ہو۔

تھائی نے آخری سانس میری آغوش میں لیے تھے اور اسے ہم نے مردہ سمجھ کر دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا لیکن شاید وہ مری نہیں تھی۔ ہم نے اس کی زندگی یا موت کا فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لیا تھا اور وہ ہمارے ہاتھوں دریا برد ہو گئی تھی مگر کسی طرح وہ بچ گئی تھی اور اب ایک سال بعد وہ زندگی اور رعنائی سے بھرپور میرے سامنے موجود تھی۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "تم تھائی ہو۔ میری نظریں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ یہ دل جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

"کہا نا کہ میرا نام تھائی نہیں ہے اور میں تمہیں نہیں جانتی۔" اس نے پہلے کی طرح سرد لہجے میں جواب دیا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' اس کے ساتھ کار سے اترنے والا ادھیڑ عمر بھاری بھرکم آدمی آگے آگیا۔ اس کا لباس قیمتی اور چہرے پر بڑی نخوت تھی۔ وہ جم جماتی ہوئی قیمتی کار بھی بتا رہی تھی کہ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اور یقیناً اسے دولت کا بہت گھمنڈ تھا۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ لیا۔

"اے مسٹر۔" اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی "یہاں سے چلتے ہو یا میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں۔"

اس شخص کی اس حرکت پر میرا خون کھول اٹھا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ اگر کوئی میلی آنکھ سے بھی میری طرف دیکھتا تھا تو تھائی مرنے مارنے پر تل جاتی تھی اور اب وہی تھائی مجھے اس شخص کے ہاتھوں ذلیل ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور اپنا سیدھا ہاتھ اس شخص کی کلائی پر رکھ دیا۔ اسی لمحے جانکی دوڑ کر ہمارے قریب پہنچ گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ اس شخص کی کلائی سے الگ کیا اور اس شخص کا ہاتھ بھی میرے گریبان سے ہٹا دیا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر میرا ہاتھ حرکت میں آگیا تو دنیا کی کوئی طاقت اس شخص کو مجھ سے نہیں بچا سکے گی۔

"پلیز مسٹر!" وہ اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجی لہجے میں بولی "آپ لوگ اس کی حرکت کا برا مت مانئے۔ میں معافی چاہتی ہوں۔ دراصل یہ۔۔۔" اس نے ایک انگلی اپنی کنپٹی کے قریب لے جا کر مخصوص انداز میں گھمائی "پلیز! اسے معاف کر دیجیے۔"

"اگر یہ پاگل ہے تو اسے سڑک پر لے کر کیوں پھر رہی ہو۔ گھر لے جاؤ اسے۔" اس عورت نے ناگوار سے لہجے میں کہا۔

"یہ پاگل ہی تو ہو گیا ہے۔" جانکی نے کہا اور مجھے پکڑ کر ایک طرف چلنے لگی۔

میں نے جانکی کو اپنی کنپٹی کے قریب انگلی گھماتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس کی باتیں بھی سن لیں۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن یکایک میری قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ لگتا تھا جیسے میرے وجود میں سناٹا سا طاری ہو گیا ہو۔

جانکی مجھے تقریباً کھینچتی ہوئی اس مکان میں لے آئی جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کمرے میں گھستے ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے اور پھر میرے ہونٹوں سے سسکیاں اور ہچکیاں خارج ہونے لگیں۔ میرا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

میں اپنے ماں باپ کی موت پر اس طرح رویا تھا اور دوسری مرتبہ اس وقت بلک بلک کر رویا تھا۔ جب میں نے اپنے ہاتھوں سے تھائی کو میکانگ کی لہروں کے سپرد کیا تھا اور اب پھر تھائی کے لیے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ میرے سامنے کھڑی تھی اور اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔

"وجو۔۔۔ چپ ہو جاؤ۔ وجو۔۔۔" جانکی نے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اپنے آپ کو سنبھالو وجدان۔ جو کچھ دیکھا اسے ایک خیال سمجھ کر بھول جاؤ۔"

"وہ۔۔۔ وہ تھائی ہی تھی نا؟" میں نے سر اٹھا کر جانکی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔

"بعض اوقات ہم جو کچھ دیکھتے ہیں وہ' وہ نہیں ہوتا جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔" جانکی نے کہا "سمجھ میں نہیں آتا اس کیفیت کو کیا نام دوں۔ نظروں کا فریب۔ سراب۔ تصور یا لاشعوری دھوکا۔"

"یہ لاشعوری دھوکا۔۔۔ سراب' تصور یا نظروں کا فریب نہیں تھا۔ ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جسے تم بھی نہیں جھٹلا سکتیں۔" میں نے جواب دیا "تم بھی طویل عرصے تک اس کے ساتھ رہی ہو۔ میری طرح تمہارے دل میں بھی اس کے لیے چاہت ہے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دو کہ وہ تھائی نہیں تھی۔"

"ہو سکتا ہے وہ اس کی کوئی جڑواں بہن ہو جو بچپن میں کبھی بچھڑ گئی ہو۔" جانکی نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"تھائی کی زندگی کا کوئی گوشہ مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اگر کوئی بہن ہوتی تو مجھے ضرور بتاتی لیکن اس نے کبھی ایسا ذکر نہیں کیا۔ ہم نے راتوں میں جاگ جاگ کر ایک دوسرے سے باتیں کی ہیں۔ ایک دوسرے کی زندگی کے گوشے گوشے میں جھانکا ہے۔ نہیں جانکی اس کی کوئی بہن نہیں تھی۔ وہ تھائی ہے اور۔۔۔ اور ہو سکتا ہے اس کی یادداشت کھو گئی ہو اور اسی لیے وہ مجھے اور تمہیں نہیں پہچان سکی۔"

"تم ایک اور حقیقت کو بھول رہے ہو وجدان۔" جانکی

نے کہا "تم بھول گئے ہو کہ اس نے تمہاری آغوش میں دم توڑا تھا اور تم نے اپنے ہاتھوں سے اسے دریا کی لہروں کے حوالے کیا تھا۔ وہ زندہ کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے اس وقت ہمیں دھوکا ہوا ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "عین ممکن ہے کہ اس پر سکتے جیسی کیفیت طاری ہو گئی ہو اور ہم نے اسے مردہ سمجھ کر دریا میں پھینک دیا۔ تم تو ڈاکٹر ہو جانگی۔ تم بتاؤ کیا ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔"

"ہو سکتا ہے۔" جانگی بولی "بعض اوقات مریض کومے میں چلا جاتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ کومے کی کیفیت بعض اوقات کئی کئی مہینوں تک طوالت کھینچ لیتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں مریض کا زندہ بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ کومے ہی میں ختم ہو جاتا ہے لیکن اس دوران میں بھی اس کے دل کی دھڑکن بند نہیں ہوتی۔ اسے سانس اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے جو مصنوعی طریقوں سے اسے پہنچائی جاتی ہے مگر تھائی کو تو ہم نے دریا میں ڈال دیا تھا۔ اگر وہ کوما میں بھی تھی تو پانی میں ڈوبنے کے بعد وہ چند منٹ سے زیادہ زندہ نہیں رہی ہو گی۔"

"نہیں جانگی۔" میں نے کہا "ہم اسے پانی میں ڈال کر موٹر بوٹ پر وہاں سے بہت دور چلے گئے تھے اور ہو سکتا ہے تھائی پانی کی لہروں پر بہتی ہوئی کنارے پر آ لگی ہو اور کسی نے اسے بچا لیا ہو۔ وہ زندہ تو بچ گئی مگر دماغ پر ہیروئن کے اثر سے اس کی یادداشت چلی گئی جس وجہ سے وہ ہمیں نہیں پہچان سکی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہو گا۔" میں چند لمحوں کو خاموش رہا پھر بولا "آج رات ہمارا یہاں سے جانے کا پروگرام ہے مگر میں نہیں جاؤں گا۔ میں اسے تلاش کروں گا۔"

"پاگل مت بنو وجدان۔" جانگی نے کہا "ہم پاسپورٹ اور کاغذات کے بغیر چوری چھپے سفر کر رہے ہیں۔ چین، ویت نام اور لاؤس جیسے کمیونسٹ ملکوں میں بغیر کاغذات کے سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے لیکن یہ ہماری خوش قسمتی رہی ہے کہ اب تک ہمیں ایسے لوگ ملتے رہے ہیں جو ہمیں تمام مصیبتوں سے بچاتے رہے ہیں۔ آج رات ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع مل رہا ہے تو نکل جانا چاہیے۔"

"تھائی کے بغیر؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہاں سے چند میل دور دریائے میکانگ ہے۔" جانگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور میکانگ کے اس طرف چیانگ سائین ہے۔ سردار تھالوب کا علاقہ۔ اس نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ دریا پار لاؤس میں بھی اس کے کچھ لوگ ہیں۔ ہم سردار تھالوب کو صورتِ حال سے آگاہ کریں گے۔ وہ خود یہاں آ کر تھائی کو تلاش کر لے گا اور ویسے بھی آج رات کے بعد یہاں رہنا ہمارے لیے مناسب نہیں۔" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "تھائی کے ساتھ جو آدمی تھا وہ شکل سے ہی خبیث لگتا ہے۔ وہ دولت مند ہے۔ اس کے تعلقات بھی بہت ہوں گے۔ اس نے جس طرح تمہیں گریبان سے پکڑا تھا میں تو گھبرا گئی تھی کہ اس نے اگر واقعی پولیس کو بلا لیا تو ہمیں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جائے گا۔ اگر ہم یہاں رہے تو ممکن ہے کسی وقت ہمیں [illegible] کر وہ ہمارے خلاف کوئی سنگین قدم اٹھا بیٹھے اور ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ فی الحال تھائی کو بھول جاؤ۔ جیسے ایک سال سے بھولے ہوئے تھے۔"

"یہ تم نے کیسے کہہ دیا کہ میں تھائی کو بھولا ہوا تھا۔" میں نے کہا "میں تو ایک لمحے کو بھی اسے نہیں بھولا۔ وہ تو ہر گھڑی ہر پل میرے ساتھ رہی ہے۔"

جانگی چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ہو سکتا ہے میری اس بات سے اسے کچھ دکھ بھی پہنچا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ گزشتہ ایک سال کے دوران میں اس نے تھائی کی جگہ لینے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ تھائی ہی کی طرح اس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ تکلیفیں اٹھائی تھیں، دکھ سہے تھے۔ مجھے تھائی کی طرح بہت پیار دیا تھا مگر اس حقیقت سے بھی انکار کرنا میرے لیے ممکن نہیں کہ میں تھائی کو ایک لمحے کو بھی نہیں بھولا تھا اور آج جب میں نے تھائی کو دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھا تھا مگر اس کی اجنبیت اور بے اعتنائی سے میرا دل پھٹ کر رہ گیا اور ایک سال سے آنکھوں میں رکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔

"تم ادھر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں کافی بنوا کر لاتی ہوں۔" جانگی نے مجھے اپنی آغوش سے ہٹا کر ایک طرف کیا اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ تقریباً بیس منٹ بعد خادمہ کے ساتھ ہی واپس آئی تھی۔ خادمہ نے کافی کے دونوں مگ چھوٹی میز پر رکھ دیے اور میری طرف دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔ جانگی میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

کافی پیتے ہوئے بھی ہم تھائی ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ وہ تھائی ہی تھی۔ جبکہ جانگی اس سلسلے میں کسی ایک فیصلے پر قائم نہیں تھی۔

تھی۔ کبھی وہ کہتی کہ ممکن ہے وہ واقعی تھائی ہی ہو اور کبھی کہتی وہ تھائی ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے مرے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے اور مرنے کے بعد کوئی زندہ نہیں ہوتا۔

"اس میں شبہ نہیں کہ اسے دیکھ کر میں بھی کچھ بدحواس ہو گئی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "لیکن وہ اس کی کوئی ہم شکل بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور دو ہم شکلوں کو دیکھا گیا ہے بلکہ ان میں کوئی رشتہ یا کوئی تعلق بھی نہیں۔ یہ بھی ایک ایسا ہی اتفاق ہو سکتا ہے۔"

"ہم شکل ہونے کا اتفاق ہو سکتا ہے لیکن اس کی حرکات و سکنات، آواز اور اندازِ گفتگو میں بھی کوئی فرق نہیں تھا۔ تمہیں یاد ہو گا کہ تھائی جب غصے میں بولتی تھی تو اس کی آواز تھرتھرانے لگتی تھی اور اس کی ٹانگ پر گلابی رنگ کا وہ پیدائشی نشان۔ وہ نشان کسی اور کے جسم پر کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اتفاق۔" جانگی نے کہا "میں اسے حیرت انگیز اتفاق ہی کہوں گی۔ بہرحال، تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔ یہاں رہ کر ہمیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ سردار تھالوب اپنے ذرائع سے اس عورت کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لے گا۔"

"اور اگر وہ تھائی ہی ہوئی تو۔۔۔؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تو پھر ہم اسے یہاں سے لے جائیں گے۔" جانگی نے جواب دیا "میں بھی تمہارے ساتھ آؤں گی۔ تمہارے اور تھائی کے لیے اگر جان کی قربانی بھی دینی پڑے تو میں دریغ نہیں کروں گی۔ میرے دل میں تھائی کے لیے جو کچھ ہے، تم ابھی تک اس کا اندازہ نہیں لگا سکے ہو۔"

میں جواب دینے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جانگی مجھے خاموش پا کر مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ باہر کے دروازے پر ہلکی سی دستک سن کر ہم دونوں چونک گئے۔ سامنے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ اس وقت گیارہ بجنے والے تھے۔ ہمیں کہا گیا تھا کہ کوئی آدمی آدھی رات کے بعد ہمیں لینے کے لیے یہاں آئے گا اور ابھی گیارہ بھی نہیں بجے تھے پھر خیال آیا کہ ممکن ہے ہمیں لے جانے والوں کے انتظامات وقت سے پہلے ہی مکمل ہو چکے ہوں۔

اسی دوران میں دستک کی آواز ایک بار پھر ابھری۔ اس مرتبہ بھی زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن لگتا تھا جیسے دستک دینے والا عجلت میں ہو۔ میں غیر ارادی طور پر اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے سے نکل کر میں نے ساتھ والے دروازے کی طرف دیکھا جو بند تھا۔ میرے خیال میں خادمہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سو چکی تھی۔ میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگا۔ اس دوران میں تیسری مرتبہ دستک کی آواز ابھری۔ میں دروازے کے سامنے پہنچ چکا تھا۔

میں نے دروازے کی جھریوں میں سے جھانکنے کی کوشش کی مگر باہر گلی میں تاریکی تھی۔ میں نے آہستگی سے کنڈا ہٹا کر دروازہ کھول دیا۔

سیاہ چادر میں لپٹا ہوا وہ انسانی ہیولا دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے سے آنگن میں جلنے والے بلب کی روشنی اگرچہ اس پر پڑ رہی تھی لیکن اس نے چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ نہ صرف چہرہ بلکہ ہاتھ بھی چادر کے اندر چھپے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ہیولا مجھے ایک طرف ہٹاتا ہوا اندر گھس آیا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور جب اس نے میری طرف گھوم کر اپنے اوپر سے چادر ہٹائی تو میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

وہ تھائی وانگ تھی۔

میں اپنی جگہ پر اس طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ تھائی بھی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ ڈالا اور پھر والہانہ انداز میں مجھے چومنے لگی۔

آواز سن کر جانگی بھی دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آ گئی اور پھر تھائی کو دیکھ کر وہ بھی دوڑ کر تھائی سے لپٹ گئی۔ عجیب جذباتی منظر تھا۔ تھائی کبھی جانگی سے لپٹ جاتی اور کبھی مجھ سے لپٹ کر مجھے چومنے لگتی۔

تین چار منٹ گزر گئے۔ ہم ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے پھر شاید جانگی ہی کو اس بات کا خیال آیا تھا۔ وہ ہم دونوں کو بانہوں سے پکڑے کمرے کی طرف لے جانے لگی اور شاید ہماری آواز سن کر خادمہ بھی جاگ گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی حیرت زدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ابھی تم نے ہمیں کافی پلائی تھی۔" جانگی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "بہت خوش ذائقہ تھی۔ ایک کپ اور پینے کو دل چاہتا ہے۔"

خادمہ سر ہلاتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی۔ ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ تھائی نے مجھے بیڈ پر گرا دیا اور ایک بار پھر

مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ کبھی قدرے پیچھے ہٹ کر مجھے اس طرح دیکھنے لگتی جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔

"تم نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے تھائی۔" میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "مجھے پہچاننے سے انکار کر کے تم نے میرا دل پاش پاش کردیا تھا۔"

"وہ میری مجبوری تھی دجو۔" تھائی نے میرا سر اپنے سینے سے لگالیا "میں ایسا رویہ اختیار نہ کرتی تو تان منہ تمہارا دشمن ہوجاتا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔ اس وقت میری جو حالت ہوئی تھی، تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم دونوں کو دیکھ کے میں بھونچکا سی رہ گئی تھی۔ میرا بھی دل چاہا تھا کہ دوڑ کر تم سے لپٹ جاؤں لیکن مجھے اپنے جذبات کے اظہار سے زیادہ تم دونوں کی سلامتی کا خیال تھا اس لیے میں نے وہ رویہ اختیار کیا جس پر میں خود بھی دل ہی دل میں روتی رہی۔"

"اور جانتی ہو، وجدان یہاں آکر کتنا رویا ہے۔" جانکی نے کہا "میں نے اسے کبھی اس طرح بلکتے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"میں جانتی ہوں تم دونوں پر خاص طور سے وجو پر کیا گزری ہوگی۔" تھائی نے کہتے ہوئے مجھے ایک بار پھر اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

تھائی جب بھی مجھے اپنے ساتھ لپٹاتی یا میرا منہ چومتی تو مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوجاتی اور میرے لیے اس سرور آگیں کیفیت کو کوئی نام دینا مشکل تھا۔

"وہ کون تھا؟" جانکی نے پوچھا "میرا مطلب ہے وہ آدمی جو تمہارے ساتھ کار سے اترا تھا۔"

"تان منہ۔" تھائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "وہ اس شہر کا بہت بڑا رئیس ہے۔ اس کے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں تو وہ تم لوگوں کو ختم کرا دیتا یا پولیس کے حوالے کردیتا۔ میں جانتی تھی تم لوگ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے ہو۔ یہاں کی پولیس ایسے لوگوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے، اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم لوگ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو میں نے موقع پا کر ایک ہاکر کو کچھ رقم کا لالچ دے کر تم لوگوں کے پیچھے بھیج دیا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد اس نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ تم لوگ کہاں ہو۔ میں اب سے تقریباً ایک گھنٹے پہلے نکلی تھی اور بڑی مشکل سے چھپتی چھپاتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اگر تان منہ کو پتا چل گیا تو وہ میرے ساتھ تم لوگوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں بڑی گہری نظروں سے تھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ تقریباً ایک سال پہلے جب میں نے گولڈن ٹرائی اینگل میں اسے دارا کے قبضے سے چھڑایا تھا تو ہیروئن کے کثرت استعمال سے وہ بالکل مردہ ہوچکی تھی۔ وہ کسی ویران کھنڈر کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ پچکے ہوئے گال اور اندر کو دھنسی ہوئی ویران آنکھیں۔ ہیروئن نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں اس کی زندگی سے مایوس ہوگیا تھا اور بالآخر چند روز بعد اس نے "دم توڑ" دیا تھا اور میں نے اسے دریا کی لہروں کے حوالے کردیا تھا اور ایک معجزہ ہی تھا کہ اس "سانحے" کے ایک سال بعد وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

پہلی مرتبہ جب میں نے تھائی کو دیکھا تھا تو وہ اسی طرح زندگی سے بھرپور اور ایسی ہی حسین تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی اور اس وقت تو یہ چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

ایک سوال اب تک میرے ذہن میں چکرا رہا تھا۔ ہیروئن نے تھائی کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر گولڈن ٹرائی اینگل سے فرار ہوتے ہوئے وہ گولیاں کھا کر گری تھی۔ خون میں لت پت تھی اور میں نے خود اسے اٹھا کر ... اور پھر کشتی میں ڈالا تھا اور پھر اسے اپنے ہاتھوں سے دریا کی تیز لہروں کے حوالے کردیا تھا لیکن وہ زندہ کیسے بچ گئی۔ جانکی کے ذہن میں بھی شاید یہی سوال گردش کر رہا تھا اور بالآخر اس نے تھائی سے یہ سوال کر ہی ڈالا۔

"یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔" تھائی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم تم لوگوں نے میرے لیے کیا کیا تھا۔ میں شاید تمہاری گود میں سر رکھے ہوئے تھی۔" اس نے میری طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "آنکھ کھلی تو میں ایک جھونپڑے میں زمین پر بچھی چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ میرے بائیں کندھے اور کمر پر زخم تھے۔ میرے اردگرد کئی لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور دو آدمی ایسے تھے جن کے جسموں پر فوجی وردی تھی۔

"ان کی باتوں سے پتا چلا کہ میں ایک چادر میں لپٹی جھاڑیوں میں الجھی دریا میں بہتی ہوئی آ رہی تھی کہ کنارے پر سرحدی محافظوں نے مجھے دیکھ لیا۔ کنارے سے دور ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ایک محافظ ... ماہی گیروں کو بلا لایا اور مجھے دریا سے نکال کر اس ... چند ماہی گیروں کی بستی میں پہنچا دیا گیا۔

"ان لوگوں کی دیکھ بھال کی وجہ سے میں ہوش میں آگئی۔ وہ میرے بارے میں پوچھتے رہے مگر میرا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ میں انہیں کچھ نہیں بتا سکی۔ سرحدی محافظوں کا خیال تھا کہ میں کوئی جاسوس ہوسکتی ہوں لیکن کچھ لوگ اس بات سے متفق تھے کہ مجھ جیسی لب گور عورت جاسوس نہیں ہوسکتی۔ ان کے خیال میں میرا تعلق اسمگلروں کی کسی پارٹی سے ہوسکتا تھا۔ جو کسی جھڑپ میں زخمی ہو کر دریا میں گری تھی اور لہروں پر بہتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی۔

"پانی میں رہنے سے میرے زخموں سے خون بہنا بند ہوگیا تھا۔ بستی کے مکھیا نے اپنے طور پر میرے زخموں کی مرہم پٹی کردی تھی تاکہ مزید خون نہ بہہ سکے۔

"میں رات اس جھونپڑے ہی میں پڑی رہی۔ دو محافظ بھی میری نگرانی کے لیے موجود رہے۔ تاکہ میں بھاگ نہ جاؤں حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت بھی نہیں دے سکتی تھی۔

"صبح ہوئی تو ایک عورت نے مجھے چمچے سے تھوڑا سا سوپ پلا دیا۔ فوجی محافظ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن میں اپنی زبان کو بھی حرکت دینے کے قابل نہیں تھی۔

"محافظ مجھے شہر لے جا کر حکام کے حوالے کردینا چاہتے تھے لیکن اتفاق سے شہر کا ایک رئیس تان منہ ماہی گیروں کی اس بستی میں پہنچ گیا۔ محافظوں نے اسے بتایا کہ گزشتہ رات دریا کے دوسری طرف گولڈن ٹرائی اینگل کے علاقے میں زبردست فائرنگ ہوتی رہی ہے۔ انہوں نے ایک ہیلی کاپٹر بھی تباہ ہو کر دریا میں گرتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کے بعد ہی میں انہیں دریا میں ملی تھی۔ ان کے خیال میں، میں کوئی جاسوسہ تھی مگر تان منہ بھی ان کے اس خیال سے متفق نہیں تھا۔

"میری حالت اور میری دونوں بانہوں پر انجکشنوں کے نشانات دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ میری یہ حالت ہیروئن کے کثرت استعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ تان منہ ایک با اثر آدمی ہے۔ وہ اپنی ضمانت پر مجھے شہر لے آیا اور ایک اسپتال میں داخل کرا دیا۔

"میں چند ہفتے اسپتال میں رہی پھر مجھے تان منہ کی کوٹھی میں منتقل کردیا گیا۔ باقاعدہ علاج، دیکھ بھال اور بہترین خوراک کی وجہ سے میں بڑی تیزی سے روبہ صحت ہونے لگی۔ میری یہ حالت دیکھ رہے ہو۔ میں آج پھر اپنے آپ کو پہلے جیسی محسوس کرتی ہوں۔ زندگی سے بھرپور۔" تھائی خاموش ہو کر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تان منہ بہت دولت مند آدمی ہے۔ اس کا بزنس کئی ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔ وہ ایک بہت نچلی سطح سے اٹھ کر اوپر آیا ہے۔ اس نے بڑی محنت بھی کی مگر ماضی کی محرومیوں اور اب دولت کی فراوانی نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔ وہ بڑا اکھڑ اور بدمزاج آدمی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کی بدمزاجی اور اکھڑپن کی وجہ سے اس کی بیوی کئی سال پہلے اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ وہ تنہا ہے۔ اس کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔

"اس کے بارے میں، میں نے بہت باتیں سنی ہیں مگر حیرت انگیز طور پر میرے ساتھ اس کا رویہ بہت مختلف ہے۔ وہ میرے سامنے بچھا جاتا ہے۔ میرے سامنے اس نے کبھی اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی۔

"شروع میں جب میں اسپتال میں تھی تو مختلف متعلقہ اداروں کے اہلکار مجھے تنگ کیا کرتے تھے۔ میں کون ہوں۔ کہاں سے آئی ہوں۔ یہاں آنے کا میرا مقصد کیا ہے؟ مگر میں نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ تان منہ نے اپنے تعلقات استعمال کر کے مجھے ان پریشانیوں سے نجات دلا دی اور مجھے اسپتال سے اپنے گھر لے آیا جہاں میرا ہر طرح سے خیال رکھا گیا۔

"تان منہ نے بھی مجھ سے میرے بارے میں پوچھنا چاہا۔ وہ یہ تو سمجھ گیا کہ میں تھائی لینڈ کی رہنے والی ہوں لیکن اس نے کوئی بات جاننے کے لیے کبھی مجھ سے ضد نہیں کی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ جس روز مجھے دریا سے نکالا گیا تھا اس سے ایک رات پہلے گولڈن ٹرائی اینگل میں بڑا زبردست ہنگامہ ہوا تھا اور اس کی معلومات کے مطابق اس رات جنرل کھوراٹ کے کچھ قیدی گولڈن ٹرائی اینگل سے فرار ہوگئے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ میں بھی فرار ہونے والے انہی قیدیوں میں سے ایک ہوسکتی ہوں لیکن اس نے مجھ سے بھی اس سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔

"تان منہ بہت دولت مند، غصہ ور، بے رحم اور بدمزاج و اکھڑ ہونے کے باوجود بہت شریف آدمی ہے۔ بیوی چھوڑ کر چلی گئی تو اس نے کسی عورت کو کبھی اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ حالانکہ اس قسم کے لوگ بڑے بدمعاش اور عیاش

ہوتے ہیں۔

"میں تقریباً ایک سال سے اس کے پاس ہوں۔ اس نے کبھی میلی آنکھ سے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ مجھ سے شادی کا خواہش مند ہے لیکن میری مرضی کے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔ شادی کی خواہش کا اظہار اس نے دو مہینے پہلے کیا تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پاکر بھی اس نے اصرار نہیں کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جس روز میں خود رضامندی کا اظہار کروں گی' اسے خوشی ہوگی۔ ویسے میرے لیے اس کے دل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ میرا بہت احترام کرتا ہے اور بقول شخصے' مجھے دیکھ دیکھ کر جیتا ہے لیکن میرے معاملے میں وہ اس قدر حساس ہے کہ کسی مرد کا میرے قریب کھڑے ہونا بھی برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک مہینہ پہلے ایک دعوت میں ایک بہت بڑے سرکاری آفیسر نے میرا ہاتھ پکڑلیا تھا۔ تان منہ نے سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اسے مار مار کر ادھ موا کردیا۔ یہ تو دوسرے روز پتا چلا کہ تان منہ نے اس آفیسر کی ٹانگ کی ہڈی بھی توڑ دی تھی اور وہ ابھی تک اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔

"تم خوش قسمت ہو کہ آج بچ گئے۔ اگر بات ذرا سی بھی بڑھتی تو بہت برا ہوتا۔ تم جس طرح میری طرف لپکے تھے اور تم نے جو باتیں کی تھیں' اس سے اسے شبہ ہوگیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ہمارا کوئی پرانا تعلق ہوسکتا ہے۔

"میں اب وہ سب کچھ چھوڑ کر آگئی ہوں۔ میرا واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ دو چار دن میں یہاں سے نکل جائیں اور اگر اس نے ہمیں تلاش کرلیا تو مجھے تمہارے ساتھ دیکھ کر میری محبت بھی اس کے دل سے نکل جائے گی۔"

"دو چار روز نہیں تھائی۔" میں نے تھائی کے خاموش ہونے پر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم آج رات ہی یہاں سے جارہے ہیں۔ تمام انتظامات مکمل ہوچکے ہیں۔ ہمیں اس آدمی کا انتظار ہے جو ہمیں لینے کے لیے یہاں آنے والا ہے۔"

"اوہ!" تھائی کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی "کون ہے وہ؟"

"ہے ایک شریف آدمی۔ جس نے ہمارے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کیا ہے۔ ویسے سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً سات میل۔" تھائی نے جواب دیا "دریا کے قریب کا کچھ علاقہ گھنے جنگل پر مشتمل ہے۔ ان جنگلوں میں فوجی محافظ چھپے رہتے ہیں تاکہ دریا پر نگاہ رکھ سکیں۔ اس طرح دریا پار کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

"ہمارے محسن نے کوئی نہ کوئی بندوبست تو کیا ہی ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ خادمہ کافی لے کر آگئی۔ ہمارے سامنے کافی رکھتے ہوئے وہ عجیب سی نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی تھائی کو دیکھ رہی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں بھی ہماری گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ میں بار بار تھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شام کو اس نے نیوی بلیو کلر کا بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس وقت جینز کی پینٹ اور ڈینم کی شرٹ میں تھی جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر اس کے بارے میں میرا تاثر یہ تھا کہ وہ پہلے سے زیادہ قیامت خیز ہوگئی تھی۔

"میں نے تمہیں مردہ سمجھ کر اپنے انہی ہاتھوں سے دریا کی لہروں کے سپرد کیا تھا۔ یقین نہیں آتا کہ تم اس وقت زندہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہو۔" میں نے ایک بار پھر اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی واہ۔" جانکی نے زوردار قہقہہ لگایا "تھوڑی دیر پہلے تمہیں اس کے مرنے کا یقین نہیں تھا اور اب تمہیں اس کے زندہ ہونے کا یقین نہیں آرہا۔"

"ہاں۔ بعض اوقات اسی طرح یقین ڈانواں ڈول ہوجاتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

تھائی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اب ہمارے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہی تھی اور اب اسے اپنے بارے میں بتانے کی میری باری تھی۔ میں نے کافی کی ایک دو چسکیاں لیں اور اسے پچھلے ایک سال کے اہم واقعات کے بارے میں بتانے لگا۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم بھول کر غلط جگہ سے سرحد عبور کرکے لاؤس میں نکل آئے تھے۔" میں کہہ رہا تھا "اگر ہم صحیح جگہ سے سرحد پار کرکے برمائی علاقے میں نکل جاتے تو تم سے ملاقات نہ ہوتی اور ہم تمہارے بارے میں بے خبر ہی رہتے اور تمہیں مردہ ہی سمجھتے رہتے۔"

"کافی دکھ اٹھائے ہیں تم نے بھی۔" تھائی نے کہا۔

"ہاں۔ تمہارے بغیر دکھوں کا احساس بھی زیادہ رہا۔" میں نے جواب دیا۔

"بڑے احسان فراموش ہو۔" جانکی نے مجھے گھورا "میں نے قدم قدم پر تمہارا خیال رکھا۔ کبھی تمہیں تنہائی کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اور میں کسی شمار میں ہی نہیں۔"

"نہیں جانکی۔" میں نے کہا "تم دونوں ہی تو ہو جن کی وجہ سے میں آج تک زندہ ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تم نے مجھے تھائی کی عدم موجودگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ تم تھائی کی طرح میرے دل میں گھسی بیٹھی ہو۔"

میری اس بات پر تھائی نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر جانکی گھورتے ہوئے بولی۔

"کیوں جانکی۔ میری عدم موجودگی میں تم اس کے ساتھ بڑی رہی ہو؟"

"مجھے افسوس ہے میں کوشش کے باوجود تمہاری جگہ لینے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تمہاری جگہ کوئی دوسرا لے بھی نہیں سکتا۔ اب تم آگئی ہو تو سنبھال لو اپنے لاڈلے کو۔"

لاڈلے کے لفظ پر تھائی نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میں بہت خوش تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے یہ خوشی ملی تھی۔ ہم اسی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ ہمیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں رہا اور جب میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

سوا دو بجنے والے تھے اور ہمیں لینے کے لیے ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ کہیں آج کا پروگرام منسوخ تو نہیں ہوگیا اگر ایسا ہوا تو بہت مشکل ہوجائے گی۔ تھائی بھی تان منہ کے گھر سے بھاگ آئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ تھائی کو تلاش کرتا پھر رہا ہو۔ اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے معلومات حاصل کررہا ہو۔ رات گزر جانے کے بعد صبح ہوتے ہی اس کی سرگرمیاں تیز ہوجائیں گی۔ اس لیے آج رات ہمارا یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔

میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اب میں بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جانکی کی آنکھوں میں بھی بے چینی دکھائی دے رہی تھی۔

ڈھائی بجے کے قریب بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سن کر ہم اچھل پڑے۔ میں اٹھ کر تیزی سے باہر آگیا اور احتیاط سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے ایک دبلا پتلا سا لمبے قد کا آدمی کھڑا تھا۔ اس نے سر پر سرخ رنگ کا دو تین انچ چوڑا کپڑا پٹی کی طرح باندھ رکھا تھا۔ اس نے کالے رنگ کی پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ ممکن ہے ان کپڑوں کا رنگ کچھ اور ہو اندھیرے میں وہ کالے ہی لگ رہے تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اندر آگیا۔

"آپ لوگ جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہارا سامان کہاں ہے؟"

"ہمارے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنی۔ ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔" میں کہتے ہوئے کمرے کی طرف آیا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی آگیا۔

وہ دروازے میں رک کر باری باری تھائی اور جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"کون کون جائے گا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم تینوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تینوں!" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی "لیکن ہمیں دو آدمیوں کے لیے کہا گیا تھا اور یہ۔۔۔" اس نے تھائی کی طرف اشاروں کیا "یہ تو تان منہ کی عورت ہے۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ ہم نے اسے سرحد پار پہنچایا ہے تو وہ ہماری پارٹی کے کسی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

میں کانپ اٹھا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس نے تھائی کو پہچان لیا تھا کہ وہ تان منہ کی عورت تھی اور ہم اسے چوری چھپے اپنے ساتھ لے جارہے تھے۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی دھواں ہورہا تھا۔

"تان منہ کو پتا نہیں چلے گا کہ تم نے مجھے سرحد پار کرائی تھی۔" تھائی نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے کئی کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے "تم اپنی زبان بند رکھو گے۔ تم نے مجھے کبھی نہیں دیکھا۔ تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

اس شخص نے نوٹ لے کر پتلون کی جیب میں ٹھونس لیے۔

"مگر ہمیں صرف دو آدمیوں کو سرحد پار کرانے کے لیے کہا گیا تھا۔" وہ ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مسٹر کن منہ کہاں ہے۔ تمہارے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ کن منہ ہمارا وہی دولت مند ہمدرد تھا جس نے ہمارے فرار کا بندوبست کیا تھا۔

"مسٹر کن منہ تو اس وقت اپنے گھر میں سو رہے ہوں گے۔ اوید میہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

محض کسی نام سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے یا مرد لیکن اس شخص نے چونکہ اس مشکل نام کے ساتھ مؤنث کا صیغہ استعمال کیا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔

"چلو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

ہم تینوں کمرے سے باہر آ گئے۔ میں نے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھول کر خادمہ کو جگا دیا۔ اسے بتایا کہ ہم جا رہے ہیں وہ باہر کا دروازہ بند کر لے۔

ہم چاروں تاریک گلی میں دبے قدموں چلتے رہے۔ وہ آگے تھا اور ہم اس کے پیچھے۔ گلی کے موڑ پر ایک بند وین کھڑی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ اگر اودھیہ نے ہم تینوں کو لے جانے سے انکار کر دیا تو ہم آج نہیں جائیں گے۔ ظاہر ہے میں نہ تو جانکی کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی تھائی کو۔ اودھیہ کے انکار کی صورت میں ہم واپس آ جاتے اور صبح میں اپنے مہربان دوست کن منہ سے بات کرتا۔

وین کے شیشوں پر سیاہ شیٹس لگی ہوئی تھیں۔ آگے ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ہمارے ساتھ آنے والے نے وین کا دروازہ کھول کر اندر جھکتے ہوئے کچھ کہا۔ جواب میں ایک نسوانی آواز بھی سنائی دی تھی۔ اس شخص نے ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وین کے پچھلے حصے میں ایک عورت کے علاوہ دو آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے مگر تاریکی کے باعث ان کے چہرے نظر نہیں آ رہے تھے۔ عورت نے چھت پر لگی ہوئی بتی جلا دی۔ روشنی اگرچہ زیادہ تیز نہیں تھی مگر ایک دوسرے کے چہرے دیکھے جا سکتے تھے۔

اس عورت نے باری باری ہماری طرف دیکھا اور پھر اس کی نظریں تھائی کے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے بیٹھنے کے بعد وین چل پڑے گی مگر وین حرکت میں نہیں آئی۔ وہ عورت تھائی سے مختلف سوالات کرنے لگی اور میں اسی دوران میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ خاصی حسین تھی اور چہرے سے خرانٹ لگ رہی تھی۔ کسی جرائم پیشہ گروہ کی سربراہی کرنا کسی شریف عورت کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔

تان منہ شہر کا ایک مشہور و معروف آدمی تھا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں شہر کا بچہ بچہ واقف ہوتا ہے۔ تھائی ایک سال تک اس کے ساتھ رہی تھی۔ بہت سے لوگ اسے بھی جانتے تھے۔ اس آدمی نے تھائی کو ”تان منہ کی عورت“ کہا تھا۔ ممکن ہے شہر کے لوگ تھائی کو تان منہ کی داشتہ سمجھتے ہوں۔

تقریباً پانچ منٹ تک تھائی اور اودھیہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں تھائی نے اپنا ہینڈ بیگ اس کے حوالے کر دیا۔ اودھیہ نے بیگ کھول کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ غالباً بیگ میں تگڑی رقم موجود تھی۔ اودھیہ نے چھت کی بتی بجھا دی۔ ڈرائیور سے کچھ کہا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا اور وین حرکت میں آ گئی۔

مجھے اودھیہ سے مذاکرات کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سارا معاملہ تھائی ہی نے طے کر لیا تھا۔ وہ تان منہ کے گھر سے نکلتے وقت غالباً خاصی بڑی رقم لے کر آئی تھی۔ اسے خیال ہوگا کہ یہاں رہتے ہوئے ہمیں رقم کی ضرورت پڑے گی اور اس طرح رقم کام آ گئی تھی۔ تھائی نے پورا بیگ اس کے حوالے کر دیا تھا۔ ظاہر ہے تھائی نے بھی سوچا ہوگا کہ ہم تو یہاں سے جا ہی رہے ہیں۔ لاؤس کی کرنسی تھائی لینڈ میں ہمارے کام نہیں آئے گی۔

تاریک شیشوں سے ہم تو باہر دیکھ سکتے تھے لیکن باہر سے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ شہر کی سڑکیں سنسان تھیں۔ صرف ایک سڑک پر سامنے سے آتی ہوئی ایک کار دکھائی دی تھی اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ شہر میں کسی جگہ پولیس کی کوئی گشتی پارٹی بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

وین شہر سے نکل کر دریا کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ اس سڑک کے دونوں طرف درخت تھے۔ درختوں میں وین کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی سرنگ میں سفر کر رہے ہوں۔

بالآخر وین ایک جگہ رک گئی۔ ڈرائیور نے انجن بند کر دیا۔ اس کے چند ہی منٹ بعد ایک کھلی جیپ ہماری وین کے قریب آ کر رکی۔ اس میں فوجی وردیوں میں ملبوس دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اودھیہ وین سے اتر کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ چند منٹ بعد ہمیں وین سے اتار کر جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اودھیہ اور اس کے دو ساتھی بھی ہمارے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئے تھے اور جیپ حرکت میں آ گئی۔ اودھیہ کے باقی ساتھی وین ہی میں رہ گئے تھے۔

چھ سات منٹ بعد جیپ درختوں کے درمیان ایک جگہ پر رک گئی۔ یہاں لکڑی کے تین چار ہٹ بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک ہٹ میں روشنی ہو رہی تھی۔ اودھیہ جیپ سے اتر کر ایک فوجی کے ساتھ اس ہٹ میں داخل ہو گئی تھی۔

یہ سرحدی محافظوں کی نگران پوسٹ تھی۔ تقریباً پچاس گز آگے دریائے میکانگ بہہ رہا تھا اور دریا کے دوسری طرف تھائی لینڈ تھا۔ ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے تھے۔ راستے میں صرف میکانگ حائل تھا۔ اگر کوئی گڑبڑ نہ ہوئی تو ہم چند منٹ بعد تھائی لینڈ میں ہوں گے۔

وہ محافظ اودھیہ کو ہٹ میں چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ہٹ کا دروازہ کھلا اور اودھیہ ایک اور فوجی کے ساتھ ہٹ سے برآمد ہوئی۔ اودھیہ کی شرٹ کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ ہٹ سے برآمد ہونے والا آفیسر اس نگران پوسٹ کا انچارج تھا۔ وہ ہماری جیپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ ہٹ کے کھلے ہوئے دروازے سے آنے والی روشنی جانکی اور تھائی کے چہروں پر پڑ رہی تھی اور وہ آفیسر باری باری ان دونوں کو گھور رہا تھا۔ وہ دونوں بے چینی سے پہلو بدلنے لگیں اور میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی۔ آفیسر نے ان دونوں سے نظریں ہٹا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے سوالات کرنے لگا۔

میں جانتا تھا کہ ہمارے ہمدرد کن منہ نے ہمیں سرحد پار کرانے کے لیے اودھیہ کو ایک خطیر رقم دی ہوگی اور اودھیہ نے اس آفیسر کو بھی حصہ دیا ہوگا۔ اس کے بغیر تو ہم دریا کے اتنا قریب آ بھی نہیں سکتے تھے لیکن اس کے باوجود کسی گڑبڑ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس موقع پر میں نے ترپ کا پتا پھینکنے کا فیصلہ کر لیا اور مجھے امید تھی کہ یہ پتا کام کر جائے گا۔ میں نے مہاراج اور سردار تھالوب کے ناموں کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

آفیسر یہ دونوں نام سن کر چونک گیا۔ مہاراج کا نام لاؤس کے لوگوں کے لیے بھی اجنبی نہیں تھا۔ یہاں کے لوگ بھی تھائی لینڈ سے کک باکسنگ کی ٹریننگ لے کر آتے تھے۔

اور سردار تھالوب کو تو یہ آفیسر زیادہ جانتا تھا۔ وہ تھائی لینڈ کے ایک بہت بڑے قبیلے کا سردار تھالوب اور یہ قبیلہ پہاڑیوں میں دریا کے ساتھ ساتھ اپنی سرحد میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سردار تھالوب ویسے بھی منشیات کی پیداوار کی وجہ سے شکنی کے حوالے سے ان علاقوں میں خاصی شہرت رکھتا تھا۔ اسی حوالے سے لاؤس کے سرحدی علاقوں میں بسنے والے بعض بڑے بڑے لوگوں اور سرکاری افسروں سے بھی اس کے رابطے تھے۔

سردار تھالوب کا نام سن کر آفیسر مجھ سے اس کے بارے میں سوالات کرتا رہا اور میں ایک سال پہلے تک کے واقعات اس کے بارے میں اسے بتاتا رہا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنے ماتحت سے کچھ کہا۔ ماتحت نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم جیپ سے اتر کر اسی کے ساتھ چل پڑے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اودھیہ آفیسر کے ساتھ اس کے ہٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

دریا کے کنارے پر ایک موٹر بوٹ تیار کھڑی تھی۔ ہم تینوں کے علاوہ اودھیہ کے دونوں آدمی بھی بوٹ میں بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے انجن اسٹارٹ کر کے کنٹرول لیور سنبھال لیا۔

ہمارے ساتھ آنے والے فوجی نے اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔ وہ دوڑتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ اس کے تقریباً پانچ منٹ بعد اس طرف سے ٹارچ کی روشنی حرکت کرتی ہوئی دکھائی دی۔

”گو۔“ ہمارے قریب کھڑے ہوئے فوجی نے چیخ کر کہا اور موٹر بوٹ حرکت میں آ گئی۔

بوٹ دریا کی تند لہروں کو چیرتی ہوئی سامنے والے کنارے کی طرف دوڑنے لگی۔ یہاں دریا کا پاٹ ہزار میٹر سے بھی زیادہ تھا۔ ہمارے کپڑے گہرے رنگوں کے تھے اور بوٹ پر بھی سیاہ رنگ پینٹ کیا ہوا تھا۔ تاریکی میں دور سے بوٹ کو دیکھ لینا آسان نہیں تھا۔

بوٹ دریا کے وسط میں پہنچ چکی تھی۔ اچانک فائرنگ کی آواز سن کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جانکی تو سیٹ سے اچھل کر نیچے گر پڑی تھی۔ میں بھی نیچے آ گیا اور تھائی کو بھی سیٹ کے نیچے کھینچ لیا۔

آٹومیٹک رائفلوں سے فائرنگ کی آوازوں نے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر دیکھا۔ اودھیہ کے دونوں آدمی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور تب مجھے احساس ہوا کہ وہ فائرنگ ہماری بوٹ پر نہیں کی جا رہی تھی۔ میں محتاط انداز میں اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

فائرنگ بائیں جانب تقریباً ایک ہزار میٹر دور ہو رہی تھی اور پھر اودھیہ کے ساتھی نے بتایا کہ جب بھی یہاں سے کوئی بوٹ چوری چھپے دوسرے کنارے کی طرف جاتی ہے تو تھائی محافظوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کچھ دور فائرنگ شروع کر دی جاتی ہے۔ دوسرے کنارے پر گشت کرنے والے تھائی محافظ اس طرف چلے جاتے ہیں اور بوٹ خیریت سے منزل پر پہنچ جاتی ہے۔ اس وقت بھی یہی حکمتِ عملی اختیار کی گئی تھی۔

چند منٹ میں ہی بوٹ دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ کنارے پر گنجان درختوں کی شاخیں پانی میں جھکی ہوئی تھیں۔

”چند گز آگے تمہیں ایک پگڈنڈی ملے گی۔ اسی پر چلتے چلے جاؤ۔ کہیں رکنے کی کوشش مت کرو۔“ اودھیہ کے

ایک آدمی نے کنارے پر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ خود کنارے پر اتر گیا تھا۔ ہم دونوں نے پہلے جانکی اور تھائی کو بوٹ سے اترنے میں مدد دی پھر میں نے بھی چھلانگ لگا دی۔ وہ آدمی دوبارہ بوٹ پر بیٹھ گیا اور بوٹ تیزی سے واپس روانہ ہو گئی۔

ہم وہاں رکے نہیں۔ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے تیزی سے درختوں میں چلتے رہے۔ کچھ ہی دور جانے کے بعد ہمیں وہ پگڈنڈی مل گئی۔ وہ ایک باقاعدہ کشادہ راستہ تھا۔ ہم تیز رفتاری سے چلتے رہے۔

اندھیرے میں جانکی اور تھائی کو کئی مرتبہ ٹھوکریں لگی تھیں اور دو مرتبہ تو میں ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا تھا۔

یہ پتھریلا راستہ بتدریج بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ تھائی اور جانکی ہانپنے لگی تھیں مگر ہم رکے بغیر چلتے رہے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد راستہ نشیب میں اترنے لگا۔

"رک جاؤ۔" تھائی ہانپتے ہوئے بولی "تھوڑی دیر کو رک جاؤ۔ اب مجھ سے ایک قدم نہیں چلا جا رہا۔" وہ ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

میں اور جانکی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ سناٹے میں حشرات الارض کی آوازیں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔

اس وقت شاید پانچ سے اوپر کا وقت تھا۔ اندھیرا بتدریج کم ہو رہا تھا اور فضا میں بہت مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد ہم نشیب میں اترنے لگے۔

ہم مزید دو گھنٹوں تک رکے بغیر چلتے رہے اور اب دھوپ پھیل رہی تھی۔ دھوپ کی روپہلی نرم کرنیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ایک چٹان کے اوپر سے گھوم کر ہم جیسے ہی دوسری طرف آئے، تھائی ٹھٹک کر رک گئی اور ہاتھ سے بائیں طرف اشارہ کرنے لگی۔

نشیب میں تاحدِ نگاہ دھان کے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور ان کھیتوں کے بیچ میں ایک مکان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مکان ہم سے کم از کم ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اگر نشیب میں نہ ہوتا تو اتنی دور سے ہمیں وہ مکان نظر نہ آتا۔

ہم چند منٹ وہاں رکے اور پھر نشیب میں اترنے لگے۔ نیچے کھیتوں تک پہنچنے کے لیے کوئی سیدھا راستہ نہیں تھا۔ ہمیں بائیں طرف مڑنا پڑا۔ اس طرف گنجان درخت تھے جن کی شاخیں راستے پر جھکی ہوئی تھیں لیکن ٹوٹی ہوئی شاخوں سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس راستے پر گاڑیوں کی آمدورفت رہی ہو گی جن کے ٹکرانے سے شاخیں ٹوٹی تھیں۔

ہم تقریباً پندرہ منٹ تک ان گنجان درختوں میں چلتے رہے اور پھر اس راستے سے مڑ کر ایک پگڈنڈی پر آگئے جو ہمیں دھان کے کھیتوں تک لے گئی۔ وہ مکان اتنا قریب نہیں تھا جتنا ہمیں اوپر سے نظر آیا تھا۔ وہ اب بھی تقریباً دو سو گز دور تھا۔ ہم ایک اونچی جگہ پر رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ مکان کے آس پاس تو کیا دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"حیرت ہے کوئی نظر نہیں آرہا۔" جانکی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی "حالانکہ کاشتکار قسم کے لوگ تو سورج نکلنے سے پہلے ہی کھیتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔"

"کھیتوں میں پانی بھرا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا "ہوسکتا ہے اس موقع پر فصل کو کاشتکار کی توجہ کی زیادہ ضرورت نہ ہو۔ بہرحال، آگے چل کر دیکھتے ہیں۔ ممکن ہے وہ لوگ ابھی تک سو رہے ہوں۔"

ہم اونچی جگہ سے اتر کر کھیتوں کے درمیان ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ سب سے آگے تھائی تھی۔ اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے جانکی۔ دھان کے پودے دو ڈھائی فٹ اونچے تھے۔ ان میں ابھی پھل آنا شروع ہوا تھا۔ دھان کی فصل کو پنیری کی بوائی سے لے کر پھل پکنا شروع ہونے تک بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بعد پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اس وقت فصل جوان تھی اس لیے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ تنگ سی پگڈنڈی بھی پانی میں بھیگی ہوئی تھی۔

ہم سب بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے۔ میرے پیچھے جانکی کے پیر کے نیچے سے اچانک ہی مٹی نکل گئی۔ اس نے سنبھلنے کے لیے مجھے پکڑ لیا۔ وہ خود تو نہ سنبھل سکی بلکہ میرا توازن بھی بگڑ گیا اور میں اس کے ساتھ لڑکھڑاتا ہوا کھیت میں گر گیا۔ میرے ساتھ ہی جانکی بھی گری تھی۔

تھائی ہم سے چند قدم آگے تھی۔ اس کے حلق سے بے اختیار قہقہے ابل پڑے۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی جانکی کی طرف۔ میں چند لمحے پانی میں پڑا جانکی کو گھورتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں سر سے پیر تک کیچڑ میں لتھڑ گیا تھا۔ مجھے دیکھ کر جانکی نے بھی قہقہے لگانا شروع کر دیے اور کوشش کر کے وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے دیکھ کر ہنس رہی ہو۔ ذرا اپنا حلیہ دیکھو۔ بالکل بھتنی لگ رہی ہو۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

جانکی نے اپنا جائزہ لیا مگر اس کی ہنسی نہیں رکی۔ وہ مکان اب وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور میرا خیال تھا کہ قہقہوں کی آواز سن کر کوئی نہ کوئی باہر ضرور آئے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم ایک بار پھر آگے چلنے لگے۔ اس مکان کے سامنے دو تین سو گز ہموار جگہ تھی جہاں کیاریوں میں پھول لگے ہوئے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ اس مکان میں جو بھی لوگ تھے ابھی تک گہری نیند سو رہے تھے لیکن قریب پہنچے تو ہمارا یہ خیال سو فیصد غلط ثابت ہوا۔ مکان کے دروازے پر ایک چھوٹا سا تالا لگا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ ہماری آوازیں سن کر بھی کوئی باہر کیوں نہیں نکلا تھا۔

"میرا خیال تھا کہ یہاں کسی سے ہمیں کپڑے مل جائیں گے مگر اب تو کیچڑ ہی میں رہنا پڑے گا۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے۔" جانکی بولی "ان گیلے کپڑوں میں تو ہم ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ میں دیکھتی ہوں۔" اس نے ایک پتھر اٹھا لیا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے میری ایک بات نہیں سنی اور تالے پر پتھر سے ضربیں لگانے لگی۔ دیسی قسم کا تالا زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ تیسری ہی ضرب پر ٹوٹ کر لٹک گیا۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا جانکی۔" تھائی نے کہا "اس طرح کسی کے گھر کا تالا توڑنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"ہم یہاں چوری کرنے تو نہیں جا رہے۔" جانکی نے تالا کنڈے سے نکالتے ہوئے جواب دیا "ہمیں خشک کپڑوں کی ضرورت ہے۔ ہم اپنے کپڑے دھو کر ڈال دیں گے۔ یہ سوکھ جائیں گے تو ہم ان کے کپڑے اتار دیں گے۔"

اس نے دروازے کے دونوں پٹ مکمل کھول دیے۔ میں جانکی کے ساتھ ہی اندر داخل ہو گیا۔ کافی بڑا کمرا تھا جس میں سامنے کی دیواروں کے ساتھ لکڑی کے دو تخت بنے تھے جو غالباً بیڈ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ صرف ایک بیڈ پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک میلا سا تکیہ بھی پڑا تھا۔ ایک دیوار کی کھونٹیوں پر میلے سے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ جینز کی ایک پتلون اور ایک اوپن شرٹ اور ایک کھونٹی پر ایک میلی سی چادر ٹنگی ہوئی تھی۔

کمرے کے بائیں طرف ایک دروازہ تھا اور پچھلی طرف ایک کھڑکی۔ میں کھڑکی کے قریب پہنچ کر باہر جھانکنے لگا۔ مکان سے پچھلی طرف تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک ندی بہہ رہی تھی جس کا پاٹ چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ پانی بالکل شفاف تھا۔ کھیتوں کو اسی ندی سے پانی دیا جاتا تھا۔

میں پیچھے مڑا تو تھائی دوسرے دروازے میں داخل ہو رہی تھی۔ میں بھی اس طرف پہنچ گیا۔ یہ ایک کشادہ اور لمبا سا کچن تھا۔ ایک طرف چولھا بنا ہوا تھا جس کے قریب ہی لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لکڑی کے تختوں کے عارضی شیلف بنے ہوئے تھے جن پر برتن اور کچھ ڈبے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ جانکی ان ڈبوں کی تلاشی لینے لگی۔ بالآخر اسے دو ڈبوں میں چائے کی پتی اور چینی مل گئی۔ ایک طرف پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایلومینیم کی کیتلی بھی پڑی تھی جو دھوئیں سے بالکل سیاہ ہو رہی تھی۔ تھائی کیتلی دھونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چائے بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

باورچی خانے کے عقب میں بھی ایک کھڑکی تھی جہاں سے وہ ندی اور اس کے پیچھے دور تک کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ میں چولھے کے سامنے بیٹھ کر اس میں لکڑیاں جمانے لگا۔ اس دوران میں تھائی نے کیتلی دھو کر اس میں چائے کے لیے پانی ڈال لیا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ ہمارے پاس ماچس تو تھی نہیں آگ کیسے جلائی جائے گی۔ یہی بات میں نے تھائی سے کہی تو وہ مسکرا دی۔

"اس شیلف پر میں نے ایک ماچس بھی رکھی ہوئی دیکھی تھی۔ اس لیے تو چائے بنانے کا خیال ذہن میں آیا تھا۔" اس نے کہا۔

میں اٹھ کر شیلف پر دیکھنے لگا۔ ماچس تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ میں چولھے میں آگ جلانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھائی نے کیتلی چولھے پر رکھ دی۔ آگ جلانے سے دھواں پھیلا تو میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ میں اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور تھائی چوکی پر بیٹھ کر آگ جلانے لگی۔ ہم یہ سب کچھ اس طرح اطمینان سے کر رہے تھے جیسے یہ اپنا ہی گھر ہو اور ہمیں کسی کی مداخلت یا پکڑے جانے کا کوئی خوف نہ ہو۔

میں شیلفوں میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یقیناً یہاں کسی کی مستقل رہائش تھی۔ جو کسی کام سے قریبی بستی یا شہر گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ رات ہی کو گیا ہوا ہو اور اب آنے والا ہو۔

میری نظر اچانک ہی عقبی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی اور مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جانکی ندی کے قریب بے لباس کھڑی تھی۔ اس نے جسم سے اتارے ہوئے گندے کپڑے ندی کے کنارے پر پھینک دیے تھے۔

دھو کر ڈال دوں۔ نہا کر یہ چادر لپیٹ لوں گا۔"

جانکی نے وہ چادر مجھے دے دی۔ وہ دونوں اٹھ کر باہر آکر دھوپ میں بیٹھ گئیں۔ میں چادر لے کر مکان کے پچھلی طرف چلا گیا۔ ندی کچھ آگے جا کر بائیں طرف کھیتوں میں مڑ گئی تھی۔ میں بھی اس طرف جا کر ایسی جگہ رک گیا جہاں کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

میری واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ میں نے چادر کو بھکشوؤں کی طرح جسم پر لپیٹ لیا تھا۔ دھوئے ہوئے کپڑے دھوپ میں پھیلا دیے۔ وہ دونوں مکان کے دروازے کے قریب دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ جانکی اب پہلے کی طرح نہیں کانپ رہی تھی۔ اس کا گریبان بھی اب کھلا ہوا نہیں تھا۔ کیکر کے کانٹے کی طرح سوئی جیسے ایک لمبے کانٹے سے گریبان بند کر دیا گیا تھا اور یہ کام غالباً تھائی نے کیا تھا۔ جانکی نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

تھائی اٹھ کر اندر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد قہوہ گرم کر کے لے آئی۔ قہوے کا یہ دوسرا دور چل رہا تھا کہ کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر ہم تینوں اچھل پڑے۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور قرب و جوار میں کوئی کتا دکھائی نہیں دیا تھا اور اب کسی کتے کے بھونکنے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا تھا۔ یہ آواز دائیں طرف سے آ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی طرف دیکھنے لگا۔ دائیں طرف تقریباً سو گز دور درختوں کا جھنڈ تھا اور اس جھنڈ سے ذرا آگے ایک مریل سا کتا کھڑا بھونک رہا تھا۔ اس کا رخ مکان کی طرف تھا۔ غور سے دیکھنے پر درختوں کے جھنڈ میں ایک خچر بھی نظر آگیا۔ جس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی کھڑا تھا اور اس کے ساتھ غالباً کوئی عورت بھی تھی جو درختوں کی آڑ میں کھڑی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اس گھر کے مالک تھے جو واپس آ گئے تھے لیکن مکان کے سامنے پھیلے ہوئے کپڑے دیکھ کر انہوں نے یہاں ہماری موجودگی کا اندازہ لگا لیا تھا اور وہ لوگ وہیں رک گئے تھے۔ کتے نے بھی کسی اجنبی کی موجودگی محسوس کر کے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔

درختوں میں خچر کے قریب کھڑے ہوئے اس بوڑھے نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مڑ کر درخت کے پیچھے کھڑی ہوئی عورت سے کچھ کہا اور دوبارہ میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے تھائی اور جانکی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں میرے قریب آ گئیں۔

"اس مکان کے مالک آ گئے ہیں اور غالباً کسی ڈر سے آگے نہیں آ رہے۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ذرا آگے جا کر انہیں بتاؤ کہ ہم چور نہیں ہیں۔ ان سے انہیں کوئی خطرہ نہیں۔"

تھائی کے ساتھ جانکی بھی اس طرف چلنے لگی۔ میں جگہ پر کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان دونوں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ بوڑھا کچھ محتاط ہو گیا تھا۔ تھائی اور جانکی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کتا کچھ اور بھی زور سے بھونکنے لگا تھا۔ تھائی اور جانکی دور ہی رک گئیں۔ تھائی اونچی آواز میں اس بڈھے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ بڈھے نے بھی کچھ کہا۔ جواب میں تھائی کچھ بولی۔ ان کے مذاکرات تقریباً تین منٹ تک جاری رہے۔ اس دوران میں کتے کی مداخلت بھی جاری رہی تھی۔ بالآخر بڈھے نے پیچھے مڑ کر اس عورت سے کچھ کہا۔ وہ عورت درخت کی آڑ سے نکل کر سامنے آ گئی اور پھر وہ دونوں درختوں کے جھنڈ سے نکل کر آگے آنے لگے۔ عورت نے پتلون اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر گھاس سے بنا ہوا چوڑے چھجے کا ہیٹ تھا۔ جس کی نوک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اس خطے کے کاشتکار عام طور پر اسی قسم کے ہیٹ پہنتے تھے۔ ہیٹ کا چھجا آگے کو جھکا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے جسم سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جوان عورت تھی۔ بوڑھا آگے بڑھتے ہوئے کتے کو بھی ڈانٹ رہا تھا۔

تھائی اور جانکی کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔ تھائی اور اس بوڑھے میں ایک بار پھر مذاکرات شروع ہو گئے۔ بوڑھا خاصا برہم نظر آ رہا تھا لیکن بالآخر تھائی نے اپنی باتوں سے اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا اور میری طرف ان کا سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ قریب پہنچ کر اس عورت نے چھجے والا ہیٹ سر سے اتار دیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ بے حد حسین تھی اور میرے خیال میں اس کی عمر تیئس چوبیس سال سے زیادہ نہیں تھی اور میرے لیے یہ اطلاع خاصی دلچسپ ثابت ہوئی کہ وہ اس بوڑھے کی بیوی تھی۔ بوڑھے کی عمر پچپن سال سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔

خچر پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ بوڑھا وہ سامان اتارتے ہوئے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ اب بھی ناراض تھا۔ اسے ناراض ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہم نے نہ صرف ان کے مکان کا تالا توڑا تھا بلکہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے کپڑے بھی استعمال

وہ ساتھ والے کمرے میں کھونٹی پر ٹنگی ہوئی پینٹ شرٹ بھی لے گئی تھی۔ یہ دونوں کپڑے بھی قریب ہی پڑے تھے۔

وہ پانی میں اتر گئی۔ ندی کا پانی اس کی کمر تک آ رہا تھا۔ اس نے پانی میں کھڑے کھڑے اپنے کپڑے دھو کر کنارے کے قریب گھاس پر اچھال دیے اور پانی میں بیٹھ گئی۔ غوطہ لگانے کے بعد وہ پانی سے ابھری تو پانی اس کے بدن سے آبشاروں کی طرح بہنے لگا۔

میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں کسی قدر مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اپنے آپ کو روکنا چاہتا تھا مگر میری بے قابو نظریں بار بار اس طرف اٹھ رہی تھیں۔ کبھی میں تھائی کی طرف بھی دیکھنے لگتا۔ یہ بھی خوف تھا کہ تھائی میری یہ چوری نہ پکڑ لے۔

تھائی اور جانگی میرے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ تھائی تو کئی مرتبہ میرے سامنے بے لباس ہوئی تھی جب میں اس کے جسم پر کوڑے اور چھڑیاں برسایا کرتا تھا۔ جانگی کو بھی کئی مرتبہ مختصر ترین لباس میں دیکھا تھا لیکن آج اسے اس طرح بے لباس پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

وہ ندی کے پانی میں بیٹھی ہوئی تھی اور میں بے حس و حرکت کھڑا اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ میرا سانس بھی جیسے رک گیا تھا اور آنکھیں جیسے پلک جھپکنا بھول گئی تھیں اور پھر اچانک اپنے کان پر ہلکی سی گرفت محسوس کر کے میں اچھل پڑا۔

"بڑے بدتمیز ہو گئے ہو تم۔" یہ تھائی کی آواز تھی جس نے میرے کان کو چٹکی میں پکڑ رکھا تھا "بری بات ہے۔ اچھے بچے ایسی نازیبا حرکتیں نہیں کرتے۔ چلو۔ بیٹھو میرے پاس۔"

میری نظریں جھک گئیں اور چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ مارے ندامت کے میں کٹا جا رہا تھا۔

"وہ... وہ تھائی... میں تو..." میں ہکلا کر رہ گیا۔ ظاہر ہے میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"میں سمجھتی ہوں۔ تم تو بہت شریف آدمی ہو۔ محض اتفاق سے نظریں اس طرف اٹھ گئی تھیں۔" تھائی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "تم میرے بغیر تقریباً ایک سال جانگی کے ساتھ رہے ہو۔ کیا..."

"نہیں تھائی۔" میں ایک دم تڑپ اٹھا "تمہاری قسم۔ میں کبھی جانگی کے اتنا قریب نہیں گیا کہ..."

"قسم مت کھاؤ۔ مجھے تم پر یقین ہے۔" تھائی نے میری بات کاٹ دی اور پھر نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اپنا سر تھائی کے سینے پر رکھ دیا۔ میرے اندر وہی احساس جاگ اٹھا جب میں پہلے اسی طرح تھائی کے سینے پر سر رکھ کر سو جایا کرتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس جس میں ممتا کی حدت بھی تھی اور کسی عزیز ترین ہستی کی چاہت بھی۔

میری سسکیوں کی ہمک پا کر تھائی نے ایک ہاتھ میری پشت پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ مجھے عجیب سا سکون محسوس ہونے لگا۔

کیتلی کا پانی کھول کر چولہے میں گرنے لگا تو شوں کی آواز سن کر تھائی کے ساتھ میں بھی چونک گیا۔ میں تھائی سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ تھائی نے کیتلی میں پتی ڈال کر اسے چولہے سے اتار لیا۔ بغیر دودھ کی چائے کے لیے اتنا ہی ابال کافی تھا۔

میں شیلف پر رکھے ہوئے پلاسٹک کے کپ اٹھانے کے لیے کھڑا ہوا تو میری نظریں ایک بار پھر غیر ارادی طور پر کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ اس وقت تک جانگی نہ صرف ندی سے باہر آ چکی تھی بلکہ اس نے کپڑے بھی پہن لیے تھے اور اپنے دھوئے ہوئے کپڑے اٹھائے واپس آ رہی تھی۔

میں اور تھائی کپ اور کیتلی لے کر کمرے میں آ گئے۔ جانگی اس وقت اپنے کپڑے مکان کے سامنے دھوپ میں گھاس پر پھیلا رہی تھی۔ تھائی نے تینوں کپوں میں قہوہ انڈیل دیا۔ جانگی اندر آئی تو اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور جانگی نے اس شرٹ کے نیچے کچھ بھی نہیں پہنا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی میرے سامنے دوسرے تخت پر بیٹھ گئی۔

"اچھا ہوا تمہیں یہاں چائے بنانے کا سامان مل گیا۔" وہ تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں تو سردی سے ٹھٹھر رہی ہوں۔ ندی کا پانی بھی کم بخت بہت ٹھنڈا ہے۔ مجھے واقعی اس وقت چائے کی ضرورت تھی۔"

تھائی نے ایک کپ اٹھا کر جانگی کی طرف بڑھا دیا۔ واقعی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ میری نظریں اب پھر بار بار جانگی کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے اپنا کپ اٹھایا اور کمرے سے باہر آ کر دھوپ میں کھڑا ہو کر قہوے کی چسکیاں لینے لگا۔ میرے جسم پر بھی بھیگے ہوئے کپڑے تھے اور سردی مجھے بھی لگ رہی تھی۔

میں اپنی چائے ختم کر کے کمرے میں آ گیا۔ جانگی نے چادر اوڑھ رکھی تھی جو میں نے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی دیکھی تھی۔

"تم باہر دھوپ میں بیٹھ جاؤ اور یہ چادر مجھے دے دو۔" میں نے جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں بھی اپنے کپڑے

رہے تھے۔ تھائی بدستور بوڑھے کے ساتھ آگے پیچھے چلتے ہوئے اس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ہم برے لوگ نہیں ہیں۔ ہمیں مجبوراً مکان کا تالا توڑنا پڑا تھا۔ ہم نے اجازت کے بغیر اس کے کپڑے استعمال کیے تھے۔ چائے بھی بنائی تھی لیکن کوئی ایسا نقصان نہیں کیا تھا جس کا ازالہ نہ ہو سکے۔ ہماری وجہ سے جو کوفت ہوئی تھی ہم اس کا ازالہ کرنے کو تیار تھے۔

جانگی نے عقل مندی یہ کی کہ اس دوران میں ان دونوں کے لیے قہوہ بنا لیا۔ وہ دونوں ایک لمبے سفر سے آئے تھے اور انہیں چائے کی ضرورت تھی۔ چائے کے دوران میں میں نے بھی ان کی باتوں میں مداخلت شروع کر دی اور جب میں نے باتوں ہی باتوں میں سردار تھالوب کا نام لیا تو بوڑھا چونک گیا۔

"تم لوگ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آئے ہو۔ سردار تھالوب سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" وہ مجھے گھورنے لگا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے تھائی کی طرف دیکھا اور پھر تھائی اس بوڑھے کو بتانے لگی کہ سردار تھالوب سے ہمارا کیا تعلق ہے۔

"اوہ!" بوڑھے نے ایک بار پھر چونک کر باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا "تو تم لوگ وہی ہو جن کی وجہ سے چیانگ سائین میں خون خرابا ہوا تھا اور سردار تھالوب کے بھی کئی آدمی مارے گئے تھے۔"

"خون خرابا ہماری وجہ سے نہیں ہوا تھا۔" میں نے گفتگو کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہمارے بارے میں اس کے ذہن میں کس قسم کا شبہ تھا۔ وہ شاید یہی سمجھ رہا تھا کہ ایک سال پہلے چیانگ سائین میں ہونے والے خون خرابے کے ذمے دار ہم لوگ تھے "بات وہ نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔" میں نے اس کا ذہن صاف کرنے کے لیے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس خون خرابے کی ذمے داری ہم پر نہیں جنرل کھوراٹ کے آدمیوں پر عائد ہوتی ہے جو تین غیر ملکیوں کی مدد سے یہاں اپنے اڈے بنا رہے تھے۔ ہم ان تین غیر ملکیوں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آئے تھے۔ سردار تھالوب سے ہماری ملاقات چیانگ سائین میں نہیں چیانگ رائے میں ہوئی تھی۔ وہ ہمارا ہم خیال تھا۔ تم جانتے ہو اس نے اپنے اثر کے علاقوں میں پوست کی کاشت ممنوع قرار دے رکھی ہے۔ وہ بھی ہیروئن کی پیداوار، اس کے پھیلاؤ اور اس کے استعمال کا شدید مخالف ہے۔ اس لیے وہ ہماری مدد کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے تمام آدمی میری کمان میں دے دیے تھے۔ بعد میں وہ خود بھی چیانگ سائین آ گیا تھا۔ وہ جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کے خلاف ہمارے شانہ بشانہ لڑا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس جنگ میں اس کے بھی کئی آدمی مارے گئے لیکن ہم نے یہاں جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کے قدم نہیں جمنے دیے۔ انہیں یہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سردار تھالوب کی بہت بڑی کامیابی ہے۔"

"لیکن تم لوگ اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔" بوڑھے نے میرے خاموش ہونے پر کہا "بعد میں اکیلے رہ جانے والے سردار تھالوب کو جو مشکلات پیش آئیں... اس کے بارے میں تم لوگ شاید کچھ نہیں جانتے۔"

"ہم بعد کی صورتِ حال کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے۔" میں نے جواب دیا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ذہین اور سمجھ دار آدمی ہے اور اپنے اردگرد کے ماحول کی پوری خبر رکھتا ہے "سب سے پہلے تو میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ یہاں سے بھاگے نہیں تھے بلکہ جنرل کھوراٹ کے ساتھیوں، ان تین غیر ملکیوں کا تعاقب کرتے ہوئے گولڈن ٹرائی اینگل میں داخل ہو گئے تھے۔ اس کا انتظام بھی سردار تھالوب نے کیا تھا اور ایک کشتی پر ہمیں رخصت بھی اسی نے کیا تھا۔ ہم اسے چھوڑ کر نہیں بھاگے تھے لیکن اب تمہاری باتوں سے مجھے بڑی تشویش ہو گئی ہے۔ اندازہ ہو رہا ہے کہ بعد میں بھی بہت کچھ ہوا تھا۔ اب میں تم سے اس کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

"زیادہ تفصیل میں نہیں جانتا۔" بوڑھے نے جواب دیا "لیکن اس ہنگامے کے تھوڑے ہی عرصے بعد سردار تھالوب پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ جن میں وہ بال بال بچتا رہا۔ قریبی پہاڑیوں سے راکٹ برسا کر اس کے مکان کو تباہ کر دیا گیا۔ یہ سردار تھالوب کی خوش قسمتی تھی کہ وہ حملہ ہونے سے صرف ایک گھنٹا پہلے اس مکان سے نکل گیا تھا۔"

"اوہ..." میرے منہ سے بے اختیار نکلا "حملہ کرنے والے کون لوگ تھے؟"

"میں زیادہ نہیں جانتا لیکن اُڑتی اُڑتی خبر سنی تھی کہ سردار تھالوب کے مکان کی تباہی اور اس پر ہونے والے قاتلانہ حملوں میں جنرل کھوراٹ کے علاوہ یہاں کے کچھ سرکاری افسروں کا بھی ہاتھ تھا۔"

"اوہ!" میں چونک گیا "میرے ذہن میں شہنشاہ نے

خلاف وہ سازش ابھر آئی جسے کچلنے کی ذمے داری مجھے مہاراج نے سونپی تھی اور شہنشاہ کے ایک کزن رتنا کوسن نے مجھے بریف کیا تھا۔ اس سازش کے حوالے سے بھی چیانگ سائین میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ بنکاک میں بھی وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ ہوئی تھی۔ اس سازش میں شریک حکومت کے کئی بڑے بڑے افسروں کو بھی سلاخوں کے پیچھے بند کردیا گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ سازش انہی دنوں ختم ہوگئی تھی لیکن اس بوڑھے کی باتوں سے انکشاف ہوا تھا کہ بعد میں بھی یہاں بڑے زبردست ہنگامے ہوتے رہے تھے۔ میں سردار تھالوب اور رنگولی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کہاں تھے۔

"سردار تھالوب آج کل بنکاک میں ہے۔" بوڑھے نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا ہو "سننے میں آیا تھا کہ اسے حکومت میں ایک اہم عہدے کی پیشکش کی گئی تھی لیکن اس نے انکار کردیا تھا لیکن اس کے بعد اس کی بنکاک آمدورفت بڑھ گئی ہے۔ وہ کئی کئی روز وہاں رہتا ہے۔ اب بھی تقریباً تین ہفتوں سے گیا ہوا ہے۔"

"اور اس کی دوست۔" میں نے کہا "میرا مطلب ہے اس کی ایک دوست رنگولی بھی اس کے پاس رہ رہی تھی۔ وہ کہاں ہے؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"سردار تھالوب پر حملوں کے الزام میں کوئی پکڑا بھی گیا تھا یا نہیں!" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"کئی لوگ پکڑے گئے تھے لیکن وہ سب نچلے درجے کے کارندے تھے۔" بوڑھے نے جواب دیا "سردار تھالوب کے مکان پر پہاڑیوں سے راکٹ برسائے جانے کے بعد دریا کے ساتھ ساتھ فوج تعینات کردی گئی تھی۔ اس طرح سرحد سیل کردینے سے حملے بند ہوگئے مگر چھ ماہ بعد فوج ہٹالی گئی۔ اس کے بعد کوئی حملہ نہیں ہوا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر باری باری ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم لوگ اگر سردار تھالوب کے دوست اور ہمدرد ہو تو اتنا عرصے کہاں غائب رہے۔ لوٹ کر اس کی خبر کیوں نہ لی۔"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "جنرل کھوراٹ کے ساتھی میری اس دوست کو اٹھا کر لے گئے تھے۔" میں نے تھائی کی طرف اشارہ کیا "اس کا نام تھائی ہے۔ چیانگ سائین میں ہونے والے ہنگاموں کے دوران میں ہی یہ ان کے قابو میں آگئی تھی اور جب ہمیں پتا چلا کہ وہ لوگ اسے لے کر گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف نکل گئے ہیں تو میں نے بھی ان کے پیچھے جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سردار تھالوب بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا مگر میں نے اسے روک دیا تاکہ وہ یہاں کے معاملات سنبھال سکے۔ بہرحال میں اور جانگی۔" میں نے جانگی کی طرف اشارہ کیا "ایک رات کشتی پر گولڈن ٹرائی اینگل پہنچ گئے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر گولڈن ٹرائی اینگل میں پیش آنے والے واقعات اُسے مختصر طور پر بتانے لگا۔ آخر میں کہہ رہا تھا "ہم نے تھائی کو ان کے قبضے سے تو چھڑا لیا لیکن اس عرصے میں ہیروئن کے انجکشن دے دے کر اسے ادھ موا کردیا گیا تھا۔ ہم دریائے میکانگ میں گولڈن ٹرائی اینگل سے برما کی سرحد کی طرف فرار ہوگئے۔ تھائی کی حالت بہت بری تھی اور ایک موقع پر یہ کومے میں چلی گئی اور ہم نے اسے مردہ سمجھ کر دریا کی لہروں کے سپرد کردیا۔ میں اور جانگی برما سے ہوتے ہوئے چین کی طرف نکل گئے۔ اس دوران میں ہم زندگی کے کن مراحل سے گزرے؟ اس کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال، کچھ عرصہ شاؤلن ٹیمپل میں گزارنے کے بعد واپس آتے ہوئے ہم غلطی سے برما کے بجائے لاؤس کی سرحد میں داخل ہوگئے اور۔۔۔"

"ایک منٹ!" بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آگے بولنے سے روک دیا "ابھی تم نے بتایا تھا کہ ہیروئن کے استعمال سے یہ ادھ موئی ہوچکی تھی اور تم لوگوں نے اسے مردہ سمجھ کر دریا میں پھینک دیا تھا لیکن یہ تو ہمارے سامنے زندہ موجود ہے اور اس کی صحت بھی غالباً ہم سب سے زیادہ اچھی اور قابلِ رشک ہے۔"

"یہ تمہارے سامنے زندہ کس طرح موجود ہے؟ یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے اور اس کی تفصیل تمہیں تھائی خود بتائے گی۔" میں نے کہتے ہوئے تھائی کی طرف اشارہ کیا۔

ہماری اس گفتگو کے دوران میں اب تک نہ تو تھائی نے دخل اندازی کی تھی اور نہ ہی جانگی نے۔ بوڑھے کی جوان اور حسین بیوی بھی خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آتی اور کبھی چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگتے۔ میں نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے اور پھر تھائی بتانے لگی کہ وہ زندہ کس طرح بچی تھی۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ آخر میں تھائی کہہ رہی تھی۔

"تان منہہ نے میری زندگی بچائی تھی۔ وہ بہت ضدی مند اور ظالم آدمی ہے۔ اسے عورتوں کی بھی کمی نہیں لیکن میرے لیے وہ ایک مختلف انسان ثابت ہوا۔ شرافت کا پیکر۔ اس نے مجھے کبھی چھوا تک نہیں۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس سلسلے میں اس نے مجھ پر کبھی دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں خود ہاں کروں۔

"اسی دوران میں۔۔۔ میرا ایک روز اچانک ہی ہوئے سائی میں ان سے سامنا ہوگیا۔" اس نے میری اور جانگی کی طرف اشارہ کیا "میرے ساتھ تان منہہ تھا۔ اس کی وجہ سے میں ان کے لیے اس وقت بالکل اجنبی بن گئی لیکن بعد میں چوری چھپے ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئی اور رات کے آخری پہر ہم دریا پار کرکے اس طرف آگئے۔ کتنا سکون مل رہا ہے مجھے اپنے وطن کی سرزمین پر آنے کے بعد۔ لگتا ہے میں اپنی ماں کی محبت بھری آغوش میں آگئی ہوں۔" وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے اپنے وطن سے واقعی کتنی محبت تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹوں کو پھر حرکت ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی "اگر اب بھی تمہیں ہماری باتوں کا یقین نہ آیا ہو تو میں مزید کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتی۔ ہم نے اپنے وطن کی سلامتی کے لیے جان کی بازی لگائی ہے۔ قدم قدم پر موت سے پنجہ آزمائی کی ہے بلکہ میں نے تو ایک طرح سے موت کا مزہ بھی چکھا ہے۔ ہمیں کسی سے اپنی وفاداری کا سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے ہماری باتوں کا یقین کرلیا ہے تو ٹھیک ہے۔ بصورتِ دیگر۔۔۔"

"دھیرج تھائی دھیرج!" میں اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

"میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہا ہوں۔" بوڑھے نے تھائی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "مجھے تم لوگوں پر شبہ تو تھا مگر اتنی تفصیلی باتیں ہونے کے بعد اب کسی شبے کی گنجائش نہیں رہی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "دراصل پچھلے سال ان خونی ہنگاموں میں کچھ غیر ملکیوں کا بھی کثرت سے ذکر رہا ہے۔ تم تو تھائی لینڈ ہی کی رہنے والی ہو مگر یہ دونوں چہرے مقامی نہیں ہیں اس لیے مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔" اس نے میری اور جانگی کی طرف اشارہ کیا "اب بات صاف ہوچکی ہے اس لیے شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

"اگر بات صاف ہوچکی ہے تو ہمارے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔" تھائی نے کہا "ہم نے ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ خالی قہوہ پی کر پیٹ میں اور بھی اینٹھن ہونے لگی ہے۔"

تھائی کی اس بات پر بوڑھا مسکرا دیا۔ اس کی جوان بیوی کے ہونٹوں پر بھی آسودہ سی مسکراہٹ آگئی۔

بوڑھے نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ جہاں خچر سے اتارا جانے والا کچھ سامان رکھا گیا تھا۔ بوڑھا تھائی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اس سے میرے اور جانگی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

اس بوڑھے کا نام بوری رام اور بیوی کا نام مائے پانگ تھا۔ بوڑھے کا تعلق لیزو قبیلے سے تھا۔ یہ قبیلہ بھی صدیوں سے برما کی سرحد پر آباد تھا۔ تاہم کئی لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ بوڑھے کا خاندان کئی نسلوں سے یہاں آکر آباد ہوگیا تھا اور انہوں نے کھیتی باڑی شروع کردی تھی۔ اس کی بیوی مائے پانگ تھانگ سانگ کی رہنے والی تھی۔ یہ قصبہ یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ بوری رام کی پہلی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کا مکان تھانگ سانگ میں بھی تھا جہاں وہ اکثر جاتا رہتا تھا۔ مائے پانگ اس کے ایک بہت غریب دوست کی بیٹی تھی۔ کثرتِ اولاد کی وجہ سے وہ خاصا پریشان تھا۔ دوست کی غربت پر ترس کھا کر بوری رام نے مائے پانگ سے شادی کرلی تھی۔ اس شادی کو دو سال ہوچکے تھے۔ بوری رام اپنی بیوی کے ساتھ کبھی اس فارم ہاؤس میں رہتا اور کبھی ایک آدھ دن کے لیے تھانگ سانگ چلا جاتا۔ وہ گزشتہ روز دوپہر کے بعد تھانگ سانگ گئے تھے اور اب واپس آئے تھے۔

بوڑھے کی باتوں سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہم چیانگ سائین سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھے۔ یہاں سے چھ میل تھانگ سانگ تھا اور اس سے بارہ میل آگے چیانگ سائین اور یہاں اس بوڑھے کے پاس اس خچر کے سوا کوئی سواری نہیں تھی اور ظاہر ہے ایک خچر پر ہم تینوں سفر نہیں کرسکتے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد مائے پانگ نے ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کردیا۔ چائے دودھ والی تھی۔ پاؤڈر کا دودھ یہ لوگ قصبے سے لے کر آئے تھے۔ گھر کا بنا ہوا ایک' موٹی موٹی روٹیاں اور کھانے پینے کی کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ یہ لوگ جب بھی تھانگ سانگ جاتے تھے اپنے لیے اس قسم کی کچھ نہ کچھ چیزیں لے آتے تھے۔

ان لوگوں کے آنے سے پہلے میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کررہا تھا کیونکہ اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ہمیں کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن بوری رام اور مائے پانگ کے آجانے اور ان سے باتوں کے بعد میری بے چینی ختم ہوگئی تھی۔

ہمارے کپڑے سوکھ چکے تھے۔ میں اپنے کپڑے اٹھا کر ایک کھیت میں گھس گیا اور کپڑے بدل کر واپس آگیا۔ وہ چادر میں نے شکریے کے ساتھ بوری رام کو واپس کردی۔ جانکی اپنے کپڑے لے کر دور درختوں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ زحمت بھی اس نے بوری رام اور مائے پانگ کی موجودگی کی وجہ سے کی تھی اگر وہ دونوں نہ ہوتے تو جانکی ڈھیٹ بن کر ہم دونوں کے سامنے ہی کپڑے بدل لیتی۔

اس وقت دوپہر ہونے والی تھی۔ جانکی اور تھائی روانگی کے لیے پر تول رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہم تھانگ سانگ تک پیدل چلیں گے اور وہاں سے کسی سواری کا بندوبست کرکے چیانگ سائین کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔ ان دونوں کے خیال میں اب چونکہ ہم اپنی سرزمین پر تھے اس لیے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں ان کے اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ پہلے بھی تو ہم اپنی ہی سرزمین پر تھے اور ہمیں سکھ کا سانس لینا دشوار ہورہا تھا۔ بوری رام سے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ ہمارے جانے کے بعد چیانگ سائین میں خاصے معرکے ہوئے تھے۔ سردار تھالوب کا گھر برباد کردیا گیا تھا۔ اب اگرچہ وہ صورتِ حال نہیں رہی تھی مگر بوری رام کی باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ چیانگ سائین اور اس کے قرب و جوار میں کچھ نہ کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہوں گے جن کا شمار ہمارے پرانے دشمنوں میں کیا جاسکتا ہو۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی سرگرمِ عمل ہوجائیں گے اور پھر سردار تھالوب بھی چیانگ سائین میں موجود نہیں تھا۔ ہمیں کچھ دشواریاں پیش آسکتی تھیں۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ دن کی روشنی میں سفر کرنے کے بجائے شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد یہاں سے روانہ ہوا جائے۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" بوری رام نے کہا "اس وقت تک سواری کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مائے پانگ خچر پر واپس چلی جائے اور تھانگ سانگ سے گاڑی لے آئے۔" بوری رام نے کہا "یہاں چونکہ چھکڑا گاڑی کی ان دنوں ضرورت نہیں ہوتی اس لیے میں اسے تھانگ سانگ والے مکان پر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ مائے پانگ اس میں یہی خچر جوت کر لے آئے گی۔"

تجویز معقول تھی۔ جانکی نے فوراً ہی ہاں میں ہاں ملادی اور تھائی نے بھی تائید میں گردن ہلادی۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی اور ویسے بھی بہتر یہی تھا کہ پیدل سفر کرنے کے بجائے کسی سواری کا بندوبست کیا جائے۔

آدھے گھنٹے بعد مائے پانگ خچر پر سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اس وقت دھوپ تیز ہورہی تھی۔ اس نے چوڑے چھجے والا ہیٹ سر پر جما رکھا تھا۔ کتا بھی خچر کے پیچھے چل پڑا تھا۔

ہمارے پاس انتظار کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم باہر درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ گئے۔ بوری رام پہلے کچھ دیر کمرے کے اندر اپنے کاموں میں مصروف رہا پھر اس نے قریب کے کھیتوں کا ایک چکر لگایا اور ہمارے قریب آکر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی کھیتی باڑی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں ہوتی تھیں۔ ان دونوں فصلوں کے بیچ میں کچھ سبزیاں اگانے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔

"ہم نے گزشتہ رات اس طرف سے دریا پار کیا تھا۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا "یہاں اور لوگوں کی بھی غیر قانونی آمدورفت رہتی ہوگی۔"

"اکثر۔" بوری رام نے جواب دیا "لیکن غیر قانونی طور پر سرحد پار کنارے کے ساتھ ساتھ چٹانوں اور گھنے درختوں میں چھپ کر دور نکل جاتے ہیں۔ دیکھ لیے جانے یا پکڑے جانے کے خوف سے اس طرف یا کسی اور بستی کا رخ نہیں کرتے۔"

"اور سرحدی محافظ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم لوگ آئے تھے تو کیا میکانگ کے دوسری طرف سرحدی محافظوں نے تم لوگوں کو روکا تھا؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کرڈالا۔

"ہم تو انہیں رقم دے کر آئے تھے۔ ہمارے دریا پار کرنے کے لیے کشتی بھی انہوں نے ہی فراہم کی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔" بوری رام نے جواب دیا "یہ راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ کام دونوں طرف کے محافظوں کی ملی بھگت سے ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو کرپشن کا شکار نہ ہو۔ ہر جگہ سب کچھ ہورہا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے گہرا سانس لیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور پھر کرپشن ہی کے موضوع پر باتیں ہونے لگیں۔ بوری رام..... بظاہر ایک جاہل سیدھا سادہ کسان نظر آتا تھا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ وہ بہت سلجھا ہوا اور باخبر آدمی ہے۔ اسے سب سے زیادہ دکھ تو اس بات کا تھا کہ جن لوگوں کو کسی چیز کی حفاظت کی ذمے داری سونپی جاتی ہے وہی اسے نقصان پہنچاتے ہیں۔

باتیں کرتے کرتے وہ اچانک ہی خاموش ہوگیا۔ ایک مرتبہ ادھر اُدھر دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

"تین بجنے والے ہیں اور میں نے ابھی تک تم لوگوں کو کھانا نہیں کھلایا۔"

اس وقت واقعی ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ بوری رام نے وہی کھانا ہمارے سامنے چن دیا جو ہم صبح ناشتے میں کھا چکے تھے۔ کھانے کے بعد جانکی اور تھائی ایک تخت پر لیٹ گئیں اور کچھ ہی دیر بعد ان کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ دونوں رات بھر کی جاگی ہوئی تھیں اور مجھے حیرت تھی کہ اب تک کس طرح آنکھیں کھولے بیٹھی رہی تھیں۔ جلن میری آنکھوں میں بھی ہورہی تھی لیکن میں ابھی تک برداشت کررہا تھا۔

پانچ بجے کے قریب مائے پانگ چھکڑے پر واپس آگئی۔ ریکشہ ٹرالی کی طرح چھکڑا تھا جس میں موٹر کے پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس گاڑی کو کھینچنے کے لیے گھوڑے کے بجائے خچر سے کام لیا جارہا تھا۔

مائے پانگ اپنے ساتھ کچھ اور چیزیں بھی لے کر آئی تھی۔ جنہیں وہ کمرے میں سنبھال کر رکھنے لگی۔ اس کی آواز سن کر تھائی اور جانکی جاگ گئیں۔ مائے پانگ ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ میں باہر بوری رام کے ساتھ تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ مائے پانگ نے کمرے میں لیمپ روشن کردیا اور ہم سب کے لیے چائے بنانے لگی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہم یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ بوری رام نے ہمیں اس مکان کے بارے میں بتادیا تھا جہاں ہمیں یہ خچر گاڑی چھوڑنی تھی۔

اندھیرا گہرا ہورہا تھا۔ ہم روانگی کی تیاری کررہے تھے کہ فضا اچانک ہی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ سنگل شاٹ تھی۔ یہ آواز اس طرف سے آئی تھی جس طرف سے ہم دریا پار کرکے آئے تھے۔ ہم سب مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔

دو تین منٹ بعد ہمیں بہت دور ڈھلان پر دو سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آگئے۔ ان دونوں نے سفید لباس پہن رکھے تھے جس وجہ سے وہ ہمیں نظر آگئے تھے۔ اگر لباس تیرہ رنگ دار ہوتے تو اندھیرے میں دکھائی نہ دیتے۔

"اب تم لوگوں کا جانا مناسب نہیں ہے۔" بوری رام نے کہا "خچر گاڑی دیکھ کر انہیں شک ہوجائے گا کہ کوئی یہاں سے گیا ہے۔ میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی ہے۔ اس لیے تم لوگ اس وقت تک یہاں رک جاؤ جب تک وہ لوگ کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔"

"یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"تان منہ۔" تھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا "اس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر میں کبھی اسے چھوڑ کر گئی تو وہ دنیا کے آخری سرے تک میرا پیچھا کرے گا۔ ہوسکتا ہے اس نے پتا چلالیا ہو کہ میں تم لوگوں کے ساتھ بھاگی ہوں۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" میں نے تھائی کو گھورا "اسے کیا پتا کہ ہم سرحد پار کرکے کس طرف گئے ہوں گے۔"

"میں ایک سال اس کے ساتھ رہی ہوں اور اسے اچھی طرح جان چکی ہوں۔ وہ میری تلاش میں تھائی لینڈ کا چپا چپا چھان مارے گا۔" تھائی نے کہا۔

تھائی کی بات میں کچھ وزن تھا۔ عین ممکن ہے تان منہ ہی اس کی تلاش میں آیا ہو لیکن وہ گولی کیوں چلائی گئی تھی۔

"تم لوگ اوپر چھت پر چلے جاؤ۔" بوری رام نے کہا "ادھر پچھلی طرف اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ چھت پر چڑھنے میں آسانی رہے گی۔ میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔"

ہم فوراً ہی مکان کے پچھلی طرف آگئے۔ جہاں دیوار کے ساتھ اینٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے اور بوری رام نے پہلے تھائی اور جانکی کو اوپر چڑھنے میں مدد دی پھر میں بھی اوپر آگیا۔ بوری رام نے ڈھیر پر سے کچھ اینٹیں گرا دیں اور سامنے کی طرف چلا گیا۔

چھت کے کنارے پر تقریباً دو فٹ اونچی منڈیر تھی۔ ہم سینے کے بل لیٹ کر منڈیر کے دوسری طرف دیکھنے لگے۔

وہ دو ہی آدمی تھے جو کھیتوں میں چلتے ہوئے مکان کی طرف ہی آرہے تھے۔ انہیں مکان تک پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ بوری رام اس وقت کمرے سے باہر آگیا اور جب ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے اونچی آواز میں بوری رام سے کچھ پوچھا تو تھائی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ وہی ہے۔" اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں ذرا سا آگے جھک کر دیکھنے لگا۔

کمرے میں لیمپ جل رہا تھا اور کھلے ہوئے دروازے سے مدھم سی روشنی باہر بھی آرہی تھی اور اس مدھم سی روشنی میں دونوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ تھائی نے آواز سے ٹھیک پہچانا تھا۔ میں نے تان منہ کو صرف ایک

مرتبہ ہوئے سائی میں تھائی کے ساتھ دیکھا تھا اور اس وقت اسے پہچاننے میں مجھے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ بوری رام ان دونوں کے سامنے کھڑا تھا اور وہ تان منہ کے سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ کل رات اگر کسی نے دریا پار کیا تھا تو وہ کس طرف گیا۔ ویسے کل رات میں یہاں تھا بھی نہیں۔ تھانگ سانگ گیا ہوا تھا۔ آج صبح ہی واپس آیا ہوں۔"

"ایک آدمی دو عورتیں۔" تان منہ نے کہا "انہوں نے یہیں سے دریا پار کیا تھا۔ سب سے پہلے تمہارا ہی فارم ہاؤس آتا ہے۔ تم نے یقیناً انہیں دیکھا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ یہاں آئے بھی ہوں اور تم نے انہیں پناہ دی ہو۔ اس لیے بتا دو کہ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" بوری رام نے جواب دیا "میں نے کہا نا کہ کل رات میں یہاں نہیں تھا۔"

"تم یہ مت سمجھو کہ میں چوری چھپے سرحد پار کرکے آیا ہوں تو یہاں چھپ کر رہوں گا اگر وہ عورت مجھے نہ ملی تو میں اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ اس لیے مجھے بتا دو کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔ میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ تم زندگی بھر ان زمینوں پر ہل چلانے کے بعد بھی حاصل نہیں کرسکو گے۔"

"میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" بوری رام نے جواب دیا۔

"تورانا۔" تان منہ نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم مکان کی تلاشی لو۔ مجھے یقین ہے وہ یہاں ضرور ٹھہرے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ان کا کوئی سراغ مل جائے۔"

دوسرا آدمی تورانا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کے صرف ایک منٹ بعد کمرے سے مائے پانگ کی ہلکی سی چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تورانا اسے بازو سے پکڑے کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔

"یہ عورت اندر ایک کونے میں چھپی ہوئی تھی۔" تورانا نے تان منہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے یہ کچھ بتا سکے۔"

"کون ہے یہ؟" تان منہ نے بوری رام سے پوچھا۔

"میری بیوی ہے۔" بوری رام نے جواب دیا "یہ بھی میرے ساتھ گاؤں گئی ہوئی تھی۔ ہم آج صبح ہی آئے ہیں۔ یہ بھی کچھ نہیں جانتی۔"

"چارمنگ۔" تان منہ، مائے پانگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بہت حسین ہے۔ تم بھی اسے اس طرح پیار کرتے ہوگے جس طرح میں اس عورت کو پیار کرتا ہوں جو مجھے دھوکا دے کر بھاگ آئی ہے۔ تمہاری یہ خوب صورت بیوی بتائے گی کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے یا نہیں اور اگر آئے تھے تو کہاں گئے۔" اس نے سرگوشی میں تورانا سے کچھ کہا اور خود تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔

تورانا ان دونوں کو پستول کی زد پر لیے کھڑا تھا۔ میرے خیال میں اب کھیل شروع ہونے والا تھا۔ یہ لوگ ہمارے بارے میں پوچھنے کے لیے مائے پانگ کے ساتھ زیادتی کریں گے اور ظاہر ہے میں اپنے آپ کو اس معاملے سے الگ نہیں رکھ سکوں گا لیکن۔۔۔ ابھی میری مداخلت کا وقت نہیں آیا تھا۔

تان منہ تقریباً پانچ منٹ بعد کمرے سے برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ غصے میں لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زنانہ ہینڈ بیگ تھا جسے دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ تھائی کا ہینڈ بیگ تھا۔

"یہ ہینڈ بیگ۔" تان منہ بیگ بوری رام کے چہرے کے سامنے نچاتے ہوئے غرایا "اسی عورت کا ہے۔ تمہارے فارم ہاؤس میں اس بیگ کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے اور ممکن ہے اب بھی یہاں موجود ہوں اور ہمیں آتے دیکھ کر تم نے انہیں کہیں چھپا دیا ہو۔ بتاؤ وہ کہاں ہیں؟"

"یہ بیگ میری بیوی کا ہے۔ میں کسی اور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" بوری رام نے جواب دیا۔

تان منہ چند لمحے خوں خوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے بیگ بڑے زور سے بوری رام کے منہ پر مار دیا۔ بوری رام کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"تم زیادتی کر رہے ہو۔" وہ تان منہ کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا "ایک تو تم غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے آئے ہو اور اوپر سے ہمیں ہراساں کر رہے ہو۔ میں اتھارٹیز کو اطلاع کردوں گا۔"

"اتھارٹیز کو اطلاع تو تم اس وقت دوگے جب اپنے پیروں پر چلنے کے قابل رہو گے۔" تان منہ نے کہا "میں اب بھی تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ تمہارے کمرے میں اس بیگ کی موجودگی ثابت کرتی ہے کہ وہ لوگ یہاں آئے تھے۔ ہو سکتا ہے تم نے انہیں کہیں چھپا دیا ہو۔ ان کے بارے میں بتا دو تو میں تمہیں منہ مانگا انعام دوں گا۔ بصورت دیگر تمہاری یہ خوب صورت بیوی۔۔۔" اس نے خاموش ہو کر مائے پانگ کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "تم دونوں کی عمروں میں کم از کم تیس سال کا فرق لگتا ہے۔ تمہاری عمر بتا رہی ہے کہ تم اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہو اور اب تک شاید اس بے چاری کا کچھ نہیں بگاڑ سکے لیکن ہم اس کا جو حشر کریں گے وہ دیکھ کر تم۔۔۔"

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔" بوری رام چیخ اٹھا۔

"اگر تم ان لوگوں کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہاری بیوی کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔" تان منہ نے جواب دیا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔" بوری رام نے اس بار بھی چیخ کر جواب دیا۔

"لیکن یہ جانتی ہے اور ہمیں بتا بھی دے گی۔" تان منہ، مائے پانگ کی طرف متوجہ ہوگیا "کیا خیال ہے۔ تمہارے شوہر کو تو تمہاری عزت اور جان کا کچھ خیال نہیں۔ اگر تم اپنی عزت بچانا چاہتی ہو تو۔۔۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" مائے پانگ نے خوف زدہ ہونے کے باوجود ٹھوس لہجے میں جواب دیا "یہ بیگ میرا ہے اور یہاں کوئی اور نہیں آیا۔"

"تورانا۔ یہ پستول مجھے دو اور اسے بتاؤ کہ اس جیسی کمینہ کی زبان ہم کس طرح کھلواتے ہیں۔"

تورانا نے پستول تان منہ کے حوالے کردیا اور اچانک مائے پانگ پر جھپٹ پڑا۔ مائے پانگ چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسی کھینچا تانی میں اس کی قمیص چاک ہوگئی۔ وہ جدوجہد کرتی رہی۔ قمیص اس کے جسم سے الگ ہو کر تورانا کے ہاتھ میں آگئی۔ تورانا نے قمیص پھینک دی اور لپک کر مائے پانگ کو دبوچ لیا۔

اس موقع پر بوری رام نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر تان منہ نے اس کے پیروں کے قریب گولی چلا دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھیڑیے کی طرح غرایا۔

"اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ اگر حرکت کی تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی اڑا دے گی۔ ویسے تمہارے پاس اب بھی موقع ہے۔ اپنی بیوی کی عزت بچا سکتے ہو۔"

میرا خیال تھا کہ بوری رام اب زبان کھول دے گا لیکن مجھے اپنے اس خیال پر شرمندہ ہونا پڑا۔ بوری رام قبائلی تھا۔ یہ قبائلی مہمان نوازی کی روایات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہم اگرچہ ان کی عدم موجودگی میں تالا توڑ کر ان کے گھر میں گھسے تھے مگر بعد میں اس نے بہرحال ہمیں اپنا مہمان تسلیم کرلیا تھا اور یہ لوگ مہمان کی عزت و سلامتی کے لیے اپنی عزت اور جان تک قربان کردیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ قومی سلامتی کا معاملہ بھی تھا۔ صبح کی باتوں سے اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ ہم لوگ بھی اس وطن کی سلامتی کے لیے اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے اس لیے ان دونوں میاں بیوی نے ہمارے بارے میں اپنی زبانیں بند رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن اب میں بھی خاموش نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔

"ہاں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ لوگ یہاں آئے تھے۔" بوری رام نے چیختے ہوئے کہا "لیکن تمہیں نہیں بتاؤں گا کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ ہم نے انہیں چھپا رکھا ہے لیکن تم ہماری زبان نہیں کھلوا سکو گے اور تم بھی یہاں سے بچ کر نہیں جاسکو گے۔"

میں نے مڑ کر تھائی اور جانگی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور منڈیر پر چڑھ کر چھلانگ لگانے کے لیے پر تول رہا تھا کہ بوری رام نے پستول کی پروا کیے بغیر تورانا کی طرف چھلانگ لگادی جس نے مائے پانگ کو دبوچ رکھا تھا۔ اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ تان منہ کی چلائی ہوئی گولی بوری رام کی ٹانگ پر لگی اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ تان منہ نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر رسید کردی۔

"اب تم زبان کھولو گے۔" وہ غرایا "تورانا۔ چیر ڈالو اس عورت کو۔ اسے بتا دو کہ ہم کسی کی زبان کس طرح کھلواتے ہیں۔"

میں نے منڈیر پر سے چھلانگ لگادی۔ کمرے کی چھت تقریباً بارہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے اوپر دو فٹ کی منڈیر تھی۔ میں تقریباً چودہ فٹ کی بلندی سے تان منہ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر گرا۔ اگر تان منہ عین وقت پر اپنی جگہ سے نہ ہٹ جاتا تو میں اس کے اوپر ہی گرتا۔

اپنے عقب میں دھب کی زوردار آواز سن کر تان منہ اچھل کر میری طرف گھوم گیا لیکن میں نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع دیے بغیر پیر کی زوردار ٹھوکر اس کے پستول والے ہاتھ پر رسید کردی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

تان منہ اس اچانک افتاد سے بدحواس ہوگیا۔ میں نے اس کی بدحواسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہتھیلی پھیلا کر اس کے چہرے پر وار کیا۔ یہ ضرب گھونسے سے بھی زیادہ

شدید ثابت ہوئی۔ وہ بلبلاتا ہوا دوہرا ہوگیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں نے ایک زوردار کک بھی لگادی۔ وہ ایک بار پھر چیختا ہوا بائیں طرف الٹ گیا۔

تورانا نے اب بھی مائے پانگ کو دبوچ رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف چھلانگ لگادی۔ میری ٹکر سے وہ مائے پانگ کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر ڈھیر ہوگیا۔

تان منہ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ لڑائی بھڑائی کا آدمی نہیں تھا اور اس میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا لیکن تورانا دراز قامت اور ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اس کی عمر بھی تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس سے مجھے مقابلے کی توقع تھی۔

تورانا نیچے گرتے ہی سنبھل گیا تھا۔ اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی مگر میں نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ میری زوردار سائڈ کک اس کے کولہے پر لگی۔ وہ... لڑکھڑایا مگر سنبھل گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر مجھ پر حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک اور حربہ استعمال کیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے مائے پانگ کی طرف چھلانگ لگادی اور اسے گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مائے پانگ کو گرفت میں لے کر مجھے مزید کارروائی سے روکنے کی کوشش کرے گا لیکن مائے پانگ کی مزاحمت کی وجہ سے وہ اپنی اس کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ مزید برآں میں نے بھی اس پر چھلانگ لگادی تھی۔

میں تورانا کو رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔ مائے پانگ اپنے آپ کو چھڑا کر الگ ہوگئی تھی۔ بوری رام زخمی ہونے کے باوجود تان منہ سے لپٹ گیا تھا۔ تان منہ دولت سے کھیلنے والا آدمی تھا۔ عیاشیوں نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ لڑائی بھڑائی سے تو وہ بالکل واقف نہیں تھا۔ اس کے برعکس بوری رام کی عمر بھی اگرچہ پچاس سے اوپر تھی مگر وہ کسان تھا۔ دھرتی کا سینہ چیرنے والا۔ اس میں اب بھی بہت دم خم تھا۔ وہ تان منہ کو بری طرح رگید رہا تھا اور تان منہ کے منہ سے گندی گالیاں نکل رہی تھیں۔ دوسری طرف بوری رام کے کتے نے بھی بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کتے اور تان منہ میں زوردار قسم کی گالیوں کا تبادلہ ہو رہا ہو۔

میں تورانا کو رگید رہا تھا۔ ایک موقع پر تورانا کا داؤ چل گیا۔ وہ میرے سینے پر سوار ہوگیا۔ اس نے میرے گلے کو گرفت میں لے لیا تھا اور دونوں انگوٹھے میرے نرخرے پر دباؤ ڈال رہے تھے۔

اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے مائے پانگ کی طرف دیکھا۔ اس نے لیک کر وہ پستول اٹھالیا جو شروع میں تان منہ کے ہاتھ سے نکل کر دروازے کے قریب جا گرا تھا۔

تھائی اور جانکی چھت پر کھڑی چیخ رہی تھیں۔ وہ شاید نیچے نہیں اتر پا رہی تھیں کیونکہ ہمارے چھت پر چڑھنے کے بعد بوری رام نے دیوار کے قریب ڈھیر بہت سی اینٹیں ہٹادی تھیں مگر مجھے تورانا کی گرفت میں دیکھ کر ان دونوں نے بیک وقت چھت سے چھلانگ لگادی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے جانکی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔

مائے پانگ پستول اٹھا کر ہماری طرف لپکی۔ اس نے پستول کے دستے کی زوردار ضرب تورانا کے سر پر لگائی۔ تورانا کراہتا ہوا ایک طرف الٹ گیا۔ اس کی گرفت سے نجات ملتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اس سے پہلے کہ میں تورانا کی طرف بڑھتا، مائے پانگ پستول سیدھا کرکے پے در پے ٹریگر دباتی چلی گئی۔ تورانا کی صرف ایک چیخ سنائی دی تھی۔ گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوتی رہیں اور وہ مرغِ بسمل کی طرح زمین پر لوٹتا رہا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر مائے پانگ کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ اس کے چہرے پر جنون کی سی کیفیت تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے پستول لے لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھپانے لگا اور پھر اچانک ہی وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔

تھائی دوڑ کر میرے قریب آگئی۔ میں نے مائے پانگ کو اس کے حوالے کیا اور دوڑ کر بوری رام اور تان منہ کے قریب پہنچ گیا۔ بوری رام اگرچہ تان منہ کو چھوڑ کر الگ ہوگیا تھا مگر تان منہ پشت کے بل بے حس و حرکت اپنی جگہ پر پڑا تھا۔

جانکی اسی جگہ پڑی کراہ رہی تھی جس جگہ وہ چھت سے گری تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بایاں پیر پکڑ رکھا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ یک بارگی چیخ اٹھی۔ اس کے ٹخنے میں موچ آگئی تھی اور وہ اس پر دباؤ نہیں ڈال سکتی تھی۔ میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور کمرے میں لے جاکر تخت پر بٹھادیا۔ تھائی، مائے پانگ کو اپنے ساتھ لپٹائے کھڑی تھی۔ جانکی نے مائے پانگ کو پکڑ کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھالیا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو تھائی بھی میرے پیچھے ہی چلی آئی۔ بوری رام نے ایک بار پھر تان منہ کو دبوچ رکھا تھا۔

تھائی نے آگے بڑھ کر بوری رام کو کھینچ کر الگ کردیا اور تان منہ پر پستول تان لیا۔

"اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "اپنے ساتھی کا انجام دیکھ چکے ہو۔ اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تمہارا انجام اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔"

اس کی حالت دیکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی گڑبڑ کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اپنے آدمی کا انجام دیکھ کر اس کی ساری طراری ختم ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"تھائی وانگ۔" وہ تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی "میں نے تمہارے ساتھ بھلائی کی اور تم نے مجھے اس طرح دھوکا دیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ تم۔"

"تم نے میری زندگی بچائی تھی۔ میں اس کے لیے تمہاری احسان مند ہوں لیکن کسی پر احسان کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے بدلے کی توقع رکھی جائے۔ مجھے زندہ پاکر تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ یہ بہرحال تمہاری مہربانی ہے کہ تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "یہ محض اتفاق تھا کہ میرے یہ دوست ہوئے سائی میں نظر آگئے تھے۔ میں اگر تمہیں ان سے متعارف کروا دیتی تو تم یقیناً انہیں پکڑوا دیتے یا ختم کروا دیتے۔ اس لیے میں نے تمہارے سامنے انہیں پہچاننے ہی سے انکار کردیا تھا لیکن میں نے خفیہ طور پر یہ معلوم کرلیا تھا کہ یہ لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور پھر میں اسی رات ان کے پاس پہنچ گئی۔ یہ لوگ رات ہی کو وہاں سے روانگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں ان کے ساتھ آگئی۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ اس نے زمین پر بیٹھے ہوئے بوری رام کی طرف دیکھا پھر دوبارہ تان منہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم نے ان بے گناہوں پر زیادتی کرکے نہایت ذلالت کا ثبوت دیا ہے۔ تورانا کو تو اس کے کیے کی سزا مل گئی۔ تمہارے لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ تمہیں لے جاکر پولیس کے حوالے کردیا جائے۔ تم اپنے ملک میں ضرور معزز ہوگے مگر یہاں تمہارے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ تم اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی کوشش کررہے تھے۔ اب تم خود ہمارے رحم و کرم پر ہو۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی اور چند لمحوں بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "میں احسان فراموش نہیں ہوں تم نے میری زندگی بچائی تھی۔ تمہارا یہ احسان میں زندگی کے آخری لمحوں تک یاد رکھوں گی اور اس وقت میں اپنے کندھوں پر تمہارے احسان کا کچھ بوجھ اس طرح ہلکا کرسکتی ہوں کہ تمہیں یہاں سے زندہ سلامت نکل جانے کا موقع دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ جس کشتی پر آئے تھے، دریا کے ساحل پر کسی جگہ چھپا رکھی ہوگی۔ اب تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنی جان بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ہم تمہیں صرف دو گھنٹوں کا وقت دے سکتے ہیں۔ دو گھنٹے گزرنے کے بعد سرحد کے اِس طرف دکھائی دیے تو وہ تمہاری زندگی کا آخری وقت ہوگا۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

"تھائی۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔" تھائی نے اسے کچھ کہنے سے روک دیا "تم مجھ سے شادی کے لیے میرا فیصلہ سننا چاہتے تھے۔ میں نے اپنا فیصلہ سنادیا ہے۔ اب تم بھاگ لو یہاں سے۔"

اس موقع پر بوری رام نے مداخلت کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک دیا۔ اس کے خیال میں تان منہ کو اس طرح چھوڑنے کے بجائے پولیس کے حوالے کردینا چاہیے تھا لیکن میں نے اسے خاموش کرادیا۔

تان منہ کچھ دیر کھڑا تھائی کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ سرد مہری تھی اور پھر وہ مڑ کر کھیتوں میں پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ کتے نے بھونکتے ہوئے اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کی مگر بوری رام نے اسے ڈانٹ کر دوسری طرف بھگا دیا۔

ہم دیر تک وہیں کھڑے تان منہ کو کھیتوں میں جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور جب وہ دور پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تو ہم بھی کمرے میں آگئے۔ میں جھک کر بوری رام کی ٹانگ کو دیکھنے لگا۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چھیلتی ہوئی چلی گئی تھی۔ بہت معمولی سا خون رس رہا تھا۔ میں نے چادر کی ایک پٹی پھاڑ کر اس کے زخم پر باندھ دی اور جانکی کا پیر دیکھنے لگا۔ ٹخنے کے آس پاس سوجن بڑھ رہی تھی۔ چھت سے چھلانگ لگاتے ہوئے زمین پر اس کا پیر سیدھا نہیں پڑا تھا جس سے ٹخنا مڑ گیا تھا۔ مائے پانگ اس کے ساتھ لپٹی بیٹھی تھی۔ خود تکلیف میں ہونے کے باوجود جانکی نے ایک ہاتھ سے اسے اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔ مائے کی شرٹ تو پھٹ گئی تھی۔ مائے پانگ کا جسم اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ جنون کی کیفیت میں اس کے ہاتھوں ایک قتل ہوگیا تھا اور یہ غالباً اسی خوف کا نتیجہ تھا۔

میں جانکی کے پیر کو ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ مارشل آرٹ کی تربیت کے دوران میں میرے ساتھ بھی اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میرے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا تھا اور میں نے یہ بھی سیکھ لیا تھا کہ اکھڑے ہوئے جوڑ کس طرح بٹھائے جاتے ہیں۔

ٹخنے کے آس پاس ہلکا سا دباؤ ڈالنے سے جانکی کراہنے لگی۔ میں اس کے کراہنے کی پروا کیے بغیر ٹخنے کے آس پاس پیر کو ٹٹولتا رہا اور پھر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ کڑک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی جانکی کے منہ سے چیخ نکل گئی مگر میں نے اس کا پیر نہیں چھوڑا۔ بوری رام بھی شاید ایسی چیزوں سے واقف تھا۔ وہ لپک کر کچن سے سرسوں کے تیل کی بوتل اٹھالایا اور خود ہی جانکی کے پیر پر مالش کرنے لگا۔ جانکی کراہتے ہوئے مچل رہی تھی مگر میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ بوری رام نے چادر کا ایک لمبا ٹکڑا پھاڑ کر جانکی کے پیر پر پٹی باندھ دی۔

تھائی اور مائے پانگ سامنے والے تخت پر بیٹھ گئی تھیں۔ تھائی نے اسے اپنی آغوش میں اوندھا لٹا رکھا تھا اور آہستہ آہستہ اس کا کندھا تھپتھپا رہی تھی۔

"تم نے اسے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔" بوری رام تھائی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسے تو باندھ کر پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے تھا۔"

"یہ درست ہے کہ وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا تھا۔ ہم اسے قانون کے حوالے کر دیتے تو اسے سزا بھی ہو سکتی تھی مگر تم نے شاید تصویر کے دوسرے رخ پر غور نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"دوسرا رخ..... کیا مطلب!" بوری رام نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تصویر کا دوسرا رخ اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔" میں نے کہا "تمہاری بیوی کے ہاتھوں ایک قتل ہو چکا ہے۔ اگر ہم تان منہ کو لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیتے تو وہ اپنے آدمی کی ہلاکت کا رونا روتا اور اس طرح مائے پانگ بھی قانون کی گرفت میں آجاتی اور تم بھی اس چکر میں پھنس جاتے۔"

"لیکن وہ قانون کا مجرم تھا۔ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا تھا۔" بوری رام نے کہا۔

"بلاشبہ وہ مجرم تھا مگر سزا دینے کا حق صرف عدالت کو ہے۔ کسی اور کو قانون ہاتھ میں لینے اور اپنے طور پر فیصلے کرنے کی اجازت نہیں۔" میں نے کہا۔

بات بوری رام کی سمجھ میں آگئی۔

"اس نے مائے پانگ کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی توہین کی تھی۔ مائے نے اسے سزا دے دی۔ اگرچہ اس نے یہ قدم نہایت اشتعال میں اٹھایا تھا۔ اس صورت میں اس کے ساتھ کچھ قانونی رعایت ہو سکتی ہے لیکن سزا سے بہرحال وہ پھر بھی نہ بچ سکتی اور تم جانتے ہو جب کوئی قانون کے چکر میں پھنستا ہے تو اسے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ تم دونوں کو ان مصائب سے بچانے کے لیے ہی ہم نے تان منہ کو جانے دیا تھا۔"

"اگر وہ واپس جانے کے بجائے اپنے آدمی کے قتل کی اطلاع دینے کے لیے پولیس کے پاس چلا گیا تو؟" بوری رام نے کہا۔

"وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔" مجھ سے پہلے تھائی بول پڑی "وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے آیا ہے۔ اپنے ملک میں وہ کتنا ہی بارسوخ سہی' یہاں اس کی حیثیت ایک مجرم کی ہوگی۔ پولیس قتل کے بارے میں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر دے گی۔ نہیں بوری رام' وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اس نے تو اپنی جان بچ جانے پر شکر ادا کیا ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ وہ کہیں رکے بغیر چلتا ہوا اب تک دریا پر پہنچ چکا ہوگا۔"

"باہر جو لاش پڑی ہے اس کا کیا کرنا ہے؟" جانکی نے ہماری باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ وہ اب اپنے آپ کو قدرے پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔

"ظاہر ہے اسے اس طرح نہیں چھوڑا جا سکتا۔" میں نے کہا "اسے مکان سے کہیں دور لے جا کر دفن کرنا ہوگا تاکہ بعد میں بھی اس کا سراغ نہ لگایا جا سکے۔"

تھوڑی دیر بعد میں اور بوری رام باہر آگئے۔ بوری رام دو پھاوڑے بھی لے آیا تھا۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ مکان کے پیچھے کافی دور جا کر ایک مناسب جگہ پر ہم گڑھا کھودنے لگے۔ زمین نرم تھی اس لیے پانچ چھ فٹ گہرا گڑھا کھودنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گڑھا کھودنے کے بعد میں لاش کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لے آیا۔

تورانا کی لاش دفن کرنے کے بعد ہم نے واپس آکر اس جگہ کی مٹی کھود کر برابر کر دی جہاں تورانا قتل ہوا تھا اور اس کا خون پھیلا ہوا تھا۔

منہ ہاتھ دھونے کے لیے ہمیں ایک بار پھر مکان کے پیچھے ندی پر جانا پڑا تھا۔

ہم واپس آئے تو تھائی اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور

...ی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ اس وقت ہم سب ...ی چائے کی طلب محسوس کر رہے تھے۔ چائے پینے کے ...ن میں ہم پروگرام بھی بناتے رہے۔ اب بوری رام اور ...نگ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھے۔ مائے پانگ ...ح خوف زدہ تھی۔ اس نے تو کہہ دیا تھا کہ اب وہ کبھی ...ہ یہاں واپس نہیں آئے گی۔ بوری رام کو زخم کے ...ی ضرورت تھی اور ظاہر ہے یہاں وہ اپنا علاج نہیں ...کتا تھا۔

چائے پینے کے بعد میں اور بوری رام باہر آگئے۔ خچر ...ی تیار کرنے میں' میں بھی اس کی مدد کرنے لگا اور پھر ...گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے' وہ بھی گاڑی میں ڈال دیں ...۔ تھائی اور مائے تو خود ہی گاڑی پر سوار ہو گئیں البتہ ...ی کو مجھے گود میں اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ مائے نے عقل مندی یہ ...ی کہ دوبارہ جب وہ تھانگ سانگ گئی تھی تو واپسی پر ایک ...بھی لے آئی تھی اور اس وقت دروازے پر وہی تالا لگایا ...تھا۔

میں بوری رام کے ساتھ اگلے حصے پر بیٹھ گیا تھا۔ لگام ...ی رام کے ہاتھ میں تھی۔ سردی کی وجہ سے اب اس کے ...ں میں ہلکی ہلکی تکلیف بھی شروع ہو گئی تھی۔

تاریکی میں کھیتوں میں چھ میل کا یہ فاصلہ تقریباً ایک ...ٹے میں طے ہوا۔ خچر بہت ہی سست رفتار تھا۔ ویسے بھی ...چڑے کی وجہ سے گاڑی بار بار راستے سے اتر کر کیچڑ میں ...س جاتی تھی جسے نکالنے کے لیے مجھے ہی نیچے اتر کر زور ...ا پڑتا تھا۔

تھانگ سانگ خاصا بڑا قصبہ تھا۔ اس وقت رات کے ...ج چکے تھے لیکن قصبے میں ابھی رونق تھی۔ بوری رام ...و قصبے کے بیرونی علاقے میں مختلف کشادہ سڑکوں پر ...ا ہوا..... ایک مکان کے بہت بڑے پھاٹک کے سامنے ...یا۔ اس نے نیچے اتر کر آہنی چادر والے گیٹ کو زور ...سے کھٹ کھٹایا اور دوبارہ گاڑی پر بیٹھ گیا۔

...چند منٹ بعد گیٹ کھل گیا۔ بوری رام گاڑی کو اندر ...یا۔ گیٹ کے اندر بہت وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ ...رے تھے جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ بوری رام نے ...ی ایک طرف روک لی۔ اس دوران میں گیٹ کھولنے ...ی وہاں پہنچ گیا۔ وہ روشنی میں آیا تو پتا چلا کہ وہ ایک ...عورت تھی۔ مائے پانگ گاڑی رکتے ہی چھلانگ لگا کر ...ئی اور اس عورت سے لپٹ گئی۔ وہ عورت مائے کی

یہ بات راستے ہی میں طے ہو گئی تھی کہ بوری رام کے گھر والوں یا کسی اور کو اصلی بات نہیں بتائی جائے گی۔ البتہ یہ بتایا جائے گا کہ فارم پر کام کے دوران میں بوری رام کو چوٹ لگ گئی تھی جس وجہ سے ان دونوں کو واپس آنا پڑا اور ہم چیانگ کھون سے چیانگ سائین کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ بھٹک کر ان کے فارم ہاؤس کی طرف نکل گئے اور یہ ...وں ہمیں ساتھ لے آئے۔

بوری رام کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہیں تھا۔ مائے پانگ کی ماں اور اس کی بڑی بہن اس مکان میں رہتی تھیں۔ بوری رام نے گاڑی پر بیٹھے بیٹھے اپنی ساس کو ایک من گھڑت کہانی سنا دی۔ میں نے نیچے اتر کر اسے گاڑی سے اترنے میں مدد دی۔ بوری رام نے اپنی ساس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میری ایک ساتھی کے پیر پر بھی چوٹ لگی ہوئی ہے اور وہ چل نہیں سکتی۔

بوری کی ساس نے کمروں کے سامنے کھڑی ہوئی اپنی دوسری بیٹی سے اونچی آواز میں کچھ کہا اور پھر مجھے بتایا کہ میں جانکی کو وہاں لے جاؤں۔ میں نے جانکی کو گود میں اٹھا لیا۔ مائے پانگ اپنے شوہر کو سہارا دے کر چلنے لگی۔ تھائی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بوری رام کی ساس خچر کو گاڑی سے کھولنے لگی تھی۔

میں جانکی کو لے کر اس کمرے میں داخل ہو گیا جس کے دروازے پر کھڑی ہوئی مائے پانگ کی بہن نے اشارہ کیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھی۔ میں نے جانکی کو بیڈ پر بٹھا دیا اور مائے کی بہن کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا لیکن یہ یاد نہیں آرہا تھا کہ کب اور کہاں دیکھا تھا۔ چند سیکنڈ بعد جیسے ہی تھائی کمرے میں داخل ہوئی مائے کی بہن اسے دیکھ کر اچھل پڑی۔ تھائی بھی اسے دیکھ کر چونک گئی۔

"ارے انزاک تم۔" تھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا اور انزاک بھی "ارے تھائی" کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ دریائی سرحد پار کرنے کے بعد ہم پناہ لینے کے لیے بوری رام کے فارم ہاؤس میں رکے تھے۔ ان دونوں میاں بیوی نے ہمارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا بلکہ ہماری وجہ سے اپنی جانیں بھی خطرے میں ڈال دی تھیں اور یہاں بوری رام کی سالی انزاک' تھائی کی شناسا نکلی تھی اور پھر یہ انکشاف بھی میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا کہ جس زمانے میں تھائی بنکاک میں مساج پارلر چلایا کرتی تھی' انزاک بھی اس کے پاس کام کرتی تھی۔ انزاک اس

کے ایک مساج پارلر برانچ کی انچارج تھی اور پھر مجھے بھی یاد آگیا کہ میں نے انزاک کو کہاں دیکھا تھا۔ دراصل میں نے انزاک کو نہیں بلکہ تھائی کے بنگلے میں موجود ایک البم میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ تصویر نہایت مختصر لباس میں تھی اور اب میں اس کے بارے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔

میری وجہ سے جب تھائی پر دارا اور ٹائیگر کا قہر نازل ہونا شروع ہوا تو اس کا سارا بزنس چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنا وہ مساج پارلر انزاک کو دینے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ اسے نہیں چلا پائی تھی اور چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

مائے پانگ اور بوری رام بھی اس کمرے میں آگئے اور جب انزاک نے انہیں تھائی کے بارے میں بتایا تو بوری رام کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی تھی۔ انزاک کی باتوں نے اس کہانی کی تصدیق کردی تھی جو ہم اپنے بارے میں پہلے ہی بوری رام کو سنا چکے تھے۔

مائے پانگ کی ماں کمرے میں آکر دیر تک بوری رام سے سوال جواب کرتی رہی۔ بوری رام نے اسے بتایا کہ کام کرتے ہوئے لوہے کا نوک دار سریا اس کی ٹانگ کے گوشت کو چیرتا ہوا چلا گیا تھا۔

"انزاک۔" ماں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم ان لوگوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرو میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔ اس کے زخم کی ڈریسنگ بہت ضروری ہے۔ انفیکشن ہوگیا تو زخم بگڑ جائے گا اور مائے تم بھی بوری کو دوسرے کمرے میں لے چلو۔"

مائے پانگ کی ماں چلی گئی۔ مائے بھی بوری رام کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور انزاک بھی کھانے کا بندوبست کرنے کے لیے کمرے سے نکل گئی۔

ہمیں بوری رام اور مائے پانگ کی وجہ سے کچھ حوصلہ تو تھا ہی' انزاک کی وجہ سے مزید اطمینان ہوگیا۔

جانکی کی وجہ سے ہمیں تقریباً ایک ہفتہ وہاں رہنا پڑا۔ اس دوران میں ایک مخصوص تیل سے جانکی کے پیر کی مالش ہوتی رہی جس سے اسے کافی فائدہ ہوا اور وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

اس ایک ہفتے کے دوران میں ہم میں بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ انزاک' تھائی کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ تھائی سے پیش آمدہ حالات کے بارے میں پوچھتی رہتی۔ ہماری باتوں میں اکثر سردار تھالوب کا بھی ذکر آتا۔ انزاک اکثر چیانگ سائین جاتی رہتی تھی۔ اس نے بتایا کہ تین چار مہینے پہلے سردار تھالوب کے تباہ شدہ مکان کی جگہ نیا مکان تعمیر ہو چکا ہے۔

مزید دو دن گزارنے کے بعد بالآخر ہم نے چیانگ سائین جانے کا فیصلہ کرلیا۔ انزاک بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔

انزاک' مائے پانگ سے تین سال بڑی تھی۔ اس کے دوسرے بہن بھائی الگ مکان میں رہتے تھے۔

اس روز ہم بوری رام اور مائے پانگ سے رخصت ہو کر شام کی آخری بس سے چیانگ سائین کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس وقت دن کی روشنی تھی لیکن پہاڑیوں میں راستہ نہایت دشوار گزار ہونے کی وجہ سے بس کی رفتار بہت کم تھی۔ بارہ میل کا فاصلہ تقریباً ایک گھنٹے میں طے ہوا۔

چیانگ سائین پہنچے تو آٹھ بج رہے تھے۔ میں ایک سال بعد اس شہر میں آیا تھا۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ جس جگہ ہم بس سے اترے تھے وہاں سے سردار تھالوب کے بنگلے کا فاصلہ تقریباً ایک میل کے لگ بھگ تھا اور ہم نے یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک سال پہلے جب ہم یہاں تھے تو صورت حال مختلف تھی۔ اس وقت ہمارے چاروں طرف دشمن پھیلے ہوئے تھے۔ ہمیں قدم قدم پر محتاط رہنا پڑتا تھا لیکن آج صورت حال مختلف تھی۔ اس وقت ہم آزادی سے ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس شہر میں اب بھی میرے بہت سے دشمن موجود تھے اور بوری رام نے مجھے خبردار بھی کردیا تھا۔

ہم چاروں باتیں کرتے' ٹہلتے ہوئے چل رہے تھے کہ سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار ٹرو جیپ ہمارے قریب سے گزر گئی لیکن بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سن کر ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تقریباً پچاس گز دور وہ جیپ رک گئی اور پھر وہ یوٹرن لے کر واپس آنے لگی۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں نے تھائی وغیرہ کو کسی ممکنہ خطرے سے آگاہ کردیا اور جیب سے وہ پستول نکال لیا جو چند روز پہلے تک تان منہ کی ملکیت تھا۔ اس کے چیمبر میں دو یا زیادہ سے زیادہ تین گولیاں ہوں گی مگر ہنگامی صورت حال میں یہ بھی کار آمد ثابت ہو سکتی تھیں۔

پیچھے سے آنے والی جیپ ہمارے قریب سے بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سے ہم سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ ہم رک گئے۔ میں کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کرنے کے لیے تیار تھا۔

جیپ کا ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت آدمی اتر کر ہماری طرف لپکا۔ قریب ہی ایک نائٹ کلب کی پیشانی پر رنگ برنگا نیون سائن جگمگا رہا تھا۔ ویسے بھی اس جگہ کافی روشنی تھی۔ اس دراز قامت شخص کو جیپ سے اتر کر اپنی طرف لپکتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ سردار تھالوب تھا!

سردار تھالوب کی گرم جوشی قابلِ دید تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح ملا تھا جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا سگا بھائی مل گیا ہو۔ وہ بار بار میرا منہ چوم رہا تھا۔ گلے لگا کر بھینچ رہا تھا۔ تھائی اور جانکی سے بھی وہ اسی گرم جوشی سے ملا تھا البتہ انزاک سے اس نے ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ہم کچھ دیر تک وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے پھر سردار تھالوب کے ساتھ اس کی ٹرو جیپ میں بیٹھ گئے۔ یہ جیروکی کی جیپ بہت شان دار تھی۔ تھائی وغیرہ پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئی تھیں اور میں آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سردار تھالوب اس وقت کسی کام سے مائے سین کی طرف جا رہا تھا لیکن ہم سے ملاقات کے بعد اس نے ارادہ بدل دیا اور جیپ کا رخ اپنے بنگلے کی طرف موڑ دیا۔

پہلے یہاں قدیم طرز کی عمارت ہوا کرتی تھی جو جنرل پورات کے آدمیوں نے راکٹوں سے تباہ کردی تھی۔ اس جگہ اب بڑی شان دار جدید طرز کی عمارت نظر آرہی تھی۔

جیپ جیسے ہی گیٹ میں داخل ہوئی' مجھے لوما نظر آگیا۔ اس کے ساتھ دو قبائلی اور بھی تھے۔ وہ تینوں عمارت کے برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے لیکن جیپ کو گیٹ میں داخل ہوتے دیکھ کر اٹھ گئے تھے۔ مجھے اور تھائی کو جیپ سے اترتے دیکھ کر لوما پہلے تو حیرت سے ہمیں گھورتا رہا پھر چونکا اور پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس نے بھی سردار تھالوب ہی کی طرح گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"دیکھو لوب کو تم سے کتنی محبت ہے۔" سردار تھالوب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم لوگوں کے لیے سب متفکر تھے۔ اب دیکھو لوما کا چہرہ کیسے کھل اٹھا ہے۔"

"ہمارے دلوں سے بھی کسی کی محبت کم نہیں ہوئی۔" میرے بجائے تھائی نے جواب دیا "ہم بھی ہر ہر لمحہ تم سب کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ بلکہ میں نے تو مرنے سے پہلے بھی تم سب لوگوں کو یاد کیا تھا۔"

"مرنے سے پہلے کیا مطلب؟" سردار تھالوب نے اسے گھورا "تم کہنا چاہتی ہو کہ تم مرچکی ہو اور اس وقت ہمارے سامنے تمہاری روح کھڑی ہے۔"

"یہی سمجھ لو تھالوب۔" میں نے کہا "یہ تھائی کا دوسرا جنم ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" سردار تھالوب کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی۔

"لمبا قصہ ہے۔ اطمینان سے بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا۔ چلو۔ اندر تو چلو۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ تم لوگوں کو باہر ہی روکے ہوئے ہوں اور لوما۔" وہ لوما کی طرف گھوم گیا "تمہارے مہمان آئے ہیں۔ ان کی کوئی خاطر نہیں کرو گے۔"

"کیوں نہیں سردار۔" لوما بولا "پہلے میں انہیں کافی پلاؤں گا اور پھر ان کے لیے تھائی سوپ اور کھانا تیار کردوں گا۔"

ہم سردار تھالوب کے ساتھ اندر آگئے اور پہلے گھوم پھر کر مکان دیکھنے لگے۔ مکان پہلے سے بڑے رقبے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ کمروں کی تعداد بھی زیادہ تھی اور وہ پہلے سے زیادہ کشادہ بھی تھا۔ اوپر جانے کے لیے گول زینہ تھا۔ اوپر کی منزل پر بھی پانچ کمرے تھے۔ ہم گھوم پھر کر نیچے نشست گاہ میں آگئے۔ تمام کمرے بہت شاندار تھے' فرنیچر سے آراستہ تھے۔

"بہت شان دار۔" جانکی نے کہتے ہوئے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا "لیکن ایک چیز کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔"

"تم جس چیز کی کمی محسوس کر رہی ہو' وہ اس وقت چیانگ رائے میں ہے۔" سردار تھالوب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

تھالوب کے اس جواب پر جانکی نے بڑا جان دار قسم کا قہقہہ لگایا تھا۔ پہلے تو میں مطلب نہیں سمجھ سکا پھر بات سمجھ میں آگئی۔ جانکی نے رنگولی کی کمی کا ذکر کیا تھا۔

"رنگولی چیانگ رائے میں کیا کر رہی ہے؟ اسے تو یہاں ہونا چاہیے تھا۔" میں نے تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسے رقص سے عشق ہے۔" تھالوب نے جواب دیا "یہاں اس چھوٹے سے شہر میں اسے موقع نہیں ملتا۔ یہاں اس کے فن کی داد دینے والا بھی کوئی نہیں۔ فنکاروں کو داد کی طلب ہوتی ہے اور داد وہیں ملتی ہے جہاں قدر داں ہوں اور قدر داں چیانگ رائے اور بنکاک جیسے بڑے شہروں ہی میں ہوتے ہیں۔ میں اس کے شوق میں مزاحم نہیں ہونا چاہتا اس

لیے۔۔۔"

"اسے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔" جانگی نے اس کا جملہ مکمل کردیا۔

"چھوٹ۔" تھالوب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "میں اس پر پابندی لگانے والا کون ہوتا ہوں؟"

"میرا خیال ہے کہ تم دونوں کے بیچ میں جو حجاب ہے اسے اب ختم ہو جانا چاہیے۔" جانگی نے سردار تھالوب کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"حجاب!" تھالوب کے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

اسی وقت لوما کافی لے کر آگیا۔ دور سے میں نے اس کی گنگناہٹ کی آواز سنی تھی لیکن قریب آکر اس نے گنگنانا بند کردیا۔

کافی آنے کے بعد گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ تھائی نے انزاک کا تعارف کرایا جو اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی بوری رام اور مائے پانگ کا ذکر بھی آیا اور ان کے ساتھ تان منہ کا تذکرہ بھی ضروری ہوگیا۔

"تان منہ!" سردار تھالوب کے لہجے میں حیرت تھی "وہ حرامی یہاں کیسے آگیا؟"

"وہ تھائی کے پیچھے آیا تھا۔" میں نے کہا اور پھر میں اسے تھائی کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

"میں تان منہ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت حرامی آدمی ہے۔" تھالوب نے میرے خاموش ہونے پر کہا "یہ تھائی کی خوش قسمتی ہے کہ اس کے چنگل سے بچی رہی۔ میں آج ہی سرحدی چوکی کے کمانڈر کو فون کرکے اس کے بارے میں بتا دیتا ہوں اگر تان منہ تھائی سرحد میں موجود ہو تو اسے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کردیا جائے گا اور تم لوگ۔" وہ انزاک کی طرف دیکھنے لگا "بوری رام اور مائے پانگ کو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مائے پانگ کے ہاتھوں اگر کسی کا قتل ہوا ہے تو اس میں مائے پانگ کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے اشتعال میں گولی چلائی تھی اور اس کی ذمے داری بھی تان منہ پر عائد ہوتی ہے جس نے اپنے آدمی کو مائے پانگ پر مجرمانہ حملہ کرنے پر اکسایا تھا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں بھی بات کروں گا اور تم لوگوں کو خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔"

انزاک حیرت سے ہم سب کی صورتیں دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے تو یہ انکشاف ہی بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کے ہاتھوں کوئی قتل ہو چکا ہے۔ انزاک سے اس کی ماں کو تو ہم نے تان منہ اور اس قتل کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔

وقفے وقفے سے گفتگو کا موضوع بھی بدلتا رہا۔ سردار تھالوب کہہ رہا تھا۔

"مجھے یہ تو پتا چل گیا تھا کہ تم لوگ جنرل کھوراٹ کو بھاری نقصان پہنچانے کے بعد گولڈن ٹرائی اینگل سے بنکاک کی طرف نکل گئے ہو لیکن تھائی کے بارے میں مجھے پتا نہیں چلا تھا کہ اس پر کیا بیتی تھی اور پھر اس کے کئی مہینوں بعد تک تم لوگوں کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں ملی۔ بالآخر ایک روز میں نے مہاراج سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ تم لوگ شاؤلن ٹیمپل پہنچ چکے ہو لیکن تھائی کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ میں بہرحال مطمئن ہوگیا کہ تم لوگ خیریت سے ہو۔"

"خیریت!" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "جنرل کھوراٹ اور دارا کے آدمیوں نے تو آخر تک وہاں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر ہلکسیان اور میگا تیراڈ کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں کہہ رہا تھا "سنا ہے دارا آج کل پھر بنکاک میں ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔" تھالوب نے جواب دیا "لیکن اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وہ ویسے بھی پس منظر میں ہے۔ بہرحال' اب تم لوگ آگئے ہو۔ تلاش کرلیں گے اسے۔"

دس بجے کے قریب لوما نے کھانا تیار ہوجانے کی اطلاع دی۔ ہم لوگ نشست گاہ سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئے۔ بڑی سی میز لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔ لوما نے کھانا تیار کرنے میں بڑی عجلت دکھائی تھی۔ یوں تو تمام ہی کھانے مزے دار تھے مگر تھائی سوپ کی اپنی ہی لذت تھی۔

کھانے کے بعد میں نے فون پر بنکاک میں مہاراج کا نمبر ملایا۔ وہاں سے پتا چلا کہ مہاراج اس وقت جمنازیم میں ہیں اور دیر تک وہیں رہیں گے۔ میں نے کریڈل ٹیپ کرکے جمنازیم کا نمبر ملایا۔ کال ماسٹر ہوچن نے ریسیو کی تھی۔ میری آواز سنتے ہی شاید وہ اچھل پڑا تھا۔

"ہے وجدان۔" وہ چیخ کر بولا "کہاں غائب ہو تم۔ شاؤلن ٹیمپل سے تو تم کئی روز پہلے روانہ ہوگئے تھے۔"

"یس ماسٹر۔" میں نے جواب دیا "ہمارا خیال تو یہ تھا کہ چین کی سرحد سے برما میں داخل ہوکر کنچن بوری کی طرف سے تھائی لینڈ آئیں گے مگر ہم غلطی سے لاؤس کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ چند روز پہلے میکانگ پار کرکے ہم تھائی لینڈ پہنچے ہوئے ہیں اور اس وقت چیانگ سائین میں سردار تھالوب کے مہمان ہیں۔"

"اوہ۔" ماسٹر ہوچن کی آواز سنائی دی "مجھے تمہارے واپس آنے کی خوشی ہے۔ تم لوگ ٹھیک ہو نا۔ تھائی اور جانگی کیسی ہیں؟"

"ہم سب ٹھیک ہیں۔" میں نے جواب دیا "تم کیسے ہو اور مہاراج کیسے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک۔ لو مہاراج سے بات کرو۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر ریسیور پر مہاراج کی آواز سنائی دی "ہیلو وجدان کیسے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں مہاراج۔ آپ کیسے ہیں؟" میں نے پوچھا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے تک مہاراج سے باتیں ہوتی رہیں۔ مہاراج نے تھائی' جانگی اور سردار تھالوب سے بھی بات کی تھی۔ انہوں نے سردار تھالوب سے کہا تھا کہ وہ ہمیں لے کر جلد بنکاک پہنچ جائے۔

فون بند کرنے کے بعد ہم پھر باتوں میں مصروف ہوگئے۔ جانگی' تھائی اور انزاک ایک کمرے میں جا کر سو گئی تھیں۔ میں اور سردار تھالوب ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے رہے۔ ہماری باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ہمارے پاس کرنے کو بہت سی باتیں تھیں۔

"میں نے سنا تھا کہ تمہیں حکومت میں کسی بڑے عہدے کی پیشکش بھی کی گئی تھی؟" میں نے سردار تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ اور یہ پیشکش میری خدمات سے متاثر ہو کر کی گئی تھی لیکن میں نے جو کچھ بھی کیا تھا' وہ کسی معاوضے یا لالچ کے لیے نہیں کیا تھا۔ وطن کی خدمت کے لیے کسی عہدے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی محب وطن سرکاری عہدوں سے بے نیاز ہو کر بھی وطن کی خدمت کرسکتا ہے اور پھر میرے اوپر اپنے قبیلے کی بھی ذمے داریاں ہیں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا انعام ہے کہ حکومت نے میری خدمات کا اعتراف کیا اور اس سرحد کے حوالے سے میرے مشوروں کو اہم سمجھ کر ان پر عمل درآمد کیا جس کے نتیجے میں اس علاقے میں جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کی مداخلت کچھ کم ہوگئی ہے۔ اس کے کئی اڈے تو ہم نے اسی زمانے میں ختم کردیے تھے۔ کچھ اڈے باقی ہیں جو نہایت خفیہ ہیں اور مجھے یقین ہے ہم آہستہ آہستہ انہیں بھی ختم کردیں گے۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے کہ حکومت اب مجھ سے مشورے لیتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "برما اور لاؤس کی سرحد کی طرف بعض قبائل اب بھی پوست کی کاشت کرتے ہیں۔ منشیات کے بین الاقوامی اسمگلر بھاری معاوضے پر ان سے فصل خرید لیتے ہیں جن سے تیار ہونے والی منشیات انسانیت کی تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہ قبائل بھی پوست کاشت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس پر ایک تو محنت کم ہوتی ہے اور معاوضہ زیادہ ملتا ہے۔ دوسرے ان کے پاس اتنے وسائل نہیں کہ ان زمینوں پر کچھ اور کاشت کرسکیں۔ میں نے حکومت کو تجویز پیش کی تھی کہ ان علاقوں میں لیچی اور اسٹرابری کی کاشت ہوسکتی ہے مگر کاشتکاروں کے پاس اتنے وسائل بھی نہیں اور انہیں ان فصلوں کا زیادہ معاوضہ بھی نہیں ملے گا لیکن اگر حکومت ان کی مالی معاونت کرے تو صحت مند فصلیں کاشت کرکے پوست کی کاشت کو بتدریج کم کیا جاسکتا ہے۔ حکومت نے میری یہ تجویز مان لی اور گزشتہ چار پانچ مہینوں سے اس پر کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بار بار بنکاک بھی جانا پڑتا ہے اور ان قبائلی علاقوں کے دورے بھی کرنے پڑتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تقریباً ایک منٹ کی خاموشی کے بعد سردار تھالوب نے دوبارہ لب کشائی کی۔ وہ کہہ رہا تھا "ہم اس برائی کو مکمل طور پر ختم تو نہیں کرسکتے مگر اسے کم کرنے میں اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ایک سال پہلے جب تم سے ملاقات ہوئی تھی تو میں تمہاری باتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اگرچہ اس وقت بھی میں منشیات کے خلاف تھا۔ اپنے زیر اثر علاقوں میں پوست کی کاشت کا خاتمہ کرچکا تھا لیکن تمہاری باتوں اور تمہارے خیالات نے میرے خیالات کو مہمیز کیا اور میں ہر طرح سے تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ یہ ہماری مشترکہ مہم کا نتیجہ ہے کہ ہم کم از کم اپنے علاقے میں اس برائی کو کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ہم اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور ایک نہ ایک دن کم از کم اپنے علاقے میں اس برائی کا جڑ سے خاتمہ کردیں گے۔"

مجھے سردار تھالوب کی نیت پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر اس کے لیے بہت کام کیا تھا۔ اپنے کئی آدمی مروائے تھے۔ اپنی جان خطرے میں ڈالے رکھی تھی۔ اپنا گھر تباہ کروالیا تھا مگر اس کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی تھی۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کے دل میں کوئی لالچ نہیں تھا۔ دل میں لالچ ہوتا تو وہ ان سرگرمیوں میں میرا ساتھ ہی نہ دیتا۔ اپنے علاقوں میں پوست کاشت کرکے عیش کرتا مگر اس کے دل میں انسانیت کا درد تھا۔ وہ

جان گیا تھا کہ یہ لعنت انسانیت کو مفلوج کر رہی ہے۔ اس نے اپنے علاقے میں اس کی کاشت بند کروا دی تھی۔ اسے حکومت میں ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی گئی تھی جسے اس نے قبول نہیں کیا تھا۔ لالچ ہوتا تو وہ یہ عہدہ قبول کرکے بھی عیش کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے مکان کو راکٹوں سے حملہ کرکے تباہ کردیا گیا تھا۔ حکومت کی طرف سے اسے مکان کے معاوضے اور تعمیر کی پیشکش بھی کی گئی تھی لیکن اس نے یہ پیشکش بھی قبول نہیں کی تھی۔

"تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں مہاراج جیسا آدمی مل گیا۔" سردار تھالوب کہہ رہا تھا "تم اگر غلط ہاتھوں میں چلے جاتے تو آج دوسروں کے لیے بہت بڑا خطرہ بن چکے ہوتے لیکن مہاراج نے جس طرح تمہاری تربیت کی ہے' وہ قابلِ رشک ہے۔"

"ہاں۔ یہ واقعی میری خوش قسمتی ہے۔" میں نے جواب دیا "مہاراج جیسے لوگوں کی محبت اور شفقت بھی قسمت والوں کو ہی ملتی ہے۔"

رات بیتی جارہی تھی لیکن ہماری باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ اس دوران میں لوما نے ہمیں کم از کم دو مرتبہ کافی بنا کر دی تھی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا کہ نجانے کب ہمیں کس چیز کی ضرورت پڑجائے لیکن بالآخر صبح چار بجے کے قریب میرے قویٰ مضمحل ہونے لگے اور جمائیاں آنے لگیں۔

"رات ختم ہو رہی ہے۔" سردار تھالوب نے کہا "اب تم بھی سو جاؤ۔ میں صبح مائے سین چلا جاؤں گا۔ تین چار گھنٹوں میں واپسی ہوگی۔ شام سے ذرا پہلے ہم چیانگ رائے کے لیے روانہ ہوجائیں گے۔ اس وقت تک تم لوگ بھی یہاں گھوم پھر لینا۔ میں ٹرو جیپ یہیں چھوڑ جاؤں گا۔"

سردار تھالوب نے مجھے وہ کمرا دکھا دیا جہاں مجھے رات کا باقی حصہ گزارنا تھا۔ اس کا اپنا بیڈ روم اوپر کی منزل پر تھا۔ سردار تھالوب اوپر چلا گیا۔ میرے سامنے والے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر بتی جل رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ جانکی' تھائی اور انزاک ایک ہی بیڈ پر ایک دوسرے پر لدی سو رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد میں کچھ دیر تک نہیں سو سکا اور سردار تھالوب کے بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر میری آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہونے لگیں۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو گیارہ بج رہے تھے۔ باہر لان سے جانکی وغیرہ کی باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا اور جب باہر نکلا تو لوما میز پر ناشتا لگا رہا تھا۔

"یہ اتنا سارا ناشتا؟ کیا صرف میرے لیے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے لوما کی طرف دیکھا۔

"صرف تم نہیں۔ سب لوگ ناشتا کریں گے۔" لوما نے جواب دیا۔

"سردار تھالوب بھی؟"

"وہ تو صبح سات بجے چلے گئے۔" لوما نے کہا "مادام تھائی وغیرہ نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔ انہوں نے کہا تھا وہ تینوں بھی تمہارے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کریں گی۔"

"چلو۔ بلاؤ انہیں۔" میں کہتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے افسوس بھی ہوا تھا۔ وہ تینوں پتا نہیں کب سے اٹھی ہوئی تھیں لیکن میری وجہ سے بھوکی بیٹھی تھیں۔

چند منٹ بعد وہ تینوں بھی اندر آگئیں۔

"ارے واہ۔" جانکی تنک کر بولی "ہم تو تمہارے انتظار میں صبح سے بھوکے بیٹھے ہیں اور تم سے چند منٹ انتظار نہیں ہو سکا۔"

"ابھی میں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔" میں نے جواب دیا "تم لوگ بیٹھو تو ناشتا شروع ہو۔"

وہ تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ لوما ایک ایک چیز اٹھا کر ہمارے سامنے رکھ رہا تھا۔ طویل عرصے بعد اس طرح بھرپور ناشتا ملا تھا۔ خوب سیر ہو کر کھایا۔

ہم ناشتے کے بعد نشست گاہ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ لوما نے ایک پھولا ہوا والٹ میری طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سردار نے تمہارے لیے دیا تھا۔" لوما نے جواب دیا "تم لوگ شہر گھومنے کے لیے جاؤ گے نا۔ کوئی چیز دیکھ کر دل مچل سکتا ہے۔" لوما نے کہا پھر بولا "ڈرائیور باہر موجود ہے جب جانا ہو تو بتا دینا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم بتا دیں گے اور یہ والٹ مجھے دے دو۔ ہمارا دل مچل سکتا ہے۔ اس بندے کے سینے میں تو دل ہے ہی نہیں۔ مچلے گا کیا۔"

لوما نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس سے والٹ لے کر جانکی کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے ہوا میں ہی جھپٹ لیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم باہر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

...ن میں ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔ ...نے بتایا یہ ڈرائیور ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے وانگ ڈن یاد ...۔ وہ بھی اسی طرح مستعد رہتا تھا۔ اس سے ہماری بہت ...تکلفی بھی ہو گئی تھی۔

"ہم ڈرائیور کو ساتھ نہیں لیں گے۔" جانکی نے اس کی ...رف دیکھتے ہوئے کہا "ہمارا دل چاہتا ہے کہ آج ہم آزادی ...ے گھومیں پھریں۔ اپنی مرضی سے جہاں جائیں جہاں ...ہیں۔ اسی لیے۔"

"ٹھیک ہے میڈم۔" اس شخص نے جواب دیا اور ...گاڑی کی چابیوں کا گچھا اس کی طرف بڑھا دیا "ٹینکی پوری ...رح بھری ہوئی ہے۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

جانکی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ انزاک پسنجرز ...یٹ پر بیٹھ گئی اور میں تھائی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر ٹک گیا۔ ...نزاک کو میں نے اگلی سیٹ پر اس لیے بٹھا دیا تھا کہ وہ اس ...ہر سے واقف تھی اور جانکی کو راستوں کے بارے میں بتا ...سکتی تھی۔

گیٹ سے باہر نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے ایک ...یپ کو اپنے تعاقب میں محسوس کرلیا۔ وہ جیپ بنگلے کے باہر ...چھ دور سڑک کے کنارے کھڑی تھی جو ہماری جیپ کے ...گیٹ سے نکلتے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔ اس میں ...ڈرائیور کے علاوہ تین اور آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ...ب قبائلی تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس ...نکل گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سردار تھالوب کے ...آدمی تھے۔ ظاہر ہے۔ صبح مائے سین جانے سے پہلے سردار ...تھالوب نے اپنے آدمیوں کو ہمارے بارے میں بہت سی ...ہدایات دی ہوں گی۔

جانکی جیپ کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتی رہی۔ اس کے ...ساتھ بیٹھی ہوئی انزاک راستوں' سڑکوں اور عمارتوں کے ...بارے میں بتا رہی تھی۔ یہاں ہم پہلے بھی گھومتے رہے تھے ...لیکن ہمیں بہت سی چیزوں کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

ہم اس سڑک سے بھی گزرے جہاں ایک گلی کے کارنر ...پر رنگ سنت کا کاٹیج تھا۔ جانکی نے میرے کہنے پر بنگلے کے ...سامنے سڑک پر جیپ روک لی اور ہم بنگلے کی طرف دیکھنے ...لگے۔ بنگلے کے باہر دیوار کے ساتھ ساتھ بے تحاشا جھاڑیاں ...اگی ہوئی تھیں۔ اندر درختوں کی شاخیں بہت نیچے تک جھکی ...ہوئی تھیں۔ بہت سی شاخیں سوکھ چکی تھیں اور ان سے لٹکے ...ہوئے مکڑی کے جالے دور سے نظر آرہے تھے۔ برآمدے ...میں بھی مکڑیوں نے جالے تان رکھے تھے۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ رنگ سنت انہی دنوں ماری گئی تھی۔ اس کی بیٹی سونیا اپنی ماں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے ہمارے ساتھ مل گئی تھی۔ سونیا نے واقعی اس مٹی سے وفا کا حق ادا کردیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ قدم قدم پر موت کا سامنا کیا تھا۔ گولڈن ٹرائی اینگل کے جہنم سے فرار ہونے کے بعد وہ بوما اور اس کی بیوی ہوفا کے ساتھ برما سے ہوتی ہوئی ہندوستان کی طرف چلی گئی تھی۔ سونیا کی یاد سے میرے اندر ایک پھریری سی دوڑ گئی۔ مجھے گولڈن ٹرائی اینگل کی وہ رات یاد آگئی جب تاریک غار میں اس نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے چیت کردیا تھا حالانکہ جانکی بھی عرصے سے ایسی کوشش کرتی رہی تھی مگر میں نے اسے کامیاب نہیں ہونے دیا تھا لیکن سونیا... وہ لمحات یاد کرکے میں اپنے آپ میں ندامت محسوس کرنے لگا اور شاید ندامت کا یہ احساس زندگی بھر میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

ہم اس پہاڑی پر بھی گئے جہاں فاسٹ فوڈ کے کئی ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے اور جہاں سے نشیب میں بہت دور دریائے میکانگ کے اس پار گولڈن ٹرائی اینگل کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ اس وقت بھی یہاں بہت سے غیر ملکی سیاح موجود تھے۔ جنگلے کے قریب ایک میز پر بیٹھ کر فرائی فش کھاتے ہوئے مجھے اسی ریسٹورنٹ کی ویٹرس مائے سا یاد آگئی۔ جس نے وانگ ڈن کے کہنے پر ہمارے لیے کام کیا تھا اور بالآخر ماری گئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹا وہاں رکنے کے بعد ہم واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ جیپ اب بھی ہمارے پیچھے تھی جس میں چار قبائلی بیٹھے ہوئے تھے۔ جانکی وغیرہ نے بھی اس جیپ کو بہت پہلے دیکھ لیا تھا اور وہ تینوں بھی سمجھ گئی تھیں کہ وہ قبائلی ہماری حفاظت کے لیے ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

انزاک یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوئی تھی۔ تھالوب اس علاقے کے سب سے بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ ہمارے ساتھ اس کے سلوک نے بھی انزاک کو بے حد متاثر کیا تھا۔

ہم جب بنگلے پر واپس پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد سردار تھالوب بھی واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ ہم پانچ بجے یہاں سے چیانگ رائے کے لیے روانہ ہوں گے۔ اس نے انزاک سے بھی پوچھ لیا تھا کہ کیا وہ بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔

"نہیں سردار۔" انزاک نے جواب دیا "میں گاؤں

واپس جاؤں گی اور میرا خیال ہے کہ اب مجھے آپ لوگوں سے اجازت لے لینی چاہیے۔ بازار سے کچھ چیزیں بھی خریدنی ہیں۔ میں چھ بجے والی بس سے چلی جاؤں گی۔"

"بس سے نہیں۔ میرا ڈرائیور تمہیں جیپ پر چھوڑ آئے گا اور۔۔۔" اس نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی "یہ رکھ لو۔ بازار میں کچھ شاپنگ کرلینا اور ایک بات ذہن میں رکھنا۔ تم لوگوں کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے متعلقہ حکام سے بات کرلی ہے۔ تان منہہ کو تھائی لینڈ کی سرحد میں دیکھتے ہی گرفتار کرلیا جائے گا اور اگر کوئی تم لوگوں کو پریشان کرنے کی کوشش کرے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ یہ میرا کارڈ بھی رکھ لو۔ اس میں میرا یہاں کا اور چیانگ رائے کا بھی فون نمبر موجود ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "تم نے میرے ان دوستوں کی مدد کر کے دراصل مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اور میں یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم لوگوں کو کسی بھی قسم کا مسئلہ درپیش ہو بلا تکلف میرے پاس چلی آنا اور اب تم جانا چاہو تو ہماری طرف سے اجازت ہے۔ تمہیں بازار میں بھی کچھ وقت لگے گا۔"

انزاک رقم لیتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس نے تھائی کی طرف دیکھا۔ تھائی نے سردار کے ہاتھ سے نوٹوں کا بنڈل لے کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سردار تھالوب نے ڈرائیور کو بلا کر ہدایت کردی کہ وہ دوسری جیپ پر انزاک کو لے جائے اور بازار میں شاپنگ کے بعد اسے تھانگ سانگ چھوڑ آئے۔ انزاک بڑی گرم جوشی سے ہم لوگوں سے مل کر رخصت ہوگئی۔

ہم ٹھیک پانچ بجے چیانگ سائین سے روانہ ہوگئے۔ مجھے بوری رام نے بتایا تھا کہ سردار تھالوب کے بعض دشمن اب بھی اس علاقے میں موجود ہیں اور ظاہر ہے وہ جنرل کھوراٹ کے آدمی تھے۔ اس کا تذکرہ تو خود سردار تھالوب نے بھی کیا تھا اس لیے سردار تھالوب کبھی بھی غیر محتاط نہیں رہا تھا۔ آج صبح مائے سین جانے سے پہلے وہ ہماری حفاظت کا بندوبست بھی کر گیا تھا اور اب بھی محافظ ہمارے ساتھ موجود تھے۔ ایک جیپ ہم سے پانچ منٹ پہلے روانہ ہوچکی تھی اور محافظوں کی دوسری جیپ ہم سے پچیس تیس گز پیچھے تھی۔

جب ہم پہلی مرتبہ چیانگ رائے سے چیانگ سائین آئے تھے تو سفر اندھیرے میں ہوا تھا لیکن اس وقت ہم دن میں سفر کر رہے تھے۔ سردار تھالوب ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جانکی اور تھائی پچھلی سیٹ پر تھیں۔ دن کی روشنی میں ہمیں یہ علاقہ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔ راستے میں جگہ جگہ خطرناک موڑ تھے۔ گاڑی کے ڈرائیور کی معمولی سی غفلت ہمیں موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ سردار تھالوب بھی بہت محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

فاصلہ اگرچہ صرف اُنسٹھ ساٹھ کلو میٹر تھا۔ سڑک ہموار ہوتی تو یہ فاصلہ پینتیس چالیس منٹ میں طے ہوسکتا تھا لیکن ہم تقریباً دو گھنٹوں کے بعد چیانگ رائے کے نواح میں پہنچے تھے۔ اس کے مزید آدھے گھنٹے بعد ہم سردار تھالوب کی عالی شان کوٹھی میں موجود تھے۔

میرا خیال تھا کہ یہاں رنگولی ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوگی لیکن سردار تھالوب نے بتایا کہ اس نے ابھی تک رنگولی کو ہمارے بارے میں اطلاع ہی نہیں دی۔ دراصل وہ رنگولی کو سرپرائز دینا چاہتا ہے۔

رنگولی اس بنگلے میں بھی رہائش پذیر نہیں تھی۔ وہ اپنے اسی چھوٹے سے مکان میں ہی رہ رہی تھی جہاں چند روز ہم بھی رہے تھے۔ تھالوب نے بتایا کہ چیانگ سائین سے واپس آنے کے بعد سے وہ اسی مکان میں تھی۔

"وہ آج کل گولڈن ٹرائی اینگل ہوٹل میں پروگرام کر رہی ہے۔" سردار تھالوب بتا رہا تھا "اس ہوٹل میں بہت کم رقاصاؤں کو اپنے فن کے مظاہرے کا موقع ملتا ہے۔ رنگولی نے اپنے فن میں واقعی کمال حاصل کیا ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے خود اسے معاہدے کی پیشکش کی تھی۔ ہفتے میں صرف دو پروگرام۔۔۔ اور ان دو پروگراموں میں اسے لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ اس کے معاہدے کا آخری مہینہ ہے۔ شاید دو ہفتے اور رہ گئے ہیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ اس سے مزید تین مہینے کا معاہدہ کرنا چاہتی ہے مگر رنگولی نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ آج رات اس کا پروگرام ہے۔ میں تم لوگوں کو اچانک سامنے لا کر اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اسے تم لوگوں کے بارے میں ابھی تک کوئی اطلاع نہیں دی۔"

"پہلے تو شاید وہ ڈولفکس کلب میں تھی نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں شاید۔" تھالوب نے مختصر سا جواب دیا اور ملازم کو رات کے کھانے کے بارے میں ہدایات دینے لگا جو ہمارے لیے کافی لے کر آیا تھا۔

اور پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم گیارہ بجے کے قریب بنگلے سے نکلے۔ رنگولی کا پروگرام ساڑھے گیارہ بجے

شروع ہوتا تھا۔ اسٹیج کے قریب سردار تھالوب کی میز اگرچہ ہمیشہ ریزرو رہتی تھی لیکن اسی رات چیانگ رائے پہنچتے ہی اس نے فون کرکے ایک اور میز مخصوص کروالی تھی۔

اور یہ میز اسٹیج سے بہت ہٹ کر تھی۔ میں سمجھ گیا کہ تھالوب نے یہ میز کیوں ریزرو کروائی تھی تاکہ رقص کے دوران میں رنگولی ہمیں نہ دیکھ سکے۔

رنگولی واقعی اپنے فن میں یکتا تھی۔ اس کے رقص کے دوران میں لوگ سانس تک لینا بھول جاتے تھے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ رقص کے دوران میں اس کی نظریں بار بار اسٹیج کے قریب اس میز کی طرف اٹھ رہی تھیں جو خالی تھی اور جس پر ریزروڈ کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ وہ سردار تھالوب کی مخصوص میز تھی مگر آج وہ ہمارے ساتھ اسٹیج سے دور دوسری میز پر بیٹھا تھا۔

رقص کے اختتام پر رنگولی نے ایک بار پھر اس خالی میز کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اداسی صاف نظر آرہی تھی۔ وہ جیسے ہی اسٹیج کے پیچھے غائب ہوئی، سردار تھالوب نے اشارہ کیا اور ہم اسٹیج کے پہلو کے دروازے سے نکل کر اس طرف آگئے جہاں ڈریسنگ رومز تھے۔ رنگولی والے ڈریسنگ روم کے دروازے پر اس کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ سردار تھالوب دروازے پر ہلکی دستک دے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ رنگولی نے دروازہ کھولا اور ہمیں دیکھ کر مارے خوشی کے چیخ اٹھی۔

ہم پندرہ بیس منٹ تک رنگولی کے ساتھ ڈریسنگ روم میں رہے اور پھر ہال میں آگئے۔

ہم دو بجے تک ہوٹل میں رہے۔ سردار تھالوب نے رنگولی کو بھی اپنے بنگلے پر چلنے کی پیشکش کی تھی لیکن وہ ہمیں اپنے مکان پر لے جانا چاہتی تھی۔ سردار تھالوب ہم سب کو اپنی گاڑی پر رنگولی کے مکان پر چھوڑ کر چلا گیا۔

رنگولی کے مکان کو اندر سے دیکھ کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ سردار تھالوب نے اس کی آمدنی لاکھوں میں بتائی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس نے گھر میں قیمتی سازوسامان جمع کر رکھا ہوگا لیکن گھر کی حالت بالکل ویسی تھی جو ایک سال پہلے تھی۔ بالکل بے سروسامانی کی سی کیفیت تھی۔

"تھالوب نے تو بتایا تھا کہ تم لاکھوں کما رہی ہو لیکن تمہارے گھر کی یہ حالت......" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اور پھر ہمارے لیے یہ انکشاف بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا نوّے فی صد حصہ "اینوائرنمنٹ فرینڈلی" نامی ایک تنظیم کے عطیے میں دے دیتی تھی۔ یہ تنظیم دیہاتی ترقیاتی پروگرام کے علاوہ اور بھی کئی رفاہی پروجیکٹ چلا رہی تھی جس کا ایک پروجیکٹ منشیات کے عادی افراد کی بحالی بھی تھا۔ اس پروجیکٹ میں کئی ایسے ادارے کام کررہے تھے جہاں منشیات کے عادی افراد کا علاج کرکے انہیں معاشرے میں باعزت مقام حاصل کرنے میں مدد دی جاتی تھی۔

رنگولی کے بارے میں یہ جان کر واقعی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے ایک سال پہلے مار دھاڑ میں بھی ہمارا ساتھ دیا تھا۔ "اینوائرنمنٹ فرینڈلی" نام کا یہ ادارہ چند مہینے پہلے ہی قائم ہوا تھا اور اسے بہت اچھا رسپونس ملا تھا۔

یوں تو تینوں کمروں میں بیڈ بچھے ہوئے تھے لیکن سونے کا ہوش کسے تھا۔ ہم سب رنگولی ہی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ رنگولی اس ایک سال کے عرصے میں ہم پر بیتی ہوئی ہر بات کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔

اس وقت پونے چار بجنے والے تھے۔ رنگولی چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ میں جانگی اور تھائی کے ساتھ پلنگ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رنگولی نے دروازے میں قدم رکھا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں چار کپ رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دوسرا قدم اٹھایا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ رنگولی اچھل کر گری۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ تھائی بھی چیختی ہوئی اچھل کر پلنگ سے گر گئی۔ میں بھی اچھل کر جانگی کو ساتھ لیتا ہوا دوسری طرف آگرا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا ایک اور کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور پھر تو گویا ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

یکے بعد دیگرے چار دھماکے ہوئے۔ لگتا تھا جیسے مکان پر راکٹوں سے حملہ کردیا گیا ہو یا بم پھینکے جارہے ہوں۔ چھت کا ایک حصہ اڑ گیا۔ ٹوٹی ہوئی چھت ہمارے اوپر گر رہی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ چھت پختہ لینٹر کی نہیں تھی۔ یہ مکان پرانی طرز کا تھا۔ زمین سے پانچ فٹ اونچی دیوار۔ اس کے اوپر لکڑی کی بلیوں کا فریم بنا کر اندر کی طرف خام میٹریل سے بنے ہوئے دو انچ موٹے گتے کے پیس اور باہر کی طرف ٹین کی چادریں تھیں۔ چھت بھی اسی طرح تھی۔ سیلنگ موٹے گتے کی اور اوپر ہٹ کی طرح سلانٹ ٹین کی چھت۔ اس علاقے کے بیشتر مکان اسی طرز کے تھے۔

دیوار کی ایک بلی ٹوٹ کر میرے سر پر لگی۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرتی ہوئی

محسوس ہونے لگیں۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ جانگی اور تھائی کی چیخیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ رنگولی چھت کے گرنے والے ایک حصے کے نیچے دب گئی تھی اور شاید بے ہوش ہوگئی تھی اس لیے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہماری طرف والی ایک دیوار اندر کی طرف جھک رہی تھی۔ میں نے جانگی کو پلنگ کے نیچے دھکیل دیا اور خود بھی نیچے گھس کر دوسری طرف سے تھائی کو کھینچنے لگا۔ اسی لمحے ایک اور زوردار دھماکا ہوا اور پوری کی پوری چھت ہمارے اوپر آن گری۔

تھائی کا اوپر کا دھڑ پلنگ کے نیچے تھا مگر اس کی ٹانگیں گری ہوئی چھت کے نیچے دب گئی تھیں۔ میں اور جانگی پلنگ کے نیچے ہونے کی وجہ سے محفوظ رہے تھے۔ مجھے سر پر جو چوٹ لگی تھی میں اس سے سنبھل گیا تھا مگر سر میں ابھی تک ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

اب دھماکے نہیں ہورہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مکان پر راکٹوں یا بموں سے حملہ کیا گیا تھا۔ حملہ آور غالباً جاچکے تھے لیکن ایک اور خوفناک حقیقت نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ دھوئیں کی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

میں پلنگ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ تھائی بھی بے ہوش ہوچکی تھی۔ میں نے پلنگ کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی مگر گرنے والی چھت کے بوجھ سے پلنگ کی ایک پٹی ٹوٹ گئی تھی جس سے پلنگ نیچے دب گیا تھا اور ہم اس کے نیچے پھنس گئے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب میں نے شاؤلن ٹیمپل میں عمارت کے ملبے کے نیچے دبے ہوئے ایک آدمی کو نکالا تھا۔ وہ میری چی کا کارنامہ تھا اور اس وقت بھی میں نے چی سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا اور پھر مجھے مشکل پیش نہیں آئی۔ میں نے پلنگ کو اپنے اوپر سے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

اور پھر وہ خوفناک حقیقت کھل کر میرے سامنے آگئی۔ کمرے کے دروازے کے باہر نارنجی شعلے اٹھ رہے تھے۔ دھوئیں میں سانس لینا مشکل ہورہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ لکڑیوں اور گتے سے بنے ہوئے اس مکان میں آگ پھیلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

میں نے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگایا۔ جانگی کے بھی کندھے اور سر پر چوٹ لگی تھی اور وہ کراہ رہی تھی۔ تھائی بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ رنگولی تو پوری کی پوری

چھت کے ایک حصے کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ میں نے سب سے پہلے ملبا ہٹا کر رنگولی کو کھینچ کر باہر نکالا اور اسی وقت شور اور چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ آگ پھیلتی جارہی تھی۔ دروازے کی طرف سے نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔

"جانگی۔" میں جانگی کو اٹھاتے ہوئے بولا "آگ پھیل رہی ہے۔ دیوار کا یہ حصہ گرانے میں میری مدد کرو۔"

دیوار اس طرح ٹوٹ کر گری تھی کہ اس طرف کا راستہ بھی بند ہوگیا تھا۔ میں نے لکڑی کی ایک بلی توڑ کر الگ کی اور دیوار پر مارنے لگا۔ چند ضربوں سے وہ حصہ ٹوٹ گیا اور چھت کا باقی حصہ دھڑام سے میرے اوپر آن گرا۔

آگ پھیل رہی تھی اور باہر سے شور کی آوازیں بھی بڑھتی جارہی تھیں۔ گلی کے دوسرے مکانوں کے لوگ جمع ہوگئے تھے اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آگ بجھانے کے لیے کہہ رہے تھے۔

شاید دو تین آدمی آگ کے خوف کی پروا کیے بغیر مکان میں گھس آئے تھے۔ ایک آدمی چیخ چیخ کر رنگولی کو آوازیں بھی دے رہا تھا۔ وہ شاید کوئی پڑوسی تھا اور رنگولی کو جانتا تھا۔

آگ خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ میں ملبے کو بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹا رہا تھا۔ دیوار میں اتنا گیپ بن گیا تھا کہ ایک آدمی باہر نکل سکے۔ میں نے جانگی کو اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ وہ چیخ چیخ کر اس طرف سے لوگوں کو مدد کے لیے پکارنے لگی۔

کچھ لوگ دوڑ کر اس طرف آگئے اور دیوار توڑنے لگے۔ وہ کام کم اور شور زیادہ مچا رہے تھے۔ میں نے ملبے کے نیچے دبی ہوئی تھائی کو بھی نکال لیا تھا۔ پلنگ کی پٹی ٹوٹنے سے اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔ جس سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

باہر سے لوگوں نے دیوار کا کافی حصہ توڑ لیا تھا۔ میں نے تھائی کو دوسرے لوگوں کے حوالے کیا اور رنگولی کی طرف لپکا۔ دھوئیں سے سانس لینا دشوار ہورہا تھا۔ میں رنگولی سے ابھی کچھ دور ہی تھا کہ دیوار کی لکڑیوں کا جلتا ہوا پورا فریم رنگولی کے اوپر گرا۔ میں نے بڑی تیزی سے جلتی ہوئی بلیاں ایک طرف ہٹائیں اور رنگولی کو ایک طرف گھسیٹنے لگا۔ اسی دوران میں دو آدمی ٹوٹی ہوئی دیوار سے کود کر اندر آگئے اور انہوں نے رنگولی کو سنبھال لیا۔

پہلے رنگولی کو باہر نکالا گیا اور پھر میں بھی باہر آگیا۔ گلی میں بیسیوں لوگ جمع تھے۔ بہت سے لوگ بالٹیوں سے پانی آگ پر پھینک رہے تھے۔ وہی سب کچھ ہورہا تھا جو ایسے

مواقع پر ہوتا ہے۔ لوگ بدحواسی کا شکار تھے اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو ہدایت دے رہے تھے۔

آگ پھیل گئی تھی اور پڑوس کا ایک مکان بھی اس کی لپیٹ میں آ رہا تھا۔

رنگولی اور تھائی کو وہاں سے دور ایک مکان کے سامنے چھوٹے سے لان میں ڈال دیا گیا۔ جانگی بھی ان کے پاس کھڑی تھی۔ بہت سے لوگ اردگرد جمع ہو رہے تھے۔ ایک دو آدمی چیخ چیخ کر انہیں اسپتال لے جانے کو کہہ رہے تھے اور پھر اسی گلی کا ایک آدمی گاڑی لے آیا۔ بے ہوش رنگولی اور تھائی کو گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ ایک اور آدمی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے اور جانگی کو دوسری گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ دو آدمی ہمارے ساتھ بھی بیٹھ گئے تھے اور پھر دونوں گاڑیاں تیزی سے حرکت میں آ گئیں۔

دونوں گاڑیاں گلیوں سے نکل کر سماٹ روڈ سے ہوتی ہوئی سپرہائی وے پر آ گئیں۔ کنگ مینگرائے اسٹیچو والے چوراہے سے اگلی کار تو سنگھا کلائے روڈ پر مڑ گئی جبکہ ہماری کار سپرہائی وے پر سیدھی دوڑتی رہی۔

"وہ گاڑی اس طرف گئی ہے۔ تم کس طرف جا رہے ہو۔" میں نے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ اوور بروک اسپتال کی طرف گئے ہیں لیکن یہ راستہ ذرا لمبا ہے۔ ہم شارٹ کٹ سے نکلیں گے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے کیونکہ کار سائمون نامی بدھ عبادت گاہوں کے قریب سائمون روڈ پر مڑ گئی تھی۔ اس راستے سے ہم اوور بروک اسپتال تو نہیں البتہ مخالف سمت جا رہے تھے۔

"یہ.... یہ تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔ یہ اسپتال کا راستہ تو نہیں ہے۔" میں نے ایک بار پھر ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"خاموشی سے بیٹھے رہو مسٹر۔" میرے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی سخت چیز میرے پہلو میں چبھنے لگی "اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو سینے میں سوراخ کر دوں گا۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی بھی ہماری طرف مڑ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔

"ہمیں مکان پر راکٹ برسانے کے بعد چلے جانا چاہیے تھا۔" اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا "لیکن ہم کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتے۔ ہماری ماضی کی غلطیوں سے تم بچتے رہے ہو لیکن اس مرتبہ ہم کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہمیں شبہ تھا کہ تم میں سے کوئی زندہ نہیں بچ جائے اس لیے ہم ایک طویل چکر کاٹ کر واپس آ گئے اور ... بھیڑ میں شامل ہو گئے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر "تم...... واقعی ڈھیٹ اور سخت جان قسم کے لوگ ہو ... نے اس مکان پر چار راکٹ مارے تھے۔ مکان آگ کی لپیٹ میں آ گیا تھا مگر اس کے باوجود تم لوگ بچ نکلے مگر اب ... گے۔ ان دونوں عورتوں کو تو محلے والے اسپتال لے گئے اور تم لوگ ہمارے ہاتھ لگ گئے۔ بدحواسی میں کسی نے یہ ... بھی نہیں دی ہوگی کہ تم لوگوں کو کون لے گیا تھا۔ تم لوگوں کی تلاش میں شہر کے تمام اسپتال چھان مارے جائیں گے مگر تم لوگوں کا سراغ کسی کو نہیں ملے گا۔"

"تم لوگ کون ہو۔ ہماری تو تم سے کوئی دشمنی نہیں۔" میں نے کہا۔

"دشمنی تو تم سے ہماری بھی نہیں ہے۔ ہم تو اوپر کے احکامات کی تعمیل کر رہے ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا "بنکاک والوں کو تمہارے واپس آنے کی اطلاع اسی وقت دی گئی تھی جب تم سردار تھالوب کے بنگلے پر آئے تھے۔ ہمیں فوراً ہی حکم مل گیا تھا کہ تمہارا بندوبست کر دیا جائے۔ ہمیں حکم تو یہ ملا تھا کہ تم لوگوں کو ختم کر دیا جائے لیکن یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر تم زندہ ہاتھ آ جاؤ تو ہمارا معاوضہ دگنا ہوگا اور اب یہ ہماری قسمت ہے کہ تم زندہ ہی ہاتھ لگے ہو۔ جس کا مطلب ہے ہمارا معاوضہ ڈبل۔"

"اگر میں تمہیں اس سے بھی ڈبل معاوضہ دوں تو؟" میں نے کہا۔

"بات نہیں بنے گی۔" اس نے جواب دیا "ان سے غداری کر کے ہم دشمنی مول نہیں لینا چاہتے۔ تم سے ہمیں ان سے دگنا معاوضہ تو مل جائے گا مگر وہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے اس لیے بات ختم۔ اب تم خاموش بیٹھے رہو۔"

"اچھا۔ یہ تو بتا دو کہ تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"وانگ جائے۔" اس شخص نے جواب دیا "یہ جگہ ... سے زیادہ دور نہیں ہے۔ دو چار دن وہاں تم لوگوں ... مہمان رکھیں گے اور جب یہ ہنگامہ کچھ سرد پڑ جائے گا تو ... دونوں کو بنکاک والوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

اس کے بعد میں نے واقعی کوئی بات نہیں کی۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ کار اب سائمون روڈ سے اتر کر وانگ جا... طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ آگے دریا کا ایک ... کی طرح شہر کے اندر نکلا ہوا تھا۔ کار کا رخ اسی ... تھا۔ آگے ایک موڑ کی وجہ سے کار کی رفتار کم ہو گئی۔ ... دروازے کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے پہلو ... سا ٹہوکا دیا اور موڑ گھومنے کے لیے کار کی رفتار جیسے ... کم ہوئی، جانگی نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر ... لگا دی۔

"اے۔ اے۔ روکو اسے۔" اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی ...

جانگی نے مجھے جیسے ہی ٹہوکا دیا تھا، میں اسی وقت سنبھل ... تھا اور اس نے جیسے ہی دروازے کو جھٹکا دیا، میں نے بڑی ... سے حرکت کرتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کا ... موڑ دیا۔ پستول کا رخ پچھلی طرف ہو گیا تھا۔ اس شخص ... ٹریگر دبا دیا یا بدحواسی میں دب گیا تھا۔ گولی پچھلی ونڈ ... میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ ... ایک اور جھٹکا دیا۔ اس کا ہاتھ اوپر سے مڑتا ہوا سامنے کی ... آ گیا اور پستول کی نال اگلی سیٹ کی پشت سے لگ گئی۔ ... وقت ٹریگر ایک بار پھر دب گیا۔

اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا آدمی تیزی سے پیچھے مڑا تھا مگر ... سے نکلی ہوئی گولی سیٹ میں سوراخ کرتی ہوئی اس کی ... میں پیوست ہو گئی۔ وہ اپنی سیٹ پر اچھلا اور قدرے ... کی طرف لڑھک گیا۔

ڈرائیور بھی اس صورتِ حال سے بدحواس ہو گیا تھا۔ ... اسی وقت سامنے دوسرے موڑ سے ایک گاڑی اسی ... مڑی۔ اس پر چمکتی ہوئی سرخ اور نیلی فلیش لائٹ بتا ... رہی تھی کہ وہ پولیس کی گاڑی تھی جسے دیکھ کر ڈرائیور کچھ ... بدحواس ہو گیا تھا۔ کار سڑک پر لہرانے لگی۔

میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے حریف کا ہاتھ ... مروڑ دیا کہ پستول کا رخ فرش کی طرف ہو گیا۔ اس ... موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ... طرف کا دروازہ کھول دیا اور باہر چھلانگ لگانے کی ... کرنے لگا۔ اس کا پورا جسم کار سے باہر لٹک گیا۔ ہاتھ ... گرفت میں تھا۔ کار سڑک پر لہرا رہی تھی۔ میں نے اس ... کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

ڈرائیور بری طرح بدحواس ہو گیا تھا۔ سامنے سے آنے ... والی پولیس کار نے بھی اس کا راستہ روک لیا۔ میں نے اپنی ... سنبھل کر ایک بازو ڈرائیور کے گلے پر لپیٹ دیا۔ کار ... ہو کر سڑک کے کنارے فٹ پاتھ سے ٹکرا گئی۔ مجھے بھی زوردار جھٹکا لگا تھا۔ ڈرائیور کی گردن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی اور ایک طرف دوڑنے لگا۔

اس وقت پولیس کار سے تین کانسٹیبل برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک نے چیخ کر ڈرائیور کو رکنے کا حکم دیا اور جب وہ نہیں رکا تو گولی چلا دی۔ ڈرائیور چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔ میں بھی کار سے اتر آیا۔ ایک پولیس والے نے مجھے ریوالور کی زد پر لے لیا۔

"یہ لوگ ہمیں اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔" میں نے کہا اور جلدی جلدی اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں کہا "میری ساتھی نے اس موڑ پر کار سے چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ زخمی ہے۔"

پولیس والے نے میرے ساتھ اس طرف دوڑ لگا دی۔ تقریباً پچاس گز پیچھے جانگی لنگڑاتی ہوئی اسی طرف آ رہی تھی۔ کار سے چھلانگ لگانے سے اس کے دونوں گھٹنوں پر چوٹ لگی تھی۔

کار سے چھلانگ لگانے والا دوسرا آدمی گلیوں میں غائب ہو گیا تھا۔ میں جانگی کو سہارا دے کر کار تک لے آیا۔ زخمی ڈرائیور کو ایک پولیس والے نے ریوالور کی زد پر لے رکھا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا دوسرا آدمی ختم ہو چکا تھا۔ سیٹ کی پشت سے لگنے والی گولی پچھلی طرف سے اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھی۔ لاش کو کار ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ ایک پولیس والا مجھ سے جرح کرنے لگا۔

"تم وقت ضائع کر رہے ہو آفیسر۔" میں نے اس کی جرح سے تنگ آ کر کہا "میری دوست زخمی ہے۔ اسے طبی امداد کی ضرورت ہے اور میری ساتھی دو خواتین کو بے ہوشی کی حالت میں اوور بروک اسپتال بھیجا گیا تھا۔ پتا نہیں وہ بھی وہاں پہنچ پائی ہیں یا ان کے ساتھ بھی کوئی دھوکا ہوا ہے۔ یہ شخص۔" میں نے زخمی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا "اس نے اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ رنگولی کے مکان پر راکٹوں سے حملہ کیا تھا۔ ہم لوگ بچ گئے مگر وہ مکان اب بھی جل رہا ہے۔ تم اپنے ہیڈ کوارٹر یا متعلقہ پولیس اسٹیشن سے اس کی تصدیق کر لو۔ مکان پر حملے کی اطلاع پولیس اسٹیشن پہنچ چکی ہوگی۔"

"کیا نام بتایا تم نے۔ رنگولی۔ یہ وہی مشہور رقاصہ تو نہیں ہے؟" پولیس مین نے پوچھا۔

"ہاں وہی۔ ہم اس کے دوست ہیں۔" میں نے جواب دیا "جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کرو آفیسر۔ اگر مزید کوئی گڑبڑ ہو گئی تو سردار تھالوب تم لوگوں کو معاف نہیں کرے گا۔"

"سردار تھالوب۔" پولیس مین چونک گیا۔ اس نے ایک دو اور سوال کیے اور پھر اپنی کار کے ریڈیو پر ہیڈ کوارٹر سے بات کرنے لگا۔ چند منٹ بعد وہ میری طرف آگیا "پولیس کی گاڑیاں یہاں آرہی ہیں۔ ہمارے آفیسر کے آنے سے پہلے تم لوگ یہاں سے نہیں جاسکتے۔"

میں جھنجلا کر رہ گیا لیکن ظاہر ہے جھنجلاہٹ کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں جانگی کے قریب آگیا جو فٹ پاتھ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کار سے چھلانگ لگانے سے اس کی ایک کہنی اور دونوں گھٹنوں پر رگڑ لگی تھی جن سے خون رس رہا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد پولیس کی دو اور گاڑیاں وہاں پہنچ گئیں۔ ایک آفیسر کچھ دیر ہم سے سوالات کرتا رہا پھر ہمیں ایک کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس وقت سڑکوں پر اِکّادُکّا گاڑیوں کی آمدورفت شروع ہوچکی تھی۔ فاصلہ اگرچہ بہت زیادہ تھا لیکن ٹریفک نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کار کو سنگھا کلائے روڈ پر واقع اودربروک اسپتال پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

تھائی اور رنگولی وہاں موجود تھی۔ تھائی تو ہوش میں آچکی تھی مگر رنگولی ابھی تک بے ہوش تھی۔ ملبے کے نیچے دبنے سے تھائی کی ٹانگوں پر دباؤ پڑا تھا مگر تکلیف زیادہ نہیں تھی۔ جانگی کو بھی فوراً ہی ایمرجنسی میں ایک ڈاکٹر کے حوالے کردیا گیا۔ پولیس پہلے بھی وہاں موجود تھی لیکن تھائی نے ابھی تک پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا تھا البتہ یہ درخواست کی تھی کہ سردار تھالوب کو کسی طرح اس حادثے کی اطلاع دے دی جائے۔

"انہوں نے سردار تھالوب کو اطلاع دی یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" تھائی نے اثبات میں سرہلایا "وہ گھر سے روانہ ہوچکا ہے اور میرا خیال ہے یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔"

مزید دس منٹ گزر گئے۔ رنگولی ہوش میں آگئی اور اس کے چند منٹ بعد ہی سردار تھالوب بھی پہنچ گیا۔ رنگولی کو پیشانی پر چوٹ بھی لگی تھی جس پر بینڈیج کردی گئی تھی۔ میرے سر پر بھی گومڑ سا بن گیا تھا اور جانگی کے گھٹنوں اور کہنی پر بھی بینڈیج تھی۔ اس کی پیشانی پر بھی چوٹ لگنے سے گومڑ سا ابھر آیا تھا۔ ہم سب کی یہ حالت دیکھ کر سردار تھالوب لال بھبوکا ہوگیا۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا اور ہمیشہ پُرسکون رہتا تھا لیکن اس وقت اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ پولیس آفیسر اس کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔

"وہ لوگ پکڑے گئے یا نہیں؟" تھالوب نے اس پولیس آفیسر سے پوچھا جو میرے ساتھ آیا تھا۔

"ایک آدمی کو زخمی کرکے حراست میں لے لیا گیا ہے۔ دوسرا اپنے ساتھی کی گولی سے ہلاک ہوچکا ہے اور تیسرا فرار ہوگیا ہے مگر۔۔۔"

"میں دو گھنٹوں کے اندر اندر اسے سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔" سردار تھالوب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اس کے زخمی ساتھی سے اس کا ٹھکانا معلوم کرو۔ اگر وہ دو گھنٹوں میں گرفتار نہ ہوا تو۔۔۔" اس نے جان بوجھ کر جملہ۔۔۔ ادھورا چھوڑ دیا۔

اسی دوران میں پولیس کے چند اعلیٰ افسران بھی پہنچ گئے۔ انہیں بھی اطلاع مل چکی تھی کہ معاملہ سردار تھالوب کا ہے۔ اس لیے وہ صبح صبح بستر چھوڑ کر بھاگے چلے آئے تھے۔

رنگولی کو کم از کم دو گھنٹے اسپتال میں رکھا گیا۔ سردار تھالوب نے ہم سب کو بنگلے پر چھوڑا اور خود باہر چلا گیا۔ اس وقت تک میں اسے سب کچھ بڑی تفصیل سے بتا چکا تھا۔

سردار تھالوب ہمیں صبح چھ بجے کے قریب بنگلے پر چھوڑ گیا تھا اور اس کی واپسی گیارہ بجے ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ اب بھی غصے سے تمتما رہا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟ مفرور پکڑا گیا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کون تھے وہ لوگ؟"

"جو بھاگ گیا تھا' وہ پکڑا گیا لیکن اس نے کچھ بتانے سے پہلے خودکشی کرلی۔" سردار تھالوب نے جواب دیا "البتہ کار کا ڈرائیور جو پہلے ہی پولیس کی گولی سے زخمی ہوگیا تھا وہ اس وقت بھی پولیس کی تحویل میں ہے۔ تلاشی لینے پر اس کی جیب سے بھی پوٹاشیم سائنائڈ کا ایک کیپسول نکلا تھا۔ اس سے بہرحال بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔"

"مثلاً؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کے کہنے کے مطابق تین دن پہلے چنگ چی نامی ایک شخص نے بنکاک سے اسے فون پر بتایا تھا کہ تم تھائی لینڈ واپس آگئے ہو اور میرے بنگلے میں مقیم ہو۔ تم لوگوں کو ختم کرنے یا تمہیں زندہ پکڑنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ جس کے عوض بھاری معاوضے کی پیشکش کی تھی۔" تھالوب نے بتایا "ان لوگوں نے چیانگ مائی میں تم لوگوں کی نگرانی شروع کردی تھی لیکن میرے آدمیوں کی وجہ سے انہیں موقع نہیں مل سکا۔ انہوں نے بنکاک تک ہمارا تعاقب کیا لیکن صورتِ حال وہی رہی یعنی وہ کوشش کرتے رہے لیکن کلب سے واپسی پر تم لوگوں کو رنگولی کے مکان پر چھوڑتے ہوئے مجھ سے یہ غلطی ہوگئی کہ میں نے اپنے آدمیوں کو وہاں نہیں چھوڑا اور اس طرح انہیں مکان پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا لیکن بہرحال' غنیمت ہے کہ تم لوگوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔"

"چنگ چی۔ یہ کون ہوسکتا ہے۔ یہ نام میں نے پہلی بار سنا ہے۔" میں نے کہا۔

"بنکاک میں سوکھم وٹ روڈ پر واقع ڈی جے نائٹ کلب اس کا ہے۔ وہ ان لوگوں سے اکثر کام لیتا رہتا ہے اور ظاہر ہے دارا ہی کے لیے کام کررہا ہوگا۔" سردار تھالوب نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے کہا "چنگ چی چینی نام ہے۔ دارا کا ساتھی چی فانگ بھی چینی ہے۔ اس سے کوئی تعلق ضرور ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص سے دارا یا چی فانگ کا پتا معلوم ہوسکتا ہے لیکن حیرت ہے کہ چنگ چی یا دارا کو کیسے پتا چلا کہ ہم تھائی لینڈ واپس آچکے ہیں۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان کے آدمی اب بھی یہاں موجود ہیں۔" تھالوب نے جواب دیا "انہوں نے تم لوگوں کو دیکھ لیا ہوگا۔ یقیناً بنکاک میں دارا کو اطلاع کردی اور دارا نے یہ ذمے داری چنگ چی کو سونپ دی جس نے یہاں اپنے آدمیوں کو استعمال کیا۔"

"ان لوگوں کے پکڑے جانے سے چنگ چی محتاط ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے وہ غائب ہوجائے اور میں چاہتا ہوں کہ اسے اپنے آدمیوں کے پکڑے جانے سے پہلے ہی گرفت میں لے لیا جائے۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔" سردار تھالوب نے کہا "میرے ساتھ۔" وہ مجھے لاؤنج میں لے آیا جہاں ٹیلی فون تھا۔ اس ٹیلی فون کا ایک ایکس ٹینشن اس کے بیڈ روم میں بھی تھا۔

میں نے صوفے پر بیٹھ کر فون اپنے سامنے رکھ دیا اور نمبر ملا کر بنکاک میں مساراج کے جمنازیم کا نمبر ڈائل کیا۔ کال کسی لڑکی نے ریسیو کی تھی۔ ماسٹر ہوچن اس وقت جمنازیم میں کلاس لے رہا تھا۔ میرا نام سن کر لڑکی نے اسے بلانے کو کہا اور پھر دو منٹ بعد ریسیور پر ماسٹر ہوچن کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو ماسٹر! تم لوگوں کو تو آج یہاں پہنچنا تھا۔"

"لیکن یہاں تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی ہے ماسٹر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر اسے گزشتہ رات کے بارے میں بتانے لگا۔

"تم لوگ ٹھیک ہو۔ کوئی زیادہ نقصان؟" اس نے پوچھا۔

"تھائی اور جانگی کو معمولی چوٹیں آئی ہیں لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔ ہمیں دو تین دن اور یہاں رہنا پڑے گا لیکن اس دوران میں تمہیں ایک کام کرنا ہے بلکہ آج اور فوری طور پر۔"

"کوئی ایمرجنسی؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ایمرجنسی ہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا "ہم پر حملہ چنگ چی نامی کسی شخص کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ وہ بنکاک میں سوکھم وٹ روڈ پر واقع ڈی جے نائٹ کلب کا مالک ہے۔ اس سے ہمیں دارا کے بارے میں معلوم ہوسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ حملہ ناکام ہونے کی اطلاع چنگ چی تک پہنچنے سے پہلے اسے گرفت میں لے لیا جائے۔ ایسا نہ ہو وہ غائب ہوجائے اور ہم ایک بار پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہ جائیں۔"

"اپنا نمبر بتاؤ۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹوں بعد تمہیں اطلاع دوں گا۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

میں نے اسے فون نمبر نوٹ کروا دیا اور چند منٹ مزید گفتگو کرنے کے بعد فون بند کردیا۔

صبح یہاں آنے کے بعد ہم نے صرف ایک ایک کپ چائے پی تھی اور سردار تھالوب نے تو ابھی تک چائے بھی نہیں پی تھی۔ اس نے ملازم کو ناشتا تیار کرنے کو کہا اور اس کمرے میں آگیا جہاں رنگولی لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ جانگی اور تھائی دوسرے کمرے میں تھیں۔ میں تھالوب کے ساتھ کچھ دیر اس کمرے میں رہا پھر تھائی والے کمرے میں آگیا۔ وہ دونوں بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ میں بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پروگرام تو یہ تھا کہ آج ہم بنکاک چلے جائیں گے لیکن اب ہمیں دو چار دن یہیں رہنا پڑے گا۔" میں نے تھائی اور جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں رہنے کا کوئی فائدہ تو نہیں۔" تھائی نے کہا "ہمیں آرام ہی کرنا ہے اور وہ ہم بنکاک میں بھی کرسکتے ہیں۔"

"تھائی ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں یہاں رکنے کے بجائے بنکاک چلے جانا چاہیے۔" جانگی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

میں بھی ان کے خیال سے متفق تھا۔ اب یہاں میرا بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ بنکاک میں بھی اگرچہ ہمارا کوئی ایسا مستقل ٹھکانا نہیں تھا جسے گھر کہا جاسکتا مگر میں اسے ہوم سک ہی کہوں گا کہ جہاں ہماری زندگیوں کا بیشتر حصہ گزرا تھا۔ اب وہ جگہ ہمیں بڑی شدت سے یاد آرہی تھی۔

ہم ابھی باتیں کرہی رہے تھے کہ کامن روم سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ماسٹر ہوچن نے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا تھا اور ابھی آدھا گھنٹا ہی ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سردار تھالوب کے لیے کال ہوگی۔ اس لیے میں اپنی جگہ پر اطمینان سے بیٹھا رہا۔

سردار تھالوب نے اپنے کمرے سے نکل کر کال ریسیو کرلی اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد اس نے مجھے آواز دے کر بلالیا۔

"مہاراج تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے ریسیور میری طرف بڑھادیا۔

میں نے ریسیور لے لیا۔ پانچ منٹ کی گفتگو کے دوران میں سردار تھالوب سے مہاراج نے بہت کچھ معلوم کرلیا ہوگا لیکن وہ میری زبان سے بھی کچھ سننا چاہتے تھے۔ میں تقریباً پندرہ منٹ تک مہاراج سے باتیں کرتا رہا۔ سب سے پہلے انہوں نے ہماری خیریت دریافت کی اور پھر مجھے گزشتہ رات کے واقعات کی تفصیل دہرانی پڑی۔

"وہاں اگر کوئی گڑبڑ نہیں ہے تو تم لوگ بنکاک آجاؤ۔ تاکہ یہاں تم لوگوں کا بہتر علاج اور دیکھ بھال ہوسکے۔" مہاراج نے کہا۔

"سردار تھالوب کی وجہ سے یہاں ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن ہم سوچ رہے ہیں کہ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں بنکاک آجائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ جو تم مناسب سمجھو اور میری طرف سے تھائی، جانکی اور رنگولی کو پوچھنا اور اب تم ریسیور تھالوب کو دے دو۔" مہاراج نے کہا۔

میں نے ریسیور سردار تھالوب کو دے دیا۔ تھالوب تقریباً پانچ منٹ تک مہاراج سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مہاراج کو تسلی دے رہا تھا کہ ہمارے لیے پریشان نہ ہوں۔ ایک دو دن آرام کرنے کے بعد وہ خود ہمیں بنکاک لے آئے گا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ملازم نے بتایا کہ میز پر ناشتا لگا دیا گیا ہے۔ ہم سب ڈائننگ ہال میں آگئے۔ رنگولی بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں تک آگئی تھی۔ یوں تو ہم سب کو چوٹیں لگی تھیں مگر رنگولی سب سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔

ناشتا کرنے کے فوراً ہی بعد وہ کمرے میں جاکر لیٹ گئی۔ تھالوب کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہم بھی اسی کمرے میں آگئے جہاں پہلے بیٹھے تھے۔ تھائی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر لیٹ گئی اور کچھ ہی دیر میں اونگھنے لگی۔ جانکی بھی اس کے قریب ہی ٹانگیں پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک کہنی اور دونوں گھٹنوں پر بینڈیج تھی۔ گھٹنوں کے زخموں کی وجہ سے اس نے پینٹ کے بجائے نیکر پہن رکھی تھی جو گھٹنوں سے بہت اوپر تھی۔

تقریباً دو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو میں نے کامن روم میں آکر کال ریسیو کی۔ وہ بنکاک سے ماسٹر ہوچن کی کال تھی۔

"یس ماسٹر ہوچن۔ کیا رہا؟" میں نے پوچھا۔

"گڑبڑ ہوگئی لٹل ماسٹر۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا۔

"میں نے تمہاری طرف سے اطلاع ملنے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈی جے کلب پر ریڈ کیا تھا لیکن چنگ جی کو شاید چیانگ رائے میں اپنے آدمیوں کے مارے اور پکڑے جانے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہوگیا۔ البتہ ہوشنگ نام کی ایک چینی لڑکی ہمارے ہاتھ لگی ہے۔ جس نے کچھ اور سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔"

"ہوشنگ!" میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ہوشنگ وہی لڑکی تھی جس نے شاؤلن ٹیمپل میں مجھے دھوکے سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور پھر ایک ویرانے میں میگا تیراؤ کے ساتھ فرار ہوگئی تھی لیکن ممکن ہے ڈی جے کلب سے پکڑے جانے والی ہوشنگ نام کی یہ لڑکی کوئی اور ہو۔ میں نے تصدیق کرنے کے لیے پوچھا "کیا اس لڑکی کا شاؤلن ٹیمپل سے بھی کوئی تعلق رہا ہے؟"

"یس لٹل ماسٹر۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "یہ وہی لڑکی ہے جس نے شاؤلن ٹیمپل میں تمہیں دھوکے سے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے اور بھی بہت سی باتیں بتائی ہیں۔ میگا نام کا اس کا ایک اور ساتھی بھی یہاں موجود تھا۔ وہ بھی چنگ جی کے ساتھ غائب ہوچکا ہے۔"

"اوہ۔" میں نے کہا "ہوشنگ بہت خطرناک لڑکی ہے ماسٹر۔ اس کا خیال رکھنا۔ اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔"

"اس کی تم فکر مت کرو لٹل ماسٹر۔" ہوچن نے جواب دیا "تم کب تک یہاں آرہے ہو؟"

"میں کل یا پرسوں پہنچ جاؤں گا۔" میں نے جواب

اور چند منٹ مزید باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا اور کمرے میں آکر تھائی اور جانکی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

تھائی ہوشنگ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی البتہ جانکی اس سے اچھی طرح واقف تھی۔

"تو وہ حرافہ بنکاک بھی پہنچ گئی۔" جانکی نے کہا "ہم لوگ تو لاؤس میں بھٹکتے رہے۔ وہ لوگ یقیناً ہم سے پہلے بنکاک پہنچ گئے ہوں گے اور ہمارے آنے سے پہلے انہوں نے ہمارے استقبال کی تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔"

"اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری عدم موجودگی میں دارانے یہاں آکر ہاتھ پیر کافی پھیلا لیے ہیں لیکن اب میں انہیں زیادہ پھیلنے کا موقع نہیں دوں گا۔"

"صحیح صورتِ حال کا اندازہ تو وہاں پہنچ کر ہی ہوگا۔" جانکی نے کہا۔

ہم دیر تک یہی باتیں کرتے رہے۔ میگا تیراؤ نے جس طرح شاؤلن ٹیمپل تک میرا پیچھا کیا تھا اور جس طرح وہ مجھ سے پہلے بنکاک پہنچ گیا تھا' اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جنرل کھوراٹ مجھے کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اس نے شاید طے کرلیا تھا کہ دنیا کے آخری سرے تک اور زندگی کے آخری لمحوں تک میرا پیچھا کرے گا۔ میں غالباً پہلا شخص تھا جس نے گولڈن ٹرائی اینگل میں گھس کر اسے کروڑوں ڈالر کا نقصان پہنچایا تھا۔ میں نے اس کی نہ صرف ہیروئن کی ایک جدید ترین لیبارٹری تباہ کی تھی بلکہ اس کے کئی آدمی بھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور ہمارے فرار کے دوران میں اسے اپنے ایک ہیلی کاپٹر سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس طرح میں اس کا دشمن نمبر ایک بن گیا تھا اور وہ مجھے کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے تین بجے کھایا۔ اس وقت میں نے سردار تھالوب کو ماسٹر ہوچن کی کال کے بارے میں بتادیا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔" سردار تھالوب نے کہا "ہم نے چیانگ سائین سے ان کے قدم اکھاڑے ہیں تو بنکاک میں بھی انہیں نہیں ٹکنے دیں گے۔ بس دو چار دن کی بات اور ہے۔"

سردار تھالوب کو ہوشنگ اور میگا تیراؤ کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔ میں نے ان دونوں کے بارے میں اسے تفصیل سے بتادیا۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔" تھالوب نے کہا۔

کھانے کے بعد تھالوب فوراً ہی رنگولی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کھانے پر نہیں آئی تھی۔ سردار تھالوب جس طرح

ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں

کتابیات پبلی کیشنز اور مکتبہ نفسیات کی کتب کے ہول سیل ڈسٹری بیوٹر

شمائلہ بک ایجنسی

ہماری تمام کتب کے حصول کیلئے ان سے رابطہ کریں۔

آپ کے آرڈر کی فوری تعمیل کرتے ہوئے، کتب، آپ کی دکان پر پہنچائی جائیں گی۔

شمائلہ بک ایجنسی

دربار بابا بجلی شاہ اسٹریٹ،
چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ
فون 515011
موبائل 0300-4291286

رنگولی کے پلنگ کی پٹی سے لگا بیٹھا.... تھا اور جس طرح اس کی ناز برداری کر رہا تھا اس سے ہمیں اندازہ ہو گیا کہ وہ رنگولی کو کس قدر چاہتا ہے۔

اس رات کھانے کے بعد میں' جانگی اور تھائی بھی ان کے کمرے میں آگئے اور ہم نے ان دونوں کو گھیر لیا۔

"مجھے تم لوگوں کی نیت کچھ اچھی نہیں لگ رہی۔" سردار تھالوب نے مسکراتے ہوئے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔

"ہاں تھالوب۔" تھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آج ہم نے طے کر لیا ہے کہ کوئی فیصلہ کر کے ہی یہاں سے اٹھیں گے؟"

"کیسا فیصلہ؟" تھالوب بولا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ غالباً ہماری باتوں سے سمجھ گیا تھا کہ ہم کیا کہنے والے ہیں۔

"اب وقت آگیا ہے کہ تم دونوں میں جو تھوڑا بہت فاصلہ ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔" میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ اب تم دونوں کو شادی کر لینی چاہیے۔"

"کیا یہ کافی نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر زندہ ہیں۔" سردار تھالوب نے کہا۔

"اگر تم دونوں میں سے ایک ٹل گیا تو حسرتیں بھی ساتھ ہی دفن ہو جائیں گی۔" تھائی نے کہا "اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں...."

"تھائی...." رنگولی نے اسے ٹوک دیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر تھائی نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔

"تم چپ رہو۔" تھائی نے اسے ڈانٹ دیا "جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹے نہیں بولتے۔"

تھائی کی اس بات پر سب ہی نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"اگر رنگولی کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں...."

"اعتراض۔" جانگی نے اس کی بات کاٹ دی "ارے اس کے دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہیں۔ بس تم یہ بتاؤ کہ تم دونوں ایک کب ہو رہے ہو۔"

تھالوب چند لمحے رنگولی کی طرف دیکھتا رہا پھر میری طرف رخ کر کے بولا۔

"بنکاک والا معاملہ ختم ہو جائے تو ہم کوئی دن مقرر کر لیں گے۔"

"بنکاک والا معاملہ تو چلتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ طول بھی کھینچ جائے لیکن ہم تم دونوں کو صرف ایک ہفتے کی مہلت دے رہے ہیں۔ صرف ایک ہفتہ۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس وقت تک رنگولی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ تم بھی اپنے قبیلے والوں کو بتا دو۔ یہ شادی چیانگ سائین میں ہوگی اور تمہارے قبیلے کی رسم و روایات کے مطابق بڑی دھوم دھام سے ہوگی۔"

سردار تھالوب کے خیال میں ایک ہفتے کی مہلت بہت کم تھی۔ بہرحال یہ مہلت دو ہفتے کر دی گئی۔ ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تھالوب نے ریسیور اٹھا لیا اور پھر دوسری طرف کی بات سننے کے بعد ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"تمہاری کال ہے۔"

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بنکاک سے ماسٹر ہوچن کی کال تھی۔ اس نے جو اطلاع دی' وہ خاصی تشویش ناک تھی۔

"ہوشنگ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ وہ شدید زخمی ہے اور بے ہوش پڑی ہے۔"

"کیا ہوا؟" میں جلدی سے بولا "وہ تو تم لوگوں کی تحویل میں تھی۔ اس پر حملہ کیسے ہوا؟"

"ان لوگوں کو شاید ہمارے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا تھا۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "اس ٹھکانے پر ہمارے صرف دو آدمی تھے۔ حملہ ہوا تو انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حملہ آور یقیناً چنگ چی یا دارا کے آدمی تھے۔ وہ لوگ ہوشنگ کو لے جانا چاہتے تھے لیکن ہمارے آدمیوں کی مزاحمت کے باعث وہ اپنے اس مقصد میں تو کامیاب نہیں ہو سکے تاہم فائرنگ میں اسے دو گولیاں لگی ہیں۔ وہ بے ہوش پڑی ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس حملے میں ہمارا آدمی مارا گیا ہے اور دوسرا معمولی زخمی ہوا ہے۔"

"ہوشنگ کہاں ہے۔ اسپتال میں یا...."

"اسے دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ دو ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے ماسٹر۔ میں کل بنکاک پہنچ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"روانگی سے پہلے اطلاع دے دینا۔" ہوچن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں فون کر دوں گا۔" میں نے کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور تھالوب اور تھائی وغیرہ کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا پھر میں نے تھالوب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں کل صبح جہاز پر سیٹیں مل سکیں؟"

"کیوں نہیں۔" سردار تھالوب نے کہا "میں ابھی بندوبست کرتا ہوں۔" اس نے فون اٹھا کر اپنے سامنے رکھ لیا اور نمبر ملانے لگا۔

وہ کئی منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھتے ہوئے بولا "صبح دس بجے والی فلائٹ سے تم تینوں کی سیٹوں کا بندوبست ہو گیا ہے۔ دو تین دن بعد میں بھی پہنچ جاؤں گا۔"

اس کے بعد بھی ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن موضوع بدل گیا تھا۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہم وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگئے۔

صبح نو بجے کے قریب ہم ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔ سردار تھالوب ہمارے ساتھ تھا۔ وہ رن وے پر جہاز کی سیڑھیوں تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ ماسٹر ہوچن کو روانگی کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔" تھالوب نے میری بات کے جواب میں کہا "میں یہاں سے لاؤنج میں پہنچتے ہی فون کر دوں گا۔ میں اپنے آدمیوں کو بھی اطلاع دے دوں گا' وہ گاڑی لے کر ائرپورٹ پر پہنچ جائیں گے۔ اگر ماسٹر ہوچن کسی وجہ سے نہ پہنچ سکا تو میرے آدمی تم لوگوں کو پہنچا دیں گے۔"

سردار تھالوب رخصت ہو گیا اور تھوڑی دیر بعد جب جہاز نے ٹیک آف کیا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آرہی تھی۔ ایک سال پہلے ہم یہی تینوں تھے۔ میں تھائی اور جانگی۔ ہم نے پیڈرو اور دارا کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا اور اب بھی ہم تینوں ہی تھے لیکن اب ہماری یہ ٹیم لنگڑے لولوں پر مشتمل تھی۔

ایک گھنٹا پچیس منٹ کا راستہ تھا۔ جہاز نے چیانگ رائے ائرپورٹ سے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا تھا اور مقررہ وقت پر بنکاک ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔

میرا خیال تھا کہ ماسٹر ہوچن یا اس کا کوئی نہ کوئی آدمی ہمیں لینے کے لیے ائرپورٹ پر موجود ہوگا لیکن کوئی ایسا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا۔

"مسٹر وجدان۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں بولا "ہمیں فون پر آپ کے آنے کی اطلاع مل گئی تھی۔ آیئے گاڑی اس طرف کھڑی ہے۔"

سردار تھالوب نے اپنے آدمیوں کو بھی فون پر اطلاع دے دی تھی۔ میں نے ماسٹر ہوچن یا اس کے آدمیوں کا انتظار کرنے کے بجائے اسی آدمی کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے ہاتھ میں بیگ تھا جو اس شخص نے لے لیا۔

ہم ٹرمنل سے نکل کر پارکنگ میں آگئے۔ پارکنگ کے آخر میں نیلے رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے ڈرائیور بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے شخص نے بیگ ویگن کی چھت پر رکھ کر دروازہ کھول دیا۔ پہلے جانگی اندر بیٹھی پھر تھائی اور آخر میں' میں اندر داخل ہوا۔ میں پوری طرح سیٹ پر بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پچھلی سیٹوں اور ڈرائیور کی سیٹ کے درمیان لوہے کا جنگلا دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ شیشے رنگین اور ون وے تھے۔ اندر سے تو باہر دیکھا جا سکتا تھا مگر باہر سے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا اور پھر دونوں طرف کے دروازوں پر نظر پڑتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اندر کی طرف سے دونوں دروازوں کے ہینڈل غائب تھے۔

ہمیں اپنے ساتھ لانے والا آدمی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے سیٹ پر بیٹھتے ہی ہماری طرف رخ کر کے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔

"تم میں سے کسی کے منہ سے آواز نہیں نکلنی چاہیے۔" اس کے حلق سے غراہٹ نکلی "یہ پستول شور مچانا پسند نہیں کرتا۔ کسی نے شور مچانے کی کوشش کی تو یہ خاموشی سے تم لوگوں کا خاتمہ کر دے گا۔"

جانگی اور تھائی کو بھی صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا۔ ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ میں نے ایک خاصا گہرا سانس لیتے ہوئے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ ہم واقعی چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔

ویگن ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی اور پارکنگ سے نکل کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگی۔ اس صورت میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہم واقعی پنجرے میں بند تھے۔ وین کے دونوں دروازوں کے ہینڈل اندر سے غائب تھے۔ آگے لوہے کا جنگلا لگا ہوا تھا جس کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں سائیلنسر لگا ہوا پستول تھا۔ اس وقت ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اگر ہم کچھ کرنا بھی چاہتے تو اس جنگلے کی وجہ سے ہماری کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔

بنکاک ائرپورٹ کو اس خطے کا مصروف ترین ائرپورٹ کہا جا سکتا ہے۔ مختلف فلائٹس کی آمد و رفت کی وجہ سے ائرپورٹ کے سامنے خاصا ٹریفک تھا۔ وین ائرپورٹ کی حدود سے نکل کر چاہون یوتھن روڈ پر نکل آئی جو وکٹری میموریل والے چوراہے سے ہوتی ہوئی اندرون شہر تک چلی گئی تھی۔

وین کی رفتار خاصی تیز تھی لیکن سوتھی سان روڈ کے چوراہے پر سگنل بند ہونے کی وجہ سے وین رک گئی۔ اس

شخص نے پستول اس طرح اپنے جسم کی آڑ میں چھپا لیا تھا کہ باہر سے نہ دیکھا جا سکے لیکن ہم اس کی زد میں تھے۔

وین کے دونوں طرف گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم تو ان گاڑیوں اور ان میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھ سکتے تھے مگر باہر والے لوگ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اس وقت ہمارے بائیں طرف کا ٹریفک ائرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گاڑی کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس کار کے اسٹیئرنگ کے سامنے ماسٹر ہوچن بیٹھا ہوا تھا۔ جانکی اور تھائی نے بھی اسے دیکھ لیا۔

"وہ... وہ ہوچن...."

"زبان بند رکھو۔" گن بردار بھیڑیے کی طرح غرایا اور تھائی اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکی۔

ماسٹر ہوچن کی کار تیزی سے ائرپورٹ کی طرف نکل گئی۔ اس طرف کا ٹریفک رکا تو دائیں طرف کا ٹریفک سامنے سے گزرنے لگا۔ پُر ہجوم سڑک پر ٹریفک زیادہ تھا۔ ہماری طرف کا سگنل ڈیڑھ منٹ بعد کھلا تھا۔ ہمارے آگے بھی تین چار گاڑیاں تھیں۔ ہمارا ڈرائیور وین ان سے آگے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ایک زوردار دھماکا ہوا اور وین لڑکھڑانے لگی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا گن مین اچھل پڑا اور محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وین کا اگلا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے وین کو سنبھال لیا اور اسے ٹریفک کے ہجوم سے نکال کر سڑک کے کنارے پر لگا کر روک لیا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

"ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔" اس نے اپنے ساتھی کو بتایا۔

"اسے تبدیل کرو۔ جلدی۔" وہ شخص غرایا۔

"اسپیئر ٹائر تو چھت پر رکھا ہے لیکن ٹول بکس اور جیک اندر ہے۔" ڈرائیور نے بتایا۔

"دروازہ کھول کر جیک اور ٹول بکس نکالو۔ میں انہیں دیکھتا ہوں۔" اس شخص نے کہا پھر ہماری طرف دیکھ کر غرایا "اگر تم میں سے کسی نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو بلا دریغ گولی مار دوں گا۔"

ڈرائیور نے جانکی کی طرف والا دروازہ باہر سے کھول دیا۔ اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کے تاثرات تھے۔ اس نے سیٹ کے پیچھے جھک کر ٹول بکس اور جیک باہر کھینچ لیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ ہم تینوں اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے تھے۔

ڈرائیور نے جیک لگا کر پہلے برسٹ شدہ ٹائر نکالا اور پھر دوسرا ٹائر چڑھانے لگا۔ دوسرا آدمی ہمیں پستول کی زد پر لیے سیٹ پر بیٹھا رہا۔ میں کچھ دیر تو اس کی طرف دیکھتا رہا پھر دروازے کے لاک کی طرف دیکھنے لگا جہاں ہینڈل لگا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ وہاں راڈ تھوڑی سی باہر نکلی ہوئی تھی۔ میری نظریں اسی راڈ پر مرکوز تھیں اور پھر وہ راڈ آہستہ آہستہ گھومنے لگی۔

اس وقت میرے دل میں خواہش تھی کہ یہ دروازہ کھل جائے اور میرے اندر کی مخفی قوت نے میری نظروں کے ذریعے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہی کھٹک کی ہلکی سی آواز ابھری اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔

"اے۔ دروازہ کیسے کھلا... خبردار...!" گن بردار چیخا۔

اور ٹھیک اسی وقت ایک کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سے وین سے چند گز آگے رکی اور ماسٹر ہوچن ایک اور لڑکے کے ساتھ کار سے اتر کر ہماری وین کی طرف دوڑا۔

ڈرائیور اور گن مین نے انہیں دیکھ لیا۔ گن مین تیزی سے پلٹا۔ اسی وقت میں نے دروازے سے چھلانگ لگا دی۔ میں گن مین کی طرف لپکا لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی غیبی قوت نے مجھے اٹھا کر ہوا میں اچھال دیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھماکے کی آواز بھی میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔

وہ نجانے کون سی قوت تھی جس نے مجھے ہوا میں اچھال دیا تھا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو گن مین کی چلائی ہوئی گولی میری پیشانی میں سوراخ کر دیتی۔ مگر میرے اچھلنے سے گولی بائیں طرف کان کے قریب سے گزر گئی۔ گن مین کو دوسری گولی چلانے کا موقع اس لیے نہیں مل سکا کہ ماسٹر ہوچن اور اس کے دونوں ساتھی طوفان کی طرح دہاڑتے اور چنگھاڑتے ہوئے بڑھے آ رہے تھے۔ ماسٹر ہوچن کے ہاتھ میں پستول تھا جبکہ دونوں لڑکوں کے ہاتھوں میں تیر نما چوڑے پھل والے خنجر تھے۔

گن مین نے ان کی طرف گھومتے ہی فائر کھول دیا اور پے در پے تین گولیاں چلیں۔ اس کے پستول پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ فائر کی آوازیں تو نہیں گونجی تھیں البتہ ٹریگر دبنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

گن مین نے فائرنگ اگرچہ بدحواسی میں کی تھی مگر اس کی چلائی ہوئی ایک گولی ماسٹر ہوچن کے ایک ساتھی کے بازو میں لگی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر بھی ہوا میں اڑتا ہوا دور جا گرا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنا زخمی بازو تھامتا ہوا دہرا ہو گیا۔

وین کا ڈرائیور بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وین کے ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے ریوالور بھی نکال لیا تھا مگر اسے فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ ماسٹر ہوچن کی چلائی ہوئی گولی اس کے پیٹ میں لگی اور وہ چیختا ہوا دہرا ہوتا چلا گیا۔

ماسٹر ہوچن کا دوسرا ساتھی خنجر لہراتا ہوا گن مین کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ اس نے زوردار حملہ بھی کر دیا مگر اس کا خنجر گن مین کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول پر لگا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔ خنجر کا وار چند انچ اور آگے پڑتا تو پستول کے بجائے اس کی کلائی کٹ کر پورا ہاتھ ہی نیچے گرتا۔ پستول ہاتھ سے چھوٹتے ہی اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ میں اس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک ٹانگ آگے کر دی۔ وہ میری ٹانگ سے الجھ کر لڑکھڑاتا ہوا آگے کھڑی ہوئی ایک اور کار سے ٹکرا گیا۔ ماسٹر ہوچن کے آدمی نے بھی اس کی طرف چھلانگ لگا دی۔

اسی لمحے فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ پیچھے سے آنے والی ایک اور کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ ہم سے چند گز کے فاصلے پر رکی تھی اور یہ فائرنگ اس کار سے کی گئی تھی۔

"جانکی۔ تھائی۔ نیچے جھک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا اور سڑک پر پڑا ہوا وہ پستول اٹھا لیا جو ہمیں اغوا کرنے والے کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔ پستول ہاتھ میں آتے ہی میں وین کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔

دوسری کار سے فائرنگ ہم پر کی گئی تھی اور کم از کم دو گولیاں وین کی باڈی میں لگی تھیں۔ ماسٹر ہوچن نے ایک کار کی آڑ لے کر حملہ آور کار پر فائرنگ شروع کر دی۔

دوسری کار سے آٹومیٹک رائفل سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ ان کا نشانہ ہماری وین تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ اس کار میں بھی ہمیں اغوا کرنے والوں کے ساتھی ہی تھے۔ جو غالباً شروع ہی سے ہماری وین کے پیچھے تھے لیکن کسی جگہ ٹریفک میں پھنس کر پیچھے رہ گئے تھے۔

میرے خیال میں ان لوگوں کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ہم اس فلائٹ سے بنکاک پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے اغوا کا منصوبہ بڑی عجلت میں بنایا ہوگا مگر اس کے لیے بھی باقاعدہ پلاننگ کی گئی تھی۔ ایک وین میں ہمیں اغوا کیا گیا تھا جبکہ ایک اور کار کو اس وین کے پیچھے رکھا گیا تھا تاکہ کسی ایسی ہی صورتِ حال میں اپنے ساتھیوں کی مدد کی جا سکے مگر وہ کار ٹریفک کے ہجوم میں پھنس کر پیچھے رہ گئی تھی۔

میں نے وین کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ اس کار میں بھی دو آدمی تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا پچھلی سیٹ پر بیٹھا فائرنگ کر رہا تھا۔

فائرنگ سے سڑک پر ٹریفک کی روانی میں گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کئی کاریں ایک دوسرے سے ٹکرا گئی تھیں۔ دور کہیں پولیس سائرن کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے پولیس کی گاڑی کو آگے آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

دوسری کار سے چلائی جانے والی ایک گولی وین کے پچھلے فینڈر پر لگی۔ میرے لیے فائر کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میرے خیال میں جانکی اور تھائی کا وین میں رہنا مناسب نہیں تھا۔ وین کی پیٹرول کی ٹنکی اسی طرف تھی جس طرف سے فائرنگ کی جا رہی تھی۔ اگر کوئی گولی ٹنکی پر لگ گئی تو ہم تینوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں

بچ سکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ہماری وین فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس سے آگے کشادہ سروس روڈ تھی جس کے دوسری طرف بلند عمارتیں تھیں جن کے نیچے دکانیں تھیں ان میں کئی بڑے بڑے سپر اسٹورز بھی تھے لیکن فائرنگ شروع ہوتے ہی دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگی تھیں اور اب دور دور تک کوئی بھی دکان کھلی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی البتہ سروس لین کے دونوں طرف متعدد گاڑیاں کھڑی تھیں۔

"تھائی۔ جانگی۔ نیچے اترو۔ ہری اپ!" میں نے وین کے دروازے کے سامنے آتے ہوئے چیخ کر کہا۔

وہ دونوں جھک کر وین سے باہر آگئی تھیں۔ ہم تینوں فٹ پاتھ پر دوڑتے ہوئے سروس روڈ پر آگئے۔ ہمارا بیگ وین کی چھت پر رکھا ہوا تھا لیکن اس وقت بیگ اٹھانے کا ہوش کسے تھا اور پھر اس میں کوئی قیمتی چیز بھی نہیں تھی۔ صرف ہم تینوں کے کپڑے ہی تھے۔

ماسٹر ہوچن نے ہمیں وین سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ہم تینوں سروس روڈ پر کھڑی ہوئی کاروں کی آڑ لیتے ہوئے ایک طرف دوڑتے رہے۔ جانگی کی ٹانگوں میں اگرچہ تکلیف تھی مگر جب جان پر بنی ہو تو اس قسم کی معمولی تکالیف خود بخود نظر انداز ہو جاتی ہیں۔

میں نے ایک لمحے کو رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دکانوں کے درمیان ایک کشادہ گلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم اس گلی کے موڑ پر پہنچے ہی تھے کہ فضا کان پھاڑ دینے والے ایک زوردار دھماکے سے گونج اٹھی۔ ہم تینوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔ کوئی گولی وین کے پیٹرول ٹینک میں لگی تھی۔ وین کے پرخچے اڑ گئے۔ آگ اور گاڑھے دھوئیں کا ایک بہت بڑا گولا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ دھماکا ہوتے ہی وہ بھی گلی کے اندر کی طرف دوڑ پڑے۔

جب ہم وین سے اتر کر اس طرف آئے تھے تو بہت سے لوگوں نے ہمیں دیکھا تھا لیکن اب وہاں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بھی ایک طرف دوڑتے چلے گئے۔

یہ بڑا بارونق علاقہ تھا۔ فائرنگ سے پہلے تو بھگدڑ مچی پھر سناٹا چھا گیا۔ میں جانگی اور تھائی کے ساتھ پہلے تو دوڑتا رہا پھر ہم ایک جگہ رک گئے۔ ہم وہاں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ اس طرف دکانیں وغیرہ کھلی ہوئی تھیں اور رونق بھی نظر آرہی تھی۔

دوڑتے ہوئے جانگی اور تھائی کے سانس پھول گئے تھے مگر ہم وہاں صرف دو منٹ رکے اور تیز تیز چلتے ہوئے ایک اور کشادہ گلی میں مڑ گئے۔ اس گلی میں بھی دکانیں تھیں۔ اس طرف پہنچ کر معلوم ہوا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔

تقریباً سو گز آگے یہ گلی ایک بڑی سڑک سے جا ملی۔ یہاں بڑے بڑے شاپنگ مالز اور سپر اسٹورز تھے۔ میں بنکاک میں بہت کم گھوما پھرا تھا اور یوں ہی واپس آگیا تھا اس لیے مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی مگر جانگی اور تھائی تو اس شہر کے چپے چپے سے واقف تھیں۔ تھائی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بتایا کہ یہ ونگ نام روڈ ہے۔ ہم یہاں سے چائنا ٹاؤن یا کسی بھی طرف جا سکتے تھے۔

ہم تینوں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلنے لگے۔ ابھی چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے سے آنے والی ایک کار ہمارے قریب آکر رک گئی۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ماسٹر ہوچن کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ پچھلی سیٹ پر اس کا ایک ساتھی تھا جس نے اس شخص کو دبوچ رکھا تھا جس نے وین میں ہمیں پستول کی زد پر لیے رکھا تھا۔

"کار میں بیٹھو۔ جلدی کرو۔" ماسٹر ہوچن نے کھڑکی سے گردن نکال کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تھائی اور جانگی اگلی سیٹ پر ایک دوسرے میں پھنس کر بیٹھ گئیں اور میں پچھلی سیٹ پر آگیا۔ اس طرح وہ قیدی میرے اور ماسٹر ہوچن کے آدمی کے بیچ سینڈوچ بن کر رہ گیا۔ میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ قیدی کی ٹانگ زخمی تھی اور اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کار ونگ نام روڈ سے یوتھی روڈ اور وہاں سے راما سکس روڈ کی طرف مڑ کر تیزی سے دوڑنے لگی۔

"اچھا ہوا تم لوگ مل گئے ورنہ ہم پریشان ہوتے رہتے۔" ماسٹر ہوچن نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے ماسٹر۔ وہ شاید زخمی ہو گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔" ہوچن نے کار ایک اور سڑک پر موڑتے ہوئے جواب دیا۔

"پولیس!" میں چونک گیا۔

"سائرن کی آوازیں تم نے بھی سنی ہوں گی۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "ٹریفک جام ہوجانے کی وجہ سے پولیس گاڑی کو تو آگے آنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن پولیس والے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ اس حرامی کو تو ہم نے اپنی گاڑی میں ڈال لیا تھا۔" اس نے قیدی کی طرف اشارہ کیا "مگر یودھی کو کار تک آنے کا موقع نہیں مل سکا۔ پولیس کی ایک گولی اس کی ٹانگ میں لگی تھی جس وجہ سے وہ کار تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر ہم اس کا انتظار کرتے تو ہم بھی یا تو مارے جاتے یا دھر لیے جاتے اس لیے ہمیں اس کے بغیر ہی وہاں سے بھاگنا پڑا۔"

"اور میرا خیال ہے دوسری کار والے بھی بھاگ گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔" ہوچن نے جواب دیا "فائرنگ کرنے والا پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ ڈرائیور نے کار بھگانے کی کوشش کی تھی مگر ایک گولی سے اس کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ پولیس نے ڈرائیور کو بھی گرفت میں لے لیا ہو گا۔"

"تم لوگوں کو ائرپورٹ پہنچنے میں اتنی دیر کیوں ہو گئی اور پھر یہ کیسے پتا چلا کہ ہم اس وین میں ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"تقریباً ایک گھنٹا پہلے سردار تھالوب نے فون پر اطلاع دی تھی کہ تم لوگ اس فلائٹ سے روانہ ہو چکے ہو۔ اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے لیکن راستے میں کار کا اگلا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ ڈگی میں اسٹپنی موجود تھی ٹائر تبدیل کرنے میں چند منٹ لگ گئے اور جب ائرپورٹ پہنچے تو پتا چلا کہ فلائٹ آچکی ہے اور بیشتر مسافر جا چکے ہیں۔ تم لوگ نظر نہیں آئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ اتفاق سے ایک پرانا شاگرد مل گیا۔ اس نے تم لوگوں کو نیلے رنگ کی اس وین میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اسے بھی شہر کی طرف آنا تھا۔ مجھے بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ وین ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہو گی۔ اس لیے میں کار کو تیزی سے دوڑاتا رہا اور پھر یودھی نے سڑک پر کھڑی ہوئی وہ وین دیکھ لی۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا تمہارے سامنے ہی ہوا تھا۔"

"یودھی۔" میں نے کہا "وہ زخمی ہے اور پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ کیا اس طرح مزید گڑبڑ نہیں ہو جائے گی۔"

"اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔" ماسٹر ہوچن نے کہتے ہوئے کار ایک اور سڑک پر موڑ دی۔

میرا خیال تھا کہ ماسٹر ہوچن ہمیں اپنے جمنازیم یا وات پٹ لے جائے گا مگر کار راتو نام ڈسٹرکٹ میں پھٹ بوری سے مڑ کر پھایا تھائی روڈ پر آگئی اور ہوٹل ایشیا کے سامنے سے ہوتی ہوئی ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ میں خاموش بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ ساتھ بیٹھا ہوا آدمی ایک دو بار کسمسایا تھا لیکن ایک طرف سے میں نے دباؤ ڈالے رکھا اور دوسری طرف سے ماسٹر ہوچن کے آدمی نے۔

کار ایک اور کشادہ گلی میں گھوم گئی۔ اس گلی میں دونوں طرف بڑے بڑے بنگلے تھے۔ کار گلی کے وسط میں ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ماسٹر ہوچن نے صرف ایک مرتبہ ہارن بجایا تھا۔ گیٹ فوراً ہی کھل گیا۔ ہوچن نے کار اندر لے جا کر پورچ میں روک دی جہاں پہلے ہی ایک کار کھڑی تھی۔

کار رکتے ہی سب سے پہلے تھائی اور جانگی نیچے اتری تھیں۔ ماسٹر ہوچن نے انجن بند کر دیا اور پیچھے مڑ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اسے اندر لے جا کر تہ خانے میں پہنچا دو۔ اگر یہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو گولی مار دینا۔"

میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اسی دوران میں ایک آدمی برآمدے والے دروازے سے نکل کر سامنے آچکا تھا۔ اس نے اسٹون واشڈ جینز کی پینٹ اور ڈینم کی نیلی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ درمیانے قد کا قدرے بھاری بھرکم آدمی تھا۔ بال قریب سے ترشے ہوئے اور بائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ چالیس اور پینتالیس کے درمیان لگایا جا سکتا تھا۔ چہرے کے تاثرات میں نرمی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایک شریف آدمی ہی لگتا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر پہلے ماسٹر ہوچن اور پھر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ فوراً ہی قیدی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟"

"ابھی تک ہم نے اس کا نام یا حدود اربعہ معلوم نہیں کیا لیکن اس نے اپنے کچھ ساتھیوں کی مدد سے ائرپورٹ سے لٹل ماسٹر کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔" ماسٹر ہوچن نے بتایا۔

"اس کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟" اس شخص نے پوچھا۔

"ایک پولیس کے ہاتھوں مارا گیا اور دو زخمی ہو کر پولیس کی گرفت میں آگئے۔ یہ ہمارے ہاتھ لگ گیا۔ اب یہ ہمیں بتائے گا کہ اس نے کس کے کہنے پر لٹل ماسٹر کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ شخص ماسٹر ہوچن کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "توران اسے نیچے پہنچا دو۔ کچھ دیر بعد اس سے معلوم کرتے ہیں کہ یہ کون ہے اور کس کے لیے کام کر رہا

ہے۔"

قیدی کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ توران اسے دھکے دیتا ہوا برآمدے والے دروازے میں داخل ہوگیا۔ تھائی اور جانکی بھی برآمدے میں آچکی تھیں اور پھر اسی وقت ماسٹر ہوچن نے اس شخص سے ہمارا تعارف کرایا۔

وہ چندا روبن تھا۔ مہاراج کا ایک پرانا شاگرد اور رتنا کوسن کا قریبی عزیز۔ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس سے وابستہ تھا اور یہ بنگلا اسی کا تھا۔ ماسٹر ہوچن جس طرح براہِ راست ہمیں یہاں لے کر آیا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پروگرام پہلے سے طے تھا کہ ہمیں یہاں لایا جائے گا۔

چندا روبن ہمیں کامن روم میں لے آیا۔ یہ وسیع و عریض کمرا شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ روبن نے خادمہ کو بلا کر کافی کے لیے کہا اور ماسٹر ہوچن سے ہمارے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ چیانگ رائے میں ان کا کوئی آدمی موجود تھا جو ان کی نگرانی کر رہا تھا۔ ان کے ایئرپورٹ پر پہنچتے ہی اس نے بنکاک والوں کو اطلاع دے دی اور وہ ایئرپورٹ پہنچ گئے اور ان پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل گیا۔" چندا روبن نے ماسٹر ہوچن کے خاموش ہونے پر کہا۔

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور کس کے کہنے پر ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟" تھائی نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"لٹل ماسٹر کے ازلی دشمنوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔" چندا روبن نے کہا "دارا اور اس کے ساتھی بنکاک میں ہیں لیکن اس مرتبہ وہ خود پس منظر میں ہے۔ اس نے کچھ اور لوگوں کو آگے کر رکھا ہے جن میں چنگ چی سرفہرست ہے لیکن کچھ اور نام بھی سامنے آئے ہیں اور یہ نام بھی پہلی مرتبہ سنے گئے ہیں۔ اس سے پہلے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا گیا تھا۔"

"مثلاً کون سے نام؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوشنگ۔ جو اس وقت ہماری قید میں ہے۔" اس نے بتایا "اس کے علاوہ میگا اور تان منہ کے نام ہمارے لیے نئے ہیں۔"

"تان منہ۔" میں اچھل پڑا۔ میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی متغیر ہوگیا تھا۔

"کیا بات ہے!" چندا روبن نے باری باری ہماری طرف دیکھا "یہ نام سن کر تم دونوں چونک کیوں گئے۔ جانتے ہو انہیں؟"

"میگا تیراڈ، جنرل کھوراٹ کا آدمی ہے جس نے شاؤلن ٹیمپل تک میرا پیچھا کیا تھا اور ہوشنگ اس کی ساتھی ہے۔" میں نے جواب دیا "اور تان منہ لاؤس کا ایک رئیس ہے جو تھائی کا پیچھا کرتا ہوا چیانگ سائین تک پہنچ گیا تھا اور مجھے حیرت ہے وہ بنکاک بھی پہنچ گیا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" چندا روبن نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "تھائی تو تمہارے ساتھ تھی۔ لاؤس کے کسی رئیس سے اس کا کیا تعلق؟"

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر اسے تھائی کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا۔

"چیانگ سائین سے اٹھارہ میل دور ایک فارم ہاؤس میں اس سے سامنا ہوگیا تھا۔ اس تصادم میں ایک عورت کے ہاتھوں اس کا ساتھی مارا گیا اور اسے ہم نے وارننگ دے کر بھگا دیا اور یہی میری غلطی تھی۔ اسے جانے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا۔"

"یہ واقعی تمہاری غلطی تھی۔" چندا روبن نے کہا "اس قسم کے لوگ کوبرا سے زیادہ زہریلے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تو پہلے موقع پر ہی سر کچل دینا چاہیے۔ ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی جائے تو بعد میں خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ بہرحال ــــ" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "اسے بھی ہم تلاش کرلیں گے۔"

اسی دوران میں خادمہ کافی لے کر آگئی۔ ماسٹر ہوچن اپنا کپ لے کر دوسری سیٹ پر جا بیٹھا جہاں قریب ہی اسٹینڈ پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ اس نے کپ صوفے کے سامنے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ تقریباً دس منٹ تک وہ فون پر بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ دیا اور دوبارہ ہمارے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ہم میگا اور تان منہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"دو دن پہلے تمہاری اطلاع پر ہوچن نے ڈی جے نائٹ کلب پر ریڈ کیا تھا۔" چندا روبن کہہ رہا تھا "ہوشنگ نامی لڑکی تو ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی مگر چنگ چی اپنے دو آدمیوں کے ساتھ فرار ہوگیا تھا۔ ان میں ایک میگا تیراڈ کا نام بھی سننے میں آیا تھا۔"

"میگا تیراڈ جنرل کھوراٹ کا آدمی ہے جو میرا تعاقب کرتا ہوا شاؤلن ٹیمپل تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے کئی آدمیوں

میرے پیچھے لگایا تھا مگر سب بتدریج ختم ہوتے گئے۔ ہوشنگ بھی اسی کی ساتھی ہے جس کے ذریعے اس نے مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس میں بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور وہ فرار ہوگیا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تفصیل سے شاؤلن ٹیمپل کے واقعات کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں، میں نے پوچھا۔

"ہوشنگ کہاں ہے؟"

"اس کوٹھی کے تہ خانے میں۔" چندا روبن نے کہا "کافی پی لو پھر اس سے تمہاری ملاقات کراتے ہیں۔"

کافی پیتے ہوئے میں نے کئی بار جانکی اور تھائی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ دونوں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھیں۔ وہ دونوں چیانگ رائے میں ایک سنگین حادثے سے گزری تھیں۔ انہیں جسمانی تکلیف تو تھی ہی مگر ذہنی طور پر بھی اپ سیٹ تھیں اور یہاں آتے ہی یہ واقعہ پیش آگیا جس نے ان کے ذہنوں کو کچھ زیادہ ہی متاثر کیا تھا اور میرے خیال میں اب انہیں آرام کی ضرورت تھی۔

"ہماری رہائش کا بندوبست کیا ہوگا؟" میں نے ماسٹر ہوچن کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہم یہیں رہیں گے یا ــــ"

"تم لوگ یہیں رہو گے۔" چندا روبن میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بول پڑا "میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ خواتین کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی ہیں اور میرے خیال میں انہیں آرام کی ضرورت ہے۔ آؤ۔ پہلے انہیں کمرا دکھا دوں۔"

یہ بنگلا دو منزلہ تھا اور اوپر جانے کے لیے زینہ اندر ہی سے تھا۔ اوپر ایک بہت بڑا ہال، ایک کچن اور تین بیڈ رومز تھے۔ ہر کمرا شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ چندا روبن ہمیں کمرے دکھاتا رہا۔

"یہ تینوں بیڈ رومز تم تینوں کے استعمال میں رہیں گے۔" اس نے دوبارہ ہال میں آکر کہا پھر جانکی اور تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اب تم لوگ کچھ دیر آرام کرلو۔ دوپہر کا کھانا تیار ہوجائے گا تو بتا دیں گے۔ ہم نیچے لٹل ماسٹر کے ساتھ کچھ باتیں کریں گے۔"

جانکی اور تھائی ایک ہی کمرے میں گھس گئی تھیں۔ ہم دوبارہ نیچے آگئے۔

"ہوشنگ کہاں ہے؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"آؤ۔ تمہیں ہوشنگ سے بھی ملا دیا جائے۔" چندا روبن نے کہا۔

اس مرتبہ ماسٹر ہوچن بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہم تینوں ایک بڑے کمرے میں آگئے۔ یہ بھی بیڈ روم ہی تھا۔ ایک طرف دیوار کے اندر شیشے کے دروازے والی بہت بڑی الماری فٹ تھی جس میں کتابیں آراستہ تھیں۔ انہی کتابوں میں دو تین جگہوں پر کچھ آرائشی چیزیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ انہی میں ایک تقریباً چھ انچ اونچا مہاتما بدھ کا مجسمہ بھی تھا۔

چندا روبن نے الماری کھول کر مجسمے کے پیچھے ہاتھ ڈال کر اس میں لگی ہوئی ایک ناب کو گھمایا۔ اس کے ساتھ ہی الماری اپنی جگہ پر گھوم گئی۔ الماری کے پیچھے ایک کشادہ زینہ تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ اس بتی کا تعلق غالباً اس میکنزم سے تھا جس سے الماری گھومی تھی۔

ہم تینوں زینے سے اتر کر نیچے آگئے۔ سامنے ایک وسیع ہال تھا۔ جس سے آگے تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہال میں ایک میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ توران ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

"اس نے کچھ بتایا؟" چندا روبن نے توران سے پوچھا۔ اس کا اشارہ اس قیدی کی طرف تھا جسے یہاں لایا گیا تھا۔

"میں نے ابھی کچھ پوچھا ہی نہیں سر۔ آپ لوگوں کا انتظار کر رہا تھا۔" توران نے جواب دیا "ویسے وہ بہت بدحواس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ایک دو ہاتھ پڑنے پر ہی سب کچھ اُگل دے گا۔"

"ابھی دیکھتے ہیں۔ پہلے اس لڑکی کے کمرے کا دروازہ کھولو۔" چندا روبن نے کہا۔

توران دائیں طرف والے ایک دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ دروازہ لوہے کی موٹی چادر کا تھا۔ اس میں کوئی کنڈا یا ہینڈل وغیرہ نظر نہیں آرہا تھا البتہ چوکھٹ پر ذرا اوپر ایک پش بٹن لگا ہوا تھا۔ توران نے وہ بٹن دبا دیا۔

لوہے کا دروازہ اپنی جگہ سے سرکتا ہوا دائیں طرف کی دیوار میں غائب ہوگیا۔

کمرا کافی کشادہ تھا۔ چھت بہت اونچی تھی جہاں ایک مرکزی بلب روشن تھا۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ دائیں طرف بیڈ تھا اور آگے باتھ روم کا دروازہ تھا۔ بیڈ پر ہوشنگ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پیٹ اور بائیں کندھے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔

"تت ــــ تم ــــ" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"تمہارا خیال تھا کہ میں ساری زندگی شاؤلن ٹیمپل ہی میں گزار دوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ کافی خوف زدہ تھی۔ اس نے سرمئی بلاؤز اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا اور یہ لباس غالباً کئی دنوں سے اس کے

جسم سے جدا نہیں ہوا تھا۔
"یہاں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی؟" میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔
"زیادتی! یہ عجیب سوال کیا ہے تم نے۔" وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "مجھے دو دن سے زخمی حالت میں اس کمرے میں بند رکھا گیا ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "یہ لوگ دو دن سے مجھ سے الٹے سیدھے سوال کر رہے ہیں۔ میں بتا چکی ہوں کہ میں دارا نام کے کسی شخص کو نہیں جانتی۔ میرا اس نام کے کسی شخص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو پہلی مرتبہ بنکاک آئی ہوں۔ مجھے تو اس حرامی میگا نے پھنسا دیا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ اس نے میگا تیراڈ کو چند موٹی موٹی نہایت فحش قسم کی گالیاں دیں پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "شاؤلن ٹیمپل میں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ تم سے اپنی کسی توہین کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ تمہیں کسی قسم کا سبق سکھانا چاہتا ہے۔ میں نے یہی سمجھا تھا کہ مارشل آرٹ کے کسی مقابلے میں اس نے تمہارے ہاتھوں شکست کھائی ہوگی اور وہ اپنا انتقام لینا چاہتا ہوگا۔ شاؤلن ٹیمپل میں اس قسم کے ڈرامے ہوتے رہتے ہیں اس لیے میں اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہوگئی تھی اور پھر جب تمہارے اغوا کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ بھاگ گیا اور تم مجھے بھی ویرانے میں چھوڑ گئے تو مجھے تم پر اور اس پر بھی بہت غصہ آیا تھا۔
"میں شاؤلن کس طرح پہنچی تھی؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔ میں اس روز کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل گئی اور تین چار روز بعد فان کنگ پہنچ گئی۔ اس کے ایک ہفتے بعد میگا مجھے فان کنگ میں مل گیا۔ دیر تک اپنے طرزِ عمل کی معافی مانگتا رہا اور پھر اس نے مجھے ایک نئی پٹی پڑھائی۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی چندا روبن اور ماسٹر ہوچن نے مداخلت کی۔ کچھ دیر بعد ہوشنگ بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ کہنے لگی۔
"میگا نے مجھے بتایا کہ تم شاؤلن ٹیمپل کے اندر ایک ایسی جگہ سے واقف ہو جہاں منگ خاندان کا صدیوں پرانا خزانہ دفن ہے۔ وہ خزانہ اتنا قیمتی ہے کہ اس کی ایک ایک چیز آج کے دور میں کروڑوں ڈالر مالیت کی ہوسکتی ہے۔ اگر ہم تم سے اس خزانے کا راز معلوم کرلیں تو کسی شہنشاہ کی طرح دولت مند ہوسکتے ہیں۔ اس نے مجھے اس خزانے کے چالیس فی صد حصے کا لالچ دیا اور مجھے اپنے ساتھ بنکاک لے آیا۔ تاکہ تمہیں پکڑ کر خزانے کا راز معلوم کیا جاسکے۔
"یہاں ہماری ملاقات چنگ چی سے ہوئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ چنگ چی نے بتایا کہ تم بنکاک نہیں آئے۔ میگا کو یقین تھا کہ تم یہاں ضرور آؤ گے۔ چنگ چی نے جگہ جگہ اپنے آدمی پھیلا دیے تاکہ تم جیسے ہی بنکاک میں داخل ہو انہیں اطلاع مل جائے۔
"مجھے چنگ چی کے نائٹ کلب میں رقص کے پروگرام مل گئے۔ اس طرح مجھے وقت گزارنے کا بہانہ مل گیا اور پھر ایک رات میں نے چھپ کر میگا اور چنگ چی کی باتیں سن لیں۔ تب مجھے پتا چلا کہ اصل قصہ کیا ہے۔ میگا جنرل کھوراٹ کا آدمی ہے اور تم کسی وقت جنرل کھوراٹ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا چکے ہو اور جنرل کھوراٹ تمہیں ہر قیمت پر اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتا ہے۔ میگا اسی چکر میں تمہارے پیچھے لگا ہوا تھا۔
"ان کی باتوں میں چی فانگ اور دارا نامی کسی شخص کا ذکر بھی آیا تھا لیکن میں ان دونوں کو نہیں جانتی نہ ہی انہیں کبھی دیکھا ہے لیکن بہرحال اصل بات معلوم ہونے کے بعد میں خوف زدہ ہوگئی تھی اور یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی۔ ایک موقع پر میں نے ایسی کوشش بھی کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں کنچن بوری سے ہوتی ہوئی برما کی طرف نکل جاؤں گی لیکن بنکاک سینٹرل ریلوے اسٹیشن پر پکڑی گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ ان کے شکنجے سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ میری نگرانی کی جاتی تھی۔
"اور پھر اس روز میں دوپہر کے وقت ڈی جے کلب کی اوپر والی منزل پر اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ شور کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ کلب میں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ دو آدمی میرے کمرے میں بھی گھس آئے تھے اور مجھے پکڑ کر کلب سے نکال لے گئے۔ پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ پولیس نے چھاپا مارا ہے لیکن بعد میں پتا چلا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ یہ لوگ مجھے کسی بنگلے میں لے گئے۔ اس بنگلے پر بھی حملہ ہوگیا۔ اس مرتبہ شاید مجھے ہی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں واقعی بہت ڈھیٹ اور سخت جان ہوں کہ دو گولیاں لگنے کے باوجود اب تک زندہ ہوں۔"
"تم سمجھتی ہو کہ میں نے تمہاری کہانی پر یقین کرلیا ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔
"انہوں نے بھی یقین نہیں کیا۔" ہوشنگ نے چندا روبن اور ماسٹر ہوچن کی طرف اشارہ کیا "مگر سچ وہی ہے جو میں بتا چکی ہوں۔ اس کے سوا میں کچھ نہیں جانتی اور نہ ہی کچھ بتا سکتی ہوں۔"
"شاید تم نے اپنی زبان اس لیے بند رکھی ہے کہ تمہارے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جارہا ہے۔" میں نے کہا "لیکن میرا پوچھ گچھ کا طریقہ ان سے قدرے مختلف ہے۔ میں پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کردیتا ہوں۔ تم مجھے اچھی طرح جان چکی ہو۔ میں اس بات کی بھی پروا نہیں کروں گا کہ تم عورت ہو یا زخمی ہو۔ میں تم سے صرف چند سوال پوچھوں گا۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک جواب دے دو گی تو میں تمہاری کچھ مدد بھی کرسکوں گا لیکن میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔"
"سچ وہی ہے جو میں بتا چکی ہوں۔" ہوشنگ نے جواب دیا۔
"یہ لوگ تمہاری کسی بھی کہانی پر یقین کرسکتے ہیں۔" میں نے چندا روبن اور ماسٹر ہوچن کی طرف اشارہ کیا "اگر تم رو رو کر بار بار یہی کہانی دہراؤ گی تو یہ لوگ تمہیں معصوم اور مظلوم سمجھ لیں گے لیکن میں نہیں کیونکہ میں تمہیں بہت اچھی طرح جان چکا ہوں۔ اس لیے میں تم سے کہانیاں نہیں صرف اور صرف سچ سننا چاہوں گا۔"
"یہی سچ..."
"ہاں۔ صرف سچ!" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر چندا روبن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس کے زخموں کی پوزیشن کیا ہے؟"
"پیٹ میں اور ہنسلی کی ہڈی کے قریب گولیاں لگی تھیں۔" چندا روبن کے بجائے ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "گولیاں نکال دی گئی ہیں۔ تقریباً چار بوتل خون دیا گیا ہے۔ تب کہیں بچ سکی ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد ڈاکٹر اسے چیک کر رہا ہے۔ اس وقت تو اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر نظر آرہی ہے۔ میرا خیال ہے دو چار روز میں یہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگے گی۔"
میں نے ایک بار پھر بغور ہوشنگ کا جائزہ لیا۔ تکلیف اور پھر خوف کی وجہ سے اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ کندھے والی پٹی پر سرخ دھبا سا نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنا بایاں پیر پلنگ کی پٹی پر رکھ لیا اور پتلون کا پائنچہ کچھ اوپر اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا۔
میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر ہوشنگ کے چہرے پر خوف کے سائے کچھ اور گہرے ہوگئے۔ آنکھوں میں ویرانی سی چھاگئی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے پیٹ پر بندھی ہوئی پٹی کے نیچے رکھ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پٹی کٹتی چلی گئی۔ میں نے خنجر ہی کی نوک سے پٹی سے کٹے ہوئے دونوں حصوں کو الگ الگ کردیا اور زخم پر رکھا ہوا کاٹن ہٹانے لگا۔
چندا روبن اور ماسٹر ہوچن بھی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ہوشنگ کی حالت تو ایسی تھی جیسے وہ ابھی چیخ پڑے گی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ زخم پر رکھنا چاہا تو میں نے خنجر کی نوک اس کے ہاتھ کی پشت پر چبھو دی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔
ناف سے ذرا اوپر زخم خاصا بڑا تھا۔ گولی نکالنے کے لیے آپریشن کیا گیا تھا جس سے زخم پھیل گیا تھا۔ دس بارہ ٹانکے لگے ہوئے تھے۔
"یہ لوگ بہت رحمدل ہیں۔" میں نے چندا روبن اور ہوچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان پر کبھی ظلم نہیں ہوا۔ انہیں کبھی تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ ان کی نظروں کے سامنے ان کے کسی عزیز کو ذبح نہیں کیا گیا اس لیے یہ لوگ نہیں جانتے کہ ظلم اور تشدد کیا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کسی پر ظلم کرنا بھی نہیں جانتے۔ تمہارے ساتھ تو انہوں نے بہت رحم دلی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن میں ان سے بہت مختلف ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ کو ذبح ہوتے دیکھا ہے۔ میں اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگتا رہا ہوں۔ خونی بھیڑیے میرا پیچھا کرتے رہے ہیں۔ میں ایک لمحہ بھی کبھی سکون سے نہیں بیٹھ سکا۔ جان کا خوف ہر ہر لمحہ میرے ذہن پر سوار رہا۔ میں نے بے پناہ ظلم برداشت کیے ہیں۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو خوف سے ہی مر چکا ہوتا لیکن میں بہت سخت جان واقع ہوا ہوں۔ مجھے صرف ایک چیز زندہ رکھے ہوئے ہے۔ انتقام۔۔۔ اپنے بے گناہ ماں باپ کے قتل کا انتقام۔۔۔ اپنی بربادی کا انتقام جو میری رگوں میں دوڑنے والے خون میں رچ بس گیا ہے اور تم جانتی ہو... کہ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا انسان اس حد تک آگے چلا جاتا ہے کہ وہ انسانیت کو بھی بھول جاتا ہے۔ میں بھی انتقام کی آگ میں جل رہا ہوں اور انسانیت کو بھول چکا ہوں۔ میں درندہ ہوں جس کے دل میں درگزر اور رحم نام کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ میں اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں اپنے دشمنوں کی تلاش میں ہوں اور تم جانتی ہو وہ لوگ کہاں ہیں۔" میں خاموش ہو کر ہوشنگ کی طرف دیکھنے لگا۔ خوف سے اس کا چہرہ ایک دم سیاہ پڑ گیا تھا اور جسم پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے زخم کے قریب پیٹ پر رکھ دی "میرے ہاتھ کا ایک ہلکا سا جھٹکا تمہارا پیٹ چاک کردے گا۔ تمہاری آنتیں

باہر نکل آئیں گی اور۔۔۔"

"نہیں۔" ہوشنگ ہذیانی انداز میں چیخ اٹھی "تم ایسا نہیں کرسکتے۔ تم ایسا نہیں کروگے۔"

"مجھے کون روک سکے گا۔" میں نے کہا "مجھے یاد ہے چند سال پہلے دارا نے میری ایک ہمدرد کا پیٹ اسی طرح چاک کیا تھا اور میں تمہارا پیٹ چاک کرنے میں جھجک کیوں محسوس کروں گا۔ مجھے تم پر بالکل رحم نہیں آئے گا۔"

"نہیں نہیں۔ تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ ایک بار پھر چیخی۔

"سنو ہوشنگ۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "میری تمہاری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے پیسے کے لالچ میں میرے ساتھ کچھ زیادتیاں کی ہیں اور تمہیں یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ تم پر جب بھی برا وقت آیا تمہیں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ شاؤلن ٹیمپل میں بھی میگا تمہیں ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا اور یہاں بھی میرے آدمیوں نے تمہیں نائٹ کلب سے اٹھایا تو انہوں نے تمہیں جان سے ماردینے کی کوشش کی تاکہ تم ان کے بارے میں کچھ نہ بتا سکو۔ موقع ملتے ہی وہ لوگ تمہیں پھر جان سے مارنے کی کوشش کریں گے۔ کیا تم ایسے لوگوں پر بھروسا کرسکتی ہو جو تمہاری جان کے دشمن ہوں؟

"میں تمہاری جاں بخشی کرسکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم یہ بتادو کہ وہ لوگ کہاں ہیں۔ بصورتِ دیگر میں تمہارا پیٹ چاک کروں گا اور مجھے تمہاری موت کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

میں نے اس کے پیٹ پر خنجر کی نوک کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ چیخ اٹھی۔

"اب بھی تمہارے پاس وقت ہے۔" میں غرایا "میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔ اگر اب بھی تم نے زبان نہ کھولی تو میرا ہاتھ حرکت میں آجائے گا۔"

"ٹھ۔۔۔ ٹھہرو۔" وہ چیخی "ب۔۔۔ بتاتی ہوں۔۔۔"

"گڈ۔" میں نے خنجر ہٹالیا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب تم بولنا شروع کردو۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ دارا کہاں ہے؟"

وہ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ماسٹر ہوچن کو اشارہ کیا۔ اس نے کاٹن دوبارہ زخم پر رکھ دی۔ پٹی تو میں کاٹ چکا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر دوسری پٹی باندھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"بتاؤ۔ دارا کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"مم۔۔۔ میں دارا کو نہیں جانتی۔" وہ گہرے سانس لیتے ہوئے بولی "سچ کہتی ہوں۔ میں اسے نہیں جانتی۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔۔۔صرف نام سنا ہے۔"

"چنگ چی کا دارا سے کیا تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔" ہوشنگ نے جواب دیا "میگا مجھے چنگ چی کے پاس لے کر آیا تھا اور مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ وہ چنگ چی کی مدد سے تمہیں تلاش کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اصل کہانی معلوم نہیں تھی۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ تم شاؤلن ٹیمپل میں منگ خاندان کے کسی دفینے کے راز سے واقف ہو۔ اتفاق سے میں نے ایک روز چوری چھپے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔ جس سے پتا چلا کہ اصل معاملہ کچھ اور ہے اور میگا تمہیں ہر حالت میں گولڈن ٹرائی اینگل لے جانا چاہتا ہے۔ ان کی باتوں میں دارا اور چی فانگ کا نام بھی آیا تھا۔ وہ دونوں بھی میگا کے ساتھی ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ چنگ چی کے نائٹ کلب میں آتے رہے ہوں مگر میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"مجھے کس کے کہنے پر اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"چنگ چی اور میگا نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔" ہوشنگ نے جواب دیا "چند روز پہلے تان منہ نامی ایک شخص نے نائٹ کلب میں ان سے ملاقات کی تھی۔"

"تان منہ۔" میں اچھل پڑا۔

"ہاں۔ یہی نام بتایا تھا اس نے۔" ہوشنگ نے کہا "وہ لاؤس کا رہنے والا ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ تم ہوئے سائی سے اس کی عورت کو بھگا کر چیانگ سائین لے آئے ہو جہاں اس کا ایک آدمی بھی تمہارے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ وہ تمہارے خلاف کارروائی کرنا چاہتا تھا مگر تم تھالوب نامی کسی شخص کے پاس چلے گئے۔ جس کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ بہت طاقت ور قبائلی سردار ہے۔ اس کی موجودگی میں تمہارے خلاف کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تان منہ بنکاک آگیا۔ یہاں اس نے چنگ چی اور میگا تیراڈ سے رابطہ کیا۔"

"کیا وہ پہلے سے انہیں جانتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے یہ لوگ پہلے سے ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہوں۔" ہوشنگ نے جواب دیا "تان منہ نے کہا تھا کہ تھائی نامی عورت کو تمہارے قبضے سے آزاد کراکے اس کے حوالے کردیا جائے۔ وہ منہ مانگا معاوضہ دے گا۔ اس کے بعد ہی انہوں نے پروگرام بنایا تھا اور چیانگ رائے میں اپنے آدمیوں کو مطلع کردیا تھا کہ تم لوگوں پر نگاہ رکھی جائے۔

"میگا تو تمہیں زندہ ہی پکڑنا چاہتا تھا تاکہ جنرل کھوراٹ کے سامنے پیش کیا جاسکے لیکن اسی رات چنگ چی کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ میں بھی اس وقت اس کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ چنگ چی نے فون پر باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم لوگوں کو چیانگ رائے ہی میں ختم کردیا جائے گا اور اس کے بعد اس نے فون پر چیانگ رائے میں اپنے آدمیوں کو اس قسم کی ہدایات بھی دی تھیں۔

"تم لوگ تو چیانگ رائے میں بچ گئے لیکن یہاں میگا تیراڈ اور چنگ چی کی شامت آگئی۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ یہاں تمہارے آدمی اتنی جلدی کوئی کارروائی کریں گے مگر میگا اور چنگ چی کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ تان منہ بھی ان کے ساتھ ہی تھا مگر میں پھنس گئی۔"

"آج صبح بھی ان کے آدمیوں نے ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "اس کا مطلب ہے کہ وہ کسی محفوظ جگہ پر ہیں اور تم ان کے ٹھکانے کے بارے میں ضرور جانتی ہوگی۔"

"وہ دونوں ایک مرتبہ مجھے ایکامائی روڈ پر واقع برونائی کے سفارت خانے کے پچھلی طرف ایک بنگلے میں لے گئے تھے۔ میگا تو واپس آگیا تھا اور میں چنگ چی کے ساتھ تین دن اسی بنگلے میں رہی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ اسی بنگلے میں چھپے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ میں ان کے کسی اور ٹھکانے کے بارے میں نہیں جانتی۔" ہوشنگ نے کہا۔

وہ اس بنگلے کا نمبر نہیں جانتی تھی لیکن اس نے لوکیشن سمجھادی اور یہ لوکیشن بھی اسے برونائی کے سفارت خانے کی وجہ سے یاد رہ گئی تھی۔

"وہاں اور کون کون ہوسکتا ہے؟" میں نے ہوشنگ سے آخری سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" ہوشنگ نے جواب دیا "جب مجھے وہاں لے جایا گیا تھا تو ایک بوڑھی خادمہ کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے ہوشنگ۔" میں نے کہا "میں ان سے کہوں گا کہ ڈاکٹر کو بلا کر تمہاری ڈریسنگ کردی جائے۔ اگر اس بنگلے سے چنگ چی یا اس کے کسی ساتھی کا سراغ مل گیا تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا اور اگر یہ پتا چلا کہ چنگ چی یا میگا تیراڈ کا اس بنگلے سے کوئی تعلق نہیں اور انہیں کبھی وہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تو تم سمجھ سکتی ہو کہ تمہارا انجام کیا ہوگا۔"

ہوشنگ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے ساتھ کرب کے آثار بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کا زخم خاصا سیریس تھا اور اسے آرام کی ضرورت تھی۔ جبکہ میں نے اس کا زخم کھول کر خنجر کی نوک اس کے پیٹ پر رکھ دی تھی اور اسے مزید دہلا دیا تھا۔ حالانکہ اسے مزید زخمی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اگر میں یہ حربہ استعمال نہ کرتا تو وہ زبان بھی نہ کھولتی۔ اس نے اگرچہ اس بنگلے کا پتا بتادیا تھا جہاں وہ چنگ چی کے ساتھ دو تین دن رہی تھی لیکن میرے حوالے سے میگا کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی' وہ جھوٹی تھی۔ یہ غلط تھا کہ میگا نے اسے کسی خزانے میں حصے کا لالچ دیا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں اس نے مجھے کوئی اور کہانی سنائی تھی۔

ہم تینوں اس کمرے سے باہر آگئے۔ ماسٹر ہوچن نے چوکھٹ پر لگا ہوا بٹن دبا کر دروازہ بند کردیا۔ توران اس دوران میں باہر ہی کھڑا رہا تھا۔ اس نے ہوچن کا اشارہ پاکر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازہ بھی اسی قسم کا تھا۔ اس لحاظ سے یہ تہ خانہ اس حد تک محفوظ ہوگیا تھا کہ کمروں کے دروازے بند کرنے کے بعد اگر تہ خانے میں آمدورفت کا راستہ کھلا بھی رہ جاتا تو قیدیوں کے فرار ہونے کا اندیشہ نہیں تھا۔

دوسرا کمرا بھی اسی طرح کا تھا۔ سپاٹ دیواریں اور ایک بیڈ۔ پچھلی طرف ایک باتھ روم تھا۔ وہ آدمی بیڈ پر اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس نے دایاں گھٹنا کھڑا کر رکھا تھا۔ پائنچہ اوپر چڑھا ہوا تھا اور پنڈلی خون آلود تھی۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ ماسٹر ہوچن نے بتایا تھا کہ سڑک پر جب پولیس آگئی تھی تو اس شخص نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر توران نے اس کی ٹانگ پر خنجر سے وار کرکے زخمی کردیا تھا۔ زخم اگرچہ معمولی تھا مگر مسلسل خون بہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگ تر ہو رہی تھی اور خون جوتے پر بھی جما ہوا تھا۔

ہمیں دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے صرف ایک ٹانگ پر زور دے رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں ہوگئے تھے۔

"توران۔ اس سے پوچھو کہ اس نے کس کے کہنے پر ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ لوگ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔" میں نے توران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

توران نے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکال لیا۔ اس خنجر کا پھل آگے سے کسی قدر چوڑا اور مڑا ہوا تھا۔ اس نے

آگے بڑھ کر خنجر کو اس کے چہرے کے سامنے لہرایا اور اچانک ہی بائیں ہاتھ کا پنچ اس کے جبڑے پر رسید کردیا۔ وہ شخص کراہتا ہوا پشت کے بل بیڈ پر گرا۔ توران بھی چھلانگ لگا کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ بائیں ہاتھ سے اس کے بال جکڑ لیے اور خنجر اس کے کان سے ذرا نیچے گردن پر رکھ دیا۔

"یہاں سے تمہاری صرف ایک نس کٹے گی اور تمہارے جسم کا سارا خون بہہ جائے گا۔" توران کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی۔

"ب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" وہ شخص ہکلایا۔ اس کا چہرہ خوف سے ایک دم سیاہ پڑگیا تھا۔

توران نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سرہلا دیا اور وہ اس شخص کو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ وہ شخص بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک اپنا جبڑا سہلاتا رہا پھر بولا۔

"میگا تیراؤ نے حکم دیا تھا کہ تم لوگوں کو ائرپورٹ سے اغوا کرکے بروتائی کے سفارت خانے کے پیچھے ایک بنگلے میں پہنچا دیا جائے۔ وہاں وہ لوگ ہمارا انتظار کرتے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر اب دو گھنٹے ہوچکے ہیں۔ انہیں گڑبڑ کی اطلاع مل چکی ہوگی اور وہ لوگ وہاں سے چلے گئے ہوں گے۔"

اس شخص کی باتوں سے ہوشنگ کے بیان کی تصدیق ہوگئی تھی کہ چنگ چی اور میگا بروتائی کے سفارت خانے کے عقب میں واقع کسی بنگلے میں روپوش تھے اور اس شخص نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا' انہیں دیر ہوجانے کے باعث میگا وغیرہ کو کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا ہوگا اور ممکن ہے وہ لوگ اب تک وہاں سے غائب ہوچکے ہوں۔

"ان کا کوئی اور ٹھکانا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔

"ڈی جے نائٹ کلب۔" اس شخص نے جواب دیا "لیکن اب وہاں کوئی نہیں ملے گا۔ چند روز پہلے ان لوگوں نے وہاں چھاپا مارا تھا تو اس وقت سب لوگ بھاگ گئے تھے۔"

"دارا اور چی فانگ کہاں ملیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے دارا کا صرف نام سنا ہے' دیکھا نہیں۔ البتہ چی فانگ کو میں جانتا ہوں۔ وہ آج کل مادام اوتوکو کے ساتھ رہ رہا ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"مادام اوتوکو کون ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"رقاصہ ہے۔ خود ریٹائر ہوچکی ہے۔ اس نے تین چار لڑکیاں رکھی ہوئی ہیں جن کے سر پر وہ عیش کررہی ہے۔" اس نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "مادام اوتوکو دراصل ٹائیگر کی داشتہ تھی۔ ٹائیگر کی موت کے بعد وہ پیڈرو کی تحویل میں آگئی۔ پیڈرو مارا گیا تو مختلف لوگوں کے ساتھ رہی۔ چی فانگ گولڈن ٹرائی اینگل سے واپس آیا تو اس وقت سے مادام کے ساتھ رہ رہا ہے۔"

"اور یہ مادام اوتوکو کہاں رہتی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ناتا نوا روڈ پر واقع آکاش بلڈنگ کے پنٹ ہاؤس میں۔" اس نے جواب دیا "لیکن کسی اجنبی کے لیے اس بلڈنگ میں داخل ہونا آسان نہیں۔ وہ بہت بڑی بلڈنگ ہے جہاں دولت مند لوگوں کی رہائش ہے۔ گیٹ پر بڑی سخت سیکیورٹی ہے۔ ہر فلیٹ سیکیورٹی کے مرکزی نظام سے وابستہ ہے۔ میرا خیال ہے تم لوگ وہاں داخل نہیں ہوسکو گے۔"

"یہ ہمارا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا "بہرحال' تم اس وقت تک رہو گے جب تک وہ لوگ ہمارے قابو میں نہیں آجاتے۔"

"مم۔۔۔ میری ٹانگ میں تکلیف ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا "میری ڈریسنگ کرادو۔ خون زیادہ بہہ گیا تو۔۔۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" چندا روبن نے کہا "ڈریسنگ کردیں گے۔ فی الحال آرام سے یہاں لیٹے رہو۔"

ہم لوگ تہ خانے سے باہر آگئے۔ اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ خادمہ نے بتایا کہ کھانا تیار ہوچکا ہے۔

"تم لوگ بیٹھو۔ میں اوپر سے جانکی اور تھائی کو بلا لاؤں۔" میں کہتے ہوئے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

جانکی اور تھائی ایک ہی کمرے میں تھیں۔ جانکی تو گہری نیند سو رہی تھی۔ تھائی اس کے قریب ہی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی۔

"کھانا تیار ہوچکا ہے۔ جانکی کو بھی جگا دو۔" میں نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"اسے سونے دو۔" تھائی آہستگی سے بیڈ سے اترتے ہوئے بولی "اس نے کہا تھا کہ اگر سوجائے تو جگایا نہ جائے۔"

ہم دونوں کمرے سے باہر آگئے اور کچھ ہی دیر بعد ہم نیچے ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ میز پر کھانا لگا ہوا تھا اور چندا روبن اور ماسٹر ہوچن ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ توران کچن ہی میں ایک کرسی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا اگرچہ پر تکلف تھا۔ تین چار چیزیں تھیں مگر میری بھوک مرچکی تھی۔ میں نے صرف تھائی سوپ پر ہی اکتفا کیا۔ تھائی

نے بھی بہت کم کھایا تھا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں آگئے اور تھوڑی ہی دیر بعد خادمہ نے ہمارے سامنے کافی سرو کردی۔

"میں نے مہاراج کو فون پر اب تک کی صورت حال سے آگاہ کردیا تھا۔" ماسٹر ہوچن نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "مہاراج رات کو یہاں آئیں گے۔ میں نے ہوشنگ والے بنگلے اور آکاش بلڈنگ کی نگرانی کے لیے بھی کہہ دیا ہے۔ تم بہت تھک چکے ہوگے۔ چائے پینے کے بعد آرام کرو۔ جو کچھ بھی ہوگا شام کو دیکھا جائے گا۔"

میں اس وقت خاموش رہا۔ چائے پینے کے بعد تھائی اوپر چلی گئی۔ چندا روبن بھی باہر نکل گیا۔ میں اور ماسٹر ہوچن باتیں کرنے لگے۔ یہاں آتے ہی ہنگامہ شروع ہوگیا تھا اور اب پہلی مرتبہ ہمیں اس طرح آرام سے بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ ہم دیر تک باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن کھانا کھانے کے بعد مجھ پر سستی سی طاری ہونے لگی۔ میرے لیے بیٹھنا مشکل ہورہا تھا۔ نیند کے جھونکے آرہے تھے۔ ماسٹر ہوچن میری کیفیت کو سمجھ گیا اور میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے لٹل ماسٹر۔ اب تم اوپر جاکر آرام کرو۔ شام کو باتیں ہوں گی۔"

میں صوفے سے اٹھ گیا۔ اوپر آکر اس کمرے میں جھانکا۔ تھائی بھی جانکی کے ساتھ اسی بیڈ پر سو رہی تھی۔ میں سامنے والے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

مجھے شام چھ بجے کے قریب جانکی نے جگایا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ عجیب یتیمی سی برس رہی تھی۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" میں اس کی شکل دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

"پیٹ میں اینٹھن ہورہی ہے۔" وہ پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ تمہیں یاد ہے ہم نے تو صبح ناشتے کے بعد کچھ بھی نہیں کھایا۔"

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ بھوک کبھی بھی جانکی سے برداشت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ صبح چیانگ رائے میں سردار تھالوب کے گھر سے ناشتا کرکے نکلے تھے۔ بنکاک ائرپورٹ سے نکلتے ہی ہنگامہ شروع ہوگیا تھا۔ بارہ بجے کے قریب اس بنگلے میں آکر ایک ایک کپ کافی کا پیا تھا اور پھر دو بجے کے قریب ہم نے تو کھانا کھالیا تھا مگر جانکی اس وقت سو رہی تھی۔

"ہم نے تو دوپہر کو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم سو رہی تھیں اور تم نے ہی تھائی کو منع کیا تھا کہ جگایا نہ جائے۔"

"اس وقت بڑے زور کی نیند آرہی تھی۔" جانکی بولی۔

"اور اب بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا "تھائی کہاں ہے۔"

"وہ باتھ روم میں ہے۔" جانکی نے جواب دیا۔

"نیچے خادمہ سے جاکر کہہ دو ناکہ تمہیں کچھ کھانے کو دے دے لیکن ٹھہرو۔ میں خود کہہ کر آتا ہوں۔ چائے کے لیے بھی کہہ دوں گا۔" میں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نیچے نہ تو ماسٹر ہوچن تھا اور نہ ہی چندا روبن۔ وہ دونوں باہر گئے ہوئے تھے۔ البتہ توران باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کچن میں برتنوں کی آواز آرہی تھی۔ میں کچن کے دروازے پر آگیا۔ خادمہ میری طرف دیکھ کر مسکرادی۔

"چائے کی طلب ہورہی ہے؟" وہ بولی "چند منٹ لگیں گے۔ بس میں تیار کررہی ہوں۔"

"میری ایک ساتھی نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ اسے بھوک لگ رہی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ہو تو۔۔۔"

"میں نے ڈاکٹر جانکی کے لیے کھانا رکھا ہوا ہے۔" خادمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "صرف چند منٹ میں آواز دے دوں گی۔"

"تم ڈاکٹر جانکی کو جانتی ہو؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کئی سال پہلے میں نے اپنی بیٹی کا علاج اس سے کروایا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے میری بیٹی کو نئی زندگی دی تھی۔ ڈاکٹر جانکی تو مجھے بھول گئی ہے مگر میں اسے کس طرح بھول سکتی ہوں۔ بہرحال' کھانا اوون میں رکھا ہوا ہے۔ چائے تیار ہونے میں چند منٹ لگیں گے۔ میں آواز دے دوں گی۔"

میں اوپر آگیا اور جانکی کو بتایا کہ خادمہ اس سے اپنی بیٹی کا علاج کرواچکی ہے اور اسے اچھی طرح جانتی ہے۔

"جانتی ہوگی۔" جانکی نے کندھے اچکا دیے "میں سرکاری اسپتال میں تھی اور بعد میں پرائیویٹ کلینک میں پریکٹس کرتی رہی۔ میرے پاس سیکڑوں مریض آتے تھے۔ بہت سے لوگ مجھے جانتے ہوں گے مگر میرے لیے تو ہر ایک کو یاد رکھنا ممکن نہیں۔ صبح میں نے اسے دیکھا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔ اب دیکھوں گی' شاید پہچان لوں۔"

میں جانکی کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کے باتھ روم میں

گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے میری کسل مندی دور ہوگئی۔ جب میں باہر نکلا تو تھائی اور جانکی کمرے کے سامنے ہی کھڑی تھیں۔ اسی وقت ادھیڑ عمر خادمہ بھی زینے پر نمودار ہوئی۔ ہمیں دیکھ کر وہ واپس مڑ گئی۔

ڈائننگ روم میں میز پر جانکی کے لیے کھانا اور ہمارے لیے چائے رکھی ہوئی تھی۔ جانکی کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے واقعی کئی روز سے فاقے سے ہو۔ قریب کھڑی ہوئی خادمہ بھی مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جانکی نے چند منٹ میں ہی پلیٹیں صاف کردیں اور پھر چائے کا کپ اٹھالیا۔ اس دوران میں ہمارے چائے کے کپ صرف آدھے ہی ہوئے تھے۔

"باہر لان میں چل کر بیٹھیں۔ کھلی ہوا میں۔" تھائی نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"چلو۔" میں نے بھی اپنا کپ اٹھالیا۔

جانکی اس وقت خادمہ سے باتوں میں مصروف ہوچکی تھی۔ وہ جانکی کو یاد دلانے کی کوشش کررہی تھی کہ اس نے کس طرح اس کی بیٹی کی جان بچائی تھی۔

میں اور تھائی لان میں آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دھوپ رخصت ہورہی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ تھوڑی دیر بعد جانکی بھی وہیں آگئی۔

ہم تقریباً ایک سال بعد بنکاک واپس آئے تھے اور یہاں آتے ہی ہنگامے شروع ہوگئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ ہنگامے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ میری ساری زندگی اسی طرح مار دھاڑ میں گزر جائے گی اور میں اور کچھ نہیں کرسکوں گا۔

مہاراج نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ مجھے قاتلوں سے پناہ دی تھی اور ایک خاص انداز میں میری پرورش کی تھی۔ میں بہت عرصے سے سنتا آرہا تھا کہ مہاراج مجھ سے کوئی خاص کام لینا چاہتے ہیں اور وہ کام بھی میرے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ شہنشاہ کے خلاف سازش کچلی جاچکی تھی۔ کچھ سازشی عناصر اگرچہ اس وقت بچ نکلے تھے مگر اب ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مہاراج کی خواہش پر میں نے شاؤلن ٹیمپل سے ٹریننگ بھی حاصل کرلی تھی۔ میرا خیال تھا کہ واپس آؤں گا تو امن و سکون سے زندگی گزار سکوں گا مگر یہاں پھر وہی ہنگامے میرے منتظر تھے۔

میں ایک ایسا جنگ جو بن کر رہ گیا تھا جس کے لیے کوئی اور انتخاب نہیں رہا تھا لیکن میں اب ان ہنگاموں سے اکتا گیا تھا۔ پرسکون زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب تک اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو جہنم رسید نہیں کردوں گا مجھے سکون نہیں آئے گا۔ یہی میری زندگی کا مقصد تھا۔ چند گھنٹے پہلے میں نے یہی بات ہوشنگ سے بھی کہی تھی کہ انتقام ہماری رگوں میں رچ بس گیا ہے۔ ہم بعض اوقات انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ انسان اور انسانیت کو بھی بھول جاتے ہیں۔ انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے میں بھی انسانیت کو بھول گیا تھا۔ لیکن۔۔۔ اپنی بربادی کے ساتھ مجھے ان لوگوں کا بھی خیال تھا جو میری خاطر برباد ہوئے تھے۔ اپنی جانیں تک قربان کردی تھیں۔ اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا۔ تھائی اور جانکی چند سال پہلے تک اسی شہر میں عیش و آرام کی زندگی گزارتی تھیں۔ آزادی سے گھومتی پھرتی تھیں کوئی خوف نہیں تھا انہیں لیکن میرا ساتھ دینے کے جرم میں ان کا سب کچھ تباہ کردیا گیا تھا۔ انہیں ہر چیز سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اپنی جان کے خوف سے میرے ساتھ دنیا کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک بھاگتی پھری تھیں اور اب بھی اس بنگلے میں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کیا یہ بھی میری طرح زندگی بھر ایسے ہی بھاگتی رہیں گی۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کار کے ہارن کی آواز سے میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ آواز گیٹ کے بالکل سامنے سے آئی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ گیٹ کی جھریوں سے روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ کار گیٹ کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ میرا خیال تھا برآمدے میں بیٹھا ہوا توران اٹھ کر گیٹ کھولے گا مگر وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور پھر اسی لمحے کڑک کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور گیٹ کے دونوں پٹ خود بخود اندر کی طرف کھلنے لگے۔ گیٹ میں الیکٹرک سسٹم تھا اور اندر ہی سے کوئی بٹن دبا کر گیٹ کھولا گیا تھا اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ صبح جب ہمارے آنے پر گیٹ کھلا تھا تو کوئی آدمی دکھائی کیوں نہیں دیا تھا۔ اس وقت بھی خادمہ نے اندر ہی سے بٹن دبا کر گیٹ کھولا تھا۔

کار اندر داخل ہونے کے بعد گیٹ بند ہوگیا۔ کار پورچ میں جاکر رکی۔ میں نے اسٹیرنگ کے سامنے ماسٹر ہوچن کو دیکھ لیا تھا۔ میں نے جانکی اور تھائی کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود اٹھ کر کار کے قریب آگیا۔ ماسٹر ہوچن جیسے ہی انجن بند کرکے کار سے اترا، میں نے اسے بو کیا اور پھر ہم دونوں لان ہی میں آگئے۔

"میں تو سارا دن سویا رہا۔ کوئی خاص خبر ماسٹر؟" میں نے

...نگاہوں سے ماسٹر کی طرف دیکھا۔

"جنگ چی کے بنگلے اور آکاش بلڈنگ کی نگرانی جاری ..." ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "جنگ چی کے بنگلے میں کسی ...تے جاتے نہیں دیکھا گیا۔ البتہ چی فانگ کے بارے میں ...لی ہے کہ وہ آکاش بلڈنگ ہی میں رہ رہا ہے لیکن وہ ...بجے کے قریب بلڈنگ سے باہر گیا تھا اور ابھی تک ...نہیں آیا۔ وہ جیسے ہی واپس آئے گا بلڈنگ پر ہلہ بول ...ئے گا۔"

"چندا روبن کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے ذاتی کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔ نو بجے تک ...ئے گا۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا۔

اسی دوران میں خادمہ ماسٹر ہوچن کے لیے چائے لے ... چائے کے دوران میں بھی ماسٹر ہوچن بولتا رہا۔ جانکی ...ھائی خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔

ہم کافی دیر لان میں بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر اندر ... نو بجے کے قریب چندا روبن بھی پہنچ گیا اور اس کے ...ڑی ہی دیر بعد ایک اور گاڑی گیٹ کے سامنے آکر رکی۔ ...نے برآمدے والے دروازے کے قریب ہی سوئچ بورڈ ...ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ باہر کا گیٹ کھل گیا۔

میں جس جگہ بیٹھا ہوا تھا وہاں کھڑکی سے باہر کا گیٹ ... نظر آرہا تھا۔ سفید رنگ کی ایک بہت شان دار لمبی سی ...یٹ میں داخل ہوکر پورچ میں چندا روبن کی کار کے پیچھے ...ئی۔ برآمدے میں جلنے والی ٹیوب کی روشنی میں کار میں ...ٹھے ہوئے افراد کو دیکھ کر میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ ماسٹر ...اور چندا روبن بھی دروازے کی طرف لپکے تھے۔

...جب برآمدے میں پہنچے تو کار کا ڈرائیونگ سائڈ کا ...کھل چکا تھا۔ ایک باوردی شوفر نیچے اتر کر پچھلی ...ٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر رتنا کوسن اور ...کے ساتھ ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آگے پسنجرز سیٹ ...راج بیٹھے ہوئے تھے۔ ماسٹر ہوچن نے تیزی سے آگے ...پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور مہاراج بھی نیچے اتر

...میں نے آگے بڑھ کر مہاراج کو بو کیا۔ مہاراج حسب ...بدھ بھکشوؤں والے لباس میں تھے۔ پیلی چادر جو ...انداز میں جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ پیروں میں سلیپر تھے۔ ...چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے اور پھر دونوں بانہیں ...میں بے اختیار ہوکر مہاراج کے سینے سے لپٹ گیا ...جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ مہاراج مجھے سینے سے بھینچے رہے اور ایک ہاتھ سے میرا کندھا تھپتھپاتے رہے۔

مہاراج وانگ ونگ یائے میرا روحانی باپ بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور مہاراج نے میرے لیے جس طرح اپنی آغوش وا کی تھی، اس سے تو میں اور بھی بے قابو ہوگیا تھا اور ان کے بوڑھے سینے سے لپٹ کر بے اختیار رو دیا تھا۔

مہاراج نے مجھے اپنے سے الگ کیا۔ دونوں بانہوں سے پکڑ کر میرے چہرے کو دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی پراسرار سی مسکراہٹ آگئی تھی پھر انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور رتنا کوسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"رتنا کوسن بھی تم سے ملنے کو بے چین تھے۔"

میں نے رتنا کوسن کو بو کیا۔ اس نے بھی مجھے سینے سے لپٹا لیا اور پھر میری پیشانی پر بوسہ دیا۔

"مجھے تم پر فخر ہے مائی سن۔ پوری قوم کو تم پر فخر ہے۔ میں پوری تھائی قوم اور شہنشاہ کی طرف سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک سال پہلے تم نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، اس سے یہ ملک ایک بہت بڑی تباہی سے بچ گیا تھا۔

"شہنشاہ خود تم سے مل کر تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے مگر اپنے دشمنوں کا تعاقب کرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔ شہنشاہ کو تمہاری آمد کی اطلاع مل چکی ہے۔ وہ بھی تم سے ملنے کو بے چین ہیں۔۔۔" رتنا کوسن رکے بغیر بولے چلا جارہا تھا اور میں اپنے آپ کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کررہا تھا۔

"اور ان سے ملو۔۔۔" وہ آخر میں کہہ رہا تھا "مادام اینا کورنیکو۔ میری مسز۔ یہ خاص طور پر تم سے اور تمہاری دوستوں تھائی اور جانکی سے ملنے آئی ہیں۔"

میں نے مادام اینا کورنیکو کو بو کیا۔ اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

مادام اینا کورنیکو بڑی شان دار عورت تھی۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے روایتی تھائی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر بالوں کا گول جوڑا بنا ہوا تھا جس سے نکلی ہوئی بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر لٹکی ہوئی تھی۔ جسم صحت مند اور چہرے کے نقوش بہت دل فریب اور آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس کی عمر اگرچہ پینتالیس سے کچھ اوپر ہی رہی ہوگی لیکن وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آرہی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بہت شان دار، بہت پروقار اور حسین

عورت تھی۔

ہم لوگ چند منٹ وہیں کھڑے رہے اور پھر اندر آگئے۔ جانکی اور تھائی انہیں دیکھ کر اٹھ گئیں۔ مادام اینا کورنیکو بڑے پرجوش انداز میں انہیں باری باری گلے لگا کر ملیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد چندا روبن کے کہنے پر خادمہ نے ہم سب کے سامنے کافی سرو کردی اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔

رتنا کوسن کی باتوں سے یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ایک سال پہلے اگر ہم شہنشاہ کے خلاف اس سازش کو ناکام نہ بناتے تو یہاں ایک خوفناک خانہ جنگی شروع ہوجاتی اور یہ ملک تباہ ہوجاتا۔ گفتگو میں سردار تھالوب کا بھی ذکر آیا تھا۔ رتنا کوسن کے کہنے کے مطابق سردار تھالوب کو حکومت میں ایک اعلیٰ عہدے کی پیشکش کی گئی تھی جسے اس نے قبول نہیں کیا تھا تاہم اس کی خدمات کے پیش نظر برما اور گولڈن ٹرائی اینگل کی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھالوب کے قبیلے اور دوسرے قبائل کو بھی بہت سی مراعات دی گئی تھیں۔ تھالوب کے مشورے سے ان قبائل کی بہبود کے لیے ایک منصوبہ بنالیا گیا تھا۔ جن قبائلی علاقوں میں پوست کاشت کی جاتی تھی وہاں دوسری صحت مند فصلوں کی پیداوار کے لیے منصوبے بنائے جارہے تھے۔

سردار تھالوب نے "ایوائرنمنٹ فرینڈلی" کے نام سے بھی ایک منصوبہ بنایا تھا۔ اس تنظیم کے تحت دیہی ترقیاتی پروگراموں کے علاوہ اور بھی کئی رفاہی پراجیکٹس نے کام شروع کر رکھا تھا۔ اس پراجیکٹ کے تحت منشیات کے عادی افراد کی بحالی کا ایک ادارہ بھی شامل تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ رنگولی اپنی آمدنی کا نوے فی صد حصہ اسی ادارے کو عطیے کے طور پر دیتی تھی اور اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ یہ ادارہ سردار تھالوب کی نگرانی میں کام کررہا ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ سردار تھالوب کو حکمران طبقے میں اس قدر پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اس کا حق دار بھی تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کی فلاح و بہبود، ملک کی سلامتی اور انسانیت کی خدمت کے لیے بہت کام کیا تھا اور کررہا تھا۔

مادام اینا کورنیکو تو جانکی اور تھائی سے باتیں کرنے لگی تھی اور ہم الگ بیٹھے تازہ ترین صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کررہے تھے۔

"اب صورتِ حال پہلے جیسی نہیں رہی۔" رتنا کوسن کہہ رہا تھا "شہنشاہ کے خلاف سازش کچلی جاچکی ہے۔ جو اکا دُکا عناصر بچ نکلے ہیں وہ روپوش ہیں۔ ان سے بہرحال کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بنکاک اور دوسرے بڑے شہروں میں دہشت گردی، غنڈا گردی، منشیات فروشوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں بھی دراصل اسی سازش کا ایک حصہ تھیں۔ خانہ جنگی کی مکمل تیاری کرلی گئی تھی مگر اس سازش کے سرغنہ کرداروں کی موت کے ساتھ ہی صورتِ حال بھی بدل گئی۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ٹائیگر اور پیڈرو تمہارے ہاتھوں ختم ہوگئے تھے۔ وہ گروہ اگرچہ اب بھی موجود ہیں مگر بہت کمزور پڑچکے ہیں۔ ان کے خلاف بھی بہت جلد حکومت ایک کریک ڈاؤن مشن شروع کرنے والی ہے جس سے ان گروہوں کا خاتمہ کروا جائے گا۔ غیر ملکیوں پر بھی نگاہ رکھی جارہی ہے۔ دارا جیسے لوگوں کو تلاش کیا جارہا ہے اور بہت جلد تم یہ خوش خبری سنو گے کہ دھرتی ان کے ناپاک وجود سے نجات حاصل کرچکی ہے۔"

"پیڈرو کے گینگ کو کون لیڈ کررہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چنگ چی۔" رتنا کوسن نے جواب دیا "وہ ایک تھرڈ کلاس نائٹ کلب کا مالک اور تھرڈ ریٹ غنڈا ہے۔ ایسے لوگوں پر قابو پانا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ پولیس کا ایک معمولی انسپکٹر بھی اسے پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کرسکتا ہے مگر یہاں کچھ سیاسی مصلحتیں حائل ہیں جس وجہ سے اس کے خلاف ابھی تک کوئی مؤثر کارروائی نہیں ہوسکی۔"

"مثلاً۔ کیا مصلحتیں ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چنگ چی کو ایک سیاسی لیڈر کی پشت پناہی حاصل ہے۔" رتنا کوسن نے جواب دیا "پہلے تو صورتِ حال یہ تھی کہ ہم اس سیاسی لیڈر کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن ایک معاملے میں اس سیاسی لیڈر پر بھی ہمیں شبہ ہوا تھا۔ خفیہ طور پر اس کی نگرانی کی جارہی تھی۔ وہ ایسی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا ہے جو حکومت اور عوام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہیں اس لیے بہت جلد اس کے خلاف بھی کارروائی ہونے والی ہے۔"

"کیا آپ تازہ ترین صورتِ حال سے واقف ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ آج جو کچھ ہوا اس کے بارے میں آپ کو رپورٹ ملی ہے یا نہیں؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے مہاراج سے یہ معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں نے تم لوگوں کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی مگر پولیس نے بروقت مداخلت سے اغوا کی کوشش ناکام بنادی تھی۔"

اس نے جواب دیا۔

"اور آپ کو یہ جان کر یقیناً حیرت ہوگی کہ ہمارے اغوا کی کوشش کے پیچھے بھی چنگ چی کا ہاتھ تھا۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" رتنا کوسن چونک گیا "سیاسی لیڈر کی پشت پناہی کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ چنگ چی میں اتنا دم خم نہیں ہے کہ تم جیسے آدمی پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی کرسکے۔ یہ انکشاف میرے لیے خاصا دلچسپ ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اسے کسی اور طرف سے بھی شہ مل رہی ہے۔"

"دارا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" رتنا کوسن نے نفی میں سر ہلایا "دارا جب سے واپس آیا ہے مسلسل پس منظر میں ہے۔ ہم نے تو یہ بھی سنا تھا کہ اسے اس شرط پر گولڈن ٹرائی اینگل سے واپس آنے دیا گیا تھا کہ وہ کسی بھی طریقے سے جنرل کھورات کا نقصان پورا کرے گا جو اسے تمہاری وجہ سے اٹھانا پڑا تھا۔ لیکن اب اتنا دم خم نہیں رہا لیکن ہوسکتا ہے کہ...."

"جنرل کھورات کا ایک آدمی میگا تیراؤ بھی میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اوہ!" رتنا کوسن ایک بار پھر چونک گیا "ایسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ دارا اور چنگ چی اس سے مل گئے ہوں اور یہ ان کا مشترکہ منصوبہ ہو۔"

"یہ ان تینوں کا مشترکہ منصوبہ ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "بلکہ اس منصوبے میں لاؤس کا ایک رئیس تان منہہ بھی شریک ہے۔" میں نے اسے تان منہہ اور تھائی منہہ کے بارے میں مختصراً بتایا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "چنگ چی کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں آچکا تھا۔ اس نے ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے چنگ چی کے ٹھکانے کا پتا چل گیا۔ اس بنگلے کی نگرانی کی گئی تھی لیکن وہ وہاں سے بھی غائب ہوچکا ہے۔ آپ کی بات سے مجھے خیال آرہا ہے کہ اب اس کا ایک ہی ٹھکانا رہ جاتا ہے۔"

"وہ کونسا؟" رتنا کوسن نے پوچھا۔

"وہی سیاست داں جس کی اسے پشت پناہی حاصل ہے۔" میں نے کہا "وہی اسے پناہ دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو اب نہ تو چنگ چی بچ سکے گا اور نہ ہی وہ سیاسی لیڈر۔" رتنا کوسن نے کہتے ہوئے چندا روبن کو اشارہ کیا۔ اس نے ٹیلی فون اٹھا کر سامنے رکھ دیا۔ رتنا کوسن نے ریسیور اٹھایا اور پولیس کمشنر کو کچھ ہدایات دینے کے بعد فون بند کردیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "چنگ چی وہاں نہ بھی ہوا تو وہ سیاسی لیڈر ہماری گرفت میں آجائے گا۔ اس کے خلاف ہمارے پاس اتنے ثبوت موجود ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت نہیں کرسکے گا اور چنگ چی بھی کہیں پناہ حاصل نہیں کرسکے گا۔"

چند لمحے خاموش گزرے پھر ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب رتنا کوسن اپنی بیگم مادام اینا کورنیکو کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ مہاراج وہیں رہ گئے تھے۔ رتنا نے جاتے جاتے ہوئے کہا تھا کہ ایک دو روز میں مجھے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

رتنا کوسن اور مادام اینا کورنیکو کو رخصت کرنے کے بعد ہم مہاراج کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مہاراج ہم سے بہت خوش تھے۔

اس وقت گیارہ بج چکے تھے۔ کسی نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ خادمہ نے چندا روبن سے پوچھ کر کھانا میز پر لگا دیا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ چندا روبن نے اٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا۔ وہ تقریباً دو منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر ماسٹر ہوچن کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے سرگوشی میں کچھ کہا اور پھر ریسیور ماسٹر ہوچن کے ہاتھ میں دے دیا۔ فون پر بات کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ تقریباً تین منٹ بات کرنے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور ہمارے قریب آگیا۔

"چی فانگ آکاش بلڈنگ کے پینٹ ہاؤس میں پہنچ چکا ہے۔ اس کے ساتھ دارا بھی ہے۔" اس نے پہلے مہاراج اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا....؟" میں اچھل پڑا "تو پھر سوچ کیا رہے ہو ماسٹر۔ ہمیں انہیں وہاں سے ملنے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔"

"دھیرج مائی سن دھیرج!" مہاراج نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا پھر ماسٹر ہوچن کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس اطلاع کے بارے میں تفصیل سے پوچھنے لگے۔

"ٹھیک ہے۔" وہ آخر میں بولے "میرا خیال ہے زیادہ لوگ ہوئے تو وہ ہوشیار ہوجائیں گے۔ توران یہاں موجود ہے۔ ایک اور لڑکے کو بلالو۔ دو تم ہو۔ میرا خیال ہے تم چاروں ان سے نمٹ سکتے ہو۔"

"ان کے لیے تو ہم دونوں ہی کافی ہیں مہاراج۔" میں نے کہا "آپ اجازت دیں تو ہم ابھی روانہ ہو جائیں۔"

"ان کے لیے تو تم اکیلے ہی کافی ہو سکتے ہو۔" مہاراج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس مرتبہ ان میں سے کوئی بچ نکلے اور یہ بھی ممکن ہے ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہو جو نگرانی کرنے والے کی نگاہوں میں نہ آیا ہو اس لیے دو لڑکے اور ساتھ لے جاؤ۔"

"یس مہاراج۔" میں نے سر جھکا دیا۔

ماسٹر ہوچن ایک اور لڑکے کو بلانے کے لیے فون کرنے لگا۔ میں اپنی سیٹ پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ جانکی اور تھائی بار بار میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ میری بے چینی کو سمجھ رہی تھیں۔ وہ خود بھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ جانا چاہتی تھیں مگر مہاراج کی وجہ سے دل کی بات نہیں کہہ سکتی تھیں کیونکہ مہاراج انہیں کسی صورت بھی ہمارے ساتھ جانے کی اجازت نہ دیتے۔

ہم اس وقت پھایا تھائی روڈ کے قریب تھے اور چائنا ٹاؤن میں مہاراج کا جمنازیم وہاں سے کافی دور تھا۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر ہوچن کا آدمی بیس پچیس منٹ سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکے گا لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ تقریباً آٹھ منٹ بعد کوئی گاڑی گلی میں رکی اور پھر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ توران اس وقت باہر ہی موجود تھا۔ اس نے آکر بتایا کہ رنگٹ پہنچ چکا ہے۔ دراصل ماسٹر ہوچن نے مہاراج کے جمنازیم کے بجائے اسی علاقے میں واقع اپنے ایک شاگرد کے ٹریننگ سینٹر پر فون کردیا تھا۔ جہاں سے رنگٹ سات آٹھ منٹ میں یہاں پہنچ گیا تھا۔

مہاراج نے ہمیں آشیرباد دی اور ہم وہاں سے رخصت ہوگئے۔ دروازے سے نکلنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جانکی اور تھائی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ چندا روبن ہمیں رخصت کرنے کے لیے گیٹ تک ساتھ آیا تھا۔

باہر سفید رنگ کی ایک وین کھڑی تھی۔ رنگٹ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور توران باہر کھڑا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی وین کا دروازہ کھول دیا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد وہ بھی پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور وین حرکت میں آگئی۔

"آکاش بلڈنگ کی طرف لے چلو۔" ماسٹر ہوچن نے رنگٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

میں نے رنگٹ کو دیکھتے ہی اس کے بارے میں ایک رائے قائم کرلی تھی۔ اس کی عمر انتیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، گٹھا ہوا جسم اور سر کے بال خاصے لمبے تھے جنہیں اس نے گردن پر ایک چٹیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ اس نے سلیولیس ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ بازوؤں کے ابھرے ہوئے مسلز دیکھ کر اس میں بھری ہوئی طاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔

وین ایشیا ہوٹل کے قریب سے پہلے پھایا تھائی روڈ پر اور پھر پھلن چٹ روڈ کی طرف گھوم گئی۔ اگرچہ آدھی رات ہو رہی تھی مگر سڑکوں پر ٹریفک خاصا تھا اور پھر ہم ایکسپریس وے اور ریلوے برج سے ہوتے ہوئے مین سوکھم وٹ روڈ پر آگئے۔ یہ شہر کا مرکزی اور سب سے بارونق علاقہ تھا۔ مین سوکھم وٹ روڈ یہاں سے شروع ہوتا تھا اور یہاں اس وقت بھی دن کا سا سماں تھا مگر ہمیں سوکھم وٹ روڈ پر زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔ رنگٹ نے ہوٹل گرینڈ ان کے قریب سے وین کو نانا نوا روڈ پر موڑ لیا۔

اس سڑک پر پاکستانی سفارت خانے کے سامنے سے ہوتے ہوئے ہوٹل ہمپٹن ان اور ایک اسپتال کی عمارت کے قریب سے وین بائیں طرف ایک اور سڑک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر ذرا ہی آگے دائیں طرف مائیک پیلس ہوٹل کی بلڈنگ تھی۔

"ہوٹل سے اگلے موڑ پر گھما کر گاڑی روک لو۔" ماسٹر ہوچن نے آگے کو جھکتے ہوئے کہا۔

رنگٹ نے وین کی رفتار کم کرلی اور ہوٹل سے آگے نکل کر بائیں طرف ایک گلی میں مڑتے ہی وین روک لی۔ اس گلی میں بنگلے تھے مگر سناٹا تھا۔ گلی میں کسی قسم کی آمدورفت نہیں تھی جبکہ چند گز کے فاصلے پر ہوٹل کے سامنے خاصی چہل پہل نظر آرہی تھی۔

وین رکنے کے صرف ایک منٹ بعد ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر وین کے قریب پہنچ گیا۔ وہ پاتھی تھا جو آکاش بلڈنگ کی نگرانی کررہا تھا۔ بلڈنگ میں چی فانگ اور دارا کی آمد کی اطلاع اسی نے دی تھی۔

"کیا رپورٹ ہے؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"ان دونوں کے بعد ایک اور آدمی پینٹ ہاؤس کی لفٹ پر سوار ہو کر اوپر گیا ہے۔" پاتھی نے بتایا "لیکن شکل و صورت سے وہ تھائی لینڈ کا باشندہ نہیں لگتا۔"

"کوئی انڈین؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کے چہرے کے نقوش ویت نامیوں سے ملتے جلتے ہیں۔" پاتھی نے بتایا۔

"اوہ!" میں چونک گیا۔ میرے ذہن میں اچانک ہی تان منہہ کا خیال ابھر آیا تھا۔ لاؤس اور ویت نام کے باشندوں کے چہرے ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ میں نے تان منہہ کا حلیہ بتایا تو پاتھی زور زور سے سرہلانے لگا۔

"یہی ہے۔ بالکل یہی حلیہ ہے ماسٹر۔" اس نے کہا۔

"وہ تان منہہ ہے۔" میں نے ماسٹر ہوچن کو بتایا۔

"ان کے علاوہ اور کون کون ہے؟" ماسٹر ہوچن نے پاتھی سے پوچھا۔

"مادام اوتوکو اور دو لڑکیاں۔ جو چی فانگ اور دارا کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ ان میں ایک لڑکی غالباً نشے میں دھت تھی جسے چی فانگ نے سنبھال رکھا تھا۔" پاتھی نے جواب دیا۔

پاتھی کی بات سن کر ماسٹر ہوچن جیسے چونک سا گیا۔ وہ پاتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہاں ہوٹل میں کوئی لڑکی ملے گی۔ بہت زوردار قسم کی ہونی چاہیے۔"

"سمونے اس وقت ہوٹل میں موجود ہے۔" پاتھی نے مائیک پیلس ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ تھرڈ کلاس نائٹ کلبوں کی رقاصہ ہے آج کل بڑے ہوٹلوں میں پروگرام حاصل کرنے کے لیے ایسی جگہوں پر پھرتی ہے۔ بائیس تئیس سال عمر ہے۔ بڑی حسین لڑکی ہے۔"

"لے آؤ اسے مگر جلدی۔۔۔ جو مانگے دے دینا۔" ماسٹر نے کہا۔

"لیکن ماسٹر۔ آپ چاروں کو دیکھ کر شاید وہ ساتھ جانا پسند نہ کرے۔" پاتھی بولا۔

"تم اسے لے آؤ۔ میں بات کرلوں گا۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

پاتھی چند لمحے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر سرہلاتا ہوا ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

ماسٹر ہوچن کی باتوں سے میں بھی الجھ کر رہ گیا تھا۔ ہم وارا اور چی فانگ جیسے شاطر اور خطرناک لوگوں سے دو دو ہاتھ کرنے آئے تھے اور ماسٹر ہوچن کو لڑکی کی سوجھ رہی تھی۔ میں نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا اور پھر دھیمے لہجے میں بتانے لگا کہ اسے کسی حسین لڑکی کی ضرورت کیوں پڑگئی تھی۔

میں وین سے نیچے اتر آیا۔ اس سڑک پر تقریباً سو گز آگے آکاش بلڈنگ تھی۔ ماسٹر ہوچن بھی میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور آکاش بلڈنگ کے بارے میں بتانے لگا۔

یہ بلڈنگ ایک ہندو تاجر کی ملکیت تھی۔ وہ کروڑ پتی آدمی تھا اور شہر میں اور بھی بہت سی پراپرٹی تھی۔ آٹھ منزلہ آکاش بلڈنگ کو تعمیر ہوئے صرف پانچ سال ہوئے تھے۔ یہاں صرف دولت مندوں کی رہائش تھی۔ اس بلڈنگ کے گرد چار ایکڑ رقبے پر خوب صورت لان بنے ہوئے تھے جن میں فوارے بھی تھے اور ایک بہت شان دار سوئمنگ پول بھی۔ بلڈنگ کے مکینوں کو تفریح کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں ان کی تفریح کا ہر سامان موجود تھا۔ سوئمنگ پول کے دوسری طرف ٹینس کورٹ بھی بنا ہوا تھا اور بلڈنگ کے نیچے بیسمنٹ میں خواتین کے لیے فٹنس کلب اور ریکریشن ہال بھی تھا جہاں چھوٹی موٹی تقریبات بھی ہوتی رہتی تھیں۔

اس بلڈنگ کی سیکیورٹی کے بارے میں ہمارا قیدی پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اصل بلڈنگ گیٹ سے بہت دور تھی۔ گیٹ کے اندر کی طرف گارڈ روم بنا ہوا تھا۔ جہاں چوبیس گھنٹے ایک گارڈ موجود رہتا تھا۔ چار دیواری بہت اونچی تھی اور اس پر خار دار تار لگے ہوئے تھے جہاں سے کسی کے کودنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ گارڈ روم میں انٹر کام سسٹم بھی موجود تھا۔ جہاں سے بلڈنگ کے کسی بھی فلیٹ سے رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ گیٹ سے آگے کشادہ روش تھی جس کے دونوں طرف لان تھے۔ روش کے کناروں پر مور پنکھ قسم کے پودے تھے اور کوئی بھی پودا چار فٹ سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ روش کے اختتام پر بلڈنگ کے سامنے آگے کو نکلا ہوا وسیع و عریض پورچ تھا۔ جس کے بعد ایک کشادہ لابی تھی۔ اس لابی کے اندر دونوں طرف اوپر آمدورفت کے لیے کشادہ زینے تھے اور سامنے چار لفٹیں لگی ہوئی تھیں۔ دو عام لوگوں کے استعمال کے لیے اور دو پینٹ ہاؤسز کے لیے۔ اس وسیع و عریض بلڈنگ پر دو پینٹ ہاؤسز تھے جن میں سے ایک مادام اوتوکو کے استعمال میں تھا۔

ماسٹر ہوچن مجھے آکاش بلڈنگ کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ بڑی بڑی برائیوں کے اڈے ایسی ہی عالی شان عمارتوں میں ہوتے ہیں جہاں شہر کے معزز اور دولت مند لوگ رہتے ہیں۔ ایسی برائیاں پھیلانے میں انہی معزز لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے مگر المیہ تو یہ ہے کہ حکومت کے متعلقہ ادارے انہیں نظر انداز کردیتے ہیں۔

تقریباً دس منٹ بعد پاتھی ایک لڑکی کے ساتھ اس طرف آتا ہوا نظر آیا۔ ہم جس جگہ کھڑے تھے وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ دونوں ہمارے قریب آکر کھڑے ہوگئے۔

میں غور سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سمونے تھی اور واقعی بے حد حسین تھی۔ اس کی عمر بائیس تئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے لباس پہننے کا محض تکلف کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے جسم پر سجے ہوئے ان ریشمی چیتھڑوں کو لباس نہیں کہا جاسکتا تھا۔

سمونے نے پہلے ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر وین میں بیٹھے ہوئے توران اور رنگٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات ابھر آئے۔

"نہیں مسٹر۔" وہ پاتھی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں تم لوگوں کے ساتھ نہیں جاسکتی۔۔۔"

وہ دو قدم پیچھے ہٹی تو ماسٹر ہوچن نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ سمونے کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ایک منٹ سمونے۔" ماسٹر ہوچن نے نرم لہجے میں کہا "ہم نے تمہیں کسی برے مقصد کے لیے نہیں بلایا۔ ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ایک معمولی سا کام ہے جو تمہیں کرنا ہے اور تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔"

"تم۔۔۔" سمونے نے پہلی مرتبہ غور سے ماسٹر ہوچن کی طرف دیکھا "میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ ہاں۔۔۔ یاد آگیا۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ مہاراج کے جمنازیم گئی تھی۔ وہاں تمہیں۔۔۔"

"تم نے ٹھیک پہچانا۔" ماسٹر ہوچن نے اس کی بات کاٹ دی "میں مہاراج کا نائب ہوچن ہوں اور یہ میرے دوست ہیں۔ ہم برے لوگ نہیں ہیں بلکہ ایک برائی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں جس میں اس وقت ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے اور تمہیں اس کا معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ یہ رقم پیشگی سمجھ کر رکھ لو۔" ماسٹر ہوچن نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ کئی ہزار بھات کے نوٹ تھے۔

سمونے کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ ماسٹر ہوچن کو پہچان لینے کے بعد وہ کسی قدر مطمئن ہوگئی۔ اس نے نوٹ اپنے پرس میں ڈال لیے اور ہوچن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ کیا کام لینا چاہتے ہو؟"

"اس طرف آجاؤ۔" ماسٹر ہوچن اسے لے کر وین کی دوسری طرف چلا گیا کیونکہ اس وقت سامنے سے کوئی گاڑی آرہی تھی اور یہ بھی خدشہ تھا کہ ہمیں ایک لڑکی کے ساتھ اس نیم تاریک جگہ پر دیکھ کر کسی کو شبہ نہ ہوجائے۔ میں بھی ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

ماسٹر ہوچن سمونے کو ایک فرضی کہانی سنانے لگا۔ اس کہانی میں مادام اوتوکو کا نام بھی تھا۔ اوتوکو کے نام پر سمونے چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"دراصل ہم مادام اوتوکو کے مہمانوں کو سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔" ماسٹر ہوچن کہہ رہا تھا "وہ ہمارے دوست ہیں۔ بہت پرانے دوست۔ چند گھنٹے پہلے کلب میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لڑکیوں کے چکر میں ہمیں غچا دے کر نکل گئے۔ ہم نے معلوم کرلیا کہ وہ لوگ مادام اوتوکو کے فلیٹ پر ہیں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اگر ہم بلڈنگ کے گارڈ کو بتائیں گے تو وہ انٹر کام پر مادام کو ہماری آمد کی اطلاع دے دے گا۔ اس طرح سارا مزہ کرکرا ہوجائے گا اس لیے ہم بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں سمجھ گئی۔" سمونے نے کہا "لیکن کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوگا؟"

"ہوسکتا ہے ہمارے دوست ہمارے اس مذاق کا برا مان کر کچھ شور مچائیں مگر تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلڈنگ میں داخل ہونے کے بعد تمہیں نیچے ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ تم چاہو تو واپس بھی آسکتی ہو۔ آگے کا کام ہم خود سنبھال لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔" سمونے نے کہا اور میرا خیال ہے کہ وہ معاملے کی تہ کو پہنچ گئی تھی۔ اتنی بے وقوف تو وہ ہرگز نہیں تھی کہ بات کو نہ سمجھ سکتی لیکن اس کے پاس واپس آنے کا چانس تھا اور اسی لیے وہ آمادہ بھی ہوگئی تھی۔

"ٹھیک ہے ماسٹر۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

ماسٹر ہوچن نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سرہلا دیا۔ پانچ منٹ مزید گزر گئے۔ اب میں سمونے کو سمجھا رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور پھر ہم دونوں وین سے اتر آئے۔

آکاش بلڈنگ وہاں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ میں اور سمونے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چلتے رہے۔ سمونے اس طرح جھوم رہی تھی جیسے نشے میں ہو۔ گیٹ کے سامنے پہنچ کر ہم رک گئے۔ میں نے ہولے سے گیٹ پر ہاتھ مارا۔ ذیلی دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ وہ ایک باوردی گارڈ تھا جس کے ہولسٹر میں پستول کا دستہ جھانک رہا تھا۔ اگر میں اکیلا

ہوتا تو شاید وہ دروازہ چند انچ سے زیادہ نہ کھولتا مگر میرے ساتھ ایک حسین لڑکی تھی۔ اس نے اطمینان سے دروازہ کھول دیا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ ہم چونکہ اس کے لیے اجنبی تھے اس لیے ہمیں مزید آگے جانے سے روک دیا گیا۔

"کس سے ملنا ہے آپ لوگوں کو۔۔۔ کون سے فلیٹ میں؟" گارڈ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"مادام اوتوکو۔ پنٹ ہاؤس۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک منٹ۔ میں ان سے پوچھ لوں۔ مادام کے پاس پہلے ہی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ مصروف ہوں۔" گارڈ کہتے ہوئے گیٹ سے ملحق گارڈ روم میں گھس گیا۔

سمونے بھی اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوگئی۔ میں دروازے میں کھڑے ہو کر محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ گارڈ انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھا چکا تھا کہ سمونے لڑکھڑاتی ہوئی اس سے ٹکرا گئی اور اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ گارڈ بدحواس سا ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔"

"نشے میں ہے۔" میں نے کہا "لیکن میں نشے میں نہیں ہوں۔"

میں نے بڑی پھرتی سے آگے بڑھ کر گارڈ کو گرفت میں لے لیا۔ ایک ہاتھ سے اس کا منہ دبائے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے کان کے پیچھے گردن کی نس مسلنے لگا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ میرے ہاتھوں میں جھول گیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر پیچھے ایک کرسی پر ڈال دیا۔

سمونے فوراً ہی گارڈ روم سے نکل کر دروازے سے باہر نکل گئی تھی اور پھر تیس سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں رنگٹ اور توران اندر داخل ہوئے اور گارڈ کو اٹھا کر باہر لے گئے۔

دو منٹ بعد ماسٹر ہوچن، رنگٹ، توران، پاتھی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ پاتھی کے جسم پر گارڈ کی وردی تھی۔ بے ہوش گارڈ کو گیٹ کے باہر والے چھوٹے سے لان کی باڑھ کے پیچھے ڈال دیا گیا تھا۔ وہ دو گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔

وہ چاروں گارڈ روم میں داخل ہو کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ میں اس وقت گارڈ روم کی عقبی کھڑکی سے بلڈنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماسٹر ہوچن کا اشارہ پا کر میں سمونے کے ساتھ باہر آگیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بلڈنگ کی طرف چلنے لگا۔ روش کے دونوں طرف مور پنکھ کے پودے تھے جن کے پیچھے وسیع لان تھے۔ ہوسکتا ہے شام کے بعد کچھ دیر کے لیے یہاں بتیاں جلتی ہوں لیکن اس وقت لان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وسیع و عریض پورچ میں کافی آگے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سمونے پہلے بھی اس بلڈنگ میں آچکی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ بلڈنگ کے پچھلے بیسمنٹ میں مکینوں کی گاڑیوں کے لیے پارکنگ تھی۔

لابی کافی کشادہ تھی۔ مختلف جگہوں پر چند صوفے رکھے ہوئے تھے۔ کنکریٹ کے بڑے بڑے گملے بھی تھے جن میں چھوٹے قد کے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ مرکزی دروازے کے بائیں طرف ایک دروازے پر آفس کی تختی لگی ہوئی تھی۔ دن میں یہاں عمارت کا نگران بیٹھتا ہوگا لیکن اس وقت دفتر بند تھا۔ اس دروازے کے ساتھ ہی دیوار پر ایک بہت بڑے بورڈ پر کارڈ لگانے والے چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ ہر خانے پر فلیٹ نمبر اور مکین کے نام کا کارڈ لگا ہوا تھا۔ اوپر دو پنٹ ہاؤسز کے خانے تھے۔ جن میں ایک پر "اے" اور دوسرے پر "بی" لکھا ہوا تھا۔ بی والے خانے میں مادام اوتوکو کے نام کا۔۔۔کارڈ لگا ہوا تھا۔ اے والے خانے کا کارڈ دیکھنے کی میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔

ایک کشادہ زینہ دائیں طرف تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ سامنے چار لفٹس تھیں۔ درمیان والی دو عام مکینوں کے استعمال کے لیے اور دائیں بائیں والی دونوں پنٹ ہاؤسز کے لیے مخصوص تھیں۔

لابی کے دائیں طرف اس بیس منٹ کا راستہ تھا۔ جہاں مکینوں کے لیے ریکریشن ہال تھا۔ نیچے جاتے ہوئے اس راستے میں اگرچہ مدھم سی روشنی تھی مگر اس طرف سناٹا تھا۔ ظاہر ہے رات ایک بجے تو ریکریشن ہال نہیں کھلا ہوگا۔

میں نے لابی کے دروازے کے قریب آ کر باہر کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کر دیا۔

ماسٹر ہوچن، رنگٹ اور توران گارڈ روم سے نکل کر تیزی سے اس طرف آنے لگے۔ پاتھی وہیں رہ گیا تھا۔

ہم سب لفٹ بی کے قریب جمع تھے۔ لفٹ اوپر تھی۔ ماسٹر ہوچن نے دو تین مرتبہ بٹن دبایا لیکن لفٹ نیچے نہیں آئی۔

"ایک منٹ!" سمونے آگے بڑھتے ہوئے بولی "لفٹ اوپر لاک ہوگی۔ ایمرجنسی کا بٹن دبانے سے لاک کھل جائے گا اور لفٹ نیچے آئے گی۔" اس نے پلیٹ پر وہ بٹن دبا دیا جس پر ای لکھا ہوا تھا۔ وہ ہندسہ روشن ہوگیا اور دوسرے ہی لمحے

دوسرا خانہ روشن ہوگیا جس پر ایرو کا نشان بنا ہوا تھا تیر کا رخ نیچے کی طرف تھا جس کا مطلب تھا کہ لفٹ نیچے آرہی تھی۔

ماسٹر ہوچن نے توران کو اشارہ کیا۔ وہ ایک صوفے کے پیچھے جھک کر بیٹھ گیا۔ لفٹ کو نیچے آنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ سمونے نے ٹاپ فلور کا بٹن دبا دیا۔ ویسے بھی یہ لفٹ ٹاپ فلور کے لیے ہی تھی۔ راستے میں کہیں نہیں رکتی تھی۔

لفٹ رکنے سے پہلے ہی میں نے جھک کر پائنچے کے نیچے سے خنجر نکال لیا۔ ماسٹر ہوچن نے بھی جیب سے پستول نکال لیا تھا اور رنگٹ کے ہاتھ میں بھی خنجر نظر آرہا تھا۔

ہمارے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھ کر سمونے کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ معاملہ گمبھیر تھا اور کوئی گڑبڑ ہوسکتی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔" وہ باری باری ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے ہکلائی "تم لوگ تو اپنے دوستوں کو سرپرائز دینا چاہتے ہو نا۔۔۔"

"ہاں۔ یہ بھی سرپرائز کا ایک طریقہ ہے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تم وہی کرو گی جو ہم کہیں گے۔"

لفٹ رک گئی اور دروازہ کھل گیا۔ لفٹ کے دروازے کے سامنے ایک کینوپی سی بنی ہوئی تھی۔ اس سے آگے ایک خوب صورت لان تھا اور لان کے پرلی طرف پنٹ ہاؤس تھا۔ لان میں دو جگہوں پر مرکری ٹیوب لائٹیں جل رہی تھیں۔ لفٹ کے بائیں طرف ذرا ہٹ کر نیچے آمدورفت کے لیے زینہ بھی تھا جس کا دروازہ بند تھا۔

یہ پنٹ ہاؤس کسی طرح بھی ایک شان دار بنگلے سے کم نہیں تھا۔ لفٹ سے لے کر۔۔۔ برآمدے تک لان کے بیچوں بیچ ایک روش تھی جس کے اوپر سائے کے لیے ایک طویل سائبان بنا ہوا تھا۔

برآمدے والا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ دائیں بائیں کے کمروں کی کھڑکیوں میں روشنی جھلک رہی تھی۔ کھڑکیوں کے سامنے اندر کی طرف باریک ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے باری باری دونوں کھڑکیوں میں جھانک کر دیکھا مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔

ماسٹر ہوچن نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے گھما دیا۔ دروازہ آواز پیدا کیے بغیر آہستہ آہستہ کھلتا چلا گیا۔ اندر کسی طرف سے قہقہوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ماسٹر نے سمونے کو اشارہ کیا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ ماسٹر نے دوبارہ پستول سے اشارہ کیا تو وہ دروازے میں داخل ہوگئی۔

اس کے پیچھے ہی میں بھی دروازے میں داخل ہوگیا۔ ماسٹر ہوچن نے رنگٹ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اندر آگیا۔

یہ مختصر سی راہداری تھی۔ جس کے آگے ایک وسیع ہال تھا جو شان دار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہال کے اختتام پر بائیں طرف دو کمرے تھے اور دائیں طرف ایک کشادہ راہداری تھی۔ اس راہداری میں بھی آمنے سامنے دو کمرے تھے اور قہقہوں کی آوازیں اسی طرف سے آرہی تھیں۔

ہال کے اختتام پر دونوں کمروں کے دروازے چند انچ کے قریب کھلے ہوئے تھے۔ اس طرف بھی ایک کمرے سے نسوانی قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ماسٹر ہوچن نے سمونے کو اس طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سمونے نے ابھی دو ہی قدم اٹھائے تھے کہ وہ دروازہ کھل گیا اور مادام اوتوکو باہر نکلتی ہوئی نظر آئی۔ عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی مگر بڑی حسین عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ دروازے کے باہر پہلا قدم رکھتے ہی وہ سمونے اور پھر ماسٹر ہوچن کو دیکھ کر اچھل پڑی۔

"اے۔۔۔ کون ہو تم لوگ!" وہ چیخی۔

ماسٹر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اوتوکو چیختی ہوئی دوبارہ کمرے میں گھس گئی۔ اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی مگر ماسٹر ہوچن نے بڑی پھرتی سے پیر دروازے میں پھنسا دیا تھا۔ سمونے نے صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرتے ہوئے ایک بھاری صوفے کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔

میں نے راہداری کی طرف چھلانگ لگا دی۔ دائیں طرف کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور قہقہوں کی آوازیں اسی کمرے سے آرہی تھیں۔ میں نے پیر کی زوردار ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

کمرے کے اندر کا منظر بہت شرمناک تھا۔ تان منہ ایک لڑکی کے ساتھ بیڈ پر گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔ دروازے پر لگنے والی میری ٹھوکر خاصی زوردار تھی۔ ان دونوں نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر لڑکی کے حلق سے خوفناک چیخ نکل گئی اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو تان منہ کی گرفت سے چھڑا کر وہ چیختی ہوئی باتھ روم کی طرف لپکی۔ تان منہ نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میرا خیال

تھا کہ وہ میرے اوپر حملہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بھی باتھ روم کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے اندر گھستے ہی دروازہ دھڑ سے بند کردیا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دیا۔ تان منہ نے اس لڑکی کے ساتھ باتھ روم میں گھس کر بہت بڑی حماقت کا ثبوت دیا تھا۔ باہر رہ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تو شاید اس کے بھاگ نکلنے کا کوئی چانس ہوتا مگر باتھ روم میں گھس کر اس نے خود ہی اپنے آپ کو قید کرلیا تھا۔

میں باتھ روم کے دروازے کو کنڈا لگا کر مڑا ہی تھا کہ سامنے والے کمرے سے ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اوتوکو۔ کیا ہوا؟"

یہ چی فانگ کی آواز تھی۔ اس آواز کو تو میں لاکھوں کے ہجوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔ میں نے اس طرف چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک اسی وقت سامنے والا دروازہ کھلا اور چی فانگ باہر نکلتا ہوا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ بد حواس سا ہوگیا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

میں اس کے پیچھے ہی کمرے میں گھس گیا۔ چی فانگ بے لباس تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک کرسی سے ٹکرایا اور کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ کمرے میں ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ چیختی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی اور دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔ چی فانگ نے بھی اٹھ کر باتھ روم کی طرف چھلانگ لگائی تھی مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میرے پیر کی زوردار ٹھوکر سے وہ بیڈ کے دوسری طرف گرا۔

میں نے راستے میں پڑی ہوئی کرسی اٹھا کر ایک طرف پھینک دی اور چی فانگ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اچھل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں اگرچہ خنجر تھا مگر اس نے خنجر کی پروا کیے بغیر چھلانگ لگا دی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میرے خنجر والے ہاتھ پر لگی۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل کر ڈریسنگ ٹیبل پر جا گرا۔ وہاں پہلے سے چی فانگ کا پستول بھی رکھا ہوا تھا۔ چی فانگ نے سنبھلتے ہوئے مجھے سائیڈ کک لگانے کی کوشش کی مگر میں نے وہ کک کلائی پر روک لی اور جوابی حملہ کرتے ہوئے اسے زوردار فرنٹ کک رسید کردی۔ وہ چیختا ہوا بیڈ پر گرا۔ میں اس پر دوسرا وار کرنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ وہ سانپ کی طرح بڑی تیزی سے رینگتا ہوا بیڈ کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا اور ڈریسنگ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ غالباً اپنا پستول اٹھانا چاہتا تھا مگر اسی لمحے میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے ٹانگوں سے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔ تاہم پستول کے بجائے میرا خنجر اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میری گرفت میں تھیں۔ اس نے اپنے کندھے اوپر اٹھاتے ہوئے خنجر سے حملہ کردیا۔ میں نے اس کی ٹانگیں چھوڑ کر وار روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ خنجر کی نوک میرے بازو کے مسل پر کھال چیرتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی چی فانگ نے میرے سینے پر زوردار ٹھوکر بھی رسید کردی تھی۔

میں کراہتا ہوا پیچھے الٹ کر بیڈ سے نیچے گر گیا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی چی فانگ نے اٹھ کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس نے خنجر سے حملہ کیا تھا مگر میں نے اس کا وار روک لیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی موڑنے لگا۔

بہت عرصے بعد چی فانگ سے میرا اس طرح مقابلہ ہوا تھا اور میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ چی فانگ میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کی بانہوں میں فولادی قوت تھی۔ اس عرصے میں' میں نے بھی اگرچہ مسلسل پریکٹس کی تھی مگر اس وقت تو مجھے واقعی دانتوں پسینہ آگیا تھا۔

خنجر کی نوک میری آنکھ کے عین اوپر تھی۔ تقریباً ایک انچ کا فاصلہ تھا۔ چی فانگ کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔ وہ خنجر کو نیچے لانے کے لیے پوری طاقت استعمال کررہا تھا۔ خنجر آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ کا ایک معمولی سا جھٹکا مجھے ایک آنکھ سے محروم کرسکتا تھا۔

میں نے پوری قوت سے اس کا ہاتھ موڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی گھٹنے سے اس کی ٹانگوں میں ضرب لگائی تھی۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے اسے دونوں پیروں پر اٹھا کر پوری قوت سے اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل گرا۔

میں نے اٹھتے ہی اس کے ہاتھ پر زوردار ٹھوکر ماردی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا مگر وہ خود ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے موقع ملتے ہی دائیں ٹانگ پر جھکتے ہوئے بائیں پیر سے فرنٹ ہائی کک لگائی۔ کک اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگی۔ وہ کراہتا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔

باتھ روم سے لڑکی کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ اگرچہ اس نے اندر سے بند کرلیا تھا مگر خوف سے وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کی چیخوں کی آواز سن کر کوئی مدد کے لیے آجائے گا لیکن کم از کم اس فلیٹ میں اس کی مدد کو آنے والا کوئی نہیں تھا۔ بلڈنگ

میں کسی اور جگہ اس کی آواز سنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پینٹ ہاؤس تھا۔ آٹھ منزلہ بلڈنگ کی چھت۔ آواز فضا میں تو چاروں طرف پھیل سکتی تھی لیکن اس بلڈنگ کے کسی فلیٹ میں سنے جانے کا امکان نہیں تھا۔

یہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ مارشل آرٹ کا مظاہرہ کیا جاتا۔ یہ موقع تو ایسا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے حریف کو زیر کرنے کی کوشش کی جائے۔ چی فانگ بھی غالباً اس رخ پر سوچ رہا تھا۔ وہ کسی قدر نیچے جھک کر تیزی سے میری طرف لپکا۔ وہ غالباً میرے سینے یا پیٹ پر سر کی ٹکر مارنا چاہتا تھا۔ میں نہ صرف تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا بلکہ اس کے سر پر زوردار ٹھوکر بھی رسید کردی۔ وہ کراہتا ہوا باتھ روم کے دروازے کے قریب گرا۔

اسی لمحے باہر سے فائر کی آواز سنائی دی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ گولی کس نے چلائی تھی۔ میں تان منہ کو دوسرے کمرے کے باتھ روم میں بند کرچکا تھا۔ چی فانگ میرے سامنے تھا۔ اب صرف دارا رہ جاتا تھا اور اس کے مقابلے پر دو آدمی تھے۔ ماسٹر ہوچن اور رنگٹ۔ ہوسکتا ہے گولی ماسٹر ہوچن ہی نے چلائی ہو لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا کہ دارا کے پاس بھی پستول یا ریوالور موجود ہو اور گولی اس نے چلائی ہو۔

چی فانگ نے ایک بار پھر اٹھ کر حملہ کردیا۔ اسی وقت ایک اور فائر کی آواز سنائی دی۔ چی فانگ جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ وہ میرے گلے پر ہاتھ جمانے کی کوشش کررہا تھا مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے رہے اور پھر میں نے اسے اپنے پیروں پر اٹھا کر پیچھے کی طرف اچھال دیا۔ وہ قلا بازی کھاتا ہوا باتھ روم کے دروازے سے ٹکرایا۔ وہ لڑکی باتھ روم اندر سے لاک نہیں کرسکی تھی۔ چی فانگ کی ٹکر سے دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کی خوفناک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ چی فانگ پشت کے بل گرا تھا۔ اس کا اوپر کا دھڑ باتھ روم کے اندر تھا اور ٹانگیں باہر۔ میں نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑلیں اور اوپر اٹھاتے ہوئے اسے پیچھے الٹا دیا اور بڑی پھرتی سے دروازہ کھینچ کر باہر سے کنڈا لگا دیا اور پھر اسی وقت باہر سے مجھے ایک تیز نسوانی چیخ بھی سنائی دی تھی۔

میں باہر کی طرف لپکا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا۔ پلٹ کر ڈریسنگ ٹیبل سے چی فانگ کا پستول اٹھایا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی لیکن راہداری میں آتے ہی ایک چیختی اور غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وہیں رک جاؤ۔ ورنہ اس لڑکی کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

وہ دارا کی آواز تھی۔ میں رک گیا لور میرے منہ سے اس طرح گہرا سانس نکل گیا جیسے اچانک ہی غبارے کی ہوا نکل گئی ہو۔ دارا نے سمونے کو گرفت میں لے رکھا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال سمونے کی کنپٹی کو چھو رہی تھی۔

"ایک روز میں نے کہا تھا نا کہ تم بہت تیز دوڑ رہے ہو۔ منہ کے بل گرو گے۔" دارا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم واقعی بہت تیز دوڑ رہے ہو۔ تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا ہے' قابل تعریف ہے۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے بچ کر نکل جانے والا کوئی معمولی آدمی نہیں ہوسکتا۔ تم بلاشبہ بہت نڈر' حوصلہ مند اور تیز رفتار آدمی ہو لیکن اس وقت میں تمہاری تعریف کرنے کے لیے یہاں نہیں رکوں گا۔ پستول پھینک دو۔ ورنہ میں اس لڑکی کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

میں نے ماسٹر ہوچن اور رنگٹ کی طرف دیکھا۔ ماسٹر ہوچن کا پستول اس سے دور قالین پر پڑا تھا۔ ماسٹر نے اشارہ کیا اور میں نے بھی پستول پھینک دیا۔ سمونے بے گناہ تھی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ دارا اس کی زندگی کا چراغ گل کردے۔

"گڈ۔ سمجھ دار ہو۔" دارا کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آگئی "میں چاہوں تو اس وقت تمہیں بھی گولی سے اڑا کر یہ قصہ ختم کرسکتا ہوں لیکن تمہاری وجہ سے میں اپنا سب کچھ ہار چکا ہوں۔ میرے سارے منصوبے ملیا میٹ ہوچکے ہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں بچا لیکن پاکستان میں تمہارے باپ کا چھپایا ہوا سونا اب بھی محفوظ ہے اور اس سونے کا راز اس ڈائری میں ہے جو تمہارے قبضے میں ہے۔ وہ سونا میرے نقصان کا ازالہ کرسکتا ہے۔ اگر اس وقت تمہیں مار ڈالوں تو میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔ اس وقت میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ تم سے الجھ سکوں لیکن میں جانتا ہوں کہ ہماری ملاقات ضرور ہوگی۔ کسی اور وقت کسی اور جگہ۔۔۔ اور ہماری وہ ملاقات فیصلہ کن ہوگی۔" بات کرتے ہوئے اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ وہ اتنا غیر محتاط نہیں تھا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکتی۔ میں نے بھی اِدھر اُدھر دیکھا۔ مادام اوتوکو بھی ایک طرف کھڑی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہورہا تھا۔ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک لڑکی

بیڈ کے قریب قالین پر اوندھی پڑی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا کہ وہ بے ہوش تھی یا مرچکی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کوئی انتظام کیے بغیر اوپر نہیں آئے ہو گے۔" دارا نے ایک بار پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہارے داؤ پیچ بڑی حد تک سمجھ چکا ہوں۔ نیچے گیٹ پر بھی تمہارا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور موجود ہو گا۔ یہاں سے انٹر کام پر اپنے آدمی کو ہدایت کردو کہ میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے اگر اس نے کوئی گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی تو یہ لڑکی زندہ نہیں رہے گی۔ چلو۔۔۔ سامنے انٹر کام لگا ہوا ہے۔ اپنے ساتھی کو بتاؤ کہ میں نیچے آرہا ہوں۔ گیٹ کھول دے۔"

میں نے آگے بڑھ کر دیوار پر لگے ہوئے انٹر کام سیٹ کا ریسیور اٹھالیا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ گارڈ روم میں کس نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

"اوتوکو۔ اسے گیٹ کا نمبر بتاؤ۔" دارا نے اوتوکو کی طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

مادام اوتوکو نے وہیں کھڑے کھڑے گارڈ روم کا نمبر بتادیا۔ میں نے مطلوبہ نمبروں کے بٹن دبائے۔ دوسری مرتبہ گھنٹی بجنے کے بعد ہی دوسری طرف سے ریسیور اٹھایا گیا تھا۔

"یس۔ آکاش بلڈنگ۔"

اگر اصل گارڈ انٹر کام کی یہ کال ریسیو کرتا تو وہ آکاش بلڈنگ کبھی نہ کہتا۔ کیونکہ یہ باہر کی کال نہیں تھی۔ بلڈنگ کے اندر سے انٹر کام کی کال تھی اور کال ریسیو کرنے والا یقیناً پاتھی تھا۔

"پاتھی۔" میں نے کہا "دارا سمونے کے ساتھ نیچے آرہا ہے۔ کوئی مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ توران کو بھی لابی سے باہر بلالو اور گیٹ کھول دو۔ سنا تم نے۔ کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔"

"یس لٹل ماسٹر۔" پاتھی کی آواز سنائی دی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور دارا کی طرف دیکھنے لگا۔

"شکریہ۔" دارا کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ آگئی "تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ مجھے اس طرح نکل جانے کا موقع دو گے۔"

"ہاں۔ میں تمہیں موقع تو دے رہا ہوں لیکن پھر ملاقات ہو گی۔ بقول تمہارے کسی اور وقت، کسی اور جگہ۔ ویسے ایک بات تم بھول رہے ہو۔ ترپ کا پتا اب بھی میرے پاس ہے۔" میں نے کہا۔

"میں سمجھ گیا تم کس پتے کی بات کررہے ہو۔" دارا بولا "میں چی فانگ کے شور کی آواز سن رہا ہوں۔ اسے شاید تم نے کمرے کے باتھ روم میں بند کردیا ہے۔ اگر مجھے اس کی ضرورت ہوتی تو سب سے پہلے اسی کو چھڑانے کی کوشش کرتا، لیکن اب وہ میرے کام کا نہیں رہا۔ بوجھ بن چکا ہے۔ میں تو پہلے ہی اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ یہ ایک اچھا موقع ہے اور اب تم لوگ اس طرف جاکر کھڑے ہو جاؤ۔ اگر کسی نے ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو اس لڑکی کا بھیجا اڑا دوں گا۔"

"تم اس لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔" میں نے کہا "اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے تو ہم زبردستی پکڑ کر لائے تھے۔ بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور اب تم لوگ ادھر۔" اس نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

ہم سب ہال کے آخری کونے میں چلے گئے۔ دارا اس لڑکی کو لے کر دروازے کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کی نظریں ہم پر ہی مرکوز تھیں۔ برآمدے والے دروازے سے باہر نکل کر اس نے دروازہ دھڑ سے بند کردیا اور باہر سے کنڈا لگائے جانے کی آواز بھی سنائی دی۔

میں اور ماسٹر ہوچن اپنے اپنے پستول کی طرف لپکے۔ رنگٹ بھی حرکت میں آگیا تھا اور پھر ایک سیکنڈ بعد ہم دروازے کے سامنے موجود تھے۔ رنگٹ دروازے پر کندھے سے ٹکریں مار رہا تھا۔ بعد میں میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن بہت جلد ہمیں اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ یہ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا اور باہر سے کنڈا لگا دیا گیا۔ اسے باہر سے ٹکریں مار کر تو توڑا جاسکتا تھا لیکن اندر سے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

"اے ادھر۔" مادام اوتوکو کی آواز سن کر میں چونک گیا "ادھر کچن کی طرف سے بھی باہر نکلنے کا راستہ ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم کچن کی طرف لپکے۔ اس طرف سے ایک چھوٹا دروازہ پہلو میں کھلتا تھا۔ ہم بڑی تیزی سے اس دروازے سے باہر نکلے تھے اور پھر ہال میں دوڑتے ہوئے لفٹ کے دروازے کے سامنے رک گئے۔ لفٹ نیچے جاچکی تھی۔

"ماسٹر۔" میں نے ماسٹر ہوچن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ان دونوں کمروں کے باتھ رومز میں تان منہ اور چی فانگ بند ہیں۔ تم دونوں انہیں سنبھالو۔ انہیں فرار کی کسی کوشش

کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔ میں دارا کو دیکھتا ہوں۔"

میں تیزی سے زینے کی طرف دوڑا اور دروازہ کھول کر ...یوں پر چھلانگ لگا دی۔ میں ایک ایک چھلانگ میں کئی ...ڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔

میں جب نیچے پہنچا تو دارا سمونے کو لے کر لابی کے باہر ...میں پہنچ چکا تھا۔ باہر کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ توران اور ...گیٹ کے قریب ایک طرف کھڑے تھے۔

...دارا نے پستول بدستور سمونے کی کنپٹی سے لگا رکھا تھا۔ ...ے ہاتھ سے وہ اسے بازو سے پکڑے کھینچتا ہوا جا رہا تھا۔ ...بوسچ میں آتے دیکھ کر وہ چیخا۔

"...پنی جگہ پر رک جاؤ اور اپنے آدمیوں سے کہو دور ...ے رہیں۔"

میں رک گیا۔ پاتھی اور توران بھی ایک طرف ہٹ ...دارا، سمونے کو لے کر گیٹ سے باہر نکل گیا اور پھر ...نے کی اور سمونے کی چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

میں دوڑ کر گیٹ کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لمحے کو رکا پھر ...پر نکل آیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا ...سا نکل گیا۔ سمونے سڑک پر پڑی ہذیانی انداز میں چیخ رہی ...اور تاریکی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی ...رہی تھیں اور پھر وہ آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔

میں دوڑ کر سمونے کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سڑک پر بڑی ...بری طرح چیخ رہی تھی۔ میں جھک کر اسے ٹٹولنے لگا۔ ...خیال تھا شاید دارا نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تھا لیکن ...والی بات نہیں تھی۔ دارا نے اسے دھکا دے کر دور ...پھینک دیا تھا جس سے اسے معمولی سی چوٹ لگی تھی۔ وہ ...ت چیخ رہی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

...اس دوران میں پاتھی اور توران بھی دوڑتے ہوئے ...پہنچ گئے۔ توران دارا کے پیچھے جانا چاہتا تھا مگر میں نے ...سے روک دیا۔

"کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے کہا "ان تاریک گلیوں میں ...بہت دور جاچکا ہو گا۔ اب وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ بیکار ہے ...کے پیچھے جانا۔"

توران اور پاتھی، سمونے کو بنگلے کے گارڈ روم میں لے ...اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ خوفناک ترین لمحات اگرچہ ...چکے تھے۔ اب وہ ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ اسے کوئی ...گیا تھا مگر ان خوفناک لمحات کے تصور سے وہ تھر تھر ...پ رہی تھی۔

...پیش ہونے والی بھاگ دوڑ اور سمونے کی چیخوں کے نتیجے میں بلڈنگ کے بعض فلیٹوں کی کھڑکیاں روشن ہو گئی تھیں۔ بعض نچلی منزلوں کی کھڑکیاں کھل گئی تھیں اور کچھ لوگ آگے کو جھکے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت نے گارڈ کا نام لے کر چیختے ہوئے پوچھا بھی تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ یہ گڑ بڑ کیسی ہے۔ وردی میں ملبوس پاتھی کو وہ گارڈ ہی سمجھی تھی لیکن پاتھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم لوگ یہیں رکو۔ میں اوپر جارہا ہوں۔" میں نے پاتھی اور توران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دوڑتا ہوا لابی میں پہنچ گیا۔

وہ لفٹ نیچے ہی تھی۔ میں نے اندر داخل ہو کر بٹن دبا دیا۔ لفٹ تیزی سے اوپر اٹھنے لگی۔

لفٹ رکی تو دروازہ کھلتے ہی میں نے باہر چھلانگ لگا دی اور دوڑتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ میرے بعد ماسٹر ہوچن یا رنگٹ نے برآمدے والا دروازہ باہر سے کھول دیا تھا۔

اندر کا منظر خاصا دلچسپ تھا۔ چی فانگ اور تان منہ قالین پر پڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھ باندھنے سے پہلے ماسٹر ہوچن نے انہیں کپڑے پہننے کا موقع دے دیا تھا۔ تین جوان اور خوب صورت لڑکیاں اس وقت تک کپڑے پہن چکی تھیں اور ایک صوفے پر مادام اوتوکو اور دوسرے پر وہ تینوں لڑکیاں ایک دوسرے سے لپٹی بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک تو بھائیں بھائیں رو رہی تھی۔

"کیا رہا؟" ماسٹر ہوچن نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"بھاگ گیا۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور وہ لڑکی؟"

"وہ محفوظ ہے، نیچے گارڈ روم میں ہے۔" میں نے جواب دیا اور چی فانگ کی طرف دیکھنے لگا "بہت زعم تھا تمہیں دارا کی دوستی پر۔ دیکھ لیا اس دوستی کا انجام۔ بھاگ گیا تمہیں چھوڑ کر۔ تم اس کے لیے بوجھ بن گئے تھے اور وہ تم سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس وقت تو اسے ایک بہانہ مل گیا تھا۔"

"نہیں۔ تم جھوٹ بکتے ہو۔ دارا ایسا نہیں کرسکتا۔" چی فانگ چیخا۔

"ایسا تو ہو چکا۔" میں نے پوچھا "اور ایسا کیوں ہوا؟ یہ تم اسی سے پوچھ لینا۔ اگلے جنم میں۔"

چی فانگ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں تان منہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میں نے چیانگ سامین کے اس فارم ہاؤس میں

اس کے ہاتھوں سے بچ نکلا اور کبھی وہ اپنی جان بچا کر بھاگ گیا اور آج کا منظر کچھ ایسا تھا کہ وہ مکمل طور پر میرے قابو میں تھا۔ میں نے اسے غسل خانے میں بند کردیا تھا اور اگر میں دارا کے پیچھے نہ بھاگتا تو چی فانگ کی ٹانگیں چیر ڈالتا۔ دارا کے فرار کے بعد جب میں فلیٹ میں واپس آیا تو چی فانگ بندھا ہوا پڑا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر نجانے مجھے کیوں جوش نہیں آیا۔ خون میں ابال کیوں نہیں پیدا ہوا۔ میں نے اسے خوں خوار بھیڑیے کی طرح چیر پھاڑ کیوں نہیں دیا تھا۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں خوں خوار بھیڑیا نہیں تھا۔ میری رگوں میں شریف النفس والدین کا خون دوڑ رہا تھا۔ میں فطرتاً رحم دل اور شریف انسان ہی تھا مگر مجھے جنگ جُو بنا دیا گیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں دوسروں کی جان لیتا رہا تھا اور اب شاید میں نے چی فانگ کو اس لیے نہیں مارا تھا کہ وہ میرے سامنے بے بسی کی حالت میں بندھا پڑا تھا۔ اگر اس کے ہاتھ پیر کھلے ہوتے اور وہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی اور وہ میرے ہاتھوں سے زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔

"تمہیں افسوس ہو رہا ہوگا کہ چی فانگ کو پولیس کے حوالے کیوں کردیا گیا۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے تھے۔

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا مقصد تو اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا تھا۔" جانکی بولی "ضروری نہیں کہ کسی سے انتقام لینے کے لیے اسے اپنے ہاتھوں ہی سے قتل کیا جائے۔ وہ قاتل ہے کئی بے گناہ لوگ اس کے ہاتھوں مارے جاچکے ہیں۔ اب وہ قانون کی تحویل میں ہے اور قانون اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرے گا۔ اسے اس کے جرائم کے مطابق سزا ضرور ملے گی۔"

"ہاں یہی ایک اطمینان ہے کہ قانون اسے معاف نہیں کرے گا۔" میں نے کہا "اب دارا باقی رہ گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی زیادہ دنوں تک آزاد نہیں رہ سکے گا۔ اسے میں قانون کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ سارا ہنگامہ اس نے شروع کیا تھا۔ میرے ماں باپ کا اصل قاتل تو وہی ہے۔ میں اسے کسی صورت معاف نہیں کروں گا۔"

"ہم بھی اسی کی وجہ سے یہ عذاب بھگت رہے ہیں۔" تھائی نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "وہ یہاں نہ آتا تو یہ سارے ہنگامے شروع نہ ہوتے اور ہمیں اس بری طرح برباد نہ ہونا پڑتا۔"

میں نے تھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی زبان پر پہلی مرتبہ اس قسم کی کوئی بات آئی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ اپنی بربادی کا احساس ہوا تھا اور شاید اب اسے کچھ پچھتاوا بھی ہو رہا تھا۔

"ٹھیک کہتی ہو تھائی۔" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا "مجھے وہ رات اچھی طرح یاد ہے جب میں اسی چی فانگ سے اپنی جان بچانے کے لیے تمہاری کار میں چھپ گیا تھا اور تمہاری بربادی تو اسی وقت شروع ہوگئی تھی جب تم نے مجھے اپنے گھر میں پناہ دی تھی اگر تم اسی وقت مجھے دھتکار دیتیں تو آج تمہیں یہ دن۔۔۔"

"وجو۔۔۔" تھائی کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی "میں تمہاری زبان سے ایسی کوئی بات نہیں سننا چاہتی جس سے مجھے دکھ پہنچے۔"

"لیکن تمہارا شکوہ۔۔۔"

"میں نے کوئی شکوہ نہیں کیا۔" تھائی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی "میں تو صورتِ حال کا تجزیہ کررہی تھی۔ صرف میں، تم اور جانکی ہی ان وحشیوں کی بربریت کا شکار نہیں ہوئے۔ انہوں نے تو درجنوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ کئی گھر اجاڑے ہیں۔ میں اور جانکی بھی اس لپیٹ میں آگئیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم نہ ہوتے تو ہماری جگہ کوئی اور ہوتا۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ ہم نے ایک سچائی کا ساتھ دیا اور ہمارے قدم نہیں ڈگمگائے۔"

"یہی تمہاری بڑائی ہے کہ سب کچھ چھن جانے کے باوجود تم دونوں اب تک ثابت قدم رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"بس اب اس بات کو ختم کرو۔" تھائی نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "آئندہ تمہاری زبان سے ایسی کوئی بات نہیں نکلنی چاہیے جس سے مجھے اور جانکی کو کوئی دکھ پہنچے۔ اچھا اب سو جاؤ۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔"

جانکی نے بتی بجھا دی۔ وہ دونوں بستر پر لیٹ گئیں۔ میں بھی اپنے کمرے میں جانے کے بجائے کوچ پر ہی لیٹ گیا مگر مجھے بہت دیر تک نیند نہیں آسکی تھی۔ میں ان دونوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنی عظیم ہیں یہ دونوں۔ سب کچھ برباد ہوجانے کے بعد بھی انہیں کوئی شکوہ نہیں تھا۔ ان کی زبان پر کوئی شکایت نہیں تھی۔

میرا ذہن برسوں پیچھے چلا گیا۔ ایک ایک بات مجھے یاد تھی۔ ایک ایک واقعہ فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شدت سے اپنے گھر کی

یاد ستانے لگی۔ وہ گھر جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ جس کے دروازے کے سامنے میرے ماں باپ کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور قاتلوں کے خوف سے مجھے بھی وہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ کئی سال بیت چکے تھے لیکن میں اس گھر کو ایک لمحے کو بھی نہیں بھولا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد تھا۔ کس کمرے میں کون سی چیز کہاں رکھی ہوئی تھی آنگن میں کہاں کون سا پودا لگا ہوا تھا۔ کن کن پودوں کے گملے کہاں کہاں رکھے ہوئے تھے۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا سانس بھی تیز ہو رہا تھا۔ میں اپنے گھر کب جاؤں گا؟

میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر میں گھر کے سپنے دیکھتا ہوا سو گیا۔

صبح دس بجے سے پہلے میری آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ تھائی اور جانکی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔ وہ دونوں کمرے میں بھی نہیں تھیں۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو جانکی اوپر آرہی تھی۔ مجھے دیکھ کر زینے پر ہی رک گئی۔

"ناشتا تیار ہوچکا ہے۔ میں تمہی کو بلانے آرہی تھی۔" جانکی نے کہا۔

تھائی ہال میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ بھی اٹھ گئی اور ہم تینوں ڈائننگ ٹیبل پر آگئے۔

"چندا روبن کہاں ہے؟" میں نے خادمہ سے پوچھا۔

"صبح پولیس آئی تھی۔" خادمہ نے جواب دیا "تہ خانے میں بند دونوں قیدیوں کو ان کے حوالے کردیا گیا ہے۔ چندا روبن ان کے ساتھ گئے ہیں۔"

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ خادمہ نے کال ریسیو کی اور پھر مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اٹھ کر ریسیور لے لیا۔ ماسٹر ہوچن کی کال تھی۔

"گزشتہ رات چی فانگ کی گرفتاری کے بعد پولیس نے آپریشن کریک ڈاؤن شروع کردیا ہے۔" ماسٹر ہوچن نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد کہا "کئی بڑے مگرمچھوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کردیا گیا ہے۔ لاتعداد چھوٹی مچھلیاں بھی پکڑی گئی ہیں۔ جرائم پیشہ لوگ پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ معمولی چور اچکے اور جیب تراش قسم کے لوگ بھی اس جال میں پھنس رہے ہیں۔ رتنا کوسن اس آپریشن کی نگرانی کررہا ہے۔ جب تک اس شہر سے جرائم پیشہ لوگوں کا خاتمہ نہیں ہوجاتا وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔"

"اور دارا کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا لیکن اب اسے بھی پناہ نہیں ملے گی۔ ایک آدھ دن میں وہ بھی گرفت میں آجائے گا۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا اور پھر بولا "تمہارے لیے ایک خوش خبری یہ ہے کہ اب تم لوگ آزادی سے گھوم پھر سکتے ہو۔ کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مہاراج نے کہا ہے کہ تم لوگ اپنی مرضی سے کہیں بھی آجا سکتے ہو۔ آدھے گھنٹے میں ایک گاڑی تمہارے پاس پہنچ جائے گی اور اسی خوشی میں تم لوگ آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ گے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اندرا ریجنٹ ہوٹل کے سالہ تھائی ریسٹورنٹ میں۔ ٹھیک آٹھ بجے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "میں نے ٹیبل ریزرو کروالی ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے تھائی کلاسک ڈانس پروگرام شروع ہوجاتا ہے۔ تم لوگ انجوائے کروگے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس سے پہلے ہم اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے جانکی والے بنگلے میں۔" میں نے کہا۔

"ہوٹل سے واپسی پر تم لوگوں کو وہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ میں دو تین لڑکوں کو سکھدر کے ساتھ وہاں بھیج دیتا ہوں۔ وہ صفائی وغیرہ کردیں گے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا اور پھر چند اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

میں نے تھائی اور جانکی کو ماسٹر ہوچن سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ دونوں کھل اٹھیں۔ وہ دونوں یہیں کی رہنے والی تھیں۔ یہیں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی پوری زندگی یہاں گزری تھی لیکن چند سال پہلے مجھ سے ملاقات ہونے کے بعد شہر کے در و دیوار ان کے لیے اجنبی بن گئے تھے۔ لوگ اجنبی بن گئے تھے۔ ان کے اپنے ہی ان کے دشمن ہوگئے تھے۔ ان کے آشیانوں کو جلا کر خاکستر کردیا گیا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے چھپتی پھر رہی تھیں اور آج چند سال بعد انہیں یہ نوید ملی تھی کہ یہ شہر انہی کا ہے۔ وہ آزادی سے اس شہر کے گلی کوچوں میں گھوم پھر سکتی ہیں۔ آزاد فضا میں سانس لے سکتی ہیں۔

"ابھی تم نے بتایا کہ جرائم پیشہ لوگوں کے خلاف آپریشن کریک ڈاؤن شروع کردیا گیا ہے۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا ایسی صورت میں کھلے عام پھرنا ہمارے لیے خطرناک نہیں ہوگا؟"

"ماسٹر ہوچن نے کہا ہے کہ بڑی بڑی مچھلیوں کو پکڑ لیا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا "گزشتہ رات کو چی فانگ کی

گرفتاری کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا تھا جو صبح تک جاری رہا۔ بڑے بڑے سب لوگ سلاخوں کے پیچھے پہنچ چکے ہیں۔ اب صرف چھوٹی مچھلیاں رہ گئی ہیں جنہیں پکڑنے کے لیے جال پھیلائے جا رہے ہیں اور بھلا ہمیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"میں خطرات سے تو نہیں ڈرتی ہوں۔" جانگی مسکرائی "بہرحال، چلیں گے۔ آج خوب گھومیں پھریں گے۔"

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارا موضوع دارا تھا۔ وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگا تھا اور ہم سوچ رہے تھے کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ بہرحال، اب اس کی طاقت ٹوٹ چکی تھی۔ وہ زیادہ دنوں تک چھپا نہیں رہ سکے گا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ اس مرتبہ پولیس نے پوری سنجیدگی سے کارروائی شروع کی تھی۔ رتنا کوسن اس آپریشن کی نگرانی کر رہا تھا اور اس میں کسی پولیس آفیسر کی طرف سے کوتاہی کی توقع نہیں تھی۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ خادمہ اس وقت لان میں گیٹ کے قریب ہی تھی۔ اس نے پہلے ذیلی دروازہ کھولا اور پھر پورا گیٹ کھول دیا۔ سفید رنگ کی ایک شان دار کار اندر آکر پورچ میں رک گئی۔ میں اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ کار کی ڈرائیونگ سیٹ سے جو آدمی نیچے اترا، وہ کاسپرو تھا۔

تھائی اور جانگی بھی باہر آچکی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ کاسپرو نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے لفافہ کھولا تو میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس میں بڑی مالیت کے تھائی کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ کار اور یہ کرنسی نوٹ ہمارے لیے رتنا کوسن نے بھیجے تھے۔ ہمارے پاس واقعی رقم وغیرہ نہیں تھی اور رتنا کوسن نے کار کے ساتھ رقم بھی بھیج دی تھی۔

چند منٹ بعد ہی ہم اس شان دار کار میں چندا روبن کے بنگلے سے نکل رہے تھے۔ کار ائرکنڈیشنڈ تھی اور بلٹ پروف بھی۔ رتنا کوسن کو شاید یہ احساس تھا کہ ہم ابھی پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔

سب سے پہلے ہم سوکھم وٹ روڈ پر گئے جہاں سوئے گیارہ پر نیورائل فیشن شاپ تھی۔ یہ بنکاک کی سب سے بڑی فیشن ٹیلرنگ شاپ تھی۔ یہاں ریڈی میڈ ملبوسات بھی تھے۔ اس اسٹور کا مالک ایک سکھ تھا۔ دکان پر اگرچہ کئی سیلز مین موجود تھے لیکن اتفاق سے ہمارا سامنا سکھ مالک ہی سے ہوا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے ہم اسٹور میں رہے۔ ہم تینوں نے اپنے لیے دو دو سوٹ پسند کیے تھے۔ سوکھم وٹ روڈ سے نکل کر ہم کرونگ تھان بوری روڈ پر آگئے۔ جہاں ایک ذیلی گلی میں نہر کے قریب تھائی کا بنگلا ہوا کرتا تھا۔ وہاں ملبا اب بھی موجود تھا۔ صرف مٹی کا ڈھیر تھا۔

تھائی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ جانگی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسری طرف سے میں نے تھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے اور پھر کار میں بیٹھ گئے۔

"اب کہاں چلنا ہے لٹل ماسٹر؟" کاسپرو نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہیں بھی۔" میرے بجائے جانگی نے کہا "پورا شہر گھما دو۔ کہیں بھی ڈرائیو پر لے چلو۔"

کاسپرو بھی مسکرا دیا۔

کار ٹاکسن برج سے ہوتی ہوئی سیتھرون روڈ پر آگئی اور ایکسپریس وے عبور کرتے ہوئے رامافور روڈ پر نکل آئی اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کار کن کن سڑکوں پر ہوتی ہوئی شہر سے باہر جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری نظر اچانک ہی عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے کی طرف اٹھ گئی۔ پیچھے آنے والی ایک سرخ کار کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کار کو میں ایک دو مرتبہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

"کاسپرو۔" میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا "ایک سرخ کار ہمارے پیچھے آرہی ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ پہلے بھی اسے دیکھا ہے۔"

"وہ سرخ کار۔" کاسپرو مسکرا دیا "گھبرانے کی ضرورت نہیں لٹل ماسٹر۔ اس میں اپنے ہی گن مین ہیں۔"

"گن مین!" میں چونک گیا "کیوں۔۔۔؟"

"تم لوگوں کی طرف سے آنکھیں تو بند نہیں رکھی جا سکتیں۔" کاسپرو نے جواب دیا "تم نے شاید دھیان نہیں دیا۔ یہ کار شروع ہی سے ہمارے پیچھے ہے۔"

میں نے مزید کچھ نہیں کہا۔ کار تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھائی اور جانگی کسی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔" میں نے سڑک کے بائیں طرف ایک شان دار عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کاسپرو سے پوچھا۔

"تم شاید اس جگہ کو بھول گئے ہو لٹل ماسٹر۔" کاسپرو نے جواب دیا "یہ وہی جگہ ہے جہاں سوامی رگوناتھ کا آشرم ہوا کرتا تھا۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ایک سال میں یہ شہر کتنا بدل گیا ہے۔ سوامی رگھوناتھ کا آشرم تو جل کر راکھ ہو گیا تھا اور رگوناتھ بھی ختم ہو گیا تھا۔ یہ بلڈنگ نئی ہے۔ کس نے بنائی ہے؟"

"آپ کے چیانگ سائین والے دوست سردار تھالوب نے۔" کاسپرو نے جواب دیا "یہ زمین اس نے حکومت سے لے لی تھی۔ یہاں اس نے حکومت ہی کے تعاون سے منشیات کے عادی افراد کی بحالی کے لیے اسپتال بنایا ہے۔ اس بلڈنگ کی تعمیر کے لیے دن رات کام ہوا تھا اور تقریباً دو مہینے پہلے ہی یہاں کام شروع ہوا ہے۔"

"گڈ۔" میں نے کہا "اس کا مطلب ہے سردار تھالوب واقعی بہت کام کر رہا ہے۔"

وہ عمارت واقعی بہت شاندار تھی۔ ذرا آگے جانے کے بعد میں نے کار واپس مڑوالی اور عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے پھر اس طرف دیکھنے لگا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں لادینیت اور فحاشی کا بہت بڑا اڈا قائم تھا۔ یہاں کئی لوگوں کی زندگیاں برباد ہوئی تھیں۔ کئی گھر اجڑے تھے اور اب اس جگہ پر نشے میں مبتلا ہو کر زندگی سے دور ہونے والوں کو زندگی کے قریب لایا جا رہا تھا۔

کار دوبارہ شہر میں داخل ہو کر ایک بار پھر رامافور روڈ پر مڑنے لگی۔

اس وقت دو بج رہے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے کاسپرو سے کہا کہ وہ کار کسی اچھے ریسٹورنٹ کے سامنے روک لے۔

کچھ دیر بعد کاسپرو نے کار رامافور روڈ سے ذرا ہٹ کر ڈوسیٹ تھانی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر روک لی۔ اس کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ٹورسٹ پولیس اسٹیشن اور اس کے پیچھے لم فینی پارک تھا جس کے گیٹ کے قریب شہنشاہ راما ششم کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔

ڈوسیٹ تھانی بہت بڑا رہائشی ہوٹل تھا۔ اس کا ریسٹورنٹ بھی بڑا شان دار تھا۔ کاسپرو اگرچہ باہر گاڑی میں ہی رکنا چاہتا تھا مگر ہم اسے بھی اپنے ساتھ ریسٹورنٹ میں لے گئے تھے۔

ہوٹل کا کھانا بھی بہت لذیذ تھا۔ تھائی اور جانگی کھانے کے دوران میں بھی چہکتی رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جب سے ہم کار پر چندا روبن کے بنگلے سے باہر نکلے تھے وہ دونوں چہک رہی تھیں اور بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ انہیں خوش دیکھ کر مجھے بھی خوشی ہو رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی سال بعد ہم تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

ہوٹل سے نکل کر بھی ہم دیر تک کار میں شہر کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ ایک سال پہلے جب میں یہاں تھا تو ہنگاموں میں گھرا رہا تھا۔ میری زندگی بھاگ دوڑ میں ہی گزری تھی۔ مجھے شہر کی سڑکوں اور عمارتوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں اور اب تھائی اور جانگی میری معلومات میں اضافہ کر رہی تھیں۔

پانچ بجے کے قریب میں نے کاسپرو کو ہدایت کی کہ وہ کار کو جانگی کے بنگلے کی طرف موڑ لے۔ اس وقت ہم شہر کے جنوبی علاقے میں بس ٹرمنل کے آس پاس تھے۔ کاسپرو نے کار پہلے پھراپن روڈ اور پھر روون امارن روڈ پر موڑ لی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم جانگی کے بنگلے والی گلی میں مڑ رہے تھے۔

ہم ایک سال بعد یہاں آئے تھے۔ یہاں کی فضا بڑی عجیب اور اجنبی سی لگ رہی تھی حالانکہ یہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہم نے ایک سال پہلے چھوڑا تھا۔

گیٹ کے سامنے کار رکتے ہی میں نیچے اتر گیا اور بیل بجانے لگا۔ اسی دوران میں تھائی اور جانگی بھی میرے قریب آگئی تھیں اور وہ اچک اچک کر گیٹ کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گیٹ کے دوسری طرف دیکھ سکتا تھا اور میں نے سکھدر کو برآمدے سے نکل کر گیٹ کی طرف آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

گیٹ کھلا اور ہم تینوں بے صبری سے اندر داخل ہو گئے۔ کار ہمارے بعد گیٹ میں داخل ہوئی تھی۔ سکھدر نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا۔ جانگی اور تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو میں پہلے بھی دیکھا کرتا تھا۔

برآمدے کے سامنے لان میں بے ترتیب سا فرنیچر اور گھر کا دوسرا سامان بکھرا ہوا تھا۔ جب ہم اندر آئے تو مہاراج کے جمنازیم کے دو لڑکے ایک کمرے میں فرنیچر سیٹ کر رہے تھے۔ تمام کمروں کے فرش دھلے ہوئے تھے۔ تمام دیواریں جھاڑ دی گئی تھیں۔ چھتوں سے لٹکے ہوئے پنکھے بھی صاف کر دیے گئے تھے۔ اب صرف سامان سیٹ کرنا باقی رہ گیا تھا۔

وہ کمرا تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ دونوں لڑکے بیڈ پر چادر بچھا

کر باہر چلے گئے۔ میں پلنگ پر گر گیا۔ مجھے عجیب سا سکون مل رہا تھا یہاں آکر۔ جانکی اور تھائی بھی پلنگ پر ڈھیر ہو گئیں۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد سکھدر کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس نے بتایا کہ ہال نما کمرے میں کرسیاں اور صوفے لگا دیے گئے ہیں۔ ہم اٹھ کر ہال نما کمرے میں آگئے۔

"سکھدر۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کسی کو بھیج کر بازار سے چائے منگوالو۔ اس وقت بڑی طلب ہو رہی ہے۔"

"یس باس۔" سکھدر کہتے ہوئے باہر چلا گیا۔

اس نے چائے لانے کے لیے ایک لڑکے کو بھیج دیا جبکہ خود دوسرے لڑکے کے ساتھ مل کر دوسرے کمرے کا فرنیچر سیٹ کرنے لگا۔

چائے آگئی اور پھر چائے پینے کے بعد ہم نے وہ شام وہیں گزار دی۔ کار سے ہم نے بازار سے خریدا ہوا سامان نکال لیا تھا اور پھر کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے ساڑھے سات بجے کے قریب ہم اندرا ریجنٹ ہوٹل جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک جگہ تھائی نے کار رکوالی۔

"کاسپرو۔" وہ ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم صبح سے ہمارے ساتھ ڈرائیونگ کر رہے ہو۔ تھک گئے ہو گے۔ اب تم گھر چلے جاؤ۔"

"لیکن مس..."

"کچھ نہیں۔" تھائی کہتے ہوئے اپنی سائڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی "گاڑی میں ڈرائیو کرلوں گی۔ جانکی بھی ڈرائیونگ جانتی ہے۔"

کاسپرو نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ وہ انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر گیا۔ تھائی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسٹیرنگ سنبھال لیا اور مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کار آگے بڑھا دی۔

ماسٹر ہوچن سالہ تھائی ہال میں ہمارا منتظر تھا۔ یہ ڈنر کا وقت تھا اور اس وقت پورا ہال گاہکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

اس ہوٹل میں داخل ہوتے ہی مجھے وہ وقت یاد آگیا جب میں پہلی مرتبہ یہاں آیا تھا اور ٹائیگر کے آدمیوں نے ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ہم نے ماسٹر پھو کو ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی۔ ماسٹر پھو نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ ہوٹل کے سامنے ٹائیگر اور اس کے آدمیوں کے گھیرے میں آگیا تھا اور انہوں نے بڑی بے دردی سے ماسٹر پھو کو موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا۔

مجھے سب کچھ یاد تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ تھائی کس طرح مجھے ہوٹل سے نکال کر لے گئی تھی اور یہیں سے میرے ساتھ تھائی کی بربادی کا بھی آغاز ہوا تھا۔ وہ ہوٹل کے پارکنگ میں تھائی کی گاڑی کے لائسنس نمبرز کے ذریعے کھوج لگاتے ہوئے اس کے بنگلے تک پہنچ گئے تھے۔ اگر تھائی مجھے ان کے حوالے کر دیتی تو اس کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح آرام اور سکون کی زندگی گزار رہی ہوتی مگر تھائی نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا مگر مجھ سے دستبرداری قبول نہیں کی تھی۔ اس کا بنگلا جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ جان بچانے کے لیے میرے ساتھ بھاگتی پھر رہی تھی۔

لیکن آج صورتِ حال مختلف تھی۔ آج ہمارے ذہنوں میں کوئی خوف نہیں تھا۔ میرے دشمن اگرچہ آج بھی زندہ تھے اور اسی شہر میں تھے لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ پہلے ہم ان سے چھپا کرتے تھے اور آج انہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور وہ پناہ کی تلاش میں بھاگے پھر رہے تھے۔

کھانا بہت لذیذ تھا۔ ماسٹر ہوچن نے آرڈر بھی بہت لمبا چوڑا دیا تھا۔ وہ پلیٹیں اٹھا اٹھا کر ہمارے سامنے رکھ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہر چیز ہمارے حلق میں ٹھونس دیتا۔

کھانے کے بعد تیرھویں صدی کے سیامی کلاسک ڈانس نے تو شام کو اور بھی رنگین بنا دیا تھا۔ کینڈل ڈانس میرے لیے بہت ہی حیرت انگیز ثابت ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اس طرح تفریح کا موقع ملا تھا اور ہم اس سے جی بھر کے محظوظ ہو رہے تھے۔

رات ایک بجے کے قریب ہم ہوٹل سے نکلے۔ ماسٹر ہوچن کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ وہ ہم سے ہاتھ ملا کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور ہم اپنی گاڑی میں۔ اس مرتبہ اسٹیرنگ جانکی نے سنبھالا تھا۔

ہوٹل سے روانہ ہونے کے بعد ماسٹر ہوچن کی گاڑی بھی ہمارے پیچھے لگی رہی اور جب ہم ٹاکسن انیچو والے چوراہے سے جانکی کے بنگلے کی طرف جانے والی سڑک پر مڑے تو ماسٹر ہوچن کی گاڑی سیدھی آگے نکل گئی تھی۔

سکھدر بنگلے میں موجود تھا جبکہ دوسرے دونوں لڑکے جا چکے تھے۔ پورا گھر آراستہ کر دیا گیا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔ سکھدر نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ جو چیز پہلے جس جگہ پر تھی اسے دوبارہ اسی جگہ پر رکھا جائے۔ اس کے باوجود وہ دیر تک تھائی اور جانکی کو سمجھاتا رہا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ اس طرح ڈھائی بج گئے۔

جانکی اور تھائی ایک کمرے میں چلی گئیں۔ سکھدر بیرونی کمرے میں چلا گیا اور میں برآمدے والا دروازہ بند کر کے دوسرے کمرے میں آگیا۔

اس روز بستر پر گرتے ہی میں نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا اور شاید طویل عرصے بعد میں پہلی بار سکون کی گہری نیند سویا تھا۔

میں صبح دس بجے سے پہلے نہیں جاگ سکا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی جانکی میرے لیے چائے لے کر آگئی اور پھر اسی وقت پتا چلا کہ جانکی صبح سویرے ہی جاگ گئی تھی اور اس نے سکھدر کو بھیج کر بازار سے ضرورت کی تمام چیزیں منگوالی تھیں۔ اس روز ناشتا بھی جانکی ہی نے بنایا تھا۔

ناشتے کے بعد میں نے ماسٹر ہوچن کو فون کرنا چاہا تو پتا چلا کہ ٹیلی فون ڈیڈ پڑا ہوا ہے اور پھر اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ تقریباً ایک سال سے یہ فون استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں بل وغیرہ جمع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اس لیے کنکشن کاٹ دیا گیا تھا۔

بارہ بجے کے قریب ہم ایک بار پھر اپنے آوارگی کے مشن پر روانہ ہو گئے۔ مختلف سڑکوں پر گھومتے ہی جانکی نے کار کا رخ اس طرف موڑ دیا جہاں ہندوؤں کی آبادی اور بہت بڑا مندر تھا۔ اسی مندر کے پیچھے ایک گلی میں جانکی کا وہ مکان تھا جہاں تھائی کے بنگلے پر ٹائیگر کے غنڈوں کے حملے اور آتش زنی کے بعد فرار ہو کر میں نے اور تھائی نے پناہ لی تھی لیکن اسی رات جانکی کی ملازمہ اور اس کے نواسے کی بدمعاشی کی بدولت ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔

گلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ایک دو گاڑیاں اور ٹک ٹک اس طرح کھڑے تھے کہ زیادہ راستہ رکا ہوا تھا۔ جانکی بڑے محتاط انداز میں کار چلا رہی تھی۔ گلی میں کھیلتے ہوئے کچھ ننگ دھڑنگ بچے بھی کار کے پیچھے لگ گئے تھے۔

جانکی نے اپنے مکان کے سامنے کار روک دی۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں بھی نیچے اتر آئے اور پھر اپنے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے جانکی ٹھٹک کر رک گئی۔ میں بھی رک کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ سانولی رنگت اور ماتھے پر بندیا لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے گہری نظروں سے جانکی کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر دروازے میں گھس گئی۔

کچھ دیر بعد یہ انکشاف خاصا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ جانکی کے مکان پر کسی اور ہندو فیملی نے قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ خبر بھی پوری گلی میں پھیل گئی تھی کہ ڈاکٹر جانکی دیوی واپس آگئی ہے۔ بہت سی عورتیں اس مکان میں جمع ہو گئی تھیں۔

اچھی خاصی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ مکان پر قابض ہونے والا ہندو ایک شراب خانے کا مالک تھا اور اس کے تھوڑے بہت تعلقات بھی تھے اور غالباً ان تعلقات کی بنا پر ہی وہ مکان خالی کرنے کو تیار نہیں تھا اور الٹا جانکی کو دھمکا بھی رہا تھا۔

"میں تمہیں صرف ایک ہفتے کی مہلت دے رہی ہوں۔ اگر تم نے مکان خالی نہیں کیا تو پولیس کے ذریعے سامان باہر پھنکوا دوں گی اور تمہیں بھی سلاخوں کے پیچھے بند کروا دوں گی۔" جانکی نے اسے دھمکی دی اور پیر پٹختی ہوئی باہر آگئی۔

وہاں سے ہم واٹ ٹریمٹ (خانقاہ) پہنچے۔ مہاراج ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ٹیلی فون کی بات کی تو جانکی نے اپنے مکان کا مسئلہ بھی بتا دیا۔ مہاراج نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

ہم رات نو بجے کے قریب گھر واپس پہنچے تھے۔ اس وقت تک ہمارا ٹیلی فون ٹھیک ہو چکا تھا۔ یہ مہاراج کا کمال تھا۔ انہوں نے متعلقہ محکمے کو فون کیا ہو گا اور ان کو ایک ہی کال کی ہو گی اور فون بحال ہو گیا۔ جانکی اگر ذاتی طور پر کوشش کرتی تو شاید کئی روز لگ جاتے۔

اس رات بھی ہم دیر تک جاگتے اور گپ شپ کرتے رہے اور پھر اگلی صبح فون پر جو سب سے پہلی خبر ملی، وہ یہ تھی کہ گزشتہ رات چی فانگ پولیس کی حراست سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ اطلاع ماسٹر ہوچن نے دی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو ماسٹر!" میں چیخ اٹھا "یہ کیسے ہوا؟ وہ کس طرح فرار ہو گیا؟"

"پولیس نے ابھی اسے عدالت میں پیش نہیں کیا تھا۔" ماسٹر ہوچن کہہ رہا تھا "دراصل پولیس اس کے خلاف ایسا کیس عدالت میں پیش کرنا چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح بھی سزا سے نہ بچ سکے۔ چالان کی تیاری کے لیے پولیس مختلف لوگوں سے رابطے کر کے تفتیشی رپورٹ تیار کر رہی تھی۔ تمہیں یاد ہے تھنگ ماہلک ڈسٹرکٹ کے ایک بنگلے میں پامیلا نامی ایک لڑکی دارا کے ہاتھوں ماری گئی تھی اور اس بنگلے میں ٹائیگر تمہارے ہاتھ لگا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ میں پامیلا کی موت کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ دارا نے اسے خنجر سے اس طرح چیر پھاڑ ڈالا تھا کہ وہ منظر یاد کر کے آج بھی روح کانپ اٹھتی ہے مگر اس واقعے کا یہاں کیا ذکر؟" میں نے کہا۔

"اس کیس کی تفتیش کیلئے پولیس چی فانگ کو رات دو بجے اس بنگلے میں لے گئی تھی۔ دراصل پولیس دارا کو بھی اس کیس میں نامزد کرنا چاہتی ہے۔ اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے چی فانگ کو وہاں لے جایا گیا تھا مگر اس نے موقع پاکر ایک پولیس والے کا ریوالور اس کے ہولسٹر سے نکال لیا اور ایک کانسٹیبل کو قتل کر کے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ پولیس نے اس پورے علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ رات بھر اس کی تلاش ہوتی رہی۔ محکمے کی ساری نفری پورے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ کئی مشکوک مقامات پر چھاپے مارے گئے۔ کئی مشتبہ لوگوں کو حراست میں لیا گیا تاکہ ان سے چی فانگ کے بارے میں پوچھ گچھ کی جاسکے لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔" ماسٹر ہوچن چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "رتنا کوسن کو صبح چار بجے اس کی اطلاع دی گئی تھی۔ وہ فوراً ہی پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ صورتِ حال کا صحیح علم ہونے کے بعد اس پولیس اسٹیشن کے سارے عملے کو معطل کر کے گرفتار کرلیا گیا ہے۔"

"کیا چی فانگ کے فرار میں پولیس کے کسی آدمی کی سازش ہوسکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا "یہ تو تحقیقات کے بعد ہی پتا چلے گا کہ کوئی پولیس والا اس سازش میں شریک تھا یا نہیں لیکن اتنے خطرناک ملزم کو اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر پولیس اسٹیشن سے باہر لے جانا شبہات کو ہوا دے رہا ہے اگر کوئی پولیس والا اس سازش میں ملوث ثابت ہوا تو بچ نہیں سکے گا۔"

"اور دارا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا بھی ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔ خیال ہے کہ چی فانگ بھی اسی کے پاس گیا ہوگا۔ پورے شہر کی پولیس بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کررہی ہے۔" ماسٹر ہوچن نے جواب دیا۔

کافی دیر تک ماسٹر ہوچن سے اس موضوع پر بات ہوتی رہی پھر میں نے فون بند کردیا اور جانکی اور تھائی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں بھی تشویش ابھر آئی تھی۔ بات تھی بھی تشویش کی۔ چی فانگ کا فرار خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اگر وہ دونوں دوبارہ مل گئے تو صورتِ حال بڑی دھماکا خیز ہوسکتی تھی۔

ناشتے کے دوران میں بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ چی فانگ فرار ہو کر کہاں جاسکتا ہے اور دارا کہاں چھپا ہوا ہوگا۔ اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوا؟" جانکی اور تھائی نے بیک وقت پوچھا۔

"میری وہ پینٹ کہاں ہے۔" میں نے کہا "چندا رون کے بنگلے سے یہاں آنے کے بعد ہم نے کپڑے بدلے تھے میری پینٹ کہاں ہے؟"

"اس وقت گھر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں نے سارے میلے کپڑے اس کمرے میں الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیے تھے مگر کیا بات ہے؟" تھائی نے کہا۔

"ایک منٹ میں ابھی آرہا ہوں۔" میں کہتا ہوا کمرے کی طرف چلا آیا۔

یہ وہی کمرا تھا جہاں سب سے پہلے فرنیچر وغیرہ آراستہ کردیا گیا تھا اور ہم تینوں نے باری باری اسی کمرے میں لباس تبدیل کیے تھے۔ سب سے پہلے میں نے کپڑے بدلے تھے اور اتارے ہوئے کپڑے پلنگ پر ڈال کر ہی باہر چلا گیا تھا۔ آخر میں تھائی نے لباس تبدیل کیا تھا اور سارے میلے کپڑے اٹھا کر الماری کے نچلے خانے میں ڈال دیے تھے۔

میں نے الماری کھول کر نچلے خانے میں رکھے ہوئے کپڑے نکال لیے اور اپنی پینٹ اٹھا کر جیبوں کی تلاشی لینے لگا اور بالآخر پچھلی جیب سے مطلوبہ چیز مل گئی۔ یہ وہی وزیٹنگ کارڈ تھا جو مادام اوتوکو کے پینٹ ہاؤس میں دارا کی قمیص کی جیب سے ملا تھا۔

"مس شیوانی۔۔۔ کک باکسنگ پرموٹر!"

میں نے کارڈ پر لکھا ہوا نام زیرِ لب دہرایا اور اس کارڈ کو چٹکی میں دبائے کمرے سے باہر آگیا۔

"یہ کیا ہے؟" تھائی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ وزیٹنگ کارڈ مادام اوتوکو کے پینٹ ہاؤس میں دارا کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔" میں نے کہا اور پھر تفصیل بتانے لگا اور آخر میں کہہ رہا تھا "مس شیوانی کک باکسنگ پرموٹر ہے۔ دارا کی جیب سے اس کارڈ کے برآمد ہونے کا مطلب ہے کہ ان دونوں کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے ہوسکتا ہے دارا نے اس کے ہاں پناہ لے رکھی ہو۔"

"عین ممکن ہے لیکن۔۔۔" جانکی کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کارڈ دارا کی جیب میں تھا اور اسے قمیص چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔" جانکی نے کہا "اسے معلوم ہوگا کہ کارڈ اس کی جیب میں ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ یہ کارڈ تمہارے یا

ٖلیس کے ہاتھ آسکتا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ دارا ٖں شیوانی کے ہاں جانے کی حماقت نہیں کرے گا۔"

"نادانستہ غفلت۔" میں نے کہا "لوگوں کو اکثر یاد نہیں ٖیتا کہ اُن کی جیبوں میں کیا کچھ بھرا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے ٖا کو بھی یاد نہ رہا ہو کہ یہ کارڈ اس کی جیب میں تھا اور عین ٖمکن ہے اس نے مس شیوانی کے پاس ہی پناہ لے رکھی ہو۔ ٖبات کو آج چار دن ہوچکے ہیں اور اگر وہ وہیں ہے تو اب ٖاسے اطمینان ہوگیا ہوگا کہ پولیس مس شیوانی کے ٖرے میں نہیں جانتی۔"

"ممکن ہے تمہاری بات درست ہو۔" جانکی نے میرے ٖائل تسلیم کرتے ہوئے کہا "کوئی کارروائی کرنے سے پہلے ٖں کی تصدیق کرنی پڑے گی اور اس میں بڑی احتیاط سے کام ٖنا ہوگا۔"

"ہاں۔ اگر احتیاط نہ برتی گئی تو دارا کو وہاں سے بھی ٖار ہونے کا موقع مل جائے گا۔" میں نے کہا۔

کچھ دیر بعد میں نے ماسٹر ہوچن کو فون کیا اور اسے بنگلے ٖآنے کو کہا۔ فون پر تفصیل سے بات نہیں ہوسکتی تھی۔

ماسٹر ہوچن تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہاں پہنچ گیا۔ میں نے ٖے مس شیوانی کا وہ کارڈ دکھایا اور اپنے خدشات کا اظہار ٖیا۔

"مس شیوانی لیڈیز کک باکسنگ کی پرموٹر ہے اور اسے ٖہر کا ہر وہ شخص جانتا ہے جسے کک باکسنگ سے ذرا سی بھی ٖچسپی ہو۔" ماسٹر ہوچن نے کہا "شیوانی کو میں بھی جانتا ہوں ٖگر اس سے ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ وہ بہت بے ایمان اور ٖبے ضمیر عورت ہے۔ وہ کک باکسنگ کے مقابلے تو منعقد ٖکراتی ہے لیکن اکثر و بیشتر مخالف پارٹی سے پیسے لے کر اپنی ٖباکسرز کو ہروا دیتی ہے۔ پیسہ ہی اس کا دین دھرم ہے۔ ٖہوسکتا ہے پیسے کے لالچ میں اس نے دارا کو اپنے ہاں پناہ ٖدے رکھی ہو۔"

"لیکن کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس کی تصدیق ٖبہت ضروری ہے کہ دارا وہاں موجود ہے یا نہیں اور اس ٖمقصد کے لیے ہمیں کسی ایسی لڑکی کو استعمال کرنا پڑے گا جس ٖکا تعلق کک باکسنگ سے ہو۔" میں نے کہا۔

"ایسی لڑکیاں تو مل سکتی ہیں لیکن رتنا کوسن چونکہ اس ٖانویسٹی گیشن کی نگرانی کررہا ہے اس لیے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ٖاسے علم میں لانا ہوگا۔ میرا خیال ہے تم فون پر رتنا کوسن ٖسے بات کرو۔ اس کے بعد ہم اس سے مل لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ نمبر بتاؤ میں بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

ماسٹر ہوچن نے نمبر بتانے کے بجائے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملایا اور لائن ملنے کے بعد ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ کال رتنا کوسن کی سیکریٹری نے ریسیو کی تھی۔ میں نے اپنا نام بتایا تو اس نے فوراً رتنا کوسن سے لائن ملادی۔

میں تقریباً پانچ منٹ تک رتنا کوسن سے بات کرتا رہا پھر فون بند کردیا اور ماسٹر ہوچن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب چل پڑو ماسٹر۔ اس نے ہمیں فوری طور پر اپنے دفتر میں بلایا ہے۔"

میں اور ماسٹر ہوچن فوراً ہی روانہ ہوگئے۔ ماسٹر اپنی گاڑی لے کر آیا تھا۔ تھائی اور جانکی سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ کہیں جانا چاہیں تو چلی جائیں۔

ہم تقریباً آدھے گھنٹے میں رتنا کوسن کے دفتر میں پہنچ گئے۔ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور فوراً ہی اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس وقت رتنا کوسن کے پاس دو اور اعلیٰ افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں فوراً ہی فارغ کردیا گیا۔

میں نے مس شیوانی کا وزیٹنگ کارڈ رتنا کوسن کو دکھایا اور اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ہم میں تقریباً آدھا گھنٹا گفتگو ہوتی رہی اور بالآخر طے پایا کہ دو لڑکیوں کے ذریعے مس شیوانی کے دفتر اور گھر پر یہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کہ دارا وہاں موجود ہے یا نہیں۔

رتنا کوسن کے دفتر سے نکل کر ماسٹر ہوچن نے مجھے بنگلے پر چھوڑا اور خود دوسرے انتظامات کرنے کے لیے چلا گیا۔

اور پھر اسی شام یہ اطلاع مل گئی کہ مس شیوانی کے فلیٹ میں کچھ پراسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ عام حالات میں کک باکسنگ سے تعلق رکھنے والی لڑکیاں اس کے فلیٹ میں آتی رہتی تھیں مگر چند روز سے لڑکیوں کو فلیٹ پر آنے سے روک دیا گیا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے مس شیوانی دفتر بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ ہر وقت فلیٹ پر ہی موجود رہتی تھی۔ کوئی لڑکی اس کے ہاں جاتی بھی تو اسے دروازے ہی سے لوٹا دیا جاتا تھا۔

اس رپورٹ سے میرے شبہے کو تقویت ملی۔ رتنا کوسن کو بھی اطلاع کردی گئی اور بالآخر یہ طے ہوا کہ پولیس کے ذریعے چھاپا مارنے کے بجائے ماسٹر ہوچن اور میں اپنے آدمیوں کے ساتھ کارروائی کریں۔

ماسٹر ہوچن اور میں ایک کمرے میں بیٹھ کر پلاننگ کرنے لگے۔ مس شیوانی کا دفتر اور فلیٹ سیلوم روڈ پر واقع تھے۔ یہ

وہ علاقہ تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں رات کبھی نہیں ہوتی۔ چوبیس گھنٹے لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی۔ اس لیے یہ طے پایا کہ اس فلیٹ پر چھاپا رات دس اور گیارہ بجے کے درمیان مارا جائے کیونکہ وہاں رات کے آخری پہر بھی لوگوں کی آمدورفت کی صورتِ حال کچھ ایسی ہی رہتی تھی اس لیے انتظار کرنا بیکار تھا۔ پلاننگ کرتے ہوئے چھاپے میں ایک لڑکی کی ضرورت بھی محسوس ہوتی اور ظاہر ہے تھائی یا جانگی میں سے کسی کو ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ یہ بندوبست ہوجائے گا۔ ان دونوں لڑکیوں میں سے کسی ایک کو بلالیں گے۔" ماسٹر ہوچن نے کہا۔

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ ماسٹر ہوچن نے ٹیلی فون پر رنگٹ، پاتھی اور پونیا نامی ایک لڑکی کو اطلاع دے دی کہ وہ لوگ رات دس بجے سیلوم روڈ پر واقع مونارک ہوٹل سے ذرا آگے پولین ریسٹورنٹ میں پہنچ جائیں۔

پونے دس بجے کے قریب میں اور ماسٹر ہوچن بھی نکل کھڑے ہوئے۔ ہم نے دریا پھرا پوک کلاؤ برج سے پار کیا تھا۔ وہاں سے ہم سونگ واٹ روڈ سے ہوتے ہوئے نیو روڈ پر آگئے۔ کئی بڑی سڑکیں نیو روڈ سے آکر ملتی تھیں۔ یہاں دور دور تک بہت بڑے بڑے شاپنگ سینٹر ریسٹورنٹ اور ہوٹل وغیرہ تھے۔ یہیں سے سیلوم روڈ بھی شروع ہوتا تھا۔

سیلوم روڈ کو بنکاک کی وال اسٹریٹ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرف سے سوامی وانگ روڈ، دوسری طرف سے راما فور روڈ، تیسری طرف سے نیو روڈ اور چوتھی طرف سے سیتھرون روڈ سے گھرا ہوا ہے۔ شہر کا وسطی علاقہ ہونے کے علاوہ یہ سب سے بڑا کاروباری مرکز بھی ہے۔ اس سڑک کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی نہر بھی ہے جس کے مغربی کنارے پر ایک بہت بڑی پن چکی ہے۔ اس پن چکی ہی کی وجہ سے اس سڑک کا نام بھی سیلوم روڈ رکھا گیا تھا۔

تمام بڑے بڑے بینک، بہت سے سفارت خانے اور بڑے بڑے رہائشی ہوٹل اسی علاقے میں واقع ہیں۔ یہ شہر کا وہ حصہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کبھی رات نہیں ہوتی۔ مرکزی شاہراہ کے علاوہ ایک دوسرے کو ملانے والی ذیلی سڑکوں پر بھی لاتعداد ریسٹورنٹ، شراب خانے اور سپر اسٹور ہیں جہاں چوبیس گھنٹے لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے۔

تین کلومیٹر لمبی سیلوم روڈ کے تقریباً آخر میں پیٹ پونگ نام کی دو ذیلی سڑکیں سوامی وانگ روڈ سے آکر ملتی ہیں۔ دن کے وقت اس علاقے میں کاروباری لوگوں کا ہجوم رہتا ہے لیکن شام پانچ بجے کے بعد یہاں آمدورفت کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ شام کے بعد یہاں لوگ صرف تفریح، ناؤنوش اور عیاشی کے لیے آتے ہیں۔ دونوں پیٹ پونگ اسٹریٹس پر لاتعداد چھوٹے بڑے شراب خانے، ریستوران اور جوئے خانوں کے علاوہ بازارِ حسن بھی ہے۔ صرف ان دو گلیوں میں ایک ہزار سے زیادہ طوائفیں آباد ہیں جو قدم قدم پر راہ گیروں کو دعوتِ گناہ دیتی نظر آتی ہیں۔

نیو روڈ پر نیو فیوجی شاپنگ سینٹر سے ذرا آگے ماسٹر ہوچن نے کار سیلوم روڈ پر موڑ لی۔ مونارک ہوٹل تقریباً ایک کلومیٹر آگے تھا۔ اس سڑک پر ٹریفک اس قدر زیادہ تھا کہ گاڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی چل رہی تھیں۔ میرے خیال میں چیونٹی کی رفتار سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے والے اس ٹریفک میں شامل ہونے کے بعد یہ بھول جانا چاہیے کہ مقررہ وقت پر کہیں پہنچنا ہے۔ سائڈ اسٹریٹس کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ پیدل چلنے والوں کا بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے شہر کا ہر شخص اس طرف آگیا ہو۔ جگمگاتی ہوئی رنگ برنگی روشنیوں سے یہ علاقہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔

"غلطی ہوگئی۔" ماسٹر ہوچن بڑبڑایا "ہمیں سوراوانگ روڈ کی طرف سے آنا چاہیے تھا۔ بیچ کی کسی گلی سے نکل آئے۔"

"اب تو پھنس ہی گئے ہیں۔ کار کو سر پر اٹھا کر تو لے جا نہیں سکتے۔" میں نے کہا۔ کار چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھتی رہی اور میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ میں پہلی مرتبہ اس طرف آیا تھا۔ لوگ کس طرح زندگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے جبکہ میری زندگی مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ میں گزری تھی۔

خدا خدا کرکے ہم کسی نہ کسی طرح مونارک ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے۔ ماسٹر نے ہوٹل سے آگے نکل کر کار ایک سائڈ اسٹریٹ پر موڑ کر روک لی اور انجن بند کردیا۔

"آگے پیدل ہی جانا پڑے گا۔" وہ نیچے اترتے ہوئے بولا "کار پر تو ہمیں وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ جائے گا۔"

میں بھی کار سے اتر آیا اور ہم مین روڈ پر آکر ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ پولین ریسٹورنٹ تقریباً پچاس گز آگے تھا اور جب ہم وہاں پہنچے تو سوا دس بج چکے تھے۔ رنگٹ، پاتھی اور پونیا دروازے کے ساتھ ہی ایک میز پر موجود تھیں۔ ماسٹر کا اشارہ پاکر وہ تینوں ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ ہم ایک بار پھر تیزی سے آگے چلنے لگے۔ تقریباً

ڈیڑھ کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے پندرہ منٹ میں طے کرلیا۔

پیٹ پونگ اسٹریٹ ون اور پیٹ پونگ اسٹریٹ ٹو پر زیادہ رش تھا۔ ان دونوں سڑکوں پر لاتعداد ریسٹورنٹ، شراب خانے اور جوئے خانے تھے۔

ہم پیٹ پونگ اسٹریٹ ٹو پر چند گز چلنے کے بعد رک گئے۔ ماسٹر ہوچن نے سڑک کے دوسری طرف ایک پرانی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ عمارت کے نیچے دو شراب خانے اور ایک ریسٹورنٹ تھا۔ شراب خانے کے ساتھ ہی اوپر جانے کے لیے تنگ سا زینہ تھا۔ ان دکانوں کے اوپر صرف ایک رہائشی یونٹ تھا۔ اس اکہری عمارت کے دائیں بائیں والی عمارتیں کئی کئی منزل بلند تھیں۔ اس طرح یہ چھوٹی عمارت ان کے بیچ میں سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔

دکانوں اور اوپر والے رہائشی یونٹ کے درمیان میزنائن فلور تھا۔ اوپر والے فلیٹ اور میزنائن فلور کی کھڑکیاں سڑک کی طرف تھیں اور سب میں روشنی نظر آرہی تھی۔

"اوپر والے فلیٹ میں شیوانی کی رہائش ہے۔" ماسٹر ہوچن نے بتایا "اس کے نیچے میزنائن فلور ہے جس پر طوائفوں کا قبضہ ہے۔ ویسے وارانے چھپنے کے لیے بڑی اچھی جگہ کا انتخاب کیا ہے کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔"

"کیا مس شیوانی بھی طوائف ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شیوانی جیسی عورتوں اور طوائفوں کے کردار میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" ماسٹر نے جواب دیا اور پھر رنگٹ اور پاتھی کو سمجھانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

رنگٹ تو وہیں کھڑا رہا۔ یہاں سے وہ زینے اور فلیٹ پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ پاتھی سڑک پار کرکے زینے کے بائیں طرف شراب خانے کے دروازے کے قریب کھڑا ہوگیا۔

"اور تم۔" ماسٹر نے پونیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اوپر جاکر دروازہ کھلواؤ اور کوشش کرنا کہ دروازہ کھولنے والے کو دو تین منٹ تک باتوں میں الجھائے رکھو۔ اگر وہ دروازہ بند کرنے کی کوشش کرے تو پیر پھنسا دینا۔ یہ تم اچھی طرح سمجھتی ہو کہ دروازہ کھولنے والے کو کس طرح باتوں میں لگایا جاسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پونیا نے کہا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے فٹ پاتھ سے اتر گئی۔

میں اور ماسٹر ہوچن اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ پونیا سڑک پار کرکے زینے والے دروازے میں داخل ہوگئی۔ ماسٹر ہوچن نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں سڑک پار کرکے دوسری طرف آگئے۔

میں نے دروازے کی آڑ میں کھڑے ہوکر سیڑھیوں پر دیکھا۔ تقریباً پندرہ سیڑھیوں پر ایک لینڈنگ تھی جس کے دائیں بائیں ایک ایک دروازہ تھا۔ بائیں طرف کا دروازہ نیم وا تھا جبکہ دائیں طرف والا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور نیم عریاں لباس میں ایک عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ نیچے سیڑھیوں والے دروازے کے قریب بھی دو طوائفیں کھڑی تھیں جن میں سے ایک نے لمبے بالوں والا ایک چھوٹا سا کتا بغل میں دبا رکھا تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے گھوم کر دیکھا تو وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور ایک اور آدمی کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دوسری طوائف ماسٹر ہوچن کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کررہی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اوپر دیکھا۔ پہلی لینڈنگ سے دس بارہ سیڑھیاں اوپر ایک اور لینڈنگ تھی۔ وہاں ایک ہی دروازہ تھا اور پونیا دروازے میں کھڑی ہوئی کسی عورت سے باتیں کررہی تھی۔

میں نے ماسٹر ہوچن کو اشارہ کیا اور سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ میزنائن والی لینڈنگ کے کھلے ہوئے دروازے میں کھڑی ہوئی عورت یہ سمجھی کہ میں اس کے پاس آرہا ہوں۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا اس نے اچانک ہی مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجھے اندر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس اچانک افتاد پر میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

میرے چیخنے کی آواز سن کر اوپر والے دروازے میں کھڑی ہوئی عورت نے نیچے دیکھا اور پھر پونیا کو دھکا دے کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ پونیا اگرچہ دھکا کھا کر پیچھے گری تھی مگر اس نے اپنا پیر دروازے میں پھنسا دیا تھا۔ اندر کھڑی ہوئی عورت نے چیختے ہوئے اس کے پیر پر زوردار ٹھوکر ماری۔ پونیا بھی چیخ اٹھی اور اس نے پیر پیچھے ہٹا لیا۔

میزنائن والی عورت مجھ سے لپٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس دوران میں ماسٹر ہوچن سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا اوپر آگیا اور میرے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اوپر پہنچ کر اس نے پونیا کو گھسیٹ کر ایک طرف ہٹایا اور دروازے پر کندھے سے ٹکریں مارنے لگا۔ میں نے بھی اس عورت کو دھکا دے کر پیچھے گرا دیا اسے بھی شاید کسی گڑبڑ کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس نے اٹھ کر جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔ میں اوپر کی طرف دوڑا۔

فلیٹ کا دروازہ خاصا مضبوط تھا۔ اندر سے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دو نسوانی آوازیں

تھیں اور ایک کسی مرد کی اور میں نے وہ آواز پہچان لی۔ وہ دارا تھا۔

میں بھی ماسٹر ہوچن کے ساتھ دروازے پر کندھے سے ٹکریں مارنے لگا۔ تیسری ٹکر پر دروازہ جھول گیا اور چوتھی ٹکر پر تختہ اندر جا گرا۔ میں اور ماسٹر ہوچن گرتے گرتے بچے تھے اور پھر اسی لمحے فائر کی آواز گونج اٹھی۔ گولی میرے سر کے چند انچ اوپر سے گزر گئی تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت ایک اور فائر ہوا۔ اس مرتبہ گولی ماسٹر ہوچن نے چلائی تھی۔

ایک طرف سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے تیزی سے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ دروازے کے قریب میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے آگے کھلی جگہ تھی اور اس سے آگے کمرے تھے۔ ایک طرف اوپر جانے کے لیے لکڑی کے تختوں کی سیڑھیاں تھیں اور ایک آدمی ان سیڑھیوں پر دوڑتا ہوا اوپر جا رہا تھا۔

میں نے پتلون کا پائنچہ اٹھا کر پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ جب میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو وہ اوپر آخری سیڑھی پر پہنچ چکا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔

وہ دارا تھا۔ اس نے فائر کرنے کے لیے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ میں نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل کر دارا کے بازو کو زخمی کرتا چلا گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ لڑکھڑایا مگر دوسرے ہی لمحے سنبھل گیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا تھا۔ دارا نے دوسری طرف دوڑ لگا دی۔

میں پھر اوپر کی طرف دوڑا۔ میں نے راستے میں ایک سیڑھی پر پڑا ہوا اپنا خنجر اٹھایا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔

دارا اس وقت چھت کے دوسرے سرے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے مڑ کر فائر کر دیا۔ اس سے صرف ایک لمحہ پہلے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گر گیا۔ اگر میں نیچے نہ گرتا تو گولی میرا بھیجا اڑا دیتی۔

میں اٹھ کر دوبارہ دارا کے پیچھے لپکا۔ وہ اس وقت منڈیر پر چڑھ کر باہر کی طرف ایک پائپ کے ساتھ لٹک چکا تھا۔ یہ پائپ پچھلی گلی میں گٹر لائن کی گندی گیس کے اخراج کے لیے لگایا گیا تھا جو چھت سے چار پانچ فٹ اوپر تک چلا گیا تھا۔ پائپ دیوار کے ساتھ آہنی کلپوں سے لگایا گیا تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو دارا اس پائپ سے لٹک کر منڈیر سے نیچے جا چکا تھا تاہم اس کا ایک ہاتھ ابھی منڈیر سے اوپر پائپ کو گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ میں نے خنجر سے اس کے ہاتھ پر وار کر دیا۔ اس نے چیختے ہوئے ہاتھ ہٹایا لیکن اس کی ایک انگلی کٹ گئی تھی۔ اس کا دوسرا بازو میں پہلے ہی زخمی کر چکا تھا لیکن وہ پائپ کے ساتھ لپٹا بڑی تیزی سے نیچے کی طرف پھسل رہا تھا۔ میں منڈیر پر چڑھ کر پائپ کے ساتھ لٹکنا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔

چھ انچ قطر کا وہ پائپ زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ دارا کے بوجھ سے ہی دیوار کے ساتھ اس کا اوپر والا ایک کلپ اکھڑ چکا تھا۔ میں پائپ کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلنے لگا۔ میری کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ دو کلپ اور اکھڑ گئے اور دارا کے بوجھ کی وجہ سے پائپ بتدریج دیوار سے پیچھے ہٹنے لگا لیکن میرے خیال میں اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ دارا کافی نیچے پہنچ چکا تھا۔

پچھلی گلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ روشنی کا انتظام بھی مناسب نہیں تھا۔ یہاں بھی طوائفوں ہی کی آبادی تھی اور گلی میں معقول تعداد میں لوگ بھی موجود تھے۔

ایک راہ گیر نے دارا کو پائپ سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا۔ کچھ اور لوگ بھی اس طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں دارا نے پائپ چھوڑ کر چھلانگ لگا دی۔

ایک دو آدمی اسے کوئی حادثہ سمجھ کر دارا کی طرف دوڑے تھے مگر دارا نے دو ہوائی فائر کر دیے۔ لوگ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ دارا نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ میں منڈیر پر کھڑا بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ دارا کچھ دور تک لوگوں کو دھکے دیتا دوڑتا ہوا نظر آیا اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا اور پھر دوسرے لمحے نسوانی چیخوں کی آواز سن کر میں نے سیڑھیوں کی طرف چھلانگ لگا دی۔

ماسٹر ہوچن ایک آدمی سے گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ پونا میں شیوانی کو رگید رہی تھی اور پاتھی بھی ایک عورت سے الجھا ہوا تھا۔ ماسٹر ہوچن دوسرے آدمی کے نیچے دبا ہوا تھا اور اس آدمی کی شکل دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ میگا تیراز تھا۔

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر میگا کو بالوں سے پکڑ لیا اور اس کو اوپر کھینچتے ہوئے پے در پے اس کے چہرے پر کئی گھونسے جڑ دیے۔ ماسٹر ہوچن ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا

ہو گیا۔

"ونسٹل ماسٹر۔ تم اسے سنبھالو۔ میں دوسرے کو دیکھتا ہوں۔" وہ چیختا ہوا ایک کمرے کی طرف دوڑ گیا اور بند دروازے پر کندھے سے ٹکریں مارنے لگا۔

میں نے میگا تیراڈ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت خنجر میرے ہاتھ میں نہیں تھا اگر ہوتا تو اب تک میں میگا کا کام تمام کر چکا ہوتا۔

دارا کے فرار ہو جانے سے میں بہت تاؤ کھائے ہوئے تھا اور اپنا سارا غصہ میگا پر اتار رہا تھا۔ میگا کے ہونٹوں' ناک اور ایک کان سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑ کھڑا رہا تھا مگر میں اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کرتا رہا۔

ماسٹر ہوچن جس کمرے کے دروازے پر ٹکریں مار رہا تھا' وہ سڑک کی طرف تھا۔ ہم نے سڑک پر سے اس کمرے کی کھڑکیوں میں روشنی دیکھی تھی۔ اس کے ساتھ بھی ایک کمرا تھا جس کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔

ماسٹر کی تیسری ٹکر سے دروازہ ٹوٹ گیا اور پھر اسی لمحے چھناکے سے شیشے ٹوٹنے اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ماسٹر ہوچن دوڑتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔

"چنگ چی نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔" اس نے چیخ کر کہا "تم ان لوگوں کو سنبھالو۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔"

وہ نیچے جانے کے لیے دروازے کی طرف لپکا لیکن دروازے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ سیڑھیوں پر دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر پانچ چھ پولیس والے سیڑھیوں والے دروازے سے اندر آگئے۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا جس نے پستول سے دو تین ہوائی فائر کر دیے۔ دوسرے پولیس والوں نے بھی رائفلیں تان لی تھیں۔

میں میگا کو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ وہ چکراتا ہوا نیچے گرا تھا۔ پاتھی نے بھی اس عورت کو چھوڑ دیا۔ پونیا اور شیوانی اب بھی ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ دونوں خوں خوار بلیوں کی طرح غرا رہی تھیں۔ انہیں بڑی مشکل سے ایک دوسرے سے الگ کیا گیا۔

"ماسٹر ہوچن۔" انسپکٹر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے افسوس ہے ہمیں اوپر آنے میں کچھ دیر ہو گئی۔"

"چنگ چی نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی ہے وہ۔۔۔"

"اس کی فکر مت کرو ماسٹر۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی "ہمارے آدمی نیچے موجود ہیں۔ وہ اسے سنبھال لیں گے۔ یہاں تمہارے آدمی کون ہیں؟"

ماسٹر نے پاتھی' پونیا اور میری طرف اشارہ کر دیا۔ ہم تینوں الگ ہو گئے۔ میگا' شیوانی اور دوسری عورت کو پولیس والوں نے گرفت میں لے لیا اور دو پولیس والے دوڑ دوڑ کر کمروں کو چیک کرنے لگے۔

اور پھر انسپکٹر کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ اسے آج شام ہی کو اوپر سے یہ حکم جاری ہوا تھا کہ اس علاقے پر خاص طور پر نگاہ رکھی جائے۔ اسے ماسٹر ہوچن کے نام کے حوالے سے خاص طور پر کچھ ہدایات دی گئی تھیں کہ وہ لیڈی لگ باکسنگ کی پروموٹر شیوانی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والا ہے اگر کوئی گڑ بڑ ہو تو وہ اپنی فورس لے کر اس کی مدد کو پہنچ جائے۔ اسے سختی سے یہ وارننگ بھی دی گئی تھی کہ اگر یہ خبر کسی کارروائی سے پہلے لیک ہوئی تو اسے نہ صرف ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا بلکہ اس کے خلاف غداری کے الزام میں کارروائی بھی کی جائے گی۔ انسپکٹر کے کہنے کے مطابق وہ ایک ایک کر کے اپنے آدمیوں کو سامنے والی بلڈنگ میں جمع کر چکا تھا۔ وہ ایک تاریک کمرے کی کھڑکی سے شیوانی والی عمارت پر نگاہ رکھے ہوئے تھے اور جب اس نے ماسٹر ہوچن کو سیڑھیوں والے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا تو ہوشیار ہو گیا اور پھر فائر کی آواز سن کر اس نے اپنے آدمیوں کے ساتھ اس طرف دوڑ لگا دی۔

"اب آپ لوگ چاہیں تو جا سکتے ہیں۔" انسپکٹر نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "یہاں کی صورتِ حال اب میں سنبھال لوں گا۔"

ہم لوگ نیچے آگئے۔ میز نائن والے دونوں دروازے بند تھے اور اندر تاریکی تھی۔ یہاں کی طوائفیں یا تو خوف زدہ ہو کر بھاگ گئی تھیں یا انہوں نے اپنے کمروں میں بند ہو کر بتیاں بجھا دی تھیں۔

نیچے عمارت کے دروازے کے سامنے بھی کئی پولیس والے موجود تھے۔ آس پاس کے شراب خانے اور ریستوران بند ہو چکے تھے۔ لوگوں کی آمد و رفت اگرچہ جاری تھی مگر سامنے والے فٹ پاتھ سے۔

چنگ چی پولیس کے گھیرے میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک بازو اور ایک ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔

رنگٹ بھی وہاں موجود تھا مگر پولیس نے اسے آگے نہیں آنے دیا تھا۔ ماسٹر نے رنگٹ' پاتھی اور پونیا کو رخصت کر دیا۔ میں اور ماسٹر ہوچن ایک طویل چکر کاٹ کر شیوانی کی عمارت کے پچھلی طرف آگئے جہاں سے دارا فرار ہوا تھا۔

یہاں کی رونق پہلے کی طرح تھی۔ دارا کی ہوائی فائرنگ سے کچھ بھگدڑ مچی تھی مگر اس کے بعد صورتِ حال پھر پرسکون ہو گئی تھی۔ راہ گیروں اور طوائفوں میں آزادانہ طور پر سودے بازی ہو رہی تھی۔

عمارت کے ساتھ وہ پائپ سڑک کی طرف جھکا ہوا تھا اور میں ماسٹر ہوچن کو بتا رہا تھا کہ دارا کس طرح فرار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں جھک کر پائپ اور دیوار کے آس پاس دیکھ رہا تھا اور پھر مجھے وہ چیز مل گئی جس کی تلاش تھی۔

وہ ہاتھ کی کٹی ہوئی چھوٹی انگلی تھی جو خون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ دارا اگرچہ ایک بار پھر فرار ہو گیا تھا۔ مجھے اس کے فرار ہونے کا افسوس تو تھا لیکن خوشی بھی تھی کہ اس بار میں اس پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور جھک کر وہ انگلی اٹھا لی۔

"یہ کیا ہے؟" ماسٹر ہوچن نے پوچھا۔

"دارا کے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی۔" میں نے کہا "ہو سکتا ہے اب وہ کبھی میرے سامنے نہ آئے لیکن جب تک زندہ رہے گا مجھے یاد رکھے گا۔"

میں نے دارا کے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلی رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لی اور ہم واپس پلٹ گئے۔

اس رات بھی میں دیر تک نہیں سو سکا۔ مجھے دارا کے بچ نکلنے کا بے حد افسوس تھا۔ میرے سینے میں بھڑکنے والے انتقام کے شعلے کچھ اور ہوا پا گئے تھے۔ جب دشمن اس طرح بچ کر نکل جائے تو ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔

دن پر دن گزرتے رہے۔ اگرچہ رتنا کوسن کا مشن کریک ڈاؤن جاری تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کو کونوں کھدروں سے تلاش کر کے آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کیا جا رہا تھا مگر دارا اور چی فانگ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ انہیں ہر اس جگہ تلاش کیا گیا جہاں ان کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ایک مہینہ گزر گیا اور پھر ایک روز ہمیں ایک خاص تقریب میں رائل پیلس میں شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس موقع پر سردار تھالوب بھی موجود تھا اور مہاراج بھی۔ تھائی' جانگی اور میں اس تقریب کے مرکزی کردار تھے۔ ملکی سلامتی کے لیے ہماری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہمیں بے پناہ مراعات اور انعام سے نوازا گیا۔ مجھے قومی ہیرو قرار دیا گیا اور تھائی لینڈ کی اعزازی شہریت بھی دی گئی۔

رتنا کوسن کا مشن کریک ڈاؤن بے حد کامیاب ہو گیا تھا۔ جرائم پیشہ گروہوں کا خاتمہ ہو جانے کے بعد لوگوں نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ امن و آشتی کی یہ صورتِ حال زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہے گی۔ شرپسند عناصر کچھ ہی عرصے بعد دوبارہ سر اٹھانے لگیں گے۔

ہمیں بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ ہم مکمل طور پر آزاد تھے لیکن اب میرا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ میں گھر جانا چاہتا تھا اپنے گھر۔ جہاں ماں باپ کی شفقت و محبت کے سائے میں میرا بچپن گزرا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہاں میرے ماں باپ نہیں تھے مگر مجھے اب اس گھر کی یاد بڑی شدت سے آرہی تھی۔

میں نے جانگی اور تھائی سے ذکر کیا تو وہ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہو گئیں۔ یہاں انہیں بہت کچھ مل گیا تھا۔ تھائی کو اس پلاٹ پر نیا بنگلا بنا دینے کا وعدہ بھی کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں کام بھی شروع ہو چکا تھا۔ جانگی کا مکان بھی خالی کرا دیا گیا تھا اسے سرکاری اسپتال میں ملازمت کی پیشکش بھی کی گئی تھی اور بھی بہت کچھ ملا تھا۔ وہ یہاں عیش و آرام کی زندگی گزار سکتی تھیں مگر وہ دونوں مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ بقول جانگی کے' میں ان دونوں کی سانجھے کی جائداد تھا اور دونوں میں سے کوئی بھی مجھ سے دستبردار ہونے کو تیار

شیخ کرامت کی سرگزشت
جو اس نے بسترِ مرگ پہ بیان کی
ہمزاد
مکمل
قیمت 60 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
ایک پراسرار شخصیت کی کہانی جس کیلئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں تھا
اس شخص کا قصہ جس کے چہرے کی عمر 130 سال تھی
اور بقیہ جسم کی عمر 25 سال
شیخ کرامت نے ہمزاد کو کس طرح تسخیر کیا
کتاب کی قیمت معہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں
کتابیات پبلی کیشنز
5802551 فون 5895313
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

نہیں تھی۔

میں نے مہاراج سے ذکر کیا تو وہ میری بات سن کر کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔

"مجھے معلوم تھا کہ اب تم یہاں نہیں رہنا چاہو گے اور میں تمہیں اب روکوں گا بھی نہیں۔ میں تمہارے جانے کا بندوبست کردوں گا۔"

اور جب میں نے بتایا کہ جانکی اور تھائی بھی میرے ساتھ جانا چاہتی ہیں تو مہاراج کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

اور پھر ایک ہفتے بعد ہمارے پاسپورٹ بھی تیار ہوگئے۔ میں نے کئی روز پہلے ہی سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو کو بتا دیا تھا کہ میں واپس آنے والا ہوں۔ سنگاپور میں ہمارے مکان کی چابیاں اس کے پاس تھیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ میرے آنے سے پہلے مکان ٹھیک کروادے گا۔ انسپکٹر چیانگ شو سے ویسے بھی وقتاً فوقتاً ٹیلی فون پر میری بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ یہ جان کر بے حد خوش ہوا تھا کہ میں واپس آنے والا ہوں۔

بنکاک میں اگلے چند روز بڑی مصروفیت میں گزرے۔ سب کو پتا چل گیا تھا کہ میں واپس جانے والا ہوں۔ دعوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہمیں تحائف سے لاد دیا گیا اور بالآخر وہ دن بھی آگیا جب ہم بنکاک کو الوداع کہنے والے تھے۔ ماسٹر ہوچن اور پھر مہاراج سے رخصت ہوتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان سے بچھڑنے کا مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا۔ مہاراج میرا روحانی باپ تھا۔ انہوں نے مجھے جینا سکھایا تھا اور میں مرتے دم تک انہیں نہیں بھول سکتا تھا۔

سنگاپور کے چانگئی ائرپورٹ پر انسپکٹر چیانگ شو نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہم کئی سال بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ انسپکٹر چیانگ شو تو مجھے نہیں پہچان سکا تھا مگر میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ بوڑھا ہوگیا تھا مگر اس کی شخصیت اب بھی بہت شان دار تھی۔

وہ ہمیں سیدھا گھر لے جانے کے بجائے ایک ہوٹل میں لے گیا جہاں پہلے سے ہمارے لیے ایک کمرے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو بھی شام تک ہمارے ساتھ ہوٹل ہی میں رہا۔ شام سے ذرا پہلے حارث کاشی اور چاچا پرتاب سنگھ کے دوست خشونت سنگھ کی بیوی رجنی اور بیٹی ارملا بھی آگئیں۔ خشونت سنگھ کا انتقال ہوچکا تھا اور ارملا شادی کے بعد دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ ان کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے محلے کی دو خواتین بھی آگئیں۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر تھی اور دوسری بوڑھی ہو چکی تھی۔ ان سب کو انسپکٹر چیانگ شو نے بلایا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جب میں گھر میں داخل ہوں گا تو میری کیا کیفیت ہوگی اسی لیے اس نے ان سب کو یہاں جمع کر لیا تھا۔

اور پھر اسی رات نو بجے کے قریب جب میں نے گھر کے دروازے میں قدم رکھا تو میری عجیب سی کیفیت تھی۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے روشنی کے چمکتے ہوئے لہریے سے رقص کرنے لگے۔ میں بہت مضبوط اعصاب کا مالک ہوں لیکن اس وقت نہ جانے مجھے کیا ہوا تھا کہ میں اپنے حواس پر قابو نہیں پاسکا۔ جذبات آنسوؤں کا سیلاب بن کر بہہ نکلے اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں اس گھر کے در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر خوب رویا۔ انسپکٹر چیانگ شو اور دوسرے لوگ مجھے گلے سے لپٹا لپٹا کر دلاسا دیتے رہے۔ میں جب پر سکون ہوا تو میرے یہ مہمان ایک ایک کر کے جانے لگے۔ آخر میں صرف انسپکٹر چیانگ شو رہ گیا تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں تھائی، جانکی اور انسپکٹر چیانگ شو کے ساتھ سٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت چاچا پرتاب سنگھ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چاچا پرتاب سنگھ کے تذکرے پر بھی میرا دل بھر آیا اور میں ایک بار پھر ہچکیاں لینے لگا۔ وہ خوفناک منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب مجھے بچانے کے لیے اس نے اپنی جان دے دی تھی۔

سوا دو بجے کے قریب انسپکٹر چیانگ شو جانے کے لیے اٹھ گیا۔

"ایک بات اور۔" وہ پہلے جانکی اور تھائی اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں تم لوگوں کی حفاظت کے لیے دو آدمی یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

"کیوں؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تم جن دشمنوں سے بچنے کے لیے برسوں تک مختلف ملکوں میں بھاگتے پھرتے رہے ہو وہ بھی دوبارہ یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

"کیا...!" میں اچھل پڑا۔

مجھے انسپکٹر چیانگ شو کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ میں کچھ کہے بغیر پھٹی پھٹی سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میرے سر پر گویا بم پھٹ پڑا تھا۔

یہ خبر ہی ایسی تھی جس نے وقتی طور پر میرے حواس مختل کردیے تھے۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں اور گردن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

مجھے یاد تھا۔ چی فانگ سے آخری مرتبہ میرا سامنا بنکاک میں مادام اوتو کے فلیٹ پر ہوا تھا۔ دارا بھی وہیں موجود تھا۔ وہ دونوں اس فلیٹ میں دادِ عیش دے رہے تھے اور ہم نے چھاپا اس طرح مارا تھا کہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوسکی تھی لیکن عین آخری لمحوں میں بازی اس طرح پلٹ گئی تھی کہ دارا تو سمونے کو ڈھال بنا کر وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا اور چی فانگ ہمارے قبضے میں آگیا تھا جسے پولیس کے حوالے کردیا گیا تھا۔ اس کے چند روز بعد لیڈی باکسنگ پروموٹر مس شیوانی کے فلیٹ پر دارا سے مڈبھیڑ ہوئی تھی جہاں دارا نے مقابلے کے بجائے فرار کو ترجیح دی تھی اور اس کوشش میں اس کے ایک ہاتھ کی انگلی بھی کٹ گئی تھی۔

مس شیوانی کے فلیٹ سے دارا کے فرار کے چند روز بعد چی فانگ بھی حیرت انگیز طور پر پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ دونوں مل گئے تو ایک بار پھر نئے سرے سے ہنگامے شروع ہوجائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کی بھی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ رتنا کوسن نے اپنی نگرانی میں بنکاک میں زبردست قسم کا آپریشن کریک ڈاؤن شروع کر رکھا تھا۔ جرائم پیشہ لوگ یا تو بنکاک چھوڑ گئے تھے یا اپنی پناہ گاہوں میں دبک گئے تھے۔ کافی لوگوں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا تھا۔

دارا اور چی فانگ کی خاموشی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے اس کے حواریوں اور حمایتیوں کی بنیادیں تک کھود ڈالی تھیں۔ وہ جب بنکاک میں آئے تھے تو انہیں ٹائیگر مل گیا تھا۔ ٹائیگر میرے ہاتھوں ختم ہوا تو اس کی جگہ پیڈرو نے لی تھی مگر طویل عرصے کی جنگ کے بعد پیڈرو بھی ختم ہوگیا اور دارا کو گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف فرار ہونا پڑا۔ وہ تھائی کو بھی یرغمال بنا کر لے گیا تھا جس کی وجہ سے مجھے بھی گولڈن ٹرائی اینگل کا رخ کرنا پڑا۔ گولڈن ٹرائی اینگل، خونخوار بھیڑیوں کا بھٹ۔ میں نے وہاں داخل ہو کر بہت بڑی حماقت کی تھی مگر قسمت اچھی تھی۔ میں ان لوگوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچاتا ہوا وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ آپ کے علم میں آچکا ہے۔

دارا سے آخری تصادم کے بعد میں تقریباً ایک ڈیڑھ مہینہ بنکاک میں رہا تھا۔ اس دوران میں خاموشی ہی رہی تھی۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ رتنا کوسن کا آپریشن کریک ڈاؤن جاری تھا۔ دارا اور چی فانگ کو تلاش کیا جارہا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ دونوں بنکاک ہی میں کہیں روپوش ہوگئے ہیں لیکن اب انسپکٹر چیانگ شو سے ملنے والی یہ اطلاع میرے لیے بم کا دھماکا ہی ثابت ہوئی تھی کہ وہ دونوں مجھ سے پہلے سنگاپور پہنچ چکے تھے۔

یہ خبر سنتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ میرے جبڑے بھنچ گئے۔ میری مٹھیاں بھی اس سختی سے بھنچ گئی تھیں کہ انگلیوں کے جوڑ سفید ہوگئے۔

"ایزی، مائی بوائے ایزی۔" انسپکٹر چیانگ شو نے آگے بڑھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "تم نے انہیں تھائی لینڈ میں نہیں ٹکنے دیا۔ انہیں جب پتا چلے گا کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو تو وہ یہاں سے بھی فرار ہونے کی کوشش کریں گے اور پھر ہم بھی یہاں موجود ہیں۔ سنگاپور کی پولیس بنکاک پولیس سے بہت مختلف ہے۔ ہم انہیں تلاش کر رہے ہیں جیسے ہی سراغ ملا ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی جائیں گی۔"

"وہ لوگ یہاں کب آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"دارا کے آنے کی اطلاع تو پندرہ دن پہلے ملی تھی۔" انسپکٹر چیانگ شو نے جواب دیا "اسے چانگئی ائرپورٹ پر دیکھا گیا تھا اس کے بعد وہ غائب ہوگیا اور پھر ایک ہفتہ پہلے چی فانگ کو بھی دیکھا گیا۔ وہ ٹرین کے ذریعے آیا تھا۔ اسپیشل پولیس کے ایک آدمی نے اسے پہچان لیا۔ اسے پکڑنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ پولیس مین کو زخمی کرکے فرار ہوگیا۔ ان کے تمام پرانے اڈوں اور پرانے دوستوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔ ابھی تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میرا خیال ہے وہ کسی جزیرے پر روپوش ہیں۔ انہیں تلاش کرلیا جائے گا اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اب اس جزیرے پر وہ پرانی کہانی دہرائی نہیں جائے گی لیکن بہرحال تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے چیانگ انکل۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں محتاط رہوں گا لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے محافظوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ اپنے آدمی واپس لے جائیے۔ میں اپنی حفاظت خود کرسکتا ہوں۔"

"اوکے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا "میں چلتا ہوں۔ کل کسی وقت ملاقات ہوگی۔"

چیانگ شو نے میرے بعد جانکی اور تھائی سے بھی ہاتھ

ملایا۔ میں اسے رخصت کرنے کے لیے باہر کے دروازے تک آیا اور اس وقت تک باہر ہی کھڑا رہا جب تک اس کی جیپ گلی کا موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ میں دروازہ بند کر کے اندر آ گیا۔ انسپکٹر چیانگ شو نے کہا تھا کہ وہ میری حفاظت کے لیے مقرر کیے جانے والے اپنے آدمیوں کو واپس بھیج دے گا لیکن مجھے یقین تھا کہ حفاظت کے لیے اس کا کوئی نہ کوئی آدمی سادہ لباس میں ہمارے آس پاس موجود رہے گا۔

تھائی اور جانگی ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ہم دیر تک دارا اور چی فانگ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ اب یہاں ہاتھ پیر پھیلانے کی کوشش نہیں کریں گے۔" میں نے کہا "یہاں ان کے گروہ کا شیرازہ پہلے ہی بکھر گیا تھا۔ ہمارے بنکاک جانے کے بعد اس کے کزن جمال نے یہاں قدم جمانے کی کوشش کی تھی اور میں نے انسپکٹر چیانگ شو کو بنکاک سے فون پر اطلاع دے دی تھی۔ جس نے وہ سینڈیکیٹ قائم ہونے سے پہلے توڑ دیا۔ جمال اور اس کے ساتھی ابھی تک جیل میں ہیں۔ اب یہاں کی صورت حال کیا ہے' اس کے بارے میں' میں نہیں جانتا لیکن ایک بات طے ہے کہ اب وہ لوگ یہاں قدم نہیں جما سکیں گے۔"

"لیکن ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟" جانگی نے کہا۔

"مقصد کچھ بھی رہا ہو لیکن اب وہ یہاں نہیں نکیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ بات کرتے ہوئے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں تھائی لینڈ میں کئی مرتبہ دارا کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ ایسے کسی بھی موقع پر مجھے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن اسے کسی طرح یہ پتا چل گیا تھا کہ میرے ڈیڈی نے لاہور چھوڑنے سے پہلے ان کا جو سونا غائب کیا تھا' اس کا راز کسی ڈائری میں محفوظ ہے اور میں اس ڈائری کے بارے میں جانتا ہوں۔ وہ کروڑوں کی مالیت کا سونا تھا اور اب تو اس کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی ہو گی۔ بنکاک میں مادام اوتوکو کے فلیٹ پر دارا نے کہا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ ہار چکا ہے۔ اس کے سارے منصوبے ملیامیٹ ہو چکے ہیں اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ وہ بالکل قلاش ہو چکا ہے لیکن پاکستان میں میرے ڈیڈی کا چھپایا ہوا سونا اب بھی محفوظ ہے اور وہ ڈائری میرے قبضے میں ہے جس میں سونے کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ سونا اس کے نقصان کا ازالہ کر سکتا ہے اور وہ مجھ سے وہ ڈائری ضرور حاصل کرے گا۔

اب مجھے دارا کے سنگاپور آنے کے مقصد کا پتا چل گیا تھا۔ سنگاپور دارا کے لیے ڈینجر زون تھا۔ یہاں سے فرار ہونے سے پہلے یہاں وہ لاتعداد جرائم کا مرتکب ہو چکا تھا۔ کئی بے گناہ اس کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ چی فانگ اور دارا سنگاپور پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھے۔ انہیں تو اس طرف کا رخ بھی نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن وہ دونوں یہاں پہنچ گئے تھے۔ دارا ہر قیمت پر وہ سونا حاصل کرنا چاہتا تھا اور ڈائری کے بغیر اسے سونے کا سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ یقیناً ڈائری کی تلاش ہی میں یہاں آیا تھا لیکن اسے کچھ کرنے کا موقع شاید اس لیے نہیں مل سکا تھا کہ یہاں اس کی آمد کا پتا چل گیا تھا اور پولیس سرگرم ہو گئی تھی۔

میں نے تھائی اور جانگی کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو ان دونوں کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"یقیناً یہی بات ہے۔" جانگی نے کہا "اس کے یہاں آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور اب تک اس کی خاموشی بھی بلاوجہ نہیں ہو گی۔"

"پولیس کو اس کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔" میں نے کہا "اس کی تلاش فوراً ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے تمام پرانے اڈوں کی نگرانی ہو رہی ہے اس لیے وہ کہیں دبک کر بیٹھ گیا ہے۔ اس کی یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے اور یہ طوفان اچانک ہی اٹھے گا۔"

"یہاں بنکاک والی صورت حال تو نہیں ہے۔" جانگی نے کہا "وہاں تو ان کے درجنوں حواری موجود تھے۔ دارا انہیں کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ ملا لیتا تھا لیکن یہاں۔۔۔"

"تم شاید بھول رہی ہو کہ شروعات یہیں سے ہوئی تھیں۔" میں نے کہا "اس نے پاکستان سے یہاں آتے ہی پنجے گاڑ۔۔۔ لیے تھے۔ پیسے کے لالچ میں ہر کوئی برائی کا حصہ بننے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے کچھ پرانے دوست اب بھی یہاں موجود ہیں۔ وہ دونوں اتنے دنوں سے یہاں روپوش ہیں اور پولیس ان کا سراغ نہیں لگا سکی۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں یہاں آتے ہی کچھ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہو چکی ہیں جنہوں نے انہیں پناہ دے رکھی ہے۔ ہو سکتا ہے دارا نے اندر ہی اندر اپنے کچھ حمایتی تیار کر لیے ہوں یا ایسا کرنے کی کوشش کر رہا ہو اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ موقع پا کر اچانک ہی کچھ کرے گا۔ ہو سکتا ہے اسے ہماری آمد کا پتا چل چکا ہو۔ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو جائے گا۔"

جانگی اس مرتبہ خاموش رہی۔ تھائی تو اس دوران میں

خاموش بیٹھی رہی تھی۔ ہم جب سے یہاں آئے تھے وقت سے مہمانوں کی آمد و رفت لگی رہی تھی۔ گلی کے لوگ بھی آتے رہے تھے اور ہم لوگ ڈرائنگ روم اٹھ کر کسی اور کمرے میں نہیں جا سکے تھے۔ دو بجے چیانگ شو کے جانے کے بعد بھی ہم یہیں بیٹھے رہے اور اس وقت تین بجنے والے تھے۔ جانگی جماہی لیتے اٹھ گئی۔

"اب تو نیند آ رہی ہے لیکن سونے سے پہلے میں تمہارا مکان دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب سے آئے ہیں ایک ہی کمرے بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تھائی بھی اٹھ گئی۔ میں انہیں گھر دکھانے لگا۔ مختلف وں سے ہوتے ہوئے میں انہیں اپنے امی ابو والے بیڈ م میں لے آیا۔ یہ مکان کئی سال بند رہا تھا لیکن میرے نے سے پہلے انسپکٹر چیانگ شو نے بڑی محنت سے صفائی وائی تھی۔ ہر چیز صاف ستھری نظر آ رہی تھی۔ میں نے ینگ ٹیبل کی سب سے اوپر والی دراز کھولی۔ اس میں ین لیس اسٹیل کا وہ خوب صورت فریم رکھا ہوا تھا جس می اور ڈیڈی کی تصویر تھی۔ میں نے وہ فریم اٹھا لیا۔ میرا ل ہے کہ یہ فریم صاف کر کے ٹیبل پر رکھنے کے بجائے نا بوجھ کر دراز کے اندر رکھ دیا گیا تھا تاکہ فوری طور پر نظر اس پر نہ پڑ سکے۔

میں فریم اٹھا کر تصویر دیکھنے لگا۔ میری آنکھوں میں نمی تھی۔

تھائی نے فریم میرے ہاتھ سے لے لیا۔ چند لمحے تصویر یکھتی رہی پھر میرا کندھا تھپتھپانے لگی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ویر کس کی ہو سکتی ہے۔ جانگی نے بھی تصویر لے کر دیکھی پھر فریم ڈریسنگ ٹیبل پر سجا دیا۔ میرے منہ سے بے ہچکی سی نکل گئی۔

میں دوسری درازیں کھول کر دیکھنے لگا۔ نیچے والی دراز میری بھی ایک فریم شدہ تصویر موجود تھی۔ یہ تصویر ممی کے قتل سے تقریباً دو مہینے پہلے گھر کے آنگن میں کھینچی گئی۔ ڈیڈی کو یہ تصویر بہت پسند آئی تھی اور انہوں نے انلارج کروا کر فریم میں لگوا لیا تھا۔

"یہ تصویر کس کی ہے؟" جانگی نے پوچھا۔ حالانکہ وہ تھی کہ یہ تصویر کس کی ہو سکتی ہے "بہت پیارا سا لڑکا کون ہے یہ؟"

"ارے تم نے پہچانا نہیں جانگی۔ تمہارے سامنے ہی تو ہے یہ لڑکا۔" تھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گویا تم بچپن ہی سے ایسے تھے۔ دوسروں کو پریشان کرنے والے۔" جانگی بھی مسکرا دی۔

"بچپن کی نہیں یہ میرے لڑکپن کی تصویر ہے۔ ممی ڈیڈی کے انتقال سے تقریباً دو مہینے پہلے کھینچی گئی تھی۔ اس روز میری چودھویں سالگرہ تھی۔ مجھے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک بات یاد ہے۔ رات کو ہم ہوٹل سے ڈنر کر کے واپس آ رہے تھے۔ ہماری ٹیکسی جیسے ہی دروازے کے سامنے رکی تھی ایک اور کار ہمارے قریب آ کر رکی تھی اور دارا اور اس کے ساتھیوں نے ممی ڈیڈی کو گھیر کر ان پر حملہ کر دیا تھا اور میں۔۔۔" میں اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ میری آواز بھرا گئی تھی۔

تھائی نے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ مجھے کمرے سے باہر لے آئی۔ لاؤنج میں رک کر اس نے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے اور میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے بولی۔

"تم نے نوعمری میں اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کی بہت بڑی ٹریجڈی دیکھی۔ تم نے بڑے ضبط اور صبر سے کام لیا۔ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں پرتاب سنگھ اور انسپکٹر چیانگ شو جیسے سرپرست مل گئے تھے۔ ان لوگوں نے تمہیں محبت بھی دی اور تمہارے اندر زندگی کا حوصلہ بھی پیدا کیا۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا میں اس سے ناواقف تو نہیں ہوں۔ تم نے بڑی کٹھنائیاں برداشت کی ہیں۔ اب تم جوان ہو۔۔۔ اور اب تو تمہیں زیادہ حوصلے کی ضرورت ہے۔ ابھی تمہارا مشن پورا تو نہیں ہوا۔ تم نے تو قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام نہیں لے لو گے تمہیں چین نہیں آئے گا اور اگر حوصلہ ہار بیٹھے تو اپنے مشن کو کیسے پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ گے۔"

"میں نے حوصلہ نہیں ہارا تھائی۔" میں نے جواب دیا "بہت عرصے بعد یہاں آیا ہوں نا۔ ایک ایک چیز ممی ڈیڈی کی یاد دلا رہی ہے۔ میری ہمت اور میرا حوصلہ اب بھی قائم ہے۔ یہاں چاچا پرتاب سنگھ اور انسپکٹر چیانگ شو نے مجھے سہارا دیا اور تھائی لینڈ میں مہاراج اور تم دونوں میرا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ اگر مجھے تم لوگوں سے حوصلہ نہ ملتا تو میں عرصہ پہلے زندگی کی بازی ہار چکا ہوتا۔"

"ساڑھے تین بج رہے ہیں۔" تھائی دیوار پر آویزاں گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے اب سو جانا چاہیے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ باقی باتیں ہم صبح

کریں گے۔"

میں ممی ڈیڈی والے بیڈ روم میں سونا چاہتا تھا لیکن وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے آئیں جو کبھی میرا بیڈ روم تھا۔ میں پہلے بھی یہیں سویا کرتا تھا۔ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر وہ دونوں سامنے والے کمرے میں چلی گئیں جو دراصل گیسٹ روم تھا اور اس کا ایک دروازہ برآمدے کی طرف بھی کھلتا تھا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور جانکی اور تھائی نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا تھا۔

مجھے سامنے والے کمرے سے ان دونوں کی سرگوشیوں میں باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ آوازیں بند ہو گئیں۔ میرا خیال ہے وہ دونوں سو گئی تھیں لیکن میں دیر تک جاگتا رہا اور ممی ڈیڈی کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے آج بڑی شدت سے ان کی یاد آ رہی تھی۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے بار بار میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت غنودگی سی طاری ہو رہی تھی اور پھر یوں لگا جیسے ایک ہیولا کمرے میں داخل ہوا ہو۔ مسکراتا ہوا وہ چہرہ ماتا کے نور سے روشن ہو رہا تھا۔

وہ ہیولا میرے قریب آکر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں اپنے آپ کو بادلوں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ میری نظریں اس ماتا بھرے مسکراتے ہوئے چہرے پر مرکوز تھیں۔ نقش واضح نہیں تھے لیکن وہ میری ماں کا چہرہ تھا۔ وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

غنودگی گہری ہوتی گئی اور پھر نیند کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ آنکھوں پر چمک پڑنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے آنے والی دھوپ میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں چند لمحے یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا اور پھر ایک اور بات محسوس کرکے میں چونک گیا۔ میرا سر تکیے کے بجائے کسی کی آغوش میں تھا۔ میں نے ہلنا چاہا تو ایک نرم اور گداز ہاتھ نے ہلکا سا دباؤ ڈال کر مجھے حرکت کرنے سے روک دیا اور بڑے ہولے ہولے میرے بالوں میں انگلیاں چلنے لگیں۔

میں نے بڑی آہستگی سے اپنی گردن کو حرکت دی اور اس کے ساتھ ہی میرے پورے جسم میں سنسنی سے پھیلتی چلی گئی۔ وہ تھائی تھی جو پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز سو رہی تھی۔ میرا سر اس کی گود میں تھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا اور دوسرا سر پر۔ میں نے جب ہلنے کی کوشش کی تھی تو اس نے نیند ہی میں مجھے ہلنے سے روک دیا تھا اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ تو رات کو میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں آنے والا وہ ہیولا اور ماتا کے نور سے منور وہ چہرہ محض تصور نہیں تھا۔ وہ تھائی تھی جو میرے کمرے میں آگئی تھی اور میرا سر اپنی گود میں رکھ کر اسی طرح بیٹھی رہی تھی۔

مجھے یاد آگیا۔ بنکاک میں بھی ایک مرتبہ واٹ زیمٹ کے کمرے میں تھائی اسی طرح میرا سر اپنی گود میں رکھے رات بھر بیٹھی رہی تھی۔

میں چند لمحے تھائی کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر بڑی آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے سینے سے ہٹا کر اپنا سر اس کی گود سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھائی کی آنکھ کھل گئی۔

"سو جاؤ۔ ابھی رات باقی ہے۔" تھائی کا انداز بڑبڑانے والا تھا اور لہجہ خوابیدہ سا تھا۔

"تھائی۔" میں نے کہا۔

تھائی کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی ماتا کا نور نظر آیا جو میں نے چشم تصور سے دیکھا تھا۔

"تھائی۔" میں ہولے سے بولا "تم یہاں کب آئیں اور کب سے اس طرح بیٹھی ہوئی ہو؟"

"تم شاید نیند میں اپنی ممی کو پکار رہے تھے۔" تھائی نے بھی ہولے سے جواب دیا "تمہاری آواز سن کر میں یہاں آگئی۔ تم نیند میں بے چین ہو رہے تھے اور بار بار ممی کو پکار رہے تھے۔ میں نے تمہارا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور تم پرسکون ہوتے چلے گئے اور پھر میں نے یہاں سے اٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"تھائی تم۔" میں اس سے آگے کچھ نہیں کہہ سکا۔

تھائی نے جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میں اٹھ کر تھائی سے لپٹ گیا۔ تھائی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اس کے سینے سے لگ کر مجھے بڑا سکون مل رہا تھا۔ جیسے مجھے ماں کی ممتا بھری آغوش مل گئی ہو۔

تھائی میری پیشانی پر بوسے دیتے ہوئے میری پیٹھ سہلا رہی تھی۔ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ میں ایک عجیب سرور کی سی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر بند ہونے لگیں۔

میں تھائی کی آغوش میں پھر سو گیا تھا اور جب دوبارہ آنکھ کھلی تو میرا سر تھائی کی گود میں نہیں تکیے پر تھا البتہ تھائی پلنگ پر بیٹھی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"اٹھنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"آج تو واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اتنی آسودگی اور اتنا سکون میں نے پہلی کبھی محسوس نہیں کیا۔ لگتا ہے آج طویل عرصے بعد ممتا کی آغوش میں دبک کر سویا ہوں۔ واقعی اٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"انسپکٹر چیانگ شو دو مرتبہ فون پر تمہیں پوچھ چکا ہے اور گلی کے کچھ لوگ بھی بار بار آ رہے ہیں۔" تھائی نے کہا۔

"پھر تو اٹھنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہتے ہوئے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا "ارے۔ دو بجنے والے ہیں۔" میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

باتھ روم سے فارغ ہو کر نکلا تو تھائی کمرے میں نہیں تھی۔ کچن کی طرف سے برتنوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اشتہا انگیز خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ یکایک مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا۔ گزشتہ رات بھی ہم نے برائے نام ہی کھانا کھایا تھا۔ مجھے اچانک ہی یہ خیال بھی آیا تھا کہ جانکی اور تھائی بھی بھوکی بیٹھی ہوں گی کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتی تھیں لیکن اس بات پر بھی حیرت تھی کہ جانکی نے شور کیوں نہیں مچایا تھا۔ اس کی آواز سنائی کیوں نہیں دے رہی تھی۔ اس سے تو بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ ہنگامہ کھڑا کر دیا کرتی تھی۔

میں نے اپنے کمرے سے نکل کر سامنے والے کمرے میں جھانکا۔ جانکی وہاں نہیں تھی۔ میرا خیال تھا وہ بھی تھائی کے ساتھ کچن میں ہوگی لیکن وہ کچن میں بھی نہیں تھی۔

"جانکی کہاں ہے؟" میں نے کچن کے دروازے پر رک کر تھائی سے پوچھا۔

"سامنے والے مکان میں کوئی انڈین فیملی رہتی ہے۔ کوئی مس رنجنا پاٹیل ہے۔ وہ یہاں آئی تھی۔ جانکی اس کے ساتھ چلی گئی ہے۔" تھائی نے بتایا۔

"مس رنجنا پاٹیل۔" میں سوچنے والے انداز میں بولا "اس نام کی تو کوئی عورت اس گلی میں نہیں رہتی۔ سامنے والے مکان میں تو ایک پارسی فیملی رہتی ہے۔ نام شاید مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

"تم اپنے بچپن کی بات کر رہے ہو۔" تھائی نے کہا "تم کئی سال باہر رہے ہو۔ اس دوران میں یہاں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہوں گی۔ مس رنجنا بتا رہی تھی کہ انہوں نے یہ مکان تقریباً دو سال پہلے خریدا تھا۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ہاں۔ واقعی بہت سی تبدیلیاں آچکی ہوں گی لیکن۔ تم یہ پتیلی میں کیا پکا رہی ہو۔ خوشبو تو بہت مزے کی آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے گھر میں تو ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

"گھر میں برتن تو تھے۔" تھائی نے جواب دیا "تمہیں یاد ہے انسپکٹر چیانگ شو رات کو کچھ رقم دے گیا تھا۔ جانکی صبح ہی مارکیٹ سے کچھ چیزیں لے آئی تھی۔ میں نے اسٹو کے لیے کہا تھا۔ سب کچھ تیار ہو چکا ہے۔ صرف تمہارا انتظار تھا۔"

"میں جانکی کو بلاتا ہوں۔ تم کھانا نکالو۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

باہر آکر میں نے گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں دو قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا اور جانکی نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک اور ادھیڑ عمر عورت بھی تھی۔ اس نے گلابی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر بندیا بھی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہی مس رنجنا پاٹیل تھی۔

جانکی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آگئی۔

"تمہاری دوستی شروع ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"موقع ملا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے نا۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اب جلدی سے اندر چلو۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کیوں۔ مس رنجنا نے کچھ کھلایا نہیں۔" میں نے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"وہ بے چاری تو کھانے کو بہت کہہ رہی تھی مگر میں نے ہی منع کر دیا پھر اس نے کافی بنالی۔ خالی پیٹ بلیک کافی پی کر آنتیں سلگ اٹھی ہیں۔" جانکی نے جواب دیا۔

ہم دونوں اندر آگئے۔ تھائی اس وقت میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ جانکی نے کرسی پر بیٹھتے ہی ہاتھ مارنا شروع کر دیے۔

میں کھانا ختم کرکے کرسی سے اٹھا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ وہ انسپکٹر چیانگ شو کی کال تھی۔ اس نے یونہی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ کئی منٹ تک فون پر گپ شپ ہوتی رہی۔

"آج شام کی چائے تم لوگ میرے ساتھ پیو۔" اس نے آخر میں کہا "شام پانچ بجے ہیاٹ ریجنسی کے ہوگو

ریسٹورنٹ میں آجاؤ۔ وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم پہنچ جائیں گے۔" میں نے جواب دیا اور چند جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے جانکی اور تھائی کو بتا دیا کہ شام کی چائے انسپکٹر چیانگ شو کے ساتھ پی جائے گی۔ وہ دونوں اٹھ کر برتن سمیٹنے لگیں۔ اس کے بعد ہم لاؤنج ہی میں بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ مجھ پر حسب معمول کھانے کے بعد غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ نیند کے جھونکے آرہے تھے اور پھر کال بیل کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ جانکی مجھ سے پہلے اٹھ کر باہر چلی گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ دو عورتیں اور ایک آدمی تھا۔ اس کے سر پر مخصوص انداز میں بندھی ہوئی پگڑی دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ سکھ ہے۔

وہ جگ جیت سنگھ اروڑا تھا۔ ادھیڑ عمر عورت اس کی بیوی امریتا کور اور جوان لڑکی اس کی بیٹی نرنجن کور تھی۔ جگ جیت سنگھ کی شکل وصورت تو واجبی سی تھی البتہ دونوں ماں بیٹیاں خاصی حسین تھیں۔

میں نے اٹھ کر جگ جیت سنگھ سے ہاتھ ملایا۔ دونوں خواتین کو سلام کیا اور ان کے بیٹھنے کے بعد خود بھی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ باتوں کی ابتدا ہی میں مجھے پتا چل گیا کہ جگ جیت سنگھ چاچا پرتاب سنگھ کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ کافی عرصہ پہلے کام کی تلاش میں سنگاپور آیا تھا۔ کچھ عرصہ پرتاب سنگھ کے پاس بھی رہا تھا مگر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ ہندوستان واپس چلا گیا۔

بنکاک میں چاچا پرتاب سنگھ کی ہلاکت کے بعد سنگاپور میں اس کی جائداد کی وراثت کا مسئلہ کھڑا ہوا تو جگ جیت سنگھ ہی اس کا ایسا قریبی رشتے دار تھا جسے اس کا جائز وارث قرار دیا جاسکتا تھا۔

سنگاپور میں سکھوں کی تنظیم "خالصہ جتھہ" اور انسپکٹر چیانگ شو کے تعاون سے جگ جیت سنگھ کو ہندوستان سے سنگاپور بلالیا گیا اور پرتاب سنگھ کی ساری جائداد اور کاروبار قانونی طور پر اس کے حوالے کردیا گیا۔ انہی لوگوں کی کوششوں سے اسے یہاں کی شہریت بھی مل گئی اور اس نے اپنی بیوی اور بیٹی کو بھی یہاں بلالیا۔ ان کی رہائش پڑوس والے چاچا پرتاب سنگھ کے مکان ہی میں تھی۔

ان لوگوں کے مخلص اور ہمدرد ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ جانکی نے چائے بنالی تھی اور چائے کے ساتھ دیر تک باتوں کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ دونوں میاں بیوی بار بار مجھ سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اب مجھے پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں۔ چار بجے جب وہ جانے لگے تو انہوں نے ہمیں رات کے کھانے پر بھی مدعو کرلیا۔ ہمارے انکار کے باوجود وہ اپنی ضد پر قائم رہے کہ ہم رات کا کھانا انہی کے گھر پر کھائیں گے۔

پونے پانچ بجے کے قریب ہم بھی تیار ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ جانکی نے ساڑی پہنی تھی۔ جو اس پر خوب جچ رہی تھی جبکہ تھائی نے پینٹ اور اوپن شرٹ پہنی تھی۔ میں نے جینز اور ٹی شرٹ کو ترجیح دی تھی۔

گلی سے نکل کر ہم مین روڈ پر آگئے۔ وہاں سے تقریباً دو سو گز آگے ریڈ کراس ہاؤس والے چوراہے کے قریب ٹیکسی اسٹینڈ سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جانکی اور تھائی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ ٹیکسی کلی مینسی روڈ سے ہوتی ہوئی دوسرے چوراہے پر آرچرڈ روڈ پر مڑ گئی۔

آرچرڈ روڈ پر اس وقت ٹریفک کا اژدحام تھا۔ جس وجہ سے ٹیکسی کی رفتار بھی کم رہی اور بالآخر طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹیکسی اسکاٹس روڈ پر مڑ گئی۔ اس طرف بھی ٹریفک کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ اس سڑک پر بھی بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز اور لاتعداد فائیو اسٹار ہوٹلز کے علاوہ بڑی بڑی بین الاقوامی تجارتی کمپنیوں کے دفاتر تھے۔

ٹیکسی ہیاٹ ریجنسی ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو کر عالیشان پورچ میں رک گئی۔ پورچ میں کھڑے ہوئے ایک باوردی ملازم نے جلدی سے آگے بڑھ کر ٹیکسی کا پہلے اگلا دروازہ کھولا اور پھر پچھلا دروازہ بھی کھول دیا۔ میری جیب میں تو پیسے نہیں تھے۔ تھائی نے نیچے اتر کر کرایہ دینے کے لیے پرس کھولا تو کوئی چیز پرس سے نکل کر چھناکے کی آواز پیدا کرتی ہوئی نیچے گر گئی اور اس چیز کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ پھل کاٹنے والی چھری تھی۔

میں نے جھک کر چھری اٹھاتے ہوئے ٹیکسی کے قریب کھڑے ہوئے ہوٹل کے ملازم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی الجھن سی تیر گئی تھی اور تھائی کی حالت تو ایسی تھی جیسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔

"یہ کیا؟" میں نے تھائی سے تھائی زبان میں پوچھا۔ ہوٹل کا وہ ملازم انڈین یا پاکستانی تھا۔ وہ انگریزی یا چینی زبان تو سمجھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ تھائی زبان نہیں سمجھتا ہوگا۔ اسی لیے میں نے تھائی زبان میں بات کی تھی۔

"ہمارے لیے سنگاپور میں بھی خطرہ تو بہرحال ہے نا۔" تھائی نے جواب دیا "کوئی اور ہتھیار تو تھا نہیں۔ اسی لیے میں نے یہ چھری اپنے پرس میں رکھ لی تھی تاکہ اگر دارا یا چی فانگ کا آمنا سامنا ہوجائے تو۔۔۔"

میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ جانکی بھی ہنس پڑی۔ تھائی واقعی بہت معصوم تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید دارا یا چی فانگ خالی ہاتھ ہمارے سامنے آکر ہمیں للکاریں گے۔ تھائی کے چہرے پر خجالت سی تھی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کرکے ایک ڈالر کا نوٹ ہوٹل کے ملازم کے ہاتھ پر بھی رکھ دیا اور مجھ سے چھری لے کر پرس میں رکھ دی۔

ہوٹل کے دروازے سے لابی میں داخل ہوتے ہوئے میں سنجیدگی سے تھائی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اپنے رویے پر افسوس ہورہا تھا۔ پھل کاٹنے والی چھری پرس میں رکھ کر تھائی نے کسی حماقت کا ثبوت نہیں دیا تھا۔ یہ اس کی عقل مندی تھی۔ اس نے احتیاط کا دامن تو نہیں چھوڑا تھا۔ ضرورت کے وقت یہ معمولی سی چھری بھی خطرناک ہتھیار ثابت ہوسکتی تھی۔

ہوٹل کا ہوگو ریسٹورنٹ بہت شان دار تھا۔ سائڈ کی ایک میز پر بیٹھا ہوا انسپکٹر چیانگ شو ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ہمیں دور سے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا اور ہم میزوں کے درمیان چکراتے ہوئے اس کی میز پر آگئے۔ انسپکٹر سادہ لباس میں تھا۔ گرے ایوننگ سوٹ میں اس کی شخصیت بہت شان دار لگ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا۔

"تم لوگ پورے پندرہ منٹ لیٹ ہو۔" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوری انکل۔" میں نے کہا "پڑوس سے جگ جیت سنگھ انکل اپنی فیملی کے ساتھ آگئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد تیار ہو کر نکلے تو ٹیکسی کے لیے دور تک پیدل چلنا پڑا اور پھر سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم۔ اس طرح ہمیں دیر ہوگئی۔ میں ان کی طرف سے بھی معذرت چاہتا ہوں۔" میں نے تھائی اور جانکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پہلا موقع ہے اس لیے معاف کیا۔" چیانگ شو مسکرایا "ویسے جگ جیت سنگھ اروڑا بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ اس نے تمہیں بتایا ہوگا کہ وہ کون ہے اور اس مکان میں کیسے رہ رہا ہے۔"

"جی ہاں۔ اس سے خاصی تفصیلی باتیں ہوئی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی بیوی امریتا کور بھی بڑی ہمدرد خاتون ہے۔ ان کی وجہ سے تم لوگوں کو بڑی سہولت ہوجائے گی۔ وہ جانکی اور تھائی کو یہاں اجنبیت محسوس نہیں ہونے دیں گی۔"

"اس کا اندازہ ہمیں ہوگیا ہے۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر چیانگ شو نے ویٹریس کو بلا کر چائے کے لیے کہہ دیا۔ چند منٹ بعد ہی میز چائے اور دیگر لوازمات سے سج گئی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ چیانگ شو نے ہمارے آنے سے پہلے ہی لمبا چوڑا آرڈر دے رکھا تھا۔

چائے نوشی کے دوران میں صورت حال پر تبادلہ خیال بھی ہوتا رہا۔ میرا تو آج یہاں پہلا دن تھا۔ یعنی آج پہلی مرتبہ ہی گھر سے باہر نکلا تھا۔ کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کیا ہورہا ہے۔ البتہ صبح جانکی مارکیٹ سے سودا لینے گئی تھی تو اخبار بھی لے آئی تھی۔ اخبار میں میرے بارے میں بھی لکھا ہوا تھا کہ میں کس طرح اپنے ماں باپ کے قتل کے بعد اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گیا تھا اور اب کئی سال بعد واپس آیا ہوں۔ دارا اور چی فانگ کے بارے میں بھی ایک خبر تھی کہ پولیس بڑی سرگرمی سے ان قاتلوں کو تلاش کررہی ہے۔

تقریباً ایک گھنٹا ہم وہاں بیٹھے۔ انسپکٹر نے بل ادا کردیا اور ہم باہر آگئے۔ پارکنگ میں چیانگ شو کی کار کھڑی تھی۔ بہت پرانے ماڈل کی فیاٹ کار تھی۔

"آپ کی جیپ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سرکاری جیپ ہے اسے میں صرف سرکاری کاموں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "ڈیوٹی کے بعد اپنے پرائیویٹ کاموں کے لیے میں اپنی کار ہی استعمال کرتا ہوں۔ بیٹھو تم لوگ۔"

میں آگے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ تھائی اور جانکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ کار ہوٹل کی پارکنگ سے نکل کر اسکاٹس روڈ پر آگئی اور وہاں سے آرچرڈ روڈ کی طرف مڑ گئے۔

اس وقت شام ہوچکی تھی۔ پورا علاقہ رنگ برنگی روشنیوں سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ ٹریفک کچھ اور بڑھ گیا۔ ٹریفک کی رفتار اگرچہ کم تھی مگر رکاوٹ کہیں بھی نہیں تھی۔ ایک سسٹم کے تحت روانی کسی خلل کے بغیر جاری تھی۔

کار جب آرچرڈ روڈ سے کلی مینسی ایونیو کی طرف مڑی تو میں یہی سمجھا تھا کہ انسپکٹر چیانگ شو ہمیں گھر چھوڑنے کے لیے جارہا ہے لیکن کار ریڈ کراس بلڈنگ والے چوراہے سے فورٹ کیننگ روڈ پر مڑنے کے بجائے سیدھی نکل گئی تو میں نے گردن گھما کر انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر کچھ کہنے کے بجائے صرف مسکرا کر رہ گیا تھا۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تھائی اور جانکی بڑی دلچسپ نظروں سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ میں پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کار ریورویلی روڈ پر مڑ گئی آگے بہت بڑا چوراہا تھا جہاں سے کار نیو برج روڈ کی طرف گھوم گئی۔ اب میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر چیانگ شو ہمیں چائنا ٹاؤن کی طرف لے جا رہا تھا۔

کار ریورواگ گیلریا اور چائنا ٹاؤن پوائنٹ شاپنگ سینٹر کے سامنے سے ہوتی ہوئی ریور برج روڈ پر دوڑتی رہی۔ یہاں واقعی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ کئی سال پہلے جب میں ابو کے ساتھ دکان پر آیا کرتا تھا تو چائنا ٹاؤن کچھ اور ہوا کرتا تھا۔ تنگ سے بازار جہاں چلنے کو راستہ نہیں ملتا تھا' اندھیری گلیاں اور ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتی ہوئی پرانی عمارتیں مگر اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ اندھیری گلیاں تھیں اور نہ پرانی عمارتیں۔ لگتا تھا جیسے یہاں ایک نیا شہر آباد ہو گیا ہو۔ خوب صورت عالیشان کئی کئی منزلہ بلڈنگیں' کشادہ سڑکیں اور روشنیاں ایسی کہ رات کو بھی دن کا گماں گزرتا تھا۔

کار نیو برج سینٹر کے ساتھ اسمتھ اسٹریٹ پر مڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی چائنا ٹاؤن کمپلیکس بلڈنگ تھی۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی تھی۔ اس جگہ بہت تنگ تنگ سی گلیاں اور بازار ہوا کرتے تھے مگر اب کئی کئی منزلہ شاندار شاپنگ سینٹرز تھے جو رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے اور گاہکوں کی خوب بھرمار تھی۔

مجھے یاد آیا کہ میرے ابو کی دکان اسی علاقے ہی میں۔ ساگو اسٹریٹ پر واقع ایک پرانی سی عمارت میں ہوا کرتی تھی اور جب کار ساگو اسٹریٹ پر گھومی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر چیانگ شو یہ علاقہ دکھانے کے لیے مجھے اس طرف لایا تھا مگر ساگو اسٹریٹ بھی بالکل بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کوئی پرانی عمارت کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی کئی منزلہ جدید عمارتیں تھیں۔ جن کے گراؤنڈ لیول پر شاندار دکانیں اور اوپر تجارتی کمپنیوں کے دفاتر یا رہائشی فلیٹ تھے۔ میں ایک بار پھر پیچھے کی طرف گھوم گیا اور جانکی اور تھائی کو بتانے لگا کہ اس اسٹریٹ پر کہیں میرے والد کا جنرل اسٹور ہوا کرتا تھا لیکن اب تو وہ قدیم بلڈنگ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔

کار ایک سائڈ اسٹریٹ پر مڑ کر رک گئی۔ انسپکٹر چیانگ شو نے انجن بند کر دیا۔

"یہاں آپ نے کار کیوں روک لی انکل۔ کوئی خاص بات؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر چیانگ شو کی طرف دیکھا۔

"تمہاری ایک امانت ہے میرے پاس جو اب تمہیں لوٹانا چاہتا ہوں۔" انسپکٹر نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

ہم بھی نیچے اتر آئے۔ گلی سے نکل کر سڑک پر آئے تو سامنے ایک دکان پر "عابد علی اینڈ سن" کا بورڈ دیکھ کر اچھل پڑا۔ وہ کئی منزلہ جدید طرز تعمیر کی حامل عمارت تھی اور اس کے گراؤنڈ لیول پر تین بڑے بڑے جنرل اسٹور تھے اور وہ بورڈ درمیان والے اسٹور پر تھا۔

ایک لمحے کو تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ ابو کے انتقال کے بعد میں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا پھرا تھا اور پھر چاچا پرتاب سنگھ مجھے تھائی لینڈ لے گیا تھا۔ گھر کی یاد تو مجھے اکثر ستاتی رہتی تھی لیکن دکان کا خیال کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ دکان انہی دنوں ختم ہو گئی ہو گی اور وہاں کسی اور کا قبضہ ہو گا مگر اب اپنے ابو کے نام کا بورڈ دیکھ کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

بازار میں خاصا ہجوم تھا۔ بقول شخصے کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ یہاں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ نظر آ رہے تھے۔ ہم سڑک پار کر کے اسٹور میں داخل ہو گئے۔ میں دکان کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ہر قسم کا مال بھرا ہوا تھا۔ دوسری دکانوں کی طرح یہاں بھی گاہکوں کا رش تھا اور چار سیلز مین ان سے نمٹ رہے تھے۔

دکان کے پیچھے ایک دروازے پر آفس کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو کا رخ اسی طرف تھا۔ تمام سیلز مینوں نے اسے دیکھ کر سلام کیا تھا۔

"بوٹا سنگھ کہاں ہے؟" انسپکٹر نے ایک سیلز مین سے دریافت کیا۔ سیلز مین نے آفس والے دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اسی وقت آفس کا شیشے والا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر آ گیا۔ وہ سکھ تھا۔ سر پر پگڑی اس کے دھرم کی نشان دہی کر رہی تھی۔

میں اس وقت جانکی اور تھائی کو بتا رہا تھا کہ یہ میرے والد کی دکان تھی۔ بورڈ تو اب بھی انہی کے نام کا لگا ہوا ہے لیکن صورت حال کیا ہے۔ اس کے بارے میں' میں کچھ نہیں جانتا۔

دفتر سے برآمد ہونے والا شخص بوٹا سنگھ تھا۔ اس نے پہلے انسپکٹر چیانگ شو سے ہاتھ ملایا پھر مجھ سے۔

"بوٹا سنگھ۔" چیانگ شو بولا "یہ وجدان ہے۔ عابد علی کا بیٹا۔ کل ہی تھائی لینڈ سے آیا ہے۔ میں نے سوچا آج اس کی امانت واپس کر دوں۔"

بوٹا سنگھ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر "خوش کیتا ای۔" کہتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کے انداز میں بڑی گرم جوشی تھی۔

"آؤ اندر آ ؤ جی۔ باہر کیوں کھلوتے ہو۔" اس نے کہا۔

ہم سب اندر آ گئے۔ دفتر اگرچہ کافی کشادہ تھا۔ اس میں ایک طرف لاتعداد کارٹن نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ آفس ٹیبل زیادہ بڑی نہیں تھی اور چیزوں کے علاوہ دو ٹیلی فون سیٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ پچھلی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا جس پر اسٹور کی تختی لگی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر کمپیوٹر بھی رکھا ہوا تھا۔

میں میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے لگا تو بوٹا سنگھ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایتھے نئیں۔ تسی اوتھے بیٹھو پتر جی۔" اس نے میز کے پیچھے اپنی کرسی کی طرف اشارہ کیا "تسی خیر نال واپس آ گئے او۔ تہاڈی جگہ وہ ہے۔"

"چاچا جی۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ وہاں بیٹھ جائیے۔" میں نے بڑی آہستگی سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

بوٹا سنگھ نے چیانگ شو کی طرف دیکھا اور پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھنٹی بجا کر ایک لڑکے کو بلا لیا اور کچھ ٹھنڈا وغیرہ لانے کو کہا۔

چند منٹ بعد ہی لیمونیڈ آ گیا۔ ٹھنڈے مشروب کی چسکیاں لیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بہت ہی زیادہ سنسنی خیز ثابت ہوا تھا کہ میری عدم موجودگی میں انسپکٹر چیانگ شو نے نہ صرف میرے مکان کا خیال رکھا تھا بلکہ میرے والد کا کاروبار بھی سنبھال لیا تھا۔ بوٹا سنگھ اس کا بہت پرانا جاننے والا تھا جسے اس نے دکان کا منیجر بنا دیا تھا۔ بوٹا سنگھ بہت ذہین اور کاروباری ذہنیت کا مالک تھا۔ اس نے جدید خطوط پر کاروبار کو از سر نو منظم کیا۔ میرے جانے کے ایک سال بعد پرانی بلڈنگ گرا کر یہ نئی بلڈنگ تعمیر کی گئی تھی۔ گراؤنڈ لیول پر پہلے پانچ دکانیں ہوا کرتی تھیں لیکن اب صرف تین تھیں۔ بوٹا سنگھ نے دو اور دکانوں کی جگہ خرید کر اس دکان میں شامل کر لی تھی۔ اس طرح یہ دکان دوسری دکانوں سے بہت زیادہ بڑی تھی اور مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی تھی کہ انسپکٹر چیانگ شو اور بوٹا سنگھ نے میرے باپ کے نام کو یہاں زندہ رکھا تھا۔

"تم نے واپس آ کر بہت چنگا کیا پتر۔" بوٹا سنگھ کہہ رہا تھا "یہ سب کچھ تمہاری امانت ہے۔ کئی وریوں کا سارا حساب کتاب اس کمپیوٹر اور بہی کھاتوں میں محفوظ ہے۔ اب تم سنبھالو اس کو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے ہے کہ بھائی چیانگ شو نے سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ یہ نہ ہوتے تو یہاں تمہارا سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا۔ پرتاب سنگھ کی جائداد اور بزنس کو بھی اس نے بکھرنے سے بچایا ہے۔ اب تم ایسا کرو کہ کل صبح سے یہاں بیٹھنا شروع کر دو۔ میں دو چار دن میں سارا حساب کتاب تمہیں سمجھا دوں گا۔"

"نہیں چاچا۔" میں نے کہا "ابھی میں اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے کاروبار کی کچھ سمجھ بھی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ آپ ہی سنبھالے رکھیے۔ میرا مشن ابھی۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر بات پوری نہیں کی۔

"ٹھیک ہے پتر۔" بوٹا سنگھ نے کہا "تھوڑے دن آرام کر لو۔ سیر سپاٹا کرو اور پھر ریلکس ہو کر بیٹھ جاؤ اپنے باپو کی گدی پر۔"

اس مرتبہ میں خاموش ہی رہا۔ انسپکٹر چیانگ شو نے موقع پا کر بات شروع کر دی۔ وہ بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ اب مجھے اپنے ماضی کو بھلا کر پرسکون زندگی شروع کر دینی چاہیے۔

"اپنے ماں باپ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے تم سے جو کچھ ہو سکتا تھا' وہ تم نے کر لیا۔" چیانگ شو کہہ رہا تھا "تمہیں یاد ہے جب تم اپنی جان کے خوف سے بھاگے پھر رہے تھے۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ تمہارے دشمن اپنی جان بچانے کے لیے تم سے چھپتے پھر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ دوبارہ یہاں کیوں آئے ہیں حالانکہ وہ یہاں کی پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ پولیس سے خوف زدہ نہ ہوں لیکن جب انہیں یہ پتا چلے گا کہ تم بھی یہاں پہنچ گئے ہو تو وہ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں گے۔ تم سے جو کچھ ہو سکا تم نے کیا۔ اب اپنا فیصلہ خدا پر چھوڑ دو۔"

"دارا یہاں کیوں آیا ہے انکل۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "ہو سکتا ہے وہ اس مرتبہ بھی پولیس کے ہاتھ نہ آئے لیکن میں نے بہرحال یہ طے کر رکھا ہے کہ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔"

"تم یہ بات ایک پولیس آفیسر کے سامنے کہہ رہے ہو۔" چیانگ شو نے کہا۔

"سوری انکل۔" میں نے کہا "میں بعد میں اس موضوع پر آپ سے بات کروں گا اور یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری طرف سے لا اینڈ آرڈر کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔"

انسپکٹر چیانگ شو گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

ہم لوگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ بوٹا سنگھ زیادہ تر کاروبار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر دفتر سے نکل کر وہ ہمیں دکان دکھانے لگا۔ یہ شعبہ جاتی اسٹور تھا۔ ہر شعبہ الگ الگ تھا اور سیلزمین بھی الگ الگ تھے۔

تھائی اور جانکی یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں یہ تو بتایا تھا کہ میرا باپ سنگاپور میں ایک شاپ کیپر تھا لیکن ہو سکتا ہے ان کے ذہن میں کسی معمولی دکان دار کا تصور ابھرا ہو لیکن یہاں ان کے لیے نئے نئے انکشافات ہو رہے تھے۔ میرا مکان، یہ اتنا بڑا اسٹور اور میری آؤ بھگت دیکھ کر انہیں شاید میری اہمیت کا کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔

"انکل۔ ہمیں ایک گاڑی چاہیے۔" میں نے انسپکٹر چیانگ شو کے ساتھ اس کی کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "کسی کار رینٹل ایجنسی سے اگر کوئی گاڑی مل جائے تو ہمیں آمدورفت میں کچھ آسانی ہو جائے گی۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر کار مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گھومتی ہوئی نیو برج روڈ پار کر کے یو تانگ سین اسٹریٹ پر نکل آئی۔ یہ بھی ایک کشادہ اور بارونق سڑک تھی اس کے دوسری طرف سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر تھا۔ انسپکٹر چیانگ شو کی ڈیوٹی بھی یہیں ہوتی تھی۔ اس نے کار پولیس ہیڈ کوارٹر کے کمپاؤنڈ میں روک لی اور ہمیں وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔

اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے ہوئی تھی۔

"ڈرائیونگ لائسنس کس کے پاس ہے۔" اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کسی کے پاس نہیں۔" میں نے جواب دیا "میں نے تو آج تک ڈرائیونگ سیکھی نہیں۔ تھائی اور جانکی ڈرائیونگ جانتی ہیں۔ بنکاک میں تو ان کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی تھے لیکن یہاں....."

"یہاں ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر کوئی گاڑی نہیں چلا سکتا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے میری بات کاٹ دی "سنگاپور دنیا کے بہت سے ممالک سے بہت مختلف ہے۔ یہاں قانون بنائے جاتے ہیں تو ان پر سختی سے عمل بھی کرایا جاتا ہے۔ کسی معمولی سی بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاتا۔ بہرحال، مجھے بندوبست کرنا پڑے گا۔"

کار پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر یو تانگ سین اسٹریٹ پر آ گئی۔ ایک بار پھر نیو برج روڈ عبور کر کے مختلف سڑکوں اور گلیوں میں ہوتے ہوئے میکس ویل روڈ پر ٹریفک پولیس ہیڈ کوارٹر آ گئے۔ یہاں انسپکٹر چیانگ شو ہمیں بھی اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ایک دفتر میں پہنچ کر اس نے جانکی اور تھائی کے نام کاغذات تیار کرائے۔ ان دونوں کے دستخط بھی کروائے گئے تھے اور پھر ایک ایک کاپی انہیں بھی دے دی گئی۔

"یہ ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے۔" اس نے کہا "جزیرے کی سڑکوں پر کار چلانے کا عارضی اجازت نامہ ہے۔ تم دونوں کے نام رجسٹر کر لیے گئے ہیں پندرہ دن کے اندر اندر ڈرائیونگ لائسنس بنوانے ہوں گے۔"

ٹریفک پولیس ہیڈ کوارٹر سے نکل کر انسپکٹر چیانگ شو ہمیں کلب اسٹریٹ کے کراسنگ پر واقع "اِن آف سکتھ ہیپی نیس" لے گیا۔ پہلے ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر ہوٹل ہی کی بلڈنگ میں واقع ایک کار رینٹل ایجنسی کے دفتر میں داخل ہو گئے۔ جہاں سے ہم نے اپنی پسند کی ایک کار کرائے پر حاصل کی اور دفتر سے باہر آ گئے۔ ایجنسی کے آدمی نے پارکنگ میں کھڑی ہوئی اس کار کی نشان دہی کر کے چابی ہمارے حوالے کر دی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں
جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے۔

آتش فشاں

آتش فشاں

راوی: وجدان علی
تحریر: اقبال کاظمی

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بنا سکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں۔ بالاخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

اس ٹمٹماتے چراغ کا احوال جو اچانک ہی آندھیوں کی زد پر آگیا تھا

انسپکٹر چیانگ شو کی وجہ سے ہماری بہت سی مشکلیں حل ہوگئی تھیں۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے اپنی کرائے کی کار میں بیٹھ گئے۔ اسٹیئرنگ جانکی نے سنبھال لیا تھا۔ میں اور تھائی پیچھے بیٹھ گئے تھے۔

ہم ایک بار پھر میکس ویل روڈ سے ہوتے ہوئے آنسن روڈ اور اس سے آگے آنز راجا ایکسپریس وے پار کر کے کیپل روڈ پر آگئے۔ یہ سڑک ریلوے اسٹیشن کے قریب سے ہوتی ہوئی ساحل کے قریب واقع ورلڈ ٹریڈ سینٹر تک چلی گئی تھی۔ اس کے قریب ہی جزیرہ سنتوشا جانے کے لیے فیری اسٹیشن اور اس سے ذرا ہٹ کر کیبل کار اسٹیشن تھا۔

اس وقت یہاں بڑی رونق تھی۔ جانکی نے کار ایک ایسی جگہ روک لی جہاں پارکنگ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہاں اور کاریں بھی کھڑی تھیں۔ کار ہم نے وہیں چھوڑ دی اور دیر تک ادھر گھومتے رہے۔ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔

واپسی کے لیے ہم نے لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں طویل عرصے بعد یہاں آیا تھا۔ بچپن میں گھر کے آس پاس کے علاقوں میں سائیکل پر گھومتا رہتا تھا۔ زیادہ دور میں کبھی نہیں گیا تھا اس لیے راستوں کی شناخت بھی نہیں تھی۔ جانکی اپنی مرضی سے کار چلاتی رہی اسی طرح ہم شینٹن وے سے ہوتے ہوئے کئی سڑکوں پر گھوم کر ساؤتھ برج روڈ پر آگئے اور سنگا پور ریور پر ایلگن برج عبور کر کے نارتھ برج روڈ پر آگئے اور وہاں سے جیسے ہی اسٹیم فورڈ روڈ پر پہنچے مجھے راستہ یاد آگیا۔

"یہاں سے بائیں طرف موڑ لو جانکی۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

جانکی نے بڑی پھرتی سے کار اس طرف گھمائی تھی۔ اسٹیم فورڈ سے کار ہل اسٹریٹ پر مڑ گئی۔ ٹیلی فون ہاؤس کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے امریکن چرچ کے قریب دائیں طرف کیننگ وائز کی طرف کا موڑ کاٹ لینے کو کہا۔

یہ سڑک فورٹ کیننگ پارک کے ساتھ ساتھ فورٹ کیننگ روڈ تک چلی گئی تھی لیکن ہمیں وہاں تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ تو وہ جگہیں تھیں جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ پارک سے آگے دوسری گلی میں ہی تو ہمارا گھر تھا۔

"اوہ!" اس گلی میں کار موڑتے ہی جانکی بولی "ہم تو گھر پہنچ گئے۔"

"تو گویا تمہیں گھر کی شناخت ہوگئی۔" میں مسکرا دیا۔
"پام کے وہ تین درخت۔" جانکی نے سامنے اشارہ کیا "صبح جب میں سودا لینے کے لیے مارکیٹ گئی تھی تو پام کے ان تین درختوں کو نشانی کے طور پر ذہن میں رکھا تھا۔"

کار مکان کے سامنے رک گئی۔ جانکی نے انجن بند کردیا اور کار کے ڈیش بورڈ میں لگی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "بارہ بجنے والے ہیں۔ ہم شام پانچ بجے کے قریب گھر سے نکلے تھے۔ سات گھنٹے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

"کوئی پریشانی نہیں تھی اس لیے سیر سپاٹے میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔" میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جانکی اور تھائی بھی نیچے اتر آئیں۔ جانکی نے کار کے دروازے لاک کردیے۔ گھر کی چابیاں تھائی کے پاس تھیں۔ اس نے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکالا اور تالا کھولنے لگی۔

اندر داخل ہونے کے بعد میں نے احتیاط سے دروازے بند کردیے۔ لونگ روم میں آکر تھائی تو صوفے پر ڈھیر ہوگئی اور جانکی نے سیدھا کچن کا رخ کیا تھا۔ میں بھی تھائی کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا اور کسی قدر جھک کر اپنا سر تھائی کے کندھے پر ٹکا دیا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ صبح جاگنے کے بعد جب میں نے اپنے آپ کو تھائی کی آغوش میں پایا تھا اور تھائی سے لپٹ کر جس طرح مجھے سکون ملا تھا' اس کے بعد سے میں اپنے آپ میں کچھ عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ کرائے کی اس کار میں گھومتے ہوئے بھی میں پچھلی سیٹ پر تھائی کے ساتھ چپکا بیٹھا رہا تھا اور جانکی نے تو ایک دو مرتبہ چبھتے ہوئے جملے بھی کہے تھے لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تھائی کی گود میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ میری کیفیت اس بچے کی سی تھی جو ممتا کو ترس گیا ہو اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میں تو ممتا کو ترسا ہوا تھا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ تھائی نے مجھے اس طرح پیار کیا ہو۔ اکثر ایسا ہوا تھا۔ تھائی نے مجھے جب بھی اس طرح اپنی آغوش میں لیا تھا' میں نے ممتا کی حدت محسوس کی تھی اور آج تو یہ احساس فزوں تر ہوگیا تھا اور نجانے مجھے آج صبح سے یہ احساس بھی کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی انجانی قوت تھائی کو مجھ سے چھین لے گی۔

میں تھائی کے کندھے سے سر ٹکائے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ تھائی میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی اور شاید میں اسی طرح بیٹھے بیٹھے سو جاتا کہ جانکی کی آواز سن کر چونک گیا۔

"کیا بات ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں صبح سے دیکھ رہی ہوں کہ تم تھائی سے چپکے جا رہے ہو۔"

"تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" تھائی نے اسے گھورا۔ میں اس کے کندھے سے سر اٹھا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔ مجھے اعتراض کیوں ہونے لگا۔" جانکی نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ٹرے میز پر رکھ دی۔ جس میں کافی کے تین مگ رکھے ہوئے تھے۔

تھائی اور جانکی کئی سال سے میرے ساتھ تھیں۔ یہ دونوں مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ ہر نازک موقع پر انہوں نے مجھے بچانے کے لیے اپنے آپ کو ڈھال بنایا تھا۔ وہ دونوں ہی مجھ پر اپنا حق سمجھتی تھیں اور ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ میرے حوالے سے ان دونوں میں کبھی حسد و رقابت کا جذبہ نہیں ابھرا تھا۔ کبھی ایک دوسرے کو ٹیڑھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں مجھے ٹوٹ کر چاہتی تھیں لیکن ان کی چاہت میں تھوڑا سا فرق تھا۔

تھائی کے ذہن میں میرے حوالے سے کبھی اوٹ پٹانگ خیالات نہیں آئے تھے۔ ہم دونوں کئی مرتبہ ایسی حالت میں ایک دوسرے کے قریب رہے تھے کہ کوئی اور دیکھ لیتا تو ہم دونوں کو..... گردن زدنی سمجھتا لیکن نہ تو کبھی تھائی کی طرف سے ایسی حرکت ہوئی تھی اور نہ ہی میری طرف سے۔ البتہ جانکی کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کی چاہت کا رنگ کچھ اور تھا۔ ماضی میں اسے جب بھی موقع ملا تھا اس نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی تھی۔ جانکی بھی جانتی تھی کہ میں پٹڑی سے اترنے والا نہیں لیکن اسے جب بھی موقع ملتا وہ شرارت کر گزرتی۔

اور اس وقت بھی اس نے یہ جملہ شرارتاً ہی کہا تھا اور ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اس کے دل میں حسد یا رقابت کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ دونوں میری دکان کے بارے میں باتیں کرتی رہیں اور پھر انسپکٹر چیانگ شو کا ذکر بھی چل نکلا۔ وہ ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہی نہیں تھا بلکہ ایک شریف' مخلص اور ہمدرد انسان بھی تھا اگر اس میں شرافت اور دیانت نہ ہوتی تو چاچا پرتاب سنگھ کی جائداد اس کے وارث کے حوالے نہ کرتا اور میرے ابو کی دکان اور مکان کو امانت سمجھ کر نہ سنبھالے رکھتا۔ اس نے نہ صرف دکان کو سنبھالے رکھا بلکہ اسے ترقی بھی دیتا رہا۔ دکان کی دیکھ بھال

کے لیے اس نے بوٹا سنگھ جیسے شخص کا انتخاب کیا تھا جس نے بزنس کو ترقی دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔

چاچا پرتاب سنگھ اور بوٹا سنگھ کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک ہی مجھے اپنے پڑوسی جگ جیت سنگھ اروڑا کا خیال آگیا۔ وہ لوگ آج بعد دوپہر ہمارے گھر آئے تھے اور کتنے خلوص سے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا مگر ہمیں بالکل یاد نہیں رہا تھا۔ میں نے جانکی اور تھائی کو یاد دلایا تو وہ بھی پریشان سی ہوگئیں۔

"صبح سب سے پہلے میں ان کے گھر جا کر معذرت کروں گی اور انہوں نے ہمارے لیے جو کچھ بھی پکا رکھا ہے وہ ہم دوپہر کو کھائیں گے۔" جانکی نے کہا۔

باتوں کا سلسلہ دو بجے تک چلتا رہا۔ جانکی جماہی لیتے ہوئے اٹھی تو ہم بھی اٹھ گئے۔ وہ دونوں تو اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں اپنے کمرے میں آگیا اور پھر اس رات بستر پر لیٹتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

اگلے چار پانچ روز سیر و تفریح میں ہی گزرے۔ بوٹا سنگھ نے مجھے اخراجات کے لیے معقول رقم بھجوا دی تھی۔ اس سیر و تفریح کے دوران میں ہی میں نے جانکی سے ڈرائیونگ بھی سیکھنا شروع کردی۔ تھائی لینڈ میں بڑی ہنگامہ خیز زندگی گزری تھی۔ میں نے کئی مرتبہ چاہا تھا کہ ڈرائیونگ سیکھ لوں لیکن ایک ایک لمحہ تو بھاگ دوڑ میں گزارتا رہا تھا۔ کبھی اتنا وقت نہیں ملا کہ ہم سکون کا سانس لے سکیں اور میں کسی سے ڈرائیونگ سیکھ سکوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں ایک سنگین اور نازک صورت حال سے دوچار ہوگیا تھا۔ میں دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس وقت میرے قریب ایک کار موجود تھی۔ اگنیشن میں چابی بھی لگی ہوئی تھی لیکن مجھے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی اور اس وقت میں اس سنگین صورت حال سے کس طرح عہدہ برا ہوا تھا' یہ میں ہی جانتا ہوں۔

اس روز سہ پہر کے قریب میں اور جانکی ریور دیلی روڈ کی طرف نکل گئے۔ ریور دیلی روڈ کا ایک حصہ شہر کے کاروباری علاقے میں تھا جہاں صبح سے رات تک ٹریفک کا اژدحام اور لوگوں کا رش رہتا تھا۔ جبکہ اس سڑک کا دوسرا حصہ رہائشی علاقے میں سے گزرتا تھا۔ ہم اسی طرف آئے تھے جہاں کچھ اور ایسی سڑکیں بھی تھیں جہاں ٹریفک زیادہ نہیں ہوتا تھا اور ڈرائیونگ سیکھی جا سکتی تھی۔

تھائی اس روز گھر پر ہی تھی اور جب تھائی آس پاس نہ ہو تو جانکی شرارت کے موڈ میں ہوتی تھی۔ اس روز بھی اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ شرارت کے موڈ میں ہے۔

تیس پینتیس منٹ تک تو وہ مجھے ڈرائیونگ کا سبق دیتی رہی پھر اس نے مجھے پسنجرز سیٹ پر بٹھا دیا اور خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ وہ کار کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتی ہوئی سارا شہر پار کرکے لٹل انڈیا کی طرف لے آئی۔

"اس طرف آنے کی کوئی خاص وجہ؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کسی جگہ بیٹھ کر' تنہائی میں۔" جانکی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

"راستے میں بہت سی ایسی جگہیں تھیں جہاں ہم بیٹھ سکتے تھے۔ ویسے کار میں بھی تو ہم دونوں اکیلے ہی ہیں۔ ویسے اس وقت تم کچھ سنجیدہ سی نظر آرہی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں میں سنجیدہ ہوں اور میرے خیال میں تمہیں بھی اب سنجیدہ ہوجانا چاہیے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا۔ ایسا کرو۔" میں نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس طرف آگئے ہیں تو کار کو سیرانگون روڈ پر موڑ لو۔ اس طرف ذرا آگے چاچا خشونت سنگھ کا مکان ہے۔ ذرا ان کے گھر سے ہوتے چلیں۔ چاچی رجنی اور ارملا سے ملاقات!!

ایک اچھوتی سرگزشت

چھلاوا

بیسویں صدی کی ایک نہایت پُراسرار خاتون
صبیحہ بانو کی آپ بیتی

* دولت مند' آزاد خیال، پُروقار، خوبصورت اور خطرناک صبیحہ بانو، جنہیں لوگ جانتے ہیں مگر نہیں جانتے!
* جرائم پیشہ افراد انہیں ''چھلاوا'' کہتے ہیں!
* صبیحہ بانو کی زندگی عجیب اور خطرناک حالات سے گزرتی رہی ہے۔ انہوں نے جب اپنی زندگی کے کچھ حالات قلم بند کیے تو انہیں پڑھ کر ہزاروں لوگ ان سے ملنے اور انہیں جاننے کے متمنی ہوگئے۔ اسی لئے ان کی آپ بیتی کی اشاعت اردو زبان میں ایک ریکارڈ ہے۔

اس کتاب کا آٹھواں ایڈیشن شائع ہوچکا ہے

صفحات 1120 — قیمت 200 روپے — ڈاک خرچ 30 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

"میں تنہائی چاہتی ہوں اور تم مجھے خشونت سنگھ کے گھر لے جا رہے ہو پھر کسی وقت مل لینا ان سے۔" جانکی نے کہا۔ تاہم اس نے کار سیرانگون روڈ پر موڑلی تھی۔

"میں نے برسوں پہلے چاچا خشونت سنگھ کے پاس ایک امانت رکھوائی تھی۔ چاچا تو اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ چاچی رجنی سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی امانت؟" جانکی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا "کیا تمہارے خیال میں وہ امانت خشونت سنگھ کے گھر والوں کے پاس اب تک محفوظ ہوگی؟"

"ہونی چاہیے۔" میں نے جواب دیا "میرے ابو کی ڈائری ہے۔ چاچا خشونت سنگھ اس کی قدر و قیمت سے واقف تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے وہ ڈائری یقیناً چاچی رجنی یا کسی اور وارث کے حوالے کردی ہوگی۔ وہ ڈائری میرے لیے بہت ضروری ہے۔"

"اوہ! وہ ڈائری جس میں سونے کا راز پوشیدہ ہے اور جس کے لیے دارا نے بھی اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی ہے۔" جانکی نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "ویسے میری بات مانو تو اس ڈائری کو وہیں رہنے دو جہاں وہ اس وقت ہے۔ وہ وہیں زیادہ محفوظ ہے۔ دارا کا کانٹا نکل جائے تو وہ ڈائری لے آنا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ وہ ڈائری نہیں لیتا لیکن ان لوگوں سے مل تو لیا جائے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت نہیں۔" جانکی نے جواب دیا "پھر کبھی آجانا۔ اس وقت میرا موڈ کچھ اور ہے۔"

"تم واقعی بہت سنجیدہ ہو رہی ہو۔" میں اس کے چہرے کو تکنے لگا۔

جانکی نے جواب نہیں دیا۔ اس وقت سیرانگون روڈ پر ٹریفک زیادہ تھا۔ جانکی بہت محتاط ہو کر ڈرائیو کر رہی تھی۔

کاربلیوس روڈ کے موڑ پر کالی ماتا کے مندر کے قریب پہنچی تو ایک آدمی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ دراز قامت اس آدمی نے آف وائٹ کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں مگر وہ چہرہ۔ اس چہرے کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ دارا تھا۔

وہ سڑک کے کنارے ایک کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مندر کا ایک پجاری اور ایک خوب صورت عورت بھی کھڑی تھی جس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔

"اے جانکی۔ روکو۔ گاڑی روکو!" میں ایک دم چیخ اٹھا۔

"کک... کیا ہوا؟" جانکی ایک دم بدحواس سی ہوگئی۔

"دارا... میں نے وہاں دارا کو کھڑے دیکھا ہے۔" میں نے کہا اور مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا۔ دارا اس پجاری اور عورت کے ساتھ کار میں بیٹھ رہا تھا۔

جانکی نے کار کی رفتار مزید کم کردی لیکن ٹریفک کی وجہ سے اسے روکنے کا موقع نہیں مل رہا تھا اور پھر تقریباً سو گز آگے جا کر کار روکنے کی جگہ مل سکی۔

میں کار سے اتر کر پیچھے کی طرف دوڑا۔ اس وقت سرخ رنگ کی وہ کار سائڈ اسٹریٹ میں داخل ہو رہی تھی اور جب میں اس موڑ پر پہنچا تو وہ کار آگے کسی اور گلی میں مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں وہیں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہ گیا۔

اس دوران میں جانکی بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔

"کیا ہوا... کہاں گیا؟" اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھاگ گیا۔" میں نے جواب دیا "وہ یہاں سرخ رنگ کی ایک کار کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ مندر کا ایک پجاری اور عورت بھی تھی جس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔"

"تمہیں دھوکا تو نہیں ہوا۔" جانکی بولی "پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور وہ اس طرح آزادی سے تو نہیں گھوم سکتا۔"

"میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔" میں نے جواب دیا "اس نے اگرچہ داڑھی مونچھیں رکھ لی ہیں مگر میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ اگر تم اس وقت کار روک لیتیں تو اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔"

"دیکھ رہے ہو یہاں ٹریفک کی کیا صورت حال ہے۔" جانکی نے کہا "آگے بھی گاڑیاں تھیں اور پیچھے بھی۔ مجھے کار روکنے کا موقع ہی نہیں ملا لیکن کیا اس نے بھی تمہیں دیکھ لیا تھا؟"

"میرا خیال ہے اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا "لیکن اتنا تو پتا چل گیا ہے کہ اس مندر کے کسی پجاری سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ میں نے اس پجاری کا چہرہ ذہن نشین کرلیا ہے۔ اب اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"اس کے بارے میں کچھ معلوم کیا جائے۔ میرا مطلب ہے اس پجاری کے بارے میں۔" جانکی نے کہا۔

ہم دونوں مندر کی طرف چلنے لگے۔ سنگاپور میں ہندوؤں کے کئی مندر ہیں۔ جو مختلف دیویوں اور دیوتاؤں کے ناموں

سے منسوب ہیں۔ کالی کے ماننے والے بھی دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں بھی کالی کے ماننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ "کالی ماتا" کا یہ مندر بہت بڑا اور بہت شان دار تھا۔

مندر کے گیٹ سے کچھ دور جانکی نے اندر سے آنے والے ایک پجاری کو روک لیا۔ وہ کچھ دیر تک اس سے بات کرتی رہی پھر میں اس پجاری کا حلیہ بتا کر اس کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ میں نے اس عورت کا حلیہ بھی بتایا تھا۔

"یہ تو کالی ماتا کا استھان ہے۔ یہاں بہت لوگ آتے جاتے ہیں۔ پجاری بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ ویسے مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم جس پجاری کا حلیہ بتا رہے ہو اس کا نام مرلی دھر ہے۔ پہلے وہ شری پیرومل مندر میں ہوا کرتا تھا۔ چند روز سے ہی یہاں آنے لگا ہے۔ ویسے اگر تمہیں اس کی تلاش ہے تو وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے دیوی؟" وہ جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہمیں اسی لیے اس کی تلاش ہے کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔" جانکی نے جواب دیا "ویسے وہ اس مندر کے علاوہ کہاں مل سکتا ہے۔ میرا مطلب اس کا کوئی مستقل ٹھکانا۔"

"مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ویسے سنا ہے کہ وہ چھتیاری مندر کے آس پاس کہیں رہتا ہے۔ وہاں سے معلوم کرلو۔ تمہیں ٹھیک پتا چل جائے گا۔" پجاری نے جواب دیا۔

"چھتیاری مندر۔ وہی جو امپریل ہوٹل کے قریب ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں وہی۔" پجاری نے سرہلایا "وہاں سے تمہیں پتا چل جائے گا۔"

چھتیاری مندر تو ہمارے گھر کے راستے ہی میں تھا۔ ہم اس پجاری کا شکریہ ادا کر کے اپنی کار کی طرف آگئے۔ جانکی نے اب اپنا پروگرام بدل دیا تھا۔ اس گڑبڑ کی وجہ سے اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

ہم کلی مینئی ایونیو کی طرف آگئے۔ ریڈ کراس بلڈنگ والے چوراہے سے ایک سڑک تو ہمارے گھر کی طرف چلی جاتی تھی اور دوسری ٹینک روڈ نام کی سڑک ریور ویلی روڈ کی طرف چلی گئی تھی۔ میرے کہنے پر جانکی نے کار اس طرف موڑلی۔ یہ سڑک اگرچہ زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن یہاں ایک دو اچھے ہوٹل اور ایک شاپنگ سینٹر بھی تھا جو اگرچہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن شام کے وقت یہاں خاصی رونق رہتی تھی۔ چھتیاری مندر کے علاوہ ایک بہت بڑا چرچ اور یہودیوں کا سب سے بڑا معبد سائناگاگ اسی علاقے میں تھا۔

ٹینک روڈ پر چھتیاری مندر سے ذرا آگے نکل کر جانکی نے کار روک لی اور ہم دونوں کار سے اتر کر مندر کی طرف آگئے۔ یہ بھی بہت بڑا مندر تھا۔ جانکی نے مندر کے باہر ہی ایک پجاری کو پکڑ لیا اور اس سے مرلی دھر کے بارے میں پوچھنے لگی۔

"وہ راکھشس۔" پجاری بولا "تم اس سے کیوں ملنا چاہتی ہو۔ کیا تم بھی انہی عورتوں میں ہو جو پیسہ کمانے کے لیے مرلی دھر جیسے شیطان کے ساتھ مل کر دھرم نشٹ کرتی ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے پنڈت جی۔" جانکی نے کہا "میری ایک سکھی دو دن سے غائب ہے۔ آخری بار وہ مرلی دھر کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ ہم اسی لیے مرلی دھر کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

"اوہ!" پجاری بولا "وہ ناری تو نہیں جو چند روز پہلے ہندوستان سے آئی تھی۔"

"ہاں ہاں وہی۔" جانکی جلدی سے بولی "ہمیں اس کی تلاش ہے۔"

"مرلی دھر اب یہاں نہیں آتا۔ اب اس نے کالی ماتا کے مندر کو اپنی بدمعاشیوں کا اڈا بنا رکھا ہے۔ ویسے وہ تان چیاؤ ہائی اسکول کے پیچھے مارٹن روڈ پر رہتا ہے۔" پجاری نے کہا اور مکان کا پتا سمجھانے لگا۔

تان چیاؤ ہائی اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ وہی اسکول تھا جہاں ایک مرتبہ دارا کے آدمیوں سے بچنے کے لیے میں نے پناہ لی تھی۔

مارٹن روڈ رہائشی علاقہ ہے۔ ایک بغلی گلی میں وہ بنگلا تلاش کرنے میں ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی جس کی نشان دہی چھتیاری مندر کے پجاری نے کی تھی۔

اس بنگلے میں ہمارا سامنا ایک ادھیڑ عمر ہندو عورت سے ہوا۔ اپنی عمر سے قطع نظر وہ خاصی حسین تھی۔ باتوں کے دوران وہ گہری نظروں سے جانکی کو گھورتی رہی تھی۔ اس کی باتوں سے تصدیق ہوگئی تھی کہ یہ بنگلا مرلی دھر ہی کا تھا لیکن وہ اس وقت کہاں ہوگا۔ وہ عورت کچھ نہیں بتا سکی تھی۔ میں نے دارا کا موجودہ حلیہ بتا کر اس کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا مگر وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس حلیے سے ملتے جلتے شخص کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس بھاگ دوڑ میں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا لیکن بہرحال ڈور کا ایک سرا ہاتھ آگیا تھا جس سے الجھی ہوئی گتھی سلجھانے میں مدد مل سکتی تھی۔

ہم جب گھر پہنچے تو نو بجنے والے تھے۔ تھائی خاصی پریشان تھی۔ اس نے ہم دونوں کو اس طرح گھورا جیسے ماں دیر سے گھر آنے والے بچوں کو گھورتی ہے۔

"کہاں تھے تم دونوں؟" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"تھائی۔" جانکی ہنس پڑی "تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے ہم دونوں چھوٹے بچے ہوں۔"

اس سے پہلے کہ تھائی کچھ کہتی' میں بول پڑا۔

"دارا کی جھلک نظر آگئی تھی۔ اس کی تلاش میں بھاگے پھر رہے تھے۔"

"اوہ!" تھائی کے منہ سے بے اختیار نکلا "اس کا مطلب ہے کہ ـــــ"

"مطلب کچھ بھی نہیں تھائی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ٹریفک کی وجہ سے ہمیں کچھ تاخیر ہوگئی اور اسے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ ویسے میرا خیال ہے اس نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ ہم اسی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے پھر رہے تھے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔

"میں ایک بات کہوں۔" تھائی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "بہتر ہوگا کہ خود کوئی قدم اٹھانے کے بجائے انسپکٹر چیانگ شو کو اس کے بارے میں بتا دو۔ یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہاں کی صورت حال تھائی لینڈ سے بہت مختلف ہے۔ وہاں تمہیں کچھ رعایتیں حاصل تھیں۔ یہاں قانون کی پاسداری ہے۔ کسی معمولی سی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ انسپکٹر تمہیں وارننگ بھی دے چکا ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ سب کچھ اسے بتا دو۔ وہ خود ہی ان لوگوں کو تلاش کرلے گا۔"

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے خیال میں تھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میں نے اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا کر انسپکٹر چیانگ شو کا نمبر ملایا اور اسے صورت حال سے آگاہ کردیا۔

"گڈ۔" چیانگ شو نے کہا "میں اپنا ایک آدمی بھیج رہا ہوں۔ وہ سادہ لباس میں ہوگا۔ اسے ساتھ لے جاکر مارٹن روڈ والا وہ بنگلا دکھا دو۔ اس کے بعد تم سامنے نہیں آؤ گے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔" میں نے کہا "مجھے اپنے آدمی کا نام بتا دیں۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے اپنے ایک ماتحت کا نام بتا دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر کا ماتحت پہنچ گیا۔ وہ سادہ لباس ہی میں تھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل وہیں کھڑی کردی اور میرے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ میں چونکہ ابھی پوری طرح ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکا تھا اس لیے میں نے اس کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا تھا۔

مارٹن روڈ تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میرے اشارے پر اس نے کار بغلی گلی میں موڑ کر رفتار کم کردی۔ اس بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اشارہ کردیا۔ وہ کار کو روکے بغیر آگے نکال لے گیا اور آگے والی سڑک، ہائی اسکول کے پچھلی طرف سے ہوتے ہوئے کار کو دوبارہ مارٹن روڈ پر لے آیا۔

"ٹھیک ہے مسٹر وجدان۔" انسپکٹر کے ماتحت نے میرے مکان کے سامنے کار روکتے ہوئے کہا "تم لوگ اب اس بنگلے سے دور ہی رہو گے۔ ہم معلوم کرلیں گے کہ یہ مسٹر مرلی دھر کون ہے اور اس کا دارا یا چی فانگ سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں دور ہی رہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر اس رات گیارہ بجے کے قریب ہم تینوں نشست گاہ میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ تھائی قریب بیٹھی ہوئی تھی' اس نے ریسیور اٹھالیا اور مختصر سی بات کرنے کے بعد اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"کوئی عورت ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

"ہیلو۔" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا "میں وجدان بول رہا ہوں۔ آپ کون؟"

"تمہارا باپ۔" دوسری طرف سے دارا کی آواز سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ تھائی نے اس کی آواز کو عورت کی آواز کیسے سمجھ لیا تھا۔ میرے چہرے کے تاثرات بھی شاید بدل گئے تھے۔ تھائی اور جانکی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔

"تم واقعی بزدل ہو دارا۔ کہاں تک بھاگو گے۔ میں نے تو طے کر رکھا ہے کہ دنیا کے آخری سرے تک تمہارا تعاقب کروں گا۔ تم پولیس کو چکما دے سکتے ہو مجھے نہیں۔ تم نے اگرچہ اپنا حلیہ بدل رکھا ہے مگر میں نے ایک نظر دیکھتے ہی تمہیں پہچان لیا تھا۔ افسوس تو اس بات کا ہوا کہ تم آج نکل گئے۔"

"میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔" دارا نے جواب دیا "میں بزدل نہیں ہوں۔ مصلحتاً وہاں سے ہٹ گیا تھا لیکن مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی مرلی دھر کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلو گے لیکن یہاں تم سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ اگر تم مرلی دھر کے بنگلے پر جانے کے بجائے خفیہ طور پر نگرانی کرتے تو شاید میں دھوکے میں مار کھا جاتا مگر تم نے بنگلے پر جاکر بہت بڑی غلطی کی۔ مجھے تمہاری سرگرمیوں کا پتا چل گیا۔ اب تم میری گرد کو بھی نہیں پاسکو گے۔ ویسے میری ایک تجویز ہے۔"

"بکو۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"تم نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ کئی مرتبہ موت کے منہ سے بچے ہو۔ میں بھی بہت پریشان ہوا ہوں۔ تمہاری وجہ سے میرا سب کچھ تباہ ہوچکا ہے۔ تمہارے باپ کا چھوڑا ہوا کاروبار خوب پھلا پھولا ہے۔ تم زندگی بھر عیش کرسکتے ہو۔ میری تجویز یہ ہے کہ اگر تم اپنے باپ کی ڈائری میرے حوالے کردو تو میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا اور پچھلے چند برسوں میں جو کچھ ہوا ہے سب بھول جاؤں گا۔"

"لیکن میں نہیں بھول سکتا۔" میں نے کہا "جب تک اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن نہیں مروڑ دوں گا مجھے چین نہیں ملے گا۔"

"تم جوان ہو۔ حوصلہ مند ہو۔ ابھی تو تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم اس زندگی کو آرام و سکون سے گزارو لیکن اگر تم زندگی بھر انگاروں ہی سے کھیلنا چاہتے ہو تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" دارا نے کہا "ویسے مجھے وہ ڈائری حاصل کرنے میں دو تین دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ ہوسکتا ہے اس دوران میں میری اور تمہاری ایک ملاقات بھی ہوجائے اور یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ میں تمہیں کل شام تک کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر میری تجویز مان لو اور ڈائری از خود میرے حوالے کردو تو یہ تمام معاملات ختم ہوسکتے ہیں۔"

"میرا جواب کل بھی یہی ہوگا۔ اس لیے ـــــ" میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لائن کٹ گئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ تھائی اور جانکی اب بھی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"تم دارا سے بات کررہے تھے لیکن میں نے جس سے بات کی تھی وہ تو کوئی عورت تھی۔" تھائی نے کہا۔

"ہوسکتا ہے اس نے نمبر کسی عورت سے ملوایا ہو۔" میں نے جواب دیا "اب تم پوچھو گی کہ اسے یہاں کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟ تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے کوئی بھی نام اور ایڈریس بتا کر نمبر معلوم کیا جاسکتا ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر انہیں دارا سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ ٹوٹ رہا ہے۔" تھائی نے میرے خاموش ہونے پر کہا۔

"ہاں۔ اس کے شکست خوردہ لہجے سے تو کچھ ایسا ہی اظہار ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں ابو کی ڈائری اس کے حوالے کردوں تو وہ خاموشی سے یہاں سے چلا جائے گا لیکن میں آسانی سے اسے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ ایک تو مجھے دارا سے اپنا حساب کتاب کرنا ہے اور اس کے بعد چوہدری نوازش علی سے بھی اپنے باپ کی بربادی کا حساب چکانا ہے۔"

"یہ چوہدری نوازش علی کون ہے؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "یہ نام تو میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔"

"چوہدری نوازش علی ہی دراصل سارے فساد کی جڑ ہے۔" میں نے کہا "میرے باپ کا تعلق ایک زمیں دار گھرانے سے تھا۔ پاکستان میں ان کی زمین انڈیا کی سرحد سے ملی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چوہدری نوازش علی کے باپ کی بھی زمین تھی۔ وہ اسمگلر تھا اور ہمارے خاندان کی زمین بھی خریدنا چاہتا تھا تاکہ آزادی سے انڈیا کی سرحد سے اپنی غیر قانونی سرگرمیاں جاری رکھ سکے مگر میرے دادا نے وہ زمین بیچنے سے انکار کردیا۔ نوازش علی کے باپ نے جعل سازی سے وہ زمین ہتھیانے کی کوشش کی۔ عدالت میں سالہا سال تک مقدمہ چلتا رہا۔

"چوہدری نوازش علی اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا۔ اس نے دارا جیسے غنڈے پال رکھے تھے۔ وہ طاقت کے زور پر زمین پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرے ماں باپ کو زندہ جلانے کی کوشش بھی کی۔ میں اس وقت صرف دو مہینے کا تھا۔ میرے ماں باپ مجھے لے کر سنگا پور آگئے۔ یہاں انہوں نے محنت کی۔ دکان بنائی اور یہ مکان خرید لیا۔

"تقریباً چودہ سال بعد دارا یہاں پہنچ گیا۔ چوہدری نوازش علی اور دارا نے پاکستان میں منشیات کی اسمگلنگ کا ایک بہت بڑا ریکٹ بنالیا تھا۔ وہ یہاں بھی ایسا ہی ایک سینڈیکیٹ بنانا چاہتا تھا اور دارا صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے یہاں آیا تھا۔ یہاں اس نے ڈیڈی کو دیکھ لیا اور سمجھ گیا کہ وہ اس کے راستے کی رکاوٹ بنیں گے۔ اس نے ڈیڈی

اور ممی کو قتل کر دیا اور اس طرح ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔

"اور سونے کا کیا چکر ہے؟" جانکی نے پوچھا۔

"جب میرے ڈیڈی لاہور میں تھے اور اپنی زمینوں پر تھے تو ایک رات چوہدری نوازش علی کے آدمی بڑی مقدار میں سونا سرحد پار لے جانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ڈیڈی نے انہیں للکارا۔ وہ یہی سمجھے کہ پولیس یا رینجرز نے انہیں گھیر لیا ہے۔ وہ گاڑی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ڈیڈی نے گاڑی کی تلاشی لی اور سونے سے بھرے ہوئے دو بیگ اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسمگلروں کو احساس ہو گیا کہ وہ دھوکا کھا گئے ہیں۔ وہ پلٹے تو ڈیڈی کو وہاں سے بھاگنا پڑا۔

"وہ ابو کو پورے شہر میں شکاری کتوں کی طرح تلاش کرتے رہے۔ یہی دارا پیش پیش تھا۔ ایک موقع پر اس نے مجھے اور امی ابو کو زندہ جلانے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس واقعے کے بعد ہی ابو ہمیں لے کر سنگاپور آ گئے تھے۔

"اس ڈائری میں نہ صرف سونے کا راز پوشیدہ ہے بلکہ چوہدری نوازش علی، دارا اور اس کے ساتھیوں کے جرائم کی پوری داستان بھی رقم ہے۔ یہ ڈائری اگر پاکستان میں پولیس کے حوالے کر دی جائے تو ان سب کو موت کی سزا سے کوئی نہیں بچا سکتا۔"

"ہوں۔" میرے خاموش ہونے پر جانکی نے ہنکارا بھرا "تو اسی لیے وہ اس ڈائری کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں لیکن وہ قیامت تک یہ ڈائری حاصل نہیں کر سکے گا۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ہم نے مارٹن روڈ والے بنگلے پر اس عورت سے بات کر کے واقعی غلطی کی۔ ہمارے آنے کے بعد اس نے دارا کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ اب وہ محتاط ہو جائے گا۔ پولیس نے اگرچہ اس بنگلے کی نگرانی شروع کر دی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہاں اب کچھ نہیں ملے گا۔"

"پھر تو اس کی نگرانی بھی بیکار ہے۔" تھائی نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"ہاں۔ میں انسپکٹر چیانگ شو کو بتا دوں۔ نگرانی جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ وہ خود ہی کرے گا۔" میں نے کہتے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا اور نمبر ملانے لگا۔

لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی لیکن پولیس ہیڈ کوارٹر سے بتایا گیا کہ وہ آدھا گھنٹہ پہلے گھر جا چکا ہے۔ میں نے کریڈل ٹیپ کر کے گھر کا نمبر ملایا۔ کال تیسری گھنٹی پر ریسیو کی گئی تھی اور کال ریسیو کرنے والا چیانگ شو ہی تھا۔

"خیریت۔" وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔

"کچھ دیر پہلے دارا کا فون آیا تھا انکل۔" میں نے کہا اور پھر اسے اس گفتگو کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔

"وہ ڈائری کہاں ہے؟" چیانگ شو نے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں انکل۔" میں نے گول مول جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی کے انتقال کے بعد وہ ڈائری میں نے چاچا پرتاب سنگھ کو دے دی تھی۔ اب مجھے یاد نہیں کہ چاچا پرتاب سنگھ وہ ڈائری اپنے ساتھ تھائی لینڈ لے کر گیا تھا یا یہاں کسی کو دے گیا تھا۔"

"تھائی لینڈ میں تو تم بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس کے قتل کے بعد ڈائری اس کے سامان سے ملی تھی یا نہیں؟" چیانگ شو نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا "اس وقت میری اپنی حالت بہت خراب تھی۔ مجھے مہاراج کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ چاچا پرتاب سنگھ کا سامان ہوٹل میں تھا جو بعد میں پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ ڈائری اس سامان میں تھی یا نہیں۔"

"میری معلومات کے مطابق سنگاپور چھوڑنے سے پہلے وہ تمہیں اپنے دوست خشونت سنگھ کے پاس لے گیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ڈائری اس کے حوالے کر گیا ہو۔" چیانگ شو نے کہا۔

"لیکن ان کا تو انتقال ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ ڈائری کو اپنے ساتھ قبر میں نہیں لے گیا ہوگا۔" چیانگ شو نے جواب دیا "اس کے گھر والوں سے معلوم کرو۔ خشونت سنگھ نے مرنے سے پہلے اپنی بیوی یا بیٹی کو اس ڈائری کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا۔ تم صبح سب سے پہلے ان کے گھر جا کر معلوم کرو۔ اگر اس ڈائری میں ان لوگوں کے بارے میں تمہارے فادر نے کچھ لکھا ہے تو وہ انہیں پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔ میں صبح ہی جا کر معلوم کروں گا۔" میں نے کہا۔ میں نے ڈائری کا تذکرہ اس انداز میں کیا تھا کہ اس میں دارا وغیرہ کے خلاف کچھ ثبوت ہیں۔ میرا خیال تھا کہ چیانگ شو ڈائری کو اتنی اہمیت نہیں دے گا لیکن وہ بال کی کھال نکالتا چلا گیا تھا "مارٹن روڈ والے بنگلے کی نگرانی کے بارے میں اب آپ کا کیا خیال ہے انکل۔"

"وہ ہمارا درد سر ہے۔" چیانگ شو نے جواب دیا "اب

تم اس بات کو بھول جاؤ۔ مجھے بہرحال تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ یہ تمہارے توسط سے ایک کلیو تو ملا۔ اب آگے کا راستہ ہم خود تلاش کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے انکل۔" میں نے کہا اور ایک دو رسمی جملوں کے بعد میں نے فون بند کر دیا۔

جانکی اور تھائی سے باتیں کرتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ بات اگرچہ کئی سال پرانی ہو چکی تھی لیکن انسپکٹر چیانگ شو کو یاد تھا کہ سنگاپور چھوڑنے سے پہلے چاچا پرتاب سنگھ مجھے خشونت سنگھ کے گھر لے گیا تھا اور یہ بات تو دارا کو بھی نہیں بھولنی چاہیے تھی کیونکہ دارا نے تو اپنے غنڈوں کے ذریعے میرے اوپر وہاں بھی حملہ کروایا تھا اور اسے بڑی زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے فون پر بات کرتے ہوئے دارا نے کہا تھا کہ وہ دو تین دن میں ڈائری تک پہنچ جائے گا اور اب میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس کے ذہن میں بھی تو وہی بات نہیں تھی جس کا اظہار انسپکٹر چیانگ شو نے کیا تھا۔

"صبح کا انتظار کیوں کیا جائے۔ ہم ابھی جا کر معلوم کر لیتے ہیں۔"

"ابھی۔" میں نے کہتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ عام طور پر لوگ بارہ بجے سے پہلے نہیں سوتے۔ خشونت سنگھ کے گھر والے بھی ابھی جاگ ہی رہے ہوں گے "ٹھیک ہے چلو۔" میں کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

اور پھر دس منٹ بعد ہم گھر سے باہر آ چکے تھے۔ تھائی نے تالا لگا کر چابیوں کا گچھا اپنے پرس میں ڈال لیا۔ کار کی چابی جانکی کے پاس تھی۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ان چند دنوں کے دوران میں' میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ گھر تھائی نے سنبھال لیا تھا اور ڈرائیور کی ڈیوٹی جانکی نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ صبح مارکیٹ سے سودا وغیرہ بھی وہی لاتی تھی۔

کار گلیوں سے نکل کر پہلے فورٹ کیننگ روڈ اور پھر دھوبی گھاٹ کے قریب سے آرچرڈ روڈ پا کر کے سلیبی روڈ پر آ گئی۔ اس وقت اگرچہ ٹریفک زیادہ نہیں تھا لیکن جانکی نے کار کی رفتار کو کنٹرول ہی میں رکھا تھا۔ یہ سڑک سیدھی روچر کینال روڈ اور بکت تیما روڈ کے سنگم پر نہر کا پل پار کر کے سیرانگون روڈ سے جا ملتی تھی۔ یہ لٹل انڈیا کا علاقہ تھا اور اس وقت اسے شہر کا سب سے زیادہ بارونق علاقہ کہا... جا سکتا تھا۔ یہاں ریسٹورنٹ' شراب خانے اور کھانے پینے کی دکانیں رات گئے تک کھلی رہتی تھیں۔

سیرانگون روڈ پر کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے جانکی کو کار بائیں طرف کیرباؤ روڈ پر موڑ لینے کا اشارہ کیا۔ اس طرف کچھ آگے سکھوں کا بہت بڑا گردوارہ تھا اور اس کے آس پاس کی زیادہ آبادی بھی سکھوں پر ہی مشتمل تھی۔ اس سے آگے سیرانگون روڈ پر ہی کالی کا مندر تھا۔ جہاں صبح میں نے دارا کو دیکھا تھا۔ اس مندر کے آس پاس ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی بلکہ سید علوی روڈ اور مسجد عبدالغفور روڈ کے آس پاس کا علاقہ مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل تھا۔

گردوارے سے آگے نکل کر میں نے کار تیسری گلی میں مڑوا کر ایک جگہ رکوالی اور نیچے اتر کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس گلی میں بھی بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ گلی کے دونوں طرف کئی نئے مکان نظر آ رہے تھے۔ میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا چلتا رہا لیکن خشونت سنگھ والا مکان میں بھول گیا تھا۔

میں ایک جگہ رک گیا۔ کار بھی میرے قریب رک گئی تھی۔ اسی دوران میں سامنے سے دو سائیکل سوار آتے ہوئے نظر آئے۔ وہ مجھ سے ذرا آگے ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد۔ وہ دونوں یوریشین تھے۔ میں نے آدمی سے خشونت سنگھ کے مکان کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بولا۔

"مسٹر خشونت سنگھ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اس کا مکان وہاں موجود ہے۔ وہ پیلے گیٹ والا۔" اس نے سامنے والی لین کے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس مکان کے سامنے آ گیا۔ جانکی بھی گاڑی قریب لے آئی۔ مکان کے اندر بتی جل رہی تھی۔ میں نے بلا جھجک کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ چند منٹ بعد ہی ایک آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دھوتی اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ سر پر پگڑی نہیں تھی البتہ بالوں کا جوڑا بنا ہوا تھا۔ داڑھی گول اور چھوٹی تھی۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا پھر چاچی رجنی کے بارے میں پوچھا۔

"آؤ جی۔ جی آیاں نوں۔ اندر آ جاؤ جی۔" اس نے گیٹ کا ذیلی دروازہ پوری طرح کھول دیا۔

میں نے کار میں بیٹھی ہوئی جانکی اور تھائی کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں نیچے اتر آئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ شخص اندر بھاگ گیا اور چاچی چاچی پکارتا ہوا برآمدے والے دروازے میں غائب ہو گیا۔

ہم تینوں اندر آ گئے۔ میں نے گیٹ کا ذیلی دروازہ بند

کردیا اور پھر ایک منٹ بعد ہی چاچی رجنی برآمدے والے دروازے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم تینوں کو باری باری گلے لگا کر پیار کیا اور اندر لے گئیں۔ برآمدے والے دروازے کے ساتھ ہی اندر کی طرف ڈرائنگ روم کا دروازہ تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر بتیاں جلا دیں اور ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اُرملا اور وہ آدمی بھی آگیا جس نے گیٹ کھولا تھا۔ اب اس نے کُرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ اُرملا کا شوہر سنت سنگھ تھا۔

وہ سب ہمارے آنے سے بہت خوش تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ارملا ہمارے لیے ٹھنڈا مشروب لے آئی۔

"خیر تو ہے نا پتر۔ اس وقت ادی رات کو؟" چاچی رجنی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ایک بہت ضروری کام آن پڑا تھا چاچی جس کے لیے آپ لوگوں کو اس وقت زحمت دی۔" میں نے کہا۔

"یہ تو تمہارا اپنا گھر ہے پتر۔ تکلیف کیسی۔ ہم تو جاگ رہے تھے۔ ویسے پریشانی تو ہوجاتی ہے نا۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ تم خیر نال آئے ہو۔ اب بتاؤ کیا کام ہے۔" چاچی رجنی نے کہا۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ جب میں چاچا پرتاب سنگھ کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس وقت دارا کے غنڈوں نے حملہ کردیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں اس دُرگھٹنا کو کیسے بھول سکتی ہوں پتر۔" چاچی نے کہا "تم یہاں سے جاکر بھائی پرتاب سنگھ کے ساتھ غائب ہوگئے تھے تو ہم سب گھر والے کئی روز تک پریشان رہے تھے۔ ہم تو پل پل تمہاری زندگی اور سلامتی کی دعائیں مانگتے رہے۔"

"آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی میں آج زندہ اور سلامت ہوں۔" میں نے کہا "اس رات ہم نے چاچا خشونت سنگھ کو ایک بریف کیس دیا تھا جس میں میرے کچھ ضروری کاغذات تھے۔"

"کئی ورش گزر گئے بیٹا۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں۔" چاچی نے جواب دیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اگر انہوں نے بریف کیس یا اس میں رکھی ہوئی ڈائری اور کاغذات بیکار سمجھ کر پھینک دیئے ہوں گے تو۔۔۔ میں اس سے آگے نہیں سوچنا چاہتا تھا۔

"مجھے یاد ہے ماں جی۔" ارملا کی زبان سے یہ الفاظ سن کر مجھے کچھ تسلی ہوئی "باپو نے وہ بریف کیس آپ کو دیا تھا اور آپ نے مجھے دے دیا تھا۔"

"کہاں ہے وہ بریف کیس؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ بریف کیس تو ٹوٹ گیا تھا۔" ارملا نے جواب دیا۔

"اور اس میں رکھی ہوئی ڈائری اور کاغذات کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ محفوظ ہیں۔" ارملا نے جواب دیا۔

میری جان میں جان آئی۔ "کہاں ہے وہ ڈائری۔" میں نے پوچھا۔

"وہ کاغذات اور ڈائری میں نے ایک تھیلے میں لپیٹ کر بڑی پیٹی میں سامان کے نیچے رکھ دی تھی اور وہ پیٹی تو ان کے فلیٹ میں رکھی ہوئی ہے۔" اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا۔

"فلیٹ قریب ہے یا دور۔ میرا مطلب ہے اس وقت۔۔۔"

"اس وقت تو نہیں ویر جی۔" ارملا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "فلیٹ تو قریب ہی ہے بنیلو روڈ پر مگر وہاں کی بجلی کٹی ہوئی ہے۔ آپ صبح آجانا ویر جی۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل دن میں کسی وقت آجاؤں گا۔" میں نے کہا "ایک بات اور۔" میں نے سنت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "میرے دشمن اب بھی میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ بھی ڈیڈی کی وہ ڈائری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جس میں ان کے سیاہ کرتوتوں کی تفصیل درج ہے۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ بھی کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں۔ اس لیے تم لوگ ذرا محتاط رہنا۔"

"فکر ہی نہ کرو بھائی جی۔" سنت سنگھ نے کہا "آپ کی چیزیں ہمارے پاس امانت ہیں۔ وہ کسی اور کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔"

میں نے اسے اپنا اور انسپکٹر چیانگ شو کا فون نمبر بھی دے دیا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو دونوں میں سے کسی نمبر پر فوری طور پر اطلاع دے دی جائے۔

واپسی پر ہم سیرانگون روڈ سے بکٹ روڈ کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے سینٹرل ایکسپریس وے کا راستہ اختیار کیا اور وہاں سے آرچرڈ روڈ کراس کرتے ہوئے کلی مینسی ایونیو کی طرف نکل آئے۔

کار جب اپنے مکان والی گلی کی طرف مڑی تو رات کے دو بج رہے تھے۔ اس علاقے میں مکمل سناٹا تھا۔ گلی کے آگے والے موڑ پر ایک کار کھڑی تھی جس کی ساری بتیاں بجھی

ہوئی تھیں۔ میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہاں ایسے مکان بہت کم تھے جن میں گیٹ کے اندر گاڑی کھڑی کرنے کی گنجائش تھی۔ لوگ عام طور پر اپنی گاڑیاں گلی میں یا اِدھر اُدھر ہی کھڑی کردیتے تھے اور میرے خیال میں وہ کار بھی کسی نے اسی طرح کھڑی کردی تھی۔

کمپاؤنڈ والا دروازہ کھول کر ہم برآمدے میں پہنچے تو میں ٹھٹک گیا۔ ہم گھر کی تمام بتیاں بند کرکے گئے تھے لیکن اس وقت اندر مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی اور وہ روشنی متحرک تھی۔ جانکی اور تھائی نے بھی وہ روشنی دیکھ لی۔

"اے۔ کون ہے۔ اندر کون ہے؟" جانکی نے چیخ کر پوچھا۔

روشنی بجھ گئی اور پھر یوں لگا جیسے کوئی تیزی سے ایک طرف دوڑا ہو۔ کوئی کرسی وغیرہ الٹنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے تھائی سے چابی لے کر تالا کھولا اور دروازے کو زور دار دھکا دیا۔

دروازہ دھڑ کی آواز سے کھل گیا۔ پچھلی راہداری کی طرف آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں چیختا ہوا تیزی سے اس طرف دوڑا مگر راہداری میں کسی چیز سے ٹکرا کر گر گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی میں دیوار سے ٹکرا گیا اور پھر ٹھیک اسی وقت پچھلی طرف ایک فائر کی آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

میں سنبھل کر پھر اس طرف دوڑا۔ عقبی دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں تیزی سے اس طرف لپکا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے تک پہنچتا ایک اور گولی چلی۔ اس مرتبہ فائر کی یہ آواز مکان کے باہر سے آئی تھی۔ میں ایک بار پھر اس طرف دوڑا۔

مکان کے پچھلی طرف بھی ایک مختصر سا لان تھا۔ میں جب دروازے سے نکل کر اس طرف پہنچا تو پچھلی گلی میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں لان سے نکل کر کھلی جگہ پر آگیا۔ اسی وقت ایک سایہ اگلی گلی میں دائیں طرف مڑتا ہوا نظر آیا۔ میں بھی تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا اور جب میں گلی کے موڑ پر پہنچا تو وہ سایہ اس کار تک پہنچ چکا تھا جو میں نے اپنے مکان کے سامنے والے رخ پر گلی کے اگلے موڑ پر کھڑی دیکھی تھی۔

کار اسٹارٹ ہوکر حرکت میں آچکی تھی۔ دوڑتا ہوا وہ سایہ بھی کار میں گھس چکا تھا اور پھر میں نے کار کی طرف سے ایک شعلہ سا لپکتا ہوا دیکھا۔ میں بڑی تیزی سے نیچے گر گیا۔ شعلہ چمکتے ہی فائر کی آواز بھی فضا میں گونجی تھی۔

جب میں سنبھلا تو وہ کار بہت دور جاچکی تھی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا اس کی عقبی سرخ بتیوں کو دیکھتا رہا اور پھر وہ سرخ بتیاں بھی غائب ہوگئیں۔

میں مڑ کر دوڑتا ہوا عقبی گلی ہی سے مکان میں واپس آیا تھا۔ ساری بتیاں جلی ہوئی تھیں۔ مکان میں داخل ہوتے ہی میرا سامنا سب سے پہلے تھائی سے ہوا۔ اس کی آنکھوں۔۔۔ اور چہرے پر وحشت تھی۔ میں دروازہ بند کرکے اندر آگیا۔

گھر کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ممی اور ڈیڈی والے بیڈ روم کی حالت سب سے زیادہ ابتر تھی۔ الماریوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ تمام کپڑے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ بیڈ کا میٹریس غالباً چاقو سے کاٹ دیا گیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں بھی کھلی ہوئی تھیں اس میں کئی چیزیں بھی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

دوسرے کمروں کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بڑی تفصیل سے تلاشی لی گئی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا کا کوئی آدمی مکان کی نگرانی کررہا ہوگا اور ہمارے جانے کے بعد اس نے فون پر دارا کو اطلاع دی ہوگی اور اس کا کوئی اور آدمی بھی یہاں پہنچ گیا ہوگا۔ ممکن ہے دارا خود بھی یہاں آیا ہو لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی ہوگی۔ اسے ڈائری کی تلاش تھی اور ڈائری تو ابھی تک میرے قبضے میں بھی نہیں آئی تھی۔ اسے کہاں سے ملتی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے مکان کی نگرانی ہو رہی تھی۔" جانکی نے کہا "اور موقع ملتے ہی انہوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔"

"اور انہیں مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا۔" میں نے جواب دیا۔

"سب سے پہلے تو تم پولیس کو اطلاع دو۔ اس کے بعد یہ سامان درست کیا جائے گا۔" تھائی نے کہا۔

"پولیس کے آنے کا فائدہ تو کوئی نہیں ہوگا لیکن ایک فارمیلٹی پوری ہوجائے گی۔" میں نے جواب دیا اور رلونگ روم میں آکر پولیس کو فون پر اطلاع دینے لگا۔

اسی دوران میں کال بیل کی آواز سنائی دی۔ وہ چاچا جگ جیت سنگھ تھا جو کال بیل کا بٹن دبانے کے ساتھ میرا نام لے کر آوازیں بھی دے رہا تھا۔

میں نے باہر کا دروازہ کھول دیا۔ چاچا جگ جیت سنگھ کے علاوہ اس گلی میں رہنے والے چار اور آدمی بھی موجود تھے۔

"خیر تو ہے پتر۔ یہ گولیوں کی آواز کیسی تھی؟" جگ جیت

سنگھ نے پوچھا۔
"ہماری عدم موجودگی میں چور گھس آئے تھے چاچا۔" میں نے جواب دیا "ہم واپس آئے تو ہماری آواز سن کر بھاگ گئے۔"
"کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟" ایک اور آدمی نے پوچھا۔
"سارا سامان بکھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے وہ چور کچھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ خالی ہاتھ ہی گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔
ہم ابھی باہر کھڑے باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس سائرن کی آواز سنائی دینے لگی۔ اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی پولیس کار گلی میں داخل ہوئی اور ہمارے قریب پہنچ کر رک گئی۔
اس پولیس پارٹی کا انچارج سب انسپکٹر وجے ملہوترہ ہندوستانی تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی تھی اور انداز گفتگو میں بھی بڑی نخوت تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ملزم میں ہی ہوں۔ میں اسے اندر لے آیا اور کمروں میں بکھرا ہوا سامان دکھانے لگا۔
"تم لوگ کہاں تھے؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا اور پھر تھائی اور جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔
"اپنے ایک جاننے والے کے ہاں گئے ہوئے تھے۔" میں نے جواب دیا۔
"کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی؟" دوسرا سوال تھا۔
"میرا خیال ہے نہیں۔"
سب انسپکٹر وجے ملہوترہ گھوم پھر کر جائزہ لیتا رہا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔
"مسٹر وجدان۔ چند سال پہلے یہاں جو دُرگھٹنا ہوئی تھی مجھے اس کا افسوس ہے۔ میں اس زمانے میں دوسرے ڈسٹرکٹ میں تھا اور یہاں کا چارج انسپکٹر چیانگ شو کے پاس تھا۔ اس نے تمہیں ہیرو بنانے کی پوری کوشش کی تھی اور اب بھی وہ تم پر اپنا سایہ کیے ہوئے ہے لیکن میں ایک بات تمہیں ذہن نشین کرا دینا چاہتا ہوں کہ اس علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کا ذمے دار میں ہوں۔ میں یہاں کسی قسم کی بدامنی پسند نہیں کروں گا لہٰذا اس قسم کے ڈرامے اب ختم ہو جانے چاہئیں۔"
"آفیسر۔" میرے قریب کھڑی ہوئی جانکی نے اسے گھورتے ہوئے کہا "تم سمجھتے ہو کہ یہ سب کچھ ہم نے خود کیا ہے اور۔۔۔"
"ایک منٹ!" میں نے جانکی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا اور سب انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو گیا "میں نے پولیس کو ایک واردات کی اطلاع دی تھی۔ تم یہاں آ گئے ہو تو یہ تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ جو کارروائی کرنا چاہتے ہو کرو اور چلے جاؤ اور اس زعم میں مت رہنا کہ تم پولیس آفیسر ہو۔۔۔"
"مجھے دھمکی دے رہے ہو۔" ملہوترہ نے میری بات کاٹ دی۔ اس کا لہجہ کاٹ کھانے والا تھا۔
"نہیں۔ تمہیں تمہارا فرض یاد دلا رہا ہوں۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔
اس وقت چاچا جگ جیت سنگھ نے بھی کچھ کہنا چاہا تھا' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر خاموش کرا دیا۔
سب انسپکٹر ملہوترہ تقریباً آدھے گھنٹے تک مختلف کمروں کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے اسے پچھلا دروازہ بھی کھول کر دکھایا اور پھر پچھلی گلی سے ہوتا ہوا اپنی گلی کے اس موڑ پر آ گیا جہاں میں نے وہ کار کھڑی دیکھی تھی۔
"تم نے کار کا نمبر تو نوٹ کیا ہو گا۔" ملہوترہ نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"نہیں۔" میں نے جواب دیا "کار اس رخ پر کھڑی تھی کہ گلی سے اس کی نمبر پلیٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ویسے بھی فاصلہ زیادہ ہونے کے علاوہ یہاں اندھیرا بھی ہے اور مجھے یہ شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ کار یہاں کیوں کھڑی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" سب انسپکٹر ملہوترہ نے کہا "ہم دیکھیں گے کہ پولیس اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے اور ہاں۔۔۔ انسپکٹر چیانگ شو کے پاس فریاد لے کر جانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کروں گا۔"
"ٹھیک ہے آفیسر۔" میں نے جواب دیا۔ میں بڑی مشکل سے ضبط کر رہا تھا "میں کسی کے پاس فریاد لے کر نہیں جاؤں گا۔ ایک ذمے دار شہری ہونے کے ناتے میرا جو فرض تھا وہ میں نے ادا کر دیا ہے۔ ویسے اس قسم کے معاملات سے نمٹنا میں بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آئندہ ایسی کوئی بات ہوئی تو میں پولیس کو زحمت نہیں دوں گا۔"
"اگر تم نے کسی موقع پر قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تو پچھتاؤ گے۔ میرا شمار ان پولیس آفیسرز میں ہوتا ہے جو رشوت' سفارش اور لحاظ سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔"
"میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا آفیسر۔" میں نے کہا "تم نے یہاں تک آنے کی جو زحمت کی ہے اس کے لیے بہت شکریہ۔"
میں نے ملہوترہ سے ہاتھ ملانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔ چند لوگ اس وقت بھی گلی میں کھڑے تھے۔ میں ان سب کو نظرانداز کرتا ہوا اندر آ گیا۔ چاچا جگ جیت سنگھ بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا اور پھر ہم نے مل کر سامان سیٹ کرنا شروع کر دیا۔
چار بج گئے۔ چاچا جگ جیت سنگھ اس دوران میں مسلسل سب انسپکٹر ملہوترہ کو برا بھلا کہتا رہا۔
"یہ سالا ہے ہی ایسا۔ بددماغ اور بدتمیز۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "سالا کہتا ہے میں سفارش اور رشوت نہیں مانتا۔ حقیقت یہ ہے کہ رشوت کے بغیر یہ کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ ایک سال پہلے تک یہ انسپکٹر تھا۔ اپنی بددماغی اور بدتمیزیوں کی وجہ سے انسپکٹر کے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھا اور لگتا ہے کہ اب یہ اپنی نوکری سے بھی ہو جائے گا۔"
"ایسے لوگوں کے ساتھ تو یہی کچھ ہوتا ہے چاچا۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔
چاچا جگ جیت سنگھ کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر دیا۔ جانکی اور تھائی اپنے کمرے میں گھس گئیں اور میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک سب انسپکٹر ملہوترہ کے رویے کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ایک پولیس آفیسر تھا۔ میں نے ایک واردات کی اطلاع دی تھی۔ شکایت سننا اور تحقیق و تفتیش کرنا اس کا فرض تھا لیکن اس کا طرز عمل ایسا تھا جیسے اس واردات کا ذمے دار میں ہی ہوں۔ اس کے علاوہ وہ بلاوجہ انسپکٹر چیانگ شو کا ذکر لے بیٹھا تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ دوسرے آفیسروں سے جلتا تھا اور چیانگ شو سے تو وہ کچھ زیادہ ہی الرجک تھا۔ اس کے علاوہ اس نے مجھے بہت واضح الفاظ میں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ میں قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کروں۔
میں دیر تک ملہوترہ کے اس رویے کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

ڈائری میں نے اپنے قبضے میں لے لی تھی۔
اگرچہ میں نے اس ڈائری کو گھر پر ہی چھپایا تھا لیکن اس کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا کہ کسی اجنبی کے لیے اسے تلاش کرنا ممکن نہیں تھا اور اس روز سے صورت حال میں بھی کچھ تبدیلی رونما ہونا شروع ہو گئی تھی۔
میں نے اگرچہ انسپکٹر چیانگ شو کو گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں آگاہ نہیں کیا تھا لیکن اگلے روز دوپہر کو وہ گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے پولیس ہی کے کسی آدمی سے پتا چل گیا تھا کہ سب انسپکٹر ملہوترہ نے میرے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔
"ملہوترہ کے بارے میں ہیڈ کوارٹر میں اور بھی بہت سی رپورٹس جمع ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چند روز میں اس کے خلاف کوئی کارروائی ہونے والی ہے۔" چیانگ شو نے کہا۔
"اس کی گزشتہ رات والی حرکت پر مجھے کچھ اور شبہ ہونے لگا ہے۔" میں نے کہا۔
"مثلاً؟ کس قسم کا شبہ؟" چیانگ شو نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"گزشتہ رات جب میں نے پولیس اسٹیشن فون کیا تھا تو اس کے پانچ منٹ بعد ہی ملہوترہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اس علاقے میں موجود تھا اور پولیس اسٹیشن سے ریڈیو پر اطلاع ملتے ہی یہاں آ گیا تھا۔"
"یہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔" چیانگ شو نے کہا "ممکن ہے وہ گشت پر اس علاقے میں موجود ہو اور اطلاع ملتے ہی پہنچ گیا ہو۔"
"لیکن اس نے جس طرح کی گفتگو کی تھی' اس سے شبہ ہوتا ہے کہ۔۔۔"
"اوکم آن بوائے۔" چیانگ شو نے میری بات کاٹ دی "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ملہوترہ ان لوگوں سے ملا ہوا ہے جنہوں نے تمہارے مکان کی تلاشی لی تھی اور ان لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے آس پاس موجود تھا۔"
"ہاں۔ مجھے کچھ ایسا ہی شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"ہو سکتا ہے۔" چیانگ شو سر ہلاتے ہوئے بولا "ممکن ہے تمہارا شبہ درست ہو۔ میں اس سلسلے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال' تم لوگوں کو اب محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی بات ہو تو اسے چھپانے کی کوشش مت کرو۔ مجھے اطلاع دے دینا۔"
انسپکٹر چیانگ شو چلا گیا۔
ایک دو روز اور گزر گئے اور پھر مجھے یہ شبہ ہونے لگا کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ نگرانی کرنے والا کوئی شخص اگرچہ نظروں میں نہیں آ سکا تھا مگر یہ احساس قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ میں جہاں بھی ہوتا ہوں' کسی کی نظروں میں رہتا ہوں۔ جانکی نے بھی ایسے ہی شبہے کا اظہار کیا تھا۔ وہ سودا سلف لینے کے لیے روزانہ صبح مارکیٹ جاتی تھی۔ اسے بھی یوں لگتا تھا جیسے اس کی نگرانی کی جا رہی ہو مگر کوئی مشتبہ شخص اس کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

دو تین روز اور گزر گئے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ اور چاچی رجنی کے ہاں بھی گیا تھا۔ اس سے اگلے روز رات گیارہ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو ریسیور میں نے ہی اٹھایا تھا۔ اس وقت جگ جیت سنگھ اور اس کے گھر والے بھی ہمارے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ کال ارملا کی تھی اور اس نے جو اطلاع دی تھی وہ بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس کا شوہر سنت سنگھ زخمی حالت میں کان ڈانگ اسپتال میں پڑا تھا۔

میں فون بند کرکے فوراً ہی اسپتال جانے کو تیار ہوگیا۔ جگ جیت سنگھ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ یوں تو جانکی وغیرہ بھی جانے کو تیار تھیں مگر میں نے انہیں روک دیا اور انہیں ہدایت کردی کہ یا تو وہ امرتا کور اور نرنجن کے ساتھ ان کے گھر چلی جائیں یا ہماری واپسی تک انہیں اپنے پاس بٹھائیں رکھیں۔

کار کا اسٹیئرنگ جگ جیت سنگھ نے سنبھال لیا۔ کان ڈانگ اسپتال مین سیرانگون روڈ کے آس پاس ہی تھا۔ جگ جیت سنگھ راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر ہم سیرانگون روڈ کی طرف سے جاتے تو لمبا راستہ پڑتا۔ تیما روڈ پر نہر کا پل پار کرتے ہی اس نے کار فوڈ سینٹر مارکیٹ کے قریب سے بکٹ روڈ پر موڑ لی اور پھر ایک ذیلی سڑک سے ہوتے ہوئے ہم اسپتال کے سامنے پہنچ گئے۔

سنت سنگھ ایمرجنسی روم میں تھا۔ ارملا اور چاچی رجنی سے ہماری ملاقات ویٹنگ روم ہی میں ہوگئی۔ وہ دونوں رو رہی تھیں۔

"کیا ہوا چاچی۔" میں نے قریب پہنچ کر کہا "سنت سنگھ کیسے زخمی ہوا۔ کوئی حادثہ۔۔۔"

"حادثہ نہیں پتر اسے مارا پیٹا گیا ہے۔" چاچی رجنی نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مارا پیٹا ہے۔" میں چونک گیا "کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ کون تھے وہ لوگ؟"

"سنت سنگھ کا کبھی کسی سے جھگڑا نہیں ہوا۔" رجنی نے بتایا۔ "شام سات بجے کے قریب دو آدمی اسے بلا کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔ ہم نے اس کے دوستوں سے معلوم کیا لیکن کسی کو اس کا پتا نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹا پہلے میں اور ارملا دروازے میں کھڑی تھیں کہ لال رنگ کی ایک کار ہمارے قریب آکر رکی۔ دروازہ کھول کر دو آدمیوں نے سنت سنگھ کو باہر پھینک دیا اور کار تیزی سے آگے چلی گئی۔

"سنت سنگھ خون میں لت پت اور بے ہوش تھا۔ اسے دیکھ کر ہماری چیخیں نکل گئیں۔ ہمارے رونے پیٹنے کی آواز سن کر گلی کے لوگ جمع ہوگئے اور سنت سنگھ کو گاڑی میں ڈال کر یہاں پہنچا دیا۔ وہ ہوش میں آگیا ہے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ تمہیں بلائیں۔ اندر ایمرجنسی روم میں پڑا ہے۔ ڈاکٹر اور پولیس والے ہمیں اس سے ملنے نہیں دیتے۔ جاؤ پتر۔ تم دیکھو اسے کیا ہوا ہے۔ ظالموں نے مار مار کر اس کی کیا حالت کردی ہے۔"

"پریشان مت ہو چاچی۔ میں دیکھتا ہوں اور ارملا۔ تم حوصلہ رکھو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" میں نے کہا اور ویٹنگ روم سے نکل کر ایمرجنسی روم کی طرف چل پڑا۔ جگ جیت سنگھ بھی میرے ساتھ تھا۔

ایمرجنسی روم میں دو ڈاکٹروں کے علاوہ دو پولیس والے بھی موجود تھے۔ ان میں ایک تو نچلے درجے کے رینک کا آفیسر تھا اور دوسرا کانسٹیبل۔ سنت سنگھ لمبی سی ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

"کیا ہوا سنت سنگھ۔ کون تھے وہ لوگ؟" میں نے قریب پہنچ کر پوچھا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

سنت سنگھ کراہ اٹھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ڈاکٹر اور پولیس والوں کی طرف دیکھنے لگا۔ میں ایک ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوگیا اور اس سے سنت سنگھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

"ایک ٹانگ اور دائیں بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ جسم کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹیں آئی ہیں۔ ایکسرے لے لیے گئے ہیں۔ رپورٹ کا انتظار ہے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

میں پولیس آفیسر سے بات کرنے لگا۔ انہوں نے ابھی تک سنت سنگھ کا بیان نہیں لیا تھا۔

"میں اپنے دوست سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں آفیسر اگر آپ اجازت دیں تو۔۔۔"

"کیوں نہیں۔" پولیس آفیسر نے جواب دیا اور اپنے ماتحت کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

دونوں ڈاکٹر بھی باہر چلے گئے تو میں سنت سنگھ کے قریب آگیا۔

"کیا معاملہ ہے۔ کون تھے وہ لوگ سنت سنگھ۔" میں نے پوچھا۔

"وہ دو آدمی تھے جو مجھے گھر سے بلا کر دھوکے سے لے

گئے تھے۔" سنت سنگھ نے جواب دیا "گردوارے والی گلی کے موڑ پر ایک سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی جس میں ایک چینی پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے اچانک ہی پستول نکال کر میرے پہلو سے لگا دیا اور مجھے زبردستی کار میں بٹھا دیا۔ وہ دونوں بھی میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور کار حرکت میں آگئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوگیا۔ اسے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا "پہلے وہ لوگ مجھے کنگ لی روڈ، کپونگ جاوا روڈ اور اس کے آس پاس کی چھوٹی سڑکوں پر گھماتے رہے اور تمہارے بارے میں پوچھتے رہے۔ کار ڈرائیو کرنے والے چینی نے کہا تھا کہ تم نے کئی سال پہلے خشونت سنگھ کو ایک ڈائری دی تھی اگر میں وہ ڈائری تلاش کرکے ان کے حوالے کردوں تو وہ مجھے نہ صرف کوئی نقصان پہنچائے بغیر چھوڑ دیں گے بلکہ ایک معقول رقم بھی انعام میں دیں گے۔ میں ڈائری کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتا رہا پھر وہ لوگ دھمکیوں پر اتر آئے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بڑھ گئے تھے۔ وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"نیوٹن روڈ پر پہنچ کر انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ مزید آدھے گھنٹے تک سڑکوں پر گھماتے رہے پھر ایک جگہ کار رک گئی اور مجھے اتار لیا گیا۔ کار کسی بنگلے کے کمپاؤنڈ میں رکی تھی۔ انہوں نے میری آنکھوں کی پٹی کھول دی۔ میں اس جگہ کا صحیح اندازہ تو نہیں لگا سکا لیکن وہاں سے کچھ دور رائل ہوٹل کا نیون سائن نظر آرہا تھا۔ وہ لوگ مجھے فوراً ہی اندر لے گئے۔

"اس بنگلے میں دو آدمی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ایک تو کوئی ہندو پنڈت تھا اور دوسرا شاید مسلمان تھا۔ اس نے داڑھی اور مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔"

سنت سنگھ نے داڑھی والے اور چینی کار ڈرائیور کا جو حلیہ بتایا، اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دارا اور چی فانگ تھے اور ہندو پنڈت کا جو حلیہ بتایا وہ سو فی صد اس پجاری کا تھا جسے میں نے کالی کے مندر کے سامنے دارا کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔

"وہ مجھے تہ خانے میں لے گئے۔" سنت سنگھ کہہ رہا تھا "پہلے تو مجھے لالچ دیا گیا کہ میں ڈائری کے بارے میں بتا دوں پھر دھمکیاں دیں اور اس کے بعد مجھ پر تشدد کیا جانے لگا۔ میں جانتا تھا کہ تم ڈائری لے جا چکے ہو۔ اگر میں انہیں بتا دیتا تو وہ تمہارے پیچھے لگ جاتے اور تمہیں مار ڈالتے لیکن میرا خیال ہے تمہارے پیچھے تو وہ اب بھی لگے ہوئے ہیں مگر میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ وہ دونوں آدمی جو مجھے گھر سے بلا کر لائے تھے، ہندو تھے۔ وہ مجھے بے تحاشا پیٹتے رہے۔ لوہے کے سریے سے مجھے مارا پیٹا گیا۔ میری ٹانگ اور بازو کی ہڈیاں تو یقیناً ٹوٹ چکی ہیں۔ تم میری حالت دیکھ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ جسم کی کئی اور ہڈیاں بھی کریک ہوئی ہوں گی۔"

"یہ تم نے کیا کیا سنت سنگھ۔" میں نے کہا "تم بتا دیتے کہ میں ڈائری لے جا چکا ہوں۔ تمہیں اتنی تکلیف تو نہ اٹھانی پڑتی۔"

"کیسے بتا دیتا۔" سنت سنگھ نے کہا "میں نے ارملا کے ساتھ گردوارے جا کر گرنتھ صاحب (سکھوں کی مذہبی کتاب) پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ ڈائری کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔"

"ہندو پنڈت، چینی اور داڑھی والے کے بارے میں تو میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ کون ہیں۔ وہ دونوں ہندو کون تھے جو تمہیں گھر سے لے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔ ویسے میں سنت سنگھ کے کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے اپنی ہڈیاں تڑوالی تھیں مگر ڈائری کے بارے میں زبان نہیں کھولی تھی۔

"غنڈے ہی تھے۔" سنت سنگھ نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "یہ ہندو تو جہاں جاتے ہیں گند ہی پھیلاتے ہیں۔ یہاں بھی زیادہ تر یہی لوگ جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ چینی غنڈوں کے ساتھ مل کر ان کے حوصلے کچھ اور بڑھ گئے ہیں۔"

"اس کار کے بارے میں کچھ یاد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سرخ رنگ کی کار تھی۔" سنت سنگھ نے جواب دیا "جب وہ مجھے گھر سے بلا کر کار کی طرف لائے تھے تو میں نے اس کار کا نمبر دیکھ لیا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر کار کا نمبر بتا دیا جسے میں نے ذہن نشین کرلیا۔

"تمہیں چھوڑ دینے کا مطلب ہے کہ انہوں نے تمہاری باتوں کا یقین کرلیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میری باتوں کا یقین نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے مجھے مردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا۔" سنت سنگھ نے جواب دیا "میں ان کی مار کھاتے ہوئے۔۔۔۔ دو مرتبہ بے ہوش ہوا تھا اور دونوں مرتبہ میرے اوپر پانی پھینک کر مجھے ہوش میں لے آئے تھے۔ تیسری مرتبہ بے ہوش ہوا تو شاید وہ دھوکا کھا گئے تھے اور مجھے مردہ سمجھ لیا گیا تھا کیونکہ بہت دور کی کوئی آواز

میرے لاشعور سے ٹکرائی تھی جیسے کوئی کہہ رہا ہو "مرگیا سالا۔ اس کی لاش اس کے گھر کے سامنے لے جاکر پھینک دو۔" اور اس کے بعد واقعی میرے حواس شاید سو گئے تھے۔ ہوش آیا تو یہاں پڑا ہوا تھا۔"

"تم نے پولیس کو ابھی بیان تو نہیں دیا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ابھی تک میں نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سنت سنگھ۔" میں نے کہا "تم نے مجھے بچانے کے لیے اتنی بڑی قربانی دی جسے میں فراموش نہیں کرسکتا۔ بہرحال، پولیس تمہارا بیان لینا چاہتی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے سب کچھ بتادو لیکن کار کا نمبر...."

"نہیں بتاؤں گا۔" سنت سنگھ نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں اس سے کچھ اور بھی پوچھتا لیکن اس وقت دونوں ڈاکٹر کمرے میں آگئے۔ ان میں ایک کے ہاتھ میں ایکسرے فلمیں تھیں۔

"اب آپ باہر جائیے پلیز۔" ایک ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ ویٹنگ روم میں جاکر بیٹھیے۔ آپ کی ضرورت ہوگی تو بلالیا جائے گا۔"

میں خاموشی سے کمرے سے نکل آیا۔ دونوں پولیس والے باہر کھڑے تھے اور چاچا جگ جیت سنگھ بھی۔ میں چاچا کو اشارہ کرتا ہوا ویٹنگ روم میں آگیا جہاں چاچی رجنی اور ارملا بیٹھی ہوئی تھیں۔ ارملا اب بھی رو رہی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اسے تسلی دینے لگا۔

سنت سنگھ کو اس طرح اسپتال چھوڑ کر چلے جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فون پر تھائی اور جانگی کو بتادیا کہ میری واپسی دیر میں ہوگی۔ وہ لوگ محتاط رہیں۔

تین بجے کے قریب ایک نرس مجھے بلا کر لے گئی۔

سنت سنگھ آپریشن ٹیبل پر بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے دائیں بازو اور ایک ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سینے اور کندھے پر بھی کریپ بینڈیج لگی ہوئی تھی۔

سنت سنگھ کو ایک کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے ظاہر ہے اس کا بیان نہیں لیا جاسکتا تھا۔ پولیس آفیسر کانسٹیبل کو چھوڑ کر چلا گیا۔

ہم میں سے کسی کے وہاں رہنے کی ضرورت نہیں تھی مگر ارملا وہاں رہنے پر بضد تھی لہٰذا اسے وہیں چھوڑ کر ہم اسپتال سے باہر آگئے۔ پہلے چاچی رجنی کو اس کے گھر پر چھوڑا اور پھر میں اور جگ جیت سنگھ اپنے گھر کے لیے روانہ ہوگئے۔ سنت سنگھ کا کزن ان کے گھر آچکا تھا اس لیے مجھے چاچی اور ارملا کے بچوں کی بھی زیادہ فکر نہیں تھی۔

لیکن سنت سنگھ کے بارے میں پریشانی ضرور تھی۔ ٹی فانگ وغیرہ نے اسے مردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ اگر انہیں پتا چل گیا تو وہ اسے ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یاد تھا۔ چاچا پرتاب سنگھ کا باڈی گارڈ سوتر سنگھ ہماری حفاظت پر مامور تھا۔ ایک رات دارا کے آدمیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کردیا تھا۔ جس میں سوتر سنگھ زخمی ہوکر اپنی یادداشت کھوچکا تھا اور دارا نے جعلی نرس کے ذریعے زہر کا انجکشن لگوا کر اسے اسپتال ہی میں ختم کروادیا تھا اور اب مجھے شبہ تھا کہ اگر انہیں سنت سنگھ کے زندہ ہونے کا پتا چل گیا تو وہ اسے بھی ختم کروانے کی کوشش کریں گے۔

صبح ہوتے ہی میں نے انسپکٹر چیانگ شو کو صورت حال سے آگاہ کردیا اور اسے سرخ کار کا نمبر بھی بتادیا جس میں سنت سنگھ کو اغوا کرکے لے جایا گیا تھا۔ اس روز دوپہر کے بعد میں خود بھی اسپتال پہنچ گیا تھا۔ میرے ساتھ جانگی اور تھائی بھی تھی۔

اسپتال میں رجنی اور ارملا بھی موجود تھیں۔ سنت سنگھ کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کم از کم تین مہینوں تک بستر سے نہیں اٹھ سکے گا۔ گھر کا سارا خرچ وہی چلاتا تھا اب یہ میری ذمے داری تھی کہ میں انہیں مالی معاملات میں پریشان نہ ہونے دوں۔ لہٰذا اسپتال کے اخراجات کے علاوہ میں نے گھر کے اخراجات کی ذمے داری بھی سنبھال لی۔

اس سے اگلے روز اسپتال سے واپس آتے ہوئے میرا یہ شبہ یقین میں بدل گیا کہ ہماری نگرانی ہورہی ہے۔ وہ نیلے رنگ کی فیاٹ کار تھی۔ جو اسپتال سے نکلتے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی۔

تھائی اس وقت ڈرائیونگ کررہی تھی۔ جانگی اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور میں پچھلی سیٹ پر تھا۔ میں نے ان دونوں کو اس کار کے بارے میں بتادیا۔

ہماری کار اس وقت لیونڈر سے ہوتی ہوئی وکٹوریا اسٹریٹ پر آچکی تھی۔ میرے کہنے پر تھائی نے کار کو چین آئی لینڈ ایکسپریس وے کی طرف موڑ دیا۔ یہ سڑک چانگئی ائرپورٹ کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والی کار میں صرف دو آدمی تھے اور میں نے ان سے نمٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اس مقصد کے لیے شہر کا بیرونی علاقہ ہی مناسب تھا۔ اس

لیے میں شہر سے باہر کا رخ اختیار کررہا تھا۔

کار ایرنارتھ چانگئی روڈ پر آگئی اور چانگئی جیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہم لوایانگ ایونیو والی سڑک پر آگئے۔ ہمارے دائیں طرف چانگئی انٹرنیشنل ائرپورٹ تھا اور یہ سڑک چانگئی اسپتال، چانگئی گولف کورس اور چانگئی ولیج سے ہوتی ہوئی چانگئی سیلنگ کلب تک چلی گئی تھی۔ اگر ہم چاہتے تو ائرپورٹ کے اوپر سے گھوم کر ساحل کے ساتھ ساتھ نکول روڈ پر ہوتے ہوئے فیری ٹرمینل کی طرف جاسکتے تھے اور ایسٹ کوسٹ روڈ سے ہوتے ہوئے...... دوبارہ شہر کے مرکزی علاقے کی طرف آسکتے تھے مگر میرا خیال ہے کہ ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے جگہ کی تلاش میں ہمیں اتنا طویل چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے مقصد کے لیے گولف کورس بہترین جگہ تھی۔

لوایانگ ایونیو والی سڑک پر چانگئی ولیج کی طرف مڑتے ہی بائیں طرف گولف کورس شروع ہوجاتا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ اس نے کار کچے میں اتاردی۔ پورا خطہ سرسبز گھاس سے اٹا ہوا تھا۔ زمین اونچی نیچی اور ناہموار تھی۔ کار اچھلتی ہوئی جارہی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ نیلی فیاٹ بھی سڑک سے اتر کر ہمارے پیچھے ہی آرہی تھی۔ گویا اب وہ لوگ کھل کر سامنے آگئے تھے۔

میں نے تھائی کو اشارہ کیا۔ اس نے پام کے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب کار روک لی اور انجن بند کردیا۔ میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور آگے جاکر بونٹ کھول دیا۔

وہ گاڑی ہم سے تقریباً بیس گز پیچھے رک گئی۔ وہ دونوں آدمی نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک تو کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور دوسرا ہماری طرف آنے لگا۔ اس کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔

وہ دونوں ہندوستانی تھے۔ ہمارا تعاقب کرنے کے بعد جس انداز میں انہوں نے کار روکی تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان کی نیت اچھی نہیں تھی اور ان کے پاس یقیناً پستول بھی ہوں گے۔

سنگاپور جیسی جگہوں پر پستول وغیرہ کا حصول کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ البتہ ایک عدد خنجر کا انتظام کرلیا تھا جو حسب معمول میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ اس وقت میں نے پتلون بھی کھلے پائنچے کی پہن رکھی تھی اور خنجر نکالنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس وقت شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ گولف کورس ویران تھا البتہ دور ایک طرف میریڈین چانگئی ہوٹل اور دوسری طرف چانگئی اسپتال کی عمارت پر جگمگاتے نیون سائن نظر آرہے تھے۔

وہ آدمی میرے قریب پہنچ رہا تھا۔ وہ شکل ہی سے چھٹا ہوا بدمعاش لگ رہا تھا۔ اتنے میں جانگی بھی کار سے اتر کر میرے قریب آگئی۔

"ان کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگتے۔" جانگی نے سرگوشی کی۔

"مجھے اندازہ ہوگیا ہے اسی لیے میں اس طرف آیا ہوں۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

"ہیلو۔" وہ شخص ہمارے قریب آکر بولا "گاڑی خراب ہوگئی۔ میری مدد کی ضرورت ہو تو...."

"شکریہ۔" میں نے خشک لہجے میں جواب دیا "ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں ہے۔"

"اوہ سمجھ گیا۔" وہ معنی خیز انداز میں جانگی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم تو جان بوجھ کر اس ویرانے میں آئے ہو۔ میں تمہارا مقصد سمجھ گیا ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم دو دو عورتوں کے ساتھ کیسے نمٹ رہے ہو۔ ویسے دونوں ہیں بڑی زوردار۔ اگر تمہاری گاڑی میں کوئی خرابی نہیں ہے تو کیا ہوا۔ کوئی خرابی پیدا کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔"

اس نے پتلون کی جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے پستول کا رخ اگلے ٹائر کی طرف کرکے ٹریگر دبادیا۔

ٹائر پھٹنے کا دھماکا زیادہ زوردار نہیں تھا۔ جانگی اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

"اب تو گاڑی خراب ہوگئی نا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "شہر یہاں سے بہت دور ہے۔ اس طرف کوئی ٹیکسی ملنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ میں تمہیں اپنی کار میں لفٹ دے سکتا ہوں۔ صرف تمہیں۔ ان دونوں کو چھوڑنے کا دل تو نہیں چاہتا لیکن ہماری گاڑی میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ انہیں تو سڑک پر کوئی بھی لفٹ دے دے گا مگر مسئلہ تمہارا ہے۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"میرے خیال میں تم سے بڑا احمق اس دنیا میں کوئی اور نہیں ہوگا۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا "تم کیا سمجھتے تھے کہ ہم بے خبری میں تمہارے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ میں نے

تو تمہاری کار کو اس وقت دیکھ لیا تھا جب اسپتال سے تم لوگوں نے ہمارا تعاقب شروع کیا تھا۔ ہم تو جان بوجھ کر اس طرف آئے تھے تاکہ کسی پرسکون جگہ پر تم لوگوں سے نمٹا جاسکے اور میرے خیال میں اس مقصد کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی۔ دور دور تک کوئی نہیں ہے۔ اس طرح کسی کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔"

"اوہ!" اس شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا "ایسا کرکے تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے لیکن اب بہتر یہی ہے کہ تم خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑو اور یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میرا پستول شور مچانا پسند نہیں کرتا۔ چلو۔ آگے بڑھو۔ ورنہ میں ٹریگر دبانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاؤں گا۔"

"مجھ سے واقعی غلطی ہوگئی۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ اس طرح مسلح ہوگے۔ اب تمہارے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور تم لوگ۔" میں جانگی کی طرف مڑگیا۔

"مجبوری ہے ڈیئر۔ مجھے ان لوگوں کے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔ تم لوگ سڑک پر چلی جانا۔ کسی نہ کسی گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔"

"تم تو بہت بزدل نکلے۔" وہ شخص بولا "ہم نے تو سنا تھا کہ تم بہت خوفناک قسم کے آدمی ہو۔ تھائی لینڈ میں تم نے بڑے نامی گرامی غنڈوں کو انگلیوں پر نچا رکھا تھا مگر شاید وہ سب فرضی داستانیں تھیں۔ بہرحال اب واقعی تم پھنس گئے ہو۔ اس ویرانے میں کوئی تمہاری مدد کو بھی نہیں آئے گا۔ چلو۔ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

میں کار کے سامنے سے گھوم کر ڈرائیونگ سائڈ والے دروازے کے قریب سے گزر گیا۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے میں نے اس کے سامنے واقعی ہتھیار ڈال دیے ہوں۔ میں کار کے پچھلی نشست والے دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ شخص مجھ سے دو قدم پیچھے تھا۔ وہ جیسے ہی ڈرائیونگ سائڈ والے دروازے کے قریب پہنچا اندر بیٹھی ہوئی تھائی نے دروازے کو پوری قوت سے باہر کی طرف دھکا دیا۔

کار کا دروازہ اس شخص کی ٹانگ پر لگا۔ وہ کراہتا ہوا... لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' میں نے بڑی تیزی سے گھوم کر اسپن کک لگا دی۔ کک اس کے بازو پر کہنی سے ذرا اوپر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ اس نے نیچے گرتے ہی سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ ایک شعلہ سا چمکا۔ گولی کار کے پچھلے دروازے کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی لیکن اسے دوسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ جانگی کسی پرندے کی طرح اڑتی ہوئی اس کے اوپر آن گری تھی۔

جانگی نے کسی ریسلر کی طرح ہی اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ اس کی کہنی کا وار اس شخص کے کندھے پر لگا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس مرتبہ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ تھائی شاید تاک میں بیٹھی تھی۔ اس نے کار میں سے چھلانگ لگا دی اور پستول اٹھا لیا۔

اسی دوران میں دوسرا آدمی چیختا ہوا ہماری طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ تھائی تیزی سے اس طرف گھوم گئی۔

"گولی مت چلانا تھائی۔" میں چیخا اور آنے والے سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

وہ شخص اپنے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا آرہا تھا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا اور اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں میں پھنسا دی۔ وہ نیچے گرا اور قلابازیاں کھاتا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ خنجر اب بھی اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے خنجر والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ چند لمحے وہ خنجر کو میرے سامنے مخصوص انداز میں حرکت دیتا رہا پھر ہاتھ سر سے بلند کرکے وار کردیا۔ میں نے سیزرز ہینڈ ڈیفنس کی ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے بڑی تیزی سے دونوں بازوؤں کو کراس کی صورت میں ملا لیا۔ اس کی کلائی میرے دونوں بازوؤں کے جوڑ پر آگئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے مٹھیاں بھینچ لیں اور دونوں ہاتھوں کی پشت کو آپس میں ملا لیا۔ اس طرح اس شخص کی کلائی میرے بازوؤں کے شکنجے میں پھنس چکی تھی۔

یہ ٹیکنیک میں نے اس سے پہلے شاؤلن ٹیمپل میں ماسٹر لیشی یان کے ساتھ ٹریننگ میں ہی استعمال کی تھی۔ حقیقی لڑائی کا یہ پہلا موقع تھا اور میں نے اس ٹیکنک کے استعمال میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

خنجر آگے میرے چہرے کی طرف نکلا ہوا تھا اور وہ شخص اپنے ہاتھ کو پوری قوت سے جھٹکے دے رہا تھا مگر میرے اس شکنجے سے تو ماسٹر لیشی یان بھی اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا تھا اور یہ تو ایک معمولی بازاری غنڈا تھا جو مارشل آرٹس کی ابجد سے بھی واقف نہیں تھا۔

وہ خاصا طاقت ور تھا لیکن ہر جگہ طاقت کام نہیں کرتی۔ طاقت کے استعمال کے ساتھ کسی ٹیکنیک کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بغیر کسی ٹیکنیک کے طاقت کا مظاہرہ کررہا تھا۔

اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اب کرب کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ میں نے اپنا شکنجہ تھوڑا سا کسا۔ اس کی انگلیاں کھل گئیں اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہم دونوں کے درمیان زمین پر گر گیا۔

وہ شخص اب باقاعدہ چیخنے لگا تھا۔ میں نے زوردار جھٹکا دے کر اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر گرا اور دوسرے ہاتھ سے مجروح کلائی پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

میں نے جانگی کی طرف دیکھا۔ وہ دوسرے حملہ آور سے بہت خوبی سے نمٹ رہی تھی۔ جانگی نے میرے ساتھ شاؤلن ٹیمپل میں جو ٹریننگ کی تھی' وہ اس کے کام آرہی تھی۔

یہ دونوں بازاری غنڈے تھے۔ اسٹریٹ فائٹنگ میں تو ماہر ہوسکتے تھے لیکن مارشل آرٹس سے واقف نہیں تھے۔ ایک میرے ہاتھوں کلائی کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا اور دوسرا جانگی کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔

گولف کورس میں جس جگہ یہ ہنگامہ ہورہا تھا سڑک وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ اس جگہ سڑک پر ذرا سی گولائی تھی۔ اسی وقت شہر کی طرف سے آنے والی ایک کار اس سڑک پر گھومی تو ہم سب ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آگئے۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ پولیس کار تھی جس کی چھت پر فلیشر چمک رہے تھے۔

شاید پولیس والوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا تھا۔ فوراً ہی سائرن کی آواز گونج اٹھی اور پولیس کار رک گئی۔ میں نے دو پولیس والوں کو کار سے اتر کر اس طرف دوڑتے دیکھا۔

جانگی کا حریف بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو جانگی کی گرفت سے چھڑایا اور اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی۔

دوسرے آدمی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑلی۔

دونوں پولیس والے دوڑتے ہوئے قریب آگئے۔ ان میں سے ایک نے ریوالور نکال لیا۔ ایک اور پولیس والا کار سے اتر کر فرار ہونے والے شخص کے پیچھے دوڑا لیکن وہ تاریکی میں غائب ہوچکا تھا۔

تینوں پولیس والوں نے ہمیں گھیر لیا۔ دو کے ہاتھ میں ریوالور نظر آرہے تھے۔ ان تینوں میں ایک ہندوستانی ایک چینی اور تیسرا یوریشین تھا۔ ان تینوں نے ہمیں ہینڈز اپ کروالیا تھا۔

"یہ کیا ہورہا تھا۔ کیا معاملہ ہے؟" پولیس پارٹی کے انچارج نے باری باری ہم سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ لوگ مجھے اور میرے ساتھی کو لوٹنا چاہتے تھے آفیسر۔" وہ شخص فوراً ہی بول پڑا جس کی کلائی میں نے توڑ دی تھی "ہم لوگ چانگی ائرپورٹ سے نکل رہے تھے کہ اس آدمی نے ان دو خوب صورت عورتوں کا لالچ دے کر ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور یہاں اس ویرانے میں آکر ہمیں لوٹنے کی کوشش کی۔ مزاحمت کرنے پر یہ ہم سے الجھ پڑے۔ میرے بازو کی ہڈی توڑ دی۔ میں بہت اذیت میں ہوں۔ اگر آپ لوگ نہ آجاتے تو یہ ہم میں سے ایک کو یا دونوں کو ختم کردیتا۔"

جانگی اور تھائی تو اس کی بات سن کر سناٹے میں آگئیں۔ میں البتہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"بھاگنے والا کون تھا؟" پولیس آفیسر نے اس سے پوچھا۔

"میرا ساتھی تھا۔ وہ اگر نہ بھاگتا تو یہ اسے مار ڈالتے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"کیا یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" پولیس آفیسر مجھے گھورنے لگا "تم کون ہو اور یہ عورتیں کون ہیں؟"

"میرا خیال ہے اسے اور ہم دونوں کو پولیس اسٹیشن لے چلو۔ وہیں چل کر فیصلہ ہوگا کہ حقیقت کیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ پولیس آفیسر چند لمحے گھورتا رہا پھر اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے اور اس آدمی کے لباس تھپتھپائے میری پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر اس کے قبضے میں چلا گیا۔ پولیس والے کو وہ خنجر بھی مل گیا جو کار سے کچھ دور پڑا تھا۔ تھائی نے وہ پستول اس طرح چھپایا تھا کہ پولیس والوں کو اس کا پتا بھی نہ چل سکا۔

ہماری کار کا ایک ٹائر برسٹ ہوچکا تھا۔ ہم تینوں کو پولیس کار کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا جبکہ دو پولیس والے اس شخص کے ساتھ اس کی نیلی فیاٹ میں بیٹھ گئے۔

لویانگ پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس وقت شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ پولیس اسٹیشن میں خاصی گہما گہمی تھی۔ میں نے جاتے ہی ایک سینئر آفیسر سے ملاقات کی اور اپنا تعارف کرانے کے بعد اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ آفیسر سب انسپکٹر تھا اور انسپکٹر چیانگ شو کی ماتحتی میں رہ چکا تھا۔ اس نے فوراً ہی ٹیلی فون پر انسپکٹر چیانگ شو کو اطلاع دے دی۔ انسپکٹر چیانگ شو نے مجھ

سے بھی بات کی اور پھر کئی منٹ تک سب انسپکٹر سے بات کرتا رہا۔

سب انسپکٹر نے فون بند کردیا اور ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے آیا جہاں سلیقے کا فرنیچر لگا ہوا تھا۔ ہمیں وہاں بٹھا کر اس نے ہمارے لیے چائے منگوالی اور خود دفتر والے کمرے میں چلا گیا۔

انسپکٹر چیانگ شو تقریباً ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔ اسے ایک بار پھر پوری بات بتانی پڑی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم معلوم کرلیتے ہیں وہ کون ہیں اور تم لوگوں کا پیچھا کیوں کررہے تھے۔" انسپکٹر چیانگ شو کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

ہمیں تقریباً ایک گھنٹا اور اس کمرے میں بیٹھنا پڑا اور پھر چیانگ شو کے ساتھ وہ سب انسپکٹر بھی کمرے میں داخل ہوا۔

"تم نے مجھے سنت سنگھ والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔" چیانگ شو نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ ایک مختلف معاملہ تھا۔ میں نے آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ دونوں وہی غنڈے ہیں جنھوں نے سنت سنگھ کو اغوا کرکے اس پر تشدد کیا تھا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بتانے لگا کہ مُرلی دھر نامی ایک ہندو پنڈت نے بھاری معاوضے پر ان کی خدمات حاصل کی تھیں اور انہیں رمیش نامی ایک اور آدمی کے پاس لے گیا تھا۔ جس نے انہیں سنت سنگھ کو اغوا کرنے کی ذمے داری سونپی۔

اس شخص نے رمیش نامی داڑھی مونچھ والے جس شخص کا حلیہ بتایا' وہ سو فی صد دارا پر فٹ آتا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ دارا اس مرتبہ کھل کر سامنے نہیں آیا تھا۔ حلیہ بدلنے کے ساتھ اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔

"وہ لوگ سنت سنگھ کو اغوا کرکے بیکلے روڈ کے ایک بنگلے میں لے گئے تھے جہاں اس سے کسی ڈائری کے بارے میں پوچھنے کے لیے تشدد کیا گیا اور بالآخر مردہ سمجھ کر اس کے گھر کے سامنے پھینک دیا گیا۔" انسپکٹر چیانگ شو کہہ رہا تھا "آج صبح انہیں پتا چل گیا کہ سنت سنگھ زندہ ہے۔ وہ اسپتال کی نگرانی کرنے لگے۔ رمیش نامی اس شخص کو یقین تھا کہ تم اسپتال ضرور آؤ گے۔ رمیش نے انہیں حکم دیا تھا کہ اگر تم نظر آجاؤ تو تمہیں اغوا کرکے بیکلے روڈ کے اس بنگلے میں پہنچا دیا جائے۔" انسپکٹر چیانگ شو چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "انہوں نے تمہیں اسپتال سے نکلتے دیکھ کر تعاقب تو شروع کردیا مگر تم پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ کرسکے کیونکہ تم لوگ تین تھے۔" چیانگ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی "جب تم لوگ شہر سے باہر کی طرف نکل گئے تو انہیں حوصلہ ہوا کہ اس نسبتاً غیر آباد علاقے میں تم لوگوں پر قابو پایا جاسکتا ہے اور جب تمہاری کار گولف کورس میں داخل ہوکر رک گئی تو انہوں نے تم لوگوں پر قابو پانے کا فیصلہ کرلیا۔"

"بہت بھونڈا طریقہ اختیار کیا تھا انہوں نے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"بہرحال۔" انسپکٹر چیانگ شو بولا "ایک پولیس پارٹی اس بنگلے پر چھاپا مارنے کے لیے جاچکی ہے۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں پولیس کو اب کچھ نہیں ملے گا۔ اس کا دوسرا ساتھی تقریباً دو گھنٹے پہلے گولف کورس سے بھاگا تھا۔ اس کا رخ میریڈین چانگئی ہوٹل کی طرف تھا۔ وہاں سے اس نے یا تو فون پر اطلاع دے دی ہوگی یا ٹیکسی وغیرہ مل گئی ہوگی۔ وہ لوگ بنگلا خالی کرکے جاچکے ہوں گے۔"

"بہرحال' کوئی سراغ تو ملے گا۔" چیانگ شو نے کہا "تم لوگ اب چلے جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔ جو بھی صورت حال ہوگی تمہیں فون پر آگاہ کردوں گا۔"

"میرا خنجر۔" میں نے کہا "وہ میں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہوا ہے اور ہماری کار بھی گولف کورس میں کھڑی ہے۔ اس کا ایک ٹائر برسٹ ہوگیا تھا بلکہ گولی مار کر برسٹ کردیا گیا تاکہ ہم لوگ بھاگ بھی نہ سکیں۔"

"میں اپنی گاڑی پر تم لوگوں کو بھیج دیتا ہوں۔ ایک کانسٹیبل تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہ ٹائر بھی بدل دے گا۔" یہ بات سب انسپکٹر نے کہی تھی جو اب تک خاموشی سے ہماری باتیں سنتا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ چلو۔ میں فون پر تمہیں بتا دوں گا۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

ہم اس کمرے سے باہر آگئے۔ سب انسپکٹر نے میرا خنجر واپس کردیا جسے میں نے پنڈلی پر بندھے ہوئے ہولسٹر میں اڑس لیا اور پھر گیٹ سے باہر آکر ہم پولیس کی ایک کار میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور ایک کانسٹیبل تھا۔

ہم تقریباً دس منٹ میں گولف کورس میں کھڑی ہوئی اپنی کار کے قریب پہنچ گئے۔ میں نے تھائی سے چابی لے کر کار کی ڈکی کھول دی۔ کانسٹیبل نے اپنی کار اس طرح کھڑی کردی

کہ اس کے ہیڈ لیمپس کی روشنی ہماری کار پر پڑتی رہے۔ میں نے اس دوران میں اپنی کار کی ڈکی سے فاضل ٹائر اور جیک وغیرہ نکال لیا۔

ٹائر تبدیل کرنے میں دس بارہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہم نے کانسٹیبل کا شکریہ ادا کرکے اسے رخصت کردیا اور اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت اسٹیئرنگ کے سامنے میں بیٹھا تھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ سڑک پر ٹریفک اس وقت بہت کم تھا۔

جانکی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کوئی غلطی کیے بغیر ہلکی رفتار سے کار چلاتا رہا۔ ہمارا رخ چانگئی ولیج کی طرف تھا۔

ہم چانگئی سیلنگ کلب کے قریب سے نکول روڈ پر مڑگئے اور ملائشیا کے جزیرے نان جنگ بیلنگ کورکے لیے فیری ٹرمینل کے سامنے سے ہوتے ہوئے چانگئی کوسٹ روڈ پر آگئے۔ یہ سڑک آگے جاکر ایسٹ کوسٹ پارک وے سے جاملتی تھی۔

ایسٹ کوسٹ پارک وے سے میں اسٹیڈیم روڈ پر نکل آیا اور سنگاپور ران ڈور اسٹیڈیم کے قریب کار روک کر ڈرائیونگ سیٹ جانکی کے حوالے کردی اور خود پچھلی سیٹ پر تھائی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آگے شہر کا بارونق علاقہ تھا۔ میرے پاس چونکہ لائسنس نہیں تھا اس لیے میں ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ گیا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ بھوک سے بے چینی سی ہورہی تھی۔ جانکی تو حسب معمول بلبلا رہی تھی۔ وہ آتے ہی کچن میں گھس گئی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسیور اٹھالیا۔ میرا خیال تھا انسپکٹر چیانگ شو ہوگا جو مجھے بیکلے روڈ والے بنگلے پر چھاپے کے بارے میں بتانا چاہتا ہوگا لیکن ہیلو کے جواب میں اتنی غلیظ گالی سنائی دی کہ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں نے ریسیور کان سے ہٹالیا۔

"میری آواز سن رہے ہو حرام زادے!" دارا کی آواز اب بھی میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ دارا کہہ رہا تھا "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اب مجھے اس ڈائری کی بھی پروا نہیں۔ دو تین دن۔ صرف دو تین دن انتظار کرو۔ تمہاری زندگی کے دن پورے ہونے والے ہیں۔ اب تم زندہ نہیں رہو گے۔"

"بکتے رہو۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"تمہاری وجہ سے میں مکمل طور پر تباہ ہوچکا ہوں۔ اب میں تمہارا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔ دو تین دن اور زندگی کے مزے لوٹ لو۔ اس کے بعد تمہارے لیے یہ سب کچھ ختم ہوجائے گا۔" دارا نے کہا۔

"میں بہت عرصے سے تمہاری یہ دھمکیاں سن رہا ہوں۔ اب کچھ کر بھی چکو۔" میں نے کہا۔

جواب میں ایک بہت غلیظ گالی سنائی دی اور لائن منقطع ہوگئی۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

"میرا خیال درست نکلا۔" میں نے تھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دارا اس بنگلے سے فرار ہوچکا ہے۔ وہ تیل میں پھلکی کی طرح ناچ رہا ہے۔ کاش! میں اسے اس حالت میں دیکھ سکتا۔"

"تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ تم اسے اس سے بھی بدتر حالت میں دیکھو گے۔" تھائی نے کہا۔

اسی دوران میں جانکی انڈے اور کافی بنا کر لے آئی۔ وہ انڈے کھانے کے بعد میں کافی پی رہا تھا کہ انسپکٹر چیانگ شو کا فون آگیا۔

"تمہارا خیال درست نکلا۔ اس بنگلے میں کچھ نہیں ملا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "شراب کی خالی بوتلیں' کپڑے اور کچھ اور سامان بکھرا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ بڑی افراتفری میں وہاں سے بھاگے ہیں۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہاں کچھ نہیں ملے گا۔" میں نے کہا "اگر آپ دارا اور چی فانگ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو پہلے اس ہندو پنڈت کو تلاش کریں۔ میرا مطلب ہے مُرلی دھر کو۔ وہ ان لوگوں تک ہماری رہنمائی کرسکتا ہے۔"

"مارٹن روڈ والے بنگلے کی بھی نگرانی ہورہی ہے۔ وہ عورت بھی وہاں سے غائب ہے جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا لیکن ہم مُرلی دھر کو تلاش کررہے ہیں اور اب اس غنڈے کو بھی تلاش کیا جارہا ہے جو گولف کورس سے فرار ہوگیا تھا۔ اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔" انسپکٹر چیانگ شو نے کہا۔

"وہ زندہ تو نہیں لیکن ہوسکتا ہے اس کی لاش آپ کو کہیں مل جائے۔" میں نے کہا "وہ ہماری نظروں میں آچکا ہے۔ دارا بہت چالاک آدمی ہے۔ وہ اپنے ایسے آدمیوں کو زندہ نہیں چھوڑتا جو دشمن کی نظروں میں آجاتے ہیں اور وہ غنڈا تو ویسے بھی اس کے لیے زیادہ اہم نہیں ہوگا۔ وہ تو ایک معمولی سا مہرا ہے۔" میں چند لمحوں کو... خاموش ہوا پھر بولا

"ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا۔ چند منٹ پہلے دارا کا فون آیا تھا۔ اس نے دھمکی دی ہے کہ دو تین دن میں میری زندگی کا چراغ گل کردے گا۔"

"تمہاری حفاظت کا بندوبست کرنا پڑے گا۔" چیانگ شو نے کہا۔ "میں صبح ہی سادہ لباس میں دو آدمی بھیج دیتا ہوں۔ وہ دور رہ کر تم لوگوں کی نگرانی کریں گے۔"

اس مرتبہ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چند منٹ اور بات کرنے کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

کافی پینے کے بعد بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر اچانک ہی مجھے اس پستول کا خیال آگیا جو گولف کورس میں وہ غنڈا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔

"وہ پستول کہاں ہے تھائی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس ہے۔" تھائی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور اٹھ کر اپنے ٹراؤزر میں ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی "بہترین چیز ہے اور میرا خیال ہے نیا ہی ہے۔"

میں نے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔ اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ ایک دو دن میں اس کی ضرورت پڑے گی۔" میں نے پستول اسے لوٹا دیا۔

اس وقت دو بج چکے تھے۔ تھائی تو اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور جانکی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر مجھے بھی جماہیاں آنے لگیں۔

دو تین دن گزر گئے۔ دارا کی دھمکی کے باوجود ہماری... سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پولیس کے دو آدمی سادہ لباس میں دور رہ کر ہماری نگرانی کررہے تھے۔ شام کو ان کی ڈیوٹی بدل جاتی۔ ان کی جگہ دوسرے دو آدمی آجاتے جو صبح تک ہمارے مکان کے آس پاس موجود رہتے۔

میں دارا کی دھمکی کو محض گیدڑ بھبکی نہیں سمجھا تھا۔ وہ بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ شکست خوردہ آدمی جب جھنجلاہٹ میں وار کرتا ہے تو زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور میں جانتا تھا کہ دارا بھی اس مرتبہ کوئی ایسی ہی حرکت کرے گا۔

پولیس ابھی تک نہ تو مرلی دھر کا کوئی سراغ لگا سکی تھی اور نہ ہی اسے کوئی اور کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ البتہ میری یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی کہ دارا اس غنڈے کو ختم کردے گا جو گولف کورس سے فرار ہوا تھا۔ اس کی لاش اگلے ہی روز نیوٹن روڈ کے قریب ایک ویران جگہ پر پڑی ہوئی مل گئی تھی۔ اسے پیشانی میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔

اس روز شام کو ہم سنت سنگھ کو دیکھنے کے لیے اسپتال گئے تو چاچی رجنی وہاں موجود تھی۔ ارملا بھی عام طور پر اس وقت اسپتال آجایا کرتی تھی لیکن اس روز اس کے چھوٹے بیٹے کو بخار تھا جس کی وجہ سے وہ گھر پر ہی رہ گئی تھی۔ چنانچہ جب اسپتال سے نکلے تو یہ پروگرام بنالیا کہ ان کے گھر سے ہوتے ہوئے چلیں گے۔ چاچی رجنی بھی ہمارے ساتھ ہی تھی۔

ارملا ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ہمارا پروگرام تو چند منٹ وہاں رکنے کا تھا مگر ارملا اور چاچی رجنی نے ہمیں رات کے کھانے تک روک لیا۔

ہم دس بجے کے قریب وہاں سے نکلے تو پینکولین اسٹریٹ پر واقع ایک نائٹ کلب میں رک گئے۔ ہم بہت عرصے بعد کسی نائٹ کلب میں آئے تھے۔ ایک انڈین رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کررہی تھی۔

ہمیں اسٹیج کے قریب ایک میز مل گئی اور ہم دیر تک رقص کے اس پروگرام سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ انڈین رقاصہ کے بعد ایک یوریشین رقاصہ اسٹیج پر آگئی۔ وہ صرف جسم کی نمائش کے فن میں ماہر تھی۔ ہم دوسرے ہال میں آگئے۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ہم کلب سے باہر نکل آئے۔

ڈرائیونگ کی ذمے داری اس وقت میں نے سنبھال لی تھی۔ تھائی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی اور جانکی پیچھے۔ ہمارے محافظوں کی کار ہمارے پیچھے ہی پارکنگ سے نکلی تھی۔ ہمارے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور کار بھی پارکنگ سے نکلی تھی لیکن میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

پارک پلازا کے قریب سے براس باشی روڈ کراس کرکے ہم نیشنل میوزیم اینڈ آرٹ گیلری کی طرف نکل آئے۔ اس دوراہے سے ایک طرف آرچرڈ روڈ شروع ہوتا تھا اور دوسری طرف فورٹ کیننگ روڈ۔ ہماری کار اس چوراہے پر پہنچی ہی تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار فائرنگ کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزر گئی۔

اسٹیئرنگ پر میری گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ کار لہرا گئی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے کار سنبھال لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے مڑ کر جانکی پھر تھائی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر وحشت تھی لیکن وہ دونوں محفوظ تھیں۔ تب مجھے احساس

...ا کہ فائرنگ ہماری کار پر نہیں کی گئی تھی بلکہ وہ جو کوئی بھی ...ے ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے نکل گئے تھے۔ پورا برسٹ مارا ...یا تھا۔

"یہ... یہ کون لوگ تھے۔" پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ...کی نے کہا۔ اس کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔

"میرا خیال ہے کوئی اور ہی چکر ہے۔" میں نے جواب ...اگر وہ لوگ ہمارے پیچھے ہوتے تو ہوائی فائرنگ کے ...ائے براہ راست ہمیں نشانہ بناتے۔"

تھائی نے بڑی پھرتی سے اپنے پرس میں سے پستول نکال ...تھا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگی۔ ہمارے محافظوں کی کار بھی ...ی تیزی سے ہمیں اوور ٹیک کرتے ہوئے گزر گئی۔ وہ اس ...ر کے پیچھے گئے تھے جو فائرنگ کرتے ہوئے گزر گئی تھی۔ ...ں نے عقبی منظر پیش کرنے والے آئینے میں دیکھا۔ بہت ...ر ایک اور گاڑی آرہی تھی۔

میں نے کلچرل تھیٹر کے قریب سے کار ایک ذیلی سڑک پر ...ڑلی۔ اس طرح فورٹ کیننگ روڈ پر جانے کے بجائے ہم ...یوں ہی گلیوں میں ہوتے ہوئے اپنے گھر پہنچ سکتے تھے۔

تین چار گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم اپنے مکان والی ...ی میں پہنچ گئے۔ میں نے مکان کے سامنے پہنچ کر انجن بند ...ردیا۔ تھائی نے پستول دوبارہ پرس میں رکھ لیا تھا۔ وہ اور ...کی مجھ سے پہلے کار سے اتر چکی تھیں۔ میں دروازہ کھول کر ...ر رہا تھا کہ ایک کار گلی میں داخل ہوئی۔ ہم تینوں ہیڈ ...یمپس کی روشنی میں نہا گئے۔ میں نے زیادہ توجہ نہیں دی ...یونکہ میرے خیال میں وہ ہمارے محافظوں کی کار تھی۔

وہ کار تیزی سے آگے نکل کر رک گئی۔ میں اس وقت ...ی کار کا دروازہ بند کرکے لاک میں چابی گھما رہا تھا کہ تھائی ...ی چیخ سن کر چونک گیا۔

"وجدان... بچو...!"

میں جلدی سے سیدھا ہوگیا۔ تین آدمی آگے والی کار ...ے اتر کر چیختے ہوئے ہماری طرف لپک رہے تھے۔ مجھے ...ورت حال کی سنگینی کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں ...ئی۔

ان تینوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ایک میری طرف ...ا۔ ایک کا رخ تھائی کی طرف تھا اور تیسرے کا رخ جانکی کی ...رف۔

میری طرف آنے والا آدمی چنگھاڑتا ہوا حملہ آور ہوا۔ ...ں نے بڑی پھرتی سے اس کا وار روکا۔ بائیں ہاتھ سے اس ...ی خنجر والی کلائی پکڑلی اور دائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر پنچ مارنے کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو بچالیا تھا۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی اس کی کلائی پر جمادیا اور اس کا بازو مروڑنے لگا اور پھر اسی وقت اگلی کار کی طرف سے دارا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"آج تم نہیں بچ سکو گے حرام زادے!" وہ کہہ رہا تھا "میں اگر چاہتا تو راستے میں تم تینوں کو گولیوں سے چھلنی کردیا جاتا لیکن میں تم لوگوں کو اس طرح مارنا چاہتا تھا جس طرح تمہارے ماں باپ کو مارا تھا۔ اس جگہ تمہارے گھر کے سامنے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر چیختے ہوئے بات جاری رکھی "راستے میں وہ ہوائی فائرنگ اس لیے کرائی گئی تھی کہ تمہارے محافظوں کو ہٹایا جاسکے۔ تم لوگوں کو میں یہیں پر گھیرنا چاہتا تھا۔ تم لوگ میرے گھیرے میں آگئے ہو۔ اب تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا۔"

وقت اپنے آپ کو دہرا رہا تھا لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ وہ سب کچھ نہیں ہونے دوں گا جو کئی سال پہلے اسی وقت، اسی جگہ پر ہوا تھا۔

میں اپنے حریف کی کلائی پوری قوت سے مروڑتا چلا گیا۔ میں اس کے ہاتھ سے خنجر چھڑانے کی کوشش کررہا تھا مگر خنجر پر اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور پھر اس نے اپنے آپ کو اس طرح زوردار جھٹکا دیا کہ میرا ایک پیر سلپ ہوگیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا اپنی کار سے ٹکرا گیا۔ اب اسے موقع مل گیا تھا۔ وہ مجھے دباتا ہوا خنجر کو میرے چہرے کے قریب لا رہا تھا۔

وہ مجھ سے زیادہ قد آور اور زیادہ طاقت ور تھا۔ میں نے بھی پوری قوت سے اس کے ہاتھ کو روکا ہوا تھا مگر اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آرہا تھا۔ خنجر کی نوک میری بائیں آنکھ سے دو تین انچ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ ایک معمولی سا جھٹکا مجھے نہ صرف ایک آنکھ سے بلکہ زندگی سے بھی محروم کرسکتا تھا۔

اسی لمحے مجھے تھائی کی کربناک چیخ سنائی دی اور پھر دوسری چیخ گونجی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ تھائی کس صورت حال سے دوچار ہورہی ہوگی۔ میری پشت کار سے لگی ہوئی تھی اور میرا حریف پورے قد سے میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ خنجر کی نوک میری آنکھ کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ خنجر میری آنکھ میں پیوست ہوجاتا۔ تھائی کی ایک اور چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔ میں نے ایک پیر مضبوطی سے زمین پر جمائے رکھا اور دوسرا پیر اٹھا کر گھٹنے سے حریف کی ٹانگوں کے بیچ میں ضرب لگائی۔ وہ اپنی جگہ سے اچھلا۔ میں نے اسی جگہ

پر ایک اور ضرب لگائی جو پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔

میرا حریف چیخ اٹھا۔ اس کا جارحانہ انداز رخصت ہونے لگا۔ میں نے اس کی کلائی سے ایک ہاتھ ہٹا کر اس کی بغل میں ایک زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وہ کم از کم ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ میں نے دوسرا گھونسا اس کی ٹھوڑی کے نیچے لگایا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گھٹنے سے ٹانگوں میں ایک اور ضرب لگادی۔ اس مرتبہ وہ بلبلا اٹھا۔ خنجر کے دستے پر اس کی مٹھی کھلنے لگی اور وہ نیچے جھکنے لگا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے خنجر چھین لیا اور سنبھل کر ایک بار پھر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا اور دونوں ہاتھ ٹانگوں کے بیچ میں رکھ کر نیچے جھکتا چلا گیا۔ میں نے اس کی کھوپڑی پر ٹھوکر ماردی۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

اس وقت تھائی کی ایک اور کربناک چیخ سنائی دی۔ میں اپنے حریف سے چھینا ہوا خنجر سنبھالتا ہوا اس طرف لپکا اور پھر صورت حال دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔

تھائی مکان کے سامنے گارڈینیا کی باڑھ پر پشت کے بل گری ہوئی تھی اور ایک آدمی اس پر جھکا پے در پے اس پر خنجر کے وار کررہا تھا۔ میں نے اس شخص کو بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور ایک جھٹکے سے زمین پر گرادیا اور پھر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ چی فانگ تھا۔

رگوں میں میرا خون اچھلنے لگا اور پھر میرے لیے اپنے آپ پر قابو پانا ممکن نہیں رہا۔ خنجر چی فانگ کے ہاتھ میں بھی تھا مگر میرا ہاتھ برق رو سے زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ میرا چہرہ دیکھ کر چی فانگ کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کی خوفناک چیخ فضا میں پھیلتی چلی گئی۔

میرا خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہوچکا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے خنجر کو باہر کھینچ کر دوبارہ وار کیا۔ دوسری چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی اور پھر میں پے در پے اس کے سینے پر وار کرتا چلا گیا۔

فائر کی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا۔ تھائی اور چی فانگ کی چیخوں کی آواز سن کر شاید گلی کے مکانوں سے کچھ لوگوں نے باہر آنے کی کوشش کی تھی اور دارا نے انہیں مداخلت سے باز رکھنے کے لیے ہوائی فائر کردیا تھا اور پھر ٹھیک اسی لمحے ایک کار موڑ پر گلی میں گھومی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دارا کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"پنڈت بھاگو۔۔۔"

دارا نے اپنی کار کی طرف بھاگتے ہوئے میری طرف فائر کردیے تھے لیکن اتفاق سے میں اس وقت زمین پر گرگیا تھا۔ دونوں گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔

دارا والی کار کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ وہ ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔ دارا ہوائی فائر کرتا ہوا کار میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک اور آدمی دوڑتا ہوا کار کے دروازے سے لٹک گیا۔ میرے حریف نے بھی اٹھ کر کار کی طرف دوڑنے کی کوشش کی تھی مگر جانکی نے اس پر چھلانگ لگادی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

میں خنجر چی فانگ کے سینے میں چھوڑ کر تھائی کی طرف لپکا۔ وہ گارڈینیا کی باڑھ پر پڑی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ میں تھائی کو اٹھانے کی کوشش کررہا تھا کہ آہٹ سن کر تیزی سے پیچھے مڑا۔ وہ چی فانگ تھا جس نے اپنے سینے میں پیوست خنجر نکال لیا تھا اور مجھ پر حملہ کرنے کے لیے لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے گھوم کر اسے کک رسید کردی۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا اور پھر وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میں نے جانکی کو دونوں بانہوں میں بھرلیا۔ وہ خون میں لت پت تھی اس کے سینے پر کئی گھاؤ تھے جن سے خون بہہ رہا تھا۔

گلی میں مڑنے والی کار بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہمارے محافظوں کی کار تھی۔ وہ دونوں نیچے اترے۔ ایک جانکی کی طرف لپکا جس نے ایک حملہ آور کی ٹانگوں کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ دوسرا محافظ میری طرف دوڑا۔

میں اس وقت تھائی کو اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ تھائی زخموں سے چور تھی۔ وہ چیخ اٹھی اور پھر اس کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"نن۔۔۔ نہیں وجو۔۔۔" وہ کہہ رہی تھی "مم۔۔۔ مجھے مت اٹھاؤ۔ مم۔۔۔ میں اب نہیں بچوں گی۔ تت۔۔۔ تم اپنا خیال رکھنا۔۔۔"

تھائی کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

"نہیں تھائی۔" میں چیخ اٹھا "آنکھیں کھولو۔ تم اس طرح نہیں مرسکتیں۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"

میرا ایک محافظ دوڑتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا تھا۔ تھائی کو دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہوگیا۔

"کک۔۔۔ کیا ہوا اسے۔۔۔" وہ بدحواسی میں اپنی بات پوری نہیں کرسکا اور قریب پڑی ہوئی چی فانگ کی لاش کی طرف دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ایمبولینس کے لیے فون کرو۔ جلدی!" میں اس کی طرف دیکھ کر چیخا "میں تھائی کو مرنے نہیں دوں گا۔ جلدی فون کرو۔"

محافظ ایک طرف بھاگ گیا۔ اس وقت کئی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے۔ چاچا جگ جیت سنگھ بھی باہر آگیا۔ صورت حال دیکھ کر وہ بھی بدحواس ہوگیا۔

"وجدان۔۔۔ تھائی۔۔۔ کہاں ہو تم۔"

جانکی کی آواز سن کر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اپنے حریف کا مقابلہ کرتی رہی تھی لیکن خنجر کا ایک وار پڑ ہی گیا تھا۔ اگر وہ مارشل آرٹس سے واقف نہ ہوتی تو شاید اپنا دفاع نہ کرپاتی اور تھائی کی طرح وہ بھی زخموں سے چور ہوجاتی۔

"امریتا کور۔ نرنجن۔ دیکھو انہیں کیا ہوا ہے۔" جگ جیت سنگھ چیخا "تم انہیں دیکھو۔ میں اسپتال فون کرتا ہوں۔" وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوگیا۔

جانکی کو امریتا کور نے سنبھال لیا اور میں نے تھائی کا سر اپنی گود میں سنبھال لیا۔

"تھائی۔۔۔ تھائی۔۔۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو۔۔۔ میں ہوں۔" میں بار بار تھائی کو پکار رہا تھا۔

تھائی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور ان آنکھوں میں کیا تھا؟ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ایسی چمک میں نے اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی ہو۔

"حوصلہ رکھو تھائی۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

تھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ واضح ہوگئی۔ آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ چمک بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی اور پھر وہ آنکھیں ویران ہوگئیں۔

"تھائی!" میں چیخ اٹھا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور زور سے ہلانے لگا۔

جانکی بھی تڑپ کر میرے قریب آگئی اور وہ بھی تھائی کو کندھوں سے پکڑ کر ہلانے لگی۔ اتنے میں جگ جیت سنگھ بھی واپس آگیا تھا اور بھی بہت سے لوگ ہمارے گرد جمع ہوگئے۔

"حوصلہ رکھو پتر۔" جگ جیت سنگھ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "میں نے فون کردیا ہے۔ ایمبولینس تھوڑی دیر میں آنے ہی والی ہے۔"

جانکی کے پیٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بھی نڈھال سی ہوکر ایک طرف کو لڑھک گئی۔ جگ جیت سنگھ نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

امریتا کور اور دو اور عورتیں تھائی پر جھک گئیں۔ امریتا کور نے تھائی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ دوسری عورت جھک کر تھائی کو دیکھتی رہی اور پھر وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ جاچکی ہے۔"

ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"نہیں!" میں ایک دم چیخ اٹھا اور تھائی کو کھینچ کر دوبارہ اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

اسی وقت سائرنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھیں اور پھر دو منٹ کے اندر اندر دو ایمبولینس اور پولیس کی ایک کار گلی میں داخل ہوکر رک گئیں۔

پولیس پارٹی کا انچارج ایک چینی سب انسپکٹر تھا۔ اس نے صورت حال کا تجزیہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ ایک ایمبولینس میں ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ اس نے تھائی کو دیکھا اور دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے مگر میں تھائی سے الگ ہونے کو تیار نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر زبردستی ایک طرف کھینچ لیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر تھائی کو دیکھا اور پھر اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کردیں۔

جانکی کو ایک ایمبولینس میں اسپتال روانہ کردیا گیا۔ میں اپنے آپ کو ان آدمیوں کی گرفت سے چھڑا کر دوبارہ تھائی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

تھائی ہم سے بچھڑ گئی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔

○☆○

سنگاپور میں بدھ کے ماننے والے بھی بڑی تعداد میں آباد تھے۔ تھائی کی آخری رسومات بدھ عقیدے کے مطابق ادا کی گئی تھیں۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رویا تھا۔ ماں باپ کے بعد مجھے تھائی ہی سے محبت ملی تھی۔ اسی سے مجھے ممتا ملی تھی اسی سے مجھے محبوبہ کا پیار ملا تھا۔ وہی میرے لیے سب کچھ تھی اور اب سب کچھ مجھ سے چھن گیا تھا۔

جانکی سنگاپور جنرل اسپتال میں تھی جہاں اس کی

حفاظت کے لیے پولیس کا ایک پورا اسکواڈ موجود تھا۔ چی فانگ کی لاش تین دن تک اسپتال کے مردہ خانے میں رکھی رہی تھی اور بالآخر ایک رفاہی ادارے کے ذریعے اس کی آخری رسومات بھی ادا کردی گئیں۔

جانکی کے پیٹ، ٹانگ اور بازو پر زخم تھے۔ تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ میں پولیس کی تحویل میں تھا لیکن مجھے باقاعدہ طور پر حراست میں نہیں لیا گیا تھا اس لیے مجھے سلاخوں کے پیچھے بند بھی نہیں کیا گیا تھا۔

جانکی نے زخمی ہونے کے باوجود جس طرح ہمت اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس شخص کو گرفت میں لیا تھا، وہ قابل تعریف تھا۔ وہ یوریشین تھا جو اس سے پہلے بھی مختلف جرائم میں ملوث رہا تھا۔ اسے پولیس کی ایک تفتیشی ٹیم کے حوالے کردیا گیا تھا جو اس سے دارا وغیرہ کے بارے میں پوچھ گچھ کررہی تھی۔

انسپکٹر چیانگ شو پاگل ہوا پھر رہا تھا۔ ان دو پولیس والوں کو غفلت برتنے کے الزام میں معطل کردیا گیا تھا جنہیں سادہ لباس میں ہماری حفاظت پر مامور کیا گیا تھا لیکن میرے خیال میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان سے کوئی غفلت بھی نہیں ہوئی تھی۔ راستے میں جب وہ کار ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزری تھی تو وہ یہی سمجھے تھے کہ ہم پر حملہ کیا گیا ہے اور وہ ہمیں چھوڑ کر اس کار کے تعاقب میں نکل گئے تھے اور وہ کار بھی انہیں چکمادے کر نکل گئی تھی اور جب وہ واپس آئے تھے تو ہم پر قیامت گزر چکی تھی اور یہ انکشاف تو دارا ہی نے کیا تھا کہ محافظوں کو ہٹانے کے لیے ہماری کار کے قریب ہوائی فائرنگ والا ڈراما کیا گیا تھا۔

پولیس نے جزیرے سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کردی تھی۔ ائرپورٹ، ملائشین ریلوے اسٹیشن، ملائشیا کی طرف جانے والی کشتیوں کے گھاٹ اور بس ٹرمینل کے علاوہ کاز وے پر ملائشیا کی طرف جانے والی ٹیکسیوں اور پرائیویٹ گاڑیوں کی بھی بڑی سخت چیکنگ ہورہی تھی۔

شہر میں بھی جگہ جگہ چھاپے مارے جارہے تھے۔ درجنوں مشتبہ افراد کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی جارہی تھی لیکن دارا کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ دارا نے فرار ہوتے وقت کسی پنڈت کو آواز دی تھی اور مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ پنڈت مُرلی دھر تھا۔ سنگاپور میں دارا کا نیا دوست جس نے اسے پناہ دے رکھی تھی۔

یہ اندازہ تو مجھے بنکاک ہی میں ہوگیا تھا کہ دارا، چی فانگ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن وہ اس کے پیچھے بھی پہنچ گیا تھا اور یہاں دارا نے اسے مجھ سے بھڑا دیا بالآخر وہ میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوگیا۔

پولیس نے ابھی تک کیس کی ابتدائی رپورٹ تیا کی تھی۔ انسپکٹر چیانگ شو چونکہ برسوں پہلے بھی میر کا انچارج رہ چکا تھا اس لیے یہ کیس بھی اس کے کردیا گیا۔

چی فانگ کی موت اگرچہ میرے ہی ہاتھوں وا تھی مگر خنجر پر میری انگلیوں کے نشان نہیں تھے۔ میں فانگ پر آخری وار کرکے خنجر اس کے سینے ہی میں چھوڑ دیا تھا اور چی فانگ نے اپنے سینے سے وہ خنجر نکا پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح خون آلو میری انگلیوں کے نشان مٹ گئے تھے اور چی فانگ کی کے نشان آگئے تھے۔

پولیس رپورٹ میں میرے خلاف کوئی سنگین الز تھا۔ میں نے اپنا دفاع کیا تھا۔ اس طرح ایک حملہ فانگ) میرے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن اس کا بھی کو ثبوت نہیں تھا۔ پولیس رپورٹ میں اگرچہ مجھے کلیئ تھا لیکن مجھے شامل تفتیش رکھا گیا تھا۔

میں پولیس کی اجازت کے بغیر سنگاپور سے با جاسکتا تھا لیکن جزیرے پر کہیں بھی آمدورفت کے پوری آزادی تھی۔

دس دن گزر گئے۔ جانکی اسپتال ہی میں تھی۔ دیکھ بھال کے لیے جگ جیت سنگھ کی بیٹی نرنجن بھی ساتھ ہی رہ رہی تھی۔ میں بھی دن میں ایک آدھ اور رات کو بھی دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اکیلے رہتے ہوئے مجھے بڑی وحشت ہونے لگی تھی کسی نہ کسی طرح گزر جاتا مگر رات کو تنہائی میں طر کے خیالات مجھے گھیر لیتے۔ تھائی کا خیال مجھے بے چین اس کی یاد سے بعض اوقات میرے منہ سے بے سسکیاں نکل جاتیں۔

تھائی نے میرے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ملاقات سے پہلے بڑی پرسکون اور خوش حال زندگی تھی لیکن مجھے پناہ دے کر وہ مشکلات کا شکار ہو میرے ساتھ وہ بھی اپنی زندگی بچانے کے لیے بھاگتی اور بالآخر میری خاطر اس نے اپنی جان دے دی تھی۔

اور جانکی۔ وہ بھی تھائی سے کسی طرح پیچھے نہیں اس نے بھی اپنا سب کچھ برباد کردیا تھا۔ میری خاطر

موت کے منہ میں چھلانگ لگائی تھی اور اب بھی وہ موت کے منہ سے نکلی تھی۔

یہ تو میں نے پہلے بھی طے کر رکھا تھا کہ دارا کو کسی صورت میں زندہ نہیں چھوڑنا۔ وہ اپنے جرائم کی فہرست میں مسلسل اضافہ کرتا رہا تھا اور اب تھائی کو مجھ سے چھین کر اس نے اپنے لیے مزید مشکلات پیدا کرلی تھیں اور میں نے قسم کھائی تھی کہ دنیا کے آخری سرے تک اس کا پیچھا کروں گا۔

پولیس دارا اور پنڈت مرلی دھر کی تلاش میں تھی لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ سنگاپور کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بھی انہیں تلاش کیا جارہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ یا تو اسی رات سنگاپور سے نکل گئے تھے یا وہ اگر سنگاپور میں تھے تو کسی جگہ دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے شبہ تھا کہ انہوں نے کسی مندر میں پناہ لے رکھی تھی۔ میں نے انسپکٹر چیانگ شو کے سامنے بھی اپنے اس شبہے کا اظہار کیا تھا لیکن محض شبہے کی بنا پر کسی مندر پر چھاپا نہیں مارا جاسکتا تھا البتہ مندروں کی خفیہ طور پر نگرانی کی جارہی تھی۔

میں بھی اپنے طور پر اس کی تلاش میں تھا۔ اگرچہ یہ خطرہ بھی تھا کہ اچانک ہی کسی طرف سے حملہ ہوسکتا ہے لیکن اب مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں ہر خطرے سے بے نیاز آزادی سے گھوم پھر رہا تھا۔ میرے لیے اب زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ سوائے اس کے کہ مجھے دارا سے اپنے ماں باپ کے قتل کا انتقام لینا تھا اور اب تھائی کے قتل نے میرے انتقام کی آگ بھڑکا دی تھی اور میں نے صرف ایک بات طے کرلی تھی۔ مرو یا مارو اور مجھے یقین تھا کہ دارا کو ٹھکانے لگائے بغیر میں نہیں مروں گا۔

پولیس تو اپنی سی کوشش کر رہی تھی میں بھی دارا کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ میں نے اپنی توجہ مندروں پر مرکوز رکھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر دارا سنگاپور میں موجود ہے تو وہ کسی مندر ہی میں چھپا ہوا ہوگا۔ سنگاپور میں کئی مندر تھے۔ کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے۔ ان مندروں میں ہی دارا کو تلاش کرنے کے لیے میں نے خفیہ طور پر دو آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں۔ وہ دونوں ہندو تھے اور مندروں میں گھومتے رہتے تھے لیکن وہ بھی دارا یا مرلی دھر کا کوئی سراغ نہیں لگا سکے تھے۔

سنگاپور جزیرے سے ملائشیا جانے کے لیے کئی ذرائع تھے۔ ہوائی جہاز، ٹرین، بسوں یا ٹیکسیوں کے ذریعے بڑی آسانی سے جزیرہ چھوڑا جاسکتا تھا بشرطیکہ تمام کاغذات مکمل ہوں۔ غیر قانونی طور پر جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ کشتی...

ملائشیا جانے کے لیے کشتیوں کے دو گھاٹ تھے جہاں سے چھوٹی کشتیوں کے علاوہ اسٹیمر بھی چلتے تھے۔ میں ان دونوں فیری اسٹیشنوں پر بھی معلومات حاصل کر رہا تھا کہ اس رات یا اس کے بعد کوئی کشتی غیر قانونی طور پر حاصل کی گئی ہو لیکن اس طرح بھی کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

پندرہ دن ہو چکے تھے۔ جانکی کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ تھوڑا بہت چلنے لگی تھی۔ مجھے گھر کی تنہائی بری طرح کھلنے لگی تھی اور جانکی بھی اسپتال میں پڑے پڑے تنگ آگئی تھی۔ چنانچہ میں اسے گھر لے آیا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک پرائیویٹ نرس کا انتظام بھی کرلیا۔

جس روز میں جانکی کو اسپتال سے گھر لے کر آیا تھا اس سے اگلے ہی روز میرے چھوڑے ہوئے دو جاسوسوں میں سے کمار نامی شخص نے اطلاع دی کہ چائنا ٹاؤن میں واقع ہنومان مندر میں کچھ مشتبہ سرگرمیاں دیکھی گئی ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق گزشتہ رات وہ ایک سادھو کے بھیس میں اس مندر میں موجود تھا۔ اس نے ایک یوریشین عورت کو ایک سادھو کے ساتھ مندر کے اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق دوسرے مذاہب کے لوگوں کا مندروں میں آنا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ باہر سے آنے والے سیاح مندروں اور مسجدوں میں بھی جاتے ہیں لیکن جس یوریشین عورت کو اس سادھو کے ساتھ مندر کے اندرونی حصے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا اسے وہ جانتا تھا۔ وہ جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک ہوٹل میں ویٹریس ہوا کرتی تھی۔ کمار نے پہلی مرتبہ اسے اسی ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس کا کردار قابل تعریف نہیں تھا۔ وہ پیسے کے لیے کسی بھی مرد کے ساتھ کہیں بھی جاسکتی تھی اور کچھ بھی کرسکتی تھی۔

کمار کے کہنے کے مطابق وہ اس وقت تک مندر میں موجود رہا تھا جب دروازے بند کیے جارہے تھے۔ اس وقت تک وہ یوریشین عورت باہر نہیں آئی تھی۔ مندر بند ہونے کے بعد بھی کمار رات بھر باہر چھپا بیٹھا رہا تھا۔

"مجھے شبہ ہے کہ وہ یوریشین عورت رات بھر مندر میں رہی ہے یا رات کے کسی حصے میں مندر کے کسی اور خفیہ راستے سے باہر نکل گئی تھی۔" کمار نے کہا۔

"کیا مندر میں..."

"تم نہیں جانتے باس۔" کمار نے میری بات کاٹ دی۔ "میں ہندو ہوں۔ اپنے پنڈتوں اور پجاریوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ مندر ان کے لیے نہ صرف کمائی کا ذریعہ ہیں بلکہ عیاشی کے اڈے بھی ہیں۔ تمہاری مسجدوں میں تو جوتے پہن کر جانا ہی گناہ سمجھا جاتا ہے مگر ہمارے مندروں میں ایسی ایسی حرکتیں ہوتی ہیں کہ کوئی اجنبی شاید ایسی باتوں پر یقین نہ کرے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "مجھے یقین ہے کہ مرلی دھر اس مندر میں کہیں چھپا ہوا ہے اور اگر وہ نہ ہو تو کوئی اور لوگ ہوں گے جو..."

"میں سمجھ گیا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن اس کی تصدیق کس طرح کی جائے۔"

"اس کا ایک طریقہ ہے۔" کمار نے کہا "اس کام کے لیے کسی خوب صورت ہندو عورت کو آمادہ کیا جائے۔ اگر تم کہو تو میں اس کا بندوبست کرسکتا ہوں۔"

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"میری ایک دوست۔" کمار نے جواب دیا "قابل بھروسا اور نڈر۔ وہ اندر تک کی بات معلوم کرلے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اس سے بات کرلو۔ مجھے زیادہ سے زیادہ دو دن میں معلوم ہوجانا چاہیے کہ وہاں کون ہے اور کیا ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

اور پھر اس کے دو دن بعد مجھے سرلا نامی اس عورت سے بھی رپورٹ مل گئی۔ وہ پوری رات مندر میں گزار کر آئی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق دارا یا مرلی دھر میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ البتہ ان کا ایک اور ساتھی وہاں چھپا بیٹھا جو اس رات ہمارے خلاف ہونے والی کارروائی میں شریک تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ پولیس کی سرگرمیاں سرد پڑیں تو وہ سنگاپور سے بھاگ نکلے۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔ اس رات تین آدمی ہم پر حملہ آور ہوئے تھے۔ ایک چی فانگ جو مارا گیا تھا۔ دوسرا مرلی دھر جو بھاگ کر کار میں سوار ہوگیا تھا۔ تیسرے کو جانکی نے پکڑ لیا تھا۔ چوتھا دارا تھا لیکن وہ کون تھا۔

اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ جب یہ سارا ہنگامہ ہو رہا تھا تو دارا کار کے قریب کھڑا تھا اور کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک آدمی کار میں بھی اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور یہ یقیناً وہی آدمی ہوگا جس نے مندر میں پناہ لے رکھی تھی اور اس سے دارا یا مرلی دھر کے بارے میں معلوم ہوسکتا تھا۔

میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ مندر پر ہلہ بول سکتا۔ اس لیے میں نے انسپکٹر چیانگ شو کو صورت حال سے آگاہ کردیا۔

اور پھر اسی رات چیانگ شو نے مندر کو گھیرے میں لے کر چھاپا مار دیا۔ ہریش چندر نامی اس شخص نے مندر کے پچھلی طرف ایک خفیہ دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن دھرلیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ مندر کے دو پنڈت اور دو عورتیں بھی پکڑی گئی تھیں۔

ہریش چندر پنڈت مرلی دھر کا آدمی تھا جو دارا کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق اس رات اس نے دارا اور مرلی دھر کو ایسٹ کوسٹ پارک وے پر اتار دیا تھا۔ کار کو کسی اور جگہ چھوڑ کر وہ اس مندر میں آگیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ دارا اور مرلی دھر کہاں ہیں۔ وہ خود یہاں سے نکلنے کے لیے موقع کے انتظار میں تھا۔ ہریش چندر پر تھرڈ ڈگری بھی استعمال کی گئی تھی مگر اس کے بیان میں فرق نہیں آیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

سارے راستے ایک بار پھر بند ہوگئے لیکن میں مایوس نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ دارا وغیرہ کو سنگاپور سے باہر نکلنے کا موقع نہیں مل سکا اور وہ جزیرے پر ہی کسی جگہ روپوش تھا اور مجھے توقع تھی کہ بہت جلد اس سے میرا سامنا ضرور ہوگا۔

جانکی کی حالت... پہلے سے کافی بہتر تھی۔ اب وہ اٹھ کر چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگی تھی۔ اس لیے نرس کی چھٹی کردی گئی تھی۔ دن کے وقت امریتا کور یا اس کی بیٹی نرنجن آجاتی تو کھانا وغیرہ تیار کردیتی۔ رات کو جگ جیت سنگھ دیر تک بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔

نرس کی چھٹی کردینے کے بعد میں نے اسپرنگ والی ایک چارپائی جانکی والے کمرے میں ڈال لی تھی اور رات کو میں وہیں سوتا تھا۔

جانکی کئی روز تک مضمحل اور اداس سی رہی۔ تھائی کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا جاتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں پر لگے ہوئے زخم بھی بھرنے لگے۔

جانکی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا تھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بھی عود کر آئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں شرارت بھی چمکنے لگی تھی۔

پہلے میں تنہائی میں اس کے قریب رہتے ہوئے گھبرایا کرتا تھا۔ ایک انجانا سا خوف رہتا تھا کہ وہ نجانے کس وقت کیا کر گزرے لیکن حیرت کی بات تھی کہ اب مجھے اس سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اور نہ اس کی آنکھوں کی چمک سے۔ اب تو

میں اس سے دور بھی نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میری نیت یا عزائم میں کچھ تبدیلی آگئی تھی اور مزید حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جانکی میں بھی بہت سی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس رات ہوا جب میرا سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ اسپرین کھانے کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ میں اس وقت جانکی کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا اور وہ میرا سر دبا رہی تھی۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور ہولے ہولے دباتی رہی۔ مجھے توقع تھی کہ وہ کوئی شرارت کرے گی۔

میں اس کی گود میں سر رکھے ہوئے سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جانکی پلنگ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی سو رہی تھی۔ میرا سر اس کی گود میں تھا اور اس کا ہاتھ میرے سر پر۔ میں نے اٹھنا چاہا تو وہ... ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

"شی!" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی "سو جاؤ۔ ابھی بہت رات باقی ہے۔" وہ دوسرے ہاتھ سے پھر میرا سر دبانے لگی۔

مجھے بڑی شدت سے تھائی یاد آگئی۔

"جانکی۔" میں نے اس کی گود سے سر اٹھاتے ہوئے کہا "تم رات بھر اسی طرح بیٹھی رہی ہو۔"

"اوہ..." وہ جیسے حواس میں آگئی "تمہارا سر دکھ رہا تھا نا۔ کیسی طبیعت ہے اب۔ سو جاؤ۔ میں تمہارا سر دبا دوں۔"

"اب میں بالکل ٹھیک ہوں جانکی۔" میں نے جواب دیا "تم رات بھر بیٹھی میرا سر دباتی رہی ہو۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم آرام سے سو جاؤ۔"

جانکی تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اس نے میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا۔ میں بھی اس کے قریب لیٹ گیا۔ جانکی نے میرے بازو پر سر رکھ دیا اور چند سیکنڈ بعد ہی اس کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد میں بھی سو چکا تھا۔

کال بیل کی گھنٹی کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ جانکی اب بھی میرے بازو پر سر رکھے سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سر کے نیچے سے نکالا اور باہر آکر دروازہ کھول دیا۔

وہ چاچی امریتا کور تھی۔ جو آلو کے پراٹھے بنا کر لائی تھی۔ میں نے جانکی کو جگا دیا اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ اس دوران میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ ہیلو کے جواب میں دوسری طرف کی آواز سن کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

وہ دارا تھا۔

"امید ہے تمہاری طبیعت کچھ صاف ہوگئی ہوگی۔" وہ کہہ رہا تھا "اس رات تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ گئے۔ چی فانگ اپنے ہاتھوں سے تمہیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا جس طرح اس نے تمہاری ماں کو اسی جگہ خنجر کے پے در پے وار کرکے ہلاک کیا تھا مگر وہ تمہاری چہیتی تھائی اس کے آڑے آگئی اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور چی فانگ خود تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ اچھا ہوا مر گیا سالا۔ بوجھ بن گیا تھا مجھ پر۔ اور اب..."

"تمہاری باری ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم کب تک چھپے رہو گے۔ سنگاپور بہت چھوٹی سی جگہ ہے۔ میں ایک نہ ایک دن تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"جزیرے کی ساری پولیس مجھے تلاش نہیں کر سکی تو تم کیا کر لو گے اور اب تو ویسے بھی میں تم لوگوں کی پہنچ سے دور نکل چکا ہوں۔" دارا نے کہا۔

"تم میری پہنچ سے دور نہیں جا سکتے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت تو میں تمہاری دسترس سے بھی بہت دور ہوں۔" دارا نے کہا "جس رات پولیس نے ہنومان مندر پر چھاپا مار کر ہریش چندر کو گرفتار کیا تھا اس رات میں اس مندر سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک اور بلڈنگ میں تھا اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ میں کل رات ہی سنگاپور سے ایک کشتی کے ذریعے ملائشیا کے جزیرے جوہو پر پہنچ گیا تھا اور اس وقت تو کوالالمپور میں بیٹھا ہوا ہوں۔ دو گھنٹوں بعد میں یہاں سے بھی نکل جاؤں گا۔ چند گھنٹوں بعد جہاز مجھے پاکستان پہنچا دے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ تمہاری وجہ سے مجھے اس وقت میدان چھوڑنا پڑا ہے لیکن میں بھاگ نہیں رہا پھر آؤں گا۔ نئی طاقت کے ساتھ اور اپنے ہاتھوں سے تمہیں موت کے گھاٹ اتاروں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لائن کٹ گئی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے امریتا کور کی موجودگی میں کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا لیکن بہرحال وہ سمجھ گئی تھی کہ کس کی کال ہو سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد امریتا چلی گئی تو میں نے جانکی کو بتا دیا کہ دارا اس وقت کوالالمپور میں ہے اور دو گھنٹوں بعد وہاں سے پاکستان کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔

"انسپکٹر چیانگ شو کو بتا دو۔" جانکی نے کہا "وہ کوالالمپور پولیس کو فون کر دے گا۔ دارا کو ہوائی اڈے پر پکڑا جا سکتا ہے۔"

"بیکار ہے۔" میں نے کہا "وہ بہت چالاک ہے۔ ایک مہینے سے یہاں چھپا ہوا تھا لیکن پولیس اسے تلاش نہیں کر سکی۔ وہ کل رات بڑے اطمینان سے یہاں سے نکل گیا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔ ظاہر ہے پولیس میں سب ہی لوگ چیانگ جیسے فرض شناس اور دیانت دار..... نہیں ہیں۔ دارا کسی بھی بد دیانت پولیس آفیسر کی مدد کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا تھا۔ بہرحال جس طرح وہ یہاں سے نکل گیا ہے اسی طرح کوالالمپور سے بھی نکل جائے گا۔ اب اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مجھے پاکستان جانا پڑے گا۔"

"کیا...!" جانکی اچھل پڑی "تم پاکستان جاؤ گے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "میرا اصل وطن تو پاکستان ہی ہے۔ میں نے جنم تو اس مٹی سے لیا تھا۔ دارا سے دو دو ہاتھ کرنے کے علاوہ مجھے ملک نوازش علی سے اپنے باپ کا حساب بھی کرنا ہے۔"

جانکی جواب دینے کے بجائے مجھے تکتی رہ گئی۔

اس روز میں نے بہرحال انسپکٹر چیانگ شو کو دارا کے بارے میں بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں پاکستان جانا چاہتا ہوں اور کاغذات وغیرہ کی تیاری کے سلسلے میں مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

انسپکٹر چیانگ شو مجھے روکنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی کوئی بات نہیں مانی اور اپنے طور پر تیاری شروع کر دی۔ جانکی بھی میرے ساتھ جانے کو تیار تھی۔

دارا سے میری جو جنگ کئی سال پہلے شروع ہوئی تھی، وہ ابھی تک جاری تھی۔ اس میں زیادہ نقصان تو میرا ہی ہوا تھا۔ میرے ہمدرد اور میرے چاہنے والے ہی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ابھی یہ جنگ ادھوری تھی اور میں اسے اختتام تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

دس بارہ دن اور لگ گئے اور پھر وہ دن بھی آگیا جب میں اور جانکی سنگاپور ائرلائن کی ایک فلائٹ سے پرواز کر رہے تھے۔

اس فلائٹ کا پہلا اسٹاپ ہندوستان کا شہر بمبئی تھا اور اس کے بعد کراچی۔

بمبئی سے ٹیک آف کرنے کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوائی جہاز ائرپاکٹ میں آگیا۔ مسافروں کو اپنے سیٹ بیلٹ باندھ لینے کی ہدایت کر دی گئی۔ جہاز بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ کبھی ایک طرف جھکتا اور کبھی دوسری طرف۔

جہاز کے مسافروں میں مختلف قومیتوں اور مذاہب کے لوگ تھے۔ سب لوگ بلند آواز سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ جہاز کے مائیک سسٹم سے بار بار مختلف اعلان ہو رہے تھے۔ آخری اناؤنس منٹ یہ تھی کہ جہاز کو کراچی لے جانے کے بجائے راجستھان کے شہر جودھ پور کے ہوائی اڈے کی طرف لے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس اعلان کی بازگشت ابھی پوری طرح ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ جہاز تیزی سے بائیں طرف جھکنے لگا۔ بعض مسافر چیخ رہے تھے۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو کلیجا منہ کو آتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

زمین بڑی تیزی سے قریب آرہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بچپن میں قرآن شریف کی جتنی سورتیں پڑھی تھیں، زیر لب دہرانے لگا۔ ہوائی جہاز بڑی تیزی سے زمین کی طرف جا رہا تھا۔ میرے کان کسی دھماکے کے منتظر تھے اور اس دھماکے کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جاتا۔ جہاز کے تقریباً دو سو مسافر بڑی تیزی سے موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ زمین کا فاصلہ کچھ اور کم ہو گیا تھا۔ جہاز بڑی تیزی سے بائیں پہلو پر نیچے جا رہا تھا۔ نیچے ایک بہت بڑی جھیل تھی جو لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھی یا بہ الفاظ دیگر جہاز بہت تیزی سے جھیل کے پانی میں غوطہ لگانے کے لیے جھک رہا تھا۔ جھیل کے آس پاس اونچے درخت اب صاف دکھائی دے رہے تھے اور میرا خیال تھا کہ جہاز پہلے ان درختوں سے ٹکرائے گا۔

میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ہماری زندگیوں کا خاتمہ ہونے میں صرف چند ہی گھڑیاں باقی رہ گئی تھیں لیکن پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔ جہاز بڑی تیزی سے اوپر اٹھنے لگا۔

ہوا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہوائی جہاز کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔ تقریباً دو سو مسافروں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں جن میں سے بیشتر لوگ چیخ رہے تھے۔ باقی اونچی آواز میں اپنی اپنی زبان میں اپنے اپنے خدا کو یاد کر رہے تھے اور پھر اسی شور میں جہاز کے مائیک سسٹم پر ائرہوسٹس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"معزز مہمانوں سے درخواست ہے کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ جہاز کنٹرول میں ہے۔ کسی ائرپورٹ تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اب ہم ریگستان پر کریش لینڈنگ کی تیاری کررہے ہیں۔ مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں۔ سیفٹی بیلٹ کھولنے کی کوشش نہ کریں اور....."

اس کے بعد ائرہوسٹس کی آواز سنائی نہیں دی۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کی ساری بتیاں بھی بجھ گئی تھیں۔ جہاز کا ایک انجن بند ہوگیا تھا۔ تاریکی چھاتے ہی ایک مرتبہ پھر مسافروں کی چیخیں گونج اٹھیں۔

جہاز دائیں بائیں ہچکولے کھاتا ہوا نیچے جھک رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس جھیل کا اب نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا جو کچھ دیر پہلے نظر آئی تھی۔ چاروں طرف وسیع و عریض اور لق و دق صحرا نظر آرہا تھا اور جہاز اس ریگ زار پر جھک رہا تھا۔

میں نے گردن گھما کر جانکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ خوف سے پیلا ہورہا تھا اور ہونٹ بڑی دیر سے حرکت کررہے تھے۔ وہ زیرِ لب کوئی دعا مانگ رہی تھی مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آگے والی سیٹ کو تھام رکھا تھا۔

اس علاقے کی ریت شاید سخت تھی کیونکہ جہاز زمین سے ٹکرا کر کئی فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بتیاں ایک بار پھر روشن ہوگئیں۔

جہاز دوسری مرتبہ زمین سے ٹکرایا تو مسافروں کی چیخیں پہلے سے زیادہ خوفناک اور بلند تھیں۔ جہاز مینڈک کی طرح سخت ریتلی زمین پر پھدک رہا تھا۔ اسے بڑے زوردار جھٹکے لگ رہے تھے۔ میرا خیال تھا جہاز کے پہیے ریت میں دھنس رہے تھے۔ ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ جہاز کی باڈی زمین پر رگڑ کھانے لگی۔ کئی مسلسل جھٹکے لگنے کے بعد ایک اور زوردار جھٹکا لگا اور جہاز رک گیا۔

کئی مسافروں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ائرہوسٹس کچھ کہہ رہی تھی مگر مسافروں کی چیخ و پکار میں اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کئی مسافر اپنے بیلٹ کھول کر سیٹوں سے اٹھ رہے تھے۔ ائرہوسٹس اب بھی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی تھی لیکن لوگوں کے شور میں اس کے الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

اور پھر جہاز کے دروازے کھل گئے۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں دروازے کی طرف لپکے۔ جہاز کا دروازہ زمین سے تقریباً بیس فٹ بلند تھا۔ دو چار آدمیوں نے چھلانگیں بھی لگا دیں۔ ان میں سے ایک کی خوفناک چیخ بھی سنائی دی تھی۔ دوسرے رک گئے۔

"جہاز پھٹنے والا ہے۔ باہر چھلانگ لگا دو۔" یہ کسی مسافر کی آواز تھی جو چیخ چیخ کر جہاز کے دھماکے سے پھٹنے کی پیش گوئی کررہا تھا۔

دو چار اور آدمیوں نے چھلانگ لگا دی اور پھر ائرہوسٹس کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو پُرسکون رہنے کی درخواست کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آپ لوگ پُرسکون رہیے۔ جہاز کے شوٹس کھولے جارہے ہیں۔ برائے مہربانی ان شوٹس پر دوڑنے کی کوشش نہ کریں اور نیچے اتر کر جہاز سے زیادہ سے زیادہ دور چلے جانے کی کوشش کریں۔ شوٹس کھلنے کے بعد پہلے خواتین اور بچوں کو اترنے کا موقع دیں۔"

جہاز کے دونوں طرف ایمرجنسی دروازے کھل گئے اور جہاز کے اندر پوشیدہ شوٹس سلائیڈز کی طرح پھسلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ان کے اگلے حصے زمین پر ٹک گئے۔ اس طرح جہاز کے دروازوں سے زمین تک ایک ڈھلان بن گئی۔ اس ڈھلان پر دوڑنا ممکن نہیں تھا۔ صرف پھسل کر ہی اترا جاسکتا تھا۔ لوگ سیٹوں کے درمیان ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

"پہلے بچوں اور خواتین کو اترنے کا موقع دیں پلیز!" کوئی آدمی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

مگر اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ہر ایک کو اپنی جان پیاری تھی اور ہر کوئی سب سے پہلے جہاز سے اترنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ خطرہ بہرحال اپنی جگہ موجود تھا کہ جہاز کا فیول ٹینک کسی بھی وقت زوردار دھماکے سے پھٹ سکتا تھا۔

میں اور جانکی بھی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر دھکے کھاتے ہوئے ایک ایمرجنسی دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اس وقت دو عورتیں اپنے بچوں کو سینوں سے چمٹائے شوٹ کی چکنی ڈھلان پر بیٹھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے خوف سے زرد تھے۔ ہمارے عقب میں ایک آدمی دھکے دیتا ہوا آگے بڑھا۔

"جہاز کے پچھلے حصے سے شوں شوں کی آواز آرہی ہے۔" وہ چیخ رہا تھا "جلدی باہر نکلو۔ جہاز پھٹنے والا ہے۔"

لوگوں میں کچھ اور بھی خوف و ہراس پھیل گیا اور پھر وہی شخص دوسروں کو دھکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا اور پھر شوٹ

کی ڈھلان پر بیٹھنے کے بجائے دوڑنے لگا۔ دوسرے ہی قدم پر اس کا پیر پھسلا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ منہ کے بل گرا اور قلابازیاں کھاتا ہوا گرتا چلا گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخیں بڑی خوفناک تھیں۔

لوگ افراتفری میں شوٹس سے اتر رہے تھے۔ وہ شخص نیچے ریت پر پڑا ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ دو آدمیوں نے اسے اٹھا کر ایک طرف ڈال دیا۔ کچھ اور لوگ بھی اس کے گرد جمع ہوگئے۔

میں اور جانکی نیچے اترے تو وہ شخص بے حس و حرکت ہوچکا تھا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ ختم ہوچکا تھا۔

جہاز کے پچھلے حصے سے بڑے زور کی شوں شوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کسی نے چیخ کر اس طرف متوجہ کیا تو لوگ بدحواس ہوکر ایک طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

ایک ادھیڑ عمر عورت..... جس نے ساڑی پہن رکھی تھی، پانچ چھ سال کی بچی کو اٹھائے ہانپتی ہوئی ایک طرف کو بھاگ رہی تھی۔ اچانک اس کا پیر ساڑی میں الجھا اور وہ منہ کے بل گری۔ اس کے ساتھ بچی کے منہ سے بھی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے دوڑ کر بچی کو اٹھالیا۔ جانکی اس عورت کو سہارا دے کر اٹھانے لگی اور پھر ہم دوڑتے ہوئے وہاں سے دور ہوتے چلے گئے۔

جہاز سے تقریباً سو گز دور ہم رک گئے۔ دوسرے لوگ بھی وہاں جمع ہونے لگے۔ وہ عورت اس بچی کے ساتھ اکیلی سفر کررہی تھی۔ وہ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور اسے کراچی جانا تھا۔ اکیلی ہونے کی وجہ سے اس حادثے نے اسے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ کر رکھا تھا۔ ہم نے چونکہ اس کے ساتھ تھوڑی سی ہمدردی کی تھی اس لیے وہ..... ہمارے ساتھ ہی کھڑی رہی۔ بچی میری گود سے اتر کر اس کی ٹانگوں سے لپٹی کھڑی تھی۔

جہاز کے دوسری طرف بھی سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر کچھ لوگ ٹولیوں میں کھڑے تھے اور کچھ ابھی تک جہاز سے اتر رہے تھے۔

جہاز کا کیپٹن اور کاک پٹ کریو سب سے آخر میں جہاز سے اترا تھا۔ ان میں کیپٹن اور کو پائلٹ کے علاوہ چار پرسر اور پانچ ائرہوسٹس تھیں۔ کچھ لوگوں نے جہاز کے کیپٹن کو گھیر لیا تھا اور اس سے طرح طرح کے سوال کررہے تھے۔

"جہاز کا فیول ٹینک تو نہیں پھٹ جائے گا؟ جہاز تباہ تو نہیں ہوجائے گا؟ ہم کس جگہ پر ہیں؟ یہاں سے کیسے جائیں گے؟"

بہت سے سوال تھے جن کا کپتان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ لوگوں کو تسلی دے رہا تھا۔ جہاز کا دوسرا عملہ بھی مسافروں کو پرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

بہت سے لوگ اپنے سامان کے لیے فکرمند تھے۔ ان میں کچھ لوگ بیوپاری بھی تھے۔ یہ لوگ سنگاپور سے جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ سنگاپور میں چند روز اپنی دکان پر بیٹھنے سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان سے بہت سے ایسے لوگ آتے ہیں جو عام استعمال کا کچھ سامان اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور واپس جا کر بیچ دیتے ہیں جس سے انہیں معقول منافع ملتا ہے۔ چند روز آرام سے گزارنے کے بعد وہ دوبارہ سنگاپور آجاتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ناہید نامی اس عورت کی باتوں سے یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اس کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا۔ ناہید بیوہ عورت تھی۔ تین سال پہلے کراچی میں ٹریفک کے ایک حادثے میں اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ کراچی کے فیڈرل بی ایریا کے علاقے میں دو سو چالیس گز کے ایک مکان کے سوا کوئی

جائداد نہیں تھی۔ اس مکان پر بھی ناہید کے سسرال والوں نے قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ جھگڑا عدالت تک پہنچا۔ ایک سال کی مقدمے بازی کے بعد عدالت نے ناہید کے حق میں فیصلہ دیا اور مکان کا قبضہ اسے دلوا دیا۔

شوہر کے انتقال کے بعد جو جمع پونجی تھی' وہ مقدمے پر خرچ ہوگئی۔ شوہر کی پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کی وجہ سے کسی پنشن وغیرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ناہید انٹرپاس تھی۔ اسے کوئی اچھی ملازمت تو نہیں مل سکتی تھی البتہ محلے ہی کے ایک پرائیویٹ اسکول میں پرائمری کے بچوں کو پڑھانے کی نوکری مل گئی۔ تنخواہ صرف پندرہ سو روپے تھی۔ فارغ وقت میں لوگوں کے کپڑے سی کر وہ اپنی گزر اوقات کر رہی تھی۔ اسی دوران میں ناہید کی ملاقات صدر میں الیکٹرونکس کا کاروبار کرنے والے سلطان احمد نامی ایک آدمی سے ہوگئی۔ اس نے ناہید کو سنگاپور کے پھیرے لگانے کی پیشکش کی۔ معقول معاوضے کے لالچ میں ناہید نے یہ پیشکش قبول کرلی۔ سلطان احمد ہی نے اسے پاسپورٹ بنوا دیا تھا۔

ناہید تقریباً ڈیڑھ سال سے یہ "پھیرے" لگا رہی تھی اور اس مرتبہ وہ اپنی بیٹی ببلی کو بھی ساتھ لے آئی تھی مگر بدقسمتی سے یہ حادثہ پیش آگیا۔ ناہید کو اپنی بیٹی اور اس سامان کی فکر تھی جو ہزاروں روپے مالیت کا تھا اور جہاز کے لگیج ہولڈ میں رکھا ہوا تھا۔

جہاز کے تمام مسافر ایک جگہ جمع ہوچکے تھے۔ ان میں کئی لوگ کریش لینڈنگ کے دوران میں لگنے والے جھٹکوں سے زخمی ہوئے تھے۔ جہاز کے دروازوں سے بدحواسی میں چھلانگ لگانے والوں میں ایک آدمی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چیخ رہا تھا۔ ایک مسافر ہلاک ہوا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے شوٹس سے دوڑتے ہوئے اترنے کی کوشش کی تھی اور قلابازی کھاتا ہوا زمین تک پہنچا تھا۔ اس کی لاش کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ جہاز میں نہ تو آگ لگی تھی اور نہ ہی فیول ٹینک پھٹا تھا۔ لوگ جہاز کے کیپٹن اور دوسرے عملے کو گھیرے ہوئے تھے کہ وہ یہاں سے نکلنے کا کوئی حل تلاش کریں۔

جہاز کا کیپٹن' کو پائلٹ اور دو پرسرز کو اشارہ کرتا ہوا جہاز کی طرف چل پڑا۔ میرے ساتھ دو اور آدمی بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

جہاز کا کیپٹن اور اس کے ساتھی تو کسی طرح شوٹ پر سے ہوتے ہوئے جہاز میں چلے گئے اور ہم نیچے ہی رہ کر جہاز کا معائنہ کرنے لگے۔ جہاز کے پہیئے ٹوٹ چکے تھے۔ باڈی کا نچلا حصہ بھی زمین سے رگڑ کھا کر ایک دو جگہوں سے ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ جہاز کا فیول ٹینک کیوں نہیں پھٹا تھا اور جہاز تباہ کیوں نہیں ہوا تھا۔ جہاز کی حالت دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہے گا۔ اس ویرانے میں اگر اس کی مرمت کر بھی دی گئی تو اسے اڑانے کے لیے لمبا چوڑا رن وے تعمیر کرنا پڑے گا جو ممکن نہیں تھا اور ریت پر ائربس جیسے اس جہاز کے لیے دوڑنا اور ٹیک آف کرنا اس سے بھی زیادہ ناممکن تھا۔

دونوں پرسر ایمرجنسی میڈیکل کٹس لیے جہاز سے اتر آئے۔ ہم بھی ان کے ساتھ واپس آگئے اور زخمی مسافروں کو طبی امداد دی جانے لگی۔ ائرہوسٹس اس سلسلے میں بڑی مہارت کا ثبوت دے رہی تھیں۔ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اسے کس کر پٹی باندھ دی گئی۔ اس سے زیادہ اس کی مدد نہیں کی جاسکتی تھی۔

لوگ مختلف ٹولیوں میں ریت پر بیٹھے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ اس مصیبت سے کیسے نجات ملے گی اور ایک پرسر مسافروں کو تسلی دے رہا تھا کہ کیپٹن جہاز کے ریڈیو پر قریبی ائرپورٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے گھنٹے دو گھنٹوں میں امدادی ٹیم یہاں پہنچ جائے۔

میں جانکی اور ناہید کے ساتھ لوگوں سے ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ ببلی' ناہید سے جڑی بیٹھی تھی۔ وہ بار بار ٹھنک رہی تھی اور ناہید کبھی اسے پیار کرتی اور کبھی ڈانٹنے لگتی۔

ہمارے چاروں طرف دور دور تک ویرانہ تھا۔ بے برگ و گیاہ ریگستان تھا بہت دور ریت کے ٹیلے بھی نظر آرہے تھے۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ جہاز سخت ریت والے اس خطے پر اتر گیا تھا۔ اگر کچھ آگے لینڈنگ کی کوشش کی جاتی تو ٹیلوں سے ٹکرا کر تباہ ہوجاتا۔

کسی کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہم کسی آبادی سے کتنی دور ہیں۔ کریش لینڈنگ سے چند منٹ پہلے میں نے ایک جھیل دیکھی تھی۔ ہوسکتا ہے اس جھیل کے آس پاس کوئی آبادی بھی ہو اور ہوسکتا ہے اس بستی کے لوگوں نے جہاز دیکھا بھی ہو لیکن جھیل کے عین قریب پہنچ کر جہاز اوپر اٹھ گیا تھا اور تین چار منٹ تک پرواز کرتا ہوا وہاں سے میلوں دور نکل آیا تھا۔ جھیل کے آس پاس کسی بستی کے لوگوں نے جہاز کو دیکھا بھی ہوگا تو وہ ہماری مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے۔

سنگاپور سے ٹیک آف کرنے کے بعد جہاز نے بنگلورا

پورٹ پر قیام کیا تھا۔ اس وقت موسم بہت خوشگوار تھا۔ بمبئی ائرپورٹ پر قیام کے دوران میں ہی موسم تبدیل ہونا شروع ہوا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش کے آثار تھے لیکن کنٹرول ٹاور سے جہاز کو ٹیک آف کرنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی شاید موسم میں شدت آنا شروع ہوگئی تھی اور پھر جہاز ائرپاکٹ میں پھنس گیا۔ کیپٹن نے شاید ایس او ایس کا سگنل نشر کردیا تھا اور اس کے بعد ہی ائرہوسٹس نے اعلان کیا تھا کہ جہاز کو جودھ پور ائرپورٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن جہاز تیز ہواؤں کے گرداب میں پھنس گیا تھا اور پائلٹ کی وہ کوشش ناکام ہوگئی تھی لیکن اس کی ذہانت اور مہارت نے جہاز کو تباہ ہونے سے بچالیا تھا اور اس ریگستان میں کریش لینڈنگ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

اس وقت پانچ بج رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی طرف کوئی بگولا بھی دکھائی دے جاتا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس جگہ زمین سخت تھی اور زیادہ ریت نہیں اڑ رہی تھی۔ اگر ریت نرم ہوتی تو یہاں اس طرح بیٹھنا مشکل ہوجاتا۔

مسافروں کو پریشانی تو تھی لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ پائلٹ جہاز کے ریڈیو پر کسی قریبی ائرپورٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اگر کہیں رابطہ ہوگیا تو زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹوں میں کوئی امداد پہنچ جائے گی۔

ایک گھنٹے بعد کیپٹن اور کو پائلٹ جہاز سے اتر کر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ بہت سے لوگ ان کی طرف چل دیے اور انہیں راستے ہی میں جالیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ کیپٹن ایک چھوٹے سے جلوس کی صورت میں اس جگہ پہنچا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اسے گھیر لیا۔

"امدادی پارٹی کب تک پہنچے گی کپتان صاحب؟ وہ لوگ یہاں کیسے پہنچیں گے؟ کیا وہ لوگ ہیلی کاپٹر پر آئیں گے؟"

کیپٹن پر سوالات کی بوچھار ہو رہی تھی اور وہ خاموش کھڑا لوگوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے کیپٹن صاحب۔" ایک اور آدمی نے کہا "آپ کچھ بتاتے کیوں نہیں۔ امدادی ٹیم یہاں کب تک پہنچے گی؟"

کیپٹن نے مڑ کر سوال کرنے والے شخص کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

"جہاز کا ریڈیو سسٹم خراب ہوگیا ہے۔ ہمارا کسی سے رابطہ نہیں ہوسکا۔"

ایک لمحے کو یوں لگا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سناٹا سا چھا گیا اور پھر مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ لوگ پہلے سرگوشیاں کرتے رہے پھر ان کی آوازیں بلند ہوتی چلی گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ اب کیا ہوگا؟

کسی آبادی سے میلوں دور بے برگ و گیاہ ریگستان میں بے یارومددگار پڑے رہنے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔

"آپ لوگ شانت رہیے۔" کیپٹن کی آواز سنائی دی "کریش لینڈنگ سے پہلے ہم نے ایس او ایس کا سگنل دیا تھا۔ یوں بھی کسی نہ کسی بستی سے ہمارے جہاز کو دیکھ لیا گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کسی بڑے شہر تک یہ خبر پہنچ جائے اور ہماری تلاش شروع ہوجائے۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"موسم کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔" ایک آدمی نے کہا "کیا ایسے خوفناک موسم میں ایسی کوئی توقع کی جاسکتی ہے۔"

"مایوس نہ ہوں۔" کیپٹن نے کہا "امید ہے کہ جلد ہی کوئی نہ کوئی امدادی پارٹی اس طرف آجائے گی۔"

کیپٹن مسافروں کو تسلیاں دیتا رہا اور لوگ طرح طرح کے خدشات کا اظہار کرتے رہے۔ سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ اگر کوئی امدادی پارٹی نہ پہنچ پائی تو کیا ہوگا۔ مسافروں میں زخمی بھی تھے اور چھوٹے بچے بھی۔ خوراک کی صورت حال کا علم نہیں تھا۔ آیا جہاز پر اتنی خوراک موجود تھی کہ ایک دو وقت تک تقریباً دو سو مسافروں کی ضرورت پوری ہوسکے۔ اس ہولناک ویرانے میں رات بسر کرنے کا تصور ہی ہولناک تھا۔

ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ آسمان پر گہرے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا سا تھا کچھ دیر بعد شام ہوجائے گی اور اندھیرا گہرا ہوجائے گا اور اس کے بعد کسی امدادی پارٹی کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہوا کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ موسم اگرچہ بتدریج پرسکون ہوتا جارہا تھا مگر لوگوں کے دلوں پر ایک انجانا سا خوف طاری تھا۔ اگر کوئی امدادی پارٹی نہ پہنچی تو کیا ہوگا؟

"او کے۔۔ وہ دیکھو۔ کوئی آرہا ہے!" ایک آدمی چیخ اٹھا۔

میں نے بھی چونک کر اس طرف دیکھا۔ دائیں طرف بہت دور دو گھڑ سوار دکھائی دے رہے تھے اور پھر ان کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ جہاز کے مسافر خوشی سے چیخ اٹھے۔ امداد پہنچ رہی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ دور کی کسی بستی کے لوگ تھے جنہوں

نے اس طرف جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا ہوگا اور اس کی تلاش میں اس طرف نکل آئے تھے۔

ان گھڑ سواروں کی تعداد پندرہ اور بیس کے درمیان تھی۔ فاصلہ بتدریج کم ہوتا جارہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ اتنا قریب آگئے کہ ہم ان کی شکلیں دیکھ سکتے تھے۔

ان گھڑ سواروں کو دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ ان کے حلئے بہت عجیب تھے۔ کئی آدمیوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے۔ رائفل ہر ایک کے پاس نظر آرہی تھی۔ ہر ایک کی کمر پر بیلٹ بندھے ہوئے تھے جن میں کارتوس بھرے ہوئے تھے۔

میری طرح کچھ اور لوگوں کے ذہنوں میں بھی کچھ خدشات ابھرے ہوں گے جن کا اظہار ان کے چہروں سے بھی ہو رہا تھا۔

”وجدان!“ جانکی نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی ”یہ لوگ ہماری مدد کو نہیں آئے۔ یہ... یہ تو ڈاکو ہیں۔“

ہمارے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔ ان گھڑ سواروں نے قریب آتے ہی ہوائی فائرنگ شروع کردی اور اس طرح پھیل گئے جیسے ہمیں گھیرے میں لینا چاہتے ہوں۔

فائرنگ سے عورتیں اور بچے چیخنے چلانے لگے۔ مرد بھی خوف زدہ ہوگئے تھے۔ عجیب صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ ہم تو پہلے ہی مصیبت میں گرفتار تھے اور اب ڈاکوؤں کے اس گروہ نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ جہاز کے مسافروں میں سے کسی کے پاس اسلحہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی جبکہ ڈاکو پوری طرح مسلح تھے۔ ان سے مقابلہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوگی۔ یہ لوگ ڈاکو ضرور تھے لیکن انسان تو تھے۔ ہماری مصیبت دیکھ کر لوٹ مار کا خیال ذہن سے نکال دیں گے اور ہماری مدد کریں گے مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ وہ ڈاکو تھے۔ جن کے دل رحم اور ہمدردی جیسے جذبات سے نا آشنا تھے۔

”سب لوگ ایک جگہ کھڑے ہوجاؤ۔ کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔“ ایک گھڑ سوار نے چیخ کر کہا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ لمبا قد، مضبوط جسم، سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ سینے پر کراس کرتے ہوئے دو بیلٹ تھے جن میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں خون جیسی سرخی تیر رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کے حلئے بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔

”دیکھو مسٹر!“ جہاز کا کیپٹن آگے بڑھ گیا ”تم دیکھ رہے ہو کہ ہم لوگ پہلے ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ہمارے ساتھ عورتیں بھی ہیں، بچے بھی اور کچھ مسافر زخمی ہیں۔ ہمارے جہاز کا ریڈیو خراب ہوچکا ہے۔ کسی طرف سے امداد کی توقع نہیں۔ تم لوگ ہماری مدد کرو۔ اگر کوئی بستی قریب ہو تو...“

”ہم یہیں پر بستی بنا دیں گے۔ لاشوں کی بستی۔“ اس شخص نے کہا۔ وہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا سردار تھا ”ہم ڈاکو ہیں بھایا۔ ڈاکو کا کام لوٹنا ہوتا ہے کسی کی مدد کرنا نہیں۔ تم سب لوگ اپنی اپنی جیبوں سے ساری چیزیں نکال کر ایک طرف رکھ دو۔ او رانا۔“ اس نے گردن گھما کر اپنے ایک ساتھی کو مخاطب کیا ”یہاں نیچے چادر بچھا دے اور ان سب کی جیبیں خالی کرا دے۔“

وہ آدمی گھوڑے سے اتر آیا اور زمین پر ایک چادر بچھا دی۔

مسافروں میں سے ایک دو نے انسانیت کا واسطہ دے کر سردار کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ ڈاکو تھا۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور ڈاکوؤں کا کام صرف لوٹنا ہوتا ہے۔

جہاز کے مسافر بے حس و حرکت اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ رانا نامی ڈاکو نے کیپٹن کو گریبان سے پکڑ کر آگے کھینچ لیا۔ پہلے اس کی کلائی سے گھڑی اتاری اور پھر جیبیں خالی کرنے کا حکم دیا۔

ان کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ سنگاپور سے آنے والی عورتیں طلائی زیوروں سے لدی پھندی تھیں۔ مردوں کی انگلیوں میں بھی موٹی موٹی انگوٹھیاں اور گلے میں موٹی موٹی سونے کی چین پڑی ہوئی تھیں۔ سنگاپور سے خریدا جانے والا یہ سونا پاکستان جاکر مہنگے داموں فروخت کردیا جاتا مگر اب یہ سب کچھ زمین پر پڑی ہوئی چادر پر ڈھیر ہو رہا تھا۔

ایک آدمی نے مزاحمت کی تو رانا نامی ڈاکو نے بڑی بیدردی سے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ اس شخص کی لاش ریت پر تڑپنے لگی اور پھر ٹھنڈی ہوگئی۔ ایک آدمی کا حشر دیکھ کر دوسروں کو مزاحمت کی جرأت نہیں ہوئی۔

سردار نے اپنے چار پانچ ساتھی جہاز کی طرف بھیج دیے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی مسافروں کا وہ سامان نیچے پھینکنے لگے جو ہینڈ بیگیج کے طور پر مسافروں نے دوران سفر اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ ان میں الیکٹرونک کا بھی بہت سا سامان موجود تھا۔

ڈاکوؤں کی لوٹ مار جاری تھی۔ کسی کی آہ و زاری ان پر اثر انداز نہیں ہو رہی تھی۔ مسافروں کی جیبوں سے سب کچھ نکلوا لیا گیا۔ ان کی گھڑیاں اور انگوٹھیاں بھی اتروالی گئیں۔ عورتوں کے زیور اتروا لیے گئے۔ ایک بچی کے کانوں سے سونے کی بالیاں نوچ لی گئیں۔

مزاحت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک کا انجام سب لوگ دیکھ چکے تھے۔ کسی اور میں احتجاج یا مزاحمت کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ ایسا کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

دوسرے ڈاکو بھی جہاز میں سے بہت سا سامان نیچے پھینک کر باہر آگئے تھے۔ انہوں نے قیمتی سامان چادروں میں جمع کرلیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ڈاکوؤں کی سرگرمیاں جاری تھیں۔ ایک عورت اپنا لاکٹ چھپانے میں کامیاب ہوگئی تھی مگر اتفاق سے وہ لاکٹ ایک ڈاکو کی نظروں میں آگیا۔ اس نے آگے بڑھ کر عورت کے گلے پر ہاتھ ڈال دیا اور لاکٹ نوچ لیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ اچانک رک گیا۔ اس کی نظریں عورت کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔

”سردار!“ وہ چیخا ”کیا یہ خزانہ یہیں چھوڑ جاؤ گے۔ دیکھو تو یہاں کیسے قیمتی ہیرے ہیں۔“ وہ اس عورت کو کلائی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا سردار کی طرف لے جانے لگا۔

عورت بری طرح چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اسے چھڑانے کی کوشش کی تو ایک اور ڈاکو نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی رائفل کا بٹ پوری قوت سے اس کے سر پر رسید کردیا۔

ادھیڑ عمر وہ شخص چیخ کر گرا اور پھر اس کی آواز نہیں نکلی۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی تھی۔ بعض لوگوں کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ یہ جہاز کے مسافروں میں دوسرا بے گناہ تھا جو ان بے رحم ڈاکوؤں کی سفاکی کا شکار ہوا تھا۔ تقریباً دو سو افراد کا مجمع اس طرح خاموش تھا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

اور پھر فائرنگ کی آواز سے سناٹا ٹوٹ گیا۔ سردار نے رائفل اوپر اٹھا کر ایک برسٹ چلا دیا تھا۔ گولیوں کی آواز دیر تک ویرانے میں گونجتی رہی اور پھر بچوں کی چیخیں سنائی دینے لگیں۔ عورتیں خوف زدہ ہو کر مردوں کے پیچھے چھپنے لگیں مگر ان کی یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ سردار کا اشارہ پاکر چار ڈاکو آگے بڑھے اور چار عورتوں کو گھسیٹتے ہوئے مجمع سے باہر نکال لے گئے۔ وہ چاروں بے حد حسین تھیں۔ ان میں ایک کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ دوسری بائیس تیئیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے فگرز غیر معمولی تھے۔ باقی دونوں عورتوں کی عمریں تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوں گی۔ وہ بھی بے حد حسین تھیں۔

جانکی اور ناہید کے چہرے بھی خوف سے پیلے پڑ رہے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ جن عورتوں کو ڈاکوؤں نے اپنے قبضے میں لیا تھا ان کا کیا حشر ہونے والا تھا۔ میں بھی سمجھ گیا تھا کہ ڈاکو ان عورتوں کو اپنے ساتھ لے جائیں گے اور اس وقت تک ان کی بوٹیاں نوچتے رہیں گے جب تک ان میں دم باقی رہے گا اور پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔

ناہید ہم سے ذرا دور ہٹ کر دو آدمیوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ننھی ببلی بھی اس کی طرف لپکی۔ اس طرح ناہید ایک ڈاکو کی نظروں میں آگئی۔ اس نے لپک کر ناہید کو پکڑ لیا اور ایک طرف گھسیٹنے لگا۔

ببلی چیختی ہوئی ناہید سے لپٹ گئی۔ ڈاکو نے اسے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر دور پھینک دیا۔ ببلی اٹھ کر دوبارہ ماں کی طرف لپکی تو ڈاکو نے زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ وہ چیختی ہوئی اچھل کر دور جا گری۔ ایک آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور چیخ چیخ کر اس ڈاکو کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ ڈاکو بھیانک انداز میں قہقہے لگاتا ہوا ناہید کو گھسیٹتا رہا۔ ناہید اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مزاحمت کرتی رہی۔ اس کھینچا تانی میں اس کی ساڑی بھی اس کے جسم سے الگ ہوگئی تھی اور اب اس کے جسم پر صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ رہ گیا تھا۔

ناہید نے موقع پاکر دانت اس ڈاکو کے بازو پر گاڑ دیے۔ ڈاکو بلبلا اٹھا مگر ناہید نے اسے نہیں چھوڑا۔ ڈاکو نے دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار گھونسا ناہید کی کنپٹی پر رسید کردیا۔ ناہید چیخ اٹھی۔ ڈاکو کے بازو سے گوشت کا ایک لوتھڑا لٹک گیا۔ ناہید کے منہ سے بھی خون ٹپک رہا تھا۔ ڈاکو نے اپنے زخمی بازو کو دیکھا اور پھر گویا اس پر جنون سا طاری ہوگیا۔ وہ ناہید پر جھپٹ پڑا۔ اس نے ناہید کو گرفت میں لے کر دانت اس کے جسم پر گاڑ دیے۔ ناہید کی خوفناک چیخیں اور دوسرے ڈاکوؤں کے وحشت ناک قہقہے فضا میں گونج رہے تھے۔

میں اپنی جگہ پر خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھ سے عورتوں کی یہ تذلیل برداشت نہیں ہو رہی تھی مگر میں

بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھا۔ دو آدمیوں کا حشر میں دیکھ چکا تھا۔ اگر مقابلہ دست بدست ہوتا تو میں اب تک دو چار کو ڈھیر کر چکا ہوتا مگر وہ سب آتشیں اسلحے سے لیس تھے۔ ان کے ساتھ پنگا لینا خودکشی کے مترادف تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں دوسروں کی طرح خاموش تماشائی بنا رہوں۔

ایک ڈاکو نے وہ چادر سمیٹ کر ایک گٹھڑی سی بنالی جس میں مسافروں سے لوٹ کا مال جمع کیا گیا تھا۔ وہ گٹھڑی سردار کے حوالے کردی گئی۔ جہاز کی طرف سے بھی دوسرے ڈاکو واپس آگئے تھے۔ انہوں نے بھی کئی گٹھڑیاں اپنے گھوڑوں پر لاد رکھی تھیں۔ ان عورتوں کو بھی ڈاکوؤں نے اپنے گھوڑوں پر بٹھالیا تھا جنہیں مال غنیمت سمجھ کر انہوں نے اپنے قبضے میں کیا تھا۔ وہ عورتیں اگرچہ بری طرح مچل رہی تھیں لیکن ہٹے کٹے تنومند ڈاکوؤں نے انہیں قابو میں کر رکھا تھا۔

بلی اس شخص کی گود میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اس کی چیخیں دردناک تھیں۔

سردار نے ایک بار پھر ہوائی برسٹ مارا اور ہجوم کی طرف دیکھا۔

"ادھر ایک بستی ہے کئی کوس دور۔" وہ کہہ رہا تھا "ہم وہاں کے لوگوں کو بتا دیوے گا۔ وہ سویرے تک تمہاری مدد کو پہنچ جاویں گے۔ یہاں تمہیں کوئی کھترہ ناہی ہے۔ آرام سے رات گجار لو گے۔"

آرام سے رات گزار لینے والی بات اُس نے اس طرح کہی تھی جیسے ہمیں کسی بہت شاندار قسم کے ریسٹ ہاؤس میں چھوڑ کر جا رہا ہو۔ یہاں کم سے کم دو درجن افراد زخمی تھے۔ لاشوں کی تعداد تین ہو چکی تھی اور وہ ہمیں آرام سے رات گزار لینے کا مشورہ دے رہا تھا۔

تمام ڈاکو روانگی کے لیے تیار ہوگئے۔ ان کا رخ جہاز کی طرف تھا۔ شاید وہ جہاز کے قریب سے گزر کر کسی اور طرف جانا چاہتے تھے۔ وہ پانچ عورتوں کو اغوا کر کے ساتھ لے جا رہے تھے جو گھوڑوں پر لدی ہوئی تھیں اور بری طرح چیخ رہی تھیں۔

اچانک میرے پیٹ میں بڑی شدت کا مروڑ اٹھا۔ میں دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر دہرا ہوتا چلا گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنتوں میں گرہیں پڑ رہی ہوں۔ تکلیف کی شدت سے میرے جبڑے بھنچ گئے۔ یہ کیفیت چند سیکنڈ برقرار رہی پھر درد کی ایک لہر پیٹ سے سینے کی طرف منتقل ہونے لگی۔ ناف پر جو بوجھ پڑا تھا وہ بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔ درد کی وہ لہر سینے میں پہنچ کر برف کی ٹھنڈک کی طرح پورے سینے میں پھیلتی چلی گ... ...ر اس کے ساتھ ہی میں پرسکون ہوتا چلا گیا۔

"کیا ہوا۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" جانکی نے جھک کر میرا بازو پکڑ لیا۔

"کک... کچھ نہیں۔" میں آہستہ آہستہ سیدھا ہوگیا۔

اب میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کر... تھا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کی ساری قوت می... آنکھوں میں سمٹ آئی ہو۔ میں ان ڈاکوؤں کی طرف دیکھنے... جو جہاز کے قریب پہنچ چکے تھے۔

ڈاکو جہاز کے قریب رک گئے تھے۔ ایک ڈاکو دو... ڈاکو کے گھوڑے پر لدی ہوئی ناہید کو اپنے گھوڑے پر منتق... کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ان دونوں ڈاکوؤں میں ناہید کے لیے کھینچا تانی ہو... لگی۔ ناہید کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں اور پھر وہ گھوڑ... سے گر گئی۔ دونوں ڈاکو بھی گھوڑوں سے اتر آئے اور ناہی... قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوش... کرنے لگے۔

میری نظریں ایک اور ڈاکو کی طرف منتقل ہوگئیں... ڈاکو اپنے دوسرے ساتھی پر پل پڑا جس نے اپنے گھوڑ... جینز اور ٹی شرٹ والی لڑکی کو دبوچ رکھا تھا۔ وہ لڑکی بھی گر گئی اور دونوں ڈاکو بھی گھوڑوں سے اتر کر ایک دو... سے گتھم گتھا ہوگئے۔

میرے اندر کی وہ پُراسرار قوت بیدار ہوگئی تھی... حاصل کرنے کے لیے میں نے برسوں ریاضت کی تھی... کے لیے شاؤلن ٹیمپل تک کا سفر کیا تھا۔ بڑے مصائب... کٹھنائیاں اٹھائی تھیں اور اب میرے اندر کی وہ پرا... قوت میری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔

میری نظریں ڈاکوؤں کے اس گروہ میں متحرک تھیں... اب تمام ڈاکو گھوڑوں سے اتر کر ایک دوسرے سے گتھم... ہو رہے تھے۔ سردار پہلے تو چیختا رہا پھر وہ بھی اپنے ایک... پر پل پڑا۔

جہاز کے مسافر حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہے... ان کے لیے یہ ایک دلچسپ تماشا تھا۔ جو ڈاکو انہیں لو... اور ان کے درمیان سے پانچ عورتوں کو اٹھا کر لے جا... تھے۔ وہ آپس میں اس طرح لڑ رہے تھے جیسے ایک دو... کے ازلی دشمن ہوں۔

ڈاکو تو ان عورتوں کے حصول کے لیے آپس میں لڑ... تھے اور وہ پانچوں عورتیں موقع پا کر چیختی چلاتی ہوئی وہاں... بھاگ نکلیں۔

ڈاکوؤں کی دست بدست لڑائی جاری تھی اور پھر ایک فائر ہوا۔ کسی ڈاکو نے گولی چلا دی تھی اور پھر دست بدست لڑائی ایک باقاعدہ محاذ میں تبدیل ہوگئی۔ ڈاکو ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے۔

ناہید اور دوسری عورتیں گرتی پڑتی قریب پہنچ گئی تھیں۔ جانکی نے آگے بڑھ کر ناہید کو سنبھال لیا اور بلی دوڑ کر ناہید سے لپٹ گئی۔

ڈاکوؤں میں زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ چند گولیاں جہاز کی باڈی میں بھی لگی تھیں۔ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج رہی تھی اور پھر میں جیسے ہوش میں آگیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نیند سے بیدار ہوا ہوں۔ سینے پر بوجھل پن اور سر بھاری محسوس ہونے لگا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

فائرنگ کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور جہاز کے مسافر مارے خوف کے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بچوں اور عورتوں کے چیخنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

جہاز کے آس پاس گولیوں کی برسات دیکھ کر میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے جھک کر بلی کو گود میں اٹھالیا اور ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جانکی بھی ناہید کا ہاتھ پکڑے دوڑ رہی تھی۔

جہاز کے مسافر ایک ٹیلے کے پیچھے رک گئے۔ ہم بھی اسی طرف دوڑ رہے تھے۔ اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا ہو۔ جانکی اور ناہید لڑکھڑا کر گر پڑیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

ڈاکوؤں میں سے کسی کی گولی جہاز کے فیول ٹینک میں لگی تھی اور فیول ٹینک ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جہاز کے پرخچے اڑ گئے۔ تاریک فضا روشن ہوگئی۔ آگ کے شعلے اور دھوئیں کے بادل آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ہوا میں اڑتے ہوئے جہاز کے ٹکڑے ادھر اُدھر گرنے لگے۔ ایک جلتا ہوا ٹکڑا ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر گرا۔ کچھ اور ٹکڑے آس پاس گر رہے تھے۔

"بھاگو یہاں سے!" میں چیخا۔

ناہید اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے بلی کو گود میں سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے ناہید کو سہارا دے کر اٹھا دیا۔

"جانکی! ناہید کو سنبھالو اور اس ٹیلے کے پیچھے پہنچنے کی کوشش کرو۔ جلدی کرو۔"

ہم لوگ دوڑتے ہوئے ٹیلے کے پیچھے پہنچ گئے۔ جہاز کے بہت سے مسافر اسی ٹیلے کے پیچھے پناہ لیے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ کسی اور طرف بھاگ گئے تھے۔

"رکو مت۔ اسی طرف چلتی رہو۔" میں نے جانکی اور ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں ٹیلے کے دوسری طرف پہنچ کر بھی رکے بغیر چلتے رہے۔ میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا۔ جہاز اگرچہ اب نظر نہیں آ رہا تھا مگر اٹھتے ہوئے شعلے دکھائی دے رہے تھے۔ فضا میں نارنجی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

ہم تیز تیز چلتے ہوئے لوگوں سے دور پہنچ گئے۔ آگے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ہم کبھی ان ٹیلوں کے گرد گھومتے ہوئے چلنے لگتے اور کبھی کسی ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جاتے۔

میں ایک ٹیلے پر رک گیا اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ ہم وہاں سے تقریباً دو میل دور نکل آئے تھے۔ جہاز سے اٹھنے والے شعلے اب دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس طرف ایک محدود حصے میں مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

جانکی کی سانس پھول گئی تھی اور اس کے قریب ریت پر بیٹھی ہوئی ناہید ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں نے بلی کو گود سے اتار دیا۔ وہ دوڑ کر ناہید سے لپٹ گئی۔

پندرہ بیس منٹ وہاں رکنے کے بعد ہم ٹیلے کے دوسری طرف اترنے لگے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جہاز کے مسافر وہیں رکے رہ گئے تھے یا ہماری طرح وہ بھی اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے۔ اصولی طور پر تو ہمیں بھی ان لوگوں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا لیکن کسی غیبی قوت نے مجھے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کردیا تھا اور جانکی تو میرے ساتھ تھی ہی، ناہید اور اس کی بیٹی کو بھی ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں کس طرف جانا چاہیے تھا۔ صحرا میں کسی راستے کا تعین ممکن نہیں تھا اور پھر تاریکی میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جانکی، ناہید اور بلی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانا اب میری ذمے داری تھی۔ فوری طور پر تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ذمے داری کو کس طرح پورا کیا جائے۔ میرے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ ہم چلتے رہیں۔ ہوسکتا ہے اس ریگستان میں کوئی ایسی بستی ہو جہاں ہمیں پناہ مل سکے۔ ایک موقع پر جب جہاز منہ کے بل زمین کی طرف آ رہا تھا تو ایک بہت بڑی جھیل نظر آئی تھی۔ اگرچہ جہاز سیدھا ہو

کر چند منٹ میں ہی وہاں سے میلوں دور نکل گیا تھا اور پھر یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ جھیل کس طرف رہ گئی تھی لیکن دل میں امید تھی کہ شاید ہم اس طرح چلتے چلتے اس جھیل تک پہنچ جائیں۔ صحراؤں میں پانی کے کسی ذخیرے یا کسی جھیل کے آس پاس کوئی نہ کوئی آبادی ضرور ہوتی ہے اور یہ امید ہی ہمیں کشاں کشاں لیے جارہی تھی اور پھر ڈاکوؤں کے سردار کی بات بھی رہ رہ کر میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں سے کوسوں دور ایک بستی ہے۔ اس بستی کے لوگوں نے جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا تھا اور ممکن ہے وہ صبح تک ہماری مدد کو پہنچ جائیں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ان ڈاکوؤں نے بھی یقیناً جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا ہوگا اور اسی لیے گھوڑوں پر سوار ہو کر اس طرف آئے تھے۔ ان کا مقصد جہاز کے مسافروں کی مدد کرنا نہیں انہیں لوٹنا تھا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ عین آخری لمحوں میں جب وہ مسافروں اور جہاز سے لوٹا ہوا مال اور پانچ عورتوں کو اٹھا کر فرار ہو رہے تھے' میرے اندر کی وہ پُراسرار قوت (جی) بیدار ہو گئی اور یہ اسی پُراسرار قوت کا کرشمہ تھا کہ ڈاکو آپس میں لڑ پڑے تھے۔ وہ پُراسرار قوت سمٹ کر میری آنکھوں میں جمع ہو گئی تھی اور میں نے اپنی نظروں کی قوت سے کام لے کر ان ڈاکوؤں کو آپس میں لڑا دیا تھا لیکن یہ بات تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کی کوئی گولی جہاز کے فیول ٹینک میں لگ جائے گی اور جہاز تباہ ہو جائے گا۔

مجھے یاد آرہا تھا کہ وہ ڈاکو اسی طرف سے آئے تھے جس طرف ہم جا رہے تھے۔ ہو سکتا ہے ڈاکوؤں کا ٹھکانا زیادہ دور نہ ہو۔ چند میل... اور چند میل کا یہ فاصلہ چند گھنٹوں میں طے ہو سکتا تھا بشرطیکہ ہم صحیح سمت میں چلتے رہیں۔

آسمان پر گہرے بادل تھے جن کی وجہ سے تاریکی کچھ اور بھی دبیز ہو گئی تھی۔ ہوا اگرچہ بہت پہلے تھم چکی تھی لیکن مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں بارش شروع نہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ہمیں کہیں پناہ نہ ملتی۔

لیکن ایک اور انکشاف نے میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہر سی دوڑا دی۔ مجھے اگرچہ اس کا تجربہ نہیں تھا لیکن سنا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ ریگستان کے دن گرم اور راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ صحرائی علاقوں میں دن کے وقت دماغ پگھلا دینے والی گرمی پڑتی ہے تو رات کو جسم میں خون منجمد کر دینے والی سردی ہوتی ہے۔ مجھے اس کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے ہلکی سی خنکی تھی جس میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ ہمارے لباس بھی ایسے نہیں تھے کہ سردی کی شدت کا مقابلہ کر سکتے۔ میں نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جانکی نے بھی ایسا ہی لباس پہنا ہوا تھا۔ ببلی کے جسم پر گھٹنوں تک لمبا فراک تھا اور سفید موزے پنڈلیوں تک چڑھے ہوئے تھے جبکہ ناہید کے جسم پر صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ تھا۔ اس کی ساڑی تو ڈاکو کے ساتھ کھینچا تانی میں اتر کر گر گئی تھی۔

ہم بہت دور نکل آئے تھے۔ میں نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے کہیں مدھم سی روشنی بھی نظر نہیں آئی۔ جہاز کی آگ یا تو بجھ گئی تھی یا ہم نشیبی علاقے میں آ گئے تھے جس کی وجہ سے وہ خطہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

آگے ریت نرم تھی جس کی وجہ سے تیز چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ جہاں تک زمین سخت تھی ہمارے چلنے کی رفتار بھی تیز تھی لیکن نرم ریت کی وجہ سے ہماری رفتار کم ہو گئی تھی۔ جانکی اور ناہید تھک گئی تھیں۔ وہ بار بار رک کر ہانپنے لگتیں لیکن میں انہیں چلتے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وقت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میرے خیال میں ہمیں چلتے ہوئے کم سے کم چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد جہاز تباہ ہوا تھا اور اس کے فوراً ہی بعد ہم بھاگ نکلے تھے۔ اس طرح ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا کوئی وقت ہوگا۔

ناہید چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر گئی۔ جانکی نے پہلے تو اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن پھر خود بھی ڈھیر ہو گئی۔ ظاہر ہے مجھے بھی رک جانا پڑا۔ اس وقت میں نے ببلی کو کسی دیہاتی کی طرح کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے اسے نیچے اتارا تو وہ اپنی ماں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔

"اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" ناہید نے ہانپتے ہوئے کہا "تم لوگ جاؤ میں تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔"

"یہ شہر کی کوئی سڑک نہیں ریگستان ہے۔" میں نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "یہاں تو دن کی روشنی میں کسی سمت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تم رات کی تاریکی میں ہمیں کیسے تلاش کرو گی۔"

"مجھ سے اب بالکل نہیں چلا جاتا۔" وہ کراہتے ہوئے بولی "سینے میں درد ہو رہا ہے اور سردی بھی لگ رہی ہے۔ تم لوگ جاؤ۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" میں نے کہا "ہم تمہیں رات کی تاریکی میں اس ویرانے میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔ یہاں بیٹھے رہنے سے تو اور زیادہ سردی لگے گی۔ چلتی رہو گی تو خون میں حرارت پیدا ہوگی۔"

مگر ناہید نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ ہانپتی اور کراہتی رہی۔ جانکی بھی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ دونوں اپنی کیفیت پر کسی حد تک قابو پانے میں کامیاب ہو سکی تھیں۔ میں نے ببلی کو ایک بار پھر کندھے پر اٹھالیا اور اس طرح ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا مگر اب ہمارے چلنے کی رفتار کچھ اور سست ہو گئی تھی۔ وہ دونوں بار بار رک جاتیں۔

ناہید ایک بار پھر گر گئی۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو چونک گیا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹی شرٹ اتار کر اسے پہنا دی۔

میرے جسم پر بنیان رہ گئی تھی۔ سردی اگرچہ مجھے بھی لگ رہی تھی مگر میں برداشت کر سکتا تھا۔ پچھلے کئی برسوں کے دوران میں مارشل آرٹ کی ریاضت نے مجھے اس قدر سخت جان بنا دیا تھا کہ میں موسم کی سختیاں برداشت کر سکتا تھا اور پھر میرے اندر وہ پُراسرار قوت پوشیدہ تھی جو مجھے موسم کی شدت سے بچا سکتی تھی۔ میرا مطلب جی کی قوت سے تھا۔ میں اس پُراسرار قوت کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ یہ قوت تو ہر جاندار کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جسے یہ قوت اجاگر کرنے کے لیے خاصی ریاضت کرنی پڑتی ہے اور بہت کم لوگ اس میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ اپنی ریاضت' خود اعتمادی اور ماسٹر ہنگ پائی اور ماسٹر لیشی یان کی توجہ اور محنت سے اپنے اندر پوشیدہ اس پُراسرار قوت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس قوت کے بل بوتے پر میں نے ڈاکوؤں کو آپس میں لڑنے پر مجبور کر دیا تھا (لیکن جہاز کی تباہی کا مجھے افسوس تھا) اور اب میرے اندر کی یہی پُراسرار قوت مجھے موسم کی سختی سے بچا سکتی تھی۔

جانکی کی حالت بھی اب غیر ہو رہی تھی۔ مسلسل چلتے رہنے سے ٹانگیں تو شل ہو رہی تھیں اب اس پر بھی سردی کا اثر ہونے لگا تھا۔ ببلی بھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے سینے سے لپٹا رکھا تھا۔ تاکہ میرے جسم کی حرارت سے تھوڑی بہت گرمی پہنچاتی رہے۔

اب پھر سخت زمین شروع ہو گئی تھی۔ میں ان دونوں کو چلتے رہنے پر مجبور کرتا رہا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ ناہید تو قدم قدم پر لڑکھڑا کر گر رہی تھی۔ جانکی اپنی حالت غیر ہونے کے باوجود اسے سنبھالے ہوئے تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے سینے سے لپٹی ہوئی ببلی بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ناہید سے اب واقعی نہیں چلا جا رہا تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا کر گر رہی تھی۔ جانکی اسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے خود بھی ڈگمگا رہی تھی۔

ایک موقع پر چلتے ہوئے میرے پیر کو ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر گیا۔ ببلی بھی میرے ساتھ ہی گری تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ ہمارے سامنے جھاڑیاں تھیں اور ببلی جھاڑیوں میں گری تھی۔ اس طرح وہ چوٹ لگنے سے محفوظ رہی تھی۔

مجھے پہلی مرتبہ جھاڑیوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل میں امید کی ایک کرن سی جاگ اٹھی۔ جھاڑیاں یا سبزہ وغیرہ تو اسی جگہ ہوتا ہے جہاں زمین میں پانی موجود ہو اور ان جھاڑیوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ قرب و جوار میں کوئی جھیل یا دریا موجود ہے۔ وہ دریا یا جھیل کہیں آس پاس بھی ہو سکتی تھی اور میلوں دور بھی۔ بہرحال' ایک امید بندھی تھی۔

میں نے ببلی کو گود میں اٹھالیا اور ناہید اور جانکی کی حوصلہ افزائی کرتا ہوا آگے چلنے لگا۔ وہ دونوں بڑی مشکل سے میرا ساتھ دے رہی تھیں۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو اب تک کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ تقریباً ایک گھنٹے مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے اور خوش قسمتی سے چند کھنڈر بھی نظر آگئے۔ یہاں یقیناً کسی زمانے میں کوئی بستی رہی ہوگی جو امتدادِ زمانہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ناہید اور جانکی ایک جگہ پر ڈھیر ہو گئیں۔ میں نے ببلی کو بھی ان کے قریب بٹھا دیا اور خود کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگا جہاں سردی سے محفوظ رہا جا سکے۔

یہ بستی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ کوئی مکان سلامت نہیں تھا۔ ٹوٹی پھوٹی دیواریں رہ گئی تھیں۔ البتہ ان مکانوں سے ذرا ہٹ کر ایک ٹوٹا پھوٹا مندر بھی تھا۔ یہ عمارت مکمل طور پر تباہ نہیں ہوئی تھی اور اس میں پناہ لی جا سکتی تھی۔

میں جانکی وغیرہ کو مندر میں لے آیا۔ گہری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم شکستہ دروازے میں داخل ہو کر ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ببلی کو جانکی

نے گود میں لے لیا تھا۔

اب مجھے بھی تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ ہم رات بھر چلتے رہے تھے۔ اس وقت آگے بڑھتے رہنے کا جذبہ تھا اور تھکن کا احساس نہیں ہوا تھا مگر اب پڑاؤ پر پہنچتے ہی میرا حوصلہ دم توڑ گیا اور قویٰ مضمحل ہونے لگے۔

میں نے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے دائیں طرف جانکی بیٹھی ہوئی تھی اور بائیں طرف ناہید تھی۔ وہ دونوں گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں۔

اندر کی فضا باہر کے مقابلے میں بہت بہتر تھی بلکہ نہایت خوشگوار تھی۔ سردی کا احساس بھی بتدریج کم ہو رہا تھا۔

میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ ناہید مسلسل کراہ رہی تھی۔ اس کے کراہنے کی ہلکی ہلکی آوازیں میری سماعت سے ٹکراتی رہیں لیکن پھر وہ آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ میں نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو بستر خاک پر دراز پایا۔ ناہید میرے بازو پر سر رکھے اس طرح سو رہی تھی کہ اس کا ہاتھ میرے سینے پر تھا اور گھٹنے دہرے ہو کر پیٹ سے ملے ہوئے تھے۔

دن کی روشنی ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک آنکھیں مچ مچا کر صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے دوسری طرف بلی بھی گرد آلود فرش پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ جانکی مجھے نظر نہیں آئی۔ میں نے ناہید کو اپنے آپ سے الگ ہٹایا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مندر کا ہال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک طرف ٹوٹا پھوٹا سا چبوترہ تھا۔ ہر طرف مکڑی کے جالے تنے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ایک چمگادڑ بھی پر پھڑپھڑاتی ہوئی باہر نکل گئی لیکن چند سیکنڈ بعد ہی واپس آگئی اور چھت کے قریب ایک دو چکر لگانے کے بعد کسی تاریک گوشے میں غائب ہوگئی۔

جانکی ہال میں موجود نہیں تھی۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ آسمان پر بادل چھٹ گئے تھے اور سورج چمک رہا تھا۔ تیز دھوپ میں ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں اور جب میری آنکھیں تیز روشنی سے مانوس ہوئیں تو میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بائیں طرف بستی کے کھنڈر تھے اور سامنے تقریباً سو گز کے فاصلے پر وہ جھیل تھی۔ جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ جھیل کے کناروں پر ناریل یا اس سے ملتے جلتے درخت بھی تھے مگر بالکل ٹنڈ منڈ۔ سوکھے ہوئے۔

جانکی باہر بھی کہیں دکھائی نہیں دی۔ میری پریشانی بڑھنے لگی۔ وہ کہاں جاسکتی ہے؟

”جانکی۔۔۔!“ میں نے زور سے پکارا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ دوسری آواز کے بعد جانکی کھنڈروں کی طرف سے آتی ہوئی دکھائی دی تو مجھے اطمینان ہوا۔

ایک بہت بڑے سیاہ بادل نے سورج کو ڈھانپ لیا۔ میں جانکی کے ساتھ چلتا ہوا جھیل کے کنارے پر آگیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ یہ بستی ویران کیوں ہوئی تھی۔ جھیل کا پانی کڑوا تھا۔

ہوسکتا ہے کسی زمانے میں جھیل کا پانی میٹھا رہا ہو۔ جس کی وجہ سے یہاں یہ بستی بھی آباد تھی لیکن شاید کسی وجہ سے پانی کا ذائقہ تبدیل ہوگیا ہو۔ ہوسکتا ہے زیر زمین نمکین پانی کی کوئی رگ جھیل کے پانی سے مل گئی ہو اور اس طرح جھیل کا سارا پانی نمکین ہوگیا۔ یہ پانی کڑوے پن کی حد تک نمکین تھا اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ یہاں کی آبادی کسی اور جگہ منتقل ہوگئی تھی اور یہ بستی ویران ہوگئی تھی۔

میں اور جانکی جھیل کے کنارے پر کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ مندر کی طرف سے ناہید کی چیخ کی آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ ناہید کی وہ چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں نے مندر کی طرف دوڑ لگا دی۔ جانکی بھی میرے پیچھے دوڑی آرہی تھی۔

ناہید کے ساتھ اب بلی کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں مندر کے دروازے میں داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر اس طرح رک گیا جیسے زمین نے پیر پکڑ لیے ہوں۔ ناہید اور بلی ایک طرف کھڑی بری طرح چیخ رہی تھیں اور سامنے گرد آلود فرش پر ایک آدمی بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

اس آدمی کو بلاشبہ کسی بھوت یا عفریت سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔ جسم کے نچلے حصے پر میلی سی دھوتی لپٹی ہوئی تھی۔ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ اس کی رنگت توے جیسی سیاہ اور سینہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح آپس میں ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ ماتھے پر سفید دھاریاں (تلک) سی بنی ہوئی تھیں۔ اس کے قریب ہی ایک ترشول بھی پڑا ہوا تھا۔ اس کے گلے میں کپڑے کے ایک تھیلے کا اسٹریپ بھی نظر آرہا تھا اور تھیلا شاید اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔

”کیا ہوا۔۔۔ کون ہے یہ؟“ میں حیرت سے اس شخص کی

طرف دیکھ رہا تھا۔ جانکی نے لپک کر بلی کو گود میں اٹھالیا اور اسے چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے ناہید کو دونوں بانہوں سے پکڑلیا اور پھر اس کی شرٹ پر خون کے دھبے دیکھ کر میں اچھل پڑا ”یہ یہ کیا۔۔۔ یہ خون۔۔۔“

”یہ ایک الگ معاملہ ہے۔“ ناہید نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا ”پہلے اس کو دیکھو۔ وہ پ۔۔۔ پتا نہیں کون ہے۔“

”لیکن یہ وحشی آیا کہاں سے؟“ میں نے کہا۔

”پ۔۔۔ پتا نہیں۔“ ناہید ہکلائی ”میں سو رہی تھی کہ سینے پر بوجھ محسوس کرکے میری آنکھ کھل گئی۔ یہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ اس کی خوفناک شکل دیکھ کر میں چیخ اٹھی۔ میں نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور جب یہ دوبارہ میری طرف بڑھا تو میں نے قریب پڑا ہوا وہ پتھر اٹھا کر دے مارا۔ یہ چوٹ کھا کر گر پڑا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا تو تم دونوں غائب تھے۔ میری چیخ سن کر بلی بھی جاگ گئی اور اس وحشی کو دیکھ کر یہ بھی خوف سے چیخنے لگی۔ تم دونوں کہاں چلے گئے تھے ہمیں چھوڑ کر؟“

”اوہ!“ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے آخری الفاظ جس شاکی لہجے میں کہے تھے اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ہمیں محض وقتی ہم سفر نہیں اپنا ساتھی سمجھنے لگی تھی ”اسے تو میں بعد میں دیکھوں گا مگر تمہاری شرٹ پر خون کے یہ دھبے کیسے ہیں؟ اگر ہوائی جہاز کی کریش لینڈنگ کے دوران میں تمہیں کوئی چوٹ لگی تھی تو تم نے بتایا کیوں نہیں تھا۔“

”مجھے چوٹ نہیں لگی تھی۔“ ناہید نے جواب دیا ”جب وہ ڈاکو مجھے اٹھا کر لے جارہا تھا تو میں نے اس کے بازو پر دانتوں سے کاٹ لیا تھا۔ جس کا بدلہ لینے کے لیے اس نے خون خوار بھیڑیے کی طرح میرے سینے پر دانت گاڑ دیے تھے۔ میں رات بھر تکلیف میں مبتلا رہی ہوں۔ پیدل چلتے رہنے سے تکلیف کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ اس وقت بھی بڑی اذیت محسوس کر رہی ہوں۔“

اس اذیت اور کرب کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جاسکتا تھا۔ رات کو راستے میں، میں نے کئی بار اسے کراہتے ہوئے سنا تھا اس وقت میں نے کوئی خیال نہیں کیا تھا میں تو یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ سردی اور تھکن سے کراہ رہی تھی لیکن اب مختلف صورت حال سامنے آئی تھی۔ اسے سردی سے بچانے کے لیے میں نے اپنی ٹی شرٹ پہنادی تھی جو اب خون آلود ہو چکی تھی۔

”جانکی۔ تم ناہید کو باہر لے جا کر دیکھو۔ زخم زیادہ خطرناک تو نہیں۔ میں اس وحشی کو دیکھتا ہوں۔“ میں نے جانکی سے کہا اور وہ ناہید اور بلی کو لے کر مندر سے باہر چلی گئی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر زخم زیادہ خطرناک بھی ہوا تو ہم کیا کرسکیں گے۔ آبادی سے دور اس ویرانے میں اس کا علاج تو نہیں ہوسکتا تھا۔

میں اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش اور بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ اس کڑوے پانی کی جھیل کے آس پاس تو کسی قسم کی زندگی کے آثار نہیں تھے البتہ نواح میں کوئی بستی ضرور موجود ہوگی۔ اس شخص کا تعلق بھی اسی بستی سے ہوگا۔

اور پھر اچانک میں چونک گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس شخص نے ایک آنکھ میں ذرا سی جھری پیدا کرکے میری طرف دیکھا ہو۔ یہ میرا واہمہ بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے اس کے پیر پر ہلکی سی ٹھوکر ماردی۔

”اگر تم ہوش میں آچکے ہو تو شرافت سے اٹھ جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں اپنے طریقے سے ہوش میں لانے کی کوشش کروں گا۔“ میں نے اس کے پیر پر ایک اور ہلکی سی ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے نہ صرف قریب پڑا ہوا ترشول اٹھالیا بلکہ مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش بھی کی۔

مجھے اس وحشی سے اس اقدام کی توقع نہیں تھی لیکن بہرحال میں غافل بھی نہیں تھا۔ اس نے ترشول سے میرے پیٹ پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں برق سرعت سے ایک طرف ہٹ گیا اور ترشول کو پنجے کے پیچھے ڈنڈے سے پکڑلیا۔

ترشول کا ڈنڈا تقریباً چار فٹ لمبا تھا۔ دوسرا سرا اس وحشی کے ہاتھ میں تھا۔ میں ترشول کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ وہ شخص بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن ترشول کا ڈنڈا اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ میں اسے اپنی طرف کھینچنے لگا اور پھر اس نے وہی حربہ استعمال کیا جو ایسے موقع پر کیا جانا چاہیے تھا۔ اس نے اچانک ہی ڈنڈا ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا، اس نے

میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی وزنی چٹان میرے اوپر گری ہو۔ میں اس کے بوجھ کے نیچے دب گیا۔ وہ دونوں ہاتھ میرے گلے پر دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیوں پر ہاتھ جما دیے اور اس کے پنجوں کو اپنے گلے سے دور رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ناخن بھیڑیے کے پنجوں کی طرح نکیلے تھے اگر وہ میرے گلے تک پہنچ جاتے تو یقیناً میرا نرخرا ادھیڑ کر رکھ دیتے۔

میں آہستہ آہستہ اپنی ٹانگیں دہری کرنے لگا اور پھر پیر اس کے پیٹ پر جما کر اسے پوری قوت سے اوپر اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا پشت کے بل پیچھے گرا۔

میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ دونوں پنجے پھیلا کر کسی بھیڑیے ہی کی طرح غراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ اس کی آنکھیں اس قدر سرخ تھیں جیسے خون ٹپک رہا ہو۔

وہ مجھے گرفت میں لینے کے لیے لپکا مگر میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل گیا۔ میں نے پیچھے سے اس کے کولھے پر ایک زوردار کک رسید کردی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس کی پیشانی پر پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی تھی۔ دیوار سے سر ٹکرانے سے ایک اور چوٹ لگی تو وہ بلبلا اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ پلٹ پڑا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ سانڈ کی طرح طاقت ور تھا۔ اس پر قابو پالینا کوئی آسان نہیں تھا اور اس وقت تو وہ سانڈ ہی کی طرح بپھر گیا تھا۔ وہ پھنکارتا ہوا آگے بڑھا تو میں طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔

میری فلائنگ کک اس کے سینے پر لگی، وہ بلبلا اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈھیر ہو جائے گا لیکن وہ محض لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر پھر میری طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اس کے پیٹ پر اسٹریٹ کک رسید کردی۔ وہ ذرا سا آگے جھکا تو میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سائڈ کک لگائی اور پھر سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر ککس برساتا رہا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ گوشت کے اس پہاڑ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے ایک اور فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی تو اس کا داؤ چل گیا۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری دونوں ٹانگیں پکڑ لیں اور مجھے الٹا لٹکا دیا۔ میں بھی اچھے قد کاٹھ اور تن و توش کا مالک تھا لیکن اس نے مجھے چوہے کی طرح اپنے سامنے الٹا لٹکا رکھا تھا۔

میرا سر اس کے پیروں سے چند انچ اوپر تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے ٹخنوں سے ذرا اوپر پنڈلیوں پر جما دیے اور اسے اپنی جگہ سے ہلانے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ میں اس کی ٹانگوں کو زور زور سے جھٹکے دیتا رہا مگر میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔

اس نے میری ٹانگوں کو جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ پہلے میرا سر زمین سے ٹکرایا پھر میں پورے قد کے ساتھ کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گرا۔

ایک لمحے کو تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری گردن کندھوں کے اندر دھنس گئی ہو۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس وحشی نے پیر میرے سینے پر رکھ دیا۔

مجھے سینے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ میرے سینے پر پیر کا بوجھ بڑھاتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دوسرا پیر زمین سے اٹھا رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی اور پھر اچانک مجھے یاد آگیا کہ شاؤلن ٹیمپل میں جب میں نے اپنے اندر چی کی قوت پر قابو پایا تھا تو کئی من وزنی پتھر سینے پر رکھ کر ہتھوڑی سے تڑوایا تھا۔ وہ میری چی کی قوت تھی جس نے اس وقت نہ تو مجھے سینے پر پتھر کا بوجھ محسوس ہونے دیا تھا اور نہ ہی وزنی ہتھوڑوں کی ضرب۔ وہ سب کچھ یاد آتے ہی میں نے اس وقت بھی چی کی قوت سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سانس روک لیا اور جب گہرا سانس لیا تو میری مشکل حل ہو چکی تھی۔ وہ اب میرے سینے پر اپنا پورا بوجھ ڈال رہا تھا لیکن اب میں نہ تو سینے پر دباؤ محسوس کر رہا تھا اور نہ ہی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا دوسرا پیر زمین سے چھ انچ کے قریب اوپر اٹھا ہوا تھا۔ میں نے وہ پیر پکڑ لیا اور پوری قوت سے موڑتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ وہ اچھل کر پیچھے گرا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس پر حملہ کرتا، وہ پہل کر گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے لپک کر مجھے گرفت میں لے کر سر سے اوپر اٹھا لیا اور پوری قوت سے ایک طرف اچھال دیا۔

میں دیوار سے ٹکرا کر دھد کی آواز سے نیچے گرا۔ دیوار سے ٹکرانے اور نیچے گرنے سے میرے اندر کا سارا سسٹم ہل کر رہ گیا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میرے سنبھلنے سے پہلے اس نے پھر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ وہ میرے

جسم پر تابڑ توڑ ٹھوکریں برسا رہا تھا۔

ایک ٹھوکر میرے سر پر لگی۔ میرا دماغ بل کر رہ گیا۔ پہلے آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں اور پھر اندھیرے کی چادر پھیلنے لگی۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ مجھے اپنے آپ کو سنبھالنا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر میرے حواس مختل ہو گئے تو وہ میری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے۔

میں سر کو زور زور سے جھٹکتا رہا۔ میری یہ کوشش بار آور ثابت ہو رہی تھی۔ تاریکی چھٹنے لگی۔ میرے حواس بحال ہو رہے تھے۔ میں بمشکل سنبھل پایا تھا کہ اس نے زمین پر پڑا ہوا ترشول اٹھا کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ترشول کی اگلی تینوں نوکیں زمین میں پیوست ہو گئیں۔ اگر مجھے وہاں سے ہٹنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ ترشول میرے سینے کے آرپار ہو چکا ہوتا۔

ترشول زمین میں گڑا ہوا تھا۔ اس کا دستہ اب بھی اس وحشی کی گرفت میں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ ڈنڈے کے درمیانی حصے پر جما دیے اور پوری قوت سے اچھل کر دونوں پیروں کی بھرپور کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

میرا یہ وار کارگر ثابت ہوا۔ وہ بلبلا اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ترشول ابھی تک زمین میں گڑا ہوا تھا۔ میں نے ڈنڈے سے پکڑ کر ترشول کو کھینچ لیا اور اپنے حریف کی طرف لپکا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک پیر اس کے پیٹ پر رکھ دیا اور ترشول کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔

وہ شخص اب مکمل طور پر میرے رحم و کرم پر تھا۔ میرے ہاتھوں کا ایک مضبوط جھٹکا اس کی زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ اس نے بھی شاید صورت حال کو بھانپ لیا تھا۔ اس کا چہرہ خوف کی شدت سے کچھ اور سیاہ پڑ گیا۔ سرخ انگارا آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی اور پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھیک مانگتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہمارے کو مت مارو بھایا۔ ہم تمہارا کیا بگاڑت ہے۔ چھما کر دیو ہم کا۔"

اچانک ایک اور خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ ہم لوگ جہاز کی تباہی کی جگہ سے کتنی دور نکل آئے تھے اور یہ کون سی جگہ تھی۔ کوئی بستی یہاں سے کتنی دور تھی۔ یہ شخص ہماری امیدوں کا واحد مرکز تھا۔ یہی ہمیں کسی آبادی تک لے جا سکتا تھا اگر اسے مار دیا تو ہم پھر ویرانے میں بھٹکتے رہیں گے۔ ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ میرا اسے جان سے مار دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو اس بات پر غصہ آگیا تھا کہ پہلے اس نے سوئی ہوئی ناہید کو مال غنیمت سمجھ کر اس پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے قریب پڑا ہوا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ پتھر کنپٹی پر کسی نازک جگہ پر لگا تھا جس سے وہ وقتی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر ہوش آجانے پر بھی وہ بے ہوشی کا مکر کیے رہا اور مکاری سے کام لیتے ہوئے اس نے ترشول سے مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اگر میں غافل ہوتا تو اس کے پہلے ہی حملے میں مارا جاتا اور اب وہ میرے سامنے پڑا مجھ سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

"اس عورت نے کیا قصور کیا تھا کہ تم اسے مارنا چاہتے تھے یا۔۔۔"

"ہم اس ناری کو مارنا نہیں چاہت تھا۔ کچھ بھی کرن کو نہیں تھا۔" وہ گھگیایا "ہم تو اس کو دیکھ کر حیران ہو وہت تھا کہ وہ اس ویران مندر میں کہاں سے آئی رہت ہے۔ ہم تو دیکھن کو جھکت گیا تھا۔ رام قسم۔۔۔ ہم اس ناری کو کچھ کرن کا نہیں تھا۔"

"پھر تم نے مجھ پر حملہ کیوں کیا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہم کا غلطی ہو گئی۔ چھما کر دو نا۔" وہ بولا "رام بھلی کرے گا۔ ہم اس کا پرائسچت کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے پیٹ پر سے پیر ہٹا لیا "لیکن اگر تم نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں وچن دیوت ہوں بھایا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا "تم مہان ہو جایا۔ تم نے ہم کا جیون دان کر دیا۔ ایک گریب سنیاسی کا جیون دان کر دیا۔ بھگوان تمہاری رکھشا کرے گا۔"

وہ راجستھانی زبان بول رہا تھا۔ اس کے بعض الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے لیکن میں اس کی باتوں کا مفہوم بخوبی سمجھ رہا تھا۔

میں اسے اٹھا کر مندر سے باہر لے آیا۔ ترشول میرے ہاتھ میں تھا لیکن مجھے توقع تھی کہ اب وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ ایک اور بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی کہ ہماری اس دھینگا مشتی اور اٹھا پٹخ کے باوجود کپڑے کا وہ میلا سا تھیلا ابھی تک اس کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔

باہر دھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی تیز دھوپ چمکنے لگتی۔ ناہید اور جانکی

مندر کی عمارت سے بیس پچیس گز دور ایک جگہ بیٹھی ہوئی تھیں، بلی بھی ان کے قریب موجود تھی۔

اس وحشی کو میرے ساتھ دیکھ کر ناہید کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے لہرا گئے۔

"اب اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "یہ ہمارا مطیع ہو چکا ہے۔ اب یہ کوئی حرکت نہیں کرے گا۔"

ترشول بھی میرے ہاتھ میں تھا اس لیے ناہید کچھ مطمئن ہو گئی۔ البتہ بلی ڈر کر اپنی ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔

اس وحشی نے ناہید اور جانکی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور معافی مانگنے لگا اور پھر وہ بتانے لگا کہ یہ سب کچھ ایک غلط فہمی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ پچھلی طرف کے راستے سے مندر کی عمارت میں داخل ہوا تو ایک عورت اور ایک بچی کو زمین پر پڑے دیکھ کر حیران ہو گیا تھا اور پھر ناہید کی قمیص پر خون کے دھبے دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے ہی اس پر جھکا تھا کہ ناہید کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے چیخنے سے سنیاسی اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور ناہید نے قریب پڑا ہوا پتھر اٹھا کر اس پر دے مارا۔ جس سے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور بعد میں بھی جو کچھ ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا تھا اور اب وہ باری باری ان دونوں سے معافی مانگ رہا تھا۔

"ناری کے سینے پر زخم کیسا ہے بھایا۔ یہ کیسے گھائل ہوئی تھی؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ زخم کیسے لگا تھا تو اس نے فوراً ہی گلے میں لٹکا ہوا تھیلا اتار لیا اور زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھیلے میں سے تین چار چھوٹی چھوٹی ڈبیاں نکال لیں اور پھر ایک ڈبیا منتخب کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کچھ کہنے لگا۔

وہ ناہید کے سینے کا زخم دیکھنا چاہتا تھا مگر ناہید اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے ڈبیا جانکی کے ہاتھ میں تھما دی اور اسے بتانے لگا کہ اس میں سے تھوڑا سا مرہم نکال کر اس کے زخم پر لگا دے۔ جانکی ناہید کو وہاں سے کچھ دور لے گئی اور ایک شکستہ دیوار کی آڑ میں بیٹھ کر اس کے زخم پر مرہم لگانے لگی۔ چند منٹ بعد وہ واپس آ گئی۔ جانکی نے ڈبیا سنیاسی کو لوٹا دی۔ سنیاسی نے بتایا کہ اس علاقے میں سانپ اور بچھو بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دوسری ڈبیوں میں ایسے مرہم موجود ہیں کہ زہریلے سے زہریلے سانپ یا بچھو کے کاٹے کے زخم پر فوری طور پر لگا دیا جائے تو زہر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

اس کا نام واسو دیو تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ سنیاسی تھا اور بعض دواؤں کی تیاری کے لیے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس طرف آتا رہتا ہے۔ بہت سی دواؤں کی تیاری میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں ایسے علاقوں میں پائی جاتی ہیں جہاں کھارا پانی ہو۔ یہاں ایک ایسی بوٹی بھی پائی جاتی ہے جس سے تیار کی جانے والی دوا سے مرگی کا کامیاب علاج کیا جاتا ہے۔

"اور بھایا۔" وہ میری طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں بولا "یہاں ایسے چھوٹے چھوٹے جانور بھی پائے جاوت ہیں جن کی چربی سے تیار ہونے والی دوا سو سالہ بڈھے کو بھی اٹھارہ سال کا جوان بنا دیوت ہے۔ راجستھان کے بڑے بڑے راجے مہاراج ہم سے یہ دوا خریدت ہیں۔"

"تم کہاں سے آئے ہو؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "میرا مطلب ہے قریب ترین بستی یہاں سے کتنی دور ہے۔"

"ادھر پانچ کوس کی دوری پر ایک چھوٹی سی بستی ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

اس کے کہنے کے مطابق وہ بستی چند گھروں پر مشتمل تھی جبکہ اس سے دس بارہ کوس آگے ایک اور بڑا گاؤں ہے۔ وہ خود جودھ پور کا رہنے والا ہے اور جڑی بوٹیوں اور اپنی دواؤں کی تیاری کے لیے ان چھوٹے چھوٹے جانوروں کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق شکل صورت میں چھپکلی سے ملتے جلتے مگر سائز میں اس سے کسی قدر بڑے ہوتے ہیں۔

"جودھ پور کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دھون پور گاؤں سے چھ سات گھنٹے کا راستہ ہے۔ وہاں سے بسیں چلتی ہیں۔" واسو دیو نے بتایا۔

ہمارا جہاز جب ائرپاکٹ میں پھنسا تھا تو ائر ہوسٹس نے اعلان کیا تھا کہ جہاز کو جودھ پور ائرپورٹ کی طرف لے جانے کی کوشش کی جائے گی مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی تھی اور ریگستان میں کریش لینڈنگ کرنی پڑی تھی۔

"تم نے یا بستی کے دوسرے لوگوں نے کل شام کو ہوائی جہاز کو گرتے ہوئے دیکھا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"نہیں بھایا۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا "میں کل رات میں اس بستی میں پہنچا تھا۔ کسی جہاز کو گرتے ہوئے کیا اس بستی کے اوپر سے گزرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔"

اب تک میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم کون ہیں اور اس ویرانے میں کیسے پہنچے تھے لیکن اب میں نے اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ حیرت سے ہماری صورتیں دیکھتا رہا۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ ہم رات بھر ریگستان میں پیدل چلتے رہے ہیں۔

"کیا تم ہمیں کسی بستی تک پہنچا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

"کیوں نہیں مہاراج۔" وہ بولا "پانچ کوس کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم ایک گھنٹے میں پہنچ جاویں گے۔"

"تو پھر چلو۔ اب ہمیں یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا اور اٹھ کر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

ہم جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوسری طرف آ گئے۔ آگے تا حد نگاہ ہمارے سامنے ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کانٹے دار جھاڑیاں بھی تھیں۔ سنیاسی واسو دیو آگے آگے چل رہا تھا۔ میں بلی کو اٹھائے اس کے پیچھے تھا۔ واسو دیو کا ترشول میرے ہی پاس تھا۔ سنیاسی سے کسی دھوکے کی توقع تو نہیں تھی لیکن پھر بھی میں محتاط تھا۔

کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے بلی کو جانکی کے حوالے کر دیا اور واسو دیو کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس سے باتیں کرنے لگا۔ بلی کے ٹھنکنے کی آواز سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"کیا بات ہے بلی۔ تھک گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ بہت تھک گئی ہوں انکل۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی ہے۔" بلی نے ٹھنکتے ہوئے جواب دیا۔

اور تب یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ کل دوپہر سے ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بنگلور سے ٹیک آف کرنے کے بعد جہاز میں مسافروں کو کھانا سرو کیا گیا تھا اور بمبئی سے ٹیک آف کرنے کے بعد چائے سرو کی جانے والی تھی کہ جہاز ائرپاکٹ میں پھنس گیا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ آپ جان چکے ہیں۔

بلی واقعی بہت صابر بچی تھی۔ جو اب تک خاموش رہی تھی۔ رات بھر کے سفر کے دوران میں بھی اس کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا تھا لیکن اب شاید اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی اور اس نے پہلی بار بھوک کی بات کی تھی۔

"واسو دیو۔" میں اس کے قریب پہنچ گیا "تمہاری اس زنبیل میں کھانے کی کوئی چیز ہے یا نہیں۔" میں نے اس کے تھیلے کو چھوتے ہوئے کہا۔

زنبیل کا مطلب وہ سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو مگر تھیلے کو چھونے سے وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"کھانے کی چیز۔ ہاں ہاں۔ روٹی ہے اور اچار بھی۔" وہ رک گیا اور تھیلا گلے سے اتار لیا۔

بچوں کے اسکول لنچ باکس کی طرح ایک پرانا سا پلاسٹک کا ڈبا تھا جو ایک پرانے سے شاپنگ بیگ میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے پہلے شاپنگ بیگ کھولا پھر ڈبا۔ اس میں دو موٹی موٹی روٹیاں تھیں اور اس پر مرچوں کا اچار رکھا ہوا تھا۔ اوپر والی روٹی تو اچار سے آلودہ ہو گئی تھی۔ میں نے نیچے والی روٹی الگ کر کے بلی کو دے دی۔ وہ بے چاری بہت بھوکی تھی۔ فوراً ہی دانتوں سے نوالے توڑ کر کھانے لگی۔

"تم کھاؤ گے واسو دیو۔" میں نے سنیاسی سے پوچھا۔

"ناہی بھایا۔" وہ بولا "ہم کا ابھی بھوک ناہی ہے۔ بستی میں جا کر کھا لیوں گا۔ تم لوگ پیٹ پوجا کر لیو۔"

پیٹ پوجا۔ میں مسکرا دیا۔ ایک روٹی اور کھانے والے تین۔ میں نے ایک نوالہ توڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور باقی روٹی جانکی کے ہاتھ میں دے دی۔ جانکی کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سے بھوک ذرا بھی برداشت نہیں ہوتی تھی لیکن انتہائی حیرت کی بات تھی کہ چوبیس گھنٹے کی بھوکی ہونے کے باوجود اس نے کوئی فریاد نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ بھی میں سمجھ سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس ویرانے میں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔

جانکی نے روٹی کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر بڑی ایمان داری سے روٹی کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ ناہید کو دے دیا اور دوسرا حصہ خود ندیدوں کی طرح کھانے لگی اور پھر اچار کی مرچ چباتے ہی وہ چلانے لگی۔

"پانی۔۔۔ پانی۔۔۔" وہ سی سی کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"باؤلی ہوئی ہو۔" میں نے کہا "یہاں ریگستان میں تمہیں پانی کہاں سے ملے گا۔ کس نے کہا تھا مرچ چبانے کو۔"

واسو دیو چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے مسکرا کر جانکی کی طرف دیکھا اور پھر تھیلے میں سے مٹیالے سے رنگ کا ایک قرص (گولی) نکال کر جانکی کی طرف بڑھا دی۔

"یہ چوس لے سُندری۔ ساری پیاس مر جاوے گی۔"

اگر عام حالات میں واسو دیو سے آمنا سامنا ہوا ہوتا تو جانکی اسے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتی۔ وہ نہایت بدہیئت اور کریہہ صورت تھا مگر صورت حال ایسی تھی کہ جانکی نے نہ صرف اس کے ہاتھ کی دی ہوئی روٹی کھالی تھی بلکہ وہ گولی بھی

اس کے ہاتھ سے جھپٹ لی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس نے گولی منہ میں ڈال لی۔

وہ گولی واقعی حیرت انگیز طور پر پُر تاثیر تھی۔ منہ میں رکھنے کے چند سیکنڈ بعد ہی جانکی پُر سکون ہو گئی۔ اسے اب نہ تو مرچیں لگ رہی تھیں اور نہ ہی پیاس۔

"اور تمہارا کیا حال ہے؟" میں نے چلتے چلتے ناہید کی طرف دیکھا "لگتا ہے وہ مرہم لگانے سے تمہیں بھی کافی فائدہ ہوا ہے۔"

"ہاں۔" ناہید نے جواب دیا "وہ تکلیف تقریباً نوے فی صد ختم ہو چکی ہے۔ سنیاسی کی یہ مرہم تو تریاق ثابت ہوئی ہے میرے لیے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ بلی کو میں نے پھر کندھے پر اٹھالیا۔ واسو دیو نے کہا تھا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ پانچ کوس کا فاصلہ طے کرنا ہو گا۔ ہم دو گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے مگر یہ فاصلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ اس ریگ زار میں دور دور تک کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

آدھا گھنٹا مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ٹیلے پر رک گئے۔ دوسری طرف نشیب میں بہت دور کچھ بکھرے ہوئے درخت نظر آرہے تھے۔ انہی درختوں میں چند مکانوں کے ہیولے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ہم جیسے جیسے قریب پہنچتے رہے وہ مکان واضح ہوتے چلے گئے۔

ہمیں وہاں پہنچنے میں آدھا گھنٹا اور لگ گیا۔ وہ کوئی باقاعدہ آبادی نہیں تھی۔ پانچ چھ کچے مکان تھے۔ ایک محدود رقبے پر ناریل کے کچھ درخت اور تھوڑا بہت سبزہ تھا جس کے وسط میں ایک چھوٹی سی جھیل نظر آرہی تھی بلکہ جھیل کے بجائے ایک بڑا تالاب کہنا مناسب ہو گا اور چند گھروں پر مشتمل یہ آبادی بھی پانی کے اس مختصر سے ذخیرے کی وجہ سے تھی۔ میں نے صحراؤں میں نخلستانوں کے بارے میں سنا تھا اور یہ ایک چھوٹا سا نخلستان ہی تھا۔ زیر زمین پانی چشمے کی طرح بہہ کر ایک بہت بڑے تالاب کی صورت میں جمع ہو گیا تھا۔ جو اس مختصر سی آبادی کا باعث بن گیا تھا۔

ناریل کے علاوہ یہاں کچھ اور درخت بھی تھے جنہیں میں شناخت نہیں کر سکا۔ ان درختوں کے نیچے پانچ چھ اونٹ اور تین گدھے بندھے ہوئے تھے۔ ان جانوروں کے علاوہ کسی اور ذی روح کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ان مکانوں کا رخ تالاب کی طرف تھا۔ ہم اوپر سے گھوم کر سامنے پہنچے تو ایک درخت کے نیچے چارپائی پر دو آدمی بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ دونوں اٹھ گئے۔ دونوں کے لباس ان ڈاکوؤں سے مختلف نہیں تھے جنہوں جہاز کے مسافروں پر حملہ کیا تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں کی سے ان کی شکلیں بھی بڑی خوفناک ہو گئی تھیں۔ ان دو کے کندھوں پر رائفلیں ٹنگی ہوئی تھیں اور دونوں کے سی پر کراس کرتے ہوئے بیلٹ تھے جن میں گولیاں بھری تھیں۔

انہیں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میرے ذہن میں وقت صرف ایک ہی خیال ابھرا تھا کہ ہم ایک مصیبت نکل کر کسی اور بڑی مصیبت میں پھنسنے والے تو نہیں تھے؟

"یہ کون ہیں واسو دیو؟ انہیں ادھر کیوں لے کر آ رے۔" ان میں سے ایک آدمی نے پوچھا۔ اس کا قد چھ سے کم نہیں تھا۔

"یہ پردیسی ہیں وجے ٹھاکر۔" واسو دیو نے جواب "ادھر ریگستان میں بھٹک رہت تھے۔ بولت ہیں کسی جہا گرت گئے تھے۔ بے چارے بہت پریشان تھے۔ میں ا لے آیا۔ شہر جانے کا ہے۔"

"تیرا دماغ تو کھراب نہیں ہوت گیو واسو دیو۔" شخص نے سنیاسی کو گھورا "جہاز سے گرت گیو ہیں تو بچ کیے ہیں یہ لوگاں۔"

"ہم کا تو یہی بولت ہیں جی۔" واسو دیو نے جواب دیا

"اچھا اچھا۔۔۔ بہت بری حالت ہو رہت ہے ان" وجے ٹھاکر نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ان ناریا شیلا مائی کے پاس لے جاؤ اور جوان۔۔۔ تم ادھر کو آ ہمارے کنے۔ نارائن جا شیلا مائی سے کہہ کر ان کے بھوجن کا بندوبست کرو۔ مجھے تو یہ بھوکے دکھت ہیں۔"

واسو دیو اور نارائن' جانکی' ناہید اور بلی کو لے کر مکان کے دروازے کی طرف چل پڑے۔ اندر داخل ہ سے پہلے جانکی نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔

"بیٹھ جا مورکھ۔" وجے ٹھاکر نے چارپائی کی ط اشارہ کیا "اور بتا تم کون لوگاں ہو اور جہاز والی با ہے۔"

میں چارپائی پر بیٹھ گیا اور کچھ دیر بعد میں وجے ٹھا جہاز کے بارے میں بتانے لگا۔ اس دوران میں اس کا ساتھی نارائن پانی کا گلاس لے آیا۔ مجھے واقعی بہت شد کی پیاس لگی تھی۔ ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر چند لمحے خاموش رہا اور ایک بار پھر انہیں اپنی داستان لگا۔ ان دونوں کے چہروں سے لگتا تھا جیسے انہیں میری کہ

باش یقین نہ آیا ہو اور اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ میرے خاموش ہونے پر وجے ٹھاکر نے کہا۔

"تمہاری بات اپنے حلق سے نہ اترے ہے بھایا۔" اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں "پر تم جن ڈاکوؤں کی بات کرت ہو نا۔ وہ رانا شمشیر سنگھ کا گروہ ہے۔ یہ علاقہ اس کا ناہی ہے۔ وہ تو یہاں سے پچاس کوس دور ہی رہت ہے۔ اچھا بھایا۔" اس نے گہرا سانس لیا "تم کہت ہو تو ہم مان لیتا ہوں۔ تم لوگاں سرجانے کا ہے نا۔ پہنچا دیویں گے۔ جرور پہنچا دیویں گے۔ پر آج کا دن اور رات یہاں رہنا پڑے گا۔ کل سویرے چلاں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی دائیں طرف مکان سے ایک اور آدمی برآمد ہوا۔ اس کا حلیہ بھی اس سے ملتا جلتا ہی تھا۔ سر پر سیندوری رنگ کی پگڑی تھی۔ وجے ٹھاکر تیز تیز لہجے میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ دوسرا آدمی سرہلاتا رہا پھر اونٹوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک اونٹ کی رسی کھول لی اور کچھ ہی دیر بعد وہ اونٹ پر سوار ریگستان کی طرف جارہا تھا۔

میں چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ بے پناہ تھکن کی وجہ سے اونگھ سی طاری ہورہی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھلی رکھے ہوئے تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد نارائن اور واسودیو بھی مکان سے باہر آگئے۔ نارائن نے ایک تھال اٹھا رکھا تھا جس میں دو روٹیاں اور ایک کٹوری میں اچار رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کٹورے میں اونٹ کے خشک گوشت کے تلے ہوئے تِکّے رکھے ہوئے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد میرے لیے بیٹھے رہنا مشکل ہوگیا۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ وجے ٹھاکر وغیرہ سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی باتوں کی آواز مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہوگئیں اور میں نیند کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا۔

میری آنکھ کھلی تو سہ پہر ہورہی تھی۔ اگرچہ ہوا چل رہی تھی لیکن اس میں ہلکی سی تپش تھی اور میرا جسم پسینے میں تر ہورہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہورہی تھی۔ میں کچھ دیر تک تو چارپائی پر لیٹا بے معنی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد ہی واسودیو ایک مکان سے نکل کر سامنے آگیا۔

"بوہت سویا ہو مہاراج۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ تھکن بہت تھی۔ گہری نیند آگئی۔" میں نے کہا "وہ تینوں کہاں ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ تینوں بھی سورہت ہیں۔" واسودیو نے جواب دیا۔

اسی دوران میں ریگستان میں ایک طرف دھول کا بادل سا دکھائی دیا تو واسودیو درختوں سے نکل کر ذرا آگے چلا گیا۔ میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔

وہ کوئی شترسوار تھا جو اسی طرف آرہا تھا۔ اونٹ کے دوڑنے سے ریت اڑ رہی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ شترسوار لحہ بہ لحہ قریب آتا گیا۔

واسودیو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک مکان میں چلا گیا اور میں وہیں کھڑا اس شترسوار کو دیکھتا رہا جو قریب پہنچ گیا تھا۔ اس کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے علاوہ پورا چہرہ چھپا ہوا تھا۔ درختوں کے نیچے پہنچ کر اونٹ رک گیا اور اس کا سوار میری طرف دیکھنے لگا۔

وہ اونٹ کو بٹھا کر نیچے اتر آیا اور چہرے کا ڈھاٹا کھول دیا۔ اس کے داڑھی نہیں تھی مگر مونچھیں بڑی خوفناک تھیں۔ ٹھوڑی پر دائیں طرف تقریباً ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا اور آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے میری طرف دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے نمسکار کیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔

اسی دوران میں وجے ٹھاکر وغیرہ بھی مکان سے باہر آگئے اور سب لوگ درخت کے نیچے بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ واسودیو نے پانی کا ایک گلاس شترسوار کی طرف بڑھا دیا جسے وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ پی گیا۔

وہ خالص ہندی زبان میں باتیں کررہے تھے۔ ایک آدھ لفظ ہی میری سمجھ میں آرہا تھا لیکن ایک آدھ لفظ سے پوری گفتگو کا مفہوم اخذ کرنا مشکل تھا۔ میں اٹھ کر وہاں سے تقریباً بیس گز دور تالاب کی طرف آگیا اور کنارے پر بیٹھ کر منہ ہاتھ دھونے لگا۔

میں بیس پچیس منٹ تک وہاں بیٹھا رہا اور پھر بلی کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ انکل انکل کہتی ہوئی میری طرف دوڑی آرہی تھی۔

جانکی اور ناہید ایک درخت کے نیچے کھڑی تھیں اور وجے ٹھاکر وغیرہ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ ان دونوں کے ساتھ ایک بھاری بھرکم اور دراز قامت عورت بھی تھی جس نے راجستھانی لباس پہن رکھا تھا۔

میں بلی کے ساتھ ان کے قریب آگیا۔ وہ بھاری بھرکم عورت شترسوار سے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے چبھتی ہوئی

نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے مختصر سی چولی اور پھول دار کپڑے کا گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ رنگت تانبے جیسی اور چہرے کے نقوش خاصے دل فریب تھے۔ اس عمر میں بھی وہ بڑی پُرکشش لگ رہی تھی۔

"شیلا مائی۔" وجے ٹھاکر اس عورت سے کہہ رہا تھا "یہ ناریاں تمہاری مہمان ہیں مگر تم نے ان کی دیکھ بھال پر توجہ نہیں دی۔"

"ارے یہ سو رہی تھیں ٹھاکر۔" اس عورت نے جسے شیلا مائی کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، جواب دیا "ابھی سورج ڈھل جائے تو یہ اشنان کرکے کپڑے بدل لیویں گی۔ پھر تم ان کو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ ان کو۔۔۔ اور ان کا خیال رکھو۔" وجے ٹھاکر نے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا "تم بھی اشنان کرلو بھایا۔ تمہارے شریر پر بھی ریت جمی ہوئی ہے۔ ادھر تالاب میں ایک کھاڑی سی نکلی ہوئی ہے۔ ادھر کو چلے جاؤ۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

شیلا مائی، جانکی وغیرہ کو اندر لے جاچکی تھی۔ میں اس کے بعد بھی وہاں بیٹھا رہا۔ اس شترسوار کا نام وکرم سنگھ تھا۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آج رات وہاں کچھ اور لوگ آنے والے تھے اور صبح ہمیں ان کے ساتھ روانہ کردیا جائے گا۔

میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھ رہے تھے۔ مجھے ان کی نیتوں پر شک ہورہا تھا۔ سنیاسی واسودیو کا رویہ بھی بڑا پُراسرار سا ہوگیا تھا۔ میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ہم کسی اور بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔

واسودیو چائے بنوا کر لے آیا۔۔۔۔۔۔ بغیر دودھ کا قہوہ اس وقت واقعی مزہ دے گیا۔ میرے اعصاب پر طاری کشیدگی کسی حد تک کم ہوگئی۔

سورج کا سرخ تھال افق کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ ریت میں دھنسنے کی کوشش کررہا ہو۔ آسمان پر اب بھی کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج کی سرخی سے فضا بڑی دہشت ناک ہوگئی تھی۔ ریگستان کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے خون کا سمندر لہریں لے رہا ہو۔

میں اٹھ کر تالاب کی اس کھاڑی کی طرف چلا گیا جو تیس چالیس گز اندر تک چلی گئی تھی۔ یہ کھاڑی تقریباً بیس فٹ چوڑی تھی۔ دونوں کناروں پر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ میں نے جھاڑیوں میں گھس کر اِدھر اُدھر دیکھا اور کپڑے اتار کر پانی میں گھس گیا۔ میرے کپڑوں میں اس وقت جینز کی پینٹ اور بنیان شامل تھی۔ ٹی شرٹ تو میں ناہید کو دے چکا تھا۔ بنیان بہت زیادہ گندی تھی جسے میں نے دھو کر جھاڑیوں پر پھیلا دیا اور پانی میں غوطے لگانے لگا۔

○☆○

وہ کمرا خاصا بڑا تھا۔ فرش پر چٹائی اور اس کے اوپر اونٹ کے بالوں کا گدہ سا بچھا ہوا تھا۔ ایک کونے میں گھڑونچی پر پانی کا گھڑا رکھا ہوا تھا جس کے اوپر ایلومینیم کا ایک پرانا سا گلاس بھی تھا۔ گھڑونچی کے قریب ہی اسٹول پر ایک لالٹین بھی رکھی ہوئی تھی۔

کمرے میں کوئی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی۔ ایک روشن دان پچھلی دیوار میں تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ روشن دان چوڑائی میں آٹھ انچ سے زیادہ نہیں تھا البتہ لمبائی میں چار فٹ سے بھی زیادہ تھا۔

دوسرا روشن دان بائیں طرف کی دیوار میں تھا جو اتنا ہی لمبا چوڑا تھا۔ اس کے دوسری طرف غالباً کوئی اور کمرا تھا۔

کمرے کا دروازہ لکڑی کا نہیں تھا۔ لوہے کی سلاخوں والا تھا۔ ایسے دروازے عام طور پر جیل کی کوٹھڑیوں میں ہوتے ہیں۔ واسودیو نے ہمیں بتایا تھا کہ یہاں کسی زمانے میں ڈھور ڈنگر بند کیے جاتے تھے۔ اس لیے یہاں اس قسم کے سلاخوں والے دروازے لگائے گئے تھے کہ ہوا کی آمدورفت جاری رہے لیکن میں واسودیو کی اس توجیہہ سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے دائیں طرف ناہید بیٹھی ہوئی تھی۔ بلی اس کے گھٹنے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ سامنے جانکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ٹانگیں سامنے کو پھیلا رکھی تھیں اور ہاتھ پیچھے لگا رکھے تھے۔ اس کا سارا بوجھ ہاتھوں پر تھا۔

ابھی شام ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ہم لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ کچھ دیر بعد شیلا مائی دروازے میں نمودار ہوئی اور جانکی اور ناہید کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ ناہید نے بلی کا سر آہستگی سے زمین پر ٹکا دیا اور وہ دونوں شیلا مائی کے ساتھ چلی گئیں۔

ان دونوں کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ انہوں نے نہانے کے بعد کپڑے بدل لیے تھے اور ان کے لباس دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مختصر سے لباس میں ناہید کچھ حجاب سا محسوس کررہی تھی اور وہ ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

شاید اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ اونٹوں کی آوازیں سن کر میں چونک سا گیا۔ شام کے وقت وجے ٹھاکر اور شتر سوار کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ آج رات کو کچھ لوگ آنے والے تھے اور میرا خیال تھا کہ وہ لوگ آگئے تھے۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔

اونٹوں کے بلبلانے کی آواز تیز ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دو نسوانی چیخیں بھی سنائی دیں۔ جانکی اور ناہید نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کرکے تیزی سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے سامنے برآمدہ اور اس سے آگے وسیع آنگن تھا۔ اس آنگن میں بھی دو نیم کے اور تین چار ناریل کے درخت تھے۔ یہاں بھی شاید اونٹ یا گدھے بندھے ہوں گے کیونکہ سوکھے ہوئے فضلے کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا بیرونی دروازے کے قریب آگیا۔ یہ دروازہ محض بھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک پٹ کھولا اور باہر نکل گیا۔

باہر گہری تاریکی تھی مگر درختوں کے نیچے کچھ سرگرمی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی وقت اونٹ کی بلبلاہٹ اور ایک عورت کی خوف زدہ سی چیخ بیک وقت سنائی دی۔ میں دروازے سے نکل کر دو تین قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی طرف سے اچانک ہی ایک سایہ نمودار ہوا اور میرے سامنے آکر راستہ روک لیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

"نہیں مورکھ۔ تم آگے نہیں جاؤ گے۔ واپس جاؤ۔" تاریکی میں اس شخص کی غراہٹ سنائی دی۔

"وہ... وہ عورت کون ہے جو چیخ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ وہ استری کون ہے تم اندر جاؤ۔" وہ شخص پھر غرایا اور رائفل کی نال میرے سینے پر رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلنے لگا۔

میں نے اس سے الجھنا مناسب نہیں سمجھا اور خاموشی سے واپس آگیا۔ دروازے میں داخل ہوا تو اس شخص نے دھڑ سے دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا چڑھا دیا۔ میں کمرے کی طرف جانے کے بجائے وہیں رک گیا۔

یہ دو پٹ کا دروازہ تھا۔ زنجیر چڑھائے جانے کے باوجود اس میں تقریباً آدھے انچ کی جھری رہ گئی تھی۔ میں اس جھری سے آنکھ لگا کر باہر دیکھنے لگا۔ اس طرف کسی طرف سے ایک آدمی لالٹین لے کر درختوں کے نیچے پہنچ گیا۔

لالٹین کی یرقان زدہ زرد روشنی میں سات آٹھ سائے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں تین عورتیں تھیں۔ اس کا اندازہ میں نے ان کے لباس سے لگایا تھا۔ دو نے ساڑیاں پہن رکھی تھیں اور ایک کے جسم پر شلوار قمیص تھی۔ ان کے ساتھ چار آدمی تھے اور ان سب کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے غراتے ہوئے ان عورتوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا مگر وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ اس شخص نے ایک عورت کو بازو سے پکڑ کر آگے دھکیلا تو وہ خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھی۔

"نہیں نہیں۔ بھگوان کے لیے مجھے کچھ مت کہو۔ چھوڑ دو مجھے۔"

"تمہیں چھوڑ بھی دیں تو اس ویرانے میں کہاں جاؤ گے۔" اس شخص نے جواب دیا "رات کو تو یہاں بھیڑیے آجاتے ہیں۔ چیر پھاڑ کے رکھ دیں گے تمہیں۔ اندر چلو۔ ہم کم از کم تمہیں چیر پھاڑ کر کھائیں گے تو نہیں۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اب مجھے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ یہ لوگ ان عورتوں کو کہیں سے اغوا کرکے لائے تھے۔ اب مجھے جانکی اور ناہید کی خیریت بھی خطرے میں نظر آرہی تھی۔

وہ لوگ ان عورتوں کو لے کر کسی اور مکان میں چلے گئے۔ کچھ دیر تک عورتوں کی آہ و زاری کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ باہر بھی صرف ایک آدمی کا چلتا پھرتا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شاید اونٹوں کو چارا وغیرہ ڈال رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی اور پھر وہ انسانی ہیولا بھی غائب ہوگیا۔ میں بھی دروازے سے ہٹ کر کمرے میں آگیا۔

"کیا ہوا؟ یہ کون عورتیں چیخ رہی تھیں؟" جانکی نے پوچھا۔

"یہاں آتے ہی میرے ذہن میں جو خدشات سر ابھارنے لگے تھے۔ وہ حقیقت کا روپ دھار رہے ہیں۔" میں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب! کیسے خدشات؟" اس مرتبہ ناہید نے سوال کیا۔

"ہم دھوکا کھا گئے۔" میں نے کہا "یہ اچھے لوگ نہیں ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کا تعلق بھی ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے ہے۔"

"لیکن... ہمارے پاس اب کیا ہے جو یہ لوٹنا چاہیں گے۔" ناہید بولی "جو کچھ تھا وہ تو پہلے ہی ان ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور پھر وہ جہاز بھی تباہ ہوگیا جس میں ہمارا سامان تھا۔"

"تم بھول رہی ہو کہ عزت ہی عورت کی سب سے بڑی ولت ہوتی ہے۔ اگر عورت حسین ہو تو اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے یہ لوگ ئین عورتوں کو کہیں سے اغوا کرکے لائے ہیں۔ چیخنے کی آواز نہی عورتوں کی تھی۔"

لالٹین کی زرد روشنی میں ناہید کا چہرہ کچھ اور زرد ہوگیا۔ بانکی کے چہرے پر بھی پیلاہٹ دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے ٹھ کر دروازہ بند کرکے اندر سے کنڈا لگا دیا۔ میرے ہونٹوں خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کی یہ احتیاط فضول تھی۔ سلاخوں والے دروازے کو اندر سے کنڈا لگانے کا کوئی فائدہ ہیں تھا۔ باہر سے ہاتھ ڈال کر کنڈا کھولا جاسکتا تھا۔ دروازہ ند کرکے ہم محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔

دروازہ بند کرکے جانکی مٹکے کے قریب رک گئی۔ پہلے و دپانی پیا پھر ایک گلاس بھر کے ناہید کے قریب آگئی۔ ناہید نے بھی ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔

ناہید میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی وف زدہ ہو رہی تھی۔ ہم سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے کہ باہر سے قدموں کی آواز سن کر خاموش ہوگئے۔ چند سیکنڈ ند ہی واسو دیو دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے یک ہاتھ میں تانبے کا تھال اٹھا رکھا تھا جس میں تین پیالیاں ھی ہوئی تھیں۔ اس نے سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر دروازہ ھولا اور اندر آگیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چائے۔" واسو دیو نے کہا "سہر کے لوگ رات کو بھی ئے پیویں ہیں۔ وکرم شہر سے دودھ لے کر آیا ہے اس لیے ں سے دودھ والی چائے بنالی ہے۔ سب لوگ پی رہے ہیں۔ ابھی پیو۔"

اس نے ہم تینوں کے سامنے ایک ایک پیالی رکھ دی۔ ب وہ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

"شہر سے کون لوگ آئے ہیں واسو دیو۔" میں نے وچھا "یہ عورتیں کون تھیں، جو چیخ رہی تھیں؟"

"کیا بتاؤں بھایا۔" واسو دیو میرے سامنے بیٹھ گیا "وہ ؤں وجے ٹھاکر، وکرم اور ہمیر سنگھ کی لوگائیاں ہیں۔ دو ماں تھیں تو بڑی خسی سے رہ رہی تھیں۔ تیسری سہر سے آئی اداس ہوگئی۔ اس نے دوسری دونوں استریوں کو بھی ورغلایا ور تین دن پہلے چوری چھپے تینوں سہر چلی گئیں۔ آج وکرم نھیں واپس لے آیا ہے اس لیے چیخ چلا رہی تھیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اب ہی بتاؤ نا بھایا۔ جہاں پتی ہوگا تو لگائی کو بھی تو وہیں رہنا ہے نا۔ کوئی پتی اپنی پتنی کے بغیر تو نہیں رہ سکتا نا۔"

"مگر وہ کیسے بھاگ گئیں۔ شہر یہاں سے قریب ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"سہر تو بہت دور ہے۔" واسو دیو نے جواب دیا "سہر میں رہنے والی یہ ناریاں ریگستان کا سفر نہیں کرسکتیں مگر تم راجستھان کی ناریوں کو نہیں جانتے بھایا۔ یہ اونٹ پر سو سو کوس کا سفر کرلیتی ہیں اور تھکتی نہیں ہیں۔"

اگر واسو دیو یہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کا یقین کرلیا ہے تو یہ اس کی حماقت تھی۔ جب تک ہم چائے پیتے رہے وہ بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر خالی پیالیاں لے کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر یہ کہا تھا کہ صبح ہمیں شہر بھیج دیا جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد جانکی نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔

رات کا ابتدائی حصہ تھا مگر ہر طرف سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں کبھی کبھی کسی اونٹ کے بلبلانے یا گدھے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دے جاتی۔

دروازہ بند نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ سمجھ رہے تھے اور میرا خیال تھا کہ ہم رات بھر جاگتے رہیں گے تاکہ اگر صورت حال کوئی ناخوشگوار رخ اختیار کرے تو اس کا کسی حد تک تو مقابلہ کیا جاسکے۔ ویسے میں نے طے کر رکھا تھا کہ ان لوگوں نے رات کو کسی وقت کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں ناہید اور جانکی کو بچانے کے لیے زندگی کے آخری لمحوں تک مقابلہ کروں گا۔ ناہید سے اگرچہ ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ جہاز کے حادثے کے بعد ہی ان ماں بیٹی سے ہمارا واسطہ پڑا تھا اور پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران میں ان سے کچھ اُنس سا ہوگیا تھا اور ان دونوں کی حفاظت بھی میں اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔

لیکن میرے سارے عزائم دھرے کے دھرے رہ گئے۔ میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ پورے بدن میں سنسناہٹ سی پھیلنے لگی اور نیند کے بوجھ سے پلکیں جھکی جارہی تھیں۔ اس وقت مجھے ایک ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی رو رہا ہو۔ سناٹے میں رونے کی آواز بڑی پُراسرار لگ رہی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور اندرونی دیوار میں روشن دان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دوسری طرف بھی کمرا تھا اور رونے کی وہ آواز اسی طرف سے آرہی تھی۔

میں نے جانکی اور ناہید کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں فرش پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھیں۔ میں نے باری باری ان دونوں کو پکارا مگر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔

میں اپنے آپ کو گھسیٹ کر جانکی کے قریب آگیا اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلانے لگا۔

"جانکی۔۔۔ جانکی۔۔۔ سو گئیں کیا۔۔۔؟" مجھے اپنی آواز بھی کنوئیں کی گہرائیوں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

ہلانے یا پکارنے کا جانکی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں ناہید کی طرف مڑ گیا۔ اب تو میرے بازو میں بھی اتنی قوت نہیں رہی تھی کہ میں اسے حرکت دے سکتا۔ اسی وقت رونے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی وہ کوئی عورت تھی جو سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں نے پھر روشن دان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اس طرف بڑھا لیکن ابھی دوسرا ہی قدم اٹھایا تھا کہ سنسناہٹ پورے جسم میں پھیل گئی۔ ٹانگیں بے جان سی ہو گئیں۔ ان میں جسم کا بوجھ اٹھانے کی قوت نہیں رہی اور میں آہستہ آہستہ نیچے جھکتا چلا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہیں رہا۔

○☆○

آنکھ کھلی تو پچھلی دیوار کے روشن دان سے آنے والی دھوپ میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔

میں کچھ دیر آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ پورے جسم پر بوجھل پن اور بے پناہ تھکن کا احساس ہو رہا تھا جیسے میں میلوں دور سے بھاگتے بھاگتے تھک کر گر گیا ہوں۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں اور دماغ پر بھی جیسے منوں بوجھ لدا ہوا ہو۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں۔

یہ ماحول مجھے اجنبی سا لگا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں کب اور کیسے آیا تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ دماغ پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی اور پھر سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

جانکی، ناہید اور ببلی اس کمرے میں نہیں تھیں۔

میں دروازے کی طرف لپکا لیکن ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس مرتبہ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ دماغ کی نسوں میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا۔ دروازے پر باہر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔

مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں ایک منٹ لگ گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ گزشتہ رات ہماری چائے میں بے ہوشی کی کوئی چیز ملا دی گئی تھی۔ جانکی اور ناہید تو چائے پیتے کے تھوڑی ہی دیر بعد بے ہوش ہو گئی تھیں اور میں اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر اس کے بعد بھی کافی دیر تک جاگتے رہنے کی کوشش کرتا رہا تھا اور جب میں نے ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر اٹھنے کی کوشش کی تھی تو میری قوت مدافعت بھی جواب دے گئی تھی اور میں بھی اتنا غنیل ہو گیا تھا اور وہ لوگ رات ہی کو کسی وقت جانکی وغیرہ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ کھارے پانی والی جھیل کے کنارے ٹوٹے ہوئے مندر میں سنیاسی واسودیو سے میرا مقابلہ ہوا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا لیکن اپنی موت کو سامنے دیکھ کر اس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ میں بھی اسے مارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس کی رہنمائی کے بغیر ہم اس ظالم ویرانے سے نہیں نکل سکتے تھے لیکن وہ بے حد مکار نکلا اور ہمیں دھوکے سے یہاں لے آیا۔ وجے ٹھاکر کو دیکھ کر کل ہی شبہات نے میرے ذہن میں جنم لینا شروع کر دیا تھا اور رات کو ان عورتوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں سن کر تو میرے شبہات یقین میں بدل گئے تھے اور ان کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔

میں دروازے کی سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔ آہنی دروازے کی دھڑ دھڑاہٹ کی آواز دور تک پھیل گئی۔

"واسودیو۔۔۔ واسو۔۔۔ کہاں ہو تم؟" میں چیخ چیخ کر اس مکار سنیاسی کو پکارنے لگا۔

دو منٹ بعد ہی دو آدمی دروازے کے سامنے نمودار ہوئے۔ ایک تو واسودیو تھا اور دوسرا لمبا تڑنگا آدمی جس نے ایک ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل اٹھا رکھی تھی۔ یہ چہرہ میرے لیے اجنبی تھا شاید یہ ان لوگوں میں شامل تھا جو رات کو ان تین عورتوں کو لے کر یہاں آئے تھے۔

"کیا بات ہے۔ کیوں چیختا پڑا ہے مورکھ۔" واسودیو نے غراتے ہوئے کہا۔ وہ ایک دم بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر بڑی کرختگی اور آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

"یہ تالا کھولو۔ وہ دونوں عورتیں اور بچی کہاں ہیں؟" میں نے اس کی غراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

"وہ تینوں آرام سے ہیں مورکھ اور تو بھی اپنی خیریت چاہتا ہے نا تو آرام سے بیٹھا رہ۔" واسودیو نے جواب دیا۔

"تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں چیخا۔

"اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے منش۔" واسودیو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس وقت ہم تیرے آگے تھ نہ جوڑتا تو تو ہم کا مار دیتا۔ اپنا جیون بچانے کا ایک ہی لریقہ تھا۔ جو میں نے اختیار کیا۔ میں تمہیں سہر کا راستہ کھانے کے لیے تو نہیں لایا تھا۔ تم نے مندر میں مار مار کر میرا رتا بنا دیا تھا۔ ہم وہ مار کبھی نہیں بھولوں گا۔ پر دیکھ، میں نے س مار کا ایسا بدلہ لیا ہے کہ تو زندگی بھر مار کھاتا رہے گا۔"

واسودیو بات کرتا ہوا دروازے کے بالکل قریب آگیا ا۔ میں نے اچانک ہی سلاخوں سے ہاتھ نکال کر اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکے سے اپنی طرف کھینچ لیا۔

واسودیو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ اپنے آپ کو ھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اسودیو گھوم گیا۔ اس کی پشت دروازے کی سلاخوں سے لگ ئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک بازو اس کے گلے میں لپیٹ یا اور دوسرے ہاتھ سے بدستور اس کے بال جکڑے رکھے۔

واسودیو بری طرح اچھل رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پنے گلے سے میری گرفت چھڑانے کی کوشش بھی کر رہا تھا لین میری یہ گرفت ایسی نہیں تھی جسے وہ چھڑا سکتا۔

اس کے ساتھ آیا ہوا گن مین بھی ایک لمحے کو بدحواس وگیا۔ اسے شاید میری طرف سے کسی ایسے اقدام کی توقع ہیں تھی۔ وہ چند سیکنڈ تو مبہوت سا کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا ر رائفل ایک طرف پھینک کر اس نے بھی دونوں ہاتھ یرے بازو پر جما دیے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ میری یہ گرفت زو کٹنے کے بعد ہی چھوٹ سکتی تھی۔

واسودیو بری طرح پیر پٹخ رہا تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اس ی آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ حلق سے کتے جیسی خرخراہٹ ور غرغراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔

گن مین نے میرے بازو سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ بری لرح ہانپ گیا تھا۔ اس نے لپک کر رائفل اٹھا لی اور اس کے بٹ سے میرے پیٹ پر وار کرنے لگا لیکن واسودیو کے گلے پر میری گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی۔ مجھ پر جنون سا طاری ور رہا تھا۔ اس کی گردن پر میرے بازو کا شکنجہ گزرنے والے ر لمحے کے ساتھ مزید ٹائٹ ہو رہا تھا۔

گن مین پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے رائفل سیدھی کر لی۔ س کی نال میرے پہلو سے لگا کر انگلی ٹریگر پر رکھ دی۔ میں مجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے لیکن میرا جنون کم نہیں ہوا ور پھر اس نے فائر کرنے کے بجائے رائفل پیچھے ہٹا لی اور چنا ہوا باہر کی طرف دوڑ گیا۔

صرف دو منٹ بعد تین چار آدمی دوڑتے ہوئے آنگن والے دروازے سے اندر داخل ہوئے اور پھر وہ بھی چیختے چلاتے ہوئے آگے لپکے۔ اس دوران میں واسودیو کی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ اس کے دونوں بازو پہلوؤں میں لٹک گئے تھے۔ وہ لوگ چیختے چلاتے ہوئے جیسے ہی قریب پہنچے میں نے واسودیو کو ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ مٹی کی بوری کی طرح بھد سے نیچے گرا۔ میں نے صرف ایک لمحے کو اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور زبان باہر لٹک گئی تھی۔

دو آدمیوں نے واسودیو کو ٹانگوں سے پکڑ کر دروازے سے دور گھسیٹ لیا۔ میں دروازے سے ہٹ کر پیچھے والی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا اور اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک آدمی واسودیو پر جھکا ہوا تھا۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے اور میں جانتا تھا کہ اس کی یہ کوشش بیکار تھی۔ میری اس گرفت میں آنے کے بعد کسی کے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

وہ آدمی ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔

"یہ مرگیو وے!" وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر چیخا "اس نے ہتیا کر دی واسودیو کی۔ یہ ہتیارا ہے۔ مار دو اسے۔"

گن مین نے رائفل میری طرف تان لی اور انگلی ٹریگر پر پہنچ گئی۔ اس کی انگلی کی معمولی سی حرکت میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی اور اب مجھے بھی جیسے ہوش آگیا تھا۔ غصے اور طیش میں، میں نے واسودیو کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ ایسا کر کے میں نے جانکی، ناہید اور ببلی کی کوئی مدد۔۔۔۔ نہیں کی تھی۔ میں زندہ رہ کر تو ان کی مدد کر سکتا تھا لیکن میری موت کے بعد وہ میری مدد سے محروم ہو جاتیں اور مکمل طور پر ان کے رحم و کرم پر ہوتیں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گولی کی آواز کا انتظار کرنے لگا۔ ایک دھماکا ہوتا اور اس کے ساتھ ہی میری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن گولی نہیں چلی بلکہ ایک اور گرج دار چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ وجے ٹھاکر تھا جو دوڑتا ہوا اندر آیا تھا۔ گن مین نے رائفل نیچے کر لی۔ مجھے زندگی کے چند اور لمحے مستعار مل گئے۔ گن مین تیز تیز لہجے میں وجے ٹھاکر کو بتانے لگا۔ وجے ٹھاکر، واسودیو کی لاش پر جھک گیا۔ اس کی زبان اب بھی باہر لٹکی ہوئی تھی اور آنکھیں حلقوں سے باہر تھیں۔ وجے ٹھاکر

نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد تناؤ ختم ہو چکا تھا۔

وجے ٹھاکر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دروازے کے قریب آکر میری طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے گولی مار دینے کا حکم دے گا لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ گن مین نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی منتخب کی اور تالا کھول دیا۔

گن مین اور وجے ٹھاکر دروازے ہی میں کھڑے رہے اور چار آدمی اندر گھس آئے۔ وہ چاروں موت کے فرشتوں کی طرح میری طرف بڑھنے لگے اور میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا انہیں آگے آتے ہوئے دیکھتا رہا۔

میں سمجھ گیا وہ میرے ساتھ کیا کرنے والے تھے۔ گولی سے اڑا دینے کے بجائے اپنے ایک ساتھی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے وہ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ میری طاقت کا اندازہ انہیں ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ چاروں بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔

ان کا خیال تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ مزاحمت کروں گا۔ انہیں مجھ سے جارحانہ انداز کی توقع نہیں تھی لیکن وہ جیسے ہی قریب پہنچے میں کسی نہایت طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس طرح کھڑے کھڑے فلائنگ کک لگانا بڑی مہارت کا کام ہوتا ہے اور اس میں ذرا سی غلطی اپنے لیے ہی نقصان کا باعث بنتی ہے لیکن مجھے مارشل آرٹ کے ہر شعبے میں ایسی تربیت دی گئی تھی کہ اس میں غلطی کا امکان نہیں تھا۔

اپنی جگہ سے اچھلتے ہی میں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے YELL بھی کیا تھا۔ کمرا میری دہاڑ سے گونج اٹھا۔ اس قسم کی دہاڑ بھی حریف کا حوصلہ پست کر دیتی ہے۔ وہ چاروں بھی کسی قدر بد حواس ہو گئے۔

میں نے ڈبل فلائنگ کک لگائی تھی۔ میرا ایک پیر ایک آدمی کے منہ پر اور دوسرا پیر دوسرے آدمی کے سینے پر لگا۔ وہ دونوں بلبلاتے ہوئے پشت کے بل جا گرے۔ میں بھی زمین پر گرتے ہی سنبھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے تیسرے آدمی کے پیٹ پر اسٹریٹ کک رسید کر دی۔ وہ پیٹ پکڑ کر چیختا ہوا دہرا ہو گیا۔ البتہ چوتھے آدمی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری ٹانگ پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ میں... لڑکھڑایا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔

جس شخص کے منہ پر فلائنگ کک لگی تھی، اس کا شاید ایک دانت اپنی جگہ سے اکھڑ گیا تھا۔ اس کے منہ سے بہہ رہا تھا اور وہ بری طرح چیختے ہوئے اچھل رہا تھا۔ جس سینے پر کک لگی تھی، وہ سنبھل گیا تھا۔ البتہ تیسرا ابھی پیٹ پکڑے ہوئے تھا۔

دو آدمی بیک وقت حملہ آور ہوئے۔ میں دونوں دے کر اپنے آپ کو بچا گیا۔ ان میں سے ایک تو اپ جھونک میں دیوار سے جا ٹکرایا جبکہ دوسرے نے بڑی سے پلٹ کر حملہ کر دیا تھا۔

یہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ مجھے کھل کر اپنے حربی فن مظاہرے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ حریف اگر ایک ہوتا جگہ ہوتی مگر وہاں ہم پانچ آدمی تھے۔ جس وجہ سے تنگ ہو گئی تھی۔

میں ان سے دور رہ کر ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش تھا۔ وہ بھی اب محتاط ہو گئے تھے اور پھر مجھ سے ایک ہو گئی جس کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دو آدمی مجھ لپٹ گئے۔ وہ مجھے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ایک کی پسلیوں میں کہنی سے ضرب لگائی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں دوسرے کی گردن پر بازو لپیٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

چوتھے آدمی نے پانی سے بھرا ہوا مٹکا اٹھا کر میرے دے مارا تھا۔ گھڑا میرے سر پر ٹوٹا اور میں سر سے پیر تک میں شرابور ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص کی گردن پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس شخص نے ایک زور دار جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور پھر وہ چاروں مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ پہلے تو میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا کامیاب نہیں ہو سکا۔ ایک آدمی نے میرے گھٹنے کی طرف ٹھوکر ماری۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور پھر مجھے موقع نہیں مل سکا۔

میرے جسم پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش ہو... میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ایک مجھے کھڑے ہونے کا موقع مل گیا۔ ایک آدمی کو تو میں نے چار ہاتھ جڑ ہی دیے تھے لیکن دوسرا جونک کی طرح لپٹ گیا اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ جبکہ نے مجھ پر گھونسے بازی کی پریکٹس جاری رکھی۔

میں اگرچہ بھرپور مزاحمت کر رہا تھا لیکن مجھے جو تھا، وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ چاروں تابڑ توڑ حملے کر رہے ایک گھونسا میرے جبڑے پر لگا۔ میرا ایک دانت ہل میں اپنے خون کا ذائقہ محسوس کر کے مجھ پر ایک بار

ساطاری ہو گیا۔ میں نے زخمی شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے حملہ آوروں کو پیچھے دھکیل دیا لیکن اس مرتبہ مجھے بھی زیادہ ہاتھ پیر چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔

کنپٹی پر لگنے والے ایک گھونسے سے میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی سی چنگاریاں رقص کرنے لگیں۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دو تین گھونسے اور پڑے۔ میرے حواس مختل ہونے لگے اور آنکھوں کے سامنے پہلے دھند اور پھر تاریکی چھانے لگی۔ میں تیورا کر نیچے گرا۔ گرنے کے بعد بھی میرے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش ہوتی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی گہری ہوتی چلی گئی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

○☆○

چیخوں کی وہ آواز مجھے میلوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن پھر وہ آواز واضح ہوتی گئی۔ میرے حواس بتدریج بحال ہو رہے تھے۔

کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں ٹیسیں نہ اٹھ رہی ہوں۔ ظالموں نے مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے جسم پر صرف پتلون رہ گئی تھی۔ بنیان تو چیتھڑوں میں بدل کر میرے جسم سے الگ ہو گئی تھی۔

دبی دبی چیخوں کی وہ آواز اب واضح ہو گئی تھی۔ یہ آواز بیچ والی دیوار کے روشن دان سے آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر دیوار کے قریب پہنچ گیا اور سر اٹھا کر روشن دان کی طرف دیکھنے لگا۔

روشن دان میرے قد سے تقریباً چار فٹ اوپر تھا۔ میں نے اچک کر سلاخیں پکڑ لیں اور اپنے جسم کو آہستہ آہستہ اوپر کھینچنے لگا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے چہرے کو سلاخوں کے برابر لا سکا تھا اور پھر دوسری طرف کا منظر دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔

وہ دو آدمی تھے جو ایک نازک اور دھان پان سی عورت کو دبوچے ہوئے تھے۔ یہ ان تین عورتوں میں سے ایک تھی جنہیں گزشتہ رات یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے کپڑے کمرے میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور وہ دونوں وحشی بھیڑیوں کی طرح اسے نوچ رہے تھے۔ وہ عورت اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

میں زیادہ دیر تک یہ منظر نہیں دیکھ سکا۔ سلاخیں میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں اور میں نیچے گر گیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ناہید اور جانکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ دونوں کہاں ہیں۔ ان کا کیا حشر ہوا ہو گا۔

مجھے اس طرح بیٹھے ہوئے شاید آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر میں نے سامنے دیکھا۔ دو آدمی دروازے کے سامنے نمودار ہوئے۔ ایک کے ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں پیتل کا تھال جس میں کھانا رکھا ہوا تھا اور پانی کا گلاس بھی۔ میں اٹھ کر دروازے کے قریب آ گیا۔

"پیچھے۔ پیچھے ہٹو۔ اس دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" گن مین نے رائفل تان کر غراتے ہوئے کہا۔

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا..... واسودیو والے تجربے کے بعد وہ لوگ کوئی نیا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ میں پیچھے ہٹتا ہوا دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دوسرے آدمی نے دروازے کے قریب آکر پہلے گلاس سلاخوں کے اندر رکھا پھر تھال بھی دروازے کے نیچے سے اندر سرکا دیا۔ اسی دوران میں اس کی نظریں مسلسل میری طرف اٹھی رہی تھیں۔ اسے شاید اندیشہ تھا کہ میں اس پر جھپٹ نہ پڑوں۔

"جانکی اور ناہید کہاں ہیں؟" میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر گن مین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم لوگ اچھا نہیں کر رہے۔ پچھتاؤ گے۔"

"شکر کرو وجے ٹھاکر کی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی۔" گن مین نے گھورتے ہوئے جواب دیا "ویسے تم ہو بڑے جان دار آدمی۔ فولاد بھرا ہوا ہے تمہاری بانہوں میں۔ تم نے جس طرح واسودیو کی گردن مروڑی ہے وہ سب کے لیے حیرت کی بات ہے۔ وہ سانڈ تو چار آدمیوں کے قابو میں بھی نہیں آتا تھا۔"

"وہ تھا ہی اس قابل۔" میں نے کہا "اس نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اسے تو اس سے بھی زیادہ بھیانک موت ملنی چاہیے تھی۔ ویسے تم نے میری بات کا جواب نہیں کیا۔ وہ دونوں عورتیں کہاں ہیں؟"

"تمہاری دونوں عورتیں ابھی تک خیریت سے ہیں۔ انہیں کسی نے چھوا تک نہیں۔" گن مین نے جواب دیا "شکر کرو واسودیو ہم میں سے نہیں تھا اگر وہ ہمارا ساتھی ہوتا تو تمہارے شریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے لیکن تمہاری وجہ سے ہمارا پروگرام غارت ہو گیا ہے۔"

"کیسا پروگرام؟" میں نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس

کی طرف دیکھا۔
"کل صبح منڈی لگنے والی ہے۔ ہمیں آج وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا مگر تمہارے ہاتھوں واسو دیو کی ہتیا کی وجہ سے ہمیں آج کا دن یہاں رکنا پڑا۔ اب تم یہ بھوجن کرلو اور ایک بات کا کھیال رکھنا۔ اب اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو تم زندہ نہیں بچو گے۔"
"تم لوگ بھی ایک بات یاد رکھنا۔" میں نے کہا "اگر میری ساتھیوں میں سے کسی کو کچھ ہوا تو میں تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ایک کی گردن مروڑ دوں گا۔"
گن مین مجھے گھور کر رہ گیا اور پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ ساتھ والے کمرے سے اب عورت کی سسکیوں اور آہوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اچک کر روشن دان کی سلاخوں کو پکڑلیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔
اس طرف کا منظر دیکھ کر میں دہل گیا۔ کمرے میں اس عورت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ وہ بے لباس تھی اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیے سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس نے دونوں بازو گھٹنوں پر لپیٹ رکھے تھے۔ دوسری طرف کی ایک کھڑکی سے آنے والی دھوپ براہ راست اس پر پڑ رہی تھی۔ اس کے بائیں بازو پر کندھے سے ذرا نیچے خون کا دھبا بھی صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں کمرے کی فضا میں بڑا افسوس ناک تاثر پیدا کررہی تھیں۔
"اے۔ کیا تم میری آواز سن رہی ہو۔" میں نے ہولے سے اسے پکارا۔
اس نے چونک کر گھٹنوں پر جھکا ہوا سر اٹھایا اور وحشیانہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔
"اِدھر۔ تمہارے سامنے والی دیوار کے روشن دان میں۔" میں نے اسے توجہ دلانے کے لیے کہا۔ میری آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔
اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے لپک کر چند فٹ دور فرش پر پڑی ہوئی ساڑی اٹھا کر اپنے اوپر ڈال لی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا' وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔
"کون ہو تم؟" اس کے لہجے میں خوف نمایاں تھا۔
"قیدی۔" میں نے جواب دیا "یہاں تمہارے علاوہ دوسری عورتیں بھی ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟"
"پتا نہیں مگر تم کون ہو؟" اس نے پھر پوچھا۔
"میں بھی ان وحشیوں کی قید میں ہوں۔ میرے ساتھ عورتیں تھیں ان لوگوں نے ہمیں دھوکے سے اپنا قیدی بنا اور ان عورتوں کو مجھ سے الگ کردیا۔ ان کے ساتھ میرے ہاتھ سلاخوں پر پھسل رہے تھے' میں جملہ ادھورا چھوڑ کر گرفت جمانے کی کوشش کرنے لگا مگر ہتھیلیوں میں پسینے کی وجہ سے اپنی گرفت قائم نہ رکھ سکا اور دھپ سے نیچے آ
میں نے متجسس نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھا اور ایک کونے میں گھڑونچی اور اس کے قریب لکڑی کا اسٹول دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اسٹول تقریباً دو فٹ اونچا تھا جسے میں نے اٹھا کر دیوار کے قریب رکھ دیا اور اس کے اوپر گھڑونچی رکھ دی۔
میں گھڑونچی پر کھڑا ہوگیا۔ دونوں چیزیں خاصی مضبوط تھیں۔ ان کی چولیں ہل رہی تھیں۔ میں نے گھڑونچی پر کھڑے ہو کر روشن دان کی سلاخوں کو تھام لیا اور اپنا زیادہ وزن ہاتھوں پر ہی رکھا۔
اب میرا چہرہ روشن دان کے سامنے تھا اور میں دشواری کے بغیر دوسرے کمرے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ عورت اب بھی سامنے والی دیوار کے ساتھ بیٹھی اس طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے ساڑی سے اپنا جسم ڈھانپ لیا تھا۔
"کیا تم ان دو عورتوں کے بارے میں کچھ جانتی ہو جن کے ساتھ ایک بچی بھی تھی۔" میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"وہ... وہ سب دوسرے مکان میں ہیں۔" اس نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔
"تم کون ہو۔ یہ لوگ تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"مم... میں..." وہ بولی "انہوں نے مجھے رنک پور سے دھوکے سے اٹھایا تھا۔"
"رنک پور۔ کیا تم رنک پور کی رہنے والی ہو۔ یہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میں احمد آباد کی رہنے والی ہوں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے آئی ہوئی تھی۔ تین دن پہلے تاریخی عمارتوں کی سیر کرتے ہوئے میں اپنے گھر والوں سے بچھڑ گئی۔ میں انہیں تلاش کرتی پھر رہی تھی کہ ایک آدمی میرے قریب آکر بتایا کہ میرے گھر والے ڈاک بنگلے پر انتظار کر رہے ہیں۔ میں اس کے ساتھ ڈاک بنگلے میں وہاں میرے گھر والے نہیں تھے۔ البتہ دو آدمی اور تھے سمجھ گئی کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ میں نے وہاں

بھاگنے کی کوشش کی تو انہوں نے مجھے پکڑلیا اور کچھ سونگھا کر بے ہوش کردیا۔
"انہوں نے پہلے مجھے جنگل میں واقع کسی مکان میں رکھا۔ وہاں دو عورتیں اور بھی تھیں۔ کل رات یہ لوگ ہمیں اونٹوں پر لاد کر یہاں لے آئے۔ میرے ماتا پتا نجانے کس حال میں ہوں گے۔ یہ انسان نہیں درندے ہیں۔ دیکھو۔ انہوں نے میری کیا حالت کردی ہے۔" اس نے اپنے جسم پر سے ساڑی ہٹا دی۔
میں کانپ اٹھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ دانتوں سے کاٹے جانے کے نشان تھے۔ وہ واقعی انسان نہیں درندے تھے۔ اس نے ساڑی کو دوبارہ چادر کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔
اس کی عمر بائیس تیئیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ دبلی پتلی' نازک سی۔ چہرے کے نقوش بڑے تیکھے اور جاذب نظر تھے۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جن میں بے پناہ وحشت بھری ہوئی تھی۔ بال لہریے دار اور گردن تک کٹے ہوئے تھے۔
میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازے کی طرف سے غراہٹ سن کر چونک گیا۔ میں نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ وہی گن مین تھا جو پہلے بھی آچکا تھا۔
"دیکھ لیا لونڈیا کو۔ سالی پٹھے پر ہاتھ نہ دھرن دیوے تھی۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ آگئی تھی۔
"تم لوگ انسان نہیں درندے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ اسی دوران میں بے خیالی میں گھڑونچی پر بوجھ زیادہ پڑ گیا اور وہ میرے پیروں کے نیچے سے پھسل گئی۔ میں روشن دان کی سلاخوں سے لٹکا رہ گیا اور پھر میں نے ہاتھ چھوڑ دیے اور دھپ سے نیچے گرا۔
"تم لوگ ٹھیک نہیں کر رہے۔ میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے غرایا۔
"تو اپنی کھال بچا بھایا۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا "وجے ٹھاکر کو پتا نہیں تم سے عشق کیوں ہوگیا ہے وہ نہ ہوتا تو تیرا ابھی تیا پانچا ہو چکا ہوتا۔ زیادہ ہوشیار مت بن۔ وکرم تم پر بہت گرمی کھائے ہوئے ہے۔ تو نے اس کا دانت توڑا ہے نا۔ اسے موقع مل گیا تو وہ تیری گردن توڑ دے گا اور تو نے بھوجن نہیں کیا۔ پسند نہیں آیا کیا۔"
"میں تمہارا خون پیوں گا۔" میں نے جواب دیا۔
"واہ بھئی واہ۔" وہ مسکرا دیا "اتنی مار کھانے کے بعد بھی اکڑ نہیں گئی تیری۔ کوئی بات نہیں۔ سب کچھ بھول جائے گا۔"
میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ روشن دان کی طرف سے اس عورت کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
"نہیں نہیں۔ چھوڑ دو مجھے... بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ چیخ چیخ کر فریاد کررہی تھی۔
میں پچھلی دیوار کی طرف لپکا اور اچک کر روشن دان کی سلاخوں سے لٹک گیا۔ دو آدمی اس عورت کو گھسیٹتے ہوئے لے جارہے تھے۔ چادر کی طرح لپٹی ہوئی ساڑی ایک بار پھر اس کے بدن سے جدا ہوگئی تھی۔ وہ دونوں وحشی اسے گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ میں نیچے اتر آیا۔ گن مین بھی جاچکا تھا اور دروازے کے اندر کی طرف رکھا ہوا کھانے کا تھال بھی غائب تھا۔ اس نے موقع پاکر تھال باہر کھینچ لیا تھا۔ البتہ پانی سے بھرا ہوا گلاس وہیں رکھا ہوا تھا۔
میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اس عورت کی چیخیں دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ میرے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے کے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھالیا اور ایک ہی سانس میں پانی حلق میں انڈیل لیا اور وہیں بیٹھ کر اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔
وہ دن گزر گیا۔ میں دروازے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اس دوران میں نہ تو کسی عورت کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی ڈاکوؤں کا کوئی آدمی میری طرف آیا تھا۔
صورت حال عجیب سی پیچیدگی اختیار کرگئی تھی۔ نہ جہاز کو حادثہ پیش آتا اور نہ ہم اس مصیبت میں گرفتار ہوتے اور میرا خیال میں اس سے نجات حاصل کرنا کچھ آسان نہ تھا۔
شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ کمرے میں مچھر بھنبھنانے لگے۔ لالٹین تو موجود تھی لیکن میرے پاس ماچس نہیں تھی کہ لالٹین جلا کر روشن کرلیتا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جارہا تھا اس کے ساتھ ہی مچھروں کی یلغار بڑھتی گئی۔ یہ مچھر تو کم بخت ان قزاقوں سے بھی زیادہ خطرناک اور خوں خوار تھے جو میرا خون چوس رہے تھے۔
قدموں کی آہٹ سن کر میں چونک گیا اور پھر بائیں طرف سے مدھم سی روشنی دکھائی دینے لگی جو بتدریج واضح ہوتی چلی گئی۔
وہ وہی دونوں آدمی تھے جو دن میں بھی آچکے تھے۔ ایک گن مین تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں کھانے کا تھال تھا۔ وہ

دونوں دروازے سے چند فٹ دور ہی رک گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آگے نہیں آئیں گے اسی لیے میں دروازے کے قریب سے اٹھ کر سامنے والی دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گن مین تو رائفل تانے کھڑا رہا اور دوسرے آدمی نے دروازے کی سلاخوں کے نیچے سے تھال اندر سرکا دیا اور قریب ہی پانی کا گلاس بھی رکھ دیا۔

"تم میں سے کسی کے پاس ماچس ہو تو دے دو۔ لالٹین جلانی ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا۔

گن مین نے جیب سے ماچس نکال کر سلاخوں میں سے میری طرف اچھال دی۔ ماچس میرے گھٹنے سے ٹکرا کر گری جسے میں نے اٹھالیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے لالٹین جلا کر ماچس باہر پھینک دی۔ گن مین نے جھک کر ماچس اٹھائی اور وہ دونوں کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔

میں نے تھال اپنی طرف سرکالیا۔ توے کی پکی ہوئی دو موٹی موٹی روٹیاں ایک کٹوری میں اچار اور اونٹ کے گوشت کے تلے ہوئے قتلے تھے جن میں سے ہلکی سی بساند آرہی تھی۔

میں دو دن سے فاقے سے تھا۔ پیٹ سے دشمنی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنے حقیقی دشمنوں سے نمٹنے کے لیے مجھے جسمانی طاقت کی ضرورت تھی اور یہ توانائی کھانے پینے سے ہی حاصل ہوسکتی تھی۔ یہی سوچ کر میں نے کھانے پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔

کھانے کے بعد میں سامنے والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ٹانگیں آگے کو پھیلالیں۔ میں کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی آنکھیں پوری طرح کھول کر باہر تاریکی میں گھورنے لگتا۔

سناٹے میں کسی وقت کسی اونٹ کے بلبلانے کی آواز سنائی دے جاتی اور اس کے بعد پھر خاموشی چھا جاتی۔

وہ شاید آدھی رات کا وقت تھا۔ نسوانی چیخ کی وہ آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی دور تک پھیل گئی تھی۔ میں اچھل پڑا۔ چیخ کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فضا شیطانی قہقہوں سے گونج اٹھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ وحشی پھر کسی عورت کو بھنبھوڑنے لگے تھے۔ وہ نسوانی چیخ پھر سنائی دی لیکن اس مرتبہ آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ناہید اور جانکی کا خیال ابھر آیا۔ چیخ کی آواز میں نہیں پہچان سکا تھا مگر وہ ان دونوں میں سے بھی کوئی ہوسکتی تھی۔

میں اٹھ کر دروازے کے قریب آگیا اور سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ دروازہ توڑ کر باہر نکل جاؤں اور ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں جو کسی معصوم عورت کی عزت سے کھیل رہے تھے۔ ان کے شیطانی قہقہوں کی گونج فضا میں بکھرتی جارہی تھی۔

میرے ہاتھ سلاخوں پر پھسلتے ہوئے نیچے آگئے۔ ایک ہاتھ کی انگلیاں باہر کے کنڈے میں لگے ہوئے تالے سے مس ہوئیں تو میں غیر ارادی طور پر تالے کو ٹٹولنے لگا۔

میرے دماغ میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ مجھے بنکاک کا وہ واقعہ یاد آگیا جب میں تھائی اور جانکی کے ساتھ چیانگ رائے سے واپس آیا تھا تو بنکاک ائرپورٹ پر دارا کے آدمیوں نے ہمیں ایک وین میں اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وین کے دروازے لاک تھے۔ اندر سے ہینڈل نکلے ہوئے تھے۔ اس وقت میری نظریں وین کے ایک دروازے کے لاک پر مرکوز ہوگئی تھیں اور لاک کھل گیا تھا اور ابھی تین دن پہلے ہی تو میں نے اپنی نظروں کی اس پُراسرار قوت سے کام لے کر جہاز کے مسافروں کو لوٹنے والے ڈاکوؤں کو آپس میں لڑا کر ان کا خاتمہ کردیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان میں سے کسی کی چلائی ہوئی گولی جہاز کے فیول ٹینک میں لگی تھی اور جہاز بھی تباہ ہوگیا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میری نظروں کی یہ پُراسرار قوت میرے اندر پوشیدہ چی کی وجہ سے تھی یا اس کا سبب کچھ اور تھا۔ بہرحال میں نے اس وقت بھی اس پُراسرار قوت سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا اور تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر نظریں اس پر جما دیں۔

ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفے میں کلک کی ہلکی سی آواز ابھری اور تالا کھل گیا۔ میں نے بڑی آہستگی سے تالے کو کنڈے میں سے نکال کر ایک سلاخ میں اٹکا کر کنڈا کھول دیا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

دوسرا قدم اٹھاتے ہی میں رک گیا۔ کمرے میں واپس جا کر لالٹین بجھا دی اور دروازہ بند کرکے تالا کنڈے میں اٹکا دیا اور دبے قدموں بیرونی دروازے کی طرف چلنے لگا۔

گہری تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ آنگن کا باہر والا دروازہ کس طرف ہے۔ راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی اس لیے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلتا رہا۔

دروازے کو باہر سے کنڈا لگا ہوا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دیوار چھ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں اچک کر اوپر چڑھ گیا اور بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔

آسمان پر بادل تھے اور باہر درختوں کی وجہ سے تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری تھی۔ میں رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پانچ چھ مکان تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جانکی وغیرہ کو کس مکان میں رکھا گیا تھا اور وہ لوگ کس مکان میں تھے اور یہ کہ وہ نسوانی چیخ کس مکان سے سنائی دی تھی۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ گھٹی گھٹی چیخ دوبارہ سنائی دی۔ میں اچھل پڑا۔ اس چیخ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ وہ شیطان کس کمرے میں تھے۔ میں دبے قدموں اس طرف چلنے لگا۔

یہ مکان بھی پہلے مکان جیسا ہی تھا۔ آنگن اور پچھلی طرف کمرے۔ آنگن کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں دیوار چڑھ کر بڑی آہستگی سے دوسری طرف کود گیا۔

اس آنگن میں بھی نیم کے دو درخت تھے۔ میں چند لمحے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا رہا اور پھر بہت محتاط انداز میں چلتا ہوا۔ ایک درخت کے نیچے رک گیا۔ آنگن کافی کشادہ تھا۔ جس کے آخر میں غالباً دو کمرے تھے۔ ان کے دروازے دائیں رخ پر تھے جو یہاں سے نظر نہیں آرہے تھے البتہ اس طرف بہت مدھم روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ کسی کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ دبی دبی چیخوں اور شیطانی قہقہوں کی آوازیں بھی اسی طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔

میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک آواز سن کر رک گیا۔

"میں اب چلتا ہوں۔" یہ وجے ٹھاکر کی آواز تھی "تم لوگ رات بھر اس چھوکری سے کھیل مت کرتے رہنا۔ سویرے جلدی جانا ہے۔"

اس کے چند سیکنڈ بعد ہی ایک انسانی ہیولا اس طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور درخت کے تنے کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔ درخت کا تنا اگرچہ زیادہ موٹا نہیں تھا لیکن یہاں گہری تاریکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔

وجے ٹھاکر مجھ سے چار پانچ فٹ کے فاصلے سے گزر گیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ بھیڑنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اسے یونہی کھلا چھوڑ گیا تھا۔

میں درخت کی آڑ سے نکل کر آہستہ آہستہ اس طرف چلنے لگا۔ جس طرف سے وجے ٹھاکر آیا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس طرف دو ہی کمرے تھے۔ پہلے کمرے کا دروازہ اگرچہ کھلا ہوا تھا مگر اندر تاریکی تھی البتہ دوسرے کمرے میں روشنی تھی اور دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ شیطان اس کمرے میں تھے۔ ان کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر ایک روتی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔

"خدا کے لیے چھوڑ دو مجھے۔ مرجاؤں گی میں۔ چھوڑ دو مجھے۔ خدا کے لیے چھوڑ دو۔"

میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ مجھے ناہید کی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ جو اُن شیطانوں کو خدا کے واسطے دے کر اپنی جاں بخشی کی فریاد کررہی تھی۔

"تمہارا خدا سرحد کے دوسری طرف رہتا ہے سُندری۔ یہ ہندوستان ہے یہاں تو کالی ماں کی پوجا کرنے والے سُورماؤں کا راج ہے۔ یہاں تو بھگوان بھی بے بس ہے۔ تمہارا خدا یہاں آکر تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ اسی لیے۔۔۔"

میں اس سے آگے نہیں سن کا۔ وہ جو کوئی بھی تھا واقعی شیطان تھا اور اس قسم کے لوگوں کے سامنے تو واقعی ان کا بھگوان بھی بے بس ہوتا ہے۔

میں اس وقت اپنے پورے بدن میں سنسناہٹ سی محسوس کررہا تھا۔ میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔

میں دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر کتنے آدمی تھے۔ سوچے سمجھے بغیر خوں خوار بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں متجسس نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ دروازے کے دوسری طرف تین چار فٹ آگے دو رائفلیں دیوار کے ساتھ کھڑی تھیں۔

میں نے اپنا سانس روک لیا اور آہستہ آہستہ آگے سرکنے لگا اور پھر بڑی تیزی سے دروازے کے سامنے سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گیا اور ایک رائفل اٹھالی۔

"اے۔ کون ہے رے اُدھر؟"

اندر سے ایک آواز سنائی دی۔ میں دونوں ہاتھوں میں رائفل تھامے دروازے کے سامنے آگیا۔ اس وقت ایک آدمی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شاید یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ دروازے کے سامنے سے کون گزرا ہے لیکن مجھے دیکھ کر وہ اس طرح بے حس و حرکت ہوگیا جیسے پتھر کا ہو کر رہ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت ابھر آئی تھی۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پوری قوت سے رائفل کا بٹ

اس کے سینے پر رسید کردیا۔ وہ بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

کمرے میں دو آدمی اور تھے۔ جن میں سے ایک نے زمین پر پڑی ہوئی ناہید کے ہاتھوں کو سر کے پیچھے لے جاکر گرفت میں لے رکھا تھا اور دوسرا کسی خونی بھیڑیے کی طرح ناہید کو بھنبھوڑ رہا تھا اور ناہید سرپٹخ رہی تھی۔

اپنے ساتھی کی چیخ سن کر وہ دونوں چونک گئے۔ پہلا آدمی ناہید کے ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے دوسرے آدمی کے کندھے پر رائفل کے بٹ سے زوردار وار کیا۔ وہ بھی چیختا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔

ناہید کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مٹی کے فرش پر پڑی ہاتھ پیر پٹخ رہی تھی۔ وہ شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس کے سینے پر ایک زخم تو پہلے ہی تھا۔ گردن کے قریب بھی خون کا ایک دھبا نظر آرہا تھا۔

"ناہید۔ اٹھو۔ جلدی کرو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

میری آواز سن کر ناہید نے آنکھیں کھول دیں۔ بے پناہ ویرانی تھی۔ ان آنکھوں میں لیکن صورت حال کا ادراک کرتے ہی اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک عود کر آئی۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ سکی تھی۔

میں نے ان تینوں کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر بے پناہ خوف تھا۔ آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ لوگ دوبدو لڑائی میں میری قوت کا اندازہ لگا چکے تھے اور اب تو میرے ہاتھ میں ہتھیار بھی تھا۔

میں نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر ان بدمعاشوں پر قابو پالیا جائے تو میں ان تمام عورتوں کو لے کر صحرا میں اس طرف نکل جاؤں گا جس طرف سے پہلے روز میں نے اس شتر سوار کو آتے ہوئے دیکھا تھا۔ کھارے پانی کی جھیل پر سنیاسی واسو دیو نے بتایا تھا کہ چند گھروں پر مشتمل اس چھوٹی سی بستی سے دس بارہ کوس آگے ایک بڑا قصبہ ہے اور میرا خیال تھا کہ ہم صبح ہونے تک اس قصبے میں پہنچ جائیں گے لیکن میں نے تصویر کے دوسرے رخ کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اگر میرا منصوبہ ناکام ہوگیا تو دنیا کی کوئی طاقت کم از کم مجھے تو بھیانک موت سے نہیں بچا سکے گی۔

"ناہید! وہ چادر اٹھا کر اوڑھ لو اور اس طرف آجاؤ۔" میں نے ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ناہید نے چادر اٹھا کر اوڑھ لی اور میرے قریب آگئی۔ میں نے کچھ دیر پہلے یہاں سے وجے ٹھاکر کو واپس جاتے ہوئے دیکھا تھا اور پھر ناہید کی حالت دیکھ کر کوئی احمق بھی سمجھ سکتا تھا کہ اس کا دامن عصمت تار تار ہوچکا ہے۔ اس کے منہ سے نکلنے والی سسکیاں اور ہچکیاں بھی اس کی تصد کررہی تھیں۔

"ماردو انہیں۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی "مار انہیں میرے بھائی۔ انہیں بھون دو گولیوں سے۔ یہ انسا نہیں خون خوار درندے ہیں۔ ان تین دنوں میں انہوں ہم عورتوں کو بری طرح روندا ہے۔ ہمیں اپنے گندے تلے پامال کیا ہے۔ یہ کالی کے پجاری ہیں تباہی اور بربادی ہرکارے۔ یہ انسان نہیں بھیڑیے ہیں۔ ماردو انہیں میر بھائی۔ زندہ مت چھوڑو انہیں۔ ماردو۔ انہیں ختم کردو۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل کانپ کر رہ اس نے کہا تھا کہ "ان تین دنوں میں انہوں نے ہم عور کو بری طرح روندا ہے" میرے ذہن میں جانکی کا خیال آیا۔ کیا وہ بھی ان بدمعاشوں کی ہوس کا شکار ہوچکی ہے۔

"ہمیں مار کر بھی تم لوگ یہاں سے زندہ نہیں جا گے۔" میرے سامنے کھڑے ہوئے تینوں بدمعاشوں میں ایک نے کہا "ہم نہیں جانت ہیں کہ تم اس کوٹھری سے کیسے نکلے ہو۔ یہاں تک چلے آنے کو اپنی کامیابی م سمجھو۔ تمہاری موت تمہارے سر پر منڈلا رہی ہے لیکن تم بندوق پھینک کر اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو تو تمہیں معاف کرسکتے ہیں۔ پھینک دو بندوق۔"

"نہیں بھائی۔ بندوق مت پھینکنا۔" ناہید چیخی "درندے ہیں۔ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔"

"نہیں۔ میں وچن دیتا ہوں کہ تمہیں کچھ نہیں جائے گا۔" اس شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

بات کرتے کرتے اس کی نظریں میرے پیچھے کی ط اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھر آئی اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ میں تیزی سے مڑا مگر مجھے دیر ہوچکی تھی۔ میرے کندھے پر لگنے والی خاصی زوردار تھی۔

میں بری طرح لڑکھڑا گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرنے پہلے ہی وہ آدمی چیل کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑا۔ جس نے بندوق پھینک دینے کا مشورہ دیا تھا۔

اسی وقت ناہید کی زوردار چیخ سنائی دی۔ دروازے مجھ پر حملہ کرنے والے نے اسے بھی کسی بھاری چیز ضرب لگائی تھی اور وہ چیختی ہوئی زمین پر گر گئی تھی۔

میرا حریف مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہا تھ اس نے رائفل پر گرفت بھی مضبوط کرلی تھی۔ میں نے

پیروں پر اچھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا اس کے عکس اس نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا ایک ساتھی ٹھوکروں سے بھی میری تواضع کررہا تھا۔

رائفل کے ٹریگر والے حصے پر میرے حریف کا ہاتھ آگیا تھا اور پھر کھینچا تانی میں اس کی انگلی سے ٹریگر دب گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی ناہید کی خوفناک چیخ بھی فضا میں گونج اٹھی۔ وہ زد میں آگئی تھی اور رائفل سے نکلنے والی گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بدن سے خون کے کئی فوارے پھوٹ پڑے تھے اور پھر اسی لمحے میری کھوپڑی کے پچھلے حصے پر زوردار ٹھوکر لگی اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

وہی کمرا تھا اور میں فرش پر تقریباً اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پیر پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں جس رخ پر پڑا تھا وہاں سے دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور بڑی مشکل سے پہلو بدلنے میں کامیاب ہوسکا تھا۔ اب مجھے دروازہ بھی نظر آرہا تھا اور کمرے کا باقی حصہ بھی۔

یہ کمرا ناہید کا مقتل بنا تھا۔ فرش کے ایک بڑے حصے پر خون پھیلا ہوا تھا جو جم کر سیاہ ہوچکا تھا۔ ناہید کی لاش وہاں سے اٹھالی گئی تھی۔

پچھلے واقعات کسی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گھومتے چلے گئے۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آیا تھا تو وہ خون خوار بھیڑیوں کی طرح ناہید کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ دروازے کے باہر رکھی ہوئی رائفل میرے ہاتھ لگ گئی تھی اور میں نے ان تینوں پر تقریباً قابو پا ہی لیا تھا کہ عقب سے کسی نے مجھ پر حملہ کردیا۔ اس طرح بازی پلٹ گئی اور نہ صرف میں مار کھا گیا بلکہ ناہید بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھ لیا تھا جس نے دروازے کے باہر سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ وہ وجے ٹھاکر تھا جو پہلے تو باہر چلا گیا تھا مگر بعد میں واپس آگیا تھا یا تو اس کی چھٹی حس نے اسے کسی خطرے سے آگاہ کیا تھا اور یا ہوسکتا ہے وہ ساتھ والے مکان میں گیا ہو جہاں سے اس نے اپنے کسی آدمی کی چیخ سن لی تھی۔

میں فرش پر پھیلے ہوئے خون کے اس دھبے کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ مندر کے کھنڈر میں سنیاسی واسو دیو سے تصادم کے بعد قدم قدم پر شکست میرا مقدر کیوں بن گئی تھی۔

کیا میری صلاحیتیں دم توڑ رہی تھیں؟

میں نے سر جھٹک کر ان خیالات کو ذہن سے نکال دیا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگا تھا۔ وہ تو سچویشن ہی کچھ ایسی ہوجاتی تھی کہ میری دھنائی ہوجاتی تھی ورنہ میری صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ اس طرح اپنے حریفوں سے پٹ رہا تھا لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ میں ہمیشہ بالا دست ہی رہوں۔ مارشل آرٹ میں مہارت حاصل کرلینے کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں سپرمین اور ناقابل تسخیر بن گیا ہوں۔ فتح اور شکست لڑائی کے حصے ہیں۔ اب شکست میرے حصے میں آرہی تھی اور یہ میں جانتا تھا کہ ایک مرتبہ مجھے ان پر بالادستی حاصل ہوگئی تو ان میں سے کوئی بھی میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکے گا۔

میں نے بچپن میں ہندوستان کے بارے میں بہت سی کہانیاں سنی تھیں جن سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ہندوستان کوئی بہت ہی پراسرار ملک ہے لیکن میں نے ان باتوں پر کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ ہندوستان کے بہت سے لوگ سنگاپور میں آباد تھے۔ ان میں چاچا پرتاب سنگھ جیسے لوگ بھی تھے۔ مخلص اور ہمدرد۔ میں نے ان لوگوں میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی تھی۔ جسے پراسرار کہا جاتا۔ البتہ سنگاپور ہی میں آباد بعض ہندو ایسے بھی تھے جو دوسروں سے تو کیا اپنے آپ سے بھی مخلص نہیں تھے۔ فریب' دھوکا اور مکاری ان کی سرشت میں شامل تھی اور شاید ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہندوستان کو پراسرار کہا جاتا تھا۔

میں حادثاتی طور پر ہندوستان پہنچ گیا تھا اور یہاں آتے ہی میں جن تجربات سے گزر رہا تھا اسی سے میں یہ رائے بہ آسانی قائم کرسکتا تھا کہ دھوکا اور فریب یہاں کی مٹی میں شامل ہے۔ ان لوگوں کو تو ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیے تھا۔ ہماری مدد کرنی چاہیے تھی لیکن صورت حال اس کے برعکس تھی۔ پہلے ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے جہاز کے مصیبت زدہ مسافروں کو لوٹنے کی کوشش کی اور پھر خود ہی تباہ ہوگئے اور اب یہ لوگ۔۔۔ یہ انسان نہیں شیطان تھے۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا' میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی گئی اور پھر باہر سے کسی کے کھانسنے کی آواز سن کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ وہ آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ میں ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بائیں طرف روشن دان سے بہت مدھم سا اجالا دکھائی دے رہا تھا

جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ رات بیت چکی تھی اور دن طلوع ہونے والا تھا۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ آنے والا یہ نیا دن اپنے دامن میں ہمارے لیے کیا لے کر آرہا تھا۔

چند منٹ اور گزر گئے اور پھر باہر سے اونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو تین آدمیوں کی بھی زور زور سے بولنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ دروازے کے باہر ایک بار پھر کھانسی کی آواز سنائی دی۔

میں نے ایک بار پھر پہلو بدلا اور بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ اسی دوران میں باہر قدموں کی آواز ابھری جو قریب آکر رک گئی اور اس کے کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔

وہ دو آدمی تھے اور دونوں کے پاس رائفلیں تھیں۔ ان میں سے ایک رائفل تانے کھڑا رہا اور دوسرا میرے قریب بیٹھ کر میرے پیروں کی رسی کھولنے لگا۔

"یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "تمہارے صرف پیر کھولے جارہے ہیں۔ اگر تم نے اس مرتبہ کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو تمہیں بے دریغ گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ اس لیے اگر تمہیں اپنا جیون پیارا ہے تو کوئی ایسی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

میں نے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ میرے پیر کھول کر اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھا دیا اور لالٹین بجھا دی اور وہ دونوں مجھے دھکے دیتے ہوئے کمرے سے باہر لے آئے۔

ہم اس مکان سے نکل کر درختوں کے جھنڈ کی طرف آگئے جہاں جانکی بھی دوسری تین عورتوں کے ساتھ موجود تھی۔ بلی اس کی ٹانگوں سے لپٹی رو رہی تھی۔ بلی کو دیکھ کر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ کیا اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کی ماں اس سے بچھڑ چکی ہے اور وہ مامتا کے سائے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوچکی ہے۔

وجے ٹھاکر کے آدمی اونٹوں پر کجاوے کس رہے تھے اور وجے ٹھاکر خود ایک طرف کھڑا احکامات جاری کررہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شیلا مائی بھی ایک مکان سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے بڑی سی ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی۔

جانکی اور دوسری عورتوں کو مختلف اونٹوں پر بٹھایا جانے لگا۔ وہ دونوں آدمی مجھے بھی دھکیلتے ہوئے ایک اونٹ کی طرف لے گئے۔ اونٹ کے قریب پہنچ کر میں نے غیر ارادی طور پر بائیں طرف دیکھا اور ٹھٹک گیا۔ چند گز آگے مجھے جھاڑیوں میں ایک پیر نظر آیا۔ میں اس طرف چلنے لگا۔ مجھے روکا نہیں گیا۔

اور پھر جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر میں کانپ اٹھا۔ ناہید کی برہنہ لاش جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ زخموں سے بہنے والا خون جم کر سیاہ ہوچکا تھا اور میرا خیال ہے لاش اکڑ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری طرف دیکھ رہی ہو۔

یہ سفاکی اور بربریت کی انتہا تھی۔ ایک انسان کی لاش کو مردہ کتے کی طرح پھینک دیا گیا تھا۔ ایسے شقی القلب انسان میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے مگر یہ لوگ انسان تھے ہی کب۔ شیطان تھے یہ تو۔

"اس کو دیکھن سے دل بھر گیا ہو تو چلو بھایا۔"

یہ آواز سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ گن مین رائفل لیے میرے قریب کھڑا تھا۔ ہم اونٹوں کے قریب آگئے۔ سب لوگ اونٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ جانکی اور وہ تینوں عورتیں الگ الگ اونٹوں پر تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ایک آدمی بھی پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ وجے ٹھاکر نے ایک اونٹ پر بلی کو سنبھال رکھا تھا جو بری طرح روتے اور چیختے چلاتے ہوئے مچل رہی تھی اور بار بار ماں کو پکار رہی تھی۔ میرے ہاتھ پشت سے کھول کر آگے باندھ دیے گئے۔

"چل بھایا۔ بیٹھ اس اونٹ پر۔" میرے ساتھ آنے والے نے کہا۔

"میرے ہاتھ تو کھول دو۔ میں اونٹ پر کیسے بیٹھوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہ بھایا۔ یہ غلطی میں نہ کرسکتا۔" اس نے جواب دیا "یوں ادھر پیر رکھ کر اوپر چڑھ جا اور کجاوے کو یہاں سے پکڑ لے۔"

میں اونٹ پر کسے ہوئے کجاوے کو دیکھنے لگا۔ اس پر دو آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ میں لکڑی پر پیر رکھ کر اوپر چڑھ گیا اور دوسرا پیر دوسری طرف لٹکا لیا۔ آگے سے کجاوے کی لکڑی نصف دائرے کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ میں بندھے ہوئے ہاتھوں کو الگ الگ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے دونوں ہاتھ ایک ہی جگہ اس لکڑی پر جما دیے۔

میرے شتربان نے منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا اور میرے پیچھے بیٹھ کر اونٹ کی نکیل کی رسی پکڑلی اور رسی کو جھٹکا دیتا ہوا ہش ہش کرنے لگا۔ رسی کھینچنے سے اونٹ بلبلا اٹھا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ اونٹ پر بیٹھنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا اور زوردار جھٹکے لگنے سے میں گرتے گرتے بچا تھا۔

دوسرے اونٹ بھی بلبلاتے ہوئے اٹھ گئے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ تمام آدمیوں نے اپنے چہروں پر ڈھاٹے باندھ لیے تھے۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

دن کا اجالا پھیل رہا تھا۔ جانکی اور تینوں عورتوں کے چہروں پر خوف کے سائے نظر آرہے تھے۔ بلی بدستور اپنی ماں کو پکارتے ہوئے رو رہی تھی۔ وجے ٹھاکر نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور تمام اونٹ بلبلاتے ہوئے ایک طرف چل پڑے۔ شیلا مائی بھی ایک الگ اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی چہرے پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور میں نے اسے اس کے کپڑوں سے پہچانا تھا۔

اونٹ اس نخلستان سے نکل کر مشرق کی طرف چلنے لگا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ مڑ کر ان جھاڑیوں کی طرف دیکھا جہاں ناہید کی بے کفن لاش پڑی ہوئی تھی۔ مجھے ناہید کی موت کا بے حد افسوس ہوا تھا اور بلی پر ترس آرہا تھا جو وحشیوں کے اس دیس میں اکیلی رہ گئی تھی۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اونٹ کی بے ڈھنگی چال سے زوردار جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں قدرے آگے جھکا ہوا تھا اور سامنے والی لکڑی کو بڑی سختی سے پکڑ رکھا تھا۔

نخلستان بہت پیچھے رہ گیا۔ اونٹ ایک قطار میں چلتے رہے۔ میں نے کسی فلم میں اونٹوں کے ایک کارواں کو صحرا میں چلتے ہوئے دیکھا تھا۔ فلم میں کارواں کا وہ منظر بہت اچھا لگا تھا اور آج میں خود ایک کارواں میں شامل تھا لیکن میری حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور میں اس سفر سے بالکل بھی لطف اندوز نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس دل و دماغ میں طرح طرح کے وسوسے ابھر رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنا قیدی کیوں بنا رکھا ہے اور یہ لوگ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں۔

سامنے افق پر سرخی پھیل رہی تھی۔ سورج نکلنے والا تھا۔ دن کے وقت صحرا میں سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جائے گا، ریت بھی تپتی جائے گی۔ اوپر آگ برساتا ہوا سورج اور نیچے تپتی ہوئی ریت۔ اس جہنم میں سفر کرنے کا تصور ہی ہولناک تھا۔

سورج نکل آیا۔ دھوپ کی رو پہلی کرنیں شروع میں تو بہت بھلی لگیں لیکن پھر ان کی حدت بڑھتی گئی اور بدن پر سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ہم مشرق کی طرف سفر کررہے تھے۔ دھوپ براہ راست چہروں پر پڑ رہی تھی۔ تیز روشنی میں آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔

ہمارے چاروں طرف تاحد نگاہ ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ ہوا نے ریت پر لہریں سی بنا دی تھیں اور لگتا تھا جیسے یہ ریت کا لہریں لیتا ہوا سمندر ہو جس میں ہم سفر کررہے تھے۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ مجھے یوگا کی پریکٹس تھی اور میں گھنٹوں ایک ہی اسٹانس میں بیٹھا رہ سکتا تھا لیکن یہاں ایسی صورت حال نہیں تھی۔

اونٹ کے جھٹکوں کی وجہ سے میری کمر دکھنے لگی تھی۔ کبھی میں آگے کو جھک جاتا اور کبھی سیدھا ہوجاتا۔ اگر میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو شاید اتنی زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔

دھوپ خاصی تیز ہوگئی تھی۔ میرے جسم کا اوپر کا حصہ برہنہ تھا۔ اس لیے دھوپ براہ راست سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پسینے کی دھاریں پورے بدن پر کیچووں کی طرح رینگ رہی تھیں پھر شاید قدرت کو ہم پر رحم آگیا۔

آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے تو پہلے ہی سے تھے لیکن اب وہ ابر پارے آپس میں جڑتے جارہے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آسمان بادلوں سے ڈھک گیا۔

ہمارے اس قافلے میں سات اونٹ شامل تھے۔ جو ایک قطار میں چل رہے تھے۔ وجے ٹھاکر کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا اور اس کے ساتھ ہی شتر سواروں نے اونٹوں کی رفتار تیز کردی۔ میرے اونٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے نکیل کی رسی کو ایک مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ اونٹ پہلے بلبلایا اور پھر دوڑنے لگا۔

پہلے تو مجھے ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن اب میں باقاعدہ اچھل رہا تھا۔ میں نے آگے کو جھک کر لکڑی کو اس قدر مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ میری انگلیوں کے جوڑوں میں درد ہونے لگا۔

عورتوں کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں لیکن شتر سواروں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اونٹوں کو دوڑاتے رہے اور پھر وہ حادثہ پیش آگیا جس کی شاید میں توقع کررہا تھا۔

ایک عورت اونٹ سے گر گئی۔ اس کی چیخیں بڑی خوفناک تھیں کچھ آگے جا کر اونٹ روک لیے گئے اور دو آدمی اپنے اونٹوں سے اتر کر اس طرف دوڑے جہاں وہ عورت ریت پر پڑی چیخ رہی تھی۔

یہ وہی عورت تھی جسے اس روز میں نے اپنے ساتھ والے کمرے میں روتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ اسے دوبارہ اونٹ پر بٹھا دیا گیا اور قافلہ پھر چل پڑا۔

تین گھنٹوں کے جان لیوا سفر کے بعد درختوں کا ایک جُھنڈ سا نظر آیا۔ یہ کیکر کے درخت تھے جو تقریباً ایک فرلانگ کے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ پانی کا کوئی چشمہ وغیرہ نہیں تھا لیکن شاید زیرِ زمین پانی موجود تھا جس سے کیکر کے یہ درخت پرورش پا گئے تھے۔

ان درختوں کے قریب اونٹ روک لیے گئے۔ اونٹوں کے بیٹھنے کا انداز بھی بڑا روح فرسا تھا۔ اونٹ جب آگے کی طرف جھکا تو میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا تھا۔

کیکر کے درختوں کے اس ذخیرے میں دو چار نیم کے درخت بھی تھے۔ ہم ان درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ جانکی اپنے اونٹ سے اترتے ہی میری طرف دوڑی تھی لیکن اسے میرے قریب آنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ وہ مجھ سے چند فٹ دور بیٹھ گئی۔

شیلا مائی نے اپنی پوٹلی کھول لی۔ جس میں روٹیاں بندھی ہوئی تھیں ان کے ساتھ مرچوں کا اچار تھا۔ اس نے ایک ایک روٹی ہم سب میں تقسیم کر دی۔ ہر روٹی پر اچار کی.... ایک مرچ بھی رکھ دی گئی تھی۔ میرے ہاتھ اس وقت بھی نہیں کھولے گئے البتہ جانکی کو یہ اجازت دے دی گئی کہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے روٹی کھلا دے۔

جانکی میرے قریب آ گئی۔ آج کئی روز بعد مجھے جانکی کو دیکھنے اور بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں ویرانی سی تھی لیکن میرے سامنے آ کر وہ اپنے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہو گئی۔

ہم انگریزی میں باتیں کرنے لگے۔ ناہید کی افسوسناک موت پر ہم دونوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا اور بلی کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ اس کا کیا ہو گا۔ بلی وجے ٹھاکر کے پاس ہی بیٹھی روٹی کھا رہی تھی۔ وجے ٹھاکر نے نجانے اس بچی پر کیا جادو کیا تھا کہ وہ ہمیں بھول کر اس کے پاس ہی بیٹھی رہی تھی۔

باتوں ہی باتوں میں' میں نے محتاط الفاظ میں جانکی سے وہ سوال بھی پوچھ ہی لیا جو کافی دیر سے میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ جانکی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی اور پھر اس نے بتا بھی دیا کہ وہ ان وحشیوں کی ہوس سے محفوظ ہی رہی ہے۔

میرا خیال تھا کہ شاید جانکی کو علم ہو کہ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے لیکن اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمارا کارواں ایک بار پھر چل پڑا۔

ہم لوگ صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اس نخلستان سے روانہ ہوئے تھے۔ ایک بجے کے قریب ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ تقریباً چھ گھنٹوں کے اس سفر میں ہمیں کوئی آبادی دکھائی نہیں دی تھی یا پھر یہ بات تھی کہ یہ لوگ قصداً ایسے راستے پر چلتے رہے تھے جہاں آبادی نہ ہو۔ اس جنگل سے مجھے اندازہ ہوا کہ شاید اس کے دوسری طرف کوئی آبادی ہو کیونکہ جنگل میں جانے والے راستوں پر ٹائروں کے نشان بھی نظر آ رہے تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں مختلف گاڑیوں کی آمدورفت بھی ہوتی رہی ہے۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے جنگل گنجان ہوتا جا رہا تھا لیکن بالآخر ہم آدھے گھنٹے بعد ایک کھلی جگہ پر نکل آئے اور پھر میری آنکھیں حیرت کے باعث کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

وہ بہت شاندار اور وسیع و عریض عمارت تھی۔ اس کی بیرونی چار دیواری کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ عمارت کے اردگرد کئی ایکڑ زمین گھیری گئی تھی۔ عمارت کا گیٹ کسی پرانے قلعے کی طرح تھا جو اس وقت بند تھا۔

وجے ٹھاکر اپنے اونٹ سے اتر کر گیٹ کے قریب پہنچ کر ذیلی دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ وہ دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ اس سے برآمد ہونے والا آدمی بھی شکل و صورت سے ڈاکو ہی لگ رہا تھا۔ کندھے پر آٹومیٹک رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ وجے ٹھاکر کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا اور پھر اس شخص نے اندر جا کر گیٹ کا ایک حصہ کھول دیا اور ہمارا قافلہ اندر داخل ہو گیا۔

چار دیواری کے اندر کا منظر میرے لیے اور بھی حیران کن تھا۔ فصیل کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف لاتعداد کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے سامنے برآمدے بھی تھے۔ سامنے بہت شاندار عمارت تھی جس کے سامنے ایک وسیع و عریض بارہ دری بنی ہوئی تھی اور اس کے اطراف میں کسی اسٹیڈیم کی سیٹوں کی طرح سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اس بارہ دری میں کوئی کھیل تماشے ہوتے ہوں گے اور چاروں طرف وہ سیڑھیاں تماشائیوں کے بیٹھنے کے لیے تھیں۔

اس فصیل کے اندر پورا شہر آباد تھا۔ درمیان میں بہت وسیع و عریض میدان تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونٹ اور گھوڑے وغیرہ بندھے ہوئے تھے۔ اس میدان کے ایک طرف گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے جگہ تھی جہاں اس وقت دس بارہ لینڈ کروزر قسم کی قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ فصیل کے ساتھ ساتھ واقع بہت سے کمرے آباد تھے۔ ہر طرف لوگوں کی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ گیٹ سے ایک

طرف وجے ٹھاکر کے اونٹ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو تھوڑی دور جا کر ایک جگہ رک گیا۔ ہمارا قافلہ بھی وہاں رک گیا۔ اس جگہ سیمنٹ کنکریٹ کا ایک چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

ہم لوگوں کو اتارنے کے بعد اونٹوں کو اس حوض کے قریب کھونٹوں سے باندھ دیا گیا۔ وجے ٹھاکر اس آدمی کے ساتھ ایک طرف چلا گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

ایک طرف فصیل کے ساتھ ان کمروں کے سامنے پہنچتے ہی میں اچھل پڑا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ہر تیسرا یا چوتھا کمرا ایسا تھا جس میں لوہے کی سلاخوں والا دروازہ لگا ہوا تھا اور ایسے کئی کمروں میں عورتیں اور مرد قید تھے۔ بعض عورتوں کے رونے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

جانکی اور ان تینوں عورتوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ بلی بھی ان کے ساتھ تھی۔ مجھے ایک اور کمرے میں دھکیل کر سلاخوں والے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا۔

یہ کمرا دس بائی دس فٹ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش پر سرخ رنگ کی میلی سی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک بلب اور چھت پر لٹکا ہوا پنکھا دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔ شہر سے میلوں دور ویرانے میں واقع اس عمارت میں اپنا بجلی پیدا کرنے کا جنریٹر لگا ہوا تھا۔ میں نے پنکھا بھی چلا دیا اور بلب بھی جلا دیا۔

اس کمرے میں پچھلی طرف بھی ایک دروازہ تھا۔ وہ باتھ روم تھا جس میں نلکے کے نیچے پلاسٹک کی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی۔ باتھ روم کی پچھلی دیوار میں اوپر ایک روشن دان تھا جس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

چھ گھنٹوں تک اونٹ پر مسلسل سفر نے میرا انجر پنجر ڈھیلا کر دیا تھا جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کمرے میں بند کرنے سے پہلے میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے۔ میری کلائیوں پر رسی کی رگڑ سے سرخ نشان پڑ گئے تھے۔ جن میں جلن سی ہو رہی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے دوسرے لوگ کون ہیں۔ بہت سے کمروں میں مردوں اور عورتوں کو بند دیکھ چکا تھا۔ یہ جیل تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے کاروان سرائے بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جنگل بیابان میں اتنی شاندار عمارت جیل یا کاروان سرائے نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو کسی راجہ کا محل ہی ہو سکتا تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ میں سامنے وسیع و عریض میدان میں لوگوں کو آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ان لوگوں کی سرگرمیاں بڑی پراسرار سی لگ رہی تھیں اور پھر ایک آدمی دروازے کے سامنے رک گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تاروں سے بنا ہوا چھینکا تھا جس میں چائے کے متعدد گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک گلاس چھینکے سے نکال کر سلاخوں کے اندر دروازے کے قریب رکھ دیا اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں اتنے لوگوں کو قید میں کیوں رکھا گیا ہے؟" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

وہ شخص پہلے تو مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا پھر بولا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ غلاموں کی منڈی ہے بھایا۔" اس شخص نے جواب دیا "یہ جو قیدی ہیں سب کنیزیں اور غلام ہیں۔ انہیں نیلامی کے لیے یہاں لایا گیا ہے اور تم بھی ان میں سے ایک ہو۔ وجے ٹھاکر اس مرتبہ بڑی اچھی چیزیں لے کر آیا ہے اور تمہارے جیسا جوان تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وجے ٹھاکر روکڑا کما کر لے جائے گا اس مرتبہ۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ دماغ اس طرح سن ہو گیا جیسے برف جم گئی ہو۔ میں وحشت زدہ سی نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ آج کے جدید ترین دور میں کنیزوں اور غلاموں کی تجارت! لیکن اس شخص نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ یہاں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا' اس سے اس کی باتوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔

اس شخص نے جو کچھ بھی بتایا وہ بہت خوفناک تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہاں ہر تین مہینوں بعد کنیزوں اور غلاموں کی منڈی لگتی ہے۔ بردہ فروشوں کے گروہ پورے ہندوستان میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ لڑکیوں اور عورتوں کو اغوا کر کے یہاں لے آیا جاتا ہے۔ بعض مرد بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں لیکن زیادہ توجہ حسین اور جوان عورتوں پر دی جاتی ہے۔

یہاں تین دن تک میلا سا لگا رہتا ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے دولت مند لوگ کنیزیں اور غلام خریدنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ نیلامی رات کے وقت اس بارہ دری میں ہوتی ہے جس کے چاروں طرف خریداروں کے بیٹھنے کے لیے سیٹیں بنی ہوئی ہیں۔

"انسانوں کی خرید فروخت تو جرم ہے۔ کیا یہاں کی حکومت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"سرکار!" وہ شخص مسکرا دیا "میں تو یہ جانتا ہوں بھایا کہ دنیا کے ہر ملک میں انسانوں کی خرید و فروخت کو سنگین ترین جرم سمجھا جاتا ہے مگر دنیا میں ہر جگہ یہ گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔ انداز مختلف ہیں۔ طریقے الگ الگ ہیں۔ یہ منڈی کسی بھی آبادی سے میلوں دور ہے مگر سرکار سب کچھ جانتی ہے۔ قانون کی رکھشا کرنے والوں کو بھتا ملتا ہے تو وہ اس کے خلاف کارروائی کیوں..... کریں گے۔ یہاں تو سیاسی لیڈر بھی آتے ہیں اور خوب صورت کنیزیں خرید کر کے جاتے ہیں۔ تم چائے پیو بھایا۔ یہ سب کچھ مت سوچو۔ تمہاری تقدیر پر تو مہر لگ چکی ہے۔ سوچنا اب تمہارا کام نہیں ہے۔"

وہ شخص چلا گیا اور میں دیر تک بیٹھا اس صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہاں انسانوں کی تجارت ہوتی ہے۔ میں جیسے جیسے سوچتا گیا میرا ذہن الجھتا گیا۔ ہندوستان واقعی بہت پراسرار ملک ہے۔

مجھے بھی نیلامی کی سولی پر چڑھایا جانے والا تھا۔ یہ سوچ کر ہی میرا دل قہقہے لگانے کو چاہ رہا تھا۔ میں نے سلاخوں کے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھالیا اور چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لینے لگا۔

میرے دماغ میں اب بھی سنسناہٹ سی پھیلی ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میری کہانی یہیں پر ختم ہوجائے گی؟ کیا میں اپنے ماں باپ، تھائی اور ان درجنوں بے گناہوں کا بدلہ نہیں لے سکوں گا جنہیں وارا اور اس کے ساتھیوں نے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ کیا وارا اسی طرح دندناتا پھرے گا۔ اسے اس کے گھناؤنے جرائم کی سزا نہیں ملے گی اور کیا میری باقی زندگی غلامی میں گزرے گی۔ میرے گلے میں طوق پڑا رہے گا اور میں اپنی مرضی سے سانس بھی نہیں لے سکوں گا؟

یہ سوچیں بڑی بھیانک تھیں لیکن حقیقت سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان سے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔

نخلستان میں ایک کوشش کرچکا تھا لیکن مقدر نے میرا ساتھ نہیں دیا تھا اور یہاں تو ایسا کوئی چانس نظر نہیں آتا تھا اگر میری ایسی کوئی کوشش کامیاب ہو بھی گئی تو یہاں نکل نہیں سکوں گا۔

وقت کی رفتار جیسے تھم گئی تھی۔ میں سلاخوں بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ لوگوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں کارواں اور یہاں آئے تھے۔ لوگوں کی ہاہو کے ساتھ کی بلبلاہٹ کی آوازیں بھی فضا میں گونج رہی تھیں تین اور شان دار گاڑیاں پارکنگ ایریا کی طرف جاتے دیکھی تھیں۔ یہ خریداروں کی گاڑیاں تھیں۔ ان رہائش کا انتظام بھی عمارت کے مرکزی حصے میں تھا لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا رہا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ وسیع و عریض میدا عمارت کے مختلف حصوں میں برقی قمقمے جگمگا اٹھے کی سرگرمیاں کچھ اور تیز ہوگئیں۔ ہر طرف سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

آٹھ بجے کے قریب وہی آدمی میرے لیے کھانا آگیا جو پہلے چائے لایا تھا۔ پیتل کے تھال میں دو روٹیا ہوئی تھیں۔ ایک کٹوری میں پانی کی طرح مونگ کی دال تھی اور دوسری کٹوری میں آلو کی بھجیا تھی۔

میں ابھی کھانا کھا رہا تھا کہ وجے ٹھاکر دروا سامنے نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کالے رنگ بنیان تھی اور ایک نیکر جو اس نے سلاخوں سے اند دی۔

"روٹی کھا کر نہا لینا اور یہ کپڑے پہن لینا۔" اور رکے بغیر واپس چلا گیا۔

اور پھر تقریباً دو گھنٹوں بعد مجھے رانفلوں کی زد کی طرف لے جایا گیا۔ اس وقت میرے پیر بھی تھے اور ہاتھ بھی آزاد تھے۔ میرے ہاتھ اس باندھے گئے تھے کہ انہیں شاید یہ یقین تھا کہ بیسیوں موجودگی میں میں کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہیں کرا

وہ منظر دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کھلی رہ گئیں۔ بارہ دری بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ چارا سیٹوں پر وہ دولت مند لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو خوب کنیزیں اور غلام خریدنے کے لیے ہندوستان کے کے شہروں سے یہاں آئے تھے۔

اس وقت بارہ دری کے وسط میں ایک نہا صورت عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر تیس بیس ہوگی۔ اس کے جسم پر نہایت مختصر سا لباس تھا۔ وہ ہرنی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی

ت آدمی کھڑا تھا جس نے زرق برق مقامی لباس پہن رکھا وہ اس حسینہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا تھا۔ اس کے حسن و شباب کی تعریفوں کے پل باندھنے کے تھ ساتھ وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو چھو رہا تھا اور عورت ایسے ہر موقع پر اپنا بدن چرانے کی کوشش کر رہی

اور پھر اس کی بولی لگنے لگی۔ بولی دینے والے اپنی جگہ اٹھ کر آتے۔ اس حسینہ کے بدن کو ٹٹول کر دیکھتے اور بولی اپنی جگہ پر چلے جاتے۔

ایک گھنٹے میں تین لڑکیاں نیلام ہوگئیں۔ ان کی قسمت سودے ہوگئے۔ ان کی قیمت لگ گئی اور وہ ایک ہاتھ سے ہاتھوں میں منتقل ہوگئیں۔ ان کی تقدیر پر غلامی کی مہر گئی تھی۔

آدھی رات کے قریب دو غلام بھی نیلام ہوئے اور پھر بارہ دری میں لایا گیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میرے تے ہی وہاں کچھ ہلچل سی مچ گئی تھی۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ طرح سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔

نیلامی کی آواز لگانے والے کو غالباً میرے بارے میں کچھ بتا دیا گیا تھا۔ وہ اپنی چرب زبانی سے مجھے سُپرمین ت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے جسم کے مختلف وں پر ہاتھ مار کر میرے اندر بھری ہوئی طاقت اور میرے دی جسم کے بارے میں بتا رہا تھا۔

اس نے مجھے یوسف ثانی کا نام بھی دیا تھا۔ وہ جو کچھ بھی رہا تھا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ گوری چٹی رنگت، دراز ت اور ابھرے ہوئے مسلز، میرے جسم پر سیاہ رنگ کی اور بنیان تھی جو خاص طور پر پہنائی گئی تھی۔ اس مختصر لباس میں میرے مسلز کچھ اور بھی نمایاں ہوگئے تھے۔

ایک دو آدمیوں نے میرے قریب آکر مجھے اس طرح تھا جیسے قربانی کا بکرا خریدنے سے پہلے ٹٹولا جاتا ہے۔ میں آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سنسنی بھی برقی لہروں کی طرح میرے پورے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ہو سکتا ہے میں کسی کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتا مگر جانکی کے بغیر میں کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس دوران میں وجے ٹھاکر بھی اوپر آگیا۔ وہ مسکراتی نظروں سے کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی چاروں طرف بیٹھے لوگوں کو دیکھنے لگتا۔ دوسرا شخص میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"سنیاسی واسو دیو کو آپ سب لوگ جانتے ہیں۔ بہت سی نظریں اسے تلاش بھی کر رہی ہیں مگر آج وہ یہاں نہیں ہے۔ آپ لوگ جانتے ہیں واسو دیو ایک بپھرا ہوا سانڈ تھا۔ وہ چار آدمیوں کے قابو میں بھی نہیں آتا تھا مگر یہ نوجوان۔" اس نے میرا ہاتھ کچھ اور اوپر اٹھا دیا "یہ ہے وہ نوجوان جس نے دو منٹ میں واسو دیو کی گردن مروڑ دی اور اسے نرک میں پہنچا دیا۔"

ایک بار پھر سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اس نے سب کے سامنے مجھے قاتل ثابت کر دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اس کا خریدار وہی ہوگا جو اسے سنبھال سکے۔ ہے کوئی ایسا دل والا جو اس شیر کو اپنے گھر لے جاسکے۔ میری بولی پچیس ہزار۔"

سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ ایک بار پھر فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔

"پچاس ہزار!"

ایک طرف سے یہ کھنکتی ہوئی نسوانی آواز سنتے ہی سناٹا سا چھا گیا۔ خاموشی اس قدر گہری تھی جیسے وہاں زندگی کا وجود

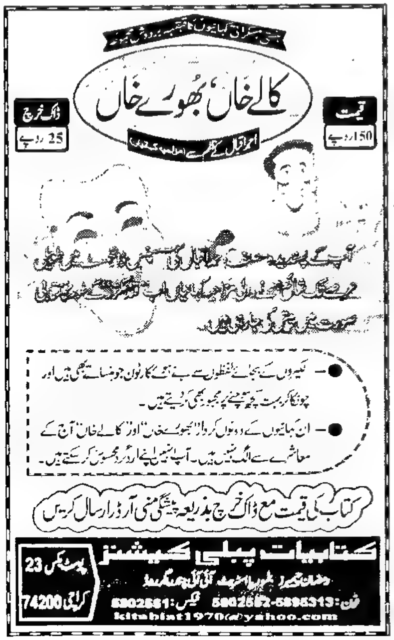

ہی نہ رہا ہو۔ سب لوگ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے اور پھر وہ خاموشی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ لوگوں کی سرگوشیاں ایک بار پھر مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی پیدا کرنے لگی۔ میں نے بھی چونک کر اس آواز کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میری بولی لگانے والی اپنی جگہ سے اٹھ رہی تھی۔ میں نے زندگی میں بڑی حسین عورتیں دیکھی تھیں اور بعض تو ایسی تھیں جن پر نظر پڑتے ہی دل میں کچھ ہونے لگتا تھا مگر یہ تو کچھ اور ہی چیز تھی۔ کسی اپسرا نے عورت کا روپ دھار لیا تھا۔

چھ فٹ کے قریب قد' بھرا بھرا سڈول جسم' غزال جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں' سیب جیسے گال اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے سرخ ہونٹ۔ اس کا لباس بھی عجیب تھا جس سے بدن کے نشیب و فراز بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر شاہانہ تمکنت اور کھڑے ہونے کا انداز بڑا دل فریب تھا۔ وہ پُر وقار انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی بارہ دری میں آ گئی۔ چند لمحے میرے سامنے کھڑی بڑی دل فریب نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لیتی رہی پھر ہاتھ بڑھا کر بازو کے مسل ٹٹولنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ آ گئی۔

لوگوں کی سرگوشیاں اب بھی جاری تھیں۔ میں تین چار گھنٹوں سے یہاں کنیزوں اور غلاموں کو نیلام ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ بعض حسین ترین عورتیں بھی نیلام ہوئی تھیں لیکن کسی کے لیے کوئی بھی بولی پانچ ہزار سے زیادہ نہیں بڑھی تھی اور اس اپسرا نے میرے لیے ڈبل بولی لگا کر لوگوں کو حیران کر دیا تھا اور غالباً چہ میگوئیاں اسی سلسلے میں ہو رہی تھیں۔

"ہیرے کی قدر جوہری جانتا ہے۔" بولی کی آواز لگانے والا کہہ رہا تھا "یہ ہیرا صرف پچاس ہزار میں۔ کوئی اور قدر داں۔"

"ساٹھ ہزار۔" ایک اور مردانہ آواز سنائی دی۔

سب لوگوں نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ بھاری بھرکم اور اونچے لمبے قد کے مالک اس شخص نے راجستھانی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر گلابی رنگ کی پگڑی تھی۔ شان بڑھانے کے لیے کمر کے ساتھ میان میں تلوار بھی لٹکی ہوئی تھی۔

"ایک لاکھ۔" میرے سامنے کھڑی ہوئی حسینہ نے بولی لگائی۔ ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔

"سوا لاکھ۔" اس کے حریف نے پچیس ہزار بڑھا دیے۔

"دو لاکھ۔" حسینہ نے پچھتر ہزار کا اضافہ کر...
کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ڈھائی لاکھ۔" حریف نے نئی بولی لگائی۔

سناٹا برقرار تھا۔ لوگ حیرت سے ایک دو...
طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا...
نے ایک طرف کھڑے ہوئے وجے ٹھاکر کی طرف دیکھ...
کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"تین لاکھ۔" حسینہ نے بولی لگائی اور مسکرا...
نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"دھنے واد روپ متی جی۔" حریف نے دونوں ہا...
دیے۔

بولی تین لاکھ پر رک گئی۔ روپ متی نام کی اپ...
فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا۔ ایک مسکراتی...
میرے چہرے پر ڈالی اور پُر وقار انداز میں قدم اٹھا...
اپنی جگہ پر چلی گئی۔

بولی کی آواز لگانے والا اشتعال دلانے والے انداز...
بولی بڑھانے کی آواز لگاتا رہا لیکن سناٹے میں کوئی آوا...
نہیں دی۔ اس نے بولی روپ متی کے نام پر ختم کر...
میرے گلے میں نصف انچ موٹی سیاہ رسی کا طوق پہنا...
لیے آگے بڑھا تو روپ متی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے بلند آواز میں کہا "اس کی ض...
نہیں۔ اسے میرے آدمیوں کے حوالے کر دو۔"

نیلام ہونے والی ہر عورت اور مرد کے گلے میں...
کا طوق پہنا دیا جاتا تھا لیکن روپ متی نے مجھے غلامی...
پہنانے سے منع کر کے بھی لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا...

دو لمبے تڑنگے آدمی بارہ دری میں آ گئے اور مجھے...
بانہوں سے پکڑ کر عمارت کے اندر لے گئے۔ اندر...
عمارت بہت شان دار تھی۔ کئی راہداریوں سے...
ہوئے وہ ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔ دروازہ...
مجھے اندر دھکیل دیا اور دروازہ بند کر کے باہر سے تالا...
کمرے میں قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر نام کی کوئی...
تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورت حال...
کرنے لگا۔ کیا میرا مقدر یہی تھا کہ باقی زندگی ایک...
غلامی میں گزار دوں؟

یہاں آنے کے بعد جانکی کو مجھ سے الگ کر دیا...
مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کی بولی مجھ سے پہلے لگ...
اس کی نیلامی ابھی باقی تھی۔ کیا میں اسے دوبارہ د...

یا نہیں۔ قسمت کی عجیب ستم ظریفی تھی۔ اس نے میرے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ قدم قدم پر اپنی زندگی داؤ پر لگائی تھی اور بالآخر مجھ سے اس طرح بچھڑ جائے گی۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

میرے ذہن میں روپ متی کا خیال ابھر آیا۔ وہ بلاشبہ دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اس نے مجھے تین لاکھ میں خریدا تھا۔ مجھ سے پہلے کسی بھی غلام کی بولی تیس پینتیس ہزار سے اوپر نہیں گئی تھی اور میری بولی تین لاکھ پر ختم ہوئی تھی۔

بولی شروع ہوتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ روپ متی مجھے ہر قیمت پر خریدنا چاہتی ہے۔ اس کا حریف بولی بڑھاتا تو یہ اور آگے بڑھتی مگر حریف نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور روپ متی نے مجھے تین لاکھ میں خرید لیا تھا اور یہاں کی روایت کے برخلاف اس نے میرے گلے میں غلامی کا طوق بھی نہیں ڈالنے دیا تھا۔

روپ متی نے مجھے کیوں خریدا تھا؟ یہ سوالیہ نشان بار بار میرے ذہن میں ابھر رہا تھا۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ جو دروازے کے سامنے رک گئی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا۔ کسی نے ایک عورت کو اندر دھکیلا اور دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔

وہ عورت منہ کے بل قالین پر گری۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی اور جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو میں اچھل پڑا۔

وہ جانکی تھی۔

جانکی نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں والہانہ انداز میں ایک دوسرے کی طرف لپکے اور اس طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئے جیسے صدیوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔

میں نے جانکی کو اپنے سے الگ کیا تو اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

اسی لمحے دروازہ کھلا۔ میں نے آواز سن کر اس طرف دیکھا۔

روپ متی دروازے میں کھڑی عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے اور آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی۔

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت -/100 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ جو بگیرزگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت -/250 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کالی کہانیاں
جرائم، جادو، شیطانیت، ارواح، طنز و مزاح، اسرار و خوف، سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت -/30 روپے ڈاک خرچ -/23 روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے
دو حصے۔ قیمت فی حصہ -/60 روپے
قیمت -/60 روپے ڈاک خرچ -/23 روپے

-/500 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
یہ رعایت پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی حاصل ہو گی

کتابیات پبلی کیشنز
74200

روپ متی کو اس طرح اچانک سامنے دیکھ کر میرا دل یک بارگی اچھل پڑا۔ کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ میں نے جانکی کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے میرے گرد اپنی بانہوں کا حصار کچھ اور بھی مضبوط کردیا۔ اس کے دل کی دھڑکن مجھے اپنے سینے میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا اس لیے وہ روپ متی کو نہیں دیکھ سکی تھی۔

میں نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بڑھ گئی تھی۔ چہرے پر تناؤ نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ میرے دل میں ایک عجیب سا خوف جاگ اٹھا۔ میں اب روپ متی کا زر خرید غلام تھا۔ وہ میرے ساتھ کچھ بھی سلوک کرسکتی تھی لیکن میں روپ متی سے خوف زدہ نہیں تھا۔ خوف زدہ تو میں ان حالات سے تھا جنہوں نے مجھے ایک عورت کی غلامی میں دے دیا تھا۔ غلاموں کی اس منڈی میں آنے کے فوراً ہی بعد مجھے اور جانکی کو ایک دوسرے سے الگ کردیا گیا تھا۔ میں تو سمجھ بیٹھا تھا کہ اب کبھی جانکی کی صورت نہیں دیکھ پاؤں گا۔ غلاموں اور کنیزوں کے خریدار مختلف شہروں سے آئے ہوئے تھے۔ مجھے روپ متی نے خریدا تھا اور اس کمرے میں آنے کے بعد میں یہی سوچتا رہا تھا کہ جانکی کا خریدار نجانے کون ہوگا۔ وہ کس شہر میں جائے گی۔ میں کبھی اس کا سراغ پا بھی سکوں گا یا نہیں لیکن پھر قسمت نے ایک عجیب کرشمہ دکھایا۔ جانکی کی بولی بھی روپ متی ہی نے جیتی تھی اور قدرت نے ایک بار پھر اسے مجھ سے ملا دیا تھا لیکن اب روپ متی کو سامنے دیکھ کر میرے دل میں اچانک ہی یہ خوف اجاگر ہوگیا تھا کہ کہیں جانکی کو مجھ سے دوبارہ الگ نہ کردیا جائے۔ میری نیلامی کے وقت روپ متی نے جس طرح مجھے ٹٹول کر دیکھا تھا، جس طرح میری بولی بڑھاتی چلی گئی تھی اس سے میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اب تک اس منڈی میں فروخت ہونے والا میں سب سے مہنگا غلام تھا اور کوئی آقا یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا زر خرید غلام اس کی مرضی کے بغیر کوئی قدم اٹھا سکے۔ میرا خریدار کوئی مرد نہیں ایک حسین عورت تھی۔ غالباً دنیا کی حسین ترین عورت۔ وہ کیسے برداشت کرسکتی تھی کہ اس کا غلام اس کی مرضی کے بغیر کسی عورت سے اس طرح ملے کہ وہ ایک نظر آئیں۔

سب سے زیادہ خوفناک بات یہ تھی کہ ہمیں اس طرح ایک دوسرے سے لپٹے دیکھ کر روپ متی یہ سمجھ گئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہیں اور اس حقیقت کا انکشاف ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔

روپ متی کی آنکھوں کی وحشت اب تحیر میں بدلتی جارہی تھی۔ اسے غالباً اس بات پر حیرت تھی کہ اپنی نئی مالکہ کو سامنے دیکھ کر بھی ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوئے تھے۔

روپ متی کے عقب میں وہی دو ہٹے کٹے راجپوت کھڑے تھے جو مجھے اس کمرے میں ڈال گئے تھے۔ وہ دونوں بھی تعجب خیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور پھر ان میں سے ایک روپ متی کے پہلو سے کترا کر آگے بڑھ آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پتلون کی جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ مجھے یا جانکی کو گولی نہیں مارے گا۔ پستول تو اس نے محض ڈرانے کے لیے نکالا تھا لیکن روپ متی نے بازو پھیلا کر اسے مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ بھی ابھر آئی تھی اور غالباً اب وہ اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور ستم کی بات تو یہ تھی کہ جانکی ابھی تک ان کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ وہ مجھ سے اس طرح لپٹی ہوئی تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو ہم پھر ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے۔

"جانکی!" میں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی "ہم اس وقت تنہا نہیں ہیں۔ دروازے میں کچھ لوگ کھڑے ہیں۔"

جانکی یوں اچھل کر مجھ سے الگ ہوگئی جیسے میں نے اسے اپنے قرب و جوار میں کہیں ایٹم بم پھٹنے کی اطلاع دی ہو۔ وہ سنبھل کر وحشت زدہ سی نظروں سے روپ متی اور اس کے قریب کھڑے ہوئے افراد کی طرف دیکھنے لگی۔

"اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ تم دونوں پہلے ہی سے ایک دوسرے کو جانتے ہو اور ایک دوجے سے پریم بھی کرتے ہو۔" روپ متی کہہ رہی تھی۔ اس کی آواز میں کھنک سی تھی جیسے پانی سے لبریز، چاندی کی دو ننھی ننھی کٹوریاں ہولے ہولے آپس میں ٹکرا رہی ہوں "میں پریم کو برا نہیں سمجھتی۔ انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی سے پریم ضرور کرنا چاہیے۔ پریم کے بغیر یہ جیون بالکل پھیکا پھیکا سا لگتا ہے لیکن یہ پریم کتنا اس وقت اچھی لگتی ہے جب انسان آزاد ہو۔ اس کی زندگی اپنی ہو۔ خواہشات اس کی مرضی کے تابع ہوں لیکن جب زندگی کا مالک و مختار کوئی اور ہو، سانسوں کی ڈور کسی دوسرے کے ہاتھ میں ہو تو پریم کی باتیں بڑی عجیب سی لگتی ہیں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "پریم تو آزاد فضاؤں کا پنچھی ہے۔ قید میں رہ کر وہ پرواز نہیں کرسکتا بلکہ پھڑ پھڑا کر رہ جاتا ہے اور۔۔۔"

"زیادہ فلسفہ بگھارنے کی ضرورت نہیں۔" جانکی نے روپ متی کی بات کاٹ دی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ تلخی تھی "آج تم نے دولت کے بل بوتے پر ہمیں خرید لیا ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ کل کو ہم بھی تمہیں اپنے پیر چاٹنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔"

روپ متی کے چہرے پر شدید تناؤ پیدا ہوگیا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں چنگاریاں سی مچلنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو حرکت دیتی، دوسرا آدمی اس کے عقب سے نکل کر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی جس کی موٹائی ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے برابر اور لمبائی تین فٹ کے قریب تھی۔ اس نے جانکی کو گستاخی کی سزا دینے کے لیے چھڑی والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ بید کی لچک دار چھڑی ہوا کو چیرتی ہوئی "زوں" کی آواز کے ساتھ جانکی کی طرف بڑھی لیکن اس سے پہلے کہ چھڑی جانکی کے بدن کے کسی حصے کو چھوتی، میں نے بڑی پھرتی سے ہاتھ بڑھا کر چھڑی کو پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی ایک زوردار جھٹکا دیا۔

اس لمبے تڑنگے شخص کو شاید میری طرف سے اس ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ جھٹکا کھا کر اپنی ہی جھونک میں لڑکھڑاتا ہوا سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے طاقت کا یہ ہلکا سا مظاہرہ اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر بیٹھے بیٹھے ہی کیا تھا۔ چھڑی اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دیوار سے ٹکرانے والا وہ شخص بڑی تیزی سے پلٹا تھا۔ اپنی اس توہین پر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور پھر اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طرف چھلانگ لگا دی لیکن مجھ پر حملہ کرنے کی حسرت اس کے سینے ہی میں دم توڑ گئی۔ وہ جیسے ہی میرے قریب پہنچا، میں تیزی سے نیچے جھکا اور اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اچھال دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ اس کے حلق سے تیز کراہ نکل گئی تھی۔

روپ متی کے دائیں طرف کھڑا ہوا دوسرا آدمی پستول سنبھال کر تیزی سے آگے بڑھا لیکن روپ متی نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"نہیں تیج سنگھ۔" وہ بولی "تم مداخلت نہیں کرو گے۔ مجھے یہ دیکھنے کا موقع دو کہ میں نے اس غلام پر پیسے ضائع تو نہیں کیے اور تم یہ پستول جیب میں رکھ لو۔ میں کوئی گڑبڑ پسند نہیں کروں گی۔"

تیج سنگھ نے عجیب سی نظروں سے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس نے کچھ کہنا بھی چاہا مگر روپ متی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میرا حریف اب وہی تھا جسے میں نے اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔ اسے اٹھنے میں دو تین سیکنڈ لگے تھے۔ وہ پورے قد کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید تناؤ سا پیدا ہوگیا تھا اور آنکھیں ایک دم سرخ ہوگئی تھیں۔

"چھوکرے!" اس کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی "تم نے دھرمیش کے ساتھ پنگا لے کر اچھا نہیں کیا۔ میں چاہوں تو ایک سیکنڈ میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہوں لیکن راج کماری نے تم پر رو کڑا خرچ کیا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ رو کڑا (رقم) بدبودار گوشت کا ڈھیر بن جائے۔"

"تم میرے رو کڑے کی پروا مت کرو دھرمیش۔" روپ متی نے کہا "جب اس کی نیلامی ہو رہی تھی تو تم نے وجے ٹھاکر کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ اس نے واسو دیو جیسے سانڈ کی گردن بھی دو منٹ میں مروڑ دی تھی۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ اسے خریدتے ہی اس کی طاقت دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ تم میرے رو کڑے کی فکر مت کرو۔ اگر تم نے اس کی گردن مروڑ دی تو میں تمہاری وہ خواہش پوری کردوں گی جو اب بھی تمہارے دل میں مچل رہی ہے۔"

دھرمیش نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ روپ متی کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آگئی۔ ہونٹوں میں مخصوص انداز میں خم پیدا ہوتے ہی اس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا ڈمپل پیدا ہوگیا۔ اس چھوٹے سے چاہِ زنداں نے اس کے حسن میں کئی گنا اضافہ کردیا۔ اس نے اس کے ساتھ ہی اپنے بدن کو اس زاویے سے حرکت دی کہ اس کے دائیں کندھے پر ٹکا ہوا کپڑے کا اسٹریپ سرک کر کندھے کے بالکل کنارے پر آگیا اور اس کے بدن کا سامنے والا وہ حصہ کچھ اور عریاں ہوگیا۔

میں نے اس نظر سے روپ متی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی تک اسے نظر بھر کر دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا مگر گال پر نمودار ہونے والے چاہِ زنداں اور اس قیامت خیز منظر نے میرے سینے میں بھی ہلچل سی مچا دی تھی مگر۔۔۔ یہ دل فریب منظر میرے لیے نہیں تھا بلکہ دھرمیش کو اشتعال دلانے کے لیے تھا تاکہ وہ مجھ پر حملہ آور ہو اور روپ متی کو میری طاقت کا مظاہرہ دیکھنے کا موقع بھی

مل سکے۔

ویسے یہ بات میں سمجھ گیا تھا کہ روپ متی کے حوالے سے دھرمیش کے سینے میں کون سی خواہش مچل رہی ہوگی اسی لیے تو روپ متی اسے اشتعال دلا رہی تھی۔

"اور تم۔" روپ متی معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم جانتے ہو' میں نے تمہیں تین لاکھ روپوں میں خریدا ہے۔ تم میرے غلام ہو۔ تمہیں دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ تم غلامی کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہو لیکن غلاموں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے' تم اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھو گے مگر میں تمہیں بھی شروع ہی میں ایک موقع فراہم کر رہی ہوں۔ دھرمیش کو اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے۔ اسے آج تک کوئی سورما چھو نہیں سکا لیکن تم نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا۔ تمہاری یہ ادا مجھے پسند آئی اگر تم دھرمیش کو پچھاڑنے میں کامیاب ہوگئے تو تمہیں بہت سی "مراعات" مل سکتی ہیں۔"

میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دھرمیش کو جو جھلک دکھائی تھی وہ میرے لیے بھی تھی۔ اس نے مجھے بھی اشتعال دلانے کی کوشش کی تھی مگر۔۔۔ میں ایسی خرافات سے ابھی بہت دور تھا۔ میری زندگی میں کتنی حسین لڑکیاں آئی تھیں مگر میرے دل میں کبھی ایسی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ صرف ایک مرتبہ گولڈن ٹرائی اینگل میں سونیا کے فریب میں آگیا تھا۔ اس کے بعد زندگی میں کئی ایسے موڑ آئے تھے کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ہر موڑ پر پھسلتا مگر میں بڑی مضبوطی سے قدم جمائے چل رہا تھا۔ اس سے زیادہ استقلال کیا ہو سکتا ہے کہ جانکی جیسی کافر ادا حسینہ مستقل طور پر میرے ساتھ تھی اور میں اپنے آپ کو اب تک اس سے بچائے ہوئے تھا لیکن یہاں اس کمرے میں مجھے اور جانکی کو ایک دوسرے سے لپٹے دیکھ کر روپ متی نے کچھ غلط مطلب اخذ کیا اور اب اپنے حسن و شباب کی جھلک دکھلا کر مجھے اپنے پالتو سانڈ دھرمیش کے خلاف اشتعال دلا رہی تھی۔

دھرمیش واقعی سانڈ ہی تھا۔ ساڑھے چھ فٹ کے قریب قد' کسرتی بدن اور بازوؤں کے ابھرے ہوئے مسلز۔ اگر اس کا ایک ہاتھ بھی مجھے پڑ جاتا تو میں کئی قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرتا لیکن میں سمجھ گیا تھا کہ اس میں صرف طاقت تھی۔ اس کے استعمال کا سلیقہ نہیں تھا۔ میں یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ گرم دماغ کا آدمی ہے۔ ٹھنڈے دماغ کا ہوتا تو اس طرح جانکی کو مارنے کے لیے نہ لپکتا اور نہ ہی سوچے سمجھے بغیر پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوتا جس کی سزا اسے بھگتنا پڑی تھی۔

یہ کمرا خاصا بڑا تھا۔ دھرمیش مجھ سے تقریباً آٹھ فٹ دور کھڑا خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی مٹھیاں بھینچتا اور کبھی انگلیوں کو خوفناک پنجے کی طرح موڑنے لگتا۔ اس کے جبڑوں کے مسلز بھی ابھر آئے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا اس طرح ہل رہا تھا جیسے حملہ کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں ہو۔

میں اپنی جگہ پر پُر سکون حالت میں کھڑا تھا۔ بید کی چھڑی ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک نظر جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھی۔ میں نے چھڑی اس کی طرف اچھال دی جسے اس نے ہوا ہی میں جھپٹ لیا اور سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

میرا خیال ہے' اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ باہر غلاموں اور کنیزوں کا نیلام اب بھی جاری تھا۔ کمرے کے عقبی روشن دان سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور غالباً کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے میں ایک خوفناک ڈراما شروع ہونے والا ہے۔

دھرمیش کسی پہلوان کی طرح دونوں ہاتھ سامنے نکالے آگے بڑھنے لگا۔ شاید وہ اکھاڑے کے پہلوانوں کی طرح کشتی کے شروع میں پنجے لڑانا چاہتا تھا۔ اس طرح حریف ایک دوسرے کی طاقت کا کچھ اندازہ لگا لیتے ہیں لیکن میں ایسی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا گہری نظروں سے دھرمیش کی طرف دیکھتا رہا۔ دھرمیش کی نظریں بھی میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے جب دیکھا کہ میں پنجہ لڑانے کے موڈ میں نہیں ہوں تو وہ ارنے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ اس طرح آگے کو بڑھے ہوئے تھے جیسے وہ میری گردن کو گرفت میں لینا چاہتا ہو۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور قدرے دائیں طرف ہٹتے ہوئے اس کی بائیں بغل کے نیچے راؤنڈ ہاؤس کک لگا دی۔ میں نے اگرچہ پوری قوت استعمال نہیں کی تھی لیکن بغل کے نیچے ضرب خاصی زوردار لگی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ابھر آئی تھی۔ میں بھی ممکن جوابی حملے سے بچنے کے لیے اپنی جگہ سے اچھل کر دور ہٹ گیا تھا لیکن اس نے فوری طور پر حملہ نہیں کیا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے ایک بار پھر حملہ کر دیا۔ اس مرتبہ میں کوئی جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اچھل کر دور ہٹ

گیا۔ اپنے حملے کو ناکام ہوتے دیکھ کر شاید اس کا دماغ بھنا گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر دوسرا حملہ کیا۔ اس مرتبہ میں نہ صرف اپنے آپ کو بچا گیا بلکہ اس کے پہلو میں ایک ہلکی سی کک بھی لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ لڑکھڑایا تو مجھے بھی موقع مل گیا۔ میں کھڑے کھڑے ایک ٹانگ پر گھوم گیا۔ میری پہلی اسپن کک اس کے بائیں بازو پر کندھے سے ذرا نیچے لگی۔ وہ کراہ اٹھا۔ دوسری ایسی ہی کک اس کے سینے پر لگی۔ تیسری کک لگانے کا مجھے موقع ہی نہیں مل سکا کیونکہ وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا تھا۔

مجھے پے در پے حملے کرتے دیکھ کر روپ متی بے اختیار چیخ اٹھی۔ "واہ! کیا داؤ لگایا ہے۔ ایک اور۔۔۔"

تیج سنگھ کو شاید روپ متی کی زبان سے میری تعریف پسند نہیں آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی دھرمیش کی حمایت میں چیخ اٹھا۔

"منا! اٹھ۔ گردن مروڑ دے اس کی۔ ڈر مت۔ داؤ لگا۔" وہ چیخ چیخ کر دھرمیش کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

دھرمیش اٹھ گیا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے سائیڈ کک لگانے کی کوشش کی لیکن اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں ایک ٹانگ پر۔۔۔ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسری آزاد ٹانگ سے اس کے پیٹ پر کک لگانا چاہی تو میری یہ ٹانگ بھی اس کی گرفت میں آگئی۔ اب میری پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ اس نے میرے دونوں پیر ٹخنوں کے قریب سے اپنی بغلوں میں دبوچ رکھے تھے۔ میں پشت کے بل تھا اور میرا سر زمین پر لگا ہوا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو دباؤ ڈال کر بڑی آسانی سے میری گردن توڑ سکتا تھا لیکن اس کے بارے میں میرے تمام اندازے سو فی صد درست ثابت ہوئے تھے۔ اس میں طاقت تو بلاشبہ بے پناہ تھی مگر اس کے استعمال کا سلیقہ نہیں تھا۔ یہ اس کے لیے بہترین موقع تھا کہ مجھے زیر کر لیتا لیکن اس نے حماقت کا ثبوت دیتے ہوئے میری ٹانگوں کو گرفت میں لیے رکھا اور اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گھومنے لگا اور میری کھوپڑی کو قالین پر رگڑنے لگے۔ میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھ اپنی ٹانگوں پر جما لیے اور سر کو کسی قدر اوپر اٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔

دھرمیش مجھے پھرکی کی طرح گھما رہا تھا۔ میرے بدن کا سارا خون جیسے سر میں جمع ہوگیا تھا۔ دماغ کی نسیں جیسے پھٹی جا رہی تھیں۔ تین چار چکر دینے کے بعد وہ رک گیا لیکن مجھے چھوڑا نہیں۔ میری ٹانگیں بدستور اس کی گرفت میں تھیں۔ اس کے رک جانے سے میرا سر زمین سے ٹکرایا تھا۔ اگر قالین نہ ہوتا تو کھوپڑی کی کھال پھٹ جاتی۔

دماغ کی نسوں میں تناؤ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ میں پوری طرح اس کی گرفت میں تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اگرچہ آزاد تھے لیکن میں ان سے کوئی کام لینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

صورت حال واقعی بے حد نازک اور سنگین تھی۔ آنکھوں کے آگے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہی صورت حال کچھ دیر اور برقرار رہی تو میرے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی اور ناک اور کانوں سے خون بہنا شروع ہو جائے گا۔

دھرمیش نے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا یہی داؤ مجھے شکست سے دوچار کر سکتا ہے اس لیے وہ میری ٹانگوں کو گرفت میں رکھنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہا تھا۔

"منا! اس کے سر پر دباؤ ڈال۔ گردن توڑ دے اس کی۔"

تیج سنگھ کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے صورتِ حال کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا اور دھرمیش کو میری گردن توڑ دینے کا مشورہ دیا تھا۔

"وجو! سنبھالو اپنے آپ کو۔۔۔ اٹھو۔۔۔ سنبھالو!"

یہ جانکی کی آواز تھی جو کسی گہرے کنوئیں کی تہ سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن اس آواز نے مجھے ایک نیا حوصلہ بخشا اور میں نے اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ چی کی وہ پُراسرار قوت تھی جس نے مجھے ہر تکلیف اور اذیت سے بے نیاز کر دیا۔ میں یہ بھول گیا کہ میرے دماغ میں شدید تناؤ ہے اور نسیں پھٹنے والی ہیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں اور میں اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔

آپ میری پوزیشن کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس طرح اپنے آپ کو ایک انچ اوپر اٹھانا بھی ممکن نہیں تھا مگر میرے اندر چی کی پُراسرار قوت نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ قوت جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے شاؤلن ٹیمپل کے غاروں میں بڑی ریاضت کی تھی۔

میرے کندھے ایک ایک انچ کر کے آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگے۔ میرے دونوں بازو میرے سینے کے سامنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں اس طرح بھنچی ہوئی تھیں جیسے میں نے کسی چیز کا سہارا لے رکھا ہو۔

تیج سنگھ اور جانکی کی ملی جلی آوازیں میری سماعت سے

ٹکرا رہی تھیں۔ جانکی میری حوصلہ افزائی کررہی تھی اور تیج سنگھ دھرمیش کو اشتعال دلا رہا تھا۔

دھرمیش میری ٹانگوں کو پوری قوت سے گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ وہ بار بار جھک کر میرے سر کو زمین سے ٹکرانے کی کوشش کررہا تھا لیکن اب اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہورہی تھی۔ میں اپنے آپ کو آہستہ آہستہ اوپر اٹھا رہا تھا۔ میری ٹانگوں پر اس کی مضبوط گرفت اب میرا سہارا بن گئی تھی۔ یہاں مارشل آرٹ کے حوالے سے وہ بات بالکل سچ ثابت ہورہی تھی کہ حریف کو اس کی قوت سے شکست دی جائے۔ میں دھرمیش کی قوت کو اس کے خلاف استعمال کررہا تھا۔

میں چاقو کی طرح بالکل دہرا ہوگیا۔ میرا سر اب اس کے سینے کے برابر پہنچ گیا۔ میں نے دونوں بازو سیدھے کرلیے۔ میں دونوں ہاتھ دھرمیش کی گردن کے پیچھے لے جانے کی کوشش کررہا تھا اور وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ زور زور سے سر کو جھٹکے دینے لگا لیکن اس کی گردن میری گرفت میں آگئی۔

"منا!" تیج سنگھ چیخا "اس کی ٹانگیں چھوڑدے.....“

لیکن منا کو اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ میں نے اس کی گردن پر دونوں ہاتھوں سے گرفت جماتے ہی اپنے آپ کو نیچے کی طرف زوردار جھٹکا دیا۔

اس طرح زوردار جھٹکے سے دھرمیش کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ بھی میرے ساتھ جھکتا چلا گیا۔ میری پشت زمین پر لگی اور دھرمیش میرے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا "دھپ" کی آواز کے ساتھ پشت کے بل میرے پیچھے کی طرف گرا۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی تھی۔

میری ٹانگیں اس کے شکنجے سے آزاد ہوچکی تھیں لیکن میرے اندر اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں بے دم سا پڑا تھا۔ میرے جسم کا سارا خون اب بھی میرے سر میں جمع تھا۔ لگتا تھا جیسے خون کی روانی ٹھہر گئی ہو۔ دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔

جانکی کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر میری حوصلہ افزائی کررہی تھی۔ پہلے تو یہ آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی پھر بتدریج واضح ہوتی چلی گئی۔

میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے۔ جمود ٹوٹنے لگا۔ میرے حواس بحال ہونے لگے اور جسم میں توانائی عود کر آنے لگی۔ میں پہلو کے بل ہوگیا اور کہنیاں قالین پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اٹھنے میں تو کامیاب ہوگیا لیکن اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہ سکا اور لڑکھڑا گیا۔ کم بخت دھرمیش نے میری ٹانگیں ..... دو منٹ تک اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کس کر رکھی تھیں جس سے خون کی روانی متاثر ہوئی تھی۔

میں نے باری باری دونوں ٹانگوں کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے۔ اس دوران میں، میں نے ایک نظر روپ متی کی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی تھی اور آنکھوں میں تحیر کا سمندر لہریں لے رہا تھا۔ اس کے قریب کھڑا تیج سنگھ اب بھی چیخ چیخ کر اپنے منا کو حوصلہ دلا رہا تھا۔

دروازے کے قریب وہ دونوں اب اکیلے نہیں تھے۔ ان کے پیچھے دروازے میں اور باہر راہداری میں مجھے چہرے نظر آئے۔ سب لوگ حیرت زدہ سی نگاہوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

جانکی سامنے والی دیوار کے قریب کھڑی اب بھی چیخ چیخ کر میری حوصلہ افزائی کررہی تھی۔ اس کی آواز نے ہی ... کا کام کیا تھا اور میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہوسکا تھا۔

دھرمیش اب بھی بے سُدھ سا پڑا تھا۔ تیج سنگھ اس کے قریب جھکا مسلسل چیخ رہا تھا۔ بالآخر دھرمیش کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ کہنیوں کا سہارا لے کر اٹھ گیا۔ ... سے بھی ٹھیک طرح سے کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا۔ وہ بدمست ہاتھی کی طرح جھوم رہا تھا۔

میں اب پوری طرح اپنے حواس میں آچکا تھا اور دھرمیش کو پوری طرح سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے ... حملہ کردیا۔ میری سائیڈ کک اس کے دائیں بازو کی ... لگی۔ وہ کراہا تھا اور بازو جھٹکنے لگا۔ میں نے ایک اور ... لگانے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ وہ اپنے آپ کو نہ ... بچا گیا بلکہ سنبھل کر جوابی کارروائی کے لیے بھی پر تولنے ...

اس مرتبہ دھرمیش کا انداز بالکل مختلف تھا۔ وہ ... تجربہ کار اور منجھا ہوا پہلوان نظر آرہا تھا۔ اس کا انداز ... بہت محتاط تھا۔ اس مرتبہ میں بھی محتاط تھا۔ پہلے ذرا ... پروائی کا نتیجہ بھگت چکا تھا۔ دھرمیش میں طاقت گویا ... کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر بات وہی تھی۔ اسے طاقت ... استعمال کا سلیقہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس ہنر سے واقف ... اب تک میری زندگی کا خاتمہ ہوچکا ہوتا اور میں اس ... سے بھی واقف تھا کہ اگر اس مرتبہ میں اس کے ہاتھ ... تو زندہ نہیں بچ سکوں گا اس لیے اب میں اسے ایسا کوئی ... نہیں دینا چاہتا تھا۔

... لپک کر مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ ... دھرمیش نے ... اپنے آپ کو بچا گیا مگر اس نے بڑی پھرتی سے پلٹ کر ... حملہ کردیا۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میرے بائیں پہلو پر ... میں لڑکھڑا گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ دھرمیش ... سنبھل کر دوبارہ میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ... لڑکھڑا گیا تھا اس لیے اس کے داؤ میں آجاؤں گا لیکن ... میں نے اس کی یہ خوش فہمی فوراً ہی رفع کردی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ مجھے اس طرح اچھلتے دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر میری فلائنگ کک اس کے سینے پر ... اور وہ بلبلاتا ہوا لڑکھڑا گیا تھا۔ یہ اس کی ہمت تھی کہ ... میری فلائنگ کک برداشت کرگیا تھا اور گرا نہیں تھا۔ وہ ... ہی سنبھل کر میری طرف لپکا۔

میں نے اس مرتبہ اپنی فائٹنگ ٹیکنک میں تھوڑی سی ... تبدیلی پیدا کرلی اور دھرمیش کی طرف سے رخ موڑ کر مخالف سمت والی دیوار کی طرف لپکا۔ میں نے اچھل کر فلائنگ کک کے انداز میں دونوں پیر دیوار پر ٹکائے اور پوری قوت سے دیوار کو دھکیلتا ہوا پیچھے کی طرف پلٹا اور ہوا میں اڑتا ہوا دھرمیش کی طرف لپکا۔

ظاہر ہے، دھرمیش میری اس ٹیکنک کو نہیں سمجھ سکا ... جب میں دیوار کی طرف لپکا تھا تو وہ یہی سمجھا تھا کہ میں ... اس سے بچنے کے لیے راہِ فرار اختیار کررہا ہوں لیکن جب ... اپنے پیروں سے دیوار کو دھکیل کر ہوا میں واپس پلٹا تو ... لمحے کو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید ترین حیرت ابھر آئی تھی لیکن میں نے ... زیادہ دیر تک حیران ہونے کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے لمحے میری فلائنگ کک نے اسے بلبلانے پر مجبور کردیا۔ ... نے بائیں ٹانگ اندر کی طرف سمیٹ رکھی تھی اور کک ... ٹانگ سے لگائی تھی۔ میرے پیر کا تلوے والا حصہ اس کی پیشانی پر لگا۔ میرے پیروں میں جو گرز تھے۔ ضرب زوردار ... اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور فوراً ہی خون رسنے ...

دھرمیش اونٹ کی طرح بلبلاتا ہوا لڑکھڑا کر پشت کے بل ...

میں نے جس انداز سے دیوار کا سہارا لے کر فلائنگ ... لگائی تھی اس پر دروازے میں کھڑے ہوئے سب ہی ... بے اختیار "واہ واہ" پکار اٹھے تھے۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اب لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ پیچھے والے لوگ آگے والوں کو دھکیل کر اندر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ روپ متی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے قریب کھڑا ہوا تیج سنگھ ایک بار پھر چیخ چیخ کر دھرمیش کی حوصلہ افزائی کررہا تھا۔

دھرمیش اس مرتبہ حیرت انگیز طور پر بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اچھل کر فلائنگ کک لگادی۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر اس کا پیر میرے بائیں کندھے پر لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کئی من وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ میں ذرا سا جھکا تو دھرمیش نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک اور کک لگادی۔ اس مرتبہ ٹھوکر میرے سینے پر لگی۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دھرمیش نے تیسری ٹھوکر مارنے کی کوشش کی تو میں نے اس کی یہ کک کلائی پر روک لی اور فوراً ہی سنبھل کر جوابی حملہ کردیا۔

میری پہلی سائیڈ کک اس کے کولھے پر لگی۔ وہ... لڑکھڑایا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے دوسری کک رسید کردی اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا مگر میری ہر کک اس کے بدن کے کسی نہ کسی حصے کو گرما دیتی۔ سائیڈ، فرنٹ اور اسپن کک۔ میں ہر طرح سے اس کی تواضع کررہا تھا اور پھر ایک زوردار بیک کک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔

دروازے کے سامنے اور اندر لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ یہ وہ دولت مند لوگ تھے جو ہندوستان کے دور دراز شہروں سے غلاموں اور کنیزوں کی خریداری کے لیے کسی بھی آبادی سے میلوں دور ویرانے میں لگنے والی انسانوں کی اس منڈی میں آئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں میں وہ شخص بھی شامل تھا جس نے میری بولی لگانے میں روپ متی کا مقابلہ کیا تھا اور پھر شکست تسلیم کرکے روپ متی کے حق میں بولی سے دستبردار ہوگیا تھا۔

میں ایک بار پھر دھرمیش کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کردی۔ میری دوسری ٹھوکر اس طرح ناکام ہوئی کہ اس نے بڑی پھرتی سے میرا پیر پکڑلیا تھا۔ میں ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا اور پھر دھڑام سے دھرمیش کے قریب گرگیا۔

دھرمیش نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور میرے اوپر لد گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے آپ کو بچانے

کی کوشش کرتا' اس نے میری گردن دبوچ لی۔ اس کا ایک گھٹنا میرے سینے پر اور دونوں انگوٹھے میرے نرخرے پر تھے۔ میرے سینے اور نرخرے پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔

دھرمیش پر جنون طاری ہوچکا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ اب وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ نرخرے اور سینے پر دباؤ بڑھ رہا تھا اور مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ طاقت کا پہاڑ تھا جو میرے اوپر لدا ہوا تھا۔ میرے لیے صرف ایک چانس تھا۔

میں اس کی گردن کو گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سر کو جھٹکے دے کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہا تھا لیکن بالآخر اس کے بال میری گرفت میں آگئے۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے اس کی زخمی پیشانی پر ضرب لگائی۔ وہ کراہ اٹھا اور سر کو جھٹکا دے کر بال چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

میں نے اس کی زخمی پیشانی پر ایک اور ضرب لگائی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو گرفت میں لے لیا۔

میری اپنی حالت اگرچہ غیر تھی۔ نرخرے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ سانس رکنے لگا تھا مگر میں صرف ایک بات جانتا تھا کہ میری معمولی سی کمزوری میری موت کا باعث بن جائے گی۔ میں نے اپنی تمام تر قوت اپنی بانہوں میں مجتمع کرلی اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے اس کی ہنسلی کی ہڈیوں سے ذرا اوپر گردن پر جما دیے۔

گردن کے دونوں طرف کے یہ پریشر پوائنٹ اب میرے انگوٹھوں کے نیچے تھے۔ یہ خطرناک ترین پریشر پوائنٹ تھے۔ انگوٹھوں کا غیر معمولی دباؤ حریف کی موت کا باعث بن سکتا تھا مگر میں دھرمیش کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے میں نے انگوٹھوں کا بہت معمولی سا دباؤ ڈالا جسے وہ برداشت کرگیا پھر میں آہستہ آہستہ دباؤ بڑھانے لگا۔

دھرمیش کے چہرے پر اب جنون کے بجائے تکلیف اور اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میری گردن پر اس کی گرفت بتدریج کمزور پڑنے لگی اور بالآخر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑگئے۔ اس کے بدن میں تناؤ سا پیدا ہونے لگا۔ چہرے پر بے پناہ کرب ابھر آیا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ جیسی گھٹی گھٹی سی آواز خارج ہونے لگی اور پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔

دفعتاً اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی میرے سر سے چند انچ کے فاصلے پر قالین میں لگی تھی۔ میں نے اس کی دھمک محسوس کی تھی۔ میں نے دھرمیش کو اپنے اوپر سے ایک طرف دھکیل دیا۔ وہ مٹی کی بوری کی طرح "بھد" سے نیچے گرا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا

ایک عجیب منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ تیج سنگھ کی کلائی اپنے دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی رکھی تھی۔ تیج سنگھ کے ہاتھ میں پستول تھا جس کا وقت اوپر کی طرف تھا۔ وہ جھٹکے دے کر اپنی کلائی چھ کوشش کررہا تھا لیکن جانکی کی گرفت خاصی مضبوط سنگھ کے چہرے پر کرب و اذیت کے آثار ابھر آئے خیال میں جانکی عام سی عورت تھی۔ نازک اندام نہیں جانتا تھا کہ جانکی زندگی کی کٹھنائیوں کی بھٹی تھی۔ اس نے شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کی لی تھی۔ اس کی گرفت آہنی شکنجے سے کم نہیں تھی۔

تیج سنگھ کی انگلی ابھی تک ٹریگر پر تھی۔ ہاتھ کو جھٹکا لگنے سے ٹریگر دب گیا۔ اس مرتبہ گولی جانکی بالکل قریب سے گزرتی ہوئی سامنے والی دیوار میں قریب پلستر ادھیڑتی ہوئی پیوست ہوگئی۔

پہلے فائر کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کے اند ہوئے لوگ چیختے ہوئے باہر بھاگ گئے تھے اور اب کے سامنے راہداری میں کھڑے یہ تماشا دیکھ ر کمرے کے اندر صرف دو افراد رہ گئے تھے۔ ایک اور دوسرا وہ شخص جس نے میرے نیلام کی بولی میں کا مقابلہ کیا تھا۔

مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشوا نہیں آئی۔ میری اور دھرمیش کی لڑائی کے دوران چیخ چیخ کر دھرمیش کی حوصلہ افزائی کرتا رہا تھا۔ ا خلاف داؤ جاتا رہا تھا لیکن اس نے جب دیکھا کہ پوری طرح میرے شکنجے میں پھنس چکا ہے اور اس کوئی امید نہیں تو تیج سنگھ نے دھرمیش کو بچانے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پستول نکال لیا نے عین وقت پر اس کی یہ حرکت دیکھ لی اور اس پڑی۔ اس کا ہاتھ بروقت تیج سنگھ کے پستول والے ہا تھا جس سے پستول کا رخ بدل گیا اور گولی میرے سر انچ دور قالین میں لگی۔ اگر جانکی بروقت کارروائی میری کھوپڑی میں سوراخ ہوچکا ہوتا۔

میں نے دھرمیش کی طرف دیکھا۔ وہ بے حس پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھول پچک رہا تھا جس کا مطلب زندہ تھا۔ میرا اسے مارنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں نے اس کی گردن کی نسوں پر صرف اتنا ہی دباؤ ڈالا کچھ دیر کے لیے اتنا غفیل ہوجائے۔

میں نے مڑ کر ایک بار پھر روپ متی کی طرف دیکھا۔ وہ طہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ رہا تھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں سی برس رہی تھیں۔

"تیج سنگھ۔" وہ چیخی "پستول پھینک دو۔"

"نہیں راج کماری۔" تیج سنگھ نے جواب دیا۔ اس کی واز گھٹی گھٹی سی تھی "اس نے میرے منا کو مار دیا۔ میں سے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں تمہیں حکم دیتی ہوں' پستول پھینک دو۔" روپ نی پھر چیخی۔

لیکن پستول پھینکنا بھی اب تیج سنگھ کے اختیار میں نہیں ا۔ جانکی نے اس کی کلائی اس طرح اپنی گرفت میں لے ھی تھی کہ وہ پستول بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر کی نے دونوں انگوٹھوں کے ناخن اس کی کلائی کی رگ میں پست کردیے۔

تیج سنگھ کے چہرے پر اذیت کے تاثرات بڑھ گئے اور ں کے ساتھ ہی پستول کے دستے پر اس کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گرگیا۔ وپ متی کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے جھپٹ کر پستول ٹھا کر مجھے زد پر لے لیا۔ اس کا خیال تھا کہ میں ان میں سے سی پر حملہ کرنے کی کوشش کروں گا مگر میرا ایسا کوئی ارادہ میں تھا۔

جانکی نے ابھی تک تیج سنگھ کی کلائی گرفت میں لے رکھی ی۔ تیج سنگھ بھی دھرمیش کی طرح قد آور اور تنومند آدمی تھا ر اس میں شبہ نہیں کہ جانکی نے میرے ساتھ مارشل رٹ کی تربیت حاصل کی تھی اور اسے لڑائی کا خاصا تجربہ ی حاصل تھا مگر مجھے اس بات پر بھی حیرت ضرور تھی کہ تیج لہ جیسا مضبوط قد کاٹھ کا شخص جانکی سے اپنی کلائی نہیں ڑا سکا تھا۔

جانکی غالباً اب بھی اس کی کلائی چھوڑنے کو تیار نہیں ی۔ اس نے شاید یہ طے کرلیا تھا کہ اپنے ناخنوں سے اس ی کلائی کی رگ کاٹ کر ہی رہے گی۔

روپ متی اب چیخ چیخ کر جانکی کو حکم دے رہی تھی کہ وہ سنگھ کو چھوڑ دے مگر جانکی پر اس کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر یں ہو رہا تھا۔

میرے خیال میں بات اس وقت تک بہت بڑھ چکی ی۔ صورتِ حال بہت سنگین تھی۔ ہم روپ متی کے زر ید غلام تھے۔ اس صورتِ حال کے بعد وہ ہمارے ساتھ ولی بھی بے رحمانہ سلوک کرسکتی تھی لیکن میں اس صورتِ حال کو مزید سنگین نہیں بنانا چاہتا تھا۔ روپ متی نے اگرچہ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں دھرمیش کو پچھاڑ دوں تو مجھے کچھ "مراعات" مل جائیں گی لیکن مجھے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ روپ متی نے اگرچہ تیج سنگھ کو بھی شروع ہی میں مداخلت کرنے سے منع کیا تھا لیکن اس نے دھرمیش کو میرے ہاتھوں پٹتے دیکھ کر مجھے گولی مارنے کی کوشش کی تھی مگر جانکی کی بروقت مداخلت سے میری جان بچ گئی تھی اور اب میں زیادہ ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے جانکی کو اشارہ کیا کہ وہ تیج سنگھ کو چھوڑ دے۔

جانکی نے ایک پیر اوپر اٹھا کر ٹانگ دہری کرلی اور تیج سنگھ کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے زوردار ٹھوکر ماردی۔ تیج سنگھ چیختا ہوا دہرا ہوگیا۔ جانکی نے زوردار جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

تیج سنگھ بالکل دہرا ہوگیا۔ اس نے ایک ہاتھ ٹانگوں کے بیچ میں رکھا ہوا تھا اور مضروب کلائی کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

جانکی روپ متی کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

"اپنے کتوں کو پٹے ڈال کر رکھا کرو ورنہ کسی کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔" وہ روپ متی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے غرائی۔

روپ متی کا چہرہ کچھ اور سرخ ہوگیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے قریب کھڑا ہوا شخص اس سے پہلے ہی بول پڑا۔

"اے چھوکری۔" اس کے لہجے میں غراہٹ نمایاں تھی "راج کماری روپ متی نے تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپے دے کر خریدا ہے۔ اب تم ان کی کنیز ہو۔ تمہیں اب اس لہجے میں بات کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اب اگر تم نے ایک بھی لفظ کہا تو تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔"

"یہ بھی اپنے آپ کو مرد سمجھتا ہے مگر میرے پنجے سے اپنی کلائی نہیں چھڑا سکا اور تم۔۔۔" جانکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اگر تمہیں بھی مرد ہونے کا دعویٰ ہے تو آؤ پنجہ لڑالو۔"

اس شخص نے پستول کو نال کی طرف سے پکڑلیا اور بھناتے ہوئے انداز میں جانکی کی طرف بڑھا مگر روپ متی نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"نہیں ٹھاکر بھنور سنگھ۔" وہ بولی "تم جانتے ہو جب پہلی مرتبہ کسی کے ماتھے پر غلامی کا ٹھپا لگتا ہے تو وہ اسی طرح اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ یہ چھوکری بھی غالباً پہلی مرتبہ

منڈی میں بکی ہے اور میرے خیال میں اس کا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے اسی لیے کتیا کی طرح چلا رہی ہے۔"

"بہت بھونک لیا تم نے بھی۔ اپنی زبان کو لگام دو!" جانکی چیخی۔

روپ متی نے اس مرتبہ کسی شدید ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ مسکرا کر رہ گئی۔ ٹھاکر بھنور سنگھ اور اس سے پہلے تیج سنگھ نے اسے راج کماری کہہ کر مخاطب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا تعلق کسی بہت اونچے خاندان سے تھا اور اس بات کی عکاسی تو اس کی حیثیت بھی کر رہی تھی۔ وہ کوئی معمولی عورت ہرگز نہیں تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی ٹھاکر بھنور سنگھ نے انکشاف کیا تھا کہ روپ متی نے جانکی کو ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدا تھا اور میری اپنی قیمت کا تو مجھے علم تھا۔ جو عورت کھڑے کھڑے ساڑھے چار لاکھ روپے میں دو انسانوں کو خرید سکتی تھی وہ کوئی معمولی عورت تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اس کے ایک اشارے پر وہاں کھڑے ہوئے آدمی جانکی کا بھرتا بنا سکتے تھے۔ زر خرید غلام یا کنیز کی حیثیت ہی کیا ہوتی ہے مگر روپ متی نے ایسا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آگئی تھی۔ وہ ٹھاکر کی طرف مڑی تو اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

"ٹھاکر بھنور سنگھ جی۔" اس کے لہجے میں چاندی کی گھنٹیوں جیسی کھنک عود کر آئی تھی "آپ اس غلام کو خریدنا چاہتے تھے لیکن نیلام کی بازی ہم نے جیت لی۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا "پھر اس چھوکری کی پہلی بولی بھی آپ نے لگائی تھی۔ دوسری بولی ہماری تھی لیکن اس کے فوراً ہی بعد ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلی بولی نہیں لگائیں گے تاکہ اس کی بولی آپ کے حق میں ختم ہو جائے مگر ایک اور ٹھاکر بیچ میں کود پڑا اور آپ دستبردار ہو گئے۔ اس طرح ہمیں مجبوراً بولی بڑھانی پڑی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "ہماری وجہ سے آپ کو نیلام میں زک اٹھانی پڑی جس کے لیے ہم شرمندہ ہیں۔ ہم آپ کو پہنچنے والی کوفت کی تلافی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو؟"

"راج کماری روپ متی جی۔" ٹھاکر بھنور سنگھ بولا "آپ کی مہربانی ہے جو آپ میرے بارے میں اس طرح سوچ رہی ہیں۔ آپ کا معمولی اور حقیر سا تحفہ بھی میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہو گا۔"

"تو پھر میری طرف سے یہ تحفہ قبول کیجیے بھنور [illegible] جی۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے جانکی کی طرف اشا[رہ] کیا۔

میں ایک دم سناٹے میں آگیا۔ میرے دماغ پر جیسے [illegible] سی جم گئی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں۔ میں [کچھ] کہنا چاہتا تھا مگر قوتِ گویائی نے بھی جیسے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ [میں] پھٹی پھٹی سی نظروں سے کبھی روپ متی کی طرف دیکھ [رہا] تھا اور کبھی جانکی کی طرف۔

جانکی کا چہرہ بھی دھواں ہو گیا تھا لیکن اس کے حو[اس] میری طرح مختل نہیں ہوئے تھے اور وہ میری طرح خامو[ش] بھی نہیں رہ سکی۔

"تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" وہ روپ متی کی طرف [دیکھتے] ہوئے چیخی "میں کوئی بے جان چیز نہیں ہوں جسے اٹھا [کر] دوسروں کو دے دیا جائے۔ میں ایک انسان ہوں۔ ایک [جیتا جاگتا] انسان۔ مجھے دھوکے سے پکڑ کر۔۔۔"

"خاموش۔" روپ متی پہلی مرتبہ اونچی آواز میں [بولی] "تمہاری آزادی تو اس وقت سلب ہو گئی تھی جب دھ[ریش] جیسے شخص کا سایہ تم پر پڑا تھا۔ میں نے ایک بڑی رقم [خرچ] کرکے تمہیں خریدا ہے۔ اب تم میری ملکیت ہو۔ یہ میری مرضی پر منحصر ہے کہ تم سے اپنے پیروں کے تلو[ے] چٹواؤں یا کسی کو تحفے میں دے دوں۔" وہ ایک لمحے کو خا[موش] ہوئی پھر بولی "اب ٹھاکر بھنور سنگھ تمہارا آقا ہے۔ ٹھاکر [جی] تجربہ کار آدمی ہیں۔ انہیں غلام اور کنیزیں پالنے کا شوق [ہے۔] یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تم جیسی خوب صورت کنیز کو [کس] طرح رکھا جا سکتا ہے۔ ٹھاکر جی!" اس نے آخری دو [الفاظ] ٹھاکر بھنور سنگھ سے مخاطب ہو کر کہے تھے "ہماری طرف [سے] یہ تحفہ قبول کیجیے اور اب اسے یہاں سے لے جائیے۔"

"شکریہ راج کماری جی!" ٹھاکر بھنور سنگھ کی با[چھیں] کھل گئیں۔

"نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتیں رنڈی!" جانکی چیخ[تی ہوئی] روپ متی کی طرف لپکی۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ روپ متی کے قریب پہنچ[تی] ٹھاکر بھنور سنگھ کا اشارہ پا کر تین مشٹنڈے کمرے کے [اندر] گھس آئے اور جانکی سے لپٹ گئے۔ جانکی چیخ چیخ کر گا[لیاں] بکتے ہوئے مزاحمت کرنے لگی۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر چلا [رہی] تھی مگر ان تین مشٹنڈوں کے سامنے اس کی ایک نہیں چل [رہی تھی۔] وہ بے بس چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ وہ تینوں مشٹ[نڈے] اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔

[م]یں اب بھی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ میرا [دما]غ ابھی تک سُن تھا۔ وہ لوگ جانکی کو اٹھا کر لے گئے اور [میں] کچھ نہیں کر سکا تھا اور شاید کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ جانکی [کی] چیخیں دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔

اور پھر جیسے میرے دماغ پر طاری جمود ٹوٹ گیا۔ میں [ہو]ش میں آگیا۔

فضا میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ تھی۔ دروازے کے [ساm]نے راہداری میں بہت سے لوگ جمع تھے جو روپ متی کی [س]خاوت پر سرگوشیوں میں تبصرے کر رہے تھے۔ ٹھاکر [بھ]نور سنگھ کے آدمی جانکی کو لے جا چکے تھے لیکن وہ ابھی تک [یہا]ں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا [ر]خ میری طرف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اب میں کچھ نہ [کچ]ھ ضرور کروں گا لیکن میرا اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں [تھ]ا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کچھ کرنا خودکشی کے مترادف [تھ]ا۔ میں ایک غلام تھا اور یہاں سب وہ لوگ تھے جو غلام [خری]دنے آئے تھے۔ بہ الفاظِ دیگر وہ سب آقا تھے اور کسی آقا [کو] غلام سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔

میرے اس طرح خاموش رہنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ [مجھ]ے جانکی سے کوئی ہمدردی نہیں رہی تھی اور میں بے حس [ہو] گیا تھا۔ میں نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا مگر جانکی نے میری [سو]چ پر پانی پھیر دیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ آج کے دور میں غلاموں کی خرید و [فر]وخت ایک سنگین جرم ہے لیکن اس کے باوجود یہاں [غلا]موں کی جو منڈی لگی تھی وہ میرے لیے حیرت انگیز تھی۔ [یہ] جگہ اگرچہ کسی آبادی سے میلوں دور تھی مگر زمین کی [گہ]رائیوں میں تو نہیں تھی کہ کسی کو اس کا پتا نہ چلتا اور یہ [کو]ئی ایک دن کی بات بھی نہیں تھی۔ غالباً برسوں سے یہ [گھ]ناؤنا ترین کاروبار ہو رہا تھا۔ انڈیا کے دور دراز کے شہروں [س]ے لوگ یہاں آکر غلاموں اور کنیزوں کی خرید و فروخت [ک]رتے تھے جس کا مطلب تھا کہ لوگ اس منڈی کے بارے [می]ں جانتے تھے۔ یہاں کی حکومت بھی واقف تھی لیکن یہ [کا]روبار ہو رہا تھا۔

غلاموں کے اس غیر قانونی کاروبار کے خلاف پہلے بھی [آ]وازیں اٹھائی جاتی ہوں گی لیکن یہ دھندا جاری تھا۔ یہ [ک]اروبار کرنے والے بہت طاقت ور تھے۔ خریداروں میں بھی [اث]ر رسوخ والے لوگ تھے۔ روپ متی کی مثال میرے [س]امنے تھی۔ اس کے بارے میں ابھی تک میں کچھ نہیں جان [س]کا تھا لیکن اس کی حیثیت دیکھ کر یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس

کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ اس دولت سے ہر چیز خرید سکتی تھی۔ انسان بھی اور انسان کی آزادی بھی۔ اس دولت کے بل بوتے پر اس کا ایسا رسوخ ... ہوگا کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

جب میری بولی لگی تھی تو میں واقعی پریشان ہو گیا تھا لیکن جانکی کو دوبارہ اپنے قریب دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا اور ذہن میں اس سنگین ترین صورتِ حال سے نجات کا ایک منصوبہ بھی ترتیب دینے لگا تھا۔

روپ متی نے جس انداز سے میری بولی لگائی تھی اور میں نے اس کی آنکھوں میں جو پُراسرار سی چمک دیکھی تھی اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس نے مجھے محض غلام بنانے کے لیے نہیں خریدا تھا۔ اتفاق سے جانکی کی خریدار بھی وہی تھی اور اس طرح ہم دوبارہ مل گئے تھے۔ ہمیں ایک ہی جگہ پر رہنا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ سب سے پہلے ہم روپ متی کا اعتماد حاصل کریں گے اور اس کے بعد رہائی کی کوئی ترکیب سوچی جائے گی مگر جانکی کی گرم دماغی نے میری سوچوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ روپ متی کا سامنا ہوتے ہی اس سے الجھ پڑی۔ دھرمیش نے جانکی کو اس کی گستاخی کی سزا دینا چاہی تو میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہ سکا اور اس طرح بات بڑھتی چلی گئی۔ میں اور دھرمیش ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے۔ روپ متی نے فائٹ کے شروع میں مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں دھرمیش کو پچھاڑ دوں تو مجھے بہت سی مراعات مل جائیں گی۔ مجھے اس کے وعدے پر اعتبار تو نہیں تھا لیکن اگر واقعی مجھے کچھ مراعات حاصل ہو جاتیں تو ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر جانکی نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا جس کے نتیجے میں روپ متی نے اسے دوسرے کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ روپ متی بہت دولت مند تھی۔ وہ لاکھوں روپے مالیت کے تحائف اپنے دوستوں کو پیش کر سکتی تھی۔ ڈیڑھ لاکھ روپے میں خریدی ہوئی کنیز کی کیا حیثیت تھی لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے ٹھاکر بھنور سنگھ کو یہ تحفہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یا خیر سگالی کے جذبے کے تحت نہیں دیا تھا۔ وہ تو دونوں بولیوں میں اس کا حریف تھا۔ جانکی کو اس کی جھولی میں ڈال دینا دراصل جانکی کے خلاف انتقامی کارروائی تھی۔ جانکی کو اس کی بد زبانی اور گستاخی کی سزا دینے کے لیے ایک بگڑے ہوئے رئیس کے قدموں میں ڈال دیا گیا تھا اور اس کا سب سے زیادہ دکھ مجھے ہوا تھا۔ جانکی کے ساتھ آنے والے وقت میں

کیا ہوگا؟ اس کا اندازہ میں لگا سکتا تھا۔
میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھا۔ دھرمیش ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا اور تیج سنگھ اس کے قریب بیٹھا اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی اپنی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ مجھے متوجہ پا کر اس نے میری طرف دیکھا اور بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے بولا۔
"اگر میرے منا کو کچھ ہوگیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"
"میری زندگی کا چراغ گل کرنے کے لیے تمہیں راج کماری روپ متی سے اجازت لینی پڑے گی جس نے مجھے خریدنے کے لیے رو کڑا خرچ کیا ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر پُرسکون لہجے میں جواب دیا "ویسے تم اطمینان رکھو۔ تمہارے منا کو کچھ نہیں ہوگا۔ بس چند روز بدن کی مالش کرنی پڑے گی۔"
میری اس بذلہ سنجی پر تیج سنگھ تو تلملا کر رہ گیا البتہ روپ متی کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ آگئی تھی۔ میں نے اس کے نام کا حوالہ خاص طور پر دیا تھا۔ اس طرح میں یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ میں تیج سنگھ کا نہیں، روپ متی کا زر خرید غلام ہوں اور اب میری مالک و وارث وہی ہے۔ یہ بات کہہ کر گویا میں نے اپنے اس منصوبے پر عمل شروع کر دیا تھا جس کے تانے بانے میں نے اس کمرے میں جانکی کے آتے ہی بننا شروع کر دیے تھے۔ اگرچہ جانکی اب جا چکی تھی مگر مجھے روپ متی کا اعتماد حاصل کرنا تھا۔ ایک وفادار غلام بن کر۔
"تیج سنگھ۔" روپ متی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دھرمیش کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے جاؤ اور جب یہ ہوش میں آجائے تو روانگی کی تیاری کرو۔ ہم صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ یہ غلام میرے ساتھ جائے گا۔"
روپ متی کے اس فیصلے پر تیج سنگھ چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر روپ متی نے ہاتھ اٹھا کر زبان کھولنے کا موقع نہیں دیا۔
"راج کماری جی!" قریب کھڑے ہوئے بھنور سنگھ نے کہا "آپ دیکھ چکی ہیں، یہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے باوجود آپ اسے اپنے کمرے میں لے جانا چاہتی ہیں۔ بغیر محافظوں کے..."
"میرے محافظوں کا حال تو آپ بھی دیکھ چکے ہیں ٹھاکر جی۔" روپ متی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ اصیل ہے اور میں اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی۔ آپ اطمینان رکھیے۔ یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سک... تم میرے ساتھ آؤ۔" اس نے مجھے اشارہ کیا "تمہاری طا... اور مہارت کا مظاہرہ میں دیکھ چکی ہوں۔ اس میں شبہ نہ... کہ تم پلک جھپکنے کی دیر میں بڑے بڑے سورماؤں کی... مروڑ سکتے ہو لیکن راج کماری روپ متی سے بغاوت کا... خیال بھی ذہن میں مت لانا۔ ایسی صورت میں تم... ہندوستان تو کیا، دنیا کے کسی گوشے میں بھی پناہ نہیں ملے... آؤ میرے ساتھ۔"
راہداری میں کھڑے ہوئے لوگ بھی روپ متی کے... اس فیصلے پر حیران اور پریشان تھے۔ ہم جیسے ہی کمرے سے نکلے، لوگ راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹتے چلے... روپ متی بڑی شان اور تمکنت سے آگے چل رہی تھی... میں اس کے پیچھے ایک مطیع اور فرماں بردار غلام کی طرح... جھکائے چل رہا تھا۔
ہم ایک اور راہداری میں مڑ گئے۔ یہ بہت وسیع... عریض عمارت تھی۔ یہاں راہداریوں کا جال سا بچھا ہوا... ہر راہداری میں آمنے سامنے کئی کئی کمرے تھے۔ ہر کمرا... تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہندوستان کے دور... شہروں سے آئے ہوئے سیکڑوں لوگ تھے جو اس وقت... قدیم محل نما عمارت میں مقیم تھے۔ یہ سب دولت مند... تھے جو غلام اور کنیزیں خریدنے آتے تھے جبکہ غلاموں... ان کے تاجروں کے لیے رہائش کا انتظام باہر والے حصے... کیا گیا تھا جہاں وسیع و عریض میدان کے اطراف میں... کے ساتھ ساتھ لاتعداد کمرے بنے ہوئے تھے۔
میرے خیال میں اس وقت صبح کے چار بجنے والے... مگر ہر شخص جاگ رہا تھا۔ تمام راہداریاں روشن تھیں... لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہم جس طرف سے... گزرتے، لوگ مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگتے۔ روپ... واقعی روپ متی تھی۔ اس کے حسن میں کوئی شبہ نہیں... وہ ایک مکمل عورت تھی۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن... تھا کہ اس کے گداز و حسین بدن کے تمام نشیب و فراز... ہو رہے تھے۔ اس کی چال میں بھی ایک تمکنت تھی... تھا۔ لوگ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور... کے ساتھ میں تھا۔ میں نے کبھی اپنے بارے میں اس... نہیں سوچا تھا لیکن میری زندگی میں جتنی بھی عورتیں... تھیں، اپنی اداؤں سے اور اپنی باتوں سے مجھے احساس... رہتی تھیں کہ میں گلفام سے زیادہ خوب رو اور حسین... مجھے نیلام کرنے والے نے تو مجھے یوسف ثانی کا خطاب

تھا اور میری نیلامی کی بولی میں روپ متی جیسی عورت بولی لگاتے ہوئے تین لاکھ تک چلی گئی تھی۔ ان سب باتوں سے اب مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ میں کچھ ہوں۔
ایک راہداری میں مڑ کر ہم زینے پر چڑھنے لگے۔ اس زینے کے سامنے والے حصے پر سنگ مرمر کی نہایت نفیس کام کی خوب صورت جالیاں لگی ہوئی تھیں جن سے نہ صرف تازہ ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے بلکہ سامنے کا وسیع و عریض کمپاؤنڈ بھی نظر آرہا تھا۔ زینے کی پہلی لینڈنگ سے وہ بارہ دری بھی نظر آرہی تھی جہاں مجھے نیلام کی سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ وہ حصہ اب بھی روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بارہ دری میں نیلامی کا کاروبار اب بھی جاری تھا۔ مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
زینے کے اختتام پر ہم راہداری میں دائیں طرف مڑ گئے۔ یہاں بھی کچھ لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ راہداری کے اختتام پر لکڑی کے اسٹول پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے میرون رنگ کا ڈریس پہن رکھا تھا۔ کمر پر بالشت بھر چوڑا سنہری بیلٹ تھا جس میں بائیں طرف ہولسٹر بھی لگا ہوا تھا جس سے پستول کا دستہ جھانک رہا تھا۔ سر پر بل دار پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ روپ متی کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بائیں طرف کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔
روپ متی اندر داخل ہوگئی جبکہ میں باہر ہی کھڑا رہا۔ وہ دربان بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ روپ متی نے کمرے کے وسط میں رک کر میری طرف دیکھا۔
"تم باہر کیوں رک گئے۔ اندر آؤ۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔
میں سر جھکائے اندر داخل ہوگیا۔ دربان نے دروازہ بند کر دیا۔
ڈرائنگ روم کے طور پر آراستہ یہ وسیع کمرا بہت شان دار تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی قیمتی تھا۔ بائیں طرف ایک اور دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ اس کے دوسری طرف بیڈ روم تھا جس کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔
یوں تو محل نما اس عمارت میں وہ دولت مند لوگ مقیم تھے جو غلام اور کنیزیں خریدنے کے لیے یہاں آتے تھے لیکن عمارت کے اوپر کا یہ حصہ راج مہاراج قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں کے اخراجات بھی زیادہ تھے۔
روپ متی بیڈ روم میں داخل ہوگئی۔ اس نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ یہ کمرا بہت شان دار طریقے پر آراستہ تھا۔ مسہری پر آرام دہ میٹرس تھا جس پر ہلکے نیلے رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کے پچھلی طرف کشادہ کھڑکی تھی جس سے تازہ ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔ کھڑکی عمارت کی عقبی سمت میں کھلتی تھی لیکن باہر چونکہ ابھی اندھیرا تھا اس لیے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔
"بہت تھک گئی ہوں۔" روپ متی یہ کہتے ہوئے مسہری پر ڈھیر ہوگئی۔
وہ کچھ اس انداز میں بستر پر گری تھی کہ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں سر جھکائے کھڑا اس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا مگر کم بخت یہ نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔
"صبح ہوتے ہی پھر ایک طویل سفر کرنا ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میرے پیر دبا دو۔ بہت تھکن ہو رہی ہے۔"
میں کانپ اٹھا۔ غلام کی حیثیت سے یہ میرے لیے پہلا حکم تھا۔ کسی اور کام کے لیے کہا جاتا تو میں عمل کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کرتا مگر اس کے پیر دبانے میں مجھے کچھ تامل تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں اس کے پیر دبانے کو اپنی توہین سمجھتا تھا بلکہ اس لیے کہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے اپنی عزت خطرے میں نظر آرہی تھی۔ میرا وہ شبہ بالکل درست ثابت ہو رہا تھا کہ روپ متی نے مجھے محض غلام بنانے کے لیے نہیں خریدا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ میری رعنائی پر مرمٹی تھی جس کے لیے اس نے تین لاکھ روپے خرچ کر دیے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری بولی پچاس لاکھ تک جاتی تب بھی وہ پیچھے نہ ہٹتی۔
مجھے وہ وقت یاد آگیا جب تھائی نے مجھے کمرے میں لے جا کر ہنٹر اٹھا لیا تھا اور مجھے کپڑے اتارنے کا حکم دیا تھا اور پھر اپنی قمیص بھی اتار دی تھی۔ تھائی نے بھی میرے جسم کو ٹٹول کر دیکھا تھا اور پھر مجھے اپنے جسم پر ہنٹر برسانے کا حکم دیا تھا لیکن یہاں صورتِ حال مختلف تھی۔ میں سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔
"سنا نہیں تم نے۔ ہم نے کیا کہا ہے۔" روپ متی کی آواز اگرچہ کسی قدر بلند تھی لیکن لہجے میں سختی نہیں تھی۔
میں نے جھک کر دونوں ہاتھ اس کے پیروں پر رکھ دیے اور پنجوں کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اس نے گھٹنے اوپر اٹھا لیے۔ اس کے ساتھ ہی لباس بھی سمٹ گیا۔ پنڈلیاں برہنہ ہوگئیں۔ میرے دل کی دھڑکن کچھ اور تیز ہوگئی۔
میں نے جیسے ہی اس کی پنڈلی پر ہاتھ رکھا، میرا دل اچھل

کر حلق میں آگیا۔ کنپٹیاں سُلگنے لگیں۔ روپ متی بھی کراہ اٹھی تھی۔

ممکن ہے میں جذبات کی اس دلدل میں پھنس جاتا مگر دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا۔ روپ متی نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ میں سیدھا ہو کر کھڑا ہوگیا۔ روپ متی بڑبڑاتی ہوئی اٹھ گئی اور باہر والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ روپ متی نے باہر کا دروازہ کھول دیا حالانکہ وہ دروازہ کھولنے کا حکم مجھے بھی دے سکتی تھی لیکن اس نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔

باہر تیج سنگھ تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر مجھے بیڈ روم میں کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت سی بھر گئی۔

"کیا بات ہے تیج سنگھ۔" روپ متی قدرے دُرشت لہجے میں بولی "دھرمیش کیسا ہے اب۔ ہوش میں آیا یا نہیں۔"

"دھرمیش اب ٹھیک ہے راج کماری جی۔" تیج سنگھ نے بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "چتوڑ گڑھ کا راج کمار کنور بلونت سنگھ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

روپ متی کی بھویں سکڑ گئیں۔ وہ چند لمحے خشمگیں نظروں سے تیج سنگھ کی طرف دیکھتی رہی جیسے راج کمار بلونت سنگھ کی خواہش میں اس کا قصور ہو۔

"راج کمار کو اندر لاکر بٹھاؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔" روپ متی کے لہجے میں ناگواری تھی۔

وہ پھر بیڈ روم میں آگئی۔ اس نے بیچ کے دروازے پر پردہ کھینچ دیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر اس نے اپنا حلیہ درست کیا۔ اس دوران میں دوسرے کمرے سے اب کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ روپ متی نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا دوسری طرف کی آوازیں سنتا رہا۔ وہ غالباً چتوڑ گڑھ کا راج کمار تھا جو اس وقت کہہ رہا تھا۔

"ہمیں یہاں پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی راج کماری روپ متی جی۔ مگر سنا ہے آپ نے ایک ایسا ہیرا خرید لیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ کہاں چھپا کر رکھا ہے اسے۔ ہمیں بھی تو اس کے درشن کرا دیجیے راج کماری جی۔"

"ہاں۔ وہ ہیرا ہی ہے۔ آپ بھی دیکھیں گے تو پھڑک اٹھیں گے کنور جی۔ میں ابھی بلاتی ہوں اسے۔" روپ متی نے جواب دیا۔

اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی دروازے کا پردہ ہٹا اور تیج سنگھ کی صورت دکھائی دی۔ وہ بڑی خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اب وہ میرے بالکل سامنے آیا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کا دایاں بازو گلے میں پڑی ہوئی پٹی میں رکھا ہوا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ کلائی پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ جانکی نے کچھ زیادہ ہی زور لگا دیا تھا۔

"میری صورت کیا دیکھ رہا ہے۔ چل۔ راج کماری نے طلب کیا ہے تجھے۔" اس کے لہجے میں نفرت بھری ہوئی تھی مگر آواز زیادہ اونچی نہیں تھی۔

مجھے اس کے بارے میں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ہماری دشمنی کی بنیاد تو اسی وقت رکھی گئی تھی جب میں نے دھرمیش کو پچھاڑا تھا اور تیج سنگھ نے مجھے گولی مارنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اب روپ متی کے پاس ہی رہنا تھا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک مجھے نجات کا کوئی راستہ نہ مل جاتا اور اس کا مطلب تھا کہ میری اور تیج سنگھ و دھرمیش کی دشمنی لمبے عرصے تک چلنے والی تھی۔

تیج سنگھ کے حکم پر میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا دوسرے کمرے میں آگیا۔

ایک صوفے پر روپ متی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ سامنے والے صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔

"واہ۔" ان میں سے ایک کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ دراز قامت اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ عمر تیس پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے راجستھانی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر گہرے نیلے رنگ کی پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ مونچھیں زیادہ بھاری نہیں تھیں مگر ہونٹوں کے کناروں پر اوپر کی طرف بل کھائی ہوئی تھیں۔ گلے میں موتیوں کی ایک مالا بھی پڑی ہوئی تھی "واہ روپ متی جی۔" وہ کہہ رہا تھا "تو واقعی ہیرا ہے۔ کالی ماں کی قسم۔ اگر ہم ہوتے تو اسے دوسرے کے پاس جانے نہ دیتے۔ وجے ٹھاکر کو منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتے لیکن۔۔۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن میرے خیال میں وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں نکلا آپ نے یہ ہیرا تین لاکھ میں خریدا ہے۔ ہم آپ کو چھ لاکھ دینے کو تیار ہیں۔ ہمارے پاس بہت دولت ہے۔"

"دولت تو ہمارے پاس بھی بہت ہے کنور جی۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہم شوق سے خریدی ہوئی کوئی چیز بیچتے نہیں ہیں۔ تحفے کے طور پر دے سکتے ہیں لیکن اس وقت ہم تحفہ دینے کے موڈ میں بھی نہیں ہیں۔"

"دس لاکھ۔ پندرہ لاکھ۔" کنور بلونت سنگھ نے میری بولی لگائی۔ میں چونک گیا۔ اس کے پاس واقعی بہت دولت تھی اور وہ مجھے ہر قیمت پر خریدنے پر آمادہ نظر آرہا تھا۔

"کنور جی!" روپ متی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر تناؤ سا پیدا ہوگیا "آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم اپنے گھر کی کوئی چیز بیچتے نہیں ہیں۔ آپ ہماری توہین کر رہے ہیں۔ تشریف لے جائیں۔"

"آپ تو ناراض ہوگئیں روپ متی جی۔" کنور بلونت سنگھ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا "ایک غلام کے لیے آپ اپنے دوستوں کو بھی ناراض کر رہی ہیں۔ خیر۔ جیسی آپ کی مرضی لیکن یہ بات یاد رکھ لیں کہ یہ غلام بالآخر آئے گا ہمارے پاس۔ میں چلتا ہوں۔ نمسکار۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی اور آنکھوں میں مکاری چمکنے لگی تھی۔

روپ متی چند لمحے اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں تشویش ابھر آئی تھی۔ اس نے تیج سنگھ کو رخصت کردیا اور میری طرف دیکھنے لگی پھر آگے بڑھ کر وہ میرے بالکل سامنے کھڑی ہوگئی۔ دونوں ہاتھ میرے بازوؤں کے فولادی مسلز پر رکھ دیے اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میرے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ دل کی دھڑکن کنپٹیوں میں محسوس ہونے لگی۔ روپ متی کی آنکھوں میں ستارے سے ناچ رہے تھے۔ میں زیادہ دیر تک اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ میں نے نظریں جھکائیں تو ایک بار پھر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ روپ متی کا تنفس بے ربط ہو رہا تھا اور اس کے نیم برہنہ سینے کا زیر و بم قیامت ڈھا رہا تھا۔

روپ متی نے اچانک میرے بازو چھوڑ دیے اور دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے میں جاکر بستر پر گر گئی۔ میں مبہوت سا اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ روپ متی نے ایک بڑی رقم خرچ کر کے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدا تھا لیکن اس کا اب تک کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ سب سے پہلے اس نے مجھ سے پیر دبوائے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام خدمت کے طور پر نہیں لیا گیا۔ پیر دباتے ہوئے اس پر جو کیفیت طاری ہوئی تھی وہ ایک دوسری کہانی تھی اور اب وہ جس انداز میں میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی یہ بھی ایک دوسری کہانی تھی۔

روپ متی کی اس کیفیت سے قطع نظر میرے خیال میں یہاں ایک اور کہانی جنم لے چکی تھی۔ کنور بلونت سنگھ نے میرے لیے پندرہ لاکھ کی آفر دے دی تھی اور روپ متی نے انکار کردیا تھا اور اس طرح میرے خیال میں ان دونوں کے بیچ بھی دشمنی کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

میں ایک عجیب سی صورتِ حال سے دوچار ہو گیا تھا۔ جانکی مجھ سے الگ ہوگئی تھی۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ٹھاکر بھنور سنگھ کون تھا۔ وہ کس شہر کا رہنے والا تھا اور جانکی کو لے کر کہاں جائے گا لیکن بہرحال میں نے اسے تلاش کرنا تھا اور اس سے پہلے اپنے غلامی کے طوق سے نجات حاصل کرنی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس میں مجھے خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف روپ متی نے اپنے آدمیوں کے مقابلے میں میری حمایت کر کے میرے لیے مزید مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ اگر میں دھرمیش کو پچھاڑ دوں تو مجھے بہت سی مراعات حاصل ہو جائیں گی۔ یہ جملہ گویا دھرمیش کے مقابلے میں میری حمایت کا اعلان تھا۔ میں نے دھرمیش کو ادھ موا کردیا تھا جس کے نتیجے میں وہ دونوں میرے دشمن ہوگئے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ دونوں کون تھے۔ ان کا آپس میں کیا رشتہ تھا اور روپ متی سے ان کا کیا تعلق تھا۔ وہ دونوں اس کے غلام تو ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔

تیج سنگھ اور دھرمیش نہایت خوب رو اور بھرپور جوان آدمی تھے اور پھر میری بولی لگاتے ہوئے بھی روپ متی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے میرے بازوؤں کے مسلز بھی ٹٹول کر دیکھے تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے جس طرح وہ میرے بازو تھام کر میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں جس طرح پُراسرار چمک ابھری تھی اس سے میں نے روپ متی کے بارے میں ایک مختلف رائے قائم کرلی تھی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا کہ روپ متی کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ مجھے خواب گاہ میں طلب کر رہی تھی۔ میں اندر داخل ہو کر اس کے سامنے مسہری کے قریب کھڑا ہوگیا۔

وہ مسہری پر تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اس کی نظریں میرے بدن کا طواف کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں اس وقت بھی وہی پُراسرار سی چمک تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ ساتھ ہی اس نے مسہری کے سامنے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری اس فرماں برداری کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کا غلام تسلیم کرلیا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ میں اطاعت اور

فرماں برداری کا مظاہرہ کرکے اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنی آزادی کا کوئی راستہ نکال سکوں۔ میں غلام بن کر ساری زندگی تو یہاں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں اپنا مشن نہیں بھولا تھا۔ مجھے اپنے ماں باپ کی المناک موت یاد تھی۔ وہ بیسیوں بے گناہ بھی یاد تھے جنہیں میری وجہ سے دارا اور اس کے ساتھیوں نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مجھے وہ منظر بھی یاد تھا جب میرے ماں باپ کے قتل کے برسوں بعد ٹھیک اسی جگہ پر' جہاں میرے ماں باپ کا خون بہایا گیا تھا' تھالی کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ تھالی میری محسنہ تھی۔ ماں باپ کے بعد سب سے زیادہ محبت مجھے اسی سے ملی تھی اور پھر جانکی تھی جس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا اور اب وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔

میں یہ سب کچھ کیسے بھول سکتا تھا اور پھر مجھ جیسا شخص کسی کا غلام بن کر کیسے رہ سکتا تھا لیکن وقت نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ میں نے وقت سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ وقت ہی نے مجھے ایک عورت کے قدموں میں لا پھینکا تھا تو میں اس وقت ہی کے سہارے اس صورتِ حال سے نجات بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میرے سامنے اس وقت ایک اور موقع بھی تھا جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ نیلامی ختم ہونے پر روپ متی نے میرے گلے میں غلامی کا طوق ڈالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس نے مجھے دھرمیش کے ساتھ لڑتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا اور یہ بھی جان گئی تھی کہ میں کس قدر خطرناک ہوں۔ نیلامی کے وقت دھرمیش ٹھاکر نے بھی گویا میری تعریف کرتے ہوئے لوگوں کو خبردار کردیا تھا کہ میں نے سنیاسی واسودیو جیسے سانڈ کی گردن مروڑ دی تھی اور جب روپ متی مجھے اکیلے ہی اپنے ساتھ کمرے میں لانا چاہ رہی تھی تو ٹھاکر بھنور سنگھ نے بھی اسے خبردار کردیا تھا لیکن روپ متی نے اس کی پروا نہیں کی تھی اور کسی محافظ کے بغیر مجھے اکیلے ہی اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ اسے شاید اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ عورت کے لیے کسی مرد کو غلام بنانے کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ہاتھ میں ہنٹر اٹھائے رکھے۔ میرے خیال میں مرد کو مطیع کرنے کے لیے عورت کو ہنٹر اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور روپ متی جیسی بھرپور' جوان اور حسین عورت تو سرکش سے سرکش مرد کو بھی اپنے پیر چاٹنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ جب میں اور دھرمیش حریف بن کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوئے تھے تو روپ متی نے دھرمیش کو بھی یہ آفر دی تھی کہ اگر وہ میری گردن مروڑ دے تو وہ اس کی دیرینہ خواہش پوری کرسکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اس نے بڑے دل فریب انداز میں کندھے سے اسٹریپ سرکا کر ایک جھلک بھی دکھلا دی تھی۔ اس کی اس بات سے بھی میں اندازہ لگا چکا تھا کہ دھرمیش جیسا کڑیل جوان اس کے حسن کا اسیر ہے اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے مگر اس وقت تو اس کی یہ حسرت سینے ہی میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ روپ متی کو اپنے آپ پر اعتماد تھا اسی لیے وہ کسی محافظ کے بغیر مجھے اکیلے ہی اپنے کمرے میں لے آئی تھی اور دوسری طرف میرے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ روپ متی کا گلا گھونٹ کر کمرے سے نکلوں اور جانکی کو تلاش کرکے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں لیکن میں اس حقیقت سے بھی بخوبی واقف تھا کہ یہاں سے فرار ہونا ممکن نہیں۔ یہاں سیکڑوں لوگ تھے۔ ہر ایک کے پاس اسلحہ بھی تھا اور بالفرض میں جانکی کو تلاش کرکے غلاموں کی اس منڈی سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ہم کہاں جائیں گے۔ اس قدیم محل نما عمارت کے چاروں طرف میلوں دور تک گھنا جنگل تھا اور جنگل کے بعد میلوں دور تک بے آب و گیاہ ریگستان پھیلا ہوا تھا۔ ہم یہاں سے فرار ہو کر کتنی دور جاسکیں گے؟ چند میل! اور اس کے بعد ہمیں گھیر لیا جائے گا اور ممکن ہے ہمیں زندہ پکڑنے کے بجائے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ایک غلام کی زندگی کی وقعت ہی کیا ہوتی ہے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ میں تو نجات حاصل کرنے کا کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا جس پر آگے جاکر کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

میں کرسی پر بیٹھا یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر دیکھا تو روپ متی کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سوچکی تھی۔ اس کے سینے کا ہموار زیرو بم اس کی پُرسکون کیفیت کا اظہار کررہا تھا۔ میں نے بھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ کل دن بھر صحرا میں اونٹوں پر سفر اور پھر رات بھر جاگنے کی وجہ سے میں بُری طرح تھک گیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا تھا لیکن پسلیوں پر پڑنے والی ایک زوردار ٹھوکر مجھے ہوش میں لے آئی۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی اور میں کرسی سمیت الٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں حواس پر قابو پا کر اپنے آپ کو سنبھالتا' ایک اور زوردار ٹھوکر نے مجھے ایک بار پھر کراہنے پر

کردیا۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے ریں برسانے والے کی طرف دیکھا۔ وہ تیج سنگھ تھا۔ اس آنکھوں میں شدید نفرت کی چنگاریاں بھڑک رہی تھیں چہرے پر درندگی تھی۔

میں نے مسہری کی طرف دیکھا۔ روپ متی مسہری پر تھی۔ وہ شاید ساتھ والے کمرے میں بھی نہیں تھی اور لہ کو بدلہ چکانے کا موقع مل گیا تھا۔

"اٹھ جا حرام کے پلے۔" وہ میری ٹانگ پر ایک اور مارتے ہوئے خوں خوار بھیڑیے کی طرح غرایا "مالکن کی بستر گاہ میں پڑا اینٹھ رہا ہے۔ ایک غلام کی یہ جرأت! یاد تو غلام ہے۔ رو کڑا خرچ کرکے تجھے خریدا گیا ہے۔ تو کے آداب نہیں جانتا تو میں تجھے سکھاؤں گا۔ اٹھ جا حرام۔"

اس نے ایک اور ٹھوکر مارنے کی کوشش کی مگر میں نے کر کلائی پر روک لی اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ محض ٹھوکریں مارنے پر اکتفا کرتا تو شاید میں برداشت تا لیکن گالیوں سے میری قوتِ برداشت جواب دے گئی

اس کا سیدھا ہاتھ ابھی تک گلے میں لٹکے ہوئے سلنگ میں تھا۔ بائیں ہاتھ میں وہی بید کی چھڑی تھی جسے اس ابھی تک استعمال نہیں کیا تھا لیکن میں جیسے ہی اٹھ کر ہوا' اس نے چھڑی سے وار کردیا۔ میں اس مرتبہ بھی ت میں مار کھا گیا۔ چھڑی میرے بائیں بازو پر گی۔ وار رد تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے بازو پر اس جگہ انگارے بھر گئے ہوں۔ اس نے دوسرا وار کیا لیکن اس بار میں نے کو بائیں ہاتھ پر روک کر گرفت میں لے لیا اور دائیں کا ایک بھرپور پنچ اس کے چہرے پر رسید کردیا۔ اس کی سے خون بہہ نکلا۔ وہ بری طرح ڈگرایا تھا لیکن دوسرے لمحے اس نے چھلانگ لگادی اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اسی دوران میں' میں دوسری کرسی سے ٹکرایا تھا اور الٹ گئی تھی۔

میری کھوپڑی دیوار سے ٹکرائی تھی۔ میرا دماغ جھنجنا آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے تیج سنگھ مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور دوسرے ہی لمحے سر نیچے کو جھکائے ارنے بھینسے کی طرح میری طرف وہ میرے پیٹ میں سر کی ٹکر مارنا چاہتا تھا اور اس مقصد کامیاب بھی ہوگیا۔

ٹکر زوردار تھی۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر ایک اور ٹکر مارنے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔

تیج سنگھ کی گردن اب میرے بازو کی لپیٹ میں تھی اور وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ میں اگر چاہتا تو ایک ہی جھٹکے میں بڑی آسانی سے اس کی گردن مروڑ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا تھا کہ صورتِ حال سنگین ہوجائے گی۔ ایک غلام کے ہاتھوں کسی معزز آدمی کے قتل کو کوئی بھی برداشت نہیں کرے گا۔ اس طرح میرے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی تھیں اور میں اپنے لیے صورتِ حال کو سنگین تر نہیں بنانا چاہتا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں ایک گھونسا رسید کردیا۔ وہ کراہتا ہوا تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ وہ سینے کے بل نیچے گرا۔

دبیز قالین ہونے کی وجہ سے غالباً اسے زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن ٹھیک اسی وقت کڑکتی ہوئی ایک نسوانی آواز کمرے میں گونجی۔ میں نے اپنے آپ کو تیج سنگھ کے حملے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ روپ متی تھی جو دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" وہ ایک بار پھر چیختی ہوئی آگے بڑھی۔ بجلی کی طرح کڑکتی ہوئی یہ آواز اس کی کھنکتی ہوئی آواز سے بالکل مختلف تھی۔

میں اپنے آپ کو تیج سنگھ کی زد سے بچا کر دیوار کے ساتھ ایک طرف سرک گیا تھا جبکہ تیج سنگھ بھی اپنی جگہ رک گیا تھا۔ اس کا مجروح ہاتھ سلنگ سے نکل گیا تھا جسے وہ ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کی آستین سے ناک سے رسنے والا خون پونچھا اور بے ربط تنفس پر قابو پانے کے لیے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے پُرسکون کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سفید قمیص پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔

"میں پوچھتی ہوں' یہ کیا ہورہا ہے۔ تم بولتے کیوں نہیں تیج سنگھ۔" روپ متی کی آواز میں بجلی کی سی کڑک تھی۔

"میں اس غلام کو گستاخی کی سزا دے رہا تھا راج کماری۔" تیج سنگھ نے ایک بار پھر ناک سے رسنے والا خون پونچھتے ہوئے جواب دیا "میں جب کمرے میں آیا تو یہ حرامی

کرسی پر بیٹھا سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا تو اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ یہ اپنے آپ کو بہت بڑا سورما سمجھتا ہے۔ میں اس گستاخی پر اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔"

"اگر یہ میری خواب گاہ میں کرسی پر سو رہا تھا اور اس نے تمہارے ساتھ بھی گستاخی کی تھی تو تم نے اسے گولی کیوں نہیں مار دی۔" روپ متی بولی۔ اس کی آنکھیں اب بھی شعلے اگل رہی تھیں۔

"میرے پاس پستول ہوتا تو ضرور ایسا کرتا۔" تیج سنگھ نے جواب دیا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے مالکن۔" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تو پھر سچ کیا ہے؟" روپ متی نے کہا۔ اس کے لہجے کی کڑک اب بھی برقرار تھی۔

"یہ درست ہے کہ میں اس کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس نے مجھے جگانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ٹھوکر مار کر مجھے گرا دیا۔ اس کے بعد بھی یہ مجھ پر ٹھوکریں برساتا رہا اور بید کی چھڑی سے وار کیے۔" میں نے اسے اپنا بازو دکھایا جس پر تقریباً تین انچ لمبی سرخ لکیر بن گئی تھی "اگر تیج سنگھ میری کھال بھی ادھیڑ دیتا تو میں اف نہ کرتا لیکن اس نے مجھے ماں کی گالی دی تھی۔ اسے سمجھا دو مالکن کہ اب اگر اس نے منہ سے کوئی ایسا لفظ نکالا تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

"یہ جھوٹ بکتا ہے راج کماری۔۔۔"

"چپ رہو۔" روپ متی نے غراتے ہوئے تیج سنگھ کی بات کاٹ دی "میں جان چکی ہوں کہ کون جھوٹ بول رہا ہے اور کون سچا ہے لیکن اسے سزا دینے کا اختیار کس نے دیا تمہیں؟"

"راج کماری، یہ آپ کی خواب گاہ میں۔۔۔"

"اسے خواب گاہ میں، میں لے کر آئی تھی اور میری ہی اجازت سے یہ کرسی پر بیٹھا تھا" راج کماری نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "میں جب اس کمرے سے گئی تھی تو یہ سو رہا تھا۔ میں نے اسے گستاخی نہیں سمجھا تو تم نے اپنے آپ کو اس کا آقا کیسے سمجھ لیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں بات کی تہ تک پہنچ چکی ہوں۔ تم نے دھرمیش کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اس مرتبہ تو میں تمہیں معاف کررہی ہوں لیکن آئندہ ایسی کوئی بات برداشت نہیں کروں گی۔ اب تم جاسکتے ہو۔۔۔ اور سنو۔ اس وقت سات بج رہے ہیں۔ میں

نے روانگی کا پروگرام ملتوی کردیا ہے۔ اب میں بارہ بجے روانہ ہوں گی لیکن تم اور دھرمیش ناشتا کرکے کے اندر اندر یہاں سے روانہ ہوجاؤ۔"

"آپ مالکن ہیں راج کماری۔۔۔ لیکن آپ غا ہیں۔ اس غلام پر اعتماد کرنا خطرناک ہوگا۔" تیج سنگھ

"میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔" روپ اسے گھورا "تم سے جو کہا گیا ہے وہ کرو۔ اب تم جا ہاں رنگو کو اندر بھیج دو۔"

تیج سنگھ خوں خوار نظروں سے میری طرف دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ہماری دشمنی کی جڑ گہری ہوگئی تھیں۔ اس وقت روپ متی نے کھا طرف داری کی تھی۔ اس نے ایک نئے زرخرید کو اپنے پرانے اور وفادار ملازم کی بات پر زیادہ تھی اور روپ متی کی اس حمایت نے جلتی پر تیل تھا۔

تیج سنگھ کے جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی وہی داخل ہوا جسے یہاں آتے ہوئے میں نے راہ اسٹول پر بیٹھے دیکھا تھا۔

"رنگو۔" روپ متی اس کی طرف دیکھتے "ہمارے لیے ناشتا لے کر آؤ۔ بھوک لگ رہی سنو۔ ناشتا دو آدمیوں کا ہونا چاہیے۔ سمجھے۔"

رنگو سرہلاتا ہوا واپس چلا گیا۔ روپ متی ا والے دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔ وہ۔ اٹھاتی ہوئی میرے قریب آگئی۔

"ہمیں صبح سویرے ہوا خوری کی عادت ہے اٹھ کر عقبی لان میں چلے گئے تھے۔" وہ کہہ رہی میں ایک بار پھر وہی کھنک لوٹ آئی تھی "ہمیں کہ ہماری عدم موجودگی میں تمہیں تیج سنگھ کی ز ہونا پڑا۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس نے یہ سب لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ آئندہ ایسی کوئی حرکت گا۔"

میں تو کہنا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ اتنی مہربانی کیوں؟ میں تو ایک غلام ہوں لیکن الفاظ مے آسکے۔ اس نے ایک قدم مزید آگے بڑھ کر میرا پکڑ لیا۔ چند لمحے چھڑی کے اس سرخ نشان کو د جھک کر اپنے ہونٹ میرے بازو پر ٹھیک اس جگہ جہاں چھڑی کی ضرب نے سرخ لکیر بنادی تھی۔ میرے روم روم میں سنسنی کی لہریں سی دو

ہونے لگے۔ دل کی کیفیت تو یہ تھی جیسے سینے دھماکے سے پھٹ جائے گا… پنجرہ توڑ کر باہر نکل جائے گا۔ ایک عجیب بے خودی کی سی کیفیت تھی جو مجھ پر طاری ہورہی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کے شعلوں کی طرح تپتے ہوئے ہونٹ اب میرے بازو کی سرخ لکیر پر تھے اور نظریں میرے چہرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اس سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

میں نے صرف ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا اور پھر ہوئی کرسیاں وغیرہ درست کرنے لگا اور پھر میں مسہری کے گھوم کر کمرے کی عقبی کھڑکی کی طرف چلا گیا اور پردہ سمیٹ کر ایک طرف ہٹانے لگا۔

عمارت کے عقب میں بہت وسیع و عریض اور بہت خوب صورت لان تھا جس میں دو تالاب بھی بنے ہوئے تھے فوارے بھی لگے ہوئے تھے۔ سبز مخملیں گھاس کے اطراف میں کیاریوں میں انواع و اقسام کے پھول کھلے ہوئے۔ یہ خوب صورت لان عقبی فصیل تک پھیلا ہوا تھا جو عمارت سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھی۔ فصیل کے ساتھ ساتھ ناریل کے درخت بھی قطاروں کی صورت میں لگے ہوئے تھے۔ فصیل اگرچہ خاصی بلند تھی مگر اس کے اوپر خاردار تاروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ فصیل کے دوسری طرف دور تک جنگل پھیلا ہوا تھا۔

باہر کی فضا میں دھوپ چھاؤں کا منظر تھا۔ آسمان پر بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ سورج کبھی کسی ٹکڑے کے پیچھے چھپ جاتا اور کبھی سامنے آکر دنیا پر سنہری کرنیں نچھاور کرنے لگتا۔

میں کھڑکی کے قریب کھڑا یہ دل فریب منظر دیکھ رہا تھا کہ گردن پر گرم گرم سانسوں کا لمس محسوس کرکے چونک پڑا۔ آہستگی سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تو روپ متی میرے قریب کھڑی تھی۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسیں میری گردن کو چھو رہی تھیں۔ میں نے روپ متی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ سرخی شب بیداری کی وجہ سے تھی یا اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

میں پہلو بچا کر اس کے قریب سے گزر گیا اور مسہری پر چادر درست کرنے لگا پھر تکیے کو ٹھیک طرح سے اس کی جگہ رکھا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ اب مجھے

کیا کرنا چاہیے۔

روپ متی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں سنبھل گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ڈبیا دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسٹین لیس اسٹیل کی یہ ڈبیا پالش کی ڈبیا سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔

"لاؤ۔ تمہارے زخم پر یہ مرہم لگا دوں۔ تکلیف سے نجات مل جائے گی۔" وہ میرے سامنے رکتے ہوئے بولی۔

مجھے شدید جلن کی تکلیف تو ہورہی تھی لیکن میں ضبط کیے ہوئے تھا۔ میں نے ڈبیا لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا مگر اس نے ڈبیا میرے ہاتھ میں دینے کے بجائے ڈھکنا ہٹا کر انگلی سے مٹیالے سے رنگ کا مرہم نکالا اور میرے بازو کے زخم پر لگانے لگی۔ چھڑی کی ضرب سے کھال پھٹی نہیں تھی، سرخ ہوگئی تھی جس میں شدید جلن ہورہی تھی۔ مرہم لگتے ہی مجھے سکون سا مل گیا۔ یہ اس مرہم کا کمال تھا یا روپ متی کی انگلی کے لمس کا اثر کہ جلن بتدریج غائب ہوتی چلی گئی اور ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا۔

"بس کیجئے مالکن۔ اب مجھے تکلیف نہیں ہورہی۔" میں نے مدھم سے لہجے میں کہا۔

روپ متی نے ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے اس کے دوسرے ہاتھ سے ڈبیا لے لی اور ڈھکنا اٹھا کر ڈبیا پر لگانے لگا۔ روپ متی ہاتھ دھونے کے لیے ملحق باتھ روم میں گھس گئی اور ٹھیک اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ابھری۔

میں نے ڈبیا ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی اور سٹنگ روم میں آکر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ وہ دربان رنگو تھا جس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس نے ایک بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں رکھے ہوئے ناشتے کی چیزیں ایک خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

میں نے اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا اور ٹرے کافی ٹیبل پر رکھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹرے میز پر رکھ دی اور پھر دو گلاس اور پانی سے لبریز جگ بھی باہر سے لاکر رکھ دیے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور وہیں کھڑے ہوکر روپ متی کا انتظار کرنے لگا اور پھر اسے آنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ میز کے سامنے صوفے پر بیٹھی تو میں نے مؤدبانہ انداز میں جھک کر ٹرے پر سے خوان پوش اٹھا لیا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

"یہ ناشتا میں نے دونوں کے لیے منگوایا ہے۔ بیٹھو تم

بھی۔" روپ متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مالکن۔ غلام پر اتنی مہربانی نہ کیجیے کہ وہ غلامی کے آداب کو فراموش کردے۔ آپ ناشتا کیجیے۔ میں بعد میں کھالوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔

"غلام! ہاں ٹھیک ہے' تم میرے غلام ہو۔ میں نے ایک بڑی رقم خرچ کرکے تمہیں خریدا ہے لیکن تم ناشتا میرے ساتھ بیٹھ کر کروگے۔ یہ میرا حکم ہے۔"

میں روپ متی کا حکم نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پراٹھے' انڈے کا آملیٹ' آلو میتھی کی بھجیا اور ایک کٹوری میں اچار بھی تھا۔ روپ متی نے ناشتا شروع کیا تو میں نے بھی ہاتھ بڑھادیا۔ اس وقت مجھے واقعی بہت سخت بھوک لگی تھی اس لیے بے تکلفی سے کھانے لگا۔ یہ احساس تو مجھے بہت بعد میں ہوا کہ روپ متی نے ٹرے خالی ہونے تک صرف دو چار نوالے ہی لیے تھے اور وہ ہاتھ روکے بیٹھی دلچسپ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"بھوجن اور منگواؤں؟" اس نے کہا۔

"نہیں مالکن۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پلیٹ کی طرف دیکھا۔ اس میں اب چپا پراٹھا ہی رہ گیا تھا یا پھر تھوڑا سا آملیٹ بچا تھا۔ مجھے واقعی بہت شرمندگی ہورہی تھی "مجھے افسوس ہے مالکن۔ میں نے کھانا کھانے کے آداب کا بھی خیال نہیں رکھا۔ مجھے اس طرح ندیدے پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"تمہیں بھوک لگی ہوئی تھی' تم نے کھالیا۔ اس میں ندیدے پن کی کیا بات ہے اور اس میں شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔" روپ متی نے یہ کہتے ہوئے پلیٹ میں بچا ہوا پراٹھا اٹھالیا "جب آدمی کھانے کے لیے بیٹھا ہو تو اسے کسی قسم کی جھجک کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ دسترخوان سے خالی پیٹ اٹھ جانے کو میں حماقت ہی سمجھتی ہوں۔"

میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازے پر پہلے ہلکی سی دستک کی آواز ابھری اور پھر دروازہ کھل گیا۔

تیج سنگھ اور دھرمیش کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

مجھے روپ متی کے ساتھ کھانے کی میز پر اس طرح بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں سُلگ اٹھے تھے۔ دونوں کی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھرگئی تھیں۔

تیج سنگھ کا سیدھا ہاتھ اب پھر گلے میں لٹکا رکھا ہوا تھا۔ اس کی ناک پھول کر پکوڑا ہورہی تھی پر اور ناک کے اوپر کسی قسم کی دوا لگائی گئی تھی۔ ا بھی سوجا ہوا تھا۔ جبکہ دھرمیش کی پیشانی پر بھی آرہی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور صورت بیمار نظر آرہا تھا۔

"کیا بات ہے تیج سنگھ ---- اور تم کیسے ہو" روپ متی نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا لہجے میں بے اعتنائی نمایاں تھی۔

"ٹھیک ہوں راج کماری۔" دھرمیش نے "ہم پوچھنے آئے تھے کہ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"میں نے شاید تیج سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ کرکے روانہ ہوجاؤ۔ ہم شام کو یہاں سے" روپ متی نے جواب دیا۔

"راج کماری۔" اس مرتبہ تیج سنگھ بولا "رات ہوجائے گی اور آپ جانتی ہیں کہ راستہ بغیر محافظوں کے اس علاقے میں رات کے وقت

"کیا تم لوگ میری حفاظت کرسکتے ہو؟" بات کاٹتے ہوئے باری باری ان دونوں کو گھورا جاؤ اور میری فکر مت کرو۔ میں راج بھون پہنچ فیصلہ کروں گی۔"

تیج سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر روپ متی نے اسے روک دیا اور زبان سے کچھ کہے بغیر انہیں اشارہ کیا۔

وہ دونوں خوں خوار نظروں سے میری طرف چلے گئے۔ روپ متی نے جس انداز میں واپس فیصلہ کرنے کی بات کی تھی' اس سے مجھے اندازہ دونوں اس کے ملازم تھے اور غالباً باڈی گارڈ جس طرح میرے ہاتھوں پٹے تھے' روپ متی طرح بددل ہوگئی تھی۔

یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا اور میر روپ متی کا اس طرح رویہ تبدیل کرلینا مناسب وہ بھی اس وقت جبکہ وہ اپنے گھر سے دور تھی کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتے تھے۔ میں نے کا اظہار کیا تو روپ متی کے ہونٹوں پر خفیف آگئی۔

"مجھے درندے پالنے کا شوق ہے۔" وہ بولی

شدھانا اور انہیں کنٹرول میں رکھنا جانتی ہوں۔ جو جانور سرکشی کرتا ہے یا میں سمجھتی ہوں کہ وہ میرے کام کا نہیں رہا' میں اسے گولی مار دیتی ہوں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ دونوں بھی میرے پالتو ہیں۔ میں نے انہیں اپنی حفاظت کے لیے رکھا تھا لیکن اب یہ بھونکتے زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ واپس جا کر ان کا فیصلہ کروں گی۔"

میرے کانوں کی لویں تپنے لگیں۔ روپ متی کی بات بالکل واضح تھی۔ اس نے کتے پالے تھے جو اب نہ صرف سرکشی پر آمادہ تھے بلکہ ان میں پہلے جیسا دم خم بھی نہیں رہا تھا۔ اسے اپنی دانست میں میری صورت میں ایک نیا اور تازہ دم کتا مل گیا تھا اور وہ ان دونوں ناکارہ کتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

روپ متی نے شاید میری کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی لیکن زبان سے کچھ نہیں بولی۔

میں نے اٹھ کر برتن سمیٹے اور باہر لے جا کر دربان رنگو کے حوالے کر دیے۔ میں واپس آیا تو وہ خواب گاہ میں جا چکی تھی۔ میں نے ایک کرسی کی پشت پر پڑا ہوا کپڑا اٹھا کر میز صاف کی اور خواب گاہ کے دروازے میں جھانکنے لگا۔

روپ متی اس کمرے میں بھی نظر نہیں آئی۔ وہ باتھ روم میں تھی۔ میں پیچھے ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب میری جھجک دور ہو چکی تھی۔ روپ متی نے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدا تھا لیکن ابھی تک میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ ناشتا بھی مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر کرایا تھا۔ غلاموں یا نوکروں کے ساتھ ایسا مہربانی کا سلوک نہیں کیا جاتا جس کا واضح مقصد تھا کہ اس نے مجھے کسی اور مقصد کے لیے خریدا تھا اور میری خاطر اپنے دو پرانے ملازموں بہ الفاظِ دیگر باڈی گارڈز کو بھی برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ شاید آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔ خواب گاہ سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ روپ متی باتھ روم سے نکل کر مسہری پر سو گئی ہوگی۔ وہ بھی تو رات بھر جاگی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اندر جھانک کر دیکھ لوں مگر پھر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔

چند منٹ اور گزر گئے اور پھر خواب گاہ سے ہلکی سی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میری نظریں بے اختیار دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ دروازے کے سامنے ہلکے نیلے رنگ کا غالباً شیفون کا باریک سا پردہ پڑا ہوا تھا جو تھوڑا سا سمٹا ہوا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل پڑی ہوئی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل ذرا سی آڑی رکھی ہوئی تھی اور اس کے آئینے میں کمرے کے دوسرے حصے کا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔

آئینے پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ روپ متی باتھ روم سے بے لباس ہی باہر نکل آئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روپ متی لباس پہن چکی تھی لیکن وہ لباس بھی ایسا تھا کہ اس کے بدن کے خطوط نمایاں ہو گئے تھے۔ اس وقت تولیا اس نے پگڑی کی طرح سر کے بالوں پر لپیٹ رکھا تھا۔ تولیا سر سے ہٹاتے ہوئے اس کی نظریں ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اٹھ گئیں۔

ایک لمحے کو ہماری نگاہوں کا تصادم ہوا اور روپ متی کے ہونٹوں پر دل فریب مسکراہٹ آ گئی۔ میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشوار پیش نہیں آئی کہ بہت پہلے روپ متی نے بھی مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ لیا تھا۔

وہ تولیے سے بالوں کو جھٹک رہی تھی پھر اس نے تولیا ایک طرف ڈال دیا اور مسہری کے اوپر سے گھوم کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر برش سے بال سنوارنے لگی۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

اپنے آپ کو بنانے سنوارنے میں اسے آدھا گھنٹا لگ گیا اور پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مجھے اشارے سے اندر بلا لیا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ لاتے ہوئے پوچھا۔

میں چونک گیا۔ وہ اپنے غلام سے پوچھ رہی تھی کہ کیسی لگ رہی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ہلکے سے میک اپ سے اس کا حسن نکھر آیا تھا۔ اس نے گہرے رنگ کا ٹخنوں تک اسکرٹ پہن رکھا تھا جس کے ایک طرف اوپر تک چاک تھا۔ وہ اس طرح کھڑی تھی کہ چاک کھل گیا تھا اور اس کی ٹانگ ران تک برہنہ ہو رہی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر اسی رنگ کا نہایت مختصر بلاؤز تھا۔ کانوں میں ہیرے کے ٹاپس اور گلے میں خوب صورت لاکٹ تھا جس میں جڑا ہوا ہیرا بلب کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔

"بہت اچھی مالکن۔" یہ الفاظ میرے منہ سے بے اختیار نکلے تھے۔

روپ متی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس کے رخسار پر نمودار ہونے والا ننھا سا ڈمپل اس کے حسن میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔

روپ متی نے مڑ کر ایک بار پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اس وقت دس بجنے والے تھے۔ راہداری میں اِکّا دُکّا لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہم زینے سے ہوتے ہوئے نیچے آ گئے۔ نچلی راہداری میں زیادہ لوگوں کی آمدورفت تھی۔ جو لوگ رات بھر جاگتے رہے تھے وہ تو شاید اپنے کمروں میں دبکے سو رہے تھے لیکن صبح سے اب تک بہت سے نئے لوگ بھی آ گئے تھے اور ایک دوسرے سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔

لوگ عجیب سی نظروں سے روپ متی کو اور مجھے دیکھ رہے تھے۔ روپ متی کو اپنے حسن و شباب پر فخر تو تھا ہی' وہ مجھ پر بھی گھمنڈ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی شان بڑھانے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لیا تھا۔ اس کے کچھ شناسا بھی ملے تھے اور وہ لوگ مجھ جیسے خوب رو غلام کی خریداری پر اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

روپ متی اپنی شان بڑھانے کے لیے مجھے ساتھ لے کر تقریباً دو گھنٹوں تک اس محل نما عمارت میں گھومتی رہی اور بعض لوگوں سے ملاقاتیں کرتی رہی۔

عمارت کے سامنے والا وسیع و عریض کمپاؤنڈ اب بھی پوری طرح آباد تھا اور ایک بہت بڑی کاروان سرائے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ آنگن کے وسط میں کہیں اونٹ بندھے ہوئے نظر آ رہے تھے اور کہیں خچر یا گھوڑے۔ ہر طرف لوگوں کی آمدورفت جاری تھی البتہ وہ بارہ دری ویران تھی جہاں گزشتہ رات غلاموں اور کنیزوں کی نیلامی ہوئی تھی۔ یہاں کا کاروبار تو رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد شروع ہوتا تھا۔

روپ متی کے ساتھ گھومتے ہوئے میں متجسس نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ نظر نہیں آئی۔ ٹھاکر بھنور سنگھ بھی کہیں دکھائی نہیں دیا اور ایک موقع پر یہ معلوم ہو گیا کہ ٹھاکر بھنور سنگھ آج صبح سویرے ہی اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے ایک جاننے والے نے روپ متی کو بتایا کہ بھنور سنگھ تو آج رات بھی ٹھہرنے کے موڈ میں تھا مگر کسی نے اسے ڈرا دیا کہ روپ متی کے نئے غلام نے آج صبح ہی تیج سنگھ کی دھنائی کر دی تھی اور ممکن ہے' وہ جانکی کو حاصل کرنے کے لیے اس (بھنور سنگھ) سے بھی بھڑ جائے۔ اس لیے بھنور سنگھ کوئی اور کنیز خریدنے کا خیال ذہن سے نکال کر روپ متی سے تحفے میں ملنے والی کنیز پر ہی اکتفا کر کے واپس چلا گیا تھا۔

میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ جانکی جا چکی تھی۔ مجھے پتا نہیں وہ کہاں گئی تھی لیکن مجھے بہرحال اسے تلاش کرنا تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب میں خود آزادی حاصل کر لیتا۔ میری آزادی سلب ہو چکی تھی لیکن اپنے ساتھ روپ متی کا طرزِ عمل دیکھ کر مجھے امید ہو چلی تھی کہ میں بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

ہم عمارت سے نکل کر عقبی لان میں آ گئے۔ یہاں بھی بڑی رونق تھی۔ آسمان پر اب بھی بادل تیر رہے تھے اور موسم بڑا خوشگوار تھا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ روپ متی جیسی ایک حسین عورت نظر آئی۔ اس نے بھی شان دار لباس پہن رکھا تھا۔ وہ روپ متی کو دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ روپ متی نے بھی اسے دیکھ لیا۔

دونوں بڑے پُرجوش انداز میں ایک دوسرے سے ملیں۔ روپ متی کے ساتھ مجھے دیکھ کر اس عورت کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

"میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں پہنچی ہوں۔" وہ روپ متی سے کہہ رہی تھی "مجھے آتے ہی پتا چل گیا تھا کہ تم نے کیا خریدا ہے۔ واقعی تمہارے ذوق کی داد دینی پڑتی ہے۔ تمہارے اس غلام کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"

وہ بات تو روپ متی سے کر رہی تھی لیکن اس کی نظریں میرے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں "لیکن سنا ہے یہ بڑا خطرناک ہے اور تم نے اسے اس طرح آزاد چھوڑ رکھا ہے۔"

"یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اور یوں بھی ہر ایک کے گلے میں پٹا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی کچھ آگے نکل گئیں اور میں وہیں کھڑا رہا۔ چند سیکنڈ بعد ہی اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو چتوڑ گڑھ کے راج کمار کنور بلونت سنگھ کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ وہ میرے سامنے آ گیا اور مجھے اس طرح ٹٹول کر دیکھنے لگا جیسے بکرا خریدنے سے پہلے دیکھا جاتا ہے۔

"شان دار۔" وہ بولا "روپ متی نے واقعی ہیرا خریدا ہے لیکن وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔ تم جیسے غلام تو ہم

جیسے مردوں کے پہلو میں کھڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ تو تمہیں نچوڑ ڈالے گی۔ میں جانتا ہوں' اس نے تمہیں کیوں خریدا ہے۔ کچھ ہی عرصے میں جب تمہاری قوت دم توڑے گی تو وہ تمہیں اٹھا کر اصطبل میں پھینک دے گی۔ وہ اس آدمی کو دیکھ رہے ہو۔" اس نے ایک طرف کھڑے ہوئے دبلے پتلے مگر دراز قامت شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے گال نارنگی کی طرح پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں "دو سال پہلے یہ بھی تمہاری طرح نہایت خوب رو اور تندرست و توانا تھا۔ اسے دیکھ کر عورتیں ٹھنڈی سانس بھرا کرتی تھیں۔ روپ متی نے اسے اسی منڈی سے تمہاری طرح مہنگے داموں خریدا تھا مگر دو سال کے عرصے میں اسے اس طرح نچوڑ کر پھینک دیا کہ اب وہ اپنے جیون سے بھی بیزار ہو رہا ہے لیکن...... میں تم پر ایسا وقت نہیں آنے دوں گا۔"

"حکم! آپ کہو تو ہم اسے بھی اٹھا کر لے جائیں۔ دیکھاں گے کہ وہ چھوکری کیا کر لیوے گی۔" بلونت سنگھ کے قریب کھڑے ہوئے ایک لمبے تڑنگے شخص نے کہا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا اور وہ دونوں مسلح تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بلونت سنگھ کے محافظ تھے۔

"نہیں۔" بلونت سنگھ نے ہاتھ اٹھا دیا "روپ متی ہماری پرانی جانکار ہے۔ میں شریفانہ طور پر ایک اور کوشش کر لینا چاہتا ہوں۔ اگر بات نہ بنی تو پھر گھی نکالنے کے لیے انگلی ٹیڑھی کرنی ہی پڑے گی۔"

وہ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں روپ متی اپنی دوست کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھنا چاہا تو بلونت سنگھ کے محافظوں نے مجھے روک لیا۔

"دو مالک آپس میں بات کر رہے ہوں تو غلاموں کو ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔" ان میں سے ایک نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

میں بھی اسے گھور کر رہ گیا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا تھا کہ ان کے ہولسٹروں میں پستولوں کی پروا کیے بغیر بھڑ جاؤں لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ میں فی الحال اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور ویسے بھی میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس شخص نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جب دو مالک آپس میں بات کر رہے ہوں تو غلاموں کو دور ہی رہنا چاہیے۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ کنور بلونت سنگھ اور روپ متی باتیں کر رہے تھے۔ پہلے تو ان دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی لیکن پھر بتدریج تاثرات بدلتے گئے۔ روپ متی کے حسین چہرے پر تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا۔

بلونت سنگھ نے مڑ کر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ اس کے چہرے پر بھی تناؤ سا تھا۔ اس کے دونوں محافظ بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے پیچھے چل دیے تھے۔ میں بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روپ متی کے قریب پہنچ گیا۔

"مالکن!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ حکم دیں تو میں کنور بلونت سنگھ کو اس کی گستاخی کا مزہ چکھا دوں۔"

"نہیں۔" روپ متی نے نفی میں سر ہلا دیا "میں کوئی بدمزگی نہیں چاہتی۔ ہمیں آج شام سے پہلے یہاں سے چلے جانا ہے۔ بلونت سنگھ بھی دو چار روز بعد سب کچھ بھول جائے گا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ روپ متی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ میں نے جب اسے بلونت سنگھ کے محافظ کی بات بتائی' یعنی مجھے اٹھا لینے والی' تو اس کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں ابھر آئیں۔

"اچھا ہوا تم نے بتا دیا۔" وہ مدھم لہجے میں بولی "اس سے کسی بھی اقدام کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن مجھے اس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔"

اور پھر میرے لیے یہ انکشاف خاصا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ یہاں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ کسی غلام یا کنیز کی بولی پر دو پارٹیوں میں ٹھن جاتی اور کبھی کبھار تو ایک آدھ لاش بھی گر جاتی تھی۔ کبھی کوئی حریف پارٹی کسی۔ اس کا خریدا ہوا غلام یا کنیز چھین لی جاتی تھی۔ زیادہ واردات کنیزوں کے چھیننے کی ہوتی تھیں۔ یہاں آنے والے دولت مند لوگ عیاشی کے لیے حسین کنیزیں خرید کر لے جاتے اور جب ان سے دل بھر جاتا تو انہیں اپنے شہروں کی طوائفوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا تھا۔

غلاموں یا کنیزوں کو طاقت کے بل بوتے پر چھیننے کی وارداتیں اس محل نما عمارت کے باہر ہی پیش آتی تھیں۔ ان وارداتوں میں بھی کبھی ایک آدھ لاش گر جاتی تھی اور کبھی تو وہ کنیز ہی ماری جاتی تھی جس کے لیے یہ سارا جھگڑا کھڑا ہوتا لیکن قانون کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ قانون کے ہاتھ لمبے ضرور سہی مگر یہ جگہ تو قانون کے ہاتھوں کی پہنچ سے بہت دور تھی اس لیے یہاں کسی کے دل میں قانون کا خوف نہیں تھا۔

روپ متی ایک بار پھر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی عمارت

... آ گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے کمرے میں واپس جائے گی ... اندر داخل ہو کر وہ پہلی راہداری میں بائیں طرف مڑ گئی ... ایک کمرے کا دروازہ کھول کر بے دھڑک اندر داخل ... ئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔

... بہت بڑا کمرا دفتر کے طور پر آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز ... ین اور شان دار صوفے بچھے ہوئے تھے اور اس وقت ... نصف درجن آدمی ان صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ... نے ایک بہت شان دار آفس ٹیبل تھی جس کے پیچھے ... ی پر ایک ادھیڑ عمر بہت بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ... کا سر گنجا' کوتاہ گردن' پیشانی تنگ اور آنکھیں چہرے کے ... سے بہت چھوٹی تھیں۔ تانبے جیسی رنگت پر بڑی بڑی ... مونچھیں اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا تاثر دے رہی ... وہ مارواڑی تھا اور اس نے لباس بھی مارواڑی طرز کا ... رکھا تھا۔

اس کے سامنے کرسی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے جن سے ... تیں کر رہا تھا۔ روپ متی کو دیکھ کر وہ گنجا مارواڑی اٹھ کر ... ا ہو گیا اور ہونٹوں پر بھدی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے ... ں ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ غلاموں کی اس منڈی کا مالک ... ھے سنگھ تھا۔ جب وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کی ہیئت دیکھ کر ... دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی توند ... کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔

میں دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا جبکہ روپ ... میز کے قریب جا کر رک گئی۔ اس نے مدھم لہجے میں ... ھے سنگھ سے کچھ کہا اور اودھے سنگھ نے اپنی کرسی سے ... ہٹ کر پچھلی طرف کا ایک دروازہ کھول دیا اور روپ ... کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ روپ متی اندر داخل ہو گئی۔ اس ... پیچھے ہی اودھے سنگھ بھی اندر غائب ہو گیا اور دروازہ بند ... ا۔

اودھے سنگھ کی ہیئت دیکھ کر میرے ذہن میں اس کے ... ے میں کچھ عجیب سا خیال ابھرا تھا۔ کوتاہ گردن' تنگ ... نی اور چھوٹی آنکھیں اس کے نہایت مکار اور کینہ پرور ... کی غمازی کر رہی تھیں اور درحقیقت ایسے ہی مکار اور ... لوگ قانون کی گرفت سے بے نیاز ہو کر بڑے پیمانے پر ... قسم کے گھناؤنے کاروبار کر سکتے ہیں۔

دفتر میں بیٹھے ہوئے لوگ بار بار میری طرف دیکھ رہے ... ان میں سے ایک آدمی اٹھ کر معنی خیز نگاہوں سے میری ... دیکھتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد میز کے پچھلی طرف والا دروازہ کھلا اور پہلے روپ متی برآمد ہوئی پھر اودھے سنگھ باہر نکلا۔ اس نے رخصتی انداز میں روپ متی کو سلام کیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

روپ متی میرے قریب سے گزرتی ہوئی دفتر سے باہر نکل گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ اس مرتبہ اس کا رخ زینے کی طرف تھا اور پھر چند منٹ بعد ہی ہم اس کے کمرے میں موجود تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے روپ متی نے دربان رنگو سے چائے لانے کو کہہ دیا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر روپ متی ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے ایک پیر اٹھا کر سامنے کافی ٹیبل پر رکھ لیا۔ اس طرح اس کے اسکرٹ کا چاک کھل گیا تھا اور ٹانگ اوپر تک برہنہ ہو گئی تھی۔ میں سامنے کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں الجھن اور چہرے پر تشویش اب بھی نمایاں تھی۔ کنور بلونت سنگھ سے ملاقات سے پہلے وہ بالکل تازہ دم تھی اور اب تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ وہ آنکھیں موندے صوفے پر پڑی رہی۔

دس منٹ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ رنگو تھا۔ اس نے اندر داخل ہو کر چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور واپس چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ دروازے پر دستک اور میز پر ٹرے رکھنے کی آواز سے وہ سنبھل کر بیٹھ جائے گی مگر اس نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ ہی میز پر سے پیر ہٹایا۔

"مالکن!" میں نے ہولے سے پکارا "چائے آ گئی ہے۔"

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا مگر پیر میز پر سے نہیں ہٹایا۔

"ٹھیک ہے۔ چائے بناؤ۔" اس کی آواز سے بھی تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں میز کے قریب قالین پر بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ ٹرے میں دو کپ تھے۔ صبح رنگو نے مجھے روپ متی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرتے دیکھا تھا اس لیے سمجھ گیا تھا کہ میں کچھ اسپیشل قسم کا غلام ہوں۔ اس لیے وہ اس وقت چائے بھی ہم دونوں کے لیے لایا تھا۔

میں نے چائے بنا کر ایک کپ روپ متی کی طرف بڑھا دیا۔ اس مرتبہ اس نے پیر میز سے ہٹا لیا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں قالین پر ہی بیٹھا رہا اور دوسرا کپ میز پر اپنی طرف سرکا لیا۔ روپ متی نے مجھے کرسی یا صوفے پر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ اس کا ذہن شاید کہیں اور الجھا ہوا تھا۔ وہ خاموش

بیٹھی چائے کی چسکیاں لیتی رہی۔

"مالکن!" بالآخر میں نے ہی جمود توڑا "آپ کچھ بجھی بجھی سی نظر آرہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کنور بلونت سنگھ کی دھمکی نے آپ کو پریشان کر رکھا ہو؟"

"تم ٹھیک سمجھے۔" روپ متی نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "وہ بہت کینہ پرور آدمی ہے۔ میں نے تیج سنگھ اور دھرمیش کو پہلے بھیج کر غلطی کی ہے لیکن شاید کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ دونوں مُہرے پٹ چکے ہیں۔ میرے لیے بیکار ہو چکے ہیں۔ تم نے جس طرح ان کی دھنائی کی تھی اس سے میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ اب وہ کسی کام کے نہیں رہے لیکن بہرحال میں نے اس کا بندوبست کرلیا ہے۔"

"کیسا بندوبست مالکن؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اودھے سنگھ سے بات کی تھی۔ تھوڑی دیر میں دو مسلح محافظ یہاں پہنچ جائیں گے جو جے پور تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔" روپ متی نے کہا۔

"کیا آپ کو اپنے اس غلام پر بھروسا نہیں مالکن۔" میں نے کہا۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"میں نے تمہیں دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف پایا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی "جب کوئی نئی کنیز یا نیا غلام خریدا جائے وہ سرکشی ضرور دکھاتا ہے۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی اندازہ لگالیا تھا کہ تمہارا تعلق کسی اچھے خاندان سے ہے۔ تم نے اب تک جس طرح اطاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے میں سمجھ گئی ہوں کہ تم نے حالات سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ یہ تم پر میرا اعتماد ہی تھا کہ میں نے دھرمیش اور تیج سنگھ کے مقابلے میں تمہاری حمایت کی حالانکہ وہ میرے پرانے خدمت گار ہیں اور میرے پیر چاٹتے ہیں لیکن ان کے مقابلے میں میں نے تم پر زیادہ اعتماد کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم مجھے دھوکا نہیں دو گے۔ یہ تم پر میرا اعتماد ہی تو ہے کہ تم نقل و حرکت میں آزاد ہو اور میرے کسی محافظ کے بغیر یہاں میرے پاس موجود ہو ورنہ جو غلام خریدے جاتے ہیں ان کے گلوں میں طوق ڈال کر انہیں سلاخوں کے پیچھے بند رکھا جاتا ہے اور یہاں سے لے جانے کے لیے انہیں زنجیروں یا رسیوں سے باندھا جاتا ہے تاکہ وہ سرکشی دکھانے یا فرار ہونے کی کوشش نہ کریں مگر تم۔۔۔"

"آپ مجھے بے وفا نہیں پائیں گی مالکن۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ درست ہے کہ آزادی سلب ہوجانے پر مجھے بھی دکھ ہے مگر آپ نے یہ بھی ٹھیک سوچا کہ م... وقت سے سمجھوتا کرلیا ہے۔ وقت نے میری پیشانی پر غلا... مہر لگائی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وقت ہی یہ داغ صاف... گا۔"

روپ متی نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خا... میری طرف بڑھا دیا جسے میں نے میز پر رکھ دیا۔ و... نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے منہ سے... ہوئے چند الفاظ سے اسے بڑا حوصلہ ملا تھا اور اس ک... کے تاثرات بدل گئے تھے۔ آنکھوں میں بھی وہ تشو... نہیں رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" اس کے یاقوتی لبوں سے سرسرا... سی آواز نکلی "غلاموں کی اس منڈی تک کیسے پہنچے... ٹھاکر کے ہاتھ کیسے لگے؟"

"کیا آپ وجے ٹھاکر کو جانتی ہیں؟" میں نے... نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ صحرا کا چوہا ہے۔" روپ متی کے ہونٹوں پر... سی مسکراہٹ آگئی "اسے راجستھان کا ہر وہ شخص جا... جسے غلام یا کنیزیں پالنے کا شوق ہے۔ وجے ٹھاکر... ہندوستان کے کونے کونے میں گھومتے رہتے ہیں جو... صورت عورتوں کو دھوکے سے اپنے جال میں پھنسا کر... کرکے اس کے پاس پہنچا دیتے ہیں جنہیں ہر تین... اس منڈی میں فروخت کردیا جاتا ہے۔ اس کے بار... کہا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ بہترین مال لے کر منڈی میں... اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں۔ اس منڈی کے علاو... راجستھان کے مختلف شہروں میں حسین عورتیں راج... کے پاس فروخت کرتا رہتا ہے مگر میں دیکھ چکی ہوں... آدمیوں کے قابو میں آنے والے تو نہیں۔ وجے ٹ... ہتھے کیسے چڑھ گئے؟"

"یہ سب مقدر کا کھیل ہے مالکن۔" میں نے گہ... لیتے ہوئے جواب دیا اور اپنی اصلیت ظاہر کیے بغ... بارے میں بتانے لگا۔

"میں سنگاپور سے کراچی جانے کے لیے جس ہو... میں سفر کررہا تھا وہ ایک حادثے کا شکار ہوگیا۔ ہم ہوا... کے حادثے میں تو بچ گئے مگر ہمیں ڈاکوؤں کے ایک... گھیر لیا جن سے بچ کر ہم رات بھر صحرا میں بھٹکتے رہ... چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے بعد کے واقعا... لگا۔ میں آخر میں کہہ رہا تھا "ناہید بے چاری وج... اس کے آدمیوں کی ہوس کا شکار ہو کر اپنی جان سے...

بیٹی۔ اس کی عمر چھ سات سالہ بیٹی ہمارے ساتھ تھی۔ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ اسے کوئی خرید کرلے گیا یا ابھی تک وجے ٹھاکر کے قبضے میں ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کررہی ہے۔"

روپ متی فوری طور پر کچھ نہیں بولی۔ اس کی نظریں بار بار میرے چہرے کی طرف اٹھ رہی تھیں پھر وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

"اس جہاز کی تباہی کا تو بہت چرچا رہا ہے۔ ہیلی کاپٹروں اور ائر فورس کے طیاروں کے ذریعے تلاش کی مہم شروع کی گئی تو دوسرے دن اس کا ملبا ریگستان میں پڑا ہوا ملا۔ جہاز کے زیادہ مسافر ملبے کے آس پاس ہی مل گئے۔ وہ بھوک پیاس اور شدید گرمی سے بدحال تھے۔ انہیں ہیلی کاپٹروں کے ذریعے جودھ پور پہنچا دیا گیا۔ کئی مسافر لاپتا تھے۔ ان کی تلاش اب بھی جاری ہے۔ جائے حادثہ سے میلوں دور مختلف سمتوں میں ایک عورت اور تین مردوں کی لاشیں بھی مل چکی ہیں جن کے بارے میں تصدیق ہوچکی ہے کہ وہ بدنصیب اسی جہاز کے مسافر تھے لیکن آٹھ مسافر ایسے بھی ہیں جن کی تلاش اب بھی جاری ہے اور تم بھی ان میں سے ایک ہو۔"

میں نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا اور سوچنے لگا کہ طیارے کے حادثے کے بعد وہاں سے کسی پناہ کی تلاش میں روانہ ہونے والے چار تو ہم تھے۔ میں، جانکی، ناہید اور اس کی بیٹی بیلی۔ ہمارے بعد کچھ اور لوگ بھی پناہ کی تلاش میں ریگستان میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ ان میں سے چار لقمۂ اجل بن گئے۔ اس طرح میرے حساب سے چار مسافر باقی رہ گئے تھے جو واقعی گمشدہ تھے اور ان کی تلاش جاری تھی۔ میرے خیال میں یا تو وہ کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہوں گے جہاں انہیں پناہ مل گئی ہو یا وہ بھی بھوک، پیاس اور ریگستان کی شدید گرمی سے موت کا شکار ہوگئے ہوں گے اور ممکن ہے ان کی لاشیں اڑتی ہوئی ریت کے نیچے دفن ہوچکی ہوں۔

"وہ عورت کون تھی؟" روپ متی نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ جانکی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"جانکی!" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا "جانکی دیوی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات برسوں پہلے بنکاک میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس کے خاندان کے کچھ لوگ ہندوستان میں بھی ہیں۔"

"کیا تم اس سے پریم کرتے ہو یا وہ۔۔۔؟" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ براہِ راست میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"نہیں۔ ہم میں انڈر اسٹینڈنگ ہے۔" میں نے جواب دیا "ہم طویل عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں لیکن ہم میں کبھی ایسا کوئی تعلق نہیں رہا۔ وجے ٹھاکر نے یہاں پہنچ کر ہمیں ایک دوسرے سے الگ کردیا تھا لیکن پھر اتفاق سے اسے بھی آپ نے خرید لیا۔ دوبارہ ملنے کی خوشی میں وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ آپ نے ہمیں دیکھا تو شاید۔۔۔"

"میں غلط سمجھی تھی۔" اس نے میری بات مکمل کردی "اور میں اسے برداشت نہیں کرسکی تھی۔ میں جس چیز کو اپنا سمجھ لیتی ہوں، اس پر کسی دوسرے کا حق تسلیم نہیں کرتی۔ میں نے نیلامی میں تمہیں دیکھتے ہی پسند کرلیا تھا اور یہ طے کرلیا تھا کہ تمہیں ہر قیمت پر خریدوں گی۔ ٹھاکر بھنور سنگھ چھوٹا آدمی ہے۔ وہ بولی کو آگے نہ بڑھا سکا لیکن اگر تمہاری بولی پچاس لاکھ تک بھی جاتی تو میں پیچھے نہ ہٹتی۔"

میں نے "کیوں" والا سوال نہیں کیا۔ میں اب تک بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ اس نے مجھے کیوں خریدا تھا اور یقیناً اسی لیے اس نے جانکی کو مجھ سے الگ کردیا تھا تاکہ کباب میں ہڈی کا وجود ہی نہ رہے۔

کئی لمحات خاموشی کی نذر ہوگئے۔ میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا لیکن جب باتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا تو اس نے میری مشکل حل کردی اور خود ہی اپنے بارے میں بتانے لگی۔

ہندوستان تقسیم ہونے سے پہلے راجستھان لاتعداد چھوٹی بڑی جاگیروں اور ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن پر راجپوت راجے اور مہاراجے حکمران تھے لیکن بعد میں ساری خود مختار ریاستیں ختم کرکے اس خطے (راجپوتانہ) کو راجستھان کے نام سے ہندوستان کا ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ راجوں کے اختیارات ختم کرکے ان کے لیے سرکار کی طرف سے گراں قدر وظائف مقرر کردیے گئے۔

روپ متی کا باپ سیوا سنگھ جے پور سے ملحق ایک چھوٹی سی ریاست کا حکمران تھا۔ اس کی ریاست ختم ہوگئی تو کچھ عرصے بعد وہ جے پور آگیا جہاں اس نے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی صرف دو اولادیں تھیں۔ روپ متی اور اس کا ایک بڑا بھائی جو شکار کا بہت شوقین تھا۔ ایک مرتبہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ جنگلوں میں شکار کھیلنے گیا تو خود چیتے کا شکار ہوگیا۔

روپ متی اٹھائیس سال کی عمر کی تھی تو اس کی شادی ہوگئی۔ اس کا شوہر نروان سنگھ بھی ایک سابق راجا کا بیٹا تھا۔ بڑا کڑیل جوان تھا وہ لیکن روپ متی کے ساتھ اسے صرف ایک رات گزارنے کا موقع مل سکا۔ شادی کے اگلے ہی روز بھرے بازار میں اس کے دشمنوں نے اسے گولیوں سے چھلنی کرڈالا۔

روپ متی بیوہ ہوگئی لیکن اس نے مذہبی رسموں کی قیدی بننے سے انکار کردیا۔ سفید ساڑی کے بجائے وہ اپنی پسند کے کپڑے پہنتی' چہرے پر میک اپ کرتی' زیور بھی پہنتی اور محفلوں میں بھی شریک ہوتی۔ وہ زندگی کی وہ تمام خوشیاں حاصل کرنا چاہتی تھی جو اس کے پتی کو موت کے گھاٹ اتار کر اس سے چھین لینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے ایک بیوہ کی حیثیت سے کوئی بھی پابندی قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔

وہ پڑھی لکھی ضرور تھی۔ خود مختار بھی تھی لیکن عقل کی تھوڑی سی اس میں کمی تھی اور اس کی اس بے وقوفی سے دوسرے فائدہ اٹھاتے رہے۔ خود غرض اور ہوس پرست مرد دونوں طرح سے اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ مالی بھی اور جسمانی بھی۔ وہ مردوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنتی رہی۔ وہ کسی ایک مرد کو اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتی تھی۔ جس کا بھی انتخاب کرتی وہ اسے خوب صورت کھلونا سمجھ کر کھیلتا اور جب شادی کی بات آتی تو وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوجاتا۔ راتوں کو رنگین بنانے کی حد تک تو بات درست تھی لیکن ایک بیوہ سے شادی کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔

روپ متی کو بہت عرصے بعد عقل آئی تھی لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔ وہ اس دلدل میں پھنس چکی تھی جس سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ پہلے تو وہ فریب کا شکار ہوتی رہی تھی' اب وہ اپنی مرضی سے اپنی راتوں کو رنگین اور سنگین بنانے لگی۔

اونچی سوسائٹی میں شہر کا کوئی ایسا خوب رو جوان نہیں تھا جو روپ متی کے حسن و شباب سے فیض یاب نہ ہوا ہو۔ راج کمار اور کنور اس کے ابرو کے اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ کتوں کی طرح اس کے آگے پیچھے دُم ہلاتے پھرتے تھے مگر پھر بھی روپ متی تنہا تھی۔ وہ سب کی تھی مگر کوئی اس کا نہیں تھا۔

تیج سنگھ اور دھرمیش اس کے دور کے رشتے دار تھے۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے۔ ان کا باپ پہلوان تھا اور یہ دونوں بھی اکھاڑے میں پہلوانی کرتے تھے۔

تیج سنگھ اور دھرمیش کو دیکھا تو روپ متی کا ... اٹھا۔ روپ متی نے ایک بڑی تنخواہ پر ان دونوں بھا... اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ ان کی تربیت کی' انہیں ... سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب سکھائے اور انہیں ... ساتھ لے کر ادھر ادھر آنے جانے لگی۔ کبھی تیج سنگھ ... دھرمیش کو اور کبھی دونوں اس کے دائیں بائیں نظر ...

روپ متی نے اپنے دھرم کی رسومات سے بغا... تھی۔ اس کے دل سے رشتوں ناتوں کی پاکیزگی بھی خت... تھی۔ تیج سنگھ کو تو وہ فیض یاب کرچکی تھی۔ دھرمیش ... ترسا رہی تھی۔ وہ اسے خلوت میں آنے کا موقع ضرور ... اس سے پیر دبواتی' جسم دبواتی مگر اس سے آگے ... موقع کبھی نہیں دیا تھا۔ دھرمیش کبھی ایسی کوئی کوشش ... کرتا تو روپ متی اسے لات رسید کردیتی اور وہ کتے ... کی طرح "چیاؤں چیاؤں" کرتا ہوا اس کی خلوت گاہ ... جاتا۔

دو سال پہلے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ غلا... اس منڈی میں آئی تھی۔ اسے بھی یہ جان کر حیرت ہو... کہ آج کے جدید دور میں بھی غلاموں اور کنیزوں کی ... ہوتی ہے۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ محض تفریح کے ... سے یہاں آئی تھی لیکن غلامی کے دوران میں اسے ... خوب رو اور گبرو جوان پسند آگیا جس کی بولی کے ... پارٹیوں میں مقابلہ ہو رہا تھا۔ روپ متی نے بھی بولی ... اور یہ بولی اتنی زیادہ تھی کہ نیلامی میں حصہ لینے والے ... آدمی ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

روپ متی نے دو سال کے عرصے میں اس جوان ... طرح نچوڑ کر رکھ دیا کہ وہ بالکل جھول کر رہ گیا۔ یہ وہ ... تھا جس کی نشان دہی کنور بلونت سنگھ نے بھی کی تھی۔

تیج سنگھ اور دھرمیش اب کسی حد تک سرکشی کی ... مائل ہو رہے تھے۔ روپ متی نے ان دونوں بھائیوں ... چھوٹے سے اکھاڑے سے اٹھا کر محل میں لا بٹھایا تھا۔ انہیں ہر طرح کا عیش و آرام حاصل تھا لیکن اب ان ... دماغوں پر چربی چڑھنے لگی تھی اور وہ کچھ دوسری باتیں ... لگے تھے۔ روپ متی ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ... وہ یہ بھی جانتی تھی کہ دونوں بھائی حویلی کی جوان اور ... نوکرانیوں کے ساتھ راتیں گزارنے کے علاوہ شہری ... عورتوں کے ساتھ بھی جھک مارتے رہتے تھے اور اب ... وہ دم خم بھی نہیں رہا تھا۔

روپ متی کئی مرتبہ غلاموں کی اس منڈی میں آچکی تھی ... ہمیشہ خالی ہاتھ ہی واپس گئی تھی اور اس مرتبہ میں اس ... لوں میں بِچ گیا تھا۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنتا ... لیکن یہ سچ تھا کہ میں بہت ہی خوب رو اور گبرو جوان ...

... دوپہر ہوچکی تھی۔ روپ متی صوفے پر آڑی ترچھی نیم ... تھی اور میں اس کے سامنے قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ روپ ... نے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدا تھا لیکن میرے سامنے ... نے اپنی زندگی کے ڈھکے چھپے گوشوں سے بھی پردہ اٹھا دیا ... اپنے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ... چھائی تھی۔

"یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے ... تھی "کہتے ہیں دولت سے سب کچھ خریدا جاسکتا ... ہی میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ میں سب کچھ خریدنے ... کی طاقت رکھتی ہوں۔ انسان بھی۔ حسن و شباب کی دولت ... مجھے بھگوان نے جی کھول کر دی ہے۔ بڑے بڑے ... راج ایک اشارے پر میرے قدموں پر جھک جاتے ہیں۔ ... پاس سب کچھ ہے پر من کی شانتی نہیں ہے۔" وہ ... ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں گہری نظروں ... ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی بڑھ ... خوب صورت آنکھوں میں ویرانی سی جھلکنے لگی۔ اس ... ہونٹوں کو ایک بار پھر حرکت ہوئی۔ وہ سرسراتی ہوئی سی ... میں کہہ رہی تھی "یہ زندگی بھی ایک عجب تماشا ہے۔ ... خوشیوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہیں ... چھولینے' پالینے کی آرزو میں مر مر کر جیتے ہیں۔ یہ ہاتھ ... نہیں۔ ترسا ترسا کر مارتی ہیں۔ قریب آکر دور بھاگتی ... ہیں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ خوشیاں ہمارے ... پیچھے ماری ماری پھرتی ہیں۔ یہ ہمارے قریب آنے کی ... کوشش کرتی ہیں' ہم اتنا ہی ان سے دور بھاگنے کی ... کرتے ہیں۔ یہ ہمارا پیچھا کرتی ہیں اور ہم دیوانہ وار ... رہتے ہیں پھر ہمارے قدم اس وقت رکتے ہیں جب یہ ... ہم سے کوسوں میل دور جاچکی ہوتی ہیں۔" وہ ایک ... خاموش ہوگئی۔ اس کی اداس نظریں میرے چہرے پر ... تھیں جیسے کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ اس کی سرسراتی ... آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی "میں جیون کی ... خوشیوں کی تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ بھگوان جانے ... ان تک پہنچ بھی سکوں گی یا بے کل آتما کی طرح اسی ... بھٹکتی رہوں گی۔"

میں خاموش بیٹھا ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر مجھے واقعی افسوس ہوا تھا اور اس سے ہمدردی بھی ہونے لگی تھی مگر اس کی ہمدردی میں کھو کر میں اپنے مقصد کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ روپ متی نے جس طرح مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اس سے اگرچہ مجھے آزادی حاصل کرنے میں آسانی ہوسکتی تھی لیکن میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ پر جو اعتماد کیا تھا میں اسے ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا لیکن بہرحال کوئی اور راستہ اپنایا جاسکتا تھا۔

ہم دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ خاموشی کا یہ دورانیہ طویل ہوتا جا رہا تھا پھر دروازے پر دستک کی آواز سن کر ہم دونوں ہی اچھل پڑے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دو لمبے تڑنگے آدمی راہداری میں کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر ایسے ہی ڈریس تھے جیسا دربان رنگو نے پہن رکھا تھا۔ دونوں کے بیلٹوں میں پستول اڑسے ہوئے تھے۔ رنگو نے بتایا کہ روپ متی کے لیے یہ محافظ اودھے سنگھ نے بھیجے تھے۔

میں گہری نظروں سے ان کا جائزہ لینے لگا۔ دونوں کی بڑی بڑی مونچھوں نے ان کے چہروں کو خاصا خوفناک بنا دیا تھا۔

میں نے روپ متی کو بتایا تو انہیں اندر طلب کرلیا گیا۔ وہ بڑے مستعد انداز میں روپ متی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیتی رہی پھر پسندیدگی کے انداز میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی "تم لوگ باہر انتظار کرو۔ ہم پانچ بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ جتنی دیر کمرے میں کھڑے رہے تھے' میری طرف ہی دیکھتے رہے تھے۔

اس وقت دو بج رہے تھے۔ روپ متی نے رنگو سے کہہ کر کھانا منگوالیا۔ کھانے کے بعد روپ متی روانگی کی تیاری کرنے لگی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر پھیلا ہوا میک اپ کا سامان اٹھا کر وینٹی بیگ میں ڈالا اور ادھر ادھر پھیلے ہوئے کپڑے سمیٹنے لگی۔ میں بھی کپڑے اٹھا کر تہ کرکے سوٹ کیس میں رکھنے میں اس کی مدد کر رہا تھا۔

"باتھ روم میں کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے ہیں۔ وہ بھی اٹھا لاؤ۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میں باتھ روم میں داخل ہو کر کھونٹیوں پر ٹنگے ہوئے کپڑے اٹھالیے۔ ان میں جسم کے بالائی حصے کا زیر جامہ بھی

تھا۔ اسے اٹھاتے ہوئے روپ متی کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس نے وہ زیر جامہ سوٹ کیس میں بھرے ہوئے کپڑوں کے نیچے ٹھونس دیا۔

تیاری مکمل کرنے کے بعد روپ متی کچھ دیر کے لیے اودھے سنگھ کے دفتر میں بھی گئی تھی۔ غالباً بل وغیرہ چکانے کے لیے۔

اور پھر پانچ بجے کے قریب ہم کمرے سے نکل آئے۔ روپ متی بڑے پُروقار انداز میں آگے آگے چل رہی تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ میں نے سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا جو خاصا بھاری تھا۔

وسیع و عریض کمپاؤنڈ میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ دو نئے کاروان آئے تھے۔ اونٹوں کی بلبلاہٹ ہر طرف سے سنائی دے رہی تھی۔ پارکنگ ایریا میں بہت سی شان دار گاڑیاں کھڑی تھیں۔

روپ متی گرے رنگ کی ایک شان دار لینڈ کروزر کے پاس رک گئی۔ اس نے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر دروازہ کھول دیا۔

ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے دو اور سیٹیں تھیں اور ان کے پیچھے بھی کافی کشادہ جگہ تھی جہاں میں نے سوٹ کیس رکھ دیا۔ دونوں محافظ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے حکم پر پسینجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔

روپ متی نے چابی گھمائی مگر انجن اسٹارٹ نہیں ہوا۔ دوسری اور تیسری کوشش بھی ناکام رہی۔ وہ تقریباً دو منٹ تک انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

"ذرا بونٹ کھول کر دیکھو۔ کیا گڑبڑ ہے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں انجن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو ڈرائیونگ بھی نہیں آتی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" اس نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔

روپ متی نے ایک بٹن دبا کر بونٹ کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ میں بھی نیچے اتر آیا اور پھر بونٹ میں نے ہی اٹھا کر راڈ پر اٹکا دیا تھا۔

روپ متی گہری نظروں سے انجن کا معائنہ کرنے لگی۔

"اوہ!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "یہ۔۔۔ یہ ڈسٹری بیوشن کی لیڈ غائب ہے۔" اس کی آواز میں ہکلاہٹ تھی۔

میں انجن کو نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ تو نظر آ رہا تھا کہ روپ متی انگلی سے جس طرف اشارہ کر رہی تھی وہاں ایک تار غائب تھا۔ میں نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر انجانے سے خوف کے ہلکے سے سائے لہرا رہے تھے۔

میرے دماغ میں بھی چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ڈسٹری بیوشن وائر خود بخود غائب نہیں ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس کسی انجانے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔

"یہ یقیناً کسی کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"جی مالکن۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ "خود بخود تو نکل کر غائب نہیں ہو گیا۔"

"میں سمجھ گئی' یہ کس کی شرارت ہو سکتی ہے۔ تم یہاں رکو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ یہ کہتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

دونوں محافظ بھی نیچے اتر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا جیسے اسے شبہ ہو کہ میں موقع پا کر کہیں بھاگنے کی کوشش کروں گا لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میں خاموش کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ گاڑی سے تار نکالنے کے حوالے سے مجھے شبہ تھا کہ یہ کنور بلونت کی شرارت ہو سکتی ہے۔ کل رات اس نے کھلے الفاظ میں روپ متی کو دھمکی دی تھی کہ وہ اس غلام کو (مجھے) چھین لے گا اور آج دن میں بھی محل کے عقبی لان میں کوئی بات ہوئی تھی۔ میں ان کی باتیں نہیں سن سکا تھا لیکن چہروں کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو خوشگوار نہیں تھی اور اب گاڑی میں سے ایک تار کا غائب ہو جانا۔ دھیان بلونت ہی کی طرف جاتا تھا۔ وہ شاید ہم لوگوں کو یہاں روکنا چاہتا تھا۔

روپ متی کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ اودھے سنگھ بھی تھا جس کی توند غبارے کی طرح پھول پچک رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک خدمت گار بھی چلے آ رہے تھے۔

اودھے سنگھ نے گاڑی کے انجن کا معائنہ کیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بھی تشویش کی لہریں آئیں۔

"پریشان نہ ہوں روپ متی جی۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے کسی نے شرارت سے تار نکال کر ادھر ادھر پھینک دیا ہو گا۔ مل جائے گا۔"

"ہمیں دیر ہو رہی ہے اودھے سنگھ۔" روپ متی کے لہجے میں ناگواری تھی "اگر تار نہ ملا تو کیا ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

"نہیں روپ متی جی۔" اودھے سنگھ بولا "میں نے کہا نا آپ پریشان نہ ہوں۔ اودھے سنگھ اپنے مہمانوں کا خیال رکھتا ہے۔ اس کے لیے کبھی کوئی بات مسئلہ نہیں بنی۔"

اور واقعی اودھے سنگھ کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود تھا۔ پہلے تو وہ تار تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اس کا خیال تھا کہ کسی نے شرارتاً تار نکال کر ادھر ادھر پھینک دیا ہو گا لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ یہ کسی کی شرارت نہیں سازش تھی۔ تار کو نہ ملنا تھا نہ ملا لیکن اودھے سنگھ نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔

پارکنگ ایریا میں اور بھی کئی لینڈ کروزر گاڑیاں کھڑی تھیں۔ صحرائی اور ناہموار علاقوں میں طویل سفر کے لیے ایسی گاڑیاں ہی مناسب رہتی ہیں۔ ان میں سفید رنگ کی ایک لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی جو اسی میک اور ماڈل کی تھی۔ اودھے سنگھ نے بڑے اطمینان سے اس کا تار نکال کر روپ متی کی گاڑی میں لگا دیا۔

"آپ کا کام ہو گیا دیوی جی۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "آپ کی گاڑی کا تار کہیں مل جائے گا تو وہ اس گاڑی کو لگا دیا جائے گا۔"

روپ متی نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اگنیشن کی گھما دی۔ اس مرتبہ پہلی کوشش میں انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

لینڈ کروزر اس قدیم محل نما عمارت کے بیرونی گیٹ سے نکل کر جنگل کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے وجے ٹھاکر کا قافلہ آیا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد روپ متی نے گاڑی ایک طرف ایک اور راستے پر موڑ دی۔ یہ راستہ کشادہ تھا اور درختوں میں بل کھاتا ہوا چلا گیا تھا۔

راستہ ناہموار ہونے کی وجہ سے گاڑی کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ میرے سامنے ڈیش بورڈ کے اوپر دائیں سے تقریباً ایک انچ موٹی آہنی راڈ لگی ہوئی تھی۔ میں نے سہارے کے لیے ایک ہاتھ اس راڈ پر جما رکھا تھا۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ مزید طے ہو جانے کے بعد پیچھے بیٹھے ہوئے ایک محافظ نے گاڑی رکوالی۔ وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور میری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ میں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اب بھی ڈیش بورڈ کی اوپر والی راڈ پر ٹکا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ محافظ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے نہایت غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پتلون کی بیک پاکٹ سے ہتھکڑیوں کا جوڑا نکال کر ایک ہتھکڑی میری ایک کلائی میں ڈال دی اور دوسری اس آہنی راڈ میں۔

میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑا۔ اس صورتِ حال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ روپ متی بھی اچھل پڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ محافظ کو گھورتے ہوئے درشت لہجے میں بولی "تم نے اسے ہتھکڑی کیوں لگائی؟"

"معافی چاہتا ہوں دیوی جی۔" محافظ نے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "ہمیں حکم ملا تھا کہ آپ کو اور آپ کے اس غلام کو بحفاظت جے پور پہنچانا ہے۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ راستے میں کچھ نامعلوم لوگ آپ کے اس غلام کو چھیننے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن اسے ہتھکڑی لگانے کا کیا مطلب؟" روپ متی نے اسے گھورا۔

"خطرہ صرف موہن لال کے ڈھابے تک ہے۔" محافظ نے جواب دیا "راستے میں اگر کوئی پارٹی حملہ کرتی ہے تو وہ لوگ اسے لے جانے کی کوشش کریں گے لیکن اب وہ ایسی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اگر اس غلام کے دل میں بھی فرار ہونے کا کوئی خیال ہو تو اس کا سدِباب بھی ہو گیا ہے۔ اب نہ تو کوئی حملہ آور پارٹی اسے ہم سے چھین کر لے جا سکتی ہے اور نہ ہی یہ راستے میں فرار کی کوشش کر سکتا ہے۔"

"یہ فرار کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کی ہتھکڑی کھول دو۔" روپ متی کے لہجے کی ناگواری اب بھی برقرار تھی۔

"معافی چاہتا ہوں دیوی جی۔" محافظ نے جواب دیا "اس غلام کو آپ کے ساتھ بحفاظت منزل تک پہنچانا ہماری ذمے داری ہے۔ اگر ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے تو اودھے سنگھ کھڑے کھڑے ہماری کھال اتار دے گا۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ خطرہ صرف

موہن لال کے ڈھابے تک ہے۔ راستے کا جنگل خطرناک ہے۔ غلام اس جنگل میں فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ ایسا نہیں کر سکے گا۔ موہن لال کے ڈھابے پر پہنچ کر اس کی ہتھکڑی کھول دی جائے گی۔"

روپ متی نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اپنا آزاد ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"کوئی بات نہیں مالکن۔" میں نے کہا "گارڈ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ انہیں اپنی ذمے داری پوری کرنے دیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔"

روپ متی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ چہرے کے تاثرات بگڑے ہوئے تھے۔

ہم لوگ اپنے پروگرام سے تقریباً ایک گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوئے تھے۔ سورج ابھی اگرچہ خاصا اوپر تھا لیکن جنگل بہت گھنا ہونے کی وجہ سے فضا میں کچھ اندھیرے کا احساس ہو رہا تھا۔

دونوں محافظوں نے ہولسٹروں سے پستول نکال لیے تھے اور بڑی چوکنا نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔ روپ متی بھی خاصی محتاط نظر آ رہی تھی۔

"اگر ہم وقت پر روانہ ہو جاتے تو اس جنگل سے نکل کر سورج غروب ہونے کے تھوڑی دیر بعد موہن لال کے ڈھابے پر پہنچ جاتے مگر اب جنگل ہی میں اندھیرا ہو جائے گا۔" ایک محافظ نے کہا۔

"یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے' غلاموں کی یہ منڈی کس جگہ پر ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ روپ متی کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھی اور میں باتوں میں اس کا دھیان بٹانا چاہتا تھا۔ ویسے میرے ذہن میں بھی کچھ خدشات سر ابھارنے لگے تھے۔

"یہ محل تین سو سال پرانا ہے۔ اس کی تاریخ کسی کو معلوم نہیں۔" روپ متی نے جواب دیا "سنا ہے' پہلے یہاں آبادی ہوا کرتی تھی لیکن حوادث زمانہ نے اس آبادی کا نام و نشان تک مٹا دیا اور یہاں جنگل پھیلتا چلا گیا۔ یہاں سے قریب ترین آبادی۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس طرف تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر پوکھران ہے اور اس سے چند کلومیٹر آگے رام دیو دھا نامی قصبہ ہے۔ وہاں سے تقریباً سو کلومیٹر آگے پاکستان کی سرحد ہے جہاں سے تھر کا بے آب و گیاہ صحرا شروع ہوتا ہے اور اس طرف۔" اس نے دوسری طرف اشارہ کیا

"تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر جودھ پور ہے۔ اس سے کلومیٹر پہلے ایک چھوٹا سا نخلستان ہے جہاں موہن ڈھابا ہے۔ اس نخلستان کی آبادی صرف دو تین مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ جودھ پور تک کوئی آبا ہے۔ ہر طرف دور دور تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔"

"سو کلومیٹر زیادہ فاصلہ تو نہیں۔" میں نے کہا کی حکومت کو یہ معلوم نہیں کہ یہاں انسانوں کی تج گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔"

"سرکار کو سب کچھ معلوم ہے۔" روپ متی

"لیکن سرکار سے زیادہ طاقت اودھے سنگھ جیسے لو پاس ہے جو یہ کاروبار کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ قانون سے زیادہ لمبے ہیں۔ راج مہاراج اور بڑے سیاسی لیڈران کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ اس لیے بے خوف ہو کر اس قسم کے غیر قانونی اور گھناؤنے کرتے ہیں۔ کئی سال پہلے۔۔۔" وہ ایک بار پھر خاموش اس کی نظریں سرچ لائٹس کی طرح ادھر ادھر تھیں۔ باتوں سے اس کا خوف بھی کسی قدر کم ہو گیا ہے کئی سال پہلے جب غلاموں کی اس منڈی کا بھ تھا تو ایک پولیس پارٹی کو تحقیقات کے لیے اس طرف تھا۔ پولیس کی وہ پارٹی ایک اے سی پی' دو انسپکٹروں سب انسپکٹروں پر مشتمل تھی۔ اگلے روز ان سب کی لاشیں اس جنگل کے شروع میں پڑی ہوئی ملی تھیں۔ یہ خبر دی گئی کہ جنگل میں داخل ہوتے ہی انہیں جنگلی درندوں نے ادھیڑ ڈالا تھا حالانکہ اس جنگل صورت پرندوں' خرگوشوں اور ان جیسے بے ضرر جانوروں کے سوا کسی اور خطرناک جانور کا وجود اس واقعے کے بعد قانون کے محافظوں کی کوئی اور طرف نہیں آئی۔ اس طرح اودھے سنگھ اور دوسرے لوگوں کا یہ کاروبار بلا کسی خوف خطر ہے۔ ویسے اس جنگل کی طرف آنے کا کوئی باقاعدہ نہیں ہے۔ محض یادداشت پر بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ والے تو ریگستان میں بھٹک کر موت کا شکار بن جاتے

میں خاموش بیٹھا روپ متی کی باتیں سنتا رہا ٹھیک ہی کہا تھا۔ اودھے سنگھ جیسے لوگوں کے ہاتھ زیادہ لمبے ہوتے ہیں۔ وہ تو قانون کو اپنے سامنے مجبور کر دیتے ہیں مگر قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس جنگل میں سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹا سورج غروب ہو رہا تھا۔ جنگل میں اندھیرا پھیل گیا

متی نے گاڑی کے ہیڈ لیمپس روشن کر لیے تھے۔ مجھے تھائی لینڈ میں بھی اور برما اور چین کے بعض علاقوں میں بھی جنگلوں میں سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ جنگل میں ہوا کی آمدورفت کم ہونے سے گرمی اور گھٹن کا احساس زیادہ ہوتا ہے لیکن یہاں کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم شان دار گاڑی میں سفر کر رہے تھے جس کے شیشے بند تھے اور اندر ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا۔

روپ متی کے کہنے کے مطابق اس جنگل میں کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹے اور سفر کرنا تھا۔ اس کے بعد کھلے صحرا میں پہنچ کر گاڑی کی رفتار بڑھائی جا سکتی تھی۔

آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ اب ہمارے چاروں طرف گہری اور ہولناک تاریکی تھی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سامنے درختوں میں روشنی کی ایک سرنگ سی بنتی جا رہی تھی۔

اور پھر اچانک ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ یوں لگا تھا جیسے اچانک ہی ہمارے سامنے سورج طلوع ہو گیا ہو۔ میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑا۔ روپ متی بھی بد حواس ہو گئی۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور لینڈ کروزر اپنے راستے سے ہٹ کر جھاڑیوں میں گھس گئی۔ روپ متی نے غالباً غیر ارادی طور پر بریک پیڈل دبا دیا تھا۔ لینڈ کروزر رک گئی اور ایک جھٹکے سے اس کا انجن بند ہو گیا۔

لینڈ کروزر کے مڑ جانے سے سامنے تیز روشنی کا زاویہ بھی بدل گیا تھا۔ میں نے اپنی سیٹ پر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس طرف دیکھا۔ وہ اسٹیشن ویگن یا اسی قسم کی کوئی گاڑی تھی جس کی اندر کی بتی بھی جل رہی تھی اور کنور بلونت سنگھ سیٹ پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ویگن کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آگے دو آدمی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

روپ متی کے پیچھے بیٹھے ہوئے محافظ نے دروازہ کھول کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میرا خیال تھا' وہ ویگن کے سامنے کھڑے ہوئے آدمیوں پر حملہ کرے گا یا گولی چلائے گا۔ ایک محافظ سے اسی قسم کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن اس نے نہ تو کسی پر حملہ کیا اور نہ ہی گولی چلائی بلکہ خوف زدہ انداز میں چیختے ہوئے تاریک اور گھنے درختوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی لمحے سامنے کھڑے ہوئے ایک آدمی کے پستول نے شعلہ اگلا۔ جنگل گولی اور بھاگنے کی کوشش کرنے والے محافظ کی چیخ سے گونج اٹھا۔ بڑا ہی بزدل تھا وہ۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی روپ متی بھی چیخ اٹھی۔ ویگن کے سامنے کھڑا ہوا دوسرا آدمی دوڑتا ہوا لینڈ کروزر کی

ڈرائیونگ سائیڈ پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور روپ متی کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ روپ متی خوف سے چیخ اٹھی۔

دوسرا آدمی' جس نے محافظ کو گولی ماری تھی' دوڑتا ہوا میری سائیڈ پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں ہمارا دوسرا محافظ بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں بھی تھا مگر اس کا رخ زمین کی طرف تھا۔ میرا خیال تھا کہ پہلا محافظ بزدل تھا۔ بھاگنے کی کوشش میں مارا گیا تھا۔ یہ دوسرا محافظ حملہ آور کا مقابلہ کرے گا کیونکہ راستے میں اس نے جو باتیں کی تھیں اس سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ کچھ ذمے دار آدمی ہے اور اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دے گا۔ وہ جب مجھے ہتھکڑی لگا رہا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں کچھ خدشات بھی ابھرے تھے اور اس وقت میرے وہ خدشات درست ثابت ہو رہے تھے۔ وہ دوسرا محافظ قریب آنے والے بلونت سنگھ کے آدمی سے کہہ رہا تھا۔

"کنور جی کو بولو' اپنی امانت سنبھال لیں۔ ہم بہت بڑا رسک لیا ہوں۔ بڑی مشکل سے اسے ہتھکڑی لگا کر رکھا ہوں۔"

"گڈ۔" وہ شخص بولا "تم تو واقعی کام کے آدمی ثابت ہوئے۔ ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟"

محافظ نے جیب سے چابی نکال کر اس کے حوالے کر دی اور میری طرف کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

"یہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ ذرا ہوشیار رہنا اور ہمارا انعام۔" محافظ بولا۔

"اس سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ یہ تو غلام ہے۔ اسے خریدا تو روپ متی نے تھا مگر سیوا ہمارے کنور جی کی کرے گا اور تمہارا انعام۔" وہ بولا "کنور جی ویگن میں بیٹھے ہیں۔ اپنا انعام لے لو۔"

محافظ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ویگن کی اس کھڑکی کے سامنے رک گیا جس کے اندر کنور بلونت سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ کہا بھی تھا جس کے جواب میں بلونت سنگھ کا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکلا اور اس ہاتھ میں پستول دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ دوسرے ہی لمحے فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ محافظ کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی تھی۔ گولی نے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

دوسری طرف روپ متی کی چیخیں بھی گونج رہی تھیں۔

وہ اپنے آپ کو اس آدمی سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دونوں ویگن کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھے۔ اس شخص نے ایک ہاتھ سے روپ متی کے بال پکڑ رکھے تھے اور دوسرے ہاتھ سے بھی اسے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دھینگا مشتی میں روپ متی کا بلاؤز بھی پھٹ گیا تھا اور اس کے سینے کا ایک حصہ برہنہ ہو رہا تھا لیکن اسے شاید برہنگی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔

دوسرا آدمی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی چابی۔ ہتھکڑی لگائے جانے کے بعد سے اب تک میں نے ہتھکڑی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا لیکن میرے خیال میں اب اس کا وقت آگیا تھا کہ میں اپنے آپ کو اس قید سے آزاد کرالوں۔

میں نے اپنی نظریں ہتھکڑی کے اس حصے پر مرکوز کردیں جو آہنی راڈ میں لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کلک کی ہلکی سی آواز ابھری اور ہتھکڑی کھل گئی۔

وہ شخص میری ہتھکڑی کھولنے کے لیے ہی چابی والا ہاتھ آگے بڑھا رہا تھا۔ ہتھکڑی کھلتے دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس سے پہلے کہ وہ حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھل سکتا، میں نے سیٹ پر تیزی سے گھوم کر اس کے سینے پر زوردار لات رسید کردی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑایا اور پشت کے بل جھاڑیوں میں جاگرا۔ میں نے پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف جھاڑیوں میں گرتے ہوئے دیکھا تھا۔

میں نے بڑی پھرتی سے ہتھکڑی کو راڈ سے نکالا اور نیچے چھلانگ لگادی۔ وہ شخص اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے موقع دیے بغیر اس کے سینے پر ایک اور کک جمادی۔ وہ چیختا ہوا ایک بار پھر ڈھیر ہوگیا لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دوسرا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا اور میں بھی لڑکھڑا کر گرا تھا۔

وہ شخص مجھ سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر میری کھوپڑی پر ٹھوکر ماردی۔ میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں نے سر کو زوردار جھٹکا دیا اور کہنیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس شخص کی دوسری ٹھوکر میری پسلیوں پر لگی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

ہم لینڈ کروزر کے پہلو میں تھے۔ ہیڈ لیمپس اگرچہ روشن تھے مگر ان کی روشنی سامنے جھاڑیوں اور درختوں پر پڑ رہی تھی۔ ویگن کی روشنی کا رخ بھی ہماری طرف نہیں تھا۔ اس طرف جس جگہ ہم ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے وہاں کم روشنی تھی بلکہ روشنی کا شائبہ سا تھا۔

وہ شخص مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا اور کسی چٹان کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا اور پھر اچانک ہی اس نے حملہ کردیا۔ وہ غالباً میری گردن پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا مگر میں تیزی سے جھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ شخص جھونک میں آگے نکل گیا لیکن پھر فوراً ہی پلٹ پڑا لیکن اس کے ساتھ ہی میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ میری فلائنگ کک اس کے سینے کے اوپر والے حصے پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

میں نے سنبھل کر دوبارہ اس پر چھلانگ لگادی۔ اس وقت وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں نے اسے دبوچ لیا۔ سیدھا بازو اس کی گردن پر لپیٹ کر گرفت مضبوط کرنے کے لیے اس ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسالیں۔

یہ میرا پسندیدہ داؤ تھا۔ حریف کا زندہ بچ نکلنا کسی صورت ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ شخص دونوں ہاتھ میرے بازو پر جما کر اپنی گردن سے میری گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دونوں پیر بھی مضبوطی سے زمین پر جمالیے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کرسکے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جس مصیبت میں وہ پھنس چکا ہے اس سے اب موت ہی اسے نجات دلا سکتی ہے۔

میں نے بازو کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کی گردن گینڈے کی طرح مضبوط تھی۔ اس جھٹکے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی اور پھر میں مسلسل جھٹکے دیتا رہا۔ وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ ٹانگیں چلا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ جھاڑیوں میں گھومتا جا رہا تھا۔ چوتھے جھٹکے پر کڑک کی آواز ابھری۔

گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور اسے چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ وہ جھاڑیوں میں اس طرح تڑپنے لگا جیسے بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا جائے۔

روپ متی کی چیخوں کی آواز اب بھی میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ میں لینڈ کروزر کی آڑ سے نکل کر اس طرف دوڑا۔

کنور بلونت سنگھ اور اس کا آدمی روپ متی کو

گھسیٹتے ہوئے ویگن میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے اور روپ متی اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بری طرح مچل رہی تھی۔

میں چیختا ہوا اس طرف دوڑا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ بلونت سنگھ کا ساتھی روپ متی کو چھوڑ کر میری طرف لپکا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرے اور گتھم گتھا ہوگئے۔ وہ شخص میرے نیچے دب گیا تھا لیکن اس نے مجھے اپنے پیروں پر اٹھا کر پیچھے اچھال دیا۔ اسی وقت میں نے روپ متی کی خوفناک چیخ بھی سنی تھی جو بتدریج طویل کراہ میں تبدیل ہوتی ہوئی خاموشی میں ڈوب گئی۔

میں الٹی قلابازی کھاتا ہوا گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اسی لمحے مجھے بلونت سنگھ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔"

اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی بات پر عمل بھی کر ڈالا۔ اس نے ٹریگر دبایا اور ٹھیک اسی وقت اس کے ساتھی نے میرے اوپر چھلانگ لگادی۔ اس طرح وہ میرے سامنے ڈھال بن گیا اور گولی اس کی گردن میں پیوست ہوگئی۔ میں نے اسے ہاتھوں پر روک لیا اور جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہوگیا۔

کنور بلونت سنگھ کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔ اس نے ایک اور فائر کیا مگر بدحواسی میں چلائی گئی گولی میرے سر کے کئی فٹ اوپر سے گزر گئی۔ بلونت سنگھ خوف زدہ ہوگیا اور یہ اس بے پناہ خوف کا نتیجہ ہی تھا کہ اس نے راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے ایک طرف دوڑ لگادی۔ میں بھی چیتے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور اپنا ایک پیر اس کی ٹانگوں میں پھنسا دیا۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگرا مگر اس وقت اسے پستول کی نہیں، اپنی جان کی فکر تھی۔ اس نے اٹھ کر ایک بار پھر تاریک درختوں کی طرف دوڑ لگادی۔ میں اٹھ کر کچھ دور تک اس کے پیچھے بھاگا لیکن پھر رک گیا۔ رات کے وقت اس تاریک جنگل میں اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں پلٹ کر روپ متی کی طرف لپکا جو ویگن کے قریب بے ہوش پڑی تھی۔

روپ متی کا لباس اس دھینگا مشتی میں تار تار ہوچکا تھا۔ میں نے اسے "مالکن مالکن" کہہ کر دو تین آوازیں دیں لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ میں نے مالکن اور غلام کے بیچ آداب کو بالائے طاق رکھ دیا اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ہلانے لگا۔

"روپ متی۔۔۔ روپ متی۔ اٹھو۔ ہوش میں آؤ۔ آنکھیں کھولو۔۔۔" لیکن روپ متی نے آنکھیں نہیں کھولیں، نہ ہی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔

میں پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے چاروں طرف سناٹا تھا۔ جھینگروں اور دیگر حشرات الارض کی آوازیں ماحول کو کچھ اور بھی وحشت ناک بنا رہی تھیں۔ میں ایک بار پھر روپ متی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس مرتبہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے ذہن میں ایک نیا شبہ سر ابھارنے لگا۔ جب میں اس آدمی سے گتھم گتھا تھا تو مجھے روپ متی کی آخری چیخ سنائی دی تھی۔ اس کے سر پر شاید کوئی زوردار ضرب لگائی گئی تھی لیکن اس کا ہوش میں نہ آنا میرے لیے تشویش کا باعث بن رہا تھا۔

میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سینے کے بہت ہلکے سے زیر و بم سے میری تشویش رفع ہوگئی۔ وہ زندہ تھی۔ میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈالا اور اسے گھسیٹ کر ویگن کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں لے آیا۔

میرا خیال درست نکلا۔ اس کی پیشانی پر بائیں طرف گومڑ سا ابھر آیا تھا۔ بلونت سنگھ نے غالباً پستول کے دستے سے ضرب لگائی تھی اور شاید چوٹ کچھ زیادہ ہی زوردار لگی تھی جس سے وہ گہری بے ہوشی میں چلی گئی تھی۔

مجھے اچانک ہی ایک اور خیال آیا اور میں اٹھ کر لینڈ کروزر کی طرف لپکا۔ سیٹوں کے پچھلی طرف جہاں میں نے سوٹ کیس رکھا تھا وہاں دونوں طرف لگے ہوئے ہکس کے ساتھ پانی کے دو مشکیزے لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے ایک مشکیزہ۔۔۔ اٹھایا اور دوڑتا ہوا دوبارہ روپ متی کے قریب پہنچ گیا اور مشکیزے کے منہ پر بندھی ہوئی ڈوری کھول کر روپ متی کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

اس مرتبہ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ دو تین مرتبہ پانی کے چھینٹے دینے کے بعد روپ متی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں اور پھر اچانک ہی اس نے چیختے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے دونوں ہاتھ سر پر رکھ کر دوبارہ گر گئی اور ہولے ہولے کراہنے لگی۔

"مالکن۔۔۔ مالکن۔۔۔ ہوش میں آیئے مالکن۔" میں نے روپ متی پر جھکتے ہوئے ہولے سے پکارا "سب ٹھیک ہوگیا ہے۔ اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

روپ متی نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر کراہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے اس کی گردن کے نیچے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی سر

پر تھا۔

"کیا ہوا۔ مجھے کیا ہوا تھا؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔

اس کے حواس ابھی تک بحال نہیں ہوئے تھے۔ میں نے مشکیزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں گیا اور کچھ پانی ہونٹوں سے بہہ کر گلے کو تر کرتا ہوا سینے پر بہنے لگا۔

پانی کا ایک آدھ گھونٹ پینے سے اس کے حواس بحال ہو گئے۔ وہ چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں گئے؟ بلونت سنگھ کہاں ہے؟"

"بلونت سنگھ بھاگ گیا۔" میں نے جواب دیا "باقی سب ٹھیک ہے مالکن۔ اب آپ جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالیے تاکہ یہاں سے روانہ ہو سکیں۔" میں اسے لاشوں کے بارے میں بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ہمارے محافظ کہاں ہیں اور بلونت سنگھ اور اس کے ساتھی۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اس کی نظریں بائیں طرف جھاڑیوں میں پڑی ہوئی بلونت سنگھ کے ساتھی کی لاش پر گویا جم کر رہ گئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خوف ابھر آیا "یہ۔۔۔ یہ۔۔۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

"صورت حال بڑی خوفناک ہے مالکن۔" میں نے کہا "یہاں چار لاشیں پڑی ہوئی ہیں اور ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔"

"چار لاشیں!" اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں۔

"ہاں مالکن۔" میں نے کہا "دو لاشیں ہمارے محافظوں کی ہیں اور دو کنور بلونت سنگھ کے آدمیوں کی۔" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اسے اس پورے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

وہ خود بھی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی لیکن اس وقت تو وہ خود مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی اور شاید صورتِ حال پر پوری طرح توجہ نہیں دے سکی تھی لیکن اب تفصیل جان کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"تم نے میری خاطر۔۔۔"

"اپنی مالکن کی جان بچانے کے لیے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مالکن نہیں۔۔۔ روپ متی۔۔۔ صرف روپ متی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہتر ہے دیوی جی۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا' صرف روپ متی۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے روپ متی جی۔" میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی "لیکن اب ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔ بلونت سنگھ جنگل میں روپوش ہو گیا ہے۔ [illegible] نہیں لیکن عین ممکن ہے وہ چھپ کر حملہ کر دے اس لیے یہاں بیٹھے رہنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"بلونت سنگھ۔" روپ متی نے دانت کچکچائے "اس کا تو میں وہ حشر کروں گی کہ زندگی بھر یاد کرے گا اور تم۔۔۔" اس نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں "میں نے تمہیں قیمت دے کر خریدا تھا لیکن تم نے مجھے بے قیمت خرید لیا ہے۔ تم میرے غلام نہیں۔ میں تمہاری داسی ہوں۔"

"یہ باتیں کرنے بولنے کا وقت نہیں روپ متی جی۔" میں نے کہا۔

"اچھا۔ مجھے اٹھاؤ۔" روپ متی نے ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور جسم کا بالائی حصہ بالکل برہنہ ہو رہا تھا۔ ویگن کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اس کا بدن کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ میں گردن گھما کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میری نظریں بلونت سنگھ کے ساتھی کی لاش کے قریب پڑے ہوئے پستول پر جم گئیں۔ میں نے غیر ارادی طور پر آگے بڑھ کر پستول اٹھا لیا اور ویگن کے سامنے آ گیا۔

میں نے دو فائر کیے اور ویگن کے اگلے دونوں ٹائروں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ جنگل کی پرسکوت فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔ روپ متی نے مجھے فائر کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"اب بلونت سنگھ نہ تو ہمارا پیچھا کر سکے گا اور نہ آسانی سے منڈی تک واپس پہنچ سکے گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب ہمیں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ پہلے آپ گاڑی میں بیٹھ کر کپڑے بدل لیں۔ اس کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

روپ متی لینڈ کروزر میں گھس گئی اور آخری سیٹ پر بیٹھ کر پیچھے رکھا ہوا سوٹ کیس کھولنے لگی۔ میں نے زمین پر پڑا ہوا پانی کا مشکیزہ اٹھا کر اپنی سیٹ کے آگے فٹ میٹ پر ڈال دیا اور گاڑی کے باہر ہی کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر بلونت سنگھ کی ویگن کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں اندر کی طرف جھک کر ڈیش بورڈ پر لگے ہوئے بٹنوں کو دباتا چلا گیا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ ہیڈ لیمپس بجھ گئے۔ میں دوبارہ لینڈ کروزر کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

میری دائیں کلائی میں اب بھی ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی جس کا دوسرا کڑا نیچے لٹکا ہوا تھا اور میری انگلیاں اس کڑے سے کھیل رہی تھیں۔ دس منٹ بعد میں نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ روپ متی کپڑے بدل چکی تھی۔ جب وہ گاڑی سے اتری تو اتارے ہوئے کپڑے اس کے ہاتھ میں تھے جو دھینگا مشتی کے دوران میں پھٹ چکے تھے۔ اس نے وہ کپڑے جھاڑیوں میں اچھال دیے اور ایک ہاتھ سے پیشانی سہلانے لگی۔

وہ گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آئی تو اس کی پیشانی پر گومڑ خاصا بڑا ہو چکا تھا اور ظاہر ہے اسے تکلیف بھی ہو رہی تھی اسی لیے وہ بار بار پیشانی سہلا رہی تھی۔

"وہ مرہم کہاں ہے جو تم نے۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ نے میرے بازو پر لگایا تھا۔" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرا اٹھی۔ چہرہ کھل سا گیا۔

"تم کہنا اچھا لگا۔" وہ بولی "اب تم مجھے تم ہی کہو گے اور وہ مرہم۔۔۔ مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ سوٹ کیس میں رکھا ہے۔ میں ابھی نکال کر لاتی ہوں۔"

وہ ایک مرتبہ پھر گاڑی میں گھس گئی۔ اس بار سوٹ کیس کھولنے اور مرہم تلاش کرنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ میں نے ڈبیا اس کے ہاتھ سے لے لی اور ڈھکنا کھول کر سیدھے ہاتھ کی انگلی سے مرہم نکالا اور اس کی پیشانی پر لگانے لگا۔

"ارے! یہ کیا۔۔۔!" اس کے لہجے میں حیرت تھی "مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ راڈ سے یہ کڑا کیسے کھلا تھا۔"

"گارڈ کو گولی مارنے کے بعد بلونت سنگھ کے آدمی نے یہ کڑا کھول دیا تھا۔ اس سے آگے میں نے اسے کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے لات مار کر دور گرا دیا اور گاڑی سے اتر کر اسے دبوچ لیا۔ میرا خیال ہے اس کے ہاتھ سے چابی یہیں کہیں گری ہو گی۔" میں نے جواب دیا اور اس کی پیشانی کے گومڑ پر مرہم لگانے لگا۔

عجیب اتفاق تھا۔ آج صبح سویرے وہ میرے بازو پر یہ مرہم لگا رہی تھی اور اب میں اس کی مسیحائی کر رہا تھا۔ روپ متی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔

"گاڑی کو ذرا پیچھے ہٹاؤ۔ ہتھکڑی کی چابی یہیں کہیں گری تھی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں نظر آ جائے گی۔" میں نے اس سے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

روپ متی میری طرف دیکھتی ہوئی لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ریورس گیئر میں پیچھے لیتی چلی گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے گاڑی روک لینے کو کہا اور جھک کر نیچے دیکھنے لگا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ آدمی میری لات کھا کر گرا تھا۔ اس جگہ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور میرے خیال میں ان جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی چابی کا ملنا مشکل ہی تھا لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تیز روشنی میں چمکتی ہوئی وہ چابی نظر آ گئی۔ میں نے چابی اٹھائی اور گاڑی کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھتے ہوئے چابی روپ متی کی طرف بڑھا دی۔

"دل تو چاہتا ہے کہ دوسری کڑی اپنی کلائی میں پہن کر اس چابی کو دور پھینک دوں اور۔۔۔"

"اس طرح نہ تم گاڑی ڈرائیو کر سکو گی اور نہ میں آرام سے بیٹھ سکوں گا اس لیے بہتر ہے کہ اس خیال کو ذہن سے نکال دو اور میری ہتھکڑی کھول دو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس نے مسکراتے ہوئے میری ہتھکڑی کھول دی۔ میں نے ہتھکڑی ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دی اور کلائی سہلانے لگا۔

روپ متی گاڑی کو مزید پیچھے لے گئی اور پھر اس کا رخ بدل کر اصل راستے کی طرف لانے لگی۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تین لاشیں نظر آئی تھیں۔ ایک اس محافظ کی جس نے مجھے ہتھکڑی لگائی تھی اور بالآخر بلونت کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور دو لاشیں بلونت سنگھ کے آدمیوں کی تھیں۔ ایک تو میرے ہاتھوں گردن تڑوا کر ہلاک ہوا تھا اور دوسرا بلونت سنگھ کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ ہمارے دوسرے محافظ کی لاش وہاں سے کچھ دور تھی جو نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ لاشیں دیکھ کر روپ متی کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے ابھر آئے اور اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ کانپ گئے۔

"تم ٹھیک ہو نا۔ گاڑی چلا لو گی؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کنور بلونت سنگھ فرار ہو کر زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ وہ آس پاس ہی کہیں موجود ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ ہم سے بہت قریب تاریکی میں درختوں کے پیچھے چھپا ہمیں دیکھ رہا ہو۔

میں نے اس کی ویگن کے دونوں ٹائر برسٹ کر کے اسے بے بس کردیا تھا۔ ویگن میں یقیناً ایک اسٹپنی موجود ہوگی لیکن وہ صرف ایک ٹائر کی جگہ لگائی جاسکتی تھی۔ وہ تین پہیوں پر گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔ اب ہمارے تعاقب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس تاریک جنگل میں وہ پیدل واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔ شاید اسے یہ رات اپنی ویگن ہی میں بیٹھ کر گزارنی پڑے۔ صبح یا تو وہ پیدل اس قدیم عمارت تک پہنچنے کی کوشش کرے گا یا انسانوں کے بیوپاریوں کی کسی پارٹی کا اس طرف سے گزر ہو تو اسے کچھ سہارا مل جائے۔

روپ متی اب اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی۔ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی تھی اور اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت بھی مضبوط تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ اس نے جو لباس بدلا تھا میں نے پہلے اس پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اب اسے دیکھ کر میں اپنے آپ میں کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کشادہ گلے کی سفید رنگ کی سلیولیس ٹی شرٹ اور گھٹنوں سے ذرا اوپر تک کی ڈینم کی شارٹ پہن رکھی تھی۔

"تمہیں یہ دونوں محافظ اودھے سنگھ نے فراہم کیے تھے۔" میں نے اس کے لباس سے توجہ ہٹانے کے لیے باتوں کا سلسلہ شروع کردیا "کیا یہ اس کی سازش ہو سکتی ہے؟ میرا مطلب ہے کنور بلونت سنگھ نے اسے رشوت دے کر۔۔۔"

"اودھے سنگھ ایسا نہیں کرسکتا۔" روپ متی نے میری بات کاٹ دی "اودھے سنگھ ایک کاروباری آدمی ہے۔ اس کا یہ کاروبار ہم جیسے لوگوں کے سہارے ہی چل رہا ہے۔ وہ اپنے گاہکوں سے مخلص ہے۔ کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کرسکتا۔ کسی ایک کے ساتھ دھوکا کرنے کی صورت میں وہ دوسروں کی حمایت سے بھی محروم ہو جائے گا اور اس طرح نہ صرف اس کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا بلکہ اس کا مستقبل بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ یہ بلونت سنگھ کی سازش تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تم جانتے ہو' وہ تمہیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ دو مرتبہ کوشش کرچکا تھا۔ پہلی مرتبہ تمہارے سامنے بات ہوئی تھی۔ اس نے تمہارے لیے پندرہ لاکھ کی پیشکش کی تھی۔ دوسری مرتبہ آج صبح لان میں اس نے اپنی پیشکش پانچ لاکھ کے اضافے کے ساتھ دہرائی تھی۔ میرے انکار پر اس نے دھمکی دی تھی کہ میں تمہیں اپنے ساتھ جودھ پور نہیں لے جاسکوں گی۔"

"تو پھر اودھے سنگھ کے فراہم کردہ محافظ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "سوفی صد بات ہے۔ وہ دونوں محافظ اس سازش میں شریک تھے۔ بلونت سنگھ نے معلوم کرلیا ہوگا کہ میں نے اودھے سنگھ سے محافظوں کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس نے محافظوں سے رابطہ قائم کیا اور انہیں انعام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملالیا۔ وہ دونوں لالچی تھے۔ ان کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔"

"دونوں نہیں' ایک۔" میں نے کہا "وہ محافظ جس نے مجھے ہتھکڑی لگائی تھی۔ مجھے اسی وقت اس پر شبہ ہوا تھا۔ دوسرا محافظ تو شاید اس سازش سے بے خبر تھا کیونکہ جب ہماری گاڑی روکی گئی تھی تو اس نے خطرہ دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر گولی کا نشانہ بن گیا جبکہ دوسرا اپنے انعام کا انعام لینے کے لیے ویگن کے قریب پہنچا تو بلونت سنگھ نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو مگر۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "لیکن تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ میں زندگی کے آخری سانس تک نہیں بھلا سکوں گی۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا "میں تمہارا زر خرید غلام ہوں اور ایک وفادار غلام کا فرض ہے کہ اپنے آقا کی اطاعت کرے اور وقت پڑنے پر اس کے لیے اپنی جان بھی دے دے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو نا۔" روپ متی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی "کوئی دوسرا ایسا نہیں سوچتا۔ یہاں حریف پارٹیاں ایک دوسرے سے کنیزیں اور غلام چھین لے جاتے ہیں اور کنیزیں اور غلام اس کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں جو طاقت کے بل پر انہیں چھین لیتا ہے۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ انہیں خریدنے والا کون تھا۔ انہیں اپنی عافیت عزیز ہوتی ہے اور وہ طاقت کے غلام ہوتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا گیا۔ میرے گلے میں غلامی کا طوق نہیں ڈالا گیا۔ مجھے زنجیروں سے

نہیں باندھا گیا۔ میرے پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالی گئیں۔ تم نے مجھ پر اعتماد کیا اور میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے اس بُرے وقت میں تمہاری مدد کرنا اپنا فرض سمجھا اور مجھے خوشی ہے کہ میں سرخ رو ہوا اور تمہیں بھی ان درندوں سے بچالیا۔"

"بلونت سنگھ واقعی درندہ ہے۔ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس نے شاید محسوس کرلیا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا اس لیے وہ مجھے ہی ویگن میں ڈال کر وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر تم نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاتا تو۔۔۔" بات کرتے ہوئے اسے جھرجھری سی آگئی "وہ میرا جو حشر کرتا تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ وہ واقعی درندہ ہے۔ اب بھی وہ چین سے تو نہیں بیٹھے گا۔ کچھ روز تو اپنے زخم چاٹتا رہے گا اور پھر میرے خلاف کوئی کارروائی کرے گا۔"

"کیا وہ جودھ پور جاکر تمہارے خلاف پولیس کو اس واقعے کی رپورٹ کرے گا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔" روپ متی بولی "پولیس سے پہلے اودھے سنگھ کو اس واقعے کی خبر ہو جائے گی۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ لاشیں غائب کر کے اس واقعے کے سارے نشانات مٹا دے گا۔ یہ جنگل اودھے سنگھ کی عملداری میں سمجھا جاتا ہے۔ قانون کی دسترس سے بہت دور۔ پولیس اس طرف آنے کی حماقت نہیں کرے گی اور پھر بلونت سنگھ خود اس واردات میں ملوث ہے۔ دو آدمی اس کے اپنے ہاتھوں سے مارے گئے ہیں اس لیے وہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت نہیں کرے گا لیکن شاید مجھ سے بدلہ لینے کے لیے کوئی دوسرا اوچھا حربہ استعمال کرے۔"

"ایک اور بات میرے ذہن میں آرہی ہے۔" میں نے کہا "دھرمیش اور تیج سنگھ میرے ہاتھوں زک اٹھا چکے ہیں۔ تم نے بھی ان کے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار کیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں بھی اس سازش میں بلونت سنگھ کے ساتھ شریک رہے ہوں؟"

"ہو سکتا ہے' تمہارا خیال درست ہو۔" روپ متی نے جواب دیا "ان کے بارے میں' میں پہلے ہی فیصلہ کرچکی ہوں لیکن اگر وہ اس سازش میں کسی بھی طرح شریک پائے گئے تو میں انہیں کتوں سے نچوا دوں گی۔"

میں اس مرتبہ خاموش رہا اور گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سامنے دیکھتا رہا۔ آگے جنگل اب چھدرا ہونا شروع ہو گیا تھا اور بالآخر "جائے حادثہ" سے روانگی کے آدھے گھنٹے بعد ہم اس جنگل سے نکل آئے۔ اب ہمارے سامنے اور چاروں طرف وسیع و عریض ریگستان پھیلا ہوا تھا۔

گھنے جنگل میں سفر کرتے ہوئے گنجان اور فلک بوس درختوں کی وجہ سے ہمارے اطراف میں تاریکی ہی رہی تھی لیکن کھلی جگہ پر آکر انکشاف ہوا کہ آسمان پر سے بادل غائب ہو چکے تھے۔ مطلع صاف تھا اور چودھویں کا چاند چمک رہا تھا۔

"آج پونم کی رات ہے۔" روپ متی نے باہر دیکھتے ہوئے کہا "ہمارے دھرم میں پونم کی رات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ میرا خیال تھا کہ ہم جودھ پور کے ہوٹل اجیت بھون کے رنگا رنگ پروگرام میں شریک ہو سکیں گے۔ ہم وقت پر جودھ پور پہنچ تو جائیں گے مگر میں یہ بگڑی ہوئی صورت لے کر کسی تقریب میں شریک نہیں ہونا چاہتی۔" بات کرتے ہوئے اس کا ایک ہاتھ بے اختیار پیشانی کے گومڑ پر پہنچ گیا تھا۔

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ رنگین محفلوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ریت سخت تھی جس پر گاڑی چلانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ یہاں کوئی باقاعدہ سڑک تو نہیں تھی۔ ایک غیر ہموار سا راستہ تھا جس کی' ہیڈ لیمپس کی روشنی میں واضح طور پر نشان دہی ہو رہی تھی۔ روپ متی لینڈ کروزر کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔

میں خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ پورے چاند کی روشنی میں تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا صحرا عجیب پُراسرار سا منظر پیش کر رہا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ بڑا سحر تھا چاندنی رات کے اس منظر میں۔

روپ متی بھی اب خاموش تھی۔ اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر تھی۔ ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور نظریں سامنے راستے پر مرکوز تھیں۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک لینڈ کروزر تیز رفتاری سے ریگ زار میں دوڑتی رہی اور بالآخر بہت دور چند روشنیاں جھلملاتی ہوئی نظر آنے لگیں۔

"وہ موہن لال کا ڈھابا ہے۔" روپ متی نے ان روشنیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہاں دو چار گھروں کے سوا کوئی آبادی نہیں ہے اور وہ گھر بھی موہن لال

کے بھائی اور نہایت قریبی عزیزوں کے ہیں جو اس ڈھابے پر مل جل کر کام کرتے ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "دراصل پوکھران سے بلوترا جانے والی سڑک اس طرف سے گزرتی ہے اور جودھ پور سے آنے والی سڑک بھی اسی جگہ پر ملتی ہے۔ اس طرح وہاں ایک جنکشن سا بن گیا ہے۔ جودھ پور وہاں سے قریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بیچ میں کوئی آبادی بھی نہیں۔ اگر جودھ پور زیادہ دور نہ ہوتا تو ممکن ہے اس جنکشن پر بھی کوئی بڑی بستی آباد ہوچکی ہوتی۔ اس صورتِ حال سے فائدہ موہن لال نے اٹھایا اور کئی سال پہلے وہاں ڈھابا کھول لیا۔ دن میں کئی بسیں اس طرف سے گزرتی ہیں۔ رات کو ٹرکوں کی آمدو رفت بھی رہتی ہے جن کی وجہ سے اس ڈھابے پر رونق رہتی ہے اور اس طرح موہن لال کو بھی معقول آمدنی ہوجاتی ہے۔"

"میلوں دور تک آبادی نہیں تو وہاں پانی وغیرہ کی تو بڑی پریشانی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"وہاں دراصل ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔" روپ متی بولی "جھیل کیا' ایک قدرتی چشمہ ہے جس کا پانی ایک بڑے تالاب میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ پانی کی وجہ سے وہاں کھجور اور ناریل کے کچھ درخت بھی ہیں۔ موہن لال نے بڑی محنت سے نیم کے چند درخت بھی لگا رکھے ہیں۔ وہ ایک چھوٹا سا خوب صورت نخلستان ہے۔"

میں سامنے دیکھ رہا تھا۔ روشنیاں قریب آتی جارہی تھیں اور پھر ہم اس نخلستان میں پہنچ گئے۔ واقعی صرف چند مکان تھے۔ ایک دکان تھی جہاں ضرورت کی ہر چیز دستیاب تھی۔ ریسٹورنٹ تھا۔ اسے چارپائی ہوٹل کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور دور تک چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ذرا آگے دو مال بردار ٹرک کھڑے تھے جن کے ڈرائیور اور کلینرز دو چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دور دور تک زمین میں گڑے ہوئے بانسوں کے ساتھ رنگ برنگی ٹیوب لائٹیں لگی ہوئی تھیں۔ بجلی کے لیے موہن لال نے اپنا جنریٹر لگا رکھا تھا۔

روپ متی گاڑی کا انجن بند کرکے نیچے اتر گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور ہم دونوں ہی قریب پڑی ہوئی چارپائیوں کی طرف بڑھ گئے۔

روپ متی تو ایک چارپائی پر لیٹ گئی اور میں اس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جنگل میں پیش آنے والے واقعے نے روپ متی کو اَپ سیٹ کردیا تھا اور وہ نڈھال سی لگ رہی تھی۔

دو منٹ بعد ہی مٹکے جیسی توند والا ایک ادھیڑ عمر ہمارے قریب آگیا۔ اس نے دھوتی پہن رکھی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر بغیر آستین کی صدری جیسی کوئی چیز پہن رکھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کا بالوں بھرا سینہ نظر آرہا تھا۔ گنجے سے سر پر بالشت بھر لمبی چٹیا تھی۔ ماتھے پر اس کے کٹر ہندو ہونے کی نشان دہی کررہا تھا۔ وہ اس ڈھابے کا مالک موہن لال تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور للچائی ہوئی نظروں سے روپ متی کی برہنہ ٹانگوں کو دیکھنے لگا۔

"موہن لال جی۔ ہمیں چائے پلا دو مگر ذرا جلدی۔" روپ متی نے اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر کہا "مگر میرا مطلب یہ نہیں کہ تم جوشاندہ بنا کر لے آؤ۔ چائے بہترین ہونی چاہیے۔"

"جی دیوی جی۔" موہن لال نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے اور مینڈک کی طرح پھدکتا ہوا چلا گیا۔

طویل ڈرائیونگ نے بھی روپ متی کو تھکا دیا تھا۔ بان کی کھردری چارپائی پر چاروں خانے چت لیٹی ہوئی گہرے سانس لے رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کررہا تھا۔ سلیولیس اور کشادہ گلے والی ٹی شرٹ میں اس کے سینے کا زیروبم بڑا توبہ شکن منظر پیش کررہا تھا۔

دوسری چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور کلینر دلچسپ نظروں سے اس طرف دیکھ رہے تھے اور پھر ایک تڑنگا آدمی اٹھ کر ٹہلتا ہوا اس طرف آگیا۔ لمبا قد' ڈیل ڈول' سیاہی مائل رنگت اور بڑی بڑی مونچھوں نے اس کے چہرے کو بڑا خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ وہ ہوس بھری نظروں سے روپ متی کو دیکھتا ہوا آگے نکل گیا۔ مجھے اس کی نیت میں کچھ فتور نظر آیا تھا لیکن میں کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

وہ شخص چند گز آگے جاکر مڑا اور ایک بار پھر ہوس بھری نظروں سے روپ متی کو دیکھتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس جاکر بیٹھ گیا اور سرگوشیوں میں ان سے باتیں کرنے لگا۔

ڈھابے میں اگرچہ دو تین ملازم بھی موجود تھے لیکن موہن لال روپ متی سے خود آرڈر لینے آیا تھا اور چائے بھی خود ہی لے کر آیا۔ روپ متی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

چائے واقعی خوش ذائقہ تھی۔ ہم چائے پینے کے بعد فوراً ہی اٹھ گئے۔ روپ متی نے موہن لال کو بلا کر سو سو کے دو نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ موہن

لال کی باچھیں کھل اٹھیں۔

وہ لمبا تڑنگا آدمی ایک بار پھر اٹھ کر ہمارے پاس منڈلانے لگا تھا۔ ہم اس پر توجہ دیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ روپ متی نے انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ شخص جان بوجھ کر راستے میں آگیا۔ اس دوران میں دو آدمی اور چارپائی سے اٹھ چکے تھے۔ روپ متی کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ اس نے صورتِ حال کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا پھر اسٹیئرنگ پر ہاتھ جماتے ہوئے ہارن بجایا اور اس کے ساتھ ہی ایکسیلیریٹر پر ایک دم دباؤ ڈال دیا۔ لینڈ کروزر مینڈک کی طرح اچھل کر آگے بڑھی۔ وہ شخص بڑی تیزی سے اچھل کر ایک طرف گرا۔ روپ متی گاڑی کو اسی رفتار سے آگے لیتی چلی گئی۔

"سالا۔ حرامی۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولی "عورتوں کو دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ مفت کا مال سمجھتے ہیں۔"

قہقہوں کی آواز سن کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ آدمی اٹھ کر کپڑے جھاڑ رہا تھا اور اس کے ساتھی قہقہے لگا رہے تھے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ کچھ آگے جاکر لینڈ کروزر جودھ پور کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی اور روپ متی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم جودھ پور پہنچ گئے۔ ریگستان میں دور تک پھیلا ہوا یہ شہر اس وقت رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کے گیارہ بجنے والے تھے مگر شہر کے کئی علاقوں میں دن کا سا سماں تھا اور بڑی رونق تھی۔

لینڈ کروزر شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی سرکٹ ہاؤس کے گیٹ میں داخل ہو کر پارکنگ لاٹ پر رک گئی۔ ایک باوردی ملازم فوراً ہی ہمارے قریب پہنچ گیا۔

سرکٹ ہاؤس میں کمرا حاصل کرنے میں روپ متی کو کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی لیکن مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے میرے لیے سرونٹ روم کا انتظام کرایا تھا۔

عمارت کے پچھلی طرف چھوٹے چھوٹے کمروں کی ایک قطار تھی۔ سرکٹ ہاؤس میں قیام کرنے والے دولت مندوں کے ملازمین کو انہی کمروں میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ مجھے بھی انہی میں سے ایک کمرا دے دیا گیا اور کھانا بھی وہیں بھجوایا گیا۔

مجھے روپ متی کے اس رویے پر بڑا دکھ ہوا لیکن پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس میں افسردہ ہونے کی کیا بات تھی۔ میں اس کا زر خرید غلام ہی تو تھا۔ وہ میرے ساتھ کوئی بھی سلوک کرسکتی تھی۔ جنگل میں اس حادثے کے بعد اور سفر کے دوران میں اس نے مجھ سے جو بھی باتیں کی تھیں وہ محض میرا دل رکھنے کے لیے کی تھیں لیکن بہرحال' یہ اس کی مہربانی تھی کہ اس نے اب بھی مجھ پر اعتماد کیا تھا اور مجھے رسیوں سے باندھ کر ڈالنے کے بجائے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

میں رات کو دیر تک روپ متی کے اس طرزِ عمل کے بارے میں سوچتا رہا پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

صبح چھ بجے مجھے سرکٹ ہاؤس کے ایک ملازم نے جگا دیا۔

"آدھے گھنٹے میں تیار ہو کر ناشتا کرلو۔ تمہاری مالکہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے پارکنگ میں پہنچ جائے گی۔"

میں نے کیا تیاری کرنی تھی۔ کمروں کی اس قطار کے آخر میں غسل خانہ تھا۔ میں نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھو کر کسل مندی دور کی اور جب کمرے میں واپس پہنچا تو چھوٹی سی سالخوردہ میز پر ٹرے میں ناشتا رکھا ہوا تھا۔

ناشتا کرکے میں پارکنگ میں آگیا۔ روپ متی گاڑی کے قریب کھڑی تھی۔ مجھے اس کے رویے نے بہت بد دل کردیا تھا۔ کئی مرتبہ بھاگ جانے کا خیال آیا تھا لیکن کہاں جاتا۔ یہی سوچ کر ہر مرتبہ بھاگنے کا ارادہ بدل دیا۔

مجھے دیکھتے ہی روپ متی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کردیا۔ میں خاموشی سے پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی سرکٹ ہاؤس سے نکل کر شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ ایک پیٹرول پمپ سے فیول ٹینک فل کروالیا گیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد گاڑی شہر کی حدود سے نکل کر جے پور کی طرف جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

"تمہیں شاید میرے رات والے رویے پر دکھ پہنچا ہے۔" روپ متی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "مجھے اس کا افسوس ہے مگر اس کی ایک خاص وجہ ہے جو بعد میں بتاؤں گی۔"

"میں آپ کا غلام ہوں مالکن۔ مجھے آپ کے رویے پر کوئی دکھ نہیں۔"

"وٹ نان سنس۔" روپ متی نے مجھے ڈانٹ دیا "اگر تم ایسی باتیں کروگے تو میں تمہیں اتار دوں گی۔"

"مجھے تو آزادی مل جائے گی البتہ نقصان آپ ہی کا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی مگر تم اس طرح خاموش رہو گے

تو مجھے دکھ ہوگا۔"

اس کی باتوں سے مجھے ایک بار پھر حوصلہ ملا اور میری کیفیت بحال ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد میں اس کے گزشتہ رات والے رویے کو بھول چکا تھا۔

"تم پہلی مرتبہ ہندوستان آئے ہو۔ یہ بڑا پُراسرار ملک ہے اور یہ خطہ راجستھان' ہندوستان سے بھی زیادہ پُراسرار ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں یہ خطہ صدیوں سے نہایت اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔" وہ مجھے اس خطے کے بارے میں بتانے لگی "یہ شہر جودھ پور جہاں سے ابھی ہم نکل کر آئے ہیں' اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ صدیوں پہلے قنوج کے راٹھور ہجرت کرکے دنیا کے اس گرم ترین خطے میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے یہ علاقہ مارواڑ کہلانے لگا۔ وہ لوگ ایک قبیلے کی صورت میں مندور اور اس کے آس پاس آباد تھے۔ دو سو سال بعد ۱۴۵۹ء میں راؤ جودھا نے اس شہر کی بنیاد رکھی کیونکہ مندور اب رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ پانچ سو سال بعد راجا امید سنگھ نے اس علاقے کے لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے ۳۴۷ کمروں پر مشتمل ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔ یہ محل آج کل ہوٹل ہے۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "جودھ پور قلعہ چار سو فٹ بلند پہاڑی پر واقع ہے جسے اس زمانے میں بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کے اندر پہنچنے کے لیے سات گیٹوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں آج کل ایک میوزیم بھی ہے جہاں قدیم سامان حرب اور نوادرات رکھے ہوئے ہیں۔ یہ بڑا خوب صورت شہر ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں تمہیں پورے شہر کی سیر کراتی لیکن پھر کبھی سہی۔"

روپ متی مجھے جودھ پور کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی باتیں سن کر میرا دل چاہنے لگا کہ میں ان تاریخی عمارتوں کو دیکھوں مگر وہ شہر اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری سے دوڑتی رہی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف تاحدِ نگاہ ریگستان پھیلا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

تقریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے ہم اجمیر جیسے خوب صورت شہر میں پہنچ گئے۔ روپ متی نے گاڑی ایک شان دار ائر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ کے سامنے روکی تھی۔ ریسٹورنٹ کی پُرسکون اور خنک فضا میں کھانا کھاتے ہوئے وہ مجھے اجمیر کی تاریخی اہمیت کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی باتیں سن کر لگتا تھا جیسے اسے راجستھان کے تمام شہروں کی تاریخ ازبر ہو۔

کھانا کھانے اور ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد ہم جے پور کی طرف روانہ ہوگئے جو اجمیر سے ایک سو پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ روپ متی راستے میں آنے والے ہر قصبے، گاؤں' بستی اور ان چھوٹی بڑی جھیلوں کے بارے میں بتاتی رہی جن کی بدولت زندگی اس ریگستان میں سانس لے رہی تھی۔ شام چھ بجے کے قریب ہماری گاڑی جے پور شہر کی حدود میں داخل ہوگئی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس شہر کی ہر چھوٹی بڑی عمارت کا رنگ گلابی تھا۔

"جے پور کو گلابی شہر بھی کہتے ہیں۔" روپ متی میرے پوچھنے پر بتا رہی تھی "جے پور سے پہلے امبر راجستھان کا دارالحکومت ہوا کرتا تھا لیکن وہاں زندگی کی سہولتیں مفقود ہونے لگیں تو ۱۷۲۸ء میں وہاں سے صرف گیارہ کلومیٹر دور مہاراجا سیوائی جے سنگھ ثانی نے اس شہر کی بنیاد رکھی۔

"اس شہر کی عمارتیں بھی دوسرے شہروں کی طرح مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی تھیں لیکن ۱۸۸۳ء میں برطانیہ کے پرنس البرٹ نے جے پور کا دورہ کیا تو اسے خوش آمدید کہنے کے لیے اس شہر کی تمام عمارتوں پر گلابی رنگ کروایا گیا جسے خوشی اور شادمانی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔"

شہر کی قدیم اور شان دار عمارتوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ روپ متی مختصراً راستے میں آنے والی ان عمارتوں کے بارے میں بتا رہی تھی اور بالآخر گاڑی شہر کے مشرقی علاقے میں واقع ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں ایک نہایت عالی شان محل نما عمارت میں داخل ہوگئی۔

یہ روپ متی کی حویلی تھی جو کسی شاہی محل سے کم نہیں تھی۔ بہت وسیع و عریض لان تھا جس کے وسط میں بہت بڑے حوض میں فوارہ لگا ہوا تھا۔

شان دار پورچ میں گاڑی رکی تو دو ملازم اچانک ہی کسی طرف سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ دونوں مخصوص راجستھانی لباس میں تھے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر روپ متی کو پرنام کیا اور میری طرف دیکھنے لگے۔ روپ متی نے انہیں کچھ ہدایات دیں اور مجھے ساتھ لے کر برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہوگئی۔

یہ وسیع و عریض ہال دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ مجھے لگتا تھا جیسے میں کسی شاہی محل میں ہوں۔ ہر کمرا بہت کشادہ' قیمتی اور شان دار ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ پورچ میں ملنے والے دو آدمیوں کے علاوہ جوان اور حسین عورتیں بھی ملی تھیں۔ وہ بھی روپ متی کی خادمائیں تھیں۔

روپ متی مجھے ایک شان دار خواب گاہ میں چھوڑ کر چلی گئی۔ میں کچھ دیر کمرے کے وسط میں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر آرام دہ بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ اس طویل سفر نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

روپ متی سے میری اگلی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی تھی۔ مجھے نو بجے کے قریب ایک ملازمہ نے جگایا تھا۔ میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرکے تازہ دم ہو کر خادمہ کے ساتھ کھانے کے کمرے میں پہنچا تو روپ متی میری منتظر تھی۔ اسے دیکھ کر میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ بہت ہی شرمناک لباس پہن رکھا تھا اس نے۔

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک خادم نے ٹھاکر بھنور سنگھ کی آمد کی اطلاع دی۔ بھنور سنگھ کا نام سن کر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی جبکہ روپ متی کی خوب صورت پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ اس نے مہمان کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا اور کچھ دیر بعد جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

صوفے پر بیٹھا ہوا ٹھاکر بھنور سنگھ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"کیا بات ہے ٹھاکر جی۔ آپ کی صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔" روپ متی نے اس کے پرنام کے جواب میں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"غضب ہوگیا روپ متی جی۔" ٹھاکر بولا "وہ داسی فرار ہوگئی جو آپ نے مجھے تحفے میں دی تھی۔"

"اوہ! کیسے؟" روپ متی چونک گئی۔

"کل دوپہر جودھ پور سے آتے ہوئے ہم کھانا کھانے کے لیے پشکر کے ایک ہوٹل میں تھوڑی دیر کے لیے رکے تھے۔" ٹھاکر بھنور سنگھ کہہ رہا تھا "وہ داسی باتھ روم گئی تھی۔ بس غلطی ہوگئی' میں اس کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ وہ موقع پاکر پچھلے دروازے سے فرار ہوگئی اور ـــ"

میں اب ٹھاکر کی بات نہیں سن رہا تھا۔ پشکر کا نام سن کر میرے دماغ میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ میری نظروں کے سامنے کامنی کا چہرہ گھومنے لگا۔ وہی کامنی جس نے تاؤلن نیمپل میں میرے ساتھ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی۔ جانکی سے بھی اس کی دوستی تھی اور جانکی یہ بھی جانتی تھی کہ کامنی پشکر کی رہنے والی تھی اور اتفاق سے جانکی ٹھاکر کے ساتھ پشکر پہنچ گئی تھی جہاں موقع پاکر وہ غائب ہوگئی۔

روپ متی اور ٹھاکر بھنور سنگھ باتیں کر رہے تھے اور میں خاموش کھڑا دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

ٹھاکر بھنور سنگھ کے آجانے سے میری بہت بڑی مشکل حل ہوگئی تھی۔ مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ جانکی کہاں تھی۔ پشکر ـــ کامنی کا شہر تھا اور مجھے یقین تھا کہ ٹھاکر بھنور سنگھ کے بھنور سے نکل کر جانکی سیدھی کامنی ہی کے پاس پہنچی ہوگی۔ میں جانکی کی ذہانت اور ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا اور ایک بڑی مصیبت سے نکل گئی تھی لیکن میرے ذہن میں کچھ اور وسوسے بھی سر ابھار رہے تھے۔ ٹھاکر کے شکنجے سے نکل کر جانکی اپنی منزل پر پہنچ سکی تھی یا کسی اور مصیبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ جانکی کی پیدائش تھائی لینڈ کی تھی۔ وہ بچپن میں شاید ایک مرتبہ ہندوستان آئی تھی مگر اس نے بتایا تھا کہ وہ بنارس گئی تھی اور اس شہر تک ہی محدود رہی تھی اور پھر یہ بہت پرانی بات تھی۔ کئی سال بیت گئے تھے۔ بنارس کی چند روزہ یادیں بھی اس کے ذہن سے مٹ گئی تھیں۔ پچیس تیس برسوں میں تو کسی شہر کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ اب اگر اسے بنارس جانے کا بھی اتفاق ہو تو وہ ان راستوں کو تلاش نہیں کر پائے گی جہاں سے وہ بچپن میں صرف ایک مرتبہ گزری تھی۔ بنارس کے حوالے سے بچپن کی ان یادوں سے قطع نظر ہندوستان میری طرح جانکی کے لیے بھی اجنبی تھا۔ پشکر کا اس نے بھی صرف نام ہی سنا تھا۔ اس شہر کے بارے میں وہ بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ کسی اجنبی شہر میں نامعلوم منزل تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا اور جانکی جیسی حسین عورت اکیلی ہو تو اس کے لیے خطرات اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ اس کا حلیہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ [illegible] لباس اور برہنہ پا۔ پولیس ایسے لوگوں کی طرف جلد [illegible] ہوجاتی ہے اور اگر پولیس توجہ نہ بھی دے تو [illegible] حسین اور بدحال عورتیں غنڈوں اور بدمعاشوں کی [illegible] میں تو فوراً ہی آجاتی ہیں۔ وہ تو ایسی حسین عورتوں کی تاک میں رہتے ہیں جنہیں آسانی سے شکار کیا جاسکے۔ یہ میں جانتا تھا کہ جانکی آسانی سے کسی کا شکار ہونے والی نہیں تھی مگر بدترین اندیشوں کو نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا تھا مگر ـــ میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی تھا۔ جانکی بغیر سوچے سمجھے فرار نہیں ہوئی ہوگی۔ پشکر شہر کا نام سنتے ہی اس کے ذہن میں کامنی کا نام بھی ابھرا ہوگا اور اسی لیے اس نے اچانک ہی فرار کا منصوبہ بنایا ہوگا اور اسے موقع بھی مل گیا۔

کامنی کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھی۔ اس کا تعلق جے پور کے ایک بہت بڑے برہمن خاندان سے تھا۔ پشکر میں اس کا ماما تھا جس کا نام میں بھول گیا تھا مگر ممکن ہے جانکی

کو یاد ہو۔ ویسے بھی میرے خیال میں کسی بڑے شہر میں بھی کامنی جیسی عورت کو تلاش کرلینا مشکل نہیں تھا۔ وہ کوئی گمنام ہستی تو تھی نہیں۔ اس نے پشکر میں مارشل آرٹس کا ٹریننگ سینٹر کھول رکھا تھا۔ اس کے نام سے سینٹر کو تلاش کرلینا مشکل نہیں ہوگا۔ اس قسم کے خیالات سے مجھے کچھ حوصلہ ملا اور میں نے گویا اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ جانکی' کامنی کے پاس پہنچ گئی ہوگی اور اب ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہوگی۔

دوسری طرف راجکماری روپ متی بھی کوئی غیر معروف ہستی نہیں تھی۔ اس نے مجھے جو اپنی داستان سنائی تھی اور یہ محل نما حویلی دیکھ کر بھی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اسے بھی جے پور کا بچہ بچہ جانتا ہوگا۔ کامنی بھی تو جے پور ہی کی رہنے والی تھی۔ وہ بھی روپ متی کو جانتی ہوگی۔ ہوسکتا ہے جانکی نے کامنی کے میرے بارے میں بھی بتادیا ہو اور عین ممکن ہے مجھے اس غلامی سے رہائی دلانے کے لیے بھی کوئی کوشش کی جائے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ٹھاکر جی۔" روپ متی کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہوگئے اور میں ایک بار پھر ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہوگیا "مجھے حیرت ہے وہ عورت تم جیسے گھاگ آدمی کو کیسے چکما دے گئی!"

"میری بدھی (عقل) گھاس چرنے چلی گئی تھی روپ متی جی۔" ٹھاکر نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "وہ بولی تھی کہ اسے باتھ روم جانا ہے۔ یوں انگلی اٹھا دیو تھی۔" اس نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی "میں ویٹریس کو بول دیا کہ اسے باتھ روم کا راستہ دکھا دے۔ یہی میرے سے غلطی ہوگیو تھی۔ مجھے خود اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ میں دروازے کے باہر کھڑا رہتا مگر یہ بات اس وقت میری کھوپڑی میں نہیں آیو تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "باتھ روم' ریسٹورنٹ کے پچھلی طرف تھا۔ وہ کتیا خاموشی سے اس طرف سے نکل گئی۔"

"تو تم نے اسے تلاش نہیں کیا....؟" روپ متی نے پوچھا۔

"میں تلاش نہیں کیا!" ٹھاکر کے لہجے میں استعجاب تھا۔ "میں تو کل سارا دن ادھر رہا۔ رات ادھر رہا۔ آج دوپہر تک وہاں رہا۔" وہ کہہ رہا تھا "دو بندے تو میرے اپنے ساتھ تھے جو اسے پہچانتے بھی تھے۔ چار چھ بندے میں نے رانا پریم سنگھ سے مانگ لیے تھے۔ ہم سب اس کو تلاش کیے رہا۔ سارا چھان مارا۔ گاؤشالا' آشرم' مندر ہر جگہ دیکھ لیا مگر اس کا پتا نہیں چلا۔ پتا نہیں وہ کتیا کہاں غائب ہوگیو ہے۔"

"پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی ہوتی۔" روپ متی نے کہا۔

"پولیس کو کیا بتاتا۔" ٹھاکر نے کہا "یہی کہ ہم کنیز خرید لایو تھا' وہ بھاگ گیو ہے! نہیں روپ متی جی۔ ہم پولیس کے پاس بھی نہیں جاسکتے۔"

"تو پھر صبر کرلو۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"صبر تو کرلوں گا پر میں ادھر اس لیے آیا ہوں کہ اگر وہ لونڈیا کبھی ادھر آجائے تو میرے پاس بھیج دینا۔"

"واہ ٹھاکر جی۔" روپ متی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "تو ایسے کہہ رہے ہیں کہ وہ میرے گھر سے گئی ہے اور یہاں آجائے گی۔"

ٹھاکر بھنور سنگھ اپنی حماقت پر خجل سا ہوگیا۔ وہ روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے جھینپ مٹانے کے لیے بولا۔

"یہ آپ کے سر پر کیا ہوا روپ متی جی۔"

"چوٹ لگ گئی تھی۔" روپ متی نے جواب دیا "جے پور سے نکلتے ہوئے گاڑی کے سامنے اچانک ہی ایک اونٹ آگیا تھا۔ ایک دم بریک لگانے سے میرا سر ونڈ اسکرین سے ٹکرا گیا پر آپ پریشان نہ ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

ٹھاکر بھنور سنگھ کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے وہ واقعی پریشان ہوگیا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے تاثرات معمول پر آگئے۔

میں ایک مطیع و فرماں بردار غلام کی طرح ایک طرف کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔ دو دن پہلے غلاموں کی منڈی میں میں نے ٹھاکر کی باتیں سنی تھیں اور اب بھی اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ان باتوں سے میں اندازہ لگا چکا تھا کہ ٹھاکر بھنور سنگھ بہت ہی لیچڑ قسم کا آدمی ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا تعلق کسی اچھے خاندان سے ہو۔ اس کے پاس دولت کی بھی کمی نہیں ہوگی لیکن ذاتی طور پر وہ بہت ہی لیچڑ قسم کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ روپ متی نے ڈیڑھ لاکھ میں خریدی ہوئی کنیز اسے دی تھی جو اسے دھوکا دے کر بھاگ گئی تھی مگر بہرحال وہ روپ متی کا احسان مند تھا۔

ٹھاکر بھنور سنگھ عیاش آدمی تھا۔ وہ عیاشی کے لیے کنیزیں خریدا کرتا تھا اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ روپ متی کے لیے بھی اس کا دل للچاتا ہوگا۔ اگر روپ متی اسے معمولی سا اشارہ بھی کردے تو وہ فوراً ہی اس کے تلوے چاٹنے لگے۔

ٹھاکر بھنور سنگھ تقریباً آدھا گھنٹا وہاں رہا۔ اس دوران روپ متی نے اسے چائے یا پانی تک نہیں پوچھا تھا اور جب وہ رخصت ہونے لگا تو روپ متی نے اتنے اخلاق کا مظاہرہ ضرور کیا کہ پورچ تک اس کے ساتھ آگئی تھی۔ میں بھی مستعد باڈی گارڈ کی طرح روپ متی کے پیچھے ہی تھا۔

پورچ میں روپ متی کی لینڈ کروزر کے پیچھے نیلے رنگ کی شاندار اسپورٹس کار کھڑی تھی۔ ٹھاکر بھنور سنگھ اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کرکے اس نے روپ متی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کار کو ریورس میں لیتا چلا گیا۔

"بے وقوف کہیں کا۔" روپ متی بڑبڑائی "ایک لونڈیا اسے لات مار کر چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"ٹھاکر نے کہا تھا کہ جانکی پشکر کے ایک ہوٹل سے غائب ہوگئی تھی۔ ہم بھی تو اس طرف سے آئے ہیں۔ ہمارے راستے میں تو اس نام کا کوئی شہر یا قصبہ نہیں آیا تھا۔" میں نے ٹھاکر کے بارے میں اس کے تبصرے کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"ہم اجمیر کی طرف سے آئے تھے۔" روپ متی نے اندر آنے کے لیے واپس مڑتے ہوئے کہا "پشکر اجمیر سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جودھ پور سے اجمیر کی طرف آتے ہوئے چند میل پرے ایک اور چھوٹا سا قصبہ ہے جہاں سے ایک سڑک پشکر کی طرف نکل جاتی ہے۔ پشکر سے ایک سڑک تو اجمیر کو ملاتی ہے اور دوسری سڑک اوپر سے ہوتی ہوئی جے پور آنے والے ہائی وے سے آن ملتی ہے۔ اب یہ ڈرائیو کرنے والے کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ ان دونوں شہروں میں سے کسی ایک کو بائی پاس کرتا ہوا نکل جائے مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ جانکی کی تلاش میں جانے کا ارادہ ہے کیا؟" بات ختم کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"یہ غلام اتنی جرأت نہیں کرسکتا کہ اپنی مالکن کے اعتماد کو دھوکا دے کر بھاگنے کی کوشش کرے۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر وہی مالکن۔" روپ متی نے مجھے گھورا "ویسے جانکی تمہیں یاد تو آتی ہوگی اور اس کے اس طرح بھاگ جانے پر خوشی بھی ہوئی ہوگی؟"

"جانکی سے میرا کئی برسوں کا ساتھ تھا۔ اس نے کئی مرتبہ میری خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگائی تھی اور اب تک جو کچھ بھی ہوا' میری وجہ سے ہوا۔ اسے میں آسانی سے نہیں

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب
احساس کمتری
اسباب تدارک علاج
اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ
● احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
● کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔
قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں
خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
74200
فون: 5802552-5886313 فیکس: 5802561
1-4-2001
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

بُھلا سکتا اور جہاں تک اس کے بھاگ جانے کا تعلق ہے تو مجھے یہ خبر سن کر واقعی خوشی ہوئی ہے۔" میں نے خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھا "اب میری دعا ہے کہ وہ دوبارہ غلط ہاتھوں میں نہ پڑ گئی ہو اور وہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ گئی ہو۔"

"تم نے بتایا تھا کہ ہندوستان میں اس کے خاندان کے کچھ لوگ موجود ہیں۔ تمہارے خیال میں پشکر میں اس کے لیے کوئی محفوظ جگہ ہو سکتی ہے؟" روپ متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بچپن میں ایک مرتبہ بنارس گئی تھی۔" میں نے جواب دیا "اب مجھے نہیں معلوم کہ بنارس پشکر سے کتنی دور ہے اور یہ کہ پشکر میں اسے کوئی سہارا مل سکتا ہے یا نہیں۔"

"بنارس ہندوستان کے دوسرے سرے پر ہے۔" روپ متی نے کہا "اور جہاں تک سہارے کا سوال ہے تو جانکی جیسی حسین اور جوان عورتوں کو کوئی سہارا تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ وہ سہارا کس قیمت پر ملتا ہے اور کتنا پائیدار ہوتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اندر آ گئے۔ اس وقت ایک ملازمہ ہال میں موجود تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگت ایسی گوری کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے۔ اس کے چہرے کے نقوش عام ہندوستانی عورتوں سے مختلف تھے لیکن اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ اٹھتا ہوا شباب تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا راجستھانی گھاگرا اور اسی رنگ کی چولی پہن رکھی تھی۔

"یہ مُندری ہے۔" روپ متی نے ملازمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف اس سے کہہ دینا۔ میں دوسروں کو بھی ہدایت کر دوں گی۔ کوئی بھی ملازم یا ملازمہ تمہاری بات نہیں ٹالے گی۔ آؤ۔ میں پہلے تمہیں اپنی حویلی دکھاؤں۔"

میں نے ایک بار پھر مندری کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور الجھن بھی۔ حیرت شاید اس بات پر تھی کہ گھر کے پرانے ملازموں کی باگ ڈور اس غلام کے ہاتھ میں دی جا رہی تھی جسے مالکن آج ہی خرید کر لائی تھی۔

"مُندری کے چہرے کے نقوش بتا رہے ہیں کہ یہ ہندوستانی تو نہیں ہے۔" میں نے روپ متی کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر نجانے کیوں مجھے چیانگ سائین میں

پولیس وومن رنگ سنت کی بیٹی سونیا یاد آ گئی تھی۔ ... جو گولڈن ٹرائی اینگل تک ہمارے ساتھ گئی تھی اور ... کے بعد ہندوستان کی طرف آ گئی تھی۔ مندری کے چہرے ... نقوش بڑی حد تک سونیا سے مشابہت رکھتے تھے۔

"مندری سو فی صد ہندوستانی ہے۔" روپ متی نے جواب دیا "اس کی ماں تبتی تھی اور باپ پنجاب کا ... دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ تین سال پہلے میں ایک کام ... دہلی گئی تھی۔ وہاں اپنے ایک رشتے دار کے گھر میں ... دیکھا۔ یہ اگرچہ تھی تو ملازمہ ہی مگر اس کے ساتھ بہت افسوس ناک سلوک کیا جاتا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ ... آئی۔ اس وقت سے یہ میرے پاس ہے۔ میں نے سارا ... اس پر چھوڑ رکھا ہے۔ بہت بھروسے کی اور قابلِ اعتماد ... ہے۔"

میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے روپ متی ... ساتھ چلتا رہا۔ وہ مجھے گھوم پھر کر اپنی حویلی دکھاتی رہی۔ جو ... کیا تھی، ایک محل تھا۔ کئی غلام گردشیں اور متعدد کم... تھے۔ ہر کمرا قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ اوپر کی منز... بھی چار کمرے تھے جن کے آگے بہت وسیع ٹیرس بنا ہوا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے میں اس حویلی میں گھومنے کے بعد ... مرکزی ہال میں واپس آ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہو... کہ روپ متی کا باپ ایک چھوٹی سی ریاست کا راجا تھ... ریاست ختم ہو گئی تو اسے ہند سرکار کی طرف سے وظیفہ ... لگا۔

باپ اور بھائی کے مرنے کے بعد سرکار سے وہ وظیف... اب روپ متی کو ملتا تھا۔ نقد لاکھوں روپے سالانہ کے علا... سرکار کی طرف سے اور بھی بہت سی مراعات اسے حاص... تھیں۔ ان کے علاوہ اسے اپنے سورگ باشی پتی نروان ... کی طرف سے بھی کروڑوں کا ورثہ ملا تھا اور یہ ساری دول... اتنی تھی کہ روپ متی کے بعد اس کی آنے والی دو تین نسلی... بھی کوئی کام دھندا کیے بغیر عیش کی زندگی گزار سکتی تھیں۔

بارہ بج چکے تھے۔ ہم ایک بار پھر ہال میں آ گئے۔ دو ... ملازمہ ہمارے لیے کافی بنا کر لے آئی۔ اس کا نام کملا تھا۔ ... بھی مندری کی طرح حسین تھی اور اس کی عمر بھی ... تیئس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ تیسری ملازمہ کو میں ... شروع میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہ... آئی تھی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو دو ہٹے کٹے مرد ملازم ... دکھائی دیے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی اب تک ایک ... مرتبہ بھی اندر داخل نہیں ہوا تھا۔ انہیں شاید اندر دا...

...ہونے کی اجازت نہیں تھی۔

...کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے روپ متی راجستھان کے ...راجواڑوں کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی ہر بات ...ایک نیا انکشاف تھا۔ تمام راجواڑے سرکار کے دیے ہوئے وظیفوں پر پل رہے تھے۔ ان کے پاس دولت کی ریل پیل تھی اور کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ انہیں عیاشیوں اور آپس کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ کوئی اور کام کیسے کرتے!

باتوں کے دوران میں مجھے اچانک ہی تیج سنگھ اور دھرمیش کا خیال آ گیا۔ وہ لوگ ہم سے کئی گھنٹے پہلے منڈی سے روانہ ہوئے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہوں گے لیکن جب سے ہم آئے تھے ان میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے روپ متی سے ان کے بارے میں پوچھا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"دو چار روز تک تو وہ مجھے اپنی صورت نہیں دکھائیں گے اور جب آئیں گے تو میرے پیر چاٹنا شروع کر دیں گے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے لیے اب میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"کیا اس طرح وہ تمہارے دشمن نہیں بن جائیں گے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"چڑیا چڑے کی کا شوربا۔" روپ متی نے کہا "ان کی اوقات ہی کیا ہے۔ میں نے انہیں گندی نالی سے اٹھا کر محل میں پہنچایا تھا۔ وہ یہاں عیش کرتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے۔ بڑی لمبی چوڑی جائداد بنا لی ہے۔ اگر وہ شرافت سے رہیں گے تو ان کے دن اچھے گزر جائیں گے اور اگر پر پرزے نکالنے کی کوشش کی تو میں انہیں مچھر کی طرح چٹکی میں مسل دوں گی۔"

"وہ چٹکی میں مسلے جانے سے پہلے تمہارے لیے کچھ پریشانیاں تو پیدا کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا "یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔ نہ میں بیچ میں آتا اور نہ یہ بدمزگی پیدا ہوتی۔ ان کے بھی کچھ اپنے تعلقات ہوں گے۔ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کے لیے وہ دوسروں سے بھی مدد لے سکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں ان سے یہ دشمنی مہنگی پڑ جائے!"

"ان میں اتنی جرأت نہیں کہ میرے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھا سکیں لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی کی دشمنی کی پروا نہیں۔ میں نے تم پر وشواس (اعتماد، یقین، بھروسا) کیا ہے اور میں۔۔۔" وہ خاموش ہو کر میری آنکھوں میں جھانکنے لگی "اور میں نے کسی کو

پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کی۔"

"دھوکا اور فریب میری فطرت میں نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں۔" روپ متی مسکرائی "منڈی سے روانہ ہونے سے لے کر یہاں تک تمہیں بہت سے مواقع ملے تھے۔ جنگل میں جب ہمیں روکا گیا تھا اور تمہاری ہتھکڑی بھی کھل گئی تھی تو تم بڑی آسانی سے وہاں فرار ہو سکتے تھے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس مجھے ان لوگوں سے بچانے کے لیے اپنا جیون داؤ پر لگا دیا اور جب میں بے ہوش ہو گئی تھی اور تم میرے دشمنوں کو بھی ختم کر چکے تھے اس وقت بھی تمہیں بھاگ جانے کا موقع حاصل تھا مگر تم نے وفا پر آنچ نہیں آنے دی اور پھر۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئی۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں "جودھ پور میں سرکٹ ہاؤس میں قیام کے دوران بھی تمہیں ایسا موقع ملا تھا۔ تم پر کوئی نگرانی نہیں تھی۔ تم سرکٹ ہاؤس سے نکل کر شہر میں گم ہو سکتے تھے۔ جودھ پور بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں کسی کو تلاش کر لینا آسان نہیں اور تم بڑی آسانی سے غائب ہو سکتے تھے مگر تم نے وہاں بھی ایسا نہیں کیا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ تم پر آنکھیں بند کر کے وشواس کیا جا سکتا ہے؟"

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے جواب دیا "میں تمہارے اس وشواس کو دھوکا نہیں دوں گا لیکن ایک بات میں بھی تم سے نہیں چھپانا چاہتا اور۔۔۔"

"میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" روپ متی نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"کیا۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میرے بارے میں اس کا ایک اندازہ تو درست تھا کہ میں اس کے ساتھ کبھی دھوکا نہیں کروں گا اور اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا اور اب میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے بارے میں اس کا دوسرا اندازہ کہاں تک درست نکلتا ہے۔

"بتا دوں۔۔۔؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں۔ بتا دو۔" میں بھی مسکرا دیا۔

"یہی کہ تم زندگی بھر میرے غلام بن کر نہیں رہ سکتے اور ایک نہ ایک دن مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" روپ متی نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

میں اچھل پڑا۔ درحقیقت یہی بات تھی جو میں اس سے

کہنا چاہتا تھا۔ وہ واقعی سمجھ دار تھی۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "شیر کو پنجرے میں قید کر کے رکھا تو جاسکتا ہے لیکن اس کا من نہیں جیتا جاسکتا اور من جیتنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے پریم کے جال میں رکھا جائے۔"

"ایک بات یاد رہے کہ میں تمہارا زر خرید غلام ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور کسی غلام سے پریم کرنا بڑی معیوب سی بات ہوگی۔"

"میں پریم کا فلسفہ نہیں جانتی مگر یہ سمجھتی ہوں کہ پریم دھرم' ذات پات' امیری غریبی اور آقا غلام کی تفریق کو نہیں سمجھتا۔ بہرحال۔" وہ جماہی لیتے ہوئے بولی "اس وقت مجھے نیند آرہی ہے۔ بہت تھک گئی ہوں۔ اس موضوع پر صبح بات کریں گے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے بھی اپنی سیٹ چھوڑ دی۔ اسی وقت مندری بھی کسی طرف سے نمودار ہو کر سامنے آگئی۔

"مندری۔" روپ متی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں سونے جارہی ہوں۔ ان مہاشے کو بھی کمرا دکھا دو اور اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو بندوبست کر دینا۔"

"جی مالکن۔" مندری نے جواب دیا۔

روپ متی نے مڑ کر میری طرف دیکھا پھر میرے قریب آکر دونوں بازو پکڑ لیے اور میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیر رہے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے گی جسے کم از کم میری لغت میں غیر اخلاقی ہی کہا جائے گا مگر خیریت گزری۔

"گڈ نائٹ۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور میرے بازو چھوڑ کر زینے کی طرف چلنے لگی۔

اوپر جانے والا زینہ ذرا سی گولائی لیے ہوئے تھا۔ نیچے سے اوپر تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی رہی اور میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اوپر والی بالکونی پر پہنچ کر روپ متی نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر پیچھے ہٹتی ہوئی میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

"میرے ساتھ آؤ۔"

مندری کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ اب بھی اس الجھن کا شکار تھی کہ ایک زر خرید غلام اس قدر قابلِ اعتماد اور پیارا کیسے ہوسکتا ہے کہ نہ صرف مالکن اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے بلکہ اسے رہائش کے لیے شان دار بیڈ روم بھی دیا جائے اور پرانے اور وفادار ملازمین کو یہ حکم بھی دے دیا جائے کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھا جائے اور اس کے ہر حکم کی تعمیل بھی کی جائے۔

وہ چند لمحے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی پھر اشارہ کرتے ہوئے ایک طرف چل پڑی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

مندری مجھے اسی کمرے میں لے آئی جس میں' میں نے دوپہر سو کر گزاری تھی۔ بہت شان دار بیڈ روم تھا۔ دوپہر کو میں روپ متی کے ساتھ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کر کے آیا تھا۔ منڈی میں جب دھرمیش سے میری لڑائی ہوئی تھی تو میری بنیان پھٹ گئی تھی۔ میرے بدن پر صرف نیکر تھی جو گھٹنوں سے اوپر تھی۔ اس وقت سے میں یہی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ میرا برہنہ جسم گرد آلود تھا اور جب دوپہر کو میں اس بستر پر لیٹا تھا تو سفید اجلی چادر پر گرد کے دھبے لگ گئے تھے جو اب بھی نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو۔" کمرے میں پہنچ کر مندری نے کہا۔

"میرا جسم بہت گندا ہو رہا ہے۔ میں نہانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ باتھ روم کا دروازہ ہے۔" مندری نے اشارے سے بتایا "وہاں تمہیں ضرورت کی ہر چیز ملے گی۔"

"کپڑے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا مجھے پہننے کے لیے کپڑے مل سکتے ہیں؟"

"تم باتھ روم میں جاؤ۔ میں کوئی بندوبست کرتی ہوں۔" مندری نے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر چلی گئی۔

میں باتھ روم میں گھس گیا۔ یہ باتھ روم بھی بہت شان دار تھا۔ ایک دیوار پر قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوب صورت میڈی سن کیبنٹ تھی جس میں اینٹی سیپٹک اور مختلف اقسام کے لوشن رکھے ہوئے تھے۔ ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی راڈ پر سفید تولیا ٹنگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک اسٹینڈ پر صابن اور شیمپو وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

نہانے کے لیے ایک خوب صورت ٹب بھی تھا اور اس سے ذرا ہٹ کر شاور بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے نہانے کے لیے شاور کو ترجیح دی۔

ٹھنڈے پانی کی پھوار جسم پر پڑی تو مجھے عجیب سا سکون ملا۔ بہت دیر تک شاور کے نیچے کھڑا پھوار سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ کئی روز بعد اس طرح نہانے کا موقع ملا تھا۔

ابھی میں شاور کے نیچے ہی کھڑا تھا کہ دروازے پر ہلکی دستک سن کر چونک گیا۔

"کون ہے؟" میں نے دروازے کے قریب آکر مدھم آواز میں پوچھا۔

"کپڑے لے لو پہننے کے لیے۔" یہ مندری کی آواز تھی۔

میں نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر ہاتھ باہر نکال دیا۔ مندری نے میرے ہاتھ میں کپڑے تھما دیے۔ میں نے دروازہ بند کر کے کپڑے کھونٹی پر ٹانگ دیے اور ایک بار پھر شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا۔

اور بالآخر تولیے سے جسم خشک کر کے میں کھونٹی پر ٹنگے ہوئے کپڑے اتار کر پہننے لگا۔ وہ سلیپنگ سوٹ تھا' پاجامہ اور شرٹ۔ شرٹ میں سے بڑی مسحور کن خوشبو آرہی تھی۔ شرٹ اگرچہ مجھے کسی قدر تنگ تھی لیکن بہرحال میں اس میں سما گیا۔ پاجامہ بھی ٹخنوں سے کافی اوپر تھا۔ یہ کپڑے پہننے کے بعد جب میں نے قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ زنانہ سلیپنگ سوٹ تھا۔ شرٹ کا گلا گولائی میں تھا اور اس پر نصف انچ چوڑی خوب صورت بیل بھی لگی ہوئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مندری نے روپ متی سے جا کر کہا ہوگا اور روپ متی نے اپنا یہ سلیپنگ سوٹ بھیج دیا تھا۔ مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ سلیپنگ سوٹ زنانہ تھا یا مردانہ۔ میری ضرورت فی الوقت پوری ہوگئی تھی۔ فکرِ فردا نہیں کی جاتی۔

میں باتھ روم سے باہر آگیا۔ مندری جا چکی تھی اور بستر پر سفید داغ دار چادر کے بجائے ہلکے گلابی رنگ کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ایک خوب صورت فلاسک اور اس کے قریب ہی شیشے کا ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ میرے خیال میں فلاسک میں چائے تو ہرگز نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے فلاسک کھول کر دیکھا بھی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ اس میں ٹھنڈا پانی تھا۔

میں نے ایک گلاس پانی پیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ بیڈ کے دائیں طرف دیوار پر ایک سوئچ بورڈ لگا ہوا تھا۔ بیڈ پر لیٹے لیٹے بھی ہاتھ اس سوئچ بورڈ تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر ہاتھ سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا دیا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ کمرے میں جلنے والی ٹیوب لائٹ اور نائٹ بلب کے سوئچ اس بورڈ پر تھے۔ میں نے ٹیوب لائٹ آف کر کے نائٹ بلب جلالیا۔ نیلگوں روشنی آنکھوں کو بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ بستر بھی بہت آرام دہ تھا۔ لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

صبح دس بجے سے پہلے میری آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ مجھے کسی نے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ آنکھ کھل جانے کے بعد بھی میں دیر تک بستر پر پڑا رہا۔ پہلے تو میں سمجھ ہی نہ سکا کہ کہاں ہوں۔ دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی لیکن یہ دھند بتدریج چھٹتی چلی گئی اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

جہاز کی تباہی کے بعد پناہ کی تلاش میں صحرا میں بھٹکنا' وجے ٹھاکر کے ہتھے چڑھ جانا' غلاموں کی منڈی میں نیلام ہونا' جانکی کا بچھڑ جانا اور اس عجیب و غریب اور پُراسرار عورت روپ متی کا زر خرید غلام بن جانا۔ روپ متی کھلی کتاب ہونے کے باوجود میرے لیے بہت ہی پُراسرار تھی۔ اس نے میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک ہرگز نہیں کیا تھا۔ وہ اب تک میرے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے تھی جیسے میں بھی اس کا ہم پلہ ہوں۔ میری خاطر اس نے نہ صرف پرانے باڈی گارڈز کو نکالنے کا فیصلہ کرلیا تھا بلکہ ایک راج کمار سے دشمنی بھی مول لے لی تھی۔

روپ متی نے میرے اوپر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ مجھ پر فی الحال کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس نے مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہونے والی ہے بلکہ وہ کہانی جنم لے چکی ہے۔ تیج سنگھ' دھرمیش اور بلونت سنگھ کی فطرت سے میں اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ وہ تینوں نہ صرف روپ متی سے ذلیل ہوچکے تھے بلکہ میرے ہاتھوں بھی ذلت اٹھا چکے تھے۔ تیج سنگھ اور دھرمیش تو میرے ہاتھوں گدھوں کی طرح پٹے تھے اور کنور بلونت سنگھ کو میری وجہ سے اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس کا ایک آدمی بھی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور خود اسے بری طرح ذلیل ہو کر رات کی تاریکی میں جنگل میں فرار ہونا پڑا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ اب میں بھی اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تینوں روپ متی سے اپنی ذلت و رسوائی کا بدلہ لینے کے لیے مجھے بھی اس معاملے میں لپیٹنے کی کوشش کرسکتے تھے۔

اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں یہاں ان معاملات میں الجھ کر رہ جاؤں گا یا اپنے ماں باپ کے قاتلوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی اقدام کرسکوں گا۔ دارا سنگاپور سے فرار

ہو کر ہندوستان آیا تھا لیکن ظاہر ہے ہندوستان اس کی منزل نہیں تھی۔ اس کی منزل تو لاہور تھی جسے وہ اپنی پناہ گاہ سمجھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب تک لاہور پہنچ چکا ہوگا جبکہ میں نے طے کر رکھا تھا کہ اسے دنیا کے کسی کونے میں بھی پناہ نہیں لینے دوں گا لیکن اب میرے سامنے سوال یہ تھا کہ یہاں سے کیسے نکلا جائے؟

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور مندری چائے کا کپ لے کر اندر داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

چند منٹ بعد میں دوبارہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز گرم گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا خیال تھا کہ روپ متی جاگ چکی ہوگی اور ناشتا بھی کر چکی ہوگی لیکن پتا چلا کہ وہ ابھی تک سو رہی ہے۔ اس نے رات ہی کو کہہ دیا تھا کہ صبح اسے ڈسٹرب نہ کیا جائے اس لیے مندری نے اسے جگانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

"بھوجن کرو گے۔ بنا دوں؟" مندری نے میرے قریب آکر کہا۔

"ابھی نہیں۔ مالکن اٹھ جائے تو ناشتا کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

مندری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ بات میں نے کل ہی نوٹ کرلی تھی کہ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اُبھر آتی تھی۔

میں ہال سے ہوتا ہوا باہر آگیا۔ روپ متی کی لینڈ کروزر اب بھی پورچ ہی میں کھڑی تھی۔ میں چند لمحے پورچ میں کھڑا رہا اور پھر گھوم پھر کر کمپاؤنڈ کا جائزہ لینے لگا۔ کمپاؤنڈ کم از کم دو ایکڑ رقبے پر مشتمل تھا۔ بڑے خوب صورت لان بنے ہوئے تھے۔ جن کے کناروں پر پھولوں کے پودے بھی بکثرت تھے۔ بیرونی فصیل نما دیوار کے ساتھ ساتھ ناریل کے درخت تھے۔

حویلی کی عمارت کے ایک طرف تین گیراج بنے ہوئے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ میں ان کے سامنے سے گزرا۔ ایک گیراج خالی تھا لیکن دو دروازوں کی جھریوں سے اندر کھڑی ہوئی گاڑیاں نظر آگئیں۔ میں حویلی کی عمارت کے پچھلی طرف آگیا۔

اس طرف بھی بہت لمبی چوڑی کھلی جگہ تھی اور عمارت سے بہت ہٹ کر عقبی دیوار کے ساتھ کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سرونٹ کوارٹروں کی تو تھی۔ ہر کوارٹر کے سامنے مختصر سا صحن بھی تھا اور باہر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ہر کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ رو یہاں اکیلی ہی رہتی تھی۔ اس کی خدمت اور گھر کی د کے لیے زیادہ سے زیادہ دو ملازم کافی تھے لیکن اس ملازموں کی ایک فوج پال رکھی تھی۔ پانچ ملازم تو ا حویلی میں موجود تھے۔ تین عورتیں اور دو مرد اور دو +دھرمیش) کو وہ نکالنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

میں حویلی کی وسیع و عریض عمارت کے اوپر سے ہوا ایک بار پھر سامنے کے رخ پر آگیا۔ ایک دبلا پتلا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اس کے بدن پر صرف دھوتی تھی جو مخصوص انداز میں بندھی ہوئی تھی۔ آبنوسی پنڈا دھوپ میں چمک رہا تھا۔ اس کے تر تراشے ہوئے بال چاندی کی طرح سفید تھے۔ ا چہرے پر بڑی بڑی سفید مونچھیں عجیب سی لگ رہی میں قریب پہنچا تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

میں کچھ دیر لان میں اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا فوار قریب رک گیا۔ اس وقت میری نظر اتفاقاً حویلی کی ط گئی تھی۔ اوپر والی منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی کا پ ہٹا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی اس پردے کی جھانک رہا ہو۔ میں اس کی ایک معمولی سی جھلک ہی تھا اور پھر پردہ برابر ہوگیا تھا۔ وہ روپ متی کے علاوہ ا ہو سکتا تھا۔

میں ایک درخت کے سائے میں کھڑا اِدھر اُ رہا۔ میں اس وقت عجیب ذہنی الجھن میں گرفتار ت روپ متی کا زر خرید تھا لیکن اس نے مجھے آزاد چ تھا۔ میں اگر چاہتا تو بڑے اطمینان سے یہاں سے ج مگر میری قوتِ فیصلہ بھی شاید مفلوج ہو کر رہ گئی تھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن ا طے تھی کہ میں روپ متی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تو نے مجھ پر اعتماد کیا تھا اور میں اس کے اعتماد کو ٹھیس اپنی نظروں میں نہیں گرنا چاہتا تھا۔

میں نیم کے درخت کے سائے میں کھڑا کی سوچتا رہا کہ یہاں سے نکل بھی گیا تو کہاں جاؤں گا۔

لیے اجنبی تھا۔ یہاں کے لوگ اجنبی تھے اور لک میرے یہاں پہنچا تھا وہ بھی بڑے عجیب تھے۔ ہرمیں جن حالات میں ہوائی جہاز کی تباہی کے بعد جہاز اور مسافروں کی یکستان میں شروع ہوگئی تھی۔ کچھ مسافر مل گئے تھے۔ کچھ کی لاش مل گئی تھیں اور کچھ ابھی تک لاپتا تھے۔

میں اگر یہاں سے نکل کر اپنے آپ کو سرکاری حکام کے سامنے پیش کر دیتا تو میرے لیے مزید الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں اتنے روز کہاں غائب رہا؟ میں نے کسی اتھارٹی سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ میری یہ بات ماننے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوگا کہ مجھے پکڑ کر غلاموں کی منڈی میں بیچ دیا گیا تھا۔ غلاموں کی منڈی کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں۔ حکمران بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ راجستھان میں انسانوں کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے مگر وہ جاننے والے بھی منڈی کے وجود سے انکار کر دیں گے۔

دوسری طرف میں جانکی کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور اس پر یہ عذاب بھی میری ہی وجہ سے نازل ہوا تھا۔ اسے بے یار و مددگار چھوڑ جانا زیادتی ہوتی۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ روپ متی برآمدے میں نمودار ہوئی۔ وہ ایک لمحے کو وہاں رکی تھی اور پھر برآمدے سے اتر کر نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی میری طرف آئی۔ اس نے شب خوابی کا باریک لباس پہن رکھا تھا جس میں اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ وہ شاید نہا کر نکلی تھی اور بال نہیں کیے تھے۔ بالوں سے نچڑنے والے پانی سے میکسی بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گئی تھی۔

وہ میرے سامنے آکر رک گئی اور مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگی اور پھر اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی۔

"یہ۔ یہ کپڑے کہاں سے لیے تم نے؟" اس نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"رات کو مندری نے دیے تھے۔ شاید تمہارے ہی ہیں" میں نے جواب دیا۔ میں اس لباس میں پہلے ہی کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا اور اب تو میں جھینپ سا گیا تھا۔

"یہ میرے کپڑے نہیں ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "مندری کے ہیں۔ تم نے مانگے ہوں گے تو اس نے اپنے کپڑے لا دیے لیکن۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ مندری نے رات تمہارے کمرے میں گزاری

میں بری طرح جھینپ گیا "میرے خیالات اتنے پست نہیں ہیں۔"

"برا مان گئے۔" وہ مسکرا دی "میں نے تو یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ ویسے تم ہو ایسی چیز کہ تمہیں دیکھ کر ہر جوان عورت کے سینے میں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ بہرحال، آؤ۔ میں تمہیں اپنا گارڈن دکھاؤں۔"

وہ مجھے لان کے مختلف حصوں میں گھماتی ہوئی اس طرف لے گئی جہاں ایک لمبا چوڑا قطعہ گلاب کے پودوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں کئی رنگوں کے گلاب تھے اور وہ مجھے بتا رہی تھی کہ گلاب کا کون سا پودا کہاں سے لا کر لگایا گیا تھا۔

میں روپ متی کے ساتھ ساتھ چلتا "ہوں ہاں" کرتا رہا۔ اس وقت دوپہر ہو رہی تھی۔ میں نے دس بجے کے قریب چائے کا ایک کپ پیا تھا اور اب پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

کملا نامی ملازمہ نے برآمدے میں نمودار ہو کر کھانا لگائے جانے کی اطلاع دی تو میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

"آؤ۔ کھانا لگ چکا ہے۔ تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔" روپ متی نے کہا اور ہم لان سے نکل کر اندر کی طرف چل پڑے۔

میز پر انواع و اقسام کے کھانے لگے ہوئے تھے۔ اس میز کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی خاص مہمان کے لیے پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا ہو۔ تین ڈشز سبزیوں کی تھیں جن میں پنیر استعمال کیا گیا تھا۔ ایک ڈش چکن فرائی کی تھی۔

ہم دونوں میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نظریں جھکائے کھانا کھاتا رہا۔ میں روپ متی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ البتہ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اے کملا۔" روپ متی کو اچانک ہی جیسے کچھ یاد آگیا "دھرمیش کے کوارٹر کی چابی تو تمہارے پاس ہے نا؟"

"جی مالکن۔" کملا نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں جھک گئی تھیں جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"اس کے کمرے سے کپڑوں کے دو تین جوڑے نکال لاؤ۔" روپ متی نے کملا سے کہا پھر میری طرف مڑ گئی "میرا خیال ہے دھرمیش کے کپڑے تمہیں پورے آجائیں گے۔ چند روز تو انہی پر گزارہ کرو۔ اس دوران میں کوئی اور بندوبست کرلیا جائے گا۔"

"وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا؟" میں نے کہا۔

"اعتراض!" روپ متی بولی "اگر اس نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو میں اس کی زبان کھینچ لوں گی۔ ویسے اطمینان رکھو۔ وہ دونوں بھائی اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ فیصلہ سنانے سے پہلے ہی وہ میرے فیصلے سے آگاہ ہو چکے ہیں۔"

کملا روپ متی کا حکم سن کر اسی وقت چلی گئی تھی۔ ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو کملا بھی آگئی۔

"میں نے کپڑے ان شریمان جی کے کمرے میں رکھ دیے ہیں۔" اس نے بتایا۔

میں روپ متی کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ کئی قیمتی سوٹ ہینگروں میں لگے ہوئے تھے۔ لاتعداد شرٹس اور پتلونیں الگ سے تہ کی ہوئی رکھی ہوئی تھیں۔ کئی جوڑے راجستھانی لباس کے بھی تھے۔

روپ متی نے کملا کو دو چار جوڑے لانے کو کہا تھا مگر وہ شاید اس کے وارڈ روب کے سارے کپڑے نکال لائی تھی۔

میں نے ایک پتلون اٹھا کر اپنی ٹانگوں سے لگا کر دیکھی۔ دھرمیش قد و قامت میں میرے جیسا ہی تھا اور میرے خیال میں اس کے کپڑے مجھے پورے آسکتے تھے۔ گہرے رنگ کی اس پتلون کے ساتھ پہننے کے لیے میں کوئی مناسب شرٹ تلاش کر رہا تھا کہ روپ متی نے وہ پتلون میرے ہاتھ سے لے کر ایک طرف ڈال دی اور نیلے رنگ کی ایک اسٹون واشڈ جینز اور گہرے رنگ کی ٹی شرٹ نکال کر میری طرف بڑھا دی۔

"یہ پہن لو۔ اچھی لگے گی۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "تم یہ کپڑے بدل لو۔ میں کچھ اور تلاش کرتی ہوں۔"

میں کپڑے لے کر باتھ روم میں گھس گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ کپڑے میرے جسم پر بالکل فٹ تھے۔ میں جب باتھ روم سے باہر نکلا تو روپ متی بیڈ پر جھکی ڈھیر میں سے کپڑے الگ کر رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور میرے بازوؤں کے مسلز ٹٹولنے لگی۔ آدھی آستین کی ٹی شرٹ میں میرے بازوؤں کے مسلز ابھرے ہوئے تھے۔ سینہ بھی کسی باڈی بلڈر کی طرح تنا ہوا تھا اور روپ متی یہی سب کچھ دیکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے میرے لیے ایسے لباس کا انتخاب کیا تھا۔

میں اب تک روپ متی کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ وہ جنم جنم کی پیاسی تھی۔ اس نے جب بھی اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کی تسکین کے بجائے اس کی پیاس اور بڑھ گئی تھی اور اب وہ مجھ سے تسکین حاصل کرنا چاہتی تھی۔ یہ شروعات تھیں اور میں جانتا تھا آگے کیا ہونے والا ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ مجھے اس شر سے اپنے آپ کو کس طرح بچانا تھا۔ میں گولڈن ٹرائی اینگل کے غاروں میں دھوکا کھا گیا تھا۔ جانکی عرصے سے میرے پیچھے پڑی تھی اور میں اپنے آپ کو اس سے بچاتا رہا تھا اور اب روپ متی سے بچنا تھا جو میری مالکن تھی اور میں اس کا غلام۔

روپ متی نے میرے لیے اسی ڈھنگ کے جوڑے نکال کر الگ کر لیے اور کملا کو بلا کر باقی کپڑے لے جانے کا حکم دیا۔

"اور دیکھو۔" روپ متی نے کہا "اگر وہ دونوں میری عدم موجودگی میں یہاں آئیں تو ان سے کہنا اپنا سامان لے جائیں ورنہ سڑک پر پھینک دیا جائے گا اور اگر وہ آئیں تو صرف اپنے کوارٹرز تک جائیں گے۔ انہیں حویلی کے کسی اور حصے میں جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ سمجھ گئیں؟"

"جی مالکن۔" کملا نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اب وہ دونوں بھائی یہاں کیوں آئیں گے۔

کچھ دیر بعد روپ متی نے تارا سنگھ اور دوسرے ملازموں کو بھی یہ حکم سنا دیا۔

چار بجے کے قریب روپ متی مجھے ساتھ لے کر باہر آگئی۔ لینڈ کروزر اب بھی پورچ ہی میں کھڑی تھی۔ وہ برآمدے سے اتر کر گیراج کی طرف چلی گئی۔ اسے جاتے دیکھ کر تارا سنگھ بھی دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔

تارا سنگھ نے ایک گیراج کا دروازہ کھول دیا اور جا کر گہرے رنگ کی ایک کار صاف کرنے لگا۔ روپ متی بھی گیراج میں داخل ہو کر کار میں بیٹھ گئی اور اسٹارٹ کر کے کار کو باہر نکال لائی۔

چند سال پرانے ماڈل کی مرسڈیز تھی جو اس طرح چم چما رہی تھی جیسے ابھی شوروم سے نکل کر آئی ہو۔ پورچ اتنا کشادہ تھا کہ دو کاریں پہلو بہ پہلو کھڑی ہو سکتی تھیں۔ روپ متی نے کار 'لینڈ کروزر' سے ذرا آگے روک لی اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر مجھے اشارہ کیا۔

میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے نہیں پوچھا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ پوچھنے کا کوئی حق بھی

نہیں تھا۔ وہ میری مالکن تھی اور جہاں چاہے، مجھے لے جا سکتی تھی۔ کار آگے بڑھانے سے پہلے اس نے مندری کو بلا کر اتنا بتا دیا تھا کہ ہم لوگ رات کا کھانا باہر ہی کھائیں گے۔

کار حویلی سے نکل کر شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ یہ شہر قدیم تاریخی عمارتوں سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا راجستھان کے راجوں مہاراجوں کو قلعہ نما حویلیاں اور محلات بنوانے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

"یوں تو اس شہر کو دیکھنے کے لیے کئی روز درکار ہیں لیکن آج میں تمہیں چند بہت خاص عمارتیں دکھانے کے لیے لائی ہوں۔" روپ متی نے کار ایک اور سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔

"گویا آج تم مجھے سیر کرانا چاہتی ہو۔" میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہی سمجھ لو۔" اس نے جواب دیا "اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم شہر کی سڑکوں سے واقف ہو جاؤ۔ آج تو میں تمہیں یونہی گھما رہی ہوں۔ کل میں تمہیں ڈرائیونگ سکھانے کے لیے لے جاؤں گی۔"

"ڈرائیونگ!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "تمہیں یہ خیال کیسے آگیا کہ مجھے ڈرائیونگ ضرور سیکھنی چاہیے۔"

"مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے اب تک ڈرائیونگ سیکھی کیوں نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تم نے اپنا جو پس منظر بتایا ہے اس کے پیش نظر تو تمہیں ڈرائیونگ کا ماہر ہونا چاہیے تھا۔ بہرحال 'اب' میں تمہیں ڈرائیونگ سکھاؤں گی لیکن آج کا دن میں تمہیں شہر کے راستوں سے متعارف کرانا چاہتی ہوں۔"

وہ کار کو شہر کی مختلف کشادہ سڑکوں پر گھماتی رہی۔ وہ مجھے راستے میں پڑنے والی ہر مشہور عمارت کے بارے میں بھی بتاتی جا رہی تھی۔ ہوا محل کو دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ باہر کی طرف نیچے سے اوپر تک لاتعداد محرابیں تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے جھروکے بنے ہوئے تھے۔ گلابی رنگ کی یہ عمارت بہت خوب صورت تھی۔

ہم مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے جنتر منتر پہنچ گئے۔ یہ بہت وسیع و عریض پارک تھا جہاں آبزرویٹری بنی ہوئی تھی۔ قدیم طرز کی یہ آبزرویٹری مہاراجا جے سنگھ ثانی نے ۱۷۲۸ء میں بنوائی تھی۔

ہم کار سے اتر کر دیر تک جنتر منتر کے مختلف حصوں میں گھومتے رہے۔ روپ متی مجھے ہر چیز کے بارے میں اسی طرح بتا رہی تھی جیسے میں صرف سیاحت کے لیے یہاں آیا ہوں اور وہ میری گائیڈ ہو۔

ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ میرے ساتھ چلتے ہوئے روپ متی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے ساتھ میری موجودگی پر بڑا فخر کر رہی ہو۔ لوگ بھی مڑ مڑ کر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ جب کوئی عورت میری طرف دیکھتی تو روپ متی یا تو میرا ہاتھ پکڑ لیتی یا میرے ساتھ جڑ کر چلنے لگتی۔

اس پارک کے ایک حصے میں کھانے پینے کی اشیا کے لاتعداد ٹھیلے بھی کھڑے تھے۔ وہیں ایک ٹھیلے کے قریب کھڑے ہو کر ہم نے بھیل پوری کھائی اور ایک دوسرے ٹھیلے سے ناریل میں اسٹرا لگا کر میٹھا پانی پیا۔

روپ متی مجھے شہر کے مختلف حصوں میں گھماتی رہی۔ میں ہر عمارت اور ہر راستے کو ذہن نشین کرتا رہا۔ آج کی یہ سیر بعد میں میرے کام آسکتی تھی۔

مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے بالآخر ہم جوہری بازار پہنچ گئے۔ یہ شہر کا گنجان آباد اور بارونق کمرشل ایریا تھا۔ یہاں ہر قسم کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور پورا علاقہ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ یوں تو مقامی باشندوں کا بھی خاصا رش تھا مگر غیر ملکی سیاح بھی بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ یہاں کپڑے، 'ریڈی میڈ گارمنٹس' لکڑی کی آرائشی مصنوعات، ماربل کی مصنوعات اور زیورات کی بے شمار دکانیں تھیں۔ راجستھانی زیورات کو ان دکانوں میں نمایاں طور پر سجایا گیا تھا۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے ایسی جگہوں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ روپ متی کے اس انکشاف پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ راجستھان میں ہر سال چھ لاکھ غیر ملکی سیاح آتے ہیں۔

روپ متی نے کار ایک بڑی عمارت کے سامنے پارکنگ لاٹ پر چھوڑ دی تھی اور ہم دونوں پیدل ہی چلتے رہے۔ اس علاقے کو دیکھ کر مجھے سنگاپور کا لٹل انڈیا یاد آگیا۔

روپ متی ایک اور کشادہ بازار میں گھوم گئی۔ یہاں بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ روپ متی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جیسے اندیشہ ہو کہ میں اس ہجوم میں کھو جاؤں گا یا اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

اور بالآخر وہ کپڑے کی ایک بہت بڑی دکان میں داخل ہو گئی۔ اسے کپڑے کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور کہا جا سکتا تھا۔ ایک حصہ مردانہ کپڑوں اور دوسرا حصہ زنانہ کپڑوں پر مشتمل تھا۔ ریکس میں تھان آراستہ تھے اور شوکیسوں میں ڈمیوں پر خوب صورت ساڑیاں سجی ہوئی تھیں۔

اس دکان میں بھی خاصا رش تھا۔ کئی سیلزمین تھے جو گاہکوں سے نمٹنے میں مصروف تھے۔ دائیں طرف آخر میں کیش کاؤنٹر تھا جہاں سانولی رنگت اور تیکھے نقوش والی ایک جوان لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سفید پاجامہ اور سفید کلف لگا ہوا کرتہ۔ پیشانی پر سرخ ٹیکا چمک رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔

روپ متی کو دیکھتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ گیا۔ اس نے بڑے پُرجوش انداز میں آگے بڑھ کر روپ متی کا استقبال کیا۔

"دھن بھاگ ہمارے (ہماری خوش قسمتی) راج کماری روپ متی جی۔ بہت عرصے بعد درشن دیے ہو اپنے۔" سیٹھ دھنی رام کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ تھی۔

"ذرا مصروفیت رہی۔ اس طرف آنے کا موقع نہیں ملا سیٹھ جی۔" روپ متی نے جواب دیا۔

"تھوڑی دیر پہلے ٹھاکر بھنور سنگھ بھی آئے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ آپ نے کوئی ہیرا خریدا ہے۔ کیا وہ۔۔۔" اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں دھنی رام جی۔" روپ متی نے جواب دیا "یہ میرے دوست ہمت سنگھ ہیں۔ یہ کل ہی دہلی سے آئے ہیں۔ دوران سفر ہیں کوئی مسافر غلطی سے ان کا سوٹ کیس اٹھا کر لے گیا۔ ان کے لیے کچھ کپڑے سلوانے ہیں۔"

"غلطی سے نہیں روپ متی جی۔" دھنی رام مسکرایا "ٹرینوں میں چوری کی وارداتیں عام ہوگئی ہیں۔ کوئی چور تاک میں ہوگا۔ انہیں غافل پاکر سوٹ کیس اٹھا لے گیا۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا شریمان جی؟" اس نے آخری الفاظ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"کم یا زیادہ۔ اس سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے جواب دیا۔ مجھے روپ متی کے جھوٹ بولنے پر بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میرے بارے میں بتاتے ہوئے وہ یہ بات بھی جانتی ہوگی کہ جلد یا بدیر اس کا یہ جھوٹ کھل جائے گا۔

دھنی رام نے کاؤنٹر کی پچھلی دیوار پر لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد کاؤنٹر کے ساتھ تنگ سے زینے سے ایک آدمی اتر کر نیچے آگیا۔ دکان کے اوپر والے حصے میں درزی خانہ تھا اور وہ آدمی ٹیلر ماسٹر تھا۔ دھنی رام نے اسے میرے بارے میں بتایا اور جب ٹیلر ماسٹر نے مجھے اوپر آنے کا اشارہ کیا تو روپ متی بھی ہمارے ساتھ ہی اوپر آگئی۔

اوپر بہت بڑا درزی خانہ تھا۔ کئی کاریگر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں۔ ٹیلر ماسٹر نے ایک فیشن بک ہمارے سامنے رکھ دی۔ روپ متی فیشن بک کھول کر دیکھنے لگی۔

روپ متی نے میرے کپڑوں کے ڈیزائن بھی اپنی مرضی سے پسند کیے۔

ایک گھنٹے بعد ہم نیچے آگئے۔ کپڑا پسند کرنے میں بھی ایک گھنٹا لگ گیا اور بالآخر ہم اس دکان سے باہر آگئے۔

"تم نے دھنی رام سے میرے بارے میں جھوٹ کیوں بولا؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "کیا تم سمجھتی ہو کہ اسے پتا نہیں چلے گا کہ میں کون ہوں بلکہ میں تو جانتا ہوں کہ اس نے تمہاری بات کا یقین ہی نہیں کیا ہوگا اور سمجھ گیا ہوگا کہ میں ہی وہ غلام ہوں جسے۔۔۔"

"اس غلام کو تو میں نے اسی وقت آزاد کردیا تھا جب اس نے جنگل میں بلونت سنگھ اور اس کے گرگوں سے میری جان بچائی تھی۔" روپ متی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اور اب میں تمہاری زبان سے کبھی غلام کا لفظ نہ سنوں۔ میری طرف سے آخری وارننگ ہے۔ سمجھے!"

"جی مالکن۔" میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" اس نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ مجھے مسکراتے پاکر اس کے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔

اس وقت نو بجنے والے تھے۔ مرسیڈیز ایک بار پھر مختلف سڑکوں پر دوڑنے لگی اور بالآخر بھوانی سنگھ روڈ پر رام باغ پیلس ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہو کر پارکنگ لاٹ میں رک گئی۔ وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا یہ ڈی لکس ہوٹل تھا۔

یہاں جس طرح روپ متی کا سواگت (استقبال) ہوا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ اکثر یہاں آتی رہتی تھی۔ ڈائننگ ہال بھی پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ ہمیں ایک میز مل گئی جس پر "ریزرو" کی تختی رکھی ہوئی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی ہیڈ ویٹر نے وہ تختی ہٹا دی۔ میں سمجھ گیا کہ روپ متی نے حویلی سے نکلنے سے پہلے فون کر کے میز ریزرو کروائی ہوگی۔

کھانے کے بعد ہم ریکریشن ہال میں آگئے۔ یہاں روپ متی کے کئی جانکار (شناسا) تھے۔ وہ اپنے ملنے والوں سے بڑے فخر سے میرا تعارف ہمت سنگھ کے نام سے کرا رہی تھی۔ روپ متی میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ میں نے کئی عورتوں کی نظروں سے حسد کی چنگاریاں بھی پھوٹتی دیکھی تھیں اور بعض کی نظروں میں رشک بھی نمایاں تھا۔ کچھ آدمی ایسے بھی تھے جنہوں نے میری طرف بڑی نفرت

نگاہوں سے دیکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کسی وقت روپ متی کے قریب رہ چکے تھے اور اب مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر ان کے دلوں میں حسد و رقابت کے جذبات جاگ اٹھے تھے۔

ہر میز پر کوئی نہ کوئی جوان اور حسین عورت موجود تھی۔ یہ یا تو شکاری عورتیں تھیں یا ان کا تعلق ایسے گھرانوں سے تھا جہاں شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ان عورتوں کے لباس ہی نہیں حرکات بھی شرمناک تھیں۔ میں نے سنگاپور اور تھائی لینڈ کے ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں بڑے شرمناک مناظر دیکھے تھے۔ ہندوستان کے بارے میں سنا تھا کہ یہ پس ماندہ ملک ہے جہاں عورت کو آزادی حاصل نہیں ہے لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر تو میں کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان کی عورت سب سے زیادہ آزاد ہے۔ ایک مثال تو روپ متی کی صورت میں میرے سامنے تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس نے پابندی کی تمام زنجیروں کو توڑ دیا تھا۔ مذہبی رسم و روایات سے بغاوت کرکے وہ راہ اپنائی تھی جو بہت ہی شرمناک تھی۔ ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نئے مرد کو پہلو میں لے کر چلنے کو وہ اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتی تھی۔

ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہاں روپ متی کے جاننے والے دو افراد اور بھی تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ مرد کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی جبکہ عورت کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ اپنی شکل و صورت، لباس اور باتوں ہی سے فاحشہ لگتی تھی۔ مرد بھی بہت گھاگ تھا۔

میز پر انگلش وہسکی کی بوتل رکھی ہوئی تھی جو ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں آدھی سے زیادہ خالی ہو چکی تھی۔ مجھے شراب سے نفرت تھی اور میں روپ متی کو بھی بار بار ٹوک رہا تھا لیکن وہ دوسری عورت۔۔۔ وہ نہ صرف خود سوڈا ملائے بغیر پی رہی تھی بلکہ اپنے ہاتھ سے اپنے ساتھی کو بھی پلا رہی تھی اور اس کا ساتھی اپنا گلاس بار بار روپ متی کے ہونٹوں سے لگا رہا تھا اور روپ متی بھی خالص وہسکی حلق میں انڈیلتی جا رہی تھی۔

اسٹیج پر ایک رقاصہ تھرکتے ہوئے اپنے نیم عریاں جسم کی نمائش شروع کر چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسٹیج سے اتر کر ہال میں میزوں کے گرد چکرانے لگی۔ یہ ڈی لکس ہوٹل تھا۔ فائیو اسٹار سے بھی اوپر کی چیز۔ گاہک ایسے تھے جن کا شمار شہر کے معززین میں ہوتا تھا۔ صنعت کار، بزنس مین اور سیاست داں، سابق راجے اور مہاراجے۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کے ہونٹوں سے نکلا ہوا ایک جملہ اسٹاک مارکیٹ کو کریش کر سکتا تھا یا سیاست کا رخ بدل سکتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شہر کی ان معزز ترین ہستیوں اور گندے خانے میں ٹھرا یا تاڑی پی کر ہنگامہ کرنے اور گندی گالی بکنے والے شرابیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ بھی تاڑی یا ٹھرا پی کر بہک جاتے ہیں اور یہ معززین بھی انگلش وہسکی پی کر بے قابو ہو رہے تھے۔ کوئی میزوں کے درمیان گھومتی رقاصہ کو پکڑ کر اپنی آغوش میں گرانے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت کو بے لباس کرنے کی کوشش میں تھا۔

ایک کے بعد دوسری رقاصہ آتی رہی اور اپنے جسم کی نمائش کرکے شہر کے ان باعزت لوگوں کے جذبات کی آگ بھڑکاتی رہی۔

ایک بجنے والا تھا۔ روپ متی اب کسی قدر بہکنے لگی تھی۔ میری قوت برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کرسی سے اٹھا لیا۔

"بس کرو اب!" میں نے اس کے دوسرے ہاتھ سے گلاس لے کر میز پر پٹخ دیا "اور پیو گی تو یہیں ڈھیر ہو جاؤ گی۔"

"تت۔۔۔ تم کون ہوتے ہو مم۔۔۔ مجھے روکنے والے۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔ پیوں گی۔۔۔ اور۔۔۔ اور پیوں گی۔" روپ متی نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اور نہیں پینے دوں گا۔ اب گھر چلو۔" میں نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

"تت۔۔۔ تمیز سے۔۔۔ بات کرو۔ تم میرے غلام ہو۔ مم۔۔۔ ما۔۔۔ لک نہیں۔ مم۔۔۔ میں نے تمہیں تین لاکھ میں خریدا۔۔۔ تھا۔"

وہ ایک بار پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح میرے دل پر لگے تھے۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ایک لمحے تو ذہن میں خیال آیا کہ اسے چھوڑ دوں۔ آخر میں اس کا غلام ہی تو تھا۔ مجھے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں تھا لیکن۔۔۔ میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ میں غلام ضرور تھا لیکن وفاداری بھی میری سرشت میں تھی اور ایک وفادار غلام اپنی مالکن کو اس حالت میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے اس مرد اور عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں روپ متی کی بات پر چونک گئے تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات بدل گئے۔ وہ دونوں بلانوش تھے۔ زیادہ شراب پینے کے باوجود وہ نہیں بہکے تھے جبکہ روپ متی کے دماغ پر اثر ہونے لگا تھا۔

میں نے میز پر رکھا ہوا روپ متی کا بیگ دوسرے ہاتھ میں اٹھایا اور اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ روپ متی چیخی چلائی تو نہیں البتہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش ضرور کرتی رہی۔ ہم دروازے سے دو تین قدم ہی رہ گئے تھے کہ ایک ویٹر نے راستہ روک لیا۔

"ایکسکیوزمی سر۔"

"کیا بات ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"بل۔" ویٹر بولا "میڈم کا بل پے نہیں ہوا سر۔" اس نے بل کی پرچی مجھے دکھائی۔

میں نے روپ متی کو چھوڑ دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں نے ویٹر کے ہاتھ سے پرچی جھپٹ لی۔ تین ہزار سے اوپر کا بل تھا۔ میں نے روپ متی کا پرس کھولا۔ اس میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ میں نے مطلوبہ رقم نکال کر ویٹر کے ہاتھ میں تھما دی، پرس اپنے کندھے پر لٹکایا اور روپ متی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا ہال سے باہر لے آیا۔ اس مرتبہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔

لابی سے گزرتے ہوئے ایک اور آدمی نے ہمارا راستہ روک لیا۔

"اے۔" اس شخص کا لہجہ بہت اکھڑ تھا۔ حلیے سے بھی وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا۔ وہ اس کلاس کا بھی نہیں تھا جو ایسے بڑے ہوٹلوں میں آمد و رفت اور اخراجات کے متحمل ہو سکتے ہیں "اے۔" وہ ایک بار پھر مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا "روپ متی جی کو اس طرح گھسیٹ کر کدھر لے جانے کا ہے؟"

"جہنم میں۔ تم کون ہو؟" میں نے بھی اسی طرح کرخت لہجے میں جواب دیا۔

میرے لہجے کی غراہٹ نے اس شخص کو وہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں روپ متی کو کھینچتا ہوا پارکنگ میں لے آیا۔ اس کی کار کے قریب پہنچ کر میں نے اس کے پرس میں سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر روپ متی کو ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیل دیا اور چابی دروازے کے لاک سے نکال کر اگنیشن میں لگا دی۔

"دوسری طرف کا لاک کھولو اور انجن اسٹارٹ کرو۔" میں نے کہا اور کار کے سامنے سے گھوم کر دوسری طرف آ گیا۔

اور ٹھیک اسی وقت وہ آدمی بھی پارکنگ میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ ان دونوں کے تیور اچھے نہیں دکھائی دیتے تھے۔

"اے۔" وہی شخص آگے بڑھتے ہوئے غرایا "روپ متی جی کو چھوڑ دو ورنہ ہم تمہارا ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

"دیکھو۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا "میں روپ متی کو اغوا کرکے نہیں لے جا رہا۔ میں اس کا دوست ہوں۔ اس نے شراب زیادہ پی لی ہے اس لیے میں اسے زبردستی وہاں سے نکال کر لایا ہوں۔ ویسے تم لوگ کون ہو اور روپ متی سے تمہارا کیا تعلق ہے۔"

"روپ متی تو ہمارے دلاں کی رانی ہووے ہے۔" اس شخص نے جواب دیا "اب تم چلے جاؤ۔ ہم اس کو گھر چھوڑ دیواں گا۔"

میرا خون کھول اٹھا۔ روپ متی کے بارے میں نئے نئے انکشاف ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اتنا گرا لیا تھا کہ ان جیسے تھرڈ ریٹ غنڈے بھی آس لگائے بیٹھے تھے۔

میں نے ان دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو لڑنے پر بضد تھے۔ روپ متی نشے میں تھی اور ان دونوں کا خیال تھا کہ مجھے راستے سے ہٹا کر وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے لیکن میں ایسا کیوں ہونے دیتا۔ میں نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر ان میں سے ایک نے چاقو نکال لیا۔

اب میری قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ شخص چاقو لہراتا ہوا آگے بڑھا۔ میں نے کندھے پر لٹکا ہوا روپ متی کا پرس کار کی چھت پر رکھ دیا اور گھوم کر بڑی تیزی سے لات چلا دی۔ میرے پیر کی ٹھوکر اس کے ہاتھ پر لگی۔ چاقو اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا چھ یا پانچ فٹ کار کے پیچھے جا گرا۔

وہ شخص حملہ آور ہونے کے لیے میری طرف لپکا۔ میں نے بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ کر ٹانگ گھما دی۔ اس مرتبہ میرے پیر کی ٹھوکر اس کے ٹخنے سے ذرا اوپر پنڈلی پر لگی۔ وہ کراہتا ہوا نیچے گرا۔

میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھتے ہوئے دوسرے شخص کے پہلو میں سائیڈ کک رسید کر دی۔ وہ بھی کراہتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ وہ دونوں غنڈے ہوں گے۔ لڑنا بھی جانتے ہوں گے لیکن اسٹریٹ فائٹنگ اور لڑائی کی ٹیکنیک کے استعمال میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

وہ دونوں سنبھل گئے تھے۔ اس مرتبہ ان دونوں نے بیک وقت میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ کوشش کے باوجود میں

ا ... ب کو نہیں بچا سکا۔ وہ مجھے رگیدتے ہوئے ایک دوسری نار تک لے گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑی پھرتی سے مجھے پیچھے سے گرفت میں لے لیا اور دوسرا میرے پیٹ اور سینے پر گھونسے برسانے لگا۔

اس دوران میں کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ روپ متی کی کار تھی جو ایک جھٹکے سے حرکت میں آگئی تھی۔ اس کی چھت پر رکھا ہوا پرس نیچے گر گیا۔

میں ان دونوں سے پٹ رہا تھا مگر میرا دھیان روپ متی کی طرف تھا۔ وہ نشے میں تھی اور کار کو بڑے خطرناک انداز میں پارکنگ سے نکال کر لے گئی تھی۔ گیٹ پر بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد کار پھر خطرناک انداز میں اچھل کر آگے بڑھی تھی۔

وہ شخص اب بھی مجھ پر گھونسے برسا رہا تھا۔ ایک گھونسا میرے منہ پر لگا۔ ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ میں نے اپنا سارا بوجھ اس شخص پر ڈال دیا جس نے مجھے پیچھے سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر میں نے دونوں پیر پوری قوت سے سامنے والے شخص کے سینے پر رسید کردیے۔ وہ بلبلاتا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔

اپنے پیر زمین پر ٹکتے ہی میں بڑی تیزی سے نیچے جھکا۔ دوسرا شخص بھی میرے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں نے ان دونوں پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

"اے۔ کون ہے۔ ادھر کیا ہو رہا ہے؟"

یہ آواز سنتے ہی وہ دونوں اٹھ کر پارکنگ ایریا کی عقبی سمت میں بھاگ نکلے۔ میں نے جھک کر روپ متی کا پرس اٹھا لیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

وہ پارکنگ کا نگران تھا۔ اس نے روپ متی کی کار کو خطرناک انداز میں نکلتے ہوئے دیکھا تھا اور ہمارے لڑنے کی آوازیں سن کر اس طرف آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول بھی نظر آرہا تھا۔

"کیا ہوا حکم! وہ کون لوگ تھے؟" اس نے میرے قریب آکر پوچھا۔ وہ مجھے پہلے روپ متی کے ساتھ دیکھ چکا تھا ورنہ ممکن ہے کسی شک میں مجھے ہی دھر لیتا۔

"بدمعاش تھے۔" میں نے جواب دیا "میری دوست کا پرس چھین کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھاگ گئے سالے۔"

"کدھر گئے وہ؟" نگران نے پوچھا۔

"اس طرف۔" میں نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا "پیچھے جانا بیکار ہے۔ اب وہ ہاتھ نہیں آئیں گے۔"

نگران نے میرا مشورہ مان لیا اور ان بدمعاشوں کا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی اور پھر میرے ہونٹوں سے خون بہتے دیکھ کر وہ چونک گیا۔

"آپ زخمی ہو حکم۔ آپ کے منہ سے رت (خون) بہہ رہا ہے۔" اس کے لہجے میں تشویش تھی "آؤ۔ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ معمولی چوٹ ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" میں نے انگلیوں سے ہونٹ ٹٹولتے ہوئے جواب دیا۔ نگران نے اپنی جیب سے رومال نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں اس کے ہاتھ سے رومال لے کر ہونٹوں سے بہنے والا خون پونچھنے لگا۔ مجھے روپ متی کی طرف سے تشویش تھی۔ وہ نشے میں تھی اور بڑے خوفناک انداز میں کار کو پارکنگ سے نکال کر لے گئی تھی۔ وہ راستے میں کسی حادثے کا شکار بھی ہوسکتی تھی۔

میں نگران کا شکریہ ادا کرکے پارکنگ سے باہر آگیا۔ گیٹ پر بھی ایک باوردی گن مین کھڑا تھا۔ وہ بھی مجھے روپ متی کے ساتھ آتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور ظاہر ہے اس نے روپ متی کو واپس جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ میں زنانہ پرس تھا اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ ان حالات میں مجھے کوئی اٹھائی گیر ہی سمجھا جاسکتا تھا لیکن گن مین چونکہ مجھے پہلے روپ متی کے ساتھ کار میں یہاں آتے دیکھ چکا تھا اس لیے اسے مجھ پر کوئی شبہ نہیں ہوا۔ اس کے برعکس اس کی نگاہوں میں تشویش تھی۔

"وہ گاڑی کس طرف گئی ہے۔ میرا مطلب ہے روپ متی کی گاڑی؟" میں نے گارڈ سے پوچھا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"کماری جی کی گاڑی اس طرف گئی ہے حکم۔" گارڈ نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا مگر چند قدم چلنے کے بعد رک گیا۔ میرے دماغ میں اچانک ہی آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ روپ متی سے اور ان حالات سے نجات حاصل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ روپ متی شراب کے نشے میں بڑی تیزی سے گاڑی لے گئی تھی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ خیریت سے گھر پہنچ سکے گی۔ راستے میں وہ کسی خوفناک حادثے کا شکار بھی ہوسکتی تھی۔

میرے پاس روپ متی کا پرس تھا جس میں ہزاروں روپے کی رقم موجود تھی۔ میں یہ رات کہیں بھی گزار لیتا اور صبح سویرے پشکر کے لیے روانہ ہوجاتا۔ وہاں کامنی کا مارشل آرٹس ٹریننگ سینٹر تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ ہوگا اور مجھے یقین تھا کہ جانکی بھی وہیں ہوگی۔ ہم دونوں کامنی کی مدد سے نہایت آسانی سے ہندوستان سے نکل سکتے تھے۔

یہ خیال آتے ہی میں ایک طرف چل پڑا لیکن چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میرے قدم ایک بار پھر رک گئے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ جس عورت نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ بھاری رقم خرچ کرکے مجھے غلام کی حیثیت سے خریدا تھا مگر میرے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس نے مجھے تمام آسائشیں مہیا کی تھیں۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ میرے لیے کپڑے بنوانے کے لیے ہزاروں روپے خرچ کرکے آئی تھی۔ کیا میں اس عورت کو دھوکا دوں جس نے میرے ساتھ اس قدر ہمدردی کا سلوک روا رکھا تھا؟ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں اس کی اپنی بھی کوئی غرض پوشیدہ تھی لیکن مجھے زیب نہیں دیتا تھا کہ میں اس کے ساتھ دھوکا کروں۔ اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں۔ میں نے تو اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی کھلی جنگ لڑی تھی۔ ہمیشہ للکار کر سامنے سے وار کیا تھا۔ میں نے تو وارا جیسے دشمن پر بھی کبھی دھوکے سے وار نہیں کیا تھا۔ روپ متی تو میری محسنہ تھی۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور شخص مجھے خرید لیتا تو وہ مجھے غلام بنا کر ہی رکھتا۔ میرے گلے میں غلامی کا طوق ہوتا اور شاید پیروں میں بیڑیاں بھی لیکن روپ متی نے میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو بڑے فخر سے اپنے جاننے والوں سے دوست کی حیثیت سے میرا تعارف کرایا تھا۔ ہوٹل میں صرف ایک مرتبہ اس نے مجھے غلام کہا تھا۔ وہ اس وقت شراب کے نشے میں تھی لیکن اگر اس نے مجھے غلام کہہ بھی دیا تھا تو غلط نہیں کہا تھا۔ میں اس کا غلام ہی تو تھا۔

میرا ضمیر مجھے کچوکے لگا رہا تھا۔ کیا میں روپ متی کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں جبکہ اس وقت وہ میری ہمدردی اور توجہ کی مستحق تھی۔ اسے میری ضرورت تھی۔

نہیں۔ میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ دھوکا اور فریب میری سرشت میں شامل نہیں تھا۔ میں نے سر جھٹک کر پراگندہ خیالات کو ذہن سے نکال دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ہوٹل کے گیٹ کی طرف سے ایک خالی ٹیکسی اسی طرف آرہی تھی۔ میں نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا اور ٹیکسی جیسے ہی میرے قریب رکی، میں جھٹ سے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ میرے ہونٹوں سے اب بھی خون رس رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا رومال بھی خون سے تر ہوچکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے سامنے لگے ہوئے آئینے کو ایڈجسٹ کرکے مجھے دیکھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بولا۔

"کہاں چلوں حکم۔ اسپتال یا پولیس اسٹیشن!"

"سیدھے چلتے رہو۔ میں تمہیں راستہ بتا دوں گا۔" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔"

"منہ پر چوٹ کیسے لگی حکم؟" ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں دو غنڈوں نے میری دوست کا پرس چھیننے کی کوشش کی تھی۔ پرس اور اپنی دوست کو بچانے کی کوشش میں ان میں سے کسی کا ہاتھ پڑ گیا۔" میں نے جواب دیا۔

ٹیکسی کی رفتار تیز ہوگئی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے راستوں کا پتا چل جائے گا مگر بڑی مایوسی ہوئی۔ ڈرائیور میری ہدایت پر ٹیکسی کو مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا اور بالآخر اس نے ایک جگہ ٹیکسی روک لی۔

"رات کے دو بج رہے ہیں حکم۔" اس نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر پولیس والوں نے روک لیا تو تمہارا حلیہ دیکھ کر تمہیں تھانے پہنچا دیں گے۔ تمہیں جانا کہاں ہے۔ مجھے جگہ کا نام بتاؤ۔"

"جگہ کا نام ہی تو پتا نہیں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا ... "میں اس شہر میں نیا ہوں۔ وہ راستہ بھی بھول گیا ہوں جس طرف سے آیا تھا۔"

"کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس یا کسی کے گھر مہمان ٹھہرے ہوئے ہو؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"روپ متی۔ راج کماری روپ متی نام ہے اس کا۔ میں اسی کی حویلی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ایسا بولنے کا ہے نا۔" ڈرائیور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

اور پھر ٹھیک پندرہ منٹ بعد ٹیکسی روپ متی کی حویلی کے گیٹ کے سامنے رک رہی تھی۔ میں نے پرس کھول کر ڈرائیور کو منہ مانگا کرایہ ادا کردیا اور آگے بڑھ کر گیٹ کے ستون پر نصب کال بیل کا بٹن دبا دیا۔

دو منٹ بعد گیٹ کی چھوٹی سی کھڑکی سے کسی نے جھانک کر دیکھا اور پھر ذیلی دروازہ کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوگیا۔ وہ تارا سنگھ تھا جو عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا

تھا۔

"روپ متی آگئی یا نہیں؟" میں نے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔

"مالکن تو آگئی۔ بہت دیر ہوئی۔" تارا سنگھ نے جواب دیا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے چلنے لگا۔ پورچ میں لینڈ کروزر کے پیچھے مرسیڈیز کھڑی تھی۔ میں جیسے ہی برآمدے میں داخل ہوا' دروازہ کھل گیا۔ وہ مندری تھی جو اب تک جاگ رہی تھی اور اس نے غالباً جالی والے دروازے سے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میری حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

"روپ متی کہاں ہے؟" میں نے مندری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اوپر۔ اپنے کمرے میں۔" مندری نے جواب دیا "مگر تمہیں کیا ہوا۔ یہ کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"جھگڑا ہو گیا تھا۔" میں یہ کہتے ہوئے زینے کی طرف بڑھ گیا۔

روپ متی اپنے کمرے میں موجود تھی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہر چیز بکھری ہوئی تھی۔ کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نظر نہیں آ رہی تھی۔

میرے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ روپ متی خیریت سے تھی۔ اسے راستے میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تھا۔ البتہ وہ گھر آنے کے بعد اپنا غصہ اس طرح اتار رہی تھی کہ اس کا کمرا کسی میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ کچھ اور بھڑک گئی اور بیڈ پر پڑی ہوئی لوشن کی ایک بوتل اٹھا کر میری طرف کھینچ ماری۔ میں بڑی پھرتی سے جھک کر اپنے آپ کو بچا گیا۔ بوتل دیوار پر لگ کر ٹوٹ گئی۔ لوشن بکھر گیا۔ کمرے کی فضا میں تیز خوشبو پھیل گئی۔

روپ متی اب بھی نشے میں تھی۔ وہ کوئی اور چیز اٹھانے کے لیے جھکی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دونوں بانہوں میں پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"ہوش میں آؤ روپ متی۔" میں نے درشت لہجے میں کہا "تم نشے میں ہو۔ تمہیں نہیں معلوم' کیا کر رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔"

"مم۔ میں نشے... میں ہوں۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اور اپنے آپ کو مجھ سے چھڑا کر دو قدم دور ہٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی شرٹ کے گریبان پر رکھے اور ایک زوردار جھٹکے سے قمیص پھاڑ ڈالی "یہ یہ دیکھو۔ شرٹ سیدھی پھٹی ہے نا۔ اگر میں نشے... میں ہوتی تو یہ ٹیڑھی سیدھی... نہ پھٹتی۔ مم... میں... میں نشے میں نہیں ہوں۔ تم نکل جاؤ۔ یہاں سے..."

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پانی کا جگ رکھا ہوا تھا۔ میں نے جگ اٹھا کر روپ متی پر انڈیل دیا۔ وہ چیخ اٹھی اور مارنے کے لیے میری طرف لپکی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ایک ہاتھ کی گرفت میں لے لیے اور دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر دو چار کرارے طمانچے جڑ دیے۔ وہ چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے چند گندی گالیاں بھی نکلی تھیں لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی اور اسے دھکا دے کر بیڈ پر گرا دیا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ تھپڑوں سے اس کا دماغ ٹھکانے پر آگیا تھا۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ میرے سامنے کھڑی چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

مجھے روپ متی کی حالت پر واقعی ترس آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹی سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس دوران میں آہٹ سن کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور باہر مندری کھڑی تھی۔ وہ غالباً میرے پیچھے ہی اوپر آگئی تھی اور باہر کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔

میں نے روپ متی کو بیڈ پر ڈال دیا۔ وہ بستر پر اوندھی پڑی سسکیاں بھرتی رہی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ مندری آگے آنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا اور اوندھی پڑی ہوئی ایک کرسی سیدھی کر کے بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔

روپ متی اوندھی پڑی سسکیاں بھرتی رہی۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگا جس میں مجھے تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔

لوشن کی جو بوتل دیوار پر لگ کر ٹوٹی تھی اس کی کرچیاں دیوار کے قریب بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے موٹی موٹی کرچیاں اٹھا کر ایک طرف ڈال دیں۔ لوشن گرنے سے قالین پر دھبہ پڑ گیا تھا۔

میں دوبارہ بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھا تو روپ متی اس وقت بھی بستر پر اوندھی پڑی تھی اور سسکیاں اب بھی جاری

"مالکن!" میں نے دھیمے لہجے میں پکارا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"تم نے پھر مجھے مالکن کہا۔" اس کے لہجے میں اب بھی کپکپاہٹ تھی۔

"میں تو آپ کا غلام ہوں مالکن۔" میں نے جواب دیا "اور کوئی غلام اپنی مالکن سے بدتمیزی سے بات نہیں کر سکتا۔ ہوٹل میں مجھ سے گستاخی ہوئی تھی۔ اس کی معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیا اور مجھ سے لپٹ کر ایک بار پھر رونے لگی۔ پہلے میں غصے میں تھا لیکن اب پُرسکون تھا۔ وہ مجھ سے لپٹی تو میں اپنے آپ میں عجیب سنسنی محسوس کرنے لگا۔ میں اسے الگ ہٹانا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے بڑی سختی سے اپنی بانہوں کے شکنجے میں لے رکھا تھا اور جب میں اسے اپنے سے الگ کرنے میں کامیاب ہوا تو اس نے شاید پہلی مرتبہ توجہ سے میری طرف دیکھا تھا۔ میرا کٹا ہوا اور سُوجا ہوا ہونٹ دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔

"یہ... یہ کیا ہوا؟" وہ میرے ہونٹوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں۔ ٹھوکر لگنے سے گر گیا تھا۔ منہ پر چوٹ لگ گئی۔" میں نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"بعض لوگ کوشش کے باوجود ڈھنگ سے جھوٹ بھی نہیں بول سکتے اور تم بھی ان میں سے ایک ہو۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "بتاؤ کیا ہوا تھا۔ چوٹ کیسے لگی تھی؟"

میں چند لمحے خاموش رہا پھر اسے بتانے لگا کہ چوٹ کیسے لگی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" وہ مدھم لہجے میں بولی "میری وجہ سے تمہیں اتنا کشٹ (مشکل) اٹھانا پڑا۔"

اس نے بیڈ سے اتر کر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی باتھ روم میں لے گئی اور میڈی سن کیبنٹ کھول کر اینٹی سیپٹک لوشن کی ایک بوتل نکال لی اور کاٹن کے ایک رول سے ٹکڑا توڑ کر الگ کرنے لگی۔

روپ متی میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ میرے اور اس کے بیچ تین چار انچ کا فاصلہ تھا۔ اس کی قمیص سامنے سے پھٹی ہوئی تھی اور وہ لوشن سے بھیگی ہوئی کاٹن سے میرے ہونٹ صاف کر رہی تھی۔ میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں اس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا مگر میری نظریں کم بخت بار بار اسی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لوشن کی بوتل اور کاٹن لے لی۔

"لاؤ۔ میں خود لگا لیتا ہوں۔ تم کمرے میں جا کر کپڑے بدل لو۔" میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ رخسار پر پڑنے والا ننھا سا ڈمپل پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگا۔

"اوہ! سمجھ گئی۔" وہ بولی "ہونٹ صاف کر کے وہ کریم لگا لینا۔" اس نے کیبنٹ میں رکھی ہوئی ایک ٹیوب کی طرف اشارہ کیا اور باتھ روم سے باہر نکل گئی۔

میں دیوار میں لگے ہوئے قدِ آدم آئینے کی طرف گھوم گیا۔ میرا نچلا ہونٹ درمیان سے کٹ گیا تھا۔ اوپر کا ہونٹ بھی سوجا ہوا تھا۔ میں نے خون اچھی طرح صاف کر کے ٹیوب والی کریم لگالی اور باتھ روم سے باہر آگیا۔

روپ متی کپڑے بدل چکی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ میری توقع کے عین مطابق مندری بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کافی بنا کر لانے کو کہا اور دوبارہ کمرے میں آگیا۔ روپ متی بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"ہوٹل میں جو کچھ بھی ہوا تھا مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے جو کچھ بھی کیا' بہت ٹھیک کیا۔" روپ متی نے جواب دیا "شرمندگی تو مجھے ہے کہ میں نے نشے میں تمہیں نجانے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ اس بات کی خوشی بھی ہے کہ کوئی تو میرا ہاتھ روکنے والا ہے۔ جسے مجھ سے واقعی ہمدردی ہے۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا ہرگز نہ کرتا بلکہ گلاس بھر بھر کے مجھے اپنے ہاتھ سے پلاتا۔ سب لوگ اب تک ایسا ہی کرتے رہے ہیں۔ تم ان لوگوں سے بالکل مختلف ثابت ہوئے ہو۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کئی لمحات خاموشی میں بیت گئے۔ وہ ایک بار پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"تم نے موقع سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ میں تمہیں ہوٹل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ اس وقت میں نشے میں تھی۔ ہوش میں نہیں تھی۔ مجھے احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ

تمہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ تم اگر چاہتے تو کہیں بھی جا سکتے تھے۔ تمہارے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی مگر تم سیدھے یہاں چلے آئے اور یہاں آکر بھی تم نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کوئی اور ہوتا تو بھیڑیے کی طرح رات بھر مجھے بھنبوڑتا رہتا۔ میرے شریر (بدن) کی بوٹیاں نوچتا رہتا۔ میں نشے میں تھی۔ مجھے کچھ پتا نہ چلتا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے مگر تم مجھے تھپڑ مار مار کر ہوش میں لے آئے۔" وہ بات کرتے ہوئے اپنے گال سہلانے لگی۔

میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں گالوں پر میری انگلیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ غصے میں ہاتھ زیادہ ہی سخت پڑ گیا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ مجھے تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔" میں نے ندامت کا اظہار کیا۔

"نہیں۔ تم نے بہت ٹھیک کیا۔" روپ متی بولی "اگر تم ہاتھ نہ اٹھاتے تو میں ہوش میں نہ آتی اور مجھے ان باتوں کا احساس بھی نہ ہوتا۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "یہ درست ہے کہ تم نے مجھے ایک بڑی رقم خرچ کر کے خریدا تھا لیکن تم نے میرے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ تم میری محسنہ ہو اور میں اپنی محسنہ کو برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"برباد تو میں پہلے ہی ہو چکی ہوں۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن مجھے خوشی ہے کہ تمہاری صورت میں مجھے ایک ایسا آدمی تو ملا جسے مجھ سے واقعی ہمدردی ہے۔ جو میری بھلائی چاہتا ہے۔ جو میرا ہاتھ روک سکتا ہے اور مجھے طمانچے مار سکتا ہے۔"

"اپنی بربادی کی ذمے دار تم خود ہو۔" میں نے کہا "میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ عورت کمزور ہوتی ہے اور مرد اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عورت کے بارے میں میرا نظریہ دوسروں سے مختلف ہے۔ میں عورت کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔ عورت ہی مرد کو جنم دیتی ہے اور عورت ہی کے وجود سے مرد توانائی و قوت حاصل کرتا ہے۔ عورت ماں ہو سکتی ہے' بہن ہو سکتی ہے' بیٹی ہو سکتی ہے' بیوی ہو سکتی ہے مگر کنیز اور لونڈی نہیں ہو سکتی۔

"اس میں شبہ نہیں کہ خدا نے عورت کو مرد کی تسکین کے لیے بنایا ہے۔ اس میں وہ کشش پیدا کی ہے کہ مرد بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور اس کشش کی بدولت اپنے ظاہری غلبے کے باوجود اندر سے مغ ہے۔ بڑے بڑے جابر و فاتح اور رستم زماں اور عورت کے سامنے اپنے اقتدار و تحکم کو بالائے طا جھک جاتے ہیں۔

"عورت کمزور نہیں۔ اس نے اپنے آپ کو لیا ہے۔ میرا کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عورت ہے اور وہ مردوں پر حکومت کر سکتی ہے۔ اسے ہاتھ لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے اندر کی طاقت مقابلہ کر سکتی ہے۔ اس کے ظلم و ستم کا شکار ہو سکتی ہے۔ اگر عورت اپنے اندر کی طاقت کا ادراک وہ اس طرح برباد نہ ہو مگر المیہ یہ ہے کہ عورت نے کو کمزور سمجھ لیا ہے اور مرد اس کے اس احساس فائدہ اٹھا کر اس سے کھلونے کی طرح کھیلتا ہے اور کا جی بھر جاتا ہے تو اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔"

"تم پہلے مرد ہو جو عورت کے حق میں ایس رہے ہو۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ میں عورت کی عظمت ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کو دروازے میں داخل ہوتے دیکھ کر خاموش ہو گیا

"ارے۔ تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟" روپ چونک کر کہا۔

"میرا خیال ہے جس کے دل میں تمہارے بھی ہمدردی ہے وہ چین کی نیند نہیں سو سکتا۔" "تم جس حالت میں گھر میں آئی تھیں' اس سے تو چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے کافی لا میں نے ہی کہا تھا۔"

روپ متی کو پُرسکون دیکھ کر مندری کے رونق سی آگئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں صورت سی ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں کافی کے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک مگ ڈریسنگ ٹیبل پر' جگہ بنا کر رکھ دیا اور دوسرا قریب سائیڈ ٹیبل پر۔ دونوں مگ دیکھ کر میں دل مندری کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا دودھ والی تھی اور روپ متی کے لیے بغیر دودھ کی

روپ متی اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی اور کے چھینٹے مار کر واپس آگئی۔ میں نے کمرے میں چیزیں سمیٹ کر ایک طرف ڈال دی تھیں۔ اٹھا کر سلیقے سے ان کی جگہوں پر رکھنے لگی۔

تم جا کر سو جاؤ مندری۔" روپ متی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "چار بج رہے ہیں۔ یہ کام صبح کر لینا۔"

مندری نے کام چھوڑ دیا۔ اس نے ایک نظر روپ متی کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

کافی کی چسکیوں کے دوران میں گفتگو کا سلسلہ ایک بار پھر چل نکلا۔ موضوع وہی تھا - عورت کی کمزوری۔ میں کامنی اور جانکی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ بھی عورتیں تھیں مگر انہوں نے اپنے اندر کی طاقت استعمال کی تھی اور کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ بڑی دلیری سے دنیا کے بدترین مردوں کا مقابلہ کرتی آئی تھیں اور ٹھاکی نے تو جان دے دی تھی مگر مرد کی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور جانکی اب بھی میرے شانہ بشانہ صورتِ حال کا مقابلہ کر رہی تھی۔

جانکی اور ٹھاکی کے بارے میں ذرا تفصیل سے جان کر روپ متی کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔

"اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔" روپ متی میرے خاموش ہونے پر بولی۔

"کس بات کا افسوس؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہاری دوست جانکی کو تم سے جدا کرنے کا۔" اس نے کہا "ٹھاکر بھنور سنگھ کی حماقت سے وہ اسے بھی چکما دے گئی۔ کاش! مجھے پتا ہوتا کہ وہ کہاں ہے؟"

"کیوں؟" میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے اس سے تھوڑی ہمدردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسے عورت کی عظمت کا احساس دلایا تھا اور وہ اس قدر متاثر ہوئی تھی کہ اب اسے جانکی کو مجھ سے الگ کرنے کا پچھتاوا ہو رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ آگے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

"اگر وہ اب بھی ٹھاکر بھنور سنگھ کے پاس ہوتی تو میں اسے تمہارے پاس لے آتی۔" روپ متی نے جواب دیا۔

مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ مجھے اس کی بات پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا' خلوص دل سے کہا تھا۔

"اگر میں اس کا پتا بتا دوں تو کیا تم اسے لے آؤ گی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"شاید اس طرح میں اپنی زیادتی کا پرائچت (تلافی) کر سکوں۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "مگر تمہیں کیا پتا کہ وہ کہاں ہو گی اور کس حال میں ہو گی؟"

"میں جانتا ہوں وہ کہاں ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا۔۔۔!" وہ اچھل پڑی "جانکی بھنکر میں غائب ہوئی تھی۔ تم اس وقت سے میرے پاس ہو۔ اب سے پہلے تم حویلی سے بھی باہر نہیں گئے تھے۔ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس کے بارے میں جانتے ہو جبکہ بھنکر بھی یہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر دور ہے۔"

"وہ بھنکر میں غائب ہوئی تھی اس لیے جانتا ہوں وہ کہاں ہو گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔" اس نے مجھے گھورا "یا میں یہ سمجھوں کہ تم دونوں نے پہلے ہی سے ایسا کوئی منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اپنے آقا کی قید سے فرار ہو کر کہاں پہنچنا ہے۔"

"ہمارا پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں تھا۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے کامنی کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں' میں کہہ رہا تھا "بھنکر پہنچ کر جانکی کو بھی کامنی کا خیال آیا ہو گا اسی لیے وہ باتھ روم جانے کے بہانے ہوٹل سے غائب ہو گئی۔"

"اوہ!" روپ متی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

"جب تمہیں معلوم تھا کہ جانکی کہاں ہو سکتی ہے تو تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی جبکہ تمہیں آج رات موقع بھی میسر تھا؟"

"میں نے کہا ناکہ میری سرشت میں دھوکا اور فریب شامل نہیں ہے اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں کبھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا اور تمہیں میرے وہ الفاظ بھی یاد ہوں گے۔"

"کون سے الفاظ؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں نے کہا تھا کہ زندگی بھر تمہارا غلام بن کر یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایک نہ ایک دن ضرور یہاں سے جاؤں گا لیکن تمہیں دھوکا دے کر نہیں۔" میں نے جواب دیا "بے شک مجھے فرار ہونے کا بہترین موقع حاصل تھا لیکن میں کبھی تمہارے ساتھ دغا نہیں کروں گا۔ میں یہاں سے اس طرح جاؤں گا کہ تم خود مجھے رخصت کرو گی۔"

"شاید ایسا ہی ہو گا۔" روپ متی نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا "تم نے میرے اوپر احسانات کا اتنا بوجھ لاد دیا ہے کہ میری گردن جھکتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے پہلے بھی تمہیں ہر پابندی سے آزاد رکھا تھا اور اب تو میں پابندی کا کوئی خیال ذہن میں بھی نہیں لا سکتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تین لاکھ روپے خرچ کر کے مجھے ایک اچھا دوست مل

گیا ہے۔ بہت ہی اچھا دوست۔"

"دوست اور دوستی۔" میں نے کہا "کسی سیانے نے کہا ہے کہ جب کوئی دوست بناؤ تو اپنے دل میں ایک قبرستان بھی بنالو جس میں اس کی تمام برائیاں دفن کرسکو۔ تم نے اب تک جتنے بھی دوست بنائے ہیں وہ سب دوستی کے مفہوم سے ناآشنا تھے۔ تم بھی نہیں جانتی تھیں کہ دوستی کیا ہوتی ہے۔ تم نے اپنی تعریف کرنے والے ہر شخص کو اپنا دوست سمجھا اور تنقید کرنے والے کو اپنا دشمن گردانا۔ ابن الوقت لوگ دوسروں کی تعریف کرکے اپنا الو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہوجاتا ہے تو طوطے کی طرح نظریں پھیر لیتے ہیں۔ اچھا دوست وہی ہے جو تمہیں غلط کاموں سے ٹوکے۔ تم پر تنقید کرے۔ ممکن ہے تمہارے حلقے میں ایسے لوگ بھی رہے ہوں جنہیں تم نے اپنا دشمن اور حاسد سمجھ کر چھوڑ دیا اور تم ایسے لوگوں کے جال میں پھنسی رہیں جو تمہاری چاپلوسی کرکے، تمہاری تعریفیں کرکے تمہاری دولت اور تمہارے حسن و شباب سے فیض یاب ہوتے رہے اور تم بخوشی ان کے ہاتھوں لٹتی رہیں۔ میں نے ابھی کہا تھا ناکہ دوست بنانے کے ساتھ اپنے دل میں ایک قبرستان بھی بنانا پڑتا ہے جس میں دوست کی برائیوں کو دفن کیا جاسکے۔ تمہیں بھی اپنے دل میں ایک قبرستان بنانا پڑے گا جس میں میری برائیوں کو دفن کرسکو۔ میں بھی انسان ہوں۔ میرے اندر بھی بہت سی برائیاں ہیں اور۔۔۔"

"نہیں۔" روپ متی نے مجھے ٹوک دیا "تمہارے اندر کوئی برائی نہیں ہوسکتی۔"

"یہ تو تمہاری اعلیٰ ظرفی ہے کہ تمہیں میرے اندر ابھی تک کوئی برائی نظر نہیں آئی لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ انسان کو پرکھنے کے لیے ایک یا دو ملاقاتیں کافی نہیں ہوتیں۔ اسے جاننے اور پہچاننے کے لیے اس کے اندر بسنا پڑتا ہے۔ ایک ملاقات میں دوستی کرنے والے لوگ ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں اس لیے پہلے انسان کو پرکھ لو، جان لو پھر دوستی کا دعویٰ کرو۔ اگر تم دوستی کو سچے دل سے نبھاؤ گی تو دوستی کا اصل مقام بھی پالو گی۔"

"میر، تمہارے اندر بسے بغیر تمہیں جان چکی ہوں اور تمہیں پرکھ بھی لیا ہے۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے تم باتیں بہت اچھی کرلیتے ہو لیکن اس وقت ہم تمہاری دوست جانکی کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔"

"جانکی تمہاری بھی بہت اچھی دوست ثابت ہوگی۔" میں نے کہا۔

"اسے بھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی لیکن... بتایا تھا تم نے اس لڑکی کا؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"کامنی۔" میں نے جواب دیا "وہ یہیں جے پور کی رہنے والی ہے۔ پشکر میں تو اس کا ماما ہے۔ اس کے ماں باپ) جے پور ہی میں ہیں۔ بڑا معزز برہمن خاندان ہے۔ اس کے باپ کا نام مجھے یاد نہیں رہا لیکن چند سال پہلے وہ جے پور کا میئر (MAYER) بھی رہ چکا ہے۔"

"اوہ۔ تم پنڈت ہری رام کی بات تو نہیں کررہے..." اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"شاید یہی نام ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلا...

"اگر کامنی پنڈت ہری رام ہی کی بیٹی ہے تو... رات جانکی اس حویلی میں ہمارے ساتھ بیٹھی کھانا... ہوگی۔" روپ متی نے کہا "ویسے بھی میں تم سے... ہوں کہ کل رات جانکی ہر حالت میں یہاں ہوگی۔ پشکر میں کامنی کے پاس ہوئی تو۔۔۔"

"مجھے یقین ہے وہ وہیں ہوگی۔" میں نے جواب... کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ باہر دن کی روشنی پھیلنے... باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا... سے اٹھ گیا "رات آنکھوں میں بیت گئی۔ اب تمہیں بھی نیند آرہی ہوگی۔"

"بالکل نہیں۔" وہ مسکرادی "دل تو چاہتا ہے... زندگی تمہارے سامنے بیٹھی تمہیں دیکھتی رہوں اور... زبان سے نکلنے والے شبد (الفاظ) سنتی رہوں لیکن... تمہیں نیند آرہی ہے۔ تم یہیں سوجاؤ۔ میرے پلنگ... قالین پر لیٹ جاؤں گی۔"

"تم آرام سے اپنے بستر پر سوجاؤ۔ میں بھی جا... اپنے کمرے میں۔" میں نے کہا۔

"اور ہاں۔" روپ متی نے کہا "کل دن کا... کھاتے ہی ہم پشکر روانہ ہوجائیں گے۔ میں جانکی... کر آؤں گی۔"

میں نے ایک لمحے اس کی طرف دیکھا پھر ہاتھ... کمرے سے باہر آگیا۔

میں اپنے بستر پر لیٹا دیر تک روپ متی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ فریب کا شکار ہوتی رہی تھی۔ اسے... دھوکا دیا گیا تھا۔ اسے محبت کی تلاش تھی لیکن وہ... پھنستی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنے دھرم سے... سے بغاوت کی تھی۔ اسے سمجھانے والا کوئی نہیں...

لا، بہتی گنگا سمجھ کر ہاتھ دھوتا رہا لیکن اس کے بارے میں میرا اندازہ بڑی حد تک درست نکلا تھا۔ اس کی رگوں میں شریف ماں باپ کا خون تھا۔ مجھ سے بھی ذرا سی ہمدردی ملی، محبت کے دو بول سنے تو رو پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسے کوئی سچا دوست مل جائے تو وہ راہ راست پر آسکتی تھی۔

میں صبح چھ بجے کے قریب سویا تھا اور مجھے دو بجے کے قریب جھنجوڑ کر جگا دیا گیا۔ وہ روپ متی تھی جو میرے اوپر جھکی کندھوں سے پکڑے مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔

مجھے بستر چھوڑنے میں پندرہ منٹ لگ گئے اور پھر پندرہ بیس منٹ تک میں باتھ روم میں شاور کے ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا رہا۔ اس طرح دماغ کی تپش اور ساری کسل مندی دور ہوگئی۔

تین بجے کے قریب ہم نے کھانا کھایا اور چار بجے کے قریب ہم لینڈ کروزر پر پشکر کے لیے روانہ ہوگئے۔ روپ متی نے تارا سنگھ کو بھی ساتھ لے لیا تھا جو رائفل سنبھال کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

جے پور سے اجمیر جانے والی شاہراہ اگرچہ کافی کشادہ تھی لیکن اس سڑک پر ٹریفک کی بھی بھرمار تھی۔ جے پور سے اجمیر، پشکر، جودھ پور، چتوڑ گڑھ اور صوبہ گجرات اور مدھیہ پردیش آنے جانے والا سارا ٹریفک اسی نیشنل ہائی وے سے گزرتا تھا۔

شہر سے کئی میل آگے نکل آنے کے بعد ہائی وے کے دونوں طرف ریگستان شروع ہوگیا۔ اس وقت دھوپ تیز تھی۔ ریگستان کی طرف دیکھتے ہوئے لگتا تھا جیسے الاؤ دہک رہے ہوں۔ باہر یقیناً شدید گرمی ہوگی لیکن لینڈ کروزر میں "اے سی" چل رہا تھا اور اندرونی فضا بڑی خوشگوار تھی۔

روپ متی پر میری رات کی باتوں کا خاصا اثر ہوا تھا اور شاید یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس وقت اس نے نیم عریاں لباس کے بجائے پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں نے بھی دھرمیش ہی کا دوسرا جوڑا پہن لیا تھا۔ یہ بھی جینز اور ٹی شرٹ ہی تھی۔

میرا نیچے کا ہونٹ کچھ زیادہ ہی سوج گیا تھا اور مجھے بات کرنے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ روانگی سے پہلے میں نے کریم ہونٹوں پر لگائی تھی اور وہ ٹیوب بھی گاڑی کے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ لی تھی۔

اس وقت ہم دھرمیش اور تیج سنگھ کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔ روپ متی کا خیال تھا کہ اب وہ حویلی کا رخ نہیں کریں گے مگر مجھے روپ متی سے اختلاف تھا۔ ابھی تو وہ دونوں بھائی اپنی چوٹیں سہلا رہے ہوں گے اور مجھے یقین تھا کہ وہ موقع ملتے ہی کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ انہیں ذلت میری وجہ سے اٹھانی پڑی تھی اور میں یہ بات بھی پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ان کا نشانہ بھی میں ہی بنوں گا۔

جے پور سے پشکر کا فاصلہ اگرچہ ڈیڑھ سو کلو میٹر سے کچھ کم ہی تھا اور روپ متی کا خیال تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ دو گھنٹوں میں وہاں پہنچ جائیں گے مگر تقریباً ستر کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہونے سے پہلے ایک زوردار دھماکا ہوا اور لینڈ کروزر سڑک پر لہرا گئی جسے روپ متی نے بڑی مہارت سے سنبھال لیا۔

گاڑی کا اگلا ٹائر برسٹ ہوگیا تھا۔ روپ متی بہت آہستہ آہستہ گاڑی کو چلاتی ہوئی بستی تک لے گئی اور ایک ڈھابے کے سامنے روک لی۔ سڑک پر کچھ اور گاڑیاں بھی تھیں۔ آنے جانے والی بسیں تھوڑی دیر کے لیے یہاں رکتی تھیں۔

فضا میں اب بھی جسم کو جھلسا دینے والی تپش تھی۔ گاڑی میں اگرچہ فاضل ٹائر موجود تھا مگر روپ متی چاہتی تھی کہ برسٹ ہونے والا ٹائر بھی درست کروالیا جائے کیونکہ راستے میں اس قسم کا کوئی اور حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔

ہم گاڑی سے اتر کر ڈھابے کے سامنے نیم کے درختوں کے نیچے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ تارا سنگھ کسی پنکچر لگانے والے کو تلاش کرنے چلا گیا۔ اس کی واپسی پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والا آدمی گاڑی کے نیچے جیک لگا کر پہیا نکال کر لے گیا تھا۔ تارا سنگھ ہمارے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ روپ متی نے کولڈ ڈرنکس منگوالیے اور ہم جھلستی ہوئی فضا میں ٹھنڈے مشروب کی چسکیاں لیتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے انجن اسٹارٹ کیا اور ٹھیک اسی وقت میری نظر سڑک کی دوسری طرف ایک کار کی طرف اٹھ گئی۔ مخالف سمت سے آنے والی سرخ رنگ کی وہ کار اس وقت وہاں آکر رکی تھی۔

اس کار میں اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ چتوڑ گڑھ کا راج کمار بلونت سنگھ تھا۔ کار کی پچھلی سیٹ پر بڑی بڑی مونچھوں اور خوفناک شکل والا ایک گن مین بیٹھا ہوا تھا۔

بلونت سنگھ نے بھی ہمیں دیکھ لیا۔ وہ چونک سا گیا اور پھر اس کی نظروں میں نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے روپ متی کو اس طرف متوجہ کیا۔ بلونت

سنگھ کو دیکھ کر روپ متی کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

بلونت سنگھ اپنی کار سے اتر گیا اور نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا سڑک پار کرکے ہماری طرف آنے لگا۔

"تم بیٹھی رہو۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ چوہا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" میں نے روپ متی کا ہاتھ تھپتھپایا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور گاڑی کے سامنے سے گھوم کر روپ متی والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

بلونت سنگھ کا گن مین بھی کار سے اتر گیا تھا۔ اس نے رائفل دونوں ہاتھوں میں اس طرح تھام لی تھی کہ اسے کسی بھی لمحے استعمال کرسکتا تھا۔

بلونت سنگھ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میرے سامنے رک گیا۔ اس کی نظریں شعلے اگل رہی تھیں اور میں کسی بھی طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرچکا تھا۔

"میں کسی زر خرید سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔" بلونت سنگھ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں غراہٹ نمایاں تھی۔

"مالکن تک پہنچنے سے پہلے تمہیں اس زر خرید سے ہی بات کرنی ہوگی۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا "ویسے تم بہت ڈھیٹ ہو اور بے غیرت قسم کے آدمی ہو۔ اس رات جنگل میں جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد تو تمہیں کہیں ڈوب مرنا چاہیے تھا۔"

"اے!" وہ بھیڑیے کی طرح غرایا "اپنی اوقات میں رہ۔ تو جانتا نہیں، کس سے بات کررہا ہے۔ مچھر کی طرح چٹکی میں مسل کر رکھ دوں گا۔ اس رات دھوکے سے تمہارا داؤ چل گیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہت بڑے سورما ہو۔ اس وقت میرے ایک اشارے پر تم زندگی بھر کے لیے سلاخوں کے پیچھے پہنچ جاؤ گے۔"

"کوئی اشارہ کرنے سے پہلے ہی میں تمہاری انگلی توڑ دوں گا اور ویسے بھی میرا خیال ہے کہ تم ایسا کرنے کی ہمت نہیں کرسکتے۔ اس رات جنگل میں گرنے والی چار لاشوں میں زیادہ حصہ تمہارا ہے۔ میرے ہاتھوں تو صرف ایک آدمی مارا گیا تھا۔ ایک تمہارے گرگے کے ہاتھوں مرا تھا اور دو تمہاری گولیوں کا نشانہ بنے تھے۔ اب اگر تم کسی کو اشارہ کرسکتے ہو تو ضرور کرو۔" میں نے جواب دیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

ایک لمحے کو بلونت سنگھ کے چہرے کے تاثرات بدل گئے لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

اس دوران میں روپ متی اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ بڑی سختی سے اسٹیئرنگ پر رکھے تھے۔ اس کے چہرے پر اب بھی خوف کے سائے رقص کررہے تھے۔

تارا سنگھ بھی گاڑی سے اتر گیا تھا۔ وہ رائفل سنبھالے گاڑی کی آڑ میں اس طرح کھڑا ہوگیا تھا کہ سڑک کی دوسری طرف کھڑا ہوا بلونت سنگھ کا باڈی گارڈ اس کی رائفل کی زد میں تھا۔

لوگ ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ کسی نے ہم پر توجہ نہیں دی تھی۔ کاروبار حیات معمول کے مطابق جاری تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ موسم کی حدت میں یہاں کسی اور قسم کا لاوا بھی کھول رہا ہے۔

"بلونت سنگھ!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "ایک بار تم گدھے کی طرح میرے ہاتھوں پٹ چکے ہو اور ذلیل ہوچکے ہو۔ وہاں تمہارا حشر دیکھنے والے بھی ہوگئے تھے لیکن اگر تم اس بھرے بازار میں دوبارہ ذلیل ہونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تمہیں پہل کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ اٹھاؤ ہاتھ۔"

بلونت سنگھ خوں خوار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن زبان سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔

"میں جانتا ہوں تم میں اتنی جرأت نہیں ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "تم مجھ سے اور روپ متی سے اپنی ذلت کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ ضرور لو۔ لیکن کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لینا کہ میں روپ متی کا محافظ ہوں۔ اس کی طرف اٹھنے والا ہر ہاتھ جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا۔"

بلونت سنگھ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ایک نظر روپ متی کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی کار کی طرف چلا گیا۔ کار کے قریب کھڑے ہوئے گن مین نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ بلونت سنگھ نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ میرے اور اس کے درمیان اگرچہ پچیس تیس فٹ کا فاصلہ تھا لیکن کار کے اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ صاف نظر آرہی تھی۔

بلونت سنگھ کا گارڈ بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا اور پھر کار اس قدر زوردار جھٹکے سے حرکت میں آئی تھی کہ قریب سے گزرنے والے لوگ اچھل پڑے تھے۔

بلونت سنگھ کی کار کا رخ جے پور کی طرف تھا۔ میں مسکراتی ہوئی نظروں سے دور ہوتی ہوئی اس کار کو دیکھتا رہا پھر لینڈ کروزر کے اوپر سے گھوم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تارا سنگھ بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

کار کا "اے سی" بند تھا۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور گاڑی اندر سے تنور کی طرح تپ رہی تھی۔ میں نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔ جبڑے بھینچے ہوئے تھے، پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی ٹی شرٹ بھی پسینے سے تر ہورہی تھی۔

"تمہارا یہ دوست تو بہت بزدل نکلا۔" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا یہاں ہنگامہ ہوگا۔ طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔ ایک آدھ لاش گرے گی مگر ـــــ کچھ نہیں ہوا۔ وہ ہماری طرف آیا تو بہت غصے میں تھا مگر چوہے کی طرح دُم دبا کر بھاگ گیا۔"

روپ متی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی۔

"وہ بڑا کمینہ آدمی ہے۔" وہ سامنے رکھے ہوئے ڈبے میں سے ٹشو پیپر نکال کر ہتھیلیوں کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی "چھپ کر پیٹھ پر وار کرنے والا۔ اس وقت اگر تم اس سے دب جاتے تو وہ مجھے اٹھا کر لے جانے کی کوشش کرتا اور ہوسکتا ہے اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتا لیکن تمہارے تیور دیکھ کر وہ دم دبا کر بھاگ گیا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ خاموش نہیں رہے گا اور ہمارے خلاف کچھ کرنے کے لیے موقع تلاش کرے گا۔"

"میں اسے ایسا موقع ضرور دوں گا۔" میں نے کہا "اب تم گاڑی کا "اے سی" چلا دو۔ گرمی سے دم گھٹا جارہا ہے اور میرا خیال ہے روانہ ہونے سے پہلے ٹھنڈے پانی کی ایک ایک بوتل ہوجائے۔" میں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر مڑ کر تارا سنگھ کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے گاڑی سے اتر گیا۔

روپ متی نے اپنی طرف کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔ پہلے انجن اسٹارٹ کیا اور پھر کچھ دیر بعد "اے سی" آن کردیا۔ گاڑی کے اندر کی فضا بتدریج خوشگوار ہوتی چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد تارا سنگھ ٹھنڈی بوتلیں لے آیا۔

روپ متی اب بڑی حد تک پرسکون ہوچکی تھی۔ چند منٹ بعد ہماری لینڈ کروزر اس بستی سے نکل کر نیشنل ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

ہم بلونت سنگھ ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ روپ متی خوف زدہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بلونت سنگھ ایک بار پھر ذلیل ہوا تھا اور اپنی اس توہین کا بدلہ لینے کے لیے وہ انتقامی کارروائی ضرور کرے گا۔

میں بلونت سنگھ کی فطرت سے واقف ہوچکا تھا۔ اس کی کمینگی کا اندازہ تو مجھے اسی وقت ہوگیا تھا جب اس نے غلاموں کی منڈی میں روپ متی کو دھمکی دی تھی اور پھر اس نے جنگل میں گھات لگا کر حملہ کیا تھا اور مجھے روپ متی سے چھیننے کی کوشش کی تھی لیکن اسے چار لاشیں چھوڑ کر رات کی تاریکی میں جنگل میں فرار ہونا پڑا تھا اور اب محض اتفاق سے اس سے آمنا سامنا ہوگیا تھا۔ میرے خیال میں وہ روپ متی کو دھمکانا چاہتا تھا لیکن میں اس کے آڑے آگیا۔ اس نے تو یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ایک زر خرید غلام اس طرح اس کے سامنے تن کر کھڑا ہوجائے گا۔ اس نے جنگل والے واقعے کے حوالے سے مجھے بھی دھمکانے کی کوشش کی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ ہمارے خلاف پولیس کے پاس جانے کی ہمت نہیں کرسکے گا کیونکہ اس کے اپنے ہاتھ بھی دو آدمیوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے اور یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس حوالے سے اگر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرے گا تو خود بھی نہیں بچ سکے گا۔

میرے اکڑ جانے سے اس وقت تو وہ دُم دبا کر بھاگ گیا تھا لیکن میں روپ متی کے اس خیال سے متفق تھا کہ وہ موقع ملتے ہی وار کرے گا اور چھپ کر وار کرے گا۔

اگر راستے میں گاڑی پنکچر نہ ہوتی اور بلونت سنگھ سے سامنا نہ ہوتا تو ہم چھ بجے سے پہلے ہی پشکر پہنچ چکے ہوتے لیکن اس وقت جب ہم شہری حدود میں داخل ہوئے تو سات بجنے والے تھے۔

پشکر، جے پور جیسا بڑا شہر تو نہیں تھا لیکن اس کی اپنی ایک تاریخی اہمیت تھی۔ یہ شہر سیاحت کا مرکز تھا۔ یہاں بے شمار تاریخی عمارتیں تھیں۔ یہ شہر پہاڑی کے دامن میں آباد تھا اور اس کے پہلو میں ایک خوب صورت جھیل بھی تھی۔ اس جھیل کو گنگا کی طرح پوتر (پاکیزہ) سمجھا جاتا تھا اور ہر سال یہاں ایک بہت بڑا میلا بھی لگتا تھا۔

لینڈ کروزر ہلکی رفتار سے مختلف سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ ایک پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے روپ متی کو گاڑی روکنے کو کہا تو اس نے ایک دم بریک لگا دیے۔ اس طرح اچانک بریک لگنے سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تارا سنگھ

اچھل کر اگلی سیٹ سے ٹکرایا اور اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکل گئی تھی۔

پارک کے ایک کونے میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی عمارت پر "تائی کوان ڈو" سینٹر کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے وہاں سے کامنی کے ٹریننگ سینٹر کا پتا معلوم ہو سکتا ہے۔" میں نے اس بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

روپ متی نے انجن بند کر دیا اور مجھے اشارہ کرتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ ہمارے ساتھ تارا سنگھ بھی آ گیا تھا۔

میرا خیال درست نکلا۔ اس ٹریننگ سینٹر کے ماسٹر نے اپنا ایک شاگرد ہمارے ساتھ کر دیا۔ میں نے اس لڑکے کو پسنجر سیٹ پر بٹھا دیا اور خود پیچھے تارا سنگھ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ لڑکا روپ متی کو راستہ بتاتا رہا اور بالآخر گاڑی ایک بہت بڑے احاطے کے سامنے رک گئی۔ گیٹ پر کامنی کے نام سے اس کے مارشل آرٹ ٹریننگ سینٹر کا نام لکھا ہوا تھا۔

وہ لڑکا واپس چلا گیا۔ ہم بھی گاڑی سے اتر کر احاطے کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ اس وقت شام کا دھندلکا پھیل رہا تھا۔

یہ عمارت دراصل بہت پرانی حویلی تھی۔ گیٹ کے ساتھ ہی دائیں طرف ایک کمرا تھا جس کی دیواروں کا پلستر ادھڑا ہوا تھا۔ سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا جو دبیز گھاس سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس میدان کے دوسری طرف حویلی کی عمارت تھی۔ اس عمارت کے کھنڈر بننے میں کچھ ہی کسر باقی رہ گئی تھی۔

حویلی کی عمارت پر سامنے کی طرف بڑی بڑی دو سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی میدان میں پڑ رہی تھی اور میدان میں کم و بیش دو سو اسٹوڈنٹس تھے جو مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے اپنے ٹیچرز کے ساتھ پریکٹس کر رہے تھے۔

اس احاطے کے گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ میں اس امید پر یہاں آیا تھا کہ جانکی مل جائے گی لیکن اب دل میں طرح طرح کے وسوسے سر ابھارنے لگے تھے۔ اگر جانکی یہاں نہ ہوئی تو؟

گیٹ کے دائیں طرف والے کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ہم جیسے ہی قریب پہنچے ایک آدمی کمرے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ یہ کمرا دراصل اس ٹریننگ سینٹر کا استقبالیہ تھا۔ اندر دیواروں کے ساتھ بورڈ لگے ہوئے تھے جن پر چھوٹے چھوٹے خانے بنے ہوئے تھے۔ بہت سے خانوں میں کارڈز لگے ہوئے تھے۔ کلب کے اسٹوڈنٹس اندر داخل ہو کر اپنے اپنے کارڈ یہاں جمع کروا دیتے تھے اور واپسی پر لے لیتے تھے۔

"کامنی دیوی کہاں ملے گی؟" میں نے اس شخص سے پوچھا۔

"وہاں۔ اس طرف۔" اس نے میدان کے اس پار حویلی کی عمارت کی طرف اشارہ کیا اور الجھی ہوئی نظروں سے باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا۔ وہ غالباً تارا سنگھ کو دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔

"تارا سنگھ۔ تم یہیں رکو۔ ہم تھوڑی دیر میں آ رہے ہیں۔" میں نے تارا سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور روپ متی کے ساتھ حویلی کی عمارت کی طرف چلنے لگا۔

ہم گھاس کے میدان کے اوپر سے گھومتے ہوئے جا رہے تھے اور جب ہم حویلی کی عمارت کے سامنے پہنچے ایک لڑکی اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ سے الگ ہو کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی ہماری طرف آ گئی۔ اس نے اپنے اسٹائل کا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ سینے پر سنہری دھاگے سے اسٹائل کا مخصوص مونوگرام بھی بنا ہوا تھا۔ میں نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔

وہ کامنی تھی اور اتنے عرصے میں ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

لیکن حیرت تھی کہ وہ مجھے دور سے نہیں پہچان سکی مگر قریب پہنچتے ہی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ چند لمحے غیر یقینی سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر جیسے حواس بحال ہو گئے۔ آ گئی۔ سب سے پہلے اس نے مجھے بو (BOW) کیا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے اور روپ متی کو پرنام کیا اور دوسرے ہی لمحے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

روپ متی متحیر سی نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے کامنی کو اپنے سے الگ کیا اور اسے اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا۔ اس کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہمارے آنے سے پہلے وہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ایک گروپ کو پریکٹس کرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا اور لباس بھی بھیگا ہوا تھا۔

"مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم یہاں آؤ گے۔"

"محض اتفاق کہہ لو۔" میں نے جواب دیا "دوسرے لفظوں میں یہ کہہ لو کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ دل میں ملنے کی لگن تھی سو تم سے ملاقات ہو گئی اور ان سے بھی...

...روپ متی۔ یہ سابق ریاست..."

"انہیں کون نہیں جانتا۔" کامنی نے میری بات کاٹ دی۔ "ان کے چرچے تو پورے راجستھان میں ہیں۔" میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔ روپ متی نے بھی غالباً اس طنز کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ کھڑے کھڑے پہلو بدل کر رہ گئی۔

"ایک منٹ!" کامنی نے کہا اور اپنے اسٹوڈنٹس کی طرف چلی گئی۔

وہ ایک جگہ کھڑی ہو کر اونچی آواز میں بولنے لگی۔ تمام اسٹوڈنٹس اس کی طرف متوجہ تھے اور پھر صف بندی ہو گئی۔ ... کے لحاظ سے ہر گروپ کے اسٹوڈنٹس قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ ان میں لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی۔ ہر گروپ کے سامنے ان کا کیپٹن تھا۔ کامنی ان سب کے سامنے تھی۔ میں روپ متی کے ساتھ کھڑا دلچسپ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ روپ متی کی آنکھوں میں حیرت لہریں لے رہی تھی۔

کامنی اونچی آواز میں اپنے اسٹوڈنٹس کو میرے بارے میں بتا رہی تھی۔

"یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ آج شاؤلن ٹیمپل کا ... عظیم ماسٹر ہمارے درمیان موجود ہے۔ ان کا مکمل تعارف میں بعد میں کسی وقت کراؤں گی۔ اس وقت ہم ان کا ... (استقبال' خیر مقدم) کرتے ہوئے انہیں ویل کم ... دیں گے۔"

اور یہ "ویلکم ٹریٹ" بڑا دلچسپ تھا۔ بالکل اسی طرح ... ہم شاؤلن ٹیمپل میں اپنے گرینڈ ماسٹر کو سالانہ تقریب کے موقع پر تعظیم دیا کرتے تھے۔ آخر میں وسیع و عریض میدان "یل" اور نعروں سے گونج اٹھا۔

روپ متی کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی جا رہی تھیں۔ میں نے ... اسے اپنے بارے میں اگرچہ بہت سی باتیں بتائی تھیں مگر میری زندگی کا یہ پہلو محض اتفاق سے اس کے سامنے آیا تھا۔

کامنی نے اپنے نائبین کو کچھ ہدایات دیں۔ ایک لڑکے کو کولڈ ڈرنکس لانے کو بھیج دیا اور ہمیں لے کر حویلی کے ایک کشادہ کمرے میں آ گئی۔ دیواروں کے ساتھ شیشے کے دروازوں والے شیلف بنے ہوئے تھے جن میں لاتعداد ٹرافیاں اور میڈلز سجے ہوئے تھے۔

یہ کمرا کامنی کا دفتر تھا۔ وہ میرے سامنے گویا بچھی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ خوشی سے پھولی پڑ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک جوان لڑکی کولڈ ڈرنکس لے کر آ گئی۔ اس نے بڑے احترام سے ہمیں ڈرنکس پیش کیے اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔

"بڑی اچھی جگہ ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "کرائے پر ہے یا..."

"یہ حویلی میرے ماما کی ہے۔" کامنی نے بتایا "انہوں نے مجھے دے دی ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے میدان میں گھاس لگوائی تھی۔ ایک دو کمروں کو درست کروایا ہے۔ آہستہ آہستہ کام کرواؤں گی اور بھگوان کی اچھا (مرضی) ہوئی تو ایک روز اسے ایشیا کا سب سے بڑا مارشل آرٹ کلب بنا دوں گی۔"

"مجھے امید ہے کہ تم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گی۔" میں نے کہا۔

کولڈ ڈرنکس کی چسکیوں کے ساتھ دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ کامنی نے یہ بھی بتایا کہ اس کا باپ ابھی تک اس سے ناراض ہے۔ البتہ ماما کی مکمل حمایت حاصل ہے اور ماما کی حمایت اور حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی وہ اس حد تک کامیابی حاصل کر سکی ہے۔ ماما اسے بہت اوپر دیکھنا چاہتا ہے۔

میں اپنے آپ میں بے چینی محسوس کرنے لگا۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہو رہی تھیں لیکن ابھی تک کامنی کی زبان پر جانکی کا نام نہیں آیا تھا۔ میرے دل میں ایک بار پھر وسوسے سر ابھارنے لگے۔ کیا جانکی اس کے پاس نہیں آئی تھی؟ وہ ٹھاکر بھنور سنگھ سے فرار ہو کر کسی اور کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی؟

کامنی نے تو ویسے بھی مجھ سے جانکی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں اکٹھے ہی تھے۔ اگر جانکی اس کے پاس نہیں آئی تھی تو اسے میرے ساتھ نہ دیکھ کر کامنی کو کم از کم اس کے بارے میں پوچھنا تو چاہیے تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ممکن ہے جانکی نے یہاں آ کر کامنی کو سب کچھ بتا دیا ہو۔ ایسی صورت میں اسے یہ بھی معلوم ہو چکا ہو گا کہ روپ متی مجھے غلام کی حیثیت سے خرید کر لے گئی تھی۔ روپ متی اس وقت میرے ساتھ تھی۔ کامنی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ میں نے جب روپ متی کا تعارف کرایا تھا تو بات کرتے ہوئے کامنی کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ روپ متی کی موجودگی کی وجہ سے کامنی جان بوجھ کر جانکی کا نام زبان پر نہ لا

رہی ہو۔

"ایک بات پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔" کامنی نے کہتے ہوئے پہلے روپ متی کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھنے لگی "غلاموں کے ساتھ اس طرح برابری کا سلوک میں نے پہلی بار دیکھا ہے بلکہ میں محسوس کر رہی ہوں کہ مالکن دبی ہوئی ہے۔"

"کیا۔۔؟" میں اچھل پڑا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ جانکی اس کے پاس پہنچ چکی ہے۔

"میں تمہاری آزادی کے لیے روپ متی جی کو منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہوں۔" اس نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

روپ متی کا چہرہ دھواں ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

"کامنی جی۔" وہ کرسی سے اتر کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے "میں نے شریمان جی کو نہ پہلے غلام سمجھا تھا نہ اب سمجھتی ہوں۔ یہ تو میرے لیے دیوتا سمان ہیں۔ میں ان کی داسی ہوں۔ ان کے احسان کے بوجھ سے تو میں اپنا سر بھی نہیں اٹھا سکتی۔"

اس مرتبہ میں نے کامنی کے چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس کی بات سن کر روپ متی بھڑک اٹھے گی لیکن یہاں تو صورت حال ہی مختلف ہو گئی تھی اور روپ متی کامنی کے سامنے جھک گئی تھی۔

"کامنی جی۔" روپ متی کہہ رہی تھی "ہم تو جانکی دیوی کو لینے آئے ہیں۔ شریمان کو یقین ہے کہ وہ آپ کے پاس پہنچ گئی ہے اگر جانکی دیوی مل جائے تو میں سمجھوں گی کہ میرے گناہوں کا پرائچت ہو گیا۔"

کامنی چند لمحے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئی۔ اس نے روپ متی کو بانہوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

"مجھے چھما (معاف) کرو روپ متی جی۔" وہ اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولی "میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔ انجانے میں کچھ کہہ دیا ہو تو چھما کر دو۔"

"کر دیا چھما۔" میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "جانکی کہاں ہے؟"

"گھر پر ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔" کامنی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اس نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔" میں نے کہا "جب مجھے پتا چلا کہ وہ جے پور میں ایک ہوٹل سے غائب ہو گئی ہے تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تمہارے ہی پاس آئی ہو گی۔ اتنی دیر سے تمہاری زبان پر اس کا نام نہیں آیا تو میں [illegible] ہو رہا تھا۔"

"میں روپ متی کی وجہ سے خاموش تھی۔" [illegible] ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی "میں نے سوچا تھا کہ الگ لے جا کر بتا دوں گی لیکن جلد ہی بات کھل گئی۔ جانکی تمہارے لیے پریشان ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ [illegible] کی ایک دولت مند عورت تمہیں خرید کر لے گئی ہے۔ اس دولت مند عورت کا نام اس کے ذہن سے نکل [illegible] آج دوپہر جب اس نے روپ متی کا نام بتایا تو ماما [illegible] جے پور چلے گئے تاکہ روپ متی سے تمہارے سلسلے [illegible] کی جا سکے۔ میں بھی جانا چاہتی تھی لیکن انہوں [illegible] زبردستی یہاں روک دیا۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کامنی [illegible] مجھ سے اتنا لگاؤ تھا کہ جانکی سے میرے بارے میں [illegible] میری بازیابی کے لیے کوشش شروع کر دی تھی اور [illegible] لیے بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کے علاوہ کوئی او[illegible] بھی اٹھانے کو تیار ہو جاتی۔

ہماری باتیں سن کر روپ متی کے چہرے کے [illegible] لحظہ بدل رہے تھے۔ میرے بارے میں انکشافات [illegible] وہ سوچ رہی ہو کہ کس مصیبت میں پھنس گئی۔ [illegible] کی طرف دیکھتے ہوئے یہی بات کہی تو وہ مسکراتے ہو۔

"میں تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں کہ [illegible] شخص سے ملاقات ہو گئی لیکن یہ راز میں نہیں سمجھ [illegible] اتنے عظیم مارشل آرٹسٹ ہو تو دبے ٹھاکر کے ہتھے گئے تھے؟"

"اسے بھی میں ایسا ہی کہوں گا۔" میں نے [illegible] لیتے ہوئے جواب دیا "دھوکے سے تو شیر کو بھی جال [illegible] جا سکتا ہے۔ میں بھی دھوکے میں مار کھا گیا تھا اور [illegible] مجھے غلاموں کی منڈی تک لے گئی۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کامنی کی [illegible] خوب صورت جوان لڑکی دروازے میں نمودار [illegible] نے کامنی اور مجھے بو کیا اور پھر کامنی کی طرف دیکھ [illegible] بولی۔

"نو بج رہے ہیں میڈم۔ کلاس آف کر دی جا[illegible]"

"او۔ ہاں۔" کامنی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی [illegible] وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔"

کامنی نے ہم سے معذرت کی اور دروازے [illegible]

[illegible]گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے ہی کمرے سے باہر آ گئے۔ [illegible] کی نائب نے کلاس ڈسمس کرنے کا اعلان کر دیا۔ تمام [illegible]ٹس ادھر ادھر بکھرنے لگے۔

کامنی حویلی کے ایک اور کمرے میں چلی گئی اور تقریباً [illegible]بیس منٹ بعد لباس تبدیل کر کے واپس آ گئی۔ اب اس [illegible] ساڑی پہن لی تھی۔ اسے اس لباس میں دیکھ کر کوئی بھی [illegible] کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی مار دھاڑ کی ماہر ہو گی۔

[illegible] عمارت کے پہلو میں کامنی کی ماروتی کار بھی کھڑی تھی۔ [illegible] سامنے لے آئی اور انجن چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آئی اور [illegible]رت کے اندرونی حصے سے برآمد ہونے والے دو آدمیوں کو [illegible] بند کرنے اور دیگر کاموں کے بارے میں ہدایات دینے [illegible] اس نے اپنے نائبین کو بھی رخصت کر دیا اور پھر ہماری [illegible] متوجہ ہو گئی۔

روپ متی نے بتایا کہ ہمارے پاس اپنی گاڑی موجود ہے [illegible] مسکراتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ تم دونوں میری گاڑی میں بیٹھو۔ [illegible] ڈرائیور گاڑی پیچھے پیچھے لے آئے گا۔"

کامنی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور ہم دونوں پیچھے بیٹھ [illegible] گیٹ کے پاس گاڑی روکنی پڑی۔ روپ متی نے تارا [illegible] ہدایت کر دی کہ وہ لینڈ کروزر کو ماروتی کے پیچھے لیتا [illegible]

دونوں گاڑیاں مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی براہما مندر [illegible] تقریباً دو فرلانگ آگے ایک بہت بڑی حویلی کے کھلے [illegible] گیٹ میں داخل ہو کر رک گئیں۔ یہ کامنی کے ماما کی [illegible] تھی جہاں ان کی رہائش تھی۔ کامنی نے مجھے شاؤلن [illegible] میں بتایا تھا کہ اس کا تعلق جے پور کے معزز ترین [illegible] خاندان سے ہے جو صدیوں سے اس خطے میں دھرم کی [illegible] آ رہا ہے۔ ہندوستان کے مندر تو دراصل سونے کی [illegible] تھیں جن پر پنڈتوں اور پجاریوں کا قبضہ تھا۔ کامنی کے [illegible] اجداد نے بھی ان مندروں سے بڑی لمبی چوڑی ذاتی [illegible] بنائی تھیں اور مالی لحاظ سے وہ لوگ بھی راجستھان [illegible] راجوں مہاراجوں سے کم نہیں تھے۔ بعض پنڈتوں نے تو [illegible] بڑے راجوں سے بھی زیادہ دولت جمع کر رکھی تھی۔

[illegible] کے خاندان کی دولت کا اندازہ میں اس حویلی سے [illegible] جس میں اس نے مارشل آرٹ کلب کھول رکھا تھا [illegible] میں اس حویلی کے کمپاؤنڈ میں کھڑا تھا جو کسی محل [illegible] تھی۔

ہم گاڑی سے اتر کر برآمدے کے سامنے سرخ پتھر کی کشادہ سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے کہ سامنے محرابی دروازے سے جانکی نمودار ہوئی۔ مجھے دیکھ کر وہ چند لمحوں تک پلکیں جھپکاتی رہی پھر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"مجھے یقین تھا، تم یہاں تک ضرور پہنچو گے۔" وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی اور پھر اس کی نظر روپ متی کی طرف اٹھ گئی "یہ۔۔۔ یہ کتیا۔۔۔"

میں نے جلدی سے جانکی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"روپ متی میری مالکن نہیں ہماری دوست ہے۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا "اگر یہ میرا ساتھ نہ دیتی تو میں کبھی تم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ہمیں تو اس کا احسان مند ہونا چاہیے کہ۔۔۔"

"اس میں بھی کوئی چال ہو گی اس کی۔" جانکی نے منہ سے میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا "اس ٹھاکر نے اسے جا کر بتا دیا ہو گا کہ اس نے بھیک میں جو کنیز اسے دی تھی وہ جے پور میں غائب ہو گئی ہے۔ اس نے تم سے اگلوا لیا کہ میں جے پور میں کہاں پناہ لے سکتی ہوں۔ تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو جو اسے سب کچھ بتا دیا اور لے کر یہاں آ گئے۔"

"نہیں جانکی۔ یہ بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "مجھے دیکھو۔ میں آزاد ہوں۔ اپنی مرضی کا مالک و مختار ہوں۔ منڈی میں جو کچھ ہوا تھا، بھول جاؤ اسے۔ روپ متی کو اپنے اس رویے پر پچھتاوا ہے۔ وہ تم سے نہ صرف معافی مانگنے آئی ہے بلکہ تمہیں ساتھ لے جانے کے لیے آئی ہے تاکہ ہم دونوں پہلے کی طرح اکٹھے رہ سکیں۔"

"شریمان جی ٹھیک کہتے ہیں جانکی دیوی۔" روپ متی نے کہا "مجھ سے جو غلطیاں اور کوتاہیاں ہوئی ہیں، میں ان کی تلافی کرنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم موقع ضرور دو گی۔"

جانکی کو اس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ یقین تو شاید اسے میری باتوں کا بھی نہیں آ رہا تھا۔ میں اور کامنی تقریباً آدھے گھنٹے تک وہیں کھڑے اسے سمجھاتے رہے اور بڑی مشکل سے اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو سکے کہ اس مرتبہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو رہا اور روپ متی پورے خلوص سے ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو اہل خانہ محرابی دروازے کے قریب خاموش کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جو کامنی کی ماسی تھی۔ دو نو عمر لڑکیاں تھیں۔ ایک کی عمر چودہ اور دوسری کی بارہ کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ ایک نو دس سال کی عمر کا لڑکا تھا جس نے گیروے رنگ

کا کُرتہ اور اسی رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کا سر گنجا تھا مگر کھوپڑی پر قدرے بائیں طرف بالشت بھر لمبی چٹیا تھی۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی دو مالائیں اور ماتھے پر تلکا بھی تھا۔ دونوں لڑکیاں اور وہ لڑکا کامنی کے عم زاد تھے۔ میرا تعارف ہونے پر وہ سب بہت خوش ہوئے۔

ہمیں اندر لا کر ہال نما کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ وسیع و عریض کمرا قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور آرام دہ صوفے۔ سامنے والی دیوار کے ایک طاقچے میں کسی دیوی کی مورتی بھی رکھی ہوئی تھی۔

ان لوگوں نے کامنی کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ چند منٹ بعد ایک طرف قالین پر دستر خوان بچھا دیا گیا۔ ملازمہ نے ہر ایک کے سامنے پیتل کی ایک ایک تھالی رکھ دی تھی جس میں پیتل کی کٹوریوں میں دو تین قسموں کے سالن تھے۔ ایک میں دال، ایک میں آلو میتھی کی بھجیا اور تیسری کٹوری میں پڑی ہوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ میں نے صرف آلو میتھی کی بھجیا پر ہی اکتفا کیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے تو دس بج چکے تھے اور اس وقت جے پور واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تارا سنگھ کے لیے بھی ایک سرونٹ کوارٹر میں رات گزارنے کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

کامنی نے جے پور فون کر کے اپنے ماما کو اطلاع دے دی تھی کہ میں لیشکر پہنچ گیا ہوں۔ وہ میرے بارے میں چنتا (فکر) نہ کریں اور کل واپس آجائیں۔

ہم کافی دیر تک ہال میں بیٹھے کامنی کے گھر والوں سے باتیں کرتے رہے پھر کامنی ہمیں اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس وسیع و عریض کمرے میں دو بیڈ بچھے ہوئے تھے جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جانکی بھی اسی کمرے میں رہائش پذیر تھی۔ ان دو مسہریوں کے علاوہ ایک صوفہ سیٹ اور تین چار کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں اور جانکی صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ روپ متی اور کامنی بھی سامنے والے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک ملازمہ ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں چار بڑے گلاس رکھے ہوئے تھے جن میں کافی کلر کا کوئی مشروب بھرا ہوا تھا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کوک یا پیپسی ہوگی۔ میں نے ایک گلاس لے لیا اور پہلا گھونٹ بھرتے ہی اچھل پڑا۔ یہ نہ کوک تھی نہ پیپسی اور نہ کوئی اور کولا۔ میں نے ایک اور چسکی لی۔ ہلکی سی کھٹاس لیے ہوئے بہت خوشگوار ذائقہ تھا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے ایک اور گھونٹ بھر کر کا
طرف دیکھا۔

"جل زیرہ۔" کامنی نے مسکراتے ہوئے جواب
"بھنے اور پسے ہوئے زیرے کا شربت جس میں شکر کے
تھوڑی سی لیموں کی کھٹائی بھی ملا دی جاتی ہے۔ خوش ذا
ہونے کے علاوہ یہ نہ صرف نظام ہضم کو درست رکھتا ہے
گرمی کا بھی دشمن ہے۔"

اس میں شبہ نہیں کہ یہ جل زیرہ واقعی بہت خ
ذائقہ تھا اور ہاضم بھی کیونکہ اس کے پینے کے فوراً
مجھے ڈکار بھی آگئی تھی اور کھانا کھانے کے بعد میں پہلے
جو بوجھل پن محسوس کر رہا تھا اس سے بھی نجات مل گئی۔

جل زیرہ تو جلد ہی ختم ہو گیا لیکن ہماری باتوں کا
دراز ہوتا گیا۔ وقت گزرنے کا احساس کسی کو نہیں تھا
باتوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ روپ متی کے بارے میں
کے ذہن میں جو شبہات تھے وہ رفع ہو گئے۔ جانکی صوفے
اٹھ کر روپ متی کے قریب جا بیٹھی تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں صوفے پر دراز ہو گیا
پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی تھی۔

صبح نو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو کامنی اپنے
آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی اور دوسرے بیڈ پر جا
روپ متی ایک دوسرے سے لپٹی گہری نیند کے مزے
رہی تھیں۔ یہ دلچسپ منظر دیکھ کر میں مسکرائے بغیر نہ
سکا تھا۔

○☆○

ہم دوپہر سے پہلے پہلے واپس آنا چاہتے تھے لیکن
کامنی کے ماما نے روک لیا جو اس روز صبح سویرے
پور سے واپس آگیا تھا۔ کامنی کا بھی اصرار تھا کہ ہم کچھ
وہاں رہیں۔ گو کہ میری کوئی مصروفیات نہیں تھیں
جے پور پہنچ کر اپنے بعض معاملات سیدھے کرنا چاہتا تھا
جلد سے جلد ہندوستان سے نکل کر پاکستان جا سکوں۔
لیے سب سے بڑا مسئلہ کاغذات کا حصول تھا۔

گو کہ ہم حادثاتی طور پر ہندوستان پہنچے تھے۔ ہمارا
اور پاسپورٹ وغیرہ بھی تباہ ہونے والے جہاز کے ساتھ
راکھ ہو چکے تھے۔ ہم پناہ کی تلاش میں وہاں سے روانہ
تھے اور پھر وجے ٹھاکر کے ہتھے چڑھ کر نہایت
میں جائے حادثہ سے سیکڑوں میل دور پہنچ گئے تھے
گمشدہ مسافروں کی تلاش کا سرکاری سلسلہ بھی اب
گیا تھا۔ ادھر اُدھر بکھر جانے والے چند مسافر تو زندہ

تھے اور کچھ کی لاشیں ملی تھیں۔ البتہ چار مسافر اب بھی لاپتا تھے جن میں دو عورتیں، ایک مرد اور ایک بچی شامل تھی اور سرکاری طور پر ان کی تلاش بھی ختم کردی گئی تھی۔ ان کے بارے میں یہ باور کرلیا گیا تھا کہ وہ بھی بھوک پیاس اور گرمی کی شدت سے ریگستان میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئے ہوں گے اور ان کی لاشیں ریت نے ڈھانپ دی ہوں گی۔

جہاز کے گمشدہ وہ چار مسافر کون تھے؟ یہ میں جانتا تھا۔ ناہید کو وجے ٹھاکر کے آدمیوں نے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لیے پھینک دی تھی۔ اس کی بیٹی بلی، جانکی اور میں غلاموں کی منڈی میں نیلام ہوگئے تھے۔ بلی کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا کہ اسے کس نے خریدا تھا اور کہاں گئی تھی۔ میں اور جانکی بچھڑنے کے بعد ایک بار پھر یکجا ہوگئے تھے۔

روپ متی اب میری آقا نہیں، دوست بن گئی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہم جب بھی چاہتے یہاں سے رخصت ہوسکتے تھے لیکن ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ کاغذات کا حصول تھا۔ ایک آسان طریقہ تو یہ تھا کہ ہم کسی پولیس اسٹیشن پہنچ کر اپنے بارے میں بتا دیتے لیکن پولیس سب سے پہلے یہ سوال کرتی کہ ہم اتنے دن کہاں غائب رہے اور اس طرح ہمیں وہ کہانی سنانی پڑتی جس پر پولیس یقین نہ کرتی اور ہمارے لیے مزید الجھنیں پیدا ہوسکتی تھیں۔

دو دن پشکر میں گزارنے کے بعد ہم جے پور واپس آگئے۔ یہاں کچھ اور سنگین نوعیت کے حالات ہمارے منتظر تھے۔

حویلی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہلاکو کی فوج یہاں سے گزری ہو۔ سامان بکھرا ہوا تھا۔ بہت سی اشیا ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ابتری دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی نے بڑے اطمینان سے توڑ پھوڑ کی ہو۔ مندری کا ایک بازو گلے میں پڑی ہوئی پٹی میں لٹکا ہوا تھا اور پیشانی پر بھی بینڈیج نظر آرہی تھی۔ روپ متی کا دوسرا ملازم دیوان سنگھ بھی زخمی تھا اور کملا غائب تھی۔

روپ متی یہ سب کچھ دیکھ کر سناٹے میں آگئی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے بھی تشویش ناک تھی اور میرے ذہن میں سب سے پہلے بلونت سنگھ کا نام ابھرا تھا کیونکہ دو دن پہلے پشکر جاتے ہوئے راستے میں اس سے ملاقات ہوگئی تھی اور ہماری یہ مختصر سی لبِ سڑک ملاقات ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے تک ہی محدود رہی تھی اور اب یہ صورتِ حال دیکھ کر میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ ہماری عدم موجودگی میں بلونت سنگھ ہی یہاں آیا ہوگا۔ ممکن ہے اس کے ساتھ آدمی اور بھی ہوں اور ہمیں یہاں موجود نہ پاکر اس نے توڑ پھوڑ کرکے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہو۔ مندری، دیوان سنگھ وغیرہ نے انہیں روکنے کی کوشش کی ہوگی تو انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

"یہ سب کیسے ہوا۔ کون تھے وہ لوگ؟" روپ متی نے مندری سے پوچھا۔ وہ غصے کی شدت سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"تیج سنگھ اور دھرمیش۔" مندری نے جواب دیا "وہ دونوں آج صبح یہاں آئے تھے۔ دیوان سنگھ نے انہیں اندر میں داخل ہونے سے روک دیا لیکن وہ دونوں زبردستی گھس آئے اور دیوان سنگھ کو مار پیٹ کر [illegible] کردیا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں نے بھی انہیں آپ کا پیغام پہنچا دیا اور سرونٹ کوارٹر سے اپنا سامان اٹھا کر چلے جانے کو کہا۔ وہ دونوں زبردستی گھس آئے اور توڑ پھوڑ شروع کردی۔ میں نے روکنے کی کوشش کی تو تیج سنگھ نے مجھے بھی مارا پیٹا اور میرا بازو مروڑ کر زور زور سے جھٹکے دیے۔ یہاں بہت تکلیف ہے۔" اس نے تندرست ہاتھ سے دوسرے کندھے کو چھوا۔

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ ویسے تو مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے وہ دونوں بھائی کوئی کارروائی ضرور کریں گے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ وہ حویلی میں گھس کر توڑ پھوڑ اور مار پیٹ کریں گے۔

"کملا اور شانتی کہاں ہیں؟" روپ متی نے اپنی ملازماؤں کے بارے میں دریافت کیا۔

"شانتی تو کل شام مجھے بتا کر اپنی بہن کے گھر گئی تھی۔ آج دوپہر کے بعد آنے کو کہا تھا اور کملا۔ وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔" مندری نے جواب دیا "جب وہ توڑ پھوڑ کر رہے تھے تو وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی تھی۔ اس نے انہیں روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"ان کی یہ ہمت۔" روپ متی نے دانت پیسے۔

"میرے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے اب مجھ پر ہی غرانے لگے ہیں۔" وہ بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے سامان کو دیکھتے ہوئے پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم میرے ساتھ آؤ۔"

"کہاں۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پولیس اسٹیشن۔ ان حرامیوں کے خلاف رپورٹ درج کرانے۔" روپ متی نے کہا۔

"ایک بات کہوں روپ متی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "پولیس تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکے گی۔"

"کیوں۔۔۔؟" روپ متی نے مجھے گھورا۔

"ان دونوں نے یہ کارروائی بہت سوچ سمجھ کر کی ہے۔" میں نے جواب دیا "انہوں نے اپنی توہین اور ذلت کا بدلہ لینا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے گرم جوشی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے کام لیا۔ کئی روز انتظار کیا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا ہے اور انہیں کسی کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔" میں چند لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "ایک بات اور بتا دوں۔ کہنے کو تو وہ تمہارے باڈی گارڈ تھے۔ تمہارے تنخواہ خوار لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے تم سے زیادہ طاقت حاصل کر رکھی ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" روپ متی بولی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"تم نے زندگی بھر دولت لٹائی۔ اپنے آپ کو لٹایا۔ تمہارے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان میں راج نیتی بھی ہیں۔ بڑے بڑے راج مہاراج بھی۔ صنعت کار بھی اور ایسے بڑے بڑے بزنس مین بھی جن کے ایک اشارے پر شہر میں خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں لیکن کیا اس وقت تم چار آدمی بھی جمع کرسکتی ہو جو تمہاری حمایت میں ان سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔" میں اس کے چہرے پر نظریں جمائے کہہ رہا تھا "نہیں روپ متی۔ ایسی صورت میں کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ زبانی طور پر ہمدردی جتانے والے تو بہت ہوں گے مگر عملی طور پر کوئی کچھ نہیں کرے گا اور یہ جو کچھ ہوا ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا ہے اور عین ممکن ہے اس سلسلے میں انہیں پولیس کی آشیرباد بھی حاصل ہو۔ تیج سنگھ اور دھرمیش جیسے لوگ ایسا کوئی کام کرنے سے پہلے اپنے بچاؤ کا بندوبست بھی کرلیتے ہیں۔ ویسے اگر تم پولیس کے پاس جانا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تمہاری یہ خوش فہمی دور ہوجائے گی کہ تم توپ قسم کی کوئی چیز ہو۔"

روپ متی چند لمحے گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر مجھے اشارہ کرتی ہوئی باہر جانے کے لیے مڑ گئی۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

دارا سنگھ رائفل سنبھال کر لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ روپ متی طوفانی رفتار سے گاڑی چلا رہی تھی۔ پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ وہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

میرے خدشات درست نکلے۔ انسپکٹر نے ملاقات کے لیے پہلے تو آدھا گھنٹا انتظار کروایا اور پھر تیج سنگھ اور دھرمیش کے خلاف رپورٹ لکھنے سے انکار کردیا۔ البتہ یہ مہربانی ضرور کی کہ جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے لیے دو کانسٹیبل ہمارے ساتھ بھیج دیے۔

کانسٹیبل حویلی میں گھوم پھر کر بکھرے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے سامان کو دیکھتے رہے۔ مندری نے انہیں ساری تفصیل بتا دی تھی۔

"کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ لے کر تو نہیں گئے؟" ایک کانسٹیبل نے ملازمہ سے پوچھا۔

"نہیں۔" مندری نے جواب دیا "وہ سرونٹ کوارٹر سے صرف اپنی کچھ چیزیں لے کر گئے ہیں۔ اس کے سوا اور کوئی چیز ساتھ لے کر نہیں گئے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ یہ نہ تو چوری کی واردات ہے اور نہ ڈکیتی کی۔ البتہ ایک بات میری سمجھ میں آتی ہے۔" کانسٹیبل بولا "وہ اپنا سامان لینے آئے ہوں گے۔ تم لوگوں نے انہیں روکا ہوگا جس پر غصے میں آکر انہوں نے کچھ چیزیں اٹھا کر پٹخ دیں لیکن یہ کوئی کیس نہیں بنتا راج کماری جی۔ اگر ایسے چھوٹے چھوٹے ذاتی معاملات میں پولیس کو گھسیٹا جائے تو ہم کوئی اور کام تو کر ہی نہیں سکیں گے۔"

"گیٹ آؤٹ!" روپ متی دہاڑی۔

روپ متی اس زور سے چیخی تھی کہ اس کے قریب کھڑی ہوئی جانکی بھی اچھل پڑی۔ پولیس والوں نے گھورتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف چل پڑے۔

پولیس والوں کے اس طرزِ عمل اور اس "جواب" پر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ پولیس کے بارے میں روپ متی کی خوش فہمی تو تھانے ہی میں دور ہوگئی تھی اور اب دو کانسٹیبلوں کے اس رویے پر اس کی طبیعت صاف ہوگئی۔ وہ غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑی نرمی سے اسے ہاتھ سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور مندری کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر پانی لے آئی۔

"پانی پیو۔ غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

روپ متی نے گلاس پکڑا تو اس کا ہاتھ بھی کپکپا رہا تھا۔

کچھ پانی چھلک کر اس کی شرٹ پر گرا۔ میں نے گلاس لے کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ شراب نے اسے اندر سے کھوکھلا کردیا تھا اور وہ شاید بلڈ پریشر کی مریضہ بن گئی تھی۔ غصے میں چیختے ہوئے اس طرح ہاتھ پیر کانپنے کا مطلب تو یہی ہو سکتا تھا۔

"میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ پولیس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا "میں اس قسم کے حالات سے گزر چکا ہوں اور جانکی اس بات کی گواہ ہے۔ غنڈوں نے ہمارا جینا حرام کردیا تھا۔ جانکی اور میری انجہانی دوست تھالی کے گھر جلا کر خاک کردیے گئے۔ ہم اپنی جان بچانے کے خوف سے بھاگے پھر رہے تھے۔ پولیس ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتی تھی بلکہ اصل بات تو یہ تھی کہ پولیس ان بدمعاشوں کے ہاتھ بک چکی تھی جو ہمیں موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔ ہم اپنی جان بچانے کے خوف سے چھپتے پھر رہے تھے اور وہ غنڈے پورے شہر میں دندناتے رہے تھے۔ پولیس بھی ہماری تلاش میں تھی۔ ہمیں کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ یہ بنکاک کی بات ہے مگر ہر جگہ کی پولیس ایک جیسی ہی ہوتی ہے اور ہندوستان کی پولیس کے بارے میں تو سنا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے زیادہ کرپٹ پولیس ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ پولیس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم ایک سابق ریاست کی راج کماری ہو۔ تمہارے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ تمہارے پاس دولت کی بھی کمی نہیں ہے۔ تم حسین بھی ہو اور جوان بھی۔ تم نے ہر لحاظ سے لوگوں کو خوش رکھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے لیکن وہ دونوں پہل کرگئے ہیں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "کسی بڑی شخصیت سے پنگا لینا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اس قسم کے کام پولیس کے تعاون اور مدد کے بغیر نہیں ہوتے اور پھر وہ دونوں بہت عرصہ تمہارے پاس رہ چکے ہیں۔ تمہاری کمزوریوں سے واقف ہیں اور وہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ پولیس والوں کا رویہ تم دیکھ چکی ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی "ایک معمولی کانسٹیبل جو عام حالات میں تمہارے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا' اس نے کس قدر دیدہ دلیری سے کہہ دیا کہ یہ کوئی کیس ہی نہیں بنتا۔ کیا کوئی معمولی کانسٹیبل اس قسم کی بات کرسکتا ہے؟ یہ تو دراصل اس انسپکٹر کے الفاظ تھے جو کانسٹیبل کی زبان سے کہلوائے گئے تھے۔ اس کا مطلب... اب تم خاموش بیٹھی رہو۔ ویسے اس کو بھی غنیمت... تمہارے خلاف کوئی کیس نہیں بنا دیا گیا۔"

"میرے خلاف کیس!" روپ متی نے چونک کر... طرف دیکھا۔ وہ اپنی کیفیت پر بڑی حد تک قابو پا چکی... توڑ پھوڑ میں نے کی ہے؟ میرے خلاف کیوں کیس بنا...

"مار پیٹ۔ توڑ پھوڑ۔" میں نے کہا "وہ دونوں تمہارے... ملازم تھے۔ تم نے کسی بات پر ناراض ہو کر انہیں نوکری... نکال دیا اور جب وہ اپنا ذاتی سامان لینے کے لیے حویلی... آئے تو تم نے اپنے نوکروں سے ان کی پٹائی کرادی اور... الزام لگانے کے لیے خود ہی اپنے گھر میں توڑ پھوڑ کرا...

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" روپ متی... مجھے گھورا "جب یہاں یہ سب کچھ ہوا تھا تو میں یہاں... تھی۔"

"تم کہیں بھی ہو مائی ڈیئر۔ یہ الزام تم پر لگ سکتا ہے..." میں نے کہا "پولیس کے پاس بڑے اختیارات ہوتے... قانون تو موم کی گڑیا ہے جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق... شکل چاہیں' دے سکتے ہیں۔ اگر تم خاموش بیٹھی رہیں تو... ایسی کوئی بات نہ ہو لیکن اگر تم نے ان کے خلاف پولیس... دباؤ ڈالنے کی کوشش کی تو تمہارے خلاف ایسا کوئی الزام... جاسکتا ہے۔"

"میں انہیں معاف تو ہرگز نہیں کروں گی۔" روپ متی... نے کہا "میرے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے مجھے ہی کاٹ... دوڑیں۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔"

"پھر کیا کرو گی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے ا... طرف دیکھا۔

"ان دونوں حرامیوں کا تو جو ہوگا سو ہوگا۔ اس... دار کو تو میں ایسا سبق سکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد کرے..."

وہ اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس چلی گئی اور ریسیور اٹھا... ملانے لگی۔ میں بھی اس کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا... فون مائیک سسٹم والا تھا۔ اس میں اسپیکر بھی لگا ہوا تھا... سے فون پر ہونے والی گفتگو کمرے میں موجود دوسرے... بھی سن سکتے تھے۔

روپ متی نے پولیس کے ایک اسسٹنٹ کمشنر... ملایا تھا۔ دوسری گھنٹی پر ہی کال ریسیو کرلی گئی اور ایک... آواز سنائی دی۔

"اے سی پی (اسسٹنٹ کمشنر پولیس) مہندر... اسپیکنگ!"

"میں راج کماری روپ متی بول رہی ہوں مہندر ناتھ جی۔" روپ متی نے کہا۔ دونوں طرف سے چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر روپ متی اسے اپنا مسئلہ بتانے لگی۔

"آپ حوصلہ رکھیے روپ متی جی۔" دوسری طرف سے کہا گیا "میں معلوم کرتا ہوں' کیا معاملہ ہے۔ انسپکٹر نے اگر ایسی کوئی بات کی ہے تو اس کے خلاف ایکشن ضرور لیا جائے گا۔ میں چند منٹ بعد آپ کو فون کروں گا۔"

روپ متی نے ریسیور رکھ دیا اور بکھرے ہوئے سامان کو دیکھنے لگی۔ جانکی بھی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ مندری اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ روپ متی نے مندری کو چائے بنانے کے لیے کہا تو جانکی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"یہ بے چاری چائے کیسے بنائے گی۔ میں بناتی ہوں۔" جانکی مندری کو ساتھ لے کر کچن میں چلی گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ ہم چائے کی چسکیاں لے رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ روپ متی نے ریسیور اٹھائے بغیر ایک بٹن دبا دیا۔

"یس روپ متی۔" وہ فون کی طرف کسی قدر جھک کر بولی۔

"اے سی پی مہندر ناتھ بول رہا ہوں روپ متی جی۔" دوسری طرف سے وہی بھاری آواز سنائی دی "میں نے انسپکٹر جگت سنگھ سے بات کی ہے۔ وہ تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے۔"

"کیسی کہانی؟" روپ متی بولی۔

"انسپکٹر کے کہنے کے مطابق تیج سنگھ اور دھرمیش بھی آپ سے پہلے اس کے پاس گئے تھے۔" مہندر ناتھ کہہ رہا تھا "وہ دونوں زخمی تھے۔ آپ نے انہیں نوکری سے نکال دیا ہے اور وہ اپنا ذاتی سامان لینے حویلی گئے تھے۔ آپ نے سامان ان کے حوالے کرنے کے بجائے اپنے نوکروں سے انہیں پٹوایا۔ ان کے کہنے کے مطابق آپ نے کسی غنڈے کو بھی اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اس غنڈے نے چند روز پہلے بھی انہیں مارا پیٹا تھا۔ بہرحال' انسپکٹر ان دونوں بھائیوں کی رپورٹ پر آپ کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن میں نے اسے روک دیا ہے۔"

روپ متی نے جواب دیے بغیر ریسیور پٹخ دیا۔

"باسٹرڈ!" وہ چیخی "دیکھ لوں گی۔ ان سب کو دیکھ لوں گی۔"

"چائے پیو۔" میں نے کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا "اور تمہیں میری ذہانت کی داد دینی چاہیے کہ میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ درست ثابت ہوا۔ اب صورتِ حال تمہارے سامنے واضح ہوگئی ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان دونوں بھائیوں کے ہاتھ تم سے زیادہ لمبے ہیں۔ تمہارے ساتھ رہتے ہوئے انہوں نے تمہاری حیثیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے لیے وہ جگہ بنالی جس کے بارے میں تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا اور تم وہیں کی وہیں رہیں۔"

"میں انہیں چھوڑوں گی نہیں۔" روپ متی غرائی۔

"ان الفاظ کی رٹ لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "اس کیس میں اب میرا نام بھی آگیا ہے۔ ان کی اصل دشمنی تو مجھ سے ہی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ میری ہی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ میری ہی وجہ سے تم نے بھی انہیں ذلیل کیا۔ وہ اصل انتقام تو مجھ سے لینا چاہتے ہیں۔ میرے اگرچہ اپنے معاملات بھی خاصے گمبھیر ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ کسی نہ کسی طرح تم سے اجازت لے کر چلا جاؤں گا لیکن اب ان حالات میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ تیج سنگھ اور دھرمیش کو سبق سکھانے کے لیے ہمیں دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ ان کتوں کو میں اپنے پیر چاٹنے پر مجبور کردوں گی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

میں نے بھی ایک نظر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر نظر نہیں آرہی تھی۔ کئی قیمتی چیزیں توڑ دی گئی تھیں۔ میرے حساب سے لاکھوں کا نقصان ہوا تھا۔

میں نے تارا سنگھ اور دیوان سنگھ کو بھی اندر بلالیا اور ہم سب مل کر بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے لگے۔

○☆○

تین چار دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی نئی بات نہیں ہوئی تھی۔

اسی روز روپ متی نے تیسرے گیراج میں سے نیلے رنگ کی ایک شیراڈ کار نکالی اور مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر حویلی سے تقریباً تین میل دور ایک بہت بڑے میدان میں آگئی۔ وہ مجھے ڈرائیونگ سکھانے کے لیے یہاں لائی تھی اور یہ وسیع و عریض میدان شاید اسی مقصد کے لیے مخصوص تھا کیونکہ یہاں اور بھی بہت سے لوگ تھے جو ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کئی گاڑیاں ڈرائیونگ سکھانے والے اسکولز کی تھیں جن کے دونوں طرف نام لکھے ہوئے تھے۔

بہت سی پرائیویٹ گاڑیاں بھی تھیں اور دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ڈرائیونگ سیکھنے والوں میں زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔

روپ متی نے مجھے اسٹیئرنگ کے سامنے بٹھادیا اور خود ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر کسی ماہر ٹرینر کی طرح اسٹیئرنگ پر گرفت' گیئر' بریک' کلچ اور ایکسیلریٹر کے استعمال کے بارے میں بتانے لگی۔ میں اتنا بدھو بھی نہیں تھا کہ ان چیزوں کو نہ سمجھ سکتا۔ تھائی لینڈ میں اکثر جانگی' تھائی اور گانگ وغیرہ کے ساتھ کسی کار میں سفر کرتے ہوئے انہیں دیکھتا رہتا تھا۔ میں ان سب چیزوں کے استعمال سے کسی حد تک واقف تھا اور مجھے یقین تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو دن میں گاڑی چلانا سیکھ جاؤں گا۔

روپ متی کی ہدایت کے مطابق میں نے گیئر کو نیوٹرل میں رکھ کر اگنیشن کی چابی گھمادی اور کلچ پیڈل دبا کر گیئر بدلنے لگا۔ روپ متی کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا۔ وہ انجن کو فرسٹ گیئر میں ڈالنے میں میری مدد کر رہی تھی اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق میں آہستہ آہستہ کلچ پلیٹ کو ڈھیلا چھوڑنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی کار بھی آہستہ آہستہ حرکت میں آنے لگی۔

روپ متی نے ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر بھی رکھا ہوا تھا۔ کار ہلکی رفتار سے چلتی رہی اور وہ مجھے مختلف ہدایات دیتی رہی۔ میدان میں اور بھی بہت سی گاڑیاں اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ دو تین چھکڑا قسم کے ٹرک بھی نظر آرہے تھے۔ ان پر بھی ڈرائیونگ اسکولز کے نام لکھے ہوئے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ اب روپ متی نے اسٹیئرنگ پر سے ہاتھ ہٹالیا تھا اور گیئر بھی میں خود ہی بدلتا رہا۔ تاہم اس میں روپ متی کی ہدایات شامل تھیں۔ کار کی رفتار بھی ذرا تیز ہوجاتی اور کبھی آہستہ۔

"تم تو واقعی بہت ذہین ثابت ہوئے۔" روپ متی نے یہ کہتے ہوئے اپنی سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی "میرا تو خیال تھا کہ ان باتوں کو سمجھنے میں ہی تم تین دن لگادو گے لیکن اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ کل شام تک تم شہر کی پُرہجوم سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھرو گے۔"

"اگر بے وقوف ہوتا تو اب تک کسی کے ہاتھوں مارا جاچکا ہوتا اور میری ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہوتیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تھوڑی دیر اور پریکٹس کرلو پھر واپس چلتے ہیں۔ مجھے بھوک لگنے لگی ہے۔" روپ متی نے کہا۔

"تم بھی جانگی کی طرح ہو۔ بھوک برداشت نہیں کرسکتیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنی ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں نے میدان کا ایک اور چکر لگالیا۔ دوسرے چکر کے لیے کار گھمائی ہی تھی کہ اچانک ہی سامنے سے ایک کشادہ سا ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے آگے ریڈی ایٹر کے سامنے آہنی پائپوں کا ایک جنگلا سا لگا ہوا تھا تاکہ کسی حادثے کی صورت میں ریڈی ایٹر یا انجن کو زیادہ نقصان نہ پہنچے۔

ٹرک میں دو آدمی تھے۔ ایک زیر تربیت ڈرائیور اور دوسرا شاید ٹرینر تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے۔ ٹرک کی رفتار بھی کم تھی۔ میرا خیال تھا کہ قریب پہنچنے سے پہلے ہی ٹرک کا رخ بدل جائے گا یا میں اپنی کار کو ایک طرف ہٹالوں گا۔ فاصلہ کم ہوتا گیا۔ میں نے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں کی۔

اب تقریباً بیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں بری طرح چونک گیا۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں کے چہرے اب صاف نظر آرہے تھے۔

وہ تیج سنگھ اور دھرمیش تھے۔ اسٹیئرنگ کے سامنے تیج سنگھ تھا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر دھرمیش۔ ان دونوں کے چہروں پر بے پناہ کرختگی تھی۔

ان دونوں کو دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا' ٹرک کی رفتار ایک دم تیز ہوگئی۔ ٹرک کسی خونخوار درندے کی طرح اور بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی سی تیز رفتاری سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے حواس ایک لمحے کو مختل ہو کر رہ گئے تھے۔

روپ متی چیختی ہوئی اپنی سیٹ پر اچھل پڑی۔ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ ٹرک موت کے فرشتے کی طرح دندناتا ہوا ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی نظر آنے لگی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی ندامت نہیں کہ اس وقت میرے حواس ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ دماغ جیسے سُن ہوگیا تھا اور قوت فیصلہ بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھوں کی گرفت بالکل ڈھیلی پڑگئی تھی۔

ٹرک بالکل سامنے پہنچ گیا تھا اور کسی بھی لمحے دھماکا ہوسکتا تھا۔ روپ متی چیختی ہوئی میری طرف گری۔ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر آگئے اور اس نے پوری قوت سے اسٹیئرنگ کو بائیں طرف گھمادیا۔

کار تیزی سے بائیں طرف گھوم گئی۔ اسی لمحے ایک

دھماکا ہوا اور ہماری کار لٹو کی طرح گھوم گئی۔ وہ ٹرک کار کی پچھلی سائیڈ کو ٹکر مارتا ہوا نکل گیا تھا۔

میں پہلے دھکا کھا کر دروازے سے ٹکرایا پھر اسٹیئرنگ کی طرف جھکا۔ میرا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرا گیا۔ روپ متی بھی چیختی ہوئی ایک طرف گری تھی۔ اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ کار لٹو کی طرح گھومتی ہوئی ہلکے سے دھماکے سے ایک اور کار سے ٹکرا کر رک گئی۔

اس وقت ایک اور دھماکے کی آواز سنائی دی۔ ہماری کار کی سائیڈ سے ٹکرانے کے بعد وہ ٹرک ایک اور کار سے ٹکرا گیا تھا۔ دھماکے کے ساتھ نسوانی چیخوں کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں تین سیکنڈ لگ گئے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹرک تیز رفتاری سے میدان سے باہر جارہا تھا۔ جس دوسری کار کو اس نے ٹکر ماری تھی اس کے اندر سے اب بھی نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں روپ متی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے اوپر اٹھانے لگا۔

میدان میں تمام گاڑیاں رک چکی تھیں اور لوگ گاڑیوں سے اتر کر ہماری اور دوسری کار کی طرف دوڑ رہے تھے۔ چند سیکنڈ بعد ہی ہماری کار کے گرد آٹھ دس آدمی جمع ہوچکے تھے۔ ہماری کار کے دونوں طرف کے دروازے کھول دیے گئے۔ ایک آدمی دوسری طرف سے روپ متی کو بازو سے پکڑ کر نیچے اتارنے لگا۔ ایک آدمی نے مجھے بھی بازو سے پکڑ کر نیچے اتارنا چاہا لیکن میں نے اس کا ہاتھ ہٹادیا اور خود ہی نیچے اتر آیا۔ میرے حواس اب آہستہ آہستہ بحال ہورہے تھے۔

ہر شخص ہماری مدد کرنے پر تلا ہوا تھا لیکن جب انہیں پتا چل گیا کہ ہم میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا' بہت معمولی چوٹیں آئی ہیں تو لوگوں کو اطمینان ہوا۔ میں نے تو اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا لیکن روپ متی اس صدمے سے نڈھال ہورہی تھی۔ میں لوگوں کو ہٹاتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے دونوں بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔

"ہوش میں آؤ روپ متی۔ سب ٹھیک ہے۔ کچھ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"انہیں سائے میں لے جاؤ۔ وہاں درختوں کے نیچے۔" ایک آدمی چیخا۔ ایک عورت بھی لوگوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتی ہوئی آگے آگئی اور روپ متی کو سہارا دے کے میدان کے باہر درختوں کی طرف لے جانے لگی۔

میں دوسری کار کی طرف آگیا۔ وہ کسی ڈرائیونگ اسکول کی کار تھی۔ اسے ٹرک نے سامنے والے حصے پر ٹکر ماری تھی اور فینڈر کو ادھیڑتا ہوا نکل گیا تھا۔ زوردار جھٹکا لگنے سے آگے والی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی۔ اس کار میں بھی دو عورتیں ہی تھیں۔ ایک زیر تربیت اور ایک ٹرینر جس کے بازو اور چہرے سے خون رس رہا تھا۔ یہ زخم اسے شیشے کی کرچیوں سے آئے تھے۔ زیر تربیت ڈرائیور ایک نوجوان لڑکی تھی۔ وہ دونوں بہت زیادہ بدحواس ہورہی تھیں۔

ان دونوں کو بھی میدان کے باہر درختوں کے سائے میں پہنچادیا گیا۔ ایک آدمی اپنی کار میں سے فرسٹ ایڈ باکس نکال لایا۔ اس کا تعلق کسی ڈرائیونگ اسکول سے تھا اور ایسی ہر گاڑی میں فرسٹ ایڈ بکس لازمی ہوتا تھا۔ وہ آدمی بکس کھول کر زخمی لیڈی ٹرینر کے زخموں پر بینڈیج کرنے لگا۔

میں روپ متی کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ اب اپنے آپ کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔ اس کی پیشانی پر پہلا گومڑ دو تین دن پہلے ہی ٹھیک ہوا تھا اور اب ایک نیا گومڑ ابھر آیا تھا۔

ہمارے چاروں طرف لوگ جمع تھے اور اس ٹرک ڈرائیور کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی زیر تربیت ڈرائیور تھا جس سے ٹرک بے قابو ہوگیا تھا اور وہ بدحواسی میں بریک پیڈل کے بجائے ایکسیلریٹر دباتا چلا گیا تھا۔ لوگ ہمیں خوش قسمت قرار دے رہے تھے کہ ہم لوگ ایک خوفناک حادثے سے بچ گئے تھے۔

اس ہجوم میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو نہ صرف روپ متی کو پہچانتا تھا بلکہ اس نے اس شک کا اظہار کیا تھا کہ یہ حادثہ محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ ٹرک ڈرائیور اناڑی نہیں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر روپ متی کی کار کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر روپ متی کی طرف دیکھنے لگا۔ روپ متی نے عقلمندی یہ کی کہ اپنی زبان بند رکھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیں پولیس کو اس واقعے کی اطلاع ضرور دینی چاہیے لیکن ایک اور آدمی نے ہماری یہ مشکل یہ کہہ کر حل کردی کہ اس ٹرک پر نہ تو کوئی نام لکھا ہوا تھا اور نہ ہی نمبر پلیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ حادثے کا شکار ہونے والی دوسری دو خواتین بھی پولیس کے پاس جانے کو تیار نہیں تھیں۔

روپ متی اب اپنے آپ کو پوری طرح سنبھال چکی تھی۔ ہم دونوں میدان میں اپنی کار کے قریب آ گئے۔ نئی کار کا سوا ستیاناس ہو گیا تھا۔ پچھلی طرف کا ایک حصہ جہاں ٹکر لگی تھی' اندر کی طرف پچک گیا تھا۔ اس طرف سے فینڈر بھی اکھڑ کر دہرا ہو گیا تھا۔ کار کی باڈی کا وہ حصہ دب کر پہیے کو چھو رہا تھا۔ اس زوردار ٹکر میں بھلا اس سائیڈ کی بیک لائٹ کیسے محفوظ رہ سکتی تھی۔

میں کار کا معائنہ کرنے کے بعد زمین پر بیٹھ گیا۔ دونوں پیر پہیے پر رکھے اور باڈی کے پچکے ہوئے حصے کو باہر کی طرف کھینچنے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ باڈی کا وہ حصہ پہیے سے اتنی دور ہٹ گیا کہ کار چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی۔

روپ متی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"ڈرائیونگ میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئے گی؟" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں' میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔" روپ متی نے پیشانی سہلاتے ہوئے کہا اور انجن اسٹارٹ کرکے کار ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"اب وہ حرامی پوری طرح میرے مقابلے پر آگئے ہیں۔" روپ متی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "آج تو انہوں نے ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"موت ہمارے بہت قریب سے گزری ہے۔" میں نے کہا "ٹرک کو سر پر آتے دیکھ کر میں واقعی بدحواس ہو گیا تھا۔ میرا دماغ بالکل سُن ہو گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر تم بروقت اسٹیئرنگ کو نہ گھما دیتیں تو ہمارے کچلے جانے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔"

"اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔" روپ متی بولی "ان کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

"ہاں' اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن ایک بات تمہیں ذہن میں رکھنی ہوگی۔ حویلی میں توڑ پھوڑ کے بارے میں تم نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ درست کیا۔ تمہارا قانونی فرض پورا ہو گیا لیکن اس واقعے کے بارے میں تم کسی سے کچھ نہیں کہوگی۔ میرا مطلب ہے کسی کو یہ نہیں بتاؤ گی کہ اس ٹرک میں کون تھے۔"

"اطمینان رکھو۔" روپ متی بولی "انہیں یہی تاثر دیا جائے گا کہ ہم ان سے ڈر گئے ہیں اور دبک گئے ہیں۔" ایک بار پھر پیشانی سہلانے لگی اور بولی "میرا پروگرام تھا کہ ہم دوپہر کا کھانا کسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے مگر ان حرامیوں نے سب کچھ غارت کر دیا۔"

"کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے کئی مواقع ملیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

روپ متی بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

میدان سے روانہ ہونے کے بیس منٹ بعد ہماری کار حویلی کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

○☆○

تین دن میں' میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی اور بقول روپ متی میں اب شہر کی پرہجوم سڑکوں پر بھی گاڑی دوڑا سکتا تھا۔ نیلی شیراڈ مرمت کے لیے ورکشاپ بھیج دی گئی تھی اور روپ متی نے مرسڈیز میرے حوالے کر دی تھی۔

اس روز والے واقعے کے بارے میں جاننے کے بعد جانکی اب ہر وقت میرے ساتھ رہنے لگی تھی۔ میں جب باہر جانے لگتا' وہ میرے ساتھ ہو لیتی۔ اس دوران میں کام بھی دو تین مرتبہ یہاں آ چکی تھی۔

کامنی کو میں نے سب کچھ بتا دیا تھا کہ ہم کن حالات میں یہاں پہنچے تھے۔ اسے میں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ہم جلد جلد لاہور پہنچنا چاہتے تھے تاکہ دارا کو تلاش کرکے میں اپنا مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکوں لیکن یہاں ایک نئی کہانی شروع ہو چکی تھی اور میں ان حالات میں روپ متی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ میری محسنہ تھی۔ اس نے آزادی دی تھی اور میں ایسا احسان فراموش نہیں تھا کہ ان حالات میں اسے چھوڑ کر چلا جاتا۔

جانکی نے روپ متی کو بھی میرے بارے میں سب بتا دیا تھا اور اس رات جب ہم کھانے کے بعد روپ متی کے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو روپ متی نے اس موضوع پر بات چھیڑی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف یہاں روک کے رکھا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "تمہیں اپنے ماتا پتا کے ہتیاروں (قاتلوں) کی تلاش ہے لیکن قسمت تمہیں یہاں لے آئی۔ میں تمہیں مزید نہیں روکنا چاہتی تم جب چاہو' جا سکتے ہو اور اس سلسلے میں مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکے گا' تمہاری مدد کروں گی۔"

"اب کچھ مصلحتیں ہیں جن کی وجہ سے میں کچھ دن رکنے پر مجبور ہوں۔" میں نے جواب دیا "تم جانتی ہو کہ ہم کن حالات میں یہاں پہنچے ہیں۔ جہاز کے حادثے کے بعد ہم پناہ کی تلاش میں چل پڑے تھے اور بدقسمتی سے وحشیوں کے ہاتھ لگ گئے۔ اگر ہم دو چار دن میں پولیس سے رابطہ کرکے انہیں اپنے بارے میں بتا دیتے تو کوئی پریشانی نہ ہوتی لیکن اب دو مہینوں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ اب اگر ہم پولیس کے پاس جائیں گے تو ہم سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ اتنا عرصہ کہاں اور کیوں غائب رہے اور تم۔۔۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی "تم ہماری ضرور ہو۔ ایک سابق راجا کی بیٹی لیکن اب تم صرف نام کی راج کماری ہو۔ اس کا تمہیں خود بھی اندازہ ہے۔ تم اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتیں۔ اس کے علاوہ۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "تم اس وقت جن حالات میں پھنس چکی ہو' میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ کم از کم ان دو لوگوں کا بندوبست کرنے کے بعد ہی یہاں سے جانے کا پروگرام بناؤں گا۔"

"ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا۔۔۔ تم نے یہ ضرب المثل سنی ہوگی۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نام کی راج کماری سہی لیکن اب بھی میرے اندر دم خم ہے۔ میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ پہلے میں دولت کو بے مقصد لٹا رہی تھی لیکن اب اس سے کام لوں گی۔ میں یہاں سے تم لوگوں کے جانے کا بندوبست کر سکتی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جیسلمیر میں میرے خاندان کے کچھ لوگ آباد ہیں۔" روپ متی نے کہا "جیسلمیر پاکستان کی سرحد کے قریب ہے۔ وہاں اس طرف سرحد پر چوری چھپے لوگوں کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔ سرحدی علاقوں میں اسمگلروں کی پارٹیاں سرگرم رہتی ہیں۔ وہاں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی مل ہی جائے گا جو تم لوگوں کو سرحد پار کرا دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن پہلے تیج سنگھ اور دھرمیندر کا بندوبست ہو جائے۔ اس کے بعد یہاں سے جانے کا پروگرام بنائیں گے۔"

اس رات ہم دیر تک باتیں کرتے رہے پھر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ جانکی روپ متی کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ ان دونوں میں اب خوب گاڑھی چھننے لگی تھی۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں نیند میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہا تھا اور پھر اپنے سینے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کرکے میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چند لمحوں تک تو میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ جانکی میرے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر تھا اور ایک ٹانگ بھی میری ٹانگ پر تھی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جانکی پر ایک بار پھر دورہ پڑا تھا۔ ریگستان میں وحشیوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد سے وہ مجھ سے دور ہی رہی تھی۔ یہاں آنے کے بعد بھی ہم میں فاصلہ رہا تھا لیکن آج شاید اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا تھا اور وہ موقع پاکر میرے بیڈ پر آ گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ جانکی جاگ رہی ہوگی لیکن وہ گہری نیند میں تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ کیا اور بیڈ سے اٹھ کر دیوار کے قریب پڑی ہوئی سیٹی پر لیٹ گیا۔ جانکی کو اس طرح گہری نیند میں دیکھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی بری نیت سے میرے کمرے میں نہیں آئی تھی لیکن اس کے ساتھ لیٹے رہنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ سیٹی پر لیٹتے ہی میں ایک بار پھر نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

ریگستان میں تباہ ہونے والے جہاز کے گمشدہ چار مسافروں کی تلاش کی مہم اگرچہ سرکاری طور پر ختم کر دی گئی تھی لیکن اخبارات اب بھی وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے تھے اور اس روز جے پور سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار میں چھپنے والی ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ خبر کیا تھی' ایک مختصر سا فیچر تھا اور مضمون نگار نے اس کی تیاری میں بڑی محنت کی تھی۔ گمشدہ چار مسافروں کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ ناہید کے بارے میں تو لکھا تھا کہ وہ کراچی کی ایک کھپیی عورت تھی جو اسمگلنگ کے سلسلے میں کراچی اور سنگاپور کے درمیان چکر لگاتی رہتی تھی۔ اس مرتبہ وہ اپنی بیٹی کے ساتھ جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ اس کے بارے میں مضمون نگار نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے وہ بھی مر کھپ چکی ہوں اور صحرا کی ریت میں دفن ہو چکی ہوں۔

میرے اور جانکی کے بارے میں اس سے زیادہ تفصیل تھی۔ میرے بارے میں لکھتے ہوئے سنگاپور کے پولیس انسپکٹر چیانگ شو' میرے پڑوسیوں' والد کے دوستوں اور بنکاک کے کچھ لوگوں کے حوالے بھی دیے گئے تھے۔ اس فیچر میں میرے بارے میں بتایا گیا تھا کہ میرے بچپن میں میرے ماں

باپ کو پرانی دشمنی کی بنا پر قتل کردیا گیا تھا اور میں انتقام لینے کے لیے اپنے ماں باپ کے قاتلوں کا پیچھا کررہا تھا۔ اس اخباری اطلاع کے مطابق میں پاکستان جانے کے لیے جانکی دیوی کے ساتھ اس جہاز میں سفر کررہا تھا جو ریگستان میں گر کر تباہ ہوگیا تھا۔ مضمون نگار نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ممکن ہے ہم دونوں بھی مرچکے ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اس قوی امکان کا بھی اظہار کیا تھا کہ ہوسکتا ہے ہم دونوں زندہ ہوں اور راجستھان کے کسی شہر میں موجود ہوں۔ اخبار نے آخر میں ایک نوٹ بھی لکھا تھا کہ اس سلسلے میں مزید تفصیلات آئندہ دو تین روز میں شائع کی جائیں گی۔

یہ مختصر سا مضمون جانکی اور روپ متی نے بھی پڑھا تھا اور یہ بھی غنیمت تھا کہ ریگستان میں وجے ٹھاکر کے ہاتھ آنے سے لے کر نیلام ہونے تک اور اس کے بعد بھی ہم نے اپنے اصل نام کسی کو نہیں بتائے تھے۔ صرف روپ متی ایسی تھی جسے میں نے جانکی کا نام بتایا تھا اور میرا نام تو اسے اب بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ مجھے شریمان جی ہی کہتی تھی اور اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں مسلمان ہوں لیکن اب اخبار میں یہ مختصر سا فیچر پڑھنے کے بعد وہ بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہوں۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں "تم نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن کچھ باتیں تم نے مصلحتاً چھپائی تھیں۔ مثلاً ـــ"

"مثلاً یہ کہ میں مسلمان ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تمہیں میرے دھرم کے بارے میں جان کر شاید دکھ ہوا ہو اور ـــ"

"بالکل نہیں۔" اس مرتبہ روپ متی نے میری بات کاٹ دی "میں تنگ نظر اور متعصب نہیں ہوں اور ویسے بھی میں خود کون سی اپنے دھرم کی پابند ہوں۔ دھرم کا تو محض ٹھپا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "جانکی بھی ہندو ہے اور کئی سال سے تمہارے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم دین اور دھرم کے چکروں سے نکل جائیں تو بہتر زندگی گزار سکتے ہیں۔"

"ایسا بھی نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دھرم کوئی بھی ہو اس میں ضابطۂ اخلاق اور ضابطۂ حیات ہوتا ہے۔ مذہبی پابندیاں نہ ہوں تو انسان جانوروں سے بھی بدتر ہوجائے۔ بہرحال، میں اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم میں ایسا کوئی تعصب نہیں ہے۔"

"لیکن اس انکشاف کے بعد ہمارے لیے [illegible] ضرور پیدا ہوجائیں گی۔" روپ متی نے کہا "اگر دھرمیش کو پتا چل گیا کہ تم دونوں وہی ہو تو وہ [illegible] مشکلات پیدا کرسکتے ہیں۔"

"انہیں کیسے پتا چلے گا۔" میں نے کہا "اخبا[ر میں] تصویریں تو چھپی نہیں جن سے وہ ہمیں پہچان [سکیں]۔ بہرحال، ہم محتاط رہیں گے اور تم مجھے اس نام [سے پکارنا] جس نام سے مجھے دوستوں سے متعارف کرایا تھا۔ [وہ نام] میں تو بھول گیا۔"

"ہمت سنگھ۔" روپ متی نے کہا "اور [یہ نام] غلط نہیں رکھا تھا۔ تم واقعی ہمت والے ہو۔" [اس کے] ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

جانکی خاموش بیٹھی ہماری باتیں سن رہی [تھی۔ کچھ] دیر بعد ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ دھر[م] سنگھ کے بارے میں بات کرتے ہوئے کملا کا [ذکر آیا تو میں] چونک گیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب روپ متی نے کملا [سے] لیے دھرمیش کے کپڑے لانے کے لیے کہا تھا تو [اس] کوارٹر کی چابی کملا کے پاس تھی اور اس بات پر [وہ] بھی گئی تھی جس سے میں یہ اندازہ لگا چکا تھا [کہ کملا اور] دھرمیش کے تعلقات کچھ زیادہ ہی گہرے تھے۔ [جب] دونوں بھائیوں نے حویلی میں آکر توڑ پھوڑ کر[ی تو روپ متی] کے کہنے کے مطابق کملا ایک طرف خاموش کھ[ڑی رہی] اور پھر ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔

ان ساری باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچ[ا کہ کملا] شروع ہی سے ان کے ساتھ تھی اور موقع ملتے [ہی ان کے] ساتھ چلی گئی تھی۔

"کملا کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟" میں نے [روپ متی کی] طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ کب سے تمہارے پا[س ہے اور] یہاں کس کے توسط سے آئی تھی؟"

"میری ایک دوست نے اس کے لیے [سفارش کی] تھی۔" روپ متی نے جواب دیا "کملا دراصل [...] رہنے والی ہے۔ یہ قصبہ یہاں سے چند میل کے [فاصلے پر] ہے۔ اس کا باپ قصبے میں تانگا چلاتا تھا۔ شرابی [تھا۔] کوئی بھی ایسا عیب نہیں تھا جو اس میں نہ ہو۔ [جو کماتا] جوئے اور شراب میں اڑا دیتا پھر اس نے تانگا [بھی بیچ دیا۔] اس کی بیوی لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی [...] اسے جھوٹا موٹا کھانا اور کچھ پیسے مل جاتے تھے [وہ] پیسے چھین لیتا۔ اس نے گھر کی ساری چیزیں بیچ ڈا[لیں ...]

[اس] کی نظریں جوان بیٹی پر پڑ گئیں۔ وہ اسے بھی بھیج دیتا [...] تھا۔

"کملا کی ماں شوہر کے مظالم سے تنگ آگئی تھی۔ اس [نے ج]ب یہ سنا کہ وہ اپنی بیٹی کا بھی سودا کررہا ہے تو وہ کانپ [گئی۔] اس نے میری دوست لکشمی کو بتایا جس کے گھر کا کام [وہ] کرتی تھی۔ لکشمی اس کے شرابی شوہر کو ذرا دھمکا کر کملا [کو اپن]ے گھر لے گئی۔

"کملا کے باپ کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ سونے کی چڑیا [اس] کے ہاتھ سے نکل گئی اور وہ اپنی بیوی کو قصوروار سمجھتا [تھا۔] ایک رات شراب کے نشے میں اس نے اپنی بیوی کو اس [قدر پ]یٹا کہ وہ بے چاری جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اس کے [بعد وہ] روپوش ہوگیا۔

"کملا چار سال لکشمی کے پاس رہی۔ تقریباً ایک سال [پہلے لکشمی] امریکا جانے لگی تو کملا کو میرے حوالے کردیا۔ کملا اس [وقت س]ے میرے پاس ہے۔" روپ متی چند لمحوں کو خاموش [ہوئی پ]ھر بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوئی "شروع میں تو یہ [ٹھیک ٹ]ھاک رہی لیکن بعد میں پر پرزے نکالنے لگی۔ ایک [دن] میں نے اسے دھرمیش کے کوارٹر سے نکلتے ہوئے دیکھ [لیا۔ م]یں نے اسے ڈانٹا اور حویلی سے نکال دینے کی دھمکی بھی [د]ی۔ وہ چند روز تک تو محتاط رہی لیکن پھر اسی ڈگر پر چل [پڑی۔] میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔"

"اور میرا خیال ہے اب وہ دھرمیش کے ساتھ ہوگی۔" [میں] نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"ظاہر ہے۔ وہ اور کہاں جاسکتی ہے۔" روپ متی نے [جواب] دیا۔

"اور یہ دونوں بھائی کہاں ملیں گے۔ ان کا کوئی ٹھکانا؟" [میں] نے پوچھا۔

"چند مہینے پہلے میری عدم موجودگی میں تیج سنگھ ایک [...] عورت کو حویلی میں لے آیا تھا۔ میں نے سرزنش کی تو [اس نے] جھیل کے قریب ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ [...] [حر]ام زدگیوں کے لیے یہ دونوں بھائی اکثر وہاں جاتے [ہیں] اور میرا خیال ہے اب بھی وہیں ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "کل رات ہم ان کے گھر [...] [چلیں] گے۔"

"[...] جائیں؟" روپ متی نے گھور کر میری طرف دیکھا۔

"[...] اس سے پہلے کہ وہ ہمارے خلاف کوئی اور حرکت [کریں] انہیں بتا دینا چاہیے کہ ہم بے بس نہیں ہیں۔"

روپ متی مجھے گھورتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

میں جانتا تھا کہ یہ پنگا لینے والی بات ہے لیکن اس کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ وہ دو مرتبہ ہمارے خلاف سنگین نوعیت کی کارروائیاں کرچکے تھے۔ دوسری مرتبہ تو انہوں نے ہمیں موت کے گھاٹ اتارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور میرے خیال میں تیسری مرتبہ انہیں پہل کرنے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا کیونکہ اس طرح وہ ہمیں کوئی نقصان بھی پہنچا سکتے تھے۔

نیلی شیراڈ مرمت ہوکر ورکشاپ سے آچکی تھی۔ اگلے روز ہم نے اسی گاڑی کا انتخاب کیا اور رات نو بجے کے قریب ہم تینوں اس گاڑی پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ میں ڈرائیو کررہا تھا۔ روپ متی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور جانکی پچھلی نشست پر تھی۔

سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ میرے اندر ابھی کچھ جھجک تھی اس لیے میں نے کار کی رفتار ہلکی ہی رکھی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد ہم جھیل کے ساتھ والی سڑک پر پہنچ گئے۔ جھیل کے کناروں پر گنجان آبادی تھی۔ مختلف گلیوں میں گھومنے کے بعد روپ متی کے کہنے پر میں نے ایک جگہ کار روک لی۔

"یہ گلی مڑو گے تو دائیں طرف دوسرا مکان ہے۔"

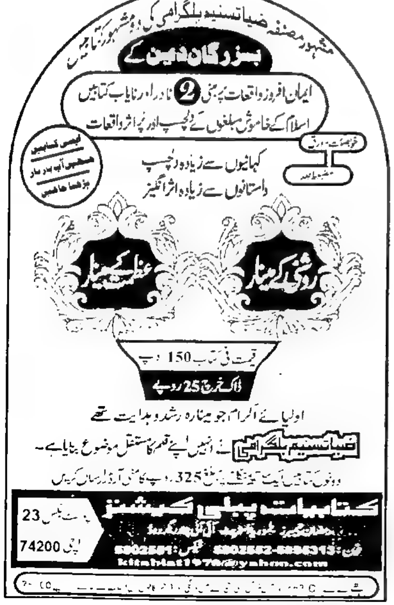

روپ متی نے اشارے سے بتایا۔

میں نے روپ متی کو کار ہی میں بیٹھے رہنے کو کہا اور جانکی کو اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر آیا۔

گلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ تقریباً ہر مکان کے دروازے کے سامنے دو دو تین تین سیڑھیاں تھیں۔ اس مکان کے سامنے بھی تین سیڑھیاں تھیں۔ دروازہ ایک بالشت کے قریب کھلا ہوا تھا۔

میں چوروں کی طرح مکان میں داخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نے سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑے ہو کر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسری اور تیسری دستک کے جواب میں بھی خاموشی رہی۔ میں نے جانکی کو اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

صحن بہت کشادہ اور فرش سرخ اینٹوں کا تھا۔ بائیں طرف مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ دو کمرے دائیں طرف تھے۔ دو سامنے۔ بائیں طرف ایک چھ سات فٹ چوڑا گلیارہ سا تھا۔

سامنے اور دائیں طرف والے کمروں کے دروازے بند تھے اور اندر تاریکی تھی۔ میں اس گلیارے کی طرف بڑھ گیا۔ جانکی بھی میرے پیچھے تھی۔

سامنے نظر آنے والے کمروں کے پچھلی طرف بھی مختصر سا صحن تھا جس کے اختتام پر دائیں بائیں کمرے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پرانی طرز کے اس مکان میں دو خاندان رہائش پذیر تھے یا رہ سکتے تھے بلکہ ایسے مکان میں تو کئی کئی خاندان رہتے تھے لیکن اس وقت یہ مکان بظاہر خالی ہی نظر آ رہا تھا۔

میں کچھ اور آگے بڑھا تو بائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اندر روشنی ہو رہی تھی۔

میں اور جانکی دبے قدموں دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا اور اندر سے کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ ایک نسوانی ہنسی کی دبی دبی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جانکی بڑی آہستگی سے دروازے کے دوسری طرف چلی گئی اور اس سے پہلے کہ میں اندر جھانکنے کے لیے آگے جھکتا‘ اس نے جھری سے آنکھ لگا دی اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بڑے ناگوار تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے مجھے اشارہ کیا۔

میں بھی جھری سے آنکھ لگاتے ہی ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اندر بہت ہی قابلِ اعتراض منظر تھا۔

تیج سنگھ بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور کملا اس تھی۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ مجھے شدید جھٹکا لگا۔ کملا تو چھوٹے بھائی دھرمیش کی لیکن اس وقت بڑا بھائی اس سے دل بہلا رہا تھا۔

میں نے جانکی کو اشارہ کیا اور پیر کی ٹھوکر کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ وہ دونوں بدحواس ہو پڑے۔ کملا نے بیڈ سے چھلانگ لگا دی اور کر چادر اٹھا کر اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

تیج سنگھ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھٹی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

جانکی بھی اندر آ کر دروازے کے سامنے تھی۔ اسے دیکھ کر بھی تیج سنگھ کی آنکھیں پھٹ تھیں۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا مگر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا تھا۔

"تمہیں تمہاری موت ہی یہاں کھینچ لائی میری طرف دیکھتے ہوئے غرایا "اب یہاں سے تم ہی اٹھے گی۔"

"ابھی پتا چل جائے گا کہ ارتھی کس کی میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا "تم نے جو کھ اب میری باری ہے۔"

جانکی مجھ سے دو قدم آگے نکل گئی تھی۔ ا کی طرف تھا تاکہ اسے قابو میں کر سکے۔

"تمہارا منا کہاں ہے۔ اسے بھی بلا لو تا دونوں کا فیصلہ ہو سکے۔" میں نے تیج سنگھ کی طرف کہا۔

"منا۔۔۔ یہ رہا رے۔"

اپنے عقب سے آواز سن کر میں اچھل سے پلٹا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ دھرمیش ہوئی شراب کی بوتل سر پر لگی اور میری آنکھوں نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچنے لگیں۔ بوتل سر پر لگ تھی اور شراب میرے سر اور چہرے کو تر گردن پر بہنے لگی۔ سخت ناگوار بو میرے نتھنو جا رہی تھی۔

میں لڑکھڑا گیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کو لیکن دوسرے ہی لمحے تیج سنگھ نے میرے اوپر چھ اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرا ٹکرایا اور دوسرے ہی لمحے میری نظروں کے سا چادر پھیلتی چلی گئی۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی بڑھ رہی تھی۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف ایک ہی بات تھی۔ اگر اس وقت میں نے اپنے حواس بحال نہ رکھے تو یہ میری زندگی کے آخری لمحات ہوں گے۔

تیج سنگھ نے ایک بار پھر مجھے گرفت میں لے کر دیوار کے ساتھ بھینچ دیا لیکن اس مرتبہ میرا سر دیوار سے نہیں ٹکرایا تھا۔ اس کے برعکس ایک اور کرشمہ یہ ہوا کہ زوردار جھٹکا لگنے سے میرے حواس بحال ہونے لگے تھے اور آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تاریکی بھی چھٹنے لگی اور پھر اسی لمحے میری سماعت سے ٹکرانے والی ایک نسوانی چیخ مجھے ہوش میں لے آئی۔ یہ چیخ اگرچہ کسی گہرے کنوئیں کی تہ سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن اس آواز نے میرے ہوش و حواس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے سر کو ایک اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے سامنے کھڑے ہوئے تیج سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن دھند بتدریج چھٹتی چلی گئی اور اس کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا۔

ایسا مکروہ اور خوفناک چہرہ میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ تیج سنگھ اگرچہ خاصا خوب رو آدمی تھا مگر غصے کی شدت نے اس کے چہرے کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ انگارے برساتی ہوئی سرخ آنکھیں‘ بھنچے ہوئے بھاری جبڑے‘ خونخوار بھیڑیے کی طرح چمکتے ہوئے دانت اور شدید تناؤ سے اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی آ گئی تھی وہ اس وقت انسان نہیں کوئی خونخوار درندہ ہی لگ رہا تھا۔

وہ نسوانی چیخ ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس مرتبہ آواز بہت واضح اور بہت قریب سے آئی تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر اس طرف دیکھا۔ جانکی دھرمیش کی گرفت میں تھی اور وہ اسے مسہری پر گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

تیج سنگھ نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ میرے گریبان پر ڈال دیئے۔ وہ اس مرتبہ بھی مجھے اٹھا کر پٹخنا چاہتا تھا لیکن اب میں نے اسے موقع نہیں دیا اور اپنے تمام حواس مجتمع کر کے اس کے چہرے پر زوردار ٹکر مار دی۔

تیج سنگھ کی ناک پر لگنے والی ٹکر خاصی زوردار تھی۔ وہ بلبلا اٹھا اور میرے گریبان سے ہاتھ ہٹا کر جھکتا چلا گیا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی ناک پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے سنبھل کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ناک سے بہنے والا خون ہاتھ کو تر کرتا ہوا فرش پر ٹپک رہا تھا۔

میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے بے پناہ تاثرات امڈ آئے تھے۔ شاید اس کی ناک کا بانسا ٹوٹ گیا تھا۔ خون دھار کی صورت میں بہہ رہا تھا لیکن مجھے اس پر ذرا بھی ترس نہیں آیا۔ وہ میری جان کا گاہک تھا۔ میں اسے کس طرح معاف کر سکتا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کا گھونسا بنایا لیکن پھر مٹھی پوری طرح کھول دی اور کھلی ہتھیلی سے اس کے منہ پر ایک اور زبردست وار کیا۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے بھی خون بہہ نکلا تھا۔

وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا ہوا سائیڈ ٹیبل سے ٹکرایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا اور حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی شراب کی خالی بوتل اٹھا لی اور دوسرے ہی لمحے پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے بوتل زور سے دیوار پر ماری۔

بوتل پیندے کی طرف سے اس طرح ٹوٹ گئی کہ شیشے کی کئی نوکیں نکل آئیں۔ وہ بوتل کو گردن کی طرف سے پکڑے میری طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر سفاکی کے نقاب میں چھپ گیا تھا۔ ناک اور منہ سے بہتے ہوئے خون سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔

ٹوٹی ہوئی بوتل ایک خطرناک ہتھیار بن گئی تھی۔ وہ بوتل والا ہاتھ نکالے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک دو مرتبہ حملہ آور انداز میں اس نے ہاتھ کو حرکت بھی دی تھی لیکن میں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

میرا پاؤں فرش پر پڑی ہوئی ایک خالی بوتل پر پڑا۔ وہ بوتل فرش پر پھسل گئی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور... لڑکھڑا گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور پشت کے بل فرش پر گرا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا‘ تیج سنگھ نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

چھلانگ لگاتے ہوئے اس نے ٹوٹی ہوئی بوتل سے میرے چہرے پر حملہ کیا اگر میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ نہ روک لیتا تو خنجر کی طرح بوتل کی کئی نوکیں میرے چہرے کو اس طرح مسخ کر دیتیں کہ میں خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکتا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کا وار روکا تھا لیکن پھر دوسرا ہاتھ بھی اس کی کلائی پر جما دیا۔ وہ میرے سینے پر سوار تھا اور بوتل والے ہاتھ کو پوری قوت سے نیچے لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس میں بے پناہ طاقت تھی۔ بوتل آہستہ آہستہ میرے گلے کی طرف نیچے آرہی تھی۔ میں نے دانت بھینچ لیے اور میرے جسم کی پوری طاقت اس وقت میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔ میں اس بوتل کو اپنی شہ رگ سے دور رکھنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔

میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتا کہ اس وقت میں واقعی شدید دباؤ میں تھا۔ میرے جسم کے مسام بڑی تیزی سے پسینہ اگلنے لگے تھے اور چہرے پر بھی پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ موت لمحہ بہ لمحہ میری شہ رگ کے قریب آرہی تھی۔

تیج سنگھ نے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔ بوتل کا ایک کنارہ میری ٹھوڑی کو چھو گیا۔ ہلکا سا چرکا لگا اور خون رسنے لگا۔

اس کا ہاتھ کچھ اور نیچے آگیا تھا۔ میرے نرخرے اور بوتل کے درمیان غالباً ایک انچ یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا اور یہ فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا۔ کسی بھی لمحے میرا نرخرا اُدھڑ سکتا تھا۔

"اب یا کبھی نہیں۔"

میرے دماغ میں ایک زوردار جھماکا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے میری بانہوں میں نئی قوت بھر گئی ہو۔ میں اس کا ہاتھ اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل پہلے میرے گلے اور پھر میرے چہرے سے اوپر ہوتی چلی گئی اور پھر میں نے اس کے ہاتھ کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔

تیج سنگھ دائیں طرف فرش پر الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل دیوار سے ٹکرا کر مزید ٹوٹ گئی۔ اب اس کے ہاتھ میں صرف بوتل کی گردن رہ گئی تھی۔

میں بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنا پیر اس کی کلائی پر رکھ دیا اور دباؤ ڈالتا چلا گیا۔ اس کی مٹھی بتدریج کھلتی چلی گئی اور ٹوٹی ہوئی بوتل کی گردن بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے دوسرے پیر سے اس کے اسی بازو کے کندھے پر زوردار ٹھوکر ماری۔

تیج سنگھ بلبلا اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے پیر کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں نے پوری قوت سے اچھل کر اپنا پیر اس کی گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف ہٹ گیا اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی ٹھوڑی پر رسنے والا خون پونچھنے لگا۔

تیج سنگھ بھی بڑا جگرے والا آدمی تھا۔ جس طرح اس کی ناک کا بانسا ٹوٹا تھا اور شاید سامنے کے ایک دو دانت بھی اپنی جگہ سے ہل گئے تھے اسے تو ہتھیار ڈال دینا چاہیے تھے لیکن وہ نہ صرف میرا مقابلہ کررہا تھا بلکہ مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش بھی کررہا تھا۔

وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر ارنا بھینسے کی طرح حملہ آور ہوا مگر میں اسے طرح دے کر اپنے آپ کو بچا گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں دیوار سے جا ٹکرایا۔

میں نے دوسری طرف دیکھا۔ دھرمیش جانکی کو رگید رہا تھا لیکن جانکی بھی بڑی دلیری سے اس کا مقابلہ کررہی تھی اور دھرمیش ابھی تک اسے پوری طرح زیر نہیں کرسکا تھا۔

کملا چادر جسم پر لپیٹے کمرے کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ دہشت اور چہرے پر خوف تھا اور پھر وہ موقع پاکر دروازے کی طرف لپکی۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا مگر اسی وقت تیج سنگھ نے ایک بار پھر پلٹ کر مجھ پر حملہ کردیا۔

میں غفلت میں اس مرتبہ مار کھا گیا اور وہ مجھے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا اس نے میرے جبڑے پر دو تین بہت ہی کرارے قسم کے گھونسے جڑ دیے۔

میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ میں نے تیج سنگھ کی کلائی گرفت میں لے کر دوسرے ہاتھ سے اسی بازو کی بغل میں ایک زوردار گھونسا مارا۔ وہ تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ میرا دوسرا گھونسا اس کے کندھے والے جوڑ پر پڑا۔ وہ بری طرح چیخ اٹھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ضرب لگا کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ دہرا ہوگیا اور میں دھرمیش کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ جانکی کے گلے پر جما رکھے تھے اور جانکی بری طرح ہاتھ پیر پٹخ رہی تھی۔ اس کے منہ سے خرخراہٹ کی عجیب گھٹی گھٹی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

دھرمیش کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے کف بہہ رہا تھا۔ شاید اسے اس بات کا بھی غصہ تھا کہ اتنی دیر میں ایک عورت اس کے قابو میں نہیں آرہی تھی اور جب وہ اس کے قابو میں آئی تو اس پر جنون طاری ہوگیا تھا اور وہ جانکی کو جان سے مار ڈالنا چاہتا تھا۔

میں نے لپک کر دھرمیش کی پسلیوں پر زوردار ٹھوکر رسید کردی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میری دوسری ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر پڑی۔ یہ وار کارگر ثابت ہوا اور وہ کراہتا ہوا دوسری طرف الٹ گیا۔ میں نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کردی۔ اس دوران میں تیج سنگھ میری طرف لپکا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلا اور اس کے سینے پر

فلائنگ کک رسید کردی۔ وہ الٹ کر دروازے میں گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر مجھ پر حملہ کرے گا لیکن اس نے سنبھلتے ہی دروازے سے باہر چھلانگ لگادی۔

"منا بھاگ!" وہ چیخا۔

منا یعنی دھرمیش بھی کھوپڑی سہلاتا ہوا اٹھ گیا تھا۔ میں نے لپک کر اسے گدی مارنا چاہی لیکن وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ میں اپنا توازن کھو بیٹھا اور لڑکھڑا کر گر گیا اور جب ... تو دھرمیش دروازے کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔

میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں بھائی باہر والے دروازے کی طرف گئے ہوں گے لیکن بائیں طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے اس طرف دیکھا۔ اس طرف دیوار کے ساتھ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں تھیں اور وہ دونوں سیڑھیوں پر دوڑے جارہے تھے۔ میں اس طرف لپکا لیکن وہ چھت پر پہنچ چکے تھے۔

میں دوڑتا ہوا کمرے میں واپس آگیا۔ جانکی مسہری پر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے حلقوں سے ابلی پڑرہی تھیں۔ چہرہ بالکل سرخ ہورہا تھا۔ اسے شاید سانس لینے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا گلا سہلا رہی تھی۔

"جانکی۔ جانکی۔ ہوش میں آؤ۔" میں نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا۔

"پپ... پانی..." اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ الماری کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل پر شیشے کا جگ رکھا ہوا تھا جو آدھے کے قریب پانی سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر جگ اٹھالیا اور جانکی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی جانکی کے حلق میں گیا اور کچھ اس کی ٹھوڑی اور گلے پر بہتا ہوا شرٹ کو تر کرنے لگا۔

پانی کے ایک دو اور گھونٹ پینے کے بعد جانکی کے حواس بحال ہونے لگے۔ وہ متوحش نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"وہ بھاگ گئے۔" میں نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"تت... تم ٹھیک ہو...؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا "کیا تم اٹھ سکتی ہو۔ یہاں زیادہ دیر رکنا مناسب نہیں ہے۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ جانکی بالکل نڈھال ہورہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھا دیا اور بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف چلنے لگا۔ دو تین قدم چلنے کے بعد وہ سنبھل گئی۔ میں دروازے کے قریب رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ڈریسنگ ٹیبل کی اوپر والی دراز ذرا سی کھلی ہوئی تھی اور اس میں کوئی چیز چمکتے دیکھ کر میں اس طرف بڑھ گیا اور دراز پوری طرح باہر کھینچ دی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔

دراز میں ایک خطرناک خنجر تھا۔ کھلی ہوئی دراز میں وہی خنجر بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ خنجر کے ساتھ ہی چھوٹی نال والا ایک ریوالور بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ ریوالور اٹھالیا۔ کھول کر دیکھا تو اس میں پوری گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ ریوالور میں نے جیب میں ڈال لیا اور خنجر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ایک طرف دھار تھی اور دوسری طرف درانتی کی طرح بہت باریک باریک دندانے بنے ہوئے تھے۔ میں نے خنجر بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ ان دونوں بھائیوں میں سے کسی کو یہ ہتھیار اٹھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگر ریوالور ان میں سے کسی کے ہاتھ میں آجاتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

جانکی دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی ایک ہاتھ سے گلا سہلا رہی تھی۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آگیا۔ وہ دونوں بھائی جس طرح بھاگے تھے ان کے واپس آنے کی کوئی توقع نہیں تھی۔

بیرونی دروازے کے قریب آکر میں نے گلی میں ادھر اُدھر جھانکا۔ کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک عورت بائیں طرف جارہے تھے۔ مرد نے کندھے پر تین چار سال کے ایک بچے کو بٹھا رکھا تھا۔

میں نے جانکی کو اشارہ کیا اور ہم مکان سے نکل کر گلی میں آگئے۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے مخالف سمت سے آنے والے دو اور آدمی بھی ملے تھے۔ وہ اپنے کسی گھریلو مسئلے پر بحث کرتے ہوئے چل رہے تھے اس لیے ہماری طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی۔

روپ متی کی کار دوسری گلی میں موجود تھی لیکن جب ہم کار کے قریب پہنچے تو روپ متی کو کار میں نہ پاکر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لیے روپ متی کار سے اتر کر کسی تاریک گوشے میں دبک گئی ہوگی۔

میں متجسس نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے سرگوشیانہ انداز میں اس کا نام لے

کردو تین مرتبہ پکارا بھی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔
میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اگر روپ متی اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لیے کار سے اتر کر کہیں چھپی ہوتی تو ہمیں دیکھ کر یا میری آواز سن کر اسے سامنے آجانا چاہیے تھا۔
میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر اُبھارنے لگے۔ میں نے جانکی کو کار کے قریب چھوڑا اور روپ متی کو اِدھر اُدھر کی گلیوں میں تلاش کرنے لگا۔ میں اس کا نام لے کر سرگوشیوں میں آوازیں بھی دے رہا تھا لیکن روپ متی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں واپس آگیا۔ جانکی کار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔
وہاں سے چند گز کے فاصلے پر بجلی کے کھمبے پر بلب جل رہا تھا جس کی زرد روشنی یہاں تک بھی پہنچ رہی تھی۔ بلب کی روشنی میں جانکی کا چہرہ کچھ اور بھی پیلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور قمیص دائیں کندھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔
میری حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ٹھوڑی کے زخم سے اب بھی بہت ہلکا خون رس رہا تھا جسے میں بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ شراب کی بوتل میرے سر پر ٹوٹی تھی۔ میرے بال بھی بھیگے ہوئے تھے اور شرٹ بھی تر تھی۔ شراب کے بھبکے مسلسل میرے دماغ میں گھسے جارہے تھے اور میں اس وقت سے اب تک بڑی مشکل سے یہ بو برداشت کررہا تھا۔
ہم روشنی میں کھڑے تھے اور اس وقت تو ابھی رات کے گیارہ ہی بجے تھے۔ گلی میں اکادکا لوگوں کی آمدورفت بھی جاری تھی۔ جب کوئی ہمارے قریب آتا تو ہم رخ بدل لیتے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ہماری حالت دیکھ کر کوئی راہ گیر ہم سے پوچھ تاچھ شروع نہ کردے۔
''روپ متی نہیں ملی۔ کہاں گئی؟'' جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''پتا نہیں کہاں غائب ہوگئی۔'' میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ وہ دونوں بھائی چھت پر سے بھاگے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ مکان کی چھتوں ہی چھتوں پر ہوتے ہوئے اس طرف کہیں گلی میں اترے ہوں اور روپ متی کو اکیلے دیکھ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔
''گاڑی میں بیٹھو۔ ہم زیادہ دیر یہاں انتظار نہیں کرسکتے۔'' میں نے جانکی سے کہا اور اس کے لیے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔
جانکی کے بیٹھنے کے بعد میں بھی اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
''تمہاری ٹھوڑی سے خون بہہ رہا ہے۔'' جانکی نے سیٹ پر آگے جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی۔
''ہاں۔'' میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ''غنیمت ہے کہ چوٹ ٹھوڑی تک ہی محدود رہی۔ اگر ٹوٹی ہوئی بوتل کی نوک میری شہ رگ کو چھو جاتی تو میں مرحوم ہو چکا ہوتا۔''
''ایسی باتیں منہ سے مت نکالا کرو۔'' جانکی نے کہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی ''روپ متی کو تلاش کرا گلیوں میں۔ اگر وہ ان حرام زادوں کے ہاتھ لگ گئی تو وہ اس کا حشر کردیں گے۔''
''مجھے شبہ ہے کہ وہ دونوں بھائی چھتوں سے ہوتے ہوئے اس گلی میں کودے ہوں گے اور یہاں روپ متی کو دیکھ کر اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔'' میں نے کہا۔
''مجھے تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔'' جانکی نے کہا ''اگر انہوں نے یہاں روپ متی کو دیکھا ہوتا تو وہ گاڑی کو نظرانداز نہ کرتے۔ گلیوں میں پیدل دوڑنے سے لاکھ درجے بہتر ہوتی۔''
جانکی کا خیال بھی غلط نہیں ہوسکتا تھا۔ تیج سنگھ بری طرح زخمی تھا۔ دھرمیش کا چہرہ بھی جانکی نے اپنے ناخنوں سے نوچ ڈالا تھا۔ وہ اپنے گھر سے بھاگے بھی ننگے پیر تھے۔ اس وقت ان کا حلیہ ایسا تھا کہ کوئی بھی شخص انہیں جرائم پیشہ سمجھ کر پولیس کے حوالے کرسکتا تھا۔ اگر وہ اس طرف آئے ہوتے تو روپ متی سے زیادہ اس گاڑی پر توجہ دیتے جو انہیں فرار ہونے میں مدد دے سکتی تھی۔ تو پھر روپ متی کہاں گئی؟
یہی سوچتے ہوئے میں نے گاڑی آگے بڑھا کر بائیں طرف کی ایک گلی میں موڑ دی۔ دراصل مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ راستہ آگے کس طرف جاتا تھا۔ میں تو گاڑی گلی میں موڑ کر ریورس میں لینا چاہتا تھا تاکہ جس راستے سے ہم آئے تھے اس راستے سے واپس جاسکیں۔
اس گلی میں اندھیرا تھا۔ میں نے کار کے ہیڈ لیمپس نہیں جلائے تھے۔ کار کو اس گلی میں موڑا ہی تھا کہ کوئی کار سے ٹکرا گیا۔ میں نے جلدی سے بریک لگادیے اور

[...]ے ساتھ ہی ہیڈ لیمپس روشن کردیے۔ دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔
کار سے ٹکرانے والا وہ سایہ کملا تھی اور اس کے پیچھے روپ متی تھی جو کملا کو دھکے دیتی ہوئی لا رہی تھی۔ کملا نے ایک ہاتھ سے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی چادر پکڑ رکھی تھی لیکن اس کے جسم کا کچھ حصہ برہنہ ہو رہا تھا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی میں اس کے چہرے پر بے پناہ خوف نظر آرہا تھا۔
''ارے روپ متی۔ کہاں غائب ہوگئی تھیں تم؟'' میں انجن بند کر کے جلدی سے کار سے اتر آیا۔
''یہ کتیا اتفاق سے مجھے اس گلی سے نکلتی ہوئی نظر آگئی تھی۔'' روپ متی نے جواب دیا ''مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں کار سے اتر کر اس کے پیچھے لپکی۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ کم بخت نے دوڑا دوڑا کر تھکا دیا۔ اس کا حساب کتاب تو میں حویلی میں جاکر کروں گی اور تم۔۔۔ زخمی ہورہے ہو۔ ان دونوں حرامیوں کا کیا ہوا؟''
''وہ دونوں بھاگ گئے اور مجھے ٹھوڑی پر معمولی سی چوٹ لگی ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ ہم تو تمہیں گاڑی میں نہ پاکر پریشان ہوگئے تھے۔''
''تم اسے لے کر پیچھے بیٹھو۔ میں ڈرائیو کرتی ہوں۔'' روپ متی نے کہا اور اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔
میں کملا کو بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے آیا۔ پہلے اسے دھکا دے کر اندر بٹھایا اور پھر خود بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ کملا میرے اور جانکی کے بیچ سینڈوچ بن کر رہ گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے جسم پر لپٹی ہوئی چادر کو سامنے سے سمیٹ کر پکڑ رکھا تھا۔
روپ متی نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی اسی گلی میں آگے بڑھادی اور پھر مختلف گلیوں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک مین روڈ پر نکل آئی۔ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی کملا بالکل خاموش تھی لیکن میں اس کے جسم کی کپکپاہٹ کو واضح طور پر محسوس کررہا تھا۔ وہ اس طرح پکڑے جانے پر خوف زدہ تھی اور خوف نے اس کی زبان بھی بند کر رکھی تھی۔
کار مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی دیانند مارگ میں چار دروازہ کی طرف نکل آئی اور وہاں سے سورج پول بازار اور رام گنج بازار کا چوک پار کر کے گھاٹ دروازے سے ہوتی ہوئی نہارگڑھ کی طرف نکل آئی۔
یہاں میں ایک بات اور بھی بتاتا چلوں کہ جے پور ایک تاریخی شہر ہے اس کی بنیاد مہاراجہ جے سنگھ ثانی نے ۱۷۲۷ء میں رکھی تھی۔ اس نے تقریباً چوالیس سال جے پور پر راج کیا۔ اس نے جے پور شہر میں بہت سی خوب صورت عمارتوں کے علاوہ شہر کے نواح میں واقع پہاڑی پر ایک بہت مضبوط اور شان دار قلعہ بھی تعمیر کروادیا۔ یہ قلعہ ۱۷۳۴ء میں تعمیر ہوا تھا لیکن بعد میں آنے والے مہاراج اس میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں بھی کرتے رہے۔ اس قلعے کا قدیم نام تو سدھرشن گڑھ ہے مگر جے پور سے قلعے تک جانے والا راستہ چونکہ نہارگڑھ نامی بستی سے گزرتا ہے اس لیے اس کا نام ہی نہارگڑھ قلعہ پڑگیا اور آج کل اسی نام سے جانا جاتا ہے۔
شہر کے تین اطراف میں پہاڑیاں اور ایک طرف ریگستان ہے۔ شہر کو دشمن کے حملوں اور ریگستان کی طرف سے اٹھنے والے ریت کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گرد ایک بہت اونچی اور بہت مضبوط فصیل تعمیر کروائی گئی تھی۔ شہر میں آمدورفت کے لیے سات مرکزی دروازے تھے جو آج بھی موجود ہیں اور مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ ساتھ شہر فصیل کے باہر بھی چاروں طرف پھیلتا چلا گیا۔ اس قدیم فصیل کے بیشتر حصے آج اگرچہ غائب ہوچکے ہیں لیکن ان دروازوں سے اس کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔
میں نے چار دروازہ اور گھاٹ دروازہ نامی جن دو دروازوں کا ذکر کیا ہے یہ دروازے بھی اسی فصیل کا ایک حصہ ہوا کرتے تھے۔ آج یہ ان علاقوں کے نام ہیں۔
آگرہ مارگ کی مرکزی سڑک پر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد کار آدرش نگر کی طرف مڑ گئی۔ اس طرف مڑتے ہی مجھے بھی راستے کی سمجھ آگئی۔ روپ متی کی حویلی آدرش نگر ہی میں تھی۔
حویلی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ روپ متی نے دور ہی سے ہارن بجا دیا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو حویلی کا گیٹ کھلا ہوا ملا۔ روپ متی رکے بغیر کار کو اندر لیتی چلی گئی۔
پورچ میں کار رکتے ہی تارا سنگھ وہاں پہنچ گیا۔ کار کا انجن بند ہوتے ہی میں اور جانکی بھی نیچے اتر آئے تھے۔ وہاں تیز روشنی تھی روپ متی فوراً ہی ہماری طرف متوجہ ہوگئی۔ جانکی اب بھی کچھ نڈھال سی ہو رہی تھی اور بار بار ایک ہاتھ سے اپنا گلا سہلا رہی تھی۔ روپ متی فوراً ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ میں نے بھی پہلی بار جانکی کو غور سے دیکھا۔ اس کے گلے پر دھرمیش کی انگلیوں کے نشان ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ نرخرے پر دو تین خراشیں بھی تھیں۔ خون تو نہیں

نکلا تھا البتہ وہ جگہ سرخ ہوگئی تھی۔
روپ متی میری طرف مڑ گئی۔ وہ جیسے ہی میرے سامنے آئی۔ ایک جھٹکے سے رک گئی اور مجھے گھورتے ہوئے بولی۔
"شراب کی بو۔۔۔ کیا۔۔۔"
"جب ہم تیج سنگھ کے مکان میں داخل ہوئے تو تیج سنگھ کملا کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے روپ متی کی بات کاٹ دی "اس کے فوراً ہی بعد دھرمیش بھی شراب کی نئی بوتل لے کر آگیا۔ میں ان کا مہمان تھا۔ انہوں نے شراب سے میری تواضع کرڈالی اور میں پوری بوتل۔۔۔"
"دھرمیش نے شراب کی بوتل اس کے سر پر توڑ دی تھی۔" جانکی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"اوہ!" روپ متی بولی "میں بھی راستے بھر حیران رہی کہ گاڑی میں سے شراب کی بو کہاں سے آرہی ہے۔ لگتا ہے انہوں نے تم لوگوں کی کچھ زیادہ ہی تواضع کرڈالی تھی۔ تمہاری ٹھوڑی سے بھی خون بہہ رہا ہے۔ اندر چلو۔ اوپر میرے کمرے میں۔" اس نے کہا اور پھر قریب کھڑے ہوئے تارا سنگھ کی طرف دیکھ کر گویا ہوئی "اس کتیا کو کار سے اتار کر پیچھے سرونٹ کوارٹر میں لے جاکر بند کردو۔ میں تھوڑی دیر بعد اس سے بات کروں گی۔"
کملا ابھی تک کار ہی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ تارا سنگھ نے اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا تو وہ روپ متی کے قدموں پر گر گئی۔ وہ اس طرح کانپ رہی تھی جیسے شدت کی سردی میں ٹھٹھر رہی ہو۔
"مجھے معاف کردو دیدی۔۔۔" وہ اس کے پیر پکڑ کر گڑگڑائی۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں دھرمیش کے بہکاوے میں آگئی تھی۔ مجھے معاف کردو۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"
"چپ رہ کتیا!" روپ متی نے اسے ٹھوکر مار کر دور گرا دیا "گندی نالی کے کیڑے گندی نالی ہی میں اچھے رہتے ہیں۔ لکشمی نے غلطی کی تھی کہ تمہیں تمہارے باپ سے بچالیا تھا اور اس سے بڑی غلطی مجھ سے ہوئی کہ میں تمہیں یہاں لے آئی۔ یہاں تمہیں کیا دکھ تھا۔ عیش کرتی تھیں لیکن نیچ آخر نیچ ہی ہوتے ہیں۔ تم اس تھالی میں سوراخ کرتی رہیں جس میں کھاتی تھیں۔ میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دھرمیش کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا تو تنبیہہ کرکے چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم سدھر جاؤ گی لیکن تم وہی سب کچھ کرتی رہیں جس سے میں تمہیں روکنا چاہتی تھی لیکن وہ حرامی پتا نہیں تمہیں کیا سبز باغ دکھاتا رہا اور تم بھی اتنی بے غیرت نکلیں کہ بیک وقت دونوں بھائیوں کے ساتھ گل چھرے اڑاتی رہیں۔ بہت آگ لگی ہوئی ہے تمہارے اندر۔ میں بجھادوں گی یہ آگ۔ برف کی طرح ٹھنڈا کر دوں گی تمہیں۔"
"مجھے چھما (معاف) کردو راج کماری جی۔" کملا نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے "میں مجبور تھی۔ وہ مجھے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دیتے تھے۔"
"لے جاؤ اسے تارا سنگھ۔" روپ متی نے یہ کہتے ہوئے کملا کو ایک اور ٹھوکر مار دی۔
تارا سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ کملا کی چادر اتر گئی۔ اس کے جسم پر لباس کے نام پر نہایت مختصر زیر جامہ تھا۔ تارا سنگھ پروا کیے بغیر اسے گھسیٹتا ہوا حویلی کے پچھلی طرف لے گیا۔
مندری بھی آوازیں سن کر پورچ میں آگئی تھی۔ تشویش آمیز نگاہوں سے مجھے اور جانکی کو دیکھ رہی تھی۔ اندر داخل ہوکر روپ متی کے پیچھے چلتے ہوئے اوپر اس کے کمرے میں آگئے۔
کمرے میں آتے ہی جانکی مجھ سے پہلے باتھ روم میں گھس گئی۔ واپس آنے میں اس نے تقریباً بیس منٹ لگا دیئے۔ اس نے منہ دھو کر گلے پر اینٹی سیپٹک لوشن لگا لیا تھا۔ اس کے بعد میں باتھ روم میں گھس گیا۔ پہلے ٹھوڑی کا زخم صاف کرکے اینٹی سیپٹک لوشن لگایا اور پھر کپڑے اتار کر شاور کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ میرے سر کے بال اور کپڑے اب بھی شراب سے تر تھے اور بو سے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ نہا کر میں نے ایک بار پھر ٹھوڑی پر لوشن لگایا اور بڑا تولیا لپیٹ کر باتھ روم سے نکل کر کمرے میں رکے بغیر تیز قدم اٹھاتا ہوا نیچے اپنے کمرے میں آگیا اور دروازہ بند کرکے الماری سے کپڑے نکال کر پہننے لگا۔
میں جب دوبارہ اوپر پہنچا تو جانکی بھی کپڑے بدل چکی تھی اور مندری بھی میرے پیچھے ہی چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ عقل مند عورت تھی۔ اسے احساس تھا ہمیں کس وقت کس چیز کی ضرورت ہوسکتی ہے۔
"مندری۔ دیکھو اس دراز میں بینڈیج کے اسٹرپ ہوں گے۔ ایک نکال لاؤ۔" روپ متی نے کہا۔
مندری نے ڈریسنگ کی ایک دراز کھول کر کاغذ کے ٹائٹ کور میں سے ایک بینڈیج اسٹرپ نکال کر روپ متی کی طرف بڑھا دیا۔ روپ متی نے کاغذ پھاڑ کر بینڈیج نکالا

اور اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے پہلے میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور پھر بڑی احتیاط سے زخم پر بینڈیج لگا دی۔ بینڈیج کے ساتھ ایڈ ہیسو ٹیپ تھا جو میری جلد پر چپک گیا تھا۔
جانکی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔
"ان دونوں حرامیوں کا کیا ہوا؟" روپ متی نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
"بھاگ گئے وہ دونوں۔" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا "اگر مجھے جانکی کی فکر نہ ہوتی تو ان میں سے ایک تو قابو آہی جاتا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا "اور جب ہم واپس آئے تو تمہیں غائب پاکر مجھے کچھ اور پریشانی ہوئی تھی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ گلی میں کار ریورس کرتے ہوئے تم مل گئیں ورنہ ہم تمہیں وہیں چھوڑ آتے اور تم ہمیں ڈھونڈتی رہتیں۔"
"میں نے محض اتفاق سے کملا کو اس گلی سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔" روپ متی نے میرے خاموش ہونے پر کہا "اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی۔ میں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی لیکن سامنے والی گلی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا تو کھمبے پر جلنے والے بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ نظر آگیا اور میں نے بھی کار سے اتر کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔" وہ خاموش ہوکر چائے کی چسکیاں لینے لگی اور پھر تفصیل سے بتانے لگی کہ اندھیری اور پر پیچ گلیوں میں کملا کو تلاش کرنے اور پھر اس پر قابو پانے میں اسے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ وہ ایک بار پھر چائے کی چسکیاں لینے لگی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ کہہ رہی تھی۔
"تیج سنگھ کے کم از کم دو ٹھکانے ایسے ہیں جن کے بارے میں، میں جانتی ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی جگہ نہیں ملیں گے۔"
"مثلاً۔ وہ ٹھکانے کیسے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں وہ اپنے آپ کو وہاں محفوظ سمجھ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"ایک تو ان کا اکھاڑا ہے۔ اجمیری گیٹ کے قریب۔" روپ متی نے جواب دیا "وہ گنجان آبادی کا علاقہ ہے۔ میرے پاس آنے کے بعد وہ اگرچہ اکھاڑا بند کرچکے تھے لیکن کبھی کبھی وہاں جاتے رہتے تھے۔ بڑی لمبی چوڑی جگہ ہے۔ وسیع و عریض احاطے میں ایک طرف اکھاڑا ہے اور اس کے ساتھ ہی تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی وہ عمارت ہے جو اگرچہ کھنڈر بن چکی ہے لیکن اس کے کچھ کمرے اب بھی رہائش کے قابل ہیں۔ یہ عمارت دراصل تیج سنگھ کے استاد نٹور سنگھ پہلوان کی ملکیت تھی۔ نٹور سنگھ پہلوان کا دور قریب کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اور وہ وسیع و عریض عمارت اسے ورثے میں ملی تھی۔ تیج سنگھ چالاک آدمی ہے۔ اس نے نٹور سنگھ کو اس طرح شیشے میں اتار لیا کہ اس پہلوان نے اسے اپنا بیٹا بنالیا اور یہ عمارت اس کے نام لکھ دی۔ نٹور سنگھ کا کوئی اور رشتے دار تو تھا نہیں جو اس کے اس فیصلے کو چیلنج کرتا۔ بہرحال، تیج سنگھ کے نام جائداد منتقل کرنے کے تقریباً چھ مہینے بعد نٹور سنگھ پہلوان پراسرار طور پر ہلاک ہوگیا۔۔۔ اور اس کا دوسرا ٹھکانا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "بھگوان داس روڈ پر واقع ایک عالی شان بلڈنگ میں وہ لگژری فلیٹ ہے جو اس نے تقریباً ایک سال پہلے خریدا تھا۔ وہ دونوں بھائی چھٹیاں اس فلیٹ میں گزارہ کرتے تھے لیکن مجھے پورا وشواش (یقین) ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی جگہ پر نہیں ملیں گے۔"
"مجھے تم سے اتفاق ہے۔" میں نے کہا "وہ یقیناً کسی ایسی جگہ پناہ لیں گے جس کے بارے میں تم نہ جانتی ہو۔"
"لیکن کملا ضرور جانتی ہوگی۔" روپ متی نے کہا "میں تو اب تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ وہ صرف دھرمیش کے ساتھ گل چھرے اڑاتی رہی ہے لیکن یہ انکشاف تو میرے لیے بڑا ہی سنسنی خیز ہے کہ وہ دونوں بھائی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے رہے ہیں۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ وہ اکثر تیج سنگھ کے ساتھ بھی باہر جاتی رہی تھی۔ بہرحال، آؤ۔ کملا سے معلوم کرتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں وہ کہاں پناہ لے سکتے ہیں۔"
وہ ہاتھ میں پکڑا ہوا خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے اٹھ گئی۔ میں نے بھی سیٹ چھوڑتے ہوئے سوالیہ نظر سے جانکی کی طرف دیکھا۔
"تم لوگ جاؤ۔ میں سونا چاہتی ہوں۔" جانکی نے جواب دیا اور کرسی سے اٹھ کر روپ متی کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ وہ یہیں سویا کرتی تھی۔ روپ متی کے ساتھ۔
میں روپ متی کے ساتھ نیچے آگیا۔ تارا سنگھ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔
"وہ کہاں ہے؟" روپ متی نے پوچھا۔
"سرونٹ کوارٹر میں راج کماری۔" تارا سنگھ نے جواب دیا اور ہمارے آگے آگے چل دیا۔
تارا سنگھ نے اسے اپنے سرونٹ کوارٹر میں بند کیا تھا۔ دروازے کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا اور چابی تارا سنگھ کے پاس

موجود تھی۔

صحن والا دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ کوارٹر دو دو کمروں کے تھے۔ کمروں کے سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے میں بتی جل رہی تھی۔

تارا سنگھ نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا اور ایک چابی منتخب کرکے دائیں طرف والے کمرے کا تالا کھولنے لگا۔ کمرے کے اندر بھی بتی جل رہی تھی جس کی روشنی دو پٹ والے دروازے کی جھریوں سے جھلک رہی تھی۔

تارا سنگھ نے تالا کھول کر دونوں ہاتھوں کے ہلکے سے دھکے سے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

کملا ایک پھندے میں چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بہت ہی خوفناک منظر تھا۔ کملا گلے میں پڑے ہوئے پھندے سے جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی اور زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ بہت بھیانک ہوگیا تھا۔

اپنے قریب ہی ہلکی سی چیخ سن کر میں چونک گیا۔ وہ روپ متی تھی جو کملا کو اس طرح پھندے سے لٹکے ہوئے دیکھ کر چیخی تھی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر بے پناہ وحشت تھی۔ ہمارے پیچھے کھڑا ہوا تارا سنگھ بھی وحشت زدہ سا نظر آرہا تھا۔

میں ایک بار پھر سامنے دیکھنے لگا۔ کمرے کی چھت کافی اونچی تھی۔ یہ لینٹر کی چھت نہیں تھی بلکہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آہنی گارڈر ڈال کر چھت تیار کی گئی تھی۔

کملا نے بستر کی چادر کی ایک چوڑی پٹی پھاڑ کر اسے رسی کی طرح بٹ لیا تھا اور اسے چھت کے آہنی گارڈر میں سے گزار کر پھندا بنا کر اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔ رسی کو چھت کے آہنی گارڈر سے گزارنے اور گلے میں پھندا ڈالنے کے لیے ایک چھوٹی میز اور کرسی استعمال کی گئی تھی۔ میرا اندازہ ہی نہیں بلکہ یہ حقیقت، روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ کملا چھوٹی میز پر کرسی رکھ کر اس کے اوپر چڑھی ہوگی۔ پہلے اس نے رسی گارڈر میں سے گزاری پھر گلے میں پھندا ڈال کر کرسی کو پیروں کے نیچے سے گرا دیا اور وہ پھندے سے لٹک کر رہ گئی۔ کرسی اور میز اس کی جھولتی ہوئی لاش کے عین نیچے فرش پر الٹی پڑی تھیں۔

میں اور میرے پیچھے روپ متی اور تارا سنگھ بھی کمرے میں آگئے تھے۔ تارا سنگھ نے تیزی سے آگے بڑھ کر پہلے میز سیدھی کی پھر کرسی اس کے اوپر رکھ کر اوپر چڑھ گیا اور آہنی گارڈر میں رسی کی گرہ کھولنے لگا۔ میں نے بھی آگے بڑھ کر پھندے سے جھولتی ہوئی کملا کی ٹانگوں کو گرفت میں لے لیا تاکہ رسی کھلنے سے وہ نیچے نہ گر سکے۔

تارا سنگھ کو وہ گرہیں کھولنے میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ میں نے لاش کو سنبھال کر آہستگی سے نیچے اتارا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ تارا سنگھ نیچے اتر آیا۔ اس نے کرسی اور میز اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ تارا سنگھ مار دھاڑ کا آدمی تھا۔ جنگجو قسم کا۔ ممکن ہے زندگی میں ایک دو آدمی اس کے ہاتھوں مارے بھی جا چکے ہوں یا شدید زخمی ہوئے ہوں۔ وہ ایسی باتوں سے خوف زدہ ہونے والا نہیں تھا لیکن کملا کی لاش کو دیکھ کر وہ بھی دہشت زدہ سا ہوگیا تھا۔

میں نے کملا کے گلے پر سے بڑی مشکل سے پھندے کی گرہ کھول کر رسی اس کے گلے سے الگ کی۔ گلے پر رسی کا گہرا نشان بن گیا تھا۔ نرخرے کی جگہ دبی ہوئی نظر آرہی تھی۔

کملا کے جسم پر زیر جامے کے نام پر ایک نہایت ہی مختصر لباس تھا۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی تحریک محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے کان کے نیچے گردن پر ایک مخصوص جگہ پر انگلی رکھی۔ وہاں بھی خاموشی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چارپائی کے تکیے کے قریب چند اور چیزوں کے علاوہ ایک چھوٹا آئینہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے یہ ساری چیزیں پہلے میز پر پڑی ہوں گی۔ میز استعمال کرنے کے لیے کملا نے یہ چیزیں اٹھا کر چارپائی پر ڈال دی تھیں۔ میں نے وہ آئینہ اٹھا کر کملا کی ناک کے نیچے لگا دیا لیکن مایوسی ہوئی۔ کچھ نہیں ملا۔ کملا میں اگر زندگی کی رمق ہوتی تو خواہ وہ ہلکی ہی سہی، سانس کی آمد و رفت بھی ہوتی جس سے ناک کے نیچے رکھا ہوا آئینہ دھندلا جاتا لیکن آئینہ بالکل صاف تھا۔ کملا کو پھندے سے لٹکے ہوئے دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ختم ہوچکی ہے لیکن یہ سب کچھ میں نے تارا سنگھ اور روپ متی کی تسلی کے لیے کیا تھا۔

کملا کا چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔ میں نے بستر کی چادر کھینچ کر اس کے اوپر ڈال دی اور روپ متی کی طرف گھوم گیا۔

"ختم ہوچکی ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں یہاں آ...

...دو گھنٹے تو ہو ہی چکے ہیں۔ اگر کملا نے اس کے ایک گھنٹے بعد بھی گلے میں پھندا ڈالا ہوگا تو اتنی دیر لٹکے رہنے کے بعد اس کے زندہ بچ جانے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھندے پر تو دو منٹ میں ہی جان نکل جاتی ہے۔

موت... کتنا بھیانک لفظ ہے۔ ہر ذی روح اس سے خوف زدہ رہتا ہے۔ اپنے آپ کو اس سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے لیکن... آتما ہتیا (خود کشی)... اپنے آپ کو خود موت کے حوالے کرنا واقعی بہت جرأت اور ہمت کا کام ہے۔

کملا نے خوف ہی کی وجہ سے اپنے آپ کو پھندے سے ختم کرلیا تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں بیج سنگھ اور ... کا حشر دیکھ لیا تھا۔ پکڑے جانے کے بعد اسے بھی ... تھا کہ اس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بدتر سلوک کیا جائے گا۔ اس تشدد اور اذیت سے بچنے کے لیے اس نے خود کشی کرلی۔ اس کے خیال میں تمام تکلیفوں اور اذیتوں سے ... یہ ایک آسان راستہ تھا۔

میں نے گھوم کر روپ متی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی وحشت سی بھری ہوئی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں ایک اور بات سوچ رہا تھا۔ اگر پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی جاتی تو ہم خود ہی کسی چکر میں پھنس سکتے تھے۔ روپ متی کے ساتھ پولیس کا رویہ میں دیکھ چکا تھا۔ کوئی بھی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ کملا نے خود کشی کی ہے۔ جب اس کی موت کی خبر سامنے آئے گی تو وہ دونوں بھائی بھی سامنے آجائیں گے۔ وہ پولیس کو بتائیں گے کہ ہم کملا کو اغوا کرکے لے گئے تھے اور پھر اسے گلا گھونٹ کر مار دیا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس ان دونوں بھائیوں کے بیان کو اہمیت دے گی اور روپ متی ایک ایسے چکر میں پھنس جائے گی جس سے نکلنا مشکل ہوجائے گا اور ظاہر ہے میں بھی اس کے ساتھ لپیٹ میں آجاؤں گا۔

"اب کیا ہوگا؟" روپ متی کی سرسراتی ہوئی آواز سن کر میں اس کی طرف گھوم گیا لیکن میرے کچھ بولنے سے پہلے تارا سنگھ بول پڑا۔

"پولیس کو خبر کردوں راج کماری جی؟"

"بکواس بند... چپ رہو...!" روپ متی اس زور سے چیخی تھی کہ تارا سنگھ اچھل پڑا۔ "خبردار... اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ نکالا تو..."

"نہیں... نہیں... راج کماری جی۔" تارا سنگھ سہم گیا۔

"پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب ہوگا کہ ہم کسی نئی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پولیس پہلے ہی تمہارے خلاف ہے۔ تمہیں بڑے آرام سے قتل کے کیس میں پھانس لیا جائے گا۔"

"تو پھر..." روپ متی بولی "لاش کو حویلی کے کمپاؤنڈ میں کسی جگہ دبا دیا جائے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "کملا کی گمشدگی پر وہ دونوں بھائی پولیس کو تمہارے خلاف ضرور ورغلائیں گے۔ تم پر اس کے قتل کا شبہ بھی ظاہر کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے پولیس حویلی کی تلاشی بھی لے۔ ایسی صورت میں وہ سب سے پہلے کمپاؤنڈ پر توجہ دے گی۔ تازہ کھدی ہوئی جگہ پر فوراً شبہ ہوگا۔ لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے کوئی اور جگہ تلاش کرنی ہوگی۔"

"حرام زادی... کتیا...!" روپ متی کملا کی لاش کی طرف دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے بولی "مرنے کے بعد بھی میرے لیے مشکلیں پیدا کرگئی۔"

"اب وہ تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتی۔" میں نے کہا۔ "لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہمیں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی ہوگی جہاں سے اس کا سراغ نہ لگایا جاسکے۔"

"اس وقت ذہن میں صرف ایک ہی بات آرہی ہے۔" وہ بولی۔

"کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سنگانیر۔" روپ متی نے جواب دیا "یوں تو بہت سی جگہیں ہیں جہاں اس حرافہ کی لاش کو پھینکا جاسکتا ہے لیکن سنگانیر ایسی جگہ ہے جہاں کئی روز تک اس کا پتا نہیں چل سکے گا۔"

"یہ کہاں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً سولہ کلومیٹر جنوب میں ایک قدیم شہر ہے جو اب تقریباً کھنڈرات میں بدل چکا ہے۔ وہاں کچھ تاریخی عمارتیں اور قدیم مندر بھی ہیں۔ اگرچہ سیاح اس طرف جاتے رہتے ہیں لیکن اس لاش کو ان کھنڈروں میں کہیں بھی ڈالا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی وہ علاقہ زیادہ تر جنگل سے پٹا پڑا ہے۔"

"تو پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے کہا "بہتر ہوگا کہ ہم دن کی روشنی طلوع ہونے سے پہلے پہلے اس لاش کو ٹھکانے لگا دیں۔"

"تارا سنگھ۔" روپ متی اس کی طرف مڑ گئی "اس لاش کو کسی بوری میں ڈال دو یا چادر میں گٹھڑی باندھ دو۔ میں

ابھی آرہی ہوں اور سنو۔۔۔" اس نے تارا سنگھ کے چہرے پر نظریں جما دیں "تمہاری زبان بند رہنی چاہیے۔ کملا کے بارے میں کوئی بات اس حویلی کی چار دیواری سے باہر نہ نکلے۔"

"میں نے آپ کا نمک کھایا ہے راجکماری۔" تارا سنگھ نے جواب دیا۔ روپ متی اس کی طرف دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

تارا سنگھ نے کملا کی لاش پر پڑی ہوئی چادر کھینچ کر فرش پر بچھا دی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر لاش اٹھا کر چادر پر ڈال دی۔ تارا سنگھ نے بڑی بے دردی سے لاش کی ٹانگیں موڑ کر گٹھڑی باندھ دی اور باہر جاکر کہیں سے بوری لے آیا۔ ہم دونوں نے مل کر وہ گٹھڑی اس بوری میں ڈال دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ بوری سرونٹ کوارٹر سے نکال کر پجارو کے پچھلے حصے میں ڈال دی گئی۔ مندری بھی برآمدے میں کھڑی تھی۔ جانکی کے بارے میں مندری نے بتایا کہ وہ سو چکی ہے۔

تارا سنگھ نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ مندری اس کے برابر پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اور روپ متی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے لباس بدل لیا تھا۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی تھا اور وہ بڑی حد تک ترو تازہ نظر آرہی تھی۔ پجارو حویلی کے گیٹ سے نکل کر تیزی سے ویران سڑکوں پر دوڑنے لگی۔

مندری کو ساتھ لے جانے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی اور جب یہی سوال میں نے روپ متی سے کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"جے پور ائرپورٹ بھی اسی طرف ہے۔ بعض اوقات اس طرف آنے جانے والی گاڑیوں کو چیکنگ کے لیے روک لیا جاتا ہے لیکن اگر گاڑی میں عورتیں ہوں تو چیک نہیں کیا جاتا۔"

روپ متی کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

اس وقت تین بجنے والے تھے۔ پجارو آدرش نگر سے نکل کر موتی ڈونگری روڈ پر آگئی۔ یہی سڑک انڈسٹریل روڈ کو کراس کرتی ہوئی سنگانیر اور ائرپورٹ کی طرف چلی گئی تھی۔

اس سڑک پر اِکا دُکا گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ شہر سے تقریباً پانچ کلو میٹر دور نکل آنے کے بعد تارا سنگھ نے پجارو ایک اور ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ یہ سڑک بالکل سنسان تھی۔

سنگانیر سہر کی قدر نشیب میں واقع تھا۔ یہ شہر بالکل ویران نہیں تھا۔ بہت زیادہ قدیم عمارتیں کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھیں جبکہ باقی حصہ آباد تھا۔ شہر کے ویرانے کے ساتھ ایک گنجان اور بہت بڑا جنگل تھا۔ تارا سنگھ پجارو اس جنگل کی طرف جانے والے راستے پر موڑ... اور بالآخر ایک جگہ اس نے گاڑی روک لی۔

کسی بہت قدیم عمارت کے کھنڈر تھے۔ قدِ آدم تک جھاڑیوں' بیلوں اور بے تحاشا پھیلے ہوئے درختوں نے عمارت کو تقریباً چھپا رکھا تھا۔

تارا سنگھ نے انجن بند کردیا۔ تمام روشنیاں بجھا دیں۔ اس کے ساتھ میں بھی نیچے اتر آیا۔ ہم دونوں نے مل کر بوری کو باہر نکالا جسے تارا سنگھ نے کندھے پر لادا اور عمارت کے کھنڈر کی طرف جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔

میں گاڑی کے قریب کھڑا رہا۔ تارا سنگھ کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

تارا سنگھ نے واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ جنگل سے نکل کر گاڑی نئے شہر کے باہر ہی باہر ہوتی ہوئی ائر پورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئی۔ ائرپورٹ کی وجہ سے اس سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت تھی۔ ہماری گاڑی بھی اس ٹریفک میں شامل ہوگئی۔

شہر کے پہلے چوراہے پر پولیس کی ایک پارٹی بعض گاڑیوں کو روک رہی تھی۔ ہماری گاڑی کو بھی رکنے کا اشارہ کیا گیا۔ تارا سنگھ نے رفتار کم کردی لیکن گاڑی کے پوری طرح رکنے سے پہلے ہی پولیس والے نے آگے بڑھنے کا اشارہ کردیا۔ روپ متی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ پولیس والے نے اگلی سیٹ پر مندری کو بیٹھے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ روپ متی کلا... دوسری طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے کانسٹیبل کی نظر اس پر بھی پڑی ہو لیکن میرا خیال ہے کہ مندری کو دیکھ کر ہی کانسٹیبل نے گاڑی کو جانے کا اشارہ کردیا تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے حویلی پہنچ گئے۔

"تم جاکر سوجاؤ مندری۔" روپ متی نے اندر آنے کے بعد کہا "اور ایک بات یاد رکھنا۔ کملا یہاں نہیں آئی تھی۔ اس روز تیج سنگھ اور دھرمیش کے ساتھ جانے کے بعد نہ تم نے کملا کو دیکھا نہ تم نے اس کے بارے میں کچھ سنا۔ دیوان سنگھ اور تارا سنگھ کو بھی یہ بات اچھی طرح...

...سمجھ گئی راج کماری۔" مندری سرہلاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

روپ متی نے دروازہ بند کردیا۔ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ آٹومیٹک لاک کی ناب آن ہوگئی۔ مندری کے پاس ڈپلی کیٹ چابی موجود تھی۔ صبح اندر آنے کے لیے وہ اپنی چابی سے دروازہ کھولتی تھی۔ ویسے مندری عام طور پر حویلی کے اندر ہی کسی کمرے میں رہتی تھی لیکن اس وقت روپ متی نے اسے کیوں باہر نکال دیا تھا۔

ہم دونوں اوپر آگئے۔ روپ متی والے کمرے میں جانکی گہری نیند سو رہی تھی۔ ہم نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور روپ متی مجھے اشارہ کرتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ اوپر کی منزل پر اگرچہ اور کمرے بھی تھے لیکن روپ ... لے آئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے کمرے میں آئے گی لیکن وہ راہداری میں مڑگئی اور اس کے ساتھ میں جس کمرے میں داخل ہوا اسے دیکھ کر میری آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یوں تو پوری حویلی ہی کسی محل کا منظر پیش کرتی تھی لیکن اس وسیع و عریض کمرے کو دیکھ کر یوں لگا جیسے میں واقعی کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔

بہت شان دار کمرا تھا۔ درمیان میں ایک بہت بڑا بیڈ تھا جس پر ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی چادر بچھی ہوئی تھی۔ فرش پر دبیز قالین تھے اور بہت قیمتی اور آرام دہ صوفے بچھے ہوئے تھے۔

روپ متی بیڈ پر ڈھیر ہوگئی اور میں اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

"اب یہ ایک نئی پریشانی پیدا ہوگئی۔" روپ متی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اگر ان دونوں بھائیوں کو شبہ ہوگیا کہ کملا کو پکڑ لائے تھے تو وہ میرے خلاف ایک نیا محاذ کھڑا کردیں گے۔"

"تمہارے خلاف نہیں میرے خلاف۔" میں نے تصحیح کی "کم از کم آج رات تو تم چکر میں نہیں آئیں۔ ان دونوں نے مجھے اور جانکی کو دیکھا تھا۔ کملا وہاں ہماری وجہ سے ہی بھاگ گئی تھی۔ کملا کی گمشدگی کے بارے میں انہیں کوئی شبہ ہوا تو ہم دونوں پر ہوگا۔"

"لیکن وہ مجھے نظر انداز نہیں کریں گے۔" روپ متی نے کہا "وہ تو تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ تمہیں میں ہی لے کر آئی ہوں۔"

"بالکل یہ درست ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں رہی تھی۔" میں نے کہا "لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں تلاش کس طرح کیا جائے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ ہمیں یہ زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔" روپ متی نے جواب دیا "دو چار دن تو وہ کسی پناہ گاہ میں دبکے رہیں گے اور پھر خود ہی سامنے آجائیں گے۔ اس وقت دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں یہ کہتے ہوئے صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ صوفہ اس قدر نرم تھا کہ میں اس کے اندر دھنسا جارہا تھا۔

"تم یہاں بیڈ پر آجاؤ۔ میں صوفے پر لیٹ جاتی ہوں۔" روپ متی یہ کہتے ہوئے بیڈ سے اتر گئی۔

میرے منع کرنے کے باوجود وہ اس بات پر مصر رہی کہ میں بیڈ پر سوجاؤں اور بالآخر مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔

آج کی اس بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ ٹھوڑی میں بھی تکلیف ہورہی تھی لیکن اس تکلیف سے قطع نظر میں آرام دہ بستر پر لیٹتے ہی سوگیا۔

میں ابھی زیادہ گہری نیند میں نہیں تھا کہ میری آنکھ کھل گئی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ روپ متی میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اس کمرے میں کیوں لائی تھی۔

میں نے اسے اپنے سے الگ کرنا چاہا تو وہ اور بھی سختی سے میرے ساتھ لپٹ گئی۔ وہ جاگ رہی تھی۔

"پلیز! مجھے اسی طرح لپٹے رہنے دو۔" وہ خوابیدہ سے لہجے میں بولی "زندگی میں پہلی بار ایسا سکون مل رہا ہے۔ مجھے اس سے محروم نہ کرو۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ روپ متی میرے ساتھ لپٹی رہی اور پھر وہ سوگئی۔

میں نے یہ آدھا گھنٹا کانٹوں کی سیج پر گزارا تھا۔ روپ متی اس وقت گہری نیند میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ کیا اور اس سے بھی زیادہ احتیاط اور آہستگی سے بیڈ سے اتر کر ننگے پیر دبیز قالین پر چلتا ہوا دروازے کی طرف آگیا۔ دروازہ کھول کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور باہر نکل کر آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا۔

ہال میں آکر میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوگیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس وقت میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور میں پندرہ بیس منٹ بعد اپنی کیفیت پر قابو پا سکا تھا اور پھر پتا نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔

میں دس بجے کے قریب بیدار ہوا تھا۔ جانکی میرے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مندری بھی کام کرتے ہوئے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جانکی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ اتنی بڑی حویلی میں تمہیں کوئی کمرا نہیں ملا تھا اور روپ متی بھی اپنے کمرے کے بجائے اس کمرے میں سوئی ہوئی ہے اور میرا خیال ہے اس صوفے پر آنے سے پہلے تم بھی وہیں تھے۔"

"ہاں۔ میں نے روپ متی کو لوری سنا کر، تھپک تھپک کر سلا دیا اور خود یہاں آگیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آج کل تم عورتوں کو بہت تھپکیاں دینے لگے ہو۔ نیت میں فتور تو نہیں آرہا؟" جانکی نے مجھے گھورا۔

"تھپکیاں تو میں نے کل تیج سنگھ کو بھی دی تھیں۔" میں نے جواب دیا۔ "بہرحال، تمہارے گلے کی تکلیف کیسی ہے؟" میں نے موضوع بدل دیا۔

"بہتر ہے۔ صبح تارا سنگھ کو بازار بھیج کر دوا منگوائی تھی۔ اس سے کافی فرق پڑا ہے۔" جانکی نے جواب دیا۔

"رات ہم تمہارے کمرے میں آئے تو تم سو رہی تھیں اسی لیے ہم دوبارہ نیچے آگئے تھے۔" میں نے کہا۔

"میرے کمرے میں آئے تھے؟ کہاں گئے تھے تم لوگ؟" اس نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر جیسے کچھ یاد آجانے پر بولی "اوہ..... تم لوگ کملا سے پوچھ تاچھ کے لیے سرونٹ کوارٹر میں گئے تھے۔ کیا بتایا اس نے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اسی وقت مندری میرے لیے چائے لے کر آگئی۔

"تمہیں مندری نے کچھ نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو۔ کوئی خاص بات؟" جانکی بولی۔

میں نے مندری کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں چرالیں۔ میں سمجھ گیا۔ رات کو روپ متی نے کہا تھا کہ وہ کملا کے سلسلے میں زبان بند رکھے گی اور اسی لیے اس نے جانکی کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔

"کیا بات ہوئی۔ تم نے بتایا نہیں؟" جانکی نے پہلے مندری کی طرف دیکھا اور پھر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"کملا نے خودکشی کرلی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا...؟" جانکی اچھل پڑی۔

"رات کو جب ہم سرونٹ کوارٹر میں دا[خل ہوئے تو]
اس کی لاش پھندے میں لٹکی ہوئی تھی۔" میں
اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں، میں

"روپ متی نے اسے دونوں بھائیوں کا طعنہ دیا
طعنہ سن کر اس کی غیرت جاگ اٹھی اور اس
پھندا ڈال کر آتما ہتیا (خودکشی) کرلی یا وہ اس قد[ر خوف]
زدہ ہوگئی تھی کہ متوقع تشدد اور اذیت سے بچ[نے کے لیے]
ہی اپنے آپ کو موت کے حوالے کردیا۔"

"اب کیا ہوگا؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظرو[ں سے میری]
طرف دیکھا۔

"جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں

"اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسلے تو پڑیں گے ہی۔"

اس کے بعد خاموشی ہی رہی۔ چائے پی[نے کے تھوڑی]
دیر بعد میں اپنے کمرے کے باتھ روم میں چلا گیا
آدھے گھنٹے بعد میں لان میں مالی کے ساتھ پودوں
رہا تھا۔

○☆○

دو دن گزر گئے۔

اس دوران میں نہ تو تیج سنگھ اور دھرمیش
کوئی ردِعمل سامنے آیا اور نہ ہی کملا کی لاش
کچھ سنا گیا جس کا مطلب تھا کہ اس کی لا[ش]
دریافت نہیں ہوئی تھی۔ اگر لاش دریافت
اخبارات میں اس کے بارے میں کوئی خبر ضرور

وہ چوتھا دن تھا۔ منگل کا دن اور پورن ما[شی کی]
چودھویں رات کی۔ مندری ویسے تو روزانہ ہی
ہی واقع ایک چھوٹے سے مندر میں پوجا کے لیے
لیکن پورن ماشی کی شب وہ سنگھ پول گیٹ کے
کے مندر میں گزارتی تھی۔ روپ متی اسے
اس سے اگلے دن کی چھٹی دے دیا کرتی تھی او[ر]
شام کے بعد تارا سنگھ یا دیوان سنگھ گاڑی پر
چھوڑ بھی آیا کرتا تھا۔

اس روز شام سے ذرا پہلے مندری جا[نے]
کرنے لگی تو جانکی بھی اس کے ساتھ جانے کو تیا[ر]

"یہ میرے لیے انوکھی بات ہے۔" میں
گھورتے ہوئے کہا "تم تو دین دھرم کی قید
تمہیں پوجا پاٹ کا خیال کیسے آگیا؟"

"کسی درخت کی ایک آدھ شاخ سوکھ جائے تو اس کی جڑیں ختم نہیں ہو جاتیں۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میری جڑیں تو اس دھرم ہی میں ہیں نا اور جڑیں ابھی سوکھی نہیں ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "مندری نے اپنے کمرے کے ایک حصے میں چھوٹا سا ایک مندر بنا رکھا ہے۔ تم نے اس کا کمرا نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ روزانہ صبح سویرے اس چھوٹے سے مندر میں رکھی ہوئی درگا ماں کی پوجا کرتی ہے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی کسی بھگوان، دیوی یا دیوتا کی پوجا کروں اس لیے آج میں بھی مندری کے ساتھ مندر جارہی ہوں۔"

"ہندو دھرم میں تو سیکڑوں بھگوان اور ہزاروں دیویاں اور دیوتا ہیں۔ تمہارے من میں کوئی خاص...؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" جانکی نے میری بات کاٹ دی "پوجا کالی ماں کی کی جائے، گنیش دیوتا کی، شیرانوالی کی یا ہنومان کی۔ پرارتھنا تو (دعا، التجا، درخواست) بھگوان سے ہی کی جاتی ہے۔"

جانکی کی اس توجیہ پر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس کے دل میں دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ مندری کو پوجا کرتے دیکھ کر اس کے دل میں بھی شوق اٹھا تھا اور وہ محض شوقیہ طور پر اس کے ساتھ جارہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "تم مندری کے ساتھ جارہی ہو تو صبح ہی واپس آؤ گی۔"

"ہاں۔ اور تم اپنا خیال رکھنا۔" جانکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ یہ بات کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

مندری اور جانکی آٹھ بجے کے قریب حویلی سے رخصت ہوگئیں۔ دیوان سنگھ انہیں شیراڈ پر لے گیا تھا۔ اب صرف تارا سنگھ رہ گیا تھا۔ روپ متی نے نو بجے کے قریب کھانے کے بعد اسے بھی چھٹی دے دی۔

"تم بہت دنوں سے اپنے بھتیجے کے پاس جانا چاہتے تھے نا؟" روپ متی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج رات تم اس کے پاس چلے جاؤ اور ہاں۔ خالی ہاتھ مت جانا۔ اس کے بچوں کے لیے مٹھائی ضرور لے جانا۔" اس نے مٹھی میں دبا ہوا سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

تارا سنگھ نے اس کے ہاتھ سے نوٹ لیتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور سرونٹ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک پھولا ہوا شاپنگ بیگ ہاتھ میں لٹکائے واپس آگیا۔

"تارا سنگھ کی بیوی کوئی اولاد پیدا کیے بغیر اس جہان سے سدھار گئی تھی۔" روپ متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ جے پور میں اس کا بھتیجا رہتا ہے جس کے بچوں سے اسے بہت پیار ہے۔ اپنی تنخواہ میں سے پیسے بچا بچا کر ان کے لیے چیزیں خریدتا رہتا ہے اور ہفتے میں ایک مرتبہ وہاں ضرور جاتا ہے لیکن اس مرتبہ اسے جانے کا موقع نہیں مل سکا اس لیے آج میں نے اسے چھٹی دے دی۔"

تارا سنگھ ایک لمحے کو ہمارے قریب رکا۔ اس نے ہم دونوں کو پرنام (سلام) کیا اور پھر "جے رام جی" کہتا ہوا گیٹ کی طرف چلا گیا۔ ہم اس وقت برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس نے باہر سے دروازہ بھیڑا تو آٹومیٹک لاک کی کلک کی ہلکی سی آواز یہاں بھی سنائی دی تھی۔

میں برآمدے سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا لان میں آگیا۔ لان میں بانس کی کھپچیوں سے بنی ہوئی آرام دہ کرسیاں اور میز بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ لان کے وسط میں پختہ روش پر فینسی الیکٹرک پولز پر بلب بھی جل رہے تھے۔ اوپر لگے ہوئے شیڈز کی وجہ سے ان کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیل رہی تھی۔ لان کے دوسرے حصے میں خوب صورت حوض میں فوارہ بھی چل رہا تھا۔ مدھم روشنی اور سبزے میں گھرے ہوئے یہاں بیٹھنا اور بھی اچھا لگ رہا تھا۔ کسی طرف سے آنے والی، رات کی رانی کی بھینی بھینی مہک بھی نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

میں جب اٹھ کر اس طرف آیا تو روپ متی بھی اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ برآمدے والے دروازے میں نمودار ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ جس میں لیمن اسکوائش کی رنگت سے ملتا جلتا مشروب بھرا ہوا تھا۔

میں ایک اور بات دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ روپ متی نے اندر جا کر لباس بھی تبدیل کرلیا تھا۔ جب سے جانکی یہاں آئی تھی وہ عام طور پر رات کو اوپن شرٹ اور ڈھیلے ڈھالے پاجامے پر مشتمل سلیپنگ سوٹ پہنا کرتی تھی لیکن آج اس نے گلابی رنگ کی نائٹی پہن لی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر بھی بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور میرے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے گلاسوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں بھرے ہوئے مشروب میں برف کی ٹکڑیاں بھی تیر رہی تھیں۔

"سوم رس۔" روپ متی اس مرتبہ مسکرائی تو اس کے رخسار پر ننھا سا چاہ زنخداں نمودار ہوگیا "میں نے سوچا آج تمہیں چائے کے بجائے سوم رس پلایا جائے۔ اس کا ذائقہ اور سرور تم مدتوں یاد رکھو گے۔"

میں نے ایک گلاس اٹھا کر ہلکی سی چسکی لی۔ دیکھنے میں یہ مشروب لیمن اسکوائش ہی لگتا تھا لیکن اس میں صندل جیسی مہک تھی اور ذائقہ بھی صندل جیسا ہی تھا۔ میں نے گلاس دوبارہ ٹرے میں رکھ دیا اور روپ متی کی طرف دیکھنے لگا۔

باریک نائٹی میں اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ مجھے اس کی نیت پر شبہ ہو رہا تھا۔ جانکی مندری کے ساتھ چلی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ بھی روپ متی کی کوئی سازش ہی ہو۔ میں تو نہیں جانتا تھا کہ مندری ہر پورن ماشی کی شب واقعی کالی کے مندر میں جاتی تھی یا نہیں۔ یہ بات تو مجھے روپ متی ہی نے بتائی تھی۔ اب مجھے اس پر شبہ ہو رہا تھا۔ اس نے باقاعدہ پلاننگ کے تحت مندری کو بھیجا تھا اور ہو سکتا ہے اس کے کہنے پر مندری نے جانکی کو بھی ایسی پٹی پڑھائی ہو کہ وہ بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ دیوان سنگھ بھی ان کے ساتھ ہی گیا تھا۔ چار گھنٹے ہو چکے تھے اور وہ اب تک واپس نہیں آیا تھا اور روپ متی نے تارا سنگھ کو بھی رات بھر کے لیے چھٹی دے دی تھی۔ یقیناً کوئی گڑ بڑ تھی۔ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجانے لگی۔

"دیوان سنگھ تو ان دونوں کو مندر چھوڑنے گیا تھا نا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔" میں نے اپنے خیال کی تصدیق یا تردید کے لیے پوچھا۔

"اگر مندری اکیلی جاتی تو وہ اسے چھوڑ کر واپس آجاتا۔" روپ متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن جانکی ساتھ تھی۔ صبح واپسی پر انہیں بسوں میں دھکے کھانے پڑتے اس لیے میں نے دیوان سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ مندر کے باہر کسی جگہ گاڑی ہی میں رات گزار لے اور ان کا انتظار کرے۔"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" میں نے یہ کہتے ہوئے روپ متی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

روپ متی کے حلق سے بڑا زوردار قہقہہ نکلا اور پھر وہ ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ میں اس کے بل کھاتے ہوئے جسم کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کرسی کی پشت سے اس طرح ٹیک لگالی کہ اس کے جسم میں تناؤ سا پیدا ہوگیا۔ ہوا سے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے ہٹائے اور ایک جھٹکے سے سیدھی ہوگئی۔

"تم پہلے مرد ہو جو عورتوں سے اس طرح ڈرتے ہو۔" مسکراتے ہوئے بولی "لیکن اطمینان رکھو۔ میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔ ویسے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آج کی رات میں اور تم اس حویلی میں اکیلے رہیں۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے۔"

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ چودھویں شب کا چاند اپنا نصف سفر مکمل کرنے والا تھا۔ آج پورن ماشی (پورے چاند) کی رات تھی۔ ہندوؤں کے عقیدے بھی بڑے عجیب ہیں۔ پورن ماشی اور اماوس کی راتوں کو ان کے دھرم میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

"سوم رس پیو۔ اس میں برف ختم ہو رہی ہے۔"

روپ متی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھالیا تھا۔ دوسرا گلاس میں نے اٹھالیا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ صندل کی خوشبو والا یہ شربت واقعی بہت خوش ذائقہ تھا۔

مشروب پینے کے بعد بھی ہم کافی دیر وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ سینے میں جیسے الاؤ بھڑکنے لگے تھے اور دماغ میں بھی ہلکی ہلکی سی سنسناہٹ ہونے لگی تھی۔ میں بار بار کرسی پر پہلو بدل رہا تھا۔ اس بے چینی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی لیکن ایک تبدیلی میرے اندر آئی تھی جسے میں نے خود بھی نوٹ کیا تھا۔

پہلے میں روپ متی کی طرف دیکھنے سے کتراتا رہا تھا لیکن اب میری نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ روپ متی بھی بار بار عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

دور کہیں کسی گھڑیال نے ایک کا گھنٹا بجایا اور روپ متی کرسی سے اٹھ گئی۔

"ایک بج چکا ہے۔ آؤ۔ اب اندر چلیں۔"

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور ایک بار پھر سوچنے لگا کہ اس بے چینی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اچانک مجھے اس مشروب کا خیال آگیا۔ روپ متی نے کہیں اس میں شراب نہیں ملا دی تھی۔ لیکن نہیں۔ اس میں اگر شراب کا ایک

قطرہ بھی شامل ہوتا تو میں اس کی بو کو فوراً محسوس کرلیتا۔ یہ تو صندل کی خوشبو والا بڑا خوش ذائقہ شربت تھا۔

برآمدے والے دروازے میں داخل ہوتے ہی روپ متی نے دروازہ بند کرکے لاک کردیا اور جب میں اپنے کمرے کی طرف مڑنے لگا تو روپ متی نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"ادھر نہیں اوپر۔" اس نے سرسراتی سی آواز میں کہتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی اور پھر میں منہ سے ایک بھی لفظ نکالے بغیر اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے اب بھی میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

کمرے میں آکر روپ متی نے دروازہ بند کردیا اور مجھے بیڈ پر گرا کر قہقہے لگانے لگی۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں تو میں پوری طرح ہوش میں تھا لیکن سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے روپ متی نے بھی بیڈ پر چھلانگ لگا دی لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھ گئی۔ شیشے والی الماری میں نیچے کہیں سے شراب کی بوتل نکالی اور دو گلاسوں میں شراب انڈیل کر اس نے ایک طرف رکھے ہوئے چھوٹے فریج میں سے ٹرے نکال کر برف کی ٹکڑیاں دونوں گلاسوں میں ڈال دیں۔ ایک گلاس میرے ہونٹوں کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اصل سوم رس۔" روپ متی کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔ "اسے پی کر تم جھوم اٹھو گے۔" اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔

پہلا گھونٹ بھرتے ہی یوں لگا جیسے پگھلا ہوا لاوا حلق کو جلاتا ہوا پورے سینے میں پھیل گیا ہو۔ شدید جلن ہونے لگی لیکن میں اس جلن کو فوراً ہی بھول گیا۔ میرے اندر تو پہلے ہی سے لاوا کھول رہا تھا۔

اچانک چھناکے کی آواز سُن کر میں چونک گیا۔ لگتا تھا جیسے کوئی شیشہ ٹوٹا ہو اور چھناکے کی یہ آواز نیچے سے آئی تھی۔ میں نے ابھی شراب کے دو ہی گھونٹ بھرے تھے جن سے سینے میں تو شدید جلن ہو رہی تھی مگر شراب ابھی میرے دماغ کو نہیں چڑھی تھی۔

روپ متی نے بھی یہ آواز سنی تھی۔ ایک لمحے کو وہ بھی چونکی تھی لیکن پھر چھناکے کی اس آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے گلاس ایک بار پھر میرے ہونٹوں سے لگا دیا لیکن اس مرتبہ میں نے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا اور ٹھیک اسی

باخبری

لاشعور میں دبے ہوئے خوف'

احساسات اور محرکات کو بے نقاب

کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت 25 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

لمحے چھناکے کی آواز پھر سنائی دی۔ ایک اور شیشہ ٹوٹا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری مردانہ آواز بھی ابھری تھی لیکن سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ کس کی آواز تھی اور کیا کہا گیا تھا لیکن اس مرتبہ روپ متی بھی اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔

"اوہ... !نیچے کوئی ہے۔"

روپ متی چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتر گئی۔ وہ پہلے اس دروازے کی طرف بڑھی جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے لیکن پھر کچھ سوچ کر ٹیرس پر کھلنے والے دروازے کی طرف لپکی۔

یہ دروازہ سفید فارمیکا کی الماری سے ذرا آگے تھا اور اس کے سامنے ہلکے نیلے رنگ کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ روپ متی نے پردہ کھینچ کر ایک طرف ہٹا دیا اور دروازہ کھول کر باہر ٹیرس پر نکل گئی۔

میں بھی بیڈ سے اتر آیا۔ میرے قدم لڑکھڑا گئے مگر میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور ٹیرس والے دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ روپ متی چیختی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"کون ہے... !نیچے کون ہے؟"

جواب میں نیچے کہیں ایک اور شیشہ ٹوٹا اور اس کے ساتھ ہی ایک گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ارے او منا۔ وہ اوپر ہے رے۔ اوپر جا۔ پکڑ لے اس کو۔"

میرے دماغ پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ یہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ میں ٹیرس پر نکلنا چاہتا تھا مگر روپ متی واپس پلٹی اور بدحواسی میں مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں لڑکھڑا کر دروازے سے ٹکرا گیا۔

روپ متی نے دوڑ کر دوسرے دروازے کو اندر سے نہ صرف لاک کردیا بلکہ اوپر سے بولٹ بھی چڑھا دیا۔ میں ٹیرس والے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ شراب کے صرف دو گھونٹ میرے اندر گئے تھے اور الکحل نے اپنا اثر دکھانا شروع کردیا تھا۔ باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھی اپنا اثر دکھانے لگے تھے۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ میں دروازے سے لگا کھڑا روپ متی کی طرف دیکھ رہا تھا جو بدحواسی میں کمرے میں اِدھر سے اُدھر بھاگی پھر رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ کیا ڈھونڈ رہی ہو؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا حالانکہ یہ سوال پوچھنے میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔

"وہ... وہ آگئے ہیں۔" روپ متی نے مجھے دونوں بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا "ہوش میں آؤ ورنہ وہ ہم دونوں کو مار ڈالیں گے۔"

میں ہوش میں تو تھا مگر شاید حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ روپ متی مجھے چھوڑ کر ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ وہ درازوں میں بھری ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہی تھی مگر اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ شاید اسے نہیں مل رہی تھی۔

اور پھر اسی وقت کمرے کے دروازے کو باہر سے کھولنے کی کوشش کی جانے لگی۔ روپ متی الماری کی طرف دوڑی۔ اس نے الماری کے دونوں دروازے کھول دیے اور اس میں بھرے ہوئے کپڑے اور دوسری چیزیں باہر پھینکنے لگی۔

دروازے کو اب باہر سے ٹکریں ماری جارہی تھیں۔ میں روپ متی کے قریب پہنچ گیا اور اسے دونوں بانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھما لیا اور اسے اوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ مجھے اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اندر لاوا ابل رہا ہو اور میرا سینہ کسی بھی لمحے آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گا۔

روپ متی کا چہرہ خوف کی شدت سے اس طرح سفید ہو رہا تھا۔ جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھری ہوئی تھی۔

"ہوش میں آؤ۔" روپ متی نے اپنے بازو چھڑا کر مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا "موت کے فرشتے یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ ہم دونوں کو...."

"مار ڈالیں گے۔" میں نے اس کا جملہ مکمل کردیا۔

دروازے پر لگنے والی ٹکریں میرے دماغ میں دھماکے سے پیدا کررہی تھیں۔ روپ متی مجھے چھوڑ کر ایک بار پھر الماری میں رکھی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی۔

اسی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور دروازہ ٹوٹ کر اندر کی طرف گرا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دہاڑتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"مار ڈالو اس حرامی کو۔ یہی ہے وہ...."

یہ آواز میرے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نجانے اس آواز میں کیا اثر تھا کہ میں ایک دم جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور اس طرف متوجہ ہوگیا جو خنجر سے وار کرنے کے لیے دہاڑتا ہوا

طرف لپک رہا تھا۔

اس نے خنجر والا ہاتھ اٹھا کر مجھ پر وار کیا۔ میرا ہاتھ بھی حرکت میں آگیا۔ میں نے اس کا وار آدھے راستے ہی روک لیا۔ اس کی کلائی میری گرفت میں آگئی اور میں اس کی کلائی کو موڑتا چلا گیا۔

حملہ آور کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی اور چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہونے لگے۔ میں نے اس کا بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا۔ وہ آگے جھکتا چلا گیا۔ خنجر ابھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی ... پر زوردار گھونسا رسید کردیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ... ہوا ہاتھ بھی چھوڑ دیا۔ وہ کراہتا ہوا منہ کے بل گرا۔ اس مرتبہ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔

روپ متی کی چیخ کی آواز سن کر میں تیزی سے اس طرف مڑا۔ دھرمیش عرف منا روپ متی کو گرفت میں لینے کی کوشش کررہا تھا اور روپ متی مزاحمت کرتے ہوئے چیخ رہی تھی اور اس مزاحمت کے درمیان اس کے جسم پر باریک ... کی نائٹی بھی تار تار ہوچکی تھی۔

"بہت صبر کیا ہوں روپ متی۔" دھرمیش غراتے ہوئے کہہ رہا تھا "اب دیکھوں گا تم کیسے بچتی ہو میرے ہاتھ سے ... تمہارا یہ سورما...."

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میرا گھونسا اس کی ... کنپٹی پر پڑا اور وہ روپ متی کو ساتھ لیتا ہوا صوفے پر گرا۔ ... آگے بڑھ کر اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور جبڑے پر ایک اور زوردار گھونسا جڑ دیا۔ روپ متی ایک بار پھر الماری کی طرف لپکی۔ اس مرتبہ وہ درازیں کھول کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔

میں دھرمیش کو ایک اور پنچ لگانا چاہتا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا۔ ... آدمی نے اٹھ کر مجھ پر حملہ کردیا تھا۔ میری کھوپڑی پر ... والے گھونسے نے میرے چودہ طبق روشن کردیے تھے ... میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور مڑ کر اس پر حملہ کیا مگر مجھے اس کی زیادہ تواضع کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک اور آدمی کمرے میں گھس آیا تھا۔ اس نے پہلا ... کی طرح ڈکراتے ہوئے میرے پیٹ پر سر ... مارا اور پھر ان دونوں نے مجھے لاتوں اور گھونسوں پر ر...

دھرمیش ایک بار پھر روپ متی پر جھپٹ پڑا تھا اور ... ایک کمرا فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ...

دھرمیش کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔

میں نے ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھا۔ روپ متی کے ہاتھ میں پستول تھا اور دھرمیش کے سینے پر، ٹھیک دل کے مقام پر ایک سوراخ ہوچکا تھا، جس سے خون کی دھار بہہ رہی تھی اور پھر وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا نیچے گر گیا۔

روپ متی کے چہرے پر بے پناہ وحشت تھی۔ وہ ٹیرس والے دروازے کی طرف دوڑی لیکن اسی وقت تیج سنگھ ٹیرس پر نمودار ہوا۔ اس کا ایک زبردست گھونسا روپ متی کی کنپٹی پر لگا اور وہ چیختی ہوئی ڈھیر ہوگئی۔

وہ دونوں آدمی مجھ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کررہے تھے۔ میرا دماغ پوری طرح ٹھکانے پر نہیں تھا اور میں بری طرح پٹ رہا تھا لیکن پھر میرا داؤ بھی چل گیا۔

اب میں ان دونوں کی دھنائی کررہا تھا لیکن تیج سنگھ نے پشت سے حملہ کردیا۔ میرے شولڈر بلیڈ پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میں چیختا ہوا نیچے گرا اور پھر ان تینوں نے مجھے اپنا ٹارگٹ بنالیا۔ گھونسے اور ٹھوکریں میرے جسم کے ہر حصے پر برس رہی تھیں۔

میں لوہے کا بنا ہوا تو نہیں تھا کہ مجھ پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ آخری چیز جو مجھے یاد تھی وہ پیٹ پر پڑنے والی ایک ٹھوکر تھی اور وہ جملہ تھا جو کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"چھوڑ دو حرامی کو۔ ختم ہوگیا۔ اس کو اب میونسپلٹی والے ہی اٹھا کر لے جائیں گے۔"

اور اس کے بعد میرے ذہن پر دبیز تاریکی چھا گئی تھی۔

○☆○

وہ ملی جلی آوازیں تھیں جو میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں اور یہ آوازیں بھی میلوں دور سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ میں شاید قالین یا بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے حرکت کرنے کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ اٹھا۔ کندھے اور سر میں اٹھنے والی ٹیسوں نے مجھے کراہنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔

میری آنکھوں کے سامنے دُھند سی چھائی ہوئی تھی۔ میرے اوپر جھکا ہوا وہ چہرہ بھی دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکائیں۔ دھند چھٹنے لگی اور وہ چہرہ بھی بتدریج واضح ہوتا چلا گیا۔

وہ نسوانی چہرہ میرے لیے قطعی اجنبی تھا لیکن اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ صبیح و ملیح چہرہ، موٹی موٹی

سیاہ آنکھیں' ستواں ناک اور پتلے پتلے ہونٹ' پیشانی پر سرخ بندیا چمک رہی تھی جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ہندو تھی۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ذہن پر زور دینے لگا کہ یہ عورت کون ہے اور میں کہاں ہوں... پھر مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ روپ متی والا وہی کمرا تھا اور میں بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ دائیں طرف تو وہ عورت کھڑی تھی جو کچھ دیر پہلے میرے اوپر جھکی ہوئی تھی اور بائیں طرف مندری کھڑی تشویش آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کی تو اس مرتبہ بھی کراہ اٹھا۔

"آرام سے لیٹے رہو۔" اس عورت نے ایک بار پھر مجھ پر جھکتے ہوئے کہا "تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ زیادہ حرکت کروگے تو تکلیف ہوگی۔"

اور پھر اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ میرے اوپر چادر پڑی ہوئی تھی اور اس کے نیچے میرا جسم برہنہ تھا۔

"میرے کپڑے کہاں ہیں؟" میں نے گردن گھما کر مندری کی طرف دیکھا۔

"تمہارے کپڑے بہت خراب ہوگئے تھے۔ میں نے باہر ڈال دیے ہیں۔" مندری نے جواب دیا "تمہارے جسم کی چوٹوں کا معائنہ کرنے کے لیے کپڑے اتارنا ضروری تھا۔ یہ ڈاکٹر رادھا ہیں۔ میں تمہارے لیے دوسرے کپڑے لے کر آتی ہوں۔ تم آرام سے لیٹے رہو۔"

مندری کی باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ اس کے حواس بھی شاید اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں گردن گھما کر ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دراز قامت حسین عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس نے میرون کلر کی ساڑی پہن رکھی تھی۔

"روپ متی کہاں ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہی بات میں تم سے پوچھنا چاہتی ہوں۔" ڈاکٹر رادھا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "مندری کے بلاوے پر جب میں یہاں آئی تو سب کچھ اس طرح بکھرا ہوا تھا۔ وہاں قالین پر خون کا دھبا تھا جو اب بھی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی بڑی یدھ (جنگ) ہوئی ہے۔ تم اس طرف قالین پر بے ہوش پڑے تھے لیکن روپ متی کا پوری حویلی میں سراغ نہیں ملا۔"

"وہ... وہ کہاں گئی؟" میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا

کہ اس طرح اٹھنے سے چادر کا ایک حصہ میرے جسم [illegible] ہٹ جائے گا۔ میں نے چادر درست کی اور سر کا پچھلا [illegible] سہلانے لگا جہاں ایک بڑا سا گومڑا نمودار ہوچکا تھا۔

"اوہ...!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اسے [illegible] لوگ اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

"کون لوگ؟" ڈاکٹر رادھا نے الجھی ہوئی نظروں [illegible] میری طرف دیکھا۔

"تیج سنگھ۔" میں نے کہا "دھرمیش کو روپ متی [illegible] ماردی تھی۔ وہ یہاں گرا تھا۔" میں نے اس طرف اشا[رہ کیا] جہاں قالین پر خون کا دھبا نظر آرہا تھا "ان دونوں [illegible] کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ پہلے انہوں نے میرے او[پر] حملہ کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو اور روپ متی کو بچا[نے کی] کوشش کرتا رہا اور جب روپ متی نے دھرمیش کو گو[لی ماری] تو وہ سب مجھ سے لپٹ گئے تھے۔ وہ لوگ مجھے پیٹتے ر[ہے اور] شاید مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔"

ڈاکٹر رادھا گہری نظروں سے میری طرف دیکھ [رہی] تھی۔ اس کے خیال میں میرا دماغ پلٹ گیا تھا۔

"تمہارے منہ سے اب بھی شراب کی بو آرہ[ی ہے] مسٹر..." وہ رک گئی۔ شاید اسے میرا نام معلوم نہیں [تھا] شاید نشے میں تھے۔ تمہاری باتیں اب بھی میری [سمجھ میں] نہیں آرہیں۔ تمہیں فی الحال آرام کی ضرورت [ہے۔] تمہارے حواس بحال ہوجائیں تو..."

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اس کی بات [کاٹ] دی "مم... میں شراب کے نشے میں نہیں تھا۔ روپ [متی نے] زبردستی دو گھونٹ پلا دیے تھے مگر میں پوری طرح ہوش [میں تھا۔]"

"جس نے کبھی شراب نہ پی ہو وہ ایک گھونٹ پ[ی کر] ہوش میں نہیں رہ سکتا۔" ڈاکٹر رادھا نے میری بات [کاٹ] دی۔

"تمہیں کیسے پتا کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی؟" [illegible] نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مندری نے بتایا تھا کہ ایک روز تم نے شراب [illegible] روپ متی کو بھی تھپڑ مارے تھے لیکن مجھے حیرت ہے کہ [تم] اس کے ہاتھ سے دو گھونٹ پینے پر بھی کیسے آمادہ [ہوگئے؟]" ڈاکٹر رادھا نے یہ کہتے ہوئے میرے چہرے پر [نظریں جما] دیں۔

"میں خود بھی نہیں سمجھ سکا۔" میں نے نظریں [illegible] ہوئے جواب دیا "اس سے پہلے روپ متی نے مجھے [ایک] مشروب پلایا تھا جس سے صندل جیسی خوشبو آرہی [تھی۔]

"یہ راجاؤں کا خطہ ہے۔" ڈاکٹر رادھا کہہ رہی تھی "ان کے پرکھوں (آباؤاجداد) کو محلات تعمیر کرنے اور جنگیں لڑنے کا شوق تھا اور یا پھر لونڈیاں پالنے کا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "لیکن اب دور بدل گیا ہے۔ راج پاٹ ختم ہوچکے ہیں۔ آپس کی جنگیں قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔ موجودہ راجاؤں کو حکومت سے لاکھوں کروڑوں روپے کے وظائف ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس عیاشی کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ گیا۔ رانیوں اور راجاؤں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ راجاؤں نے جوان اور حسین داشتائیں رکھی ہوئی ہیں تو رانیوں نے بھی پہلوان پال رکھے ہیں۔ کئی راجکماریاں اور رانیاں ایسی ہیں جو اپنے شہوانی جذبات کو برقرار رکھنے کے لیے مجھ سے انجکشن لگواتی رہتی ہیں اور راج مہاراج سنیاسیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں تاکہ ان کے نسخوں سے وہ سدا جوان رہیں۔ سوم رس..." وہ ایک بار پھر خاموش ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی پھر مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہنے لگی "سوم رس بھی ایسا ہی ایک نسخہ ہے جو خاص قسم کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے راجاؤں جیسے دولت مند لوگ یہ نسخہ حاصل کرنے کے لیے سنیاسیوں کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دیتے ہیں۔"

"لیکن روپ متی..."

"اس نے اپنے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا ہے اس سے تم سمجھ گئے ہوگے کہ وہ کس قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہے۔" ڈاکٹر رادھا نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "اسے بھی پہلوانوں کا شوق تھا۔ ہر جوان اور خوب رو شخص کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی تھی۔ وہ تمہیں بھی اپنی عیاشی کے لیے خرید کر لائی تھی لیکن تم اس کے حسن کے جال میں پھنسنے کے بجائے ناصح بن گئے اور اسے اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ ٹیلی فون پر بتاتی رہتی تھی۔ مجھے بھی تمہاری طرح اس سے ہمدردی ہے۔ صرف دو روز پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں زیر کرکے ہی چھوڑے گی۔ میں نے اس وقت بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے میری بات ہنسی میں اڑا دی تھی اور آج..."

"اور آج وہ ہوگیا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے شبہ ہے کہ اس کے دشمن اس حویلی کی مسلسل نگرانی کررہے تھے اور آج انہیں پتا چل گیا کہ حویلی میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ وہ چڑھ دوڑے اگر روپ متی میرے ساتھ یہ حرکت نہ

[illegible] پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنے اندر عجیب [illegible] بے چینی محسوس ہونے لگی۔ خون میں جیسے انگارے بھر [گئے۔]" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس کی طرف [سے] نظریں چراتے ہوئے بولا "میں فطرتاً ایک شریف آدمی ہوں۔ عورتوں میں گھرا رہنے کے باوجود میں نے کبھی اپنے کردار [کی] کمزوری کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن وہ شربت پینے کے بعد میرے اندر آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور تمام حیوانی جذبات سرکشی پر آمادہ ہوگئے۔

"پوری طرح ہوش میں ہونے کے باوجود میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ مجھے روپ متی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شراب پلانے لگی۔ مجھے شراب سے شدید نفرت ہے لیکن روپ متی [کو] میں انکار نہ کرسکا۔ ابھی دو ہی گھونٹ پیے تھے کہ نیچے کوئی [دروازہ] ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا [پھر] اس پورے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا [جیسے] میں نہیں بول رہا' میرے اندر سے کوئی اور بول رہا ہو۔ ڈاکٹر رادھا بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی تھی اور پوری توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔

"کیا نام بتایا تھا تم نے... سوم رس۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "صندل کے ذائقے والا لیسن کی رنگت جیسا شربت۔"

"ہاں ہاں۔ وہی۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ شربت پینے کے بعد ہی میں اپنے آپ میں وہ تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔"

"تو پھر تم واقعی بے قصور ہو۔" ڈاکٹر رادھا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

"کیا وہ شربت..." میں خاموش ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ ساری خرابی اس شربت ہی کی تھی۔" ڈاکٹر رادھا نے جواب دیا "روپ متی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ہم کالج میں ایک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ بہت اچھی لڑکی [تھی] لیکن شادی کے بعد اس کے پتی کا دیہانت (انتقال) ہوا تو یہ غلط راستے پر پڑ گئی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا تھا لیکن اس نے [میری] ایک بھی نہیں مانی اور اس غلاظت بھرے راستے پر [چلتی] چلی گئی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ روپ متی نے مجھے سب کچھ بتایا [تھا۔]" میں نے کہا۔

کرتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔"

ڈاکٹر رادھا کچھ کہنا چاہتی تھی مگر مندری کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ مندری نے پاجامہ اور کرتہ پلنگ پر رکھ دیا۔

"تمہارے شریر (بدن) پر بہت چوٹیں آئی ہیں۔" ڈاکٹر رادھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے دوا لگا دی ہے۔ کچھ دوائیں کھانے کے لیے بھی بھجوا دوں گی مگر تمہیں ٹھیک ہونے میں کئی دن لگیں گے۔ بہرحال۔ ہم باہر جا رہے ہیں تم کپڑے بدل لو۔ بعد میں بات کریں گے۔"

وہ دونوں کمرے سے نکل گئیں۔ مندری نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ میں نے پلنگ سے اتر کر چادر ایک طرف ڈال دی اور کپڑے پہننے لگا۔ ہر حرکت کے ساتھ میرے جسم کے مختلف حصوں میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کپڑے بدل کر میں نے دروازہ کھول دیا اور باتھ روم میں گھس کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔

میری پیشانی پر بھی دائیں طرف ایک چھوٹا سا گومڑ نظر آ رہا تھا۔ بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبا پڑ چکا تھا۔ میں نے کرتہ اٹھا کر آئینے میں اپنی پشت پر دیکھا۔ بائیں طرف شولڈر بلیڈ پر بھی بڑا سا نیلا دھبا دکھائی دے رہا تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف اسی جگہ تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ اگر ہڈی ٹوٹی ہوتی تو وہ جگہ سوج گئی ہوتی۔

میں باتھ روم سے نکلا تو وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ کمرے کا سارا سامان اسی طرح بکھرا ہوا تھا۔ میں بھی ڈاکٹر رادھا کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور مندری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں تو صبح آنا تھا۔ پہلے کیسے آگئیں اور جانکی کہاں ہے؟"

"مندر میں۔" مندری نے جواب دیا "دیوان سنگھ اسے لینے کے لیے گیا ہوا ہے۔ بس آنے ہی والی ہوگی۔"

مندری نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا تو میری نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔

"تم پہلے کیسے آگئیں اور جانکی کو وہاں کیوں چھوڑا؟" میں نے مندری کو گھورا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ..." مندری نے ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھا اور پہلو بدل کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے؟" میرے لہجے میں کرختگی آگئی "جانکی کہاں ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم اس کی چنتا (فکر) مت کرو" مندری نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے جو کچھ بتایا وہ میرے لیے بہت بھیانک اور سنسنی خیز تھا۔

کالی ماتا عرف درگا دیوی کا یہ مندر راجا مان سنگھ نے تعمیر کروایا تھا اور مشرقی بنگال سے چٹان جیسا بہت بڑا کالا پتھر منگوا کر اس سے کالی کا مجسمہ تیار کروایا تھا۔ کالی کا یہ مجسمہ اس قدر ہیبت ناک ہے کہ اسے دیکھ کر ہی دل پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

اس مندر کو سیلا دیوی کا مندر بھی کہا جاتا ہے اور پہلے کالی کے چرنوں (قدموں) میں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی تھی لیکن بعد میں راجا مان سنگھ نے انسانی جانوں کی بھینٹ پر پابندی لگا دی اور اس کی جگہ بکری یا کسی اور جانور کی بھینٹ دی جانے لگی۔

"آج رات..." مندری کہہ رہی تھی "کالی کی مورتی کے سامنے تو بکرے کی بھینٹ ہی دی جانے والی تھی مگر مندر کے پچھلے حصے میں کالی کی ایک اور چھوٹی مورتی کے چرنوں میں ایک انسان کی بھینٹ دینے کا بھی منصوبہ تھا اور اس کے بارے میں کچھ خاص خاص لوگوں کو ہی معلوم تھا۔ میری ایک جانکار (شناسا) بوڑھی عورت مجھے بھی اس طرف لے گئی تھی۔ ایک انسان کو کالی کے سامنے موت کے گھاٹ اتارتے دیکھ کر میں کانپ اٹھی اور وہاں سے بھاگ آئی۔

"جانکی مندر کے مرکزی ہال میں تھی جہاں سیکڑوں لوگ جمع تھے۔ میں بڑی مشکل سے جانکی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکی اور جب میں نے اسے اپنے ساتھ واپس آنے کو کہا تو اس نے انکار کردیا اور کہا کہ میں فوراً واپس جاؤں اور تمہیں بتا دوں کہ پنڈت مرلی دھر اس مندر میں موجود ہے۔ میں نے جاننے کی کوشش کی تھی کہ پنڈت مرلی دھر کون ہے لیکن اس نے مجھے وہاں سے بھگا دیا کہ میں تمہیں اطلاع کردوں۔

"دیوان سنگھ کی گاڑی وہاں سے تقریباً نصف میل دور تھی۔ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگا کر حویلی واپس چلنے کو کہا اور جب ہم یہاں پہنچے تو حویلی کا گیٹ چوپٹ کھلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔

"برآمدے کے دائیں بائیں والے کمروں کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور برآمدے والا دروازہ کھلا تھا۔ میں اور دیوان سنگھ نے پہلے نیچے والے کمروں میں دیکھا پھر اوپر آئے تو یہ کمرا اسی حالت میں تھا اور تم وہاں بے ہوش پڑے تھے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "پہلے میں

تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی پھر دیوان سنگھ کو ڈاکٹر رادھا کی طرف بھیج دیا۔ یہ یہاں سے ذرا ہی آگے ایک کوٹھی میں رہتی ہیں دیوان سنگھ کے جانے کے بعد میں روپ متی اور تارا سنگھ کو تلاش کرتی رہی لیکن پوری حویلی میں ان میں سے کسی کا سراغ نہیں ملا۔ میں پولیس کو بھی اطلاع دینا چاہتی تھی لیکن مجھے پولیس کا وہ رویہ یاد تھا جب تیج سنگھ اور دھرمیش یہاں توڑ پھوڑ کر کے گئے تھے اور پولیس نے روپ متی کو دھمکا کر خاموش کرا دیا تھا اس لیے میں یہ سوچ کر خاموش رہی کہ ڈاکٹر رادھا سے مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے گا۔

"مجھے تمہاری بھی چنتا (فکر) تھی۔ دیوان سنگھ کے جانے کے بعد بھی میں تمہیں بار بار ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی اور پھر ڈاکٹر رادھا بھی تقریباً ایک گھنٹے کی کوشش کے بعد تمہیں ہوش میں لا سکی ہے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ تم ٹھیک ہو لیکن راجکماری کہاں ہے کس حال میں ہوگی۔ یہ چنتا کھائے جا رہی ہے مگر وہ کون لوگ تھے؟"

"تیج سنگھ اور دھرمیش۔ ان کے ساتھ دو غنڈے بھی تھے۔ وہ یہاں سے بھاگتے ہوئے اپنے ساتھ ایک لاش بھی لے گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہائے رام! کس کی لاش؟" مندری کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔ اس نے بے اختیار اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا تھا۔

"دھرمیش کی۔" میں نے جواب دیا "روپ متی نے اسے گولی ماردی تھی۔ تیج سنگھ اور اس کے دونوں غنڈے میری پٹائی کرنے لگے۔ میں بے ہوش ہوگیا۔ وہ شاید مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے یا ممکن ہے اس خیال سے عجلت میں بھاگے ہوں کہ شاید دھرمیش کو بچایا جا سکے اور وہ روپ متی کو بھی ساتھ لے گئے لیکن تم نے کیا نام بتایا تھا کہ جانکی نے کالی کے مندر میں کس کو دیکھا تھا؟"

"پنڈت مرلی دھر۔" مندری نے جواب دیا "اس نے کہا۔ تم یہ نام سن کر سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔"

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ مندری نے پہلے بھی یہی نام بتایا تھا مگر کالی کے چرنوں میں انسانی بھینٹ کے تذکرے نے اس کے ذہن کو وقتی طور پر اس حد تک ماؤف کردیا تھا کہ میں اس نام پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔

یہ وہی پنڈت مرلی دھر تھا جس نے سنگاپور میں دارا کو زخمی کیا تھا اور دارا اسی کے ساتھ سنگاپور سے فرار ہوکر ہندوستان آیا تھا اور قسمت نے مجھے اور جانکی کو بھی ہندوستان پہنچا کر عجیب و غریب حالات میں الجھا دیا تھا اور اتفاق سے آج جانکی نے مرلی دھر کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے مندری کو واپس بھیج دیا تھا کہ وہ مجھے لے کر کالی کے مندر پہنچ جائے اور مندری کے لیے یہاں کی صورتِ حال بڑی گمبھیر ثابت ہوئی تھی۔

میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کیا دارا بھی یہاں ہوسکتا ہے؟ اس کا پتا تو اس وقت چلے گا جب پنڈت مرلی دھر گرفت میں آئے گا۔

میں ایک بار پھر مندری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اب آپ ہی بتائیے رادھا جی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ پولیس کو اطلاع دی جائے یا..."

"معاملہ اس قدر گمبھیر ہے کہ پولیس کی مداخلت ضروری ہوگئی ہے لیکن..." ڈاکٹر رادھا نے کہا "لیکن یہاں ایک لاش بھی گری تھی اور اتفاق سے وہ قتل روپ متی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اگر پولیس کو اطلاع دی جاتی ہے تو روپ متی بھی اس چکر سے نہیں نکل سکے گی۔ میں اس کی دوست ہوں۔ اس کا نمک کھایا ہے اور میں ایسی قانون پسند بھی نہیں ہوں کہ پولیس کے پاس دوڑی جاؤں۔ اس شہر کے بڑے بڑے لوگ تو اس سے بھی زیادہ سنگین معاملات میں ملوث ہیں۔ میرے سینے میں تو ایسے ایسے راز پوشیدہ ہیں کہ اگر میں انہیں ظاہر کردوں تو اس شہر میں بھونچال آجائے۔ میں اس راز کو بھی اپنے سینے میں جگہ دے سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ..."

"اس کے علاوہ کیا...؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم مسلمان ہو۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں اچھل پڑا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں مسلمان ہوں؟ میں نے ایک لمحے کو سوچا پھر خیال آگیا کہ کچھ دیر پہلے ہی تو میں چادر کے نیچے بے لباس پڑا تھا۔ میری بے ہوشی کے دوران میں میرے جسم کی چوٹوں کا معائنہ کرنے کے لیے ان دونوں نے مجھے بے لباس کیا تھا۔ میں نے مندری کی طرف دیکھا۔ اس نے نظریں جھکالیں۔

"یہ ہندوستان ہے۔ یہاں ہندو اپنے آپ کو برتر و اعلیٰ اور سپرپاور سمجھتے ہیں۔ دوسری اقلیتوں سے تو انہیں خدا واسطے کا بیر ہے۔ سکھ، عیسائی اور مسلمان ان کی زیادتیوں کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔ مسلمان تو انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں نے پاکستان بنایا تھا تو وہ

لوگ اب پاکستان کیوں نہیں چلے جاتے۔ صرف مسلمانوں کو زک پہنچانے کے لیے کٹر اور انتہا پسند ہندوؤں کی کئی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

"یہ لوگ اپنی ہی ذات سے مخلص نہیں تو دوسروں کو کیا سمجھیں گے۔ یہ تو خود اونچ نیچ میں بٹے ہوئے ہیں۔ اونچی ذات کے ہندو نچلی ذات کے ہندوؤں پر آئے دن حملے کرتے رہتے ہیں اور جب نچلی ذات کے ہندوؤں کو موقع ملتا ہے تو وہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے دس بیس بندے مار ڈالتے ہیں۔

"روپ متی ایک راج کماری ہے۔ راج پاٹ نہیں رہا تو کیا ہوا۔ اسے سرکاری طور پر تو یہ اعزاز حاصل ہے۔ معاشرے میں اس کا ایک مقام ہے۔ ایک رتبہ ہے۔ یہاں تو اسکول یا کالج میں کوئی مسلمان لڑکا کسی ہندو لڑکی سے دوستی کرلے تو خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور جب لوگوں کو یہ پتا چلے گا کہ ایک مسلمان مرد راج کماری روپ متی کے ساتھ اس کی حویلی میں رہ رہا ہے تو یہاں تو قیامت آجائے گی۔ یہاں کے راجواڑے یہ بھول جائیں گے کہ وہ اپنی عیاشی کے لیے دوسری ذاتوں اور اپنی ہی نچلی ذات کی عورتوں کو تو اپنے بستر کی زینت بناتے ہیں لیکن وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرسکیں گے کہ ایک ہندو عورت کسی مسلمان کے ساتھ اسی طرح رہے۔ وہ تمہیں بھی قتل کردیں گے اور روپ متی کے بھی ٹکڑے کرڈالیں گے۔"

"حیرت ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "ایک ہندو عورت کے منہ سے اپنے ہی دھرم (مذہب) کے خلاف ایسی باتیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"میں نے دھرم کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔" ڈاکٹر رادھا نے جواب دیا "میں تو ان جنونیوں کی بات کررہی ہوں جو دھرم کا نام لے کر دھرم کو نشٹ (تباہ و برباد) کررہے ہیں اور ایسے لوگ تو ہر دھرم میں پائے جاتے ہیں۔ ہندو دھرم میں پنڈتوں اور پجاریوں نے تعصب اور نفرت پھیلا رکھی ہے اور تمہارے دین میں یہ کام تنگ نظر، متعصب اور فرقہ پرست مُلّا انجام دے رہے ہیں۔"

میرے پاس ڈاکٹر رادھا کی اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ ہندو پنڈتوں کے بارے میں تو میں بہت اچھی طرح جان چکا تھا۔ سب سے بڑی مثال تو بنکاک کا سوامی رگھوناتھ تھا جس نے دھرم کے نام پر عیاشی کا بہت بڑا اڈا قائم کر رکھا تھا۔ کون سے جرائم تھے جو وہاں نہیں ہوتے تھے اور وہ بدبخت بالآخر میرے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچا تھا۔

دھرم کو نشٹ کرنے یا پوتر (پاکیزہ) بنانے کی اس بحث سے قطع نظر صورتِ حال میرے لیے خاصی گمبھیر اور تشو... تھی۔ جانکی کالی کے مندر میں تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اس نے پنڈت مرلی دھر کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اس... نگرانی کررہی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ خود مرلی دھر... نظروں میں نہ آگئی ہو۔ جو لوگ بے دردی سے ایک انسان... پتھر کی مورت کے قدموں میں موت کے گھاٹ اتار سکتے... ان سے کسی رحم دلی کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔

ڈاکٹر رادھا نے اگرچہ اس واقعے کے بارے میں پولیس کو اطلاع نہ دینے کا عندیہ دیا تھا لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ پولیس اس واقعے سے بے خبر رہے۔ دھرمیش کو ... گولی لگی تھی۔ میں نے خود اسے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تیج سنگھ وغیرہ اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت تک مرا نہ ہو لیکن اگر وہ مرگیا ہوگا تو تیج سنگھ اپنے منا... پر خاموش نہیں بیٹھے گا۔ وہ اگرچہ روپ متی کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے لیکن اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ پولیس کو خبر کردیں گے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ڈاکٹر رادھا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"اگر تیج سنگھ نے پولیس کو اطلاع دے دی تو؟" میں نے کہا۔

"وہ ایسا نہیں کریں گے۔" رادھا نے جواب دیا "اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آدھی رات کے بعد انہوں نے یہاں حملہ کیا تھا اور پھر دوسری بات یہ کہ معاملہ ایک قتل... ہے اور روپ متی بھی غائب ہے۔ پچھلی بار پولیس نے گھوس (رشوت) کھا کر ان کی حمایت کردی تھی لیکن اس مرتبہ... نہیں ہوگا۔ روپ متی کوئی گری پڑی عورت تو نہیں کہ ا... نظر انداز کردیا جائے گا۔ یہاں کے راجواڑے ان پولیس افسروں کی کھال کھینچ لیں گے جو اس معاملے میں تیج سنگھ... حمایت کریں گے۔ تیج سنگھ بھی اس بات کو سمجھتا ہوگا۔ اگر اس نے پولیس کے پاس جانے کی کوشش کی تو پہلے... دھرلیا جائے گا۔ ویسے...." وہ خاموش ہو کر دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھنے لگی "مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہوچکے ہیں۔ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا؟"

"ڈیڑھ اور دو بجے کے بیچ۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔ کرسی اگرچہ آرام دہ تھی مگر جسم کی چوٹوں کی وجہ سے میں کافی بے چینی محسوس کررہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تقریباً پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں۔" ...ر رادھا نے کہا "اگر انہوں نے اطلاع دی ہوتی تو پولیس ...ک یہاں پہنچ چکی ہوتی۔"

اور پھر ٹھیک اسی وقت حویلی کا پھاٹک دھڑ دھڑائے ...کی آواز سنائی دی۔

پھاٹک دھڑدھڑائے جانے کے اس انداز میں جارحیت ...اں تھی۔ کوئی عام آدمی اس طرح دستک نہیں دے سکتا ... ہم تینوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کی طرف ...ا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ...کے پائے کے قریب اندر کی طرف پستول پڑا ہوا دیکھ کر ...جلدی سے آگے لپکا اور پستول اٹھالیا۔ یہ وہی پستول تھا ...سے روپ متی نے دھرمیش کو گولی ماری تھی۔ میں چند ...پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر مندری کو اشارہ کیا۔

"تم جاکر گیٹ کھولو۔ اگر پولیس یا کوئی اور ہو تو اسے ...ہی روکنے کی کوشش کرنا۔ میں اس دوران میں دیکھوں گا ...ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

مندری اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر رادھا نے ...اٹھ کر دروازہ بند کردیا اور میرے قریب آگئی۔ میں ٹیرس والے دروازے کی طرف آگیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے پردہ برابر کردیا اور ایک کونا ذرا سا سرکا کر باہر جھانکنے لگا۔ یہاں سے حویلی کا پھاٹک صاف نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر رادھا بھی پردے کے دوسری طرف کا کونا سرکا کر باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے میرے سامنے بیٹھ کر بڑی بڑی باتیں کی تھیں۔ پنڈتوں اور پجاریوں کو برا بھلا کہا تھا۔ پولیس پر دشنام طرازیاں کی تھیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا اور نڈر کیوں نہ ہو، پولیس کے نام سے بدک جاتا ہے۔ پولیس ہر ملک کی ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔ ایک معمولی سا کانسٹیبل بھی بڑے سے بڑے آدمی کو سڑک پر ننگا کرسکتا ہے اور ڈاکٹر رادھا تو ایک عام سی عورت تھی۔ اس کے خیالات بہت سیدھے سادے تھے۔ وہ نجی محفلوں میں بیٹھ کر تو بے باکی سے اپنے ان خیالات کا اظہار کرسکتی تھی لیکن پولیس کا سامنا کرنا شاید اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی مندری پورچ سے نکل کر پھاٹک کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا اور ذیلی دروازہ کھول دیا اور اندر داخل ہونے والے کو دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا

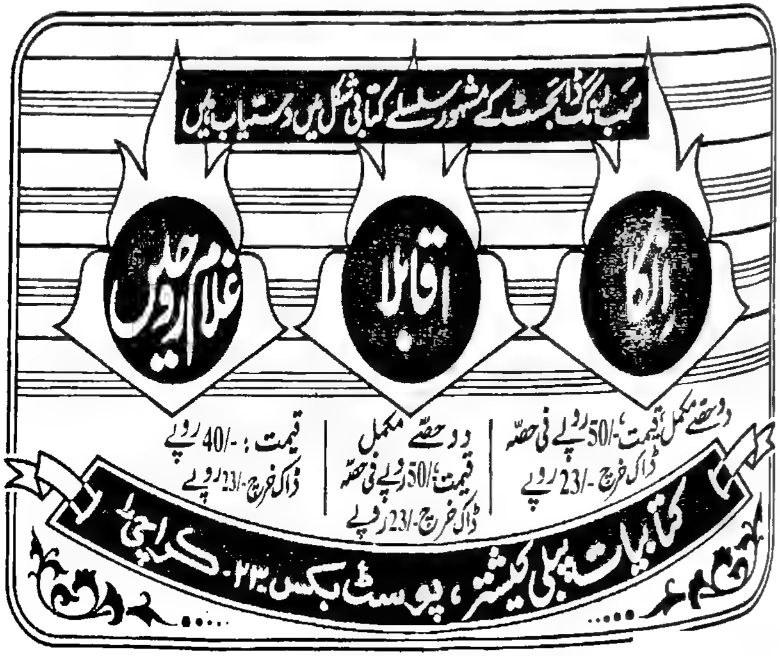

سانس نکل گیا۔

وہ جانکی تھی۔

"یہ کون ہے؟" ڈاکٹر رادھا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جانکی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ تو یہ ہے جانکی۔" رادھا بولی "روپ متی نے اس کی بہت تعریف کی تھی۔ یہ تو اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے۔"

جانکی کی تعریف سن کر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے پردہ پوری طرح ہٹا دیا اور باہر دیکھنے لگا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ نرم اور روپہلی دھوپ میں جانکی کا چہرہ دمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ مندری بھی اس کے ساتھ تھی اور شاید وہ تیز لہجے میں اسے کچھ بتانے کی کوشش کررہی تھی۔

وہ دونوں پورچ کے نیچے میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔ میں بھی اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور کمرے کا دوسرا دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر رادھا بھی کمرے کے وسط میں کھڑی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک منٹ بعد جانکی اندر داخل ہوئی۔ کمرے کی حالت دیکھ کر وہ دروازے ہی میں رک گئی اور پھر مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف لپکی۔

"اوہ۔۔۔ یہ سب کیا ہوا ہے۔ تم ٹھیک تو ہونا۔ روپ متی کہاں ہے؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا "بیٹھ جاؤ۔ آرام سے بات کریں گے۔"

جانکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ الجھی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر رادھا کی طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف۔ اس کے بال کسی حد تک بکھرے ہوئے، آنکھیں سرخ اور چہرہ تستا ہوا تھا۔ ساڑی بھی مسلی ہوئی تھی۔

"مندری۔" ڈاکٹر رادھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بہتر ہوگا کہ تم سب کے لیے چائے یا کافی بنالاؤ تاکہ ہم کوئی ڈھنگ کی بات سوچ سکیں۔ اس وقت تو ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے۔"

مندری باہر چلی گئی۔ میں نے ڈاکٹر رادھا اور جانکی کا تعارف کرایا۔

"جانکی بھی ڈاکٹر ہے۔" میں نے کہا "اس کی ساری زندگی تھائی لینڈ میں گزری ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کے خاندان کے کچھ لوگ ہیں لیکن یہاں آکر ہم عجیب حالات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ کسی سے رابطہ کرنے [illegible] نہیں مل سکا۔"

وہ دونوں کچھ دیر آپس میں باتیں کرتی رہیں پھر [illegible] کر میرے قریب آگئی اور میری چوٹوں کا جائزہ لینے لگی۔ [illegible] نے میرا کرتا اٹھا کر میری پشت پر بھی چوٹوں کا جائزہ لیا [illegible] رادھا سے اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کرنے لگی۔

"تمہارا یہ دوست بہت باہمت آدمی ہے۔" ڈاکٹر رادھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر کسی اور کی اتنی پٹائی ہوتی تو ہفتہ دس دن تک بستر سے اٹھنے کا نام نہ لیتا لیکن دیکھو۔ کتنے مزے سے ٹہل رہا ہے۔"

اتنے میں مندری چائے بنا کر لے آئی۔

"اب کیا کیا جائے۔" ڈاکٹر رادھا نے چائے کی [illegible] لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "روپ [illegible] کے بارے میں کیسے معلوم کیا جائے۔"

"تیج سنگھ کے ایک دو ٹھکانے میرے علم میں ہیں۔ [illegible] متی ہی نے بتایا تھا۔" میں نے جواب دیا "سب سے پہلے [illegible] ٹھکانوں پر معلوم کیا جائے یا پھر میرے ذہن میں ایک [illegible] ترکیب ہے۔"

"وہ کیا؟" ڈاکٹر رادھا نے پوچھا۔

"میں اور جانکی یہاں سے کسی دوسری جگہ [illegible] ہوجاتے ہیں اور مندری کی طرف سے پولیس میں رپورٹ لکھوا دی جائے۔ مندری پولیس کو یہ بتائے گی کہ وہ [illegible] سنگھ کے ساتھ کالی کے مندر گئی ہوئی تھی۔ صبح واپس [illegible] کمرا اس حالت میں ملا اور روپ متی غائب تھی۔"

"اس طرح بات بہت لمبی ہوجائے گی۔" ڈاکٹر رادھا نے جواب دیا "اور بھی بہت سے لوگ لپیٹ میں [illegible] گے۔ پولیس تم دونوں کو بھی تلاش کرے گی۔ تم ابھی یہاں [illegible] کو نہیں جانتے۔ یہاں چھٹے ہوئے غنڈے اور بدمعاش [illegible] میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔ نہایت سفاک اور بے رحم [illegible] تشدد کے ایسے ایسے طریقے جانتے ہیں کہ پتھر بھی بو[illegible] مجبور ہوجاتے ہیں۔ اگر تم دونوں ایک بار پولیس کے چکر میں پھنس گئے تو زندگی بھر اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکو گے اور [illegible] کسی ایسے چکر میں نہیں پھنسنا چاہتی۔"

"تو پھر۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہمیں اپنے طور پر انہیں تلاش کرنا چاہیے۔" رادھا نے جواب دیا۔

"ہم دونوں تو اس شہر میں اجنبی ہیں۔ اگر تم اس سلسلے میں ہماری کچھ مدد کر سکو تو۔۔۔؟" میں نے کہا۔

"میں ٹھاکر بھانوت سنگھ سے بات کرتی ہوں۔" ڈاکٹر رادھا نے کہا۔ "وہ میرا اور روپ متی کا دوست ہے۔ قابلِ اعتماد بھی ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرسکے۔"

"کیا اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" ڈاکٹر رادھا نے اثبات میں سرہلایا "وہ ان چند لوگوں میں سے ہے جو روپ متی سے واقعی مخلص ہیں۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی روپ متی کو سمجھاتا رہتا تھا لیکن پھر بالکل الگ ہوگیا اور روپ متی سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ مجھے یقین ہے وہ ہماری مدد پر آمادہ ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے ہم نیچے چلتے ہیں۔ تم فون پر اس سے بات کرو۔"

ہم روپ متی والے کمرے سے نکل آئے۔ اس کمرے کو فی الحال ایسے ہی رہنے دیا گیا تھا۔ نیچے آتے ہوئے ڈاکٹر رادھا مجھے ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کے مطابق بھانوت سنگھ کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ دراصل روپ متی کے پتی (شوہر) کا بچپن کا دوست تھا۔ اس کے دیہانت (انتقال) کے بعد جب اس نے روپ متی کو غلط راستے پر چلتے دیکھا تو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے روپ متی کو شادی کی پیشکش بھی کی تھی۔ وہ اسے اپنانے کو تیار تھا مگر روپ متی نے انکار کردیا۔ بھانوت سنگھ اس کے بعد بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر جب وہ سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھی راہ پر آنے والی نہیں تو بھانوت سنگھ نے اس سے ملنا ہی چھوڑ دیا لیکن وہ روپ متی کی حالت پر کڑھتا رہتا تھا۔ وہ اکثر ڈاکٹر رادھا سے ملتا اور روپ متی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہتا۔

ڈاکٹر رادھا نیچے آکر ہال میں اس طرف چلی گئی جہاں میز پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ میں جانکی کے ساتھ اپنے کمرے میں آگیا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ۔" میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے جانکی کی طرف دیکھا جو ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی "تم نے کالی کے مندر میں مرلی دھر کو دیکھا تھا۔ کیا دارا بھی۔۔۔"

"نہیں۔" جانکی نے میری بات کاٹ دی "دارا کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں نے صرف مرلی دھر کو دیکھا تھا اور مندری کو یہاں دوڑا دیا تھا۔ میرا خیال تھا تم آجاؤ گے تو ہم [illegible] گھیرنے کی کوشش کریں گے لیکن مندری یہاں آکر پھنس گئی۔"

"مندری نے دیوان سنگھ کو واپس بھیج دیا تھا تاکہ تمہیں لے آئے۔ وہ بھی ابھی تک واپس نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

"دیوان سنگھ مجھے وہاں تلاش کر بھی نہیں سکتا تھا۔" جانکی نے جواب دیا۔ "چار بجے کے قریب پنڈت مرلی دھر کالی کے مندر سے نکل گیا تھا اور میں بھی اس کے تعاقب میں چل پڑی تھی۔"

"تو کیا وہ اس وقت کالی کے مندر میں نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" جانکی نے جواب دیا "وہ اس وقت نیوگیٹ اور چوڑا راستہ والے چوراہے کے قریب واقع ایک مندر میں ہے۔ میں اس خیال سے اس مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی کہ شاید وہ وہاں سے کہیں اور جائے گا لیکن ایک پجاری سے پتا چل گیا ہے کہ وہ کئی ہفتوں سے اسی مندر میں رہ رہا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد میں فوراً ہی وہاں سے چل پڑی اور یہاں کی صورتِ حال دیکھ کر تو میرے حواس اڑ گئے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟"

"میرا خیال ہے تیج سنگھ وغیرہ موقع کی تاک میں تھے۔" میں نے جواب دیا اور اسے تفصیل بتانے لگا لیکن سوم رس اور شراب کا قصہ گول کرگیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں جلد ہی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ بصورتِ دیگر روپ متی کی جان کو خطرہ بھی ہوسکتا ہے۔" جانکی نے کہا۔

"ڈاکٹر رادھا نے اپنے ایک دوست کو بلایا ہے۔ اس کے آنے کے بعد ہی دیکھتے ہیں کہ کیا کیا جاسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کررہے تھے کہ مندری دروازے میں نمودار ہوئی۔

"میں ناشتا بنا رہی ہوں۔ تم لوگ بڑے کمرے میں آجاؤ۔" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور واپس چلی گئی۔

"تمہاری اب کیا حالت ہے۔ لگتا ہے انہوں نے ٹھیک ٹھاک مار لگائی تھی" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنی غلطی سے ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر میں حواس میں رہتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔"

"کیا مطلب!" جانکی نے مجھے گھورا "تمہارے حواس گھاس چرنے چلے گئے تھے کیا؟"

"وہ لوگ اچانک ہی کمرے میں گھس آئے تھے۔" میں نے بات بناتے ہوئے کہا "ایسی صورت میں حواس پر قابو رکھنا مشکل ہی ہوتا ہے۔"

جانکی چند لمحے گھورتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گئی اور میں ہال میں آگیا۔

ڈاکٹر رادھا ٹیلی فون والی میز کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور مندری کچن میں تھی۔ ویسے مندری کی حقیقت پسندی مجھے پسند آئی تھی۔ صورتِ حال کیسی بھی رہی ہو، اس نے کھانے پینے کا ہمیشہ خیال رکھا تھا۔ کسی پریشانی میں خالی پیٹ رہنے سے پریشانی بڑھ جاتی ہے اور مندری اس حقیقت سے واقف تھی کہ خالی پیٹ رہنے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

چند منٹ بعد جانکی بھی وہاں آگئی۔ نہانے اور کپڑے بدل لینے سے وہ تازہ دم لگ رہی تھی لیکن رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سرخی برقرار تھی۔

ہم ناشتا کر ہی رہے تھے کہ دیوان سنگھ بھی پہنچ گیا۔ صورت سے وہ خاصا پریشان لگ رہا تھا لیکن جانکی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ ہم نے اسے بھی اپنے ساتھ ناشتے کی میز پر بٹھالیا۔

ڈاکٹر رادھا کا دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ دس بجے کے قریب وہاں پہنچا تھا۔ وہ ایک خوب رو اور بھرپور جوان آدمی تھا۔ پُروقار شخصیت کا مالک۔

"تمہارے بارے میں میرے خیالات کچھ اور تھے۔" وہ تعارف ہونے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں یہی سمجھتا تھا کہ تم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہو جو بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کا فن جانتے ہیں لیکن ایک رات پتا چلا کہ تم نے روپ متی کو شراب نوشی پر سرزنش کی تھی اور اسے گھسیٹتے ہوئے ہوٹل سے لے آئے تھے۔ ایسی حرکت تو کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جسے واقعی اس سے ہمدردی ہو۔ اس واقعے کے بعد مجھے تمہارے بارے میں اپنے خیالات بدلنے پڑے تھے۔"

"اب سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ روپ متی کو کیسے تلاش کیا جائے۔" میں نے کہا "وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے خطرہ بھی بڑھتا جائے گا۔"

"آج ہی پتا چلالیا جائے گا۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے کہا "وہ گندی نالی کے کیڑے اگر اپنے آپ کو ہمارے برابر سمجھنے لگے ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ ناجائز طریقے پر دولت جمع کر لینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کی ذات اور فطرت بھی بدل گئی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "غلطی اس میں روپ متی ہی کی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو اتنا گرا لیا کہ تھرڈ ریٹ غنڈے بھی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ بہرحال، میں آج ہی ان کا سراغ لگالوں گا۔ وہ اس شہر میں ہوں یا کہیں اور، بچ کر نہیں جاسکیں گے۔"

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے اوپر آگئے۔ کمرے کے بکھرے ہوئے سامان کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر قالین پر ایک طرف پڑے ہوئے چاندی کے ایک تعویذ پر پڑ گئی۔ میں نے جھک کر وہ تعویذ اٹھالیا۔ اس میں سیاہ رنگ کی ڈوری تھی جو ٹوٹ جانے سے تعویذ تیج سنگھ یا دھرمیش کے گلے سے گر گیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو ایسے تعویذ پہنے ہوئے دیکھا تھا اور ظاہر ہے یہ انہی میں سے کسی ایک کا ہو سکتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹھاکر بھانوت سنگھ چلا گیا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوراً ہی اپنے آدمیوں کو ان کی تلاش پر لگا دے گا۔ ڈاکٹر رادھا بھی چلی گئی۔

ہم سب مل کر کمرے کی حالت درست کرنے لگے۔ ہم پر حملہ ہونے سے پہلے نیچے والے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے اور غالباً تیج سنگھ کی آواز سن کر ہی روپ متی نے اپنا پستول تلاش کرنا شروع کیا تھا لیکن وہ اس قدر بدحواس ہو رہی تھی کہ اس نے ڈریسنگ ٹیبل اور الماری کا سارا سامان نکال کر پھینک دیا تھا۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ پستول اس نے کہاں رکھا تھا لیکن بہرحال آخری لمحات میں پستول اس کے ہاتھ آگیا تھا اور اس نے دھرمیش کو گولی مار دی تھی۔ اگر یہ پستول پہلے اس کے ہاتھ میں آچکا ہوتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔

مجھے بھی اپنے آپ پر ندامت تھی۔ میں کس قدر آسانی سے ان لوگوں سے مار کھا گیا تھا لیکن شاید اس میں میرا بھی قصور نہیں تھا۔ غلطی تو روپ متی کی تھی جس نے اپنی ہوس مٹانے کے لیے مجھے شربت میں سوم رس جیسی چیز پلا دی تھی۔ اگر میں اپنے ہوش و حواس میں ہوتا تو تیج سنگھ وغیرہ روپ متی کو لے جانے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہوپاتے۔ مجھے روپ متی کی ذہنیت پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اور ڈاکٹر رادھا کی اس بات سے اتفاق کرنا پڑا کہ وہ برائی کے راستے پر اتنا آگے نکل چکی تھی کہ اس کی واپسی ناممکن ہوگئی تھی۔

اب یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ تیج سنگھ نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ صورتِ حال کی

نزاکت اور سنگینی سے واقف تھا۔ خود اس کے پھنس جانے کا بھی احتمال تھا اس لیے وہ پولیس سے دور ہی رہا تھا۔ روپ متی اس کے قبضے میں تھی اور وہ اپنا انتقام لینے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا اور مجھے روپ متی کے بارے میں تشویش تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، میری تشویش بھی بڑھتی جارہی تھی۔

اس شام میں اور جانکی اس مندر کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوگئے۔ روپ متی کی تلاش اگرچہ سب سے زیادہ اہم تھی مگر میں نے سوچا کہ اس دوران میں مرلی دھر کے بارے میں بھی کچھ معلومات حاصل کرلی جائیں۔

دیوان سنگھ کار چلا رہا تھا۔ میں اور جانکی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آج دوپہر کے بعد تارا سنگھ بھی واپس آگیا تھا۔ صورتِ حال جان کر وہ بھی پریشان ہوگیا تھا۔ اسے حویلی میں مندری کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

شیراڈ کار آدرش نگر سے نکل کر گووند مارگ والی سڑک پر ہوتی ہوئی آگرہ مارگ پر بائیں طرف مڑ گئی۔ یہ مرزا اسمٰعیل روڈ (ایم آئی روڈ) تھی۔ بہت کشادہ سڑک تھی۔ شہر کے تمام اہم بازار اور بعض سرکاری دفاتر اس سڑک کے آس پاس تھے۔ ماڈرن آرٹ گیلری، راجستھان گورنمنٹ ہینڈی کرافٹ ایمپوریم، سینٹرل کاٹیج انڈسٹریز ایمپوریم اور جنرل پوسٹ آفس کی خوب صورت عمارتیں بھی اسی سڑک پر واقع تھیں۔

کار ایک چوراہے پر دائیں طرف مڑ گئی۔ اگلے چوراہے پر سنگانیر گیٹ اور سامنے شہر کا مشہور ترین جوہری بازار تھا مگر گاڑی اس طرف مڑنے کے بجائے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی عمارت کے سامنے سے ہوتی ہوئی بند گیٹ والے چوراہے پر چوڑا راستہ کی طرف مڑ گئی۔ یہ بھی ایک بارونق بازار تھا جو آگے جاکر تپولیا بازار سے مل جاتا تھا۔

جانکی اب تک دیوان سنگھ کو راستہ بتاتی جارہی تھی۔ اس کے کہنے پر دیوان سنگھ نے کار ایک کشادہ گلی میں روک لی۔

"ہمیں واپسی میں شاید تھوڑی دیر ہو جائے۔ تم یہیں رک کر ہمارا انتظار کرنا۔" جانکی نے دیوان سنگھ سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔

میں بھی نیچے اتر آیا۔ شام کا وقت تھا۔ بازار میں گہما گہمی تھی اور روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ چند گز آگے جانے کے بعد جانکی بائیں طرف ایک کشادہ گلی میں مڑ گئی۔ یہی گلی آگے جاکر کشن پول بازار سے مل جاتی تھی لیکن ہمیں اس گلی میں زیادہ نہیں چلنا پڑا۔

دائیں طرف ایک بہت بڑا گنیش مندر تھا۔ دس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد عمارت کا وسیع و عریض برآمدہ تھا۔ لاتعداد ستون تھے جنہوں نے برآمدے کی چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ سیڑھیوں کے عین سامنے والے دو ستونوں گنیش دیوتا کی بہت بڑی بڑی مورتیاں کندہ تھیں۔ ویسے ہر ستون پر چھوٹی بڑی مورتیاں کندہ تھیں۔

سیاہ ماربل کے فرش والے برآمدے میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مندر کا اصل ہال سامنے ہی تھا جہاں گنیش دیوتا کی بہت بڑی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ مندر میں آنے والے لوگ چھت پر لگی ہوئی گھنٹیاں بجاتے، مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا (دعا) کرتے کوئی چیز بھینٹ چڑھاتے اور ایک طرف ہٹ جاتے۔

"پنڈت مرلی دھر کو میں نے صبح اس راہداری میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" جانکی نے سرگوشی کرتے ہوئے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کئی پجاری یہاں گھوم رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی سے اس کے بارے میں پوچھ لینا چاہیے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔ اس طرح اگر ہم سارا دن بھی یہاں کھڑے رہیں تو شاید وہ ہماری نظروں میں نہ آسکے۔ چلو اس پنڈت سے پوچھتے ہیں۔ وہ اسی طرف آرہا ہے۔" میں نے ایک پنڈت کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پیلے رنگ کی ایک چادر ساڑی کی طرح اپنے جسم پر لپیٹ رکھی تھی۔ توند مٹکے کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ مجرب چہرہ، پھولے ہوئے گال اور سرخ آنکھیں اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی کئی مالائیں نظر آرہی تھیں۔ سر گنجا اور چوڑی پیشانی پر قشقہ۔

میں اس پجاری کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ بائیں طرف سے آنے والے ایک آدمی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے جانکی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا ایک ستون کے پیچھے لے گیا۔

"کیا ہوا؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ اس طرح کھینچے جانے پر بدحواس ہوگئی تھی۔

"وہ اس آدمی کو دیکھ رہی ہو۔ وہ سفید دھوتی کرتے والا جو مورتی کی طرف جارہا ہے۔" میں نے ستون کی آڑ سے اشارہ کیا "یہ تیج سنگھ کا ساتھی ہے۔ کل رات روپ متی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے خنجر سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔"

"اوہ!" جانکی چونک گئی "تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں

ہوئی۔ میرا مطلب ہے اتنی سنگین واردات کے بعد وہ اس طرح دیدہ دلیری کا مظاہرہ کس طرح کرسکتے ہیں کہ۔۔۔"

"میری نظریں دھوکا نہیں کھاسکتیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "کل رات یہ لوگ شاید مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ انہیں تو توقع بھی نہیں ہوگی کہ میں اس طرح گھوم پھر رہا ہوں گا۔ تم ایسا کرو۔۔۔" میں نے خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تم ٹہلتی ہوئی اس کے قریب چلی جاؤ۔ اسے جال میں پھنسانا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ تم اسے لے کر اس دروازے سے باہر نکل جاؤ۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔"

جانکی میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے مسکرا کر۔۔۔ میری طرف دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ میں نے ستون کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ وہ شخص خاصا قد آور اور جسیم تھا۔ مجھے لگا جیسے اس کا تعلق بھی پہلوانوں کے کسی خاندان سے تھا مخصوص انداز میں بندھی ہوئی سفید دھوتی' اجلا سفید کرتہ اور ماتھے پر ٹیکا۔ وہ بہت بھلا مانس اور شریف آدمی لگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پیپر پلیٹ تھی جس میں ناریل' پھول' مٹھائی اور ایسی ہی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس قسم کی تیار تھالیاں باہر دکانوں پر ملتی تھیں۔

اس نے تھالی گنیش دیوتا کے چرنوں پر رکھ دی اور کرتے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چند نوٹ نکالے۔ چند قدم دور کھڑا ہوا۔ ایک پجاری فوراً قریب آگیا اور اس کے ہاتھ سے نوٹ لے کر اپنی چادر کے اندر کسی جیب میں ڈال لیے اور مورتی کے سامنے رکھی ہوئی اس کی تھالی میں سے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ یہ پرساد تھا۔

ٹھیک اسی وقت جانکی بھی وہاں پہنچ گئی۔ پنڈت نے اسے بھی پرساد دیا۔ جانکی نے مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور فوراً ہی اس شخص کی طرف متوجہ ہوگئی۔

میں ستون کی آڑ سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دائیں طرف اس دروازے کی طرف بڑھ گیا جس کے بارے میں جانکی کو ہدایت کی تھی۔ وہ دروازہ بھی کافی کشادہ تھا اور اس طرف سے بھی لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ میں اس دروازے سے نکل کر سائیڈ اسٹریٹ میں آگیا۔

یہ گلی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ مندر کے دروازے پر ایک بلب جل رہا تھا۔ اس گلی میں رہائشی مکان تھے۔ مکانوں کے سامنے مدھم روشنی والے بلب جل رہے تھے۔ دائیں طرف یہ گلی دور تک چلی گئی تھی جبکہ بائیں طرف تقریباً بیس گز آگے جا کر اس کشادہ گلی سے مل جاتی تھی جس طرف مندر کا مرکزی دروازہ اور برآمدہ تھا۔

میں دروازے سے ذرا ہٹ کر ایسی جگہ کھڑا ہوگیا جہاں روشنی زیادہ نہیں تھی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد جانکی اس آدمی کے ساتھ مندر کے دروازے سے باہر نکلی۔ میں رخ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔

صرف ایک منٹ بعد وہ دونوں میرے قریب سے گزرے۔ اس شخص نے ایک ہاتھ جانکی کی کمر میں حمائل کر رکھا تھا۔ کشادہ گلی والے موڑ پر آکر وہ دونوں رک گئے۔

"اس طرف۔" اس شخص نے جانکی سے کہا "اِدھر میری گاڑی کھڑی ہے۔"

"نہیں مسٹر! اس طرف۔۔۔ ہماری گاڑی اُدھر کھڑی ہے۔" میں نے اس شخص کے برابر پہنچ کر کہا۔

وہ شخص اس مداخلتِ بے جا پر اچھل پڑا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا تو اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا۔ اس نے جانکی کی کمر سے ہاتھ ہٹالیا۔

"نہیں۔ تم کوئی حرکت نہیں کروگے۔" میرے حلق سے غراہٹ نکلی اور اس کے ساتھ ہی میں نے پستول کی نال اس کے پہلو سے لگادی "اگر تم نے منہ سے آواز بھی نکالی تو اس پستول کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔ خاموشی سے چلتے رہو۔ بالکل اسی طرح جس طرح پہلے چل رہے تھے۔ اپنا ہاتھ اس کی کمر پر لپیٹ دو۔ شاباش۔۔۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ پہلے کی طرح جانکی کی کمر کے گرد حمائل کردیا۔ وہ ہمارے درمیان چلتا رہا۔ پہلے تو وہ جانکی کو نجانے کیسے کیسے سبز باغ دکھا رہا تھا لیکن اب اس طرح خاموش تھا جیسے زبان گنگ ہوگئی ہو۔

ہم بازار کی طرف جانے کے بجائے بیچ کی ایک تنگ سی گلی میں داخل ہوگئے۔ یہاں اِکا دُکا لوگوں کی آمدورفت تھی۔ میں نے اس کے پہلو پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا تاکہ وہ موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

دوسری کشادہ گلی میں نکل کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہماری شیراڈ بائیں طرف تقریباً دس گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ دیوان سنگھ ایک بند دکان کے تھڑے پر ایک اور آدمی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ ویسے اس کشادہ گلی میں زیادہ تر دکانیں تھیں اور خاصی رونق تھی۔

دیوان سنگھ ہمیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میں اس شخص کے ساتھ بالکل جڑ کر چل رہا تھا تاکہ کوئی راہگیر میرے ہاتھ میں پستول نہ دیکھ لے۔ کار کے قریب پہنچ کر جانکی

ے گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔

ر کے دروازے لاک نہیں تھے۔ جانکی دوسری طرف زہ کھول کر اندر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے اپنی طرف کا ھول کر اس شخص کو اندر دھکیلا اور خود بھی اس کے یٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ دیوان سنگھ نے اپنی سیٹ پر وئے ایک مرتبہ پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر انجن ی کرکے کار آگے بڑھادی۔

انکی نے عقل مندی کی۔ اس نے بیٹھتے ہی اس شخص ی بھی لے ڈالی اور اس کی دھوتی کے بند کے بل میں ا پستول نکال لیا۔

"دیوان سنگھ۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا مختصر اور رفتار تیز مگر احتیاط سے۔ حادثہ نہیں ہونا ے۔"

یوان سنگھ نے سر ہلا دیا۔

اردواپسی کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے تپولیا بازار ف نکل گئی۔ سورج پول گیٹ سے چاند پول بازار تک می سڑک بہت کشادہ تھی۔ اس پوری سڑک کو ناموں ظ سے کئی حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ سڑک کے طرف کشادہ سروس روڈز اور ان کے ساتھ بڑی بڑی تھیں۔ کئی ذیلی گلیاں اور بازار تھے۔

ار سورج پول گیٹ سے کافی آگے نکل کر دائیں طرف ور تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے آگرہ مارگ سے ولی گووند مارگ کی طرف نکل آئی اور پھر آدرش نگر میں تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

پورچ میں کار سے اترتے ہوئے اس شخص کی ٹانگیں ہولے کانپ رہی تھیں۔

"سورج بھان سنگھ تھا۔

وہ تیج سنگھ کا دوست بھی تھا اور اس کا شاگرد بھی۔ چند پہلے وہ تیج سنگھ سے پہلوانی کے داؤ پیچ سیکھا کرتا تھا لیکن تی کی نوکری کے بعد ان دونوں بھائیوں نے اکھاڑا بند سورج بھان سنگھ نے شہر کے ایک پس ماندہ علاقے میں اڑا کھول لیا۔ کوشش کے باوجود اس کے شاگردوں کی چار سے اوپر نہیں جا سکی تھی۔ اس علاقے میں وہ نے کے بجائے دادا کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ڈیل ڈول سے اس علاقے کے تھرڈ ریٹ غنڈے' بدمعاش تراش اور اٹھائی گیرے اسے دادا مان کر اس کے س میں جمع ہونے لگے۔ اس طرح سورج بھان سنگھ کا بدمعاشی کا اڈا بن گیا۔

سورج بھان سنگھ نے اپنے اردگرد جمع ہونے والوں سے اس طرح فائدہ اٹھایا کہ اس نے علاقے کے دکان داروں' ٹھیلے والوں اور خوانچہ فروشوں سے بھتا وصول کرنا شروع کردیا۔ اس علاقے سے گزرنے والے رکشے اور ٹیکسیوں سے بھی غنڈا ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔

سورج بھان سنگھ نے اپنے اس گروہ کو رکھشا منڈل کا نام دیا تھا۔ جو دکان دار بھتا دینے سے انکار کردیتا' توڑ پھوڑ سے اس کی دکان کو تہس نہس کردیا جاتا اس لیے ہر دکان دار طے شدہ رقم ہر مہینے اس کی جھولی میں ڈال دیتا۔

پولیس سورج بھان سنگھ کی ان سرگرمیوں سے آگاہ تھی لیکن علاقے کے انسپکٹر کو بھی اس کی طرف سے باقاعدگی سے بھتا مل رہا تھا اس لیے پولیس نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ صرف اس ایک علاقے پر کیا منحصر' پورے شہر میں یہ سلسلہ چل رہا تھا۔

سورج بھان سنگھ کے کہنے کے مطابق ایک ہفتہ پہلے تیج سنگھ نے اسے بلا کر روپ متی کے اغوا کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ اس سے اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتا تھا۔

"مجھے تیج سنگھ نے پچاس ہزار کی پیشکش کی تھی۔" سورج بھان سنگھ کہہ رہا تھا "تیلی دروازہ کے دادا لالہ رنجیت کو بھی اس نے اپنے ساتھ ملالیا تھا۔ کل رات ہمارے ساتھ وہی تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرا ایک آدمی ایک ہفتے سے حویلی کی نگرانی کر رہا تھا اور کل رات اس نے اطلاع دی کہ میدان صاف ہے تو ہم نے ہلا بول دیا۔ مجھے وہاں مقابلے کی زیادہ توقع نہیں تھی۔ تیج سنگھ نے تمہارے بارے میں بتایا تھا' دو چار ہاتھ سے زیادہ مار برداشت نہیں کرسکو گے لیکن وہاں صورتِ حال مختلف نکلی۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا پھر بولا "روپ متی نے دھرمیش کو گولی ماری تو تیج سنگھ نے اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مار کر اسے بے ہوش کردیا اور ہم تینوں تم پر پل پڑے اور پھر تمہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ بعد میں تیج سنگھ نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم زندہ بچ بھی گئے تو وہاں رکنے یا پولیس کے پاس جانے کے بجائے بھاگنے کی کوشش کروگے۔ تم سے اس کی زیادہ دشمنی بھی نہیں تھی۔ وہ تو روپ متی سے بدلہ لینا چاہتا تھا جس کی وجہ سے اسے اس قدر ذلت اٹھانی پڑی تھی۔"

"دھرمیش زندہ ہے یا۔۔۔؟"

"صبح تک تو زندہ تھا۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تیج سنگھ نے رات کے پچھلے پہر ہی ایک ڈاکٹر کو بلالیا تھا جس

نے اس کے سینے کے زخم سے گولی نکال دی تھی لیکن میرا خیال ہے اس کے بچنے کا زیادہ چانس نہیں ہے۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ بہرحال، میں تیج سنگھ سے اپنی رقم لے کر صبح دس بجے کے قریب وہاں سے آگیا تھا۔ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہیں لیکن تم۔۔۔" وہ وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا "میرا تو خیال تھا کہ اگر تم زندہ بچ بھی گئے تو کئی ہفتوں تک اسپتال کے بستر سے نہیں اٹھ سکو گے لیکن۔۔۔"

"تمہیں تیج سنگھ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دونوں بھائی دو مرتبہ گدھوں کی طرح مجھ سے پٹ چکے ہیں۔" میں نے کہا "بہرحال۔ وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں اور روپ متی کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہے؟"

"روپ متی کو باندھ کر ایک کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ دھرمیش کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی تیج سنگھ اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے گا لیکن اگر دھرمیش مر گیا تو تیج سنگھ روپ متی کو بھی اذیتیں دے کر ہلاک کر دے گا۔"

"ایسا وقت آنے سے پہلے ہی میں تیج سنگھ کو ختم کردوں گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا۔" سورج بھان سنگھ نے جواب دیا "تیج سنگھ کو پتا چل جائے گا کہ تم مجھے اغوا کر کے لائے ہو۔ وہ اس حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔"

"اسے ایسا موقع نہیں ملے گا۔" میں نے کہا "اس کا ٹھکانا بتاؤ؟"

"تم میری بوٹیاں نوچ دو تو بھی میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" سورج بھان سنگھ نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں۔ میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا لیکن میرے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ تم خود ہی زبان کھول دو گے اور فرفر بولنے لگو گے۔" میں نے کہا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

اور پھر پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر میں نے وہ انتظام کر لیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ سورج بھان سنگھ کو ایک چارپائی پر لٹا کر باندھ دیا گیا۔ اس کا کرتہ میں نے اتروا لیا تھا۔ چارپائی سے پانچ چھ فٹ اوپر ایک ڈبا باندھ کر اس میں فریج کا ٹھنڈا پانی اور برف ڈال دی۔ ڈبے کے پیندے میں ایک سوراخ کر دیا تاکہ قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا رہے۔

سورج بھان سنگھ وحشت زدہ سی نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ اوپر لٹکے ہوئے ڈبے کو دیکھنے لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے دیوان سنگھ کو اشارہ کیا۔ اس نے ڈ... پیندے کے سوراخ میں پھنسی ہوئی کپڑے کی چندیا... ٹھنڈے پانی کے قطرے سورج بھان سنگھ کے سینے... لگے۔ میں نے دیوان سنگھ کی مدد سے چارپائی کو اس... سے ہلا کر اس طرح سیٹ کیا کہ پانی کے قطرے اب... بھان سنگھ کے سینے پر عین دل کے مقام پر ٹپک رہے...

"میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤ... میں نے سورج بھان سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا... کے یہ قطرے چند منٹ بعد ہی تمہیں چیخنے پر مجبور... گے۔"

سورج بھان سنگھ کی آنکھوں میں وحشت سی... نے مندری کو اشارہ کیا اور ہم ہال میں آگئے۔ جانکی پہلے ہی کچن میں جا چکی تھی۔ اسے شاید چائے کی طلب تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہم سب کے لیے چائے بنا کر... دیوان سنگھ قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ تارا... ہی تھا۔ مندری اسے وہیں چائے دے آئی تھی۔

"ایک بات کہوں حکم۔ برا تو نہیں مانو گے..." سنگھ نے کہا۔

"ہاں۔ بولو۔" میں نے سوالیہ نگاہوں سے... طرف دیکھا۔

"سورج بھان سنگھ کو میں بہت اچھی طرح جا... پانی کے قطرے اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ اسے تو م... تارا سنگھ کے حوالے کر دو۔ ہم گیراج میں لے جا کر... سب کچھ اگلوا لیں گے۔" دیوان سنگھ نے کہا۔

"صرف آدھا گھنٹا۔" میں نے مسکراتے ہو... دیا "اگر میری یہ ترکیب ناکام ہو گئی تو پھر میں اسے... حوالے کر دوں گا۔"

"دیکھ لو حکم۔" دیوان سنگھ بولا "لاتوں کے بھو... سے نہیں مانتے۔"

"ایک مرتبہ آزما تو لو۔ صبر کر لو چند منٹ..." کہا۔

اور پھر آدھا گھنٹا پورا ہونے سے پہلے ہی... سنگھ کی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے مسکرا... سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر ہم سب ہال سے اٹھ کر... میں آگئے۔

چارپائی پر بندھا ہوا سورج بھان سنگھ کسمسا... خوف سے اس کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور وہ رہ رہ کر چیخ... "ابھی تو صرف ابتدا ہوئی ہے۔" میں نے از...

...ئے ہوئے کہا "قطرہ قطرہ ٹپکنے والا یہ پانی تمہارے سینے میں ...راخ کر دے گا اور پھر پانی کے یہ قطرے براہِ راست ...رے دل پر پڑیں گے اور دل میں بھی سوراخ کر دیں گے ...اس وقت تک شاید تم زندہ نہیں رہ سکو گے۔"

"نہیں!" وہ چیخا "تم یہ نہیں کر سکتے۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں کر رہا۔" میں نے جواب دیا "لیکن ...ر اس اذیت سے بچنا چاہتے ہو تو۔۔۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تیج سنگھ مجھے زندہ نہیں ...وڑے گا۔" وہ پھر چیخا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کندھے اچکا دیے "آرام سے ...ے رہو۔ میں تو تمہیں کچھ بھی نہیں کہہ رہا۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مندری اور دیوان سنگھ بھی ...ک طرف کھڑے حیرت سے سورج بھان سنگھ کی طرف دیکھ ...ے تھے۔ پانی کے قطرے وقفے وقفے سے ٹپک رہے تھے۔ ...نے پر ایک ہی جگہ ٹپکنے والا پانی کا ہر قطرہ اس کے جسم میں ...ک جھٹکا سا پیدا کر دیتا لیکن وہ چارپائی پر اس طرح بندھا ہوا ...کہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

سورج بھان سنگھ نے سختی سے دانت بھینچ رکھے تھے۔ ...ید وہ ہمارے سامنے اپنے آپ کو بزدل ظاہر نہیں کرنا چاہتا ...لیکن اس کی یہ کیفیت چند منٹ سے زیادہ برقرار نہیں رہ ...کا اور وہ ایک بار پھر چیخنے لگا۔

پانی دنیا کی نرم ترین شے ہے لیکن یہ سنگلاخ چٹانوں میں ...ی سوراخ کر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ انسان تو گوشت و ...ست کا بنا ہوا ہے۔

"...سے مجھے کھول دو۔۔۔" وہ چیخا "بب۔۔۔بتاتا ہوں۔"

"...گڈ۔" میں مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر چارپائی ...کے قریب آگیا اور اوپر رسیوں کی مدد سے لٹکا ہوا ڈبا ایک ...ہٹا دیا "ہاں۔ اب شروع ہو جاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ ...وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ۔ وہ۔ گنیش گڑھ میں ہیں۔ روپ متی بھی وہیں ...ہے۔" سورج بھان سنگھ نے جواب دیا۔

"گنیش گڑھ میں کس جگہ؟" میں نے سوال کیا اور ...سنگھ کو قریب بلا لیا تاکہ وہ اس کا بتایا ہوا پتا سمجھ سکے۔ ...سورج بھان سنگھ چند لمحے خاموش رہا پھر اس مکان کا پتا ...بتا دیا جہاں تیج سنگھ پناہ لیے ہوئے تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور دیوان سنگھ کی طرف ...دیکھتے ہوئے بولا "تارا سنگھ کو اندر بلا لو اور اس کے ہاتھ پیر ...باندھ کر گیراج یا کسی سرونٹ کوارٹر میں ڈال دو۔"

اور پھر چند منٹ بعد ہی سورج بھان سنگھ کو پیر ہاتھ باندھ کر ایک سرونٹ کوارٹر میں ڈال دیا گیا۔ وہ کمرا بالکل خالی تھا اور اس بات کا بھی خیال رکھا گیا تھا کہ وہ اپنی بندشیں نہ کھول سکے۔

ہال میں آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ مندری نے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ ایک منٹ تک کسی سے بات کرتی رہی پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ تھا۔

"ہیلو ہمت سنگھ!" اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اسے میرا نام ہمت سنگھ ہی بتایا گیا تھا "میں نے تیج سنگھ کے ٹھکانے کا پتا لگا لیا ہے۔"

"گنیش گڑھ میں۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی "تو تم بھی۔۔۔"

"ہاں۔ میں بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا تھا۔" میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا "بہتر ہوگا کہ تم بھی یہاں آجاؤ تاکہ ہم جلد سے جلد کوئی قدم اٹھا سکیں۔"

"میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے جواب دیا اور لائن بے جان ہو گئی۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھاکر بھانوت سنگھ نے بھی تیج سنگھ کے ٹھکانے کا پتا چلا لیا ہے۔ وہ آدھے گھنٹے میں یہاں پہنچ رہا ہے اور پھر ہم گنیش گڑھ کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔"

میں دیوان سنگھ سے گنیش گڑھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کسی قصبے یا آبادی کا نام ہوگا لیکن گنیش گڑھ شہر کے شمال مشرق میں چند کلو میٹر کے فاصلے پر ایک پہاڑی تھی۔ جس پر ایک پرانا قلعہ اور گنیش دیوتا کا ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔ اس پہاڑی تک پہنچنے کے لیے راجاؤں کے مرگھٹ کے پاس سے گزرنا پڑے گا۔ یہ ایک تاریخی شمشان بھومی ہے۔ جس جگہ کسی راجا کی چتا جلائی گئی، وہیں اس کی یادگار تعمیر کر دی گئی ہے۔"

گنیش گڑھ میں کوئی باقاعدہ آبادی تو تھی نہیں۔ پہاڑیوں پر ادھر ادھر قدیم عمارتیں بکھری ہوئی تھیں۔ بہت سی عمارتیں کھنڈر بن چکی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں بعض ایسی عمارتیں تھیں جہاں اب بھی دولت مندوں کی رہائش تھی اور تیج سنگھ ایسی ہی کسی عمارت میں چھپا بیٹھا تھا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ تقریباً چالیس منٹ بعد پہنچا تھا۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹا پروگرام بناتے رہے اور پھر روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے صرف دیوان سنگھ کو ساتھ لیا تھا۔ جانکی

بھی ہمارے ساتھ ہولی تھی۔

ٹھاکر جیپ پر آیا تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ جانکی اور دیوان سنگھ پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ بغیر ہڈ کی جیپ تھی اور ہم آسانی سے چاروں طرف دیکھ سکتے تھے۔

روپ متی والا پستول میرے پاس تھا۔ جو ریوالور میں تیج سنگھ کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا وہ میں نے جانکی کو دے دیا تھا۔ جانکی بھی اس وقت جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی اور ریوالور اس نے پیچھے کمر پر جینز کی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا۔

جیپ آورش نگر سے نکل کر مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی اجمیری گیٹ کی طرف آ گئی۔ اس وقت دس بھی نہیں بجے تھے۔ بازاروں میں گہما گہمی تھی۔

شہر سے نکلتے ہی ویرانہ شروع ہو گیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے تھے جو آگے جا کر بتدریج بلند ہوتے چلے گئے اور تنگ سی سڑک ان پہاڑیوں میں بتدریج بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اب میں سمجھ گیا کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ جیپ لے کر کیوں آیا تھا۔ سڑک بہت تنگ تھی۔ نہایت خطرناک اور تنگ موڑ تھے۔ کوئی بڑی گاڑی تو اس طرف آ ہی نہیں سکتی تھی اور پجارو یا مرسیڈیز جیسی نازک مزاج گاڑیوں کا بھی اس پہاڑی سڑک پر چلنا ممکن نہیں تھا۔

ان پہاڑیوں میں کہیں کہیں دائیں بائیں تنگ سے راستے نکلتے تھے۔ کئی کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹھاکر نے ایک جگہ جیپ روک لی اور تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مہاراجوں کا قبرستان بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب پہاڑیوں میں یہ تنگ سی سڑک نہار گڑھ قلعہ تک چلی گئی تھی جو یہاں سے مزید کئی کلو میٹر آگے تھا۔

"میرے آدمی نے بتایا تھا کہ اس راستے کے موڑ پر واقع چٹان پر گنیش کی ادھوری مورتی کھدی ہوئی ہے۔" وہ ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "لیکن ابھی تک ایسی کوئی چٹان نظر نہیں آئی۔ ہم غلط راستے پر تو نہیں نکل آئے؟"

"وہ چٹان سے آگے ہے حکم۔" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دیوان سنگھ نے کسی قدر آگے جھکتے ہوئے کہا "سورج بھان سنگھ نے بھی یہی نشانی بتائی تھی۔"

جیپ ایک بار پھر حرکت میں آ گئی۔ اس مرتبہ رفتار بہت ہلکی تھی۔ تقریباً نصف کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ لا ایک بار پھر رک گئی۔ چند گز آگے بائیں طرف چٹانوں میں ایک تنگ سا راستہ تھا اور بالکل سامنے والی چٹان پر ہاتھی کے چہرے والی مورتی ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی [illegible] وجہ سے ادھوری چھوڑ دی گئی تھی۔

"اسی راستے پر موڑ لو حکم۔" دیوان سنگھ نے [illegible]

جیپ ایک بار پھر حرکت میں آ کر اس تنگ سے [illegible] مڑ گئی۔ تھوڑے ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد بائیں [illegible] چٹان پر کسی قدیم عمارت کے کھنڈر دکھائی دیے۔ [illegible] رات میں وہ کھنڈر بڑا پُراسرار تاثر دے رہے تھے۔

"جیپ کو اِدھر ہی کہیں روک لو حکم۔" دیوان سنگھ [illegible] کہا "سورج بھان سنگھ نے جو نشانیاں بتائی تھیں [illegible] مطابق اب وہ عمارت زیادہ دور نہیں ہے اور جیپ کو [illegible] لے جانا خطرناک ہوگا۔ ہیڈ لیمپس کی روشنی یا انجن کی [illegible] سن کر وہ لوگ ہوشیار ہو جائیں گے۔"

دیوان سنگھ نے عقل مندی کی بات کی تھی۔ [illegible] جیپ کی رفتار مزید کم کر دی اور متجسس نظروں سے اِدھر [illegible] دیکھنے لگا اور پھر اس نے جیپ دائیں طرف ایک [illegible] سے راستے پر موڑ دی جو قد آور جھاڑیوں سے اٹا پڑا [illegible] گز آگے لے جا کر ٹھاکر نے جیپ روک لی اور انجن بند [illegible] ہیڈ لیمپس بھی بجھا دیے۔

ہم جیپ سے اتر کر اس راستے پر واپس آ گئے اور [illegible] کا فاصلہ طے کر کے ایک پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ [illegible] بہت ہی مشکل تھا۔ تقریباً سو فٹ کی بلندی تک عمودی [illegible] چڑھتے ہوئے جانکی بری طرح تھک گئی تھی۔

آگے چٹان ایک مسطح میدان کی طرح دور تک [illegible] ہوئی تھی اور تقریباً دو سو گز آگے ایک عمارت کا ہیولا [illegible] دے رہا تھا۔ اس عمارت کی کسی کھڑکی سے زرد روشنی [illegible] جھلک رہی تھی۔ اس عمارت تک پہنچنے کا راستہ [illegible] دوسری طرف سے تھا جبکہ ہم شارٹ کٹ کر کے آ [illegible]

ان خاکستری پہاڑیوں پر اونچے درخت نہیں تھے [illegible] کہیں قد آور کسی قسم کے کانٹے دار پودے [illegible] جھاڑیاں بکثرت تھیں جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے [illegible] تھیں۔

چند گز آگے بڑھ کر ہم رک گئے۔ کچھ دیر اس [illegible] جائزہ لیتے رہے پھر تین حصوں میں بٹ گئے۔ دیوان [illegible] وہیں روک دیا گیا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ دائیں طرف [illegible] اور جانکی بائیں طرف سے عمارت کی طرف بڑھنے [illegible]

چاندنی میں یہ عمارت خاصی پُراسرار لگ رہی [illegible] عمارت کے گرد یقیناً اونچی چار دیواری بھی رہی ہو [illegible] حوادثِ زمانہ نے اسے زمین بوس کر دیا تھا۔ البتہ

کہیں کہیں اس چار دیواری کے آثار نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں یہ دیوار پانچ چھ فٹ لمبی اور دو ڈھائی فٹ تک اونچی تھی۔

میں جانکی کے ساتھ سنبھل کر چلتا ہوا کافی آگے نکل گیا اور ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں بیٹھ کر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ سامنے کے رخ سے یہ عمارت حویلی کی طرح لگتی تھی اور اس کے کئی حصے شکستہ تھے۔ اس طرف بھی ایک کمرے کی کھڑکی سے زرد اور مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی اور پھر میں ایک آدمی کو اس کمرے میں ایک طرف سے دوسری طرف جاتے ہوئے دیکھ کر چونک گیا۔

وہ تیج سنگھ نہیں تھا۔

مجھے سورج بھان سنگھ کی بات یاد آ گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ لالہ رنجیت نام کا ایک بدمعاش بھی تیج سنگھ کے ساتھ تھا اور وہ شہر سے کسی ڈاکٹر کو بھی لے کر آیا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان دونوں میں سے کوئی ہو۔

میں ذرا سا اوپر اچک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے کسی زمانے میں پورچ بھی رہا ہوگا لیکن اب وہ غائب ہو چکا تھا البتہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو ستون نظر آ رہے تھے۔ ایک ستون آدھے کے قریب ٹوٹ چکا تھا۔

سامنے کافی وسیع میدان تھا جہاں تقریباً وسط میں چار پانچ درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا اور اس جھنڈ کے نیچے دو گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک تو جیپ تھی اور دوسری کار۔

"جانکی۔ تم یہیں رکو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔" میں نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی اور دیوار کی آڑ سے نکل کر جھکتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

حویلی کے قریب پہنچ کر میں دیوار کے ساتھ چپک گیا اور مرکزی دروازے کی طرف سرکتا رہا۔ روشن کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے اندر جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ فرش پر ایک پیٹرومیکس رکھا ہوا تھا جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں طرف اندر کی جانب ایک اور دروازہ دکھائی دیا جو کھلا ہوا تھا۔ میں کھڑکی سے آگے بڑھ گیا۔

حویلی کے مرکزی دروازے میں داخل ہو کر میں دائیں طرف مڑ گیا۔ یہ محرابی دروازہ بہت اونچا تھا مگر اس میں پٹ اور پٹ نہیں تھے۔ صرف ایک راستہ سا رہ گیا تھا۔

میں ابھی چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک آہٹ سن کر تیزی سے بائیں طرف ایک اور دروازے میں گھس گیا اور دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ اس کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ میں دیوار کا سہارا لے کر آگے بڑھتا گیا۔

میں مختلف کمروں سے گزرتا ہوا ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں سامنے والی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ گیا اور جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی مجھے چونک جانا پڑا۔

دوسرا کمرا بہت وسیع و عریض تھا۔ اس کمرے میں بھی کہیں پیٹرومیکس جل رہا تھا جس کی روشنی کمرے میں بھری ہوئی تھی۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ فرش پر بستر بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف پانی کا مٹکا بھی رکھا ہوا تھا جس کے ڈھکنے پر گلاس اوندھا پڑا ہوا تھا۔

ایک بستر پر دھرمیش پڑا ہوا تھا۔ اس کے برہنہ سینے پر پٹی بندھی ہوئی تھی جو خون سے تر ہو رہی تھی۔ دھرمیش ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کے چہرے پر بے پناہ کرب اور اذیت کے تاثرات تھے۔

تیج سنگھ اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دھرمیش کا ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ دوسری طرف پینٹ شرٹ والا ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیتھو اسکوپ تھا۔ وہ بار بار دھرمیش کے دل کی دھڑکنیں چیک کر رہا تھا۔ ایک ہٹا کٹا آدمی دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ وہ لالہ رنجیت تھا۔

"اسے بچاؤ ڈاکٹر۔ میرے منا کو بچاؤ۔" تیج سنگھ نے چیخ کر کہا "اگر یہ مر گیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ڈاکٹر کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے قریب پڑے ہوئے بیگ میں سے سرنج نکالی اور انجکشن تیار کرنے لگا۔ اس دوران میں دھرمیش بری طرح تڑپنے لگا۔ تیج سنگھ اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کسی بھی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

اور پھر دھرمیش کا جسم تختے کی طرح اکڑ گیا۔ اس نے دو تین جھٹکے لیے اور پھر اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔

"منا۔ ہوش میں آ۔ منا!" تیج سنگھ چیخا۔

ڈاکٹر نے سرنج ایک طرف رکھ دی اور اسٹیتھو اسکوپ سے اس کے دل کی دھڑکنیں چیک کرنے لگا۔ اس کی نبض چیک کی۔ گلے کی ایک نس پر انگلی رکھ کر دیکھی اور پھر مایوسی سے سر ہلاتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب ہم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" اس نے گہرا

سانس لیتے ہوئے کہا "یہ ہم سے بہت دور جا چکا ہے۔"

"نہیں۔ میرا منا نہیں مر سکتا۔" تیج سنگھ چیخا۔ اس نے دھرمیش کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا "ہوش میں آ منا۔ آنکھیں کھول۔ تو بولتا کیوں نہیں منا...؟"

"مرنے والے بولا نہیں کرتے تیج سنگھ۔" میں نے پستول والا ہاتھ کھڑکی میں رکھتے ہوئے کہا۔

تیج سنگھ ایک دم سیدھا ہو گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے کھڑے ہو کر اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن میری غراہٹ سن کر اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

"نہیں۔ تیج سنگھ۔ تم کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" میں نے کہا "اس حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا ہے۔ بہتر ہے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"تمہاری موت ہی تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے کتے۔" تیج سنگھ نے دانت کچکچائے "میرا منا مر گیا۔ تو بھی بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا لیکن اپنے عقب میں ہلکی سی آہٹ سن کر چونک گیا۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ میرے دائیں کندھے پر لگنے والی ضرب بڑی زوردار تھی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ پستول بھی میرے ہاتھ سے نکل کر کھڑکی کے دوسری طرف گر گیا تھا۔

میں تیزی سے مڑا۔ ایک اور ضرب میرے اسی کندھے پر سامنے کی طرف سے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے ہڈی کریک ہو گئی ہو۔ ضرب بہت شدید تھی۔

اس کمرے میں تاریکی کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور پھر میں اس اچانک حملے سے بدحواس بھی ہو گیا تھا۔ دوسری ضرب لگنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

کھڑکی سے آنے والی مدھم سی روشنی میں مجھے وہ انسانی ہیولا دکھائی دے گیا جو ایک بار پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تقریباً دو فٹ لمبا سریا تھا اور اس سریے سے اس نے میرے کندھے پر ضربیں لگائی تھیں اور اب تیسری بار حملہ کرنے کے لیے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا تھا۔

میں نے اس کا یہ وار ہاتھ پر روکا اور سریے پر گرفت جما کر اس طرح زوردار جھٹکا دیا کہ وہ شخص لڑکھڑا کر آگے آ گیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ کراہ اٹھا لیکن وہ فوراً سنبھل کر سیدھا ہو گیا۔ سریے پر اس کی گرفت اب بھی قائم تھی۔ میں نے اسے ایک اور جھٹکا دیا لیکن وہ اپنی جگہ قائم رہا۔

اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا جسم بھی قدرے بھاری بھرکم تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس میں گینڈے کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا چہرہ کھڑکی کی روشنی میں آیا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھتا رہا کہ وہ لالہ رنجیت تھا جو دوسرے کمرے سے نکل کر خاموشی سے اس طرف آ گیا تھا لیکن وہ لالہ رنجیت نہیں کوئی اور تھا۔

میں نے ایک بار پھر جھٹکا دے کر اسے اس جگہ سے ہلانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ ستون کی طرح اپنی جگہ پر گڑا رہا۔ میں نے کھڑے کھڑے اچھل کر اس کے پہلو پر رائٹ کک لگائی لیکن لگتا تھا اس پر اس کک کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یا تو اس کا جسم ہی پتھر کی طرح سخت تھا یا پھر میری کک زوردار نہیں تھی۔ میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھلا۔

دوسری کک کچھ کارآمد ثابت ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل گیا اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے کراہ سی خارج ہوئی تھی۔

لوہے کا سریا اب بھی ہم دونوں کے بیچ میں دو ڈھائی فٹ کے فاصلے کا باعث بنا ہوا تھا۔ سریے پر ہم دونوں کی گرفت تھی۔ میں نے آگے کی طرف زوردار جھٹکا دے کر سریے سے گرفت ہٹالی۔ وہ اپنی جھونک میں آگے جھک گیا۔ اس مرتبہ میں نے پہلے سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زوردار کک لگا دی۔ وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرا لیکن اس نے اٹھتے ہی سریے کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر حملہ کیا۔ میں نے ایک طرف جھک کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس نے دوسرا حملہ کیا۔ میں اس مرتبہ بھی اپنے آپ کو بچا گیا تھا لیکن تیسری مرتبہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ سریے کا وار میرے کولہے پر پڑا جسے میں برداشت کر گیا۔ اگر یہ وار کسی اور جگہ پر پڑتا تو ہڈی ٹوٹ چکی ہوتی۔

میں لڑکھڑا کر سامنے والی دیوار سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی لاشعوری طور پر میں نے ایک اور حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے دونوں ہاتھ دیوار پر ٹکا کر اپنے تن کو پیچھے دھکیلا اور اس کے ساتھ ہی ہوا میں اچھل کر فلائنگ کک لگائی۔

کک اس کے تھوبڑے پر پڑی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ سریا تو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا لیکن وہ نہیں گرا۔ میں نے فوراً ہی اس کے سینے پر دوسری فلائنگ کک لگائی۔ اس مرتبہ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے فرش پر رگیدنے لگا۔ ادھر ہمارا یہ ہنگامہ جاری تھا اور ادھر دوسرے کمرے سے تیج سنگھ کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"ماردو اس سالے حرامی کو۔" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "اس کی وجہ سے میرا منا مارا گیا۔ ٹکڑے کردو اس کے۔۔۔"

مجھے گردن گھما کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔

کھڑکی کے راستے کمرے میں آنے والی روشنی سے کمرے میں اب مدھم سا اجالا ہو رہا تھا۔

پچھلے دروازے سے آہٹ پاکر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ لالہ رنجیت تھا جو خنجر تانے حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپک رہا تھا۔

میں اس وقت اپنے حریف کے سینے پر سوار تھا۔ لالہ رنجیت نے جیسے ہی حملہ کیا' میں بڑی پھرتی سے بائیں طرف لوٹ لگا گیا اور اگلے ہی لمحے کمرا ایک بھیانک چیخ سے گونج اٹھا۔ لالہ رنجیت کا خنجر دوسرے شخص کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔ اگر میں ایک طرف لوٹ نہ لگا دیتا تو یہ خنجر میری پشت میں پیوست ہوتا۔

لالہ رنجیت کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے بڑی تیزی سے خنجر اس شخص کے سینے سے کھینچ لیا اور ہاتھ سر سے بلند کر دیا۔ اس مرتبہ وہ مجھ پر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اس کے سینے پر ٹھوکر رسید کر دی۔ لالہ رنجیت پیچھے الٹ گیا۔

"لالہ رنجیت!" کھڑکی کی طرف سے تیج سنگھ کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی "مار۔۔۔ ماردے اس حرامی کو۔ ٹکڑے کردے اس کے۔۔۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر میرا ہاتھ ایک چھوٹے سے پتھر پر پڑنے سے پھسل گیا اور میں اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسی دوران میں لالہ رنجیت سنبھل کر میری طرف لپکا۔ اس مرتبہ مجھے موت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی۔ اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنا دفاع کر سکتا یا اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا۔

لالہ رنجیت کا خنجر والا ہاتھ سر سے بلند تھا۔ صرف ایک جھٹکے کی ضرورت تھی اور خنجر میرے سینے میں پیوست ہو جاتا اور پھر اس کے ہاتھ کو جھٹکا تو لگا لیکن اس طرح نہیں جیسا میں نے سوچا تھا۔

فائر کی آواز سے کمرا گونج اٹھا تھا۔ دروازے کی طرف سے چلائی جانے والی گولی لالہ رنجیت کے خنجر والے بازو کی کہنی پر لگی تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے قریب گرا اور وہ چیختا ہوا پیچھے پلٹ گیا۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ تھا اور پھر اسی لمحے کھڑکی میں کھڑے ہوئے تیج سنگھ نے بھی فائر کر دیا۔ ٹھاکر نیچے گرا اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی کی طرف فائر کر دیا تھا۔

میں نے گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تیج سنگھ غائب ہو چکا تھا اور حویلی میں کسی طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالہ رنجیت اپنے زخمی بازو کو دوسرے ہاتھ سے پکڑے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور لاتوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔

اسی وقت حویلی کے باہر کسی جگہ فائرنگ شروع ہو گئی۔

"ٹھاکر۔ تم اسے سنبھالو۔ میں باہر دیکھتا ہوں۔" میں نے لالہ رنجیت کو ایک آخری زوردار ٹھوکر لگائی اور باہر کی طرف دوڑا۔

فائرنگ کی آواز حویلی کے سامنے کی طرف سے آرہی تھی اور پھر کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے فوراً ہی بعد ایک زوردار دھماکا ہوا۔ غالباً گاڑی کا ٹائر پھٹا تھا۔

میں حویلی کے کھنڈر نما دروازے سے باہر نکلا تو ایک جیپ بڑی تیزی سے مخالف سمت میں دوڑتی ہوئی نظر آئی اور ایک ہیولا دوسری کار کے قریب سے جھاڑیوں کی طرف دوڑتا ہوا نظر آیا۔

میں اس طرف دوڑتا چلا گیا۔ اس طرف قد آدم جھاڑیاں تھیں اور ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے دو آدمی ان جھاڑیوں میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے ہوں۔ خشک جھاڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں دوڑتا ہوا جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔

وہ جانکی تھی جو کسی آدمی سے گتھم گتھا ہو رہی تھی۔ میں نے اس شخص کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی اور پھر جلد ہی میں نے اس پر قابو پا لیا۔ وہ ڈاکٹر تھا جسے میں نے کمرے میں دیکھا تھا۔

جانکی ایک طرف کھڑی ہانپ رہی تھی۔

میں نے ڈاکٹر کو بالوں سے پکڑ لیا اور اسے دھکیلتا ہوا حویلی کی طرف لے آیا۔ جانکی بھی ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اس شخص پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بتا رہی تھی کہ اس نے دو آدمیوں کو درختوں کے جھنڈ کے نیچے کھڑی ہوئی گاڑیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے ایک آدمی پر فائر کیا لیکن نشانہ خطا گیا۔ وہ شخص جوابی فائر کرتا ہوا جیپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر جانکی اسے نہیں روک سکی۔ وہ جیپ پر فرار ہو گیا۔ دوسرا آدمی دوسری کار کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانکی کی ایک گولی نے کار کا ایک ٹائر اڑا دیا۔ وہ شخص جھاڑیوں کی طرف دوڑا اور جانکی نے بھی اسی طرف دوڑ لگا دی اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس شخص سے گتھم گتھا ہو گئی۔

وہ ڈاکٹر تھا اور غنیمت تھا کہ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا لیکن وہ جانکی سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔ اگر میں بروقت وہاں نہ پہنچ جاتا تو وہ جانکی کی گرفت سے نکل کر راہِ فرار اختیار کر چکا ہوتا۔

ہم حویلی کے دروازے سے ابھی دور ہی تھے کہ نشیب میں کسی جگہ گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں ڈاکٹر کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ ٹھاکر' لالہ رنجیت کو اسی کمرے میں لے آیا تھا جہاں فرش پر بچھے ہوئے بستر پر دھرمیش کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

دوسرے بستر کی چادر پھاڑ کر لالہ رنجیت اور ڈاکٹر کو باندھ کر ایک طرف ڈال دیا گیا۔ چند منٹ بعد دیوان سنگھ بھی دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ بھاگ گیا حکم۔" اس نے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دیوان سنگھ کی باتوں سے پتا چلا کہ فائرنگ کی آواز سن کر وہ دوڑتا ہوا حویلی کے دوسری طرف آگیا تھا۔ اس وقت اس نے جیپ کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ جیپ کو روکنے کے لیے شارٹ کٹ کرتا ہوا نشیب میں دوڑتا چلا گیا۔ اس نے فائرنگ کر کے جیپ کو روکنے کی کوشش کی تھی لیکن جیپ چٹانوں میں بل کھاتے ہوئے راستے پر غائب ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے کہا "تم یہیں رکو۔ ہم روپ متی کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ اسی حویلی کے کسی کمرے میں ہے اور ہاں۔۔۔ ایک لاش اس کمرے میں بھی ہے۔" اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

دیوان سنگھ اس کھڑکی کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے جھانک کر دوسری طرف دیکھا۔

"یہاں تو کوئی لاش نہیں ہے حکم۔" اس نے مڑ کر کہا۔

"کیا۔۔۔؟" ٹھاکر اچھل پڑا۔

اور پھر ہم دونوں بیک وقت ہی کھڑکی کے قریب پہنچے تھے۔ لاش واقعی کمرے میں نہیں تھی۔

مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ لالہ رنجیت کے خنجر کے وار سے وہ شخص مرا نہیں تھا اور موقع پاکر وہاں سے بھاگ گیا تھا۔

جانکی کو کمرے میں چھوڑ دیا گیا اور ہم تینوں اس شخص کو تلاش کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ وہ زخمی ہونے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں گیا ہوگا لیکن آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی ہمیں مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ شاید چٹانوں میں غائب ہو گیا تھا۔

ہم واپس آگئے۔ جانکی' ڈاکٹر اور لالہ رنجیت پر ریوالور تانے کھڑی تھی۔ لالہ رنجیت کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات تھے۔ گولی لگنے سے اس کی کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

دیوان سنگھ کو وہاں چھوڑ کر ہم روپ متی کو تلاش کرنے لگے۔ ٹھاکر نے دوسرے کمرے سے پیٹرومیکس اٹھا لیا تھا۔ اب اگرچہ بظاہر کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میرے اور جانکی کے ہاتھوں میں ہتھیار بالکل تیار تھے۔

بہت بڑی حویلی تھی۔ لمبی چوڑی راہداریاں اور کئی کشادہ کمرے تھے۔ کسی زمانے میں یہ حویلی واقعی بہت شان دار رہی ہوگی لیکن اب تو نصف سے زیادہ کھنڈر بن چکی تھی۔ بہت سے کمروں کی دیواریں اور چھتیں اپنی جگہ پر قائم تھیں لیکن وہ رہائش کے قابل نہیں تھے۔ صرف چند ہی کمرے ایسے تھے جن میں رہائش اختیار کی جا سکتی تھی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ بتا رہا تھا کہ پہاڑیوں میں یہ قدیم عمارتیں دراصل ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کا مسکن بنی ہوئی تھیں۔ وہ شہر یا گردو نواح کی آبادیوں میں وارداتیں کرنے کے بعد یہاں کسی عمارت میں پناہ لے لیتے تھے۔ رات کے وقت تو پولیس ان کے تعاقب میں ادھر آنے کی ہمت نہیں کرتی تھی اور دن کے وقت ڈاکو پولیس کی آمد سے آگاہ ہو جاتے تھے۔ ہر عمارت ایسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں سے دور دور تک پہاڑی راستوں پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔

ہمیں حویلی میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ انہی

کمروں کے پچھلی طرف راہداری کے ایک کمرے میں داخل ہوتے ہی میں ٹھٹک گیا۔

ٹھاکر مجھ سے پہلے اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں لٹکایا ہوا پیٹرومیکس ذرا آگے کیا تو اس کی روشنی میں مجھے کمرے کے ایک کونے میں ایک گٹھڑی سی نظر آگئی اور میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

وہ روپ متی تھی۔ اس کے جسم پر گلابی رنگ کی نائٹی تار تار ہو چکی تھی جس کا مطلب تھا کہ حویلی میں یا یہاں آکر اس نے کافی مزاحمت کی ہوگی جس کے نتیجے میں اس کا شب خوابی کا یہ باریک سا لباس پھٹ گیا تھا۔ وہ گٹھڑی کی طرح مڑی تڑی سی پڑی تھی۔ اس کے پیر اور ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر پٹی باندھ دی گئی تھی تاکہ وہ کپڑا منہ سے نہ نکال سکے۔ وہ ہوش میں ہی تھی۔ اس کے چہرے پر دہشت اور آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ ہمیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس کی آنکھیں کسی انجانے خوف سے پھیل گئیں لیکن جب ہم دو قدم آگے بڑھے اور میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا تو ہمارے چہرے پہچان کر اس کے چہرے پر تناؤ اور خوف کے تاثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔

میں گھٹنوں کے بل اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے اس کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھولی اور پھر منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والا سانس ایسے تھا جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں اس کی پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کھولنے لگا۔

جانکی بھی دوڑ کر میرے قریب آگئی تھی۔ اس نے سہارا دے کر روپ متی کو اٹھا دیا۔ روپ متی کے ہاتھ کھل چکے تھے۔ وہ جانکی سے لپٹ گئی جس سے مجھے اس کے پیروں کی بندشیں کھولنے میں کچھ دشواری پیش آئی۔

اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ روپ متی اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سترہ اٹھارہ گھنٹوں سے یہاں بندھی پڑی تھی۔ وہ تو اپنی ٹانگیں بھی سیدھی نہیں کر سکتی تھی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نے پیٹرومیکس زمین پر رکھ دیا اور آگے بڑھ کر جانکی کے ساتھ دوسری طرف سے سہارا دے کر روپ متی کو اٹھا دیا اور میں روپ متی کی ٹانگیں سیدھی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ خود بھی کوشش کر رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اس کے منہ سے کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔

اس کمرے میں گری تھی۔ روپ متی پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ میں نے پیٹرومیکس اٹھا لیا اور ہم لوگ اسے باہر لے آئے۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا سے روپ متی کے حواس کسی قدر بحال ہوئے۔

اپنی قوتِ ارادی اور ہماری کوششوں سے روپ متی تقریباً آدھے گھنٹے بعد اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکی تھی۔ جانکی اسے سہارا دے کر مسلسل ٹہلاتی رہی اور پھر جانکی اسے لے کر ایک چبوترے پر بیٹھ گئی۔

ہمارے ساتھ ٹھاکر بھانوت سنگھ کو دیکھ کر بھی روپ متی کچھ پریشان ہو رہی تھی اور جب اسے یہ بتایا گیا کہ ہمارا ٹھاکر سے رابطہ کس طرح ہوا تھا تو وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں یہ کشٹ (مشکل) اٹھانا پڑا اور۔۔۔"

"میں نے تو کشٹ برداشت کر لیا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "لیکن اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔۔۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کیا ہو سکتا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

"لگتا ہے یہاں لانے کے بعد تم پر کچھ تشدد بھی کیا گیا تھا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔" روپ متی نے جواب دیا "انہوں نے مجھے یہاں باندھ کر ڈال دیا۔ تیج سنگھ ہر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد یہاں آکر مجھے دھمکیاں دیتا کہ اگر اس کے منا کو کچھ ہو گیا تو وہ میرے بھی ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈال دے گا۔ کبھی وہ مجھے ایک آدھ ٹھوکر بھی مار دیتا۔ اسے اپنے منا کی زیادہ فکر تھی۔ اس نے آج دن میں کسی کو شہر بھیج کر کسی ڈاکٹر کو بھی بلایا تھا۔ وہ لوگ مجھے چار بجے کے قریب یہاں لے کر آئے تھے۔ اس وقت سے اب تک ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیا گیا۔ یہاں میرا دم گھٹتا رہا۔ ایک وقت تو ایسا بھی آیا جب مجھے لگا کہ میرا دم گھٹ جائے گا اور میں ختم ہو جاؤں گی۔ اگر تم لوگ نہ آجاتے تو وہ مجھے مار ہی ڈالتا۔ دھرمیش کیسا ہے۔ زندہ ہے یا۔۔۔؟"

"اس کی مکتی (نجات) ہو گئی۔" میرے بجائے جانکی نے جواب دیا۔

"تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟" روپ متی نے پوچھا۔

"یہ ایک بہت لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے

ہوئے جواب دیا "وہ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے اور پھر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ رات کے آخری پہر مندری واپس آگئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر رادھا کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا "تمہیں تو ٹھاکر بھانوت سنگھ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ اس جیسے مخلص دوست ہی وقت پر کام آتے ہیں۔ اگر یہ ہمارا ساتھ نہ دیتے تو ہمیں یہاں تک پہنچنے میں کافی دشواریاں پیش آتیں اور اس وقت تک شاید تمہارا ابھی کام تمام ہو چکا ہوتا۔"

"میں واقعی شرمندہ ہوں۔ میں نے دوستوں کی قدر نہیں کی۔" روپ متی نے ٹھاکر بھانوت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

"شرمندگی کا اظہار بعد میں کر لینا۔" ٹھاکر نے پہلی مرتبہ زبان کھولی "ہم ساری رات یہاں نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ ایک لاش یہاں پڑی ہے اور دو قیدی بھی یہاں موجود ہیں۔ ابھی ہمیں شہر جا کر پولیس سے بھی نمٹنا ہے۔"

"پپ۔۔۔ پولیس۔" روپ متی کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" ٹھاکر نے کہا "وہ لوگ زبردستی تمہارے گھر میں گھسے تھے اور تم نے اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی اور پھر دھرمیش کی لاش تمہاری حویلی میں دریافت نہیں ہوئی۔ وہ میلوں دور یہاں آکر مرا ہے۔ تم نے قانون کو ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بھی اس بات کا گواہ ہے کہ اس نے دھرمیش کو یہاں پر زخمی حالت میں دیکھا تھا' اس کے زخم سے گولی نکالی تھی اور اس کا علاج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ مر گیا۔ جرم انہی پر ثابت ہوتا ہے۔ وہ تمہیں اغوا کر کے بھی لے گئے تھے۔ تم ڈرو نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"لیکن پولیس۔" روپ متی بولی "چند روز پہلے بھی ایک ایسا واقعہ ہوا تھا لیکن پولیس نے مجھے ہی دھمکایا تھا۔"

"دیکھو روپ متی۔" ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اس میں غلطی تمہاری ہی ہے۔ تم نے ہی تیج سنگھ جیسے نیچ لوگوں کو اتنا سر چڑھا لیا تھا کہ وہ تمہارے مقابلے پر آگئے۔ ان جیسے لوگوں کی جگہ ہمارے چرنوں (قدموں) میں ہے۔ انہیں پیروں کے نیچے ہی رکھنا چاہیے۔ ان جیسے لوگوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیا جائے تو وہ ہماری برابری کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ بہر حال۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "پہلے صورت حال کچھ اور تھی۔ تیج سنگھ نے اگر کسی پولیس آفیسر کو گھوس (رشوت) دے کر ڈرایا دھمکایا تھا تو وہ اور بات تھی۔ اب معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ تیج سنگھ کا بھائی مارا جا چکا ہے۔ ایک دوسرا آدمی بھی لالہ رنجیت کے ہاتھوں زخمی ہو کر یہاں سے بھاگا ہے۔ مجھے اس کے بچنے کی بھی امید نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ بھی اب تک ختم ہو چکا ہو اور اس کی لاش پہاڑیوں میں کہیں پڑی ہو۔ ہم اس معاملے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں۔ ہمیں تو قانون کا ساتھ دینا چاہیے تاکہ ایسے جرائم پیشہ لوگوں کو ایسی سزا دی جا سکے کہ پھر کسی نیچ کو ہم جیسے لوگوں کے منہ لگنے کی جرأت نہ ہو سکے۔"

"مگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔" ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ہمت سنگھ جیسا نوجوان تمہارا دوست ہے۔ تمہارے لیے تو ان دونوں نے اپنے جیون کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ چلو۔ اب دیر مت کرو۔"

جانکی کو وہیں روپ متی کے پاس چھوڑ دیا گیا۔ میں اور ٹھاکر اندر آگئے۔ دیوان سنگھ ڈاکٹر اور لالہ رنجیت پر ریوالور تانے کھڑا تھا اور پھر ٹھاکر کے کہنے پر دیوان سنگھ باری باری ان دونوں کو کندھے پر لاد کر باہر لے آیا۔

ہماری جیپ وہاں سے کافی دور تھی اور پھر راستہ بھی دشوار تھا۔ ان دونوں کو وہاں تک لے جانا مشکل تھا۔ اس لیے دیوان سنگھ کو چابی دے کر بھیج دیا گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ دوسرے راستے سے جیپ لے کر آگیا۔

جیپ کی پچھلی سیٹیں آمنے سامنے تھیں۔ لالہ رنجیت اور ڈاکٹر کو سیٹوں کے بیچ میں ڈال دیا گیا۔ روپ متی اور جانکی آگے والی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ دیوان سنگھ اور میں نے پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر پیر ان دونوں پر رکھ لیے۔

واپسی پر ڈھلان ہونے کی وجہ سے راستہ زیادہ خطرناک تھا۔ نہایت تنگ اور خطرناک موڑ تھے۔ ٹھاکر بہت محتاط ہو کر ڈرائیو کر رہا تھا۔

جیپ اس وقت ایک نہایت خطرناک موڑ مڑ رہی تھی۔ ایک طرف چٹان تھی اور دوسری طرف عمودی ڈھلان جو تقریباً ڈیڑھ سو گز نیچے تک چلی گئی تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ جیپ کا آگے کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا اور جیپ لڑکھڑا گئی۔ اسی وقت فضا ایک بار پھر دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ گولی چلنے کی آواز تھی۔ جیپ کا ایک ہیڈ لیمپ چھناکے سے ٹوٹ گیا۔

ٹائر پھٹنے سے جیپ بری طرح لڑکھڑا گئی تھی۔ اس وقت

رفتار اگرچہ بہت ہلکی تھی مگر لہرا جانے سے اس کے اگلے دونوں پہیے ڈھلان پر اتر گئے۔ جانکی اور روپ متی چیخ اٹھیں۔

جیپ بڑی تیزی سے عمودی ڈھلان پر جا رہی تھی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نے تیزی سے نیچے جاتی ہوئی جیپ کو بڑی مہارت سے سنبھال لیا لیکن اسے روک لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایک دم بریک لگا دینے سے جیپ رکنے کے بجائے قلابازیاں کھانے لگتی اور ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔

جیپ کا ایک ہیڈ لیمپ ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے ہیڈ لیمپ کی روشنی جیپ کے اچھلنے کی وجہ سے کسی ایک جگہ نہیں ٹک رہی تھی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نے بڑی ہوشیاری سے جیپ کا رخ قدرے بائیں طرف موڑ دیا جہاں نیچے قد آدم پودوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر روپ متی اور جانکی ایک دوسرے سے لپٹ کر چیخ رہی تھیں۔ دیوان سنگھ اور میں نے سیٹوں کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

جیپ کو روکنے کے لیے ٹھاکر کی ترکیب کامیاب رہی تھی۔ جیپ گنجان پودوں کے جھنڈ میں گھس گئی اور دو چار زوردار جھٹکے کھانے کے بعد رک گئی۔ جانکی اچھل کر باہر پودوں میں گری اور بری طرح چیخنے لگی۔ میں نے سیٹ پر کھڑے ہو کر چھلانگ لگا دی اور جانکی کو پکڑ کر پودوں سے باہر کھینچ لیا۔

جیپ کا انجن بند ہو چکا تھا۔ دوسرا ہیڈ لیمپ بھی بجھ گیا البتہ عقبی سرخ بتیاں جل رہی تھیں اور پھر ٹھیک اسی وقت اوپر کہیں سے گولی چلائی گئی۔ فائر ریوالور یا پستول سے کیا گیا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے گولی یا تو کہیں راستے ہی میں دم توڑ گئی تھی یا کسی اور طرف نکل گئی تھی۔

ٹھاکر نے عقبی سرخ بتیاں بھی بجھا دیں اور چھلانگ لگا کر نیچے اتر گیا اور تیزی سے گھوم کر اس نے روپ متی کو بھی نیچے اتار لیا اور اسے کھینچتا ہوا ایک طرف گنجان پودوں کے پیچھے لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"ہمت سنگھ۔ اس طرف آ جاؤ۔ دیوان سنگھ۔ تم بھی۔ جلدی کرو۔"

میں جانکی کو کھینچتا ہوا اس طرف لے گیا۔ دیوان سنگھ بھی جیپ سے چھلانگ لگا کر وہاں پہنچ گیا۔ جانکی ہولے ہولے کراہتے ہوئے اپنے جسم کے مختلف حصے سہلا رہی تھی۔ وہ جیپ سے کانٹے دار جھاڑیوں میں گری تھی اور کچھ دور تک لڑھکتی چلی گئی تھی۔ کانٹوں نے اس کے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

"تم لوگ یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے روپ متی کو جانکی کے قریب لا کر چھوڑ دیا اور جیب سے پستول نکال کر ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ چاندنی میں کچھ دور تک اس کا ہیولا دکھائی دیا اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

جیپ کے پچھلے حصے میں فرش پر پڑے ہوئے لالہ رنجیت اور ڈاکٹر بری طرح چیخ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور ظاہر ہے جیپ کو جھٹکے لگنے سے انہیں چوٹیں بھی لگی ہوں گی۔

دیوان سنگھ دوڑتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ گیا اور اوپر چڑھ کر ان دونوں پر ٹھوکریں برسانے لگا پھر اس کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اب اگر کسی کے منہ سے آواز نکلی تو گولی اتار دوں گا کھوپڑی میں۔ سالے حرامی۔۔۔"

اس کے بعد ان دونوں کی بولتی بند ہو گئی تھی۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے اور پھر اچانک ہی اوپر چٹانوں میں فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آدھا گھنٹا اور گزر گیا اور پھر ٹھاکر بھانوت سنگھ واپس آ گیا۔

"بھاگ گیا۔" وہ اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "شہر اب بھی یہاں سے کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ اب ہمیں پیدل ہی جانا پڑے گا۔"

"جیپ کے پیچھے ایک فالتو ٹائر تو پڑا ہوا ہے حکم۔" دیوان سنگھ نے کہا "حکم کرو تو میں دو منٹ میں ٹائر بدل دوں۔"

"ٹائر تو تبدیل ہو جائے گا مگر اندھیرے میں جیپ کو اس خطرناک راستے پر اتارنا ممکن نہیں ہو گا۔ جیپ کے بارے میں صبح سوچا جائے گا۔ اس وقت تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا پھر بولا "وہ چھتریاں یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ان کے قریب ہی گنیش کا ایک چھوٹا سا مندر بھی ہے۔ وہاں لوگ آتے رہتے ہیں۔ شاید کوئی بندوبست ہو جائے۔"

"چھتریوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے جانکی کا ہاتھ پکڑ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"راجوں کا مرگھٹ یعنی قبرستان۔" ٹھاکر نے جواب دیا "دراصل ہر راجا کی قبر۔۔۔ میرا مطلب ہے جہاں اس کی چتا

جلی تھی، پر سنگِ مرمر کا خوب صورت چبوترہ اور اس پر سنگِ مرمر ہی کی خوب صورت بارہ دریاں بنی ہوئی ہیں۔ لوگ عام طور پر انہیں چھتریاں ہی کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بہت خوب صورت اور وسیع و عریض پارک ہے۔ لوگ عام طور پر پکنک منانے کے لیے اس طرف آتے ہیں۔ چاندنی راتوں میں تو کبھی کبھی تفریح کے دلدادہ لوگ رات بھی پارک میں گزار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی گنیش کا مندر بھی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔"

ہم لوگ ڈھلان پر اترتے رہے۔ میں نے جانکی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ٹھاکر نے روپ متی کا۔ ڈاکٹر اور لالہ رنجیت کے پیر کھول دیے گئے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بندھی ایک رسی دیوان سنگھ نے تھام رکھی تھی اور وہ انہیں جانوروں کی طرح ہانکتا ہوا لا رہا تھا۔

عمودی ڈھلان پر اترنا بھی خاصا خطرناک تھا۔ کانٹے دار جھاڑیاں بار بار ہمارے قدموں سے الجھ رہی تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد بہت دور نشیب میں مدھم سی چند روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔

"وہ سرخ روشنی گنیش مندر کی ہے اور نقرئی روشنیاں چھتریوں کی۔ یہ روشنیاں رات بھر جلتی رہتی ہیں۔" ٹھاکر نے بتایا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد ہم اس مندر کے سامنے پہنچ گئے۔ ایک طرف چار پانچ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں اور سامنے ہی پارک میں مختلف جگہوں پر کچھ ٹولیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں لڑکے بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ اس وقت اگرچہ رات کا ایک بج رہا تھا مگر ان لوگوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ابھی شام ہوئی ہے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ وہاں بیٹھی ہوئی ایک پارٹی میں ٹھاکر بھانوت سنگھ کا ایک جانکار (شناسا) بھی نکل آیا۔ وہ اٹھ کر بات چلتا ہوا ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے باری باری سب کو پرنام (سلام) کیا پھر ٹھاکر سے دریافت کرنے لگا۔

"مہاراج۔ آپ آدھی رات کو ادھر۔ یہ کون ہیں؟" اس نے رنجیت اور ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"ڈکیت ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا پھر فوراً ہی اصل بات پر آ گیا "تمہارے پاس گاڑی ہے؟"

"جی مہاراج۔ وہ سفید ہائی روف۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"ہمیں تمہاری گاڑی چاہیے یا کسی کو ہمارے ساتھ بھیج دو جو ہمیں شہر چھوڑ کر گاڑی واپس لے آئے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"میں خود آپ کے ساتھ چلتا ہوں ٹھاکر جی۔" اس شخص نے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کی طرف چلا گیا۔

چند منٹ بعد ہم سب اس ہائی روف وین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہی شخص خود ڈرائیو کر رہا تھا اور ٹھاکر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وین پولیس ہیڈ کوارٹر کے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ روپ متی ایک سابق راجا کی بیٹی تھی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کا تعلق بھی شہر کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ہیڈ کوارٹر میں ہلچل سی مچ گئی۔ ٹھاکر نے ڈاکٹر اور لالہ رنجیت کو ایک آفیسر کے حوالے کر دیا۔

پولیس نے اس معاملے کو کافی سنجیدگی سے لیا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر پولیس کمشنر بھی ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔

ہم صبح پانچ بجے سے پہلے وہاں سے فارغ نہیں ہو سکے تھے۔ اس دوران میں روپ متی نے اپنی حویلی فون کر کے تارا سنگھ کو بتا دیا تھا۔ وہ پجارو لے کر آ گیا۔

جب ہم لوگ پولیس ہیڈ کوارٹر سے روانہ ہوئے تو دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور سڑک پر ٹریفک کی آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔

پجارو جیسے ہی جواہر لال نہرو مارگ والے چوک پر مڑی، بائیں طرف سے ایک ٹرک تیزی سے آتا ہوا نظر آیا۔ پجارو اس وقت سڑک کے وسط میں تھی۔ ٹرک موت کے فرشتے کی طرح ہماری طرف آ رہا تھا۔ فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرک کے اسٹیئرنگ پر تیج سنگھ کو بیٹھے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرختگی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کسی بھی وقت دھماکا ہو سکتا تھا۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے
طالوت
3 حصوں میں (مکمل)
قیمت فی حصہ 50 روپے۔ ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
تینوں حصے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ 25 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 6802552-6895313 فیکس: 6802551
kitabiat1970@yahoo.com

اور پھر مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ میں اپنی جگہ سے اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ روپ متی اور جانکی بھی بری طرح چیخی تھیں۔

پجارو مینڈک کی طرح پھدک کر نہایت تیز رفتاری سے آگے بڑھی تھی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

ہماری پجارو آگے نکل گئی تھی اور ٹرک خوفناک رفتار سے چوک کے وسط کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر سامنے دیکھا اور مجھے ایک بار پھر اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پجارو تیزی سے فٹ پاتھ کے کنارے پر لگے ہوئے پائپوں کے جنگلے کی طرف بڑھ رہی تھی اور پھر پجارو وہ جنگلا توڑتی ہوئی فٹ پاتھ پر چڑھ کر سامنے والی دکان سے ٹکرا کر رک گئی۔

میں ایک بار پھر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ پچھلی سیٹوں پر سے جانکی اور روپ متی کی چیخیں ایک بار پھر سنائی دی تھیں۔ غنیمت تھا کہ وہ دکان بند تھی اور گاڑی شٹر سے ٹکرائی تھی۔ شٹر اندر کی طرف دھنس گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا' ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ تیز رفتار ٹرک چوراہے کے وسط میں ٹریفک کانسٹیبل کے لیے بنے ہوئے چبوترے اور چھتری سے ٹکرا کر الٹ گیا تھا۔

اس وقت ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ چند ہی گاڑیوں کی آمدورفت تھی۔ کچھ سائیکل سوار دکھائی دے رہے تھے۔ ٹریفک رک گیا۔ کچھ لوگ ہماری طرف دوڑے اور کچھ ٹرک کی طرف۔

ہمیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ روپ متی کا سر اگلی سیٹ سے ٹکرایا تھا جس سے اس کی پیشانی کی کھال پھٹ گئی تھی اور ہلکا سا خون رسنے لگا تھا۔ اس کے سوا کسی کو چوٹ نہیں آئی تھی۔

میں پجارو سے اتر آیا۔ اس وقت کئی لوگوں نے پجارو کو گھیر لیا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے روپ متی اور جانکی کو نیچے اتارا۔ دیوان سنگھ بھی نیچے اتر کر لوگوں کو ادھر ادھر ہٹا رہا تھا۔

چوراہے کے وسط میں بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ میں اور ٹھاکر بھی اس طرف دوڑ پڑے اور لوگوں کو ہٹا کر آگے گھستے چلے گئے۔

وہ منظر بہت ہی روح فرسا تھا۔ ٹرک اسٹیئرنگ والی سائیڈ پر الٹا تھا اور تیج سنگھ کی لاش اسٹیئرنگ اور دروازے کے بیچ میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ لاش ہی تھی۔ اس م... کی کوئی رمق نظر نہیں آتی تھی۔ چہرہ خون سے تر تھا... مڑی ہوئی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ گردن کی ہڈی... تھی۔

پولیس سائرن کی آواز سن کر لوگ ادھر ادھر... اور چند سیکنڈ بعد پولیس کی جیپ وہاں آ کر رکی۔

پولیس کی مداخلت کے بعد جلد چھٹکارے کی تو... تھی۔ جانکی اور روپ متی کو دیوان سنگھ کے ساتھ ... دیا گیا اور ہمیں آٹھ بجے سے پہلے پولیس سے نجات ... سکی تھی۔ تارا سنگھ بھی دیوان سنگھ کے ساتھ ہی چلا...

تیج سنگھ کی لاش جب ایمبولینس میں ڈالی جا... میں نے آخری مرتبہ اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ... بھیانک ہو رہا تھا۔ انتقام کی آگ میں جلتا ہوا وہ ... نرگ کی آگ میں پہنچ گیا تھا۔

ہمارا وہ دن بہت برا گزرا تھا۔ ٹھاکر بھانوت میرے اصرار پر وہیں رہ گیا۔ ناشتا کر کے وہ تو سو گیا... تک باتیں کرتے رہے۔ روپ متی بھی اپنے کمرے... سو گئی۔

رات بھر جاگنے اور بھاگ دوڑ سے مجھے ... تھکن تو ہو ہی رہی تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ ... آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کوشش کے باوجود ... بند نہیں کر سکا تھا۔

اور پھر اسی شام میں اور جانکی پنڈت مرلی دھ... میں نکل کھڑے ہوئے۔ میرے جسم پر بے شمار چو... کوئی اور ہوتا تو واقعی کئی روز تک بستر سے نہ اٹھ... میں نے جی کی قوت سے اپنی تکلیف پر قابو پا رکھا... بھی آرام سے بیٹھے رہنا میری فطرت میں شامل نہیں...

ہم نے گاڑی اجمیری گیٹ سے ذرا آگے ایک عمارت کے سامنے چھوڑ دی اور چندر پول بازار... ہوئے مندر والی گلی میں داخل ہو گئے۔

کشادہ سیڑھیاں چڑھ کر وسیع برآمدے میں دا... ہی میں رک گیا۔ میں سامنے سے آنے والے دو... دیکھ رہا تھا۔

ان میں ایک پنڈت مرلی دھر تھا اور دو... پروہت۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا پلک جھپکے بغیر ان دونوں... طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

...ن دونوں پنڈتوں اور ہمارے درمیان صرف چند گز کا ...گیا تھا۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے آ رہے ...ہی نے جانکی کی طرف دیکھا اور پھر بڑی تیزی سے ...ت ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ جانکی کو اس طرف آنے کا ...یں مل سکا۔ اس نے وہی طریقہ اپنایا جو کبوتر بلی کو دیکھ ...ے بچنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ یعنی اس نے ...بند کر لیں اور دونوں ہاتھ سامنے کو جوڑ کر کھڑی ...

...نڈت مرلی دھر اور مندر کا پروہت سر جھکائے باتیں ...ہوئے آ رہے تھے۔ شاید کوئی بہت ہی گمبھیر مسئلہ زیر ...۔ ان کے انداز سے ایسے لگتا تھا جیسے وہ اپنے علاوہ ...ر کی موجودگی سے قطعی بے خبر ہوں۔ حالانکہ حقیقت ...ہ مندر میں ان کے اور ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے ...وجود تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ دونوں ہاتھ ...انہیں پرنام کر رہے تھے مگر ان کی توجہ کسی طرف نہیں ...

...ی انہماک کی وجہ سے وہ دونوں اپنے سامنے کھڑی ...کی کو بھی نہیں دیکھ سکے اور بے دھیانی میں پنڈت مرلی ...بات ٹکرا گیا۔

...انکی لڑکھڑا گئی لیکن اس نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ ...جڑے ہوئے ہاتھ الگ کیے۔ وہ اس طرح کھڑی رہی ...وان کی پرارتھنا کرتے ہوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر ...ہو۔

...نڈت مرلی دھر بھی اس سے ٹکرا کر لڑکھڑا گیا تھا لیکن وہ ...سنبھل گیا اور روایتی انداز میں دونوں ہاتھ جانکی کی ...جوڑ کر بولا۔ "معاف کرنا دیوی جی۔ میں اپنے دھیان ...

...یکایک خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم تناؤ ...گیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی چڑھ اور گہری ہو گئی۔ ...ی نظروں سے جانکی کی طرف دیکھنے لگا جو اب بھی ...بند کیے اور ہاتھ جوڑے کھڑی زیر لب کچھ بدبدا رہی ...

...ستون کی آڑ میں کھڑا اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ پنڈت ...نے سنگاپور میں بھی جانکی کو دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ ...شرٹ پہنا کرتی تھی جبکہ اس وقت وہ سنہری بارڈر ...خوب صورت اور قیمتی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ بال ...سنورے ہوئے تھے۔ کانوں میں آویزے اور ماتھے ...جھلملا رہے تھے ...میں بھی جوگرز کے بجائے

بڑے نازک اور ہلکے پھلکے سینڈل تھے۔ وہ اس جانکی سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جسے پنڈت مرلی دھر نے سنگاپور میں دیکھا ہو گا۔

اسی دوران ایک اور جوڑا پروہت کے قریب آ کر رک گیا۔ ان دونوں کی شاید نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ لڑکی نے دلہنوں جیسا قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ زیورات سے لدی پھندی تھی۔ اس کی رنگت اگرچہ سانولی مگر چہرے کے نقوش بڑے دلفریب تھے۔ اس کی عمر بیس اکیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کے ساتھی مرد کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی لیکن وہ بھی صحت مند اور خوب رو جوان تھا۔ اس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں سونے کی ایک موٹی سی چین تھی۔

"کل ہمارا بیاہ ہوا ہے پنڈت جی۔" وہ شخص پروہت کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "ہم ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آپ کی آشیرباد لینے آئے ہیں۔"

پروہت نے آشیرباد دینے کے لیے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ان دونوں نے جھک کر پروہت اور پنڈت مرلی دھر کے چرنوں کو چھوا۔ سیدھے ہوتے ہوئے وہ لڑکی جانکی سے ٹکرا گئی اور جانکی لڑکھڑا کر پنڈت مرلی دھر سے ٹکرائی۔ پنڈت مرلی دھر شاید اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا تو جانکی بھی اس کے اوپر ہی گری تھی۔

مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جانکی نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی تھی۔ نیچے گرتے ہی وہ اس طرح چیخی تھی جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے نیچے دبے ہوئے پنڈت مرلی دھر کو ایک دو ہاتھ بھی جڑ دیے تھے۔

آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ رک گئے۔ ایک عورت نے جلدی سے آگے بڑھ کر جانکی کو سہارا دے کر اٹھا دیا۔ جانکی اپنی ساڑی درست کرتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔ دو آدمیوں نے پنڈت مرلی دھر کو بھی سہارا دے کر اٹھا دیا۔ وہ خاصا بدحواس ہو رہا تھا۔

"چھما چاہتا ہوں دیوی جی۔" وہ جانکی کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "غلطی میری نہیں تھی پھر بھی میں معافی مانگتا ہوں۔"

"مرد چاہے دیوتا کے روپ میں ہو یا پنڈت کے روپ میں۔ اپنی غلطی کبھی نہیں مانتا۔" جانکی کے لہجے میں ناگواری کا تاثر نمایاں تھا "میں یہاں کھڑی بھگوان سے پرارتھنا کر رہی تھی تو تم اس وقت مجھ سے ٹکرائے تھے۔ مرد چاہے دیوتا کا

روپ بھی دھار لے تو اس کا من میلا ہی رہتا ہے اور وہ۔۔۔"

"معاف کردو دیوی جی۔" پنڈت مرلی دھر بولا "اس وقت میں بے دھیانی میں آپ سے چھو گیا تھا اور۔۔۔"

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ مرد اپنی غلطی کبھی نہیں مانتا۔" جانکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پنڈت جی معافی مانگ رہے ہیں دیوی جی۔ اب چھما کردیں انہیں۔" قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے کہا۔

"چھما کردیا۔" جانکی نے اس شخص کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ویسے پنڈت جی سے کہہ دو کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھا کریں۔"

"میری آنکھیں تو نیند میں بھی کھلی رہتی ہیں۔ ویسے لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" پنڈت مرلی دھر جانکی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"ضرور دیکھا ہوگا مہاراج۔" جانکی نے جواب دیا "ہم اپنے پتی کی تلاش میں دو سال سے پورے ہندوستان کے مندروں کی یاترا کررہے ہیں۔ کہیں ہمارا اور آپ کا سامنا ہوگیا ہوگا۔"

"پتی کی تلاش میں مندروں کی یاترا۔" مرلی دھر نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک بھگوان ہوتا تو ہم اپنی حویلی میں چوکی پر بیٹھے بیٹھے پرارتھنا میں دو سال گزار دیتے۔" جانکی نے جواب دیا "پر ہمارے تو کئی بھگوان ہیں۔ لاتعداد دیوتا ہیں۔ ہم اس لیے ہندوستان بھر کے مندروں کی یاترا کررہے ہیں کہ کوئی بھگوان تو ہماری سنے گا۔"

جانکی کی اس بات پر پروہت کی پیشانی پر بل پڑگئے لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا اور جانکی کو آشیرباد دینے کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"تیرا پتی تجھے مل جائے گا۔ اپنا من میلا مت کرو۔ ہم جانتے ہیں تم نے بہت کشٹ اٹھایا ہے۔ پر اب تیرے من کی آشا پوری ہونے والی ہے۔۔۔ ہم خاص طور پر بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ تیرا پتی تجھے جلدی مل جائے پر وہ تجھ جیسی سندری کو چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟"

"کیا بتاؤں مہاراج!" جانکی گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "وہ ایک ناچنے والی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ وہ شاید مجھ سے زیادہ سندر تھی۔ وہ اس کے ساتھ بھاگ گیا اور مجھے مندروں کے چکر لگانے کے لیے چھوڑ گیا۔"

"مل جائے گا۔ مل جائے گا تیرا پتی۔" پروہت نے کہا۔ ایک بار پھر آشیرباد کے لیے ہاتھ اٹھایا اور آگے بڑھ گیا۔

پنڈت مرلی دھر بھی اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ مڑ کر جانکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ا… الجھن نمایاں تھی۔

جانکی ایک بار پھر آنکھیں بند کرکے ہاتھ جوڑ… ہوگئی تھی۔ میں ستون کے اوپر سے گھومتا ہوا دوسری… سے جانکی کے سامنے آگیا۔

پنڈت مرلی دھر اور پروہت مندر کے باہر… دروازے کی طرف جارہے تھے۔ مرلی دھر نے ایک… پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ دونوں جیسے ہی باہر نکلے میں بھی… کی آڑ سے نکل کر جانکی کے قریب آگیا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔" میں نے اس کی طرف دیکھ… سرگوشی میں کہا۔

"اوہ! مجھے یقین نہیں آرہا کہ پنڈت کی دعا اتنی… قبول ہوجائے گی۔" جانکی نے کہتے ہوئے جلدی سے… کھول دیں۔

"بکواس بند کرو۔" میں نے اسے ہولے سے… "مرلی دھر کے سامنے اتنی بکواس کرنے کی کیا ضرورت…"

"ضرورت تھی۔" جانکی نے جواب دیا "وہ… میرے سامنے آگیا تھا اور مجھے تمہاری طرح چھپنے… نہیں مل سکا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر شبہے میں مبتلا ہوگیا تھا… خاموش رہتی تو وہ سمجھ جاتا کہ میں کون ہوں۔ میں… لیے یہ ڈراما کیا تھا۔ ایسے نفسیاتی حربے اکثر کام کر… ہیں۔ اس کے ذہن سے یہ بات تو نکل گئی ہوگی کہ… جانکی ہوں جس سے سنگاپور میں ٹاکرا ہوا تھا۔ اب… جائے گا کہ میں کون ہوں اور ایک دو گھنٹوں بعد وہ… بھول جائے گا۔"

"لیکن وہ چلا گیا۔ اب ہم اسے کیسے تلاش کریں…" میں نے کہا۔

"چنتا مت کرو۔" جانکی مسکرائی "وہ اسی مندر… ہے۔ پروہت کے ساتھ کہیں گیا ہے۔ واپس آجائے… دوران میں ہم اس کے بارے میں یہاں سے کچھ… حاصل کرسکتے ہیں۔"

میں جواب دینے کے بجائے اِدھر اُدھر دیکھ… مندر بھی دوسرے مندروں کی طرح بہت شاندار… اتنے بڑے تھے کہ چار آدمی مل کر بھی ایک ستون… کے حصار میں نہیں لے سکتے تھے۔ مندر کی تعمیر… کثرت سے استعمال کیا گیا تھا بلکہ حقیقت تو یہ… سوا کوئی اور چیز دکھائی ہی نہیں دیتی تھی…

…اروں پر میناکاری کا کام اس مہارت اور نفاست سے کیا گیا …کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

یہ گنیش دیوتا کا مندر تھا۔ مرکزی ہال میں سامنے سنگ …مر کا ایک بہت بڑا چبوترہ تھا جس پر گنیش دیوتا کی بہت بڑی …رتی رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر اور ستونوں پر بڑی مہارت …ے ہندوؤں کے دوسرے دیوتاؤں کی مورتیاں بھی بڑی …ت سے تراشی گئی تھیں۔

ہم دونوں گنیش دیوتا کی مورتی والے چبوترے کے …یں طرف ایک بہت کشادہ راہداری میں آگئے۔ یہ …داری بھی ہال کی طرح تھی اور ادھر بھی دیواروں پر …رتیاں نظر آرہی تھیں۔ بہت سے لوگ ادھر بھی گھوم پھر …ہے تھے۔ ہر مورتی کو دیکھ کر وہ ہاتھ جوڑ دیتے۔ ذرا آگے …ہوئے لباس والا ایک پنڈت آنکھیں بند کیے آلتی پالتی …ے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم اس طرف جارہے تھے کہ ایک …ھی عورت ہمارے سامنے رک گئی اور جانکی کی طرف …تے ہوئے بولی۔

"تمہارا پتی مل گیا۔"

"پتی۔" جانکی کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "یہ تو …رے پتی کا مترت ہے جو مجھے دانہ ڈالنے کی کوشش کررہا ہے۔ …ا کا خیال ہے کہ اب میرا پتی کبھی واپس نہیں آئے گا۔ …ا سیے۔"

عورت کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔ اس نے گھوم …ہم دونوں کی طرف دیکھا اور رام رام کہتے ہوئے آگے …ڑ گئی۔

"تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گی۔" میں نے جانکی کو …ورا۔

"حرکت ہی میں برکت ہے لیکن اگر تم تھک گئے ہو تو …تھوڑی دیر کو یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔" جانکی نے مسکراتے …ئے کہا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر فرش پر بیٹھے …ئے پنڈت کے پاس بیٹھ گئی۔ میں بھی جانکی سے دو چار فٹ …ٹ کر بیٹھ گیا۔

جانکی نے آنکھیں موند کر دونوں ہاتھ سامنے کرکے جوڑ …یے اور زیر لب کچھ بدبدانے لگی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں …لگی کہ وہ اس وقت کسی شرارت کے موڈ میں ہے۔ میں کن …کھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک منٹ بعد ہی …رے خیال کی تصدیق ہوگئی۔

جانکی نے دونوں ہاتھ اپنے سامنے کچھ اس طرح جوڑے …ئے تھے کہ اس کی کہنیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس نے کہنی سے پہلو میں بیٹھے ہوئے پجاری کے پہلو میں … کا دیا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور گھور کر جانکی کو دیکھنے لگا۔

"سوامی جی۔" جانکی کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی "انسان بھگوان سے دو ہی چیزیں مانگتا ہے۔ دولت اور خوب صورت عورت جن سے جیون کو سندر بنایا جاسکے۔ اس وقت دونوں چیزیں تمہارے بہت قریب موجود ہیں۔"

"کیا انت کا شنٹ بک رہی ہو ناری۔" پنڈت کے منہ سے ہلکی سی غراہٹ نکلی "تم میری پوجا کو نشٹ کررہی ہو اور۔۔۔"

"انت کا شنٹ چھوڑ دو سوامی جی۔ یہ بتاؤ میں کیسی لگ رہی ہوں۔" جانکی نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

"بہت سندر۔" پنڈت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تو پھر سوچ کیا رہے ہو۔" جانکی بولی "تمہیں ایک عدد سندر ناری اور دولت کی ضرورت ہے جس سے تم اپنا جیون سنوار سکو اور مجھے ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو بنا چون و چرا میرے اشاروں پر چل سکے۔ تمہاری مطلوبہ دونوں چیزیں میرے پاس ہیں۔ سندرتا بھی اور روکڑا بھی۔ اگر تم یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ کسی ایسی جگہ چلو جہاں ہمارے سوا کوئی نہ ہو اور سنو۔ انکار کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا۔ لکشمی جیون میں صرف ایک بار کسی کے دروازے پر دستک دیتی ہے اور میں تو دستک دیے بغیر تمہارے پاس آگئی ہوں۔"

میں کن انکھیوں سے اس پنڈت کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر شدید الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ بار بار جانکی کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر جانکی نے اپنی بانہوں کو حرکت دیتے ہوئے اس طرح پہلو بدلا کہ ساڑی کا پلو کندھے سے نیچے گر گیا۔ اس مرتبہ پنڈت کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔

"جلدی فیصلہ کرلو سوامی جی۔" جانکی بڑبڑائی "تمہارے پاس صرف ایک منٹ رہ گیا ہے۔ ایک منٹ بعد میں تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوجاؤں گی۔ کسی اور کو تلاش کرلوں گی اور تم زندگی بھر پتھر کی ان مورتیوں کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے رہو گے اور تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ لکشمی کو ٹھکرا کر تم جیون کی سب سے بڑی غلطی کرو گے اور اسی طرح بھیک مانگتے رہو گے۔ جلدی سے فیصلہ کرلو۔ ورنہ میں یہاں سے جانے والی ہوں۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا دیوی جی۔" پنڈت کے ہونٹوں سے سرگوشی نکلی۔

"لکشمی۔ میں لکشمی ہوں۔ لوگوں کی قسمت بدل دیتی ہوں پلک جھپکنے کی دیر میں۔ بولو۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" جانکی نے کہا۔

"تم جو بولو گی میں کرنے کو تیار ہوں لکشمی جی۔ مجھے کیا کرنا ہوگا۔" پنڈت بولا۔

"سیانے آدمی ہو۔" جانکی نے کہا "کسی ایسی جگہ چلو جہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہ ہو۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔" پنڈت کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میں اب بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گیروے رنگ کی دھوتی باندھ رکھی تھی اور اسی رنگ کی ایک چادر جسم کے اوپر والے حصے پر لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے پر ایک میلا سا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا۔ جب وہ بیٹھا ہوا تھا تو اسٹریپ تو کندھے پر ہی ٹکا ہوا تھا جبکہ تھیلا اس کے پہلو میں زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ اٹھتے ہوئے اس نے تھیلے کو بھی سنبھال لیا اور اوپر چادر ڈال لی۔ اس نے چادر درست کرتے ہوئے جانکی کی طرف دیکھا تو اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہریں لے رہی تھی۔

اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے تھے۔ رنگت آبنوس جیسی گہری اور آنکھوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ دانت چوڑے اور میلے تھے۔ وہ غالباً باقاعدگی سے شیو بنانے کا عادی تھا۔ ٹوتھ برش ٹائپ کی بھاری مونچھوں نے اس کے چہرے کو کسی حد تک خوفناک بنا دیا تھا۔ اس کا سینہ برہنہ ہو رہا تھا۔ سینے پر ریچھ کی طرح بال بھرے ہوئے تھے جن میں کہیں کہیں سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو تھا مگر توجہ نہیں دی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ مندر کے مرکزی دروازے سے باہر جائے گا مگر وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ لکشمی کی دیوی کے ساتھ چلتے ہوئے دوسرے پجاریوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔

"اس طرف میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو دیوی جی۔" اس نے جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا اور وہ دونوں مخالف سمت میں چل پڑے۔ مندر میں کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کسی نے ان پر توجہ نہیں دی تھی۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ کوئی انوکھی بات تو تھی نہیں۔ مندروں میں آنے والے دولت مند لوگ کچھ دینے کے لیے پجاریوں کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔

تقریباً بیس گز آگے جاکر وہ دونوں جیسے ہی بائیں طرف مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہوئے، میں بھی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور تیز تیز چلتا ہوا اس موڑ پر پہنچ گیا۔

اس طرف ایک تنگ سی راہداری تھی۔ جو تیس چالیس فٹ سے بھی زیادہ طویل تھی اور اس میں ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر دو بلب جل رہے تھے۔

وہ دونوں اس راہداری کے آخری سرے پر پہنچ چکے تھے۔ مندر کی یاترا کے لیے آنے والے لوگ اس طرف نہیں جا رہے تھے۔ یہ راہداری غالباً مندر کے پجاریوں کے لیے مخصوص تھی جو مندر کے اندرونی یا پچھلے حصے کی طرف چلی گئی تھی۔

میں نے ہندوستان کے مندروں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ تنگ و تاریک راہداریاں، خفیہ راستے اور تہ خانے۔ یہ مندر پنڈتوں کی عیاشیوں کے اڈے اور سازشوں کے گڑھ تھے۔ یہاں آدمی کو اس طرح غائب کر دیا جاتا تھا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا۔

وہ دونوں اگلے موڑ پر غائب ہو چکے تھے۔ مجھے اب جانکی کی حرکت پر غصہ آ رہا تھا۔ کہیں وہ بھی کسی چکر میں نہ پھنس جائے۔ میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس پجاری کو جانکی پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو گیا ہو۔ اگر وہ جانکی کو لے کر مندر کے تہ خانوں میں کہیں غائب ہو گیا تو میں زندگی بھر اسے تلاش نہیں کر سکوں گا۔

آگے راہداریوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور تمام راہداریاں سنسان تھیں۔ دل پر عجیب سی وحشت طاری ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی پجاری سے سامنا ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔

میں قدموں کی آواز پر ان دونوں کا تعاقب کرتا ہوا بالآخر مندر سے باہر آگیا۔ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

یہ مندر کے پچھلی طرف تنگ اور تاریک سی گلی تھی جس کے اختتام پر بجلی کے پول پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس وقت اگرچہ رات کے دس بھی نہیں بجے تھے لیکن گلی سنسان تھی۔

اگلی گلی میں رہائشی مکان تھے اور کچھ لوگوں کی آمد و رفت بھی تھی۔ اس گلی میں بھی زیادہ روشنی نہیں تھی۔ دو اور گلیاں گھومنے کے بعد وہ ایک ایسی تنگ سی گلی میں مڑ گئے جہاں دور دور تک روشنی کا نام و نشان تک نہ

تھا۔ اب مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ وہ پجاری جانکی کو کسی ایسی جگہ لے جا رہا تھا جہاں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہ ہو اور یہ بھی اسے جانکی ہی نے کہا تھا کہ وہ اسے کسی ایسی جگہ لے چلے جہاں تیسرا کوئی نہ ہو۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جانکی کو ایسی کون سی بات سوجھی تھی جس کے لیے اس نے اس پجاری کو پٹایا تھا اور ایک طرح سے خطرہ بھی مول لیا تھا اگرچہ میں ان کا پیچھا کر رہا تھا لیکن اگر وہ پجاری اسے لے کر تاریک گلیوں میں کہیں غائب ہو گیا تو مصیبت کے وقت میں جانکی کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔

اور بالآخر ان کا یہ سفر ختم ہو گیا۔ گلی کے اختتام پر وہ ایک کھنڈر نما عمارت تھی۔ باہر کی دیوار ٹوٹ چکی تھی اور اندر بھی ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ اینٹوں کے اونچے ڈھیر کے پیچھے کہیں غائب ہو گئے۔ میں آگے بڑھ کر آڑ میں کھڑا ہو گیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی دروازے کا زنجیر والا کنڈا کھولا گیا ہو اور پھر دروازے کے کھلنے سے ہلکی سی چرچراہٹ کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھ گیا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ایک طرف ایک شعلہ سا چمکا اور ایک محدود جگہ پر زرد مدھم سی روشنی پھیل گئی۔

اس کمرے میں شاید لالٹین یا لیمپ جلایا گیا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ میں کھڑکی کے قریب رک کر اندر جھانکنے لگا۔

وہ اس کھنڈر نما وسیع و عریض عمارت کا بچا ہوا غالباً واحد کمرا تھا جس میں رہائش اختیار کی جا سکتی تھی۔ کمرا زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ ایک طرف جھلنگا سی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ زمین پر بھی گدا اور بستر بچھا ہوا تھا۔ چارپائی کے نیچے لوہے کا ایک پرانا سا ٹرنک بھی پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ایک کائی زدہ مٹکا رکھا ہوا تھا جس پر سرخ رنگ کا پلاسٹک کا ایک گلاس بھی اوندھا پڑا تھا۔ کمرے کی دیواروں میں طاقچے بنے ہوئے تھے۔ سامنے والے طاقچے میں کالی دیوی کی ایک مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس کی سرخ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ دوسرے طاقچوں میں بھی مورتیاں ہی رکھی ہوئی تھیں۔ لالٹین دیوار کے ساتھ ایک لمبی سی کھونٹی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

جانکی بھی کمرے کے وسط میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس پجاری نے کندھے پر لٹکا ہوا تھیلا اتار کر چارپائی پر ڈال دیا۔ مٹکے میں سے گلاس بھرا۔ پورا پانی ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیلا گلاس مٹکے کے ڈھکنے پر رکھا اور سیدھا ہو کر جانکی کو گھورنے لگا۔

"تمہاری خواہش کے مطابق میں تمہیں ایسی جگہ لے آیا ہوں جہاں تیجا کوئی نہیں ہے۔" وہ جانکی کو اوپر سے نیچے تک گھورتے ہوئے بولا "تم لکشمی تو ہو سکتی ہو لیکن وہ نہیں جو دوجوں پر دھن نچھاور کرتی ہے۔ پر میں جانوں کہ تمہارے پاس بھی دولت کی کمی نہیں۔ تمہارا یہ حسین مکھڑا اور خوب صورت شریر بھی بہت بڑی دولت ہے۔ ذرا ساڑی کا پلو تو ہٹاؤ۔ میں دیکھوں تو تم نے کتنی دولت چھپا رکھی ہے اپنی چولی میں۔۔۔"

"سوامی جی۔" جانکی دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "میں تو تمہیں۔۔۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔" پجاری نے اس کی بات کاٹ دی "میں تم جیسی عورتوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جو شریر کے سواد کے لیے اپنی پسند کے مردوں کو تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ تم جیسی بہت سی عورتیں مندروں کے پجاریوں کو شکار کرتی ہیں تاکہ بعد میں تمہارا راز فاش نہ کر سکیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر آگے بڑھ کر اس نے جانکی کی ساڑی کا پلو کھینچ کر ہٹا دیا "میرے پاس آنے سے پہلے تم پنڈت وشمبر ناتھ جی کو اپنے گمشدہ پتی کی کتھا سنا رہی تھیں اور اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہیں تو ہر رات ایک پتی کی تلاش رہتی ہوگی۔ اب میرا سمے برباد مت کرو اور اپنے ہاتھوں سے یہ چولی بھی اتار دو۔"

"سوامی جی۔۔۔" جانکی اب واقعی بدحواس ہو گئی تھی۔

"بند کرو یہ بکواس۔" پجاری نے اسے جھڑک دیا "آج کی رات میں ہی تمہارا پتی ہوں۔ جلدی کرو۔ مجھے مندر واپس جانا ہے۔"

"میں تمہیں دھن وان بنانے آئی تھی مگر لگتا ہے تم بھی ہوس کے پجاری ہو اور اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کی کوشش کر رہے ہو۔" جانکی کہتے ہوئے مزید دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ پجاری چند لمحے ہوس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اچھل کر اسے گرفت میں لے لیا۔ جانکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہاں نہ تو کوئی تمہاری چیخوں کی آواز سنے گا اور نہ ہی

کوئی تمہاری مدد کو آئے گا۔" وہ پجاری غراتے ہوئے کہہ رہا تھا "تم خود ہی مجھے لے کر آئی ہو۔ اب نخرے کاہے کو دکھا رہی ہو۔"

مجھے جانکی پر بڑی شدت سے غصہ آرہا تھا لیکن یہ جانکی پر غصہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس دوران میں وہ ہٹا کٹا پجاری جانکی کو چارپائی پر گرا چکا تھا اور اس پر جھک کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر پجاری کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ ایک دم سیدھا ہوگیا۔ میرا زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ کراہتا ہوا الٹ کر فرش پر بچھے ہوئے گدے پر گرا۔

"اب تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔" میں نے بڑی پھرتی سے جیب سے پستول نکال لیا۔

"کک.... کون ہو تم...." پجاری ہکلا کر رہ گیا۔ اس کا چہرہ خوف سے کچھ اور بھی سیاہ پڑ گیا تھا۔

"تمہارے لیے یم دوت (موت کا فرشتہ) بھی ثابت ہو سکتا ہوں۔" میں نے کہا "اگر پولیس کو اطلاع دے دی جائے کہ تم اس عورت کو مندر سے ورغلا کر یہاں لے آئے ہو تو تمہیں اغوا کے الزام میں آٹھ دس سال کی سزا ہو جائے گی اور تم جیل میں چکی پیستے رہو گے۔"

"نہیں مہاراج۔" اس نے ہاتھ جوڑ دیے "مجھ پر دیا کرو۔ میں نے اس ناری کو نہیں ورغلایا۔ میں تو وہاں پوجا کر رہا تھا۔ یہ خود مجھے ورغلا کر لائی ہے۔ مم.... میرا کوئی قصور نہیں ہے مہاراج۔"

میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ چارپائی سے اٹھ چکی تھی اور ساڑی سنبھال رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"میں تمہاری قسمت بدلنا چاہتی تھی مگر تم بہک گئے۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "بولو۔ تمہیں روکڑا چاہیے یا اغوا کے الزام میں جیل کی ہوا کھانا چاہتے ہو؟"

"تم جو کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔" پجاری نے ہاتھ جوڑ دیے اور باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا "میں بالکل نردوش ہوں۔ میرا کوئی دوش نہیں ہے۔"

"خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔" میں نے پستول سے اشارہ کیا اور جانکی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے قریب آگئی "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم اسے یہاں کیوں لے آئیں۔"

"اس روز درگا کے مندر میں یہ بھی پنڈت مرلی دھر کے ساتھ تھا اور آج جب میں مرلی دھر اور پروہت سے باتیں کر رہی تھی تو یہ بھی وہاں آکر رکا تھا پھر مرلی دھر نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا تو یہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ بعد میں میں اسی کو تلاش کرتی رہی تھی اور بالآخر یہ مل گیا۔ اس سے ہم مرلی دھر کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"

"اس سے مندر ہی میں کسی اور طریقے سے بھی بات کی جا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"کسی اور طریقے سے شاید یہ قابو میں نہ آتا۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی "لیکن اب یہ پوری طرح ہماری گرفت میں ہے۔ ہماری بات ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ کوشش کرتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم دونوں اس پجاری کے قریب آگئے جو اب بھی سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ ڈرپوک قسم کا آدمی ہے اور اس پر ہمیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں لکشمی ہوں۔" جانکی اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرا یہ شریر تو تمہیں نہیں مل سکے گا لیکن میں تمہیں دھن وان بنا سکتی ہوں۔"

"تم جو کہو گی میں کرنے کو تیار ہوں دیوی جی۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

"تمہاری اس کھولی کی حالت بتا رہی ہے کہ تمہارا دھرم کا دھندا کچھ چل نہیں رہا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم ہمارا ایک کام کر دو تو تمہارے دن پھر سکتے ہیں۔"

"میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مہاراج۔ پر اس بندوق کی کو ہمارے سامنے سے ہٹا لو۔ بہت ڈر لگتا ہے کا۔" وہ بولا۔

میں نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ واقعی بہت بزدل تھا۔ میں نے پتلون کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا بنڈل نکالا اور اس میں سے ہزار ہزار والے دو نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔

اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ نوٹ لیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"لے لو۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں دھن وان بنا دوں گی۔ ابھی تو تم

پر نوٹوں کی اس طرح بارش ہوگی کہ تم سنبھال نہیں سکو گے۔"

"مم.... مجھے کیا کرنا ہوگا۔" اس نے نوٹ پکڑ لیے۔ اس کی طرح اس کے لہجے میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

پہلے میں اس کے بارے میں سوال کرتا رہا۔ اس کا نام موتن داس تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ راجستھان کے مختلف مندروں میں گھوم پھر کر پنڈتوں کی سیوا کرتا رہتا ہے۔ کسی مندر کے پنڈت اسے زیادہ عرصے اپنے ہاں ٹکنے نہیں دیتے۔ وہ پچھلے کئی برسوں میں صرف دو مرتبہ پہلے یہاں آیا تھا اور اب تین مہینوں سے یہاں پڑا ہوا ہے۔ پنڈتوں کی سیوا کے بدلے اسے صرف اتنا کچھ ہی ملتا ہے کہ وہ تنگ دستی میں گزارہ کر سکے جبکہ اس کے کہنے کے مطابق بڑے بڑے پنڈت اور پروہت کروڑ پتی ہیں۔ انہوں نے کروڑوں کی جائیدادیں بنا رکھی ہیں۔ اس گنیش مندر کے پروہت پنڈت وشمبر ناتھ کے بارے میں بھی اس نے چند بڑے سنسنی خیز انکشافات کیے تھے۔ مجھے پنڈت وشمبر ناتھ سے بہرحال کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے میں جلد ہی اصل موضوع پر آگیا۔

"پنڈت مرلی دھر کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کون پنڈت مرلی دھر؟" اس کی آنکھوں میں الجھن سی ابھری "میں اس نام کے کسی پنڈت کو نہیں جانتا۔ یہ نام پہلی بار سنا ہے۔"

"وہی پنڈت جو تقریباً دو گھنٹے پہلے پنڈت وشمبر ناتھ کے ساتھ مندر سے باہر گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اوہ.... !" موتن داس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "وہ مرلی دھر نہیں۔ اس کا نام پرشو رام ہے۔ بہت حرامی آدمی ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "اسے بدلیش سے آئے ہو تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے یہاں آتے ہی پنڈت وشمبر ناتھ اور درگا مندر کے پروہت پنڈت [illegible] کو کس طرح اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ دونوں اس کی ہر بات مانتے ہیں۔"

"اس کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اکیلا ہی ہے۔" موتن داس نے جواب دیا۔

"وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بدلیش سے ایک اور آدمی بھی آیا تھا۔ بہرحال، تم پرشو رام کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟" میں نے ایک بار پھر اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"وہ بڑا حرامی آدمی ہے۔" موتن داس نے اسے ایک بار پھر گالی دی "پتا نہیں اس نے ان دونوں پنڈتوں کو کیا کھلا دیا ہے کہ وہ ہر وقت اسی کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ میں پچھلے دو مہینوں سے یہاں پڑا ہوا ہوں۔ وشمبر ناتھ کی بہت سیوا کی لیکن مجھ جیسے پجاریوں کو تو وہ اپنا زر خرید غلام سمجھتا ہے۔ پرشو رام جب یہاں آیا تو پنڈت جی نے مجھے اس کی سیوا پر لگا دیا۔ میں نے اس کی بہت سیوا کی۔ پچھلے تین چار ہفتوں کے دوران میں اس کی فرمائش پر تین مرتبہ اسے عورتیں فراہم کر چکا ہے اور وہ سالا مجھے دس بیس روپے دے کر ٹرخا دیتا ہے۔"

"پرشو رام یہاں اسی مندر میں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ یہیں رہتا ہے۔ پنڈت جی کے ساتھ عیش کرتا ہے پر وہ جس دن عورتوں کی فرمائش کرتا ہے، اس رات یہاں نہیں رہتا۔" موتن داس نے کہا۔

"تو پھر کہاں جاتا ہے وہ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"رام گڑھ جھیل والے مندر میں۔" موتن داس نے جواب دیا "وہ ہفتے میں ایک مرتبہ وہاں ضرور جاتا ہے اور وہ ہمیشہ دو عورتوں ہی کی فرمائش کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ...." وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟" میں نے اس کی بات پوری کر دی۔

"جی مہاراج۔" وہ جلدی سے بولا "یقیناً یہی بات ہے۔"

"رام گڑھ جھیل کہاں ہے اور وہ کون سے مندر میں جاتا ہے۔" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"رام گڑھ اس شہر کے شمال میں بیس بائیس کلو میٹر کی دوری پر ہے۔" موتن داس نے بتایا "وہاں ماہی گیروں کی بستی ہے۔ یوں تو اس بستی میں بھی ایک مندر ہے۔ پر مجھے وشواس ہے کہ پرشو رام اس مندر میں نہیں جاتا۔"

"تو پھر وہ کون سے مندر میں جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جھیل سے ذرا آگے پہاڑیوں میں ایک پرانا مندر ہے۔ لوگ یاترا کے لیے اس طرف جاتے رہتے ہیں مگر بہت پیدل چلنا پڑتا ہے اس لیے کم لوگ وہاں تک جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے پرشو رام اسی مندر میں جاتا ہے۔" موتن داس نے جواب دیا۔

"اس مندر کے بارے میں کوئی خاص بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہت پرانا مندر ہے۔" موتن داس نے کہا "وہاں پنڈت کلیان راج قابض ہے۔ اس کے ساتھ چند ایک گنے چنے پجاری ہیں۔ وہ کسی اور کو وہاں ٹکنے ہی نہیں دیتا۔ دور دور سے آنے والے دولت مند یاتری وہاں بہت قیمتی چیزوں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ زیورات' سونے کی مورتیاں اور نقدی۔ وہاں لاکھوں کی آمدنی ہے۔ اسی لیے پنڈت کلیان راج وہاں کسی کو پیر نہیں جمانے دیتا۔ پر یہ پرشو رام ہر ہفتے وہاں دو عورتوں کو لے جاکر جاتا ہے۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

"کیا تم وہاں رہ چکے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دو تین سال پہلے صرف ایک مرتبہ گیا تھا مگر تیسرے ہی دن پنڈت کلیان راج نے بھگا دیا۔" موتن داس نے کہا۔

"دیکھو موتن داس۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میری اس دوست نے کل تمہیں کالی کے مندر میں پنڈت مرلی دھر یا پرشو رام کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس لیے آج اس طرح مندر سے لایا گیا ہے کہ کسی کو شبہ نہ ہو اور تم بھی لالچ میں آجاؤ۔ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ پنڈت مرلی دھر کا دوست خونی ہے۔ اس نے کئی قتل کیے ہیں اور بھاگا ہوا ہے۔ پنڈت مرلی دھر یا پرشو رام اس کا شریک جرم ہے لیکن ہمیں اس کے خونی دوست کی تلاش ہے جو غالباً کسی مندر ہی میں چھپا ہوا ہے۔ تم چونکہ پرشو رام کے سیوک ہو۔ اسی لیے ہم نے تم سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ تم سے ان دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔"

"کیا تم لوگ پولیس والے ہو؟" موتن داس کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "ہمارا ان کے ساتھ کوئی اپنا حساب کتاب ہے جسے برابر کرنا چاہتے ہیں۔"

"پرشو رام کو دیکھ لیا تھا تو اسے پکڑا کیوں نہیں۔" اس نے پوچھا۔

"اگر ہم پرشو رام کو پکڑ لیتے تو اس کا دوسرا ساتھی ہوشیار ہوجاتا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے۔ ہم دونوں پر اکٹھے ہی ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تم ہم سے تعاون کرو گے تو ہم تمہیں اتنی دولت دیں گے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"لیکن۔" وہ خوف زدہ سے لہجے میں بولا "اگر پرشو رام یا پنڈت وشمبھر ناتھ کو بھنک بھی مل گئی کہ میں تم لوگوں کے لیے کام کر رہا ہوں تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"جب تک تمہاری زبان بند رہے گی کسی کو پتا نہیں چلے گا۔" میں نے کہا "ایک بات اور بھی ہے۔ اگر پنڈت و... ناتھ بھی ان کے جرائم میں ملوث پایا گیا تو اسے بھی گ... سے ہٹا دیا جائے گا اور ہو سکتا ہے اس طرح تمہیں اس کی ... میں کچھ اختیارات مل جائیں۔"

موتن داس کی آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے م... طرف دیکھا۔

"رام گڑھ جھیل والے مندر میں جاکر پتا لگاؤ کہ پر... رام کے ساتھ اور کون ہے۔ اگر تم نے صحیح اطلاع دی تو تمہیں مالا مال کر دیں گے لیکن اگر تم نے ہم سے غداری ... اور انہیں ہمارے بارے میں بتا دیا تو یاد رکھو تم ہندوستان ... کسی مندر میں محفوظ نہیں رہ سکو گے۔"

"میں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔" موتن داس نے کہا "میں کل ہی وہاں جاکر پتا کر... گا۔"

"تو پھر ہم کل رات تم سے ملیں؟" میں نے پوچھا۔

"کل رات تو میں وہیں رہوں گا۔ پرسوں رات دس گھنٹا بجتے ہی تم لوگ یہاں آجانا۔ میں تمہیں ملوں گا ... کھولی میں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "... اگر ہمارے ساتھ دھوکا ہوا تو تم زندہ نہیں بچ سکو گے۔"

"نہیں مہاراج۔ تمہارے ساتھ دھوکا نہیں ہوگا۔" اس نے کہا۔

"اب ہمیں ان گلیوں سے باہر چھوڑ کر آؤ۔ مندر کی طرف۔" میں نے کہا۔

موتن داس اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ہم کمرے سے با... آگئے۔ موتن داس نے لالٹین جلتی رہنے دی اور باہر نکل... دروازہ بند کر کے اشارہ کرتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ میں... جانکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

○☆○

روپ متی کا معاملہ کچھ الجھ گیا تھا۔

پولیس تحقیقات کرتے ہوئے شہر کی نواحی پہاڑیوں... واقع اس کھنڈر نما عمارت تک پہنچ گئی تھی جہاں روپ... باندھ کر رکھا گیا تھا۔ پولیس کو نہ صرف اس شکستہ اور ویر... عمارت سے دھرمیش کی لاش بلکہ عمارت سے تقریباً نصف میل دور پہاڑیوں میں اس شخص کی لاش بھی مل گئی تھی... لالہ رنجیت کے خنجر سے گھائل ہو کر عمارت سے بھاگا تھا۔ دونوں لاشیں آدھی سے زیادہ بھیڑیوں کی خوراک...

چکی تھیں۔ اتفاق سے ان کے چہرے سلامت تھے جن سے انہیں شناخت کیا گیا تھا۔

پہاڑیوں میں پائی جانی والی لاش بشن سنگھ نامی ایک آدمی کی تھی جس کے بارے میں تحقیقات سے پتا چلا کہ اس کا تعلق چتور گڑھ کے سابق راجہ کے خاندان سے تھا۔ اس کا باپ راجہ کا کزن تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ چتور گڑھ کی گدی کا دعوے دار تھا مگر اس وقت کی انگریز حکومت نے راجہ رگھبیر سنگھ کو چتور گڑھ کا راجہ تسلیم کرلیا تھا۔ بشن سنگھ کا باپ اودھم سنگھ گدی حاصل کرنے کے لیے اودھم مچاتا رہا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف بھی سازشیں شروع کردیں لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اسی دوران میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوگیا۔ ہندوستان میں تمام ریاستیں ختم ہوگئیں۔ راجاؤں سے اختیارات چھین لیے گئے اور ان کے وظائف مقرر کردیے گئے۔ ہند سرکار نے بھی رگھبیر سنگھ کو ہی چتور گڑھ کا سابق راجہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے لیے گراں قدر وظیفہ مقرر کیا تھا۔ اودھم سنگھ نے اپنی اودھم بازی جاری رکھی۔ عدالتوں میں مقدمے بازی سے لے کر رگھبیر سنگھ کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ہر صورت میں رگھبیر سنگھ کو گرانا چاہتا تھا تاکہ سرکار سے ملنے والا وظیفہ اور دیگر رعایتیں خود حاصل کرسکے۔

اودھم سنگھ نے راجہ رگھبیر سنگھ کے سالے دھرم ویر سنگھ کو کسی طرح اپنے ساتھ ملا لیا۔ رگھبیر سنگھ کو اب دو دشمنوں کا سامنا تھا۔ دھرم ویر سنگھ، اودھم سنگھ سے زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ ایک طرف اس نے اودھم سنگھ کو لارا لپا لگائے رکھا اور دوسری طرف وہ راجہ کے خلاف بھی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا کیونکہ ہند سرکار سے ملنے والا وظیفہ وہ خود حاصل کرنا چاہتا تھا۔

دھرم ویر سنگھ کے دہلی سے بھی بڑے اچھے تعلقات تھے۔ اس وقت کے کئی بڑے بڑے سیاسی لیڈر اور نیتا اس کے حلقہ احباب میں شامل تھے۔ اس کی رسائی راج بھون تک تھی اور بالآخر وہ اپنی ریشہ دوانیوں میں کامیاب ہوگیا۔

ہند سرکار نے راجہ رگھبیر سنگھ کو معطل کرکے دھرم ویر سنگھ کو چتور گڑھ کا سابق راجہ تسلیم کرتے ہوئے سرکاری وظیفہ اور دیگر تمام مراعات اس کے نام منتقل کردیں جبکہ راجہ رگھبیر سنگھ کو ہر چیز سے محروم کردیا۔ اس نے ساتھ ہی اس کے خلاف انکم ٹیکس کی چوری اور اختیارات کے ناجائز استعمال اور بدعنوانیوں کے لاتعداد مقدمات شروع ہوگئے۔ راجہ رگھبیر سنگھ ایک غیرت مند آدمی تھا۔ وہ یہ ذلت برداشت نہیں کرسکا۔ اس نے اپنے آپ کو گولی مار کر خودکشی کرلی۔

راجہ رگھبیر سنگھ کا باب ختم ہوگیا اور اودھم سنگھ اور دھرم ویر سنگھ میں ٹھن گئی۔ دھرم ویر سنگھ کے بیٹے بلونت اور اودھم سنگھ کے بیٹے بشن سنگھ میں گہری دوستی تھی۔ وہ دونوں بدقماش اور عیاش تھے۔ بڑوں کی لڑائی سے انہیں غرض نہیں تھی۔ انہیں اپنی رنگ رلیوں سے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ کسی اور معاملے پر توجہ دے سکیں۔ شہر کی طوائفوں کے کوٹھے ان کے دم سے آباد تھے۔ رات کو کوٹھوں سے نکلتے تو بلونت سنگھ کی حویلی میں راگ رنگ کی محفلیں جمتیں۔ جن میں شہر کی حسین ترین کال گرلز کے علاوہ ایسی لڑکیاں بھی ہوتیں جنہیں اغوا کرکے لایا جاتا۔

بلونت سنگھ اور بشن سنگھ کو ہمیشہ اکٹھے ہی دیکھا جاتا۔ لوگ حیران تھے کہ ان دونوں کے باپ تو ایک دوسرے کی جان کے دشمن تھے اور یہ دونوں ایک ہی تھالی میں کھاتے تھے۔

اور پھر ایک روز اودھم سنگھ پُراسرار طور پر ہلاک ہوگیا۔ اس کی لاش شہر سے چند میل دور ایک جھیل میں ملی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جھیل میں ڈوب کر مرا تھا اور کچھ لوگوں کے نزدیک اسے پہلے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا پھر لاش جھیل میں پھینک دی گئی۔

پولیس نے اسے ایک اتفاقی حادثہ قرار دے کر کیس بند کردیا۔ شہر کا ہر فرد جانتا تھا کہ اودھم سنگھ کی دھرم ویر سے دشمنی چل رہی تھی اور عام خیال یہ تھا کہ اودھم سنگھ کو قتل کیا گیا تھا لیکن اس کے بیٹے بشن سنگھ پر اپنے باپ کی موت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مزید تحقیقات پر بھی زور نہیں دیا۔ پولیس نے جو کچھ کہا اسے آنکھیں بند کرکے قبول کرلیا اور باپ کی چتا جلا کر گھر بیٹھ گیا۔

بشن سنگھ اب مکمل طور پر بلونت سنگھ کا ساتھی بن گیا۔ بلونت سنگھ کو بھی اس سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد بشن سنگھ نے چتور گڑھ میں اپنی موروثی حویلی اور زمین بیچ دی اور جے پور آگیا۔ یہاں کوئی جائیداد خریدنے کے بجائے اس نے سردار پٹیل مارگ کے علاقے میں ایک شاندار کوٹھی کرائے پر لے لی اور رنگ رلیوں میں مصروف ہوگیا۔ اس کے گرد ایسے لوگ جمع ہوگئے تھے جو اسے آسامی سمجھتے تھے۔ وہ اس کے خرچ پر عیش کررہے تھے۔ شراب کی کوٹھی پر ہر روز راگ رنگ کی محفلیں جمتیں۔ آوارہ عورتوں پر ہر رات ہزاروں روپے اڑائے جاتے۔ دوست عیش کررہے تھے اور روپیہ پانی کی طرح اس کے ہاتھ سے نکلا جارہا تھا۔

بلونت سنگھ بھی ہفتہ دس دن میں ایک مرتبہ اس کے پاس ضرور آتا تھا۔ اس نے بھی بشن سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ روپیہ اس طرح نہ لٹائے لیکن بشن سنگھ پر اس کی باتوں کا اثر نہیں ہوا۔ بلونت سنگھ نے اپنی باتوں پر کبھی زور بھی نہیں دیا تھا کہ وہ خود بھی اسی قماش کا تھا۔

دو سال میں بشن سنگھ قلاش ہوگیا۔ اس کے دوست بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ جو اس کی دولت پر عیش کرتے رہے تھے اب اس کے سائے سے بھی دور رہنے لگے تھے۔

بشن سنگھ کو وہ عالیشان کوٹھی خالی کرنی پڑی۔ اس نے ... دروازہ کی گنجان آبادی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا اور زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ بلونت سنگھ کبھی کبھار جے پور آتا تو اس کی تھوڑی بہت مالی مدد کر دیتا۔

اسی دوران میں بشن سنگھ کی ملاقات تیج سنگھ اور دھرمیش سے ہوگئی۔ تیج سنگھ چالاک آدمی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی وقت اسے ایسے آدمیوں کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً بشن سنگھ کی مالی مدد کرتا رہا اور اس سے کچھ ایسے کام بھی لینے لگا جو جرائم کے زمرے میں آتے تھے۔ اسے خود بھی اس بات کا احساس تھا لیکن وہ تیج سنگھ کے لیے ایسے کام کرنے پر مجبور تھا۔

بشن سنگھ ہی کے ذریعے تیج سنگھ کی ملاقات بلونت سنگھ سے ہوئی۔ وہ دونوں ایک ہی قماش کے تھے۔ تیج سنگھ راجکماری روپ متی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا اور بلونت سنگھ اپنے باپ کی دولت لٹا رہا تھا۔

تیج سنگھ کے توسط سے بلونت سنگھ راجکماری روپ متی تک پہنچ گیا لیکن روپ متی کو یہ شخص زیادہ پسند نہیں آیا اور وہ اس سے دور رہنے کی کوشش کرنے لگی۔

اور پھر غلاموں کی منڈی میں پیش آنے والے واقعے کے بعد صورت حال یک لخت تبدیل ہوگئی۔ روپ متی کے خلاف کئی محاذ کھل گئے۔ اس روز پشکر جاتے ہوئے راستے میں بلونت سنگھ سے آمنا سامنا ہوگیا تھا اگر میں نہ ہوتا تو شاید بلونت سنگھ روپ متی کو کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوجاتا مگر میں نے آنکھیں دکھائیں تو وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ موقع پا کر کوئی ایسی حرکت ضرور کرے گا جس سے مجھے اور روپ متی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکے۔ تاہم وہ ابھی تک خاموش تھا البتہ تیج سنگھ اور دھرمیش کھل کر روپ متی کے مقابلے پر آگئے تھے۔ جس کے نتیجے میں وہ دونوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دھرمیش تو روپ متی کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور تیج سنگھ ہمیں ٹرک سے کچلنے کی کوشش میں خود ہی اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔

اور اب پہاڑیوں سے بشن سنگھ کی نچی ہوئی لاش ملنے کے بعد بلونت سنگھ کھل کر سامنے آگیا تھا۔ بشن سنگھ اس کا کزن تھا اس نے بشن سنگھ کے قتل کا الزام روپ متی پر عائد کردیا اور روپ متی کو بھی سنگین نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کی وجہ سے روپ متی کی طرف سے اگرچہ مجھے بھی کچھ اطمینان ہوگیا تھا لیکن میرے لیے بھی کئی محاذ کھل گئے تھے۔ تیج سنگھ اور بلونت سنگھ وغیرہ سے روپ متی کی دشمنی کی بنیاد تو میں ہی تھا۔ تیج سنگھ تو اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن بلونت سنگھ مقابلے پر آگیا تھا۔ اس نے مجھے بھی دھمکیاں دی تھیں۔

ایک طرف بلونت سنگھ تھا اور دوسری طرف میں پنڈت مرلی دھر اور دارا کے چکر میں الجھا ہوا تھا۔ وہ دونوں سنگاپور سے فرار ہوکر آئے تھے اور اتفاق سے ہم بھی ریگستان میں جہاز کریش ہونے کے بعد یہاں پہنچ گئے تھے۔ روپ متی میرے کردار سے متاثر ہوکر مجھے آزاد کرنے کو تیار تھی اور میں کسی طرح سرحد پار کرکے پاکستان جانا چاہتا تھا لیکن اتفاق سے اس روز جانکی نے کالی کے مندر میں پنڈت مرلی دھر کو دیکھ لیا اور ہم مرلی دھر کی تلاش میں گنیش دیوتا کے مندر تک پہنچ گئے۔ جہاں پجاری موتن داس ہمارے ہاتھ لگ گیا۔ موتن داس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ مرلی دھر کا ایک اور ساتھی بھی تھا جو رام گڑھ جھیل کے کنارے کسی قدیم مندر میں چھپا ہوا تھا اور مرلی دھر ہر ہفتے اس کے لیے شراب اور عورتیں لے کر جاتا تھا۔ اب یہ تصدیق کرنا باقی تھی کہ قدیم مندر میں چھپا ہوا وہ شخص دارا ہی تھا یا کوئی اور۔ موتن داس نے دولت کے لالچ اور جان کے خوف سے اگرچہ اسی سلسلے میں معلومات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن مجھے اس پر بھروسا نہیں تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ مرلی دھر کو ہمارے بارے میں بتا دے گا۔ اسی لیے میں نے خود رام گڑھ جھیل والے مندر میں جاکر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جس رات ہم نے پجاری موتن داس کو پکڑا تھا۔ میں اس سے اگلے ہی روز رام گڑھ جھیل والے مندر کی طرف جانا چاہتا تھا مگر صبح سویرے ہی پولیس کی ایک پارٹی روپ متی سے پوچھ گچھ کے لیے حویلی پہنچ گئی۔ یہ پارٹی چار اہلکاروں پر مشتمل تھی جس کا سربراہ وہی انسپکٹر تھا جس نے پہلے روز تیج

سنگھ وغیرہ کے خلاف رپورٹ درج کرنے سے انکار کردیا تھا اور الٹا اسی کو دھمکا کر زبان بند رکھنے کا مشورہ دیا تھا لیکن آج اس کا رویہ بدلا ہوا تھا اور وہ روپ متی کے سامنے بڑی تابعداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

میں ان لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور میں ساتھ والے کمرے میں کھلنے والی کھڑکی کے قریب بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کھڑکی کے سامنے جھالر والا ساٹن کا دبیز اور خوب صورت پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس گھر میں رہنے والوں کو تو معلوم تھا کہ یہاں ایک کھڑکی بھی ہے لیکن کسی اجنبی کے ذہن میں یہ بات نہیں آسکتی تھی۔

"کنور بلونت سنگھ نے رپورٹ کی ہے کہ آپ اس کے کزن بشن سنگھ اور اس کے دوستوں تیج سنگھ اور دھرمیش کے قتل میں ملوث ہیں۔" انسپکٹر کہہ رہا تھا "جب تک کوئی ثبوت نہ مل جائے ہم آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتے لیکن آپ سے اس سلسلے میں پوچھ تاچھ کرنا ہمارا قانونی حق ہے۔"

"اسے شاید قانون کی زبان میں شامل تفتیش کرنا کہتے ہیں۔" روپ متی نے کہا۔

"یہی سمجھ لیجیے۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اب تک ہمیں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں' اس کے مطابق وہ دونوں بھائی میرا مطلب ہے تیج سنگھ اور دھرمیش کسی معاملے پر بات کرنے کے لیے آپ کے پاس آئے تھے اور......"

"تم پھر پٹڑی سے اتر رہے ہو آفیسر۔" روپ متی نے اس کی بات کاٹ دی "وہ مجھ سے کسی معاملے پر بات کرنے نہیں آئے تھے بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں بھائی دو اور غنڈوں کے ساتھ مجھے اغوا کرنے آئے تھے۔ اس رات میرے دونوں ملازم چھٹی پر تھے۔ میری ملازمہ مندری بھی میری دوست کے ساتھ مندر گئی ہوئی تھی۔ میرا دوست ہمت سنگھ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ میں اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی کہ شیشہ ٹوٹنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔

"میرے دماغ پر نیند کا خمار طاری تھا۔ میں ابھی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تیج سنگھ اپنے بھائی دھرمیش اور دو اور بدمعاشوں کے ساتھ میرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس آئے اور مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔

"میری چیخوں کی آواز سن کر ہمت سنگھ بھی اوپر آگیا اور مجھے ان سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہمت سنگھ اکیلا تھا اور وہ چار تھے۔ انہوں نے ہمت سنگھ کو مار مار کر ادھ موا کر دیا اور بے ہوش کر کے پھینک دیا۔ انہوں نے کمرے میں توڑ پھوڑ بھی کی اور مجھے گھسیٹتے ہوئے حویلی سے باہر لے گئے۔ باہر گیٹ کے سامنے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ مجھے اس گاڑی میں ڈالتے ہوئے کسی ٹھوس چیز سے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کردیا گیا تھا تاکہ میں راستے میں شور نہ مچا سکوں اور......"

"آپ نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع کیوں نہیں دی۔" انسپکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔" روپ متی نے کہا "ایک مرتبہ پہلے بھی وہ دونوں نمک حرام میری حویلی میں آکر توڑ پھوڑ کرچکے تھے اور میں فریاد لے کر تمہارے پاس آئی تھی۔ اس وقت تم نے کیا کرلیا تھا جو اب کچھ کرلیتے۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "اور پھر رپورٹ کون کرتا۔ وہ لوگ مجھے اغوا کرکے لے گئے تھے اور ہمت سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔ میری ملازمہ مندری رات کے آخری پہر مندر سے واپس آئی تو وہ صورت حال دیکھ کر بد حواس ہوگئی۔ اس نے پہلے تو خود ہی ہمت سنگھ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی پھر فون کرکے میری دوست ڈاکٹر رادھا کو بلا لیا اور ڈاکٹر رادھا نے دن چڑھے میرے ایک اور دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ کو اطلاع دے دی۔"

"ان لوگوں نے پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دی۔" اس کے خاموش ہونے پر انسپکٹر نے کہا۔

"وہ بھی جانتے ہیں کہ پولیس گھوس (رشوت) کھاتی ہے۔ انہوں نے پہلے بھی کچھ نہیں کیا تھا اور اب بھی نہیں کریں گے۔" روپ متی نے جلے کڑھے لہجے میں جواب دیا "انہیں پولیس کی بے تکی باتوں اور الٹے سیدھے سوالات میں وقت ضائع کرنے سے زیادہ میری فکر تھی۔ وہ اپنے طور پر مجھے تلاش کرتے رہے اور بالآخر انہیں پتا چل گیا کہ تیج سنگھ اور اس کے ساتھی مجھے کہاں لے کر گئے تھے۔ انہوں نے رات کو پہاڑیوں میں واقع اس کھنڈر نما عمارت پر بلہ بول کر مجھے رہا کروالیا۔"

"اور اس مسلح حملے میں بشن سنگھ آپ کے دوستوں میں سے کسی ایک کے ہاتھوں مارا گیا۔" انسپکٹر نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"یہ غلط ہے۔" روپ متی بولی "لالہ رنجیت نامی غنڈے نے میرے دوست ہمت سنگھ پر خنجر سے حملہ کیا تھا جو اس وقت بشن سنگھ سے گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ ہمت سنگھ نے اپنے آپ کو اس وار سے بچالیا اور بشن سنگھ زد میں آگیا اور خنجر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔"

"اور ڈاکٹر سین کا بیان ہے کہ تیج سنگھ نے اسے بھائی کے علاج کے لیے وہاں بلوایا تھا۔" انسپکٹر نے کہا "ڈاکٹر کے بیان کے مطابق دھرمیش کو سینے میں گولی لگی تھی۔ اس نے گولی تو نکال دی لیکن دھرمیش جاں بر نہیں ہوسکا۔ اسے گولی کس نے ماری تھی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" روپ متی نے جواب دیا "وہ لوگ جب مجھے یہاں سے اغوا کرکے لے گئے تھے تو میں بے ہوش تھی اور اس وقت دھرمیش بھی زندہ تھا۔ مجھے اس کھنڈر نما عمارت میں باندھ کر ڈال دیا تھا۔ ہوسکتا ہے ان میں آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہوگیا ہو اور اسے گولی مار دی گئی ہو۔ بہرحال۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "ٹھاکر بھانوت سنگھ اور ہمت سنگھ نے مجھے اسی کھنڈر نما عمارت سے آزاد کرایا اور ڈاکٹر سین اور لالہ رنجیت کو شہر لا کر پولیس کے حوالے کردیا۔"

"میں نے ان دونوں کے بیانات بھی لیے ہیں۔" انسپکٹر نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "لالہ رنجیت کا بیان ہے کہ بشن کو گولی یہاں حویلی میں لگی تھی اور وہ گولی......"

"ایک منٹ!" روپ متی نے اسے جلدی سے ٹوک دیا "ابھی تم نے کہا تھا کہ وہ دونوں بھائی یعنی تیج سنگھ اور دھرمیش کسی معاملے پر مجھ سے بات کرنے آئے تھے لیکن اب لالہ رنجیت کہاں سے ٹپک پڑا۔"

"میرا مطلب ہے ہوسکتا ہے لالہ رنجیت بھی ان کے ساتھ آیا ہو اور باہر کھڑا رہا ہو اور......" انسپکٹر گڑبڑا گیا تھا۔

"ایسی صورت میں وہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم لوگ حویلی کے احاطے میں تھے اور دھرمیش کو گولی کس نے ماری۔" روپ متی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم نے اپنا ہوم ورک ٹھیک سے نہیں کیا انسپکٹر۔ تم کچھ گھبرائے ہوئے ہو یا میں یہ سمجھوں کہ تم کسی کے دباؤ میں آکر مجھے اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔ ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے لیکن اب میں تمہارے دباؤ میں نہیں آؤں گی۔ میں جانتی ہوں تم مجھے پھنسانے کے لیے اور بھی بہت سے ہتھکنڈے استعمال کرسکتے ہو مگر...... اس مرتبہ نہ تو تم مجھے ڈرا سکو گے اور نہ ہی تمہارا کوئی اور ہتھکنڈا کامیاب ہوگا۔"

میں بھی روپ متی کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب تیج سنگھ وغیرہ نے حویلی میں توڑ پھوڑ کی تھی اور وہ رپورٹ لکھوانے پولیس اسٹیشن گئی تھی تو اسی انسپکٹر نے اسے دھمکا کر بھگا دیا تھا۔ اس وقت روپ متی سہم گئی تھی۔ کوئی اس کی مدد کرنے کو تیار نہیں تھا لیکن اب اس نے بڑی ذہانت سے کہانی کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ وہ نہ تو گھبرائی تھی اور نہ ہی بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں لغزش تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ جیسا آدمی اس کے ساتھ تھا۔ روپ متی جانتی تھی کہ اس وقت میں بھی پردے کے پیچھے چھپا بیٹھا ہوں۔ اسی لیے وہ ذرا اونچی آواز میں بات کر رہی تھی تاکہ میں بھی سن سکوں۔

"ہم پر اس کیس کی تحقیقات کے لیے اوپر سے دباؤ ہے اور......"

"تمہیں تحقیقات سے کس نے روکا ہے۔" روپ متی نے اس کی بات کاٹ دی "اگر تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے تو میں تمہیں اپنے خلاف کسی کارروائی سے بھی نہیں روکوں گی لیکن اگر تم نے مجھے فریم کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"راج کمار بلونت سنگھ کی رسائی بہت اوپر تک ہے اور وہ......"

"اوہو۔" روپ متی اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بول پڑی "تو اصل بات یہ ہے کہ تم قانون کے نہیں غنڈوں' بدمعاشوں اور قاتلوں کے دباؤ میں ہو۔ ٹھیک ہے انسپکٹر۔" اس نے گہرا سانس لیا "تم میرے خلاف جو کارروائی کرنا چاہتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ تم بھی اس طرح لپیٹ میں آؤ گے کہ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں بچا نہیں سکے گی۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

"میں آپ کے دوست ہمت سنگھ سے ملنا چاہوں گا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔ میں اسے تمہارا پیغام پہنچا دوں گی۔ دیوان سنگھ۔" اس نے شاید باہر کی طرف رخ کرکے دیوان کو پکارا تھا "انسپکٹر کو باہر کا راستہ دکھا دو۔"

پولیس کے جانے کے بعد روپ متی ہال نما کمرے میں آگئی۔ میں بھی اس کمرے سے نکل کر وہاں پہنچ گیا۔

"تم نے ساری باتیں سن لیں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "تم نے تو کہانی بالکل ہی بدل دی۔ مجھے لگتا ہے اس میں مزید الجھنیں پیدا ہوں گی اور میرے خیال میں تمہیں ٹھاکر بھانوت سنگھ کو اس نئی صورت حال سے آگاہ کردینا چاہیے۔"

"یہ سب کچھ انہی کی خواہش کے مطابق ہوا ہے۔"

روپ متی بولی۔

"کیا مطلب؟" میں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آج صبح ٹیلی فون پر طویل گفتگو ہوئی تھی۔" روپ متی نے کہا "میں نے کہا تھا کہ میں اپنے سر قتل کا الزام کیوں لوں۔ قانون کی مدد کسی اور طریقے سے بھی کی جاسکتی ہے۔ سچ سنگھ اور دھرمیش اگر زندہ پولیس کے حوالے کردیے جاتے تو وہ صاف بچ نکلتے۔ یہ تو یہاں کا دستور ہے۔ بے گناہوں کو تو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا ہے اور گناہگار اور مجرم دندناتے پھرتے ہیں جبکہ میں یہ مانتی ہوں کہ اپرادھی (مجرم) کو اس کے اپرادھ (جرم) کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ ان دو بھائیوں میں سے ایک کو میرے ہاتھوں سزا ملی اور دوسرے کو قدرت نے سزا دی۔ اپرادھیوں کو ان کے اپرادھ کی سزا مل گئی۔ میں اپنی گردن کیوں پھنساؤں۔ قانون کی مدد کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں اور میں نے ٹھاکر کو یہ بات سمجھا دی تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "ٹھاکر بھانوت سنگھ ایک قانون پسند شہری ہے لیکن اتنی بات وہ بھی جانتا ہے کہ قانون کے رکھوالے کرپٹ ہوں تو پھر خود بھی تھوڑا سا راستے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اس نے میری بات سے اتفاق کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ کسی کو اس کے جرم کی سزا قانون ہی دے سکتا ہے۔ کسی اور کو فیصلہ سنانے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن یہاں صورت حال اس طرح مختلف ہے کہ قانون کے محافظوں کو قانون پسند شہریوں سے نہیں قاتلوں اور لٹیروں سے ہمدردی ہے۔ ان سے کسی انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے ٹھاکر نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ کہانی کو اس طرح بدل دیا جائے۔ یہ کہانی اسی نے تیار کی تھی۔"

"لیکن کیا یہ قانون کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" روپ متی نے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔ اس کے لہجے میں تلخی آگئی تھی "تمہارے ماں باپ کو تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل کردیا گیا۔ کیا تمہیں قانون سے انصاف ملا۔ وہ ہتھیارے دنیا بھر میں قتل و غارت مچاتے پھر رہے ہیں۔ قانون نے ان کا کیا بگاڑ لیا۔ کہتے ہیں کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں تو پھر یہ لمبے ہاتھ آج تک ان اپرادھیوں تک کیوں نہیں پہنچ سکے۔ بے گناہ تو مارے جارہے ہیں اور وہ بے رحم قاتل کیوں دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہیں مائی ڈیئر۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "ہم قانون کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش نہیں کررہے بلکہ ان اپرادھیوں کو سزا دی ہے جو قانون کی گرفت میں آنے کے باوجود سزا سے بچ سکتے تھے۔ تم نے بھی انسپکٹر کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے بلونت سنگھ کا حوالہ کیوں دیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ان لوگوں کو قانون سے زیادہ اہم سمجھتا ہے جو اس کی جیبیں نوٹوں سے بھر سکتے ہیں۔"

شاید روپ متی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ اگر یہ بات سامنے آجائے کہ دھرمیش روپ متی کے ہاتھ سے چلائی جانے والی گولی سے ہلاک ہوا تھا تو اس کے گرد تو جال بُن دیا جاتا لیکن یہ مرتشی اور بے ضمیر پولیس والے اس بات کو بھی تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ دونوں بھائی... غنڈوں کو ساتھ لے کر زبردستی حویلی میں گھسے تھے اور مجھے اور روپ متی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اس نے ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ قانون سے تصادم بھی نہ ہو اور ہماری طرف سے اسے تعاون بھی حاصل رہے اور پھر انسپکٹر کی باتوں سے میں یہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ پچھلی مرتبہ اوپر سے جھاڑ پڑنے کے باوجود وہ روپ متی کو کسی نہ کسی چکر میں پھنسانا چاہتا تھا۔ وہ واقعی بے ضمیر شخص تھا۔ اسے نہ قانون کی پروا تھی نہ کسی کی عزت کا خیال۔ وہ تو بلونت سنگھ جیسے بدقماش اور بدکردار لوگوں کا آلہ کار بنا ہوا تھا۔ ان جیسے بے ضمیر اور مرتشی انسپکٹر ہی جرائم پیشہ لوگوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتے ہیں۔ اس جیسے پولیس افسروں کو تو فوراً چوراہے پر لٹکا کر جوتے لگانے چاہئیں۔

اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ جانکی، مندری کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد مندری واپس آگئی مگر جانکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔

"وہ کہاں ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے مندری کی طرف دیکھا۔

"جانکی دیوی تو مندر چلی گئی۔" مندری نے جواب دیا "اس نے کہا تھا کہ میں سودا لے کر واپس چلی جاؤں۔ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آجائے گی۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ گنیش دیوتا کے مندر ہی گئی ہوگی جہاں کل رات پنڈت مرلی دھر سے ٹاکرا ہوا تھا اور بعد میں موتی رام سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے اب جانکی پر باقاعدہ غصہ آرہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں شروع کردی تھیں جن سے ہم کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہوسکتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ دو بج گئے۔ مندری نے کھانا تیار کرکے میز پر لگا دیا۔ روپ متی مجھے صوفے سے اٹھا کر کھانے کی میز پر لے آئی۔

"پریشان کیوں ہورہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "جانکی کوئی بچی تو نہیں ہے جو راستہ بھول جائے گی۔ تم کھانا کھاؤ۔ آجائے گی وہ۔"

"بات راستہ بھولنے کی نہیں۔" میں نے کہا "تم نہیں جانتیں وہ جہاں گئی ہے، ہمارے لیے کتنی خطرناک جگہ ہے۔"

"گنیش دیوتا کے مندر میں جانکی کے لیے کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔" روپ متی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"جس رات مندری اور جانکی کالی کے مندر گئی تھیں اور یہاں ہم پر حملہ ہوا تھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مندری نے آکر بتایا تھا کہ جانکی نے پنڈت مرلی دھر کو دیکھ لیا ہے۔ وہ اس کی نگرانی کررہی ہے اور اس نے مجھے بلایا ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو وہ لوگ اٹھا کر لے گئے تھے۔" روپ متی نے کہا۔

"اوہ!" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "میرا ذہن اس قدر الجھا ہوا ہے کہ ڈھنگ سے کوئی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔" میں اپنی پیشانی مسلنے لگا اور پھر روپ متی کو مرلی دھر کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا "جانکی اسی مندر میں گئی ہے اگر مرلی دھر کو اس پر کوئی شبہ ہوگیا تو وہ کسی مصیبت میں پھنس سکتی ہے۔"

"اوہ!" اس مرتبہ روپ متی کی آنکھوں میں بھی تشویش ابھر آئی۔ "بات ہے تو تشویش کی لیکن ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔ دن کے وقت اس مندر میں سیکڑوں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کسی گڑبڑ کا خطرہ نہیں ہوسکتا۔ ویسے ممکن ہے وہ مندر سے نکل کر شاپنگ وغیرہ کے لیے بازار کی طرف نکل گئی ہو۔ تم کھانا کھاؤ۔ پریشان مت ہو۔ آجائے گی۔"

اس مرتبہ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور بے دلی سے کھانا کھانے لگا۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ روپ متی کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمایاں ہوتے جارہے تھے۔

چار بج گئے۔ نہ تو جانکی واپس آئی تھی اور نہ ہی اس نے فون پر اپنے بارے میں کوئی اطلاع دی تھی۔ اب مجھے کسی گڑبڑ کا یقین ہوگیا تھا۔ جانکی اتنی غیر ذمے دار تو نہیں تھی کہ بازاروں میں سیر سپاٹے کرتی رہتی اور یہاں کوئی اطلاع نہ دیتی۔

"میں دیوان سنگھ کو مندر بھیجتی ہوں۔ وہ معلوم۔۔"

"نہیں۔ مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔" میں نے کہا "ہوسکتا ہے وہاں موتی داس یا کسی اور ایسے پجاری سے سامنا ہوجائے جس سے جانکی کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" روپ متی بھی کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گی۔" میں نے کہا "ہم میں سے ایک کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ تم یہیں رہو تاکہ میں ٹیلی فون پر رابطہ کرکے تم سے کچھ معلوم تو کرسکوں۔"

"ٹھیک ہے۔" بات روپ متی کی سمجھ میں آگئی "جاؤ مگر اپنا خیال رکھنا۔ اگر کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو فوراً خبر کردینا۔"

میں نے اپنے کمرے میں جاکر پستول پتلون کی جیب میں رکھا اور باہر آگیا۔ روپ متی پورچ تک میرے ساتھ آئی

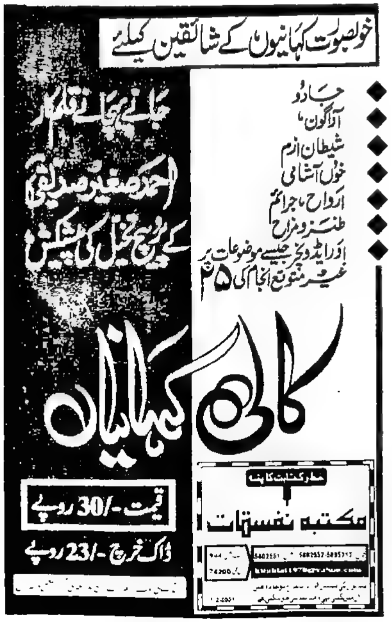

تھی جہاں پجارو اور نیلی شیراڈ کھڑی تھی۔ دونوں گاڑیوں میں چابیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں اب ڈرائیونگ میں خاصی مہارت حاصل کرچکا تھا اور جے پور کی سڑکیں بھی اب میرے لیے اجنبی نہیں رہی تھیں۔

میں کار شہر کی مختلف سڑکوں پر دوڑتا ہوا سنگانیر گیٹ اور جوہری بازار سے نکل کر تپولیا بازار کی طرف آگیا۔ میں نے کار ایک کشادہ گلی میں موڑ کر روک لی۔ انجن بند کرکے نیچے اترا۔ دروازے لاک کیے اور ایک اور گلی میں سے گزرتا ہوا گنیش مندر کی طرف آگیا۔

اس وقت چھ بجنے والے تھے۔ بازاروں میں بھی خوب رونق تھی اور مندر میں بھی سیکڑوں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ روپ متی کی اس بات پر بھی شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوسکتی تھی لیکن مندروں کے بارے میں' میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ یہاں تو ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں کسی انسان کو اس طرح غائب کردیا جاتا تھا کہ اس کا سراغ بھی نہیں ملتا تھا اور کل رات میں نے مندر کے پچھلی طرف جو پُرپیچ راہداریاں دیکھی تھیں' ان کے بارے میں' میں کہہ سکتا تھا کہ اکیلا ان میں داخل ہونے کے بعد واپس نہیں آسکتا تھا۔

مندر میں واقعی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کوئی پوجا کے لیے آیا ہوا تھا کوئی منت پوری ہونے پر بھینٹ چڑھانے اور کوئی منت ماننے۔ تمام پجاری اور پنڈت اس وقت بہت مصروف تھے۔ انہیں حقیقتاً سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں تھی۔

میں مندر میں گھوم پھر کر موتن داس کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ بالآخر میں نے ایک پنڈت کو روک لیا جو ایک تھالی اٹھائے تیزی سے ایک طرف جارہا تھا۔ اس تھالی میں ناریل' مٹھائی' پھولوں کے علاوہ گنیش دیوتا کی ایک مورتی بھی رکھی ہوئی تھی جس کی اونچائی آٹھ انچ کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ مورتی سونے کی تھی۔ آنکھوں کی جگہ دو ہیرے جڑے ہوئے تھے جو بلبوں کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس پنڈت کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر جوڑا بھی چلا آرہا تھا۔ عورت کی عمر چالیس اور مرد کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ان کے قیمتی لباس ان کی مالی پوزیشن کی عکاسی کررہے تھے۔

میں نے پنڈت سے موتن داس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ بھویں سکیڑتے ہوئے بولا۔

"اسے میں نے آج صبح دیکھا تھا۔ اس کے بعد نظر نہیں آیا۔"

میں نے اس کے ساتھ کھڑے ہوئے جوڑے کی طرف دیکھا۔

"بھگوان نے پہلا پتر دیا ہے۔ بھینٹ چڑھانے آئے ہیں۔" عورت نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا پھر تھالی کی طرف اشارہ کیا "کھالص سونے کی مورتی ہے بھگوان کھس ہوجاویں گے۔"

"پہلا بیٹا۔ اس عمر میں۔" میں نے حیرت سے عورت کی طرف دیکھا۔

"بیٹا مجھے نہیں میری بہو کو ہوا ہے۔" عورت نے تنک کر جواب دیا اور اپنے بندے کے ساتھ پنڈت کے پیچھے چل پڑی۔

میں کچھ دیر مزید اس مندر میں گھومتا رہا پھر باہر آگیا اور ایک طویل چکر کاٹتا ہوا مندر کی پچھلی طرف والی گلیوں میں آگیا۔ وہ گلی تلاش کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا کھنڈر نما عمارت میں داخل ہوگیا۔ اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا اور اس کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے لالٹین کی زرد روشنی جھلکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھتا رہا اور پھر ایک دم دروازے کے سامنے آگیا۔ میں نے اپنا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب میں پستول کے دستے پر رکھ لیا تھا۔ تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو پستول فوراً ہی جیب سے نکالا جاسکے۔

کمرے میں روشنی دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید موتن داس کمرے میں موجود ہوگا لیکن وہ کوئی اور تھا جو جھلنگا سی چارپائی پر لیٹا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ کمرے میں بیڑی کے پتے کی بو بھری ہوئی تھی۔

"کک۔۔۔ کون ہو بھایا۔ کون ہو تم!" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ بھی کوئی پجاری ہی تھا۔ اس کے جسم پر بھی پیلے رنگ کا لمبا کُرتہ تھا۔ پیشانی پر قشقہ لالٹین کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

"ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" میں نے کہتے ہوئے ہاتھ جیب سے نکال لیا۔

"تو پھر کون ہو تم۔ یہاں کیا لینے آئے ہو۔" اس نے مجھے گھورا۔

"میں دراصل سوامی موتن داس سے ملنے آیا ہوں۔ اس نے آج اس وقت مجھے یہاں بلایا تھا۔" میں کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کل یہاں زمین پر بھی ایک بستر بچھا ہوا تھا جو اس وقت غائب تھا۔

"موتن داس۔" پجاری بڑبڑایا "وہ تو آج صبح ماؤنٹ آبو چلا گیا ہے بھایا۔ میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتاؤ۔ اپنے استھان پر پوجا کرانی ہو' ہَون کرانا ہو یا کوئی اور سیوا ہو تو۔۔۔"

"نہیں سوامی جی۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "ایک ناتھ آشرم کے لیے ایک پنڈت کی ضرورت تھی۔ کوئی گھربار تو ملنے کی نہیں۔ سوامی موتن داس کو بڑی مشکل سے تیار کیا تھا پر وہ بھی بھاگ گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ماؤنٹ آبو کہاں ہے اور وہ کون سے مندر میں گیا ہے؟"

"ماؤنٹ آبو تو یہاں سے پانچ سو کلومیٹر دور ہے بھایا۔" اس نے جواب دیا "سیلانیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ وہاں بہت سے جین مندر ہیں۔ وہ کہیں بھی جاسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ دھنے واد۔" میں اس کا شکریہ ادا کرکے واپس آگیا۔

اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ ان تنگ و تاریک گلیوں سے نکل کر اپنی کار تک پہنچنے میں مجھے آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ موتن داس واقعی بزدل نکلا تھا۔ شاید وہ کسی سنگین معاملے میں نہیں الجھنا چاہتا تھا اسی لیے بھاگ گیا یا ممکن ہے صبح مندر میں اس نے مرلی دھر کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہو اور کسی خطرناک صورت حال سے بچنے کے لیے چپکے سے فرار ہوگیا تھا۔

مجھے جانکی کی حماقت پر تاؤ آرہا تھا۔ وہ مندر میں آئی تھی۔ اس پر مرلی دھر کو شبہ تو کل ہی ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے آج اسے دیکھ کر اس کا شبہ یقین میں بدل گیا ہو اور وہ کسی طرح جانکی کو وہاں سے نکال لے گیا اور مجھے یقین تھا کہ وہ اسے رام گڑھ جھیل والے مندر ہی میں لے گیا ہوگا۔

جب میں حویلی واپس پہنچا تو آٹھ بجنے والے تھے۔ روپ متی لان میں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی پورچ کی طرف آگئی جہاں میں کار روکنے کے بعد نیچے اتر رہا تھا۔ روپ متی کو اکیلے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جانکی گھر نہیں پہنچی تھی۔

"کیا ہوا۔ جانکی کا کچھ پتا چلا؟" اس نے قریب آتے ہی پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "اور موتن داس نام کا وہ پجاری بھی بھاگ گیا ہے جس نے کل رات جھیل والے مندر اور مرلی دھر کے بارے میں معلومات فراہم کی تھیں۔"

"اوہ۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ جانکی کہاں جاسکتی ہے۔" وہ بولی۔

"رام گڑھ جھیل والے مندر۔" میں اس کے ساتھ چلتا ہوا لان میں آگیا "موتن داس ڈرپوک آدمی ہے۔ کل رات اس نے پستول دیکھ کر مرلی دھر کے بارے میں کچھ بتا تو دیا تھا مگر وہ کسی سنگین معاملے میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔ اس لیے آج صبح ہی ماؤنٹ آبو کی طرف بھاگ گیا۔ فرار ہونے سے پہلے وہ تھوڑی دیر کے لیے مندر بھی گیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے مرلی دھر کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہو۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "کل رات مرلی دھر نے جانکی کو دیکھا تھا تو وہ شش و پنج میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس نے جانکی کو سنگاپور میں دیکھا تھا۔ وہاں وہ کسی اور حلیے میں تھی جبکہ کل رات وہ ساڑی پہنے ہوئے تھی اور بہت بدلی ہوئی تھی۔ جانکی نے بھی اسے اپنے بارے میں ایک نئی کہانی سنا دی تھی۔ بہرحال' وہ جانکی کو دیکھ کر شبے میں مبتلا ہوگیا تھا اور آج جب جانکی کو اس نے دوبارہ مندر میں دیکھا تو اسے یقین ہوگیا ہوگا کہ یہ جانکی ہی ہے اور ہوسکتا ہے موتن داس نے بھی صبح اسے ہمارے بارے میں بتا دیا ہو۔ اس طرح جانکی اس کے ہتھے چڑھ گئی اور مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ اسے رام گڑھ جھیل والے مندر ہی میں لے کر گئے ہوں گے۔"

"رام گڑھ جھیل یہاں سے بیس بائیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔" روپ متی نے کہا "اور وہ مندر اس جھیل سے بھی تقریباً دو کلومیٹر آگے پہاڑیوں میں ہے۔ میں ٹھاکر کو فون کرکے بلاتی ہوں۔"

"ٹھاکر کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "تم مجھے رام گڑھ کا راستہ بتا دو۔ میں اکیلا جاؤں گا۔"

"میں تمہیں اکیلے تو نہیں جانے دوں گی۔" روپ متی جلدی سے بولی "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے تیار ہونے میں صرف دو منٹ لگیں گے۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی لان سے نکل کر برآمدے کی طرف چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی ہال نما کمرے میں آگیا۔ روپ متی اس وقت اوپر اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کے فوراً ہی بعد مندری نے میرے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔ میرا خیال ہے اس نے مجھے باہر لان میں دیکھ کر چائے کا پانی چڑھا دیا تھا۔

میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھا ہوا تھا اور میں واقعی بڑی شدت سے چائے کی طلب محسوس کررہا تھا۔ میں کپ

اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔

تقریباً دس منٹ بعد روپ متی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی نظر آئی۔ جب میں یہاں آیا تھا تو وہ ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اب اس نے ٹانگوں سے چپکی ہوئی اسٹون واش نیلی جینز اور اوپر سلیولیس ٹی شرٹ پہن لی تھی اس کا رنگ بھی ہلکا نیلا ہی تھا۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ کمر پر جینز کی بیلٹ میں اس نے پستول اڑس رکھا تھا جو ٹی شرٹ کے نیچے چھپ گیا تھا۔

میں اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ روپ متی نے مندری کو اور برآمدے میں آکر دیوان سنگھ کو بھی کچھ ہدایات دیں اور شیراڈ کا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گئی۔ میں اوپر سے گھوم کر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

کار آورش نگر سے نکل کر گھاٹ دروازہ بازار سے ہوتی ہوئی رام گنج بازار پار کر کے دیانند مارگ کی طرف نکل آئی۔ ابھی رات کے نو بھی نہیں بجے تھے۔ بازاروں میں خوب گہما گہمی تھی اور ٹریفک بھی زیادہ تھا جس کی وجہ سے کار کی رفتار بھی کم ہی رہی تھی۔ چار دروازہ سے ذرا آگے نکل کر روپ متی نے کار ایک پیٹرول پمپ پر روک لی۔

روپ متی نے کار کی ٹینکی فل کروالی۔ میں نے پتلون کی جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر بل ادا کر دیا اور روپ متی نے کار آگے بڑھا دی۔ ایک دو سڑکوں پر گھومتے کار کا رخ شمال کی طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک سیدھی رام نزھ جھیل کی طرف چلی گئی تھی۔

شہر سے نکلتے ہی آبادی چھدری ہوگئی اور پھر ایک دم ویرانہ شروع ہوگیا۔ سڑک کے دونوں طرف ریگستان تھا۔ دور کہیں کہیں کوئی روشنی چمکتی ہوئی دکھائی دے جاتی۔

روپ متی نے رفتار بڑھا دی۔ اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھا۔ دس کلومیٹر کے سفر کے دوران میں سامنے سے آتی ہوئی صرف ایک گاڑی دکھائی دی تھی جو نہایت تیز رفتاری سے ہمارے قریب سے گزر گئی تھی۔

اور پھر آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں شروع ہوگئیں جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئیں۔

تقریباً دس کلومیٹر تک ہم پہاڑیوں میں سفر کرتے رہے۔ بل کھاتی ہوئی سڑک بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی اور پھر ڈھلوان راستہ شروع ہوگیا۔ ایک موڑ گھومتے ہی روپ متی نے کار روک لی۔ سامنے نشیب میں بہت دور روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ کچھ روشنیاں بکھری ہوئی اور دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

"وہ ماہی گیروں کی بستی ہے۔" روپ متی نے روشنیوں کے پھیلے ہوئے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا "بلکہ یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جو جھیل کے اس کنارے پر پہاڑی کے دامن تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے دوسری طرف جھیل ہے۔ وہ جو اطراف میں اکا دکا دور دور پھیلی ہوئی روشنیاں دیکھ رہے ہو نا وہ کاٹیج ہیں۔ پچھلے دنوں یہاں کچھ مسلسل ڈکیتی کی وارداتیں ہوئی ہیں جس وجہ سے بہت کم لوگ رات کو یہاں ٹھہرتے ہیں۔ سیر و تفریح کے لیے آنے والے لوگ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی شہر لوٹ جاتے ہیں۔ البتہ عیاشی کے لیے آنے والے ہر خوف سے بے نیاز ہو کر رات بھر کے لیے یہاں رک جاتے ہیں۔"

میں دور تک پھیلی ہوئی ماہی گیروں کی بستی اور اس کے دوسری طرف جھیل کو دیکھتا رہا۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند تھا۔ چاندنی بہت مدھم تھی۔ دور تک چمکتے ہوئے پانی کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جھیل بہت بڑی تھی اور اس کے اطراف میں ناریل کے درختوں کی بھی بہتات تھی۔ جھیل کے چاروں طرف دور دور تک پہاڑیوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔

"یہ میٹھے پانی کی جھیل ہے۔" روپ متی کہہ رہی تھی "یہاں سے پکڑی جانے والی مچھلیاں۔۔۔"

"ہم مچھلیوں کے شکار کے لیے یہاں نہیں آئے روپ متی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ مندر کہاں ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔"

"جھیل کے پرلی طرف پہاڑیوں میں۔" روپ متی نے سامنے اشارہ کیا "ایک راستہ تو اس طرف سے جاتا ہے۔ بستی کے قریب سے ہو کر جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ اور دوسرا راستہ اس طرف پہاڑیوں میں ہے۔ اس طرف ہم گاڑی زیادہ آگے نہیں لے جاسکیں گے۔ تقریباً دو کلومیٹر پیدل چلنا ہوگا۔"

"ہم اسی طرف سے جائیں گے۔" میں نے کہا "بستی کی طرف سے گاڑی دیکھ کر شبہ ہو سکتا ہے۔ تم پیدل چل سکو گی یا نہیں؟" میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"بالکل چل سکتی ہوں۔" روپ متی سنبھل کر بیٹھ گئی اور گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

کار تقریباً سو گز تک اس راستے پر چلتی رہی اور پھر روپ متی نے اسے دائیں طرف ایک اور راستے پر موڑ دیا۔ یہ راستہ بل کھاتا ہوا نسبتاً تنگ اور غیر ہموار تھا۔ روپ متی بہت احتیاط سے ڈرائیو کر رہی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک پہاڑیوں میں اس پر پیچ راستے پر

...نے کے بعد روپ متی نے کار روک لی اور انجن بند ... البتہ ہیڈ لیمپس جلتے رہنے دیے تھے۔ جن کی تیز ... جھاڑیوں پر پڑ رہی تھی اور ان جھاڑیوں سے آگے ...ان سی تھی جس نے راستہ روک رکھا تھا۔

"اب یہاں سے آگے پیدل چلنا پڑے گا۔" اس نے ...طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

...میں نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا اور دروازہ ...کر نیچے اتر آیا۔ روپ متی نے ہیڈ لیمپس بند کر دیے ...اتر کر دروازہ بند کر دیا۔

...ہیڈ لیمپس بجھ جانے کے بعد کافی دیر تک آنکھوں کے ...اندھیرا سا چھایا رہا اور جب آنکھیں اندھیرے سے ...ہو گئیں تو ہم اس چٹان پر چڑھ کر دوسری طرف آگئے۔ ...یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ ایک پر پیچ تنگ سی ...تھی۔ روپ متی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے چل رہی ...وہ اس مندر کے بارے میں بھی بتا رہی تھی۔ یہ ...جین مندر تھا جو صدیوں پہلے تعمیر ہوا تھا۔ جے پور ...راجا نے جھیل سے مندر تک ایک نہر بھی کھدوا دی ...مندر میں پانی کی ضرورت پوری کی جاسکے۔ یہ نہر ...کے قریب سے گزر کر پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی دوبارہ ...جا ملتی تھی۔

...روپ متی نے مجھے جین مت اور ہندو مت کا فرق بھی ...یا۔ جین مت کے پیروکار صرف ایک بھگوان کو مانتے ...ہندو مت کے ماننے والوں کے بھگوان لاتعداد ہیں۔ ...سانپ سے لے کر ہاتھی تک کی پوجا کرتے ہیں۔ انہیں ...درختوں اور پتھروں میں اور آسمان پر چمکتے ہوئے چاند اور ستاروں میں بھی اپنے بھگوان بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ...موتن داس یہاں گنیش دیوتا کے مندر میں تھا اور مجھے ...تھا کہ وہ ماؤنٹ آبو کے کسی جین مندر کی طرف گیا ...اس کا مطلب یہ ہوا کہ پنڈت وغیرہ۔۔۔"

"...ان پنڈتوں کا کوئی دھرم نہیں۔" روپ متی نے میری ...یہ لوگ صرف دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ ہندوستان ...مندر سونے کی کانیں ہیں۔ ان پر قبضہ کرنے کے لیے یہ ...بڑی بڑی سازشیں کرتے ہیں۔ کسی مندر پر قبضہ ...کے لیے اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان ...ایک معمولی بات ہے۔ دولت کے لیے یہ لوگ کسی بھی ...سامنے ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ یہ مندر سازشوں کا گڑھ ...عیاشیوں کے اڈے۔ آج تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو ...ان مندروں میں کیا ہوتا ہے۔" وہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر ایک اور پگڈنڈی پر مڑتے ہوئے بولی "لوگ ان مندروں کو پوتر اور پنڈتوں کو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ وہ دور دور سے مندروں کی یاترا اور پوجا کے لیے آتے ہیں۔ قیمتی چیزیں بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ عورتیں اپنے زیور تک اتار کر پتھروں کی مورتیوں کے چرنوں میں ڈال دیتی ہیں اور یہی معصوم اور بھولی بھالی عورتیں ان بدکردار پنڈتوں کی ہوس کا شکار بنتی ہیں۔ انہیں مندروں ہی میں کسی طرح غائب کر دیا جاتا ہے۔ ان دھرم چاریوں کے کردار اس قدر گھناؤنے ہیں کہ انہیں سوچ کر ہی کراہیت ہونے لگتی ہے۔"

"کیا حکومت۔۔۔"

"حکومت کیا کرے۔" روپ متی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی "یہ لوگ مادر پدر آزاد ہیں۔ مندروں پر حکومت کا کوئی کنٹرول نہیں۔ جس طرح ماضی میں بڑے بڑے راجے مہاراجے ان پنڈتوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے اسی طرح آج کے حکمران بھی ان کے سامنے بے بس ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک مرتبہ ایک پنڈت کو مندر میں آنے والی ایک لڑکی کے بلاد کار کے جرم میں پولیس نے گرفتار کیا تھا تو پورے شہر میں ہنگامے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تین دن تک شہر بند رہا تھا۔ کئی عمارتوں کو آگ لگا دی

ڈائجسٹوں کی معرکہ آرا کہانیاں
ہر کہانی، انعام یافتہ کہانی
جنہیں ایک بار پڑھنے کے بعد فراموش نہیں کیا جاسکتا

آج ہی ایک خط لکھ کر طلب فرمائیں
ملنے کا پتہ
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802652-6896313 فیکس: 5802651

گئی۔ دکانوں کے شٹر توڑ کر انہیں لوٹ لیا گیا۔ لاتعداد گاڑیوں کو نذرِ آتش کردیا گیا۔ یہ سب کچھ مندروں کے پنڈت اور پجاری بھی کر رہے تھے جنہیں بھگوان کا اوتار سمجھا جاتا ہے اور بالآخر سرکار کو ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔ اس پنڈت کو بے گناہ قرار دے کر باعزت طریقے سے رہا کردیا گیا۔"

میں اگرچہ ہندوستان کے ان پنڈتوں اور مندروں کے بارے میں تھوڑا بہت جان چکا تھا لیکن روپ متی جو انکشافات کر رہی تھی اور واقعی بڑے سنسنی خیز تھے اور اب میں خود بھی شاید کسی ایسے ہی سنسنی خیز تجربے سے گزرنے والا تھا۔

روپ متی ایک جگہ رک گئی۔ نشیب میں تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر سرخ بتی جلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس سے ذرا نیچے دو مختلف جگہوں پر بھی بلب روشن تھے۔

"وہ رام گڑھ مندر ہے۔" روپ متی روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "یہ مندر کا عقبی حصہ ہے جو چٹانوں سے ملا ہوا ہے۔ ان چٹانوں میں پہلے غار ہوا کرتے تھے جو اب مندر میں شامل ہیں اور شاید یہ مندر اس جگہ بنایا بھی اسی لیے گیا تھا کہ ان چٹانوں اور غاروں سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکے۔ مندر کا سامنے کا حصہ دوسری طرف ہے۔ ہمیں اس طرف سے گھوم کر جانا ہوگا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں غور سے اس طرف دیکھ رہا تھا مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ سامنے کے رخ سے مندر میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم فوراً ہی نظروں میں آسکتے تھے۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو کچھ یاتری بھی ہوتے اور ہم ان کی آڑ میں اندر گھس جاتے لیکن اس وقت جبکہ رات کے دس بجنے والے تھے کسی یاتری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"اس طرف آؤ۔" روپ متی نے ایک طرف اشارہ کیا۔

ہم پتھروں پر اترتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے اور تقریباً پچاس گز کا فاصلہ طے کر کے رک گئے۔ ہمارے سامنے فصیل نما اونچی دیوار تھی۔

"اسی دیوار پر چڑھ کر ہم دوسری طرف جاسکتے ہیں۔" روپ متی نے اشارہ کیا۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کسی قلعے کی فصیل کی طرح وہ دیوار تقریباً بیس فٹ بلند تھی۔ پتھروں سے بنی ہوئی اس دیوار پر چڑھنا میرے لیے اگرچہ زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن روپ متی کے بارے میں نہیں کہہ سکتا وہ اتنی اونچی دیوار پر چڑھ سکے گی یا نہیں۔

"تم اس دیوار پر چڑھ سکو گی؟" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"زیادہ مشکل تو نہیں۔" اس نے جواب دیا "پتھر بڑے ہیں اور ابھرے ہوئے ہیں۔ کوئی مشکل تو پیش نہیں آنی چاہیے۔"

"تو چلو پھر۔" میں نے اشارہ کیا۔

اس فصیل نما دیوار کی تعمیر کے لیے بڑے بڑے پتھر استعمال کیے گئے تھے جنہیں تراش کر ایک دوسرے پر جمایا گیا تھا۔ یہ پتھر باہر کی طرف ابھرے ہوئے تھے۔

روپ متی ان پتھروں پر ہاتھ پیر جما کر اوپر چڑھنے لگی۔ میں نیچے کھڑا دیکھتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اوپر سے گر گئی تو میں اسے کسی سنگین حادثے سے بچا سکوں گا؟

وہ تقریباً دس فٹ اوپر جا چکی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ پتھروں پر ہاتھ پیر جماتی ہوئی اوپر چڑھتی رہی اور کسی دشواری کے بغیر اوپر پہنچ گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور دیوار پر چڑھنے لگا۔ ان ابھرے ہوئے پتھروں کی وجہ سے دشواری پیش نہیں آئی اور میں بھی آسانی سے اوپر پہنچ گیا۔

دیوار خاصی چوڑی تھی۔ اس پر کھڑے ہو کر آسانی سے چلا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف بھی پتھر اسی طرح ابھرے ہوئے تھے۔ دیوار پر چڑھنا تو بہت آسان ثابت ہوا تھا لیکن اترنا خاصا مشکل نظر آرہا تھا۔

میں دیوار پر بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک طرف چلنے لگا۔ تیز ہوا کی وجہ سے توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا روپ متی......... بیٹھ کر آہستہ آہستہ میرے پیچھے چلی آرہی تھی۔

میں ایک جگہ رک گیا۔ مجھے بالآخر وہ جگہ مل گئی جہاں سے نیچے اترا جاسکتا۔ دیوار کے اندر کی طرف چند فٹ ہٹ کر لکڑی کا ایک کھمبا گڑھا ہوا تھا جس پر بلب اور اس پر شیڈ بھی لگا ہوا تھا۔ ایسے شیڈ عام طور پر سڑکوں پر لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں پر نظر آتے ہیں لیکن اس کے ساتھ کوئی تار وغیرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے حیرت نہیں لگی کہ دیوار کے اندر کی طرف مناسب فاصلوں پر اسی قسم کے اور کھمبے بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے دیوار کے اس حصے کو روشن رکھنے کے لیے یہ کھمبے لگائے گئے ہوں اور بعد میں کسی خرابی کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے تار کاٹ کر تار نکال لیے گئے تھے اور اب صرف کھمبے رہ گئے

...ں نے روپ متی کو سہارا دے کر آگے بڑھایا۔ وہ کھمبے ...ن کر آہستہ آہستہ نیچے پھسلنے لگی۔ اس کے پیچھے ہی ...ں طرح نیچے اترنے لگا۔

...ندر کی عمارت اس دیوار سے تقریباً بیس گز کے فاصلے ...بائیں طرف اوپر سے گھوم کر مندر کے مرکزی گیٹ کی ...پہنچا جاسکتا تھا جبکہ دائیں طرف مندر کی عمارت کا ...ہ چٹانوں سے ملا ہوا تھا۔

"اس طرف آؤ۔" روپ متی نے پچھلی طرف اشارہ کیا "...ایک مرتبہ یہاں آچکی ہوں۔ اس طرف دو چھوٹے ...ے ہیں۔ کسی ایک دروازے سے اندر داخل ہونے کی ...ی جاسکتی ہے۔"

ہم دونوں اس طرف چل پڑے۔ چھوٹے چھوٹے پتھر ...پیروں سے ٹکرا کر لڑھک رہے تھے۔ سناٹے میں ...کی آواز پھیل رہی تھی۔ ہم کچھ اور محتاط ہو کر چلنے ...

پہلا دروازہ اس طرح بند تھا جیسے ایئر ٹائٹ ہو۔ اس میں ...ی جھری بھی نہیں تھی جس سے کوئی کوشش کی ...۔ اس سے پندرہ سولہ فٹ آگے دوسرا دروازہ خاصا ...تھا اور اس میں اتنا خلا تھا کہ میں اپنا ہاتھ پھیلا کر اندر ...کر سکتا تھا۔ انگلیوں کی گرفت میں لے کر دروازے کو ...دینے سے انکشاف ہوا کہ اس کا نیچے کا قبضہ ٹوٹا ہوا ...میں نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا تو اس میں اتنا خلا ...گیا کہ میں اپنا ہاتھ پوری طرح اندر داخل کر سکتا تھا۔ ...اندر زنجیر والا کنڈا لگا ہوا تھا اور یہ ہماری خوش قسمتی ...اس کنڈے میں کوئی تالا نہیں تھا۔ میں نے زنجیر ہٹا کر ...ے کو پیچھے دھکیلا تو چرچراہٹ کی آواز سناٹے میں ...

...یہ تاریک اور تنگ سی راہداری تھی۔ میں نے پستول ...ٹ نکال کر سیدھے ہاتھ میں پکڑ لیا اور دیوار سے چپک ...نے بڑھنے لگا۔ روپ متی نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا ...تا میرے ساتھ ساتھ سرک رہی تھی۔

...یہ راہداری خاصی طویل ثابت ہوئی۔ اگلے موڑ پر ہم ...سے بائیں طرف بہت دور مدھم سی روشنی نظر آرہی ...وہ مندر کا سامنے کا حصہ تھا اور اس طرف کسی جگہ ...ن رہا تھا جس کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم ...طرف مڑ گئے۔

...پندرہ بیس گز آگے راہداریوں کا ایک اور چوراہا تھا۔ وہاں ...بل راہداری کے اختتام پر مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ہم اسی طرف چل پڑے۔ ہم دونوں نے جو گرز پہن رکھے تھے۔ ہمارے قدموں کی بہت ہلکی سی آواز ابھر رہی تھی۔

اس راہداری کے اختتام پر دائیں بائیں اور راہداریاں تھیں اور وہ روشنی دائیں طرف سے آرہی تھی۔ ہم اس طرف مڑ گئے۔ یہ راہداری زیادہ طویل نہیں تھی۔ البتہ آگے اور راہداریاں تھیں۔ مجھے ان راہداریوں کو دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ یہ مندر تھا یا کوئی بھول بھلیاں۔ کسی کسی راہداری میں روشنی تھی۔ جس طرف روشنی نظر آتی، ہم اسی طرف چل پڑتے اور بالآخر ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔

لکڑی کا وہ دروازہ پرانی طرز کا اور خاصا وزنی تھا۔ میں نے ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو وہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ پہلے میں اندر داخل ہوا اور پھر روپ متی۔

یہاں بھی سامنے ایک طویل راہداری تھی جس کے اختتام پر روشنی ہو رہی تھی۔ روپ متی نے بھی پستول ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ہم دونوں دبے قدموں آگے بڑھتے رہے۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک کسی سے آمنا سامنا نہیں ہوا تھا۔ ویسے روپ متی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہاں کسی کو غائب کردیا جائے تو اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہوگا۔

اس راہداری میں دائیں بائیں کمرے بھی تھے۔ کسی میں دروازہ تھا اور کسی میں محض محرابی راستہ بنا ہوا تھا۔ میں نے ایک دو دروازے کھول کر بھی دیکھے تھے تمام کمرے خالی تھے۔

اور پھر ہلکے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ کم از کم دو آدمی تھے جن کی اب باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"تم اس کمرے میں جاؤ۔" میں نے روپ متی کو ایک محرابی راستے میں دھکیل دیا "اور جب تک میری آواز نہ سنو باہر مت آنا۔"

میں خود سامنے والے ایک کمرے میں گھس گیا۔ یہاں بھی دروازہ نہیں تھا محض محرابی راستہ تھا۔ اندر گہری تاریکی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا اور اپنی تمام تر توجہ ان آوازوں پر مرکوز کردی۔ وہ دو آدمی تھے جو باتیں کرتے ہوئے اس راہداری میں داخل ہو چکے تھے۔ آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھیں۔

اور پھر وہ دونوں اس کمرے کے سامنے سے گزر کر آگے نکل گئے۔ میں نے جھانک کر دیکھا اور پھر باہر نکل آیا۔

"پنڈت جی۔" میں نے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "ذرا ہماری ایک بات تو سنتے جانا۔"

وہ دونوں ٹھٹک کر رک گئے اور پھر بیک وقت تیزی سے پیچھے مڑے۔ وہ دونوں میرے پستول کی زد میں تھے۔ راہداری کے آخری سرے سے آنے والی مدھم سی روشنی میں ان کے چہروں پر وحشت سی نظر آ رہی تھی۔

"تم کون ہو مورکھ؟ اور رات کے اس سمے یہاں کیسے آئے۔" ان میں سے ایک نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ وہ قدرے بھاری بھرکم اور لمبے قد کا مالک تھا۔ سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف لیکن مونچھیں گویا پورے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ کوئی بچہ ان مونچھوں کو پکڑ کر آسانی سے جھولا جھول سکتا تھا۔ اس نے پیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور جسم کے اوپر والے حصے پر ساڑی کی طرح پیلی چادر لپٹی ہوئی تھی۔ ماتھے پر سرخ ٹیکا اور آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔

دوسرا آدمی بھی اسی حلیے میں تھا۔ البتہ اس کا قد نسبتاً چھوٹا اور توند مٹکے کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھی۔

"ہم پہاڑیوں میں راستہ بھٹک گئے تھے۔" میں نے جواب دیا "کسی طرح اس مندر میں پہنچ گئے لیکن مندر کے اندر آ کر پھر بھٹک گئے۔"

"مگر یہ بندوقڑی۔" وہ پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اسے جیب میں رکھ لو اور آؤ۔ میں تمہیں باہر کا راستہ بتاؤں۔ پر مجھے لگتا ہے کہ تم کوئی بڑی واردات کر کے بھاگے ہوئے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر تم مجھے باہر کا نہیں اندر کا راستہ بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" وہ چونک گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ سنسکرت میں کوئی بات کی۔ میرے پلے کچھ نہیں پڑ سکا پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے اس طرف چلو۔"

اور پھر جو کچھ بھی ہوا میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ اس نے نہایت تیزی سے گھوم کر میرے پستول والے ہاتھ پر ٹھوکر ماردی اور پستول میرے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اچھلا اور اس کمرے میں کسی جگہ جا گرا جہاں چند لمحے پہلے میں نے پناہ لی تھی اور اس سے پہلے کہ میں اپنی حیرت پر قابو پا سکتا' وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔

میں نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور اپنے آپ کو ان کے شکنجے سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ گل مچھوں والے نے میرا بازو مروڑ کر پشت سے لگا دیا۔ جبکہ دو[سرے] نے سامنے سے آ کر میرے پیٹ پر تین چار کرارے گھونسے رسید کر دیے تھے۔

"بتاؤ تم کون ہو؟" مونچھوں والے کے حلق [سے] غراہٹ نکلی "مندر کے تمام دروازے بند ہیں۔ دو آدمی گیٹ کے اندر موجود ہیں۔ تم اندر کیسے داخل ہوئے؟ تم کون ہو اور اندر کیسے آئے ہو؟"

"میں بتاتی ہوں پنڈت جی۔"

روپ متی کی آواز سن کر وہ دونوں اچھل پڑے۔

"پہلے اسے چھوڑ دو۔ ورنہ میں تم دونوں کی کھو[پڑی] اڑا دوں گی۔" اس مرتبہ روپ متی کے منہ سے بھی خوفناک غراہٹ نکلی تھی۔

وہ دونوں پنڈت اچھل پڑے اور پھر روپ متی کے ہاتھوں میں پستول دیکھ کر گل مچھوں والے پنڈت کو مجھے گرفت سے آزاد کرنا ہی پڑا۔ میں نے آزادی ملتے ہی پوری قوت سے اس کی ناک پر ہتھیلی سے وار کر دیا۔ وہ ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کی ناک سے بہنے والا خون مونچھوں کو آلودہ کرتا ہوا ٹھوڑی کو تر کرنے لگا۔ اس سنبھلنے سے پہلے میں نے بڑی تیزی سے سائیڈ کک لگا کک اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر ٹانگ پر لگی۔ وہ لڑ[کھڑا کر] اپنے پیچھے کھڑی ہوئی روپ متی سے ٹکرا گیا۔

یہی غلطی ہو گئی کہ ہم دونوں ایک ہی لائن میں آ[گئے] اور روپ متی کو پستول استعمال کرنے کا موقع نہیں [ملا]۔ روپ متی نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر مونچھوں والے نے اس کے سینے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ روپ [متی] کر دہری ہو گئی۔ پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل [کر] فرش پر پھسلتا ہوا دور چلا گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ دوسرا پنڈت مجھ پر حملہ آور ہو[گا مگر] دوسرے ہی لمحے وہ چیختا ہوا اس طرف دوڑ پڑا جس طرف سے وہ آئے تھے۔

میں نے بھی سنبھل کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اندیشہ تھا کہ اگر وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تو [مصیبت] ہو جائے گی۔

میں نے دور ہی سے... چھلانگ لگا دی۔ میری ٹانگیں قینچی کی طرح اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ پنڈت کا سر فرش [سے ٹکرایا] تھا اور اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے موقع دیے بغیر اٹھ کر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

[ٹ]ھوکریں مارتا ہوا اس طرف لے آیا جہاں دوسرا پنڈت [اور] روپ متی گتھم گتھا تھے۔

[و]ہ منظر بھی بڑا دلچسپ تھا۔ روپ متی پشت کے بل فرش [پر پڑی] تھی۔ پنڈت اس کے اوپر اس طرح جھکا ہوا تھا کہ اس [کی] ایک ٹانگ روپ متی کے ایک طرف تھی اور دوسری [دوس]ری طرف۔ روپ متی نے اس کی بڑی بڑی مونچھوں کو [دونوں] ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑ رکھا تھا اور زور زور سے [جھٹکے] دے رہی تھی جبکہ پنڈت اپنی مونچھوں کو چھڑانے کے [لیے] اس کے سینے پر گھونسے برسا رہا تھا۔

مجھے روپ متی کے ساتھ رہتے ہوئے تین چار مہینے [ہو] چکے تھے۔ وہ اب تک بڑی بزدل اور کم ہمت ثابت ہوئی [تھی]۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جاتی لیکن اس وقت وہ بالکل [مختلف] ثابت ہو رہی تھی۔ سینے پر ہتھوڑوں کی طرح گھونسے [کھا]نے کے باوجود اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل رہی [تھی]۔

میں نے اپنے حریف کو ایک اور زوردار ٹھوکر ماری اور [مونچ]ھوں والے پنڈت کی طرف لپکا اور اس کے پہلو پر زور[دار] کک رسید کر دی۔ وہ ایک طرف الٹ گیا۔ اس کے منہ [سے] ایک بار پھر چیخ نکل گئی تھی۔ اس کی مونچھیں ابھی تک [رو]پ متی کی مٹھیوں میں تھیں۔

تقریباً تین گز آگے دیوار کے قریب فرش پر پڑا ہوا [پستو]ل چمک رہا تھا۔ میں نے لپک کر وہ پستول اٹھا لیا۔ اسی [وق]ت میرا حریف حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپکا تھا لیکن [میر]ے ہاتھ میں پستول دیکھ کر رک گیا۔

"روپ متی۔ چھوڑ دو اسے۔" میں نے کہا "اب اگر یہ [کوئ]ی حرکت کرے گا تو میں اس کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

روپ متی نے مونچھوں کو زوردار جھٹکا دیا اور اسے [چھو]ڑ کر تیزی سے الگ ہو گئی۔ وہ پنڈت دونوں ہاتھ [مونچ]ھوں پر رکھے بری طرح سر جھٹک رہا تھا۔ اس کے منہ [سے درد]ناک کراہیں نکل رہی تھیں۔ جیسے بڑی اذیت میں ہو اور [جب] اس نے ہاتھ ہٹائے تو ہاتھوں پر خون دیکھ کر میں [مسک]رائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ روپ متی نے اس کی مونچھوں [کو ٹ]ھیک ٹھاک جھٹکے دیے تھے۔ اس کی ناک سے تو پہلے ہی [خون] بہہ رہا تھا اور اب اوپر والے ہونٹ پر مونچھوں میں بھی [خون ر]سنے لگا تھا۔

"میں تم لوگوں سے شرافت سے بات کرنا چاہتا تھا مگر تم [لو]گ شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔" میں نے باری باری [د]ونوں کی طرف دیکھا "اب تم لوگ مندر کے اس حصے تک ہماری رہنمائی کرو گے جہاں اس لڑکی کو رکھا گیا ہے۔"

"کون لڑکی۔ مندر میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔" چھوٹے قد والے پنڈت نے کہا۔ دوسرا اپنی تکلیف پر قابو پانے کے لیے بار بار سر جھٹک رہا تھا۔

"میں اس کا شجرہ نہیں بتاؤں گا۔" میں نے کہا "تم سب کچھ جانتے ہو کہ آج صبح گنیش مندر سے اغوا کر کے لائی جانے والی لڑکی کہاں ہے۔ اب اگر تم نے کسی بات سے انکار کیا تو میں بلا جھجک گولی مار دوں گا۔" میں نے کہتے ہوئے پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"تم لوگ جو کوئی بھی ہو زندہ نہیں بچ سکو گے۔ تمہاری لاشیں اس مندر میں اس طرح غائب ہو جائیں گی کہ کوئی ماہر کھوجی بھی نہیں ڈھونڈ سکے گا۔" اس پنڈت نے جواب دیا۔

میں نے اس کی ٹانگ کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی ران میں لگی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی اس کی خوفناک چیخ بھی گونج اٹھی۔ انہیں سیدھے راستے پر لانے کا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے میں یہ بات نوٹ کر چکا تھا کہ یہاں بہت دیر سے دھینگا مشتی ہو رہی تھی۔ مار پیٹ کے دوران میں وہ دونوں بھی بار بار چیخے تھے اور روپ متی بھی لیکن کوئی اور شخص صورت حال معلوم کرنے کے لیے اس طرف نہیں آیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ مندر میں اگر دوسرے لوگ موجود تھے تو وہ کسی ایسے حصے میں تھے جہاں تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے بے خوف ہو کر گولی چلا دی تھی۔ وہ شخص نیچے گر گیا تھا۔ اس کی ٹانگ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹانگ کو پکڑ رکھا تھا۔

"دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔" میں نے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کر دیا۔

"بب... بتاتا ہوں... گگ... گولی مت چلائیو رے..." وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا۔

میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا پھر میں نے پستول روپ متی کے حوالے کیا اور اس کمرے میں گھس گیا جہاں میرا پستول گرا تھا۔ اندھیرے میں فرش پر ٹٹول کر پستول تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں پستول اٹھا کر کمرے سے باہر آ گیا۔

"تم دونوں آگے چلو۔ اگر کسی نے کوئی گڑبڑ یا بھاگنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ گولی مار دوں گا۔" میں نے کہا۔

"بھاگن قابل چھوڑا ہی کہاں رے۔" وہ پنڈت کراہتے ہوئے بولا۔ جس کی ٹانگ میں گولی ماری تھی۔ وہ مینڈک کی

طرح پُھد کتا ہوا ہمارے آگے چلنے لگا۔ دوسرا پنڈت بھی مونچھوں اور ناک پر ہاتھ رکھے سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیتا ہوا چل رہا تھا۔

"میں نے پہلے ہی پنڈت ہری رام سے کہا تھا کہ پرشو رام سے دوستی مت لگاؤ مگر وہ نہیں مانا۔ آج تو یہ سُورما اس کی بھی کھٹیا کھڑی کردے گا۔" زخمی ٹانگ والا پنڈت کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ پرشو رام کے نام سے اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ پنڈت مرلی دھر اسی مندر میں موجود ہے اور جانکی بھی۔

"پنڈت ہری رام ہماری کب سنے ہے۔" مونچھوں والے نے کراہتے ہوئے جواب دیا "پرشو رام نے تو ولایتی دارو... کی بوتلیں اور نئی نئی لونڈیاں دے کر اسے رام کر رکھا ہے اور اس کا دوسرا مِتر۔ اس نے تو پنڈت کو سفید پاؤڈر کا چسکا لگا دیا ہے۔ یہ پاؤڈر اس کی جان لے لیوے گا۔ پر وہ نہیں سمجھے ہے۔ ہماری بات نہ مان کر اس نے تو ہماری کھٹیا کھڑی کروا دی اور وہ بھی ایک لونڈیا کے ہاتھوں۔ اب وہ بھی نہ بچیں گے۔"

میں نے روپ متی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ حالانکہ اپنی تکلیف ضبط کرنے کے لیے وہ ایک ہاتھ سے مسلسل سینہ سہلا رہی تھی۔

کئی طویل راہداریاں گھومنے کے بعد بالآخر ہم ایک ہال نما کمرے میں آگئے۔ یہاں ایک چبوترے پر کسی دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ مونچھوں والے پنڈت نے آگے بڑھ کر مورتی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بائیں طرف گھما دیا۔ وہ چبوترا تقریباً چھ انچ اوپر اٹھ گیا اور پھر گھومتا ہوا آدھے چکر پر رک گیا۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ میں نے ان مندروں کے بارے میں جو کچھ سنا تھا' اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

چبوترا گھومتے ہی نیچے سے موسیقی اور گانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ گھنگروؤں کی آواز نمایاں تھی۔ چبوترے کے نیچے تہ خانے کی سیڑھیاں تھیں اور روشن ہو رہی تھیں۔ میں نے ان دونوں پنڈتوں کو اشارہ کیا۔ وہ سیڑھیوں پر اترنے لگے۔ ان کے پیچھے میں اور میرے پیچھے روپ متی بھی سیڑھیاں اترنے لگی۔

نیچے ایک وسیع و عریض ہال تھا۔ دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ دیواروں پر برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اس ہال کے اطراف میں تین دروازے تھے اور موسیقی اور گانے کی آواز سامنے والے دروازے کے پیچھے سے سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔

ان دونوں پنڈتوں نے دروازے کے قریب رک کر ہماری طرف دیکھا اور پھر مونچھوں والے پنڈت نے ایک زوردار جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ان دونوں کو دھکا دے کر اندر گرا دیا اور خود بھی اچھل کر اندر آگیا۔ جبکہ روپ متی دروازے کے باہر ہی کھڑی رہی تھی۔

اندر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں اور مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

بہت وسیع کمرا تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ اطراف میں سرخ اور سنہری کور والے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ شراب کی بوتلیں اور گلاس پورے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف تین جوان اور حسین لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے جسموں پر لباس برائے نام ہی تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر دو سازندے طبلے اور ہارمونیم پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ ان دونوں کے جسموں پر پجاریوں جیسے لباس تھے۔

ایک بے لباس رقاصہ کمرے کے وسط میں طبلے کی تھاپ پر رقص کے نام پر بے حیائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگروؤں کی آواز طبلے کی تھاپ سے زیادہ بلند تھی۔

وہ چار آدمی تھے جو ریشمی مسندوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ وہ پنڈتوں والے گیروے لباس میں تھے مگر انہیں شاید اپنے لباس کا ہوش نہیں تھا۔ ان چاروں کے ساتھ نیم عریاں لباس میں ایک ایک لڑکی موجود تھی۔ کوئی اپنے ساتھی کی گود میں گری پڑ رہی تھی اور کوئی شراب کا گلاس اپنے ساتھی کے ہونٹوں سے لگا رہی تھی۔ ایک پنڈت نے تو نیم عریاں لڑکی کو اس طرح دبوچ رکھا تھا جیسے اندیشہ ہو کہ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ بھاگ نکلے گی۔

اس کمرے کے پچھلی طرف دو کشادہ کھڑکیاں تھیں جن کے دوسری طرف اندھیرا تھا۔ بائیں طرف ایک دروازہ بھی تھا جو بھڑا ہوا تھا اور اس دروازے کے قریب ہی ایک چھوٹا میز پر شراب کی بوتلیں اور فوائل کی ایک چھوٹی سی ٹرے پلاسٹک کی دو تین نلکیاں اور ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک کی ایک تھیلی رکھی ہوئی تھی جس میں سفید رنگ کا پاؤڈر نظر آرہا تھا۔

میں نے پلک جھپکنے کی دیر میں اس کمرے کی صورت حال کا جائزہ لے لیا تھا مگر جانکی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔

میں نے ان دونوں زخمی پنڈتوں کو زوردار دھکے سے اندر گرایا تھا اور وہ دونوں چیخ اٹھے تھے۔ دھماکے سے دروازہ کھلنے اور ان دونوں پنڈتوں کے چیخنے سے کمرے میں موجود لوگ اچھل پڑے تھے۔ طبلے کی تھاپ رک گئی۔ ہارمونیم خاموش ہو گیا اور رقاصہ چیختے ہوئے دوڑ کر کمرے کے ایک کونے میں چلی گئی۔ دوسری لڑکیاں بھی چیخنے لگیں۔

وہ پنڈت جس نے ایک لڑکی کو دبوچ رکھا تھا' اس نے لڑکی کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور حیرت انگیز پھرتی سے اٹھ کر عقبی کھڑکی میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے فائر کر دیا۔ گولی کھڑکی کے دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چھلانگ لگانے والے پنڈت کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔

ایک اور پنڈت نے دوسری کھڑکی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے دوسری گولی چلا دی۔ میرا کسی کو مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے اس مرتبہ میں نے ہوائی فائر کیا تھا۔

لڑکیوں کی چیخیں کمرے میں گونجنے لگیں۔ وہ سب ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں اور بالآخر ایک کونے میں ایک دوسرے سے لپٹ کر تھر تھر کانپنے لگیں۔ ان سب کے چہرے خوف سے پیلے ہو رہے تھے۔

اس کمرے میں چار پنڈت تھے جن میں سے ایک عقبی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر غائب ہو چکا تھا۔ دو نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ ان میں ایک اس مندر کا پروہت ہری رام اوتار تھا۔ دوسرا شاید اس کا نائب تھا اور تیسرا جس نے کھڑکی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی تھی' پنڈت مرلی دھر تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں دہشت سی بھر گئی تھی۔

دونوں زخمی پنڈت' جنہیں میں نے دھکا دے کر گرایا تھا' اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ایک اپنی زخمی ٹانگ کو پکڑے چیخ رہا تھا اور دوسرا ناک اور مونچھوں پر ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔

"کون ہو تم اور یہ سب کیا ہے؟" پنڈت مرلی دھر میری طرف دیکھتے ہوئے غرایا۔ اس نے حیرت انگیز طور پر اپنی کیفیت پر قابو پالیا تھا "جانتے نہیں یہ کون سی جگہ ہے۔ تم مندر کی پوترتا کو..."

"آگے کچھ مت بولنا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا!" میں نے چیختے ہوئے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کر دیا "میں دیکھ رہا ہوں تم لوگ مندر کی پوترتا کا کس طرح خیال رکھے ہوئے ہو۔ تم جیسے لوگوں نے دھرم نشٹ کر رکھا ہے اور لوگوں کا اعتماد دھرم پر سے اٹھتا جا رہا ہے۔ ویسے..." میں نے

دست شناسی کے نئے رخ
مع
دست شناسی کی آسان لغت

ان لوگوں کے لئے جو کسی پیشہ ور دست شناس کے بغیر دست شناسی سیکھنا چاہتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

74200

فون: 5802552-5666313 فیکس: 5802551

کتابوں کی قیمتیں اور ڈاک خرچ ... میں کسی بھی وقت تبدیل ہو سکتی ہیں 1-6-2001

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی "ویسے ہماری پچھلی ملاقات کو اتنا عرصہ تو نہیں گزرا کہ تم میری شکل بھول جاؤ۔"

"میں نہیں جانتا تم کون ہو۔" مرلی دھر بولا "پر اتنا سمجھتا ہوں کہ تم یہاں سے اپنے پیروں پر واپس نہیں جاسکو گے۔"

"جانکی کہاں ہے؟" میں نے بات نظرانداز کرتے ہوئے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"کون جانکی۔ میں کسی جانکی کو نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

میں نے اس کے پیروں کے قریب قالین پر فائر کردیا۔ وہ اچھل پڑا۔ کمرے میں موجود لڑکیاں ایک بار پھر چیخ اٹھیں۔

"اس مرتبہ گولی قالین پر نہیں تمہاری ٹانگ پر لگے گی اور اس کے بعد تمہارے پیٹ میں۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو ان دونوں حرامیوں کی طرف دیکھ لو۔ یہ تمہیں بتا دیں گے کہ میں جو کہتا ہوں وہ کرکے بھی دکھاتا ہوں۔" میں نے ان دونوں زخمی پنڈتوں کی طرف اشارہ کیا۔

"پرشو رام..... یہ بڑا جور آور ہے۔ مان لے اس کی بات۔" زخمی ٹانگ والا مرلی دھر کی طرف دیکھ کر کراہا۔

"جانکی کہاں ہے؟" میں ایک بار پھر غرایا۔

"وہ.....وہ..... ادھر۔ اس کمرے میں ہے۔" مرلی دھر نے بھڑے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ایک بار پھر خوف طاری ہونے لگا تھا۔

میں نے روپ متی کو آواز دے کر اندر بلالیا۔

"دیکھو۔ جانکی اس کمرے ہے یا نہیں؟" میں نے روپ متی کو اشارہ کیا۔

جانکی نے آگے بڑھ کر وہ دروازہ کھول دیا۔ پہلے جھانک کر دیکھا اور پھر اندر داخل ہوگئی۔ چند منٹ بعد وہ جانکی کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔ اس نے جانکی کو قالین پر ڈال دیا۔ جانکی کی حالت دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ وہ یا تو شراب کے نشے میں مدہوش تھی یا اسے ہیروئن استعمال کرائی گئی تھی۔

"کیا کیا ہے اسے؟" میں مرلی دھر کی طرف دیکھ کر غرایا "اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"دارو کا نشہ ہے۔" مرلی دھر بولا "مرے گی نہیں۔"

میں نے جھک کر جانکی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"وہ دارو دو گھونٹ پلا دو۔ وہ ہری بوتل والا۔ دو منٹ میں نشہ اتر جائے گا اور ہوش میں آجائے گی۔" مرلی دھر نے میز پر رکھی ہوئی ایک بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے ہوش میں لاؤ۔" میں نے روپ متی سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا "وہ پنڈت جو اس کھڑکی کے راستے فرار ہوا ہے کون تھا؟" یہ سوال میں نے مرلی دھر کی طرف دیکھتے ہوئے کیا۔

"تم برسوں سے اس کا پیچھا کررہے ہو لیکن اسے پکڑنے کا تمہارا سپنا کبھی پورا نہیں ہوگا۔" مرلی دھر نے جواب دیا۔

اس کی بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ کھڑکی کے راستے فرار ہونے والا دارا تھا لیکن اس نے اس طرح پنڈتوں والا بھیس بدل رکھا تھا کہ میں اسے واقعی نہیں پہچان سکا تھا۔

روپ متی نے میز پر سے ہرے رنگ کی بوتل اٹھالی۔ اسی وقت ایک لڑکی آگے آگئی۔

"یہ بوتل مجھے دے دیں راج کماری۔ میں اسے ہوش میں لاتی ہوں۔" اس نے روپ متی کے ہاتھ سے بوتل لیتے ہوئے کہا۔

روپ متی کے منہ سے بھی گہرا سانس نکل گیا۔ اس لڑکی نے اسے پہچان لیا تھا۔ لڑکی نے جانکی کا منہ کھول کر بوتل میں سے دارو کے دو تین گھونٹ اس کے حلق میں انڈیل دیے۔ کچھ دارو ہونٹوں سے گر کر اس کی ٹھوڑی اور گردن پر بہنے لگا تھا۔

جانکی صبح ساڑی پہن کر حویلی سے نکلی تھی لیکن اس وقت اس کے بدن پر صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ نظر آرہا تھا۔

اس دوران میں ایک لڑکی اور آگے بڑھ آئی اور روپ متی کے قدموں پر سر رکھ کر گڑگڑانے لگی۔

"ہمیں معاف کردیجئے راج کماری۔ ہم بالکل نردوش ہیں۔ ہمیں پنڈت پرشو رام دھوکے سے یہاں لایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پوجا....."

روپ متی نے ٹھوکر مار کر اسے پیچھے ہٹادیا۔

"تم لوگ تو ہر رات ایسی پوجا کے لیے پرشو رام جیسے لوگوں کے ساتھ جاتی ہو۔ آرام سے وہاں بیٹھی رہو۔ تمہیں میں نے پہچان لیا ہے۔ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں بھی تم پوجا ہی کے لیے جاتی ہو۔"

میں جانکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دارو واقعی تریاق ثابت ہوا تھا۔ دو منٹ سے بھی کم وقفے میں اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے قالین پر پڑا ہوا جگ اٹھا کر جانکی پر ان دیا۔ وہ سر جھٹکتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر آہستہ آہستہ اس کے حواس بحال ہونے لگے۔

"تت..... تم....." وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہکلائی ہم

نا کیسے آ گئے؟"

"پوجا کرنے!" میں نے تلخ لہجے میں جواب دیا "اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ گھر جاکر تم سے بات کروں گا۔"

"م۔ میں تو ٹھیک ہوں۔ یہاں بات کرلو نا....." جانکی کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی اور میرا خیال ہے اس کا نشہ پوری طرح نہیں اترا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹنے کی کوشش کی تو میں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔

جانکی چیخ اٹھی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی تو روپ متی نے سنبھال لیا۔ جانکی گال سہلاتے ہوئے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ..... یہ کیا ہورہا ہے۔" پنڈت ہری رام کی لڑکھڑاتی ہوئی آواز سن کر میں اس کی طرف مڑ گیا "وہ..... وہ نرتکی کہاں گئی۔ اور..... یہ کون مہاتما ہے....."

"یہ مہاتما نہیں مسلمان ہے۔" قریب کھڑے ہوئے مرلی دھر نے کہا۔

"مسلمان۔" پنڈت ہری رام اچھل پڑا "مسلمان۔ یہ یہاں کیسے آگیا۔ اس نے مندر کو نشٹ کردیا۔ ہمارے دھرم کو نشٹ کردیا۔ ماردو اسے....."

"یہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک ہندو ناری بھی ہے۔ راج کماری روپ متی۔" مرلی دھر نے کہا۔ وہ آگ بھڑکانے کی کوشش کررہا تھا اور میں اسے روک نہیں سکا۔

"ہندو راج کماری ایک مسلمان کے ساتھ۔ ماردو..... دونوں کو ماردو۔" پنڈت ہری رام کا نشہ ہرن ہوچکا تھا۔ ایک مسلمان کے نام پر اس کی غیرت جوش میں آگئی تھی "ماردو۔ دونوں کو ماردو۔ ایک ہندو ناری کسی مسلمان کے ساتھ؟"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار پنچ رسید کیا۔ وہ چیخ کر الٹ گیا۔ اس کا سامنے کا ایک دانت ہل گیا تھا اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔

"رام رام..... ہری رام..... ہری رام....." وہ چیخنے لگا۔

"اس مسلمان نے تمہاری طرح کسی مندر کو عیاشی کا اڈہ نہیں بنا رکھا۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "اگر اپنی جان کی خیریت چاہتے ہو تو آرام سے بیٹھے رہو۔"

پنڈت ہری رام کونے میں دبک کر رام رام کی گردان کرتا رہا۔ دوسرا پنڈت بھی اگرچہ حواس میں آچکا تھا مگر اس نے مدہوش رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی تھی۔

"مرلی دھر۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تم بتاؤ گے کہ دارا کہاں گیا ہے۔ چلو۔ اسی کھڑکی کے راستے باہر نکلو۔" میں نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس سے دارا فرار ہوا تھا۔

"تم اسے تلاش نہیں کرسکو گے۔" مرلی دھر نے جواب دیا "وہ چھلاوا ہے۔ اب تک یہاں سے بہت دور جاچکا ہوگا۔"

"تم ہمیں اس کے ٹھکانے تک لے کر جاؤ گے۔" میں نے اس کے منہ پر زوردار گھونسا مارتے ہوئے کہا اور پھر روپ متی کو اشارہ کیا۔

روپ متی کھڑکی کے فریم پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی اور جانکی کو بھی سہارا دے کر دوسری طرف اتار لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر مرلی دھر کو دھکا دیا۔ وہ بھی کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا اور پھر میں نے بھی اسی طرف چھلانگ لگا دی۔

"ہمارے جانے کے بعد پولیس یہاں چھاپا مار دے گی۔ بہتر ہوگا کہ پولیس کے آنے سے پہلے تم لوگ اپنا بندوبست کرلو۔" میں نے لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور مڑ کر پنڈت مرلی دھر کو دھکا دے دیا۔

یہ ایک لمبی سی سرنگ تھی جس کے آخر میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ پنڈت مرلی دھر آگے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جارہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ہم اس وقت مندر کی عقبی پہاڑیوں کے نیچے تھے۔ ان پہاڑیوں میں غار تھے ... جنہیں تراش کر مندر میں شامل کرلیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک ہم ان سرنگوں میں چلتے رہے اور پھر ایک خفیہ راستے سے نکل کر کھلی فضا میں آگئے۔

"دارا کہاں گیا ہوگا؟" میں نے تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پنڈت مرلی دھر سے پوچھا۔

"ان پہاڑیوں میں تم اسے تلاش نہیں کرسکتے۔" مرلی دھر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آگے چلتے رہو۔ ہم تم سے پوچھ لیں گے کہ وہ کہاں گیا ہے۔" میں نے اسے دھکا دیا اور پھر روپ متی کو اشارہ کیا۔

روپ متی ہمیں راستہ بتاتی رہی اور ہم اونچے نیچے ناہموار راستے پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے رہے۔ میں نے پنڈت مرلی دھر کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے جانکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں اپنی کار کے پاس پہنچ سکے تھے۔ جانکی اس وقت تک اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی لیکن وہ

شاید مجھ سے ناراض تھی۔ راستے بھر اس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

روپ متی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میں اور جانکی پنڈت مرلی دھر کو اپنے بیچ میں لے کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ روپ متی نے اپنا پستول جانکی کے حوالے کردیا تھا۔

شہر کے بعض علاقے سنسان تھے اور بعض جگہوں پر خاصی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ کار جب حویلی میں داخل ہوئی تو اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔

جانکی اور روپ متی تو برآمدے والے دروازے کی طرف چلی گئیں اور میں دیوان سنگھ کے ساتھ پنڈت مرلی دھر کو لے کر پچھلی طرف ایک گیراج میں آگیا۔ دیوان سنگھ سمجھ گیا تھا کہ اس پنڈت کو یہاں لانے کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

"ہاں تو پنڈت مرلی دھر عرف پرشو رام۔" میں نے مرلی دھر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تم یہ بتاؤ گے کہ دارا مندر سے فرار ہو کر کہاں گیا ہے؟"

"وہ میرا گرُو ہے اور میں اپنے گرُو کے بارے میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" پنڈت مرلی دھر نے جواب دیا۔

"حیرت انگیز۔" میں نے کہا "کچھ دیر پہلے تو تم نے پنڈت ہری رام اور اس کے ساتھیوں کو بھڑکانے کی پوری کوشش کی تھی کہ ایک مسلمان نے مندر میں قدم رکھ کر دھرم کو نشٹ کردیا ہے۔ ایک ہندو لڑکی کی مسلمان سے دوستی نے تمہارے دھرم کا ستیا ناس کردیا ہے اور اب تم ایک مسلمان کو اپنا گرُو مان رہے ہو۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" مرلی دھر نے ڈھٹائی سے جواب دیا "میں کسی کو بھی گرُو مان لوں۔ تم اعتراض کرنے والے کون ہو؟"

"تو پھر یہ بھی میرا ذاتی معاملہ ہے۔" میں نے کہتے ہوئے اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ مرلی دھر لڑکھڑا گیا۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی پتلی سی دھار بہہ نکلی تھی "میرے ذاتی معاملات میں کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میں تم سے یہ پوچھ کر ہی رہوں گا کہ تمہارا گرُو کہاں گیا ہے۔"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" مرلی دھر نے جواب دیا۔

"دیوان سنگھ۔" میں دیوان سنگھ کی طرف مڑ گیا "اس سے معلوم کرو اس کا گرُو کہاں ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے تم جو من میں آئے کرسکتے ہو۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گا۔"

"کیوں پنڈت جی۔ کیا وچار ہے؟" دیوان سنگھ دو قدم آگے بڑھ کر مرلی دھر کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"تم جو کرنا چاہو کرلو۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" مر[لی دھر] نے جواب دیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے [دارا] نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اپنے با[رے] میں بہت بڑی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ تھائی لینڈ اور سنگاپو[ر] بدمعاشوں کو اپنے ساتھ ملا کر قتل و غارت کرنا اور بات [ہے] مگر یہ ہندوستان ہے۔ یہاں کی پولیس تم جیسے بدمعاشوں [سے] نمٹنا خوب جانتی ہے اور میرا خیال ہے پولیس کو بھی کچھ کر[نے] کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پنڈت ہری رام صبح ہونے [تک] بہت کچھ کرچکا ہوگا۔ ایک ہندو ناری کے ساتھ تمہاری [دوستی] طوفان کھڑا کردے گی۔ تم ہندوستان کے ہندوؤں کو [نہیں] جانتے۔ تم دونوں کو زندہ جلا دیا جائے گا اور کوئی ان کا [کچھ] نہیں بگاڑ سکے گا۔"

میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مرلی دھر نے مند[ر] میں بھس میں چنگاری ڈال دی تھی۔ اپنے کرتوت چھپا[نے] کے لیے یہ اس واقعے کو مذہبی رنگ دینے کی کوشش [کریں] گے۔ پچھلے چند مہینوں کے دوران میں میں نے یہاں [بہت] کچھ دیکھا تھا۔ یہاں کٹر ہندوؤں کی کئی انتہا پسند [تنظیمیں] سرگرم تھیں۔ دوسرے مذاہب سے انہیں شدید [نفرت] تھی۔ مسلمانوں سے انہیں خدا واسطے کا بیر تھا۔ معمو[لی] بات کو ایشو بنا کر ہنگامے کھڑے کردیے جاتے تھے۔ [اور] مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی تھی۔ کٹر اور متع[صب] انتہا پسند ہندوؤں کی ان مسلح تنظیموں کو سرکار کی بھی حما[یت] حاصل تھی۔ مختلف طریقوں سے ان کی حوصلہ افزائی کی [جاتی] تھی اور اس کے برعکس بے گناہ مسلمانوں کو جیلوں [میں] ٹھونس دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ اب ان کٹر ہندو[ؤں] کی عیسائیوں سے بھی نفرت بڑھتی جارہی تھی۔ ان کے [گرجے] جلائے جارہے تھے۔ پادریوں کو بے دردی سے موت [کے] گھاٹ اتارا جارہا تھا۔

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پنڈت ہری رام بھی یہ [نہیں] چاہے گا کہ مندر میں اس کی عیاشیوں کا راز فاش ہو۔ و[ہ] اس واقعے کو ایشو بنانے کی کوشش کرے گا۔ اگر ایسا [ہوا تو] بہت برا ہوگا۔

میں نے دیوان سنگھ کو اشارہ کیا۔ وہ اچانک ہی مرلی [دھر] پر پل پڑا۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے مرلی دھر کی تواضع [کرتا] رہا۔ اسے دو مرتبہ اٹھا کر دیوار کے ساتھ پٹخا گیا لیکن وہ [بڑا] ہی سخت جان واقع ہوا تھا۔ ہر چوٹ پر اس کی چیخ تو گونج [اٹھتی] مگر وہ زبان کھولنے پر تیار نہیں ہوا۔

"یہ ایسے نہیں مانے گا حکم!" دیوان سنگھ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔ وہ پہلوان نما آدمی تھا لیکن پٹائی کرتے ہوئے وہ بھی ہانپ گیا تھا مگر مرلی دھر زبان کھولنے پر تیار نہیں ہوا۔ مرلی دھر کے منہ اور ناک کے علاوہ سر سے بھی خون بہہ رہا تھا اور وہ اب بھی مجھے سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ دیوان سنگھ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے ایک طرف پڑی ہوئی رسی اٹھا کر مرلی دھر کے ہاتھ پیر باندھ دیے اور ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹول بکس میں سے پلاس نکال کر اس کے پیروں کی طرف بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں پنڈت!" وہ مرلی دھر کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "اب بھی کچھ بتاتے ہو یا اکھاڑ دوں تمہارے پیروں کے ناخن۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" مرلی دھر نے جواب دیا۔

دیوان سنگھ نے اس کا ایک پیر پکڑ لیا۔ مرلی دھر ٹانگیں جھٹک کر اپنا پیر چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی ٹانگ پر پیر رکھ دیا۔

دیوان سنگھ نے اس کا پیر مضبوطی سے پکڑ لیا اور انگوٹھے کا ناخن پلاس کی گرفت میں لے کر زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ مرلی دھر کی چیخیں گیراج میں گونجنے لگیں۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا تھا مگر دیوان سنگھ نے اس کا پیر نہیں چھوڑا۔ اس نے پلاس کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ انگوٹھے کا ناخن جڑ سے اکھڑ گیا اور خون کی دھار بہہ نکلی۔

دیوان سنگھ اسے چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ پنڈت فرش پر لوٹتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ اس کے انگوٹھے سے بہنے والا خون چھینٹوں کی صورت میں ہر طرف بکھر رہا تھا۔

دیوان سنگھ نے پلاس میں پھنسا ہوا ناخن باہر پھینک دیا اور مرلی دھر کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"تمہارے پیر تو تمہارے کرموں کی طرح گندے ہیں۔ ہاتھ لگاتے ہوئے بھی گھن آتی ہے۔ اب میں تمہارے ہاتھ کے انگوٹھے کا ناخن نکالوں گا۔" وہ جھک کر بیٹھ گیا اور پلاس کو حرکت دے کر کٹکٹانے لگا۔

"نہیں نہیں۔" پنڈت مرلی دھر چیخ اٹھا "ب۔۔۔ بتاتا ہوں۔"

"اب ہوئی نا بات!" دیوان سنگھ اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اب ٹسوے بہانا چھوڑو اور بولنا شروع کردو۔"

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر پنڈت مرلی دھر نے جو کچھ بتایا وہ بہت سنسنی خیز تھا۔

"ہم سنگاپور سے دہلی پہنچے تھے۔ دو دن وہاں رہنے کے بعد جے پور آگئے۔" وہ رک رک کر کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا "پنڈت ہری رام سے میری بہت پرانی دوستی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ہم کچھ دن اس کے پاس آرام سے رہ سکیں گے۔ دارا نے بھی میرے مشورے پر پنڈتوں والا بھیس اپنا لیا تھا۔ پنڈت ہری رام اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور پھر دارا نے نجانے کس طرح اسے شیشے میں اتار لیا۔ پنڈت ہری رام کو یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ مسلمان ہے لیکن اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ دارا نے اسے نئی نئی عیاشیاں شروع کروادی تھیں۔"

"مثلاً۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"دارا نے اسے ہیروئن کی لت لگا دی تھی۔" پنڈت مرلی دھر کہہ رہا تھا "پہلے تو دارا کا یہی پروگرام تھا کہ۔۔۔ چند روز یہاں رہ کر وہ پاکستان چلا جائے گا لیکن یہاں مندر میں پنڈتوں کی عیاشیاں دیکھ کر اس نے ایک اور منصوبہ بنا لیا۔"

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ مندر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔" مرلی دھر بولا۔

"کیا۔۔۔؟" میں اچھل پڑا۔

"اس کا منصوبہ یہ تھا کہ پنڈت ہری رام اور اس مندر میں رہنے والے دوسرے پجاریوں کو ہیروئن کا عادی بنا کر قبضے میں کرلیا جائے۔ اس طرح انہیں راستے سے ہٹا کر مندر پر قابض ہونا آسان ہوجاتا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "چند روز پہلے اس نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کردیا تھا۔ ہفتے میں ایک دن شہر سے خوب صورت لونڈیا کو لے آیا جاتا۔ ولایتی دارو منگوایا جاتا اور اس کے ساتھ ہیروئن بھی استعمال کرائی جاتی۔ پنڈت ہری رام اس سے بہت خوش تھا۔ اس کی ہر بات ماننے لگا تھا۔ مندر کے تمام پجاریوں پر اس کا جال مضبوط ہو رہا تھا اور دارا کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو مہینوں میں وہ ہری رام اور اس کے ساتھیوں کا پتا صاف کردے گا۔ ان کی موت اس طرح ہوتی کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا۔ مجھے اس مندر کا پروہت بنا دیا جاتا۔ دارا پس منظر میں رہتا۔ کچھ نئے پجاری یہاں رکھے جاتے جو ہمارے قبضے میں ہوتے اور ہمارے اشاروں پر چلتے۔ میں نے مختلف مندروں میں گھوم پھر کر اپنی پسند کے پنڈتوں اور پجاریوں کی تلاش شروع کردی تھی اور کچھ پنڈتوں کو منتخب بھی کرلیا تھا لیکن ابھی انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"بڑا خوفناک منصوبہ تھا۔" میں نے کہا "دارا اب کہاں

گیا ہوگا۔"

"اس نے کئی ٹھکانے بنا لیے ہیں۔" پنڈت مرلی دھر نے جواب دیا "مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔"

"دیوان سنگھ۔" میں نے کہا "اس کا ایک اور ناخن اکھاڑ دو۔"

"نہیں نہیں!" مرلی دھر چیخ اٹھا "بھگوان کے لیے مجھ پر دیا کرو۔ میں پہلے ہی تکلیف سے مرا جا رہا ہوں۔"

"تمہارے زخم کا علاج بھی کریں گے لیکن پہلے اپنے گرو کا پتا بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میرا وشواس کرو۔ مجھے نہیں پتا وہ کہاں گیا ہوگا۔ اس نے کئی ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔" مرلی دھر نے کہا۔

"تمہیں جتنے بھی ٹھکانے معلوم ہیں سب بتا دو۔ ہم اسے تلاش کرلیں گے۔" میں نے کہا۔

"کالی کا مندر اور امبر میں کلیان جی کا مندر اس کے اہم ٹھکانے ہیں۔" پنڈت مرلی دھر نے جواب دیا "اس کے علاوہ اس نے شہر میں بھی ایک دو ٹھکانے بنا رکھے ہیں لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔" اس نے شہر کے ان ٹھکانوں کے پتے بھی بتا دیے جہاں دارا کے پناہ لینے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اسے تلاش کرلیں گے۔" میں نے کہا۔

"میرا تو کوئی بندوبست کرو مہاراج۔ میں تکلیف سے مرا جا رہا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھ کر گھگیایا۔

"تمہیں تھوڑی بہت سزا تو بھگتنی چاہیے نا۔" میں نے کہا "آج کی رات اسی طرح گزار لو۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

میں نے دیوان سنگھ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گیراج سے باہر آگئے۔ پنڈت مرلی دھر چیختا چلاتا رہا لیکن دیوان نے گیٹ بند کرکے باہر سے تالا لگا دیا۔

میں دیوان سنگھ کو برآمدے ہی میں چھوڑ کر اندر آگیا۔ روپ متی اور جانکی ہال نما کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں لباس بدل چکی تھیں۔ جانکی نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور رخ بدل لیا۔ روپ متی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"سونے کا پروگرام نہیں ہے کیا۔ ڈھائی بج رہے ہیں۔" میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانکی تم سے ناراض ہے اور اسی ناراضگی کی وجہ سے کھانا بھی نہیں کھا رہی۔ حالانکہ اس نے خود ہی بتایا تھا کہ اسے دن بھر بھوکا رکھا گیا تھا اور شام کو زبردستی اتنی شراب پلا دی گئی کہ ہمارے جانے تک بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔" روپ متی نے کہا۔

"میں اس کی ناراضگی کی وجہ سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا "اگر میں اسے تھپڑ نہ مارتا تو یہ ہوش میں نہ آتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ اگر یہ مجھ سے لپٹ جاتی تو ان لوگوں کو ہمارے خلاف کچھ کرنے کا موقع مل جاتا۔ اسے تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ۔۔۔"

"ہاں۔ میں واقعی تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے تھپڑ مار کر میرا منہ سجا دیا۔" جانکی نے روٹھے ہوئے لہجے میں کہا "ابھی تک میرا جبڑا دکھ رہا ہے اور گال پر تمہاری انگلیوں کے نشان پڑ گئے ہیں۔"

"سوری ڈیئر۔" میں نے کہا "سچویشن کا تقاضا یہی تھا اگر میں تمہیں تھپڑ مار کر ہوش میں نہ لاتا تو شاید صورت حال کچھ اور ہوتی۔ ایک بار پھر سوری۔ اب مسکرا دو۔ جلدی کرو۔"

بات جانکی کی سمجھ میں آگئی تھی اور پھر اس نے مسکرانے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ روپ متی نے مندری کو آواز دے کر کھانا لگانے کو کہا۔

اور پھر کچھ ہی دیر بعد ہم تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھا رہے تھے۔

○☆○

صبح سویرے ہی ٹھاکر بھانوت سنگھ کا فون آگیا۔ کال میں نے ہی ریسیو کی تھی۔ دراصل روپ متی اور جانکی رات اوپر والے کمرے میں جاکر سو گئی تھیں اور میں ہال نما کمرے میں صوفے پر ہی لیٹ گیا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اٹھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اس وقت صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ میری آواز پہچانتے ہی بولا۔

"کل رات رام گڑھ جھیل والے مندر میں تم لوگوں کا کوئی پھڈا ہو گیا تھا؟"

"ہاں مگر تمہیں صبح ہی صبح کیسے پتا چل گیا۔" میں نے پوچھا۔

"بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ کیا معاملہ تھا؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"کل دن میں جانکی کو گنیش دیوتا کے مندر سے اغوا کر لیا گیا تھا۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے سارے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں، میں کہہ رہا تھا "دارا میرے باپ کا ہتھیارا ہے۔ میں بہت عرصے سے اس کے پیچھے لگا ہوں۔ تمہیں تفصیل بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔ مختصر یہ ہے کہ دارا پنڈت مرلی دھر کے ساتھ سنگاپور سے فرار ہو

گیا تھا اور دو چار روز پہلے اچانک ہی جانکی کی نظروں ... ہم اسے پکڑ کر دارا کے بارے میں معلوم کرنا ... تھے مگر آج اس کا داؤ چل گیا اور وہ اسے اغوا کرکے

... ہمیں پتا چل گیا کہ جانکی کو کہاں لے جایا گیا ہے۔ ... رات میں اور روپ متی اسے چھڑانے کے لیے رام ... جھیل والے مندر پہنچ گئے اور وہاں ہم نے جو کچھ بھی ... جو کچھ بھی ہوا وہ میں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا لیکن ... کیسے پتا چل گیا؟"

"تھوڑی دیر پہلے میرے ایک دوست کا فون آیا تھا۔ وہ ... کا رپورٹر ہے۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے جواب دیا "وہ ... ہے کہ میں آج کل روپ متی کو دلدل سے نکالنے کی ... کر رہا ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ روپ متی کی زندگی ... میں ہے۔ تفصیل بتانے کا وقت نہیں ہے۔ جتنی جلد ... ہو سکے تم لوگ وہاں سے نکل جاؤ۔ روپ متی سے کہو وہ ... کو لے کر میری آگرہ مارگ والی حویلی میں پہنچ ... یہ حویلی آگرہ مارگ سے بھرت پور جانے والی سڑک ... ہی آگے ہے۔ روپ متی نے وہ جگہ دیکھی ہوئی ... اب تم لوگ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں وہاں سے ... میں حویلی میں اپنے ملازموں کو فون کردیتا ہوں۔ وہ ... تمہارا خیال رکھیں گے اور باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔"

... میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف سے لائن کاٹ ... میں نے ریسیور رکھ دیا اور دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ ... اور روپ متی ایک ہی بیڈ پر سو رہی تھیں۔ انہیں ... میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی اور جب میں ... تو مندری بھی جاگ چکی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں روپ متی اور جانکی بھی نیچے آگئیں۔ ... اس وقت خاصی بدحواس ہو رہی تھی۔ حالانکہ ... بہت مختلف دکھائی دی تھی۔

روپ متی نے ایک پوٹلی بھی اٹھا رکھی تھی جس میں ... اور جانکی کے لیے چند جوڑے باندھ لیے تھے۔ ہم نے ... کو بھی ساتھ لے لیا۔

پنڈت مرلی دھر کو بھی اٹھا کر بچا رد... میں ڈال دیا گیا۔ ... پھول کر کپا ہو رہا تھا۔ تارا سنگھ اور دیوان سنگھ کو ... سمجھا کر یہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ روپ متی کے ... ابھی تک نیند کا خمار تھا۔ اس لیے ڈرائیونگ سیٹ ... سنبھال لی۔

... مارگ تک تو میں آسانی سے پہنچ گیا اور پھر روپ متی کے کہنے پر میں نے گاڑی دائیں طرف موڑ لی اور اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم بھرت پور کی طرف جانے والی ہائی وے پر نکل آئے۔

اس شاہراہ کے دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلوں پر پرانی عمارتیں تھیں۔ عمارتوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اور ہر عمارت کے گرد لمبی چوڑی جگہ بھی باؤنڈری وال میں گھری ہوئی تھی۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد روپ متی کے اشارے پر میں نے گاڑی بائیں طرف سڑک پر موڑ لی۔ اس سڑک کے دائیں بائیں ٹیلوں پر قدیم عمارتیں تھیں۔ ہمیں اس سڑک پر زیادہ آگے نہیں جانا پڑا۔

"آگے سیدھے ہاتھ پر موڑ لینا۔" روپ متی نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ ٹیلے پر جو حویلی نظر آرہی ہے وہی ہماری منزل ہے۔"

میں نے ٹیلے کی طرف جانے والے راستے پر گاڑی موڑ لی۔ ٹیلا زمین کی سطح سے چند میٹر ہی بلند تھا اور سامنے ہی وہ قدیم حویلی نظر آرہی تھی جسے دیکھ کر ذہن میں عجیب سا تاثر ابھرتا تھا۔

حویلی کے چاروں طرف ایکڑوں کے حساب سے زمین گھری ہوئی تھی اور ناریل کے لاتعداد درخت نظر آرہے تھے۔ حویلی کے گرد چار دیواری پانچ چھ فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ گیٹ پر ایک آدمی ہمارا منتظر تھا۔ اس نے گاڑی دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا۔ وہ شخص خالص راجستھانی لباس میں تھا۔ سر پر نیلے رنگ کی بل کھاتی ہوئی پگڑی تھی۔ کمر پر چمڑے کا چوڑا بیلٹ تھا جس کے بائیں طرف ہولسٹر میں ریوالور کا دستہ بھی نظر آرہا تھا۔

حویلی کی عمارت وہاں سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ میں نے کشادہ پورچ میں گاڑی روک لی اور انجن بند کردیا۔

برآمدے میں اسی حلیے کا ایک اور ملازم بھی کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے ہمارے قریب آگیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر روپ متی اور ہم سب کو پرنام کیا۔

"گاڑی میں کوئی سامان ہے راج کماری جی؟" اس نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ پیچھے رکھا ہے۔ اتار لو۔" روپ متی نے پیچھے سامان رکھنے کی جگہ پر پڑے ہوئے پنڈت کی طرف اشارہ کیا۔

اتنے میں دوسرا ملازم بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں پنڈت مرلی دھر کو دیکھ کر اچھل پڑے۔

"رام۔۔۔ رام۔۔۔ رام رام۔۔۔" ان میں سے ایک ہاتھ

جوڑتے ہوئے بولا "پنڈت جی۔ یہ آپ کو کیا ہوگیا۔ آپ کا ایک پایہ کس نے توڑ دیا۔"

"اسے اٹھا کر کسی کمرے میں ڈال دو۔ ٹھاکر آئے گا تو اس کے پائے کی مرمت کی جائے گی۔" روپ متی نے کہا۔

وہ دونوں پنڈت کو گاڑی سے نکال کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اندر لے گئے۔ میں پورچ سے نکل کر کھلی جگہ پر آگیا۔ بہت خوب صورت لان بنے ہوئے تھے۔ گہری سبز گھاس خاصی دبیز تھی۔ لانز کے کناروں پر پھولوں کے پودوں کی کیاریاں تھیں۔ ناریل کے درخت بھی بڑے سلیقے سے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ ہر لان کے وسط میں سات سات درختوں کا جھنڈ تھا۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ باغبانی کے لیے بڑی پلاننگ سے کام لیا گیا تھا۔

حویلی کی عمارت بہت پُرشکوہ اور بہت شان دار تھی۔ میں اپنے دھیان میں حویلی کو دیکھتا ہوا دائیں طرف نکل گیا اور پھر آہٹ سن کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو جانکی بھی میرے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔

ہم حویلی کے پچھلی طرف آگئے۔ حویلی کے عقب میں کم از کم دو ایکڑ زمین چار دیواری میں گھری ہوئی تھی اور یہاں کا منظر کچھ زیادہ ہی دلچسپ تھا۔ یوں تو چاروں طرف برفی کی ٹکڑیوں جیسی آہنی جالی کا جنگلا تھا مگر آدھے حصے پر جالی کی چھت تھی جو زمین سے کم از کم بیس فٹ اونچی تھی اور اس حصے میں بیس بائیس مور ٹہل رہے تھے۔ دو تین مور تو پر پھیلائے اپنی دُھن میں مست ناچ رہے تھے۔ دوسرے حصے میں ایک درجن سے زائد ہرن ٹہل رہے تھے۔ ان میں تین کالے ہرن تھے۔ راجستھان میں مور اور ہرن بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور کالے ہرن کو بہت قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ ہرنوں والے جنگلے میں مرغیاں اور مرغے بھی ٹہل رہے تھے۔

ہم حویلی کی لمبی چوڑی عمارت کے پچھلی طرف آگئے۔ اس طرف بھی ایک وسیع برآمدہ تھا جس میں بانس کی کھپچیوں کی ایک میز اور کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ برآمدے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم اسی دروازے سے اندر آگئے۔

مندری کالو رام نامی ایک ملازم کے ساتھ کچن میں مصروف ہوگئی تھی۔ ان دونوں ملازمین کو ٹھاکر نے ہمارے بارے میں پہلے سے اطلاع دے دی تھی۔ روپ متی حویلی کے مرکزی ہال میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی اور کپڑوں والی پوٹلی بھی اس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔

"بھوجن تیار ہو رہا ہے راج کماری۔"

دوسرے ملازم نے قریب آکر کہا "آپ لوگ اشنان ... میں نے سب چیزیں رکھ دی ہیں۔"

اور پھر اس نے ہمیں تین مختلف کمروں میں پہنچ... کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ روم تھا جس میں ضرورت ... موجود تھی۔ یہ حویلی اگرچہ بہت پرانی تھی لیکن ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

ایک گھنٹے بعد ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ناشتہ ... تھے۔ کالو اور شنکر جس طرح روپ متی کے ساتھ پیش ... تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پہلے بھی یہاں ... ہے اور یہ ملازم اسے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔

ناشتے کے بعد میں اور جانکی گھوم پھر کر حویلی ... بہت بڑی حویلی تھی۔ کئی راہداریاں اور کئی کمرے ... والے حصے پر بھی کئی کمرے تھے۔ میرے اندازے ... ساٹھ ستر افراد بیک وقت یہاں قیام کرسکتے تھے۔

ہم گھوم پھر کر مرکزی ہال میں آگئے جہاں ... شنکر سے باتیں کر رہی تھی۔ شنکر اس کے سامنے ... مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں مجھے ان ... رادھا نے بتایا تھا کہ وہ روپ متی کا دوست اور ... اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جان سکا تھا۔ مجھے اس ... میں کچھ صحیح اندازہ نہیں ہوسکا تھا لیکن اب یہ شا... دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ بھانوت سنگھ کتنا ... ہوگا۔

"تم نے ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں کچھ ... بتایا۔" میں نے شنکر کے وہاں سے ہٹنے کے بعد ... پوچھا "میں نے اس کی شہر والی حویلی تو نہیں دیکھی ... حویلی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بھی ... کے خاندان سے ہے۔"

"ٹھاکر بھانوت سنگھ کا دادا الفت سنگھ مہار... مادھو سنگھ کا دیوان تھا۔ ۱۹۲۲ء میں مادھو سنگھ کے ... بعد مہاراجا سوائے مان سنگھ ثانی نے گدی سنبھ... سنگھ کی خدمات کو جاری رکھا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ا... دیہانت ہوگیا تو دیوان کا عہدہ اس کے بیٹے دولت ... دے دیا گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ریاستی راج پاٹ ختم ... سرکار کی طرف سے راجا مان سنگھ کا وظیفہ مقر... دولت رام سنگھ اس وقت بھی راجا کا دیوان تھا۔

...انت (انتقال) ہوا تو بھانوت سنگھ کی عمر اس وقت ... سال تھی۔ یہ حویلی۔۔۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا ... راجا سوائے مادھو سنگھ نے اس کے دادا کو تحفے میں ... جو اس زمانے میں کچھ عرصہ آباد رہی پھر ویران ... یہ لوگ دوبارہ اپنی شہر والی آبائی حویلی میں چلے ...

...وت سنگھ کی ماتاجی بڑی ذہین عورت تھی۔ اس نے ...ع نہیں کی۔ اپنا سرمایہ کاروبار میں لگا دیا۔ جس سے ...نافع ملتا رہا۔

...اجی کا انتقال ہوا تو بھانوت سنگھ نے میٹرک کا ... کیا تھا۔ اس نے نہ صرف تعلیم جاری رکھی بلکہ ... چھوڑے ہوئے کاروبار کو بھی سنبھال لیا اور مرزا ...ل جیسے پوش اور بارونق علاقے میں ایک بہت بڑا ...ل بھی کھول لیا اور اس حویلی کو بھی رینوویٹ ... کچھ عرصے تک یہ حویلی بھی ٹورسٹ گیسٹ ہاؤس ... استعمال ہوتی رہی لیکن پھر بھانوت سنگھ نے اسے ... لیے مخصوص کرلیا۔ وہ ویک اینڈ اس حویلی میں ...ہے۔ اس کے ساتھ بعض اوقات چند دوست بھی ...۔ یوں تو حویلی کی ہر چیز شان دار ہے مگر اس کا ...ل بہت خوب صورت ہے۔"

...ٹمنگ پول۔" میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا "کیا ...پول کسی تہ خانے میں ہے۔ ہم تو ادھر سے حویلی ... گھومتے ہوئے آئے ہیں۔ ہمیں تو کہیں نظر نہیں ...نگ پول۔"

...ٹمنگ پول اسی طرف ہے۔" روپ متی نے ...ت بتایا "میرا خیال ہے تم لوگ اس طرف نہیں ...

...ر ابھی تک نہیں آیا۔" میں نے موضوع بدلتے ... اس نے فون پر کہا تھا کہ وہ خود بھی یہاں آجائے ...

...ئے گا۔ ہوسکتا ہے کسی اور کام سے نکل گیا ہو۔" ...نے جواب دیا "آؤ۔ میں تمہیں سوئمنگ پول ...۔"

...بر آکر برآمدے سے دائیں طرف مڑ گئے اور حویلی ...ف گھومتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ کڈنی شیپ ... سوئمنگ پول تھا جس میں بھرا ہوا شفاف پانی ... چھلک رہا تھا۔ ایک طرف دس بارہ فٹ کی بلندی پر ... کے لیے دو تختے لگے ہوئے تھے۔ پول کے کناروں کے ساتھ ساتھ ناریل کے درخت تھے اور باقی حصے پر دبیز گھاس کے لان تھے۔ لکڑی کے تختوں کی رنگ برنگی لمبی کرسیاں کناروں کے ساتھ ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف واش رومز بھی بنے ہوئے تھے۔ سوئمنگ پول واقعی بہت شان دار تھا۔

ہم ابھی اس طرف ٹہل رہے تھے کہ باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ شنکر تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ کی طرف جا رہا تھا اور پھر اس نے جیسے ہی گیٹ کھولا سیاہ رنگ کی ایک شان دار کار اندر داخل ہوئی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر ٹھاکر بھانوت سنگھ کو دیکھ لیا تھا۔ ہم بھی پورچ کی طرف آگئے۔

اس وقت دس بج رہے تھے۔ بھانوت سنگھ کار سے اترتے ہی دیر سے آنے پر معذرت کرنے لگا اور پھر ہم باتیں کرتے ہوئے اندر آگئے۔

"معاملہ خاصا گمبھیر ہوگیا ہے۔" رسمی گفتگو کے بعد اس نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "میرا دوست وشنو ایک انگلش ایوننگر کا رپورٹر ہے۔ یہ اخبار دوپہر بارہ بجے کے قریب مارکیٹ میں آجاتا ہے۔ وشنو قتل کی ایک اطلاع ملنے پر تفصیل حاصل کرنے کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر گیا تھا۔ وہاں رام گڑھ جھیل والے مندر کا پروہت ہری رام اور تین اور پنڈت بھی بیٹھے ہوئے تھے جن میں دو زخمی تھے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "پنڈت ہری رام نے پولیس کو ایک بڑی دلچسپ کہانی سنائی تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق راج کماری روپ متی ایک مسلمان مرد کے ساتھ مندر کے ایک اندرونی حصے میں رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ ایک پجاری نے انہیں دیکھ لیا اور ہری رام کو اطلاع کردی۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر دونوں گڑبڑا گئے مگر شرمندہ ہونے کے بجائے وہ پنڈتوں پر چڑھ دوڑے اور مارپیٹ شروع کردی۔ راج کماری روپ متی کے مسلمان یار نے ایک پنڈت کو ٹانگ پر گولی مار دی اور دوسرے نے پنڈت کی ناک کا بانسا توڑ دیا اور اس کی مونچھیں اکھاڑنے کی کوشش کی جس سے وہ مزید زخمی ہوگیا۔ مزید برآں وہ پرشو رام نامی ایک پنڈت کو اغوا کرکے لے گئے۔ پنڈت ہری رام نے دھمکی دی ہے کہ اگر چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر راج کماری روپ متی اور اس کے مسلمان عاشق کو گرفتار کرکے مغوی پنڈت کو بازیاب نہ کیا گیا تو شہر کے تمام مندروں کے پنڈت خود کارروائی کریں گے۔

"میرے دوست وشنو نے پولیس اسٹیشن سے نکلتے ہی

ایک پبلک بوتھ سے مجھے فون کردیا۔ وہ جانتا ہے کہ میں آج کل پھر روپ متی کو دلدل سے نکالنے کی کوشش کررہا ہوں۔ یہ بات تو میں نہیں مانتا کہ تم دونوں مندر میں رنگ رلیاں منا رہے ہوگے لیکن بہرحال' میں اصل بات جاننا چاہتا ہوں۔"
وہ خاموش ہوکر باری باری ہماری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی جانکی اور روپ متی کی طرف دیکھا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے اصل واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں' میں کہہ رہا تھا۔

"ہمیں جس شخص کی تلاش تھی' وہ تو بھاگ گیا لیکن اس کا ساتھی پنڈت پرشو رام ہمارے ہاتھ آگیا۔ اس کا اصل نام مرلی دھر ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"ہم اسے اپنے ساتھ لے آئے ہیں۔ وہ اس حویلی میں ہے۔" میرے بجائے روپ متی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھتا ہوں اسے لیکن صورت حال خاصی گمبھیر ہوگئی ہے۔" ٹھاکر نے کہا "پنڈتوں اور پجاریوں کے کرتوتوں سے سب ہی لوگ واقف ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ مندر عیاشی کے اڈے بنے ہوئے ہیں لیکن کسی میں ان کے خلاف آواز اٹھانے کی جُرات نہیں۔ اگر کبھی ایسی کوئی بات ہوتی ہے تو یہ پنڈت اور پجاری دھرم کی آڑ لے کر ہنگامے شروع کردیتے ہیں اور ظاہر ہے دھرم کے نام پر کچھ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ معاملہ بھی خاصا گمبھیر ہے۔ پنڈت ہری رام اپنے آپ کو بچانے اور تم دونوں کو پھنسانے کی پوری کوشش کرے گا لیکن اگر یہ ثابت کردیا جائے کہ مندر میں رنگ رلیاں تم لوگ نہیں' وہ منا رہے تھے تو بات بن سکتی ہے۔"

"ہم ثابت کرسکتے ہیں۔" روپ متی نے کہا۔

"وہ کیسے؟" ٹھاکر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پنڈت پرشو رام عرف مرلی دھر ہمارے قبضے میں ہے۔" روپ متی نے کہا "اس کے علاوہ میں ان دو لڑکیوں کو بھی جانتی ہوں جو ان کے ساتھ دادِ عیش دے رہی تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ انہیں عیاشی کے لیے شہر سے اس مندر میں لے جایا گیا تھا۔ وہ بتا سکتی ہیں کہ وہاں کیا ہورہا تھا۔"

"لیکن وہ پنڈت ہری رام کے خوف سے زبان نہیں کھولیں گی۔" ٹھاکر نے کہا۔

"اگر انہیں تحفظ کی ضمانت دی جائے تو وہ سب کچھ بتا سکتی ہیں۔" روپ متی نے کہا۔

"کون ہیں وہ؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"ایک کا نام لاجونتی ہے۔ اس نے ایم آئی روڈ ... ٹورسٹ ہوٹل میں ایک کمرا مستقل طور پر کرائے ... رکھا ہے۔ یہی اس کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ وہ بڑے بڑے ... اور گیسٹ ہاؤسز میں گھومتی رہتی ہے اور گاہکوں کو ... اسی ہوٹل میں لے جاتی ہے۔ دوسری لڑکی کا نام ریکھا ... وہ جے پور کلب میں رقاصہ ہے۔ کل رات وہ ان ... کے سامنے ڈانس کررہی تھی۔ لاجونتی اسے اچھی طر... ہے۔ دوسری لڑکیوں کے بارے میں بھی ان سے پوچھا ... ہے۔"

"کچھ کرنا پڑے گا۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے کہا "خبر جب اخباروں میں چھپے گی تو اچھا خاصا ہنگامہ اٹھ... ہوگا۔ پنڈت ہری رام اپنے آپ کو بچانے کے لیے ... کے مذہبی جذبات بھڑکائے گا اور تم لوگ جانتے ہو ک... موقع پر وہ لوگ آگے آجاتے ہیں جن کا دھرم سے دور ... کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور اس سے پہلے کہ صورت ... سنگین ہوجائے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ بہرحال' پنڈت پر... کہاں ہے؟"

"شنکر نے اسے پیچھے کسی کمرے میں ڈال دیا..." روپ متی نے جواب دیا۔

"میں ذرا اسے دیکھ لوں پھر بات کرتے ہیں۔" ٹھا... ہوئے اٹھ گیا اور میں نے بھی اس کے ساتھ ہی ... دی۔

پنڈت مرلی دھر حویلی کے پچھلی طرف ایک کم... فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیر اور ہاتھ بھی پشت ... ہوئے تھے۔ ایک پیر خون آلود تھا اور کپڑے کی طرح ... تھا۔ وہ فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اسے رات کو بھی ہم ... کھانے کو نہیں دیا تھا اور صبح شنکر نے بھی ناشتا وغیرہ ... تھا بلکہ پانی تک نہیں پلایا تھا۔ وہ فرش پر پڑا ہوا ... کراہ رہا تھا۔

"تمہارے پیر کو کیا ہوا؟" ٹھاکر بھانوت سنگھ ... جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کل رات یہ مندر سے نکل کر پہاڑیوں میں بھا... مرلی دھر سے پہلے میں بول پڑا "ننگے پیر تھا' اندھیر... ٹھوکر لگی تو ناخن اکھڑ گیا۔"

"میرا ناخن اس نے اکھاڑا ہے" مرلی دھ... "انہوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ مجھے رات سے ... نہیں دیا۔ ایک گھونٹ پانی بھی نہیں دیا۔ میری مدد کرو ورنہ میں مرجاؤں گا۔"

ٹھاکر نے میری طرف دیکھا۔

"وہ دراصل بات یہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ٹھوکر لگنے سے اس کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ گیا تھا۔ جس سے اسے تکلیف ہورہی تھی۔ دیوان نے پلاس سے ناخن اکھاڑ دیا۔ ہمارے پاس کوئی مرہم ملا نہیں تھا جو لگا دیتے۔ بس اس سے اس کا پیر پھول گیا ہے۔ معمولی سی تکلیف ہے ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ظالم آدمی ہے۔ مجھے مار ڈالے گا حکم۔" پنڈت مرلی دھر ... کی طرف دیکھتے ہوئے پھر چیخ اٹھا "رحم کرو مجھ پر۔ اس نے جو کچھ پوچھا میں نے بتا دیا۔ مجھے بچا لو اس سے۔"

"اب تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے کہا "لیکن تم مجھے بتاؤ مندر میں کیا ہوا تھا۔ میں سچ سننا چاہتا ہوں اگر ایک لفظ بھی غلط ہوا تو میں تمہارے باقی ناخن ہی نہیں شریر کی کھال بھی ادھیڑ ڈالوں گا۔"

"رام رام... رام رام..." پنڈت مرلی دھر چیخ اٹھا "تم تو اس سے بھی کڑے نکلے۔ پانی... مجھے پانی دو... اور وید کو بلاؤ۔ میرا پیر... میں مرا جارہا ہوں۔"

"شنکر پانی پلاؤ اسے۔" ٹھاکر نے کہا پھر مرلی دھر کی طرف مڑ گیا "وید کو بھی بلاؤں گا اور تمہیں کھانا بھی کھلایا جائے گا مگر پہلے بتاؤ مندر میں کیا ہوا تھا؟"

"میں نردوش ہوں حکم۔" مرلی دھر بولا "وہ حرامی دارا مجھے لالچ دے کر سنگاپور سے لایا تھا اور پھر یہاں بھی اس نے مجھے لالچ دیا کہ مجھے مندر کا پروہت بنا دے گا۔ وہ سالا حرامی... مجھے پھنسا کر بھاگ گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر وہ سب کچھ بتانے لگا جو اس نے مجھے بتایا تھا۔ البتہ بعض باتیں ایسی تھیں جن کا مجھے پہلے علم نہیں ہوسکا تھا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا "دارا نے پاکستان جانے کا خیال دل سے نکال دیا تھا۔ وہ اس مندر پر ہر صورت میں قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اگلے دو چار مہینوں میں اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتا۔"

"یوں تو ہم جانتے ہیں کہ مندروں میں کیا ہوتا ہے۔ پنڈتوں کے کرموں سے بھی واقف ہیں۔ تم یہ بات ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ رام گڑھ جھیل والے مندر میں شراب اور لڑکیاں کون لے کر جاتا تھا۔" ٹھاکر نے پوچھا۔

اس دوران میں شنکر پانی لے آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس تھا اور دوسرے میں جگ۔ اس نے دونوں چیزیں فرش پر رکھ دیں اور مرلی دھر کو سہارا دے کر اٹھا دیا اور دوسرے ہاتھ سے جگ اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے منہ میں گیا۔ زیادہ اس کی ٹھوڑی اور گردن کو تر کرتا ہوا سینے پر بہنے لگا۔

شنکر نے ٹھاکر کے کہنے پر اس کے پیروں کی رسی بھی کھول دی۔

"وہ... وہ لڑکیاں میں لے جاتا تھا اور... پنڈت بھولا ناتھ۔" پنڈت مرلی دھر نے کہا "ولایتی دارو بھی ہم دونوں ہی لاتے تھے۔ چند روز پہلے پنڈت ہری رام کسی دھن وان کے ساتھ جے پور کلب چلا گیا تھا۔ وہ وہاں تھوڑی دیر ہی رہا مگر اس نے ریکھا کو وہاں رقص کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اسی کی فرمائش پر کل رات ہی ریکھا کو لے کر آیا تھا۔ اس نے کلب میں ایک ہفتے کے پروگراموں کے معاوضے کے برابر رقم لی تھی۔ وہ زیادہ بھی مانگتی تو ہری رام دے دیتا۔ وہ تو اس کا ناچ دیکھنا چاہتا تھا اور کل رات جب محفل میں رنگ آرہا تھا تو یہ سورما اس ناری کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔"

"کیا تم یہ سب کچھ پولیس کے سامنے کہہ سکتے ہو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"وہ... وہ مجھے مار ڈالے گا۔" پنڈت مرلی دھر کے چہرے پر خوف کے سائے ابھر آئے "پنڈت ہری رام مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"پنڈت ہری رام پولیس کی تحویل میں ہے۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ نے کہا "اس نے جو بیان دیا ہے وہ تم سے بہت مختلف ہے۔"

"کک... کیا..." مرلی دھر ہکلایا "ہری رام کو پولیس نے پکڑ لیا۔ اس نے کیا بولا۔"

"اس نے بولا کہ تم اور دارا آوارہ عورتوں کو لے کر مندر میں آئے تھے اور ان کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اس نے یعنی پنڈت ہری رام نے منع کیا تو تم نے اور دارا نے ان پر حملہ کردیا۔ دو پنڈتوں کو زخمی کردیا اور مندر سے قیمتی چیزیں چرا کر بھاگ گئے۔"

"وہ حرامی ایسا بولا۔" پنڈت مرلی دھر کے حلق سے غراہٹ سے ملتی جلتی آواز نکلی "وہ جھوٹا ہے۔ مکار۔ بدمعاش۔ اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ مندر جیسی پوتر جگہ کو اس نے عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ میں... میں پولیس کو بتاؤں گا۔ لوگوں کو بتاؤں گا کہ اس کے اصل کرتوت کیا ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیا "آج شام تک یا کل صبح تمہیں پولیس کے سامنے پیش کردیا جائے گا۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دارا کو بھی ہم پکڑلیں گے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ کسی کے ہاتھ آئے گا۔" پنڈت مرلی دھر نے کہا "وہ بہت چالاک ہے۔ اس نے یہاں کئی ٹھکانے بنا لیے ہیں۔ وہ کسی ایسی جگہ چھپ گیا ہوگا جہاں اسے تلاش نہ کیا جاسکے۔"

"ہم اسے تلاش کرلیں گے۔" ٹھاکر نے کہا اور شنکر کی طرف گھوم گیا۔

"اسے بھوجن کراؤ اور اس کے ہاتھ بھی کھول دو۔ یہ بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر کوئی گڑبڑ کرے تو کھوپڑی اڑا دینا۔"

"جی حکم۔" شنکر نے سرہلا دیا اور جھک کر مرلی دھر کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ بھی کھول دیے۔

مرلی دھر کچھ دیر کلائیاں سہلاتا رہا پھر پیر کو سہلانے لگا تھا۔ اس کا پیر ٹخنے تک بہت زیادہ سوج گیا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں کمرے سے باہر آگئے۔ بھانوت سنگھ ٹیلی فون کے قریب بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ملانے لگا۔

میں روپ متی کے پاس بیٹھ گیا۔ جانکی اس وقت وہاں نہیں تھی۔

"ٹھاکر بھانوت سنگھ واقعی ذہین آدمی ہے۔" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس نے بڑی خوب صورتی سے ایک کہانی گھڑ کر مرلی دھر کو پولیس کے سامنے زبان کھولنے پر آمادہ کرلیا ہے۔"

اور یہ واقعی اس کی ذہانت تھی۔ اگر وہ پنڈت ہری رام کے بارے میں فرضی کہانی نہ سناتا تو شاید مرلی دھر بھی اتنی آسانی سے پولیس کو بیان دینے پر تیار نہ ہوتا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ تقریباً پندرہ منٹ تک فون پر بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ کر ہمارے پاس آگیا۔

"میں نے ڈاکٹر شیام سندر کو بلایا ہے۔" وہ روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں نے اسے مرلی دھر کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ اس کی ڈریسنگ کردے گا اور دوا وغیرہ دے گا اور جب تک میں اجازت نہ دوں تم لوگ۔ خاص طور سے تم!" اس نے انگلی سے روپ متی کی طرف اشارہ کیا "باہر نہیں نکلو گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ معاملہ آج رات تک ختم ہوجائے۔ اگر یہ پنڈت لوگ سڑکوں پر آگئے تو صورت حال خاصی سنگین ہوجائے گی۔"

"تم کہیں جارہے ہو؟" روپ متی نے پوچھا۔

"ہاں۔" ٹھاکر نے اثبات میں سرہلا دیا "تھوڑی بہت بھاگ دوڑ تو کرنی پڑے گی۔ ایک جگہ بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔" وہ میری طرف متوجہ ہوگیا "تمہارے لیے فی الحال زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ تمہیں تو بہت کم لوگ پہچانتے ہیں۔ ویسے بہتر ہوگا کہ چند روز تم بھی اپنے آپ کو یہاں تک محدود رکھو۔"

میں نے سرہلا دیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ شنکر اور کالو کو کچھ ہدایات دیتا ہوا رخصت ہوگیا۔

ہم جب سے آئے تھے مندری کچن میں مصروف ہوگئی تھی۔ اس نے آتے ہی کچن سنبھال لیا تھا اور اب وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہی تھی۔ کالو رام نے مرلی دھر کے لیے ناشتا بنالیا اور وہ شنکر کے ساتھ مرلی دھر والے کمرے میں چلا گیا تھا۔

میں اور روپ متی باہر آگئے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم بڑا خوشگوار ہوگیا تھا۔ تیز ہوا سے ناریل کے پودے جھکے جارہے تھے۔ ہم لان میں گھومتے ہوئے سوئمنگ پول کی طرف آئے تو جانکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ پول میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ میں اب تک یہی سمجھتا رہا تھا کہ وہ کسی کمرے میں جاکر سوگئی ہے لیکن اسے یہاں بیٹھے دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"تم اکیلی یہاں بیٹھی کیا کررہی ہو؟" میں نے اس کے قریب پڑی ہوئی لکڑی کی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اندر بیٹھے بیٹھے بور ہورہی تھی۔" جانکی نے جواب دیا "موسم بڑا خوشگوار ہورہا ہے۔ یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔"

روپ متی نے بھی سینڈل اتار دیے اور جانکی کے قریب ہی پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

ہم دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے اور پھر ایک گاڑی گیٹ کے باہر آکر رکی۔ ہم جس جگہ بیٹھے ہوئے تھے وہاں سے گیٹ نظر نہیں آرہا تھا۔ گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی اور گاڑی اندر آکر پورچ میں رک گئی۔ اس کے تقریباً پانچ منٹ بعد شنکر نے آکر بتایا کہ ڈاکٹر شیام سندر آگیا ہے۔ میں جانکی اور روپ متی کو وہیں چھوڑ کر اندر آگیا۔

ڈاکٹر شیام سندر جوان اور خوب رو آدمی تھا۔ گہرے رنگ کا سفاری سوٹ اس پر خوب جچ رہا تھا۔

"اگر میں غلطی نہیں کررہا تو تم ہمت سنگھ ہو۔" اس نے

بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

میں بھی اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا دیا۔ میں جب سے روپ متی کے ہاں آیا تھا وجدان علی سے ہمت سنگھ بن گیا تھا اور روپ متی کے جاننے والے مجھے اسی نام سے پکارنے لگے تھے۔ ڈاکٹر شیام سندر کو یقیناً ٹھاکر نے میرے بارے میں بتایا ہوگا۔

ہم پنڈت مرلی دھر والے کمرے میں آگئے۔ اب اس کے کمرے میں ایک چارپائی ڈال دی تھی جس پر بستر بھی بچھا ہوا تھا۔ مرلی دھر بستر پر نڈھال سا پڑا تھا۔ شنکر ابھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اس نے جلدی سے ڈاکٹر شیام سندر کے لیے ایک کرسی بھی لاکر رکھ دی۔

ڈاکٹر نے مرلی دھر کا پیر دیکھا اور شنکر سے گرم پانی لانے کو کہا اور مرلی دھر کا ٹمپریچر دیکھنے لگا۔

مرلی دھر کو ایک سو دو سے اوپر بخار تھا۔ شنکر پانی گرم کرکے لے آیا۔ مرلی دھر کو پیر لٹکا کر چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے نیچے تسلا رکھ کر خود مرلی دھر کا پیر دھویا۔ اسے کاٹن سے خشک کرکے اسپرٹ سے زخم صاف کیا۔ زخم پر اسپرٹ لگتے ہی مرلی دھر چیخ اٹھا تھا۔ شنکر نے اسے گرفت میں لیے رکھا۔

پیر بہت سوج جانے کی وجہ سے اس کے زخمی انگوٹھے کی ڈریسنگ میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ ڈاکٹر نے اسے ایک انجکشن بھی لگادیا اور ایک کیپسول اور دو گولیاں بھی کھلا دیں۔ چند کیپسول اور گولیاں ایک تھیلی میں ڈال کر شنکر کے حوالے کردیں اور ان کے استعمال کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔

میں ڈاکٹر کے ساتھ تقریباً آدھا گھنٹا ہال میں بیٹھا رہا۔ اس دوران میں چائے بھی پی گئی اور بہت سی باتیں بھی ہوئیں لیکن ڈاکٹر نے ایک مرتبہ بھی دریافت نہیں کیا تھا کہ پنڈت مرلی دھر کے پیر کے انگوٹھے کا ناخن کیسے اترا تھا اور میرا خیال تھا کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے اسے سمجھا دیا ہوگا۔ ڈاکٹر کو رخصت کرنے کے بعد میں سوئمنگ پول کی طرف واپس آیا تو جانکی اور روپ متی اسی طرح پول میں پیر لٹکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔

آسمان پر بادل گہرے ہوگئے تھے۔ ہوا میں بھی تیزی آگئی تھی اور پھر گھن گرج کی آواز کے ساتھ موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگیں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر برآمدے کی طرف دوڑا۔ عمارت کی دیوار کے ساتھ موڑ پر گھومتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ روپ متی اور جانکی بھی میرے پیچھے ہی آرہی ہوں گی لیکن وہ دونوں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلی تھیں۔ ان دونوں کے نقرئی قہقہے میرے کانوں میں بازگشت سی پیدا کررہے تھے۔

میں برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا اور لان کی طرف دیکھنے لگا۔ آسمان سے برستی ہوئی موٹی موٹی بوندوں نے اب باقاعدہ بارش کی صورت اختیار کرلی تھی جس میں بتدریج تیزی آتی جارہی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا پھولوں کے پودوں اور ناریل کے درختوں کو جھولتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پندرہ بیس منٹ بعد بارش بہت تیز ہوگئی۔ مجھے اچانک ہی جانکی اور روپ متی کا خیال آگیا۔ وہ دونوں ابھی تک سوئمنگ پول کی طرف ہی تھیں۔ وہ شاید پوری طرح آسمان سے برستے پانی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔

دس منٹ اور گزر گئے۔ بادلوں کی گھن گرج کے ساتھ بارش میں کچھ اور تیزی آگئی تھی اور پھر وہ دونوں پول کی طرف سے نکل کر اس طرف آتی ہوئی دکھائی دیں اور دو منٹ بعد ہی وہ برآمدے میں میرے سامنے کھڑی تھیں۔ میں بھی اندر جانے کے لیے کرسی سے اٹھ چکا تھا۔ ان دونوں کے لباس جسم سے چپکے ہوئے تھے اور پانی کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی اور پھر اسی لمحے بجلی چمکی اور زوردار کڑکا ہوا۔ میں بھی دہشت زدہ سا ہوگیا اور پھر میری دہشت اس وقت اور بڑھ گئی جب وہ دونوں چیختی ہوئی دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔

○☆○

تین گھنٹوں کی موسلا دھار بارش نے جل تھل ایک کردیا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں حویلی کے پچھلے برآمدے میں آگیا تھا۔ اس طرف بھی جل تھل ایک ہوگیا تھا۔ مور اور ہرن وغیرہ جنگلے میں شیڈز کے نیچے دبکے ہوئے تھے۔ میں چند منٹ وہاں کھڑا رہا پھر سامنے والے برآمدے میں آگیا۔ جانکی اور روپ متی وہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

شام ہوگئی۔ بارش بند ہوچکی تھی لیکن آسمان پر بادلوں کی گھن گرج اب بھی جاری تھی۔ بجلی بھی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ بارش ہوگی اور پہلے سے زیادہ شدت سے ہوگی۔

آٹھ بجے کے قریب ٹھاکر بھانوت سنگھ پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ انہی دو لڑکیوں میں سے ایک تھی جنہوں نے مندر میں روپ متی کے قدموں پر گڑگڑا کر معافی مانگی تھی۔ بعد

میں معلوم ہوا کہ اس کا نام لاجونتی ہے۔ ہمارا سامنا کرتے ہوئے اس کے چہرے پر کسی قسم کی ندامت یا شرمندگی کے تاثرات نہیں تھے۔ ندامت اور شرم و حیا کا احساس تو ان لوگوں کو ہوتا ہے جن میں کچھ غیرت ہو۔ ان جیسی لڑکیوں میں نہ تو شرم و حیا ہوتی ہے اور نہ غیرت۔ مجھے پر نام کرتے ہوئے بھی وہ بڑی ڈھٹائی سے مسکرا رہی تھی۔

"رات دس بجے ہم نے پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس کا اہتمام کیا ہے۔" ٹھاکر بھانوت سنگھ کہہ رہا تھا۔ اس وقت ہم دونوں روپ متی وغیرہ سے ذرا دور بیٹھے ہوئے تھے "آج دوپہر کے اخبارات میں پولیس میں درج کرائی جانے والی رپورٹ کی تفصیل اور پنڈت ہری رام کا بیان شائع ہوا ہے۔ اس بیان کا اثر زائل کرنے کے لیے ہمارے لیے بھی یہ قدم اٹھانا ضروری ہوگیا تھا۔" اس نے پتلون کی جیب سے تہ کیا ہوا ایک انگریزی اخبار نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اخبار کھول کر دیکھا۔ وہ خبر پہلے صفحے پر ہیڈ لائن کے ساتھ چھپی تھی۔ پنڈت ہری رام اور ان دو پنڈتوں کی تصویریں بھی تھیں جو مندر میں ہمارے ہاتھوں پٹے تھے۔ میں خبر پڑھنے لگا۔

پنڈت ہری رام نے ہم پر (میں اور روپ متی) سنگین الزامات لگائے تھے۔ اس کے بیان کے مطابق آوارہ مزاج راج کماری روپ متی اپنے ایک مسلمان عاشق کے ساتھ مندر کے ایک ویران حصے میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑی گئی تھیں۔ انہیں سرزنش کی گئی تو انہوں نے مندر کے پنڈتوں پر حملہ کردیا۔ روپ متی کے ساتھی نے گولی چلا دی جو ایک پنڈت کی ٹانگ میں لگی۔

پنڈت ہری رام نے روپ متی پر اور بھی کئی سنگین الزامات لگائے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق راج کماری روپ متی مختلف اوقات میں مختلف مردوں کو لے کر مندر میں آتی رہتی تھی۔ اس بیان میں روپ متی کی کردار کشی کی بھرپور کوشش کی گئی تھی اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔

میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

"پریس کانفرنس کا انتظام تم نے کیا ہے؟"

"میں نے پولیس کمشنر مسٹر پانڈے سے بات کی تھی۔" ٹھاکر نے جواب دیا "پہلے تو وہ میری بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا بلکہ اس نے تو مشورہ دیا تھا کہ میں اس معاملے سے بالکل الگ رہوں اور راج کماری روپ متی کی مدد سے دست کش ہو جاؤں۔

"میں نے بھی تیور کڑے کرلیے۔ مسٹر پانڈے جانتا ہے کہ اگر مجھ جیسے دو چار آدمی اکڑ گئے تو نہ صرف اس کی نوکری بلکہ جیون بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ میری بات سن کر وہ میرے مشورے پر پریس کانفرنس بلانے پر آمادہ ہوگیا جس میں پنڈت مرلی دھر اور ان چار لڑکیوں کو پیش کیا جائے گا جو کل رات مندر میں موجود تھیں۔"

"کل رات تو شاید مندر میں سات آٹھ لڑکیاں تھیں۔" میں نے کہا۔

"صرف چار ہی سے رابطہ ہو سکا ہے۔ باقی ڈر کے مارے روپوش ہوگئی ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا "ہم ساڑھے نو بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔ میرے دو آدمی رقاصہ ریکھا اور دوسری لڑکیوں کو لے کر پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں گے۔"

"کیا ہمیں بھی جانا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن تم سامنے نہیں آؤ گے۔" ٹھاکر نے کہا "جانکی اور روپ متی سامنے آئیں گی۔ جانکی بتائے گی کہ اسے گنیش مندر سے کس طرح اغوا کیا گیا تھا اور روپ متی باقی تفصیلات بتائے گی۔ پنڈت مرلی دھر اور لاجونتی وغیرہ یہ بتائیں گے کہ مندر میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ لاجونتی وہ لڑکی ہے جو کئی مرتبہ اس مندر میں جا چکی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن اگر مرلی دھر اور لاجونتی وغیرہ نے وہاں کوئی گڑبڑ کی تو۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"

"ایسی صورت میں پولیس انہیں اپنی تحویل میں لے لے گی اور خود ہی ان سے سب کچھ اگلوا لے گی۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

اس کے بعد ہم دونوں پنڈت مرلی دھر والے کمرے میں آگئے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اسے سمجھانے لگا کہ اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا تو اسے پولیس کی طرف سے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔

نو بجے کے قریب شنکر نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم روانہ ہوئے تو پونے دس بج رہے تھے۔ ٹھاکر نے اپنی کار کے بجائے روپ متی کی پجارو کو ترجیح دی تھی۔ تین گھنٹوں کی موسلا دھار بارش نے شہر کو الٹ کر رکھ دیا تھا۔ ہر طرف جل تھل ایک ہو رہا تھا۔ کئی سڑکیں اب بھی زیر آب تھیں۔

پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ایک اور سنسنی خیز خبر سننے کو ملی

ے تقریباً ایک گھنٹا پہلے جے پور کلب کی رقاصہ ریکھا کو کے گھر پر بے دردی سے قتل کردیا گیا تھا۔ اس کا باف اس وقت ہوا تھا جب آدھا گھنٹا پہلے ٹھاکر بھانوت کا ایک آدمی ریکھا کو لینے کے لیے تلسی مارگ میں واقع ی کوٹھی پر پہنچا۔ ریکھا اکیلی رہتی تھی۔ گھر کے کام کاج اس کی سیوا کے لیے ایک ملازم اور ایک ملازمہ تھی۔ ر کا آدمی بیل بجاتا رہا لیکن کافی دیر بعد جب کوئی باہر نہیں تو وہ گیٹ کے کھلے ہوئے ذیلی دروازے سے اندر داخل یا۔ وہ ملازم کو آوازیں دیتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ اس بھی کوئی سامنے نہیں آیا تو وہ اندر داخل ہوگیا۔

بیڈ روم میں ریکھا کی لاش دیکھ کر وہ چیخ اٹھا۔ ریکھا کا گلا ہوا تھا۔ پیٹ چاک تھا اور ایک خنجر دستے تک سینے میں ت تھا۔ ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔

ٹھاکر کا آدمی باہر آگیا اور پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اس تعے کی اطلاع دی۔ ایک پولیس پارٹی فوراً ہی ریکھا کی ی کی طرف روانہ ہوگئی جو ابھی تک واپس نہیں آئی

اس صورت حال نے مجھے اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کو بھی قدر بدحواس کردیا تھا۔ ٹھاکر معاملے کو سنبھالنے کی شش کرتا رہا۔

ہیڈ کوارٹر میں جمع اخبار نویس جائے واردات پر جانا ہتے تھے لیکن پولیس کمشنر نے انہیں یہ کہہ کر روک لیا کہ ھا کی لاش اس وقت تک نہیں اٹھائی جائے گی جب تک ل پریس کانفرنس سے فارغ نہیں ہوجاتے۔

میں کمیٹی روم سے ملحق کمرے میں چلا گیا۔ پریس نس شروع ہوگئی۔ پولیس کمشنر پانڈے اخبارات میں ع ہونے والی آج کی اہم ترین خبر کے حوالے سے پس منظر یا تھا پھر پنڈت مرلی دھر، لاجونتی اور دوسری دو لڑکیوں نے اخبار نویسوں کے سامنے اپنے بیانات دیے۔

"میں کسی دباؤ کے بغیر یہ بیان دے رہا ہوں۔" پنڈت دھر کہہ رہا تھا "جانکی دیوی کو میں نے ہی دارا کے کہنے پر مندر سے اغوا کیا تھا۔" وہ جانکی کے اغوا کا مقصد۔۔۔۔ کے پس منظر میں بتانے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا ت ہری رام بدمعاش آدمی ہے۔ اس نے مندر کو عیاشی ڈا بنا رکھا ہے۔ وہاں ہر رات آوارہ عورتوں کو لایا جاتا اور رات بھر رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ کل رات۔۔۔" یک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے

"یہ جھوٹ ہے کہ ہری رام اور دوسرے پنڈتوں نے راج کماری روپ متی اور اس کے مسلمان دوست کو مندر میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی ساتھی جانکی دیوی کی تلاش میں وہاں آئے تھے۔ اس وقت پنڈت ہری رام اور ہم لوگ رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔ رقاصہ ریکھا پنڈت ہری رام کی فرمائش پر برہنہ ہو کر ڈانس کر رہی تھی۔ اسے ہری رام کی خواہش پر ہی بھاری معاوضہ دے کر وہاں لایا گیا تھا۔"

ریکھا کے نام پر سب ہی اخبار نویس چونک گئے تھے۔

پنڈت مرلی دھر نے اپنا بیان جاری رکھا۔ وہ پنڈت ہری رام اور مندر کے دوسرے پجاریوں کے سیاہ کرتوت کھل کر بیان کرتا رہا۔ اس کا یہ انکشاف تو بہت ہی سنسنی خیز تھا کہ دو ہفتے پہلے اسی مندر سے پراسرار طور پر لاپتا ہونے والی پونم نامی ایک خوب صورت عورت کو بھی انہی پنڈتوں نے غائب کیا تھا۔ وہ تین دن تک اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ اس نے ایک مرتبہ موقع پا کر بھاگنے کی کوشش کی تو اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کردیا گیا اور اس کی لاش مندر کے پیچھے پہاڑیوں میں گڑھا کھود کر دبا دی گئی۔

لاجونتی اور دوسری لڑکیوں نے بھی اسی قسم کے بیانات دیے۔ لاجونتی نے تو مزید کئی انکشافات کیے تھے۔ اسے داد عیش دینے کے لیے اکثر اس مندر میں لایا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے شہر کی بعض اہم شخصیات کو بھی وہاں دیکھا تھا۔ انہیں رنگ رلیاں منانے کے لیے خاص طور پر مندر میں بلایا جاتا تھا۔ اخبار نویسوں نے پنڈت مرلی دھر، لاجونتی اور دوسری لڑکیوں سے لاتعداد سوالات کیے۔ جانکی اور روپ متی سے بھی کچھ باتیں پوچھی گئیں۔

آخر میں پولیس کمشنر پانڈے نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ شہر کی مشہور رقاصہ ریکھا کو بھی مندر کے اندر کے حقائق بتانے کے لیے یہاں لایا جانے والا تھا لیکن اسے قتل کردیا گیا۔ اس نے کھل کر اس شبے کا اظہار کیا تھا کہ رقاصہ ریکھا

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات

عظمت کے مینار

قیمت 150/- روپے

ڈاک خرچ 25/- روپے

مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی

کا قتل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو سکتی ہے۔ اسے شاید اس لیے قتل کردیا گیا کہ وہ رات کو رام گڑھ جھیل والے مندر میں رونما ہونے والے واقعے کے سلسلے میں پولیس کو کوئی بیان نہ دے سکے۔

ریکھا کے قتل سے مندر والے واقعے کے دوسرے چشم دید گواہوں کی زندگیوں کو بھی خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ پولیس کمشنر پانڈے نے بتایا کہ پنڈت مرلی دھر کو تو پولیس کی حراست میں رکھا جائے گا جبکہ دوسری لڑکیوں کی حفاظت کے لیے مضبوط انتظامات کیے جائیں گے۔

ڈیڑھ گھنٹے میں یہ پریس کانفرنس ختم ہوگئی۔ تمام اخبار نویس رقاصہ ریکھا کی کوٹھی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ اس سنسنی خیز واردات کے لیے اپنے اپنے اخباروں کے لیے رپورٹ تیار کرسکیں۔

○☆○

اگلے روز اخبارات نے تہلکہ مچادیا اور پھر اسی شام شہر میں ہنگامے شروع ہوگئے۔ دو مخالف دھڑے بن گئے تھے۔ ایک دھڑا دھرم کو نشٹ کرنے کے جرم میں پنڈت ہری رام اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور کڑی سزا کا مطالبہ کررہا تھا جبکہ دوسرا دھڑا راج کماری روپ متی اور اس کے مسلمان عاشق کی گرفتاری کا مطالبہ کررہا تھا۔ ان کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے ہے۔ مسلمانوں کو یہاں سے نکال دیا جائے۔ یہ مطالبہ ہر ہندو مسلم فساد کے موقع پر کیا جاتا تھا۔

ان ہنگاموں پر قابو پانے کے لیے پورے شہر کی پولیس حرکت میں آگئی تھی اور یہ بھی غنیمت تھا کہ ہنگامے شروع ہونے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی اور لوگ گھروں میں دبک گئے تھے۔

بارش رات بھر ہوتی رہی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ ہمیں حویلی میں چھوڑ کر دوبارہ شہر چلا گیا تھا۔

اگلے روز ہنگامے پھر شروع ہوگئے لیکن اب پولیس بلوائیوں سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھی۔ وقفے وقفے سے بارش بھی ہوتی رہی۔ اس طرح ہنگامے زیادہ زور نہیں پکڑ سکے۔

تین چار روز تک یہ صورت حال برقرار رہی۔ بارشوں نے شہر کو اتھل پتھل کردیا تھا جس سے ہنگامہ کرنے والوں کا جوش و خروش بھی دب گیا اگر بارشیں نہ ہوتیں تو صورت حال کچھ مختلف ہوتی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں ہم حویلی سے باہر نہیں گئے۔ موسلا دھار بارش کا سلسلہ اگرچہ رک گیا تھا مگر آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کبھی کبھی ہلکی سی بوندا باندی ہوجاتی۔

اور پھر اچانک ہی ایک روز پھر ہنگامہ شروع ہوگیا۔ ا ہنگامے کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔

جن دنوں یہاں یہ گڑبڑ شروع ہوئی تھی ان دنوں چ گڑھ کا بگڑا ہوا بدقماش اور راج کمار بلونت سنگھ احمد آباد ہوا تھا۔ وہ دو دن پہلے چتور گڑھ سے ہوتا ہوا یہاں آیا تو احمد آباد میں بھی وہ اخبارات میں سب کچھ پڑھتا رہا تھا یہاں آیا تو ہنگامے کسی قدر دب گئے تھے۔ پولیس شہر معززین اور بعض بڑے مندروں کے پنڈت مل بیٹھ کر معا کو سلجھانے کی کوشش کررہے تھے مگر بلونت سنگھ یہ مو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے چند نہایت کٹر قسم کے پنڈ کو جمع کرکے راج کماری روپ متی کے خلاف بھڑکا دیا کچھ کرائے کے غنڈے بھی جمع کرلیے اور نعرے لگاتے ہو روپ متی کی حویلی کی طرف چل پڑے۔ وہ لوگ حویلی کو آ لگادینا چاہتے تھے۔

روپ متی کی حویلی پر پہلے ہی دو کانسٹیبل تعینات تھ اطلاع ملتے ہی پولیس کی بھاری نفری وہاں پہنچ گئی۔ اس وق بلوائیوں کا ٹولہ بلونت سنگھ کی قیادت میں حویلی پر حملہ ہوچکا تھا۔ پولیس بروقت پہنچ گئی۔ بلونت سنگھ تو پولیس کو د ہی کھسک گیا تھا البتہ ایک گھنٹے کی ہنگامہ آرائی کے بعد پنڈت اور کئی غنڈے پولیس کے ہاتھ آگئے جنہیں سلاخو کے پیچھے بند کردیا گیا۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میں حویلی کا قیدی بن کر رہ تھا۔ جانکی بھی بیزار ہورہی تھی اور پھر اسی شام میں نے جانکی نے باہر نکلنے کا فیصلہ کرلیا اور روپ متی کی پجارو کی طرف روانہ ہوگئے۔

شہر کی رونق معمول پر آچکی تھی۔ ہم مختلف بازا میں گھومتے ہوئے ایم آئی روڈ پر راجستھان ہینڈی کرا ایمپوریم سے ذرا آگے انڈین کافی ہاؤس میں آگئے۔ ہم روپ متی وغیرہ کے لیے بہت سی چیزیں خریدی تھیں خیال تھا کہ یہاں ایک کپ کافی پی کر حویلی کی طرف ہوجائیں گے۔

کافی ہاؤس میں بڑی رونق تھی۔ ہمیں ایک میز بھی گئی۔ چند منٹ بعد جو ویٹریس آرڈر لینے کے لیے آئی دیکھ کر ہم اچھل پڑے۔ اس حسین ویٹریس کی کیفیت بھی سے مختلف نہیں تھی۔ وہ بھی متوحش نظروں سے ہما طرف دیکھ رہی تھی۔

ہمیں اپنے سامنے پاکر شاید اس ویٹریس کو اپنی وں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک متوحش وں سے باری باری ہماری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی وں میں عجیب سی چمک لہریں لینے لگی اور پھر ناقابل بیان ی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ وہ جانکی سے لپٹ گئی اور پھر اس مجھے بھی نہیں بخشا۔ وہ خوشی سے چیختے ہوئے میری پیشانی میرے گالوں پر پے در پے بوسے دے رہی تھی۔ ہال میں ے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ یہاں کی شرتی اور سماجی زندگی کا مجھے کچھ کچھ تجربہ ہوچکا تھا۔ توں کا نیم عریاں لباس پہننا تو ایک عام سی بات تھی۔ ب کی طرح یہاں بھی سرعام بوس و کنار کو برا نہیں سمجھا تا تھا لیکن میں مارے شرم کے کٹا جارہا تھا۔ کافی ہاؤس کے یں درجنوں لوگ بیٹھے ہوئے تھے جو دلچسپ نظروں سے ب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اس ویٹریس کا بس چلتا تو گھنٹوں طرح مجھ سے لپٹی رہتی اور میری پیشانی اور گال چومتی تی لیکن میں نے ہی اس کی دونوں بانہیں پکڑ کر اسے اپنے پ سے الگ کیا تھا۔

میری یہ داستان پڑھنے والے تھائی لینڈ کے سرحدی شہر نگ سائین میں ملنے والی پولیس وومن رنگ سنت کی بیٹی کو نہیں بھولے ہوں گے جو اپنی ماں کی عبرت ناک موت بعد ہم سے آن ملی تھی اور گولڈن ٹرائی اینگل تک ے ساتھ آئی تھی۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں اس نے قدم پر ہمارے ساتھ موت سے پنجہ آزمائی کی تھی۔ ڈن ٹرائی اینگل سے فرار ہوکر ہم برما کے ایک سرحدی میں پہنچ گئے تھے جہاں کئی روز تک ہم ایک نہایت پس قبیلے کے مہمان رہے تھے۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں ی مدد کرنے والے میاں بیوی بوما اور ہوفا بھی ہمارے تھے۔ بوما کے اس چھوٹے سے سرحدی گاؤں سے میں نکی تو چین کی سرحد کی طرف چلے گئے تھے اور سونیا نے ر ہوفا کے ساتھ ہندوستان کا رخ کیا تھا۔ اس نے کہا تھا ہندوستان ہی میں کہیں سیٹ ہونے کی کوشش کرے

ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ برما سے آسام کے راستے دوستان میں داخل ہونے کے بعد کئی بڑے بڑے شہر راستے پڑتے تھے لیکن کیا یہ ضروری تھا کہ سونیا کو بھی پورا ستان پار کرکے چاروں طرف سے ریگستان میں گھرے شہر جے پور ہی آنا تھا مگر اتفاقات سے انکار نہیں کیا تا تھا اور یہ حیرت انگیز اتفاق ہی تھا کہ ریگستان میں ہوائی جہاز کریش ہونے کے بعد میں اور جانکی جے پور پہنچ گئے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز اتفاق یہ ہوا تھا کہ یہاں میرا ازلی دشمن دارا بھی موجود تھا جو اس رات رام گڑھ جھیل والے مندر میں ایک جھلک دکھلا کر غائب ہوگیا تھا اور یہ اس سے بھی بڑا اور ناقابلِ یقین اتفاق تھا کہ اس وقت سونیا ہمارے سامنے موجود تھی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" سونیا اس مرتبہ جانکی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔ فرط انبساط سے اس کے لہجے میں ہلکی لرزش تھی۔ "میں تو سمجھی تھی کہ برما کے اس گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے کی صورت بھی نہیں دیکھ پائیں گے۔"

"اسے اتفاق کہہ لو کہ ہم ایک زندہ حقیقت کی طرح اس وقت تمہارے سامنے موجود ہیں۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اور اس سے مہان (بڑا) اتفاق یہ ہے کہ ہمارا وہ دشمن بھی اس شہر میں موجود ہے جس کے تعاقب میں ہم گولڈن ٹرائی اینگل جیسے موت کے حصار میں گھس گئے تھے۔"

"اوہ! تمہارا مطلب ہے ــــ دارا۔" وہ چونک کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ تم لوگ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئے ہو لیکن تم لوگ تو برما سے چین کی طرف نکل گئے تھے۔" یہ بات اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔

"ہاں۔ یہ لمبی باتیں ہیں۔ اطمینان سے بیٹھ کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ سنیں گے اور سنائیں گے۔ اس وقت تمہیں یہاں ویٹریس کے لباس میں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہورہی ہے لیکن میں یہ نہیں بھولا ہوں کہ ہم یہاں کافی پینے آئے ہیں اور ــــ" میں خاموش ہوکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "لوگ ہمیں اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے ہمارے سروں پر سینگ نکل آئے ہوں۔ بہتر ہے تم ہمیں کافی پلاؤ۔ یہاں سے چھٹی کے بعد کسی جگہ بیٹھ کر تفصیلی باتیں ہوں گی۔"

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم لوگ گاہک کی حیثیت سے یہاں آئے ہو۔" سونیا نے کہا "کون سی کافی پیو گے۔ میرا خیال ہے ایسپریسو (ESPRESSO) ہی مناسب رہے گی۔"

"مجھے تمہاری پسند سے اتفاق ہے۔" جانکی بولی "اب جلدی سے لے آؤ۔"

سونیا مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے جانکی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"کیسا حسین اتفاق ہے کہ ہم سب ایک جگہ پر جمع

ہو رہے ہیں۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی "سونیا اچھی لڑکی ہے۔ یہ مجھے پہلے بھی پسند تھی۔ اس کے ساتھ اچھا وقت گزرے گا۔"

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار سونیا کی تعریف کر چکی تھی لیکن اگر اسے یہ پتا چل جائے کہ گولڈن ٹرائی اینگل کی مہم کے دوران میں سونیا سے میرا کوئی اور تعلق بھی رہ چکا ہے تو وہ سونیا کا گلا گھونٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگائے گی۔

پندرہ بیس منٹ بعد سونیا کافی لے کر آگئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔ اگر ہماری جان پہچان نہ ہوتی تو اسے محض کاروباری مسکراہٹ کہا جا سکتا تھا لیکن وہ حقیقی مسکراہٹ تھی جو اس کی حقیقی خوشی کی عکاسی کر رہی تھی۔

میں سونیا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کافی ہاؤس کا مخصوص ڈریس پہن رکھا تھا۔ پستئی کلر کا مختصر بلاؤز اور اسی رنگ کا منی اسکرٹ۔ بلاؤز پر سامنے بائیں طرف کافی ہاؤس کا مونوگرام بھی لگا ہوا تھا۔ جب وہ کافی کا مگ میرے سامنے رکھنے کے لیے جھکی تو میری نظریں غیرارادی طور پر اس کے گریبان کی طرف اٹھ گئیں۔ بلاؤز کا گلا کافی فراخ تھا۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں میں ویٹریسوں کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے اور ان کے لیے لباس بھی ایسے منتخب کیے جاتے ہیں کہ انہیں دیکھنے کے بعد گاہک کسی دوسرے ریسٹورنٹ میں جانے کا خیال بھی ذہن میں نہ لائیں۔ کافی کا مگ رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے سونیا کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔

"تم لوگ کافی پیو۔ میں ڈریس بدل کر آتی ہوں پھر ہم گھر چلیں گے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا، جواب کا انتظار کیے بغیر کولھے مٹکاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور ہال کے آخر میں ایک دروازے میں غائب ہوگئی۔

ہم دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے۔ میں پہلے بھی ایسپریسو (ESPRESSO) کافی کئی مرتبہ پی چکا تھا لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسی عمدہ اور خوش ذائقہ کافی میں نے پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میں گاہے گاہے نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھ بھی لیتا تھا اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی شخص کو میں نے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جانکی کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ جانکی یہاں آنے کے بعد زیادہ تر ساڑی ہی پہنتی تھی اور یہ لباس اس پر لگتا بھی بہت اچھا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کالی اور پیلی دھاریوں والی باریک ریشمی ساڑی پہن رکھی تھی جس کا پلو بار بار پھسل کر نیچے گر رہا تھا۔ بلاؤز کچھ زیادہ مختصر تھا اور اسی لیے لوگوں کی نظریں بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ہال کے دائیں طرف آخر میں کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر منیجر بھی بار بار ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے تو شاید یہ تجسس ہو کہ ہم کون ہیں جن سے اس کے کافی ہاؤس کی ویٹریس اس قدر گرم جوشی اور والہانہ انداز میں ملی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سونیا کو باہر والے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ہم دونوں چونک گئے۔ اس وقت اس نے کھلے پائنچے والی سفید پتلون اور گہرے نیلے رنگ کی اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ کندھے پر ایک خوب صورت پرس بھی لٹکا ہوا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی ہماری میز پر آئی اور ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس وقت بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں سائیڈ اسٹریٹ والے دروازے سے نکل کر آئی ہوں۔" وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی "میں نے میڈم سے کہہ دیا تھا کہ میری لاٹری نکل آئی ہے اس لیے مجھے کم از کم آج کے باقی دن کی چھٹی چاہیے۔"

"لاٹری؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اتنی خوشی تو کسی بہت بڑی لاٹری کے نکلنے پر ہی ہوتی ہے۔ جتنی تم لوگوں کو پا کر ہوئی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ" سونیا نے کہا "میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔"

"چلو لیکن بل۔۔۔"

"بل ادا ہو چکا۔" سونیا نے میری بات کاٹ دی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور ہم تینوں نے اپنی اپنی سیٹیں چھوڑ دیں۔ شیشے والے دروازے کے پاس پہنچے تو باوردی دربان نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ وہ لمبا تڑنگا راجپوت دربان خالص راجستھانی لباس میں تھا۔ سر پر رنگ برنگی بل کھاتی ہوئی پگڑی، کمر پر سنہری پٹا، بائیں پہلو میں میان میں تلوار بھی لٹکی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی بل کھاتی ہوئی مونچھوں نے اس کے چہرے کو خاصا بارعب بنا دیا تھا۔

کافی ہاؤس سے نکلتے ہوئے سونیا بتا رہی تھی کہ یہ کافی ہاؤس شوبھا دیوی نامی ایک بیوہ عورت کی ملکیت ہے۔ اس کا پتی (شوہر) ڈاکٹر تھا۔ ٹھاکر اور راجا قسم کے چند بڑے بڑے لوگ اس کے پینل پر تھے جن سے اس نے خوب دولت کمائی تھی۔ کئی سال پہلے اس نے ایک راجا کو ایک نہایت موذی

۔۔۔ سے نجات دلائی تھی۔ راجا طویل عرصے سے اس ۔۔۔ مرض میں مبتلا تھا۔ بہت علاج کروائے تھے۔ بہت پیسہ ۔۔۔ کیا تھا مگر بقول شخصے۔۔۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ۔۔۔ آخر نہایت مایوسی کی کیفیت میں اس نے ڈاکٹر وجے شرما ۔۔۔ رجوع کیا۔ وجے شرما کے تین مہینوں کے علاج سے راجا ۔۔۔ کا وہ مرض جاتا رہا اور وہ پہلے کی طرح ہٹا کٹا ہوگیا۔ ۔۔۔ صاحب نے خوش ہو کر یہ بلڈنگ وجے شرما کو انعام میں ۔۔۔ دی۔

۔۔۔ ایم۔ آئی روڈ شہر کا سب سے مہنگا کاروباری علاقہ ہونے ۔۔۔ سے یہ دو منزلہ عمارت بھی بہت قیمتی تھی جس کے ۔۔۔ ونڈ فلور پر ایک انشورنس کمپنی کا دفتر اور اوپر کی منزل پر ۔۔۔ مارواڑی سیٹھ کی رہائش تھی جس کا کرایہ بھی وجے شرما ۔۔۔ ملتا تھا۔

۔۔۔ چند سال پہلے وجے شرما کا دیہانت (انتقال) ہوگیا۔ ۔۔۔ دیوی نے عقل مندی یہ کی کہ پتی کی جمع پونجی پر اکتفا ۔۔۔ نے کے بجائے انشورنس کمپنی اور مارواڑی سیٹھ سے یہ ۔۔۔ خالی کروالی۔ گراؤنڈ فلور پر اس نے یہ معیاری کافی ۔۔۔ کھول لیا اور عمارت کے اوپر والے حصے میں رہائش ۔۔۔ رکرلی۔ یہ کاروباری اور بارونق علاقہ تھا۔ اس علاقے ۔۔۔ اگرچہ چند اور بھی معیاری ریسٹورنٹ تھے لیکن یہ کافی ۔۔۔ بھی خوب چل نکلا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے اس نے ۔۔۔ آنجہانی شوہر کے ایک دوست کو جو سرکاری ملازمت ۔۔۔ ریٹائر ہو چکا تھا، منیجر رکھ لیا۔ کبھی وہ خود بھی کاؤنٹر پر بیٹھ ۔۔۔ کرتی تھی۔

ہم تینوں باتیں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر اس طرف چل ۔۔۔ تھے جہاں سڑک کے کنارے ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ ۔۔۔ درمیان میں تھا اور میرے دائیں بائیں سونیا اور جانکی۔

اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ ہر طرف رنگ برنگی ۔۔۔ تیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس علاقے کی رونق اپنے عروج پر ۔۔۔ مقامی باشندوں کے علاوہ بڑی تعداد میں غیر ملکی سیاح ۔۔۔ نظر آرہے تھے۔

جب میں پجارو کے قریب رکا تو سونیا چونکے بغیر نہیں رہ سکی۔

"یہ۔۔۔ یہ گاڑی۔۔۔؟"

"ہماری ہے۔" میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کیا۔

"اس کا مطلب ہے تم لوگ بہت عرصے سے یہاں ہو ۔۔۔ سیٹ ہو۔" وہ اپنی حیرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ۔۔۔ ئے بولی۔

"سیٹ ہونے سے اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ ہم یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں اور مستقل طور پر یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔" میں نے گاڑی کے دروازے کے لاک میں چابی لگاتے ہوئے جواب دیا "اور جہاں تک اس گاڑی کا تعلق ہے تو یہ ایک راج کماری نے مجھے انعام میں دی تھی۔"

"اتنی شان دار گاڑی۔۔۔ انعام میں۔۔۔؟" اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

"اگر کوئی راجا ڈاکٹر وجے شرما کو کروڑوں روپے مالیت کی بلڈنگ انعام میں دے سکتا ہے تو کوئی راج کماری اپنی جان بچائے جانے پر مجھے یہ معمولی سی گاڑی انعام میں نہیں دے سکتی!"

"حیرت انگیز!" سونیا بولی۔

"حیرت کا مظاہرہ بعد میں اطمینان سے کریں گے۔ اس وقت گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے کہا۔

سونیا اور جانکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

"کہاں چلنا ہے؟" میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سونیا سے پوچھا۔

"نیو گیٹ۔ میں وہیں ایک فلیٹ میں رہتی ہوں۔" سونیا نے جواب دیا۔

میں نے گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور تقریباً پچاس گز آگے سگنل پر یو ٹرن لے کر اس سڑک کے دوسرے حصے پر واپس موڑ لی۔

نیو گیٹ زیادہ دور نہیں تھا۔ اس سڑک پر پریم پرکاش سینما کے سامنے سے گزر کر تقریباً سو گز آگے نکلنے کے بعد سونیا کے کہنے پر میں نے گاڑی بائیں طرف ایک کشادہ گلی میں موڑ لی اور پچاس گز کا مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی ایک کئی منزلہ عمارت کے سامنے روک لی۔

اس کشادہ گلی کے دونوں طرف بلند عمارتیں تھیں۔ بعض عمارتوں کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں تھیں اور بیشتر عمارتیں رہائشی تھیں۔ میں نے جس عمارت کے سامنے گاڑی روکی تھی، اس کے نیچے کوئی دکان وغیرہ نہیں تھی۔

عمارت خاصی پرانی تھی۔ گیٹ کھلا ہوا تھا اور لگتا تھا جیسے یہ کبھی بند نہ ہوا ہو۔ گیٹ کے اندر کافی کشادہ جگہ تھی۔ سامنے دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ بجلی کے لاتعداد میٹر لگے ہوئے تھے اور تار مکڑی کے جالے کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ میٹروں کے قریب ہی چند سائیکلیں بھی

کھڑی تھیں۔ دو تین سائیکلیں تو ایسی تھیں جنہیں شاید کبھی استعمال ہی نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے قریب ہی تین چار بچیاں اسٹاپو کھیل رہی تھیں۔ گیٹ کے ساتھ ہی دائیں طرف دیوار پر ٹنگے ہوئے لکڑی کے ایک باکس میں بہت سارے خطوط رکھے ہوئے تھے۔

اس عمارت میں صفائی کا بالکل دھیان نہیں رکھا گیا تھا۔ گیٹ کے اندر کی طرف کوڑا بھی بکھرا ہوا تھا اور دیواریں بھی اس قدر گندی ہو رہی تھیں کہ ان کا اصل رنگ چھپ گیا تھا۔ غالباً کئی برسوں سے رنگ روغن پر توجہ نہیں دی گئی تھی۔

گیٹ کے دائیں بائیں اوپر آمدورفت کے لیے زینے تھے۔ زینوں کی دیوار اور ریلنگ بھی بہت میلی ہو رہی تھی۔ عمارت میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ہم سونیا کے پیچھے بائیں طرف والے زینے کی طرف بڑھ گئے۔

سونیا کا فلیٹ دوسری منزل پر بائیں طرف والی راہداری کے آخر میں تھا۔ دو کمروں کے اس فلیٹ میں ایک بہت مختصر سا لاؤنج اور چھوٹا سا کچن بھی تھا۔ باتھ روم دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔ سامنے ساتھ ساتھ دو کمرے تھے اور کوئی بھی کمرا دس بائی دس فٹ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ دونوں کمروں کے دروازے بھڑے ہوئے تھے۔ سونیا ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ یہ غنیمت تھا کہ ان کمروں کی کھڑکیاں سامنے گلی کی طرف کھلتی تھیں۔ سونیا نے کمرے میں داخل ہو کر پردہ ایک طرف کھینچ دیا اور کھڑکی کھول دی۔

کمرے میں گرے کلر کا سستا سا کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ کھڑکی والی دیوار کے ساتھ دو کرسیاں اور ان کے ساتھ ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔ دوسری دیوار کے ساتھ سنگل بیڈ بچھا ہوا تھا اور سامنے والی دیوار میں ایک الماری بنی ہوئی تھی۔ الماری کے لکڑی کے دروازے کے اوپر والے حصے پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ بیڈ پر میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ سونیا نے وہ کپڑے اٹھا کر کمرے کے ایک کونے میں ڈال دیے۔

"بیٹھو۔" وہ ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ فلیٹ میں نے ایک اور لڑکی کے ساتھ مل کر کرائے پر لے رکھا ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم ہے اور ایک ہفتے کی چھٹی لے کر جودھ پور گئی ہوئی ہے۔ شاید پرسوں واپس آجائے گی۔"

میں اور جانگی کھڑکی کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سونیا سامنے کھڑی باری باری ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اس قدر خوشی ہو رہی ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "بہت سی باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ڈھیروں باتیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ چائے پیو گے یا کافی ہی چلے گی۔"

"کافی ابھی تو پی کر آئے ہیں لیکن بہرحال، تم کچھ پلانے پر بضد ہو تو چائے بنالو۔" میں نے جواب دیا۔

سونیا کمرے سے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جانگی بھی اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ میں بھی اٹھ کر باہر آگیا۔ وہ دونوں کچن میں تھیں۔ میں لاؤنج میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہاں فرش پر کوئی دری یا قالین نہیں بچھا تھا۔ تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچن کے دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا فریج رکھا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف کونے میں ٹرالی پر چودہ انچ کا رنگین ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ ٹرالی کے نچلے حصے میں وی سی پی اور چند وڈیو کیسٹیں بھی رکھے ہوئے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ کمرا بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش کر رہا تھا جو میں سونیا کے کمرے میں دیکھ چکا تھا۔ یہاں بھی بیڈ پر میلے کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ سونیا کے ساتھ رہنے والی لڑکی بھی کچھ بے پروا واقع ہوئی تھی۔

وہ دونوں چائے لے کر آگئیں۔ سونیا نے چھوٹی میز کمرے کے بیچ میں کردی اور چائے کے کپ رکھ دیے۔ جانگی میرے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گئی اور سونیا بیڈ پر پیر لٹکا کر ٹک گئی۔

"ہم تو محض حادثاتی طور پر یہاں پہنچے تھے۔ تم بتاؤ یہاں کیسے آگئیں؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" سونیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "ہم برما سے نکل کر آسام سے ہوتے ہوئے انڈیا کے صوبہ بہار میں پٹنہ پہنچ گئے تھے۔ راستے میں ہم نے بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ آسام میں دو مرتبہ ہم موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے تھے۔ وہاں قبائلی طویل عرصے سے حکومت سے برسرِپیکار ہیں۔ ایک مرتبہ تو سرکاری فوجیوں کے ساتھ ہم بھی ان کے نرغے میں آگئے تھے اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ قبائلیوں ہی نے ہمیں وہاں سے بچا کر نکال دیا تھا۔ بہرحال، ہم مصیبتیں جھیلتے ہوئے کسی نہ کسی طرح پٹنہ پہنچ گئے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"بوما کا خیال تھا کہ ہم پٹنہ ہی میں سیٹ ہونے کی کوشش کریں گے۔ اسے وہاں کام بھی مل گیا تھا لیکن دو مہینے بعد وہاں ایک ایسے آدمی کو دیکھ لیا جو کچھ عرصے گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی رہ چکا تھا۔ بوما کا خیال تھا کہ شاید وہ بھی گولڈن ٹرائی اینگل سے بھاگ کر آیا ہو مگر اس سے رابطہ کرنے سے پہلے وہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرلینا چاہتا تھا اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ شخص پٹنہ میں منشیات کا ایک ریکٹ چلا رہا تھا اور اس کے رابطے اوپر گولڈن سینڈ یکیٹس سے بھی تھے۔ بوما نے وہاں سے بھاگ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔

"ہم مصائب جھیلتے ہوئے کسی نہ کسی طرح دہلی پہنچ گئے۔ خیال تھا کہ دہلی جیسے بڑے شہر میں ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہاں ہمیں کوٹلہ فیروز شاہ کے علاقے میں رہائش کے لیے ایک کھولی بھی مل گئی اور بوما کو کام بھی مل گیا۔

"بوما اور ہوفا میرا بہت خیال رکھے ہوئے تھے۔ ان کا بچہ بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا لیکن میں ان پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی۔ میں نے بھی نوکری کی تلاش شروع کردی لیکن ہر جگہ میری خوب صورتی آڑے آتی رہی۔ ایک رات کے لیے مجھے اپنے بستر کی زینت بنانے کو تیار تھے مگر نوکری نہیں ملی۔ کہیں نوکری کی امید دلائی بھی گئی تو یہ شرط رکھی گئی کہ میں ان کا دل بھی بہلاؤں گی۔

"تین مہینے گزر گئے۔ ایک شام جب میں اسی طرح مایوس ہو کر واپس لوٹی تو یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ بوما اور ہوفا کو جاسوسی کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔ یہ بات تو میں بہت دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ ہوفا کی شکل و صورت اس کے لیے کچھ گڑبڑ پیدا کر رہی تھی۔ وہ چینی تھی اور چینیوں کو ہندوستان میں شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا اور بالآخر کسی شخص نے ہوفا کو چینی جاسوس ہونے کے شبہے میں گرفتار کرا دیا اور بوما بھی لپیٹ میں آگیا۔

"پولیس کے چند اہلکار سادہ لباس میں میرے انتظار میں وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جیسے ہی وہاں پہنچی، مجھے بھی حراست میں لے لیا گیا۔

"حراست کے دوران میں، میں نے صرف ایک مرتبہ ہوفا اور بوما کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آئے اور پھر کسی طرح یہ بات باہر بھی پہنچ گئی کہ میں بدھا کی پیروکار ہوں اور ان دونوں سے میرا تعلق صرف اتنا ہے کہ میں ان کے ساتھ برما سے آئی تھی۔

"ہندوستان میں تبت کے ہزاروں مہاجرین آباد ہیں۔ ان مہاجرین کو اگرچہ میسوری اور دھرم شالہ کے علاقوں تک محدود رکھا گیا ہے لیکن لاتعداد تبتی دہلی میں بھی آباد ہیں۔

"تبت کا جلا وطن لاما بھی اتفاق سے ان دنوں دہلی میں موجود تھا۔ میری گرفتاری کی خبر اس تک بھی پہنچ گئی اور پھر محض دھرم کی بنیاد پر تبتی باشندوں کی طرف سے میری رہائی کی کوشش شروع ہوگئی۔ لاما اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس کے ایک نمائندے نے جیل میں مجھ سے ملاقات بھی کی۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ میں کون ہوں اور یہاں تک کیسے پہنچی ہوں۔

"میرے لیے تھائی سفارت خانے سے بھی رابطہ کیا گیا اور سفارت خانے کے ذریعے تھائی لینڈ سے بھی میرے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ بالآخر چار مہینے تک جلا وطن تبتی رہنماؤں اور تھائی سفارت خانے کی کوششوں سے مجھے جاسوسی کے الزام سے بری کردیا گیا۔ تاہم بغیر پاسپورٹ ہندوستان میں داخل ہونے کے جرم میں مجھے تین مہینوں کی قید کی سزا دی گئی۔

"یہ تین مہینے میں نے دہلی کی تہاڑ جیل میں گزارے۔ یہ دنیا کی خوفناک ترین جیل ہے۔ اس جیل میں قانون کا نہیں بدمعاشوں اور غنڈوں کا راج ہے۔ یہاں انہی کا قانون چلتا ہے اور جیل کے حکام انہی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ بہرحال، میں نے اس جیل میں تین مہینے جس طرح گزارے وہ میں ہی جانتی ہوں۔

"ہند سرکار میری سزا پوری ہونے کے بعد مجھے تھائی لینڈ واپس بھیجنا چاہتی تھی لیکن میں تھائی لینڈ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس موقع پر بھی جلا وطن تبتی رہنما میرے کام آئے اور انہی کی کوششوں سے مجھے ہندوستان میں رہنے کی اجازت مل گئی اور مجھے دھرم شالہ بھیج دیا گیا۔ میں نے دو مہینے دھرم شالہ کی عبادت گاہ میں گزارے اور پھر شملہ اور انبالہ ہوتی ہوئی دوبارہ دہلی آگئی۔

"یہاں بڑے بڑے شکاری گھات لگائے بیٹھے تھے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ اسی دوران میں میری ملاقات نندہ دیوی نامی ایک عورت سے ہوگئی جو مجھے یہاں لے آئی۔

"میں نندہ دیوی کو ایک شریف عورت سمجھتی تھی لیکن وہ بڑی بدمعاش نکلی۔ وہ بہت اونچی شے تھی جو جے پور کے بڑے بڑے لوگوں کو لڑکیاں سپلائی کرتی تھی۔ میں پہلی فرصت میں موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ نکلی اور کسی طرح شوبھا دیوی تک پہنچ گئی۔ اس نے مجھے اپنے کافی ہاؤس میں ملازمت دے دی۔ چند روز تو میں کافی ہاؤس کے اوپر ایک کمرے میں

رہی پھر مادھوری کے ساتھ اس فلیٹ میں رہنے لگی اور گزشتہ چھ مہینے سے یہاں ہوں۔"

"بوما اور ہوفا کے بارے میں کچھ پتا چلا۔ ان کا کیا ہوا؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"میں نے جیل سے رہا ہونے کے بعد ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں کسی اور جیل میں رکھا گیا تھا اور مجھے ان سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مجھے ان دونوں کا افسوس تو ہے لیکن سب سے زیادہ افسوس اس معصوم بچے کا رہے گا۔" سونیا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیا "ان کا افسوس تو مجھے بھی ہو رہا ہے۔ بہرحال، ہم ان کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے۔"

"اور تم لوگ یہاں کیسے پہنچے، کیا وارا کا پیچھا کرتے ہوئے؟" سونیا نے پوچھا۔

"محض حادثاتی طور پر۔" میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں کہا "یہ محض اتفاق ہے کہ ہم کافی پینے کے لیے وہاں رک گئے تھے ورنہ ہمیں پتا بھی نہ چلتا کہ تم بھی جے پور میں موجود ہو۔"

بات کرتے ہوئے میری نظر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔ روپ متی پریشان ہو رہی ہوگی۔"

"روپ متی کون؟" سونیا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "یہاں بھی ہمیں کچھ ایسے لوگ مل گئے ہیں جو ہماری سچائی پر وشواس (یقین) رکھتے ہیں اور ہماری خاطر بڑی سے بڑی برائی سے ٹکرانے کی قوت رکھتے ہیں۔"

"اوہ!" سونیا کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی "پھر تو میں ان لوگوں سے ملنا چاہوں گی۔"

"ضرور ملواؤں گا۔" میں نے کہا اور سونیا سے اس کے کافی ہاؤس کا فون نمبر لے لیا اور اس کی ڈیوٹی کے اوقات بھی معلوم کر لیے۔

سونیا ہمیں رخصت کرنے کے لیے عمارت کے باہر تک آئی تھی۔ پجارو کے قریب پہنچ کر جانکی نے مجھ سے چابی لے لی اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے سونیا سے ہاتھ ملایا اور گاڑی کے پیچھے سے گھوم کر دوسری طرف جانے لگا تو وہ میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

"دوپہر ایک بجے تک میں اپنے فلیٹ میں اکیلی ہوتی ہوں۔ کل صبح آجانا مگر جانکی کے بغیر۔"

میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ڈھٹائی سے مسکرا دی۔ میں پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟" جانکی نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں چونک گیا۔ بڑی تیز نگاہ تھی اس کی۔

"اوہ! کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا "کہہ رہی تھی اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔"

"شاید تم صحیح بات بتانا نہیں چاہتے۔" جانکی نے کہا اور گاڑی کو گلی سے نکال کر مین روڈ پر لے آئی۔

"ہوئی نا خالص عورتوں والی بات۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تمہارے لیے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ احتیاط سے گاڑی چلاؤ۔"

جانکی نے مزید جرح نہیں کی بلکہ وہ موضوع بدل کر اب ہم بوما اور ہوفا کے بارے میں باتیں کرنے لگے تھے۔ مجھے واقعی ان دونوں کی گرفتاری کا افسوس ہو رہا تھا۔ ہوفا کا چینی ہونا ہندوستان میں اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا اور بوما اس لیے رگڑا گیا تھا کہ وہ اس کا شوہر تھا۔

"دراصل یہ سب کچھ اندرا گاندھی کے دور کی ایمرجنسی کا نتیجہ ہے۔" جانکی کہہ رہی تھی "ایمرجنسی ابھی تک نافذ ہے جس سے نہ صرف ہندوستان کے عوام عذاب کا شکار ہیں بلکہ غیر ملکی بھی وقتاً فوقتاً اس کالے قانون کی زد میں آتے رہتے ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "جب ہندوستان فرنگیوں کے شکنجے سے آزاد ہوا تو چین سے ہندوستان کے بڑے اچھے تعلقات تھے لیکن پنڈت نہرو ہی کے دور میں ان تعلقات میں رخنہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ ادھر چین نے تبت کے خود مختار علاقے پر پنجے گاڑنا شروع کر دیے تھے۔ تبت میں کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی۔ بدھا کے یہ پیروکار جدال و قتال سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔ کبھی فوج کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ صرف دلائی لاما کی حفاظت کے لیے چند محافظ ہوتے ہیں۔"

"جس طرح ہندوستان نے ہمدرد بن کر سکم، بھوٹان اور گوا پر قبضہ کیا تھا، چین نے تبت میں بالکل یہی پالیسی اختیار کی تھی۔ وہ بُدھا کے ان سیدھے سادے اور بے ضرر پیروکاروں کا ہمدرد بن کر تبت میں داخل ہوا اور ہشت پا کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ اصلاحات کے نام پر قدم مضبوط کیے جانے لگے۔ چینیوں کو وہاں لا کر آباد کیا جانے لگا۔ تبتیوں کی زرخیز زمین چھین کر چینی آباد کاروں کو دے دی گئی اور اصل مالکوں کو بنجر اور ویران پہاڑوں کی طرف دھکیلا جانے لگا جس کے نتیجے میں تبتی باشندوں کے دلوں میں چینیوں کے لیے نفرت بھرتی گئی اور مسلح تصادم شروع ہو گئے۔

"چینی فوج نہتے بدھا پیروکاروں پر ظلم کے پہاڑ توڑتی رہی۔ انہیں طاقت کے زور پر ان کے ملک سے نکالا جا رہا تھا۔ ہزاروں تبتی مصائب جھیلتے ہوئے برف پوش بلند پہاڑوں کے اس پار نیپال اور انڈیا کی طرف ہجرت کرنے لگے۔

"بہت سے تبتی باشندوں نے اپنے ہی ملک میں عبادت گاہوں میں پناہ لے لی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ چینی فوج عبادت گاہوں کے تقدس کا خیال رکھے گی اور وہ لوگ محفوظ رہیں گے لیکن چینی فوجیوں نے ان عبادت گاہوں کو بھی مقتل بنا دیا۔ ہزاروں معصوم اور بے گناہ تبتی باشندے ان عبادت گاہوں میں ہی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

"تبتی باشندوں کے قتل عام کے ساتھ چینی پورے تبت میں اصلاحات کے نام پر سڑکوں کا جال بچھا رہے تھے۔ فوجی تنصیبات قائم کر رہے تھے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ تبت پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور پھر انہوں نے لہاسہ میں بھی قدم جما لیے۔

"دلائی لاما محض قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اسے محل سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ان دنوں شدید بیمار تھا اور پھر ایک رات وہ اپنے چند جاں نثاروں کے ساتھ محل سے نکل گیا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد چینی فوج نے پوٹالا محل کو گھیرے میں لے کر گولا باری کر دی۔ تبت میں بدھا کے پیروکاروں کا یہ عظیم روحانی مرکز چند ہی گھنٹوں میں کھنڈر بن گیا۔

"دلائی لاما مصائب جھیلتا ہوا کسی نہ کسی طرح ہندوستان پہنچ گیا جہاں اس وقت کے ہندوستان کے پردھان منتری (وزیر اعظم) پنڈت نہرو نے اسے سیاسی پناہ دی۔ اس کے ساتھ ہی تبتی پناہ گزیں جوق در جوق ہندوستان پہنچنے لگے۔

"ان دنوں پنڈت نہرو کے چینی حکمرانوں سے بعض معاملات پر اختلافات شروع ہو چکے تھے۔ دلائی لاما کو ہندوستان میں سیاسی پناہ دینے سے ان دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات مزید بگڑتے چلے گئے۔

"بعد میں ان دونوں ملکوں کے بیچ سرحدی جھڑپیں اور جنگیں بھی ہوئیں۔ ہندوستان میں بہت سے چینی آباد تھے۔ ان کی وفاداریاں مشکوک ہو گئیں۔ ان کی حرکات و سکنات پر شبہ کیا جانے لگا۔ یہ تو ان چینیوں کی صورت حال ہے جو نسل در نسل یہاں آباد ہیں۔ باہر سے آنے والوں کی تو کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ ان کی ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔

"ہوفا برما کی طرف سے آئی تھی۔ وہ پہلے پٹنہ میں رہی پھر مختلف شہروں سے ہوتی ہوئی دہلی آگئی۔ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بغیر ویزے اور پاسپورٹ کے اس ملک میں داخل ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ آسام میں داخل ہوتے ہی بھارتی انٹیلی جنس کی نظروں میں آگئی ہو اور اس کی نقل و حرکت پر شبہ ہو گیا ہو۔

"بھارت میں ٹاڈا کا قانون نافذ ہے اور یہ کالا قانون کسی کو نہیں بخشتا۔ ہوفا کو حراست میں لیے کئی مہینے گزر چکے ہیں۔ بھگوان جانے اب تک اس کا کیا حشر ہو چکا ہوگا یا کیا ہونے والا ہوگا۔ سونیا کی یہ خوش قسمتی ہے کہ دھرم کی بنیاد پر اسے کچھ اچھے لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہو گئی اور آج وہ آزادی سے گھوم پھر رہی ہے۔ ورنہ ہو سکتا ہے، وہ بھی کسی جیل میں پڑی سڑ رہی ہوتی اور ہمیں اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ملتی۔"

"بہت معلومات ہیں تمہیں ہندوستانی سیاست کے بارے میں۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہندوستان میرا وطن مالوف ہے۔" جانکی مسکرائی "ہر شخص کو، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں پیدا ہوا ہو، اپنے آبائی وطن سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ہوتا ہے۔ میں جب تھائی لینڈ میں تھی تو ہندوستان کے بارے میں پڑھتی رہتی تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ یہاں آکر بھی میں باقاعدگی سے اخبار پڑھتی ہوں۔ اس سے مجھے یہاں کی سیاست کا کچھ نہ کچھ پتا چلتا رہتا ہے۔ ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ آج کل پھر ہندوستان کی سیاست میں ایمرجنسی کے خلاف کچھ بازگشت سنائی دینے لگی ہے لیکن میں پورے وثوق سے کہتی ہوں کہ یہ ایمرجنسی اب مزید کئی سال تک ختم نہیں ہوگی کیونکہ اس کالے قانون کے نفاذ ہی میں حکمرانوں کی بھلائی پوشیدہ ہے۔"

میں بڑی محویت سے جانکی کی باتیں سن رہا تھا اور پھر جیسے ہی میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا، چونک سا گیا۔ ہم باتوں میں اس قدر محو رہے تھے کہ اصل راستے سے کسی اور طرف

نکل آئے تھے۔ میں نے جانکی کو متوجہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں راستہ بھولی نہیں ہوں' جان بوجھ کر اس طرف آئی ہوں۔" اس نے گاڑی کو ایک اور کشادہ سڑک پر موڑ دیا "جان بوجھ کر یہ لمبا راستہ اختیار کیا ہے تاکہ حویلی پہنچنے سے پہلے اطمینان سے کچھ باتیں کر سکیں۔"

"تمہارا مطلب ہے' اگر تم یہ باتیں روپ متی کے سامنے کہتیں تو وہ برا مان جاتی؟" میں نے کہا۔

"ان باتوں سے اسے برا ماننے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ میری تائید کرے گی اور پھر یہ تو تاریخی حقائق ہیں جنہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ میں تو کچھ اور باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" جانکی نے کہا۔

"اوہ!" میں چونک گیا "اس کا مطلب ہے' کچھ اور باتیں ابھی باقی ہیں۔"

"شکر کرو مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔ کوئی اور ہوتی تو تمہارے کان کھا جاتی۔" جانکی نے کہا۔

"خدا میری حالت پر رحم کرے۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا "سونیا کے فلیٹ سے نکلنے سے لے کر اب تک تمہاری زبان ایک لمحے کو بھی نہیں رکی اور تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں زیادہ بولنے کی عادت نہیں۔ اس کا تجربہ تو مجھے پہلے بھی ہے کہ تمہارے ہوتے ہوئے ریڈیو یا ٹی وی کی ضرورت نہیں۔ بہرحال' جو باتیں باقی رہ گئی ہیں وہ بھی کہہ ڈالو۔"

"بہت بولنے لگے ہو تم؟" جانکی نے مجھے گھورا۔

"اچھا بابا۔ میں خاموش ہوا جاتا ہوں۔ تم بولو۔" میں نے کہا۔

"اتفاق سے سونیا ہمیں مل گئی ہے۔" جانکی کہہ رہی تھی "وہ وفادار اور قابلِ اعتماد لڑکی ہے۔ اسے آزمانے کی ضرورت نہیں اور ہم یہاں جس قسم کے حالات سے دوچار ہو چکے ہیں اس کے پیشِ نظر ہمیں کسی ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کھل کر بات کرو۔" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے جانکی کی طرف دیکھا۔

"اس میں شبہ نہیں کہ روپ متی بھی ہر لحاظ سے قابلِ اعتماد ہے اور اس پر آئندہ بھی بھروسا کیا جا سکتا ہے۔" جانکی نے کہا "پنڈتوں اور پجاریوں کی سازشیں بہت گہری ہوتی ہیں اور اس وقت تو ان پنڈتوں کے پیچھے دارا جیسا دماغ کام کر رہا ہے۔ وہ ہندوستان کے مندر دیکھ چکا ہے۔ یہ عبادت گاہیں نہیں' سونے کی کانیں ہیں۔ وہ کسی نہ کسی مندر پر ہر صورت میں قبضہ کرنا چاہتا ہے تاکہ زندگی بھر عیش کر سکے اور اتفاق سے بلونت سنگھ جیسا شیطان بھی بیچ میں کود پڑا ہے۔ دو چار دن کی خاموشی کا مطلب یہ نہیں کہ یدھ (لڑائی) ختم ہو گئی ہے بلکہ میرے خیال میں یہاں ایک اور مہابھارت چھڑنے والی ہے جو طویل عرصے تک جاری رہے گی۔"

"میں اس ساری بکواس کا مطلب اب بھی نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ یہاں آکر تمہارا دماغ اتنا کند کیوں ہو گیا ہے کہ سیدھی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔" جانکی نے کہا "ہم روپ متی اور بھانوت سنگھ پر ہی ڈی پنڈ نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کو شہر کے سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ ہمیں ایمرجنسی میں کسی ایسی جگہ کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے جس کے بارے میں ان دونوں کو بھی علم نہ ہو۔"

"اوہ!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "اتنی چھوٹی سی بات کے لیے اتنی لمبی کتھا سنانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اگر تم آج کل عقل سے پیدل نہ ہوتے تو مجھے یہ کتھا سنانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔" جانکی نے جواب دیا "بہتر ہو گا کہ سونیا کو یہاں کے حالات سے پوری طرح آگاہ کر دیا جائے۔ اگر وہ اب بھی ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہو تو۔"

"تو اسے بھی اس معاملے میں گھسیٹ لیا جائے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" جانکی بولی۔

"لیکن اس کے ساتھ وہ جو مادھوری ڈکشٹ رہ رہی ہے' اس کا کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔

"مادھوری ڈکشٹ!" جانکی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "وہ ان وڑبا نما فلیٹوں میں رہنے والی نہیں۔ یہ مادھوری تو۔"

"وہی وہی۔ میں سمجھ گیا۔" میں نے کہا "اس کا کیا ہو گا۔ کیا ہم اسے اٹھا کر فلیٹ سے باہر پھینک دیں گے؟"

"ہمیں کوئی دوسرا بندوبست کرنا ہو گا۔" جانکی نے کہا "اس بلڈنگ میں رش بہت ہے۔ یہاں متوسط اور نچلے طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس بلڈنگ میں چوبیس گھنٹے لوگوں کی آمدورفت رہتی ہو گی اور ایسی کوئی جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہو سکتی۔"

"اس کا مطلب ہے اس کے لیے کوئی الگ مکان لینا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور یہ کام وہ خود ہی کرے گی۔ اسے جتنے روپوں کی ضرورت ہو گی وہ میں دے دوں گی۔" جانکی نے کہا۔

"کیا؟" میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا "تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے آ گئے؟"

"روپ متی نے مجھے اچھی خاصی رقم دے رکھی ہے اور وہ رقم اتنی ہے کہ ہم کسی درمیانے درجے کے مکان کا چھ مہینے کا کرایہ ایڈوانس تو دے ہی سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں روپ متی سے مزید رقم لے سکتی ہوں اور مجھے یقین ہے وہ کوئی جرح بھی نہیں کرے گی۔" جانکی نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر تم اس وقت جا کہاں رہی ہو؟" میں یہ کہتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ہم اس وقت اشوک مارگ میں گھوم رہے ہیں۔" جانکی نے جواب دیا "اور سینٹرل میوزیم والے چوراہے سے ہوتے ہوئے جواہر لال نہرو مارگ کی طرف نکل جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے' تم واقعی راستہ بھول گئی ہو۔" میں نے کہا "ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی آگرہ مارگ سے بھرت پور کی طرف جانے والی سڑک پر ہے جبکہ تم اس وقت روپ متی کی حویلی کی طرف جا رہی ہو۔"

"میری واقعی مت ماری گئی ہے۔" جانکی نے پیشانی پر ہاتھ مارا "میں واقعی بھول گئی تھی۔ بہرحال' ہم سینٹرل میوزیم والے چوراہے سے ہی آگرہ مارگ کی طرف نکل جائیں گے۔"

اس وقت ساڑھے گیارہ بجنے والے تھے۔ اس وقت ان سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ سینٹرل میوزیم والے چوراہے سے آگے نکل کر موتی ڈونگری کراس کرتے ہی جانکی کو رفتار کم کرنی پڑی۔ ایک ہندو سادھو سڑک کے وسط میں دونوں ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔

"یہ سادھو شاید لفٹ لینا چاہتا ہے۔" جانکی نے رفتار مزید کم کرتے ہوئے کہا "ذرا ہوشیار رہنا۔ ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔"

"تو پھر اسے لفٹ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ چڑھا دو گاڑی اس کے اوپر۔" میں نے کہا۔

"میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں کہ قصور کیے بغیر کسی آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔" جانکی نے کہا "ہماری یدھ (لڑائی) چونکہ اس قبیل کے لوگوں سے ہے اور ایسے لوگوں سے کچھ کام کی باتیں بھی معلوم ہو سکتی ہیں۔"

جانکی نے سادھو کے قریب پہنچ کر گاڑی روک لی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کھڑا ہوا وہ سادھو بہت ہی بدہیئت لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر نجانے کیوں مجھے بنکاک کا پنڈت رکھوناتھ یاد آ گیا جس نے شہر کے نواح میں روحانیت کی آڑ میں عیاشی کا بہت بڑا اڈا کھول رکھا تھا۔

پانچ فٹ کے قریب قد' آبنوسی رنگت' گنجا سر' ماتھے پر بیچ میں اوپر سے نیچے کی طرف سرخ ٹیکا اور دائیں بائیں تین تین سفید لکیریں۔ سرخ آنکھیں' چہرہ بے حد مچرب' پھولے ہوئے گال اور بڑی بڑی مونچھوں کے نیچے چمکتے ہوئے سفید دانت۔ داڑھی نہیں تھی۔ لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے ہی شیو بنایا ہو۔

اس نے پیلی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ جسم کے اوپر والے حصے پر کوئی کرتہ وغیرہ نہیں پہن رکھا تھا۔ البتہ اس نے پیلی چادر اوڑھ رکھی تھی جس پر جگہ جگہ "اوم" چھپا ہوا تھا۔ مٹکے کی طرح توند باہر کو نکلی ہوئی تھی اور سینے پر ریچھ کی طرح بال بھرے ہوئے تھے۔

اس کے ایک ہاتھ میں پیتل کا ایک ڈول تھا جس میں ڈھائی تین لیٹر پانی آ سکتا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ترشول تھا۔ یہ بھی دو ڈھائی فٹ سے زیادہ لمبا نہیں تھا۔ اس نے کندھے پر ایک تھیلا بھی لٹکا رکھا تھا جو چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کے بالے تھے اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی تین مالاؤں کے بیچ میں سونے کی ایک موٹی سی چین بھی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"کہاں جانا ہے سادھو مہاراج؟" جانکی نے اپنی سائیڈ کا شیشہ گرا کر گردن باہر نکالتے ہوئے پوچھا۔

"سوڈیا کے مندر جانے کا ہوں دیوی مہارانی۔" سادھو نے کھڑکی کے سامنے آکر کہا "بہت دیر ہو گئیو ہے۔ اس ویلے کوئی بس ناہیں ملت ہے۔ ہم کا تھوڑا آگے چھوڑ دیو تو ہم پیاں پیاں چلا جاوے گا۔"

پیاں پیاں والی بات پر میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"سوڈیا کے مندر تو نہیں پرنتو ہم تمہیں اس سے تھوڑا پہلے اتار دیں گے۔ وہاں سے تمہیں کسی اور گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔" جانکی نے کہا۔

"دھنے واد (شکریہ)۔ دھنے واد۔" سادھو نے دونوں ہاتھ جوڑنے والے انداز میں ایک دوسرے کے قریب کر دیے۔

جانکی نے پیچھے جھک کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ سادھو گاڑی میں داخل ہوا تو ناگوار سی بُو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور میں نے جلدی سے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا دیا۔ جانکی کے چہرے کے تاثرات بھی بگڑ گئے۔ اس نے اے سی بند کر دیا اور اپنی طرف کا شیشہ بھی کھلا رہنے دیا۔

"اس وقت کہاں سے آرہے ہیں سادھو مہاراج۔" جانکی نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر پوچھا۔ ظاہر ہے اس کی موجودگی میں ہم اپنی باتیں نہیں کرسکتے تھے اس لیے جانکی نے اس سادھو ہی سے دل بہلانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

"موتی ڈونگری میں گنیش دیوتا کے مندر گیا رہا ہوں۔" سادھو نے جواب دیا "تم کا کھبر تو ہے' اس نگری ماں راکھشس گھس آیا ہیں۔ ان کو باہر کرنے کا واسطے اوپائے کرن کا جرورت تو ہووت ہے نا۔"

"راکھشس! میں سمجھی نہیں سادھو جی۔" جانکی نے کہا۔

"تم دھن والے لوگن ان باتوں پر دھیان نہیں دیوت ہو۔" سادھو نے کہا "ایک مسلمان راکھشس ایک ہندو ناری کے ساتھ عیش کرتا ہے سالا۔ اس ملیچھ (پلید) نے ہمارے مندروں اور دھرم کو بھی نشٹ (تباہ) کردیا ہے۔"

"اوہ۔ تم اس مسلمان کی بات کررہے ہو جس نے رام گڑھ جھیل والے مندر میں پنڈتوں کی پٹائی کی تھی۔" جانکی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماردی تھی تاکہ میں خاموش رہوں۔

"ہاں وہی۔" سادھو بولا "وہ ہندو ناری کے ساتھ مندر میں چھپ کر موج اڑا رہا تھا۔"

"مگر سادھو جی ہم نے تو کچھ اور سنا ہے۔" جانکی بولی۔

"اور جو سنا سب غلط ہے۔" سادھو بولا "اپنی سرکار بھی جھوٹ کا چرچا کررہی ہے اس لیے بڑے بڑے مندروں کے پنڈتوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ خود سزا دیویں گے اس مسلمان چھوکرے اور ہندو ناری کو۔ دونوں کو جلا کر بھسم کرڈالیں گے۔"

اس انکشاف پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور پھر اس نے جو مزید انکشافات کیے وہ اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز تھے۔

اس سادھو کے کہنے کے مطابق مندروں کے پنڈت اس بات سے خوش نہیں تھے کہ روپ متی اور اس کے مسلمان دوست کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اس کے برعکس رام گڑھ جھیل والے مندر کے پنڈتوں پر جھوٹے الزامات لگائے گئے تھے اور پنڈت پرشو رام (مرلی دھر) سے ان کے خلاف جھوٹا بیان دلوایا گیا تھا۔

مندروں کے پنڈتوں نے روپ متی' اس کے مسلمان دوست اور شہر کے مسلمانوں کو خود سزا دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں کل آدھی رات کو سوریا مندر میں تمام پنڈتوں کی میٹنگ بلائی گئی تھی جس میں آخری فیصلہ کیا جاتا۔

اس سادھو کی باتوں سے شروع ہی سے پتا چل گیا تھا کہ اسے شہر کے دولت مند لوگوں سے نفرت ہے۔ جانکی نے کچھ اس طرح کی باتیں کی تھیں کہ ہم دولت مند ضرور ہیں مگر دھرم کی رکھشا کے لیے ہم اپنی جانیں بھی نچھاور کرسکتے ہیں اور غالباً اسی لیے وہ سادھو کچھ کھلتا چلا گیا تھا۔

گاڑی اب بھرت پور جانے والی سڑک پر نکل آئی تھی۔ اس سڑک پر کئی کلومیٹر آگے جاکر جانکی نے گاڑی روک لی اور پرس میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سادھو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"یہ دان (تحفہ) سمجھ کر رکھ لیجیے گا سادھو جی مہاراج اور یہ مت سمجھئے کہ دھن والوں کو دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ آپ ایک آواز لگائیں گے تو ہندوستان کے سارے دھن وان دھرم کی رکھشا کے لیے نکل آئیں گے۔ آپ لوگ اس یدھ میں اکیلے نہیں ہوں گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "ہم الٹے ہاتھ کو جائیں گے۔ آپ یہاں اتر جائیے۔ سوڈیا کا مندر اب زیادہ دور نہیں ہے۔ اس طرف جانے والی کسی نہ کسی گاڑی پر آپ کو لفٹ مل جائے گی۔"

"دھنے واد۔ جے رام جی کی۔" سادھو دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔

"حرامی۔ سالا۔" جانکی گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے بڑبڑائی "یہ شیطان کبھی لوگوں کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ان کے اپنے حلوے مانڈے اور عیاشیاں خطرے میں پڑگئی ہیں تو ان میں گٹھ جوڑ بھی ہورہا ہے۔ ورنہ یہ لوگ تو ایک دوسرے کو ادھیڑ ڈالنے کے لیے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "بہرحال' صورت حال خاصی گمبھیر ہوتی جارہی ہے۔ ہمیں اس کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔"

"اچھا ہی ہوا ہم نے اس سادھو کو لفٹ دے دی۔ اس کی باتوں سے پتا چل گیا ورنہ ہم اندھیرے ہی میں رہتے۔" جانکی نے کہا۔

"سوریا مندر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھی اس شہر کے بارے میں اتنا ہی جانتی ہوں جتنا تم۔" جانکی نے جواب دیا "روپ متی اور ٹھاکر بھانوت جانتے ہوں گے۔"

گاڑی اس وقت بائیں طرف کی ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ یہ سڑک بالکل

...تھی۔ دائیں بائیں ٹیلوں پر عمارتوں میں کہیں کہیں ...نظر آرہی تھی۔ جانکی نے گاڑی اس راستے پر موڑ دی ...جا ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی تک چلا گیا تھا۔

...ڑی جیسے ہی قریب پہنچی گیٹ کھل گیا۔ جانکی گاڑی کو اندر لیتی چلی گئی۔ سامنے پورچ میں ٹھاکر کی گاڑی ...تھی۔ جانکی نے پجارو اس کے پیچھے روک لی۔ میں نے ...کر پیچھے دیکھا۔ کالو گیٹ بند کرکے آرہا تھا۔ میرا خیال ...نے ہماری گاڑی کو موڑ پر اس طرف گھومتے ہوئے ...تھا اور ہارن بجانے اور گاڑی روکنے کا موقع دیے بغیر ...ول دیا تھا۔

...وپ متی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ لان ہی میں کرسیوں پر ...ے تھے۔ جانکی بھی انجن بند کرکے گاڑی سے اتر آئی ...نوں اس طرف بڑھ گئے۔ ان دونوں کے سامنے میز پر ...کے خالی کپ رکھے ہوئے تھے۔ کالو بھی گیٹ بند کرکے ...طرف ہی آگیا تھا۔

...کالو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شنکر ...ہمیں چائے پلائے اور تم پجارو کے تمام دروازے ...گاڑی میں اچھی طرح اسپرے کردو۔"

...ہوں۔ گاڑی میں کیا ہوا؟" روپ متی نے پوچھا۔

...جانکی نے راستے میں ایک سادھو کو گاڑی میں بٹھالیا ...نے جواب دیا "ایسا گندا اور غلیظ سادھو میں نے ...نہیں دیکھا۔ اس کے لباس اور بدن سے بدبو کے ...رہے تھے۔ دماغ پلٹ گیا میرا۔ مجھے تو اب تک متلی ...رہی ہے۔"

...لیکن تم لوگ غائب کہاں تھے؟" روپ متی نے اصل ...پر آتے ہوئے کہا "میں پریشان ہورہی تھی۔ دس بجے ...ٹھاکر کو فون کیا تو یہ بھی پریشان ہوگئے۔ ہماری سمجھ ...آرہا تھا کہ تم لوگوں کو کہاں تلاش کیا جائے۔"

...وری آپ دونوں سے۔" میں نے جواب دیا "ہمیں ...ٹیلی فون کرنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ آپ ...پریشانی ہوئی اس کے لیے ایک بار پھر معذرت۔"

...کہاں رہ گئے تھے؟" روپ متی نے ایک بار پھر

...طی میری تھی۔" اس مرتبہ مجھ سے پہلے جانکی بول ...ڈرائیو کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے گاڑی کا رخ دہلی ...ے ہائی وے پر موڑ دیا تھا اور پھر احساس ہی نہیں رہا ...ے کتنی دور نکل آئے ہیں۔" وہ ساڑی کا پلو ...کی کرسی پر بیٹھ گئی لیکن ایک سیکنڈ بعد ہی پلو کندھے سے ڈھلک کر نیچے گر گیا اور اس مرتبہ جانکی نے اسے سنبھالنے کی کوشش نہیں کی۔

"اور یہ سادھو کا قصہ کیا ہے؟" روپ متی نے پوچھا۔

"واپسی پر میں غلطی سے گاڑی کو آدرش نگر کی طرف لے گئی تھی۔" جانکی نے جواب دیا "وہاں سے آگرہ مارگ کی طرف مڑے تو سڑک پر کھڑے ہوئے ایک سادھو نے ہمیں روک لیا۔ وہ موتی ڈونگری والے گنیش مندر سے آیا تھا اور سوڈیا مندر جانا چاہتا تھا۔ میں نے ترس کھاکر اسے لفٹ دے دی۔ اگلے موڑ پر اسے اتار دیا ہے۔ کسی اور گاڑی سے اسے لفٹ مل جائے گی۔"

ٹھاکر کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسی وقت شنکر ہم سب کے لیے چائے لے کر آگیا۔ اس نے گرم چائے کے کپ ہمارے سامنے رکھ دیے اور پہلے سے پڑے ہوئے کپ اٹھا کر چلا گیا۔

"یہ سادھو اور سنت لوگ تم لوگوں کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔" ٹھاکر نے شنکر کے جانے کے بعد کہا "پچھلے دو چار روز کی خاموشی سے یہ سمجھ لینا کہ پنڈت لوگ دبک گئے ہیں ہماری بہت بڑی حماقت ہوگی جبکہ خوفناک حقیقت یہ ہے کہ تم دونوں کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ بنایا جارہا ہے۔"

"اور کل اسی سلسلے میں بڑے بڑے مندروں کے پنڈتوں کی ایک میٹنگ سوریا مندر میں بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ! تمہیں کیسے پتا چلا؟" ٹھاکر چونک گیا۔

"اس سادھو کے گاڑی میں بیٹھنے سے اس کے لباس اور بدن سے اٹھنے والی بو سے میرا دماغ تو گھوم گیا تھا مگر جانکی نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس سے کچھ باتیں بھی معلوم کرلی تھیں اور انہی باتوں سے ایک انکشاف یہ بھی ہوا تھا کہ اندر ہی اندر کچھ لاوا پک رہا ہے اور کل رات شہر کے بڑے بڑے تمام مندروں کے پروہتوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی ہے جس میں ہمارے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔"

"میری معلومات بھی یہی ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ سب ہی لوگ ایسے بے وقوف نہیں ہیں کہ پنڈتوں کی ہر بات پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلیں۔ رام گڑھ جھیل والے مندر کے پروہت پنڈت ہری رام نے تم دونوں پر الزام لگایا تھا کہ تمہیں مندر میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے پکڑا گیا تھا مگر اگلے ہی روز پنڈت مرلی دھر اور لاجونتی وغیرہ کے بیانات بھی اخبار میں آگئے جس سے دھرم سے لگاؤ رکھنے والوں کے دلوں میں پنڈتوں کے خلاف نفرت

پیدا ہوگئی۔ پنڈتوں کی حرکتیں لوگوں سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دھرم کو بدنام کرنے کے لیے اس قسم کے اسکینڈلز پھیلائے جارہے ہیں جبکہ سنجیدہ قسم کے لوگ ایسی باتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ انہیں یقین ہے کہ ان پنڈتوں نے ایسی گھٹیا حرکت ضرور کی ہوگی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے لوگوں کے بیانات شائع ہورہے ہیں جن میں مطالبہ کیا جارہا ہے کہ ان پنڈتوں کو مندر سے نکال دیا جائے اور ان کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"پنڈت ہری رام اوتار ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے پنڈت بوکھلائے ہوئے ہیں۔ یہ سب لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے جمع ہورہے ہیں۔ بعض لوگ تو یہ بھی مانگ (مطالبہ) کررہے ہیں کہ انہیں اس عورت کے قتل کے الزام میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے جس کے بارے میں مرلی دھر نے پریس کانفرنس میں انکشاف کیا تھا۔ کچھ آوازیں کلب کی رقاصہ ریکھا کے قتل کے حوالے سے بھی اٹھ رہی ہیں۔ آج ہی اخبار میں ایک مختصر سا مضمون چھپا ہے جس میں کلب کی رقاصہ ریکھا کے قتل کو موضوع بنا کر اعلیٰ سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ چائے کے دو گھونٹ بھرے پھر بولا "ان ساری باتوں نے پنڈت ہری رام کو بری طرح بدحواس کردیا ہے اور دوسرے پنڈت اس لیے اس کا ساتھ دے رہے ہیں کہ کل ان کے خلاف بھی اس قسم کی کارروائی ہوسکتی ہے۔ ویسے ایک بات میں پورے وشواس سے کہہ رہا ہوں کہ ان کے پیچھے کوئی اور ایسا شخص بھی ہے جو انہیں بھڑکا رہا ہے۔"

"بلونت سنگھ کے علاوہ کون ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا "اس روز بھی اس نے چند پجاریوں کو جمع کرکے روپ متی کی حویلی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہ شرپسند ضرور ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روپ متی سے انتقام لینے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں اتنا دم خم نہیں ہے۔ اس روز بھی وہ بھاگ گیا تھا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"ہمیں اپنے کسی بھی دشمن کو انڈر اسٹی میٹ نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے جواب دیا "بعض لوگ سامنے آکر مقابلہ کرنے کی جرأت تو نہیں کرسکتے لیکن درپردہ رہ کر وہ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" ٹھاکر بولا "ہم اس کا دھیان رکھیں گے لیکن میرا من کہتا ہے کہ پس منظر میں کوئی اور شخص ہے۔"

"اس کا کھوج بھی لگالیا جائے گا۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "یہ سوریا مندر کہاں ہے؟"

"شہر کے مشرق میں چند کلومیٹر کے فاصلے پر گاتا...ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کے دامن میں دور تک ا... خوب صورت وادی پھیلی ہوئی ہے۔ اس وادی میں پانی... بہت بڑے بڑے تالاب بھی ہیں۔ ان تالابوں کے پانی کو... کے پانی کی طرح پوتر (پاک) سمجھا جاتا ہے۔ ہندو یاتری دور دور سے اس پانی میں اشنان کے لیے یہاں آتے ہیں۔

"اس پہاڑی پر ذرا آگے سوریا مندر ہے جسے... دور میں راجا جے سنگھ ثانی کے نمائندے راؤ کرپا رام نے... کروایا تھا۔ یہ عمارت اتنی زیادہ خوب صورت نہیں ہے... یہاں سے وادی اور دوسری طرف پہاڑیوں کے دامن... آباد اس شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ پہلے یہ مندر یقیناً آباد... ہوگا لیکن اب تو ویران ہوچکا ہے۔ لوگ محض تفریح کے... اس طرف جاتے ہیں۔ یاتریوں کے لیے بھی اس مندر... کوئی کشش نہیں رہی البتہ جرائم پیشہ لوگ اس ویران... سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دن کے وقت تو پانی... تالابوں کی وجہ سے وہاں کافی رونق رہتی ہے البتہ شا... اندھیرا پھیلنے کے بعد اس طرف سناٹا چھا جاتا ہے۔"

"کیا وہاں صرف یہی ایک مندر ہے؟" میں نے پوچھا

"وہاں دو مندر اور بھی ہیں۔" ٹھاکر نے جواب... "ایک تو پوتر پانی کے ان تالابوں کے پاس اور دوسرا پہا... کے دامن میں پھیلی ہوئی وادی میں۔"

"تو کیا خیال ہے۔ کل رات ہلا بول دیا جائے اس... پر؟" میں نے کہا "اس طرح ہمیں یہ بھی پتا چل جائے... اس سارے ہنگامے کے پیچھے کون ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" ٹھاکر نے جواب دیا... کل دن میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر... گا۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اب میں چلتا ہوں۔ کل شا... ملاقات ہوگی۔"

ٹھاکر بھانوت سنگھ کے جانے کے بعد ہم اندر آ... اس وقت ڈیڑھ بجنے والا تھا لیکن ہم میں سے کسی کو بھی... نہیں آرہی تھی۔ ہم لاؤنج میں بیٹھے دیر تک ان پنڈتوں... بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر تین بجے کے قریب... اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

یہاں اگرچہ ہم الگ الگ کمروں میں سویا کرتے...

...ئی دی تھی۔ وقت گزرتا رہا اور میری بے چینی بڑھتی...

...ن چار منٹ گزر گئے۔ میری چھٹی حس کسی گڑبڑ کا... رہا رہی تھی۔ میں نے ایک منٹ اور انتظار کیا اور پھر... آڑ سے نکلنا ہی چاہتا تھا کہ ایک پنڈت اس کمرے... ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ کمرے سے نکل... نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر تیز تیز... تا ہوا باہر نکل گیا۔

...ی گڑبڑ کا احساس اب قوی تر ہوگیا تھا۔ مجھے سمجھنے... نہیں لگی کہ ٹھاکر کمرے کے اندر کسی مصیبت میں... کا ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی پنڈت باہر... پا دوڑتا ہوا واپس آگیا۔

...ا اچانک ہی ستون کی آڑ سے نکل کر اس کے سامنے... مجھے دیکھ کر وہ پنڈت ایک لمحے کو بدحواس ہوا لیکن اس... ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور دوسرے ہی لمحے وہ... کا نعرہ لگاتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا۔

...ا خیال تھا کہ وہ میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ڈر... اور ہتھیار پھینک دے گا لیکن اس کا یہ اقدام میری... بالکل خلاف تھا مگر میں بھی بہرحال غافل نہیں تھا۔... تیزی سے ایک طرف جھک گیا۔ اس کا ترشول... پہلو کے بالکل قریب سے گزرا اور وہ خود بھی اپنی... میں آگے بڑھ آیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے... بڑی پھرتی سے ایک ٹانگ آگے کردی۔ اس کی ٹانگ... ٹک میں الجھی اور وہ چیختا ہوا منہ کے بل گرا۔ اس... فوراً اس کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی تھی۔

...یا تیزی سے اس کی طرف لپکا لیکن اس نے حیرت... پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوٹ لگانے کے ساتھ ہی... لی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میرے پستول والے ہاتھ پر... پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔

...پنڈت میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس... نے اٹھ کر ترشول سنبھالتے ہوئے دوبارہ مجھ پر حملہ... اس مرتبہ میں نے اپنی جگہ سے ایک طرف ہٹتے... ترشول کو اس کے تین شاخے کے پیچھے ڈنڈے سے پکڑ... وار جھٹکا دیا۔

...ت آگے کو جھکا تو میں نے گھٹنے سے اس کے پیٹ پر... ید کردی۔ وہ چیخ اٹھا۔ ترشول کے ڈنڈے پر سے اس... ت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ... ترشول چھین کر ایک طرف پھینک دیا اور ایک زوردار سائیڈ کک اس کے پہلو میں رسید کردی۔ وہ لڑکھڑا کر دائیں طرف جھکا تو میں نے اس طرف سے رائٹ کک لگائی۔ یہ کک زیادہ زوردار ثابت ہوئی۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ میری اگلی کک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے اسے دو تین ٹھوکریں اور لگائیں اور جھک کر ترشول اٹھالیا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو میں نے ترشول اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"اندر کتنے آدمی ہیں؟" میں نے غرا کر کہا "جلدی بتاؤ ورنہ یہ ترشول تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔"

"اندر انسان نہیں درندے ہیں۔ تم لوگ یہاں سے زندہ واپس نہیں جاسکو گے۔" اس نے بھی غراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس کے سینے پر ترشول کا دباؤ بڑھا دیا اور اسی لمحے راہداری کے ایک کمرے سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک لمحے کو ترشول کے دستے پر میرے ہاتھ کا دباؤ کم ہوا تھا۔ پنڈت نے اس صورتِ حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ترشول کے دستے پر گرفت جما کر اسے زور سے ایک طرف جھٹکا دیا۔

میں اپنی جگہ پر لڑکھڑا گیا۔ پنڈت اپنے آپ کو ترشول کی زد سے بچا گیا تھا۔ اس نے ترشول کے دستے کو ایک اور جھٹکا دیا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ہم دونوں کے ہاتھ ترشول کے دستے پر تھے اور ہم دونوں میں ترشول کے حصول کے لیے کشمکش ہورہی تھی۔

اچانک اس نے مجھے زوردار دھکا دیتے ہوئے ترشول کے دستے پر سے ہاتھ ہٹالیے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر حملہ کرے گا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے باہر کی طرف دوڑ لگادی۔

میں اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ مندر سے نکل کر دوڑتا ہوا اس چٹانی پٹی پر پہنچ گیا جو اگلے مسطح چٹان کو مندر والے میدان سے ملاتی تھی۔

راہداری کی طرف سے ایک اور فائر کی آواز سنائی دی۔ میں مڑ کر اس طرف دوڑا۔ ستون کے قریب میرا پستول پڑا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر پستول اٹھالیا اور راہداری کی طرف لپکا۔

ایک کمرے سے نکلتے ہوئے دو آدمی مجھ سے ٹکرا گئے۔ وہ پنڈت ہی تھے۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ وہ دونوں چیختے ہوئے مرکزی ہال کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ میں نے فائر کردیا۔ گولی ایک ستون پر لگی۔ وہ دونوں صاف بچ نکلے

لیکن کبھی کبھی جانکی میرے کمرے میں بھی گھس آیا کرتی تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر میں نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں اور یوں پڑا رہا جیسے گہری نیند میں ہوں اور کچھ دیر بعد میں واقعی نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

○☆○

وہ علاقہ واقعی بڑا خطرناک تھا۔

دن کے وقت تو اسے ایک شان دار اور بہت بارونق تفریح گاہ کہا جاسکتا تھا لیکن جیسے جیسے شام کا اندھیرا پھیلنے لگتا' اس کی رونق اجڑتی جاتی۔ ایک دو اسپاٹ ایسے تھے جہاں رات دس گیارہ بجے تک بھی کچھ رونق رہتی تھی۔ یہ وہ مقامات تھے جہاں مندر اور وہ تالاب تھے جہاں یاتری اشنان کرتے تھے۔ یہاں یاتریوں کے لیے گھاٹ بھی بنے ہوئے تھے۔

سوریا مندر وہاں سے تقریباً ہزار گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے ایک طرف پتھریلا میدان تھا جو مندر اور تالابوں تک چلا گیا تھا اور دوسری طرف عمودی ڈھلانیں تھیں جہاں سے نشیب میں بہت دور شہر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ عرصہ پہلے انہی ڈھلان کے کنارے کے ساتھ ساتھ حفاظتی ریلنگ بھی لگی ہوئی تھی۔ ریلنگ تو اب نہیں رہی تھی تاہم کہیں کہیں تین چار فٹ اونچے کنکریٹ کے ستون اب بھی موجود تھے۔

پتھریلے میدان سے بیس پچیس فٹ چوڑی ایک چٹانی پٹی آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ یہ چٹانی پٹی تقریباً دو سو گز طویل تھی جس کے اختتام پر مسطح میدان سا تھا اور وہ سوریا مندر اسی جگہ پر تھا۔

مندر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ عمارت بھی زیادہ خوب صورت نہیں تھی۔ امتدادِ زمانہ نے اس کی ہیت کو بڑی حالت تک بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ مندر تک پہنچنے کے لیے اس چوڑی چٹانی پٹی پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس پٹی کے دونوں طرف عمودی نشیب تھے جہاں جھاڑیوں نے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ اس چٹانی پٹی کے دونوں طرف بھی کسی زمانے میں حفاظتی ریلنگ رہی ہوگی لیکن اب یہاں بھی صرف ستون ہی رہ گئے تھے۔

وہ میدان دراصل ایک مسطح چٹان پر مشتمل تھا۔ وسط میں وہ مندر تھا۔ اس کے اطراف میں چاروں طرف خاصی کھلی جگہ تھی اور جگہ جگہ بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ چٹان کے کنارے بالکل ڈھلان تھے۔ یہاں بھی کنارے کے ساتھ ساتھ حفاظتی ریلنگ کی باقیات نظر آرہی تھیں۔

مندر کی پچھلی طرف چٹان کے کنارے پر دو مقامات پر دو چھوٹی عمارتوں کے کھنڈر دکھائی دے رہے ان عمارتوں کو دیکھ کر کسی بہت بڑے بنگلے کے سرونٹ کوا کا گمان ہوتا تھا۔ دائیں طرف والی عمارت تین کمرو مشتمل تھی۔ سامنے کبھی صحن کی چار دیواری بھی رہی لیکن اب وہ ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ صرف ایک طرف چار فٹ لمبی اور دو ڈھائی فٹ اونچی دیوار رہ گئی تھی۔ کمروں کی چھتیں غائب تھیں البتہ تیسرے کمرے کی چ کے ایک کونے میں ڈیڑھ دو فٹ چوڑا شگاف نظر آرہا تھا باقی حصہ صحیح سلامت تھا۔ تینوں کمروں کی پچھلی طرف کھ کھڑکیاں بھی تھیں۔

ایسی ہی دوسری عمارت اس سے تقریباً سو گز کے فا پر تھی اور اس کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی تھی البتہ عمارت کی دو چھتیں اپنی جگہ پر قائم تھیں جبکہ تیسرے کم میں کھڑے ہو کر' سر پر آسمان کو دیکھا جاسکتا تھا۔ مندر ان دونوں عمارتوں کا فاصلہ پچاس گز سے زیادہ نہیں تھا۔

اس مسطح چٹان کی دوسری طرف عمودی ڈھلان تم ایک طرف پہاڑی کے دامن میں چھدری آبادی شرو ہوجاتی تھی جبکہ دوسری طرف گہرے نشیب سے آ دوسری چٹان تھی۔ اس پہاڑی سے آگے چند اور پہاڑ بھی تھیں جن پر کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کسی قسم کا نہیں تھا۔

مندر کے چار اطراف میں دروازے تھے سامنے گیٹ' پچھلی طرف بھی ایک بڑا دروازہ تھا جبکہ دائیں با بھی دروازے تھے جو زیادہ بڑے نہیں تھے۔ مرکزی ہال چاروں دروازوں کی طرف کشادہ راہداریاں جاتی تھیں کی دیواروں پر ایسے بڑے بڑے پتھر لگے ہوئے تھے جن مورتیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ان راہداریوں میں کمرے تھے جن کے دروازے عرصہ پہلے غائب ہوچکے تھے

مرکزی ہال کے عین وسط میں ایک بہت بڑا چبوترا جس پر کسی زمانے میں کسی بھگوان کی مورتی رکھی رہتی لیکن اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ چبوترہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا اور اس کی بلندی صرف تین فٹ رہ گئی تھی۔ اس چبوترے کے اطراف میں بڑے بڑے ستون تھے جنہوں چھت کو سہارا دے رکھا تھا۔ ان ستونوں پر کسی زمانے یقیناً ماربل لگا ہوا ہوگا لیکن وہ اب اکھاڑ دیا گیا تھا۔

اس رات ہم اگرچہ دیر سے سوئے تھے لیکن خلا معمول میری آنکھ صبح آٹھ بجے کھل گئی تھی اور یہ

ہوئی تھی کہ جانکی اور روپ متی مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔

اور پھر ناشتے کے بعد روپ متی ہی نے یہ تجویز پیش کی کہ آج دن میں اس مندر کی یاترا کی جائے۔ حقیقت تو یہ کہ میں خود بھی دن کی روشنی میں سوریا مندر اور اس کے آس پاس کا علاقہ دیکھنا چاہتا تھا۔ روپ متی نے ٹھاکر بھانوت کو فون کرکے اپنے پروگرام سے آگاہ بھی کردیا۔ ٹھاکر کی سے بھی بات ہوئی تھی۔ اس نے محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور کچھ نہیں۔

ہم دس بجے کے قریب حویلی سے نکلے تھے۔ روانگی سے شنکر نے میرا حلیہ اس طرح بدلا تھا کہ میں خود بھی اپنے آپ کو بڑی مشکل سے پہچان سکا تھا۔ راجستھانی لباس اور پر چنری کی طرح کے کپڑے کی رنگ برنگی پگڑی۔ آنکھوں پر دو نمبر والی عینک لگائی گئی تھی۔ اس عینک اور لباس سے حلیہ بہت بدل گیا تھا۔

یہ جگہ واقعی پکنک پوائنٹ تھی۔ بڑی تعداد میں یاتری تو ہی پکنک منانے والوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ بوں کے ساتھ اشنان کے گھاٹ بنے ہوئے تھے اور ان ٹوں پر جو لوگ اشنان کررہے تھے ان میں صحت مند لوگ تھے۔ بیمار بھی' کوڑھی بھی' بوڑھے اور بچے بھی۔ حفظانِ ت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ اشنان گھاٹ یوں کا گڑھ تھے لیکن چونکہ اس پانی کو گنگا کی طرح پوتر ماجاتا تھا اس لیے کسی کو یہ پروا نہیں تھی کہ اس پانی میں نے سے انہیں کوئی بیماری لگ سکتی تھی۔ عورتوں کے لیے چہ الگ غسل خانے بنے ہوئے تھے لیکن میں نے کئی رتوں کو کپڑوں سمیت ان تالابوں میں بھی نہاتے ہوئے ماتھا۔

سوریا مندر والی پہاڑی پر جانے کے لیے ایک کشادہ ںڈی تھی جو مسلسل بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔ اس ںڈی پر پتھر کاٹ کاٹ کر سیڑھیاں سی بنائی ہوئی تھیں۔ ا پہاڑی پر چڑھنا اگرچہ زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اس ف آنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔

ہم بھی کچھ دیر تالابوں کے آس پاس گزارنے کے بعد لوگوں کے ساتھ اس پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ ان لوگوں کا ق ایک ہی خاندان سے تھا اور ان کی باتوں سے اندازہ رہا تھا کہ یہ لوگ دکن کے کسی چھوٹے شہر سے آئے ہوئے

سوریا مندر اور اس کے سامنے والے میدان میں کچھ

اور لوگ بھی موجود تھے۔ یہاں تین چار مزدور قسم کے آدمیوں نے اسٹینڈز پر دوربینیں بھی لگا رکھی تھیں۔ یہ دوربینیں ان کی روزی کا وسیلہ تھیں۔ وہاں آنے والے لوگ ان دوربینوں سے شہر کا نظارہ کررہے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے میں ہم نے گھوم پھر کر وہ سب کچھ دیکھ لیا جو میں پچھلے صفحات میں بیان کرچکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ مندر رات کو واقعی جرائم پیشہ لوگوں اور ڈاکوؤں کی پناہ گاہ کا کام دیتا ہوگا۔

ہم تقریباً تین بجے شہر لوٹے تھے۔ ایک اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور پھر حویلی واپس آگئے۔

پہاڑی پر چڑھنے اور مسلسل گھومتے رہنے سے جانکی اور روپ متی تھک گئی تھیں۔ وہ ایک ہی کمرے میں بیڈ پر ڈھیر ہوگئیں۔ میں لاؤنج میں صوفے پر ٹانگیں پسار کرلیٹ گیا اور کچھ دیر بعد میری بھی آنکھ لگ گئی۔

جب میں بیدار ہوا تو باہر شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلنے ہی لگا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھالیا۔

وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کی کال تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ ٹھیک دس بجے یہاں پہنچ جائے گا۔ میں تیار رہوں۔ میں ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے ساری کسل مندی دور ہوگئی۔ میں لاؤنج میں آیا تو مندری میرے لیے چائے کا کپ لے کر کچن کی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے چائے کا کپ لے لیا اور باہر لان میں آگیا۔ میں نے مندری سے جانکی اور روپ متی کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں ابھی تک سو رہی ہوں گی۔

میں نے لان میں کرسی پر بیٹھ کر چائے کے دو تین گھونٹ ہی بھرے تھے کہ حویلی کے بائیں طرف نقرئی قہقہوں کی آواز سن کر چونک گیا۔

یہ آواز سوئمنگ پول کی طرف سے آئی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ سوئمنگ پول وہاں سے نظر نہیں آرہا تھا۔ میں کرسی سے اٹھا اور چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اس طرف چل دیا۔

اور پھر اس طرف پہنچتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ چھلک گیا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

جانکی اور روپ متی' دونوں ہی سوئمنگ پول میں ایک

دوسرے پر پانی اچھالتے ہوئے قہقہے لگا رہی تھیں۔ ان کے جسموں پر صرف انڈویئرز تھے اور شفاف پانی میں ان کے بدن جھلملاتے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ میں واپس مڑنا ہی چاہتا تھا کہ روپ متی کی آواز سنائی دی۔

"چھپ چھپ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ آجاؤ۔ ہم تم سے بالکل نہیں شرمائیں گے ہمت سنگھ۔"

میں رکے بغیر لان کی طرف بڑھتا رہا۔

"تمہاری ہمت اور بہادری دیکھ کر میں نے تمہارا نام ہمت سنگھ رکھا تھا لیکن اب پتا چلا کہ تم بہت ڈرپوک ہو۔" روپ متی نے چیخ کر کہا۔

"میں واقعی بہت ڈرپوک ہوں۔" میں نے بھی چیخ کر جواب دیا اور لان میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا اور حواس پر قابو پانے کے لیے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ ٹھیک دس بجے پہنچ گیا تھا۔ وہ کار پر آیا تھا اور اس وقت جانکی اور روپ متی بھی میرے قریب لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ رات کا کھانا کھا چکے تھے اور میں بھی تیار ہو چکا تھا۔ میں نے نیلی جینز پر ٹی شرٹ بھی نیلی ہی پہنی تھی تاکہ اندھیرے میں یہ لباس کسی جگہ میری موجودگی کی نشان دہی نہ کر سکے۔

ٹھاکر کھانا کھا کر آیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ صرف چائے پینا چاہتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شنکر نے ہمارے سامنے چائے رکھ دی اور چائے پینے کے فوراً ہی بعد میں اور ٹھاکر جیپ میں سوار ہو گئے۔ روپ متی اور جانکی سمجھتی تھیں کہ اس مہم میں ان کی گنجائش نہیں ہے اس لیے ان میں سے کسی نے ہمارے ساتھ چلنے کی ضد نہیں کی تھی۔

میں کار کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ پستول میں نے اپنی کمر پر چلون کی بیلٹ کے نیچے اڑس رکھا تھا۔ اوپر سے ٹی شرٹ آجانے کی وجہ سے اس جگہ پستول کی موجودگی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ خنجر بھی میں نے پنڈلی پر چمڑے کے فیتے سے باندھ لیا تھا۔ یہ وہی خنجر تھا جو تیج سنگھ وغیرہ اس رات روپ متی کی حویلی میں چھوڑ کر بھاگے تھے۔

گاڑی آگرہ مارگ سے پہلے ہی دائیں طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک سرکلر روڈ کی طرح مختلف سڑکوں کو چھوتی ہوئی آگے جا کر رام گڑھ جھیل کی طرف چلی گئی تھی لیکن سورج پول والے چوراہے پر ٹھاکر نے جیپ کو دائیں طرف گالتا کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لی۔

تین کلو میٹر آگے جا کر ٹھاکر نے کار اس سڑک پر موڑلی جس طرف پہاڑی کے دامن میں آبادی تھی۔ اشنان گھاٹ اور تالاب دوسری طرف رہ گئے تھے۔

آبادی کے بالکل آخر میں جا کر ٹھاکر نے گاڑی ایک ویران جگہ پر روک لی اور انجن بند کر دیا۔ وہ نیچے اتر کر چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر مجھے اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے پیچھے چلتے رہے۔ یہاں کچھ درخت بھی تھے لیکن کچھ ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے جھاڑیاں تھیں اور ہم ان جھاڑیوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی پر چلتے رہے۔

ہم مسلسل بلندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آگے راستہ مزید دشوار ہوتا چلا گیا اور پھر وہ پگڈنڈی بھی ختم ہو گئی۔ اس سے آگے وہ عمودی ڈھلان تھی جو آج دن میں میں نے سوریا مندر والی چٹان سے دیکھی تھی۔

یہ ڈھلان تقریباً ساٹھ کے زاویے پر تھی اور بڑی مشکل سے اوپر چڑھا جا رہا تھا۔ کئی جگہوں پر تو ہمیں جھک کر جھاڑیوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ بالآخر ہم اوپر مسطح چٹان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

میں نے عرصے سے ایکسر سائز یا یوگا وغیرہ کی پریکٹس نہیں کی تھی جس وجہ سے بڑی حد تک کاہل الوجود ہو گیا تھا اور اب ہزار بارہ سو فٹ کی چڑھائی چڑھنے سے سانس پھول گیا تھا۔ ٹھاکر بھی اپنے پھولے ہوئے سانس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم کچھ دیر ڈھلان کی چوٹی پر کھڑے رہے اور پھر مسطح چٹان پر آگئے۔ ہم اس وقت مندر کے عقب میں سونٹ کوارٹروں کے تقریباً درمیان میں تھے۔ سامنے مندر کی عمارت کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا اور عقبی دروازے سے اندر مدھم سی روشنی بھی نظر آرہی تھی۔

"تم اس طرف چلو۔" ٹھاکر نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی "میں عقبی دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ میری طرف سے اشارہ ملنے سے پہلے کوئی کارروائی مت کرنا۔"

ٹھاکر بھانوت سنگھ وہیں کھڑا رہا اور میں میدان میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

دائیں طرف والا دروازہ بند تھا۔ لکڑی کا وہ دروازہ بہت مضبوط اور وزنی تھا۔ کوشش کے باوجود میں اسے معمولی سی حرکت دینے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ میں کوشش ترک کر کے عمارت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور جیسے ہی دوسری طرف پہنچا، ٹھٹک کر رک گیا۔

مندر کے سامنے والے دروازے کی سیڑھیوں پر کوئی بیٹھا بیڑی یا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ میں دیوار کی آڑ ...رک کر اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھنے کا ارادہ ...ہی رہا تھا کہ پٹی نما چٹانی راستے کی طرف سے دو ہیولوں کو ...ت کرتے دیکھ کر رک گیا۔

سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا شخص بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس ...سلگتا ہوا سگریٹ ایک طرف پھینک دیا تھا۔ وہ غالباً بہت ...گھٹیا قسم کا سگریٹ تھا۔ اس کی ناگوار سی بُو میرے نتھنوں ...ٹکرا رہی تھی۔

چٹانی پٹی پر آنے والے دونوں ہیولے سیڑھیوں کے ...ب آگئے۔ وہاں کھڑے ہوئے شخص نے ان کا راستہ ...ل لیا۔ ان میں آپس میں چند جملوں کا تبادلہ ہوا پھر پہلے ...وہاں کھڑے ہوئے شخص کی آواز سنائی دی۔

"پدھاریے (تشریف لائیں) کلیان جی۔ آپ ہی کی ...ب (انتظار) ہو رہی ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر اس شخص کی جے رام جی ...آواز سنائی دی۔ بعد میں آنے والے دونوں آدمی اندر ...گئے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ دونوں پنڈت تھے ...جس شخص نے ان کا استقبال کیا تھا وہ بھی پنڈت ہی تھا۔

وہ شخص ایک بار پھر سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ میں اپنی جگہ پر ...سوچ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اسے کس طرح گرفت میں لیا ...ئے اسے وہاں سے ہٹائے بغیر مندر میں داخل ہونا ممکن ...تھا۔

اور پھر اچانک ہی تاریکی میں ایک شعلہ سا چمک اٹھا۔ ...ھی پر بیٹھے ہوئے پنڈت نے ایک نیا سگریٹ سلگانے کے ...دیا سلائی جلائی تھی اور اس کی روشنی میں اس شخص کا ...دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ یہ وہی بدہیت سادھو تھا جسے کل ...ت ہم نے پجارو میں لفٹ دی تھی۔ وہ سیڑھی پر بیٹھا ...ینان سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور ناگوار سی بو میرے ...وں سے ٹکراتی رہی۔

دو تین منٹ گزر گئے۔ ابھی تک ٹھاکر کی طرف سے کسی ...ل کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج ...ے تھے۔ تمام پنڈت آچکے تھے اور میرے خیال میں ان کی ...نگ یا تو شروع ہو چکی تھی یا شروع ہونے والی ہو گی۔ اس ...ھو کو شاید نگرانی کے لیے یہاں بٹھایا گیا تھا۔

میں نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور پھر دیوار کے ساتھ ...ک کر آہستہ آہستہ آگے سرکنے لگا۔ میری نظریں اس ...ھو پر مرکوز تھیں جس کا رخ مندر کی طرف آنے والے راستے کی طرف تھا۔ وہ جب سگریٹ کا کش لگاتا تو چنگاری سی چمک اٹھتی اور پھر تاریکی پہلے سے زیادہ گہری محسوس ہوتی۔

میں بہت محتاط انداز میں دیوار کے ساتھ سرکتا رہا۔ آگے ایک جگہ عمارت کا ایک حصہ چار پانچ فٹ آگے کو نکلا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے کچھ آڑ مل گئی تھی۔

سادھو نے سگریٹ کا ختم ہوتا ہوا ٹکڑا ایک طرف اچھال دیا اور تھیلے میں سے ایک چپٹی سی بوتل نکال لی اور اس کا ڈھکنا کھول کر بوتل منہ سے لگالی۔

میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گندی سی گالی دی اور اس آڑ سے نکل کر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ایک پتھر میرے پیر سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ خاموشی میں پتھر کے لڑھکنے کی آواز خاصی بلند تھی۔

سادھو اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ کر دوبارہ آڑ میں آگیا۔ سادھو نے بوتل زمین پر رکھ دی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے لباس میں چھپا ہوا پستول نکالنے میں بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

وہ پستول والا ہاتھ آگے کو نکالے آہستہ آہستہ آگے کو بڑھ رہا تھا۔ پتھر لڑھکنے کی آواز سے اسے اس طرف کسی کی موجودگی کا شبہ ہو گیا تھا اور میں بھی اس کا استقبال کرنے کو تیار تھا۔

وہ دبے قدموں چلتا ہوا جیسے ہی عمارت کے بڑھے ہوئے حصے سے آگے کو نکلا، میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ سب سے پہلے میرے پاؤں کی ٹھوکر اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول ہوا میں اچھلتا ہوا دور پتھروں میں جا گرا۔

سادھو کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن میرا زوردار گھونسا اس کی گردن پر لگا اور وہ لڑکھڑا کر رہ گیا لیکن اس مرتبہ اس نے سنبھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

سادھو کسی بلڈوزر کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔ میں اگرچہ اس کی طرف سے کسی ممکنہ جوابی کارروائی کے لیے تیار تھا لیکن اس زوردار تصادم سے اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا اور وہ مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

میری پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی اور وہ بلڈوزر ہی کی طرح مجھے دبا رہا تھا۔ مجھے سینے میں اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا میں نے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی مگر وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا اور پھر اس نے دونوں ہاتھ

پھیلا کر دونوں طرف سے میرے سر پر مارے۔

میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ سادھو نے غراتے ہوئے ایک بار پھر دونوں ہاتھ اٹھائے۔ یہ ضرب پہلے سے زیادہ زور دار تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں میری کھوپڑی پچک گئی ہو۔ میں سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

تیسری مرتبہ سادھو نے یہی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی تو میں نے اس کے دونوں ہاتھ کلائیوں پر سے پکڑ لیے اور انہیں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانے لگا۔ اس کم بخت میں گینڈے کی طرح بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کے بازوؤں کو موڑنے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ضرب لگا دی تھی۔

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو مجھے بھی اس کے دباؤ سے نکلنے کا موقع مل گیا اور پھر میں نے اس کی مٹکے جیسی توند پر گھونسوں کی بارش کر دی لیکن لگتا تھا جیسے اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو رہا ہو۔

میں اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور چند فٹ دور ہٹ کر ہوا میں اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس کے سینے پر لگی اور وہ کراہتا ہوا زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے سنبھل کر اس پر چھلانگ لگا دی لیکن وہ بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ میں منہ کے بل نیچے گرا۔ اگر دونوں ہتھیلیاں زمین پر نہ ٹکا دیتا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے۔

سادھو بھاری بھرکم ہونے کے باوجود بہت پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے پلٹ کر مجھے دبوچ لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ موڑ کر بازو اس کی گردن میں ڈال دیا اور اسے دبانے کے لیے پوری قوت استعمال کرنے لگا اور بالآخر اسے اپنے اوپر سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا اور پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میری ٹھوکریں اس کے جسم کے ہر حصے پر پڑ رہی تھیں۔

اور پھر میں نے اس کی گردن گرفت میں لے لی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ساری رات اس سے گتھم گتھا ہوتا رہتا۔ میں دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے اس کے کانوں کے پیچھے مخصوص نسیں مسلتا رہا اور پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اسے بے ہوش کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آگیا تھا۔

میں اسے گھسیٹتا ہوا آڑ میں لے گیا۔ اسے گھسیٹتے ہوئے بھی میرا سانس بے ربط ہوگیا۔ کم بخت مروہ سانڈ سے بھی زیادہ بھاری تھا۔

میں نے اس کا لباس اتار لیا جو زرد رنگ کی دھوتی اور چادر پر مشتمل تھا۔ دھوتی کے نیچے اس نے چڈی پہن رکھی تھی۔

میں نے دھوتی اپنے جسم پر لپیٹ لی اور چادر بھی اوپر اس طرح ڈال لی کہ میرا اپنا لباس چھپ گیا۔ میں نے اپنا پستول نکال لیا اور دبے قدموں مندر کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس سادھو کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔

میں نے مرکزی دروازے کے ساتھ ایک ستون کی آڑ سے جھانک کر دیکھا اور پھر دبے قدموں چلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ یہاں بہت ہلکی سی روشنی تھی۔ یہ روشنی دراصل دائیں طرف والی راہداری سے یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

میں وسط میں چبوترے کے قریب سے گزر کر ایک ستون کی آڑ میں جانا چاہتا تھا کہ ایک غراہٹ میری سماعت سے ٹکرائی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے پستول کی نال اپنی پشت پر چبھتی ہوئی محسوس کی۔ میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

"یہ میں ہوں ٹھاکر۔ گولی مت چلا دینا۔" میں نے ہاتھ اٹھانے کے بجائے سرگوشی میں جواب دیا۔ ایک تو میں نے ٹھاکر بھانوت سنگھ کی آواز پہچان لی تھی اور دوسرے فوراً ہی میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں نے کسی سادھو ہی کی طرح پیلی دھوتی باندھ رکھی تھی اور اوپر بھی پیلی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ اس لباس میں تو میں کوئی پنڈت یا پجاری ہی لگا تھا۔ کوئی پنڈت مجھ پر پستول نہیں اٹھا سکتا تھا البتہ ٹھاکر دھوکا کھا سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

"اوہ! تم۔" ٹھاکر کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے پستول ہٹا لیا "تم یہیں رکو۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں۔"

میں آگے بڑھ کر ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ ٹھاکر راہداری کی طرف بڑھ گیا۔ اس ستون کی آڑ سے بھی راہداری نظر آرہی تھی جہاں آخر میں دیوار میں لگی ہوئی ایک مشعل جل رہی تھی اور یہ روشنی اسی کی تھی۔ مشعل میں غالباً چربی یا کوئی اور بدبودار روغن استعمال کیا گیا تھا جس کے جلنے کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ اس راہداری میں دبے قدموں چلتا ہوا ایک دروازے کے قریب رکا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔

میں ستون کی آڑ میں کھڑا اس کے باہر آنے یا اندر سے کسی آواز کا منتظر رہا لیکن نہ تو ٹھاکر باہر آیا اور نہ ہی کوئی

تھے۔ میں اٹھ کر دوڑتا ہوا اس کمرے میں داخل ہوگیا جہاں سے یہ دونوں برآمد ہوئے تھے۔

کمرے کا منظر خاصا سنسنی خیز تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ مشعل جل رہی تھی اور دو بٹے کٹے پنڈت ٹھاکر بھانوت سنگھ سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کر رہا تھا۔

میں نے پستول کو نال کی طرف سے پکڑا اور آگے بڑھ کر دستے کی زور دار ضرب ایک پنڈت کے گنجے سر پر رسید کر دی۔ گنجے سر پر لگنے والی ضرب خاصی زور دار تھی۔ وہ بھیانک انداز میں چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

دوسرے پنڈت کو ٹھاکر نے ایک طرف اچھال دیا۔ وہ بھی چیختا ہوا دروازے کے قریب گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر دروازے کے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور اسی لمحے مجھے ٹھاکر کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اسے جانے دو ہمت سنگھ۔ اس طرف۔۔۔ وہ تہ خانے میں ہیں۔"

میں ایک دم واپس پلٹ آیا۔ وہ پنڈت دوڑتا ہوا مندر سے باہر چلا گیا تھا اور اس کی واپسی کی کوئی امید نہیں تھی۔

یہ کمرا بہت بڑا تھا اور ایک کونے میں فرش میں خلا نظر آرہا تھا۔ اس کے قریب ہی کنکریٹ کا ایک سلیب بھی پڑا ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میٹنگ یا تو تہ خانے میں ہو رہی تھی یا وہ لوگ اسی کمرے میں تھے اور گڑبڑ شروع ہوتے ہی کچھ لوگ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تہ خانے میں اتر گئے تھے اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ تہ خانے میں کوئی ایسا خفیہ راستہ ضرور ہوگا جس سے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا جا سکے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نے دیوار میں لگی ہوئی مشعل نکال لی اور ایک طرف فرش پر پڑا ہوا اپنا پستول بھی اٹھا لیا۔

تہ خانہ کافی کشادہ تھا۔ ایک دروازہ دائیں طرف اور ایک بائیں طرف کی دیوار میں نظر آرہا تھا۔ دائیں طرف کا دروازہ بند تھا البتہ بائیں طرف کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"اس طرف۔" ٹھاکر یہ کہتے ہوئے کھلے ہوئے دروازے کی طرف لپکا۔

یہ ایک کشادہ سرنگ تھی۔ ہم دونوں اس سرنگ میں دوڑتے رہے۔ تقریباً پچاس گز آگے جا کر سرنگ بائیں طرف مڑ گئی۔ یہاں سے آگے سرنگ کسی قدر تنگ تھی۔ اس راہداری کے آخر میں ایک لمحے کو روشنی نظر آئی پھر غائب ہوگئی۔

"وہ اسی طرف گئے ہیں۔ بھاگو۔" ٹھاکر چیخا۔

ٹھاکر کی ٹانگ زخمی تھی جس سے خون رس رہا تھا لیکن وہ مجھ سے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ یہ سرنگ بھی تقریباً پچاس گز لمبی تھی۔ اس کے آخر میں روشنی نظر آئی۔

وہ تین آدمی تھے جن میں سے ایک نے مشعل اٹھا رکھی تھی۔ وہ ہم سے تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر آگے تھے۔ ٹھاکر نے گولی چلا دی۔ طویل سرنگ فائر کی بازگشت سے گونج اٹھی لیکن اس کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ تینوں آدمی موڑ گھوم کر ہماری نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ البتہ اس طرف روشنی بدستور دکھائی دے رہی تھی۔

اور جب ہم دوڑتے ہوئے سرنگ کے اس موڑ پر پہنچے تو ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ تینوں غائب ہو چکے تھے۔ تازہ ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس طرف باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ ہم دونوں دوڑتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں وہ تینوں غائب ہوئے تھے۔

میرا خیال درست نکلا۔ اس طرف ایک تنگ سی دراڑ تھی جس سے تازہ ہوا اندر آرہی تھی۔ میں ٹھاکر سے پہلے اس دراڑ میں گھس گیا اور دیواروں سے رگڑ کھاتا ہوا آگے نکلتا چلا گیا۔ اس تنگ سی دراڑ کا اختتام اس عمودی ڈھلان پر ہوا تھا جس پر چڑھ کر ہم اوپر آئے تھے۔

اس دراڑ کے آس پاس کانٹے دار گھنی جھاڑیاں تھیں۔ اس سے آگے عمودی ڈھلان تھی اور تین انسانی ہیولے اس ڈھلان پر بڑی تیزی سے نیچے پھسلتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مشعل تھی جو اب تک جل رہی تھی اور پھر یوں لگا جیسے وہ مشعل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی ہو۔ اب وہ خود پھسلنے کے بجائے لڑھک رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی دراڑ سے نکل کر میرے قریب کھڑا ہوگیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں مشعل تھی اور دائیں ہاتھ میں پستول۔ چند سیکنڈ بعد ہی پہاڑیاں فائر کی آواز سے گونج اٹھیں۔ تقریباً سو گز نیچے ایک شعلہ سا لپکا اور گولی ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی۔

ٹھاکر نے بھی نیچے کی طرف پے در پے دو فائر کر دیے اور مشعل ایک طرف پھینکتے ہوئے چیخا۔

"ان کے پیچھے چلو۔ بھاگنے نہ پائیں۔۔۔"

عمودی ڈھلان پر کھڑے ہو کر اترنے کی کوشش کرنا یا

دوڑنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے چھلانگ لگا دی۔ میرے پیر ڈھلان پر ٹکے اور میں تیزی سے نیچے پھسلتا چلا گیا۔

یہ پہاڑی بھربھری تھی۔ میرے ساتھ مٹی اور ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے پتھر بھی پھسل رہے تھے۔ مجھ سے چند گز اوپر ٹھاکر بھی اسی طرف پھسلا آ رہا تھا۔

تقریباً تین سو گز نیچے آ کر میں جھاڑیوں میں الجھ کر رک گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے اپنے بائیں جانب چند گز کے فاصلے پر کسی کے کراہنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور پھر میں جھاڑیوں کا سہارا لیتا ہوا تیزی سے اس طرف پہنچ گیا۔

وہ ان پنڈتوں میں سے ایک تھا جو بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پکڑے کراہ رہا تھا۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی پھسلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

"تم اسے سنبھالو۔ میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں۔" ٹھاکر یہ کہتے ہوئے پھر ڈھلان پر پھسلنے لگا۔

اس پنڈت نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ ڈھلان پر لڑھکنے اور قلابازیاں کھانے سے دھوتی کھل کر راستے ہی میں کسی جگہ جھاڑیوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ پر ہاتھ رکھا تو وہ چیخ اٹھا۔

اس کا گھٹنا مڑ گیا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ قلابازیاں کھانے سے اس کی گردن نہیں ٹوٹی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے گھٹنے سے ذرا اوپر ٹانگ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پنڈلی کو پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ چیخ اٹھا۔ میں نے دوسرا جھٹکا دیا۔ اس مرتبہ اس کی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی لیکن وہ بتدریج پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ اس کے گھٹنے کا جوڑ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تھا۔

پہاڑی پر کافی نیچے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ٹھاکر کی ان دو آدمیوں سے ٹھن گئی تھی۔

"پنڈت جی۔" میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے پنڈت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آرام کر لیا ہو تو اب چلیں نیچے کی طرف۔"

"مورکھ۔ مجھے نہیں پتا تم کون ہو مگر دھرم ویروں کو پریشان کر کے تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں اس کا کشٹ اٹھانا پڑے گا۔ اچھا ہوگا کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ بولا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔

"کشٹ تو میں پہلے ہی اٹھا رہا ہوں۔ پرنتو تم اپنے بارے میں سوچو۔" میں نے جواب دیا "ابھی تو تمہاری دھوتی اتری ہے۔ یہاں اندھیرے میں کوئی دیکھ بھی نہیں رہا۔ میں تمہارا کرتہ بھی اتار دوں گا اور تمہیں گھسیٹتے ہوئے بازار میں لے جاؤں گا۔ وہاں چیخ چیخ کر تم لوگوں کو بتانا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تم نہیں بتاؤ گے تو میں بتاؤں گا پھر ایک بات اور سمجھ لو۔ تم جو کچھ بھی کہو گے لوگ اب تمہارا وشواس نہیں کریں گے۔ اب کیا ارادہ ہے۔ خود سے چلو گے کہ میں..."

"چلتا ہوں۔ چلتا ہوں۔" وہ کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم آہستہ آہستہ ڈھلان پر اترنے لگے۔ وہ ہولے ہولے لنگڑا رہا تھا اور اس کے منہ سے ہلکی ہلکی کراہیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ آگے ڈھلان بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی۔

ہم سے تقریباً سو گز آگے بھاگ دوڑ کی آوازیں سنائی دیں پھر فائرنگ ہونے لگی۔ دو مختلف سمتوں سے پانچ چھ فائر ہوئے تھے اور پھر خاموشی چھا گئی۔

تقریباً سو گز مزید آگے جا کر میں رک گیا اور متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"ٹھاکر۔ کہاں ہو تم؟" میں نے زور سے پکارا۔

"یہاں ہوں۔ اس طرف!" جواب میں نیچے قدرے دائیں طرف سے آواز سنائی دی۔

میں پنڈت کا ہاتھ پکڑے اس طرف چلنے لگا اور تھوڑی دیر بعد ہم ٹھاکر کے قریب پہنچ گئے جو اپنی ٹانگ پکڑے ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"بھاگ گئے۔ سالے حرامی۔" ٹھاکر نے جواب دیا "ان میں ایک تو بلونت سنگھ تھا۔ وہ حرامی یہاں میرے قابو میں آ گیا تھا لیکن پھر بھاگ نکلا۔ دوسرا اس سے پہلے ہی دوسری طرف نکل گیا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اسے گاڑی کی طرف لے کر چلو۔ میں آ رہا ہوں۔ وہ اس طرف جہاں سرخ بتی جل رہی ہے۔ گاڑی اس طرف ہے۔ تم چلتے رہو۔ میں بھی پہنچتا ہوں اور اس کا خیال رکھنا۔ بھاگنے کی کوشش کرے تو گولی مار دینا سالے کو۔"

"یہ اب بھاگنے کے قابل نہیں رہا۔" میں نے جواب دیا اور پنڈت کا ہاتھ پکڑ کر پھر چلنے لگا۔

تقریباً دو سو گز کا فاصلہ طے کر کے پنڈت رک گیا۔

"اب نہ چلا جاوت ہے مورکھ۔" وہ کراہتے ہوئے بولا "گوڈے میں پیڑ ہووت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ دو منٹ رک جاؤ۔ اس کے بعد تمہارے گوڈے میں پیڑ ہوئی تو میں تمہارا گوڈا ہی توڑ دوں گا۔" میں

نے کہا۔

پنڈت ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے کُرتے کے دامن کو ... کے نیچے دبا لیا تھا۔ دو تین منٹ بعد ٹھاکر بھی لنگڑاتا ہوا ... پہنچ گیا اور ہم پھر آگے چل پڑے۔

گاڑی کے پاس پہنچ کر ٹھاکر نے جیب سے چابی نکال کر ... دے دی۔

"تم ڈرائیو کرو۔" وہ بولا "مجھ سے گاڑی نہیں چلائی ... سکے گی۔ پنڈلی میں گولی لگی ہے۔"

میں دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور پچھلا دروازہ ... کھلنے کے ساتھ ہی اندر کی بتی بھی جلا دی۔ ٹھاکر نے پہلے ... پنڈت کو اندر دھکیلا اور پھر خود اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ ... انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے میری نظر سامنے لگے ہوئے آئینے ... کی طرف اٹھ گئی اور میں تیزی سے پیچھے گھوم گیا۔

وہ پنڈت ہری رام تھا۔ رام گڑھ جھیل والے مندر کا ... مہنت۔

"کیسے ہو پنڈت جی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ... ہوئے کہا۔

"او۔ ا تم...؟" پنڈت ہری رام کا چہرہ دھواں ہو گیا۔

"پہچان لیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب آئے ... ہو تم قابو میں۔ بہت شور مچا رکھا تھا تم نے۔ بہت چرچا ... کر رہے تھے مسلمان آدمی اور ہندو ناری کی دوستی کا۔ اب تم ... اپنی زبان سے لوگوں کو بتاؤ گے کہ اس رات مندر میں کیا ... ہوا تھا۔"

"اب تم گاڑی چلاؤ ہمت سنگھ۔ اس سے حساب کتاب ... بعد میں کر لیں گے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"ہمت سنگھ۔" پنڈت ہری رام چونک گیا "یہ مسلمان ... ہے۔ اس نے ایک ہندو ناری کے ساتھ مندر کی پوترتا کو..." ٹھاکر نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے ... منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔

"اپنی گندی زبان بند رکھو۔" وہ غرایا "اب اگر ایک ... لفظ بھی منہ سے نکالا تو تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔"

پنڈت چیخ اٹھا تھا۔ تھپڑ کچھ زیادہ ہی زوردار تھا۔ اس ... کے پھولے ہوئے گال پر انگلیوں کے نشان پڑ گئے۔

"کہاں چلنا ہے ٹھاکر؟" میں نے گاڑی کو ایک ہلکے سے ... جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کانتی چند رمارگ کی طرف لے چلو۔ راستے کا پتا چل ... جائے گا نا؟" ٹھاکر نے کہا۔

"تم بتاتے رہنا۔" میں نے کہا۔

"یہ سیدھی سڑک ہے۔ کسی طرف نہیں مڑنا۔ شہر کے بیچ میں سے ہوتے ہوئے لے چلو۔" ٹھاکر نے بتایا "سورج پول گیٹ سے سیدھا۔"

"رات کے دو بج رہے ہیں ٹھاکر۔ اگر راستے میں کہیں پولیس نے روک لیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ میں سنبھال لوں گا۔" ٹھاکر نے کہا۔

پہلے تو میں نے گاڑی کی رفتار ہلکی ہی رکھی لیکن پہاڑی کے دامن میں اس نواحی علاقے سے نکل کر میں نے رفتار بڑھا دی لیکن سورج پول گیٹ کے قریب پولیس کی ایک پارٹی نے ہماری گاڑی روک لی۔ کچھ فاصلے پر ایک جیپ بھی کھڑی تھی۔ ایک سب انسپکٹر گاڑی کے سامنے سے گزر کر میری طرف آ گیا۔

"میلا رام کیا بات ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے کیا؟" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹھاکر بھانوت سنگھ نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر سوال کیا۔

سب انسپکٹر میلا رام نے چونک کر پیچھے دیکھا پھر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"ٹھاکر جی آپ۔" وہ بولا "شہر ما تو کوئی گڑبڑ ناہیں ہے پرنتو فون پر ... ملت رہی ہے کہ ادھر گولیاں چلت ہیں۔" اس نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک اطلاع ملی ہے میلا رام۔" ٹھاکر نے کہا "کچھ یاتری اشنان گھاٹوں پر اور مندر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم بھی وہیں موجود تھے۔ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ یہ پنڈت جی بھی ان کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ ہم بڑی مشکل سے اسے بچا کر لائے ہیں۔"

"رام بھلی کرے۔" میلا رام بڑبڑایا "کوئی مرن ورن کا بات تو ناہیں نا؟"

"نہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا "یاتریوں نے مقابلہ کیا تو ڈاکو بھاگ گئے۔ کوئی نہیں مرا نہ ہی زخمی ہوا ہے۔ سب ٹھیک ہے۔"

پنڈت نے کچھ کہنا چاہا تو ٹھاکر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ منہ سے ایک لفظ نہیں نکال سکا تھا۔

"ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔" سب انسپکٹر میلا رام نے کہا۔ "آپ جاؤ۔ رام بھلی کرے۔ جے رام جی کی۔"

"جے رام جی کی۔" ٹھاکر نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یہ خاصی طویل سڑک تھی۔ شہر کا مرکزی اور کاروباری علاقہ تھا۔ شہر کے تمام مشہور

بازار اسی سڑک کے دائیں بائیں تھے۔ دن کے وقت اور رات دس گیارہ بجے تک یہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا لیکن اس وقت سناٹا تھا تاہم بعض علاقے ایسے تھے جہاں بعض ریسٹورنٹ کھلے رہتے تھے اور رات بھر رونق رہتی تھی۔

چاند پول گیٹ سے ذرا آگے نکل کر ٹھاکر کی ہدایت پر میں نے بائیں سمت گاڑی موڑلی۔ یہ کانتی چند ر مارگ کا علاقہ تھا۔ یہاں لبِ سڑک کئی کئی منزلہ عمارتیں تھیں اور ان کے پیچھے بنگلے تھے۔ میں ٹھاکر کی ہدایت پر گاڑی مختلف گلیوں میں گھماتا رہا اور بالآخر ایک بنگلے کے سامنے روک لی۔ ٹھاکر نے نیچے اتر کر گیٹ کی بیل بجادی۔ گیٹ تیسری مرتبہ گھنٹی بجانے کے بعد ہی کھلا تھا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ اس کا جسم اور چہرے کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں بڑی قیامت قسم کی شے رہی ہوگی۔

گیٹ کھلتے ہی میں گاڑی اندر لے گیا اور پورچ میں کھڑی ہوئی ایک کار کے پیچھے روک کر انجن بند کردیا۔ ٹھاکر نے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔

”آیئے پنڈت جی۔ پدھاریے۔“ اس نے پنڈت کو اشارہ کیا۔

پنڈت ہری رام اس عورت کی موجودگی میں کار سے اترتے ہوئے ہچکچا رہا تھا لیکن ٹھاکر نے آنکھیں دکھائیں تو اسے اترنا ہی پڑا۔ اس نے کرتے کے دامن کو آگے پیچھے سے اس طرح پکڑلیا تھا کہ ہوا سے اڑ کر اسے شیم شیم نہ کروا دے۔

”ہے بھگوان۔“ اس عورت نے پنڈت کی طرف دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا ”یہ کیا ہوا پنڈت جی۔ آپ کی وہ کہاں گئی۔ دھوتی؟“

پنڈت کا رنگ سانولا تھا۔ شرم کے مارے سیاہ پڑ گیا۔

”شرما کیوں رہے ہو پنڈت جی۔“ ٹھاکر بولا ”یہاں تمہیں اسی مہلا (عورت) کے ساتھ رہنا پڑے گا اور بھی بہت سی آویں گی۔ سیوا (خدمت) کریں گی تمہاری۔ جی بہلا رہے گا۔“

”ہم کا کوئی دھوتی دیدو مہاراج۔“ پنڈت نے ٹھاکر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے ”ہم کا ناریوں کے سامنے اس طرح جلیل مت کرو۔“

”مندر میں تو ناریوں کے ساتھ بہت خوش رہتے تھے۔ یہاں بھی خوش رہو گے۔“ ٹھاکر نے اسے بازو سے پکڑ کر آگے دھکیل دیا۔

ایک کمرے میں لے جا کر ٹھاکر نے اسے ایک چادر لپیٹنے کو دے دی اور کمرے کا دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا لگا دیا۔

”ہمارے لیے چائے بناؤ بھان متی۔“ ٹھاکر اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ”میں اتنے میں اپنے زخم کی ڈریسنگ کرلوں۔“

”مجھے بتاؤ‘ فرسٹ ایڈ باکس کہاں ہے۔ میں ڈریسنگ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ٹھاکر نے آواز دے کر بھان متی سے فرسٹ ایڈ باکس منگوالیا۔ ٹھاکر ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے اس کے سامنے قالین پر بیٹھ کر اس کی پتلون کا پائنچہ اوپر اٹھا دیا۔ زخم زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ گولی پنڈلی کے گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔

فرسٹ ایڈ باکس میں کسی ایسے موقع کے لیے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ میں نے پہلے اسپرٹ سے زخم صاف کیا اور پھر دوا لگا کر ڈریسنگ کردی۔ اسی دوران میں بھان متی چائے بنا کر لے آئی۔

”باتھ روم کس طرف ہے؟ ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

بھان متی مجھے ایک کمرے میں لے آئی اور باتھ روم کی طرف اشارہ کردیا۔ پہاڑی ڈھلان پر مٹی پر پھسلنے اور لڑھکنے سے یوں تو میرا حلیہ بگڑا ہوا تھا ہی لیکن اس وقت میں نے ہاتھ دھونے پر اکتفا کیا اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں واپس آگیا۔ ٹھاکر اس وقت فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ تقریباً دو منٹ مزید بات کرنے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”میں نے روپ متی کو اطلاع دے دی ہے کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔“ ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ اٹھالیا۔

میں نے اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ میں نے چائے کا کپ اٹھالیا اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔

”مندر کے تہ خانے میں کتنے لوگ تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”چھ سات ہی تھے۔“ ٹھاکر نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا ”جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کونے میں فرش میں خلا دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ لوگ تہ خانے میں ہیں۔ میں دو تین سیڑھیاں اتر کر جھانکنے لگا۔

...ب لوگ تہ خانے میں تھے اور بلونت سنگھ بھاشن ...ے رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ...نڈتوں کو روپ متی اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہا ...ی باتیں ایسی تھیں کہ نہایت ٹھنڈے دماغ کا شخص ...ی اٹھتا اور پھر یہ تو نہایت کٹر اور متعصب پنڈت ...

...بلونت سنگھ انہیں صلاح دے رہا تھا کہ کل رات سب ...روپ متی کی حویلی کو آگ لگادی جائے اور پھر بعض ...ں کے گھروں کو بھی جلا کر بھسم کردیا جائے۔ چار چھ ...ں کی لاشیں بھی گرادی جائیں تو ٹھیک رہے گا۔

...بلونت سنگھ کے کہنے کے مطابق ایک مسلمان نے نہ ...یک ہندو ناری کو اس کے دھرم سے گمراہ کیا ہے بلکہ ...پوترتا کو بھی نشٹ کیا ہے۔ آج اگر اس کی سزا نہ دی ...ل کو دوسرے مسلمان بھی ایسی حرکتیں کرنے لگیں ...ہندو دھرم خطرے میں پڑ جائے گا۔ دھرم کو بچانے کے ...ری ہے کہ اس یدھ (لڑائی) کے شروع ہی میں چار چھ ...ں کی لاشیں گرادی جائیں تاکہ آئندہ کسی مسلمان کو ...ت کرنے کی جرأت نہ ہو۔“ وہ چند لمحوں کو خاموش ...ت جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

...بلونت سنگھ نے ان پنڈتوں کو میرے اور تمہارے ...ی خوب بھڑکا دیا تھا۔ وہ پنڈتوں کو یہ باور کرانے کی ...کررہا تھا کہ مجھ جیسے لوگ بھائی چارے کی آڑ میں ...ں کا ساتھ دے کر ہندو دھرم کو ختم کرنے کی کوشش ...ہیں۔

...میں ابھی یہ باتیں سن ہی رہا تھا کہ اوپر کمرے میں ...ی آہٹ سن کر تیزی سے سیڑھیوں سے اوپر آگیا۔ وہ ...رکم پنڈت شاید پہلے کسی اور طرف تھا جو اس طرف ...اس نے مجھے دیکھتے ہی چھلانگ لگادی۔ باہر سے بھی ...ں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

...ھی اور اس پنڈت کی دھینگا مشتی کی آوازیں سن کر ...میں موجود پنڈت باہر آگئے۔ ان میں بلونت سنگھ بھی ...نے گولی چلادی جو میری ٹانگ کو زخمی کرتی ہوئی نکل ...ے بھی پستول نکالنے کا موقع مل گیا۔ میں نے فائر کیا تو ...تہ خانے میں واپس دوڑ گیا اور دو پنڈت مجھ سے ...اس دوران میں میرا پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ ...ر تم بروقت نہ پہنچ جاتے تو شاید وہ مسٹنڈے مجھے بے ...بس کامیاب ہوجاتے۔“

...پنڈت ہری رام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ”کیا اسے پولیس کے حوالے کردیا جائے؟“

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ پولیس ان پنڈتوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکے گی۔“ ٹھاکر نے جواب دیا ”اس کے لیے میں نے ایک اور طریقہ سوچا ہے۔ اس میں دو چار روز لگیں گے مگر اس کے بعد پنڈت ہری رام اور اس کے چیلوں کی زبانیں بند ہوجائیں گی۔“

ٹھاکر نے یہ نہیں بتایا کہ اس نے پنڈت ہری رام کی زبان بند کرنے کے لیے کیا طریقہ سوچا ہے اور اس وقت میں نے بھی کچھ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔

چار بج رہے تھے۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ٹھاکر نے مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں باتھ روم میں‘ میں نے ہاتھ دھوئے تھے۔ میں آرام دہ بستر پر گرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

ان پنڈتوں کا منصوبہ واقعی بہت خوفناک تھا اور میرا اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا کہ انہیں کسی اور کی آشیرواد حاصل تھی۔ وہ شخص جو پس منظر میں رہ کر ان متعصب پنڈتوں کو کور کررہا تھا۔ میں نے پہلے بلونت سنگھ کا نام لیا تھا اور یہ بات ثابت بھی ہوگئی تھی۔ گزشتہ رات وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کی گرفت میں آکر نکل گیا تھا۔

پنڈت ہری رام کے کہنے کے مطابق بلونت سنگھ نے اسے پچاسی ہزار روپے دیے تھے اور ہنگامے شروع کرانے کے بعد مزید رقم دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

بلونت سنگھ کے حرامی ہونے میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ کئی ماہ پہلے غلاموں کی منڈی میں اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون بہت ہی گندا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات ثابت بھی ہوتی گئی تھی۔ اس کے باپ نے بشن سنگھ کے باپ کو قتل کرکے دھوکے سے چتوڑ گڑھ کی گدی حاصل کی تھی۔ باپ کی زندگی دھوکے اور فریب میں گزری تھی تو بیٹا کس طرح نیک ہوسکتا تھا۔ یہ ساری باتیں ثابت کرتی تھیں کہ ان کا تعلق راجپوتوں کی کسی اچھی نسل سے نہیں تھا۔

بلونت سنگھ کی کمینگی میں کوئی شبہ نہیں تھا اور یہ روپ متی کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس جیسے کمینے شخص سے دوستی کر بیٹھی تھی جس کا خمیازہ اب اسے بھی بھگتنا پڑ رہا تھا۔ وہ روپ متی اور میرے خلاف کوئی موقع نہیں کھونا چاہتا تھا۔ پہلے تیج سنگھ اور دھرمیش کو ہمارے خلاف بھڑکایا۔ وہ دونوں بھائی

عقل مند ہوتے تو اس کی باتوں میں آنے کے بجائے روپ متی سے معافی مانگ لیتے اور بات ختم ہو جاتی لیکن وہ بلونت سنگھ کے بہکاوے میں آ گئے اور جوشِ انتقام میں وہ اپنی اوقات بھی بھول گئے۔ انہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ اسی روپ متی نے انہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچایا تھا۔ نوکر جب مالک کے سامنے گردن تان کر کھڑے ہو جائیں تو ان کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔ ان دونوں بھائیوں کا انجام ایسا ہی ہوا۔ محض بلونت سنگھ کے بہکاوے میں آ کر وہ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اب پنڈت ہری رام اس کی مکاری کا نشانہ بنا ہوا تھا۔

اگلے روز صبح ٹھاکر نے میری موجودگی میں پنڈت ہری رام سے پوچھ گچھ کی اور اس وقت ہری رام نے یہ سنسنی خیز انکشاف بھی کیا کہ اس رات کلب کی رقاصہ ریکھا کو بھی بلونت سنگھ ہی نے قتل کیا تھا۔ ان لوگوں کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ریکھا اور بعض دوسری لڑکیوں کو پولیس کمشنر کے سامنے پریس کانفرنس میں پیش کیا جانے والا تھا۔ رام گڑھ جھیل مندر والے واقعے کے بعد تمام لڑکیاں روپوش ہو گئی تھیں البتہ ریکھا بلونت سنگھ کے ہاتھ لگ گئی جسے اس نے ذبح کر ڈالا۔

"پنڈت جی۔" میں نے کہا "اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کسی کمینے شخص کی دوستی کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ کمینے آدمی کی دوستی اس کوئلے کی طرح ہے جو دہک رہا ہو تو ہاتھ جلا دیتا ہے اور بجھا ہوا ہو تو ہاتھ کالے کر دیتا ہے اور اس کمینے نے تمہارے ہاتھ تو کیا' منہ بھی کالا کر دیا ہے۔"

میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس رات ہم اپنی دوست کی تلاش میں تمہارے مندر میں آئے تھے جسے گنیش مندر سے اغوا کر کے وہاں لے جایا گیا تھا۔ تمہارے مندر میں ہمارا ایک پرانا دشمن بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ جرائم پیشہ آدمی ہے اور کئی بے گناہوں کا قاتل بھی۔

"ہمیں دیکھتے ہی وہ فرار ہو گیا۔ ہم نے اپنی دوست کو بازیاب کر لیا تھا اور تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کیے بغیر واپس آ گئے تھے۔ تم لوگ اگر خاموش رہتے تو بات ختم ہو جاتی لیکن دارا اور بلونت سنگھ نے تمہیں بہکا دیا اور ان کے بہکاوے میں آ کر تم لوگوں نے عام لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش کی اور ہنگامے کر دیے۔

"کل رات بھی بلونت سنگھ تم لوگوں کو بھڑکا رہا تھا لیکن تمہیں کیا ملا۔ ذلت اور رسوائی۔ میں ایک بات تمہیں بتا دوں پنڈت ہری رام۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "بلونت سنگھ کو دھرم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ محض انتقام لینے کے لیے تم لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے! دارا تو مسلمان ہے۔ ایسے لوگ اپنے نام کے ساتھ مذہب ٹھپا لگائے پھرتے ہیں جبکہ حقیقت میں ان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اور تم جانتے ہو دارا نے کیا منصوبہ بنا رکھا تھا!"

پنڈت ہری رام کچھ بولنے کے بجائے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔

"خوب صورت لونڈیا' ولایتی شراب۔ وہ تمہیں راستے سے بھٹکا رہا تھا۔ تمہیں ہیروئن کا عادی بنا رہا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ تمہیں ان چیزوں میں الجھا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور وہ اس مندر پر قبضہ کر لے۔ پنڈت پرشورام' جس کا اصل نام مرلی دھر ہے' وہ بھی جرائم پیشہ دارا کا ساتھی ہے۔ تم ان کے جال میں پھنس گئے تھے۔ وہ لوگ تو بھاگ گئے اور تمہیں سزا بھگتنے کے لیے چھوڑ دیا۔"

پنڈت ہری رام کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ وہ رحم طلب نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ٹھاکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔" ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تم اگرچہ اس دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے ہو لیکن ہم تمہیں بچانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ تم دو چار دن یہیں رہو۔ یہاں تمہیں تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر طرح سے تمہاری سیوا کی جائے گی لیکن اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو مار دیے جاؤ گے۔"

"مارے کو پولیس کے ہاتھ تو نہ دیو گے؟" پنڈت ہری رام نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"بالکل نہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا "دو چار دن میں معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو تمہیں چھوڑ دیں گے۔ جہاں چاہے' چلے جانا۔"

ہم پنڈت والے کمرے سے باہر آ گئے اور پھر ٹھاکر کچھ دیر بعد میں تو ٹھاکر کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا اور میں اسی بنگلے میں رہ گیا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ جانکی اور روپ متی سو رہی تھیں۔ مندری اور شنکر حویلی کی عقبی سمت تھے۔ مندری موروں اور ہرنوں وغیرہ کے سامنے دانہ ڈال رہی تھی اور شنکر مندری کو دانہ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہٹ گئے۔

"راج کماری اور جانکی دیوی تو سو رہی ہیں۔ آپ کے لیے چائے بنا دوں ہمت سنگھ جی؟" مندری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نہیں بھئی۔ ابھی چائے کا موڈ نہیں ہو رہا۔" میں نے ...ریا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

...میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی آنکھ ...۔ سات بجے کے قریب جانکی نے مجھے جھنجوڑ کر جگا...

...کیا بات ہے۔ قیامت آ گئی ہے کیا؟" میں نے جھنجلا کر...

...ہاں۔ قیامت ہی آ گئی ہے۔" جانکی نے جواب دیا ...ابھی ٹھاکر کا فون آیا ہے۔ کچھ غنڈوں نے اس کے ...آگ لگا دی ہے۔"

...کیا؟" میں اچھل پڑا۔ میری نیند اگرچہ کافور ہو گئی تھی ...غ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے "کب۔ کس نے ...ے؟"

...یہ تو ابھی پتا نہیں چلا کہ آگ کس نے لگائی۔ ہوٹل ...ہوں نے ایک آدمی کو پکڑ لیا ہے اور ٹھاکر بھی ہوٹل ...گیا ہے۔ اسے شبہ ہے کہ اس حویلی پر بھی حملہ کیا ...۔ تین چار مسلح آدمی اس نے ہماری حفاظت کے لیے ...ف بھیج دیے ہیں۔ اس نے کہا تھا کہ ہم میں سے کوئی ...کی کوشش نہ کرے۔"

...یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ٹھاکر پر مصیبت نازل ہو رہی ہو ...یہاں چھپ کر بیٹھے رہیں!" میں اچھل کر بیڈ سے اتر ...دونوں بہرحال حویلی سے نہیں نکلو گی۔ میں ٹھاکر کے ...کی طرف جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے' اسے میری مدد کی ...ت ہو۔"

...میں نے باتھ روم میں گھس کر منہ پر پانی کے چھینٹے ...اور تولیے سے منہ پونچھتا ہوا باہر آ گیا۔ روپ متی ...صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر و ...کے تاثرات نمایاں تھے۔

...رو کی چابیوں کا رنگ میز پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ...کر کی رنگ اٹھایا' روپ متی بھی اچھل کر کھڑی ...

...میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

...نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "اس وقت تمہارا ...ب نہیں ہوگا۔"

...ٹھاکر ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہا ہے۔ اس کی املاک کو ...جا رہا ہے۔ اس نے ہماری خاطر اپنی جان تک کو ...میں ڈال رکھا ہے۔ کیا یہ مناسب ہوگا کہ ہم یہاں ...بیٹھے رہیں!" روپ متی نے کہا۔

"میں جا رہا ہوں نا۔" میں نے کہا "وہاں نجانے کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے اس لیے فی الحال تم یہیں رہو تو بہتر ہے۔"

"کل رات تم لوگ سوریا مندر گئے تھے۔ وہاں کیا ہوا تھا۔" روپ متی نے پوچھا۔

میں نے مختصراً اسے کل رات کے بارے میں بتا دیا۔ آخر میں کہا۔

"ان پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے میں بلونت سنگھ اور دارا کا ہاتھ ہے۔ بلونت سنگھ تو ہاتھ آ کر نکل گیا۔ پنڈت ہری رام ہمارے قبضے میں ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ ٹھاکر کے ہوٹل کو آگ لگانے میں بھی بلونت سنگھ ہی کا ہاتھ ہوگا۔ ایسے بد فطرت لوگ آسانی سے اپنی ہار نہیں مانتے۔ بہرحال' میں جا کر دیکھتا ہوں کہ کیا صورتِ حال ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد موقع ملا تو فون پر بتا دوں گا۔"

جانکی اور روپ متی بھی برآمدے تک میرے ساتھ آئی تھیں اور تقریباً اسی وقت ٹھاکر کے چار آدمی جیپ پر سوار وہاں پہنچ گئے۔ ان چاروں کے پاس سب مشین گنیں تھیں۔ انہوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی اور پجارو پر سوار ہو کر وہاں سے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ٹھاکر کا وکرم ہوٹل سینٹرل بس اسٹینڈ سے ذرا آگے اسٹیشن روڈ پر واقع تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب تھا۔ ایم' آئی (مرزا اسمٰعیل) روڈ پر کم از کم دو جگہوں پر ٹریفک جام تھا۔ اس طرح اسٹیشن روڈ تک پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ پہلے میں اس طرف کبھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی ٹھاکر کا ہوٹل دیکھا تھا لیکن وکرم ہوٹل تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

ہوٹل کی عمارت چار منزلوں پر مشتمل تھی۔ گراؤنڈ فلور پر شان دار ریسٹورنٹ تھا اور اوپر کی چار منزلوں پر رہائشی کمرے تھے۔ ریسٹورنٹ کا منیجر الگ تھا اور رہائشی ہوٹل کا انتظام و انصرام دوسرے منیجر کی نگرانی میں تھا۔

مجھے پجارو دور ہی روک لینی پڑی تھی۔ ہوٹل کے سامنے سڑک کے کچھ حصے کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں ہوٹل کی عمارت کے سامنے کھڑی تھیں۔ ہوٹل کے ریسٹورنٹ کے دروازے وغیرہ ٹوٹے اور جلے ہوئے تھے۔ دھوئیں سے اوپر تک عمارت کے سامنے کا پورا حصہ کالا ہو رہا تھا۔ ریسٹورنٹ کے سامنے پانی پھیلا ہوا تھا۔ کئی فائرمین اور چند دوسرے آدمی

وہاں موجود تھے۔ ریسٹورنٹ سے اب بھی ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

میں دور کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ٹھاکر مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر مجھے ایک پولیس والے نے روک لیا اور پھر اسی وقت ٹھاکر ریسٹورنٹ سے باہر آتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس آفیسر اور فائر بریگیڈ کے دو آفیسر بھی تھے۔ میں پولیس والے کو ایک طرف دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ٹھاکر مجھے دیکھ کر چونک گیا۔

"یہ کیا ہوا؟ آگ کس نے لگائی تھی؟" میں نے ٹھاکر کے سامنے جاتے ہی پوچھا۔

"ابھی حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" ٹھاکر نے جواب دیا "منیجر کا کہنا ہے کہ چند غنڈے اندر گھس آئے تھے جنہوں نے پہلے توڑ پھوڑ شروع کردی اور پھر پردوں اور فرنیچر کو آگ لگا دی۔ ملازمین نے آگ بجھانے کی کوشش کی تو انہیں بھی مارا پیٹا گیا۔ آگ بے قابو ہو کر پھیلنے لگی تو فائر بریگیڈ کو کسی نے فون کردیا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ فائر انجن بروقت پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہوچکا ہے مگر آگ کو اوپر تک پھیلنے سے روک دیا گیا ہے۔"

"کون تھے وہ لوگ؟" میں نے پوچھا "جانکی نے بتایا تھا کہ شاید ایک آدمی کو پکڑ لیا گیا ہے۔"

"ہاں۔ وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ ویسے میں پورے وشواس (یقین) سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بلونت سنگھ کے سوا کسی اور کا کام نہیں ہوسکتا۔" ٹھاکر نے کہا۔

ہم باتیں کررہے تھے کہ پولیس آفیسر ہمارے قریب آگیا۔

"ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔" وہ ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں چلتا ہوں۔ چند پولیس والے یہاں رہیں گے۔ آپ اپنے منیجر کو پولیس اسٹیشن بھیج دیجئے تاکہ رپورٹ درج کرلی جائے۔"

"بہتر ہے۔ میں بھیج دوں گا۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

پولیس آفیسر رخصت ہوگیا۔ فائر بریگیڈ کا عملہ وہاں موجود رہا۔

آگ لگنے کی وجہ سے ہوٹل کی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔ اندھیرا ہونے کے بعد ہوٹل کے رہائشی حصے میں ایمرجنسی لائٹس کا انتظام کرلیا گیا تھا۔ آگ لگنے کے بعد مہمانوں سے ہوٹل خالی کروا لیا گیا تھا لیکن ریسٹورنٹ میں آگ پر قابو پالینے کے بعد مہمانوں اور اسٹاف کو اندر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

ٹھاکر مجھے لے کر ریسٹورنٹ میں آگیا۔ یہاں دو تین مین اب بھی موجود تھے اور ٹارچوں کی روشنی میں ہر جگہ چیک کررہے تھے۔ کہیں کہیں سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔

ٹھاکر کے ہاتھ میں بھی ٹارچ تھی جو میں نے لے لی۔ اس کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ریسٹورنٹ مکمل طور پر تباہ ہوچکا تھا اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ آگ لگتے ہی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔ بصورت دیگر پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آجاتی اور سب کچھ تباہ ہوجاتا۔

میں تقریباً دو گھنٹے وہاں رکا رہا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تو ٹھاکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"سچائی کی خاطر اگر مجھے اپنا جیون بھی لٹانا پڑے تو کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ تم کوئی چنتا (فکر) مت کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "تم گھر جاؤ اور خیال رکھنا۔ بلونت سنگھ جیسے مکار دشمن سے نمٹنے کے لیے ہمیں کچھ زیادہ ہی محتاط رہنا پڑے گا۔"

"تم حویلی نہیں آؤ گے؟" میں نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ابھی تو یہ سارے معاملات دیکھنے ہیں۔ پولیس کارروائی سے نمٹنا ہے۔ ہوسکتا ہے، میں رات کو نہ آسکوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں ٹھاکر سے ہاتھ ملا کر پجارو میں آگیا اور انجن اسٹارٹ کرکے اسے ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ چندر مارگ سے نکلتے ہوئے ایم، آئی روڈ پر گاڑی گھمائی تو سونیا کا خیال آگیا اور پھر میں نے پجارو انڈین کافی ہاؤس کے قریب روک کر انجن بند کردیا۔

سونیا کی ڈیوٹی دوپہر دو بجے سے رات دس بجے تک تھی اور اس وقت دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ جب میں کافی ہاؤس میں داخل ہوا تو سونیا نظر آئی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا اس میز پر بیٹھ گیا جہاں ایک آدمی جانکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ فوراً ہی ایک عورت دوسری میز سے اٹھ کر میری میز پر آگئی۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ جوانی میں یقیناً حسین رہی ہوگی لیکن اب اس کا حسن ڈھل چکا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو جوان بنائے رکھنے اور پُرکشش نظر آنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ ساڑی کا بندھا ہوا تھا اور بلاؤز کا گریبان اتنا کشادہ تھا کہ غیر ضروری تاک جھانک کی ضرورت نہیں تھی۔

"ہیلو۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

میں جواب دینے کے بجائے بائیں طرف کچن والے دروازے کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے سونیا برآمد ہورہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ مجھے اور اس عورت کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سی گئی۔ وہ ہم دونوں کو گھورتے ہوئے آگے نکل گئی۔ چوتھی میز پر اس نے کافی سرو کی اور ہمارے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔

"مس نائیڈو۔" وہ اس عورت کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی "یہ وہ نہیں جو تم سمجھ رہی ہو۔ اپنی میز پر چلی جاؤ۔ یہاں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع مت کرو۔"

"اوہ۔ سمجھ گئی۔" مس نائیڈو نامی اس عورت کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ آگئی اور دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کر ایک اور میز پر چلی گئی جہاں دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

سونیا اب مجھے گھور رہی تھی۔

"میں نے اسے نہیں بلایا تھا۔" میں جلدی سے بولا "وہ خود ہی میری میز پر آگئی تھی۔ شکار سمجھ کر۔"

"میں جانتی ہوں۔" سونیا بولی "میں پرسوں سے تمہارا انتظار کررہی ہوں۔ کہاں غائب ہوگئے تھے؟"

"تمہاری چھٹی کا وقت ہونے میں چند ہی منٹ رہ گئے ہیں۔" میں نے سامنے دیوار پر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں باہر پجارو میں بیٹھا تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

میں سونیا کے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر باہر آگیا۔ چند منٹ کافی ہاؤس کے سامنے کھڑا رونق دیکھتا رہا اور پھر پجارو میں آکر بیٹھ گیا۔

تقریباً سوا دس بجے سونیا سائیڈ اسٹریٹ سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے انجن اسٹارٹ کردیا اور جھک کر پسنجر سیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا۔ سونیا پجارو کے قریب آکر ایک لمحے کو رکی اور پھر دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"سب سے پہلے یہ بتاؤ تم دو دن کہاں غائب رہے؟" سونیا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم نے اگلے روز آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں انتظار ہی کرتی رہی۔"

"گڑبڑ ہوگئی تھی۔" میں نے جواب دیا "یہاں پنڈتوں سے کچھ ہنگامے بازی شروع ہوچکی ہے اور اتنے عرصے سے یہاں رہتے ہوئے تمہیں یہ تو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ پنڈت بامیں، ہندوستان کی خطرناک ترین مخلوق ہے۔ یہ جس کے پیچھے پڑ جائیں آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

"دارا سے پیچھا چھوٹنے کے بعد اب پنڈت۔۔۔"

"دارا سے پیچھا نہیں چھوٹا۔" میں نے جواب دیا "بلکہ دارا اور یہاں کے بعض پنڈتوں میں خطرناک قسم کا گٹھ جوڑ ہوگیا ہے۔ کل رات ان سے ہماری جھڑپ ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں آج میرے، دوست کے ہوٹل کو آگ لگا دی گئی۔"

"دوست کا ہوٹل۔ تمہاری مراد وکرم ہوٹل تو نہیں جسے آج سہ پہر غنڈوں نے آگ لگا دی تھی؟" سونیا نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ ہوٹل میرے دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ کا ہے۔ وہ یہاں بدی کے مقابلے میں میرا ساتھ دے رہا ہے۔ میری دوستی کا خمیازہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا کہ اس کے ہوٹل کو آگ لگا دی گئی۔ یہ غنیمت ہے کہ پوری عمارت کو آگ کی لپیٹ میں آنے سے بچالیا گیا۔ لاکھوں کا نقصان ہوا ہے مگر ٹھاکر بھانوت سنگھ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے۔ میں ابھی اس کے ہوٹل کی طرف سے ہی آرہا ہوں۔"

"اب کہاں جانے کا ارادہ ہے اور اس طرف کہاں جارہے ہو تم؟" سونیا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"زور آور گیٹ۔" میں نے جواب دیا "سنا ہے وہاں ایک دو ریستورانوں میں ہرن کی ران ملتی ہے۔ کوئلوں پر بھنی ہوئی۔"

"ہاں۔" سونیا نے جواب دیا "راجستھان میں ہرن کے شکار پر پابندی ہے مگر جے پور کے بعض ہوٹلوں میں ہرن کا گوشت دھڑلے سے فروخت ہوتا ہے۔"

جوہر بازار سے ہوتے ہوئے رام گنج بازار کراس کرکے میں گاڑی کو سرائے ڈیوڑھی بازار کی طرف لے گیا اور پھر ایک اور سڑک گھوم کر اسے زور آور گیٹ کی طرف موڑ دیا۔

زور آور گیٹ متوسط آبادی پر مشتمل ایک بارونق علاقہ تھا۔ یہاں بہت سے ریسٹورنٹ اور کھانے پینے کی اور بھی بہت سی دکانیں تھیں۔ ہرن کے گوشت کی وجہ سے دور دور سے لوگ یہاں آتے تھے۔ کوئلوں پر بھونے جانے والے گوشت کی اشتہا آمیز خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت یہاں کی رونق عروج پر تھی۔ ریستورانوں کے سامنے فٹ پاتھوں پر بھی میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ سب سے پہلے میں نے ایک پبلک فون بوتھ سے جانکی کو اطلاع دی کہ دیر سے آؤں گا۔ اسے میں نے یہ نہیں بتایا کہ دیر کس وجہ سے ہوگی اور اس کے جرح کرنے سے پہلے ہی میں نے فون بند کردیا۔

ہمیں ایک ریسٹورنٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر خالی میز مل گئی۔ ویٹر کو میں نے ہرن کی روسٹڈ ران کا آرڈر دے دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کئی لوگ کھا جانے والی نظروں سے سونیا کی طرف دیکھ رہے تھے اور جب میں نے سونیا کی طرف دیکھا تو میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ تنگ پائنچے والی پتلون اور سلیولیس ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی جس کا گریبان خاصا فراخ تھا۔

میں کئی مہینوں سے اس ایک شہر میں رہ رہا تھا لیکن جس طرح ایک چاول دیکھ کر پوری دیگ کا اندازہ لگا لیا جاتا ہے اسی طرح اس ایک شہر میں رہتے ہوئے میں ہندوستان کے معاشرے کا اندازہ لگا چکا تھا۔ یہاں خواتین کے اس قسم کے لباس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اونچی سوسائٹی میں تو خواتین ایسے لباس پہنتی تھیں کہ اسے لباس کے نام پر دھبا ہی کہا جا سکتا تھا لیکن متوسط اور نچلے درجے کی آبادی والے علاقوں میں اس قسم کا لباس پہننے کا مطلب تھا "آ بیل مجھے مار" اس طرح یہاں غنڈوں کو بھی سرگرم ہونے کا موقع مل جاتا تھا لیکن بہرحال، اب تو ہم یہاں آ ہی گئے تھے اور میں نے اپنے آپ کو کسی بھی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

لیکن خیریت ہی گزری۔ چند بدقماش قسم کے لوگ آس پاس منڈلاتے تو رہے لیکن کسی نے ایسی حرکت نہیں کی جس پر سونیا کو یا مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ملتا۔ ہم کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد وہاں سے اٹھ گئے۔

واپسی پر میں نے طویل راستہ اختیار کیا۔ میرا خیال تھا کہ ایک طویل چکر کاٹ کر چاند پول گیٹ کی طرف نکل جاؤں گا اور سونیا کو نیو گیٹ کے قریب اس کے فلیٹ والی عمارت کے سامنے اتار کر ایم، آئی روڈ سے ہوتا ہوا آگرہ مارگ کی طرف چلا جاؤں گا۔ طویل راستہ اختیار کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ راستے میں سونیا سے کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں گی لیکن میں بھول گیا تھا کہ اس شہر میں میرے لیے قدم قدم پر خطرات گھات لگائے بیٹھے تھے۔

اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ زور آور گیٹ کے علاقے میں اس وقت بھی رونق تھی لیکن دو تین کلو میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہی ویرانی شروع ہو گئی۔ ویرانی ان معنوں میں تھی کہ اس سڑک کے آس پاس بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ چند قدیم محلات تھے اور ٹریفک برائے نام ہی تھا۔

گنگوری بازار کی طرف سے آنے والی وہ سڑک ابھی مزید دو کلو میٹر آگے تھی جو اس سڑک کو قطع کرتی ہوئی چاند پول بازار کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اگلے موڑ پر ہی گاڑی کو گنگوری بازار کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لوں گا۔

"اس طرف کہاں جا رہے ہو؟" سونیا نے پوچھا "آگے تو سناٹا ہے اور غیر آباد سڑکوں پر وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے، ہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔" میں نے جواب دیا "میرا خیال تھا کہ ہم طویل ڈرائیو کرتے ہوئے باتیں بھی کرتے رہیں گے لیکن تم شاید ڈر رہی ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ میں اگلے موڑ پر گاڑی گنگوری بازار کی طرف موڑ لوں گا۔"

"تم ساتھ ہو تو مجھے ڈرنے یا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔" سونیا نے کہا "لیکن گاڑی سائیڈ پر کر لو۔ پیچھے سے ایک گاڑی آ رہی ہے۔"

میں نے سائیڈ میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی چمکتی ہوئی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی جس طرح تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ میں بجارو سڑک کے وسط میں چلا رہا تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ کو معمولی سی حرکت دے کر گاڑی سائیڈ پر لے لی۔

وہ گاڑی بڑی تیز رفتاری سے قریب آ رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ زناٹے کی آواز کے ساتھ ہمارے قریب سے گزری اور پھر اچانک ہی ہمارے آگے آ گئی۔ بریکوں کی چرچراہٹ کی آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

وہ کار ہم سے تقریباً بیس گز آگے سڑک کے وسط میں رک گئی تھی۔ میں نے پوری قوت سے بریک پیڈل دبا دیا۔ ٹائر سڑک پر چرچرائے اور بجارو اگلی کار سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ اس طرح اچانک بریک لگنے سے سونیا کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

میں گاڑی روک کر پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ آگے والی کار کے دروازے کھلے۔ دو آدمی چھلانگ لگا کر نیچے اترے اور ہماری بجارو کی طرف لپکے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

ان دونوں میں سے ایک سونیا والی سائیڈ پر چلا گیا اور دوسرا میری طرف لپکا۔ میرا خیال تھا کہ یہ غنڈے زور آور

گیٹ سے ہمارے پیچھے لگے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں قانون کا نہیں غنڈوں کا راج تھا۔ لوٹ مار' قتل و غارت اور لڑکیوں کو اٹھالینا عام سی بات تھی۔ کسی کو دن دہاڑے سرعام قتل بھی کردیا جاتا تو قانون کے محافظ کھڑے دیکھتے رہتے اور قاتل تلواریں لہراتے ہوئے اطمینان سے فرار ہوجاتے۔ کسی بارونق بازار سے کسی لڑکی کو زبردستی اٹھالیا جاتا تو بھی قانون کے یہ محافظ مداخلت نہ کرتے اور منہ دوسری طرف کرکے کھڑے ہوجاتے۔

میں یہی سمجھا تھا کہ یہ غنڈے سونیا کی وجہ سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور یہاں موقع ملتے ہی انہوں نے ہماری گاڑی روک لی تھی۔ اس کار میں مجموعی طور پر تین آدمی تھے۔ دو پستول تان کر ہماری طرف لپکے تھے اور تیسرا کار کے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا رہا تھا۔

میری طرف آنے والے نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا اور میرے گریبان پر ہاتھ ڈال کر مجھے بھی نیچے کھینچ لیا جبکہ دوسری طرف سے دوسرے غنڈے نے سونیا کو بھی نیچے کھینچ لیا تھا۔ سونیا چیخی تو اس غنڈے نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی تھی۔

"اے۔ کیا بات ہے۔ کون ہو تم لوگ؟" میں نے چیخ کر کہا۔

"خاموش رہو۔" میرا حریف گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے غرایا۔ ساتھ ہی اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول میرے سینے سے لگا دیا "اگر منہ سے آواز نکالی تو اس پستول کی ساری گولیاں تمہارے شریر (جسم) میں اتار دوں گا۔"

"ہمارے پاس زیادہ رقم نہیں ہے بھائی۔ میری جیب میں جو کچھ بھی ہے' تمہارے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ میں اپنے آپ کو بالکل کم ہمت اور بزدل ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"ہمیں تمہاری جیب سے کوئی سروکار نہیں۔" وہ غرایا "خاموشی سے کار میں بیٹھ جاؤ۔ بہت دوڑایا ہے تم نے سالے حرامی۔۔۔!"

"اے۔ گالی مت دینا۔" میں نے بھی غرا کر جواب دیا۔

اس نے اچانک ہی میرے منہ پر گھونسا ماردیا۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ وہ مجھے دھکے دیتا ہوا آگے پجارو کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں لے آیا۔ دوسرا آدمی سونیا کو بھی بازو سے پکڑے کھینچتا ہوا سامنے لے آیا تھا۔ سونیا کے چہرے پر خوف کے تاثرات نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔

میں روشنی میں آنے کے بعد باری باری ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جس شخص نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا وہ دراز قامت اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اس نے ٹانگوں سے چپکی ہوئی جینز اور اوپر ڈھیلا ڈھالا سا کرتہ پہن رکھا تھا جو گھٹنوں تک لمبا تھا۔ کرتے کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی چین روشنی میں چمک رہی تھی۔ وہ کلین شیو تھا لیکن غالباً دو دن سے شیو نہیں بنایا تھا۔ سر کے بال بھی خاصے لمبے تھے۔ بائیں کان میں سونے کی بالی چمک رہی تھی۔ اس کی ناک پچکی ہوئی تھی اور بائیں رخسار پر تقریباً ایک انچ لمبا زخم کا نشان تھا۔

دوسرا آدمی درمیانے قد کا اور کسی قدر بھاری بھرکم تھا۔ اس کا حلیہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر کٹ کا نشان تھا اور اس کے کان میں بھی سونے کی بالی چمک رہی تھی۔

"چلو۔ ادھر گاڑی میں بیٹھو۔" میرے حریف نے ایک بار پھر مجھے دھکا دیا۔

"دیکھو۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میری جیب میں جو کچھ ہے وہ لے لو اور ہمیں جانے دو۔"

"ہم تو سمجھتے تھے کہ تو اپنے نام کی طرح ہمت والا ہوگا مگر تو' تو بہت بزدل نکلا۔ چل بیٹھ گاڑی میں۔" اس نے مجھے ایک اور دھکا دیا۔

یہ جملہ سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے میرا نام معلوم تھا۔ یعنی ہمت سنگھ۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ عام غنڈے نہیں تھے اور محض سونیا کی وجہ سے زور آور گیٹ سے ہمارے پیچھے نہیں لگے تھے۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ ٹھاکر کے ہوٹل کو آگ بلونت سنگھ نے لگوائی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تھا تو ہوٹل کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے اور یقیناً یہ دونوں بھی وہیں موجود تھے اور انہوں نے وہیں سے میرا تعاقب شروع کیا تھا۔ مجھے یاد آگیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کہا تھا۔۔۔ بہت دوڑایا ہے تم نے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ لوگ شروع ہی سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

"چل بیٹھ گاڑی میں۔" وہ شخص غرایا پھر اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "ابے او پانڈو۔ لونڈیا کو دوسری طرف سے بٹھا گاڑی میں۔"

"لونڈیا تو بہت زوردار ہے رامو۔ بدیشی (امپورٹڈ) مال ہے۔" پانڈو نے کہا "اسے تو اس حرامی بلونت کے حوالے نہ
رہیں گے۔"

"ابے۔ چل تو سہی۔ اس کا فیصلہ بھی بعد میں کریں
گے" رامو نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ایک
اور دھکا دے دیا۔

دھکا لگنے سے اس کا پستول ایک لمحے کو میری پشت سے
ہٹا تھا اور اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو دنیا کا سب
سے بڑا بے وقوف کہلاتا۔

میں تیزی سے گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی میری ایک
ٹانگ بھی حرکت میں آگئی تھی۔ کک اس کے پستول والے
ہاتھ پر لگی۔ وہ اگرچہ خاصا محتاط تھا لیکن شاید اسے میری
طرف سے ایسی حرکت کی توقع نہیں تھی۔ پستول اس کے
ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتا ہوا سڑک کے کنارے ڈھلان پر
جا گرا۔

رامو کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی لیکن میں نے
اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میرا زوردار پنچ اس کے جبڑے
پر لگا اور وہ بلبلاتا ہوا لڑکھڑا کر کار کے کھلے ہوئے دروازے
سے ٹکرا گیا۔ میں نے اس کی ناک پر ایک اور پنچ رسید کردیا۔
وہ ایک بار پھر ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلایا۔ اس کی
ٹوٹی ہوئی ناک سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

دوسری طرف پانڈو سونیا کو کار میں ٹھونسنے کی کوشش
کر رہا تھا۔ سونیا بری طرح چیخ رہی تھی۔ رامو کو پٹتے دیکھ کر
پانڈو نے سونیا کو چھوڑ دیا اور کار تک پچھلی طرف سے گھوم کر
ہماری طرف لپکا۔ میں نے اس وقت تک رامو کو گریبان سے
پکڑ لیا تھا۔

"اے۔ چھوڑ دو اسے ورنہ گولی چلا دوں گا۔" پانڈو
چلایا۔

میں رامو کو گریبان سے پکڑے بڑی تیزی سے گھوم گیا۔
اس طرح رامو ڈھال بن کر میرے سامنے آگیا اور میری
پشت کار سے ٹک گئی۔

اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی بھی بڑی تیزی سے
دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کار کے
پیچھے سے گھوم کر ہماری طرف آتا' سونیا نے بڑی جرأت کا
مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر چھلانگ لگادی۔ سونیا بزدل تو نہیں
تھی۔ اس صورت حال نے اسے وقتی طور پر بوکھلا دیا تھا لیکن
اب وہ اپنے حواس میں آگئی تھی۔ اس نے اپنے حریف کو
گرالیا اور سر کے بالوں کو زوردار جھٹکے دیتے ہوئے
اس کا سر سڑک سے ٹکرانے لگی۔ وہ شخص بری طرح چیخ رہا

پانڈو پستول لیے دو تین قدم کے فاصلے پر میرے سامنے کھڑا تھا۔ اگر وہ گولی چلاتا تو رامو ہی نشانہ بنتا۔ پانڈو چیخ چیخ کر مجھے رامو کو چھوڑ دینے کا حکم دے رہا تھا۔

رامو کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ناک پر لگنے والی ضرب کچھ زیادہ ہی زوردار ثابت ہوئی تھی۔ وہ سر کو بری طرح جھٹک رہا تھا اور پھر میں نے اچانک ہی اسے اٹھا کر پیچھے اچھال دیا۔

وہ پانڈو سے ٹکرایا اور اسے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان دونوں پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔ میری پہلی ٹھوکر پانڈو کے پستول والے ہاتھ پر لگی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ دوسری ٹھوکر اس کے سر پر لگی۔ وہ چیخ اٹھا۔

میں ان دونوں کو ٹھوکریں مارتا ہوا سڑک سے نیچے لے گیا۔ ان میں اگر کوئی ایک بھی سنبھل جاتا تو میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا لیکن میں نے انہیں موقع ہی نہیں دیا۔

اور پھر سڑک کے سامنے والے کسی موڑ پر ایک گاڑی اس طرف مڑی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں دیکھ کر وہ دونوں کچھ اور گڑبڑا گئے۔ پہلے پانڈو اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا اور پھر رامو نے بھی راہ فرار اختیار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

سونیا کی چیخ سن کر میں اس طرف دوڑا۔ وہ آدمی سونیا کا گلا دبوچے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے سر پر دو ہتڑ رسید کردیا۔ اس کا سر سونیا کے سر سے ٹکرا گیا۔ سونیا کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ میں نے اس شخص کو سر کے بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پہلو میں زوردار گھونسا رسید کردیا۔ گھونسا اس کے گردے کی جگہ پر لگا تھا۔ وہ بلبلا اٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے مچل کر اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف دوڑ لگادی۔ میں اس کے پیچھے لپکا لیکن وہ تاریکی میں غائب ہوچکا تھا۔

سامنے سے آنے والی گاڑی قریب آکر بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ رک گئی۔ میں اس وقت سڑک پر پڑی ہوئی سونیا کو اٹھا رہا تھا۔ دو آدمی کار سے اتر کر ہماری طرف دوڑے۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا' کار کی پچھلی سیٹ پر ایک عورت اور دو بچے بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

"اے۔ کون ہو تم لوگ۔ کیا ہوا؟ ان یہ۔۔۔ ایک آدمی دوڑتا ہوا ہمارے قریب رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آرہا تھا۔ دوسرا آدمی بھی قریب پہنچ چکا تھا۔

"کچھ غنڈوں نے ہمیں گھیرلیا تھا۔" میں نے سونیا کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا "وہ میری دوست کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ آپ لوگوں کی گاڑی اس طرف آتے دیکھی تو بھاگ گئے۔"

"بچ گئے۔" ریوالور والے نے کہا "بہتر ہے اب جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ لوگ واپس آگئے تو زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔"

میں سونیا کو سہارا دے کر پجارو کی طرف لے آیا۔ کار کے قریب سے گزرتے ہوئے کوئی چیز چمکتی ہوئی دیکھ کر میں رک گیا اور جھک کر وہ چیز اٹھالی۔ وہ سونے کی چین تھی جو ہاتھا پائی کے دوران میں غالباً رامو کے گلے سے ٹوٹ کر گر گئی تھی۔

وہ دونوں آدمی بھی اپنی کار کی طرف چلے گئے۔ ہمدردی میں وہ یہاں رک تو گئے تھے مگر صورتِ حال جاننے کے بعد کسی قدر خوف زدہ ہوگئے تھے اور اپنے پاس ریوالور ہونے کے باوجود انہوں نے وہاں سے فوری طور پر چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے کار کے قریب ہی پڑا ہوا رامو کا پستول بھی اٹھالیا۔ پہلے سونیا کو پجارو میں بیٹھنے میں مدد دی پھر اوپر سے گھوم کر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ ہیڈلائٹس روشن ہی تھیں۔ میں نے پستول ڈیش بورڈ والے خانے میں ڈال دیا اور سونے کی چین سونیا کی طرف بڑھادی۔

"یہ ہرجانہ سمجھ کر رکھ لو۔ کام آئے گی۔" میں نے کہا۔

سونیا نے تکلیف میں ہونے کے باوجود چین لے کر مٹھی میں دبالی۔

میں نے انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی آگے بڑھادی۔ ابھی چند ہی گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ چھناکے کی زوردار آواز ابھری۔ سونیا چیخ کر میری طرف گری۔ میں بھی سیٹ سے اچھل پڑا تھا۔ ایک لمحے کو اسٹیئرنگ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ پجارو سڑک پر لہراگئی لیکن میں نے اسے فوراً ہی سنبھال لیا اور پیچھے مڑکر دیکھا۔

گاڑی کی بائیں پچھلی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہوگیا تھا۔ میں نے یہ سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی کہ اس طرف پانڈو یا رامو میں سے کسی نے پتھر مارا تھا۔ ان دونوں کے پستول تو وہیں گر گئے تھے۔ رامو کا پستول میں نے اٹھالیا تھا۔ ہمیں ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ پتھرباری پر اتر آئے تھے۔

شیشے پر گولی لگنے کے بارے میں اس لیے نہیں سوچا جاسکتا تھا کہ فائر کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ان کے تیسرے ساتھی کے پاس اگرچہ پستول ہوگا لیکن وہ سڑک کی دوسری طرف بھاگا تھا۔

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھادی اور آگے جاکر اس سڑک پر موڑلی جو کھتری ہاؤس کے قریب سے ہوتی ہوئی جانہ پول گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ سونیا بھی اب سیدھی ہوکر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ کون لوگ تھے؟" اس نے بایاں کندھا سہلاتے ہوئے پوچھا۔ اس آدمی کے ساتھ دھینگا مشتی سے اسے اہم خاصی چوٹیں لگی تھیں۔

"غنڈے۔" میں نے کہا "یہ لوگ زور آور گیٹ سے ہمارے پیچھے لگے تھے اور غالباً تمہیں لے جانا چاہتے تھے۔"

"بکواس مت کرو۔" سونیا نے مجھے گھورا "ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ لونڈیا کو بلونت کے حوالے نہیں کریں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے نہیں، تمہیں لے جانا چاہتے تھے اور میں تو بونس کے طور پر ان کے ہاتھ لگتی۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ، یہ کون لوگ تھے اور بلونت کون ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ سونیا اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اسے ٹالا جاسکتا "اس روز میں نے تمہیں کچھ باتیں بتائی تھیں لیکن بلونت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت تک میں بلونت کو کوئی اہمیت دیے جانے کے قابل نہیں سمجھتا تھا لیکن۔۔۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے بلونت کے بارے میں شروع سے بتانے لگا۔ میں آخر میں کہہ رہا تھا "پچھلے تین چار روز سے بلونت سنگھ بھی کھل کر سامنے آگیا ہے اور یہ بھی دارا سے مل گیا ہے۔ یوں کہہ لو کہ تمام شیطانی قوتیں ہمارے خلاف مشترکہ محاذ بنا رہی ہیں۔ کل رات یہ سب لوگ ایک ویران مندر میں جمع تھے۔ یہ لوگ جو منصوبہ بنا رہے تھے، وہ بہت ہی خوفناک تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنڈتوں اور پجاریوں نے بعض مندروں کو عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے لیکن یہ لڑنے بھڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔ دارا اور بلونت سنگھ انہیں بھڑکا رہے ہیں۔ کل رات بلونت سنگھ ہمارے دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ کے ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔" میں اسے کل رات کے واقعے کے بارے میں بتانے لگا پھر بولا "اسی بلونت سنگھ نے آج سہ پہر ٹھاکر کے ریسٹورنٹ کو آگ لگوادی۔ مجھے سات بجے کے بعد پتا چلا اور میں آٹھ بجے کے قریب وہاں پہنچا۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ بلونت کے آدمی وہاں موجود ہوں گے اور جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو انہوں نے میرا تعاقب شروع کردیا اور یہاں آکر انہیں کچھ کرنے کا موقع مل گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ اگر میں اپنے تعاقب کا خیال رکھتا تو صورتِ حال ایسی نہ ہوتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تمہیں بھی تکلیف اٹھانی پڑی۔"

"تمہاری خاطر تو میں موت کے منہ میں بھی چھلانگ لگا سکتی ہوں۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو کہ میں ڈرنے والی نہیں ہوں لیکن اس اچانک اور غیر متوقع صورتِ حال نے مجھے واقعی بدحواس کردیا تھا۔"

"مجھے افسوس ہے۔" میں نے ایک بار پھر اس سے ہمدردی کا اظہار کیا "بات دراصل یہ ہے کہ اس روز تم سے ملاقات کے بعد میں نے اور جانکی نے ایک پروگرام بنایا تھا۔ تمہارے بارے میں۔"

"کیسا پروگرام؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"یوں تو روپ متی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ بے حد قابلِ اعتبار اور بھروسے کے لائق ہیں۔ میری وجہ سے وہ لوگ بھی شیطانی قوتوں کے جال میں پھنستے جارہے ہیں۔ وہ بزدل نہیں ہیں۔ آگے بھی ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہمیں زیادہ پریشانی کی ضرورت نہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ ہمارے پاس ایک الگ ایسا ٹھکانا بھی ہونا چاہیے جو محفوظ ہو اور روپ متی اور ٹھاکر کو بھی اس کے بارے میں علم نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے سوچا تھا کہ تم۔۔۔"

"میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہیں۔" سونیا نے میری بات کاٹ دی۔

"تمہارا وہ گھر بہت چھوٹا ہے۔ تمہارے ساتھ ایک اور لڑکی بھی رہتی ہے اور اس بلڈنگ کی آبادی اتنی گنجان ہے کہ ہم وہاں اپنی موجودگی کو راز میں نہیں رکھ سکتے۔" میں نے کہا "ہمارا پروگرام یہ ہے کہ تم وہ فلیٹ چھوڑ کر کوئی ایسا مکان یا بنگلہ کرائے پر لے لو جہاں کسی ہنگامی صورتِ حال کے وقت ہم پناہ لے سکیں۔"

"بنگلا۔۔۔ کہاں؟" سونیا نے پوچھا۔

"یہ دیکھنا تمہارا کام ہے۔" میں نے کہا "میری نسبت تم اس شہر سے زیادہ اچھی طرح واقف ہو۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ کون سا علاقہ مناسب رہے گا لیکن کوئی ایسی جگہ ہو جہاں سے تمہیں بھی اپنے کافی ہاؤس آمدورفت میں کوئی پریشانی نہ ہو اور ہاں۔۔۔ اس بنگلے کا کرایہ وغیرہ ہم دیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں اتنی گئی گزری بھی نہیں ہوں۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں نے بھی تھوڑی بہت رقم جمع کررکھی ہے۔ وہ کس کام آئے گی!"

"ٹھیک ہے۔ ہم لوگ مل جل کر کام چلالیں گے۔" میں نے گاڑی نیو گیٹ کی طرف موڑتے ہوئے کہا "اب میں تمہیں اگلے موڑ پر اتار دوں گا۔ وہاں سے فلیٹ تک جاتے ہوئے پریشانی تو نہیں ہوگی۔"

"نہیں۔ وہاں سے فلیٹ قریب ہی ہے لیکن تم مجھے اپنی راج کماری روپ متی سے کب ملاؤ گے۔ وہ تو اس شہر کی بہت معروف ہستی ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "ابھی تو ہم نے اسے بھی تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کسی مناسب وقت پر ملاقات ہوجائے گی۔ میں کل صبح رقم لے کر تمہارے فلیٹ پر آؤں گا۔ تم کل ہی سے بنگلے کی تلاش شروع کردو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں صبح تمہارا انتظار کروں گی۔" سونیا نے سرہلا دیا۔

میں نے گلی کے موڑ پر گاڑی روک لی۔ سونیا نے نیچے اتر کر ہاتھ ہلایا اور گلی میں داخل ہوگئی۔ اس وقت ساڑھے بارہ سے اوپر کا وقت ہورہا تھا۔ گلی میں اکا دکا لوگوں کی آمدورفت تھی۔ میں گاڑی میں بیٹھا سونیا کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ اس کی چال متوازن نہیں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بار بار پشت پر آرہا تھا۔ یقیناً اسے کوئی تکلیف تھی۔

سونیا گلی میں کافی آگے نکل گئی تو میں نے بھی گاڑی آگے بڑھادی اور کچھ آگے جاکر یوٹرن لیتا ہوا دوبارہ ایم آئی روڈ پر آگیا اور گاڑی کو آگرہ مارگ کی طرف دوڑا دیا۔

جس وقت میری گاڑی حویلی میں داخل ہوئی، ایک بج رہا تھا۔ روپ متی اور جانکی لان ہی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" جانکی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی "ساڑھے دس بجے تمہارا فون آیا تھا کہ تھوڑی دیر میں آرہا ہوں۔ اس وقت ایک بج رہا ہے اور یہ اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے تم نے؟"

"کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی جس کی وجہ سے دیر ہوگئی۔" میں نے جواب دیا۔

روپ متی کرسی پر بیٹھی گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کا وہ پہلو اس طرف تھا جس طرف کا شیشہ ٹوٹا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر گاڑی کی طرف چلی گئی۔

روپ متی کچھ دیر گاڑی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کو اور اس کے اندر دیکھتی رہی پھر گاڑی کے گرد ایک چکر لگایا اور دوبارہ لان میں آ گئی۔

"تم ٹھیک ہو نا۔ کیا گڑبڑ ہوئی تھی؟" اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا "بلونت سنگھ کے آدمیوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔"

"کیا؟" ان دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"میں دو ڈھائی گھنٹوں تک ٹھاکر کے پاس رہا۔" میں نے کہا اور پھر ریسٹورنٹ میں آتش زدگی کے بارے میں بتانے لگا "میں پونے دس کے قریب وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ میں نے سوچا زور آور گیٹ سے ہرن کی بھنی ہوئی رانیں لے لی جائیں۔ میں نے فون وہیں ایک پبلک فون سے کیا تھا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے میں نے محسوس کیا کہ دو آدمی میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وہ شکل سے ہی غنڈے اور بدمعاش لگتے تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ میری نگرانی کر رہے ہیں۔ میں محض آزمانے کے لیے پجارو پر سوار ہو کر چاند پول بازار کی طرف جانے والی سڑک کی طرف نکل گیا۔ میرا شبہ درست نکلا۔ ان کے ساتھ ایک تیسرا آدمی بھی تھا۔ انہوں نے ایک ویران جگہ پر مجھے گھیر لیا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر رامو اور پانڈو سے جھڑپ کے بارے میں بتانے لگا۔ سونیا کا ذکر میں نے گول کر دیا تھا اور تھوڑا سا جھوٹ بھی بولا تھا کہ ان کے لیے ہرن کی بھنی ہوئی رانیں لینے کے لیے زور آور گیٹ کی طرف گیا تھا۔ میرے خیال میں معمولی سا جھوٹ بول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

"ہوں۔" میرے خاموش ہونے پر روپ متی نے ہنکارا بھرا "رامو وہ تو نہیں جس کے رخسار پر زخم کا نشان اور ناک پچکی ہوئی ہے۔ ذرا لمبے قد کا مالک ہے؟"

"بالکل وہی۔" میں نے جواب دیا "اب اسے پچکی ناک والا نہیں چپٹی ناک والا کہا جائے گا کیونکہ میرے پنچ نے اس کی ناک کو اب بالکل برابر کر دیا ہے۔ ویسے کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"وہ اس شہر کا بہت بڑا دادا ہے اور کرائے کا قاتل بھی۔" روپ متی نے جواب دیا "بڑے بڑے لوگ اپنے دشمنوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے بھاری معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اب تک آٹھ قتل کر چکا ہے جن میں ایک پولیس آفیسر بھی شامل ہے۔"

"حیرت انگیز!" میں نے کہا "اگر یہاں کی بدمعاشی اور دادا گیری کا معیار یہی ہے تو پھر میں تو پورے شہر کو انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" روپ متی نے مجھے گھورا۔

"میرا خیال ہے لوگوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے اس نے آٹھ آدمیوں کے قتل کا پروپیگنڈا کر رکھا ہے جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے آج تک ایک چوہا بھی نہیں مارا ہوگا۔" میں نے کہا "اگر اس پروپیگنڈے میں کوئی حقیقت ہوتی تو میں اس کے ہاتھوں قتل نہ بھی ہوتا تو اسے میری کئی ہڈیاں توڑ دینی چاہییں تھیں مگر وہ تو پہلے ہی مرحلے میں میرے قدموں میں گر گیا تھا۔ وہ پہلے تو گدھے کی طرح بجھ سے پٹا اور پھر اپنے ساتھیوں سمیت کتے کے پلے کی طرح چیاؤں پیاؤں کرتا ہوا بھاگ گیا۔"

"پھر تو واقعی حیرت کی بات ہے۔" روپ متی نے کہا "ہو سکتا ہے آٹھ آدمیوں کے قتل والی بات میں مبالغہ ہو لیکن پولیس آفیسر کے قتل کی چشم دید گواہ تو میں بھی ہوں۔"

"تو گویا وہ قتل تمہارے سامنے ہوا تھا؟" میں نے اسے گھورا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے۔ شام سات بجے کا وقت تھا۔ اس (وقت) تم جوہری بازار کی رونق کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ میں اس وقت اپنے ایک دوست کے ساتھ 'ایل ایم بی' ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ باہر شور کی آواز سنائی دی۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔

"میں بھی اپنے دوست کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکلی تو سامنے کا منظر دیکھ کر کانپ اٹھی۔ ایک آدمی سڑک پر گرا ہوا تھا اور رامو اس پر پے در پے خنجروں سے وار کر رہا تھا۔ وہ اس وقت انسان نہیں' درندہ ہی لگ رہا تھا۔ سڑک پر گرا ہوا آدمی ہر وار پر چیخ اٹھتا۔

"آس پاس سیکڑوں لوگ موجود تھے مگر کوئی آگے نہیں آیا۔ رامو کے تین ساتھی تلواریں لہراتے ہوئے خوں خوار درندوں کی طرح دہاڑتے پھر رہے تھے۔

"میں یہ دل دہلا دینے والا منظر نہیں دیکھ سکی اور دوڑ کر دوبارہ ریسٹورنٹ میں گھس گئی۔ چند منٹ بعد رامو اور اس کے ساتھی بڑے اطمینان سے ایک جیپ پر بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سناٹا چھا گیا۔ دکانیں دھڑ دھڑ بند ہونے لگیں۔ میرا دوست بھی مجھے وہاں سے لے کر نکل آیا۔

"بعد میں پتا چلا کہ رامو کے ہاتھوں بے دردی سے مارا جانے والا اے سی پی (اسسٹنٹ کمشنر پولیس) تھا جو سادہ لباس میں تھا اور کسی کام سے اس طرف آیا تھا۔ چند روز پہلے اس نے رامو کو تھانے بلوا کر اس کی دھنائی کی تھی اور اسے وارننگ دی تھی کہ وہ اس کے علاقے سے نکل جائے۔

"اس روز وہ رامو کے ہتھے چڑھ گیا اور رامو نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس رات پولیس نے شہر بھر سے درجنوں غنڈوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا۔ رامو تین دن بعد پکڑا گیا۔

"عدالت میں رامو کا مقدمہ صرف دو مہینے چلا۔ استغاثہ اس کے خلاف قتل کا کیس ثابت نہیں کر سکا۔ اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے کوئی شخص سامنے نہیں آیا۔ اس کے برعکس رامو کے وکیل نے ایسے گواہوں کی ایک طویل فہرست عدالت میں پیش کر دی جنہوں نے گیتا پر ہاتھ رکھ کر یہ گواہی دی کہ جس شام پولیس آفیسر کو جے پور میں قتل کیا گیا اس شام رامو وہاں سے تین سو بیس کلومیٹر دور بیکانیر میں تھا۔

"استغاثہ اپنا کیس ثابت کرنے میں ناکام ہو گیا۔ ایسا کوئی ایک شخص بھی عدالت میں نہیں آیا جو یہ کہہ سکتا کہ اس نے رامو کو پولیس آفیسر کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رامو کے خلاف جرم ثابت نہیں ہو سکا اور اسے بری کر دیا گیا۔" روپ متی چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "اپنی عزت اور اپنی جان سب ہی لوگوں کو پیاری ہوتی ہے۔ رامو جیسے لوگوں کے خلاف ان جرائم کی گواہی دینے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوتا اور یہ لوگ ایسے خوں خوار درندے بن جاتے ہیں جنہیں قابو کرنا قانون کے محافظوں کے بس میں نہیں ہوتا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ قانون بھی ان لوگوں کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔

"میں نے اس سے پہلے بھی رامو کے بارے میں سنا تھا کہ وہ کرائے کا قاتل ہے۔ ایسی ہی کچھ سنگین وارداتوں کے بارے میں سننے میں آتا رہا جن میں رامو کے نام کا حوالہ آتا۔ اس پولیس آفیسر کے قتل کے چھ مہینے بعد ہائی کورٹ کے ایک سینئر جج کو اس کے گھر میں قتل کر دیا گیا۔

"ایک سابق نیتا (وزیر) کا مقدمہ اس جج کے پاس زیر سماعت تھا۔ شہر میں اس مقدمے کا بہت چرچا ہوا تھا۔ اس نیتا پر بہت سنگین الزامات تھے۔ اگلے روز صبح وہ جج اس مقدمے کا فیصلہ سنانے والا تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ اس نیتا کو نہ صرف زندگی بھر کے لیے کسی بھی قسم کے انتخابات میں حصہ لینے کے لیے نااہل قرار دے دیا جائے گا بلکہ اسے کم سے کم بیس سال قید کی سزا بھی سنائی جائے گی مگر اسی رات جج کو اس کی کوٹھی میں قتل کر دیا گیا تھا۔

"اس رات جج کے تمام گھر والے شادی کی ایک تقریب میں گئے ہوئے تھے۔ جج کوٹھی پر اکیلا ہی تھا۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے صرف ایک ملازم کو چھوڑ دیا گیا۔

"جج کے گھر والے تین بجے کے قریب واپس لوٹے تو برآمدے میں ملازم کی لاش پڑی ہوئی ملی۔ اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا جبکہ جج کی لاش بیڈ روم سے ملحق دفتر میں قالین پر پڑی ہوئی ملی۔ اسے بکرے کی طرح ذبح کر دیا گیا تھا۔ سینے اور پیٹ پر بھی خنجر کے کئی گہرے گھاؤ تھے۔ خون کے چھینٹے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ دفتر کا سارا سامان بھی الٹ پلٹ تھا۔ میز کی درازیں کھلی ہوئی تھیں۔ کاغذات اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور نیتا کے کیس کی وہ فائل غائب تھی جو اس روز جج عدالت سے گھر لے کر آیا تھا۔

"جج کے قتل کے بعد وہ نیتا روپوش ہو گیا۔ چند روز بعد پتا چلا کہ وہ ملک سے فرار ہو گیا ہے۔ قتل کے حوالے سے رامو کے نام کی بازگشت سنی گئی تھی۔ کئی روز تک پولیس اس سے پوچھ گچھ بھی کرتی رہی لیکن اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ پولیس کو جائے واردات سے بھی کوئی ایسا نشان نہیں ملا جس کی بنا پر اس پر شبہ کیا جا سکتا لیکن سب جانتے تھے کہ یہ قتل بھی رامو ہی نے کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ آج بھی آزادی سے دندناتا پھرتا ہے اور پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"پھر تو واقعی حیرت کی بات ہے بلکہ میں اپنے آپ کو خوش قسمت ہی سمجھوں گا کہ ایسے خطرناک آدمی کے ہتھے چڑھ جانے کے باوجود بچ گیا۔" میں نے روپ متی کے خاموش ہونے پر کہا۔

"ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔" روپ متی نے کہا۔ "ہو سکتا ہے بلونت سنگھ نے اسے تمہارے قتل کی سپاری نہ دی ہو بلکہ اسے اس حد تک محدود رکھا ہو کہ تمہیں زندہ پکڑ کر اس کے حوالے کیا جائے۔"

"ہاں۔ یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا "میرے سامنے بے بس ہو کر وہ جس طرح دم دبا کر بھاگا تھا اس سے مجبوراً یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے لیکن کیا تم نے کبھی اسے قریب سے دیکھا ہے۔ میرا مطلب ہے' کبھی کوئی ملاقات؟"

"ہاں۔ ایک ملاقات ہوئی تھی اور یہ تقریباً ایک سال پہلے کی بات ہے۔" روپ متی نے کہا "میں اس رات پولو

گراؤنڈ میں واقع جے پور کلب میں ایک پارٹی میں شریک تھی۔ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ بدمعاش بھی وہاں آگیا اور بے تکلفی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت بہت قیمتی تھری پیس سوٹ میں تھا اور یہ شریفانہ لباس اس پر بالکل نہیں جچ رہا تھا۔ میرے ہی ایک دوست نے بتایا کہ یہ رام لال عرف رامو دادا ہے۔

"ان دنوں میری کسی سے نسل چل رہی تھی اور پورے شہر میں اس کا چرچا تھا۔ رامو نے کہا کہ اگر مجھے اپنے حریف کو اپنے چرنوں پر جھکانے کے لیے اس کی خدمات کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے۔ ممکن ہے وہ ہماری ہی میز پر ٹکا رہتا کہ ایک لڑکی اسے بازو سے پکڑ کر وہاں سے اٹھا کر لے گئی۔ وہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ میں نے اسے اتنا قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ایسا کوئی موقع نہیں آیا اور بھگوان نہ کرے کہ آئندہ بھی ایسا کوئی موقع آئے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "اس نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا تھا لیکن کبھی میرے ذہن میں اس سے رابطہ کرنے کا خیال نہیں آیا۔"

"حیرت ہے، لٹیرے اور قاتل بھی وزیٹنگ کارڈ رکھنے لگے ہیں۔" میں نے کہا "وہ کارڈ تمہارے پاس ہے یا کہیں پھینک دیا؟"

"ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا تھا۔ شاید پڑا ہوگا۔" روپ متی نے کہا "لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ رامو کے معاملے میں تم زیادہ سنجیدہ نہیں ہو اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"میں بالکل سنجیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "میں نے اپنے کسی دشمن کو کبھی کمتر یا کمزور نہیں سمجھا۔ تم نے تو رامو کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا ہے۔ میں محتاط رہوں گا۔"

"اچھا۔ اب مجھے ٹھاکر کے بارے میں بتاؤ۔ کتنا نقصان ہوا ہے ہوٹل کا اور پکڑا جانے والا آدمی کون ہے۔ کس کے کہنے پر آگ لگائی گئی تھی؟" روپ متی نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ یہ بات انہیں ٹھاکر ہی نے فون پر بتائی تھی کہ ایک آدمی پکڑا بھی گیا ہے۔

"نقصان کا اندازہ تو بعد میں لگایا جائے گا ویسے ریسٹورنٹ والا حصہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔" میں نے جواب دیا "جو آدمی پکڑا گیا تھا وہ اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ آگ لگائے جانے کے بعد بھی ہوٹل کے آس پاس بلونت سنگھ کے آدمیوں کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ آگ اسی نے لگوائی تھی۔ پولیس بہرحال زیر حراست شخص سے سب کچھ معلوم کر لے گی۔"

"ٹھاکر تو بہت پریشان ہوگا؟" یہ سوال جانکی نے کیا تھا۔

"اسے پریشان تو ہونا ہی چاہیے لیکن وہ ہمت والا آدمی ہے اور میرا خیال ہے، اسے زیادہ نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" روپ متی نے پوچھا۔

"ریسٹورنٹ اور ہوٹل یقیناً انشورڈ ہوگا۔" میں نے جواب دیا "انشورنس کمپنی سے ملنے والی رقم اس کے نقصان کا بڑی حد تک ازالہ کر دے گی۔"

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ ٹھاکر کے بھیجے ہوئے گن مینوں میں سے ایک کسی طرف سے نکل کر ہمارے قریب آگیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"سڑک پر سے ایک گاڑی اس طرف مڑی ہے حکم۔ اس کی بتیاں بھی بجھی ہوئی ہیں۔ اس میں ٹھاکر کے دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔ آپ لوگ اندر چلے جائیے۔"

ہم لوگ فوراً ہی اٹھ گئے۔ جانکی اور روپ متی تو اندر چلی گئیں۔ میں نے پجارو کے ڈیش بورڈ کے خانے سے رامو والا پستول نکال لیا اور برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔

ٹھاکر کے بھیجے ہوئے چار گن مینوں میں سے دو حویلی کی چھت پر تھے جہاں سے وہ چاروں طرف دور تک نگاہ رکھ سکتے تھے اور دو ایسی جگہوں پر تھے جہاں سے وہ حویلی کے داخلی راستوں کو کور کر سکتے تھے۔ انہی میں سے ایک نے اس گاڑی کو سڑک سے اس طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ہم لوگوں کو اندر جانے کے لیے کہا تھا۔ اس شخص نے مجھے پجارو سے پستول نکال کر برآمدے کے ستون کی آڑ میں کھڑے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اگر اس گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن ہوتیں تو اس کی روشنی برآمدے سے بھی نظر آ سکتی تھی لیکن ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں جس وجہ سے وہ گاڑی یہاں سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

رات کے سناٹے میں گاڑی کے انجن کی ہلکی سی آواز بڑا پراسرار تاثر پیش کر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے تھے لیکن پھر اپنے اس خیال پر خود ہی جھنجلا گیا۔ بلونت سنگھ کے آدمیوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے تھے۔ ان کا خیال ہوگا کہ سب لوگ سو رہے ہوں گے اور وہ حملہ کر کے ہم سب کو ختم کر دیں گے۔

اچانک ہارن کی آواز خاموش فضا میں گونج اٹھی۔ ہما

...چل پڑا۔ یہ ٹھاکر کی گاڑی کے ہارن کی آواز تھی۔ وہ جب ...ی یہاں آتا تھا، دور ہی سے اسی طرح مخصوص انداز میں ...رن بجایا کرتا تھا۔

...فنگر کسی طرف سے نکل کر دوڑتا ہوا گیٹ پر پہنچ گیا اور ...ٹ کھول دیا اس کے ہاتھ میں بھی آٹومیٹک رائفل نظر ...رہی تھی۔

چند سیکنڈ بعد ہی ٹھاکر کی گاڑی گیٹ میں داخل ہو کر ...پارو کے پیچھے رک گئی۔ میں ستون کی آڑ سے نکل کر سامنے ...گیا۔

"گن مین کہاں ہیں؟" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ...ہوئے پوچھا۔

"پوزیشن پر ہیں۔" میں نے جواب دیا "تمہاری گاڑی کو ...ڑک پر سے اس طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ بتیاں ...جھی ہونے کی وجہ سے شبہ ہوا تھا کہ یہ گاڑی دشمنوں کی بھی ...ہو سکتی ہے۔"

"یہ میرے لیے بھی حیرت کی بات ہے۔" ٹھاکر آگے ...بڑھتے ہوئے بولا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ دونوں ہیڈ ...لائٹس نے بیک وقت کام کرنا کیسے چھوڑ دیا۔ بہرحال، صبح ...سے چیک کراؤں گا لیکن تم ابھی تک کیسے جاگ رہے ہو؟"

"ہم سب ہی جاگ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا "ہم ...ل تو ادھر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گن مین نے تمہاری ...ڑی سڑک سے اس طرف مڑتے دیکھ کر ہمیں اندر چلنے کو ...کہا تھا۔"

"تین بج رہے ہیں۔ رات کو دیر تک جاگنا صحت کے ...لیے اچھا نہیں ہوتا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے!" میں نے کہا۔

ٹھاکر لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔ ہم اندر آگئے۔ جانکی اور ...روپ متی سامنے ہی صوفوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ ٹھاکر کو ...دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور پھر ان دونوں نے ٹھاکر پر ...سوالات کی بوچھار کر دی۔ ٹھاکر مسکراتا ہوا صوفے پر بیٹھ ...گیا۔

"دھیرج (حوصلہ) دھیرج!" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا ...کسی نے مجھ سے جل پان کا نہیں پوچھا اور سوالات کی ...بوچھار کر دی۔"

"جل میں پلا دیتی ہوں۔ پان یہاں نہیں ملے گا البتہ ...چائے پیش کی جا سکتی ہے۔" روپ متی نے کہا۔

"چلے گی۔ چائے بھی چلے گی۔" ٹھاکر نے مسکراتے ...ہوئے کہا۔ ہوٹل کا اتنا نقصان ہونے کے باوجود اس کی زندہ دلی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

روپ متی اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی کہ مندری کسی طرف سے نکل کر سامنے آگئی۔ وہ کسی کونے میں پڑی سو رہی تھی اور آوازیں سن کر اٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

"آپ بیٹھیے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ بالوں کا جوڑا بناتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔

پندرہ بیس منٹ میں چائے آگئی اور پھر اس کے ساتھ ہی باتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ ٹھاکر ہوٹل کے نقصان کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"ویری سیڈ!" جانکی نے کہا "ہماری دوستی تم لوگوں کو مہنگی پڑ رہی ہے۔ تمہارے ہوٹل کو آگ لگا دی اور آج رات ہی روپ متی کی گاڑی کا شیشہ توڑ دیا گیا۔"

"کیا مطلب؟" ٹھاکر بولا "شیشہ کس نے توڑا؟"

اور پھر مجھے ایک بار پھر رامو والی کہانی دہرانی پڑی۔

"پہلے میں بلونت سنگھ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن اب مجھے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔" ٹھاکر نے کہا۔

باتوں ہی باتوں میں صبح ہوگئی۔ روپ متی اور جانکی اونگھنے لگیں۔ میری آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا اور کچھ یہی کیفیت ٹھاکر کی بھی تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر باہر آگئے۔ دھوپ ابھی نہیں نکلی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ ہم دھوپ نکلنے تک وہیں بیٹھے رہے اور پھر اندر آگئے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ نو بجے کے قریب ناشتا کر کے چلا گیا۔ میں کافی دیر تک حویلی کے پچھلے حصے میں ہرنوں اور موروں کو دیکھتا رہا پھر اندر آگیا۔ جانکی اور روپ متی لاؤنج میں صوفوں پر ہی آڑھی ترچھی پڑی سو رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

دیر تک ٹھنڈے پانی کے غسل سے میری کسل مندی دور ہوگئی۔ میں تیار ہو کر باہر نکلا اور جانکی کو جگا کر کمرے میں لے آیا۔

"میں سونیا کی طرف جا رہا ہوں۔" میں نے کہا "اب ضروری ہوگیا ہے کہ ہم اپنے لیے کسی اور ٹھکانے کا بندوبست کر لیں۔ تمہارے پاس جو رقم تھی کہاں ہے وہ؟"

"اس الماری میں رکھی ہے۔ ابھی نکال کر دیتی ہوں۔" جانکی نے کہا اور آگے بڑھ کر الماری کھولنے لگی۔ ساتھ ہی وہ بتا رہی تھی کہ روپ متی کی حویلی سے عجلت میں نکلتے ہوئے

بھی وہ اس رقم کو ساتھ لانا نہیں بھولی تھی "یہ ساٹھ ہزار روپے ہیں۔" وہ ایک رومال میں لپٹا ہوا نوٹوں کا بنڈل میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے بنڈل پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔ دوسری جیب میں اپنے استعمال کے لیے کچھ اور رقم رکھی ہوئی تھی۔ پستول میں نے ٹی شرٹ کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا۔ پائنچے کے اندر پنڈلی پر خنجر بھی بندھا ہوا تھا۔ غیر محتاط تو میں پہلے بھی نہیں تھا لیکن گزشتہ رات رامو وغیرہ سے جھڑپ کے بعد مزید احتیاط کی ضرورت تھی۔ روپ متی نے جو کچھ بتایا تھا اسے میں نے مذاق میں نہیں ٹالا تھا۔ اس جیسے لوگوں کو میں نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر روپ متی مجھے اس کے بارے میں اتنی تفصیل سے نہ بھی بتاتی تو بھی میں اس کا دھیان رکھتا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں معمولی سی غفلت بعض اوقات ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔

اس وقت میں نے پجارو لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ حویلی سے نکل کر پیدل چلتا ہوا سڑک پر آگیا۔ اتفاق سے آٹو رکشا مل گیا جس پر ایک آدمی پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا۔

آگرہ مارگ کے پہلے چوراہے پر میں نے آٹو رکشا چھوڑ دیا۔ کچھ دور تک پیدل چلتا رہا پھر ایک ٹیکسی پر بیٹھ کر سورج پول گیٹ سے ہوتا ہوا دیا نند مارگ میں چار دروازہ پہنچ گیا اور یہاں ٹیکسی چھوڑ دی۔ اس طرح مجھے ایک بہت طویل چکر لگانا پڑا تھا لیکن اب میں کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس مرتبہ میں نے اپنے تعاقب کا پورا پورا خیال رکھا تھا۔ چار دروازہ سے میں ایک اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور سرائے ڈیوڑھی بازار اور ہوا محل کے سامنے سے ہوتا ہوا چوڑا راستہ سے نیو گیٹ کی طرف آگیا۔

ہوا محل۔۔۔ گلابی رنگت کی اس قدیم اور تاریخی عمارت کو فنِ تعمیر کے لحاظ سے شہر کی خوب صورت ترین عمارت کہا جا سکتا ہے۔ پانچ منزلہ یہ عمارت ۱۷۹۹ء میں سوائے پرتاب سنگھ نے بنوائی تھی۔ یہ عمارت ایک بلند چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ چبوترے تک پہنچنے کے لیے پانچ کشادہ سیڑھیاں ہیں اور اس سے آگے عمارت میں داخلے کے لیے محرابی دروازے ہیں۔ لاتعداد محرابی کھڑکیاں ہیں جن میں سنگِ مرمر کی خوب صورت جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ اوپر سے یہ عمارت بیضوی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ میں کئی مرتبہ ہوا محل کے سامنے سے گزرا تھا مگر ابھی تک اندر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ٹیکسی میں نے گلی کے موڑ پر چھوڑ دی۔ بازار میں خاصا رش تھا۔ میں کچھ دیر اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور پھر گلی میں داخل ہو گیا۔

عمارت میں بھی لوگوں کی آمد و رفت تھی لیکن کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ دوسری منزل پر راہداری کے آخری فلیٹ کے سامنے میں رک گیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھل گیا لیکن سونیا کے بجائے ایک اور عورت کو دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ مادھوری تھی اور سونیا نے بتایا تھا کہ وہ صبح آٹھ بجے ڈیوٹی پر چلی جاتی ہے لیکن اس وقت اسے گھر پر موجود دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"مجھے سونیا سے ملنا ہے۔ میں اس کا دوست۔۔۔"

"اندر آجاؤ۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے دروازہ پوری طرح کھول دیا "میں اس کی دوست ہوں مادھوری۔" اس نے تعارف کرایا "سونیا ڈاکٹر کے ہاں گئی ہے۔ بس آتی ہی ہو گی۔"

"ڈاکٹر کے پاس!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہلکا سا ٹمپریچر ہو گیا تھا۔" مادھو نے کہا "رات کو اسے کچھ غنڈوں نے گھیر لیا تھا۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے کچھ اندرونی چوٹیں آئی تھیں۔ شاید ان چوٹوں اور خوف کی وجہ سے اسے تاپ (بخار) چڑھ گیا تھا۔ تم اندر آکر بیٹھ جاؤ۔ وہ آتی ہی ہو گی۔ اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔"

میں اندر داخل ہو گیا۔ مادھوری نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے سونیا کے کمرے میں لے آئی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ مادھوری بھی میرے سامنے پلنگ کی پٹی پر ٹک گئی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہو گی۔ دراز قامت، بھرا بھرا سڈول جسم، چہرے کے نقوش نہایت دلکش اور آنکھیں بادامی جن میں ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی لیکن دوپٹا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ جودھ پور کی رہنے والی تھی اور ملازمت کے سلسلے میں یہاں مقیم تھی۔

"سونیا کی طبیعت زیادہ خراب ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"معمولی سا ٹمپریچر تھا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" مادھوری نے جواب دیا "وہ تو ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار نہیں تھی۔ میں نے ہی زبردستی بھیجا ہے۔ تاپ اگر

معمولی بھی ہو تو غفلت نہیں برتنی چاہیے۔"

"سونیا نے بتایا تھا کہ تم جودھ پور گئی ہوئی ہو۔ کب واپس آئیں؟" میں نے پوچھا۔

"کل شام۔" مادھوری نے جواب دیا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی "میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ سونیا کہے گی کہ میرے دوست کو جل (پانی) پان کو بھی نہیں پوچھا۔"

"مجھے صرف ایک گلاس ٹھنڈا جل پلا دو۔ چائے کا تکلف مت کرو۔" میں نے کہا۔

صرف دو منٹ بعد اس نے کمرے میں آکر پانی کا گلاس میری طرف بڑھا دیا۔ گلاس لیتے ہوئے میری انگلیاں اس کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد سونیا آگئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ صورت ہی سے بیمار لگتی تھی۔ تھکن کے آثار بھی نمایاں تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ میلوں کا فاصلہ پیدل طے کر کے آئی ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی۔

مادھوری نے اس سے صورتِ حال دریافت کی اور پھر کمرے سے نکل کر کچن میں چلی گئی۔ سونیا بیڈ پر لیٹ گئی۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی دوائیں اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔

"تمہیں بخار کیوں ہو گیا۔ رات کو ڈر گئی تھیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس مسٹنڈے سے دھینگا مشتی میں کچھ اندرونی چوٹیں لگی تھیں۔" سونیا نے بتایا "اس وقت تو احساس نہیں ہوا لیکن رات کو تکلیف شروع ہو گئی۔ یہاں اور یہاں۔۔۔" اس نے پہلے سینے پر اور پھر پشت پر بائیں شولڈر بلیڈ پر ہاتھ رکھا "بڑی شدت سے درد اٹھتا رہا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ مادھوری کل شام کو واپس آگئی تھی۔ وہ میری سنکائی کرتی رہی۔ رات ہی کو بخار ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی ایک سو دو کے لگ بھگ ہے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا ہے اور کچھ دوائیں بھی دی ہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "میں تو سمجھی تھی کہ تم آج بھی گول کر گئے۔"

"آج تو مجھے ہر صورت میں آنا ہی تھا لیکن اب شاید تمہاری وجہ سے معاملہ کچھ لیٹ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"ایک دو دن کی بات ہے۔" سونیا مسکرائی "آج بخار اتر گیا تو میں کل ہی اپنی مہم شروع کر دوں گی۔"

"ڈاکٹر نے کوئی خاص چیز کھانے کو کہا ہو تو بتاؤ، میں بنا دوں گی۔"

ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ میں

کتابیات پبلی کیشنز اور مکتبہ نفسیات کی

کتب کے ہول سیل ڈسٹری بیوٹر

شمائلہ بک ایجنسی

ہماری تمام کتب کے حصول کیلئے ان سے رابطہ کریں۔

آپ کے آرڈر کی فوری تعمیل کرتے ہوئے، کتب، آپ کی دکان پر پہنچائی جائیں گی۔

شمائلہ بک ایجنسی

دربار بابا بجلی شاہ اسٹریٹ،

چوہدری پارک، ٹوبہ ٹیک سنگھ

فون 515011

موبائل 0300-4291286

"کوئی پرہیز نہیں۔ جو پہلے کھاتے تھے اب بھی وہی چلے گا۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنا چائے کا کپ اٹھالیا۔

چائے پینے تک مادھوری بھی وہیں بیٹھی رہی اور پھر خالی کپ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ میں نے رومال میں لپٹا ہوا نوٹوں کا بنڈل جیب سے نکال کر سونیا کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ ساٹھ ہزار روپے ہیں۔ فوری طور پر شاید اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ بعد میں مزید بندوبست کردوں گا۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس بھی بینک میں کچھ رقم محفوظ ہے۔ کام چلالوں گی۔" سونیا نے یہ کہتے ہوئے بنڈل تکیے کے نیچے رکھ لیا۔

"جانتی ہو جس غنڈے نے رات کو ہمیں روکا تھا وہ کون تھا؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ مادھو اس وقت اپنے کمرے میں جاچکی تھی۔

"ان میں ایک کا نام پانڈو اور دوسرے کا شاید رامو تھا۔" سونیا نے کہا "دونوں نے ایک دوسرے کو انہی ناموں سے مخاطب کیا تھا۔"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سرہلایا "یہی نام تھے ان کے اور رامو اس شہر کا سب سے خطرناک غنڈا ہے۔ کرائے کا قاتل۔ سنا ہے کہ وہ اب تک آٹھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔"

"اوہ۔ یہ وہ رامو ہے جس نے چند مہینے پہلے یہاں کے ایک جج کو قتل کیا تھا۔" سونیا نے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی "میں جن دنوں یہاں آئی تھی ان دنوں اس واردات کا بہت چرچا تھا۔ اخباروں میں بھی اس کیس کے بارے میں باقاعدگی سے خبریں چھپتی رہتی تھیں لیکن پھر آہستہ آہستہ لوگ بھول گئے۔"

"ہاں۔ یہ وہی رامو ہے۔" میں نے کہا "اس مرتبہ یہ میرے پیچھے لگا ہے اور بلونت سنگھ نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں اور میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ اس کا آخری اسائن منٹ ثابت ہوگا۔ اس کے بعد وہ اس قابل نہیں رہے گا کہ کسی انسان کی زندگی کا چراغ گل کرسکے بلکہ یہ اپنے جسم پر بیٹھی ہوئی مکھی بھی نہیں مار سکے گا۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" سونیا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ابھی کچھ نہیں۔" میں نے جواب دیا "صرف دو چار دن کی بات ہے۔" مادھوری کے آجانے سے ہم نے ایک بار پھر موضوع بدل دیا۔

دو بجے کے قریب میں جانے کے لیے اٹھا تو مادھوری نے روک لیا۔ وہ کھانا تیار کرچکی تھی۔

دال چاول کھا کر واقعی مزہ آگیا۔

میں اس عمارت والی گلی سے نکل کر پیدل ہی چلتا ہوا نیو گیٹ والے چوراہے پر آگیا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھا رہے تھے اور موسم خاصا خوشگوار ہورہا تھا۔ ایسے میں پیدل ہی چلتے رہنے کو جی چاہتا تھا لیکن میں اس وقت تفریح کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں ایک جگہ رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن کوئی خالی آٹو رکشا یا ٹیکسی وغیرہ نظر نہیں آئی البتہ اسی وقت ایک سائیکل رکشا میرے قریب آکر رکا۔ ایک پارسی جوڑا رکشے سے اترا۔ میں فوراً ہی رکشے پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلو گے حکم؟" رکشا بان نے پیچھے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"اسٹیشن روڈ۔" میں نے جواب دیا۔

رکشا بان نے سیدھے ہو کر ہینڈل سنبھال لیا اور پیڈل چلانے لگا۔ وہ دُبلا پتلا سا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ دھوتی کو لنگوٹ کی طرح باندھ رکھا تھا اور بہت میلا سا کرتہ تھا جو پسینے میں تر ہورہا تھا۔ پیروں میں چپل یا جوتا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ غربت اور افلاس کی منہ بولتی تصویر تھا۔ میں نے بازار میں مزدوروں کو حمالی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ صبح سے شام تک منوں بوجھ ڈھوتے تھے تب کہیں رات کو پیٹ بھر کھانے کو ملتا تھا اور یہ انسانوں کا بوجھ ڈھو رہا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں عالی شان حویلیوں اور محلوں کی بھرمار تھی۔ یہ راجوں مہاراجوں کا شہر تھا جن کے نوکر چاکر بھی شان دار حویلیوں میں رہتے تھے اور چم چماتی کاروں میں گھومتے تھے اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے جو انسانوں کا بوجھ ڈھو کر پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔

اسٹیشن روڈ پر وکرم ہوٹل کے سامنے میں نے رکشا رکوالیا اور دس روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر رکشا بان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"کھلا نہیں ہے حکم؟" اس نے نوٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"رکھ لو۔" میں نے جواب دیا اور رکشے سے اتر کر ہوٹل کی طرف چل پڑا۔ ہوٹل کی بجلی اور ٹیلی فون لائن بحال ہوچکی تھی۔ نیچے ریسٹورنٹ والے حصے میں سے جلا ہوا فرنیچر

وغیرہ اٹھا کر باہر ڈال دیا گیا تھا اور اندر صفائی کا کام ہورہا تھا۔ ٹھاکر پہلی منزل پر ہوٹل کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔

دفتر میں آنے کے بعد میں نے سب سے پہلے جانکی اور روپ متی کو فون پر اطلاع دی کہ میں ٹھاکر کے پاس بیٹھا ہوں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

کچھ دیر ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چائے بھی پی اور پھر ٹھاکر مجھے گھوم پھر کر ہوٹل دکھانے لگا۔ وہ بہت شان دار ہوٹل تھا۔ یہاں مہمانوں کو ہر قسم کی سہولت دستیاب تھی۔ ریلوے اسٹیشن اور بس اسٹینڈ قریب ہونے کی وجہ سے ہوٹل میں مہمانوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی اور کسی وقت کوئی کمرا خالی نہیں رہتا تھا لیکن ٹھاکر نے اپنے ہوٹل کا معیار برقرار رکھا تھا۔ قرب وجوار میں اور بھی بڑے بڑے ہوٹل اور ٹورسٹ بنگلے تھے جن میں فائیو اسٹار اشوک جے پور ہوٹل قابل ذکر تھا۔ وکرم ہوٹل میں فائیو اسٹار ہوٹل جیسی سہولتیں نہ ہونے کے باوجود اس کا معیار آس پاس اپنی کیٹگری کے ہوٹلوں اور ٹورسٹ بنگلوں سے بہتر تھا اور یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے لوگ اسی ہوٹل کو ترجیح دیتے تھے۔

رات کا کھانا میں نے ٹھاکر کے ساتھ ہوٹل میں کھایا اور پھر رات دس بجے کے قریب ہم حویلی جانے کے لیے وہاں سے روانہ ہوگئے۔

موسم اس وقت کچھ اور زیادہ خوشگوار ہوگیا تھا اور غالباً موسم کا مزہ لینے کے لیے ہی ٹھاکر نے اس وقت کار کے بجائے بغیر ہڈ کی جیپ کو ترجیح دی تھی۔ ٹھاکر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا تھا۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر ٹھاکر کا ایک محافظ بیٹھ گیا تھا جس کے بیلٹ پر ہولسٹر کے فلیپ سے ریوالور کا دستہ جھانک رہا تھا۔

جیپ ریلوے اسٹیشن کے قریب سے بائیں طرف مڑ گئی اور ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کئی کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے جمنا لال بجاج مارگ کی طرف مڑ گئی۔ ٹھاکر کی رہائشی حویلی بھوانی سنگھ مارگ میں تھی اور وہ کچھ دیر کے لیے وہاں جانا چاہتا تھا۔

بھگوان داس روڈ پر سیکریٹریٹ کی وسیع وعریض عمارت سے آگے نکلتے ہی پیچھے سے آنے والی ایک اور جیپ تیزی سے ہمارے برابر پہنچ گئی۔ یہ بھی بغیر ہڈ کی جیپ تھی اور اس میں چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر رامو کو دیکھ کر میں اُچھل پڑا۔ اس کی ناک پر بینڈیج لگی ہوئی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور

دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ان میں سے ایک نے گولی چلادی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ گولی جیپ کو روکنے کے لیے ٹائر پر چلائی گئی تھی اور ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ جیپ لڑکھڑا کر سڑک سے اتر گئی اور لہراتی ہوئی ایک کمپاؤنڈ وال سے ٹکرا کر رک گئی۔

ہماری جیپ پر پیچھے بیٹھا ہوا گن مین جھٹکا لگنے سے دوسری سیٹ پر گرا لیکن وہ نہ صرف حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سنبھل گیا بلکہ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر گولی بھی چلادی تھی۔ رامو والی جیپ اگرچہ کئی گز آگے نکل چکی تھی لیکن ہمارے گارڈ کی گولی ضائع نہیں گئی۔ رامو کی جیپ کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک چیختا ہوا اچھلا اور جیپ سے نیچے گر گیا۔ رامو کی جیپ تقریباً سو گز آگے جاکر رک گئی اور رامو اور اس کے دو ساتھی چیختے ہوئے ہماری طرف دوڑے۔ رامو کے ہاتھ میں آگے سے خم کھائے ہوئے بلیڈ کا تیغہ تھا جو اسٹریٹ لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا جبکہ اس کا ایک

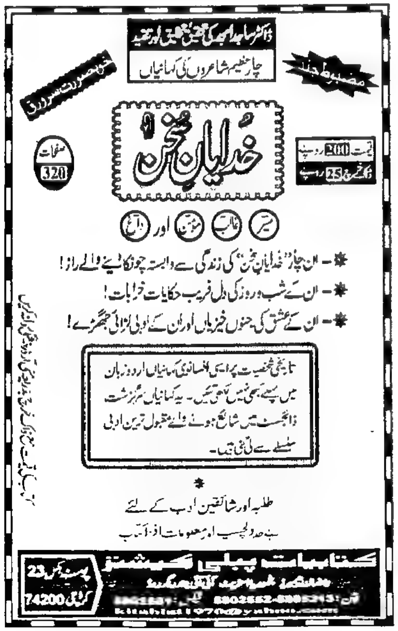

ساتھی پستول سے فائرنگ کررہا تھا۔
میں نے اور ٹھاکر نے بیک وقت جیپ سے چھلانگ لگا دی۔ جس دیوار سے ہماری جیپ ٹکرا کر رکی تھی وہ چار فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس کی دوسری طرف بہت وسیع و عریض لان تھا اور اس دیوار سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر سیکریٹریٹ کی عمارت تھی۔ دیوار کے اندر کی طرف مور پنکھ اور اسی قسم کے پودے تھے۔
ٹھاکر کا گن مین ابھی جیپ ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جوابی فائر کرتے ہوئے جیپ کی پچھلی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز اور اس کی چیخ بھی گونج اٹھی تھی۔ اسے شاید گولی لگی تھی اور وہ جیپ کی پچھلی طرف گر گیا تھا۔
"کیا ہوا راج مل؟" ٹھاکر نے چیخ کر پوچھا۔
"باجو میں گولی لگی ہے حکم۔" محافظ نے چیختے ہوئے جواب دیا "آپ ہمکر مت کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ میں ان کو روکتا ہوں۔"
"ہمت سنگھ۔ تم اس طرف جاؤ اور میں اس طرف سے جانے کی کوشش کرتا ہوں۔" ٹھاکر نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی اور دیوار کے ساتھ ساتھ دوسری طرف جانے لگا۔
میں مخالف سمت میں رینگتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جیب سے پستول نکال لیا تھا۔ چند گز آگے جا کر میں نے دیوار کے اوپر سے جھانکا۔ رامو کا ایک ساتھی فائرنگ کرتا ہوا ہماری جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا جبکہ رامو نے دیوار پر چڑھ کر اندر کی طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ میں نے تیزی سے رخ بدل کر فائر جھونک دیا۔ گولی گنجان پودوں کی شاخوں میں الجھ کر رہ گئی اور رامو پودوں کے پیچھے کہیں غائب ہو چکا تھا۔
اس سڑک پر زیادہ تر دفاتر تھے۔ شام سات آٹھ بجے کے بعد اس طرف ٹریفک کم ہو جاتا تھا اور اتفاق تھا کہ اس وقت وہ سڑک دونوں طرف دور دور تک سنسان پڑی تھی۔ سڑک پر بجلی کے کھمبے بھی دور دور تھے۔ سڑک پر بہرحال کچھ روشنی تھی لیکن دیوار کی اندر کی طرف اندھیرا تھا۔
رامو کا ساتھی ہماری جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا اور پھر راج مل نے جیپ کی آڑ سے نکل کر اس پر چھلانگ لگا دی اور دوسرے شخص کو اپنے ساتھ لیتا ہوا زمین پر گر گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔
رامو کا دوسرا ساتھی بھی دوڑتا ہوا دیوار کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں چمک رہا تھا۔
ٹھاکر نے دیوار پر چڑھ کر اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے زمین پر گرا کر رگیدنے لگا۔
اپنے پیچھے پودوں میں آہٹ پا کر میں تیزی سے مڑا لیکن مجھے دیر ہو گئی تھی۔ وہ ہیولا میرے اوپر آرہا تھا۔ میں نے پستول کا ٹریگر دبا دیا لیکن اسی لمحے میرے ہاتھ پر ٹھوکر لگی۔ پستول سے نکلی ہوئی گولی تو نجانے کس طرف چلی گئی البتہ پستول بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پودوں میں گر گیا تھا۔
وہ ہیولا اس طرح میرے اوپر آیا تھا جیسے بل ٹیریر کتا اپنے شکار پر چھلانگ لگاتا ہے۔
وہ رامو تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیغے کی چمک بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی اور اس کا ہاتھ جیسے ہی نیچے آیا میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ تیغے کا بلیڈ تقریباً آٹھ انچ لمبا تھا جو لمحہ بہ لمحہ میرے سینے کی طرف جھک رہا تھا۔
رامو میں گینڈے کی طاقت بھری ہوئی تھی۔ کل رات اسے میرے ہاتھوں زک اٹھانی پڑی تھی۔ انتقام کے جذبے نے بھی اسے وحشی بنا دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔
میں بھی اس کا ہاتھ موڑنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہا تھا اور پھر میں نے ایک ہاتھ اس کی کلائی سے ہٹا کر ہتھیلی سے اس کی زخمی ناک پر زوردار وار کیا۔
میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے اسے پوری قوت سے ایک طرف دھکیل دیا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رامو نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔
اس مرتبہ میں نے حملہ کرنے میں پہل کرنے کی کوشش کی مگر میرا پیر پودوں میں الجھ گیا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور پشت کے بل گرا۔ میرا پیر ایک پتھر سے ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، رامو نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس کا چمکتا ہوا تیغہ بجلی کے کوندے کی طرح میرے سینے کی طرف لپکا۔ میرے سینے اور تیغے کی نوک میں فاصلہ بڑی تیزی سے کم ہو رہا تھا اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ تیغہ میرے سینے میں پیوست ہو جاتا۔
میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔
میری زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ...ارہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ میں ...ھا۔ تیز دھار تیغہ کسی بھی لمحے میرے سینے میں پیوست ...ا تھا۔
...لیکن پھر اچانک میرے دماغ میں روشنی کا ایک ...ت جھماکا ہوا جیسے آسمانی بجلی کوند گئی ہو۔ اس کے ...ہی پورے بدن میں برقی لہریں بھی پھیلتی ہوئی محسوس ...۔ میرے پیٹ میں ٹھیک ناف کی جگہ پر آگ سی بھڑک ...۔ بڑی شدید کھولن ہو رہی تھی اور پھر یوں لگا جیسے کھولتا ...ا میرے سینے میں پھیلتا جا رہا ہو۔
میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ اندھیرا چھٹ چکا ...چند لمحے پہلے میں موت کے جھٹکے کا منتظر تھا لیکن اب ...تمام توانائیاں عود کر آئی تھیں۔ میں اپنے آپ میں ...نئی قوت محسوس کرنے لگا۔ میرے پورے جسم میں برقی ...سی کوندرہی تھیں۔
میرا دایاں ہاتھ اچانک ہی حرکت میں آیا اور میں نے ...کی کلائی تھام لی۔ تیغے کی نوک میرے سینے سے صرف ...دو انچ کے فاصلے پر رک گئی۔
یہ صورت حال بیان کرنے میں تو یقیناً وقت لگا ہے لیکن ...بھی ہوا تھا، پلک جھپکنے کی دیر میں ہو گیا تھا۔
رامو۔۔۔ کرائے کا قاتل، اس شہر کا سب سے بڑا دادا، ...جان کا گاہک۔ جو میری زندگی کا خاتمہ کرنے جا رہا تھا، ...صورت حال پر چونک گیا۔ ایک لمحہ پہلے تک اس کے ...میں یقیناً یہ بات تھی کہ تیغے کے ایک ہی وار سے ...ے جیون (زندگی) کا انت (خاتمہ) کر دے گا۔ وہ مجھے ...ناترین شکار سمجھتا تھا۔ وہ تو اس بات کا منتظر تھا کہ اس کا ...میرے خون سے اپنی پیاس بجھانے والا ہے لیکن اس بدلی ...صورت حال نے اسے بڑا مایوس کیا تھا۔ اس کی آنکھوں ...ایک لمحے کو الجھن کے تاثرات ابھرے لیکن اگلے ہی ...اس کے چہرے پر درندگی کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی ...خونخوار درندے کی سی تھی جس کے ہاتھ سے اس کا ...نکلا جا رہا ہو۔
رامو تیغے کی نوک میرے سینے میں گاڑنے کے لیے اپنی ...ر قوت کو بروئے کار لا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید ...تھا۔ گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔
تیغے کی نوک میرے سینے سے آہستہ آہستہ پرے ہٹنے ...میں نے صرف ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھام رکھی ...دوسرا بازو مڑ کر میرے اپنے ہی جسم کے نیچے دبا ہوا تھا۔ رامو مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے اپنی پوری طاقت استعمال کر رہا تھا لیکن اس سمے (وقت) وہ بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ خنجر میرے سینے سے دور ہٹتا گیا۔ پھر میں نے اپنے جسم کو ذرا سی حرکت دے کر نیچے دبا ہوا اپنا دوسرا بازو سیدھا کیا۔ انگلیوں کو ایک دو مرتبہ حرکت دی اور پھر زوردار پنچ اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ نکلی لیکن شاید اس پنچ کا اس نے زیادہ اثر نہیں لیا تھا لیکن دوسرے پنچ نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔
میں اب بھی اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹنے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ میرے دونوں پیر اس کے پیٹ پر آگئے اور میں اپنی پوری قوت کو ٹانگوں میں سمیٹ کر اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔
رامو میرے پیروں پر میرے جسم سے تقریباً ایک فٹ اوپر اٹھ گیا۔ اس کی تیغے والی کلائی اب بھی میری گرفت میں تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے میرے سر پر گھونسے مارنے کی کوشش کی مگر میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا وہ ہاتھ بھی پکڑ لیا۔
اب رامو پوری طرح میرے قبضے میں تھا۔ میں نے اسے تقریباً ڈیڑھ فٹ اوپر اٹھا لیا تھا اور پھر پوری قوت سے اسے اچھال دیا۔
وہ "بھد" کی آواز سے کیاری میں گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ رامو سے نجات ملتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رامو نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر میرے سامنے کھڑا ہاتھ آگے کو نکالے تیغے کو مخصوص انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید الجھن کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ شاید اس بات پر حیران تھا کہ میں اس کے اس حملے سے بچ کیسے گیا تھا۔
اس کا یہ حملہ یقیناً بہت ہی خطرناک تھا اور اس وقت میں جس کیفیت سے دوچار تھا اس کے پیش نظر تو مجھے اس وقت خاک و خون میں لوٹتے ہوئے نظر آنا چاہیے تھا لیکن میں چٹان کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا اور یہ سب میرے اندر پراسرار جی کی قوت کا کمال تھا۔ جی۔۔۔ وہ پراسرار قوت جو میں نے بڑی تپسیا (ریاضت) کے بعد حاصل کی تھی اس نے بروقت میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔
آگے کو بڑھے ہوئے ہاتھ کو آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہوئے رامو نے اچانک ہی ہاتھ سر سے بلند کیا۔ تیغے کی چمک آسمانی بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی۔ میرے ہاتھ اس سے بھی زیادہ تیزی سے حرکت میں آگئے۔

میں نے اس حملے سے بچنے کے لیے نائف ہینڈ ڈیفنس کی ٹیکنیک استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ فیصلہ برقی رو سے بھی زیادہ تیزی سے ہوا تھا۔ مارشل آرٹس کی کڑی ریاضت جہاں بدن میں چوکسی پیدا کرتی ہے وہاں دماغی صلاحیتوں کو بھی صیقل کرتی ہے اور مارشل آرٹسٹ ذہنی طور پر بھی اس قدر چاق چوبند ہوتا ہے کہ اسے فوری طور پر کوئی درست فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور یہی صلاحیتیں حریف پر برتری حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

میرے دونوں بازو ایک دوسرے کو کراس کرتے ہوئے سامنے آ گئے۔ رامو کا وار میں نے اپنی کلائیوں کے بیچ میں روکا اور بڑی پھرتی سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر انہیں پشت کی طرف سے آپس میں ملا لیا۔ رامو کی کلائی میری کلائیوں کے شکنجے میں پھنس گئی تھی۔

اپنا یہ وار بھی ناکام ہوتے دیکھ کر رامو کی آنکھوں میں ایک بار پھر شدید الجھن ابھر آئی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر یہ وہ شکنجہ تھا جس میں زیادہ زور آزمائی سے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ تو سکتی تھی مگر آزاد نہیں ہو سکتی تھی۔

میں زمین پر پیر جمائے اپنی جگہ پر اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس وقت میری تمام تر قوت بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔ میں نے کلائیوں کے شکنجے کو ذرا اور کس دیا۔

رامو کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب وحشت سی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی کلائی چھڑانے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اس کا پورا جسم بھی متحرک تھا۔ وہ زاویے بدل بدل کر زور آزمائی کر رہا تھا مگر اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

میں نے اپنی کلائیوں کے شکنجے کو کچھ اور کس دیا۔ رامو کراہ اٹھا۔ اس کے چہرے پر کرب و اذیت کے تاثرات نمودار ہونے لگے اور پھر تیغے کے دستے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ انگلیاں کھلتی چلی گئیں اور تیغہ اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے پیروں کے قریب کچی زمین میں گڑ گیا۔

میں نے اچانک ہی ایک جھٹکے سے اپنی کلائیوں کا شکنجہ کھول دیا۔ رامو لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا اور دوہرا ہو کر دوسرے ہاتھ سے اپنی مضروب کلائی سہلانے لگا۔ اس کے چہرے پر اب بھی کرب کے تاثرات نمایاں تھے۔

اور پھر اچانک ہی وہ سیدھا ہو کر میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں غفلت میں مار کھا جاؤں گا لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اچھل کر سائیڈ کک لگا دی۔

ضرب اس کے پہلو پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک بار پھر طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے کک نہیں لگائی۔ میری دونوں ٹانگیں قینچی کی طرح اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو دائیں طرف زوردار جھٹکا دیا۔

نیچے گرتے ہوئے میں نے تو دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا لیے تھے لیکن رامو چیختا ہوا نیچے گرا۔ میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس مرتبہ میں نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

رامو گدھے کی طرح پٹتا رہا۔ میری ہر ٹھوکر پر وہ بلبلا اٹھتا۔ مجھے وہ آسان شکار سمجھا تھا مگر وہ خود عذاب میں پھنس گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اب وہ اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں تھا۔

میں نے ایک اور ٹھوکر مارنا چاہی تو اس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں ایک پیر پر ناچ کر رہ گیا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل پودوں میں گرا۔

میرا خیال تھا کہ رامو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے دبوچنے کی کوشش کرے گا لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی تھی۔ میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس وقت میں جھاڑیوں میں چت پڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ جھاڑیوں کی گنجان شاخوں میں الجھ گئے تھے۔ وہ اگر چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے گرفت میں لے کر بے بس کر سکتا تھا لیکن اس پر شاید میری دہشت طاری ہو گئی تھی اور اس نے مقابلے سے دستبرداری کا فیصلہ کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

میں نے اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ رامو کے ایک گرگے سے نمٹ رہا تھا۔ ٹھاکر کی ٹانگ اگرچہ پہلے ہی زخمی تھی لیکن اس کے باوجود وہ رامو کے گرگے کی خوب ٹھاک مرمت کر رہا تھا۔

دیوار کی دوسری طرف جیپ کے قریب ٹھاکر کا گن مین راج مل رامو کے دوسرے گرگے سے پٹ رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا لیکن شروع ہی میں اس کے بازو میں گولی لگی تھی جس سے وہ کمزور پڑ رہا تھا۔ میں جلدی سے اس کی مدد کو پہنچ گیا۔

میں نے اس بدمعاش کو سر کے بالوں سے پکڑ کر راج مل

اوپر سے اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے جبڑے پر ...ار گھونسا جما دیا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے دوسرا گھونسا ...کرتے ہوئے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ...ے ٹکرا گیا۔

...سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ایک لمحے میں ...ت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ رامو اس وقت سیکریٹریٹ ...سیع و عریض پارک میں دوڑتا ہوا بہت دور پہنچ چکا تھا۔ ...کا صرف ہیولا نظر آ رہا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس ...اش کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی اور دوسرے ہی ...اس نے بھی سڑک پر دور کھڑی ہوئی اپنی جیپ کی طرف ...لگا دی۔

میں نے اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ...آدمی تو رامو تھا۔ وہی بھاگ گیا تھا تو اس کے گرگوں کو ...کر کیا کرنا تھا۔ میں دیوار پھاند کر دوسری طرف پہنچ گیا ...ٹھاکر رامو کے گرگے کو بالوں سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لا رہا

دیوار کے قریب آ کر ٹھاکر نے اسے دونوں ہاتھوں میں ...کر دوسری طرف پٹخ دیا۔ زمین پر گرتے ہی وہ چیخ اٹھا۔ ...نے بھی دیوار پر چڑھ کر اس طرف چھلانگ لگا دی تھی۔ ...نے آتے ہی اس غنڈے کو دو چار ٹھوکریں رسید کر دیں۔ "بھاگ جاؤ۔" وہ اسے آخری ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا ...مارا داوا تو میدان چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن ہم اسے نہیں ...یں گے۔"

اس آدمی نے اٹھ کر جیپ کی طرف دوڑ لگا دی۔ پہلا ...جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔ دوسرا بھگوڑا ابھی دور ہی تھا ...جیپ حرکت میں آ گئی۔ وہ دوڑتا ہوا جیپ کے پیچھے لٹک ...اور جیپ بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح بھاگ نکلی۔

میں لحہ بہ لحہ دور ہوتی ہوئی جیپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ...بل میں ایک اور خیال سے اچھل پڑا۔ جب وہ جیپ تیز ...اری سے ہمارے قریب سے گزری تھی تو اس سے ہماری ...ے روکنے کے لیے ٹائر پر گولی چلائی گئی تھی اور جواب میں ...ے گن مین راج مل نے بھی ریوالور سے فائر کر دیا تھا۔ ...جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو لگی ...و چیختا ہوا جیپ سے سڑک پر گر گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ...لاش سڑک پر پڑی ہوگی لیکن دور دور تک ایسی کوئی چیز ...آ رہی تھی۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ صرف زخمی ہوا تھا اور ...لڑائی کے دوران میں وہ موقع پا کر فرار ہو گیا تھا۔

میں ٹھاکر اور راج مل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹھاکر راج مل کو سہارا دے کر زمین سے اٹھا رہا تھا۔ دوسرے بازو سے میں نے راج مل کو پکڑا تو وہ کراہ اٹھا۔ گولی اس کے بازو پر لگی تھی۔ اس کا بازو خون سے تر ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ بھی چپ چپا گیا۔

راج مل کو پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ٹھاکر کی ٹانگ کے زخم میں بھی تکلیف ہو رہی تھی اسی لیے میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ٹھاکر ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس سڑک پر سے اب تک کوئی گاڑی وغیرہ نہیں گزری تھی اور پھر جلد ہی بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس علاقے میں سیکریٹریٹ کی پچھلی طرف بھی بڑی بڑی کوٹھی نما عمارتوں میں سرکاری دفاتر تھے۔ دن کے وقت تو اس طرف اچھا خاصا ٹریفک رہتا ہوگا اور اب آدھی رات کے وقت اس طرف کون آ سکتا تھا۔

ٹھاکر کی ہدایت کے مطابق میں نے اگلے چوراہے پر جیپ کو ہائی کورٹ کی بلڈنگ سے آگے نکال کر یوتھ ہوسٹل کی طرف موڑ دیا۔ وہاں سے ٹھاکر کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی۔

ہارن بجانے کے ایک منٹ بعد حویلی کا پھاٹک کھل گیا اور میں جیپ کو اندر لیتا چلا گیا۔

جیپ سے اتر کر برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے صوفے پر نیم دراز لڑکی کو دیکھ کر میرے قدم رک گئے۔

اس لڑکی کی عمر بیس اکیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے راجستھانی لباس پہن رکھا تھا۔ مختصر سی چولی اور منی اسکرٹ کی طرح گھٹنوں سے اوپر تک گھاگھرا۔ چولی میں کپڑا صرف سامنے کی طرف تھا جس سے سینے کی ستر پوشی بھی بمشکل ہو رہی تھی۔ پشت پر کپڑا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ چند باریک ڈوریاں تھیں جنہوں نے چولی کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ مرکری بلب کی روشنی میں اس کا بدن کندن کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ صوفے پر نیم دراز ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہندی زبان کے کسی فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ کو دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رسالہ سامنے شیشے کی ٹاپ والی کافی ٹیبل پر پھینک دیا تھا۔

"کیا ہوا ٹھاکر۔ کیا پھر گولی لگی؟" وہ تیزی سے آگے بڑھ آئی اور ٹھاکر کی ٹانگ کو دیکھنے لگی۔ اس کی زخمی ٹانگ پر پتلون کا پائنچہ خون آلود ہو رہا تھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے پرانا زخم کھل گیا ہے۔" ٹھاکر

نے جواب دیا۔ "تم فون کرکے ڈاکٹر شیام کو یہاں بلالو۔ راج مل بھی زخمی ہے۔ اس کے بازو میں گولی لگی ہے۔"

"پرنتو یہ ہوا کیسے؟ کس سے جھگڑا ہوا تھا؟" لڑکی نے تشویش آمیز لہجے میں پوچھا۔

"رامو اور اس کے گرگوں سے مڈھ بھیڑ ہوگئی تھی۔" ٹھاکر نے جواب دیا "تم پہلے ڈاکٹر شیام سندر کو فون کردو۔ باتیں بعد میں کرنا۔"

لڑکی میری طرف دیکھتی ہوئی وسیع ہال میں اس طرف چلی گئی جہاں ایک صوفے کے قریب سائیڈ ٹیبل پر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ وہ صوفے کے کنارے پر ٹک گئی اور فون کا ریسیور اٹھاکر نمبر ڈائل کرنے لگی۔

ٹھاکر بھی ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور پتلون کا پائنچہ اٹھاکر پنڈلی پر بندھی ہوئی پٹی کھولنے لگا۔ پٹی بھی سرخ ہورہی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کا زخم کھل گیا تھا۔ جس طرح ماردھاڑ اور اٹھا پٹخ ہوئی تھی اس کے بعد بھی یہ نہ ہوتا تو مجھے حیرت ہوتی۔

وہ لڑکی فون بند کرکے ہمارے قریب آگئی۔ اس نے ایک نظر ٹھاکر کی زخمی ٹانگ کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کی چمک کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

میں بھی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی جوانی سمندر کی اٹھتی ہوئی موج تھی جو ساحل کی قید سے آزاد ہونے کے لیے مچل رہی تھی۔ اس کا حسن لاجواب تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی مقناطیسی کشش تھی جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد بھی میں نے بہت سی حسین عورتیں دیکھی تھیں مگر ایسی سُندر ناری (خوب صورت عورت) پہلی مرتبہ میری نظروں کے سامنے آئی تھی اور میں یہ اعتراف کرنے میں بھی باک نہیں سمجھتا کہ بملا وہ پہلی لڑکی تھی جسے دیکھ کر میرے دل میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا۔ میری نظریں اس کے حسین پیکر کا طواف کررہی تھیں۔ وہ بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھی کہ میں اسے کن نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور یہ مسکراہٹ بھی بڑے غضب کی تھی۔

ایک ملازم برآمدے والے دروازے سے اندر داخل ہوا تو بملا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"راج مل کہاں ہے۔ تم نے کہا تھا اسے بھی گولی لگی ہے!"

"راج مل باہر بیٹھا ہے۔" ٹھاکر سے پہلے وہ ملازم بول پڑا جو ابھی ابھی اندر آیا تھا۔

"اسے کوارٹر میں لے جاؤ۔ ڈاکٹر شیام سندر آنے والا ہے۔" ٹھاکر نے کہا۔ ملازم فوراً ہی باہر نکل گیا۔

میں بھی ٹھاکر کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں اب بھی بار بار بملا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"ان مہاشے کا تعارف نہیں کرایا تم نے ٹھاکر۔" اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"ان مہاشے کا تعارف۔" ٹھاکر نے سر اٹھاکر اس طرف دیکھا "حیرت ہے۔ سارا شہر ان سے متعارف ہو ہے اور تم انہیں میرے ساتھ دیکھ کر بھی نہیں سمجھ سکی ہو یہ کون ہوسکتا ہے۔"

"ہمت سنگھ۔" بملا کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس کی نظریں میری طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں پہلے سے زیادہ چمک تھی۔

"ہاں یہ ہمت سنگھ ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "سچائی اور بھگتی کے راستے کا وہ مسافر جسے ہر پگ ہتیا چار (ظلم) کا سامنا ہے اور یہ کسی سہائتا (مدد) کے بغیر ان کا مقابلہ کررہا ہے۔ بھگوان نے اس کی بانہوں میں اتنی شکتی (قوت) دی ہے کہ اسے کسی اور کی سہائتا کی ضرورت بھی نہیں۔"

"یہ تمہاری دیا (مہربانی) ہے ٹھاکر کہ مجھے اس قابل سمجھتے ہو۔" میں نے کہا "مجھے تم جیسے مہان منشوں کی سہائتا نہ ملتی تو میں ہتیا چار کا مقابلہ نہ کرسکتا۔"

ٹھاکر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ باہر سے کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

"میرا خیال ہے ڈاکٹر شیام سندر آگیا ہے۔ اسے یہیں لے آؤ بملا۔" ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اٹھ کر فوراً ہی باہر چلی گئی۔

میرے خیال میں ڈاکٹر شیام سندر کہیں قریب ہی رہتا تھا جو اتنی جلدی پہنچ گیا تھا۔ حویلی کے ایک ملازم نے اس کا بیگ اٹھا رکھا تھا جو قریب آکر اس نے کافی ٹیبل پر رکھ دیا۔

"پھر کوئی گڑبڑ۔" ڈاکٹر نے ٹھاکر کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے کہا "کیا آج پھر کسی پنڈت سے سامنا ہوگیا تھا؟"

"نہیں۔ آج کچھ دُشٹ (بدمعاش) ٹکرا گئے تھے۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ان کے بھاگ (نصیب) اچھے تھے جو بچ کر نکل گئے۔"

ڈاکٹر شیام سندر نے مزید کچھ کہنے کے بجائے ٹیبل پر رکھا ہوا بیگ اٹھاکر اپنے قریب قالین پر رکھ لیا اور اسپرٹ کی بوتل اور کاٹن نکال کر ٹھاکر کا زخم صاف کرنے لگا۔ ٹھاکر نے دانت بھینچ لیے۔ اسپرٹ تو اچھے اچھوں کو سسکاریاں بھرنے پر مجبور کردیتی ہے۔

زخم صاف کرکے ڈاکٹر نے دوا لگاکر ڈریسنگ کردی۔

"تین چار روز تک مکمل آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر زخم بگڑ گیا تو کئی روز تک کھاٹ پر پڑے رہنا پڑے گا۔"

"اب ضرور احتیاط کروں گا۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا "اب ذرا راج مل کو بھی دیکھ لو۔ اس کے بازو میں گولی لگی ہے۔"

"اوہ... کہاں ہے وہ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"اپنے کوارٹر میں ہے سرکار۔" ایک ملازم نے جلدی سے کہا۔

"چلو۔ اسے بھی دیکھ لیں۔" ڈاکٹر بولا۔

ملازم نے بیگ اٹھالیا اور میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا۔ سرونٹ کوارٹرز حویلی کی پچھلی طرف تھے۔ ہم ایک کوارٹر میں داخل ہوگئے۔ راج مل چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے زخمی بازو کو پکڑ رکھا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے چارپائی پر لٹا دیا اور اس کے بازو کو زخم کے آس پاس ٹٹول کر دیکھنے لگا اور پھر میری طرف دیکھ کر تشویش آمیز لہجے میں بولا۔

"گولی اندر رہ گئی ہے۔ آپریشن کرنا پڑے گا۔"

"اسپتال..."

"نہیں۔" ڈاکٹر نے میری بات کاٹ دی "اگر اسے اسپتال لے گئے تو ہم پولیس کی مداخلت کو نہیں روک سکیں گے۔ جو کچھ بھی کرنا ہے یہیں پر کرنا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے پاس کیا کچھ ہے۔"

وہ اپنا بیگ کھول کر اس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے سالخوردہ سی میز پر ایک صاف کپڑا بچھا دیا اور بیگ میں سے چیزیں نکال کر اس پر رکھنے لگا۔ تیز دھار والا نشتر، نوک والی چمٹی اور ایسی ہی کچھ چیزیں۔ آخر میں اس نے شیشے کی ایک بوتل نکال لی جس کا پیندا نیچے سے گول تھا اور منہ پر پرفیوم اسپرے کی بوتل کی طرح نوزل لگی ہوئی تھی۔ اس بوتل میں بے رنگ سا محلول بھرا ہوا تھا۔ یہ لوکل استھیسیا تھا۔

"راج مل۔" ڈاکٹر ایک بار پھر اس کا بازو ٹٹولتے ہوئے بولا "ڈرو نہیں۔ یہ اسپرے کرنے سے تمہارا بازو سُن ہوجائے گا اور تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

راج مل کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ گولی لگنے سے شاید اسے اتنی تکلیف نہیں ہوئی ہوگی جتنا خوف زدہ وہ اب ہورہا تھا۔

ڈاکٹر شیام سندر نے اس کے زخم کے آس پاس اسپرے کردیا اور چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد وہ نشتر سے اس کا زخم کریدنے لگا۔ راج مل نے منہ دوسری طرف کرلیا۔ میں نے آگے جھک کر اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

کسی کے زخم کو اس طرح نشتر سے کریدتے ہوئے دیکھنا بھی عام آدمی کے لیے بڑے دل گردے کا کام تھا لیکن میرا شمار عام آدمیوں میں نہیں ہوتا تھا۔ میری تو اپنی زندگی ایک مسلسل عذاب بنی رہی تھی۔ میں نے اتنے دکھ، اتنے کشٹ اٹھائے ہیں کہ کوئی عام آدمی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

میرے جسم پر بھی بڑے بڑے گھاؤ لگے ہیں۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب بنکاک میں میری ٹانگ میں گولی لگی تھی اور کئی گھنٹوں بعد میرے دوست گانگ نے خنجر کی نوک سے میرے زخم سے وہ گولی نکالی تھی۔ نہ مجھے بے ہوش کیا گیا تھا نہ میری ٹانگ کو کسی اسپرے سے سُن کیا گیا تھا۔ میں نے پورے ہوش و حواس میں رہ کر اپنے زخم کو خنجر کی نوک سے چرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے وہ اذیت کس طرح برداشت کی تھی؟ وہ میں ہی جانتا تھا۔ راج مل تو خوش قسمت تھا۔ اس کے آپریشن کا سارا سامان موجود تھا اور اس کا آپریشن کرنے والا گانگ کی طرح رکشا ڈرائیور نہیں، ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔

ڈاکٹر شیام سندر نشتر اور چمٹی کی مدد سے زخم کو کھولتا رہا اور بالآخر گوشت میں دھنسی ہوئی گولی کو چمٹی سے پکڑ کر نکال دیا۔

اس آپریشن میں صرف بیس منٹ لگے تھے۔ مزید دس پندرہ منٹ ڈریسنگ میں لگ گئے۔

"بس اتنی سی بات تھی۔" وہ راج مل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "چند روز تک اس بازو کو زیادہ حرکت مت دینا۔ میں کچھ گولیاں دے جاؤں گا۔ پیڑ (درد) ہونے لگے تو ایک گولی کھالینا۔"

راج مل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم سرونٹ کوارٹر سے نکل کر حویلی کے ہال میں آگئے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ صوفے پر نیم دراز تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ گیا۔ بملا اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر کچن کی

طرف چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔

ڈاکٹر شیام سندر چائے پی کر رخصت ہوگیا۔

"شیام سندر کون ہے؟" میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "لگتا ہے تمہارا کوئی راز اس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "شیام سندر میرا ایسا ہی گہرا اور بھروسے کا دوست ہے جس سے میں نے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔"

"میرا خیال ہے تم دونوں کا بچپن بھی ایک ساتھ ہی گزرا ہے!" میں نے کہا۔

"کسی حد تک۔" ٹھاکر نے کہا "شیام سندر دراصل ہمارے مالی کا بیٹا ہے۔ یہ چھ سال کا تھا جب اس کے پتا جی (باپ) کا دیہانت (انتقال) ہوگیا تھا۔ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا ہے۔ یہ اس وقت پہلی جماعت میں تھا۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ سبق فوراً ہی یاد کرلیتا تھا۔ اس کی ماں اسے اسکول سے اٹھا لینا چاہتی تھی لیکن اس کا شوق دیکھ کر میری ماتا جی (ماں) نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور اس کی تعلیم جاری رکھی۔

"اس نے آٹھویں جماعت پاس کی تو شیام سندر کی ماتا جی بھی گزر گئیں۔ شیام سندر آگرہ میں اپنے کسی چاچا کے پاس جانا چاہتا تھا مگر ماتا جی نے اسے منع کردیا۔

"شیام سندر ذہین لڑکا تھا۔ پڑھنے لکھنے کا بے حد شوقین۔ ماتا جی نے اس کی تعلیم جاری رکھی۔

"شیام سندر کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ ماتا جی نے اس کی حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ اس نے بہت اچھی پوزیشن میں ایم بی بی ایس پاس کرلیا تو اس کی خواہش پر ماتا جی نے اسے میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ بھیج دیا۔

"شیام سندر چھ سال انگلینڈ میں رہا۔ وہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا کہ ماتا جی شدید بیمار ہوگئیں۔ شیام سندر کو پتا چل گیا۔ وہ واپس آنا چاہتا تھا تاکہ اس دیوی کی سیوا (خدمت) کرسکے جس نے اسے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچایا تھا مگر میں نے اسے سختی سے منع کردیا اور ہدایت کی کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ مرکوز رکھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ واپس آگیا تو اس کی تعلیم کا حرج ہوگا اور ماتا جی کی حالت دیکھ کر وہ واپس جانے سے بھی انکار کردے گا۔ میں خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے اسے ماتا جی کے بارے میں تسلیاں دیتا رہا۔

"ماتا جی کا دیہانت ہوگیا۔ میں نے یہ خبر بھی شیام سندر سے چھپائی اور چند ماہ بعد جب وہ اپنی تعلیم مکمل کرکے واپس آیا تو ماتا جی کو نہ پا کر وہ اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ میرا کلیجا بھی پھٹ گیا۔

"میں بڑی مشکل سے شیام سندر کو سنبھال سکا تھا۔ اس صدمے نے کئی روز تک اسے نڈھال رکھا لیکن وقت ایک ایسا مرہم ہے جو بڑے بڑے زخم مندمل کردیتا ہے۔ شیام سندر کے دل پر ماتا جی کی موت سے جو زخم لگا تھا وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مندمل ہوتا گیا۔

"شیام سندر نے کچھ عرصے تک سرکاری اسپتال میں ملازمت کی پھر میں نے اسے رام باغ میں کلینک کھول دیا۔ رام باغ پیلس ہوٹل کے قریب ہی ہماری ایک کوٹھی ہے جو کرائے پر چڑھی ہوئی تھی۔ میں نے وہ کوٹھی خالی کروا کر شیام سندر کے حوالے کردی جہاں کلینک کھولا گیا۔

"ابھی پچھلے سال ہی میں نے اس کی شادی کرائی ہے۔ اس نے کلینک کے قریب ہی رہائش کے لیے بھی ایک کوٹھی خرید لی اور میری آشیرباد سے وہ اس کوٹھی میں منتقل ہوگئے۔

"یہ ہے شیام سندر کی کہانی۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیا "اسے تم میرا دوست کہہ لو یا بھائی۔ یہ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے اور وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتا ہے۔"

"اور یہ...؟" میں نے آنکھ سے بملا کی طرف اشارہ کیا۔

"میری دوست ہے مگر غلط مت سمجھنا۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بملا پنڈت رام سروپ برہمن کی بیٹی ہے۔"

"اور یہ پنڈت رام سروپ برہمن کون ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پنڈت رام سروپ برہمن وہ شخص ہے جس سے بلونت سنگھ نے سب سے پہلے رابطہ کیا تھا اور اسے تمہارے اور روپ متی کے تعلقات کے بارے میں بھڑکایا تھا۔ پنڈت رام سروپ برہمن ہی نے بعض دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں کو اکسایا۔ جب تم دونوں کے حوالے سے پہلی مرتبہ شہر میں ہنگامے ہوئے تھے تو پنڈتوں کے ٹولے کا سرغنہ پنڈت رام سروپ ہی تھا لیکن اس ہنگامے کے انت (اختتام) میں وہ منظر سے غائب ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے اب ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی یا وہ پولیس کی پکڑ دھکڑ سے خائف ہوگیا تھا۔"

"تو پھر اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟" میں نے پوچھا "پنڈت اور پجاری آسانی سے کوئی بات ماننے والے تو نہیں ہوتے۔"

"لیکن پنڈت رام سروپ نے بلا چون وچرا ایک مسلمان کی بات مان لی تھی۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے مزید حیرت ہورہی ہے۔" میں نے کہا۔

"بملا پنڈت رام سروپ کی دوسری بیٹی ہے۔" ٹھاکر نے اس کی طرف اشارہ کیا "مقامی یونیورسٹی میں فائن آرٹس کی اسٹوڈنٹ اور بہترین رقاصہ ہے۔ ہمارے دھرم میں رقص کو برا نہیں سمجھا جاتا بلکہ ایک طرح سے یہ ہمارے دھرم کا حصہ ہی ہے۔ اس کے رقاصہ ہونے پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک دھرماتما (مذہبی پیشوا) کے گھر کی ناریوں (عورتوں) کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ دوسری فیشن ایبل ناریوں کی طرح اپنے شریر کی نمائش نہیں کرتی پھریں گی لیکن بملا کو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ نہ صرف آزاد منش ہے بلکہ لباس بھی ایسا پہنتی ہے کہ دوسروں کی نظریں خوامخواہ اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

"لوگ اس بات کو بھی نظرانداز کرنے کو تیار ہیں لیکن بملا کی بڑی بہن پوجا بمبئی میں ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پوجا کو فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ وہ ہیروئن بننا چاہتی تھی۔ وہ بمبئی چلی گئی۔ ہیروئن تو نہ بن سکی، انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے عیاش طبع مردوں کا کھلونا بن گئی۔ بمبئی کے لوگوں کو پتا نہیں کہ پوجا ایک پنڈت کی بیٹی ہے۔ پوجا نے یہ عقل مندی ضرور کی کہ وہاں اپنے باپ کا نام نہیں اچھالا۔ وہ آج کل باندرہ میں ایک مسلمان کیمرا مین کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہ رہی ہے۔ سلیم نامی اس کیمرا مین نے اسے یہ وشواس (یقین) دلا رکھا ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اسے ہیروئن ضرور بنائے گا۔ ہیروئن تو بہت پرے کی بات ہے وہ تو اسے کسی فلم میں ایکسٹرا کا رول بھی نہیں دلا سکا۔ وہ نہ صرف خود اس کے ساتھ عیش کررہا ہے بلکہ اس کے دوست بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں۔ پوجا اس لیے اپنے آپ کو لٹا رہی ہے کہ شاید انہی میں سے کوئی اسے سکرین تک پہنچا دے۔

"بمبئی میں کیمرا مین سلیم اور پوجا کا پڑوسی جے پور کا رہنے والا ہے۔ وہ کئی سال پہلے کاروباری سلسلے میں بمبئی منتقل ہوگیا تھا۔ جب وہ یہاں تھا تو اسی علاقے میں رہتا تھا جہاں پنڈت رام سروپ کی حویلی ہے۔ فیروز شاہ نامی وہ شخص کبھی کبھار اپنے عزیزوں سے ملنے کے لیے یہاں آتا رہتا ہے۔

"جن دنوں ہندو ناری اور مسلمان مرد کے تعلقات کو بنیاد بنا کر یہاں ہنگامے شروع کیے گئے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوشش کی گئی تھی، فیروز شاہ ان دنوں یہاں آیا ہوا تھا۔ اسے پتا چل گیا کہ پنڈت رام سروپ پجاریوں اور پنڈتوں کے اس ٹولے کا سرغنہ ہے جو جگہ جگہ زہر میں بجھے ہوئے بھاشن (خطبے) دے کر لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا رہے ہیں تو فیروز شاہ پہلے روز کے ہنگاموں کے دوران میں ہی پنڈت رام سروپ کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

"فیروز شاہ کے پاس پوجا اور سلیم کی ایک تصویر بھی تھی جس میں نیم عریاں لباس میں ملبوس پوجا سلیم سے ہم آغوش تھی۔ یہ تصویر فیروز شاہ نے کیسے کھینچی تھی یا کہاں سے حاصل کی تھی؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے لیکن یہ تصویر ایک زبردست ہتھیار ثابت ہوئی۔

"فیروز شاہ نے وہ تصویر پنڈت رام سروپ کو دکھا کر دھمکی دی تھی کہ وہ اس معاملے سے الگ ہٹ جائے اور اپنی زبان بند رکھے اور دوسرے پنڈتوں کو بھی بے گناہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے سے روکے۔ بصورت دیگر وہ یہ تصویر اخبارات میں شائع کروا دے گا اور شہر کے پنڈت، پجاری اور کٹر ہندو اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔ اس کی حویلی کو جلا کر بھسم کردیں گے اور اس کے گھر کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

"یہ دھمکی کام کرگئی۔ پنڈت رام سروپ اس ٹولے سے ایسا غائب ہوا کہ آج تک کسی کو نظر نہیں آیا۔"

"کیا وہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"نہیں۔ وہ اپنی حویلی میں ہے۔" ٹھاکر نے جواب دیا "اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ پنڈت اور پجاری اس سے ملنے کے لیے جاتے مگر انہیں دروازے سے ہی لوٹا دیا جاتا۔ کم از کم دو مرتبہ بلونت سنگھ نے بھی اس سے ملنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

"ادھر ہنگاموں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ پنڈت رام سروپ سے مایوس ہو کر بلونت سنگھ نے دوسرے پنڈتوں کی طرف رخ کیا اور رام اوتار جیسے پنڈت اس کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس معاملے میں پنڈت رام اوتار ہی زیادہ متاثر ہو رہا تھا اس لیے وہ بڑی آسانی سے بلونت سنگھ کے جال میں پھنس گیا۔"

"لیکن تمہیں ان ساری باتوں کا پتا کیسے چلا؟" میں نے پوچھا اور اس کے ساتھ ہی میری نظریں غیر ارادی طور پر بملا

کی طرف اٹھ گئیں۔
"ببلا سے۔" ٹھاکر نے جواب دیا "بات دراصل یہ ہے۔ میرے متر (دوست)!" اس نے نظریں میرے چہرے پر گاڑ دیں "گھر کا ماحول بچوں کی تربیت گاہ ہوتا ہے۔ گھر میں سکون نہ ہو' انتشار ہو' ماحول مکدر ہو تو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ بچے دیوی دیوتاؤں کی طرح معصوم ہوں گے۔ یہ کسی بات کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔
"ان کے گھر کا ماحول بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پابندیوں نے بھی انہیں باغی بنا دیا۔ تین سال چھوٹا بھائی پنڈت جی کی مار کھا کر اس طرح سے بھاگا کہ آج تک اس کا پتا نہیں چلا۔ لڑکیوں نے بھی گھر کے ماحول کا کوئی اچھا اثر قبول نہیں کیا۔ یہ مادر پدر آزاد ہو گئیں۔ ایک فلمی ہیروئن بننے کے لیے بمبئی چلی گئی اور دوسری یہ۔۔۔" اس نے ببلا کی طرف اشارہ کیا "اس سے میری ملاقات چند مہینے پہلے ہوئی تھی۔ میں اس وقت اپنے ریسٹورنٹ میں تھا۔ یہ دو لڑکوں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہ اس وقت دارو (شراب) پئے ہوئے تھی اور پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھی۔
"آدھے گھنٹے بعد ایک اور آدمی وہاں آیا اور ان تینوں کو ساتھ لے گیا۔ وہ آدمی میرے ہی ہوٹل کی چوتھی منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔
"میں نے ایک ویٹر کو اشارہ کیا۔ وہ بھی ان کے پیچھے ہی ریسٹورنٹ سے نکل گیا۔ چند منٹ بعد واپس آکر اس نے بتایا کہ وہ تینوں اس لڑکی کو چوتھی منزل والے کمرے میں لے گئے ہیں۔
"اس میں شبہ نہیں کہ بیشتر رہائشی ہوٹل عیاشی کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ کئی ہوٹل تو ایسے ہیں جن کے منتظمین اور مالک خود ہوٹل میں ٹھہرنے والے مہمانوں کو لڑکیاں سپلائی کرتے ہیں۔ بعض ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے مہمان باہر سے لڑکیوں کو لے کر آتے ہیں اور ویٹروں وغیرہ کو چند روپے رشوت دے کر انہیں زبان بند کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔
"میں کوشش کرتا ہوں کہ میرے ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں ایسی کوئی بات نہ ہو لیکن بعض اوقات ایسی کوئی "واردات" ہو ہی جاتی ہے۔
"اس رات لڑکی نشے میں تھی۔ اسے دو اوباش قسم کے لڑکے لے کر میرے ریسٹورنٹ میں آئے تھے اور پھر انہیں ایک ایسا آدمی اپنے ساتھ لے گیا تھا جو میرے ہی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں تو پہلی ہی نظر میں ایسے لوگوں کو تاڑ لیتا ہوں اور یہ تو ایک کھلا ہوا کیس تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ 15 مئی 2003ء کو شائع ہوگا۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 5

آتش فشاں

تحریر: اقبال کاظمی　　　راوی: وجدان علی

ظلم وستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بناسکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کرسکیں۔ بالاخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

ظلم وجبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک سراپا انتقام جیالے کی عجیب جنون کی لرزہ خیز داستان

"میں ریسٹورنٹ چھوڑ کر اوپر آگیا اور یہ تصدیق ہوجانے کے بعد کہ وہ چاروں چوتھی منزل والے کمرے میں موجود ہیں، میں نے پولیس کو بلالیا اور جب اس کمرے کا دروازہ کھلوایا گیا تو لڑکی کے جسم پر لباس برائے نام ہی رہ گیا تھا اور وہ تینوں کھلونا سمجھ کر اس سے کھیل رہے تھے۔

"ان کے ساتھ مجھے بھی پولیس اسٹیشن جانا پڑا۔ ایک تھپڑ کھانے کے بعد لڑکی ہوش میں آگئی تھی۔ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ ان دونوں میں سے ایک لڑکا اس کا کلاس فیلو تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ وہ دونوں اسے ورغلا کرلے آئے تھے۔ اسے زبردستی شراب پلائی گئی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں رہی کہ وہ دونوں اسے کہاں کہاں لیے پھرتے رہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس ہوٹل کے کمرے میں کس طرح آئی تھی۔

"ہوش میں آنے کے بعد لڑکی نے ذلت و رسوائی کے خوف سے اپنے ماں باپ یا گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ تاہم اس کے کلاس فیلو سے معلوم ہوگیا کہ وہ ایک مہان پنڈت کی بیٹی ہے۔ وہ منت سماجت کرنے لگی کہ اس کے باپ کو کچھ نہ بتایا جائے، اور اس نے گھر جانے سے انکار کردیا۔ نجانے کیوں اس نے میرے ساتھ جانے کو ترجیح دی۔

"ان تینوں آدمیوں کو حوالات میں بند کردیا گیا اور میں لڑکی کو اپنی ضمانت پر اپنی حویلی لے آیا۔

"میں کوئی پارسا یا دیوتا نہیں ہوں لیکن اس لڑکی کے لیے میرے دل میں کوئی میل نہیں آیا۔ یہ دو دن میرے پاس رہی۔ میں اسے سمجھاتا رہا۔ دنیا کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"دو دن بعد یہ چلی گئی اور کئی روز بعد ایک شام میرے ہوٹل آگئی۔ بہت دیر تک میرے پاس بیٹھی رہی اور پھر اس کے بعد ہماری دوستی ہوگئی۔ یہ کئی کئی روز تک میری حویلی میں رہ جاتی ہے۔ پنڈت جی نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ یہ کہاں غائب رہتی ہے۔

"یہ اس مہان پنڈت کی بیٹی ہے جس نے میرے خلاف بھی بہت زہر اگلا تھا۔ مجھے مسلوں کا پٹھو، دلال اور نجانے کیا کیا کہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس کی بیٹی کئی کئی روز تک میرے پاس رہتی ہے تو شاید وہ خودکشی کرلے۔" ٹھاکر

خاموش ہو کر بلا کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے بھی بلا کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ٹھاکر کی باتوں کا برا مان گئی ہوگی لیکن اس کے چہرے پر ایسے کوئی تاثرات نظر نہیں آئے۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا تو چونک گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ تو غنیمت تھا کہ یہاں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ٹھاکر نے ٹیلی فون پر جانکی اور روپ متی کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم یہاں ہیں اور وہاں نہیں آئیں گے۔

"اچھا بھئی۔ میں تو چلا۔ نیند آرہی ہے۔" ٹھاکر اٹھتے ہوئے بولا "تم بھی اس کمرے میں جاکر سو جاؤ۔" اس نے یہ جملہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا اور ساتھ ہی ہال کی دوسری طرف ایک کمرے کی طرف اشارہ کردیا۔

"ہاں۔ نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔" میں بھی اٹھ گیا۔

میرا خیال تھا کہ میں ٹھاکر کو سہارا دے کر اس کے کمرے تک چھوڑ آؤں گا لیکن بلا نے مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر اس کا بازو اپنے کندھوں پر رکھ لیا اور اپنا ایک بازو اس کی کمر میں حائل کردیا اور اس طرح ٹھاکر کو سہارا دے کر اس کے کمرے کی طرف لے جانے لگی۔

میں چند لمحے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر اسی کمرے میں آگیا جس کی نشان دہی ٹھاکر نے کی تھی۔

وہ بہت شان دار بیڈ روم تھا۔ میں نے ٹیوب لائٹ بجھا کر نائٹ بلب روشن کردیا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں کروٹ کے بل لیٹا بلا کے بارے میں سوچتا رہا۔

مجھے اس کمرے میں آئے ہوئے شاید آدھا گھنٹا ہوا تھا۔ میں سونے کی کوشش کررہا تھا لیکن بلا کا خیال کسی طرح ذہن سے نہیں نکل رہا تھا۔ کتنی حسین تھی وہ۔ کبھی تو اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی اور کبھی میں اداس ہوجاتا۔ وہ حالات کا شکار ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت بکھر گئی تھی اور یہ بھی غنیمت تھا کہ اسے ٹھاکر بھانوت سنگھ جیسا دوست ملا تھا۔ اگر وہ ان بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ جاتی تو آج وہ نہ ہوتی جو نظر آرہی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ "چٹ" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں تیز دودھیا روشنی بھر گئی۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہونے لگی۔

بلا دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

بلا نے شاید میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ لگالیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔

"بیاکل (بے قرار) ہوگئے؟" وہ میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی "چنتا (فکر) مت کرو۔ میں تمہیں کوئی کشٹ (تکلیف) نہیں دوں گی۔" اس کے لہجے میں بے باکی تھی "میں جانتی تھی تم سوئے نہیں ہوگے اس لیے میں یہاں آگئی۔ مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔ باتیں کریں گے دونوں۔"

وہ بے تکلفی سے پلنگ پر چڑھ کر میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ میرے اندر اوپر سے نیچے تک سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا جو چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب سے خیال آرہے تھے۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کی دوست تھی اور ٹھاکر میرا محسن تھا۔ میری خاطر اس نے بہت کشٹ اٹھائے تھے۔ اس کا ریسٹورنٹ جلا دیا گیا تھا۔ اس پر قاتلانہ حملے ہوئے تھے۔ وہ زخمی ہوا تھا۔ اس کے دھرم (مذہب) کے لوگ اس کی جان کے دشمن ہوگئے تھے۔ بلا کے بارے میں اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کوئی ایسی بات نہ ہوجائے جس سے ٹھاکر کو ناراض ہونے کا موقع ملے۔

"میں ٹھاکر کی دوست ہوں۔۔۔ رکھیل نہیں۔" بلا نے جیسے میرے خیالات پڑھ لیے تھے "تم کوئی چنتا مت کرو۔ اس نے اگر مجھے تمہارے پاس بیٹھے ہوئے دیکھ بھی لیا تو کچھ کہے گا نہیں۔ ہم تو یہاں باتیں کریں گے۔ صرف باتیں۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی "ایک بات بتاؤ' تم مجھے دیکھ کر اتنے بیاکل کیوں ہورہے ہو۔ کیا کبھی کسی ناری کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا؟"

وہ واقعی بڑی ذہین تھی۔ اس نے میری بے چینی کا اندازہ لگالیا تھا۔

"ناریاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں پر۔۔۔"

"مجھ جیسی کوئی نہیں دیکھی۔" اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی "پرنتو (مگر) میں کوئی دوسروں سے مختلف تو نہیں۔ بالکل ویسی ہوں جیسے دوسری ناریاں ہوتی ہیں۔ ہاں۔ تم مجھے ذرا بگڑی ہوئی کہہ سکتے ہو۔ پر میں اتنی بگڑی ہوئی بھی نہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ اتنی بگڑی ہوئی ہوتیں تو یہاں ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی میں نظر نہ آتیں۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "تمہارا نام ہمت سنگھ تو نہیں ہوسکتا۔ سارے شہر میں تمہارا چرچا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ راج کماری روپ متی سے تمہاری دوستی ہے اور یہ دوستی ہی ان ہنگاموں کا باعث بنی ہے۔ کیا واقعی۔۔۔؟"

"اب تم بھی کسی پنڈت کی طرح سوچنے لگیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پنڈت۔ پجاری۔" بلا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "انہوں نے دھرم کا ٹھیکا لے رکھا ہے اور دھرم کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے بھی یہی لوگ ہیں۔ جاتیوں (ذات پات) کا زہر بھی انہی پنڈتوں اور پجاریوں نے پھیلایا ہے۔ میرے پتا جی برہمن ہیں۔ ہندو دھرم میں سب سے اونچی اور پوتر جاتی (ذات) مگر ان کے کرم (اعمال) نیچی جاتی کے لوگوں سے بھی بدتر ہیں۔ ملیچھ ہیں وہ۔۔۔"

"بہت نفرت ہے تمہیں اپنے پتا جی سے۔" میں نے کہا "باپ کتنا ہی برا کیوں نہ ہو' اولاد کے لیے تو دیوتا سمان (جیسا) ہوتا ہے مگر تمہاری یہ نفرت۔۔۔ اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ تم پر ضرورت سے زیادہ سختی کی گئی ہے یا۔۔۔"

"پتا جی سے نفرت کا کارن (وجہ) وہ کشٹ نہیں جو میں نے ان کی اور (طرف) سے اٹھائے ہیں۔" بلا نے جواب دیا "ماں باپ اولاد پر تھوڑی بہت سختیاں کرتے ہیں اور اولاد ان باتوں کا کبھی برا نہیں مانتی۔ یہ سختیاں ان کی بھلائی کے لیے ہوتی ہیں۔ پر ہمارے پتا جی نے ہم پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم نے ٹھیک کہا۔ پتا اولاد کے لیے دیوتا سمان ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہی اولاد اپنی زندگی کے راستے کا تعین کرتی ہے۔ باپ ہی اگر اولاد کے سامنے ننگی باتیں کرے گا۔ ننگی حرکتیں کرے گا تو اولاد سے یہ توقع کیسے کی جاتی ہے کہ وہ فرشتوں کی طرح نیک اور معصوم ہوگی۔

"میرے پتا جی کے کرم بھی کچھ ویسے ہی ہیں۔ وہ غیر عورتوں کو حویلی میں لے کر آتے۔ میری ماتا جی کو مجبور کرتے کہ ان کی سیوا کرے۔ انہیں اپنے ہاتھوں سے دارو پلائے۔ بات صرف عورتوں تک ہوتی تو قابل برداشت ہوتی۔ وہ تو عورتوں کے ساتھ دوسرے پنڈتوں کو بھی لے کر آتے تھے اور ماتا جی کو مجبور کیا جاتا تھا کہ ان پنڈتوں کو اپنے ہاتھوں سے دارو پلائے۔

"یہ سب کچھ ماتا جی کے لیے ناقابل برداشت تھا لیکن وہ یہ دکھ سہنے پر مجبور تھیں۔ ان کی موجودگی میں عورتوں کو ننگا کیا جاتا۔ یہ دھرماتما انہیں نوچتے کھسوٹتے۔ ماتا جی وہاں سے جانا چاہتیں تو انہیں زبردستی روک لیا جاتا اور یہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور کیا جاتا۔

"ماتا جی نے انہی دکھوں میں گھل گھل کر جان دے دی۔ پتا جی اس پر بھی نہیں سنبھلے۔ یہ سلسلے اس کے بعد بھی جاری رہے۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں رہا کہ ان کے گھر میں بھی دو جوان بیٹیاں ہیں۔

"اور پھر ایک رات تو۔ بے غیرتی کی انتہا ہوگئی۔ اس رات پنڈت شیو ناتھ آیا ہوا تھا۔ ایک ناری بھی تھی۔ دارو پیتے پیتے وہ اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔

"پتا جی نے پوجا کو آواز دے کر پانی منگوایا۔ پوجا پانی لے کر اندر گئی۔ وہ جگ رکھ کر لوٹنے لگی تو پنڈت شیو ناتھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پوجا نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو پنڈت اس سے لپٹ گیا۔ اس کے کپڑے پھاڑ دیے۔ پوجا نے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کی تو پتا جی نے اس کا راستہ روک لیا اور کہا "میرے دوست کو خوش کردو پتری۔ شیو ناتھ مہان پنڈت ہیں۔ شہر کے سب سے بڑے مندر کے پروہت ہیں۔ یہ خوش ہوجائیں گے تو اپنی گدی مجھے دے دیں گے۔"

"دارو کے نشے میں باپ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے کیا کہہ رہا ہے۔ پوجا کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو بچا کر وہاں سے نکل آئی اور مجھے ساتھ لے کر ایک کمرے میں بند ہوگئی۔ وہ رات بھر روتی رہی اور اگلے روز صبح ہی بمبئی چلی گئی۔ مجھے بھی اس نے خبردار کردیا تھا کہ میں اپنا بندوبست کرلوں ورنہ میرا باپ کسی دن اپنے ہی ہاتھوں مجھے ننگا کردے گا۔

"پوجا چلی گئی۔ اس نے اپنی زبان بند رکھی تھی۔ میں نے بھی اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ اگر لوگوں کو پتا چل جاتا کہ پاپ (گناہ) اور پن (ثواب) پر لمبے لمبے بھاشن دینے والے پنڈت رام سروپ کے اپنے کرم کیا ہیں تو اس کی بوٹیاں نوچ کر کتوں کو کھلا دیتے۔

"یہ ہیں ہمارے دھرم چاریوں کے کرتوت۔" بلا نے گہرا سانس لیا اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اپنے پتا کا اصل روپ دیکھ کر مجھے اس سے شدید نفرت ہوگئی۔ دھرم کا

پرچار کرنے والے خود گندگی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ گاؤ ماتا کو بھگوان کا درجہ دیتے ہیں۔ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کے گوبر کو پوتر سمجھ کر اپنے شریر پر ملتے ہیں۔ اسے کوئی کشت دینا بہت بڑا پاپ سمجھتے ہیں مگر یہی لوگ اس گاؤ ماتا کو مسلمان قصائیوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں کہ اس کے گلے پر چھری پھیرو اور اس کی بوٹیاں کھاؤ۔ اس کی کھال کے جوتے بنا کر پیروں میں پہنو۔ عجیب دھرم ہے اور عجیب تر دھرم چاری ہیں۔

"مجھے اپنے پتا سے شدید نفرت ہے مگر میں نے کسی کے سامنے ان کے خلاف کبھی زبان نہیں کھولی۔ تم پہلے شخص ہو جسے میں اپنا دکھ بتا رہی ہوں۔

"ماتا جی انہی دکھوں میں گزر گئیں۔ ایک بٹی گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ دوسری کٹی پتنگ کی طرح ڈانواں ڈول پھر رہی ہے مگر پتا جی کو اب بھی ہوش نہیں آیا۔ کسی دُشٹ (بدمعاش) کے بہکانے میں آ کر انہوں نے شہر میں ہنگامے شروع کرا دیے۔ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ انہیں دکھ تھا کہ ایک مسلمان کسی ہندو ناری کو بغل میں لے کر کیوں گھوم رہا ہے۔ ان کے خیال میں دھرم کے خلاف یہ بہت بڑی سازش تھی۔ دھرم کو نشٹ (تباہ) کیا جا رہا تھا مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے کرم کیا ہیں۔ وہ خود دھرم کو کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ وہ یہ بھی بھول گئے تھے کہ ان کی اپنی ایک بیٹی ایک مسلمان کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہ رہی ہے۔

"ممکن ہے وہ ان ہنگاموں کو مزید ہوا دیتے مگر فیروز شاہ نے پوجا اور سلیم کی تصویر دکھا کر ان کی زبان بند کرا دی اور وہ حویلی میں بند ہو کر رہ گئے۔

"اس رات اگر ٹھاکر بھانوت سنگھ مجھے ان بدمعاشوں سے نہ بچاتا تو میں برباد ہو چکی ہوتی۔ میں عزت سے یہاں نہ بیٹھی ہوتی۔ ویشیا (طوائف) بن جاتی۔

"کوئی پتری اپنے پتا کے خلاف اس طرح نہیں بولی ہوگی جس طرح تم نے مجھے کہتے سنا۔ میرا پتا انسان نہیں راکشش (وحشی۔ حیوان۔ جنگلی) ہے.... ان کے کارن مجھے بھی اس دھرم سے نفرت ہو گئی ہے جس دھرم میں جھوٹ ہو۔ مکاری ہو' دھوکا اور فریب ہو وہ دھرم سچا کیسے ہو سکتا ہے۔"

"بات دھرم کی نہیں۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "بات ان لوگوں کی ہے جو اپنی بداعمالیوں سے دھرم کو بدنام کرتے ہیں۔ بہرحال' تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کا مجھے افسوس ہے۔"

"میں اپنا بکھیڑا لے کر بیٹھ گئی۔" بہت دیر بعد بملا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی تھی "میں تم سے تمہارے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ تم مسلمان ہو۔ راج کماری روپ متی اور ٹھاکر سے تمہاری دوستی ہے۔ اپنے پتا جی اور دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں کو تو آج تک میں نے یہی کہتے سنا ہے کہ مسلمان ملیچھ (ناپاک غلیظ) ہیں لیکن ٹھاکر نے بتایا تھا کہ تم بھگوان کی طرح پوتر اور مہان (عظیم) ہو۔ تم نے ہندو ناری (روپ متی) کی نہ صرف عزت بچائی بلکہ کئی مرتبہ اس کی جان کی رکھشا (حفاظت) بھی کی۔ یہ تمہاری مہانتا (عظمت) ہے کہ تم ایک ہندو ناری کے لیے ایک خطرناک یدّ (لڑائی) لڑ رہے ہو۔"

"میں مہان نہیں۔ مہانتا تو ان لوگوں کی ہے جو سچائی کے راستے پر میرا ساتھ دے رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تم سے ملاقات ہوگی۔" بملا نے کہا "میں اس عورت سے بھی ملنا چاہوں گی جس نے تمہارے لیے اپنا گھربار اور سب کچھ چھوڑ دیا اور تمہارے ساتھ کئی ورشوں (سالوں) سے ماری ماری پھر رہی ہے۔"

"جانکی۔" میں مسکرا دیا "وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔ اس نے واقعی میرے لیے بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔ میں تمہیں اس سے ضرور ملاؤں گا لیکن اب یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے جانے کا کیا لوگی۔"

"پہلی ہی ملاقات میں تنگ آ گئے ہو۔ میں تو تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔" بملا نے کہا۔

"ساری باتیں ایک ہی ملاقات میں ختم ہو گئیں تو دوسری ملاقات میں کیا کرو گی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تمہیں دیکھتی رہوں گی لیکن خیر۔" اس نے گہرا اور لمبا سانس لیا "تم کہتے ہو تو میں اس وقت چلی جاتی ہوں۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر ایک خوفناک قسم کی انگڑائی لی اور بیڈ سے اتر گئی۔ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ جانے کے بعد وہ تیز روشنی کا بلب بجھانا نہیں بھولی تھی۔

میں نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز دیر تک بملا اور اس کے پنڈت باپ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگر بملا نے اپنے باپ کے بارے میں جھوٹ نہیں بولا تھا تو وہ واقعی بہت بے غیرت آدمی تھا جسے اپنی بیٹیوں کی عزت کا بھی خیال نہیں تھا اور میرا خیال ہے

بملا نے کوئی بات غلط نہیں کہی تھی کیونکہ ٹھاکر بھی مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا چکا تھا۔

اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اس وقت ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ لوگ رات بھر کے آرام کے بعد بیدار ہو کر ایک نئے دن کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے اور میں نیند کی لہروں میں غوطہ زن ہو رہا تھا۔

"میری آنکھ بارہ بجے سے پہلے نہیں کھل سکی تھی۔ میں بیدار ہونے کے بعد بھی دیر تک بستر پر پڑا اینٹھتا رہا۔ حویلی میں خاموشی تھی۔ کسی طرف سے آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ٹھاکر بھی رات تین بجے کے لگ بھگ سویا تھا اور بملا بھی صبح پانچ بجے کے بعد ہی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ دونوں بھی ابھی تک سو رہے ہوں گے اور ملازم شاید باہر لان میں ہوگا اسی لیے حویلی میں خاموشی تھی۔

میں اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا اور دیر تک ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جب میں کپڑے پہن کر باہر نکلا تو اسی وقت نارائن نامی ملازم کمرے میں داخل ہوا۔

"آپ تیار ہو گئے سرکار۔ ناشتا لگا دوں؟" اس نے پوچھا۔

"بملا اور ٹھاکر جاگ گئے یا ابھی سو رہے ہیں؟" میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

"بملا جی سو رہی ہیں اور ٹھاکر جی تو سویرے سات بجے ہی چلے گئے تھے۔" نارائن نے جواب دیا۔

"کہاں۔۔ ہوٹل؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہوٹل نہیں سرکار۔" نارائن بولا "کسی نے چھوٹے سرکار کی ہتیا (جان لینا) کر دی ہے۔ ٹھاکر جی وہاں گئے ہیں۔"

"کیا۔۔؟" میں اچھل پڑا "تمہارا مطلب ہے شیام سندر؟"

"جی سرکار۔" نارائن نے سر ہلا دیا۔ وہ نجانے کب سے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں رکے ہوئے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا اور آنسو بہہ نکلے۔

"کس نے ہتیا کی ڈاکٹر شیام سندر کی۔ کون تھا وہ؟" میں نے پوچھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ سینے میں طوفان کروٹیں لینے لگا۔

"پتا نہیں سرکار' وہ کون سنگ دل تھا۔ بہو رانی پاروتی دیوی بھی بہت گھائل (زخمی) ہوئی ہیں۔ سنا ہے انہیں اسپتال بھیج دیا ہے۔"

میں چند لمحے نارائن کی صورت دیکھتا رہا پھر کمرے سے نکل آیا۔ ہال نما کمرے میں بملا سے سامنا ہو گیا۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس تھا۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اور غالباً اس وقت بھی اس کے دماغ پر نیند کا خمار طاری تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام (سلام) کیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"کہاں چل دیے شریمان جی سویرے سویرے۔"

"اس وقت دوپہر ہو رہی ہے بملا۔" میں نے کہا "میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم ناشتا کر لو۔"

میں وہاں رکے بغیر باہر آ گیا۔ ٹھاکر کی جیپ موجود تھی۔ البتہ وہ کار غائب تھی جو رات کو میں نے پورٹیکو میں کھڑی دیکھی تھی۔ جیپ کا اگلا ایک ٹائر پھٹا ہوا تھا۔ گزشتہ رات رامو وغیرہ نے ہمیں سنسان سڑک پر روکنے کے لیے گولی چلا کر ٹائر برسٹ کر دیا تھا اور ان کے فرار کے بعد جیپ کو میں ہی چلاتا ہوا حویلی تک لایا تھا اور میرا خیال تھا کہ ٹیوب تو بالکل ختم ہو چکی ہوگی۔ اگرچہ جیپ کے پچھلے حصے میں ایک فاضل ٹائر موجود تھا مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ٹائر تبدیل کر سکتا۔

گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بملا برآمدے میں کھڑی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں گیٹ سے نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے ایک طرف چلنے لگا۔ اتفاق سے چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی دائیں طرف کے موڑ سے ایک خالی ٹیکسی سامنے آ گئی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی رکوالی اور بڑی عجلت میں دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلنا ہے حکم۔" ڈرائیور نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا "ٹیکسی کا میٹر ٹھیک نہیں ہے۔ بھاڑے (کرایے) کا آپ خیال رکھنا۔"

میرا دماغ بھنا گیا۔ دنیا بھر کے ٹیکسی ڈرائیور ایک جیسے ہی تھے۔ یہ لوگ کبھی میٹر درست نہیں رکھتے۔ کرایہ زیادہ وصول کرتے ہیں اور بخشش الگ سے طلب کرتے ہیں لیکن اس وقت میں میٹر پر اس سے بحث نہیں کر سکتا تھا۔

"کہاں جانے کا ہے حکم؟"

ڈرائیور نے دوبارہ پوچھا تو میں چونک گیا۔ گزشتہ رات ڈاکٹر شیام سندر کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے ٹھاکر نے بتایا تھا کہ اس کا کلینک رام باغ میں ہے اور قریب ہی کسی بنگلے میں رہائش بھی ہے۔ رام باغ بہت بڑا علاقہ تھا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ شیام سندر کا بنگلا کس طرف ہوگا۔

"پولیس اسٹیشن۔" میرے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا "رام باغ کے علاقے کو جو تھانہ لگتا ہے وہاں چلو۔"

ڈرائیور نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھادی۔

پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ عمارت کے سامنے ٹیکسی رکتے ہی میں دروازہ کھول کر نیچے اترا اور ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہہ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عمارت میں داخل ہوگیا۔ برآمدے میں مسلح سنتری نے میرا راستہ روک لیا۔

"کس کو ملنے کا ہے شریمان جی؟" اس نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"کوئی آفیسر۔" میں نے کہا "وہ دراصل ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بھائی کی ہتیا ہوگئی ہے۔ ٹھاکر میرا متر ہے مگر مجھے اس کے بنگلے کا پتا معلوم نہیں ہے۔ کوئی ایسا آدمی جو مجھے وہاں تک پہنچا سکے۔"

"اوہ...." سنتری نے ایک بار پھر مجھے گھورا "ایک منٹ رکو۔ میں دیکھتا ہوں۔"

سنتری اندر چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تقریباً دو منٹ بعد سنتری واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک سادہ پوش بھی تھا۔

"اس کو ساتھ لے جاؤ حکم۔" سنتری نے کہا "مگر میرا خیال ہے 'ڈیڈ باڈی کو اسپتال بھیج دیا گیا ہوگا۔"

میں اس آدمی کے ساتھ باہر آگیا۔ میں تو پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آدمی آگے والی سیٹ پر براجمان ہوگیا اور ڈرائیور کو رام باغ پیلس ہوٹل کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹیکسی حرکت میں آکر سڑکوں پر فراٹے بھرنے لگی اور میں ڈاکٹر شیام سندر کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے کس نے قتل کیا تھا۔ اس کی بیوی پاروتی ابھی تک زندہ ہے یا وہ بھی ختم ہوچکی ہے۔

ٹیکسی ایک جھٹکے سے رکی تو میں اپنے خیالات سے چونک گیا۔ اس بنگلے کے سامنے بہت سے لوگ جمع تھے۔ گیٹ پر دو پولیس کانسٹیبل کھڑے تھے۔ کچھ لوگ اندر بھی نظر آرہے تھے۔

سادہ پوش ساتھ ہونے کی وجہ سے گیٹ پر تعینات کانسٹیبلوں نے مجھے نہیں روکا۔ میں برآمدے میں پہنچا تو اندر کی راہداری میں وکرم ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر بھارت بھوشن کو دیکھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے بھی مجھے پہچان لیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میری طرف آگیا۔ اس کا چہرہ رنج و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"ٹھاکر کہاں ہے اور شیام سندر۔۔۔"

"اسپتال۔" بھارت بھوشن نے مجھے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا "ڈیڈ باڈی دو گھنٹے پہلے اسپتال بھیج دی گئی تھی اور پاروتی بھابی کو بھی۔ وہ شدید گھائل ہے۔ ٹھاکر بھی وہیں ہیں۔"

اسی دوران میں ایک سب انسپکٹر ہمارے قریب آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ تھا۔ جس پر لگے ہوئے کاغذات پر وہ رپورٹ مرتب کررہا تھا۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو بھارت بھوشن ہی نے بتایا کہ میں ٹھاکر بھانوت سنگھ کا قریبی دوست ہوں۔

سب انسپکٹر نے مجھ سے چند سوالات کیے۔ کچھ باتیں میں نے اس سے پوچھیں اور پھر وہ مجھے شیام سندر کے بیڈ روم میں لے گیا۔ بیڈ روم کے دروازے کے سامنے راہداری کے فرش اور دیواروں پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے اور جب میں اندر داخل ہوا تو میری روح تک کانپ اٹھی۔

ہر چیز الٹ پلٹ نظر آرہی تھی۔ ڈبل بیڈ کی سفید چادر خون میں بھیگی ہوئی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ کوئی چیز ایسی نظر نہیں آرہی تھی جس پر خون کے چھینٹے یا دھبے نہ ہوں۔ بیڈ سے ذرا ہٹ کر قالین پر بھی خون کا بہت بڑا دھبا تھا۔ لگتا تھا جیسے کچھ دیر پہلے یہاں خون کا بہت بڑا تالاب تھا جو قالین میں جذب ہوگیا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر یہ بات کہی جاسکتی تھی ۔۔۔ جیسے کسی بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر چھوڑ دیا گیا ہو۔

میں نے زندگی میں بہت خون بہتے دیکھا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ یہاں کی صورت حال دیکھ کر میرا کلیجا منہ کو آنے لگا۔ میں باہر آگیا اور برآمدے میں رک کر تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"کون سے اسپتال میں لے کر گئے ہیں؟" میں نے بھارت بھوشن سے پوچھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی باہر آگیا تھا۔

"سوائے جے سنگھ اسپتال۔" بھارت بھوشن نے بتایا۔

وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر میں اس کی پوری بات سنے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کوٹھی سے باہر آگیا۔ اس مرتبہ وہ سادہ لباس والا میرے ساتھ نہیں تھا۔

میں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اسپتال کا نام بتادیا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ میں ٹھاکر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر شیام سندر سے اس کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ اس کے ایک ادنیٰ سے ملازم کا بیٹا تھا جسے اس کی ماں نے پالا تھا لیکن ٹھاکر کو شیام سندر سے حقیقی بھائیوں جیسی محبت تھی۔ وہ بھی اسے بہت چاہتا تھا۔ شیام سندر کی موت پر ٹھاکر کا کیا حال ہوگا!

سوائے جے سنگھ اسپتال ہوٹل جے پور اشوک سے ذرا آگے سوائے جے پور ہائی وے پر واقع تھا۔ بہت وسیع و عریض اور شان دار عمارت تھی۔ کئی بلاک تھے جو وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔

مین گیٹ پر میں نے ٹیکسی کو فارغ کردیا۔ استقبالیہ سے مجھے پتا چل گیا کہ پاروتی دیوی کو ابھی تک ایمرجنسی ہی میں رکھا ہوا ہے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کشادہ راہداری میں ہی مل گیا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ اور ہوٹل کے منیجر اور اس کے چند دوست بھی وہاں جمع تھے۔ میری آواز پر ٹھاکر نے سر اٹھا کر دیکھا اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہورہی تھیں۔۔۔ بے پناہ کرب کے آثار چہرے پر ہویدا تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور میرے ساتھ لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر اس طرح رونے لگا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اس کے دوست بھی بار بار اسے اپنے ساتھ لپٹا کر دلاسا دے رہے تھے۔

ٹھاکر دیر تک مجھ سے لپٹا ہچکیاں بھرتا رہا۔

"یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ کون تھے وہ لوگ؟ کس نے یہ ظلم ڈھایا ہے۔" میں نے کہا "شیام سندر تو بہت معصوم تھا۔ وہ تو مسیحا تھا۔ دوسروں کو زندگی دینے والا۔ اس کی زندگی کس ظالم نے چھین لی۔"

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" ٹھاکر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی "اس کے شریر کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ کوئی گن نہیں سکے گا۔ اس کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دوں گا۔ ایسا انتقام لوں گا اپنے منّا کا کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔"

"پر کون تھا وہ؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "پتا چلا۔۔۔ وہ کون ظالم تھا؟"

"رامو۔" ٹھاکر کے منہ سے نکلا "وہ میرے انتقام سے بچ نہیں سکے گا۔"

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ ہم اس وقت دوسرے لوگوں سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے "تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صبح سات بجے مجھے پولیس نے ٹیلی فون پر اس دُرگھٹنا (سانحے) کی اطلاع دی تھی۔ میں نے سوچا تمہیں بھی جگا کر ساتھ لے چلوں مگر پھر خیال آیا کہ تم ساری رات جاگتے رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا اور شیام سندر کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔

"کوٹھی کے باہر بہت سے لوگ جمع تھے۔ اندر پولیس بھری ہوئی تھی۔ پڑوس کے بنگلوں کے دو تین آدمی بھی موجود تھے۔ شیام سندر کی لاش دیکھ کر میں وقتی طور پر اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پاروتی کی دشا (حالت) بھی بہت بری تھی۔ وہ بہت گھائل تھی۔ میرے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد پاروتی کو اسپتال بھیج دیا گیا تاکہ اس کا جیون (زندگی) بچایا جاسکے۔

"شیام سندر کے پڑوسی نے بتایا کہ صبح چھ بجے دودھ والے نے انہیں جگا کر بتایا کہ بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی دودھ لینے کے لیے باہر نہیں آرہا۔ اس نے کسی گڑبڑ کا شبہ ظاہر کیا تو پڑوسی دودھ والے کے ساتھ گیٹ پھاند کر اندر آگیا۔

"برآمدے والا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ شیام سندر کو پکارتے ہوئے اندر داخل ہوگئے اور بیڈ روم کا منظر دیکھ کر کانپ اٹھے۔ بیڈ کے قریب قالین پر شیام سندر کی زخموں سے چور لاش پڑی ہوئی تھی۔ پاروتی بھی اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ اس کا سر شیام سندر کے پیروں پر تھا۔

"پاروتی بھی بہت گھائل تھی۔ پڑوسی پہلے تو یہ سمجھا کہ وہ بھی ختم ہوچکی ہے لیکن وہ زندہ تھی۔ ان دونوں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو پاروتی نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹوں سے صرف "رامو" کا لفظ نکلا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

"پڑوسی نے اپنے بنگلے سے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے یہاں کی صورت حال دیکھ کر مجھے فون کردیا اور میں فوراً ہی یہاں پہنچ گیا۔ آؤ۔ میں تمہیں دکھاؤں اس راکشش نے میرے بھائی کی کیا حالت کی ہے۔"

ٹھاکر مجھے لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر ایک مسلح پولیس کانسٹیبل موجود تھا۔ اس نے ہمیں روکا نہیں۔

کمرے کی فضا برف خانے کی طرح سرد تھی۔ پہیوں والے اسٹریچر پر ایک لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چادر اگرچہ سفید تھی لیکن اس پر خون کے اتنے دھبے تھے کہ سفیدی ختم ہوتی لگ رہی تھی۔

ٹھاکر نے چادر ہٹا دی اور میں کانپ کر رہ گیا۔ شیام

سندر کے جسم پر کوئی لباس وغیرہ نہیں تھا اور لاش پر اتنے زخم تھے کہ میرے لیے انہیں گننا ممکن نہیں تھا۔

ٹھاکر جھک کر اس کی پیشانی پر بوسے دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہہ نکلے تھے اور وہ سسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے الگ ہٹایا اور لاش کو چادر سے ڈھک دیا۔

میں ٹھاکر کو لے کر سرد خانے سے باہر آگیا۔ راہداری میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں ایک دو جانے پہچانے چہرے بھی نظر آئے لیکن اس وقت مجھے یاد نہیں آسکا کہ وہ کون تھے اور میں نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔

ایک پولیس آفیسر ٹھاکر کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور دیر تک اس سے سرگوشیوں میں باتیں کرتا رہا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے ایک اور خیال آگیا۔ راہداری میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں شیام سندر اور ٹھاکر کے دوست بھی تھے اور پاروتی کے رشتے دار بھی۔ اس کی ماں تو بار بار پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کے علاوہ کچھ اور خواتین بھی تھیں لیکن جانکی یا روپ متی دکھائی نہیں دیں۔

صبح سات بجے شیام سندر کے قتل کی اطلاع ملتے ہی ٹھاکر حویلی سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے تو اس خیال سے نہیں جگایا تھا کہ میں رات بھر جاگا تھا اور پھر شیام سندر کی کوٹھی پر آنے کے بعد وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا اور اس نے روپ متی کو اس دُرگھٹنا کی اطلاع نہیں دی تھی۔

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ انسپکٹر نے ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف آگیا۔

بہت وسیع و عریض لابی تھی۔ اسے انتظار گاہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صوفے اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ مناسب جگہوں پر کنکریٹ کے بڑے بڑے خوب صورت گملے بھی رکھے ہوئے تھے جن میں ایسے پودے لگے ہوئے تھے جو صرف سائے میں ہی نشو و نما پاسکتے تھے۔

لمبے چوڑے استقبالیہ کاؤنٹر سے ذرا آگے ایک قطار میں چار ٹیلی فون بوتھ تھے۔ ایک بوتھ خالی تھا۔ ایک عورت اس طرف بڑھ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس سے پہلے ہی بوتھ میں گھس گیا۔ ریسیور اٹھا کر مطلوبہ سکے ڈالے اور نمبر ملانے لگا۔

دوسری طرف سے کال روپ متی نے ریسیو کی تھی۔

میں اِدھر اُدھر کی باتوں سے یہ ٹوہ لینے کی کوشش کرتا رہا کہ انہیں اس سانحے کی اطلاع ملی تھی یا نہیں۔ ٹھاکر نے رات ہی کو فون پر اسے راموسے جھڑپ کے بارے میں بتا دیا اور اس وقت روپ متی میری اور ٹھاکر کی خیریت دریافت رہی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کی اسے کوئی خبر نہیں تھی۔

"ایک بری خبر ہے روپ متی۔" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"کہو میں سن رہی ہوں۔" روپ متی نے کہا "لیکن بھگوان کے لیے کوئی ایسی خبر مت سنانا جسے میں برداشت نہ کرسکوں۔"

"بات کچھ ایسی ہی ہے لیکن برداشت کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا اور پھر مناسب الفاظ میں اسے ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے بارے میں بتانے لگا۔

روپ متی تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ مجھے جتنا معلوم تھا' میں نے اسے بتا دیا اور پھر فون بند کرکے میں بوتھ سے باہر آگیا۔

جب میں راہداری میں پہنچا تو پاروتی کو ایمرجنسی روم سے باہر لایا جا رہا تھا۔ وہ پہیوں والے اسٹریچر پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا البتہ چہرے پر چادر نہیں تھی۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ دو وارڈ بوائز اسٹریچر کو دھکیل رہے تھے اور ایک نرس نے خون کی وہ بوتل اوپر کرکے اٹھا رکھی تھی جس سے منسلک ربر کی پتلی سی نلکی سے قطرہ قطرہ خون پاروتی کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔

اسٹریچر کو پاروتی کے رشتے داروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی ماں تو دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اور دو عورتوں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھال رکھا تھا۔ پاروتی کے پتا رانا ایشوری سنگھ' ٹھاکر کو سہارا دیئے چل رہا تھا۔ ان دونوں کی حالت خاصی ابتر تھی۔

پاروتی کو ایک پرائیویٹ روم میں پہنچا دیا گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد جب ڈاکٹر کمرے سے نکلا تو رانا ایشوری سنگھ اور ٹھاکر کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"مریضہ اب خطرے سے باہر ہے۔ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اسے شام تک ہوش آجائے گا۔"

رانا اور ٹھاکر کمرے میں چلے گئے۔ میں باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جانکی اور روپ متی بھی پہنچ گئیں۔ روپ متی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ یہاں میں نے ہر

شخص کی آنکھوں کو اشک بار دیکھا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ ڈاکٹر شیام سندر کو بھی کتنا چاہتے تھے۔ جانکی اور روپ متی کمرے میں چلی گئیں۔ دو مسلح پولیس کانسٹیبل بھی دروازے پر کھڑے ہوگئے تھے۔

وہ دن ہم نے اسپتال ہی میں گزارا۔ ٹھاکر صبح سات بجے اطلاع پاکر حویلی سے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے چائے تک نہیں پی تھی اور میں نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ چار بجے کے قریب میں نے اور روپ متی نے زبردستی اسے تھوڑا بہت کھلا دیا۔ میں نے بھی ایک سینڈوچ لے لیا تھا۔

رات آٹھ بجے کے قریب پاروتی کو ہوش آگیا۔ پولیس آفیسر اس وقت اسپتال ہی میں موجود تھا۔ وہ ڈاکٹر کی اجازت پاکر پاروتی کا بیان لینے کے لیے آگیا۔

فالتو لوگوں کو کمرے سے نکال دیا گیا۔ رانا ایشوری سنگھ' ٹھاکر اور میرے علاوہ ڈاکٹر اور دو پولیس آفیسر تھے۔

پاروتی کو اگرچہ کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا پتی اب اس سنسار (دنیا) میں نہیں رہا لیکن گھائل ہو کر بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے جو کچھ دیکھا ہوگا اس سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کا سہاگ اجڑ چکا ہے۔

ہچکیوں' آنسوؤں اور آہوں کے بیچ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے اپنا بیان مکمل کیا۔

پاروتی کے بیان کے مطابق وہ دونوں اپنے بیڈ روم میں سو رہے تھے کہ صبح ساڑھے چار بجے کے قریب کوئی آہٹ سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ڈاکٹر شیام سندر کو جگا دیا۔ لاؤنج کی طرف سے دوبارہ آہٹ سنائی دی تو شیام سندر اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ شیام سندر کی چیخ سن کر وہ اچھل پڑی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف لپکی لیکن شیام سندر دروازے ہی میں اس سے ٹکرا گیا۔ وہ زخمی تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔

پاروتی ایک دم بدحواس ہوگئی۔ وہ پتی (شوہر) کو سہارا دینا چاہتی تھی کہ دو آدمی کمرے میں گھس آئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ ان میں ایک لمبے قد کا مالک تھا۔ اس کی ناک پر بینڈیج لگی ہوئی تھی۔ اس نے پاروتی کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور شیام سندر پر خنجر سے حملہ کردیا۔ پاروتی اسے بچانے کے لیے لپکی۔ اس مرتبہ دوسرے آدمی نے اسے ایک طرف پٹخ دیا۔

زخمی ناک والا شیام سندر پر پے در پے خنجر کے وار کر رہا تھا اور وہ اسے بچانے کے لیے بار بار لپک رہی تھی۔ اس طرح وہ کئی بار خود بھی خنجر کی زد میں آئی۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ اپنے پتی کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔

زخمی ناک والے نے اس بار براہ راست پاروتی پر خنجر سے وار کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بھیڑیے کی طرح غراتے ہوئے کہا تھا۔

"تمہاری اور ڈاکٹر کی لاشیں دیکھ کر ٹھاکر کو پتا چل جائے گا کہ راموسے پنگے بازی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آئندہ وہ رامو کا راستہ کاٹنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

وہ دونوں پے در پے خنجروں سے شیام سندر پر وار کرتے رہے اور پاروتی اسے بچانے کے لیے بار بار لپکتی رہی اور بالآخر وہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑی۔

"میں شاید بے ہوش ہوگئی تھی۔" اس نے بتایا "پتا نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ اس وقت ہمارا پڑوسی پریم چند میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ وہ پوچھ رہا تھا' یہ سب کیسے ہوا۔ وہ کون لوگ تھے۔ اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے منہ سے صرف رامو کا نام نکل سکا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔"

پاروتی کے اس بیان سے تصدیق ہوگئی کہ ڈاکٹر شیام سندر کا قاتل رامو ہی تھا۔ وہ دو مرتبہ ہمارے ہاتھوں ہزیمت اٹھا چکا تھا۔ پہلی مرتبہ مجھ سے اس وقت پٹا تھا جب اس نے مجھے اور سونیا کو ویران سڑک پر روکا تھا اور دوسری مرتبہ گزشتہ رات جب اس نے مجھے اور ٹھاکر کو سیکریٹریٹ کے عقب میں سنسان سڑک پر روک کر ہمیں کچھ سبق سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن خود ہی گدھے کی طرح مار کھا کر بھاگ نکلا تھا۔

بلونت سنگھ انتقام تو مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے متعصب پنڈتوں اور پجاریوں کو میرے اور روپ متی کے پیچھے لگایا۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے رامو جیسے غنڈے کی خدمات حاصل کیں۔ رامو کو اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا۔ وہ اس شہر کا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ آٹھ قتل اس کے کھاتے میں تھے۔ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں قتل جیسی سنگین وارداتیں کرکے بھی وہ قانون کی زد سے بچا ہوا تھا۔ شہر میں اس کے نام کی دہشت تھی۔ اسے گھمنڈ تھا کہ کوئی اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھا سکتا اور یہ شاید پہلا موقع تھا کہ اسے دو مرتبہ ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔

رامو مجھے اغوا کرکے بلونت سنگھ کے پاس پہنچانا چاہتا تھا لیکن دونوں مرتبہ اپنی کوشش میں ناکام ہوچکا تھا۔ ٹھاکر

بھانوت سنگھ کو میری پشت پر پاکر وہ جھنجلا گیا تھا اور اس جھنجلاہٹ میں اس نے شیام سندر کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ یقیناً پاروتی کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ پاروتی کے اس بیان سے اس کے اس گھناؤنے عزائم کی تصدیق بھی ہوتی تھی اور وہ غالباً پاروتی کو مردہ سمجھ کر ہی چھوڑ گیا تھا۔ پاروتی کے جسم پر بھی خنجروں کے اتنے گھاؤ لگے تھے کہ اس کے زندہ بچ جانے کی امید کی بھی نہیں جاسکتی تھی لیکن وہ بڑی خوش قسمت ثابت ہوئی تھی۔ اتنا زیادہ خون بہہ جانے کے باوجود وہ بچ گئی تھی۔

رامو نے شاید یہ سوچا ہوگا کہ شیام سندر کے قتل کے بعد ٹھاکر سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ رامو کا نام سامنے آنے کے بعد ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شیر کی طرح بپھر گیا تھا جسے زخمی کرکے چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں اسے بڑی مشکل سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ ابھی جاکر رامو کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔

پولیس نے ٹھاکر بھانوت سنگھ کا بیان بھی قلم بند کیا تھا اور ٹھاکر نے یہ بتا دیا تھا کہ گزشتہ رات رامو اور اس کے آدمیوں نے اسے راستے میں گھیر کر حملہ کیا تھا مگر خود ہی مار کھا کر بھاگ نکلا تھا اور اپنی اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے اس نے شیام سندر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ٹھاکر نے اپنے بیان میں میرا نام تک نہیں لیا تھا اور اپنے گن مین کے زخمی ہونے کا تذکرہ بھی گول کر گیا تھا۔

ہمیں وہ رات بھی اسپتال ہی میں گزارنی پڑی۔ صبح آٹھ بجے کے قریب ڈاکٹر شیام سندر کی ڈیڈ باڈی ہمارے حوالے کردی گئی۔

ڈاکٹر شیام سندر کے کریا کرم (آخری رسومات) کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ حویلی میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ کئی سابق راجے مہاراجے تھے جو ٹھاکر کو گلے سے لگا لگا کر اسے دلاسا دے رہے تھے۔ ٹھاکر کا تعلق بھی کسی معمولی خاندان سے نہیں تھا۔ اسے سوسائٹی میں ایک اعلیٰ اور معزز مقام حاصل تھا۔ سب لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ ڈاکٹر شیام سندر مالی کا بیٹا تھا۔ وہ نیچ ذات کا تھا مگر اسے ٹھاکرانی نے پالا تھا۔ اپنے سگے بیٹے کی طرح پرورش کی تھی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ ڈاکٹر بنایا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی اسے اپنے سگے بھائی کی طرح مانتا تھا۔ لوگ ان دونوں کی ایک دوسرے سے محبت سے آگاہ تھے۔ لوگ یہ بھول گئے تھے کہ شیام سندر نیچ جاتی کا تھا۔ وہ اسے ٹھاکر کا چھوٹا بھائی سمجھ کر اس کی موت کا پرسہ دینے آرہے تھے۔

سہ پہر کے قریب ارتھی اٹھائی گئی۔ جنازے کے اس جلوس میں سیکڑوں لوگ تھے اور میں پہلی مرتبہ کسی ہندو کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ ہر طرف سے "رام نام ست ہے۔ ہری اوم' ہری اوم۔ نارائن نارائن" اور مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

شمشان گھاٹ میں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ کریا کرم کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ چتا تیار تھی۔

شیام سندر کی لاش کو چتا پر لٹا کر رسیوں سے باندھ دیا گیا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ ہندو اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں لیکن اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا اور یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ لاش کے اوپر مزید لکڑیاں ڈال کر اسے پوری طرح ڈھک دیا گیا۔ جگہ جگہ ان لکڑیوں میں عود و لوبان ڈالا گیا۔ گھی کے دو کنستر چتا پر انڈیل دیے گئے۔ اس وقت وہاں تین چار پنڈت موجود تھے جو یہ سارے کام کرتے ہوئے اشلوک پڑھ رہے تھے اور پھر ٹھاکر بھانوت سنگھ نے چتا کو آگ دکھا دی۔ بھائی ہونے کے ناتے چتا کو آگ لگانا اسی کا ادھیکار (حق) تھا۔

لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ آگ کے شعلے بلند ہوتے گئے۔ گاڑھا دھواں ہوا کے دوش پر ہماری مخالف سمت پھیلتا ہوا اوپر کو اٹھ رہا تھا۔

فضا میں عود و لوبان اور گھی کے جلنے کی خوشبو پھیلتی رہی اور پھر گوشت کے جلنے کی چراند پھیلنے لگی۔ میں بار بار نتھنے سکوڑ رہا تھا۔ ماس (گوشت) کے جلنے کی بو بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی۔ دماغ جیسے سڑ رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ بڑے اطمینان سے کھڑے جلتی ہوئی چتا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر نہیں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے دور ہٹ جاؤں مگر دل پر جبر کیے کھڑا رہا۔

شعلے ماند پڑگئے۔ اب صرف دہکتے ہوئے انگارے تھے اور انہیں ٹھنڈا ہونے کے لیے پوری رات کی ضرورت تھی۔

جب ہم واپس آئے تو شام ہو رہی تھی۔ حویلی کی فضا سوگوار تھی اور یہ سوگواری تین دن تک پوری شد و مد کے ساتھ برقرار رہی۔ لوگ پرسے کے لیے آتے رہے۔

ٹھاکر کیا ہم میں سے کوئی بھی تین دن تک حویلی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ تین دن تک ٹھاکر کا ریسٹورنٹ بند رہا۔ البتہ رہائشی ہوٹل کھلا رہا۔

تیجے کے بعد حویلی کی زندگی معمول پر آنے لگی۔ باہر سے آنے والے جو مہمان حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے' ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ میں' جانکی اور روپ متی رہ گئے۔

ٹھاکر نے اپنا کاروبار منیجروں کے حوالے کردیا تھا اور خود کو اس نے رامو سے انتقام لینے کے لیے مکمل طور پر تیار کرلیا تھا اور ظاہر ہے میں اس کے ساتھ تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا تو میں پیچھے کیسے رہ سکتا تھا۔ جانکی اور روپ متی کو ٹیلے والی حویلی میں واپس بھیج دیا گیا۔ بملا بھی ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ رامو اور بلونت سنگھ جیسے کمینے دشمنوں سے کسی بھی اقدام کی توقع کی جاسکتی تھی اس لیے حویلی میں جانکی وغیرہ کی حفاظت کا بھی معقول بندوبست کردیا گیا تھا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اور ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گئے۔ سہ پہر کے قریب ہم واپس آگئے اور شہر میں رامو کی تلاش شروع کردی اور رامو اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ ٹھاکر کے بھائی کو قتل کرنے کے بعد آزادی سے گھومتا رہتا۔ ایک طرف پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی تھی اور دوسری طرف ہم اس کا کھوج لگاتے پھر رہے تھے۔

مجھے ایسے کاموں کا بہت تجربہ تھا۔ زندگی ایسے ہی ہنگاموں میں گزری تھی۔ میں جانتا تھا کہ رامو جیسے لوگوں کو کس طرح تلاش کیا جاسکتا ہے۔ میں نے ٹھاکر کے سامنے اپنے خیال کا اظہار کیا تو وہ چونک گیا۔

"تم چاہتے ہو کہ ایک بدمعاش سے نمٹنے کے لیے دوسرے بدمعاشوں کو سر پر بٹھا لیا جائے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"ایسا نہیں ہوگا ٹھاکر۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میری زندگی ایسے ہی لوگوں سے نمٹتے ہوئے گزری ہے۔ اس بڑے بدمعاش کا پتا چھوٹے بدمعاشوں ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ انہی کے توسط سے ہم رامو تک پہنچ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" بات ٹھاکر کی سمجھ میں آگئی۔ وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولا "کاش! مجھے ایک موقع مل جائے۔ میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ آئندہ کسی بدمعاش کو کسی شریف آدمی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی۔"

"چنتا مت کرو۔ تمہیں ایسا موقع ضرور ملے گا۔" میں نے کہا۔

اور پھر اسی رات ہم نے شہر کے ان علاقوں کے چکر لگانے شروع کردیے جہاں غنڈوں اور بدمعاشوں سے سامنا ہونے کی توقع تھی۔ زور آور گیٹ' تپولیا بازار' گھاٹ دروازہ' رام گنج بازار' نیو گیٹ' اسٹیشن روڈ۔ ہم نے کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی جہاں عملی طور پر غنڈوں اور بدمعاشوں کا راج تھا لیکن ان دنوں پولیس کی سرگرمیاں بھی عروج پر تھیں۔ رامو کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے پڑ رہے تھے۔ چھوٹے موٹے غنڈوں کو بھی پکڑ کر بند کیا جارہا تھا۔ بہت سے غنڈے اپنے آپ کو بچانے کے لیے روپوش ہوگئے تھے۔

چوتھے روز کشن پول بازار میں اجمیری گیٹ کے قریب بھگت نامی ایک شخص سے ملاقات ہو ہی گئی۔

بھگت کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا مالک تھا اور شکل ہی سے غنڈا لگتا تھا۔ اس نے نیلی جینز اور گھٹنوں تک لمبا کھدر کا کرتہ پہن رکھا تھا۔

رامو کا نام سن کر وہ گڑبڑا سا گیا۔ اس نے گہری نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیا۔

"رامو دادا آج کل روپوش ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ اسے تو اس کے فرشتے بھی تلاش نہیں کرسکتے مگر تم کون ہو اور اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ایک کام لینا چاہتے ہیں اس سے۔" میں نے کہا "اگر تم اس کے بارے میں کوئی صحیح اطلاع دے سکو۔ میرا مطلب ہے رابطے کا کوئی ذریعہ بتا سکو تو تمہارا بھی کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔" میں نے بات کرتے ہوئے پتلون کی ایک جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر دوسری جیب میں منتقل کرلی۔ میرا انداز ایسا تھا جیسے یہ حرکت مجھ سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوئی ہو۔

میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ نوٹوں کی گڈی دیکھ کر بھگت کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا۔

"یہاں بات کرنا مناسب نہیں۔ میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔"

ابھی رات کے دس بجے تھے۔ وہ بارونق علاقہ تھا۔ جگہ جگہ ریستوران تھے۔ کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ شراب خانے تھے۔ پان سگریٹ کے کیبن تھے۔ اِدھر اُدھر لوگ کھڑے تھے۔ ہمیں بھگت کے ساتھ دیکھ کر کسی کو شبہ ہوسکتا تھا۔ شاید بھگت بھی کچھ ڈرا ہوا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہمیں اس کے ساتھ دیکھ لے۔

وہ ہمیں لے کر ایک تاریک گلی میں گھس گیا۔ ہم اس سے آٹھ دس قدم پیچھے چل رہے تھے۔ دو اور گلیاں گھوم کر وہ

ایک جگہ رک گیا۔ ہمارے ساتھ دھوکا بھی ہو سکتا تھا لیکن ہم پوری طرح محتاط تھے۔

وہ بہت پرانی سی عمارت تھی جس میں چھوٹی چھوٹی کھولیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کھولی کا دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہو کر بتی جلائی اور ہمارے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔

"میں اس علاقے کی پولیس کے ایک ایک منش کو جانتا ہوں۔" وہ ہم دونوں کو نیچے سے اوپر تک دیکھتے ہوئے بولا "تم دونوں پولیس والے تو نہیں ہو سکتے۔ سی بی آئی سے ہو یا سی آئی ڈی سے؟"

"ہمارا تعلق نہ تو پولیس سے ہے نہ سی آئی ڈی اور نہ سی بی آئی سے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "لیکن کیا تم یہی کہنے کے لیے ہمیں یہاں لائے تھے؟"

"سمے (وقت) بڑا نازک جا رہا ہے مہاراج۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "من کی چنتا دور کر لینا ضروری ہے۔ ویسے تم لوگ رامو کو تلاش کیوں کر رہے ہو؟"

"اس سے ایک کام لینا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا میں وہ کام نہیں کر سکتا۔ بھگت کا بھی علاقے میں بڑا ٹھکا ہے۔" اس نے کہا۔

"دو آدمیوں کو قتل کر سکتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"نہ..... نہ سرکار۔" وہ جلدی سے بولا "اپن تو چھوٹے چھوٹے کام کرنے کا ہے۔ کسی کی پٹائی کرنی ہے۔ کسی کو اٹھانا ہے۔ کوئی لونڈیا چاہیے۔ بس سرکار۔ قتل جیسے کام میں اپن ہاتھ نہیں ڈالتا۔ ویسے....." وہ چند لمحے خاموش ہوا پھر بولا "ویسے اگر رامو مل بھی گیا تو وہ بھی تمہارا کام نہیں کرے گا۔ آج کل اس کا ستارہ بھی گردش میں ہے اور وہ چوہے کی طرح کسی بل میں گھسا ہوا ہے۔"

"کیوں۔ کیا وہ اتنا ہی بزدل ہے۔" میں نے کہا "ہم نے تو سنا ہے کہ وہ بڑا جگری آدمی ہے۔ پر ہجوم بازار میں کسی کو موت کے گھاٹ اتار دے تو پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔"

"پہلے ایسا ہی تھا۔ پرنتو اب اس کا سمے بدل گیا ہے۔" بھگت نے کہا "اس نے ایک غلط آدمی پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس کے بھائی کا قتل کر دیا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شہر کا بہت بڑا اور عزت والا آدمی ہے۔ وہ اپنے بھائی کی ہتیا کا بدلہ لینے کے لیے بیاکل ہوا پھر رہا ہے۔ پر تم لوگ کس دنیا میں رہتے ہو۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ معلوم نہیں۔ پورے شہر کی پولیس رامو کو کھوجتی پھر رہی ہے۔"

"ہمیں واقعی معلوم نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "ہم لوگ بیکانیر سے آئے ہیں لیکن کیا تم ٹھاکر بھانوت سنگھ کو جانتے ہو؟"

"وہ مہاپُرش (بڑا آدمی) ہے۔" بھگت نے جواب دیا "اپن نے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ پر اس کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے۔ اپن کا ایسا نصیب کہاں کہ اس جیسے مہان دیوتا کے درشن کر سکیں۔ پر مہاراج۔" وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا "تم لوگ اپنا سمے برباد نہ کرو۔ میری مانو تو بیکانیر واپس چلے جاؤ۔ پولیس رامو کا کھوج نہیں لگا سکی' تم کیا کرو گے۔ اپنے کام کے لیے بیکانیر ہی میں کسی کو تلاش کر لو۔"

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک سی ابھر آئی تھی اور میں بھی دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ بھگت ایک بدمعاش ضرور تھا لیکن اس کے دل میں کھوٹ نہیں تھا اور پھر ٹھاکر کے بارے میں بھی اس کے خیالات بہت اچھے تھے۔ وہ ہمارے کام آ سکتا تھا۔

"بھگت۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر میں یہ کہوں کہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کو رامو کی تلاش ہے تو کیا تم ہماری کچھ مدد کرو گے؟"

"ٹھاکر کو اپن دیکھا نہیں ہوں۔ تعریفاں بہت سنی ہیں۔ پرنتو اپنا نصیب کہاں کہ اس مہاپُرش کی کوئی سیوا (خدمت) کر سکوں۔ اپن تو بہت تھرڈ کلاس آدمی ہوں۔ چرس بیچ کر اور گالم گلوچ کر کے ایک وقت پیٹ بھر کے روٹی کھاتا ہوں۔ وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ۔ کہاں وہ مہان ہستی اور کہاں بھگتا دھوبی۔ وہ کیا کہتے ہیں مہاراج۔ کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگوا تیلی۔"

"راجا بھوج تمہارے سامنے ہے۔" میں نے کہا "ٹھاکر بھانوت سنگھ اس وقت تمہارے سامنے کھڑا ہے اور یہ تمہارے نصیب ہیں کہ یہ خود چل کر تمہارے پاس آئے ہیں۔"

"کیا.....!" بھگت اچھل پڑا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ٹھاکر کو دیکھنے لگا پھر اس نے دیوار میں بنی ہوئی ہفضی المار ی کے کنکریٹ کے سلیب پر رکھے ہوئے چند کپڑے اٹھا کر جھلنگا سی چارپائی پر پھینک دیے اور سلیب پر بچھا ہوا ہندی کا اخبار اٹھا لیا۔

یہ اخبار کئی مہینے پرانا تھا اور صفحہ اول پر ٹھاکر بھانوت سنگھ کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ وہ ایک مندر کے سامنے

غریبوں میں کپڑے بانٹ رہا تھا۔ یہ تصویر اس کی ماتاجی کی برسی کے موقع پر کھینچی گئی تھی۔

بھگت کبھی تصویر کو دیکھتا کبھی سامنے کھڑے ہوئے ٹھاکر کو اور پھر اس نے بڑی تیزی سے جھک کر ٹھاکر کے چرن (قدم) چھوئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"میرے بھاگ۔" وہ بولا "کیا سیوا کروں مہاراج۔ چائے' ٹھنڈا۔" وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا جیسے کوئی دیوتا آکاش سے اتر کر اس کے سامنے آ گیا ہو۔

"رامو کی تلاش کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکو تو یہی تمہاری بہت بڑی سیوا ہو گی بلکہ ہم پر بہت بڑا احسان ہو گا۔"

"مجھے شرمندہ مت کیجیے مہاراج۔" بھگت بولا "رامو نے آپ کے بھائی کی ہتیا کر کے آپ کا بہت اپمان (بے عزتی) کیا ہے۔ پرنتو آپ نراش (دکھی) نہ ہوں۔ آپ کا یہ سیوک (خدمت گار) موجود ہے مہاراج۔ وہ بدمعاش جہاں کہیں بھی ہے اسے کھوج کر آپ کے چرنوں پر ڈال دے گا۔ آپ بیٹھیے نا۔" اس نے جلدی سے کمرے میں موجود واحد سالخوردہ سی کرسی صاف کی۔ بستر کی چادر جھاڑ کر بچھائی اور ہم سے ایک بار پھر بیٹھنے کی درخواست کی۔

ہم دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ٹھاکر تو کرسی پر بیٹھ گیا اور میں چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا اور اس سے پہلے کہ ہم دونوں میں سے کوئی کچھ کہتا' بھگت دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ وہ تھمز اپ (THUMBS-UP) کی ٹھنڈی بوتلیں لے کر آیا تھا۔ اس نے بوتلیں کھول کر اسٹرا لگائے اور بوتلیں ہماری طرف بڑھا دیں۔

"میں جات کا دھوبی ہو سرکار۔" وہ بولا "پرنتو سنا ہے آپ ان باتوں پر دھیان نہیں دیتے۔ یہ آپ کی مہانتا ہے۔"

"میں ایسی باتوں پر واقعی دھیان نہیں دیتا بھگت۔" ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔

دوسری بوتل میں نے لے لی۔ اس نے میرے بارے میں پوچھا تو مجھ سے پہلے ٹھاکر بول اٹھا۔

"یہ ہمت سنگھ ہے۔ میرا متر....."

"اوہ..... ہمت سنگھ!" بھگت کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی "آپ کے ناؤں کا بھی بڑا چرچا ہے مہاراج۔ آج تو واقعی میرے بھاگ جاگ اٹھے ہیں۔"

بھگت تو ہمارے آنے سے خوش تھا ہی' میں بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ ہم ٹھیک آدمی کے پاس پہنچے تھے۔

میں کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ کمرا دس بائی دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ دیواریں کالی ہو رہی تھیں اور پلستر جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ فرش اینٹوں کا تھا اور یہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک دیوار میں تو وہی ہفضی الماری تھی جس میں کنکریٹ کے تین سلیب لگے ہوئے تھے۔ ایک خانے میں کپڑے تھے۔ دوسرے خانے میں کنگھا' چنبیلی کے تیل کی بوتل' ایک چٹخا ہوا آئینہ اور اسی قسم کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے اوپر والے خانے میں کالی کی مورتی بھی رکھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ سامنے والی دیوار پر کھونٹیوں پر چند میلے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ دیواروں پر ممتی کا ٹکر' ہیما' سری دیوی اور دیگر فلم ایکٹریسوں کی نیم عریاں رنگین تصاویر چسپاں تھیں۔ یہ تصویریں اخباروں اور رسالوں سے کاٹ کر یہاں چپکائی گئی تھیں۔

بھگت کو غالباً کمرے کی صفائی کا کوئی دھیان نہیں تھا۔ فرش پر اِدھر اُدھر سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کمرے میں کچھ ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا اور یہ دروازہ غالباً عمارت کے کمپاؤنڈ میں کھلتا تھا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ بھگت کا دھندا کچھ ٹھیک نہیں چل رہا تھا اور غالباً اس نے یہ بات بھی ٹھیک ہی کہی تھی کہ وہ اپنے علاقے میں تھوڑی بہت بدمعاشی دکھا کر روٹی کا بندوبست کر لیا کرتا تھا۔

"ہاں تو بھگت۔" میں نے خالی بوتل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "تم رامو کی تلاش میں ہماری کیا سہائتا (مدد) کر سکتے ہو؟"

"سیدھے سیدھے رامو کو تلاش کرنا تو بڑا کٹھن ہے مہاراج ہے۔" اس نے جواب دیا "اس کے قریب کے آدمی بھی روپوش ہو چکے ہیں۔ پر میں ایک ایسے بندے کو جانتا ہوں جو ہمیں اس کا پتا بتا سکتا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" مجھ سے پہلے ٹھاکر نے سوال کر ڈالا۔

"کرن ناؤں (نام) ہے اس کا۔" بھگت نے جواب دیا "وہ رام گنج بازار میں رہتا ہے۔"

"کیا تم ابھی ہمیں اس کے پاس لے جا سکتے ہو؟" ٹھاکر نے کہا۔

"دھیرج مہاراج۔ بیاکل نہ ہوں۔" بھگت نے کہا "وہ بہت چھل کپٹ (عیار) آدمی ہے۔ تم دونوں کو میرے ساتھ دیکھ کر ترنت (فوراً) سمجھ جائے گا کہ کوئی گڑ بڑ اُوشر (ضرور)

ہے اور ہو سکتا ہے وہ آپ کو جانتا بھی ہو۔" اس نے ٹھاکر کی طرف اشارہ کیا "میں آج ہی جا کر پتا کرتا ہوں کہ وہ اپنے ٹھکانے پر ہے بھی یا نہیں۔ ہم کل رات کو اس پر چھاپا ڈالیں گے۔"

ٹھاکر کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔

"بھگت ٹھیک کہتا ہے۔" میں نے کہا "جلد بازی میں کام بگڑ سکتا ہے۔ ایک امید پیدا ہوئی ہے اگر کرن کو شبہ ہو گیا تو وہ بھی روپوش ہو جائے گا۔ بہتر ہو گا کہ پوری جانکاری ملنے کے بعد ہم اگلا قدم اٹھائیں۔"

"میری بھی یہی رائے ہے ٹھاکر جی۔" بھگت نے پہلی مرتبہ اسے ٹھاکر کہہ کر مخاطب کیا "میں آج رات کرن کے بارے میں پوری جانکاری پراپت (حاصل) کر لوں گا۔ کل اسی سمے آپ یہاں آجائیں۔"

"ہم یہاں نہیں آئیں گے۔" ٹھاکر نے کہا "تم میرے ہوٹل آجانا۔ وکرم ہوٹل۔ اسٹیشن روڈ پر ہے۔ دیکھا ہے نا؟"

"ضرور دیکھا ہے سرکار۔" بھگت بولا "پر باہر سے۔ ہم جیسے لوگ اس کے اندر جانے کی ہمت نہیں کر سکتے۔"

"کل، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔" ٹھاکر بولا "رات دس بجے آجانا۔ ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔"

ٹھاکر نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم دونوں اٹھ گئے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی گڈی میں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکال کر بھگت کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پیسے کے لالچ میں ہی ہمیں کچھ معلومات فراہم کرنے پر تیار ہوا تھا لیکن اس وقت اس نے پانچ سو روپے کا نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"نہیں مہاراج۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا "میں آپ کا سیوک ہوں ٹھاکر جی۔ یہ....."

"یہ تمہارا ادیکار (حق) ہے۔ رکھ لو۔" ٹھاکر نے نرمی سے کہا۔

وہ پھر بھی پیسے لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے نوٹ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

"ہم چلتے ہیں۔" میں نے کہا "تم چند منٹ یہیں رکو۔ ہمارے بعد کھولی سے نکلنا تاکہ کوئی تمہیں ہمارے ساتھ نہ دیکھ سکے۔"

"جو آگیا (حکم) سرکار۔" بھگت نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

ہم تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے بازار میں اس جگہ پہنچ گئے جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے لیکن بازار کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ ٹھاکر ہی نے سنبھالی تھی۔ ہم اجمیری گیٹ سے نکل کر ایم آئی روڈ پر آگئے۔ میرا خیال تھا کہ ٹھاکر اپنے ہوٹل یا بھوانی سنگھ مارگ والی حویلی کی طرف جائے گا مگر اس نے جیپ کا رخ آگرہ مارگ کی طرف موڑا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم ٹیلے والی حویلی میں پہنچ گئے۔ جانکی وغیرہ جاگ رہی تھیں۔ وہ تینوں روپ متی والے کمرے میں بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ میں کمرے میں جھانک کر واپس آگیا اور وہ بھی کمرے سے نکل کر ہال میں آگئیں۔

"کچھ کامیابی ہوئی؟" روپ متی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ایک سراغ تو ملا ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "لیکن صحیح صورت حال کل رات کو سامنے آئے گی۔"

"کیا مطلب؟" روپ متی نے مجھے گھورا۔

"مطلب یہ کہ ایک آدمی کا پتا چلا ہے جو رامو کی تلاش میں ہماری سہائتا کرنے کو تیار ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے بھگت سے ملاقات کی تفصیل بتانے لگا۔ جانکی اور بملا بھی غور سے ہماری باتیں سن رہی تھیں "کل ہم کرن کو تلاش کریں گے اور مجھے امید ہے کہ ہم کل ہی رامو کی گردن پر ہاتھ ڈال دیں گے۔"

"تم لوگ باتیں کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں تو چلا۔" ٹھاکر یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

میں سمجھا وہ دوسری حویلی جانے کی بات کر رہا ہے لیکن اسے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ٹھاکر کے جانے کے بعد وہ تینوں بھی پھیل کر بیٹھ گئیں۔ میں صوفے پر کچھ بے آرامی سی محسوس کر رہا تھا اس لیے قالین پر بیٹھ کر ٹانگیں آگے پھیلا کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔ وہ تینوں بھی قالین پر آگئیں۔

"مندری۔" روپ متی نے مندری کو آواز دی "چائے بنا کر لاؤ۔ اندر سبھا (راجا اندر کی محفل) جمی ہے۔"

جانکی میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ روپ متی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ اندر سبھا ہی تھی۔ میں راجا اندر بنا بیٹھا تھا اور دنیا کی تین حسین ترین عورتیں میرے سامنے بیٹھی تھیں لیکن میں راجا اندر ہوتے ہوئے بھی راجا اندر نہیں تھا۔

میری فطرت اس سے بہت مختلف تھی۔ میں عیاش نہیں تھا۔ زندگی میں ایسے بہت سے مواقع آئے تھے۔ کئی حسین لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں اور ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح نکل گئی تھیں۔ میں نے کسی کی طرف ان نظروں سے نہیں دیکھا تھا جو میرے دل میں ہوس کی نشان دہی کرتی ہوں۔ ایک مرتبہ.... صرف ایک مرتبہ میں بہکا تھا۔ مجھے گولڈن ٹرائی اینگل کے اس غار میں سونیا کے ساتھ گزرنے والی وہ رات اب بھی یاد تھی جب سونیا نے مجھے زیر کر لیا تھا اور میں آج تک اپنے آپ سے شرمندہ تھا۔ جانکی کئی برسوں سے میرے ساتھ تھی۔ کئی مرتبہ اس نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اپنے حسن کے چٹکارے دکھائے تھے مگر میں ہر مرتبہ اپنے آپ کو بچاتا رہا تھا اور اب تو وہ مجھے اکثر سادھو کہہ کر پکارا کرتی تھی۔

یہاں روپ متی بھی تھی۔ اس نے بھی اس پہاڑ کو سر کرنے کی کوشش کی تھی مگر سنگلاخ چٹانوں سے سر ٹکرا کر رہ گئی تھی۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی یہ وہی روپ متی تھی جو گیارہ لاکھ کی آبادی والے اس گلابی شہر میں سیکس کی دیوی کے نام سے مشہور تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اتنا گرا لیا تھا کہ ہوٹلوں کے ویٹر اور سڑک چھاپ تھرڈ ریٹ غنڈے بھی اس کے حسن و شباب سے فیض یاب ہونے کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ وہ بھول گئی تھی کہ وہ ایک راج کماری ہے۔ اس کا تعلق ایک عزت دار اور معزز گھرانے سے ہے۔

مجھے بھی وہ غلاموں کی منڈی سے اسی لیے خرید کر لائی تھی کہ مجھ سے اپنی ہوس کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کر سکے۔ اس مقصد کے لیے روایتی حربوں میں ناکام ہونے کے بعد اس نے نشہ آور مشروب (سوم رس) پلا کر مجھے زیر کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن اسے اس میں بھی ناکامی ہوئی تھی اور اپنی اس غلطی کا خمیازہ اسے اس طرح بھگتنا پڑا تھا کہ اس کے دشمنوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔

مجھے وہ رات بھی یاد تھی جب شراب کے نشے میں مدہوش روپ متی نے ایک بار پھر مجھ پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی اور اس رات اس کے رخسار پر پڑنے والا میرا تھپڑ ہی اسے ہوش میں لے آیا تھا اور یہ وہی روپ متی تھی جو پہلے میری آقا تھی اور اب میری غلام بن گئی تھی۔

میں نے اسے ذلت و رسوائی کی دلدل سے نکالا تھا اور اس کے لیے تو اس کا پرانا دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی میرا شکر گزار تھا جو کچھ عرصہ پہلے اس کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اور اس کے بعد حالات کچھ ایسا رخ اختیار کرتے گئے کہ ہم طاغوتی قوتوں کے چکر میں پھنس کر رہ گئے اور ان باطل قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم ایک اکائی بن گئے تھے۔

میری وجہ سے یہاں قتل و غارت شروع ہوئی تھی۔ روپ متی کے اور ٹھاکر کے نئے نئے دشمن پیدا ہو رہے تھے۔ ٹھاکر کا منہ بولا بھائی ڈاکٹر شیام سندر جو اسے سگے بھائی کی طرح پیارا تھا' بے دردی سے مارا گیا تھا۔

میں جب پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو بہت سی باتیں یاد آجاتی ہیں۔ وہ چہرے میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں جنہوں نے میری خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ تھائی وانگ' چاچا پرتاب سنگھ' ماسٹر پھوکٹ' گانگ' رامن پرساد' پامیلا' ماسٹر پھوپھانگ اور نجانے کون کون۔ کس کس کو یاد کروں۔ کس کس کا نام لے کر آنسو بہاؤں۔

ممکن ہے میری اس سرگزشت کے کچھ حصے بعض پڑھنے والوں کو گراں گزریں لیکن جن لوگوں نے میری طرح مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ دکھ جھیلے ہیں۔ مجھ جیسے ناگفتہ بہ حالات کا شکار رہے ہیں انہیں میرے درد اور کرب کا احساس ضرور ہو گا۔

میرا درد' میری ذات کا دکھ' میرا کرب۔ میری گردشیں اور میرے مصائب ایسے نہیں کہ کوئی عام آدمی اس کا تصور بھی کر سکے۔ ایک کے بعد ایک حادثہ' یکے بعد دیگرے امتحان اور آزمائشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔ میرے اندر شکست و ریخت کے یہ مرحلے۔ اہل دل ہی انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ میری یہ داستان پڑھ کر انہی لوگوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے ہوں گے جو کبھی خود ایسے الم ناک حادثات سے دوچار رہ چکے ہوں۔

گیارہ بارہ سال کا ایک معصوم بچہ جس کی نظروں کے سامنے اس کے ماں باپ کو بڑی بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ وہ ان قاتلوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے چھپتا پھرا' بھاگتا رہا۔ جس نے بھی اسے پناہ دی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ آج وہی بچہ جوان ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں۔ اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو بھولنا بھی چاہا تو نہیں بھولنے دیا گیا۔ زندگی کے ہر موڑ پر اسے ایک نیا زخم لگا دیا جاتا پھر وہ اپنے ماضی کو کیسے بھولتا۔ اس کے سینے میں انتقام کا لاوا کھولتا رہا جو بالآخر آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا۔ اب اس کا ایک ہی مقصد تھا..... انتقام! اپنے ماں باپ کا' اپنے ان ہمدردوں اور پیاروں کا

انتقام جنہوں نے صرف اور صرف اس کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔

میں اس وقت بقول روپ متی کے 'اندر سبھا میں بیٹھا تھا مگر یہ باتیں نجانے مجھے کیسے یاد آ گئی تھیں۔ میرے دماغ میں لاوا سا پک رہا تھا۔

"کہاں کھو گئے سادھو مہاراج!"

جانکی کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ اس نے مجھے پکارنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ میرا پیر بھی پکڑ کر زور سے ہلا دیا تھا۔ میرے خیالات منتشر ہو گئے اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔

ہمارے بیچ قالین پر چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ مندری بھی قریب ہی بیٹھ گئی تھی اور وہ چاروں مجھے اس طرح گہری نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے میرا چہرہ بدل گیا ہو اور پھر غیر اختیاری طور پر میرا ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ گیا۔

"کیا ہوا۔ تم ایک دم سے اتنا پریشان کیوں ہو گئے ہو؟" جانکی اٹھ کر میرے قریب آ گئی۔ ظاہر ہے میرا سب سے زیادہ درد وہی محسوس کر سکتی تھی۔

"اوہ! کچھ نہیں۔" میں سنبھل کر بیٹھ گیا "ایسے ہی کچھ پرانی باتیں یاد آ گئی تھیں۔" میں نے جھینپ مٹانے کے لیے کہا اور اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھا لیا۔

جانکی چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر دوبارہ اپنی جگہ پر چلی گئی۔ روپ متی وغیرہ کی موجودگی میں وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔

چند لمحے فضا کچھ اداس سی رہی یا شاید مجھے ایسا لگ رہا تھا لیکن روپ متی کے ایک چٹکلے نے یہ اداسی دور کر دی اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو میں بھی بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے مجھ پر کس قدر قنوطیت طاری تھی۔

اگلے روز میں صبح دیر تک سویا رہا اور جب بیدار ہوا تو میرے آس پاس کوئی نہیں تھا حالانکہ جانکی اور روپ متی وغیرہ بھی رات کے آخری پہر وہیں قالین پر آڑی ترچھی ہو کر سو گئی تھیں۔

میں اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں آ گیا اور دروازے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ بملا میرے بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔ اس کا لباس سمٹا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرے قدم بے اختیار اس کی طرف اٹھنے لگے۔

اس وقت شاید میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میرے حواس میرے بس میں نہیں تھے۔ میں بیڈ کے قریب کھڑا چند لمحے بملا کے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس پر جھکنے لگا۔

شاید وہ میرے بے ربط سانسوں کا لمس تھا کہ بملا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر کچھ ٹٹول رہی تھیں۔ آنکھوں میں خمار بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آ گئی اور اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور اس سے پہلے کہ میں پٹڑی سے اتر جاتا' کھنکتے ہوئے نقرئی قہقہوں کی آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔

جانکی اور روپ متی کے قہقہوں کی یہ آواز ہال کی طرف سے آئی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

میرا دماغ بری طرح سلگ رہا تھا۔ سینے میں بھی جیسے انگارے سے بھر گئے تھے۔ میں نے کپڑے جیسے اپنے جسم سے نوچ کر پھینک دیے اور شاور کھول دیا اور پھر اسی وقت کمرے سے روپ متی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ روپ متی اور جانکی کمرے میں آ گئی تھیں۔

میں دیر تک شاور سے برستی ہوئی ٹھنڈے پانی کی پھوار کے نیچے کھڑا سوچتا رہا کہ مجھ سے یہ حماقت کیوں سرزد ہونے جا رہی تھی۔ میں بملا کو دیکھ کر اتنا بے قابو کیوں ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار کیوں نہیں رہا تھا۔ بملا نے مجھے اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔

باتھ روم کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ اس کے ساتھ ہی روپ متی کی آواز سنائی دی۔

"شریمان جی۔ اب جلدی سے باہر آ جاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

میں کچھ دیر اور شاور کے نیچے کھڑا رہا پھر تولیے سے رگڑ کر اپنا بدن خشک کیا اور کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند لمحے وہیں کھڑا رہا پھر باہر آ گیا۔

وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مندری نے مجھے کچن کی کھڑکی سے دیکھا اور اس کے دو تین منٹ بعد میز پر ناشتا لگا دیا۔

بملا میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر

بڑی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا۔

اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ تینوں تو وہیں بیٹھی باتیں کرتی رہیں اور میں اٹھ کر لان میں آ گیا۔ آسمان پر بادل تھے اور موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔

میں ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کر رہا تھا۔ رامو دو مرتبہ مجھ سے پٹ چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بڑا بدمعاش سمجھتا تھا۔ اس کے نام کی دہشت تھی۔ آج تک شاید کسی نے اس کے سامنے نظریں اٹھانے کی جرأت بھی نہیں کی تھی۔ وہ لوگوں کو اپنے قدموں پر جھکا دیکھنے کا عادی تھا لیکن۔۔۔ میں شاید پہلا شخص تھا جس نے اسے اپنے قدموں پر جھکا کر زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ بری طرح جھنجلا گیا تھا۔

رامو شاید یہ سمجھتا تھا کہ مجھے ٹھاکر کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ دوبارہ ٹھاکر سے ٹکرانے کی ہمت تو نہیں کر سکا تھا تاہم جھنجلاہٹ میں اس نے معصوم اور بے گناہ ڈاکٹر شیام سندر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ تو پاروتی کو بھی مار ڈالنا چاہتا تھا مگر وہ خوش قسمتی سے بچ گئی تھی۔

رامو نے شاید یہ سوچا ہو گا کہ شیام سندر کے قتل کے بعد ٹھاکر میری پشت سے ہاتھ ہٹا لے گا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ ٹھاکر کوئی معمولی آدمی نہیں تھا کہ اس معاملے کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس کی پشت پر بھی راجستھان کے کئی سابق راجے مہاراجے اور دیگر کئی اعلیٰ شخصیات تھیں۔ انہی کے دباؤ سے انتظامیہ کی پوری مشینری حرکت میں آ گئی تھی اور شہر بھر کی پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپے مارنا شروع کر دیے تھے۔ اس کے کئی گرگوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا۔

دوسری طرف ٹھاکر بھی زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ میری طرح اس کے سینے میں بھی بدلے کا لاوا کھول رہا تھا۔

سنا یہی تھا کہ رامو پہلے سرعام قتل جیسی سنگین وارداتیں کرنے کے بعد بھی آزادی سے دندناتا پھرتا تھا لیکن شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس طرح بھاگا پھر رہا تھا اور اسے چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

میں اس صورت حال پر غور کرتا رہا اور پھر میری ذہنی رو بھٹک گئی۔ اب میں بملا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میری زندگی میں کئی حسین لڑکیاں آئی تھیں مگر میں نے کسی کے لیے دل میں کسک محسوس نہیں کی تھی۔ کسی کے لیے دل اتنا مضطرب اور بے چین نہیں ہوا تھا۔ جانکی اور روپ متی بھی لاکھوں میں ایک تھیں۔ لوگ انہیں دیکھ کر گہرے سانس بھرتے تھے۔ وہ دونوں مجھے عزیز تھیں۔ ان دونوں کے لیے میرے سینے میں تڑپ تھی مگر وہ بات نہیں تھی کہ میں انہیں دیکھ کر سڑک چھاپ عاشقوں کی طرح گہرے سانس بھرتا رہتا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ آج صبح بملا کو دیکھنے کے بعد میں باؤلا سا ہو گیا تھا اور اپنے آپ میں عجیب سا اضطراب محسوس کرنے لگا تھا۔ بملا میں ایسی کیا بات تھی جو وہ میرے حواس پر چھائی چلی جا رہی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ ان تینوں کو برآمدے والے دروازے سے برآمد ہوتے دیکھ کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ وہ تینوں میرے پاس آ کر گھاس پر بیٹھ گئیں۔ میں بھی کرسی چھوڑ کر نیچے آ گیا۔

میرا وہ دن بڑی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت میں گزرا۔ میں بملا کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا مگر وہ مختلف حیلوں بہانوں سے بار بار میرے سامنے آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں پر کھیلنے والی دل فریب مسکراہٹ سے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہو جاتی۔

روپ متی نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ ہو سکتا ہے' جانکی نے بھی نوٹ کیا ہو لیکن اس نے اپنی باتوں یا چہرے کے تاثرات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ البتہ روپ متی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ ایک موقع پر مجھے اکیلے پا کر وہ شوخ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے' یہ حسین تتلی صبح سے تمہارے گرد منڈلا رہی ہے۔"

"کک۔۔۔ کون۔۔۔" میں گڑبڑا سا گیا "کون سی تتلی۔۔۔؟"

"اب زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔" روپ متی نے میری بات کاٹ دی "میں بملا کی بات کر رہی ہوں اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ جب بھی تمہارے قریب آتی ہے' تمہارے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ روپ متی بڑی گھاگ تھی۔ اس نے سب کچھ تاڑ لیا تھا۔ میں نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ باتوں ہی باتوں میں مجھ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں بھی سنبھل گیا تھا اور پھر جانکی کے آ جانے سے موضوع بدل گیا۔

ٹھاکر صبح آٹھ بجے ہی چلا گیا تھا اور میرے لیے پیغام چھوڑ گیا تھا کہ میں رات دس بجے ہوٹل پہنچ جاؤں۔

رات نو بجے کے قریب ہم نے کھانا کھا لیا۔ شنکر مجھے

روپ متی کی بجارو پر مین روڈ تک چھوڑ گیا جہاں سے مجھے ایک آٹو رکشا مل گیا اور میں پونے دس بجے کے قریب ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔

ٹھاکر کاؤنٹر کے پیچھے منیجر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور دروازے کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر بھی اٹھ کر میرے پاس آگیا۔

ٹھیک دس بجے بھگت ریسٹورنٹ کے سامنے دکھائی دیا۔ وہ شاید اندر داخل ہوتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ٹھاکر نے ویٹر کو اشارے سے قریب بلالیا۔

"اس آدمی کو اندر لے آؤ اور اسے کھانے چائے وغیرہ کا پوچھو اور اسے یہ بھی کہہ دینا کہ ہماری طرف نہ آئے البتہ جب ہم یہاں سے اٹھ کر باہر نکلیں تو ہمارے پیچھے چلا آئے۔"

ویٹر ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔ بھگت کے قریب رک کر اس نے ایک دو منٹ اس سے بات کی اور اسے اپنے ساتھ اندر لے آیا۔ بھگت ہماری میز کے قریب سے گزرا تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا بھی تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ہم سے شناسائی کا اظہار کیے بغیر ویٹر کے ساتھ آگے نکل گیا۔

اس وقت ہوٹل میں رش تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں ہائی جینٹری کے لوگ آتے تھے۔ بھگت جیسے لوگوں کو تو دروازے کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ گاہکوں میں اس وقت مردوں کے ساتھ عورتیں بھی معقول تعداد میں موجود تھیں۔ بعض لوگوں نے تو بڑی ناگوار سی نظروں سے بھگت کی طرف دیکھا تھا۔ ویٹر اسے ایک خالی میز پر بٹھا کر کچن کی طرف چلا گیا تھا۔

بھگت نے صرف چائے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے ویٹر کو بلا کر بل دینا چاہا تو ویٹر نے مسکرا کر کچھ کہا۔ بھگت نے نوٹ جیب میں رکھ لیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ٹھاکر نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر باہر آگئے۔ ٹھاکر کی جیپ پارکنگ والے حصے میں بائیں طرف سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ جیپ پر بیٹھتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بھگت ریسٹورنٹ سے نکل رہا تھا۔ ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کردیا اور اسی وقت بھگت اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے۔ رام گنج بازار؟" ٹھاکر نے جیپ کو سڑک پر لانے کے بعد بھگت کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"نہیں سرکار۔" بھگت نے جواب دیا "جیپ کو رام گڑھ جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر لے لو۔ شہر سے نکلتے ہی پانی کی سپلائی کا جو پمپنگ اسٹیشن ہے نا۔ کرن وہیں چھپا بیٹھا ہے۔"

ٹھاکر نے جیپ کا رخ چاند پول گیٹ سے اس سڑک پر موڑ دیا جو زور آور گیٹ کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ وہی سنسان سڑک تھی جہاں اس رات رامو اور اس کے ساتھیوں نے مجھے اور سونیا کو روک کر اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ زور آور گیٹ کے قریب سے ہوتے ہوئے ہم رام گڑھ جھیل کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔

رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ اس سڑک پر بھی سناٹا تھا۔ ٹھاکر نے جیپ کے ہیڈلیمپ بجھادیے اور تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جیپ کو سڑک سے ہٹا کر روک لیا اور انجن بند کردیا۔

میں دائیں طرف دیکھنے لگا جہاں تقریباً تین سو گز کے فاصلے پر ایک بلب کی روشنی نظر آرہی تھی۔

وہ شہر کو پانی کی سپلائی کا پمپنگ اسٹیشن تھا۔ رام گڑھ جھیل کے قریب تالابوں سے آنے والا پانی اس پمپنگ اسٹیشن سے آگے پہنچایا جاتا تھا۔ پمپنگ اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ اٹینڈنٹ کا کوارٹر تھا جہاں صرف ایک آدمی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔ بھگت نے بتایا کہ لکشمن نامی ایک شخص گزشتہ دو سال سے یہاں تعینات ہے۔ اس کی بیوی اور دو بچے بھی یہاں اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور کرن بھی یہیں چھپا ہوا ہے۔

پمپنگ اسٹیشن تک جانے کے لیے کوئی پختہ سڑک نہیں تھی۔ ایک پتھریلا کشادہ راستہ تھا جس پر کبھی کبھار واٹر ورکس کے افسروں کی گاڑیوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ہم اس راستے سے ہٹ کر چل رہے تھے۔

پمپنگ اسٹیشن تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ قریب پہنچ کر ٹھاکر نے پستول نکال لیا۔ میری پنڈلی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا تھا مگر میں نے اسے نکالنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

وہ کوارٹر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس کے سامنے جھاڑیوں کی باڑ لگا کر آنگن سا بنالیا گیا تھا۔ ایک کمرے میں اندھیرا تھا البتہ دوسرے کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی۔

بھگت خشک جھاڑیوں کی باڑ میں الجھ کر گرا۔ کانٹے چبھنے سے اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کی بتی بجھ گئی اور ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"کون ہے۔ ادھر کون ہے؟"

"میں بھگتا دھوبی ہوں کرن۔ تم سے ملنے آیا ہوں۔ ضروری کام ہے۔" بھگت نے چیخ کر کہا۔

جواب میں فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں بھگت کے قریب ہی کھڑا تھا۔ گولی زناٹے کی آواز کے ساتھ میرے اور بھگت کے سروں کے درمیان سے گزر گئی۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

ٹھاکر نے بھی گولی چلا دی۔ وہ کرن ہی تھا جس نے ہم پر فائر کیا تھا۔ وہ ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اور ٹھاکر نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

کرن ٹیلوں میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ایک دو فائر بھی کیے تھے۔ میں اور ٹھاکر مختلف سمتوں سے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر کرن رات کی تاریکی میں ٹیلوں میں غائب ہو گیا تو ہماری ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔

لیکن میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دور ہی سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے مڑ کر فائر کیا لیکن ٹیلے کی ڈھلان پر اس کا پیر رپٹ گیا تھا۔ گولی میرے سر کے بہت اوپر سے گزر گئی تھی اور میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گرا اور اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

کرن کا پستول والا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ ہم دونوں ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے ٹیلے کے دامن میں پہنچ گئے۔ میں نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے پستول چھڑایا اور اس کی دھنائی شروع کر دی۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گیا۔

ہم کرن کو مارتے اور گھسیٹتے ہوئے پمپنگ اسٹیشن والے کوارٹر میں لے آئے۔ بھگت نے پمپنگ اسٹیشن کے اٹینڈنٹ لکشمن اور اس کے بیوی بچوں کو حراست میں لے رکھا تھا۔ وہ سب بہت خوف زدہ تھے اور پھر لکشمن نے یہ انکشاف کیا کہ کرن اس کا دور کا رشتے دار ہے مگر اس کی بدمعاشی کی وجہ سے عرصہ پہلے وہ اس سے ملنا جلنا چھوڑ چکا تھا۔

لکشمن کے کہنے کے مطابق کرن تین دن پہلے وہاں آیا تھا اور اس نے لکشمن کو دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے بارے میں کسی کو بتایا گیا تو وہ اس کے بیوی بچوں کو قتل کر دے گا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ چند روز یہاں رہے گا اور حالات پرسکون ہوتے ہی چلا جائے گا۔

لکشمن بے قصور تھا۔ اس نے محض خوف کی وجہ سے کرن کو پناہ دے رکھی تھی۔ میں نے لکشمن اور اس کے بیوی بچوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور کرن کی طرف متوجہ ہو گیا جو ٹھاکر کی چند ٹھوکریں کھانے کے بعد فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔

"ہم تم سے رامو کا پتا جاننا چاہتے ہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم بتا دو کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہے تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا اور اگر انکار کرو گے تو تمہیں بہت کشٹ اٹھانا پڑے گا۔"

"تم مجھ سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکو گے۔" کرن نے جواب دیا۔

میں چند لمحے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بھگت کو اشارہ کیا۔ بھگت پہلے ہی پر تول رہا تھا۔ اس نے کرن پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ کرن کی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں مگر اس نے زبان نہیں کھولی۔ بھگت نے اسے پکڑ کر سر سے اوپر اٹھا لیا اور پوری قوت سے سامنے والی دیوار کی طرف اچھال دیا۔

کرن کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ وہ "بھد" سے نیچے گرا اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر تڑپنے لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ نکلا تھا۔

"بتا تیرا گرو کہاں ہے۔ نہیں تو ہڈیاں توڑ دوں گا۔" بھگت اسے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

"نن۔۔۔ نہیں بتاؤں گا۔" کرن نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

بھگت نے اسے دو تین ٹھوکریں اور لگا دیں۔

"ہٹ جاؤ بھگت۔" میں نے پتلون کے پائنچے سے خنجر نکال لیا "یہ ایسے کچھ نہیں بتائے گا۔"

میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر کرن کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے کرتے کے گریبان پر رکھ کر جھٹکا دیا۔ کرتہ نیچے تک پھٹ گیا اور اس کا سینہ برہنہ ہو گیا۔

میں نے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ کر ہلکا سا چرکا دیا۔ کرن چیخ اٹھا۔ کھال میں تقریباً تین انچ لمبا کٹ لگ گیا تھا جس سے خون رسنے لگا تھا۔

"کیا وچار (خیال) ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں تمہارے سینے پر سرخ رنگ کی اتنی لکیریں کھینچ دوں گا کہ شہر کا نقشہ بن جائے گا۔"

"وہ۔۔۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" کرن نے اس مرتبہ فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے "وہ انسان نہیں راکشش ہے۔ خوں خوار درندہ۔ اگر اسے پتا چل گیا کہ میں نے تمہیں اس کا پتا بتایا تھا تو وہ مجھے کتے کی موت مار دے گا۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ میں تمہاری رکھشا (حفاظت) کروں گا۔ بتاؤ۔۔۔ وہ درندہ کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" کرن کہتے کہتے رک گیا جیسے اسے ڈر ہو کہ زبان کھولتے ہی رامو اس کے سینے میں خنجر گھونپ دے گا "وہ۔۔۔ وہ کالی کے پرانے مندر میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور ہیں لیکن۔۔۔ میں تم لوگوں کو شکشا (مشورہ) دوں گا کہ وہاں جانے کی غلطی مت کرنا۔ وہ واقعی خونی بھیڑیا ہے۔ مار ڈالے گا تم لوگوں کو۔"

"کالی کا پرانا مندر کہاں ہے؟" میں نے اس کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"سوائے مادھو پور کی طرف جانے والی سڑک پر۔ شہر سے تقریباً پانچ کوس آگے ایک بستی کے کھنڈر ہیں۔ وہ مندر انہی کھنڈروں میں ہے۔" کرن نے بتایا۔

"کیا اس کا گروہ گھنٹال بھی اسی مندر میں ہے۔ میرا مطلب ہے کنور بلونت سنگھ جس کے لیے وہ آج کل کام کر رہا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ بلونت سنگھ وہاں نہیں ہے۔" کرن نے جواب دیا "یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے تمہیں اٹھانے کے لیے رامو کو پیسہ دیا تھا۔"

"اوہ! تو تم مجھے جانتے ہو!" میں نے پوچھا۔

"اس رات اس لونڈیا کے ساتھ تمہیں اٹھانے کی کوشش کی گئی تھی تو رامو کے ساتھ میں بھی تھا۔" کرن نے جواب دیا "میں نے تمہارے ہاتھ دیکھ لیے تھے اور رامو سے کہا تھا کہ بلونت سنگھ کا بیعانہ واپس کر دے لیکن وہ تو کچھ اور پھیل گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ دوسری مرتبہ بھی اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ اس مرتبہ تم ٹھاکر کی وجہ سے بچ گئے ہو۔" اس نے ٹھاکر کی طرف دیکھا "اس نے طیش میں آ کر ٹھاکر کے بھائی کی ہتیا کر دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ٹھاکر تمہاری پشت پناہی سے باز آجائے گا مگر یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ بلونت سنگھ بھی غائب ہو چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے کرن۔" میں نے کہا "ہو تو تم بھی بھیڑیوں کے گروہ میں سے ایک۔ تمہارے ہاتھوں بھی کوئی نہ کوئی بے گناہ مارا گیا ہو گا۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ یہ خنجر تمہارے سینے کے آر پار کر دوں لیکن میں تمہیں دیے ہوئے اپنے وچن (وعدہ) کا پالن (ایفا) کروں گا۔ اس وقت میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ آج رات تم یہیں رہو گے۔ صبح سویرے لکشمن تمہیں لات مار کر یہاں سے نکال دے گا اگر اس کے بعد تم نظر آئے تو زندہ نہیں بچ سکو گے۔"

میں ٹھاکر کو اشارہ کر کے کمرے سے باہر آ گیا۔ بھگت وہیں رہ گیا تھا۔ میں نے لکشمن کو بلا کر پچاس کا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"اس کو باندھ کر رکھنا اور صبح ہوتے ہی یہاں سے بھگا دینا۔" میں نے کہا "یہ اب تم لوگوں کو نہ کوئی دھمکیاں دے گا اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اس نے ایسا کیا تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

لکشمن نے اسی وقت بھگت کی مدد سے کرن کو باندھ کر اس کمرے میں ڈال دیا۔ ہم وہاں سے رخصت ہو کر سڑک کی طرف آ گئے جہاں جیپ کھڑی تھی۔

"اب کیا وچار ہیں ٹھاکر جی؟" بھگت نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم اسی وقت کالی کے پرانے مندر جا رہے ہیں۔" ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "تم اگر چاہو تو ہم تمہیں شہر میں کسی جگہ چھوڑ دیں گے۔"

"کیسی باتاں کرتے ہو ٹھاکر جی۔" بھگت جلدی سے بولا "میں تو اب آپ کا سیوک ہوں۔ اپنا جیون بھینٹ کر دوں گا پر پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"سوچ لو بھگت!" ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے جیپ آگے بڑھا دی۔

"سوچا تو وہاں جاتا ہے ٹھاکر جی جہاں نقصان کا ڈر ہو۔" بھگت نے جواب دیا "آپ جیسے مہاتما کی سیوا کر کے تو زندگی سپھل (کامیاب و کامران) ہو جاوے گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔" ٹھاکر جیپ کو گھما کر سڑک پر لے آیا "آج سے تم ہمارے ہو گئے۔ پچھلی زندگی سے تمہارا ناتا ختم ہو گیا۔ بھول جاؤ سب کچھ۔"

"بھول گیا ٹھاکر جی۔" بھگت خوش ہو کر بولا۔

میں نے کل بھی بھگت کی باتیں سنی تھیں اور آج بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ شہر بھر کے غنڈے رامو کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن بھگت اس کے خلاف جس طرح کھل کر ہمارا ساتھ دے رہا تھا وہ قابل تعریف تھا اور اس پر ہر لحاظ سے بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

جیپ شہر کی بیرونی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی گووند مارگ، انڈسٹریل روڈ اور سوائے مان سنگھ اسٹیڈیم کے قریب سے ہوتی ہوئی اس سڑک پر آگئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ

سوائے مادھو پور کی طرف چلی گئی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ رات کے وقت شہر سے باہر جانے والی سڑکوں پر کسی قسم کا ٹریفک نہیں ہوتا تھا۔ ریگستان میں سفر کے دوران میں قدم قدم پر ڈاکوؤں کا خطرہ رہتا تھا۔ اس وقت یہ سڑک بھی سنسان تھی۔

چاند ان دنوں رات کے آخری پہر ہی نکلتا تھا۔ اگر اس وقت آسمان پر چاند ہوتا بھی تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ آسمان کو گہرے بادلوں نے ڈھک رکھا تھا۔ چاروں طرف گھنگھور اندھیرا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی سے یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی تاریک سرنگ میں سفر کر رہے ہوں۔

تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹھاکر نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا دیں اور رفتار بھی کم کردی۔ اب ہمارے چاروں اور اندھیرا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف ریگستان تھا۔ کہیں کہیں ٹیلے بھی نظر آرہے تھے۔ ٹھاکر نے رفتار مزید کم کردی۔

تقریباً ڈیڑھ کلو میل کا فاصلہ اور گزر گیا۔ ہم گہری نظروں سے دائیں طرف دیکھ رہے تھے اور بالآخر سڑک سے ہٹ کر اندھیرے میں کسی تباہ شدہ بستی کے کھنڈر دکھائی دیئے۔ ٹھاکر نے جیپ اسی بستی کی طرف جانے والے کچے راستے پر موڑ دی۔

"تین چار سو گھروں پر مشتمل یہ چھوٹی سی بستی کبھی آباد ہوا کرتی تھی۔" ٹھاکر بتا رہا تھا "اس کی پرلی (دوسری) طرف میٹھے پانی کی ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے اطراف میں دو تین میل تک کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ ناریل کے باغات ہوا کرتے تھے۔ بڑا سبزہ تھا لیکن پھر ریگستان نے سبزے کو نگلنا شروع کردیا۔ سرسبز کھیتیاں غائب ہوتی گئیں اور ریت اس علاقے میں زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیتی گئی اور جب میٹھے پانی کی اس جھیل کو بھی ریگستان نے نگلنا شروع کردیا تو یہ بستی بھی ویران ہونے لگی۔

"صرف چالیس سال پہلے یہاں زندگی تھی' زندگی کے ہنگامے تھے۔ میٹھے پانی کی جھیل صحرا کی ریت میں دفن ہو گئی اور زندگی یہاں سے روٹھ گئی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس بستی کے لوگوں نے کالی ماتا کو ناراض کردیا تھا جس نے ان پر یہ تباہی نازل کردی۔ مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہر اچھی بری بات کو دیوی دیوتاؤں سے منسوب کردیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ جو کچھ ہوا اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ اس بستی ہی کی مثال لے لو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ریگستانوں میں طوفان آتے رہتے ہیں۔ ہوا پلک جھپکنے کی دیر میں ٹنوں ریت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کردیتی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی بات ہوئی تھی۔ پھیلتی ہوئی ریت کو روکنے کا کوئی وچار نہیں کیا گیا اور جب جھیل ریت میں دفن ہو گئی تو اسے کالی دیوی کے عذاب سے منسوب کردیا گیا۔ ہو سکتا ہے اگلے ورشوں (سالوں) میں یہاں سے ریت اڑ جانے سے وہ جھیل پھر نمودار ہو جائے۔ اس وقت بھی لوگ یہی کہیں گے کہ کالی ماتا نے انہیں معاف کردیا۔

"یہ جے پور شہر جب آباد ہوا تو اس وقت بھی یہی مسئلہ تھا۔ ریگستان کی اڑتی ہوئی ریت شہر کی سڑکوں پر جمع ہو جاتی۔ راستے بند ہو جاتے۔ مکانوں کی دیواروں کے ساتھ راتوں رات ریت کے ٹیلے معرض وجود میں آجاتے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے شہر کے گرد ایک بلند دیوار تعمیر کردی گئی۔ ریت کا پھیلاؤ رک گیا اور شہر محفوظ ہو گیا۔ اگر یہ شہر بھی ریت کے سمندر میں غرق ہو جاتا تو اسے بھی کالی ماتا کا عذاب گردانا جاتا۔"

ٹھاکر خاموش ہو گیا۔ اس کی باتوں سے میں پہلے بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ دھرم کے معاملے میں بھی وہ اعتدال پسند ہے۔ نہ اتنا کٹر تھا کہ دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے کہی جانے والی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کرلے اور نہ اتنا آزاد کہ دھرم کو ماننے ہی سے انکار کردے۔ میں نے اسے حویلی کے ایک کمرے میں بنے ہوئے چھوٹے سے مندر میں پوجا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ اس کے خیال میں دھرم کو سب سے زیادہ نقصان پنڈتوں اور پجاریوں نے پہنچایا تھا اور یہ بڑی حد تک درست بھی تھا۔ یہ سب کچھ تو میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور بھگت بھی رہا تھا۔

ٹھاکر نے جیپ بستی کے شروع میں ایک گلی میں موڑ کر روک لی اور انجن بند کردیا۔ ہم تینوں نیچے اتر آئے۔

یہ بستی تیس چالیس سال پہلے ہی ویران ہوئی تھی اس لیے پوری طرح ملبے کے ڈھیر میں تبدیل نہیں ہو سکی تھی۔ بہت سے مکانوں کی دیواریں اب بھی کھڑی تھیں البتہ لکڑی کے دروازے' کھڑکیاں وغیرہ عرصہ پہلے غائب ہو چکی تھیں۔ چھتوں کے شہتیر بھی نکال لیے گئے تھے اس لیے کسی مکان کی چھت موجود نہیں تھی۔

کالی کا پرانا مندر بستی کی دوسری طرف تھا۔ اس کے اردگرد بھی مکان تھے۔ مندر کی عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی تاہم اس کا ٹوٹا ہوا کلس رات کی تاریکی میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔

ٹھاکر ایک جگہ رک گیا۔ اس نے جیب سے پستول نکال

لیا تھا۔ بھگت کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی جھک کر پتلون کے پائنچے کے اندر سے خنجر نکال لیا۔

"تم اس طرف کھڑے رہو بھگت۔" ٹھاکر نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اور ہمت سنگھ' تم اس طرف سے جاؤ۔ میں ادھر سے آگے بڑھتا ہوں۔"

ٹھاکر بائیں طرف چلا گیا اور میں دائیں طرف کھنڈروں کے بیچ ایک تنگ سی گلی میں چلنے لگا۔ پچیس تیس گز آگے جا کر میں ایک اور گلی میں مڑ گیا۔ اس گلی کے اختتام پر کچھ کھلی جگہ تھی اور اس سے آگے بہت بڑا چبوترہ تھا جس پر مندر کی عمارت تھی۔

مندر کے مرکزی ہال کے علاوہ شاید کمرے بھی تھے۔ ایک کھڑکی سے زرد رنگ کی مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں چند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ خالی جگہ عبور کر کے میں تقریباً چھ فٹ اونچے چبوترے پر چڑھ گیا اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کھڑکی زمین کی سطح سے دس بارہ فٹ اونچی تھی اور اس میں سلاخیں بھی لگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ خنجر پتلون کی بیلٹ میں اڑسا اور شکستہ دیوار پر اوپر چڑھنے لگا۔

دیوار کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں اور مجھے اوپر چڑھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا رہا اور بالآخر میں اس کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے دو سلاخوں کو پکڑ لیا اور دونوں پیر' دیوار میں اکھڑی ہوئی اینٹوں کی جگہ بن جانے والے گڑھوں میں جما دیئے۔

یہ کھڑکی نہیں' دراصل دو فٹ چوڑا اور چار فٹ دائیں بائیں لمبا روشن دان تھا۔ اب اس کمرے سے کچھ آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ ان میں ایک نسوانی آواز بھی تھی۔ دبی دبی ہنسی کی آواز۔

میں نے سلاخوں پر مضبوطی سے گرفت جما کر اپنے آپ کو پوری طرح اوپر اٹھا دیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔

کمرا خاصا بڑا تھا۔ اندرونی دیواروں کی حالت قدرے بہتر تھی۔ ایک دیوار میں مشعل لگی ہوئی تھی جس میں کسی جانور کی چربی یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز جل رہی تھی۔ ناگوار سی ہلکی بو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔

وہ منظر جس نے میرے بدن میں برقی لہریں سی دوڑا دی تھیں واقعی بڑا سنسنی خیز تھا۔ فرش پر بچھی چٹائی پر تین آدمی اس طرح نیم دراز تھے جیسے کسی مہاراجا کے سنگھاسن پر.... براجمان ہوں اور ایک حسین لڑکی ایلومینیم کے گلاس میں انہیں اپنے ہاتھوں سے شراب پلا رہی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کے دو نہایت مختصر سے چیتھڑے تھے۔ وہ اس وقت جس آدمی کی آغوش میں گری شراب کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا رہی تھی وہ رامو تھا۔ وہ شراب کے گھونٹ بھرتے ہوئے لڑکی کے بدن کو ٹٹول رہا تھا اور لڑکی کے منہ سے دبی دبی ہنسی کی آواز خارج ہو رہی

"حرامی!" میں نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔ اس پر قتل کے کئی الزام تھے اور اس وقت وہ ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے الزام میں پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس پورے شہر میں اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اس حرامی سے شیام سندر کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا اور یہ نطفۂ ناتحقیق یہاں کالی کے مندر میں عیش کر رہا تھا۔

"ارے چھمیا۔ ادھر کو تو آ۔ اپن کی پیاس بھی بجھا دے۔ یا تجھے اپنی میا کا کھسم یہ رامو جیادہ پسند آگیا ہے۔" رامو کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے شخص نے لڑکی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

چھمیا اس کی طرف مڑ گئی۔ اس نے گلاس ابھی اس کے ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ ایک اور آدمی تقریباً دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ روشن دان کی سلاخیں میرے ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئیں۔

وہ لکشمن تھا۔ جے پور شہر کی پرلی طرف واٹر پمپنگ اسٹیشن کا اٹینڈنٹ جس پر بھروسا کر کے ہم نے کرن کو اس کے حوالے کردیا تھا۔

"رامو داوا۔ غضب ہو گیا۔" لکشمن آگے بڑھ کر رامو کے چرن چھوتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا بے حرامی۔" رامو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے قریب پڑی ہوئی شراب کی بوتل اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے پھر بولا "شہر کو آگ لگ گئی ہے یا بھونچال آگیا ہے؟"

"اس سے بھی زیاہ خطرناک بات ہے رامو داوا۔" لکشمن بولا۔

"ابے کچھ بکے گا یا خطرے کی گھنٹیاں بجاتا رہے گا۔" رامو دہاڑا۔

"رامو داوا۔" لکشمن بولا "ٹھاکر بھانوت سنگھ اور اس

کے دوست ہمت سنگھ نے میرے کوارٹر پر حملہ کر کے کرن کو پکڑ لیا تھا۔ اسے بہت مارا ہے ان لوگوں نے۔ وہ بری طرح گھائل ہے اور میرے کوارٹر میں پڑا ہے۔" لکشمن ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر رامو کو مداخلت کا موقع دیے بغیر بولا "کرن بہت گھائل ہے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ اس نے مجھے بھیج دیا ہے کہ تمہیں خبردار کر دوں تاکہ تم اپنا بندوبست کر لو۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ آج رات ہی یہاں حملہ کر دیں یا پولیس کو تمہارے اس ٹھکانے کی خبر کر دیں اور ہاں۔ ان کے ساتھ بھگت بھی تھا۔ اجمیری گیٹ والا۔"

"حرامی۔ پنچ۔ دھوبی کی اولاد۔" رامو دہاڑا "اس کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دوں گا۔ رامو کے مقابلے پر آنے کی ہمت کر کے اس نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔ پر تو یہاں کا پتا انہیں کس نے بتایا؟"

"کرن نے۔" لکشمن نے جواب دیا "اگر وہ زبان نہ کھولتا تو ہمت سنگھ خنجر سے اس کی کھال اتار دیتا۔ وہ مار ڈالتا اسے۔"

"حرامی مُسلا۔" رامو نے دانت کچکچائے "آج اگر وہ یہاں آ گیا تو کل صبح اس کی لاش پر گدھ دعوت اڑائیں گے۔ پر یہ بتا تو یہاں تک کیسے آیا ہے؟"

"موٹر سائیکل پر رامو دادا۔" لکشمن نے جواب دیا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ موٹر سائیکل پر یہاں تک آ گیا تھا اور میں نے موٹر سائیکل کی آواز نہیں سنی تھی۔ میں شاید کمرے کے اندر کا منظر دیکھنے میں کچھ زیادہ ہی محو ہو گیا تھا یا شاید وہ موٹر سائیکل کو بستی کے باہر چھوڑ آیا تھا۔

"میں جا رہا ہوں رامو دادا۔ تم لوگ اپنا بندوبست کر لو۔ وہ لوگ اکیلے یا پولیس کو لے کر کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے ہیں۔" لکشمن نے کہا۔

"ابے حرامی۔ رامو کو ڈراتا ہے۔" رامو نے کہا "اچھا ایسا کر تو اس چھمیا کو ساتھ لے جا۔ چل چھمیا کپڑے پہن لے اور اس کے ساتھ چلی جا ورنہ بے موت ماری جائے گی۔"

"نہیں رامو! اب یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔"

دروازے کی طرف سے ٹھاکر کی آواز سن کر میں ایک بار پھر چونک گیا۔ رامو اور اس کے ساتھی بھی اچھل پڑے۔ چھمیا کے منہ سے تو ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ فرش پر پڑے ہوئے کپڑے اٹھا کر ایک کونے میں دبک گئی اور تھر تھر کانپنے لگی۔

لکشمن کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ ٹھاکر کو دیکھ کر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ غداری مت کرنا۔" ٹھاکر اس کی طرف دیکھ کر غرایا "اگر مجھے وہاں شبہ بھی ہو جاتا کہ تم انہی کے ساتھی ہو تو میں تمہیں وہیں ختم کر دیتا اور کرن کو بھی زندہ نہ چھوڑتا لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

"موت تو تمہیں یہاں گھیر کر لائی ہے ٹھاکر۔" رامو نے غراتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں کہا تھا، رامو سے پنگا مت لینا لیکن تم نے اپنے بھائی کی موت سے بھی کوئی سبق نہیں لیا۔ آج تیرا حساب بھی چکتا کر ہی دوں گا۔"

"آج پتا چل جائے گا کہ تم کتنے بڑے بدمعاش ہو۔" ٹھاکر نے بھی غرا کر جواب دیا "کالی کے اس مندر کو تمہاری چتا بنا دوں گا۔"

ان دونوں میں مکالمات کا تبادلہ ہوتا رہا۔ وہ بڑے تیز و تند الفاظ میں ایک دوسرے پر حملے کر رہے تھے۔ لکشمن سہما ہوا کھڑا تھا اور رامو کے دوسرے ساتھی بھی بڑے چاق چوبند کھڑے شاید ٹھاکر پر حملہ کرنے کے لیے کسی موقع کی تلاش میں تھے لیکن ٹھاکر کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے انہیں اپنی جگہوں پر کھڑے رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ وہ لڑکی چھمیا جیسے تیسے کر کے کپڑے پہن چکی تھی اور کونے میں دیوار کے ساتھ چپکی کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

رامو کے جسم کے بالائی حصے پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اس کا سینہ ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے گہرے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی جس میں بیلٹ کے ساتھ خنجر کی میان تو لگی ہوئی تھی لیکن خنجر ایک طرف چٹائی پر شراب کی بوتلوں کے پاس پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر اس طرح اچانک پستول بدست کمرے میں وارد ہوا تھا کہ رامو کو خنجر اٹھانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

شراب کی ایک بوتل رامو کے پیروں کے قریب پڑی تھی اور وہ اپنا سیدھا پیر بہت آہستہ آہستہ بوتل کی طرف بڑھا رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی لیکن قبل اس کے کہ میں اس کا مقصد سمجھ سکتا، اس نے بوتل کو پیر سے اچھال دیا۔

بوتل چمگادڑ کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی ٹھاکر کے ماتھے پر لگی۔ ٹھاکر کے لیے بھی یہ حملہ بالکل غیر متوقع اور اچانک تھا۔ وہ کراہ کر ایک طرف جھکا۔ اس کا پستول والا ہاتھ بھی اوپر اٹھ گیا تھا۔

اور پھر یوں لگا جیسے جہنم کی ساری بلائیں بیک وقت حرکت میں آ گئی ہوں۔ رامو، اس کے دونوں ساتھی اور لکشمن بیک وقت چیختے ہوئے اپنی اپنی جگہ سے اچھلے تھے۔

رامو اپنے خنجر کی طرف لپکا تھا۔ لکشمن ٹھاکر کے قریب تھا۔ اس نے ٹھاکر کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن اسی وقت کمرے کی فضا فائر کے دھماکے اور لکشمن کی خوفناک چیخ سے گونج اٹھی۔ کمرے کی دوسری طرف کھڑکی سے چلائی جانے والی گولی اس کی پشت میں لگی اور وہ ڈکراتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ کھڑکی تو میں نے پہلے بھی دیکھی تھی مگر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اس کھڑکی میں بھی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور اس کی دوسری طرف بھگت دھوبی کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا پستول والا ہاتھ سلاخوں کے اندر تھا۔

رامو کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک ٹھاکر سے ٹکرا چکا تھا۔ ٹھاکر سر پر لگنے والی بوتل کی ضرب سے ابھی پوری طرح نہیں سنبھل سکا تھا۔ وہ بدمعاش پوری قوت سے ٹھاکر سے ٹکرایا تھا اور ٹھاکر لڑکھڑاتا ہوا دیوار کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ گیا تھا۔

اس بدمعاش نے ارنا بھینسے کی طرح دہاڑتے ہوئے ٹھاکر کے سینے پر زور سے ٹکر ماری۔ ٹھاکر بھی بلبلا اٹھا۔

رامو اپنا خنجر اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ کھڑکی کی طرف سے ایک اور فائر ہوا۔ گولی رامو کے ہاتھ پر لگی۔ اس کی چھوٹی انگلی اڑ گئی۔ وہ اچھل کے پیچھے ہٹ گیا اور زور زور سے ہاتھ جھٹکنے لگا۔ خون کے چھینٹے چاروں طرف اڑ رہے تھے۔

"تم اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرو گے رامو۔" بھگت چیخا "اب اگر تم نے حرکت کی تو دوسری گولی تمہاری کھوپڑی میں لگے گی۔"

رامو بھیڑیے کی طرح غرا کر رہ گیا۔ رامو کا دوسرا ساتھی بھی ٹھاکر سے بھڑ گیا تھا۔ وہ ٹھاکر کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر ٹھاکر بھرپور انداز میں مزاحمت کر رہا تھا۔

"اے!" کھڑکی میں کھڑا ہوا بھگت چیخا "ٹھاکر سے دور ہٹ جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کمرے کی فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ بھگت نے ہوائی فائر کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ فائر کی آواز سن کر وہ دونوں ٹھاکر سے الگ ہٹ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس طرح ٹھاکر سے الجھے ہوئے تھے کہ بھگت براہ راست کسی پر گولی نہیں چلا سکتا تھا کیونکہ اس طرح ٹھاکر کے بھی زد پر آ جانے کا اندیشہ تھا۔

بھگت نے ایک بار پھر چیختے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ اس مرتبہ فائر نہیں ہوا۔ "ٹک" کی آواز ابھر کر رہ گئی۔ یا تو اس کا پستول خالی ہو گیا تھا یا کسی اور وجہ سے گولی نہیں چلی تھی۔

رامو ایک بار پھر اپنے خنجر کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

میرے لیے اب تماشائی بنے رہنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بے جگری سے ان دونوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

"ڈٹے رہو ٹھاکر۔ میں آ رہا ہوں۔" میں نے چیخ کر کہا۔

رامو خنجر اٹھانے کے لیے جھکا ہوا تھا۔ میری آواز سن کر اس نے اوپر دیکھا۔ میں اس وقت روشن دان کے سامنے سے ہٹ گیا تھا۔

میں روشن دان کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے نیچے لٹک گیا۔ ٹٹول کر ایک پیر ذرا نیچے والی دیوار کے کھڈے میں جمایا۔ سلاخوں کو چھوڑ کر دیوار کی ٹوٹی ہوئی اینٹوں پر گرفت رکھی اور آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔

دیوار پر چڑھنا تو آسان ثابت ہوا لیکن نیچے اترنا خاصا مشکل تھا۔ میں نے تقریباً آٹھ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگا دی اور اٹھ کر مندر کے دروازے کی طرف دوڑا۔

کمرے میں گھمسان کا رن مچا ہوا تھا۔ وہ دونوں غنڈے تو اب بھی ٹھاکر سے گتھم گتھا تھے اور بھگت دھوبی رامو سے بھڑا ہوا تھا۔ بھگت نے اس کا خنجر والا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے رامو کے منہ سے غلیظ گالیوں کا گٹر ابل رہا تھا۔

میں نے ان دو غنڈوں میں سے ایک کو جو ٹھاکر سے گتھم گتھا ہو رہے تھے، بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا اور اس کے چہرے پر تابڑ توڑ کئی گھونسے رسید کر دیے۔ وہ بلبلاتا ہوا کمرے کے کونے میں چھمیا کے قریب جا گرا۔ چھمیا کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

رامو نے بھگت کی ٹانگ میں اڑنگا لگا کر اسے گرا دیا اور خنجر لہراتا ہوا ٹھاکر کی طرف لپکا۔ میں اس کے راستے میں تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اس طرح گرا کہ اس کا خنجر اپنے ہی ساتھی کی پشت میں پیوست ہو گیا جو ٹھاکر کو رگید رہا تھا۔

کمرا اس شخص کی بھیانک چیخ سے گونج اٹھا۔ رامو بھی وحشت زدہ سا ہو گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ پیچھے کھینچا

تو خنجر باہر آتے ہی اس شخص کی پشت سے خون کی دھار بہہ نکلی۔

راموپلٹ کر وحشیانہ انداز میں میری طرف لپکا۔ اس نے خنجر سے بھرپور وار کیا تھا لیکن میں نے کلائی پر اس کا وار روکا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وہ چیخ کر دہرا ہوا تو میں نے اس کے بازو پر چوپ رسید کردیا جو میری گرفت میں تھا۔ اس مرتبہ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے زوردار ٹھوکر مار کر چھوڑ دیا۔ وہ چیختا ہوا پیچھے الٹ گیا۔

ٹھاکر اب سنبھل چکا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔ ہونٹوں سے بھی خون رس رہا تھا لیکن وہ اس کی پروا کیے بغیر راموپر پل پڑا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

دوسری طرف بھگت دھوبی نے اس بدمعاش کو دبوچ رکھا تھا جسے میں نے جھمیا کے قریب گرایا تھا۔ بھگت اطمینان بخش طریقے سے اس کی ٹھکائی کررہا تھا۔

میں دوبارہ راموکی طرف متوجہ ہوگیا۔ راموا ب میرے اور ٹھاکر کے درمیان فٹ بال بن گیا تھا۔ کبھی میں اسے ٹھوکر مارتا اور کبھی ٹھاکر اسے گھونسا رسید کردیتا۔

رامو ایک لات کھا کر دروازے میں گرا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اٹھ کر باہر کی طرف دوڑ لگادی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ مندر کے ہال میں پہنچ کر رامو نے اچانک ہی پلٹ کر لات چلا دی۔ اس کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی اور میں کراہتا ہوا گر گیا۔ رامو وہاں رکا نہیں۔ وہ دوڑتا ہوا مندر سے باہر نکل گیا۔ ٹھاکر نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔

راموکی آخری ٹھوکر میری پنڈلی کی ہڈی پر لگی تھی۔ مجھے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور جب میں اٹھ کر لنگڑاتا ہوا مندر سے باہر آیا تو سامنے بستی کی گلیوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور پھر قدموں کی آوازیں معدوم ہوگئیں۔ ایک دم سناٹا چھا گیا جیسے یہاں زندگی کا وجود ختم ہوگیا ہو۔

اور پھر اچانک میں اچھل پڑا۔ وہ کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رامو نے اپنی گاڑی بستی کے کھنڈروں میں کہیں چھپا رکھی تھی اور اب وہ فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں نے مندر والے چبوترے سے چھلانگ لگادی اور گلیوں میں اس طرف دوڑنے لگا جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی۔

راموکی گاڑی کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ میرے جسم کی تمام قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی اور میں گلیوں میں چکراتا ہوا برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا اور صرف دو منٹ میں ٹھاکر کی جیپ تک پہنچ گیا۔

راموکی گاڑی کی آواز قریب آتی جارہی تھی۔ میں اچھل کر ٹھاکر کی جیپ میں بیٹھ گیا اور یہ بھی مقام شکر تھا کہ چابی اگنیشن میں موجود تھی۔

میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو ریورس میں کشادہ گلی میں لے آیا۔ بستی سے باہر نکلنے کا یہی راستہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ راموکی گاڑی اس طرف سے آئے گی اور بالفرض وہ کسی اور گلی سے بھی نکل گیا تو میں اس کا تعاقب کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

میرا پہلا خیال درست نکلا۔ راموکی گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ کھنڈروں میں ہیڈلائٹس کی روشنی چمکی تو میں نے اپنی جیپ کو گلی کے وسط میں اس طرح کھڑا کردیا کہ راستہ بند ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحے راموکی گاڑی بڑی تیزی سے اس طرف مڑی۔

وہ بھی جیپ تھی۔ رامو راستہ نہ پاکر شاید بدحواس ہوگیا تھا۔ اس نے تصادم سے بچنے کے لیے اپنی جیپ کو دائیں طرف گھمادیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پہلو سے نکل جائے گا مگر بدحواسی میں اسٹیئرنگ کچھ زیادہ ہی گھوم گیا تھا۔ جیپ کے پیچھے لٹکے ہوئے ٹھاکر کو دیکھ کر بھی میں چونک گیا تھا۔ جیپ دائیں طرف ایک کھنڈر کی دیوار سے ٹکرا گئی۔ ٹھاکر اچھل کر دور جاگرا۔ رامو نے جیپ سے چھلانگ لگادی۔ اسی لمحے میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا رامو کے اوپر گرا۔

رامو میرے نیچے دبا ہوا تھا اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا اور وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ میری گرفت سے نکل کر وہ ایک طرف بھاگا تو ٹھاکر نے اسے چھاپ لیا۔

ٹھاکر کا زوردار گھونسا کھا کر رامو اپنی جیپ سے ٹکرا گیا۔ میں نے اپنا خنجر نکال لیا۔ میرے خیال میں اس کے استعمال کا وقت آگیا تھا۔ ٹھاکر نے خنجر میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور رامو کے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔

"مجھے معاف کردو ٹھاکر۔ چھما کردو مجھے۔" رامو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف امڈ آیا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ رحم کی بھیک مانگنے لگا تھا۔ اس

بھائی کو اس نے خنجر سے چھلنی کردیا تھا
شخص سے جس نے میرے بھائی کو بھی ادھ موا کرکے پھینک دیا تھا۔

"دیکھو۔ نکل گئی ساری بدمعاشی؟" ٹھاکر غرایا "تم نے اب تک کتنے بے گناہوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ انہوں نے بھی تم سے اسی طرح زندگی کی بھیک مانگی ہوگی۔ وہ بھی تمہارے سامنے اسی طرح ہاتھ جوڑ کر گھگیائے ہوں گے۔ تم نے انہیں معاف کردیا تھا؟ اور میرے بھائی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیا جرم کیا تھا اس نے؟ تمہاری دشمنی مجھ سے تھی۔ مرد بن کر مجھے للکارتے مگر تمہاری بدمعاشی تو بے گناہوں پر ہی چلتی رہی ہے اور اب موت کو سامنے دیکھ کر گھگیانے لگے۔"

"مجھے چھما (معاف) کردو ٹھاکر۔" رامو کی آواز رودینے والی تھی "تم جو کہو گے میں کروں گا۔ مجھے بلونت سنگھ نے اکسایا تھا۔ تم کہو تو میں اس کی لاش تمہارے چرنوں میں ڈال دوں گا۔ مجھے ایک اوسر (موقع) دو ٹھاکر۔"

"بلونت سنگھ کہاں ہے؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"سارسکا میں۔ وہ اپنے گرو کے ساتھ دو دن پہلے وہاں چلا گیا تھا۔" رامو نے جواب دیا۔

"کون گرو؟" ٹھاکر بولا۔

"وہ بدیشی مُسلا جو بھیس بدل کر پنڈتوں میں گھسا بیٹھا ہے۔" رامو نے کہا۔ اس کی بات سن کر میں بھی چونک گیا۔

"ان دونوں سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے پہلے تم۔۔۔"

ٹھاکر نے یہ کہتے ہوئے اس پر خنجر سے وار کردیا۔

رامو نے وار روکنے اور بچنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا اور اس کی خوفناک چیخ ویرانے میں گونج گئی۔

ٹھاکر نے بڑی پھرتی سے خنجر کھینچ لیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرا وار کردیا۔ خنجر اس مرتبہ بھی رامو کے سینے ہی میں پیوست ہوا اور اس کے منہ سے نکلنے والی دوسری چیخ پہلے سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔

اور پھر ٹھاکر پر جیسے جنون طاری ہوگیا۔ وہ چیخ چیخ کر رامو کے سینے اور پیٹ پر خنجر کے پے در پے وار کرتا رہا۔ رامو کی پشت جیپ سے ٹکی ہوئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر اب بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہا تھا مگر اب اس میں قوت مدافعت نہیں رہی تھی۔ اس کے سینے اور پیٹ پر ٹھاکر نے اتنے وار کیے تھے کہ پیٹ سے آنتیں بھی باہر لٹک گئی تھیں۔

مجھے بنکاک میں اندرا ریجنٹ ہوٹل کے سامنے کا وہ منظر یاد آگیا جب چی فانگ نے ماسٹر پھوپھانگ کو میری نظروں کے سامنے اسی طرح خنجر کے پے در پے وار کرکے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ماسٹر پھوپھانگ کو دو آدمیوں نے گرفت میں لے رکھا تھا تاکہ وہ مزاحمت نہ کرسکے اور یہاں ون ٹو ون مقابلہ تھا۔ رامو اپنا دفاع کرنے کے لیے آزاد تھا لیکن وہ اپنا دفاع نہیں کرسکا۔

رامو زخموں سے چور ہوکر زمین پر گر گیا۔ ٹھاکر کے جنون میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی اس کے جسم کے مختلف حصوں پر خنجر کے وار کررہا تھا۔ رامو میں اب کچھ نہیں بچا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ٹھاکر کو پکڑلیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بار بار رامو پر خنجر کے وار کررہا تھا۔ بدلے کی آگ نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بھائی کا قاتل اس کے ہاتھوں ختم ہوچکا تھا مگر وہ آگ شاید ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اسے بانہوں سے جکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"بس کرو ٹھاکر۔ وہ ختم ہوچکا ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اپنے حواس پر قابو پاؤ۔" میں اسے کھینچتا ہوا رامو کی لاش سے دور لے گیا۔

کافی دیر بعد ٹھاکر اپنے حواس پر قابو پاسکا تھا۔ میں نے اسے ایک شکستہ چبوترے پر بٹھادیا اور خود اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

اس وقت مندر کی طرف کھنڈروں کی کسی گلی سے نسوانی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں ٹھاکر کو وہیں چھوڑ کر اس طرف دوڑ پڑا مگر چند قدم بعد ہی مجھے رک جانا پڑا۔

بھگت دھوبی جھمیا کو بالوں سے پکڑے گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا اور جھمیا تکلیف سے چیخ رہی تھی۔

قریب پہنچ کر بھگت نے جھمیا کو زوردار دھکا دے کر گرادیا۔ جھمیا منہ کے بل گری۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ جس جگہ ہم موجود تھے وہاں دونوں جیپوں کی ہیڈلائٹس کی روشنی پہنچ رہی تھی اور جھمیا کے چہرے پر خوف کے گہرے سائے صاف نظر آرہے تھے۔

"وہ کہاں گیا؟" میں نے بھگت سے رامو کے اس ساتھی کے بارے میں پوچھا جس سے اسے بھڑا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔"

"نرک (جہنم) میں پہنچا دیا اس سالے حرامی کو بھی۔" بھگت نے جواب دیا۔

بھگت واقعی کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ ٹھاکر نے اسے اپنا سیوک بنالیا تھا اور پہلے ہی موقع پر اس نے اپنی وفاداری

ثابت کردی تھی۔ اس نے ہمارا مان رکھ لیا تھا۔
میں ٹھاکر کو اٹھا کر اپنی جیپ کے پاس لے آیا۔ اس کے کپڑے بھی خون میں لت پت ہو رہے تھے۔ خون کے کچھ چھینٹے میرے لباس پر بھی پڑے تھے۔
بھگت نے چھمیا کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ رامو کی لاش دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ بھگت نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔
"اس حرامی کے ساتھ عیش کر رہی تھی نا۔ اس کا انجام بھی دیکھ لے۔" بھگت نے غرا کر کہا پھر ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس کا کیا کروں سرکار؟"
"اسے یہیں چھوڑ دو۔ صبح تک بھیڑیے اس کا بھی تیا پانچا کر دیں گے۔" ٹھاکر کے بجائے میں نے جواب دیا۔
"نہیں نہیں۔ مجھے یہاں مت چھوڑنا۔" چھمیا روتے ہوئے میرے قدموں پر گر گئی "میں نردوش (بے قصور) ہوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"
"اسے جیپ میں بٹھالو بھگت۔" ٹھاکر نے کہا "شہر میں کسی جگہ اتار دیں گے اسے۔"
"لیکن سرکار۔" بھگت بولا "اسے زندہ چھوڑنا بہت بڑے خطرے کی بات ہوگی۔ یہ پولیس کو بتا دے گی کہ یہاں کیا ہوا ہے۔"
"اگر یہ کسی کے سامنے زبان کھولے گی تو اس کا بھی رامو جیسا حشر ہوگا۔ بٹھالو اسے جیپ میں۔" ٹھاکر نے کہا۔
رامو نے چھمیا کو اٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر پٹخ دیا۔ ٹھاکر اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے دوسری سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔
میں جیپ کو کھنڈروں سے نکال کر سڑک پر لے آیا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔ ٹھاکر اب پوری طرح اپنے حواس میں آ چکا تھا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے انتقام کی آگ ابھی پوری طرح سرد نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ بلونت سنگھ کو مزہ چکھانے کا پروگرام بنا رہا تھا جو دو دن پہلے اپنے گرو کے ساتھ سارسکا کی طرف فرار ہو چکا تھا۔
رامو نے جن الفاظ میں بلونت سنگھ کے گرو کا تذکرہ کیا تھا اس سے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ بلونت کا وہ گرو کون ہو سکتا ہے۔ بدیشی مُسلا... وہ دارا کے علاوہ کون ہو سکتا تھا!
وہ دارا ہی تھا جس نے یہ آگ بھڑکائی تھی۔ پہلے اس نے پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا پھر اتفاق سے اسے بلونت سنگھ مل گیا جو روپ متی سے خار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ دونوں مل گئے تو ہمارے خلاف سازشوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دارا مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ بلونت سنگھ روپ متی سے اپنی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ان دونوں نے مل کر پنڈتوں کو بھڑکایا تو انہوں نے ہندو مسلم فساد مچانے کی کوشش کی۔ یہ تو اتفاق تھا کہ کچھ لوگ ہمارے ہاتھ لگ گئے تھے جنہوں نے پریس کے سامنے یہ اعتراف کر لیا کہ مندر میں روپ متی کو کسی مسلمان کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے نہیں پکڑا گیا تھا بلکہ یہ ساری حرکتیں پنڈت لوگ ہی کر رہے تھے۔ دھرم کو کسی مسلمان نے نہیں انہی دھرماتماؤں نے نشٹ کیا تھا اور پھر یہ بھی محض اتفاق تھا کہ پنڈت رام سروپ فیروز شاہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ پنڈت رام سروپ ہندوؤں کو بھڑکا رہا تھا کہ ایک مسلمان ہندو ناری کو بغل میں لے کر کیوں گھوم رہا ہے۔ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکاتے ہوئے وہ بھول گیا تھا کہ اس کی اپنی بیٹی پوجا ایک مسلمان کے ساتھ رہ رہی تھی اور شاید اس خوف سے وہ اس ٹولے سے الگ ہو گیا تھا کہ اگر اس کی بیٹی کے بارے میں پتا چل گیا تو یہی پنڈت اور پجاری اس کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔
ہماری جوابی کارروائیوں کے باعث ان پنڈتوں کی بڑی سازشیں بری طرح ناکام ہو گئی تھیں۔ ان پنڈتوں کے سیاہ کرتوت بھی لوگوں کے سامنے آ گئے تھے جس وجہ سے ہنگاموں نے شروع ہی میں دم توڑ دیا تھا تاہم جو پنڈت اور پجاری دارا اور بلونت سنگھ کے آلہ کار بنے ہوئے تھے وہ بھی ہمیں زک پہنچانے کے لیے اندر ہی اندر سازشوں میں مصروف تھے۔ ان میں سے پنڈت رام اوتار ہمارے قبضے میں تھا۔ اس سے ابھی ہم نے کام لینا تھا۔
بلونت سنگھ نے ہی رامو جیسے خطرناک بدمعاش اور کرائے کے قاتل کو ہمارے پیچھے لگا دیا تھا اور آج ہم نے اسے بھی ٹھکانے لگا دیا تھا۔
شروع میں ایک مرتبہ جب بات ہوئی تھی تو ٹھاکر نے کہا تھا کہ ان سارے ہنگاموں کے پیچھے بلونت سنگھ کا ہاتھ ہے اور میں نے کہا تھا کہ بلونت سنگھ کو بھی کسی اور کی آشیرباد حاصل ہے اور ٹھاکر کے ہاتھوں مرنے سے پہلے رامو کے بیان نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ بلونت سنگھ اپنے گرو کے ساتھ سارسکا کی طرف فرار ہو گیا تھا اور وہ گرو تھا بدیشی مُسلا۔
شہر میں داخل ہونے کے بعد ہوا محل والی سڑک پر ریلوے برج کے قریب ٹھاکر کے کہنے پر میں نے جیپ روک لی۔

"بھگت۔" ٹھاکر نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا "اس چھوکری کو یہاں اتار دو۔"
"نہیں نہیں۔ مجھے یہاں مت اتارو۔" چھمیا جلدی سے بولی "یہاں سناٹا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے ریلوے اسٹیشن کے پاس اتار دینا۔"
"ہم اسٹیشن کی طرف نہیں جا رہے۔" ٹھاکر نے کہا "یہاں اگر کسی غنڈے نے تمہیں پکڑ بھی لیا تو تمہارے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو تم کالی کے پرانے مندر میں ان حرامیوں کے ساتھ کر رہی تھیں۔ اترو نیچے۔ جلدی کرو۔"
بھگت نے چھمیا کو اٹھا کر جیپ سے نیچے پھینک دیا اور میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔
ریلوے برج پار کر کے ہم بھوانی سنگھ مارگ کی طرف نکل آئے اور پھر یوتھ ہوسٹل کے سامنے سے ہوتے ہوئے ٹھاکر کی حویلی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔
ٹھاکر فوراً ہی اپنے کمرے کے باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے بھگت کو حویلی کے ملازم جیوے کے سپرد کر دیا۔
"اسے اپنے کپڑوں کا ایک جوڑا دے دو اور باتھ روم دکھا دو۔" میں نے کہا۔ بھگت کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔
بھگت بڑی حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی زندگی تنگ و تاریک گلیوں کی کھولیوں میں گزری تھی اور اس قسم کی عمارت میں داخل ہونے کا شاید پہلا موقع تھا اور وہ بھی ٹھاکر بھانوت سنگھ کی حویلی۔
جیوا بھگت کو باتھ روم میں چھوڑ کر آیا تو اس نے بتایا کہ تقریباً دو گھنٹے پہلے ٹیلے والی حویلی سے راج کماری روپ متی کا فون آیا تھا۔
اس وقت اگرچہ تین بج رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ تینوں جاگ رہی ہوں گی۔ میں کونے والے صوفے پر بیٹھ گیا اور قریب رکھے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔
کال دوسری ہی گھنٹی پر ریسیو کر لی گئی۔ آواز روپ متی کی تھی۔
"کہاں غائب تھے تم لوگ؟" روپ متی نے میری آواز سنتے ہی کہا "تین بج رہے ہیں۔ تم لوگوں نے کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔"
"ہم لوگ بھیڑیوں کا شکار کھیلنے کے لیے ریگستان کی طرف نکل گئے تھے۔ وہاں کوئی ٹیلی فون نہیں تھا جس سے تمہیں اطلاع دی جاتی۔" میں نے کہا۔
"کیا مطلب؟" روپ متی کے لہجے میں حیرت تھی۔
"مطلب تمہیں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔ اس وقت تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہم خیریت سے ہیں۔ کل صبح ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا۔
روپ متی لمبی گفتگو کے موڈ میں تھی لیکن میں نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا اور دوسرے کمرے میں جا کر ٹھاکر کے کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور باتھ روم میں گھس گیا۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد جب میں ہال میں آیا تو ٹھاکر اور بھگت وہاں موجود تھے۔ ٹھاکر صوفے پر بیٹھا تھا اور بھگت قالین پر آلتی پالتی مارے ہوئے تھا۔ اس وقت میں نے جیوا کو بھی ٹرے اٹھائے کچن کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم اس وقت چائے پینا پسند کریں گے اور ہمارے کہنے سے پہلے ہی وہ چائے بنا کر لے آیا تھا۔
چائے پیتے ہوئے میں ٹھاکر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب وہ تناؤ بھی نہیں تھا۔ چائے پینے کے دوران میں ہم میں زیادہ گفتگو بھی نہیں ہوئی۔
پونے چار بجے کے قریب ہم اٹھ گئے۔ ٹھاکر اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں دوسرے کمرے میں آ گیا۔ بھگت ہال ہی میں قالین پر لیٹ گیا تھا۔
میری آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔ میں سونا چاہتا تھا مگر آنکھیں بند نہیں ہو رہی تھیں۔ میں ٹھاکر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دکھ اور کرب کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی عزیز ترین ہستیوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ میں نے یہ کرب جھیلا تھا۔ اس دکھ کا بوجھ اب تک اٹھائے ہوئے ہوں۔ میرے سینے میں اب تک لاوا کھول رہا ہے۔
ٹھاکر نے اپنے منہ بولے بھائی کی لاش ادھڑی ہوئی دیکھی تھی اور وہ حواس کھو بیٹھا تھا۔ اتنے دنوں سے وہ ایک لمحے کو بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ پاگلوں کی طرح بھائی کے ہتیارے (قاتل) کو تلاش کرتا رہا تھا اور بالآخر آج اس نے بدلہ لے لیا تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکتے ہوئے انتقام کے شعلے ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ اسے سکون مل گیا تھا لیکن... میں... میرے سینے میں اب تک لاوا کھول رہا تھا۔
وہ بھیانک منظر میری نظروں میں گھوم گیا جب ہم رات کو اپنے گھر کے سامنے ٹیکسی سے اترے تھے اور دارا اور

اس کے گرگوں نے میرے ممی اور ڈیڈی پر حملہ کردیا تھا۔ ان وحشیوں نے بھی ممی اور ڈیڈی کو اسی طرح ادھیڑا تھا۔

مجھے اس رات کی ایک ایک بات یاد تھی۔ میں کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ ممی اور ڈیڈی کی خوفناک چیخیں اب بھی مجھے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

یوں تو میں ایک لمحے کو بھی ممی ڈیڈی کو نہیں بھولا تھا لیکن آج بڑی شدت سے ان کی یاد آرہی تھی۔ میرے سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا اور زبان اکڑ کر تالو سے چپکی جا رہی تھی۔ مجھے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ کچن کے دروازے کے ساتھ فریج رکھا ہوا تھا۔ میں نے فریج کھولا اور پانی کی بوتل نکال کر ہونٹوں سے لگالی۔ میرا حلق تو تر ہوگیا لیکن نہ پیاس بجھی اور نہ ہی سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی ہوئی۔

میں اپنے کمرے کی طرف واپس جا رہا تھا کہ بھگت کی آواز سن کر ٹھٹک گیا۔ ہال میں اس وقت مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ بھگت ابھی تک جاگ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے سرکار۔ نیند نہیں آرہی۔"

میں نے رک کر بھگت کی طرف دیکھا اور پھر اس کے قریب ہی قالین پر بیٹھ گیا۔

"تم بھی تو ابھی تک جاگ رہے ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آج کے واقعے نے شاید تمہیں بیاکل کر رکھا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے سرکار۔" بھگت نے جواب دیا "یہ سب کچھ تو میں بچپن ہی سے دیکھتا آرہا ہوں۔ اپن کا تو جیون ہی ایسی دشاؤں (حالات) میں گزرا ہے۔ جیون میں پہلی بار آج کسی بندے کو اوپر پہنچایا ہے۔ ہاں اس کی بھی چنتا ہے پر نیند نہ آنے کا کارن (سبب) کچھ اور ہے۔"

"اور وہ کارن کیا ہے؟" میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہمت سنگھ جی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اپنا جیون فٹ پاتھوں اور کھولیوں میں بیتا ہے۔ ہمیں تو ہمیشہ گندی نالیوں کے کیڑے ہی سمجھا گیا۔ اپن ننگے فرش اور کھری بان کی چارپائیوں پر سونے کے عادی ہیں۔ یہ اجنبی جگہ۔ یہ محل۔ بس یہی کارن ہے نیند نہ آنے کا۔"

"عادی ہو جاؤ گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک بات بتانا ہمت سنگھ جی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ جو کالی کے پرانے مندر میں چار کھون (قتل) ہوئے ہیں۔ ان میں دو تو اپن کے کھاتے میں ہیں۔ ایک ٹھاکر اور دوجا جو بعد میں میرے ہاتھوں اپنی گردن تڑوا بیٹھا اور وہ لونڈیا بھی بچ گیا۔ اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اسے ٹھاکر جی نے چھوڑ دیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "ان کھونوں کا پتا تو چل ہی جائے گا۔ کیا پولیس ٹھاکر جی کی حویلی پر نہیں آئے گی؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ تھا لیکن کھل کر اپنے خوف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"قانون سے بالا دست تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا "پر تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ تم ٹھاکر بھانوت سنگھ کے شرن (پناہ) میں ہو۔ ظاہر ہے پولیس ٹھاکر جیسے معزز شخص کی بات کو اہمیت دے گی۔ اس طوائف کی بات کا یقین کون کرے گا۔ تم کوئی چنتا مت کرو۔ آرام سے رہو۔"

"اب میری چنتا مٹ گئی ہمت سنگھ جی۔" بھگت نے کہا اور اس کے چہرے پر واقعی طمانیت سی آگئی تھی۔ میں سمجھ گیا' اس کے ذہن میں جو انجانا خوف تھا وہ میری باتوں سے جاتا رہا تھا۔

مجھے نیند اب بھی نہیں آرہی تھی۔ میں بھگت سے باتیں کرتا رہا۔ اسے بھی شاید اس وقت کسی ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی جس سے وہ باتیں کرسکے۔

بھگت ذات کا دھوبی تھا اور کنکرولی کا رہنے والا تھا۔ یہ چھوٹا سا خوب صورت شہر جے پور سے تقریباً تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

بھگت کی ماں شیلا دھوبن بے حد حسین تھی۔ اسے دیکھ کر بوڑھوں کے دل بھی کانپتے تھے۔ اس نے اپنے لیے خود ہی بہت سی مصیبتیں پیدا کر رکھی تھیں۔ ہر وقت بنی سنوری رہتی۔ جب وہ گھر سے باہر نکلتی تو لونڈے لپاڑے اس کے پیچھے لگ جاتے اور بڑی عمر کے لوگ اسے دور ہی سے دیکھ کر ٹھنڈی سانسیں بھرتے۔

کنکرولی کا رانا شمشیر سنگھ بھی اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ علاقے کا بہت بڑا جاگیردار تھا۔ اس کی دو حویلیاں تھیں۔ ایک حویلی میں اس کے بیوی بچے اور خاندان کے دوسرے افراد رہتے تھے جبکہ شہر سے باہر دوسری حویلی اس کا عشرت کدہ تھی۔ وہاں مجرے ہوتے' راگ رنگ کی محفلیں جمتیں۔ شہر کی کون سی طوائف ایسی تھی جو رانا شمشیر سنگھ کی حویلی میں نہیں جا چکی تھی۔

رانا شمشیر سنگھ شیلا دھوبن کو بھی کچھ عرصے کے لیے اپنی حویلی کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ شیلا کو اپنی حویلی تک لے جانا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا لیکن صرف ایک بات اس راستے کی رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ ذات کا ٹھاکر تھا۔ برہمنوں کے بعد دوسری سب سے اونچی ذات۔ شیلا نچلی ذات کی دھوبن تھی۔ ذات کا یہ فرق ہی رانا کے قدم روکے ہوئے تھا لیکن اس نے شیلا کے حسن و شباب سے سیراب ہونے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

دھوبیوں کی بستی شہر سے باہر تھی۔ ایک رات منگل سنگھ ڈاکو کے گروہ نے بستی پر حملہ کردیا۔ منگل سنگھ کے نام کی دور دور تک دہشت تھی۔ بڑے بڑے زمیں دار اور جاگیردار اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بھتا دیتے تھے۔ ضرورت کے وقت اسے پناہ بھی دیتے تھے اور اپنے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اس سے کام بھی لیتے تھے۔ منگل سنگھ چھوٹی چھوٹی بستیوں کو بھی لوٹتا رہتا اور اس رات اس نے دھوبیوں کی بستی کا انتخاب کیا تھا۔

وہ جاتے ہوئے بستی کی دو لڑکیوں کو بھی اٹھا کر لے گیا تھا۔ ان میں ایک مالا تھی اور دوسری شیلا دھوبن۔

چھ مہینے بعد اڑتی اڑتی سی خبر سنی گئی کہ شیلا دھوبن رانا شمشیر سنگھ کی حویلی میں ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ جس رات دھوبی بستی پر منگل سنگھ نے حملہ کیا تھا' شیلا کو اسی رات رانا کی حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔

شیلا دھوبن کے ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ مزید ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے انہوں نے نہ صرف وہ بستی بلکہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ کوئی نہیں جان سکا کہ وہ کہاں گئے تھے۔

چھ مہینے بعد رانا شمشیر سنگھ کے آدمی شیلا دھوبن کو چتوڑ گڑھ لے گئے۔ اس وقت شیلا تین مہینے کے حمل سے تھی مگر اس کی پروا کیے بغیر رانا کے آدمی اسے پامال کرتے رہے۔ وہ چتوڑ گڑھ سے سوائے مادھو پور اور وہاں سے جے پور آگئے اور شیلا دھوبن کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں تھما کر واپس چلے گئے۔

شیلا دھوبن پورے دنوں سے تھی جب ایک بدمعاش شیلا کو اس شخص سے چھین کر لے گیا۔ وہ پس ماندہ علاقے میں واقع ایک کھولی میں رہتا تھا۔ اسی کھولی میں شیلا نے ایک بچے کو جنم دیا جسے دوسرے ہی روز اناتھ آشرم (بے سہارا افراد کی پناہ گاہ) پہنچا دیا گیا۔

بچے کی پیدائش کے چند ہی روز بعد شیلا دھوبن پھر پہلے جیسی ہوگئی بلکہ اس کا حسن کچھ اور بھی نکھر آیا۔ اسے صرف بچے کا غم تھا لیکن جلد ہی وہ اسے بھی بھول گئی بلکہ اسے بھولنے پر مجبور کردیا گیا۔

شیلا دھوبن کا بیٹا بھگت اناتھ آشرم میں پلتا رہا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ اناتھ آشرم سے بھاگ نکلا اور جیب تراشوں کے ایک گروہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ اسے پہلے جیب کترا بنایا گیا پھر وہ چھوٹے موٹے دوسرے جرائم میں بھی ہاتھ ڈالنے لگا۔

پکڑا جاتا تو سزا ہو جاتی۔ جیل سے نکلتا تو جرائم کے کچھ اور گر سیکھ چکا تھا۔

اس کی زندگی اسی طرح گزرتی رہی۔ اس کی راتیں کبھی فٹ پاتھ پر اور کبھی کچی بستیوں کی تنگ و تاریک کھولیوں میں گزرتیں۔

بھگت نے چوری چکاری اور غنڈا گردی کے سوا کچھ نہیں سیکھا تھا۔ بڑا ہو کر بھی وہ داداگیری ہی کرتا رہا۔ اس نے کبھی کوئی بڑا جرم نہیں کیا تھا۔ سنگین جرائم سے وہ ہمیشہ بچتا رہا اسی لیے وہ کبھی بڑا بدمعاش نہیں بن سکا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے ہاتھ سے دو بندے مارے گئے تھے لیکن پشت پر ٹھاکر بھانوت جیسے آدمی کا ہاتھ ہونے کی وجہ سے وہ مطمئن تھا کہ وہ پکڑا نہیں جائے گا۔ وہ اس بات پر بھی خوش تھا کہ ٹھاکر جیسے آدمی نے اسے اپنے شرن (پناہ) میں لے لیا تھا اور آئندہ زندگی اس کی سیوا میں گزار دے گا اور جرائم سے اسے نجات مل جائے گی۔

بھگت کے ارادے اچھے تھے۔ نیت صاف تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس کا اور ٹھاکر کا لمبا ساتھ رہے گا۔

بھگت باتیں کرتے کرتے اب اونگھنے لگا تھا۔ میں نے بھی صوفے کا کشن اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کرلیں اور پھر مجھے پتا نہیں' میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

جے پور سے ایک سو پانچ کلو میٹر کے فاصلے پر سارسکا کسی زمانے میں ایک آزاد ریاست ہوا کرتی تھی لیکن ریاست کی حیثیت سے اس کا وجود بتدریج ختم ہوتا چلا گیا اور اب یہ ریاست محض ایک ضلع بن کر رہ گئی تھی۔

سارسکا زیادہ بڑا شہر نہیں تھا لیکن چند تفریح گاہوں کی وجہ سے اسے دور دور تک خاصی شہرت حاصل تھی۔ شہر کے نواح میں ایک بہت بڑی اور خوب صورت میٹھے پانی کی جھیل تھی جسے چاروں طرف سے سبزے' کھجور اور ناریل کے

درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں رہائش کے لیے ہٹس بھی تھے اور چند ریسٹورنٹس بھی۔ جھیل کا ایک حصہ جو ایک تنگ سی کھاڑی کی طرح خشکی میں دور تک چلا گیا تھا، مچھلی کا شکار کھیلنے والوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرف کشتیاں وغیرہ نہیں جاتی تھیں۔

اس جھیل کے علاوہ چند قدیم تاریخی عمارتیں بھی تھیں جو سیاحوں کے لیے اپنے اندر خاصی کشش رکھتی تھیں۔ ان میں دو عمارتیں سب سے زیادہ اہم تھیں۔ ایک جین مندر اور دوسرا سارسکا پیلس۔ کسی مہاراجا کا یہ محل عرصے تک ویران رہا تھا اور اب یہاں ایک شان دار ہوٹل بنا دیا گیا تھا۔

جھیل اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ سارسکا کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ وہ شکارگاہ تھی جو شہر کے نواح سے شروع ہو کر میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا گنجان اور خوفناک جنگل تھا جو ایک طرف کوٹ پتلی اور دوسری طرف الور تک پھیلا ہوا تھا۔

میلوں دور تک پھیلے ہوئے اس جنگل میں بے ضرر جانوروں کے علاوہ نیل گائے، ہرن، بارہ سنگھا، سانبھر، ریچھ، چیتے اور شیر جیسے خوفناک درندے بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔

شکار کے شوقین دور دور سے شکار کھیلنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ کوئی شکار کرنے میں کامیاب ہو جاتا اور کوئی خود ان خوں خوار درندوں کا شکار ہو جاتا۔

سارسکا، جے پور دہلی نیشنل ہائی وے پر واقع ہے۔ جے پور سے اس کا فاصلہ ایک سو پانچ اور دہلی سے دو سو کلومیٹر ہے جبکہ الور نامی قصبہ صرف پینتیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

سارسکا سے ایک سڑک کوٹ پتلی تک بھی چلی گئی ہے۔ تقریباً پچاس کلومیٹر تک یہ سڑک اس خوفناک جنگل میں سے گزرتی ہے۔ ندی نالوں کے علاوہ اس جنگل میں ایک چھوٹی سی جھیل بھی ہے جس کے کنارے ماہی گیروں کی مختصر سی بستی ہے۔ مچھلیوں کے علاوہ یہ ماہی گیر بے ضرر قسم کے جانور بھی پکڑ لیتے ہیں جنہیں شہر میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ ان ماہی گیروں کا ہی حوصلہ ہے جو اس جنگل میں خوں خوار درندوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی اس جنگل میں داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ہم صبح چھ بجے جے پور سے روانہ ہوئے تھے۔ روپ متی کی پجارو میں اگلی سیٹ پر میں بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر روپ متی، جانکی اور ... بیٹھی ہوئی تھیں ... ہمارے ساتھ آئی تھی۔ آخری سیٹ پر ٹھاکر کا ملازم شنکر اور بھگت بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑا بہت سامان بھی ان کے پاس رکھا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ ٹھاکر نے سنبھال رکھی تھی۔ ہم اگرچہ ایک خطرناک مشن پر جا رہے تھے لیکن دیکھنے والے کہہ سکتے تھے کہ ہم پکنک منانے جا رہے ہیں۔

کالی کے پرانے مندر میں راموا اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ہم تین دن جے پور ہی میں رہے تھے۔ اس دوران میں پولیس نے ان لاشوں کا پتا چلا لیا تھا۔

پولیس نے رام گڑھ جھیل والی سڑک پر واٹر پمپنگ اسٹیشن سے راموا کے ساتھی کرن کو بھی زخمی حالت میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے اگرچہ الزام لگایا تھا کہ راموا اور اس کے ساتھیوں کی ہتیا میں میرا اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کا ہاتھ ہے لیکن پولیس نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ اس کی بات کا یقین بھی کیوں کیا جاتا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اس شہر کا ایک معزز آدمی تھا اور پولیس کو ایک ایسے درندے سے نجات مل گئی تھی جس نے طویل عرصے سے شہر میں خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ پولیس تو ان لوگوں کی شکر گزار تھی جنہوں نے موت کے اس فرشتے کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ بہرحال، پولیس کے ریکارڈ میں اس واقعے کی جو رپورٹ لکھی گئی تھی وہ یہ تھی کہ ڈاکٹر شیام سندر کے قتل کے بعد راموا اور اس کے ساتھی پکڑے جانے کے خوف سے کالی کے پرانے مندر میں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی اور غالباً اس عورت کی وجہ سے ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا جس نے خوف ناک لڑائی کی صورت اختیار کر لی اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو مار کر ختم ہو گئے۔

پولیس نے اپنی رپورٹ میں ایک عورت کا ذکر کیا تھا لیکن اس کا نام کہیں نہیں آیا تھا۔ وہ عورت چتیمیا تھی جو اس رات پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی لیکن اس کے بعد نہ تو چتیمیا کا نام سننے میں آیا اور نہ ہی وہ کہیں دیکھی گئی۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ دو دن پولیس کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ مصروف رہا تھا اور بالآخر یہ قضیہ ختم ہونے کے بعد تیسرے دن ہم سارسکا جا رہے تھے۔

ایک سو پانچ کلومیٹر کا فاصلہ دو گھنٹوں میں بڑی سہولت سے طے ہو گیا۔ یوں تو سارسکا میں سارسکا پیلس ہوٹل کے علاوہ دو تین اچھے رہائشی ہوٹل، دو گیسٹ ہاؤسز اور ایک ڈاک بنگلا بھی تھا لیکن ٹھاکر نے رہائش کے لیے اس ہٹ کو ترجیح دی تھی جو آبادی اور سڑک سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں واقع تھا۔ اس کے قریب ہی تین چار ہٹس اور بھی تھے جو سب کے سب آباد تھے۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف شہروں سے سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے۔

ہم نے جس ہٹ میں پڑاؤ ڈالا تھا وہ ٹھاکر کے ایک دوست کی ملکیت تھا۔ ایک ملازم یہاں موجود تھا جسے پہلے سے ہماری آمد کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم آٹھ بجے یہاں پہنچیں گے اور ناشتا بھی کریں گے چنانچہ جب ہم یہاں پہنچے تو ناشتا تیار تھا۔

ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد میں اور ٹھاکر پیدل ہی بلونت سنگھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ پجارو ہم نے اس لیے نہیں لی تھی کہ بلونت سنگھ روپ متی کی اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ہم نے ہٹ سے روانہ ہونے سے پہلے اپنے حلیوں میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کر لی تھی تاکہ فوری طور پر ہمیں شناخت نہ کیا جا سکے۔

راموا کی فراہم کردہ اطلاع کے مطابق بلونت سنگھ کے ساتھ اس کا گرو بھی تھا۔ بدیشی مسلا جو پنڈت کا بہروپ بھرے ہوئے تھا اور وہ پنڈت دارا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ دارا کو ہندوستان کے مندر پسند آ گئے تھے۔ یہ مندر سونے کی کانیں تھیں، عیاشی کے اڈے تھے اور دارا کسی مندر پر قبضہ کرنا چاہتا تھا تاکہ باقی زندگی عیش و عشرت میں گزار سکے۔ اگر پنڈت مولی دھر، دارا کے بارے میں یہ انکشاف نہ کرتا تو مندروں کی طرف میرا دھیان کبھی نہ جاتا اور اب میں نے طے کر لیا تھا کہ اسے کہیں ٹکنے نہیں دوں گا۔

شہر میں چھوٹے بڑے کئی مندر تھے۔ سب سے بڑا جین مندر تھا جو آبادی کے وسط میں تھا۔ ہم نے فی الحال جین مندر کو نظر انداز کر دیا اور انہیں چھوٹے مندروں میں تلاش کرتے رہے لیکن ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ شام تک ہم ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کر سکے۔

تین دن گزر گئے۔ ہم نے شہر کا کوئی مندر نہیں چھوڑا تھا۔ جین مندر کو بھی چیک کر لیا۔ کئی پجاریوں کو نوٹوں کی جھلک دکھلا کر کسی اجنبی پنڈت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

"ضروری نہیں کہ وہ کسی مندر میں ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہوں۔" چوتھے روز واپس آنے کے بعد میں کہا۔ اس وقت ہم سب ہٹ کے ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایسی صورت میں انہیں تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ ایک نہ ایک دن ہم انہیں کھوج نکالیں گے۔ ہم یہیں رہیں گے۔ اس وقت تک جب تک ان کا سراغ نہ لگا لیں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"تم لوگوں نے وہ محاورہ تو سنا ہو گا کہ جب تک چارا نہ ڈالا جائے، مچھلی کانٹے کے قریب نہیں پھٹکتی۔" جانکی نے ہماری گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" ٹھاکر نے اسے گھورا۔

"چارے کا مطلب چارا ہی ہوتا ہے۔" جانکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "کل میں تم لوگوں کے ساتھ چلوں گی۔ یعنی چارے کے طور پر۔ مجھے وشواس ہے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے بل سے ضرور باہر نکل آئیں گے۔"

جانکی کی بات دل کو لگتی تھی۔ بس یہی ایک طریقہ تھا جس پر عمل کرنا باقی رہ گیا تھا لہٰذا یہ طے ہوا کہ کل جانکی ہمارے ساتھ جائے گی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم بڑے کمرے میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ ملازم نے آ کر بتایا کہ ایک پجاری ہم سے ملنا چاہتا ہے۔ رات دس بجے کسی پجاری کا سن کر میں اچھل پڑا اور پھر میں اور ٹھاکر بیک وقت اپنی اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

وہ پجاری برآمدے میں کھڑا تھا۔ گیروے رنگ کی چادر

مضبوط جلد

خدایانِ سخن

خوبصورت سرورق

میر غالب مومن اور داغ

٭۔ ان چار "خدایانِ سخن" کی زندگی سے وابستہ چونکا دینے والے راز!

صفحات 320

قیمت 200 روپے ٭ ڈاک خرچ 25 روپے

طلبہ اور شائقین ادب کے لئے

بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب

اس کے جسم پر لپٹی ہوئی تھی۔ گلے میں موٹے موتیوں کی مالا' ماتھے پر قشقہ۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ مونچھوں کے بال بھی داڑھی کے بالوں سے اس طرح ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ سامنے جوڑ دیے۔

"آپ کو ایک پنڈت اور اس کے چیلے کی تلاش ہے مہاراج۔" وہ بولا "میں ایک ایسے ہی پنڈت کی خبر لایا ہوں جو اپنے چیلے کے ساتھ چند روز پہلے یہاں آیا تھا۔ وہ بہت گیان دھیان والا پنڈت ہے۔"

"ہاں ہاں۔ ہمیں اسی کی تلاش ہے۔ کہاں ہے وہ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

پجاری اس کا پتا بتانے کے بجائے اِدھر اُدھر کی مارنے لگا۔ میں سمجھ گیا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"وہ پنڈت اپنے چیلے کے ساتھ یہاں سے چار کوس دور دھول پور میں کالی کے مندر میں ملے گا۔" پجاری نے سو کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔

"کیا اس وقت بھی وہ مندر میں ہوگا؟" یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا۔

"نہیں مہاراج۔" پجاری نے جواب دیا "اس کا اصل آستانہ کسی کو معلوم نہیں۔ وہ شام ہونے سے ذرا پہلے وہاں آتا ہے اور دو تین گھنٹوں بعد کہیں اور چلا جاتا ہے۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔"

"دھنے واد (شکریہ) مہاراج۔" ٹھاکر نے کہا "وہ واقعی بہت گیان دھیان والا پنڈت ہے۔ مہا پرش۔۔۔ وہ جس کے سر پر ہاتھ دھر دیتا ہے' اس کے من کی آشا (خواہش' تمنا) اَوش (ضرور) پوری ہوتی ہے۔ ہم اسی لیے اس کی تلاش میں ہیں۔"

پجاری چند لمحے ہماری طرف دیکھتا رہا پھر "ہری اوم۔۔۔ ہری اوم۔۔۔ نارائن۔۔۔ نارائن" کی آواز لگاتا ہوا چلا گیا۔

اس رات ہم دیر تک گیان دھیان والے اس پنڈت اور اس کے چیلے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ دارا اور بلونت کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ انہیں چھپنے کے لیے کسی ایسی ہی جگہ کی ضرورت تھی جہاں کسی کا دھیان نہ جائے۔

اگلے روز سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے میں اور ٹھاکر پجارو پر روانہ ہو گئے۔ جانکی بھی ضد کر کے ہمارے ساتھ ہو لی تھی۔

یہ علاقہ تھور' کھجور' ببول اور دیگر کانٹے دار جھاڑ سے پٹا ہوا تھا۔ پجارو ہم نے دھول پور نامی اس بستی تقریباً نصف میل دور جھاڑیوں میں چھوڑ دی اور پر پیدل آگے چلتے رہے۔

وہ بستی چالیس پچاس گھروں پر مشتمل تھی۔ کالی کا بستی کی دوسری طرف تھا۔ بستی میں داخل ہوئے تو وہاں عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بستی کے ایک دیہانت (انتقال) ہو گیا تھا اور اس کے کریا کرم (آخری رسومات) کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فضا میں سوگواری کا نمایاں تھا۔

ہم کالی کے مندر کی طرف پہنچے تو پتا چلا کہ وہ گیانی دھیانی پنڈت اپنے چیلے کے ساتھ شمشان گھاٹ کی طرف گیا ہے جہاں وہ اپنی نگرانی میں چتا تیار کروا رہا ہے۔

شمشان گھاٹ مندر سے ذرا آگے تھا۔ ہم اس طرف جا کر جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے جن میں دو پنڈت بھی تھے۔ ان میں ایک تو وہی گیان دھیان والا پنڈت تھا اور دوسرا اس کا چیلا۔ انہیں دیکھ کر ہمیں بڑی مایوسی ہوئی۔ گیانی پنڈت چھوٹے قد کا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ توند مٹکے کی طرح نکلی ہوئی تھی۔ وہ دارا ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا چیلا قد میں چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس پر بھی بلونت سنگھ ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اچانک کسی لڑکی کی چیخوں کی آواز سن کر ہم چونک گئے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ بستی کی طرف سے ارتھی کا جلوس آ رہا تھا اور ایک لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی۔ دو آدمیوں نے اسے بانہوں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ارتھی کا جلوس ہمارے سامنے سے گزر گیا۔ شاید گاؤں کے سب ہی لوگ اس میں شامل تھے۔ میں نے سامنے سے گزرتی ہوئی اس لڑکی کو بھی دیکھا جسے دو آدمیوں نے گرفت میں لے رکھا تھا۔ وہ بے حد خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل سترہ سال ہوگی۔ اس نے دلہنوں جیسا لباس پہن رکھا تھا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ عورتیں ارتھی کے ساتھ شمشان گھاٹ نہیں جاتیں اور پھر اس لڑکی نے دلہنوں جیسا لباس کیوں پہن رکھا تھا؟

"اس عورت کا پتی (شوہر) مر گیا ہے۔۔۔ اسے بھی ستی کیا جا رہا ہے۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ستی۔۔۔ میں کانپ اٹھا۔ ہندوؤں کی یہ بڑی گھناؤنی رسم تھی۔ مرنے والے پتی کے ساتھ اس کی پتنی (بیوی) کو بھی چتا میں زندہ جلا دیا جاتا تھا لیکن اس ظالمانہ رسم پر پابندی لگا کر اسے ختم کیا جا چکا تھا۔۔۔ یہ۔۔۔

میں شمشان گھاٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ مرنے والے کی لاش کو چتا پر رکھ دیا گیا تھا اور اب دلہن کے لباس میں اس لڑکی کو چتا پر رکھنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ لڑکی بری طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ بھگوان کے واسطے دے رہی تھی لیکن کسی پر اس کی آہ و فغاں کا اثر نہیں ہوا۔ پانچ چھ آدمیوں نے مل کر اسے زمین پر رکھے ہوئے لوہے کے اس فریم پر لٹا دیا جس پر بیچ میں لوہے کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔

لڑکی ہاتھ پیر چلا رہی تھی لیکن پانچ چھ آدمیوں کے سامنے وہ بے بس ہو گئی۔ اس کو پٹیوں والے آہنی فریم پر چت لٹا کر اس کے ہاتھ پیر رسیوں سے باندھ دیے گئے اور اس کے جسم پر بھی کئی رسیاں لپیٹ دی گئیں تاکہ وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت نہ دے سکے۔

لڑکی کی چیخیں آسمان کی خبر لا رہی تھیں اور جب اسے اٹھا کر اس کے پتی کی لاش کے پہلو میں چتا پر لٹا دیا گیا تو اس کی چیخیں کچھ اور بلند ہو گئیں۔

ایک آدمی نے گھی کا کنستر لاش اور اس لڑکی پر انڈیل دیا اور پھر ان کے اوپر لکڑیاں رکھی جانے لگیں۔ اس طرح چتا خاصی اونچی ہو گئی۔ لکڑیوں پر بھی گھی کے کنستر انڈیلے گئے۔ اس دوران میں لڑکی بدستور بری طرح چیختی رہی۔

اور پھر اچانک ہی ڈھول بجنے لگے اور وہ شاید لڑکے کا باپ تھا جس نے چتا کو آگ لگائی تھی۔ شعلے بلند ہونے لگے۔ خشک لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ لڑکی کی چیخوں کی آواز ڈھول کی آواز سے بھی تیز تھی۔ میں متوحش نظروں سے چتا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چتا کے اندر لکڑیوں میں ہلچل سی مچی۔ آگ نے اس لڑکی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور شاید اس نے آخری مرتبہ پوری قوت استعمال کر کے اپنی بندشیں توڑنے کی کوشش کی تھی اور وہ فریم سمیت الٹ کر پتی کی لاش پر جا گری تھی۔

ڈھول کی آواز میں اس کی چیخیں بلند ہوتی گئیں۔ فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ لڑکی کی چیخیں معدوم ہوتی گئیں اور اب وہاں صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ جانکی موجود نہیں تھی۔ گاؤں کے لوگ اب بھی چتا کے چاروں طرف جمع تھے۔ ڈھول بج رہے تھے اور لوگ ناچ رہے تھے۔

ٹھاکر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم جھاڑیوں سے نکل کر اس طرف چل پڑے جہاں ہماری پجارو کھڑی تھی۔ جانکی پجارو سے ٹیک لگائے کھڑی ہانپ رہی تھی۔ وہ شاید اس وقت بھاگ آئی تھی جب اس لڑکی کے ہاتھ پیر باندھے جا رہے تھے۔

"حیرت کی بات ہے۔" میں نے پجارو میں بیٹھتے ہوئے کہا "ایک عورت کو زندہ جلا دیا گیا اور کسی نے بچانے کی کوشش نہیں کی۔"

"اگر کوئی بچانے کی کوشش کرتا تو اسے بھی چتا میں پھینک دیا جاتا۔" ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

واپسی پر چار کوس کا فاصلہ جلد ہی طے ہو گیا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی ایک نئی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر طرف غلغلہ مچا ہوا تھا۔ خوف زدہ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

اور یہ انکشاف بڑا سنسنی خیز تھا کہ گنگولی چوہدری کے گروہ نے شہر کے شمالی علاقے پر حملہ کر دیا تھا اور وہاں گیسٹ ہاؤسز اور ہٹس میں ٹھہرے ہوئے سیاحوں کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔

ہمارا ہٹ بھی اسی علاقے میں تھا۔ ٹھاکر نے پجارو کی رفتار بڑھا دی اور ہٹ کے سامنے گاڑی روکی تو ہمارے بدترین خدشات درست نکلے۔

ہٹ کے سامنے کئی پولیس والے جمع تھے۔ ہمارے ہٹ کا ملازم زخمی تھا اور روپ متی بری طرح بدحواس ہو رہی تھی۔

ہمیں دیکھ کر روپ متی دوڑتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئی اور اس نے جو انکشاف کیا' وہ بہت سنسنی خیز تھا۔ گنگولی چوہدری کے آدمی ہمارے قریبی ہٹس سے دوسرے چند سیاحوں کے ساتھ ببلا کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
طالوت
③ حصوں میں (مکمل)
قیمت فی حصہ 50 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز

میرے آس پاس کہیں بم کا دھماکا ہوتا تو اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا اس خبر سے ہوا تھا۔

روپ متی نے یہ خبر روتے ہوئے سنائی تھی۔ اس کی پوری بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ تاہم اس کے ٹوٹے پھوٹے جملوں سے یہ نتیجہ اخذ کرسکا تھا کہ گنگولی چوہدری نامی کوئی شخص اپنے گروہ کے ساتھ یہاں وارد ہوا تھا۔ انہوں نے پہلے فائرنگ کرکے لوگوں کو بدحواس کیا اور پھر گیسٹ ہاؤس اور قریب قریب واقع ان چار ہٹس کو گھیرے میں لے کر یہاں ٹھہرے ہوئے تمام سیاحوں کو ایک جگہ پر جمع کرلیا تھا اور انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے اور مارتے ہوئے جنگل کی طرف لے گئے تھے اور ان ہی ماتوں کے اس ریوڑ میں ہماری بملا بھی شامل تھی۔

روپ متی کے حواس بحال ہوئے تو میں نے ایک بار پھر اس سے اس سانحے کی تفصیل پوچھی۔

"تقریباً ڈیڑھ گھنٹا پہلے کی بات ہے۔" وہ بتا رہی تھی "میں کچھ چیزیں لینے کے لیے بازار جا رہی تھی۔ میں نے بملا کو بھی ساتھ چلنے کو کہا مگر اس نے انکار کردیا۔

"میں بازار میں شاپنگ کر رہی تھی کہ اچانک گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس کے دو منٹ بعد بازار میں شور مچ گیا کہ گنگولی چوہدری نے حملہ کردیا ہے۔

"لوگ ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ میں جس دکان میں کھڑی تھی وہاں چند گاہک اور بھی تھے۔ دکان دار نے شٹر گرا دیا۔ اس طرح ہم بھی اندر بند ہوگئے۔

"بازار سنسان ہوچکا تھا۔ آدھے گھنٹے تک کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ تاہم دور سے وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور بالآخر یہ آوازیں بھی بند ہوگئیں۔

"بازار میں لوگوں کی آوازیں سن کر دکان دار نے شٹر اٹھا دیا۔ پون گھنٹے تک دکان میں بند رہنے سے میرا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ میرے کپڑے پسینے میں بھیگ کر میرے بدن سے چپک گئے تھے۔ دوسرے لوگوں کی بھی یہی حالت تھی۔

"میرے حواس بحال ہوئے تو لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ گنگولی چوہدری نامی ڈاکو کے گروہ نے شہر کے شمالی علاقے میں واقع گیسٹ ہاؤس اور ہٹس پر حملہ کیا تھا اور وہاں مقیم کئی سیاحوں کو اغوا کرکے لے گئے تھے۔

"میں ایک بار پھر حواس باختہ سی ہوگئی اور واپسی کے لیے دوڑ لگا دی۔ مجھے بملا کی فکر تھی اور جب میں یہاں پہنچی تو میرے بدترین اندیشے درست نکلے۔ بملا اپنے ہٹ سے غائب تھی۔

"میں اسے ادھر ادھر تلاش کرتی رہی۔ میرا خیال تھا شاید وہ بچنے کے لیے کہیں چھپ گئی ہو۔ ہمارے دائیں طرف والے ہٹ میں ایک سکھ فیملی ٹھہری ہوئی ہے۔ بوڑھے سردار جی نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکو اس کے بیٹے اور بہو کو لے گئے ہیں۔ اس نے ہماری بملا کو بھی دیکھا تھا جسے ڈاکو ہٹ سے گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے تھے۔

"ہمارے ملازم پرکاش نے مزاحمت کی کوشش کی تو رائفل کا بٹ مار کر اسے زخمی کردیا۔ تیسرے ہٹ میں بھی ایک آدمی نے مزاحمت کی کوشش کی تھی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کردیا گیا۔

"پولیس آدھے گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ اس وقت تک ڈاکو لوگوں کو لے کر یہاں سے بہت دور جاچکے تھے۔ اپنی بملا کا کیا ہوگا؟ وہ لوگ مار ڈالیں گے اسے۔"

"فکر نہ کرو روپ متی۔" میں نے کہا "ہوسکتا ہے پولیس کی کوئی پارٹی ان کے تعاقب میں گئی ہو۔ پکڑ لیں گے انہیں۔"

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے جیسے اس خبر نے اسے بھی ہلا کر رکھ دیا ہو۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر ان پولیس والوں کی طرف بڑھ گیا جو بوڑھے سردار جی سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ سردار جی کی بوڑھی بیوی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ کچھ اور لوگ بھی رو رو کر انسپکٹر سے بار بار یہ سوال کر رہے تھے کہ پولیس نے ان ڈاکوؤں کا پیچھا کیوں نہیں کیا!

ٹھاکر انسپکٹر کو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا تو انسپکٹر کچھ مرعوب سا ہوگیا اور پھر انسپکٹر نے جو کچھ بتایا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔

انسپکٹر کے کہنے کے مطابق ڈاکو گنگولی چوہدری کے گروہ نے بہت عرصے سے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ اس کی سرگرمیوں کا حلقہ الور اور جنگل کی دوسری طرف کوٹ پتلی تک پھیلا ہوا ہے۔ ان شہروں کے بیچ میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیاں اور گاؤں آئے دن اس کی لوٹ مار کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

گنگولی چوہدری بہت بے رحم اور بھیڑیا صفت انسان ہے بلکہ انسان نہیں درندہ ہے۔ وہ بات بعد میں کرتا ہے گولی پہلے چلاتا ہے۔ الور کی طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور

سارسکا کا میلوں دور تک پھیلا ہوا جنگل اس کا مسکن ہے۔ ہر واردات کے بعد یا تو وہ جنگل میں روپوش ہوجاتا ہے یا ان پہاڑیوں میں پناہ لیتا ہے۔ ان پہاڑیوں میں لاتعداد غار تھے جن میں فوج کی پوری رجمنٹ بھی چھپ جاتی تو اسے تلاش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ راستے اتنے دشوار تھے کہ پولیس ان کے تعاقب میں ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرپاتی تھی اور نہ ہی پولیس کے جوان سارسکا کے جنگل میں ان ڈاکوؤں کا پیچھا کرنے کی ہمت کرتے تھے۔ جنگل میں ڈاکوؤں کے ساتھ خوں خوار درندوں کا بھی خوف ان کے قدم روک لیتا تھا۔

چند روز پہلے گنگولی چوہدری کا گروہ پولیس کے گھیرے میں آگیا تھا۔ کئی گھنٹوں کے زبردست مقابلے کے بعد ڈاکو پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ تاہم ایک ڈاکو زخمی ہوکر پولیس کے ہاتھ لگ گیا۔

گرفتار ہونے والا ڈاکو گنگولی چوہدری کا چھوٹا بھائی چترا تھا۔ گنگولی چوہدری نے دھمکی دی تھی کہ اگر چترا کو رہا نہ کیا گیا تو وہ اس شہر کو آگ لگا دے گا۔

اس واردات کے بعد گنگولی چوہدری الور کی پہاڑیوں کی طرف فرار ہوگیا تھا۔ پولیس چند روز تک چوکس رہی لیکن گنگولی کی طرف سے کوئی ری ایکشن نہیں ہوا تو شہر کے اطراف سے پہرا ہٹا لیا گیا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کا خیال تھا کہ شہر کو آگ لگا دینے کی دھمکی محض گیدڑ بھبکی تھی اور گنگولی اب طویل عرصے تک پہاڑیوں سے نکلنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

لیکن پولیس افسران کا خیال غلط نکلا۔ گنگولی چوہدری اپنے بھائی کو نہیں بھولا تھا۔ آج اسے موقع مل گیا۔ گنگولی چوہدری نے جس طرح کارروائی کی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا تھا۔ اس کے آدمی بھیس بدل کر کئی روز تک شہر کی صورت حال کا جائزہ لیتے رہے تھے۔

آج اس کے آدمی صبح سے دیہاتیوں کے بھیس میں شہر کے مختلف علاقوں میں موجود تھے اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق مقررہ وقت پر شہر کے شمالی علاقے میں اس جگہ جمع ہوگئے جہاں ایک گیسٹ ہاؤس اور یہ چار ہٹس تھے جن میں سے ایک میں ہم موجود تھے۔ چند ہٹس اور بھی تھے لیکن وہ تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھے۔

گنگولی چوہدری کے آدمیوں نے گیسٹ ہاؤس اور ہٹس کو گھیرے میں لے کر فائرنگ شروع کردی اور یہاں ٹھہرے ہوئے تمام سیاحوں کو باہر نکال کر ایک جگہ جمع کرلیا۔ ہمارے ہٹ کے ملازم نے مزاحمت کی تو اسے رائفل کا بٹ مار کر زخمی کردیا۔ ایک اور آدمی نے مزاحمت کی تو اسے گولی مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

گنگولی چوہدری کے آدمی یہاں سے تیرہ سیاحوں کو مارتے پیٹتے اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے جنگل کی طرف لے گئے۔ ان میں پانچ عورتیں اور آٹھ مرد تھے۔ دو لڑکیاں غیر شادی شدہ تھیں۔ ان میں ایک ہماری بملا اور دوسری الٰہ آباد سے آئی ہوئی ایک فیملی کی لڑکی تھی۔ وہ کالج کی اسٹوڈنٹ تھی اور اس کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب ہم شہر سے چار پانچ میل دور دھول پور نامی اس بستی کے شمشان گھاٹ میں لڑکی کے ستی ہونے کا دلدوز منظر دیکھ رہے تھے اور اب سورج غروب ہوچکا تھا اور اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس طرح ڈاکوؤں کو وہاں سے گئے ہوئے دو گھنٹے ہوچکے تھے۔

ڈاکو بوڑھوں کو چھوڑ گئے تھے شاید اس لیے کہ وہ بھاگ دوڑ میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ روپ متی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس وقت بازار گئی ہوئی تھی اور بملا کی بدقسمتی کہ وہ ہٹ میں موجود تھی۔

گنگولی چوہدری پولیس اور دیگر حکام کے لیے یہ پیغام چھوڑ گیا تھا کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی چترا کو نہ چھوڑا گیا تو چوتھے دن وہ تمام مغویوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اور پولیس کو یہ پیغام مل گیا تھا۔

"لو دیکھو جی۔" بوڑھا سردار جی کہہ رہا تھا "وہ ڈاکو یہاں سے تیرہ بندوں کو مویشیوں کی طرح ہانک کر لے گئے اور پولیس کچھ بھی نہ کرسکی۔ کم از کم ان کا پیچھا ہی کیا ہوتا۔"

"پولیس تو نہتے شہریوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسا سکتی ہے۔ ڈاکوؤں کا سامنا کرتے ہوئے انہیں موت آتی ہے۔" ایک اور شخص نے کہا "اگر ہمارے بندوں کو کچھ ہوگیا تو ہم اس شہر کو آگ لگا دیں گے۔"

انسپکٹر گھور گھور کر سب کو دیکھ رہا تھا مگر ظاہر ہے اس کے پاس بپھرے ہوئے ان لوگوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"پولیس نے ڈاکوؤں کا پیچھا کیوں نہیں کیا آفیسر؟" یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا۔

"ہمیں بہت دیر سے خبر ہوئی تھی ٹھاکر جی۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اس وقت تک ڈاکو یرغمالیوں کو لے کر جنگل میں

داخل ہو چکے تھے۔"

"جنگل میں بھی ان کا پیچھا کیا جا سکتا تھا۔" ٹھاکر نے اسے گھورا۔

"اس طرح یرغمالیوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتیں۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اعلیٰ حکام اور پولیس افسران کو اطلاع ہو گئی ہے۔ آٹھ بجے سرکٹ ہاؤس میں ان کا گٹھ جوڑ ہو گا جس میں یرغمالیوں کو ڈاکوؤں سے چھڑانے کے لیے حکمت عملی طے کی جائے گی۔"

"گویا بے گناہ یرغمالی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر رہیں گے۔" ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ تو اب بھی ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر ہیں۔" انسپکٹر نے تپ کر جواب دیا "اس وقت ہم کیا کر سکتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں تو اس خطرناک جنگل میں داخل نہیں ہوا جا سکتا جس میں ان ڈاکوؤں کے علاوہ خوفناک درندے بھی ہیں۔"

انسپکٹر کے اس جواب سے وہ شخص بھی تپ گیا اور اس نے انسپکٹر کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"اگر ہمارے آدمیوں کو کچھ ہوا تو ہم کسی پولیس والے کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" وہ شخص غرایا۔

انسپکٹر کسی اور طریقے سے سمجھانے کی کوشش کرتا تو بات لوگوں کی سمجھ میں آجاتی مگر انسپکٹر کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ ایک اور آدمی نے انسپکٹر کو تھپڑ رسید کر دیا۔ دوسرے تین پولیس والوں نے کارکردگی دکھانے کی کوشش کی تو لوگوں نے انہیں بھی پیٹنا شروع کر دیا۔

صورت حال بگڑ رہی تھی۔ میں نے اور ٹھاکر نے بڑی مشکل سے انسپکٹر اور اس کے ماتحتوں کو لوگوں سے چھڑایا اور انہیں وہاں سے رخصت کر دیا۔

لوگ سردار جی والے ہٹ کے سامنے جمع ہو گئے اور ہم اپنے ہٹ کے سامنے لان میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ زخمی ملازم کو پولیس والوں کے ساتھ اسپتال بھیج دیا گیا تھا اور تیسرے ہٹ کے سامنے پڑی ہوئی لاش بھی اٹھالی گئی تھی۔ اس ہٹ کی طرف سے بین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ صورت حال خاصی گمبھیر ہو گئی تھی۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے مجھے شنکر اور بھگت کا خیال آگیا۔

"وہ دونوں کہاں ہیں۔ بھگت اور شنکر؟" میں نے روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دونوں ڈاکوؤں کے حملے سے آدھا گھنٹا پہلے جنگل والے ریسٹورنٹ کی طرف گئے تھے۔ ڈاکوؤں کے فرار کے بعد اس طرف سے بھی گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ پتا نہیں۔ وہ لوگ کہاں ہیں!" روپ متی نے جواب دیا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں دیکھ کر آتا ہوں۔ مجھے اس طرف بھی کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔" میں یہ کہتے ہوئے پجارو کی طرف آگیا۔

چابی اگنیشن ہی میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور پجارو کو گھما کر ایک طرف دوڑا دیا۔

تقریباً نصف میل آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جس جگہ سے کوٹ تیلی کی طرف جانے والی سڑک جنگل میں داخل ہوتی تھی وہاں ایک بہت بڑا اوپن ائر ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا۔ دبیز گھاس کا بہت لمبا چوڑا پلاٹ تھا جس کے گرد پھولوں کے پودے تھے۔ پلاٹ کے ایک کونے میں ریسٹورنٹ کی مختصر سی عمارت تھی اور سامنے دور دور تک میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ لوگ تفریح کے لیے اس طرف جاتے رہتے تھے۔ چائے کھانا بھی ہوتا اور جنگل کا نظارہ بھی۔ میں دو دن پہلے ٹھاکر کے ساتھ اس طرف جا چکا تھا۔

ریسٹورنٹ کی روشنیاں دور ہی سے نظر آگئیں اور پھر پولیس کی ایک جیپ بھی دکھائی دی۔ کچھ لوگ بھی جمع تھے۔

میں نے پولیس جیپ کے قریب پجارو روک لی اور اتر کر اس طرف دوڑا جہاں پولیس والے اور دوسرے لوگ جمع تھے۔ وہاں کی صورت حال کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔ ریسٹورنٹ کی عمارت کے قریب دو تین جگہوں پر خون بکھرا ہوا تھا۔

اور پھر یہ انکشاف ہوا کہ ڈاکو یرغمالیوں کو لے کر جب اس طرف آئے تھے تو ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے چند جیالوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں ڈاکوؤں نے فائر کھول دیا تھا۔ انہیں روکنے کی کوشش کرنے والوں میں سے ایک آدمی مارا گیا تھا۔ دو زخمی ہوئے تھے۔ یرغمالیوں میں سے بھی ایک آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اسے بھی مار ڈالا گیا تھا۔ ڈاکو ریسٹورنٹ سے ایک اور آدمی کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ لاشوں اور زخمیوں کو اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

میں نے وہاں پر موجود لوگوں سے شنکر اور بھگت کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کی مگر کوئی بھی کچھ نہ بتا سکا۔ میں دوبارہ پجارو میں بیٹھ گیا اور اسے شہر کی طرف دوڑا دیا۔

اسپتال پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ یہاں بھی لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔ میں لوگوں کو دھکیلتا ہوا

جیسے تیسے آگے پہنچ گیا۔ سب سے پہلے میں نے لاشوں کو دیکھا۔ ان میں نہ بھگت تھا اور نہ شنکر۔ ایک نرس نے مجھے اس وارڈ میں پہنچا دیا جہاں زخمی پڑے ہوئے تھے۔ وارڈ میں بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں زخمیوں کو دیکھتا ہوا ایک بیڈ کے قریب رک گیا۔ وہ شنکر تھا جس کے سینے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں سمجھا کہ وہ بے ہوش ہے لیکن میں نے ہولے سے پکارا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بمشکل بول سکتا تھا۔ بہرحال' اس کی باتوں سے مجھے پتا چل گیا کہ گنگولی چوہدری کے آدمی بھگت کو پکڑ کر لے گئے تھے۔ میں شنکر سے باتیں کر رہا تھا کہ نرس آگئی۔

"مریض تھوڑی دیر پہلے ہی ہوش میں آیا ہے۔ آپ اس سے زیادہ باتیں نہ کریں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے مہذبانہ لہجے میں کہا۔

"اس کی حالت زیادہ تشویش ناک تو نہیں؟" میں نے نرس سے پوچھا۔

"فکر نہ کریں۔ گولی نکال دی گئی ہے۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔ بولنے سے اسے تکلیف ہو گی۔" نرس نے جواب دیا۔

میں شنکر کی طرف دیکھتا ہوا وارڈ سے باہر آگیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ شنکر شدید زخمی تھا اور بھگت بھی ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

میں پجارو کو طوفان کی طرح دوڑاتا ہوا ہٹ پر پہنچ گیا۔ ہٹ کے سامنے پجارو روک کر میں جس طرح نیچے اترا تھا' سامنے لان میں بیٹھا ہوا ٹھاکر بہت کچھ سمجھ گیا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے میری طرف آگیا اور مجھے راستے ہی میں روک لیا۔

"کیا ہوا؟ تم بڑے بدحواس ہو رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"بات ہی ایسی ہے ٹھاکر۔" میں نے جواب دیا "شنکر زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے اور بھگت ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔"

ٹھاکر کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ ہم چند لمحے وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے پھر جانکی اور روپ متی کو بھی سب کچھ بتا دیا۔ ان سے کچھ چھپانا بے کار تھا۔ جلد یا بدیر انہیں پتا چل ہی جاتا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب پجارو میں سوار اسپتال کی طرف جا رہے تھے۔ ہٹ کو تالا لگا دیا گیا تھا۔

ٹھاکر نے ڈاکٹر سے مل کر شنکر کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل کیں اور اسے وارڈ سے پرائیویٹ روم میں منتقل کروا دیا۔ جانکی اور روپ متی کو شنکر کے پاس چھوڑ کر ہم سرکٹ ہاؤس کی طرف چلے گئے جہاں آٹھ بجے انتظامیہ کے حکام اور پولیس کے اعلیٰ افسران کی میٹنگ ہونے والی تھی۔

سرکٹ ہاؤس کے سامنے بھی لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ جن لوگوں کے بندوں کو ڈاکو اٹھا کر لے گئے تھے وہ پولیس اور انتظامیہ کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

گیٹ پر متعین دو پولیس والوں نے ٹھاکر کو روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ انہیں دھکیلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ ہم سرکٹ ہاؤس کے اندر تو آگئے لیکن ہمیں اس کمرے میں نہیں جانے دیا گیا جہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ ہم لابی میں بیٹھ گئے جہاں کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔

رات گیارہ بجے میٹنگ ختم ہوئی۔ ٹھاکر نے ڈپٹی کمشنر کو گھیر لیا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ٹھاکر کو جانتا تھا۔

"اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا ٹھاکر جی۔" ڈپٹی کمشنر نے بتایا "رات کے وقت تاریک جنگل میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ ہم نے جے پور سے پولیس کی مزید نفری منگوائی ہے۔ امید ہے کہ یہ نفری رات کو کسی وقت پہنچ جائے گی اور صبح جنگل میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا جائے گا۔"

"آپ جانتے ہیں صورت حال کتنی نازک ہے۔" ٹھاکر نے کہا "وہ ڈاکو اب تک پانچ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ یرغمالی ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ ان بے چاروں کا کیا حال ہو گا اور یہاں جو ان کے عزیز و اقارب ہیں ان کی حالت تو دیکھیں۔"

"میں صورت حال سے پوری طرح واقف ہوں۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "لیکن اس وقت کچھ نہیں کیا جا سکتا۔"

ڈپٹی کمشنر باہر نکلا تو لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ انہیں بھی یہی کہہ کر تسلی دی گئی کہ صبح ہوتے ہی ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی شروع کر دی جائے گی۔

ہم اسپتال پہنچے تو بارہ بج رہے تھے۔ شنکر کی حالت کسی قدر تسلی بخش تھی۔ ٹھاکر نے اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس کا بندوبست کر دیا تھا۔ ہم جانکی اور روپ متی کو لے کر واپس آگئے۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ آس پاس کے تینوں ہٹس اور گیسٹ ہاؤس میں بھی لوگ جاگ رہے تھے۔ ظاہر ہے اس سانحے کے بعد نیند کس کو آتی۔

اس ہنگامے میں ہم رات کا کھانا بھی بھول گئے تھے۔ کسی کو ہوش ہی کہاں رہا تھا۔ اس وقت جانکی چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کی چسکیوں کے ساتھ ہم صورت حال پر تبصرے بھی کرتے رہے۔

یوں تو بھگت اور ببلا کے اغوا کا سب ہی نے اثر لیا تھا۔ ببلا پچھلے چند روز کے دوران میں جانکی سے کچھ زیادہ مانوس ہوگئی تھی۔ اس کے فراق میں رو رو کر جانکی کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ روپ متی بھی دیر تک روتی رہی تھی۔ ٹھاکر نے بھی اس کا بہت اثر لیا تھا لیکن میری حالت ان سب سے ابتر تھی لیکن میں نے اپنی اندرونی کیفیت کا زیادہ اظہار نہیں کیا تھا۔

ببلا سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں تھی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میں اس کے لیے اپنے دل میں ایک عجیب سی کسک محسوس کرنے لگا۔ اس کا چہرہ بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ پتا نہیں ان ڈاکوؤں نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔

رات آنکھوں میں بیت گئی۔ صبح کی روشنی پھیلی تو میں قریبی ڈھابے (چھپر ہوٹل) سے ڈبل روٹی لے آیا۔ جانکی نے چائے تیار کرلی۔ ہم نے الٹا سیدھا ناشتا کیا اور سرکٹ ہاؤس جانے کے لیے تیار ہوگئے۔

باہر نکلے تو پڑوس میں رہنے والے بوڑھے سردار جی نے بتایا کہ وہ ابھی سرکٹ ہاؤس سے ہو کر آیا ہے۔ پولیس کی نفری جنگل والے ریسٹورنٹ (جنگل ریسٹورنٹ) کے قریب جمع ہے اور بعض اعلیٰ افسران بھی وہیں موجود ہیں۔

وہ سردار جی بھی وہاں جانا چاہتے تھے۔ ہم نے انہیں بھی پجارو میں بٹھا لیا اور دس منٹ بعد جنگل ریسٹورنٹ کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ جمع تھے۔ جے پور سے رات ہی کو پولیس کی بھاری نفری پہنچ گئی تھی اور پولیس کے مسلح جوان جنگل کے ساتھ ساتھ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس مشن کا انچارج انسپکٹر ونود پانڈے تھا اور مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ پولیس کی کوئی پارٹی ابھی تک جنگل میں داخل نہیں ہوئی تھی اور پھر اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔

گنگولی چوہدری نے جنگل کی ایک بستی کے رہنے والے ایک دیہاتی کے ذریعے پولیس کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ اگر ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ تمام یرغمالیوں کو ہلاک کردیں گے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دہرائی تھی کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی چترا کو رہا نہ کیا گیا تو یرغمالیوں کے جیون (زندگی) کی ضمانت نہیں دی جائے گی اور اس دھمکی سے مرعوب ہو کر پولیس پارٹی جنگل میں داخل نہیں ہوئی تھی۔

لوگوں نے ابھی وہیں ڈیرے جما دیے۔ جنگل کے کنارے کنارے مسلح کانسٹیبل اس طرح تعینات تھے جیسے حکام کو یقین ہو کہ ڈاکو ٹہلتے ہوئے جنگل سے باہر آئیں گے تو انہیں پکڑلیں گے۔

دوپہر کے وقت تک بار بار افسران سے لوگوں کی جھڑپیں ہوتی رہیں اور پھر چھ آدمی رضاکارانہ طور پر جنگل میں داخل ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ پولیس نے انہیں بڑی مشکل سے روکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی اطلاع پاکر وہاں پہنچ گیا۔

"آپ لوگ یرغمالیوں کے جیون بھی خطرے میں ڈال رہے ہیں۔" ڈپٹی کمشنر نے ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "گنگولی چوہدری انسان نہیں درندہ ہے۔ اسے جیسے ہی پتا چلے گا کہ کوئی پارٹی اس کے تعاقب میں جنگل میں داخل ہوئی ہے تو وہ یرغمالیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔"

"ہم اپنے آدمیوں کو چھڑانے کے لیے گنگولی چوہدری کو ڈنڈ دینے کو تیار ہیں۔" ایک آدمی نے کہا "ہم دو آدمی جنگل میں جائیں گے اور گنگولی چوہدری کو تلاش کرکے اسے ڈنڈ (تاوان) کی پیشکش کریں گے۔ دولت ہی ان ڈاکوؤں کا دھرم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری پیشکش مان لے گا اور ڈنڈ لے کر ہمارے آدمیوں کو چھوڑ دے گا۔"

"یہ آپ لوگوں کی خوش فہمی ہے۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "اس کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے۔ وہ اپنے بھائی کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔"

"تو پھر اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا جاتا۔" ایک اور آدمی بولا "کیا ایک ڈاکو ان تیرہ آدمیوں سے زیادہ قیمتی ہے کہ آپ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے؟"

"آپ لوگ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔" ڈپٹی کمشنر بولا "گنگولی چوہدری کے گروہ نے طویل عرصے سے اس علاقے میں دہشت پھیلا رکھی ہے۔ وہ درجنوں بے گناہوں کو قتل کرچکا ہے۔ بستیوں کی بستیاں اجاڑ دی ہیں اس نے۔ لوگ خوف و ہراس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ پہلی مرتبہ اس کے گروہ کا کوئی آدمی پکڑا گیا ہے اور وہ بھی اس کا بھائی۔ ہم اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیں گے۔"

"اور اس کے لیے آپ لوگوں نے تیرہ بے گناہوں کی

زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا ہے۔" اس آدمی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا "میری شکشا (مشورہ) ہے کہ آپ خود اپنے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے آپ کو ڈاکوؤں کے حوالے کر کے ہمارے آدمیوں کو چھڑوا دیں اور اس کے بعد آپ لوگ انتظار کرتے رہیں کہ گنگولی چوہدری گھٹنے ٹیکتا ہے یا نہیں۔"

ڈپٹی کمشنر اسے گھور کر رہ گیا۔ بات بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ دو آدمی دو سادہ لباس پولیس والوں کے ساتھ جنگل میں جائیں گے اور گنگولی چوہدری سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ ڈنڈ لے کر یرغمالیوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا تو ٹھیک۔ بصورت دیگر پولیس کوئی نئی حکمت عملی اپنائے گی۔

وہ لوگ دو بجے کے قریب جنگل میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس صرف ایک رائفل تھی۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اگر کوئی درندہ راستہ روکنے کی کوشش کرے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ اگر سب کے پاس رائفلیں ہوتیں تو ہوسکتا ہے ڈاکو یہ سمجھتے کہ پولیس انہیں گھیرنے کی کوشش کررہی ہے اور وہ کسی وارننگ کے بغیر ان پر فائر کھول دیں۔

ہم لوگ شام تک وہاں رہے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکوؤں سے رابطہ کرنا مشکل ہوگا۔ یہ جنگل میلوں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ڈاکو کہیں سے کہیں نکل گئے ہوں گے اور ڈاکوؤں سے پہلے اگر کسی درندے سے ان کی ملاقات ہوگئی تو شاید ہی ان میں سے کوئی زندہ بچ کر واپس آسکے۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تو ہم اپنے ہٹ میں واپس آگئے۔ بعض لوگ وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ انہوں نے رات وہیں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔

ٹھاکر ہمیں ہٹ میں چھوڑ کر بازار کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ کسی ہوٹل سے کھانا لے کر آیا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ ہٹ کے سامنے لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہمارے قریب والے تینوں ہٹ اور گیسٹ ہاؤس بھی اگرچہ آباد تھے مگر خاموشی ایسی تھی کہ جیسے وہاں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ کل کے واقعے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بعض لوگ تو شہر کے ہوٹلوں میں منتقل ہوگئے تھے۔ جو لوگ ان ہٹس اور گیسٹ ہاؤس میں رہ گئے تھے ان پر بھی خوف طاری تھا۔

ہم آدھی رات تک لان میں کرسیوں پر ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی موضوع تھا۔ گنگولی چوہدری کا گروہ اور یرغمالی۔

مجھے امید نہیں تھی کہ گنگولی چوہدری یرغمالیوں کی رہائی کے لیے نقد تاوان کی پیشکش قبول کرلے گا۔ اس کا بھائی پولیس کی حراست میں تھا اور وہ ہر قیمت پر اسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسے ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ دوسروں کو تو یہ لوگ گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے تھے۔ کسی کی زندگی کو زندگی نہیں سمجھتے تھے۔ چلتے پھرتے انسان کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان کے لیے معمولی بات تھی لیکن جب اپنے آپ پر پڑتی ہے تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو یا اپنے کسی بھائی بند کو بچانے کے لیے پورے شہر کو بھی آگ لگا دینے سے گریز نہیں کرتے۔

میں بنکاک میں پیڈرو کو ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ اس کا بھائی سانی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کی لاش ہم نے بوری میں ڈال کر اسی کے کلب میں پھینک دی تھی اور پیڈرو نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کے لیے کیا قیامت مچائی تھی۔ کئی بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ لاتعداد عمارتوں کو آگ لگا دی تھی اور سڑکوں پر لاتعداد بسوں اور دوسری گاڑیوں کو نذر آتش کردیا تھا۔

اور اب گنگولی چوہدری..... اس کا بھائی بھی پولیس کی حراست میں تھا جس کے بدلے اس نے تیرہ بے گناہوں کو یرغمالی بنالیا تھا اور دو آدمی ان لوگوں کو چھڑانے کے لیے تاوان کی پیشکش لے کر گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ اس پیشکش کو قبول نہیں کرے گا۔

ہم لوگ کل رات سے نہیں سوئے تھے اور اس وقت بھی رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جانکی اور روپ متی بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھیں۔ ٹھاکر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ میری حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔

ایک بجے کے قریب ہم لوگ ہٹ کے اندر آگئے۔ جانکی اور روپ متی ایک کمرے میں چلی گئیں اور میں اور ٹھاکر الگ الگ کمروں میں۔ یہ ہٹ خاصا بڑا تھا۔ چار بیڈ رومز تھے۔ سٹنگ روم اور لاؤنج اس کے علاوہ تھا۔

میں بستر پر لیٹا ببلا کے بارے میں سوچتا رہا۔ نجانے کیوں وہ میرے دماغ پر چھائی تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس رات میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔

وہ بڑا خوفناک منظر تھا۔

ببلا جنگل میں ادھر ادھر دوڑی پھر رہی تھی۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا۔ چہرے پر خوف و دہشت کے سائے تھے۔ خون خوار بھیڑیے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ نکیلے دانت' باہر کو لٹکی ہوئی سرخ زبانیں جن سے خون ٹپک رہا تھا۔

ببلا بار بار ٹھوکریں کھا کر گر رہی تھی۔ کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا۔ اس کی ٹانگوں' بانہوں اور چہرے پر لمبی لمبی خراشیں تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔

وہ جس طرف بھی جاتی' بھیڑیے اس کا راستہ روک لیتے۔ وہ پلٹ کر دوسری طرف دوڑتی۔ اس طرف بھی خون خوار بھیڑیے دانت نکوستے ہوئے اس کے بخیے ادھیڑ دینے کو تیار نظر آتے۔

دوڑتے دوڑتے ببلا ایک بار پھر کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر گری۔ وہ ایک طرف ڈھلان پر لڑھکتی چلی گئی اور جب سنبھل کر اٹھنے کی کوشش کی تو چاروں طرف سے بھیڑیوں کو یلغار کرتے دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔

ببلا کی خوفناک چیخ کی آواز میرے کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی چلی گئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے حواس بھی شاید مختل ہو گئے تھے اور جب میرے حواس بحال ہوئے تو میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

میں اپنے بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس بھیانک خواب نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں چند لمحے بستر پر ہی بیٹھا گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور پھر اٹھ کر ہٹ سے باہر آ گیا۔ کرسیاں اب بھی لان میں پڑی تھیں۔ میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا نے نہایت خوشگوار اثر ڈالا اور میں مکمل طور پر ہوش و حواس میں آ گیا۔

اس وقت صبح ہونے والی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے ببلا کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ واقعی خوں خوار بھیڑیوں کے غول میں گھری ہوئی تھی۔ دو راتیں بیت چکی تھیں۔ وہ بھیڑیا صفت ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔ اس کے ساتھ اب تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا؟ یہ کہنا بہت مشکل تھا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے مجھے تھپک کر ایک بار پھر سلا دیا اور دوسری مرتبہ میری آنکھ اس وقت کھلی جب چاروں طرف دھوپ پھیل چکی تھی اور تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی بڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میں نے سردار جی والے ہٹ کی طرف دیکھا۔ اسی وقت ہٹ کا دروازہ کھلا اور سردار جی باہر آ کر پہلے ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی میری طرف آ گئے۔

وہ بہت وضع دار آدمی تھا۔ چوڑی دار پاجامہ' سفید کرتہ جس کا دامن فراک کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ گلے میں کرپان۔ اور سر پر نیلے رنگ کی مخصوص انداز میں بندھی ہوئی پگڑی۔ اس کے ہاتھ میں جیبی ڈائری کے سائز کی سرخ جلد والی کتاب تھی۔ وہ قریب آیا تو پتا چلا کہ یہ گرنتھ صاحب (سکھوں کی مذہبی کتاب) کا پاکٹ سائز ایڈیشن تھا۔

"پتر جی۔" وہ میرے قریب آ کر بولا "کچھ پتا لگا ان ڈاکوؤں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"نہیں سردار جی۔ کل شام اندھیرا پھیلنے تک تو وہ بندے واپس نہیں آئے تھے جو ان سے مذاکرات کرنے کے لیے جنگل میں گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"رب بھلا کرے۔" سردار جی بولے "دو دن پہلے میں بچوں کو کہہ رہا تھا کہ بہت سیر ہو چکی۔ اب واپس چلیں۔ پر وہ دلیر سنگھ کی ماں ہے نا۔ اس نے کہا تھا' ایک دن اور رک جائیں۔ رک گئے ایک دن۔ اور دیکھ لیا نتیجہ۔ اب کمرے میں بیٹھی رو رو کے پاگل ہو رہی ہے۔"

دلیر سنگھ سردار جی کا وہ بیٹا تھا جس کی شادی صرف تین مہینے پہلے ہوئی تھی اور دو دن پہلے ڈاکو دوسرے سیاحوں کے ساتھ ان میاں بیوی کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

سردار جی جالندھر کے رہنے والے تھے اور بہت عرصے بعد اپنی فیملی کو لے کر سیر و تفریح کے لیے نکلے تھے اور اب پچھتا رہے تھے کہ دو دن پہلے وہ یہاں سے چلے کیوں نہیں گئے۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ سیر کے لیے کہیں اور چلتے ہیں۔ اپنے پنجاب میں کیا تھوڑی جگہیں ہیں سیر کرنے کے لیے پر دلیر سنگھ تو راجستھان دیکھنا چاہتا تھا۔ یہاں پرانے راجوں کے محل اور حویلیاں دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھ لیا۔ یہ تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کا علاقہ ہے۔ اب جان سولی پر ٹنگی ہوئی ہے۔"

سردار جی بولتے رہے اور میں سنتا رہا۔ سردار جی جنگل ریسٹورنٹ جانا چاہتے تھے تاکہ تازہ ترین صورت حال کا پتا چل سکے۔ یہ سب کچھ تو میں بھی جاننا چاہتا تھا۔

میں ہٹ میں آ گیا۔ دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی

صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ ٹھاکر وغیرہ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے فریج میں سے بوتل نکال کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور میز پر سے گاڑی کی چابیوں کا رنگ اٹھا کر باہر آ گیا۔ ہٹ کے دروازے کو میں نے باہر سے کنڈا لگا دیا تھا۔

اس پکنک پوائنٹ پر بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ چاروں آدمی بھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس آئے تھے جو ڈاکوؤں سے مذاکرات کے لیے کل دوپہر کے وقت جنگل میں داخل ہوئے تھے۔

مذاکرات ناکام ہو گئے تھے۔ گنگولی چوہدری اپنے بھائی چڑا کی رہائی سے کم کسی بات پر سودا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے یہ دھمکی ایک بار پھر دہرائی تھی کہ اگر مقررہ مدت تک اس کے بھائی کو رہا نہ کیا گیا تو وہ یرغمالیوں کو ہلاک کر دے گا۔

مایوسی بڑھ گئی۔ لوگوں نے ایک بار پھر اس مشن کے انچارج انسپکٹر ونوڈ پانڈے کو گھیر لیا۔

"آپ لوگ جنگل پر چڑھائی کیوں نہیں کرتے۔" ایک آدمی نے چیخ کر کہا "کیا آپ لوگ اس وقت کوئی قدم اٹھائیں گے جب ڈاکو بے گناہ یاتریوں کی لاشیں گرانا شروع کر دیں گے؟"

"جنگل میں دو تین چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔" انسپکٹر ونود پانڈے نے جواب دیا "ان بستیوں کے لوگوں اور ڈاکوؤں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ ڈاکو تو بچ جائیں گے لیکن دھوکے میں بے گناہ دیہاتی مارے جائیں گے۔ ہمیں جو بھی قدم اٹھانا ہو گا' بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔"

یہ جھگڑا جاری رہا اور میں ان آدمیوں میں سے ایک کے پاس بیٹھ گیا جو جنگل سے واپس آئے تھے۔ وہ دہلی کا رہنے والا مہیش چوپڑا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس کی بیوی سیتا ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔ وہ لوگ ہمارے قریبی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

مہیش چوپڑا کے کہنے کے مطابق وہ اس روز کچھ چیزیں خریدنے کے لیے بازار کی طرف گیا ہوا تھا کہ پیچھے یہ واقعہ پیش آیا اور ڈاکو دوسرے لوگوں کے ساتھ سیتا کو بھی اٹھا کر لے گئے۔

سیتا عمر میں مہیش چوپڑا سے تقریباً پندرہ سال چھوٹی تھی۔ تیس سال کی عمر میں بھی وہ نو عمر لڑکیوں کی طرح نظر آتی تھی۔ مہیش چوپڑا نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ تین مہینے کے حمل سے تھی۔ ان کی شادی کو اگرچہ دس سال ہو چکے تھے لیکن ان کے جیون میں پہلی مرتبہ پھول کھلنے کی امید پیدا ہوئی تھی اور وہ اسی لیے پریشان بھی تھا۔

"ان ظالموں نے مجھے میری پتنی سے ملنے بھی نہیں دیا۔" مہیش چوپڑا کہہ رہا تھا "انہوں نے تمام یرغمالیوں کو ہم سے دور رکھا۔ کسی سے نہیں ملنے دیا گیا۔"

میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے کہنے کے ...مطابق" جنگل میں داخل ہونے کے تقریباً چار گھنٹوں بعد اچانک ہی دو آدمیوں نے ہمیں رائفلوں کی زد پر لے لیا تھا۔ وہ دونوں آدمی درختوں کی گنجان شاخوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ ہمارے پاس ایک رائفل تھی جو انہوں نے ہم سے چھین لی اور ہمیں وہاں سے تقریباً تین میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں لے گئے۔

"یہ بستی دس بارہ گھروں پر مشتمل تھی اور جنگل سے گزرنے والی سڑک سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ اس وقت اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہمیں ایک جھونپڑے میں بند کر دیا گیا۔

"آدھی رات کے قریب دو اور آدمی وہاں پہنچ گئے.... اور وہ لوگ ہمیں بستی سے تقریباً پانچ میل دور لے گئے۔ اس گنجان جنگل میں تو دن میں بھی اندھیرا ہی رہتا ہے اور رات کے وقت تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ لوگ اس طرح چل رہے تھے جیسے اس جنگل کا چپا چپا ان کا دیکھا بھالا ہو اور گہری تاریکی میں بھی انہیں چلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی جبکہ ہم قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے تھے۔

"وہ لوگ ایک پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں دو مشعلیں روشن تھیں جن میں شاید کسی جانور کی چربی استعمال کی جا رہی تھی۔ گنگولی چوہدری کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ یرغمالی ہم سے دور بیٹھے ہوئے تھے اور تین چار آدمی ان پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔

"ہم صبح چار بجے تک گنگولی چوہدری سے مذاکرات کرتے رہے۔ اسے منہ مانگی رقم کی پیشکش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ اسے صرف اپنا بھائی چاہیے۔ اس نے یہ دھمکی بھی دہرائی کہ اگر مقررہ وقت تک اس کے بھائی کو رہا نہ کیا گیا تو وہ یرغمالیوں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دے گا۔

"صبح پانچ بجے ہمیں دو آدمیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹا پہلے ہی یہاں پہنچے ہیں۔ ہم نے سب کچھ ان افسروں کو بتا دیا ہے لیکن پتا نہیں یہ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟"

میں تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں گھوم پھر کر معلومات

حاصل کرتا رہا۔ یہ جان کر مجھے بہرحال اطمینان ہوا تھا کہ ان ڈاکوؤں نے یرغمالیوں، خصوصاً خواتین کے ساتھ ابھی تک کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔

میں جب واپس پہنچا تو روپ متی، ٹھاکر اور جانکی ابھی تک سو رہی تھیں۔ میں نے ہٹ کا دروازہ اور کھڑکیاں پوری طرح کھول دیں اور کچن میں آ کر اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

میں باہر لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ٹھاکر بھی اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں نے اسے اب تک کی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

"مجھے لگتا ہے پولیس افسران اور دوسرے حکام اپنی ضد نہیں چھوڑیں گے اور گنگولی چوہدری بھی اپنی ہٹ سے باز نہیں آئے گا۔" ٹھاکر نے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی "اگر یرغمالیوں میں سے کوئی ایک بھی مارا گیا تو بڑے خوفناک ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔"

"ایسی صورت میں یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اپنے طور پر جنگل میں داخل ہونے کی کوشش کریں لیکن ایسا کرنا خطرناک ہوگا۔" میں نے کہا۔

"پولیس کسی کو جنگل میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔" ٹھاکر نے کہا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ جانکی اور روپ متی بھی جاگ گئیں اور پھر ناشتے وغیرہ کی تیاری ہونے لگی۔

بارہ بجے کے قریب ہم ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ یہ ریسٹورنٹ ان دنوں انفارمیشن سینٹر بنا ہوا تھا۔ یہیں سے کچھ معلومات حاصل ہو رہی تھیں۔

ٹھاکر انسپکٹر ونود پانڈے سے بات کر رہا تھا۔ جانکی اور روپ متی ایک درخت کے سائے میں گھاس پر بیٹھی ہوئی تھیں اور میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا اور بالآخر میں اس آدمی کے قریب رک گیا جو ایک طرف کھڑا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

اس شخص کو میں دو تین دن سے یہاں دیکھ رہا تھا۔ اغوا ہونے والے سیاحوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گیسٹ ہاؤس یا ہٹ وغیرہ میں بھی نہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ شہر سے بہت سے لوگ تماشا دیکھنے یہاں جمع ہوئے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ یہ شخص بھی انہی میں سے کوئی ہو۔ نہ جانے کیوں، وہ شخص مجھے مشتبہ سا لگ رہا تھا۔ "کوئی نئی خبر؟" میں نے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لمبا قد، سفید کرتا اور چوڑے پائنچوں کا سفید پاجامہ۔ پیروں میں ہوائی چپل جو خاصی پرانی لگ رہی تھی۔

وہ غالباً باقاعدگی سے شیو بنانے کا عادی تھا۔ مونچھیں ہونٹوں کے کناروں سے چوہے کی دم کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ سر کے بال بھی چڑیا کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پلاسٹک کے کالے فریم والی عینک تھی جو اس کے چہرے پر کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اس کی رنگت آبنوس کی لکڑی کی طرح خاصی گہری تھی۔

"کوئی نئی خبر نہیں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں گنگولی چوہدری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سالا حرامی یاتریوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پولیس کو چترا کو چھوڑنا ہوگا۔"

"تم گنگولی چوہدری کو کیسے جانتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"سب ہی لوگ جانتے ہیں۔ پر میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ جانکاری رکھتا ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا "دو تین مرتبہ اس سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ سالا بہت خطرناک آدمی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تمہاری ایک مہیلا (عورت) اس کے قبضے میں ہے۔ تم خود اسے چھڑانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تین دن سے باقاعدگی سے یہاں آ رہا تھا۔ وہ سب جانتا تھا کہ یہاں آنے والے کون لوگ تماشائی ہیں اور کون یرغمالیوں کے رشتے دار ہیں۔

"تمہارا خیال ہے کہ ہم میں سے کوئی آدمی کسی ایسی کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"کوشش کی جا سکتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہماری طرف آ گیا۔ وہ شخص وہاں سے کھسکنے لگا تو سب انسپکٹر نے اسے گردن سے دبوچ لیا۔

"اے نارائن۔" سب انسپکٹر اس کی گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے غرایا "سالے حرامی۔ یہاں بھی اپنا دھندا چلا رہا ہے۔ بھاگ جا یہاں سے۔ دوبارہ نظر آیا تو لے جا کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دوں گا۔"

اس شخص کا نام نارائن تھا۔ وہ انسپکٹر کو گھورتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے نارائن کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ سارے شہر کی پولیس اسے جانتی ہے۔ وہ شہر میں گھوم پھر کر چرس اور ہیروئن فروخت کرتا ہے۔ سیاحوں کے ہٹس، گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹل اس کی شکار گاہیں ہیں۔ ان مقامات پر اسے آسانی سے گاہک مل جاتے ہیں۔ وہ سیر و تفریح کے لیے اکیلے آنے والے مرد سیاحوں کو لڑکیاں بھی سپلائی کرتا ہے۔

سب انسپکٹر کو میں نے یہ نہیں بتایا کہ نارائن سے میری کیا بات ہو رہی تھی لیکن اب نارائن کسی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے گنگولی چوہدری کے بارے میں بڑے وثوق سے کچھ باتیں کی تھیں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ گنگولی چوہدری کے بارے میں دوسروں سے زیادہ جانکاری رکھتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہی شہروں میں ڈاکوؤں کے ایجنٹ کا کام کرتے ہیں اور انہیں خفیہ طور پر اطلاعات فراہم کرتے رہتے ہیں۔

میں نے نارائن کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا مگر وہ نظر نہیں آیا۔ شاید سب انسپکٹر کی دھمکی نے اسے وہاں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے ٹھاکر کو نارائن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

ہم نے وہ دن وہیں رہ کر گزار دیا۔ آج گنگولی چوہدری کی دی ہوئی مہلت کا تیسرا اور آخری دن تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ بار بار پولیس آفیسروں کو گھیر رہے تھے۔ انسپکٹر ونود پانڈے کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس گنگولی چوہدری کے بھائی چترا کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

میری تشویش بھی بڑھ رہی تھی۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں بھی بے بسی کے تاثرات نمایاں تھے۔ ہر شخص مایوس دکھائی دے رہا تھا لیکن ظاہر ہے کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس نہ تو چترا کو چھوڑنے کو تیار تھی اور نہ ہی کسی کو جنگل میں داخل ہونے کی اجازت دے رہی تھی۔

شام ہو گئی اور پھر اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم وہاں سے آ گئے۔ ہماری وہ رات بھی جاگتے ہوئے ہی گزری۔ یوں تو ہم تمام یرغمالیوں کے لیے پریشان تھے۔ وہ سب بے گناہ تھے لیکن ہمیں بھگت اور بملا کے بارے میں زیادہ تشویش تھی کہ یہ دونوں ہمارے اپنے تھے۔

صبح چھ بجے گیسٹ ہاؤس سے ملی جلی آوازیں سن کر ہم باہر آ گئے۔ اس وقت ہم چائے پی رہے تھے۔ ٹھاکر نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خالی کپ قریب کھڑی ہوئی جانکی کی طرف بڑھا دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

"کوئی گڑبڑ ہے۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں ریسٹورنٹ کی طرف جا رہا ہوں۔"

"ہم بھی تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ چائے کا آخری گھونٹ میرے حلق سے نہیں اترا تھا۔

دس منٹ بعد ہماری پجارو تیز رفتاری سے جنگل کے کنارے ریسٹورنٹ کی طرف دوڑ رہی تھی۔

وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین ہے جس کی خبر آناً فاناً پورے شہر میں پھیل گئی تھی اور بہت سے لوگ یہاں جمع ہو گئے تھے۔

ہم لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے تو ٹھٹک کر رک گئے۔ ریسٹورنٹ کی مختصر سی عمارت کے سامنے گھاس پر ایک لاش پڑی تھی۔ ہاں وہ لاش ہی تھی جو چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور چادر پر خون کے دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔ مسلح پولیس والوں نے لاش کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔

انسپکٹر ونود پانڈے بھی موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ آج صبح پانچ بجے جنگل میں ایک بستی کے دو آدمیوں نے آ کر اطلاع دی کہ گنگولی چوہدری کے آدمی یہاں سے تقریباً نصف میل دور ایک عورت کی لاش پھینک گئے ہیں۔ ہم وہ لاش اٹھا لائے ہیں لیکن ابھی تک اس کی شناخت نہیں ہو سکی۔ یرغمالیوں کے تمام رشتے داروں کو اطلاع بھجوا دی ہے۔ وہ آئیں گے تو اس کی شناخت ہوگی۔

مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا اور ہم دونوں لاش کے قریب آ گئے۔ پیٹ کی جگہ پر چادر کچھ اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور چادر کا وہی حصہ خون سے تر ہو رہا تھا۔

ٹھاکر نے جھک کر چادر کا کونا پکڑ کر اٹھایا تو اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

لاش کا چہرہ دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ بملا نہیں تھی۔ ٹھاکر نے بھی چادر برابر کر دی اور سیدھا ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ لاش بملا کی نہیں تھی لیکن وہ ایک عورت کی لاش تو تھی جو سرکار کے سرکاری افسران کی ضد کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ گنگولی چوہدری نے الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر تین دن کے اندر اندر اس کے بھائی کو نہ چھوڑا گیا تو چوتھے دن وہ یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دے گا۔ اس نے اپنی بات پوری کر دی تھی۔ آج اس نے پولیس اور ضلعی حکام کو پہلی لاش کا تحفہ بھیج دیا تھا۔

میں ایک بار پھر لاش کو دیکھنے لگا۔ اس کا پیٹ ابھرا ہوا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی میں کانپ اٹھا۔

ابھی کل ہی تو میش چوپڑا سے میری بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کی پتنی سیتا تین مہینوں کے حمل سے تھی۔ میں نے پہلے سیتا کو نہیں دیکھا تھا لیکن اس لاش کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سیتا ہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس معصوم روح کو بھی کچل دیا گیا تھا جو دنیا میں آنے کی تیاری کے ابتدائی مرحلے میں تھی۔

لوگ آتے رہے اور چادر ہٹا کر لاش کو دیکھتے رہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میش چوپڑا بھی پہنچ گیا اور پھر وہاں جو منظر دیکھنے میں آیا وہ قیامت سے کم نہیں تھا۔

میش چوپڑا دیر تک سیتا کی لاش سے لپٹا دھاڑیں مارتا رہا۔ پولیس کے ایک سب انسپکٹر نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اس پر پلٹ پڑا۔

میش چوپڑا پر جنون طاری ہو گیا۔ اس نے سب انسپکٹر کی وردی پھاڑ دی اور اسے زمین پر گرا کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھ اس کے نرخرے پر جما دیے۔ وہ اسے گلا گھونٹ کر مار دینا چاہتا تھا۔

چھ سات پولیس والوں نے بڑی مشکل سے سب انسپکٹر کو اس کے شکنجے سے نجات دلائی تھی۔ آٹھ دس کانسٹیبل میش چوپڑا کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ سانڈ کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ اسے بے بس کرنے کے لیے پولیس والے اس کی پٹائی بھی کر رہے تھے۔ ایک زوردار ضرب لگنے سے اس کے سر سے خون بہہ نکلا۔

یہ زیادتی دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور لپک کر ان پولیس والوں پر پل پڑا جو میش چوپڑا کی پٹائی کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور پولیس والا مداخلت کرتا' دو کانسٹیبل میرے ہاتھوں بری طرح پٹ چکے تھے۔ ایک کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا اور دوسرے کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

چند پولیس والے مجھے پکڑنے کے لیے لپکے تو وہاں جمع بیسیوں لوگوں نے بجرنگ بلی کا نعرہ لگاتے ہوئے پولیس والوں پر حملہ کر دیا اور اس طرح وہاں ایک باقاعدہ محاذ کھل گیا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے پولیس نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی اور شہر سے بھی پولیس کی بھاری نفری پہنچ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد یہ ہنگامہ فرو ہو سکا تھا اور لطف کی بات تو یہ تھی کہ پولیس کی ہوائی فائرنگ کے باوجود کوئی بھی شخص وہاں سے بھاگا نہیں تھا۔ جن لوگوں کے رشتے دار ڈاکوؤں کے قبضے میں تھے وہ بری طرح بپھرے ہوئے تھے۔ تماشا دیکھنے کے لیے شہر سے آئے ہوئے لوگ بھی طیش میں آئے ہوئے تھے۔ یہ لوگ پہلے ہی ڈاکوؤں کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے اور آج تو پولیس کے رویے کے خلاف سب کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد ڈپٹی کمشنر بھی پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ مجھے اور چار دوسرے آدمیوں کو پولیس والوں پر حملہ کرنے کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کی آمد کے فوراً ہی بعد چند معززین بھی شہر سے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر ہمارے خلاف قانونی چارہ جوئی اور ہمیں جیون بھر جیل میں سڑانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میرے حق میں سب سے پہلی آواز ٹھاکر نے اٹھائی تھی اور پھر شہر سے آئے ہوئے معززین بھی اس زبانی جنگ میں کود پڑے۔

"آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔" رانے پرتاب سنگھ نامی ایک بھاری بھرکم آدمی نے ڈپٹی کمشنر کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا "آپ لوگوں کی ضد کی وجہ سے ایک بے گناہ عورت ماری گئی۔ اس کے پیٹ میں اس کے بچے کی بھی جان لے لی گئی۔ اور کوئی مثبت قدم اٹھانے کے بجائے آپ لوگوں نے اس عورت کے شوہر کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ کیا کسی کو اپنے ساتھ زیادتی کے خلاف احتجاج کا بھی حق نہیں ہے اور جن لوگوں نے اسے بچانے کی کوشش کی انہیں جیل میں سڑانے کی دھمکیاں دے رہے ہو۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔"

"احتجاج کا یہ طریقہ....."

"سن رے ڈپٹی۔" ایک اور شخص نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ اور صحت قابل رشک تھی۔ اس نے سفید کرتہ اور سفید دھوتی پہن رکھی تھی۔ سر پر چنری جیسے کپڑے کی بل دار پگڑی تھی۔ ماتھے پر سیندور کا ٹیکا لگا ہوا تھا "ہم بہت دیکھ لیا ہوں اور سن بھی لیا ہوں۔ بہت ہو چکا یہ کھیل تماشا۔ اب اگر گنگولی چودھری کی طرف سے کوئی لاش آئی تو ہم تمہارے کو تمہارے بنگلے میں باندھ کر آگ لگا دیویں گے۔ جہنم میں جا کر ڈپٹی کمشنری کرتے رہنا۔ بو[ل] کیا بولتا ہے؟"

"راناجی۔ آپ حالات کو سمجھنے کی کوشش....."

"ہم حالات کو سمجھ لیا ہوں۔" راناجی نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "آج سانجھ (شام) سے پہلا پہلا ان

تمام یاتریوں کو یہاں ہونا چاہیے۔ کسی کو کوئی نقصان پہنچا تو تھاری چھٹی۔ بول کیا بولتا ہے۔ اور سن۔ ان منشوں کو چھوڑ دے۔" اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

اس مرتبہ ڈپٹی کمشنر جواب دینے کے بجائے ایک طرف ہٹ کر پولیس اور انتظامیہ کے چند اور آفیسروں کے ساتھ مشورہ کرنے لگا اور دس منٹ بعد ہی اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ٹھیک ہے رانا جی۔" وہ بولا "ہم گنگولی کے بھائی چترا کو چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ دوسرے یاتریوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔"

"چترا کو ابھی جیل سے نکال کے لاؤ اور جنگل میں دھکا دے دو اس راکشش کو۔" رانا جی نے کہا۔

"ایسا نہیں ہوگا رانا جی۔" ڈپٹی کمشنر نے کہا "ہم گنگولی چوہدری کو پہلے پیغام بھیجیں گے کہ ہمیں اس کی شرط منظور ہے۔ اس کے بعد یاتریوں اور چترا کے تبادلے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ تمام یاتری آج شام سے پہلے پہلے یہاں آجائیں گے۔"

اس طرح رانا جی اور شہر کے دوسرے با اثر لوگوں کی مداخلت سے یہ معاملہ طے ہوگیا۔ جن کے رشتے دار ڈاکوؤں کی قید میں تھے وہ خوش ہوگئے مگر میش چوپڑا کی بیوی اور اس کے پیٹ میں پلنے والا بچہ سرکار کی ضد کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ سیتا کی لاش اٹھا دی گئی اور اس کے کریا کرم کی تیاری ہونے لگی۔

وہ دو دیہاتی جو سیتا کی لاش لے کر آئے تھے انہیں پیغام دے کر گنگولی چوہدری کے پاس بھیج دیا گیا۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی وہیں ڈیرا جمائے رہے۔ چترا کو بھی جیل سے نکال کر وہاں لے آیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور اسے پولیس کی کڑی نگرانی میں ریسٹورنٹ کے برآمدے میں بٹھایا گیا تھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر اس طرح اسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

اور وہ واقعی ایک عجوبہ تھا۔ چترا کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ساڑھے پانچ فٹ کے قریب قد' صحت مند جسم' وہ نیلی جینز اور اوپن شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ دونوں کپڑے میلے ہو رہے تھے۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کئی روز کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ مونچھوں کے بال بھی بے ترتیب تھے۔ سر کے بال خاصے لمبے تھے جنہیں ربر بینڈ سے چٹیا کی صورت میں باندھ رکھا تھا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کے دونوں کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں۔ وہ صورت ہی سے راکشش لگتا تھا۔۔۔۔ وحشی۔ چترا کو دیکھ کر اس کے بھائی گنگولی چوہدری کے بارے میں بھی رائے قائم کی جاسکتی تھی۔ ایسے لوگوں سے کسی رحم کی توقع کرنا دنیا کی سب سے بڑی حماقت ہی کہلا سکتی تھی۔

شام ہوگئی۔ ان دونوں دیہاتیوں کے ذریعے پیغام رسانی کا سلسلہ جاری رہا۔ ہماری طرح دوسرے لوگ بھی اپنے پیاروں کی واپسی کی امید لگائے وہاں بیٹھے رہے اور بالآخر شام کے لگ بھگ گنگولی چوہدری کا آخری پیغام ملا کہ صبح چھ بجے دو غیر مسلح پولیس والے چترا کو لے کر وہاں سے تقریباً ایک میل جنگل کے اندر ندی کے کنارے پر اس جگہ پہنچ جائیں جہاں چار درخت تازہ کٹے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں دیہاتی ان کی رہنمائی کریں گے۔ گنگولی چوہدری نے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر وہ دونوں پولیس والے مسلح ہوئے یا انہیں دھوکے سے گھیرنے کی کوشش کی گئی تو ان یاتریوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔

یہ پیغام ملنے کے بعد وہاں کھڑے رہنا بے کار تھا۔ ہم اپنے ہٹ کی طرف جانے کے بجائے شہر آگئے۔ شہر میں یہی چرچے تھے۔ لوگوں کو سیتا کی موت کا افسوس بھی تھا اور اس بات کی خوشی بھی کہ دوسرے یاتریوں کے جیون بچ جانے کی امید پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں میں ڈپٹی کمشنر' پولیس اور دیگر افسران کے خلاف غصہ بھی پایا جاتا تھا۔

رات نو بجے کے قریب ہم نے سارسکا پیلس ہوٹل میں کھانا کھایا اور اپنے ہٹ میں واپس آگئے۔ آس پاس کے ہٹوں میں رہنے والے لوگ گیسٹ ہاؤس میں جمع تھے۔ جانکی اور روپ متی کو ہٹ میں چھوڑ کر میں اور ٹھاکر بھی گیسٹ ہاؤس کی طرف چل دیے۔ ہم سیتا کے کریا کرم میں شریک نہیں ہوسکے تھے لیکن میش چوپڑا کو پرسہ دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا۔

میش چوپڑا کی حالت واقعی بہت بری تھی۔ اس کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا تھا۔ بیوی کے ساتھ اس کے ہونے والے بچے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

ہم گیارہ بجے کے قریب اپنے ہٹ میں واپس آئے تو ہمارا پڑوسی بوڑھا سردار جی اور اس کی بیوی وہاں بیٹھے جانکی اور روپ متی سے باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے آنے کے تھوڑی دیر بعد وہ چلے گئے۔

ہماری وہ رات بھی جاگتے ہوئے گزری۔ راتوں جاگ جاگ کر اور بے آرامی سے ہم سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ سب کی آنکھیں سرخ اور چہرے ستے ہوئے تھے۔ میری

کیفیت ان سے ذرا مختلف تھی۔ میں ببلا کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین اور پریشان تھا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔ مجھے وہ صبح یاد تھی جب ٹھاکر کی حویلی میں وہ سو رہی تھی اور میں اسے پیار کرنے کے لیے غیر اختیاری طور پر اس کے چہرے پر جھکا جا رہا تھا۔

میں نے کسی لڑکی کے لیے اتنی بے چینی اور دل میں اتنی بے کلی کبھی بھی محسوس نہیں کی تھی۔ سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

ہم صبح پونے چھ بجے جنگل کے کنارے پہنچ گئے۔ بہت سے لوگ ہم سے پہلے ہی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ پولیس بھی پہلے سے زیادہ تعداد میں نظر آ رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر بھی پہنچ چکا تھا۔ رانا جی اور کچھ اور معززین بھی پھولوں کے ہار لے کر یاتریوں کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔

رانا کا تعلق سارسکا کے سابق مہاراجا کے خاندان سے تھا۔ اسے شہر کی اہم ترین شخصیت کہا جاسکتا تھا اور یہ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سرکاری حکام گنگولی چوہدری کے بھائی کو واپس کرنے پر تیار ہوئے تھے۔

پولیس کے دو غیر مسلح آدمی چترا کو لے کر جنگل میں جا چکے تھے۔ ان کے ساتھ وہ دونوں دیہاتی بھی تھے۔ وہ جگہ یہاں سے ایک میل دور تھی جہاں یاتریوں اور چترا کا تبادلہ عمل میں آنے والا تھا۔

ہم سب کی نظریں جنگل کی طرف سے آنے والے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ وقت بہت دھیمی رفتار سے گزر رہا تھا۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

سوا چھ بجے کے قریب جنگل کی طرف سے ایک فائر کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دی تو سب ہی اچھل پڑے۔ ہر چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ سب لوگ سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا گنگولی چوہدری نے بدعہدی کی تھی؟ یہ سوال میرے ذہن میں بھی اٹھ رہا تھا لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

رائفل کے اس ایک فائر کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دی تھی۔

اس کے بعد وقت کی رفتار جیسے ایک بار پھر تھم گئی تھی۔ لوگوں کے چہروں پر پریشانی اب بھی مترشح تھی۔ شاید ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر سوچ رہا تھا کہ فائر کیوں ہوا تھا؟ گولی کس پر چلائی گئی تھی؟

آدھا گھنٹا اور گزر گیا اور پھر گنجان درختوں میں کچھ لوگوں کی جھلک دیکھ کر وہاں کھڑے ہوئے سب ہی لوگ بیک وقت چیخ اٹھے۔

"آگئے۔ وہ لوگ آگئے۔"

لوگ جنگل سے آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے ان کی طرف لپکے۔ وہ لوگ تقریباً سو گز دور تھے۔ میں بھی ٹھاکر کے ساتھ دو قدم آگے بڑھا پھر ٹھٹک کر رک گیا۔ پیچھے دو آدمیوں نے ایک آدمی کو اٹھایا ہوا تھا۔

وہ لوگ تعداد میں بارہ تھے اور میری نظریں ایک ایک کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں مگر مجھے ان میں وہ چہرہ نظر نہیں آیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ تین عورتیں تھیں حالانکہ عورتوں کی تعداد چار ہونی چاہیے تھی مگر وہ تین تھیں اور ان میں ببلا نہیں تھی۔ جس شخص کو دو آدمیوں نے اٹھایا ہوا تھا' وہ بھگت تھا۔

ہم سب تیزی سے آگے بڑھے۔ قریب آکر انہوں نے بھگت کو گھاس پر لٹا دیا۔ اس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔

لوگ اپنوں سے گلے مل رہے تھے۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے جا رہے تھے۔ انہیں زندہ سلامت واپس آجانے پر مبارک باد دی جا رہی تھی مگر میرا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ببلا ان لوگوں میں نہیں تھی اور بھگت زخمی تھا۔ میں دوڑ کر بھگت کے قریب پہنچ گیا۔

"کیا ہوا بھگت۔ ببلا کہاں ہے؟" میں نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔

"بولتے کیوں نہیں بھگت۔ ببلا کہاں ہے؟" یہ سوال ٹھاکر نے کیا تھا جو دوسری طرف بھگت پر جھکا ہوا تھا۔

"ٹھاکر جی۔" بھگت نے مردہ سی آواز میں جواب دیا "گنگولی چوہدری اور اس کے آدمی ہم لوگوں کو لے کر ندی کے پاس آئے تھے۔ عین وقت پر گنگولی چوہدری نے ببلا دیوی کو بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور اعلان کیا کہ یہ چھوکری نہیں جائے گی۔ پہلے تو کچھ دیر بحث ہوتی رہی کہ وہ وعدہ خلافی کر رہا ہے مگر گنگولی ببلا دیوی کو چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ چھوکری اسے پسند آگئی ہے اور اس کے پاس ہی رہے گی۔ میں نے گنگولی پر حملہ کر دیا۔ اس کے دو آدمیوں نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا۔

"گنگولی چوہدری نے میرے اوپر رائفل تان لی اور کہا کہ ہم لوگوں کو زندہ واپس کرنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو مجھے چھلنی کر دیتا لیکن مجھے میری گستاخی کی سزا دینے کے لیے اس

نے میری ٹانگ پر گولی چلا دی اور بملا کو کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا۔

"گنگولی کے آدمی ہم پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ اس کے بھائی چترا کے ہاتھ کھول دیے گئے تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک رائفل آ گئی تھی۔ اس نے حکم دیا کہ ہم سب وہاں سے چلے جائیں ورنہ وہ فائر کھول دے گا۔"

ڈپٹی کمشنر اور دوسرے لوگوں کو بھی یہ خبر ہو گئی کہ گنگولی چوہدری نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے ایک لڑکی کو زبردستی روک لیا ہے۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ کا دماغ ہی پلٹ گیا تھا۔ اب ہنگامہ کرنے کی باری اس کی تھی۔ ڈپٹی کمشنر جانتا تھا کہ اس کا تعلق جے پور کے کس خاندان سے ہے۔ رانا جی سے بھی واقفیت نکل آئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے ٹھاکر کو سنبھالا۔

"فکر مت کر ٹھاکر۔" اس نے ٹھاکر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہم پولیس والن کو یہاں سے جانے نہیں دیوں گا جب تک تمہاری چھوکری واپس نا ہی آجاوت ہے۔"

اور پھر رانا نے ڈپٹی کمشنر اور پولیس افسران کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ڈپٹی کمشنر کو ایک بار پھر گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور پولیس کی ایک پارٹی ڈاکوؤں کے تعاقب میں بھیج دی گئی۔

بھگت کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر کے لیے ہم بھی اسپتال گئے تھے۔ وہاں ہٹ کا ملازم اور ننگر پہلے ہی زخمی پڑے ہوئے تھے۔ تیسرا بھگت بھی پہنچ گیا۔

روپ متی اور جانکی کو ہٹ میں چھوڑ کر میں اور ٹھاکر واپس اسی جگہ پر آ گئے۔ وہاں پولیس والوں کے علاوہ صرف چند لوگ رہ گئے تھے۔ ایک طرف مجھے نارائن بھی نظر آ گیا۔ وہ لان کے آخری سرے پر ریلنگ کے پائپ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں ٹھاکر کو وہیں چھوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا اور ریلنگ پر دونوں بازو ٹکا کر نارائن کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی بات کا منتظر ہو یا کسی خاص چیز کی تلاش میں ہو۔ اس کے دائیں کندھے پر کپڑے کا ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

"تمہاری چھوکری کو اس نے نہیں چھوڑا۔ وہ بہت حرامی ہے۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "اسے جو چیز پسند آجاتی ہے وہ واپس نہیں کرتا۔۔۔ چھیننا پڑے گا۔۔۔ اور گنگولی چوہدری سے کوئی چیز چھیننا ایسا ہی ہے جیسے شیر کے منہ سے اس کا نوالہ چھیننے کی کوشش کی جائے۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں جانا پڑے گا شیروں کی اس کچھار میں۔" نارائن نے جواب دیا "کل میں نے تمہیں پولیس والوں کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے جس طرح ان کی ہڈیاں توڑی تھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے اندر دم خم ہے اور شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہو۔ یہ جو پولیس والے گئے ہیں نا۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "یہ لوگ بے گناہ اور نہتے لوگوں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسا سکتے ہیں۔ گھوس (رشوت) کھا سکتے ہیں لیکن ان میں تو شہر کے سڑک چھاپ غنڈوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں، گنگولی چوہدری جیسے درندوں کا مقابلہ کرنے کی شکتی (طاقت) کہاں سے لائیں گے۔ یہ لوگ سانجھ (شام) سے پہلے پہلے پٹ پٹا کر واپس آجائیں گے۔ ہو سکتا ہے کندھوں پر اپنے ہی ایک دو ساتھیوں کی لاشیں بھی اٹھائے ہوئے ہوں۔"

"تم نے کہا تھا کہ مجھے جانا پڑے گا۔" میں نے کہا "لیکن میں کیسے جا سکتا ہوں۔ پولیس والے مجھے نہیں جانے دیں گے اور پھر سنا ہے کہ جنگل میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ میں انہیں کیسے تلاش کروں گا اور پھر سنا ہے اس جنگل میں شیر اور چیتے جیسے درندے بھی ہیں۔"

"گنگولی چوہدری اور اس کے ساتھیوں سے زیادہ خوں خوار درندے اور کون ہو سکتے ہیں۔" نارائن نے کہا "اگر تم اپنی چھوکری کو ان درندوں کی چیر پھاڑ سے بچانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیا۔۔۔؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں تمہیں جنگل میں لے جاؤں گا۔" نارائن نے جواب دیا "مجھے معلوم ہے وہ لوگ کہاں ہوں گے۔ میں تمہیں ان کے ٹھکانے تک لے جاؤں گا۔ تمہارے اندر طاقت ہے۔ تم اس چھوکری کو بچا سکتے ہو۔"

"تمہارے اس تھیلے میں کیا ہے؟" میں نے موضوع سے ہٹ کر بالکل مختلف سوال کر ڈالا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے جواب دیا "تمہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ وہ سب انسپکٹر بکواس کرتا تھا کہ میں نشے کی چیزیں بیچتا ہوں۔"

"کیا تم مجھے یہ تھیلا دکھا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے کچھ کہے بغیر تھیلا کندھے سے اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے تھیلا کھول کر دیکھا۔ پلاسٹک کی ایک تھیلی میں پاپے اور دوسری تھیلی میں دو تنوری روٹیاں تھیں۔ میں نے ان روٹیوں کو بھی کھول کر دیکھا۔ بیچ والی روٹی میں

مرچوں کا اچار رکھا ہوا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا جسے اس نے خاموشی سے کندھے پر لٹکا لیا۔

"تم نے بتایا نہیں۔ بھیڑیوں کے اس بھٹ میں جانے کو تیار ہو یا نہیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"اپنی خدمات کا کیا معاوضہ لو گے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" میں اچھل پڑا "بغیر کسی لالچ کے تم اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا چاہتے ہو؟"

"ہر کام میں کسی کا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔" نارائن نے جواب دیا "جنگل میں جانا میری بھی ضرورت ہے۔ مجھے تو ہر صورت میں جانا ہی ہے۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لے چلوں لیکن میں صرف تمہاری رہنمائی کروں گا۔ تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتا۔ ویسے میں جانتا ہوں۔ تم اپنی حفاظت بہتر طور پر کر سکتے ہو۔ تمہارے پاس اگر کوئی گن وغیرہ ہے تو ٹھیک ہے اگر چاہو تو میں تمہیں ایسی چیز دے سکتا ہوں۔ رشین۔ ایک دم فرسٹ کلاس اور قیمت بھی بہت کم۔"

"اوہ!" میں نے چونکتے ہوئے کہا "تو تمہارا اصلی دھندا یہ ہے۔"

"میں تمہیں گن خریدنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ اگر تمہارے پاس ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھ سے لینا چاہتے ہو تو واپس آکر لوٹا دینا۔ تمہاری پوری رقم تمہیں مل جائے گی۔"

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں ہو رہی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نارائن، بلونت سنگھ کا آدمی ہو اور مجھے پھنسا کر جنگل میں لے جانا چاہتا ہو۔ خوں خوار درندوں سے زیادہ خونی ڈاکوؤں کے جنگل میں پھنس کر زندہ لوٹ آنا دیوانے کا خواب ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہیں واقعی ایسا تو نہیں کہ بلونت سنگھ نے ہمیں اس شہر میں دیکھ لیا ہو اور کہیں چھپ کر بیٹھ گیا ہو اور اتفاق سے اس دوران میں یہ واقعہ پیش آ گیا اور بلونت سنگھ کے عیار دماغ نے یہ سازش تیار کر لی۔ اس کے ساتھ دارا بھی تو تھا۔ وہ اس سے زیادہ عیار تھا۔ وہ مجھے گنگولی چوہدری جیسے خطرناک ڈاکو کے جنگل میں پھنسا کر مجھ سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر سکتے تھے۔

"تمہیں ہم سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمدردی تم سے نہیں، اس لونڈیا سے ہے۔" نارائن نے جواب دیا "میں نے اس چھوکری کو دیکھا تھا۔ وہ اپسرا سے زیادہ حسین اور پھولوں سے زیادہ نازک ہے۔ وہ راکشش اسے چیر پھاڑ کر رکھ دے گا۔ وہ بھیڑیا ہے۔۔۔ بھیڑیا۔"

"اوہ!" میں نے اس کی طرف دیکھا "تو تم صرف اسی لیے ہماری مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" نارائن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو من کو بہت اچھی لگتی ہیں پر ہم جانتے ہیں انہیں حاصل نہیں کر سکتے مگر ان کی حفاظت تو کر سکتے ہیں۔ انہیں غلط ہاتھوں سے بچانے کی کوشش تو کر سکتے ہیں۔"

میں عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ بھی وحشی ہی لگتا تھا لیکن اس کی جمالیاتی حس! اس کے سینے میں بھی دھڑکتا ہوا دل تھا جو بملا کے حسن کو دیکھ کر مچل اٹھا تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے حاصل نہیں کر سکتا اور وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ بملا گنگولی چوہدری جیسے وحشی کے قبضے میں رہے اور اسی لیے وہ ہماری مدد کرنے کو تیار ہو گیا تھا اور مجھے جنگل میں چلنے کی ترغیب دے رہا تھا۔

"گن کتنے کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف پندرہ سو روپے۔" نارائن نے جواب دیا "دس ہزار کا مال ہے جو صرف پندرہ سو میں دوں گا اور رقم ابھی دینی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے گردن گھما کر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ ہم سے تقریباً تیس گز دور پولیس انسپکٹر کے پاس کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے نارائن کی آڑ لے کر پتلون کی جیب سے نوٹ نکالے اور پندرہ سو روپے اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے پوچھا۔

"پروگرام کیا ہے؟"

"صبح پانچ بجے اس طرف آجانا جہاں محکمہ جنگلات کا بورڈ لگا ہوا ہے۔" اس نے آنکھ سے بائیں طرف اشارہ کیا۔ "وقت کا دھیان رکھنا۔ ہم ٹھیک پانچ بجے اندر چلے جائیں گے۔ گن بھی تمہیں صبح مل جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں صبح پانچ بجے پہنچ جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

نارائن کے جانے کے بعد بھی میں ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا جنگل کی طرف دیکھتا رہا اور پھر فائرنگ کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ فائرنگ کی یہ آوازیں جنگل میں بہت دور سے

آتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

یہ آوازیں دوسروں نے بھی سنی تھیں اور وہ سب جنگل کی طرف دیکھ رہے تھے۔

تقریباً بیس منٹ تک سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازیں بتدریج دور ہوتی چلی گئی تھیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ٹھاکر کے قریب آگیا اور ہم اس فائرنگ کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔ صاف ظاہر تھا کہ پولیس اور ڈاکوؤں میں مڈھ بھیڑ ہوگئی تھی۔ ہمیں تشویش اس بات کی تھی کہ ببلا فائرنگ کی زد میں نہ آگئی ہو۔

میرا خیال تھا کہ پہلی پارٹی کی مدد کے لیے کوئی اور پولیس پارٹی بھیجی جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مزید کمک نہیں بھیجی گئی۔

پانچ بجے کے قریب صبح جنگل میں جانے والی پولیس پارٹی واپس آگئی۔ نارائن کا یہ کہنا سو فی صد درست ثابت ہوا تھا کہ پولیس والے پٹ کر واپس آئیں گے۔ دس آدمیوں میں سے تین زخمی تھے۔ انہوں نے ایک کی لاش شاخوں سے بنے ہوئے اسٹریچر پر اٹھا رکھی تھی اور باقیوں کے چہروں پر بے پناہ دہشت تھی۔

اس دن کی کارروائی بھی اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔ پولیس نے جنگل کا محاصرہ اٹھالیا۔ دو تین کانسٹیبلوں کو ریسٹورنٹ کے پاس چھوڑ دیا گیا اور پولیس نے وہاں اپنا کیمپ ختم کردیا اور اس طرح یہ ڈراما ختم ہوگیا۔

یہ ڈراما دوسروں کے لیے ختم ہوا تھا ہمارے لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے تو یہ کھیل اب شروع ہوا تھا۔ صرف میرے لیے۔

نارائن نے مجھے بھیڑیوں کے اس بھٹ میں جانے کے لیے اکسایا تھا اور یہ میرے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اب تک میں نے لوگوں سے گنگولی چوہدری کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس کے مطابق چوہدری انسان نہیں درندہ تھا۔ اس کا دوسرا نام موت تھا۔ طویل عرصے سے اس نے اس خطے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ جس طرف نکل جاتا اس طرف موت کے بادل چھا جاتے۔ عام لوگ تو اس کے نام ہی سے تھر تھر کانپتے تھے۔ پولیس بھی اس سے خوف زدہ تھی اور اس کی ایک مثال تو آج میں نے دیکھ ہی لی تھی۔

میں نے اس چیلنج کو قبول کرلیا تھا اور غالباً اس کے پیچھے ببلا سے لگاؤ کا جذبہ شامل تھا۔ اگر ببلا ڈاکوؤں کے قبضے میں نہ ہوتی تو میں اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑاتا مگر وہ ببلا ہی تھی جسے دیکھ کر میرے من میں کچھ کچھ ہونے لگا تھا اور میں اسے ہر قیمت پر گنگولی چوہدری سے بچانا چاہتا تھا اور اس کوشش میں میری جان بھی جاسکتی تھی لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

ہم وہاں سے سیدھے اپنے ہٹ واپس آئے تھے۔ جانکی اور روپ متی ہٹ کے سامنے والے لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم نے انہیں صورت حال سے آگاہ کیا تو ان دونوں کے چہروں پر تشویش گہری ہوگئی۔

"اب کیا ہوگا؟" جانکی نے پوچھا۔

"انسپکٹر ونود پانڈے کا کہنا ہے کہ ایک دو دن میں کوئی نئی حکمت عملی تیار کی جائے گی اور اس کے بعد بھرپور طریقے سے قدم اٹھایا جائے گا۔" ٹھاکر نے جواب دیا "لیکن مجھے نہیں لگتا کہ تین دن سے پہلے یہ کچھ کریں گے۔"

"تین دن کیوں؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ارے بھئی سیدھی سی بات ہے۔" ٹھاکر سے پہلے میں بول پڑا "تین دن تک تو یہ پولیس والے اپنے اس ساتھی کا سوگ منائیں گے جو کسی ڈاکو کی گولی کھا کر "شہید" ہوا ہے اور جو ساتھی لولے لنگڑے بن کر واپس آئے ہیں ان کو بہادری کے اعزازات دیے جائیں گے۔ ان کے لیے شاندار تقریب منعقد ہوگی اور میرا خیال ہے اس طرح پولیس کسی اور طرف دھیان نہیں دے گی۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ ان سرکاری بدمعاشوں کو بہادری کے اعزاز ملنے ہی چاہئیں۔" روپ متی نے کہا۔

پولیس والوں کے لیے "سرکاری بدمعاش" کے خطاب پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ٹھاکر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

باتوں کے دوران میں جانکی کو یہ خیال آہی گیا کہ میں اور ٹھاکر بہت تھکے ہوئے تھے اور یہ تھکن چائے یا کافی سے ہی دور ہوسکتی تھی۔ وہ ہمیں باتیں کرتے چھوڑ کر ہٹ کے اندر چلی گئی اور پندرہ بیس منٹ بعد چائے بنا کر لے آئی۔

چائے پینے کے بعد ہم اسپتال کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہٹ کے ملازم، شنکر اور بھگت کے بیڈ ایک ہی بڑے کمرے میں لگوا دیے گئے تھے اور ایک نرس ان تینوں کی دیکھ بھال پر مامور کردی گئی تھی۔ بھگت اور ہٹ کے ملازم کی حالت قدرے بہتر تھی مگر شنکر کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ اس کے سینے میں گولی لگی تھی اور اسے سنبھلنے میں ابھی خاصا وقت لگتا۔

میں بھگت کے پاس بیٹھا گنگولی چوہدری اور اس کے

گروہ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا۔

بھگت کے کہنے کے مطابق اس گروہ میں نو افراد تھے جن میں ایک عورت بھی تھی۔ اس عورت کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ گروہ کے لیے کھانا وغیرہ تیار کرتی اور چوہدری کا دل بہلاتی۔ بھگت نے ان ڈاکوؤں کے جو حلیے بتائے تھے ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں جانور ہیں۔

ہم دس بجے کے قریب ہٹ میں واپس آگئے۔ میں نے کسی کو بھی نارائن کے منصوبے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ کم از کم جانکی کو آگاہ کردینا چاہیے تاکہ میری اچانک گمشدگی پر یہ لوگ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جانکی میرے بعد کی صورت حال کو سنبھال لے گی۔

میری طرح ٹھاکر بھی بہت تھکا ہوا تھا۔ بارہ بجے کے قریب وہ اپنے کمرے میں جاکر سو گیا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد روپ متی بھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جانکی نے بھی اس کے ساتھ ہی اٹھنا چاہا تھا مگر میں نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک لیا۔

"کوئی خاص بات؟" تھوڑی دیر بعد جانکی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا "ہوسکتا ہے تم مجھ سے اتفاق نہ کرو لیکن میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟" جانکی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں چند لمحے خاموش رہا اور پھر جانکی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے لگا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟" جانکی اچھل پڑی "وہ انسان نہیں درندے ہیں۔ چار پانچ دن کے اندر اندر وہ کئی لوگوں کو بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ انہیں تو اس معصوم عورت پر بھی رحم نہیں آیا جس کی کوکھ میں ایک نئی زندگی جنم لے رہی تھی۔ ان پولیس والوں کا حشر بھی تم دیکھ چکے ہو جو ان کے تعاقب میں گئے تھے اور تم بڑے سورما ہو؟ اکیلے ان کے مقابلے پر جانا چاہتے ہو۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا؟ تم خودکشی کرنے کی کوشش کررہے ہو اور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تم بالکل نہیں جاؤ گے۔"

"لیکن۔۔۔ وہ ببلا اس وحشی کے قبضے میں ہے۔" میں نے کہا۔

"ببلا ہماری سگی تو نہیں جس کے لیے تم اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو۔" جانکی نے تڑ سے جواب دیا "اور شاید تم بھول رہے ہو کہ وہ اس ببلا ہی کا باپ تھا جس نے پورے شہر کو تمہاری جان کا دشمن بنا دیا تھا اور لوگ تمہیں قتل کرنے کے لیے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔"

"میری سگی تو تم بھی نہیں ہو جانکی۔" میں نے تپ کر جواب دیا "لیکن کیا کسی ایسی صورت حال میں، میں تمہیں تنہا چھوڑ سکتا ہوں۔ تمہیں کوئی معمولی سی تکلیف بھی ہو تو میں تڑپ اٹھتا ہوں۔ تمہارے بغیر تو مجھے ایک لمحے کو بھی چین نہیں پڑتا۔ تمہارے لیے تو میں آگ کے دریا میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہوں۔" یہ الفاظ خود بخود میرے منہ سے نکل رہے تھے۔

میرے شروع کے الفاظ سے جانکی کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے لیکن اس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کہا اس سے میرے پہلے اور قدرے سخت جملے کا تاثر زائل ہوگیا اور جانکی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی۔ چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

"سچ۔۔۔ سچ کہہ رہے ہو تم!" جانکی بولی تو اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی "تمہاری زبان سے پہلی مرتبہ ایسی باتیں سن رہی ہوں۔ میں تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ تم وہ پتھر ہو جس میں جونک نہیں لگ سکتی لیکن۔۔۔ میرے بارے میں تمہارے من کی بات جان کر آج مجھے اس قدر خوشی ہورہی ہے جس کا تم اندازہ نہیں کرسکتے۔"

اور پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے صوفے پر آگئی اور مجھ سے لپٹ کر والہانہ انداز میں پیار کرنے لگی۔ میری پیشانی، گال، ہونٹ ۔۔۔۔ وہ چٹاچٹ بوسے ثبت کیے جارہی تھی۔

"بس بس۔ اب زیادہ مت پھیلو۔" میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اپنے سے الگ کردیا۔ وہ میرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی بھر گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی "جانکی۔" میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "ہمارا ساتھ بہت پرانا ہے۔ تم نے میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ جیون برباد کرلیا۔ میرے ساتھ دردر کی ٹھوکریں کھا رہی ہو۔ قدم قدم پر موت سے آنکھ مچولی کھیل رہی ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نظرانداز کرسکتا ہوں؟ تھائی کے بعد اگر تم نہ ہوتیں تو میں کب کا مٹ چکا ہوتا۔ میں تمہارے سہارے ہی تو جی رہا ہوں۔ کیا میں تم سے الگ ہونے کا تصور کرسکتا ہوں۔ بولو۔ میری بات کا جواب دو۔"

"تم بولتے رہو۔ میں سن رہی ہوں۔ تمہاری باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" جانکی نے جواب دیا۔

"ببلا معصوم اور بے گناہ ہے۔" میں نے کہا "باپ کے گناہوں کی سزا اسے کیوں ملے اور کیا تمہارے دل میں اس کے لیے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کیا تم یہ گوارا کرلوگی کہ اسے ان وحشیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ تو سب سے زیادہ تم سے ہی مانوس ہوگئی ہے۔ ہر وقت تمہارے ہی ساتھ چپکی رہتی تھی۔ کیا اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا جائے؟"

"نہیں۔ اس کے لیے میرا دل بھی ہول رہا ہے۔" جانکی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی "لیکن ان ڈاکوؤں کے خلاف پولیس کچھ نہیں کرسکی۔ تم اکیلے کیا کرو گے۔ تم اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "یہ خطرناک جنگل میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں خوں خوار درندے بھی ہیں اور پھر تم ان ڈاکوؤں کو کہاں تلاش کرو گے؟"

"نارائن ان کے ٹھکانے سے واقف ہے۔ وہ میری رہنمائی کرے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"نارائن کون؟" جانکی نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہی آدمی جو مجھے اپنے ساتھ لے جارہا ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ گنگولی چوہدری کا انفارمر ہے۔ جتنے روز یہ ہنگامہ جاری رہا اسے میں نے جنگل کنارے کیمپ کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہی دیکھا۔ ہوسکتا ہے اس کا ساتھ بھی سفارش بن کر کام آجائے۔"

"یہ خیال ذہن سے نکال دو۔" جانکی نے کہا "ان چند دنوں کے دوران میں ہم سب نے گنگولی چوہدری کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ وہ بہت خودسر ہے۔ اس نے کبھی اپنے آدمیوں کی بات بھی نہیں مانی۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اسے اپنے ارادے پر عمل کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس کی ضد کا مظاہرہ تم خود بھی دیکھ چکے ہو۔"

"میں تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گا مگر مجھے ایک کوشش کرلینے دو۔" میں نے کہا "اگر میں بھی دوسروں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تو میرا ضمیر زندگی بھر مجھے کچوکے لگاتا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" جانکی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "جب تک تم واپس نہیں آجاؤ گے، میں انگاروں پر لوٹتی رہوں گی۔"

"شانت رہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "میں انشا اللہ ضرور واپس آؤں گا۔"

اور پھر رات کا باقی حصہ باتیں کرتے ہوئے ہی گزرا۔

جانکی میرے گھٹنے پر سر رکھے لیٹی رہی اور میں نے اسے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

مجھے صبح پانچ بجے جنگل کے کنارے مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا۔ میں نے جانکی کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ساڑھے چار بجے میں بڑی آہستگی سے ہٹ کا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ جانکی بھی میرے ساتھ ہی باہر آئی تھی۔ ہٹ کے سامنے لان کے آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ جانکی میرے سامنے کھڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

اس وقت میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میں جس مہم پر جارہا تھا اس میں زندہ واپس آنے کا امکان ایک فیصد سے بھی کم تھا اور میں ان آخری لمحوں میں جانکی کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جب میں رخصت ہوا تو جانکی کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں ہاتھ ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک میں سڑک کا موڑ گھوم کر اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

ابھی پانچ نہیں بجے تھے۔ بہت سویرا تھا۔ فضا میں ہلکی سی خنکی تھی اور ملگجا سا اجالا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جنگل کی طرف چلتا رہا۔

مقررہ جگہ تک پہنچنے میں مجھے پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس جگہ ایک بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا جس پر ہندی اور انگریزی میں سیاحوں کو درندوں کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے اور بھی بہت سی ہدایات لکھی ہوئی تھیں۔ اس بورڈ کے قریب ہی جھاڑیوں میں ایک تنگ سی پگڈنڈی جنگل کے اندر کی طرف چلی گئی تھی۔

میں بورڈ کے قریب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر نارائن مجھے نظر نہیں آیا اور پھر بائیں طرف سے دو پولیس والوں کو آتے دیکھ کر میں جلدی سے جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

وہ پولیس والے مجھ سے تقریباً دس گز کی دوری سے آگے نکل گئے۔ میں جھاڑیوں سے سر نکالے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر تقریباً پانچ منٹ بعد مجھے نارائن کی سرگوشیانہ آواز سنائی دی۔ گزشتہ روز باتوں میں، میں نے اسے اپنا نام ہمت سنگھ بتایا تھا اور وہ اسی نام سے مجھے پکار رہا تھا۔

نارائن مجھ سے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔

"یہ سالے حرامی جنگل کے ساتھ ساتھ گشت کر رہے ہیں۔" اس کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا "پتا نہیں وہ جنگل کی حفاظت کر رہے ہیں یا ڈاکوؤں کو کسی قسم کا تحفظ فراہم کر رہے ہیں یا اس شہر کو کسی آفت سے بچانا چاہتے ہیں۔ بہرحال لو۔ اپنی امانت سنبھالو۔"

اس نے ایک ریوالور جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ریوالور کھول کر دیکھا۔ وہ گیارہ چیمبرز کا ریوالور تھا اور تمام چیمبرز بھرے ہوئے تھے۔ میرے پاس پتلون کے پائنچے کے اندر پنڈلی پر اپنا خنجر بھی چمڑے کے فیتے میں بندھا ہوا تھا لیکن ریوالور دور کی لڑائی میں بہت موثر ثابت ہوسکتا تھا۔

اس وقت دن کا ہلکا سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ نارائن کے قریب زمین پر ایک شولڈر بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پر ائر انڈیا کے الفاظ چھپے ہوئے تھے۔ یہ بیگ نہ چھوٹا تھا نہ زیادہ بڑا۔ درمیانے سائز کا تھا اور پھولا ہوا تھا۔ اس نے بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکا لیا۔

"چلیں؟" اس نے میری طرف دیکھا۔

"چلو۔ میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ میں موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جارہا تھا۔ نارائن نے اوپر اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر مجھے اشارہ کردیا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور پھر ہم دونوں نے جھاڑیوں سے نکل کر پگڈنڈی کی طرف دوڑ لگادی۔

وہ دونوں پولیس والے واپس آرہے تھے۔ وہ اگرچہ ہم سے کافی دور تھے مگر انہوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ پہلے تو انہوں نے "کون ہے۔ رک جاؤ۔" کا شور مچایا اور پھر فائر کھول دیا۔

فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی لیکن ہم دونوں گنجان درختوں میں پگڈنڈی پر دوڑتے رہے۔

ہمارے پیچھے فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں اور ہم درختوں کی آڑ لیتے ہوئے جھاڑیوں میں دوڑتے رہے۔

میرا خیال تھا کہ پولیس والے ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تقریباً ایک میل تک دوڑتے رہنے کے بعد ہم ایک چھوٹی سی ندی کے قریب رک گئے۔ ندی تین فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ پانی گدلا سا تھا۔

نارائن ندی کے کنارے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا اور وہ بار بار کرتے کی آستین سے ہونٹ پونچھ رہا تھا۔ میں ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

میں جب تھائی لینڈ میں تھا تو میلوں دور تک دوڑ لگایا کرتا تھا۔ ایکسرسائز کیا کرتا تھا اور یوگا کی مشق بھی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ ان دنوں میرے اندر گینڈے جیسی طاقت اور چیتے کی سی پھرتی تھی لیکن جب سے ہندوستان آیا تھا، جسم کو چاق چوبند رکھنے والے سارے کام مجھ سے چھوٹ گئے تھے اور میں کاہل و سست ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ صرف ایک میل دوڑنے سے میرا سانس پھول گیا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا کہ دوبارہ ایکسرسائز شروع کروں مگر چھوٹی چھوٹی الجھنوں کی وجہ سے میں اپنے ارادے پر اب تک عمل نہیں کرسکا تھا۔

نارائن نے شولڈر بیگ ایک طرف رکھ دیا۔ عینک اتار کر اس کے اوپر رکھی اور ندی کے کنارے پر بیٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

تقریباً پانچ منٹ رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے۔ نارائن نے بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اسے نیچے سے بھی سہارا دیے ہوئے تھے۔ وہ ہر تھوڑی دیر بعد بیگ کو ایک کندھے سے اتار کر دوسرے کندھے پر لٹکا لیتا جس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ بیگ خاصا وزنی تھا۔ ایک دو مرتبہ میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ بیگ تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے دے لیکن اس نے ہر مرتبہ ٹال دیا تھا۔

ہم جنگل میں تقریباً تین میل اندر آچکے تھے۔ سورج اگرچہ خاصی بلندی پر آچکا تھا مگر درخت اتنے گنجان تھے کہ دھوپ زمین تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ درختوں کے نیچے جھاڑیاں بھی بے حد گنجان اور بعض جگہوں پر ہمارے قد سے بھی اونچی تھیں۔ بعض پودوں کے پتے بالشت بھر چوڑے اور دو دو فٹ لمبے تھے جن میں کوئی چھپ جائے تو تلاش کرنا مشکل ہوجائے۔

ان گنجان درختوں، بڑے بڑے پتوں والے پودوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے اچھا خاصا حبس ہو رہا تھا۔ میری شرٹ پسینے میں بھیگ کر بدن سے چپک گئی تھی اور گردن پر کیچوؤں کی طرح بہنے والی پسینے کی دھاروں سے شدید الجھن ہو رہی تھی۔

اس گھٹن اور حبس کی وجہ سے پیاس بھی بڑھتی جارہی تھی۔ حلق خشک ہوگیا اور زبان سوکھ کر کانٹے کی طرح تالو میں چبھنے لگی۔ میں چلتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ شاید کہیں پانی نظر آجائے۔ کوئی ندی، نالا یا کوئی جوہڑ... لیکن کہیں پانی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

"نارائن! یہاں کہیں پانی نہیں ملے گا۔" بالآخر میں نے نارائن سے پوچھ ہی لیا۔

"آدھا میل آگے ایک صاف پانی کی ندی ہے۔" نارائن نے ایک طرف اشارہ کیا "وہاں ہم پانی بھی پئیں گے اور کچھ دیر آرام بھی کریں گے۔"

"لگتا ہے تم پہلے بھی اس جنگل میں آتے رہے ہو۔" میں نے کہا "سنا ہے اس جنگل میں چیتے اور ریچھ وغیرہ بھی ہیں لیکن ابھی تک تو خرگوشوں اور لومڑیوں کے سوا کوئی خطرناک جانور نظر نہیں آیا۔"

"جس ندی کی میں بات کر رہا ہوں نا۔ وہاں تک کا علاقہ بڑی حد تک محفوظ ہے۔" نارائن نے جواب دیا "اس سے آگے درندوں سے سامنا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہاں چیتے بھی ہیں، سانبھر بھی اور شیر بھی لیکن کسی درندے کے منہ کو ابھی تک انسانی خون نہیں لگا۔ یہاں لاتعداد ایسے جانور ہیں جو بڑی آسانی سے ان درندوں کا شکار بن جاتے ہیں۔ کئی سال پہلے ایک شیر کے منہ کو انسانی خون کا مزہ لگ گیا تھا۔ دو مہینے کے اندر اس نے تین انسانوں کو شکار کر لیا تھا۔ سرکار کے بھیجے ہوئے درجن بھر شکاریوں نے کئی دن کی کوشش کے بعد اسے گھیر کر مار ڈالا۔ اس کے بعد آدم خوری کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے برعکس شکاری یہاں آ کر درندوں کے شکار سے اپنا شوق پورا کرتے رہتے ہیں جس وجہ سے اس جنگل میں خوں خوار درندوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"یہاں دو تین بستیاں بھی تو ہیں۔" میں نے کہا "کیا ان لوگوں کو اس خوفناک جنگل میں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"

"یہ پیٹ بہت پاپی ہے ہمت سنگھ۔" اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر مارتے ہوئے جواب دیا "پیٹ کا جہنم بھرنے کے لیے انسان کو پتا نہیں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہاں جنگل میں ناریل اور کیلے کے علاوہ بہت سے پھل دار درخت ہیں۔ ان بستیوں کے رہنے والے یہی پھل توڑ کر شہر میں فروخت کر دیتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو خطرہ تو ہر وقت لاحق رہتا ہے پر پیٹ بھرنے کے لیے ایسے خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔"

"ابھی تک تو ہمیں کوئی بستی دکھائی نہیں دی۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں ان بستیوں سے بچا کر لے جا رہا ہوں۔" نارائن نے جواب دیا "ان بستیوں میں رہنے والے سالے بہت حرامی ہیں۔ کسی نے ہمیں دیکھ لیا تو ہماری خبر ہم سے پہلے گنگولی چوہدری تک پہنچ جائے گی اور وہ ہمیں راستے ہی میں گھیر لیں گے۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ کسی بھی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

نارائن نے بتایا تھا کہ وہ ندی تقریباً نصف میل فاصلے پر ہے لیکن ہم تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد وہاں پہنچ سکے تھے۔ شروع میں ایک ڈیڑھ میل تک تو جنگل میدانی خطے میں تھا لیکن اس کے بعد پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا تھا اور ہم مسلسل بلندی کی طرف چلتے رہے تھے۔

یہ ندی بھی پتھروں میں اوپر سے نیچے کی طرف بہہ رہی تھی۔ پانی شفاف تھا۔ نارائن نے تو کسی چوپائے کی طرح پیٹ کے بل لیٹ کر منہ پانی میں ڈال دیا تھا جبکہ میں دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر پانی پیتا رہا۔

پانی پینے کے بعد نارائن ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بیڑی سلگا کر لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا پستول نکال کر قریب رکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ اس ندی پر درندے وغیرہ پانی پینے کے لیے آتے رہتے ہیں اسی لیے ہم دس منٹ سے زیادہ یہاں نہیں ٹھہریں گے۔

میں ندی پار کر کے ٹہلتا ہوا کچھ آگے نکل گیا۔ کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ آگے ڈیڑھ دو سو گز تک جنگل چھدرا تھا اور اس سے آگے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر درخت اور جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ پہاڑیاں بھی چھپ کر رہ گئی تھیں۔

میں ایک طویل چکر کاٹ کر دوسری طرف سے واپس آیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ خوفناک منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ نارائن لیٹے لیٹے اونگھ رہا تھا اور اس کے پیروں کی طرف بھورے بالوں والا ایک ریچھ پورے قد کے ساتھ کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔ اس کے سینے پر سفید بالوں سے انگریزی کے حرف وی (V) کا نشان سا بنا ہوا تھا۔ بھورے بالوں والا ریچھ کالے ریچھ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور وہ خطرناک بھورے بالوں والا ریچھ نارائن کے پیروں کے قریب کھڑا دانت نکوس رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بڑی خوفناک چمک تھی۔

میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ریچھ کو دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جیسے ہی جھکا میں نے ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھا کر ٹریگر دبا دیا۔ جنگل فائر کی آواز اور ریچھ کی دہاڑ سے گونج اٹھا۔ گولی ریچھ کے بائیں بازو پر کندھے کے قریب لگی تھی۔

نارائن بھی گولی کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس نے اپنے سامنے ریچھ کو دیکھا تو بدحواسی میں لیٹے لیٹے چھلانگ لگا دی اور ندی میں جا گرا۔ ریچھ دہاڑتا ہوا دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر نارائن کی طرف لپکا۔ نارائن نے چیختے ہوئے ایک بار پھر چھلانگ لگائی۔ اس کا پیر پھسلا اور وہ پھر پانی میں گر گیا۔ ریچھ سینہ کوبی کرتا ہوا اس کی طرف لپکا تو میں نے دوسرا فائر کر دیا۔ اتفاق سے یہ گولی بھی اس کے اسی کندھے پر لگی۔ اس بار اس نے نارائن پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ مڑ کر لنگڑاتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میں نے دوڑ کر نارائن کو ندی سے نکالا۔ وہ بری طرح بدحواس تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اسے حواس بحال کرنے میں کئی منٹ لگ گئے۔

"آنکھ لگ گئی تھی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نہ ہوتے تو آج میری کہانی ختم ہو چکی ہوتی۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چلتے ہیں گرو۔ چلتے ہیں۔" اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "یہاں رکنا اب خطرے سے خالی نہیں۔"

اس نے چپل پہنی، بیگ کندھے پر لٹکایا اور پستول ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ گیلی چپل میں پیر پھسل رہے تھے لیکن اب وہ یہاں ایک لمحہ بھی رکنے کو تیار نہیں تھا۔

ہم سامنے والی پہاڑی کی طرف جا رہے تھے جو گنجان درختوں اور قد آدم جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

"گولیوں کی آواز جنگل میں بہت دور تک گونجی ہو گی۔" نارائن نے میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ آواز انہوں نے سن لی ہو گی تو وہ ہوشیار ہو جائیں گے۔"

"اگر میں گولی نہ چلاتا تو تمہارا وہ بڑا بھائی تمہارے بخیے ادھیڑ دیتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ہمیں راستہ بدلنا پڑے گا۔" اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

وہ پہاڑی ڈھائی تین سو فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن گنجان درختوں اور گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے راستہ بڑا دشوار تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے میری دونوں بانہوں پر لاتعداد خراشیں آ چکی تھیں جن میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ ہم اس مرتبہ تقریباً تین گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہے۔ جس کی وجہ سے سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

بالآخر ہم ایک اور چھوٹی سی ندی کے قریب بیٹھ گئے۔ ندی کیا تھی ایک ڈیڑھ فٹ چوڑا نالا سا تھا جس میں شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ یہاں درخت کسی قدر چھدرے تھے اور کہیں کہیں دھوپ بھی درختوں کی شاخوں سے چھن کر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ اس دھوپ سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دوپہر ڈھل رہی تھی۔

نارائن مجھ سے الگ ہٹ گیا اور دوسری طرف رخ کر کے بیگ کھولنے لگا۔ اس نے بیگ میں سے ایک پوٹلی نکال کر زپ دوبارہ بند کر دی اور میرے قریب آ گیا۔

پوٹلی میں چھ تنوری روٹیاں تھیں جن پر مرچ کا اچار رکھا ہوا تھا۔

ہم صبح پانچ بجے سے چل رہے تھے۔ دو تین مرتبہ صرف پانی پیا تھا۔ مجھے بھی بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اور اس وقت مرچ کے اچار کے ساتھ روٹی کھانے میں واقعی مزہ آ گیا۔

یہاں آدھا گھنٹا رکنے کے بعد ہم آگے چل پڑے اور مزید دو گھنٹوں تک مسلسل چلتے رہنے کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پر نکل آئے جہاں درخت زیادہ گنجان نہیں تھے البتہ چوڑے پتوں والے پودے اور جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ سامنے چھوٹی چھوٹی کئی چٹانیں تھیں۔ بعض چٹانوں میں چھوٹے غار بھی نظر آ رہے تھے۔

نارائن ان چٹانوں سے دور ہی رک گیا۔ اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی اور اس مایوسی کی وجہ میں بھی سمجھ گیا تھا۔ چٹانوں کے قریب ایک جگہ پر تین پتھر رکھ کر چولھا سا بنا ہوا تھا۔ راکھ، بجھے ہوئے کوئلے اور جلی ہوئی چند لکڑیاں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ ادھر ادھر چند ایسی چیزیں بھی دکھائی دیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کچھ لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے جو ہمارے آنے سے پہلے ہی کہیں اور جا چکے تھے۔

"بہت برا ہوا۔" نارائن کے لہجے سے بھی مایوسی جھلک رہی تھی "ان کی تلاش میں اب ہمیں کم از کم سات آٹھ گھنٹے اور چلنا پڑے گا۔ ان کا دوسرا ٹھکانا یہاں سے پچھم (مغرب) کی طرف بہت دور ہے۔"

"سورج ڈھل رہا ہے اور ہم رات میں تو سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔" میں نے کہا۔

"رات ہمیں یہیں گزارنی پڑے گی۔" نارائن نے

جواب دیا "یہ جگہ محفوظ ہے۔ اس طرف پانی کا چشمہ بھی ہے۔" اس نے درختوں کی طرف اشارہ کیا "آگے ہمیں ایسی محفوظ جگہ نہیں ملے گی۔"

"تو پھر لگادو یہیں پر ڈیرا۔" میں یہ کہتے ہوئے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔

نارائن آس پاس کی چٹانوں میں جھانکتا رہا۔ بیگ اس نے بدستور کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور اب اس بیگ کے بارے میں میرا تجسس بڑھتا جارہا تھا۔ بیگ خاصا بھاری تھا اور نارائن صبح پانچ بجے سے اسے کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے اس کا یہ بوجھ اٹھالوں لیکن ہر مرتبہ اس نے انکار کردیا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد دو روٹیاں بچی تھیں جو نارائن نے سنبھال کر رکھ لی تھیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم نے وہ روٹیاں بھی کھالیں اور چشمے سے پانی پی کر ایک دوسرے کے قریب زمین پر لیٹ گئے۔ نارائن نے بیگ کو تکیے کی طرح سر کے نیچے رکھ لیا تھا۔ میں ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد جلد ہی اندھیرا پھیل گیا۔ میں نے نارائن سے ابھی تک نہیں پوچھا تھا کہ وہ کون ہے۔ کیا دھندا کرتا ہے۔ وہ اس جنگل میں کیوں آیا ہے۔ پولیس گنگولی چوہدری کے جس ٹھکانے کو تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی وہ آسانی سے یہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ بہت سے سوالات میرے دماغ میں کلبلا رہے تھے۔ اس نے میرے صرف پہلے سوال کا جواب دینا ہی مناسب سمجھا تھا۔

نارائن بنگلور کا رہنے والا تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا لیکن اکلوتا ہونے کے باوجود نہ تو اسے ماں کی ممتا مل سکی اور نہ ہی باپ کی شفقت۔

نارائن اپنا ماضی نہیں بھولا تھا۔ اسے سب کچھ اچھی طرح یاد تھا۔ دس سال کی عمر تک تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا لیکن پھر اچانک ہی سب کچھ بدل گیا۔ اس کے ماں باپ میں کسی بات پر ناچاقی شروع ہوگئی جس نے بڑھتے بڑھتے سنگین صورت اختیار کرلی۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر بے وفائی کے الزامات عائد کرتے رہے۔ اس کے باپ نے اس کی ماں کو آوارہ اور بدچلن قرار دے کر نارائن کو اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کردیا جبکہ نارائن کی ماں اپنے شوہر پر الزام لگاتی رہی کہ وہ آوارہ اور بدکار عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہے۔

دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ ماں کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ بیٹے کی پرورش کیسے کرتی۔ وہ نارائن کو اس کے باپ کے دروازے پر چھوڑ آئی اور نارائن کا باپ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔

دونوں میں طلاق ہوئی تو نارائن کی زندگی پر چھائے ہوئے اندھیرے کچھ اور گہرے ہوگئے۔ ماں نے دوسری شادی کرلی اور نئے شوہر کے ساتھ بنگلور چھوڑ کر چلی گئی۔ باپ شراب، جوئے اور آوارہ عورتوں کا رسیا تھا۔ ایک رات شراب خانے میں ایک عورت کی ملکیت پر جھگڑا ہوگیا۔ نارائن کے باپ نے اپنے رقیب کو پیٹ میں چھرا گھونپ کر ہلاک کردیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لوگوں نے پکڑ کر اسے پولیس کے حوالے کردیا۔

عدالت میں کیس چلا۔ جرم ثابت ہوگیا اور نارائن کے باپ کو عمر قید کی سزا ہوگئی۔ نارائن اس وقت چودہ سال کا تھا۔ باپ کے جیل جانے کے بعد وہ باپ کے مکان میں آگیا جس پر اس کا حق تھا۔ اس موقع پر اس کا ایک ہمدرد بھی پیدا ہوگیا۔ جگو چاچا پہلے بھی اسی شہر میں رہتا تھا لیکن اس نے کبھی نارائن کو منہ نہیں لگایا تھا لیکن اب اسے نارائن سے بڑی محبت ہوگئی تھی۔

جگو شہر کا بدنام ترین آدمی تھا اس نے نوعمر لڑکوں کا ایک گروہ بنا رکھا تھا جن سے وہ چھوٹے موٹے جرائم کرواتا تھا۔ وہ نوعمر لڑکوں کے اس ریوڑ کے ساتھ شہر کے نہایت پسماندہ علاقے میں واقع ایک کھنڈر نما مکان میں رہتا تھا جسے اس نے اناتھ آشرم (بے سہارا بچوں کی پناہ گاہ) کا نام دے رکھا تھا حالانکہ اس کے آشرم میں کئی ایسے بچے بھی تھے جن کے ماں باپ زندہ تھے لیکن وہ خود عسرت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اگر جگو ان کے بچوں کو اناتھ کہہ کر دو وقت کی روٹی کھلا دیتا تھا تو اس میں کیا برائی تھی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جگو ان بچوں سے جرائم کا ارتکاب کرواتا ہے لیکن انہیں اس سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔

جگو نے نارائن کو بھی قابو میں کرلیا۔ تمام بچے اس مکان میں منتقل کردیے گئے اور نارائن کا گھر اچھا خاصا اناتھ آشرم بن کر رہ گیا۔

نارائن اب کوئی بچہ نہیں رہا تھا۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا مگر نجانے کیا بات تھی کہ جگو چاچا کے سامنے اس کی زبان نہیں کھلتی تھی۔ جگو چاچا نے اسے بھی جرائم کے راستے پر لگا دیا۔

دو سال گزر گئے۔ نارائن نے چھوٹے موٹے جرائم میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی تھی اور پھر ایک روز جگو

چاچا تمام بچوں کو چھوڑ کر غائب ہوگیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد ساہوکار دولت رام اپنے آدمیوں کو لے کر نارائن کے مکان پر پہنچ گیا اور یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ جگو نے یہ مکان پچاس ہزار روپے میں اس کے ہاتھ فروخت کردیا تھا۔ کاغذات پر نارائن ہی کے دستخط تھے۔ نارائن قسمیں کھاتا رہا کہ اس نے مکان فروخت نہیں کیا اور نہ ہی کسی کاغذ پر کبھی دستخط کیے تھے مگر ساہوکار نے اسے اور تمام بچوں کو دھکے دے کر نکال دیا۔

نارائن پولیس کے پاس بھی گیا مگر پولیس نے بھی ساہوکار ہی کا ساتھ دیا۔ ساہوکار دولت رام نے اسے یہ چھوٹ البتہ دے دی کہ اگر وہ پچاس ہزار روپے ادا کردے تو وہ مکان خالی کردے گا۔ دوسری صورت میں وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔

نارائن کے پاس نہ تو ساہوکار دولت رام کو دینے کے لیے پچاس ہزار روپے تھے اور نہ ہی عدالت سے انصاف حاصل کرنے کے لیے رقم۔ وہ اناتھ (بے سہارا) بچوں کو لے کر شہر سے باہر ایک مندر کے کھنڈر میں منتقل ہوگیا۔ اب وہی ان بچوں کا ان داتا تھا۔

نارائن کی زندگی اناتھ بچوں کی پرورش کرتے ہوئے گزر گئی۔ وہ خود بھی وارداتیں کرتا اور بچوں سے بھی جرائم کرواتا۔ کبھی جیل میں اور کبھی سڑکوں پر۔ نارائن کے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے۔ وہ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے اس کا ساتھ چھوڑتے گئے اور بالآخر نارائن اکیلا رہ گیا۔

کچھ عرصے بعد اس نے بھی بنگلور چھوڑ دیا اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں دھکے کھاتا ہوا تین سال پہلے سارسکا پہنچ گیا۔ یہ جگہ اسے زیادہ پسند آگئی اور وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

نارائن نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ڈاکو گنگولی چوہدری کو کس طرح جانتا ہے اور جنگل میں کیوں آیا ہے اور یہ کہ اس بیگ میں کیا ہے؟ میں نے بھی یہ سب کچھ جاننے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ رات اگرچہ زیادہ نہیں بیتی تھی لیکن لگتا تھا جیسے رات اپنے آخری پہر میں پہنچ گئی ہو۔ تاریکی میں چاروں طرف سے آنے والی حشرات الارض کی آوازوں نے دلوں پر دہشت سی طاری کر رکھی تھی۔ کبھی کبھار کسی بھیڑیے یا اس قسم کے جانور کی خوفناک آوازیں سنائی دے جاتیں۔

نارائن باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میں اس کے بعد بھی دیر تک آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ ڈاکوؤں کی بھی کیا زندگی ہے۔ وہ ایسے جنگلوں اور پہاڑوں میں کیسے زندہ ہیں پھر مجھے ربا کا خیال آیا۔ شہر کی رہنے والی نازو نعم میں پلی ہوئی وہ لڑکی یہاں کس حال میں ہوگی۔

مجھے جانکی وغیرہ کا بھی خیال آیا۔ میرے بعد وہاں کیا ہنگامہ ہوا ہوگا۔ ہوسکتا ہے ٹھاکر پولیس اور انتظامیہ پر چڑھ دوڑا ہو۔ بہرحال، یہ سب کچھ تو واپس جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔ بشرطیکہ میں گنگولی چوہدری اور جنگلی درندوں سے زندہ بچ کر واپس جاسکا۔

آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور روشنی کی ایک لکیر چھوڑتا ہوا افق پر غائب ہوگیا۔ آسمان کتنا روشن نظر آرہا تھا۔ ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ شہر کی مصنوعی روشنیوں میں ان ستاروں کی چمک بھی ماند پڑجاتی ہے۔

میرا سر بھاری ہورہا تھا۔ تھکن سے جسم کے تمام اعضا شل ہورہے تھے اور پھر اس بات کی پروا کیے بغیر کہ رات کو کسی وقت کوئی جنگلی جانور ہمارا تیا پانچا کرسکتا ہے، میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور نیند کی وادی میں اتر گیا۔

○☆○

ماں کی کوکھ سے جنم لینے والا ہر بچہ بڑا معصوم اور فرشتہ صفت ہوتا ہے۔ وہ ماں کے پیٹ سے جرائم سیکھ کر نہیں آتا۔ دنیا میں آنے کے کئی سال بعد بھی وہ دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔ دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی۔ دنیا کے نشیب و فراز کا شعور نہیں ہوتا۔ وہ بالکل نہیں جانتا کہ اگلا قدم اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ قدم قدم پر بڑوں کی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے۔ اب یہ بڑوں پر منحصر ہے کہ وہ اسے کون سا راستہ دکھاتے ہیں۔ وہ اسے باعزت زندگی کی رفعتوں کی طرف لے جائیں یا ذلت کے مہیب کھڈ میں دھکیل دیں اور جب وہ شعور سنبھالتا ہے تو بہت کچھ اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اسے وہی کچھ کرنا ہوتا ہے جس کا اسے درس دیا گیا یا جو وہ اپنے اردگرد دیکھتا ہے۔ اگر اسے اچھی تربیت نہیں ملی، اس کے اردگرد رونما ہونے والے معاملات قابل تعریف نہیں تو وہ تباہی کے راستے کی طرف چل پڑتا ہے بلکہ اس کے لیے اسے مجبور کردیا جاتا ہے اور وہ معاشرے پر ایک بوجھ بن جاتا ہے۔

میری اپنی زندگی قابل مثال یا قابل تعریف نہیں تھی۔ میں نے جو راستہ اپنایا تھا وہ خود اختیار کردہ نہیں تھا۔ مجھے

اس کانٹوں بھرے راستے پر دھکیلا گیا تھا۔ میں نے بار بار اپنے قدموں میں زنجیر ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر ہر مرتبہ مجھے منہ کے بل گرا دیا گیا۔

میرے سینے میں تو انتقام کا جذبہ تھا۔ ممکن ہے کسی موقع پر میں وہ سب کچھ بھول جاتا اور ایک عام آدمی کی طرح نارمل زندگی گزارتا لیکن میری زندگی میں ایسا موقع آنے ہی نہیں دیا گیا۔ قدم قدم پر اور ہر لحظہ میرے سینے میں انتقامی جذبات کی آگ کو بھڑکایا گیا اور میں اس آگ میں جلتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

میں جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن زندگی کے اس کانٹوں بھرے راستے پر میرا واسطہ زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں ہی سے رہا تھا۔ چور، ڈاکو، قاتل بدمعاش اور جعل ساز۔ ان میں کئی ایسے تھے جو ایک وقت پیٹ بھر روٹی کھانے کے لیے چھوٹے چھوٹے جرائم تک محدود تھے اور کئی ایسے تھے جن کا جرائم کی دنیا میں بڑا نام تھا۔ بڑا دبدبہ تھا۔ بڑی دہشت تھی ان کے نام کی۔

لیکن ان سب میں ایک بات مشترک تھی۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے اپنی مرضی سے اس ذلت بھرے راستے پر قدم رکھا ہو۔ انہیں اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ ایسے ہر شخص کی زندگی کے پس منظر میں ایک ہی کہانی تھی۔ ایک ہی کتھا تھی... نارائن کی کتھا۔

اور اب میں اسی نارائن کے ساتھ اس خوفناک اور بھیانک جنگل میں چل رہا تھا جہاں کسی جگہ گنگولی چوہدری جیسا درندہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔

نارائن، جگو چاچا کے فریب کا شکار ہوا تھا اور میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا تھا کہ گنگولی چوہدری کا پس منظر بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ وہ بھی کسی جگو چاچا کے فریب کا شکار ہوا ہوگا یا کسی ٹھاکر کے ستم کا شکار ہوا ہوگا۔ یہاں نہ تو جگوؤں اور ٹھاکروں کی کمی تھی اور نہ ہی نارائنوں اور گنگولیوں کا قال تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا نارائن کے ساتھ چلتا رہا۔ نارائن نے حسب معمول بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر یہ پیشکش کی تھی کہ تھوڑی دیر کے لیے میں اس کا یہ بوجھ اٹھا لوں مگر اس نے اس مرتبہ بھی ہنس کر ٹال دیا تھا۔

ہمیں وہاں سے روانہ ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ ناشتے کا تو تصور ہی نہیں تھا البتہ چلنے سے پہلے خوب سیر ہو کر چشمے کا ٹھنڈا اور میٹھا پانی پیا تھا۔ اس کے بعد کہیں پانی بھی نہیں ملا تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر چلتے ہوئے پیٹ میں اینٹھن ہونے لگی۔ نارائن بیڑی پہ بیڑی پھونکے جا رہا تھا۔ شاید بیڑی کے دھوئیں سے بھوک کے احساس کو مٹانا چاہتا تھا۔

نارائن کی طرح چلتے ہوئے میری نظریں بھی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ شاید کوئی پھل دار درخت نظر آ جائے۔ ناریل کے کئی درخت نظر آئے تھے۔ ان پر پھل بھی لگا ہوا تھا مگر چکنے اور سیدھے تنے پر چالیس پچاس فٹ کی بلندی پر چڑھنا شاید ہم دونوں میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا۔

راستے میں گکروندے کی جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ خوش نما گلابی پھل سے لدی ہوئی شاخیں جھکی جا رہی تھیں۔ میں نے ایک پودے سے چند گکروندے توڑ لیے تھے لیکن دانہ منہ میں رکھتے ہی اسے تھوک دینا پڑا۔ ترشی اس قدر تھی کہ نہ تو میری زبان اسے برداشت کر سکی تھی اور نہ ہی معدہ قبول کر سکتا تھا۔

بالآخر ہم ایک اور جگہ پر رک گئے۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند ایسے درخت نظر آئے جن پر بیر جیسے پھل نظر آئے۔ درختوں کی شاخیں پھل کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے اس قسم کا پھل جے پور میں ٹھیلوں پر بکتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

نارائن نے بیگ زمین پر رکھ دیا اور پھل سے لدی ہوئی ایک شاخ کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکنے لگا۔ پکے ہوئے پھل ٹوٹ کر گرنے لگے۔ یوں لگا جیسے پھلوں کی بارش ہو رہی ہو۔

"یہ پھل تم جتنے بھی چاہو کھا لو تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔" نارائن نے گھاس پر گرے ہوئے پھل سمیٹتے ہوئے کہا۔

میں بھی بیر جیسے پھل جمع کرنے لگا۔ ایک دانہ منہ میں رکھا تو یوں لگا جیسے شہد کا چمچہ منہ میں ڈال لیا ہو۔ شہد کی طرح ہی میٹھا تھا یہ پھل۔ ہم بڑے اطمینان سے بیٹھے ان پھلوں سے پیٹ کی آگ بجھا رہے تھے کہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

ہم دونوں اچھل پڑے۔ یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ہی شیر یا چیتے کی دہاڑ جیسی آواز سنائی دی تھی۔ فائر اور دہاڑ کی آوازیں زیادہ دور کی نہیں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق فاصلہ پچاس اور سو گز کے درمیان رہا ہوگا۔

نارائن نے وحشت زدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اپنا بیگ اٹھا کر چوڑے پتوں والی گنجان جھاڑیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔

ہم چوڑے پتوں والی جھاڑیوں میں اندر تک چلے گئے۔ جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ اگر کوئی شخص چار فٹ کے فاصلے پر ہمارے سامنے سے بھی گزرتا تو ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

صرف دو گولیاں چلی تھیں اور شیر یا چیتے کی دہاڑ سنائی دی تھی۔ گولیوں کی گونج کی آواز تو جلد ہی معدوم ہو گئی لیکن لاتعداد پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور ان کے چیخنے کی آوازیں دیر تک گونجتی رہیں اور بالآخر جنگل کی فضا معمول پر آ گئی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" میں نے نارائن کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی "گنگولی چوہدری یا..."

"یہ گنگولی چوہدری یا اس کے آدمی نہیں ہو سکتے۔" نارائن نے میری بات کاٹ دی "گنگولی چوہدری ایسی جگہوں پر نہیں رکتا۔ نہ ہی وہ اس طرح جانوروں پر گولیاں ضائع کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے شکاریوں کی کوئی پارٹی اس طرف موجود ہو۔ بہرحال، اب ہمیں زیادہ محتاط رہنا پڑے گا۔ اب تم بھگوان سے یہ پرارتھنا (دعا) کرو کہ یہ کم بخت یہاں سے آگے نہ جائیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ گنگولی چوہدری اپنا وہ ٹھکانا بھی چھوڑ کر کسی اور طرف نکل جائے۔"

ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک ان جھاڑیوں میں دبکے رہے اور جب کوئی مشتبہ آواز سنائی نہیں دی تو ہم آگے چل پڑے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پیٹ کی آگ بھی بجھ گئی تھی اور ہم تازہ دم ہو کر تیزی سے چل رہے تھے تاہم کسی جگہ بھی ہم نے قد آدم پودوں یا جھاڑیوں سے نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جنگل بہت گنجان اور راستے اونچے نیچے تھے۔ چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔

دوپہر کے وقت ہم پھر ایک جگہ رک گئے۔ یہاں بھی ہمیں وہ پھل مل گئے اور شفاف پانی کی ندی بھی تھی۔ نارائن نے کہا تھا کہ ہم گنگولی کے ڈیرے پر آٹھ گھنٹوں میں پہنچیں گے۔ ہم صبح منہ اندھیرے ہی چل پڑے تھے۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے آٹھ گھنٹوں سے زیادہ وقت گزر چکا تھا مگر گنگولی کے ڈیرے کے کہیں آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ہم مزید آگے چلتے رہے۔ فائرنگ کی اس آواز کے بعد سے نجانے مجھے بار بار یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ مڑ کر دیکھا تھا مگر کوئی دکھائی نہیں دیا تھا۔ نارائن بھی کئی مرتبہ چونکا تھا اور پھر نارائن نے یہ بتا کر مجھے مزید خوف زدہ کر دیا کہ شیر یا چیتا بعض اوقات اپنے شکار کا میلوں دور تک پیچھا کرتا ہے۔ کسی انسان کے اچانک حملے سے بھی بچا جا سکتا ہے لیکن شیر یا چیتا جب گھات لگا کر حملہ آور ہوتا ہے تو اس سے بچ جانا ممکن نہیں ہوتا۔

مزید دو گھنٹے چلنے کے بعد درخت کچھ چھدرے ہونے لگے۔ سامنے بہت دور چھوٹی چھوٹی چٹانیں بھی دکھائی دینے لگیں اور میرا خیال تھا کہ ہم ایک گھنٹے سے پہلے ان چٹانوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

پودے اور جھاڑیاں اب بھی گنجان تھیں۔ ایک جگہ ہم جیسے ہی پودوں سے باہر نکلے، اپنے پیچھے "دھب" کی زوردار آواز سن کر ہم دونوں اچھل پڑے۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا اور اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ انسان ہرگز نہیں کہلا سکتا تھا لیکن بہرحال انسان تھا۔ کئی روز کا بڑھا ہوا شیو، بے تحاشا بڑھے اور بکھرے ہوئے بال، میلی پتلون اور بغیر آستین کی قمیص جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سینہ بھی ریچھ کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابھرے ہوئے رخسار، چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں اور پیلے دانت۔ مجھے وہ ریچھ یاد آ گیا جو میری گولیوں سے زخمی ہو کر بھاگ گیا تھا۔ وہ وحشی تھا جس کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفل بھی تھی۔

اس وقت ریوالور میری جیب میں تھا اور میں نے جیسے ہی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا، اس نے مجھ سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی میرے پیروں کے قریب لگی۔

"ہی ہی ہی..." وہ ہنسا تو اس کے پیلے دانت کچھ اور بھی نمایاں ہو گئے "اوپر..." اس نے رائفل سے اشارہ کیا "دونوں ہاتھ سر سے اوپر... ورنہ تم اوپر پہنچ جاؤ گے۔ ہی ہی ہی..."

میں نے نارائن کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی دونوں ہاتھ گردن پر رکھ چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے اور اس حیوان نما انسان کی طرف دیکھنے لگا جو غلیظ دانت نکالے اب بھی "ہی ہی" کر رہا تھا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ بیس فٹ کے قریب تھا۔ اس پر قابو پانے کا کوئی چانس نہیں تھا اگر میں کوشش بھی کرتا تو وہ مجھے اپنے تک پہنچنے سے پہلے ہی چھلنی کر دیتا۔

اس نے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں ڈال کر سیٹی

بچائی۔ دو آدمی دائیں بائیں قد آدم پودوں سے نکل کر سامنے آگئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں بھی آٹومیٹک رائفلیں تھیں اور ان کے حلیے بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔

اب تو بچاؤ کی امید بالکل ہی ختم ہوگئی تھی۔ میں نے ایک بار پھر نارائن کی طرف دیکھا۔

"یہ گنگولی چوہدری کے آدمی ہیں۔ کوئی گڑبڑ مت کرنا ورنہ مار دیے جاؤ گے۔" نارائن نے سرگوشی کی۔

میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں' میں نے جو تصور قائم کیا تھا یہ تینوں حیوان نما انسان اس سے بالکل مختلف ثابت ہوئے تھے۔ کئی انڈین فلموں میں بھی ڈاکوؤں کو دیکھا تھا۔ کالے کپڑے' گم بوٹ قسم کے جوتے' سینے پر کراس کرتے ہوئے گولیوں سے بھرے ہوئے بیلٹ۔ کمر پر بھی چوڑے بیلٹ جن میں گولیاں بھری ہوتیں۔ باقاعدگی سے شیو بنانے والے لیکن مونچھیں بڑی خوفناک۔ بعض ڈاکو تو کلین شیو بھی ہوتے تھے لیکن ان کے چہروں پر بھی بڑا رعب ہوتا تھا اور یہ.... یہ تو ان سے بالکل مختلف تھے۔ لگتا تھا کسی پاگل خانے سے بھاگ کر آئے ہوں اور پکڑے جانے کے خوف سے عرصے سے اس جنگل میں چھپے حیوانوں جیسی زندگی گزار رہے ہوں۔ وہ حیوان ہی تھے اور ان کے چہرے بڑے خطرناک تھے۔

وہ تینوں ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے پھر تقریباً پانچ قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ ان کی رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ پہلا حیوان نما انسان جس نے سب سے پہلے درخت سے چھلانگ لگا کر ہمیں رائفل کی زد پر لیا تھا' اس نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے میرا ریوالور جیب سے نکال لیا اور پھر نارائن کو بھی اس کے پستول سے محروم کرکے اس کا بیگ بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔ وہ بیگ کو دونوں ہاتھوں میں تولتے ہوئے "کھی کھی" کرتے ہوئے پیلے اور غلیظ دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

"چوہدری کھش ہو جاوے گا۔" وہ نارائن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "انعام دیوے گا تھارے کو۔ چل آگے لگ.... حرامی.... سالا...."

اس نے نارائن کے کولہے پر زوردار لات رسید کردی۔ نارائن لڑکھڑا گیا۔ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ دوسرا وحشی میری طرف بڑھا۔ وہ شاید مجھے بھی لات رسید کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس سے پہلے ہی آگے بڑھ گیا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد ہم ان چٹانوں کے قریب پہنچ گئے۔ چٹانوں کی طرف درخت چھدرے تھے جبکہ چند گز کے فاصلے پر درخت بھی گنجان تھے اور جھاڑیاں بھی۔ ان چٹانوں کی طرح بڑے بڑے پتھر نظر آرہے تھے اور ان کے بیچ میں ندیاں تھیں جن میں شفاف پانی بہہ رہا تھا۔ طرف قدرے گہرائی میں بہت بڑا تالاب سا تھا۔ دو ندیوں کا پانی اس تالاب میں گر رہا تھا جبکہ ایک کم چوڑی ندی تالاب کے قریب سے گزرتی ہوئی نشیب کی طرف گھنے جنگل میں گئی تھی۔

ہم گنجان درختوں سے نکل کر جیسے ہی کھلی جگہ پر آئے مجھے وہ لوگ نظر آگئے جو چٹان کے دامن میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص محتاط تھا اور ہر ایک کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل نظر آرہی تھی۔ ان میں چوہدری کا چترا بھی تھا۔

میں متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور پھر وہ نظر آگئی۔ ببلا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اسے لباس سے پہچانا تھا۔ وحشیوں کے قبیلے میں وہی ایک انسان نظر آرہی تھی۔

ایک آدمی اپنے ساتھیوں سے بالکل الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ کسرتی بدن مضبوط ہاتھ پیر' چہرہ کسی قدر لمبا' دو تین دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ ٹوتھ برش ٹائپ کی مونچھیں۔ سر کے بال گردن پر لمبے تھے اور پیشانی پر بھی کچھ بال اس طرح گرے ہوئے تھے کہ اس کی بائیں آنکھ کسی قدر چھپ کر رہ گئی تھی۔ اس نے نیلی جینز اور ڈینم کی بغیر آستین کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کے سینے پر بھی ریچھ کی طرح سیاہ بال تھے۔ ایک خنجر اس کی پتلون کے بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا اور قریب ہی زمین پر آٹومیٹک رائفل پڑی تھی۔

"یہ گنگولی چوہدری ہے۔" نارائن نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

نجانے کیا بات تھی کہ گنگولی چوہدری کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اگر وہ بہتر حلیے اور ڈھنگ کے لباس میں ہوتا تو پروقار اور شاندار شخصیت کا مالک ہوتا لیکن وہ ڈاکو تھا اور ایک ڈاکو کو یہی حلیہ سجتا تھا۔

آوازیں سن کر ببلا نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا اور یہ کرب دیکھ کر میرا دل یک لخت دھڑک اٹھا۔ ببلا نے مجھے دیکھ لیا۔ اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ چہرے پر کرب کے بجائے کچھ عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے اپنی ایک انگلی دانتوں میں

دبائی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چیختی ہوئی میری طرف دوڑی۔ اس نے دونوں بانہیں آگے کو پھیلا رکھی تھیں لیکن میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ایک وحشی نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی مگر میرے ساتھ آنے والوں میں سے ایک نے رائفل کی نال میرے سینے پر رکھ دی اور بھیڑیے کی طرح غرایا۔

"اپنی جگہ پر کھڑا رہ مورکھ (احمق)۔ حرکت کی تو تیرے شریر (بدن) میں درجنوں سوراخ بنا دوں گا۔"

میں بے حس و حرکت ہو کر رہ گیا۔ اس شخص نے ببلا کو بازو سے پکڑ رکھا تھا اور ببلا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک نازک سی لڑکی کے لیے اپنے آپ کو کسی وحشی سے چھڑانا آسان نہیں تھا۔ اس وحشی نے ببلا کو پوری طرح اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اس موقع سے کچھ اور فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ اس نے ببلا کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ رکھا تھا اور اس کے چہرے پر بوسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ببلا اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

"لونڈیا کو چھوڑ دے رامو۔" گنگولی چوہدری نے اس وحشی کو پکارتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز قدرے بلند اور لہجہ پرسکون تھا۔

مگر اس وحشی نے ببلا کو نہیں چھوڑا۔ اسے سینے سے لگائے اٹھا کر اس درخت کے نیچے لے گیا جہاں کچھ دیر پہلے ببلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ببلا کو نیچے گرا دیا اور اس کی قمیص کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ قمیص کے اوپر والے دو بٹن ٹوٹ گئے۔

رامو پر شیطان سوار تھا۔ وہ بھیڑیے کی طرح ببلا کو نوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو آدمی دوڑ کر قریب پہنچ گئے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے رامو کو ببلا سے الگ کیا اور اسے چوہدری کے سامنے لے آئے۔

چوہدری چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی وحشیانہ سی چمک ابھر آئی تھی اور پھر اس کے جسم میں اچانک ہی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے قریب پڑی ہوئی رائفل اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔

فضا فائر اور رامو کی خوفناک چیخ کی آواز سے گونج اٹھی۔ گولی اس کے سینے میں ٹھیک دل کے مقام پر لگی تھی۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور رامو زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

رامو کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے اس کے دونوں ساتھی وحشت زدہ نظروں سے کبھی چوہدری کو اور کبھی رامو کی لاش کو دیکھ رہے تھے۔ چوہدری نے رائفل پھر اپنے قریب زمین پر رکھ دی تھی۔

چترا اور اس کے دوسرے ساتھی بھی وحشت زدہ سے ہوگئے تھے۔ ببلا کی آنکھیں خوف سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بار پھر بدحواس ہو کر میری طرف دوڑی۔ اس مرتبہ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ببلا دوڑتی ہوئی میرے سینے سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں ہولے ہولے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کبھی رامو کی لاش اور کبھی گنگولی چوہدری کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب پہلے کی طرح بالکل پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔

"یہ کیا کیا تم نے چوہدری!" میرے دائیں طرف کھڑے ہوئے آدمی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "تم نے رامو کو مار دیا۔ اس کی ہتیا کردی۔"

"جو ہمارا کہت نہ مانے ہے اس کا یہی انجام ہووے گا۔ اس کی لاش اٹھا کر ادھر دور پھینک دو۔ بھیڑیے کھاویں گے اس کا ماس۔" چوہدری نے ایک طرف اشارہ کیا "سالا حرامی۔ چوہدری کے مال پر ہاتھ ڈالے ہے۔"

کسی نے مزید جرح کرنے کی جرات نہیں کی۔ دو آدمی رامو کی لاش اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے درختوں کی طرف لے گئے۔

"کروشا۔" چوہدری چٹان کی طرف رخ کرکے چیخا۔

اس کی آواز کی بازگشت ختم نہیں ہوئی تھی کہ چٹان کے غار سے ایک عورت برآمد ہوئی۔ وہ باقاعدہ غار نہیں تھا۔ کھوہ سی بنی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑا چٹانی پتھر سائبان کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہ عورت وہاں بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

میں اس عورت کو دیکھ کر پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ چھ فٹ کے قریب قد' سڈول جسم' ہرنی جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں' چہرے کے نقوش بے حد جاذب نظر' شہد کی رنگت کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے گھٹنوں سے بہت اوپر تک کی نیکر اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسے شاید بلاؤز بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کپڑے کا چند انچ چوڑا ٹکڑا تھا جو سینے پر لپٹا ہوا تھا لیکن پوری طرح پردہ پوشی نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ سینے کے گداز ابھاروں کے عین وسط میں ٹکا ہوا تھا۔ ایک کان میں بُندا تھا اور دوسرے میں چوڑی کی طرح کا طلائی بالا۔

اس کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی رنگت پہلے ضرور گوری چٹی رہی ہوگی لیکن دھوپ اور کھلی فضا میں رہنے سے جلد تانبے جیسی رنگت اختیار کرگئی تھی۔ اگر وہ جنگل میں اس حلیے میں نہ ہوتی۔ ڈھنگ کا لباس پہنا ہوتا اور ہلکا سا میک اپ ہوتا تو اسے ملکہ حسن قرار دیا جاسکتا تھا۔

گنگولی چوہدری کو مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کروشا نے قریب آکر بملا کو زبردستی مجھ سے الگ کیا اور اسے تقریباً کھینچتی ہوئی ایک طرف لے گئی۔ بملا مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میرے ساتھ آنے والے تینوں آدمی اب بھی اپنی جگہوں پر کھڑے تھے۔ دو نے رائفلیں تان رکھی تھیں اور تیسرا ابھی تک نارائن سے چھینا ہوا بیگ اٹھائے کھڑا تھا اور پھر اس نے آگے بڑھ کر وہ بیگ چوہدری کے سامنے رکھ دیا۔ چوہدری نے بیگ کی زپ کھول کر اس میں جھانکا پھر اسے اٹھا کر زمین پر پلٹ دیا۔

میں اچھل پڑا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ نارائن پولیس کے اتنے کڑے پہرے کے باوجود جنگل میں کیوں آنا چاہتا تھا اور راستے بھر اس نے مجھے اس بیگ کو ہاتھ کیوں نہیں لگانے دیا تھا۔ اس میں رائفل کی گولیاں بھری ہوئی تھیں جو اب ایک ڈھیر کی صورت میں چوہدری کے سامنے پڑی تھیں اور میرے اندازے کے مطابق ان گولیوں کی تعداد پانچ سو سے کم نہیں تھی۔

"دوسرا مال کہاں ہے؟" چوہدری نے گولیوں کے ڈھیر سے نظریں ہٹا کر نارائن کی طرف دیکھا۔

"گیسٹ ہاؤس اور ہٹوں سے یاتریوں کے اغوا کی واردات کے بعد شہر میں ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ میرے وہ بندے پکڑے جانے کے خوف سے غائب ہوگئے ہیں جن سے میں مال لیا کرتا تھا۔ دوسرا مال نہیں ملا۔ شہر میں اور جنگل کے آس پاس پولیس کا پہرا ابھی بہت کڑا ہے۔ بڑی مشکل سے یہی مال لے کر آیا ہوں۔ چند روز بعد دوسرا مال بھی پہنچا دوں گا۔"

"زندہ رہے گا تب نا۔" چوہدری نے کہا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کون ہے یہ؟ ساتھ کیوں لایا ہے اسے؟"

"وہ چھوکری اسی کی ہے چوہدری۔" نارائن نے جواب دیا "بڑا بیاکل ہو رہا تھا۔ میں اسے ساتھ لے آیا ہوں۔ چھوکری اسے واپس کردو چوہدری۔"

"ابے سالے حرامی۔" چوہدری نے رائفل پر ہاتھ رکھ دیا "تیری یہ ہمت۔ چوہدری کو شکشا (مشورہ) دیتا ہے تو۔"

"غلطی ہوگئی چوہدری۔ معاف کردو۔" نارائن نے دم ہاتھ جوڑ دیے۔ چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا۔ رامو کا انجام وہ دیکھ چکا تھا۔

چوہدری نے رائفل سے ہاتھ ہٹالیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بھی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر رکھی تھیں۔

"وہ چھوکری کیا لگتی ہے تیری؟" چوہدری نے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی "جورو ہے یا بہن ہے تیری؟"

"دیکھو چوہدری۔" میں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر پرسکون لہجے میں جواب دیا "وہ لڑکی میری جو بھی لگتی ہو میں اسے لینے کے لیے آیا ہوں اور لے کر جاؤں گا۔ میں اس کے لیے ڈنڈ دینے کو تیار رہوں۔ بولو کیا مانگتے ہو؟"

"کیا ہے تیرے پلے۔ کیا دے سکتا ہے تو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"کیا مانگتے ہو؟" میں نے جواب میں پوچھا۔

"میری بات سن!" چوہدری بولا "گنگولی چوہدری کو جو پسند آجاتی ہے نا وہ اس پر قبضہ کرلیتا ہے اور اس کا سودا نہیں کرتا۔ وہ چھوکری اپن کو پسند آگئی ہے۔ اسے یہاں سے تو نہیں لے جاسکتا۔ میں تیرے کو اتنی چھوٹ دیتا ہوں کہ آج کی رات یہاں ہمارا مہمان بن کے رہ اور اس چھوکری سے بات بھی کرلے۔ پر سویرا ہوتے ہی یہاں سے چلے جانا۔ تم پہلے آدمی ہو جسے میں زندہ واپس جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ پر ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم نے رات کو کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو تجھے بھی رامو کے پاس پہنچا دوں گا۔"

میں کافی دیر تک گنگولی چوہدری سے بحث کرتا رہا لیکن وہ کسی طرح بملا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

"باسٹرڈ۔" میرے منہ سے بے اختیار گالی نکل گئی "سن آف اے بچ۔"

"اے!" گنگولی چوہدری ایک دم بھڑک اٹھا۔ اس نے رائفل اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔ کئی گولیاں میرے پیروں کے پاس زمین پر لگیں پھر دو تین گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ میں دہشت زدہ سا ہوگیا۔ میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہوگئی تھی۔

"میں اگر چاہتا تو یہ ساری گولیاں تمہارے جسم کے پار ہوسکتی تھیں مگر نجانے کیوں مجھے تم پر ترس آرہا ہے۔

سمجھ لو کہ اس مرتبہ میں نے تمہیں پنڈت کی اس چھوکری کے صدقے میں زندہ چھوڑ دیا ہے لیکن اب اگر تم نے گالی دی تو تمہارے بدن میں اتنے سوراخ کردوں گا کہ گنے بھی نہیں جائیں گے۔"

گنگولی چوہدری نے یہ ساری باتیں انگریزی میں بڑی روانی سے کہی تھیں۔ دہشت اپنی جگہ مگر اس وقت تو چوہدری کو اس قدر روانی سے انگریزی بولتے سن کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں۔

"انگریزی میں گالی دیتا ہے سالا حرامی۔" وہ رائفل زمین پر رکھتے ہوئے بولا "انگریزی میں ماسٹرز کی ڈگری لی ہے میں نے دلی کی نہرو یونیورسٹی سے۔ چل ہٹ سامنے سے اور اب اپنی زبان پر قابو رکھنا۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ ڈاکو تھا۔ میں اسے بھی جے پور کے رامو، جو ٹھاکر کے ہاتھوں مارا گیا تھا، بھگت اور انہی جیسے دوسرے بدمعاشوں کی طرح سمجھا تھا جو غنڈا گردی کرتے کرتے ڈاکو بن گیا تھا۔ جہالت تو زندگی کو اندھیروں میں دھکیل ہی دیتی ہے لیکن ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص اور اس کا کردار اتنا خوفناک... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"ابے میرا فوٹو کیا دیکھ رہا ہے کھڑے کھڑے۔" وہ میری طرف دیکھ کر غرایا "چل ہٹ سامنے سے۔ ادھر جا کے بیٹھ جا ورنہ تیرا فوٹو بگاڑ دوں گا۔"

اس وقت میں نے اڑی (ضد) کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس درخت کی طرف چل پڑا جہاں بملا کروشا کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آواز سن کر وہ بھی دہشت زدہ سی ہوگئی تھی لیکن مجھے زندہ دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

گنگولی چوہدری کے آدمی حیرت سے کبھی اسے اور کبھی مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقیناً اس بات پر حیرت تھی کہ اس کے ایک وفادار ساتھی نے اس کی حکم عدولی کی تھی تو چوہدری نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور میں نے چوہدری کو حرامی اور کتیا کا بچہ کہا تھا مگر اس نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تھا۔

میں قریب پہنچا تو بملا اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ کروشا نے ہماری طرف دیکھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ دیکھی اور پھر وہ مڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔

بملا دیر تک میرے سینے سے لپٹی سسکیاں بھرتی رہی پھر ہم درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دو آدمی مختلف جگہوں پر رائفلیں لیے ہماری نگرانی کے لیے کھڑے تھے۔ نارائن چوہدری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے گنگولی چوہدری کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ نارائن سے خوش نہیں تھا۔ اب میں نارائن کی اصلیت جان چکا تھا۔ وہ گنگولی چوہدری کا انفارمر تھا اور اسے نہ صرف اطلاعات فراہم کرتا تھا بلکہ انہیں ایمونیشن بھی سپلائی کرتا تھا۔

گنگولی چوہدری کے آدمی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنی جگہ محتاط نظر آرہا تھا۔

میں بملا سے دھیمے لہجے میں باتیں کرتا رہا۔ وہ ابھی تک گنگولی چوہدری کے شر سے محفوظ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گنگولی کے کسی آدمی نے اسے اس طرح دبوچا تھا اور گنگولی نے اسے گولی سے اڑا دیا تھا۔

بملا کے کہنے کے مطابق وہ کروشا تھی جس نے اب تک بملا کو چوہدری سے بچائے رکھا تھا۔ کروشا کو اس سے ہمدردی تھی۔ اس ہمدردی کی وجہ عورت ہونا تھی یا کچھ اور... لیکن بہرحال میں بھی بملا کے ساتھ کروشا کا شکرگزار تھا۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ چٹان کے قریب ہی پتھروں سے ایک چولھا بنا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے خشک لکڑیاں چولھے کے پاس ڈھیر کردیں اور چند لکڑیاں چولھے میں جھونک کر آگ جلانے لگا۔

کروشا نے رات کے کھانے کی تیاری شروع کردی۔ گنگولی چوہدری کا یہ گروہ خانہ بدوشوں کی طرح ضرورت کا سامان ساتھ لے کر چلتا تھا۔ ان کے پاس کھانے پینے کی ہر چیز موجود تھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو یہ لوگ بھیس بدل کر کسی نہ کسی آبادی میں چلے جاتے۔ ویسے ان کی سیوا کے لیے نارائن جیسے لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ نارائن اس جنگل میں انہیں ایمونیشن سپلائی کرتا تھا تو کوئی اور انہیں راشن کی چیزیں بھی فراہم کرتا ہوگا۔

کروشا نے لکڑیاں لانے والے اسی آدمی سے کچھ کہا۔ اس نے چولھے کے قریب ہی پتھر جما کر ایک اور قدرے چھوٹا چولھا تیار کرکے اس میں بھی آگ جلا دی۔ اس شخص نے ضرورت کی ہر چیز چولھوں کے قریب جمع کردی تھی۔ برتنوں کے علاوہ پانی کا کنستر بھی بھر کر رکھ دیا تھا۔

کروشا ایک بڑی سی سینی میں چاول چن رہی تھی اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ایک بڑے سے پتیلے میں چاول چولھے پر چڑھا دیے۔ پتیلا باہر سے بے حد کالا ہو رہا تھا۔ دوسرے چولھے پر اس نے ایک پتیلے میں دال چڑھا دی۔

ایک گھنٹے میں کھانا تیار ہو گیا۔ تمام لٹیرے پلیٹوں میں دال چاول لے کر اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ میرے اور ببلا کے سامنے بھی ایک بڑی پلیٹ رکھ دی گئی تھی۔ دال چاول کھاتے ہوئے واقعی مزہ آ گیا۔

سورج غروب ہوتے ہی تین چار مشعلیں جلا کر مختلف جگہوں پر رکھ دی گئیں۔ دو آدمی بدستور رائفلیں تانے میری اور ببلا کی نگرانی کر رہے تھے۔ نارائن الگ تھلگ بیٹھا ہوا بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ گنگولی چو[illegible]ی بھی اپنے مخصوص انداز میں ایک طرف بیٹھا ہوا تھا۔ کروشا ایک آدمی کے ساتھ چشمے پر برتن دھونے گئی ہوئی تھی۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔

ایک آدمی نے ایک راجستھانی گیت گانا شروع کر دیا اور دوسرا پتیلی کے ڈھکنے پر تال دینے لگا۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ اگر حالات معمول پر ہوتے اور ہم پکنک منانے کے لیے آئے ہوتے تو ہم اس صورت حال سے ضرور لطف اندوز ہوتے لیکن یہاں صورت حال مختلف ہی نہیں، سنگین بھی تھی۔

میں خاموش بیٹھا فرار کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ رات میں کسی وقت ایسا کوئی موقع مل تو سکتا تھا۔ میرے پاس اپنی اور ببلا کی حفاظت کے لیے وہ خنجر بھی موجود تھا جو پتلون کے پائنچے کے اندر پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ دوپہر کے وقت جب ڈاکوؤں نے ہمیں حراست میں لیا تھا تو میری جیب سے ریوالور نکال کر ہی وہ مطمئن ہو گئے تھے۔ مزید تلاشی لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی تھی۔ وہ شاید مطمئن ہو گئے تھے کہ میرے پاس اس ریوالور کے سوا اور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

میں رات کے وقت کسی بھی موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا لیکن اس میں بھی بے پناہ خطرات تھے۔ اگر ہم ان لٹیروں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو خوں خوار درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں رات کے وقت سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا اور مجھے تو اس جنگل سے باہر نکلنے کا راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ کل ہم سارا دن سفر کرتے رہے تھے اور آج بھی بھول بھلیوں کی طرح آٹھ نو گھنٹے گھومنے کے بعد یہاں تک پہنچے تھے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ رات کو یہاں سے نکلنے کے بعد کسی خطرے سے دوچار ہوئے بغیر رات بھر چلتے رہیں اور جب صبح کی روشنی ہو تو پتا چلے کہ ہم گھوم پھر کر پھر وہیں پہنچ گئے ہیں۔ ان خدشات کے پیش نظر میں نے رات کو کسی موقع سے فائدہ اٹھانے کا خیال ذہن سے نکال دیا۔ البتہ یہ سوچ لیا کہ دن کی روشنی میں ایسا کوئی موقع ملا تو اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔

کروشا اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمارے قریب آ گئی۔ میرے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ کروشا کو دیکھ کر وہ اٹھ گئی۔ راموسے دھینگا مشتی میں ببلا کی قمیص کے اوپر کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے اپنے سینے کی برہنگی چھپانے کے لیے ایک تنکے سے بکل کا کام لیتے ہوئے گریبان بند کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ کروشا میرے سامنے آ کر بیٹھی تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ایک مشعل ہمارے ساتھ والے درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور اس کی روشنی براہ راست بیٹھی ہوئی کروشا پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس طرح جھک کر بیٹھی تھی کہ میری نظریں بار بار چھوٹے کپڑے کے پیچھے بھٹک رہی تھیں۔

"یہ گنگولی چوہدری بڑا حرامی آدمی ہے۔" کروشا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری وجہ سے وہ ابھی تک تمہاری ببلا پر ہاتھ نہیں ڈال سکا۔ میں کوشش کروں گی کہ ایک روز میں تم دونوں کو یہاں سے نکال دوں۔"

میں نے اس ہمدردی کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔

"اس نے تو مجھے صرف آج رات کی مہلت دی ہے۔ صبح سویرے مجھے یہاں سے چلے جانا ہوگا۔"

"میں کسی نہ کسی سبب تمہیں روک لوں گی۔" کروشا نے کہا "پر تمہیں ذرا محتاط رہنا پڑے گا۔ اس بیچ اگر موقع ملے بھی تو بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کے بھیڑیا صفت آدمی تم لوگوں کو زیادہ دور نہیں جانے دیں گے۔"

"لیکن تم ہمیں یہاں سے کیسے نکالو گی؟" میں نے کہا۔

"اگر بعد میں اسے پتا چل گیا کہ ہمارے فرار میں تمہارا ہاتھ ہے تو وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"میری تم فکر مت کرو۔" کروشا بولی "اب میں بھی ایک فیصلہ کر چکی ہوں اور اس پر عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"مگر تم ہمارے لیے یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم لوگوں کے لیے نہیں، اپنے لیے کر رہی ہوں۔" کروشا نے جواب دیا "میں کئی روز سے دیکھ رہی ہوں کہ چوہدری کا دل مجھ سے بھر گیا ہے۔ ببلا کو دیکھ کر تو وہ اسی روز سے مجھ سے بے رخی برت رہا ہے۔ ببلا کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدم میں نے روکے ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں اس نے ایک مرتبہ ببلا کو برت لیا تو مجھے ان وحشیوں کے حوالے کر دے گا جو عرصے سے میرے بخیے ادھیڑنے کو تیار بیٹھے ہیں لیکن چوہدری کے خوف سے انہوں نے کبھی میری طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ رامو نے ببلا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا انجام تم نے دیکھ لیا۔ چوہدری جس چیز کو اپنی مان لیتا ہے کوئی دوسرا اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ ببلا ایک مرتبہ اس کے تصرف میں آ گئی تو مجھے وہ اترن کی طرح پھینک دے گا اور یہ سب بھیڑیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں گے اور تم دیکھ رہے ہو، یہ انسان نہیں واقعی حیوان ہیں۔ میرا جو حشر کریں گے تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"تم کب سے اس کے ساتھ ہو؟" میں نے پوچھا۔

"دو سال سے۔" کروشا نے جواب دیا "اب اگرچہ میرے اندر کچھ نہیں بچا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ ان وحشیوں کے ساتھ رہتے ہوئے میں بھی وحشی بن گئی ہوں۔ مہذب دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ میں اب اس زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔"

"اگر تم نے ہمیں یہاں سے نکالنے کا کوئی منصوبہ بنایا ہے تو خود بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں تمہارا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کریں گے؟" میں نے کہا۔

"کھویا ہوا مقام!" کروشا کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آ گئی "کیا ایک عورت کی کھوئی ہوئی عزت اسے واپس مل سکتی ہے؟ مہذب دنیا میں جانے کے بعد میرے ساتھ جو سلوک ہوگا میں اس کا اندازہ بھی لگا سکتی ہوں۔ مجھے ناپاک سمجھ کر ٹھکرا دیا جائے گا یا میں طوائف بن جاؤں گی۔ کوئی مجھ سے زیادہ ہی ہمدردی کرے گا تو مجھے کسی کوٹھے پر لے جا کر بٹھا دے گا۔ اس جنگل سے نکلنے کے بعد میرا وہی ایک ٹھکانا ہوگا۔"

میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔

"تم دو سال سے گنگولی چوہدری کے ساتھ ہو۔" میں نے کہا "یہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے ماسٹرز کی ڈگری لے رکھی ہے۔ اسے تو کسی اچھی اور معزز مقام پر ہونا چاہیے تھا۔ یہ ڈاکو کیسے بن گیا؟"

"قسمت کا چکر!" کروشا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"قسمت کا چکر۔" میں نے اس کے الفاظ دہرائے "یہ قسمت کا چکر بھی عجیب چکر ہے۔ انسان کا سارا عمل اپنا ہوتا ہے اور الزام قسمت پر۔ اور کبھی تو سارا چکر واقعی قسمت کا ہوتا ہے اور انسان مورد الزام ٹھہرتا ہے۔ انسان کو اور جب کچھ حاصل نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے کہ وہ چیز قسمت میں نہیں تھی اس لیے نہیں ملی۔

باخبری

لاشعور میں دبے ہوئے خوف،
احساسات اور محرکات کو بے نقاب
کرنے والی عجیب و غریب کتاب

قیمت 25 روپے

ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
[illegible]
فون: 6895313-8802562 فیکس: 8802561
[illegible]

kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

"گنگولی چوہدری چند روز کے لیے گاؤں آیا۔ اس نے بتایا کہ اسے دلی میں بہت بڑی نوکری ملنے والی ہے۔ وہ چند مہینوں میں پنڈت دینا ناتھ کا قرضہ چکا دے گا۔

"پنڈت دینا ناتھ کچھ اور سوچے بیٹھا تھا۔ وہ گاؤں کے کئی چھوٹے کاشتکاروں کو قرضے دے کر سود در سود کے چکر میں جکڑ کر ان کی زمینوں پر قبضہ کرچکا تھا۔ وہ دھرمیش چوہدری کی زمین پر بھی دانت گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے اتنا عرصہ انتظار کیا تھا اور اب اسے خطرہ پیدا ہوگیا کہ اگر دھرمیش کا بیٹا واقعی کسی بڑی نوکری پر لگ گیا تو زمین اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

"ان دنوں فصل پک چکی تھی۔ چند روز میں کٹائی ہونے والی تھی۔ اس رات ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے گاؤں پر حملہ کردیا۔ دھرمیش چوہدری کے کھیتوں کو آگ لگا دی گئی۔ گاؤں میں اس کے گھر پہ بھی ڈاکوؤں نے حملہ کردیا۔ گنگولی کی جوان بہن، چھوٹا بھائی اور ماں باپ ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے۔

"خبر ملنے پر گنگولی واپس آیا تو اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی مارے گئے۔ گھر جل کر بھسم ہوگیا۔ زمین پر پنڈت دینا ناتھ نے اپنے مسلح آدمی بٹھا دیے۔

"زمینوں پر، گنگولی کا پنڈت دینا ناتھ کے آدمیوں سے جھگڑا ہوگیا اور دینا ناتھ کے دو آدمی گنگولی کے ہاتھوں مارے گئے۔ گنگولی پکڑے جانے کے خوف سے مدھیہ پردیش میں چنبل ویلی کی طرف بھاگ گیا۔

"وہ چنبل ویلی میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شامل ہوگیا۔ وہ کئی سال تک اس گروہ کے ساتھ مدھیہ پردیش کے علاقوں میں وارداتیں کرتا رہا۔ ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر وہ وحشی درندہ بن گیا تھا۔ اس میں انسانیت ختم ہوچکی تھی۔ مدھیہ پردیش میں اس کے نام کی دہشت پھیل گئی تھی۔

"اور پھر ایک روز اسے کسی ڈاکو سے یہ پتا چل گیا کہ کئی سال پہلے پنڈت دینا ناتھ نے ڈاکوؤں سے اس کے باپ کے کھیتوں کو آگ لگوائی تھی اور اس کے گھر پر حملہ کرایا تھا اور اس کے گھر والے مارے گئے تھے۔

"گنگولی چوہدری نے پہلے تو چنبل ویلی میں ان ڈاکوؤں کو تلاش کرکے موت کے گھاٹ اتارا پھر اس نے اپنے گروہ کے ساتھ صبح سویرے کنگن پور میں پنڈت دینا ناتھ کی حویلی پر حملہ کردیا۔ پنڈت دینا ناتھ اس کے پیروں پر گر کر رحم کی بھیک مانگنے لگا لیکن گنگولی چوہدری کے دل میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے حویلی کو لوٹ لیا۔ اس کی بیٹی نے بھاگ

"انسان کبھی بھی اپنی قسمت پر شاکر نہیں [...] انسان ہر کام یہ سوچ کر کرے کہ اسے کوشش اور [...] سے کامیابی حاصل کرنی ہے اور فلاں چیز کو ہر قیمت [...] قسمت بناتا ہے تو وہ یقیناً اس کو حاصل بھی کرلے [...] قسمت کو الزام دینے کی ضرورت بھی نہیں پڑے [...]

"انسان کا المیہ یہ ہے کہ ہم ہر بات کے منفی پہلو [...] رکھے ہوئے ہیں۔ کوئی جدوجہد کی بھی جاتی ہے تو وہ [...] میں۔ جس کے نتیجے میں ہم ناکامی کے اندھیروں میں [...] رہتے ہیں اور الزام دیتے ہیں قسمت کو۔ بہرحال۔" [...] گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں گنگولی چوہدری کی کہانی سنا چاہوں گا جسے تم قسمت کا چکر کہہ رہی ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" کروشا میرے چہرے پر [...] جماتے ہوئے بولی "گنگولی نے جدوجہد تو کی لیکن تمہارے، غلط سمت میں جس کے نتیجے میں وہ کئی سال اندھیرے میں بھٹک رہا ہے۔"

میں خاموشی سے اس کی [...] دیکھتا رہا۔ [...] اکڑوں بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ اس نے میرے کندھے [...] ساتھ ٹیک لگالی۔ کروشا نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا۔

"گنگولی راجستھان اور مدھیہ پردیش کی سرحد [...] کنگن پور نامی قصبے کے ایک کاشتکار کا بیٹا ہے۔ یہ قصبہ [...] سے تھوڑا ہی آگے ہے۔ اس قصبے سے آگے چنبل [...] جو مدھیہ پردیش میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ [...] کو ہندوستان میں ڈاکوؤں کی جنت کہا جاتا ہے۔

"گنگولی کا باپ دھرمیش چوہدری بیٹے کو اعلیٰ تعلیم [...] بہت بڑا افسر بنانا چاہتا تھا۔ گنگولی نے پرائمری تک [...] میں پڑھا۔ میٹرک جھلوار شہر کے ہائی اسکول سے پاس [...] پھر کالج میں داخلہ لینے کے لیے اسے دلی بھیج دیا [...] دھرمیش چوہدری کا بھائی رہائش پذیر تھا۔

"دھرمیش چوہدری کے پاس چند بیگھے زمین تھی [...] نے کنبے کے دوسرے افراد کو بھی پالنا تھا۔ سخت مشقت [...] باوجود زمین کی آمدنی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ وہ قصبے کے [...] پنڈت دینا ناتھ سے قرضہ لیتا چلا گیا۔ اس کا خیال [...] پڑھ لکھ کر بڑا آفیسر بنے گا تو پنڈت کی پائی پائی چکا دے [...]

"گنگولی دلی کی نہرو یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم [...] کرچکا تھا۔ اس وقت تک اس کے باپ کا بال بال قرض [...] جکڑا جاچکا تھا۔ مکان اور زمین بھی پنڈت دینا ناتھ [...] گروی تھے۔ قرضہ اتنا تھا کہ زمین اور مکان دینے کے [...] حساب چکتا نہیں ہوتا تھا۔

[...] کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی تو گنگولی چوہدری نے عقاب کی طرح اسے جھپٹ لیا۔ اس نے پنڈت دینا ناتھ کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اور بازو کاٹ کر اسے [...] چھوڑ دیا۔ حویلی اور گوداموں کو اور کھیتوں اور کھلیانوں کو آگ لگادی اور پنڈت دینا ناتھ کی جوان بیٹی کو لے کر چنبل ویلی کی طرف واپس جانے کے بجائے راجستھان کی طرف آگیا۔ اس نے دو سال سے اس علاقے میں تباہی مچا رکھی ہے۔ ہر طرف اس کے نام کی دہشت ہے جو تم بھی دیکھ چکے ہو۔"

"تم نے کہا تھا کہ اس کے تمام گھر والے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے گئے تھے مگر اس کا چھوٹا بھائی چترا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ اس کا بھائی نہیں، دوست ہے۔ جو چنبل ویلی میں اس کے ہاتھ لگا تھا۔ وہ اسے سگے بھائیوں کی طرح چاہتا ہے۔" کروشا نے جواب دیا۔

"اور پنڈت دینا ناتھ کی وہ لڑکی....." میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "تمہیں یقیناً افسوس ہوتا ہوگا کہ باپ کے کرموں کی سزا تم بھگت رہی ہو۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ قسمت کے چکر ایسے ہی ہوتے ہیں۔" کروشا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے من کے کرب کو میں محسوس کرسکتا تھا۔

"تم نے ٹھیک کہا تھا۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "قصور ہمارا اپنا ہوتا ہے اور الزام ہم قسمت کو دیتے ہیں۔ ہماری اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں زندگی کو مایوسی اور ناکامیوں کے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہیں اور یہ زندگی ایک بوجھ بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسا ناگوار بوجھ جس سے پیچھا چھڑا لینے کو جی چاہتا ہے۔"

"ہم زندگی کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں۔ کیا مفہوم لیتے ہیں اس کا۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "زندگی کیا ہے؟ کیا یہ کسی وجود کا نام ہے؟ فکری شعور کے تاثر کا نام ہے؟ زخم و اشک کے انمول رشتے کا نام ہے؟ درد و کرب کے ادراک کا نام ہے؟ محض ایک نام ہے یا زندگی صرف زندگی ہے؟

"زندگی تو ایک فلسفہ ہے لیکن ہماری ذات اس سارے فلسفے سے روگردانی کرتی ہے۔ ہمارے خیال میں زندگی میں اگر بے شمار خوب صورت مناظر ہیں تو پہاڑ جیسی مہیب مشکلات کا وجود بھی ہے۔ ہجر کی تمازت ہے تو وصال کے سائے کی انمول ٹھنڈک بھی ہے۔ آہوں کے بعد قہقہے بھی ہیں اور رنگینی ہے تو درد کا صحرا بھی ہے لیکن نجانے کیوں انسان سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ پھول دیکھتا ہے تو اس کے کانٹوں کی چبھن محسوس نہیں کرتا۔ تڑپتا ہے تو قرار کے لمحوں کو یاد نہیں کرتا۔ بس خوش فہمی کے سراب کے پیچھے دوڑ دوڑ کر سکون تلاش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وقت کا بے رحم چکر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے زمین میں دفن کردیتا ہے۔"

میں خاموش ہو کر کروشا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں پہلے ہی میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں الجھن کے تاثرات بڑھتے جارہے تھے۔

"تم نے بھی آنکھوں میں زندگی کے بہت سے خواب سجائے ہوں گے جو تمہارے باپ کی ہوس کی نذر ہوگئے۔ تم نے اپنے حسین سپنوں کی ایسی بھیانک تعبیر کا تو تصور بھی نہیں کیا ہوگا لیکن یہ تمہارے خوابوں کی تعبیر نہیں ہے۔ تم ابھی زندہ ہو۔ تم میں ابھی زندگی ہے۔ پر تم مایوس ہو رہی ہو اور مایوسی زندگی کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ اگر زندگی کو واقعی مایوسی کی دیمک لگ جائے تو اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور وہ ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے مگر تم..... اپنی زندگی کو ملبے کا ڈھیر نہیں بننے دوگی۔ تمہیں یہ فکر تو ہے کہ گنگولی چوہدری ببلا کو بھی برباد نہ کر ڈالے لیکن اپنے بارے میں سوچتے ہوئے کیوں ڈرتی ہو؟"

"میرے اندر اب کیا رہ گیا ہے۔" کروشا نے جواب دیا "میں تو پہلے ہی ملبے کا ڈھیر بن چکی ہوں۔ کھنڈر ہوگئی ہوں۔"

"عمارت میں دراڑیں ضرور پڑگئی ہیں مگر اس کی بنیادیں بہت مضبوط ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "وعدہ کرو کہ تم ان بنیادوں پر زندگی کی ایک خوب صورت اور مضبوط عمارت تعمیر کروگی۔ وعدہ کرو کہ جب ہم اس جنگل سے نکلیں گے تو اکیلے نہیں ہوں گے۔ تم ہمارے ساتھ ہوگی۔" میں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

"زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے مجھ سے ایسی باتیں کی ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "کیا تم سمجھتے ہو کہ....."

"ہاں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وحشیوں کے اس غول سے نکلنے کے بعد تم ایک نئی زندگی شروع کرسکتی ہو۔"

میں کروشا کا ہاتھ بدستور سہلا رہا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں سرخی پھیل رہی

میں اور بملا دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ بملا باتیں کرتے کرتے سو گئی۔ میں کچھ دیر تک اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر آنکھیں بند کرلیں۔

مجھے اندازہ نہیں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ ایک چیختی ہوئی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک آدمی جنگل کی طرف سے دوڑتا ہوا آرہا تھا اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"چوہدری۔۔۔ چوہدری۔۔۔ پولیس ہمیں گھیر رہی ہے۔ کرشنا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔"

کیمپ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ گنگولی چوہدری کے اونگھتے ہوئے سارے آدمی جاگ گئے اور رائفلیں سنبھالے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ گنگولی بھی چٹان کی کھوہ سے باہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔ وہ ایک طرف دوڑتے ہوئے اپنے آدمیوں کو احکامات جاری کرنے لگا اور پھر اسی وقت جنگل فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس سنگل شاٹ کے ساتھ ایک خوفناک انسانی چیخ بھی سنائی دی۔ وہ گنگولی کے کرشنا نامی اس آدمی کی چیخ تھی جو کیمپ سے تقریباً سو گز آگے پہرے کی ڈیوٹی پر تھا اور پولیس کے ہاتھ لگ گیا تھا اور شاید اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہوگی۔ پولیس نے اسے اڑا دیا تھا۔

"گنگولی چوہدری!" میگا فون پر ایک بھاری آواز سنائی دی جسے پہچاننے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ انسپکٹر ونود پانڈے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "گنگولی چوہدری۔ تم لوگ چاروں طرف سے گھیرے میں آچکے ہو۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ میں تمہیں تین منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد فائر کھول دیا جائے گا۔"

گنگولی چوہدری نے جواب نہیں دیا۔ اس کے آدمی پوزیشن لینے کے لیے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے اور وہ خود ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں پوزیشن لے چکا تھا۔ اس کی پچھلی طرف ندی تھی اور گنجان درختوں کے ساتھ قد آدم جھاڑیاں اور پودے بھی تھے۔

میں بری طرح گڑبڑایا ہوا تھا۔ بملا بھی جاگ گئی تھی۔ اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا اور وہ مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ خوف کے باعث اس کے بدن میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ میرے پاس صرف خنجر تھا لیکن ظاہر ہے اس موقع پر خنجر کام نہیں دے سکتا تھا۔ میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران نارائن ایک طرف سے دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر ادھر

تھی۔ یہ میری باتوں کا اثر تھا یا کچھ اور کہ اس پر سنجیدگی طاری ہونے لگی تھی۔

میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ چٹان کی طرف سے ایک وحشی کی آواز سنائی دی۔

"اے کروشا! چوہدری بلاوت ہے تیرے کو۔ جا، اس کے پاس۔ وہ کلپ رہا ہے۔"

"میں چلتی ہوں۔" کروشا نے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑالیا "کل بات کریں گے۔"

وہ اٹھ کر چٹان کی طرف چلنے لگی جہاں اس کھوہ کے دہانے کے سامنے گنگولی چوہدری بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ راستے میں بیٹھے ہوئے ایک وحشی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

"کبھی ہمار گود میں بھی آجایا جیون بھر چوہدری کے کھونٹے سے بندھی رہے گی۔"

"وشنو اور رامو کا انجام بھول گیا ہے تو۔" کروشا نے کہتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کردیا۔

"کھی کھی کھی۔۔۔" وہ گال سہلاتے ہوئے بے غیرتی سے ہنس پڑا "آج کی رات اور عیش کرلے چوہدری کے ساتھ۔ کل تو ہمار پاس ہی آوے گی۔ چوہدری نے منت سب کو سنا دیا ہے۔ وہ تمہیں دان (تحفہ دینا) کردے گا ہمار کو پھر کہاں جاوے گی؟؟"

میں چونک گیا۔ کروشا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بملا کو اپنے تصرف میں لانے کے بعد چوہدری اسے (کروشا کو) ان وحشیوں کے حوالے کردے گا۔ کروشا نے یہ بھی بتایا تھا کہ شروع میں ایک موقع پر گروہ کے وشنو نامی ایک آدمی نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی تو چوہدری نے اسے گولی سے اڑا دیا تھا۔ جس طرح بملا کو ہاتھ لگانے کے جرم میں چوہدری نے رامو کو گولی سے اڑا دیا تھا۔

کروشا کے جانے کے بعد بملا میری گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔ حشرات الارض کی آوازوں کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گنگولی کے بیشتر آدمی اونگھ رہے تھے۔ دو آدمی اپنی رائفلیں سنبھالے پہرے کی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ایک ہماری نگرانی کر رہا تھا اور دوسرا چٹان پر کھڑا تھا۔

ادھر دیکھا اور پھر دوڑتا ہوا چوہدری کے قریب پہنچ گیا۔

"مجھے بچالو چوہدری۔" وہ گھگھیایا "پولیس نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"ڈرتا ہے۔ بزدل۔ حرامی۔" گنگولی چوہدری دہاڑا "اے حرامی۔ پولیس تیری وجہ سے یہاں آئی ہے۔ اگر تو اس لونڈے کو ساتھ لے کر نہ آتا تو پولیس ادھر کا رخ نہ کرتی مگر ڈرو نہیں۔ میں تمہیں پولیس کے ہاتھ نہیں لگنے دوں گا۔" چوہدری نے رائفل سیدھی کرکے ٹریگر دبا دیا۔

گولی نارائن کی کھوپڑی میں لگی اور وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

"ارے او چترا۔" چوہدری کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی "اس چھوکری اور لونڈے کا دھیان رکھیو۔ لونڈا بھاگنے کی کوشش کرے تو اڑا دینا سالے کو۔"

چترا دوڑتا ہوا ہمارے قریب پہنچ گیا اور ہم دونوں کو رائفل کی زد پر لے لیا۔ میں درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور بملا مجھ سے لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ہم یہاں بالکل محفوظ نہیں تھے۔ اگر دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہوجاتی تو ہم زد میں آسکتے تھے۔

انسپکٹر ونود پانڈے کی دی ہوئی مہلت ختم ہوگئی۔ اس نے میگا فون پر ایک بار پھر وارننگ دی اور اس کے ایک منٹ بعد فائر کھول دیا۔

فائرنگ کی آوازوں سے جنگل گونج اٹھا۔ میں بملا کو اپنے ساتھ لپٹائے درخت کی آڑ میں ہوگیا۔ گنگولی چوہدری کے آدمی بھی جگہ بدل بدل کر فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں کھڑا چترا بھی فائرنگ کر رہا تھا۔ وہ بار بار ہماری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میں اگر بملا کے ساتھ وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیں گولیوں سے چھلنی کردیتا۔

اسی وقت کروشا بھی دوڑتی ہوئی وہاں پہنچ گئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی رائفل تھی۔

"چترا۔" وہ چیخی "ان لوگوں کو میں دیکھتی ہوں۔ تم رگھو کی طرف جاؤ۔ اس طرف پولیس والے پودوں میں چھپ کر آگے بڑھ رہے ہیں۔"

چترا دوڑتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ کروشا نے سامنے گنجان درختوں کی طرف ایک برسٹ مارا۔ محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور نیکر کی جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو مجھ سے چھینا گیا تھا۔

"چٹان کی پچھلی طرف نکل جاؤ۔" کروشا نے میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا "وہاں ایسی جگہیں ہیں جہاں تم محفوظ رہ سکو گے۔"

"اور تم۔۔۔" میں نے جھک کر ریوالور اٹھاتے ہوئے کہا "تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ یہ بہترین موقع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھاؤ۔"

"میری فکر مت کرو۔ تم لوگ نکل جاؤ۔ جلدی کرو۔" کروشا چیخی۔

"ضد مت کرو کروشا۔" میں نے بھی چیخ کر کہا "یہ بہترین موقع ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔"

"میں کہتی ہوں، چلے جاؤ یہاں سے۔" کروشا دہاڑی "بملا کو لے کر نکل جاؤ۔ بحث میں وقت ضائع مت کرو۔"

واقعی بحث بے کار تھی۔ میں نے آخری بار کروشا کی طرف دیکھا اور بملا کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کی طرف دوڑ لگا دی۔ چٹان کی دوسری طرف گھومنے سے پہلے میں نے مڑ کر دیکھا۔ کروشا بھی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری طرف دوڑی جا رہی تھی۔

یہ چٹان نہ تو زیادہ اونچی تھی اور نہ ہی زیادہ لمبی چوڑی۔ اس کی پچھلی طرف بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور زمین ہموار نہیں تھی۔ چھوٹے بڑے لاتعداد گڑھے تھے۔

میں بملا کا ہاتھ پکڑے ایک طرف دوڑتا رہا۔ بملا پر دہشت طاری تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی۔ اگر میں نے اس کا ہاتھ نہ پکڑ رکھا ہوتا تو وہ ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ نہ اٹھ پاتی۔

ہم چٹان کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف آگئے۔ اس طرف جھاڑیوں اور پودوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ درختوں کی بھی بہتات تھی۔ بملا کا پیر جھاڑیوں میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ چیختی ہوئی جھاڑیوں میں گری۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ کئی سنسناتی ہوئی گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ میں بملا کے اوپر گر گیا اور اسے ساتھ لے کر لوٹ لگاتا ہوا نشیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

چند منٹ تک میں بملا کا ہاتھ پکڑے بے حس و حرکت پڑا رہا پھر اسے وہیں رکنے کا اشارہ کرکے جھاڑیوں کی آڑ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔

وہ رگھو تھا جس نے گزشتہ رات کروشا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایک بڑے پتھر کی آڑ میں کھڑا پولیس والوں پر فائر کر رہا تھا مگر اس طرف ہمیں دوڑتے دیکھ کر اس نے ہم پر بھی فائر کھول دیا تھا۔

جھاڑیوں کی آواز سن کر وہ ایک بار پھر مڑا۔ اس نے

مجھے دیکھ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ رائفل سیدھی کرتا، میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی ہنسلی کی ہڈی کے قریب لگی۔ وہ چیخ کر لڑکھڑایا تو میں نے دوسرا فائر کردیا۔ یہ گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ گر کر جھاڑیوں میں لڑھکتا ہوا دوسری طرف ندی میں جا گرا۔

میں نے ببلا کو اشارہ کیا۔ وہ رینگتی ہوئی میرے قریب آ گئی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑے ایک بار پھر جھکتا ہوا دوڑنے لگا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ یا تو اوپر سے گھوم کر پولیس پارٹی کی دوسری طرف نکل جاؤں یا کسی اور محفوظ جگہ کی طرف لیکن..... بدقسمتی سے ہم اس وقت پولیس اور گنگولی چوہدری کے آدمیوں کے گھیرے میں تھے۔

پتھروں کی دوسری طرف پہنچتے ہی گنگولی کے ایک اور آدمی سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ ہم اچانک ہی ایک دوسرے کے سامنے آئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اسے فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ تاہم اس نے رائفل کو لٹھ کی طرح اٹھا کر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ببلا کا ہاتھ چھوڑ کر بڑی تیزی سے اس کے پیٹ میں سر کی ٹکر رسید کردی۔ اس کے منہ سے "اوغ" کی آواز نکلی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا اور پھر اسے دونوں ٹانگوں سے گرفت میں لے کر اوپر اٹھایا اور اپنے پیچھے اچھال دیا۔

وہ سر کے بل گرا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے بڑی پھرتی سے سنبھلنے کی کوشش کی تھی لیکن اس مرتبہ میں نے اسے کوئی موقع نہیں دیا اور ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں لگی۔ میں نے ببلا کا ہاتھ پکڑ کر ایک بار پھر ایک طرف دوڑ لگادی۔

دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے انسانی چیخوں کی آوازیں بھی گونج جاتیں۔ گنگولی چوہدری کے دو آدمی تو میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کم از کم تین آدمی پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ پولیس کے بھی کچھ آدمی زخمی یا ہلاک ہوئے تھے کیونکہ اس طرف سے بھی چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

میں ببلا کو پکڑے تیزی سے ایک طرف دوڑتا رہا۔ ببلا ایک بار پھر ٹھوکر کھا کر گری۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ کچھ زیادہ ہی خوفناک تھی اور غالباً چیخ کی آواز سن کر ہی ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہوا چترا ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

ہمیں دیکھ کر چترا کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ اس نے رائفل کا رخ ہماری طرف کرکے ٹریگر دبا دیا۔ اگر میں ببلا کے ساتھ ایک طرف لوٹ نہ لگا دیتا تو ہم دونوں کے جسم چھلنی ہو جاتے۔

چترا کی رائفل خالی ہوگئی۔ اس نے رائفل ایک طرف پھینک دی اور خنجر نکال کر میری طرف لپکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نہتا تھا۔ میں اس وقت ببلا کے قریب پشت کے بل پڑا تھا۔ چترا نے خنجر والا ہاتھ اٹھا کر خوں خوار بھیڑیے کی طرح میرے اوپر چھلانگ لگادی۔

میں نے بڑی پھرتی سے ببلا کو پرے دھکیل دیا اور ریوالور والا ہاتھ اٹھا کر ٹریگر دباتا چلا گیا۔ مجھ تک پہنچنے سے پہلے تین گولیاں چترا کے سینے میں پیوست ہوگئیں اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ میں نے بھی بڑی پھرتی سے ایک طرف لوٹ لگادی تھی۔

چترا ختم ہوگیا تھا۔ وہ چترا جسے پولیس سے چھڑانے کے لیے گنگولی چوہدری نے تیرہ بے گناہ سیاحوں کو اغوا کیا تھا اور تین دن میں کم از کم چھ افراد کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اتفاق سے وہ میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ لیا تھا۔

میں ببلا کا ہاتھ پکڑ کر پھر ایک طرف دوڑا۔ ببلا بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں اسے کھینچتا ہوا دوڑ رہا تھا۔

ایک جگہ پہنچ کر میں رک گیا۔ آگے پتھروں کی دوسری طرف وہ ندی تھی جو کچھ دور جا کر تالاب میں گرتی تھی۔ پتھروں کی دوسری طرف سے گنگولی اور کروشا کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ببلا کو چھوڑ کر آگے بڑھا اور پتھر کی دوسری طرف جھانکنے لگا۔

وہ دونوں تقریباً دس فٹ نشیب میں تھے اور وہ منظر بڑا خوفناک تھا۔ گنگولی چوہدری نے کروشا کو رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ قریب ہی ایک لاش پڑی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے چوہدری۔" کروشا چیخ رہی تھی "اس وقت تمہیں آدمیوں کی ضرورت ہے اور تم اپنے ہی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہو۔"

"تم جانتی ہو غداروں سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں۔" چوہدری نے جواب دیا "یہ بھنڈاری بھی پولیس کو رات کے اندھیرے میں یہاں لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے غداری کی سزا دی ہے اور تم....." وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "تم بھی غدار ہو۔ تم نے اس چھوکری اور اس کے عاشق کو فرار ہونے کا موقع دیا۔ تمہیں بھی غداری کی سزا ملے گی۔"

"چوہدری!" میں چیخا "رائفل پھینک دو۔ تم میری زد پر ہو۔"

چوہدری تیزی سے میری طرف گھوما۔ میں نے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ "ٹک" کی آواز نکل کر رہ گئی۔ ریوالور خالی ہو چکا تھا۔ چوہدری نے رائفل کا برسٹ مارا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف گر کر اپنے آپ کو بچایا اور پھر دوسرے لمحے کروشا کی بھیانک چیخ اور دوڑتے ہوئے قدموں کی ہی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میں نے پتھر کی آڑ سے جھانک کر دیکھا تو کلیجا منہ کو آتا ہوا محسوس ہوا۔ کروشا گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ وہ خون اور کیچڑ میں لت پت تڑپ رہی تھی۔ گنگولی چوہدری وہاں سے بھاگ چکا تھا۔

میں نے اس ڈھلان پر چھلانگ لگادی۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ دائیں بائیں بڑے بڑے چوڑے پتھر تھے جن کے اندر سے ندی کا پانی رس رہا تھا اور سامنے گنجان درخت تھے۔ فائرنگ سے بچنے کے لیے یہ محفوظ ترین جگہ تھی اور اسی لیے گنگولی چوہدری نے یہاں مورچا لگا رکھا تھا لیکن میری وجہ سے اسے یہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔

گنگولی چوہدری واقعی انسان نہیں بھیڑیا تھا۔ میرے سامنے وہ اب تک اپنے ہی تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ پہلا رامو جس نے ببلا کے ساتھ دست درازی کی کوشش کی تھی۔ دوسرا بھنڈاری جو اس کے کہنے کے مطابق پولیس کو یہاں لایا تھا۔ اس کی لاش بھی میرے سامنے پڑی تھی اور تیسری کروشا جس کا جرم یہ تھا کہ اس نے مجھے اور ببلا کو ان کے چنگل سے نکلنے میں مدد دی تھی۔

میں دوڑ کر کروشا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کیچڑ اور خون میں لت پت تھی۔ ساری گولیاں اس کے پیٹ میں لگی تھیں۔ خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں، اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن سینے کا زیروبم بتا رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ تھی۔

"کروشا... کروشا... آنکھیں کھولو۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اسی لمحے پیچھے آہٹ سن کر میں تیزی سے مڑا۔ وہ ببلا تھی جو ڈھلان پر گھسٹتی ہوئی نیچے آ رہی تھی اور پھر کروشا کو دیکھ کر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا؟" وہ بمشکل بول سکی۔

"اسے ہماری مدد کرنے کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔" میں نے جواب دیا "چوہدری نے اسے محض اس لیے گولیوں سے چھلنی کردیا کہ اس نے ہمیں بھاگنے میں مدد دی تھی۔"

"یہ۔ یہ زندہ ہے۔" ببلا نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی
علی یار خان کی سرگزشت
کتابی صورت
(گیارہ حصوں میں)
تیار ہے
مجاہد
قیمت فی حصہ 60 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200

کروشا نے آنکھیں کھول دیں۔ بے پناہ کرب تھا ان آنکھوں میں۔ وہ چند لمحے ہماری طرف دیکھتی رہی۔ شاید اسے پہچاننے میں دشواری پیش آرہی تھی اور پھر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر بملا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"بج... جا... ؤ..." اس کے ہونٹ کپکپائے اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے ایک بار پھر باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ کبھی نہ کھولنے کے لیے۔

میں نے کروشا کا ہاتھ اٹھا کر آہستگی سے اس کے پہلو میں رکھ دیا۔ بملا نے بڑی مشکل سے اس کے سینے پر سے ہاتھ ہٹایا تھا۔ خوف و دہشت سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ بملا کئی روز سے کنگولی چوہدری جیسے وحشیوں کے جال میں پھنسی ہوئی تھی اور وہ کروشا ہی تھی جو اب تک اسے بچائے ہوئے تھی اور بملا کو بچانے کے لیے ہی اس نے اپنی جان دے دی تھی۔ مجھے بھی کروشا کے اس طرح مرنے کا بہت افسوس تھا۔ اگر وہ اس وقت ہمارے ساتھ بھاگ نکلتی تو ہم یقیناً اس جنگل سے نکلنے میں بھی کامیاب ہوجاتے اور مجھے یقین تھا کہ کروشا ایک نئی اور خوشگوار زندگی کے راستے پر بھی گامزن ہوجاتی لیکن شاید یہ سب کچھ اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ قسمت کا چکر بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔

تڑتڑاہٹ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ ہمارے سامنے درختوں میں فائرنگ ہو رہی تھی۔ سامنے سے اس پناہ گاہ سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ ہم کراس فائرنگ کی زد پر آسکتے تھے۔

میں بملا کا ہاتھ پکڑ کر ڈھلان پر چڑھ گیا۔ اوپر پہنچ کر مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ میرا ریوالور تو خالی ہوچکا ہے۔ مجھے کروشا کی رائفل اٹھالینی چاہیے تھی۔

"تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے بملا سے کہا اور دوبارہ ڈھلان پر اترنے کے لیے مڑا ہی تھا کہ چوہدری کا ایک آدمی کسی طرف سے دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے مڑ کر بملا کا ہاتھ پکڑا اور دوسری طرف دوڑ لگادی۔

اب میرا وہاں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں بملا کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا اور پھر ہمیں رک جانا پڑا۔ ہمارے راستے میں حائل وہ ندی چار پانچ فٹ سے زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ میں تو آسانی سے چھلانگ لگا کر دوسری طرف پہنچ سکتا تھا لیکن بملا کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔

"رک جاؤ۔ ایک منٹ رک جاؤ ہمت سنگھ۔" بملا نے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ اس سے اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم اس جگہ سے بہت دور نکل آئے تھے۔ پولیس نے کنگولی چوہدری کے کیمپ کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور میرے خیال میں کسی کے بھی زندہ بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔ فائرنگ کی آوازیں خاصی دور تھیں اور میرے خیال میں چند منٹ رک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

میں نے بملا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ "بھد" سے نیچے بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے زمین پر ٹکالیے۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں اس کے قریب کھڑا محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔

تقریباً دس منٹ بعد بملا اپنی حالت پر قابو پاسکی تھی۔ اس نے شکم سیر ہو کر ندی سے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی ٹانگوں میں اب بھی ہلکی سی لپکپاہٹ تھی۔ میں نے بھی پانی کے چند گھونٹ پیے اور آگے روانگی کے لیے تیار ہوگیا۔

ندی کا پانی شفاف تھا۔ اس کی تہ میں پتھر نظر آرہے تھے۔ گہرائی ڈھائی تین فٹ کے قریب تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی کسی قدر تیز تھا اور بملا ندی میں اترتے ہوئے ڈر رہی تھی۔

"اگر تم پانی میں نہیں اترنا چاہتیں تو ندی پار کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا؟" بملا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ... اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے بڑی پھرتی سے جھک کر بملا کو گود میں اٹھالیا۔

بملا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میرا ایک ہاتھ اس کی ٹانگوں کے نیچے اور دوسرا گردن کے نیچے تھا۔ اس کی شرٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اور اس کے اندر کی تصویر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی پیدا کرنے لگی۔ بملا نے ایک ہاتھ میری گردن پر ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے قمیص کے گریبان کے دونوں حصے پکڑ کر میری نظروں کے سامنے پردہ ڈال دیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ بملا کی آنکھوں میں ایک دم سرخی کے ڈورے تیرنے لگے تھے اور چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔

میں بڑی احتیاط سے ندی میں اتر گیا۔ کنارے کے قریب تو پانی واقعی ڈھائی تین فٹ گہرا تھا لیکن درمیان میں پانی میری کمر تک پہنچ گیا اور بملا بھی بھیگ گئی۔ پانی کی روانی خاصی تیز تھی۔ دو تین مرتبہ میرے قدم لڑکھڑائے تھے۔ ایک مرتبہ تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔

دوسرے کنارے کے قریب پہنچ کر میں نے بملا کو کنارے کی گھاس پر ڈال دیا۔ وہ پھرتی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ندی کا کنارہ عمودی تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

یہاں بھی ہمیں اس وقت تک کھڑے رہنا پڑا جب تک ہمارے کپڑوں سے پانی نچڑنا بند نہیں ہوگیا اور پھر ہم تیزی سے ایک طرف چلنے لگے۔ بملا کا اپنے آپ پر اعتماد بحال ہو رہا تھا اور وہ بھی میرے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چل رہی تھی۔

عقب میں فائرنگ کی آوازیں دور ہوتی جارہی تھیں۔ یہ معرکہ صبح چھ بجے کے قریب شروع ہوا تھا۔ اب سورج سوا نیزے پر آرہا تھا اور یہ معرکہ ابھی تک جاری تھا۔ کنگولی چوہدری کے آدمیوں کے پاس وافر مقدار میں اسلحہ موجود تھا۔ پانچ سو گولیاں تو کل ہی نارائن نے لا کر دی تھیں اور لگتا تھا کہ پولیس بھی پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔

اونچے نیچے راستوں پر چلتے، دوڑتے ہوئے ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے تھے۔ فائرنگ کی اکا دُکا آوازیں اب بھی ہم تک پہنچ رہی تھیں اور وہ بہت دور کی آوازیں تھیں۔

اس جگہ درخت چھدرے تھے لیکن جھاڑیاں اور چوڑے پتوں والے پودے بکثرت تھے۔ کہیں کہیں تو یہ پودے اتنے گنجان تھے کہ ہمیں راستہ بنانے میں بھی خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔

دوپہر ہوگئی۔ سورج ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ بملا تھک گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر لڑکھڑانے لگی تھی۔ پیاس کی شدت سے اس کا بھی برا حال ہو رہا تھا اور میرے حلق میں بھی کانٹے چبھنے لگے تھے۔ اس ندی کے بعد سے ہمیں کہیں نہ تو کوئی اور ندی ملی تھی اور نہ ہی کسی جگہ جوہڑ یا تالاب کی صورت میں پانی کا ذخیرہ نظر آیا تھا۔ اگرچہ بھوک سے بھی پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں مگر پیاس کی شدت نے زیادہ بے چین کر رکھا تھا۔

مزید ایک گھنٹا چلتے رہنے کے بعد بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں درختوں کے جھنڈ کی دوسری طرف ایک لمبے چوڑے گڑھے میں پانی نظر آگیا۔ یہ بارش کا پانی تھا جو اس گڑھے میں جمع تھا۔ دوسرے کنارے پر دو ہرن پانی پی رہے تھے جو ہمیں دیکھ کر وہاں سے بھاگ گئے۔

دھوپ میں ہونے کی وجہ سے پانی گرم تھا لیکن بہرحال پیاس تو بجھ سکتی تھی۔ عجیب ستم ظریفی تھی۔ جس جوہڑ سے جنگلی جانور پانی پیتے تھے اسی سے ہم اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔

پانی پی کر ہم جوہڑ سے چند گز دور درختوں کے سائے میں آگئے۔ بملا گھاس پر لیٹ گئی۔ گہرے سانس لینے سے اس کے سینے کا زیر و بم بڑا دل فریب منظر پیش کر رہا تھا۔ اس سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے میری نظریں ایک بار پھر جوہڑ کی طرف اٹھ گئیں اور اس مرتبہ میں بری طرح چونک گیا۔

جوہڑ کے دوسرے کنارے پر ایک بھیڑیا پانی پی رہا تھا۔ دراصل زبان سے پانی پینے کی "چپڑ چپڑ" کی آواز نے ہی مجھے اس طرف متوجہ کیا تھا۔ پانی پینے کے بعد بھیڑیے نے تھوتھنی اوپر اٹھائی۔ وہ شاید فضا میں کچھ سونگھ رہا تھا اور پھر اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے اس کی ماں مرگئی ہو اور وہ بین کر رہا ہو۔

بملا بھیڑیے کی آواز سن کر ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ میں نے اسے پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے اس بھیڑیے کو دیکھ رہی تھی جو اب بھی تھوتھنی اٹھائے بین کر رہا تھا۔

"بھاگو یہاں سے۔" وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی "یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بلا رہا ہے۔ اگر دو چار بھیڑیے اور یہاں جمع ہوگئے تو ہمیں گھیر کر ہمارے بخیے ادھیڑ ڈالیں گے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بلا رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ بھیڑیے کی فطرت ہے۔" بملا بولی "وہ اکیلا ہو تو کسی انسان پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کرتا لیکن اگر غول کی صورت میں ہوں تو اکیلے دوکیلے انسان کو زندہ بچ کر جانے نہیں دیتے۔ اس سے پہلے کہ اس کے دو چار ساتھی اور آجائیں ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

بملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ دو تین منٹ بعد ہی جوہڑ کی دوسری طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر درختوں سے ایک اور بھیڑیا نکل کر جوہڑ کے کنارے پر پہنچ گیا اور وہ بھی پہلے بھیڑیے کے ساتھ تھوتھنی اٹھا کر منہ سے بین جیسی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ دونوں بار بار ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔

خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے بملا کا ہاتھ پکڑا یا اور ہم چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے گنجان درختوں میں گھس گئے اور پھر اٹھ کر تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگے۔ جوہڑ کے پرلے کنارے سے بھیڑیوں کے رونے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں مگر ہم لمحہ بہ لمحہ ان سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔

ہم وہاں سے بہت دور نکل آئے اور یہ شکر ہے کہ ان بھیڑیوں نے ہمارا پیچھا نہیں کیا تھا۔ مجھے اچانک ہی وہ خواب یاد آگیا جو میں نے تین چار روز پہلے دیکھا تھا۔ بھیڑیوں نے ببلا کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس پر حملہ کرنے کے لیے لپک رہے تھے۔ اسے چیر پھاڑ کر اپنی خوراک بنانا چاہتے تھے۔

میں نے اسے انسان نما بھیڑیوں کے چنگل سے تو نکال لیا تھا اور اب اصلی خوں خوار بھیڑیوں کے گھیرے میں آتے آتے رہ گئے تھے۔ میں نے ببلا کو اپنا خواب سنایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"تو تم مجھے سپنوں میں بھی دیکھنے لگے ہمت سنگھ!" اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بڑی پراسرار سی چمک تھی۔

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے اسے گھورا حالانکہ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"سپنوں میں تو اس کو دیکھا جاتا ہے جس کی من میں لگن ہو۔"

"اگر لگن نہ ہوتی تو میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر تمہیں بچانے کے لیے بھیڑیوں کے اس بھٹ میں کیوں گھستا۔" یہ الفاظ میرے منہ سے بالکل غیر ارادی طور پر نکلے تھے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ ببلا کی لگن ہی نے مجھے موت کے اس کنوئیں میں کودنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ میں نے جب سے ببلا کو دیکھا تھا، اپنے آپ میں عجیب سی ہلچل اور بے چینی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ لڑکی میرے حواس پر بری طرح چھا گئی تھی۔

ببلا پچھلی رات سے میرے ساتھ تھی۔ رات تو وہ میری گود میں سر رکھ کر سوئی رہی تھی اور صبح سے میرے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ میں نے اسے گود میں اٹھا کر ندی پار کی تھی تو اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی تھی اور اب اس کی جھجک ختم ہو گئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر چل رہی تھی اور اپنا ایک ہاتھ بھی میری کمر میں حمائل کر رکھا تھا۔

ہم خطرے سے نکل آئے تھے لیکن میرے خیال میں ہم نے خطرے کی آخری حد ابھی پار نہیں کی تھی۔ گنگولی چوہدری کے کئی آدمی میرے اور پولیس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ جو بچے تھے انہیں ہم پولیس سے الجھا چھوڑ آئے تھے۔ ان کا خطرہ تو فی الحال ٹل گیا تھا لیکن میلوں دور تک پھیلا ہوا یہ جنگل بھی ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ یہاں خوں خوار درندے بھی تھے اور ہمیں کچھ پتا نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں اور کبھی اس جنگل سے باہر نکل بھی سکیں گے یا نہیں۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے ہمت سنگھ۔"

ببلا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں اب تک اس احساس کو دبائے ہوئے تھا مگر ببلا کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"اس طرف چلو۔ شاید وہاں کوئی پھل دار درخت نظر آجائے۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں گنجان درخت تھے اور ان میں ناریل کے بھی کئی بلند درخت نظر آرہے تھے۔

وہاں پہنچنے میں ہمیں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سورج کا جھکاؤ مغرب کی طرف تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہمیں کوئی ایسی محفوظ جگہ بھی تلاش کر لینی چاہیے جہاں ہم رات گزار سکیں۔

درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چند ناریل مل گئے جو نجانے کب سے درختوں سے ٹوٹ کر وہاں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پتلون کے پائنچے سے خنجر نکال لیا اور ایک ناریل کا چھلکا ادھیڑنے لگا۔

ناریل کھول کر میں نے گری میں خنجر کی نوک سے سوراخ کیا اور اسے ببلا کی طرف بڑھا دیا۔ ببلا نے ناریل منہ سے لگا کر پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ناریل میں بچا کھچا پانی میں نے حلق میں انڈیل لیا اور خنجر سے ناریل کے ٹکڑے کرنے لگا۔

میں نے ایک اور ناریل اٹھا لیا اور ہم وہاں سے آگے چل پڑے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے مجھے ایک ایسی جگہ نظر آ ہی گئی جہاں ہم آرام سے رات گزار سکتے تھے۔ یہ پہاڑی میں ایک کھوہ سی تھی جس میں تین چار آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔ اس کھوہ کے سامنے قد آور پودے اور درخت تھے اور اس طرح یہ چھوٹا سا غار کچھ اور بھی محفوظ ہو گیا تھا۔

ابھی دن کی ہلکی سی روشنی تھی۔ میں نے اس صاف ستھرے غار کا جائزہ لے کر اندازہ لگا لیا کہ وہاں ہم سے پہلے بھی کوئی نہ کوئی رہتا رہا ہے۔

جب تک دن کی روشنی رہی، ہم باہر بیٹھے رہے اور پھر اندھیرا پھیلتے ہی غار میں آگئے اور دہانے کے قریب ہی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور باتوں میں وقت گزارنے کی کوشش کرنے لگے۔

ببلا کے بارے میں، میں نے جو کچھ بھی سنا تھا، خود کر بجانوت سنگھ ہی سے سنا تھا۔ وہ تو خود بھی اپنے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی لیکن بہت سی باتیں ایسی تھیں جو پہلی ملاقات میں نہیں کہہ سکی تھی۔

باہر رات گہری ہو رہی تھی۔ جھینگروں اور حشرات الارض کی آوازیں دلوں پر عجیب سی دہشت طاری کر رہی تھیں۔ غار میں بھی گہرا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ ببلا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے اوپر اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا اور پھر اس نے اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس کے منہ سے سرگوشی جیسی آواز نکلی۔

"ڈر۔ کس چیز سے۔" میں نے کہا "اندھیرے سے، مجھ سے یا اس جنگل سے؟"

"تم ایسی چیز تو نہیں ہو کہ تم سے ڈرا جائے لیکن ڈر تو ڈر ہی ہوتا ہے۔ یہاں اندھیرا بھی ہے۔ جنگل بھی ہے۔ خوں خوار درندے بھی ہیں اور۔۔۔"

"دیکھو ببلا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ڈر کی ٹریننگ تو ہمیں بچپن ہی سے ملتی ہے اور شروع ہی سے ہمیں بھوت، چڑیل، اندھیرے اور دوسری بہت سی چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے لیکن ایک وقت میں ایک ہی چیز سے ڈرنا چاہیے۔ تم نے تو بہت سی چیزوں کے نام لے دیے۔ اب میری سمجھ میں تو نہیں آرہا کہ تم دراصل کس چیز سے ڈر رہی ہو۔"

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور میں واقعی ڈر رہی ہوں۔ دیکھو میرا دل کس تیزی سے دھڑک رہا ہے۔" ببلا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ دیا۔

ببلا نے ایسا بے اختیاری میں کیا تھا اور میرے خیال میں اس کے ذہن میں کوئی پراگندگی بھی نہیں تھی لیکن اس کی اس معصومانہ حرکت سے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر دبا رہی تھی۔ میری گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

"دیکھا۔ دیکھا میرا دل کتنی زور سے دھڑک رہا ہے؟" اس نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

ببلا کے دل کی دھڑکن تو میں محسوس نہیں کر سکا لیکن میرے دل کی دھڑکن خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی۔ لگتا تھا جیسے میرے سینے میں دھڑکتا ہوا گوشت کا لوتھڑا سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹانا چاہا مگر اس نے میرے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ مزید بڑھا دیا۔ اسے شاید احساس ہو گیا تھا کہ وہ کیا حرکت کر گزری ہے اور شاید اب وہ اس ڈر اور خوف کے کھیل کو آگے بڑھانا چاہتی تھی۔ اس نے دوسرا ہاتھ میری گردن میں ڈال دیا اور دباؤ ڈالتے ہوئے میرا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لانے لگی۔

اس کی گرم گرم بے ربط سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے ہونٹوں پر انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ ان انگاروں کی تپش میرے اندر تک پھیلتی جا رہی تھی۔

اور پھر اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے گولڈن ٹرائی اینگل کی وہ رات یاد آگئی۔ بالکل ایسی ہی صورت حال تھی۔ میں اور سونیا موت کے ہرکاروں سے بچنے کے لیے ایسے ہی ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ایسی ہی کالی رات تھی۔ اندھیرا غار۔ ہمارے دلوں پر موت کے ہرکاروں کا خوف طاری تھا لیکن اس تاریک غار میں ایک دوسرے کے قرب میں وہ خوف ہمارے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔ گھنگھور اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن لمس سے ایک دوسرے کی موجودگی کو محسوس کر سکتے تھے۔

بالکل ایسے ہی ہوا تھا۔ سونیا اس اندھیرے غار میں اسی طرح میرے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹی تھی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ بالکل اسی طرح سونیا نے میری گردن میں بازو ڈال کر میرا چہرہ اپنے چہرے پر جھکایا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر اس کی گرم سانسوں کا لمس محسوس کیا تھا اور پھر اس کے ہونٹوں کی تپش نے میرے سینے میں آگ لگا دی تھی اور میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اپنے کردار کی عظمت کو بھول گیا تھا اور میں بلندیوں سے پستیوں کی طرف گرتا چلا گیا تھا۔

وقت اپنے آپ کو اسی رنگ اور اسی انداز میں دہرا رہا تھا۔

"نہیں!" میرے اندر سے کوئی چیخا۔

میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔ ببلا تڑپ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے اپنے سے الگ کر دیا۔

"کیا ہوا ہمت سنگھ۔ ناراض ہو گئے؟" اندھیرے میں ببلا کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"نہیں ببلا۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے

ہوئے کہا "جو کچھ ہوا... مجھے چھما (معاف) کردو۔ میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا جس سے میرے اور گنگولی چوہدری کے بیچ فرق مٹ جائے۔ ہمیں یہ سب کچھ شوبھا (زیب) نہیں دیتا۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم باتیں کریں گے۔ بہت ساری باتیں۔"

"ہاں۔ باتیں تو تم بہت اچھی کرلیتے ہو۔" ببلا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم نے کل رات یہ بھی کہا تھا ناکہ تمہیں مجھ سے بڑی لگن ہے اور یہ لگن ہی تمہیں اس خطرناک جنگل میں لے آئی تھی جہاں گنگولی چوہدری جیسے لٹیروں نے مجھے اپنے قبضے میں لے رکھا تھا۔"

"ہاں ببلا۔ میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔" میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ویسے میں اس کے طنز کو سمجھ گیا تھا "لیکن تم تو پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ سمجھ دار ہو لیکن یہ چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آسکی کہ جس کھلونے سے کھیل لیا جائے اس سے جی بھر جاتا ہے۔ میں نے تمہیں ایک دوست کی طرح اپنے دل میں جگہ دی ہے اور دوستی تو وہ پوتر اور مقدس رشتہ ہے جس کی بنیاد وفا اور اعتماد پر قائم ہوتی ہے اور اگر اعتماد ہی چکنا چور ہوجائے تو اس رشتے کا تقدس بھی ختم ہوجاتا ہے۔"

"مجھے نیند آرہی ہے۔" ... نے جواب دیا۔

میں اس کی ناراضگی کو سمجھ گیا "آؤ۔ میری گود میں سر رکھ کر سوجاؤ۔" میں نے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

وہ واقعی ناراض تھی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا اور کچھ دیر بعد وہ واقعی سوگئی۔ میں اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا اور پھر میری آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

پرندوں کے چہچہانے اور ان کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ببلا میرے پاس نہیں تھی۔ وہ غار میں بھی نہیں تھی۔ میں نے باہر دیکھا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے باہر آگیا اور پھر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

ببلا غار سے چند گز دور ایک پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ واقعی ناراض تھی۔

"کتنا اچھا لگ رہا ہے یہاں بیٹھنا۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "پرندوں کے سریلے نغمے' تازہ ہوا' پھولوں کی مہک۔ کتنی خوشگوار فضا ہے۔ ہر قسم کی آلودگی سے پاک۔ تم نے کبھی یوگا کی پریکٹس کی ہے؟"

"کیا کرتی تھی۔ عرصہ ہوا چھوڑ دی۔" ببلا نے جواب دیا۔

"میں نے بھی بہت عرصے سے پریکٹس نہیں کی۔ چلو آج دونوں تھوڑی سی مشق کرلیتے ہیں۔" میں نے کہا اور ذرا آگے جاکر ہموار جگہ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ میرا ایک پیر دوسرے پیر پر تھا اور کمر بالکل سیدھی تھی۔ ببلا بھی یہی پوسچر (آسن' انداز' پوزیشن) بناکر بیٹھی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ یوگا جانتی تھی۔

"تم تو جانتی ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "یوگا تیاگ یا خوابیدگی کی کوئی علامت نہیں بلکہ یہ ایک ضبط ہے۔ جس میں کامیابی کے بعد ایک نشہ سا طاری ہوجاتا ہے۔ فخر و برتری کا نشہ۔ یہ احساس کہ ہم نے اپنی خارجی اور داخلی کیفیات کو اپنے طابع کرلیا ہے۔ یہ احساس اس مخفی قوت کا سرچشمہ ہے جو یوگا میں کامیابی کے بعد ہمارے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے پھر آدمی کسی سے خوف نہیں کھاتا۔"

میں نے خاموش ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے گردن ہلادی۔

میں نے مزید کچھ نہیں کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

ہماری یہ پریکٹس آدھے گھنٹے سے زیادہ جاری نہیں رہ سکی۔ ببلا نے آسن توڑ دیا تھا۔ مجھے بھی مشق ختم کرنی پڑی۔ ببلا جیسی لڑکی کے لیے اتنی مشق ہی بہت تھی۔

سورج طلوع ہورہا تھا۔ میں نے دوسرا ناریل بھی ادھیڑ ڈالا اور اس طرح ناریل کا ناشتا کرتے ہوئے ہم وہاں سے چل پڑے۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ ایک فائر کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آواز اگرچہ بہت دور کی تھی لیکن ہمارے لیے خطرے کی علامت تھی۔ پولیس اور ڈاکوؤں میں ابھی تک آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔ میرا خیال تھا کوئی ایک آدھ ڈاکو ہی بچا تھا اور شاید اس کا تعاقب کرنے والا بھی فرد واحد ہی تھا۔ انہوں نے کہیں رات گزاری تھی اور پھر ایک دوسرے کے پیچھے لگ گئے تھے۔

ببلا کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ اور ایک طرف دوڑنا شروع کردیا۔ اس کے بعد اگرچہ فائر کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی مگر میں اپنے آپ کو محفوظ کرلینا چاہتا تھا۔

ہم رکتے دوڑتے وہاں سے میلوں دور چلے گئے۔ اس وقت ہم ایک پہاڑی پر تھے۔ یہاں بھی درختوں اور جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ببلا چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر گئی۔

"اب مجھ سے نہیں چلا جاتا۔" وہ کراہ رہی تھی "پانی۔ مجھے پانی دو۔ میرا گلا خشک ہورہا ہے۔ سانس رک رہا ہے۔"

میری آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔ میں چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم یہیں رکو۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں۔ شاید پانی مل جائے۔"

"جلدی آجانا۔ مم... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" ببلا نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں جواب دیے بغیر دوڑتا ہوا نشیب میں اترتا چلا گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد میں ایک چھوٹی سی ندی پر پہنچ گیا اور اتفاق سے ایک ناریل کے گری کے اوپر والے سخت چھلکے کا آدھا حصہ بھی مل گیا جو کسی کٹورے کی طرح تھا۔ شاید کبھی کوئی ادھر سے گزرا تھا جس نے یہ پیالہ نما ناریل کا چھلکا یہاں پھینک دیا تھا۔

میں نے ناریل کے پیالے کو خوب اچھی طرح دھو کر پہلے خود پانی پیا اور پھر پیالہ بھر کر واپس چل پڑا۔ واپسی میں بھی مجھے دس منٹ لگ گئے اور جب میں پودوں سے نکل کر کھلی جگہ پر آیا تو اس درخت کے نیچے ببلا کو نہ پاکر پریشان ہوگیا۔

جگہ وہی تھی مگر ببلا غائب تھی۔ وہ کہاں جاسکتی ہے؟ میں سوچتے ہوئے آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ہوسکتا ہے کسی جانور کو دیکھ کر ببلا ڈر گئی ہو اور اس سے بچنے کے لیے جھاڑیوں میں چھپ گئی ہو۔

"ببلا۔ کہاں ہو تم۔ میں آگیا ہوں۔ دیکھو تمہارے لیے پانی لے آیا ہوں۔" میں نے ببلا کو پکارا۔

جواب میں خاموشی رہی۔

"ببلا۔ کہاں ہو تم؟" میں نے اس مرتبہ زیادہ اونچی آواز میں پکارا۔

اس مرتبہ ایک طرف سے گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ میں اس طرف مڑ گیا۔ اس طرف چوڑے پتوں والے قد آدم پودوں میں حرکت ہورہی تھی اور چند سیکنڈ بعد میں نے جو منظر دیکھا وہ بہت ہی خوفناک تھا۔

وہ گنگولی چوہدری تھا جس نے ایک ہاتھ ببلا کی گردن پر سے گھما کر اس کا منہ بند رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک اس کے برہنہ سینے سے لگا رکھی تھی۔

"تم سمجھتے تھے چھوکری کو لے کر بھاگ جاؤ گے۔" گنگولی نے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی "لنگولی شیر

ہزاروں ماہرین طب کی آرا
کی روشنی میں مرتب کردہ کتاب
مٹاپا
اور
اس کا سدباب
قیمت 45 روپے ✣ ڈاک خرچ 23 روپے
مٹاپا......دل سے دشمنی
مٹاپا......زندگی کا خاتمہ
کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔
تو پھر جلدی کیجیے.....
ہماری مرتب کردہ کتاب
"مٹاپا اور اس کا سدباب" کا مطالعہ ضرور کیجیے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس پر عمل کرکے آپ ایک متناسب اور سڈول جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں
خط و کتابت کا پتہ
6802862-6596313 - 6802591
رابطے کا پتہ: 63-C فیز II ایکس ٹینشن D.H.A مین کورنگی روڈ کراچی

ہے اور اس کے منہ سے شکار چھیننے کے لیے کوئی مائی کا لال ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی مگر میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ پانی کا پیالہ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے وہ پیالہ پوری قوت سے چوہدری کی طرف اچھال دیا۔

آدھے سے زیادہ پانی راستے ہی میں گر گیا لیکن ناریل کا پیالہ گنگولی چوہدری کے منہ پر لگا۔ اس کے منہ سے گندی گالی نکلی۔ اس کا خنجر، ببلا کے سینے سے ہٹ گیا اور یہی میں چاہتا تھا۔ میں نے ایک بھی لمحہ ضائع کیے بغیر چھلانگ لگا دی اور چوہدری کو ساتھ لیتا ہوا زمین پر گرا۔ ببلا بھی چیختی ہوئی ایک طرف گر گئی تھی۔

خنجر چوہدری کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ میں کچھ دیر چوہدری کو رگیدتا رہا پھر اس کا داؤ چل گیا۔ اس کی چند ٹھوکریں کھانے کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے اور ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے پہاڑی کے کنارے کے قریب پہنچ گئے۔ دوسری طرف عمودی ڈھلان تھی اور سیکڑوں فٹ گہرا کھڈ۔

میں نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گنگولی چوہدری مجھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا اور میں اس سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹ رہا تھا۔

اور پھر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ اس طرح مجھے کھڈ کے کنارے کی طرف لا رہا تھا۔ کھڈ کا کنارہ صرف چند فٹ دور رہ گیا تھا۔

گنگولی کی ایک ٹھوکر سے بچنے کے لیے میں نے اچھلنا چاہا تو ایک پتھر میرے پیر کے نیچے سے نکل گیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور کنارے کی طرف لڑھکنے لگا۔

میری ٹانگیں عمودی کنارے سے نیچے لٹک گئی تھیں اور میں نے اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے کنارے پر ایک جھاڑی کی شاخوں کو پکڑ لیا۔ نیچے کی طرف نگاہ ڈالی تو سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کھڈ سیکڑوں فٹ گہرا تھا اور نیچے بڑے بڑے پتھر تھے۔

میرے جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

گنگولی چوہدری پر جنون طاری تھا۔ وہ جھاڑی پر سے میری گرفت چھڑانے کے لیے میرے ہاتھوں پہ ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ موت مجھے آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگی اور میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

میرے سیدھے ہاتھ پر گنگولی چوہدری کے پیر کی ایک اور ٹھوکر لگی۔ یہ ٹھوکر پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ اس نے جو گرز پہن رکھے تھے اور جوتے کی ٹو نے میری انگلیوں کے جوڑوں کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ جھاڑی پر میری گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی۔ اب میرا سارا زور بائیں ہاتھ پر تھا جس سے میں نے جھاڑی کی دوسری شاخ کو پکڑ رکھا تھا۔

گنگولی چوہدری کی حالت واقعی اس درندے جیسی تھی جس کے منہ سے اس کا نوالہ چھین لیا گیا ہو۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے سیدھے ہاتھ پر ایک اور ٹھوکر لگائی۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی۔ جھاڑی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اب میں نے صرف بائیں ہاتھ سے جھاڑی کی دوسری شاخ کو گرفت میں لے رکھا تھا اور گنگولی جس طرح میرے ہاتھوں پر وزنی ہتھوڑے کی طرح ٹھوکریں برسا رہا تھا اس سے کسی بھی لمحے میرے دوسرے ہاتھ کی گرفت بھی چھوٹ سکتی تھی۔

میں نے گردن جھکا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ مجھے سیکڑوں فٹ نیچے کی زمین گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دے کر اپنے حواس پر قابو پالیا۔ اس وقت معمولی سا خوف بھی میرے حوصلے کی مضبوط بنیادوں کو ہلا سکتا تھا اور یہ دراصل حوصلہ ہی تھا کہ میں اب تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔

گنگولی اب میرے دوسرے ہاتھ پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں کے جوڑوں کی کھال ادھڑ گئی تھی جس سے بہت ہلکا سا خون رسنے لگا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اس ہاتھ سے ایک بار پھر جھاڑی کی ایک شاخ کو پکڑ لیا۔

چٹان کے کنارے پر پتھروں میں وہ جھاڑی اگرچہ خاصی مضبوط تھی لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اس کی جڑیں زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر جمی نہیں رہ سکیں گی۔ یہ چٹان پتھروں اور سرخ بھربھری مٹی پر مشتمل تھی۔ گنگولی چوہدری کی ہر ٹھوکر کے ساتھ سرخ مٹی بھی اڑ رہی تھی۔ ہر ٹھوکر کے ساتھ میرے جسم کو جھٹکے بھی لگ رہے تھے اور ڈر اس بات کا تھا کہ کسی جھٹکے کے ساتھ جھاڑی کی جڑیں اپنی جگہ نہ چھوڑ دیں۔

کچھ دیر پہلے گنگولی چوہدری نے ببلا کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ گرنے سے اس کے سر پر شاید چوٹ لگی تھی۔ وہ کچھ دیر جھاڑیوں میں بے حس و حرکت پڑی رہی پھر اٹھ کر چیختی ہوئی گنگولی چوہدری کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور اسے وہاں

سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چیخ چیخ کر مجھے بھی خبردار کر رہی تھی۔

"ہمت سنگھ! ہمت کرو۔ میں نے اسے پکڑ رکھا ہے۔ تم اوپر آنے کی کوشش کرو....."

وہ گنگولی چوہدری کو وہاں سے چند فٹ دور لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ گنگولی چوہدری اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غلیظ گالیاں بک رہا تھا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ چھڑالی۔ دوسری ٹانگ اب بھی ببلا کی گرفت میں تھی۔ وہ جونک کی طرح اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں اس نازک بدن لڑکی کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ گنگولی چوہدری اپنی آزاد ٹانگ سے اسے ضربیں لگا رہا تھا مگر ببلا جس طرح دلیری سے اس صورتِ حال کا مقابلہ کر رہی تھی وہ قابلِ تعریف تھا۔

"ہمت سنگھ۔ اوپر آؤ۔ جلدی کرو....."

میں نے اب جھاڑی کی شاخوں کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ میں نے گرفت کچھ اور مضبوط کر کے دونوں پیر چٹان پر جما دیے۔ اس وقت میری پوزیشن بالکل ایسے تھی جیسے کوئی کوہ پیما رسی سے لٹک کر چٹان پر پیر جمائے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میرے دونوں پیر قریب قریب چٹان پر جمے ہوئے تھے پھر میں نے سیدھا پیر اٹھا کر اس جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر رکھا پھر دوسرا پیر اس سے ایک فٹ اوپر لے گیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا تمام تر بوجھ جھاڑی پر پڑ رہا تھا۔

میں نے سیدھا پیر مزید اوپر بڑھایا تو مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا دل سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جھٹکا لگنے سے میں کچھ نیچے آگیا تھا۔ جھاڑی کی جڑیں ہل گئی تھیں۔ میرے جسم کے مسام ایک بار پھر تیزی سے پسینہ اگلنے لگے۔ میں بے حس و حرکت ہو گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اگر میں چٹان پر پیر جما کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو سارا بوجھ جھاڑی پر پڑتا اور جھاڑی کی جڑیں اکھڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ ویسے بھی میرا بوجھ جھاڑی پر تھا۔ جڑیں ہل چکی تھیں اور جھاڑی کسی بھی لمحے اپنی جگہ چھوڑ سکتی تھی۔ مجھے اپنے چاروں طرف موت کے سائے رقص کرتے ہوئے نظر آرہے تھے اور ببلا کے چیخنے کی آوازیں ان لمحات کو اور بھی سنگین بنا رہی تھیں۔ وہ اب بھی گنگولی چوہدری کو اس جگہ سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میرے پاس چی کی وہ پُراسرار قوت موجود تھی جو ایسے موقع پر میری مدد کر سکتی تھی۔ مجھے شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں ماسٹر ینگ پائی کی سنائی ہوئی وہ کہانی یاد آگئی کہ کس طرح زمانۂ قدیم میں بدھ بھکشو پرندوں کی پشت پر بیٹھ کر سفر کرلیا کرتے تھے اور پرندے کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے اوپر کوئی بوجھ لدا ہوا ہے۔ ان بھکشوؤں کے پاس چی کی قوت تھی اور وہ اس سے کام لینا جانتے تھے۔ چی کی وہ پُراسرار قوت میرے پاس بھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس درجے تک پہنچ سکا ہوں جس پر زمانۂ قدیم کے وہ بھکشو فائز تھے۔ بہرحال میں نے اپنے اندر کی اس پُراسرار قوت کو آزمانے کا فیصلہ کرلیا۔

اس وقت میرے جسم کو ایک اور ہلکا سا جھٹکا لگا۔ جھاڑی کی جڑوں نے چند انچ اور جگہ چھوڑ دی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اپنے اندر اس پُراسرار قوت کو آواز دینے کے لیے مراقبہ اور ارتکاز ضروری نہیں تھا اور مجھ جیسے شخص کے لیے بھی یہ ضروری نہیں تھا کہ مراقبے کے لیے کسی جگہ اسٹانس بنا کر بیٹھا جائے۔ میں تو اپنی کسی بھی مصروفیت کے دوران میں چند لمحوں کے لیے بھی مراقبے میں جا سکتا تھا۔

اور اس وقت مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ بہت معمولی سے انداز میں حرکت کرتی ہوئی جھاڑی رک گئی۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا وزن ختم ہو گیا ہو۔ میں ہلکے پھلکے کاغذ کی طرح لٹکا ہوا ہوں۔ بے وزنی کی یہ کیفیت مجھے بہت عجیب سی لگی۔

گنگولی نے ببلا کو ایک بار پھر دور جھاڑیوں میں اچھال دیا تھا اور وہ دوبارہ میرے ہاتھوں پر ٹھوکریں برسانے لگا اور میں اس کی ٹھوکریں برداشت کرتا رہا۔

ببلا اٹھ کر چیختی چلاتی اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی۔ اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جس سے گنگولی چوہدری پر حملہ کر سکے۔ وہ ایک پودے کی ڈنڈا نما شاخ کو پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دینے لگی لیکن وہ شاخ ٹوٹ کر نہیں دی۔ وہ اس شاخ کو چھوڑ کر پاگلوں کی طرح چیختی ہوئی ایک بار پھر اِدھر اُدھر دوڑنے لگی اور بالآخر ایک بڑا سا پتھر دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گنگولی چوہدری کی طرف لپکی۔

پتھر خاصا بڑا تھا اور ببلا نے عقل مندی یہ کی کہ گنگولی کی طرف آتے ہوئے اس نے چیخنا بند کردیا تھا لیکن گنگولی چوہدری بھی غافل نہیں تھا۔ آہٹ پا کر وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔ اس دوران میں ببلا حملہ کر چکی تھی۔ گنگولی چوہدری نے

جھکائی دے کر بچنے کی کوشش کی مگر پتھر اس کے سر پر لگا۔ وہ چیختا ہوا دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ نکلا تھا۔ ببلا نے اسے زوردار لات رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور دوسری طرف کی ڈھلان پر پودوں کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

"آؤ.... آؤ ہمت سنگھ۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اوپر آجاؤ۔" ببلا نے جھک کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ببلا سینے کے بل لیٹ گئی اور مجھے اوپر کھینچنے لگی۔

میرا اوپر کا دھڑ چٹان پر پہنچ گیا تھا۔ میں نے جھاڑی کو کچھ اور پیچھے سے پکڑ لیا اور اوپر آنے کے لیے زور لگانے لگا۔ میری ٹانگیں ابھی تک نیچے لٹکی ہوئی تھیں کہ گنگولی چوہدری وحشی کی طرح چیختا ہوا ہماری طرف لپکا۔ اس نے ببلا کو ٹانگوں سے پکڑ لیا اور اسے کھڈ کی طرف دھکیلنے لگا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ ہم دونوں کو کھڈ میں دھکیل کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

"ببلا! میرا ہاتھ چھوڑ دو۔" میں نے چیخ کر کہا۔

ببلا نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے جھاڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے آپ کو جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اوپر آچکا تھا۔ گنگولی چوہدری اب بھی ببلا کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھڈ کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور ببلا بری طرح چیخ رہی تھی۔

مجھے سنبھلنے میں صرف ایک سیکنڈ لگا تھا۔ اس جھاڑی کو چھوڑتے ہی میں اپنے آپ میں آگیا تھا یا یوں کہئے کہ میری بے وزنی کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔

گنگولی چوہدری ببلا کی ٹانگیں پکڑے کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کے سر سے بہتے ہوئے خون نے اس کے چہرے کے کچھ حصے کو بھی تر کر دیا تھا جس سے اس کا چہرہ کچھ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔

میں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور دنبے کی طرح اس کے پیٹ میں زوردار ٹکر مار دی۔ گنگولی چوہدری ڈکراتا ہوا پیچھے گرا اور لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں جا گرا۔ میں نے بھی چھلانگ لگا دی۔

ہم دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کو رگیدنے لگے۔ گنگولی نے ایک موقع سے فائدہ اٹھایا اور میرے سینے پر سوار ہو کر دونوں ہاتھ میری گردن پر جما دیے۔ اس کے انگوٹھے میرے نرخرے پر تھے۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ غرایا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ سفاکی تھی "تمہاری وجہ سے میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے سارے دوست ختم ہو گئے۔ میرا راج ختم ہو گیا۔ سیکڑوں میل تک میری دہشت تھی۔ بڑے بڑے سورما میرا نام سن کر تھر تھر کانپتے تھے لیکن تمہاری وجہ سے سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا اور اس چھوکری کو بھی جہنم میں پہنچا دوں گا۔"

میرے نرخرے پر اس کے انگوٹھوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ گنگولی چوہدری کے چہرے پر درندگی بڑھتی جا رہی تھی اور پھر اس کے پیچھے ببلا کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اسے کہیں سے ایک موٹی سی لکڑی مل گئی تھی جسے اس نے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔

میری نظروں سے گنگولی چوہدری نے کسی گڑبڑ کا اندازہ لگا لیا۔ اس نے گردن گھمائی۔ ببلا اس دوران میں حملہ کر چکی تھی۔ گنگولی کا سر تو بچ گیا۔ لکڑی کا وار اس کے بائیں کندھے پر پڑا۔

میرے گلے سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اس کی دونوں کلائیوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اپنی گردن آزاد ہوتے ہی میں نے اس کی ایک کلائی چھوڑ کر اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا مار دیا۔ اس کے ساتھ ہی ببلا نے بھی دوسرا وار کر دیا تھا اور یہ وار بھی گنگولی کے بائیں کندھے پر ہی پڑا تھا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

گنگولی چوہدری نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس وقت ببلا اس پر تیسرا حملہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گنگولی نے اپنے سر کی طرف آنے والی لکڑی کو ایک ہاتھ میں روک لیا اور دوسرے ہاتھ سے ببلا کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ ببلا چیختی ہوئی گری۔ گنگولی اس کے ہاتھ سے چھینی ہوئی لکڑی سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے کسی طاقتور اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ میرے دونوں پیر اس کے سینے پر لگے اور وہ چیختا ہوا پشت کے بل گرا۔ میں نے دوبارہ اس پر چھلانگ لگا دی لیکن میرا پیر جھاڑی میں الجھ گیا اور میں لڑکھڑا کر گر گیا۔

"ہمت سنگھ۔ اٹھو۔ یہ خنجر لو اور اس وحشی کے ٹکڑے کر دو۔" ببلا کے چیخنے کی آواز سن کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اسے کہیں سے گنگولی چوہدری والا خنجر مل گیا تھا۔

لیکن مجھ سے پہلے گنگولی چوہدری نے ببلا پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے پیٹ میں لگنے والی گنگولی کی ٹھوکر بہت زوردار تھی۔ وہ چیختی ہوئی دہری ہو کر گری۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گنگولی خنجر کی طرف لپکا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

خنجر گنگولی کے ہاتھ میں آچکا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے ایک طرف لوٹ لگا دی۔ میں اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل گرا۔ اگر میں دونوں ہاتھ زمین پر نہ ٹکا دیتا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے۔ گنگولی نے خنجر سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی پھرتی سے اپنی ٹانگوں کو حرکت دے کر اس کی گردن کو پیروں کی قینچی میں لے لیا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ اٹھے کا اٹھا رہ گیا۔

ببلا ایک بار پھر لکڑی اٹھا کر چیختی ہوئی اس کی طرف لپکی لیکن اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر وہ رک گئی اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگی۔ ان قدموں کی آوازوں سے میں بھی چونک گیا۔ اگر وہ گنگولی چوہدری کا کوئی ساتھی ہوا تو پھر ہماری زندگیوں کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

میں نے آواز کی سمت دیکھا اور اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا لیکن دوسرے ہی لمحے پولیس انسپکٹر ونود پانڈے کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

میں نے گنگولی چوہدری کی گردن اب بھی ٹانگوں کی قینچی میں لے رکھی تھی اور میرے اس داؤ ہی کی وجہ سے وہ اب تک خنجر سے مجھ پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"گنگولی چوہدری۔" انسپکٹر ونود پانڈے کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ ہم سے تقریباً دس گز دور رک گیا تھا۔ اس کے پیچھے ایک کانسٹیبل بھی تھا۔ انسپکٹر پانڈے یہی سمجھا تھا کہ گنگولی اس وقت مجھ پر حاوی ہو رہا ہے اور کسی بھی لمحے خنجر کے وار سے میرا خاتمہ کر سکتا ہے۔

"مار دو۔ گولی مار دو اس حرامی کو۔ ختم کر دو اسے!"

ببلا چیختی ہوئی انسپکٹر کی طرف دوڑی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید وہ خود گنگولی کو گولی مارنا چاہتی تھی۔

انسپکٹر نے اسے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔ گنگولی چوہدری گردن چھڑانے کے لیے اپنے آپ کو جھٹکے دینے لگا۔ میں نے اپنی ٹانگوں کو پوری قوت سے بائیں طرف جھکایا۔ گنگولی بھی اس کے ساتھ ہی جھکتا چلا گیا اور پھر میں نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اپنی ٹانگیں اس کی گردن سے الگ کر لیں۔ گنگولی کراہتا ہوا الٹ گیا۔ میں اٹھ کر تیزی سے ببلا کی طرف آگیا۔ گنگولی نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

"گنگولی چوہدری!" انسپکٹر پانڈے نے چیخ کر کہا "تمہارے تمام ساتھی ختم ہو چکے ہیں۔ بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ خنجر پھینک دو اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"گنگولی چوہدری کوئی کتا نہیں جس کے گلے میں تم پٹہ ڈال سکو۔" گنگولی کے منہ سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی "گنگولی چوہدری شیر ہے اور شیر آزاد رہنا جانتا ہے۔ اسے زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا۔"

"تمہارے بچنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔" انسپکٹر نے پھر چیخ کر کہا۔

"مار دو۔ مار دو۔ اسے گولی مار دو انسپکٹر۔" ببلا چیخی "یہ انسان نہیں بھیڑیا ہے۔ اس نے ہمارے سامنے کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ مار دو اسے۔ گولی مار دو۔"

میں نے بڑی مشکل سے ببلا کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ گنگولی چوہدری کا خون آلود چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔

"گنگولی چوہدری نے اپنے فرار کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔" اس نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے خنجر کو نوک کی طرف سے پکڑ لیا تھا اور پھر خلافِ توقع اس نے خنجر پوری قوت سے ہماری طرف کھینچ مارا۔ میں ببلا کو دھکیلتا ہوا ایک طرف گر گیا۔ خنجر زناٹے کی آواز سے ہمارے سروں کے اوپر سے ہوتا ہوا پیچھے کھڑے ہوئے کانسٹیبل کے حلق میں پیوست ہو گیا۔

بیک وقت دو چیخوں اور ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ ایک چیخ اس کانسٹیبل کی تھی جس کے گلے میں خنجر پیوست ہوا تھا۔ گولی انسپکٹر پانڈے نے چلائی تھی اور دوسری چیخ گنگولی چوہدری کی تھی جو انسپکٹر کی گولی لگنے سے یا ویسے ہی لڑکھڑا کر پیچھے کھڈ میں گر گیا تھا۔ اس کی چیخ کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی اور پھر "دھد" کی زوردار آواز سنائی دی۔

میں ببلا کو چھوڑ کر چٹان کے کنارے کی طرف لپکا اور جھانک کر نیچے دیکھا تو میری روح تک کانپ اٹھی۔ تقریباً سو فٹ نیچے پتھروں میں گنگولی چوہدری کی خون میں لت پت لاش پڑی تھی۔ وہ لاش ہی تھی۔ اتنی بلندی سے پتھروں پر گرنے

کے بعد کسی کا زندہ بچ رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اب گنگولی چوہدری کے ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ گنگولی چوہدری نے اپنے فرار کا راستہ ہمیشہ محفوظ رکھا ہے اور مجھے یقین تھا کہ اس نے انسپکٹر پانڈے کی گولی لگنے سے پہلے ہی کھڈ میں چھلانگ لگادی تھی۔

میں پیچھے مڑ گیا۔ انسپکٹر پانڈے جھاڑیوں میں پڑے ہوئے کانسٹیبل پر جھکا ہوا تھا۔ خنجر ابھی تک کانسٹیبل کے حلق میں پیوست تھا اور وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے خنجر کے دستے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ کانسٹیبل کے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ شدت سے تڑپنے لگا۔ اس کے پیروں کی رگڑ سے مٹی اڑ رہی تھی اور کٹے ہوئے حلق سے خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔ بہتا ہوا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا اور بالآخر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے خون آلود خنجر کو دیکھا۔ اس کی ایک طرف تیز دھار تھی اور دوسری طرف باریک دندانے تھے جس سے اس کا نرخرا کٹ گیا تھا۔

میں نے خنجر لاش کے قریب پھینک دیا اور جیسے ہی سیدھا ہوا ببلا چیختی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے خوف کی شدت سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ جب تک یہ خونی ڈراما جاری رہا تھا اس وقت تک اس نے ہمت قائم رکھی تھی۔ گنگولی چوہدری پر بڑھ بڑھ کر حملے کرتی رہی تھی لیکن اب اس کی ہمت نے بھی دم توڑ دیا تھا اور حوصلے نے بھی۔ گزرے ہوئے خوف نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ببلا نے بڑی سختی سے مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بلاؤز کے بٹن تو پہلے ہی ٹوٹے ہوئے تھے اور اب گنگولی چوہدری سے ہاتھا پائی کے دوران میں بلاؤز پوری طرح پھٹ گیا تھا اور اس کے جسم کے بالائی حصے پر اب مختصر سا زیر جامہ ہی رہ گیا تھا۔

میں کچھ دیر اس کے کندھے تھپتھپاتا رہا پھر اسے اپنے سے الگ کر کے اپنی ٹی شرٹ اتار کر اسے پہنادی اور انسپکٹر پانڈے کی طرف دیکھنے لگا جو اٹھ کر چٹان کے کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ ببلا بھی میرے ساتھ تھی۔ سو فٹ نیچے پتھروں میں پڑی ہوئی گنگولی چوہدری کی لاش دیکھ کر وہ میرے ساتھ جڑ گئی۔

"ختم ہو گیا۔ راکھشس۔ اچھا ہوا۔" وہ بڑبڑائی اور پیچھے ہٹنے لگی۔

میں اور انسپکٹر پانڈے بھی پیچھے ہٹ گئے۔ ببلا ہم سے دور ہٹ گئی اور ہم دونوں کانسٹیبل کی لاش کے قریب بیٹھ گئے۔

انسپکٹر پانڈے کا بھی بایاں بازو زخمی تھا جس پر میلا سا رومال بندھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کل رات ان حرامیوں میں سے کسی کی گولی لگی تھی۔" انسپکٹر نے بتایا "گولی کھال کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ ذرا اور اندر کی طرف لگتی تو میرا بازو بیکار ہو جاتا لیکن اب کیا کیا جائے؟" اس نے کانسٹیبل کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"گنگولی چوہدری کی لاش تو وہاں گہرائی میں پڑی ہے۔ اسے ہم وہاں سے نکال نہیں سکتے اور یہ....." میں نے کانسٹیبل کی لاش کی طرف اشارہ کیا "ہم پتا نہیں کسی آبادی سے کتنی دور ہیں اور اس لاش کو اٹھا کر لے جانا بھی ممکن نہیں۔ تمہارے دوسرے سپاہی کہاں ہیں؟"

"سب ختم ہو گئے۔" انسپکٹر پانڈے نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "لاش کو اٹھا کر لے جانا واقعی ممکن نہیں ہے اور یہاں اس کا کریا کرم بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز ہے کہ زمین کھود کر اسے دفن کر سکیں اور نہ ہی ماچس ہے کہ اس کی چتا جلا سکیں۔"

"یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو جھاڑیوں سے ڈھک دیا جائے۔ اس کے لیے ہم اس وقت یہی کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

انسپکٹر پانڈے نے تائید میں سر ہلا دیا اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا۔ چند روپوں اور ڈیوٹی کارڈ کے علاوہ اس کی جیبوں میں کچھ نہیں تھا۔ انسپکٹر نے اس کی رائفل بھی اٹھالی جو خالی ہو چکی تھی۔

ہم آس پاس سے جھاڑیاں جمع کر کے لاش کے اوپر ڈالنے لگے۔ ببلا بھی اپنے آپ کو سنبھال چکی تھی اور اس کام میں وہ بھی ہماری مدد کر رہی تھی۔

ہم نے لاش پر جھاڑیوں کا اچھا خاصا ڈھیر لگا دیا تھا لیکن ہمیں یقین تھا کہ ہمارے جانے کے بعد یہ لاش زیادہ دیر تک جنگلی جانوروں سے محفوظ نہیں رہ سکے گی۔

"مم..... مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔" ببلا اپنے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اس ہنگامہ آرائی میں وہ اپنی پیاس کو بھولی رہی تھی لیکن اب پھر اسے پیاس لگنے لگی تھی۔

"اس طرف آؤ۔ اس طرف تھوڑی ہی دور ایک ندی ہے۔" انسپکٹر نے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنا ریوالور ہولسٹر میں ڈال لیا تھا اور کانسٹیبل والی رائفل کندھے پر لٹکا لی تھی۔

انسپکٹر پانڈے ایک طرف پودوں میں ڈھلان اترنے لگا اور میں اور ببلا اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ ببلا نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا ہمت سنگھ؟" وہ چلتے چلتے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہاں ہاتھ پر ذرا چوٹ لگی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اپنا سیدھا ہاتھ ببلا کو دکھایا جس پر گنگولی چوہدری کے پیروں کی ٹھوکروں سے انگلیوں کے جوڑوں کی کھال ادھڑ گئی تھی۔

ببلا نے میرا وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ میرا زخمی ہاتھ اپنے چہرے کے قریب لے گئی اور اپنے ہونٹ میرے ہاتھ کی پشت پر ثبت کر دیے۔ اس وقت انسپکٹر پانڈے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ میں نے جلدی سے ببلا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"وہ ندی بس تھوڑی ہی دور ہے۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے شاید ببلا کو میرے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

ہم تقریباً پندرہ منٹ میں اس ندی پر پہنچ گئے۔ یہ وہی ندی تھی جس سے میں ببلا کے لیے پانی لینے آیا تھا لیکن ہم اس جگہ سے کافی دور آ گئے تھے۔ یہاں ندی کے کنارے پر سایہ دار درخت بھی تھے۔

ببلا ندی کے کنارے پر گر سی گئی۔ اس نے بکری کی طرح منہ لگا کر پانی پیا مگر اس طرح شاید پیاس نہیں بجھی تھی۔ وہ چلو بھر بھر کے پانی پینے لگی۔ انسپکٹر پانڈے اور میں نے بھی شکم سیر ہو کر پانی پیا۔ ببلا تو ندی کے کنارے پر نڈھال سی ہو کر لیٹ گئی تھی اور ہم دونوں درختوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"تم واقعی ہمت سنگھ ہو۔" انسپکٹر پانڈے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ان درندوں کے چنگل میں پھنس کر زندہ بچ نکلنا واقعی تم جیسے باہمت لوگوں کا کام ہے۔"

میں انسپکٹر کے منہ سے اپنا نام سن کر چونک سا گیا۔

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا انسپکٹر؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے دوست ٹھاکر سے۔" انسپکٹر نے جواب دیا "اسے جب پتا چلا کہ تم ببلا کو بچانے کے لیے جنگل میں گھس گئے ہو تو اس نے ہنگامہ مچا دیا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر ہمت سنگھ اور ببلا کو کچھ ہو گیا تو وہ کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ اس نے جے پور میں آئی جی کو بھی ٹیلی فون کر دیا اور آئی جی نے حکم دیا کہ پولیس کی ایک پارٹی فوراً جنگل کی طرف روانہ کر دی جائے۔ قرعہ میرے نام نکلا اور میں ایک درجن مسلح پولیس والوں پر مشتمل پارٹی کو لے کر موت کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگل میں داخل ہو گیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اپنی اس مہم کے بارے میں بتانے لگا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ راستے میں ایک چیتے نے ان پر حملہ کر دیا تھا جسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ مجھے فائر اور کسی درندے کے دہاڑنے کی آواز یاد آ گئی۔ اس آواز کو سن کر ہی میں اور نارائن وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

انسپکٹر پانڈے گنگولی چوہدری کے گروہ سے مڈھ بھیڑ کا قصہ سنا رہا تھا۔ اس کا تو میں بھی چشم دید گواہ تھا۔ انسپکٹر کے کہنے کے مطابق اس کے چار آدمی تو کل صبح ہی جھڑپ میں مارے گئے تھے اور دو دن بھر کی لڑائی میں کام آئے تھے اور چار کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اس نے ایک کانسٹیبل کے ساتھ رات بھر گنگولی چوہدری کا تعاقب جاری رکھا اور بالآخر آج اس تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں ہمت سنگھ۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا کندھا تھپتھپایا "جب مجھے پتا چلا کہ تم ببلا کو بچانے کے لیے نارائن کے ساتھ جنگل میں گھس گئے ہو تو مجھے تم پر بہت غصہ آیا تھا۔ ایک عورت کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دینا حماقت ہی کہلا سکتی ہے لیکن اب میں کہہ سکتا ہوں کہ تم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اس جیسی سندر ناری کے لیے تو کئی جیون قربان کیے جا سکتے ہیں۔" اس نے خاموش ہو کر ببلا کی طرف دیکھا۔

ببلا آنکھیں بند کیے پشت کے بل گھاس پر لیٹی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ انسپکٹر کے منہ سے آخری الفاظ سن کر اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اب انسپکٹر کو روداد سنانے کی میری باری تھی۔ میں نے اپنی کتھا سنانے کے بعد کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہم جنگل

میں کس جگہ پر ہیں اور یہاں سے قریب ترین کون سی بستی ہو سکتی ہے؟"

"کچھ پتا نہیں۔" انسپکٹر نے جواب دیا "لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ سارسکا شہر اس جنگل کے ٹھیک پچھم (مغرب) کی طرف ہے۔ ہو سکتا ہے آج صبح کوئی اور پارٹی ہماری تلاش میں بھیجی گئی ہو لیکن ہم ان کا انتظار نہیں کرسکتے۔ یہ جنگل میلوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اس طرف آئیں۔ اگر وہ دوسری طرف نکل گئے ہوں گے تو زندگی بھر ہمیں تلاش نہیں کرسکیں گے۔ بہتر ہے کہ چند منٹ ستا کر ہم پچھم کی طرف اپنا سفر شروع کردیں اور مجھے اُمید ہے کہ سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے ہم اس جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔"

"تو پھر چل پڑو۔ یہاں بیٹھے بیٹھے وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ببلا بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور انسپکٹر پانڈے رائفل اٹھا کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس نے رائفل کندھے پر لٹکالی اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ میں اور ببلا اس سے تقریباً پانچ گز پیچھے چل رہے تھے۔

اس ندی کا بہاؤ بھی پچھم کی طرف تھا اس لیے ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، درختوں کا سلسلہ گنجان ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ندی ایک دم بائیں طرف مڑ گئی۔ ہم کچھ دیر ستانے کے لیے وہاں رک گئے پھر جی بھر کے پانی پیا اور آگے روانہ ہوگئے۔

سورج ہمارے سروں پر تھا۔ گنجان درختوں کی وجہ سے دھوپ اگرچہ بہت کم زمین تک پہنچ رہی تھی لیکن ہمیں سمت کا اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔

ببلا چلتے چلتے ایک دم کراہ کر رک گئی اور اس نے اپنا ایک پیر اوپر اٹھالیا۔ وہ ننگے پیر تھی اور اس کے پیر میں کانٹا چبھ گیا تھا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں پیر کو پکڑ لیا اور منہ بسورنے لگی۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا اور کانٹا نکالنے کے لیے جیسے ہی اس کے پیر کی طرف ہاتھ بڑھایا، وہ چیخ اٹھی۔

"نہیں نہیں۔ ہاتھ مت لگاؤ۔ تکلیف ہو رہی ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم آنکھیں بند کرلو۔ میں کانٹا نکالتا ہوں۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔

انسپکٹر پانڈے بھی ہم سے چند گز آگے رک گیا تھا۔ ببلا نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔ میں نے کانٹے کو ناخنوں سے پکڑ کر کھینچا تو اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی۔ میرے پیروں میں جو گرز تھے وہ میں نے اتار کر ببلا کی طرف بڑھا دیے۔

"لو۔ یہ پہن لو۔" میں نے کہا۔

"اور تم۔ کیا تمہیں کانٹے نہیں چبھیں گے ہمت سنگھ؟ نہیں، میں جوتے نہیں پہنوں گی۔ تم پہن لو۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔ تم پہن لو۔" میں نے کہا "جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

انسپکٹر پانڈے دور کھڑا دلچسپ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ضد کرکے ببلا کو جوگرز پہنا دیے اور ہمارا سفر ایک بار پھر شروع ہوگیا۔

میرے جسم پر صرف جینز تھی۔ پیر بھی ننگے تھے اور جسم کا بالائی حصہ بھی کیونکہ میں اپنی ٹی شرٹ پہلے ہی ببلا کو پہنا چکا تھا۔ ببلا سے تو مجھے کچھ عجیب سا لگاؤ ہوگیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کے ساتھ بھی میں یہی طرز عمل اختیار کرتا۔

انسپکٹر پانڈے نے اپنی رفتار کم کردی تھی۔ اب وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے ایک نظر ببلا کو دیکھا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"لگتا ہے تم اسے بہت چاہتے ہو اس لیے تو پہلے اسے اپنی شرٹ اتار کر پہنائی اور اب اپنے جوتے بھی اسے پہنا دیے۔ دوسروں کے لیے تکلیف اٹھانا واقعی بڑے ظرف کی بات ہے۔"

"تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے چونکہ ببلا سے لگاؤ ہے اس لیے میں نے اپنی شرٹ اور جوتے اسے پہنا دیے ہیں۔ اس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو بھی میں یہی کچھ کرتا۔" میں نے جواب دیا "کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس دنیا میں بکھرے تمام لوگوں کے دکھ اپنے اندر سمیٹ لوں۔ کسی کی پلکوں پر تیرتے ہوئے آنسوؤں کو قطرہ قطرہ کرکے اپنے دل میں اتار لوں اور میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہوجائے۔"

"بہت شاعرانہ باتیں کرتے ہو۔" انسپکٹر نے میری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں کہا "کیا رشتہ ہے تمہارا اس سے جس کے لیے تم نے اپنی جان کی بھی بازی لگا دی تھی؟"

"رشتہ!" میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ "بعض لوگ رشتوں کو بدن پر پہنے ہوئے کپڑوں کی طرح سمجھتے ہیں جنہیں کسی بھی وقت بدن سے اتارا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں رشتے شریانوں میں بہنے والے لہو کی طرح

ہوتے ہیں جن کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جیون سے وابستہ یہ تعلق کبھی دل سے جڑا ہوتا ہے تو کبھی روح سے اور ان ہی رشتوں میں ایک رشتہ ہے دوستی کا۔ میرا اور ببلا کا رشتہ دوستی کا رشتہ ہے۔"

"بہت خوب۔" انسپکٹر پانڈے بولا "کاش! میں بھی تمہارے دوستوں میں سے ہوتا۔ اس دیوی کو تو تمہاری دوستی پر گھمنڈ کرنا چاہیے۔"

اس کا خیال تھا کہ ببلا کچھ کہے گی لیکن اس نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ ہم ایک بار پھر گنگولی چودھری اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ انسپکٹر پانڈے نے اس وقت یہ انکشاف کیا کہ گنگولی چودھری کا ایک ساتھی زخمی ہو کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا اور ہو سکتا ہے اسے دوسری طرف کسی بستی میں پناہ مل گئی ہو۔

ہم تقریباً تین گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے۔ ببلا بری طرح تھک گئی تھی۔ ہم ایک بار پھر ایک ندی پر رک گئے۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ ببلا نے پانی کے چند گھونٹ بھرے اور ندی کے کنارے پر ڈھیر ہوگئی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" وہ رونی سی صورت بناتے ہوئے بولی۔

انسپکٹر پانڈے نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اٹھ کر ایک طرف چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں ناریل اٹھا رکھے تھے۔

انسپکٹر نے جیب سے چاقو نکال کر ایک ناریل کا چھلکا ادھیڑ کر اسے ایک پتھر پر دے مارا۔ ناریل دو ٹکڑے ہوگیا۔ اس نے چاقو کی نوک ہی سے گری نکال کر ہمارے حوالے کردی اور دوسرا ناریل ادھیڑنے لگا۔

چند منٹ بعد ہم ناریل کھاتے ہوئے آگے چل پڑے۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا لیکن جنگل میں کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ درختوں میں تاریکی بڑھ گئی تھی۔ انسپکٹر پانڈے کے چہرے پر بھی اب تشویش کے سائے ابھر آئے تھے۔

"ہمیں رات گزارنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہیے۔" انسپکٹر نے کہا "کچھ دیر میں سورج ڈوب جائے گا اور ہمیں چند قدم چلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔"

ہم تیز تیز چلنے لگے۔ ببلا تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی اور میں اس کا ہاتھ پکڑے اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ اس سے بہتر ہمیں اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ یہ پتھر کا ٹیلا سا تھا۔ ہم اوپر چڑھ گئے۔ ببلا تو فوراً ہی لیٹ گئی۔ میں اور پانڈے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ببلا سو چکی تھی۔ کبھی میں اونگھنے لگتا اور کبھی پانڈے۔۔۔ اور رات کے آخری پہر ہم دونوں کے اعصاب جواب دے گئے۔ نیند اور تھکن نے ہمیں زیر کرلیا تھا۔

اور پھر ببلا کی چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ انسپکٹر پانڈے بھی جاگ گیا۔ انسپکٹر پانڈے کی آنکھوں میں وحشت تھی اور ببلا کے چہرے پر بے پناہ خوف۔ وہ دونوں میری طرف دیکھ رہے تھے اور پھر ان کے خوف اور وحشت کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔

میں اس وقت پتھر پر دائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ تکیے کی طرح سر کے نیچے تھا اور دوسرا ہاتھ بالکل سیدھا پہلو پر رکھا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چیز میرے جسم پر رینگ رہی ہو۔

"ہمت سنگھ! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔ سانس روکے بالکل بے حس و حرکت پڑے رہو۔" انسپکٹر پانڈے نے سرگوشی میں کہا۔

اور پھر واقعی میرا سانس رک گیا۔ وہ سیاہ کوبرا تھا جو میری کمر اور پشت پر رینگتا ہوا آگے سینے کی طرف آرہا تھا۔ مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کوبرا میرے برہنہ بدن پر رینگتا ہوا آگے آگیا اور پھر اچانک ہی اس نے پھن پھیلا لیا۔ میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہاں سے ہٹ سکتا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچ سکتا، پہلو پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ میں غیر ارادی طور پر معمولی سی حرکت پیدا ہوئی اور اسی لمحے کوبرا نے میرے بازو پر ڈس لیا۔

میرے بازو میں سوئی جیسی چبھن ہوئی اور میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سانپ کا خوف ہی بڑا ہیبت ناک ہوتا ہے اور مجھے تو اس زہریلے کوبرا نے میری نظروں کے سامنے ڈس لیا تھا۔ میں اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ببلا اس قدر زور سے اچھلی تھی جیسے سانپ نے مجھے نہیں بلکہ اسے ڈسا ہو۔ انسپکٹر ونود پانڈے بھی ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ میں نے اسے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

انسپکٹر پانڈے کا ہاتھ ہولسٹر میں اڑسے ہوئے ریوالور کے دستے پر پہنچ گیا تھا لیکن اس نے ریوالور نکالا نہیں۔ اس

کا ہاتھ جیسے ہولسٹر سے چپک کر رہ گیا تھا۔ میری نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے میرے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ببلا کی حالت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی بے پناہ وحشت تھی اور وہ بھی میرے پیروں کی طرف دیکھ رہی تھی اور پھر وہ چیختے ہوئے اپنی جگہ سے اچھلی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچتے ہوئے دور لے گئی۔

مجھ پر بھی سانپ کے ڈسنے کی وحشت سی طاری تھی لیکن حیرت کی بات تھی کہ مجھے ابھی تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ سوئی کی چبھن اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"وہ... وہ... سانپ..." ببلا کے منہ سے خوف زدہ سی آواز نکلی۔

میں نے نیچے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے زوردار جھٹکے سے اٹھنے اور ببلا کے چیخنے سے وہ کوبرا بھاگ گیا ہوگا لیکن اس بلیک کوبرا کو اپنے پیروں کے قریب دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آگئی۔

وہ بلیک کوبرا زمین پر پڑا اس طرح اینٹھ رہا تھا جیسے اس پر تشنج کی سی کیفیت طاری ہو۔ وہ کبھی بل کھا کر بالکل گچھا سا بن جاتا اور کبھی لٹھ کی طرح بالکل سیدھا ہو کر اکڑ جاتا اور پھر چند سیکنڈ بعد ہی وہ بالکل بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔

ببلا اور انسپکٹر پانڈے اب بھی وحشت زدہ سی نظروں سے دو ڈھائی فٹ لمبے سیاہ کوبرا کو دیکھ رہے تھے۔ انسپکٹر پر تو اس قدر وحشت طاری تھی کہ وہ ہولسٹر سے ہاتھ اٹھانا بھی بھول گیا تھا۔ وہ کبھی مردہ سانپ کو دیکھ رہا تھا اور کبھی مجھے۔

ببلا کی حالت اس سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ اس کی آنکھیں خوف کی دہشت سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ مردہ سانپ کی طرف دیکھا اور پھر مجھے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"تم ٹھیک ہو۔ ہمت سنگھ تم ٹھیک ہو نا؟" وہ چیخی۔

"اوہ!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

انسپکٹر پانڈے بھی دوڑ کر قریب پہنچ گیا اور میرا بازو پکڑ کر دیکھنے لگا۔ میں نے بھی اپنے بازو کو دیکھا۔ جس جگہ سانپ نے ڈسا تھا وہاں خون کا ایک ننھا سا قطرہ چمک رہا تھا۔

میں بالکل اپنے حواس میں تھا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ سوائے سوئی کی چبھن کے احساس کے۔ ببلا میرے بازو کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی پھر وہ میرے پورے جسم کو ٹٹولنے لگی جیسے اسے میرے زندہ ہونے کا یقین نہ ہو۔ انسپکٹر پانڈے نے بھی میرے بازو کو ٹٹول کر دیکھا۔ پھر پڑے ہوئے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"بس... سانپ مر گیا۔"

"اس کی زندگی ہی اتنی تھی۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس وقت تک میں اپنی کیفیت پر قابو پا چکا تھا۔ "ہر جاندار کو ایک نہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ کوئی بھی جاندار اپنی زندگی سے نہ تو ایک لمحہ زیادہ جی سکتا ہے اور نہ ایک لمحے پہلے مر سکتا ہے۔ اس سانپ کا وقت پورا ہو گیا تھا اس لیے یہ مر گیا۔"

"مگر یہ سیاہ کوبرا بہت زہریلا ہوتا ہے۔" انسپکٹر پانڈے بولا "اس کا ڈسا تو پانی بھی نہیں مانگتا اور اس نے تمہیں ڈسا تھا مگر یہ خود مر گیا۔"

"اوہ..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو گویا سانپ کو نہیں مجھے مرنا چاہیے تھا۔"

"ہاں۔ ہاں۔" انسپکٹر نے سر ہلا دیا۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ غالباً غیر ارادی طور پر نکل گئے تھے پھر جلدی سے بولا "م... میرا مطلب ہے' یہ سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے' دونوں میں سے ایک کو تو مرنا تھا۔" میں نے کہا "سانپ مر گیا اور میں بچ گیا۔ کیا تمہیں میرے زندہ بچنے کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"ہوئی۔ بہت ہوئی۔" انسپکٹر نے پھر سر ہلا دیا "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ زہریلا کوبرا تمہیں ڈسنے کے بعد خود کیسے مر گیا۔"

"شاید میرے خون میں اس سے زیادہ زہر ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا۔" انسپکٹر نے کہا اور ایک جھاڑی کی سوکھی ہوئی شاخ توڑ کر اس سے سانپ کو اٹھا کر کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اسے اچھال دیا۔

ببلا اب بھی میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹول رہی تھی۔ وہ میرے بازو کو دباتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی ہمت سنگھ۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیوں پریشان ہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اپنے بازو کو دیکھا جہاں خون کا قطرہ جم رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے

جسم پر مچھروں کے کاٹنے کے بے شمار نشان نظر آرہے تھے۔ میرے جسم پر جگہ جگہ نہیں تھی اور مچھروں کو آزادی سے خون چوسنے کا موقع مل گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میرے خون کا ذائقہ چکھنے والا کوئی بھی مچھر زندہ نہیں بچا ہوگا۔

ببلا اور انسپکٹر پانڈے اب بھی غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں اب بھی حیرت تھی کہ مجھے ڈسنے والا زہریلا کوبرا خود کیسے مر گیا اور میں زندہ کیسے بچ گیا اور میں اپنے ماضی میں جھانک رہا تھا۔

شاؤلن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب ماسٹر ہنگ پائی مجھے اور جانگی کو صبح سویرے پہاڑی پر یوگا کی مشق کروایا کرتا تھا اور ایک روز لیکچر کے بعد اس نے ایک تھیلے میں سے سانپ نکال کر اس سے پہلے ایک جانور کو ڈسوایا تھا اور وہ جانور تین سیکنڈ سے بھی کم وقت میں تڑپ تڑپ کر ختم ہو گیا۔ ماسٹر ہنگ پائی کے کہنے کے مطابق وہ سانپ اس قدر زہریلا تھا کہ انسان کو ڈس لے تو وہ بھی دو تین سیکنڈ میں ختم ہو جائے گا اور پھر ماسٹر نے اس سانپ سے اپنے آپ کو ڈسوایا تھا اور وہ زہریلا سانپ دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا جس کا مطلب تھا کہ ماسٹر ہنگ پائی کے خون میں اس سانپ سے بھی زیادہ خطرناک اور سریع الاثر زہر موجود تھا جس نے اس زہریلے سانپ کو بھی آناً فاناً ختم کر دیا تھا۔

مجھے ماسٹر ہنگ پائی کی باتیں بھی یاد آرہی تھیں۔ اس نے بتایا تھا کہ بعض جڑی بوٹیوں میں ایسی تاثیر پائی جاتی ہے جن کے کھانے سے دنیا کا کوئی زہر اثر نہیں کرتا لیکن یہ جڑی بوٹیاں بھی ایک خاص طریقے سے خوراک میں شامل کر کے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کا غلط استعمال زہر سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

اس واقعے کے دو چار دن بعد ہی میں نے اپنی خوراک میں کچھ تبدیلی محسوس کی تھی۔ ذائقہ بدلا ہوا تھا لیکن چند روز بعد میں اس ذائقے کا عادی ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں نے یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہر کھانے کے بعد ماسٹر لیشی یا ان کم از کم دو گھنٹے میرے آس پاس ضرور موجود رہتا تھا اور بار بار میری طرف دیکھتا رہتا تھا۔ ان دنوں میں نے ایک اور بات بھی نوٹ کی تھی۔ میں اور جانگی اگرچہ اکٹھے ہی بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے لیکن کھانے میں ایک آدھ چیز ایسی ضرور ہوتی تھی جو صرف میرے لیے ہوتی اور جانگی کو وہ چیز کھانے سے منع کر دیا جاتا اور میرے خیال میں یہ بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ باڈی بلڈنگ' باکسنگ اور مارشل

آرٹس کی کٹھن پریکٹس کرنے والے لڑکے عام طور پر توانائی حاصل کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مخصوص اور اضافی خوراک کھاتے رہتے تھے۔ لڑکیاں چونکہ زیادہ ریاضت اور مشقت نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے جانکی کو میرے حصے کی وہ خوراک استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اور اب اس زہریلے سانپ کے ڈسنے اور اس کی موت کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے خوراک میں وہی مخصوص جڑی بوٹیاں کھلائی جاتی رہی تھیں اور جانکی کو شاید اس لیے منع کر دیا گیا تھا کہ وہ اسے برداشت نہیں کر پائے گی اور آج میرے خون میں شامل ماسٹر ہینگ پائی کے اس تحفے نے مجھے مرنے سے بچا لیا تھا۔ اگر مجھے وہ جڑی بوٹیاں استعمال نہ کرائی گئی ہوتیں تو اس سیاہ کوبرا کے بجائے میری لاش یہاں پڑی ہوتی۔

اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ یہ چونکہ کھلی جگہ تھی اس لیے صبح کی نرم اور کومل دھوپ یہاں بھی پہنچ رہی تھی۔ ببلا اور انسپکٹر پانڈے اب بھی غیر یقینی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ببلا تو میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹولتے ہوئے بار بار پوچھ رہی تھی کہ مجھے کوئی تکلیف تو نہیں ہو رہی۔

"کیا خیال ہے انسپکٹر؟" میں نے انسپکٹر پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ بیچ میں بول پڑا۔

"مجھے وشواش (یقین) نہیں ہو رہا۔ یہ تو چمتکار ہو گیا۔"

"میں اس چمتکار کی بات نہیں کر رہا۔" میں نے مسکرا کر کہا "میں نے تو پوچھا تھا کہ آگے چلنا ہے یا یہیں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے؟"

"اوہ!" انسپکٹر پانڈے جز بز سا ہو گیا "دیوی جی تیار ہوں تو ہم چل پڑیں۔"

"دیوی جی کو کون سا سنگار کرنا ہے۔" میں نے جواب دیا "کوئی درندہ اس کا گوشت کھاتے ہوئے یہ نہیں دیکھے گا کہ اس نے چہرے پر لیپا پوتی کر رکھی ہے یا نہیں۔"

انسپکٹر پانڈے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ببلا میرے سینے پر ہلکے گھونسے مارنے لگی۔ انسپکٹر نے جھک کر زمین پر پڑی ہوئی رائفل اٹھا لی۔

میں نے ببلا کو اپنے سے الگ کیا اور ہم ٹیلا نما اس پتھر پر مزید اوپر چڑھنے لگے اور پھر ببلا ایک دم چیخ اٹھی۔

"وہ... وہ دیکھو ادھر۔ دھواں..."

انسپکٹر پانڈے اور میں نے بیک وقت اس طرف دیکھا۔ درختوں میں بہت دور سرمئی دھوئیں کی لکیر سی اٹھتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"جنگل میں کہیں آگ لگ گئی ہے شاید۔" پانڈے بولا۔

"یہ جنگل میں لگی ہوئی آگ نہیں ہے۔" میں
"اگر درختوں میں آگ لگی ہوتی تو دھواں سیاہ ہوتا۔ یہ سرمئی دھواں لکیر کی صورت میں اوپر اٹھ رہا ہے اس کا مطلب ہے کہ اس طرف ان درختوں میں کوئی بستی ہے یا ہو سکتا ہے وہ کوئی شکاری ہوں جنہوں نے آگ جلائی ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہمت سنگھ۔" انسپکٹر پانڈے
"وہاں کوئی بستی ہو یا شکاریوں کی کسی پارٹی نے ڈیرا ڈالا ہو، ہمیں ان سے رہنمائی مل سکتی ہے یا کم از کم یہ پتا چل جائے گا کہ ہم کہاں پر ہیں اور ہمیں کسی آبادی تک پہنچنے کے لیے کس طرف جانا چاہیے۔"

ہم ٹیلے کی دوسری طرف اتر کر درختوں میں اس طرف چلنے لگے جہاں سے دھواں اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہم پھر گنجان درختوں میں داخل ہو گئے تھے اور بار بار رک رہے تھے مگر ان درختوں کی وجہ سے دھواں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہم اندازے کی بنا پر اس سمت میں چلتے رہے۔

تقریباً پون گھنٹے بعد ہم کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ وہ بستی بارہ جھونپڑوں پر مشتمل تھی۔ گھاس پھونس سے بنے یہ جھونپڑے ایک دائرے کی صورت میں تھے۔ درمیان میں چھوٹا سا میدان تھا جہاں تین چار ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ کوئی مرد یا عورت دکھائی نہیں دی۔ دھواں جھونپڑوں کے بیچ میں اس میدان میں ایک جگہ سے اٹھتا نظر آ رہا تھا۔

ایک لمحے کو رکے اور پھر ہم ایک جھونپڑے کے عقب سے گھومتے ہوئے سامنے آ گئے۔ ببلا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میرے ساتھ جڑ کر چلنے لگی۔ انسپکٹر پانڈے ہم سے آگے تھا۔

جھونپڑے کی دوسری طرف پہنچ کر ہم رک گئے۔ جھونپڑے کے سامنے پتھروں سے بنے ہوئے دو چولہوں میں آگ روشن تھی اور دو عورتیں بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ ایک عورت ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان۔ دونوں نے چولیاں اور گھاگھرے پہن رکھے تھے۔ دونوں کی بانہیں کلائیوں سے لے کر بازو کے اوپر تک پلاسٹک کی سفید اور پیلے رنگ کی چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔

جوان عورت نے ہمیں دیکھا تو اپنی ساتھی سے کچھ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا گھاگھرا تو پنڈلیوں تک تھا لیکن چولی بہت مختصر تھی۔ دوسری ادھیڑ عمر عورت بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور ایک جھونپڑے کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں کچھ کہا۔

دو آدمی ایک جھونپڑے سے نکل آئے۔ دونوں جوان تھے اور دونوں نے دھوتیاں پہن رکھی تھیں۔ ایک کے جسم پر میلا سا کرتا تھا لیکن دوسرے کا بالائی جسم بالکل برہنہ تھا۔ عورتوں کی رنگت تو قدرے صاف تھی لیکن مرد توے کی طرح کالے تھے۔

انسپکٹر پانڈے آگے بڑھ کر ان سے باتیں کرنے لگا اور میں ببلا کے ساتھ کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ دو جھونپڑوں کی پچھلی طرف کھلی جگہ پر ناریل کا بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

آوازیں سن کر کچھ اور لوگ بھی جھونپڑوں سے نکل آئے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ان میں سے بعض کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ آوازیں سن کر نیند سے بیدار ہوئے تھے۔

اس دوران میں ایک بوڑھا آدمی بھی ایک جھونپڑے سے نکل کر انسپکٹر پانڈے اور دوسرے آدمیوں کی گفتگو میں شامل ہو گیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے لیے ایک جھونپڑا خالی کر دیا گیا۔

جھونپڑے میں چٹائیاں اور ان پر میلے کچیلے سے گدے بچھے ہوئے تھے جن میں ناریل کے چھلکے بھرے گئے تھے۔ تقریباً تین فٹ تک اونچی گارے کی دیوار تھی اور اس کے اوپر لکڑی کی بلیوں کے ساتھ درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں کو ملا کر جھونپڑے کو اوپر تک مکمل کیا گیا تھا۔

ببلا ایک گدے پر لیٹ گئی اور انسپکٹر پانڈے بتانے لگا کہ یہ بھیل قبیلے کے لوگ ہیں جو برسوں سے اس جنگل میں آباد ہیں۔ بستی کے اطراف میں دور دور تک ناریل کے درختوں کی بہتات تھی اور یہ لوگ ناریل جمع کر کے شہر میں فروخت کرتے تھے۔ یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہمیں ناشتا یا کھانا دیا گیا۔ موٹی موٹی روٹیاں اور بغیر دودھ کی چائے۔ ناشتے کے دوران میں اس بستی کا بوڑھا سردار بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

سردار کے کہنے کے مطابق سارسکا شہر کی طرف جانے والی سڑک یہاں سے کم از کم چار گھنٹوں کے فاصلے پر تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ایک آدمی کو ہمارے ساتھ بھیج دیا جائے گا تاکہ ہم جنگل میں بھٹک نہ جائیں۔

کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ببلا گدے پر لیٹ کر سو گئی۔ انسپکٹر پانڈے اٹھ کر باہر چلا گیا اور میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔ اب اطمینان ہو گیا تھا اس لیے میں بھی کچھ دیر آرام کر لینا چاہتا تھا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب ہمیں جگایا گیا تھا۔ ہمارے لیے دوپہر کا کھانا بھی تیار تھا۔ ہم نے جھونپڑوں کے پیچھے بہنے والی ندی سے منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھا کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بستی کا ایک آدمی ہمارے ساتھ تھا جو تقریباً دس گز آگے چل رہا تھا۔

سردار نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم واقعی چار گھنٹوں بعد جنگل سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سارسکا سے جے پور کی طرف جانے والی ہائی وے تھی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ سارسکا شہر وہاں سے بائیں طرف تقریباً دس میل کے فاصلے پر ہے۔ میرے منہ سے ایک گہرا سانس نکل گیا۔ ہم شہر کی دوسری طرف تقریباً ایک میل آگے جنگل میں داخل ہوئے تھے اور اب دس میل ادھر جنگل سے باہر نکلے تھے۔

اس وقت سہ پہر کے پانچ بج رہے تھے اور اس گائیڈ کو ہمارے ساتھ ہی شہر جانا تھا۔ اس نے دوسری صبح اپنی بستی واپس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم جنگل میں چار دن تک بھٹکتے رہے تھے۔ اس دوران میں میلوں کا فاصلہ طے کیا تھا لیکن اب پختہ سڑک پر دس میل کا فاصلہ طے کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ببلا سڑک کے کنارے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"جے پور کی طرف سے بسیں آتی رہتی ہیں۔" انسپکٹر نے کہا "کوئی نہ کوئی بس اس طرف آنے والی ہو گی۔"

اور پھر ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا انتظار کرنا پڑا۔ جے پور کی طرف سے ایک بس کو آتے دیکھ کر انسپکٹر سڑک کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ بس اس کے قریب آ کر رک گئی۔ یہ محکمۂ سیاحت کی بس تھی جو جے پور سے الور کی طرف جا رہی تھی۔ اس بس کو رات بھر کے لیے سارسکا ہی میں رکنا تھا۔

بس بہت شان دار تھی۔ تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ اس میں غیر ملکی سیاح بھی تھے اور ہندوستانی بھی۔ وہ لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ پولیس انسپکٹر ہمیں گرفتار کر کے لے جا رہا ہے۔ ببلا کو تو دو یورپین عورتوں نے اپنے ساتھ سیٹ پر بٹھا لیا اور ہمیں کھڑے ہی رہنا پڑا تھا۔ دس میل کا فاصلہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں طے ہو گیا۔

بس کوتوالی کے سامنے سے گزری تو انسپکٹر نے اسے رکوا لیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ کوتوالی میں قدم رکھتے ہی مجھے

اندازہ ہوگیا کہ ہمارے بعد شہر میں کیا صورتِ حال رہی ہوگی۔

میں اور بملا زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ انسپکٹر پانڈے نے ہمیں جیپ پر ہمارے گیسٹ ہاؤس کی طرف بھجوادیا۔

جانکی، روپ متی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ ہٹ کے باہر لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جیپ ان سے چند گز کے فاصلے پر رکی اور مجھے اور بملا کو جیپ سے اترتے دیکھ کر وہ تینوں اچھل پڑے اور کرسیوں سے اٹھ کر ہماری طرف لپکے۔

ہمارے ملاپ کا وہ منظر بڑا ہی سنسنی خیز تھا۔ روپ متی اور جانکی، بملا کو گلے لگا کر رو رہی تھیں۔ جانکی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ ہم تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑے رہے اور پھر ہٹ کے اندر آگئے۔

"یہ کیا حلیے بنا رکھے ہیں تم دونوں نے۔" روپ متی نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری شرٹ اور جوتے بملا۔۔۔"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "فرصت میں سناؤں گا۔ اس وقت تو کوئی ہمیں چائے پلا دے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" جانکی اٹھ کر کچن کی طرف دوڑ گئی۔

بملا نے صوفے پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔

پندرہ بیس منٹ بعد جانکی سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ بملا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اور پھر چائے کے دوران میں، میں انہیں اپنی رام کہانی سناتا رہا۔

"یہاں کی کیا صورت حال رہی؟" میں نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔

"تمہارے جانے کے بعد تو یہاں بھونچال آگیا تھا۔" ٹھاکر نے کہا "ڈپٹی کمشنر پولیس پارٹی کو جنگل میں بھیجنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے جے پور آئی جی کو فون کردیا اور پھر اس کے حکم پر ایک پولیس پارٹی انسپکٹر ونود پانڈے کی قیادت میں جنگل کی طرف بھیج دی گئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "پرسوں شام تین پولیس والے زخمی حالت میں جنگل سے باہر آئے تو شہر میں ہلچلی سی مچ گئی۔ اسی شام بیس اہلکاروں پر مشتمل ایک اور پولیس پارٹی کو جنگل میں بھیج دیا گیا۔ اسلحے سے لیس ہونے کے علاوہ ان کے پاس ٹارچیں بھی تھیں۔ وہ لوگ کل تقریباً اسی وقت چند لاشیں لے کر واپس آگئے۔ ان میں چار لاشیں ان [illegible] والوں کی تھیں جو انسپکٹر پانڈے کی ٹیم میں شامل تھے۔ [illegible] لاشیں گنگولی چوہدری کے ساتھیوں کی تھیں جن میں [illegible] عورت اور چترا کی لاش بھی تھی۔ آج صبح سویرے ایک [illegible] پارٹی بھیجی گئی ہے۔ شام تک ہی اس کے بارے میں [illegible] چلے گا۔"

"یہاں کی صورتِ حال کا کچھ پتا چلا۔ میرا مطلب جس کام سے ہم یہاں آئے تھے اس میں کوئی پیش رفت [illegible] یا نہیں؟" میں نے ٹھاکر کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ہم یہاں بلونت سنگھ اور وار[illegible] تلاش میں آئے تھے مگر ڈیڑھ ہفتہ گنگولی چوہدری کے چکر میں نکل گیا تھا۔ گنگولی چوہدری کی کہانی ختم ہوگئی تھی لیکن [illegible] لگتا تھا کہ ہم ابھی وہیں کھڑے تھے جہاں سے چلے تھے۔

"ہم جب سے یہاں آئے ہیں اسی ہنگامے میں الجھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف توجہ ہی نہیں دی جاسکی لیکن۔" ٹھاکر کہتے کہتے رک گیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد [illegible] "اڑتی اڑتی یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ ایک عورت کو [illegible] کروانے کے سلسلے میں تحقیقات کے لیے پولیس جب دھول پور پہنچی تو گاؤں کے لوگوں نے پولیس پارٹی پر حملہ کردیا جس سے دو پولیس والے زخمی ہوگئے تھے۔ اس طرح پولیس پارٹی کو واپس آنا پڑا اور سننے میں آیا ہے کہ چار دن پہلے جس روز تم نارائن کے ساتھ جنگل میں گئے تھے اسی روز ایک پنڈت اپنے دو چیلوں کے ساتھ دھول پور پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کو پولیس کے خلاف بھڑکایا تھا اور لوگوں کے دلوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ عورت کو ستی کرنا ان کی مذہبی رسم ہے اور کسی کو مذہبی رسومات پر پابندی لگانے کا کوئی حق نہیں ہے اور وہ اس پابندی کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ بات بھی سننے میں آئی کہ وہ پنڈت اپنے آپ کو بدیشی (غیر ملکی) سادھو کہلاتا ہے۔"

"بدیشی سادھو؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آگے کوئی سوال مت کرنا۔" ٹھاکر بولا "اس [illegible] میں اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا۔ موقع ہی نہیں ملا۔ اب کل سب سے پہلے یہی کام کریں گے۔"

"اب کوئی اور موضوع شروع کرنے سے بہتر ہے تم دونوں جاکر اپنے حلیے درست کرو۔" روپ متی نے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "لگتا ہے جنگل میں مچھروں نے تمہارے خون پر خوب دعوتیں اڑائی ہیں۔ تمہارا پورا بدن سرخ دانوں سے بھرا ہوا ہے۔"

"ایک اور بات بتاؤں دیدی۔" بملا ایک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے گھور کر دیکھا تو بملا آگے کچھ نہ بول سکی۔ اس کا [illegible] گیا۔

"تم شاید کوئی خاص بات بتا رہی تھیں۔ چپ کیوں ہوگئیں؟" روپ متی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت سنگھ نے ایک سانپ بھی مارا تھا۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ میں تو ڈر گئی تھی۔" بملا نے بات بنا دی اور فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئی "میں تو نہانے جارہی ہوں۔ کئی روز ان وحشیوں میں رہی ہوں۔ گھن آرہی ہے مجھے اپنے آپ سے۔" وہ روپ متی والے کمرے میں چلی گئی۔

"تم بھی اپنا حلیہ بدل لو سادھو مہاراج۔" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور دروازہ بند کرکے پہلے بیگ میں سے کپڑے نکالے اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا۔ جانکی نے مجھے سادھو کہہ کر کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ میرا حلیہ واقعی آوارہ گرد سادھوؤں جیسا تھا۔ بکھرے ہوئے گرد آلود بال جن میں چند تنکے بھی پھنسے ہوئے تھے۔ تین چار دن کا بڑھا ہوا شیو اور سرخ آنکھیں۔ میں اپنی یہ حالت دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں تقریباً آدھے گھنٹے تک شاور کے نیچے کھڑا رہا اور جب کپڑے بدل کر باہر آیا تو ہال میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ہٹ سے باہر آگیا۔ جانکی لان میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بھی اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کہاں چلے گئے یہ لوگ؟" میں نے پوچھا۔

"روپ متی اور ٹھاکر بازار گئے ہیں۔ اسپتال سے ہوتے ہوئے کھانا لے کر آئیں گے اور بملا ابھی تک باتھ روم میں ہی گھسی ہوئی ہے۔" جانکی نے جواب دیا "اب تم "بندے کے پتر" لگ رہے ہو مگر شیو کیوں نہیں بنایا؟"

"موڈ نہیں ہو رہا تھا۔" میں نے جواب دیا "کیا تم ایک کپ چائے پلانا پسند کرو گی؟"

"میرا خیال ہے جنگل میں گزرے والے ایک ہفتے کی کسر تم ایک ہی دن میں نکال لینا چاہتے ہو۔" جانکی نے کہا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ ٹرے اٹھائے باہر نکلی تو اس کے ساتھ بملا بھی تھی۔ اس نے فلیپر اور سلیولیس سرخ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس وقت وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

"کہاں کھو گئے سادھو مہاراج۔ میں آپ کے لیے کافی بنا کر لائی ہوں۔ اس کے بعد آپ چائے کی طلب محسوس نہیں کریں گے۔" جانکی نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے کہا "اور ویسے دھیان دو تو ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔"

جانکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے الفاظ اور لہجے میں ہلکا سا طنز تھا جسے میں نے بھی محسوس کیا تھا اور بملا نے بھی لیکن نہ تو بملا نے اور نہ ہی میں نے اس کا جواب دینا مناسب سمجھا۔

میں نے ایک مگ اٹھالیا۔ پہلی چسکی لیتے ہی میں اچھل پڑا۔ کافی تیز اور خوش ذائقہ تھی۔

کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم جنگل میں پیش آنے والے خونی واقعات کے بارے میں بھی باتیں کرتے رہے تھے۔

"سنا ہے ڈاکوؤں کے ساتھ ایک عورت کی لاش بھی ملی ہے۔ وہ کون تھی؟" جانکی نے پوچھا۔

"گنگولی چوہدری کی رکھیل کروشا۔" میں نے جواب دیا "گنگولی چوہدری نے دو سال پہلے اسے ایک گاؤں سے اغوا کیا تھا اور اب غالباً کروشا سے اس کا جی بھر گیا تھا اسی لیے اس نے بملا کو روک لیا تھا اور یہ کروشا ہی تھی جس نے بملا کو اس وحشی کی دست برد سے بچائے رکھا تھا۔"

"حیرت ہے۔ ڈاکوؤں کی ساتھی کو کسی دوسرے سے اتنی ہمدردی؟" جانکی بولی۔

"وہ ڈاکوؤں کی ساتھی نہیں تھی۔ وہ تو ان کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔" میں نے کہا اور کروشا کے پس منظر کے بارے میں بتانے لگا "اگر کروشا ہمارا ساتھ نہ دیتی تو ہم ان وحشیوں کے چنگل سے نہیں نکل سکتے تھے۔ یا تو انہی کے ہاتھوں مارے جاتے یا کراس فائرنگ میں پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن جاتے۔ ہم نے کوشش تو کی تھی کہ کروشا کو وہاں سے نکال لاتے لیکن اسے ہماری فکر تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم کسی طرح وہاں سے نکل جائیں۔ وہ بے چاری بھی چوہدری کے ہاتھوں ماری گئی اور مجھے اس کی موت کا افسوس رہے گا۔"

"چوہدری کے ہاتھوں!" جانکی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"گنگولی چوہدری انسان نہیں وحشی تھا۔ درندہ۔۔۔" میں

نے کہا "اس نے اپنے کم از کم تین آدمیوں کو تو میرے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ ان میں ایک کا قصور یہ تھا کہ اس نے بلا کا بوسہ لینے کی کوشش کی تھی جبکہ وہ بلا کو اپنی ملکیت سمجھ چکا تھا اور کروشا کو اس نے محض اس لیے چٹنی کر دیا تھا کہ اس نے ہمیں وہاں سے بھاگنے میں ہماری مدد کی تھی اور مجھے افسوس یہ ہوا کہ میں اس وقت کروشا کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا لیکن بہرحال' میں نے گنگولی سے اس کی موت کا بدلہ لے لیا۔"

"اور دیدی۔ وہ تو راکھشس تھا راکھشس۔" بلا نے کہا "مجھے تو اس کی شکل دیکھ کر ہی خوف آنے لگتا تھا۔"

"عجیب زندگی ہے ان ڈاکوؤں کی بھی۔" جانکی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر ایک گاڑی کو سڑک سے اس طرف مڑتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

میں بھی اس گاڑی کی طرف دیکھنے لگا جو چند سیکنڈ بعد ہی ہٹ کے سامنے آکر رک گئی۔ وہ پولیس کی جیپ تھی۔ انسپکٹر پانڈے کے ساتھ دو اور پولیس آفیسر جیپ سے اتر کر ہماری طرف آگئے۔ ان میں ایک انسپکٹر تھا اور دوسرا اے سی پی۔ (اسسٹنٹ کمشنر پولیس) وہ دونوں وردی میں تھے جبکہ انسپکٹر پانڈے سادہ لباس میں تھا۔ اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا اور زخمی بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

وہ لوگ قریب آئے تو ہم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان تینوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بلا اور جانکی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ یہاں صرف چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں برآمدے سے دو اور کرسیاں اٹھا لایا۔

"یہ ہمارے اے سی پی مسٹر بھنڈاری ہیں۔" انسپکٹر پانڈے نے تعارف کرایا اور یہ انسپکٹر جارمنی داس۔ ہم آپ دونوں کا بیان ریکارڈ پر لانا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ۔"

"اس کے علاوہ کیا۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سرکار نے گنگولی چوہدری کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر پھر پانچ لاکھ روپے کا انعام مقرر کر رکھا تھا۔ آپ دونوں نے' خاص طور پر آپ نے ہمت سنگھ!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "گنگولی چوہدری کے گروہ کے خاتمے اور گنگولی چوہدری کو انجام تک پہنچانے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے سرکار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انعام کی رقم آپ دونوں کی خدمت میں پیش کر دی جائے۔"

میں نے بلا اور جانکی کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی تھی اور بلا کا تو چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ اس لیے نہیں کہ پانچ لاکھ کا انعام مل رہا تھا بلکہ اس لیے سرکار نے ہماری خدمت کا اعتراف کیا تھا۔

"پانڈے جی۔" میں نے کہا "آپ اس بات کے دید گواہ ہیں کہ گنگولی چوہدری کس طرح اپنے انجام تک پہنچا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم نے اپنی زندگیاں داؤ پر لگا دی تھیں لیکن گنگولی چوہدری کے گروہ کے خاتمے میں کردار ان پولیس اہلکاروں نے ادا کیا ہے جنہوں نے اس میں حصہ لیا اور جنہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے اس گروہ کا قلعہ قمع کیا اور آئندہ کے لیے اس کی دہشت سے نجات دلائی۔ انعام کے حق دار میں وہی ہیں اس لیے میری اور بلا کی یہ خواہش ہے انعامی رقم اس معرکے میں جان گنوانے والے اہلکاروں میں تقسیم کر دی جائے۔"

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں ہمت جی۔" اے سی پی بھنڈاری نے کہا "یہ ایک بڑی رقم اور۔۔۔"

"اور اس پر انہی کا حق ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اور بیان دینے کے لیے بھی ہم تیار ہیں۔"

"شکریہ مسٹر ہمت سنگھ!" اے سی پی نے کہا "آج تو ہم آپ سے صرف بات کرنے آئے تھے۔ بیان کے لیے آپ کو کوتوالی تک آنے کی زحمت کرنی پڑے گی۔ نو اور گیارہ کے درمیان تشریف لے آیئے۔ اس وقت میں بھی وہاں موجود ہوں گا۔"

"ہم پہنچ جائیں گے۔" میں نے کہا۔

وہ لوگ اٹھ کر اپنی جیپ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ روپ متی اور ٹھاکر بھی آگئے۔ ٹھاکر نے پجارو پولیس جیپ سے ذرا ہٹا کر روکی تھی۔ ٹھاکر کے آنے کے بعد وہ لوگ چند منٹ اور رک گئے۔ اس وقت مجھے ایک اور بات یاد آئی۔

"انسپکٹر پانڈے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کانسٹیبل اور گنگولی چوہدری کی لاشوں کو واپس لانے کا کوئی بندوبست کیا یا نہیں؟"

"شام سے پہلے پولیس کی ایک پارٹی بستی کے ایک آدمی کے ساتھ روانہ کر دی گئی تھی۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا "رات وہ لوگ بھیل قبیلے کی بستی میں رہیں گے اور صبح سویرے وہاں سے آگے روانہ ہو جائیں گے۔ پارٹی انچارج کو لوکیشن سمجھا دی گئی ہے۔ گنگولی چوہدری کی لاش اگر جنگلی جانوروں کی چیرہ دستی سے بچ گئی تو اسے چوراہے پر رکھ دیا جائے گا تاکہ لوگ اپنی آنکھوں

سے دیکھ لیں کہ جس شخص نے کئی ورشوں (سالوں) سے ان کا جینا حرام کر رکھا تھا اس کا انجام بالآخر کیا ہوا۔"

میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ یہ انجام واقعی بہت عبرت انگیز تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہم ہٹ کے اندر آگئے۔ ٹھاکر ہوٹل سے کھانا لے آیا تھا۔ روپ متی نے پجارو سے باسکٹ نکال کر جانکی کے حوالے کر دی اور پھر تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

○☆○

بدیشی سادھو کا سراغ بڑی مشکل سے ملا تھا۔

اگلے روز پولیس سے فارغ ہونے کے بعد میں اور ٹھاکر پجارو پر ڈھول پور کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ اس روز صبح سویرے ہلکی سی بارش ہوئی تھی جس سے کچا راستہ دلدل بن گیا تھا۔ ڈھول پور کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن وہاں پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ ٹھاکر نے پجارو بستی کے مرکزی چوراہے پر ایک طرف روک لی۔

یہ چوراہا خاصا بڑا تھا جس کے عین وسط میں پیپل کے دو تین درخت تھے۔ ان کے گرد تقریباً دو فٹ اونچا وسیع و عریض چبوترہ بنا ہوا تھا۔ درختوں کی جڑوں کے قریب سوکھے ہوئے پھول' کچی دال اور چاول وغیرہ بکھرے ہوئے تھے اور وہاں چیونٹیوں کی بھرمار تھی۔ یہ ہندو بھی عجیب ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جسے بھگوان مان کر یہ اس کی پوجا نہ کرتے ہوں۔ پیپل کے درخت کو بھی مقدس سمجھا جاتا ہے اور تلسی کے پودے کی تو باقاعدہ پوجا کی جاتی ہے۔ گھروں میں تلسی کا پودا لگانا باعث برکت سمجھا جاتا ہے۔

دو تین آدمی چبوترے کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے گلی کے موڑ پر بنئے کی دکان کے سامنے گاڑی روکی تھی۔ دکان کے سامنے بھی تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ جس روز اس عورت کو ستی کیا گیا تھا اس دن بھی ہم یہاں موجود تھے۔ اس روز ہمیں بستی کے زیادہ لوگوں نے نہیں دیکھا تھا لیکن دکان کے سامنے بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک چہرہ ایسا تھا جسے میں نے پہچان لیا تھا۔ اس آدمی کو میں نے اس روز بھی دیکھا تھا بلکہ میرا خیال تھا کہ اسی سے ہم نے اس پنڈت کے بارے میں دریافت کیا تھا۔

ٹھاکر نے انجن بند کر دیا اور ایک آدمی کو بلانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔ ایک کے بجائے دو آدمی اٹھ کر گاڑی کے قریب آگئے۔ ان دونوں نے ہاتھ اٹھا کر پرنام (سلام) کیا۔

"جی مہاراج۔" ان میں سے ایک نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"وہ پنڈت کہاں ملے گا؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"وہ پنڈت جی تو اس سے اگلے ہی روز یہاں سے چلے گئے تھے جب پچھلی بار آپ یہاں آئے تھے۔ آپ کے ساتھ ایک دیوی جی بھی تھیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا اور اس کی عمر تیس بیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔

میں دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس روز ہمارے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔

"میں اس پنڈت کی بات نہیں کر رہا۔" ٹھاکر نے کہا "میں بدیشی سادھو کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ دو چیلے بھی ہیں۔"

"اچھا وہ بدیشی سادھو۔" وہ شخص گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "کل شام تک تو وہ پنڈت سوبھراج جی کا مہمان تھا اور پھر وہ اپنے چیلوں کے ساتھ رات ہی کو کہیں چلا گیا تھا۔"

"پنڈت سوبھراج کہاں ملے گا؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"وہ سامنے والی گلی میں جا کر سیدھے ہاتھ مڑ جاؤ۔ وہاں مندر کے ساتھ ہی پنڈت سوبھراج کا مکان ہے۔ وہ اس وقت گھر پر ہی ہوگا۔" اس شخص نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"دھنے باد۔" ٹھاکر نے ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

گاڑی چوراہے سے گھوم کر سامنے والی گلی میں داخل ہو گئی اور پھر وہاں سے دائیں طرف موڑنے کے بجائے ٹھاکر نے گاڑی روک لی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔

گلی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ بائیں طرف شروع ہی میں ایک مکان کے رقبے کے برابر مندر تھا اور اس سے آگے پنڈت سوبھراج کا مکان۔

ہمیں دروازے پر دستک دینے یا پنڈت سوبھراج کو تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ ہم جیسے ہی مندر کے سامنے سے گزرے' ایک آدمی ملحقہ مکان کے دروازے سے برآمد ہوا۔ وہ لباس اور صورت ہی سے کوئی پنڈت یا پجاری لگتا تھا۔ پیر میں لکڑی کی کھڑاؤں' مخصوص انداز میں پہنی ہوئی دھوتی جبکہ جسم کے بالائی حصے پر زرد رنگ کی چادر بھی مخصوص انداز میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس چادر پر جا بجا "اوم" چھپا ہوا تھا۔ ایسی چادریں بازار میں عام طور پر

سستے داموں مل جاتی تھیں۔ اس شخص کا سر گنجا تھا۔ ماتھے پر سفید قشقہ، اس سے ذرا اوپر درمیان میں سرخ تلک اور دونوں رخساروں پر بھی اوپر سے نیچے سیندور سے لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ صورت ہی سے وہ کٹر، متعصب اور کینہ پرور ہندو لگتا تھا۔ اس کی بٹن جیسی آنکھوں میں عیاری کی چمک نمایاں تھی۔

ٹھاکر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر پرنام کیا تو وہ رک کر کینہ توز نظروں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگا اور پھر بادلِ ناخواستہ اس نے بھی دونوں ہاتھ اٹھا کر جوڑ دیے۔

"کون ہو تم لوگ۔ کہاں سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بھی کینہ توزی کی جھلک نمایاں تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سب کو اپنے آپ سے کم تر سمجھتا ہو۔

"ہون (آگ میں گھی پھینکنے کی ہندوانہ رسم۔ اسے ہوم بھی کہتے ہیں) کرانا ہے پنڈت جی۔ ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" ٹھاکر نے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا۔

"کہاں سے آئے ہو تم لوگ۔ اس بستی کے تو نہیں ہو۔ میں تو اس بستی کے ایک ایک چہرے کو پہچانتا ہوں۔" پنڈت نے کہا۔ اس نے نوٹ مٹھی میں دبا لیا تھا۔

"ہم سارسکا سے آئے ہیں پنڈت جی۔ آپ کو واپس یہاں چھوڑ دیں گے۔" ٹھاکر نے کہا۔

"سارسکا۔ کیا شہر میں کوئی پنڈت نہیں رہ گیا جو....؟"

"بات یہ ہے پنڈت جی۔" ٹھاکر نے کہا "پنڈت تو شہر میں بہت ہیں لیکن ہم ذرا پرانے خیالات کے لوگ ہیں۔ آج کل کے پنڈت اور پجاری تو دھرم کی پرانی رسموں کو بھول چکے ہیں۔ مجھے تو شک ہے کہ وہ اشلوک بھی ٹھیک پڑھتے ہیں یا نہیں۔ آپ کے بارے میں سنا تو ہم یہاں آ گئے اور آپ کو دیکھا تو وشواس (یقین) ہو گیا کہ آپ کا ہون ٹھیک رہے گا۔ آپ انکار نہ کیجئے پنڈت جی۔"

"کتنی دیر لگے گی؟" پنڈت نے پوچھا اور آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگا۔

"سب تیاری مکمل ہے پنڈت جی۔" ٹھاکر نے جواب دیا "زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہمارے پاس گاڑی ہے۔ ہم آپ کو واپس یہاں چھوڑ جائیں گے۔"

پنڈت سوبھراج چند لمحے خاموش رہا پھر ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے دوبارہ گھر میں گھس گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ لگے تھے۔ اس مرتبہ اس نے کندھے پر ایک تھیلا لٹکا رکھا تھا۔

ہم اس کے ساتھ باہر والی گلی میں آ گئے۔ اردگرد کئی بچے جمع تھے اور ایک بچہ تو بونٹ پر چڑھا بیٹھا [illegible] ہمیں دیکھ کر وہ سب بھاگ گئے۔

ٹھاکر نے دروازہ کھول کر پہلے پنڈت سوبھراج کو [illegible] سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ [illegible] پسنجرز سیٹ پر براجمان ہو گیا تھا۔

ٹھاکر گاڑی کو اس چوک کی طرف سے نہیں ایک گلی سے نکال کر لے گیا تھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا پنڈت لب کچھ بدبدا رہا تھا۔

بستی سے تقریباً دو میل دور آنے کے بعد ٹھاکر نے گاڑی کو اصل راستے سے ہٹا کر بائیں طرف موڑ دیا۔

"ادھر کہاں جا رہے ہو مورکھ۔ (احمق) شہر کا راستہ سامنے ہے۔" پنڈت سوبھراج فوراً ہی بول پڑا۔

"صبح بارش کی وجہ سے وہ کچا راستہ دلدل بن گیا ہے پنڈت جی۔ گاڑی کیچڑ میں پھنس جائے گی اس لیے ذرا گھوم کر جانا پڑے گا۔" ٹھاکر نے کہا۔

اس طرف کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ آک کے پودے اور ببول کی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ٹھاکر ان جھاڑیوں میں گاڑی چلاتا رہا۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹھاکر نے گاڑی روک کر انجن بند کر دیا۔

"کیا ہوا۔ تم نے موٹر کیوں روک لی؟" پنڈت نے کہتے ہوئے الجھی ہوئی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔

"مجھے ایک اور بات یاد آ گئی ہے پنڈت جی۔" ٹھاکر نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہ کسی اور پنڈت کو بھی ساتھ لے جائے۔ پوجا میں ذرا رونق ہو جائے گی۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم بدیشی سادھو اور اس کے دو چیلوں کو بھی ساتھ لے لیں۔"

"بدیشی سادھو!" پنڈت سوبھراج اچھل پڑا۔

"ہاں۔ بدیشی سادھو اور اس کے دو چیلے۔" ٹھاکر نے [illegible] "اب تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"مم۔ میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" پنڈت ہکلایا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ ٹھاکر اس پنڈت کو پوجا یا ہون کا بہانہ کر کے اپنے ساتھ کیوں لایا تھا۔ [illegible] میں شاید پنڈت سے وہ سب کچھ پوچھنا آسان نہ ہوتا جو ہم جاننا چاہتے تھے۔ آبادی سے دور اس ویرانے میں ہمارے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر یہ پنڈت نفسیاتی دباؤ میں آ سکتا تھا اور پنڈت پر شاید اس کا اثر بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔

"تم سب کچھ جانتے ہو۔" ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "کل رات وہ تمہارے گھر پر تھے اور تم جانتے ہو وہ اس وقت کہاں ہیں۔"

"میں کسی بدیشی سادھو کو نہیں جانتا۔" پنڈت نے جواب دیا۔

"تم ایسے نہیں مانو گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پتلون کے پائنچے میں سے خنجر نکال لیا۔

"تت۔۔۔ تم لوگ کون ہو۔۔۔ اور کیا چاہتے ہو۔" پنڈت ہکلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔

"صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ بدیشی سادھو اور اس کے چیلے کون ہیں اور کہاں چھپے ہوئے ہیں۔" میں نے خنجر کی نوک اس کے چہرے کے سامنے کر دی "تم انہیں بہت اچھی طرح جانتے ہو اس لیے کہ کل رات وہ تمہارے مہمان تھے اور تم نے ان کی خوب ٹہل سیوا کی تھی۔"

"مم۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" پنڈت بولا "اس گاؤں میں ایک ہی مندر ہے اور میں اس کا پنڈت ہوں اس لیے وہ لوگ میرے گھر پر آ گئے تھے اور بھوجن (کھانا) کر کے چلے گئے تھے۔"

"یہ ایسے نہیں مانے گا۔" ٹھاکر یہ کہتے ہوئے نیچے اتر گیا۔ دوسری طرف آ کر اس نے دروازہ کھولا اور پنڈت کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔

پنڈت سوبھراج چیختا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے جھاڑیوں میں گرا۔ جھاڑیوں کے کانٹے چبھے تو وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا اور جلدی سے اٹھ گیا۔

"دیکھو پنڈت۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم صرف اس بدیشی سادھو کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اگر تم شرافت سے اس کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے لیکن اگر تم نے ضد کی تو میں تمہارے شریر (بدن) کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا۔ اب جلدی سے زبان کھول دو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا اور کچھ نہیں بتاؤں گا۔" پنڈت سوبھراج نے جواب دیا۔

اس مرتبہ اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ نہ ہکلاہٹ تھی اور نہ خوف کا شائبہ اور وہ ٹھاکر کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ کرخت ہو گیا تھا۔ پنڈت سوبھراج کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس وقت وہ مجھے عام پنڈتوں اور پجاریوں سے مختلف نظر آ رہا تھا۔

ٹھاکر چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک ہی پنڈت پر ہاتھ اٹھا دیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پنڈت سوبھراج نے اس کا ہاتھ اوپر ہی روک لیا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا۔ ٹھاکر کی آنکھوں میں بھی الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے اور پھر جو کچھ ہوا وہ میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ پنڈت نے ٹھاکر کی کلائی کو زوردار جھٹکا دیا اور ساتھ ہی اس کی ٹانگ پر ٹھوکر رسید کر دی۔ ٹھاکر کراہتا ہوا جھاڑیوں میں گرا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ٹھاکر جیسا لحیم شحیم آدمی ایک ہی وار سے ڈھیر ہو گیا تھا۔ میں چھلانگ لگا کر گاڑی سے نیچے اتر آیا اور پنڈت کو للکارتا ہوا خنجر اٹھائے اس کی طرف لپکا۔ میں نے خنجر سے حملہ کرنے کی کوشش کی تو پنڈت نے بڑی مہارت سے میرے خنجر والے ہاتھ کی کلائی تھام کر میرا حملہ ناکام بنا دیا۔

پنڈت کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ لگتا تھا جیسے میری کلائی آہنی شکنجے میں جکڑی گئی ہو۔ میں کلائی چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ تو گرفت ڈھیلی ہوئی اور نہ ہی پنڈت سوبھراج نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ چٹان کی طرح جما ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

ٹھاکر اٹھ کر پنڈت کی طرف لپکا تو میں چیخ اٹھا۔

"نہیں ٹھاکر۔ تم اس پر حملہ نہیں کرو گے۔ اسے اپنی طاقت آزما لینے دو۔"

ٹھاکر تین چار قدم دور رک گیا۔

"نہیں نہیں۔ اپنے متر (دوست) کو بھی اپنی شکتی (طاقت) آزما لینے دو۔" پنڈت نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم دونوں کو بڑا گھمنڈ تھا اپنے آپ پر۔ میرے اندر اتنی شکتی ہے کہ میں تم دونوں کو خون تھوکنے پر مجبور کر دوں گا۔"

پنڈت نے میری کلائی کو جھٹکا دیا۔ میری مٹھی کھل گئی اور خنجر نیچے گر گیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میری کلائی کی ہڈی چٹخ رہی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنڈت سوبھراج کسرتی بدن کا مالک تھا اور اس میں طاقت ہونی چاہیے تھی لیکن اس کی گرفت میں آہنی شکنجے جیسی سختی! مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

ہندوستان کے پنڈت اور پجاری بڑی پُراسرار قوتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ایسی شکتی حاصل کرنے کے لیے بڑے کٹھن جاپ کرتے ہیں۔ ان میں ایسی پُراسرار شکتی آجاتی ہے کہ کوئی عام آدمی انہیں شکست نہیں دے سکتا۔

میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایسی باتیں سوچ کر میں کسی نفسیاتی دباؤ میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

میں نے پنڈت کی قوت کو آزمانے کے لیے کلائی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ پنڈت نے میری کلائی پر گرفت اور مضبوط کرلی۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور میں پنڈت کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پنڈت بھی پلک جھپکے بغیر میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ذرا سا اچھلا اور اپنا بوجھ پیچھے کی طرف ڈال کر دونوں ٹانگیں دہری کرکے اوپر کی طرف نکال لیں۔ پنڈت جھٹکا لگنے سے ذرا سا آگے کو جھکا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، میری دونوں ٹانگیں اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ میں نے اپنے آپ کو بائیں طرف گرا دیا۔

ہم دونوں کانٹے دار جھاڑیوں میں گرے۔ کئی کانٹے میرے جسم میں چبھے تھے لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پنڈت نے بھی اٹھنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

پنڈت سوبھراج نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور اس سے پہلے کہ پنڈت میرے قریب پہنچتا، میری سائیڈ کک اس کے کندھے سے ذرا نیچے بازو پر لگی۔ وہ بلبلا کر نیچے گرا لیکن اس مرتبہ بھی اس نے اٹھنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے ایک اور کک لگانے کی کوشش کی لیکن اس نے بڑی پھرتی سے میری کک بلاک کردی اور پھر وہ میری ہر کک کو بلاک کرتا رہا۔

میں سنبھل گیا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ پنڈت اور مارشل آرٹسٹ؟ میں نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے حریف سوبھراج کے لیے پنڈت کا لفظ ذہن سے نکال دیا۔ بدھ بھکشو مارشل آرٹسٹ ہوسکتے تھے تو ایک پنڈت کیوں نہیں۔ میرے سامنے ایک پنڈت نہیں، مارشل آرٹسٹ کھڑا تھا جس نے میری کئی ککس بلاک کی تھیں۔

اور پھر سوبھراج نے بھی جوابی کارروائی شروع کردی۔ میں نے اس کی ایک سائیڈ کک روکنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پہلو میں وزنی ہتھوڑے سے زوردار ضرب لگائی گئی ہو۔ میں تڑپ گیا۔ پنڈت کی دوسری کک میری اسی ٹانگ کی پنڈلی کی طرف لگی۔ اگر میں اچھل کر پیچھے ہٹنے کی کوشش نہ کرتا تو اس زوردار ضرب میں پنڈلی کا گوشت پھٹ جاتا۔ اس طرح میں اپنے پیروں پر بھی کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔

پنڈت نے آگے بڑھ کر ایک اور کک مارنے کی کوشش کی تھی مگر میں بڑی تیزی سے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور تیزی سے اٹھ گیا۔ پنڈت مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ اس نے ڈبل فلائنگ کک لگانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ وہ الٹی قلابازی کھاتا ہوا پیچھے گرا اور فوراً ہی سنبھل گیا۔

میں نے رائٹ کک کا جھانسا دے کر لیفٹ کک لگائی۔ اس مرتبہ پنڈت اپنا دفاع کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا کہ میں نے اچھل کر اس کی گردن پر راؤنڈ ہاؤس کک لگائی۔ وہ بلبلاتا ہوا گرا۔ پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بہت اچھا مارشل آرٹسٹ تھا لیکن میں نے بھی گھاس نہیں کاٹی تھی۔ بنکاک میں مہاراج وانگ ونگ یائے اور ان کے نامور شاگردوں کی مار کھائی تھی اور پھر شاؤلن ٹیمپل میں ریاضت اور تربیت کی سختیاں جھیلی تھیں۔ یہ سب کچھ میں نے اس لیے برداشت نہیں کی تھیں کہ پنڈت سوبھراج جیسے مارشل آرٹسٹ سے مار کھا جاؤں۔

میں نے آخری مرتبہ فلائنگ کک لگائی۔ پنڈت نے بچنے کی کوشش کی مگر میرا پیر اس کی پیشانی پر لگا۔ میں نے جوگرز پہن رکھے تھے جس کے کھردرے سول سے اس کی پیشانی کی کھال چھل گئی۔ وہ چیختا ہوا پشت کے بل جھاڑیوں میں گرا۔ میں چھلانگ لگا کر کھڑا ہوگیا اور ایک پیر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

"تم تو ہم دونوں کو مچھروں کی طرح چٹکی میں مسلنے جارہے تھے مہاراج۔" میں نے پیر کا دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم تو خود ڈھیر ہوگئے۔ میں اگر چاہوں تو تمہاری پسلیاں توڑ سکتا ہوں۔" میں نے پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

اس کے سینے پر میرے پیر کا دباؤ کچھ زیادہ ہی پڑ گیا تھا۔ اس کا سانس گھٹنے لگا۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں۔

"لیکن تم سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم اس سادھو کے بارے میں بتا دو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں

بصورتِ دیگر۔"

"بب۔۔ بتاتا ہوں۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

میں نے پیر ہٹالیا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے پیشانی کو سہلایا اور پھر ہاتھ پر خون دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

ٹھاکر بھانوت سنگھ اتنی دیر تک دور کھڑا تماشا دیکھتا رہا تھا۔ میرا خنجر بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ آگے آگیا۔

"وہ بدیشی سادھو اور اس کے چیلے کہاں ہیں؟ وہ تمہارے پاس کیوں آئے تھے؟" ٹھاکر نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ سب کچھ حرامی بلونت سنگھ کی وجہ سے ہوا ہے۔ میں اس کی بات نہ مانتا تو مجھے یہ سمے (وقت) نہ دیکھنا پڑتا۔" پنڈت سوبھراج نے کہا۔

بلونت سنگھ کے نام پر ہم دونوں چونک گئے۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک ابھر آئی تھی۔

"بلونت سنگھ کو کیسے جانتے ہو؟" ٹھاکر نے پوچھا۔

"میں اس حرامی کے خوف سے کئی سال سے یہاں اس بستی میں چھپا بیٹھا تھا لیکن پچھلے سال اس نے مجھے کھوج نکالا۔" پنڈت سوبھراج نے جواب دیا اور پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ خاصی دلچسپ تھی۔

پنڈت سوبھراج بھی چتوڑ گڑھ کا رہنے والا تھا۔ اس کا تعلق بھی ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ بلونت سنگھ اس کا دوست تھا۔ یہ لوگ چند اور لڑکوں کے ساتھ مل کر "حرکتیں" کرتے رہتے تھے۔ بلونت سنگھ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔ یہ لوگ آئے دن کسی نہ کسی لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے رات بھر بھوکے بھیڑیوں کی طرح اسے بھنبھوڑتے رہتے اور صبح ذرا دھمکا کر چھوڑ دیتے۔ یہ لوگ ہمیشہ چھوٹے اور نیچ گھرانوں کی لڑکیوں پر ہاتھ ڈالتے تھے اور وہ لوگ ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ بعض لوگوں نے ان کی زیادتیوں کے خلاف پولیس سے بھی رابطہ کیا تھا لیکن معزز اور دولت مند گھرانوں کے سامنے نیچ لوگوں کی کیا حیثیت تھی۔ پولیس الٹا انہی لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے بند کردینے کی دھمکیاں دے کر بھگا دیتی۔

ایک رات ایک باعزت گھرانے کی لڑکی بلونت سنگھ اور سوبھراج کے ہاتھ لگ گئی۔ سوبھراج کے کہنے کے مطابق وہ لڑکی تیرہ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن اس کے جسم کی اٹھان بڑے غضب کی تھی۔ یہ دونوں اسے بہلا پھسلا کر شہر سے باہر ایک ویران مندر میں لے گئے اور رات بھر اسے ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ وہ لڑکی زیادتیوں کو برداشت نہ کرسکی اور اس نے دم توڑ دیا۔

رات کے پچھلے پہر وہ دونوں اس لڑکی کی لاش ویران مندر میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ سوبھراج اس قدر خوف زدہ ہوا کہ صبح ہونے سے پہلے ہی شہر سے بھی بھاگ نکلا۔ سب سے پہلے اس نے جودھ پور کے ایک مندر میں پناہ لی۔ یہاں پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کے بدلے اسے کھانے کو بھی مل جاتا اور سر چھپانے کو جگہ بھی مل گئی۔

تقریباً دو مہینوں بعد وہ مندر میں دو پولیس والوں کو دیکھ کر وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔ ہوسکتا ہے پولیس والے کسی اور کام سے مندر میں آئے ہوں۔ لیکن وہ یہی سمجھا کہ شاید وہ اس کی تلاش میں آئے ہیں اور اسے بھاگنے ہی میں عافیت نظر آئی تھی۔

وہ دو سال تک مختلف مندروں میں گھومتا رہا۔ اس کے خیال میں مندر ہی اس کے لیے سب سے محفوظ ٹھکانے تھے۔ یہاں اسے کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا اور مزے مزے کے کھانے بھی ملتے تھے۔ وہ باقاعدہ پجاری بن گیا۔ اس نے دھرم کے حوالے سے وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو ایک پجاری اور پنڈت کے لیے جاننا ضروری ہوتا ہے۔

تین سال پہلے وہ سارسکا آیا تھا۔ اس نے سارسکا کے جس مندر کو ٹھکانا بنایا تھا وہاں کا پنڈت اس کی سیوا سے بہت خوش ہوا۔ اس دوران میں اس بستی کے چھوٹے سے پنڈت کا دیہانت (انتقال) ہوگیا۔ شہر والے مندر کے پنڈت نے بستی کا یہ مندر سوبھراج کے حوالے کردیا۔ سوبھراج بہت خوش تھا۔ اس چھوٹی سی بستی میں وہ اپنے آپ کو بہت محفوظ سمجھ رہا تھا۔

وہ پچھلے چند برسوں کے دوران میں جن مندروں میں بھی گیا تھا وہ کالی کے استھان تھے۔ ان مندروں کے پجاری اور پنڈت نہایت کٹر اور انتہا پسند تھے۔ یہ صفت سوبھراج میں بھی آگئی۔ اسے دھرم میں تبدیلیاں پسند نہیں تھیں۔ اس کے خیال میں کالی کے مندروں میں انسانوں کی بھینٹ بھی ہونی چاہیے اور بیوہ ہونے والی عورت کو اپنے پتی کی لاش کے ساتھ چتا میں جل مرنا چاہیے۔ یہ سوبھراج کے پرچار (تبلیغ) کا نتیجہ تھا کہ اس روز گاؤں والوں نے ایک عورت کو اس کے پتی کی لاش کے ساتھ جلا ڈالا تھا۔ پولیس کو اس کی

اطلاع مل گئی تھی۔ لڑکی کے سسر اور بعض دوسرے لوگوں کو اگرچہ پکڑلیا گیا تھا لیکن گنگولی چوہدری والے چکر میں یہ معاملہ کھٹائی میں پڑگیا تھا۔

"پچھلے سال۔" پنڈت سوبھراج کہہ رہا تھا "سارسکا شہر میں بلونت سنگھ سے مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے اس سے اپنا پیچھا چھڑالیا اور پھر اسی رات اسے یہاں بستی میں اپنے مکان کے دروازے پر دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بلونت سنگھ نے بتایا کہ چتوڑ گڑھ میں اس کم سن لڑکی کے قتل کے سلسلے میں میرا نام سامنے آیا تھا اور پولیس کو اب بھی میری تلاش ہے۔ بلونت سنگھ بہت چالاک آدمی ہے۔ پتا نہیں اس نے اپنے آپ کو قتل کے اس معاملے سے کس طرح الگ کرلیا تھا اور سارا الزام مجھ پر آگیا تھا۔ بہرحال' اس نے مجھے تسلی دی کہ وہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا اور چار دن پہلے....."

سوبھراج ایک بار پھر خاموش ہوگیا پھر بولا "چار دن پہلے وہ اپنے گرو اور ایک چیلے کے ساتھ میرے پاس آیا تھا۔ وہ خود بھی پجاری کے بھیس میں تھا۔ اس کا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا اور اس کے گرد کا دوسرا چیلا کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ بہت سندر ناری۔"

میں ایک بار پھر چونک گیا۔ ٹھاکر بھی گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بلونت سنگھ نے بتایا کہ اس کا گرو بدیشی سادھو ہے اور بہت پہنچا ہوا ہے۔" پنڈت سوبھراج کہہ رہا تھا "اس نے بتایا کہ ان کے بعض دشمن ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو انہیں جان سے مار دینا چاہتے ہیں۔ وہ چند روز یہاں رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے۔ اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے کسی کو اس کی اصلیت بتائی تو وہ مجھے چتوڑ گڑھ میں لڑکی کے قتل کے الزام میں پکڑوا دے گا۔ وہ کل رات یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں نے کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہے تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"دیکھو پنڈت جی۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ وا... ہے لیکن ان کا گرو دنیا کا سب سے خطرناک آدمی ہے... بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے۔ بلونت... کے ہاتھ بھی کئی بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے... ایک طرف پولیس ان کی تلاش میں ہے اور دوسری... ہم۔ اگر تم ہمیں ان کے بارے میں بتا دو تو بڑی اچھی... ہوگی۔ ورنہ تم مجھے دیکھ چکے ہو۔ میں تمہاری ہڈیوں کا... بنا سکتا ہوں۔ ویسے تم نے مارشل آرٹ کہاں سے سیکھا تھا؟"

"چتوڑ گڑھ میں' کالج کی تعلیم کے دوران..." سوبھراج نے جواب دیا۔

"تم بہت اچھے مارشل آرٹسٹ ہو۔" میں نے کہا... اگر تم ان صلاحیتوں کو مثبت کاموں میں استعمال کرتے... تمہاری عزت ہوتی اور نام بھی۔ بہرحال' کہاں ہیں... لوگ؟"

"میں نہیں بتاؤں گا۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"تم پھر اڑ گئے۔" میں نے اسے گھورا "ایک اور بات... بتاؤں تمہیں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے... "بلونت سنگھ کا گرو وہ بدیشی سادھو ہندو نہیں' مسلمان ہے... تمہارے دھرم کو نشٹ کررہا ہے اور بلونت سنگھ کو بھی اس... سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے ساتھ وہ خوب صورت لڑکی... کی رکھیل ہے۔ کیا تم اپنے دھرم کی یہ توہین برداشت کرتے... ہو؟"

میرا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ اس کا چہرہ ایک دم... ہوگیا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا سکتا... کہ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے شکست خوردہ سے لہجے میں بولا "میں بتا دوں گا کہ وہ لوگ کہاں... ہیں۔"

"بتاؤ۔ جلدی کرو۔" میں نے کہا اور اسی وقت میرے ہاتھ پر پانی کا چھینٹا پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان... گہرے بادل تھے اور ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔

"چلو۔ گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" ٹھاکر نے... اور میرا خنجر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے جھک کر جینز کا پائنچہ اٹھایا اور خنجر کو پنڈلی... بندھے ہوئے چمڑے کے ہولسٹر میں ڈال دیا۔ پنڈت سوبھراج... کی پیشانی سے اگرچہ خون رسنا بند ہوگیا تھا مگر پیشانی پر... ہو رہی تھی۔ اس کے بدن پر بھی کانٹوں سے کئی خراشیں...

تھیں۔ اس نے پہلے زمین پر پڑا ہوا اپنا تھیلا اٹھا کر کندھے پر ٹکایا اور پھر جھاڑیوں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر بدن پر ڈال لی۔

بارش کی بوندیں اب تیزی سے گر رہی تھیں۔ ہم دوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور دروازے بند کرکے شیشے چڑھا دیے۔ ٹھاکر نے انجن اسٹارٹ کرکے اے سی چلا دیا اور گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔ گاڑی کا رخ شہر کی طرف تھا۔

"کہاں جارہے ہو تم لوگ؟" پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پنڈت نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔

"شہر۔" ٹھاکر نے جواب دیا "بارش میں یہاں ویرانے میں کھڑے رہنا مناسب نہیں ہے لیکن اطمینان رکھو۔ ہم تمہیں واپس بستی میں چھوڑ دیں گے۔"

گاڑی مناسب رفتار سے چلتی رہی۔ اس کے ساتھ ہم نے پنڈت سوبھراج سے سوال جواب کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ اس کے کہنے کے مطابق سارسکا سے تقریباً بیس بائیس میل آگے سلرتھ نام کا ایک قصبہ ہے اور اس سے مزید پندرہ میل آگے الور نامی قصبہ ہے۔ یہ دونوں قصبے تاریخی عمارات کی وجہ سے خاصی اہمیت اور شہرت رکھتے ہیں۔ سلرتھ اور الور کا درمیانی علاقہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ ان دونوں شہروں کے بیچ میں ایک راستہ دائیں طرف کو نکلتا ہے۔ اس راستے پر تین میل آگے جاکر ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے اور اس سے آگے ریگستان ہے لیکن ایک میل مزید آگے جانے کے بعد سرخ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ان پہاڑیوں میں بے شمار چھوٹے چھوٹے غار ہیں لیکن پہاڑی سلسلے کے وسط میں ایک بہت بڑا غار ایسا بھی ہے جہاں کالی کا مندر بنا ہوا ہے۔ سال بھر یہ راستہ' مندر اور غار ویران رہتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی یاتری اس طرف چلا جاتا ہے لیکن سال میں ایک مرتبہ وہ مندر اور اس کے آس پاس کے غار آباد ہوجاتے ہیں۔ ان دنوں یہاں میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ ان دنوں کالی کے ماننے والے یاتری ہندوستان کے کونے کونے سے بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی یہاں آتے ہیں۔ یہ میلہ سات دن جاری رہتا ہے اور ان سات دنوں میں تین غار والے مندر میں کالی کے چرنوں پر تین انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ انسانی جانوں کی بھینٹ پر پابندی ہے اور رسم ختم کی جاچکی ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"پابندی تو ستی کی رسم پر بھی ہے لیکن چند روز پہلے ہم نے اپنے گاؤں میں وہ رسم ادا کی۔" پنڈت سوبھراج نے اس لہجے میں جواب دیا جیسے ایک زندہ عورت کو چتا میں جلا کر انہوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو "الور کی پہاڑیوں میں ہر سال میلہ لگتا ہے اور کالی کے چرنوں پر تین انسانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور اس میں کبھی ناغہ نہیں ہوا۔"

"کیا تم بھی کبھی وہاں گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک مرتبہ گیا تھا۔" پنڈت نے اثبات میں سر ہلایا "پھر مجھے مندر میں کالی کی مورتی کے قریب جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ بہت رش ہوتا ہے وہاں۔"

"کیا سرکار کو معلوم نہیں کہ.....؟"

"سرکار سب جانتی ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی "لیکن وہاں کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی۔ ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ گاؤں دیہاتوں کے عام میلوں ٹھیلوں میں پولیس بھی ہوتی ہے تاکہ کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو لیکن پہاڑیوں میں کالی کے اس میلے میں کوئی پولیس والا نہیں ہوتا۔ پولیس ادھر کا رخ ہی نہیں کرتی۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ بلونت سنگھ اپنے گرو یعنی بدیشی سادھو کے ساتھ وہیں گیا ہے؟" میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ لوگ وہیں گئے ہیں۔" پنڈت نے جواب دیا "میلہ اگرچہ پندرہ دن بعد شروع ہونے والا ہے۔ اس سے ایک ہفتہ پہلے لوگ اس طرف جانا شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر کوئی اس سے بھی پہلے وہاں جانا چاہے تو کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

بارش تیز ہوگئی تھی۔ کچا راستہ پہلے ہی خراب تھا۔ بارش کی وجہ سے اور گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اندیشہ اس بات کا تھا کہ پہیے دلدل میں نہ دھنس جائیں۔ ٹھاکر بہت محتاط انداز میں ڈرائیو کررہا تھا اور بالآخر ہم کچے کے علاقے سے نکل کر سارسکا شہر کے نواح میں پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ٹھاکر نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور شہر کی مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہم اپنے ہٹ کی طرف نکل آئے۔

بملا' روپ متی اور جانکی برآمدے میں بیٹھی بارش سے لطف اندوز ہورہی تھیں۔ ہمارے ساتھ ایک پنڈت کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر وہ تینوں چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔

وہ تینوں ہمارے ساتھ ہی اندر آگئی تھیں۔ پنڈت سوبھراج پلکیں جھپک جھپک کر ان تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر نے اسے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور روپ متی کو

چائے بنانے کو کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"تم لوگ مجھے یہاں لے آئے ہو؟" پنڈت سوبھراج نے میری طرف دیکھا۔

"راجا اندر کے اکھاڑے میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "یہ دیکھو۔ کتنی حسین دیویاں ہیں یہاں۔ آرام سے بیٹھے آنکھیں سینکتے رہو۔ ابھی تھوڑی دیر میں چائے بن جائے گی تو کلیجے کی سکائی بھی ہو جائے گی۔"

پنڈت کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

"یہ کون ہے؟" جانکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پنڈت سوبھراج۔ بہت پہنچے ہوئے مہا پرش (عظیم انسان) ہیں" میں نے جواب دیا "یہ اوم کا لبادہ اوڑھنے سے پہلے بڑے رنگیلے آدمی ہوا کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ ہر رات کسی نہ کسی لڑکی کو لے اڑتے تھے۔ آخری لڑکی ان کی زیادتیوں کو برداشت نہ کرتے ہوئے جاں سے گزر گئی اور یہ چتوڑ گڑھ سے ایسے بھاگے کہ آج تک پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ان مہاشے کے لیے آخری لڑکی تھی۔ چتوڑ گڑھ سے بھاگنے کے بعد انہوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہاں لڑکیوں کی تو کمی نہیں۔ انہوں نے داسیوں سے خوب خوب سیوا کروائی ہوگی۔ ان مہاشے (صاحب) کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ کہ یہ دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" جانکی اچھل پڑی۔ کچن میں کھڑی ہوئی روپ متی نے بھی یہ بات سن لی تھی اور وہ بھی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔" میں نے کہا "یہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ دارا اور بلونت سنگھ سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے اور ان کا ایک اور کارنامہ یہ بھی ہے کہ چند روز پہلے دھول پور میں اس عورت کو ستی کرنے میں انہوں نے سب سے اہم رول ادا کیا تھا۔"

"کیا۔۔۔؟" جانکی ایک بار پھر اچھل پڑی۔

"ہاں۔ یہ لکیر کے فقیر ہیں۔ انہیں دھرم میں تبدیلیاں پسند نہیں۔" میں نے کہا "انہی کے پرچار سے متاثر ہو کر دھول پور کے سیدھے سادے اور معصوم دیہاتی اس عورت کو چتا میں زندہ جلانے پر تیار ہو گئے تھے۔"

بملا اور جانکی متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہیں میری باتوں پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ ہندوستان میں ایسے کٹر، جنونی اور انتہا پسند ہندوؤں کی کمی نہیں تھی۔

پنڈت اور پجاری دھرم کو اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے جس طرح استعمال کرتے تھے اس سے سب ہی لوگ واقف تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے پنڈت سوبھراج کی خاموشی میری باتوں کی تصدیق کر رہی تھی۔

روپ متی نے چائے کے کپ میز پر رکھ دیے۔

"چائے پیو پنڈت جی۔" میں نے ایک کپ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے پرچ پکڑی تو اس میں رکھا ہوا کپ تھر تھرانے لگا۔ پنڈت سوبھراج کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"گھبراؤ نہیں پنڈت جی۔ یہاں ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ بملا، پنڈت جی کو پانی پلاؤ۔" میں نے کہا۔

بملا دوڑ کر پانی لے آئی۔ گلاس بھی پنڈت جی کے ہاتھوں میں تھر تھرا رہا تھا۔ پانی پینے کے بعد اس نے کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پالیا۔ وہ یقیناً پچھتا رہا ہوگا کہ اپنے ماضی کے بارے میں ہمیں کیوں بتایا لیکن اس وقت اس سوال میں کر رہا تھا اور میں نے اس کے ماضی کی ایک ایک بات اس کے حلق سے اگلوائی تھی۔

چائے پینے کے دوران میں ہی ٹھاکر بھی آگیا۔ بملا وغیرہ بھی ہمارے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ بھی پنڈت سے باتیں کرنے لگیں۔ پنڈت سوبھراج کو کچھ حوصلہ ملا اور اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔

"میرے ماتھے پر کچھ لگا دو مہاراج۔ بہت کشٹ (تکلیف) ہو رہا ہے۔" اس نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر رک جاؤ۔ تمہارے سارے کشٹ دور ہو جائیں گے۔" ٹھاکر نے کہا۔

ٹھاکر کی بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے پنڈت کی طرف دیکھا لیکن اس نے شاید اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی اور صرف ایک منٹ بعد انسپکٹر پانڈے دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ انہیں دیکھ کر پنڈت سوبھراج چیخ اٹھا۔ اس نے صوفے سے اٹھ کر پچھلی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کی مگر ٹھاکر نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور وہ صوفے سمیت پیچھے الٹ گیا اور پھر پولیس والوں نے اسے ہلنے کا موقع نہیں دیا۔

"بڑا انیائے (ظلم) کیا آپ نے مہاراج۔" پنڈت سوبھراج ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور تم نے زندگی میں اب تک جو کچھ کیا ہے وہ نیائے (انصاف) تھا۔" ٹھاکر نے جواب دیا اور انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "اسے لے جائیے انسپکٹر پانڈے۔ اس سے آپ اور بھی بہت کچھ پوچھ سکتے ہیں اور یہ آپ کو بہت کچھ بتائے گا۔"

انسپکٹر نے شکریہ ادا کیا اور وہ لوگ پنڈت سوبھراج کو لے کر چلے گئے۔ میں الجھی ہوئی نظروں سے ٹھاکر کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔" وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا "باہر جا کر میں نے گیسٹ ہاؤس کے ٹیلی فون سے انسپکٹر پانڈے کو اطلاع دے دی۔"

"اوہ۔۔۔!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "میں بھی حیران تھا کہ پولیس اچانک یہاں کیسے پہنچ گئی۔"

ہم دیر تک پنڈت سوبھراج کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

"کیا تمہارے خیال میں پنڈت نے دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں غلط بیانی سے کام نہیں لیا ہوگا۔ اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس نے ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ جس صورتِ حال سے دوچار تھا اس کے تحت وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور پھر دارا اور بلونت کو کسی ایسی ہی جگہ پر پناہ مل سکتی ہے جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور واقعی ہم نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان پہاڑیوں میں کالی کا کوئی مندر ہے جہاں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔"

"انسانی جانوں کی بھینٹ!" روپ متی اچھل پڑی۔

"ہاں۔ پنڈت سوبھراج نے بتایا تھا کہ الور کے قریب پہاڑیوں میں کالی کا کوئی مندر ہے جہاں ہر سال میلہ لگتا ہے اور ایک ہفتے کے دوران میں کم از کم تین انسانوں کو کالی کے چرنوں پر قربان کیا جاتا ہے اور پنڈت کے کہنے کے مطابق دارا اور بلونت سنگھ اسی طرف گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے۔"

"تو پھر ہمیں کل صبح ہی ان کے تعاقب میں روانہ ہو جانا چاہیے۔" جانکی بولی۔

"ابھی نہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا "ابھی وہ جگہ ویران ہے۔ انہیں ہماری آمد کا پتا چل جائے گا۔ دو چار دن بعد جب یاتریوں کی آمد شروع ہوگی تو ہم بھی پہنچ جائیں گے۔"

بارش رک گئی تھی۔ ہم ہٹ سے نکل کر لان میں آگئے۔ دھلے اور نکھرے ہوئے پودے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ بارش سے موسم بھی خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔

شام سات بجے کے قریب ٹھاکر اور روپ متی کھانا لینے کے لیے شہر کی طرف چلے گئے۔ اگرچہ کچن میں پورا راشن اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اور تین عورتیں بھی تھیں لیکن یہ تینوں صرف چائے اور کافی بنانے کی حد تک ہی رہی تھیں۔ ہٹ کا ملازم ابھی تک اسپتال میں پڑا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو ہمیں کھانے کی بھی پریشانی نہ ہوتی۔

جانکی، بملا اور میں لان ہی میں بیٹھے رہے۔ ساڑھے آٹھ بج گئے۔

روپ متی اور ٹھاکر ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ شنکر اور بھگت وغیرہ کو دیکھنے اسپتال چلے گئے ہوں گے۔

نو بجے کے قریب پولیس کی ایک جیپ ہٹ کے سامنے آکر رکی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ جیپ میں صرف ڈرائیور تھا۔ وہ اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہماری طرف آگیا۔

"ٹھاکر جی کی موٹر کا۔۔۔ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ انسپکٹر پانڈے نے آپ کو اسپتال بلایا ہے۔" ڈرائیور نے قریب پہنچ کر کہا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جانکی اور بملا بھی اچھل پڑی تھیں۔ ان دونوں کے چہرے ایک دم دھواں ہو گئے تھے۔

"اوہ!" میں بولا "کیسے ہیں وہ دونوں؟"

"آپ اسپتال چل کر دیکھ لیجیے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے۔ اگر کوئی معمولی حادثہ ہوتا تو پولیس کے ڈرائیور کو بھیج کر ہمیں نہ بلوایا جاتا۔ اس کا مطلب تھا کہ حادثے کی نوعیت کچھ زیادہ ہی سنگین تھی۔

جانکی نے ہٹ کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور ہم دوڑ کر جیپ پر سوار ہو گئے۔ ڈرائیور ہم سے پہلے ہی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔

اسپتال کے راستے میں سڑک کا ایک موڑ گھومتے ہوئے مجھے ٹھاکر کی پجارو نظر آگئی۔ وہ بالکل پچکی ہوئی تھی۔ اس سے مجھے حادثے کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔

اسپتال میں ٹھاکر ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سر اور

بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ ہوش میں ہی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ گیا۔ قریب کھڑی ہوئی نرس نے اسے دوبارہ لٹانے کی کوشش کی مگر ٹھاکر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ٹھاکر کو دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ اس کی حالت زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔

"یہ سب کیسے ہوا ٹھاکر۔ روپ متی کہاں ہے۔ کیسی ہے وہ؟" میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کا بہت خون ضائع ہو چکا ہے۔ اگر اسے خون نہ ملا تو وہ مر جائے گی۔" ٹھاکر نے کہا۔

میں آپریشن تھیٹر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر تھیٹر کے سامنے والی راہداری میں مل گیا۔ اس نے بتایا کہ روپ متی کو خون کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کوئی بڑا اسپتال نہیں ہے۔ یہاں بلڈ بینک نہیں ہے اور نہ ہی شہر میں کوئی بلڈ بینک ہے جہاں سے خون حاصل کیا جا سکے۔

"میرا خون لے لو ڈاکٹر۔" میں نے بازو آگے کر دیا "میرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لو اور روپ متی کی زندگی بچا لو۔"

"پہلے گروپ ٹیسٹ کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر بولا "میرے ساتھ آئیے۔"

بملا، جانکی اور ٹھاکر بھی وہاں پہنچ گئے اور ہمارے ساتھ وہ بھی لیبارٹری میں آ گئے۔ پہلے جانکی اور بملا نے اپنا بلڈ گروپ ٹیسٹ کروایا۔ ان کے گروپ مختلف تھے اور خوش قسمتی سے میرا بلڈ گروپ روپ متی کے خون سے مل گیا۔

مجھے بیڈ پر لٹا دیا گیا اور تمام انتظامات مکمل ہونے کے بعد نیڈل میری نس میں لگائی گئی تو اچانک ہی میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ میں نے بازو میں لگی ہوئی سوئی کھینچ دی اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں۔ میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دوں گا۔"

"کیا۔۔۔؟" ٹھاکر میری طرف دیکھ کر چیخا۔ اسے شاید میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔

"میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا ٹھاکر۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے کوئی اور بندوبست کرو۔" میں نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ٹھاکر بولا "تم روپ متی کو خون دینے سے انکار کر رہے ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس کی زندگی بچا سکتے ہو۔"

"نہیں ٹھاکر۔ میں اپنا خون نہیں دے سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم ایسے موقع پر روپ متی کی مدد کرنے سے انکار کر دو گے۔" ٹھاکر نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وہ روپ متی ہے۔ اس نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کیا کیا مصیبتیں نہیں جھیلیں اس نے تمہارے لیے اور اب جبکہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے تو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔ میں تمہیں ایسا احسان فراموش نہیں سمجھتا تھا۔" ٹھاکر جذبات میں آ رہا تھا "اگر روپ متی کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ روپ متی کو بچا لو وجدان۔ تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ۔ بچا لو اسے۔" وہ میرے دونوں بازو پکڑ کر جھنجوڑنے لگا۔

"میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا ٹھاکر۔" میں نے جواب دیا اور یہ بات کہتے ہوئے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے رکھا ہو "بملا۔ بتاؤ۔ ٹھاکر کو بتاؤ کہ میں روپ متی کو اپنا خون کیوں نہیں دے سکتا۔"

بملا بھی چونک گئی اور پھر شاید بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ ٹھاکر کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ایک طرف لے گئی۔

چند منٹ بعد ٹھاکر واپس مڑا تو میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی ہچکی ضبط کر سکا تھا۔

"میں احسان فراموش اور نمک حرام نہیں ہوں ٹھاکر۔" میں نے بھی اسے اپنی بانہوں میں لپیٹ لیا "تم لوگوں کے احسانات تو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ تم لوگوں کے لیے تو میں اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں لیکن میں روپ متی کو اپنا خون نہیں دے سکتا۔ میرے خون کا پہلا قطرہ اس کے خون میں شامل ہوتے ہی وہ ختم ہو جائے گی۔ میں کتنا بدقسمت ہوں کہ زندگی کے ان نازک ترین لمحات میں اپنی محسنہ کے کام نہیں آ سکتا۔"

"میں سمجھ گیا ہوں۔" ٹھاکر نے میری پیشانی پہ بوسہ دیتے ہوئے کہا "بملا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا اور کچھ سخت شبد (الفاظ) کہہ دیے تھے مجھے معاف کر دینا میرے دوست۔"

"معافی تلافی بعد میں ہوتی رہے گی۔" میں نے اپنے آپ کو اس سے الگ کرتے ہوئے کہا "پہلے ہمیں روپ متی کی زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کیا کریں۔" ٹھاکر بولا "یہاں کوئی

بلڈ بینک نہیں ہے۔ جے پور کے کسی بلڈ بینک سے خون منگوایا جائے تو اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے اور اس وقت تک روپ متی۔۔۔"

"نہیں۔ ہم روپ متی کو مرنے نہیں دیں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ اتنا بڑا شہر ہے، ہزاروں لوگ آباد ہیں یہاں۔ کسی ایک آدمی کے خون کا گروپ تو مل جائے گا۔ تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں تقریباً دوڑتا ہوا اسپتال کے برآمدے میں آ گیا۔ برآمدے کے سامنے وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا جس میں چند سایہ دار درخت بھی تھے جن کے نیچے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے کنکریٹ کی بینچیں رکھی ہوئی تھی۔ ان بینچوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں اور اس کے آس پاس بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ چھ سات آدمی ایک جگہ پر جھنڈ کی صورت میں کھڑے تھے اور اس جھنڈ میں انسپکٹر پانڈے بھی نظر آ گیا۔ وہ اس حادثے کے دو چشم دید گواہوں کے بیان نوٹ کر رہا تھا۔

"بھائیو! ذرا میری بات غور سے سنو۔" میں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت استعمال کرتے ہوئے کہا۔ لوگ فوراً ہی میری طرف متوجہ ہو گئے۔ انسپکٹر پانڈے بھی مڑ کر میری طرف دیکھنے لگا "ایک انسان موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ حادثے میں زخمی ہونے والی دیوی کو خون کی ضرورت ہے۔ آپ میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کا بلڈ گروپ اس سے مل جائے گا۔ ہم خون کی ایک بوتل کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔ قیمتاً نہیں تو انسانی ہمدردی کے ناتے۔ خون کی صرف ایک بوتل، ایک سچے اور کھرے انسان کی زندگی بچا سکتی ہے۔"

انسپکٹر پانڈے میرے قریب آ گیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"یہ وہ عظیم انسان ہے جس نے اس شہر کو اور دور دراز کے قصبوں اور دیہاتوں میں رہنے والے لوگوں کو گنگولی چوہدری جیسے عفریت سے نجات دلائی ہے۔ یہی ہے وہ مہان (عظیم) آدمی جو گنگولی جیسے راکھشس کا مقابلہ کرنے کے لیے اکیلا جنگل میں گھس گیا تھا۔ اس نے گنگولی چوہدری اور اس کے گروہ کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ میں اس کا چشم دید گواہ ہوں اور آج۔۔۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور آج اپنی دوست کی جان بچانے کے لیے اسے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اس مہان آدمی پر ثابت کر دو کہ ہم بھی احسان فراموش نہیں ہیں۔ میں اپنے آپ کو پہلے ہی پیش کر چکا ہوں لیکن بدقسمتی سے میرا بلڈ گروپ اس دیوی کے خون سے نہیں ملتا۔ تم لوگوں میں کون ہے جو اس دیوی کی جان بچانے کے لیے اپنا خون دان (تحفہ) کرے۔"

تقریباً ایک درجن آدمی ہمارے سامنے آ گئے تھے۔ وہ کسی قیمت کے بغیر خون دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے صرف سنا تھا کہ ہمت سنگھ نامی کسی سورما نے گنگولی چوہدری کو ٹھکانے لگایا تھا اور اب وہ سورما ان کے سامنے کھڑا تھا۔ لوگ آگے بڑھ بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ میرے ہاتھوں اور میری پیشانی پر بوسے دے رہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اسپتال کے کمپاؤنڈ میں موجود ہر شخص روپ متی کی زندگی بچانے کے لیے خون دینے کو تیار تھا۔

"یہ تو چمتکار ہو گیا ہمت سنگھ۔" ٹھاکر مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گیا "میں نے بہت سے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے مگر کوئی خون کا ایک قطرہ بھی دینے کو تیار نہیں تھا۔"

"یہ انسپکٹر پانڈے کا چمتکار ہے۔" میں نے جواب دیا "اگر وہ میرے نام کے ساتھ گنگولی چوہدری کا حوالہ نہ دیتا تو شاید کوئی بھی آگے نہ آتا۔ اب تم اپنے بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرو اور میں اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ روپ متی بچ جائے۔"

"میں بھی خدا ہی سے دعا مانگتا ہوں اور مجھے یقین ہے خدا ہمیں مایوس نہیں کرے گا۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

ایک گھنٹے بعد روپ متی کو خون کی پہلی بوتل لگ چکی تھی۔ چھ آدمیوں کا بلڈ گروپ مل گیا تھا۔ جن میں سے چار کو روک لیا گیا اور باقی سب کو رخصت کر دیا گیا۔ جن دوسرے دو آدمیوں کو رخصت کیا گیا تھا انہوں نے اپنے گھروں کے پتے دے دیے تاکہ ضرورت پڑنے پر انہیں کسی بھی وقت بلایا جا سکے۔

ہمیں آپریشن تھیٹر میں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ایک ڈاکٹر کو شاید ٹھاکر کا خیال آ گیا اور وہ اسے پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا اور نرس کو سختی سے ہدایت کی کہ اسے کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ نرس نے ٹھاکر کو بیڈ پر لٹا دیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بھئی۔ میری چنتا (فکر) مت کرو۔" ٹھاکر نے کہا۔

"آپ نے بہت ہنگامہ کر لیا ٹھاکر جی۔ اب آپ کو آرام

کی ضرورت ہے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے کہا "دیوی جی کی چنتا آپ بالکل نہ کریں۔ بلڈ کا بندوبست ہوگیا ہے۔ آدھا خطرہ ٹل گیا ہے۔ وہ ٹھیک ہوجائیں گی اور آپ لوگ۔۔۔" اس نے باری باری ہماری طرف دیکھا "آپ لوگ انہیں بیڈ سے نہ اترنے دیں۔"

نرس باہر نکلی تو جانکی مجھے بھی ہاتھ سے پکڑ کر باہر لے آئی۔

"تم نے روپ متی کو اپنا خون دینے سے انکار کیوں کیا تھا؟" وہ راہداری میں ایک جگہ رک کر بولی "تم تو خون دینے کے لیے لیٹ گئے تھے پھر اچانک کیوں بھاگ کھڑے ہوئے؟"

"بات یہ ہے جانکی۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں یاد ہے شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں جب ہم صبح سویرے ماسٹر ہنگ پائی کے ساتھ پہاڑی پر یوگا کی مشق کیا کرتے تھے اور ایک روز ماسٹر ہنگ پائی نے اپنے آپ کو سانپ سے ڈسوایا تھا اور۔۔۔"

"اور وہ سانپ مرگیا تھا۔" جانکی نے میرا جملہ مکمل کردیا۔

"ہاں۔" میں نے کہا "بعض خاص جڑی بوٹیوں کے استعمال سے ماسٹر ہنگ پائی کے خون میں اتنا زہر بھر گیا تھا کہ نہایت زہریلا سانپ بھی اسے ڈستے ہی مرگیا تھا۔"

"مگر تم۔۔۔ کیا تم بھی۔۔۔" جانکی کی آنکھیں وحشت سے پھیلتی چلی گئیں۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سرہلایا "تمہیں یاد ہوگا کہ کچھ عرصے تک کھانے میں صبح کوئی ایسی چیز بھی دی جاتی تھی جس کے لیے تمہیں منع کردیا جاتا تھا۔ اس خوراک میں مجھے وہ جڑی بوٹیاں استعمال کرائی گئی تھیں جن سے میرے خون میں زہر شامل ہوگیا۔"

"تم نے مجھ سے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور غالباً بملا کو بتا رکھا تھا اور اس نے ٹھاکر کو الگ لے جاکر بتایا ہوگا۔" وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ "ہمیں شاؤلن ٹیمپل سے آئے ہوئے عرصہ ہوچکا ہے لیکن مجھ سے اس سلسلے میں کبھی بات نہیں کی اور بملا سے چار دن کی دوستی میں تم نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ آخر اس چھوکری میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ تم نے اس کے لیے اپنی زندگی بھی داؤ پر لگادی تھی۔"

"تم پھر پٹری سے اتر رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھ پر بھی یہ انکشاف صرف تین دن پہلے ہوا تھا جب انسپکٹر پانڈے اور بملا کی موجودگی میں جنگل میں ایک بلیک کوبرا نے مجھے ڈس لیا تھا اور وہ بے چارہ خود ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔"

"اوہ۔۔۔!" جانکی چونک سی گئی۔

"اگر میں خود اپنی زبان سے کہتا کہ میرے خون میں زہر ملا ہوا ہے تو ٹھاکر میری بات پر یقین نہ کرتا اس لیے میں نے بملا سے کہا تھا کہ وہ ٹھاکر کو بتادے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بڑی سنگین صورتِ حال ہے۔" جانکی بولی "اگر کبھی مجھے تمہارے خون کی ضرورت پڑ گئی تو۔۔۔"

"تمہیں ایسی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "چلو۔ اب اندر چلیں۔ میں نے ٹھاکر سے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔"

ہم کمرے میں آگئے۔ کمرے میں ایک اسٹول اور دو کرسیاں تھیں۔ ایک کرسی پر بملا بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ کرسی سے اٹھ کر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

"ہاں میرے دوست۔ اب بتاؤ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" میں نے ٹھاکر کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا "اس طرف آتے ہوئے میں نے تمہاری گاڑی دیکھی تھی۔ اس کا اگلا حصہ تو بالکل پچکا ہوا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اس قدر خوفناک حادثے کے بعد۔۔۔"

"ہم زندہ کیسے بچ گئے۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے میری بات پوری کردی اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "بارش کی وجہ سے سڑکیں بھیگی ہوئی تھیں مگر میری گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ ایک موڑ پر میں نے جیسے ہی گاڑی گھمائی، مخالف سمت سے ایک تیز رفتار ٹرک کو آتے دیکھ کر میں نے پورے زور سے بریک لگا دیے۔ میری طرف کا دروازہ شاید لاک نہیں تھا۔ جھٹکا لگنے سے دروازہ کھل گیا اور میں نیچے گر کر سڑک پر لڑھکتا چلا گیا۔ پیچھے سے آنے والی ایک کار مجھ سے ٹکرا کر رک گئی اور وہ ٹرک زوردار ٹکر سے پجارو کو گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا اور پھر اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ سر پر لگنے والی چوٹ نے مجھے بے ہوش کردیا تھا۔ یہاں اسپتال میں ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میرے ساتھ پجارو میں سوار عورت کی حالت بہت نازک ہے۔ خون بہت زیادہ ضائع ہوجانے سے اس کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے۔

"اس دوران میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ انسپکٹر پانڈے مجھے دیکھ کر بدحواس سا ہوگیا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو تمہیں اطلاع دینے کے لیے دوڑا دیا۔ مجھے روپ متی کی فکر تھی۔ اس کے لیے خون کا بندوبست نہیں ہو رہا تھا۔ انسپکٹر پانڈے خون دینے کو تیار تھا مگر اس کا بلڈ گروپ نہیں ملتا۔۔۔

تین اور آدمی بھی تیار ہوگئے تھے مگر ہر ایک کا بلڈ گروپ مختلف تھا۔ میں اسپتال میں موجود دوسرے لوگوں کی منتیں کرتا رہا مگر کوئی بھی تیار نہیں ہوا اور پھر تم لوگ آگئے۔ تمہارا بلڈ گروپ مل گیا تھا مگر جب تمہیں بیڈ پر لٹایا گیا تو عین وقت پر تم نے انکار کردیا اور۔۔۔"

"مجھے افسوس ہے ٹھاکر۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں اپنی روپ متی کے کسی کام نہ آسکا۔ اس کے لیے جان لٹا دینے کا دعویٰ کرنے والا اس کی زندگی بچانے کے لیے خون کا ایک قطرہ نہیں دے سکا۔"

"ایسا نہ کہو وجدان۔" ٹھاکر نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا "صرف اور صرف تمہاری وجہ سے روپ متی کی زندگی بچنے کی اُمید پیدا ہوئی ہے۔ تم واقعی مہان ہو وجدان۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے غصے میں تمہیں جو کچھ کہا اس پر مجھے ہمیشہ شرمندگی رہے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا "غصے اور جذبات میں آکر تم نے ایک اور دلچسپ انکشاف کیا تھا جس پر میں بے حد خوش ہوں۔"

"کیا انکشاف؟" وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"روپ متی کے بارے میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم اس کے لیے جس طرح پاگل ہو رہے تھے اس سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم روپ متی کو کتنا چاہتے ہو۔"

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے ببلا اور جانکی کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ اس کے جذبات آنسو بن کر اُمڈ پڑے۔

"گھبراؤ نہیں میرے دوست۔" میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگا "روپ متی ٹھیک ہوجائے گی۔ تم نے نرس کی بات نہیں سنی تھی۔ خون کا بندوبست ہوجانے سے آدھا خطرہ ٹل گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد ٹھیک ہوجائے گی۔"

جانکی اور ببلا بھی اسے تسلیاں دینے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد میں کمرے سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی طرف آگیا۔ اس وقت اگرچہ رات کے گیارہ بج چکے تھے لیکن آپریشن تھیٹر کے سامنے والی راہداری اور برآمدے میں اب بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔

روپ متی کو خون کی دوسری بوتل لگائی جاچکی تھی۔ اس طرح خون دینے والے دو آدمی رخصت ہوگئے تھے۔ اس اسپتال میں چند گھنٹوں کے لیے بھی خون محفوظ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اس لیے باقی دو آدمی اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر آپریشن تھیٹر سے باہر آیا تو اسے روک کر روپ متی کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

"وہ ابھی بے ہوش ہے اور اگلے چوبیس گھنٹے اس کے لیے بہت اہم ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"خطرے کی کوئی بات۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن بہرحال ہمیں اچھی اُمید رکھنی چاہیے۔" ڈاکٹر میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

میں اس کمرے میں آگیا جہاں بھگت وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ انہیں بھی اس حادثے کا پتا چل گیا تھا اور وہ بھی جاگ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر افسردگی تھی۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا اور پھر ٹھاکر والے کمرے میں آگیا۔

"کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہماری فیملی کے افراد نے اس اسپتال کے پانچ بستروں پر قبضہ کر رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

ٹھاکر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ انسپکٹر پانڈے آگیا۔ وہ ٹھاکر کا بیان لینا چاہتا تھا اور ٹھاکر اس قابل تھا کہ اپنا بیان دے سکتا تھا۔

انسپکٹر پانڈے نے یہ بھی بتایا کہ اس حادثے کے بعد ٹرک وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔ سارسکا کے دونوں طرف شاہراہ پر واقع شہروں کی پولیس کو فون پر اطلاع دی جاچکی ہے۔ وہ ٹرک بچ کر نہیں جاسکے گا۔ اسے کہیں نہ کہیں پکڑ لیا جائے گا۔

انسپکٹر پانڈے کافی دیر ہمارے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں وہ بار بار میری طرف دیکھتا رہا اور میری ہمت اور جرأت کی داد دیتا رہا۔ اس نے ٹھاکر کو، جنگل میں مجھے سانپ کے ڈسنے کا واقعہ بھی سنایا۔

"میں تو حیران رہ گیا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا "کوبرا جیسا زہریلا سانپ ان شریمان جی کو ڈسنے کے بعد خود ہی مر گیا تھا۔"

"ہاں۔" ٹھاکر بولا "بعض لوگوں کا خون قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ زہریلے کیڑے مکوڑے اور سانپ کا زہر ان پر اثر نہیں کرتا اور یہ اپنا خون کسی کو دے بھی نہیں سکتے۔"

"ہاں۔ یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔" انسپکٹر پانڈے بولا۔

انسپکٹر پانڈے کے جانے کے بعد ٹھاکر نے اس سلسلے میں مجھ پر سوالات کی بوچھار کردی اور مجھے مجبوراً اسے سب کچھ بتانا پڑا کہ میرا خون اس قدر زہریلا کیوں ہوا تھا۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ میں ہر تھوڑی دیر بعد آپریشن تھیٹر کی طرف کا ایک چکر لگا آتا۔ ڈاکٹر روپ متی کو آبزرویشن میں رکھے ہوئے تھے لیکن فی الحال وہ کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے تھے۔

روپ متی کو خون کی تیسری بوتل لگی ہوئی تھی۔ خون بڑی تیزی سے اس کے جسم میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ چوتھا آدمی اس وقت بھی راہداری میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں بھی کچھ دیر اس کے قریب بیٹھا رہا۔ میں واقعی ان لوگوں کا احسان مند تھا۔ انہیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ میں نے گنگولی چوہدری اور اس کے گروہ کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور وہ میری خاطر روپ متی کو خون دینے کو تیار ہوگئے تھے اور چوتھا آدمی اس وقت بھی اسپتال میں بیٹھا ہوا تھا کہ نجانے کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ میں نے اس سے کھانے چائے کا دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ اسپتال کے ایک ملازم سے کھانا منگوا کر کھا چکا ہے۔ اس نے یہ پیشکش بھی کی کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ لا دے گا۔

ہم نے بھی ابھی تک کچھ نہیں کھایا تھا۔ روپ متی اور ٹھاکر بازار سے کھانا لانے کے لیے ہی نکلے تھے کہ یہ خوفناک حادثہ پیش آگیا۔ پہلے تو ہمیں کھانے پینے کا ہوش تک نہیں رہا تھا لیکن صورتِ حال اب کچھ اطمینان بخش ہوئی تھی تو بھوک کا احساس بھی ہونے لگا تھا۔

راجو نامی اس شخص نے بتایا کہ شہر میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں رات بھر رونق رہتی ہے اور ریسٹورنٹ وغیرہ کھلے ہوتے ہیں۔ میں نے اسے دو سو روپے نکال کر دے دیے کہ پہلے خود کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کچھ کھا پی لے اور پھر ہمارے لیے کچھ لے آئے۔ وہ فوراً ہی وہاں سے روانہ ہوگیا اور میں ٹھاکر والے کمرے میں آگیا۔

○☆○

روپ متی کو خون کی چار بوتلیں لگ چکی تھیں۔

دوپہر بارہ بجے کے قریب اسے ہوش آیا تو ڈاکٹر نے یہ نوید سنائی کہ اب اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ ہم فوری طور پر اسے دیکھنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نے منع کردیا کہ ہم شام سے پہلے اسے نہیں دیکھ سکتے۔

وہ پورا دن ہم نے اسپتال میں گزارا۔ رات آٹھ بجے کے قریب روپ متی کو بھی ٹھاکر والے کمرے میں منتقل کردیا گیا۔ یہ اسپتال زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پرائیویٹ رومز کم تھے اس لیے روپ متی کے لیے بھی اس کمرے میں بیڈ لگا دیا گیا تھا اور ایک کوچ اٹینڈنٹ کے لیے بھی ڈال دیا گیا تھا۔

روپ متی کی حالت خاصی ابتر تھی۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک بازو پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سینے، سر اور دوسری ٹانگ پر بھی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ میں نے راستے میں پجارو دیکھی تھی۔ ٹھاکر کی خوش قسمتی تھی کہ اپنی طرف کا دروازہ کھل جانے سے وہ اچھل کر باہر گر گیا تھا اور اسے معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ حادثہ اس قدر خوفناک تھا کہ روپ متی کا زندہ بچ جانا ہی ایک معجزہ تھا اور میرا خیال تھا کہ اسے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کم از کم تین مہینے ضرور لگیں گے۔ ٹانگ اور بازو کے پلستر کے لیے ڈاکٹر نے چھ ہفتوں کا وقت دیا تھا۔

وہ رات بھی ہم نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ روپ متی کو بولنے کی اجازت بالکل نہیں تھی۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ ہم آپس میں بھی سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو۔

ٹھاکر نے اگلے ہی روز ڈسچارج لے لیا اور اس کے ساتھ ڈاکٹر نے ہم سب کو بھی اسپتال سے بھگا دیا۔ صرف ایک اٹینڈنٹ کو رہنے کی اجازت تھی اور یہ ذمّے داری جانکی اور ببلا نے سنبھال لی تھی۔ ان میں سے ایک دن کے وقت اسپتال میں رہتی اور دوسری رات کو۔ میں اور ٹھاکر بھی دن میں ایک دو مرتبہ چکر لگا لیتے تھے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ حادثے کے تیسرے روز وہ ٹرک تو شہر سے بیس میل دور جے پور کی طرف جانے والی سڑک پر کھڑا مل گیا تھا البتہ ڈرائیور فرار ہوگیا تھا اور پولیس اس کی تلاش میں تھی۔

ٹھاکر اب ٹھیک ہوچکا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں پیروں کو آزادی سے حرکت دے سکتا تھا۔ ہمیں دارا اور بلونت سنگھ کی بھی فکر تھی جو الور کی پہاڑیوں میں کالی کے مندر کے آس پاس کہیں پناہ لیے ہوئے تھے۔ اگلا ہفتہ شروع ہوتے ہی شہر میں ٹریفک بڑھ گیا تھا۔

پہاڑیوں میں کالی کے مندر پر ہر سال لگنے والا میلہ ایک ایسا راز تھا جس سے ساری دنیا تو واقف تھی لیکن سرکار اور پولیس بے خبر تھی۔ جے پور کی طرف سے آنے والے یاتریوں کے جتھے کے جتھے الور کی پہاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ دوسری طرف بھرت پور اور دہلی وغیرہ سے بھی یاتری

اس طرف آرہے تھے لیکن پولیس بالکل "بے خبر" تھی کہ اس طرف میلہ لگنے والا ہے اور پہاڑیوں کے غار میں واقع کالی کے چرنوں میں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جانے والی ہے۔

میں بھی پریشان تھا اور ٹھاکر بھی۔ دارا اور بلونت سنگھ کو گھیرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا لیکن روپ متی کی وجہ سے معاملہ گڑبڑ ہوگیا تھا۔

روپ متی اب بات کرنے کے قابل ہوگئی تھی۔ اس روز شام کو اس نے کہہ دیا کہ ہم اس کی فکر نہ کریں۔ اسپتال میں اس کی مناسب دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ بلا اور جانکی بھی موجود ہیں لیکن جانکی ہمارے ساتھ جانے پر بضد تھی لیکن ظاہر ہے ہم بلا کو ہٹ میں اکیلے نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

اور بالآخر یہ طے ہوا کہ بلا' روپ متی کے پاس اسپتال میں رہے اور ہم تینوں اپنے مشن پر روانہ ہوجائیں۔

بھگت سنگھ بھی اب پہلے سے بہت بہتر تھا۔ دیکھ بھال کی کچھ ذمے داری اس نے قبول کرلی اور یہ بندوبست ہونے پر میں بھی کسی قدر مطمئن ہوگیا تھا۔

اگلے روز بلا اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چند چیزیں بیگ میں ڈال کر اسپتال لے آئی۔ میں' ٹھاکر اور جانکی اس روز زیادہ تر شہر کے مختلف بازاروں میں گھومتے رہے۔ اس مرتبہ ہم اندھا دھند چڑھائی نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ہم تینوں نے پوری رات بیٹھ کر پلاننگ کی تھی اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم تینوں بھی سادھوؤں کے بھیس میں جائیں گے کہ اس طرح ہم کسی شک کی زد سے بچے رہیں گے۔

وہ رات ہم نے اپنے ہٹ میں گزاری۔ اگلا دن بھی کچھ تیاریوں میں گزرا۔ دوپہر کو ہم نے اسپتال کا چکر لگایا اور ہٹ میں گئے۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ٹھاکر نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا اور سب سے پہلے میرے سر کے بال قینچی سے کاٹ دیے اور پھر دوسرے کام میں مصروف ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو اچھل پڑا۔ میرا سر ایسا تھا جیسے کسی کھیت میں تازہ تازہ ہل چلایا گیا ہو۔ قینچی سے بال کاٹتے ہوئے ٹھاکر نے نفاست کا خیال بالکل نہیں رکھا تھا۔ کسی آوارہ گرد سادھو کا حلیہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ ماتھے پر اوپر نیچے تین سفید افقی ایک انگلی چوڑی لکیریں۔ درمیان والی لکیر پر عین وسط میں سرخ ٹیکا' دونوں کانوں میں بندے۔ بندوں کے لیے کان چھدوانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ بازار میں کلپ والے بندے مل گئے تھے جنہیں کانوں کی لو سے چپکا لیا گیا تھا۔ ٹھاکر نے میرے دونوں رخساروں پر بھی سفیدے سے ایک ایک دھاری بنا دی تھی۔ اس طرح میرا حلیہ بڑی حد تک بدل گیا تھا۔ مجھے مخصوص انداز میں دھوتی بھی باندھنی آگئی تھی۔ دھوتی کا بچا ہوا حصہ کندھے پر ڈال کر اس کے دونوں کناروں کی گردن کے پیچھے گرہ لگا دی تھی جب کہ میری پشت برہنہ تھی۔ اب میں واقعی سادھو نظر آرہا تھا اور کوئی مجھے وجدان کی حیثیت سے آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا۔

کمرے سے باہر آکر میں نے دونوں کلائیوں میں دو دو آہنی کڑے بھی پہن لیے۔ ایک ہاتھ میں پیتل کا چھوٹا سا لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں تقریباً ایک انچ موٹا اور ڈیڑھ فٹ لمبا گول ڈنڈا پکڑ لیا۔ ڈنڈے کو میں نے اس طرح پکڑا کہ اس کا ایک سرا ہتھیلی کو چھوتا ہوا انگلیوں کی گرفت میں تھا اور ڈنڈے کا باقی حصہ بازو کے ساتھ کہنی تک چلا گیا تھا۔ انگلیوں کی حرکت سے ڈنڈا آہستہ آہستہ بازو میں پہنے ہوئے آہنی کڑوں پر بجنے لگا۔ اکثر سادھو اس طرح ڈنڈے سے کڑوں کو بجا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔

ٹھاکر جانکی کے بال بھی کاٹنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں مانی۔ شاؤلن ٹیمپل کی طرف جاتے ہوئے چین کے خطے میں سفر کے دوران میں بھی جانکی گنجی ہوئی تھی اور بہت عرصے بعد اس کے بال اتنے لمبے ہوئے تھے۔

جانکی کے بال بکھرا کر چڑیا کے گھونسلے کی طرح بنا دیے گئے۔ ٹھاکر نے اس کا حلیہ بھی بگاڑ دیا تھا اور جب وہ پیلی ساڑی اوٹ پٹانگ انداز میں لپیٹ کر کمرے سے نکلی تو وہ بھی کسی مندر کی داسی ہی لگتی تھی۔ ایک گھنٹا ٹھاکر نے اپنے آپ پر لگا دیا۔

چھ بجے کے قریب ہم ہٹ سے باہر آگئے۔ دروازے کو تالا لگا کر چابی ایک ایسی جگہ پر رکھ دی گئی جس کے بارے میں بلا کو بھی بتا دیا گیا تھا۔

ہم تینوں کسی کی نظر میں آئے بغیر ہٹ سے نکل کر سڑک کی طرف چلنے لگے۔ راستے میں ہمیں جو بھی ملتا' ہاتھ جوڑ کر پرنام (سلام) کرتا کہ ہم سادھو تھے اور عام لوگوں کا فرض تھا کہ ہمیں پرنام کریں۔

ہم تینوں کے کندھوں پر ایک ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ جن میں ہماری ضرورت کی چیزوں کے علاوہ بھنے ہوئے چنے اور گڑ کی ڈلیاں بھی تھیں کہ سادھو لوگ ایسی ہی چیزوں پر گزارا کرتے تھے۔

سڑک پر ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ فضا میں سرخی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے روانگی کے لیے خاص طور پر اس وقت کا انتخاب کیا تھا کہ الور کی پہاڑیوں میں پہنچیں تو اندھیرا ہوچکا ہو۔

ایک گاڑی کو آتے دیکھ کر ٹھاکر سڑک کے وسط میں کھڑا ہوگیا اور اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ وہ سرخ رنگ کا فورڈ پک اپ ٹرک تھا جو ٹھاکر سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے گود میں چھ سات سال کی عمر کے ایک بچے کو بھی سنبھال رکھا تھا۔ پک اپ کے پچھلے حصے میں دو عورتیں اور تین مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ ایک ہی فیملی کے ممبر تھے جو جے پور سے کالی کے مندر کی طرف جا رہے تھے۔

ٹھاکر چند منٹ ڈرائیور سے بات کرتا رہا پھر ہمیں اشارہ کیا اور ہم پیچھے آکر پک اپ پر سوار ہوگئے۔ جانکی عورتوں کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ میں اور ٹھاکر پیچھے کی طرف آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور پک اپ ٹرک حرکت میں آگیا۔

ٹرک کی رفتار خاصی تیز تھی۔ پہاڑی کی طرف جانے والے موڑ تک پہنچنے میں چالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن پہاڑیوں میں داخل ہوتے ہی رفتار کم ہوگئی۔ ان چھوٹی پہاڑیوں کے بعد ایک میل تک ریگ زار اور اس کے بعد پھر پہاڑیاں۔ ان پہاڑیوں میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم پہاڑیوں کے درمیان اس وسیع و عریض میدان میں پہنچ گئے جہاں جا بجا مشعلیں جل رہی تھیں۔ کئی جگہوں پر چھولداریاں اور چھوٹے خیمے نصب تھے جن کے سامنے پیٹرومیکس روشن تھے۔ آس پاس کی پہاڑیوں پر بھی جگہ جگہ مشعلوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

اس میدان میں جگہ جگہ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں جن کے قریب چھولداریاں یا خیمے نصب تھے۔ پک اپ والوں نے اپنے لیے ایک ٹھکانا تلاش کر کے پک اپ ٹرک روک لیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے رخصت ہوگئے۔

عجیب منظر تھا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے۔ ہر طرف مشعلیں جلتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ یہ سب کچھ بہت پُراسرار لگ رہا تھا جیسے ہم کسی اور دنیا میں آگئے ہوں۔

میرے ذہن میں میلے کا تصور کچھ اور تھا۔ جھولے' سرکس' کھیل تماشے مگر یہاں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ پوجا میلہ تھا۔ یہاں ایسی تفریحات کی ضرورت نہیں تھی تاہم رقص و سرود کی محفلیں ہر طرف جمی ہوئی تھیں۔

صبح سویرے پوجا شروع ہونے والی تھی۔ راجستھان کے مختلف شہروں میں کئی مذہبی تہوار اور میلے ہوتے تھے۔ ہم تینوں پک اپ ٹرک سے اتر کر ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ہم کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھے جہاں سے آسانی سے مندر کے اندر پہنچا جا سکے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ دارا اور بلونت سنگھ سے مندر کے اندر یا اس کے آس پاس ہی ملاقات ہوسکے گی۔

ہر طرف سے ڈھول تاشوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جگہ جگہ رقص و سرود کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ کئی لوگ اپنے ساتھ طوائفوں کو لے کر آئے تھے۔ بعض طوائفیں کسی کی دعوت کے بغیر آئی ہوئی تھیں اور انہوں نے اپنی محفلیں جما رکھی تھیں۔

ہم بالآخر ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں رک گئے۔ یہاں بھی ایک زوردار محفل جمی ہوئی تھی۔ بیسیوں لوگ دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دو آدمی ڈھول بجا رہے تھے۔ ایک چمٹا بجا رہا تھا۔ دو ادھیڑ عمر عورتیں کھڑتال بجا رہی تھیں۔ دو جوان اور خوبصورت لڑکیاں نیم عریاں لباس میں رقص کے نام پر اچھل کود کر رہی تھیں۔ ایک سادھو بھی جوش میں آکر میدان میں کود پڑا اور ان لڑکیوں کے ساتھ بے معنی اچھل کود کرنے لگا۔ ایک اور سادھو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر میرے ساتھ کھڑی ہوئی جانکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا وسط میں لے گیا۔ جانکی پہلے تو ہچکچائی لیکن پھر وہ بھی ان سادھوؤں کے ساتھ اچھل کود کرنے لگی۔ جانکی بہت اچھی رقاصہ تھی لیکن یہ رقص کے مظاہرے کا موقع نہیں تھا۔ بے معنی اچھل کود پر ہی داد مل رہی تھی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے کچھ لوگ ان پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے۔

اب باقاعدہ ہڑبونگ شروع ہوگئی تھی۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر جانکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتا ہوا وہاں سے دور لے گیا۔ وہاں سے تقریباً بیس گز دور جا کر ہم بڑے بڑے پتھروں کے قریب بیٹھ گئے۔ اچھل کود سے جانکی کا سانس پھول گیا تھا۔

ہم سے تقریباً سو گز آگے وہ پہاڑی تھی جہاں کالی کے مندر والا غار تھا۔ اس طرف سے بھجن گانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"اس وقت تو ان لوگوں کو تلاش کرنا ممکن نہیں۔" ٹھاکر نے کہا۔ "رات اسی جگہ گزار لو۔ صبح ہوتے ہی ہم ان کی تلاش شروع کردیں گے۔"

ہم پتھروں سے ٹیک لگائے باتیں کرتے رہے۔ کسی طرف سے بھجن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' کسی طرف

ڈھول پیٹے جارہے تھے اور کسی طرف سے گھنگروؤں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ یہ ہنگامے رات کے پچھلے پہر تک جاری رہے۔ میں کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی چونک کر متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگتا۔ ٹھاکر بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھا البتہ جانکی ہم دونوں کے درمیان زمین پر پڑی گہری نیند سورہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کرلیں۔

اور پھر شور کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا اور متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ رات کا اندھیرا رخصت ہوچکا تھا اور دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا۔ "جے کالی" اور "بجرنگ بلی" کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

جانکی اور ٹھاکر بھی جاگ گئے۔ چند لمحے بعد حواس بحال ہونے لگے اور پھر ہم اٹھ کر مندر والی پہاڑی کی طرف دوڑ پڑے۔ مندر والے غار کے سامنے ہزاروں لوگ جمع تھے۔ کوئی بھجن گا رہا تھا۔ کوئی دونوں ہاتھ ماتھے کے قریب جوڑے آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت کھڑا تھا اور کوئی والہانہ انداز میں رقص کر رہا تھا۔

ہم لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہم ابھی غار سے دور ہی تھے کہ ڈھول تاشے بجنے لگے۔ لگتا تھا جیسے ڈھول بجانے والوں پر جنون طاری ہوگیا ہو۔ غالباً سیکڑوں ڈھول تھے جو پوری قوت سے پیٹے جارہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جے کالی اور بجرنگ بلی کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔

ہم غار کے سامنے پہنچ گئے مگر اندر جانے کا موقع نہ مل سکا۔ بے پناہ رش تھا۔ ہم تینوں سمٹ کر چٹان کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے اندر جارہے تھے۔ کچھ لوگ باہر آرہے تھے۔ ایک پنڈت لوگوں کو دھکیلتا ہوا باہر نکلا تو اس کے خون آلود ہاتھ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ اس کے ماتھے پر بھی خون سے ٹیکا لگا ہوا تھا۔ مجھے اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ کسی بے گناہ کو کالی کے چرنوں میں ذبح کیا جاچکا تھا۔

ہم نے اندر داخل ہونے کی کوشش ترک کردی اور وہاں سے کچھ دور پیچھے ہٹ گئے۔ اب غار سے برآمد ہونے والے ہر شخص کے ماتھے پر خون کا سرخ ٹیکا نظر آرہا تھا۔

ہم ایک چٹان کے سائے میں بیٹھ گئے اور لوگوں کو آتے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ عجیب کیفیت تھی۔ لوگوں پر جنون سا طاری تھا۔ عجیب ظالمانہ رسم تھی۔ ایک انسان کو پتھر کی مورتی کے سامنے ذبح کرکے رقص کیا جارہا تھا۔ خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ اس سے پہلے میں نے دھول پور میں ستی کی رسم دیکھی تھی جب ایک بیوہ ہونے والی حسین لڑکی کو اس کے پتی کی لاش کے ساتھ زندہ جلادیا گیا تھا۔

ان ظالمانہ رسموں پر اگرچہ پابندی لگی ہوئی تھی لیکن چوری چھپے کسی نہ کسی صورت میں یہ رسمیں اب بھی جاری تھیں۔ نہایت کٹر اور انتہا پسند پنڈت سیدھے سادے لوگوں کو بھڑکاتے تھے کہ اگر انہوں نے ان قدیم رسموں کو ترک کردیا تو دیوتا ان پر عذاب نازل کردیں گے اور وہ تباہ ہوجائیں گے۔

انسان چاند پر پہنچ گیا تھا اور مریخ پر کمندیں ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سائنس اتنی زیادہ ترقی کرچکی تھی کہ ہر چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی لیکن ـــ مذہب کے حوالے سے لوگوں کے بعض طبقے جنونی کیفیت میں مبتلا ہورہے تھے۔ وہ اپنے مذہب کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں تھے۔ صرف ہندو ہی نہیں، دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بعض طبقے بھی نہایت انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے۔ صدیوں پرانی ڈگر سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ سائنسی ترقی کو وہ خرافات سمجھتے تھے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ دنیا کو ایک بار پھر پتھر کے زمانے کی طرف لے جانے کی کوشش کررہے ہوں۔

دھوپ تیز ہورہی تھی لیکن غار کے سامنے لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میدان میں بھی ہر طرف لوگ ٹولیوں کی صورت میں جمع تھے۔ ڈھول بج رہے تھے۔ رقص ہورہا تھا۔ "جے کالی" کے نعرے لگ رہے تھے۔

ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جہاں بھی ہمیں پیلے کپڑوں والا کوئی سادھو نظر آتا، ہم اس طرف چل پڑتے لیکن ہر مرتبہ مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔

دوپہر کے بعد تین بجے کے قریب ہمیں غار کے اندر داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ باہر شدید گرمی تھی لیکن غار کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔

غار بہت بڑا تھا۔ اس میں بیک وقت کم از کم دو ہزار افراد سما سکتے تھے اور اس وقت بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

ہم لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ غار کی دیواریں ناہموار تھیں۔ کہیں پتھر باہر کو ابھرے ہوئے تھے اور کہیں اندر کی طرف کوئی گڑھا سا بنا ہوا تھا۔ چھت اور

دیواریں مشعلوں کے دھوئیں سے سیاہ ہورہی تھیں۔

غار کے آخر میں ایک بہت بڑے چبوترے پر کالی کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ اس کے سامنے چبوترے پر ناریل، مٹھائی، پھول اور ایسی بہت سی چیزوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس ڈھیر میں سونے کے لاتعداد زیورات بھی نظر آرہے تھے۔ عورتیں اپنے زیورات اتار اتار کر بھینٹ چڑھا رہی تھیں اور تین چار پنڈت بار بار ان چیزوں کو سمیٹ کر چبوترے کے پیچھے کسی جگہ لے جارہے تھے۔ لوگ مورتی کے سامنے چبوترے پر ہاتھ پھیر پھیر کر اپنے چہروں پر مل رہے تھے۔ اس جگہ کالی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک انسان کو ذبح کیا گیا تھا۔ لاش وہاں سے ہٹادی گئی تھی۔ چبوترے پر کہیں کہیں خون کا کوئی دھبا لگا ہوا تھا۔ صبح سے آنے جانے والے لوگوں نے اپنے ماتھوں پر ٹیکے لگانے کے لیے ہاتھ رگڑ رگڑ کر سارا خون صاف کردیا تھا۔

میں نے کالی کی مورتیاں پہلے بھی دیکھی تھیں لیکن اس مورتی کو دیکھ کر دل پر عجیب سی ہیبت طاری ہورہی تھی۔ یہ مورتی تقریباً چار فٹ اونچی تھی۔ یہ مورتی تیار کرنے والے نے واقعی بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔

کالی کی آنکھیں دہشت زدہ انداز میں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ اس کی سرخ زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ کندھوں سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں ڈوری سے منسلک دو تھالیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں تیغہ تھا۔ یہ تیغہ اور کالی کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے۔ مورتی کی چھاتیاں برہنہ تھیں اور گلے میں سونے اور موتیوں کی مالائیں تھیں۔ ایک مالا سب سے مختلف تھی اور یہ مالا انسانی کھوپڑیوں سے تیار کی گئی تھی۔ دو کھوپڑیاں ایک طرف، دوسری طرف اور ایک درمیان میں تھی جو سینے سے نیچے پیٹ پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس مالا میں کھوپڑیوں کے ساتھ پیپل کے سوکھے ہوئے پتے بھی تھے۔ مورتی کے بدن کا زیریں حصہ بھی برہنہ تھا۔

لوگ مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے، کوئی نہ کوئی چیز اس کے قدموں میں ڈالتے، چبوترے کو چھو کر انگوٹھے سے پیشانی پر ٹیکا لگاتے اور آگے بڑھ جاتے۔

اس صورتِ حال سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کالی اپنے عام پیروکاروں میں خوشیاں بانٹتی تھی یا نہیں لیکن پنڈت اور پجاری یقیناً بہت خوشحال تھے۔ کالی صرف انہی پر مہربان تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے تھے۔

ہمیں یہاں بھی مایوسی ہوئی۔ سادھو، پنڈت اور پجاری تو بہت نظر آئے تھے مگر دارا یا بلونت سنگھ سے ملتا جلتا کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

ہم غار سے باہر آگئے۔ دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اور اب پھر مغرب کی طرف سے بادل اٹھتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ہم اپنے شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور بالآخر ایک چٹان کے سائے میں بیٹھ گئے۔

"مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ حلق خشک ہورہا ہے۔" جانکی نے کہا۔

میدان میں جگہ جگہ پانی کے ٹینکر بھی کھڑے تھے۔ یاتریوں کی سہولت کے لیے یہ پانی الور سے لایا گیا تھا۔ کوئی ٹینکر خالی ہوتا تو اس کی جگہ دوسرا آجاتا۔

"وہ اس طرف ایک ٹینکر کھڑا ہے۔ میں پانی لے کر آتا ہوں۔" میں نے کندھے پر لٹکا ہوا تھیلا اتار کر زمین پر رکھ دیا اور ڈول اٹھا کر تقریباً سو گز دور ٹینکر کی طرف چل پڑا۔

وہاں آٹھ دس افراد کھڑے تھے۔ اپنی باری آنے پر میں ٹینکر کے پائپ سے ڈول بھرنے لگا تو ایک اور سادھو بھی اپنا ڈول لے کر آگے جھک گیا۔ وہ میرے بالکل ساتھ جڑا ہوا تھا اور چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں ایک سرگوشی سن کر چونک گیا۔

"شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مندر والی چٹان کی پچھلی طرف مجھ سے ملنا ہمت سنگھ۔"

آواز نسوانی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ جسے میں سادھو سمجھا تھا وہ عورت تھی۔ اس نے لباس سادھوؤں والا ہی پہن رکھا تھا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اس نے مجھے ہمت سنگھ کے نام سے پکارا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے جانتی تھی لیکن اس کا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔

اچانک میرے دماغ میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ پنڈت سوبھراج نے بتایا تھا کہ دارا اور بلونت سنگھ کے ساتھ سادھو کے بھیس میں ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔

"مجھے اس طرح گھور کر مت دیکھو۔" اس نے ایک بار پھر سرگوشی کی۔ "پانی بھرو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میرا پیچھا کرنے کی کوشش مت کرنا اور شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد مندر والی چٹان کی پچھلی طرف پہنچ جانا۔"

میں نے اپنا ڈول بھرلیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اپنے راستے پر چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ لڑکی وہاں نہیں تھی۔

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے مجھے

ہمت سنگھ کی حیثیت سے پہچان لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میرا میک اپ اتنا اچھا نہیں تھا اور اگر یہ لڑکی دارا اور بلونت سنگھ کی ساتھی تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم ان کی نظروں میں آچکے تھے اور اب دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔ یا تو وہ چھپ کر ہم پر حملہ کرتے یا چوری چھپے یہاں سے بھی بھاگ جاتے۔

لیکن اس لڑکی نے مجھے مندر والی چٹان کی پچھلی طرف کیوں بلایا تھا۔ کیا ہمیں دیکھ لینے کے بعد انہوں نے کوئی منصوبہ بنالیا تھا اور اس لڑکی کے ذریعے مجھے چٹان کی پچھلی طرف بلا کر مجھے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔

میں نے چلتے چلتے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور ڈول کو جلدی سے پیچھے ہٹا دیا۔ وہ ٹینکر دھوپ میں کھڑا تھا اور پانی بھی گرم تھا۔ میں ٹھاکر اور جانکی کے قریب بیٹھ گیا اور ڈول جانکی کی طرف بڑھا دیا۔ پانی گرم سہی لیکن بہرحال ہم تینوں کے حلق تر ہو گئے تھے۔

میں نے جانکی اور ٹھاکر کو اس لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں اچھل پڑے۔

"یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" ٹھاکر نے کہا "اور اگر یہ وہی لڑکی ہے تو تمہیں کیسے جانتی ہے۔ وہ کون ہو سکتی ہے؟"

"یہ معلوم کرنے کے لیے شام کا اندھیرا پھیلنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔" ٹھاکر بولا۔

"اندھیرا ہونے دو ٹھاکر پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا اور اپنے تھیلے میں سے بھنے ہوئے چنے اور گڑ نکال کر کھانے لگا۔

دھوپ میں دن بھر پھرتے رہنے سے ہم تھک گئے تھے۔ گرم ہوا کے تھپیڑے ہمارے چہروں سے ٹکرا رہے تھے۔ جانکی اور ٹھاکر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ظاہر ہے' میری آنکھوں میں بھی سرخی ضرور ہو گی۔ اس لڑکی سے ملاقات کے بعد کہیں گھومنے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب جو کچھ بھی ہونا تھا' شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ہی ہونا تھا اس لیے دھوپ میں پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہم نے شام تک وہیں ٹکے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ میدان میں اب بھی ہلا گلا جاری تھا۔ میں زمین پر نیم دراز پڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

○☆○

گھرے بادلوں نے پورے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ مندر کے اندر کالی کی پوجا ہو رہی تھی اور باہر لوگ اپنے ہی جنون میں مبتلا تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو کیا ہو گا لیکن پھر اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ ان پہاڑیوں میں لاتعداد چھوٹے بڑے غار تھے جو بارش میں لوگوں کو پناہ دے سکتے تھے۔

شام ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن ہو رہی تھیں۔ ہم اپنی جگہ سے اٹھ کر مندر والی چٹان کی طرف آگئے۔ ہم میں یہ طے ہوا تھا کہ میں اس لڑکی کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف اکیلا جاؤں گا۔ جانکی اور ٹھاکر الگ الگ کچھ فاصلے پر میرے پیچھے آئیں گے۔ ٹھاکر نے کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کا بندوبست پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ان دونوں کے پاس پستول موجود تھے جو انہوں نے اپنے اپنے لباس میں چھپا رکھے تھے اور میرے پاس خنجر تھا جو میں نے پنڈلی پر باندھ رکھا تھا۔

چٹان کی پچھلی طرف پہنچنے سے پہلے ہی ہم الگ الگ ہو گئے۔ میں نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ اس چٹان کی پچھلی طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک اور پہاڑی تھی۔ اس طرح یہ ایک درّہ سا بن گیا تھا لیکن اس طرف ان چٹانوں میں کوئی غار وغیرہ نہیں تھا اس لیے اس طرف یاتریوں کی آبادی نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگوں نے مندر والی چٹان کے سامنے کے رخ پر ڈیرے جما رکھے تھے۔ اس درّے کے آخر میں ایک جگہ دو تین مشعلیں جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

میں اندھیرے میں سنبھل کر چلتا رہا اور پھر اچانک رک گیا۔ وہ ہلکی سی سرگوشی دائیں طرف سے ابھری تھی۔ میں نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پنڈلی کے فیتے سے خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور آواز کی طرف بڑھنے لگا۔

"اس طرف ہمت سنگھ۔ میں یہاں ہوں۔" وہ سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ یہ اسی لڑکی کی آواز تھی۔

میں اس طرف مڑ گیا۔ ایک انسانی ہیولا چٹان کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے کھینچتے ہوئے ایک کھوہ میں داخل ہو گئی۔ یہ دراصل ایک کشادہ دراڑ تھی جو پانچ چھ فٹ آگے جا کر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ وہ لڑکی میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔

آگے راستہ بند تھا اور یہ جگہ میرے لیے چوہے دان بن گئی تھی۔ اگر باہر سے دو آدمی بھی آجاتے تو میں آسانی سے مارا جا سکتا تھا۔ نیچے بیٹھتے ہوئے اس لڑکی کا ہاتھ میرے خنجر

سے ٹکرا گیا۔ اس نے ٹٹول کر خنجر کو دیکھا پھر سرگوشی میں بولی۔

"اس خنجر کو میان میں رکھ دو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" میں نے بھی سرگوشی میں کہا "اگر میرے ساتھ دھوکا ہوا تو اس خنجر سے تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔"

"کوئی دھوکا نہیں ہو گا۔ مجھ پر وشواس (یقین) کرو۔" اس نے جواب دیا "میں تمہاری ہمدرد ہوں۔ میرا نام امبر ہے اور میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم ان دونوں کے ساتھ ہو؟" میں نے نام لیے بغیر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ "وہ دونوں مجھے بلیک میل کر رہے ہیں اور دھمکیاں دے کر مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔ وہ لوگ یہاں بھی ایک خاص مقصد کے تحت آئے ہیں۔"

"کیا انہیں معلوم ہے کہ میں یہاں ہوں؟" میں نے پوچھا۔ اس سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ اسے کس سلسلے میں بلیک میل کیا جا رہا تھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا "یہ اتفاق ہے کہ آج دن میں' میں نے تم لوگوں کو مندر میں دیکھ لیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچان لیا۔ دوسرے کون ہیں' یہ میں نہیں جانتی۔"

"مجھے کیسے پہچانا؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے دائیں کان کی لو کے پیچھے سیاہ تل ہے۔ مسور کے برابر۔" امبر نے جواب دیا "جب تم تینوں مندر کے اندر گھوم رہے تھے تو ہم تینوں بھی تم لوگوں کے پیچھے ہی تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان تین چار گز کا فاصلہ تھا اور بیچ میں بہت سے لوگ تھے۔ اتفاق سے میری نظر تمہارے کان پر پڑ گئی۔ ان دونوں میں سے کسی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ لیتے تو شاید اب تک تمہارا قصہ پاک ہو چکا ہوتا۔ بہرحال۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "وہ اپنے دھیان میں تھے۔ ان کے سازشی ذہن کوئی اور ہی منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں ان سے الگ ہو کر تم لوگوں کے پیچھے لگ گئی اور بالآخر جب تم ٹینکر سے پانی لینے آئے تو میں بھی تمہارے قریب پہنچ گئی۔"

"مندر سے نکلنے کے بعد تو ہم دیر تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں تم لوگوں کے پیچھے تھی۔" اس نے جواب دیا "تم تینوں چٹان کے سائے میں بیٹھے تھے تو میں اس وقت بھی تم سے رابطہ کر سکتی تھی لیکن مجھے شبہ تھا کہ میری نگرانی نہ ہو رہی ہو۔"

"وہ تمہارے آس پاس نہیں تھے تو نگرانی کرنے والا کون ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں اکیلے نہیں ہیں۔" امبر نے جواب دیا "یہاں آنے کے بعد انہوں نے کم سے کم تین آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ہو سکتا ہے' ان میں سے کوئی میری نگرانی بھی کر رہا ہو۔ بلونت سنگھ کو مجھ پر پوری طرح اعتماد نہیں ہے لیکن مجھے انہوں نے اپنے منصوبے میں شامل رکھا ہے۔ بڑی گھناؤنی سازش کر رہے ہیں وہ لوگ۔"

"سازش کے بارے میں بعد میں پوچھوں گا لیکن پہلے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم کون ہو اور مجھے کیسے جانتی ہو۔ میرا نام کیسے جانتی ہو لیکن ایک منٹ!" میں نے یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "اس دراڑ میں بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔ میری دوست اور ٹھاکر باہر کہیں کھڑے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ ہم یہاں سے نکل کر کسی اور جگہ پر بیٹھ کر بات کریں گے۔"

"اگر ان میں سے کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ مجھے بھی ختم کر دیں گے۔" امبر نے جواب دیا۔

"ہم روشنی کی طرف نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا "ان چٹانوں میں تو دن کے وقت بھی کسی کو تلاش نہیں کیا جا سکتا' رات کے اندھیرے میں کون دیکھ سکے گا۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف چلنے لگا۔ ہم اندر داخل ہوئے تھے تو آگے پیچھے تھے اور اب ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ امبر میرے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس کے گداز بدن کے لمس نے ایک لمحے کو میرے اوپر سنسنی سی طاری کر دی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور اسے ساتھ لیتا ہوا اس کھوہ سے باہر آگیا۔

اس وقت ہوا میں کسی قدر خنکی تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ درّے کے دائیں طرف جہاں مشعلیں جل رہی تھیں وہاں کچھ لوگوں کے سائے حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ بائیں طرف ایک پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر میں نے اس طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا' اس پتھر کو جان بوجھ کر ٹھوکر ماری گئی تھی۔ میں نے ہونٹ سکیڑ کر ہولے سے سیٹی بجائی۔ چند سیکنڈ بعد ہی دو ہیولے ایک بڑے پتھر کی آڑ سے نکل کر ہماری طرف آنے لگے۔

قریب پہنچ چکی تھی اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے جانکی کو اس آدمی کے ساتھ جھولداریوں اور گاڑیوں کی دوسری طرف پہاڑی کے دامن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔

میں بڑی تیزی سے گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اسٹیشن ویگن کے قریب پہنچ گیا اور اگلے پہیئے کا والو دبا کر اس میں تنکا پھنسا دیا۔ ہلکی سی آواز کے ساتھ ٹائر کی ہوا خارج ہونے لگی۔ میں اس طرف کے پچھلے پہیئے کے قریب چلا گیا اور اس ٹائر کے والو میں بھی تنکا پھنسا دیا۔

میں اسٹیشن ویگن کے چاروں پہیوں کی ہوا نکالنا چاہتا تھا مگر دوسری طرف کچھ فاصلے پر لوگ موجود تھے اس لیے باقی دو پہیوں کا خیال ذہن سے نکال کر وہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔

تقریباً دس منٹ بعد جانکی واپس آگئی۔ وہ آدمی اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"کیا ہوا۔ اسے مار تو نہیں دیا؟" میں نے جانکی کے قریب آنے پر سرگوشی میں پوچھا۔

"ٹیٹوا دبا دیا ہے حرامی کا۔ آدھے گھنٹے تک ہوش میں آجائے گا۔" جانکی نے جواب دیا "بڑا حرامی ہے۔ ایک دم پھیلنے لگا تھا۔"

ہم اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے۔ انسپکٹر پانڈے ہمیں اس جگہ نظر نہیں آیا تھا جہاں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے ٹھاکر کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ہم وہاں سے اٹھ کر مندر والے غار کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ ہماری نظریں مندر میں آنے جانے والے لوگوں پر لگی ہوئی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں نے انسپکٹر پانڈے کو دو آدمیوں کے ساتھ مندر میں جاتے دیکھا۔ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر پانڈے ایک آدمی کے ساتھ واپس آگیا۔ ان کا تیسرا ساتھی مندر کے اندر ہی رہ گیا تھا۔

مندر میں لوگوں کی آمدورفت بدستور جاری تھی۔ رات ایک بجے کے قریب دو اور آدمی مندر میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں صورتوں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگتے تھے۔ اس کے تین چار منٹ بعد تین سادھو اندر داخل ہوتے ہوئے نظر آئے اور ان تین سادھوؤں میں ایک امبر تھی۔

ہم نے صرف دو تین منٹ انتظار کیا اور پھر ٹھاکر مجھے اشارہ کرتا ہوا اٹھ کر مندر میں چلا گیا۔ اس کے ایک منٹ بعد جانکی اور مزید ایک منٹ بعد میں بھی مندر میں پہنچ گیا۔

مشعلوں کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں کالی کی مورتی بہت ہی ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مندر میں کئی لوگ موجود تھے۔ کوئی دونوں ہاتھ جوڑے آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔ کوئی آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا اور کوئی یوگا کے اسٹائس میں بیٹھا پوجا کر رہا تھا۔ میں جس آدمی کے قریب رکا تھا وہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ چہرے کے سامنے جڑے ہوئے تھے۔

میں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن امبر یا اس کے ساتھیوں میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ ٹھاکر کالی کی مورتی والے چبوترے کے قریب کھڑا تھا اور جانکی اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ مورتی کے قریب اس وقت کوئی پنڈت یا پجاری نہیں تھا البتہ پوجا کرنے والے چند لوگ کھڑے تھے۔

ٹھاکر نے اشارہ کیا تو میں فرش پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ٹھاکر اور جانکی مورتی والے چبوترے کے پیچھے جا چکے تھے۔ میں نے تلے قدم اٹھاتا ہوا چبوترے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں جو بھی تھا' اپنے دھیان میں مگن تھا۔ میں نے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور چبوترے کے پیچھے رینگ گیا۔

چبوترے کی پچھلی طرف چٹان میں ایک تنگ سی دراڑ تھی۔ دو آدمی آسانی سے اس میں داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جانکی اور ٹھاکر اس دراڑ میں داخل ہو گئے۔ میں بھی اندر گھس گیا۔

تقریباً دس قدم آگے جا کر دراڑ دائیں طرف مڑ گئی تھی اور اس طرف ذرا سی روشنی نظر آرہی تھی۔ جانکی کے پیچھے میں جیسے ہی اس طرف مڑا' ٹھٹک کر رک گیا۔ تین چار قدم آگے ایک پجاری فرش پر پڑا ہوا تھا اور ٹھاکر اس پر جھکا ہوا تھا۔ میں جانکی کو ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھ گیا۔ پجاری کا ایک ہاتھ ٹھاکر کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ میں نے پجاری کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس کی گردن پر ایک مخصوص نس کو ٹٹول کر دیکھا اور مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کے جسم اور روح کا ناتا ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلاتے ہوئے پجاری کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

مجھے صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ دارا اور اس کے ساتھی اس غار میں پہنچ چکے تھے۔ ان دراڑوں سے آگے غالباً کوئی ایسی جگہ تھی جہاں مندر کے پروہتوں نے خزانہ جمع کر رکھا تھا اور دارا وغیرہ اس

وہ جانکی اور ٹھاکر تھے۔

"ہمیں کسی محفوظ جگہ کی ضرورت ہے ٹھاکر! جہاں ہم بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کر سکیں۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

"کسی جگہ کی تلاش کی ضرورت نہیں۔ میرے ساتھ چلو۔" امبر نے دوبارہ کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن ظاہر ہے میں اندھیرے میں اس کے چہرے کے تاثرات کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" امبر نے کہا "میں نے مشکل وقت کے لیے ایک پناہ گاہ تلاش کر رکھی ہے۔ ہم وہیں چلتے ہیں۔"

ہم اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک اور تنگ سے درے میں سے ہوتے ہوئے دوسری پہاڑی کی پچھلی طرف آگئے۔ اس پہاڑی میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے غار تھے اور کسی کسی غار میں مشعل یا پیٹرومیکس کی روشنی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہمارے تھیلوں میں اگرچہ ٹارچیں موجود تھیں مگر ہم نے ٹارچ روشن کرنے کے بجائے اندھیرے ہی میں رہنا مناسب سمجھا تھا۔ ہم امبر کے پیچھے پیچھے ایک تنگ سے راستے پر' پہاڑی کے اوپر چڑھتے رہے۔ تقریباً پچاس فٹ اوپر جا کر وہ پگڈنڈی ایک بہت بڑے چٹانی پتھر کے پیچھے مڑ گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر ٹھاکر نے تھیلے میں سے ٹارچ نکال کر روشن کر لی۔ امبر نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور آگے چلتے ہوئے ہمیں راستہ دکھاتی رہی۔

بیس فٹ مزید اوپر جا کر ہم ایک غار میں داخل ہو گئے۔ امبر نے ٹارچ کی روشنی میں غار کے دہانے کے قریب ہی اندر کی طرف ایک پتھر پر رکھی ہوئی ماچس اٹھالی۔ ٹارچ ٹھاکر کے حوالے کر دی اور دیا سلائی جلا کر دیوار میں لگی ہوئی ایک مشعل روشن کر دی۔

غار صاف ستھرا تھا مگر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پانچ چھ افراد آسانی سے اس میں رہ سکتے تھے اور غالباً پہلے بھی کچھ لوگ یہاں رہتے رہے تھے۔

روشنی ہونے کے بعد میں نے پہلی مرتبہ غور سے امبر کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ لانبا قد' چھریرا بدن' موٹی موٹی سیاہ آنکھیں' چہرے کے نقوش بڑے نظر فریب تھے۔ اس نے پیلے رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی لیکن بلاؤز اس قدر مختصر تھا کہ نظریں اس کی طرف اٹھتے ہوئے شرماتی تھیں۔

اور جانکی تو اسے دیکھتے ہی اچھل پڑی تھی۔ وہ اس طرح امبر کو دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو لیکن امبر کی نظروں میں کوئی حیرت نہیں تھی۔

وہ روپ متی کی دوست ڈاکٹر رادھا کی بھانجی تھی۔ ہو سکتا ہے میں نے بھی اسے کبھی دیکھا ہو لیکن مجھے اس کا چہرہ یاد نہیں تھا البتہ امبر نے مجھے یاد رکھا تھا اور میرے کان کی لو کے پیچھے تل سے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ کیا قصہ ہے۔ وہ لوگ ہمارے خلاف کون سی نئی سازش تیار کر رہے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے امبر کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہم سب غار کے فرش پر بیٹھ چکے تھے۔ یہ غار واقعی ہر لحاظ سے محفوظ تھا۔ سامنے چٹانی پتھر ہونے کی وجہ سے اسے نیچے سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

"وہ سازش تم لوگوں کے خلاف نہیں ہے۔" امبر نے جواب دیا "انہیں یہ تو معلوم ہے کہ تم لوگ سارسکا میں موجود ہو۔ جب گنگولی چودھری تمہاری ایک ساتھی کو اٹھا کر لے گیا تھا اور بعد میں تم بھی جنگل میں گھس گئے تھے تو وہ دونوں بہت خوش ہوئے تھے کہ بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس کر تمہارا زندہ واپس آنا ممکن نہیں تھا لیکن جب تم ہلا کو لے کر واپس آگئے تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ تم لوگ جس ہٹ میں ٹھہرے ہوئے تھے اس پر حملہ کرنا بہت آسان تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو تم لوگوں کے سامنے ایکسپوز نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ ایک اور سازش تیار کر رہے تھے۔"

"ہم اسی سازش کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"یہ جو کالی کے مندر پر میلہ لگا ہوا ہے نا یہاں ہفتہ بھر ہزاروں لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ تم نے میدان میں لاتعداد چم چماتی گاڑیاں دیکھ کر اندازہ لگا لیا ہوگا کہ یہاں کیسے کیسے دھن وان (دولت مند) لوگ آتے ہیں۔ یہ لوگ نقدی کے علاوہ بہت قیمتی چیزیں کالی کے چرنوں میں بھینٹ کرتے ہیں۔ ہیرے جواہرات' خالص سونے کے زیورات' سونے کی مورتیاں اور بہت کچھ۔ اس ایک ہفتے کے دوران میں یہاں لاکھوں روپے نقد اور کروڑوں روپے کے تحائف جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ کل رات وہ سب کچھ اڑا کر یہاں سے رفوچکر ہو جائیں۔ ان کے ساتھ سارنگ شہر کا غنڈا دریودھن بھی شامل ہے۔ دو اور آدمیوں کا انہوں نے بندوبست کیا ہے۔"

"اوہ!" میرے اور ٹھاکر کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"پنڈت سوبھراج کا اس میں کیا کردار ہے؟" میں نے پوچھا۔

سلسلے میں غالباً پہلے ہی بہت سی معلومات حاصل کر چکے تھے اس لیے سیدھے اندر تک پہنچ گئے تھے۔

ٹھاکر جب سیدھا ہوا تو اس کا پستول لباس سے نکل کر اس کے ہاتھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ جانکی نے بھی پستول نکال لیا تھا اور میں نے بھی پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

چند گز آگے جا کر یہ دراڑ ایک بار پھر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ آگے کشادہ جگہ تھی اور بائیں طرف کی چٹان میں ایک اور راستہ نظر آ رہا تھا جس کی دوسری طرف روشنی جھلک رہی تھی۔

یہ غار قدرتی تھے۔ ان کی بناوٹ میں کہیں بھی انسانی ہاتھوں کا دخل نظر نہیں آ رہا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ ان غاروں سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔

اس راستے کی دوسری طرف کچھ آوازیں سن کر ہم محتاط ہو گئے۔ میں نے دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دوسری طرف ایک کشادہ غار تھا جہاں چار مشعلیں روشن تھیں۔ غار کے عین وسط میں ایک پنڈت کی لاش پڑی تھی۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ پیٹ کٹا ہوا تھا اور اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کی شہ رگ بھی کٹی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس خون بکھرا ہوا تھا۔ اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور پنڈت زمین پر پڑا تھا۔ وہ زندہ تھا اور اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔

غار میں پانچ افراد تھے۔ ایک امبر جو راستے کے قریب ہی قدرے بائیں طرف کھڑی تھی۔ بلونت سنگھ اور دارا۔ ان کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ یہ وہی غنڈے تھے جنہیں میں نے دارا وغیرہ سے پہلے مندر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان دونوں نے ایک بوری کا منہ کھول رکھا تھا اور بلونت سنگھ قریب ہی انبار سے سونے کے زیورات اور سونے کی مورتیاں اٹھا اٹھا کر بوری میں ڈال رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ کروڑوں کی دولت تھی۔ ایک طرف کرنسی نوٹوں کا ڈھیر بھی لگا ہوا تھا۔

دارا ان کے قریب کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پنڈت کو اس نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

میں نے دارا کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ باقاعدگی سے سر گنجا کروانے کا عادی تھا لیکن اب اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بے ترتیب داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ اگر مجھے پہلے سے اس کے بارے میں پتا نہ ہوتا تو میں اس حلیے میں اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ پہلے سے کچھ فربہ بھی ہو گیا تھا۔ مجرب چہرہ، سرخ آنکھیں اور سادھوؤں والے لباس میں وہ سادھو ہی لگ رہا تھا۔

میں نے گردن گھما کر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس نے اشارہ کیا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

"یہ سب کچھ یہیں چھوڑ دو اور ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جاؤ۔" ٹھاکر کی کڑکتی ہوئی آواز غار میں گونجی۔

وہ سب اچھل پڑے لیکن ہاتھ کسی نے اوپر نہیں اٹھائے تھے۔

"اوہ۔۔۔ تو تم لوگ بھی ہو۔" دارا ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ وہ آہنی اعصاب کا مالک تھا۔ اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے جبکہ بلونت سنگھ وغیرہ کے چہرے دھواں ہو گئے تھے "کوئی بات نہیں۔" دارا نے بات جاری رکھی "یہاں بہت کچھ ہے۔ حصہ بانٹ لیں گے۔ تم لوگوں کے حصے میں اتنی دولت آئے گی کہ نہال ہو جاؤ گے۔"

دارا یہی سمجھا تھا کہ ہم بھی اس دولت کے چکر میں یہاں آئے تھے۔ اس کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہمیں پہچان نہیں سکا تھا۔

"تمہارا کھیل اب ختم ہو چکا دارا۔" میں نے کہا "کالی کے مندر کا یہ غار اب تمہارا مقبرہ بنے گا۔ بہتر ہے کہ اب تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔"

دارا اچھل پڑا۔

"اوہ۔۔۔ تم ہو۔" اس کے منہ سے حیرت زدہ سی آواز نکلی "اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ یہ غار تمہارا مقبرہ بھی بن سکتا ہے۔ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو۔ تمہیں پتا چل جائے گا کہ کہاں پھنس گئے ہو۔"

میں نے تو نہیں البتہ ٹھاکر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ٹھاکر کی اس بدحواسی سے دارا نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ دارا نے اپنا خنجر پوری قوت سے ہماری طرف کھینچ مارا۔ میں ٹھاکر کو دھکیلتا ہوا ایک طرف لے گیا۔ خنجر ہمارے اوپر سے ہوتا ہوا چٹان سے ٹکرا کر زمین پر گرا۔

ٹھاکر نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے فائر کر دیا۔ گولی کئی گز اوپر دیوار پر لگی۔ وہ دونوں بدمعاش اور بلونت سنگھ سب کچھ چھوڑ کر غار کی پچھلی طرف بھاگے۔ ان

"تم اسے جانتے ہو؟" امبر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہم نے بھی تھوڑا بہت ہوم ورک کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں سے لوٹ مار کرنے کے بعد یہ لوگ دھول پور میں پنڈت سوبھراج کے ہاں پناہ لیں گے۔ چند روز وہاں گزارنے کے بعد کسی اور طرف نکل جائیں گے۔" امبر نے کہا۔

"اب انہیں پنڈت سوبھراج کے ہاں بھی پناہ نہیں ملے گی لیکن بہرحال، یہ اپنے منصوبے پر کب عمل کریں گے؟"

"کل رات۔" امبر نے جواب دیا۔

"کل رات کیوں؟ ابھی تو میلہ ختم ہونے میں کئی روز باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کل کالی کے چرنوں پر دوسرا بلیدان (قربانی) کیا جائے گا۔" امبر نے جواب دیا "دوسرے بلیدان کے بعد لوگوں کی دلچسپی بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسری بھینٹ پر سب سے زیادہ چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اور ان کا منصوبہ ہے کہ کل رات ہلا بول دیا جائے۔ انہوں نے اپنی گاڑی بھی تیار رکھی ہوئی ہے۔"

"اور وہ گاڑی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے بتانے سے پتا نہیں چلے گا۔ وہاں جا کر دکھائی دے گی گاڑی۔" امبر نے جواب دیا "ان کا ایک آدمی گاڑی کے آس پاس موجود رہتا ہے۔"

"اور اب یہ بتاؤ کہ یہ لوگ تمہیں کس سلسلے میں بلیک میل کر رہے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ چیں بہ جبیں سی ہو گئی "یہ بتانا ضروری نہیں لیکن معاملہ ایسا ہے کہ اگر پولیس جان لے تو میری باقی زندگی جیل میں گزرے گی۔"

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں واپس جاؤں گی۔" امبر نے جواب دیا "وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔ اگر انہیں شبہ ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"انہوں نے کہاں ڈیرا جما رکھا ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"مندر کے سامنے والی پہاڑی پر، میدان کی دوسری طرف۔" امبر نے جواب دیا "تم لوگ اگر چاہو تو یہاں رہ سکتے ہو۔ یہ جگہ محفوظ ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"چلو۔ ہم بھی تھوڑی دور تک تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مشعل بجھا دی گئی اور ہم ٹارچ کی روشنی میں پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ پہاڑی کی دوسری طرف ہم نے اپنی رفتار کم کر لی جبکہ امبر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے چلتی رہی اور کچھ ہی دیر بعد وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہم اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ ہر طرف رقص و سرور کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں پر نیم برہنہ رقص ہو رہے تھے۔ شراب پانی کی طرح اڑائی جا رہی تھی۔ بعض لوگ شراب کے نشے میں دھت ہو کر آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ ابھی تو رات شروع ہوئی تھی۔ میلوں ٹھیلوں میں بے ہودگیاں تو ہوتی ہیں مگر کالی کی پوجا کا یہ میلہ کھلی عیاشی کا اڈا بھی تھا۔ یہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

اور پھر وہی بات ہوئی جس کا اندیشہ تھا۔ اچانک ہی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ ہم نے ایک ٹینکر سے پانی کے تینوں ڈول بھر لیے اور غار کی طرف واپس چل پڑے۔ آسمان سے برسنے والی موٹی موٹی بوندیں اب باقاعدہ بارش کی صورت اختیار کرنے لگی تھیں اور جب ہم غار میں داخل ہوئے تو بارش میں اچھی خاصی تیزی آ چکی تھی۔

اگر امبر سے ملاقات نہ ہوتی تو ہم بھی اس وقت تیز بارش میں بھیگ رہے ہوتے لیکن بہرحال، ہم اپنے دشمنوں سے بھی محفوظ تھے اور بارش سے بھی۔

○☆○

میری آنکھ "جے کالی" اور "بجرنگ بلی" کے فلک شگاف نعروں کی آواز سے کھلی تھی۔ اس میدان اور ہمارے درمیان اگرچہ تین سو فٹ اونچی پہاڑی حائل تھی لیکن نعروں کی آوازیں یہاں تک صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میرے دل پر ایک دم اداسی چھا گئی تھی۔ میں صبح سویرے بلند ہونے والے ان نعروں کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ ایک اور بے گناہ کو پتھر کی مورتی کے سامنے ذبح کر دیا گیا تھا۔

جانکی اور ٹھاکر بھی جاگ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی افسردگی کے تاثرات نمایاں تھے۔ ٹھاکر اپنا پانی کا ڈول اٹھا کر غار کے دہانے پر چلا گیا۔ اس نے پہلے کلی کی اور پھر منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور آڑ سے جھانک کر دیکھا تو امبر اوپر آ رہی تھی۔ جب وہ غار میں داخل ہوئی تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"اس وقت تم نے یہاں آکر غلطی نہیں کی؟" میں نے امبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر انہیں پتا چل گیا تو۔۔۔؟"

"انہیں پتا نہیں چلے گا۔" امبر نے میری بات کاٹ دی "وہ دونوں مندر میں کھڑے یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج کالی کے چرنوں پر دولت کا کتنا بڑا انبار لگتا ہے۔ آج دوسرا بلیدان ہے اور دوسرے بلیدان پر سب سے زیادہ بھینٹ دی جاتی ہے۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "میں اس لیے آئی ہوں کہ تم لوگوں میں سے کسی کو ان کی گاڑی دکھا سکوں۔"

"چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں فوراً ہی تیار ہو گیا۔

امبر کے ساتھ باہر نکل کر میں نے اوپر دیکھا۔ بارش رات ہی کو کسی وقت رک گئی تھی۔ آسمان پر اب بھی بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے اور بارش کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔

امبر مجھ سے تقریباً بیس گز آگے چل رہی تھی۔ اس کا رخ اس طرف تھا جہاں ایک پہاڑی کے دامن میں لاتعداد گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان گاڑیوں کے آس پاس چھولداریاں اور خیمے بھی لگے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر لگتا تھا جیسے رات کی بارش نے سب کچھ تلپٹ کر دیا ہو۔

امبر سرخ رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن کے قریب رک گئی۔ فوراً ہی ایک آدمی کسی طرف سے نکل کر اس کے قریب آ گیا۔ اس آدمی نے ویگن کا دروازہ کھولا اور وہ دونوں اندر بیٹھ گئے۔ میں ایک گاڑی کی آڑ میں کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے اور پھر وہ آدمی امبر کو بانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ امبر نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی اور اس کی طرف ہاتھ ہلا کر قہقہہ لگاتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔

میں نے اسٹیشن ویگن دیکھ لی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا امبر کی طرف چلنے لگا۔ لوگ ہجوم در ہجوم مختلف جگہوں پر کھڑے تھے۔ ڈھول تاشوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں امبر کے قریب پہنچ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"ان کے پروگرام کے بارے میں تم نے نہیں بتایا؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ہم دونوں سادھو تھے اور کسی کو ہم پر شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔

"سورج ڈوبنے کے تھوڑی دیر بعد پانی کے اس نیلے ٹینکر کے قریب ملوں گی۔ ان کا ارادہ رات کے پچھلے پہر کارروائی کرنے کا ہے۔ ان کا جو بھی فائنل پروگرام ہوگا تمہیں بتا دوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ٹینکر کے قریب ملوں گا۔" میں نے کہا۔

امبر مندر کی طرف چلی گئی اور میں لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتا ہوا اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔

اور پھر دن کا باقی حصہ ہم نے اسی غار میں آرام کرتے ہوئے گزارا۔

○☆○

سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ امبر نے ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ لوگ کیا کرنا چاہتے تھے۔ امبر کے علاوہ ان کی تعداد پانچ تھی۔ وارا، بلونت سنگھ، دریودھن اور اس کے دو ساتھی۔ پروگرام کے مطابق ان کے ایک آدمی کو اسٹیشن ویگن کے قریب رہنا تھا جبکہ دوسروں کو باقی کارروائی مکمل کرنی تھی۔

آدھی رات کے وقت مندر کے اندر لوگوں کی تعداد کم ہوتی تھی اور وہ بھی پوجا پاٹھ میں مگن رہتے تھے جبکہ میدان میں جگہ جگہ عیش و نشاط کی محفلیں جمائی جاتی تھیں۔ ڈھول تاشے بجتے تھے جن کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور مندر کے اندر کسی قسم کی کارروائی کرنے کے لیے آدھی رات کے بعد کا وقت مناسب تھا۔

اس وقت غالباً رات کے دس بجے تھے۔ ہم اس پہاڑی کے دامن میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں دو روز پہلے دن کے وقت آرام کیا تھا۔ میں نے ٹھاکر کو وہیں بیٹھے رہنے کو کہا اور جانکی کو ساتھ لے کر اس طرف چل پڑا جہاں اسٹیشن ویگن اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔

راستے میں ایک جگہ جانکی نے مجھے ہاتھ سے روک لیا اور ایک طرف اشارہ کرنے لگی۔ ہم سے بیس گز کے فاصلے پر رقص کی محفل جمی ہوئی تھی۔ نیم عریاں لباس میں دو لڑکیاں اچھل کود کر اپنے جسموں کی نمائش کر رہی تھیں۔ شراب لنڈھائی جا رہی تھی اور لوگ لڑکیوں پر نوٹ نچھاور کر رہے تھے اور عین سامنے اشنبو پانڈے کھڑا تھا۔ وہ سادہ لباس میں تھا۔ وہ بھی کالی والوں میں سے تھا اور ظاہر ہے وہ بھی پوجا کے لیے آیا تھا۔ میں نے اس کے سامنے جانا مناسب نہیں سمجھا اور جانکی کے ساتھ ایک طرف ہٹتا چلا گیا۔

اسٹیشن ویگن کا دروازہ پوری طرح کھلا ہوا تھا۔ بلونت کا آدمی سیٹ پر نیم دراز بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔ جانکی کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹتا چلا گیا اور ایک گاڑی کی آڑ میں رک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ جانکی اسٹیشن ویگن

نگرانی شروع کردی تھی اور جب تم لوگوں نے پنڈت سوبھراج کو میرے حوالے کیا تو اس نے بتایا کہ تم لوگوں کو تین سادھوؤں کی تلاش ہے۔ اس دوران میں ٹھاکر اور اس کی دوست کو حادثہ پیش آگیا اور پھر چند روز بعد میرے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ تم سادھوؤں کے لباس اور ایسی چیزیں خریدتے پھر رہے ہو جو صرف پنڈتوں اور سادھوؤں ہی کے کام آسکتی ہیں۔ مجھے شبہ ہوا اور میں نے اپنا ایک آدمی تم لوگوں کے پیچھے بھی لگا دیا جس نے رپورٹ دی کہ تم لوگ بھی اس طرف آچکے ہو۔

"میں اپنے آدمیوں کو لے کر کل یہاں پہنچ گیا تھا اور اتفاق سے کل ہی میں نے تم لوگوں کو دیکھ لیا تھا مگر جان بوجھ کر قریب نہیں آیا۔ وریودھن اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا واردات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان پنڈت جی کو اعتماد میں لے کر اپنے خدشے کا اظہار کیا اور مندر کو اندر سے بھی دیکھ لیا۔ پچھلے غار کے اندر وہ خفیہ راستہ بھی میری نظروں میں آگیا۔

"جس وقت وریودھن اور اس کے ساتھی مندر میں داخل ہوئے' میرا ایک آدمی وہاں موجود تھا۔ میں اس وقت یہاں سے..... کچھ دور اپنی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے مجھ تک پہنچنے میں کچھ وقت لگ گیا اور جب میں اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں پہنچا تو اندرونی غار میں فائرنگ شروع ہو چکی تھی لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہاں ایک لڑکی اور ایک پنڈت کی لاش اور یہ پنڈت جی بندھے پڑے ملے۔

"میں نے فوراً ہی اپنے کچھ آدمیوں کو باہر پہاڑی کی طرف دوڑا دیا تاکہ وہ اوپر جا کر ان کا راستہ روک سکیں مگر میرے آدمی غلط راستے پر نکل گئے۔ وہ پہاڑی پر اس راستے سے تقریباً سو گز دور نکلے تھے لیکن انہوں نے دو آدمیوں کو ایک طرف دوڑتے ہوئے دیکھ لیا۔ میرے آدمیوں نے پیچھا کیا تو انہوں نے فائرنگ شروع کردی اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا' تم لوگ دیکھ چکے ہو۔" انسپکٹر پانڈے چند لحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "مجھے نہیں معلوم تم لوگ ان سادھوؤں کا پیچھا کیوں کر رہے تھے۔ ان کی ساتھی لڑکی کی لاش غار میں پڑی ہے۔ ایک سادھو کی لاش اس طرف ملی ہے۔ تیسرا سادھو کہاں ہے؟"

"وہ فرار ہوگیا۔" میں جلدی سے بول پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ٹھاکر دارا کے بارے میں اسے بتادے۔ دارا بہت عرصے بعد میرے ہاتھ لگا تھا اور میں اس سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کا اور میرا حساب تو بہت لمبا تھا۔

"آؤ۔ ذرا میرے ساتھ اندر آؤ۔ آپ بھی آیئے پنڈت جی۔" انسپکٹر پانڈے نے اس پنڈت سے کہا جسے دارا نے باندھ کر ڈالا تھا۔

مندر کے سامنے تو ہجوم لگا ہوا تھا لیکن اندر صرف سادہ لباس پولیس والے تھے۔ تمام لوگوں کو باہر نکالا جا [illegible] تھا۔ ویران غار میں کالی کی مورتی کچھ اور بھی ہیبت ناک لگ رہی تھی۔

چبوترے کے پیچھے پہنچتے ہی انسپکٹر پانڈے نے [illegible] روشن کرلی اور جیسے ہی ہم دوسرے غار میں مڑے' [illegible] گیا۔ وہاں اس پجاری کی لاش پڑی ہوئی تھی جسے غار میں داخل ہوتے ہوئے ہم بھی دیکھ چکے تھے۔

"اس پجاری کو یہاں نگرانی کے لیے کھڑا کیا گیا تھا [illegible] کوئی غیر متعلق آدمی اندر تک نہ جاسکے۔" انسپکٹر پانڈے [illegible] لاش پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا "وریودھن اور اس کے ساتھیوں نے اندر داخل ہونے کے لیے پہلے اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔"

ہم غار کے اندر آگئے۔

"ان پنڈت جی کے کہنے کے مطابق پنڈت ادم [illegible] نے ان ڈاکوؤں کے خلاف مزاحمت کی کوشش کی تھی مگر ایک سادھو نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ [illegible] دیا۔ ان پنڈت جی نے خاموش رہنے کا وعدہ کیا تو انہیں باندھ کر ڈال دیا گیا اور سادھو کے لباس میں یہ لڑکی۔"

"یہ اپنے ہی ایک ساتھی کی گولی کا نشانہ بنی تھی۔" [illegible] نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے پنڈت جی نے میری [illegible] سہلا دیا۔

"پنڈت جی تم لوگوں کے بے حد شکر گزار ہیں۔" انسپکٹر پانڈے بولا "تم لوگوں کی مداخلت سے بھینٹ میں ملا ہوا خزانہ لٹنے سے بچ گیا۔"

پنڈت جی نے بھی ہاتھ جوڑ دیے۔

"ایک بات اور انسپکٹر۔" میں نے کہا "تم اس معاملے کی تحقیقات کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن [illegible] کسی الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتے۔"

"کیسی تحقیقات؟" انسپکٹر پانڈے بولا "سرکار کو تو معلوم ہی نہیں کہ یہاں کوئی میلہ لگا ہے اور کالی کے [illegible] میں انسانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ یہاں نہ کوئی میلہ [illegible] ہے نہ کوئی قتل ہوئے ہیں۔ پولیس اور سرکار اس سے بالکل لاعلم ہے۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

تحقیقات کا مطلب یہ ہوتا کہ کالی کے چرنوں پر دی جانے والی انسانی بھینٹ کو بھی سامنے لایا جاتا۔ اب تک دو انسانوں کی بھینٹ دی جا چکی تھی اور قانون کی نظروں میں یہ بھی قتل تھا۔ یہ بات سامنے آنے سے ہو سکتا تھا کسی قسم کے ہنگامے شروع ہو جاتے اس لیے قانون کا ان واقعات سے لاعلم رہنا ہی بہتر تھا۔

"تو پھر ان لاشوں کا کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"میلوں ٹھیلوں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا "کوئی بیمار ہو کر مر جاتا ہے۔ کوئی کسی کی دشمنی کا نشانہ بن جاتا ہے۔ لوگ کسی معمولی بات پر آپس میں بھی لڑ پڑتے ہیں جس کا نتیجہ کسی ایک کی موت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ادھر ان پہاڑیوں کے پیچھے ایک شمشان گھاٹ بھی ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "ایسی لاشوں کو اس شمشان گھاٹ میں لے جا کر ان کا کریا کرم کر دیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے اپنے بندے یہاں گزر جاتے ہیں وہ لاشوں کو ساتھ نہیں لے جاتے۔ یہیں پر ان کا کریا کرم کر دیتے ہیں اور ان کے نام کی پوجا بھی ہو جاتی ہے اور یہ لوگ تو ویسے بھی لاوارث تھے۔ ڈیڈ باڈی حاصل کرنے کا دعوے دار کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن یہ پنڈت؟" میں نے پنڈت کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"پنڈت جی کے وارث ہم ہیں نا۔ ان کا کریا کرم ہم کریں گے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ انسپکٹر پانڈے یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہاں جو پانچ چھ قتل ہوئے تھے ان کی ہوا بھی ان پہاڑیوں سے باہر پہنچ سکے اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس میلے میں شریک کوئی شخص ان پہاڑیوں سے باہر جا کر کسی سے اس واقعے کا ذکر نہیں کرے گا۔

انسپکٹر پانڈے نے اپنے کچھ آدمی اندر بلا لیے جو لاشیں اٹھا کر باہر لے گئے۔

"ہاں پنڈت جی۔" انسپکٹر پانڈے اب پنڈت کی طرف متوجہ ہو گیا "آپ کے حساب میں یہ سارا مال کتنے کا ہوگا؟"

"ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہم یہی حساب لگا رہے تھے۔" پنڈت نے جواب دیا "شام تک ہم نے جو نقد رقم گنی تھی وہ ساڑھے بارہ لاکھ کے قریب تھی۔ اس کے بعد بھی نقد رقم آئی تھی جو ہم نے گنی نہیں تھی اور یہ زیور اور سونے کی مورتیاں۔ میرا خیال ہے یہ سونا پندرہ کلو سے زیادہ ہوگا۔ مارکیٹ میں جو سونے کا بھاؤ ہے اس سے اس کی قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"بہت قیمتی خزانہ ہے یہ اور آپ لوگوں نے اس کی حفاظت کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا۔" انسپکٹر نے کہا "اسی لیے ان لوگوں کو اندر آنے کا موقع مل گیا مگر بھگوان کی کرپا (مہربانی) اور کالی ماں کے چمتکار (معجزہ۔ کرشمہ) سے سب کچھ بچ گیا لیکن اب کسی اور کو ایسا موقع نہیں ملنا چاہیے۔" وہ چند لحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "میرے دو آدمی یہاں رہیں گے اس غار کے اندر۔ دو کالی ماں کی مورتی والے چبوترے کے پیچھے اس غار کے داخلی راستے پر اور دو پہاڑی کے اوپر جہاں باہر نکلنے کا راستہ ہے اور باقی چار آدمی مندر کے سامنے رہیں گے۔"

"دھنے باد۔ (شکریہ)" پنڈت نے ہاتھ جوڑ دیے "بڑی کرپا ہے آپ کی مہاراج۔ میں صبح سارے پنڈتوں کو جمع کر کے اس کی سرکشا (دیکھ بھال۔ حفاظت) کا بندوبست کرا دوں گا۔"

"جب تک آپ کا بندوبست نہ ہو یہ سیوک (خدمت گار) یہاں موجود رہیں گے۔" انسپکٹر نے پولیس اہل کاروں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پنڈت نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم لوگ مندر سے باہر آگئے۔

انسپکٹر پانڈے تو اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ہم اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔

ہمیں اس غار تک پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹا لگ گیا۔ غار میں جلنے والی مشعل کی روشنی دور ہی سے نظر آرہی تھی۔ ٹھاکر آگے تھا اور میں چند قدم پیچھے۔ ٹھاکر اوپر پہنچ چکا تھا اور پھر اس کی چیخ سن کر مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ غار کے دہانے کے سامنے پہنچ کر میں اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

دارا غائب تھا اور جانکی غار کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مشعل کی روشنی میں اس کے سر کے پاس زمین پر خون بھی نظر آرہا تھا۔

مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں غار کے دہانے پر کھڑا غار کے فرش پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی جانکی کو دیکھتا رہ گیا۔

اس صورتِ حال نے مجھے حقیقتاً بدحواس کردیا تھا۔

میں غار کے دہانے پر کھڑا پھٹی پھٹی سی نظروں سے فرش پر پڑی ہوئی بے حس و حرکت جانکی کو دیکھ رہا تھا۔ مشعل کی کپکپاتی زرد روشنی میں یہ منظر بڑا خوفناک تاثر دے رہا تھا۔ قریب کھڑے ہوئے ٹھاکر نے میرے بازو کو چھوا تو میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے چھلانگ لگا کر جانکی کے قریب پہنچ گیا۔

جانکی کے سر کے قریب زمین پر خون کا ایک چھوٹا سا تالاب بن گیا تھا۔ اس کے بال' ایک کان اور گردن بھی خون آلود تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ میں ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ زیروبم بتا رہا تھا کہ وہ زندہ تھی۔

"ٹھاکر!" میں یہ کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا "تم اسے دیکھو' ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں اس مردود کو دیکھتا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

میں نے ایک طرف پڑے ہوئے تھیلے میں سے ٹارچ نکال لی اور غار سے باہر نکل آیا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں تقریباً دوڑتے ہوئے اس تنگ سے راستے سے نیچے آگیا جس سے ہم اوپر گئے تھے۔

پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر میں رک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ ایک لنگڑا آدمی اپنی جان بچانے کے لیے کتنی دور اور کس طرف جاسکتا ہے۔

میدان کی طرف جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس طرف لوگوں کی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اگر وہ لنگڑاتا ہوا اس طرف جاتا تو دوسروں کی نظروں میں آسکتا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسے کسی کی مدد کی ضرورت تھی لیکن زخمی حالت میں مدد کے لیے کسی کے پاس جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ خود پھنس جاتا۔ وہ اس طرف نہیں جاسکتا تھا۔ اسے ان پہاڑیوں کے کسی غار ہی میں پناہ مل سکتی تھی۔

میں میدان کی طرف جانے کے بجائے مخالف سمت میں دوڑ پڑا اور ٹارچ کی روشنی میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ دارا اور جانکی کو اس غار میں چھوڑ کر جانے کے بعد ہمیں واپسی میں دو گھنٹے لگے تھے لیکن یہ واقعہ ہمارے جانے کے فوراً ہی بعد پیش نہیں آیا ہوگا۔ جانکی کے سر کے قریب زمین پر جمع خون تازہ تھا۔ اگر اس کے سر پر دو گھنٹے پہلے ضرب لگائی گئی ہوتی تو خون جم چکا ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ بیس پچیس منٹ' اور میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ بیس پچیس منٹ میں دارا کتنی دور جاسکتا ہے۔

میں تقریباً آدھے گھنٹے تک آس پاس کی پہاڑیوں میں اسے تلاش کرتا رہا لیکن اس سے کچھ پتا نہیں چلا۔ رات کے اندھیرے میں ان پہاڑیوں میں کسی کو تلاش کرلینا آسان نہیں تھا۔ دوسری طرف مجھے جانکی کا بھی خیال تھا۔ میں اس کی تلاش ترک کرکے اس غار میں واپس آگیا۔

جانکی ہوش میں آچکی تھی اور ٹھاکر نے ایک تھیلے سے کپڑا نکال کر اس کے سر پر پٹی باندھ دی تھی۔ جانکی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹھاکر بھی سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"رات کے اندھیرے میں ان پہاڑیوں میں اسے تلاش کرنا ممکن نہیں" میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"لعنت بھیجو اس پر" ٹھاکر بولا "جانکی کے سر کی چوٹ شدید ہے۔ خون بہنا اگرچہ بند ہوگیا ہے لیکن اسے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میدان میں دو تین جگہوں پر میڈیکل کیمپ بھی ہیں۔ اسے وہاں لے کر چلو۔"

"اپنا سامان سمیٹو اور یہ ٹارچ سنبھالو۔ میں جانکی کو اٹھاتا ہوں" میں نے یہ کہتے ہوئے ٹارچ ٹھاکر کی طرف بڑھادی۔

ٹھاکر تھیلا سمیٹنے لگا۔ میں نے جھک کر جانکی کو اٹھالیا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہورہی تھی اور اس کا جسم ایک دم ڈھیلا پڑگیا تھا۔

میں ٹھاکر کے پیچھے ٹارچ کی روشنی میں تنگ سے ناہموار راستے پر پیر رپٹ جانے سے دو مرتبہ گرتے گرتے بچا۔ ہموار جگہ پر آتے ہی میں نے دوڑنا شروع کردیا۔

میدان میں اب بھی جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ مختلف سمتوں سے موسیقی کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگ بھول گئے تھے کہ چند گھنٹے پہلے یہاں چھ قتل ہوچکے تھے۔

"تم یہاں رکو۔ میں اس طرف دیکھتا ہوں" ٹھاکر نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ "اس طرف میں نے صبح ایک کیمپ دیکھا تھا۔ میں جاکر معلوم کرتا ہوں۔"

"رکنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ کسی سے معلوم کرلیں گے" میں نے جواب دیا اور ٹھاکر کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

بالآخر ہم اس چھولداری کے پاس پہنچ گئے جس کے ایک بانس پر ایک دوسرے کو کراس کرتی ہوئی سرخ پٹیوں والا سفید جھنڈا لگا ہوا تھا۔ چھولداری کافی کشادہ تھی۔

میں اسپرنگ والے چار سنگل بیڈ بچھے ہوئے تھے۔ ایک بیڈ پر ایک سادھو قسم کا آدمی کروٹ کے بل لیٹا بیڑی کے کش لگارہا تھا۔ باقی تین بیڈ خالی تھے۔ چھولداری کے اندر کی طرف شروع ہی میں ایک چھوٹی میز تھی اور دونوں طرف کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دو آدمی تاش کھیل رہے تھے۔ میز کی دوسری طرف لکڑی کا ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔

میں نے جانکی کو ایک بیڈ پر ڈال دیا۔ ان دونوں آدمیوں نے ہماری طرف دیکھا مگر دونوں میں سے کسی نے بھی تاش کے پتے ہاتھ سے نہیں چھوڑے تھے۔ ویسے شکل صورت سے ان دونوں میں سے کوئی بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔

"تم میں ڈاکٹر کون ہے؟" ٹھاکر نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر تو اُدھر مجرا دیکھ رہا ہے۔ ہم تو ٹائم پاس کرنے کے لیے اِدھر بیٹھ گئے تھے۔ ویسے چھوکری کو کیا ہوا ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"پہاڑی سے گرگئی تھی۔ سر میں چوٹ لگی ہے" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"وری ہم کو چریا بناتا ہے" دوسرا آدمی بولا "ایسا کیوں نہیں بولتا کہ چھوکری کو پٹا کرلے گیا تھا اور۔۔۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹھاکر کا زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر لگا اور وہ چیختا ہوا کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں ایک نیا ہنگامہ شروع ہوجائے گا اور میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو اس ہنگامے سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرلیا تھا لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ گھونسا کھانے والا اٹھ کر وہاں سے اس طرح بھاگا تھا جیسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوئی تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

دوسرا آدمی بھی بدحواس ہوکر اٹھ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تاش کے پتے بھی نیچے پھینک دیے۔

"شانتی۔۔۔ شانتی مہاشے جی!" وہ فوراً ہی بول پڑا "وہ واقعی چریا ہے۔ اچھا ہوا آپ نے اسے ایک ہاتھ جڑدیا۔ آپ اِدھر بیٹھو۔ میں ڈاکٹر کو بلا کرلاتا ہوں۔" اس نے جلدی سے الٹی ہوئی کرسی بھی سیدھی کردی۔

"جلدی سے بلا کرلاؤ۔ کہاں ہے ڈاکٹر؟" ٹھاکر کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

وہ آدمی فوراً ہی چھولداری سے نکل کر ایک طرف دوڑ گیا۔ اس کی واپسی میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جس نے سفید دھوتی اور زرد رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی ایک مالا بھی تھی۔ ماتھے پر سرخ ٹیکا بھی لگا ہوا تھا اور اگرچہ کلین شیو تھا لیکن غالباً دو دن سے شیو نہیں بنایا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہمیں پرنام کیا اور فوراً ہی جانکی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس نے کرتے کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک چابی منتخب کرکے لکڑی کے صندوق کا تالا کھولا اور صندوق میں سے کچھ چیزیں نکال کر میز پر رکھنے لگا۔

سب سے پہلے اس نے قینچی اٹھا کر جانکی کے کچھ بال کاٹ دیے۔ بائیں کان سے تقریباً دو انچ اوپر ڈیڑھ انچ لمبا زخم لگا تھا۔

"لگتا ہے کسی تیز دھار چیز سے ضرب لگائی گئی ہے۔ بالوں نے بچالیا لیکن پھر بھی گھاؤ خاصا گہرا ہے" ڈاکٹر زخم کا معائنہ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ "یہاں تو میں صرف فرسٹ ایڈ ہی دے سکتا ہوں۔ گھاؤ پر ٹانکے لگیں گے اور اسے فوری طور پر شہر کے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ وہ پریشان تو پہلے ہی تھا۔ آنکھوں میں مزید تشویش ابھر آئی۔ شہر جانے کے لیے ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں انسپکٹر ونود پانڈے کا خیال ابھر آیا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔ تم اس وقت ہماری جو بھی مدد کرسکتے ہو' ضرور کرو" میں نے کہا "اور ٹھاکر' تم یہیں رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

میں چھولداری سے نکل کر اندر کی طرف بھاگنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ انسپکٹر پانڈے مندر ہی میں ہوگا اور وہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔

مندر میں یاتریوں کا رش تھا۔ موسیقی کی آوازوں کے ساتھ کالی کے بھجن گانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یاتریوں کے اس ہجوم میں انسپکٹر پانڈے کو تلاش کرنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

"میری دوست پہاڑی سے گرگئی تھی' اسے سر پر شدید چوٹ آئی ہے" میں نے اس کا سامنا ہوتے ہی کہا "ہمیں اس وقت تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"مجھ سے جو ہوسکے گا کروں گا۔ کہو' میں تمہاری کیا سیوا کرسکتا ہوں۔" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔

"جانکی کو شہر لے جانے کے لیے گاڑی کی ضرورت ہے" میں نے کہا۔ "اگر اسے فوری طور پر اسپتال نہ لے جایا گیا تو اس کی حالت بگڑ جائے گی۔"

"کہاں ہے وہ' چلو میرے ساتھ!" انسپکٹر پانڈے نے کہا اور قریب کھڑے ہوئے اپنے ایک آدمی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

جب ہم میڈیکل کیمپ والی چھولداری میں پہنچے تو ڈاکٹر' جانکی کے زخم کی ڈریسنگ کرچکا تھا۔ انسپکٹر پانڈے نے ڈاکٹر سے ایک دو باتیں کیں اور پھر اپنے آدمی کو گاڑی لینے کے لیے بھیج دیا۔

پانچ منٹ بعد پولیس کی جیپ چھولداری کے پاس آکر رکی۔

"تم لوگ اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں مندر میں جاکر پرارتھنا کرتا ہوں کہ دیوی جی جلدی اچھی ہوجائیں" انسپکٹر پانڈے نے کہا۔

جانکی اس وقت ہوش میں تھی۔ اس نے بھی ہاتھ جوڑ کر انسپکٹر پانڈے کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے جانکی کو گود میں اٹھا کر جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا اور خود اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور ہر طرف ریت اڑ رہی تھی۔ دوسروں کا حلیہ دیکھ کر میں اپنے بارے میں بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔

میدان سے نکل کر پہاڑی کی دوسری طرف آتے ہی جیپ کی رفتار تیز ہوگئی۔ جیپ کو لگنے والے جھٹکوں سے جانکی کراہ اٹھی۔ اس کے لیے سیٹ پر سر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں جانکی کی سیٹ پر آگیا اور اس کا سر اپنی گود میں.... رکھ لیا تاکہ اسے کم سے کم جھٹکے لگ سکیں۔

پہاڑیوں سے نکل کر پختہ سڑک پر آتے ہی جیپ طوفانی رفتار سے سارسکا کی طرف دوڑنے لگی۔ وہ پولیس کا ڈرائیور تھا اور اس قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنا جانتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت سڑک سنسان تھی اور اسے تیز رفتاری میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

ہم آدھے وقت میں سارسکا پہنچ گئے۔ جیپ اسپتال کے سامنے پہنچ کر ہی رکی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ڈاکٹر کو بھی گھر سے بلانا پڑا تھا۔ ٹھاکر' روپ متی اور بملا کو بھی اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے منع کردیا کیونکہ وہ اس وقت سو رہی تھیں اور انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں تھا۔

ایک گھنٹے میں ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہوا۔ جانکی کے زخم پر سات ٹانکے لگے تھے۔ اسے انجکشن بھی لگادیا گیا تھا اور وہ نیند میں چلی گئی تھی۔ میں اور ٹھاکر ایمرجنسی روم کے باہر راہداری میں پڑی ہوئی بینچوں پر لیٹ گئے۔ مجھے نند[ا] کے اس مذاق پر ہنسی آرہی تھی۔ ہمارے پریوار کے پانچ [افراد] اس اسپتال میں داخل تھے۔ ہم دارا اور بلونت سنگھ کی [تلاش] میں یہاں آئے تھے اور یہ مہم ہمارے لیے بڑی مہنگی ثا[بت] ہوئی تھی۔

ٹھاکر تو بینچ پر لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سوگیا تھا اور [میں] جانکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں دارا کو سمجھنے میں [ایک] بار پھر غلطی کرگیا تھا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی [تھی] اور میرا خیال تھا کہ جانکی اسے کوئی حرکت نہیں کرنے [دے] گی لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا تھا۔ اگر ہم[یں] میں واپس پہنچنے میں مزید دیر ہوجاتی تو جانکی تو ختم ہوچکی [تھی]۔ یہ تو جانکی کے ہوش میں آنے کے بعد ہی معلوم ہو سک[تا تھا کہ] دارا نے اسے کس طرح زخمی کیا تھا اور وہ کس طرح [وہاں] سے بھاگا تھا؟ میں یہی سب کچھ سوچتے ہوئے سوگیا۔

صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب اسپتال میں لوگوں [کی] آمدورفت شروع ہوگئی۔ ہمیں بھی اٹھ جانا پڑا۔ میں[نے] ایمرجنسی روم میں جاکر دیکھا' جانکی بھی جاگ رہی تھی۔ [اس] کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"کیسی ہو؟" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں [لیتے] ہوئے پوچھا۔

جانکی پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ اسی وقت ایک [نرس] کمرے میں داخل ہوئی اور ٹمپریچر لینے کے لیے اس [نے] تھرمامیٹر جانکی کے منہ میں ڈال دیا۔ چند منٹ بعد نرس جانے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔

"اب مریضہ کی کیفیت کیا ہے؟"

"زیادہ تشویش کی بات تو نہیں ہے۔ گھاؤ ٹھیک [ہونے] میں چند روز تو لگیں گے۔" نرس نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کس وقت آئے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"آٹھ بجے!" نرس نے جواب دیا۔

"کیا یہ یہیں رہے گی؟" میں نے جانکی کی طرف [اشارہ] کیا۔

"کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔ انہیں تھوڑی دیر بعد [وارڈ] میں منتقل کردیا جائے گا" نرس نے جواب دیا۔

وارڈ کی حالت میں چند روز پہلے دیکھ چکا تھا۔ اسپ[تال کا] ماحول تو ویسے ہی وحشت ناک ہوتا ہے لیکن سرجری [وارڈ] میں تو داخل ہوتے ہی کراہیت سی محسوس ہونے لگتی [تھی]۔

"ہماری ایک اور مریضہ بھی اس اسپتال میں

[ہ]ے" میں نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ مناسب [نہ]یں ہوگا کہ اسے بھی وارڈ کے بجائے اسی کمرے میں منتقل [کر] دیا جائے۔"

نرس میری طرف دیکھ کر مسکرادی "ایک نہیں۔ آپ [ک]ے تو کئی مریض ہیں اس اسپتال میں۔ میں سسٹر سے بات [کر]تی ہوں۔ انہوں نے کہا تو انہیں اسی کمرے میں منتقل کردیا [جائ]ے گا۔"

میں نرس کے ساتھ ہی ایمرجنسی روم سے باہر آگیا۔ [ٹھاکر] باہر کی راہداری میں نظر نہیں آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ [رو]پ متی والے کمرے میں چلا گیا ہوگا۔ میں اس طرف [جا]نے کے لیے دوسری راہداری میں مڑا تو سامنے سے آتی [ہو]ئی بملا مجھے دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ برتن [تھے] اور وہ چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف جارہی تھی۔

"ارے ہمت سنگھ" اس کے لہجے میں حیرت تھی "یہ کیا [حلیہ] بنا رکھا ہے۔ واپس کب آئے' جانکی اور ٹھاکر کہاں [ہیں]؟"

"جانکی تو ادھر ہی ہے اور میں ٹھاکر کے بارے میں تم [سے] دریافت کرنے والا تھا۔ کیا وہ تمہارے کمرے میں نہیں [ہے]؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ٹھاکر جی' ادھر تو نہیں ہیں اور جانکی دیدی کہاں [ہیں]؟" اس نے پوچھا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ۔" میں اسے بتاتے ہوئے [کہہ] رہا تھا "جانکی زخمی ہے اور ایمرجنسی روم میں پڑی ہے۔ [ہ]م لوگ رات کو یہاں آگئے تھے۔"

"کیا ہوا جانکی دیدی کو؟" بملا کا چہرہ ایک دم دھواں [دھواں] ہوگیا۔

"سر پر چوٹ لگ گئی تھی۔ اب کچھ بہتر ہے اور روپ [م]تی کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے سے بہت اچھی ہیں۔ جانکی دیدی کو کیا ہوا' کیسے [ز]خمی ہوئی وہ؟"

"پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں اسے روپ [م]تی والے کمرے میں منتقل کردیا جائے گا۔ میں اسی طرف [جا ر]ہا تھا۔ آؤ' میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا۔

بملا بھی میرے ساتھ کمرے میں آگئی۔ روپ متی جاگ [رہی تھ]ی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرادی۔

"ارے ہمت سنگھ!" وہ دھیمے لہجے میں بولی "یہ کیا حلیہ [بنا ر]کھا ہے تم نے؟"

"کیوں۔ کیا ہوا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں ہوا' بس یوں لگتا ہے جیسے تم کسی کھدائی سے برآمد ہوئے ہو۔" یہ جملہ روپ متی کے بجائے بملا نے کہا تھا۔

ہم تین دن ریگستانی پہاڑیوں میں رہے تھے جہاں ہر وقت ریت اڑتی رہتی تھی اور ان تین دنوں میں ہمیں نہانے کا تو کیا' منہ دھونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اپنے کپڑوں کو دیکھ کر میں اپنی حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا اور پھر میں نے ٹھاکر اور دوسرے لوگوں کو بھی دیکھا تھا۔ بملا نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں یقیناً ایسا لگ رہا ہوں گا جیسے کسی کھدائی سے برآمد ہوا ہوں۔

میں نے روپ متی کو جانکی کے بارے میں بتایا تو اس کے چہرے پر بھی افسردگی سی چھاگئی۔ بملا تو بہت مضطرب ہو رہی تھی۔ وہ جانکی سے بہت زیادہ اٹیچ تھی۔ اس کی بے کلی دیکھ کر میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ جلد سے جلد جانکی کے پاس جانا چاہتی تھی۔

میں روپ متی سے باتیں کررہا تھا۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی آگیا اور اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اور اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ صبح ہوتے ہی ٹھاکر کہاں غائب ہوگیا تھا۔ وہ صبح اٹھتے ہی ہٹ پر چلا گیا تھا۔ بملا کو ہٹ سے اسپتال منتقل کرنے کے بعد اس روز جب ہم میلے کے لیے روانہ ہونے لگے تھے تو ہٹ کی چابیاں ایسی جگہ پر رکھ دی گئی تھیں کہ بعد میں اگر بملا کو بھی وہاں جانا ہوتا تو اسے پریشانی نہ ہوتی اور ٹھاکر صبح اٹھتے ہی وہاں چلا گیا تھا اور نہادھو کر بالکل فریش ہوکر آیا تھا۔

ہم باتیں کررہے تھے اور بملا چپکے سے کمرے سے نکل گئی تھی اور پھر پندرہ بیس منٹ بعد باہر سے کسی نے کمرے کا دروازہ پوری طرح کھول دیا اور دو وارڈبوائز اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئے۔ باہر کھڑی ہوئی بملا تیزی سے آگے آگئی اور نرس کے ساتھ مل کر جانکی کو خالی بیڈ پر منتقل کردیا۔ وارڈبوائز خالی اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

"اب میں چائے بنا کر لاتی ہوں" بملا نے ایک طرف میز پر رکھے ہوئے برتن اٹھالیے اور مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔ جب تک اس نے جانکی کو نہیں دیکھا تھا' بہت بے چین رہی تھی اور اب وہ قدرے مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ روپ متی اور جانکی کو اس نے سہارا دے کر بٹھادیا اور چائے کے کپ ان کے ہاتھوں میں تھما کر خود بھی جانکی کے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ

گئی۔

"کیا اب تم بات کرسکتی ہو۔ تمہیں بولنے میں تکلیف تو نہیں ہورہی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے جانکی کی طرف دیکھا۔

"ہاں' زیادہ تکلیف نہیں ہورہی" جانکی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر شروع ہوجاؤ" میں نے کہا "دارا تو بے ہوش تھا اور میں نے اس کی ایک ٹانگ بھی توڑدی تھی۔ وہ تمہیں زخمی کرکے کیسے فرار ہوگیا؟"

"میں غار کے دہانے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرا رخ باہر کی طرف تھا" جانکی نے کہنا شروع کیا۔ "اس دوران میں' میں نے کئی بار مڑکر دارا کی طرف دیکھا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا۔ وہ مسلسل بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ ختم ہی تو نہیں ہوگیا۔ یہی سوچ کر میں اسے دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔ میں نے اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرنے کے لیے جیسے ہی اس کے سینے پر ہاتھ رکھا' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ میں اس کے اوپر سے قلابازی کھاتے ہوئے دوسری طرف گری۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی وہ بڑی پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تمہارا دیا ہوا پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے فائر کردیا۔ گولی اس کے سر کے قریب سے گزر گئی۔ دارا نے مجھے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے میری کلائی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ پستول میرے ہاتھ سے نکل کر گر گیا۔

"دارا نے پستول اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے پستول کو ٹھوکر مار کر اسے دارا کی پہنچ سے دور کردیا۔ دارا نے میرا گلا دبوچ لیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑالیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو رگیدتے ہوئے غار کے دہانے کے قریب آگئے۔ اس دوران میں' میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ایک ٹانگ کو زیادہ حرکت دے رہا تھا۔ میں نے اس کی مضروب ٹانگ پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ دارا چیخ اٹھا۔ اس نے دوسری ٹانگ سے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کررہی تھی کہ دارا ایک پتھر اٹھا کر حملہ آور ہوا۔ میں نے بچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ پتھر میرے سر پر لگا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گری۔ میری آنکھوں کے سامنے پہلے تو نیلی پیلی چنگاریاں ناچتی رہیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا" وہ خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگی پھر بولی "کہاں گیا وہ... کچھ پتا چلا اس کا؟"

"نہیں" میں نے نفی میں سرہلادیا "اسے سمجھنے میں ایک بار پھر مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ لنگڑا ہونے کے ... رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر پہاڑیوں میں غائب ... بہرحال' ہم وقت پر واپس پہنچ گئے تھے اور تمہیں ... انسپکٹر پانڈے ہمارے کام آگیا۔ اگر اس کی جیپ ... تمہیں یہاں لانے میں بڑی مشکل ہوتی۔"

"انسپکٹر پانڈے سے ملاقات ہوگی تو میں ... شکریہ ادا کروں گی۔ بہت اچھا آدمی ہے وہ" جانکی ...

"آج وہاں کالی کی پوجا کا آخری دن ہے۔ میرا ... کہ دوپہر تک وہ بھی واپس آجائے گا" میں نے جواب ...

چائے پینے کے بعد میں ہٹ کی طرف جانے لگا ... میرے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔ وہ بھی تین دن سے ... ہی میں رہ رہی تھی۔ اسے اپنے کپڑے وغیرہ لینے تھے ... اور کام بھی تھے۔ اس نے میلے کپڑے اور فالتو چیزیں ... ڈال لیں اور ہم دونوں اسپتال سے باہر آگئے۔

اسپتال کے گیٹ سے نکلتے ہی ہمیں آٹو رکشا مل ... نے چند منٹ میں ہمیں ہماری منزل پر پہنچادیا۔

چابیوں کا گچھا ہٹ کے برآمدے میں ایک ... پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے چابیاں اٹھا کر دروازہ کھولا ... اندر داخل ہوگئے۔ میں نے فوراً ہی اپنے کمرے میں ... دروازہ بند کرلیا۔ باتھ روم میں آکر آئینے میں اپنے ... جائزہ لیا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ واقعی ... رہا تھا جیسے میں کسی کھدائی سے برآمد ہوا ہوں۔

میں تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی اپنے کمرے سے ... اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر ... میں نے ببلا والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ باتھ ... میں تھی۔ دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور اند ... پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں لاؤنج میں آکر صوفے پر بیٹھ گیا اور ایک بار ... صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ اب تک مایوسیاں ہی ... آئی تھیں۔ دارا ایک بار پھر ہاتھ آکر نکل گیا تھا۔ ... آنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ روپ متی کو اس کے ... بلونت سنگھ سے نجات مل گئی تھی لیکن میرا دشمن ایک ... بچ نکلا تھا۔ ہندوستان میں اسے بلونت سنگھ جیسے لوگ ... تھے اور میرا خیال تھا کہ ایک بلونت سنگھ کے ختم ہونے ... کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی ... تھی۔ دارا بہت چالاک اور عیار آدمی تھا۔ اس ... میں ٹائیگر اور پیڈرو جیسے بدمعاشوں کو اپنا مطیع بنا رکھا ... اور چی فانگ جیسے گینگسٹر اس کے اشاروں پر ناچتے ... تھے۔ ہندوستان کے پنڈت اور غنڈے تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں تھے۔ دارا ان سے کام لینے کا گر جانتا تھا۔ ایک بلونت سنگھ مرگیا تو کیا ہوا۔ اسے تو قدم قدم پر بلونت سنگھ جیسے لوگ مل سکتے تھے۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ آہٹ سن کر میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا اور میں اپنے آپ کو بکھرتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

وہ ببلا تھی' اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ببلا کو میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ نیم عریاں لباس میں دیکھا تھا' اس وقت اس نے جو نہایت مختصر سا لباس پہن رکھا تھا وہ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا البتہ اسے دیکھ کر میں کچھ دیر کے لیے تو سانس لینا ہی بھول گیا تھا۔

وہ بہت حسین تھی۔ نرم و نازک کومل سی' قدرت کے ہاتھوں بہت احتیاط سے تراشا ہوا بدن اور رنگت ایسی جیسے میدے میں گلابی رنگ گھول دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک اور ہونٹوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ تھی۔

اس کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی بالٹی تھی جس میں دھلے ہوئے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے بالٹی نیچے رکھ دی۔

"ہمت سنگھ جی!" وہ مسکراتے ہوئے بولی "تھوڑی سی ہمت کرو اور یہ کپڑے باہر دھوپ میں ڈال دو۔"

میں جیسے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی آواز سن کر ایکدم اچھل پڑا اور اس کی طرف سے نظریں چرانے کی کوشش کرتے ہوئے بالٹی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

باہر کپڑے سکھانے کے لیے کوئی رسی وغیرہ نہیں تھی۔ میں نے تمام کپڑے لان میں گھاس پر پھیلا دیے۔ ان میں ببلا کے اپنے کپڑے بھی تھے اور روپ متی کے بھی۔ میں خالی بالٹی لے کر اندر آیا تو ببلا اپنے کمرے میں جاچکی۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے بالٹی دروازے کے اندر کی طرف رکھ دی اور واپس آکر صوفے پر لیٹ گیا۔

مجھے جنگل کی وہ رات یاد تھی جو ہم نے ایک غار میں گزاری تھی۔ ببلا نے اس رات آپے سے باہر ہونے کی کوشش کی تھی۔ شاید میں بھی بہک جاتا لیکن میں نے بڑی مشکل سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اسے بھی دلدل میں گرنے سے بچالیا تھا۔ اس کے بعد گھر میں جانکی اور روپ متی کی موجودگی میں ببلا کو کبھی ایسی کوئی حرکت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور آج اسے کچھ آزادی مل گئی تھی۔

ببلا بہت معصوم لڑکی تھی۔ جسمانی طور پر تو وہ ایک بھرپور جوان لڑکی تھی لیکن ابھی اسے اتنا شعور حاصل نہیں ہوا تھا کہ اچھائی اور برائی میں تمیز کرسکتی۔ وہ زندگی کو ایک کھیل سمجھ کر اس سے کھیلنا چاہتی تھی اور وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ ایسا کھیل شروع ہوجائے تو اسے روکنا ممکن نہیں ہوتا۔

لیٹے لیٹے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ پچھلی رات بھاگ دوڑ میں گزری تھی اور میں ایک منٹ کو بھی نہیں سوسکا تھا اور پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ میں کب نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ کھلی تو نظر سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئی۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ پورا دن سوتے میں گزر گیا تھا۔

ہم ہٹ سے نکلے تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سڑک پر آتے ہی ہمیں آٹو رکشا مل گیا اور ہم چند منٹ میں اسپتال پہنچ گئے' کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ انسپکٹر جارمنی داس اور اے سی پی بھنڈاری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے لیکن تھے تو بہرحال پولیس آفیسر۔ انہیں دیکھتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ لوگ جانکی کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں ہم نے انسپکٹر پانڈے کو یہی بتایا تھا کہ جانکی پہاڑی سے گر گئی تھی اور پتھر لگنے سے سر پر چوٹ لگی تھی اور یہاں اسپتال میں بھی یہی کہانی سنائی تھی۔ پولیس کا ایک آدمی ہی ہمیں اسپتال چھوڑ کر گیا تھا۔ میں تو صبح نو بجے کے قریب ببلا کو لے کر چلا گیا تھا اور ممکن ہے بعد میں اسپتال کی انتظامیہ ہی نے پولیس کو اس سلسلے میں اطلاع دی ہو اور شاید یہ دونوں آفیسر اسی سلسلے میں

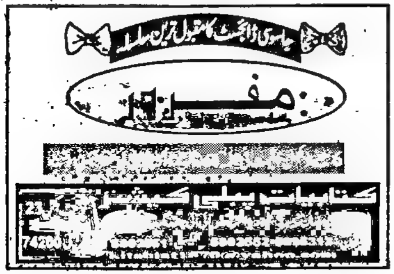

پوچھ گچھ کے لیے یہاں آئے تھے۔

لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور نکلا تھا۔

"بھنڈاری صاحب ایک بہت دلچسپ خبر لے کر آئے ہیں۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور میرا خیال ہے وہ خبر گنگولی چوہدری والے کیس کے سلسلے میں ہوگی" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور مجھے اپنی بات پر خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ان دونوں پولیس آفیسروں کو دیکھ کر میں نے گنگولی چوہدری کے بارے میں تو کچھ سوچا بھی نہیں تھا لیکن لاشعور میں دبی ہوئی یہ بات اچانک ہی ابھر کر سامنے آگئی تھی۔

"گنگولی چوہدری سے بھی زیادہ دلچسپ!" ٹھاکر بولا۔

"گنگولی چوہدری کے حوالے سے بھی ایک خبر ہے" بھنڈاری نے کہا "آپ کو یاد ہوگا کہ گنگولی چوہدری کا ایک ساتھی زخمی ہو کر جنگل میں فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب ہماری تازہ ترین اطلاع کے مطابق چند روز جنگل میں ایک بھیل قبیلے میں چھپے رہنے کے بعد وہ کوٹ پتلی کی طرف نکل جانے میں کامیاب ہوگیا ہے اور اطلاع یہ ہے کہ وہ اس علاقے کے نامی گرامی ڈاکو چورن سنگھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ پولیس سے گنگولی چوہدری اور اپنے دوسرے ساتھیوں کے قتل کا بدلہ لے سکے۔ پولیس کے علاوہ تمہارا نام بھی اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔"

"کیا یہی وہ دلچسپ خبر ہے جسے سنانے کے لیے آپ لوگوں نے یہاں آنے کی زحمت کی؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے بھنڈاری اور انسپکٹر جار منی داس کی طرف دیکھا۔

"نہیں، وہ دوسری خبر ہے" ان دونوں کے بجائے ٹھاکر بولا۔

"شاید آپ لوگ مجھے تجسس میں رکھنا چاہتے ہیں" میں نے کہا۔ میں ان کے "سہیلی بوجھ پہیلی" والے اس انداز سے کچھ الجھن سی محسوس کرنے لگا تھا۔

"انسپکٹر پانڈے کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کا مال اور نقدی لے کر فرار ہوگیا ہے۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا!" میں اس طرح اچھل پڑا جیسے میرے پیروں کے قریب بم پھٹ پڑا ہو "تم شاید مذاق کر رہے ہو۔"

"یہ اطلاع مجھے ان پولیس آفیسروں نے دی ہے اور یہ حضرات اس سلسلے میں ہم سے کچھ معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

یہ واقعی مذاق نہیں تھا لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ انسپکٹر پانڈے ایک ذمے دار، فرض شناس اور ایماندار آفیسر تھا۔ کئی روز پہلے جب گنگولی چوہدری کے آدمی یاتریوں کو اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے تو انسپکٹر پانڈے پولیس کی کارروائی میں پیش پیش رہا تھا اور پھر پولیس پارٹی بھی وہی لے کر جنگل میں گیا تھا۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا قلع قمع کرنے میں اس نے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ آخری دن جب گنگولی چوہدری سے فیصلہ کن جنگ ہو رہی تھی تو وہ انسپکٹر پانڈے ہی تھا جس نے عین وقت پر وہاں پہنچ کر میری جان بچائی تھی۔ میں اپنی زندگی کے نازک اور سنگین ترین لمحات سے دوچار تھا۔ پانڈے ہی نے میری مدد کی تھی ورنہ شاید گنگولی چوہدری کے بجائے میری لاش جنگل میں پڑی سڑ رہی ہوتی۔

انسپکٹر پانڈے جنگل میں دو دن ہمارے ساتھ رہا تھا۔ جنگل میں گزارے گئے ان دو دنوں کے دوران میں بالا نیم عریاں لباس میں رہی تھی مگر انسپکٹر پانڈے کی شرافت کی انتہا یہ تھی کہ اس نے کبھی نظر بھر کر بھی بالا کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر چند روز پہلے جب ٹھاکر اور روپ متی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو میں سمجھتا ہوں کہ روپ متی کی جان بچانے میں بھی اس نے اہم رول ادا کیا تھا۔ ٹھاکر روپ متی کی جان بچانے کے لیے اسپتال میں لوگوں سے خون کا ایک قطرہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ لوگوں کے سامنے میری اپیل بھی بے اثر ثابت ہوئی تھی اور پھر پانڈے ہی تھا جس نے میرا ہاتھ اٹھا کر لوگوں کو بتایا تھا کہ میں وہ ہوں جس نے ان لوگوں کو گنگولی چوہدری جیسے ڈاکو سے نجات دلائی تھی۔ میں اگر یہی بات کہتا تو شاید اتنا اثر نہ ہوتا یا لوگ یقین ہی نہ کرتے لیکن انسپکٹر پانڈے کے الفاظ نے انہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور لوگ خون دینے کے لیے لائن میں لگ گئے تھے اور کل رات ہی کی تو بات ہے کہ اس نے جانکی کی حالت دیکھ کر ہمیں آدھی رات کے وقت اپنی جیپ پر شہر بھیجنے کا بندوبست کیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو جانکی کی حالت بگڑ جاتی۔

ایک فرض شناس، ذمے دار اور شریف پولیس آفیسر یہ اس قسم کا دوسرا آدمی تھا جو میری نظروں سے گزرا تھا۔ سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو مجھے اب بھی یاد تھا اور حقیقت یہ ہے کہ انسپکٹر پانڈے سے مل کر مجھے انسپکٹر چیانگ شو یاد آگیا تھا۔ اگر انسپکٹر چیانگ شو کے بارے میں ایسی کوئی بات کہی جاتی تو میں کبھی یقین نہ کرتا۔ ہندوستان کی پولیس میں پانڈے بھی تو ایسا ہی تھا جو مثالی کردار کا مالک تھا اور اس وقت اس کے بارے میں جو بات کہی جا رہی تھی اس پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

"یہ مذاق نہیں حقیقت ہے" اے سی پی بھنڈاری کی آواز سن کر میں اپنے خیالات سے چونک گیا، وہ کہہ رہا تھا۔ "انسپکٹر پانڈے پہاڑیوں میں واقع کالی کے مندر میں دو پنڈتوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہاں سے کروڑوں روپے مالیت کے زیورات، سونے کی مورتیاں، بھینٹ میں دی جانے والی دوسری چیزیں اور لاکھوں روپے کی نقدی لے کر فرار ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ پولیس کے تین آدمی اور بھی ہیں اور وہ اس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔"

"یقین نہیں آرہا" میرے دماغ میں اب بھی سنسناہٹ ہو رہی تھی "آپ کو کیسے پتا چلا اور یہ اطلاع کب ملی؟"

"آج دوپہر دو بجے کے قریب" بھنڈاری نے جواب دیا "جو کانسٹیبل گزشتہ رات آپ لوگوں کو یہاں لے کر آیا تھا اسے صبح واپس جانا تھا لیکن صبح اس کی جیپ خراب ہوگئی۔ کوئی بڑا ہی نقص تھا۔ جیپ کا انجن کھولنا پڑا تھا اور اس کانسٹیبل کی قسمت بھی اچھی تھی کہ وہ واپس نہیں جا سکا تھا۔"

"پھر آپ کو انسپکٹر پانڈے کے بارے میں اطلاع کیسے ملی؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انسپکٹر پانڈے چھ آدمیوں کو لے کر یہاں سے گیا تھا ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور چار کانسٹیبل۔ آج دوپہر دو بجے کے قریب دو کانسٹیبل بڑی خستہ حالت میں یہاں پہنچے تھے۔ ساری بات انہوں نے ہی بتائی تھی۔"

اے سی پی بھنڈاری چند لمحے خاموش رہا پھر ان کانسٹیبلوں سے سنی ہوئی باتوں کی تفصیل بتانے لگا۔ اس کے کہنے کے مطابق کل پہاڑیوں والے مندر میں کالی کی پوجا کا آخری دن تھا۔ انسپکٹر پانڈے نے کسی ناخوشگوار صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اپنے آدمی مندر میں تعینات کر رکھے تھے۔ وہ خود دس بجے کے قریب سب انسپکٹر کے ساتھ مندر کی پچھلی طرف غار میں چلا گیا جہاں سب کچھ جمع کیا جاتا ہے۔ دو آدمیوں کو اس نے پہاڑی پر اس جگہ بھیج دیا تھا جہاں مندر کے نیچے غار کا خفیہ راستہ نکلتا ہے۔ ایک آدمی کو اس نے مندر کے گیٹ پر اور دوسرے کو مورتی والے چبوترے کے پیچھے اندرونی غار کی طرف جانے والے راستے پر متعین کر دیا تھا اور اسے سختی سے ہدایت کردی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندرونی غار کی طرف نہ آنے دیا جائے۔

اس وقت اندرونی غار میں دو پنڈت بھی تھے جو وہاں جمع شدہ دولت کا حساب لگا رہے تھے۔ پانڈے اور سب انسپکٹر کو اندرونی غار میں گئے ہوئے ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب کلکتہ والے کالی کے مندر سے آئے ہوئے ایک پنڈت نے اندر جانے کی کوشش کی تو چبوترے کے پیچھے کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے اسے روک لیا جبکہ وہ پنڈت اندر جانے کے لیے بضد تھا۔

پنڈت کی ضد سے مجبور ہو کر کانسٹیبل بھی اس کے ساتھ غار کے اندر چلا گیا۔ غار کے پچھلے حصے میں قدم رکھتے ہی وہ دونوں بدحواس ہوگئے۔ دو پنڈت غار میں اس طرح پڑے ہوئے تھے کہ ان کے گلے کٹے ہوئے تھے اور ہر طرف خون ہی خون بکھرا ہوا تھا جبکہ انسپکٹر پانڈے اور سب انسپکٹر غائب تھے اور غار میں جمع کیا جانے والا مال و زر اور نقد رقم بھی غائب تھی۔ کہیں ایک تنکا تک نظر نہیں آرہا تھا جبکہ کلکتہ (موجودہ کول کتا) سے آیا ہوا وہ پنڈت ایک دن پہلے جب مندر کو لوٹنے کی ایک ناکام کوشش ہو چکی تھی، اپنی آنکھوں سے وہاں دولت کے انبار دیکھ چکا تھا۔

پنڈت اور اس کانسٹیبل کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ انسپکٹر پانڈے اور اس کا ساتھی سب انسپکٹر غار کے اندر پنڈتوں کو قتل کر کے مال و زر اور نقدی لوٹ کر خفیہ راستے سے فرار ہو چکے ہیں۔

پنڈت چیختا ہوا باہر آگیا۔ وہ کانسٹیبل بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا کہ لوگوں کو جب پتا چلے گا کہ یہ واردات پولیس والوں نے کی ہے تو وہ انہیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

پنڈت کی چیخ پکار سے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ ہر شخص غار میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کانسٹیبل کسی طرح مندر سے باہر آگیا اور مندر کے گیٹ پر متعین اپنے ساتھی کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ وہ دو بجے کے قریب یہاں پہنچے اور صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"ہماری اطلاع کے مطابق انسپکٹر پانڈے کو سب انسپکٹر جگدیش، حوالدار منگل سنگھ اور ایک کانسٹیبل کے ساتھ نیلے رنگ کی ایک کار میں الور سے دہلی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔"

"کیا انسپکٹر پانڈے اور اس کے ساتھی وہاں سرکاری ڈیوٹی پر تھے؟" میں نے بھنڈاری کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"ہم سرکاری طور پر وہاں کسی کی ڈیوٹی نہیں لگا سکتے کیونکہ۔۔۔"

"کیونکہ یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے کہ ان پہاڑیوں میں ہر سال ایک بہت بڑا میلا لگتا ہے اور اس کالی کے چرنوں پر انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں لوگ دھرم کے معاملات میں کتنے حساس ہوتے ہیں" مسٹر بھنڈاری نے کہا "دیوی کے چرنوں پر انسانی جان کی بھینٹ صریح قتل ہے لیکن وہ کیا ہے کہ ان پنڈتوں کو کچھ نیتاؤں کی حمایت حاصل ہے۔ تین سال پہلے ان کے خلاف کیس بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن سرکار پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ یہ کیس واپس لینا پڑا اور ویسے بھی یہ لوگ بھینٹ کے لیے ان لوگوں کو پکڑ کر لاتے ہیں جن کا کردار نہایت گھناؤنا ہوتا ہے۔ چور' ڈاکو' غنڈے' بدمعاش اور وہ قاتل جو قانون کو چکر دے کر سزا سے بچ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوسروں کی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں لیکن خود ہر سزا سے بچے رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ ان پنڈتوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور قانون کو بھی ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"عجیب منطق ہے" میں نے کہا "گویا قانون نے اجازت دے رکھی ہے کہ دھرم کے نام پر جس کو چاہو پکڑ کر ذبح کر ڈالو؟"

"یہ بات نہیں ہے ہمت سنگھ جی!" مسٹر بھنڈاری نے کہا "بعض معاملات میں قانون کو چشم پوشی کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال' یہ ایک لمبی بحث ہے۔ آپ ہماری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ ہم تو کٹھ پتلیاں ہیں۔ دوسروں کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچنے والے۔ ہمارے پاس تو اتنے اختیارات بھی نہیں ہیں کہ میلے میں آنے والوں کو پہاڑیوں میں داخل ہونے سے روک سکیں۔"

"حیرت ہے' آپ اختیارات کی بات کر رہے ہیں۔ مجبوریوں کا رونا رو رہے ہیں" میں نے چڑ کر کہا "ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں پولیس والوں کے پاس لامحدود اختیارات ہیں۔ ایک معمولی سا کانسٹیبل بھی کسی راجا کو سڑک پر ننگا کر سکتا ہے اور۔۔۔"

"آپ اس بحث میں مت پڑیں ہمت سنگھ جی!" بھنڈاری نے مجھے ٹوک دیا۔

"ٹھیک ہے۔ یہ آپ کا مسئلہ ہے" میں نے کہا "ابھی ٹھاکر جی نے بتایا تھا کہ آپ ہم سے بھی کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں!" بھنڈاری سنبھل کر بیٹھ گیا "آپ لوگ بھی وہاں موجود تھے اور آپ لوگوں نے مندر میں ڈکیتی کی واردات کو ناکام بنایا تھا جس میں دو سادھو مارے گئے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ ان کے علاوہ بھی تین چار ہلاک ہوئے تھے۔"

"ہمارا ان ہلاکتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے" میں نے کہا۔

"میں ان ہلاکتوں سے آپ کا کوئی تعلق ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا" بھنڈاری مسکرادیا "لیکن مجھ تک جو اطلاعات پہنچی ہیں ان کے مطابق آپ کو معلوم تھا کہ وہاں اس قسم کی کوئی واردات ہونے والی ہے اور اس سے کئی روز پہلے آپ نے ڈھول پور کے پنڈت سوبھراج نامی ایک شخص کو انسپکٹر پانڈے کے حوالے کیا تھا۔ اس کا اس معاملے سے تعلق تھا؟"

"یہ بات آپ اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ضرور پوچھ لیتا" بھنڈاری بولا "بشرطیکہ وہ یہاں ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک گیا۔

"آج صبح سویرے ایک سنتری کو قتل کر کے وہ حوالات سے فرار ہو گیا ہے" بھنڈاری نے جواب دیا۔

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "بات دراصل یہ ہے مسٹر بھنڈاری" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں "ہمیں دارا نامی ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو ہمارے ساتھ فراڈ کر چکا ہے۔ اس نے جے پور میں ٹھاکر جی کے ریسٹورنٹ کو بھی آگ لگوا کر تباہ کر دیا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں تھے ہمیں پتا چلا کہ وہ اپنے دو گرگوں کے ساتھ سادھوؤں کے بھیس میں سارسکا آیا ہوا ہے۔ ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے تھے کہ بیچ میں گنگولی چوہدری والا واقعہ پیش آگیا۔ ہماری ایک دوست بھی اس لپیٹ میں آگئی جسے چھڑانے کے لیے ہمیں بہت کشٹ اٹھانا پڑا۔ بہرحال اس واقعے سے نمٹنے کے بعد ہم نے اپنے اصل کام کی طرف توجہ دی تو ہمیں پتا چلا کہ وہ سادھو ڈھول پور کے مندر میں چھپے ہوئے ہیں۔

"وہ تینوں سادھو ہمارے پہنچنے سے پہلے ڈھول پور سے جا چکے تھے۔ ہمارا سامنا پنڈت سوبھراج سے ہو گیا جس نے انکشاف کیا کہ ان تین سادھوؤں میں ایک عورت بھی ہے۔ میں نے ذرا سختی کی تو پنڈت سوبھراج کھل گیا۔ اس نے ان کے بارے میں کچھ ایسے سنسنی خیز انکشافات کیے کہ میں ا[illegible]

چھوڑ نہیں سکتا تھا۔" میں چند لمحے خاموش رہنے کے بعد چتوڑ گڑھ کی اس نوعمر لڑکی کے بارے میں بتانے لگا جو سوبھراج اور بلونت سنگھ کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ اس تفصیل کے بعد میں نے واقعات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان تین سادھوؤں میں ایک تو وہ خوبصورت دراز قامت لڑکی تھی جس کا نام امبر تھا۔ وہ ہماری ایک عزیزہ ڈاکٹر رادھا کی بھانجی تھی۔ دارا اور بلونت سنگھ نے اسے زبردستی اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ وہ ان دونوں کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی تھی بالآخر بلونت سنگھ کے ہاتھوں ماری گئی۔ دوسرا ہمارا مطلوبہ آدمی دارا اور تیسرا بلونت سنگھ تھا۔ بلونت سنگھ خود نوعمر لڑکی کے قتل میں ملوث ہونے کے باوجود پنڈت سوبھراج کو بلیک میل کر رہا تھا۔ پنڈت سوبھراج ہی نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ تینوں سادھو پہاڑیوں میں کالی کے میلے میں گئے ہیں۔ وہاں ان کا کوئی بڑی واردات کرنے کا ارادہ ہے اور اس کے بعد وہ ڈھول پور واپس آکر چند روز اس کے ہاں پناہ لیں گے۔

"میں نے پنڈت سوبھراج کو انسپکٹر پانڈے کے حوالے کر دیا کہ چتوڑ گڑھ میں اس لڑکی کے قتل کے بارے میں تحقیقات کرے۔ اس سے اگلے ہی روز ٹھاکر جی اور ان کی دوست روپ متی کو حادثہ پیش آگیا اور ہم کئی روز تک کسی اور طرف توجہ نہیں دے سکے اور پھر ہم بھی سادھوؤں کے بھیس میں میلے میں پہنچ گئے۔ ہمارا بھیس بدلنے کا مقصد یہ تھا کہ دارا اور اس کے ساتھی ہمیں پہچان کر بھاگ نہ جائیں۔ اسی دوران میں وہاں انسپکٹر پانڈے سے ملاقات ہو گئی اور وہاں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ کے آدمی آپ کو بتا چکے ہیں۔"

"کیا انسپکٹر پانڈے نے یہ بتایا تھا کہ وہ سرکاری ڈیوٹی پر ہے؟" میرے خاموش ہونے پر بھنڈاری نے پوچھا۔ انسپکٹر جارمنی داس اس دوران میں خاموش ہی بیٹھا رہا تھا اور ٹھاکر نے بھی ہم دونوں کی گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "میں نے اس سے یہ سوال کیا تھا اور اس نے بتایا کہ وہ پوجا کے لیے آیا ہوا ہے۔ مندر کے پیچھے والے غار میں جو کچھ بھی ہوا تھا' اس کے بعد انسپکٹر پانڈے نے اس خزانے کی حفاظت کی ذمے داری لے لی تھی اور مجھے اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ اب وہاں ایسی کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکے گی۔ اسی دوران میں رات کو ہماری یہ دوست" میں نے جانکی کی طرف اشارہ کیا "پہاڑی سے گر کر زخمی ہو گئی اور انسپکٹر پانڈے نے بڑی مہربانی کی کہ ہمیں اپنی جیپ میں یہاں بھیج دیا۔"

میری اس کہانی میں تھوڑا سا جھوٹ بھی شامل تھا' دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں۔۔کیونکہ ان دونوں کے بارے میں اگر اصل بات بتادی جاتی تو ہمارے لیے کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ بلونت سنگھ اگرچہ ٹھاکر کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا لیکن میں نے اس کی ہلاکت بھی پولیس کے کھاتے میں ڈال دی تھی۔ وہاں قانون بھی بے بس ہو گیا تھا تو ہمیں اپنے آپ کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

اے سی پی بھنڈاری اور انسپکٹر جارمنی داس کافی دیر تک مجھ سے اور ٹھاکر سے سوالات کرتے رہے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ہم بھی انسپکٹر پانڈے کے ساتھ اس ڈکیتی میں ملوث ہو سکتے ہیں۔

"مسٹر بھنڈاری!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "پہاڑیوں میں لگنے والا یہ میلا کسی سرکاری ریکارڈ میں نہیں ہے۔ آپ کا قانون بھی اس سے قطعی لاعلم ہے۔ تین دنوں کے دوران میں ان پہاڑیوں میں کم از کم دس افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ تین کو تو کالی کے قدموں میں ذبح کیا گیا اور باقی پولیس یا انسپکٹر پانڈے اور اس کے آدمیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ قانون ان دس ہلاکتوں کو نظرانداز کر رہا ہے تو مندر میں ڈکیتی کی واردات کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جا رہی ہے۔ کیا لوٹی جانے والی وہ دولت دس گیارہ انسانی جانوں سے زیادہ قیمتی ہے؟"

"میلا ریکارڈ پر نہیں ہے لیکن کالی کا مندر اپنا وجود رکھتا ہے" بھنڈاری نے جواب دیا "ہم میلے کے حوالے سے ان ہلاکتوں کو سرکاری کاغذات پر نہیں لا سکتے لیکن مندر میں ہونے والی ڈکیتی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تحقیقات تو ہمیں کرنی پڑے گی۔ چار پانچ پنڈت اس وقت بھی میرے دفتر کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ان پنڈتوں اور پجاریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دولت کو ان کے دھرم میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اس کی پوجا کرتے ہیں۔ کالی کے اس مندر میں تین پنڈتوں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ ان کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا گیا لیکن دولت لٹ جانے سے ان کی نانی مری جا رہی ہے۔"

"ہم اس سلسلے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں" ٹھاکر نے پہلی مرتبہ زبان کھولی "ہم جو کچھ جانتے تھے وہ آپ کو بتا دیا۔ ہم کسی کے دل کا حال تو نہیں جانتے۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ انسپکٹر پانڈے نے پہلے ہی سے ایسا کوئی منصوبہ

بنا رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھاکر جی!" بھنڈاری گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "آپ لوگوں کو زحمت دی۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں" وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "اپنا خیال رکھنا ہمت سنگھ جی۔ گنگولی چوہدری کا زندہ بچ جانے والا آدمی انوپم تمہارے لیے کسی وقت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ! میں خیال رکھوں گا" میں نے جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد بھی ہم دیر تک انسپکٹر پانڈے کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مجھے واقعی بڑی شدید حیرت ہو رہی تھی۔ پانڈے جیسا فرض شناس اور ذمے دار آفیسر۔ لیکن پھر دولت ایسی چیز ہے جس کی چمک آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی ہے۔ بڑے بڑے نیک اور دیانت دار لوگ اس سنہری جال میں پھنستے ہیں تو نکل نہیں پاتے۔

پانڈے انسپکٹر تھا۔ اس کی تنخواہ بھی محدود ہوگی اور وہ رشوت بھی نہیں کھاتا تھا۔ اس کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ اس کے پاس سب کچھ ہو۔ وہ چاہتا تو رشوت لے کر اپنی خواہشات پوری کر سکتا تھا لیکن اس نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا اور پھر مندر میں زر و جواہر کے انبار دیکھ کر شاید اس کی نیت بدل گئی تھی۔

ہو سکتا ہے اس نے پہلے سے مندر کو لوٹنے کا منصوبہ بنا رکھا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دولت کا ڈھیر دیکھ کر اچانک ہی اس کے دل میں اسے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ اس نے اپنے بھروسے کے آدمیوں سے بات کی اور وہ بھی آمادہ ہوگئے۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی دولت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

بہرحال جو کچھ بھی ہوا تھا، میرے خیال میں بہت برا ہوا تھا۔ انسپکٹر پانڈے کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک مثالی پولیس آفیسر کا جو خوبصورت تصور قائم ہوا تھا وہ ایک ہی جھٹکے میں چکنا چور ہوگیا تھا۔

ہم تقریباً ایک ہفتہ مزید سارسکا میں رہے۔ ٹھاکر کی تباہ شدہ پجارو پہلے ہی جے پور بھیج دی گئی تھی۔ جانکی اور روپ متی اب بڑی حد تک ٹھیک ہو چکی تھیں۔ ان کے زخم مندمل ہو رہے تھے اور اب انہیں صرف آرام کی ضرورت تھی اور یہ آرام گھر جا کر بھی ہو سکتا تھا۔

اور پھر ایک روز صبح سویرے ہم سب لوگ بس پر سوار جے پور جا رہے تھے۔

○☆○

زندگی میں جیسے ٹھہراؤ آگیا تھا۔ کوئی ہلچل نہیں تھی نہ کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ وہی معمول کے شب و روز۔ وہی بیزار کن یکسانیت۔ لگتا تھا جیسے زندگی کی ساری دلچسپیاں ختم ہوگئی ہوں۔

جے پور آنے کے بعد جو ہنگامے شروع ہوئے تھے وہ ختم ہوگئے تھے۔ روپ متی کی زندگی میں جو بھونچال آیا تھا تو وہ گزر گیا تھا۔ اس کا دشمن ختم ہوگیا تھا لیکن میرا دشمن ایک بار پھر مجھے غچا دے گیا تھا۔

ہم پھر ٹھاکر کی اس ٹیلے والی حویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اس مرتبہ تو بملا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہماری عدم موجودگی میں روپ متی کی ملازمہ مندری یہیں رہ رہی تھی۔ واپس آئے تو روپ متی اور جانکی کو زخمی دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی۔ سارسکا میں بملا نے ان دونوں کی بڑی خدمت کی تھی اور اب یہ ذمے داری مندری نے سنبھال لی تھی۔ ٹھاکر کا ایک دوست ڈاکٹر بھی ہر دوسرے دن انہیں دیکھ لیتا تھا۔

میں دن بھر یا تو گھر میں ہی پڑا رہتا یا..... ٹھاکر کے ریسٹورنٹ یا ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتا۔ ٹھاکر نے کہا تھا کہ میں ان دونوں میں سے ایک جگہ سنبھال لوں اور مستقل یہیں رہوں لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو صرف چند روز اور یہاں رہنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکے۔ مجھے یقین تھا کہ دارا مندروں کے حصار سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اسے کسی مندر ہی میں پناہ مل سکتی تھی اور کسی ایسے آدمی کی تلاش میں، میں نے جے پور کے مندروں کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ کبھی بملا میرے ساتھ ہوتی اور کبھی میں اکیلا ہی مندروں میں گھومتا رہتا۔

ہمیں سارسکا سے واپس آئے ہوئے شاید دسواں دن تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ میں اس وقت ٹھاکر کے ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ریسٹورنٹ میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ اِکّا دُکّا میزوں پر ہی گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔

کچن کی طرف سے شور کی آواز سنائی دی تو میں کاؤنٹر سے اٹھ کر کچن میں چلا گیا۔ کک اور اس کا اسسٹنٹ آپس میں کسی بات پر جھگڑ پڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف شکایت کرنے لگے تھے۔ اسسٹنٹ ایک نوعمر لڑکا سا تھا۔ داڑھی مونچھ ابھی نہیں آئی تھی۔ گوری رنگت اور گول مٹول سا چہرہ۔ کک نے اس کے گال پر چٹکی بھری تھی جس پر وہ لڑکا ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ میں نے ڈانٹ

ڈپٹ کر دونوں کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ کچن سے باہر آتے ہوئے بائیں طرف کی ایک میز پر ایک جوڑے کو بیٹھے دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ جب میں کچن میں گیا تھا تو یہ میز خالی تھی۔ یہ گاہک میرے بعد یہاں آ کر بیٹھے تھے اور وہ دونوں آمنے سامنے کی کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے ایک دوسرے کے برابر کرسیوں پر بیٹھے تھے اور مرد نے اپنا ایک ہاتھ عورت کی پشت پر رکھا ہوا تھا۔

اس عورت کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ گوری رنگت پر نیلے رنگ کی ساڑی جچ رہی تھی۔ وہ سڈول جسم کی مالک ایک حسین عورت تھی۔ ڈارک براؤن لہریے دار بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد کی عمر بھی پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی اور میں ٹھٹکا اسی کو دیکھ کر تھا۔ اس کے سر کے بال چھوٹے تھے جو سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس کی رنگت گندمی اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سونے کی ایک چین گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ لاکٹ کی جگہ تقریباً ایک انچ لمبی اور نصف انچ چوڑی سونے کی پلیٹ تھی جس پر کچھ کندہ تھا۔ اس کی گردن پر ذرا دائیں طرف ایک انچ لمبے زخم کا نشان تھا۔

اس شخص نے بھی میری طرف سرسری سے انداز میں دیکھا۔ عورت کی پشت سے ہاتھ ہٹا لیا اور ویٹر کو اشارہ کیا جو اسی طرف آ رہا تھا۔

میں کاؤنٹر کے پیچھے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بار بار اس شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ یہاں سے اس کا چہرہ اگرچہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہو لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی گردن پر زخم کا وہ نشان میرے ذہن میں الجھن سی پیدا کر رہا تھا اور میں اس نشان کے حوالے سے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور پھر میرے دماغ میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آگیا کہ زخم کا وہ نشان میں نے کس کی گردن پر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پنڈت سوبھراج کا نام ابھرا تھا۔

میں آنکھیں بند کر کے چشمِ تصور سے پنڈت سوبھراج کو دیکھنے لگا۔ بات زیادہ پرانی تو نہیں تھی۔ چند روز پہلے ہی تو دھول پور میں پنڈت سوبھراج سے ملاقات ہوئی تھی اور میں بھلا اس ملاقات کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ پنڈت سوبھراج کا پیکر میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ مخصوص انداز میں بندھی ہوئی دھوتی، جسم کے بالائی حصے پر پیلے رنگ کی چادر جس پر جابجا لفظ "اوم" چھپا ہوا تھا۔ پیروں میں لکڑی کی کھڑاؤں، گنجا سر، ماتھے پر سفید قشقہ، اس سے ذرا اوپر درمیان سرخ ٹیکا اور دونوں رخساروں پر بھی اوپر سے نیچے سیندور سے لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور قدرے چھوٹی تھیں۔ دونوں کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں۔ وہ صورت ہی سے کٹر، متعصب اور کینہ پرور ہندو لگتا تھا۔ اس کی گردن پر ذرا دائیں طرف تقریباً ایک انچ لمبا پرانے زخم کا نشان بھی تھا۔

ویٹر کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سمجھا تھا شاید مجھے نیند آ رہی ہے۔ وہ کسی گاہک کا بل لے کر آیا تھا۔ سو کے نوٹ میں سے بل کی رقم کاٹ کر میں نے باقی پیسے پلیٹ میں رکھ دیے اور کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر کچن کی طرف چل پڑا۔

ویٹر نے ان دونوں کی میز پر کافی سرو کر دی تھی۔ میں ان کی طرف دیکھے بغیر کچن میں چلا گیا اور ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہوگیا جہاں سے میں اس شخص کو دیکھ سکتا تھا لیکن میں اس کی نظروں میں نہیں آ سکتا تھا۔

اس رخ سے روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر میں اپنے آپ میں سنسنی کی لہریں سی دوڑتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ اب اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ پنڈت سوبھراج ہی تھا لیکن اب اسے پنڈت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس نے بڑی مہارت سے اپنا حلیہ تبدیل کیا تھا۔ بے ترتیب داڑھی مونچھیں صاف کر دینے سے ہی اس کے چہرے پر بڑی تبدیلی آگئی تھی اور باقی کمی دوسری چیزوں نے پوری کر دی تھی۔ اس کی بٹن جیسی آنکھیں اگرچہ کالی تھیں لیکن آج کل تو آنکھوں کی رنگت تبدیل کرنا بھی کچھ مشکل نہیں رہا تھا۔ نیلے رنگ کے کونٹیکٹ لینسز نے اس کی آنکھوں کی رنگت بھی بدل دی تھی۔ اس نے گنجے سر پر یقیناً وگ لگا رکھی تھی۔ چند روز میں بال اتنے بڑے نہیں ہو سکتے۔ اس کے کانوں میں اگرچہ بالیاں نہیں تھیں لیکن سوراخوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

وہ سوبھراج ہی تھا اور مجھے اس کی ہمت کی داد دینی

پڑی۔ ہم نے اسے سارسکا میں انسپکٹر پانڈے کے حوالے کیا تھا تاکہ کئی سال پہلے چتوڑ گڑھ میں سوبھراج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والی معصوم لڑکی کی ہلاکت کی تحقیقات کی جاسکے لیکن چند روز پہلے وہ سارسکا کے پولیس اسٹیشن میں ایک سنتری کو قتل کرکے حوالات سے بھاگ نکلا تھا۔ اسے تو اتنی دور چلے جانا چاہیے تھا کہ پولیس اس کی گرد کو بھی نہ پاسکے لیکن وہ جے پور میں عیش کررہا تھا جبکہ سارسکا یہاں سے صرف دو ڈھائی گھنٹوں کے فاصلے پر تھا۔ وہ واقعی حوصلہ مند آدمی تھا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ پنڈتوں والا بھیس ختم کردینے سے اس کے حلئے میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ اسے پنڈت سوبھراج کی حیثیت سے کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا اور میری نظروں میں بھی وہ محض اتفاق سے آگیا تھا۔ اگر اس کی گردن پر زخم کا وہ نشان دکھائی نہ دیتا تو شاید میں بھی اسے نہ پہچان سکتا۔ زخم کا وہ پرانا نشان ہی میرے تجسس کا باعث بنا تھا اور میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں بھی دو مرتبہ اس کے سامنے سے گزرا تھا۔ کہیں اس نے بھی تو مجھے نہیں پہچان لیا؟

میرے خیال میں اس نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ دھول پور میں جب ہمارا آمنا سامنا ہوا تھا تو میں بھی سادھو کے بھیس میں تھا اور اب میرا حلیہ بھی اس سادھو سے بہت مختلف تھا۔ اس نے یقیناً مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اگر پہچان لیا ہوتا تو وہ اس عورت کے ساتھ اس طرح اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں نہ لے رہا ہوتا۔

میں ایسے لوگوں کے بارے میں خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ جو لوگ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب ہوں یا کسی اور وجہ سے پکڑے جانے کا خوف ہو یا کسی دشمن کی طرف سے وار کا اندیشہ ہو' ایسے لوگ لاکھ حلیہ بدل لینے کے باوجود چوکنا اور چوکس رہتے ہیں اور کسی مشتبہ شخص کو دیکھ کر وہاں ٹکنے کے بجائے فرار کا راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ میں خود بھی کئی مرتبہ ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوچکا تھا۔

"کیا چاہیے سر' آپ کو کسی چیز کی تلاش ہے؟"

شیف کی آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اوہ' کچھ نہیں" میں نے بات بنائی "یونہی' ذرا تمہاری اس راج دھانی کا معائنہ کررہا تھا۔"

میری اس بات پر شیف بھی مسکرا دیا۔ کچن میں اور بھی کئی خانساماں اور دوسرے ملازم موجود تھے اور غالباً کسی کو یہ شبہ نہیں ہوا تھا کہ میں کچن میں کیوں آیا تھا۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا جیسے واقعی کچن کا معائنہ کررہا ہوں۔ پھر سامنے والے دروازے سے ہال میں آنے کے بجائے پہلو کے دروازے سے نکل گیا۔

اس طرف ایک تنگ سی راہداری تھی جو آگے جاکر اس کشادہ راہداری سے مل جاتی تھی جہاں اوپر ہوٹل میں جانے کے لیے زینہ تھا اور اس زینے کے نیچے ریسٹورنٹ میں آنے کے لیے بھی ایک چھوٹا دروازہ تھا۔

اس دروازے سے اندر داخل ہوا تو کاؤنٹر کے قریب ٹھاکر کو کھڑے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اچھا ہوا تم آگئے۔ ورنہ آج ایک شکار ہاتھ سے نکل جاتا" میں نے اس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

"کیا مطلب؟ کیا تم نے شکار کھیلنا بھی شروع کردیا ہے" ٹھاکر مسکرایا۔ "لیکن میں زیادہ دیر یہاں نہیں رکوں گا۔ باہر گاڑی میں ہملا بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی تھی۔ تین گھنٹے سے مجھے پورے شہر میں گھمارہی ہے۔ ایک چیز گھاٹ دروازے سے خریدی جارہی ہے تو دوسری چیز بھوانی سنگھ مارگ سے اور تیسری چیز کے لیے سوائے ڈیوڑھی کی طرف دوڑ لگائی جارہی ہے۔ اس لڑکی نے تو مجھے بری طرح تھکا دیا ہے۔ میں تو تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ بارہ بجے یہاں کے معاملات پرکاش کے حوالے کرکے گھر آجانا۔ ویسے تم کس شکار کی بات کررہے ہو۔ کسی لونڈیا سے تو تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ کون ہے وہ؟"

"پنڈت سوبھراج!" میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔

"چونکو نہیں" میں نے کہا "دائیں طرف سیکنڈ لاسٹ ٹیبل پر ایک کپل بیٹھا ہوا ہے۔ اس عورت کو تو میں نہیں جانتا کہ کون ہے مگر وہ آدمی پنڈت سوبھراج ہے۔ اس کا حلیہ بہت بدلا ہوا ہے۔ اسے پہچاننا آسان نہیں۔ میں نے تسلی کرلی ہے۔ وہ سوبھراج ہی ہے۔"

ٹھاکر نے بالکل غیر محسوس انداز میں اس طرف دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں' یہ وہی ہے" میں نے جواب دیا "تم یہاں کاؤنٹر پر بیٹھو اور گاڑی کی چابی مجھے دو۔"

"ہملا گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہے اور چابی بھی لگی ہوئی ہے" ٹھاکر نے جواب دیا "لیکن اب اس سے ہمارا کیا واسطہ۔ وہ پولیس کی حراست سے بھاگا ہے۔ پولیس جانے

اور وہ جانے۔ بلونت سنگھ بھی اب ختم ہوچکا ہے اور۔"

"دارا ابھی زندہ ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہوسکتا ہے یہ دارا کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ ایسے لوگ ایک دوسرے سے دور رہ کر بھی ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔"

"سوچ لو۔ کسی نئی مصیبت میں مت پھنس جانا" ٹھاکر بولا۔

"مصیبتوں سے گزر کر ہی تو سکھ اور شانتی کا راستہ ملتا ہے" میں نے جواب دیا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

پارکنگ ایریا کی بائیں طرف فٹ پاتھ کے ساتھ ٹھاکر کی نیلی کار کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھ گیا۔ ہملا پسنجرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرادی اور جب میں نے غور سے ہملا کی طرف دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔

وہ ایک مختصر سا بلاؤز اور منی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ سیٹ پر بیٹھنے سے اس کا اسکرٹ سمٹ کر کچھ اور اوپر ہوگیا تھا۔ ایک براہمن پنڈت کی اس بیٹی کو دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہوتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو کپڑوں کے یہ چیتھڑے بھی بدن پر سجانے کا تکلف نہ کرتی لیکن یہ غنیمت تھا کہ یہ گھر سے نکل کر کسی طرح ٹھاکر جیسے شریف انسان کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اگر کسی اور کے ہتھے چڑھ جاتی تو اس کا حشر ہوچکا ہوتا۔

"تم گاڑی چلالیتی ہونا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت اچھی طرح۔ بلکہ تم سے زیادہ اچھی طرح" ہملا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ تم اسٹیئرنگ سنبھالو۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہوں" میں ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"پچھلی سیٹ پر کیوں ہمت سنگھ جی۔ میرے قریب بیٹھنے کی ہمت نہیں ہے کیا؟" اس نے شوخ لہجے میں کہا اور اپنی سیٹ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگئی اور انجن اسٹارٹ کردیا۔

"انجن بند کردو اور اندر کی بتی بھی بجھادو۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے ہمت سنگھ جی۔ روشنی سے ڈر لگ رہا ہے کیا؟" ہملا نے کہا۔ اس کے لہجے کی شوخی برقرار تھی "اور یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟"

"فی الحال نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر میں بھی پیچھے آجاؤں؟" اس نے کہا۔

"اس سیٹ پر کانٹے چبھ رہے ہیں کیا؟ آرام سے بیٹھی رہو" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

"ڈانٹنا بھی جانتے ہو" ہملا ڈھٹائی سے مسکرائی پھر بولی "کیا بات ہے' ٹھاکر جی کا انتظار ہے کیا؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "ابھی تھوڑی دیر میں ایک عورت اور ایک مرد ریسٹورنٹ سے نکلیں گے۔ اگر وہ کسی ٹیکسی یا رکشا وغیرہ میں بیٹھے تو ان کا تعاقب کرنا ہے مگر بڑی ہوشیاری سے۔ انہیں شبہ نہ ہونے پائے۔"

"تمہیں دلچسپی کس سے ہے' عورت سے یا مرد سے؟" ہملا نے کہا۔ پھر جلدی سے بولی "لیکن شاید میرا یہ سوال ہی غلط ہے۔ تمہیں کسی عورت سے دلچسپی کیوں ہونے لگی البتہ میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ وہ مرد کون ہے؟"

"پنڈت سوبھراج" میں نے جواب دیا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟" ہملا نے پوچھا۔

"سارسکا میں ٹھاکر اور روپ متی کا ایکسی ڈنٹ ہونے سے ایک روز پہلے ہم' دارا اور بلونت سنگھ کی تلاش میں دھول پور گئے تھے۔ بلونت سنگھ وغیرہ تو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل چکے تھے البتہ پنڈت سوبھراج سے ایک یادگار ملاقات ہوگئی تھی اس نے کچھ ایسے انکشافات کیے تھے کہ ہمیں اسے پولیس کے حوالے کرنا پڑا اور اس روز اسپتال میں اے سی پی بھنڈاری نے تمہارے سامنے ہی بتایا تھا کہ پنڈت سوبھراج ایک سنتری کو قتل کرکے حوالات سے فرار ہوگیا تھا اور یہی پنڈت سوبھراج اس وقت ایک حسین عورت کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا کافی پی رہا ہے۔"

"میری ایک بات مانو ہمت سنگھ جی!" ہملا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اپنا جیون بلاوجہ جوکھوں میں مت ڈالو۔ یہ معاملہ پولیس کے لیے چھوڑدو۔ وہ خود ہی اسے تلاش کرلیں گے۔ تم کیوں کشٹ اٹھاتے ہو؟"

"وہ چاہے چھ قتل اور بھی کردے تو مجھے پروا نہیں ہوگی لیکن یہ واحد شخص ہے جس سے دارا کے بارے میں کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" ہملا نے کہا "پھر تو میں جہنم تک اس کا پیچھا کرنے کو تیار۔۔۔"

"جہنم میں نہیں۔ ہمیں اس دنیا ہی میں اس کو پکڑنا ہے" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

بملا سے باتیں کرتے ہوئے میں بار بار ریسٹورنٹ کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید بملا نے سوچا ہو کہ میں اس کے لباس کی وجہ سے اسے نظرانداز کرنے کے لیے پچھلی سیٹ پر آیا ہوں لیکن میرے پچھلی سیٹ پر آنے کی دو وجوہات تھیں۔ سوبھراج اتنا بے پروا بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اپنے تعاقب پر توجہ نہ دیتا۔ مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھ کر اسے کسی قسم کا شبہ ہو سکتا تھا۔ اگر ایک خوبصورت لڑکی پیچھے آ رہی ہو تو اس پر زیادہ شبہ نہیں ہوتا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ مجھے نہ دیکھ پائے اس لیے میں نے کار کی اندر کی بتی بھی آف کروادی تھی۔

بیس منٹ گزر گئے۔ اس دوران میں دو تین گاہک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تھے اور ایک جوڑا باہر بھی نکلا تھا۔ پانچ منٹ اور گزر گئے۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ ایک بار پھر کھلا اور اس مرتبہ سوبھراج کو اس عورت کے ساتھ برآمد ہوتے دیکھ کر میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہی ہیں وہ" میں نے دھیمے لہجے میں بملا کو بتایا "لیکن ابھی انجن اسٹارٹ مت کرنا۔ انہیں کچھ دور نکل جانے دو۔"

بملا بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ عورت اور سوبھراج سڑک پر آ کر یا تو وہیں رک کر کسی ٹیکسی وغیرہ کا انتظار کریں گے یا مخالف سمت میں تقریباً ڈیڑھ سو گز آگے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جائیں گے لیکن وہ ہال سے نکلنے کے بعد پارکنگ ایریا کی طرف مڑ گئے اور سرخ رنگ کی ایک فیاٹ کار کے قریب رک گئے۔ عورت نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر سوبھراج کی طرف بڑھا دیا۔ سوبھراج ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور جھک کر پسنجرز سیٹ کے دروازے کی لاک ناب اٹھا دی۔ وہ عورت بھی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

دو منٹ بعد سرخ فیاٹ پارکنگ ایریا سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور ہماری گاڑی کے قریب سے گزر گئی۔ میں جھک کر نیچے ہو گیا تھا لیکن ان دونوں میں سے کسی نے ہماری کار کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

بملا نے کار کا انجن اسٹارٹ کر کے اسے ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ٹھاکر ریسٹورنٹ کے دروازے میں کھڑا تھا۔

اس وقت پونے بارہ کا وقت تھا۔ اسٹیشن روڈ پر اچھا خاصا ٹریفک تھا اور بملا بڑی ہوشیاری سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے سرخ فیاٹ اور اپنے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ رکھا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ کسی کے تعاقب کے لیے یہ بہت مناسب فاصلہ تھا۔

سوبھراج کی کار ایک اور سڑک پر گھوم کر ہوٹل اشوک کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ اس سڑک پر کچھ ٹریفک تھا اس لیے تعاقب کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اشوک ہوٹل سے آگے سوائے جے سنگھ ہائی وے کے واٹرورکس روڈ کی طرف مڑتے ہی بملا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس نے درمیانی فاصلہ کچھ اور بڑھا دیا۔ اس سڑک پر ٹریفک برائے نام ہی تھا اور اندیشہ تھا کہ سوبھراج کو تعاقب کا شبہ ہو جائے۔

واٹرورکس روڈ آگے جا کر نروان مارگ سے مل جاتی تھی لیکن وہاں تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ سوبھراج کی فیاٹ دائیں طرف ایک ذیلی سڑک پر مڑ گئی تھی۔ اس طرف رہائشی بنگلے تھے اور کئی گلیاں تھیں۔

بملا نے کار اس طرف موڑنے سے پہلے ہی ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ اگلی کار ہم سے تقریباً دو سو گز آگے تھی اور پھر وہ کار ایک گلی میں مڑ گئی۔ بملا نے عقلمندی یہ کی کہ کار گلی میں گھمانے کے بجائے موڑ پر روک لی اور انجن بند کر دیا۔

میں کار سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کارنر والے بنگلے کی دیوار کی آڑ سے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ تقریباً پچاس گز آگے وہ کار ایک بنگلے کے سامنے رکی ہوئی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور وہ عورت کار سے اتر کر بنگلے کا گیٹ کھول رہی تھی۔

سرخ فیاٹ بنگلے میں داخل ہو گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ میں گلی میں چلتے ہوئے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا اور تھوڑی دور آگے جانے کے بعد واپس آ گیا۔ بنگلے کے گیٹ اور برآمدے کی بتی نہیں جلائی گئی تھی لیکن برآمدے کے ساتھ دائیں طرف والی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

وہ گلی کے موڑ سے چوتھا بنگلا تھا۔ واپس آ کر میں گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بملا نے میرے بیٹھتے ہی انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔

"آگے والی گلی میں موڑ لو" میں نے اشارہ کیا۔

کار اس گلی سے آگے نکل کر بنگلے کی پیچھے والی گلی میں مڑ گئی۔ گلی کے اختتام پر دائیں بائیں سڑک تھی اور سامنے پارک تھا۔ میرے اشارے پر بملا نے کار دائیں طرف موڑ کر پارک کے جنگلے کے ساتھ ایک درخت کے نیچے روک کر انجن بند کر دیا۔

"تم کار ہی میں بیٹھی رہو۔ ڈرو گی تو نہیں؟" میں نے اپنی

طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"اب مجھے ڈر نہیں لگتا اور اس وقت تو۔۔" اس نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر اس میں رکھا ہوا پستول نکال لیا اور پُراعتماد لہجے میں بولی "اور اس وقت اگر کسی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تو گولی سے اڑا دوں گی۔"

"یہ پستول تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" میں چونک گیا۔

"ٹھاکر جی نے رکھا تھا اور مجھے بھی بتا دیا تھا" بملا نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں کار سے اتر آیا۔ بملا نے دروازہ اندر سے لاک کر کے کار کی پارکنگ لائٹ بجھا دی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ پستول اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔ اس کے پاس پستول کی موجودگی سے مجھے بھی اطمینان ہو گیا تھا۔

میں گلی میں چلتے ہوئے اس بنگلے کی پشت پر آ گیا۔ سوبھراج اور اس عورت کے بارے میں، میں اب بھی الجھن کا شکار تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ ریسٹورنٹ میں ان دونوں کو دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ وہ کوئی شکاری عورت ہے لیکن کار میں بیٹھنے سے پہلے اس عورت نے پرس میں سے کار کی چابی نکال کر جس طرح سوبھراج کے حوالے کی تھی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے تعلقات نئے نہیں ہیں۔ وہ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ سوبھراج تو دھول پور میں رہتا تھا۔ یہاں کسی عورت سے اس کا کیا تعلق؟ میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرا ذہن الجھتا گیا۔

بنگلے کی عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اندر کی طرف ناریل کے دو چار درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ میں دیوار کے قریب رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے والی قطار کے بنگلوں کی پشت بھی اسی طرف تھی۔ یوں بھی رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گلی میں سناٹا تھا اور تاریکی بھی۔

میں نے جھک کر پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ میرا پرانا خنجر تو کالی کے مندر والی پہاڑیوں ہی میں کہیں گر گیا تھا اور جے پور آنے کے بعد مجھے ایک نیا خنجر خریدنا پڑا تھا۔

دیوار پر چڑھنے اور دوسری طرف کودنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہاں کافی کھلی جگہ تھی اور جا بجا گارڈینیا کے پودے لگے ہوئے تھے جن کی شاخیں اوپر سے کاٹ کر چھتریوں جیسی شکل دے دی گئی تھی۔ زمین پر خشک پتے بکھرے ہوئے تھے۔

بنگلے کے دونوں طرف کشادہ گلیارے سے تھے اور وہاں بھی دیواروں کے ساتھ ساتھ پودے لگے ہوئے تھے۔ پچھلی طرف غالباً تین کمرے تھے لیکن تمام کھڑکیاں تاریک تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں سامنے والے رخ پر کسی کمرے میں تھے۔

اس طرف ایک دروازہ بھی تھا جو بند تھا۔ میں دبے قدموں اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ خشک پتے میرے پیروں کے نیچے آ کر چرمرا رہے تھے۔ میں بہت محتاط ہو کر آگے چلتا رہا۔

دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بائیں طرف والے گلیارے میں آ گیا۔ اس طرف ایک کھڑکی میں روشنی تھی۔ اندر کی طرف اگرچہ نیلے رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا لیکن ایک طرف چند انچ کے قریب پردہ ہٹا ہوا تھا۔ میں نے شیشے سے آنکھ لگا دی۔

یہ بیڈ روم تھا۔ وہ عورت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی لیکن آئینے میں اس کا سامنے کا رخ نظر آ رہا تھا۔

سوبھراج بیڈ کی پٹی پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کر رہے تھے لیکن ان میں کسی کی آواز زیادہ اونچی نہیں تھی اس لیے الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

وہ عورت اپنے بدن پر سجے ہوئے زیور اتار رہی تھی۔ پہلے اس نے کانوں کے جھمکے اتار کر اپنے سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے پھر نیکلیس اتارا اور آخر میں چوڑیاں اور انگوٹھیاں اتار کر رکھ دیں۔ سر کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور برش پھیرنے لگی۔

"تم کپڑے بدل لو۔ میں کچن میں جا رہا ہوں۔ چائے کا موڈ ہو رہا ہے۔" سوبھراج یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز بلند تھی اور الفاظ میری سمجھ میں آ گئے تھے۔

سوبھراج کمرے سے نکل گیا۔ وہ عورت بھی برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر کھڑی ہو گئی اور ساڑی کے بل کھولنے لگی۔ اس نے ساڑی اتار کر پھینک دی اور پھر بلاؤز بھی اتار دیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ گردن پر چیونٹیاں سی رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگیں۔ وہ آئینے کے سامنے قدرے آگے جھک کر دائیں کندھے پر انگلی سے ٹٹول کر کچھ دیکھنے لگی پھر سیدھی ہوئی تو اس کا ہاتھ پیٹی کوٹ پر پہنچ گیا۔

اور پھر ٹھیک اسی لمحے اپنے عقب میں خشک پتوں کے... چرمرانے کی آواز سن کر میں تیزی سے پیچھے مڑا لیکن مجھے دیر

ہوچکی تھی۔ سوبھراج نے ڈنڈے سے میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن وار میرے بائیں کندھے پر پڑا اور میں بے اختیار کراہ اٹھا۔

اب بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ انہوں نے شاید کھڑکی کے قریب میری موجودگی کو محسوس کرلیا تھا اور سوبھراج نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت جانتی تھی کہ میں کھڑکی سے جھانک رہا ہوں۔ اس نے محض اس لیے کپڑے اتارنا شروع کردیے تھے کہ میں اس کی طرف متوجہ رہوں اور سوبھراج اپنا کام کرگزرے۔

سوبھراج نے دوسرا وار کرنے کے لیے ڈنڈا سر سے اوپر اٹھایا۔ میرے کندھے پر اگرچہ زوردار ضرب لگی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا' میں نے اس کا وار بائیں کلائی پر روکا اور دائیں ہاتھ سے اس کی بغل میں زوردار گھونسا رسید کردیا۔

سوبھراج اپنی جگہ سے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑلی اور دوسرا گھونسا اس کی کہنی کے نیچے مارا۔ اس مرتبہ وہ کراہ اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سنبھل کر میری پنڈلی پر ٹھوکر ماردی۔ وہ لیدر شوز پہنے ہوئے تھا۔ جوتے کی سخت ٹو ہتھوڑے کی طرح ہڈی پر لگی اور میں ناچ کر رہ گیا۔ سوبھراج نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اچھل کر سائیڈ کک رسید کردی۔ میں نے کک روکنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہتھوڑے جیسی ضرب میرے پہلو میں لگی اور میں لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا۔

یہ کک کھاتے ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میرا مقابلہ کسی سڑک چھاپ غنڈے سے نہیں ایک ماہر مارشل آرٹسٹ سے تھا۔ ڈھول پور میں اس سے دو دو ہاتھ ہوچکے تھے۔

سوبھراج نے دوسری کک لگائی جسے میں نے بڑی پھرتی سے بلاک کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اچھل کر ایک اور کک لگائی لیکن میں نے اس کا یہ حملہ بھی ناکام بنادیا اور پھر وہ پے درپے کک پر کک لگاتا رہا اور میں اس کی ہر کک بلاک کرتا رہا اور بالآخر مجھے بھی جوابی کارروائی کا موقع مل گیا۔ میری پہلی راؤنڈ ہاؤس کک اس کے بائیں بازو پر کہنی اور کندھے کے درمیان لگی۔ وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پے درپے اس پر حملے کرتا رہا۔ اس نے میری ایک دو ککس بڑی خوب صورتی سے بلاک کی تھیں لیکن اس کے باوجود اسے جوابی کارروائی کا موقع نہیں مل سکا۔

ہم دونوں ایک دوسرے پر حملے کرتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے میں آگئے تھے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گارڈینیا کے تراشے ہوئے پودے لگے ہوئے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی وہ فلائنگ کک لگانے کے لیے ہوا میں اچھلا لیکن میں نے اس کے دونوں پیر پکڑ کر ہوا میں ہی اچھال دیا۔ وہ قلابازی کھاتے ہوئے ایک پودے کے اوپر گرا اور شاخیں دبنے سے وہ دوسری طرف لڑھک گیا۔

میں سنبھل کر اس کے اوپر جاگرا اور اسے گھونسوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ سوبھراج کی پٹائی کرتے ہوئے میں اپنے استاد کا دیا ہوا سبق بھول گیا تھا کہ ـــ حریف کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔ اس کی پٹائی کے جوش میں مجھے اس وقت یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ سوبھراج یہاں اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

میں سوبھراج کے سینے پر سوار تھا۔ اِدھر میں نے اس کے جبڑے پر گھونسا مارا' اُدھر میرے سر پر دھماکا ہوا۔ میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ آنکھوں کے سامنے پہلے بجلی کا کوندا سا لپکا پھر رنگ برنگے ذرات ناچنے لگے۔ میں نے سر کو زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے نیچے دبے ہوئے سوبھراج نے مجھے ایک طرف اچھال دیا۔

میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسی لمحے میں نے ایک ہیولے کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔ وہ عورت دونوں ہاتھوں میں ڈنڈا اٹھائے مجھ پر حملہ آور ہورہی تھی۔ میرے سر پر بھی اسی نے ڈنڈے سے حملہ کیا تھا۔

اس مرتبہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کا حملہ روکنے کی کوشش کی۔ ڈنڈا میرے ہاتھ پر لگتے ہوئے سر پر لگا اور اس مرتبہ میں اپنے حواس برقرار نہیں رکھ سکا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

میں شاید زیادہ دیر تک بے ہوش بھی نہیں رہ سکا تھا۔ ہوش میں آیا تو میں ایک کمرے میں قالین پر پڑا ہوا تھا۔ یہ غالباً ڈرائنگ روم تھا۔ کمرا خاصا بڑا تھا۔ صوفوں کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ سامنے ایک صوفے پر سوبھراج کے ساتھ وہ عورت بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر پنٹی کوٹ اور اوپر بلیک رنگ کا مختصر سا اِنرویئر تھا۔ وہ اگرچہ خود بھی نہایت خطرناک شے تھی لیکن اس وقت سب سے زیادہ خطرناک چیز سیاہ رنگ کا وہ پستول تھا جو اس کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر سوبھراج ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور میرے کولھے پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔

"میں نے تمہیں اس وقت دیکھ لیا تھا جب تم بنگلے کی عقبی دیوار سے اندر کودے تھے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی "سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم کون ہو۔ ویسے شکل سے تم پولیس والے تو نہیں لگتے۔"

"پولیس کا خوف تو اسے ہوتا ہے جس نے کوئی جرم کیا ہو۔" میں نے جواب دیا "تمہارے اس جملے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم کسی معاملے میں پولیس کو مطلوب ہو اور میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تم پولیس سے کیوں خوف زدہ ہو پنڈت سوبھراج!"

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔ اس نے عورت کی طرف دیکھا اور پھر میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کردی "تم میری اصلیت جانتے ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن اس سے پہلے میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تم کون ہو؟"

"بہت جلد بھول گئے۔" میں نے جواب دیا "چند روز پہلے ہی تو ڈھول پور میں ہماری دھواں دھار ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے تمہیں پولیس کے حوالے کیا تھا لیکن تم ایک سنتری کو قتل کرکے حوالات سے بھاگ نکلے۔ اس بدلے ہوئے حلئے میں تم پولیس کو تو دھوکا دے سکتے ہو' میری نظروں کو نہیں۔ میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"اوہ!" سوبھراج کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وہ چند لمحے گہری نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر پل پڑا۔ اس مرتبہ اس کی ٹھوکریں زیادہ زوردار تھیں۔ ایک مرتبہ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا کر اسے دبوچ لیا۔ اسی لمحے وہ عورت صوفے سے اٹھ کر میری طرف لپکی۔ اس نے پستول کے دستے سے میرے سر پر ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن وار میرے کندھے پر پڑا۔ میں کراہ اٹھا اور سوبھراج کو میری گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ دونوں میری ٹھکائی کررہے تھے۔

"بس بس۔ بہت ہوچکی۔ اب چھوڑ دو اسے۔"

یہ آواز سن کر ان دونوں کے ہاتھ پیر مشینی انداز میں رک گئے اور اس آواز نے تو مجھے بھی چونکا دیا تھا لیکن اسی لمحے غالباً غیر ارادی طور پر سوبھراج کی ٹانگ حرکت میں آئی تھی۔ اس کی ٹھوکر میرے پہلو پر پڑی اور میں کراہ اٹھا۔

"میں نے کہا نا' بس کرو۔ بچے کی جان لوگے کیا؟" دروازے میں کھڑی ہوئی بملا نے کہا اور پھر اس عورت کو مخاطب کرکے بولی "اے۔ چھمک چھلو۔ اپنے ہاتھ سے پستول پھینک دو۔"

اس عورت نے پستول نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور وہ دستے سے میرے جسم پر ضربیں لگاتی رہی تھی۔ وہ بملا کو دیکھ کر یقیناً بدحواس سی ہوگئی تھی۔ جب کوئی ایسی صورتِ حال ہوتی ہے تو آدمی یقیناً کنفیوز ہوجاتا ہے اور کوئی سیدھی سادی بات بھی فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور وہ عورت بھی کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھی کیونکہ پستول ابھی تک اسی انداز میں پکڑا ہوا تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتی تھی۔

اچانک فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں اس عورت کی چیخ بھی ابھری تھی۔ بملا کی چلائی ہوئی گولی اس کے پیر سے تقریباً ایک فٹ دور قالین پر لگی تھی اور وہ عورت چیختے ہوئے اچھل کر وہاں سے دو قدم دور ہٹ گئی۔ اس کے ہاتھ سے پستول بھی چھوٹ کر گر گیا تھا۔

"چھی چھی۔" بملا اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "کتنی بے شرم ہو تم۔ ایسے کپڑے پہن کر غیر مردوں سے کبڈی کھیلتی ہو۔ جاؤ۔ ڈھنگ کے کپڑے پہن کر آؤ۔" اس نے پستول سے سامنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس عورت کے چہرے پر خوف کے ساتھ آنکھوں میں شدید الجھن کے تاثرات بھی تھے لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اسے جانے کو کہا گیا تھا۔ اس نے جیسے ہی قدم اٹھایا' بملا چیخ اٹھی "ارے نہیں۔ یہیں رک جاؤ۔ باہر جاکر کہیں تم کوئی گڑبڑ نہ کردو۔ اس صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ بیٹھو۔"

بملا نے آخری لفظ اس قدر زور سے چیخ کر کہا تھا کہ وہ عورت بری طرح گڑبڑا گئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی بلکہ وہ صوفے پر گر گئی تھی۔ اس کا چہرہ خوف کی شدت سے پیلا پڑ گیا تھا اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

میں حیرت سے بملا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت کم گو لڑکی تھی اور بہت سنجیدہ گفتگو کرتی تھی۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ایسی کم عمر لڑکی اس قدر سنجیدہ کیسے ہوسکتی ہے اور اس وقت تو وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی لیکن بہرحال' وہ جیسی بھی تھی اس وقت اس نے بازی پلٹ دی تھی۔

"اب تمہاری باری ہے ہمت سنگھ۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس جعلی پنڈت کو اتنی مار لگاؤ کہ اپنا نام بھول جائے اور اس حرافہ کی اب تم فکر مت کرنا۔ یہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھے گی۔"

میں اچانک ہی کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں گھوم گیا۔ اچھلتے ہی میں نے اپنی ایک ٹانگ سمیٹ لی تھی اور دوسری ٹانگ پھیلا کر زوردار کک لگائی۔ میرے پنجے کا نچلا حصہ سوبھراج کی گردن پر لگا اور وہ الٹ کر صوفے کے قریب گرا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال کر دوبارہ اس کی طرف لپکا تو اس نے چیختے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"ٹھہرو... ٹھہرو..."

میں میکانکی انداز میں رک گیا۔

"میں نہیں جانتا تم کون ہو اور میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو۔" سوبھراج بولا "تم اپنے دوست کے ساتھ بلونت سنگھ کے بارے میں پوچھنے ڈھول پور میرے پاس آئے تھے اور اس وقت بھی تم نے میری پٹائی کر دی تھی۔ اگر بلونت سنگھ سے تمہاری کوئی دشمنی ہے تو اس کا بدلہ مجھ سے کیوں لے رہے ہو۔ میں تو خود اس کا ڈسا ہوا ہوں۔"

"میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اس روز ڈھول پور میں تم نے مارشل آرٹ کے بہت شان دار ہاتھ دکھائے تھے لیکن تم تو بالکل پھسپھسے نکلے۔ ایک ہی کک میں ناک آؤٹ ہو گئے۔"

"میں بلاوجہ کسی سے دشمنی نہیں چاہتا اور تمہیں تو میں جانتا بھی نہیں۔" سوبھراج نے جواب دیا "اگر تمہیں بلونت سنگھ سے کسی بات کا بدلہ لینا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میری بربادی کا ذمے دار بھی وہی ہے۔ اگر تم چاہو تو ہم دونوں اس کے خلاف گٹھ جوڑ کر سکتے ہیں۔"

میری نظریں سوبھراج کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ اگرچہ نہایت کینہ خصلت تھا لیکن میرے خیال میں اس وقت وہ مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کر رہا تھا اور اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کی بربادی کا ذمے دار بھی بلونت سنگھ ہی تھا۔ اس روز ڈھول پور میں سوبھراج نے اپنے بارے میں جو کچھ بتا دیا تھا اس سے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک شریف انسان تھا لیکن بلونت سنگھ کی دوستی اسے غلط راستے پر لے گئی تھی اور وہ ایک سنگین جرم میں ملوث ہو گیا تھا۔ پولیس تو اس لڑکی کے قاتلوں کا سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن بلونت سنگھ اسے بلیک میل کرتا رہا تھا اور سوبھراج کو اس سے بچنے کے لیے پنڈت کا روپ دھارنا پڑا تھا لیکن بلونت سنگھ نے اسے دور دراز ڈھول پور جیسے گاؤں میں بھی تلاش کر لیا تھا۔

سوبھراج سے میری بھی کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں تو اس سے دارا کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کالکا کے مندر والی پہاڑیوں کی طرف جانے سے پہلے دارا اور بلونت سنگھ تین چار روز سوبھراج کے پاس رہے تھے۔ ہو سکتا ہے بلونت یا دارا نے اس کے ساتھ کوئی پروگرام بنایا ہو۔ سوبھراج کی باتوں سے میں نے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ اسے ابھی تک بلونت سنگھ کی موت کا پتا نہیں چل سکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "میری بھی تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں تو تم سے چند باتیں پوچھنا چاہتا تھا اور یہ باتیں خوشگوار ماحول میں بھی ہو سکتی ہیں۔ اٹھو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اور یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تم میں سے کسی نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی کو گولیاں چلانے کا بہت زیادہ شوق ہے۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔" سوبھراج نے اٹھتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا "سوبھراج دوستی کا بھوکا ہے۔ سچی اور کھری دوستی۔ دوست بن کر دکھاؤں گا اور تمہارے لیے اپنا جیون بھی قربان کر دوں گا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بڑی گرم جوشی تھی اس کے انداز میں۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑا تو وہ گردن سہلاتے ہوئے بولا۔

"بڑے کڑے ہاتھ ہیں تمہارے۔ میری تو ہڈیاں تک... کڑکڑا اٹھی ہیں۔ کہاں سے سیکھا؟"

"یہ فن سیکھنے کی ابتدا بنکاک سے ہوئی اور آخری سبق شاؤلن ٹیمپل سے حاصل کیا لیکن ابھی بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"شاؤلن ٹیمپل!" وہ اچھل پڑا "میں بھی شاؤلن ٹیمپل جانا چاہتا تھا لیکن بیڑا غرق ہو بلونت سنگھ کا۔ اس نے مجھے دلدل میں دھکیل دیا۔ پتا نہیں کیسے کیسے سپنے دیکھے تھے۔ سب چکنا چور ہو گئے۔"

"ایسا ہوتا ہے۔" میں نے کہا "آدمی جو سوچتا ہے ہمیشہ پورا نہیں ہوتا۔"

"ایک منٹ۔" وہ بولا "اگر تم اجازت دو تو لاجونتی کچن میں جا کر چائے بنا لائے۔"

"جب میں تمہارے بیڈ روم کی کھڑکی کے باہر کھڑا تھا تو اس وقت تم بھی اس سے چائے بنانے کے لیے کہہ کر کچن کی طرف گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"اوہ! تو تم نے سن لیا تھا۔" وہ مسکرایا "لیکن اس کے باوجود تم مار کھا گئے۔"

"تمہاری اس لاجونتی نے حربہ ہی ایسا استعمال کیا تھا کہ

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی مار کھا جاتا۔ بہرحال، اب یہ چائے بنانے کے لیے کچن میں جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

ببلا ابھی تک پستول بدست دروازے میں کھڑی تھی۔ لاجونتی اس کے قریب سے گزری تو ببلا مسکراتے ہوئے راستے سے ایک طرف ہٹ گئی اور لاجونتی کے کمرے سے نکلنے کے بعد وہ بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی۔

"یہ لاجونتی کون ہے اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے سوبھراج کی طرف دیکھا۔

"تین سال پہلے میں ٹھوکریں کھاتا ہوا جے پور آیا تھا تو لاجونتی ہی نے مجھے سہارا دیا تھا۔" سوبھراج نے جواب دیا "اس روز میں جین مندر میں چلا گیا تھا جہاں ایک پنڈت سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ کئی پنڈتوں نے مل کر مجھے بری طرح پیٹ ڈالا اور اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ میں زخمی تھا۔ لوگ میرے قریب سے گزرتے رہے لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ لاجونتی بھی اس وقت مندر میں موجود تھی۔ یہ مجھے اٹھا کر یہاں اپنے گھر لے آئی۔ ڈاکٹر کو بلا کر میرا علاج کروایا اور میری بڑی خدمت کی۔

"ان دنوں بھی میں پجاری ہی کا روپ دھارے ہوئے تھا اور پولیس سے بچنے کے لیے مندروں ہی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لاجونتی کو نجانے کس طرح میری باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ میں پولیس سے چھپنے کی کوشش کر رہا ہوں اور پھر مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتانا پڑا۔

"لاجونتی نے مجھے اپنا حلیہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اپنی داڑھی وغیرہ منڈوانی پڑی۔ پتا نہیں لاجونتی کو میرے اندر ایسی کیا بات نظر آئی تھی کہ وہ مجھے اٹھا کر اپنے گھر لے آئی تھی۔ وہ شاید ہمدردی کا جذبہ تھا لیکن اس میں بتدریج تبدیلی آتی گئی۔ ہمدردی کے بجائے کوئی اور جذبہ اس کے سینے میں جنم لے رہا تھا۔

"میں تین مہینے لاجونتی کے ساتھ اس بنگلے میں رہا۔ میں بہت کم باہر نکلتا اور وہ بھی رات کے وقت... اور پھر ایک رات میں لاجونتی کے ساتھ ایک نائٹ کلب چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے بلونت سنگھ کو دیکھ لیا۔

"اور پھر اس کے بعد میں گھر سے نہیں نکلا۔ میں نے ایک بار پھر داڑھی مونچھیں بڑھانا شروع کر دیں۔ مزید دو مہینے بعد میں نے سر بھی گنجا کروا دیا۔ میرا حلیہ اگرچہ بڑی حد تک بدل چکا تھا لیکن میرے لیے جے پور میں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر پنڈتوں والا روپ دھارا اور سارسکا چلا گیا۔ وہاں مجھے ایک مندر میں پناہ مل گئی اور ایک سال بعد مجھے ڈھول پور والا مندر مل گیا۔ میں اس دوران میں پنڈت ہی کے بھیس میں یہاں بھی آتا رہا۔ میں ڈھول پور کے مندر کو اپنے لیے محفوظ ترین جگہ سمجھتا تھا لیکن ایک روز سارسکا کے بازار میں بلونت سنگھ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ پتا نہیں اس کم بخت نے کس طرح مجھے پہچان لیا تھا۔

"اس کے ساتھ ایک لونڈیا اور ایک سادھو بھی تھا۔ انہیں چند روز کے لیے پناہ چاہیے تھی۔ اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے انکار کیا تو وہ پولیس کو میرے بارے میں بتا دے گا حالانکہ وہ بھی اس جرم میں اتنا ہی ملوث تھا جتنا میں ہو سکتا تھا۔ میں اپنا سکون برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں پناہ دینے کا وعدہ کر لیا لیکن میں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کے واپس آنے سے پہلے مندر چھوڑ کر یہاں آجاؤں گا کیونکہ یہی میرے لیے ایک جائے پناہ تھی لیکن بیچ میں تم لوگ ٹپک پڑے اور تم نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا اور وہاں سے بھاگنے کے لیے مجھے ایک پولیس والے کی جان لینا پڑی۔ یہ میری زندگی کا پہلا جرم ہے جو میں نے دانستہ طور پر کیا تھا۔

"پولیس کو اس پنڈت کی تلاش ہو گی جو ایک سنتری کو قتل کر کے بھاگا ہے۔ یہاں آتے ہی میں نے اپنا حلیہ بدل لیا۔ آنکھوں میں کونٹیکٹ لینسز لگانے سے میری آنکھوں کی رنگت بھی بدل گئی لیکن حیرت ہے تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"تمہارے زخم کے اس نشان سے۔" میں نے اس کی گردن کی طرف اشارہ کیا "جب تم لاجونتی کے ساتھ ریسٹورنٹ میں کافی پینے گئے تھے تو میں بھی وہاں موجود تھا۔ تمہارا یہ نشان دیکھ کر ہی مجھے شبہ ہوا تھا۔" میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس ریسٹورنٹ سے میرا بھی کوئی تعلق ہے "تم نے بتایا کہ بلونت اور اس کے ساتھی تمہارے پاس واپس آنے والے تھے؟"

"ہاں۔ ان کا پروگرام یہی تھا۔" سوبھراج نے جواب دیا "بلونت سنگھ کا ساتھی، وہ بدیسی سادھو بہت حرامی تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ انہوں نے کوئی خاص منصوبہ بنا رکھا تھا اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر انہیں اس طرف آنے کا موقع نہ ملا تو وہ ہردوار کی طرف نکل جائیں گے۔"

"ہردوار۔ یہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ میں نے یہ تو سن رکھا تھا کہ ہردوار ہندوؤں کا کوئی مقدس مقام ہے لیکن آج تک اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یوپی میں ہے اور بہت دور ہے۔" سوبھراج نے جواب دیا۔

"لیکن کیا تمہیں معلوم ہے کہ بلونت سنگھ کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"جہنم میں۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ اچھل پڑا۔

"جہنم اس جیسے لوگوں کے لیے ہی بنایا گیا ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے کالی کے مندر والی پہاڑیوں میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

اس کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "گویا اب مجھے اس سے نجات مل گئی۔"

میں کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ ببلا اور لاجونتی کمرے میں آگئیں۔ لاجونتی نے کپڑے بدل لیے تھے اور اس نے چائے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اب اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا لیکن آنکھوں میں الجھن بدستور تھی۔ اس نے ٹرے میز پر رکھ دی اور ایک کپ اٹھا کر پہلے میری طرف بڑھایا اور دوسرا سوبھراج کو دے دیا۔ وہ تیسرا کپ ببلا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بیٹھ جاؤ دیدی۔ تم کھڑی کیوں ہو؟"

"دیدی!" ببلا نے زوردار قہقہہ لگایا "میں تو آپ سے بہت چھوٹی ہوں۔ آپ مجھے دیدی کیوں کہہ رہی ہیں۔ ببلا کہہ کر پکاریے نا۔"

"اچھا۔ ببلا رانی' بیٹھ جاؤ اور چائے پیو۔" لاجونتی بولی۔

ان کی گفتگو سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ان میں بھی مفاہمت ہو چکی تھی۔ میز پر سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے میری نظریں سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اٹھ گئیں جس کی سوئیاں ایک بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ وقت دیکھتے ہی مجھے ٹھاکر اور جانکی وغیرہ کا خیال آگیا۔ وہ یقیناً پریشان ہو رہے ہوں گے۔

میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک دیوار کے ساتھ کھڑکی کے قریب اسٹینڈ پر ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا جس کے قریب ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھا اور فون کا ریسیور اٹھا کر ٹھاکر کے ہوٹل کا نمبر ملانے لگا۔ ٹھاکر ابھی تک ہوٹل ہی میں تھا اور ہمارے لیے پریشان تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد گھر پہنچ جائیں گے۔ کریڈل ٹیپ کر کے میں نے حویلی کا نمبر ملایا اور جانکی کو بھی اپنی خیریت کی اطلاع دے کر اپنی جگہ پر آگیا۔

میں سوبھراج سے بہت کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتوں میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ضرور لگ جائے گا۔

"تم بلونت سنگھ کو کیسے جانتے ہو اور اس سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟" سوبھراج نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بلونت سنگھ دراصل راج کماری روپ متی کا دوست تھا اور۔۔۔"

"راج کماری روپ متی کا دوست!" سوبھراج کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں' یہ واقعی حیرت کی بات ہے۔" میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ بلونت کے باپ کے پاس بھی دولت کی کمی نہیں۔ وہ زندگی بھر اپنے باپ کی دولت پر عیش کر سکتا تھا لیکن وہ فطرتاً کمینہ آدمی تھا۔ اس کی نظریں ہمیشہ دوسروں کے مال پر رہتی تھیں۔ اس نے راج کماری روپ متی سے دوستی بھی اسی لیے کی تھی کہ اس کی دولت پر عیش کر سکے اور۔۔۔"

"اور راج کماری کے حسن و شباب سے بھی لطف اندوز ہو سکے۔" سوبھراج نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ روپ متی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

"روپ متی ایک آزاد منش عورت تھی۔" میں نے کہا "اور اس کی یہ روش ہی اسے غلط راستے پر لے گئی تھی۔ اسے لوٹ کا مال سمجھ لیا گیا تھا۔ گویا وہ بہتی گنگا تھی جس میں ہر شخص ہاتھ دھونے کا خواہش مند تھا اور جب میں راج کماری روپ متی کے حلقہ احباب میں داخل ہوا تو اس کے بہت سے دوست مجھ سے ناراض ہو گئے کیونکہ میں روپ متی کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روپ متی کے دو ذاتی ملازم اور بلونت سنگھ میری ان کوششوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ بلونت سنگھ سے دشمنی کی اصل وجہ کیا تھی "ان تینوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "روپ متی کے ذاتی ملازم دونوں سگے بھائی تھے۔ دھرمیش اور تیج سنگھ۔ وہ دونوں روپ متی کے کزن بھی تھے لیکن ان دونوں نے روپ متی کو اپنی جائداد سمجھ لیا تھا۔ مجھ سے پنگے بازی کے نتیجے میں وہ دونوں اپنے انجام کو پہنچ گئے اور۔۔۔"

"ایک منٹ!" اس مرتبہ لاجونتی نے مجھے ٹوک دیا "تم ہمت سنگھ تو نہیں؟"

"ہاں۔ میرا نام ہمت سنگھ ہے۔" میں نے کہا "اور تم میرے نام سے واقف ہو تو اور بھی بہت کچھ جانتی ہوگی۔"

"جی ہمت سنگھ جی۔ بہت کچھ۔" لاجونتی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے "اور میرا خیال ہے اب ہمیں تم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ آج تم جیسے آدمی کے درشن ہوگئے۔ آپ تو بڑے مہان ہیں۔ مہا پرش۔"

"شکریہ۔" میں نے بھی ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "بلونت سنگھ ہم سے انتقام لینے کے لیے ایک ایسے شخص سے مل گیا جو میرا ازلی دشمن تھا۔ میں اس کی تلاش میں تھا اور اتفاق سے وہ بھی یہاں جے پور میں موجود تھا۔ ان دونوں نے ہمارے خلاف کیا کیا سازشیں نہیں کیں اور کہاں کہاں محاذ نہیں کھولے۔ ہم انہی کی تلاش میں سارسکا گئے تھے۔ وہاں سے مندر والی پہاڑیوں میں پہنچ گئے۔ وہاں بلونت سنگھ تو مارا گیا اور دارا بھی میرے ہاتھ آگیا تھا لیکن وہ میری دوست کو زخمی کرکے فرار ہوگیا۔"

"اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔" میرے خاموش ہونے پر سوبھراج نے کہا "جب وہ دھول پور میں میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے تو پرگھیا راج نام کے کسی رشی (نیک' پرہیز گار۔ عابد۔ زاہد) کے بارے میں بات کررہے تھے جو پہلے جے پور میں تھا لیکن کچھ عرصے پہلے ہردوار چلا گیا تھا۔ بلونت سنگھ نے کہا تھا کہ اگر وہ لوگ دھول پور واپس نہ آسکے تو ہردوار چلے جائیں گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "بلونت سنگھ مارا گیا اور مجھے یقین ہے کہ دارا اس لونڈیا کو لے کر... ہردوار چلا گیا ہوگا۔ میرے خیال میں... ہردوار جیسی دور دراز جگہ ہی اس کے لیے محفوظ ہوسکتی ہے۔"

"ان کے ساتھ جو لونڈیا تھی وہ بھی ماری گئی بلکہ اسے تو دارا ہی نے گولی ماری تھی۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" سوبھراج کے منہ سے بے اختیار نکلا "تو پھر یقین کرو کہ وہ ہردوار ہی گیا ہوگا۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ فی الحال تو سل سرتھ' الوریا قرب و جوار میں کسی جگہ چھپا ہوگا۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ توڑ دی تھی اور وہ لنگڑی ٹانگ کے ساتھ اتنا طویل سفر نہیں کرسکتا۔"

کچھ دیر تک خاموشی رہی اور پھر ہم دارا اور ہردوار کے بارے ہی میں باتیں کرتے رہے۔ ہم میں دوستی کی بنیاد پڑگئی تھی۔ میں ان دونوں کے بارے میں بہت کچھ جان گیا تھا اور وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔

دوبارہ ملنے کا وعدہ کرکے ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور بملا پسنجر سیٹ پر بیٹھ کر اونگھنے لگی۔

○☆○

میرے اندر ایک نئی بے چینی جنم لے چکی تھی۔

میں نے ٹھاکر سے ہردوار کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ ہردوار ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے اور ہر ہندو زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ وہاں جانا ضروری سمجھتا ہے۔

میں اِدھر اُدھر سے بھی لوگوں سے ہردوار کے بارے میں پوچھتا رہا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی اور میں نے بہت سی معلومات حاصل کرلیں۔

سوبھراج اور لاجونتی سے بھی میرے اچھے دوستانہ تعلقات استوار ہوچکے تھے اور پچھلے ایک مہینے کے دوران میں کئی مرتبہ ان سے مل چکا تھا۔ کبھی بملا میرے ساتھ ہوتی اور کبھی میں اکیلا ہی چلا آتا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔

ایک روز میں نے سوبھراج سے ہردوار کے بارے میں بات کی تو وہ فوراً ہی میرا ساتھ دینے کو تیار ہوگیا۔ وہ بدلے ہوئے حلئے میں یہاں اگرچہ بڑی حد تک محفوظ تھا لیکن دل کو ایک دھڑکا تو لگا ہوا تھا۔ سر پر خوف کی ایک تلوار تو لٹک رہی تھی اس لیے وہ بھی یہاں سے دور چلے جانا چاہتا تھا۔

"لیکن ایک بات ہے۔" سوبھراج نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا "ہمیں کسی کو بتائے بغیر یہاں سے جانا ہوگا۔ نہایت خاموشی سے۔"

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم بینڈ باجے کے ساتھ رخصت ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔" سوبھراج نے کہا "یہ لاجونتی ہے نا۔ اگر اسے پتا چل گیا تو یہ بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہوجائے گی اور میں اسے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ نجانے وہاں ہمیں کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے۔"

"یہی صورتِ حال میرے ساتھ بھی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "دو بلائیں میرے ساتھ بھی لپٹی ہوئی ہیں۔ بملا اور جانکی کو پتا چل گیا تو وہ کسی بھی حالت میں مجھے نہیں جانے دیں گی۔ جانکی کو تم نہیں جانتے۔ وہ مجھے ایک قدم نہیں ہلنے دیتی۔ میری وجہ سے کئی مرتبہ اپنا جیون خطرے

میں ڈال چکی ہے۔"

"یہ ناریاں بھی بڑی عجیب مخلوق ہیں۔" سوبھراج مسکرایا "یہ جس مرد کو اپنا مان لیتی ہیں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دینے کو تیار ہوجاتی ہیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔"

لاجونتی کے آجانے سے ہماری گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ اس نے ہمارے سامنے چائے کے کپ رکھ دیے اور باری باری ہمارے چہروں کو تکتے ہوئے بولی۔

"کوئی خاص بات ہو رہی تھی؟"

"نہیں۔" سوبھراج بولا "ہم یہ بات کررہے تھے کہ مادھوری ڈکشٹ زیادہ حسین ہے یا ہیما مالنی۔ اب یہ فیصلہ تم ہی کروگی کہ ان دونوں میں زیادہ حسین کون ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ان دونوں میں زیادہ حسین کون ہے البتہ یہ ضرور بتاسکتی ہوں کہ ان دونوں سے زیادہ حسین تو میں ہوں۔" لاجونتی نے جواب دیا۔

"اور یہ فیصلہ ہی صحیح ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہم نے اگرچہ ہیما مالنی اور مادھوری ڈکشٹ کے ناموں کی آڑ لے کر بات کو ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے خیال میں لاجونتی اتنی بے وقوف نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہم کسی خاص موضوع پر بات کررہے تھے اور وہ بات اس سے چھپانا چاہتے تھے لیکن اس نے اصل بات جاننے کے لیے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔

اس سے اگلے روز ریسٹورنٹ میں ایک بدھ بھکشو سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک اور آدمی کے ساتھ کافی پینے آیا تھا اور وہ دونوں کاؤنٹر کے قریب ہی ایک میز پر بیٹھے تھے۔ ان کی باتیں سن کر میں بھی متوجہ ہوگیا۔ بھکشو اس آدمی کو یوگا کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران میں وہ کبھی تن کر بیٹھ جاتا اور اشاروں سے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا۔

میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی میز پر آگیا۔ کہیں پر بات یوگا یا مارشل آرٹس کی ہو رہی ہو اور میں اس میں دلچسپی نہ لوں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ زندگی بھر کے تجربے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ بدھ بھکشو اور ہندو یوگی' یوگا میں جتنی مہارت رکھتے ہیں ان کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ میں نے بھی یوگا سیکھا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یوگا تن کر بیٹھ جانے اور مخصوص انداز میں سانس لینے ہی کا نام نہیں ہے۔ یوگا تو ایک ایسا پُراسرار علم ہے جسے سیکھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔

اس بدھ بھکشو نے بھی یوگا کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتائیں اور چند باتیں اس حوالے سے میں نے کیں تو وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے بتایا کہ ہردوار کے قریب رشی کیش کو دنیا بھر میں یوگا کا سب سے بڑا اور اہم ترین مرکز سمجھا جاتا ہے۔ پہاڑیوں اور جنگلوں میں گھرے ہوئے اس چھوٹے سے قصبے کو YOGA CAPITAL OF THE WORLD بھی کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے لوگ یوگا کا پُراسرار علم سیکھنے کے لیے یہاں آتے ہیں۔

اس بدھ بھکشو کی باتوں سے میرے جذبات کچھ اور بھی بھڑک اٹھے۔ اب مجھ سے وقت گزارے نہیں گزرتا تھا۔

میں نے اور سوبھراج نے چپکے ہی چپکے تیاری شروع کردی اور پھر اپنی روانگی سے ایک روز پہلے میں نے ٹھاکر کو اعتماد میں لے کر بتادیا کہ میں ہردوار جارہا ہوں۔

"ہردوار۔" ٹھاکر چونک گیا "مگر تم تو ہندو نہیں ہو۔ کیا کروگے وہاں جاکر۔ وہاں تو ہر طرف مندر ہی مندر ہیں۔"

"اور انہی مندروں میں مجھے دارا کے ملنے کی توقع ہے۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ سنا ہے ہردوار سے چند میل کی دوری پر رشی کیش میں یوگا کا بہت بڑا مرکز ہے۔ میں وہاں بھی جانا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہاری وہ جو چہیتی ہے جانکی؟" ٹھاکر بولا "وہ تو میری جان کھاجائے گی۔ بوٹیاں نوچ لے گی میری اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بملا بھی تمہارے بغیر سانس نہیں لے سکتی اور وہ جو ہے راج کماری روپ متی جی! وہ بھی تم پر جان چھڑکتی ہے۔ بہت پریم کرتی ہے تم سے۔ میں ان تینوں آفتوں سے کیسے نمٹوں گا۔ وہ تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گی۔"

"روپ متی تو تم سے پریم کرتی ہے ٹھاکر جی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بہت چاہتی ہے وہ تمہیں اور میں جانتا ہوں' تم بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میری مانو تو اب تم دونوں ایک ہو ہی جاؤ۔"

ٹھاکر کا چہرہ اس طرح سرخ ہوگیا جیسے وہ کوئی لڑکی ہو اور میں نے اس کے پریتم کا نام لے کر اسے چھیڑ دیا ہو۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "تم ہردوار سے واپس آجاؤ تو اس سلسلے میں سوچوں گا۔ ویسے تم کب جارہے ہو؟"

"کل سویرے۔" میں نے جواب دیا "سوبھراج نے پنک سٹی ایکسپریس پر دہلی کے لیے سیٹیں بُک کروالی ہیں۔"

"اوہ!" ٹھاکر چونک گیا "سوبھراج بھی تمہارے ساتھ جارہا ہے؟"

"ہاں۔ صرف سوبھراج۔ وہ قابلِ اعتماد آدمی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیا "تمہارے بعد جو کچھ بھی ہوگا' بھگت لوں گا اور تمہیں میرے یہ بال بہت اچھے لگتے ہیں نا۔" اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا "واپس آکر اگر تمہیں میرے سر پر کوئی بال نظر نہ آئے تو افسوس مت

کرنا۔“

”میں اتنی لمبی مدت کے لیے تو نہیں جا رہا کہ۔۔۔“

”بات لمبی مدت کی نہیں۔“ ٹھاکر نے میری بات کاٹ دی ”تم مجھے تین بلاؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جا رہے ہو۔ میرے بال نوچنے میں تو انہیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“

میں اس بات پر قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ میرے بعد وہ تینوں واقعی ٹھاکر کی بوٹیاں نوچ لیں گی۔

”اور دیکھو۔“ ٹھاکر نے کہا ”اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہو تو مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دینے میں دیر مت کرنا۔ میں فوراً پہنچ جاؤں گا۔“

”اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں تمہیں ضرور اطلاع دوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

میں نے اور سوبھراج نے اپنے الگ الگ بیگ تیار کرلیے تھے۔ ان میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی ہمیں ضرورت پڑ سکتی تھی اور یہ دونوں بیگ ہم نے ٹھاکر کے ہوٹل ہی میں رکھے ہوئے تھے۔

پنک سٹی ایکسپریس اپنی نوعیت کی ایک منفرد ٹرین تھی۔ راجستھان میں ہر سال سات آٹھ لاکھ غیر ملکی سیاح آتے تھے اور یہ ٹرین صبح چھ بجے دہلی سے روانہ ہو کر دوپہر کے وقت جے پور پہنچتی تھی۔ سہ پہر چار بجے جے پور سے روانہ ہو کر رات کو دہلی واپس آجاتی۔ موسم کے مطابق اس ٹرین کے ٹائم ٹیبل میں ردّوبدل بھی ہوتا رہتا تھا۔ دو سو ستر کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے میں پانچ گھنٹے لگتے تھے۔

رات نو بجے کے قریب ہم دہلی ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہو رہی تھی۔ میں کاغذات کے بغیر غیر قانونی طور پر ہندوستان میں مقیم تھا۔ طیارے کے حادثے کے بعد اگر میں پولیس سے رابطہ کرلیتا تو ہمیں پاکستان بھیجنے کا بندوبست ہو سکتا تھا لیکن ریگستان میں جہاز کے حادثے کے بعد حالات نے اس طرح پلٹا کھایا تھا کہ ہم ہندوستان کے قیدی بن کر رہ گئے تھے۔ جے پور میں اجنبی لوگوں سے ہماری دشمنیاں بھی چلیں اور کچھ مخلص دوست بھی ملے اور ان دوستوں ہی کی وجہ سے ہم قانونی الجھنوں سے بچے رہے تھے لیکن اب میرے وہ دوست بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ سوبھراج میرے ساتھ تھا لیکن وہ بھی اس شہر میں اجنبی تھا اور ظاہر ہے کسی اجنبی جگہ پر دل میں انجانے سے وسوسے ضرور جنم لیتے ہیں۔

ہم ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں گئے۔ دلی کی سیر کا ہمارا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہمیں تو یہاں صرف رات گزارنی تھی۔ صبح ہمیں دہرا دون چلے جانا تھا جہاں سے ہم میسوری کے لیے روانہ ہو جاتے۔

دہلی سے ستر کلو میٹر کے فاصلے پر میرٹھ شہر آباد ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں سے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی کا آغاز ہوا تھا۔ میرٹھ سے تقریباً سو کلو میٹر آگے سہارنپور میں ٹرین رکی تو آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ دو اسٹیشن آگے ایک مال گاڑی پٹری سے اتر جانے سے اس لائن پر ریلوے ٹریفک معطل ہو چکا ہے اور ٹرین کم از کم چھ گھنٹے بعد روانہ ہوگی۔

ہم چھ گھنٹے انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ ہماری طرح اور بھی بہت سے مسافر ٹرین سے اتر کر لاری اڈے کا رخ کرنے لگے۔

دو ہزار میٹر بلند اور ہمالیہ کے قدموں میں آباد دہرا دون ایک بڑا اور بارونق شہر ہے۔ اس سے صرف پینتیس کلو میٹر کے فاصلے پر خوب صورت ہل اسٹیشن میسوری واقع ہے۔ ہم نے دہرا دون میں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور لاری اڈے پر ایک بس سے اتر کر دوسری بس پر سوار ہو گئے۔

پینتیس چھتیس کلو میٹر کا فاصلہ تین گھنٹوں میں طے ہوا تھا۔ پہاڑی راستے نہایت دشوار گزار اور سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ دہرا دون سے کچھ فاصلے پر نینی تال ہے۔ اس سے تھوڑا ہی آگے ہندوستان کی سرحدیں ایک طرف نیپال اور دوسری طرف چین میں تبت سے ملتی ہیں۔ نینی تال سے دہرا دون تک ایک ویلی پھیلی ہوئی ہے جہاں دنیا کے خوفناک ترین درندے پائے جاتے ہیں۔

دہرا دون شمال میں ہندوستان کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے اور یہاں ایک بہت بڑی ملٹری اکیڈمی بھی ہے۔ ایک بس سے اتر کر دوسری بس پر سوار ہونے کے درمیان تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہم چائے وغیرہ پینے کے لیے یہاں رکے تھے۔

میسوری پہنچتے ہوئے شام ہوگئی۔

یہاں کئی اچھے ہوٹل تھے لیکن ہمیں کہیں بھی جگہ نہیں ملی۔ تقریباً دو گھنٹے ایک ایجنٹ کے ساتھ گھومنے کے بعد ایک پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس میں کمرا مل گیا۔ یہ گیسٹ ہاؤس شہر کے مرکز سے دور ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں واقع تھا۔ یہاں کچھ غیر ملکی سیاح بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

دن بھر کے سفر نے مجھے بُری طرح تھکا دیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد میں بستر پر لیٹتے ہی سو گیا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

○☆○

ہم دوپہر تک میسوری میں رہے اور پھر ایک بس پر سوار ہو کر ہردوار کے لیے روانہ ہوگئے۔ بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ہندوستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ گنگوتری کی یاترا کے لیے جا رہے تھے۔ ہر بس کا یہی حال تھا۔ ہماری بس میں تین چار پنڈت اور پجاری بھی سوار تھے جو اونچی اور بھاری آوازوں میں بھجن اور اشلوک گا رہے تھے۔

چوبیس کلو میٹر کا یہ فاصلہ بھی ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ ہمالیہ کے قدموں میں بکھرا ہوا یہ شہر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑیوں پر اور پہاڑیوں کے دامن میں رنگ برنگی چھتوں والی چھوٹی چھوٹی عمارتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ ان پہاڑیوں کے پس منظر میں ہمالیہ کی وہ برف پوش چوٹیاں تھیں جہاں سے ندی نالوں کی صورت میں بہنے والا پانی ہردوار کے دامن میں گنگوتری کے مقام پر ایک باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ یہی گنگا تھا جس کے پانی کو ہندو دھرم میں مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ گنگا کے پاک پانی میں غسل کرلینے سے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں۔

میرے خیال میں ہردوار اور گنگوتری کو ہندوؤں کا مکہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ہندوؤں میں گنگا جل کو اس طرح مقدس اور متبرک مانا جاتا ہے جیسے ہم آبِ زم زم کو متبرک سمجھتے ہیں۔

میرے خیال میں اس دریا کا نام ”گنگا“ بھی شاید اس لیے پڑا تھا کہ پہاڑوں سے ندی نالوں کی صورت میں بہنے والا پانی گنگوتری نامی گاؤں کے قریب ایک باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہاں اس دریا کا پاٹ کہیں تو بہت چوڑا ہے اور کہیں ایک تنگ پہاڑی نالے کی صورت اختیار کرلیتا ہے لیکن جیسے جیسے یہ نشیب کی طرف بہتا ہے‘ اس کا پاٹ باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

ٹھاکر نے ٹھیک کہا تھا۔ ہردوار مندروں کا شہر تھا۔ یہاں لاتعداد چھوٹے بڑے مندر تھے اور اگر وارا یہاں آیا تھا تو انہی مندروں میں کہیں چھپا ہوا ہوگا۔

لیکن سب سے پہلے ہمیں اپنا ٹھکانا بنانے کی فکر تھی اور مجھے کوئی ٹھکانا تلاش کرلینا مشکل ہی لگ رہا تھا۔ یہاں اگرچہ لاتعداد رہائشی ہوٹل‘ سرائے اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے لیکن یاتری بھی ہزاروں کی تعداد میں نظر آرہے تھے۔

وہ تقریباً چھ بجے کا وقت تھا۔ سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ موسم اگرچہ بہار کا تھا مگر شمال میں ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے اترنے والی ہوا میں خنکی بڑھتی جارہی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ اگر کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملی تو ہم رات کی سردی میں ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ سوبھراج نے کہا۔

”وہ سامنے ایک دھرم شالا کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔ اگر وہاں رات گزارنے کی جگہ مل جائے تو۔۔“

”جاؤ۔ وہاں بھی قسمت آزمالو۔“ میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

سوبھراج سڑک پار کرکے دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں یاتریوں کے لیے کئی دھرم شالے بھی تھے۔ یہ دھرم شالے دراصل ان غریبوں کے لیے تھے جن کے پاس سر چھپانے کی جگہ نہ ہو لیکن یہاں بھی دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے دولت مند ہندو یاتریوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ ان دھرم شالوں کے پنڈتوں کی بھی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھے۔ ہم نے کئی جگہ قسمت آزمائی کی تھی لیکن ہر جگہ ہمیں ہری جھنڈی دکھا دی گئی تھی۔

سوبھراج دھرم شالا کے گیٹ میں غائب ہو چکا تھا اور میں موڑ پر کھڑا اِدھر اُدھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ اپنے کندھے پر ہلکا سا بوجھ محسوس کرکے چونک گیا۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے گھوم گیا اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ قد لمبا اور بالوں میں سفیدی کا رنگ غالب تھا۔ رنگت گوری اور چہرے کے نقوش اب بھی جاذبِ نظر تھے۔ جوانی میں وہ یقیناً بہت حسین رہی ہوگی۔ اس نے پھولدار کپڑے کا گھاگھرا پہن رکھا تھا اور اوپر آتشی گلابی رنگ کی ایک چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ اس کے بدن کا سامنے کا حصہ تو چھپ گیا تھا مگر پشت برہنہ تھی۔ اس کی پیشانی پر سرخ ٹیکا لگا ہوا تھا اور گلے میں کئی مالائیں تھیں۔ کانوں میں چوڑیوں جتنی بڑی چاندی کی بالیاں تھیں اور ایک کلائی میں بھی چاندی کا کڑا نظر آرہا تھا۔

اس شہر میں بھکاریوں کی بھی کمی نہیں تھی اور میں اسے بھی کوئی بھکارن ہی سمجھا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سکہ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

”میں بھکارن نہیں ہوں شریمان جی؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کون ہو تم شریمتی جی۔“ میں نے اسے گھورا۔

”میں بہت دیر سے دیکھ رہی ہوں کہ تم دونوں سر چھپانے کی کسی جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہو۔“ اس عورت نے جواب دیا ”تمہارا وہ مِتر سامنے والے دھرم شالا میں یہی معلوم کرنے گیا ہے۔ ابھی دیکھنا وہ منہ لٹکائے واپس آجائے گا۔“

”گویا تم دیر سے ہمارا پیچھا کررہی ہو؟“ میں نے ایک بار پھر اسے گھورا۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ بولی "ان دھرم شالوں پر تو دھن والوں کا قبضہ ہوتا ہے اور یہ سالے پنڈت بھی بہت حرامی ہیں۔ خوب دھن کماتے ہیں یہ۔"

"کیا تم یہی بتانے کے لیے ہمارا پیچھا کر رہی تھیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اور میں تمہارا مسئلہ حل کر سکتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ!" میں اچھل پڑا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ کسی رہائشی ہوٹل' سرائے یا گیسٹ ہاؤس کی ایجنٹ تھی "کوئی ہوٹل' سرائے یا گیسٹ ہاؤس؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایک چھوٹی سی کٹیا ہے جہاں تم لوگوں کو رات گزارنے کی جگہ مل سکتی ہے۔ باہر رہو گے تو ٹھٹھر جاؤ گے۔" اس نے جواب دیا۔

"اور اس کٹیا میں رہنے کا ایک رات کا کرایہ کیا لوگی؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے کہا "ویسے جو تمہارے من میں آئے صبح نندا دیوی کے مندر میں بھینٹ چڑھا دینا۔"

میں حیرت سے اس کی صورت تکنے لگا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہاں تو بڑے بڑے دین دھرم والے پیسے کی ہوس میں مرے جا رہے تھے۔ مندر جیسے مقامات پر بھی دیوی دیوتاؤں کے بجائے پیسے ہی کی پوجا کی جاتی تھی اور یہ سادھو قسم کی عورت ہمیں کسی لالچ کے بغیر اپنی کٹیا میں رات گزارنے کی اجازت دے رہی تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ ہو سکتا ہے دارا یہاں پہنچ گیا ہو۔ ہم دوپہر سے یہاں گھوم رہے تھے۔ میں اپنی اصل شکل صورت میں تھا۔ ممکن ہے دارا نے مجھے دیکھ لیا ہو اور مجھے پھانسنے کے لیے اس سادھو عورت کے بھیس میں ایک نیا جال تیار کیا ہو۔

"اگر تم ہمیں اپنی کٹیا میں جگہ دے دو گی تو خود کہاں رہو گی؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"میری کٹیا میں بہت جگہ ہے اور من میں بھی۔" اس نے جواب دیا۔

باتیں کرتے ہوئے میری نظریں آشرم کی طرف اٹھ گئیں۔ اس عورت نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سوبھراج دھرم شالا کے دروازے سے باہر نکلا تو اس کا چہرہ واقعی لٹکا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے وہاں سے بھی ہری جھنڈی دکھا دی گئی تھی۔

"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا کہ تم لوگوں کو کہیں جگہ نہیں ملے گی۔" اس عورت نے کہا۔ اس نے بھی سوبھراج کو آشرم سے باہر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا "میرے ساتھ چلو میری کٹیا میں۔"

"کہاں ہے تمہاری کٹیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرف۔۔۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "یہاں سے گنگوتری بھی زیادہ دور نہیں ہے۔"

سوبھراج سڑک پار کر کے ہمارے قریب پہنچا تو وہ عورت "میرے پیچھے آجاؤ۔" کہتے ہوئے ایک طرف چل پڑی۔ سوبھراج نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں اسے اشارہ کرتے ہوئے اس عورت کے پیچھے چلنے لگا جو ہم سے تقریباً دس قدم آگے نکل چکی تھی۔

"کون ہے یہ اور ہمیں کہاں لے جا رہی ہے؟" سوبھراج نے سرگوشی میں پوچھا۔

"اپنی کٹیا میں۔" میں نے جواب دیا "وہاں چل کر پوچھیں گے کہ یہ کون ہے اور ہم پر اتنی مہربان کیوں ہے؟"

"ایسی جگہوں پر دھوکے بازوں اور لٹیروں کی بھی بھرمار ہوتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ عورت ہمیں پھانس کر کسی ایسی جگہ لے جا رہی ہو جہاں سے ہمارے لیے واپسی کا کوئی راستہ نہ رہے۔"

"مجھے لوٹے جانے کا نہیں بلکہ ایک اور شبہ ہے۔" میں نے کہا اور پھر دارا کے بارے میں اپنے اندیشے کا اظہار کرنے لگا اور پھر آخر میں کہا "اب تو چلتے رہو۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

ہم اس عورت کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ہم اس کے ساتھ آ رہے ہیں یا نہیں۔

شہر کی آبادی بکھری ہوئی تھی۔ ہم گلیوں سے نکل کر ایسی طرف آ گئے جہاں عمارتیں ایک دوسرے سے فاصلے پر تھیں۔ کسی پہاڑی پر کوئی مندر تھا اور کسی پہاڑی کے دامن میں کوئی پرائیویٹ گیسٹ ہاؤس یا مکان۔

سورج اب مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ پہاڑیوں کے پیچھے چھپ جانے والا تھا۔ وہ عورت ہمیں ایک ایسی جگہ پر لے آئی جہاں مکان وغیرہ ایک دوسرے سے بہت دور دور تھے۔

وہ عورت لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایک مکان کے سامنے رک گئی جو دیکھنے میں زیادہ بڑا نہیں لگتا تھا۔ آس پاس چیڑ کے چند درخت تھے اور پندرہ بیس گز آگے ایک کشادہ پہاڑی نالا تھا۔ اس کا شفاف پانی ڈوبتے ہوئے سورج کی روپہلی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ ایک طرف کچھ لوگ نہا رہے تھے۔ وہ غالباً ایک ہی فیملی تھی۔ مرد بھی تھے' عورتیں بھی اور بچے بھی۔ دو عورتیں کپڑوں سمیت پانی میں بیٹھی ہوئی تھیں اور ہاتھوں سے اپنے سروں پر پانی ڈال رہی تھیں۔ ان کے قریب ہی دس گیارہ سال کی عمر کا ایک لڑکا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی غسل کر رہے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ نالا بھی اسی دریا ہی کا حصہ ہے جس کے پانی کو مقدس سمجھا جاتا ہے اور یہ سب لوگ اس پاک پانی میں اپنے گناہ دھو رہے تھے۔

ہمارے ساتھ آنے والی عورت نے چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکالی اور مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ہم دونوں باہر کھڑے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ اس مکان کے اطراف میں سو سو گز کے فاصلے تک کوئی اور مکان وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ہمیں اوپر پہنچانے کا کوئی منصوبہ بنایا گیا تھا تو اس کے لیے بہترین جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ پہاڑی نالے پر غسل کرنے والے لوگ اب واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

"ارے! تم باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آجاؤ نا۔"

اس عورت کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے سوبھراج کی طرف دیکھا اور پھر ہم دونوں اندر داخل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں حیرت سی ابھر آئی۔ اس عورت نے جسے کٹیا کہا تھا وہ لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک مکان تھا جو اندر سے تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرا تو وہی تھا جس میں ہم کھڑے تھے اور یہاں اس نے کیروسین کا لیمپ جلا لیا تھا اور دیگر ساتھ ساتھ ملے ہوئے دو کمروں کے دروازے بھی اس کمرے میں کھلتے تھے۔

یہ کمرا بڑا تھا۔ اس کے ایک حصے میں آتش دان بنا ہوا تھا جس کے آس پاس کچھ برتن وغیرہ سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ دائیں طرف ایک کھُرا بھی تھا جس میں پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی رکھی ہوئی تھی اور کھُرے کے باہر ایک مٹکا تھا جس کے ڈھکنے پر ایک گلاس بھی اوندھا پڑا تھا۔ کمرے میں بھیڑ کے بالوں سے بنا ہوا ایک نمدہ بچھا ہوا تھا جس پر تین چار آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔

"بیٹھو تم لوگ۔۔۔ میں چائے بناتی ہوں۔" عورت نے کہا اور آتش دان کے قریب بیٹھ گئی۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کندھوں پر لٹکے ہوئے بیگ اتار کر نیچے رکھ دیے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ٹانگیں آگے کو پھیلا لی تھیں۔ وہ عورت خاموشی سے اپنے کام میں اس طرح مصروف تھی جیسے ہماری موجودگی کو بھول گئی ہو۔

تقریباً بیس منٹ بعد چائے تیار ہو گئی تو اس نے ایک ایک پیالی ہمارے سامنے رکھ دی اور خود بھی ہمارے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک پیالی اپنے قریب رکھ لی تھی۔

"یہ کٹیا تمہاری ہے؟" میں نے لفظ کٹیا پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اس کے ہونٹوں پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ آ گئی "پہلے میں اس کا بھاڑا دیتی تھی پھر میں نے اسے خرید لیا۔"

"تم کون ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا "اور ہمیں یہاں کس لیے لائی ہو؟"

"تم لوگوں کو رات گزارنے کے لیے جگہ کی تلاش تھی اس لیے یہاں لے آئی ہوں۔" اس نے جواب دیا "اور یہاں کیوں لائی ہوں' یہ بھی بتا دوں گی۔ پہلے اطمینان سے چائے پیو۔"

میں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا البتہ بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جوانی میں یقیناً بہت حسین رہی ہو گی لیکن اب تو اس کا حُسن مرجھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

میں اپنی پیالی اٹھا کر چائے کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ وہ عورت ہمارے سامنے بالکل یوگا کے انداز میں آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی کمر تنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ اسی انداز میں بیٹھنے کی عادی ہو۔

سوبھراج چائے ختم کر کے باہر چلا گیا۔ وہ عورت اب بھی خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے کا اطمینان دیکھ کر میں کچھ الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اگر وہ ہمارے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوتی تو اس طرح مطمئن اور پرسکون نہ ہوتی۔ اس پر کچھ نہ کچھ گھبراہٹ ضرور طاری ہوتی لیکن وہ بالکل پرسکون تھی۔

"تم کون ہو؟" میں نے ایک بار پھر سوال کیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک اور سوال بھی آیا۔ کہیں یہ کوئی شکاری عورت تو نہیں؟ لیکن پھر فوراً ہی میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ شکاری عورتوں کا حلیہ اس طرح اجڑا ہوا نہیں ہوتا۔ وہ تو مردوں کو متوجہ کرنے کے لیے اپنے آپ میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ستر سال کی بڑھیا بھی ہو گی تو وہ میک اپ کے سہارے جوان بننے کی بھرپور کوشش کرے گی لیکن اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں وجدان!"

اس کی زبان سے اپنا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی گردن پر چیونٹیاں سی رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگی اور سنسنی کی ایک لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ہندوستان کے اس

دور دراز خطے میں میرا شناسا کون ہو سکتا تھا۔ جے پور میں سب لوگ مجھے ہمت سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ میرے اصل نام سے ٹھاکر اور راج کماری روپ متی سمیت صرف چار پانچ افراد ہی واقف تھے یا پھر دارا تھا جس کی تلاش میں' میں یہاں آیا تھا۔ یہ عورت کون تھی جس نے مجھے اصل نام سے مخاطب کیا تھا۔

"کک۔۔۔ کون ہو تم؟" میں اپنی ہکلاہٹ پر قابو نہیں پا سکا۔

"میں تمہاری دوست ہوں۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے تمہیں پہچانا نہیں اور میرا خیال ہے اس سے پہلے میں نے کبھی تمہیں دیکھا بھی نہیں۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھا ہے۔ تم نے مجھے دیکھا ہے لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب تم نوعمر تھے۔" اس عورت نے جواب دیا۔

نوعمری کے حوالے سے میں ایک بار پھر چونک گیا۔ وہ شاید مجھے سنگاپور یاد دلانے کی کوشش کر رہی تھی جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ ایک ایک چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ میری والدہ کی بہت سی عورتوں سے دوستی تھی۔ ان میں ہندو عورتیں بھی تھیں لیکن یہ چہرہ مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔

"میرا نام چترا پریتم ہے۔" اس نے کہا "سنگاپور میں تم خشونت سنگھ جی کو تو نہیں بھولے ہوگے!"

"انہیں میں کیسے بھول سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ خشونت سنگھ کے نام سے کچھ اور چہرے میری نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ چاچی رجنی' ان کی بیٹی اُرملا کور اور بہت سے لوگ لیکن یہ چہرہ اب بھی مجھے یاد نہیں آرہا تھا البتہ یہ نام کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔

"میں خشونت سنگھ جی کی بڑی بیٹی ہوں۔ چترا پریتم۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "جن دنوں تم باپو کے گھر میں رہ رہے تھے' میں وہاں نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ باپو سے چوری چھپے وہاں آئی تھی۔ تم نے بھی مجھے دیکھا تھا لیکن شاید تمہیں یاد نہیں رہا۔"

"باپو کے گھر میں چوری چھپے آنا۔ کیا مطلب؟" میں نے کہا۔

"گھر والوں کو بتائے بغیر میں نے ایک ہندو لڑکے سے شادی کرلی تھی اور اپنا دھرم بھی تبدیل کرلیا تھا جس پر باپو مجھ سے ناراض ہوگئے اور قطع تعلق کرلیا۔" چترا پریتم نے کہا "انہی دنوں تم وہاں آکر رہے۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا اور تم نے بھی۔۔۔"

"وہ میرا بچپن تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ... "اس وقت سے اب تک میرے اندر بہت سی تبدیلیاں ... ہیں۔ بچپن سے جوانی تک سفر کرتے ہوئے چہرے ... بھی بدل جاتے ہیں۔ تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟"

"کچھ عرصے پہلے' کئی سال بعد تم دوبارہ سنگاپور ... تھے۔" چترا پریتم نے جواب دیا "اس وقت تمہارے ساتھ ... عورتیں بھی تھیں جن میں سے ایک کو تمہارے گھر ... سامنے قتل کردیا گیا تھا بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے ماں باپ کو قتل کیا تھا۔"

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں پکڑ کر بھینچ ... ہو۔ میں چشم تصور سے اپنے ماں باپ اور پھر تھائی کو دیکھ ... جسے میرے گھر کے سامنے ٹھیک اسی جگہ قتل کیا گیا تھا جہاں ... میری ماں کو خنجر کے پے در پے وار کرکے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ چترا پریتم نے پرانی باتیں یاد دلا کر میرے زخم تازہ کردیے تھے۔

"میں اس وقت تم سے ملنا چاہتی تھی۔" چترا پریتم کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہوگئے۔ وہ کہہ رہی تھی "میں تمہارے گھر پر بھی آئی تھی مگر تم موجود نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ ملنے کی کوشش کی مگر ہر مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ تمہیں دور سے تو دیکھا مگر ملاقات نہیں ہوسکی پھر تم سنگاپور سے چلے گئے۔"

"تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"بات اب پرانی ہوچکی ہے اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔" چترا پریتم نے جواب دیا۔

میں چاچا خشونت سنگھ اور اس کے گھر والوں کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ ٹھیک ٹھیک جواب دیتی رہی۔ اس نے چاچا پرتاب سنگھ کے بارے میں بھی کچھ باتیں بتائیں جس سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ میں کسی فریب کا شکار نہیں ہورہا اور نہ ہی میرے گرد کسی نئی سازش کا جال بُنا جارہا ہے۔

اس کی باتوں سے یہ تو مجھے یاد آگیا کہ چاچا خشونت سنگھ کی بڑی بیٹی نے اپنی مرضی سے کسی ہندو لڑکے سے شادی کرکے دھرم بھی تبدیل کرلیا تھا اور خشونت سنگھ نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا لیکن مجھے اس سلسلے میں زیادہ تفصیلات معلوم نہیں تھیں۔

"مگر تم یہاں اور تمہارا یہ حلیہ؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"لمبی کہانی ہے۔" چترا پریتم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس وقت سوبھراج بھی واپس آکر خاموشی سے ہمارے

قریب بیٹھ گیا۔ چترا پریتم کہہ رہی تھی "میرا شوہر کندن لال کاروباری آدمی تھا۔ اسے دھرم سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ وہ ہر صبح باقاعدگی سے مندر جاتا تھا۔ اس نے گھر کے ایک کمرے میں بھی ایک چھوٹا سا مندر بنا رکھا تھا۔ چند مہینے پہلے۔۔۔" بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئی اور آگے کی کہانی سنانے لگی۔

چترا پریتم کے کہنے کے مطابق اس کے شوہر کندن لال کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ ایک مرتبہ ہردوار جاکر گنگوتری میں غسل کرلے مگر کاروباری مصروفیات سنگاپور سے نکلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔ بالآخر چند مہینے پہلے وہ اپنا بزنس اپنے بھائی کی نگرانی میں دے کر ہردوار جانے کی تیاری کرنے لگا۔ چترا پریتم اور ان کی پندرہ سالہ بیٹی پلوی بھی بڑے زور و شور سے تیاریاں کررہی تھیں۔

کندن لال کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ یہاں آتے ہی اس نے یہ کاٹیج کرائے پر لے لیا۔ ان کا پروگرام تھا کہ کم از کم ایک مہینہ یہاں ضرور رہیں گے۔ پہلا ایک ہفتہ مختلف مندروں کی یاترا میں بیت گیا اور پھر ایک روز وہ گنگوتری سے تقریباً تین میل دور پہاڑیوں میں ایک چھوٹے مگر بہت قدیم مندر کی یاترا کے لیے گئے ہوئے تھے کہ اچانک ہی بارش شروع ہوگئی۔ وہ شام کا جھٹ پٹا تھا۔ بارش بڑی قیامت خیز تھی۔ آس پاس کی پہاڑیوں سے پانی سیلابی ریلوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

شام گزر گئی اور پھر رات ہوگئی۔ بارش کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مندر میں ان کے سوا کوئی اور یاتری بھی نہیں تھا۔ صرف تین پنڈت تھے اور تینوں ہٹے کٹے۔ وہ تینوں شاید نشہ کرنے کے عادی تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ اور چہروں پر پھٹکار برستی تھی۔ چترا پریتم کے دل میں انجانا سا خوف تھا۔ اس نے جوان بیٹی کو اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا مگر کندن لال مطمئن تھا کہ مندر جیسے پاک مقام پر کوئی ان کے ساتھ زیادتی کی کوشش نہیں کرے گا۔ وہ سنگاپور میں پلا بڑھا تھا۔ ہندوستان کے مندروں اور پنڈتوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب بارش رک گئی۔ وہ لوگ شہر واپس آنا چاہتے تھے مگر پنڈتوں نے انہیں روک لیا۔ رات کے اندھیرے میں شہر کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ راستے بہت دشوار تھے اور پانی اب بھی سیلابی ریلوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہلکی بارش پھر شروع ہوگئی اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا کہ کبھی آسمان سے پانی برسنے لگتا اور کبھی رک جاتا۔

وہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ کندن لال فرش پر لیٹ کر سوگیا تھا مگر پریتم جاگ رہی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں سامنے کو پھیلا رکھی تھیں اور اس کی جوان بیٹی پلوی بھی اس کی گود میں سر رکھے رکھے سوگئی تھی اور بالآخر چترا پریتم بھی اونگھنے لگی۔

چیخ کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی اور پھر وہ خود بھی چیخنے لگی۔ ایک پنڈت پلوی کو بازو سے پکڑے کھینچ رہا تھا اور پلوی چیختے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کررہی تھی۔

وہ تینوں پنڈت نشے میں تھے۔ ایک کے ہاتھ میں شراب کی بوتل بھی تھی۔ کندل لال اٹھ کر بیٹی کو چھڑانے کے لیے لپکا تو تیسرے پجاری نے خنجر سے اس پر حملہ کردیا۔ پہلا وار کندن لال کے سینے پر لگا۔ وہ چیخ اٹھا۔ خون بہہ نکلا لیکن وہ بیٹی کو بچانے کے لیے پھر لپکا۔ پجاری نے خنجر سے ایک اور وار کیا۔ کندن لال زمین پر گر گیا اور پجاری اس پر خنجر کے پے در پے وار کرتا رہا۔

چترا پریتم چیختی ہوئی کبھی شوہر کو بچانے کے لیے دوڑتی کبھی بیٹی کو چھڑانے کے لیے لیکن وہ تین ہٹے کٹے وحشی درندے تھے۔ ان پر جنون طاری تھا۔ پریتم بیٹی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ دوسرے پجاری نے شراب کی بوتل سے اس پر حملہ کیا۔ شراب کی بوتل اس کے سر پر ٹوٹ گئی۔ چترا پریتم چیخ اٹھی۔ اس کے سر سے خون بہہ نکلا لیکن وہ پھر بیٹی کو بچانے کے لیے لپکی تو پجاری نے پھر اس پر حملہ کیا۔ ٹوٹی ہوئی بوتل کی نوکیں اس کے پیٹ میں گھس گئیں۔ وہ چیختے ہوئے ڈھیر ہوگئی۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ پلوی کی چیخیں اس کے ذہن میں گونجتی رہیں اور پھر سناٹا چھا گیا۔

چترا پریتم کو جب ہوش آیا تو اس کا سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ ایک طرف اس کے شوہر کی لاش پڑی تھی۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ اس کی آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں اور چند گز کے فاصلے پر اس کی جوان بیٹی پلوی بھی خون میں لت پت پڑی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں۔ اس کے سینے اور پیٹ پر بھی گہرے زخم تھے۔ خون چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

دن کی روشنی پھیل رہی تھی اور ہلکی بارش اب بھی ہورہی تھی۔ مندر ویران تھا۔ وہ تینوں پنڈت غائب تھے۔ چترا پریتم مندر کے دروازے پر کھڑی مدد کے لیے چیختی رہی لیکن ویرانے میں اس کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ابھی تو دن کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تھی اور یہ مندر شہر سے تین میل دور پہاڑیوں میں تھا۔ راستہ ویسے بھی کٹھن اور دشوار گزار تھا اور پھر سیلابی پانی کے ریلے بہہ رہے تھے۔ ایسی

صورت حال میں کوئی یاتری شہر سے اس طرف آنے کی جُرات کیسے کرسکتا تھا۔

چترا پریتم کبھی بیٹی کی لاش سے لپٹ کر چیختی، کبھی شوہر کی لاش سے اور بالآخر وہ مندر سے نکل کر کسی نہ کسی طرح شہر پہنچ گئی۔ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ وہ خود بھی شدید زخمی تھی اور پولیس والوں کو شدید حیرت تھی کہ وہ اس حالت میں یہاں تک پہنچی کس طرح تھی۔ چترا پریتم کو اسپتال بھجوا کر پولیس کی ایک پارٹی مندر کی طرف روانہ ہوگئی۔

دونوں لاشوں کی آخری رسومات ادا کردی گئیں۔ پولیس نے رپورٹ درج کرلی تھی مگر کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔ چترا پریتم اسپتال میں پڑی تھی۔ اس کے سر کا زخم تو زیادہ تکلیف دہ نہیں تھا لیکن پیٹ میں لگنے والے گھاؤ کی وجہ سے وہ بیس بائیس روز تک بستر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔

پولیس کا خیال تھا کہ وہ تینوں پنڈت پکڑے جانے کے خوف سے ہردوار سے بھاگ گئے تھے اور اگر وہ ہردوار میں موجود تھے بھی تو کسی مندر میں چھپے ہوئے ہوں گے۔ یہاں چھوٹے بڑے بیسیوں مندر تھے اور مندر میں کسی پنڈت پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں تھا۔

چترا پریتم چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو۔۔ اس نے اپنے طور پر ان پنڈتوں کی تلاش شروع کردی۔ وہ صبح سے رات تک مندروں میں گھومتی رہتی اور بالآخر ایک روز اس نے گنگوتری مندر میں اس پنڈت کو دیکھ لیا جو اس طوفانی رات میں' ویران مندر میں اس کی بیٹی پلوی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے جا رہا تھا۔

وہ پوجا کا وقت تھا۔ گنگوتری مندر میں بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ چترا پریتم دھکے کھاتے ہوئے آگے تک پہنچی تھی۔ اس پنڈت کو دیکھ کر وہ لوگوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھی اور جب اس جگہ پر پہنچی تو وہ پنڈت وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اندر کی طرف کسی دروازے میں غائب ہوگیا تھا۔ چترا پریتم اسے تلاش کرتی رہی لیکن وہ دوبارہ نظر نہیں آیا۔

پولیس کو اطلاع دینے سے پہلے اپنے اطمینان کے لیے وہ مسلسل تین دن تک اس مندر میں جاتی رہی۔ اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ اور اس پنڈت کو دیکھا مگر اس مرتبہ بھی وہ پہلے کی طرح غائب ہوگیا تھا۔ چترا کو بہرحال یقین ہوگیا کہ وہ پنڈت اس مندر میں پناہ لیے ہوئے ہے۔ اس کے دوسرے ساتھی یا تو ہردوار سے بھاگ گئے تھے یا دوسرے مندروں میں پناہ لیے ہوئے تھے۔

چترا پریتم نے پولیس کو گنگوتری مندر میں اس پنڈت کی موجودگی کی اطلاع دے دی۔

گنگوتری کو ہندوستان کی چار اہم ترین ہمالیائی یاتراؤں میں ایک اہم اور مقدس ترین مقام حاصل ہے۔ دوسری اہم اور دھارمک یاترائیں بدری ناتھ' کیدار ناتھ اور یمنوتری ہیں۔ ان چاروں کے مجموعے کو ہندو دھرم میں "چار دھم" کہا جاتا ہے۔

گنگوتری مندر کے تقدس کے پیش نظر یہ ممکن نہیں تھا کہ چترا پریتم کی نشان دہی پر پولیس مندر پر دھاوا بول کر اس پنڈت کو گرفتار کرلیتی لیکن چترا پریتم بھی آرام سے بیٹھنے والی نہیں تھی۔ اس نے پولیس کے اعلیٰ ترین افسروں سے رابطے کیے اور بالآخر اس کی نشان دہی پر پنڈت کو مندر سے باہر نکال کر حراست میں لے لیا گیا لیکن وہ پنڈت زیادہ دیر تک پولیس کی حراست میں نہیں رہ سکا تھا۔ گنگوتری مندر کا پروہت درجنوں پنڈتوں کو لے کر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سیکڑوں پجاریوں اور پنڈتوں نے پولیس اسٹیشن کا محاصرہ کرلیا۔

گنگوتری مندر کے پروہت اور وہاں کے دوسرے پنڈتوں اور پجاریوں نے یہ بیان دیا کہ یہ ناری جس طوفانی رات کا ذکر کر رہی ہے اس رات وہ پنڈت گنگوتری مندر میں موجود تھا بلکہ۔۔۔ اس سے کئی روز پہلے بھی وہ مندر سے باہر نہیں گیا تھا اور اس طوفانی رات کے کئی روز بعد بھی گنگوتری مندر سے باہر نہیں نکلا۔ اس سارے عرصے میں وہ ایک جاپ میں مصروف رہا تھا۔

پولیس اس پنڈت کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکتی تھی۔ اگر محض چترا پریتم کے بیان پر اسے حراست میں رکھا جاتا تو سیکڑوں پنڈت اور پجاری ہنگامہ شروع کردیتے جس پر قابو پانا مشکل ہوجاتا۔

اس پنڈت کو چھوڑ دیا گیا۔ چترا پریتم تلملا کر رہ گئی۔ اس کی بیٹی اور شوہر کا قاتل اس کے سامنے تھا۔ اس نے پولیس کو اس کی نشان دہی کردی تھی لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اور وہ آزادی سے دندنا رہا تھا۔

"میرا دیور بھی اس واردات کی اطلاع ملنے پر سنگاپور سے یہاں آگیا۔" چترا پریتم کہہ رہی تھی "وہ دلی سے کسی وزیر کی چٹھی بھی لے کر آیا تھا لیکن اس پر بھی پولیس نے قاتلوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ میرا دیور مجھے اپنے ساتھ سنگاپور واپس لے جانا چاہتا تھا لیکن میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک گنگا کے اُجلے پانی کو اپنی معصوم بیٹی اور شوہر کے قاتلوں کے خون سے آلودہ نہ کردوں' یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔ یہاں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو دس بیس ہزار روپے لے کر کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں لیکن میں ان قاتلوں کو اپنے ہاتھوں سے ان کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک اپنی بیٹی اور شوہر کے خون کا بدلہ نہ لے لوں۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ رنج و ملال کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی کہانی سن کر مجھے واقعی دکھ ہوا تھا۔

"آج تمہیں دیکھا تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔" چترا پریتم کہہ رہی تھی "پہلے تو مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں تمہیں پہچاننے میں غلطی کر رہی ہوں لیکن میرا من کہہ رہا تھا کہ تم وہی ہو۔ میں نے تمہارا پیچھا شروع کردیا۔ میں سمجھ گئی کہ تم لوگوں کو رہائش کی تلاش ہے اور میں یہ بھی جانتی تھی کہ تمہیں کہیں رہائش نہیں ملے گی۔ دو ڈھائی گھنٹوں تک تمہارا پیچھا کرنے کے بعد بالآخر میں نے تم سے رابطہ کرلیا۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے یقین کرلینا پڑا کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کی اور نجانے کیا بات ہے کہ اب میں اپنے آپ کو وہ نہیں سمجھتی جو چند گھنٹے پہلے تھی۔ تنہا تنہا اور بے یارو مددگار۔ اب مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر ایک نئی طاقت آگئی ہے لیکن تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے۔ ایک مسلمان کا گنگوتری میں کیا کام!؟"

چترا پریتم کا یہ آخری جملہ سن کر سوبھراج بھی چونک گیا۔ وہ مجھے ہمت سنگھ کے نام سے جانتا تھا۔ اس نے مجھے سادھو کے بھیس میں بھی دیکھا تھا اور یہ بھی جان گیا تھا کہ میں بہت عرصے سے ٹھاکر بھانوت سنگھ اور روپ متی کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ وہ مجھے ہندو ہی سمجھتا تھا لیکن اس وقت میرے مسلمان ہونے کے انکشاف پر اس کی بٹن جیسی چھوٹی آنکھیں کچھ اور سکڑ گئی تھیں۔

"عبادت گاہ کا تعلق کسی بھی دھرم سے ہو' سب کے لیے قابلِ احترام ہوتی ہے۔" میں نے چترا پریتم کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہاری عبادت گاہیں! یہ مقدس مقام۔ انہیں تو ہوس پرست پنڈتوں نے عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے۔" چترا پریتم بولی "میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ میری معصوم اور بے گناہ بچی کو جس طرح ایک مندر میں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا' میں اسے کیسے ایک مقدس مقام سمجھ لوں۔ میرے شوہر کا خون بہایا گیا۔ میں کیسے مانوں کہ یہ مندر بھگوان کا گھر ہے' ایک مقدس مقام ہے۔ غنڈے اور بدمعاش یہ حرکت کرتے تو شاید مجھے زیادہ دکھ نہ ہوتا مگر یہ سب کچھ تو ان پنڈتوں نے کیا ہے جنہیں ہم بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ دیوتا سمان مانتے ہیں۔ میں۔۔۔ میں یہ سب کچھ کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"یہ سب کچھ واقعی افسوس ناک ہے۔"

میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا اور اس کے ساتھ ہی موضوع بدل کر چاچا خشونت سنگھ کے بارے میں بات کرنے لگا۔ جب میں تھائی لینڈ سے سنگاپور واپس آیا تھا تو مجھے پتا چل گیا تھا کہ چاچا خشونت سنگھ اور رجنی چاچی کا انتقال ہوچکا ہے۔ ان کی چھوٹی بیٹی اُرملا کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ اُرملا ہی سے مجھے پتا چلا تھا کہ چاچا خشونت سنگھ نے میرے ڈیڈی کی ڈائری لاہور میں اپنے کسی دوست کو بھیج دی تھی۔ اُرملا نے مجھے اس کا نام اور پتا بھی سمجھا دیا تھا کہ میں جب لاہور جاؤں تو وہ ڈائری اس سے لے لوں۔ میں جانکی کے ساتھ سنگاپور سے لاہور جانے کے لیے ہی روانہ ہوا تھا لیکن راجستھان کے ریگزار میں ہوائی جہاز کے حادثے نے میرا راستہ بدل دیا اور میں دارا کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گیا اور مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ بے راہ قدم مجھے کہاں لے جائیں گے اور اب چترا پریتم کی کہانی بھی میری کہانی میں شامل ہو رہی تھی۔

"میں کھانا تیار کروں۔ تم لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔" چترا پریتم نے کہا "سامنے ندی بہہ رہی ہے۔ تم لوگ چاہو تو منہ ہاتھ دھو آؤ۔"

وہ ایک کنستر سے تڑے میں چاول نکال کر چھٹنے لگی۔ میں اور سوبھراج ہٹ سے نکل کر ندی پر آگئے۔

"تم نے پہلے تو نہیں بتایا تھا کہ تم مسلمان ہو؟" سوبھراج نے کہا۔ اس وقت ہم دونوں ندی کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا بدلا ہوا لہجہ میں نے فوراً ہی محسوس کرلیا تھا۔

"میں نے اپنے بارے میں سب کچھ تمہیں بتا دیا تھا سوائے نام کے۔" میں نے جواب دیا "اور اس رات جب بلونت سنگھ اور دارا کے بارے میں بات ہو رہی تھی تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ان دونوں نے جے پور کے پنڈتوں اور پجاریوں کو میرے اور روپ متی کے خلاف بھڑکا کر ہندو مسلم فساد کروانے کی کوشش کی تھی۔ ان ہنگاموں کی ساری تفصیل تو تمہیں لاجونتی نے بھی بتائی تھی۔"

"ہاں۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے۔" سوبھراج نے جواب دیا "بہرحال اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اور دوستی کسی دین دھرم کی پابند نہیں ہوتی۔"

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ سردی بھی اچھی خاصی تھی اور پھر چترا پریتم کی آواز سن کر ہم اندر آگئے۔ اس نے فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر ہی دسترخوان بچھا دیا تھا۔ پلیٹوں کے ساتھ اس نے دال اور چاولوں والی دونوں

پتیلیاں بھی دسترخوان پر ہی رکھ دی تھیں۔

کھانے کے دوران میں زیادہ تر خاموشی ہی رہی۔ اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ سوبھراج اونگھنے لگا تھا۔ اس وقت اگرچہ صرف نو ہی بجے تھے لیکن لگتا تھا' رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہو۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے سوبھراج جی۔" چترا پریتم نے پوچھا "اس کمرے میں بستر لگا ہوا ہے۔ اندر جا کر سو جاؤ۔"

اس نے اٹھ کر دائیں طرف والے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

لیمپ کی روشنی اس کمرے کے اندر تک پہنچ رہی تھی۔ وہاں بھی نمدہ بچھا ہوا تھا اور دو تین کمبل پڑے ہوئے تھے۔ سوبھراج اس کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور کمبل اوڑھ لیا۔

"آؤ۔ ہم اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔ بہت دنوں بعد تو کوئی اپنا ملا ہے۔ تمہارے سامنے باتیں کر کے دل کا بوجھ ہلکا کروں گی۔" چترا پریتم نے اٹھ کر باہر والا دروازہ بند کر دیا اور دوسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

لیمپ ایسی جگہ رکھا ہوا تھا کہ تینوں کمروں میں روشنی کی ضرورت کو پورا کر رہا تھا۔ اس کمرے میں بھی نمدہ بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور دونوں پیر آگے کو پھیلا لیے۔ چترا میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کی کمر بالکل سیدھی تھی اور سینہ تنا ہوا تھا۔

"لگتا ہے تمہیں یوگا سے بہت دلچسپی ہے۔ تمہاری بیٹھک کا یہ آسن۔۔۔"

"یوگا سے مجھے شروع ہی سے دلچسپی رہی ہے۔" اس نے میری بات پوری نہیں ہونے دی "میں سنگاپور میں شادی سے پہلے اور بعد میں بھی مشقیں کیا کرتی تھی۔ کئی سال تک یوگا کی مشقیں کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کر لی ہے لیکن میں ایسا نہیں کہوں گی۔ یوگا تو ایک پُراسرار علم ہے جسے سیکھنے کے لیے پورا جیون بھی کم ہے۔ چند آسن سیکھ لینے سے اپنے آپ کو یوگا کا ماہر نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے ابھی کچھ نہیں سیکھا۔ بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہوں۔"

"آبادی سے دور ویرانے میں اس کاٹیج میں اکیلے رہتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگتا جبکہ تمہارے دشمن بھی شاید آس پاس منڈلا رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں اکیلی کب ہوتی ہوں۔" چترا پریتم نے جواب دیا "یہاں کے رہنے والے میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ میں دن بھر مندروں اور بازاروں میں گھومتی رہتی ہوں اور شام ہونے سے پہلے کسی یاتری فیملی کو لے کر آ جاتی ہیں۔ دور دراز سے آنے والے یاتری رہائش کے لیے پریشان ہوتے ہیں۔ میں جب کسی فیملی کو یہاں لے کر آتی ہوں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور آج تو اتفاق سے تم مل گئے۔ میرے اندر ایک نئی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے ایک نیا حوصلہ ملا ہے۔ لگتا ہے جیسے میرا کوئی اپنا مجھے مل گیا ہو۔"

چترا پریتم سے میری کبھی ایسی ملاقات نہیں ہوئی تھی جسے یاد رکھا جا سکتا۔ اس کے کہنے کے مطابق جن دنوں میں چاچا خشونت سنگھ کے ہاں پناہ گزیں تھا انہی دنوں وہ دو تین مرتبہ وہاں آئی تھی مگر مجھے یاد نہیں تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ چاچا خشونت سنگھ اور اس کے گھر والوں کے حوالے سے میں بھی اس سے کچھ اپنائیت سی محسوس کرنے لگا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں۔ تم یہاں کیسے آئے ہو اور تمہارے ساتھ یہ سوبھراج کون ہے؟" چترا نے پوچھا۔

پہلے میں نے اسے سوبھراج کے بارے میں بتایا پھر ہوائی جہاز کے حادثے کے بعد کے واقعات بتانے لگا اور میں بولا۔

"میری اطلاع کے مطابق دارا یہاں آ چکا ہے یا آنے والا ہے۔ وہ بھی مندروں ہی میں چھپتا پھر رہا ہے۔ میں نے بھی تمہاری طرح قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک اس سے اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لے لوں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا اور دنیا کے آخری کونے تک پیچھا کروں گا۔"

"تم نے یہاں کے مندروں اور پنڈتوں کو دیکھ لیا اور پھر بھی کہتے ہو کہ یہ مقدس عبادت گاہیں ہیں۔" وہ خاموش ہونے پر بولی۔

"عبادت گاہوں کا تو اس میں کوئی تصور نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہ مندر واقعی مقدس مقامات ہیں۔ قصور ان دھرم چاریوں کا ہے جنہوں نے ان کے تقدس کا خیال نہیں رکھا اور ان عبادت گاہوں کو اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ بہرحال۔" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "تم کئی مہینوں سے یہاں ہو۔ مندروں میں رہتی ہو۔ بہت سے پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے میں جان چکی ہو گی۔ پرگھیا راج نامی کسی پنڈت کے بارے میں جانتی ہو؟"

"کیا کہا۔ پرگھیا راج۔ یہی نام لیا نا تم نے؟" چترا اچھل پڑی۔ اس کے چہرے پر سنسنی کے سے تاثرات آئے تھے۔

"ہاں۔ پرگھیا راج۔" میں نے جواب دیا "میں نے ابھی کہا نہیں۔ صرف نام سنا ہے اور یہ پنڈت پرگھیا راج ہی دارا کا دوست ہے۔ دارا اس کے پاس یا تو آ چکا ہے یا آنے والا ہے۔ لیکن تم اس نام پر کیوں چونک گئیں؟" میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہی وہ وحشی ہے جس نے میری معصوم بچی کو پامال کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" بات کرتے ہوئے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا "یہی درندہ میرے شوہر کا قاتل ہے جو آج بھی آزادی سے دندنا رہا ہے۔"

"اوہ!" اس مرتبہ میں اچھل پڑا "اگر یہ وہی پنڈت پرگھیا راج ہے تو اطمینان رکھو۔ اس سے تمہاری بیٹی اور شوہر کے خون کا بدلہ ضرور لیا جائے گا۔ قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو کوئی بات نہیں۔ ہم اپنی عدالت لگائیں گے۔"

"مجھے۔۔۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہی میری مدد کرو گے۔" چترا پریتم کا لہجہ جذباتی ہو گیا "تمہیں دیکھتے ہی مجھے اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس ہونے لگی تھی۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ میری بیٹی اور میرے شوہر کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ ان کی آتماؤں کو سکون ضرور ملے گا۔"

چترا پریتم کی بات پر مجھے پہلے بھی یقین تھا اور اب یہ یقین اور زیادہ مضبوط ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی اور شوہر کو پنڈت پرگھیا راج اور اس کے دو دوسرے ساتھیوں ہی نے قتل کیا تھا اور جب کئی روز بعد چترا نے اسے شناخت کر لیا تو پورے شہر کے پنڈت اور پجاری اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے ایک ساتھی کو بچانے کے لیے وہ دھرم کو بیچ میں لے آئے تھے اور دھرم کے نام پر شروع ہونے والی کسی تحریک پر آسانی سے قابو نہیں پایا جا سکتا اور اسی لیے پولیس کو پنڈت پرگھیا راج کو چھوڑنا پڑا تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ پولیس اب اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی اور وہ اپنی گھناؤنی سرگرمیاں جاری رکھے گا۔

دارا کے دوست ایسے ہی لوگ ہو سکتے تھے جنہیں شرافت یا انسانیت چھو کر نہ گزری ہو۔ دارا مجھ سے بچنے کے لیے سنگاپور سے بھاگ کر ہندوستان آ گیا تھا اور اتفاق سے ہوائی جہاز کے حادثے نے مجھے بھی ہندوستان پہنچا دیا اور خوش قسمتی سے دارا بھی میری نظروں میں آ گیا۔ وہ مجھ سے بچتا پھر رہا تھا۔ مجھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے اس نے [illegible] میرے خلاف کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو [illegible] مجھے پنڈتوں اور پجاریوں سے مروانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی ہر سازش اس پر الٹتی رہی تھی۔ کالی [illegible] والی پہاڑیوں میں وہ میرے ہاتھ آ بھی گیا تھا لیکن ایک مرتبہ پھر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جے پور میں دوبارہ پنڈت سوبھراج سے ملاقات ہو گئی اور اس سے ایک معرکے کے بعد اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ پنڈت پرگھیا راج کے بارے میں انکشاف سوبھراج ہی نے کیا تھا اور میں اس امید پر یہاں چلا آیا تھا کہ دارا پناہ لینے کے لیے پنڈت پرگھیا راج ہی کے پاس آئے گا اور اتفاق سے یہاں آتے ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ پرگھیا راج دارا سے بھی زیادہ خوفناک درندہ ہے۔

میں پنڈت پرگھیا راج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن چترا پریتم نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ وہ دارا کی طرح انسان کے قالب میں خوں خوار بھیڑیا تھا۔

میں اور چترا پریتم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور چترا پریتم اسی طرح تن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک گھاگھرا اور ایک چادر جسم پر ڈال رکھی تھی اور اس چادر کے نیچے کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے قریب پڑا ہوا کمبل اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"لو یہ کمبل اوڑھ لو۔ تمہیں سردی لگ رہی ہو گی۔"

"سردی تو تمہیں بھی لگ رہی ہو گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ کمبل تم اوڑھ لو اور میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ آج میں تمہیں رات بھر نہیں سونے دوں گی۔ بہت دنوں بعد اپنا کوئی ملا ہے۔ میں رات بھر تم سے باتیں کرتی رہوں گی۔" وہ اٹھ کر سامنے والے کمرے میں چلی گئی اور آتش دان میں آگ جلا کر چائے بنانے لگی۔

میں نے کمبل اپنے اوپر ڈال لیا اور اسے کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ چائے بنا کر لے آئی۔ ایک پیالی میری طرف بڑھا دی اور دوسری اپنے قریب رکھ لی۔

"تم بھی کمبل اوڑھ لو۔ سردی لگ جائے گی۔" میں نے یہ کہتے ہوئے کمبل کا ایک کونا پکڑ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے گھور کر میری طرف دیکھا تو مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ نیم عریاں تھی اور میں اسے اپنے کمبل میں لپٹنے کی دعوت دے رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور کمبل کو کھول کر دونوں پر پھیلا دیا۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی تھی۔ میں اس کے بدن کی حرارت محسوس کر رہا تھا لیکن نہ تو میرے دل کی دھڑکن بے ربط ہوئی اور نہ ہی سینے میں کوئی ہلچل پیدا ہوئی۔

رات دھیرے دھیرے بیتتی رہی اور ہم باتیں کرتے رہے۔ میں بار بار پنڈت پرگھیاراج کا ذکر کرکے اس کے زخموں کو نہیں کریدنا چاہتا تھا اس لیے میں جان بوجھ کر اس موضوع سے دور ہی رہا اور زیادہ تر سنگاپور کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سنگاپور کی یادوں سے میرے زخم ہرے ہورہے تھے اور سینے میں پیدا ہونے والی کسک بہت اچھی لگ رہی تھی۔ یہ کسک ہمیشہ سے تھی اور میرے زخم بھی کبھی مندمل نہیں ہوئے تھے۔ میں ان باتوں کو کبھی نہیں بھولا تھا۔ وہ گھر اور اس میں ہنستے مسکراتے چہرے۔ کتنا سکون تھا ہماری زندگیوں میں۔ باپ کی شفقت' ماں کی مامتا..... لیکن دارا نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ اس نے میری زندگی میں انگارے بھر دیے تھے اور اب وہ کئی برسوں سے مجھ سے بچنے کے لیے بھاگتا پھر رہا تھا اور میں موت کا سایہ بن کر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ دارا شاید اب تھک گیا تھا۔ میں چڑھتا سورج تھا اور وہ ڈھلتا سایہ۔ اسے پناہ کی ضرورت تھی اور ہندوستان کے اس دور دراز کونے میں' ہمالیہ کی ترائیوں میں وہ پناہ کی تلاش میں ہی آرہا تھا یا آچکا تھا لیکن میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ ہمالیہ کی یہ گود اس کی آخری پناہ گاہ ثابت ہوگی۔

سنگاپور کی یادوں نے مجھے اداس کردیا۔ چترا پریتم بھی شاید سمجھ گئی تھی۔ اس نے موضوع بدل دیا اور یوگا کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

"یہ ہر دوار ہے..... جسے WAY TO GOD GATE بھی کہا جاتا ہے۔ گنگوتری سے گنگا جنم لیتا ہے۔ گنگوتری ہندوؤں کا سب سے اہم اور مقدس ترین مقام مانا جاتا ہے۔ جس طرح مسلمان حج کے لیے مکہ جاتے ہیں اسی طرح ہندو بھی زندگی میں کم از کم ایک بار گنگوتری یاترا کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔ یہاں سے صرف چوبیس کلومیٹر کے فاصلے پر رشی کیش ہے۔ وہ جگہ میسوری اور نینی تال سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ رشی کیش کو یوگا کا گھر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

"دنیا کے کونے کونے سے لوگ یوگا سیکھنے کے لیے وہاں آتے ہیں۔ وہاں تمہیں لاتعداد مندر بھی ملیں گے اور بدھوں کے اسٹوپے بھی۔ ہندو یوگی اور بدھ بھکشو یوگا کے استاد سمجھے جاتے ہیں۔ انہیں اس پُراسرار علم پر عبور حاصل ہے۔ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ ایسے کارنامے کس طرح انجام دے لیتے ہیں کہ جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

"تم رشی کیش گئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سرہلایا "پلوی اور اپنے شوہر کندن لال کے قتل کے بعد جب مجھے اسپتال سے ملی تھی تو میں نے پرگھیاراج اور اس کے ساتھیوں کی تلاش شروع کردی تھی۔ میں لوگوں کو ان کے حلیے بتا کر پوچھ رہی تھی۔ مجھے پتا چلا کہ ان میں سے ایک کے حلیے سے ملتا جلتا ایک پنڈت رشی کیش کے ایک مندر میں موجود ہے۔ میں رشی کیش پہنچ گئی اور تقریباً ایک ہفتے تک اس پنڈت کو تلاش کرتی رہی۔ وہ پنڈت تو مجھے نہیں ملا البتہ ایک بدھ بھکشو سے ملاقات ہوگئی تھی۔ میں اس سے کچھ سیکھنا چاہتی تھی لیکن میرا دھیان نہیں لگا۔ تاہم اس کی باتوں سے میں نے جان لیا تھا کہ وہ اس پُراسرار علم کے بارے میں بہت معلومات رکھتا ہے۔"

"کون ہے وہ.....؟" میں نے پوچھا "موقع ملا تو اس سے ضرور ملوں گا۔"

"اس کا نام گوتم بھوش ہے۔" چترا پریتم نے کہا "وہ کچھ عرصے پہلے ہی تبت سے آیا تھا۔ تبت ان پُراسرار علوم کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے لیکن راستے اتنے دشوار اور خطرناک ہیں کہ کوئی اس جانب جانے کی ہمت نہیں کرپاتا۔"

"اگر من میں کچھ پالینے کی لگن ہو تو راستے کی کٹھنائیاں اور خطرات کوئی معنی نہیں رکھتے۔" میں نے جواب دیا۔

چترا پریتم کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ یوگا کے بارے میں وہ مجھ سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔ میں نے مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی اور اس کے لیے مجھے سخت ریاضت کرنی پڑی تھی۔ میں نے اپنے اندر کی پُراسرار قوت پر قابو پایا تھا۔ یوگا مجھے اس حد تک آتا تھا جس کی ضرورت تھی اور اب چترا کی باتیں سن کر یوگا میں میری دلچسپی بڑھتی جارہی تھی اور میں نے طے کرلیا کہ موقع ملا تو اس میدان میں بھی کچھ حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں نے تبت سے آنے والے بدھ بھکشو گوتم بھوش کا نام ذہن نشین کرلیا تھا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ چاند نیچے کی طرف پھسلتے پھسلتے بالکل لیٹ چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مجھے رات بھر جگائے گی اور مجھ سے باتیں کرتی رہے گی لیکن اب وہ اونگھنے لگی تھی۔

میں بڑی آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ کمبل اچھی طرح اسے اوڑھا دیا اور دوسرے کمرے میں آگیا۔ سوبھراج دونوں کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔ میں بھی کمبل میں گھس گیا اور کچھ دیر بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

پنڈت پرگھیاراج کو انسان سمجھنا انسان کی بہت بڑی غلطی تھی۔ وہ شکل و صورت ہی سے درندہ لگتا تھا۔ لمبا قد' بھاری بھرکم جسم' سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے جنہیں تین چار چٹیوں میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ تلاش کرنا مشکل تھا۔ ناک سموسے کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور آنکھیں سرخ جن سے صاف لگتا تھا کہ وہ نشہ کرنے کا عادی ہے۔ اس کا سینہ بھی ریچھ کی طرح سیاہ بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے دھوتی باندھ رکھی تھی اور جسم کے بالائی حصے پر پیلی چادر اوڑھی ہوئی تھی جو ایک کندھے سے بار بار پھسل رہی تھی۔

میں اور سوبھراج' چترا پریتم کے ساتھ اس مندر میں آئے تھے۔ ہمیں تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا تھا اور پھر وہ اچانک ہی مندر کے پچھلے حصے میں سے کسی طرف سے نکل کر سامنے آیا تھا۔ چترا پریتم اس کی نشان دہی کرکے فوراً ہی واپس چلی گئی تھی۔

مندر میں یاتریوں کا ہجوم تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہوئے آجا رہے تھے۔ میں اور سوبھراج ایک طرف کھڑے پنڈت پرگھیاراج کو دیکھتے رہے۔ میں نے سوبھراج کو بتادیا تھا کہ یہی وہ پنڈت ہے جس نے اپنے دو دوسرے پنڈتوں کے ساتھ مل کر چترا پریتم کی معصوم بیٹی کو بے آبرو کرکے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور اس کے شوہر کندن لال کو بھی خنجروں کے پے در پے وار کرکے ہلاک کردیا تھا اور یہی وہ پنڈت پرگھیاراج ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔

سوبھراج کو مندر میں پرگھیاراج کی نگرانی پر چھوڑ کر میں ہردوار کی سڑکوں پر گھومنے لگا۔ یہاں کئی مندر تھے۔ میں ہر مندر میں جھانکتا اور دارا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میرے خیال میں یہ حماقت ہی تھی۔ دارا حلیہ تبدیل کرنے کا ماہر تھا اور محض حلیے کی بنا پر اسے تلاش کرلینا ممکن نہیں تھا۔

دو دن گزر گئے اور پھر اچانک ہی ہردوار کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔ یوں تو ہزاروں کی تعداد میں یاتری روزانہ یہاں آتے جاتے تھے لیکن اس روز اچانک ہی یاتریوں کی آمد میں اضافہ ہوگیا تھا۔

سرائے' ہوٹلز اور گیسٹ ہاؤسز... کہیں جگہ نہیں رہی تھی۔ لوگ کھلی جگہوں پر پڑے تھے۔ متمول یاتری اپنے ساتھ چھوٹے خیمے اور چھولداریاں لے کر آئے تھے۔ پنڈت' سادھو اور پجاری بھی سیکڑوں کی تعداد میں چلے آرہے تھے اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ اگلے اتوار کو سورج گرہن ہونے والا ہے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن ہندو دھرم میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر خاص پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جوتشی اور پنڈت اپنے حساب کتاب میں مصروف ہوجاتے ہیں اور پجاری جاپ پر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس روز صبح گیارہ بجے کے قریب میں اور چترا پریتم گنگوتری کی طرف چلے گئے۔ یوں تو دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ایسے گھاٹ بنے ہوئے تھے جہاں گنگا جل میں غسل کرنے والوں کا رش لگا رہتا تھا لیکن گنگوتری کا وہ مقام جہاں مختلف سمتوں سے پہاڑی ندی نالوں کا پانی آکر گرتا ہے وہاں بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ اس جگہ چٹانوں کے ساتھ ایک بہت لمبا چوڑا پختہ تالاب بنا ہوا تھا جس میں نیچے اترنے کے لیے پختہ سیڑھیاں بھی بنی ہوئی تھیں۔ اس طرف پہاڑوں سے آنے والا پانی اس وسیع و عریض تالاب میں گرتا اور دوسری طرف بہہ کر دوسرے پانی میں مل جاتا۔ اس طرف بھی پہاڑوں سے مختلف سمتوں سے آنے والا پانی جمع ہوکر نشیب کی طرف بہتا تھا اور ذرا آگے جاکر اس کا پاٹ ایک باقاعدہ دریا کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جسے گنگا کی جنم بھومی بھی کہا جاسکتا ہے۔

اس تالاب کے ساتھ ہموار اور کشادہ جگہ تھی اور اس سے آگے عمودی چٹانیں تھیں جن میں لاتعداد گپھائیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سب گپھائیں اور غار قدرتی تھے جو صدیوں میں پانی کے کٹاؤ سے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ کئی غار اور گپھائیں ایسی تھیں جن میں پانی نہیں تھا اور وہاں یاتریوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ تاہم لاتعداد گپھائیں ایسی تھیں جن میں پہاڑوں کے اندر ہی اندر سے آنے والا تیز رفتار پانی پُرشور آواز سے بہہ رہا تھا۔ یہ غار اور سرنگیں پہاڑوں میں بہت اندر تک چلی گئی تھیں۔

اس وسیع و عریض تالاب پر بہت رش تھا۔ تالاب کے اندر بھی لوگ بھرے ہوئے تھے اور کشادہ سیڑھیوں پر بھی لوگ ایک دوسرے پر گویا چڑھے رہے تھے۔ بچے' مرد اور عورتیں سب ایک ہی جگہ غسل کررہے تھے۔ بعض عورتیں نیم عریاں تھیں بعض نے اگرچہ لباس پہن رکھے تھے لیکن بھیگے ہوئے لباس جسم سے چپک کر انہیں برہنہ کررہے تھے مگر کسی کو ہوش نہیں تھا۔ تالاب کے کنارے پر بھی لوگ ہجوم در ہجوم جمع تھے۔

ٹھیک بارہ بجے سورج گرہن شروع ہونے والا تھا۔ یہ جزوی سورج گرہن تھا جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہتا اور ہر ہندو کی خواہش تھی کہ وہ اس وقت پوجا میں مصروف ہو یا گنگا جل میں غسل کررہا ہو تاکہ اس کے سارے گناہ دُھل جائیں۔

میں چترا پریتم کے ساتھ ایک طرف کھڑا افراتفری کا یہ

منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک ہٹا کٹا آدمی لوگوں کو دھکے دیتے ہوئے تالاب کی طرف بڑھتے ہوئے نظر آیا۔ اس نے سفید دھوتی باندھ رکھی تھی۔ جسم کے بالائی حصے پر کوئی کرتہ وغیرہ نہیں تھا البتہ ایک سفید کپڑا دوپٹے کی طرح بند کر کے گلے میں لٹکا رکھا تھا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ لمبا قد' توانا جسم' مضبوط ہاتھ پاؤں' گنجا سر اور ماتھے پر قشقہ۔ وہ کوئی پنڈت یا پجاری نہیں تھا لیکن اس کے حلیے اور انداز و اطوار سے لگتا تھا کہ وہ دھرم کے معاملے میں بہت کٹر ہے۔ وہ لوگوں کو ادھر اُدھر دھکے دیتا راستہ بناتے ہوئے تالاب میں اتر گیا اور تقریباً وسط میں پہنچ کر رک گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر زیر لب کچھ بدبدانے لگا پھر چلوؤں میں پانی بھر بھر کر اپنے اوپر ڈالتا رہا۔ اس دوران میں وہ بار بار سورج کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے سورج پر نچلی طرف سیاہ دھبا پڑنا شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں اشلوک اور بھجن وغیرہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

تالاب کے وسط میں کھڑا وہ آدمی کچھ زیادہ ہی پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ وہ کبھی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا اور کبھی اپنے گنجے سر پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگتا اور کبھی دونوں ہاتھ اوپر پھیلا کر چیخنے والے انداز میں کوئی بھجن گانے لگتا یا اشلوک پڑھنے لگتا۔

نجانے کیا بات تھی کہ اتنے بڑے ہجوم میں میری توجہ اسی ایک شخص پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں تو ہر شخص اپنے اپنے انداز میں پوجا کر رہا تھا لیکن اس شخص کی حرکتیں کچھ زیادہ ہی دلچسپ لگ رہی تھیں۔

سورج پر سیاہ دھبا بڑھ گیا تھا۔ روشنی کم ہوگئی تھی۔ لوگوں کے اشلوک پڑھنے اور بھجن گانے کی آوازیں بلند ہوتی گئیں اور پھر آدھے گھنٹے بعد گرہن لوٹنا شروع ہوا۔

میری نظریں تالاب کے دوسرے کنارے پر تین باوردی پولیس والوں کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ابھی ابھی وہاں نمودار ہوئے تھے۔ ان میں ایک سب انسپکٹر تھا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ باقی دو کانسٹیبل رائفلیں سنبھالے ہوئے تھے۔ وہ تینوں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور پھر ایک کانسٹیبل نے چیختے ہوئے تالاب کے وسط میں اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ سب انسپکٹر نے بھی اسے دیکھ لیا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔

"آشوتوش! اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ تم گھیرے میں آچکے ہو۔ بچ کر نہیں جاسکو گے۔"

تالاب کے وسط میں کھڑے ہوئے آشوتوش نامی اس شخص نے چونک کر پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر وحشت سی ابھر آئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیختے ہوئے تالاب کے اس کنارے کی طرف آنے کی کوشش کرنے لگا جہاں ہم کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر نے ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا کر ہوائی فائر کردیا۔ پہلے فائر پر شاید لوگوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے فائر پر کھلبلی سی مچ گئی۔

تالاب میں بھی لاتعداد لوگ تھے۔ پانی آشوتوش کے سینے تک تھا۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر فرد کو ہاتھ مار کر دھکا دے کر ہٹا کر آگے بڑھتا رہا۔ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں جنہیں کوئی معنی نہیں پہنائے جاسکتے تھے۔ پولیس والے تالاب کے کنارے پر دوڑنے لگے۔ کنارے اگرچہ فٹ پاتھ کی طرح کشادہ تھے لیکن لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"آشوتوش رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔" سب انسپکٹر لوگوں کو دھکے دے کر راستہ بناتے ہوئے چیخا۔

لیکن آشوتوش جانتا تھا کہ پولیس والے اس پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ وہاں سیکڑوں لوگ موجود تھے۔ بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ گولی کسی اور کو بھی لگ سکتی تھی۔

آشوتوش تالاب کے کنارے پر آگیا۔ اس کی دھوتی اور گلے میں دوپٹے کی طرح پڑے کپڑے سے بھی پانی نچڑ رہا تھا۔ وہ ایک جگہ پر رک گیا اور پھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ ایک ٹانگ کتے کی طرح اٹھالی۔ ایک ہاتھ بھونپو کی طرح منہ پر رکھا اور چیختے ہوئے منہ سے عجیب آوازیں نکالنے لگا۔ یہ حرکت عام طور پر بچے کسی کو چڑانے اور طیش دلانے کے لیے کرتے ہیں۔

آشوتوش کی اس حرکت پر مجھے اس کے ذہنی توازن پر بھی شبہ ہونے لگا۔ اس نے دو تین مرتبہ یہ حرکت دہرائی اور ایک ہاتھ میں دھوتی پکڑ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ بالکل وحشی بن گیا تھا۔ اس نے نو دس سال کی عمر کے ایک بچے کو ٹھوکر مار کر دور گرا دیا۔ اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کیا معاملہ ہے اور پولیس اسے کیوں پکڑنا چاہتی ہے۔

میں آشوتوش کے راستے سے ہٹ گیا مگر چترا پریتم اس کی زد میں آگئی۔ اس نے چترا کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر میری طرف اچھال دیا۔ چترا چیختے ہوئے میرے اوپر آئی اور ہم دونوں زمین پر گر گئے۔ آشوتوش وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے چٹان کے ایک غار میں گھس گیا۔ اس دوران میں پولیس والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے چترا کو سہارا دے کر اٹھا دیا تھا اور میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بات ہے آفیسر۔ یہ پاگل کون ہے؟" میں نے سب

انسپکٹر سے پوچھا۔

"یہ پاگل نہیں قاتل ہے۔ دو جوان لڑکیوں کا مرڈر کرچکا ہے۔ ایک تیسری لڑکی اس کے قبضے میں ہے جسے یہ قتل کرنا چاہتا ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا اور پھر جلدی جلدی میں جو تفصیل بتائی وہ بڑی خوفناک تھی۔

سب انسپکٹر کے کہنے کے مطابق آشوتوش کا تعلق راجستھان کے شہر انوپ گڑھ سے تھا۔ وہ پُراسرار قوتوں کو تسخیر کرنے کے لیے مختلف قسم کے جاپ کرتا رہتا تھا۔ کچھ عرصے پہلے وہ ایک پنڈت کے ہتھے چڑھ گیا تھا جس نے اسے ایک ایسا جاپ بتایا جس پر عمل کرکے ابدی حیات حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس جاپ پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تین سورج گرہن پر چودہ سالہ تین کنواری ناریوں کی بھینٹ دی جائے۔ ناغہ ہونے کی صورت میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ آشوتوش اب تک دو لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ یہ تیسرا سورج گرہن تھا۔ اس نے ایک چودہ سالہ کنواری لڑکی کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ جسے وہ عین اس وقت ہلاک کرتا جب گرہن ختم ہونے کے آخری لمحات میں ہوتا۔

"ہم اس کی تلاش میں تھے۔" سب انسپکٹر کہہ رہا تھا "لیکن وہ بھاگ گیا اگر اسے نہیں پکڑا گیا تو وہ اس لڑکی کو ہلاک کردے گا۔"

"ارے روکو اسے۔" چترا پریتم چیخی "وہ میری بچی کو مار ڈالے گا۔ روکو اسے۔"

میں نے چونک کر چترا پریتم کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی جوان بیٹی کھو چکی تھی۔ اسے بے آبرو کرکے ہلاک کیا گیا تھا اور اب کسی اور کی بیٹی کو ذبح کیا جانے والا تھا۔

سب انسپکٹر اپنے آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے اس غار میں گھس گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا اور چترا نے بھی میرے پیچھے دوڑ لگا دی۔ یہ چٹان زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ تقریباً سو گز آگے ہم کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ کھلی جگہ بھی پچاس ساٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس سے آگے بلند چٹانیں تھیں۔ ان میں بھی کئی سرنگیں تھیں۔ ایک سرنگ میں داخل ہونے والا پانی ندی کی صورت میں چٹان کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا آگے جاکر تالاب کی دوسری طرف کسی جگہ سے گزرتا تھا۔ میں نے پولیس والوں کو ایک سرنگ میں گھستے دیکھا تو میں دوسری سرنگ کی طرف دوڑا۔ چترا بھی میرے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آرہی تھی۔

یہ سرنگ خاصی طویل تھی جو آگے جاکر ایک اور سرنگ سے مل گئی تھی جس میں پانی بہہ رہا تھا۔ یہ سرنگ بہت کشادہ تھی۔ پانی بیچ میں تھا اور اطراف میں خشک جگہ تھی۔ میں اور چترا دیوار کے ساتھ ساتھ آگے چلتے رہے۔

آگے تنگ اور کشادہ سرنگوں کا جال سا بنا ہوا تھا۔ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے بہنے والے پانی نے ان چٹانوں کو اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا اور یہ عمل دو چار سال میں نہیں' صدیوں میں اس حد تک پہنچا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان چٹانوں کو اندر ہی اندر کاٹنے کا' پانی کا عمل اب بھی جاری تھا جس کا نتیجہ مزید کئی صدیاں گزرنے کے بعد سامنے آئے گا۔

ان سرنگوں میں اندھیرا نہیں تھا۔ کہیں کہیں چٹانیں ٹوٹی ہوئی تھیں اور مدھم روشنی سرنگوں کے اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ پانی بڑی تیزی سے ان سرنگوں میں بہہ رہا تھا۔ پانی کی رفتار اور اس کا شور اعصاب پر دہشت سی طاری کر رہا تھا۔ بعض سرنگوں میں تو پانی اس قدر زیادہ تھا کہ ان میں داخل ہونا اپنے آپ کو موت کے حوالے کردینے کے مترادف تھا۔ ایسی جگہوں پر ہمیں راستہ بدل کر کسی اور سرنگ میں داخل ہونا پڑتا۔

پولیس والوں کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کس طرف چلے گئے تھے اور میں یہی سوچ رہا تھا کہ آشوتوش کے پیچھے آکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ لیکن میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ ایک لڑکی کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ ایک جنونی کے جنون کی بھینٹ چڑھنے والی تھی اور شاید اس کی زندگی کے چند ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

میں جلد سے جلد آشوتوش کو تلاش کرلینا چاہتا تھا لیکن ہم ان سرنگوں کی بھول بھلیوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ میں ایک اور سرنگ میں داخل ہوگیا۔ سرنگ کے کنارے پر کچھ جگہ اونچی تھی اور نیچے طوفانی رفتار سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں چٹانی دیوار کے ابھرے ہوئے پتھروں کے سہارے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ چترا مجھ سے دو تین قدم پیچھے تھی۔ اگر ہم میں سے کسی کا پیر پھسل جاتا تو تیز رفتار پانی تنکے کی طرح ہمیں بہا کرلے جاتا۔ چترا بھی اس خطرے سے پوری طرح آگاہ تھی اور بہت سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔ اگلے موڑ پر پہنچ کر ہم رک گئے۔

"یہ۔۔۔ یہ آواز سنی تم نے۔۔۔؟"

چترا کی کپکپاتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا اور پھر وہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی شخص ایک انگلی منہ میں ڈال کر اسے حرکت دیتے ہوئے چیخ رہا ہو۔ بالکل بچوں جیسی حرکت۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ آشوتوش تھا۔ تالاب سے بھاگتے ہوئے بھی اس نے ایسی ہی حرکت کی تھی۔ اس آواز کا مطلب تھا کہ ہم آشوتوش کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ہم

دوسری سُرنگ میں مڑ گئے۔ یہ سُرنگ زیادہ طویل نہیں تھی۔ دوسری طرف روشنی دکھائی دے رہی تھی اور پھر ڈھول کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا جنونی انداز میں پوری طاقت سے ڈھول بجا رہا تھا اور ظاہر ہے وہ آشوتوش کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

غار کے دہانے پر پہنچ کر میں رک گیا۔ سامنے کھلی جگہ تھی اور دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھول کی آواز بائیں طرف سے آرہی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے جھانک کر اس طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے سینے میں اپنا سانس رکتا محسوس ہونے لگا۔

وہ بہت کھلی جگہ تھی۔ اس کے چاروں طرف سنگلاخ چٹانیں کنوئیں کی دیواروں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ بائیں طرف پتھر پر ایک جوان لڑکی رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کا سر گنجا تھا اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور آشوتوش گلے میں ڈھول لٹکائے اسے پوری طاقت سے پیٹتے ہوئے اس پتھر کے چاروں طرف ناچ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ منہ سے چیخوں جیسی آوازیں نکالتا اور بار بار سر اٹھا کر اوپر دیکھتا۔

میں نے ذرا اور آگے بڑھ کر اوپر دیکھا۔ سورج سر پر تھا۔ گرہن سے سورج پر جو سیاہ دھبا پڑ گیا تھا وہ آدھے سے زیادہ ختم ہو گیا تھا۔ گرہن پوری طرح ختم ہونے میں دس بارہ منٹ باقی تھے اور اس لڑکی کی زندگی کی مہلت بھی اتنی ہی رہ گئی تھی۔ گرہن مکمل ہونے کے آخری لمحات میں اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جانے والا تھا۔

چترا پریتم نے بھی آگے جھک کر وہ خوفناک منظر دیکھا۔ اگر میں جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو اس کی چیخ آشوتوش کو ہماری موجودگی سے آگاہ کر دیتی۔

میں محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سامنے والی بعض سُرنگوں میں تیز رفتار پانی کے بہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا، کسی سُرنگ کے اندر پانی بلندی سے گر رہا تھا۔ اس کھلی جگہ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چند بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کسی سُرنگ سے ایک فٹ چوڑی نالی کی صورت میں پانی باہر بھی بہہ رہا تھا جو کھلی جگہ پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے قریب جمع ہو کر زمین کے اندر کہیں غائب ہو رہا تھا۔

صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد میں نے چترا پریتم کو سرگوشی میں کچھ ہدایات دیں اور آشوتوش ڈھول بجاتے ہوئے جیسے ہی دوسری طرف مڑا، میں سُرنگ سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے ایک بڑے پتھر کے پیچھے پہنچ گیا اور پھر مجھے اس سے آگے والے پتھر کے پیچھے پہنچنے کا موقع مل گیا۔

اب میں اس تیسرے پتھر کے پیچھے پہنچ چکا تھا جس کے قریب سرنگ سے آنے والا پانی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ آشوتوش سے میرا فاصلہ اب دس گز سے زیادہ نہیں تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، آشوتوش کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ پتھر پر بندھی ہوئی لڑکی کے چاروں طرف ڈھول بجاتے اور ناچتے ہوئے وہ بار بار اوپر دیکھ رہا تھا۔ اب میں اس لڑکی کو بھی پوری طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں بے پناہ دہشت تھی۔ آشوتوش جس طرف جاتا، اس کی نظریں بھی گھوم جاتیں۔ وہ ہاتھوں اور پیروں کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھی البتہ سر کو زور زور سے جھٹک رہی تھی۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے اگلے پتھر تک جانے کا موقع مل جائے تو میں آشوتوش پر حملہ کر کے اسے گرفت میں لے سکتا تھا اور پھر میں نے جیسے ہی اس پتھر کی طرف چھلانگ لگائی آشوتوش نے مجھے دیکھ لیا۔

اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈھول گلے سے اتار کر پھینک دیا اور ایک ڈنڈا اٹھا کر وحشیانہ انداز میں چیختے ہوئے میری طرف لپکا۔

میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا، میں نے ڈنڈے کو دونوں ہاتھوں پر روکا اور اسے گرفت میں لے کر پوری قوت سے آگے کی طرف جھٹکا دیا۔ آشوتوش کو شاید اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور آگے کو قلابازی کھاتا ہوا گرا لیکن اس نے اٹھنے میں بھی بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔

وہ ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر لگی۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے لے گیا۔ میں پیچھے پتھر سے ٹکرایا تو زوردار جھٹکے سے مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر کا سارا سسٹم ہل کر رہ گیا ہو۔ آشوتوش پیچھے ہٹ گیا اور پیٹ پر سر سے ایک اور ٹکر ماری۔ وہ تیسری ٹکر مارنے کے لیے پیچھے ہٹا تو میں اپنے آپ کو سنبھال کر پوری قوت سے اس پر حملہ آور ہوا۔ میرا گھونسا اس کے جبڑے پر لگا تو وہ ایک جھٹکے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے گھونسا مارنا چاہا تو میں..... اس کا وار روک کر کلائی دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے کر اسے موڑتا چلا گیا۔ آشوتوش دہرا ہو گیا۔ میں نے اس کی کلائی کو ایک ہاتھ میں پکڑے رکھا اور اس کی گردن پر زوردار گھونسا مار دیا۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ٹانگ چلا دی۔ اس کا پیر میرے گھٹنے کے پیچھے لگا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتے ہوئے اس کے اوپر گرا۔ اس دوران میں نے چترا پریتم کو سُرنگ سے نکل کر اس پتھر کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھ

لیا تھا جس پر وہ لڑکی بندھی ہوئی تھی۔

آشوتوش نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھے اٹھا کر دور اچھال دیا۔ میں پشت کے بل پتھروں پر گرا، میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ آشوتوش دہاڑتے ہوئے چترا کی طرف لپکا۔ اس نے چترا کو اٹھا کر دور پھینک دیا۔ چترا بھی چیخ اٹھی۔

آشوتوش نے آسمان کی طرف دیکھا۔ میری نظریں بھی اوپر اٹھ گئیں۔ سورج کے نچلے کنارے پر سیاہی کی بہت معمولی سی لکیر رہ گئی تھی۔ آشوتوش دونوں ہاتھ سینے پر مار کر وحشیوں کی طرح چیخا اور پتھر کی دوسری طرف جا کر نیچے جھک گیا اور جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل والی تلوار دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ وہ پتھر کی اس طرف آگیا جہاں سے پتھر پر پڑی ہوئی لڑکی پر وار کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر جلد بازی میں میرا پیر چھوٹے چھوٹے پتھروں پر رپٹا اور میں پھر گر گیا۔

آشوتوش نے ایک بار پھر سورج کی طرف دیکھا اور تلوار کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے بلند کر لیا۔ میں اٹھ کر آشوتوش کی طرف لپکا لیکن چترا پریتم مجھ سے زیادہ تیز ثابت ہوئی۔ وہ بھی زمین پر پڑا ہوا ڈنڈا اٹھا کر آشوتوش کی طرف لپکی تھی۔ آشوتوش کے منہ سے عجیب سی زوردار آواز نکلی اور اس سے پہلے کہ وہ لڑکی کی گردن پر تلوار کا وار کرنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دیتا، چترا نے اس پر حملہ کر دیا۔ ڈنڈا بڑے زور سے آشوتوش کے سر پر لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

آشوتوش زخمی شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے پیچھے مڑا۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور چترا کو ساتھ لیتا ہوا دور جا گرا۔ آشوتوش نے گھومتے ہوئے بڑی قوت سے تلوار چلائی تھی۔ اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چترا کی گردن اڑ جاتی یا تلوار کی زد میں آکر میرا بازو کٹ جاتا۔

آشوتوش کے سر پر لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی۔ خون اس کی گردن کو تر کرتا ہوا کندھے پر بہہ رہا تھا۔ اس پر جنون طاری تھا اور اس کا چہرہ کچھ اور بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر تلوار کو اوپر اٹھا کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ میرے ساتھ گرنے سے چترا کے ہاتھ سے ڈنڈا بھی چھوٹ گیا تھا جو ہمارے قریب ہی پڑا تھا۔ میں نے ڈنڈا اٹھا کر لیٹے ہی لیٹے پوری قوت سے آشوتوش کی ٹانگوں پر وار کیا۔

میرا یہ حربہ کارگر رہا۔ آشوتوش چیختا ہوا نیچے گرا۔ پنڈلی پر لگنے والی ضرب خاصی زوردار تھی۔ اس مرتبہ تلوار بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ میں پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آشوتوش پر ٹھوکریں برسانے لگا۔

ایک موقع پر اس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ آشوتوش اٹھ کر تلوار کی طرف لپکا لیکن میں نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

اب ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ آشوتوش کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اس میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ مجھے رگیدتا ہوا دور لے گیا اور میرا سر ایک پتھر سے ٹکرانے لگا۔ میرا دماغ ہل کر رہ گیا۔

میں نے اپنی پوری طاقت مجتمع کر کے اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آشوتوش نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے میری طرف بڑھا لیکن اس مرتبہ میں اسے کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے، طاقتور اسپرنگ کی طرح اچھلا۔ میں نے اچھلتے ہی ایک ٹانگ اندر کی طرف سمیٹ لی اور دوسرے پیر کی کک اس کے سر پر لگائی۔ میں نے موٹے سول کے جوگرز پہن رکھے تھے۔ کک اس کی پیشانی پر لگی۔ کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا لیکن میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر پے در پے ٹھوکریں برساتا رہا۔ وہ بہت سخت جان تھا یا یہ اس کا جنون تھا کہ میری ہر کک کھانے کے بعد بھی وہ ڈکراتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا رہا۔

ایک مرتبہ اسے میرے قریب آنے کا موقع مل گیا۔ میں نے کھلی ہتھیلی سے اس کے چہرے پر وار کیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا۔ وہ بڑے زور سے چیخا تھا مگر اس کے جنون کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

خون میں تر اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر میری طرف لپکنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ میں نے ہوا میں اچھل کر پیروں سے اس کی گردن پر نیک لاک لگا دیا اور اپنے آپ کو جھٹکے سے ایک طرف گرا لیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی گرا۔

میں نیچے گرتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میرا سر ایک پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ آشوتوش اٹھ کر ایک بار پھر میری طرف لپکا۔۔۔ اور اسی وقت فضا ایک فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی آشوتوش کی بھیانک چیخ بھی چٹانوں میں گونج اٹھی۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ میں نے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہی سب انسپکٹر اور پولیس والے چند گز کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ سب انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

آشوتوش گولی کھانے کے بعد بھی نہیں گرا تھا۔ وہ بری

طرح دہاڑ رہا تھا۔ پھر وہ مڑ کر اس پتھر کی طرف بڑھنے لگا جہاں چترا اس لڑکی کے ہاتھوں کی رسیاں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چترا نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا تھا اور وہ لڑکی بھی بری طرح چیخ رہی تھی۔

آشوتوش کے لیے شاید ایک گولی کافی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ سب انسپکٹر نے دوسرا فائر کیا۔ اس مرتبہ گولی آشوتوش کے سر کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتے ہوئے گر گیا۔

آشوتوش کے جسم کو بار بار ہلکے ہلکے جھٹکے لگتے رہے اور پھر وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ سورج کو دیکھ رہا ہو۔

سب انسپکٹر دونوں پولیس والے دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گئے جب کہ میں دوڑ کر اس پتھر پر چڑھ گیا اور اس لڑکی کے پیروں کی رسیاں کھولنے لگا۔ چترا اس کے ہاتھ کھول چکی تھی۔ اس نے اپنی چادر اتار کر لڑکی پر ڈال دی۔ لڑکی اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔

میں پتھر سے اترا تو مجھے وہ کپڑا نظر آ گیا جو آشوتوش نے لمبائی کے رخ پر تہ کر کے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ میں نے وہ کپڑا اٹھا کر اس کی تہیں کھول دیں۔ وہ ایک پوری چادر تھی جو میں نے چترا پر ڈال دی اور آشوتوش کی لاش کے قریب آ گیا۔

"شکریہ شریمان جی۔" سب انسپکٹر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اگر آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو یہ درندہ اس لڑکی کو ختم کر دیتا۔"

"یہ لڑکی کون ہے۔ اس کے وارثوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک ہفتے پہلے اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔" انسپکٹر نے بتایا۔ "اس کے دوسرے ہی روز لاپتا ہو گئی۔ اس کے باپ نے تھانے میں رپورٹ لکھوا دی تھی اور پھر ہمارے ایس پی صاحب نے آشوتوش کا فائل نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ یہ پچھلے دو سورج گرہن کے موقعوں پر بھی ایسی وارداتیں کر چکا ہے اور ایس پی صاحب کو یقین تھا کہ اس لڑکی کو بھی اسی نے اغوا کر کے پہاڑوں میں کہیں چھپا رکھا ہو گا۔ ہم اس کی تلاش میں تھے اور آج صبح دس بجے ہمیں اطلاع ملی کہ اسے گنگوتری میں دیکھا گیا ہے۔ فوراً ہی اس کی تلاش شروع کر دی گئی اور پھر یہ میری نظروں میں آ گیا لیکن یہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ ہم ان پہاڑیوں میں سرنگوں کے اندر کھو کر رہ گئے اور اگر آپ یہاں نہ پہنچ جاتے تو بے چاری لڑکی ماری جاتی۔ آپ کا بھی بہت شکریہ دیوی جی۔" آخری الفاظ اس نے چترا کی طرف دیکھ کر کہے تھے جو لڑکی کو ساتھ لپٹائے بیٹھی تھی۔

"میری ایک مدد اور... شریمان جی۔" سب انسپکٹر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں ایک کانسٹیبل کو آپ کے ساتھ کر دیتا ہوں۔ آپ اس لڑکی کو ہردوار تھانے تک پہنچا دیں۔ تھانے کے سب لوگ دیوی جی کو جانتے ہیں۔ آپ کو رکنے کی ضرورت نہیں اور اگر ضرورت پڑی تو ہم خود آپ سے اور ان دیوی جی سے رابطہ کر لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے اپنی ٹی شرٹ اتار کر چترا کی طرف اچھال دی۔ وہ لڑکی کو لے کر پتھر کی دوسری طرف اتر گئی۔ چند منٹ بعد جب وہ گھوم کر ہمارے سامنے آئیں تو اس لڑکی نے ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور چترا والی چادر دھوتی کی طرح باندھ رکھی تھی۔ آشوتوش والی سفید چادر چترا نے لپیٹ لی تھی۔

ہم آدھے گھنٹے بعد سرنگوں سے نکل کر باہر آ گئے۔ صورتِ حال ویسی کی ویسی تھی۔ ہزاروں یاتری گنگوتری میں غسل اور پوجا میں مصروف تھے۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ ہمالیہ کی گود میں کھیلا جانے والا ایک خونی ڈراما اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

کانسٹیبل ہمارے ساتھ تھا۔ ہم گنگوتری سے الٹے ہردوار تھانے آ گئے۔ ہمیں تقریباً آدھا گھنٹا تو وہاں رکنا پڑا اور پھر ہم اس لڑکی کو پولیس کی تحویل میں دے کر چترا کے کاٹیج میں آ گئے جسے وہ کٹیا کہتی تھی۔

میری حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ کم بخت آشوتوش میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے جس طرح مجھے رگیدا تھا اسے میں عرصے تک یاد رکھوں گا۔

میں کاٹیج میں آتے ہی بستر پر گر گیا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ گیا تھا اور سینے میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا تھا۔ چترا بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔ چند منٹ بعد باہر نکلی تو اس نے پیلے رنگ کی دوسری چادر اوڑھ رکھی تھی۔

"میں چائے بناتی ہوں۔ کھایا تو ہم نے کچھ نہیں پھر بھی نہیں چاہ رہا۔ سر دکھ رہا ہے بہت شدت سے" پریتم آتشدان کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس وقت تین بج رہے تھے۔ بھوک واقعی مر گئی رہی تھی البتہ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ میں چترا کی طرف دیکھتا رہا۔ گنگوتری میں سب [illegible] تھا کہ [illegible] سال کی ایک کنواری لڑکی کو بلی دی جانے والا ہے تو وہ کس طرح تڑپ اٹھی تھی۔ کس طرح [illegible] روکو۔ وہ میری بچی کو مار ڈالے گا۔" چترا اپنی جوان بیٹی [illegible] برداشت کر گئی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی اور کے ساتھ بھی ایسا ہو اور پھر اس نے لڑکی کو رسیوں سے کھول [illegible] طرح اپنے ساتھ لپٹایا تھا وہ منظر بھی میں کبھی نہیں [illegible] سکتا تھا۔

چترا چائے بنا کر لے آئی تو میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ [illegible] چترا میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے ہم اس لڑکی کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر آشوتوش کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

"اگر ہم اس لڑکی کو نہ بچا لیتے اور آشوتوش اس کی بھینٹ کر دیتا تو کیا واقعی اسے حیاتِ ابدی مل جاتی۔ وہ موت کو شکست دے دیتا؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" چترا نے جواب دیا "لیکن اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے یہ ہندو پنڈت اور پجاری پُراسرار قوتیں حاصل کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں۔ یہ سفلی علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ کوئی قوت حاصل کرنے کے لیے جاپ کرنا پڑتا ہے اور اس کے لیے کوئی نہ کوئی بھینٹ بھی دینی پڑتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی۔ چائے کی ایک دو چسکیاں لیں اور پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "جاپ کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ جتنی بڑی قوت کو حاصل کرنا ہو جاپ اتنا ہی کٹھن ہو گا اور انسانی خون کی بھینٹ اس کا لازمی حصہ ہو گی۔ اس کے بغیر جاپ مکمل نہیں ہو گا۔ بعض لوگ تو ایسی پُراسرار قوتیں حاصل کر بھی لیتے ہیں اور بعض ناکام ہونے کے بعد دوبارہ جاپ شروع کر دیتے ہیں۔ میں [illegible] نہیں کہہ سکتی کہ تیسری لڑکی کی بھینٹ دینے کے بعد آشوتوش کو اپنے گھناؤنے مقصد میں کامیابی ہوتی یا نہیں لیکن اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ ناکام ہونے کے بعد وہ اپنا جاپ دوبارہ شروع کر دیتا۔"

"اسے کیسے پتا چلتا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہے یا نہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ علوم بڑے پُراسرار اور کٹھن ہیں۔ یقین سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی لیکن ہر جاپ کا کوئی نہ کوئی رد عمل ضرور ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی نشانی ضرور ہوتی ہے جس سے پتا چل جاتا ہے کہ جاپ مکمل ہوا ہے یا نہیں۔ پُراسرار قوتیں حاصل کرنا اگرچہ ناممکن نہیں لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ موت کو شکست نہیں دی جا سکتی۔"

ہم ابھی یہی باتیں کر رہے تھے کہ باہر کچھ لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں یہی سمجھا کہ شاید کچھ لوگ اس ندی پر نہانے کے لیے آئے ہیں لیکن قدموں کی آوازیں ہمارے کاٹیج کے قریب رک گئیں۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا اور پھر وہ کانسٹیبل دروازے کے سامنے نمودار ہوا جو گنگوتری سے ہمارے ساتھ آیا تھا۔

"چترا دیوی جی۔ کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔" اس نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

اور پھر چار افراد اندر آ گئے۔ ان میں دو عورتیں تھیں اور دو مرد۔ تین چہرے تو ہمارے لیے اجنبی تھے لیکن چوتھے چہرے کو شناخت کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ وہی لڑکی تھی جسے ہم نے آشوتوش سے بچایا تھا۔ ادھیڑ عمر کے مرد اور عورت لڑکی کے ماں باپ تھے اور تیسرا جوان آدمی لڑکی کا بڑا بھائی تھا۔

انہیں دیکھ کر ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان چاروں نے ہمارے پیر چھوئے اور عاجزانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر ہمارے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"ہماری سیتا کی جان بچا کر آپ نے ہم پر جو احسان کیا ہے اسے ہم جیون بھر نہیں بھول سکتے۔" لڑکی سیتا کے باپ نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

"ہم نے اگر سیتا کو کسی راون سے بچایا ہے تو کسی پر احسان نہیں کیا۔ نہ سیتا پر اور نہ آپ پر۔" میں نے جواب دیا "ایک انسان ہونے کے ناتے یہ ہمارا فرض تھا جسے ہم نے پورا کیا۔"

"آپ بہت مہان ہیں۔" سیتا کے باپ نے کہا "ہمیں شریمتی جی کے بارے میں پتا چلا ہے۔ ان کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بھگوان ان کے من کو شانتی دے۔"

"مجھے سکون مل گیا۔" چترا نے آگے بڑھ کر سیتا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دینے لگی "مجھے راحت مل گئی۔ میری بیٹی مجھے مل گئی" وہ جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

میں نے پہلی مرتبہ سیتا کو غور سے دیکھا۔ وہ بے حد حسین تھی اور چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم بروقت اس کی مدد کو نہ پہنچتے تو اس کا یہ حسین وجود خاک و خون میں لوٹ چکا ہوتا۔

کانسٹیبل انہیں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔ وہ لوگ بھی بیٹھ گئے۔ چترا نے ان کے لیے بھی چائے بنا لی تھی۔ باتوں میں پتا چلا کہ وہ لوگ مراد آباد کے رہنے والے تھے جہاں ان کا برتنوں کا کاروبار تھا۔ سیتا کے باپ بدری ناتھ نے بتایا کہ کوئی پُراسرار آدمی پچھلے تین مہینوں سے سیتا کا پیچھا کر رہا تھا۔ سیتا نے گھر والوں سے شکایت بھی کی تھی اور ایک مرتبہ آشوتوش کو سیتا کا پیچھا کرتے ہوئے پکڑا بھی گیا تھا۔ آشوتوش اس

وقت پنڈت کے بہروپ میں تھا۔ اس نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ اسے تنبیہہ کرکے چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد وہ نظر نہیں آیا۔

ایک ہفتہ پہلے بدری ناتھ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہردوار آگیا۔ اس کا خیال تھا کہ دو دن یہاں پوجا پاٹھ کے بعد وہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔ اگلے ہی روز بدری ناتھ نے پنڈت آشوتوش کو بھی ہردوار میں دیکھا تو زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہ گنگا کی جنم بھومی تھی۔ مقدس مقام تھا۔ پنڈتوں اور سادھو سنتوں کے لیے تو اس جگہ میں ایک خاص کشش تھی۔ پنڈت آشوتوش بھی گھومتا پھرتا یہاں آگیا ہوگا لیکن اگلے ہی روز سیتا غائب ہوگئی۔ پہلے اسے اپنے طور پر تلاش کیا گیا اور پھر پولیس میں رپورٹ درج کرادی گئی۔ بدری ناتھ نے پولیس کو پنڈت آشوتوش کے بارے میں بھی سب کچھ بتادیا تھا۔

"اب کیا خیالات ہیں آپ کے؟" چترا نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم کل صبح پوجا کے لیے گنگوتری مندر جائیں گے اور اس کے فوراً بعد واپس چلے جائیں گے۔۔۔ مراد آباد۔" بدری ناتھ نے جواب دیا اور جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھادیا "اگر کبھی مراد آباد آنا ہو تو سیدھے ہمارے غریب خانے پر آجایئے" اور پھر اس نے جیب سے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ "ہم آپ کے احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتے۔ یہ ایک چھوٹی سی بھینٹ قبول کیجئے۔"

میں نے چترا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اسے بہت دکھ پہنچا ہو۔ میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھا کر بدری ناتھ کے ہاتھ میں تھمادی۔

"ہم نے کسی لالچ میں آپ کی بیٹی کی جان نہیں بچائی تھی۔ آپ یہ رقم اپنے پاس رکھئے اور گھر پہنچ کر اسے غریبوں میں بانٹ دیجئے۔"

اور پھر شام چھ بجے کے قریب جب وہ رخصت ہونے لگے تو چترا نے ایک بار پھر سیتا کو اپنے سینے سے لگالیا اور دیر تک اسے پیار کرتی رہی۔ پھر سیتا مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"آپ ہمارے گھر ضرور آیئے بھیا!" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس ایک لفظ "بھیا" نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ کسی لڑکی نے مجھے کبھی بھائی نہیں کہا تھا اور اب سیتا نے بھیا کہہ کر مخاطب کیا تو میرے انگ انگ میں کیف و سرور کی ایک لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ میں نے پھر سیتا کو اپنے ساتھ لپٹالیا اور اس کی پیشانی پر بوسے دیتے ہوئے بولا۔

"ضرور آؤں گا۔ میں تم سے ملنے کے لیے ضرور آؤں گا۔"

وہ لوگ چلے گئے اور میں دیر تک سیتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا اور پھر رات اپنے پر پھیلانے لگی۔

کھانا کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد چترا [illegible] قریب ہی لیٹ کر سوگئی۔

میں کبھی اٹھ کر باہر آجاتا اور کبھی کمرے میں [illegible] جاتا۔ مجھ پر عجیب سی بے چینی طاری ہو رہی تھی۔ [illegible] صبح سے گنگوتری مندر گیا ہوا تھا۔ اسے شام تک واپس آ جانا چاہئے تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک کمبل چترا پر [illegible] اور دوسرا خود اوڑھ لیا۔ وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ آدھی رات کے بعد کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔

صبح سویرے میری آنکھ کھل گئی۔ چترا بھی جاگ [illegible] سوبھراج نہیں آیا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر اور انتظار [illegible] پھر سوبھراج کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میرا رخ [illegible] مندر کی طرف تھا۔

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ جگہ جگہ ہندو [illegible] میں مصروف تھے۔ گنگوتری مندر سے تقریباً پانچ سو [illegible] ایک جگہ چند لوگوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ میں غیر ارادی [illegible] لوگوں کو ادھر ادھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ گیا اور پھر [illegible] ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

زمین پر سوبھراج کی لاش پڑی تھی۔ اس کا نرخرہ [illegible] تھا۔ پیٹ بھی چرا ہوا تھا اور آنتیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ [illegible] کے دوسرے حصوں پر بھی لاتعداد زخم تھے۔

لاش کے آس پاس کہیں بھی خون کا ایک قطرہ تک نہیں آ رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اسے کہیں اور قتل [illegible] لاش یہاں پھینک دی گئی تھی۔

"ہری اوم۔۔۔ ہری اوم۔۔۔" ایک آدمی بڑبڑایا۔ اس [illegible] ہاتھ میں پیتل کی گڑوی تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ [illegible] نے گڑوی میں انگلیاں بھگو کر سوبھراج کی لاش پر پانی کے چھینٹے ڈالے اور "ہری اوم ہری اوم" کی گردان کرتے [illegible] ایک طرف چلا گیا۔

ہجوم بڑھ رہا تھا۔ میں سوبھراج کی لاش سے [illegible] ظاہر کیے بغیر پیچھے ہٹ گیا بالکل اجنبیوں کی طرح۔

سوبھراج کا یہ بہیمانہ قتل میرے لیے پیغام [illegible] شروع ہوجانے کا اور میں اس کھیل کو انجام تک پہنچانے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

پنڈت سوبھراج کے اس بہیمانہ قتل نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور میں جانتا تھا اسے اس طرح بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارنے والا بھی ایک پنڈت تھا۔۔۔ دھرم چاری۔ یہ لوگ ایسے ہی کردار کے مالک تھے۔ مندروں کے سنگھاسن پر بیٹھ کر نیکی اور بھلائی کا پرچار کرتے تھے اور انہی مندروں کو انہوں نے قتل گاہیں اور عیاشی کے اڈے بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی ان سرگرمیوں میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ اس کا تجربہ مجھے پہلے بھی ہوچکا تھا اور اب بھی میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ سوبھراج ان کی نظروں میں آگیا ہوگا اور یہ بات بھی میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ سوبھراج کو مندر میں کسی جگہ قتل کرکے اس کی لاش ویران سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ پنڈت پرگھیا راج اکیلا نہیں تھا۔ اس گھناؤنے فعل میں اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ ممکن ہے وہی دو پنڈت یا ان میں سے کوئی ایک جنہوں نے چترا پریتم کی بیٹی اور شوہر کو قتل کیا تھا' اس کے ساتھ ہو۔

واپس جاتے ہوئے میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا ہوگا۔ انہیں سوبھراج پر کسی قسم کا شبہ ہوا ہوگا اور وہ کسی طرح اسے مندر کے تہ خانے میں یا کسی اور جگہ لے گئے ہوں گے۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس سے پوچھ گچھ بھی کی ہوگی۔ اس پر تشدد بھی کیا ہوگا۔ سوبھراج اگرچہ خاصا سخت جان واقع ہوا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک تشدد برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے یاد تھا جب میں اور ٹھاکر اسے دھول پور سے لے گئے تھے اور ببول کے جنگل میں اس سے دارا اور بلونت سنگھ کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا تو پہلے تو وہ مقابلے پر اتر آیا تھا لیکن میرے دو چار ہاتھ کھانے کے بعد اس نے اگل دیا تھا کہ دارا وغیرہ پہاڑیوں میں کالی کے مندر کی طرف گئے ہیں اور چند ہفتے پہلے جب میں بملا کے ساتھ اس کا پیچھا کرتے ہوئے اس کے بنگلے پر پہنچ گیا تھا تو اس روز بھی اس نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے تھے اور گزشتہ رات وہ پنڈتوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا جنہوں نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ پنڈت پرگھیا راج نے اس سے ضرور پوچھا ہوگا کہ وہ کس کے کہنے پر اس کی نگرانی کررہا ہے۔ زیادہ تشدد سے بچنے کے لئے اس نے میرے بارے میں بتادیا ہوگا جس کا مطلب تھا کہ اب میں بھی محفوظ نہیں تھا اور مجھے بھی اپنا بندوبست کرلینا چاہئے تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں چترا کی کٹیا پر پہنچ گیا۔ شاید میرے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جس سے چترا نے صورتِ حال کو بھانپ لیا تھا۔

"تمہاری صورت پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" وہ میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولی "سوبھراج کا کچھ پتا نہیں چلا؟"

"سوبھراج کو ماردیا گیا ہے۔ میں اس کی ادھڑی ہوئی لاش دیکھ کر آرہا ہوں" میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہ! یہ سب کیسے ہوا؟" وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے ہوا لیکن اس کا قصہ بہرحال ختم ہوچکا ہے اور۔۔۔"

"تم فوراً پولیس کو اطلاع دے دو" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "پرگھیا راج کے ساتھ اب کسی قسم کی رعایت نہیں ہونی چاہئے۔"

"ٹھیک کہتی ہو' ایسے درندوں کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہونی چاہئے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پر ہاتھ کون ڈالے گا" میں نے کہا "اس کا تجربہ تو تمہیں خود بھی ہوچکا ہے۔ تم نے اسے شناخت کرلیا تھا۔ پولیس کو اس کی نشاندہی کی تھی لیکن کیا ہوا؟ پولیس نے ان دھرم چاریوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور یہاں تو ہمارے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ سوبھراج کو پنڈت پرگھیا راج یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے قتل کیا ہے۔ تم اپنی بیٹی اور پتی کے قتل کی چشم دید گواہ تھیں مگر تمہیں جھٹلا دیا گیا اور یہاں محض شک اور مفروضے کی بنیاد پر ان کے خلاف کوئی کارروائی کیسے ہوسکتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو" چترا گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "اس کا مطلب ہے کہ ہمیں خود ہی کوئی کارروائی کرنی ہوگی۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست کرنا ہوگا" میں نے جواب دیا "ممکن ہے سوبھراج نے میرے یا ہم دونوں کے بارے میں انہیں بتادیا ہو اور وہ لوگ۔۔۔"

"ایک منٹ!" چترا نے میری بات کاٹ دی "تم نے بتایا تھا کہ سڑک پر جہاں لاش پڑی ہوئی تھی وہاں یا اس جگہ کے آس پاس خون نہیں تھا۔"

"ہاں۔۔۔ اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اسے کسی اور جگہ قتل کیا گیا تھا اور لاش سڑک پر پھینک دی گئی تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسے کئی گھنٹے پہلے قتل کیا گیا تھا" چترا نے کہا "ہوسکتا ہے وہ رات کے ابتدائی حصے میں ان کے ہاتھ لگ گیا ہو اور آدھی رات کے قریب اسے قتل کرکے لاش ویران سڑک پر ڈال دی گئی۔ جب لاش سڑک پر پھینکی گئی تو اس کا خون جم چکا تھا اور۔۔۔" وہ خاموش ہوگئی۔ اس کی پیشانی پر لکیریں سی ابھر آئی تھیں۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اگر اسے آدھی رات کے لگ بھگ بھی قتل کیا گیا تھا تو اس سے پوچھ گچھ تو اس سے بھی بہت پہلے کی گئی ہوگی" چترا نے جواب دیا "میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "اگر انہیں تمہارے بارے میں معلوم ہو بھی گیا تھا تو ان کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ رات ہی کو کسی وقت اس کٹیا پر حملہ کرکے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں" میں نے کہا "لیکن ہوسکتا ہے ہمارا ری ایکشن جاننے کے لئے انہوں نے فوری طور پر کوئی کارروائی نہ کی ہو۔ ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں خاموش پاکر ایک دو دن بعد وہ کوئی کارروائی کریں۔ بہرحال' ہمیں اب محتاط رہنا پڑے گا۔"

"ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو" چترا نے کہا اور اٹھ کر آتش دان کے پاس چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر وہ دوبارہ اسی جگہ پر آگئی۔ چائے پینے کے دوران میں بھی ہم اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

نو بج گئے تھے۔ کچھ آوازیں سن کر میں دروازے سے باہر آگیا۔ وہ آٹھ دس افراد تھے جن میں مرد' عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ وہ ہمارے سامنے والی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے تقریباً سو گز آگے جاکر رک گئے۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر اندر آگیا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد چترا معلومات حاصل کرنے کے لئے شہر کی طرف چلی گئی۔ اس نے کٹیا کی ایک چابی مجھے دے دی تھی لیکن میں اندر بیٹھے رہنے کے بجائے باہر گھومنے لگا۔ بہت سے لوگ اشنان (غسل) کے لئے اس ندی پر بھی آرہے تھے۔ یہ ندی تقریباً نصف میل آگے جاکر چٹان نما بڑے بڑے پتھروں میں گھومتے ہوئے دریا کے دہانے پر جا ملتی تھی۔

میں آس پاس کی چٹانوں پر گھومتا رہا۔ یہاں درختوں کی بھی بہتات تھی اور خودرو جھاڑیوں کی بھی۔ بعض جھاڑیوں میں رنگ برنگ پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ چٹانوں میں ایک چھپر سا بنا ہوا تھا۔ چار آڑی ترچھی لکڑیاں کھڑی کرکے ان پر شاخوں اور جھاڑیوں کا سائبان بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے جھاڑیوں ہی کا بستر بچھا ہوا تھا۔ آس پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ یہاں کسی کی رہائش ہوگی۔ سادھو اور پنڈت آبادی سے دور پُرسکون جگہوں پر جاپ وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ ممکن ہے کسی نے اسی مقصد کے لئے یہ سائبان بنا رکھا ہو لیکن اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس وقت دوپہر کے دو بجنے والے تھے۔ میں پہاڑیوں میں گھومتے گھومتے تھک سا گیا تھا۔ کچھ دیر آرام کی غرض سے سائبان کے نیچے لیٹ گیا۔

وہ مچان پہاڑیوں کے اوپر ایسی جگہ پر تھا جہاں سے اس ندی کا کچھ حصہ اور چترا پریتم کی کٹیا بھی نظر آرہی تھی۔ میں جھاڑیوں کے بستر پر کروٹ کے بل لیٹا اس طرف دیکھتا رہا اور پھر ایک آدمی کو اس کٹیا کے اردگرد منڈلاتے ہوئے دیکھ کر میں چونک سا گیا۔ اگرچہ سامنے والی ندی کی طرف اور بھی بہت سے لوگوں کی آمدورفت تھی مگر گیروے لباس کی وجہ سے وہ آدمی دوسروں سے بالکل مختلف لگ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ یاتریوں ہی میں سے کوئی ہو اور محض تجسس کی بنا پر اس کٹیا کے اردگرد منڈلا رہا ہو لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

گیروے لباس والا وہ شخص پنڈت پرگھیا راج کا فرستادہ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ شاید میرے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہو اور یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کٹیا میں کون کون ہے مگر کٹیا کو تالا لگا ہوا تھا۔

گیروے لباس والا وہ شخص کٹیا سے دور جاچکا تھا اور پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ میں کافی دیر تک کٹیا کی طرف دیکھتا رہا لیکن نہ تو گیروے لباس والا وہ شخص دوبارہ نظر آیا اور نہ ہی کوئی اور مشتبہ شخص دکھائی دیا۔

دھوپ اگرچہ تیز تھی مگر موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سائبان کے نیچے سائے میں لیٹے ہوئے ہوا کے جھونکے بڑے فرحت بخش لگ رہے تھے۔ ہوا کی تھپکیوں سے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر بعد میں انٹا غفیل ہوگیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو سورج مغرب میں پہاڑی کی چوٹی پر جھک رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اپنی جگہ پر ساکت ہوگیا۔ گیروے لباس والا وہی شخص چترا کی کٹیا کی کھڑکی کے پاس کھڑا اندر جھانک رہا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ میں کئی روز سے اس کٹیا میں رہ رہا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ دن یا رات کے وقت کبھی کوئی کھڑکی

نہیں کھولی گئی تھی۔

جس جگہ میں بیٹھا تھا' کٹیا کا فاصلہ وہاں سے سو گز کے قریب تھا۔ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ خاموشی سے جا کر اس شخص کی گردن دبوچ لوں مگر بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو اس ارادے پر عمل کرنے سے باز رکھ سکا تھا۔ اب میرا یہ شبہ قوی تر ہوتا جا رہا تھا کہ اس شخص کا تعلق مخالف پارٹی سے ہے۔ پہلی مرتبہ میں نے اس شخص کو دوپہر دو بجے کے قریب کٹیا کے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ دوبارہ اس وقت نظر آیا تھا جبکہ سورج غروب ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی۔ وہ کوئی یاتری نہیں ہو سکتا تھا۔ یاتری تو گنگا جل میں اشنان کرتے تھے اور مندروں کی یاترا کے چکر میں گھومتے رہتے تھے۔

صبح سے اب تک کئی یاتری اس ندی پر آئے اور واپس گئے ہوں گے لیکن وہ شخص تقریباً ساڑھے چار گھنٹے گزرنے کے بعد بھی اس جگہ پر موجود تھا جبکہ آس پاس کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کٹیا کا پچھلا حصہ تھا۔ گیروے لباس والا وہ شخص کافی دیر تک کھڑکی کے اندر جھانکتا رہا اور پھر کھڑکی بند کر کے شہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑا۔

میں بھی اس چٹان سے اتر آیا اور بڑے بڑے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے کٹیا کی طرف چلنے لگا۔

سورج اس وقت غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ کی الوداعی کرنیں مشرقی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھیں۔ میں تیز تیز چلتے ہوئے کٹیا کے سامنے والے رخ پر آگیا۔ ندی بھی ویران تھی اور آس پاس کسی ذی روح کا نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس طرف آنے والے یاتری سورج غروب ہونے سے بہت دیر پہلے ہی واپس چلے جایا کرتے تھے۔

کٹیا کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے گھوم کر پگڈنڈی کی طرف دیکھا۔ وہ شخص کافی آگے جا چکا تھا۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ سوبھراج نے مرنے سے پہلے انہیں ہمارے بارے میں بتا دیا تھا۔ رات کو انہوں نے کوئی کارروائی کرنا مناسب نہیں سمجھا ہوگا اور ہو سکتا ہے موقع ہی نہ ملا ہو لیکن دن میں انہوں نے کٹیا کی نگرانی شروع کرا دی تھی۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے شاید وہ لوگ یہ جان لینا چاہتے تھے کہ اس کٹیا میں اور کون کون ہے۔ گیروے لباس والا وہ شخص یقیناً انہی کا آدمی تھا۔ اگر وہ کوئی چور ہوتا اور چوری کی نیت سے آس پاس منڈلا رہا ہوتا تو اس وقت تو اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے ایک کھڑکی بھی کھول لی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے اندر داخل ہو سکتا تھا لیکن وہ چوری کی نیت سے وہاں نہیں آیا تھا۔

وہ شخص کافی آگے نکل گیا تھا۔ سورج بھی غروب ہو چکا تھا لیکن میں نے اس شخص کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ مناسب فاصلے سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے میں چترا پریتم کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

وہ صبح دس بجے کے قریب معلومات حاصل کرنے کے لیے شہر کی طرف گئی تھی اور اب تک واپس نہیں آئی تھی اور پھر یہ بات بھی تھی کہ میں خود پہاڑیوں میں گھومتا رہا تھا اور کٹیا کی طرف نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے دن میں کسی وقت چترا کٹیا میں آئی ہو اور مجھے نہ پا کر شہر واپس چلی گئی ہو۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کہیں چترا بھی تو ان کے ہتھے نہیں چڑھ گئی۔ وہ شخص جس طرح اطمینان سے کٹیا کے آس پاس منڈلا رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت بھی ملتی تھی۔ بہرحال میں نے اس شخص کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ شخص پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے آبادی میں داخل ہو گا۔ شہر میں برقی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔

مین بازار میں پہنچ کر وہ شخص کچھ دور تک چلتا رہا اور پھر ایک اور تنگ سے بازار میں داخل ہو کر ایک آشرم کے دروازے میں غائب ہو گیا۔ یہ ایک پرانا سا دو منزلہ مکان تھا جسے آشرم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ دروازہ بھی عام مکانوں کی طرح تھا۔ اس کے اوپر آشرم کا بورڈ لگا دیا گیا تھا اور وہ بورڈ بھی خاصا پرانا ہو چکا تھا۔

اس تنگ سے بازار میں خاصا رش تھا۔ زیادہ تر دکانیں گفٹ آئٹم کی تھیں۔ بہت سی دکانیں مورتیوں سے بھی بھری ہوئی تھیں۔ ہردوار آنے والے اور واپس جانے والے یاتریوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ہر چیز یہاں سے مل جاتی تھی۔ واپس جانے والے اپنے عزیزوں کے لیے تحائف کی خریداری زیادہ تر اسی بازار میں کرتے تھے۔

میں آشرم کے سامنے سڑک کی دوسری طرف رک گیا۔ وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہی کچوری والا ایک ٹھیلا کھڑا تھا۔ کچوریاں تلے جانے کی اشتہا انگیز خوشبو نے مجھے یاد دلایا کہ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میں اس ٹھیلے کے قریب آگیا۔ اور بھی کئی لوگ کھڑے کچوریاں کھا رہے تھے میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ اچار اور چٹنی سے گرم گرم کچوریاں کھاتے ہوئے طبیعت خوش ہو گئی۔

اس دوران میں میری نظریں مسلسل آشرم کے دروازے پر لگی رہیں۔ بہت سے لوگ آشرم میں آ جا رہے تھے لیکن گیروے لباس والا وہ شخص دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ کچوریاں کھانے کے بعد بھی میں ٹھیلے کے قریب کھڑا رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ شخص آشرم کے دروازے پر نمودار ہوا لیکن ابھی وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ چار پانچ آدمیوں نے اسے روک لیا۔ ان لوگوں کا باتیں کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی بات پر جھگڑ رہے ہوں۔ میں بھی سڑک پار کر کے ان کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں کوئی میرا صورت شناس نہیں تھا اس لیے پہچان لیے جانے کا خوف نہیں تھا۔

ان لوگوں کی باتوں سے مجھے گیروے لباس والے اس شخص کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ سوامی پرمانند تھا۔ وہ اس آشرم کا منشی تھا اور جو لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے وہ اسی آشرم میں رہائش پذیر تھے اور اس سے اپنا سامان کے چوری ہونے کی شکایت کر رہے تھے۔

"اس نوٹس بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ اپنے سامان کی حفاظت خود کریں۔ چوری وغیرہ کی ذمّے داری ہم پر نہیں ہوگی۔" سوامی پرمانند نے دروازے کے ساتھ دیوار پر لگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کیا "اب اگر سامان چوری ہو گیا ہے تو اس کے ذمّے دار ہم تو نہیں ہیں۔ تم لوگوں کو اپنے سامان کی حفاظت کرنی چاہیے تھی۔"

سوامی پرمانند ان لوگوں سے جان چھڑا کر آگے بڑھ گیا۔ دو آدمی کچھ دور تک اس کے ساتھ گئے پھر واپس لوٹ آئے۔

روشنی میں مجھے سوامی پرمانند کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ کے لگ بھگ تھا۔ شیو باقاعدگی سے بنانے کا عادی تھا لیکن مونچھیں خاصی بڑی تھیں۔ گنجا سر مگر درمیان بالشت بھر چٹیا تھی۔ دونوں کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی سونے اور چاندی کی کئی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے نگینے جڑے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو مختلف صفات کے حامل نگینوں سے خاص لگاؤ ہوتا ہے۔

میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ وہ مختلف سڑکوں پر چلتا رہا۔ اس کا رخ گنگوتری مندر کی طرف تھا اور بالآخر میرا اندازہ درست نکلا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ گنگوتری مندر میں داخل ہوا تو میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

مندر کی کشادہ سیڑھیوں پر لاتعداد بھکاری بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ گھوم پھر کر پھول بیچ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں جو مندر میں آنے والے یاتریوں کا راستہ روک کر پھول بیچ رہی تھیں۔ ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر عورت ایک ٹوکری میں پھول' ناریل اور مٹھائی بیچ رہی تھی۔ اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں پہلو بچا کر نکل گیا۔

مندر کے اندر خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ میں سوامی پرمانند کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ سامنے ایک اونچے چبوترے پر تقریباً دو فٹ اونچا کالے رنگ کا گول پتھر رکھا ہوا تھا جس پر سفید رنگ سے چہرے کے نقوش بنے ہوئے تھے۔ اس کے آس پاس پھولوں کا انبار لگا ہوا تھا اور سامنے چبوترے پر لوگ بھینٹ کی جانے والی چیزیں رکھتے جا رہے تھے۔

سوامی پرمانند اس چبوترے کی پچھلی طرف ایک ہٹے کٹے پنڈت کے قریب کھڑا نظر آگیا۔ وہ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے اور پھر پیچھے ہٹتے ہوئے ایک راہداری میں غائب ہو گئے۔ میں اس طرف لپکا تو دو ادھیڑ عمر عورتوں نے مجھے روک لیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تھالیاں تھیں اور دونوں تھالیوں میں ناریل' مٹھائی وغیرہ رکھی ہوئی تھی۔

"بیٹا۔ رام جی کا پرساد۔" ایک عورت نے تھالی میرے سامنے کر دی۔

میں نے برفی کی ڈلی میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور جب آگے بڑھا تو سوامی پرمانند اور دوسرا پنڈت غائب ہو چکا تھا۔

میں مندر کی راہداریوں میں چکراتا رہا لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میں دوبارہ مندر کے مرکزی ہال میں آگیا۔ کچھ دیر وہاں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور پھر باہر آکر سیڑھیوں پر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

اب یہ بات طے شدہ تھی کہ سوامی پرمانند' پنڈت پرگھیا راج ہی کا آدمی تھا اور اسے میرے اور چترا پریتم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہی کٹیا کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ چترا کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اب مجھے اس کی طرف سے بھی تشویش ہونے لگی تھی۔

سوامی پرمانند کے بارے میں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ آشرم کا منشی تھا اور اسے بہرحال آشرم میں واپس جانا تھا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رات اسی مندر میں گزار دے لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد سوامی پرمانند مندر کے ایک سائیڈ ڈور سے نکلتے ہوئے نظر آیا۔

وہ دروازہ مرکزی گیٹ سے تقریباً پندرہ فٹ ہٹ کر تھا۔ اس طرف یاتریوں کی آمدورفت نہیں تھی اور وہ دروازہ شاید مندر میں رہنے والے پنڈتوں اور پجاریوں کے لیے ہی

مخصوص تھا۔
میں اپنی جگہ پر کھڑا سوامی پرمانند کو سیڑھیوں سے اترتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ سیڑھیاں اُتر کر پندرہ بیس گز آگے جا چکا تھا۔ اس کے پیچھے جانے کے لیے میں نے جیسے ہی قدم آگے بڑھایا' کسی نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔

وہ ایک پجارن تھی۔ توے جیسی کالی رنگت' سفید بال اور سر سے پیر تک گیروے رنگ کی چادر میں لپٹی ہوئی۔ چہرے اور کہنی تک بانہوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ پہلی عورت تھی جسے میں نے اس طرح مکمل طور پر لباس میں چھپے ہوئے دیکھا تھا۔ سیاہ چہرے پر آنکھوں کے چمکتے ہوئے سفید دیدے اور موتیوں جیسے دانت بڑا خوفناک اور پُراسرار تاثر دے رہے تھے۔

بھیک مانگنے کے لیے لوگ عجیب و غریب حلیے دھار لیتے ہیں۔ یاتریوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جیبوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے عجیب و غریب ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ میں اسے بھی کوئی ایسی ہی عورت سمجھا تھا جس نے غالباً بھیک مانگنے کے لیے یہ بہروپ دھار رکھا تھا۔

"ارے کیا ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"شانت رہو۔ گھبراؤ نہیں۔" بھکارن نے جواب دیا "خود پر ضبط کرو ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔"

میں یہ آواز سن کر چونک گیا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ چترا پریتم تھی اور میں نے محض آواز سے اسے پہچانا تھا۔

"اوہ تم!" میرے منہ سے نکلا۔ جلدی چلو ورنہ وہ نکل جائے گا۔"

"لیکن وہ تو ابھی تک اندر ہی بیٹھا ہوا ہے۔ تم کس کی بات کر رہے ہو۔" چترا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سوامی پرمانند۔ وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں دارا کی بات کر رہی ہوں۔" چترا نے جواب دیا "وہ اس وقت مندر میں موجود ہے۔"

"اوہ۔!" میں اچھل پڑا۔ میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی تھی "کہاں ہے وہ؟"

"آؤ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" چترا نے یہ کہتے ہوئے ایک بار پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف کھینچنے لگی۔ لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کئی لوگوں نے ہماری طرف بھی دیکھا تھا مگر کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

ہم سیڑھیوں سے اتر کر کچھ دور تک چلتے رہے پھر ایک تنگ سے راستے پر مڑ گئے۔ چند گز آگے کھلی جگہ تھی جہاں پہاڑوں سے آنے والا پانی جمع ہوتا اور اس طرف مندر کی دیواروں کو چھوتے ہوئے دوسری طرف بہہ رہا تھا۔ ہم پانی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا اور آس پاس کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ ہم اطمینان سے بات کر سکتے تھے۔

"ہاں۔ اب بتاؤ۔" میں نے چترا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ دارا مندر میں موجود ہے۔ میرا مطلب ہے تم نے اسے کیسے پہچانا؟"

"تم نے دارا کا جو حلیہ بتایا تھا وہ اس پر بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔" چترا نے جواب دیا "تم نے یہ بھی بتایا تھا کہ کسی موقع پر تم نے اس کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ وہ ایک بیساکھی کے سہارے چلتا ہے لیکن لگتا ہے اس کی ٹانگ پوری طرح مفلوج نہیں ہوئی۔ کسی وقت بیساکھی ہٹا کر وہ اس ٹانگ پر بوجھ ڈالتا ہے۔"

میں اپنے آپ میں سنسنی کی عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ سوبھراج کا خیال درست نکلا تھا۔ دارا بالآخر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتا نہ چلتا تو یہ اس کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ اس نے شاید یہی سوچا ہوگا کہ باقی زندگی انہی مندروں میں گزار دے گا لیکن شاید وہ بھول گیا تھا کہ میں موت کا سایہ بن کر اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

"اس کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتی کہ اس کے ساتھ اور کون یہاں آیا ہے لیکن پنڈت پرگھیا راج کا ساتھ ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ دارا کو میں نہیں جانتی لیکن پرگھیا راج کے بارے میں بتا چکی ہوں کہ انسانیت نام کی کوئی شے اسے چھو کر نہیں گئی۔ وہ درندہ ہے۔ خوں خوار بھیڑیا۔"

"دارا اس سے بھی زیادہ خوں خوار درندہ ہے۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تم بھی غائب ہو اور میں تمہارے لیے پریشان تھا۔ یہ سب بھیس..." میں اس کی طرف اشارہ کر کے خاموش ہو گیا۔

"مجھے معلومات حاصل کرنے کے لیے مندر کے اندر جانا تھا۔" چترا نے جواب دیا "یہاں پنڈت' پجاری اور ایسے کئی ہندو بھی طرح طرح کے سوانگ بھرتے رہتے ہیں اس لیے لوگوں پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ اگر میں اپنے اصل حلیے میں ہوتی تو مجھے فوراً پہچان لیا جاتا۔ اس لیے مجھے اپنے بدن پر کالک ملنی پڑی۔ اس طرح میں مندر کے اندر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "آج دو بجے کے قریب جب میں یہاں سے باہر جانے والی تھی تو مندر میں پرگھیا راج کے ساتھ اس شخص کو دیکھ کر چونک گئی۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں دارا کا خیال ابھرا۔ حلیہ وہی تھا جو تم نے بتایا تھا۔ اس شخص کو دیکھنے کے بعد میں نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

"دارا اور پرگھیا راج کچھ دیر ہال میں رہے اور پھر اندر چلے گئے۔ میں بھی انہیں مندر کی راہداریوں میں تلاش کرتی رہی لیکن وہ نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے اور پھر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ایک پنڈت مل گیا جو کھانے پینے کا کچھ سامان اٹھائے جا رہا تھا۔ اس نے کچھ سامان میرے حوالے کر دیا اور اسی طرح مجھے اندر جانے کا موقع مل گیا۔

"دارا یہی ہے۔ ان پنڈتوں کے ساتھ مل کر عیش کر رہا ہے وہ حرامی۔ اچھے کھانے' شراب اور خوب صورت لڑکیاں۔ میں دن بھر ان کے ساتھ رہی۔ میری کالی رنگت نے مجھے بچا لیا۔ اگر میں اپنے اصل رنگ و روپ میں ہوتی تو میں بھی ان درندوں سے نہیں بچ سکتی تھی۔

"میں نے پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا لیکن کبھی یقین نہیں کیا تھا مگر اس کا پہلا تجربہ اس وقت ہوا جب ایک مندر میں میری بیٹی کی عزت کو تار تار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور میرے شوہر کو بھی قتل کیا گیا اور دوسری مرتبہ آج دیکھا کہ دھرم کا پرچار کرنے والے پنڈت اور پجاری کس طرح دارو پی کر اپنے کپڑوں سے باہر ہو رہے تھے۔ وہ جوان لڑکیوں کو اس طرح بھنبھوڑ رہے تھے جیسے خوں خوار بھیڑیے اپنے شکار کے بخیے ادھیڑتے ہیں۔ میں تو پورا وقت شرم سے پانی پانی ہوتی رہی۔ کئی بار دل چاہا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں لیکن ان کے بارے میں جاننے کے لیے وہاں ٹھہری رہی پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"دارا مسلمان ہے لیکن وہ ان پنڈتوں کے ساتھ اس طرح رہ رہا ہے جیسے خود بھی ہندو ہو۔"

"دارا بہت چالاک ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "ایسے لوگوں کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔ وہ دھن کو ہی اپنا دھرم سمجھتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تمہیں سوبھراج کے بارے میں کیا معلوم ہوا۔ اس کی جان کس نے لی؟"

"دارا کل شام کو یہاں پہنچا تھا۔" چترا نے جواب دیا "اس نے مندر میں داخل ہوتے ہی سوبھراج کو دیکھ لیا تھا۔ وہ اسے پوری طرح نہیں پہچان سکا تھا لیکن شک میں پڑ گیا تھا۔ اس نے پنڈت پرگھیا راج کو اس کے بارے میں بتا دیا اور پرگھیا راج کے آدمی اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

"ان لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ سوبھراج آسانی سے زبان کھولنے کو تیار نہیں ہوا تھا۔ اسے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا اور بالآخر اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی اور اس نے تمہارے اور میرے بارے میں بتا دیا۔

"انہوں نے سوبھراج کو ہلاک کر ڈالا اور اس کی لاش مندر سے دور ویران سڑک پر پھنکوا دی۔ دارا کا خیال تھا کہ انہیں رات ہی کو ہماری کٹیا پر حملہ کر دینا چاہیے تھا مگر پرگھیا راج نے اس کی مخالفت کی۔ میری بیٹی اور قتل کے حوالے سے اس کا نام پولیس کی لسٹ پر آ چکا تھا۔ اگر میری کٹیا پر حملہ کر کے تمہیں یا مجھے ہلاک کر دیا جاتا تو پولیس کو قاتل کے بارے میں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آتی اس لیے پنڈت پرگھیا راج نے یہ منصوبہ بنایا کہ فی الحال ہماری نگرانی کر کے ہماری سرگرمیوں پر نگاہ رکھی جائے اور تمہیں ختم کرنے کے لیے بعد میں کوئی اور منصوبہ بنایا جائے۔"

"لیکن دارا کو کیسے شبہ ہوا کہ سوبھراج میرے ساتھ ملا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ سب کچھ مجھے ان کی باتوں ہی سے معلوم ہوا ہے۔" چترا نے جواب دیا "دارا سوبھراج کو یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ اس نے پنڈت پرگھیا راج کو اس کے بارے میں بتایا تو پنڈت نے اسے اٹھوا لیا۔ دارا کی زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ یہاں اسے کوئی پہچاننے والا موجود نہ ہو لیکن یہاں سوبھراج کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ وہ پرگھیا راج کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا اور جب سوبھراج کو دارا اور پنڈت پرگھیا راج کے سامنے لے جایا گیا تو پوچھ گچھ کے دوران میں سوبھراج نے یہ انکشاف کیا کہ تم بھی دارا کی تلاش میں یہاں پہنچ چکے ہو اور اس طرح دارا کو نہ صرف تمہارے بارے میں پتا چل گیا بلکہ سوبھراج کو بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔"

"اور تم جانتی ہو میں جس شخص کا تعاقب کر رہا تھا وہ کون ہے؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ چترا نے نفی میں سر ہلا دیا تو میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ شمر کے ایک آشرم کا متھی سوامی پرمانند ہے۔ وہ آج دن بھر ہماری

کٹیا کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ شام کے وقت اس نے ایک کمرے کی عقبی کھڑکی کھول کر اندر جھانکا بھی تھا۔ اسے کٹیا کے آس پاس دیکھ کر مجھے اس پر شبہ ہوگیا تھا۔ شام کے بعد جب وہ شہر کی طرف واپس آیا تو میں نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ وہ پہلے آشرم گیا تھا اور پھر یہاں آیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے مندر کے اندر رہنے کے بعد وہ واپس جا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا کہ تم نے مجھے روک لیا۔"

"اب اس کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں۔" چترا نے جواب دیا "یہ لوگ جب تک مندر کے اندر ہیں، ہم ان کے خلاف کچھ نہیں کرسکتے۔ انہیں کسی نہ کسی طرح باہر نکالنا ہوگا۔"

"یہ اتفاق ہے کہ میرے اور تمہارے دشمن اکٹھے ہوگئے ہیں اور دونوں خون خوار درندوں کی طرح نہایت خطرناک ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب یہاں بیٹھنا بے کار ہے۔ واپس چلو۔" چترا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں کا ساتھ چلنا مناسب نہیں ہے۔ اگر اب مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا گیا تو کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔ تم آگے چلتی رہو۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔"

چترا مندر کی طرف چلی گئی۔ میں بھی کچھ فاصلہ دے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ مندر کے سامنے پہنچ کر چترا شہر کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی۔ میرے اور اس کے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا۔ تقریباً دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں اس کے ساتھ مل گیا۔

ہم کچھ دور تک اکٹھے ہی چلتے رہے۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے۔ ایک موڑ پر پہنچ کر میں رک گیا۔

"تم جاؤ۔ میں ذرا بازار کی طرف سے ہو کر آتا ہوں۔ کچھ کھانے کو لے آؤں۔" میں نے کہا۔

چترا پہاڑیوں کی طرف جانے والے راستے پر مڑ گئی اور میں بازار کی طرف چل پڑا۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کروایا۔ بازار سے کچھ اور چیزیں خریدیں اور کٹیا کی طرف چل پڑا۔

دن کے وقت تو اس طرف لوگوں کی آمدورفت رہتی تھی لیکن اس وقت یہ راستہ سنسان پڑا تھا۔

میں ابھی کٹیا سے چند گز دور ہی تھا کہ ایک ہلکی سی نسوانی چیخ سن کر چونک گیا۔ یہ آواز کٹیا کی طرف سے آئی تھی اور اسے پہچاننے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ چترا کے چیخنے کی آواز تھی۔

کٹیا کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ اس طرح براہ راست اندر داخل ہونا مناسب نہیں تھا۔ میں دبے قدموں چلتے ہوئے کٹیا کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور تک کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کٹیا کے اندر جو ڈراما ہو رہا تھا اس کا اندازہ لگانے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی۔

میں پچھلی کھڑکی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ یہ وہی کھڑکی تھی جہاں سے شام کو سوامی پرمانند نے جھانک کر دیکھا تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے سے آنکھ لگا دی۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں رات کو میں سویا کرتا تھا۔ یہ کمرا خالی تھا البتہ دروازے کی دوسری طرف آتش دان والے کمرے میں دکھائی دینے والا منظر بڑا سنسنی خیز اور خوفناک تھا۔

اس کمرے میں چترا کے علاوہ دو آدمی تھے اور وہ دونوں خوفناک صورتوں والے پجاری تھے۔ ان کے حلیے دیکھ کر لگتا تھا جیسی ان کے جیون کا بیشتر حصہ جنگلوں میں گزرا ہو۔ ان میں سے ایک نے چترا کے بازو موڑ کر اسے پیچھے سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ چترا کے بدن پر اب وہ چادر نہیں تھی۔ لال چھوٹے زیر جامے تھے۔ گھٹنوں سے گردن تک اس کا بدن اپنی اصل رنگت میں تھا جبکہ گردن سے اوپر چہرہ، پورے بازو اور گھٹنوں سے پیروں تک کی رنگت سیاہ تھی۔

دوسرا پجاری چترا کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرے پر بڑے خوفناک تاثرات تھے۔

"گرو جی بہت خوش ہوں گے۔" وہ پیلے اور گندے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا "اسے جب پتا چلے گا کہ کالے مندر والی جو لونڈیا دن بھر اس کی نظروں کے سامنے رہی ہے وہ اپسرا کی طرح حسین ہے وہ تو بہت خوش ہوں گے۔"

"گبرو! پہلے اپنا تو منہ میٹھا کرلے۔" اس پجاری نے کہا جس نے چترا کو گرفت میں لے رکھا تھا "گرو تو ایسی چیزوں کے مزے لیتا ہی رہتا ہے۔ آج ہم بھی چکھ لیں۔"

"پہلے اس سے پوچھ تو لیں اس کا پریمی کہاں ہے۔" پہلا پجاری نے جواب دیا۔ جسے گبرو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ چترا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"ہاں تو چترا دیوی۔ بہت ناٹک رچا لیے تم نے۔ اب تمہارا بھید کھل گیا ہے۔ بتا دو تمہارا پریمی کہاں ہے۔ وہی جس کی ہمارے گرو کو تلاش ہے۔ ورنہ تم جانتی ہو تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ چھوڑ دو مجھے۔" چترا نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم لوگوں نے میری معصوم بیٹی اور میرے شوہر کو مار ڈالا۔ میں نے قسم کھائی ہے کہ تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تمہارے گندے اور غلیظ خون سے گنگا کے پوتر پانی کو بھی گندا کروں گی۔"

"سنا تم نے بھیرو۔" گبرو نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا "یہ ناری ہمارے لہو سے گنگا جل کو گندا کرے گی۔ پر یہ نہ جانے ہے کہ ہمارا خون تو گنگا جل سے بھی زیادہ پوتر ہے۔"

"اس کا منہ تو دھلاؤ گبرو۔ چماٹو گے تو تمہارا بھی منہ کالا ہوجائے گا۔" بھیرو نے کہا۔

"ہاں۔ یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی اس کا مکھڑا دھلاتا ہوں۔ ویسے اپنا منہ بھی تو پہلے ہی کالا ہے۔ ایک بار اور کالا کرلیں گے تو کیا فرق پڑجائے گا۔" گبرو یہ کہتے ہوئے کمرے کے اس حصے کی طرف چلا گیا جہاں پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ اس طرح وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے شاپنگ بیگ بڑی آہستگی سے زمین پر رکھ دیے اور احتیاط سے کھڑکی کھولنے لگا۔ یہ کھڑکی شام کو سوامی پرمانند نے کھولی تھی اور پھر اس کے پٹ بھیڑ دیے تھے اور اس وقت مجھے کھڑکی کھولنے میں ذرا سی بھی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میں کھڑکی کے فریم پر چڑھ رہا تھا کہ گبرو پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر سامنے آگیا۔

"لے منہ دھولے۔ تیرا اصل روپ تو دیکھیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے پانی چترا کے منہ پر پھینک دیا۔

چترا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے چہرے پر تھپا ہوا رنگ پانی کے ساتھ بہہ نکلا۔ وہ ذرا سی مچلی تو اس کے پیچھے بھیرو نے اس کے ہاتھ کچھ اور مضبوطی سے جکڑ لیے۔

"چھوڑ دو مجھے۔ چھوڑ دو۔" وہ چیخی "ایک عورت پر ظلم کرتے ہوئے تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اپنے اس پریمی کے بارے میں بتا کہاں ہے وہ۔" بھیرو نے اس کی بانہوں کو مروڑتے ہوئے کہا "وہ مرد ہوتا تو تمہیں اکیلے چھوڑ کر بھاگ نہ جاتا۔ خیر۔ اس کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے۔ پہلے تیرے ساتھ تو۔۔۔"

"میں آگیا شیطانو!" میں نے گونج دار آواز میں کہتے ہوئے کھڑکی سے اندر چھلانگ لگا دی "تمہیں انتظار کا کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا۔ میں آگیا ہوں اور اب تم دونوں تیار ہوجاؤ۔"

میں اچھل کر بیچ والے دروازے کے قریب آگیا تھا۔ ان دونوں نے بیک وقت میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے ان دونوں کے دیوتا کوچ کر گئے ہوں لیکن پھر ان دونوں نے حیرت انگیز طور پر بہت جلدی اپنے آپ پر قابو پالیا۔ بھیرو نے اچانک ہی چترا پریتم کو پوری قوت سے میری طرف دھکیل دیا۔

چترا لڑکھڑاتی ہوئی مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ میں نے چترا کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس جھٹکے سے میں بھی ایک لمحے کو گڑبڑا گیا تھا اور پھر میرے سنبھلنے سے پہلے ہی گبرو اور بھیرو نے بیک وقت دو مختلف سمتوں سے مجھ پر حملہ کردیا۔

میں چترا کو ساتھ لے کر بڑی پھرتی سے نیچے گر گیا اور تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ گبرو اور بھیرو اپنی ہی جھونک میں ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ ان کے سر آپس میں ٹکرائے تھے۔ ان دونوں میں کسی کے منہ سے چیخ بھی نکلی تھی۔

میں نے چترا کو اپنے سے الگ کیا اور اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہی ایک زوردار سائیڈ کک بھیرو کے رسید کردی۔ کک نپی تلی تھی۔ بھیرو چیختے ہوئے گبرو سے ٹکرا گیا اور وہ دونوں ڈھیر ہوگئے۔ میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ان پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے رہے مگر میری ہر ٹھوکر ان میں سے کسی نہ کسی کو چیخنے پر مجبور کردیتی بالآخر بھیرو کا داؤ چل گیا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ بھیرو نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں ٹانگیں سمیٹ کر اسے پیروں پر روکا اور پوری قوت سے دور اچھال دیا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی گبرو بھی چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں اسے روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ وہ بھاری چٹان کی طرح میرے اوپر گرا۔

وہ کم بخت خاصا بھاری بھرکم تھا۔ ایک لمحے کو تو مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا لیکن پھر میں ایک گھٹنا سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ٹھوکر لگانے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے گھٹنے سے اسی انداز میں دوبارہ ٹھوکر لگائی۔ اس مرتبہ وہ بری طرح بلبلایا۔ میں نے دوسری ٹانگ بھی سمیٹ لی اور اسے پیروں پر اٹھا کر پیچھے کی طرف اچھال

دیا۔ وہ میرے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے بھد سے پیچھے کی طرف گرا۔

میرے اٹھنے تک وہ دونوں بھی اٹھ گئے اور ارنا بھینسے کی طرح پھنکارتے ہوئے میری طرف بڑھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی لیکن وہ لڑنے کے فن سے واقف نہیں تھے جبکہ مجھے ان پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ میں مارشل آرٹس میں مہارت رکھتا تھا۔

ان دونوں کے انداز بڑے خطرناک تھے۔ وہ مجھے گرفت میں لینا چاہتے تھے اور میں جانتا تھا کہ اگر ان کے قابو میں آگیا تو وہ میری ہڈیوں کا سرمہ بنا دیں گے۔ میں اس طرح پیچھے ہٹنے لگا جیسے ان سے خوف زدہ ہو رہا ہوں۔ تین قدم پیچھے ہٹتے ہی میں طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے ڈبل کک لگائی تھی۔ میرا ایک پیر بھیرو کے منہ پر اور دوسرا گبرو کے سینے پر لگا تھا۔ وہ دونوں بلبلاتے ہوئے پیچھے الٹ گئے۔

اور پھر میری آنکھوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ چترا پریتم جو اب تک بیچ والے دروازے کے قریب پڑی ہوئی تھی۔ بڑی تیزی سے اٹھ کر آتش دان کی طرف لپکی جہاں برتنوں میں سبزی کاٹنے کی لمبے پھل والی چھری پڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں صورتِ حال کو سمجھ سکتا' چترا نے چھری اٹھا کر بھیرو پر حملہ کردیا۔

منہ پر میری کک لگنے سے بھیرو کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا اور وہ قدرے آگے کو جھکا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ناک اور منہ پر تھا۔ چترا نے خوفناک انداز میں چیختے ہوئے چھری پوری قوت سے اس کے بائیں پہلو میں اتار دی۔

بھیرو چیختے ہوئے منہ کے بل گرا۔ چترا نے چھری اس کے جسم سے باہر کھینچ کر دوبارہ حملہ کردیا۔ یہ وار بھی بھیرو کے پہلو ہی پر پڑا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا۔ اس کے جسم پر لگنے والے دو زخموں سے خون بہہ نکلا تھا۔ وہ زمین پر لوٹتے ہوئے جیسے ہی سیدھا ہوا' اس مرتبہ چترا نے چھری اس کے سینے میں اتار دی۔

گبرو ایک طرف پڑا دہشت زدہ سی نظروں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور پھر وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ اس نے اٹھ کر چیختے ہوئے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔

میں بھی چترا پریتم کے جنون کو دیکھ رہا تھا۔ گبرو کی چیخ سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے بھی گبرو کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ گبرو کا پیر میرے ہاتھ میں آگیا۔ وہ دروازے سے ٹکرایا۔ دروازہ باہر کی طرف کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی گبرو بھی گرا اور اس کا پیر میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا' میں نے چھلانگ لگا کر اسے جھاپ لیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو پتھروں پر رگیدتے رہے۔ گبرو کو اس دوران میں کئی مواقع ملے تھے۔ وہ اگر چاہتا تو میری گردن مروڑ سکتا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگنے کی کوشش میں تھا۔ بھیرو کا حشر دیکھ کر اس پر بری طرح خوف سوار ہو گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس مرتبہ اس کی گردن میرے بازو کی گرفت میں آگئی۔

میں نے گبرو کی گردن کو بازو کی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ گرفت چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن میرے بازو کا لگایا ہوا نیک لاک چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ اس کی پشت میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے لیکن پتھروں میں ایڑیاں رگڑنے کے سوا وہ کچھ نہیں کر سکا تھا۔

اور پھر مجھے وہ موقع مل گیا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں نے اس کی گردن کو زوردار جھٹکا دیا۔ خاصی موٹی گردن تھی۔ جھٹکا لگنے سے وہ چیخ اٹھا تھا لیکن میرا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا اور پھر تیسرے جھٹکے پر "کڑک" کی آواز ابھری۔

گبرو بری طرح مچلا۔ اس کے حلق سے خرخراہٹ کی دبی دبی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اور پھر اسی لمحے چترا چیختے ہوئے کٹیا سے باہر آگئی۔ خون آلود چھری اس کے ہاتھ میں تھی۔

ہم جس جگہ پر تھے وہاں کھلے ہوئے دروازے سے لیمپ کی مدھم سی روشنی پہنچ رہی تھی۔ چترا نے آتے ہی گبرو پر حملہ کردیا۔ چھری اس کے پیٹ میں اتر گئی۔ میں نے گبرو کی گردن کو ایک اور جھٹکا دیا اور اسے چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا۔

گبرو کو میں نے چترا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ پتھروں پر بری طرح لوٹ رہا تھا اور چترا چھری سے اس پر پے در پے حملے کر رہی تھی۔ اس پر جنون طاری تھا۔ اس نے انہی لوگوں کے ہاتھوں اپنی بیٹی اور اپنے شوہر کو اسی طرح قتل ہوتے دیکھا تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ بیٹی اور شوہر کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑے گی اور میں نے اسے یہ موقع فراہم کردیا تھا۔

گبرو ختم ہو چکا تھا لیکن چترا کے جنون میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی چھری سے پے در پے اس پر وار کر رہی تھی۔

"چترا رک جاؤ!" میں نے چیخ کر کہا "وہ ختم ہو چکا ہے۔ چھوڑ دو اسے۔"

"میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ٹکڑے کردوں گی اس کے۔" چترا نے بھی چیخ کر جواب دیا اور گبرو کے مردہ جسم پر حملے جاری رکھے۔

میں نے پیچھے سے چترا کو اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی رہی لیکن میں اسے گھسیٹتے ہوئے وہاں سے دور ندی کی طرف لے گیا۔

چترا کی یہ کاٹیج یا کٹیا آبادی سے بہت دور تھی۔ سناٹے میں چیخ پکار کی آوازیں اگرچہ دور تک پہنچی ہوں گی اور کہیں نہ کہیں سنی بھی گئی ہوں گی لیکن مجھے یقین تھا کہ تحقیقِ حال کے لیے کوئی اس طرف نہیں آئے گا اور پھر کسی کے لیے یہ اندازہ لگانا بھی دشوار ہوگا کہ چیخنے کی یہ آوازیں کس طرف سے آئی تھیں اس لیے کم از کم اس وقت یا فوری طور پر کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔

میں چترا کو کھینچتے ہوئے ندی پر لے گیا۔ اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ایک طرف ڈال دی اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا اور پھر وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ وہ کتنی دیر تک گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر میرے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپاتا رہا اور جب اس کی سسکیاں تھمیں تو میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کردیا۔

"آج میرے من کو کچھ تسکین مل گئی۔" وہ اب بھی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی "لیکن پوری تسکین اس وقت ملے گی جب میں اس تیسرے درندے پنڈت پر گھیا راج کو بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اتاروں گی۔"

"لیکن اس سے پہلے ہمیں اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔" میں نے اس کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا "ان دونوں لاشوں کو ٹھکانے لگانا ہے اور اپنے لیے کسی دوسرے ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہے۔ یہ جگہ اب ہمارے لیے محفوظ نہیں رہی۔" میرے ذہن میں اچانک ہی خیال آیا تھا کہ گبرو اور بھیرو کو دارا اور پنڈت پر گھیا راج نے مجھے اور چترا پریتم کو ختم کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ دونوں جب واپس نہیں پہنچیں گے تو یقینی بات ہے وہ کسی اور کو بھی اس طرف بھیجیں گے اس طرح یہ جگہ ہمارے لیے بالکل غیر محفوظ ہو گئی تھی۔

چترا ان لاشوں کو ندی میں پھینکنا چاہتی تھی تاکہ اپنی قسم پوری کر سکے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ لاشیں پانی میں بہہ کر زیادہ دور تک نہیں جا سکیں گی۔ آگے جا کر اس ندی کا پاٹ چوڑا ہو گیا تھا اور پانی کے بہاؤ کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ مزید بر آں آگے ندی میں بڑے بڑے پتھر بھی تھے اور کناروں پر جھاڑیاں بھی تھیں جن کی شاخیں پانی کے اندر تک پھیلی ہوئی تھیں وہ لاشیں ان جھاڑیوں اور پتھروں میں اٹک جاتیں اور کل دن میں کسی بھی وقت ان کا پتا چل سکتا تھا جبکہ میرے ذہن میں کچھ اور منصوبہ تھا۔

کاٹیج میں آکر ہم نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس کمرے میں جا بجا خون پھیلا ہوا تھا جہاں بھیرو کی لاش پڑی تھی۔ خون صاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کاٹیج میں ہر جگہ اور ہر چیز پر ہماری انگلیوں کے نشانات موجود تھے۔ پولیس اگر تحقیقات کرتی تو ہمیں قاتل ثابت کرنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ ہم ویسے بھی پولیس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ چترا پریتم تو اپنی بیٹی اور شوہر کے قتل کے حوالے سے پہلے ہی پولیس سے رابطے میں تھی اور میں بھی تیس مار خان بنا ہوا تھا۔ سورج گرہن والے دن ہم نے گنگوتری کے پہاڑی غاروں میں بدری ناتھ کی نوجوان بیٹی سیتا کو پنڈت آشوتوش سے بچایا تھا اور پولیس والے ہمارے بے حد مشکور و ممنون ہوئے تھے اور پولیس پر یہ احسان اب ہمارے لیے خصوصاً میرے لیے بہت بڑا خطرہ بن گیا تھا۔ پولیس والے جان گئے تھے کہ میں چترا کے ساتھ رہ رہا ہوں اور اب چترا کے ساتھ مجھے بھی تلاش کیا جانا لازمی تھا۔

اس کاٹیج سے اپنے جرم کا ہر ثبوت مٹانا ہمارے لیے ضروری تھا تاکہ ہم سامنے بھی رہیں تو کم از کم پولیس ہم پر قتل کا شبہ نہ کر سکے اور میں نے چترا کو سمجھا دیا تھا کہ ثبوت کس طرح مٹائے جا سکتے ہیں۔

میں نے گبرو کی لاش بھی باہر سے اٹھا کر کاٹیج میں بھیرو کی لاش کے قریب ڈال دی۔

چترا اپنے کمرے میں گھس گئی جہاں ایک طرف اس کا سوٹ کیس پڑا ہوا تھا۔ اس نے سوٹ کیس کھول کر چند کپڑے ایک تھیلے میں بھر لیے۔ میں نے بھی دوسرے کمرے میں جا کر اپنے بکھرے ہوئے کپڑے اپنے بیگ میں ٹھونس لیے۔

"شہر کا رخ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔" میں نے چترا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ رات ہمیں پہاڑوں میں ہی گزارنی پڑے گی۔ صبح کسی ایسی جگہ کا بندوبست کریں

گے جہاں ہم چند روز تک محفوظ رہ سکیں۔"

"ایک ایسی جگہ ہے۔" چترا نے کہا "تم وہ کمبل اٹھالو۔ ہمیں اس کی ضرورت پڑے گی۔"

ایک کمبل چترا نے بھی اٹھالیا تھا۔ دوسرا میں نے تہ کرکے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ میں نے وہ کھڑکی بھی اندر سے بند کردی۔ چترا کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

میں نے جلتا ہوا لیمپ اٹھالیا۔ چترا باہر جاچکی تھی۔ لیمپ کا ڈھکن کھول کر پہلے میں نے ان دونوں لاشوں پر تیل چھڑکا پھر تینوں کمروں میں تیل کے چھینٹے دینے لگا۔

لیمپ میں تیل کے چند ہی قطرے بچے تھے۔ اس کی بتی ابھی تک جل رہی تھی۔ میں نے اس کا شیشہ اتار کر نیچے پھینک دیا اور لاشوں کے قریب ایک کپڑے پر جلتا ہوا لیمپ پھینک دیا۔

کپڑے نے فوراً ہی آگ پکڑلی۔ میں جلدی سے باہر آگیا اور دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ چترا دروازے سے چند قدم دور کھڑی تھی۔

"کس طرف جانا ہے؟" میں نے قریب پہنچ کر پوچھا اور چترا نے ایک طرف اشارہ کردیا۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس طرف چلنے لگے۔ تقریباً سو گز دور نکلنے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کاٹیج کی عقبی کھڑکیوں میں روشنی نظر آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ اندر آگ پھیلنے لگی تھی۔ یہ مختصر سی عمارت لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی تھی اور میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں ہی پوری عمارت آگ کی لپیٹ میں آجائے گی اور اس کے ساتھ ہی ہمارے اس جرم کے تمام ثبوت مٹ جائیں گے۔

ہم تیز تیز چلتے رہے۔ ہمارا رخ بلندی کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد چترا ہانپنے لگی۔ اس وقت ہم کاٹیج سے تقریباً نصف میل دور نکل آئے تھے۔ چترا کی وجہ سے مجھے رک جانا پڑا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ہم چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں تھے۔ جلتا ہوا مکان اگرچہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن اس طرف فضا میں نارنجی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

پانچ چھ منٹ وہاں رکنے کے بعد ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ ہم پہاڑیوں میں بدستور بلندی کی طرف جارہے تھے۔ بلندی، سبزہ اور گھنے درختوں کی وجہ سے سردی میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ میں نے چترا سے اس کا تھیلا لے لیا اور اس کا کمبل کھول کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔ کمبل کی وجہ سے چترا کو چلنے میں مزید دشواری پیش آرہی تھی۔ چترا نے ایک ہاتھ سے اپنے بدن پر لپٹے ہوئے کمبل کے دونوں کنارے پکڑ رکھے تھے اور اس کا دوسرا ہاتھ میں نے تھام رکھا تھا اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے لے جارہا تھا۔

ہم تقریباً تین گھنٹے تک رک رک کر چلتے رہے اور ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ چترا زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگی اور میں بائیں طرف نشیب میں دیکھنے لگا جہاں دور دور تک بکھری ہوئی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ہم پہاڑیوں میں چلتے ہوئے شہر کی دوسری طرف نکل آئے تھے اور ہردوار شہر ہم سے تقریباً تین میل دور نشیب میں تھا۔

ہمیں تقریباً بیس منٹ تک اس جگہ رکنا پڑا اور بالآخر ایک بار پھر آگے روانہ ہوگئے۔ پہاڑیوں میں اونچے نیچے راستوں پر چلنا خاصا دشوار کام تھا اور تاریکی میں تو اور بھی مشکل پیش آرہی تھی۔ کئی مرتبہ بڑے بڑے پتھر ہمارے پیروں کے نیچے سے پھسل کر ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔ میں نے چترا کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

مزید دو گھنٹے چلنے کے بعد ہم ایک بار پھر رک گئے۔ ہم جب کاٹیج سے روانہ ہوئے تھے تو اس وقت تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا اور میرے خیال میں اب تین تو ضرور بج رہے ہوں گے۔ پہاڑیوں پر چلتے چلتے چترا بری طرح ہانپ رہی تھی۔ سردی بھی لگ رہی تھی۔ اس کے جسم پر صرف انڈر ویئر تھے۔ اگر میں اسے کمبل نہ اوڑھاتا تو وہ ٹھٹھر کر رہ جاتی۔

میں چترا کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتا رہا جس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ پہاڑی راستے اس کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ اس وقت بھی گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کردیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور ایک چٹان سے آبشار کی طرح پانی گر رہا تھا۔ وہ چٹان بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی اور آبشار بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پانی ایک بڑے پرنالے کی صورت میں نیچے گر رہا تھا اور جمع ہونے یا ندی کی صورت میں آگے بہنے کے بجائے وہیں پتھریلی زمین کے اندر غائب ہورہا تھا۔ یہی پانی چٹانوں کے اندر ہی اندر بہتا ہوا گنگوتری کے مقام پر کہیں نہ کہیں سے باہر نکل آتا تھا۔

اس آبشار سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک چٹان کے پیچھے دوسری چٹان میں ایک تنگ سا غار تھا۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر چترا نے مجھ سے تھیلا لے لیا اور اس کے اندر ٹٹول کر ایک ٹارچ نکال لی۔

میں نے چترا کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اس کی

روشنی میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ غار زیادہ بڑا نہیں تھا۔ فرش پر پیال بچھا ہوا تھا۔

"تم پہلے سے اس غار کے بارے میں جانتی تھیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے چترا کی طرف دیکھا۔

"میں کئی مرتبہ یہاں آچکی ہوں۔" اس نے جواب دیا "پہلی مرتبہ تو میں محض اتفاق سے اس طرف نکل آئی تھی۔ ان دنوں یہاں ایک سادھو جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آنے لگی اور پھر ایک روز جب یہاں آئی تو وہ سادھو غائب ہوچکا تھا۔ شاید اس کا جاپ پورا ہوگیا تھا اور وہ کہیں چلا گیا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "اندر چلو۔ مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

دو چٹانوں کی وجہ سے یہاں ایک درہ سا بن گیا تھا جس سے تیز ہوا آرہی تھی۔ جب تک ہم پہاڑیوں پر چڑھتے رہے تھے، خون کی گردش تیز رہی تھی اور سردی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اب ایک دم سردی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔

ہم غار کے اندر آگئے۔ میں نے اپنا بیگ کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

چترا کمبل اوڑھے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اسے شاید زیادہ سردی چڑھ گئی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور کمبل کا کچھ حصہ اس کے اوپر ڈال دیا لیکن چترا کی سردی کم نہیں ہوئی اور وہ مسلسل کانپتی رہی اور بالآخر میرے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے دونوں کمبل ملا کر لپیٹ لیے۔

چترا میرے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے دانت بج رہے تھے اور جسم میں جیسے بھونچال سا آیا ہوا تھا لیکن بالآخر وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔

چترا شاید سوگئی تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا صورتِ حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں کئی سوال تھے۔ ان حالات سے چھٹکارا کب ملے گا اور یہ قتل و غارت کب ختم ہوگی؟ کیا میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد رہ گیا تھا؟ کیا میری زندگی میں کبھی ٹھہراؤ نہیں آئے گا اور میں اسی طرح حالات کی متلاطم لہروں پر بہتا رہوں گا؟

میں جیسے جیسے سوچتا رہا، میرا دماغ الجھتا گیا۔ کئی ایسے مواقع آئے تھے کہ میں نے ان ہنگاموں سے الگ ہونے کی کوشش کی تھی لیکن میرے دشمنوں نے مجھے کبھی بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا تھا۔ میرے زخموں کو کریدا گیا تھا اور قدم قدم پر مجھے یہ احساس دلایا گیا تھا کہ اگر مجھے زندہ رہنا ہے تو مجھے یہ ظلم بھی برداشت کرنا پڑیں گے۔

میں یہ ظلم برداشت کرتا رہا۔ میرے زخم ہرے ہوتے رہے۔ بار بار میری نظروں میں وہ منظر گھوم جاتا جب میرے ماں باپ کو میرے سامنے نہایت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور یہ احساس بھی مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف ڈٹے رہنے پر مجبور کرتا رہا کہ مجھے ان معصوم لوگوں کے قتل کا بدلہ لینا ہے جنہیں ان کی بے گناہی کی سزا دی گئی تھی۔

میری زندگی میں کوئی رات ایسی نہیں آئی تھی جب میں سکون کی نیند سویا ہوں۔ یہ رات بھی ایسی ہی تھی۔ مجھے ایک بار پھر موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی لیکن میں اس مرتبہ بھی بچ نکلا تھا اور اپنی طرح ظلم کا شکار ایک بے گناہ عورت کے ساتھ اس غار میں پڑا سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔

ہمالیہ کی گود میں یہ رات میرے لیے بڑی اذیت ناک ثابت ہورہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لیے میں مختلف حوالوں سے سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں جانکی کا خیال ابھر آیا۔ جانکی، روپ متی، بملا اور ٹھاکر۔ ٹھاکر تو جانتا تھا کہ میں کہاں اور کیوں جارہا ہوں لیکن جانکی وغیرہ بالکل لاعلم تھیں۔ انہوں نے تو واقعی ٹھاکر کی بوٹیاں نوچ لی ہوں گی۔ اتنے روز سے میں نے ٹھاکر کو اپنے بارے میں کوئی اطلاع بھی نہیں دی تھی اور یقیناً وہ بھی پریشان ہوگا۔

رات کے آخری پہر سردی بڑھ گئی۔ میں اپنے اندر بھی کپکپاہٹ سی محسوس کرنے لگا چترا اگرچہ میرے ساتھ لپٹی سو رہی تھی۔ میں نے دونوں کمبلوں کو اچھی طرح لپیٹا اور چترا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا کہ شاید اس طرح سردی کا احساس کچھ کم ہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں چترا کو چھوڑ کر سیدھا ہوگیا اور آنکھیں بند کرکے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میرے اندر چھپی پُراسرار قوت بیدار ہونے لگی۔ میرے اندر کی کپکپاہٹ بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور میں بالکل پُرسکون ہوگیا۔

سردی کا احساس مٹتے ہی میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو میں اکیلا ہی پیال پر لیٹا ہوا تھا۔ دونوں کمبل میرے اوپر پڑے ہوئے تھے۔ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور دن کی روشنی غار کے اندر بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ چترا غار میں نہیں تھی۔

میں نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹا کر ایک طرف پھینک

دیے اور غار سے باہر آگیا۔ چترا آس پاس کہیں بھی نہیں تھی۔ میں نے ایک دو مرتبہ چترا کا نام لے کر پکارا لیکن کہیں سے جواب نہیں ملا۔ میں چٹان کے اوپر سے گھوم کر اس طرف چلتا گیا جہاں رات کو آبشار دیکھا تھا۔

اور پھر ایک بہت بڑے چٹانی پتھر سے گھوم کر میں جیسے ہی دوسری طرف آیا' ٹھٹک کر رک گیا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر چترا پریتم آبشار کے نیچے کھڑی نہا رہی تھی۔ اس کے جسم کی ساری کالک دھل گئی تھی۔ وہ رات بھر میرے ساتھ لپٹی رہی تھی لیکن میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی لغو خیال نہیں آیا تھا مگر اس وقت چترا کو نہاتے دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں وہاں سے ہٹ کر اس پتھر کے پیچھے چلا گیا اور ایک جگہ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میرے لباس اور جسم پر بھی خون کے دھبے تھے اور یہ سوچ کر ہی گھن سی محسوس ہونے لگی کہ میرا جسم اور لباس ان غلیظ پجاریوں کے گندے خون سے آلودہ ہے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد چھوٹے چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر میں سمجھ گیا کہ پریتم واپس آرہی ہے۔

"میں یہاں ہوں پریتم۔" میں نے اونچی آواز میں پکار کر اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی چترا میرے سامنے آگئی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ بالوں سے پانی نچڑ رہا تھا جس سے قمیص تر ہو رہی تھی۔ اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

ہم غار کے سامنے آگئے۔ چترا دھوپ میں ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میں نے کمبل لا کر اس کے اوپر ڈال دیا اور اپنے بیگ میں سے کپڑے نکال کر نہانے کے لیے چلا گیا۔

اور پھر ایک گھنٹے بعد میں بھی چترا کے پاس دھوپ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غار میں جا کر اپنے تھیلے میں سے پلاسٹک کی ایک تھیلی نکال لائی تھی جس میں ایک کلو کے لگ بھگ کالے بھنے ہوئے چنے بھرے ہوئے تھے۔ ان میں نقل دانے بھی تھے۔

"میں اپنی کٹیا میں ہمیشہ ایسی چیزیں رکھتی ہوں جو نہایت سنگین صورتِ حال میں کام آجاتی ہیں۔" وہ تھیلی کھولتے ہوئے بولی "کٹیا سے نکلنے سے پہلے میں نے ایسی چیزیں تھیلے میں ڈال لی تھیں جو اب ہمارے کام آئیں گی۔"

ہم چنے کھاتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ چترا پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آچکی تھی۔ یہ جگہ ہردوار شہر سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر اور کافی بلندی پر تھی۔ اس طرف بہت کم لوگ عموماً آتے تھے۔ لوگ اس طرف جاتے تھے جہاں پہاڑیوں میں مندر بنے ہوئے تھے اور اس طرف کوئی مندر نہیں تھا۔

دن گزر گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی خنکی میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ پورے دن میں شہر کا کوئی آدمی اس طرف نہیں آیا تھا جس سے ہمیں شہر کی صورتِ حال کا علم ہوتا۔

وہ رات بھی ہم نے تاریک غار کے اندر گزاری۔ میرے اندر چھپی پُراسرار قوت نے مجھے سردی سے بچا لیا تھا۔ میں نے دونوں کمبل چترا کو دے دیے تھے تاہم دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے میں نے بھی کمبل کا ایک حصہ ٹانگوں پر ڈال رکھا تھا۔

اگلے روز دوپہر تک ہم غار کے آس پاس ہی رہے اور پھر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس طرف سے ہم لوگ اس رات آئے تھے وہ بہت طویل فاصلہ تھا لیکن ایک اور راستہ بھی تھا جہاں سے شہر کا فاصلہ دو ڈھائی میل سے زیادہ نہیں تھا اور یہ راستہ بہت کٹھن اور دشوار تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ لوگ اس طرف سے نہیں آتے تھے۔

اس راستے سے شہر تک پہنچنے میں ہمیں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ شہر کے نواحی علاقے میں زیادہ تر گیسٹ ہاؤسز تھے۔ آبادی بہت چھدری تھی۔ کوئی مکان یا گیسٹ ہاؤس کسی پہاڑی کے دامن میں تھا اور کوئی پہاڑی پر واقع تھا۔

ہم لوگ جس سڑک پر چل رہے تھے اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن اگر اسے ٹھنڈی سڑک کا نام دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دونوں طرف گھنی شاخوں والے درخت تھے جن کی شاخیں اوپر سے آپس میں ملی ہوئی تھیں۔

اس وقت دو بج رہے تھے اور ہم نے سوچا تھا کہ سب سے پہلے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور پھر کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ میں نے چلتے چلتے چترا پریتم کی طرف دیکھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی البتہ دوپٹا نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ کنگھا نہ ہونے کی وجہ سے بال الجھے اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر کسی قسم کا میک اپ بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس کا تعلق پنجاب کے اس سکھ گھرانے سے تھا جو برسوں پہلے سنگاپور میں جا کر آباد ہو گیا تھا۔ سنگاپور میں سیکڑوں سکھ خاندان آباد تھے۔ پاکستان اور ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اور بھی ہزاروں خاندان سنگاپور کو اپنا وطن بنا چکے تھے لیکن جو چارم سکھ عورتوں میں تھا وہ کسی اور

قوم کی عورتوں میں نظر نہیں آتا تھا۔

میں نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے۔

اِکا دُکا دکانیں شروع ہو چکی تھیں۔ ہم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے اور بالآخر ایک مارواڑی ہندو کے ہوٹل کے سامنے رک گئے۔ ہوٹل کے سامنے پھلوں اور کچوری وغیرہ کے ٹھیلے بھی تھے۔ یہ جگہ خاصی بارونق تھی۔

"بھوک لگ رہی ہے۔" چترا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ہیں پھر آگے چلیں گے۔"

بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی۔ ہم اس ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ خاصا لمبا چوڑا ہال تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بہت سی میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بڑی تعداد میں گاہک بھی موجود تھے۔ گاہکوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو ہندوستان کے مختلف شہروں سے گنگوتری یاترا کو آئے ہوئے تھے۔ ان میں بچے بھی تھے اور عورتیں بھی۔

میں اور چترا پریتم ہال کے آخر میں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ میز پر پلاسٹک کا ایک میلا سا جگ اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی میلے کچیلے لباس میں ملبوس ایک لڑکا آگیا اور کندھے پر پڑی ہوئی میلی سی صافی اتار کر میز صاف کرنے لگا اور پھر وہ اپنے ہوٹل میں تیار کھانوں کی تفصیل بتانے لگا۔ وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔ بہت سی چیزوں کے نام تو میری سمجھ میں ہی نہیں آسکے۔

"دال چاول لے آؤ۔ ہم دونوں کے لیے۔" چترا نے کہا "لیکن پہلے یہ جگ اور گلاس دھو کر تازہ پانی لاؤ۔"

لڑکا جگ اور گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ چند منٹ بعد اس نے ہمارے سامنے پانی سے بھرا ہوا جگ اور دونوں گلاس رکھ دیے اور پھر تھوڑی دیر بعد چاول کی دو پلیٹیں بھی ہمارے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ چاولوں پر دال پڑی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی اپنی پلیٹ اپنی طرف سرکا لی۔ کسی پلیٹ میں بھی چمچ نہیں تھا۔ مجھے بھی بہرحال ہاتھ سے چاول کھانے کا تجربہ ہو چکا تھا۔

ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ایک سادھو ہمارے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ٹخنوں تک لمبا گیروے رنگ کا چوغہ' گلے کے بٹن کھلے ہوئے جہاں سے سینے کے سیاہ بال جھانک رہے تھے۔ گلے میں رنگ برنگے موتیوں کی کئی مالائیں تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں اسٹیل کے کڑے تھے۔ ماتھے پر قشقہ اور دونوں گالوں پر بھی سفید لکیریں کھنچی ہوئی تھیں۔ دونوں کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ سر کے لمبے بال اس طرح الجھے اور گتھے ہوئے تھے جیسے مٹی میں کسی قسم کا گم ملا کر لپائی کی گئی ہو۔ صاف لگ رہا تھا۔ برسوں سے پانی کو بالوں کے قریب نہیں آنے دیا گیا تھا۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح آپس میں ملے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ تلاش کرنا مشکل تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول تھا اور دوسرے ہاتھ میں پیتل کی ایک چھوٹی سی بالٹی تھی۔ دائیں کندھے پر ایک میلا سا کپڑے کا تھیلا بھی لٹکا ہوا تھا جس میں نجانے کیا کچھ بھرا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر وہ سادھو بہت ہی غلیظ تھا۔

اسے اپنے قریب دیکھ کر میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال ابھرا کہ کہیں وہ پنڈت پرگھیا راج کا آدمی تو نہیں۔ اس نے شاید ہمیں پہچان لیا ہو۔ چترا پریتم کے چہرے کا رنگ بھی ایک لمحے کو متغیر ہو گیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔

وہ سادھو اگرچہ خاصا ہٹا کٹا تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر یتیمی برس رہی تھی اور وہ جس انداز میں ہمارے قریب آکر کھڑا ہوا تھا اس سے مجھے اس کے بارے میں اپنی پہلی رائے بدلنی پڑی۔

"اوئے چھوکرے۔" کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا مارواڑی سیٹھ

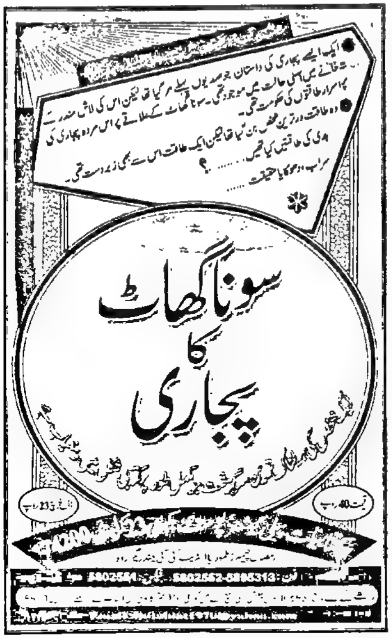

چیخا "اس سادھو کو باہر نکال۔ گراکوں (گاہکوں) کو پریشان کرتا ہے۔"

ویٹر لڑکا میزوں کے درمیان گھومتے ہوئے ہماری طرف آگیا اور قریب پہنچ کر سادھو کا بازو پکڑ لیا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

"ایک منٹ!" میں نے ہاتھ اٹھا کر لڑکے کو روک دیا اور سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھوک لگ رہی ہے۔ بھوجن کرو گے؟"

سادھو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اس کے لیے ایک پلیٹ دال چاول لاؤ۔" میں نے لڑکے سے کہا اور سادھو کو اشارہ کیا۔

وہ بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ترشول میز کے ساتھ ٹکا کر کھڑا کر دیا اور بالٹی کرسی کے قریب فرش پر رکھ دی۔ ایسے غلیظ آدمی کو تو دور سے دیکھ کر ہی کراہیت محسوس ہوتی تھی لیکن میں نے اسے اپنے ساتھ بٹھا لیا تھا اور میری اس سادھو سے ہمدردی بلاوجہ نہیں تھی۔

ہم اپنا کھانا ختم کر چکے تھے۔ چند منٹ بعد ہی لڑکے نے سادھو کے سامنے چاولوں کی پلیٹ رکھ دی اور اس سادھو نے جس طرح چاول کھائے وہ میں یہاں بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے لیے دوسری اور تیسری پلیٹ بھی منگوائی گئی۔ چترا اس دوران میں منہ پھیرے بیٹھی رہی۔

کسی گندے اور غلیظ سادھو کو اس طرح اپنے پاس بٹھانا اور اس کی سیوا کرنا کوئی انوکھی اور غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے سادھوؤں کو بہت قوتوں والا اور پہنچا ہوا سمجھا جاتا تھا اور لوگ ان کے پیچھے پیچھے پھرا کرتے تھے۔

کھانا ختم ہونے کے بعد سادھو نے چائے بھی پی اور پھر میں اسے لے کر ہوٹل سے باہر آگیا۔ میں اس سے جو بات کرنا چاہتا تھا اس کے لیے وہ جگہ مناسب نہیں تھی۔ ہم ہوٹل سے نکل کر سڑک پار کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ سادھو زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

"یہاں کہاں رہتے ہو۔ میرا مطلب ہے کون سے مندر میں؟" میں نے پوچھا۔

"سادھوؤں کا کوئی پکا استھان نہیں ہوتا۔" اس نے بے ترتیب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم آج ہی بنارس سے آئے ہیں۔ گنگوتری کی یاترا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ تم نے ہماری سیوا کی بالک۔ ہم بہت خوش ہوئے۔"

"آپ جیسے مہا پرشوں کی سیوا کرنا ہمارا دھرم ہے مہاراج۔" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ہم آپ کی اور بھی سیوا کریں گے پر آپ کو بھی ہمارے لیے کچھ کرنا ہوگا۔"

سادھو نے گھور کر میری طرف دیکھا پھر بولا۔

"تمہاری اچھا اوش (خواہش یقیناً) پوری کریں گے۔ مانگ کیا مانگتا ہے بالک؟" اس نے خاموش ہو کر معنی خیز نگاہوں سے چترا کی طرف دیکھا پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"میں سمجھ گیا۔ بتانے کی ضرورت نہیں۔ گھر کا آنگن سونا ہے ــ اولاد مانگتے ہو؟"

میں نے پریتم کی طرف دیکھا۔ شرم یا غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نہیں مہاراج۔" میں نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ایک اور معمولی سا کام ہے۔ وہ کر دو تو ہم تمہاری بہت سیوا کریں گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے پانچ پانچ روپے والے دو سکے اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔

"بول۔ کیا بولتا ہے؟" اس نے دونوں سکے پیتل کی بالٹی میں ڈال لیے۔

میں جواب دینے سے پہلے چند لمحے خاموشی سے چترا کی طرف دیکھتا رہا پھر سادھو کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں بولا۔

"آپ میری بات کا برا مت مانیے مہاراج لیکن بات ایسی ہے کہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "چند روز پہلے ایک پنڈت مہاراج ہمارے گھر کی ایک کنیا (لڑکی) کو ورغلا کر لے گئے تھے۔ ہم اس کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ وہ پنڈت مہاراج ہماری کنیا کے ساتھ گنگوتری مندر میں چھپا ہوا ہے اور پرگھیا راج نامی ایک پنڈت کا مہمان ہے۔ ہم مندر میں ان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرنا چاہتے۔ آپ ہمیں یہ پتا کر کے بتا دیں کہ وہ پنڈت مہاراج اور کنیا اب بھی مندر میں ہیں یا نہیں۔ بس مہاراج اتنی سی بات ہے۔"

"اتنی سی بات ہے۔ بہت بے وقوف ہو تم بالک۔" سادھو نے کہا "تین پلیٹ چاول، ایک کپ چائے اور دس روپوں میں اتنا بڑا کام کرانا چاہتا ہے۔ میں چند مہینوں بعد یہاں ضرور آتا ہوں اور پنڈت پرگھیا راج کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بڑا حرامی آدمی ہے۔ اگر اسے مجھ پر شک بھی ہو گیا تو میری چمڑی اتروا دے گا۔ پر تو چنتا (فکر) نہ کر۔ تیرا کام اوش (ضرور) ہوگا۔ لا ــ سو کا پتا نکال۔" اس نے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

اس کی باتیں سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ کچھ کم حرامی نہیں تھا۔ کام کی نوعیت کو فوراً ہی سمجھ گیا تھا اور یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے صرف سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ ہزار دو ہزار بھی مانگ سکتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چترا کی طرف دیکھا اور جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سادھو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"پر ایک بات ہے سادھو مہاراج۔" میں نے کہا "پنڈت پرگھیا راج یا کسی اور کو ــ"

"شانت رہو مورکھ (بے وقوف)۔" اس نے میری بات کاٹ دی "اس حرامی کے تو باپ کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ پر کام ہو جانے کے بعد پانچ سو روپے اور لوں گا۔ یہ سو روپے تو میں نے بیعانہ لیا ہے۔"

وہ واقعی بہت حرامی تھا۔ اپنا ریٹ بڑھا رہا تھا لیکن میں نے حامی بھر لی۔

"ہم شام کو چھ بجے اسی ہوٹل میں ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا اور ہری رام ــ نارائن" کے نعرے لگاتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔

"تم نے بہت بڑا رسک لیا ہے۔" چترا نے اس کے جانے کے بعد کہا "یہ پنڈت، سادھو اور پجاری ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ اگر اس نے پنڈت پرگھیا راج کو ہمارے بارے میں بتا دیا تو ــ"

"وہ ایسا نہیں کرے گا۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگا لیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس نے جو الفاظ استعمال کیے تھے ان سے تم نے بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ پنڈت پرگھیا راج سے اسے کتنی نفرت ہے۔ اس کی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دربدر ہے۔ جبکہ پرگھیا راج ایک بڑے مندر میں بیٹھا ہوا ہے۔ اسے یہ بھی دکھ ہوگا کہ پرگھیا راج تو عیش کر رہا ہے جبکہ وہ خود ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ بس اطمینان رکھو۔ وہ پرگھیا راج کو ہمارے بارے میں نہیں بتائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ آئندہ بھی ہمارے کام آئے۔ ہمیں ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔" چترا نے کہا "میرا خیال تھا کہ ہم ایک دو گھنٹے میں واپس چلے جائیں گے لیکن اب چھ بجے تک یہاں رہنا پڑے گا۔"

"ہم اس دوران میں ہم قرب و جوار کی دکانوں سے اپنی ضرورت کی چیزیں خریدیں گے اور کسی جگہ بیٹھ کر وقت گزار دیں گے اور اس دوران میں ہم لوگوں سے پرسوں رات والے واقعے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگے۔ ابھی ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے کچھ لوگوں کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن ان چہروں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ اور اس کے ساتھ جانکی، روپ متی اور ببلا تھیں۔ انہوں نے بھی ہمیں دیکھ لیا اور قریب آکر وہ جس طرح مجھ سے ملے وہ منظر چترا پریتم کے لیے خاصی حیرت اور پریشانی کا باعث بنا تھا۔

ان کی باتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ وہ لوگ میری تلاش میں تین دن سے یہاں آئے ہوئے تھے اور آشرموں، ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز میں میرا حلیہ بتا کر مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

ٹھاکر نے اس طرف ــ جس طرف سے ہم آئے تھے، پہاڑی کے دامن میں ایک کاٹیج کرائے پر لے لیا تھا۔ ویسے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں یہاں آتے ہی کاٹیج مل گیا تھا جبکہ لوگ خوار ہوتے پھرتے تھے اور کھلے آسمان کے نیچے ٹھٹھر ٹھٹھر کر راتیں گزارنے پر مجبور تھے۔

وہ کاٹیج مارواڑی کے اس ہوٹل سے، جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا تقریباً ایک میل کے فاصلے پر پہاڑی کے دامن میں تھا۔ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر کچھ اور بھی کاٹیج تھے اور ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے پہاڑی سے اتر کر ہم اس طرف سے گزر کر آئے تھے۔

کاٹیج دو بڑے کمروں اور ایک رسوئی پر مشتمل تھا اور انہوں نے یہاں چائے وغیرہ بنانے کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ کاٹیج میں آنے کے تھوڑی دیر بعد روپ متی چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ جانکی اور ببلا میرے دائیں بائیں جس طرح چپک کر بیٹھی ہوئی تھیں اسے دیکھ کر چترا گویا الجھ کر رہ گئی تھی۔

روپ متی کو چائے لانے میں دیر نہیں لگی اور چائے کی چسکیوں کے دوران ہی میں، میں نے انہیں چترا پریتم کے بارے میں بھی بتا دیا اور انہیں اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

"اگر دارا یہیں ہے تو اس مرتبہ اسے بچ کر نہیں جانا چاہیے۔" میرے خاموش ہونے پر ٹھاکر نے کہا۔

"وہ یہیں ہے اور گنگوتری مندر میں چھپا ہوا ہے۔ میں

نے ایک سادھو کو اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ شام چھ بجے اس سادھو سے ملاقات ہوگی تو کچھ پتا چلے گا۔"

"رہنے کا کہاں بندوبست کیا ہے تم نے؟" ٹھاکر نے پوچھا۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے چترا پریتم کی طرف بھی دیکھا تھا۔

"پرسوں رات تک تو میں چترا کے کاٹیج میں تھا لیکن دارا نے ہمیں ڈھونڈ نکالا تھا۔ اس رات اس کے دو آدمیوں نے کاٹیج پر حملہ کردیا اور۔۔۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے پرسوں رات کے بارے میں بتانے لگا اور آخر میں کہا "دو راتیں ہم نے پہاڑیوں پر ایک غار میں گزاری ہیں لیکن اب بہرحال، ہمیں ٹھکانا تو مل ہی گیا ہے۔" میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"پرسوں رات۔" ٹھاکر میرے خاموش ہوتے پر بولا "کاٹیج کو آگ لگنے کے بعد شہر کے بہت سے لوگ اس طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ہم اس وقت مین بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ آگ پر قابو نہیں پایا جاسکا تھا۔ کاٹیج مکمل طور پر جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ اگلے روز پتا چلا کہ ملبے سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں لیکن پولیس ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکی تھی۔ البتہ کسی اِگّی اور اس کے کسی پریمی کا نام لیا جا رہا ہے۔"

میں نے مسکرا کر چترا پریتم کی طرف دیکھا اور پھر جانکی کی طرف دیکھنے لگا اس کی بھویں تن گئی تھیں۔

"چترا پریتم میرے ایک مربی چاچا خشونت سنگھ کی بیٹی ہے۔ یہ سنگاپور سے یہاں آئی تھی اور۔۔۔"

"بس۔" جانکی نے مجھے ٹوک دیا "اب میں جان گئی کہ یہ کون ہے۔" جانکی نے یہ جملہ بات کو ختم کرنے کے لیے ادا کیا تھا۔

اور پھر موضوع بدل گیا۔ ٹھاکر کی باتوں سے یہ تو پتا چل گیا کہ اس رات ہمارے کاٹیج کے جل جانے کے بعد اگلے روز ملبے میں سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں اور میرا اور چترا کا نام لیا جا رہا تھا لیکن یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ پولیس نے ہمارے بارے میں کیا رائے قائم کی تھی۔ آیا پولیس کی نظروں میں ہم دونوں جل کر راکھ ہوگئے تھے یا ہمیں آتش زنی اور قتل کا ملزم ٹھہرایا جا رہا تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے مجھے شہر میں ایسے لوگوں سے رابطہ کرنا تھا جو اس سلسلے میں کچھ زیادہ جانکاری رکھتے ہوں اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ پولیس ہمیں تلاش کررہی ہو۔ میں اور چترا رسک لے کر پہاڑوں سے اتر آئے تھے اور خوش قسمتی سے ہم ... گیا تھا۔ چترا کو اب فی الحال باہر جانے کی ضرورت ... لیکن مجھے یہ رسک لینا ہی تھا۔

ٹھیک چھ بجے میں اور ٹھاکر کاٹیج سے نکل کر شہر ... روانہ ہوگئے۔ چند منٹ سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا ... کے قریب پہنچ کر میں اور ٹھاکر الگ الگ ہوگئے۔ اس ... پر اگرچہ مجھے کوئی شبہ نہیں تھا لیکن ایسے لوگوں پر پورا ... بھی نہیں کیا جاسکتا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ احتیاط ... ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔

ٹھاکر ہوٹل کے سامنے سڑک کی دوسری طرف ... اور میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ... وقت یہاں زیادہ رونق تھی۔ ہوٹل کے اندر بھی کوئی ... نہیں تھی۔ فلمی گانوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی ... دے رہی تھی۔

میں ہوٹل میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ ... اسی میز پر بیٹھا ہوا تھا جہاں دوپہر کو ہم نے کھانا کھایا تھا ... میز پر دو آدمی اور تھے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ سادھو ... سامنے چاولوں کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی اور وہ بڑی بدتمیزی ... چاول کھا رہا تھا۔ میں اس کے قریب جانے کے بجائے ... اور میز پر بیٹھ گیا۔ ویٹر لڑکے نے پوچھے بغیر میرے ... چائے کا کپ لا کر رکھ دیا۔

چائے بہت بدمزہ تھی لیکن مجھے پینی پڑی۔ اس ... دوران میں بار بار اس سادھو کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ ... ختم کرنے کے بعد سادھو نے جگ اٹھا کر منہ سے لگایا ... سنے ہوئے ہاتھ اپنے کرتے کے دامن سے پونچھتے ہوئے ... اُدھر دیکھنے لگا۔ دوپہر کو بھی اس نے یہی حرکت کی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا تاکہ سادھو مجھے دیکھ لے ... اندازہ درست نکلا۔ سادھو مجھے دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے ... کر کھڑا ہوگیا۔ میں اس دوران میں کاؤنٹر پر پیسے ... سادھو عقل مند آدمی تھا۔ میں نے پیسے نکالنے کے لیے ... میں ہاتھ ڈالا تو وہ بھی میرے قریب پہنچ گیا۔

"ہم نے بھوجن (کھانا' کھانا) کیا ہے۔ پیسے ... دے دو بالک۔ رام بھلی کرے گا۔" اس نے میری ... دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بھیک مانگنے والا تھا۔

میں نے پہلے تو گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر اس ... پیسے بھی دے دیے اور ہوٹل سے باہر آگیا۔ سادھو مجھ سے ... پہلے ہی باہر آچکا تھا۔ وہ "ہری اوم ہری اوم" کہہ کر ... ایک طرف جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے چلا رہا۔

... کچھ دور جا کر سادھو رک گیا۔

"پانچ سو روپے نکال بالک۔" اس نے میرے سامنے ... ہاتھ پھیلا دیا "تمہارے کارن (وجہ سے) ہمیں بڑا کشٹ ... اٹھانا پڑا ہے۔"

میں نے کچھ کہے بغیر جیب سے پانچ سو روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اس دوران میں ٹھاکر بھی ہمارے ... قریب پہنچ چکا تھا۔ سادھو اسے دیکھ کر کچھ جھجکا۔

"اس کی چنتا مت کرو۔ یہ اپنا ہی بندہ ہے۔" میں نے کہا "اب تم وقت ضائع کرنے کے بجائے بولنا شروع کردو۔"

"تمہاری مشکل ابھی انت (ختم) نہیں ہوئی بالک۔" سادھو نے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"دوپہر کو میں یہاں سے سیدھا گنگوتری مندر گیا تھا۔" سادھو کہہ رہا تھا "میں نے مندر کے تمام پنڈتوں اور پجاریوں سے پوچھ لیا۔ تمہارے لیے جانکاری یہ ہے کہ پنڈت پرگھیا ... اپنے متر (دوست) کے ساتھ کل صبح سویرے ہی گنگوتری مندر سے چلا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک چھوکری ... بھی تھی۔"

"اوہ۔ کہاں گئے ہیں وہ لوگ؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جانکاری نہیں ملی بالک۔" سادھو نے جواب دیا "پر ... پتا چلا ہے کہ وہ لوگ بڑی عجلت میں وہاں سے گئے تھے۔"

"ٹھیک ہے سادھو مہاراج۔ اب تم جاسکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"کوئی اور سیوا بالک۔" سادھو نے پوچھا۔

"کچھ نہیں مہاراج۔ دھنے باد (شکریہ)۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

سادھو "ہری اوم ہری اوم۔ نارائن نارائن کی ... گردان" کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں نے اس سے مزید ... کام لینے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ وہ جس طرح شروع ہی ... سے کیا تھا آگے چل کر ہمارے لیے خطرناک ثابت ... ہوسکتا تھا۔ میں نے اسے چھ سو روپے دیے تھے اور میری یہ ... رقم ضائع نہیں گئی تھی۔ کم از کم یہ پتا تو چل گیا تھا کہ دارا ... مہاراج گنگوتری سے چلے گئے تھے۔ وہ کہاں گئے تھے؟ ... یہ معلوم کرنا ابھی باقی تھا۔

... واپس آگئے۔

... "تم نے اس سادھو کو بھی بھگا دیا۔ اس کے ذریعے یہ ... معلوم کیا جاسکتا تھا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"یہ سادھو قابلِ اعتماد نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "ان کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے گا اور ہاں۔ یاد آگیا۔" میں ایک دم اچھل پڑا۔

"کیا ہوا؟ کیا یاد آگیا۔" ٹھاکر نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سوامی پرمانند۔" میں نے کہا اور پھر اسے سوامی پرمانند کے بارے میں بتانے لگا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" ٹھاکر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہوگیا "ابھی چلو۔ اس کام میں ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

جانکی وغیرہ کو کچھ ہدایات دینے کے بعد میں اور ٹھاکر کاٹیج سے نکل کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ مین بازار تک پہنچنے میں ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگا۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے اور بازار میں خاصی رونق تھی۔ آشرم والی گلی تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں سوامی پرمانند بھی ان لوگوں کے ساتھ غائب نہ ہوگیا ہو لیکن یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے آشرم سے باہر گیا ہے اور اس کی واپسی میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا ہے اور دو گھنٹے بھی لیکن ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ایک طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیا۔ میں نے اشارے سے ٹھاکر کو بتا دیا۔ سوامی پرمانند اکیلا ہی تھا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آرہا تھا۔ ٹھاکر نے آگے بڑھ کر اسے آشرم میں داخل ہونے سے پہلے ہی روک لیا۔ میں سامنے آنے کے بجائے دور ہی کھڑا رہا تھا۔

ٹھاکر چند منٹ سوامی سے باتیں کرتا رہا پھر وہ آشرم کے سامنے سے ہوتے ہوئے اس گلی میں آگے چلنے لگے۔ میں کچھ فاصلہ دے کر ان کے پیچھے چلتا رہا۔

وہ دونوں اگلی گلی میں مڑ کر رک گئے۔ اس طرف دکانیں وغیرہ نہیں تھیں۔ رہائشی مکان تھے اور لوگوں کی آمد و رفت بھی بہت کم تھی۔ میں جیسے ہی ان کے قریب پہنچا' سوامی پرمانند میری صورت دیکھ کر اچھل پڑا۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔!"

"کیوں۔ مجھے دیکھ کر کرنٹ لگ رہا ہے کیا؟" میں نے کہا۔ مجھے دیکھ کر وہ جس طرح بدحواس ہوا تھا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ مجھے جانتا تھا۔ میں کئی روز سے چترا پریتم کے ساتھ رہ رہا تھا اور پھر

سوبھراج نے بھی مرنے سے پہلے ان لوگوں کو میرے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ لوگ غالباً میری نگرانی بھی کرتے رہے تھے۔ اس طرح میرا چہرہ ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

"تت..... تم مجھے دھوکے سے کہیں لے جا رہے تھے۔" سوامی، ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر خوف نمایاں تھا "مم..... میں واپس جا رہا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گا۔"

"میرا یہ کھلونا تم سے زیادہ شور مچا سکتا ہے۔" ٹھاکر نے پستول نکال لیا "خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے رہو۔ اگر کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔"

"میں نہیں جانتا، تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔" سوامی ہکلایا "میں تم لوگوں کو جانتا بھی نہیں۔ مجھ سے تمہاری کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"تمہارے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ ہم تمہیں جانتے ہیں اور بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر ٹھاکر کی طرف متوجہ ہو گیا "تم اسے لے کر چلو ٹھاکر۔ میں دوسری طرف سے ہو کر آتا ہوں۔ اگر یہ راستے میں کوئی گڑبڑ کرے تو اڑا دینا اس کی کھوپڑی۔"

"چلو سوامی جی۔" ٹھاکر نے اسے اشارہ کیا۔

وہ دونوں گلی میں آگے کی طرف چلنے لگے اور میں واپس آ گیا۔ مین بازار میں آ کر میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔ ہمیں شاید دوبارہ بازار کی طرف آنے کا موقع نہ ملتا اس لیے میں نے یہ چیزیں خرید لی تھیں کہ رات کو فاقہ نہ کرنا پڑے۔

ٹھاکر اور سوامی پرمانند مجھ سے پہلے ہی کاٹیج میں پہنچ چکے تھے۔ سوامی، چترا پریتم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔

میں نے شاپنگ بیگ جانکی کے حوالے کر دیے اور ہم سوامی کو لے کر کاٹیج سے باہر آ گئے۔ سوامی کے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اس کے لیے کاٹیج جیسی جگہ مناسب نہیں تھی۔ قرب و جوار میں اور بھی کاٹیج تھے۔ شور سن کر کوئی اس طرف آ سکتا تھا۔

ہم کاٹیج کی پچھلی طرف سے ہو کر پہاڑیوں کی طرف چلنے لگے۔ ٹھاکر نے سوامی کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا ہوا چل رہا تھا۔ شاید خوف کی وجہ سے بھی اسے کچھ کم دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پیر رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔

تقریباً ایک میل دور نکل آنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ ایک مسطح چٹان تھی۔ اس کے اطراف گہرے کھڈ تھے اور ان سے آگے بلند پہاڑیاں تھیں۔ سوامی پرمانند سے پوچھ گچھ کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ اس کے چیخنے کی آواز پہاڑوں میں تو گونج سکتی تھی لیکن کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"تم لوگ کون ہو اور مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو؟" اس نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"تم سے کچھ جانکاری چاہیے سوامی جی۔" میں نے کہا "اگر تم ہماری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گے تو ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے اور اگر تم نے اڑی کی تو تمہاری لاش کے ٹکڑے کر کے یہاں پھینک دیں گے۔ بھیڑیے رات بھر دعوت اڑاتے رہیں گے۔"

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" سوامی نے پوچھا۔

"مجھے اور شریمتی چترا کو دیکھ کر تو تم سمجھ گئے ہو گے کہ ہم کون ہیں۔ تمہارے گرو نے چترا پریتم کی بیٹی اور شوہر کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ چند روز پہلے میرے ایک دوست کو قتل کر کے اس کی ادھڑی ہوئی لاش سڑک پر پھینک دی۔ دو دن پہلے مجھے اور چترا کو بھی مارنے کی کوشش کی گئی لیکن ہمیں مارنے کے لیے جو دو شیطان بھیجے گئے تھے وہ جل کر بھسم ہو گئے۔ تمہارا گرو گنگوتری مندر سے کہیں اور چلا گیا ہے۔ ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

"میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا۔ پتا نہیں تم کس کی بات کر رہے ہو۔" سوامی پرمانند نے کہا۔

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بغیر اس کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیختے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سامنے کا ایک دانت اکھڑ گیا۔ ہونٹوں سے خون کی دھار نکلی تھی۔

"کچھ یاد آیا یا....."

"میں نہیں جانتا کون سا گرو۔" اس نے کراہتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

میں نے پے در پے دو تین گھونسے اور جڑ دیے۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا تو میں نے ایک دو ٹھوکریں بھی مار دیں۔

"میں پنڈت پرگھیا راج کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "اس کے ساتھ ایک اور حرامی بھی آیا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے تم انہیں جانتے ہو۔ بتاؤ وہ لوگ کہاں ہیں؟"

"وہ..... وہ لوگ گنگوتری مندر میں ہیں لیکن میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔" سوامی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"تم انہیں نہیں جانتے!" میں نے ایک اور ٹھوکر مار دی "پرسوں دن بھر ہمارے کاٹیج کی نگرانی کیوں کرتے رہے۔ شام کو کاٹیج کی کھڑکی سے جھانک کر کیا دیکھنا چاہتے تھے۔ بتاؤ؟"

"وہ..... وہ دراصل....."

"نہیں سوامی جی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں نہ تو کبھی بے خبر رہا ہوں نہ غافل۔ اگر دوسروں کی طرح احمق ہوتا تو کب کا مارا جا چکا ہوتا۔ اس رات گبرو اور بھیرو کو بھیجا گیا تھا ہمیں ٹھکانے لگانے کے لیے لیکن وہ دونوں خود ہی جال میں پھنس گئے۔ ان کی موت ہی انہیں کھینچ کر وہاں لے گئی تھی۔ اور تم ان لوگوں سے الگ نہیں ہو۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ تمہیں بتانا ہو گا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"

"ہاں میں جانتا ہوں۔" سوامی پرمانند اچانک ہی تن کر کھڑا ہو گیا "لیکن میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم میرے گرو کے بارے میں ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں پوچھ سکو گے۔"

"گڈ۔" میں نے کہا "مجھے ایسے لوگ اچھے لگتے ہیں جو صورتِ حال کو فیس کرنا جانتے ہوں۔ اب تم سے بات کرنے میں مزہ آئے گا۔ کہاں گئے ہیں وہ لوگ؟"

"میں نہیں جانتا۔" سوامی نے جواب دیا۔

میں نے ایک دم آگے بڑھ کر اسے زوردار گھونسا لگا دیا۔ یہ گھونسا اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تو ٹھاکر نے اسے سنبھال لیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر گھماتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ پر گھونسا مارا۔ وہ دوہرا ہوا تو ٹھاکر نے گھٹنے سے اس کی ٹھوڑی پر ضرب لگائی۔ وہ چیختے ہوئے سیدھا ہو گیا اور ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ ٹھاکر نے اس کے سینے پر گھونسا مار دیا۔ وہ الٹے قدموں لڑکھڑاتے ہوئے میری طرف آیا تو میں نے اسے سنبھال لیا۔

اور پھر تقریباً دس منٹ تک وہ میرے اور ٹھاکر کے بیچ فٹ بال بنا رہا۔ میری طرف آتا تو میں اسے کک رسید کر دیتا۔ ٹھاکر کی طرف جاتا تو وہ اسے ٹھوکر یا گھونسا لگا کر میری طرف اچھال دیتا۔

آخری مرتبہ ٹھاکر کا گھونسا کھا کر وہ لڑکھڑاتے ہوئے پشت کے بل گرا تو میں ہوا میں اچھلا اور پیروں کے بل اس کے سینے پر گرا۔ اس کی چیخ بڑی خوفناک تھی لیکن مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ ایسے لوگوں پر مجھے ذرا بھی ترس نہیں آتا تھا جو دوسروں کی زندگیوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے تھے۔ کسی کو موت کے گھاٹ اتار کر مونچھوں پر اس طرح تاؤ دیتے تھے جیسے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

میں ایک بار پھر اچھلا۔ اس مرتبہ میرا ایک پیر اس کے سینے پر اور دوسرا اس کے کندھے پر پڑا تھا۔ پہاڑیاں اس کی چیخوں سے گونج رہی تھیں لیکن ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اول تو اس کی چیخیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچی ہوں گی اور اگر بہت دور کسی نے سنا بھی ہو تو رات کے وقت پہاڑیوں کی طرف آنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ میں نے اس کا ایک بازو پکڑ کر پیر اس کے کندھے پر رکھ دیا اور بازو کو زوردار جھٹکا دیا۔ "کڑک" کی آواز سے اس کے کندھے کا جوڑ اکھڑ گیا۔ اس کی چیخ پہاڑیوں میں بازگشت پیدا کرنے لگی۔

"تم بہت سخت جان ہو۔" میں نے اس کا دوسرا بازو پکڑ کر کندھے پر پیر رکھتے ہوئے کہا "لیکن میں تمہارے جسم کا جوڑ جوڑ الگ کر دوں گا اور اس وقت تک تمہیں نہیں چھوڑوں گا جب تک زبان نہیں کھولو گے۔"

زوردار جھٹکے سے میں نے اس کا دوسرا کندھا بھی اکھاڑ دیا۔ پہاڑیاں ایک بار پھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھیں۔ میں اسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور وہ پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح زمین پر لوٹنے لگا۔ وہ واقعی بہت سخت جان تھا۔ کوئی اور ہوتا تو نوبت یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی یا تو زبان کھول دیتا یا ختم ہو چکا ہوتا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر اوپر اٹھا دیا اور جانگھ پر پیر رکھ کر اس کی ٹانگ کو اٹھاتا چلا گیا۔

"رر..... رک جاؤ۔ ایشور کے لیے رک جاؤ۔" وہ ایک ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخا "بب..... بتاتا ہوں۔ رک جاؤ....."

میں نے اس کی ٹانگ ایک ہلکے سے جھٹکے سے چھوڑ دی۔ اس کے لیے یہ جھٹکا بھی کافی تھا۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

"جلدی بتاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے مجھے۔" میں نے اس کے سینے پر پیر رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ..... وہ لوگ سنکری مندر گئے ہیں۔" وہ رک رک کر بولا "یہ درست ہے کہ پرسوں رات پنڈت پرگھیا راج اور اس کے متر پنڈت سنگھ نے گبرو اور بھیرو کو تمہیں اور اس ننگی عورت چترا کو ٹھکانے لگانے کے لیے بھیجا تھا۔ پنڈت پرگھیا راج کو اس ناری سے خطرہ تھا۔ اس کی بیٹی اور پتی (شوہر) کے قتل کے الزام میں پولیس اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ عورت زندہ رہے گی،

خطرے کی تلوار اس کی گردن پر لٹکی رہے گی۔ دوسری طرف پنڈت سنگھ کو تم سے خطرہ تھا۔ وہ تم سے چھپتا پھر رہا ہے اور اس کا خیال تھا کہ وہ یہاں تم سے محفوظ رہے گا لیکن تم یہاں بھی پہنچ گئے۔ مندر میں سوبھراج نام کا ایک آدمی اس کے ہاتھ لگ گیا جس نے مار کھا کر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور انہوں نے سوبھراج کو قتل کر کے لاش سڑک پر پھنکوا دی۔

"ایک طرف وہ دونوں شیطان اس مندر میں جمع ہو گئے تھے اور دوسری طرف ان دونوں کے بدترین دشمن بھی آپس میں مل گئے تھے۔ وہ تم دونوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور بھیرو اور گبرو کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ تم دونوں کو ختم کر دیا جائے لیکن۔۔۔" وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ بھیرو اور گبرو کی واپسی کے منتظر تھے۔ اوم نام کا ایک تیسرا آدمی بھی دور رہ کر ان کی نگرانی کر رہا تھا تاکہ اگر ضرورت پڑے تو ان کی مدد کر سکے۔ اوم کو اس عورت کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور وہ یہی سمجھتا رہا کہ بھیرو اور گبرو تم دونوں پر حاوی ہو رہے ہیں لیکن جب کاٹیج میں آگ لگی تو اس نے تم دونوں کو پیچھے پہاڑیوں کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اوم دوڑتا ہوا کاٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔ اس وقت تک کاٹیج کے اندر آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے بھیرو اور گبرو کی لاشوں کو جلتے ہوئے دیکھا تو وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

"پنڈت پرگھیا راج اور پنڈت سنگھ کو جب اوم سے صورتِ حال کا پتا چلا تو وہ دونوں بری طرح بدحواس ہو گئے۔ پنڈت سنگھ نے پرگھیا راج کو بتایا کہ تم انسان نہیں شیطان ہو اور ہر مرتبہ اس کے حملوں سے بچتے رہے ہو اور اب تم ان لوگوں کو نہیں چھوڑو گے۔"

"وہ لوگ تم سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ صبح ہونے سے پہلے ہی گنگوتری سے نکل گئے۔ صرف دو آدمی جانتے ہیں کہ وہ سنکری مندر گئے ہیں۔ ایک میں اور دوسرا گنگوتری مندر کا پروہت پنڈت رام دیال۔"

"سنکری مندر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً دس کلومیٹر دور اونچے پہاڑوں میں۔ اس سے آگے ہمالیہ کا برفانی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔" سوامی پرمانند نے جواب دیا۔

"ان کے ساتھ اور کون ہے اور مندر میں کتنے لوگ ہیں جو ان کا ساتھ دے سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے صرف ایک چھوکری ان کے ساتھ گئی ہے اسے پنڈت سنگھ ہی اپنے ساتھ لایا تھا۔" سوامی پرمانند نے جواب دیا "سنکری مندر ایک بہت پرانا مندر ہے وہاں صرف دو پجاری رہتے ہیں۔ راستہ بہت کٹھن اور دشوار ہے اس لیے بہت کم یاتری اس طرف جاتے ہیں۔ ان کے من میں بھی یاترا کی لگن نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار دو چار نوجوان یاتری محض مہم جوئی کے شوق میں اس طرف چلے جاتے ہیں۔"

"پنڈت سنگھ کو جانتے ہو وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ پنڈت پرگھیا راج کا دوست ہے۔ ان دونوں کی ملاقات راجستھان کے کسی مندر میں ہوئی تھی۔ یہاں آ کر اس نے پرگھیا راج کو بتایا تھا کہ راجستھان کی پہاڑیوں میں واقع کالی کے مندر میں کوئی درگھٹنا (واردات) ہو گئی تھی اور تم نے اس کی ٹانگ توڑنے کی کوشش کی تھی اور اس نے بے ہوش ہو جانے کا ناٹک کر کے اپنے آپ کو بچایا تھا۔"

"اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" سوامی نے جواب دیا۔

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ پنڈت سنگھ ہندو نہیں ہے۔ وہ نہ تو پنڈت ہے اور نہ ہی یہ اس کا اصل نام ہے۔ وہ مسلمان ہے اور۔۔۔"

"کیا۔۔۔؟" سوامی پرمانند چیخا "ایک مسلا ہمارے دھرم کو نشٹ (برباد) کر رہا ہے۔"

"تم کون سا دھرم کی سیوا کر رہے ہو۔" میں نے کہا "پنڈت پرگھیا راج اور تم جیسے لاتعداد دھرم چاری ایسے ہیں جو دھرم کو بدنام کر رہے ہیں۔ تم لوگوں کا اصل دھرم تو دھن، شراب اور عورت ہے۔ تم ہی لوگوں نے مندر جیسی پوتر (پاک) جگہوں کو عیاشی کے اڈے بنا رکھا ہے۔ ایک ہندو یا مسلا اگر تم جیسے بے دھرم پنڈتوں کے ساتھ مل گیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال، میں اس معاملے پر تم سے کوئی بحث نہیں کروں گا۔ تم نے ہمیں جو جانکاری دی ہے اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ اب تم بھی نرک (دوزخ) کی طرف روانہ ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہاں سے تمہاری مکتی (نجات) ہونے والی ہے۔"

"کک۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ چیخا "کیا تم مجھے مار دو گے؟"

"تمہیں زندہ چھوڑ کر ہم اپنی زندگیاں خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔" میں نے کہا۔

"ایشور کے لیے مجھے چھوڑ دو۔" وہ ایک بار پھر چیخا "تم نے جو کچھ پوچھا، میں نے بتا دیا۔ اب مجھے کیوں مارتے ہو؟"

"میں نے کہا نا کہ تمہیں زندہ چھوڑ دینے سے ہماری زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی اور ہم یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتے۔" میں نے کہا۔

میں نے ٹھاکر کو اشارہ کیا۔ اس نے سوامی پرمانند کو دونوں پیروں سے پکڑ لیا اور میں نے بانہوں سے۔ اس کے دونوں بازو تو بے کار ہو چکے تھے البتہ وہ ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ٹھاکر کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

ہم اسے چٹان کے کنارے پر لے آئے۔ سوامی پرمانند بری طرح چیخ رہا تھا۔ ہم نے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے دو تین جھولے دیے اور پھر پوری قوت سے اسے کھڈ کی طرف اچھال دیا۔

سوامی پرمانند کے منہ سے نکلنے والی وہ آخری چیخ بہت ہی خوفناک تھی جو دیر تک چٹانوں میں بازگشت پیدا کرتی رہی۔ وہ کھڈ غالباً سیکڑوں فٹ گہرا تھا اسی لیے بہت دیر بعد اس کے گرنے کی بھد کی آواز سنائی دی تھی اور پھر اچانک سناٹا چھا گیا۔

"خس کم جہاں پاک!" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ایک زندہ انسان کو سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں دھکیلتے ہوئے مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ دھرم اور انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکا تھے۔ ایک ایسا دھبا جسے مٹانے کے لیے صرف یہی طریقہ اپنایا جا سکتا تھا۔

کسی پہاڑ پر چڑھنا آسان ہوتا ہے لیکن اترنا بہت مشکل اور رات کی تاریکی میں تو یہ کام اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ ہمارے پاس ٹارچ وغیرہ نہیں تھی۔ ہم بہت سنبھل سنبھل کر پہاڑیوں سے اترتے رہے اور بالآخر تقریباً ایک گھنٹے بعد کاٹیج میں پہنچ گئے۔

جانکی وغیرہ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ شاپنگ بیگ بھی میز پر ویسے ہی رکھے ہوئے تھے جن میں، میں کھانا لے کر آیا تھا۔ روپ متی ہمیں دیکھتے ہی شاپنگ بیگ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی اور میں اور ٹھاکر منہ ہاتھ دھونے کے لیے ایک طرف لگے ہوئے بیسن کے سامنے کھڑے ہو گئے اور پھر چند منٹ بعد ہم سب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

○☆○

راستہ دشوار ہی نہیں بہت خطرناک بھی تھا اور اب سوامی پرمانند کی کہی ہوئی یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ یاتری اس طرف کیوں نہیں آتے تھے۔ یہاں تو وہی مہم جو آ سکتا تھا جسے ہمالیہ کی کوئی چوٹی سر کرنے کا شوق ہو لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ مذہب کے ٹھیکے داروں کو ایسی جگہوں پر مندر بنانے کا کیا شوق تھا جہاں کوئی جا ہی نہ سکے۔

یوں تو ہندوستان کے ہر شہر میں قدم قدم پر مندر نظر آتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں مندروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہردوار اور اس سے ملحق علاقوں رشی کیش، ہری کی دون ویلی، سنکری، وادی تال، گرکھ، کیدار تال، کیدار ناتھ اور بدری ناتھ ویلی اور اس کے ساتھ ہماچل پردیش میں چھ ہزار سے زیادہ مندر موجود ہیں۔ ان میں کچھ مندر تو سیکڑوں سال پرانے ہیں، کچھ کھنڈر بن چکے ہیں اور لاتعداد مندر ایسے ہیں جہاں سال کے بارہ مہینوں میں یاتریوں کی آمدورفت رہتی ہے لیکن بہت سے مندر ایسے ہیں جہاں کبھی کبھار ہی کوئی یاتری جاتا ہے۔ ایسے مندر یا تو کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں یا آبادی سے اتنی دوری پر ہیں کہ کوئی یاتری اس طرف جانا پسند نہیں کرتا۔

سنکری کا شمار بھی ایسے ہی مندروں میں ہوتا تھا۔ یہ مندر نہ صرف آبادی سے دور تھا بلکہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی بہت خطرناک تھا۔

ہم اپنی تیاری مکمل کر کے صبح سات بجے کاٹیج سے روانہ ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ چترا پریتم اور جانکی بھی تھیں۔ یہ دونوں بہت ضد کر کے ہمارے ساتھ آئی تھیں جبکہ بالا اور روپ متی کو کاٹیج ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

جانکی اور چترا پریتم کی وجہ سے ہمیں راستہ طے کرنے میں مزید مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ وہ کوئی باقاعدہ راستہ بھی نہیں تھا۔ سنگلاخ چٹانوں کے بیچ ایک تنگ سی پگڈنڈی تھی جو بل کھاتی ہوئی بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھی۔

جانکی اور چترا بری طرح ہانپ رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے ہمیں بار بار رکنا پڑ رہا تھا۔ بعض جگہوں پر تو راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف عمودی چٹان اور دوسری طرف گہرے کھڈ۔ معمولی سی غفلت موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔ چترا اور جانکی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں کہ ان کم بختوں کو ایسی جگہ پر مندر بنانے کا کیا شوق ہوا تھا جہاں تک پہنچنا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔

جس وقت ہم کاٹیج سے روانہ ہوئے تھے، سورج طلوع

ہو چکا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی لیکن پھر یکایک آسمان پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ ہم جیسے جیسے بلندی کی طرف جا رہے تھے' ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی اور خنکی بڑھ رہی تھی اور اب بادلوں کی وجہ سے خنکی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی جگہ سے ہمیں ہمالیہ کی وہ بلند چوٹیاں بھی نظر آجاتیں جو برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر بارش شروع ہو گئی تو ہمارے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ پہاڑی علاقوں کے موسم کا اعتبار نہیں ہوتا اور یہ تو ہمالیہ کا سلسلہ تھا۔ ہم ہمالیہ کی گود میں تھے۔ اگر بارش ہو جاتی تو سیلابی پانی کے ریلوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔

میں نے ایک مرتبہ ٹھاکر کو مشورہ بھی دیا تھا کہ واپس چلے چلیں اور ان دونوں (جانکی + پریتم) کو چھوڑ کر اگلے روز دوبارہ اس طرف آئیں لیکن ٹھاکر بھی میری طرح ضدی تھا۔ اس نے یہ کہہ کر میرا مشورہ مسترد کر دیا تھا کہ اب جو ہونا ہے' آج ہو ہی جائے۔

ٹھاکر ہم سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے چترا پریتم پھر جانکی اور سب سے آخر میں' میں تھا۔ اس وقت ہم تنگ سے راستے سے گزر رہے تھے جس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف گہرا کھڈ۔ نیچے عمیق گہرائی میں درخت اس طرح نظر آرہے تھے جیسے چھوٹے چھوٹے پودے ہوں۔

چترا کے پیر کے نیچے سے اچانک ہی ایک پتھر پھسل گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اس کی چیخ سن کر ٹھاکر بڑی تیزی سے پیچھے پلٹا اور عقاب کی طرح لپک کر اس نے چترا کو بازو سے پکڑ کر چٹان کی طرف کھینچ لیا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو چترا سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ میں گر چکی ہوتی اور ہم وہاں بیٹھے اس کا ماتم کر رہے ہوتے۔

چترا ٹھاکر سے لپٹ گئی تھی اور ٹھاکر ایک ہاتھ سے اس کا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔ جانکی بھی قریب پہنچ گئی اور اس نے چترا کو ٹھاکر سے الگ کر کے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

ہمیں تقریباً پندرہ منٹ وہاں رکنا پڑا اور پھر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ ٹھاکر نے چترا کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور میں نے جانکی کو سنبھال رکھا تھا۔

ہم اس خطرناک راستے سے آگے نکل آئے۔ اس سے آگے راستہ کشادہ اور بڑی حد تک محفوظ تھا۔ ہم کچھ دیر کے لیے وہاں رک گئے اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ آسمان پر بادل گہرے ہو گئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ ہم ایک چٹان کی اوٹ میں ہو گئے۔

ہلکی بوندا باندی اچانک ہی تیز بوچھار میں بدل گئی لیکن تین چار منٹ بعد جس طرح اچانک بارش شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک بھی گئی۔ بارش رکتے ہی ہم آگے بڑھنے لگے۔

ہمیں ہمالیہ کی گود میں سفر کرتے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ سوامی پرمانند نے بتایا تھا کہ سنکری مندر تقریباً دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں طے ہو جاتا مگر مسلسل بلندی اور دشوار راستے کی وجہ سے ہمیں اتنا وقت لگ گیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر ہمیں تیز بارش نے گھیر لیا۔ اس مرتبہ بھی ہمیں پناہ کی جگہ مل گئی اور بارش بھی اس بار تقریباً پندرہ منٹ تک ہوتی رہی۔

بارش رکی تو ہم پھر آگے چلنے لگے۔ اس مرتبہ ہمیں زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ ایک چٹان کے گرد تنگ سے راستے پر گھوم کر جیسے ہی ہم اوپر پہنچے' ٹھاکر نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

میں جانکی کا ہاتھ چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا اور ٹھاکر کے برابر پہنچ کر سامنے دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ سامنے سنگلاخ چٹانوں کے بیچ میں بہت وسیع و عریض پتھریلا میدان تھا جس کے وسط میں چھ فٹ اونچے چبوترے پر مندر بنا ہوا تھا۔

یہ چبوترہ بھی بہت کشادہ تھا۔ مندر کی عمارت پتھروں سے بنی ہوئی تھی اور یہ پتھر انہی چٹانوں کو توڑ کر تراشے گئے تھے۔ عمارت کے اطراف میں بھی چبوترے پر بہت وسیع و عریض جگہ تھی۔ چبوترے پر پہنچنے کے لیے چھ کشادہ سیڑھیاں تھیں۔

مندر کی عمارت بہت پرانی تھی۔ اوپر سے کلس کا بہت سا حصہ ٹوٹ چکا تھا۔ چبوترے اور سیڑھیوں پر بھی ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آرہے تھے۔

مندر کی عمارت نیچے سے چوکور تھی اور اوپر سے ہشت پہلو تھی۔ عمارت میں لگے ہوئے پتھروں پر جابجا مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔

ہماری نظروں کے بالکل سامنے مندر کا محرابی دروازہ تھا۔ محراب بہت بڑی تھی لیکن اس میں کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ کسی اور طرف کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ جہاں سے روشنی اندر تک پہنچ رہی تھی لیکن اس ہال کے اندر اور عمارت کے آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان تک نظر

نہیں آرہا تھا۔

عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ نیچے سے اوپر تک لاتعداد چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ مورتیوں کے درمیان ان کھڑکیوں میں سے کسی کھڑکی میں اگر کوئی کھڑا ہو تو اسے دیکھ لینا دشوار تھا لیکن میں گہری نظروں سے ان کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا۔

پتھریلے میدان کے دائیں طرف بالکل آخر میں چٹان سے ملی ہوئی ایک اور چھوٹی سی عمارت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ عمارت تین یا چار کمروں پر مشتمل ہوگی اور کسی زمانے میں رہائش کے لیے استعمال ہوتی ہوگی لیکن اس وقت تو اس طرف بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس عمارت کے ساتھ ہی پہاڑی پر جانے کے لیے سیڑھیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چند سیڑھیاں تھیں جو چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی تھیں۔ اس سے اوپر چار پانچ فٹ چوڑا راستہ تھا جو اوپر کہیں چلا گیا تھا۔ اس طرف سبزہ تھا اور اس راستے پر جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس سے اوپر قد آدم پودے اور درخت تھے۔

"یہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا۔" ٹھاکر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "کہیں سوامی پرمانند نے ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا۔"

"بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو موت کے سامنے جھوٹ بولنے کی ہمت کر سکیں۔" میں نے جواب دیا "وہ جانتا تھا کہ جھوٹ بولنے سے اس کی جان نہیں بچ سکے گی۔ وہ لوگ یقیناً یہیں آئے ہیں۔ مندر کا وہ چبوترہ دیکھ رہے ہو۔ تقریباً چھ فٹ اونچا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس عمارت کے نیچے تہ خانہ ضرور ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ وہیں ہوں۔"

"تو پھر آگے چلا جائے یا یہیں رک کر کسی کے باہر آنے کا انتظار کریں؟" ٹھاکر نے کہا۔

"آگے ہی جانا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ چٹان کی آڑ سے نکل آئے۔ میں اور ٹھاکر آگے تھے۔ جانکی اور چترا ہمارے پیچھے چل رہی تھیں۔ پتھریلے میدان میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی جمع تھا۔ ہم ان گڑھوں سے بچتے ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ ٹھاکر نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرے پاس اگرچہ پستول نہیں تھا لیکن پتلون کے پائینچے کے اندر پنڈلی کے ساتھ خنجر بندھا ہوا تھا جسے میں کسی بھی وقت نکال سکتا تھا۔

ہم چبوترے پر آگئے۔ ایک لمحے کو رک کر ادھر ادھر دیکھا اور مندر میں داخل ہو گئے۔ باہر سے مندر کی عمارت اگرچہ زیادہ بڑی نہیں لگتی تھی لیکن اندر ہال خاصا بڑا تھا۔ بالکل سامنے والی دیوار کے قریب تین مربع فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر کسی زمانے میں کوئی مورتی رکھی رہتی ہوگی لیکن اب وہاں ایک ٹوٹا پھوٹا سا پتھر پڑا ہوا تھا۔ اس چبوترے کے پیچھے ایک کشادہ دروازہ تھا۔ مندر کے اندر چاروں دیواروں میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ صرف ایک کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا جبکہ دوسرے کمروں کے دروازے سلامت تھے اور بھڑے ہوئے تھے۔

ہم ہال میں داخل ہو کر رک گئے۔ بیچ میں ایک پتھریلا ستون تھا جو چھت تک چلا گیا تھا۔ اس ستون پر بھی چاروں طرف مورتیاں بنی ہوئی تھیں اور دیواروں پر بھی مورتیوں کی شبیہ ابھری ہوئی تھی۔

دو منزلوں تک دو کشادہ بالکونیاں تھیں جن کے سامنے ریلنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ ریلنگ کئی جگہوں سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں کئی منٹ تک ہال کی دیواروں' بالکونیوں اور ان دروازوں کو دیکھتا رہا پھر ٹھاکر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے' وہ یہیں تہ خانے میں ہوں گے۔ ہمیں تہ خانے کا راستہ تلاش کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تہ خانے کا راستہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے سامنے ہیں۔" یہ آواز سن کر ہم سب اچھل پڑے۔ ہال میں آواز گونجتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ پہلی منزل کی بالکونی پر دارا اور پنڈت پرکھیا راج کھڑے تھے۔ دارا کے ساتھ ایک خوب صورت اور جوان لڑکی تھی۔ اس نے بھی ساڑی کی طرح کا گیروے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا "مجھے یقین تھا کہ تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں بھی آؤ گے۔" دارا کہہ رہا تھا "بد روحوں سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اب میں نے طے کر لیا ہے کہ بلی چوہے کے اس کھیل کا فیصلہ ہو ہی جائے۔ آج کے بعد کوئی آسیب میرا پیچھا نہیں کر سکے گا اور ٹھاکر۔۔۔!" آخر میں اس نے ٹھاکر کو مخاطب کیا "تم نے اس شیطان کا ساتھ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں اب تک جو نقصان پہنچ چکے ہیں ان سے تم نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اب تمہارا بھی انت (اختتام) ہونے والا ہے۔ پستول پھینک دو اور کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میرے پستول میں اتنی گولیاں ہیں کہ دو دو تو تم لوگوں کے حصے میں آہی جائیں گی۔ پھینک دو پستول۔" آخر میں دارا کی آواز ہال میں گونج اٹھی تھی۔

ٹھاکر نے میری طرف دیکھا اور پستول پھینک دیا۔
دارا ایک بیساکھی کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے بیساکھی سنبھال رکھی تھی اور دائیں ہاتھ میں پستول تھا۔

"نیرو۔ نیچے جاؤ اور ان کی تلاشی لو۔ ہم بھی آرہے ہیں۔" دارا نے اپنے پیچھے کسی کو اشارہ کیا۔

ایک اور آدمی ایک لمحے کو ہمارے سامنے آیا اور پچھلی طرف کہیں غائب ہوگیا۔ دارا ہم پر پستول تانے کھڑا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد ہال میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور وہی آدمی برآمد ہوا جس کی ہم نے صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔

وہ بھی انہی کے قبیل کا آدمی تھا۔ اس نے گیروے رنگ کے کپڑے کی دھوتی باندھ رکھی تھی۔ ایک پیلی چادر پشت پر ڈال رکھی تھی جس کے دو کناروں کو آگے سینے پر لا کر گرہ دے رکھی تھی۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ بے حد مضبوط جسم' سرخ آنکھیں اور بے ترتیب داڑھی مونچھیں۔

اس نے آتے ہی سب سے پہلے زمین پر پڑے ہوئے پستول پر قبضہ کیا پھر ٹھاکر کی پشت پر پہنچ کر اس کا لباس تھپتھپانے لگا۔ ٹھاکر کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر نیرو نام کا وہ پنڈت میری پشت پر آگیا اور اوپر سے نیچے تک میرے جسم کو تھپتھپانے لگا۔ اس کا ہاتھ میرے گھٹنوں سے نیچے نہیں گیا تھا جس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اگر اس کا ہاتھ میری پنڈلی تک پہنچ جاتا تو میرا خنجر بھی مجھ سے جدا ہوجاتا۔

نیرو ہماری تلاشی لیتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ محتاط نہ بھی ہوتا تو ہم کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ بالکونی پر کھڑا دارا ہمیں پستول کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ نیرو چترا کی طرف بڑھا تو وہ چیختے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میرے شریر (بدن) کو ہاتھ مت لگانا۔ وہیں کھڑے رہو۔"

"اس کو چھوڑ دو نیرو۔ اس کی تلاشی ہم لیویں گے۔" دارا کے ساتھ کھڑے ہوئے پنڈت پرگھیا راج نے چیخ کر کہا۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا۔

نیرو ہمارے سامنے تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہم چاروں کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ دارا وغیرہ بالکونی سے غائب ہوگئے تھے اور پھر ایک ڈیڑھ منٹ بعد وہ نیچے والے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پنڈت پرگھیا راج اور آخر میں وہی لڑکی دروازے سے باہر آئی تھی۔ اس کی عمر تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی ہرن جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے اور یہاں بھی آؤ گے۔" دارا نے میرے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اس کے پستول کا رخ میرے سینے کی طرف تھا "تم واقعی بد روح ہو۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں تم میرے پیچھے پہنچ جاتے ہو۔ ہردوار میں صرف دو آدمیوں کو معلوم ہے کہ ہم یہاں آئے ہیں اور تم ان دونوں میں سے کسی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے باوجود تم نے۔۔۔"

"ان دو میں سے صرف ایک باقی رہ گیا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "سوامی پرمانند جہنم میں پہنچ چکا ہے اور اب تمہاری باری ہے اور تم یہ بات ذہن میں رکھ لو کہ اس مرتبہ میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ آج ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہوگا' فیصلہ کن ہوگا۔ اب ہم دونوں میں سے ایک رہے گا۔ میں یا تم۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آج فیصلہ ہو ہی جائے۔" دارا نے کہا "یہ تمہاری زندگی کی آخری گھڑیاں ہیں اور تمہارے ساتھ ان لوگوں کا بھی خاتمہ ہوجائے گا اور مجھے ان کا کوئی افسوس نہیں ہوگا۔"

"افسوس تو تمہیں ان سیکڑوں بے گناہوں کا بھی نہیں ہوا جنہیں تم اب تک موت کے گھاٹ اتار چکے ہو لیکن اب تمہیں ان سب کا حساب دینا ہوگا۔" میں نے کہا "میں ان خوفناک لمحات کو اب تک نہیں بھولا ہوں جب میرے ماں باپ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور پھر بھائی کو بھی اسی طرح مار ڈالا گیا۔ ان کے علاوہ سیکڑوں بے گناہ تمہارے ہاتھوں اپنی زندگیاں گنوا بیٹھے۔ تمہیں کسی کا افسوس نہیں ہوا۔ تم تو لاشوں پر کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے تھے۔ تم نے مجھے ایک لمحے کو بھی چین سے کہیں ٹکنے نہیں دیا اور جب میرے قدم زمین پر ٹکے تو تم بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں نے بھی عہد کرلیا تھا کہ جب تک اپنے ہاتھوں سے تمہاری گردن نہ مروڑ دوں گا' سکون سے نہیں بیٹھوں گا اور اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ تم میں کبھی اتنا حوصلہ نہیں رہا کہ سامنے آکر مقابلہ کرسکو۔ تم نے ہمیشہ بھاگنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی لیکن آج میں تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔ نہ تو تمہیں پوجنے والے یہ لوگ تمہاری حفاظت کرسکیں گے اور نہ ہی یہ پہاڑ تمہیں پناہ دے سکیں گے۔"

"میں بھی تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں دوں گا۔" دارا نے بیساکھی والا پیر زمین پر ٹکاتے ہوئے کہا "آج یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔"

اس نے پستول والا ہاتھ آگے نکال لیا۔ ٹھاکر نے میری طرف دیکھا اور پھر نیرو کی طرف دیکھنے لگا جس نے ہم سب کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔

میں نے نظریں دارا کے پستول والے ہاتھ پر جمادیں۔ اس وقت دارا سے نمٹنے کے لیے میں نے اپنے اندر کی پُراسرار قوت سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے پیٹ میں' ناف کے قریب گرہیں سی پڑتے ہوئے محسوس ہوئیں اور پھر ایک دم یوں لگا جیسے میرے اندر سے کوئی چیز اوپر کو اٹھ رہی ہو۔

میری آنکھیں سلگنے لگیں۔ آنکھوں کے حلقوں میں تپش میں صاف طور پر محسوس کررہا تھا۔ میری نظریں دارا کے پستول والے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔

دارا کا ہاتھ پوری طرح آگے کو نکلا ہوا تھا پھر اس کا بازو آہستہ آہستہ پیچھے کو ہٹنے لگا۔ میں نے ایک لمحے کو اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور آنکھوں میں عجیب سی وحشت نظر آئی۔

اس ایک لمحے سے فائدہ اٹھا کر اس نے ہاتھ پھر آگے کرلیا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور پھر وہ انگلی آہستہ آہستہ حرکت کرتے ہوئے ٹریگر سے ہٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی مٹھی بھی آہستہ آہستہ کھلتی چلی گئی۔ اب پستول اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور پستول نیچے گر گیا۔

پنڈت پرگھیا راج اور نیرو نے بھی حیرت سے یہ تماشا دیکھا۔ دارا نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے پستول نکالا تھا لیکن پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ نیرو کے چہرے پر تو ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ میں نے ہندو پنڈتوں اور پجاریوں کے بارے میں بہت سنا تھا کہ وہ پُراسرار قوتیں حاصل کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں۔ نیرو شاید یہی سمجھا تھا کہ میں بھی کچھ ایسی ہی قوتوں کا مالک ہوں۔ اس کی حیرت اور وحشت سے فائدہ ٹھاکر نے اٹھایا۔

ٹھاکر نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیرو کے پستول والے ہاتھ پر ٹھوکر ماردی۔ پستول نیرو کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ وہ خود بھی اچھل کر پیچھے ہٹا تھا۔ ٹھاکر نے اس پر چھلانگ لگادی اور اسے دھکیلتے ہوئے دور لے گیا۔

دارا ایک دم جیسے ہوش میں آگیا تھا۔ اس نے بیساکھی سے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے بیساکھی کا وار کلائی پر روکا اور دوسرے ہاتھ سے بیساکھی کو گرفت میں لے کر زوردار جھٹکا دیا۔ دارا بھی بیساکھی کے ساتھ آگے کی طرف کھنچ آیا۔ میں نے جھٹکا دے کر بیساکھی کو چھوڑ دیا تھا۔ دارا منہ کے بل زمین پر گرا لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

دارا نے اٹھ کر ایک بار پھر بیساکھی سے حملہ کردیا۔ اس مرتبہ بھی میں نے وار ہاتھوں پر روکا۔ ہم دونوں میں بیساکھی کے لیے قوت آزمائی ہونے لگی۔

دارا نے میری ٹانگ پر ٹھوکر ماردی۔ میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ بیساکھی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ دارا نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلہاڑے کی طرح بیساکھی کو سر سے اوپر اٹھا کر حملہ کردیا۔ میں تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ دارا ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر حملے کرتا رہا اور میں فرش پر لوٹ لگاتا ہوا اس کے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر مجھے موقع مل گیا۔ میں نے بیساکھی کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ دارا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور میرے اوپر سے ہوتے ہوئے منہ کے بل گرا۔

میں لوٹ لگا کر اٹھ گیا اور دارا کو ٹھوکروں پر رکھ لیا لیکن دارا ایسا نہیں تھا کہ دیر تک مار کھا سکتا۔ اس نے میرا پیر پکڑ کر گرانے کی کوشش کی۔ میں تو نہیں گرا البتہ دارا کو اٹھنے کا موقع مل گیا۔

دارا میرے سامنے ایک دم تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا مفلوج پیر بھی زمین پر ٹکا ہوا تھا۔ اس وقت اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس کی ٹانگ میں کوئی نقص نہ ہو اور وہ پوری طرح فارم میں نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے برستے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ اس نے اچانک ہی لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر خنجر نکال لیا۔

"تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔" اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ نکلی "اب تمہاری کوئی شکتی (قوت) کام نہیں آئے گی۔ تمہاری موت تمہارے باپ سے زیادہ خوفناک ہوگی۔"

باپ کے نام پر یوں لگا جیسے میرے دل پر گھونسا لگا ہو۔ ایک لمحے کو وہ خوفناک منظر میری آنکھوں کے سامنے گھوم گیا جب میرے باپ پر خنجروں سے وار کیے جارہے تھے۔

دارا نے خنجر سے حملہ کردیا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر خنجر کے لیے ہم میں کھینچا تانی ہونے لگی۔ دارا نے ایک بار پھر وہی حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی تھی لیکن میں سنبھل گیا تھا۔

میں نے ایک ہاتھ سے دارا کی خنجر والی کلائی تھامے رکھی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی بغل کے نیچے زوردار گھونسا رسید کردیا۔ دارا تقریباً ایک فٹ اوپر اچھلا تھا۔ اس کے پیر جیسے ہی زمین پر ٹکے میں نے اڑنگا دے کر اسے گرادیا۔

خنجر اب بھی دارا کے ہاتھ میں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو زمین پر رگیدنے لگے۔

دوسری طرف بھی گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر اور نیو لڑتے ہوئے مندر سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی غراہٹیں اور اٹھا پٹخ کی آوازیں یہاں تک سنائی دے رہی تھیں۔

پنڈت پرگھیا راج جانکی اور چترا کو رگید رہا تھا۔ اس میں گینڈے کی طرح طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ تو تین آدمیوں کے بس کا بھی نہیں تھا اور اس وقت تو اس کے مقابلے پر دو عورتیں تھیں۔ چترا تو لڑائی بھڑائی والی عورت نہیں تھی۔ بیٹی اور پتی (شوہر) کے قتل کا انتقام اسے بھڑکائے ہوئے تھا اور جانکی۔۔۔ اسے تو مارشل آرٹ میں خاصی مہارت حاصل تھی لیکن اسے کوئی وار کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کبھی وہ دونوں پرگھیا راج سے لپٹ جاتیں اور کبھی پرگھیا راج ان پر گھونسے اور ٹھوکریں برسانے لگتا۔ اس مار دھاڑ میں چترا کی قمیص پھٹ گئی تھی لیکن اسے شاید اس کی پروا نہیں تھی۔

دارا نے اس وقت مجھے اپنے نیچے دبوچ لیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی میری گرفت میں تھا۔ اس نے خنجر سے میرے سینے پر وار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا وار روک لیا اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور اسی لمحے میری نظر پرگھیا راج کی طرف اٹھ گئی۔

چترا پریتم اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑے زمین پر لوٹ رہی تھی اور جانکی بھی پشت کے بل پڑی ہوئی تھی اور پنڈت پرگھیا راج ترشول کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے اس پر حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

پرگھیا راج ارنا بھینسے کی طرح پھنکارتے ہوئے جانکی پر حملہ آور ہوا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ ترشول اور جانکی کے سینے کے بیچ چند انچ کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ میں پرگھیا راج سے ٹکرا گیا اور اسے لیتے ہوئے دوسری طرف جا گرا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو ترشول جانکی کے سینے میں پیوست ہوچکا ہوتا۔

میں اٹھ کر پرگھیا راج کی طرف لپکا لیکن اسی وقت دارا نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ دارا مجھے رگیدتے ہوئے دور تک لے گیا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔

دارا میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں اس کی گردن کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ چترا کی چیخ سن کر چونک پڑا۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا تو کانپ اٹھا۔

پنڈت پرگھیا راج کا ترشول اس کے سینے میں پیوست تھا۔ پرگھیا راج نے ترشول ایک جھٹکے سے باہر کھینچا تو چترا کے سینے سے خون کی تین دھاریں بہہ نکلیں۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گر گئی۔ پرگھیا راج نے اس پر ایک اور حملہ کیا۔ ترشول اس مرتبہ بھی دستے تک چترا کے سینے میں پیوست ہوگیا۔ چترا کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔

میں نے دارا کو چھوڑ کر پنڈت پر حملہ کرنے کی کوشش کی مگر دارا نے میری ٹانگ پکڑلی اور میں لڑکھڑا کر اس کے اوپر ہی گر گیا۔ دارا جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

چترا پریتم نے ترشول کے دستے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا اور پرگھیا راج دستے کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔

میں اپنے آپ کو دارا سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس دوران میں جانکی اٹھ کر کسی پرندے کی طرح ہوا میں اڑتے ہوئے پنڈت پرگھیا راج کی طرف لپکی۔ اس کی ڈبل فلائنگ کک پرگھیا راج کے چہرے پر لگی۔ وہ ڈکراتے ہوئے پیچھے گرا۔ ترشول چترا کے سینے ہی میں رہ گیا تھا۔

پنڈت پرگھیا راج جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ جانکی نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہوا میں اچھلی۔ اس مرتبہ بھی اس کی کک پنڈت کے سینے پر لگی۔ پنڈت پھر بلبلاتے ہوئے گرا اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ پنڈت پرگھیا راج جیسے ہی اٹھتا جانکی کی فلائنگ کک اسے دوبارہ زمین چاٹنے پر مجبور کردیتی۔

پانچ ٹھوکریں کھا کر پنڈت پرگھیا راج نڈھال ہوچکا تھا۔ اس نے آخری مرتبہ اٹھنے کی کوشش کی تو جانکی کی کک اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ ایک بار پھر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ نکلا تھا۔ مسلسل چھ فلائنگ کک لگانے سے جانکی بھی ہانپ گئی تھی۔

میں اپنے آپ کو دارا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ کم بخت جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں کہنی سے اس کے سر پر ضربیں لگانے لگا۔ اس دوران میری نظر ایک بار پھر چترا پریتم کی طرف اٹھ گئی۔ اس

نے ترشول کو دستے سے پکڑ کر اپنے سینے سے کھینچ لیا تھا۔ اس کے سینے پر کئی جگہوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں لیکن وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور لڑکھڑاتے ہوئے پنڈت پرگھیا راج کی طرف بڑھی۔

پرگھیا راج پشت کے بل پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ منہ پر تھا۔ چترا کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف اور وحشت سے پھیل گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔

"مجھے مت مارو۔ بھگوان کے لیے مجھے مت مارو۔" وہ گھگھیایا۔

"تمہیں نہ ماروں کیونکہ تم بھگوان کے اوتار ہو۔" چترا کے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس نے ترشول کو دونوں ہاتھوں میں اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ "تم نے جب میری پھول سی نازک بیٹی کا شریر (بدن) ادھیڑا تھا۔ میرے بے گناہ شوہر پر خنجر سے وار کیے تھے اس وقت تمہیں خیال نہیں آیا تھا کہ وہ بھی انسان ہیں۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی پرگھیا راج۔۔۔ تم۔۔۔ تم انسان نہیں شیطان ہو۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

اور پھر چترا پریتم نے چیختے ہوئے پوری قوت سے وار کیا۔ ترشول دستے تک پرگھیا راج کے پیٹ میں اتر گیا۔ پرگھیا راج کی چیخوں سے مندر گونج اٹھا۔ چترا نے ترشول باہر کھینچ کر ایک اور وار کیا اور پھر گویا اس پر جنون طاری ہوگیا۔ وہ ترشول سے پرگھیا راج پر پے در پے وار کرتی رہی۔ پرگھیا راج کی آنتیں پیٹ سے نکل کر باہر بکھر گئی تھیں اور پھر شاید چترا کی ہمت جواب دے گئی۔ اس وقت ترشول پنڈت پرگھیا راج کے سینے میں پیوست تھا۔ چترا کے دونوں ہاتھ دستے پر تھے۔ اس کے ہاتھ دستے پر پھسلنے لگے اور وہ نیچے جھکتی چلی گئی۔

دارا اب بھی جونک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ وہ اچانک ہی مجھے چھوڑ کر چند فٹ دور پڑے ہوئے پستول کی طرف لپکا لیکن اسی وقت جانکی نے لپک کر اسے ٹھوکر مار دی۔ دارا پلٹ کر مندر کے دروازے کی طرف لپکا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ دارا نے میرے بائیں پہلو پر پے در پے چند گھونسے مارے تھے جس سے گردے میں درد کی شدید لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ میں اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے چترا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ زخمی پڑی تھی اور جب میں نے اسے سیدھا کیا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ وہ ختم ہوچکی تھی۔

پنڈت پرگھیا راج بھی ختم ہوچکا تھا۔ میں نے گردن گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دارا باہر بھاگ گیا تھا اور جانکی بھی اس کے پیچھے گئی تھی۔ میں کھڑے ہو کر چند لمحے اپنا پہلو سہلاتا رہا اور پھر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔

ٹھاکر ابھی تک نیو سے گتھم گتھا تھا لیکن وہ اس پوزیشن میں تھا کہ نیو اب اس سے بچ نہیں سکتا تھا۔

دارا میدان کے آخر میں اس چھوٹی عمارت کی طرف بھاگ رہا تھا جس کے ساتھ ہی چٹان کاٹ کر سیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور ان سے آگے اوپر جانے کا تنگ سا راستہ تھا۔ جانکی بھی اس کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ میں نے بھی اس طرف دوڑ لگا دی۔ دارا حسبِ معمول پھر راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ اب اسے بھاگنے کا موقع نہیں دوں گا۔

دارا سیڑھیاں چڑھ کر پتھریلے راستے پر پہنچ چکا تھا۔ بارش کی وجہ سے اس ڈھلان پر ہلکا سا پانی بہہ رہا تھا۔ دارا چند قدم اوپر گیا تھا کہ اس کا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ وہ پھسلتے ہوئے تین چار فٹ نیچے آیا پھر اوپر چڑھنے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ پوری طرح اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے اس کی پھرتی دیکھ کر واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

وہ ابھی دو تین قدم اوپر چڑھا تھا کہ جانکی نے اسے پیر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ دارا پھر چند فٹ نیچے آگیا۔ اس نے دوسری ٹانگ چلا دی۔ ٹھوکر جانکی کے کندھے پر لگی۔ دارا کا پیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور جانکی ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے پتھریلی سیڑھیوں پر آن گری۔

میں جانکی کے قریب سے گزرتے ہوئے دارا کے پیچھے دوڑا۔ وہ اس دوران میں تقریباً پچاس فٹ اوپر پہنچ چکا تھا۔ گیلے پتھروں اور جھاڑیوں میں میرا پیر بھی بار بار پھسل رہا تھا۔ میں کبھی جھاڑیاں پکڑ کر اور کبھی پتھروں کے سہارے اوپر چڑھتا رہا۔ ایک مرتبہ مڑ کر دیکھا تو جانکی بھی میرے پیچھے آرہی تھی۔

تقریباً سو فٹ مزید اوپر جاکر دارا میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں تیزی سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں نے صرف ایک بات سوچ رکھی تھی کہ اگر دارا آج میرے ہاتھ سے نکل گیا تو دوبارہ اس سے کبھی سامنا نہیں ہوسکے گا۔

اس تنگ سے پتھریلے راستے کے اختتام پر ایک مختصر سا میدان تھا جس کے دو اطراف میں چٹانیں تھیں۔ تیسری سمت وہ تھی جہاں سے ہم اوپر آئے تھے اور چوتھی سمت

سیکڑوں فٹ گہرا کھڈ تھا۔

ایک چٹان تو بالکل عمودی تھی جس کے اوپر سے پانی کا پرنالا سا گر رہا تھا۔ یہ پرنالا پتھروں میں گر رہا تھا اور پانی وہیں زمین میں غائب ہو رہا تھا جبکہ دوسری چٹان ایسی تھی کہ اس پر آسانی سے چڑھا جا سکتا تھا۔ اس چٹان پر جھاڑیاں بھی تھیں اور اِکا دُکا اونچے درخت بھی جو اوپر تک چلے گئے تھے اور دارا اسی چٹان کی طرف دوڑ رہا تھا۔

میں پوری قوت سے دوڑنے لگا اور اس پہاڑی پر چند گز اوپر جا کر اسے پکڑ لیا۔ دارا کی نیم مفلوج ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ میں اسے نیچے کھینچنے لگا۔ وہ دوسری ٹانگ سے مجھے ٹھوکریں مارنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں اپنا چہرہ اس سے بچاتا رہا۔

ہم دونوں جھاڑیوں میں لڑھکتے ہوئے نیچے آ گئے۔ دارا نے سنبھلتے ہی مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو بچا گیا اور اچھل کر ڈبل سائیڈ کک اس کے پیٹ پر ماری۔ وہ چیختے ہوئے نیچے گرا اور وہ جیسے ہی سنبھلا میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھل کر گھوم گیا۔ اسپن کک اس کی پسلیوں پر لگی۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس کے گرنے سے پہلے میں نے ایک اور سائیڈ کک رسید کر دی۔

دارا جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے رگیدتے ہوئے دور تک لے گیا۔ اس دوران میں دارا کو موقع مل گیا۔ اس نے مجھے پیروں پر اٹھا کر دور اچھال دیا۔

میرے خیال میں میرے اور دارا کے بیچ برسوں سے جاری لڑائی کے فیصلہ کن لمحات آن پہنچے تھے۔ میں جھاڑیوں میں پشت کے بل گرا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے پتلون کا پائنچہ اٹھا کر خنجر نکال لیا۔

دارا اس وقت مجھ پر حملہ کرنے والا تھا لیکن میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر ایک دم خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔

میں آگے بڑھا تو دارا آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ راہِ فرار تلاش کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے میرا وار روک لیا اور بڑی مضبوطی سے میری کلائی کو گرفت میں لے لیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کہنی پر نیچے کی طرف ضرب لگائی۔ اس نے بلبلا کر میری کلائی چھوڑ دی۔ وہ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے خنجر سے وار کر دیا۔

دارا نے اس مرتبہ بھی حملہ روکنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ دارا کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں نے جھٹکے سے اس کے سینے سے خنجر کھینچ لیا۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے بہہ نکلا۔ میں نے ایک اور وار کیا اور اس کے سینے میں ایک اور سوراخ بنا دیا۔

اس مرتبہ دارا اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل جھاڑیوں میں گرا۔ میں نے چھلانگ لگا دی اور اس کے سینے پر ایک اور وار کر دیا اور پھر تو مجھ پر جنون طاری ہو گیا۔ میں دارا پر پے در پے خنجر کے وار کرتا رہا۔ میری آنکھوں کے سامنے مختلف چہرے گھومتے رہے۔ میری ماں، میرا باپ، ماسٹر پھوپھانگ، تھائی اور نجانے کون کون معصوم اور بے گناہ لوگ تھے جو اس خوں خوار بھیڑیے کے ہاتھوں موت کا شکار ہو چکے تھے۔

میرا ہاتھ مشینی انداز میں چل رہا تھا اور پھر اچانک پیچھے سے کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔

وہ ٹھاکر تھا جو مجھے پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہاں سے دور لے گیا۔ چٹان کے کنارے پر جانکی بھی کھڑی تھی۔ ٹھاکر مجھے لے کر اس کے قریب رک گیا۔ میں زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میرا ازلی دشمن، میرے ماں باپ کا قاتل آج میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ میری قسم پوری ہو گئی تھی۔ اب اگر مجھے موت بھی آ جاتی تو پروا نہیں تھی۔

جانکی اور ٹھاکر بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھاکر میرا کندھا تھپتھپا رہا تھا اور جانکی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اچانک آہٹ سن کر ہم تینوں چونک گئے اور جب میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

دارا میرا خنجر ہاتھ میں پکڑے لڑکھڑاتے ہوئے ہماری طرف آ رہا تھا۔ میرا خنجر دستے تک پیوست اس کے جسم میں رہ گیا تھا۔ میں نے اس پر خنجر سے اتنے وار کیے تھے کہ اس کی آنتیں باہر نکل آئی تھیں لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ اس نے خنجر پیٹ سے نکال لیا تھا اور حملہ کرنے کے لیے ہماری طرف آ رہا تھا۔ آنتیں اس کے کٹے ہوئے پیٹ سے نکل کر لٹکی ہوئی تھیں۔

جانکی اسے دیکھ کر چیخ اٹھی۔ ہمارے اور دارا کے درمیان صرف تین چار گز کا فاصلہ تھا۔ ٹھاکر مجھے دھکیل کر ایک طرف لے گیا۔ جانکی نے بھی اٹھ کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی لیکن پتھروں پر اس کا پیر رپٹ گیا اور وہ لڑکھڑا کر

پشت کے بل گری اور اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر پوری طرح سنبھل سکتی، دارا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ دارا کا چہرہ بہت بھیانک ہو رہا تھا۔ وہ خوفناک عفریت کی طرح جانکی پر حملہ آور ہوا۔ سنبھلنے کی کوشش میں جانکی ایک بار پھر لڑکھڑا گئی۔ دارا کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اس کے پیٹ میں پیوست ہو گیا۔

جانکی کی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ میں اور ٹھاکر اٹھ کر ان کی طرف لپکے۔ دارا جانکی سے لپٹ گیا اور اسے اپنے ساتھ رگیدتے ہوئے چٹان کے کنارے کی طرف لے گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ میں نے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔

دارا کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ کر نکل گئی۔ دارا جانکی کو اپنے ساتھ لپٹائے کھڈ کے عین کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر چھلانگ لگا دی۔ اس مرتبہ دارا کا ایک پیر میرے ہاتھ میں آ گیا لیکن اس کا دوسرا پیر زمین چھوڑ چکا تھا۔ وہ جانکی کو ساتھ لیے چٹان کا کنارہ چھوڑ چکا تھا۔ میں اس کے ساتھ گھسٹ رہا تھا لیکن اچانک ٹھاکر نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔ دارا کا پیر میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

جانکی کی وہ آخری چیخ بڑی خوفناک تھی جو ہمالیہ کی چٹانوں میں دیر تک گونجتی رہی۔

ٹھاکر مجھے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کھڈ کے کنارے سے پیچھے لے گیا۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن ٹھاکر نے مجھے بڑی سختی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس وقت اگر ٹھاکر میری ٹانگ نہ پکڑ لیتا تو میں بھی ان دونوں کے ساتھ عمیق گہرائیوں میں پہنچ چکا ہوتا۔

تقریباً دس منٹ بعد ٹھاکر نے مجھے چھوڑ دیا اور ہم کنارے پر پہنچ کر نیچے جھانکنے لگے۔ تقریباً دو سو فٹ گہرائی میں پتھروں میں جانکی کی شکستہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ میرا دماغ چکرا گیا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھانے لگی۔ میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے لہرایا تو ٹھاکر بڑی تیزی سے مجھے کھینچتے ہوئے پیچھے لے گیا۔

میری ٹانگیں بے جان ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میں تاریکی کی بانہوں میں جھول گیا تھا۔

○☆○

میرے حواس آدھے گھنٹے بعد بحال ہوئے تھے۔

دارا واقعی شیطان تھا۔ عفریت ـــ جس نے مرتے ہوئے بھی ایک انسان کی جان لے لی تھی۔ وہ خوفناک منظر بار بار میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ میں جانکی کو نہیں بچا سکا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ٹھاکر نے مجھے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور مجھے دلاسا دینے لگا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔

میرا اور جانکی کا ساتھ کئی سال رہا تھا۔ تھائی کی طرح اس نے بھی میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا اور بالآخر جان بھی دے دی تھی۔

ہم تقریباً دو گھنٹے تک ان پہاڑوں میں نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرتے رہے لیکن چٹانیں بالکل عمودی تھیں۔ دور دور تک کہیں ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے نیچے اترنے کی کوشش کی جا سکتی۔ ایک جگہ پر میں نے اترنے کی کوشش کی تھی مگر ٹھاکر نے مجھے روک دیا تھا۔ کسی بھی طرف سے نیچے اترنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔

ہم پھر اسی جگہ پر آ گئے اور میں کنارے پر جھک کر نیچے جھانکنے لگا۔ دو سو فٹ نیچے پتھروں پر جانکی کی لاش تو نظر آ رہی تھی۔ اسے کپڑوں سے شناخت کیا جا سکتا تھا لیکن دارا کی لاش کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بھی کسی پتھر کی آڑ میں یا جھاڑیوں میں پڑی ہو گی۔

میں دیر تک جانکی کی لاش کو دیکھتا رہا۔ اس نے میرے لیے جان دے دی تھی لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پا رہا تھا کہ اس کی آخری رسومات انجام دے سکوں۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ ٹھاکر نے مجھے سہارا دے کر اٹھا لیا۔ میں نے آخری مرتبہ جانکی کی لاش کی طرف دیکھا اور ٹھاکر کے ساتھ ڈھلان اترنے لگا۔

جب ہم ڈھلان کے اختتام پر پتھر کی سیڑھیوں پر پہنچے تو بارش تیز ہو چکی تھی۔ ہم مندر کی طرف دوڑنے لگے۔ نیرو کی لاش میدان میں پڑی تھی۔ بارش کے پانی کے ساتھ اس کا خون میدان میں دور تک بہہ رہا تھا۔

مندر میں دو اور لاشیں ہماری منتظر تھیں۔ پنڈت پرگھیا راج کے سینے میں اب بھی ترشول پیوست تھا۔ اس کے قریب ہی چترا پریتم کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی اور شوہر کا انتقام لے لیا تھا اور خود بھی اس پاپی سنسار سے بہت دور چلی گئی تھی۔

باہر بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ بارش کے شور میں اچانک ایک اور آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔ اس

نے بھی وہ آواز سن لی تھی جس نے مجھے چونکایا تھا۔

بارش کے شور میں یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ سسکیوں کی وہ آواز کس طرف سے آرہی تھی اور پھر اچانک ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

مجھے وہ خوب صورت لڑکی یاد آگئی جسے ہم نے دارا وغیرہ کے ساتھ اس مندر میں دیکھا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

"اے! کہاں ہو تم؟ سامنے آجاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

ٹھاکر کچھ دیر متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر دیوار کے قریب اس چبوترے کی طرف بڑھنے لگا جس پر مورتی کا ٹوٹا ہوا پتھر پڑا ہوا تھا۔ ٹھاکر گھوم کر اس چبوترے کی دوسری طرف چلا گیا۔ وہ جھک کر میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور جب واپس آیا تو وہ لڑکی اس کے ساتھ تھی۔ ٹھاکر نے اس کا ایک بازو پکڑ رکھا تھا۔

وہ بے حد حسین لڑکی تھی لیکن خوف سے اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دیر سے رو رہی تھی۔ ہم نے مندر کے اندر داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد اسے بالکونی میں دارا کے ساتھ دیکھا تھا اور پھر یہ ان کے ساتھ نیچے بھی آئی تھی اور جب لڑائی شروع ہوئی تھی تو میں نے اسے نظرانداز کردیا تھا اور وہ بھی شاید ڈر کر اس چبوترے کے پیچھے چھپ گئی تھی اور آخر وقت تک نظر نہیں آئی تھی۔

ہمارے جانے کے بعد اس نے شاید یہ لاشیں دیکھی تھیں اور خوف زدہ ہو کر پھر چبوترے کے پیچھے بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ اگر اس کی سسکیاں سنائی نہ دیتیں تو شاید اب بھی ہمیں اس کا خیال نہ آتا۔

وہ سردی اور خوف سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ ٹھاکر اسے لے کر ستون کی دوسری طرف بیٹھ گیا تاکہ لاشوں پر اس کی نظر نہ پڑ سکے۔ میں بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔ ٹھاکر اسے تسلیاں دے رہا تھا کہ ہم سے اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ لڑکی اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پا سکی تھی۔ ہم نے اسے وہیں ستون کے قریب بیٹھے چھوڑ دیا اور چترا پریتم کی لاش اٹھا کر ایک کمرے میں فرش پر ڈال دی اور دروازہ بند کردیا۔ یہاں نہ تو لکڑیاں تھیں اور نہ ہمارے پاس ماچس کہ اس کی چتا تیار کرکے آخری رسم ادا کی جاسکتی۔ ہم نے اس کی لاش کمرے میں ڈال دی تھی تاکہ جانوروں کی خوراک بننے سے بچی رہے۔

ہم اس لڑکی کو لے کر مندر سے باہر آگئے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ ہم دروازے کی محراب میں کھڑے رہے۔ اس لڑکی کو سردی لگ رہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

ٹھاکر برستی ہوئی بارش کو دیکھ رہا تھا اور میں اس لڑکی سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اوپر کی دو منزلوں پر کمرے ہیں اور وہ لوگ پہلی منزل کے دو کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں ایک کمرے کی کھڑکی سے دیکھ لیا تھا اور ہمارا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق اس وقت تین بج رہے تھے۔ مزید آدھے گھنٹے بعد بارش بند ہو گئی۔ ہم نے کچھ دیر انتظار کیا اور بالآخر واپسی کے لیے روانہ ہو گئے۔

ہم میدان سے گزر کر اس راستے کی طرف جا رہے تھے جہاں سے آئے تھے لیکن لڑکی نے ہمیں اس طرف جانے سے روک دیا۔

"ہم لوگ اس طرف سے آئے تھے۔ یہ بہت اچھا راستہ ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں نے راستے کے بارے میں اس سے ایک دو سوال کیے اور پھر اسے اشارہ کرتے ہوئے ہم اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ یہ راستہ کافی کشادہ تھا۔ کئی جگہوں پر اگرچہ تنگ اور خطرناک موڑ تھے لیکن ہمیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک دو مقامات پر ہمیں چٹانوں پر بھی چڑھنا پڑا تھا۔ راستہ اگرچہ طویل بھی تھا لیکن مجموعی طور پر یہ اس راستے سے کہیں بہتر تھا جہاں سے ہم مندر کی طرف گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مندر کی طرف جاتے ہوئے ہم غلط راستے پر پڑ گئے تھے جس سے نہ صرف ہمیں خاصی دشواریاں پیش آئی تھیں بلکہ وقت بھی بہت لگا تھا۔ یہ راستہ طویل ہونے کے باوجود ہم تین گھنٹے میں پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے تھے۔

دن کا اجالا شام کے اندھیارے کی آغوش میں سمٹ رہا تھا۔ نشیب میں بکھرے ہوئے شہر کی بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ آسمان پر اب بھی گہرے بادل تھے اور کسی بھی لمحے مزید بارش ہو سکتی تھی۔

اس لڑکی کا نام دیگاوتی تھا۔ میں راستے میں اس سے باتیں کرتے ہوئے آیا تھا۔

"لگتا ہے تمہارا تعلق کسی اچھے گھرانے سے ہے۔ پھر تم اس شیطان کے ہاتھ کیسے لگ گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں متھرا کی رہنے والی ہوں۔" دیگاوتی نے جواب دیا "ہم برہمن خاندان سے ہیں۔ میرے پتا جی بھی پنڈت ہیں۔ ان کی بہت مانی جاتی ہے۔ لوگ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ مجھے بھی دھرم سے بہت لگاؤ تھا۔ میں بھی گوپی بن کر دھرم کی سیوا کرنا چاہتی تھی۔ پتا جی نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں مندر ہی میں رہنے لگی۔

"چند روز پہلے پنڈت سنگھ ہمارے مندر میں آیا۔ اس کی ایک ٹانگ مفلوج ہو رہی تھی۔ اس وقت پتا جی بھی مندر ہی میں موجود تھے۔ سیلانی پنڈت اور پجاری مندر میں آتے رہتے تھے لیکن پتا جی نے کبھی ایسے لوگوں کو مندر میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ایسے لوگوں کے لیے ایک الگ آشرم بنایا گیا تھا۔ انہیں وہیں بھیج دیا جاتا تھا لیکن پنڈت سنگھ نے نجانے کیسے پتا جی کو رام کرلیا اور اسے مندر میں نہ صرف رہنے کی اجازت دے دی بلکہ اس کی ٹانگ کے علاج کے لیے ڈاکٹر کا بھی بندوبست کردیا۔ یوں تو مندر کے تمام پجاریوں کو حکم دیا گیا تھا کہ پنڈت سنگھ کی دیکھ بھال کریں لیکن دو گوپیوں کو خاص طور پر اس کی سیوا (خدمت) کے لیے مقرر کردیا۔ ان میں ایک ساوتری تھی اور دوسری میں۔

"چند ہی روز میں مجھے پتا چل گیا کہ پتا جی پنڈت سنگھ سے اتنا زیادہ متاثر کیوں تھے۔ پنڈت سنگھ نے پتا جی کو بتایا تھا کہ جے پور میں ایک مسلمان نے ہندو راجکماری کو اپنی رکھیل بنا رکھا تھا۔ اس بات پر جے پور میں ہنگامے بھی ہوئے تھے۔ پتا جی بھی ان ہنگاموں سے واقف تھے۔ پنڈت سنگھ نے پتا جی کو بتایا تھا کہ وہ ایک ایسا منصوبہ بنا رہا ہے کہ آئندہ کسی مسلمان کو کسی ہندو ناری کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہو۔ اس نے پتا جی کو یہ بھی بتایا تھا کہ اس کی ٹانگ اسی مسلمان نے توڑی تھی۔

"پتا جی کو مسلمانوں سے شدید نفرت ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو مٹا دیں۔ پنڈت سنگھ ان کا ہم خیال تھا اور یہی وجہ تھی کہ پتا جی اسے بہت پسند کرنے لگے تھے۔

"پنڈت سنگھ کی ٹانگ ٹھیک ہو گئی۔ وہ بیساکھی کے سہارے چلنے لگا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ چند مہینوں بعد وہ بیساکھی کے بغیر بھی چلنے لگے گا۔

"پتا جی پنڈت سنگھ کی شرافت کے بھی قائل ہو گئے تھے۔ میرے اور ساوتری کے علاوہ اور بھی کئی گوپیاں اس کی خدمت پر مامور تھیں لیکن پنڈت سنگھ نے کبھی آنکھ اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"پنڈت سنگھ نے ہردوار آنے کا پروگرام بنایا تو میں بھی تیار ہو گئی۔ گنگوتری یاترا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ پتا جی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انہیں اطمینان تھا کہ میں پنڈت سنگھ کے ساتھ جا رہی ہوں جو مجھے پتری کہا کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔" دیگاوتی خاموش ہو گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ خاموشی سے چلتا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"لیکن گنگوتری پہنچ کر پنڈت سنگھ کی اصلیت آشکارہ ہو گئی۔ اس رات پنڈت سنگھ اور پنڈت پرگھیا راج تہ خانے والے کمرے میں بیٹھے دارو پی رہے تھے۔ انہوں نے دوسرے سیوکوں (خادموں) کو باہر بھیج دیا تھا۔ میں پنڈت سنگھ کے پیر دبا رہی تھی۔ اس کی یہ سیوا میں پہلے بھی کیا کرتی تھی لیکن اس رات اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے اوپر گرا لیا۔ پہلے تو میں نے کوئی اعتراض یا احتجاج نہیں کیا لیکن جب اس کی دست درازی بڑھنے لگی تو میں نے مزاحمت شروع کردی۔

"میرا خیال تھا کہ پنڈت پرگھیا راج اسے روکے گا لیکن وہ بھی میرے ساتھ دست درازی کرنے لگا تو میں بدحواس ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ کو چھڑا کر اس کمرے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر پنڈت سنگھ نے مجھے دبوچ لیا۔

"میں چیختی رہی مگر مندر کے تہ خانے میں میری چیخیں سننے والا کون تھا اور اس رات یہ انکشاف بھی ہوا کہ پنڈت سنگھ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ اس نے اپنے کسی دشمن سے بچنے کے لیے یہ سوانگ بھرا ہوا تھا اور پرگھیا راج جیسے دھرم کے غدار اس کا ساتھ دیتے رہے تھے۔

"اور پھر مجھے پتا چل گیا کہ پنڈت سنگھ دراصل کون ہے۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ اس کا دشمن بھی ہردوار پہنچ گیا ہے اور پھر ایک رات وہ ایک آدمی کو پکڑ لائے جس سے کچھ پوچھنے کے لیے بے پناہ تشدد کیا گیا اور جب وہ ختم ہو گیا تو اس کی لاش مندر سے دور پھنکوا دی۔

"اگلے روز ان کے دو آدمی مارے گئے۔ انہیں جلا کر بھسم کردیا گیا تھا۔ پنڈت سنگھ بری طرح خوف زدہ ہو گیا اور پھر پنڈت پرگھیا راج ہی اسے یہاں لے کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں ان کا سراغ نہیں لگایا جاسکے گا۔ چند روز بعد پنڈت سنگھ کا دشمن بھی مایوس ہو کر ہردوار سے چلا جائے گا تو وہ گنگوتری واپس آجائیں گے لیکن شاید ان کی موت ہی انہیں گھیر کر اس ویران مندر میں لے آئی تھی۔" وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ ہماری حالت ایسی نہیں تھی کہ بازار کا رخ کرسکتے۔ اس لیے آبادی سے دور رہ کر چلتے رہے۔ ٹھاکر خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے ہوئے ہماری باتیں سنتا رہا تھا لیکن جب ہم ایک سڑک پر پہنچے تو وہ رک گیا اور ویگاوتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہاں جاؤں۔" ویگاوتی نے جواب دیا "میں اس مندر میں نہیں جانا چاہتی جہاں دھرم کی سیوا کی آڑ میں میری عزت لوٹی گئی تھی۔ سب کچھ چھن جانے کے بعد میں اپنے گھر بھی نہیں جانا چاہتی۔ کیا منہ دکھاؤں گی اپنوں کو۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔ جے پور۔" ٹھاکر نے کہا۔

ویگاوتی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ اس کے دل میں یقیناً اندیشے اور وسوسے ہوں گے لیکن کاٹیج میں روپ متی اور بملا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

روپ متی اور بملا کو جب چترا اور جانکی کے بارے میں پتا چلا تو وہ دونوں مجھ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہ میرے اور جانکی کے لگاؤ کے بارے میں جانتی تھیں۔ میرے ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ گئے اور میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میری وہ رات بڑی اذیت میں گزری۔ میں نے اگرچہ اپنے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا لیکن اس کے لیے مجھے کتنا طویل فاصلہ طے کرنا پڑا تھا یہ کچھ میں ہی جانتا تھا۔ کتنی لاشوں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ خون کی کتنی ندیاں پار کی تھیں میں نے یہاں تک پہنچنے کے لیے۔ میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا تھا۔ مجھے بڑے اچھے دوست اور ہمدرد ملے تھے۔ وہ بھی ایک ایک کرکے مجھ سے چھنتے گئے۔ جانکی کو مجھ سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی تھی۔ اس نے کبھی بھی مجھے اکیلے باہر نہیں جانے دیا تھا اور اب مجھے اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی۔

رات بھر میرا ذہن انہی خیالات میں الجھا رہا۔ اس رات کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کسی کا دل ہی نہیں چاہا تھا۔

صبح چھ بجے روپ متی نے چائے بنالی۔ اس وقت بھی ہم جانکی ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات بھر جاگنے سے میری آنکھوں میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ میں اس وقت ان لوگوں سے الگ تھلگ بیٹھا ہوا تھا۔ ویگاوتی سب کی باتیں سنتی اور سب کے چہرے دیکھتی رہی تھی۔ اس وقت وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی۔

"جانکی کون تھی؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا "اور وہ جو پنڈت پرگھیا راج کے ہاتھوں۔۔۔"

"وہ چترا پریتم تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ کئی مہینے پہلے اپنے شوہر اور جوان بیٹی کے ساتھ یاترا کے لیے یہاں آئی تھی۔ پنڈت پرگھیا راج اور اس کے دو چیلوں نے اس کی بیٹی کی عزت کو تار تار کردیا۔ باپ نے بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"اسی گنگوتری مندر میں؟" ویگاوتی بولی۔

"نہیں۔ اس روز وہ تینوں پہاڑیوں میں ایک مندر کی یاترا کرنے کے لیے گئے تھے۔ بارش شروع ہوگئی اور انہیں رات اسی مندر میں رکنا پڑا۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے چترا پریتم کے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کے بارے میں بتانے لگا "اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "پنڈت پرگھیا راج کے دو چیلے اس رات اس کے کاٹیج میں جل کر بھسم ہوگئے تھے اور کل پرگھیا راج اس کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"اور جانکی؟" ویگاوتی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "میرا خیال ہے وہ تمہاری پتنی (بیوی) تھی؟"

"نہیں۔ جانکی میری دوست تھی۔ ہمارا کئی برسوں کا ساتھ تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کون ہو؟" وہ میری طرف دیکھنے لگی "پنڈت سنگھ سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

"وہ میرے ماں باپ کا ہتیارا (قاتل) تھا۔" میں نے جواب دیا "جیسا کہ تم جان چکی ہو، وہ ہندو نہیں مسلمان تھا۔ کئی سال پہلے اس نے سنگاپور میں میرے ماں باپ کو قتل کردیا تھا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں کسی طرح بچ گیا۔ میں دارا کے اس جرم کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ مجھے بھی قتل کرنا چاہتا تھا اور میں اس سے چھپتا پھر رہا تھا۔ مجھے جس نے بھی پناہ دی اسے اس شیطان نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جانکی بھی ان لوگوں میں سے ایک تھی جس نے میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔

"پہلے میں دارا سے چھپتا رہا تھا اور جب میں زمین پر قدم جمانے کے قابل ہوا تو دارا مجھ سے بچنے کے لیے بھاگتا رہا۔ جانکی نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور بالآخر اس نے بھی اپنی جان لٹا دی۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ کبھی نہیں۔"

میرا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ روپ متی بھی اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

ٹھاکر مجھے اٹھا کر باہر لے گیا۔ ہم دیر تک درختوں کے نیچے بیٹھے رہے۔ تازہ ہوا نے خوشگوار اثر ڈالا تھا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ٹھاکر ناشتے کا سامان لینے کے لیے بازار چلا گیا۔

تین دن گزر گئے۔ میں اس دوران میں کاٹیج سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کہیں جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ ٹھاکر، روپ متی اور بملا کے دل بھی جیسے بجھ سے گئے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر کاٹیج ہی میں رہے۔ ویگاوتی بھی خاصی متاثر ہوئی تھی۔ دارا اور پنڈت پرگھیا راج کی حقیقت جاننے کے بعد اسے بھی ان جیسے لوگوں سے نفرت ہوگئی تھی۔ وہ تو خود اس تجربے سے گزر چکی تھی۔ ان کی ہوس کا شکار ہو چکی تھی۔ اسے کچھ اور جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود لٹ چکی تھی۔ اس طرح اجڑ کر اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی تھی اسی لیے اس نے ٹھاکر کی پیشکش قبول کرلی اور ہمارے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس سے اگلے روز میں نے بھی اپنے ان دوستوں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا اور اس وقت میری بات سن کر وہ سب ہی چونک گئے تھے۔

"راج کماری روپ متی جی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہارا زر خرید غلام ہوں۔ میں تمہاری کوئی سیوا نہیں کرسکا نہ ہی وہ قیمت ادا کرسکتا ہوں لیکن تمہاری اجازت کے بغیر میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا جس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے اس لیے میری خواہش ہے کہ تم مجھے آزاد کردو۔ زندگی رہی اور قسمت نے ساتھ دیا تو میں اپنی قیمت چکانے کی کوشش کروں گا۔"

"ہمت سنگھ!" روپ متی کے چہرے کا رنگ ایک دم متغیر ہوگیا اور پھر وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ میری پیشانی اور گالوں پر بوسے دیتی رہی پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو وجدان۔ میں نے تمہیں قیمت دے کر خریدا ضرور تھا لیکن تم نے میرے لیے جو کچھ کیا، میں تو خود تمہاری داسی بن گئی ہوں۔ اگر تم میری زندگی میں نہ آتے تو آج شاید میں کسی کوٹھے پر بیٹھی اپنے مقدر کو کوس رہی ہوتی مگر تم نے تو میرے جیون کے راستے بدل دیے۔ مجھے گناہ کی دلدل سے نکال کر اس مقام پر لا کھڑا کیا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی۔ تم بہت مہان ہو ہمت سنگھ۔ میں تمہارے احسانوں کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکوں گی لیکن۔۔۔ لیکن۔" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی "لیکن یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تم ہمیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم تمہیں نہیں جانے دیں گے۔"

"مجھے جانا ہی ہوگا روپ متی جی۔" میں نے کہا۔

"تمہارا مشن پورا ہوگیا ہے۔" روپ متی نے کہا "تم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اپنے ماتا پتا (والدین) کے ہتیاروں (قاتلوں) کو موت کے گھاٹ نہیں اتارو گے، چین سے نہیں بیٹھو گے۔ تمہارے سارے دشمن نرک (جہنم) میں پہنچ چکے ہیں۔ اب تمہارے لیے ایسا کوئی کام نہیں رہا۔ تم نے بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔ اب کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہ کر آرام کرو اور پھر کوئی بزنس شروع کردو۔ ٹھاکر اپنا ہوٹل تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہے۔"

"نہیں روپ متی۔" میں نے جواب دیا "تم لوگوں کے تو پہلے ہی مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں گردن نہیں اٹھا سکتا اور پھر میرا مشن ابھی مکمل نہیں ہوا۔ میرے دل میں ایک کانٹا باقی رہ گیا ہے۔ میں اسے بھی نکال ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" روپ متی نے مجھے گھورا "دارا ہی اصل آدمی تھا جسے تم نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اب کون سا کانٹا رہ گیا ہے؟"

"دارا تو جیون کی بساط پر ایک مہرا تھا جس کے ہاتھوں میرے ماں باپ قتل ہوگئے۔" میں نے جواب دیا "ان مہروں کو حرکت دینے والا اصل شیطان تو ابھی باقی ہے۔"

"وہ کون ہے؟" روپ متی نے پوچھا۔

"جس نے میرے ماں باپ کو ان کی زمینوں اور گھر سے بے دخل کرکے انہیں زندہ جلا ڈالنے کی کوشش کی تھی اور انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔" میں نے جواب دیا "میں اس وقت چند روز کا تھا۔ میری ماں مجھے سینے سے لپٹائے جان بچانے کے لیے بھاگی پھر رہی تھی۔ انہیں کہیں پناہ نہیں ملتی تھی اور بالآخر انہیں وہ شہر تو کیا وہ ملک ہی چھوڑ دینا پڑا تھا۔ بہت پرانا حساب ہے جسے میں بے باق کرنا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو وجدان۔" روپ متی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "دارا نے تمہارے ماتا پتا کی ہتیا کی تھی۔ تم نے اسے ختم کرکے بدلہ چکا دیا۔ میرا خیال ہے اس معاملے کو اب یہیں ختم کردو۔ گڑے مردے اکھاڑنے کا

کوئی فائدہ نہیں۔ تم ہمارے ساتھ جے پور چلو اور سب کچھ بھول کر ایک نئی زندگی شروع کرنے کی کوشش کرو۔"

ٹھاکر بھی مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے مجھے روکنے کے لیے یہ پیشکش بھی کردی کہ ہوٹل کے علاوہ ٹیلے والی حویلی بھی مجھے دینے کو تیار ہے۔

"میں تمہاری مہربانیوں اور محبت کو کبھی نہیں بھول سکوں گا ٹھاکر۔" میں نے کہا "لیکن مجھے مجبور مت کرو۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "کہاں جاؤ گے؟"

"فی الحال تو میں رشی کیش جاؤں گا۔ کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد پنجاب کی طرف نکل جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔" ٹھاکر نے کہا "میں جانتا ہوں کہ نہ تو ہوا کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جاسکتی ہیں اور نہ ہی بگولوں کو قید کیا جاسکتا ہے لیکن کم از کم آج کا دن تو ہمارے پاس رک جاؤ۔ کل ہم تمہیں نہیں روکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل روانہ ہوجاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر وہ پورا دن ہم نے کانیج ہی میں گزارا۔ ٹھاکر صرف دوپہر اور رات کا کھانا لینے کے لیے بازار گیا تھا۔ وہ رات بھی ہم نے جاگتے ہوئے گزاری۔ ویگادتی بھی ہماری باتوں میں پوری طرح دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ سب سے خاصی بے تکلف ہوگئی تھی۔ اس کے اطمینان اور بے تکلفی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کے دل سے ہر قسم کا خوف نکل گیا تھا۔

ببلا میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ یوں تو میرے جانے کے فیصلے سے روپ متی اور ٹھاکر بھی اداس تھے لیکن ببلا کی کیفیت کچھ اور تھی۔ اس نے ایک مرتبہ کھل کر اپنی محبت کا اظہار بھی کردیا تھا لیکن میں نے ہر مرتبہ اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ محبت کے سیلاب کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں ہوتا لیکن میں ببلا کو ہر وقت یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ جس راستے پر چلنے کی کوشش کررہی ہے اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ میری باتوں کا ببلا پر اثر ہوا تھا یا نہیں؟ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ میرے جانے کے بعد وہ پریشان ضرور ہوگی۔

ہم رات بھر جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

صبح ناشتے کے بعد ہم لاری اڈے پر آگئے۔ اس وقت آٹھ بجے تھے۔ رشی کیش کی ایک بس جاچکی تھی اور دوسری نو بجے جانے والی تھی۔ میں نے ٹکٹ لے لیا اور ہم ایک بنچ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اپنا بیگ گود میں رکھ لیا تھا۔ ٹھاکر نے مجھے اچھی خاصی رقم دے دی تھی جو کئی روز تک میرے کام آسکتی تھی۔

رشی کیش جانے والے بہت سے مسافر لاری اڈے پر موجود تھے۔ ان میں زیادہ تعداد غیر ملکی سیاحوں کی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

رشی کیش یوگا کا بہت بڑا مرکز تھا۔ دنیا بھر سے لوگ یوگا سیکھنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ یوگا صرف ورزش ہی نہیں یہ تو سمندر کی طرح بہت گہرا اور بہت پُراسرار علم تھا اور اس پُراسرار علم کو سیکھنے کی جستجو لوگوں کو دنیا کے دور دراز کونوں سے یہاں کھینچ لاتی تھی۔

بس کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے تھے۔ لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ رہے تھے۔ میں بھی اپنے دوستوں سے رخصت ہونے لگا۔ ان سب نے بڑی گرم جوشی سے مجھے سینے سے لگا کر بھینچا۔ سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ببلا ضبط نہیں کرسکی اور آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔

ان سے رخصت ہو کر میں بس میں آگیا۔ میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ دو غیر ملکی آکر بیٹھ گئے ان میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی اور دوسرا ادھیڑ عمر مرد۔ ان کا تعلق یورپ کے کسی ملک سے تھا۔ بس میں ان کے اور ساتھی بھی تھے جو دوسری سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

بس حرکت میں آئی تو میں ٹھاکر وغیرہ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔ وہ سب بھی ہاتھ ہلا رہے تھے۔ بس آگے نکل آئی۔ میں اپنی سیٹ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد بس ہردوار کی شہری حدود سے نکل کر رشی کیش کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

سڑک کے دونوں طرف پہاڑیاں سبزے سے لدی ہوئی تھیں۔ ڈھلانوں پر رنگ برنگے پھولوں کی گویا چادریں سی بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے تھائی لینڈ میں چیانگ رائے اور چیانگ سین کے پہاڑی علاقوں میں بھی سفر کیا تھا۔ اسی طرح سبزے سے ڈھکے ہوئے پہاڑ، مہکتی ہوئی وادیاں اور گنگناتی ہوئی ندیاں لیکن مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ہمالیہ کی ترائیوں میں واقع یہ خطہ اس سے کہیں زیادہ حسین تھا۔

رشی کیش ہردوار سے اگرچہ صرف چوبیس کلومیٹر کے

فاصلے پر واقع ہے لیکن بل کھاتا ہوا راستہ بہت خطرناک تھا۔ کہیں بلندیاں تھیں، کہیں پستیاں اور کہیں نہایت خطرناک موڑ۔ ڈرائیور کی معمولی سی غفلت بس کے مسافروں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی تھی۔

چوبیس کلومیٹر کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا۔ یہ شہر بھی پہاڑیوں پر بکھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ مندر دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑیوں پر اور ان کے دامن میں بنے ہوئے مکان بہت بھلے لگ رہے تھے۔

رشی کیش کا لاری اڈا زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا میدان اور اس کے اطراف میں بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی عمارتیں۔ زیادہ تر عمارتیں لکڑی کے تختوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔

میں بس سے اتر کر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا۔ چائے پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے مجھے گوتم بھوش کو تلاش کرنا ہے۔ یہ وہی یوگی تھا جس کے بارے میں مجھے چترا پریتم نے بتایا تھا۔

آدھے گھنٹے تک میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر کاؤنٹر پر پیسے دیتے ہوئے میں نے گوتم بھوش کے بارے میں دریافت کیا تو اس شخص نے کندھے اچکا دیے۔

"یہاں تمہیں قدم قدم پر یوگی ملیں گے۔ کسی ایک شخص کے بارے میں سب لوگ نہیں جانتے۔" اس شخص نے کہا "ویسے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اِدھر اُدھر گھومنے کے بجائے بھوت ناتھ آشرم چلے جاؤ۔ وہاں ویردل کو پوچھ لینا۔ وہ گائیڈ ہے اور بہت سے یوگیوں کو جانتا ہے۔ ہوسکتا ہے، تمہیں گوتم بدھ کے بارے میں بتادے۔"

"گوتم بدھ نہیں۔ گوتم بھوش۔" میں نے نام کی تصحیح کی۔

"وہی وہی۔" اس شخص نے کہا "یہاں سے نکل کر بائیں طرف چلے جاؤ۔ کسی سے بھی پوچھ لینا' آسانی سے بھوت ناتھ آشرم پہنچ جاؤ گے۔"

میں ریسٹورنٹ سے نکل کر بائیں طرف چل پڑا۔ ہردوار کے مقابلے میں زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں خنکی بھی زیادہ تھی۔ میں بیگ کندھے پر لٹکائے ایک طرف چلتا رہا۔ اس چھوٹے سے شہر میں مجھے کئی قومیتوں کے لوگ نظر آئے تھے۔ سکھ' مسلمان' ہندو' عیسائی۔ بہت سے غیر ملکی بھی تھے۔ کئی ایسے غیر ملکی بھی نظر آئے تھے جو میری طرح بیگ کندھوں پر لٹکائے کسی نہ کسی جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔

یوگا کا مرکز ہونے کے علاوہ رشی کیش کو مندروں اور آشرم سراؤں کا شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں قدم قدم پر مندر تھے اور آشرم تھے۔ لاتعداد چھوٹے چھوٹے رہائشی ہوٹل اور پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ مجھے کئی جگہ ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کے ایجنٹوں نے روکا تھا لیکن رہائش کے لیے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرنے سے پہلے میں یوگی گوتم بھوش کو تلاش کرلینا چاہتا تھا۔

بھوت ناتھ آشرم تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک پہاڑی کے دامن میں پتھروں اور لکڑی کے تختوں کی دو منزلہ عمارت خاصی بڑی تھی۔ نیچے چار فٹ تک پتھروں کی دیوار بنی تھی اور اوپر سارا کام لکڑی کا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک مندر بھی تھا۔ بھوت ناتھ دراصل اس مندر ہی کا نام تھا اور یہ آشرم بھی اس کے نام سے منسوب کردیا گیا تھا۔

آشرم کے چھوٹے سے دفتر میں تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ چوکی کے سامنے بیٹھا ہوا باریک مونچھوں والا شخص اس آشرم کا منشی تھا۔ میں نے ویردل کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے باہر کی طرف اشارہ کردیا۔

باہر آشرم کے سامنے تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر ایک ڈھابا سا بنا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا ایک بڑا سا کیبن تھا جو لکڑی ہی کے ستونوں پر زمین سے تقریباً تین فٹ اوپر تھا۔ اس کے اندر دکان دار بیٹھا ہوا تھا اور باہر ایک آدمی کھڑا اس سے باتیں کرتے ہوئے بیڑی کے کش لگا رہا تھا۔

وہ ویردل تھا جو فوراً ہی میری طرف متوجہ ہوگیا۔ ویردل گائیڈ تھا لیکن اس کے پاس لائسنس نہیں تھا اور وہ گھوم پھر کر اپنے گاہک تلاش کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ ایسا سیاح سمجھا تھا جسے اس کی خدمات درکار تھیں لیکن جب میں نے اس سے یوگی گوتم بھوش کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔

"وہ تو تین دن پہلے دھرم شالا جاچکا ہے۔ اگر اس کے ڈیرے پر جانا چاہو تو میں تمہیں وہاں پہنچا سکتا ہوں۔ پانچ روپے دینے پڑیں گے۔" ویردل نے کہا۔

ویردل سے زیادہ مایوسی تو مجھے ہوئی تھی لیکن بہرحال، میں نے اس کے ساتھ جانے کی ہامی بھرلی اور جیب سے پانچ روپے کا ایک سکہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

گوتم بھوش کا ڈیرا وہاں سے خاصا دور تھا۔ یہ بھی لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک کیبن تھا۔ ویردل راستے میں مجھے مندروں اور دوسری چیزوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس

طرح اس نے میری معلومات میں اضافہ کر کے پانچ روپے وصول کرنے کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔

اس کیبن میں دو آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ایک ہندو تھا اور دوسرا بدھ بھکشو۔ میں دیر تک بھکشو سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ گوتم بھوش دھرم شالا جا چکا ہے اور اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے مجھے یہ پیش کش بھی کی تھی کہ میں چاہوں تو یوگا سیکھنے کے لیے اس کی شاگردی اختیار کر سکتا ہوں۔

"ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت محسوس کی تو میں دوبارہ تمہارے پاس آجاؤں گا۔"

میں شہر کی طرف واپس آگیا۔ لاری اڈے پر پہنچ کر دھرم شالا کی بس کے بارے میں معلوم کیا تو پتا چلا کہ یہاں سے کوئی بس سیدھی دھرم شالا نہیں جاتی۔ پہلے مجھے شملہ جانا پڑے گا۔ رات وہاں گزارنے کے بعد اگلے روز صبح دھرم شالا کی بس ملے گی۔

مجبوری تھی۔ مجھے کم از کم یہ رات تو رشی کیش میں گزارنی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر یہاں کوئی ماہر یوگی مل جائے تو چند روز یہیں رہ جاؤں گا۔

یہاں یوگیوں کے کئی سینٹرز تھے۔ میں مختلف جگہوں پر گھومتا رہا۔ کئی سینٹروں پر یوگا کی مشق کے کئی دلچسپ مناظر بھی دیکھے۔ ایک ہندو یوگی آہنی کیلوں کے بستر پر دراز تھا۔ ایک یوگی کو ایک ٹانگ پر کھڑے دیکھا جس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ صبح چھ بجے سے ایک ٹانگ پر کھڑا ہے اور شام چھ بجے تک اسی طرح کھڑا رہے گا۔ ایک اور یوگی کو سر کے بل کھڑے دیکھا۔ ان کے علاوہ مختلف یوگی مختلف آسنوں میں نظر آئے۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھایا اور اس کے بعد ایک بار پھر کسی یوگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک جگہ میں ایک بوڑھے ہندو یوگی کو دیکھ کر رک گیا۔ وہ خاصا بوڑھا تھا۔ اس کے بدن پر ایک مختصر سے لنگوٹ کے علاوہ لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ مختلف شعبدے دکھا رہا تھا۔ میں دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا اور جب وہ اپنی شعبدے بازی سے فارغ ہوا تو میں اس کے قریب زمین پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ برقی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں۔ میں ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا اور کھانا کھاتے ہوئے یہ سوچتا رہا کہ دو چار روز یہاں رہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

کھانا کھانے کے بعد میں کسی گیسٹ ہاؤس کی تلاش میں چل پڑا۔ آشرموں، ہوٹلوں اور گیسٹ ہاؤسز کی یہاں کمی نہیں تھی۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر میں ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا اور پھر جیسے ہی پیچھے مڑا، اچھل پڑا۔

وہ سونیا تھی!

سونیا کو یہاں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس دور دراز خطے میں کسی جانکار سے ملاقات ہو سکتی ہے اور جانکار بھی وہ جو میرے قریب بلکہ بہت قریب رہ چکا ہو۔

سونیا کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ عجیب سے تھے۔ اسے بھی یقیناً یہاں مجھ سے ملاقات کی توقع نہیں تھی۔

سونیا سے میری آخری ملاقات تقریباً تین مہینے پہلے جے پور میں ہوئی تھی۔ میں نے جانکی کو اس کے بارے میں بتایا تو تھا لیکن ان دونوں کا آپس میں سامنا نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں بلونت سنگھ، رامو بدمعاش اور اس کے گرگوں سے ہماری ٹھنی ہوئی تھی۔ ہم اگرچہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کے ساتھ رہ رہے تھے اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے لیکن جب رامو، بلونت سنگھ اور دارا جیسے کمینے دشمنوں سے مقابلہ چل رہا ہو تو اپنے آپ کو مکمل طور پر محفوظ نہیں سمجھا جا سکتا۔ میں ماضی کے تجربات نہیں بھولا تھا۔ دارا نے ہمیشہ چھپ کر وار کرنے کی کوشش کی تھی اور جے پور میں بھی اسی سوچ کے پیش نظر میں نے ٹھاکر کی حویلی کے علاوہ کسی اور محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنے کا بھی فیصلہ کیا تھا تاکہ کسی ہنگامہ صورت حال میں وہاں پناہ لے سکیں اور اس مقصد کے لیے میں نے سونیا کو ایک خطیر رقم بھی دی تھی تاکہ وہ کسی مکان کا بندوبست کر سکے لیکن پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ سونیا سے اس کے بعد ملاقات ہی نہ ہو سکی۔

ہم بلونت سنگھ اور دارا کے تعاقب میں سارسکا چلے گئے۔ جہاں چوہدری ڈاکو کے آدمی ببلا کو اٹھا کر لے گئے۔ کئی روز اس مہم میں لگ گئے۔ ڈاکو ببلا کے ساتھ کئی اور بیاحوں کو بھی اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے۔ پولیس ان بے گناہوں کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑانے میں بالکل ناکام رہی تھی اور بالآخر میں اکیلا جنگل میں گھس گیا تھا اور ایک زبردست معرکے کے بعد میں نے نہ صرف ببلا اور دوسرے لوگوں کو چھڑا لیا بلکہ خطرناک ڈاکوؤں کے اس گروہ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ گنگولی چوہدری میرے ہاتھوں مارا گیا۔

ڈاکوؤں کے اس گروہ نے سیکڑوں مربع میل کے علاقے

میں تباہی پھیلا رکھی تھی۔ کوئی بستی محفوظ نہیں تھی۔ لوگ خوف و ہراس میں زندگی گزار رہے تھے لیکن میرے ہاتھوں اس گروہ کے خاتمے سے لوگوں کو خوف و دہشت سے نجات مل گئی۔

ہم بلونت اور دارا کی تلاش میں سارسکا گئے تھے لیکن وہاں ہماری اپنی الجھنیں بڑھتی رہیں۔ جنگل سے ببلا کی رہائی اور چوہدری کے گروہ سے نمٹنے کے بعد روپ متی اور ٹھاکر ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ ٹھاکر کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں لیکن روپ متی کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس کی زندگی بچانے کے لیے ہم نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔

اسی دوران میں ہمیں پتا چلا کہ بلونت اور دارا سل سرتھ کے قریب پہاڑیوں کی طرف چلے گئے ہیں جہاں کالی کے مندر میں انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے۔ روپ متی کی حالت سنبھل گئی تھی۔ میں، جانکی اور ٹھاکر، دارا کے تعاقب میں کالی کے مندر کی طرف چلے گئے۔ وہاں ایک معرکے میں بلونت مارا گیا اور دارا جانکی کو زخمی کر کے فرار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ پولیس کا ایک نہایت ذمے دار اور فرض شناس (میری نظروں میں) آفیسر کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کا مال لوٹ کر فرار ہو گیا۔

سارسکا سے واپس آکر جے پور میں ہماری کچھ اور مصروفیات رہیں۔ اس دوران میں، میں نے کئی مرتبہ سونیا سے ملنا چاہا تھا لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی مسئلہ آڑے آتا رہا اور پھر پنڈت سوبھراج سے ملاقات ہو گئی جس نے پٹنے کے بعد میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا اور پھر میں اور سوبھراج دارا کی تلاش میں ہردوار آگئے۔

ہردوار میں جو کچھ بھی ہوا وہ آپ جان چکے ہیں اس لیے میں مزید تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ دارا کو جہنم رسید کرنے کے بعد ببلا، روپ متی اور ٹھاکر جیسے دوستوں سے رخصت ہو کر میں رشی کیش چلا آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں کچھ عرصہ یوگی گوتم بھوش کے پاس رہ کر کچھ علم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس کے بعد پنجاب سے ہوتا ہوا سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ جاؤں گا جہاں لاہور میں چوہدری نوازش علی سے اپنے والدین کا پرانا حساب چکانا تھا۔ فساد کی اصل جڑ تو چوہدری نوازش علی ہی تھا جس کی وجہ سے میرے والدین کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا تھا۔

مجھے یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ یوگی گوتم بھوش یہاں سے جا چکا ہے اور اب سونیا کو اپنے سامنے دیکھ کر میری مایوسی حیرت میں بدل چکی تھی بلکہ سونیا کو یہاں دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی۔

"ارے! تم یہاں کیا جھک مار رہی ہو۔" میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ موسم میں خنکی ہونے کے باوجود وہ اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔

"یہی سوال میں تم سے کر سکتی ہوں۔" سونیا یہ کہتے ہوئے والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی اور میرے گالوں اور پیشانی پر چٹاچٹ بوسے دینے لگی۔ قریب سے گزرتے ہوئے لوگ مسکراتی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی کے لیے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں سرِراہ بوس و کنار کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو اور جانکی کہاں ہے؟" اس نے مجھ سے الگ ہو کر کہا اور متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

جانکی کے نام پر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ سونیا نے میرے چہرے سے میری کیفیت کو بھانپ لیا۔

"کیا بات ہے۔ جانکی کا نام سن کر تم خاموش کیوں ہو گئے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟" وہ بولی۔

"جانکی مجھے چھوڑ کر جا چکی ہے۔ دور... بہت دور جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔" میرے لہجے میں بھی افسردگی نمایاں تھی۔

"اوہ... کیا ہوا اسے؟" سونیا بھی ایک دم افسردہ ہو گئی۔

"آؤ۔ کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" میں نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہم اسی ریسٹورنٹ میں آگئے جہاں سے کچھ دیر پہلے میں کھانا کھا کر نکلا تھا۔ میں نے کافی منگوا لی اور کافی کی چسکیوں کے دوران میں اسے بیتے ہوئے واقعات اور جانکی کے بارے میں بتاتا رہا۔ سونیا سے بھی جانکی کا طویل ساتھ رہا تھا۔ جانکی کی موت کا سن کر وہ بھی رنجیدہ ہو گئی۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے واقعی حیرت ہو رہی ہے۔" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ کسی کے ساتھ آئی ہو یا...؟"

"اپنی باس کے ساتھ آئی ہوں۔" سونیا نے جواب دیا "وہ بہت عرصے سے بیمار ہے۔ علاج کروانے کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ کسی نے بتایا کہ یوگا کی ورزشوں سے یہ بیماریاں رفتہ رفتہ دور ہو سکتی ہیں۔ وہ کچھ عرصے تک تو جے پور ہی میں یوگا کی ابتدائی ایکسرسائز کرتی رہی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک ہندو یوگی کی خدمات بھی حاصل کر رکھی

تھیں پھر اس یوگی نے مشورہ دیا کہ وہ رشی کیش چلی جائے۔ یہاں کی آب و ہوا سے بھی اس پر اچھا اثر پڑے گا۔ اس ہندو یوگی نے یہاں اپنے گرو کا پتا بتا دیا تھا۔ ہم تقریباً ایک ہفتے سے یہاں ہیں اور تم۔۔۔" اس نے خاموش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "میرا خیال ہے تم کچھ دیر پہلے ہی یہاں آئے ہو۔ شاید آخری بس سے جو پانچ بجے کے قریب یہاں پہنچتی ہے۔"

"میں صبح گیارہ بجے کے قریب یہاں آیا تھا۔" میں نے جواب دیا "یہاں رہائش کا بندوبست کرنے سے پہلے میں ایک یوگی کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ دھرم شالا جا چکا ہے۔ اب مجھے رہائش کے لیے کسی جگہ کی تلاش تھی۔"

"اب تمہیں کوئی جگہ تلاش نہیں کرنی پڑے گی۔" سونیا نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اپنی باس کے ساتھ ایک کاٹیج میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ کاٹیج کافی کشادہ ہے اور میرا خیال ہے تمہارے وہاں آجانے سے شوبھا دیوی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے اس سے تمہارا غائبانہ تعارف کرا رکھا ہے۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوگی۔"

"تو پھر چلو۔ صبح سے ان اونچے نیچے راستوں پر پھرتے ہوئے تھک گیا ہوں اور کچھ آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ سونیا ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے آئی تھی کہ مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ ریسٹورنٹ سے نکلنے کے بعد اس نے ایک ڈھابے سے مطلوبہ چیزیں خریدیں اور میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

وہ کاٹیج وہاں سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔ اس پہاڑی پر بھی چیڑ اور چنار کے درختوں کی بہتات تھی۔ بل کھاتے ہوئے راستے کے دونوں طرف رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی خود رو جھاڑیاں تھیں۔ وہ کاٹیج تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر تھا جبکہ وہ راستہ کاٹیج کے قریب سے گزرتے ہوئے مزید اوپر چلا گیا تھا۔ پہاڑی پر اوپر بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اور بھی کاٹیج اور ہٹ تھے۔ درختوں میں کہیں کہیں ان کاٹیجز میں جلتی ہوئی روشنیاں اچھی لگ رہی تھیں۔

سونیا والا کاٹیج ایک کھلی جگہ پر تھا۔ آس پاس کی جگہ یا تو درختوں سے محروم تھی یا درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ تعمیر کے حوالے سے یہ کاٹیج بھی دوسروں سے مختلف نہیں تھا۔ چار فٹ تک پتھروں کی دیواریں اور اس سے اوپر لکڑی کے تختے۔

اس کاٹیج کے تین کمرے تھے۔ ایک نشست گاہ اور دو بیڈ رومز۔ نشست گاہ میں ایک کافی ٹیبل' ایک عامیانہ سا صوفہ سیٹ اور تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سونیا مجھے وہاں بٹھا کر دائیں طرف والے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی باس شوبھا بھی تھی۔

جے پور میں سونیا سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ جس ہوٹل میں وہ کام کرتی ہے اس کی مالکن ایک بیوہ عورت ہے۔ بیوگی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک بوڑھی عورت کا تصور ابھرا تھا لیکن اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز قامت' چھریرا بدن' چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے لیکن پژمردگی اس کے حسن کو متاثر کر رہی تھی۔ اس نے سفید ساڑی پہن رکھی تھی۔ جو اس کے بیوہ ہونے کی نشان دہی کر رہی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام (سلام) کیا "بیٹھو نا۔ کھڑے کیوں ہو۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ بھی میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "سونیا نے مجھے جے پور میں تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ تمہارے ساتھ واقعی بہت انیائے (ظلم) ہوا ہے۔ میں نے سونیا سے کہا تھا کہ تمہیں میرے پاس لے کر آئے لیکن تم نے دوبارہ سونیا سے بھی رابطہ نہیں کیا جس سے وہ بہت پریشان رہی تھی۔"

"کچھ ایسی الجھنیں پیدا ہوگئی تھیں جس کی وجہ سے میں سونیا سے بھی رابطہ نہیں کر سکا تھا۔" میں نے کہا "میں ان دنوں جے پور سے باہر ہی رہا اور واپس آیا تو چند روز بعد مجھے ہردوار آنا پڑا۔ آج صبح یہاں آیا ہوں۔"

"ابھی سونیا بتا رہی تھی کہ تم رہائش کے لیے کوئی گیسٹ ہاؤس تلاش کر رہے تھے۔" شوبھا نے کہا "گیسٹ ہاؤس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں بڑی گنجائش ہے۔ تم یہاں رہ سکتے ہو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں بھی ڈھارس رہے گی۔ ہمیں اکیلی سمجھ کر۔۔۔"

"کوئی مسئلہ؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پرسوں رات۔" شوبھا کے بجائے سونیا نے جواب دیا "پرسوں رات کوئی ہمارا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے شور مچا دیا تو وہ بھاگ گیا۔"

"چلیے جب تک میں یہاں ہوں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" میں نے کہا "لیکن میں بھی زیادہ دنوں تک یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ مجھے دراصل ایک یوگی کی تلاش ہے جو دھرم شالا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے مجھے اس کے پیچھے جانا پڑے۔"

گوتم بھوش کے تذکرے کے ساتھ ہی ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔ شوبھا بے خوابی کا شکار تھی۔ اسے ہائی بلڈ پریشر تھا۔ سانس کی تکلیف بھی تھی اور دل کی مریضہ بھی تھی۔ وہ اگرچہ ان تکالیف کا ایلوپیتھک علاج بھی کروا رہی تھی لیکن کسی ہمدرد نے اسے مشورہ دیا تھا کہ ان بیماریوں کے علاج کے لیے کسی یوگی کی خدمات حاصل کرے۔ پہلے اس نے جے پور ہی میں ایک یوگی کی خدمات حاصل کیں اور پھر یہاں آگئی اور تقریباً ایک ہفتے سے یوگی دھیراج کی ہدایات کے مطابق شیو آسن پر عمل کر رہی تھی۔ خون کے دباؤ کو نارمل رکھنے کے لیے یوگا میں اس سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔ شوبھا صبح شام پندرہ بیس منٹ کے لیے یہ ورزش کر رہی تھی۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ اسے رات کو سونے کے لیے خواب آور گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ رات کو گولی کھائے بغیر سکون کی میٹھی نیند سوتی تھی۔

آج کے مشینی دور میں انسان افراتفری کا شکار ہے۔ جذباتی خلفشار نے اسے ادھ موا کر رکھا ہے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ اپنی صحت برقرار رکھنے کے لیے وقت طلب ورزشیں کر سکے لیکن یوگا کی ورزشوں پر کم سے کم وقت میں اور زیادہ آسانی سے عمل کر کے اپنے آپ کو چاق و چوبند اور تندرست و توانا رکھا جا سکتا ہے۔

یوگا کی یہ ورزشیں نئی نہیں' ہزاروں سال سے ان پر عمل ہو رہا ہے اور یوگا صرف ورزشوں کا نام ہی نہیں' ایک فن اور سمندر کی طرح گہرا اور پُراسرار علم ہے اور یہ پُراسرار علم ہزارہا سال سے سادھوؤں' یوگیوں اور راہبوں سے بڑے پُراسرار طریقے سے نسل در نسل منتقل ہوتا رہا ہے۔ اس پُراسرار علم کو عام لوگوں سے ہمیشہ خفیہ رکھا گیا۔ صرف خواص ہی اس سے فائدہ اٹھاتے رہے اور یہ علم عام آدمی کی دسترس سے دور رہا۔

یوگا کی مشقیں آج سے نہیں' ہزارہا سال سے لاکھوں انسانوں کو روشن ضمیری کی دولت سے مالا مال اور سپر نارمل صلاحیتوں سے لیس کر چکی ہیں۔ سانس کی مشقیں یوگا کی مشقوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ حبس دم کی مشق انسانی قوت میں غیر معمولی حرکت پیدا کرتی ہے۔ ایک پُراسرار قوت ریڑھ کی ہڈی کی نچلی تہ میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے خوابیدہ حالت میں ہوتی ہے۔ سانس کی مشقوں سے یہ قوت بیدار ہو کر دماغ کی طرف سفر شروع کرتی ہے۔ یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ قوت آزاد ہو کر انسان کے دماغی اور اعصابی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ یہ مشقیں کسی ماہر استاد کی نگرانی ہی میں کی جائیں۔

ہو سکتا ہے' کچھ لوگ اس سے اختلاف بھی کریں لیکن اس حقیقت سے تو بہرحال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا تو اسے بے پناہ قوتیں بھی عطا فرمائیں۔ بعض قوتیں تو ایسی ہیں جن سے ہر کوئی واقف ہے لیکن بعض قوتوں کو انسان سے پوشیدہ رکھا اور انسان کو یہ قدرت بھی دی کہ وہ مختلف ریاضتوں سے اپنے اندر پوشیدہ ان قوتوں کو اجاگر کر سکے۔

یوگا کے ماہرین نے ان ہی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے تجربات کیے اور انسان کے اندر بے شمار پُراسرار پوشیدہ قوتوں کا سراغ لگایا اور کئی قسم کی ریاضتیں ایجاد کیں جن کے ذریعے جسم کے ہر ہر عضو کو کنٹرول کیا اور یہاں تک کمال حاصل کر لیا کہ جب دل چاہا' دل کی حرکت بند کر کے ایک معینہ مدت کے لیے مصنوعی موت طاری کر لی۔

چھٹی حس کے بعد انسان میں اور بھی کئی حسیں موجود ہیں جو بعض اوقات خود بخود اور بعض اوقات مشقوں سے بیدار کی جا سکتی ہیں اور پھر فطرت کے خلاف بھی کام کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ خلافِ فطرت اس کام کے بعد ازاں بڑے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔

شوبھا حیرت سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹ سے بول پڑی۔

"سونیا۔ یوگی مہاراج کی کل سے چھٹی کردو۔ ہم پرسوں جے پور واپس جا رہے ہیں۔ تمہارا یہ دوست بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

"یوگی مہاراج کی چھٹی کیوں کردی جائے دیدی؟" سونیا حیرت سے بولی۔

"اب مجھے کسی گرو کی ضرورت نہیں۔" شوبھا نے کہا "میں نے تمہارے دوست وجدان کو گرو مان لیا ہے۔ مجھے وشواس ہو گیا ہے کہ یہ بھی بہت دھارمک یوگی ہے اور یہ میرا علاج کر سکتا ہے۔ اب مجھے کسی اور یوگی کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں شوبھا جی۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "میں یوگا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں تو خود کچھ سیکھنے کے لیے

یہاں آیا ہوں۔ آپ کو تو ماہر یوگی کی ضرورت ہے۔ آپ یہاں اپنی مشقیں جاری رکھیے۔ اس وقت آپ جو مشقیں کر رہی ہیں وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ کو بتدریج دوسری مشقیں بھی کرائی جائیں گی اور آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ جب تک میں یہاں ہوں تم ہمارے ہی پاس رہو گے۔" شوبھا نے کہا۔

اور پھر باتوں ہی باتوں میں یہ انکشاف ہوا کہ دھیراج نامی جس یوگی سے شوبھا راہنمائی حاصل کر رہی تھی وہ پانچ سو روپے ہفتہ معاوضہ لے رہا تھا اور ایک مہینے کا معاوضہ ایڈوانس لے چکا تھا۔ وہ صرف دو وقت مشق کرواتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ صبح اور پندرہ بیس منٹ شام کو۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے شوبھا سے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر افسردگی سی چھا گئی اور پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بتانے لگی کہ اس کا شوہر ڈاکٹر وجے شرما ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔

یہ پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ شوہر کی موت کے بعد اس کے رشتے داروں نے ہمدردی کر رادھیکا سے اس کی جائداد ہتھیانے کی کوشش کی تھی۔ اسے بڑے سبز باغ دکھائے تھے لیکن وہ کسی کی باتوں میں نہیں آئی۔ اس کے جیٹھ نے زبردستی اس بلڈنگ پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ شوبھا کو بلڈنگ سے نکال دیا گیا تھا لیکن شوبھا نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس کے پاس شوہر کا وصیت نامہ موجود تھا جس میں شوبھا کو اس کی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد کا وارث قرار دیا گیا تھا۔ شوبھا نے اپنے جیٹھ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور شوہر کا وصیت نامہ بھی عدالت میں پیش کیا۔ اس طرح شوبھا کو اپنے شوہر کی جائداد مل گئی۔

یہ بلڈنگ کرائے پر اٹھی ہوئی تھی جسے شوبھا نے خالی کروالیا اور گراؤنڈ فلور پر ایک معیاری کافی ہاؤس قائم کر کے اوپر کے حصے پر رہائش اختیار کر لی۔ اسے کچھ مخلص لوگ بھی مل گئے تھے جو نہ صرف اخلاقی طور پر بلکہ کاروبار میں بھی اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس طرح شوبھا نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور وہ بڑی ثابت قدمی سے زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کر رہی تھی۔

شوبھا کی کہانی ان ہزاروں عورتوں سے مختلف نہیں تھی جو تنہا رہ جانے کے بعد ظلم و ستم کا شکار ہو جاتی ہیں۔ بعض ہمت ہار کر حالات کے سامنے سر جھکا دیتی ہیں اور بعض سینہ تان کر میدان میں اتر آتی ہیں۔ شوبھا کا شمار بھی ایسی ہی عورتوں میں ہوتا تھا جو زندگی کے آخری لمحوں تک بھی شکست تسلیم نہیں کرتیں۔

شوبھا گیارہ بجے کے قریب سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور سونیا کچھ دیر بیٹھک ہی میں بیٹھے رہے پھر سونیا اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے دونوں کپ میز پر رکھ دیے اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"تم کافی پیو۔ میں کپڑے تبدیل کر لوں۔"

سونیا کمرے میں چلی گئی۔ میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ اس نے کافی واقعی بہت خوش ذائقہ بنائی تھی۔ کوئی چیز گرنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میرا خیال تھا' یہ آواز کچن کی طرف سے آئی تھی لیکن وہاں کچھ نہیں تھا۔ میری نظریں کمرے کی طرف اٹھ گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

کمرے کا دروازہ چند انچ کے قریب کھلا ہوا تھا اور سونیا عین سامنے کمرے میں کھڑی اپنے جسم پر سے لباس اتار رہی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

سونیا کا دھیان دوسری طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے کمرے میں جان بوجھ کر کوئی چیز گرائی تھی اور غافلانہ انداز اختیار کر لیا تھا۔

میں اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ میری نظریں دروازے کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ مجھے اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ وہ منظر میرے ذہن میں گھوم گیا جب گولڈن ٹرائی اینگل کے ایک غار میں اسی سونیا نے مجھے پچھاڑ دیا تھا اور اب یہ وہی سونیا تھی جو ایک بار پھر میرے راستے میں آ گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے سونیا کے ساتھ یہاں آ کر غلطی تو نہیں کی!

"ارے! سو گئے کیا؟"

سونیا کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھ کر میں نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن کب تک ایسا کر سکتا تھا۔ مجھے دوبارہ آنکھیں کھولنا پڑیں۔

سونیا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے شب خوابی کا باریک لباس پہن رکھا تھا جس سے اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور فاسد خیالات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔" وہ میرے سامنے اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ہاں۔ آج سارا دن اونچے نیچے راستوں پر گھومتا رہا ہوں۔" میں نے اپنا کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

سونیا نے بھی اپنا کپ اٹھالیا اور کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

باتیں کرتے ہوئے رات کا ایک بج گیا۔ میں سونا چاہتا تھا لیکن سونیا کو شاید نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ مجھے بھی جگائے رکھنا چاہتی تھی۔

"تمہیں نیند آرہی ہے۔" بالآخر وہ اٹھتے ہوئے بولی "تم اندر میرے بیڈ پر سوجاؤ۔ میں یہاں صوفے پر لیٹ جاؤں گی۔"

"میں صوفے پر ٹھیک ہوں۔ تم اپنے بستر پر آرام سے سوجاؤ۔" میں نے جواب دیا۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ سونیا بھی میرے ساتھ ہی آئی تھی۔ میں ایک جگہ رک کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک دیوار پر بھارتی فلمی اداکاراؤں کی نیم عریاں تصویریں چسپاں تھیں جو کسی میگزین سے کاٹی گئی تھیں۔ سونیا ایسی بد ذوق نہیں تھی کہ کمرے کو ایسی چیزوں سے سجاتی۔ ہوسکتا ہے ان سے پہلے جو کرائے دار یہاں رہائش پذیر رہے ہوں یہ ان کا ذوق ہو۔

دوسری دیوار پر لگی ہوئی کھونٹی پر سونیا کے تین چار جوڑے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باتھ روم کا دروازہ تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ باتھ روم زیادہ بڑا نہیں تھا۔

سونیا بستر کی چادر درست کررہی تھی۔ بیڈ پر دو کمبل تھے جنہیں اٹھا کر اس نے کرسی پر رکھ دیا تھا۔ چادر درست کرکے اس نے ایک کمبل بیڈ پر رکھ دیا اور دوسرا اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"رات کے آخری پہر یہاں اچھی خاصی سردی ہوجاتی ہے۔ اگر تم ایک کمبل میں سردی محسوس کرو تو۔۔۔"

"مجھے سردی نہیں لگے گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "تم چاہو تو یہ دوسرا کمبل بھی لے جاسکتی ہو۔"

سونیا مجھے گھورتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے کمرے کی بتی بجھا دی اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دن بھر گھومنے سے میں بہت تھک گیا تھا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گیا تھا۔ ممی' ڈیڈی' چاچا پرتاب سنگھ' مہاراج تھائی' جانکی اور کئی چہرے میری نظروں کے سامنے گھومتے چلے گئے۔ رنگولی اور سردار تھالوب۔ انہوں نے ہمارا کتنا ساتھ دیا تھا۔ سونیا بھی چیانگ رائے سے ہماری پارٹی میں شامل ہوئی تھی۔ اس کی ماں پولیس میں تھی لیکن دوسروں کی طرح وہ بھی کرپشن کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھی۔ اس کی موت کے بعد ہی سونیا پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس کی ماں کرپٹ تھی اور شہنشاہ کے خلاف ایک گھناؤنی سازش میں شریک تھی۔ ماں کے گناہوں کا پراسچت (کفارہ) کرنے کے لیے وہ ہمارے ساتھ مل گئی تھی اور گولڈن ٹرائی اینگل میں بھی ہمارے ساتھ گئی تھی جہاں قدم قدم پر موت سے ہمارا سامنا ہوتا رہا تھا۔

گولڈن ٹرائی اینگل سے نکل کر جب ہم برما پہنچے تو سونیا' بوما اور ہوفا کے ساتھ ہندوستان کی طرف نکل گئی تھی اور میں جانکی کے ساتھ شاؤلن ٹیمپل کے راستے پر چل پڑا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سونیا سے دوبارہ کبھی ملاقات نہیں ہوگی لیکن وہ جے پور میں مل گئی اور اب جے پور سے سیکڑوں میل دور ہمالیہ کی گود میں بھی وہ اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر مجھے مل گئی تھی۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں جو کچھ ہوا وہ مجھے یاد تھا اور مجھے اب تک اس پر ندامت تھی لیکن سونیا کو اس کا احساس نہیں تھا۔ اس نے جے پور میں بھی کوشش کی تھی اور یہاں بھی گولڈن ٹرائی اینگل والے واقعے کو دہرانے کی کوشش میں تھی لیکن میں اسے دوبارہ ایسا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا جس سے مجھے اپنے آپ سے شرمندگی محسوس ہونے لگے۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

○☆○

آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔

صبح کے سات بج رہے تھے۔ سونیا میرے لیے چائے کا کپ لیے کھڑی تھی۔ اس وقت خاصی سردی تھی اور سونیا نے شال اوڑھ رکھی تھی۔ مجھے چائے دے کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں کمرے سے باہر نکلا۔ رات کو شوبھا نے بتایا تھا کہ یوگی دھیراج صبح سات بجے آتا ہے لیکن آج وہ ابھی تک نہیں آیا تھا اور پھر آٹھ بج گئے۔

میں سونیا کے ساتھ شوبھا کے کمرے میں آگیا۔ وہ یوگی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی تاکہ اپنی مشق شروع کرسکے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

"آپ شیو آسن کی مشق کررہی ہیں نا شوبھا جی۔" میں نے کہا۔ شوبھا نے اثبات میں سرہلا دیا تو میں نے کہا "آج یہ مشق آپ کو میں کروا دیتا ہوں۔ میں یوگا کے بارے میں اتنا علم تو رکھتا ہوں کہ کسی کو یہ بے ضرر مشق کرواسکوں۔ آپ یہاں لیٹ جائیے۔" میں نے فرش پر بچھی ہوئی دری کی طرف اشارہ کیا۔ شوبھا کرسی سے اٹھ کر دری پر لیٹ گئی اور میں اسے ہدایات دینے لگا "آپ کو یہ آسن بنانے میں دشواری پیش نہیں آنی چاہیے۔ بالکل سیدھی لیٹیے۔ آپ کی ایڑیاں ملی ہوئی ہوں۔ ہتھیلیاں پھیلا کر ہاتھوں کا رخ اوپر کی طرف رکھیے اور اب آنکھیں بند کرلیں۔" شوبھا ایک ہفتے سے یہ پریکٹس کررہی تھی۔ اسے میری ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ میں مسلسل بول رہا تھا "اب آپ آنکھیں بند کرلیں اور اپنی تمام تر توجہ سیدھے پیر کے انگوٹھے پر مرکوز رکھیں اور یہ تصور کریں کہ آپ کے پیر کے انگوٹھے کا تناؤ ختم ہورہا ہے۔" میں تقریباً ایک منٹ تک خاموش رہا اور پھر ہدایات دینے لگا "آپ کے انگوٹھے میں تناؤ نہیں رہا۔ اب آپ انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی پر توجہ مرکوز کریں اور یہ تصور کریں کہ اس انگلی کا تناؤ ختم ہورہا ہے۔ بالکل ٹھیک۔۔۔ اب باری باری دوسری انگلیوں کے بارے میں بھی یہی تصور کیجیے۔

"اب دوسرے پیر کی طرف آجائیے اور انگوٹھے سے شروع کرکے اس ترتیب سے اس تصوراتی عمل کو دہرائیے۔ اب ایک بار پھر سیدھے پیر کی طرف آجائیں اور پنڈلی پر توجہ مرکوز رکھیں اور اب دوسری پنڈلی کا تناؤ بھی اسی طرح ختم کردیجیے۔

"اب سیدھی ٹانگ کولھے تک اور پھر الٹی ٹانگ کولھے تک۔ اس کے بعد پیٹ اور سینے پر توجہ مرکوز کریں اور یہ تصور کرتی رہیے کہ تناؤ ختم ہورہا ہے۔ ٹھیک۔۔۔ اب ہاتھوں اور بازوؤں کی باری ہے۔ ان کا طریقہ بھی یہی ہے۔ گردن' چہرے' ناک' کان' آنکھیں اور جسم کے ہر حصے کا تناؤ اس طرح تصور میں ختم کیجیے۔ اب آخر میں دماغ کی طرف آجائیے۔ دماغ کا تناؤ ختم کرتے ہوئے یہ جملے دہراتی رہیے ۔۔۔ میرے دماغ پر اب کوئی بوجھ نہیں ہے۔ میرا دماغ بالکل پرسکون اور آزاد ہے۔ یہ جملے پانچ چھ مرتبہ دہرائیے۔۔۔ اور اب دوبارہ یہ عمل سیدھے پیر کے انگوٹھے سے شروع کردیں۔ ٹھیک ہے۔ میں یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ آپ یہ عمل جاری رکھیے۔۔۔"

میں نے شوبھا کو یہ مشق بیس منٹ تک کرائی اور پھر اسے اٹھا دیا۔

"آپ کو کبھی دل کا دورہ تو نہیں پڑا شوبھا جی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی ایسی نوبت نہیں آئی لیکن انجائنا کی تکلیف تو ہے۔" شوبھا نے جواب دیا۔

"ایسی صورت میں بہتر ہوگا کہ شیو آسن کی اس مشق کو آپ اپنی عادت بنالیں۔" میں نے کہا "اسے صبح وشام جاری رکھیے۔ کم سے کم پندرہ منٹ اور زیادہ سے زیادہ نوّے منٹ لیکن اپنے گرو سے مشورہ ضرور کرلیں۔ دل کے مریضوں اور خون کے دباؤ کو نارمل رکھنے کے لیے اس سے بہتر یوگا کی اور کوئی مشق نہیں ہوسکتی۔ اگر اس مشق کو عادت بنالیا جائے تو کبھی دل کا دورہ نہیں پڑسکتا۔"

"تم تو کہتے تھے کہ سیکھنا چاہتے ہو لیکن۔۔۔" شوبھا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "لیکن تم نے تو ایک ماہر یوگی کی طرح مجھے یہ مشق کرائی ہے۔ یوگی مہاراج بھی مجھے یہ مشق ایسے ہی کراتے ہیں۔"

"یہ بہت معمولی اور ابتدائی مشقیں ہیں جو میں نے شاؤلن ٹیمپل میں سیکھی تھیں۔ اصل یوگا تو بہت دور ہے جو میں سیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو کیا یوگا کی بھی کئی قسمیں ہیں؟" شوبھا نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک۔" میں نے جواب دیا "ایک تو منتر یوگا ہے جس سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ روحانی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے کس قسم کی ریاضتوں یا جاپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ راج یوگا سے لاشعور کے دریچے کھولے جاسکتے ہیں اور پُراسرار ذہنی قوتیں بیدار کی جاسکتی ہیں۔ کنڈلینی یوگا سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں جو پُراسرار قوت محو خواب ہے اسے کس طرح بیدار کیا جائے۔ یہ وہ پُراسرار قوت ہے جس پر قابو پاکر اور بھی لاتعداد طلسماتی قوتوں کو قبضے میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ان پُراسرار قوتوں کا غلط استعمال تباہی اور بربادی کا باعث بنتا ہے۔ ہندو پنڈت اور یوگی عام طور پر اس پُراسرار قوت کو تسخیر کرنے کے لیے جاپ کرتے رہتے ہیں لیکن بہت کم لوگ کامیاب ہوپاتے ہیں۔ ہتھ یوگ' یوگا کی وہ قسم ہے جس کے مختلف آسنوں پر عمل کرکے اپنے آپ کو جسمانی طور پر تندرست' صحت مند اور چاق و چوبند رکھا جاسکتا ہے۔ ہتھ یوگ ہی سے نہ صرف مختلف بیماریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے بلکہ چہرے پر جھریاں اور جسم پر بڑھاپے کے اثرات کو بھی روکا جاسکتا ہے۔ یہ جو آپ

شیو آسن کی مشق کررہی ہیں ہتھ یوگ ہی کی ایک قسم ہے۔"

ہم ابھی یہ باتیں کرہی رہے تھے کہ یوگی دھیراج بھی آگیا۔ اس نے آتے ہی اپنے تاخیر سے آنے پر شوبھا سے معذرت کی اور جب آسن کی تیاری کے لیے کہا تو شوبھا نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اس وقت کی مشق تو وہ کرچکی ہے۔ یوگی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور میں بھی مسکرا دیا۔

اس یوگی کی عمر ساٹھ اور پینسٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ دبلا پتلا جسم' تمام نسیں ابھری ہوئی اور ہڈیاں تک گنی جاسکتی تھیں۔ اس نے صرف دھوتی لنگوٹ کے انداز میں باندھ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔ میری طرف دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"اگر میں سمجھنے میں غلطی نہیں کررہا تو تم وہی نوجوان ہو جو گوتم بھوش مہاراج کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں اچھل پڑا "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"پریشان مت ہو۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "کل رات ویرول میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ گوتم بھوش مہاراج میرے گرو ہیں۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "مگر وہ تو کل مجھے کسی اور جگہ پر لے گیا تھا جہاں سے پتا چلا کہ گوتم بھوش دھرم شالا جاچکے ہیں۔"

"ویرول بڑا پاپی ہے۔" یوگی دھیراج بدستور مسکرا رہا تھا "آج اگر تم باہر نکلو گے تو وہ انہیں تلاش کرلے گا اور باتیں بناکر تمہاری جیب سے پھر کچھ پیسے نکلوا لے گا۔ اس کا دھندا یہی ہے۔ خیر! تم گوتم بھوش مہاراج سے ہی کیوں ملنا چاہتے ہو۔ یہاں اور بھی سیکڑوں یوگی ہیں۔ جن کے پاس لوگ بہت دور دور سے آتے ہیں۔"

"میں بھی بہت دور سے آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا "اس میں شبہ نہیں کہ یہاں بڑے بڑے ماہرِ فن یوگی موجود ہیں لیکن گوتم بھوش۔۔۔"

"میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔" اس نے میری بات کاٹ دی "گرو مہاراج دھرم شالا نہیں گئے۔ یہیں ہیں۔ رشی کیش میں۔ تم آج شام ان سے مل سکتے ہو۔"

"کہاں؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں شام کو یہاں آؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔" دھیراج نے کہا اور پھر یوگا کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ یوگی دھیراج کی باتوں سے میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ میں نے بھی اگرچہ شاؤلن ٹیمپل سے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن دھیراج کی باتیں سن کر میں اپنے آپ کو طفلِ مکتب سمجھنے لگا اور میں واقعی طفلِ مکتب تھا۔ میں یہاں سے کچھ سیکھنے اور لینے ہی کے لیے تو آیا تھا۔

ہم بہت دیر تک یوگا کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر ہمارا موضوع شعور اور لاشعور کی طرف مڑگیا۔

"یوگا کی طرح لاشعور بھی ہمارے اندر کی ایک پُراسرار قوت ہے جس کے بارے میں جاننا بہت ضروری ہے۔ کسی بھی علم اور لاشعور کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جب ہم یوگا کی بات کرتے ہیں تو ہم لاشعور کو اس سے الگ نہیں کرسکتے۔" یوگی دھیراج کہہ رہا تھا "ہم میں سے کسی نے بھی لاشعور کو دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بے حد طاقت ور ہونے اور ہمہ جہت اثرات کی بنا پر ہم اس کے وجود کو محسوس ضرور کرتے ہیں۔

"ہم میں سے ہر شخص لاشعور کا حامل ہے کہ لاشعور ہمارے نظامِ تنفس' نظامِ ہضم' حرکتِ قلب اور دیگر تمام جسمانی و ذہنی اعمال و افعال پر اَن دیکھی حکومت کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اسٹور روم ہے جہاں ہماری سوئی ہوئی یادوں کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ ہمارا لاشعور ہی ہماری تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا تعین کرتا ہے۔ یہ ہماری زندگی کو ایک دہشت انگیز خواب میں تبدیل کرکے ہمیں خوف زدہ کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ زندگی کو ہمارے لیے زیادہ خوشگوار اور فرحت انگیز بناکر ہمیں شاد اور مسرور بھی کرسکتا ہے۔" دھیراج خاموش ہوکر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"لاشعور کی دریافت سے ہمیں معلوم ہوا کہ ہم ہمیشہ اپنی تقدیر کے کامیاب مالک نہیں بن سکتے۔ ایک نادیدہ اور نامعلوم قوت ہمیں اکثر و بیشتر ہدایات دیتی رہتی ہے چنانچہ ہمارے لاشعوری ذہن میں جو کچھ موجود ہے اس کی آگاہی کے ساتھ اس پر مکمل قابو حاصل کرلینا ہمیں زندگی کی مسرتوں سے ہمکنار کرسکتا ہے کیونکہ لاشعور ہماری تخلیقی قوت اور ہمارے تخیل کی بنیاد کا سرچشمہ ہے۔

"تحلیلِ نفسی ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے انسان اپنے ذہن و دماغ کا افہام و ادراک حاصل کرلیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسا فن بھی ہے جس کی مدد سے کوئی شخص اپنے لاشعوری احساسات سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ اس طرح لاشعور میں مقید جذبات آزاد ہوجاتے ہیں اور انسان

ان تمام دکھوں سے نجات حاصل کرلیتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ اہم رہے ہوں۔ تحلیلِ نفسی کی تخلیق نے انسان کے لیے یہ امکان پیدا کردیا ہے کہ وہ ان جذبات اور احساسات کی عکاسی کرسکے جو اس کے لیے تکلیف اور دکھ کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ جن کی بنا پر وہ بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ مسائل پیدا کرلیتا ہے۔

"لاشعور سے آگہی کا علم انسان کے سخت رویے' جارحانہ پن' خوف اور نقصانات کے دکھ پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور انسان کی مختلف تحریکات اور توانائیوں کا رخ مثبت امور کی طرف موڑتا ہے۔ یہ علم اس عام اور مشترک ذہنی خلل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو ہر شخص کے دماغ کی سطح کے نیچے موجود ہے۔ اس نظریے نے ثابت کردیا ہے کہ انسانی فطرت تبدیل ہوسکتی ہے اور لاشعور کی آگہی کے ذریعے انسان اپنے آپ کو ماضی کے غلط خوف سے اور ہر طرح کے ڈر سے آزاد کراسکتا ہے اور ڈر اور خوف ہی وہ چیز ہے جو ہمیں کسی عمل سے دور رکھتی ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ شوبھا اور سونیا بھی بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں صحیح جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ مجھے بدھ بھکشو گوتم بھوش کی تلاش تھی اور دھیراج اس کا چیلا تھا اور اس کے پاس بھی بہت کچھ تھا۔

"اب میں ایک بار پھر یوگ کی طرف آتا ہوں۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا "اگر ہمیں اپنے لاشعور کے بارے میں جانکاری ہوجائے تو یوگ ہمارے لیے زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ یوں تو یوگ کی بہت قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ اہم ہتھ یوگ اور راج یوگ ہے۔

"ہتھ یوگ کا تعلق انسانی شریر (بدن) سے ہے۔ یعنی یہ کہ اپنے شریر کو کیسے تندرست و توانا رکھا جائے اور اسے بیماریوں سے کیسے بچایا جائے جبکہ راج یوگ کا تعلق براہِ راست دماغ سے ہے۔ یعنی اپنے دماغ کو کیسے کنٹرول کیا جائے۔ ہمارے اندر جو پُراسرار قوتیں خوابیدہ ہیں انہیں کیسے بیدار کیا جائے اور منفی جذبات اور تخریبی رجحانات سے کیسے بچا جائے۔

"یوگ میں یہی دو بڑے مکتب ہائے فکر ہیں اور ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہتھ یوگ کے ماہرین کہتے ہیں کہ راج یوگ اس کی ہمسری نہیں کرسکتا۔ کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق انسان کا جسمانی لحاظ سے تندرست ہونا کافی ہے۔ اگر دماغی طور پر سست بھی ہوں تو اس سے زندگی متاثر نہیں ہوگی۔ دوسری طرف راج یوگ کے ماہرین راج یوگ کو ہی افضل و برتر سمجھتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق اگر کوئی شخص دماغی لحاظ سے نارمل ہے اور اس کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہوچکی ہیں تو وہ محض ان قوتوں کے بل بوتے پر اپنے شریر کی دیکھ بھال کرسکتا ہے۔ ذہن بیمار نہیں ہے تو شریر بھی بیمار نہیں ہوسکتا۔ ان ماہرین کے نظریے کے مطابق دماغ تندرست ہو تو شریر پر کوئی بیماری حملہ آور نہیں ہوسکتی۔

پتنجلی (PATANJLI) کو فادر آف یوگا کہا جاتا ہے۔ یہ مہا یوگی تین ہزار سال پہلے چندر گپت کے زمانے میں ہوا تھا اور تاریخ میں پہلی مرتبہ یوگ کو اس کی نگرانی میں ضبطِ تحریر میں لایا گیا تھا۔ پتنجلی کو بھی ہتھ یوگ سے اختلاف تھا اس لیے اس کی کسی بھی تحریر میں ہتھ یوگ کا ذکر نہیں ملتا۔

"یوگ کے ان دونوں شعبوں کے ماہرین کے اختلافات اپنی جگہ لیکن سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر کوئی انسان ریچھ جیسی طاقت رکھتا ہے مگر اس کا دماغ خالی ہے تو اسے کامیاب انسان نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے برعکس ایک بالکل کمزور و نحیف آدمی' جس کے لیے دو قدم چلنا بھی مشکل ہو' اسے چلتی پھرتی لاش کہا جائے مگر وہ ذہنی طور پر بیدار ہے۔ بے پناہ مخفی قوتوں کا مالک بن چکا ہے لیکن اس شخص کی زندگی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

"ہمارے لیے اہم شخص وہ ہے جو جسمانی لحاظ سے تندرست و توانا' صحت مند ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ دماغی لحاظ سے بھی چاق و چوبند اور بے پناہ قوتِ ارادی کا مالک ہو۔ اپنے دماغ اور مخفی قوتوں پر اسے پورا کنٹرول حاصل ہو' ہر معاملے کو فہم و فراست اور عقل و دانش سے سلجھاتا ہو۔ جہاں طاقت کی ضرورت ہو وہاں دماغ کی نگرانی میں طاقت کا مظاہرہ بھی کرتا ہو۔ اس کے تمام مظاہر عقل کے دائرے میں رہتے ہوئے بالکل معتدل اور معقول ہوں تو یہ شخص سپر ہیومن SUPER HUMAN کہلانے کا حق دار ہے۔

"ہتھ یوگ اور راج یوگ ایک دوسرے کے لیے لازم ملزوم ہیں۔ تنہا کوئی بھی شاخ کسی انسان کو برتر انسان نہیں بنا سکتی۔ پہلے ہتھ یوگ سے اپنے آپ کو جسمانی طور پر مضبوط اور طاقت ور بنایا جائے اور اس کے بعد راج یوگ پر عمل کرتے ہوئے دماغی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ ان کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ان کے منفی جذبات کا دھارا تعمیری مقاصد کی طرف موڑا جائے۔

"کوئی بھی علم سہل نہیں ہوتا۔ راج یوگ تو بہت گہرا اور بہت ہی پُراسرار علم ہے۔ اس میں مراقبے کا بھی بڑا دخل ہے۔ مراقبہ ایک ایسا عمل ہے جس میں آنکھیں' کان اور منہ بند کرکے تمام تر توجہ اپنے من کی طرف مبذول کردی جاتی ہے۔ ہمارا من کیا ہے؟ "من" کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہمارے اپنے اندر ایک بے حد وسیع و عریض دنیا قائم ہے جس کی ہم نے کبھی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ مختلف مراقبوں اور ریاضتوں اور جاپ سے ہم اس دنیا کی سیر کرتے ہیں۔ اس کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرتے ہیں۔ اس پُراسرار جزیرے کی خاک چھانتے ہیں۔ اس کے غاروں اور بھول بھلیوں کو کھنگالتے ہیں اور اگر ہمارے سر پر گرو کا ہاتھ نہ ہو تو ہم بھٹک بھی سکتے ہیں۔

"قدرت نے ہمیں بے شمار قوتوں سے نوازا ہے۔ بے پناہ طاقتیں ہمیں عطا فرمائی ہیں لیکن ہمیں اپنے اندر چھپی ہوئی بے پناہ قوتوں کا علم ہی نہیں ہے کیونکہ ہم نے کبھی ان پر توجہ ہی نہیں دی۔ ہم تو صرف مادی دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ عالی شان محلات' ہرے بھرے باغات' مرغن غذائیں' شوخ و شنگ حسینائیں' راگ رنگ کی محفلیں' ہم نے انہی سب چیزوں کو زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔ یہ تو ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ہمارے اندر جو ایک عظیم الشان سلطنت موجود ہے اور جس کے ہم خود بادشاہ ہیں' وہ کیسی ہے؟ اس کے محلات' اس کے باغات کیسے ہیں؟ اس میں کیسی کیسی پُراسرار وادیاں ہیں' کیسی کیسی خوب صورت گھاٹیاں ہیں۔ اس پُراسرار دنیا کے تاریک غاروں میں کیسی کیسی جھلملاتی روشنیاں ہیں اور یہ دنیا کتنی پُراسرار اور رنگین ہے۔ یہ جاننے کی ہم نے کبھی زحمت ہی نہیں کی۔"

یوگی دھیراج ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس مرتبہ خاموشی کچھ زیادہ طول کھینچ گئی اور بالآخر اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"یہ سب کچھ جاننے کے لیے محنت کرنی پڑے گی۔ بعض لوگ محنت سے گھبراتے ہیں اور آدھے راستے ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ بات لگن' ہمت اور حوصلے کی ہے۔ ساگر کی موجوں کو دیکھو جو سنگلاخ چٹانوں سے بار بار ٹکراتی اور واپس آجاتی ہیں۔ بظاہر ان کی جدوجہد بے بنیاد نظر آتی ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ حقیقت میں ان ہی موجوں نے چٹانوں کے اندر پیوست ہوکر انہیں کمزور کیا ہے۔ زندگی میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے محنت کی ضرورت ہے اور وہ بھی سچائی' ایمان داری' خلوص اور خود اعتمادی کے ساتھ ہو تو کامیابی ضرور قدم چومے گی۔"

یوگی دھیراج اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اب میں چلتا ہوں۔" وہ بولا "میں شام کو آؤں گا۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں نے تمہاری باتیں سنی ہیں اور مجھے وشواس (یقین) ہے کہ تم بہت اوپر جاؤ گے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی اوپر۔"

یوگی دھیراج چلا گیا۔ وہ میرے اندر ایک نئی آگ بھڑکا گیا تھا اور میں چشم تصور سے اپنے آپ کو ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی اوپر اڑتے ہوئے محسوس کررہا تھا۔

میں نے شاؤلن ٹیمپل میں ماسٹر ہینگ پائی سے یوگا پر بھی بہت سیکھا تھا لیکن میری وہ مشقیں حبس دم اور صحت کے حوالے سے تھیں۔ کسی پراسرار شکتی کے حصول کا خیال ذہن میں نہیں تھا۔ اس وقت تو میری تمام تر توجہ مارشل آرٹس پر مرکوز تھی۔ میں اس فن میں مہارت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسری چیزیں میرے لیے ضمنی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان چیزوں کے بارے میں مجھے اتنا ہی بتایا گیا تھا جتنی مجھے اس وقت ضرورت تھی۔ یوگا کی چند خاص مشقوں کے علاوہ مجھے مراقبہ اور ارتکاز کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا اور لاشعور کو اجاگر کرنے کی بھی تھوڑی بہت تربیت دی گئی تھی۔

لیکن اب یوگا کے حوالے سے یوگی دھیراج کی باتیں سن کر میری آتش شوق بھڑک اٹھی تھی اور میں نے اس میں بھی کچھ شدبد... حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شدبد... کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ کوئی علم مکمل طور پر حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ انسان زندگی بھر بھی اگر سیکھتا رہے وہ نامکمل ہی رہتا ہے۔

کوئی بھی علم سطحی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علم اتنا گہرا اور اتنا پراسرار ہوتا ہے کہ طالب علم جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس پر ایسے ایسے سنسنی خیز انکشافات ہوتے ہیں کہ اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ذہن ایسی باتوں کو قبول کرنے سے انکار کردیتا ہے لیکن اس کے لیے حقیقت کو جھٹلانا بھی آسان نہیں ہوتا۔

جب میں نے مارشل آرٹس سیکھنا شروع کیا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ انسان کے اندر ایسی پراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں جن پر اگر قابو پالیا جائے تو انسان مافوق الفطرت بن جائے لیکن ان باطنی قوتوں کا حصول آسان نہیں ہے۔ ان کے لیے کٹھن ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسی کوشش کرتے ہیں مگر کٹھنائیوں سے گھبرا کر آدھے راستے ہی میں ہمت ہار جاتے ہیں۔ لاکھوں میں ایک ایسا ہوگا جو اپنی منزل پر

پہنچ سکا ہو۔ مارشل آرٹس میں انسان کے اندر پوشیدہ پراسرار قوتوں میں "چی" کی قوت کا بڑا چرچا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے جسم میں ناف کے نیچے پوشیدہ قوت واقعی بہت پراسرار ہے اور ہر مارشل آرٹسٹ چی کی اس پراسرار قوت کے حصول کے خواب دیکھتا ہے لیکن اس میں بھی لاکھوں میں ایک آدھ ہی منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوپاتا ہے۔

میں اپنے آپ کو اس حوالے سے بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میرا شمار بھی دنیا کے چند ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنے اندر چی کی اس پراسرار قوت کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوسکے ہیں۔ میں کوئی شیخی نہیں بگھار رہا بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے' کسی بھی منزل تک پہنچنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ بڑے کٹھن اور دشوار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے بڑی لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ثابت قدمی سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ معمولی سی لڑکھڑاہٹ سارے کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے اور منزل پر پہنچنے کا خواب چکنا چور ہوجاتا ہے۔

میں نے بھی چی کی پراسرار قوت حاصل کرنے کے لیے بڑی کٹھنائیاں برداشت کی ہیں۔ بڑی ریاضت کی ہے۔ میری کامیابی میں میرے ماسٹرز کا بھی بڑا ہاتھ ہے جنہوں نے مجھے سنبھالے رکھا اور میرے پایۂ استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہونے دی اور میری لگن بھی تھی جو اس پرخار راستے پر کشاں کشاں مجھے آگے لیتی چلی گئی اور بالآخر میں نے اپنے اندر پوشیدہ ہزاروں پراسرار قوتوں میں سے ایک "چی" پر مکمل طور پر قابو پالیا۔ میں اگر چاہتا تو یہ پراسرار قوت حاصل ہوجانے کے بعد اپنے آپ کو سپرمین ثابت کرسکتا تھا۔ اپنے گرد دولت کے انبار لگا سکتا تھا۔ کسی بھی شخص کو اپنے قدموں پر جھکنے پر مجبور کرسکتا تھا لیکن میرے دل میں کبھی ایسی کوئی گندی خواہش نہیں ابھری۔ میرے دل میں کبھی کوئی لالچ پیدا نہیں ہوئی۔ خیالات کبھی پراگندہ نہیں ہوئے۔ میں نے اس پراسرار قوت کو قدرت کی ایک امانت سمجھ کر اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔ میں نے اسے جب بھی استعمال کیا اچھے مقصد کے لیے ہی استعمال کیا اور پراسرار چی ہر مشکل وقت پر میری مدد کو پہنچتی رہی۔

مجھے یاد ہے' شاؤلن ٹیمپل میں جب ایک جمنازیم کی تعمیر ہورہی تھی تو ایک آدمی ملبے کے نیچے دبا چیخ رہا تھا۔ بہت سے لوگ اس کے اوپر سے آہنی گارڈر ہٹانے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ وزنی گارڈر اپنی جگہ سے ہل کر نہیں دے رہا تھا اور پھر یکایک میرے اندر یہ تحریک اٹھی کہ مجھے اس شخص کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے آگے بڑھ کر بڑے آرام سے وہ آہنی گارڈر اٹھالیا اور اس کے نیچے دبے ہوئے آدمی کو نکال لیا گیا۔

میرے اندر اتنی طاقت نہیں تھی۔ میں اپنی جسمانی قوت کے مطابق ہی وزن اٹھا سکتا تھا مگر میں نے وہ وزنی آہنی گارڈر ایک ہاتھ سے بڑے آرام سے اٹھالیا تھا جسے کئی آدمی مل کر ہلا بھی نہیں سکے تھے۔

وہ دراصل میرے اندر چی کی وہی پراسرار قوت تھی جو انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی اور میرے ہاتھوں سے ایک ایسا کام کروا دیا تھا جس کا میں تو کیا' دوسرے بھی تصور نہیں کرسکتے تھے۔

وہ پہلا موقع تھا جب مجھے بھی احساس ہوا کہ میرے اندر وہ خفیہ قوت بیدار ہوچکی ہے جس کے لیے میں طویل عرصے سے بڑی کٹھن ریاضت کررہا تھا۔

اور اب یوگا جس کے بارے میں ماسٹر ہینگ پائی نے بھی بتایا تھا کہ یہ بڑا پراسرار علم ہے اور اس علم کے ذریعے بھی انسان کے اندر پوشیدہ بے پناہ پراسرار خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرکے زندگی کو خوش گوار بنایا جاسکتا ہے۔ میں کچھ عرصے اور وہاں رہتا تو ماسٹر ہینگ پائی ہی سے اس علم کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن اس وقت تو میرا سینہ انتقام کی آگ سے تپ رہا تھا۔ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کرنے کے بعد جلد از جلد دارا کو تلاش کرکے اپنے انتقام کی آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔

دارا کا قصہ ختم کرنے کے بعد میں لاہور جانا چاہتا تھا لیکن لاہور میں چوہدری نوازش علی کی گردن پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ابھی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ وقت کی ڈور کو ڈھیل دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہردوار میں رہتے ہوئے میں نے کئی ہندو یوگیوں اور سادھوؤں کو دیکھا تھا جو بھوک پیاس اور موسم کی شدتوں سے بے نیاز ایک مختصر سا لنگوٹ باندھے یوگا کی ریاضت یا جاپ میں مصروف تھے۔ اگر آپ کو بھی کبھی ہمالیائی سلسلے میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو آپ کو جگہ جگہ ایسے دلچسپ منظر دکھائی دیں گے۔ آبادی سے دور ویرانوں میں' پہاڑوں کی گپھاؤں میں' کسی شمشان گھاٹ میں یا گنگا کے کنارے ایسے ہندو یوگی' پنڈت اور سادھو نظر آئیں گے جو شدت کی سردی میں صرف ایک لنگوٹ باندھے ننگ دھڑنگ اپنے یوگ کی تپسیا میں مصروف نظر آئیں گے لیکن یہ ہندو یوگی' پنڈت اور سادھو حصول علم کے لیے نہیں' اس علم کے اسرار سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے

اندر کی پراسرار قوتوں کو قابو کرنے کے لیے جاپ کرتے ہیں۔ انسان کے اندر کی یہی وہ پراسرار قوتیں ہیں جن پر قابو پاکر ہمالیہ کو بھی اپنے قدموں میں جھکنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے اور یہ ہندو یوگی اور پنڈت کسی نیک مقصد کے لیے یہ تپسیا نہیں کرتے۔ ان کے تو ارادے ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔

انہی ننگ دھڑنگ یوگیوں کو دیکھ کر میرے اندر بھی یوگا سے کچھ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اس رات یوگا کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے چترا پریتم نے بھی میرے اس شوق کو کچھ ہوا دی تھی۔ اس نے بدھ یوگی گوتم بھوش کے بارے میں بتا کر میرے جذبہ شوق کو مہمیز کیا تھا۔

یہ میں جانتا تھا کہ یوگ کی جنم بھومی ہندوستان ہے لیکن اس نے پرورش تبت کی بدھ عبادت گاہوں میں پائی تھی۔ بدھ بھکشوؤں نے ہندوستان سے یہ علم سیکھا اور تبت میں اسے درجہ کمال حاصل ہوا۔ انسان کے اندر خوابیدہ خفیہ طاقتوں کو ابھارنے کے لیے بدھ راہبوں نے نت نئی ریاضتیں ایجاد کیں۔ یہ ریاضتیں یا جاپ بے پناہ کٹھن اور وقت طلب تھیں مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اس علم کے اسرار سے پردے اٹھاتے رہے۔

کٹھن ریاضتوں سے بدھ راہبوں نے اپنے اندر پوشیدہ کئی پراسرا قوتوں کو زیر کرلیا۔ وہ مختلف ریاضتوں کے ذریعے اپنے اوپر وقتی طور پر مصنوعی موت طاری کرسکتے ہیں۔ کیا یہ اس فن کا کمال نہیں کہ ایک شخص محض ایک لنگوٹ پہن کر صفر سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر برف پر لیٹا رہتا ہے لیکن نہ تو اس کا خون جمتا ہے اور نہ ہی اس کے جسم کا درجہ حرارت گرتا ہے۔ ان خاص مشقوں کے ذریعے انتہائی ناموافق حالات میں بھی جسم کا درجہ حرارت برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ وہ انتہائی گرم درجہ حرارت جس پر انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے لیکن اپنے آپ پر مصنوعی موت کی مشق میں مہارت رکھنے والے اس سے بھی دس بارہ سینٹی گریڈ زیادہ درجہ حرارت پر زندہ رہ سکتے ہیں۔

یوگ کا یہ کمال صرف بدھ راہبوں ہی نے حاصل نہیں کیا' ہندو یوگیوں نے بھی اس پر دسترس حاصل کی لیکن ایسے ہندو یوگی خال خال ہی ملتے ہیں اور یوگی دھیراج کی باتوں سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس کے پاس بہت کچھ ہے اور میرے لیے دلچسپی کی بات یہ تھی کہ وہ ایک ایسے بدھ راہب کا چیلا تھا جس کے بارے میں چترا پریتم نے بھی مجھے بتایا تھا کہ وہ واقعی گرو ہے۔

یوگی دھیراج کی باتوں نے میری آتش شوق کو کچھ اور بھی بھڑکا دیا تھا اور میں نے کچھ عرصہ وہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا تاکہ اس سے کچھ حاصل کرسکوں۔

دھیراج کے جانے کے بعد ہم دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر سونیا اٹھ کر کاٹیج کے چھوٹے سے کچن میں چلی گئی اور کچن کی طرف سے کچھ ہی دیر بعد انڈے اور پراٹھے تلنے کی خوشبو آنے لگی۔

اس دوران میں شوبھا دیوی سے میں باتیں کرتا رہا۔ شوبھا بتا رہی تھی کہ اس نے یہ ڈیکوریٹیڈ کاٹیج دو ہزار روپے ماہوار کرائے پر حاصل کیا تھا اور کچھ برتن بازار سے خرید کر اپنے پکانے کھانے کا بندوبست بھی کرلیا تھا۔ اس طرح بہت سی زحمتوں سے بچ گئے تھے۔ سونیا نے کئی ہندوانی کھانے بنانا سیکھ لیے تھے اور شوبھا بتا رہی تھی کہ سونیا اس کی بڑی خدمت کرتی ہے۔

ہماری گفتگو کے دوران ہی میں سونیا نے دروازے پر نمودار ہو کر بتایا کہ ناشتا تیار ہوچکا ہے۔ ہم اس کمرے میں آگئے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ صوفوں اور کرسیوں کے درمیان اگرچہ سینٹر ٹیبل موجود تھی مگر سونیا نے وہ میز ہٹا دی تھی اور صوفے اور کرسیاں بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر کردیے تھے۔ بیچ میں دری کا فرش تھا جس پر سونیا نے دسترخوان بچھا کر ناشتا لگا دیا تھا۔ تکونے پراٹھے' انڈوں کا آملیٹ بھی تھا اور دوسری پلیٹ میں ہاف فرائی انڈے رکھے تھے۔ ان کے ساتھ ایک کٹوری میں دال تھی اور بغیر گھی کے ایک چپاتی۔

یوگا کی مشقوں میں مرغن اور بھاری غذائیں کھانے کی ممانعت تھی اور یہ دال اور چپاتی شوبھا کے لیے تھی جبکہ پراٹھے اور انڈے میرے اور سونیا کے لیے تھے۔ ہندو دیوی بھی ماس خور نہیں ہوتے اور مجھے بھی سبزیاں اور دال وغیرہ کھانے کی عادت سی ہوگئی تھی اور اس وقت کا ناشتا زبردست تھا۔ میرا ایک تجربہ یہ بھی تھا کہ گوشت خوری کی پابندی صرف ان ہندوؤں تک محدود رہ گئی تھی جو دھرم کے قریب تھے جبکہ آج کے دور میں اکثر ہندو بھی باقاعدگی سے گوشت کھانے لگے۔ ناشتے کے دوران میں اس گوشت خوری کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے شوبھا دیوی نے ایک بڑی دلچسپ بات کہی تھی۔

"میں گوشت سے پرہیز نہیں کرتی۔ کبھی کبھی گوشت بھی کھالیتی ہوں۔" اس نے کہا "ہندو گائے کا گوشت اس لیے نہیں کھاتے کہ اسے مقدس سمجھتے ہیں لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ یہی ہندو گاؤ ماتا کو قصائیوں کے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں کہ چھیردو اس کے گلے پر چھری۔ ہے نا مزے کی بات؟"

بات تو واقعی مزے کی تھی لیکن میں اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ میں ابھی شوبھا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ گاؤ ماتا اور قسائی کی بات سے اگرچہ کچھ اندازہ ہوگیا تھا لیکن نجانے میری کون سی بات اسے بری لگ جائے اس لیے میں نے یہ موضوع ہی بدل دیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم کاٹیج سے باہر آکر کھلی فضا میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل بھی تھے اور برف پوش پہاڑی چوٹیوں پر بادلوں نے گویا مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

یہ کاٹیج اس پہاڑی پر زمین کی سطح سے تقریباً دو سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس سے اوپر بھی چند کاٹیج نظر آرہے تھے۔ ایک پتھریلا راستہ پہاڑ پر بل کھاتا ہوا اوپر تک چلا گیا تھا۔ یہ راستہ اتنا کشادہ تھا کہ دو کاریں پہلو بہ پہلو آسانی سے چل سکتی تھیں۔ اس سڑک کے علاوہ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی کئی پگڈنڈیاں تھیں جن سے اوپر آنے جانے کا فاصلہ بہت کم ہوجاتا تھا۔

شوبھا دیوی دل کی مریضہ تھی۔ پہاڑی پر چڑھنا اس کے لیے مشکل اور تکلیف دہ کام تھا۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی' صرف دو مرتبہ بازار کی طرف گئی تھی اور اس کے لیے بھی دونوں مرتبہ کرائے کی موٹر منگوائی تھی۔ اس کا زیادہ وقت کاٹیج کے آس پاس ٹہلتے ہوئے یا آرام کرتے ہوئے گزرتا تھا۔

"یہ بہت اچھی جگہ ہے۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "میں سوچ رہی ہوں کہ اگر یہاں جگہ مل جائے تو جے پور کی جائداد فروخت کرکے یہاں ایک شاندار گیسٹ ہاؤس بنوالوں۔ کاروبار بھی چلتا رہے گا اور صحت افزا ماحول میں وقت بھی اچھا گزرے گا۔"

"بہت اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا "لیکن کیا آپ اکیلی یہاں رہ سکیں گی؟"

"اکیلی کیوں؟" شوبھا نے کہا "سونیا میرے پاس ہے۔ اب تو میں نے اس کو اپنا سب کچھ مان لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ بھی مجھے کبھی چھوڑ کر نہیں جائے گی۔" وہ مسکرا کر سونیا کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی دیدی۔" سونیا نے اٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اگر واقعی آپ سنجیدہ ہیں تو میرا ایک دوست اس سلسلے میں آپ کی بہت مدد کرسکتا ہے۔" میں نے کہا "اسے اس دھندے کا بہت تجربہ ہے۔ گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے سلسلے میں وہ آپ کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔"

"کون؟" شوبھا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ٹھاکر بھانوت سنگھ۔" میں نے جواب دیا "آپ نے جے پور میں اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ بہت معروف شخصیت ہے۔"

"وہ دکرم ہوٹل والا ٹھاکر۔" شوبھا بولی "اسے کون نہیں جانتا لیکن تمہارا اس سے کیا تعلق؟"

"وہ کل تک ہردوار میں میرے ساتھ تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "وہ بہت اچھا انسان اور بہت مخلص دوست ہے۔ میں کئی مہینے جے پور میں اس کے پاس رہا ہوں۔ اس کی دوست راج کماری روپ متی....."

"تم روپ متی کو بھی جانتے ہو۔" شوبھا کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی "وہ تو جے پور کی بڑی معروف اور متنازعہ شخصیت ہے۔ معاف کرنا وہ....."

"میں آپ کا مطلب سمجھ رہا ہوں شوبھا دیوی۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی "لیکن روپ متی اب متنازعہ شخصیت نہیں رہی۔ اب وہ بہت بدل گئی ہے۔"

"اس کے بارے میں تو آئے دن نئے اسکینڈلز سننے میں آتے رہے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جے پور کے پنڈتوں نے اس کے خلاف بغاوت کردی تھی۔ وہ کسی مسلمان مرد کے ساتھ....."

"اور وہ مسلمان میں ہوں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا.....؟" وہ اچھل پڑی اور اس طرح دیکھنے لگی جیسے میری بات کا یقین نہ ہو۔

"یہ درست ہے۔" میں نے کہا "بات کا بتنگڑ بنانے میں بعض لوگوں کو بہت ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ بات وہ نہیں تھی جس کا چرچا ہوا تھا۔ اصل قصہ یوں ہے کہ بلونت سنگھ نامی ایک بدمعاش جو اپنے آپ کو چتوڑگڑھ کا راج کمار کہتا تھا' اسے پریشان کررہا تھا۔ میں نے اس کے خلاف روپ متی کی مدد کی تھی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے پورا قصہ سنانے لگا۔ غلاموں کی منڈی والا حصہ میں نے گول کردیا تھا۔ شوبھا بڑی دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں آخر میں کہہ رہا تھا "بات صرف اتنی سی تھی۔ بدقسمتی سے میرا ایک ازلی دشمن بھی بلونت سنگھ کے ساتھ مل گیا تھا۔ ہمارے خلاف ان کے پاس ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر محاذ کھولا جاسکتا۔ انہوں نے پنڈتوں کو ہمارے خلاف بھڑکا دیا کہ ایک مسلمان مرد ایک ہندو عورت کو زبردستی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ بات دھرم کی ہو تو لوگ بڑے جذباتی ہوجاتے ہیں۔ وہ اصل بات جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ دھرم کی آڑ لے کر لوگوں کو بھڑکانا بہت آسان ہوتا ہے۔ میرے اور

روپ متی کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

"ہمارے خلاف وہ پنڈت اور پجاری تھے جنہوں نے خود دھرم کو برباد کر رکھا تھا۔ مندر جیسے پوتر استھانوں کو عیاشی کے اڈے بنا رکھا تھا۔ ان کے اپنے کرتوت کالے تھے۔ ہمارا وہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ اس کے برعکس وہ خود تباہ و برباد ہو گئے۔

"ٹھاکر بھانوت سنگھ راج کماری روپ متی کے سورگ باشی پتی کا دوست ہے۔ اس نے اس معاملے میں ہماری بڑی مدد کی۔ وہ ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اگر آپ یہاں گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ بنانے کے معاملے میں اس کی مدد لینا چاہیں گی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔"

"اب مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے کہا "تم ہو' سونیا ہے' ٹھاکر اور روپ متی ہیں تو مجھے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔"

"میں تو سیلانی آدمی ہوں۔" میں نے کہا "میرا کوئی بھروسا نہیں' کب چلا جاؤں البتہ سونیا تو آپ کے پاس رہے گی اور روپ متی اور ٹھاکر بھی آپ کے پاس ہوں گے۔ اگر آپ گیسٹ ہاؤس بنانے کے معاملے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو پروگرام بنا لیجیے۔ ٹھاکر کو یہاں بلایا جا سکتا ہے یا ان سے آپ کی ملاقات جے پور میں بھی ہو سکتی ہے۔"

"اب تو سنجیدگی سے سوچنا ہی پڑے گا۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن۔۔۔ تم کہاں جاؤ گے ہمیں چھوڑ کر؟"

"میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔" میں نے جواب دیا "میری منزل کا کوئی نشان نہیں ہے۔ میں تو پتا نہیں کب تک اور کہاں کہاں بھٹکتا رہوں گا۔"

سونیا اس دوران میں اٹھ کر اندر جا چکی تھی۔ ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ وہ تیار ہو کر باہر آ گئی۔ اس نے وہی کل شام والا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

"دیدی! ہم ذرا بازار تک جا رہے ہیں۔ اگر آپ کو جانا ہو تو گاڑی منگوا لی جائے؟" سونیا نے قریب آ کر کہا۔

"نہیں بھئی۔ فی الحال میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ تم لوگ جاؤ۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" شوبھا نے جواب دیا۔

میں نے کرسی چھوڑ دی اور پھر پانچ منٹ بعد میں اور سونیا پہاڑی کی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر اتر رہے تھے۔

اس وقت شملہ اور ہردوار کی طرف سے آنے والی دو بسیں اڈے پر آ کر رکی تھیں اور زیادہ رونق نواح میں تھی۔

ان بسوں کے مسافروں میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ غیر ملکی سیاحوں کی ہر پارٹی میں ایک دو خوب صورت اور جوان لڑکیاں ضرور شامل تھیں۔

میں سونیا کے ساتھ کچھ دیر بازار میں گھومتا رہا۔ اس نے کچھ سودا سلف خریدا اور کاٹیج کی طرف واپس چلی گئی۔ میں آزادانہ طور پر کچھ دیر گھومنا چاہتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک تو میں بازاروں میں گھومتا رہا پھر پہاڑیوں کی طرف نکل گیا۔ شہر کے اطراف کی پہاڑیوں پر بھی مندروں کی بھرمار تھی۔ ہر تھوڑے فاصلے پر کوئی نہ کوئی مندر ضرور نظر آ جاتا تھا۔

کئی جگہوں پر غیر ملکی سیاحوں کی ٹولیاں ڈیرے جمائے نظر آئیں۔ پیسے بچانے کے لیے ان لوگوں نے رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ کسی پارٹی نے تو باقاعدہ خیمہ گاڑ رکھا تھا اور بہت سی پارٹیاں ایسی تھیں جنہوں نے محض چھولداریاں لگا رکھی تھیں۔

میں سہ پہر تک آس پاس کی پہاڑیوں پر گھومتا رہا اور بالآخر کاٹیج واپس آ گیا۔ سونیا اور شوبھا اس وقت بھی کاٹیج کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سونیا مجھے دیکھتے ہی اٹھ گئی۔

"ارے کہاں رہ گئے تھے تم۔ بیٹھو۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں۔"

"کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ چائے چلے گی۔" میں نے اس کی چھوڑی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سونیا کاٹیج میں چلی گئی۔ پہلے اس نے ایک کرسی لا کر وہاں رکھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ غیر ملکی سیاحوں کی ایک پارٹی اس طرف نکل آئی۔ ان میں تین مرد اور دو عورتیں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کندھے پر بیگ لاد رکھا تھا۔ وہ لوگ شاید پہاڑی پر مزید اوپر جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں دیکھ کر رک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کھلی جگہ پر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا اور پھر وہ لوگ ہماری طرف آ گئے۔

ان میں ایک آدمی کلین شیو تھا۔ دو کے چہروں پر بے ترتیب داڑھیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کی عمر پینتیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ تینوں ٹی شرٹس اور نیکرز پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دونوں لڑکیاں بے حد خوب صورت تھیں۔ ایک کی عمر سترہ اٹھارہ سال اور دوسری کی بیس اکیس سال رہی ہو گی۔ ان میں سے ایک نے جینز اور ٹی شرٹ پہنا ہوا تھا اور دوسری نے نہایت مختصر نیکر اور اوپن شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور سامنے کھڑا ہوا شخص بڑے اطمینان سے گریبان کے اندر تک جھانک سکتا تھا۔

"ہیلو!" قریب آ کر کلین شیو والے نے باری باری ہماری طرف دیکھا پھر اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئیں "اگر ہم یہاں کیمپ لگا لیں تو تم لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔

"یہ لوگ ہمارے لیے کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کریں گے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اردو میں کہا۔

"کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں کریں گے البتہ یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ ہمارا پڑوس آباد ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ ان سے کہہ دو جہاں جی چاہے کیمپ لگا لیں۔" شوبھا نے جواب دیا۔

میں نے ان سیاحوں کو اجازت دے دی کہ وہ جہاں چاہیں' اپنا کیمپ لگا لیں۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

وہ ہمارا شکریہ ادا کر کے کھلی جگہ پر اِدھر اُدھر گھومنے لگے اور بالآخر ہمارے کاٹیج سے تقریباً پچھتر گز کے فاصلے پر بڑے بڑے پتھروں کے بیچ میں انہوں نے کیمپ کے لیے جگہ منتخب کر لی۔ اس جگہ کیمپ لگانے کا ایک فائدہ یہ تھا کہ وہ ہوا سے بچ سکتے تھے۔

انہوں نے اپنے بیگ کھول لیے اور کام میں مصروف ہو گئے اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر وہاں پیرا شوٹ کے کپڑے کا ایک خیمہ نظر آ رہا تھا۔ اس خیمے کے اندر پانچ چھ آدمی آرام سے سو سکتے تھے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ پیرا شوٹ کا یہ خیمہ انہوں نے اپنے ایک بیگ میں سے برآمد کیا تھا۔

ان یورپین سیلانیوں کی زندگی بھی عجیب ہے۔ خانہ بدوشوں کی طرح دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے رہتے ہیں۔ نہ گھر کی فکر نہ وطن کی یاد۔ ان لوگوں کا کوئی وطن ہوتا ہی نہیں۔ جہاں پڑاؤ ڈال دیا وہی جگہ عارضی وطن بن گئی۔

ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ سورج غروب ہونے میں

اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد کتاب

پُراسرار بندے

قیمت 150 روپے

ڈاک خرچ 25 روپے

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں

کتابیات پبلی کیشنز

23 کراچی 74200

فون: 5802551, 5802552-58953

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لیے: C-63 فیز III ایکس ٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ ہم لوگ کاٹیج میں آگئے اور تھوڑی ہی دیر بعد یوگی دھیراج بھی پہنچ گیا۔ وہ شوبھا کو شیو آسن کی مشق کرانے لگا تو میں بھی قریب بیٹھا خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

مشق ختم کرانے کے بعد وہ دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا اور جب وہ واپس جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم پہاڑی سے اتر کر بازار میں آگئے اور مختلف راستوں سے گھومتے ہوئے شہر کی دوسری طرف ایک اور پہاڑی کے دامن میں پہنچ گئے۔

وہ کاٹیج خاصا بڑا تھا۔ وسطی کمرا تو کسی بڑے ہال کی طرح تھا۔ اس ہال میں کئی لوگ تھے جو یوگا کی اپنی اپنی مشقیں کر رہے تھے۔ دھیراج مجھے کاٹیج کے اوپر ایک کمرے میں لے گیا۔

بدھ یوگی گوتم گھوش کو دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار مہاراج اور ماسٹر ہنگ پائی یاد آگئے تھے۔

گوتم بھوش کی عمر پچاسی سال سے کم تو کسی طرح نہیں ہوگی۔ وہ لکڑی کی ایک چوکی پر آلتی پالتی مارے اس طرح سیدھا بیٹھا تھا کہ اس کی کمر اور گردن ایک ہی لائن میں تھی۔ ذرا سا بھی خم نہیں تھا حالانکہ اس عمر میں کمر کمان بن جاتی ہے اور چہرہ مکڑی کے جالے کا تاثر دینے لگتا ہے لیکن اس کے چہرے پر ایک بھی لکیر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اس کا سر گنجا تھا اور میرے اندازے کے مطابق اس کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔ اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ عام شخص اسے آلتی پالتی ہی کہہ سکتا تھا لیکن وہ پدم آسن کا انداز تھا۔ (پدم آسن کو کنول آسن یا لوٹس پوسچر بھی کہتے ہیں) بایاں گھٹنا موڑ کر پیر دائیں ران پر جانگ کے قریب اور دایاں گھٹنا موڑ کر بائیں ران پر جانگ کے قریب رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور بازوؤں میں معمولی سا خم بھی نہیں تھا۔

اس کے سامنے بچھی ہوئی دری پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ انہیں کوئی لیکچر دے رہا تھا۔ ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے' دوسرے لوگوں نے تو باری باری ہماری طرف دیکھا تھا مگر گوتم بھوش نے ہماری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ لگتا تھا جیسے اسے ہمارے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی ہو۔

یوگی دھیراج نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا اور میں بھی دری پر بیٹھے ہوئے ان آدمیوں کے پیچھے پدم آسن بنا کر بیٹھ گیا۔ میرے قریب ہی دھیراج نے بھی یہی آسن اختیار کیا تھا۔

پدم آسن یوگا میں ایک بہت ہی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے جسم میں غددوں کی نشوونما ہوتی ہے جس سے ہارمونز پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے دل' پھیپھڑوں' معدہ' جگر اور تلی کی کارکردگی پر خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہروں اور پٹھوں میں لچک پیدا ہوتی ہے۔ یہ انداز نشست جسم کو صحت مند رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور ستر اسی یا اس سے بھی زیادہ عمر میں آدمی اپنے آپ کو جوان محسوس کرتا ہے۔ مراقبے اور ارتکاز کی مشقوں میں بھی عام طور پر یہی آسن اختیار کیا جاتا ہے۔

دس منٹ گزر گئے اور پھر گوتم بھوش نے گہرا سانس لیتے ہوئے یہ نشست ختم کردی اور پیر چوکی سے نیچے لٹکا لیے۔ دری پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی نشست ختم کردی اور اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے مگر میں اپنی جگہ پر اسی انداز میں بیٹھا رہا۔

یوگی دھیراج اپنی جگہ سے اٹھ کر گوتم بھوش کے قریب چلا گیا اور اسے مدھم لہجے میں میرے بارے میں بتانے لگا۔ گوتم بھوش نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی اور مقناطیسی کشش تھی۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ عام آدمی کے لیے اس سے نظریں ملانا ممکن نہیں تھا لیکن میں پلکیں جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس وقت مجھے ماسٹر ہنگ پائی یاد آگیا تھا جس نے شمس بنی کے ذریعے میری آنکھوں میں بے پناہ قوت پیدا کی تھی کہ میں سانپ کی طرح پلکیں جھپکے بغیر گھنٹوں اپنے مقابل کی آنکھوں میں جھانک سکتا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ میں شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کر رہا تھا تو ماسٹر ہنگ پائی طلوع آفتاب سے ایک گھنٹا پہلے پہاڑی پر پرسکون اور کھلی فضا میں مجھے سانس اور مراقبے کی مشقیں کرایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شمس بنی کی مشقیں بھی ہوتی تھیں۔

مشرقی افق پر جب سرخی پھیلنے لگتی تو میں یہی پدم آسن اختیار کرکے پہاڑ کی چوٹی پر اس جگہ نظریں جما دیتا جہاں سے سورج طلوع ہونے والا ہوتا اور جب سورج طلوع ہونا شروع ہوتا تو میری نظریں خود بخود اس آتشی گولے پر مرکوز ہو جاتیں اور میں یہ تصور کرلیتا کہ سورج کی توانائی آنکھوں کے راستے میرے اندر منتقل ہو رہی ہے۔

شروع میں یہ پریکٹس صرف پانچ منٹ تک محدود رہی اور پھر ہر ہفتے اس میں ایک ایک منٹ کا اضافہ ہونے لگا۔ شروع میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ کبھی آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگتی اور کبھی پانی بہنے لگتا لیکن مجھے ماسٹر ہنگ پائی جیسے استاد کی رہنمائی حاصل تھی اس لیے میں نے بہت جلد ان دشواریوں پر قابو پالیا۔

انسان کے اندر پوشیدہ پراسرار اور غیر مرئی قوتوں کو بیدار کرنے کے لیے مختلف مشقیں اور ریاضتیں کی جاتی ہیں۔ ان میں شمس بنی کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شمس بنی سے آنکھوں میں ایسی پراسرار مقناطیسی چمک پیدا ہوجاتی ہے کہ کوئی عام آدمی اس سے نظریں نہیں ملا سکتا۔ اس سے نہ صرف دوسروں کو ہپناٹائز کیا جاسکتا ہے بلکہ ٹیلی پیتھی کی قوت کو بھی اجاگر کیا جاسکتا ہے۔

میں اس وقت یوگی گوتم بھوش کو کسی قسم کا چیلنج نہیں کر رہا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ میری نظریں گویا اس کی نظروں سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ گوتم بھوش نے سیدھا ہاتھ آشیرباد دینے والے انداز میں اٹھا دیا تو میرے دماغ کو ایک بار پھر جھٹکا سا لگا اور میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور اب میں پلکیں بھی جھپکا رہا تھا۔

بدھ یوگی گوتم بھوش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"کہاں سے آئے ہو؟" اس نے ملی جلی ہندی اور اردو میں پوچھا۔

"بہت دور سے۔" میں نے جواب دیا "کچھ لینے آیا ہوں۔ مجھے امید ہے' آپ مایوس نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں' تم نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "تمہاری نظریں بتا رہی ہیں کہ جو ارادہ کرلیتے ہو اس سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ میں تمہارے اندر اور بھی بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ تم نے کسی گرو سے سیکھا ہے یا......"

"گرو سے۔" میں نے کہا "میں نے کچھ وقت شاؤلن ٹیمپل میں گزارا ہے جہاں ماسٹر ہنگ پائی سے مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی اور......"

"ماسٹر ہنگ پائی!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"ماسٹر ہنگ پائی۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "میں نے ماسٹر ہنگ پائی سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کے ایک چیلے کی زیارت کرکے مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "سیوا تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں۔ میں آپ سے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں جاؤ گے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "ماسٹر ہنگ پائی کی آتما تمہیں میرے پاس دیکھ کر بہت خوش ہو رہی ہوگی۔"

"ماسٹر ہنگ پائی کی آتما!" میں اچھل پڑا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ چند مہینے پہلے ماسٹر ہنگ پائی کا انتقال ہوگیا تھا۔

ماسٹر کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں دارا کے تعاقب میں دنیا بھر کی آوارہ گردی کرتا رہا تھا اور مجھے کہیں سے ماسٹر ہنگ پائی کے انتقال کی خبر نہیں ملی تھی۔ ماسٹر کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی مہاراج وانگ ونگ پائے کا خیال بھی میرے ذہن میں ابھر آیا۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت ان کی عمر پچھتر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ کئی برس گزر گئے تھے اور پتا نہیں وہ ابھی زندہ تھے یا اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ بہرحال یہ دو ہستیاں ایسی تھیں جنہیں میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ انہی کی محبت اور محنت سے میں اس قابل ہوا تھا کہ نہ صرف اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکوں بلکہ دنیا والوں کو اپنے وجود کا احساس بھی دلا سکوں۔

میں مطمئن ہوگیا کہ ٹھیک جگہ پر آیا تھا۔

ہم دیر تک ماسٹر ہنگ پائی کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر ہمارا موضوع بدل گیا اور اب ہم یوگ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"یوگا کی جنم بھومی ہندوستان ہے۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "اور ہندو فلسفے کے مطابق لفظ "اوم" کو سب سے مقدس و متبرک سمجھا جاتا ہے۔ یہ آتما یا برہما کا نشان بھی ہے چنانچہ مختلف جاپ اس لفظ سے کیے جاتے ہیں۔ جاپ کے دوران میں انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوجاتا ہے اور اس پر ایک قسم کی محویت سی طاری ہوجاتی ہے لہٰذا اس محویت کے عالم میں جاپ کرنے والے کی غیر معمولی قوتیں بیدار ہونا شروع ہوجاتی ہیں جس کے نتیجے میں یوگی بہت سی غیر مرئی قوتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ ہندو یوگی اسے اوم کا کمال سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یوگا کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ کوئی بھی یوگی اپنے دھرم کے متبرک ترین نام سے جاپ کرکے کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

"کسی بھی ریاضت یا جاپ میں دھرم کو نظرانداز نہیں

کیا جاسکتا۔ ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ جنہوں نے فلسفہ ریاضت کے ذریعے مختلف مذاہب کی بنیاد ڈالی' راجے مہاراجے تھے۔ ان کے راج ان کے نظریات کے فروغ میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوئے لیکن وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ ان سے اوپر بھی ایک ایسی ہستی موجود ہے جسے قوت کا سرچشمہ کہا جاسکتا ہے۔

"تین ہزار سال قبل چندر گپت کے دور میں پیدا ہونے والا پتنجلی نامی شخص نہ صرف یوگ کا جد امجد مانا جاتا تھا بلکہ اس کی تھیوری کو بھی مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔ پتنجلی نے خدا کے وجود پر زور دیتے ہوئے انسان کو اس کے فعل کا مختار بنا کر باور کرایا کہ وہ ریاضت کاملہ کے ذریعے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرسکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی ذاتی صفات کو مٹا کر حواس کو مردہ کردے تاکہ روح عظیم سے جاملے۔ انسان فعل کا خود مختار ہے۔ وہ چاہے تو اپنے آپ میں خدائی صفات پیدا کرسکتا ہے۔" گوتم بھوش چند لمحوں کو خاموش ہو کر میری طرف دیکھتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو کہ انسان میں بے پناہ پراسرار قوتیں پوشیدہ ہیں۔ بعض قوتیں تو بغیر کسی کوشش اور جدوجہد کے حاصل ہوجاتی ہیں لیکن بعض قوتیں مختلف کٹھن ریاضتوں اور مشقوں کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہیں۔

"ماہرین یوگ نے ان پوشیدہ اور پراسرار قوتوں کو منکشف کرنے کے لیے نت نئے تجربات کیے۔ بھوک پیاس سے اپنے آپ کو نڈھال کیا اور عرصہ دراز تک اپنے آپ کو اذیتیں دیتے رہے اور بالآخر ان مخفی اور پراسرار قوتوں کا سراغ لگالیا اور انہیں اجاگر کرنے کے طریقے بھی وضع کیے۔ انہی پوشیدہ قوتوں میں ایک نہایت پراسرار اور زبردست قوت کنڈلینی ہے۔"

گوتم بھوش ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس بار اس کی خاموشی قدرے طول کھینچ گئی اور بالآخر وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماہرین یوگ کے کہنے کے مطابق ہماری ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں ایک ناگن کنڈلی مارے سو رہی ہے۔ مختلف جاپ اور ریاضتوں سے جب اس پر ضرب لگائی جاتی ہے تو یہ جاگ اٹھتی ہے اور بیدار ہونے کے بعد ریڑھ کی ہڈی میں پوشیدہ نسوں اور پٹھوں کے ذریعے دماغ کی طرف سفر شروع کردیتی ہے۔ اس سفر کے دوران میں کئی پڑاؤ آتے ہیں جنہیں یوگا کی اصطلاح میں کنول یا چکر کہا جاتا ہے۔ وہ ناگن یا پراسرار قوت ان پڑاؤ سے گزرتے ہوئے بالآخر دماغ کے اس حصے تک پہنچ جاتی ہے جہاں مائع ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس قوت یعنی کنڈلینی کا ملاپ دماغ کے مخصوص حصے سے ہوجاتا ہے تو اس وقت انسان کے قلب کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قلب سے مراد گوشت کا وہ لوتھڑا نہیں جو ہر انسان کے سینے میں دھڑکتا ہے بلکہ قلب سے مراد "مرکز روح" ہے۔ اس ملاپ کے بعد یوگی کی مشاہدے کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ یوگی پورے طور پر اپنے قلب اور جسم سے علیحدہ ہوجاتا ہے اور اس کا جسم مکمل طور پر اس کے کنٹرول میں آجاتا ہے اور اس سے حیرت انگیز کام لیے جاسکتے ہیں جن کا عام آدمی تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

گوتم بھوش ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس نے دھیراج کو اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ دھیراج کی واپسی ایک منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے بھی اشارے ہی سے گوتم بھوش کو کچھ بتایا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ گوتم بھوش نے میری طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"اس پراسرار قوت کنڈلینی کی بیداری کے بعد یوگی اپنے جسم سے بالکل علیحدہ ہوجاتا ہے اور وہ جسم کے ہر ہر عضو کو کنٹرول میں لے آتا ہے۔ اس وقت انسان کے قبضے میں بے شمار قوتیں آجاتی ہیں۔ وہ ہوا میں اڑ سکتا ہے اور پانی پر چل سکتا ہے۔ بھوک و پیاس سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور برسوں بغیر کھائے پیئے محض فضا سے خوراک حاصل کرکے زندہ رہ سکتا ہے۔ سردی گرمی اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتی اور وہ واقعی مافوق الفطرت بن جاتا ہے۔

"ریڑھ کی ہڈی سے دماغ تک کے سفر کے دوران میں کنڈلینی راستے میں کس کس پڑاؤ پر رکتی ہے اور اپنے اندر پوشیدہ اس پراسرار قوت کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے؟ یہ تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا اور مجھے وشواس ہے کہ تمہیں اس پراسرار سفر میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

گوتم بھوش اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اور دھیراج نے بھی اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ بیرونی ہال میں اس وقت بھی بیس پچیس لوگ بیٹھے ہوئے اپنی اپنی مشقوں میں مشغول تھے۔ ان میں ایک یورپی مرد اور دو عورتیں بھی شامل تھیں۔

گوتم بھوش وہیں رک گیا۔ اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی کو چھوا جس کا مطلب تھا کہ آج کی ملاقات ختم۔

یوگی دھیراج کالج کے باہر والے دروازے تک رخصت کرنے کے لیے میرے ساتھ آیا۔ اسے یہ جان کر بڑی خوشی

ہوئی تھی کہ میں اس کے گرو کا چیلا ہوں۔

کالج کے دروازے پر ہم نے ایک دوسرے کو پرنام کیا اور میں وہاں سے چل پڑا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت ساڑھے دس کا وقت تھا۔ خنکی بہت بڑھ گئی تھی۔ بازاروں کی رونق بھی اجڑ چکی تھی۔ تاہم کہیں کہیں ریسٹورنٹس کھلے ہوئے تھے۔

میں جب اپنے کاٹیج پر پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔ شوبھا دیوی سوچکی تھی اور سونیا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"ارے! کہاں رہ گئے تھے تم؟ میں تو پریشان ہوگئی تھی۔" سونیا نے کہا۔

"پریشانی کیسی؟" میں نے جواب دیا "میں کوئی بچہ تو ہوں نہیں جو راستہ بھٹک جاتا۔"

"راستہ بھٹکنے کی بات نہیں ہے۔" سونیا بولی "یہاں رہزنی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ غنڈے اور بدمعاش کونوں کھدروں میں گھات لگائے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اکیلے آدمی کو دیکھ کر جھپٹ پڑتے ہیں۔ چند روپوں کے لیے کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ہم جب سے یہاں آئے ہیں اس وقت سے اب تک یہاں اسی طرح قتل کی دو وارداتیں ہوچکی ہیں۔"

"یہ اتفاق ہے کہ مجھے راستے میں کوئی رہزن یا بدمعاش نہیں ملا۔ شاید آئندہ کبھی ملاقات ہوجائے۔" میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"چائے پیو گے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ طلب تو ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"چائے نہیں۔ میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔ بہت دیر سے میرا بھی دل چاہ رہا تھا اور میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" سونیا یہ کہتے ہوئے کچن کی طرف چلی گئی اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ باہر اگرچہ خاصی سردی تھی لیکن دروازے اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے بنگلے کے اندر کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ پیروں سے جوگرز اتارتے ہوئے مجھے اچانک ہی ان غیر ملکی سیاحوں کا خیال آیا جو کھلی فضا میں چھولداریوں یا خیموں میں پڑے ہوئے تھے لیکن پھر میں نے سر جھٹک دیا۔ ان کی زندگیاں گھروں سے باہر ہی گزرتی ہیں اور اس قسم کی تکلیفوں کے عادی ہوتے ہیں لیکن میں جانتا تھا کہ انہوں نے سردی کے بچاؤ کا معقول کوئی بندوبست ضرور کر رکھا ہوگا۔

چند منٹ بعد سونیا کافی بنا کر لے آئی۔ اس نے دونوں مگ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تمہارے نئے پڑوسیوں کا کیا حال ہے؟" میں نے اپنا مگ اٹھا کر چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد دو افراد یہاں آئے تھے۔ ایک وہ لڑکی جس نے نیکر پہن رکھی تھی اور دوسرا اس کا داڑھی والا ساتھی۔" سونیا نے جواب دیا "یہ لوگ پیرس سے آئے ہیں اور ایک دو روز یہاں رہ کر دھرم شالا کی طرف چلے جائیں گے۔ تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے میں انہی لوگوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ لوگ سردی سے ٹھٹھر رہے ہوں گے۔" سونیا بولی۔

"یہ تمہارا خیال ہے۔" میں نے جواب دیا "ان کے پاس سردی سے بچاؤ کا پورا بندوبست ہوگا۔ یہ لوگ سلیپنگ بیگز اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور یہ سلیپنگ بیگز اتنے گرم ہوتے ہیں کہ سردی لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"پھر بھی کھلی فضا میں۔۔۔۔" وہ بولی۔

"تو پھر ایسا کرو کہ انہیں یہاں لے آؤ۔" میں نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا "وہ لوگ یہاں کمرے میں سوجائیں گے اور ہم باہر گھوم پھر کر رات بتادیں گے۔"

"اب ایسی بھی ہمدردی نہیں ہے مجھے ان سے۔" سونیا نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔

میں نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کافی پینے کے بعد میں کچھ دیر اور وہاں بیٹھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ سونیا خالی مگ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

میں کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گیا اور پائنتی کی طرف پڑا ہوا کمبل کھول کر اپنے اوپر ڈال لیا۔ میرا خیال تھا کہ سونیا بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی جائے گی لیکن وہ میرے کمرے میں آگئی۔ ٹھنڈے پانی سے مگ دھونے سے وہ ایک دم سردی محسوس کرنے لگی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک کرسی بھی پڑی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائے گی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر بیڈ پر آگئی اور میرے کمبل میں گھس گئی۔ میں ایک دم حواس باختہ سا ہوگیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں شور مچا دوں گی۔ شوبھا اٹھ کر آجائے گی اور وہ تمہارے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں لے گی۔ آرام سے لیٹے رہو۔" اس نے مجھے کھینچ کر دوبارہ بستر پر گرا دیا۔

سونیا نے بڑی خوفناک دھمکی دی تھی۔ اگر اس کی تیز آواز سن کر شوبھا آجاتی تو وہ قصوروار مجھے ہی سمجھتی۔ ایسے معاملات میں مجرم مرد کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تو کوئی سوچنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتا کہ عورت بھی کسی مرد کے ساتھ اس قسم کی زیادتی کر سکتی ہے۔

میں نے سونیا کو گھور کر دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ آگئی۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میں واقعی شور مچا دوں گی۔" وہ بولی "لیکن کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے پاس بیٹھ سکوں۔"

"پرانی دوستی کے ناتے میں تمہیں اس حق سے محروم نہیں کروں گا لیکن اس حق کے معاملے میں مجھے تم پر بھروسا نہیں رہا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گی۔" سونیا نے جواب دیا۔

"لیکن اگر شوبھا جاگ گئی اور اس نے ہمیں اس طرح دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گی!" میں نے کہا۔

"شوبھا کی آنکھ صبح چھ بجے سے پہلے نہیں کھلے گی اور ویسے اطمینان رکھو۔ تمہارے بارے میں اس کے خیالات بہت مختلف ہیں۔ آج وہ تمہاری باتوں سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں اس کے بارے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

میں گہرا سانس لیتے ہوئے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور کمبل اپنے اوپر سے ہٹا دیا تاکہ اتفاق سے شوبھا کی آنکھ کھل جائے اور وہ اپنے کمرے سے نکل کر اس طرف آجائے تو اسے کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو۔

"کیا بتانا چاہتی ہو؟" میں نے گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شوبھا جے پور میں اپنی جائداد بیچنے اور یہاں گیسٹ ہاؤس کھولنے کے معاملے میں خاصی سنجیدہ ہے۔" سونیا نے جواب دیا۔

"کوئی بات ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"دوپہر کو بھی بات ہوئی تھی اور شام کو تمہارے جانے کے بعد بھی۔" سونیا نے جواب دیا "تمہاری باتوں سے اسے کافی حوصلہ ملا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے وہ جے پور سے نکلنا چاہتی ہے۔"

"کوئی خاص بات؟" میں نے ایک بار پھر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جے پور کا ایک سیاست داں دلیش مکھ بہت عرصے سے شوبھا کو پریشان کر رہا ہے۔" سونیا نے جواب دیا۔ وہ بھی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی تھی اور میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی "یوگا سے علاج تو ایک بہانہ ہے۔ وہ دلیش مکھ سے چھپ کر یہاں آئی ہے۔"

"کب تک چھپی رہے گی۔ ایک دن تو اسے واپس جانا ہی ہو گا۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "لیکن دلیش مکھ اسے کیوں پریشان کر رہا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے؟"

"پہلے تو دلیش مکھ کی نظریں شوبھا کی پراپرٹی پر تھیں۔" سونیا نے جواب دیا "کافی ہاؤس والی بلڈنگ کے علاوہ مہاویر روڈ پر اس کا ڈیڑھ ایکڑ کا ایک پلاٹ بھی ہے جس پر بھینسوں کا باڑا بنا ہوا ہے۔ یہ پلاٹ شوبھا کے شوہر نے بہت عرصے پہلے خریدا تھا اور اس کے گرد چار دیواری اٹھا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مناسب وقت پر بیچ دیا جائے گا لیکن زندگی نے اسے موقع نہیں دیا۔

"شوبھا نے یہ پلاٹ اپنے ایک جاننے والے کو بغیر کرائے کے دے دیا جس پر اس نے بھینسوں کا باڑا بنا لیا۔ شوبھا کا خیال تھا کہ اس طرح اس کے پلاٹ کی حفاظت رہے گی اور ضرورت کے وقت اسے خالی کروا لیا جائے گا لیکن تقریباً ایک سال پہلے گوالے کو پلاٹ خالی کرنے کو کہا گیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے پولیس کی دھمکی بھی دی گئی لیکن اس کے چند ہی روز بعد دلیش مکھ شوبھا کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔" سونیا خاموش ہو گئی۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ اس نے ٹانگیں سمیٹ کر کمبل اچھی طرح لپیٹ لیا "اس وقت میں بھی وہاں موجود تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ شوبھا کو دیکھ کر دلیش مکھ کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ تم نے شوبھا کو تو دیکھا ہی ہے۔ کتنی حسین ہے وہ۔ سادگی میں بھی اس کا حسن قیامت خیز ہے۔ میک اپ اور دوسرے کپڑوں میں تو وہ اور بھی قیامت بن جاتی ہو گی۔ بہرحال، دلیش مکھ کی آنکھوں سے ابھرنے والی چمک دیکھ کر میں بھی دہل گئی تھی۔

"دلیش مکھ نے شوبھا سے کہا کہ اس کے پلاٹ پر جس گوالے نے بھینسوں کا باڑا بنا رکھا ہے وہ اس کا آدمی ہے اس لیے اسے وہاں سے ہٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس

کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ وہ شکل و صورت سے بھی غنڈا ہی لگتا ہے اور اس نے غنڈوں کی فوج بھی پال رکھی ہے۔ دلیش مکھ کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جو اپنے رتبے سے بھرپور طور پر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور سماجی کاموں کی آڑ میں گھناؤنے دھندے کرتے ہیں۔ شہر میں ولایتی شراب اور منشیات کی سپلائی پر دلیش مکھ کا کنٹرول ہے۔ ایک دو اور پارٹیاں بھی اگرچہ یہ دھندا کر رہی ہیں لیکن دلیش مکھ نے ان سب کو دبا رکھا ہے۔

"انہی دنوں ایک اخبار نے اس کے کالے دھندوں کی تفصیل شائع کی تھی۔ اس کے ایک ہفتے بعد اخبار کے دفتر کو آگ لگا دی گئی۔ ایڈیٹر کو اس کے دفتر میں قتل کر دیا گیا اور اس رپورٹر کی ادھڑی ہوئی لاش بھی ایک سڑک پر پڑی ہوئی ملی تھی جس نے اس کے خلاف وہ رپورٹ مرتب کی تھی۔ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ اخبار کے دفتر اور پریس میں آتش زدگی اور ایڈیٹر اور رپورٹر کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن پولیس نے دلیش مکھ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کے برعکس اس کی مخالف پارٹی کے چند آدمیوں کو پکڑ کر ان کی دھنائی کر دی۔ بہرحال....." سونیا نے گہرا سانس لیتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"شوبھا نے ایک بار پھر گوالے کو پلاٹ خالی کرنے کو کہا اور اس کے انکار پر وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ پولیس کو یہ پتا چل گیا تھا کہ دلیش مکھ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ انہوں نے شوبھا کو ٹال دیا اور گوالے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

"اس کے دو دن بعد دلیش مکھ ایک بار پھر شوبھا کے فلیٹ پر پہنچ گیا اور اس کا پلاٹ خریدنے کی پیشکش کی۔ اس نے پلاٹ کی اتنی کم قیمت لگائی تھی کہ اس پر سوچنا بھی وقت اور ذہنی ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ اس وقت وہ پلاٹ کم سے کم بیس کروڑ روپے مالیت کا ہے اور دلیش مکھ اسے صرف پچاس لاکھ کی آفر دے رہا ہے۔ اس نے اپنے غنڈوں کے ذریعے شوبھا پر دباؤ بھی ڈلوانا شروع کر دیا۔ کافی ہاؤس میں نئے دن توڑ پھوڑ ہونے لگی۔ پولیس کو ان واقعات کی اطلاع دی جاتی لیکن شوبھا کے ساتھ قانون کے محافظوں کا رویہ بھی معاندانہ تھا۔ وہ الٹا اس کو دبانے کی کوشش کرتے۔

"دلیش مکھ کا دباؤ بڑھتا رہا۔ شوبھا نے راجا صاحب سے رابطہ کیا۔ یہ وہی سابق راجا ہے جس کا علاج شوبھا کے شوہر نے کیا تھا اور اس نے خوش ہو کر کافی ہاؤس والی بلڈنگ تحفے میں دے دی تھی۔ راجا صاحب کے دباؤ کی وجہ سے پولیس نے وہ پلاٹ خالی کروا دیا لیکن دلیش مکھ تلملا اٹھا۔

"ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کارروائی کے بعد دلیش مکھ دبک کر بیٹھ جاتا لیکن اس قسم کے لوگ آسانی سے کسی بات کو نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کو اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ دلیش مکھ بھی بپھر گیا اور شوبھا کو ہراساں کرنے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگا۔

"وہ سیاست داں ہے۔ اسمبلی کا ممبر ہے۔ اس کا بھی اثر و رسوخ ہے۔ اس کے علاوہ وہ غنڈا بھی ہے۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنی شکست نہیں مانتے۔ اس نے ایک اور چال چلی۔"

"کیسی چال؟" سونیا کے خاموش ہونے پر میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"چند مہینے پہلے وہ ایک بار پھر شوبھا کے فلیٹ پر آیا تو یکسر بدلا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ دلیش مکھ، شوبھا کے لیے بہت سے تحائف لے کر آیا تھا اور ان تحائف میں جیولری کا ایک قیمتی سیٹ بھی تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں شوبھا کو شادی کی پیشکش کی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھی اور انہیں ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔

"دلیش مکھ نے اسے سوچنے کے لیے ایک مہینے کا وقت دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اس نے غلط فیصلہ کیا تو اسے سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔

"اس بات کو تین مہینے گزر چکے ہیں۔ اس دوران میں دلیش مکھ خود تو اس کے فلیٹ پر نہیں آیا لیکن وہ بار بار فون کرتا رہتا ہے۔ پندرہ دن پہلے اس نے فون پر آخری مرتبہ دھمکی دی تھی کہ اگر شوبھا نے جواب نہیں دیا تو وہ اسے اپنے آدمیوں کے ذریعے اٹھوا لے گا اور جب تک کوئی اس کی مدد کو آئے گا اس وقت تک وہ شوبھا کے ساتھ بہت کچھ کر چکا ہو گا۔

"میں شوبھا کو بہت اچھی طرح سمجھ چکی ہوں۔ وہ بہت شریف عورت ہے۔ خوب صورت ہے، عمر بھی زیادہ نہیں ہے۔ دھرم کے معاملے میں اتنی کٹر بھی نہیں ہے۔ اسے دوسری شادی کرنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن دلیش مکھ جیسے شخص سے تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ وہ آدمی ہے جو کپڑوں کی طرح عورتیں بدلتا ہے۔ ایسے لوگ شادی کا مفہوم نہیں سمجھتے۔ شوبھا جانتی ہے وہ اسے شادی کا چکما کیوں دے رہا ہے۔ اس کی نظریں دراصل شوبھا کی جائداد، خصوصاً اس پلاٹ پر ہیں۔ شوبھا کے حسن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک جاگ اٹھتی ہے لیکن

میں جانتی ہوں شوبھا سے اس کا دل بہت جلد بھر جائے گا اور اس دوران میں جب وہ دھوکے سے یا دھونس دھمکیوں سے شوبھا کی جائداد پر قابض ہو جائے گا تو اسے اٹھا کر سڑک پر پھینک دے گا۔

"دلیش مکھ سے بچنے کے لیے ہی شوبھا چوری چھپے یہاں آتی ہے۔ کل گیسٹ ہاؤس یا ریسٹورنٹ کی بات ہوئی تھی۔ اس معاملے میں وہ اب بہت سنجیدہ ہے اور اس کا خیال ہے کہ جے پور کی جائداد فروخت کرنے کے لیے تمہارے دوست ٹھاکر سے مدد لے گی۔ شوبھا سمجھتی ہے کہ یہاں وہ محفوظ رہے گی۔ جے پور میں وہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دے گی کہ کہاں گئی ہے۔"

"یہ اس کی خام خیالی ہے کہ یہاں دلیش مکھ کے شر سے محفوظ رہے گی۔" میں نے سونیا کے خاموش ہونے پر کہا "دارا کو شاید تم بھول چکی ہو۔ اس گندی فطرت کے لوگ نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں نہ دوسروں کو بیٹھنے دیتے ہیں۔ دارا نے ہمیں کتنا پریشان کیا تھا۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔ اس نے کہیں بھی ہمیں چین سے نہیں بیٹھنے دیا لیکن بہرحال، شوبھا اگر یہ سمجھتی ہے کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی تو میں اس کے دل میں کوئی وسوسہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں ٹھاکر سے کہہ دوں گا۔ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا لیکن میرے خیال میں شوبھا اگر جے پور ہی میں رہے تو ٹھاکر بہتر طور پر اس کی مدد کر سکے گا۔"

"میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں ہے۔" سونیا نے جواب دیا "وہ دلیش مکھ سے خوف زدہ ہے۔ ایک اکیلی عورت اس جیسے لوگوں کے خلاف کر بھی کیا سکتی ہے۔ جے پور میں رہتے ہوئے اسے ٹھاکر کا سہارا تو بہت ہوگا اور وہ اپنے پتی کے دوست راجا سے بھی مدد لے سکتی ہے لیکن بات تو وہی ہے۔ جب تک کوئی اس کی مدد کو آئے گا شوبھا کا کام ہو چکا ہوگا اس لیے وہ اتنا دور چلی جانا چاہتی ہے کہ دلیش مکھ کی نظر اس تک نہ پہنچ سکے۔ اس نے شاید بہت پہلے سے یہ فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ یہاں چوری چھپے آئی ہے۔ اس کے کانی ہاؤس کے منیجر کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شوبھا یہ سوچ کر ہی یہاں آئی ہو کہ صورت حال کا جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کرے گی اور کل اس نے تمہارے سامنے اس کا تذکرہ بھی کردیا اور تم نے کاروباری حوالے سے اپنی رائے بھی دے دی اور ٹھاکر کے تعاون اور امداد کی امید بھی دلا دی لیکن اصل بات وہی ہے جو میں نے بتائی ہے۔ وہ دلیش مکھ کی نظروں سے دور رہنا چاہتی ہے۔"

"لیکن اس نے شاید یہ نہیں سوچا کہ اس دنیا میں قدم قدم پر دلیش مکھ جیسے لوگ ہیں جو اس کا جینا حرام کر دیں گے۔" میں نے کہا "عورت خوب صورت ہو، جوان ہو، اکیلی ہو اور اس کے پاس بے حساب دولت بھی موجود ہو تو یہ وقت کے پجاری مُردار خور گدھوں کی طرح اس کے آس پاس منڈلانے لگتے ہیں۔"

"ایک بات کہوں؟" سونیا میری طرف دیکھنے لگی۔

"بولو۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لیے اب کوئی مسئلہ باقی نہیں رہا۔ تم یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟" سونیا نے کہا "شوبھا کو بھی سہارا رہے گی اور۔۔۔"

"نہیں سونیا۔" میں نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا "میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہ سکوں گا۔"

"فی الحال تو تم یہیں ہو نا۔" سونیا نے کہا "ٹھیک ہے۔ ہم پھر کسی وقت بات کریں گے۔ ہو سکتا ہے صورت حال کو دیکھتے ہوئے تم اپنا خیال بدل دو۔"

"اس وقت تو مجھے نیند آرہی ہے۔" میں نے کہا "دن نکل رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم بھی جا کر سو جاؤ۔ صبح بات کریں گے۔"

اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ سونیا بغیر کسی حیل و حجت کے بستر سے اٹھ کر شوبھا والے کمرے میں چلی گئی۔" اپنا بستر گزشتہ رات ہی اس کمرے میں لے گئی تھی۔

میں نے بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھ لیا۔ کچھ دیر تک شوبھا کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

رات کو دیر سے سونے کے باوجود میری آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ میں بستر سے نکلا اور کاٹیج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا اور پھر ایک جگہ پر بیٹھ کر سانس کی مشق کرنے لگا۔ میں نے اس وقت بھی بیٹھنے کے لیے پدم یا کنول آسن اختیار کیا تھا۔ یوگا کی لاتعداد مشقوں میں یہ آسن اختیار کیا جا سکتا تھا۔

جیسے ہی سورج طلوع ہوا، میں اپنی مشق ختم کر کے کاٹیج کی طرف واپس آ گیا۔ واپسی پر میں بڑے بڑے پتھروں کی میں غیر ملکی سیاحوں کے خیمے کے قریب سے گزرا تھا۔ خیمہ چاروں طرف سے بند تھا اور اندر خاموشی تھی۔ ظاہر ہے وہ لوگ سلیپنگ بیگز میں دبے گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ ٹھیک سات بجے یوگی دھیراج آ گیا۔ وہ شوبھا کو اس کے کمرے میں مشق کرواتا رہا لیکن میں اس کے سامنے نہیں آیا اور اپنے کمرے میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا چائے پیتا رہا۔ سونیا بھی میرے سامنے بیٹھی چائے کی چسکیاں لے رہی تھی۔

شوبھا سے میری ملاقات ناشتے پر ہی ہوئی تھی لیکن اس وقت کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ میں خود سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا اور میرا خیال تھا کہ سونیا نے رات کو مجھ سے جو باتیں کی تھیں، شوبھا سے ابھی تک ان کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

ہم ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ گٹار کی آواز سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ان غیر ملکی ٹورسٹوں کا خیال ابھر آیا۔ کل جب وہ لوگ یہاں آئے تھے تو کسی ایک کے پاس میں نے گٹار بھی دیکھا تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد فضا میں ایک ناگوار سی بو محسوس کر کے میں چونک گیا۔ یہ بو میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ سونیا اور شوبھا نے بھی یہ بو محسوس کرلی تھی۔ شوبھا تو ناگوار سے انداز میں اپنے نتھنے سکوڑنے لگی۔

"یہ۔۔۔ یہ بو کیسی ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"ہمارے پڑوس میں جو لوگ آ کر آباد ہوئے ہیں وہ دم مار رہے ہیں۔" میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ شوبھا شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی لیکن سونیا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

میں کاٹیج سے باہر آ گیا اور نتھنے پھلا پھلا کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر ٹہلنے والے انداز میں ان بڑے بڑے پتھروں کی طرف چلنے لگا جن کی دوسری طرف ان غیر ملکیوں کا خیمہ نصب تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ ان کا داڑھی والا ایک ساتھی ایک پتھر پر بیٹھا گٹار بجا رہا تھا اور باقی چاروں خیمے کے سامنے زمین پر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھے چرس پی رہے تھے۔ نیکر والی لڑکی کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی چلم تھی جس میں تمباکو کے ساتھ چرس بھری ہوئی تھی۔ اس کے نیچے ایک باریک کپڑا لگا ہوا تھا۔ لڑکی نے چلم کو دونوں ہاتھوں میں مخصوص انداز میں پکڑ کر نچلا حصہ ہونٹوں سے لگایا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے سانس اندر کو کھینچنے لگی۔

ایک بھرپور کش لگانے کے بعد اس نے سلفی اپنے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دی اور نڈھال سی ہو کر زمین پر بوس ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔ وہ زمین پر بے سدھ سی پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

وہ باری باری کش لگاتے رہے۔ میں پتھر کی آڑ میں کھڑا تھا اس لیے وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ سکے تھے۔ میں جب ان کے سامنے آیا تو اس وقت سلفی دوسری لڑکی کے پاس تھی۔

انہوں نے مجھے دیکھ لیا لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ دوسری لڑکی نے سلفی دکھا کر مجھے بھی دعوت دی۔ میں ان کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور باری باری ان کی شکلیں دیکھنے لگا۔

یہ منظر میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ تھائی لینڈ میں خصوصاً بنکاک میں قدم قدم پر ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے تھے۔ امریکی اور یورپین ہپی محض منشیات کی طلب میں دنیا بھر میں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ان ممالک کا رخ کرتے ہیں جہاں چرس اور ہیروئن جیسی منشیات آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔

ان لوگوں کا تعلق بھی اسی قبیل سے تھا۔ ان میں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا تعلق لندن سے تھا جبکہ باقی تینوں فرانس کے رہنے والے تھے۔ سفر کے دوران میں ہی یہ لوگ آپس میں مل گئے تھے اور اس طرح باجماعت آوارہ گردی کر رہے تھے۔ منشیات کی طلب انہیں ہندوستان لے آئی تھی۔ ہندوستان میں انہوں نے اپنا سفر بمبئی سے شروع کیا تھا اور کل شام یہاں پہنچے تھے۔ ان کا ارادہ ہماچل پردیش کی طرف جانے کا تھا، جہاں بقول ان کے، دنیا کی بہترین چرس ملتی تھی۔

میں بھی ایک عرصے سے ہندوستان میں رہ رہا تھا لیکن یہاں منشیات کے حوالے سے میری معلومات صفر کے برابر تھی لیکن ان ہپیوں کو ایک ایک بات کا علم تھا۔ انہیں پتا تھا کہ پوست کی کاشت کن علاقوں میں ہوتی تھی اور سب سے اچھی چرس یا ہیروئن کہاں مل سکتی تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق پوست جتنی زیادہ بلندی پر کاشت ہوگی، چرس اور ہیروئن کی کوالٹی اتنی ہی زیادہ بہتر ہوگی اور یہ لوگ چرس اور ہیروئن کی اعلیٰ کوالٹی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہماچل پردیش کی طرف جا رہے تھے۔ وہاں چرس کی خرید و فروخت اور اس کے استعمال پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ چرس یا ہیروئن کسی بھی دکان یا ڈھابے سے بغیر کسی دشواری کے خریدی جا سکتی تھی۔

ہم جیسے لوگ جب سفر پر نکلتے ہیں تو سب سے بڑی پریشانی زادِ راہ کی ہوتی ہے۔ ہمیں سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ سفر کے دوران میں ہم کھائیں گے کہاں سے؟ ٹھہریں گے کہاں اور

دوسرے اخراجات کیسے پورے ہوں گے لیکن یورپین ہپیوں کو ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ اپنا بینک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہپیوں کے ہر گروپ میں کوئی نہ کوئی خوب صورت اور جوان لڑکی ضرور ہوتی ہے اور یہی خوب صورت لڑکی ان کے لیے بیرر چیک کی حیثیت رکھتی ہے جسے جب چاہا اور جہاں چاہا کیش کروالیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کے اخراجات پورے ہوتے رہتے ہیں۔

اس گروپ کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ دونوں جوان اور حسین تھیں اس لیے ان لوگوں کو اخراجات کی بھی کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک ان کے پاس بیٹھا گپ شپ کرتا رہا۔ انہوں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔ چائے کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا تھا لیکن چرس کا زہر بے دھڑک اپنے پھیپڑوں میں اتار رہے تھے۔ سلفی کے کش لگانے کے بعد اب انہوں نے چرس بھرے سگریٹ سلگا لیے تھے اور اِدھر اُدھر بیٹھے کش لگا رہے تھے۔ اس دوران میں نیکر والی وہ لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے اپنی شرٹ کا ایک اور بٹن کھول لیا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے میری طرف جھکنے لگی۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ بھی میری طرف بڑھا دیا۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کاٹیج کی طرف واپس آگیا۔

سونیا اور شوبھا کاٹیج کے سامنے کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک خالی کرسی میرے لیے بھی رکھی ہوئی تھی۔ ناشتے کے دوران میں ہم نے چائے نہیں پی تھی۔ سونیا کاٹیج میں جاکر چائے بنالائی اور چائے پیتے ہوئے میں انہیں ان غیر ملکی ٹورسٹوں کے بارے میں بتانے لگا۔

انہی باتوں کے دوران میں سونیا نے رات والی گفتگو کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس طرح مجھے شوبھا کے بارے میں اس سے براہ راست بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں نے صرف ایک سوال کیا تھا اور شوبھا پلٹ پڑی تھی۔ وہ رکے بغیر اپنے بارے میں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

"کیا آپ سمجھتی ہیں کہ اس طرح دلیش مکھ کے شر سے محفوظ رہ سکیں گی؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"شاید ایسا نہ ہو۔" شوبھا نے جواب دیا "لیکن میرے غائب رہنے سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ وہ شیطان مجھے بھلا دے گا اور عرصے بعد جب کبھی ہمارا آمنا سامنا ہو تو ہو سکتا ہے وہ....."

"دلیش مکھ جیسے بدکردار لوگ دولت اور عورت کو کبھی نہیں بھولتے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن بہرحال، اگر آپ اس میں اپنا کوئی مفاد سمجھتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں آج ہی ٹھاکر سے فون پر بات کرکے اسے یہاں بلوا لیتا ہوں۔ وہ آپ کو بہتر مشورہ دے سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم ٹھاکر کو یہاں بلا ہی لو۔ میں اس سے بات کروں گی۔" شوبھا نے کہا۔ گویا وہ جے پور میں اپنی جائداد بیچنے اور یہاں رشی کیش میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کرچکی تھی۔

اس دوران میں سونیا سودا سلف لینے کے لیے بازار چلی گئی۔ اس نے مجھے بھی چلنے کو کہا تھا لیکن اس وقت میرا کہیں جانے کا موڈ نہیں تھا۔ میں وہیں بیٹھا شوبھا سے باتیں کرتا رہا اور پھر شوبھا بھی اٹھ کر کاٹیج میں چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی نیکر اور اوپن شرٹ والی ہپی لڑکی آگئی اور نہایت بے تکلفی سے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کافی دیر تک بیٹھی باتیں کرتی رہی اور پھر میں نے اسے بھگا دیا۔

میں کرسی سے اٹھنا چاہتا تھا کہ شوبھا کاٹیج سے باہر آگئی۔ اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ نہا کر آئی تھی۔ کپڑے بھی بدل لیے تھے۔ وہی سفید ساڑی اور سفید بلاؤز۔ ساڑی کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا اور سر کے لمبے بال اس نے تولیے میں لپیٹ رکھے تھے۔

میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسے اس طرح بغور دیکھنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا تھا۔ وہ بیوہ ضرور تھی لیکن عمر زیادہ نہیں تھی اور اس کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ لانبا قد، گداز بدن، بادام جیسی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، گلاب کی پتیوں جیسے سرخ ہونٹ، لمبے سیاہ بال اور بدن کی رنگت ایسی جیسے میدے میں گلابی رنگ گھول کر بنایا گیا ہو۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ کم بخت دلیش مکھ نیچے جھاڑ کر اس کے پیچھے کیوں پڑ گیا تھا۔ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے جو اسے دیکھ کر ٹھنڈے سانس بھرتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کچھ نے مہذبانہ انداز میں اپنے دل کی بات بھی کہہ دی ہو لیکن انکار سن کر دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی ہو۔ یہ ہمت تو دلیش مکھ میں پیدا ہوئی تھی اور وہ اس کے درپے آزار ہو گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شوبھا کے حسن و شباب کے ساتھ اس کی دولت بھی تھی۔ دلیش مکھ سیاست داں تھا۔ اس کے بارے میں ہر شخص بہت

کچھ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوگا۔ شوبھا بھی جانتی ہوگی اور جب اس نے گوالے کے ذریعے اس کے پلاٹ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی تو شوبھا کو تجربہ ہو گیا تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے اور اب وہ اس سے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" شوبھا نے مجھے اپنی طرف گھورتے پاکر کہا۔

"اوہ۔ کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا سا گیا۔

شوبھا نے جرح نہیں کی اور کرسی اٹھا کر دھوپ میں بیٹھ گئی۔ اس وقت اگرچہ گیارہ بج چکے تھے لیکن نرم دھوپ بہت بھلی اور خوشگوار لگ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں ان ہپیوں کو پتھروں کی آڑ سے برآمد ہوتے دیکھ کر چونک سا گیا۔ انہوں نے اپنے بیگ کندھوں پر لاد رکھے تھے۔ قریب سے گزرتے ہوئے وہ چند لمحوں کو رک گئے۔ کلین شیو والے نے بتایا کہ وہ شملہ جا رہے ہیں۔ وہاں سے دھرم شالا کی طرف نکل جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد سونیا بھی سودا لے کر آگئی اور میں اٹھ کر اسی سرسبز پہاڑی پر اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ کاٹیج کے عقب میں تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ میں پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

شام کی چائے میں نے سونیا اور شوبھا کے ساتھ پی اور پھر میں بازار کی طرف نکل گیا۔ بازار میں کئی پبلک فون شاپس تھیں۔ میں ایک دکان پر رک گیا۔ دکان کیا تھی، سڑک کے کنارے لکڑی کا ایک بڑا سا کیبن تھا۔ وہاں ایک لمبی سی میز تھی جس پر تین ٹیلی فون سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے ایک لمبی سی بینچ بچھی ہوئی تھی۔ دوسری طرف ایک کرسی تھی جس پر اس فون شاپ کا مالک بیٹھا ہوا تھا۔ اس کیبن میں ایک طرف بوتھ بھی بنا ہوا تھا اس میں بھی دیوار کے ساتھ ایک ٹیلی فون سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس بوتھ میں ایک آدمی کھڑا ہو کر فون پر بات کر سکتا تھا۔

میز پر رائٹنگ پیڈ اور بال پین بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے ٹھاکر کا نمبر لکھ کر پیڈ کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف بڑھا دیا۔

"جے پور کا نمبر ہے۔ لائن ملنے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"لائن تو ایک سیکنڈ میں مل جائے گی مگر پچاس روپے ہوں گے مہاشے۔" اس نے نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کتنے منٹ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"منٹ کی کوئی پابندی نہیں۔ آرام سے بات کرلینا۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ نمبر ملا دو۔ میں اس فون پر بات کروں گا۔" میں نے بوتھ کی طرف اشارہ کیا اور جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کے حوالے کردیے۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ ٹرنک کال صرف پچاس روپے میں اور وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی حالانکہ ٹرنک کالز میں ایک ایک منٹ کا حساب ہوتا ہے اور بڑی مہنگی کالز ہوتی ہیں۔ یہ سب کرپشن کا کمال تھا۔ پی سی او اور ٹیلی فون ایکسچینج والے ملی بھگت سے ایسے دھندے کر رہے تھے کہ کمائی تو ان لوگوں کی ہو اور بوجھ سرکار کو اٹھانا پڑے۔

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لائن ملنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے اور پھر اس نے مجھے بوتھ کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے بوتھ میں داخل ہو کر ہک پر ٹنگا ہوا ریسیور اٹھا لیا۔

کال ٹھاکر ہی نے ریسیو کی تھی۔ وہ میری آواز سنتے ہی چہک اٹھا۔ میں پہلے تو ٹھاکر سے خیر خیریت دریافت کرتا رہا پھر جلد ہی اصل موضوع پر آگیا اور اسے شوبھا کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"بہتر ہوگا کہ تم ایک دو دن کے لیے یہاں آجاؤ۔ تم لوگوں سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں روپ متی اور ببلا کو لے کر ایک دو روز میں پہنچ رہا ہوں۔ وہ دونوں بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ بس تمہارے ہی نام کی مالا جپتی رہتی ہیں۔ ببلا تو ہمیں بہت پریشان کرتی ہے کہ ہم نے تمہیں جانے ہی کیوں دیا تھا۔ وہ جب تمہارے بارے میں سنے گی تو بہت خوش ہوگی۔"

"اوکے۔" میں نے کہا "میں انتظار کروں گا۔" میں نے اسے اپنا پتا سمجھا دیا اور فون بند کرکے بوتھ سے باہر آگیا۔

"مہاراج۔ آپ کو جب بھی فون کرنا ہو، یہاں آجایا کریں۔ ڈومیسٹک کال پچاس روپے اور انٹرنیشنل صرف سو روپے۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ اپنے دوستوں اور گھر والوں سے جتنی دیر چاہیں بات کریں۔"

"شکریہ مہاراج۔" میں نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے "جب بھی کہیں کال کرنے کی ضرورت پڑی، میں یہیں آؤں گا۔"

فون شاپ سے نکل کر میں کچھ دیر بازاروں میں گھومتا

رہا اور پھر گوتم بھوش کے کاٹیج آگیا۔ یہاں لوگ مختلف مشقوں میں مشغول تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔

مشقوں سے فارغ ہو کر کافی دیر گوتم بھوش سے گپ شپ ہوتی رہی اور پھر یہ طے ہوا کہ اگلے روز صبح مجھے کنڈلینی کی ریاضت شروع کردینی چاہیے۔

اس روز بھی میں رات گیارہ بجے کے قریب اپنے کاٹیج واپس آیا تھا۔ شوبھا سوچکی تھی البتہ سونیا میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے کھانے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کردیا۔ طبیعت نہیں چاہ رہی تھی۔

اگلے روز صبح ہی میں گوتم بھوش کے پاس پہنچ گیا۔ میرے لیے ایک الگ کیبن نما کمرے کا انتظام کردیا گیا تھا۔ اصل جاپ شروع کرنے سے پہلے میں نے سانس کی ایک دو مشقیں کیں اور پھر پدم آسن اختیار کرکے بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے گوتم بھوش نے مجھے بڑی تفصیل سے بتادیا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کے نیچے پوشیدہ آتشی ناگن یا کنڈلینی کو کس طرح بیدار کیا جاسکتا ہے اور پوری ریاضت کے دوران میں کیسے کیسے مرحلے پیش آتے ہیں۔

گوتم بھوش کے کہنے کے مطابق' ریاضت پر عمل کرتے ہوئے ایک خاص عرصہ گزر جانے کے بعد اچانک بجلی سی چمکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور یوگ کرنے والا اس روشنی میں نہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ یوگی اپنے آپ کو ہوا میں معلق محسوس کرتا ہے جیسے زمین سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا ہو اور جب ریاضت سے توجہ ہٹتی ہے تو وہ اپنے آپ کو زمین پر بیٹھے ہوئے پاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب اور ناقابل یقین قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور پھر وہ مرحلہ بھی آجاتا ہے جب ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے سے کوئی چیز اوپر کی طرف رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی کنڈلینی یا آتشی ناگن یا اس پراسرار قوت کی بیداری کا نقطہ آغاز ہے۔

جیسے ہی یہ پراسرار قوت بیدار ہونا شروع ہوتی ہے انسان کے اندر لاشعوری مزاحمت بھی شروع ہوجاتی ہے "ارے چھوڑو۔ یہ کس چکر میں پڑگئے ہو۔ یہ تو سادھوؤں کے کام ہیں۔ تم تو اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہو۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔" اس قسم کے لاشعوری خیالات حملہ آور ہوتے رہتے ہیں اور دراصل یہی وہ وقت ہوتا ہے جب زیادہ یک سوئی اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عدم توجہی سے سارا کھیل بگڑ سکتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے جب یوگ کرنے والے کو اپنا جسم سکڑتا اور سمٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی یہ تو اس پراسرار قوت کا کرشمہ ہے جو ریڑھ کی ہڈی میں بدستور اوپر کی طرف سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یوگی روشنی کے سمندر میں غوطہ زن ہو۔ پانی کی طرح روشنی کی لہروں کے تھپیڑے لگتے رہتے ہیں۔ یوگی اپنے آپ کو ایک نئی اور پراسرار دنیا میں محسوس کرتا ہے جہاں کی ہر چیز انوکھی ہے۔ ریاضت ختم کرنے پر سب کچھ غائب ہوجاتا ہے لیکن ریاضت جب دوبارہ شروع کی جاتی ہے تو یوگی ایک بار پھر اس پراسرار دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مرحلہ آتا ہے جب یوگی اپنے آپ کو بالکل مفلوج اور بے دست وپا سمجھنے لگتا ہے جیسے جسم میں جان نہ رہی ہو لیکن رفتہ رفتہ یہ کیفیت ختم ہوجاتی ہے اور یوگی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذہنی قوتیں وسعت اختیار کرنے لگتی ہیں اور ریڑھ کی ہڈی میں لہریں بدستور اوپر کی طرف رینگتے ہوئے محسوس ہوتی رہتی ہیں۔

اور پھر ایک اور نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ بھوک پیاس غائب ہوجاتی ہے۔ کسی سے بات کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بالکل الگ تھلگ رہنے کو دل چاہتا ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس پراسرار دنیا کی سیر کی جائے۔ بعض اوقات نیند اڑ جاتی ہے اور بے چینی کی سی کیفیت طاری رہنے لگتی ہے لیکن چند روز بعد یہ کیفیت تو ختم ہوجاتی ہے البتہ ایک نئی الجھن پیدا ہوجاتی ہے۔

یہ مرحلہ بہت زیادہ کٹھن ہوتا ہے۔ ریاضت یا جاپ میں دل نہیں لگتا۔ خیالات کو یکسو کرنا بے حد کٹھن لگتا ہے اور وہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر یوگی ہمت ہار جائے تو ساری محنت پر پانی پھر جاتا ہے۔ تاہم کوشش جاری رکھی جائے تو یکسوئی حاصل ہوتے ہی وہ پراسرار شکتی ریڑھ کی ہڈی کے نیچے ایک بار پھر اوپر کی طرف رینگتے ہوئے محسوس ہونے لگتی ہے۔

اس موقع پر کانوں میں عجیب خوفناک اور گرج دار آوازیں گونجنے لگتی ہیں جیسے پہاڑ ٹوٹ رہے ہوں۔ جسم پھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے حالانکہ جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یوگی کو یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی پراسرار قسم کے چکر میں پھنس گیا ہو اور اس چکر سے نکلنا اس کے بس میں نہ ہو۔

اب ایک نیا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ بھوک پیاس ختم

غائب ہوجاتی ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے اور بستر پر لیٹنے کی صورت میں ریڑھ کی ہڈی میں کرنٹ سا محسوس ہوتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں اور چہرے سے وحشت سی برسنے لگتی ہے۔ اس دوران میں وہ پراسرار قوت بدستور اوپر کی طرف چڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے اور بعض اوقات سانپ کے پھنکارنے کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں شاید اسی لیے اس پراسرار قوت کا نام کنڈلینی شکتی رکھا گیا ہے۔ اس پراسرار قوت کی حرکت روز بہ روز بڑھتی رہتی ہے اور وہ ریڑھ کی ہڈی میں راستہ بناتے ہوئے دماغ کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

اور پھر وہ آخری مرحلہ آتا ہے جب یوگی طرح طرح کے اندیشوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اسے خوف کے سائے گھیرنے لگتے ہیں۔ چہرہ زرد' گال پچکے ہوئے اور جسم میں آگ سی لگتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ یوگی برسوں کا بیمار نظر آتا ہے۔ اس دوران میں وہ پراسرار قوت بدستور اوپر کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے اور جب یہ دل میں سے گزرتی ہے تو دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔

اور پھر یہ مرحلہ بھی گزر جاتا ہے۔ جسم کی توانائیاں آہستہ آہستہ بحال ہونے لگتی ہیں۔ یہ پراسرار قوت جسم کے جس جس عضو سے گزرتی ہے اسے بیدار کرتی چلی جاتی ہے اور جب یہ کنڈلینی یا پراسرار قوت دماغ میں پہنچتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے پورا وجود روشنی میں نہا گیا ہو اور یوگی اپنے آپ کو نیا انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے اندر وہ قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں جن کا عام انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔

"گرو کی رہنمائی کے بغیر اس طرح کے جاپ خطرناک بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔" گوتم بھوش کہہ رہا تھا "اس لیے جب بھی تم کوئی پریشانی یا غیر معمولی بات محسوس کرو' مجھے بتا دینا۔ جاپ کے دوران میں خوراک کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ میں تمہیں ساتھ ساتھ بتاتا رہوں گا۔ اب تم شروع ہوجاؤ۔ ویسے مجھے وشواس ہے کہ تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

گوتم بھوش اس کیبن نما کمرے سے نکل گیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور تپسیا شروع کردی۔ گوتم بھوش نے مجھے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی کے نچلے حصے میں خوابیدہ اس پراسرار قوت کو بیدار کرنے کے لیے کس طرح ضربیں لگائی جاسکتی ہیں۔

تین چار روز گزر گئے۔ میری ریاضت جاری رہی اور اس دوران میں میری معمول کی سرگرمیوں میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

ٹھاکر کو فون کیے ہوئے پانچ روز گزر چکے تھے اور وہ چھٹا دن تھا۔ اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ ہم کاٹیج میں شوبھا والے کمرے میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے باتیں کررہے تھے کہ باہر سے بہت سے قدموں اور باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر ایک آواز سن کر میری آنکھوں میں چمک سی ابھر آئی۔ وہ ٹھاکر کی آواز تھی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک کی آواز ابھری اور میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔

وہ ٹھاکر ہی تھا۔ اس کے ساتھ روپ متی اور بملا بھی تھی۔ وہ تینوں مجھ سے اس طرح ملے جیسے مدتوں سے بچھڑے ہوئے ہوں۔ بملا کی آنکھوں میں تو آنسو آگئے تھے۔

سونیا اور شوبھا بھی روپ متی اور بملا سے اسی انداز میں ملی تھیں۔ شوبھا کی ان سے اگرچہ پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن روپ متی جے پور کی ایک معروف ہستی تھی۔ اسے تو شہر کا ہر شخص جانتا تھا۔ شوبھا نے ٹھاکر سے مل کر بھی بہت خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"آپ لوگ کب آئے۔ اس وقت تو کوئی بس نہیں آتی؟" سونیا نے پوچھا۔

"ہم لوگ دوپہر کو یہاں پہنچے تھے۔ بہت تھکے ہوئے تھے۔ گیسٹ ہاؤس میں جاتے ہی سوگئے۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

"گیسٹ ہاؤس کیوں ٹھاکر جی؟" شوبھا بولی "یہ کاٹیج موجود ہے نا۔ اس میں اتنی گنجائش تو ہے کہ سب لوگ سما سکیں۔"

"بات یہ ہے شوبھا جی۔" ٹھاکر نے کہا "میں نے سوچا سوٹ کیس اٹھائے کہاں گھومتے پھریں گے۔ پہلے کسی ٹھکانے کا بندوبست کرلیا جائے پھر تسلی سے آپ لوگوں کو تلاش کریں گے۔"

"اب تو آپ یہاں پہنچ گئے نا۔" شوبھا بولی "اب آپ لوگ واپس نہیں جائیں گے۔ صبح سونیا گیسٹ ہاؤس سے سامان لے آئے گی۔"

"چلیے' ٹھیک ہے۔ ہم آپ کی بات مان لیتے ہیں۔" ٹھاکر مسکرایا۔

"ہمارا یہ ٹھکانا تلاش کرنے میں دشواری تو پیش نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے پتا اس قدر تفصیل سے سمجھایا تھا کہ ہمیں کسی اور دروازے پر دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ گیسٹ ہاؤس سے نکلنے کے بعد سیدھے یہیں آکر رکے

ہیں۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔

سونیا ببلا کے قریب بیٹھی باتیں کررہی تھی پھر وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی اور کچھ دیر بعد چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پینے کے دوران میں باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ٹھاکر اور شوبھا ذاتی طور پر ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے مگر ان کا بزنس ایک ہی تھا۔ وہ ہوٹلنگ کے بزنس کے بارے میں بات کرتے رہے۔

"یہ جگہ بھی اچھی ہے۔" ٹھاکر کہہ رہا تھا "میں دو تین مرتبہ پہلے بھی یہاں آچکا ہوں۔ یہاں سرائے، گیسٹ ہاؤسز اور ہوٹل تو بے شمار ہیں مگر کوئی ڈھنگ کا ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بھی یہاں ہوٹل بنانے کے بارے میں سوچا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔"

"تو پھر آپ کا کیا خیال ہے؟" شوبھا نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا "اگر یہاں کوئی معیاری گیسٹ ہاؤس اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ بنایا جائے تو اس کی کامیابی کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟"

"اس قسم کے بزنس کبھی فیل نہیں ہوتے۔" ٹھاکر نے جواب دیا "میرا پروگرام تو یہ تھا کہ ایک معیاری رہائشی ہوٹل کے ساتھ ایک ہاسٹل بھی بنایا جائے۔ لوگ دور دراز کے علاقوں سے یہاں یوگا سیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہر شخص کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہوتا کہ وہ کسی اچھے ہوٹل میں رہائش اختیار کرسکے۔ سستے گیسٹ ہاؤسز اور سرائے وغیرہ میں انہیں وہ سہولتیں نہیں ملتیں جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ ہوسٹل کا ایک ایک کمرا دو دو آدمیوں کے لیے مخصوص رکھا جائے۔ کرایہ بھی کم ہوگا اور انہیں مناسب سہولتیں بھی ملیں گی لیکن یہ لمبا کام ہے۔ آپ ان بکھیڑوں میں کہاں پڑیں گی۔ ایک معیاری گیسٹ ہاؤس اور اس کے ساتھ ریسٹورنٹ ایک آئیڈیل پروگرام ہے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو بھی ہوسکے گا وہ میں آپ کے لیے کروں گا۔"

"شکریہ ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "لیکن اس کے لیے سب سے پہلے ہمیں یہاں کوئی مناسب جگہ دیکھنی ہوگی۔"

"وہ ہم دیکھ لیں گے۔" ٹھاکر نے جواب دیا "میں دو چار دن یہاں رہوں گا۔ ہم گھوم پھر کر دیکھ لیں گے۔ جگہ تلاش کرلیں گے۔"

"اور ٹھاکر جی۔" شوبھا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جے پور میں میرا پلاٹ اور کافی ہاؤس ہے۔ اس کا بندوبست بھی آپ ہی کو کرنا ہوگا۔ دراصل میں اب واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں آپ کو پاور آف اٹارنی دے سکتی ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں، میری جائداد کو ڈسپوز آف کردیں۔ اس شہر سے میرا دل اچاٹ ہوگیا ہے۔"

"کافی ہاؤس اور وہ بلڈنگ تو سمجھئے میں نے خرید لی۔" ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ اس کی جو قیمت لگائیں گی وہ میں دوں گا۔ اس میں کوئی بارگیننگ نہیں ہوگی اور وہ پلاٹ۔ اس کے لیے مجھے مارکیٹ سے قیمت لگوانی ہوگی اور وشواس کیجئے۔ میں اس میں بھی آپ کو کوئی نقصان نہیں ہونے دوں گا۔"

"وشواس!" شوبھا بولی "آپ نے عجیب بات کہہ دی ٹھاکر جی۔ وجدان کے ہوتے ہوئے مجھے کیا پروا ہوسکتی ہے۔ آپ میرے لیے جو بھی کریں گے، ٹھیک ہی کریں گے۔"

"وجدان تو ہیرا ہے ہیرا۔" ٹھاکر مسکرایا "میں نے تو اسے کہا تھا کہ میرا ہوٹل یا ریسٹورنٹ سنبھال لے لیکن یہ نہیں مانا۔ چلئے اچھا ہے آپ کے ساتھ رہے گا۔ آپ دونوں سے ملاقات کے بہانے ہمیں بھی کبھی کبھی یہاں آنے کا موقع مل جایا کرے گا لیکن وجدان نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ آپ دلیش مکھ سے خوف زدہ ہیں اور اس کی وجہ سے جے پور چھوڑنا چاہتی ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ جے پور ہی میں رہیں۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی مائی کا لال آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اس دلیش مکھ کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو تھرڈ ریٹ غنڈا ہے۔ رام گنج بازار اور گھاٹ دروازہ کے علاقے کی دکانوں سے بھتا وصول کیا کرتا تھا اور آئے دن پٹتا تھا۔ لوگوں سے بھی اور پولیس سے بھی۔ وہ تو پریم چند راٹھور نے اسے اٹھا دیا لیکن اسے بھی کیا ملا؟ دلیش مکھ کی وجہ سے اسے ذلت اٹھانی پڑی اور آخر اسی نمک حرام کے ہاتھوں مارا بھی گیا لیکن راٹھور ہی نے اپنی آستین میں پلنے والے اس سانپ کو دودھ پلا پلا کر اتنا طاقت ور بنا دیا تھا کہ پولیس راٹھور کے قتل کے الزام میں بھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرسکی۔ دراصل راٹھور کی زندگی میں ہی اس دلیش مکھ نے اپنے پنجے زمین میں اس مضبوطی سے گاڑ لیے تھے کہ اسے ہلانا مشکل ہوگیا تھا۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہوچکا ہے۔" شوبھا نے کہا "وہ تو بھگوان بھلا کرے راجا صاحب کا۔ اگر وہ پولیس کمشنر پر دباؤ نہ ڈالتے تو یہ شیطان میرا پلاٹ ہضم کرجاتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ اس نے میرے پلاٹ پر کئی منزلہ پلازا تعمیر کرانے کے لیے نقشہ بھی بنوالیا تھا۔"

"لیکن محض دلیش مکھ کے خوف سے جے پور چھوڑ کر آپ بہت بڑی غلطی کررہی ہیں شوبھا جی۔" ٹھاکر نے کہا۔

"اب تو اس شہر سے جی اکھڑ چکا ہے۔" شوبھا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "یہ جگہ مجھے پسند آگئی ہے۔ ہردوار بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ مہینے میں ایک چکر تو لگتا رہے گا۔"

"میں ایک بار پھر کہوں گا کہ دلیش مکھ کا خوف ذہن سے نکال دیں۔" ٹھاکر نے کہا "میں وہاں موجود رہوں گا۔ اس کے تعلقات کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں، وہ کتنا ہی طاقت ور کیوں نہ بن گیا ہو، اس نے غنڈوں کی کتنی ہی بڑی فوج کیوں نہ بنالی ہو مگر میں بھی ایسے لوگوں سے نمٹنا جانتا ہوں۔ میں غنڈوں کی اس سے بھی بڑی فوج جمع کرسکتا ہوں۔ اس نے کبھی آپ کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اسے جے پور تو کیا، پورے ہندوستان میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔"

"نہیں ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "میں نے جے پور واپس نہ جانے اور یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے اس کے ساتھ ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

شوبھا دو بجے تک ہمارے پاس بیٹھی رہی پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ہم لوگ لاؤنج میں تھے۔ میں نے ببلا اور روپ متی سے کہا تھا کہ وہ سونیا والے کمرے میں سوجائیں مگر انہوں نے اس جگہ سے اٹھنے کا نام نہیں لیا۔ صوفے اور کرسیاں ہٹادی گئیں۔ اس طرح دری پر اتنی جگہ بن گئی کہ ہم سب وہیں نیم دراز ہوگئے۔ سونیا کمرے سے کمبل اٹھا لائی تھی جو ہم نے پیروں پر ڈال لیے۔

چار بجے تک باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کبھی روپ متی، سونیا کو جے پور میں میری سرگرمیوں کے قصے سنانے لگتی اور کبھی سونیا مسکرا کر تھائی لینڈ والی میری کہانیاں اسے سنانے لگتی۔ روپ متی کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ میں نے تھائی لینڈ کے شہنشاہ کے خلاف ایک خوفناک سازش کو ناکام بنایا تھا اور میرے لیے اب بھی تھائی سرکار کی طرف سے یہ پیشکش برقرار ہے کہ میں جب چاہوں وہاں جا کر کوئی بڑا عہدہ سنبھال سکتا ہوں۔

اور پھر جانکی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ سونیا انہیں بتا رہی تھی کہ جانکی کس طرح مجھ پر جان چھڑکتی تھی۔ اس داستان میں تھائی کا ذکر بھی آیا۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ سونیا نے اس کی یاد تازہ کرکے میرے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔

صبح چار بجے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ٹھاکر تو بہت پہلے ہی اونگھنے لگا تھا۔ ببلا اور روپ متی ایک لمبے سفر سے تھکی ہوئی تھیں لیکن یہ ہمت تھی کہ چار بجے تک جاگتی رہی تھیں اور بالآخر وہ بھی اونگھنے لگیں۔ میں ٹھاکر کے قریب لیٹ گیا اور سونیا نے بھی ببلا کے قریب جگہ سنبھال لی۔

صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ سونیا بھی جاگ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ اس نے میرے لیے ہلکا سا ناشتا تیار کردیا۔ میں نے کچن ہی میں چوکی پر بیٹھ کر ناشتا کیا اور پھر بڑی آہستگی سے کاٹیج سے نکل گیا۔

صبح ناشتے کے بعد جوگنگ اور لمبی واک اگرچہ صحت کے اصولوں کے خلاف تھا لیکن میں پہاڑیوں پر دور تک چکر لگاتا رہا۔ مجھے جگہ جگہ کئی یوگی جاپ اور مختلف مشقوں میں مصروف نظر آئے تھے۔ میں نے بھی ایک جگہ بیٹھ کر تھوڑی دیر سانس کی مشق کی اور پھر گوتم بھوش کے کاٹیج پہنچ گیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد اپنی ریاضت شروع کردی۔

دس بجے میں اپنے کاٹیج واپس پہنچا تو شوبھا اور ٹھاکر باہر کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا اور سونیا نے کاٹیج سے برآمد ہوکر چائے کی ایک پیالی میرے ہاتھ میں بھی تھمادی۔ ببلا اور روپ متی ابھی تک سو رہی تھیں۔

گیارہ بجے کے قریب وہ دونوں بیدار ہوئیں تو میں اور ٹھاکر اس وقت بازار کی طرف جارہے تھے۔

ہم دونوں پورا دن شہر کے گرد و نواح میں گھومتے رہے۔ ہم نے دو تین جگہوں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ جگہیں شہر کے مرکز سے زیادہ دور بھی نہیں تھیں کہ کسی کے لیے وہاں پہنچنا مشکل ہو۔ ان میں ایک جگہ مجھے سب سے زیادہ پسند آئی تھی۔ وہ تقریباً پانچ سو فٹ اونچی پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع پتھریلا سا میدان تھا جس کے ایک طرف نشیب میں تاحد نگاہ سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میدان کے عقب میں پہاڑی میں تقریباً تیس فٹ چوڑی ایک دراڑ تھی جہاں تقریباً سو فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ جہاں پانی گرتا تھا وہاں ایک لمبا چوڑا تالاب سا بن گیا تھا اور اس تالاب کا پانی ایک چھوٹی ندی کی صورت میں نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔

ایک پتھریلا راستہ شہر کے نواح سے یہاں تک آتا تھا۔ اس راستے پر اگرچہ گاڑی وغیرہ نہیں چل سکتی تھی لیکن یہاں سڑک بنائی جاسکتی تھی۔

میرے خیال میں یہ گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے لیے ایک آئیڈیل جگہ تھی۔ اس آبشار کو گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کی حدود میں شامل کرکے اسے خوب صورت بنایا جاسکتا تھا۔

"یہ جگہ مجھے بھی پسند آئی ہے۔" ٹھاکر نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم شوبھا کو بھی یہ تمام جگہیں دکھادیں تاکہ وہ بھی کوئی رائے دے سکے۔"

"یہی مناسب رہے گا۔" میں نے کہا۔

واپس آتے ہوئے ہم ایک ڈھابے کے سامنے بیٹھ گئے جہاں چائے کا بھی بندوبست تھا۔ یہاں بینچوں پر چند گاہک اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ملازم لڑکے نے ہمارے سامنے چائے لاکر رکھ دی۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے؟" ٹھاکر نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے یوگا کی ایک مشق شروع کر رکھی ہے۔ تم اسے جاپ کہہ سکتے ہو۔ اس کے مکمل ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا۔ اس کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے بھی اپنا کپ اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ کپ اگرچہ میلا سا تھا لیکن پہلی چسکی لیتے ہی اندازہ ہوگیا کہ چائے بڑی خوش ذائقہ تھی۔

"میں نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ جے پور میں ہوٹل یا ریسٹورنٹ سنبھال لو لیکن تم نے منع کردیا۔" ٹھاکر نے کہا "اب تمہیں میرا مشورہ یہ ہے کہ یہاں رہ جاؤ۔ شوبھا کے پاس۔ وہ بڑی اچھی عورت ہے اور تم سے بہت متاثر ہے۔ تم یہاں رہ جاؤ گے تو اسے بھی ڈھارس رہے گی۔"

"کسی ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا شاید میرے مقدر میں نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "میرا کام ابھی ادھورا ہے۔ اسے مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد اگر موقع ملا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔"

"سونیا کی باتوں سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بہت عرصے تمہارے ساتھ رہی ہے اور جے پور میں بھی اس سے تمہاری ملاقات ہوچکی ہے لیکن جے پور میں تم نے کبھی اس کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔" ٹھاکر نے کہا۔

"جے پور میں سونیا سے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوئی تھی۔" میں نے جواب دیا "میں اس رات کافی پینے کے خیال سے کافی ہاؤس گیا تھا اور وہاں سونیا کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ ایک دو ملاقاتیں اس کے بعد بھی ہوئی تھیں اور میرا خیال تھا کہ میں اسے تم لوگوں سے ملواؤں گا لیکن ان دنوں ہم بلونت سنگھ والے معاملے میں الجھے ہوئے تھے اور پھر ہم سارسکا چلے گئے۔ واپس آنے کے بعد نہ تو سونیا سے میری ملاقات ہوئی اور نہ ہی میں اسے تم لوگوں سے ملوا سکا اور پھر جس روز میں یہاں رشی کیش پہنچا ہوں اس روز شام کو اتفاق سے سونیا سے آمنا سامنا ہوگیا۔ وہ مجھے کاٹیج میں لے آئی جہاں شوبھا سے ملاقات ہوئی۔

"شوبھا کے بارے میں سونیا نے مجھے دوسرے دن بتایا تھا اور پھر اس سے اگلے روز شوبھا سے براہ راست بات ہوئی۔ وہ دلیش مکھ سے اس قدر خوف زدہ ہے کہ جے پور واپس نہیں جانا چاہتی۔"

"لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ یہاں محفوظ رہے گی۔" ٹھاکر نے میرے خاموش ہونے پر کہا "دلیش مکھ کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کمینہ آدمی ہے۔ اس کے غائب ہونے کے بعد وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا رہے گا اور کبھی نہ کبھی اسے تلاش کرلے گا۔ شوبھا بے حد حسین ہے۔ اس کا خیال آسانی سے دل سے نہیں نکالا جاسکتا اور پھر اس کے ساتھ کروڑوں کی دولت بھی ہے۔ اس کا ڈیڑھ ایکڑ کا وہ پلاٹ ہی کم سے کم بیس بائیس کروڑ کا ہوگا۔ کافی ہاؤس والی بلڈنگ اور ہوا محل کے قریب رام گنج بازار کے چوراہے پر ایک بڑا مکان اور اس کے نیچے تین دکانیں بھی ہیں۔ کروڑوں کی جائداد ہے یہ اور دلیش مکھ جیسا شخص اس دولت کے لیے نرک تک بھی کسی کا پیچھا کرسکتا ہے۔ اگر شوبھا جے پور میں رہتی تو اسے کچھ تحفظ فراہم کیا جاسکتا تھا۔ وہ ہم سے تقریباً تین دن کے فاصلے پر آگئی ہے۔ کسی ایمرجنسی میں فوری طور پر اس کے پاس پہنچا بھی نہیں جاسکتا۔"

"لیکن وہ اب یہیں رہنے پر بضد ہے۔ یہاں بھی اس کی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بندوبست تو کرنا ہی پڑے گا۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "آؤ اب چلیں۔" ٹھاکر مجھ سے پہلے بینچ سے اٹھ گیا۔ اس نے چائے کے پیسے ادا کیے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا "تمہارے لیے ایک مسئلہ پیدا ہونے والا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے گردن گھما کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بملا۔" ٹھاکر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "وہ کہتی ہے کہ اب تمہارے پاس ہی رہے گی۔ جہاں تم جاؤ گے، تمہارے ساتھ جائے گی۔"

"یہ تو واقعی ایک مسئلہ ہوگا۔" میرے لہجے میں تشویش نمایاں تھی "میرا کوئی بھروسا نہیں کہ میں کب کس طرف نکل جاؤں اور میرے ساتھ کس وقت کیا حادثہ پیش آجائے۔ میں اسے اپنے ساتھ ساتھ نہیں لیے پھر سکتا۔ پلیز ٹھاکر! اسے کسی نہ کسی طرح واپس لے جانا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بملا بہت اچھی لڑکی ہے۔ بہت پیاری، بہت معصوم اور بہت بھولی بھالی۔ اگر میرا کہیں ٹک بیٹھنے کا ارادہ ہوتا تو اسے ضرور اپنے ساتھ رکھتا لیکن میں تو سیلانی ہوں۔ میرا اپنا کوئی بھروسا نہیں۔ اسے کس طرح اپنے ساتھ ساتھ لیے پھروں گا۔ اس کے علاوہ۔۔۔"

"اس کے علاوہ کیا؟" ٹھاکر نے میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"میرے سر پر نحوست کے سائے منڈلا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا "جس نے بھی میرا ساتھ دیا، مارا گیا۔ چاچا پرتاب سنگھ، تھائی، جانکی اور نجانے کون کون۔ مجھے تو ان کے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہے۔ تم خود کتنا نقصان اٹھا چکے ہو۔ روپ متی کو میری وجہ سے کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھانی پڑیں۔ یہ سب کچھ تو تمہارے ساتھ اور تمہارے سامنے ہوا ہے اور اب تم چاہتے ہو کہ میں بملا کو اپنی نحوست کے پروں میں سمیٹ لوں۔"

"وارا واقعی نحوست کا سایہ تھا جو کئی برسوں سے تمہارے سر پر منڈلا رہا تھا۔" ٹھاکر نے کہا "لیکن اب نحوست کا وہ سایہ فنا ہوچکا ہے۔ اب تمہارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ تمہارے آگے پیچھے خوف یا نحوست کا کوئی سایہ نہیں رہا۔ اب تمہیں اپنے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ یہ زندگی آوارہ گردی میں تو نہیں گزاری جاسکتی۔ میری باتوں کا برا مت ماننا وجدان۔ میں تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھ کر ہی بات کررہا ہوں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ہم سب تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔ روپ متی کو تم نے جس طرح سنبھالا دیا ہے وہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ میں تو اس سے مایوس ہوگیا تھا لیکن تم نے اپنی شرافت اور اپنے کردار سے اسے جس طرح گندگی کی دلدل سے نکالا ہے وہ ایک بہت بڑا چمتکار ہے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسا کبھی نہ کرتا بلکہ وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتا اور پھر بملا۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ جنگل میں دو دن تمہارے ساتھ رہی ہے۔ مجھے روپ متی نے بتادیا تھا۔ بملا نے جنگل میں رہتے ہوئے بے قابو ہونے کی کوشش کی تھی مگر تم نے اسے جس طرح سنبھالا وہ قابل تعریف ہے اور یہ تمہاری شرافت ہے کہ بملا تمہارے ہی نام کی مالا جپتی ہے۔ چند روز پہلے جب اسے یہ پتا چلا کہ ہم تمہارے پاس آرہے ہیں تو تم اس کی خوشی کا اندازہ نہیں لگاسکتے۔ اب اگر تم نے اسے واپس بھیج دیا تو وہ مرجائے گی۔ ویسے میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ تم ایک جگہ ٹک جاؤ۔ یہاں ہم ہیں، شوبھا ہے۔ یہ سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم ہمارے ہو۔ تمہیں اب فیصلہ کرلینا چاہیے۔"

ہم کاٹیج پہنچ گئے اور ہماری گفتگو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی تھی۔

اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے اور یوگی دھیراج شوبھا کو یوگا کی مشق کروا کے واپس جارہا تھا۔ اس سے ہماری ملاقات ہٹ سے چند گز کے فاصلے پر ہوئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پرنام کیا۔ خیرو عافیت دریافت کی اور وہ رخصت ہوگیا۔

سونیا کچن میں کھانا پکانے کی تیاری کررہی تھی اور بملا بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ کام چھوڑ کر فوراً ہی ہماری طرف آگئی اور جب میں صوفے پر بیٹھا تو وہ بھی میرا بازو پکڑ کر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی شوبھا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

رات کے کھانے کے بعد پھر ہماری محفل جمی۔ ٹھاکر نے شوبھا کو بتادیا تھا کہ ہم آج کچھ جگہیں دیکھ کر آئے ہیں۔ ایک جگہ ہم دونوں کو پسند ہے اور کل کسی وقت شوبھا کو بھی ساتھ لے جاکر دکھادیں گے اور پھر کوئی فیصلہ کرنے کے بعد اس جگہ کو خریدنے کی کوشش شروع کردی جائے گی۔

صبح ناشتے کے بعد سونیا بازار جاکر کرائے کی کار لے آئی اور ہم سب اس میں لد کر بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہم نے شوبھا کو وہ تمام جگہیں دکھادیں جنہیں ہم نے گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے قیام کے لیے گزشتہ روز منتخب کیا تھا۔ آخر میں آبشار والی پہاڑی کے دامن میں آگئے۔ یہاں گاڑی کا راستہ نہیں تھا اس لیے ہمیں ایک لمبا فاصلہ پیدل ہی طے کرنا پڑا تھا۔

آبشار سے چند گز کے فاصلے پر چند یورپین ہپی بیٹھے چرس بھرے سگریٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی تھیں اور ادھیڑ عمر اور جوان مرد بھی۔

"یہ اس قوم کے افراد ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔" ٹھاکر نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "لیکن ان لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تہذیب انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ یہ چرس اور ہیروئن کی طلب میں دنیا بھر میں مارے مارے پھرتے ہیں۔"

"اسی قوم نے تو اس خطے پر بھی طویل عرصے تک حکمرانی کی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور اب بھی یہ اپنے آپ کو ہمارا آقا اور ہمیں اپنا

غلام سمجھتے ہیں۔" ٹھاکر نے کہا "یہ لوگ جو ہمارے سامنے بیٹھے ہیں، چرسی اور موالی ان لوگوں سے بات کی جائے تو پتا چلے گا یہ اپنے آپ کو ہم سے برتر سمجھتے ہیں۔"

"اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں ٹھاکر۔" میں نے کہا "ان کے ہندوستان سے جانے کے بعد بھی یہاں آباد قوموں نے اپنے آپ کو نہیں سنبھالا۔ متحد اور متفق ہونے کے بجائے ان میں نفرتیں بڑھتی گئیں اور بہت سے معاملات تمہارے سامنے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو ان سے برتر تو نہیں کہہ سکتے۔"

"یہی تو المیہ ہے۔" ٹھاکر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "ہم نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوتا تو انہیں باہر سے آکر ہم پر حکومت کرنے کا موقع ہی نہ ملتا۔"

"ارے بھئی، تم لوگ کس بحث میں پڑ گئے۔ مجھے کچھ بتاؤ۔ سمجھاؤ تو سہی۔"

یہ شوبھا کی آواز تھی۔ ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ٹھاکر اسے بتانے لگا کہ اگر یہ زمین مل گئی تو گیسٹ ہاؤس کس طرف بنایا جائے گا اور ریسٹورنٹ کس طرف۔

"یہ آبشار بھی اوپن ائر ریسٹورنٹ کا ایک حصہ ہوگا۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے بتا رہا تھا "ریسٹورنٹ کی عمارت اس طرف ہوگی اور گیسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کے لیے وہ بہترین جگہ ہے۔" اس نے دوسری طرف اشارہ کیا "اور اس نشیب کے کنارے پر ریلنگ لگا کر اس کے ساتھ ساتھ بھی پختہ روش اور سرسبز لان بنایا جائے گا اور اس طرف پورا قطعہ لان پر مشتمل ہوگا جس میں حوض اور فوارے بھی ہوں گے۔ آپ یقین کریں شوبھا جی۔ اگر یہ جگہ مل گئی اور میری پلاننگ کے مطابق کام ہوا تو یہ اس وادی کا سب سے حسین اور سب سے بارونق گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ ہوگا۔ لوگ دور دور سے یہاں آیا کریں گے۔"

"سب کچھ آپ ہی کو کرنا ہے ٹھاکر جی۔" شوبھا نے کہا "اس جگہ کو خریدنے کا بندوبست، مل گئی تو نقشہ اور اس کے بعد تعمیر سب آپ ہی کے منشا کے مطابق آپ کی نگرانی میں ہوگا۔ ویسے یہ جگہ مجھے پسند آئی ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ اگر گنجائش نکلی تو میں اپنی رہائش کے لیے بھی ایک طرف کوارٹر بنوالوں گی۔"

"کوارٹر!" ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی "ارے اس طرف اس کارنر میں ایک خوب صورت کوٹھی بن سکتی ہے۔ بس آپ تو یہ پرارتھنا کیجئے کہ یہ جگہ ہمیں مل جائے۔"

ہم لوگ تقریباً ایک گھنٹے تک اس جگہ اور اس کے آس پاس گھوم پھر کر جائزہ لیتے رہے اور پھر واپس آگئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے بازار کے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا تھا۔

روپ متی اور ٹھاکر دو دن مزید رہ کر چلے گئے لیکن بلا یہیں رہ گئی۔ ٹھاکر نے شوبھا کی جے پور والی جائداد کو ڈسپوز آف کرنے کے لیے بھی ایک پروگرام بنالیا تھا۔ اس نے چند روز بعد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔

میری ریاضت معمول کے مطابق جاری تھی۔ میں نے اس میں کوئی ناغہ نہیں ہونے دیا تھا۔ میں روزانہ صبح مقررہ وقت پر یوگی گوتم بھوش کے کاٹیج میں پہنچ جاتا۔ اس ریاضت کے علاوہ بھی میں نے مختلف ہلکی پھلکی مشقیں جاری رکھی تھیں۔

بلا کی وجہ سے مجھے کچھ الجھن سی ہو رہی تھی لیکن میں اس سے بے رخی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت معصوم تھی اور میں اس کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف سونیا تھی۔ اس نے بھی ماضی کے حوالے سے مجھ سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔ ویسے مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ ہندوستان میں آکر ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر اسے شوبھا جیسی عورت مل گئی تھی۔ سونیا اس سے وابستہ رہ کر اپنی زندگی بنا سکتی تھی۔

ٹھاکر اور روپ متی کو گئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اس روز میں اور سونیا بازار سے واپس آرہے تھے۔ ہم دونوں کے پاس کچھ سامان تھا جس سے چلنے میں خاصی دقت پیش آرہی تھی۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ پہاڑوں کی برف پوش چوٹیاں سر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ سونیا کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک آدمی ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔" سونیا نے جواب دیا "ایک گھنٹا پہلے میں نے اسے بنئے کی دکان پر دیکھا تھا جہاں سے ہم سودا لے رہے تھے پھر آدھے گھنٹے بعد وہ دوسری جگہ بھی نظر آیا تھا اور اس وقت بھی ہمارے پیچھے آرہا ہے۔ تم ایک دم سے پیچھے مڑ کر مت دیکھنا۔ ہم کوئی چیز لینے کے بہانے سامنے والے ڈھابے پر رک جائیں گے۔ اس وقت تم اسے دیکھ سکو گے۔ وہ بغیر آستین کی چمڑے کی کالی جیکٹ پہنے ہوئے ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آرام سے چلتی رہو۔" میں نے جواب دیا "ہو سکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہو۔ اس شخص سے بار بار آمنا سامنا اتفاق بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ جس طرف ہم جا رہے ہیں اسے بھی ادھر ہی جانا ہو۔"

وہ ڈھابا ہم سے تقریباً پچاس گز آگے دو راستوں کے سنگم پر تھا۔ وہاں سے ایک راستہ تو ہمارے کاٹیج والی پہاڑی کی طرف جاتا تھا اور دوسرا راستہ دائیں طرف درختوں میں ہوتے ہوئے ایک اور پہاڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس طرف بھی کاٹیج تھے اور ایک گیسٹ ہاؤس بھی تھا۔

میں نے ڈھابے سے خشک دودھ کا ایک پیکٹ خریدا اور اسی دوران میں مجھے اس شخص کو دیکھنے کا موقع بھی مل گیا جو ہم سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رک گیا تھا اور بیڑی کے کش لگاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

درمیانے قد کا وہ آدمی گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس نے جینز اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کے اوپر کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی چین تھی جس میں لگا ہوا لاکٹ اس کے بالوں بھرے سینے پر جھول رہا تھا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ کلین شیو تھا مگر سر کے بال لمبے تھے جو چٹیا کی صورت میں گردن پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں کان میں سونے کی بالی تھی۔

میں نے ڈھابے پر جان بوجھ کر دیر لگا دی۔ میں اس دوران میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس طرح مجھے اس کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔

وہ چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اسے میں اپنا دشمن بھی نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن وہ صورت سے تو بدمعاش ہی لگتا تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ہو سکتا ہے وہ محض سونیا کی وجہ سے ہمارے پیچھے لگا ہو۔ سونیا کم بخت تھی بھی تو بہت حسین۔ اس نے بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس طرح وہ خود لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی تھی اور یہ بدمعاش شاید کسی توقع پر اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔ مجھے تو شاید اس نے نگاہوں میں ہی نہیں رکھا ہوگا۔ اس قسم کے غنڈے حسین عورتوں کے ساتھی مردوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بزعم خود وہ اپنے آپ کو بہت طاقت ور سمجھتے ہیں اور انہیں بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اپنے آپ پر۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مرد کو ایک دو ہاتھ مار کر مفلوج کر دیں گے اور عورت کو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس کے ذہن میں بھی شاید کوئی ایسی ہی بات تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ اب صرف پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر چمک رہی تھی جبکہ وادی میں سرمئی اندھیارا پھیلنے لگا تھا۔ میں نے سونیا کو اشارہ کیا اور ہم اپنے شاپنگ بیگز اٹھا کر آگے چلنے لگے۔

اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ شخص ہمارا پیچھا ہی کر رہا تھا لیکن میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ابھی تک ہمیں کسی طرح بھی پریشان نہیں کیا تھا۔ سونیا کو چھیڑا بھی نہیں تھا۔ کوئی آوازہ نہیں کسا تھا۔ میں کس بنیاد پر اس پر ہاتھ ڈالتا۔ ہمارے پاس کیا ثبوت تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے بھی اسی طرف جانا ہو جس طرف ہم جا رہے تھے۔

میں نے زندگی کا بہت کٹھن راستہ طے کیا تھا۔ بہت مشکلیں اٹھائی تھیں۔ یہاں چند لمحے سکون کے میسر آئے تھے۔ یہ میری زندگی کا عارضی پڑاؤ تھا اور میں یہاں کسی سے پنگے بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں اور سونیا باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔ پہاڑی پر درختوں کی وجہ سے شام کا دھندلکا کچھ زیادہ گہرا لگ رہا تھا اور ویسے بھی اب تو اندھیرے کو گہرا ہونا ہی تھا۔ آس پاس کے کاٹیجز میں بتیاں جل اٹھی تھیں۔

ہم پہاڑی کے بل کھاتے ہوئے کشادہ راستے سے اس راستے کی طرف مڑ گئے جو پودوں میں بل کھاتے ہوئے ہمارے کاٹیج کی طرف چلا گیا تھا۔ کچھ آگے جانے کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دو تین منٹ بعد وہ آدمی اسی کشادہ راستے پر سیدھا آگے کو نکل گیا تھا۔

کاٹیج کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی۔ بملا اور شوبھا برآمدے ہی میں کرسیاں ڈالے بیٹھی ہوئی تھیں۔ بملا نے اٹھ کر ہمارے ہاتھوں سے شاپنگ بیگ لے لیے اور اندر چلی گئی۔

کاٹیج کی طرف آنے والا راستہ بل کھاتا ہوا تھا اور اس راستے کے دونوں طرف قد آور پودے تھے۔ کاٹیج کے برآمدے میں بیٹھا ہوا آدمی کشادہ راستے پر آنے جانے والے کسی شخص کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن باہر کا کوئی آدمی چاہے تو پودوں میں چھپ کر بڑی آسانی سے کاٹیج کی نگرانی کر سکتا تھا۔

میں برآمدے میں بیٹھا سامنے دیکھتا رہا لیکن نہ تو کوئی ہیولا دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی آہٹ سنائی دی۔

باہر کھلی فضا میں بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن خنکی بڑھ گئی تھی اور مچھروں نے بھی یلغار کر دی تھی۔ ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔

شوبھا نے شاید میرے چہرے سے میرے بارے میں کچھ اندازہ لگا لیا تھا اور میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ پچھلے ایک دو روز کے دوران میں وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اس نے شاید یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لی تھی کہ گفتگو کے دوران میں جب میرے والدین یا تھائی اور جانکی کا تذکرہ ہوتا تو میرے چہرے پر اداسی چھا جاتی تھی اور پچھلے دو تین دنوں کے دوران میں تو میں خود اپنے آپ میں ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ کبھی لگتا جیسے میری کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور کبھی میں خود بیٹھے بیٹھے کھو جاتا۔

اس وقت میں شوبھا کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ بملا ہمیں چائے بنا کر دے گئی تھی اور وہ سونیا کے ساتھ کچن کے کاموں میں مصروف تھی۔

"میں دو تین دن سے دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ بجھے بجھے سے رہنے لگے ہو۔" شوبھا نے چائے کی چسکی لے کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس سے پہلے تو میں نے تمہیں ہمیشہ چہکتے ہوئے دیکھا ہے لیکن جب بھی کبھی جانکی وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو ایک دم اداس ہو جاتے ہو۔ تم خوش رہا کرو نا۔ تم ہنستے مسکراتے اچھے لگتے ہو۔"

"ہنستے مسکراتے چہرے تو سب کو اچھے لگتے ہیں لیکن میری خوشیاں تو نجانے کہاں کھو گئی ہیں۔ عجیب سی وحشت اور بے چینی رہنے لگی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔" شوبھا نے کہا "خوشی تو ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب کوئی انسان خوش ہوتا ہے تو اسے دنیا کی ہر چیز حسین لگتی ہے لیکن جب انسان اندر سے اداس ہوتا ہے تو دنیا کی خوب صورتی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جب من کا موسم پر کیف دپربہار ہوتا ہے تو باہر کا موسم خود بخود سہانا لگنے لگتا ہے۔ یاد رکھو، خوشیوں کو کوئی پلیٹ میں سجا کر ہمارے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ ہمیں خود ہی خوشیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہونا سیکھے کیونکہ ایک روز یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں خود بخود بڑی خوشیوں میں بدل جائیں گی۔

"ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرو اور دوسروں کو بھی خوش رکھو۔ دوسروں میں خوشیاں بانٹنے سے خوشیاں کم ہونے کے بجائے دگنی ہو جاتی ہیں۔ وہ باتیں جن کے یاد کرنے سے دل کو تکلیف پہنچتی ہے ان باتوں کو بھلانے کی کوشش کرو کیونکہ بار بار کریدنے سے زخم بھرتا نہیں بلکہ ناسور بن جاتا ہے اسی لیے ہمیں ہر لمحہ خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے اور زندگی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز ہونا چاہیے۔" وہ خاموش ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میرے حالات سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہوگا لیکن اس کے باوجود میں خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میری یہ ایک پریشانی دور ہو جائے تو دیکھنا میں کس طرح بدلتی ہوں۔ پتی کے زندہ رہنے تک میں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ ان کے بعد بس انہی کی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے سوا مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔"

شوبھا کا لیکچر خاصا طویل ہو گیا تھا۔ میں بھی دوسروں کو ایسے ہی لیکچر دیا کرتا تھا۔ خود دکھی تھا مگر دوسروں کو سکھی رہنے کی تلقین کرتا تھا اور اب شوبھا۔ وہ مجھے لیکچر دے رہی تھی۔ ہمیشہ خوش رہنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ گزرے ہوؤں کو بھول جانے کی تلقین کر رہی تھی لیکن خود سوگ کی سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور سوگ کی یہ سفید چادر پتی کی یاد کو اس کے دل میں تازہ رکھے ہوئے تھی۔

"آپ شاید مجھے تسلی دینے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہی ہیں حالانکہ آپ نے خود یہ سفید ساڑی..." میں کہتے کہتے رک گیا۔ مجھے اچانک ہی خیال آگیا کہ ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔

"یہ سفید ساڑی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "محض دنیا کو دکھانے کے لیے ہے۔ اس کے لیے تو میں نے بھی اپنا من مار رکھا ہے لیکن اب میں اس سے عاجز آگئی ہوں۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں بھی دنیا کے ہنگاموں میں حصہ لوں۔ رنگینیوں میں رنگی جاؤں اور..."

"اور میرا خیال ہے آپ کا دیا ہوا لیکچر مجھے دہرانا چاہیے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

شوبھا نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی بملا خالی کپ لینے آئی تو ہم بھی اٹھ کر لاؤنج میں آ گئے۔ سونیا کچن میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ بملا ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ اب ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا تھا۔ اسی دوران میں سونیا بھی ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"آدھے گھنٹے میں کھانا تیار ہو جائے گا۔" اس نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شوبھا سر ہلا کر رہ گئی اور پھر وہ نشا کر کے بارے میں بات

کرنے لگی۔ اسے ٹھاکر کی شخصیت بہت پسند آئی تھی۔

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے ہلکی سی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ وہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی چھوٹا سا پتھر لڑھکا ہو اور میرا خیال تھا کہ وہ آواز کسی اور نے نہیں سنی تھی کیونکہ ان میں سے کسی کے چہرے پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن میں اس آواز کو اپنا واہمہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی اٹھا دی اور اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے قدرے اونچی آواز میں بولا۔

"اب باتوں کا سلسلہ یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ میں باتھ روم سے ہو کر آؤں تو ہم یہ سلسلہ وہیں سے جوڑیں گے جہاں سے ٹوٹا تھا۔ بس چند منٹ" میں نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا اور قدرے جھک کر چلتے ہوئے شوبھا والے کمرے میں گھس گیا۔ اس طرح میں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میرے پیٹ میں شدید قسم کا مروڑ اٹھ رہا ہے۔

شوبھا والے کمرے میں آ کر میں نے بیچ کا دروازہ کھلا ہی رہنے دیا اور سیدھا ہو کر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر کی طرف بھی کھلتا تھا اور میرا رخ اسی طرف تھا۔

میں نے بڑی آہستگی سے بولٹ ہٹایا اور آہستہ آہستہ دروازہ کھولنے لگا۔ سونیا لاؤنج والے کمرے میں عین سامنے والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے کمرے کا بیرونی دروازہ کھولتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نمودار نہیں ہوا جس سے شوبھا یا ببلا کو کسی قسم کا شبہ ہو سکتا۔

میں کمرے سے نکل کر دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کاٹیج کی پچھلی طرف بڑھنے لگا۔ پتھر لڑھکنے کی وہ آواز اسی طرف سے آئی تھی۔

میرا شبہ درست نکلا۔ ایک انسانی ہیولا کھڑکی کے قریب کھڑا اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ لاؤنج ہی کی عقبی کھڑکی تھی لیکن اندر کی طرف دبیز پردہ پڑا ہوا تھا اور اس شخص کو شاید اندر دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ بار بار جگہ بدل رہا تھا اور پھر ایک جگہ اس نے آنکھیں شیشے کے ساتھ چپکا دیں۔ وہاں کونے سے شاید پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا اور اسے اندر دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں پیچھے سے جا کر اس کی گردن دبوچ لوں گا لیکن میں کار نر گھوم کر جیسے ہی آگے بڑھا' میرا پیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ پتھر پر شور آواز سے لڑھکتے ہوئے دور چلا گیا۔

وہ آدمی ایک دم سیدھا ہو گیا اور پھر مجھے دیکھتے ہی اس نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ یہ وہی آدمی تھا جو شام کو بازار سے ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آیا تھا۔ اس وقت تو وہ آگے نکل گیا تھا اور اب موقع پا کر کاٹیج کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ وہ پلک جھپکنے کی دیر میں مجھ سے تقریباً بیس گز آگے نکل گیا اور پھر شاید اس کا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں دوڑتے ہوئے پوری قوت سے اچھلا اور ہوا میں اڑتے ہوئے اس کے اوپر جا گرا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے جھاڑیوں میں ڈھیر ہو گیا۔

اس نے اپنے آپ کو چھڑا کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے گرفت میں لینے کی کوشش میں میرا ہاتھ اس کی گردن پر جھولتی ہوئی چٹیا پر پڑ گیا۔ اب کوئی شک باقی نہیں رہا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا۔

میں نے چٹیا کو مٹھی میں لے کر زور سے جھٹکا دیا۔ وہ کراہ اٹھا اور پھر شاید تکلیف کی پروا کیے بغیر اس نے اپنے سر کو زوردار جھٹکا دے کر چٹیا کو میری گرفت سے چھڑا لیا اور پلٹ کر اندھا دھند ہاتھ چلا دیا۔

اس کا گھونسا میری گردن پر لگا۔ میں لڑکھڑا گیا۔ سنبھلنے سے پہلے ہی دوسرا گھونسا کھوپڑی پر لگا۔ میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ اس کے تیسرے وار سے بچنے کے لیے میں تیزی سے نیچے جھک گیا۔ اس مرتبہ اس شخص کا وار خالی گیا اور وہ اپنی جگہ پر گھوم کر رہ گیا۔ میں نے اس کے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ کراہ کر دوہرا ہو گیا۔ میں نے کسی توقف کے بغیر ایک دو گھونسے اور جڑ دیے۔ وہ پیٹ پکڑے جیسے ہی مزید نیچے جھکا' میں نے اس کی گردن پر دو ہتڑ جما دیا۔ وہ منہ کے بل میرے قدموں میں گرا اور اس کے ساتھ ہی اسے موقع بھی مل گیا۔

اس نے میرے دونوں پیر پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ میں پشت کے بل گرا۔ وہ مجھ سے پہلے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میرے جسم پر ٹھوکریں برسانے لگا اور پھر ایک ٹھوکر مارنے کی کوشش میں اس کا اپنا پیر پھسل گیا۔ وہ لڑکھڑایا تو مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا اور اس مرتبہ میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

میری ہر ٹھوکر اور میرا ہر گھونسا اسے بلبلانے پر مجبور کر دیتا۔ میں نے ایک چوب سے اس کے کندھے پر وار کیا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹا تھا اور میرا یہ چوب کلہاڑے کی طرح اس کی

ہنسلی کی ہڈی پر لگا۔

اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا۔ میں نے اسے دو تین ٹھوکریں رسید کر دیں لیکن وہ موقع پا کر اٹھ گیا اور اندھا دھند لات گھما دی۔

ٹھوکر میری پنڈلی پر لگی۔ میں کراہتے ہوئے ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شخص حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے اوپر گرا۔

اس کی ایک ٹانگ میری گرفت میں آ گئی تھی اور وہ زوردار جھٹکے دیتے ہوئے اپنی ٹانگ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں کاٹیج کی طرف سے ببلا اور سونیا کی آوازیں سنائی دیں۔

"وجدان! کہاں ہو تم۔۔۔ کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے ادھر؟"

یہ سونیا کی آواز تھی۔ انہوں نے میرے حریف کی چیخ اور اٹھا پٹخ کی آوازیں سن لی تھیں۔ ببلا اور سونیا شاید اسی طرف دوڑی آ رہی تھیں۔

ان دونوں کی آوازوں کی وجہ سے میری توجہ ایک لمحے کو ہٹی تھی جس سے اس شخص کو موقع مل گیا۔ اس نے زور سے میرے کندھے پر دوسرے پیر کی ٹھوکر ماری۔ اس کی ٹانگ میری گرفت سے نکل گئی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ مجھ سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگتا رہا لیکن وہ قد آور پودوں اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اندھیرے میں اس کے دوڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور میں اس آواز کا تعاقب کر رہا تھا۔

اور پھر اچانک میرا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ میں منہ کے بل گرا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میں جھاڑیوں ہی میں گرا تھا۔ اگر پتھروں پر گرتا تو اچھی خاصی چوٹ آ سکتی تھی۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی اب غائب ہو چکی تھی۔ وہ شخص تاریکی میں بہت دور نکل گیا تھا اور عین ممکن تھا وہ اب تک پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا ہو۔ اب اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ببلا اور سونیا مجھے آوازیں دے رہی تھیں۔ میں اٹھ کر اس طرف چل پڑا۔ وہ دونوں مجھے کاٹیج سے دس بارہ گز دور ہی مل گئیں۔

"کیا ہوا۔ کون تھا وہ؟" سونیا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"وہی تھا جس نے شام کو ہمارا پیچھا کیا تھا۔ بھاگ گیا حرامی۔" میں نے ایک طرف تھوکتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی ہمت سنگھ؟" ببلا چلتے چلتے مجھے ٹٹولنے لگی۔

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ کوئی چوٹ نہیں آئی۔" میں نے کہا۔

ہم کاٹیج کے قریب پہنچے تو شوبھا بھی اپنے کمرے کے باہر والے دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے بھی سوالات کی بوچھار کر دی۔

"پتا نہیں کون تھا۔ کھڑکی میں سے جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے پکڑنے کی کوشش کی تو بھاگ نکلا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ کوئی باہر کھڑا کھڑکی سے جھانک رہا ہے؟" شوبھا نے پوچھا۔ اس وقت ہم اندر آ گئے تھے۔

"جب ہم یہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو میں نے کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنی تھی اور اس وقت مجھے باہر کسی کی موجودگی کا شبہ ہوا تھا۔" میں نے کہا اور پھر اس کے آگے کی بات بتانے لگا۔

"مگر وہ تھا کون اور اس طرح کھڑکی سے کیوں جھانک رہا تھا؟" شوبھا نے کہا۔ اس کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی اور میرا خیال ہے وہ معاملے کی تہ کو پہنچ رہی تھی۔

"پتا نہیں کون تھا۔" میں نے جواب دیا "شام کو جب ہم بازار سے لوٹے تھے تو اس وقت اس نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ سونیا نے میری توجہ تو دلائی تھی مگر میں نے زیادہ پروا نہیں کی تھی اور وہ اسی راستے پر اوپر چلا گیا تھا۔"

"یہ۔ یہ آدمی ایک دو مرتبہ کانی ہاؤس میں بھی آیا تھا۔" سونیا نے بتایا۔

"کیا۔۔۔؟" میں اچھل پڑا۔

"جے پور میں جب دلیش مکھ سے معاملہ چل رہا تھا تو پہلی مرتبہ میں نے اسے دلیش مکھ کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد بھی یہ ایک دو مرتبہ کانی ہاؤس میں آیا تھا۔" سونیا نے کہا۔

"اوہ۔۔۔" میں اس انکشاف پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا "تم نے شام کو یہ بات کیوں نہیں بتائی جب وہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا؟"

"اس وقت یہ بات میرے ذہن میں بھی نہیں رہی تھی۔" سونیا نے جواب دیا۔

اب یہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ شام کو ہمارا تعاقب محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ غنڈا دلیش مکھ کا آدمی تھا اور اسے

شوبھا کی تلاش تھی۔ سونیا چونکہ شوبھا کے کافی ہاؤس میں کام کرتی تھی اور شوبھا کے ساتھ وہ بھی جے پور سے غائب تھی اسی لیے اسے یہاں دیکھ کر اس نے سونیا کا تعاقب شروع کردیا تھا تاکہ اس کے ذریعے شوبھا کا پتا چلا سکے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ رشی کیش میں اس شخص کی موجودگی محض اتفاق تھی یا وہ شوبھا کی تلاش میں خاص طور سے یہاں آیا ہوا تھا؟ دلیش مکھ کو میں نے پرکھا نہیں تھا لیکن شوبھا اور ٹھاکر سے اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دارا سے بھی زیادہ کمینہ اور گھٹیا آدمی تھا۔ ایسے لوگ آسانی سے اپنی ہار نہیں مانتے۔

شوبھا کے حسن و شباب کے ساتھ کروڑوں کی جائداد بھی تھی۔ دلیش مکھ آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ شوبھا کے جے پور سے غائب ہوجانے کے بعد دلیش مکھ نے اس کی تلاش میں چاروں طرف اپنے آدمی دوڑا دیے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے اسے یہاں شوبھا کی موجودگی کی بھنک مل گئی ہو اور اس کی تلاش میں اپنا ایک آدمی یہاں بھی بھیج دیا ہو یا اس شخص کی یہاں آمد محض اتفاق ہو اور اس نے سونیا کو دیکھ کر اس کا پیچھا شروع کردیا ہو تاکہ شوبھا کی موجودگی کی تصدیق کرسکے۔

اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ آدمی بچ کر نکل گیا۔ اگر سونیا شام ہی کو اس کے بارے میں بتا دیتی تو میں اس کا کچھ ایسا بندوبست کرتا کہ وہ واپس نہ جاسکتا۔ اب صورت حال کچھ تشویش ناک ہوگئی تھی۔ میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"اگر یہ دلیش مکھ کا آدمی ہے تو اب کیا ہوگا؟" شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی... تھرتھراہٹ تھی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں ذرا احتیاط کرنی پڑے گی۔" میں نے جواب دیا۔

ایک بات میرے ذہن میں بھی تھی اور وہ یہ کہ یہ جگہ اب ہمارے لیے محفوظ نہیں تھی۔ ہمیں کسی اور جگہ کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ شخص اکیلا ہی تھا یا اس کا کوئی دوسرا ساتھی بھی اس شہر میں موجود تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے کچھ دشواریاں پیدا ہوسکتی تھیں۔

بملا اب بھی بار بار میرے جسم کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی کہ مجھے کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔ اس شخص کے چند گھونسے مجھے پڑے تھے۔ تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن ظاہر ہے' میری یہ تکلیف دوسروں کو نظر نہیں آرہی تھی۔

گیارہ بج گئے۔ ہم نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد سونیا نے دری پر دستر خوان بچھا دیا اور کھانا لگانے لگی۔

ہم نے تو پھر بھی تھوڑا بہت کھالیا لیکن شوبھا کے حلق سے نوالہ نہیں اتر رہا تھا۔ اس نے یہاں چند روز سکون سے گزارے تھے لیکن اب اس کا سکون برباد ہوگیا تھا۔ ہم نے زبردستی اسے کچھ کھانا کھلا دیا۔

اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے۔ مجھے شبہ تھا کہ اگر اس شخص کا کوئی اور ساتھی بھی رشی کیش میں موجود ہوا تو یہ رات ہمارے لیے بھاری ہوسکتی تھی لیکن میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا اور وہ رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح حسب معمول میں یوگی گوتم بھوش کے کاٹیج پہنچ گیا۔ اپنی مشق کی اور دس بجے کے قریب واپس آگیا۔

شوبھا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور انجانے سے خوف سے چہرے پر زردی سی کھنڈ رہی تھی۔ میں ناشتا کرکے دوبارہ شہر کی طرف آگیا اور مکان کی تلاش شروع کردی۔

مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ سہ پہر چار بجے تک میں نے تین چار مکان دیکھ ڈالے۔ ایک بنگلا نما مکان مجھے پسند آیا تھا۔ یہ بنگلا نہ تو زیادہ گنجان آبادی میں تھا اور نہ ہی وہاں آبادی زیادہ چھدری تھی۔ اس علاقے میں زیادہ تر بنگلے ہی تھے۔ یہ بنگلے مختلف شہروں کے رہنے والے ان دولت مند لوگوں کے تھے جو گرمیوں کا سیزن یہاں آکر گزارتے تھے۔ کچھ بنگلے مقامی لوگوں نے بھی بنوا رکھے تھے۔ یہ بنگلا ایک مقامی آدمی ہی کا تھا۔ بازار میں اس کی گرین گروسری اور پھلوں کی ایک دکان بھی تھی۔ وجے نامی اس شخص سے میری ملاقات ایک پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے ہوئی تھی۔

تین بیڈ رومز کے اس بنگلے کا لان خاصا وسیع تھا اور اس کی چار دیواری بھی خاصی اونچی تھی اور سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ یہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا اور ٹیلی فون کی وجہ سے زیادہ کرایہ دینا پڑا تھا۔

اسی روز میں نے یوگی دھیراج سے کہہ کر حفاظت کے لیے دو آدمیوں کا بھی بندوبست کرلیا تھا۔ وہ دونوں نیپالی تھے۔ ایک درمیانے قد کا تھا اور دوسرا قدرے نکلتے ہوئے قد کا مالک تھا۔ وہ دونوں چہروں ہی سے خرانٹ لگتے تھے اور ان دونوں کے پاس پستول بھی موجود تھے۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی ان کا یہ اسلحہ لائسنس یافتہ تھا یا ناجائز۔ مجھے بہرحال اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی۔ مجھے تو کام چاہیے تھا۔

یہ بنگلا ڈیکوریٹیڈ تھا۔ تینوں بیڈ رومز میں اور لاؤنج میں ضروری فرنیچر موجود تھا۔ میں نے کچھ اور سامان بھی ڈلوا دیا تھا۔ یہ سارا بندوبست کرتے ہوئے مجھے بار بار بازار کی طرف جانا پڑا تھا۔ اس دوران میں میری نظریں اس شخص کو بھی تلاش کرتی رہی تھیں لیکن وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کوئی اور مشتبہ آدمی نظروں میں آیا تھا۔

میں جب کاٹیج واپس پہنچا تو شام ڈھل رہی تھی۔ میں بیچ میں بھی ایک مرتبہ ادھر آیا تھا اور ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ سامان وغیرہ پیک کرلیں۔ ہم آج رات ہی یہاں سے شفٹ ہوجائیں گے۔

میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے سونیا وغیرہ نے تمام تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ سامان وغیرہ پیک کیا جاچکا تھا۔ کھانے پینے کے کچھ برتن ابھی کچن میں تھے۔ میں نے دن بھر کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھی میرا صرف چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔

سونیا چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پیتے ہوئے میں زیادہ تر شوبھا سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بے چاری بہت خوف زدہ تھی اور میں اسے تسلیاں دے رہا تھا۔ بملا بھی اسے بتا رہی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ میں نے کس طرح جے پور میں رامو جیسے بدمعاش کو مارا تھا اور پھر سارسکا کے جنگل میں لنگولی چوہدری ڈاکو کو کس طرح موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

چائے پینے کے بعد سونیا نے وہ برتن بھی دھو کر پیک کرلیے۔ اب ہم لوگ یہاں سے رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن مجھے گاڑی کا انتظار تھا۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے کرائے کی ایک گاڑی کا بندوبست کرلیا تھا اور اسے آٹھ بجے کے قریب یہاں آنے کا کہہ دیا تھا۔

سات بجے یوگی دھیراج بھی آگیا لیکن شوبھا آج یوگا کی پریکٹس کے موڈ میں نہیں تھی۔ یک سوئی اور ذہنی سکون نہ ہو تو کوئی بھی کام نہیں ہوسکتا اور یوگا کی پریکٹس کے لیے تو مکمل یک سوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ٹھیک آٹھ بجے گاڑی آگئی۔ یہ ٹویوٹا پک اپ تھی۔ سامان لاد کر سونیا اور بملا پیچھے ہی بیٹھ گئیں اور میں شوبھا کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ کاٹیج کو تالا لگا کر چابی میں نے اپنے پاس سنبھال رکھی تھی۔ یہ چابی کل صبح کاٹیج کے مالک کو واپس کردی جانی تھی اور اتفاق سے شوبھا نے یہ کاٹیج بھی اسی پراپرٹی ایجنٹ کے توسط سے لیا تھا جس نے مجھے وجے والا یہ بنگلا دلایا تھا۔

رات دس بجے تک ہم اس بنگلے میں سامان سیٹ کرچکے تھے۔ ایک کمرا شوبھا کو دے دیا گیا۔ ایک پر سونیا اور بملا نے قبضہ کرلیا اور تیسرا کمرا میرے حصے میں آیا۔ میرا اور شوبھا کا کمرا ساتھ ساتھ تھا اور بیچ میں دروازہ بھی تھا۔ شوبھا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس نے بیچ کا دروازہ کھول دیا تھا۔

ہمارے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دونوں نیپالی گارڈز بھی پہنچ گئے تو شوبھا کو کچھ تسلی ہوئی۔ مجھے بھی اس سیٹ اپ سے اگرچہ قدرے اطمینان ہوگیا تھا لیکن میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ ہم نے یہاں شفٹ ہونے میں کسی قسم کی رازداری سے بھی کام نہیں لیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یہ شہر اتنا چھوٹا تھا کہ کسی کو آسانی سے تلاش کیا جاسکتا تھا اور ویسے بھی ظاہر ہے ہم چوبیس گھنٹے گھر میں چھپ کر نہیں بیٹھے رہ سکتے تھے۔

اس رات کھانا میں ہوٹل سے لے کر آیا تھا۔ شوبھا نے کل رات کے بعد پہلی مرتبہ رغبت سے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد چائے کا دور بھی چلا۔ چائے کے دوران میں باتیں بھی ہوتی رہیں۔ شوبھا کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اس نے یہاں گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کا جو پروگرام بنایا تھا اس پر اب عمل نہیں ہوسکے گا۔

"کیوں۔ ایسی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں دلیش مکھ کی وجہ سے جے پور سے بھاگ کر یہاں آئی تھی۔" اس نے جواب دیا "اس نے یہاں بھی میرا کھوج لگالیا ہے۔ وہ مجھے چین سے بیٹھنے نہیں دے گا۔"

"یہ صورت حال وقتی ہے۔" میں نے کہا "اگر جے پور میں ہماری ملاقات ہوئی ہوتی تو یہ ٹنٹا ختم ہوچکا ہوتا۔ میں مانتا ہوں کہ وہ یہاں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ پہلے تو وہ اکیلی سمجھ کر تمہیں پریشان کرتا رہا ہے لیکن اب تم اکیلی نہیں ہو۔ ہم ہیں نا! اب اسے سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔"

"ہم نے جو پروگرام بنایا تھا' کیا اس پر عمل ہوسکے گا؟" شوبھا نے پوچھا۔

"کیا رکاوٹ ہے اس میں؟" میں نے کہا "میں نے کہا نا کہ وقتی پریشانی ہے۔ اس کے بعد سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے اس بات کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اٹھ کر باہر آگیا۔ دونوں نیپالی گارڈز اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ گیٹ کے اندر اور باہر دونوں طرف کیبن بنے ہوئے تھے۔ لمبے قد والا سریندر اندر والے کیبن میں بیٹھا ہوا تھا اور دوسرا درمیانے

قد والا رابندر باہر والے کیبن میں تھا۔ میں نے پہلے سریندر کے ساتھ گھوم پھر کر اندر کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ چار دیواری تقریباً چھ فٹ اونچی تھی اور اس کے اوپر کانٹوں والے تار کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ دیواروں کے اندر کی طرف قد آور پودے تھے لیکن ان پودوں کی شاخیں پتلی اور لچک دار تھیں۔ ان پر کسی کے چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس بنگلے کی پچھلی طرف خالی جگہ تھی۔ دائیں طرف ایک بنگلا تھا لیکن دونوں بنگلوں کے بیچ تقریباً پندرہ فٹ جگہ خالی تھی۔ اس طرح ایک گلی سی بن گئی تھی۔ بائیں طرف دو تین پلاٹوں کی جگہ خالی تھی۔ اس کے بعد ایک بنگلا تھا اور پھر کچھ جگہ خالی تھی۔ سامنے بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ کوئی بھی بنگلا ایک دوسرے سے ملا ہوا نہیں تھا۔

میں رابندر کے ساتھ دیر تک باہر کی صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر ان دونوں کو مختلف ہدایات دینے کے بعد اندر آگیا۔ میرے اندر آنے کے فوراً ہی بعد سونیا نے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کردی تھیں۔ عقبی دروازہ تو اس نے لاک کرکے اس کے سامنے ایک بھاری صوفہ رکھ دیا تھا۔

ٹیلی فون لاؤنج ہی میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھا کر جے پور میں ٹھاکر کا نمبر ملانے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس وقت ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں موجود ہوگا۔ میں نے ریسٹورنٹ کا نمبر ملایا اور کال ٹھاکر ہی نے ریسیو کی تھی۔

میں نے ٹھاکر کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کاٹیج سے اس بنگلے میں منتقلی کا بھی بتا دیا اور ٹیلی فون نمبر بھی نوٹ کروا دیا۔

"گھبراؤ نہیں۔" اس نے میری پوری بات سننے کے بعد کہا "میں یہاں دلیش مکھ کے بارے میں معلوم کرتا ہوں۔ اس کے بارے میں جیسے ہی کچھ پتا چلا' میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"

"میں تو نہیں' شوبھا گھبرا رہی ہے۔" میں نے جواب دیا "وہ کچھ اپ سیٹ ہو رہی ہے اور سوچ رہی ہے کہ شاید اسے یہاں سے بھی بھاگنا پڑے۔"

"وہ دلیش مکھ کے ڈر سے کب تک اور کہاں تک بھاگتی رہے گی۔ اس سے کہو' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ میری بات کراؤ اس سے۔" ٹھاکر نے کہا۔

میں نے شوبھا کو بلا کر ریسیور اس کے حوالے کردیا۔ شوبھا تقریباً دس منٹ تک ٹھاکر سے بات کرتی رہی پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے کچھ دیر ٹھاکر سے بات کی اور پھر فون بند کردیا۔

وہ رات بھی تقریباً جاگتے ہوئے گزری تھی۔ میں نے اگرچہ حفاظت کا معقول بندوبست کرلیا تھا لیکن شوبھا کے ذہن میں اب بھی کچھ خوف تھا۔ اگر وہ شوبھا کا معاملہ نہ ہوتا اور صرف سونیا یا ببلا میرے ساتھ ہوتی تو مجھے یہ سارا جھیڑا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ایسا مفلوج یا اپاہج تو نہیں تھا کہ مجھے اپنی حفاظت کے لیے گن مینوں کی ضرورت پڑتی اور ویسے میں یہ بات بھی جانتا تھا کہ ہونے والی بات ہو کر ہی رہتی ہے۔ میں نے نہایت معقول حفاظتی انتظامات کرلیے تھے لیکن اگر کچھ ہونا ہوگا تو میں اور دونوں گن مین بھی اسے نہیں روک سکیں گے۔

دو تین دن گزر گئے۔ شوبھا کے چہرے کا رنگ بھی اب نکھر گیا تھا۔ اس کے گالوں پر پھر سرخی نظر آنے لگی تھی۔ اس کا خوف بتدریج دور ہو رہا تھا اور وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح چہکنے لگی تھی۔

اور پھر اس دن تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں حسب معمول صبح چھ بجے ریاضت کے لیے یوگی گوتم بھوش کے کاٹیج چلا گیا تھا جہاں سے میری واپسی دس بجے کے قریب ہوئی۔ سونیا سے تو لان ہی میں ملاقات ہوگئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"کوئی عورت تم سے ملنے کے لیے آئی ہوئی ہے۔" سونیا نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "پتا نہیں تم کب سے چھپ چھپ کر اس سے ملتے رہے ہو۔ ہم سے تو کبھی تم نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا۔"

"کون عورت؟" میں گڑبڑا سا گیا "میں یہاں کسی عورت کو نہیں جانتا اور نہ ہی کسی سے ملتا رہا ہوں۔ کون ہے وہ؟"

"اندر بیٹھی ہوئی ہے۔ جا کر دیکھ لو۔" سونیا نے جواب دیا۔

میں برآمدے والے دروازے سے اندر آگیا۔ سونیا بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ لاؤنج میں عین سامنے والے صوفے پر ببلا بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹ بھی مسکرا دیے۔ اس کے سامنے دوسرے صوفے پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور میں صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ اس نے سرمئی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔

میں جھجکتے ہوئے آگے بڑھا اور جیسے ہی سامنے پہنچا' وہ عورت اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میرے دماغ میں ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ شوبھا تھی۔ سرمئی ساڑی اس کے گورے بدن پر خوب کھل رہی تھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کے حسن میں بے حد نکھار پیدا کردیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جس نے کل تک سوگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

سرمئی ساڑی پر ایک بالشت چوڑا خوب صورت بارڈر تھا۔ سلیولیس بلاؤز خاصا مختصر تھا۔ اس نے سونے کا خوب صورت لاکٹ اور ہلکے بندے پہن رکھے تھے۔ وہ ایک بھرپور جوان اور حسین عورت تھی۔ بلاؤز میں اس کا شباب گویا چھلکا پڑ رہا تھا۔ میرے لیے اس پر نظریں ٹکانا مشکل ہوگیا اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر دلیش مکھ اس کے لیے مرنے مارنے کو تیار تھا تو کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ اس عورت کے لیے تو سلطنت بھی لٹائی جاسکتی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک اپنی زندگی کو اس طرح ضائع کیوں کرتی رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسے شوہر کی موت کا بہت صدمہ ہوگا لیکن چند روز پہلے کاٹیج میں اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جانے والوں کے لیے اپنی زندگی کو روگ نہیں لگایا جاسکتا۔ بن باس لے لینا یا اپنی زندگی کو تج دینا تو اپنے ساتھ ہی بہت بڑا ظلم ہوتا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عورت کو عیش و عشرت میں زندگی گزارنی چاہیے یا وہ شمع محفل بنی رہی لیکن اسے اتنا حق تو حاصل ہو کہ وہ زندگی کی خوشیوں میں سے اپنا حصہ وصول کرسکے۔

میرے سامنے کھڑی ہوئی شوبھا نے نمسکار کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلکش مسکراہٹ تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور عورت نظر آرہی تھی۔ نجانے اس وقت میرا دل یہ کیوں چاہنے لگا کہ میں آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں لیکن میں بڑی مشکل سے اپنا اس خواہش پر قابو پاسکا تھا۔

"گڈ!" میں مسکرا دیا "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی لیکن بہرحال' دیر آید درست آید۔"

میری اس بات پر ان تینوں نے قہقہہ لگایا اور جب ہنسی تھمی تو میں نے شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو یکایک یہ خیال کیسے آگیا؟"

"میں کئی روز سے اپنا حلیہ بدلنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس روز میں نے تمہیں تو لمبا چوڑا لیکچر سنا دیا تھا لیکن بعد میں اپنے بارے میں سوچتی رہی کہ میں خود ان باتوں پر کس حد تک عمل کر رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے....." وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

"میں جب جے پور سے نکلی تھی تو یہ طے کرلیا تھا کہ جہاں بھی جاؤں گی' اس اداسی اور افسردگی سے نجات حاصل کرلوں گی۔ میں اپنے بہت سارے کپڑے اور زیور ساتھ لے کر آئی تھی لیکن ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ لوگوں کی باتوں سے ڈر لگتا تھا لیکن جب سے اس بنگلے میں آئے ہیں یہ دونوں میرے پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔" اس نے ببلا اور سونیا کی طرف اشارہ کیا "اور پھر میں نے بھی سوچا کہ پوری زندگی تو سوگ میں نہیں گزاری جاسکتی۔ دھرم بھی ودھوا (بیوہ) عورت پر یہ پابندی نہیں لگاتا کہ وہ دوسری شادی نہ کرے۔ یہ عورت پر منحصر ہے کہ وہ مرنے والے پتی کی یاد کو سینے سے لگائے رکھے یا پہاڑ جیسی زندگی گزارنے کا کوئی دوسرا سہارا تلاش کرلے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجھے اپنے پتی سے بہت محبت تھی۔ اس نے مجھے زندگی میں بہت خوشیاں دیں۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی لیکن کسی کی یادوں کے سہارے تو زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "میں جے پور میں بہت سی ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جنہوں نے ودھوا ہونے کے بعد دوسری بلکہ اس کے بعد تیسری شادی بھی کرلی۔ ودھوا عورت کے لیے شادی نہ کرنا کوئی زبردستی نہیں ہے۔ اگر وہ دوسری شادی کرنا چاہے تو اسے منع نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ دولت مند طبقے میں تو سب کچھ جائز سمجھا جاتا ہے۔ دھرم کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے طرح طرح کی تاویلیں گھڑلی جاتی ہیں اور پنڈت بھی ان دھن والوں کا ساتھ دیتے ہیں لیکن نچلے اور غریب طبقے پر ساری پابندیاں عائد رکھی جاتی ہیں۔ ان کا کوئی قدم عام ڈگر سے ہٹ جائے تو ان کا حقہ پانی بند کردیا جاتا ہے اور....."

"لمبی بحث میں جانے کی ضرورت نہیں شوبھا جی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ مجھے یہ بتایئے کہ کیا آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کسی کو نظروں میں ٹکالیا ہے؟"

"نہیں نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" شوبھا جلدی

سے بولی۔ اس کا چہرہ کچھ اور گل گوں ہو گیا تھا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو بس۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا "تو پھر کیوں نا آج دوپہر کا کھانا باہر ہو جائے۔ یہاں ایک اچھا ریسٹورنٹ بھی ہے۔ پریم نورس۔ یورپین اور چائنیز کھانے بہت اچھے بنتے ہیں وہاں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن۔۔۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی "ایک بار باہر نکلو گی تو ساری جھجک اور خوف دور ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ چلو۔" شوبھا نے میری بات مان لی۔

"ارے بھئی۔ ہمیں دس منٹ کا وقت دو۔ ہم بھی تو تیار ہو جائیں۔" سونیا نے جلدی سے کہا۔

وہ دونوں فوراً ہی اپنے کمرے میں گھس گئیں اور دروازہ بند کر لیا۔ میں شوبھا کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ میری نظریں بار بار شوبھا کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میری نظروں میں میل نہیں تھا نہ ہی من میں کھوٹ تھی لیکن نجانے کیوں میرے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی تھی اور دل چاہتا تھا اسے دیکھتا رہوں۔

ٹھیک دس منٹ بعد سونیا اور بملا بھی تیار ہو کر کمرے سے نکل آئیں اور اس کے دو تین منٹ بعد ہم بنگلے کے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ میں نے سریندر اور رابندر کو کچھ ہدایات دیں اور ہم ایک طرف چلنے لگے۔

بازار زیادہ دور نہیں تھا۔ شوبھا ہمارے ساتھ پہلی مرتبہ اس طرح آزادی سے باہر نکلی تھی اور بہت خوش تھی۔

ہم کافی دیر تک بازاروں میں گھومتے رہے۔ ایک چکر لاری اڈے کا بھی لگایا۔ شوبھا انجائنا کی مریضہ تھی۔ اس کی وجہ سے ہمارے چلنے کی رفتار بہت سست رہی تھی۔

دو بجے کے قریب ہم پریم نورس ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ بہت کشادہ ہال تھا۔ مناسب فاصلوں پر میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ ہٹ نما کیبن بنے ہوئے تھے۔ اوپر بھی وسیع بالکونی تھی اور وہاں بھی میزیں بچھی ہوئی تھیں اور کیبن بھی تھے۔ نچلے ہال میں اگرچہ ایک دو میزیں خالی تھیں لیکن ہم اوپر بالکونی میں آ گئے اور ایک ایسی میز پر بیٹھ گئے جہاں سے نیچے آمدورفت کے دروازے پر بھی نگاہ رکھی جا سکتی تھی۔ اس ریسٹورنٹ میں اگرچہ مقامی گاہک بھی تھے مگر زیادہ آمدورفت یورپین سیاحوں کی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں چائنیز اور یورپین کھانے دستیاب تھے۔

ریسٹورنٹ میں سروس کے لیے حسین اور خوب صورت لڑکیاں تھیں۔ اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس یہ خوب صورت لڑکیاں گاہکوں کی سیوا کے لیے بڑی مہارت اور پھرتی سے اِدھر اُدھر آ جا رہی تھیں۔ ایک ویٹرس ہماری میز پر بھی آ گئی اور ہم نے تین چار مختلف ڈشوں پر مشتمل چائنیز کھانے کا آرڈر دے دیا۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر ہم پھر بازاروں میں گھومنے لگے۔ ضرورت کی چند چیزیں بھی خریدیں اور واپس آ گئے۔

شوبھا کی جھجک اور خوف دور ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں ہمیں کوئی ایسا آدمی بھی نظر نہیں آیا تھا جس پر کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا۔ شوبھا ایک بار پھر گیسٹ ہاؤس اور ریسٹورنٹ کے منصوبے بنانے لگی تھی۔

اس کے تیسرے دن ہم پھر پریم نورس ریسٹورنٹ میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ اس وقت بملا بھی ساڑی میں تھی اور شوبھا نے بھی نیوی بلیو ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس ساڑی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ سونیا حسب معمول اسکرٹ بلاؤز میں تھی۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ہم ریسٹورنٹ سے نکل کر ٹہلتے ہوئے گیارہ بجے کے قریب کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گیٹ کے باہر کیبن میں کرسی پر بیٹھا ہوا نیپالی گارڈ رابندر ہمیں دیکھتے ہی اٹھ گیا۔

"صاحب جی۔ آپ کے دو مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ہم نے انہیں بڑی عزت سے اندر بٹھا دیا ہے۔" اس نے باری باری ہماری طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

"دو مہمان!" میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا پھر میرے ذہن میں اچانک ہی ٹھاکر اور روپ متی کا خیال ابھر آیا "اوہ۔۔۔ جے پور سے آئے ہیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے رابندر کی طرف دیکھا۔

"جی صاحب۔ مہمان لوگ ایسا ہی بولا۔ جے پور سے آنے کا ہے۔" رابندر نے جواب دیا۔

ہم گیٹ کے اندر داخل ہوئے تو سریندر نے بھی اٹھ کر سلام کیا۔

"ٹھاکر اور روپ متی آئے ہوں گے۔" شوبھا نے کہا۔

"ان کے سوا کون ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا "تین دن پہلے ٹھاکر سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس وقت تو اس نے یہاں آنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے وہ ہمیں سرپرائز دینا چاہتے ہوں اس لیے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی۔" بملا نے کہا۔

ہم برآمدے والے دروازے میں داخل ہوئے تو میں ٹھٹک کر رک گیا۔

مجھے یوں لگا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔ سامنے ہی صوفے پر دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے فوراً ہی پہچان لیا۔ کئی مرتبہ اخباروں میں اس کی تصویر دیکھ چکا تھا۔

وہ دلیش مکھ تھا۔

میں نے مڑ کر شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا جیسے سارا خون نچڑ گیا ہو۔ سونیا اور بملا کے چہروں پر بھی ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ دونوں سہمی ہوئی نظروں سے دلیش مکھ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

دلیش مکھ صورت ہی سے غنڈا لگتا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب تو ضرور رہا ہو گا۔ کسرتی بدن، سر پر گول ٹوپی جس پر رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ٹوپی کسی قدر ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کے دائیں گال پر چنے کے دانے کے برابر کالا مسّا تھا۔ وہ باقاعدگی سے شیو بنانے کا عادی تھا۔ باریک مونچھیں جو کناروں سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں انہیں شاید تلوار کٹ مونچھیں کہا جاتا تھا۔

دلیش مکھ نے جینز کی پتلون اور اوپن شرٹ پہن رکھی تھی جس کے اوپر کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور گلے میں سونے کی موٹی سی چین نظر آ رہی تھی۔ وہ نیتا (سیاست داں) تھا اور میرے خیال میں کسی سیاست داں کو اس قسم کا حلیہ زیب نہیں دیتا تھا لیکن پھر یہ بات بھی تھی کہ وہ بنیادی طور پر غنڈا تھا۔ اس کی فطرت تو نہیں بدل سکتی تھی۔ وہ صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا دوسرا ساتھی درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ صورت سے وہ بھی چھٹا ہوا بدمعاش لگتا تھا۔

"واہ شوبھا دیوی۔" وہ اپنی جگہ پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ اس کی ہوس بھری نظریں شوبھا کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں "یہاں آ کر تو خوب پر پرزے نکال لیے۔ روپ بھی غضب کا نکالا ہے۔ یہ لونڈا پھانس لیا ہے کیا۔ ہم میں کیا کمی ہے؟"

"اے! کون ہو تم اور یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟" میں نے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"اے۔ ہوش میں رہ چھوکرے۔" دلیش مکھ پہلو بدلتے ہوئے غرایا "تو ہم کا نہیں جانت ہو۔ نیتا ہوں نیتا۔۔۔ الٹا ٹانگ کے چمڑی اتروا دوں گا۔ تو چپکا کھڑا رہ۔ ہم شوبھا سے بات کر رہا ہوں۔"

"پہلے تو میں تمہاری نیتائی نکال دوں۔" میں نے بھی غرا کر کہا اور شوبھا کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا "سنا ہے تم بہت بڑے غنڈے ہو۔ لوگ تمہارا نام سن کر کانپتے ہیں۔ تمہیں تمہاری شامت ہی یہاں کھینچ لائی ہے۔ اب تم اپنے پیروں پر چل کر یہاں سے نہیں جا سکو گے۔"

"ارے۔ کتے کی طرح کیا بھونکت ہو۔" دلیش مکھ نے کہا۔ وہ اب بھی صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی مجھ پر جھپٹ پڑنے کو تیار تھا "ہمارا تمہارا کوئی دشمنی نا ہی ہے اے۔ ہم اس کو لینے آیا ہوں۔ شوبھا کو۔ بہت عیش کر لیا تم نے اس کا ساتھ۔ اب اسے ہمار حوالہ کر دو۔ ہم یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"یہ درست ہے کہ پہلے میری اور تمہاری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے لیکن تم نے اس گھر میں داخل ہو کر دشمنی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کا وقت دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو۔۔۔"

"کیا دیکھت رہے ہو رانگڑ!" دلیش مکھ نے میری بات کاٹ کر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا "لونڈے کو بتا ہم کون ہووت ہیں اور یہاں کیوں آیا ہوں۔ اس کو یہ بھی بتا کہ شوبھا ہماری ہے۔ اس نے اب تک اس کے ساتھ جو عیاشی کر لی وہ ہم ماف کرت دیویں ہوں۔ چل۔ بتا دے اس کو۔ ہم شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر شکار چھین لیوت والا ہوں۔"

رانگڑ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جینز کی پتلون پر بغیر آستین کی چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ بازوؤں کے مسلز ابھرے ہوئے تھے۔ سینے اور چہرے پر زخموں کے کئی نشان تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ لڑتے ہوئے ہی گزرا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرخی بھی نظر آ رہی تھی۔

وہ صوفے سے اٹھ کر نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے میری طرف بڑھا اور دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ میں اس طرح آگے کو جھکا جیسے اس کی ٹانگوں سے لپٹنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے تیزی سے نیچے جھکا لیکن میں نے اس سے بھی زیادہ تیزی سے سیدھا ہو کر اس کی ٹھوڑی پر گھٹنے سے زوردار ضرب لگا دی۔ وہ کراہتے ہوئے سیدھا ہوا تو میں نے اپنی جگہ پر اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کک لگائی۔

کک اس کے سینے پر لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈھیر ہو جائے گا مگر وہ محض لڑکھڑا کر رہ گیا تھا۔ میں پھر اچھلا۔ اس مرتبہ میں نے ہوا میں گھوم کر کک لگائی تھی۔ میرے دائیں پیر

کا پنجہ گدی کی طرف سے اس کے دائیں کندھے کے جوڑ پر لگا۔ اس مرتبہ وہ کراہ کر دو قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔

میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس مرتبہ میں نے فلائنگ کک کے بجائے وہیں کھڑے کھڑے لٹو کی طرح گھوم کر اسپن کک لگائی۔ یہ ضرب اس کے پہلو پر لگی۔ وہ اس مرتبہ بھی گرنے کے بجائے گھوم کر رہ گیا۔ وہ ایک ہاتھ پہلو پر رکھے نیچے جھکا تو میں بھی تیزی سے نیچے جھک گیا اور اسے کندھے پر اٹھا کر صوفے کی طرف اچھال دیا۔

رانگڑ دیش مکھ کے اوپر گرا۔ دیش مکھ چیخ اٹھا۔ وہ دونوں صوفے سمیت پیچھے الٹ گئے۔ میں بھی چھلانگ لگا کر صوفے کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ دیش مکھ کی ٹوپی دور جا گری تھی۔ اس کے بال اتنے بڑے نہیں تھے کہ مٹھی میں آسکتے۔ میں نے اسے شرٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے کولھے پر ایک زوردار ٹھوکر مار دی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل صوفے کی دوسری طرف گرا۔ میں بھی چھلانگ لگا کر واپس اسی طرف آگیا۔

دیش مکھ بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب تک پہنچتا، میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھلا۔

میری دونوں ٹانگیں اس کی گردن سے لپٹ گئیں۔ اس طرح میرا سر نیچے کی طرف ہوگیا تھا۔ دیش مکھ نے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ اگر اس کی گرفت جم جاتی تو میری خیریت خطرے میں پڑ جاتی لیکن میں نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکا کر اپنے آپ کو آگے کی طرف جھٹکا دیا۔

دیش مکھ میرے اوپر سے ہوتے ہوئے پورے قد کے ساتھ الٹی قلابازی کھا کر پشت کے بل سینٹر ٹیبل پر گرا۔ میز کی ٹاپ شیشے کی تھی۔ شیشہ ایک زوردار چھناکے سے ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی دیش مکھ کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی تھی۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا تھا اور اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ رانگڑ ہاتھ میں چاقو لیے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اسے دونوں پیروں پر روک کر پوری قوت سے دوسری طرف اچھال دیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

رانگڑ بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کو موقع نہیں دیا۔ میں نے زوردار راؤنڈ ہاؤس کک لگادی جو اس کی پنڈلی کی پچھلی طرف لگی۔ وہ چیختے ہوئے نیچے گرا۔ میرا خیال تھا اس کی پنڈلی کا گوشت پھٹ گیا تھا۔

دیش مکھ اس دوران میں اٹھ چکا تھا اور وہ ایک بار پھر جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس مرتبہ بھی اسے موقع نہیں دیا۔

میری سائیڈ کک اس کے بازو پر لگی اور پھر میں نے اسے نکلنے کا موقع نہیں دیا اور کک پر کک لگاتا چلا گیا۔ اسی دوران میں رانگڑ بھی سنبھل کر میری طرف لپکا تھا لیکن میں اس سے غافل نہیں تھا۔ میری ایک ہی اسپن کک نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ میں پھر دیش مکھ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا ایک بھرپور پنچ اس کے جبڑے پر لگا۔ وہ چیخ اٹھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسی جگہ ایک اور پنچ لگایا۔ اس مرتبہ اس نے خون تھوکا تو اس کے ساتھ ایک دانت بھی تھا۔

"مارو۔ مار دو اسے۔ اور مارو..."

یہ شوبھا کی آواز تھی۔ میں نے اسے کمرے میں بھیجا تھا لیکن وہ باہر آگئی تھی۔ ان دونوں کو میرے ہاتھوں پٹتے دیکھ کر اس کا حوصلہ بڑھا تھا اور وہ چیخ چیخ کر میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

مجھے واقعی اس کے چیخنے سے مزید حوصلہ ملا تھا۔ میں نے دیش مکھ اور رانگڑ کو ایک بار پھر ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ شوبھا کے جی میں جانے کیا آئی کہ وہ بھی میدان جنگ میں کود پڑی اور پھر بِملا بھی اس سے پیچھے نہیں رہی تھی۔ ان دونوں نے ٹوٹی ہوئی سینٹر ٹیبل کے پائے کھینچ لیے تھے اور ان دونوں کی اس طرح دھنائی کر رہی تھیں جیسے دھوبی گھاٹ پر بیٹھی کپڑے کوٹ رہی ہوں۔

سونیا باہر دوڑ گئی تھی۔ وہ دونوں نیپالی گن مینوں کو لے آئی۔ نیپالی گن مینوں نے یہ صورت حال دیکھی تو رانگڑ اور دیش مکھ پر پل پڑے۔ میں نے بِملا اور شوبھا کو پیچھے کھینچ لیا۔ شوبھا بری طرح بپھری ہوئی تھی۔ میں اسے بانہوں کی لپیٹ میں لے کر کمرے میں آگیا۔

"چھوڑ دو مجھے۔" وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہی تھی "میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ مار دو اسے۔ اس نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔ مجھے سولی پر ٹانگ رکھا تھا اس نے..."

"ہوش میں آؤ شوبھا۔" میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا "اپنے حواس قابو میں رکھو۔ اب وہ تمہیں پریشان نہیں کرے گا۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔ باہر مت آنا۔"

میں اسے کمرے میں چھوڑ کر لپک کر باہر آگیا۔ سریندر نے اپنا پستول نکال لیا تھا اور رابندر لاتوں اور گھونسوں سے ان دونوں کی دھنائی کر رہا تھا۔

"بس۔ چھوڑ دو اب انہیں۔" میں نے چیخ کر کہا "گھر آئے ہوئے مہمانوں کی اتنی ہی سیوا کافی ہے۔"

سریندر اور رابندر مشینی انداز میں رک گئے اور پھر میری ہدایت پر رابندر ان کی تلاشی لینے لگا۔ دیش مکھ کی پتلون کی جیب سے پستول برآمد ہوا جسے لڑائی کے دوران میں وہ بار بار نکالنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

رانگڑ کے پاس سے کوئی آتشیں اسلحہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کے پاس وہی چاقو تھا جو اب ٹوٹی ہوئی میز کے قریب دری پر پڑا تھا۔ رابندر نے وہ چاقو بھی اٹھالیا۔

"کیا خیال ہے نیتا جی۔" میں نے دیش مکھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس حالت میں تمہاری تصویر کھینچ کر اخباروں میں چھپوا دی جائے تو کیسی رہے؟"

"تیرا داؤ چل گیا ہے لونڈے۔" دیش مکھ کے منہ سے آواز بھی بمشکل نکل سکی تھی "ہم اب بھی کہتا ہوں کہ شوبھا کو میرے حوالے..."

اس کی کھوپڑی پر لگنے والی میری ٹھوکر سے اس کے آخری الفاظ چیخ میں بدل گئے تھے۔

"اب اگر تمہاری زبان پر شوبھا کا نام آیا تو میں تمہاری زبان کاٹ دوں گا۔" میں نے اسے ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے کہا "تم شوبھا کو جس طرح پریشان کرتے رہے ہو مجھے سب معلوم ہو چکا ہے لیکن اب اگر تم نے شوبھا کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو آنکھیں نکال دوں گا اور تمہارے ہاتھ پیر کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گا۔ تم بھیک مانگنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

"بول لے۔ بول لے تو۔" دیش مکھ نے دری پر خون تھوکتے ہوئے کہا "پر یہ جان لے اے کہ شوبھا میری ہے۔ دنیا کی کوئی شکتی اسے مجھ سے نہیں بچا سکتی۔ وہ..."

اس کے آخری الفاظ ایک بار پھر چیخ میں بدل گئے۔ پتا نہیں شوبھا کس وقت کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میز کا پایہ پوری قوت سے اس کے کندھے پر مارا تھا اور پھر پے در پے اس پر ضربیں لگاتی رہی۔ دیش مکھ اپنے آپ کو بچانے کے لیے دری پر لوٹتا رہا لیکن شوبھا کا ہر وار اسے چیخنے پر مجبور کردیتا۔ میں نے لپک کر شوبھا کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا تھا۔

"شوبھا کو تم نے لوٹ کا مال سمجھ رکھا ہے۔" وہ چیخی "تف ہے تمہاری مردانگی پر!" اس نے دیش مکھ کے منہ پر تھوک دیا "کمزور اور بے سہارا عورتوں پر دھونس جما کر اپنے آپ کو بہت بہادر سمجھتے تھے۔ ایک مرد سامنے آیا تو تمہاری ساری مردانگی نکل گئی۔ تھو..." اس نے ایک بار پھر تھوک دیا۔

"مردانگی تو ہم تمہیں دکھاؤں گا۔" دیش مکھ بولا۔

وہ واقعی بہت ڈھیٹ اور بہت بے غیرت تھا۔ اتنی پٹائی ہونے کے بعد بھی اسے غیرت نہیں آئی تھی۔

"بہتر ہے کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "میں تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔ یہ پہلا اور آخری موقع ہے۔ آئندہ اگر تم نے شوبھا کے راستے میں آنے کی کوشش کی تو تم اپنے پیروں پر چلنے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔"

"دیکھ لوں گا اے۔ تیرے کو بھی دیکھ لوں گا۔" دیش مکھ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس کو چھوڑنے کا مت صاحب۔" سریندر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس لوگ کو پولیس کسٹڈی میں دینے کا ہے نا۔"

"نہیں۔ اس مرتبہ انہیں جانے دو لیکن اگر آئندہ کہیں آس پاس نظر بھی آئیں تو اڑا دینا گولیوں سے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک بولنے کا ہے صاحب۔" سریندر نے کہا اور دیش مکھ کو شرٹ کے کالر سے پکڑ کر اٹھا دیا "چل اٹھ۔ تم تو ہم کو بولنے کا تھا کہ بیگم صاحب کا رشتے دار ہو اس لیے ہم تم کو عزت کے ساتھ اندر بٹھا دیا۔ کوئی چیز تو چوری نہیں کیا ہو؟"

"تم ہماری تلاشی لے چکے ہو۔" دیش مکھ نے جھٹکے سے اپنا کالر چھڑالیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہم چلتا ہوں۔"

"چلے بھی جاؤ۔" میں نے غصے میں کہا "اور ہاں۔ اپنا یہ دانت بھی اٹھا کر لے جاؤ۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا اور رانگڑ کو اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ رانگڑ لنگڑاتے ہوئے چل رہا تھا۔ اس کی پنڈلی کی پچھلی طرف لگنے والی میری راؤنڈ ہاؤس کک سے گوشت پھٹ گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ آٹھ دس دن مالش کرواتا رہے گا۔ دیش مکھ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اس کا ایک دانت ٹوٹ چکا تھا اور جسم کے دوسرے حصوں پر بھی چوٹیں آئی تھیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہیں بتا چکا ہوں کہ اس قسم کے

غنڈوں کی ساری طاقت ان کے گرگوں میں ہوتی ہے۔ وہ خود کسی کے ہتھے چڑھ جائیں تو چند ہاتھ کھا کر ہی قدموں پر گرجاتے ہیں اور گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے لگتے ہیں۔ دلیش مکھ اس لحاظ سے دوسرے غنڈوں سے مختلف ثابت ہوا تھا کہ بری طرح پٹنے کے بعد بھی وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا نہیں تھا بلکہ آخری وقت تک سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا تھا۔

میں بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ بملا بھی میرے ساتھ تھی۔ سریندر اور رابندر دلیش مکھ اور رانگڑ کو دھکے دیتے ہوئے گیٹ سے باہر لے آئے اور ان کے کولھوں پر لاتیں رسید کر کے چھوڑ دیا۔

وہ دونوں گلی کے آخر میں موڑ پر کھڑی ہوئی ایک کار کے قریب رک گئے۔ جب ہم بازار سے واپس آئے تھے تو اس کار کے قریب سے گزرے تھے مگر توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ چند سیکنڈ بعد انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر کار پر شور آواز کے ساتھ مخالف سمت میں چلی گئی۔

میں نے رابندر کو گیٹ پر ہی چھوڑ دیا اور سریندر کو اشارہ کرتے ہوئے اندر آگیا۔ سونیا اور شوبھا اسی جگہ پر کھڑی تھیں جہاں میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ شوبھا کی ساڑی کا پلو نیچے لٹکا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے اس نے صرف دھوتی اور بلاؤز پہن رکھا ہو..... میں اس کے سامنے رک گیا۔ وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سونیا' بملا اور سریندر کی موجودگی کی پروا کیے بغیر والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی اور میرے رخساروں اور پیشانی پر چٹاچٹ بوسے دینے لگی۔

"تم واقعی بہت بہادر اور حوصلہ مند ہو۔" وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "دلیش مکھ کو یہاں دیکھ کر تو میری روح فنا ہوگئی تھی۔ میں تو یہ سمجھی تھی کہ شاید....."

"ہمارا انت ہونے والا ہے۔" میں نے اس کا جملہ مکمل کردیا۔

"ہاں ہاں۔ میں تو کانپ کر رہ گئی تھی۔" اس نے سرہلا دیا۔

"میرا ہمت سنگھ بہت ہمت والا ہے دیدی۔" بملا بول پڑی "مجھے یاد ہے جب سارسکا میں ڈاکو مجھے اٹھا کر جنگل میں لے گئے تھے تو یہ اکیلا ان ڈاکوؤں کے پیچھے جنگل میں آگیا اور ڈاکوؤں کے سردار کو اس طرح پٹخ پٹخ کر اور اچھل اچھل کر مارا کہ وہ منظر میں آج بھی نہیں بھول سکتی۔"

"باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہاں کی صفائی تو کرلی جائے۔" میں نے کہا۔

سریندر پہلے ہی اپنے کام میں مصروف ہوچکا تھا۔ اس نے الٹے ہوئے صوفے اور کرسیاں سیدھی کردیں اور ٹوٹی ہوئی میز اور شیشے کے ٹکڑے اٹھانے لگا۔

بملا اور سونیا بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ سریندر نے شیشے کے ٹکڑے اٹھا کر باہر پھینک دیے۔ سونیا ایک بالٹی میں پانی اور پرانا کپڑا لے آئی۔ سریندر کپڑا بھگو کر دری پر خون کے دھبے صاف کرنے لگا۔ اس نے دلیش مکھ کا ٹوٹا ہوا دانت بھی اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دلیش مکھ چار چھ روز تک اپنے جبڑوں کی سنکائی ضرور کرے گا۔

صفائی میں پون گھنٹا لگ گیا۔ صفائی کے دوران میں دری سے دلیش مکھ اور رانگڑ کی سونے کی زنجیریں بھی ملی تھیں۔ لڑائی کے دوران میں زنجیریں ان کے گلوں سے ٹوٹ کر گری تھیں۔ میں نے ایک چین سریندر کو اور دوسری رابندر کو انعام کے طور پر دے دی۔ وہ دونوں بہت خوش ہوئے۔ پستول اور چاقو میں نے سریندر سے لے لیا تھا۔ ان دونوں نے پھر اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔

سونیا نے ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ کافی بنا کرلے آئی۔ اس وقت واقعی چائے یا کافی کی طلب محسوس ہورہی تھی۔ اس دوران میں شوبھا بار بار میرا جسم ٹٹول رہی تھی اور پوچھ رہی تھی کہ مجھے چوٹ تو نہیں لگی۔

"تم نے انہیں یہاں سے چلے جانے کا موقع دے کر اچھا نہیں کیا۔" شوبھا نے کہا "وہ دھمکی دے کر گیا ہے اور پھر آئے گا۔"

"اب اگر وہ آیا تو اپنے پیروں پر چل کر نہیں' کھاٹ پر ہی واپس جائے گا۔" میں نے جواب دیا "ویسے آج تم نے بھی اپنے دل کی کچھ بھڑاس نکال لی۔ اب تمہارے دل میں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔ غنڈوں سے ڈرا جائے تو وہ اتنا ہی زیادہ دباتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ ہے جو آج تم نے دیکھ لیا۔"

"ہاں۔ اب میرے دل میں کوئی خوف نہیں رہا۔ اب میں اسے معاف نہیں کروں گی۔" شوبھا نے جواب دیا۔

ہم ابھی باتیں کررہے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم سب اچھل پڑے۔ بملا قریب بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر تمتماہٹ سی آگئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس کی کال ہوسکتی ہے اور پھر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"دیدی روپ متی ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے ریسیور لے لیا۔ چند لمحے روپ متی سے بات ہوتا رہا پھر ٹھاکر لائن پر آگیا۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا۔

"میں اپنے ایک آدمی کے ذریعے دلیش مکھ کی نگرانی کروا رہا تھا لیکن دو دن پہلے وہ اچانک غائب ہوگیا۔ وہ جے پور میں نہیں ہے۔"

"اس سے ہماری ملاقات ہوگئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے" میں نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ کیا وہ....."

"ہاں۔ وہ یہاں پہنچ گیا ہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے ہماری کوٹھی پر آیا تھا۔ ہم نے اس کی مناسب تواضع کردی تھی۔ امید ہے اسے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔" میں نے کہا اور پھر اسے آج کے واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"اوہ!" ٹھاکر نے کہا "میری ضرورت ہو تو آجاؤں؟"

"فی الحال نہیں۔" میں نے جواب دیا "ابھی تو کئی روز تک وہ اپنی چوٹیں سہلاتا رہے گا۔ ہوسکتا ہے رشی کیش ہی میں کہیں چھپا رہے یا کہیں اور چلا جائے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ واپس ضرور آئے گا اور اگر ضرورت پڑی تو میں تمہیں فون کروں گا۔"

"اگر کہو تو میں ایک دو آدمی بھیج دوں۔" ٹھاکر نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے یہاں بندوبست کرلیا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ ایسی کوئی بات ہوئی تو میں فوراً تمہیں اطلاع دوں گا۔" میں نے جواب دیا اور کچھ دیر مزید گفتگو کے بعد فون بند کردیا۔

میں فون بند کر کے شوبھا وغیرہ کو ٹھاکر سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے لگا اور پھر اس رات بھی ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شوبھا اسی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی یعنی اس کی ساڑی کا پلو زمین پر پڑا ہوا تھا اور میری نظریں بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

تین بجے کے قریب سب سے پہلے بملا اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور پھر شوبھا بھی اٹھ گئی۔ میں نے باہر آکر سریندر اور رابندر کو ہوشیار رہنے کی ہدایات دیں اور اندر آکر دروازے اور کھڑکیاں بند کردیں۔ اگرچہ آج کی رات دلیش مکھ کی طرف سے کسی کارروائی کی توقع نہیں تھی لیکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

سونیا بھی کمرے میں جاچکی تھی۔ میں بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ میں تھکن سی محسوس کررہا تھا۔ جسم کے بعض حصوں میں درد بھی ہورہا تھا۔ رانگڑ اور دلیش مکھ سے یہ لڑائی اگرچہ پندرہ بیس منٹ تک ہی محدود رہی تھی لیکن اس دھواں دھار لڑائی نے میرا انجر پنجر ڈھیلا کردیا تھا۔ میری زندگی دشمنوں کے خلاف لڑتے ہوئے گزری تھی لیکن آج کی لڑائی سب سے برق رفتار تھی جس کا فیصلہ چند منٹ ہی میں ہوگیا تھا اور اس دوران میں' میں نے اپنے دو طاقت ور حریفوں کو ایک لمحے کو بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ اگر میری طرف سے ذرا بھی سستی یا غفلت ہوتی تو شاید اس لڑائی کا نتیجہ مختلف ہوتا۔

بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پردہ لٹکا ہوا تھا۔ شوبھا والے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی بتی بجھا دی اور بستر پر گر گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ شوبھا میرے پلنگ پر بیٹھی میری ٹانگیں دبا رہی تھی۔

"ارے شوبھا جی۔" میں نے جلدی سے ٹانگیں سمیٹ لیں "یہ آپ کیا کررہی ہیں؟"

"مجھے اپنے محسن کی سیوا سے محروم نہ کرو۔" شوبھا نے کہا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی "تم نے میری خاطر اپنا جیون داؤ پر لگا دیا اور کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں کہ میں تمہاری ذرا سی سیوا کرسکوں۔ تمہارے پیر دباتے ہوئے مجھے بڑا سکون مل رہا ہے۔ آرام سے لیٹے رہو۔"

"نہیں شوبھا جی۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ بھی تھکی ہوئی ہیں۔ آپ جاکر سوجائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا۔"

"تم نیند میں کراہ رہے تھے۔ آواز سن کر ہی تو میں آئی تھی۔" شوبھا نے کہا "ہوسکتا ہے تمہیں لڑائی میں کچھ چوٹیں بھی آئی ہوں لیکن بعض اوقات تھکن کے کارن بھی آدمی نیند میں کراہنے لگتا ہے۔ میں تمہاری ٹانگیں دبانے لگی تھی تاکہ تمہیں کچھ سکون تو ملے لیکن تم اٹھ کر بیٹھ گئے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں شوبھا جی۔" میں نے جواب دیا۔

"تم نے آج کمال ہی کردیا وجدان۔" اس نے کہا "میں تو ڈر گئی تھی۔ وہ دو تھے اور تم اکیلے۔ اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرتی لیکن تم نے جس طرح ان کی ہڈیوں کی سنکائی کی ہے اس پر مجھے حیرت بھی ہوئی' خوشی بھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ان دونوں کو اس طرح ڈھیر کردو گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "سونیا نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ

دیکھ لیا ہے۔ مجھے تم پر گھمنڈ ہے۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔"

شوبھا باتوں کے موڈ میں تھی اور مجھے نیند آرہی تھی۔ میں اس سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر سو جائے لیکن شاید اسے خود ہی خیال آگیا۔

"دیکھو میں تمہیں کتنا پریشان کر رہی ہوں۔ تمہیں نیند سے جگا کر بٹھا دیا۔ اچھا۔ اب تم سو جاؤ۔ میں چلتی ہوں۔" شوبھا نے کہا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر جھک کر اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔

میرے پورے بدن میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی لیکن میرے سینے میں کسی فتنے نے سر نہیں ابھارا تھا نہ ہی کوئی لغو خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ نجانے کیوں مجھے اس وقت تائی یاد آگئی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ شوبھا اسی طرح میرے اوپر جھکی رہے اور اس کے ہونٹوں کا لمس میری پیشانی کو گرماتا رہے۔ عجیب سا سرور تھا اس بوسے میں۔

شوبھا سیدھی ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

"میں چلتی ہوں۔" وہ پلنگ سے اتر گئی "سو جاؤ۔ تمہیں نیند آرہی ہے۔" دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا "شبھ راتری۔" (شب بخیر) اس نے گنگناتی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں دروازے کے سامنے ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتا رہا اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں سرور و کیف کی عجیب سی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

کئی روز گزر گئے۔

اس دوران میں یوگی گوتم بھوش کے کانج میں میری ریاضت جاری رہی۔ میرے اندر خوابیدہ پراسرار قوت کی بیداری کا ابتدائی مرحلہ شروع ہو چکا تھا اور میں اپنے آپ میں عجیب سی تبدیلی اور کیفیت محسوس کرنے لگا تھا۔ اب مجھے یکسوئی اور مکمل توجہ کی ضرورت تھی اور اس معاملے میں ذرا سی غفلت سے سب کیے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا۔

پہلے تو روزانہ رات کو ٹھاکر کا فون آتا رہا پھر اس میں ایک دن کا وقفہ آگیا۔ وہ دیش مکھ کی وجہ سے ہمارے لیے پریشان تھا۔ ٹھاکر دیش مکھ کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے شبہ تھا کہ دیش مکھ چند روز کہیں دبکا رہے گا اور پھر ہمارے خلاف کوئی کارروائی کرے گا۔ ٹھاکر کو یہ اندیشہ اس لیے بھی تھا کہ دیش مکھ جے پور واپس نہیں پہنچا تھا۔

دیش مکھ رشی کیش میں بھی کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہمارا نیپالی گن مین سریندر بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ اس نے دو اور آدمیوں کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہ بھی نیپالی اور اسی کی طرح خرانٹ تھے۔ ان میں سے ایک کو تو اس نے دیش مکھ اور اس کے ساتھی رانگڑ کی تلاش پر لگا دیا تھا۔ اس نے رشی کیش اور اس کے گرد و نواح میں تمام ہوٹل، گیسٹ ہاؤسز اور مندر دیکھ ڈالے تھے مگر ان کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ وہ یا تو کہیں چھپے ہوئے تھے یا شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تھے لیکن مجھے یہ بھی یقین تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے اور پلٹ کر ضرور آئیں گے۔

شوبھا کے دل میں اب کسی قسم کا خوف نہیں رہا تھا۔ اب تو وہ سونیا یا ببلا کو ساتھ لے کر میرے بغیر سیر و تفریح کے لیے یا کوئی سودا وغیرہ لینے کے لیے بازار کی طرف چلی جاتی تھی۔ اوچن نام کا ایک نیپالی گن مین بہرحال ان کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ ان دو میں سے ایک تھا جن کی خدمات سریندر کے ذریعے حاصل کی گئی تھیں۔

اس روز صبح سویرے ہی ٹھاکر کا فون آیا تھا۔ اس نے شوبھا سے بات کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے شوبھا کے کالی ہاؤس والی بلڈنگ کی قیمت لگوائی ہے۔ اس نے شوبھا کو وہ قیمت بتا کر اس کی رائے مانگی تھی کہ اگر شوبھا اس قیمت پر بلڈنگ بیچنے کو تیار ہو تو وہ (ٹھاکر) اسے خرید لے گا۔ شوبھا نے بلا جھجک آمادگی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ وہ کاغذات تیار کرا لے۔ اس کے ساتھ ہی مہاویر روڈ والے پلاٹ کی بات بھی ہوئی تھی لیکن ٹھاکر نے بتایا تھا کہ اس کی ابھی مناسب قیمت نہیں لگ رہی۔ ڈیڑھ ایکڑ کے اس پلاٹ کو تو کوئی بلڈر ہی خرید سکتا تھا اور وہ مختلف کمپنیوں سے رابطے کر رہا تھا۔

اسی روز میں، سونیا اور شوبھا کے ساتھ بازار کی طرف نکل گیا۔ ببلا گھر پر ہی رہ گئی تھی۔ شوبھا کا خیال تھا کہ مستقل یہاں رہنا ہے تو اب اسے کوئی بنگلا خرید ہی لینا چاہیے اور ہم بنگلے کی تلاش میں پراپرٹی ایجنٹوں کے دفتروں میں جھانکتے پھر رہے تھے۔

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا۔ ببلا کے لیے کھانا پیک کروا لیا گیا۔ ہم صبح نو بجے سے گھوم رہے تھے اور اس وقت دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔ سونیا اور شوبھا تھک گئی تھیں اس لیے ہم نے واپسی کے لیے ٹیکسی لی۔ ٹیکسی مختلف راستوں پر گھومتی ہوئی نیلم ندی کی طرف آگئی۔ یہ بارونق علاقہ تھا۔ ہماری ٹیکسی نے جیسے ہی نیلم ندی کا پل عبور کیا، پیچھے سے آنے والی ایک کار تیزی سے اوور ٹیک کرتے ہوئے ہماری ٹیکسی کے آگے آگئی۔ ڈرائیور کو مجبوراً ٹیکسی روکنا پڑی۔ ایک کار ٹیکسی کے پیچھے بھی رک گئی تھی اور اس سے پہلے کہ میں صورت حال کا کچھ اندازہ لگا سکتا ٹیکسی کے آگے کھڑی ہوئی کار سے دو آدمی اترے۔ دونوں نے چہروں پر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ انہوں نے کار سے اترتے ہی ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔

میں فوری طور پر نہیں سمجھ سکا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن چونکا تو اس وقت جب اگلی کار سے اترنے والے ایک آدمی نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر شوبھا کو نیچے گھسیٹ لیا۔ شوبھا خوف و دہشت سے چیخنے لگی۔ وہ آدمی اسے گھسیٹتے ہوئے اگلی کار کی طرف لے جا رہا تھا۔

مجھے یکایک جیسے ہوش آگیا۔ میں ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر تھا۔ دروازہ کھول کر بڑی عجلت میں نیچے اترا اور اس شخص کی طرف لپکا جو شوبھا کو گھسیٹ رہا تھا مگر اس شخص نے پلٹ کر میرے پیٹ پر ٹھوکر مار دی۔ میں بلبلا کر دوہرا ہو گیا مگر اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر اٹھ کر دوبارہ اس شخص کی طرف لپکا۔ میں نے شوبھا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ اس دوران میں دوسرا آدمی بھی اس طرف پہنچ گیا اور اس نے رائفل کا بٹ پوری قوت سے میرے کندھے پر مار دیا۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شوبھا کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے سنبھلنا چاہا مگر اس شخص نے ایک بار پھر رائفل گھما دی۔ اس مرتبہ رائفل کا بٹ میرے کولھے پر لگا۔

پہلا آدمی شوبھا کو گھسیٹتے ہوئے اگلی کار تک لے جا چکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے ہاتھ سے اس نے شوبھا کی کلائی تھام رکھی تھی۔ وہ پوری قوت سے اسے کار میں ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شوبھا بری طرح چیختے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ اس نے اس شخص کی کلائی پر دانت گاڑ دیے۔ وہ شخص چیخ اٹھا۔ اس شخص نے شوبھا کو دھکا دیتے ہوئے دروازے میں دھکیل دیا اور خود بھی اندر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا۔

میں اپنے انجام کی پروا کیے بغیر دوسرے آدمی سے لپٹ گیا۔ اس دوران میں پچھلی کار سے بھی دو آدمی اتر آئے تھے اور سونیا کو ٹیکسی سے کھینچ کر اپنی کار کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ سونیا بھی چیختے ہوئے مزاحمت کر رہی تھی۔ میں اس طرف لپکا۔ میرا پیر ایک آدمی کے پیر میں الجھا اور میں... لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل گرا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر پڑی۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر سڑک پر لوٹنے لگا۔ وہ دونوں آدمی میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کرتے رہے جبکہ ان کا تیسرا ساتھی آٹومیٹک رائفل سے مسلسل ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔

"چلو بھاگو۔ اب دیر نہیں کرو۔" فائرنگ کرنے والا چیخا۔ اس کا ایک ساتھی دوڑ کر اگلی کار میں سوار ہو گیا جس میں شوبھا کو ٹھونسا گیا تھا اور دوسرا پچھلی کار کی طرف دوڑا جہاں سے سونیا کے چیخنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

دونوں کاریں حرکت میں آکر تیز رفتاری سے آگے بڑھ گئیں۔ میں اٹھ کر کاروں کے پیچھے دوڑا لیکن ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ میں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا کہ لوگو! ان بدمعاشوں کو روکو۔ ان دو معصوم عورتوں کو بچاؤ جنہیں وہ اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔

وہاں آس پاس سیکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ تقریباً سو گز کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن تھا لیکن نہ تو پولیس آئی اور نہ ہی کسی اور نے ان بدمعاشوں کو روکنے کی کوشش کی۔ اپنی جان ہر ایک کو پیاری ہوتی ہے۔ کوئی آگے بڑھنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

میں پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے ادھر ادھر دوڑتا رہا لیکن کوئی شخص میری مدد کو تیار نہیں تھا۔ میں ٹیکسی کی طرف لپکا لیکن ٹیکسی ڈرائیور بھی دہشت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچنے لگا لیکن اسی لمحے میرے سر میں ایک زوردار ٹیس اٹھی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن تاریکی کی چادر پھیلتی چلی گئی اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

ہوش میں آنے کے بعد میں کچھ دیر تک دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھتا رہا۔ پہلے تو مجھے یہ جگہ اجنبی سی لگی لیکن اپنے اطراف میں بیڈ پر لیٹے ہوئے مریضوں کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسپتال میں ہوں لیکن مجھے یہ احساس نہیں ہو سکا کہ میں اسپتال میں کیوں ہوں؟ ذہن پر زور ڈالنے سے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے پھر یکایک مجھے یاد آگیا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ شوبھا اور سونیا کو دن دہاڑے اغوا کر لیا گیا تھا اور میں انہیں بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

ان دونوں کا خیال آتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ چیخ کی آواز سن کر ایک نرس اور اس کے ساتھ ببلا دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئیں۔ ببلا نجانے کب سے وارڈ کے آخر میں نرس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ میں بیڈ سے اترنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ دونوں مجھے پکڑ کر دوبارہ لٹانے

کی کوشش کرنے لگیں۔

"ارے ارے۔ کہاں جارہے ہو۔ لیٹے رہو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" بملا نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں بملا۔" میں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں یہاں لیٹ کر آرام نہیں کرسکتا۔ وہ لوگ شوبھا اور سونیا کو اٹھا کرلے گئے ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔" بملا بولی "تم دو گھنٹوں بعد ہوش میں آئے ہو۔ وہ لوگ پتا نہیں اب تک کتنی دور جاچکے ہوں گے اور پھر تم زخمی ہو۔ دیکھو، تمہارے پورے جسم پر نیل پڑے ہوئے ہیں۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں بیڈ سے اتر آیا "آؤ۔ میرے ساتھ چلو بملا۔ ہم وقت ضائع نہیں کرسکتے۔"

اس دوران میں ایک ڈاکٹر بھی وارڈ میں آگیا۔ اس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش کی مگر میں اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

یہ چھوٹا سا اسپتال ہمارے بنگلے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم پیدل ہی وہاں تک چل کر آئے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے۔ جسم کے ہر حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ سر میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ اگر بملا مجھے سہارا نہ دیے ہوئے ہوتی تو میں راستے میں کئی بار گرتا اور یہاں تک پہنچنا مشکل ہوجاتا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے اسٹیٹ ڈیلر کو ٹیلی فون کیا۔ روشن نامی اس شخص سے میری اچھی خاصی دوستی ہوچکی تھی۔ وہ پراپرٹی کے علاوہ کاروں کی خرید و فروخت اور کرائے پر دینے کا کاروبار بھی کرتا تھا۔

"ہیلو روشن۔" میں نے ریسیور پر اس کی آواز سنتے ہی کہا "مجھے ایک گاڑی چاہیے۔ بہترین حالت میں ہو اور لمبے سفر کے لیے کارآمد ہو۔ ہاں ہاں۔ میں ٹھیک ہوں اور سنو۔ کار کی ٹینکی فل ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں۔ تم اس کی پروا مت کرو۔ اگر کار واپس نہ آئی تو میرے دوست ٹھاکر بھانوت سنگھ سے تمہیں اس کی پوری قیمت مل جائے گی۔ ٹھیک ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں۔"

میں نے فون بند کردیا اور باتھ روم میں گھس کر آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ میرا حلیہ اس قدر بگڑا ہوا تھا کہ مجھے اپنے آپ کو پہچاننے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔ بائیں آنکھ کے نیچے سیاہ دھبا تھا۔ دایاں جبڑا بھی سوجا ہوا تھا۔ کندھے پر دونوں طرف شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کولھے میں بھی تکلیف تھی اور سر پر بھی گومڑ بنا ہوا تھا۔ ان ظالموں نے بری طرح میری دھنائی کی تھی۔

میں نے منہ ہاتھ دھو کر سوجے ہوئے جبڑے اور رخسار پر لوشن لگالیا اور کپڑے بدل کر باہر آیا تو بملا چائے بنا چکی تھی اور اس وقت میں واقعی چائے کی طلب بڑی شدت سے محسوس کررہا تھا۔

چائے کا کپ لیتے ہوئے میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ لگتا تھا وہ دیر تک روتی رہی ہو اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اس وقت اپنے آپ پر قابو پائے ہوئے تھی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں چائے ختم کرکے اپنے کمرے میں آگیا اور تھیلے میں اپنے کپڑے ٹھونسنے لگا۔

"یہ بھی اسی میں ڈال لو۔" بملا کی آواز سن کر میں پیچھے مڑا۔ وہ بھی غالباً میرے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے اپنے کپڑوں کے دو جوڑے میری طرف اچھال دیے۔ میں سیدھا ہوکر کھڑا ہوگیا۔

"بملا!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ان کی تلاش میں نجانے مجھے کہاں کہاں ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔ کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں تمہیں ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ تم آج کی رات یہاں گزار کر صبح جے پور چلی جاؤ۔ مجھے کہیں موقع ملا تو میں فون پر ٹھاکر سے بات کرلوں گا۔"

"تم میرے بغیر جاسکو گے؟" بملا نے کہا "نہیں ہمت سنگھ۔ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ بالکل نہیں۔"

"میرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی منزل نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں تو ہمیشہ ہی سے خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ ان طاغوتی قوتوں سے لڑتے ہوئے عرصہ گزر گیا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ میں اب تک زندہ کیسے ہوں۔ اب میں جس سفر پر نکل رہا ہوں وہ پہلے سے کہیں زیادہ کٹھن اور خطرناک ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی۔۔۔"

"نہیں ہمت سنگھ۔" وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی "تم ہمیشہ دوسروں کے لیے لڑتے رہے ہو۔ دوسروں کے لیے اپنے جیون کو خطرے میں ڈالے رکھا اور اب بھی تم موت کے اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے جارہے ہو۔ کس کے لیے؟ دوسروں کے لیے نا؟ تو کیا کسی دوسرے کو یہ حق نہیں کہ وہ چند قدم تک تمہارا ساتھ دے سکے۔ نہیں۔ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے اسے بانہوں سے پکڑ کر اپنے سے الگ کیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ میرے ساتھ جانے پر بضد رہی۔

"تم مجھے کمزور مت سمجھو۔" وہ کہہ رہی تھی "جانکی نے قدم قدم پر تمہارا ساتھ دیا اور بالآخر اپنا جیون تمہارے لیے بھینٹ کردیا۔ سونیا کب سے تمہارے ساتھ ہے۔ اس نے تمہارے لیے کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھائی ہوں گی لیکن میں نے اس کے چہرے پر کبھی بھی گھبراہٹ نہیں دیکھی۔ شوبھا تمہیں بہت پسند کرنے لگی تھی۔ اس نے بھی فیصلہ کرلیا تھا کہ تمہیں کہیں نہیں جانے دے گی اور میں۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "کیا تم مجھے ان سے کمزور سمجھتے ہو۔ یقین کرو میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بنوں گی۔ اس وقت تمہیں میری ضرورت ہے اور میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب میں یہ سمجھوں گی کہ تم پر بوجھ بن رہی ہوں یا تمہارے راستے کی رکاوٹ بن رہی ہوں تو میں خاموشی سے اپنا راستہ بدل لوں گی اور تمہیں اکیلا چھوڑ دوں گی۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے کچھ کہنے کے بجائے اس کے کپڑے بھی تھیلے میں ٹھونس لیے۔ بملا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی اور وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور تھیلا بملا کے حوالے کردیا کہ وہ اس میں ضرورت کی اور چیزیں ڈال لے۔

میں اس کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگیا۔ اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ مجھے واقعی آرام اور علاج کی ضرورت تھی۔ میرے پورے بدن میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بات کرنے کے لیے منہ بھی پوری طرح نہیں کھل رہا تھا لیکن میں جو کچھ بھی کررہا تھا، اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کررہا تھا۔

میں نے کرسی پر بیٹھ کر فون کا ریسیور اٹھالیا اور جے پور میں ٹھاکر کا نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال ٹھاکر نے ہی ریسیو کی تھی۔ میں نے ایک دو رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ٹھاکر کو صورت حال سے آگاہ کردیا۔

"اوہ!" ٹھاکر بولا "اس کے ساتھ اور کون لوگ تھے؟"

"وہ خود نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے اس نے یہ کام کرائے کے غنڈوں سے کروایا ہے جنہوں نے چہروں پر نقاب چڑھا رکھے تھے۔ رشی کیش میں تو ایسا کوئی دل والا غنڈا نہیں جو اتنی سنگین واردات کا ارتکاب کرسکے۔ میرے خیال میں اس نے ہردوار یا دہرادون سے ان غنڈوں کی خدمات حاصل کی ہوں گی اور ہوسکتا ہے اس وقت وہ خود ہردوار یا دہرادون میں بیٹھا رہا ہو۔ بہرحال، میں ان کے پیچھے جارہا ہوں۔" اس موقع پر ٹھاکر نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا "تم کچھ مت بولو ٹھاکر، میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔ البتہ تمہیں میرے جانے کے بعد یہاں آکر ایک دو کام کرنے ہوں گے۔" میں نے کہا اور پھر اسے سمجھانے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے اسے یہ بھی بتادیا کہ بملا میرے ساتھ جارہی ہے۔

میں ابھی فون پر باتیں کررہا تھا کہ پراپرٹی ایجنٹ روشن لال پہنچ گیا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر فون پر ٹھاکر کو اس کے بارے میں بتانے لگا اور پھر میں نے فون بند کردیا۔

میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر اس وقت پورے شہر میں پھیل گئی تھی۔ روشن لال نے اس موقع پر تاسف کا اظہار کیا۔

"گاڑی لے آئے؟" میں نے موضوع بدل کر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا "گاڑی دیکھنے میں اگرچہ پرانی لگتی ہے لیکن اس کا انجن بہترین حالت میں ہے۔ پہاڑی راستوں پر بھی بالکل پریشان نہیں کرے گی۔ ٹینکی فل کروا دی ہے۔ اس کے علاوہ ڈکی میں پیٹرول سے بھرے ہوئے پانچ پانچ گیلن والے تین کین بھی رکھوا دیے ہیں۔ پانی کا مشکیزہ اور کچھ کھانے پینے کی اشیا بھی پچھلی سیٹ پر رکھوا دی ہیں۔ تمہیں راستے میں ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔"

"شکریہ روشن لال۔" میں نے کہا "میں نے جے پور میں اپنے دوست سے کہہ دیا ہے۔ وہ چند روز میں یہاں آئے گا۔ اگر ایک ہفتے تک میں واپس نہ آیا تو وہ اس بنگلے، کار اور تمہاری گاڑی کا حساب کردے گا۔ احتیاطاً تم بھی اس کا فون نمبر لکھ لو۔" میں نے اسے ٹھاکر کا فون نمبر لکھوا دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "میں نے ان میں سے ایک کار کا نمبر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ڈی این کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ کیا تم بتاسکتے ہو یہ سیریل نمبر کہاں کا ہے؟"

"یہ تو دہرادون کا نمبر ہے۔" اس نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"مگر قصہ کیا تھا۔ کون لوگ تھے وہ؟" روشن نے پوچھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "زندہ رہا اور واپس آگیا تو ضرور بتاؤں گا۔ ویسے کیا تم بتاسکتے ہو کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہوں گے؟"

"سننے میں تو یہی آیا تھا کہ وہ لوگ ہردوار کی طرف فرار ہوئے تھے۔ لوگوں نے پولیس تھانے کا گھیراؤ کرلیا تھا کہ ان کا پیچھا کیا جائے لیکن پولیس نے کوئی کارروائی نہیں کی۔"

"پولیس ایسے موقعوں پر کوئی کارروائی نہیں کرتی اور ایسی سنگین وارداتیں پولیس کے تعاون کے بغیر کی بھی نہیں جاسکتیں۔" میں نے کہا۔

"عام لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو گھوس (رشوت) کھلا دیا گیا تھا تاکہ وہ مداخلت نہ کرے۔" روشن لال نے کہا "اور ویسے بھی یہاں کے تھانے کا انچارج بہت حرامی آدمی ہے۔"

"شکریہ روشن لال جی۔" میں نے کہا "اس بنگلے کی چابی میں آپ کو دے کر جارہا ہوں۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ آجائے تو اس سے سارا حساب کر لیجیے۔"

"آپ ان کے پیچھے جارہے ہیں؟" روشن کے لہجے میں حیرت تھی "آپ کی اپنی حالت اچھی نہیں ہے۔ ویسے بھی شام کا اندھیرا چھا رہا ہے۔ رات کے وقت ان خطرناک پہاڑی راستوں پر سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔"

"پہلے ہی بہت وقت ضائع ہوچکا ہے۔" میں نے کہا "اس سے پہلے کہ میرے اور ان کے درمیان وقت کی خلیج مزید وسیع ہو جائے' میں ان تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے ببلا کو اشارہ کیا۔ وہ تھیلا اٹھا کر باہر نکل گئی۔ میں نے بتیاں بجھا کر دروازہ بند کردیا اور چابی روشن کے حوالے کردی۔ گیٹ پر نیپالی محافظ موجود تھے۔

"آپ ان سب کا حساب کردیجیے روشن لال جی اور اگر مناسب سمجھیں تو ایک آدمی کی ڈیوٹی یہاں لگائے رکھیں۔ گھر کی حفاظت ہوتی رہے گی۔" میں نے کہا۔

"میں سارا انتظام کرلوں گا۔ آپ چنتا نہ کریں۔" روشن لال نے کہا۔

گاڑی گیٹ کے سامنے موجود تھی۔ چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔ روشن لال نے بتا دیا کہ گاڑی کے کاغذات بھی ڈیش بورڈ میں رکھے ہوئے ہیں۔

ببلا نے تھیلا پچھلی سیٹ پر ڈال دیا اور آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے روشن لال سے ہاتھ ملایا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ چابی گھماتے ہی انجن اسٹارٹ ہوگیا۔ اس کی ہموار آواز سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ انجن واقعی بہترین حالت میں تھا۔ میں نے روشن لال کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

شہر کی حدود سے نکلتے ہی میں نے رفتار بڑھا دی۔ پہاڑیوں میں بل کھاتے ہوئے دوسرے ہی موڑ پر سامنے سے آنے والی بس کو دیکھ کر میں نے رفتار کم کرکے کار کو بالکل سائیڈ پر لے لیا۔ یہ ہردوار کی طرف سے آنے والی آخری بس تھی جو سات بجے رشی کیش کے اڈے پر پہنچ جاتی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان پہاڑی راستوں پر سفر کرنا نہایت خطرناک تھا اسی لیے شام کے بعد اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں ہوتا تھا۔ ہماری طرح کسی مجبوری کے تحت سفر کرنا اور بات تھی۔

اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹس جلالی تھیں۔ اندھیرے میں چکراتی ہوئی ہیڈ لیمپس کی روشنی بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھی۔ میں بہت محتاط ہو کر ڈرائیو کررہا تھا۔ ببلا اپنی سیٹ پر سکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے تاثرات تھے۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہردوار شہر کے نواح میں پہنچ گئے۔ لب سڑک چونگی ناکے پر مجھے کار روک لینا پڑی۔ سڑک پر بیریئر لگا ہوا تھا۔ کار رکتے ہی سڑک کے کنارے پر بنی ہوئی کوٹھری سے ایک آدمی نکل کر سامنے آگیا۔ میں نے کار کے اندر کی بتی جلادی۔ اس نے قریب آکر پہلے ہمیں پھر کار کی پچھلی سیٹ پر دیکھا اور آگے جاکر سڑک پر تنی ہوئی لوہے کی زنجیر گرادی۔ میں نے کار آگے بڑھادی اور پھر اچانک ہی ایک اور خیال کے تحت اس شخص کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک لی۔ رشی کیش سے ہردوار کی طرف آنے والا یہی ایک واحد راستہ تھا اور چونگی کے بیریئر کی وجہ سے ہر گاڑی کو یہاں رکنا پڑتا تھا۔ یہ شخص اگر شام سے پہلے بھی یہاں ڈیوٹی پر تھا تو اس نے ان لوگوں کو یہاں سے گزرتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔

"سنو۔" میں نے اس شخص کو مخاطب کیا "تم کتنے بجے سے یہاں ڈیوٹی پر ہو؟"

"میں تو چوبیس گھنٹے یہاں ڈیوٹی پر رہتا ہوں سرکار۔" اس نے جواب دیا۔

"سہ پہر تین بجے کے بعد رشی کیش کی طرف سے دو کاریں اس طرف آئی تھیں' ان میں دو آدمیوں کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ ایک کار کا نمبر میں تمہیں بتا سکتا ہوں۔ کیا تم....."

"مجھے کسی کار کا نمبر تو یاد نہیں ہے سرکار مگر ان عورتوں کو میں نے دیکھا تھا۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے اس لیے یاد ہے کہ ان میں سے ایک کار میں رادھن بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ دونوں عورتیں بیمار ہیں اور انہیں اسپتال لے جارہے ہیں۔"

"اوہ!" میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اسے جانتا تھا۔

"رادھن کون ہے۔ کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رادھن کو تو سارا شہر جانتا ہے سرکار۔ وہ ادھر کا دادا

ہے" اس شخص نے جواب دیا "وہ سرائے داروں اور گیسٹ ہاؤس والوں سے بھتا لیتا ہے۔ اس کی منظوری کے بغیر کوئی یہاں دھندا نہیں کرسکتا۔"

میں نے سونیا اور شوبھا کے حلیے بتا کر پوچھا تو اس نے تصدیق کردی کہ ان کاروں میں یہی دو عورتیں تھیں جو بے ہوش پڑی ہوئی تھیں۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ان دونوں کو یقیناً بے ہوش کرکے رکھا گیا ہوگا۔ میں نے ببلا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ میں نے چونگی محرر کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

اچھا ہی ہوا کہ میں نے چونگی محرر سے پوچھ لیا تھا۔ اس طرح ہماری بہت بڑی مشکل آسان ہوگئی تھی۔ کم از کم ایک سراغ تو مل گیا تھا۔ چونگی محرر کے کہنے کے مطابق رادھن یہاں کا مشہور بدمعاش تھا۔ اس جیسے شخص کا ٹھکانا معلوم کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اگر وہ نہ بھی ملا تو اس کے کسی گرگے سے یہ تو معلوم ہوجائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ رادھن قابو آجائے تو اس سے دیش مکھ کا پتا معلوم کیا جاسکتا تھا۔

بازاروں میں رونق تھی۔ میں نے کار ایک گلی میں موڑ کے ایسی جگہ پر کھڑی کردی جہاں کسی قدر اندھیرا تھا اور زیادہ لوگوں کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔ سامنے بازار تھا۔ اس طرف البتہ خاصی رونق تھی۔

"ہم نے دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھایا تھا اور تمہارے لیے کھانا لے کر آرہے تھے کہ راستے میں یہ سانحہ پیش آگیا۔" میں نے ببلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے دوپہر کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا اور اب نو بج رہے ہیں۔ تم یہیں کار میں بیٹھی رہو۔ میں کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔"

"من نہیں چاہ رہا۔ ویسے کھانے پینے کا سامان تو پیچھے بھی رکھا ہوا ہے۔" ببلا نے کہا۔

"اوہ! اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔" میں نے کہا اور سیٹ کے اوپر سے جھک کر پچھلی سیٹ پر پڑی ہوئی پوٹلی اٹھالی۔

پلاسٹک کا ڈھکنے والا باؤل تھا جس میں پوری مرغی روسٹ کی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے ساتھ چار پانچ تنوری نان تھے۔ پچھلی سیٹ پر ایک تنکوں والی ٹوکری بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس میں پھل وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ روشن لال نے روسٹڈ چکن اور نان کسی ہوٹل سے خرید کر پیک کروائے تھے۔

ہم کار ہی میں بیٹھے کھانا کھاتے رہے۔ جبڑے اور رخسار کی ہڈی پر سوجن کی وجہ سے مجھے نوالہ چبانے میں خاصی تکلیف ہورہی تھی لیکن پیٹ میں کچھ نہ کچھ ایندھن ڈالنا ضروری تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ڈرائیونگ سیٹ پر سیدھا بیٹھے رہنے سے میری کمر تختے کی طرح اکڑ گئی تھی اور پورا جسم دکھ رہا تھا لیکن میں نے بھی قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک آرام نہیں کروں گا جب تک سونیا اور شوبھا کو چھڑا کر دیش مکھ کا مکھڑا نہ بگاڑ دوں۔

کھانے کے بعد میں قریبی ہوٹل سے چائے لے آیا۔ چائے پینے کے بعد ہی حواس کچھ بحال ہوئے تھے۔

ہردوار میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ میں کئی روز یہاں رہ چکا تھا۔ تقریباً تمام راستے میرے دیکھے بھالے تھے۔ میں کار اسٹارٹ کرکے پچھلی سڑک پر لے آیا۔ یہاں ٹریفک بہت کم تھا اور میں نے کار کی رفتار کم ہی رکھی تھی۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے اس طرف نکل آیا جہاں ذرا آگے ببلا اور ٹھاکر وغیرہ کے ساتھ کاٹیج میں ٹھہرا تھا۔

"اس طرف ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔" ببلا نے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شاید سمجھ گئی تھی کہ مجھے کس چیز کی تلاش ہے۔

میں نے کار اسی سڑک پر گھما دی اور تقریباً دو سو گز آگے جاکر نارائن گیسٹ ہاؤس کے سامنے کار روک لی۔ خاصا بڑا گیسٹ ہاؤس تھا۔ گیٹ پر اور اندر لان میں رنگ برنگی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں ببلا کو کار میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرکے نیچے اتر آیا اور نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ میں داخل ہوگیا۔

لان ایک بارونق اوپن ائر ریسٹورنٹ کا منظر پیش کررہا تھا۔ میں بجری والی روش پر چلتے ہوئے عمارت میں داخل ہوگیا۔ برآمدے سے اندر داخل ہوتے ہی کشادہ راہداری تھی جہاں استقبالیہ کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے ہال تھا اور اس ہال میں بھی خاصی رونق نظر آرہی تھی۔

کاؤنٹر کے پیچھے ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ نقش و نگار بتا رہے تھے کہ وہ جوانی میں بڑی حسین رہی ہوگی۔ میں کاؤنٹر کے سامنے رک گیا۔ اس عورت نے میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ آگئی لیکن میرا حلیہ دیکھ کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"سوری سر۔" وہ بولی "اگر آپ کو کمرے کی ضرورت ہے تو میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کرسکوں گی۔ البتہ کل ایک کمرا خالی ہونے والا ہے۔ اگر آپ....."

"مجھے کمرا نہیں چاہیے۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے نہیں دی "مجھے ایک آدمی کی تلاش ہے اور میں جانتا

ہوں کہ تم اس کے بارے میں بات سکتی ہو۔"

"کون؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "کس کو پوچھ رہے ہو؟"

"رادھن!" میں نے کہا۔

یہ نام سنتے ہی اس کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر مجھے گھور کر دیکھنے لگی۔

"سوری سر۔ میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتی۔" وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھو میڈم!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں "میں نے کہا تھا کہ تم اسے جانتی ہو۔ وہ تم سے بھتا وصول کرتا ہے۔ اگر تم مجھے اس کے بارے میں بتا دو تو میں خاموشی سے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ دوسری صورت میں تمہارا یہ خوب صورت گیسٹ ہاؤس صبح تک کھنڈر بن جائے گا۔"

اس کا چہرہ ایک بار پھر دھواں ہو گیا۔

"تم اس کو کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیوں ملنا چاہتے ہو اس سے؟" اس نے پوچھا۔

"میرا یہ چہرہ دیکھ رہی ہو۔" میں نے انگلی سے اشارہ کیا "میرے جسم پر اور بھی ایسے بہت سے نشان ہیں اور میں رادھن سے ان کا حساب چکانا چاہتا ہوں۔"

"لگتا ہے تم پہلے ہی اس سے بہت نقصان اٹھا چکے ہو۔" وہ بولی "رادھن بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کا تجربہ تمہیں ہو چکا ہے۔ بہتر ہے مزید پنگا مت لو اور جہاں سے آئے ہو، خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔"

"میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔" میں نے کہا "اس کا پتا بتا رہی ہو یا۔۔۔"

"ایک منٹ!" اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔ چند لمحے محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر رازدارانہ لہجے میں بولی "میں تمہیں اس کا پتا بتا دوں گی لیکن۔۔۔"

"اطمینان رکھو۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پاروتی آشرم۔۔۔" وہ ایک بار پھر محتاط نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی "اس نے ایک سال سے پاروتی آشرم پر قبضہ جما رکھا ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے۔"

"اور یہ پاروتی آشرم کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گاندھی مارگ کے آخر میں درختوں میں گھرا ہوا ایک مکان ہے۔ تین چار کمروں کا ہوگا۔" اس نے بتایا "چند سال پہلے یہ مکان ایک دولت مند آدمی نے خرید کر اپنی سورگ باشی پتنی کے نام پر آشرم بنا دیا تھا لیکن ایک سال پہلے نجانے کس طرح رادھن نے اس پر قبضہ کر لیا۔ وہ آشرم اس کے تصرف میں ہے۔ ایک دو گرگے اس کے ساتھ رہتے ہیں۔"

"شکریہ شریمتی جی۔" میں نے کہا "لیکن اگر تم نے اسے میرے بارے میں اطلاع دینے کی کوشش کی تو۔۔۔"

"نہیں نہیں۔ میں کسی سے کچھ نہیں بولوں گی۔" وہ جلدی سے بولی "ویسے تم مجھے شکل و صورت اور گفتگو سے شریف آدمی لگتے ہو۔ بہتر ہے اس جیسے حرامی آدمی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے بجائے واپس چلے جاؤ۔"

"شکریہ۔" میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

مجھے یقین تھا کہ گیسٹ ہاؤس کی مالک یہ عورت رادھن کو میرے بارے میں اطلاع نہیں دے گی۔ غنڈوں سے ہر کوئی پریشان رہتا ہے۔ ہر شخص ان سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہے۔

بملا کار میں بیٹھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ میں نے اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کچھ معلوم ہوا؟" بملا نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"رادھن گاندھی مارگ کے ایک آشرم میں رہتا ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے اس عورت سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔

گاندھی مارگ کا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں چترا پریتم کے ساتھ کئی مرتبہ اس طرف آچکا تھا۔ وہیں سے ایک راستہ گنگوتری کی طرف بھی جاتا تھا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ علاقہ گنجان آبادی سے ہٹ کر تھا اور یہاں زیادہ لوگوں کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔ پاروتی آشرم تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ درختوں میں گھرا ہوا یہ مکان بھی آبادی سے کافی ہٹ کر تھا۔

میں نے کار کو مکان سے دور درختوں کے نیچے روک کر انجن بند کر کے بتیاں بھی بجھا دیں۔ بملا بھی میرے ساتھ جانے کو تیار تھی لیکن میں نے اسے وہیں روک دیا اور تھیلے میں سے دلیش مکھ والا پستول نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا۔

"اگر میں پندرہ بیس منٹ تک مکان سے باہر نہ آؤں یا تم کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو اندر آجانا اور کوئی بھی مزاحمت کی کوشش کرے تو بے دریغ گولی مار دینا۔"

میں کار سے اتر کر درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں اس مکان کی بعض کھڑکیوں سے مدھم سی روشنی جھلکتی

...نظر آ رہی تھی۔ یہ مکان دو منزلہ تھا اور اوپر کی ایک دو ...کھڑکیوں میں بھی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

مکان کا گیٹ خاصا بڑا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک چھوٹا ...دروازہ بھی تھا۔ گیٹ اور دروازہ دونوں بند تھے۔ میں نے ...درزوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ صحن میں تاریکی تھی لیکن ...بائیں طرف کسی جگہ ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔

میں گیٹ پر چڑھ کر اندر داخل ہونے کے بارے میں ...سوچ ہی رہا تھا کہ صحن میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں آڑ ...میں کھڑا ہو گیا۔ وہ آواز چھوٹے دروازے کے قریب آکر ...رک گئی اور پھر اندر سے دروازے کا آہنی بولٹ ہٹائے ...جانے کی آواز سنائی دی۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک ...آدمی باہر نکلا۔

میں اس آدمی پر جھپٹ پڑا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ ...پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں اسے گرفت میں لینے کی ...کوشش کر رہا تھا کہ وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکل گیا۔ ...اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔ وہ ...ایک دم گڑبڑا گیا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا مگر اس سے پہلے ...کہ وہ اپنے دفاع میں یا میرے خلاف کوئی کارروائی کرتا یا منہ ...سے کوئی آواز نکالتا، میں عقاب کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے ...دبا کر گرفت میں لے لیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا ...تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ اس کی گردن میرے سیدھے بازو کی ...لپیٹ میں تھی۔

وہ بری طرح مچل رہا تھا۔ میں اس کی گردن پر دباؤ ...بڑھانے لگا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ بھی اندیشہ ...تھا کہ اس کا کوئی اور ساتھی نہ آجائے۔ میں اس کی گردن کو ...دباتا رہا۔ وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے مچھلی کی طرح ...تڑپ رہا تھا لیکن میری یہ گرفت ایسی نہیں تھی جس سے ...وہ آسانی سے چھٹکارا پا سکتا۔

میں نے اس کی گردن کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا۔ ...ل" کی آواز ابھری۔ گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں نے ...دو اور جھٹکے دیے۔ وہ میرے ہاتھوں میں بری طرح مچل ...رہا تھا۔ میں اسے گھسیٹتے ہوئے گیٹ سے دور لے گیا اور ...درختوں کے نیچے چھوڑ دیا۔

اس کے حلق سے "خرخراہٹ" کی عجیب سی آوازیں ...نکل رہی تھیں۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہا ...تھا۔ میں نے اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا اور مکان کے ...دروازے کی طرف لپکا۔

میری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ جسم بری طرح دکھ رہا ...تھا لیکن یہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں اپنی تکلیف کے بارے میں سوچتا۔ میں گیٹ میں داخل ہو کر ایک لمحے کو رکا اور پھر صحن پار کرتے ہوئے اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جہاں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

ابھی میں چند قدم دور ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور میں پوری طرح کمرے سے آنے والی روشنی میں نہا گیا۔ کمرے سے برآمد ہونے والا آدمی مجھے دیکھ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔

"اے۔ کون ہو تم۔۔۔؟" اس دراز قامت شخص نے یہ کہنے کے ساتھ ہی اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

لیکن میں نے اس کا ہاتھ جیب تک نہیں پہنچنے دیا۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا اور اس کے اوپر جا گرا۔ ہم دونوں دروازے سے ٹکرا کر کمرے کے اندر گرے تھے۔ مجھ سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں، میں گرتے ہوئے اس شخص کے نیچے دب گیا تھا۔

اس شخص نے بڑی تیزی سے میرے مضروب جبڑے پر دو تین گھونسے جڑ دیے۔ میرا دماغ جھنجنا اٹھا لیکن میں نے اسے مزید موقع نہیں دیا اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پوری قوت سے اس کی ناک پر مار دی۔ وہ بلبلا اٹھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے اسے اپنے اوپر سے ایک طرف گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کے چہرے پر تابڑ توڑ گھونسے برسانے لگا لیکن میں زیادہ دیر تک اپنے حملے جاری نہیں رکھ سکا تھا۔ اس نے مجھے پیروں پر اٹھا کر پیچھے اچھال دیا اور سنبھل کر میرے اوپر چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اپنے آپ کو اس کی زد سے بچا لیا اور بڑی پھرتی سے پلٹ کر اس کی گردن کو بازو کی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میری کلائی پر جما دیے اور گرفت چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ میرا پسندیدہ داؤ تھا اور میرا کوئی حریف آج تک اس سے بچ نہیں سکا تھا۔

"رادھن کہاں ہے؟" میں نے اس کی گردن پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا "جلدی بتاؤ ورنہ گردن توڑ دوں گا۔"

"وہ۔۔۔ وہ اوپر ہے۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی "تت۔۔۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔"

"اور وہ حرام زادہ کہاں ہے۔ دلیش مکھ؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"مم۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔" اس نے جواب دیا۔

"رادھن کے ساتھ اور کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ لونڈیا۔۔۔" گردن پر میرے بازو کے دباؤ کی وجہ سے آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔

"اور کون ہے؟"

"کک۔۔۔ کوئی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں اس کی گردن پر دباؤ بڑھانے لگا۔ وہ اپنی گردن چھڑانے کی کوشش کے ساتھ بری طرح لاتیں چلا رہا تھا۔ اس کی گردن پر میرا دباؤ بڑھتا گیا اور پھر میں نے زوردار جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز ابھری اور میں نے دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اس کے حلق سے خر خراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑی تھیں اور زبان باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں اس کے مرنے کا انتظار کرنے کے لیے وہاں رکا نہیں۔

کمرے سے نکل کر میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر برآمدے کی دوسری طرف اوپر جانے کی سیڑھیاں نظر آگئیں۔ میں دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھتا چلا گیا۔

اوپر بھی تین چار کمرے تھے۔ دو کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک کمرے کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں تیزی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کمرے کا دروازہ بند تھا اور نیچے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ میں نے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمانے کی کوشش کی مگر دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر کچھ نظر نہیں آیا اور پھر میں سیدھا ہو کر زور زور سے دروازہ دھڑدھڑانے لگا۔

"دن ہے بے.... کیا ہوا؟" اندر سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

"دروازہ کھولو دادا۔ پولیس نے گھیرا ڈال لیا ہے۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اندر سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا کہ میں کون ہوں۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ اس کے ساتھ ہی میرا گھونسا اس شخص کے منہ پر پڑا جس نے دروازہ کھولتے ہی باہر آنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چیختے ہوئے لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے جبڑے پر ایک اور زوردار گھونسا جما دیا۔ اس مرتبہ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا اور پشت کے بل گر گیا۔

میں نے بڑی پھرتی سے جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکال لیا لیکن وہ میرے حملے سے پہلے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم یہاں تک پہنچ گئے۔" اس کے حلق سے بھیڑیے کی سی غراہٹ نکلی "رادھن کے ڈیرے پر آکر کوئی زندہ واپس نہیں گیا۔ تمہاری موت ہی تمہیں یہاں لے آئی ہے۔"

"موت کس کی آئی ہے' یہ فیصلہ ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" میں نے جواب دیا "اگر تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہ بتا دو کہ دلیش مکھ کہاں ہے اور... لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"دلیش مکھ شوبھا کو لے کر المورا چلا گیا ہے۔ لڑکی اس نے مجھے دان کر دی تھی۔ وہ سالی تو بڑی نخرے... بے ہوش ہو گئی ہے۔ اب تم آگئے ہو تو اپنی آنکھوں سے... لینا اس کا کیا حشر ہوتا ہے۔ رامو۔ چندر۔ ادھر آؤ۔... ہے۔"

"کوئی نہیں آئے گا رادھن۔" میں نے کہا "وہ... خود شکار ہو چکے ہیں اور اب تمہاری باری ہے۔"

رادھن کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر... اور اندر والے دروازے کی طرف دوڑا۔ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی لیکن... دروازے سے ٹکرا گیا۔ دروازے کی ٹکر سے وہ پیچھے...

میں نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن میرا پیر فرش... ہوئی دری میں الجھ گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور لڑکھڑا کر ایک کرسی سے ٹکرایا اور کرسی سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ خنجر بھی میرے ہاتھ سے نکل کر گر گیا تھا۔

رادھن نے لپک کر میرا خنجر اٹھا لیا اور مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن میں اس سے پہلے ہی سنبھل چکا تھا۔ اس کا وار میں نے ہاتھ پر روکا۔ اس کی کلائی میری گرفت میں آگئی۔ میں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی گرفت میں لے لیا اور اسے پیچھے دھکیلنے لگا۔

اس دوران میں میری نظریں پلنگ کی طرف اٹھ گئیں جہاں سونیا بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہو... ہو گا۔

میں رادھن کو دھکیلتے ہوئے پیچھے لے گیا اور پھر اچانک ہی اس نے میری ٹانگ میں اڑنگا لگا دیا۔ میں لڑکھڑا کر پشت کے بل سونیا والے بیڈ پر گرا۔ رادھن کی کلائی بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

رادھن نے خنجر والا ہاتھ اوپر اٹھا کر حملہ کیا۔ میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

میں تو اس حملے سے بچ گیا لیکن رادھن کا خنجر بیڈ پر بے سدھ پڑی ہوئی سونیا کے سینے میں دستے تک پیوست ہو گیا۔ میں پھٹی پھٹی سی نظروں سے سونیا کو دیکھ رہا تھا جس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا تھا۔

اگر میں خنجر کے وار سے بچنے کے لیے لوٹ نہ لگاتا اور وار کو روکنے کی کوشش کرتا تو یہ صورتِ حال نہ ہوتی لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔

سونیا بے ہوش تھی لیکن خنجر سینے میں پیوست ہوا تو اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اس کے سینے سے بہتا خون دیکھ کر میری آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ رادھن کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو عجیب سے تاثرات ابھرے۔ اسے شاید اس بات پر اچنبھا ہوا تھا کہ اس کے خنجر نے میرے بجائے سونیا کو شکار کر لیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ اسے شاید اس بات کی پروا نہیں تھی کہ خنجر کس کے جسم میں پیوست ہوا تھا۔ ظاہر ہے اسے سونیا سے بھی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

رادھن نے بڑی پھرتی سے خنجر کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی خون کا فوارہ سونیا کے سینے سے بہہ نکلا تھا۔ میں لوٹ لگا کر دوسری جانب اپنی ٹانگوں پر آگیا تھا۔ اس کے سینے سے بہتا خون دیکھ کر ایک لمحے کو میرے حواس مختل ہو گئے تھے۔ رادھن نے دوبارہ وار کیا۔ اس مرتبہ بھی اس کا نشانہ میں ہی تھا لیکن اب میں اپنے حواس پر قابو پا چکا تھا۔

میں نے بڑی پھرتی سے اس کا وار روکا اور اس کی کلائی مروڑنے لگا۔ اس کم بخت میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی۔ وہ خنجر کو میرے جسم میں پیوست کرنے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔

ایک ہلکے سے جھٹکے سے خنجر کا رخ بدل گیا اور اب اس کی نوک میری شہ رگ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میری پشت سونیا کی ٹانگوں پر ٹکی ہوئی تھی اور میری ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ رادھن میرے اوپر اس طرح چڑھا ہوا تھا کہ میری ٹانگیں اس کے نیچے دب گئی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ایک ٹانگ سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے ٹھوکر لگائی لیکن یہ ٹھوکر زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس رادھن کو مزید طاقت لگانے کا موقع مل گیا تھا۔

خنجر کی نوک اب میرے نرخرے سے صرف ڈیڑھ دو انچ کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ رادھن کے ہاتھ کا ہلکا سا جھٹکا میری زندگی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ کی مٹھی سے اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ میرا یہ وار کچھ کارگر ثابت ہوا۔ میں نے دوبارہ یہی حربہ آزمایا۔ اس نے بچنے کے لیے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ اس طرح اس کے خنجر والے ہاتھ کا دباؤ کم ہو گیا اور مجھے موقع مل گیا۔ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اس کا بازو موڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی گھٹنا سمیٹ کر اس کی ٹانگوں کے بیچ میں ایک اور ضرب لگائی۔ یہ وار بھی کارگر ثابت ہوا اور وہ اچھل کر سونیا کے سینے پر گرا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک ایک بار پھر سونیا کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ سونیا کے جسم کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

میں نے بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر رادھن کا خنجر والا ہاتھ موڑ دیا۔ خنجر ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے ہٹا تو سونیا کے سینے سے خون کی ایک اور دھار بہہ نکلی۔

سونیا کے بدن سے بہتا خون دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے اس کا بازو موڑ کر اس کی پشت سے لگا دیا اور انگوٹھے کا ناخن اس کی کلائی کی نس میں پیوست کر دیا۔

رادھن آہستہ آہستہ اپنے جسم کو سمیٹ رہا تھا اور پھر اچانک ہی اس نے ایک زوردار جھٹکا لے کر مجھے گرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس مجھے موقع مل گیا اور میں نے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ الٹی قلابازی کھاتا ہوا بیڈ کے دوسری طرف جا گرا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر بیڈ پر گر گیا تھا۔

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ سونیا کے سینے پر دو جگہوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس نے ایک آخری جھٹکا لیا اور ساکت ہو گئی۔

میں اس وقت عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ رگوں میں خون کھول رہا تھا اور سینے میں جیسے آگ سی بھر گئی تھی۔ میں نے رادھن پر چھلانگ لگا دی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔

مجھ پر جنون سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے رادھن پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی اور اسے بیڈ کے دوسری طرف کھلی جگہ پر لے آیا۔ رادھن سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ ایک مرتبہ اس نے باہر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی ٹانگ میری گرفت میں آگئی۔ وہ منہ کے بل ایک کرسی پر گرا۔ اس کا منہ کرسی کے ہتھے سے ٹکرایا تھا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔

میں نے اسے ایک بار پھر گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ وہ ہر مرتبہ اپنے آپ کو چھڑا کر باہر بھاگنے کی کوشش کرتا مگر میں اسے پکڑ لیتا۔ وہ

اپنے گُرگوں کے نام لے لے کر چیخ رہا تھا۔ انہیں مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

رادھن اس شہر کا بہت بڑا بدمعاش تھا۔ یہاں کا دادا تھا۔ شہر کے سارے گیسٹ ہاؤسز سے بھتّا وصول کرتا تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر یہاں کوئی شریف آدمی کام دھندا نہیں کرسکتا تھا۔ لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے لیکن اس کی ساری بدمعاشی اور دادا گیری ناک کے راستے نکل گئی تھی۔ وہ مدد کے لیے اپنے گرگوں کو پکار رہا تھا۔

ایک موقع پر اس کا داؤ چل گیا اور میں اس کے قابو میں آگیا۔ اس نے میرے جبڑے پر ایک گھونسا بھی لگا دیا تھا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا لیکن میں نے اسے دوسرا وار کرنے کا موقع نہیں دیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر زور زور سے ٹکرانے لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ ہر ٹکر پر اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکل جاتی۔

رادھن نے گھٹنے سے میری ٹانگوں کے بیچ ٹھوکر لگائی۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس نے موقع پاکر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس مرتبہ اس نے بیڈ کی طرف چھلانگ لگائی تھی جہاں سونیا کے برہنہ جسم کے قریب خنجر پڑا ہوا تھا۔ رادھن خنجر اٹھا کر بڑی تیزی سے میری طرف پلٹا تھا۔ اگر میں غافل ہوتا تو خنجر میرے سینے میں پیوست ہوچکا ہوتا لیکن میں بڑی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور وہ اپنی ہی جھونک میں آگے نکل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اسے دبوچ لیا۔ میں اپنے دونوں بازو اس کی بغلوں کے نیچے سے نکال کر ہاتھ اس کی گردن پر لے آیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسالیں۔ اس طرح اس کی گردن میرے شکنجے میں آگئی تھی اور اس کے دونوں بازو بھی میرے داؤ کی گرفت میں تھے۔

میں نے ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس کی گردن اور کندھوں پر دباؤ پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ میں نے ایک اور جھٹکا دے کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ منہ کے بل نیچے گرا۔ اس نے ایک بار پھر خنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن اس سے پہلے خنجر میرے ہاتھ میں آگیا۔

اسی لمحے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے دہاڑنے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ رادھن ہی کا کوئی آدمی تھا جو کمرے میں داخل ہوکر خنجر تانے مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا لیکن اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اس آدمی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ وہ کھڑے کھڑے کٹے ہوئے درخت کی طرح لہرایا اور ڈھیر ہوگیا۔ اس کی پشت پر بائیں طرف سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔

وہ بملا تھی۔ جو پستول ہاتھ میں لیے دروازے میں کھڑی تھی اور پھر اس کی نظر جیسے ہی بیڈ پر پڑی ہوئی سونیا پر پڑی، چیختی ہوئی اس کی طرف دوڑی۔

رادھن نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے دروازے کے قریب اسے دبوچ لیا اور اسے نیچے گرا کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ اس کا خون آلود چہرہ بہت بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے نرخرے پر رکھ دی۔

”وہ حرامی دیش مکھ، شوبھا کو لے کر کہاں گیا ہے۔ سچ بتاؤ ورنہ تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔“ میں نے اس کے نرخرے پر خنجر کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ المورا۔۔۔“ اس کے حلق سے بمشکل یہ آواز نکلی تھی۔

”المورا۔ کس جگہ۔۔۔؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”شش۔۔۔ شہر کے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر کھٹال جاگیشور مندر سے ذرا ہٹ کر آبشار کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی ہٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سرخ چھت اور نیلی دیواروں والا ہٹ دیش مکھ کی ملکیت ہے۔ وہ ہر سال چھٹیاں منانے کے لیے وہاں جاتا ہے۔ نینی تال میں بھی اس کا ایک ہٹ ہے۔ کبھی وہاں بھی چلا جاتا ہے۔“

”تم اسے کب سے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت عرصے سے۔“ رادھن نے جواب دیا ”کبھی وہ راجستھان سے کسی لڑکی کو ساتھ لے کر آتا تھا اور کبھی میں اسے لڑکیاں سپلائی کرتا تھا۔ یہاں ہردوار میں لڑکیوں کی کمی نہیں۔ ملک کے کونے کونے سے یاتری یہاں آتے ہیں۔ ان میں خوب صورت لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ ایسی جگہوں پر کسی لڑکی کو اٹھانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں مندروں کے بعض پنڈت بھی ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ لڑکیوں کو اٹھا کر نینی تال یا المورا جہاں دیش مکھ ہوتا ہے پہنچا دیا جاتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس مرتبہ دیش مکھ وقت سے پہلے آگیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس مرتبہ رشی کیش سے ایک عورت کو اٹھانا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھے پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ تمہاری وجہ سے ہمیں خاصی مشکل پیش آئی تھی لیکن دیش مکھ کی مطلوبہ عورت کے ساتھ یہ لڑکی بھی ہمارے ہاتھ لگ گئی۔“ اس نے بیڈ کی طرف دیکھا ”دیش مکھ کسی حسین لڑکی کو نہیں چھوڑتا لیکن اس مرتبہ اسے صرف شوبھا کی ضرورت تھی۔ یہ لڑکی اس نے مجھے تحفے میں دے دی۔“

”اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟“ میں نے ایک اور سوال کیا۔

”دو۔۔۔ وہ دونوں اس کے ساتھ راجستھان سے آئے تھے۔“ رادھن نے جواب دیا ”وہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ تم دیش مکھ تک نہیں پہنچ سکو گے لیکن اگر تم مجھے چھوڑ دو تو میں اس کے خلاف تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔“

”دیش مکھ سے تو میں نمٹ لوں گا لیکن تم جیسے حرامی کو زندہ چھوڑ دینا میری سرشت میں نہیں ہے۔“ میں نے یہ کہنے کے ساتھ ہی پوری قوت سے اس کے نرخرے پر خنجر پھیر دیا اور اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔

رادھن پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی شہ رگ سے خون فوارے کی طرح اچھل رہا تھا اور خرخراہٹ کی عجیب سی آوازیں خارج ہو رہی تھیں۔

چند منٹ بعد وہ بے حرکت ہوگیا۔ فرش پر چاروں طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ رادھن کا چہرہ کچھ اور بھیانک ہوگیا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر لپک کر بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔

بملا، سونیا پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ بملا کے ہاتھ میں تھا۔ بستر کی چادر خون سے تربتر ہو رہی تھی۔ میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ وحشت اور آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے سونیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نبض ٹٹولنے کی کوشش کرنے لگا پھر میں نے ہاتھ اس کے جبڑے کے نیچے گلے پر رکھ دیا۔ میری انگلیاں اس کے گلے کو مختلف جگہوں سے ٹٹولتی رہیں لیکن کہیں بھی کوئی تحریک محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے ہر طرح سے اطمینان کرلیا۔ سونیا میں زندگی کا کوئی نشان نہیں رہا تھا۔ خنجر کا پہلا وار سینے پر عین دل کے مقام پر ہوا تھا اور خنجر دستے تک سینے میں پیوست ہوگیا تھا۔ ایسے خوفناک وار کے بعد بھی وہ زندہ بچ جاتی تو مجھے حیرت ہوتی۔

میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ اس کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنکھوں میں رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے اور وہ مجھ سے لپٹ کر ہچکیاں بھرنے لگی۔ میں بھی اپنے آنسو ضبط نہیں کرسکا۔

میں نے بڑی مشکل سے بملا کو اپنے آپ سے الگ کیا۔ دوسرے کمرے کے بیڈ سے چادر اٹھا کر سونیا پر ڈال دی۔ آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا اور پھر چہرہ بھی ڈھک دیا۔ ہم اس سے زیادہ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔

میں بملا کو لے کر کمرے سے باہر آگیا اور جب ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے تو سامنے دور سے کسی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ گاڑی اسی طرف آرہی تھی۔ میں نے بملا کا ہاتھ پکڑلیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر بملا کا پیر رپٹ گیا۔ وہ چیختی ہوئی نیچے گری۔ میں نے جھک کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ایک بار پھر چیخ اٹھی۔

”اٹھو۔ جلدی کرو۔ وہ گاڑی اسی طرف آرہی ہے۔“ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میرا پیر!“ وہ کراہ اٹھی۔

میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور تقریباً دوڑتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ گاڑی کافی دور تھی۔ وہ اگرچہ اس آشرم کی طرف ہی آرہی تھی لیکن اس کا رخ قدرے بائیں طرف تھا۔ وہ راستہ ذرا سا گھوم کر آشرم کی طرف آتا تھا۔ راستے کے اس خم کی وجہ سے ہم اس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے۔

میں بملا کو گود میں اٹھائے درختوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ کار کے قریب پہنچ کر میں نے بملا کو نیچے اتار دیا اور پسنجرز سائڈ کا دروازہ کھول دیا۔ اسی دوران وہ کار آشرم کے سامنے پہنچ کر رک چکی تھی۔

”جلدی سے بیٹھ جاؤ۔“ میں بملا کو چھوڑ کر سامنے سے گھومتا ہوا ڈرائیونگ سیٹ کی طرف لپکا۔

اس کار میں آنے والے بھی یقیناً رادھن ہی کے آدمی تھے اور میں جانتا تھا کہ آشرم کے اندر کی صورتِ حال دیکھ کر وہ پاگل ہوجائیں گے اور ظاہر ہے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش کریں گے۔

بملا بمشکل کار میں بیٹھ سکی تھی۔ اس نے دروازہ زور سے بند کیا تھا جس کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی تھی اور پھر اسی وقت آشرم کی طرف سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تھی۔ انہوں نے غالباً دیوار کے قریب پڑی ہوئی اس شخص کی لاش دیکھ لی تھی جو سب سے پہلے میرے ہاتھوں سے مارا گیا تھا اور پھر اسی وقت آشرم کی طرف سے ایک اور چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

”وہ دیکھو۔ اس طرف کوئی گاڑی کھڑی ہے۔“

"تم اندر جاؤ۔ میں اس گاڑی کو دیکھتا ہوں۔" یہ دوسری آواز تھی۔

وہ شخص ہماری طرف دوڑا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کردیا اور کار کو ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ وہ شخص ہماری طرف دوڑ رہا تھا۔ فاصلہ تقریباً سو گز کے قریب تھا۔ میں نے کار کو تیزی سے دائیں طرف گھما دیا اور ایکسلی ریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ اسی لمحے فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ پہلی گولی کار کی پچھلی ونڈ شیلڈ کے ایک کونے میں لگی اور شیشے میں سوراخ کرتی ہوئی کھڑکی سے نکل گئی۔

میں درختوں میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اس کے بعد دو فائر اور ہوئے تھے لیکن کوئی گولی ہماری کار تک نہیں پہنچ سکی تھی۔

کار درختوں سے نکل کر سڑک پر آگئی' میں نے اسے بائیں طرف گھما دیا اور اس کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہماری کار شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ سڑک پر سناٹا تھا۔ اس وقت اس سڑک پر ٹریفک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ پختہ سڑک تھی۔ میں تیز رفتاری سے کار دوڑاتا رہا۔ ہم نے اس آشرم یا رادھن بدمعاش کے اڈے پر چار آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ پانچویں لاش سونیا کی تھی۔ رادھن اور اس کے گرگے بدمعاش تھے۔ شہر والوں کی زندگیوں کے لیے عذاب بنے ہوئے تھے۔ امن و امان کے لیے مستقل خطرہ تھے۔ ان کی موت سے شہر والوں کو کچھ عرصے کے لیے سکون ضرور ملے گا مگر ان کا قتل بہرحال جرم تھا۔ کسی عام آدمی کو ان کے جرائم کی سزا دینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کسی مجرم کو سزا دینا صرف قانون کا کام تھا لیکن اس ملک میں قانون کتنا بے بس تھا؟ وہ میں دیکھ چکا تھا۔ جے پور میں روپ متی کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس نے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی لیکن قانون کو تو ان لوگوں نے خرید لیا تھا جو قانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور آج دن میں کیا ہوا تھا؟ سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں شوبھا اور سونیا کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ وہاں سے صرف سو گز کے فاصلے پر پولیس اسٹیشن تھا۔ لوگوں نے تھانے جاکر اس واردات کی اطلاع بھی دے دی۔ فائرنگ کی آوازیں تھانے تک بھی سنی گئی تھیں لیکن قانون کے محافظوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ میں دو گھنٹے اسپتال میں بے ہوش پڑا رہا تھا لیکن قانون کے کسی محافظ نے آکر میری خبر تک نہیں لی تھی۔ بعد میں بھی کسی نے مجھ سے یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ سونیا اور شوبھا کو اغوا کرنے والے کون لوگ تھے؟

کوئی بڑا جرم قانون کے رکھوالوں کے تعاون کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ دلیش مکھ نے بھی یہ واردات کرنے سے پہلے قانون کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور محافظوں کے ہاتھ دولت کی زنجیر سے باندھ دیے تھے۔

میں نے خود ان لوگوں کا سراغ لگایا تھا۔ میں اگر پولیس کے پاس جاتا تو بھی رادھن اور اس کے آدمیوں کا کچھ نہ بگڑتا۔ وہ بدمعاش آدمی تھا۔ طاقت ور تھا۔ پولیس والے بھی اس کی طاقت سے خائف تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ گیسٹ ہاؤسز والوں سے بھتا کیوں وصول کرتا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کا خوف کیوں ہوتا؟ قانون کے محافظ اس کے جرائم سے پردہ پوشی کیوں کرتے؟ اگر قانون کے یہ رکھوالے فرض شناس اور ایمان دار ہوتے تو رادھن بدمعاش کیوں بنتا۔ جرائم کیوں ہوتے؟ رادھن اور اس کے گرگے مارے گئے تھے۔ دو شریف عورتوں کو بھرے بازار سے اغوا کرلیا گیا تھا تو قانون کے محافظوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ اب رادھن جیسا بدمعاش اور اس کے گرگے مارے گئے تھے تو شہر میں قیامت مچ جائے گی۔ پولیس کا ہر فرد قاتلوں کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑتا ہوا نظر آئے گا۔ ممکن ہے وہ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر بھی توجہ دیں اسی لیے میں جلد سے جلد شہر سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔

ببلا اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا بایاں پیر دبا رکھا تھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے صرف ایک دو مرتبہ اس کی طرف دیکھا تھا لیکن بات نہیں کی تھی۔ میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ سونیا کی دردناک موت نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے پرانے ساتھی ایک ایک کرکے مجھے چھوڑ گئے تھے۔ تھائی۔۔۔ جانکی اور اب سونیا۔ مجھے لگتا تھا جیسے میرے بدن کا ایک اور حصہ مجھ سے الگ ہوگیا ہو۔

سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گھنے جنگل تھے۔ کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی نے تاریکی میں ایک سرنگ سی بنادی تھی اور لگتا تھا جیسے ہم ایک طویل اور ختم نہ ہونے والی سرنگ میں سفر کررہے ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم رورکی نامی ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک سڑک سہارنپور' انبالہ' چندی گڑھ اور

پنجاب کی طرف چلی گئی تھی جبکہ دوسری سڑک نگینہ، خاص پور اور رامپور سے ہوتی ہوئی بریلی اور لکھنؤ وغیرہ کی طرف جاتی تھی۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ بستی سناٹے اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے کار کی رفتار کم کردی تھی۔ بستی کے ایک دو آوارہ کتے بھونکتے ہوئے ہماری کار کے پیچھے لگ گئے تھے لیکن میں نے ان کی پروا نہیں کی۔ کتوں کا تو کام ہی راہ گیروں پر بھونکنا ہوتا ہے۔

میں ہلکی رفتار سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک ذیلی سڑک پر روشنی دیکھ کر میں نے کار اس طرف موڑ دی اور مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس طرف ایک بنئے کی دکان کھلی ہوئی تھی میں نے دکان کے سامنے کار روک لی۔

دکان میں دو آدمی بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ ان میں ایک تو دکان دار تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ میں کار سے اتر کر دکان میں داخل ہوگیا اور پرنام کرکے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دروازہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر اندر سے دکان بہت بڑی تھی اور بقول شخصے یہاں سوئی سے لے کر ہاتھی تک مل سکتا تھا۔ ایک طرف شیلفوں پر ایلوپیتھی کی ادویات بھی سجی ہوئی تھیں۔

"کیا چاہیے مہاراج۔ کس چیز کی تلاش ہے آپ کو؟" دکان والے نے پوچھا۔

"وہ دراصل میری پتنی کے پیر میں موچ آگئی ہے۔ اس کے لیے کوئی مرہم وغیرہ ہو تو۔۔۔" میں کہتے ہوئے ایک بار پھر اوھر ادھر دیکھنے لگا۔

"مرہم تو مل جائے گا۔ پر موچ آئی ہے یا چوٹ لگی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پیر رپٹ گیا تھا اور۔۔۔"

"نارائن۔" دکان دار نے میری بات کاٹ کر اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "بٹیا کو دیکھ لے۔ وہ سامنے موٹر میں بیٹھی ہے اور یہ مرہم لے جا۔ لگا کر پٹی باندھ دینا۔" اس نے ایک ڈبیا نارائن کی طرف بڑھا دی پھر میری طرف دیکھ کر بولا "نارائن رامپور میں پہلوانی کیا کرتا تھا۔ اب تو سب چھوڑ دیا۔ عرصے سے یہاں رہ رہا ہے۔"

نارائن کے ساتھ میں بھی دکان سے باہر آگیا۔ میں نے پسنجرز سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور ببلا کو اشارہ کیا۔ وہ سیٹ پر پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ نارائن دروازے کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور ببلا کا پیر ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ اس نے پیر کو ایک دو ہلکے ہلکے جھٹکے بھی دیے۔ ببلا سسکاریاں بھر کر رہ گئی۔

"موچ نہیں آئی۔ ہلکا سا جھٹکا لگا ہے۔ میں مالش کرتا ہوں ٹھیک ہوجائے گی۔" نارائن نے کہا اور مرہم سے پیر کی مالش کرنے لگا۔

ببلا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے تکلیف ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ نارائن نے مالش کرکے اپنے کندھے پر پڑا ہوا پٹکا اتارا اور اسے پھاڑ کر پیر پر پٹی باندھ دی۔

"صبح اس مرہم سے پھر مالش کرلینا۔ بٹیا ٹھیک ہوجائے گی۔" اس نے کہا۔

ببلا نے ڈبیا اس سے لے لی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نارائن کے ساتھ دکان میں آگیا اور ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک طرف مجھے کمبل بھی تہ در تہ رکھے ہوئے نظر آئے۔ یہ آرمی کے نیلام شدہ کمبل تھے۔ میں نے دو کمبل لے لیے۔

دکان دار نے کمبلوں کے پیسے تو لے لیے لیکن مرہم کے پیسے نہیں لیے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ایسے ہمدرد اور نیک لوگ بھی موجود ہیں جنہیں اجنبیوں سے بھی ہمدردی ہوتی ہے۔

"شریمان جی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آدھی رات کو اتنا لمبا سفر۔۔۔"

"ہم رام پور سے آرہے ہیں۔" میں نے کہا "راستے میں گاڑی خراب ہوگئی جس وجہ سے دیر ہوگئی۔ ہمیں بہرحال صبح سے پہلے پہلے ہردوار پہنچنا ہے۔ اس لیے رات میں بھی سفر جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن آپ لوگ اس وقت دکان کیوں کھولے بیٹھے ہیں جبکہ بستی کے سب لوگ گہری نیند سو رہے ہیں۔"

"رام پور سے آنے والی ٹرین بھی آج چار گھنٹے لیٹ ہوگئی ہے۔" دکان والے نے جواب دیا۔

اور پھر اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رورکی ایک چھوٹا سا ریلوے جنکشن ہے۔ آٹھ بجے رام پور سے چندی گڑھ جانے والی ٹرین یہاں سے گزرتی ہے۔ اس کی بہن اور بہنوئی اس ٹرین سے آنے والے ہیں۔ اس کا گھر بھی دکان کے پیچھے ہے اس لیے وہ دکان کھولے بیٹھے ہیں۔ اس کے کہنے کے مطابق ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ آگے تھا۔ اس طرف بعض دکانیں اور ایک آدھ ہوٹل ضرور کھلا ہوگا۔

میں نے باتوں ہی باتوں میں ان سے یہ بھی معلوم کرلیا کہ الموڑا جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو نگینہ شہر سے پکی سڑک ہے جو رام نگر شہر تک چلی گئی ہے۔ اس سے آگے الموڑا جانے والی سڑک ابھی زیرِ تعمیر ہے لیکن زیادہ ٹریفک اس طرف سے جاتا ہے۔ دوسرا راستہ اس بستی سے الموڑا کی طرف جاتا ہے۔ یہ سڑک کہیں پکی ہے اور کہیں کچی لیکن گھنے جنگلوں کی وجہ سے یہ راستہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ان جنگلوں میں خوں خوار درندے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے لوگ دن کے وقت بھی اس طرف سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

میں ان کا شکریہ ادا کرکے کار میں واپس آگیا اور انجن اسٹارٹ کرکے کار کو ریورس میں لیتا ہوا سڑک پر لے آیا اور اسے اس طرف موڑ دیا جس طرف سے ہم آئے تھے۔ الموڑا کی طرف جانے والا راستہ ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میں نے ان لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ ہم رام پور سے آئے تھے اور ہردوار جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر کسی وقت یہاں سے ہمارے بارے میں پوچھا جائے تو ہمارا سراغ نہ لگایا جاسکے اور ویسے بھی اب ہم ہردوار کی طرف ہی جا رہے تھے۔

اس سڑک پر تقریباً ایک میل آگے جا کر میں نے کار دائیں طرف موڑ دی۔ یہ سڑک اگرچہ پختہ تھی لیکن زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ چند میل کا فاصلہ طے ہونے کے بعد ہی گھنا جنگل شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے دونوں کمبل ببلا کے حوالے کردیے تھے۔ اس نے ایک کمبل اپنے اوپر لپیٹ لیا تھا اور دوسرا گود میں رکھا ہوا تھا۔

آج دن میں دیش مکھ اور اس کے ساتھیوں نے رشی کیش میں میری اچھی خاصی دھنائی کی تھی پھر طویل سفر اور آشرم میں رادھن اور اس کے آدمیوں سے مار پیٹ۔ اس وقت میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے جوڑوں میں تکلیف شروع ہوگئی تھی لیکن میں اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

مجھے سیٹ پر بار بار پہلو بدلتے دیکھ کر ببلا نے دوسرا کمبل کھول کر میرے اوپر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اگر راستے میں کوئی بستی آئے تو ہم گھنٹا دو گھنٹے وہاں رک کر آرام کرلیں لیکن میں نے اس وقت تک آرام نہ کرنے کی قسم کھائی تھی جب تک دیش مکھ کی گردن نہ مروڑ لوں۔

ہم اس جنگل میں میلوں دور آچکے تھے۔ اچانک کار کا انجن ہچکولے کھانے لگا۔ میں گیئر بدل بدل کر اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ کار کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر وہ رک گئی۔

"اس کم بخت کو بھی۔۔۔ یہیں خراب ہونا تھا۔" میں دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارتے ہوئے بڑبڑایا۔

"پیٹرول تو ختم نہیں ہوگیا؟" ببلا نے کہا۔

ببلا کی بات سنتے ہی میں اچھل پڑا اور میری نظریں بے اختیار ڈیش بورڈ کی طرف اٹھ گئیں۔ فیول بتانے والی سوئی زیرو پر رکی ہوئی تھی۔ ہم جب رشی کیش سے روانہ ہوئے تھے تو روشن لال نے کار میرے حوالے کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے ٹینک فل کروا دیا ہے۔ ٹینک میں کتنے گیلن پیٹرول آتا تھا اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا لیکن ہم شام چھ بجے سے سفر کر رہے تھے۔ رشی کیش سے ہردوار وہاں سے رورکی اور رورکی سے اس جنگل میں کم و بیش پچاس میل کا فاصلہ طے ہوچکا تھا۔ پیٹرول کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ راستے میں مجھے کہیں بھی خیال نہیں آیا تھا کہ پیٹرول ختم بھی ہوسکتا ہے۔ ہردوار میں رادھن کو تلاش کرنے سے پہلے پیٹرول ڈلوایا جاسکتا تھا۔ بہرحال یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ کار کی ڈکی میں پانچ پانچ گیلن والے تین کین رکھے ہوئے تھے۔

میں نے اپنے کندھوں پر سے کمبل ہٹا دیا اور اگنیشن میں سے کی رنگ نکال کر نیچے اتر آیا۔ کار کا دروازہ کھولتے ہی یخ ہوا کا جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تھا اور ایک لمحے کو میں کپکپا کر رہ گیا تھا۔

جنگل بہت گنجان تھا۔ سڑک کے کنارے تک خود رو پودے اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اوپر درختوں کی شاخیں اس طرح آپس میں ملی ہوئی تھیں کہ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں تو دن کے وقت دھوپ بھی زمین تک نہیں پہنچتی ہوگی۔

ہر طرف گہری تاریکی طاری تھی۔ حشرات الارض کی آوازیں اس تاریکی میں بڑا خوفناک تاثر دے رہی تھیں۔ اچانک ہی مجھے رورکی کے اس بوڑھے دکان دار کی بات یاد آگئی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس جنگل میں خوفناک درندے بکثرت پائے جاتے ہیں اور لوگ ان درندوں کے خوف سے دن کے وقت بھی سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں اور یہ تو رات کا آخری پہر تھا۔ درندوں کے خوف سے میں ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔

میں نے ڈکی کھول کر پہلے پیٹرول کا ایک کین نکالا اور ٹینکی کا ڈھکنا کھول کر اس میں پیٹرول انڈیل رہا تھا کہ پتوں اور جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ایک باریک سی سیٹی کی طرح کی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ پیٹرول کا کین میرے ہاتھ سے گرتے گرتے

بچا۔ جسم کے مسام پسینہ اگلنے لگے۔

دو جانور گاڑی کے سامنے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک کے ایک طرف سے دوڑتے ہوئے دوسری طرف تاریک جھاڑیوں میں غائب ہوگئے۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے والے وہ جانور جنگلی بلی یا لومڑی سے زیادہ بڑے نہیں تھے۔

میں نے باری باری تینوں کین کا پیٹرول ٹینکی میں انڈیلا' آخری کین سڑک پر ہی پھینک دیا' ٹینکی کا ڈھکنا بند کیا اور ڈگی کا ڈھکنا گرا کر بند کرلیا۔

"کیا ہوا؟" بملا نے میری طرف دیکھا "شاید تم ان جانوروں سے ڈر گئے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "یہ تو بے ضرر جانور تھے۔ ان کی جگہ درندے بھی ہوسکتے تھے۔"

"تو کیا ہوا۔ تم تو بہت اچھے مارشل آرٹسٹ ہو۔"

"ہاں۔ میں تو بہت اچھا مارشل آرٹسٹ ہوں مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ جنگلی درندے مارشل آرٹ نہیں جانتے۔ بہرحال' تمہارا پیر کیسا ہے؟"

"اس مرہم کی مالش سے تکلیف حیرت انگیز طور پر کم ہوگئی ہے۔ اب تو میں کمبل کے اندر پیر کو آہستہ آہستہ حرکت بھی دے رہی ہوں۔"

"زیادہ حرکت مت دینا۔ بس اسی طرح کمبل لپیٹ کر آرام سے بیٹھی رہو... بلکہ بہتر ہے تم سوجاؤ۔" میں نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

گاڑی کو آگے بڑھانے سے پہلے میں نے بھی اپنے کندھوں پر کمبل ڈال لیا تھا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس دکان پر مجھے یہ کمبل نظر آگئے تھے۔ بصورتِ دیگر سردی میں سفر کرنا مشکل ہوجاتا۔

اس خطرناک اور تاریک جنگل میں ہمارا سفر جاری رہا۔ کئی مرتبہ بعض جانوروں کو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک پر یا اس کے آس پاس دیکھا تھا لیکن ہمیں کوئی ناخوشگوار حادثہ پیش نہیں آیا۔

صبح پانچ بجے کے قریب ہم ایک بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بستی سڑک کے دائیں طرف قدرے ہٹ کر تھی جبکہ دوسری طرف تقریباً پچاس گز کھلی جگہ تھی اور اس سے آگے ڈھلان پر دھان کے کھیت تھے جن کے پرلی طرف تاحدِ نگاہ گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا۔

بستی میں ایک آدھ ہی کچا مکان دکھائی دے رہا تھا جبکہ باقی سب جھونپڑے تھے۔ گھاس پھونس اور درختوں کی شاخوں سے بنے ہوئے گول جھونپڑے جیسے بڑے بڑے پیالے اوندھے رکھے ہوں۔ اوپر وسط میں ایک ایک فٹ تک بانسوں کی کھپچیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ہر جھونپڑے کے گرد خشک جھاڑیوں اور درختوں کی موٹی موٹی شاخوں سے باڑھ لگی ہوئی تھی۔

ہماری کار جیسے ہی بستی کی حدود میں داخل ہوئی دو کتوں نے بھونکتے ہوئے ہمارا تعاقب شروع کردیا۔ میں نے کار کی رفتار پہلے ہی کم کردی تھی۔ بستی میں سڑک کی طرف دو جھونپڑوں میں شاید دکانیں بنی ہوئی تھیں اور دونوں جھونپڑوں کے اوپر کوکا کولا کے بورڈ لگے ہوئے تھے۔ انہی سے میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ یہ دکانیں یا ڈھابے ہیں۔ دونوں دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ڈھابے کے سامنے کار روک لی۔ کتے بھی ہمارے پیچھے رک گئے۔ کچھ دیر بھونکتے رہے اور پھر واپس چلے گئے۔

ڈھابے کا مالک ایک اُدھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس نے ابھی ابھی دکان کھولی تھی اور اپنی چیزیں درست کررہا تھا۔ میں کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

"چائے ملے گی کاکا؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"ضرور ملے گی مہاراج۔ پر دس منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم انتظار کرلیتے ہیں۔ دو چائے بنادو۔" میں نے کہا۔

بملا بھی نیچے اتر آئی اور ہم ڈھابے کے آس پاس ٹہلنے لگے۔ میں نے بملا کو سہارا دے رکھا تھا اور وہ اپنے مضروب پیر پر ہلکا سا دباؤ ڈال کر چل رہی تھی۔ ڈھابے کے مالک نے دو فولڈنگ کرسیاں نکال کر رکھ دیں۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

چائے تیار ہونے میں دس کے بجائے بیس منٹ لگے تھے۔ دکان دار کو یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی تھی کہ ہم رات ہی رات میں رورکی کی طرف سے سفر کرتے ہوئے آئے ہیں۔

"اس علاقے میں رات کو کوئی سفر نہیں کرتا مہاراج۔" اس نے بتایا۔ اس جنگل میں شیر اور چیتے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لوگ تو دن کے وقت بھی اس طرف سفر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔"

اور پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے بتایا کہ یہاں سے چند میل آگے رانی کھیت نام کا ہل اسٹیشن ہے۔ ایک بس صبح چھ بجے رانی کھیت سے رورکی کے لیے روانہ ہوتی ہے جو پونے سات بجے کے قریب یہاں پہنچتی ہے۔ بس کے آنے سے

پہلے پہلے اسے اپنی دکان تیار کرنی پڑتی ہے۔

اس کی باتوں سے ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا۔ یہ وادی کماؤں کا علاقہ تھا جو ہزاروں مربع میل تک پھیلا ہوا تھا۔ دنیا کے خوب صورت اور خطرناک ترین جنگلات اس خطے میں پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں دوسرے درندوں کے علاوہ شیر اور چیتے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ چیتے اور شیر آئے دن ان جنگلوں میں آباد انسانی بستیوں میں تباہی پھیلاتے رہتے ہیں۔ جب کسی شیر یا چیتے کے منہ کو انسانی خون لگ جاتا ہے تو سیکڑوں مربع میل تک انسانی بستیوں میں خوف و ہراس پھیل جاتا ہے۔

اسی وادی کماؤں میں نینی تال' میسوری' رانی کھیت اور الموڑا جیسے خوب صورت ہل اسٹیشن ہیں جہاں گرمیوں کے موسم میں ہزاروں کی تعداد میں سیاح سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔

اس بستی سے رانی کھیت تک پختہ سڑک تھی۔ دن کی روشنی میں جنگل سے آئے ہوئے پہاڑی راستوں پر سفر کرتے ہوئے واقعی مزہ آگیا۔

ہمالیہ کی تراشیوں میں تقریباً آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع رانی کھیت رشی کیش سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اونچی نیچی سڑکیں' بکھری ہوئی پختہ اور لکڑی کے تختوں سے بنی ہوئی عمارتیں' ایک دو مختصر شاپنگ سینٹرز' ریسٹورنٹ اور گیسٹ ہاؤسز۔ سب سے زیادہ بارونق جگہ لاری اڈا تھا جس کے اطراف میں شاپنگ سینٹرز بھی تھے۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی اور ہم دونوں اُتر کر ریسٹورنٹ میں آگئے۔ موسم میں خنکی تھی۔ اگرچہ دھوپ چڑھ آئی تھی مگر زیادہ رونق نہیں تھی۔ ایسی جگہوں پر تو لوگ آرام سے سو کر اٹھتے ہیں اور نو بجے کے بعد ہی بازاروں میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔

ناشتے کے بعد ہم نے تقریباً ایک گھنٹے تک اسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر آرام کیا۔ رات بھر کے سفر نے مجھے بُری طرح تھکا دیا تھا۔ بملا بھی اگرچہ راستے میں اونگھتی رہی تھی لیکن تھکن اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھی۔

ایک پیٹرول پمپ سے میں نے نہ صرف کار کی ٹینکی فل کروالی بلکہ دونوں خالی کین بھی بھروا کر ڈگی میں رکھ لیے۔ اب مجھے افسوس ہورہا تھا کہ میں نے تیسرا کین جنگل میں کیوں پھینک دیا تھا۔

اس پیٹرول پمپ سے ہمیں معلوم ہوگیا کہ الموڑا وہاں سے تقریباً دو گھنٹوں کی مسافت پر ہے اور سڑک پختہ ہے۔ راستے میں لبِ سڑک کچھ بستیاں بھی ہیں جہاں سے ہمیں ضرورت کی چیزیں مل سکتی ہیں۔

پیٹرول پمپ سے نکل کر بتائے ہوئے راستوں پر کار دوڑاتا ہوا میں الموڑا کی طرف جانے والی شاہراہ پر آگیا اور رفتار بڑھادی۔

اس سڑک پر کوئی ماہر ڈرائیور ہی گاڑی چلا سکتا تھا۔ میں روپ متی کا شکر گزار تھا کہ اس نے جے پور میں مجھے ڈرائیونگ سکھادی تھی۔ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی ہوتی تو اس وقت میں دلیش مکھ کے تعاقب میں یہاں تک نہیں آسکتا تھا۔ سڑک پر بعض جگہ عمودی چٹانیں اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ موڑ ایسے خطرناک کہ ذرا سی غلطی تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ مسلسل سیٹ پر بیٹھے رہنے سے کمر تختے کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ اگر ہم رانی کھیت کے ریسٹورنٹ میں گھنٹا بھر آرام نہ کرتے تو میرے لیے گاڑی چلانا مشکل ہوجاتا۔ میں ہلکی رفتار سے اور بہت محتاط ہو کر کار چلا رہا تھا۔ اس طرح ہم نے یہ فاصلہ دو کے بجائے ڈھائی گھنٹوں میں طے کیا۔ الموڑا میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک گیسٹ ہاؤس کے سامنے کار روک لی۔

میرا خیال تھا کہ ہم یہاں چائے وغیرہ پی کر تازہ دم ہوں گے اور پھر دلیش مکھ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے لیکن بملا بضد تھی کہ ہمیں چند گھنٹے یہاں ضرور آرام کرنا چاہیے اور پھر یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں ایک کمرا بھی مل گیا جو اسی وقت خالی ہوا تھا۔

بملا نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے آرام کی اشد ضرورت تھی۔ کمرے میں آتے ہی میں بستر پر گرا تو پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

میری آنکھ سہ پہر چار بجے کھلی تھی۔ بملا بھی میرے بستر پر گہری نیند سو رہی تھی۔ میں چند منٹ بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس وقت بھی بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

میں کافی دیر گرم پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا۔ گرم پانی سے جسم کی ٹکور ہو رہی تھی اور بڑا سکون مل رہا تھا۔

میں کپڑے پہن کر باہر آیا تو بملا بھی جاگ گئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور لگتا تھا جیسے اس کے دماغ پر اب بھی نیند کا خمار طاری ہو۔

"تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں تو پریشان ہوگئی تھی۔" اس کا لہجہ بھی خوابیدہ سا تھا۔

"میں تو یہیں تھا۔ تم شاید کہیں اور پہنچی ہوئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا پیر اب کیسا ہے؟"

"اب تو ٹھیک ہے۔ کوئی تکلیف بھی نہیں ہو رہی۔" وہ پیر کو پکڑ کر اِدھر اُدھر موڑنے لگی "میرا خیال ہے کوئی نس چڑھ گئی تھی۔ مالش اور آرام کرنے سے ٹھیک ہو گیا۔ اب بالکل تکلیف نہیں ہو رہی۔"

"اچھا تو اب بہت آرام ہو چکا۔" میں نے کہا "پانی گرم ہے۔ تم بھی نہا لو۔ کسل مندی دور ہو جائے گی پھر ہم شوبھا کی تلاش میں نکلیں گے۔"

بملا کچھ دیر بیڈ پر پڑی اینٹھتی رہی اور پھر اتر کر باتھ روم کی طرف چل پڑی۔ میں گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا پیر بالکل سیدھا پڑ رہا تھا اور میرا خیال ہے اس میں اب کوئی تکلیف بھی نہیں رہی تھی۔

بملا جیسے ہی باتھ روم میں گھسی میں کمرے کے ایک کونے میں آلتی پالتی مار کر مراقبے میں چلا گیا۔ دو دن سے میں نے اپنی یوگا کی مشق نہیں کی تھی اور اس ریاضت کو جاری رکھنے کا اب فی الحال کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ گرو کی موجودگی کے بغیر میں اس ریاضت کو جاری بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن مراقبہ ایک مختلف چیز تھی۔ اس کی ریاضت تو میں پہلے بھی کر چکا تھا۔

آدھے گھنٹے کے مراقبے سے میں اپنے آپ کو بالکل ہشاش بشاش اور تر و تازہ محسوس کرنے لگا۔ میرے اندر ایک نئی توانائی آ گئی تھی۔ مراقبے کا یہی تو کمال ہے۔ تھوڑی سی ریاضت سے ہی انسان کے اندر چھپی ہوئی توانائیاں انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگتی ہیں۔

بملا تیار ہو گئی تھی۔ وہ بھی تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔

ہم کمرے سے نکل کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ یہاں خاصی رونق تھی۔ ہمیں ایک ایسی میز مل گئی جہاں دو عورتیں پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے ہمارے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ پر ہی اکتفا کیا گیا۔

کاؤنٹر پر بل دیتے ہوئے میں کھٹال جا گیش وری مندر کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اتفاق سے ہم اسی کے نواح میں تھے اور وہ مندر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک میل کا فاصلہ تھا۔

آدھے میل تک تو گاڑی نے ہمارا ساتھ دیا۔ اس سے آگے گاڑی کا راستہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے دامن میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم نے بھی کار ایک طرف کھڑی کر دی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔

تنگ سے راستے سے گزر کر پہاڑی کے دوسری طرف کھٹال جا گیش وری مندر تھا۔ یہ مندر بہت بڑا تھا اور لوگ دور دور سے یاترا کے لیے یہاں آتے تھے لیکن ہمارا رخ مندر کی طرف نہیں تھا۔ ہم مندر کے پہلو میں ایک اور تنگ سے راستے سے گزرتے ہوئے پچھلی طرف آ گئے اور اس طرف کا منظر دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے تھائی لینڈ میں بھی بہت سے حسین قدرتی مناظر دیکھے تھے مگر ہمالیہ کی گود میں یہ منظر دیکھ کر تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔

سبزے اور رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی پہاڑی پر تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی سے آبشار گر رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے سفید ریشمی چادر اوپر سے نیچے تک پھیلا دی گئی ہو۔ نیچے جہاں پانی گر رہا تھا ایک چھوٹی سی جھیل معرضِ وجود میں آ گئی تھی اور ایک کشادہ ندی جھیل سے نکل کر نشیب کی طرف بہہ رہی تھی۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ لاتعداد لوگ مختلف جگہوں پر ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ ندی کے پانی سے کھیل رہے تھے اور کچھ آبشار کے قریب کھڑے تھے۔

ایک اور دلچسپ منظر یہ تھا کہ جس جگہ آبشار گر رہا تھا وہاں پانی کی چادر کے پیچھے پہاڑی میں ایک تنگ سی کھوہ بنی ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ اس پہاڑی کے ساتھ تنگ سے راستے پر چلتے ہوئے پانی کی چادر کے پیچھے اسی کھوہ سے گزر کر جھیل کے دوسری طرف جا رہے تھے۔

اس دلکش منظر کو قدرت کا ایک حسین شاہکار کہا جا سکتا تھا۔ لوگ یہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے تھے اور پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے لیکن ہم پکنک منانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ ہمیں اس کاٹیج کی تلاش تھی جہاں دیش مکھ چھپا بیٹھا تھا۔

آبشار کے گرد و نواح میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کئی کاٹیج تھے۔ بعض کاٹیج تو باقاعدہ بنگلوں کی طرح تھے۔ ان کی تعمیر بھی پختہ تھی اور ان کے اردگرد باؤنڈری وال بھی تھی۔

میں اور بملا سرخ چھت اور نیلی دیواروں والا کاٹیج تلاش کرتے رہے۔ مختلف جگہوں پر سرخ کھپریل والے دو تین کاٹیج نظر آئے تھے مگر ایسا کوئی کاٹیج دکھائی نہیں دیا تھا جس کی دیواریں بھی نیلی ہوں۔

اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی دم

توڑنے لگی۔ تفریح اور پکنک کے لیے آئے ہوئے لوگ واپس جانے لگے۔ بملا نے بھی واپسی کی تکرار شروع کر دی لیکن میں اس وقت تک اپنی تلاش جاری رکھنا چاہتا تھا جب تک دن کی روشنی ساتھ دے رہی تھی۔

میں جھیل سے نکلنے والی ندی کے ساتھ ساتھ نشیب کی طرف چلنے لگا۔ تقریباً سو گز آگے ایک پُلیا تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ پلیا نہیں تھی۔ درختوں کے دو موٹے تنے ساتھ ساتھ ندی پر ڈال کر ان پر مٹی ڈال دی گئی تھی۔ اس طرح پیدل چلنے والوں کے لیے ندی کے اوپر ایک گزرگاہ سی بن گئی تھی جسے بہرحال پُلیا بھی کہا جا سکتا تھا۔

ندی کے دوسری طرف بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کاٹیج اور بنگلے تھے لیکن اب اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ بعض کاٹیج اور بنگلوں کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی لیکن باہر کی تاریک فضا میں مطلوبہ کاٹیج کی تلاش جاری رکھنا ممکن نہیں تھا۔

ہم ندی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ کھٹال مندر بائیں طرف پیچھے رہ گیا تھا۔ مندر کے کلس پر سرخ بتی جل رہی تھی اور گیٹ کی روشنیاں بھی یہاں سے دکھائی دے رہی تھیں۔

دو سو گز مزید آگے چلنے کے بعد ندی پر ایک کشادہ اور پختہ پلیا نظر آ گئی جس پر سے دو کاریں پہلو بہ پہلو آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ اس کے دونوں طرف کشادہ راستے تھے۔ انہیں پختہ سڑک نہیں کہا جا سکتا تھا مگر گاڑیوں کی بکثرت آمدورفت سے سڑک کی طرح ایک باقاعدہ اور پختہ راستہ بن گیا تھا۔ ہم پُلیا پار کر کے دوسری طرف آ گئے اور اس کشادہ راستے پر چلتے رہے۔ اس دوران ایک ہمارے عقب سے اور دو سامنے سے آنے والی گاڑیاں بھی قریب سے گزری تھیں۔ بتدریج بلندی کی طرف جاتا ہوا یہ راستہ پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر بہت آگے اس سڑک سے جا ملا تھا جو شہر سے مندر والی پہاڑی کی طرف چلی گئی تھی۔ ہماری گاڑی اس پہاڑی کے دوسری طرف تھی۔

بملا تھک گئی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ مسلسل چلتے رہنے سے اس کے پیر میں بھی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر چلاتا ہوا اس پتھریلے میدان میں آ گیا جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔

مندر اور آبشار کی طرف سے آنے والے بہت سے لوگ واپس جا چکے تھے لیکن تین چار گاڑیاں اب بھی موجود تھیں۔ میں اپنی کار کے قریب رک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اب صورتِ حال میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ مندر اور آبشار کی طرف جانے والا اصل راستہ وہی تھا جس طرف سے ہم واپس آئے تھے۔ پلیا والا راستہ تو ندی کے دوسری طرف بکھرے ہوئے کاٹیج اور بنگلوں کی طرف چلا جاتا تھا لیکن پلیا سے پہلے ایک کشادہ راستہ مندر اور آبشار کی طرف بھی جاتا تھا۔ اس طرف کے کاٹیج میں رہنے والے وہی راستہ استعمال کرتے ہوں گے۔ جس راستے سے ہم آبشار تک گئے تھے وہ اگرچہ قریب پڑتا تھا لیکن اس طرف سے گاڑی نہیں جا سکتی تھی۔

ہم گیسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ تقریباً تین گھنٹے اونچے نیچے راستوں پر پیدل چلتے رہنے سے بملا کے پیر میں ہلکی سی تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ایک ہاتھ سے ہولے ہولے پیر کو دبا رہی تھی۔ میں نے تھیلے میں سے مرہم کی ڈبیا نکال لی اور اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"لاؤ۔ تمہارے پیر پر مالش کر دوں۔" میں نے کہا "مجھے خیال نہیں رہا تھا۔ تمہیں اتنا زیادہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔"

بملا نے خاموشی سے وہ پیر آگے کر دیا۔ میں نے ڈبیا کھول کر انگلی پر مرہم لگایا اور اس کے ٹخنے کے آس پاس ملنے لگا۔ بملا نے شلوار کا پائنچا اوپر کھینچ لیا۔ میں اب چاروں انگلیوں سے مالش کر رہا تھا۔ پیر کے اوپر، جہاں پانچوں انگلیوں کے جوڑ ملتے ہیں، ٹخنے پر دونوں طرف اور ذرا اوپر پنڈلی کی طرف۔ بملا کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں سی نکل رہی تھیں۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ہاتھ کے دباؤ سے اسے تکلیف محسوس ہو رہی ہے اور پھر اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا....؟" میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔

بملا کے چہرے پر سنسنی کے عجیب سے تاثرات تھے اور آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور آگے میری طرف جھکنے لگی۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ دیا۔

"ہوش میں آؤ بملا اور پیروں پر کمبل ڈال لو تاکہ ہوا نہ لگے۔" میں بیڈ سے اتر کر کھڑا ہو گیا "میں ہاتھ دھو کر چائے منگواتا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کریں گے اور پھر نو بجے کے قریب کھانا کھانے کے لیے چلیں گے۔ کھانا ہم یہاں نہیں کسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے۔"

بملا کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور کمبل اپنے اوپر کھینچ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ میں اس کے غصے کو نظرانداز کرتا

ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

ویٹر کو کمرے میں بُلانے کے لیے کوئی بیل وغیرہ نہیں تھی۔ چائے کا آرڈر دینے کے لیے مجھے خود ہی کاؤنٹر پر جانا پڑا۔ کاؤنٹر پر اس وقت ایک خوب صورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کی رنگت اگرچہ سانولی تھی مگر چہرے کے نقوش بڑے غضب کے تھے۔ بڑا چارم تھا اس میں۔

میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ وادی کماؤں کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"یہ دنیا کی خوب صورت ترین ویلی ہے۔" وہ کہہ رہی تھی "یہاں کئی ہل اسٹیشن ہیں جہاں گرمیوں میں خوب رونق رہتی ہے۔ یہاں سے آگے کوشانی' بیج ناتھ اور اس سے آگے دھیکوری اور دیوال کی طرف نکل جاؤ تو پندوری، گلیشیر اور پچیس ہزار چھ سو پچیس فٹ بلند نندا دیوی کی برف پوش چوٹی کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ کماؤں ویلی کے گھنے جنگلات شیروں' چیتوں اور دوسرے خطرناک درندوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں کے ساتھ جم کاربٹ کا نام بھی زندہ رہے گا۔ جم کاربٹ کو جانتے ہونا؟"

"نہیں میڈم!" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "بد قسمتی سے میں اس نام سے واقف نہیں ہوں۔ کیا یہ بہت بڑی شخصیت ہے؟"

"جم کاربٹ شکاری ہے۔" اس عورت نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "آدم خور شیروں کا شکار اس کی ہابی ہے۔ کماؤں ویلی اس کی شکارگاہ ہے۔ وہ درجنوں خوں خوار اور آدم خور شیروں کو ہلاک کرچکا ہے۔ کماؤں ویلی میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں۔ جہاں کے لوگ جم کاربٹ کو دیوتا سمان سمجھتے ہیں۔"

"کیا آپ کبھی اس شخص سے ملی ہیں۔ میرا مطلب ہے جم کاربٹ سے۔" میں نے پوچھا۔

"کئی مرتبہ۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا "وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے۔ کیا تمہیں بھی شکار سے دلچسپی ہے؟"

"ہاں لیکن میں کسی اور قسم کا شکار کرتا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جس طرح جم کاربٹ اپنے شکار کا دور تک پیچھا کرتا ہوگا اسی طرح میں بھی اپنے شکار کا دور بلکہ بہت دور تک پیچھا کرتا ہوں۔ ابھی کچھ دن پہلے میں نے ایک شکار کیا ہے جس کا میں کئی سال سے پیچھا کر رہا تھا۔"

"اوہ!" اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا "وہ کون سا درندہ تھا جس کا تم کئی ورشوں سے پیچھا کرتے رہے۔"

"بد روح! میں بد روحوں کا شکاری ہوں اور دور تک ان کا پیچھا کرتا ہوں۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ!" اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

اسی دوران ویٹر نے آکر بتایا کہ چائے میرے کمرے میں پہنچائی جاچکی ہے۔ میں کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی نمکین حسینہ کو الجھن میں مبتلا چھوڑ کر کمرے کی طرف چل پڑا۔ چائے کا کہنے کے بعد میں جان بوجھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہاں رکا تھا تاکہ اس دوران بملا کا غصہ فرو ہوجائے۔

میں کمرے میں آیا تو چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی ہوئی تھی اور بملا اسی طرح بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بنائی۔ کیتلی اور دودھ دانی میز پر رکھ دی۔ دونوں کپ ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھا کر بملا کے سامنے بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ایک کپ اٹھا کر بملا کی طرف بڑھا دیا۔

"لو چائے پیو۔" میں نے کہا "گرم ہونے کے باوجود چائے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے دماغ میں بھرے ہوئے بخارات ٹھنڈے ہوجاتے ہیں۔"

"تم بہت ستاتے ہو مجھے۔" بملا نے کپ لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شکوے کی جھلک نمایاں تھی۔

"دیکھو بملا۔" میں نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے کہا "ایک روز جے پور میں' میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں جانتا ہوں تم مجھے بہت چاہتی ہو مگر چاہت کی انتہا جسموں کا اتصال تو نہیں۔ یہ تو ایک بہت پوتر جذبہ ہے۔ ان جذبوں میں لغویت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ایک بار کھوٹ آجائے تو سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر رہ سکتے ہیں اور دوستی کے جذبے تو پریم سے بھی زیادہ پوتر ہوتے ہیں۔ اگر تم اس جذبے کا اظہار کرو گی تو تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

میں بولتا رہا اور بملا خاموشی سے سنتی رہی۔ چائے ختم ہونے کے بعد میں نے خالی کپ اس سے لے کر ٹرے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد بھی میں اس کے سامنے بیٹھا باتیں کرتا رہا اور پھر دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر میں بیڈ سے اٹھ گیا۔

وہ ویٹر تھا جو خالی برتن لینے کے لیے آیا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کردیا اور بملا کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری باتوں سے بملا کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کے چہرے پر خشونت غائب ہوگئی اور وہ پھر

بجلی کی طرح چہکنے لگی۔

ساڑھے نو بجے کے قریب ہم تیار ہو کر کمرے سے نکل آئے۔ بملا تین دن سے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھی اور میرے کہنے پر اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ اس راجستھانی لباس میں بھی وہ اچھی لگ رہی تھی۔

میں نے اگرچہ رانی کھیت میں کار کی ٹینکی فل کروالی تھی۔ پانچ پانچ گیلن کے دو بھرے ہوئے کین بھی ڈکی میں رکھے ہوئے تھے لیکن ایک پیٹرول پمپ دیکھ کر میں نے کار روک لی اور رانی کھیت سے یہاں تک جتنا پیٹرول استعمال ہوا تھا اتنا ہی ٹینکی میں ڈلوالیا۔

ہم کافی دیر تک مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ موسم میں خنکی ہونے کے باوجود شاپنگ سینٹروں پر خاصی گہما گہمی تھی۔

میں نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک لی اور ہم نیچے اتر کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوگئے۔ ریسٹورنٹ کے اندر کی فضا خاصی خوشگوار تھی۔ تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ بعض میزیں ایسی تھیں جن پر..... ایک یا دو سیٹیں خالی تھیں۔ دائیں طرف والی میز سے ایک آدمی اور دو عورتیں اٹھیں تو ہم نے آگے بڑھ کر اس میز پر قبضہ کرلیا اور ویٹر کو بلا کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔

میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک آدمی دروازے میں داخل ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک ایسی میز کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک کرسی خالی تھی۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی نظریں میری طرف بھی اٹھ گئیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا تھا۔

کرسی پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ کن انکھیوں سے بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس پر شبہ ہوا۔ کوئی بات ضرور تھی جو مجھے دیکھ کر وہ شخص بد حواس ہو رہا تھا۔ اسی دوران ویٹر نے اس کے سامنے چائے رکھ دی تھی۔ اس نے کپ اٹھایا تو اس کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ چائے چھلک گئی۔ اس نے کپ دوبارہ پرچ میں رکھ دیا اور ایک بار پھر کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

شکل صورت سے تو وہ کوئی اچھا آدمی نہیں لگتا تھا لیکن مجھے حیرت تھی کہ مجھے دیکھ کر وہ خوف زدہ کیوں ہوگیا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔

اس میز پر دو عورتیں اور ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بھی اس شخص کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ ادھیڑ عمر آدمی نے آگے جھک کر کچھ کہا بھی تھا جواب میں وہ شخص بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے بھی اس نے دو تین مرتبہ میری طرف دیکھا تھا۔

اچانک میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ رشی کیش میں جن لوگوں نے شوبھا کو اغوا کیا تھا ان تمام نے چہروں پر ماسک چڑھا رکھے تھے۔ میں کسی کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ ان کے تعاقب میں ہردوار پہنچتے ہی اتفاق سے چونگی محرر سے رادھن کے بارے میں پتا چل گیا تھا۔ رادھن کے تین اور آدمی جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے وہ بھی رشی کیش کے حملہ آوروں میں شامل تھے اور یہ شخص..... میرا شبہ یقین میں بدل گیا کہ یہ بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ یہ لوگ مجھے مردہ سمجھ کر پھینک آئے تھے اور اب مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ بد حواس ہو رہا تھا۔ یقیناً یہی بات تھی۔ ورنہ میں کوئی بھوت تو نہیں تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اس طرح خوف زدہ ہوگیا تھا۔

اس شخص نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور اپنی سیٹ سے اٹھ گیا۔ کاؤنٹر پر پیسے دے کر باہر نکلتے ہوئے بھی اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔

"بملا۔" میں نے ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کار کی چابیوں کا گچھا اس کی طرف سرکا دیا۔

"وہ آدمی جو ابھی اس ٹیبل سے اٹھ کر گیا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ دلیش مکھ کا آدمی ہے اور اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔ تم کھانا ختم کرکے گیسٹ ہاؤس چلی جانا۔ میں اس کے پیچھے جا رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے مجھے واپسی میں دیر ہوجائے مگر تم پریشان مت ہونا۔"

"مم..... میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" بملا نے کہا۔ وہ بھی ایک دم بد حواس ہوگئی تھی۔

"میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو بملا۔" میں نے کہا۔ "پتا نہیں کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے۔ تمہارے پیر میں پہلے ہی تکلیف ہے۔ ہوسکتا ہے تم میری مدد کرنے کے بجائے میرے لیے مسئلہ بن جاؤ۔ اس لیے تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں غلط سمجھ رہا ہوں اور وہ آدمی کوئی اور ہو۔ ایسی صورت میں....."

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اور اپنا خیال رکھنا۔" بملا نے کہا۔ میں نے جیب سے کچھ رقم بھی نکال کر بملا کے حوالے

کردی اور سیٹ چھوڑ دی۔ ریسٹورنٹ سے نکلتے ہی میں دروازے کے بالکل ساتھ بنے ہوئے پان سگریٹ کے کیبن کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس شخص کو زرد رنگ کی شرٹ سے پہچان لیا۔ وہ بائیں طرف تقریباً پچاس گز آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔ میں موقع پاتے ہی دوڑ کر سڑک کے دوسری طرف پہنچ گیا اور لوگوں کی آڑ لیتا ہوا اس کا پیچھا کرنے لگا۔

وہ شخص جلد ہی شہر کی حدود سے نکل گیا۔ اس کا رخ اسی طرف تھا جس طرف ہم دن میں کھٹائل مندر اور آبشار کا چکر لگا کر آئے تھے۔ اس طرف اندھیرا تھا اور مجھے تعاقب کرنے میں آسانی ہو رہی تھی۔

وہ اسی کشادہ راستے پر جا رہا تھا جس سے ہماری واپسی ہوئی تھی۔ میں اس راستے کے بالکل کنارے بڑے پتھروں اور قد آدم پودوں کی آڑ میں چل رہا تھا اور میری یہ احتیاط کام آگئی تھی۔ سامنے مندر والے موڑ سے اچانک ہی ایک کار اس راستے پر مڑی تھی۔ زرد شرٹ والا وہ شخص تو کار کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں آگیا لیکن میں فوراً ہی پودوں میں دبک گیا۔

میں اس وقت تک پودوں کے پیچھے چھپا رہا جب تک وہ کار میرے قریب سے گزر کر دور نہیں نکل گئی۔

میں پودوں کی آڑ سے نکل آیا۔ قدموں کی ہلکی آہٹ بتا رہی تھی کہ وہ شخص اس دوران کافی آگے نکل چکا تھا۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ میرے پیروں میں جوگرز تھے اس لیے آواز زیادہ نہیں اُبھر رہی تھی۔

پلیا پر پہنچ کر میں رک گیا۔ یہاں گہری تاریکی تھی اور وہ شخص نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن قدموں کی ہلکی آہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اس آواز کا تعاقب شروع کر دیا۔

پلیا سے قریب ترین کاٹیج تقریباً چالیس گز کے فاصلے پر تھا جس کے دروازے پر نہایت مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیل رہی تھی۔

میں اس کاٹیج کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ قدموں کی آواز بائیں طرف سے آ رہی تھی۔ میں بھی اس طرف چلتا رہا اور پھر چند چھوٹے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ شخص اصل راستہ چھوڑ کر شارٹ کٹ اختیار کر رہا تھا۔

تعاقب کا یہ سلسلہ تقریباً دس منٹ اور جاری رہا اور ایک کاٹیج کی آڑ سے نکلتے ہی مجھے دوبارہ جھاڑیوں میں دبک جانا پڑا۔ وہ شخص وہاں سے تقریباً بیس گز آگے ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے کھڑا کال بیل کا بٹن دبا رہا تھا۔

بنگلے کے گیٹ پر بلب جل رہا تھا اور اس کی روشنی میں دیوار پر نیلا رنگ دیکھ کر میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس شخص پر میرا شبہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ دلیش مکھ کا ہی آدمی تھا اور مجھے دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہوا تھا کہ ریسٹورنٹ سے نکل کر سیدھا اس بنگلے پر آیا تھا۔ اس نے شاید مجھے اپنا پیچھا کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ سیدھا یہاں نہ آتا۔

کال بیل کی آواز سناٹے میں دور تک پھیل گئی تھی۔ چند منٹ بعد گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلا اور وہ شخص تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک منٹ بعد میں نے ایک اور آدمی کو دروازے سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک وہاں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر سر ہلاتا ہوا اندر چلا گیا اور گیٹ بند ہو گیا۔

میں اس کے بعد بھی تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑا رہا اور پھر جھاڑیوں سے نکل کر دبے قدموں اس بنگلے کے عقبی سمت بڑھنے لگا۔

بنگلے کی دیوار چھ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پچھلی دیوار پہاڑی سے ملی ہوئی تھی۔ میں اس پہاڑی پر سے ہوتا ہوا دیوار پر آگیا اور بڑی آہستگی سے اندر کی طرف کود گیا۔ اندر کی طرف کیاریاں تھیں اور پودے لگے ہوئے تھے۔ کچی جگہ پر کودنے سے آواز زیادہ نہیں ابھری تھی۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا اور پھر گھنگروؤں کی آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ آواز سامنے والے کمرے سے آئی تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا اور کھڑکی کے قریب رک گیا۔

کھڑکی کے اندر کی طرف پردہ کھنچا ہوا تھا لیکن ایک کونے سے مجھے جھانکنے کا موقع مل گیا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی جو قالین پر مسند سے ٹیک لگائے بیٹھے ایک شخص پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن لڑکی جب سیدھی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس تھا جس میں چند گھونٹ بچے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لڑکی قالین پر بیٹھے ہوئے شخص کو اپنے ہاتھ سے شراب پلا رہی تھی۔

اس کی عمر بیس اکیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ خوب صورت نقش و نگار اور رنگت گوری تھی۔ اس نے لباس بھی بہت مختصر سا پہن رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں پائل تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میں نے گھنگروؤں کی جو مدھم سی آواز سنی تھی وہ اس پائل کی تھی۔ میں اس شخص کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر

کامیاب نہیں ہو سکا۔

میں دبے قدموں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا اور گھوم کر دوسری طرف آگیا۔ اس طرف بھی ایک کمرے میں مدھم نیلگوں روشنی نظر آرہی تھی۔ اندر شاید نائٹ بلب جل رہا تھا۔ اس کھڑکی کا پردہ ایک بالشت کے قریب ہٹا ہوا تھا۔ میں نے شیشے سے آنکھ لگا دی۔

اندر کا منظر دیکھ کر میں چونک گیا۔ بیڈ پر کوئی عورت سو رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو دل کی دھڑکن خطرناک حد تک تیز ہو گئی۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ مدھم نیلگوں روشنی میں شوبھا کو پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

وہ پشت کے بل بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ زندہ ہے اور گہری نیند سو رہی ہے۔

میں نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آیا اوپر سے گھوم کر برآمدے والے دروازے سے اندر گھس جاؤں اور شوبھا کو اٹھا کر بھاگ نکلوں لیکن یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔

ہردوار میں رادھن نے مرنے سے پہلے بتایا تھا کہ دلیش مکھ کے ساتھ دو آدمی تھے جو راجستھان ہی سے اس کے ساتھ آئے تھے۔ ایک کو تو میں نے دیکھ لیا تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں تک آیا تھا اور دوسرا ساتھ والے کمرے میں بیٹھا ہوا اس نیم عریاں عورت کے ہاتھوں سے شراب پی رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ دلیش مکھ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا لیکن تیسرا آدمی ابھی تک میری نظروں میں نہیں آسکا تھا۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک دراز قامت آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں بنفشی رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ بیڈ کے قریب رک گیا اور جھک کر سرنج کی سوئی شوبھا کے بازو میں پیوست کر دی۔ شوبھا کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ سرنج کا سارا سیال شوبھا کے بازو میں منتقل ہو گیا۔ اس شخص نے انجکشن کی جگہ پر شوبھا کے بازو کو ذرا سا مسلا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ شوبھا بے ہوش تھی۔ اسے انجکشنوں کے ذریعے مسلسل بے ہوش رکھا جا رہا تھا۔ وہ آدمی چہرے سے کسی طرح بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا لیکن آج کل تھوڑی سی کوشش سے انجکشن لگانا سیکھا جا سکتا تھا اور ایسے انجکشن بلکہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ادویات حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

بہرحال، یہ صورتِ حال میرے لیے خاصی تشویش ناک تھی۔ شوبھا کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے نکالنا بڑا مشکل تھا...... لیکن ظاہر ہے میں مایوس ہونے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔ مجھے شوبھا کو ہر صورت میں اس وحشی کے چنگل سے نکالنا تھا۔

میں دبے قدموں چلتا ہوا دوبارہ اس کمرے کی کھڑکی کے سامنے آگیا جہاں اس نیم عریاں لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس مرتبہ پردے کی جھری سے آنکھ لگا کر اندر جھانکا تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ سامنے ہی زرد شرٹ والا وہ آدمی موجود تھا جس کا تعاقب کرتا ہوا میں یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ وہی آدمی تھا جس نے شوبھا کو انجکشن لگایا تھا اور نیم عریاں لباس میں وہ لڑکی تھی جو اس وقت سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی۔ پیلی شرٹ والے کے چہرے پر بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔

"اتنی دیر تک خاموش کیوں رہے تھے۔ کہاں دیکھا تھا اسے؟" یہ گرجتی ہوئی آواز اس شخص کی تھی جس کا چہرہ میں ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا لیکن میں نے آواز سے اسے پہچان لیا۔ وہ دلیش مکھ ہی تھا۔

"ایک ہوٹل میں سرکار۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "وہ ایک چھوکری کے ساتھ بھوجن کر رہا تھا اور وہ چھوکری......"

"کون تھی وہ؟" دلیش مکھ کی آواز گونجی۔

"جے پور کے پنڈت رام سروپ کی بیٹی۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ بھنگ تو نہیں پی رکھی تم نے؟" دلیش مکھ چیختا ہوا آگے آگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"میں سچ کہتا ہوں سرکار۔" پیلی شرٹ والے نے جواب دیا "ایک مرتبہ آپ کے کہنے پر ہم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ٹھاکر بھانوت سنگھ کے شرن (پناہ) میں چلی گئی تھی اور اس کے بعد سرکار نے ہی روک دیا تھا کہ اس لونڈیا کو نہ چھیڑا جائے۔ آج تو میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا سرکار۔ وہ اپنے راجستھانی لباس میں تھی اور وہ تو ہیرا ہے

سرکار ہیرا۔ میری مانو تو اسے بھی اٹھوا ہی لیں۔ آپ کو اس کی ضرورت نہیں تو اسے ہمیں دان (تحفے میں دینا) کر دینا۔ آخر وہ لونڈیا بھی تو سرکار نے رادھن کو دان کر دی تھی۔"

"سمپت۔" دلیش مکھ نے دوسرے آدمی کو مخاطب کیا "تم ابھی جا کر پتا کرو کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اور کون کون لوگ ہیں۔ اگر وہ اکیلا ہو تو ختم کر دو اسے اور بلا کو اٹھا لاؤ یہاں۔ سارے ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز چھان مارو۔ وہ کہیں نہ کہیں مل جائے گا اور پران تم۔" وہ پیلی شرٹ والے کی طرف گھوم گیا۔

میرا خون کھول اٹھا تھا۔ میں یہ نہیں سن سکا کہ اس نے پران سے کیا کہا تھا۔ میں نے جھک کر پتلون کے پائنچے کے نیچے پنڈلی پر بندھا ہوا خنجر نکالا اور اس کا دستہ زور سے کھڑکی کے شیشے پر دے مارا۔

چھناکے کی زوردار آواز ابھری۔ شیشہ چکنا چور ہو کر بکھر گیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی ہٹا دی اور کھڑکی کھول کر پردہ ایک طرف کھینچ دیا اور دونوں ہاتھ چوکھٹ پر ٹکا کر بڑی پھرتی سے اوپر چڑھ گیا۔

"نہیں دلیش مکھ۔ میری تلاش میں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود یہاں موجود ہوں۔" میں نے چیختے ہوئے کہا۔

یہ سب کچھ ایک سیکنڈ میں ہو گیا تھا۔ وہ سب بدحواس ہو کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

"پکڑو اسے۔ مار ڈالو۔ زندہ نہ بچ کر جائے۔" دلیش مکھ چیخا اور اس نے خود باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے کھڑکی پر سے چھلانگ لگا دی۔ میرا اندازہ کسی قدر غلط نکلا۔ میں دلیش مکھ کے اوپر تو نہیں گرا لیکن میری لات اس کے کولھے پر لگی تھی۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر گر گیا۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا لیکن اس دوران پران اور سمپت میرے اوپر چھلانگ لگا چکے تھے۔ سمپت نے میرے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ خنجر میرے ہاتھ سے نکل گیا لیکن اس کے فوراً بعد میں نے خود کو ان کی گرفت سے چھڑا لیا اور پران کو اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔ پران اس لڑکی پر گرا جو ایک طرف سہمی کھڑی تھی۔ وہ خوف ناک انداز میں چیختے ہوئے پران کے ساتھ ہی نیچے گری۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سمپت نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی اور مجھے دھکیلتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ میرا سر دیوار سے ٹکرایا اور دماغ جھنجنا اٹھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر جما دیے اور اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر جما ہوا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں کے بیچ گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔ وہ اچھل پڑا۔ مجھے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کا موقع مل گیا۔

دلیش مکھ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی تھی لیکن اسی وقت پران اور سمپت نے بیک وقت میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میں نے لوٹ لگا کر بچنے کی کوشش کی تھی لیکن سمپت نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ مجھے بُری طرح رگید رہا تھا۔ ایک موقع پر مجھے داؤ لگانے کا موقع مل گیا۔ میں نے ایک ٹانگ سمیٹ کر پیر اس کے پیٹ پر جما دیا اور اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔ مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میں نے اسے پوری قوت سے اچھال دیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ قریب ہی وہ لڑکی بھی دیوار کے ساتھ سمٹی کھڑی تھی اس نے اپنے دونوں بازو سینے پر لپیٹ رکھے تھے اور اس کے منہ سے خوف زدہ آوازیں نکل رہی تھیں۔

دلیش مکھ اور پران کمرے سے نکل چکے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازے کی طرف چھلانگ لگانے کی کوشش کی تو سمپت نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ اس نے پشت کی طرف سے بایاں بازو میرے گلے پر لپیٹ دیا تھا اور دائیں ہاتھ سے میرے پہلو پر زوردار گھونسے مار رہا تھا۔ ہر ضرب مجھے براہِ راست گردے پر لگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے بازو پر جما دیے اور گلے پر اس کی گرفت ڈھیلی کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ میرا نرخرا دب رہا تھا اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں اس کے بازو پر دونوں ہاتھ جمائے آہستہ آہستہ آگے جھکنے لگا۔ اسی طرح سمپت میری پشت پر لدتا چلا گیا اور پھر میں گھٹنوں کو جھکاتا ہوا ایک جھٹکے سے آگے جھکا۔ سمپت میرے اوپر سے قلا بازی کھاتا ہوا پشت کے بل نیچے گرا۔ میں ایک ہاتھ سے گلا سہلاتا ہوا بڑی تیزی سے اٹھ گیا لیکن سمپت نے لیٹے لیٹے ٹانگ چلا دی۔ ٹھوکر میرے گھٹنے کے پیچھے لگی اور میں بھد سے نیچے گر گیا۔

اسی وقت باہر کسی گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے اور بنگلے کا گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ دلیش مکھ بھاگ رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف چھلانگ لگائی تو سمپت مجھ سے لپٹ گیا۔

ہم ایک بار پھر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ کم بخت جونک کی طرح مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ میں نے کہنی سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ گیا لیکن سمپت نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک بار پھر میری طرف جھپٹا۔ اس مرتبہ میں نے بڑی تیزی سے نیچے جھک کر اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور سر سے اوپر لے جا کر پوری قوت سے اچھال دیا۔

نیچے گرتے ہوئے سمپت کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ جب میں برآمدے والے دروازے سے نکلا تو سرخ رنگ کی ایک کار بنگلے کے گیٹ سے نکل رہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی لیکن کار بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی اور جب میں گیٹ پر پہنچا تو کار تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی تقریباً پچاس گز دور جا چکی تھی اور اس کی عقبی سرخ بتیاں لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔ کار کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی۔

اور جب میں شوبھا والے کمرے میں داخل ہوا تو ایک جھٹکے سے رک گیا۔ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بیڈ خالی تھا۔ وہ کم بخت دلیش مکھ شوبھا کو کار میں ڈال کر لے گیا تھا۔

میں آہٹ سن کر ایک دم پلٹ پڑا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میری زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ سمپت خنجر تانے دہاڑتا ہوا میری طرف لپکا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ خون میں تر ہو رہا تھا۔

اس کے ہاتھ میں میرا ہی خنجر تھا۔ اس نے جیسے ہی حملہ کیا میں نے اس کا وار روک لیا۔ اس کی کلائی میرے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں آ گئی۔ میں نے پوری قوت سے بائیں طرف جھکائی دیتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر گرا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

میں نے سمپت کو ہلنے کا موقع نہیں دیا اور بیڈ پر چڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔

"وہ کہاں گئے ہیں۔ جلدی بتاؤ ورنہ میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا۔" میرے حلق سے غراہٹ سی نکلی۔

سمپت مجھ سے زیادہ قد آور اور طاقت ور تھا لیکن اس کی گردن میرے مخصوص داؤ کی گرفت میں تھی۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں نے اس کی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ چیخ اٹھا۔

"میں تمہیں صرف ایک منٹ دے رہا ہوں۔" میں ایک بار پھر غرایا "بتاؤ وہ کہاں گیا ہے۔ ورنہ ایک ہی جھٹکا۔۔۔"

"ب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" وہ چیخا۔

میں نے اس کی گردن پر دباؤ ذرا سا کم کر دیا۔

"تت۔۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ دلیش مکھ یہاں ہے۔۔۔" وہ رک رک کر بولا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔" میں نے کہا "لیکن میں تمہاری یہ خواہش پوری کر دینے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتا۔ سب سے پہلے میں نے ہردوار میں رادھن کا سراغ لگایا۔ وہ بھی اپنے آپ کو بہت بڑا بدمعاش سمجھتا تھا اس نے سونیا کو مار دیا۔ وہی لڑکی جو دلیش مکھ نے اس کے حوالے کی تھی۔ میں سونیا کی موت کا اصل ذمّے دار دلیش مکھ کو ہی سمجھتا ہوں اور اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رادھن نے بھی تمہاری طرح اَڑی کی تھی۔ اسے اپنے گرگوں پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن تین آدمی ضائع کروانے کے بعد اس نے بتایا کہ تم لوگ اس طرف آئے ہو۔ ہم دونوں رات بھر جنگلوں اور پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے آج صبح ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ ایک گھنٹا پہلے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہوئے پران میری نظروں میں آ گیا۔ میں اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر اس طرح بدحواس ہو گیا تھا جیسے اس نے بھوت دیکھ لیا ہو۔ مجھے اس پر شک ہوا اور میں اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچ گیا۔ مجھے افسوس ہے' دلیش مکھ بچ کر نکل گیا لیکن میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ بتاؤ وہ کہاں گیا ہے؟" میں نے ایک بار پھر اس کی گردن پر دباؤ ڈال دیا۔

"ب۔۔۔ بتاتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر چیخا۔ میں نے دباؤ کم کر دیا۔ وہ رک رک کر بولا "یہاں اس کا دوسرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ وہ۔۔۔ وہ نینی تال کی طرف نکل گیا ہوگا۔ وہاں۔۔۔ وہاں بھی اس کا کاٹیج ہے۔ وہ وہیں گیا ہوگا۔"

"نینی تال میں کس جگہ۔۔۔ کاٹیج کہاں ہے۔۔۔" میں نے پوچھا۔

وہ رک رک کر کاٹیج کا پتا سمجھانے لگا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تو میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ بری طرح مچلنے لگا لیکن میں نے اس وقت تک اسے نہیں چھوڑا جب تک اس کی گردن کی ہڈی نہیں توڑ دی۔ میں اسے چھوڑ کر بیڈ سے کود گیا۔ وہ کٹے ہوئے بکرے

کی طرح بیڈ پر تڑپتا رہا پھر نیچے گر گیا۔

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اسی کمرے میں آگیا جہاں سب سے پہلے ان لوگوں سے سامنا ہوا تھا۔ شراب کی دو بوتلیں اور گلاس قالین پر لڑھکے ہوئے تھے۔ میں آگے بڑھ گیا۔ وہ لڑکی دروازے کے پیچھے دیوار کے ساتھ بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ خوف کی شدت سے اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر یہاں سے بھاگ کیوں نہیں گئی تھی۔

"اے۔ اٹھو۔ تم کون ہو اور ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"مم۔۔۔ میرا ان سے۔۔۔ کوئی تعلق نہیں ہے۔" لڑکی ہکلائی "یہ لوگ مجھے شہر سے لے کر آئے تھے۔ ایک رات کے لیے۔۔۔"

"اوہ۔۔۔" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ کال گرل تھی۔ المورا جیسے تفریحی مقامات پر ایسی عورتوں کی کمی نہیں ہوتی جو شکار کی تلاش میں رہتی ہیں "تمہارے کپڑے کہاں ہیں؟" میں نے یہ کہتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کمرے میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

"وہ۔۔۔ دوسرے کمرے میں ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"چلو۔ کپڑے پہنو جا کر۔" میں نے کہا۔

وہ بمشکل اٹھ کر کھڑی ہو سکی تھی۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھی لڑکھڑا گئی۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ ورنہ وہ گر پڑتی۔ میں اسے کمرے سے باہر لاؤنج میں لے آیا۔ وہ دائیں طرف مڑی تو میں بھی اس کا بازو پکڑے اس کے ساتھ مڑ گیا۔

یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں، میں نے سمپت کی گردن موڑی تھی۔ یہ بھی بیڈ روم ہی تھا۔ بستر پر اس لڑکی کے کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی اور کپڑے اٹھا کر پہننے لگی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

میں کمرے میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ایک کھونٹی پر مردانہ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ یہ یقیناً دلیش مکھ کا کمرا تھا اور وہ کپڑے بھی اسی کے تھے۔

میری ٹی شرٹ خون آلود تھی۔ میں نے اپنی شرٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی اور کھونٹی سے دلیش مکھ کی نیلے رنگ کی ایک ٹی شرٹ اتار کر پہن لی۔ وہ لڑکی بھی کپڑے پہن چکی تھی۔ وہ اس وقت تک اپنے آپ پر بڑی حد تک قابو پا چکی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا۔ کہاں رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام سونالی ہے اور میں مس ورما کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"گیسٹ ہاؤس میں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے کہ یہاں کی رہنے والی نہیں ہو؟"

"میں مراد آباد کی رہنے والی ہوں۔ گرمیوں کے سیزن میں کبھی نینی تال اور کبھی یہاں آجاتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا بدن اب بھی ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور آواز میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ وہ طوائف تھی جو شکار کی تلاش میں گھومتی رہتی تھی مگر اس مرتبہ خود شکار ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً دلیش مکھ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہوگی اس لیے میں نے اس سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔

میں اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر آگیا۔ لاؤنج سے ملحق باورچی خانے میں پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور دوبارہ اسی کمرے میں آگیا۔ وہ اب بھی بیڈ کی پٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"لو۔ پانی پیو اور یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔" میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا "یہاں ایک لاش بھی پڑی ہے اور ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔"

وہ گلاس پکڑ چکی تھی۔ لاش کا سنتے ہی اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ پانی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گرا۔ میں نے جلدی سے گلاس پکڑ کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ پینے کے بعد اس نے گلاس منہ سے ہٹا دیا۔

خوف سے اس کے چہرے پر ایک بار پھر پیلاہٹ بڑھ گئی تھی۔ اسے اپنی حالت سنبھالنے میں مزید دس منٹ لگ گئے تھے۔ میں اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں آگیا جہاں سمپت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک ہو گیا تھا۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور آنکھیں بھی اپنے حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرا خنجر بیڈ پر ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ میں نے خنجر اٹھا کر پنڈلی پر بندھے ہوئے فیتے میں اڑسا اور باہر آگیا۔

بنگلے کے تمام دروازے اور کاٹیج کا گیٹ بھی میں نے کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ قرب و جوار میں اگرچہ بہت سے کاٹیج اور بنگلے تھے مگر کسی کو دلیش مکھ والے کاٹیج میں اس ہنگامے کی خبر

ہی تھی۔ دولت مند لوگ ایسی جگہوں پر عیاشی کے ... تھے اور کوئی بھی اپنے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا ...

... شہر کی طرف جانے والے راستے پر چلتے رہے۔ ... نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ پلیا پار کرنے ... تھوڑی ہی دیر بعد سامنے سے ایک کار آتی ہوئی دکھائی ... ہیڈ لیمپس کی تیز روشنی میں میری آنکھیں چندھیا ... میں سونالی کو لے کر سڑک کے کنارے پر ہو گیا۔

... کار ست روی سے ہمارے قریب سے گزر گئی۔ کار ... اندر کی بتی بھی جل رہی تھی۔ پچھلی سیٹ پر دو عورتیں ... ایک آدمی ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

... چڑھائی چڑھتے ہوئے سونالی ہانپ رہی تھی۔ بالآخر ... گھنٹے بعد ہم پختہ سڑک پر اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے ... راستہ میرے گیسٹ ہاؤس کی طرف اور دوسرا شہر کی ... طرف جاتا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت گیارہ بجے تھے اور ... کی طرف روشنیاں جگمگاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب تم اپنے گیسٹ ہاؤس تک اکیلی ... سکتی ہو۔" میں نے سونالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنے کمرے میں جا کر آرام ... کرو۔ اس بنگلے میں جو کچھ بھی ہوا اسے بھول جاؤ۔ اگر کسی ... سے کچھ کہو گی تو خود ہی پھنس جاؤ گی۔ ہو سکتا ہے تمہیں قتل کے الزام میں دھر لیا جائے۔ بہتر ہے کہ صبح پہلی بس سے ... یہاں سے نکل جاؤ۔"

"مم۔۔۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے میرا ہاتھ ... چھوڑنے کے بجائے گرفت مضبوط کر دی "مجھے۔۔۔ مجھے آگے ... تک چھوڑ آؤ۔"

"چلو۔" میں نے کہا۔

... اس نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اندیشہ ہو کہ ... میں اسے چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔

... المورا میں کئی نائٹ کلب تھے۔ جن کے باہر رنگ برنگی ... روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس وقت اگرچہ گیارہ بج رہے ... تھے مگر ہوٹل اور ریسٹورنٹس ابھی کھلے ہوئے تھے۔ تقریباً ... منٹ بعد ہم ایک اور سڑک پر مڑ گئے اور بالآخر ایک ... گیسٹ ہاؤس کے سامنے رک گئے۔

"... میں نے جو کچھ کہا ہے اسے ذہن میں رکھنا۔" میں نے ... اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ ... پہلی بس پر یہاں سے نکل جاؤ۔"

"شکریہ میرے دوست۔ میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گی۔" سونالی کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ آئی تھی "میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے لیکن۔۔۔ تم واقعی اچھے انسان ہو۔ مجھ سے ہمدردی کر کے تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں لیکن کیا تم بتاؤ گے نہیں کہ قصہ کیا ہے۔ وہ عورت کون تھی جو اس بنگلے میں بے ہوش پڑی تھی اور دلیش مکھ سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔"

"یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔" میں نے آہستگی سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "اب تم جاؤ اور اگر مصیبت سے بچنا چاہتی ہو تو میری باتوں کا خیال رکھنا۔"

میں واپس چل پڑا۔ تقریباً پچاس گز آگے جانے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ سونالی اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلتا رہا۔

جب میں اپنے گیسٹ ہاؤس پہنچا تو بارہ بج چکے تھے۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو بملا سامنے ہی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر میری طرف لپکی۔ کمبل اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ بملا نے پستول بیڈ پر پھینک دیا اور آگے بڑھ کر مجھے ٹٹولنے لگی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے "لیکن تم۔۔۔"

"میں کسی بھی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔" اس نے کہا "میں نے طے کر لیا تھا کہ جیسے ہی کوئی اندر داخل ہوگا اسے گولی مار دوں گی۔ اسی لیے میں نے دروازہ بھی لاک نہیں کیا تھا تاکہ مجھے اپنی جگہ سے اٹھنا نہ پڑے لیکن تم۔۔۔ یہ شرٹ۔۔۔"

"میری شرٹ پر خون کے دھبے لگ گئے تھے۔ اس لیے میں نے تبدیل کر لی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔" وہ بولی "شوبھا کا پتا چلا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "دلیش مکھ اسے انجکشنوں کے ذریعے مسلسل بے ہوش رکھے ہوئے ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسے چھڑا نہیں سکا۔ دلیش مکھ اسے لے کر فرار ہو گیا ہے۔ تم بھی اپنی چیزیں سمیٹ لو۔ ہم نینی تال جا رہے ہیں۔"

"اس وقت۔ آدھی رات کو؟" بملا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ اسی وقت۔" میں نے کہا "دلیش مکھ بھی نینی تال ہی گیا ہے۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔"

ببلا اپنی چیزیں سمیٹنے لگی اور میں اسے اس واقعے کی تفصیل بتاتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اس گیسٹ ہاؤس سے نکل رہے تھے۔ میں نے گیسٹ ہاؤس کے منیجر کو بتایا تھا کہ ہمیں ایک ہوٹل میں جگہ مل گئی ہے جہاں ہمارے کچھ اور جاننے والے بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔

الموڑا میں بھی لاتعداد مندر اور آشرم تھے۔ شہر سے باہر ایک مندر کے قریب پہنچتے ہی گاڑی کا انجن پھر گڑبڑ کرنے لگا۔ مندر سے کچھ دور گاڑی رک گئی۔ میں نے ڈیش بورڈ پر مختلف ڈائلز کو چیک کیا اور پھر نیچے اتر کر بونٹ اٹھا دیا۔

ریڈی ایٹر میں پانی نہیں تھا۔ بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہم نے زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ ورنہ انجن سیز بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے بونٹ کھلا چھوڑ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آس پاس اگر کوئی ندی تھی بھی تو اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ڈکی میں سے خالی ڈبا نکال لیا اور ببلا کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا مندر کی طرف چل پڑا۔

سڑک سے تقریباً پچاس گز ہٹ کر بہت بڑا مندر تھا۔ گیٹ اگرچہ بند تھا مگر سامنے بتیاں جل رہی تھیں۔ سڑک سے ایک پختہ راستہ مندر تک چلا گیا تھا۔ میں مندر کے سامنے رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر ایک آواز سن کر اچھل پڑا۔ یہ آواز بائیں طرف سے آئی تھی۔ میں تیزی سے اس طرف مڑ گیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو مورکھ۔ کس چیز کی تلاش ہے؟"

وہ دراز قامت ہٹا کٹا پجاری تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترشول بھی تھا۔ وہ پجاری نجانے کس طرف سے نکل کر وہاں آگیا تھا۔

"جل مہاراج" میں نے کہا "ہماری گاڑی کے ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو گیا ہے۔ میں پانی کی تلاش میں اس طرف آیا ہوں۔"

"ادھر ندی ہے۔ وہاں تمہیں جل مل جائے گا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا "پر اس سمے کہاں سے آئے ہو؟"

"ہم نینی تال جا رہے ہیں مہاراج۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ ہمارا صبح سے پہلے وہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"نینی تال جانے کا یہ راستہ بند ہو گیا ہے مورکھ۔" پجاری نے کہا "آج شام سے ذرا پہلے یہاں سے بیس میل آگے پہاڑی کا ایک تودہ سڑک پر گر جانے سے راستہ بند ہو گیا ہے۔ اسے صاف کرنے میں کم از کم دو دن لگیں گے۔"

"اوہ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کوئی اور راستہ نہیں ہے مہاراج؟"

"ہے۔ دوسرا راستہ ہے۔" پجاری نے سر ہلایا "یہاں سے دو کلومیٹر پیچھے چلے جاؤ۔ وہاں ایک راستہ پہاڑوں میں جاتا ہوا ملے گا۔ وہ راستہ اگرچہ زیادہ اچھا نہیں ہے مگر تقریباً پانچ کلومیٹر آگے جا کر وہ کچا راستہ پکی سڑک سے مل جاتا ہے۔ وہ سڑک نینی تال کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس طرح تمہارا سفر اگرچہ طویل ہو جائے گا مگر تمہیں کوئی کشٹ نہیں اٹھانا پڑے گا۔"

میں نے پجاری کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں جا کر ندی سے ڈبے میں پانی بھرا اور کار کی طرف واپس آگیا۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کے بعد میں نے ببلا کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

انجن ٹھنڈا ہونے تک ہمیں کم از کم آدھا گھنٹا وہیں کھڑے رہنا پڑا اور پھر میں نے بونٹ بند کر دیا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو واپس گھما لیا۔

دو کلومیٹر پیچھے آ کر وہ راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ گنجان درختوں میں گھرا ہوا وہ کچا راستہ جھاڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ جھاڑیاں دبی ہوئی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ پہلے بھی یہاں سے کچھ گاڑیاں گزر چکی ہیں۔

کار کی رفتار بہت کم تھی اور مسلسل جھٹکے لگ رہے۔ پانچ کلومیٹر کا یہ فاصلہ کوئی آدھے گھنٹے میں طے ہوا اور بالآخر ہم پختہ سڑک پر پہنچ گئے۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔

بہت ہی گنجان اور خوفناک سفر تھا۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم مکتسار پہنچ گئے۔ جو رات کے اس سمے تاریکی اور سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم رکے بغیر اس قصبے سے نکل گئے۔ مزید دو گھنٹوں کے بعد ہم بھیوالی نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ یہ رات کا آخری پہر تھا اور یہاں بھی سناٹا تھا۔

بھیوالی سے ایک سڑک کاٹھ گودام اور دوسری نینی تال کی طرف چلی گئی تھی۔ میں نے کار کا رخ نینی تال کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔

یہ راستہ زیادہ دشوار اور خطرناک تھا۔ میں کئی گھنٹوں سے مسلسل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ڈرائیونگ اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری حالت بڑی خستہ ہو رہی تھی لیکن میں اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

صبح سات بجے کے قریب ہم نینی تال کے نواح میں پہنچ گئے اور ایک آشرم سے ذرا آگے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے میں نے کار روک لی۔ دلیش مکھ پر حملہ آور ہونے سے پہلے میں توانائی مجتمع کر لینا چاہتا تھا۔

ریسٹورنٹ میں ہلکا سا ناشتا اور گرم گرم چائے سے ہوش و حواس کسی قدر بحال ہو گئے۔ ببلا بھی اس سفر میں زیادہ تر جاگتی ہی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

تقریباً آدھا گھنٹا مزید اسی ریسٹورنٹ میں رکنے کے بعد ہم کار میں آ کر بیٹھ گئے۔ ایک پیٹرول پمپ سے میں نے ٹینکی فل کروائی۔ آگے نجانے کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے اور میں پیٹرول کے چکر میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اب میں پوری طرح سے تیار تھا اور دلیش مکھ کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ الموڑا میں سمپت نے مجھے جو پتا بتایا تھا وہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ لوگوں سے پوچھتے ہوئے جب ہم اس جگہ پہنچے تو صبح کے نو بج رہے تھے۔

پہاڑی کے دامن میں یہ بھی ایک خوب صورت بنگلا تھا۔ اس کے آس پاس اور بھی بنگلے اور کاٹیج تھے۔ دلیش مکھ والے بنگلے کا گیٹ بند تھا۔ میں نے کار گیٹ کے عین سامنے روک دی۔ میں نے ہر قسم کی احتیاط کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور براہِ راست حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔

میں نے انجن بند کر دیا۔ ببلا کو کار ہی میں بیٹھے رہنے کا کہا اور خود نیچے اتر کر گیٹ کے قریب پہنچ کر جھری سے جھانکنے لگا۔

کمپاؤنڈ خاصا وسیع تھا لیکن اندر کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ دلیش مکھ ہم سے تقریباً دو گھنٹے پہلے الموڑا سے روانہ ہوا تھا۔ اسے اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنی کار بنگلے کے پیچھے کمپاؤنڈ میں کھڑی کی ہو یا الموڑا سے نکلنے کے بعد کوئی اور راستہ اختیار کیا ہو اور ابھی تک یہاں پہنچا ہی نہ ہو۔

میں ذرا پیچھے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بجلی کے تاروں کے علاوہ ٹیلی فون لائن بھی نظر آ رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس بنگلے میں ٹیلی فون بھی موجود تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر گیٹ کے ستون پر کال بیل کا بٹن دبا دیا اور انگلی اس وقت تک نہیں ہٹائی جب تک برآمدے والا دروازہ نہیں کھل گیا۔

میں گیٹ کی جھری میں سے جھانک رہا تھا۔ برآمدے والے دروازے سے برآمد ہونے والا آدمی ادھیڑ عمر تھا اور حلیے سے کٹر ہندو لگتا تھا۔ دھوتی اور کھدر کا کرتہ۔ گنجا سر، ماتھے پر قشقہ اور کھوپڑی پر پچھلی طرف چٹیا کی طرح مٹھی بھر بال۔

"کون ہے بھایا۔ آتا ہوں۔ صبر تو کرو۔" وہ اونچی آواز میں بولتا ہوا برآمدے سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف آگیا۔ اس نے جیسے ہی ذیلی دروازہ کھولا میں نے اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔

وہ چیخ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اندر داخل ہو کر دھڑ سے دروازہ بند کر دیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھک کر اپنا خنجر نکال لیا۔

"کک۔۔۔ کون ہو تم مہاشے۔۔۔ کک۔۔۔ کیا بات ہے۔" وہ ہکلا گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے تھے۔

"اندر کون ہے۔ دلیش مکھ کہاں ہے؟" میں نے غراتے ہوئے خنجر کی نوک اس کے سینے پر رکھ دی۔

"کک۔۔۔ کوئی نہیں مہاراج۔ اندر کوئی نہیں ہے۔" وہ گھگیایا۔

قارئین کے ذوق کی نذر
ایک شاہکار معاشرتی ناول
بہتے پانی پہ مکاں
اس نے بہتے پانی پہ مکاں بنانا چاہا...!!!
لیکن مقدر کی بات کہ وہ ہارتے ہارتے جیت گئی۔
ناہید سلطانہ اختر کے قلم کا ایک طلسماتی شاہکار
مضبوط جلد — قیمت 100 روپے — خوبصورت سرورق
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کے لیے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی 75500

"اندر چلو۔" میں نے اسے دھکا دیا۔
بنگلے میں واقعی کوئی نہیں تھا اور نہ ہی ایسے کوئی آثار نظر آئے تھے جس سے پتا چلتا کہ یہاں کوئی آیا ہوگا۔
"دلیش مکھ کا یہاں اور کوئی ٹھکانا ہے؟" میں نے اس شخص کے سینے پر خنجر کی نوک رکھتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں مہاراج۔ وہ جب بھی آتے ہیں یہیں آتے ہیں لیکن آپ کون ہیں اور کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ شخص خوف زدہ لہجے میں بولا۔
میں جواب دینے کے بجائے چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔
میں ابھی اس کی دھنائی کر رہا تھا کہ ببلا دوڑتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ وہ بدحواس ہو رہی تھی۔
"وجدان بھاگو۔ وہ لوگ نکل گئے۔" وہ مجھے دیکھتے ہی چیخی۔
"کیا ہوا۔ وہ لوگ کہاں نکل گئے؟ یہ بنگلا تو خالی پڑا ہے۔" میں نے کہا۔
"وہ سامنے والی سڑک سے آئے تھے۔" ببلا اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "بنگلے کے سامنے ہماری کار دیکھ کر انہوں نے اپنی گاڑی دور ہی روک لی۔ میں اپنی کار سے اتر کر باہر کھڑی تھی۔ دلیش مکھ کے ساتھ وہ آدمی بھی تھا جسے تم نے المورا کے ریسٹورنٹ میں دیکھا اس نے میری طرف اشارہ کرکے چیخ کر کچھ کہا اور دلیش مکھ نے گاڑی تیزی سے واپس گھمالی۔ جلدی چلو۔ وہ کہیں دور نکل جائیں گے۔"
میں نے اس شخص کو ایک زوردار دھکے سے پیچھے گرا دیا اور ببلا کے ساتھ باہر کی طرف دوڑا۔
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر ڈیش بورڈ کے اوپر ڈال دیا اور انجن اسٹارٹ کرنے لگا۔ اسی دوران ببلا بھی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے ایک زوردار جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی اور اگلے موڑ پر اسے ببلا کی بتائی ہوئی سمت میں موڑ دیا۔
المورا والے بنگلے میں میں نے سرخ رنگ کی کار دیکھی تھی اور دلیش مکھ اسی کار پر وہاں سے فرار ہوا تھا۔ وہ ہم سے دو گھنٹے پہلے المورا سے نکلا تھا اور تقریباً تین گھنٹے بعد یہاں پہنچا تھا اور بنگلے کے سامنے ہماری کار دیکھ کر فرار ہو گیا تھا۔
میں جگہ جگہ گاڑی روک کر دلیش مکھ کی سرخ کار کے بارے میں پوچھتا رہا اور بالآخر ہم شہر سے نکل کر کاٹھ گودام کی طرف جانے والی شاہراہ پر نکل آئے۔ کاٹھ گودام نیپال کی سرحد کی طرف ایک بڑا قصبہ تھا۔ وہاں سے ایک سڑک نیپال کی سرحد کی طرف اور ایک سڑک رامپور اور بریلی وغیرہ کی طرف چلی گئی تھی۔
اس پختہ شاہراہ پر آتے ہی میں کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ نینی تال پہنچتے ہی میں نے کار کی ٹینکی فل کروالی تھی اور اب مجھے پیٹرول کی بھی فکر نہیں تھی۔
اس شاہراہ پر تقریباً بیس میل کا فاصلہ طے ہو چکا تھا اور پھر مجھے دلیش مکھ کی کار نظر آگئی۔ وہ سرخ کار ایک موڑ کاٹ کر پہاڑی کے دوسری طرف چلی گئی تھی۔ راستہ اگرچہ انتہائی خطرناک تھا۔ جگہ جگہ اندھے موڑ تھے مگر میں ایکسلی ریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔
سرخ کار ایک بار پھر نظر آگئی۔ فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا اور پھر یہ فاصلہ پچاس گز کے قریب رہ گیا اور اس وقت میں نے پران کو کار کی کھڑکی سے باہر جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہی لمحے اس کا پستول شعلے اگلنے لگا۔
پہلی گولی میرے اور ببلا کے درمیان ونڈ اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔ ببلا چیختی ہوئی نیچے جھک گئی۔ دوسری گولی نے بھی ببلا کے سامنے ونڈ اسکرین میں سوراخ کیا تھا۔ اگر ببلا سیٹ پر نہ جھکتی تو یہ گولی ونڈ شیلڈ میں سوراخ کرنے کے بعد ببلا کی پیشانی میں بھی سوراخ کر دیتی۔
سڑک کے ایک طرف عمودی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف ڈھلان تھی۔ یہ ڈھلان اگرچہ زیادہ خطرناک نہیں تھی لیکن نیچے بہت دور پھیلی ہوئی وادی تک چلی گئی تھی۔
ایک اور گولی کار کے فینڈر پر لگی۔ میں نے پروا کیے بغیر ایکسلی ریٹر پر پیر کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اچانک زوردار دھماکا ہوا اور کار لہرا گئی۔ اس مرتبہ گولی اگلے ٹائر پر لگی تھی اور ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ کار بری طرح لہرائی تھی۔ میں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور وہ سڑک سے ہٹ کر ڈھلان پر اترنے لگی۔
ڈھلان پینتالیس یا پچاس کے زاویے پر نشیب میں میلوں دور تک چلی گئی تھی۔ ڈھلان پر آتے ہی کار کی رفتار بھی ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ ایک دم بریک لگانے سے کار کے الٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ ببلا بری طرح چیخ رہی تھی اور میں آہستہ آہستہ بریک لگاتے ہوئے کار کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالآخر تقریباً دو سو گز نیچے آکر میں کار کو جھاڑیوں میں روکنے میں کامیاب ہو گیا۔
"نیچے اترو۔ جلدی کرو۔" میں چیخا۔
ببلا نے دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ میں نے ہینڈ بریک بھی لگا دیے اور کار کا دروازہ کھول کر آہستگی سے نیچے اتر آیا۔ میرا خیال تھا کہ کار پھر ڈھلان پر لڑھکنے لگے گی مگر اس کے پہیے جھاڑیوں میں پھنس گئے تھے۔
میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ سرخ کار بہت دور چٹانوں کے ساتھ ساتھ سڑک پر جاتی ہوئی نظر آرہی تھی اور پھر وہ ایک موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں گہرا سانس لے کر ببلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ خوف سے پیلا ہو رہا تھا۔ وہ دوڑ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپانے لگا اور پھر اسے الگ ہٹا کر صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔
صورتِ حال نہایت تشویش ناک تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ڈھلان زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ اگر ڈھلان عمودی ہوتی تو کار کے پرخچے اڑ جاتے اور ہمارا بھی خاتمہ ہو چکا ہوتا۔
کار میں اسٹپنی نہیں تھی۔ ہوتی بھی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کار کو اس چڑھائی پر ڈرائیو کرتے ہوئے تقریباً دو سو گز اوپر لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کار کا اور ہمارا ساتھ یہیں تک کا تھا۔ میں نے تھیلا اور کمبل نکال لیے اور پھر ہم دونوں چڑھائی چڑھنے لگے۔
مجھے دلیش مکھ کے نکل جانے کا بہت افسوس تھا۔ شوبھا بھی اس کے ساتھ تھی۔ المورا والے بنگلے تک تو میں نے خود دیکھا تھا کہ اسے بے ہوش رکھا گیا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش ہی ہوگی لیکن کس حال میں؟ کاش! میں دلیش مکھ کو روکنے میں کامیاب ہو جاتا۔
پتھریلی چڑھائی پر چڑھنا خاصا دشوار کام تھا۔ ببلا ہانپ رہی تھی۔ اس کا پیر بار بار رپٹ جاتا۔ میں نے تھیلا بھی کندھے سے لٹکایا ہوا تھا اور دونوں کمبل بھی اٹھا رکھے تھے۔ ایک ہاتھ سے ببلا کا ہاتھ بھی تھام رکھا تھا۔
ہم تقریباً ایک گھنٹے میں سڑک پر پہنچ سکے تھے۔ ببلا ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو جھاڑیوں میں پھنسی ہوئی وہ کار ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔
"کیا ہم سارا دن یہیں بیٹھے رہیں گے۔ اس ویرانے میں؟" ببلا نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
"یہ پختہ اور بڑی سڑک ہے۔ یہاں بسوں کی آمد و رفت بھی ضرور ہوگی۔" میں نے سڑک پر دونوں طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی نہ کوئی بس یا کوئی اور گاڑی یہاں سے ضرور گزرے گی۔"
اور پھر ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بیس پچیس منٹ بعد فضا میں موٹر کے انجن کی گرر گرر کی آواز سنائی دینے لگی اور تھوڑی دیر بعد ہی نینی تال کی طرف سے آنے والی ایک بس پہاڑی کا موڑ گھوم کر سامنے آگئی۔ میں سڑک کے وسط میں کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ بس مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔
یہ بس کاٹھ گودام جا رہی تھی اور اس میں کئی سیٹیں خالی تھیں۔ ہم بس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیور اور بس کے کئی مسافروں نے نشیب میں ہماری کار کو دیکھ لیا تھا۔ کنڈکٹر نے اس حوالے سے پوچھا بھی تھا۔
"ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔" میں نے جواب دیا "کار سنبھلی نہیں اور ڈھلان پر اترتی چلی گئی۔ بڑی مشکل سے دور جا کر اسے روکنے میں کامیاب ہو سکا۔ کار سے تو اب ہاتھ دھونے ہی پڑے ہیں۔ شکر ہے ہماری جانیں بچ گئیں۔"
میں نے کاٹھ گودام کے ٹکٹ لے لیے۔ ہمارے ساتھ والی سیٹ پر ایک لمبا تڑنگا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سانولی رنگت اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ وہ خاصا اسمارٹ اور خوب رو

ایک مقبول ترین سلسلہ
شاطر
قیمت فی حصہ 50 روپے | 2 حصے مکمل | ڈاک خرچ 23 روپے
کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
شاطر کو مشہور انعام یافتہ مصنف شکیل انجم نے اپنے خاص انداز میں تحریر کیا ہے۔
ایک ایسی دلچسپ ہنگامہ آرا اور سنسنی خیز داستان جس میں قدم قدم سسپنس اور سطر سطر قیامت آرائی ہے۔
کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال فرمائیں
کتابیات پبلی کیشنز

آدمی تھا۔ اس نے گرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔ وہ مشتبہ نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی بملا کی طرف اور پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کردیں۔ وہ جس طرح مجھ سے سوالات کر رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ اس کا تعلق پولیس ہی سے ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ بملا میری پتنی ہے۔ اپنا نام میں نے ہمت سنگھ ہی بتایا تھا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ہماری شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی اور ہم تین ہفتے پہلے سیرو تفریح کے لیے نکلے تھے کہ آج یہ حادثہ پیش آگیا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ میری باتوں سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ کرید کرید کر پوچھتا رہا اور میں مناسب جواب دیتا رہا۔

بس پہاڑوں میں آباد مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رکتی ہوئی کاٹھ گودام پہنچ گئی۔

میں بس سے اتر کر بملا کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ میں جگہ جگہ لوگوں سے سرخ کار کے بارے میں بھی پوچھتا رہا اور بالآخر ایک پیٹرول پمپ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی وہ کار، جس میں پچھلی سیٹ پر ایک بیمار عورت بھی پڑی تھی، نیپال کی سرحد پر واقع تنک پور نامی گاؤں کی طرف گئی ہے۔ میں نے دلیش مکھ اور شوبھا کے حلیے بتائے تو پیٹرول پمپ کے سروس بوائے نے اس کی تصدیق کردی۔ اس کار میں اس نے پیٹرول بھرا تھا۔

تنک پور یہاں سے چونسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن نیپال کی سرحد سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تنک پور ایک چھوٹی بستی تھی۔ کاٹھ گودام سے تنک پور کے لیے صرف دو بسیں چلتی تھیں۔ ایک صبح آٹھ بجے اور دوسری دوپہر دو بجے۔ دوسری بس آدھا گھنٹا پہلے نکل چکی تھی۔ اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ ہمیں اس سڑک پر لفٹ ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور ایک رہائشی ہوٹل میں آگئے۔ نہایت گھٹیا ہوٹل تھا۔ کمرے مرغی کے دڑبوں کی طرح چھوٹے تھے۔ سنگل بیڈ کے کمرے کا کرایہ بھی ڈبل بیڈ کے برابر وصول کیا گیا۔ بہرحال، ہماری مجبوری تھی۔ ہمیں آج کا دن اور رات گزارنی تھی۔ یہاں بھی میں نے بملا کو اپنی پتنی ہی بتلایا تھا۔

بملا کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر پر گر گئی۔ میں نے دروازہ بند کردیا۔ کمرے میں ایک چھوٹی تپائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے تھیلا اور کمبل ایک کرسی پر رکھ دیے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بملا سو چکی تھی۔ میں بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کرسیوں اور بیڈ کے درمیان فرش پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں کمبل بچھا کر سو جاتا۔ یوں بھی فرش اتنا گندہ تھا کہ کمبل بچھانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ نیند بڑی شدت سے آرہی تھی۔ میرے لیے کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر میں کرسی سے اٹھ کر بملا کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

○☆○

دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹٹولتے ہوئے پہلے بجلی کا سوئچ آن کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی دوران دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ میں نے اوپر کی کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کے بیرے کو دیکھ کر میرا دماغ بھنا گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیوں اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہے ہو۔"

"سرکار۔ دو گھنٹوں میں چھ بار دروجا بجایا ہوں۔" ویٹر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا "سیٹھ بولا ایک بار اور کوسس کرو پھر پولیس کو بلالو۔ سرکار۔ ادھر لوگ آتا ہے نسہ کرکے سوتا ہے تو پھر اس کالاس اٹھانا پڑتا ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"آٹھ بجا ہے نا سرکار۔" بیرے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ سیٹھ کو بولو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور باتھ روم کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ادھر۔ آخر میں۔" ویٹر نے راہداری میں ایک طرف اشارہ کردیا پھر بولا "چائے وائے پینے کا ہے یا نہیں۔"

"میں بتا دوں گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کردیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سنسناہٹ ہو رہی تھی جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ ہم تین بجے اس کمرے میں آئے تھے اور ایسے غافل ہو کر سوئے تھے کہ کسی

مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں تم۔۔۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ اٹھنے والے پگ مجھے کہاں لے جائیں گے۔" بملا نے میری بات کاٹ دی "آئندہ مجھے واپس جانے کے لیے مت کہنا۔ میں نے تمہیں اپنا جیون ساتھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم تو سیریس ہو گئیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"تم بھی تو ہر جگہ مجھے اپنی پتنی بتا رہے ہو۔" وہ مسکرا دی۔

"اس لیے کہ لوگ ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ کرسکیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ سمبندھ (تعلق) اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ سدا رہے تو۔۔۔"

"اگر تمہارے قبیل کے لوگوں کو پتا چل گیا تاکہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بغل میں لیے گھوم رہا ہے تو جانتی ہو کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے موضوع بدل دیا۔ ایک دکان سے میں نے کچھ پھل خریدے اور ہم ہوٹل واپس آگئے۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں اس لمبے تڑنگے شخص کو استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ جو بس میں بھی مجھ سے الٹے سیدھے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس نے اس وقت بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ رشی کیش جانے سے پہلے ہردوار میں میرے ہاتھوں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ چترا پریتم کے جلے ہوئے کاٹیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کرلیا گیا تھا کہ وہ میری اور چترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند میل دور پہاڑوں میں واقع مندر سے پنڈت رگھیا راج، ایک

اور پجاری اور چترا پریتم کی لاشیں بھی مل گئی تھیں اور پولیس کو ہمارے آگ میں جل کر مر جانے کے حوالے سے ہمارے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا اور پھر تین چار روز پہلے بھی ہردوار میں رادھن بدمعاش اور اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خفیہ پولیس کا یہ لمبا تڑنگا آدمی میری ہی تلاش میں نکلا ہو اور اتفاق سے میں اس کی نظروں میں آگیا۔ شاید وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میرے بارے میں تصدیق کرلینا چاہتا تھا اور اس وقت ہوٹل کے نیجر یا مالک سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ بملا کے چہرے پر بھی میں نے تشویش کے آثار دیکھے تھے۔

"تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا۔" بملا نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "وہی جو ہمیں بس میں ملا تھا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں بھی تھا۔ جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور اب یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ پولیس کا آدمی ہے۔"

"مجھے بھی اس پر یہی شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا "یہاں سے بھاگنے کی کوئی کوشش بے کار ہوگی۔ ہمیں بہرحال محتاط رہنا پڑے گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ شخص ہمارے کمرے تک آنے کی کوشش کرے گا۔ الٹے سیدھے سوالات کرکے ہمارے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میں نے خنجر نکال کر ایک سیب کاٹا اور دو ٹکڑے بملا کی طرف بڑھا دیے۔ بملا بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور میں کرسی پر۔ پھل کھاتے اور مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔

اس رات بملا بھی دیر تک جاگتی رہی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ رات کو کسی وقت ہمیں گھیرنے کی کوشش جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت دھیرے دھیرے گزر رہا۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بملا بیڈ پر اونگھ رہی تھی۔ میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

❖ اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں ❖
جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

آدمی تھا۔ اس نے گہرے کلر کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی سے ہے۔ وہ مشتبہ نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا اور کبھی بملا کی طرف اور پھر اس نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ جس طرح مجھ سے سوالات کر رہا تھا اس سے میرے اس شک کو تقویت مل رہی تھی کہ اس کا تعلق پولیس ہی سے ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ بملا میری پتنی ہے۔ اپنا نام میں نے ہمت سنگھ ہی بتایا تھا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ہماری شادی چند مہینے پہلے ہوئی تھی اور ہم تین ہفتے پہلے سیر و تفریح کے لیے نکلے تھے کہ آج یہ حادثہ پیش آ گیا۔

لیکن میرا خیال ہے کہ میری باتوں سے وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ کرید کرید کر پوچھتا رہا اور میں مناسب جواب دیتا رہا۔

بس پہاڑوں میں آباد مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رکتی ہوئی کاٹھ گودام پہنچ گئی۔

میں بس سے اتر کر بملا کے ساتھ ایک طرف چل پڑا۔ میں جگہ جگہ لوگوں سے سرخ کار کے بارے میں بھی پوچھتا رہا اور بالآخر ایک پیٹرول پمپ سے مجھے یہ پتا چل گیا کہ سرخ رنگ کی وہ کار، جس میں پچھلی سیٹ پر ایک بیمار عورت بھی پڑی تھی، نیپال کی سرحد پر واقع تنک پور نامی گاؤں کی طرف گئی ہے۔ میں نے ویش مکھ اور شوبھا کے حلیے بتائے تو پیٹرول پمپ کے سروس بوائے نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس کار میں اس نے پیٹرول بھرا تھا۔

تنک پور یہاں سے چونسٹھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھا لیکن نیپال کی سرحد سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر تنک پور ایک چھوٹی بستی تھی۔ کاٹھ گودام سے تنک پور کے لیے صرف دو بسیں چلتی تھیں۔ ایک صبح آٹھ بجے اور دوسری دوپہر دو بجے۔ دوسری بس آدھا گھنٹا پہلے نکل چکی تھی۔ اس وقت ڈھائی بج رہے تھے۔ ہمیں اس سڑک پر لفٹ ملنے کی توقع بھی نہیں تھی۔

ہم نے ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا اور ایک رہائشی ہوٹل میں آ گئے۔ نہایت گھٹیا ہوٹل تھا۔ کمرے مرغی کے دڑبوں کی طرح چھوٹے تھے۔ سنگل بیڈ کے کمرے کا کرایہ بھی ڈبل بیڈ کے برابر وصول کیا گیا۔ بہرحال، ہماری مجبوری تھی۔ ہمیں آج کا دن اور رات گزارنی تھی۔ یہاں بھی میں نے بملا کو اپنی پتنی ہی بتلایا تھا۔

بملا کمرے میں داخل ہوتے ہی بستر پر گر گئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ کمرے میں ایک چھوٹی تپائی اور دو کرسیاں بھی تھیں۔ میں نے تھیلا اور کمبل ایک کرسی پر رکھ دیے اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی بملا سو چکی تھی۔ میں بھی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھلی تو ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کرسیوں اور بیڈ کے درمیان فرش پر اتنی جگہ نہیں تھی کہ میں کمبل بچھا کر سو جاتا۔ یوں بھی فرش اتنا گندہ تھا کہ کمبل بچھانے کو بھی دل نہیں چاہتا تھا۔ نیند بڑی شدت سے آ رہی تھی۔ میرے لیے کرسی پر بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر میں کرسی سے اٹھ کر بملا کے ساتھ بیڈ پر لیٹ گیا۔ میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی اور آنکھیں بند کرتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

○☆○

دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اٹھ کر ٹٹولتے ہوئے پہلے بجلی کا سوئچ آن کیا اور پھر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی دوران دروازہ ایک بار پھر دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ میں نے اوپر کی کنڈی گرا کر دروازہ کھولا تو سامنے ہوٹل کے بیرے کو دیکھ کر میرا دماغ بھنا گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کیوں اتنی زور سے دروازہ پیٹ رہے ہو۔"

"سرکار۔ دو گھنٹوں میں چھ بار رو جا بجایا ہوں۔" ویٹر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا "سیٹھ بولا ایک بار اور کوسس کرو پھر پولیس کو بلالو۔ سرکار۔ ادھر لوگ آتا ہے نسہ کر کے سوتا ہے تو پھر اس کا لاس اٹھانا پڑتا ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ٹائم کیا ہوا ہے؟"

"آٹھ بجا ہے نا سرکار۔" بیرے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ سیٹھ کو بولو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور باتھ روم کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ ادھر۔ آخر میں۔" ویٹر نے راہداری میں ایک طرف اشارہ کر دیا پھر بولا "چائے وائے پینے کا ہے یا نہیں۔"

"میں بتا دوں گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے دروازہ بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سنسناہٹ ہو رہی تھی جیسے آندھیاں چل رہی ہوں۔ ہم تین بجے اس کمرے میں آئے تھے اور ایسے غافل ہو کر سوئے تھے کہ کسی

مشورہ دوں گا کہ تم واپس چلی جاؤ۔ اس سے پہلے کہ واپسی کے تمام راستے بند ہو جائیں تم۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں کہ تمہارے ساتھ اٹھنے والے پگ مجھے کہاں لے جائیں گے۔" بملا نے میری بات کاٹ دی "آئندہ مجھے واپس جانے کے لیے مت کہنا۔ میں نے تمہیں اپنا جیون ساتھی مان لیا ہے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تم تو سیریس ہو گئیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"تم بھی تو ہر جگہ مجھے اپنی پتنی بتا رہے ہو۔" وہ مسکرا دی۔

"اس لیے کہ لوگ ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ کر سکیں۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ سمبندھ (تعلق) اچھا لگتا ہے۔ اگر یہ سدا رہے تو۔"

"اگر تمہارے قبیلے کے لوگوں کو پتا چل گیا کہ ایک مسلمان ایک ہندو لڑکی کو بغل میں لیے گھوم رہا ہے تو جانتی ہو کیا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں اس بات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے موضوع بدل دیا۔ ایک دکان سے میں نے کچھ پھل خریدے اور ہم ہوٹل واپس آ گئے۔

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں اس لمبے تڑنگے شخص کو استقبالیہ کاؤنٹر کے سامنے کھڑے دیکھ کر چونک گیا۔ جو بس میں بھی مجھ سے الٹے سیدھے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس نے اس وقت بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرا یہ شبہ اب یقین میں بدلتا جا رہا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے ہے۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ رشی کیش جانے سے پہلے ہردوار میں میرے ہاتھوں کئی لوگ مارے گئے تھے۔ چترا پریتم کے جلے ہوئے کاٹیج سے دو جلی ہوئی لاشیں ملی تھیں جن کے بارے میں یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ وہ میری اور چترا کی لاشیں ہیں اور پھر اس کے چند روز بعد پولیس کو شہر سے چند میل دور پہاڑوں میں واقع مندر سے پنڈت پرکھیا راج، ایک اور بہاری اور چترا پریتم کی لاشیں بھی مل گئی تھیں اور پولیس کو ہمارے آگ میں جل کر مر جانے کے حوالے سے ہمارے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا اور پھر تین چار روز پہلے بھی ہردوار میں رادھن بدمعاش اور اس کے تین ساتھی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے اور اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خفیہ پولیس کا یہ لمبا تڑنگا آدمی میری ہی تلاش میں نکلا ہو اور اتفاق سے میں اس کی نظروں میں آ گیا۔ شاید وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے میرے بارے میں تصدیق کر لینا چاہتا تھا اور اس وقت ہوٹل کے منیجر یا مالک سے میرے بارے میں پوچھ رہا ہو۔

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ بملا کے چہرے پر بھی میں نے تشویش کے آثار دیکھے تھے۔

"تم نے اس آدمی کو دیکھا تھا۔" بملا نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "وہی جو ہمیں بس میں ملا تھا اور اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہا تھا۔ وہ اس ہوٹل میں بھی تھا۔ جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور اب یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ پولیس کا آدمی ہے۔"

"مجھے بھی اس پر یہی شبہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں سے بھاگنے کی کوئی کوشش بے کار ہو گی۔ ہمیں بہرحال محتاط رہنا پڑے گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ شخص ہمارے کمرے تک آنے کی کوشش کرے گا۔ الٹے سیدھے سوالات کر کے ہمارے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

میں نے خنجر نکال کر ایک سیب کاٹا اور دو ٹکڑے بملا کی طرف بڑھا دیے۔ بملا بیڈ پر بیٹھ گئی تھی اور میں کرسی پر۔ پھل کھاتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

اس رات بملا بھی دیر تک جاگتی رہی۔ جیسے اسے بھی اندیشہ ہو کہ رات کو کسی وقت ہمیں گھیرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔

رات کے دو بج گئے تھے۔ بملا بیڈ پر اونگھ رہی تھی اور میں اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ گہرا سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں
جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 6

آتش فشاں

ظلم و ستم کے شعلوں میں جلنے والے ایک معصوم ذہن کی لرزہ خیز سرگزشت

راوی: وجدان علی تحریر: اقبال کاظمی

وہ اپنے ماں باپ کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا اور اس کا دماغ کسی آتش فشاں کی طرح ابل رہا تھا۔ اس کے شب و روز کی ہر کروٹ اس کے لئے نت نئے ہنگاموں کی پیامبر تھی۔ بے رحم و سفاک قاتل اسے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا پہچانتا تھا لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کو ایسی پناہ گاہ کی تلاش تھی۔ جہاں وہ ان درندوں سے محفوظ رہ کر خود کو اتنا توانا و طاقت ور بنا سکے کہ وہ اس کا بال بھی بیکا نہ کر سکیں بالآخر قدرت اسے ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں اس کی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھلنے والی تھی۔

اس ٹمٹماتے چراغ کا احوال جو اچانک ہی آندھیوں کی زد میں آگیا تھا

اچانک ایک آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے سامنے کی راہداری میں کوئی چیز گری ہو۔ میں نے اٹھ کر آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے لگا۔

راہداری میں بائیں طرف مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور دائیں طرف، جس طرف باتھ روم تھا، ایک گملا الٹا ہوا تھا اور مجھے یوں لگا جیسے کوئی انسانی ہیولا بڑی تیزی سے باتھ روم میں گھسا ہو۔

ہوسکتا ہے وہ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا کوئی ایسا شخص ہو جسے اس وقت باتھ روم میں جانے کی ضرورت پیش آگئی ہو اور راہداری میں رکھا ہوا گملا اس کے پیر کی ٹھوکر سے گر گیا ہو لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ میں نے آہستگی سے دروازہ بھیڑ دیا اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس قسم کے چھوٹے ہوٹلوں میں چوری کی وارداتیں ہوتی رہتی تھیں۔

ایک منٹ بعد میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ایک سایہ باتھ روم کے قریب راہداری میں دائیں طرف مڑتا نظر آیا۔ اس طرف بھی چند کمرے تھے۔

میرے شک کو تقویت مل رہی تھی۔ کسی جگہ کسی گڑبڑ کے آثار نظر آئیں اور میں خاموش بیٹھا رہوں، یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ میں اپنے کمرے سے باہر آگیا اور دروازہ بند کرکے آہستگی سے باہر سے کنڈا لگا دیا اور دبے قدموں باتھ روم کی طرف چلنے لگا۔ راہداری کے موڑ پر پہنچ کر میں رکا اور جھانک کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس راہداری میں بھی کمرے تھے اور ایک سائے کو میں نے دوسرے کمرے کے دروازے میں داخل ہوتے دیکھا۔

میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا سوچ رہا تھا کہ مجھے کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ لیکن میری چھٹی حس مسلسل مجھے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر اتفاق سے اس وقت ہوٹل کا کوئی مہمان اپنے کمرے سے نکل آئے تو مجھے یہاں کھڑے دیکھ کر کیا سوچے گا۔ ہوسکتا ہے وہ چور چور کا شور مچاتے ہوئے مجھ سے لپٹ جائے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کمرے سے اٹھا پٹخ اور غراہٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔ صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں نے جھری سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی تو اندر سے کوئی شخص دھڑ سے دروازے سے ٹکرایا۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔

اندر سے مارپیٹ اور غراہٹوں کی آوازیں تیز ہوگئی تھیں۔ میں نے دھکا دے کر دروازہ کھول دیا۔

کمرے کے اندر کا منظر بڑا سنسنی خیز اور خوفناک تھا۔ دو آدمی، جن کے چہروں پر نقاب لگے ہوئے تھے، ایک آدمی کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور پٹنے والے اس آدمی کو دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہ وہی لمبا تڑنگا آدمی تھا جس پر مجھے پولیس والا ہونے کا شبہ تھا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔

ایک نقاب پوش کے ہاتھ میں خنجر تھا۔ وہ بار بار حملے کر رہا تھا۔ سلیپنگ سوٹ والا دراز قامت آدمی نہ صرف دوسرے نقاب پوش سے نمٹ رہا تھا بلکہ خنجر کے حملوں سے بھی بچ رہا تھا۔

لمبے قد والے پر اگرچہ مجھے شبہ تھا کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے لیکن اس سے مجھے اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور اس وقت وہ جس خطرناک صورتِ حال سے دوچار تھا، میری ہمدردی کا مستحق تھا۔

خنجر والے نقاب پوش نے ایک بار پھر حملہ کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ میں نے لپک کر اسے گرفت میں لے لیا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ اوپر ہی اٹھا رہ گیا۔ میں نے اسے گھما کر چھوڑ دیا۔ وہ کرسی سے گر کر دیوار سے ٹکرایا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ کرسی کی پشت اور سیٹ کے درمیانی خلا میں چلا گیا۔ میں نے اس کا وہ ہاتھ پکڑ لیا اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ اس طرح جھٹکے لگنے سے اس کا چہرہ بار بار کرسی سے ٹکرا رہا تھا۔

میں نے اس کے بازو کو موڑا تو خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر فرش پر گر گیا۔ میں خنجر اٹھانے کے لیے جیسے ہی جھکا اس شخص نے الٹے ہاتھ سے زوردار گھونسا میری گردن پر رسید کر دیا۔ میرے منہ سے کراہ سی نکل گئی اور میں مزید نیچے جھکتا چلا گیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میری گرفت سے چھوٹ گیا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اس شخص نے میری گردن سے ذرا نیچے شولڈر بلیڈز کے درمیان ریڑھ کی ہڈی پر ایک اور زوردار گھونسا جڑ دیا۔ یہ ضرب ہتھوڑے کی طرح وزنی تھی لیکن میں اس وار کو برداشت کر گیا اور بڑی تیزی سے پلٹ کر اپنے حریف پر حملہ آور ہوا اور اسے گھونسے مارتا ہوا دوسری دیوار تک لے گیا۔

اور پھر اسی لمحے کمرا فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ میرے ہاتھ رک گئے۔ میرا حریف بھی ایک لمحے کو ساکت ہو گیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ سلیپنگ سوٹ والے لمبے تڑنگے آدمی کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا نقاب پوش حریف لڑکھڑاتا ہوا بیڈ کے دوسری طرف ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے پر عین دل کے مقام سے شرٹ پر خون کا دھبا نمودار ہو کر پھیلتا چلا گیا تھا۔

میرے حریف نے یہ صورتِ حال دیکھی تو باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے بھی اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے ساتھ لیتا ہوا دروازے سے باہر راہداری میں گرا۔

سلیپنگ سوٹ والا بھی چھلانگ لگا کر کمرے سے باہر آگیا اور نقاب پوش پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

"ہمت سنگھ۔ چھوڑ دو اسے۔ اب یہ کہیں نہیں جائے گا۔" سلیپنگ سوٹ والے نے کہا اور پھر نقاب پوش کو مخاطب کرتے ہوئے غرایا "اٹھ کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔"

میں اس نقاب پوش کو چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور پھر اسی وقت دھڑا دھڑ مختلف کمروں کے دروازے کھلنے لگے۔ پورے ہوٹل میں شور سا مچ گیا۔ لوگ اس راہداری میں جمع ہونے لگے۔ ہوٹل کا منیجر بھی آنکھیں ملتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

"کیا ہوا۔ یہ گولی کیسے چلی تھی اور۔۔۔" وہ آگے بڑھا تو صورتِ حال دیکھ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔

"پولیس کو فون کرو منیجر۔ کہنا یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔ فوراً پہنچیں۔" سلیپنگ سوٹ والے نے کہا۔

"قق۔۔۔ قتل۔۔۔" منیجر ہکلا گیا "کون قتل ہوا۔ لاش کہاں ہے؟"

"لاش کمرے میں ہے۔ تم جا کر پولیس کو فون کر دو۔" اس شخص نے کہا۔

منیجر واپس بھاگ گیا۔ قتل کا سن کر وہاں جمع ہونے والے لوگ بھی اپنے کمروں کا رخ کرنے لگے۔ سلیپنگ سوٹ والے نے نقاب پوش کی تلاشی لی اور اسے دھکیلتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

"ہمت سنگھ! اس کا نقاب اتار دو اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دو۔" وہ شخص بولا۔

میں نے ایک ادنیٰ غلام کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے چہرے پر وہ نقاب دراصل ایک موزہ تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے موزہ اس کے سر پر سے کھینچ لیا اور اس سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔

"دیوار کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور ہلنے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔" سلیپنگ سوٹ والے نے اسے زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا اور وہ چیختا ہوا دیوار کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے تھے۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ہمت سنگھ۔" سلیپنگ سوٹ والا میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اگر تم بروقت یہاں نہ پہنچ جاتے تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیتے۔"

"تت۔۔۔ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تم شاید بھول گئے ہو کہ میں تم لوگوں کے ساتھ بس میں سفر کر چکا ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تمہاری پتنی نے تمہیں کئی بار اس نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ نام میرے لیے غیر معمولی تھا۔ اس لیے مجھے یاد رہا۔ ویسے تمہاری پتنی۔۔۔"

"وہ کمرے میں ہے اور میں نے دروازے کو باہر سے کنڈا لگا دیا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "گولی کی آواز اور شور اس نے بھی سنا ہوگا۔ وہ ضرور پریشان ہو رہی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس نے کہا "میں اس معاملے سے نمٹ کر تم سے ملوں گا۔ ویسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں کمرے سے باہر آگیا۔ راہداری میں اب بھی کئی لوگ جمع تھے۔ ایک دو آدمیوں نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی لیکن میں جواب دیے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اس شخص نے کہا تھا کہ اس معاملے سے نمٹ کر بعد میں مجھ سے ملاقات کرے گا لیکن مجھے یقین تھا کہ پولیس اسے قتل کے الزام میں دھر لے گی اور اس کے بعد شاید وہ اپنے وکیل سے بھی ملاقات کر سکے گا تو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر۔

بملا جاگ رہی تھی اور خاصی پریشان تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر میری طرف لپکی۔

"کیا ہوا۔ فائر کی آواز کیسی تھی اور تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"دو نقاب پوشوں نے اس شخص کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی جس پر ہمیں بھی شبہ تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" بملا اچھل پڑی "اس ہوٹل میں۔ وہ اس وقت یہاں کیا کر رہا تھا۔"

"وہ اس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔" میں نے کہا "ہم تو تین بجے اپنے کمرے میں بند ہو کر سو گئے تھے اور رات آٹھ بجے بیرے نے ہمیں جگایا تھا پھر ہم باہر چلے گئے تھے۔ اسے اس ریسٹورنٹ میں بھی دیکھا جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور پھر اس ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر بھی۔ اگر ہم پانچ گھنٹے سو کر وقت ضائع نہ کرتے تو ہمیں پتا چل جاتا کہ وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ بہرحال۔" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اس واقعے کی تفصیل بتانے لگا۔

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔۔۔؟" بملا میرے خاموش ہونے پر بولی "کیوں گئے تھے مجھے چھوڑ کے۔"

"تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میرا کسی معاملے میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن ایک خطرناک صورتِ حال دیکھ کر اپنے آپ کو روک بھی نہیں سکا۔"

ہماری باتیں جاری تھیں۔ ہوٹل میں لوگوں کے آنے جانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ پولیس آگئی۔ میں بھی بملا کو دروازہ اندر سے بند کر لینے کی ہدایت دیتا ہوا کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف چل دیا۔

نصف درجن مسلح پولیس والے تھے۔ جنہوں نے لوگوں کو دور ہٹا دیا تھا۔ مجھے بھی روک لیا گیا لیکن سلیپنگ سوٹ والے نے مجھے دیکھ کر آگے بلا لیا۔

اس نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر پولیس انسپکٹر کو دے دیا۔ انسپکٹر نے کارڈ دیکھا اور کھٹ سے سلیوٹ جھاڑ دیا۔ اس کے ماتحتوں نے بھی ایڑیاں بجا دیں اور رائفلیں جھکا لیں۔ میرا خیال تھا کہ پولیس آتے ہی اسے ہتھکڑی پہنا دے گی لیکن پولیس والے تو اسے سلیوٹ کر رہے تھے۔

"ہمت سنگھ!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم اپنے کمرے میں چلو۔ میں فارغ ہو کر وہیں آتا ہوں پھر آرام سے بات کریں گے۔"

میرا خیال تھا کہ مجھے گواہی وغیرہ کے لیے روکا جائے گا میرا بیان لیا جائے گا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔

پولیس والے اپنی کارروائی مکمل کر کے لاش اٹھا کر لے گئے۔ پکڑے جانے والے نقاب پوش کو بھی پولیس ہتھکڑی لگا کر لے گئی تھی۔ اس وقت چار بج چکے تھے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہی شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے اخلاقاً اسے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔ بملا بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر سمٹ گئی اس نے کمبل اچھی طرح اوڑھ لیا تھا۔ میں اس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھ گیا اور اس شخص کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کر دی۔

اس کے بارے میں میرا کم از کم یہ شبہ درست نکلا تھا کہ اس کا تعلق خفیہ پولیس سے تھا لیکن دوسرے شبہات غلط ثابت ہوئے کہ وہ ہماری نگرانی کر رہا ہے۔ وہ سی بی آئی کا آفیسر اعظم خان تھا۔ اس کا عہدہ اگرچہ انسپکٹر تھا لیکن آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹیز ہونے کی وجہ سے اسے بے پناہ اختیارات حاصل تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس کا کارڈ دیکھ کر اس کا ہم

رتبہ انسپکٹر اسے سیلوٹ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اعظم خان ہمارے کمرے میں آنے سے پہلے منیجر کو چائے کے لیے کہہ کر آیا تھا۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ بعد چائے بھی آ گئی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

انسپکٹر اعظم خان کی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔ وہ بیس سال کی عمر میں کانسٹیبل کی حیثیت سے پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ ساتھ ہی اس نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور پرائیویٹ امتحان دے کر تعلیمی میدان میں بھی آگے بڑھتا رہا۔

وہ ایک ذمے دار، فرض شناس اور دلیر پولیس اہلکار ثابت ہوا تھا۔ انہی صفات کی بنا پر وہ ترقی بھی کرتا رہا اور بالآخر وہ انسپکٹر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ وہ ماسٹرز کرنے کے بعد کرمنالوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر چکا تھا۔ وہ جرائم پیشہ افراد کی نفسیات سے خوب واقف تھا اور مشکل سے مشکل کیس کو حل کر دینے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔

اسے تین مرتبہ انسپکٹر سے اوپر کے عہدے پر ترقی دی گئی لیکن اس نے ہر مرتبہ یہ ترقی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا موقف تھا کہ وہ دفتر میں بیٹھ کر کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ اس کی صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔

اعظم خان کو سی بی آئی میں بھیج دیا گیا اور اسے 'ایس' ڈی بنا کر اس کے اختیارات میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور دلیری کے بل بوتے پر کئی اہم ترین کیس حاصل کیے تھے۔ سی بی آئی میں خدمات انجام دیتے ہوئے اس کا واسطہ ایسے سیاست دانوں سے بھی پڑا تھا جو کرپشن کی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے۔ اسے دھمکیاں بھی دی گئیں۔ سیاسی دباؤ بھی ڈالا گیا لیکن وہ نہ تو دھمکیوں سے مرعوب ہوا اور نہ ہی کسی دباؤ میں آیا۔ ملک کے جس حصے میں اس کی ضرورت ہوتی اسے وہاں بھیج دیا جاتا اور وہ ہمیشہ ہی سرخ رو ہوا۔

کچھ عرصے پہلے حکومت کو اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ کھٹمنڈو میں ایک ایسے جرائم پیشہ گروہ کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں جو نیپال میں سیاسی انتشار پیدا کر کے ہندوستان اور نیپال کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس گروہ کو ہانگ کانگ کی خوفناک مافیا تنظیم ٹرایڈ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ ٹرایڈ (TRIAD) کی تنظیم دراصل نیپال کے بعض علاقوں میں افیون کی کاشت پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتی تھی۔

اس جرائم پیشہ گروہ کا منصوبہ یہ تھا کہ افراتفری پیدا کر کے دونوں ملکوں کے تعلقات میں بگاڑ پیدا کیا جائے۔ اس طرح ان لوگوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔ وہ گروہ اپنے آدمی سیاست میں داخل کر دے گا۔ اس منصوبے میں بعض سیاسی شخصیات کا قتل بھی شامل تھا۔ ان میں نیپال کے علاوہ ہندوستان کی بعض سیاسی شخصیات کے نام بھی شامل تھے جو وقتاً فوقتاً ذاتی یا سرکاری دوروں پر نیپال جاتے رہتے تھے۔

انسپکٹر اعظم خان ان دنوں چندی گڑھ میں تعینات تھا۔ اسے اسی گروہ کا سراغ لگانے کے لیے کھٹمنڈو جانے کے احکامات دے دیے گئے۔ نیپال کی پولیس کو بھی اس سے تعاون کے احکامات مل چکے تھے۔

انسپکٹر اعظم خان اگر چاہتا تو چندی گڑھ سے دہلی جاتا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر کھٹمنڈو پہنچ جاتا لیکن رازداری کے خیال سے اس نے سفر کا دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ چندی گڑھ سے بذریعہ ٹرین انبالہ سے ہوتا ہوا سہارن پور آیا تھا اور اس سے آگے بسوں کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اسے تنک پور سے سرحد پار کر کے نیپال میں داخل ہونا تھا۔ سرحد پار کر کے بھی اسے سیکڑوں میل کا سفر بسوں کے ذریعے ہی طے کرنا تھا۔

اس کے پروگرام اور روانگی کو اگرچہ رازداری میں رکھا گیا تھا لیکن دشمنوں کو کسی طرح پتا چل گیا تھا اور اسے سرحد پار کرنے سے پہلے ہی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن میری مداخلت سے نہ صرف اعظم خان کی جان بچ گئی تھی بلکہ اس کا ایک دشمن مارا گیا تھا اور دوسرا پکڑا گیا تھا جس سے وہ بہت کچھ معلوم کر سکتا تھا۔

"تم نے نہ صرف میری جان بچائی بلکہ ہند سرکار پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا "میں ذاتی طور پر تو شاید اس کا بدلہ نہ اتار سکوں لیکن کوشش کروں گا کہ ہند سرکار سے تمہارے لیے کچھ۔۔۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ میرے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں درجنوں آدمی میرے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں۔ اگر وہ میری اصلیت جان لیتا تو شاید میرا اتنا احسان مند نہ ہوتا بلکہ مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا کر خوشی محسوس کرتا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "میں نے تو تمہیں اپنا محسن سمجھ کر اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اب تم بھی کچھ بتاؤ۔ کیا یہ واقعی تمہاری بہن ہے اور تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا وہ درست ہے؟"

میں اچھل پڑا۔ بلا بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"بس میں تم سے ملاقات ہوئی تھی تو مجھے شک ہو گیا تھا کہ تمہارا تعلق پولیس یا کسی ایجنسی سے ہے اور میرا یہ شبہ درست نکلا۔" میں نے کہا "اور تم نے ہمارے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے وہ بھی درست ہے۔ بلا میری بہن نہیں دوست ہے۔"

"دوست!" وہ حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی بلا کو دیکھنے لگا "میرا خیال ہے یہ دوستی کچھ زیادہ ہی گہری نہیں؟"

"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ بلا میری دوست ہے، رکھیل نہیں اور نہ ہی میں اسے بھگا کر لایا ہوں۔ یہ جے پور کے ایک بہت بڑے اور مشہور پنڈت رام سروپ کی بیٹی ہے اور ہم سیر و تفریح کے لیے نہیں ایک مشن پر نکلے ہوئے ہیں اور جب تک یہ مشن پورا نہیں ہوتا ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

"کیا میں اس مشن کے بارے میں پوچھ سکتا ہوں۔" اعظم خان نے کہا۔

"وہ مشن۔" میں نے بلا کی طرف دیکھا اور پھر اعظم خان کی طرف رخ کر کے بات جاری رکھی "جے پور کا ایک بدمعاش ایم پی بلا کی بہن کو اغوا کر کے بھاگا ہوا ہے۔ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ نینی تال میں وہ ہمارے ہاتھ آتے آتے رہ گیا تھا۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ وہ تنک پور کی طرف نکل گیا ہے۔ ہمیں بس نہیں مل سکی جس وجہ سے ہمیں رات یہاں رہنا پڑا۔ سننے میں آیا ہے کہ وہ نیپال کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے کچھ مشکلیں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن ہم اس شیطان کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

"جے پور کا ایم پی۔" اعظم خان بڑبڑایا "تم دلیش مکھ کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟"

"ہاں وہی۔" میں ایک دم بول پڑا "تم جانتے ہو اسے؟"

"دلیش مکھ کو کون نہیں جانتا۔" اعظم خان نے گہرا سانس لیا "چند مہینے پہلے مجھے دہلی میں اس کا فائل دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ سرکار ایسے تمام ایم پیز اور سیاست دانوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہے جو کرپشن میں ملوث ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے بیشتر سیاست داں گندگی کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اور بعض تو اس معاملے میں بہت بدنام ہیں اور ان میں دلیش مکھ سر فہرست ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "اس کا فائل خاصا ضخیم ہو چکا ہے۔ چند مہینے پہلے کسی عورت کے حوالے سے اس کا ایک اور اسکینڈل سامنے آیا تھا۔ وہ کوئی دولت مند بیوہ ہے جس کے پلاٹ اور دوسری جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے یہ اس سے زبردستی شادی کرنا چاہتا تھا۔ سرکار اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والی ہے اور میرا خیال ہے یہ کیس انسپکٹر گھوسلے کو دیا جانے والا تھا۔"

"یہ دولت مند بیوہ وہی ہے جسے وہ رشی کیش سے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ یعنی بلا کی دیدی۔" میں نے کہا۔ میرے اس انکشاف پر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں نے اسے شوبھا کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیا جو ضروری سمجھا۔ اس میں کچھ مبالغہ اور جھوٹ بھی شامل تھا لیکن انسپکٹر اعظم خان ایک گھاگ آدمی تھا۔ وہ اس کیس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا اور اس نے میرا ایک جھوٹ پکڑ لیا تھا۔

"تم نے بتایا تھا کہ بلا پنڈت رام سروپ کی بیٹی ہے۔" وہ بولا "اس طرح یہ شوبھا کی بہن تو نہیں ہوئی۔ اس کی تو۔۔۔"

"مجھے شوبھا دیدی نے ہی پالا ہے۔" مجھ سے پہلے بلا بول پڑی "شوبھا دیدی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ مجھے اپنے پاس لے گئی تھی۔ وہ مجھے اپنی سگی بہنوں کی طرح مانتی تھی۔ میں بھی اسے بہت مانتی ہوں۔ وہ شیطان اگر اسے نیپال کی طرف لے گیا تو۔۔۔"

"تم فکر مت کرو۔" اعظم خان نے اس کی بات کاٹ دی "اگر اس نے نیپال کا رخ کیا تو سیدھا کھٹمنڈو جائے گا اور میں جانتا ہوں کھٹمنڈو میں وہ کہاں ملے گا۔"

"لیکن ہم کھٹمنڈو کیسے جا سکیں گے۔ ہمارے پاس تو۔۔۔"

"میں ہوں نا۔" انسپکٹر خان نے میری بات کاٹ دی "میں تم لوگوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم نے میری زندگی بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے۔ میں اس کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا لیکن اس معاملے میں تمہاری تھوڑی بہت مدد کر سکتا ہوں اور تمہارے کسی کام آ کر مجھے خوشی ہوگی۔"

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ اس وقت صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک پولیس کانسٹیبل کو دیکھ کر چونک گیا۔

"خان صاحب کو ملنے کا ہوں۔" کانسٹیبل نے کہا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ کانسٹیبل نے اندر داخل ہو کر انسپکٹر اعظم خان کو سیلوٹ کیا۔

"کیا بات ہے کانسٹیبل۔ کیسے آئے ہو۔ اس نے کچھ بتایا؟" اعظم خان نے پوچھا۔

"اس نے آتما ہتیا (خودکشی) کرلیا سرکار۔" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" اعظم خان ایک دم اچھل پڑا۔

"اس کے پاس کوئی زہریلا کیپسول تھا سر جسے اس نے نگل لیا۔ اس کو بچانے کا بہت کوشش کیا۔ ڈاکٹر کو بلایا مگر وہ مر گیا۔" کانسٹیبل نے بتایا۔

"تم لوگ آرام کرو۔ میں آتا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے اس سے کچھ معلوم ہونے کی توقع تھی لیکن بہت گڑبڑ ہوگئی۔ بہرحال' میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں اور ہم آج ہی کسی وقت تنک پور روانہ ہو جائیں گے۔"

"پہلی بس آٹھ بجے روانہ ہوتی ہے یہاں سے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اس کی تم فکر مت کرو۔ میں بندوبست کرلوں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کانسٹیبل نے مڑ کر بلا کی طرف دیکھا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔

میں نے دروازہ بند کردیا اور بلا کے قریب پلنگ پر لیٹ گیا۔ رات بھر کرسی پر بیٹھے رہنے سے میں تھک گیا تھا اور کچھ دیر لیٹ کر کمر سیدھی کرلینا چاہتا تھا۔ بلا بھی لیٹ گئی اور کمبل اوپر کھینچ لیا۔ ہم کچھ دیر تک انسپکٹر اعظم خان کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

دروازے پر دستک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بلا بھی جاگ گئی تھی میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ وہی پولیس کانسٹیبل تھا۔

"کھان صاحب بولا آپ لوگ تیار ہو جاؤ۔ ایک گھنٹے بعد یہاں سے جانے کا ہے۔" اس نے میرے کندھے کے اوپر سے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم تیار رہیں گے۔" میں نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔

اس وقت نو بج رہے تھے۔ آٹھ بجے والی بس تو نکل چکی تھی لیکن انسپکٹر اعظم خان نے کچھ تو انتظام کیا ہی ہوگا۔

ہم نے آدھے گھنٹے میں تیاری مکمل کرلی۔ کچھ وقت ناشتے میں لگا۔ میں نے ہوٹل کا بل بھی چکا دیا۔ ہم انسپکٹر اعظم خان کا انتظار کرنے لگے۔ سوا دس بجے کے قریب ہوٹل کے ایک ملازم نے آکر بتایا کہ ہمیں لینے کے لیے پولیس کی جیپ آچکی ہے۔ ہم اپنے کمبل اور تھیلا اٹھا کر باہر آگئے۔

وہ پولیس کی کھلی جیپ تھی۔ اسٹیئرنگ کے سامنے مقامی پولیس کا وہی انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا اس کے ساتھ والی سیٹ پر اعظم خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہی کل والا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں ہم نے تو تین چار گھنٹے آرام کرلیا تھا لیکن لگتا تھا کہ خان کو ایک لمحے کے لیے بھی آنکھیں بند کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

پیچھے والی سیٹیں آمنے سامنے تھیں۔ ایک سیٹ پر دو کانسٹیبل آٹومیٹک رائفلیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ میں اور بلا سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے اور جیپ حرکت میں آگئی۔

قصبے کی حدود سے نکلتے ہی جیپ کی رفتار تیز ہوگئی۔ اعظم خان اپنی سیٹ پر پیچھے کی طرف مڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے وہ باربار اس بات پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا کہ پکڑے جانے والے حملہ آور سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور میں اپنی جگہ پر سوچ رہا تھا کہ وہ گروہ کس قدر طاقت ور ہوگا۔ مجھے ایسی باتوں کا تجربہ تھا۔ ایسے ہر گروہ کے پیچھے کوئی نہ کوئی بڑی طاقت ضرور ہوتی ہے۔ تھائی لینڈ میں شہنشاہ کے خلاف سازش کرنے والے گروہ کو گولڈن ٹرائی اینگل کے جنرل کھوراٹ کی پشت پناہی حاصل تھی اور ایسی طاقتیں بلاوجہ کسی گینگ کی پشت پناہی نہیں کرتیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ جنرل کھوراٹ شہنشاہ کا تختہ الٹنے کے بعد تھائی لینڈ میں منشیات کی تجارت پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تھائی لینڈ کو راہداری کے طور پر استعمال کرکے وہ آزادی سے پوری دنیا میں منشیات کا زہر پھیلا سکتا تھا لیکن میں نے ان کا یہ گھناؤنا منصوبہ ناکام بنا دیا تھا اور نیپال میں ترباڈ نامی تنظیم کسی گروہ کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ اس جرائم پیشہ گروہ کے مقاصد کچھ بھی ہوں لیکن ترباڈ کے عزائم واضح تھے۔ نیپال کے بیشتر اور خصوصاً جنوبی پہاڑی علاقے اور اس سے ملتے ہوئے بھارت کے شمالی علاقے' جن میں کچھ علاقہ یوپی کا اور اس کے ساتھ ہماچل پردیش کا علاقہ شامل تھا' پوست کی پیداوار کے لیے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ یہاں دنیا کی بہترین افیون' چرس اور ہیروئن تیار ہوتی تھی۔ نیپال کے علاوہ ان علاقوں کی سرحدیں تبت اور چین سے بھی ملتی تھیں اور ترباڈ انہی علاقوں پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے نیپال میں افراتفری پھیلانے کے لیے اس گروہ کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ اس جیسی تنظیمیں بے پناہ وسائل کی مالک ہوتی ہیں۔ انسپکٹر اعظم خان کے پروگرام اور روانگی کو اگرچہ نہایت خفیہ رکھا گیا تھا لیکن انہوں نے پتا چلا لیا تھا اور اسے نیپال کی سرحد پار کرنے سے پہلے ہی قتل کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس پر اس طرح کے مزید حملے بھی ہوں گے۔

یہ سب سیاسی کھیل تھے۔ کوئی دولت سمیٹنے کے چکر میں تھا' کوئی اپنے گرد طاقت جمع کرنا چاہتا تھا اور کوئی طاقت کے بل بوتے پر اپنے ملک کی سرحدوں کو پھیلانے کے چکر میں تھا۔ مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اپنے اردگرد کے حالات سے آنکھیں بھی بند نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں کئی مہینوں سے ہندوستان میں تھا اور یہاں کی سیاست اور یہاں کے حالات سے بڑی حد تک واقف ہو چکا تھا۔

یہاں رہتے ہوئے یہ بات میں نے جانی تھی کہ ہندوستان کے حکمران شروع ہی سے اپنے ملک کی سرحدوں کو وسعت دینے کی کوشش میں تھے اور وہ ان کوششوں میں بتدریج کامیابیاں حاصل کرتے رہے تھے اور ان کی یہ گھناؤنی کوششیں اب بھی جاری تھیں۔ انہوں نے طاقت کے بل بوتے پر گوا کی آزاد ریاست پر قبضہ کیا۔ سکم اور بھوٹان پر بزور طاقت تسلط جمایا۔ ایک طرف آسام اور اور دوسری طرف کشمیر میں نصف صدی سے لڑائی جاری تھی۔ ان دونوں خطوں کے باشندے ہندوستان کے لیے لوہے کا چنا بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف نیپال تھا۔ یہاں ہند سرکار کی پالیسی مختلف تھی۔ یہاں دوستی کی آڑ میں پیر پھیلائے جا رہے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ہندوستان کا عمل دخل بڑھ رہا تھا۔ معیشت پر تو بھارت کے ہندو مکمل طور پر قابض ہو چکے تھے۔

نیپالی عوام بھارتی حکمرانوں کی اس گھناؤنی سازش سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔ ان میں بیداری پیدا ہو رہی تھی۔ نیپال کے مختلف شہروں میں بھارت کے خلاف مظاہرہ ہوتے رہتے تھے اور جہاں تک میرا خیال تھا اس وقت بھی کوئی ایسی ہی صورت حال تھی۔ ممکن ہے کوئی نیپالی تنظیم کھل کر سامنے آگئی ہو۔ بھارت کو اس سے خطرہ محسوس ہوا ہو اور اسے جرائم پیشہ گروہ کا نام دے کر اس کی سرکوبی کا فیصلہ کرلیا۔ بہرحال' صورت حال کچھ بھی ہو۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے تو دلیش مکھ کی تلاش تھی اور اتفاق سے اعظم خان سے ملاقات ہوگئی تھی جو اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار ہوگیا تھا۔ مجھے کسی اور معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

کاٹھ گودام سے تقریباً بیس کلو میٹر آگے چورگلیا نامی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہ بستی ہائی وے کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سڑک کے کنارے پر دکانیں اور کئی چھوٹے چھوٹے ہوٹل تھے۔ جن کے سامنے کھلی جگہوں پر بھی میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔

انسپکٹر نے جیپ ایک ہوٹل کے سامنے روک لی۔ یہ بستی کاٹھ گودام تھانے کی حدود میں تھی اور انسپکٹر اس طرف کے دورے کرتا رہتا تھا۔ جیپ رکتے ہی ہوٹل کا مالک دوڑ کر وہاں پہنچ گیا۔

"دھن بھاگ ہمارے۔" وہ پرنام کرتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں خوشامد کی جھلک نمایاں تھی "پدھاریے سرکار۔ بھوجن ہوگا یا چائے یا ٹھنڈا چلے گا۔" وہ کندھے پر پڑا ہوا انگا اتار کر ایک میز اور کرسیاں صاف کرنے لگا۔

"چائے پلاؤ رگھو صرف چائے اور جلدی کرو۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ہمیں آگے جانا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ابھی حاضر کرتا ہوں سرکار۔" رگھو نے جواب دیا۔

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے جبکہ دونوں کانسٹیبل جیپ کے قریب ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ دس منٹ بعد رگھو خود چائے لے کر آگیا۔ دو پلیٹوں میں کیک' پیسٹریاں اور بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔ انسپکٹر نے کانسٹیبلوں کو بلا کر چائے کے دو کپ اور ایک پلیٹ ان کے حوالے کردی۔ میں نے چائے کا ایک کپ بلا کی طرف بڑھا دیا اور دوسرا خود اٹھا لیا۔

ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ ہماری میز کے گرد لوگوں کا جمگھٹا سا لگ گیا۔ ایسی چھوٹی بستیوں میں تھانے دار کو راجا سے کم نہیں سمجھا جاتا۔ لوگ اپنی فریادیں لے کر جمع ہو رہے تھے۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی بلا کو اشارہ کیا اور کرسی سے اٹھ گیا۔ مجھے لگتا تھا کہ یہاں کم از کم آدھا پون گھنٹا ضرور لگ جائے گا اور میں اس دوران کچھ معلومات حاصل کرلینا چاہتا تھا۔

میری محنت رائگاں نہیں گئی۔ ایک ہوٹل سے پتا چل گیا کہ کل یہاں سے سرخ رنگ کی ایک موٹر گزری تھی جس میں ایک بیمار عورت اور دو آدمی تھے۔ انہوں نے اسی ہوٹل پر رک کر چائے پی تھی۔ ہوٹل کے مالک اور ملازم نے اس بیمار عورت اور ان دونوں آدمیوں کا جو حلیہ بتایا اس سے تصدیق ہوگئی کہ وہ شوبھا اور دلیش مکھ ہی تھے۔

خلافِ توقع پندرہ بیس منٹ بعد ہی انسپکٹر جیپ میں بیٹھ گیا اور پھر ہمارے بیٹھتے ہی جیپ حرکت میں آگئی۔

چند میل تک میدانی علاقہ تھا۔ پہاڑیاں بہت دور تھیں لیکن کچھ اور فاصلہ طے ہونے کے بعد ہم ایک بار پھر پہاڑیوں میں داخل ہوگئے۔ سڑک ان پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور جیپ لہرا گئی۔ اس کے ساتھ ہی فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ بائیں

طرف کی پہاڑی سے جیپ پر فائرنگ کی جارہی تھی۔ ایک گولی نے جیپ کا آگے کا ایک ٹائر برسٹ کردیا تھا اور دوسری گولی میرے اور ہما کے درمیان سے گزرتی ہوئی سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایک کانسٹیبل کے بائیں بازو میں لگی تھی۔ وہ کانسٹیبل چیختا ہوا اچھل پڑا تھا۔

انسپکٹر نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے جیپ کو سڑک سے اتار کر ایک چٹان کے قریب روک لیا۔ ہما بری طرح چیخ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر چھلانگ لگادی اور جیپ اور چٹان کے درمیان دبک کر بیٹھ گیا۔

اعظم خان' انسپکٹر اور دونوں کانسٹیبل بھی چھلانگ لگا کر جیپ سے اتر گئے تھے۔ بازو زخمی ہونے کے باوجود اس کانسٹیبل نے رائفل سنبھال لی تھی۔

"وہ سامنے پہاڑی پر۔" انسپکٹر چیخا۔ اس کے پاس اگرچہ ریوالور موجود تھا مگر اس نے بھی اپنی سیٹ کے پاس رکھی ہوئی آٹومیٹک رائفل اٹھالی تھی۔

دونوں کانسٹیبل اور انسپکٹر اندھا دھند پہاڑی پر فائرنگ کررہے تھے۔ جہاں سے فائرنگ ہورہی تھی۔

اور پھر ایک کانسٹیبل اور انسپکٹر دوڑتے ہوئے پہاڑی پر چڑھ گئے۔ زخمی کانسٹیبل وہیں رک گیا تھا۔ اعظم خان ہمارے قریب جیپ کی آڑ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا اور خالی ہاتھ گن مینوں کا پیچھا کرنا حماقت ہی ہوتی اور اعظم خان اتنا احمق نہیں تھا۔

انسپکٹر اور کانسٹیبل تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپس آئے۔ کانسٹیبل نے ایک آدمی کو کندھے پر لاد رکھا تھا۔

وہ لاش تھی۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ اس کے خون سے کانسٹیبل کی شرٹ بھی سرخ ہورہی تھی۔ اس نے وہ لاش ہماری سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دی۔

"دو تھے۔" انسپکٹر نے خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایک پہاڑیوں میں فرار ہوگیا۔ دوسرا آپ کے سامنے پڑا ہے۔"

اعظم خان لاش کے کپڑوں کی تلاش لینے لگا لیکن کچھ رقم اور چار بیڑیوں کے سوا کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔ اس رقم میں دو نوٹ نیپالی کرنسی کے تھے جس سے بہرحال یہ طے ہوگیا کہ یہ حملہ بھی اعظم خان پر ہی ہوا تھا اور میرا اندازہ درست نکلا تھا کہ اس پر ایسے قاتلانہ حملے اور بھی ہوں گے اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس مرتبہ بھی بچ گیا تھا۔ پہلی گولی اس طرف کے آگے والے ٹائر پر لگی تھی جس طرف وہ بیٹھا ہوا تھا۔ نشانہ یقیناً اسے ہی بنایا گیا ہوگا لیکن گولی اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر ٹائر میں لگی تھی۔

ہم بھی لپیٹ میں آگئے تھے لیکن ہماری بھی خوش قسمتی تھی کہ بال بال بچ گئے تھے۔ جیپ کی باڈی پر اس طرف کئی گولیاں لگی تھیں۔

دوسرا کانسٹیبل جیپ کا ٹائر تبدیل کرنے لگا۔ خان نے زخمی کانسٹیبل کے بازو پر اپنے رومال سے پٹی باندھ دی تھی لیکن اس کے زخم سے خون رس رہا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی اور یہ طبی امداد اسے ایک گھنٹے سے پہلے نہیں مل سکتی تھی۔

ٹائر تبدیل ہونے کے بعد ہمیں بیٹھنے کو کہا گیا تو ہما جیپ پر چڑھتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے تاثرات تھے۔ سیٹوں کے درمیان وہ لاش پڑی تھی اور ہما جیسی لڑکی کے لیے لاش پر پیر رکھ کر بیٹھنا ممکن نہیں تھا۔ اعظم خان نے صورت حال کو تاڑ لیا اور ہما کو اپنی سیٹ پر بٹھا کر خود میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

جیپ ایک بار پھر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔ انسپکٹر والی رائفل اعظم خان نے لے لی تھی اور دونوں کانسٹیبل بھی چاق و چوبند بیٹھے سڑک کے اطراف میں پہاڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پہاڑیوں سے نکل گئے۔ آگے کسی حد تک میدانی علاقہ تھا۔ پہاڑیاں بہت دور نظر آرہی تھیں اور میرا خیال ہے کوئی بھی پہاڑی تین چار ہزار فٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ تاہم ان کے پیچھے شمال کی طرف یہ پہاڑی سلسلہ بتدریج بلندی اختیار کرتا چلا گیا تھا۔

کسی حادثے یا ناخوشگوار واقعے سے دوچار ہوئے بغیر ہم مزید چالیس منٹ بعد تنک پور پہنچ گئے۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا۔ انسپکٹر نے جیپ اسپتال کے سامنے جاکر ہی روکی تھی۔

انسپکٹر جیپ سے اتر کر دونوں کانسٹیبلوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ہما اگلی سیٹ پر بیٹھی رہی۔ میں اور اعظم خان بھی نیچے اتر آئے۔ اسپتال میں آنے والے لوگ جیپ میں پڑی ہوئی لاش دیکھ کر رکنے لگے اور بہت جلد وہاں جمگھٹا لگ گیا۔ تقریباً دس منٹ بعد کانسٹیبل کے ساتھ اسپتال کے دو ملازم اسٹریچر لے کر آگئے اور لاش کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ جیپ کے پچھلے حصے میں خون پھیلا ہوا تھا اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ میں نے ہما کو اشارہ کیا۔ وہ بھی جیپ سے اتر آئی۔

ہم اسپتال کے گیٹ کے اندر کی طرف ایک درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھ گئے۔ انسپکٹر اپنے کانسٹیبلوں کے ساتھ تقریباً

آدھے گھنٹے بعد اسپتال سے برآمد ہوا تھا۔ زخمی سپاہی کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"آپ لوگ ہوٹل میں جاکر آرام کیجئے۔ میں فارغ ہوکر آتا ہوں۔ جیپ بھی صاف کروانی ہے۔ پچھلی طرف خون بکھرا ہوا ہے۔" انسپکٹر نے خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور زخمی بازو والے کانسٹیبل کو ہمارے ساتھ کردیا۔

نیپال کی سرحد پر واقع یہ قصبہ بیس پچیس ہزار کی آبادی پر مشتمل تھا۔ پیلی بھیت سے بھی ایک پختہ سڑک یہاں تک آئی تھی اور ایک پختہ سڑک نیپال کی سرحد کے دوسری طرف بھی چلی گئی تھی۔ بارونق قصبہ تھا۔ پرانی طرز کی عمارتیں تھیں۔

ہم کانسٹیبل کے ساتھ مختلف بازاروں میں گھومتے ہوئے ایک ہوٹل میں آگئے۔ یہ ہوٹل پرانی طرز کی ایک حویلی نما عمارت میں بنا ہوا تھا۔ چار دیواری کے اندر وسیع و عریض کمپاؤنڈ تھا۔ جس کے کچھ حصے پر گھاس لگی ہوئی تھی اور باقی حصے میں مٹی اڑ رہی تھی۔ حویلی کی دو منزلہ عمارت بہت بڑی تھی۔ نیچے اوپر کئی کمرے تھے۔ مجھے اور ہما کو جو کمرا ملا وہ اوپر والی منزل کی راہداری کے عین آخر میں تھا۔ کمرے کے سامنے ایک کشادہ بالکونی تھی جس کے اوپر سائبان سا بنا ہوا تھا۔ اس بالکونی میں بیٹھ کر سامنے دور تک بازار کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ اس کمرے میں باتھ روم بھی تھا اور ہمیں باہر راہداری میں کسی جگہ باتھ روم کے سامنے لائن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

انسپکٹر اعظم خان کو گراؤنڈ فلور پر کمرا ملا تھا۔ اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہوگئے تھے۔ میرے خیال میں یہ اس قصبے کا سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ اسی لیے یہاں سب سے زیادہ رونق تھی۔

ایک گھنٹے بعد اعظم خان سے ہماری ملاقات ڈائننگ روم میں ہوئی۔ ڈائننگ روم بھی خاصا بڑا تھا اور میزیں کرسیاں بھی سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ یہاں کا کھانا بھی لذیذ تھا۔

کھانے کے بعد اعظم خان کہیں چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ ہم چاہیں تو شہر میں گھوم پھرلیں لیکن رات نو بجے کے بعد ہم اپنے کمرے ہی میں رہیں کیونکہ عین ممکن ہے ہم لوگ رات ہی کے کسی حصے میں سرحد پار کرجائیں۔

کھانے کے بعد ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ ہما تو بیڈ پر لیٹ گئی اور میں بالکونی میں بیٹھ کر سامنے بازار کا نظارہ کرنے لگا۔ بڑا بارونق بازار تھا۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہمیشہ مجھ پر سستی سی طاری ہوجایا کرتی تھی۔ میں اٹھ کر اندر آگیا۔ ہما بھی خراٹے لے رہی تھی۔ بیڈ کافی کشادہ تھا۔ میں بھی ایک طرف لیٹ گیا۔

پانچ بجے کے قریب ہما نے مجھے جگا دیا۔ اس نے نہا کر کپڑے بدل لیے تھے اور خاصی تازہ دم لگ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک بستر پر اینٹھتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے ساری تھکاوٹ اور کسل مندی دور ہوگئی۔

چھ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے نکل کر بازار میں آگئے۔ اس وقت بھی بڑی گہما گہمی تھی۔ گاہکوں میں زیادہ تر دیہاتی قسم کے لوگ تھے۔ جو آس پاس کی بستیوں سے آئے ہوئے تھے اور اب انہیں واپس جانے کی جلدی تھی۔

ہم ٹہلتے ہوئے قصبے کے مرکزی چوراہے پر آگئے اور پھر چوراہے کے دوسری طرف ایک دکان کے سامنے سرخ رنگ کی ایک کار رکتے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ یہ وہی کار تھی۔ نمبر بھی وہی تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ یہاں اس کار کی موجودگی کا مطلب تھا کہ دلیش مکھ بھی یہیں ہے۔ ہوسکتا ہے اسے ابھی تک سرحد پار کرنے کا موقع نہ ملا ہو۔ میں نے ہما کو اس طرف متوجہ کیا تو اس کے چہرے پر بھی سنسنی سی پھیل گئی۔

ایک جوان عورت دکان سے نکل کر کار میں بیٹھ رہی تھی۔ میں ہما کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا چوراہا خاصا بڑا تھا اور اس وقت یہاں بڑی گہما گہمی تھی۔ ہر قسم کا ٹریفک تھا۔ موٹریں بھی تھیں' سائیکل رکشا بھی۔ تانگے اور بیل گاڑیاں بھی۔ میں ہما کا ہاتھ پکڑے اسے کھینچتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک سائیکل سوار ہما سے ٹکرا گیا۔ ہما چیختی ہوئی سڑک پر گری۔ سائیکل سوار بھی گرا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"اندھی ہو۔ نظر نہیں آتا۔ بیچ سڑک کے۔۔۔"

میرے گھونسے نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ چیختا ہوا پھر ڈھیر ہوگیا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی گردن مروڑ دیتا۔ میں ہما کا ہاتھ پکڑے ٹریفک سے بچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وہ کار حرکت میں آکر آگے روانہ ہوچکی تھی۔ میں چوک کے عین بیچ میں تھا اور کوئی نہ کوئی گاڑی راستہ روک لیتی تھی۔ میں کئی مرتبہ کسی کار یا رکشا وغیرہ سے ٹکرایا تھا۔

ڈرائیور چیخ چیخ کر برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک بار تو میں ایک تانگے کے گھوڑے سے ٹکرا گیا اور بلا تانگے کے پہیے کے نیچے آتے آتے بچی تھی۔ وہ خوف زدہ انداز میں چیخ اٹھی تھی۔

اور جب ہم چوراہے کے دوسری طرف پہنچے تو وہ سرخ کار تقریباً سو گز آگے موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میں بدحواسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اکیلا ہوتا تو شاید اس کار کے پیچھے دوڑ لگا دیتا لیکن بلا میرے ساتھ تھی۔ لوگ پہلے ہی عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر ہم دوڑنا شروع کر دیتے تو پتا نہیں کیا صورت حال ہوتی۔

تقریباً دو منٹ بعد ایک آٹو رکشا ہمارے قریب آکر رکا۔ دو عورتیں اتر رہی تھیں۔ میں نے بلا کو رکشے میں دھکیلا اور خود بھی اچھل کر بیٹھ گیا۔

"کدھر جانے کا ہے مہاشے۔" ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپن ادھر پہلے چائے پینے کا ہے پھر کدھر جائیں گا۔"

"چائے بعد میں پی لینا۔ جلدی چلو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"لونڈیا کو بھگا کر لایا ہے کیا؟ پولیس پیچھے لگا ہے؟" ڈرائیور نے کہا "نیچے اتر جاؤ۔ ہم کدھری نہیں جانے کا۔"

میں نے پتلون کے پائنچے سے خنجر نکال لیا "رکشا آگے بڑھاؤ۔ جلدی۔ ورنہ......" میں نے خنجر کی نوک اس کے کندھے پر رکھ دی۔

ڈرائیور ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے رکشا اسٹارٹ کرنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

"تیز چلاؤ اور آگے موڑ پر بائیں طرف گھما لینا۔" میں نے اپنی سیٹ پر آگے جھکتے ہوئے کہا۔

رکشا کی رفتار تیز ہو گئی۔ بائیں طرف والی سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا لیکن سرخ کار کا دور دور تک کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ڈرائیور کو رکشا زیادہ تیز چلانے پر اکساتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی میں دائیں بائیں کی سڑکوں اور گلیوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

تقریباً نصف میل آگے آکے بائیں طرف کی ایک سڑک پر اس سرخ کار کی جھلک نظر آگئی۔ وہ تقریباً دو سو گز آگے ایک اور موڑ پر گھوم رہی تھی۔

"ادھر۔ اسی طرف۔" میں نے چیخ کر کہا۔

رکشا آگے نکل چکا تھا۔ روکتے روکتے بھی وہ پندرہ بیس گز آگے نکل گیا۔ ڈرائیور نے اسے گھما کر اس سڑک پر موڑ دیا۔ دو سو گز آگے جا کر میرے کہنے پر اس نے رکشا اس طرف موڑ لیا جس طرف وہ کار گئی تھی۔

یہ کشادہ گلی تھی۔ دونوں طرف پرانی طرز کے حویلی نما بڑے بڑے مکان تھے لیکن گلی دور تک خالی نظر آرہی تھی۔ سرخ گاڑی کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے میری نظر اس طرف اٹھ گئی۔ ایک آدمی گیٹ بند کر رہا تھا اور گیٹ کے اندر وہ سرخ کار نظر آگئی۔ میں نے کچھ آگے جا کر رکشا رکوا لیا اور دس روپے کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ڈرائیور نے عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور رکشا بھگا کر لے گیا۔

میں راستے بھر اسی عورت کے بارے میں سوچتا رہا تھا جو چوراہے پر ایک دکان سے نکل کر کار میں بیٹھی تھی۔ وہ جوان عورت تھی اور اس نے ساڑی پہن رکھی تھی۔ میں یہی سوچتا رہا کہ وہ کون ہو سکتی ہے اور دلیش مکھ سے اس کا کیا تعلق ہوگا لیکن۔۔۔ دلیش مکھ جیسے لوگوں کو ایسی عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے یہ عورت اس کی جاننے والی ہو اور دلیش مکھ نے اس کے گھر میں پناہ لے رکھی ہو۔

"آؤ۔" میں نے مکان کی طرف بڑھتے ہوئے بلا کو اشارہ کیا۔

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" بلا کے لہجے میں وحشت تھی۔

"یہ اچھا موقع ہے۔" میں نے کہا "وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم اس طرح ان کے سر پر پہنچ جائیں گے۔ میں انہیں سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر ان پر جھپٹ پڑنا چاہتا ہوں۔"

"حماقت مت کرو۔" بلا نے کہا "ہم نے ان کا ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔ انہیں کوئی شبہ بھی نہیں کہ وہ ہماری نظروں میں آگئے ہیں۔ اس وقت بہتر یہی ہے کہ ہم واپس چلیں اور اعظم خان کو صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ وہ پولیس کے ساتھ یہاں ریڈ کرے گا تو یہاں سے کسی کو بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل سکے گا۔"

"میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ آؤ۔" میں نے کہا۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر میں نے جھری سے اندر جھانکا۔ وہ عورت برآمدے میں کھڑی تھی اور ڈرائیور کار کی پچھلی سیٹ سے کچھ پیکٹ وغیرہ اتار رہا تھا جس شخص نے گیٹ کھولا تھا وہ بھی قریب ہی کھڑا تھا۔

میں زور زور سے گیٹ دھڑ دھڑانے لگا۔ وہ شخص تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گیٹ کی طرف آگیا۔ اس نے چھوٹا دروازہ

کھول کر جیسے ہی باہر جھانکا میں نے اس کے منہ پر زوردار گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیخ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا۔ میں چھلانگ لگا کر اندر آگیا۔ خنجر میرے ہاتھ میں تھا۔ بلا بھی میرے پیچھے ہی اندر آگئی۔ اس نے دروازہ بند کر کے لباس میں چھپا ہوا پستول نکال لیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ ہوٹل سے نکلتے وقت پستول اپنے لباس میں چھپا لیا تھا۔

"اے! کون ہو تم لوگ۔ ٹھہرو۔ تمہاری تو۔۔۔" ہٹا کٹا ڈرائیور دہاڑتا ہوا میری طرف لپکا۔

وہ جیسے ہی قریب پہنچا میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ جڑ دیا۔ وہ بھی چیختا ہوا لڑکھڑا گیا۔

برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت یہ صورت حال دیکھ کر بدحواس ہو گئی اور چیختی ہوئی دروازہ کھول کر اندر گھس گئی۔

"بلا۔ تم انہیں سنبھالو۔ میں اندر دیکھتا ہوں۔" میں چیختا ہوا برآمدے کی طرف دوڑا۔

دروازے کے دوسری طرف ایک مختصر سی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک وسیع ہال تھا۔ یہاں قالین بچھا ہوا تھا اور شاندار فرنیچر موجود تھا۔ وہ عورت ہال میں کھڑی چیخ چیخ کر کسی کو پکار رہی تھی۔ قالین پر دو نوجوان لڑکیاں اور ایک کم سن لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تینوں بھی مجھے دیکھ کر چیخنے لگے۔ اس دوران دائیں طرف کی راہداری سے ایک بوڑھا آدمی دوڑتا ہوا سامنے آگیا۔ اس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ وہ منحنی سا چھوٹے قد کا آدمی تھا۔ سفید مونچھیں، گنجا سر اور ماتھے پر تلک۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ اسے گاندھی کا ڈپلی کیٹ کہا جا سکتا تھا۔ وہ بھی مجھے اور میرے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ میں نے لپک کر ایک جوان لڑکی کو بائیں بازو میں لپیٹ کر خنجر اس کے گلے پر رکھ دیا۔

"کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے ورنہ گلا کاٹ دوں گا اس کا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

اسی دوران بلا بھی ڈرائیور اور دوسرے آدمی کو پستول کی زد پر دھکیلتی ہوئی اندر آگئی۔

"تک۔۔۔ کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟" گاندھی کی صورت والا بوڑھا آدمی ہکلایا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

"کہاں ہیں وہ لوگ۔ جلدی بتاؤ ورنہ میں اس کا گلا کاٹ دوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"کون کہاں ہیں۔" بوڑھے نے ادھر ادھر دیکھا "ہم سب تو یہاں ہے۔ ہمارا پورا پریوار (خاندان) تمہارے سامنے ہے۔"

"میں دلیش مکھ اور اس عورت کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دلیش مکھ۔" بوڑھے کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی "یہاں کوئی دلیش مکھ یا کوئی اور عورت نہیں ہے۔"

"ان کا خیال رکھو بلا۔" میں نے لڑکی کو چھوڑ دیا "اگر کوئی گڑ بڑ کی کوشش کرے تو گولی سے اڑا دینا۔ میں دیکھتا ہوں۔"

بلا نے ان سب کو ایک طرف کر کے پستول کی زد پر لے لیا۔ میں دوڑتا ہوا سامنے والی راہداری میں گھس گیا۔ اس راہداری میں دو کمرے تھے اور دونوں خالی تھے۔ دو کمرے ہال کے دوسری طرف تھے۔ ان میں بھی کوئی نہیں تھا میں زینے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

اوپر والی منزل پر بھی ایسا ہی ایک ہال اور چار کمرے تھے مگر وہ تمام کمرے بھی خالی تھے۔ میں ہال کا پچھلے والا دروازہ کھول کر عقبی ٹیرس پر آگیا اور ٹیرس کے آخری سرے پر جا کر عقبی لان میں بھی جھانک لیا۔ لان بھی سنسان تھا۔ کسی کمرے میں بھی ایسے آثار نظر نہیں آئے تھے جس سے اندازہ ہوتا کہ کوئی افراتفری میں یہاں سے بھاگا ہوگا اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ہم نے اس قدر اچانک یہاں ہلا بولا تھا کہ کسی کو بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل سکتا تھا۔

میں نیچے آگیا۔ وہ سب لوگ ایک طرف جمع تھے اور بلا نے انہیں پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔

کم سن لڑکا گاندھی کی شکل والے بوڑھے سے اور دونوں لڑکیاں اس عورت سے لپٹی ہوئی تھیں جس کا پیچھا کرتے ہوئے ہم یہاں تک آئے تھے۔ ان سب کے چہروں پر خوف کے سائے رقص کر رہے تھے۔ ڈرائیور اور چوکیدار بھی قالین پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔

"ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" میں نے بوڑھے اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم بتا دو کہ دلیش مکھ اور اس عورت کو کہاں چھپایا ہے تو ہم تم لوگوں کو چھوڑ دیں گے۔ بصورت دیگر میں ایک ایک کو کاٹ کر پھینک دوں گا۔"

"ہم کسی دلیش مکھ کو نہیں جانتے۔" بوڑھے نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا "تم دونوں کسی اچھے اور شریف گھرانے سے لگتے ہو۔ تمہیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم کسی دلیش مکھ کو نہیں جانتے۔ نہ ہی یہاں کوئی آیا ہے۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم؟" میں چیخ اٹھا "اگر تم دلیش مکھ کو نہیں جانتے ہو تو اس کی گاڑی تمہارے گھر میں کیوں ہے؟ بتاؤ کہاں ہے وہ؟"

"اوہ!" بوڑھے کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "دھیرج دھیرج۔" وہ بولا "اب میں سمجھ گیا۔ تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ خنجر اور پستول ہٹالو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں بتاتا ہوں کہ یہ گاڑی ہمارے گھر میں کیوں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی الجھن تیر رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ بھیا۔" اس عورت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں واقعی غلط فہمی ہوئی ہے اور یہ غلط فہمی شاید اس گاڑی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ہم تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کریں گے۔"

میں نے ایک بار پھر بملا کی طرف دیکھا اور اسے اشارہ کرتا ہوا ایک صوفے کے کنارے پر ٹک گیا۔ بملا بھی مجھ سے ذرا ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس عورت اور بوڑھے کے چہرے پر طمانیت سی آگئی لیکن دونوں لڑکیاں اور نوعمر لڑکا اب بھی خوف زدہ تھے۔ وہ لوگ بھی صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔

"تم لوگ باہر جاؤ اور۔۔۔"

"نہیں۔ کوئی یہاں سے اٹھ کر نہیں جائے گا۔" بملا نے بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے ایک دم پستول تان لیا۔

بوڑھا شاید ڈرائیور اور چوکیدار کو وہاں سے ہٹانا چاہتا تھا۔

"ڈرو نہیں بٹیا۔" بوڑھے نے کہا "میں وعدہ کر چکا ہوں۔ ہم میں سے کوئی کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرے گا اور ویسے بھی نوکروں کے سامنے کوئی بات کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

بملا نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ان دونوں کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔

"برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔" بوڑھے نے انہیں حکم دیا "اور کوئی ایسی حرکت مت کرنا جو کسی کے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔"

وہ دونوں باہر چلے گئے تو بوڑھا میری طرف متوجہ ہوگیا "ہاں بیٹا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ تم دونوں اس قدر غصے میں کیوں ہو؟"

"پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اگر تم کسی دلیش مکھ کو نہیں جانتے تو اس کی گاڑی تمہارے گھر میں کیوں ہے؟"

"کیا یہ گاڑی چوری کی ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا "میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"ٹھیک ہے۔" بوڑھے نے میری بات کاٹ دی "یہ گاڑی میرے بیٹے نے کل ہی کسی سے خریدی تھی۔ بیچنے والا ضرورت مند تھا۔ اس لیے سستی دے دی۔"

"تمہارا بیٹا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ آج صبح دلی چلا گیا ہے۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں بہت بڑا آفیسر ہے۔ میرا خیال ہے جس شخص سے اس نے گاڑی خریدی تھی وہ اسے جانتا تھا۔ میں نے اس شخص کو نہیں دیکھا تھا لیکن گاڑی کے کاغذات موجود ہیں اور اتفاق سے میں نے ابھی تک وہ بھی نہیں دیکھے۔"

"کیا میں وہ کاغذات دیکھ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ کاغذات دکھا دو مالا بیٹی۔" بوڑھے نے اس عورت سے کہا۔

وہ عورت اٹھنے لگی تو میں نے اسے ٹوک دیا "تم نہیں۔ اس لڑکی کو بھیج دو۔"

مالا گہرا سانس لے کر رہ گئی "تم جاؤ رادھا۔" اس نے اپنے دائیں طرف بیٹھی ہوئی لڑکی کو اشارہ کیا "کاغذات میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھے ہوئے ہیں۔"

رادھا اٹھ کر راہداری میں ایک کمرے میں چلی گئی۔ اسے واپس آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس نے کاغذات میری طرف بڑھا دیے۔ رجسٹریشن بک میں بیس روپے کے اسٹامپ پیپر پر لکھی ہوئی ایک رسید بھی تھی۔ پہلے میں نے رجسٹریشن بک دیکھی۔ یہ کار دلیش مکھ کے نام پر تھی اور جے پور میں رجسٹرڈ تھی۔ اس میں نمبر بھی وہی تھا جو کار کی پلیٹ پر لکھا ہوا تھا۔ وہ رسید دلیش مکھ کی طرف سے تھی۔ اس رسید کے مطابق اس نے اپنی یہ کار پرکاش آنند کو بیس ہزار روپے میں فروخت کردی تھی۔

"کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی تھی کہ تین لاکھ کی کار بیس ہزار میں کیسے مل گئی۔" میں نے بوڑھے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ کار چوری کی ہے؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ کاغذات درست ہیں لیکن یہ کار اغوا اور قتل جیسی سنگین وارداتوں میں استعمال ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔

ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"پرکاش آنند میرے پتی ہیں۔" اس عورت نے کہا "انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ جس سے انہوں نے کار خریدی ہے وہ راجستھان کا کوئی نیتا (وزیر) ہے جسے وہ اچھی طرح

جانتے ہیں۔ دہلی میں ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ وہ نیپال جارہا تھا۔ اسے فوری طور پر رقم کی ضرورت تھی اس لیے وہ اتنے سستے داموں میں یہ کار میرے پتی کے ہاتھ بیچ گیا۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ نہ تو یہ کاغذات غلط تھے اور نہ ہی یہ لوگ جھوٹ بول رہے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ منزل ایک بار پھر میرے قدموں تلے سے نکل گئی تھی۔ دلیش مکھ صرف ایک دن پہلے نیپال کی طرف فرار ہوگیا تھا اور ظاہر ہے وہ شوبھا کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔

"ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو جو تکلیف پہنچی اس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ لوگ۔۔۔"

"کیا تم اصل بات نہیں بتاؤ گے۔" بوڑھے نے کہا "تم نے ابھی کہا تھا کہ یہ کار اغوا اور قتل جیسی وارداتوں میں استعمال ہوئی ہے۔ کیا تم دونوں کا تعلق پولیس سے ہے۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ صرف ہم جانتے ہیں کہ یہ کار سنگین وارداتوں میں استعمال ہوئی ہے اور ہم اس سلسلے میں اپنی زبانیں بند رکھیں گے۔"

"تم لوگ کون ہو اور اس شخص کو تلاش کیوں کررہے ہو۔ کیا نام بتایا۔۔۔ دلیش مکھ۔" بوڑھے نے کہا۔

"دلیش مکھ راجستھان کا نیتا ہے اور بہت بدمعاش آدمی ہے۔ وہ بملا کی دیدی کو اغوا کرکے لے گیا ہے اور ہم کئی روز سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے آج یہاں پہنچے ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ اس طرف آیا ہے اور نیپال کی طرف فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے بازار میں یہ کار نظروں میں آگئی لیکن۔۔۔" میں خاموش ہوگیا۔

اسی دوران رادھا اپنی ماں کا اشارہ پاکر پھر کسی طرف چلی گئی تھی۔ میں بوڑھے سے باتیں کرتے ہوئے اسے شوبھا کے بارے میں بتا رہا تھا۔ شوبھا اور سونیا کا ذکر کرتے ہوئے میری آواز رندھ گئی تھی۔ بملا کے چہرے پر بھی افسردگی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مالا اسے کرسی سے اٹھا کر اپنے پاس لے آئی اور اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ اس دوران رادھا چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی۔ پہلا کپ اس نے میری طرف بڑھایا پھر دوسروں کو چائے دینے لگی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں بیٹھے رہے۔ بوڑھے نے، اتفاق سے اس کا نام بھی کندن لال تھا، ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا اور مالا تو بملا کو سینے سے لپٹائے اسے تسلیاں دے رہی تھی کہ اس کی دیدی ضرور ملے گی۔

وہ سب برآمدے تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ بوڑھے کندن لال نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ ہمیں گاڑی میں ہوٹل چھوڑ آئے۔ ہم کار میں بیٹھ گئے اور کار حویلی سے نکل کر سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں قدرت کی اس ستم ظریفی پر مسکرا رہا تھا کہ ہم رشی کیش سے جس کار کا تعاقب کرتے ہوئے آئے تھے اس وقت بڑے اطمینان سے اسی کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ہم ہوٹل پہنچے تو نو بج رہے تھے۔ اعظم خان استقبالیہ لاؤنج میں بے چینی سے ہمارا انتظار کررہا تھا۔

"ارے کہاں چلے گئے تھے تم لوگ۔ میں کب سے انتظار کررہا ہوں۔" وہ ہمیں دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم شام کو ہوٹل سے نکلے تو اتفاق سے ہمیں دلیش مکھ کی کار نظر آگئی۔" میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتانے لگا۔ آخر میں بولا "اور تم بے چینی سے ہمارا انتظار کیوں کررہے تھے؟"

"دلیش مکھ کا دوست پران پولیس کی حراست میں ہے۔ وہ زخمی ہے اور اسپتال میں زیر علاج ہے۔" خان نے کہا۔

"اوہ!" میں اچھل پڑا "اس سے پتا چل سکتا ہے کہ دلیش مکھ نیپال میں کہاں جائے گا۔ چلو۔ میں ابھی اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں موجود تھے۔ وارڈ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ صرف دس بیڈز تھے۔ پانچ ایک طرف پانچ سامنے۔ پران دائیں طرف والی لائن کے تیسرے بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے اور پیٹ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔ وارڈ کے دروازے پر ایک مسلح کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا اور ایک کانسٹیبل پران کے بیڈ کے سامنے بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"کیا اسے الگ کمرے میں نہیں لے جایا جاسکتا۔" میں نے اعظم خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔" خان نے جواب دیا "یہ دلیش مکھ کے ہاتھوں زخمی ہوا ہے۔ اس کے بارے میں رضاکارانہ طور پر ہی سب کچھ بتانے کو تیار ہوجائے گا۔"

"یہ کب اور کہاں سے ملا تھا؟" میں نے پوچھا "اور تمہیں اس کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"میں آج سہ پہر تھانے میں انسپکٹر سے باتیں کررہا تھا تو میں نے اس سے دلیش مکھ کے بارے میں پوچھ لیا۔ وہ سیاست دان ہے اور راجستھان کا ایم پی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شاید

یہاں کے لوگ بھی اسے جانتے ہوں اور کسی نے اسے دیکھا ہو۔ انسپکٹر نے بتایا کہ اس نے دلیش مکھ کو تو نہیں دیکھا البتہ وہ کل رات اپنے ایک آدمی کو زخمی کر کے نیپال کی طرف بھاگ گیا ہے۔ میں انسپکٹر کے ساتھ فوراً یہاں چلا آیا۔ اس نے جو کہانی سنائی ہے تمہارے لیے یقیناً دلچسپ ہوگی۔ تم خود ہی پوچھ لو۔"

میں بیڈ کے قریب بینچ پر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے پران سے شوبھا کے بارے میں دریافت کیا۔

"وہ ٹھیک ہے اور ابھی تک محفوظ ہے۔" پران نے جواب دیا "پہلے اسے دواؤں کے زیر اثر بے ہوش رکھا جاتا تھا لیکن اب اسے گن پوائنٹ پر رکھا جا رہا ہے۔ اس کے حواس پوری طرح بحال نہیں ہیں۔ وہ کسی وقت بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگتی ہے۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے کبھی بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ہر وقت خلا میں گھورتی رہتی ہے۔ اس کے سامنے کھانا رکھ دو تو کھا لیتی ہے۔ اس نے خود سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

"وہ حرامی اسے نیپال لے گیا ہے۔ تمہارے خیال میں وہ کہاں جائے گا۔" میں نے پوچھا۔

"کھٹمنڈو۔" پران نے جواب دیا "وہاں اس کا ایک پرانا دوست روی رہتا ہے۔ وہ کاروباری آدمی ہے اور ہندوستان بھی آتا رہتا ہے۔ دلیش مکھ نے کل ٹیلی فون پر اسے بتا دیا تھا۔"

"روی کھٹمنڈو میں کہاں رہتا ہے۔ اسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کبھی کھٹمنڈو نہیں گیا لیکن دلیش مکھ نے بتایا تھا کہ کانتی پاتھ میں اس کا ہوٹل ہے۔ ہوٹل کا نام مجھے یاد نہیں۔" پران نے جواب دیا۔

"کیا روی کا بھی سیاست سے کوئی تعلق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" پران نے نفی میں سر ہلایا "وہ ادھر کا داوا ہے۔ بعض سیاست داں اس کے دباؤ میں ہیں۔ وہ کئی مرتبہ دلیش مکھ کے پاس جے پور آ چکا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس کی باتیں سنی تھیں۔ روی نے دلیش مکھ سے کہا تھا کہ ہندوستان میں جب بھی اس پر مصیبت کا وقت آئے وہ کھٹمنڈو آ جائے۔ وہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھے گا۔"

"تمہارے ساتھ یہ سب کیسے ہوا؟" میں نے پوچھا "سنا ہے تم تو بہت عرصے سے اس کے ساتھ تھے اور اس کے خاص آدمیوں میں سمجھے جاتے تھے۔"

"میں اس وقت سے دلیش مکھ کے ساتھ ہوں جب وہ ایک معمولی اور سڑک چھاپ غنڈا ہوا کرتا تھا۔" پران نے جواب دیا "پھر وہ راٹھور کے پاس آ گیا۔ میں اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا۔ دلیش مکھ نے راٹھور کے ایک دشمن کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس طرح وہ راٹھور کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ دلیش مکھ چالاک آدمی تھا۔ رفتہ رفتہ راٹھور پر حاوی ہوتا چلا گیا اور پھر ایک روز اس نمک حرام نے راٹھور کو بھی قتل کر دیا اور اس کی جائداد اور بزنس پر قابض ہو گیا۔ دولت ہاتھ آتے ہی وہ سیاست میں بھی کود پڑا۔ وہ بہت ہاتھ پیر پھیلا چکا تھا۔ آدھے سے زیادہ شہر میں اس کے جوئے اور منشیات کے اڈے تھے۔ اس کے گرگے شہر بھر میں بھتا وصول کرتے تھے۔ طوائفیں بھی اس کے کنٹرول میں تھیں۔ ایم پی بننے کے بعد وہ کچھ اور پھیل گیا۔ پولیس میں بھی اس کا حکم چلنے لگا۔ کوئی فرض شناس اور ایمان دار آفیسر اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیتا تو اس کا تبادلہ کرا دیا جاتا یا اسے راستے سے ہٹا دیا جاتا۔ وہ دو پولیس آفیسروں کو اپنے گرگوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتروا چکا ہے۔"

میں توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہو کر کچھ دیر گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر کہنے لگا۔

"میں نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا۔ ہر آڑے وقت میں اس کے کام آیا۔ شوبھا کے معاملے میں بھی میں پیش پیش تھا۔ وہ شوبھا کے پلاٹ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن راجا صاحب کی مداخلت سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا اور پھر یہ پٹی میں نے ہی اسے پڑھائی تھی کہ اگر وہ شوبھا سے شادی کر لے تو وہ پلاٹ ہی نہیں شوبھا کی ساری جائداد اس کے قبضے میں آ جائے گی۔

"اس کے لیے اسے اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ ایک اچھا انسان بن کر اپنے آپ کو شوبھا کے سامنے پیش کرنا ہوگا لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے یہاں بھی داداگیری استعمال کرنے کی کوشش کی۔ شوبھا کو دھمکیاں دیں۔ شوبھا خوف زدہ ہو کر غائب ہو گئی۔

"دلیش مکھ اسے تلاش کرتا رہا۔ اس نے کافی ہاؤس کے منیجر اور ملازموں پر تشدد کر کے بھی اس کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن کسی کو علم نہیں تھا کہ شوبھا کہاں چلی گئی ہے اور پھر دلیش مکھ کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ شوبھا رشی کیش میں موجود ہے۔ اس کا وہ آدمی تم سے پٹ کر گیا تھا اور پھر دلیش مکھ ہردوار پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے چند غنڈے ساتھ لیے اور رشی کیش پہنچ کر شوبھا کو اٹھا لیا۔ تمہیں وہ مردہ سمجھ کر

چھوڑ گیا تھا لیکن المورا میں تمہیں دیکھ کر میں بھی خوف زدہ ہو گیا تھا۔

"وہ تمہارے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ المورا سے بھاگنے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دے گا۔ تم موت کے سائے کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر تم سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے تو شوبھا کو چھوڑ دے لیکن وہ شوبھا سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا اور بالآخر کل یہاں اس نے اپنی گاڑی بیچ دی اور کل رات ہی سرحد پار کر کے نیپال چلا گیا۔" پران ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ اسے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ چند لمحے گہرے گہرے سانس لیتا رہا پھر بولا۔

"مجھے اس نے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ جو آدمی ہمیں سرحد پار کرانے کے لیے آیا تھا اس کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ دلیش مکھ نے پہاڑیوں میں گاڑی رکوائی اور بہانے سے مجھے نیچے اتار کر فائرنگ کر دی۔ مجھے دو گولیاں لگیں۔ ایک سینے میں اور ایک پیٹ میں۔

"دلیش مکھ سرحد کی طرف فرار ہو گیا۔ میں تقریباً ایک گھنٹا پہاڑیوں میں پڑا رہا اور پھر مجھے معلوم نہیں میں پہاڑیوں سے نکل کر آبادی تک کس طرح پہنچا۔ میں ایک سنسان سڑک پر بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ ہوش آیا تو یہاں موجود تھا۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ کچھ طویل ہو گیا اور بالآخر پہلے سے بھی زیادہ مدھم لہجے میں کہنے لگا۔

"میں زندہ رہوں یا مر جاؤں۔ اس کی اب مجھے پروا نہیں لیکن دلیش مکھ کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے تم اس تک پہنچ جاؤ گے۔ اسے سزا دینا تمہارا کام ہے۔"

میں روی اور دلیش مکھ کے بارے میں مزید سوالات کرتا رہا لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میں بینچ سے اٹھ گیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم اسپتال سے نکل رہے تھے۔

اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم نے ابھی تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے ساتھ چلتی ہوئی بملا بار بار مجھے کہنی سے ٹھوکے مار رہی تھی اور میرا خیال ہے۔ اعظم خان نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ ایک ریسٹورنٹ کی طرف مڑا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بملا کے چہرے پر بھی رونق سی آ گئی تھی۔ اس وقت مجھے جانکی یاد آ گئی۔ اس سے بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی اور یہی صفت میں نے بملا میں بھی نوٹ کی تھی۔

کھانے کے بعد ہوٹل پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ میں جاتے ہی اپنے بستر پر گر گیا۔ پران کی باتیں اس وقت بھی میرے دماغ میں سنسناہٹ سی پیدا کر رہی تھیں۔ دلیش مکھ شوبھا کو لے کر سرحد پار کر گیا تھا۔ پران کے کہنے کے مطابق شوبھا ابھی تک اگرچہ دلیش مکھ کے شر سے محفوظ رہی تھی لیکن اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں پران نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میں پریشان ہو گیا تھا۔ وہ جس نوع کے حالات سے دوچار تھی اس کے پیش نظر کچھ ایسی ہی توقع کی جا سکتی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس کا دماغ نہ پلٹ جائے اور اس سے پہلے کہ شوبھا کو کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے اسے ہر صورت میں دلیش مکھ کے چنگل سے چھڑانا تھا۔

دلیش مکھ ایک رات پہلے سرحد پار کر گیا تھا۔ اس طرح وہ ہم سے چوبیس گھنٹے آگے نکل گیا تھا اور میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سرحد پار کرنے کا موقع کب ملے۔ اعظم خان کی صورت میں ایک امید بندھی تھی لیکن ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کو خان نے کہا تھا کہ شاید آج رات.....

دروازے پر دستک کی ہلکی سی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بملا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

اسی دوران دستک کی آواز دوبارہ ابھری۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اعظم خان تھا۔

"سو گئے تھے؟" وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "آج کل نیند شاید ہم سے روٹھ گئی ہے۔ تم اس وقت....."

"ہم جا رہے ہیں۔" اس نے میری بات کاٹ دی "تم لوگ تیار ہو جاؤ۔ اس وقت ڈیڑھ بجا ہے۔ ٹھیک دو بجے تمہیں حویلی کے برآمدے میں ہونا چاہیے۔ دو بجے کے بعد کسی بھی وقت گاڑی ہمیں لینے کے لیے پہنچ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم چند منٹ میں نیچے آ جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

اعظم خان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر دیا۔ بملا اچھل کر بیڈ سے اتر گئی تھی۔ دوپہر کو یہاں آنے کے بعد ہم نے کپڑے بدلے تھے۔ میلے کپڑے ابھی تک باتھ روم میں ٹنگے ہوئے تھے۔ بملا وہ کپڑے اٹھا کر تھیلے میں ٹھونسنے لگی اور میں کمبل تہ کرنے لگا۔ پہاڑی علاقوں میں رات کے وقت سردی بڑھ جاتی تھی۔ اس طرح یہ کمبل ہمارے لیے بہت اہم ہو گئے تھے اور میں یہ کمبل چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم دو بجے سے پہلے ہی اپنا سامان لے کر ہوٹل کے برآمدے میں پہنچ گئے۔ ہوٹل کا ایک ملازم کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی آہٹ سن کر وہ اٹھ گیا۔ برآمدے میں کچھ اور بھی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بملا کو اشارہ کیا اور ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ٹھیک دو بجے اعظم خان بھی آگیا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ ہمارے قریب رکھ دیا اور برآمدے سے نکل کر حویلی کے پھاٹک کی طرف چلا گیا۔

بیس منٹ بعد پھاٹک کے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ اعظم خان تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہمارے قریب آیا اور ہم اپنا سامان اٹھا کر اس کے ساتھ چل پڑے۔

وہ سیاہ رنگ کی بڑی لینڈ کروزر تھی۔ پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں سفر کے لیے اس سے بہتر کوئی اور گاڑی نہیں ہوسکتی تھی۔ مجھے اور بملا کو سب سے پیچھے والی سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ اعظم خان ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ درمیان کی سیٹ خالی تھی۔ ڈرائیور نے خان کی طرف دیکھا اور گاڑی ایک ہلکے سے جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

شہر مکمل طور پر سنسان اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ اگر کوئی بڑا شہر ہوتا تو اس وقت بھی سڑکوں پر اکا دکا گاڑیوں کی آمدورفت ضرور رہتی لیکن رات کے اس سمے تنک پور کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے جن پھر گیا ہو۔ البتہ ایک موڑ پر دو تین کتوں نے بھونکتے ہوئے گاڑی کا تعاقب ضرور کیا تھا لیکن تھک کر خود ہی پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

گاڑی شہر سے نکل کر اس سڑک پر آگئی جو سرحد کی طرف چلی گئی تھی۔ سرحد کا فاصلہ شہر کے مرکز سے چند کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ وہاں چوکی تھی اور دن کے وقت پاسپورٹ کے ذریعے سرحد پار کرنے والوں کی باقاعدہ آمدورفت رہتی تھی لیکن شام چھ بجے اس چوکی کے پھاٹک بند کر دیے جاتے تھے۔

تقریباً دو کلومیٹر اس سڑک پر آگے جانے کے بعد ہماری گاڑی دائیں طرف ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ یہ راستہ آگے جا کر پہاڑیوں میں داخل ہوگیا۔ گاڑی اس پتھریلے راستے پر ہلکی رفتار سے چلتی رہی اور بالآخر ایک جگہ رک گئی۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ گاڑی کی تمام بتیاں بھی بجھا دی گئی تھیں۔ ڈرائیور بار بار کلائی پر بندھی ہوئی الیکٹرانک واچ کا بٹن دبا کر اس کے اندر نمودار ہونے والی نہایت مدھم روشنی میں وقت دیکھ رہا تھا۔

ٹھیک تین بجے سامنے بہت دور قدرے بلندی پر شعلہ سا چمکا۔ یوں لگا تھا جیسے کسی نے سگریٹ سلگانے کے لیے دیا سلائی یا لائٹر جلایا ہو۔ وہ شعلہ فوراً ہی بجھ گیا تھا۔ ڈرائیور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اس طرف لگی ہوئی تھیں۔ وہ شعلہ وقفے وقفے سے تین مرتبہ چمکا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہیڈ لیمپس یا گاڑی کی کوئی اور بتی نہیں جلائی گئی تھی۔ گاڑی اندھیرے میں ہلکی رفتار سے چٹانوں میں بل کھاتے ہوئے راستے پر چلتی رہی۔ لگتا تھا جیسے یہ راستہ ڈرائیور کا خوب اچھی طرح دیکھا بھالا ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے بھی گاڑی چلا سکتا ہو۔

تقریباً پندرہ منٹ تک یہی صورت حال رہی۔ گاڑی ہلکی رفتار سے چلتی رہی۔ آگے ڈھلان شروع ہوگئی تھی اور پھر اچانک ہی ڈرائیور نے ہیڈ لیمپس روشن کر دیے اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

"ہم نے سیما (سرحد) پار کرلی ہے۔" اعظم خان نے پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایک گھنٹے بعد ہم جوڑیا پانی پہنچ جائیں گے۔"

"جوڑیا پانی!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں۔ یہ ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ہم کچھ دیر وہاں رکیں گے اور پھر دوسری گاڑی پر آگے روانہ ہوجائیں گے۔" اعظم خان نے بتایا۔

ہم اس وقت جوڑیا رینج کے پہاڑی علاقے کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ یہاں پہاڑیاں زیادہ بلند نہیں تھیں۔ تاہم شمال کی طرف بڑھتے ہوئے یہ پہاڑیاں بتدریج بلندی اختیار کرتے ہوئے عظیم ہمالیہ کی صورت اختیار کر جاتی تھیں جبکہ جنوب کی طرف بتدریج میدانی علاقہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر بھارت کی سرحد تھی جس کے دوسری طرف اترپردیش (یو۔پی) کا علاقہ تھا۔

تنک پور سے جوڑیا پانی کا علاقہ ساٹھ پینسٹھ کلومیٹر کے لگ بھگ تھا۔ ہم تقریباً سوا گھنٹے میں جوڑیا پانی پہنچ سکے تھے۔ یہ بستی بھی سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی مگر گاڑی بستی کی طرف جانے کے بجائے اس سے دو کلومیٹر پہلے ہی دائیں طرف ایک کچے راستے پر مڑ گئی اور مزید تین چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بہت بڑے پھاٹک کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور کو ہارن بجانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ گاڑی رکنے کے تیس سیکنڈ بعد پھاٹک کھل گیا اور ڈرائیور گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔

یہ بہت بڑا احاطہ تھا۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔

احاطے میں جا بجا اونچے درخت نظر آرہے تھے اور احاطے کے بالکل آخر میں ایک دو منزلہ عمارت تھی۔ میں اسے حویلی ہی کہوں گا۔ گاڑی حویلی کے کشادہ برآمدے کے سامنے رک گئی۔ جہاں پہلے بھی سلور کلر کی ایک کار کھڑی تھی۔

دو آدمی تاریکی میں کسی طرف سے نمودار ہوئے اور ہم لوگ گاڑی سے اتر آئے۔ سرحد پار کرنے کے بعد سے بملا مسلسل اونگھتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ہم نے اپنا سامان گاڑی ہی میں چھوڑ دیا۔ ہمیں حویلی کے ایک وسیع کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ایک بھاری بھرکم طویل قامت آدمی ہمارا منتظر تھا۔

وہ نیپالی تھا۔ سفید تنگ موری کا پاجامہ، شیروانی کی طرح کالا کوٹ جو گھٹنوں تک تھا اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی چائے آگئی۔ اس کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے۔ لگتا تھا انہیں ہماری آمد کی اطلاع تھی اور سارے انتظامات پہلے ہی سے کیے گئے تھے۔ چائے ختم ہونے کے بعد اس شخص نے نیپالی زبان میں اعظم سے کچھ کہا اور اعظم میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ اس کمرے میں جا کر کچھ آرام کرلو۔ ہم لوگ صبح سات بجے یہاں سے روانہ ہوں گے۔"

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ ہمارے اور دیش مکھ کے بیچ وقت کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا اور مجھے شوبھا کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ بے بسی میرے آڑے آرہی تھی اور ظاہر ہے اس صورت حال میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہمیں ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں شاندار اور آرام دہ بستر لگا ہوا تھا۔ اس وقت ساڑھے چار بجنے والے تھے۔ ہمارے پاس آرام کے لیے تقریباً ڈھائی گھنٹے تھے۔ بملا بستر پر اوندھ کر سو گئی اور میں ایک آرام کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔

ساڑھے چھ بجے ہمیں جگا دیا گیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتا کیا اور سوا سات بجے ہم روانگی کے لیے تیار ہوگئے۔ اس مرتبہ سلور کلر والی کار سفر کے لیے منتخب کی گئی تھی۔ وہ دراز قامت نیپالی، ہمارا میزبان بریندرا ہمارے ساتھ تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ اسی نے سنبھالی تھی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ اعظم نے سنبھال لی، میں اور بملا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ہمارا سامان کار کی ڈکی میں رکھ دیا گیا تھا۔

جوڑیا پانی زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ رائل وائلڈ لائف رینج تھا جو کئی میل آگے بھارت کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ وسیع و عریض جنگل ہاتھیوں کی افزائش نسل کے لیے مخصوص تھا اور یہاں ہاتھی کا شکار انسانی قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔

پختہ اور کشادہ سڑک جنگل کے ساتھ ساتھ چلی گئی تھی۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر پہاڑی سلسلہ تھا جو شمال کی طرف بتدریج بلند ہوتا چلا گیا تھا۔

نیپال میں جگہ جگہ بدھ عبادت گاہیں تھیں اور ہندوؤں کے قدیم تاریخی مندر تھے۔ اس کے علاوہ کئی نیشنل پارک، پرندوں اور جنگلی جانوروں کے ریزر وائرز تھے جہاں جنگلی حیات کو مکمل تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ غیر ملکی سیاح بھی بڑی تعداد میں ان مقامات پر سیر و تفریح کے لیے آتے تھے اور اسی لیے سڑکوں اور راستوں پر خاص توجہ دی گئی تھی تاکہ سیاحوں کو آمدورفت میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

تقریباً سوا دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم دوپہر کے قریب تیل پانی نامی قصبے میں پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی میلوں تک پھیلا ہوا پرندوں کا ریزر وائر اور اس سے آگے نیشنل پارک تھا جو میلوں آگے تک چلا گیا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے تیل پانی کے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہوگئے۔

بڑا سرسبز اور خوب صورت علاقہ تھا۔ سڑک بھارت کی سرحد کے متوازی چل رہی تھی۔ اس کے دوسری طرف یوپی کا صوبہ تھا جسے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ کہیں ہم سرحد کے بالکل قریب پہنچ جاتے اور کہیں میلوں کا فاصلہ حائل ہو جاتا۔

شام پانچ بجے کے قریب ہم بٹوال پہنچ گئے۔ یہ متوسط درجے کا شہر تھا اور یہاں ائرپورٹ بھی تھا۔ اس شہر سے تقریباً چالیس کلومیٹر جنوب میں بھارت کی عین سرحد پر مہاتما بدھ کی جنم بھومی لمبین نامی قصبہ تھا اور شاید اسی وجہ سے بٹوال شہر میں بھی بدھ بھکشو بڑی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ لمبین جانے والی سڑک سدھارتھ ہائی وے پر ٹریفک کی آمدورفت زیادہ تھی۔

بٹوال میں ہم نے ایک ہوٹل میں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ مجھے اور بملا کو ہوٹل میں چھوڑ کر اعظم اور بریندرا کہیں چلے گئے تھے لیکن چھ بجے کے قریب وہ دونوں واپس آگئے۔ بریندرا تو ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھا رہا تھا اور اعظم ہمارے کمرے میں آگیا۔

"جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ ہم تان سین جا رہے ہیں۔" اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے تان سین کا نام سن رکھا تھا۔ وہ تو کوئی کلاکار تھا۔ سنا ہے اس کے گلے میں بڑا سوز تھا۔ وہ جب گاتا تھا تو کائنات کی ہر شے ساکت ہو جاتی تھی مگر اعظم خان پتا نہیں کس تان سین کی بات کر رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔ تان سین۔۔۔"

"ارے بھئی شہر کا نام ہے جو یہاں سے چالیس پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شکار دلیش مکھ تان سین میں واقع نارائن مندر میں موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ وہاں سے نکل جائیں ہمیں وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ میں نے پیروں کو آرام پہنچانے کے لیے جوگرز اتار رکھے تھے۔ مجھے جوگرز پہننے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ بلا مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہوٹل سے باہر آنے میں بھی ہمیں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

بریندرا کار میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ انجن اسٹارٹ تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے کار آگے بڑھا دی۔

شہری حدود سے نکل کر کار شمال کی طرف جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ اس طرف پہاڑوں میں یہ ہائی وے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر دور پوکھارا نامی شہر تک چلی گئی تھی۔ بھارت کی سرحد پر واقع لمبین قصبے سے پوکھارا تک یہ سڑک سدھارتھ ہائی وے ہی کہلاتی تھی۔ اس وقت ہم شمالی سدھارتھ ہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔

اس ہائی وے پر بھی اچھا خاصا ٹریفک تھا۔ پورا نیپال پہاڑوں پر مشتمل ہونے کے باوجود پوری طرح آباد تھا۔ ہر چند کلومیٹر کے بعد کوئی نہ کوئی بستی موجود تھی۔ پہاڑ سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے جہاں نشیبی علاقے تھے وہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ پہاڑوں میں پھلوں کے باغات تھے۔ ترائیوں میں سال میں دو مرتبہ دھان کی فصل ہوتی تھی۔ تمام قصبے، شہر اور گاؤں پختہ سڑکوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمالیہ کے اس دیس میں سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہر بڑے اور درمیانے شہروں کے درمیان ہوائی رابطے بھی تھے۔

دھوبن اور لاگر نامی قصبوں میں رکے بغیر کار شمال کی طرف سفر کرتی رہی۔ یہ سڑک بتدریج بلندی کی طرف چلی گئی تھیں۔ کہیں کہیں نشیب بھی تھے۔

بٹوال سے روانگی کے چند منٹ بعد ہی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر کار کے ہیڈ لیمپس کی متحرک روشنی بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہم تان سین پہنچ گئے۔ یہ بھی ایک بڑا قصبہ تھا۔ نارائن مندر کی وجہ سے یہاں بھی سیکڑوں یاتریوں کی آمدورفت تھی۔ اچھا بارونق قصبہ تھا۔

بریندرا نے کار ایک سرائے کے سامنے روک لی۔ بلا کو سرائے میں چھوڑ دیا گیا۔ کار بھی وہیں چھوڑ دی گئی تھی۔ ہم تینوں پیدل ہی ایک طرف چلنے لگے۔

نارائن مندر زیادہ دور نہیں تھا۔ بہت بڑا مندر تھا۔ اس وقت اگرچہ شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے لیکن مندر میں خاصی رونق تھی۔ باہر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

بریندرا نے ہمیں گیٹ کے قریب رکنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک پنڈت بھی تھا۔ عجیب ہیئت تھی اس پنڈت کی۔ پیشانی کوئی بالشت بھر چوڑی تھی۔ گنجی کھوپڑی کے پچھلی طرف بالوں کی جھالر تھی۔ داڑھی صاف تھی لیکن مونچھیں خاصی بڑی تھیں۔ کانوں میں سونے کے بالے اور ناک میں بھی دونوں نتھنوں کے بیچ میں سونے کی بالی تھی۔ ناک میں ایسی بالیاں میں نے راجستھان میں عورتوں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ پنڈت نے گیروے رنگ کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ پیٹ مٹکے کی طرح آگے کو نکلا ہوا تھا اور گلے میں رنگ برنگی کئی مالائیں تھیں۔ وہ جب سانس لیتا تو یوں لگتا جیسے سانپ پھنکار رہا ہو۔

ہم اسے مندر کے گیٹ سے ہٹا کر دور ایک تاریک گوشے میں لے گئے۔

"تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو پنڈت رگھوناتھ۔" بریندرا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "فی الوقت تو تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اگر تم نے ہماری باتوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیا تو تمہاری باقی زندگی جیل میں گزرے گی۔ ساگر ماتھا کی پولیس ابھی تمہیں بھولی نہیں ہے۔"

"حکم کرو مہاراج۔ ہم تو تمہارے داس ہیں۔" پنڈت رگھوناتھ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ کچھ اور تاریک ہو گیا تھا۔

"یہاں انڈیا سے کچھ لوگ آئے ہیں۔" بریندرا نے کہا "ایک ادھیڑ عمر آدمی اور ایک بیمار عورت۔" اس نے دلیش مکھ کا حلیہ بتایا "دو آدمی مقامی ہیں۔ بدمعاش۔ اچکے۔۔۔ وہ لوگ مندر میں آئے ہوئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ۔۔۔"

گیٹ کی طرف سے بہت کم روشنی اس طرف پہنچ رہی تھی۔ میری نظریں پنڈت رگھوناتھ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ بریندرا کی بات سن کر اس کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوگیا تھا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

"وہ لوگ آئے تھے سرکار۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے جواب دیا "وہ مندر میں پنڈت بھوج کے پاس آئے تھے۔ ان کے ساتھ روی کے دو آدمی تھے۔ پر وہ ایک گھنٹا یہاں ٹھہر کر چلے گئے۔"

"کب آئے تھے اور کہاں گئے؟" بریندرا نے پوچھا۔

"چار بجے آئے تھے سرکار۔ پانچ بجے کاٹ منڈو (کھٹمنڈو) چلے گئے۔" پنڈت نے جواب دیا۔

"سوچ لو پنڈت۔" بریندرا نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں "اگر تمہاری یہ بات غلط ثابت ہوئی اور وہ لوگ مندر ہی میں یا تان سین شہر میں موجود ہوئے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا کیا حشر کروں گا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں سرکار۔" پنڈت نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیے "میں آپ کے سامنے کوڑ (جھوٹ) نہیں ماروں گا۔ وہ لوگ کاٹ منڈو چلے گئے۔ روی کے پاس ملیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ لیتے ہیں لیکن تم ایک گھنٹے تک مندر کے اندر نہیں آؤ گے۔" بریندرا نے کہا۔

"ٹھیک ہے سرکار۔ میں یہیں دھرنا جمالیتا ہوں۔" پنڈت وہیں زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

ہم مندر میں آگئے۔ کئی اور داسوں اور داسیوں سے بھی پوچھا گیا۔ کوئی بھی کچھ نہیں بتا سکا۔ صرف ایک داسی سے یہ پتا چلا کہ دوپہر کے بعد ایک عورت اور تین آدمی پنڈت بھوج کے پاس آئے تھے۔ عورت بیمار تھی۔ اس داسی نے انہیں پنڈت بھوج کے استھان میں تو جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ باہر جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیے تھے۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے تک مندر میں معلومات حاصل کرتے رہے پھر باہر آگئے۔

"وہ لوگ نکل گئے۔" بریندرا نے مندر سے باہر آتے ہوئے کہا "اب کھٹمنڈو ہی میں ان کا کچھ پتا چلے گا۔"

ہم لوگ کھانا کھانے کے لیے بازار کے ایک ریسٹورنٹ میں رک گئے۔ ان دونوں نے طے کرلیا تھا کہ رات تان سین ہی میں گزار کر صبح سویرے یہاں سے روانہ ہوا جائے۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے بملا کے لیے کھانا پیک کروالیا۔ بریندرا اور اعظم خان مجھے سرائے کے سامنے چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے رات کہیں اور گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بملا تھکی ہوئی تھی اور شاید وہ سوگئی تھی۔ کئی مرتبہ کھٹ کھٹانے کے بعد دروازہ کھلا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا تو میں نے اس کے سامنے میز پر کھانا رکھ دیا۔

یہ کمرا اگرچہ کشادہ تھا لیکن بیڈ ایک ہی تھا اور غنیمت تھا کہ اس کے ساتھ باتھ روم بھی تھا۔ لکڑی کا دروازہ دو پٹ کا پرانے طرز کا تھا جس پر درمیان اور اوپر زنجیر والی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔

یہ سرائے شاید بہت قدیم تھی اور اس میں کوئی جدید تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا جس کے چاروں طرف قطاروں میں کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے سامنے طویل برآمدے تھے۔ وسط میں میدان تھا۔ جس میں گھاس لگا دی گئی تھی اور درمیان ایک مختصر سا حوض بنا کر فوارہ بھی لگا دیا گیا تھا۔ جس کے آس پاس تین چار لکڑی کے کھمبوں پر بلب بھی روشن تھے اور اس وقت کچھ لوگ ٹولیوں کی صورت میں گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔

کئی دن کے اس طویل سفر نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا۔ لگتا تھا جیسے ہمارا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

میں نے دروازہ بند کرکے کنڈے میں لوہے کی مڑی ہوئی وہ سلاخ پھنسا دی جو پہلے ہی سے کنڈے کی زنجیر میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس مڑی ہوئی سلاخ سے گویا تالے کا کام لیا جارہا تھا۔

کھانے کے تھوڑی ہی دیر بعد بملا بستر پر لیٹ گئی تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا صورتِ حال کا تجزیہ کرتا رہا۔ پچھلے چار پانچ دنوں میں ہم نے سیکڑوں میل کا سفر کرلیا تھا لیکن ہم اب بھی بے نیل و مرام ہی تھے۔ اپنی منزل سے بہت دور۔

باہر لوگوں کے چلنے پھرنے اور باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ وہ سو چکی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ مجھے اس پر ترس بھی آرہا تھا کہ بلاوجہ جوکھوں میں پڑی ہوئی ہے۔ اگر اپنے گھر پر ہوتی تو اس وقت آرام دہ بستر پر سکون کی میٹھی نیند سو رہی ہوتی۔ سو تو وہ اس وقت بھی رہی تھی لیکن وہ نیند میں بھی بے چین تھی۔

میں نے باتھ روم کی بتی بجھا کر دروازہ چند انچ کے قریب کھلا چھوڑ دیا اور کمرے کی بتی بجھا کر بملا کے پہلو میں بستر پر لیٹ گیا اور اس کے بعد مجھے بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

صبح پانچ بجے کے قریب دستک کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اعظم خان تھا۔

"ہم کھانے والے کمرے میں بیٹھے ہیں۔" اعظم نے کہا "تم لوگ تیار ہو کر وہیں آجاؤ۔ ہم چھ بجے روانہ ہوجائیں گے۔"

اعظم واپس چلا گیا۔ ان دونوں نے رات پتا نہیں کہاں گزاری تھی۔ میں نے دروازہ بند کرکے بملا کو جگا دیا اور آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر ہم سرائے کے دفتر سے ملحق کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ یہاں بریندرا اور اعظم کے علاوہ دو اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کمرے سے ملحق کچن تھا۔ بریندرا اٹھ کر کچن میں چلا گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ ملازم کے ساتھ ناشتا لے کر آگیا۔

ناشتے کے بعد سوا چھ بجے کے قریب ہم تان سین سے روانہ ہوگئے۔ اس وقت سورج نہیں نکلا تھا۔ فضا میں دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ اگر ہم سدھارتھ ہائی وے پر سفر کرتے ہوئے تقریباً سو کلومیٹر دور پوکھارا کی طرف جاتے تو وہاں سے مشرق کی طرف پرتھوی ہائی وے کا رخ کرتے اس طرح کھٹمنڈو پہنچنے کے لیے ہمیں مزید ڈھائی سو میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا لیکن تان سین سے نکل کر چند کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بریندرا نے کار مشرق کی طرف ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی یہ سڑک کہیں پختہ تھی اور کہیں کچی۔

ہم دریائے کالی گنڈکی کے ساتھ ساتھ اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے دوپہر سے ذرا پہلے مہندر راہائی وے پر نکل آگئے۔ چند کلومیٹر آگے نارائن گڑھ شہر تھا لیکن ہم وہاں نہیں رکے۔ اس سے چند کلومیٹر آگے بھرت پور شہر تھا۔ جہاں ائرپورٹ بھی تھا۔

ہم بھرت پور میں صرف ایک گھنٹے رکے تھے۔ کھانا کھانے کے علاوہ گاڑی میں پیٹرول بھی ڈلوایا گیا اور پھر اس سڑک پر تقریباً نوّے کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے ہم تری بھون ہائی وے پر آگئے۔ یہاں سے کھٹمنڈو صرف ایک سو تیس کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

ہم نے تری بھون ہائی وے پر شمال کی طرف سفر جاری رکھا اور بالآخر سہ پہر پانچ بجے کے قریب تھان کوٹ پہنچ گئے۔

تھان کوٹ، کھٹمنڈو سے پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک خوب صورت آبادی تھی۔ بریندرا نے کار آبادی سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ میں ایک خوب صورت بنگلے کے سامنے روک لی۔ ہارن بجاتے ہی بنگلے کا گیٹ کھل گیا اور بریندرا کار کو اندر لیتا چلا گیا۔ برآمدے کے سامنے پہلے بھی نیلے رنگ کی ایک چھوٹی کار کھڑی تھی۔ بریندرا نے اپنی کار اس کے پیچھے روک لی اور انجن بند کردیا۔

اس وقت برآمدے والے دروازے سے ایک خوب صورت عورت کو برآمد ہوتے دیکھ کر میری آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال ہوگی۔ اس نے نیپالی لباس پہن رکھا تھا۔ بریندرا سے وہ بڑی گرم جوشی سے ملی تھی۔ ہمارا استقبال بھی اس نے بڑی گرم جوشی سے کیا تھا۔

وہ میگھنا تھی۔ بریندرا کی دوست جو ایک ادھیڑ عمر ملازم کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ رسمی تعارف کے بعد میگھنا نے فوراً ہی ہماری خاطر مدارات شروع کردی۔ اس نے ملازم کو بازار بھیج کر کیک پیسٹریاں اور پھل وغیرہ منگوالیے اور چائے کے ساتھ یہ سارے لوازمات ہمارے سامنے پیش کردیے۔

چائے کے دوران اور اس کے بعد بھی بریندرا زیادہ تر میگھنا ہی سے باتیں کرتا رہا تھا اور پھر تقریباً سات بجے کے قریب وہ اعظم خان کو اشارہ کرتا ہوا اٹھ گیا۔

"ہم کھٹمنڈو شہر جارہے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہوسکتا ہے رات کو دیر سے آئیں یا صبح سے پہلے نہ لوٹ سکیں۔ تم لوگ یہاں آرام سے رہو۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہم کھٹمنڈو میں دیش مکھ اور روی کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرلیں گے۔ گھبراؤ نہیں۔ ایک دو دن بعد شوبھا تم لوگوں کے ساتھ ہوگی۔" بریندرا نے میگھنا کو بھی ہمارا خیال رکھنے کو کہا اور اعظم کے ساتھ باہر چلا گیا۔

جب ہم تنک پور سے سرحد پار کرنے کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ہماری باگ ڈور اعظم خان کے ہاتھ میں تھی لیکن سرحد پار کرکے جوڑیا پانی سے یہ باگ دوڑ بریندرا نے سنبھال لی تھی اور اب ہم اسی کے ڈسپوزل پر تھے۔

ان کے جانے کے بعد میگھنا رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ کبھی وہ خود مصروف ہوجاتی، کبھی ملازم کو ہدایات دینے لگتی اور کبھی ہمارے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگتی۔ بالآخر اس نے ایک کمرا ہمیں دے دیا کہ ہم نہا دھو کر تھکن اتارلیں اور تازہ دم ہوجائیں۔

رات کے کھانے پر بھی میگھنا خوب چہکتی رہی۔ وہ واقعی بہت خوش اخلاق اور مخلص عورت تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ ہماری خدمت خاطر میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

میگھنا سے خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ کھانے کے بعد ہم بڑے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اعظم خان نے ہمیں بریندرا کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا لیکن میرا

اندازہ تھا کہ اس کا تعلق نیپال کی خفیہ پولیس سے ہے اور اب میکھنا کی باتوں سے اس کی تصدیق ہوگئی تھی۔ وہ خفیہ پولیس میں لیڈی انسپکٹر تھی۔

میکھنا کی اپنی کہانی بڑی دلچسپ تھی۔

ذات پات ہندو دھرم میں ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے ہندوؤں کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ انہیں نیچ اور ملیچھ گردانا جاتا ہے۔ دھرم پر برہمن قابض ہیں۔ نیچ ذات کا کوئی ہندو پنڈت نہیں بن سکتا لیکن مندروں میں دیوتاؤں اور پنڈتوں پجاریوں کی سیوا کے لیے نیچ ذات کی لڑکیوں کو ہی گوپی' داسی یا جوگن بنایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے خوب صورت لڑکیوں کا انتخاب کیا جاتا ہے اور یہ خوب صورت گوپیاں اور داسیاں مندروں میں کسی دیوی یا دیوتا کے نہیں بلکہ برہمن پنڈتوں اور پجاریوں کے کام آتی ہیں۔ وہی ان سے سیوا کراتے ہیں اور وہی انہیں استعمال کرتے ہیں۔

بعض لڑکیوں کو دس گیارہ سال کی عمر میں ہی مندر کے حوالے کردیا جاتا ہے۔ کسی دیوی یا دیوتا سے ان کی شادی کردی جاتی ہے اور اس شادی کے بعد وہ کسی مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ تاہم مندر کے پنڈت اور پجاری آزادی سے اسے استعمال کرتے ہیں اور جب وہ ان کے لیے بے کار ہوجاتی ہے' کسی کام کی نہیں رہتی تو اسے مندر سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ سڑکوں پر بھیک مانگ کر اور جسم بیچ کر اپنا پیٹ پالتی ہے۔

بڑے بڑے دولت مند لوگ بھی مندروں کی ان خوب صورت گوپیوں اور داسیوں سے اپنی ہوس کی آگ بجھاتے ہیں۔ وہ پنڈتوں کی مٹھی گرم کرکے ان داسیوں کو اپنے عشرت کدوں میں لے جاتے ہیں اور جی بھر جانے کے بعد انہیں واپس مندر میں پہنچا دیتے ہیں تاکہ ان جیسا کوئی دوسرا عیاش آدمی ان کے حسن و شباب سے اپنی ہوس کی آگ بجھا سکے۔

میکھنا بھی چودہ سال کی عمر میں کھٹمنڈو کے تارا دیوی مندر میں آئی تھی۔ وہ تین سال تک مندر کے پنڈتوں اور پجاریوں کی سیوا کرتی رہی۔ اس نے شہر کے کئی دولت مندوں کی ہوس کی آگ بھی بجھائی اور پھر ایک دن انسپکٹر بریندرا کی نظروں میں آگئی۔ انسپکٹر بریندرا مندر کے پروہت کو ایک معقول رقم دے کر اسے لے آیا۔ بریندرا اگرچہ شادی شدہ تھا لیکن اس کی بیوی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کوئی مرد کسی گوپی' جوگن یا داسی کو مندر سے لے کر آتا ہے تو بیوی ناراض ہونے کے بجائے خوش ہوتی ہے۔ بریندرا کی بیوی نے بھی بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا۔

بریندرا نے میکھنا کو کچھ عرصے اپنے گھر پر رکھا اور پھر تھان کوٹ کے اس بنگلے میں لے آیا۔ وہ اس سے باقاعدہ شادی نہیں کرسکتا تھا لیکن میکھنا کئی سال سے اس کے پاس رہ رہی تھی اور بریندرا اس کے تمام اخراجات پورے کرتا تھا۔ وہ کبھی اپنی بیوی کے پاس رہتا اور کبھی یہاں میکھنا کے پاس۔ میکھنا نے بھی وفا شعاری کی حد کردی تھی۔ اس نے دوسرے مرد کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شاید ایک ہی کھونٹے سے بندھے رہنے میں عافیت سمجھی تھی۔

گیارہ بج گئے۔ بملا صوفے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہی تھی۔ دن بھر کے سفر نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا اور مجھے بھی نیند کے جھونکے آرہے تھے اور بالآخر میکھنا کو بھی ہماری حالت پر رحم آگیا اور ہم کمرے میں آگئے۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ نسوانی چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے بعد کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ میں اس نسوانی چیخ کو اپنا واہمہ سمجھ کر پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ نسوانی چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ چیخ کی آواز اسی بنگلے کے کسی کمرے سے آئی تھی۔

چیخ کی آواز ایک بار پھر سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز بھی گونج اٹھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔ بملا بھی جاگ گئی تھی وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

راہداری میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے بملا کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور بیڈ سے چھلانگ لگا کر دروازے کی طرف دوڑا۔ میرے دماغ پر ابھی تک نیند کا خمار تھا اور تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

میں جیسے ہی راہداری میں پہنچا سامنے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں تیغہ تھا جسے اس نے سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا اور وہ وحشیانہ انداز میں دہاڑتا ہوا حملہ کرنے کے لیے میری طرف لپک رہا تھا۔

میرا دماغ سن ہوگیا۔ میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا حملہ آور کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ دلیش مکھ تھا جو تیغہ سر سے بلند کیے مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ میرا جسم پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہوگیا ہو۔ موت میری طرف لپک رہی تھی اور میں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

دلیش مکھ کا تیغہ بڑی تیزی سے نیچے آرہا تھا اور اس کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔

میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر لاوا کھولنے لگا ہو۔ یہ کھولتا ہوا لاوا میرے پیٹ سے سینے کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر جیسے آتش فشاں پھٹ پڑا۔ میرے جسم کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور میرا بایاں ہاتھ بے اختیار اوپر اٹھ گیا۔ دلیش مکھ کا تیغے والا ہاتھ برق رفتاری سے نیچے آرہا تھا مگر میرا اٹھا ہوا ہاتھ رکاوٹ بن گیا۔

دلیش مکھ کی تیغے والی کلائی میری گرفت میں تھی۔ اسے شاید اس کی توقع نہیں تھی کہ میں وار روک لوں گا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ درندگی تھی مگر آنکھوں میں ایک لمحے کو الجھن سی تیر گئی۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ میری گرفت چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے غرایا "تمہارے سبب میرا سب کچھ برباد ہوگیا۔ تم بیچ میں ٹانگ نہ اڑاتے تو شوبھا کے ساتھ اس کی پراپرٹی پر بھی میرا قبضہ ہوچکا ہوتا مگر تم۔۔۔"

"یہ تمہاری بھول ہے دلیش مکھ۔" میں نے جواب دیا "ماتھے پر سیاست کا لیبل لگا لینے سے آدمی بھگوان نہیں بن جاتا۔ تم بھول گئے تھے کہ مظلوموں کے ساتھ بھی کوئی ایسی غیبی طاقت ضرور ہوتی ہے جو ان کی مدد کرتی ہے۔ بھگوان نے شوبھا کی مدد کے لیے مجھے بھیج دیا تھا۔ تم شوبھا کو لے بھاگے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے ہو۔"

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ شوبھا کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔" وہ ایک بار پھر غرایا "میں تمہیں تان سین ہی میں ختم کردیتا مگر روی کی ضد تھی کہ تمہیں کھٹمنڈو تک آنے دیا جائے۔ جب تم لوگ تان سین کے نارائن مندر میں پنڈت رگھوناتھ سے پوچھ رہے تھے تو ہم اس وقت مندر کے تہ خانے میں موجود تھے مگر رگھوناتھ نے بڑی خوب صورتی سے تم لوگوں کو بے وقوف بنا دیا۔ میں اسی رات سرائے میں گھس کر تمہیں ختم کردینا چاہتا تھا مگر روی نے مجھے روک دیا۔ وہ چھوٹی سی جگہ ہے۔ ہم نظروں میں آجاتے۔ پہلے تم میرے پیچھے لگے ہوئے تھے لیکن تان سین سے ہم نے تمہارا پیچھا شروع کردیا۔ تمہارے وہ دونوں گرو کھٹمنڈو میں مصروف ہیں۔ یہاں تمہاری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔ مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

دلیش مکھ نے جھٹکا دے کر تیغے والا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ میں نے اس کے اس بازو کی بغل میں زوردار گھونسا رسید کردیا۔ وہ اپنی جگہ پر اچھلا۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی اس کے اس بازو پر جما دیا اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے نیچے بیٹھتا چلا گیا۔

دلیش مکھ میرے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتے ہوئے پشت کے بل فرش پر گرا مگر اس نے پھرتی سے لوٹ لگاتے ہوئے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ تیغہ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے ایک بار پھر حملہ کیا۔ اس مرتبہ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکلا تو میں نے پیچھے سے ایک زوردار ٹھوکر جما دی وہ لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے ٹکرایا مگر بڑی پھرتی سے پلٹ کر پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑلی اور پوری قوت سے اسے موڑتے ہوئے خود بھی گھوم گیا۔ اس طرح وہ میری پشت پر آگیا اور اس کا وہ بازو میرے کندھے کے اوپر سے آگے نکلا ہوا تھا۔ میں نے دو تین جھٹکے دیے تو تیغہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے سامنے گر گیا۔

میں ایک بار پھر اس کے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے نیچے جھکا۔ وہ پھر میرے اوپر سے قلابازی کھاتے ہوئے پشت کے بل گرا۔ اس مرتبہ میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

دوسری راہداری کے ایک کمرے سے میکھنا کی گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ فائر کی وہ آواز بھی پہلے اسی طرف سے آئی تھی۔ میں میکھنا کی مدد کو پہنچنا چاہتا تھا مگر دلیش مکھ مجھ سے لپٹ گیا۔

اس نے پیچھے سے مجھے گرفت میں لے لیا تھا۔ دونوں ہاتھ میرے سینے پر لپٹے ہوئے تھے اور وہ دباؤ بڑھا رہا تھا۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں اس کی گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس نے میری پسلیوں پر دباؤ بڑھانے کے ساتھ میرے کندھے پر دانت گاڑ دیے۔

وہ واقعی بھیڑیا تھا۔ اس کے دانت کندھے پر میرے گوشت میں گڑے جا رہے تھے۔ تکلیف کی شدت سے میں بلبلا اٹھا اور اسی لمحے میکھنا چیختے ہوئے اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

میکھنا شب خوابی کے لباس میں تھی جو پھٹ چکا تھا۔ اس کے پیٹ اور سینے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بری طرح۔۔۔ لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے ہال میں ایک کرسی کا سہارا لے کر سنبھلنے کی کوشش کی تو اسی وقت اس کے کمرے سے ایک لمبا تڑنگا آدمی برآمد ہوا۔ اس کے بائیں بازو سے خون بہہ رہا تھا

اور دائیں ہاتھ میں خنجر تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر درندوں سے بھی زیادہ درندگی تھی۔ وہ میگھنا پر حملہ آور ہوا۔ میگھنا نے چیختے ہوئے بچنے کی کوشش کی مگر خنجر بائیں شولڈر بلیڈ کے قریب اس کی پشت میں پیوست ہوگیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میں نے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور اپنی تکلیف بھول کر پوری قوت سے آگے جھکتا چلا گیا۔ دلیش مکھ مجھے سیدھا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ میں نیچے جھکتا رہا۔ وہ میرے اوپر سے الٹ کر میرے سامنے گرا۔ میں بڑی تیزی سے اٹھا۔ میرے بائیں کندھے میں شدید تکلیف تھی۔ دلیش مکھ نے شاید میری بوٹی ہی نوچ لی تھی مگر میں تکلیف کی پروا کیے بغیر اس شخص کی طرف لپکا جو میگھنا پر خنجر سے ایک اور وار کرنے جا رہا تھا۔ میگھنا پشت کے بل قالین پر پڑی چیخ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ سے اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس شخص کے کندھے پر سامنے کی طرف لگی۔ وہ کراہتے ہوئے پیچھے صوفے پر گرا اور صوفے سمیت الٹ گیا۔ میں نے سنبھل کر اس پر چھلانگ لگانے کی کوشش کی مگر دلیش مکھ نے پیچھے سے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں منہ کے بل میگھنا کے قریب گرا۔

اسی لمحے کمرا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اسی طرف دیکھا۔ بملا پستول پکڑے آگے کو دوڑ رہی تھی۔ اس نے گولی تو دلیش مکھ پر چلائی تھی مگر وہ بچ گیا تھا اور گولی ایک صوفے میں پیوست ہوگئی تھی۔

دلیش مکھ نے پستول کی پروا کیے بغیر حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بملا پر چھلانگ لگا دی اور اسے ساتھ لیتے ہوئے قالین پر گرا۔ پستول بملا کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ بری طرح چیخی تھی۔ دلیش مکھ اسے رگیدتے ہوئے راہداری تک لے گیا اور پھر وہ تیغہ اس کے ہاتھ میں آگیا جس سے پہلے اس نے مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ میں بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس لمحے بملا کی خوف ناک چیخ گونجی۔ دلیش مکھ کا تیغہ اس کے سینے میں پیوست ہوچکا تھا۔ دلیش مکھ نے دوسرا وار کرنے کے لیے ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن میں نے اسے ہاتھ نیچے لانے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے دلیش مکھ کا ہاتھ پوری قوت سے موڑ دیا۔ تیغہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے تیغے پر ... قبضہ کرلیا۔ اس وقت مجھ پر جنون سا طاری ہو رہا تھا۔ میں نے اس پر وار کرنے کے لیے تیغے والا ہاتھ اوپر اٹھایا لیکن اس سے پہلے کہ اپنے ارادے پر عمل کرتا میرے سر پر دھماکا سا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ اٹھے۔

میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر... میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

ہوش مجھے ٹیکو اسپتال میں آیا تھا۔

یہ اسپتال شہر کے جنوبی علاقے ترپور سوار میں واقع تھا۔ اس سے آگے شہر کی گنجان آبادی والا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اسپتال کے ساتھ ہی وزارت ہیلتھ کے دفاتر بھی تھے۔ بعض دیگر وزارتوں کے دفاتر بھی اسی علاقے میں تھے۔ دریائے بھاگ متی کے کنارے پر آباد یہ شہر کا سب سے اہم رہائشی علاقہ بھی سمجھا جاتا تھا۔ اس طرف شہر کے دولت مندوں کی رہائش تھی۔ بڑے بڑے بنگلے تھے۔ کشادہ سڑکیں تھیں اور زندگی کی ہر وہ سہولت موجود تھی جس کی ایسے پوش علاقوں میں توقع کی جاسکتی ہے۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی میری آنکھوں کے سامنے دیر تک دھند سی چھائی رہی۔ کانوں میں سنسناہٹ کی آوازیں محسوس ہو رہی تھیں۔ میں آنکھیں کھولے بے حس و حرکت پڑا رہا۔ چند منٹ بعد دھند چھٹنے لگی اور میرے حواس بجا ہونے لگے۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہوسکتی ہے اور میں یہاں کیسے پہنچا تھا۔ میں نے اپنے اطراف میں دیکھنے کے لیے سر کو حرکت دی تو دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ درد کی ٹیسیں میرے سر کے پچھلے حصے میں پھیلتی چلی گئیں۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہوگئی اور کراہ کی آواز سن کر ہی سفید براق یونیفارم میں ملبوس وہ لڑکی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آگئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ میں کہاں ہوں۔ سفید ڈریس والی وہ لڑکی نرس تھی اور میں اسپتال میں تھا۔

"مم... مجھے کیا ہوا ہے؟ کون لایا ہے مجھے یہاں؟" میں نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مجھے بولنے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی اور دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ میرا ایک ہاتھ بے اختیار سر پر پہنچ گیا اور اس وقت پتا چلا کہ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"تم اسپتال میں ہو۔" نرس نے کہا "چھ گھنٹوں بعد ہوش میں آئے ہو۔ آرام سے لیٹے رہو۔ میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

نرس تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں دیدے گھماتے ہوئے

اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ میرے سامنے والی دیوار بالکل سپاٹ تھی۔ دائیں طرف دروازہ تھا اور بائیں طرف ایک کشادہ کھڑکی تھی جس کے سامنے نیلے رنگ کا پردہ پھیلا ہوا تھا۔ پردے پر باہر سے روشنی پڑتے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو ایک بار پھر کراہ اٹھا۔ اس مرتبہ میرے بائیں کندھے پر بھی درد کی شدید لہریں اٹھی تھیں۔ میں نے آہستگی سے گردن گھما کر دیکھا۔ بائیں کندھے پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ پورے کندھے اور اس کے ساتھ گردن میں اوپر تک شدید کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اٹھنا چاہا تو دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ ترک کردیا اور بے حس و حرکت ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ پھیلتی جا رہی تھی اور پھر بتدریج میں پرسکون ہوتا چلا گیا۔

اور پھر میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میرے جسم پر پٹیاں کیوں بندھی ہوئی ہیں۔ میں زخمی کیسے ہوا تھا اور مجھے اسپتال کون لایا تھا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اچانک ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

میں شوبھا کو دلیش مکھ کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے اس کا پیچھا کرتے ہوئے نیپال پہنچا تھا۔ میرے ساتھ بملا بھی تھی اور اعظم خان نام کا بھارتی خفیہ پولیس کا ایک آفیسر اس سلسلے میں ہماری مدد کر رہا تھا۔ مجھے یاد آگیا کہ ایک موقع پر میں نے اعظم خان کی جان بچائی تھی اور اس احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے اس نے ہماری مدد کا وعدہ کیا تھا۔ وہی ہمیں سرحد پار کروا کر نیپال لایا تھا۔ نیپال کے ایک سرحدی قصبے میں بریندرا نام کے ایک اور آدمی سے ملاقات ہوئی تھی جس کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ بھی نیپال خفیہ پولیس کا آفیسر ہے۔

ہم کھٹمنڈو سے چند میل دور تھان کوٹ میں تھے۔ بریندرا ہمیں اپنی دوست میگھنا کے بنگلے پر چھوڑ کر اعظم خان کے ساتھ کھٹمنڈو چلا گیا تھا اور پھر اس رات ایک نسوانی چیخ اور فائر کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی تھی۔

اس کے بعد جیسے جیسے مجھے یاد آتا رہا، میری حالت غیر ہوتی گئی۔ اس لمبے تڑنگے شخص نے خنجروں کے وار کرکے میگھنا کو بری طرح گھائل کردیا تھا۔ میں اسے بچانے کے لیے دوڑا تو دلیش مکھ نے بملا پر تیغے سے حملہ کردیا تھا۔ میں نے دلیش مکھ سے تیغہ چھین لیا اور وہی تیغہ اس کے سینے میں پیوست کرنا چاہتا تھا کہ میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا اور ہوش آیا تو میں یہاں اس حال میں پڑا تھا۔

میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔ میگھنا اور بملا کا خیال آتے ہی میں تڑپ اٹھا "وہ دونوں کہاں ہیں۔ کس حال میں ہیں؟" میں اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر اٹھ گیا اور بیڈ سے اترنا چاہتا تھا کہ دروازہ کھلا اور تین افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو وہی نرس تھی جو کچھ دیر پہلے باہر گئی تھی۔ ایک ڈاکٹر تھا اور تیسرا آدمی... اعظم خان تھا مجھے بیڈ سے اترتے دیکھ کر نرس تیزی سے آگے بڑھی۔

"ارے ارے! کہاں جا رہے ہو۔ لیٹ جاؤ۔ آرام سے لیٹ جاؤ۔" وہ مجھے بانہوں سے پکڑ کر لٹانے کی کوشش کرنے لگی۔

ڈاکٹر اور اعظم خان بھی قریب آگئے۔ ڈاکٹر نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لٹا دیا۔

"آرام سے لیٹے رہو۔ زیادہ حرکت کرو گے تو زخم کھل جائے گا۔"

"وہ کہاں ہیں۔ کیسی ہیں وہ دونوں... بملا اور میگھنا۔" میں نے رک رک کر کہا۔

"وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ تم پریشان مت ہو۔ آرام سے لیٹے رہو۔" یہ بات ڈاکٹر کے بجائے اعظم خان نے کہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے آرام سے لیٹے رہنے کی تلقین کرنے لگا۔

ڈاکٹر نے کن انکھیوں سے اعظم کی طرف دیکھا اور میرے جسم کے مختلف حصوں کو ٹٹول ٹٹول کر پوچھنے لگا کہ مجھے کہاں تکلیف ہے۔ میرا تو پورا جسم دکھ رہا تھا۔ ہر جوڑ جیسے ہل کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر مجھ سے باتیں کرتا رہا پھر اس نے نرس کی طرف دیکھتے ہوئے نیپالی زبان میں کچھ کہا۔ نرس فوراً ہی باہر نکل گئی لیکن اس کی واپسی میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سرنج تھی جس میں زرد رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ اس نے میرے بازو میں انجکشن لگا دیا اور خالی سرنج بیڈ کے نیچے پڑے ہوئے ڈسٹ بن میں پھینک کر چارٹ میں کچھ اندراج کرنے لگی۔

ڈاکٹر چلا گیا۔ اعظم خان بیڈ کے قریب کھڑا مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے میرا ایک ہاتھ اب بھی اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ میرا سر بھاری ہونے لگا۔ جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اعظم خان کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور پھر میرے دماغ پر دھند سی طاری ہونے لگی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو اس وقت بھی دماغ پر بوجھل پن تھا۔ آنکھوں کے سامنے دھند سی پھیلی ہوئی تھی جو بتدریج چھٹتی چلی گئی اور کچھ دیر بعد میرے حواس کام کرنے لگے۔ میں نے آہستگی سے گردن گھما کر دیکھا۔ نرس کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی اور اس سے ذرا پیچھے کوچ پر اعظم خان سو رہا تھا۔ مجھے حرکت کرتے دیکھ کر نرس اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے اعظم خان کو بھی جگا دیا۔ اعظم خان جلدی سے اٹھ کر میرے قریب پہنچ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب۔۔۔ کیا محسوس کر رہے ہو؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بہتر ہوں۔" میں نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا "کندھے اور سر میں تکلیف ہے۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔"

"تمہیں ٹھیک ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔" نرس نے میرے اوپر جھکتے ہوئے کہا "تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ اگر زخم کھل گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"وہ۔۔۔ وہ دونوں۔۔۔"

"وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔" اعظم خان نے میری بات کاٹ دی "کافی یا چائے پیو گے؟"

"کافی پیوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اعظم خان نے نرس کو اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ اعظم کرسی کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔

"تمہیں بولنے میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے بولنے میں کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔" میں نے کہا۔

"پولیس تمہارا بیان لینا چاہتی ہے لیکن ہم نے فی الحال انہیں منع کر دیا ہے۔" اعظم خان نے کہا "پولیس والے اس وقت تک اس کمرے میں قدم نہیں رکھیں گے جب تک تم بیان دینے کے قابل نہیں ہو جاؤ گے لیکن اس سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ سب کچھ کیسے ہوا۔ وہ کون لوگ تھے؟"

"دلیش مکھ۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" اعظم کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "میں سمجھا تھا شاید۔۔۔"

"شاید کیا۔۔۔؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں یاد ہے کاٹھ گودام کے ہوٹل میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور تم نے میری جان بچائی تھی۔" اعظم نے کہا "دوسرا حملہ اس وقت ہوا تھا جب ہم کاٹھ گودام سے ٹنک پور کی طرف آ رہے تھے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں ایک اہم مشن پر نیپال آ رہا تھا اور یہ مشن انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا لیکن دشمنوں کو پتا چل گیا۔ وہ ہر صورت میں مجھے نیپال آنے سے روکنا چاہتے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ بریندرا بھی نیپال کی خفیہ پولیس میں انسپکٹر ہے۔ یہ مجھے لینے کے لیے ہی تیل پانی نامی اس سرحدی قصبے میں پہنچا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہم پر راستے میں پھر کوئی حملہ ہوگا لیکن ہم خیریت سے تھانکوٹ پہنچ گئے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ہم صبح پانچ بجے نارائن چور ڈسٹرکٹ میں واقع پولیس ہیڈ کوارٹر میں ایک خفیہ میٹنگ میں تھے کہ بریندرا کی دوست میگھنا کے بنگلے پر حملے کی اطلاع ملی۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ ہمارے دشمنوں کو کسی طرح پتا چل گیا ہے کہ میں اس بنگلے میں موجود ہوں۔ ہو سکتا ہے ان کے کسی مخبر نے ہمیں بنگلے میں داخل ہوتے تو دیکھا ہو لیکن مجھے اور بریندرا کو وہاں سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ حملہ دراصل ہم پر ہوا ہے لیکن تم نے ایک اور دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ کیا وہ واقعی دلیش مکھ کے آدمی تھے؟ میرا مطلب ہے تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟"

"دلیش مکھ خود ان کے ساتھ تھا۔ اس لیے غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کیسے پتا چلا کہ تم لوگ اس بنگلے میں موجود ہو۔ وہ تو خود تم سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔" اعظم خان نے کہا۔

"تان سین میں پنڈت رگھو ناتھ نے ہمیں بلف کیا تھا۔" میں نے جواب دیا "جب ہم نارائن مندر میں ان لوگوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور پنڈت رگھو ناتھ ہمیں ان کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا رہا تھا تو دلیش مکھ اور اس کے ساتھی مندر کے تہ خانے میں موجود تھے۔ ہم پنڈت رگھو ناتھ کے فریب میں آ گئے اور ان کی تلاش ترک کر دی۔

"صبح دلیش مکھ اور اس کے ساتھیوں نے ہمارا پیچھا شروع کر دیا اور انہیں ہمارے اس ٹھکانے کا پتا چل گیا۔ ان کا کوئی آدمی شاید بنگلے کی نگرانی کرتا رہا تھا۔ آدھی رات تک تو ہم میگھنا سے باتیں کرتے رہے تھے اور پھر سونے کے لیے چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ میگھنا کی چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔" میں

خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اعظم خان گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا "میگھنا بری طرح گھائل ہو چکی تھی۔" میں نے بالآخر کہنا شروع کیا "بملا بھی زخمی ہو گئی تھی۔ میں نے کسی اور کمرے سے فائر کی آواز بھی سنی تھی۔ میں دلیش مکھ پر تیغے سے وار کرنا چاہتا تھا کہ میرے سر پر زوردار ضرب لگی اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا لیکن۔۔۔ وہ دونوں۔۔۔ میگھنا اور بملا کہاں ہیں؟ تم لوگ بتاتے کیوں نہیں۔ وہ کس حال میں ہیں؟"

"میں تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔" اعظم خان گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "تم ایک باہمت اور دلیر آدمی۔۔۔"

"بات کو الجھانے کی کوشش مت کرو خان۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "جلدی بتاؤ وہ دونوں کیسی ہیں؟" اعظم جس انداز میں بات کر رہا تھا اس سے میرے ذہن میں طرح طرح کے خدشات جنم لینے لگے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"میگھنا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "تم خود بتا چکے ہو کہ وہ شدید زخمی تھی اور بملا۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میگھنا سے میری ملاقات اگرچہ صرف چند گھنٹوں کی تھی لیکن اس نے جس طرح ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا جس خلوص اور چاہت اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس کی موت کا سن کر میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا اور بملا کے بارے میں وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کہو مسٹر خان۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اپنی آواز بھی کسی گہرے کنوئیں کی تہ سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی "میں نے زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میں نے بدترین حالات کا مقابلہ کیا ہے۔ میں نے بہت کچھ سنا ہے اور بہت کچھ سننے کی ہمت رکھتا ہوں۔"

"بملا شدید زخمی ہے اور اس کی حالت تشویش ناک ہے۔" اعظم خان نے جواب دیا۔

میرے دانت بھنچ گئے۔ سر میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے۔ میری مٹھیاں بھی بھنچی ہوئی تھیں۔ اعظم خان نے آگے جھک کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"حوصلہ رکھو دوست۔" وہ بولا "ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق بملا کے لیے اگلے چوبیس گھنٹے بہت اہم ہیں۔ اگر اس نے یہ چوبیس گھنٹے گزار لیے تو اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ خدا سے دعا کرو۔ دل سے مانگی ہوئی دعا ضرور پوری ہوتی ہے۔"

میں آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ایک بات اور۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "بملا تمہیں ہمت سنگھ کہہ کر پکارتی ہے لیکن میں تمہیں کس نام سے پکاروں؟"

"کیا مطلب؟" میں اچھل پڑا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں دوڑ گئی تھی۔

"ڈاکٹر پربھاکر نے تمہیں چیک کرنے کے لیے تمہارے کپڑے اتار دیے تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ بات صرف ڈاکٹر پربھاکر، بریندرا اور مجھے معلوم ہے کہ تم مسلمان ہو اور۔۔۔" اسی لمحے دروازہ کھلا اور نرس ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اعظم خان نے فوراً ہی بات بدل دی "اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔" وہ کہہ رہا تھا "ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ بریندرا کو جیسے ہی مقامی پولیس اسٹیشن کی طرف سے اطلاع ملی، ہم ہیڈ کوارٹر سے بھاگ کھڑے ہوئے۔" وہ خاموش ہو کر نرس کی طرف دیکھنے لگا جس نے ٹرے میز پر رکھ دی تھی اور بیڈ کے پائنتی کی طرف پہنچ کر وہ چرخی گھمانے لگی تھی جس سے بیڈ کا سرہانے والا حصہ اوپر اٹھ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیڈ کو مزید اوپر اٹھانے سے روک دیا۔ نرس نے میرے قریب آ کر تکیہ میرے پیچھے درست کر کے رکھ دیا اور ٹرالی ٹیبل کھینچ کر بیڈ کی طرف کر دی۔ ٹرالی کا ٹیبل والا حصہ بیڈ کے اوپر میرے سینے کے برابر آ گیا۔ نرس نے کافی کا ایک کپ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا اعظم خان کو تھما دیا۔

"میں اپنے ہاتھ سے آپ کو کافی پلا دوں۔" وہ میرے اوپر جھکتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں خود پی لوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

نرس تیسرا کپ لے کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

دلیش مکھ نے میرے بائیں کندھے پر دانت گاڑے تھے اور شاید وہاں سے بوٹی نوچ لی تھی۔ میرے کندھے، گردن اور بائیں بازو میں تکلیف تھی۔ یہ بازو تو تختے کی طرح اکڑا ہوا تھا۔ دایاں بازو البتہ ٹھیک تھا۔ میں نے کپ اٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے۔ گرم کافی سے مجھے خاصا سکون ملا۔

اعظم خان بھی کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بتا رہا تھا۔

"مقامی پولیس کو میگھنا کے کسی پڑوسی نے فون پر فائرنگ اور چیخوں کے سنے جانے کی اطلاع دی تھی۔" وہ کہہ رہا تھا "پولیس پہنچی تو دو آدمی وہاں سے فرار ہو گئے۔ البتہ ان

کا ایک ساتھی زخمی حالت میں پکڑا گیا۔ اسے گولی لگی تھی۔ پچھلے کمرے میں میگھنا کے ملازم کی لاش بھی ملی اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ میگھنا' بملا اور تمہیں فوری طور پر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ میگھنا شدید زخمی تھی اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا تھا۔ پولیس ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کرپائی کہ یہ ڈکیتی کی واردات تھی یا کوئی اور معاملہ تھا۔ بریندرا کی وجہ سے پولیس والے میگھنا کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ انہیں چند ایسے دولت مندوں پر شبہ ہے جو ماضی میں اسے پریشان کرتے رہے ہیں لیکن ابھی تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ ہم پولیس کو بتانا نہیں چاہتے تھے کہ یہ حملہ مجھ پر یا بریندرا پر کیا گیا ہوگا۔"

"کیا اس آدمی نے کچھ نہیں بتایا جسے زخمی حالت میں گرفتار کیا گیا تھا؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"وہ بھی اسپتال پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ختم ہوگیا تھا۔" اعظم خان نے جواب دیا "اس کی جیب سے ایسی کوئی چیز نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ہوسکتی لہٰذا یہ معاملہ الجھا ہی رہا لیکن اب تمہاری باتوں سے کچھ وضاحت ہوگئی ہے۔"

"اور میرا خیال ہے کہ وہ لمبا تڑنگا آدمی' جس نے میگھنا پر خنجر سے وار کیے تھے' روی تھا۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "دلیش کھہ نے بتایا تھا کہ وہ مجھے تان سین ہی میں ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن روی نے اسے کوئی کارروائی کرنے سے منع کردیا کیونکہ اس کے خیال میں کھٹمنڈو میں کوئی کارروائی کرنا زیادہ آسان ہوتا اور یہاں پہلا موقع ملتے ہی وہ اپنی کارروائی کرگزرے۔ مجھے میگھنا کی موت کا بہت افسوس ہے۔ وہ بے چاری ہماری وجہ سے ماری گئی۔ نہ ہم اس کے بنگلے پر آتے اور نہ ہی۔۔۔"

"موت کا ایک دن مقرر ہے۔" اعظم خان نے میری بات کاٹ دی "بہرحال' تمہاری باتوں سے ایک بات واضح ہوگئی ہے کہ حملہ آور کون تھے اور حملے کا مقصد کیا تھا۔ اس سے پولیس کو اپنی کارروائی میں آسانی ہوگی۔"

"بریندرا کا کیا حال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہت اپ سیٹ ہے۔" اعظم خان نے جواب دیا "میگھنا کی موت نے اسے گہرا دکھ پہنچایا ہے۔ اسے اس بات کا بھی صدمہ ہے کہ اس کے مہمان بھی حملہ آوروں کی کارروائی سے محفوظ نہیں رہے۔ یہ نیپالی بڑے مہمان نواز لوگ ہیں۔ مہمانوں کو بھگوان کا اوتار سمجھتے ہیں۔ ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کی حفاظت کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ مہمانوں کی توہین تو وہ برداشت کر ہی نہیں سکتے اور یہاں تو معاملہ توہین سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ جب تک حملہ آوروں کو تلاش کرکے موت کے گھاٹ نہیں اتار دے گا' چین سے نہیں بیٹھے گا اور تمہارے بیان کے بعد اسے حملہ آوروں کی تلاش میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑے گی۔ روی کو وہ آسانی سے تلاش کرلے گا۔"

ابھی ہم باتیں کررہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور بریندرا ڈاکٹر پربھاکر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ نرس جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے میرے سامنے سے کافی کا خالی کپ اٹھالیا۔

بریندرا کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا جس کے ساتھ "گیٹ ویل سُون" کا کارڈ بھی لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کے حوصلے کی داد دینی پڑی۔ وہ اپنی ایک عزیز ترین ہستی کا کریا کرم کرکے آیا تھا اور مجھے پھولوں کا گلدستہ پیش کررہا تھا۔

بریندرا دوسری کرسی گھسیٹ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر بیڈ کے دوسری طرف آگیا اور میرے کندھے کی پٹی کھولنے لگا اور تب یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ مجھے اسپتال میں آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ جب مجھے یہاں لایا گیا تھا تو میں بے ہوش تھا۔ مجھے اٹھارہ گھنٹوں بعد ہوش آیا تھا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد پھر بے ہوش ہوگیا تھا اور چھ گھنٹوں بعد آنکھ کھلی تھی اور یہی وہ موقع تھا جب میں نے بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر جانے کی کوشش کی تھی اور اس وقت مجھے ویلیم کا انجکشن لگا دیا گیا تھا۔

کندھے کی پٹی کھول کر ڈاکٹر نے زخم کا معائنہ کیا۔ میں نے گردن کے پٹھوں اور بازو میں کھنچاؤ کی شکایت کی۔ ڈاکٹر نے دوا وغیرہ لگا کر نئی ڈریسنگ کردی اور سر کی پٹی کھولنے لگا۔

میرے سر پر گیارہ ٹانکے لگے تھے۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق مجھے کئی روز اسپتال میں رہنا تھا۔ مجھے زیادہ بولنے سے بھی منع کردیا گیا تھا۔ بملا بھی اسی اسپتال کے کسی اور کمرے میں تھی۔ میں نے اس سے ملنے کی اجازت چاہی تو ڈاکٹر نے منع کردیا۔

"آج نہیں۔" اس نے کہا "تم کل شام کو اسے دیکھ سکو گے۔"

ڈاکٹر کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد نرس بھی باہر چلی گئی تھی اور تب اعظم خان بریندرا کو دلیش کھہ کے بارے میں بتانے لگا۔

"اوہ!" اس نے بھی حیرت کا اظہار کیا "اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ پنڈت رگھوناتھ کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر وہ ہمیں دلیش کھہ وغیرہ کے بارے میں سچ بتا دیتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔ یہ ہندو پنڈت نہایت مکار ہوتے ہیں۔ مجھے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا تجربہ ہوچکا ہے۔ اب مجھے افسوس ہورہا ہے کہ میں نے اس کی بات کا یقین کیوں کرلیا تھا۔ بہرحال' اب اس کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اگر تم بہتر محسوس کررہے ہو تو انسپکٹر چندر بھان کو بلالیا جائے۔ وہ تمہارا بیان لینا چاہتا ہے تاکہ اس کیس کی باقاعدہ تفتیش شروع کی جاسکے۔"

میں نے اثبات میں سرہلا دیا اور اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد انسپکٹر چندر بھان میرے کمرے میں موجود تھا۔ مجھے ایک بار پھر شروع سے اس واقعے کی تفصیل دہرانی پڑی۔ انسپکٹر چندر بھان بیچ میں سوالات بھی کرتا رہا۔

بیان میں میرا نام ہمت سنگھ ہی لکھا گیا تھا اور میں نے یہ بھی بتا دیا کہ دلیش کھہ ہندوستان سے ایک عورت کو اغوا کرکے لایا ہے جسے چھڑانے کے لیے میں اس کا پیچھا کررہا ہوں۔ میرے بیان کا یہ حصہ آف دی ریکارڈ رکھا گیا تھا۔

میں نے میگھنا کو قتل کرنے والے لمبے تڑنگے جس آدمی کا حلیہ بتایا تھا وہ روی تھا۔ دلیش کھہ کا دوست جس کے پاس وہ ہندوستان سے بھاگ کر پناہ لینے آیا تھا۔

بریندرا اور اعظم خان بھی انسپکٹر چندر بھان کے ساتھ ہی چلے گئے تھے۔ نرس میرے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ وہ مجھے کھٹمنڈو کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

نرس کی عمر چوبیس پچیس سال رہی ہوگی۔ اس کا قد لانبا' رنگت کسی قدر سانولی لیکن چہرے کے نقوش اور جسم کی ساخت پرکشش تھی۔ وہ بدھ کی پیروکار تھی۔

میں تین دن سے اسپتال میں تھا اور ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق میرا زیادہ وقت بے ہوشی میں ہی گزرا تھا اور اتفاق سے جب بھی میں ہوش میں آیا تھا' میں نے مایا متی نامی اس نرس کو دیکھا تھا حالانکہ رات کو دوسری نرس ڈیوٹی پر آجایا کرتی تھی لیکن میں نے اسے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

اگلے روز شام کو مجھے بملا سے ملاقات کی اجازت دے دی گئی۔ اس وقت مایا متی ہی کی ڈیوٹی تھی۔ وہ مجھے وہیل چیئر پر بٹھا کر کمرے سے باہر لائی تو دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے دو مسلح کانسٹیبل بھی ہمارے پیچھے چلنے لگے۔

اسپتال کی یہ راہداری کافی کشادہ اور طویل تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسپتال کتنا بڑا ہوگا۔ ہم ایک دوسری راہداری میں آگئے جس کے اختتام پر بہت کشادہ لابی تھی۔ اس لابی میں اسپتال کا استقبالیہ کاؤنٹر بھی تھا۔ بڑے سلیقے سے کرسیاں اور بینچ رکھے ہوئے تھے جن پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے کنکریٹ کے گملوں میں پودے لگے ہوئے تھے۔

لابی میں ایک طرف اوپر جانے کے لیے کشادہ زینہ تھا اور اس کے ساتھ ہی تین لفٹیں تھیں۔ مایا متی ایک نمبر لفٹ کے سامنے رک گئی۔ بٹن دباتے ہی دروازہ کھل گیا اور وہ وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے اندر لے آئی۔ دونوں پولیس والے بھی اندر آگئے۔

لفٹ بہت کشادہ تھی۔ یہ لفٹ دراصل وہیل چیئرز اور اسٹریچر پر مریضوں کو اوپر لانے لے جانے کے لیے مخصوص تھی جبکہ عام لوگوں کے استعمال کے لیے دوسری دو لفٹیں تھیں۔

تیسری منزل پر ہم لفٹ سے باہر آگئے۔ کشادہ راہداری میں نرسوں' ڈاکٹروں اور کچھ دوسرے لوگوں کی آمدورفت تھی۔ چند گز آگے بائیں طرف کی راہداری کے آخری دروازے کے ساتھ دو مسلح کانسٹیبل کھڑے تھے۔ نرس کے اشارے پر ایک کانسٹیبل نے دروازہ کھول دیا اور نرس وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے اندر آگئی۔ ہمارے ساتھ آنے والے کانسٹیبل باہر ہی رک گئے تھے۔

سامنے بیڈ پر بملا پڑی تھی۔ چہرے کے علاوہ اس کا پورا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ زرد ہورہا تھا۔ بیڈ کے قریب ہی ایک نرس کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر وہ فوراً ہی اٹھ گئی۔

مایا متی نے وہیل چیئر بیڈ کے قریب کردی۔ آہٹ سن کر بملا نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ہاتھ چادر سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیسے ہو ہمت سنگھ۔" اس کے منہ سے کمزور سی آواز نکلی۔

میں کوئی جواب دینے کے بجائے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بملا کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔

مجھے صرف پندرہ منٹ وہاں رکنے دیا گیا تھا اور پھر مایا متی میری کرسی دھکیلتے ہوئے مجھے باہر لے آئی۔

اس رات میں نے دوسری نرس کو پہلی مرتبہ اپنے کمرے میں دیکھا۔ وہ بوٹے سے قد کی گوری چٹی رنگت کی مالک دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ وہ بھی بدھ مت کی پیروکار تھی۔

اس روز نہ تو اعظم خان آیا اور نہ ہی بریندرا کی صورت دکھائی دی۔ اگلے دن بھی ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ تیسرے روز صبح جبکہ نرس مایا متی مجھے ناشتا کروا رہی تھی، انسپکٹر اعظم خان دروازے میں نمودار ہوا۔ وہ بہت تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ آنکھوں میں بھی سرخی تھی جیسے رات جاگ کر گزاری ہو۔ نرس نے فوراً ہی اسے بھی چائے بنا کر دے دی۔

"ان کا کچھ پتا چلا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پولیس کارروائی کر رہی ہے۔" اعظم خان نے جواب دیا "روی تو شہر ہی میں کسی جگہ روپوش ہے لیکن ویش مکھ کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ بختاپور کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے۔ بہت جلد ان کا سراغ لگا لیا جائے گا۔"

"بختاپور کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کھٹمنڈو سے چند کلومیٹر آگے ایک دوسرا شہر ہے۔" اعظم خان نے جواب دیا "تم اطمینان رکھو۔ وہ لوگ بچ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ انسپکٹر چندر بھان ان کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ میں اور انسپکٹر بریندرا اس طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکے کیونکہ دوسری طرف ہمارا کھیل بھی شروع ہو چکا ہے۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا لیکن میں نے کریدنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اعظم خان تقریباً ایک گھنٹے تک میرے پاس رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس دوران میں بریندرا صرف ایک مرتبہ چند منٹ کے لیے آیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے معاملے میں ابھی کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی تھی کیونکہ وہ اپنے معاملات میں الجھ کر رہ گئے تھے اور ظاہر ہے میں ان پر دباؤ نہیں ڈال سکتا تھا۔ ان کی یہ مہربانی کیا کم تھی کہ یہاں مجھے ہر طرح کا آرام اور تحفظ حاصل تھا۔ اگر اعظم خان سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید میرے لیے نیپال کی سرحد پار کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ نیپال میں آتے ہی اعظم خان کے توسط سے بریندرا سے ملاقات ہو گئی تھی اور میں ان بہت سی مشکلوں سے بچ گیا تھا جو بغیر کاغذات کے کسی ملک میں داخل ہونے کی صورت میں پیش آسکتی ہیں۔

اس سے اگلے روز نرس مایا متی ڈیوٹی پر آئی تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور آنکھوں میں وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔ ان ہنگاموں میں دو آدمی مارے گئے ہیں اور کئی زخمی ہوئے ہیں جنہیں شہر کے مختلف اسپتالوں میں داخل کرایا گیا ہے۔

مایا متی کے کہنے کے مطابق یہ ہنگامے کھٹمنڈو میں بھارتی سفیر کے اس بیان کے بعد شروع ہوئے تھے جس میں نیپالی عوام کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کیے تھے اور عوام احتجاج کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ بھارتی سفیر کو فوراً ملک سے نکال دیا جائے۔

پولیس کی بھاری نفری نے بھارتی سفارت خانے اور سفیر کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لے لیا تھا لیکن عوام بپھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے سفارت خانے کی عمارت پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ پولیس نے ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پہلے لاٹھی چارج کیا اور پھر گولی چلا دی جس سے دو آدمی مارے گئے اور اس طرح ہنگامے پورے شہر میں پھیل گئے جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے ہیں۔

ہنگامے دو دن تک جاری رہے۔ نیپال کی حکومت نے بھارتی سفیر کے متنازعہ بیان پر باقاعدہ احتجاج کیا تھا اور سفیر کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ملک چھوڑنے کا حکم بھی دے دیا گیا تھا لیکن یہاں بھی ہندو حکمرانوں کی ذہنیت کام کر گئی۔ سارا الزام پریس پر تھوپ دیا گیا کہ بھارتی سفیر کے بیان کو غلط رنگ میں اور توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا تھا لیکن سفیر یا بھارتی حکومت کی طرف سے نہ تو معذرت کی گئی اور نہ ہی بھارتی سفیر کو واپس بلایا گیا۔

ان دو دنوں میں بریندرا یا اعظم خان سے میری ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے اور اس دوران میں اسپتال نہیں آئے تھے۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ میرے زخم مندمل ہو رہے تھے لیکن بملا کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ میں دن میں کم از کم ایک مرتبہ بملا سے ملنے کے لیے اس کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے رونا آتا تھا۔ اس کے زخم میں پس پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر اگرچہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا لیکن میں مطمئن نہیں تھا لیکن ظاہر ہے کہ میں کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

تین دن مزید گزر گئے۔ میری حالت کافی بہتر تھی۔ کندھے کا زخم ٹھیک ہو چکا تھا اور پٹی کھول دی گئی تھی۔ البتہ سر کے زخم میں تھوڑی بہت تکلیف تھی اور ڈاکٹر کے [illegible]

فراہم کی ہیں۔"

"ہو سکتا ہے تمہارا بیان درست ہو۔" میں نے اس کی بات سے اختلاف نہیں کیا۔

"ویسے ایک بات بتاؤں۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی "تم اسپتال میں تھے تو اس وقت بھی میں نے یقین نہیں کیا تھا کہ تمہارا نام ہمت سنگھ ہو سکتا ہے۔"

"کیوں۔ یقین نہ کرنے کی وجہ؟" میں نے اسے گھورا۔

"جب تمہیں اسپتال لایا گیا تھا تو تم بے ہوش تھے۔ تمہارے شریر پر زخم چیک کرنے کے لیے ڈاکٹر پربھاکر نے تمہارا معائنہ کیا تھا تو میں بھی اس کے ساتھ تھی۔" اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ!" میں نے جھینپ کر نظریں جھکا لیں۔

اور پھر میں نے موضوع بدل دیا۔ ہم ایک بار پھر اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے حوالے سے گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ اس خبر میں مایا متی یا رتنا کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ پولیس نے گمنام کال کو ہی معلومات کا ذریعہ سمجھ لیا تھا اور سام سنگ نے فون پر پولیس کو جو کچھ بتایا تھا وہی پریس کو جاری کر دیا گیا تھا۔ بہرحال، صورت حال خواہ کچھ بھی ہو احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم دو چار روز تک روپوش ہی رہیں۔ سام سنگ نے رتنا یا مایا متی کا نام اس لیے نہیں لیا تھا کہ شاید اس طرح وہ مایا متی کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ دنیا کے خطرناک ترین انسان تھے۔ معمولی سے شک پر بھی کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ وہ یقیناً مایا متی کو دھوکے میں رکھ کر اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے تاکہ اس کو گرفت میں لے کر میرے بارے میں معلوم کر سکیں۔

تین دن گزر گئے۔ مایا متی نے تو گھر سے قدم تک باہر نہیں نکالا تھا البتہ میں صبح ڈھابے پر جا کر اخبار اور ضرورت کی چیزیں لے آتا۔ پہلے دن کے بعد اخبار میں اس واقعے کے حوالے سے کوئی خبر نہیں چھپی تھی۔

اس دوران میں میری ناک اور جبڑے کی سوجن بہت کم ہو گئی تھی اور مایا متی بھی اپنے آپ کو پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ دن میں کم از کم تین مرتبہ مرہم سے اس کی مالش ہوتی۔ وہ نرس تھی۔ اس کے گھر میں ایسی ادویات موجود تھیں جو ایسے موقعوں پر کام آسکتی تھیں۔

میں نے شیو بھی بڑھانا شروع کر دیا تھا تاکہ میرے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی آسکے۔ ان تین دنوں کے دوران میں مایا متی اپنی ایک نرس دوست کو فون کر کے بملا کے بارے میں معلوم کرتی رہی تھی۔ بملا میرے لیے پریشان تھی لیکن میرے لیے یہ اطلاع اطمینان بخش تھی کہ اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی۔

پانچویں روز پھر ایک چھوٹی سی خبر اخبار میں شائع ہوئی۔ اس خبر کے مطابق شہر کے دو گروہوں میں تصادم ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی مارا گیا تھا جس کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ وہ بنکاک کے بدمعاش اور منشیات کے اسمگلر وجدان کا ساتھی ہے۔ اس روز اخبار کا اداریہ بھی اس خبر کے حوالے سے تھا۔ اداریے میں کھٹمنڈو میں وجدان جیسے شخص کی موجودگی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اس شخص کو تلاش کر کے اس کی سرگرمیوں کا قلع قمع کیا جائے۔

صورت حال خاصی سنگین ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے پھنسانے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی۔ اس رات سام سنگ اور یشودھر نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ یشودھر سام سنگ کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور اس کا قتل میرے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا اور اب دو گروہوں کے تصادم میں ایک آدمی مارا گیا تھا جسے میرا ساتھی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور پولیس اور عوام کو میرے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ پولیس میرے پیچھے لگ جائے اور میں یہاں نکلنے نہ پاؤں۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سام سنگ یہاں اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی آئے ہوں گے اور یہاں بھی اپنے ہی قبیل کے لوگوں سے ان کے گہرے رابطے تھے۔ رتنا کے بارے میں مایا متی بتا چکی تھی کہ وہ ناگ پال کے لیے کام کرتی ہے۔ ناگ پال اسے اپنے آدمیوں کی دل جوئی اور مہمانوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی تھی کہ سام سنگ کا ناگ پال سے رابطہ تھا اور دوسری طرف روی سے بھی اس کا رابطہ تھا۔ اس رات مجھے ریسٹورنٹ میں دیکھ کر وہ فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا تھا اور ہو سکتا ہے اس نے ٹیلی فون کر کے یشودھر کو وہاں بلا لیا ہو یا ممکن ہے یشودھر اسی علاقے میں کہیں موجود ہو اور جب میں مایا متی کے ساتھ ریسٹورنٹ سے نکلا تو ان دونوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی اور اب ایک اور قتل۔۔۔

میں نے اعظم خان اور بریندرا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ

کے مطابق مجھے اب اسپتال میں رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔

ڈاکٹر کی اطلاع میرے لیے خاصی تشویش ناک تھی کہ مجھے اسپتال سے ڈسچارج کیا جارہا تھا۔ بریندرا اور اعظم خان کا تین دن سے کچھ پتا نہیں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسپتال سے نکلنے کے بعد کہاں جاؤں گا اور ببلا کا کیا ہوگا۔

میں پورا دن اس پریشانی میں مبتلا رہا اور پھر اسی شام اعظم خان اور بریندرا بھی آگئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ڈاکٹر مجھے ڈسچارج کررہا ہے تو بریندرا نے کہا۔

"میرے خیال میں اب تمہیں اسپتال میں پڑے رہنے کی ضرورت تو نہیں۔ آرام تو تم گھر پر بھی کرسکتے ہو۔ ڈاکٹر کی طرف سے مجھے اطلاع مل گئی تھی اسی لیے تو میں آیا ہوں کہ تمہیں گھر بھیجنے کا بندوبست کیا جاسکے۔"

"کیا اسی بنگلے میں جہاں۔۔۔"

"نہیں۔ وہ جگہ اب تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔" بریندرا نے میری بات کاٹ دی "تمہارے لیے دوسری جگہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔ وہاں تم کسی مداخلت کے بغیر آرام بھی کرسکو گے اور آزادی سے تھوڑا بہت گھوم پھر بھی سکو گے۔"

"اور ببلا کا کیا ہوگا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس کے لیے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" بریندرا نے جواب دیا "وہ ابھی چند روز اسپتال ہی میں رہے گی اور پھر اسے بھی تمہارے پاس بھیج دیا جائے گا۔"

"اور ان کا کچھ پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہم اپنی داخلی مصروفیات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہیں دے سکے لیکن مجھے امید ہے کہ اب چند روز میں ان کا بھی سراغ لگالیا جائے گا۔" بریندرا نے کہا "میرے آدمی آج رات کسی وقت تمہیں یہاں سے لے جائیں گے۔ وہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔"

وہ دونوں تقریباً آدھے گھنٹے تک میرے پاس بیٹھے رہے اور پھر ہاتھ ملا کر رخصت ہوگئے۔

رات گیارہ بجے ایک پستہ قامت آدمی کانسٹیبل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے جوگندر کے نام سے اپنا تعارف کراتے ہوئے ایک تھیلا میری طرف بڑھادیا۔

"باتھ روم میں جاکر کپڑے بدل لو۔ ہم تھوڑی دیر میں یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

میں کچھ کہے بغیر تھیلا لے کر ملحقہ باتھ روم میں گھس گیا۔ تھیلے میں تنگ پائنچے کا سفید پاجامہ' کھدر کا سفید کرتہ اور کالا ہاف کوٹ تھا۔ میں نے اسپتال کے کپڑے اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیے اور یہ کپڑے پہن کر باہر آگیا۔ جوگندر کے پاس پلاسٹک کے ایک تھیلے میں ہوائی چپل بھی تھے جو اس نے میرے سامنے رکھ دیے۔

میں نے اسپتال سے رخصت ہونے سے پہلے ببلا سے ملنے کی خواہش کی تو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم لفٹ کے ذریعے تیسری منزل پر آگئے۔

ببلا جاگ رہی تھی۔ نرس کرسی پر بیٹھی اس سے باتیں کررہی تھی۔ میں دس منٹ سے زیادہ وہاں نہیں رکا۔ ببلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے تسلی دیتا رہا اور پھر جوگندر کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔

بہت بڑا اسپتال تھا۔ آمدورفت کے لیے اس کے دو بڑے گیٹ تھے لیکن جوگندر کسی گیٹ کی طرف جانے کے بجائے راہداریوں میں گھومتے ہوئے اسپتال کی پچھلی طرف آگیا۔ وہ دونوں کانسٹیبل بھی ہمارے ساتھ تھے جو ہر وقت میرے کمرے کے دروازے پر موجود رہتے تھے۔

اس طرف ایک چھوٹا گیٹ تھا۔ اس گیٹ پر بھی ایک دربان موجود تھا لیکن اس نے ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم گیٹ سے باہر آگئے۔

اس طرف تقریباً تیس فٹ چوڑی سڑک تھی جس کے دوسری طرف بہت بڑا پارک تھا لیکن اس وقت پارک تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سڑک پر بھی روشنی کا کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ بجلی کے کھمبے تو موجود تھے لیکن بیشتر بلب یا تو ٹوٹ چکے تھے یا فیوز ہوگئے تھے۔ بائیں طرف بہت دور کسی کھمبے پر ایک بلب ٹمٹماتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔

گیٹ سے نکلتے ہی سڑک پر بائیں طرف سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ جوگندر نے آگے بڑھ کر کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ میرے بیٹھنے کے بعد اس نے پولیس والوں کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک آدمی پہلے ہی سے موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کردیا اور گاڑی حرکت میں آگئی۔ نہ تو ڈرائیور نے جوگندر سے کچھ پوچھا تھا اور نہ ہی جوگندر نے ڈرائیور کو کچھ بتانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ڈرائیور جانتا تھا اسے کہاں جانا ہے۔

گاڑی دو تین سڑکوں پر گھومنے کے بعد پیکالی بھیرو امندر

کے قریب سے گزر کر تریپور اور ٹیکو ڈسٹرکٹ کو ملانے والی مین روڈ پر نکل آئی۔ میرے ساتھ بیٹھا ہوا جوگندر مجھے بتاتا جارہا تھا کہ ہم کن کن علاقوں سے گزر رہے ہیں۔ وہ سڑکوں اور راستے میں پڑنے والی بڑی بڑی عمارتوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کررہا تھا۔

دریائے بھاگ متی پار کرکے ہم للت پور LALIT PUR کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ یہ کشادہ سڑک چوک سے ہوتی ہوئی سیدھی قدیم شاہی محل اور دربار اسکوائر کی طرف چلی جاتی تھی۔ اگرچہ رات کے بارہ بجنے والے تھے مگر اس علاقے میں خاصی رونق تھی۔ لگتا تھا ابھی شام اتری ہو۔ تمام ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔

ہماری کار دربار اسکوائر سے گزر کر مہابدھا عبادت گاہ کی طرف نکل گئی اور اس سے تقریباً نصف میل آگے رنگ روڈ کے قریب ایک بنگلے کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور کو صرف ایک مرتبہ ہارن بجانے کی ضرورت پیش آئی تھی۔ گیٹ کھل گیا اور وہ کار کو اندر لیتا چلا گیا۔

یہ بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی پہلے سے موجود تھا۔ جوگندر نے سنگھا نامی اس شخص کو میرے بارے میں ہدایات دیں اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"سنگھا آپ کا خادم ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف اس سے کہہ دیں۔"

"شکریہ۔" میں نے کہا "فی الحال تو میں کافی کی طلب محسوس کررہا ہوں۔"

جوگندر نے سنگھا کی طرف رخ کرکے صرف میرے لیے ایک کپ کافی بنانے کو کہا اور پھر مجھے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آیئے۔ میں آپ کو کمرا دکھادوں۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس بنگلے میں تین بیڈ رومز تھے۔ ہر بیڈ روم ضروری فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وہ مجھے اس بیڈ روم میں لے آیا جو دوسرے کمروں سے قدرے بڑا تھا اور اس میں ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ ایک کرسی پر اپنا بیگ اور کرسی کے نیچے اپنے جوگرز اور ببلا کے سینڈل دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ہمارا یہ سامان پہلے ہی یہاں پہنچا دیا گیا تھا اور یہ پہلے ہی سے طے تھا کہ اسپتال سے فارغ ہوکر ہمیں یہیں لایا جائے گا اور اسی لیے ہمارے لیے ڈبل بیڈ والے کمرے کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن فی الحال میں اکیلا ہی یہاں آیا تھا۔

ہم دوبارہ لاؤنج میں آگئے۔

"ٹھیک ہے سر۔" جوگندر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ کافی پی کر آرام کیجئے۔ میں چلتا ہوں اور یہ۔۔۔" اس نے جیب سے کاغذ کا ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھادیا "یہ وہ ادویات ہیں جو آپ کو اسپتال میں استعمال کرائی جارہی تھیں۔ آپ ان کا استعمال جاری رکھیے۔"

میں نے لفافہ اس سے لے لیا۔ جوگندر نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا۔ وہ سلام کرکے رخصت ہوگیا اور ٹھیک اسی وقت سنگھا کچن سے برآمد ہوا تھا۔ اس نے کافی کا کپ سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ جوگندر کی گاڑی جیسے ہی باہر نکلی وہ گیٹ بند کرکے اندر آگیا۔

میں کمرے میں کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ فرش پر سینتھیٹک قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر بھی مناسب ہی تھا۔ ایک طرف چھوٹی میز پر ٹیلی فون بھی رکھا ہوا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا اور کپ اٹھا کر ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔

میرے لیے صورت حال نہایت سنگین تھی۔ میں خود زخمی تھا اور ببلا اسپتال میں پڑی تھی جس کے بارے میں مجھے زیادہ تشویش تھی۔ ہم شوبھا کو دیش مکھ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے اور ہمارے آتے ہی دو بے گناہ مارے گئے تھے۔ شاید میرا سایہ ہی منحوس تھا۔ جہاں جاتا تھا قتل و غارت کا بازار گرم ہوجاتا تھا۔ یہاں آنے کے پہلے ہی دن دو قتل ہوگئے تھے۔ اب آگے پتا نہیں کیا ہونے والا تھا۔

یہاں اگرچہ مجھے اعظم خان اور بریندرا جیسے بااثر پولیس افسروں کی حمایت حاصل تھی لیکن میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کررہا تھا۔ میں اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا عادی نہیں تھا لیکن مجبوری یہ تھی کہ میں خود بھی زخمی تھا اور ببلا بھی' بریندرا اور اعظم خان اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ لوگ ابھی تک دیش مکھ اور روی کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔ دس بارہ روز ہوچکے تھے اور میں شوبھا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔

میں تقریباً ایک گھنٹے تک لاؤنج میں بیٹھا انہی سوچوں میں غلطاں رہا۔ میں نے ایک دو مرتبہ نوٹ کیا تھا کہ سنگھا ایک طرف قالین پر بیٹھا بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اچانک ہی خیال آگیا کہ وہ میری ہی وجہ سے یہاں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر کمرے میں آگیا۔ سنگھا بھی میرے پیچھے ہی آیا تھا۔

"میری وجہ سے تم بھی جاگ رہے ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے تو نیند نہیں آ رہی۔ تم جاکر سوجاؤ۔"

سنگھا کچھ کہے بغیر بیڈ کے سامنے والی دیوار کے قریب رک گیا۔ اس دیوار میں تین مربع فٹ کی ایک الماری بنی ہوئی تھی جس کے پٹ بند تھے۔ اس نے الماری کے دائیں طرف والے پینل پر لگا ہوا سفید رنگ کا ایک بٹن دبا دیا۔ الماری کے دونوں پٹ اسپلٹ ونڈو کی طرح اطراف میں سمٹ گئے۔

اندر ایک ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے ایک خانے میں کئی ویڈیو کیسٹ بھی رکھے ہوئے تھے۔ سنگھا نے ٹی وی کی سائیڈ میں رکھا ہوا ریموٹ کنٹرول اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔

"نیند نہیں آ رہی تو ٹی وی سے دل بہلائیے۔ اس وقت چینل نمبر سات پر بڑے اچھے پروگرام آتے ہیں۔ اگر اس دوران میں کسی چیز کی ضرورت محسوس کریں تو مجھے آواز دے کر بلالیں۔"

"نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم جاکر سوجاؤ۔" میں نے کہا۔

سنگھا کے جانے کے بعد میں اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دائیں صرف ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی جس پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کسی عورت کی آمدورفت بھی رہتی ہے۔ میگھنا نے بتایا تھا کہ بریندرا شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی ایک الگ مکان میں رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اسی کا گھر ہو اور بریندرا نے میری وجہ سے اپنی بیوی کو چند روز کے لیے کہیں اور بھیج دیا ہو۔

میں نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ ذہن پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہو تو نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں کچھ دیر تک کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر ٹی وی آن کردیا۔

اس کمرے کی سیٹنگ میں کچھ باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ مثال کے طور پر ٹی وی والی وہ الماری ایسی جگہ پر بنائی گئی تھی کہ بیڈ پر لیٹے لیٹے آرام سے ٹی وی دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے تکیے کا سہارا لے کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائی اور ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبانے لگا۔ زیادہ تر بھارتی چینلز تھے۔ میں چند منٹ ایک چینل کا کوئی پروگرام دیکھتا اور پھر دوسرا چینل لگا دیتا۔ چینل سات لگاتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ بہت ہی گندا اور بے ہودہ پروگرام تھا۔ یہ بھی انڈیا ہی کا کوئی چینل تھا۔ میں پہلے بھی کسی جگہ بتا چکا ہوں کہ بے حیائی اور بے غیرتی میں انڈیا والے یورپ اور امریکا کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گئے تھے اور یہ چینل بھی ان کی بے غیرتی کی عکاسی کررہا تھا۔ میں نے ٹی وی بند کردیا اور سوچنے لگا کہ سنگھا نے مجھے یہ دلچسپ پروگرام دیکھنے کا مشورہ کیوں دیا تھا ہم خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی تلاش کرلیا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ مجھ جیسا جوان اور تنہا آدمی شاید اس قسم کی چیزوں سے دل بہلانا پسند کرتا ہو۔

میں نے بیڈ سوئچ آف کرکے بتی بجھا دی اور آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

تیسرے دن شام کے بعد نرس مایا متی میرے سر کی پٹی تبدیل کرنے کے لیے پہنچ گئی۔

"تمہیں کس نے یہاں آنے کے لیے کہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اپنے مریض کا پیچھا اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہوجائے۔" مایا متی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تمام مریضوں کا اسی طرح پیچھا کیا جاتا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"بالکل نہیں۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "یہ تو ڈیپینڈ کرتا ہے۔ اچھا آؤ۔ میرے سامنے بیٹھو۔ تمہاری ڈریسنگ تبدیل کردوں۔"

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ میری پشت پر کھڑے ہوکر پٹی کھولنے لگی۔

"میرا خیال ہے اب ڈریسنگ کی ضرورت تو نہیں۔" وہ زخم پر انگلی پھیرتے ہوئے بولی "زخم تو ٹھیک ہوگیا ہے۔ اب صرف احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"اگر ڈریسنگ کی ضرورت نہیں تو رہنے دو۔" میں نے سر کے زخم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اچھا۔ اب یہ بتاؤ تمہارا آج شام کا کیا پروگرام ہے؟" میں نے پوچھا۔

میں کئی روز تک اسپتال میں رہا تھا اور اس دوران مایا متی سے اچھی خاصی بے تکلفی ہوچکی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ وہ کھٹمنڈو سے تقریباً سو کلومیٹر دور آرنیکو ہائی وے پر واقع سن کوسی بازار نامی چھوٹے سے قصبے کی رہنے والی ہے۔ کھٹمنڈو میں وہ اکیلی ہی رہتی تھی۔ یہاں اس نے ایک فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا جس میں اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی رہتی تھی جو کسی سرکاری آفیسر کی سیکریٹری تھی۔

"کیا مطلب؟" مایا متی نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"مطلب یہ کہ میں بیزاری کی حد تک بور ہوچکا ہوں۔ تنہائی سے گھبرانے لگا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ کم از کم آج کی شام تم میرا ساتھ دو۔ ہم دونوں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور۔۔۔"

"اور اس کے بعد؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اس کے بعد میں تمہیں تمہارے فلیٹ پر چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی خوشی ملتی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن پہلے مجھے اپنے فلیٹ پر جانا پڑے گا۔"

"کیوں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کپڑے بدلنے ہوں گے۔ اس لباس میں تو میں بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔" اس نے کہا۔

"بالکل اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ شام کو ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اسپتال سے نکلنے سے پہلے لباس تبدیل کرلیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے گرے کلر کا اسکرٹ اور سلیولیس بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ بھی گھٹنوں سے کچھ اوپر تھا۔

"تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔" وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔

"تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ صرف چند منٹ لگیں گے۔" میں اسے ہال میں چھوڑ کر کمرے میں آگیا اور دروازہ بند کرکے کپڑے تبدیل کرنے لگا پھر جوگرز پہنے اور کمرے سے باہر آگیا۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں اپنے بیگ میں سے کچھ رقم لینا نہیں بھولا تھا۔

اس وقت شام کے آٹھ بجنے والے تھے۔ مایا متی کے ساتھ میں نے سیرو تفریح کے لیے پروگرام نہیں بنایا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کررہا تھا اور پچھلے دو دن سے سوچ رہا تھا کہ اب مجھے بھی اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت دینی چاہیے۔ ان دو تین دنوں کے دوران میں میں نے سنگھا سے شہر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ ایک مرتبہ تو میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ سنگھا کو ساتھ لے کر شہر میں نکل چلوں لیکن سنگھا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہوگا۔ اتفاق سے مایا متی آگئی تھی۔ اسے ڈاکٹر پربھاکر نے میری ڈریسنگ تبدیل کرنے کے لیے بھیجا تھا اور ڈاکٹر پربھاکر کو بریندرا کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ وہ میرا خیال رکھے۔ میں نے مایا متی کو دیکھ کر ہی باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا اور مایا متی تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد تیار ہوگئی تھی۔

ہم بنگلے سے نکل کر کچھ دور تک پیدل چلتے رہے پھر میں نے ایک سائیکل رکشا روک لیا۔ یوں تو ایک دو خالی ٹیکسیاں بھی ہمارے قریب سے گزری تھیں لیکن میں نے سائیکل رکشا کو ترجیح دی تھی۔ اس طرح میں شہر کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہوسکتا تھا۔ رکشا بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ اوپر محراب کی طرح خوب صورت چھت بنی ہوئی تھی۔ یہ چھت محض رکشا کی سجاوٹ کے لیے تھی کیونکہ اس سے نہ تو دھوپ سے بچا جاسکتا تھا اور نہ ہی بارش سے۔

رکشا کی سیٹ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بالکل جُڑ کر بیٹھے تھے اور میں نے محسوس کیا تھا کہ مایا متی نے کچھ جان بوجھ کر بھی اپنا بوجھ میرے اوپر ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو کنارے کی طرف دباتے ہوئے مایا متی کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

رکشا بان ادھیڑ عمر لیکن ہٹا کٹا آدمی تھا۔ مایا متی نے اسے کانتی پاتھ (روڈ) کا کہہ دیا تھا۔

ہم جودھا گھاٹ سے دریا پار کرکے شوالیا مندر کے قریب سے ہوتے ہوئے تری بھون یونیورسٹی کے پہلو سے گزر کر کانتی پاتھ پر آگئے۔ یہ سڑک تریپور مارگ سے شروع ہوکر شہر کے دوسرے سرے پر لیکھ ناتھ مارگ تک چلی گئی تھی۔ شہر کی تمام قابل ذکر بڑی بڑی عمارتیں اور شاپنگ سینٹرز اس سڑک پر یا اس کے آس پاس واقع تھے۔ کانتی پاتھ دیکھ کر مجھے بنکاک کا سوکھم وٹ روڈ یاد آگیا۔ اس کی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کانتی پاتھ کے ایک طرف گنجان آبادی کا علاقہ تھا۔ اسے قدیم شہر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بعض کشادہ سڑکوں کے ساتھ تنگ اور پرہجوم بازاروں اور گلیوں کا ایک جال سا تھا جو چاروں طرف میلوں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہندوؤں کے لاتعداد مندر اور بُدھ عبادت گاہیں بھی اسی علاقے میں واقع تھیں۔

مایا متی مجھے ہر چیز کے بارے میں بتا رہی تھی۔ یہ جنرل پوسٹ آفس ہے' یہ ملٹری اسپتال اور یہ بیر اسپتال۔ وہ سامنے رتنا پارک ہے اور اس کے ساتھ رانی پوکھری اور وہ سامنے دائیں طرف نیشنل تھیٹر ہے۔ اس سے ذرا آگے چلے

جائیں تو کماری چوک ہے۔

مایا متی اس سڑک پر اور اس کے آس پاس واقع بڑے بڑے ہوٹلوں کی نشان دہی بھی کر رہی تھی۔ پورا شہر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مایا نے رکشا نیشنل تھیٹر سے پہلے ہی بائیں طرف آسن جمال روڈ پر مڑوالیا۔ اب ہم گنجان آبادی والے علاقے میں آ گئے تھے۔ مایا متی ایک ایک چیز کے بارے میں بتا رہی تھی اور میں اس طرح خوش ہو رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ شہر کی بتیاں دیکھنے کے لیے آیا ہوں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ میں بڑی توجہ سے سڑکوں کے نام اور راستے ذہن نشین کرتا جا رہا تھا۔

دربار چوک پر مایا متی نے رکشا رکوالیا۔ میں نے اتر کر کرایہ ادا کیا اور مایا متی کے ساتھ ایک طرف چلنے لگا۔ یوں تو اس وقت شہر کے ہر چوک، ہر سڑک اور ہر موڑ پر رونق تھی لیکن دربار اسکوائر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ یہ وہ علاقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں کبھی رات نہیں ہوتی۔ ہم گنگا پاتھ سے ہوتے ہوئے فریک اسٹریٹ پر آ گئے۔ یہاں چند اچھے ریسٹورنٹس تھے۔ فاسٹ فوڈ کی بے شمار دکانیں تھیں۔ خوراک میں زیادہ تر مچھلی اور بعض پرندوں کا گوشت استعمال ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سبزیوں سے بھی طرح طرح کی لذیذ ڈشیں تیار ہوتی تھیں۔ مچھلی سے بھی کئی طرح کی ڈشیں تیار ہوتی تھیں اور اس وقت تو پورے بازار میں تلی ہوئی اور کوئلوں پر بھونی جانے والی مچھلی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

مایا متی میرا ہاتھ پکڑے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔ اچھا معیاری اور ائر کنڈیشنڈ ریسٹورنٹ تھا۔ بیشتر میزیں اگرچہ بھری ہوئی تھیں مگر شور شرابا بالکل نہیں تھا۔ ہر میز پر مردوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی لڑکی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ ان کے لباس بھی ایسے تھے کہ نظریں بے اختیار اس طرف اٹھ جاتی تھیں۔

ایک میز خالی ہوئی تو ہم نے فوراً اس پر قبضہ جمالیا۔ اس کے چند سیکنڈ بعد ہی سانولی رنگت والی ایک جوان ویٹریس بھی ہمارے سر پر نازل ہو گئی۔ مایا متی نے اپنی پسند کا آرڈر دے دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہماری میز پر کھانا سرو کر دیا گیا۔ دو قسم کی مچھلی تھی اور بگلے کا گوشت تھا جو تکے کی طرح کوئلوں پر بھونا گیا تھا۔ میں نے بگلے کے گوشت کو تو ہاتھ نہیں لگایا البتہ میں مچھلی پر ہاتھ صاف کرتا رہا۔ مچھلی واقعی بہت لذیذ تھی یا کئی روز تک اسپتال کا پرہیزی کھانا کھانے کے بعد پہلی مرتبہ چٹ پٹی چیز کھائی تھی اس لیے مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

ہم ابھی کھانا کھا رہے تھے کہ اپنے قریب ایک نسوانی آواز سن کر میں چونک گیا۔

"ہیلو مایا۔"

"ہیلو رتنا۔" مایا متی نے سامنے کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے بھی اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مایا متی سے کسی قدر کم عمر تھی۔ رنگت گوری چٹی اور چہرے کے نقوش بھی دل فریب تھے۔ سب سے زیادہ کشش اس کے فگر میں تھی۔ اس نے بلاؤز بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ سامنے کھڑا شخص کسی اضافی کوشش کے بغیر نہایت آسانی سے بلاؤز کے اندر دور تک جھانک سکتا تھا۔ رتنا کے سرخ ہونٹوں پر بڑی پر کشش مسکراہٹ تھی۔

رتنا اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک آدمی بھی تھا اور اس آدمی کی صورت دیکھ کر میرے دماغ میں سناٹا سا چھا گیا اور شدید سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی۔

وہ شخص بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن اس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ میں جھرجھری لی اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ میرے اندر کی صلاحیتیں بتدریج بیدار ہو رہی تھیں۔ میری وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی جس نے مجھے پچھلے کئی روز سے بکری کے بچے کی طرح بزدل بنائے رکھا تھا۔ میں اب براہ راست اس شخص کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ زیادہ دیر تک میری نظروں کی تاب نہ لا سکا اور پلکیں جھپکاتے ہوئے وہ دوسری طرف دیکھنے لگا اور پھر رتنا کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"آؤ مس رتنا، دیر ہو رہی ہے۔ تم بھول گئی ہو کہ ہمیں دس بجے ایک جگہ پر پہنچنا ہے۔"

رتنا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر میں نے دیکھ لیا کہ اس کے ہاتھ پر اس شخص کی گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔

"ہم تو یہاں کھانا کھانے آئے ہیں مسٹر سام سنگ۔ تمہیں ایک دم کوئی اور بات کیسے یاد آ گئی۔ کیا اب بھوک نہیں لگ رہی؟" رتنا نے یہ کہتے ہوئے مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بھول گیا تھا۔" سام سنگ نامی اس شخص نے جواب دیا "دیر ہو گئی تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ کھانا ہم وہیں

کھالیں گے۔"

"ٹھیک ہے چلو۔" رتنا نے مایا متی کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا پھر میری طرف دیکھا اور سام سنگ کے ساتھ چل پڑی۔

سام سنگ کے نام پر میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ اب مجھے یاد آ گیا کہ وہ کون تھا اور اسے میں نے کب اور کہاں دیکھا تھا۔

گزرے ہوئے واقعات کسی فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے گزرتے چلے گئے۔ مجھے چیانگ سین کے وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب میں اور سردار تھالوب گولڈن ٹرائی اینگل کے جنرل کھوراٹ کے ساتھ ایک خوفناک جنگ لڑ رہے تھے۔ اس جنگ میں سردار تھالوب کے وفادار وانگ ڈن کے علاوہ اس کے کئی آدمی مارے گئے تھے اور جنرل کھوراٹ کے ایک دو آدمی پکڑے بھی گئے تھے لیکن وہ ہمیں دھوکا دے کر فرار ہو گئے تھے اور دارا وغیرہ کے ساتھ گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف نکل گئے تھے۔ یہ سام سنگ بھی انہی میں سے ایک تھا جو ہماری حراست سے فرار ہوئے تھے۔

اور میرا خیال ہے... نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس وقت سام سنگ نے بھی مجھے پہچان لیا تھا اس لیے اس نے وہاں سے بھاگ لینے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن مایا متی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکا۔ مجھے یہ اطمینان بھی تھا کہ رتنا مایا متی کی دوست تھی اور سام سنگ رتنا کے ساتھ تھا۔ بعد میں کسی بھی وقت رتنا سے اس کے بارے میں پوچھا جا سکتا تھا۔

"کیا بات ہے۔ کہاں کھو گئے؟" مایا متی نے یہ کہتے ہوئے میرے چہرے کے سامنے ہاتھ ہلایا تو میں چونک گیا۔

"اوہ۔ کچھ نہیں۔" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "میں تمہاری اس دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں۔ رتنا۔"

"کیوں۔ پسند آ گئی وہ؟" مایا متی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا "وہ تم سے زیادہ حسین تو نہیں۔ اس کی تو صرف چمڑی گوری ہے جبکہ تم میں اور کئی گن ہیں۔"

"وہ بہت چالاک ہے۔" مایا متی بولی "اس میں ایک گن یہ ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں کسی مرد کو پھانس لیتی ہے۔ اب اپنی ہی مثال لے لو۔ تم سے اگرچہ اس کی بات چیت بھی نہیں ہوئی لیکن وہ تمہارے ذہن میں اپنے لیے سوچ کے دروازے کھول گئی۔"

"میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم اسے کیسے جانتی ہو۔ میرا مطلب ہے رتنا کو؟"

"رتنا بھی میرے ساتھ اسپتال میں نرس تھی۔" مایا متی نے جواب دیا "اس کی ڈیوٹی زیادہ تر اسپیشل وارڈ اور پرائیویٹ رومز میں ہوتی تھی جہاں دولت مند مریض ہی داخل ہوتے ہیں۔ رتنا کو اسپتال کی سب سے دولت مند نرس سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک رینالٹ گاڑی بھی تھی۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کے پاس دولت کہاں سے آتی ہوگی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "اور پھر اس نے ایک بہت دولت مند مریض کو پھانس لیا اور اسپتال کی نوکری چھوڑ دی۔ ہمارا خیال تھا کہ رتنا اس دولت مند شخص سے شادی کر لے گی لیکن وہ رئیس اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ سیاست میں رہ کر کوئی شخص خود بے وقوف نہیں بنتا بلکہ دوسروں کو بناتا ہے۔ اس رئیس سیاست داں نے بھی رتنا کو بے وقوف بنایا تھا۔ کچھ عرصے اس سے کھیلتا رہا اور پھر اسے دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اب وہ اس کے دوستوں اور مہمانوں کا دل بہلاتی ہے لیکن رتنا بہت خوش ہے کیونکہ دل بہلاوے کے ساتھ اسے دولت بھی مل رہی ہے۔ پچھلے دنوں سنا تھا کہ اس نے گورکھا میں ایک خوب صورت لاج خرید لیا ہے۔"

"گورکھا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلومیٹر شمال میں۔" مایا متی نے جواب دیا "خوب صورت ہل اسٹیشن ہے۔ وہاں رائل پیلس اور قلعہ بھی ہے۔ نیپال کی رائل فیملی گرمیوں میں چند ہفتے وہیں گزارتی ہے۔"

"رتنا کے دوست سیاست داں کا کیا نام ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ناگ پال۔" مایا متی نے جواب دیا "اس نے انسانوں کے روپ میں واقعی بہت سے ناگ پالے ہوئے ہیں۔ وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"کیا وہ اسمبلی کا ممبر بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں لیکن وہ اسمبلی کے کسی ممبر یا منسٹر سے زیادہ طاقت ور ہے۔" مایا متی نے کہا "اس نے اپنے گرد بہت طاقت جمع کر رکھی ہے۔ اسے تم نیپال کا بال ٹھاکرے کہہ سکتے ہو۔ جب چاہے ہنگامے کروا کر شہر بند کروا دیتا ہے۔ پچھلے دنوں جو ہنگامے ہوئے تھے، سنا ہے ان میں بھی اسی کا ہاتھ تھا مگر تم اس قدر کرید کیوں کر رہے ہو؟" مایا متی نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"کچھ نہیں۔ یونہی۔ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے۔" میں نے جواب دیا اور کھانے کی طرف متوجہ ہوگیا۔

میں کھانا کم کھا رہا تھا اور سوچ زیادہ رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ جب ہم بھارت کے سرحدی قصبے تنک پور میں تھے تو انسپکٹر اعظم خان نے بتایا تھا کہ ایک خاص گروہ نیپال میں گڑ بڑ پھیلانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ نیپال اور بھارت کے تعلقات میں دراڑیں آجائیں۔ ہوسکتا ہے جرائم پیشہ لوگوں کا وہ گروہ اتنا زیادہ طاقت ور نہ ہو لیکن اسے ٹریاڈ کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ٹریاڈ TRIAD اگرچہ ہانگ کانگ کی مافیا تنظیم تھی جسے اس وقت دنیا کی سب سے خوفناک تنظیم سمجھا جاتا ہے اور میں جانتا تھا کہ ٹریاڈ کو جنرل کھوراٹ جیسے خطرناک ترین لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔

انسپکٹر اعظم خان کے کہنے کے مطابق ٹریاڈ نیپال میں اس جرائم پیشہ گروہ کی پشت پناہی کر کے نیپال کی اسمبلی میں اپنے آدمی پہنچانا چاہتی ہے تاکہ نیپال کے شمال مغربی علاقوں تک اس کی رسائی ہوسکے جہاں دنیا کی بہترین افیون پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے وہ علاقے بھی ملتے تھے جو پوست کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔

اور اب سام سنگ کو یہاں دیکھ کر انسپکٹر اعظم خان کے خیالات کی تصدیق ہو رہی تھی۔ سام سنگ یقیناً اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے کچھ اور ساتھی بھی یہاں موجود ہوں گے لیکن سام سنگ مجھے دیکھ کر کھسک گیا تھا۔

اتفاق سے سام سنگ کا تعلق بھی ایسے آدمی سے تھا جسے نیپال کی سیاست میں ٹربل میکر کہا جاسکتا تھا۔ مایا متی نے ناگ پال کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے تو ایسی ہی رائے قائم کی جاسکتی تھی۔

میں نے سام سنگ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا اور فی الوقت میری نظروں میں رتنا ہی ایسی ہستی تھی جو اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی تھی اور فوری طور پر رتنا کے بارے میں مزید کوئی سوال کرنا مایا متی کو شک میں مبتلا کرسکتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی میں دلیش مکھ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ وہی تو میرا اصل مشن تھا۔ اسے میں کیسے بھول سکتا تھا۔ دلیش مکھ' روی کی پناہ میں تھا اور وہ دونوں روپوش تھے۔ پولیس ان کا کوئی سراغ نہیں لگا سکی تھی لیکن میں نے انہیں تلاش کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ رتنا ہی سے روی کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوسکے گا۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر ہم ٹہلتے ہوئے اندرا چوک طرف آگئے۔ دس بجنے والے تھے لیکن ساری دکانیں ہوئی تھیں۔ دکانوں کے سامنے ہاکروں نے ڈیرے جما تھے۔ فٹ پاتھ اور سڑک کا بیشتر حصہ تو ان ہاکروں نے رکھا تھا۔

میں ایک ہاکر کے کیبن کے پاس رک گیا۔ آر جیولری سجی ہوئی تھی۔ میں نے ایک خوب صورت رس خرید کر مایا متی کو دیا تو وہ کھل اٹھی۔

"اپنے ہاتھ سے باندھ دو۔" اس نے مسکراتے کلائی آگے کردی۔

میں نے رسٹ بینڈ اس کی کلائی پر باندھ دیا۔ اس قیمت اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن مایا اس تحفے پر بہت ہوئی تھی۔

ہم کیل ٹول کی طرف جانا چاہتے تھے لیکن آگے بند تھا۔ دو تین گاڑیاں اس طرح پھنس گئی تھیں کہ پیچھے ٹریفک جام ہوگیا تھا۔ ایک کار فٹ پاتھ پر چڑھ گئی جس سے پیدل چلنے والوں کا راستہ بھی بند ہوگیا تھا۔

"اس طرف سے آؤ۔ اس گلی سے نکل چلتے ہیں" مایا متی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف کھینچنے لگی۔

ہم بازار کے عقب میں آکاش مندر والی گلی میں چلے گئے۔ اس مندر کا مرکزی دروازہ دوسری طرف تھا۔ پچھلی طرف واقع یہ تنگ سی گلی سنسان پڑی تھی۔ اندھیرا تھا۔ سامنے موڑ پر مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا لیکن روشنی یہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مایا متی ایک اندھیرے میں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچی۔

سامنے گلی کا موڑ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ طرف سے بھی ایک آدمی گلی میں آرہا تھا۔ ہمارے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے مڑ کر ایک عورت اور ایک مرد تقریباً پندرہ گز کے فاصلے پر پیچھے بھی آرہے تھے۔ غالباً یہ لوگ بھی ہماری طرح بازار رش سے بچنے کے لیے اس طرف آگئے تھے۔

میں مایا متی سے باتیں کرتے ہوئے چلتا رہا۔ مایا میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ سامنے سے آنے والا آدمی ہمارے قریب پہنچ وہ گلی کے عین وسط میں چل رہا تھا۔ وہ مزید قریب پہنچ نے مایا متی کو دباتے ہوئے ایک طرف ہٹنا چاہا تو یوں مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

قریب پہنچ کر اس شخص نے اچانک ہی میرے

گھونسا مار دیا۔ مجھے لگا جیسے میری ناک پر کسی وزنی ہتھوڑے سے زور دار ضرب لگائی گئی ہو۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ مایا متی بھی چیختے ہوئے نیچے گر گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا' پیچھے سے آنے والے آدمی نے بھی میری گردن پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ میں کراہتے ہوئے آگے کو گرنے لگا تو سامنے والے شخص نے زوردار ٹھوکر لگا دی۔

ٹھوکر میرے سینے پر لگی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں اچھل کر سیدھا ہوا تو دوسرے آدمی نے ایک اور گھونسا رسید کردیا۔

میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ان دونوں نے مجھے چھاپ لیا تھا۔ ان کے گھونسوں اور لاتوں سے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مایا متی کی چیخوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے عقب سے آنے والے آدمی کی ساتھی عورت مایا متی کی دھنائی کر رہی تھی۔

اب مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ تقریباً ایک گھنٹا پہلے ریسٹورنٹ میں سام سنگ سے سامنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ مایا متی کی جانکار ایک سابق نرس رتنا بھی تھی۔ سام سنگ فوراً ہی وہاں سے کھسک گیا تھا۔ اس نے رتنا سے کہیں اور پہنچنے کا بہانہ کیا تھا لیکن اب بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ کہیں جانے کے بجائے وہ ریسٹورنٹ کے آس پاس ہی کہیں موجود رہا تھا اور غالباً فون کر کے اپنے کسی ساتھی کو بلا لیا تھا۔ وہ ریسٹورنٹ سے ہی ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ بارونق بازاروں میں انہیں ہمارے خلاف کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا لیکن اس سنسان اور تاریک گلی میں انہوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔

اندھیرے میں ان کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے لیکن ان دونوں میں ایک سام سنگ تھا اور وہ عورت یقیناً رتنا تھی جو مایا متی کی پٹائی کر رہی تھی۔

میں کچھ دیر تو ان سے پٹتا رہا لیکن پھر مجھے موقع مل گیا۔ میرے پیر کی ٹھوکر سامنے والے آدمی کی پنڈلی کی ہڈی پر لگی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے ایک ٹانگ پر ناچ کر رہ گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے منہ پر زوردار پنچ رسید کردیا اور اس کے ساتھ ہی بڑی تیزی سے پیچھے پلٹ گیا۔ دوسرا آدمی مجھے کک لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا پیر پکڑ کر پیچھے اچھال دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور جب اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو میری کک اس کی پسلیوں پر پڑی اور وہ چیخ اٹھا۔

اور پھر میں نے ان میں سے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں ہر وہ حربہ استعمال کر رہا تھا جس کی اس وقت ضرورت تھی۔ ایک کو کک اور دوسرے کو پنچ۔ میری ایک کک رتنا کو بھی لگی جو مایا متی کو رگید رہی تھی۔ وہ چیختے ہوئے دوسری طرف الٹ گئی۔

سام سنگ نے چاقو نکال لیا۔ چاقو کھلنے کی "کررر" کی آواز سن کر ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ وہ ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے میری طرف لپکا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس کی پیشانی پر لگی۔ وہ بلبلاتے ہوئے پیچھے الٹ گیا۔ چاقو بھی اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتے ہوئے دور جا گرا تھا۔

فلائنگ کک لگانے کے بعد میں بھی نیچے گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ دوسرا آدمی اس دوران میں مجھ پر حملہ آور ہوچکا تھا۔ میں نے اسے ہاتھوں پر سنبھال کر دور اچھال دیا اور اٹھ کر اس پر چھلانگ لگا دی۔

میں اس کے سینے پر سوار اس کا گلا دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہمت سنگھ' بچو۔۔۔!"

یہ مایا متی کی آواز تھی۔ میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس آواز میں پوشیدہ ہدایت پر عمل کیا اور اپنے حریف کو چھوڑ کر ایک طرف لوٹ لگا دی اور اسی لمحے زمین پر پڑے ہوئے میرے حریف کی خوفناک چیخ گونج اٹھی۔

سام سنگ چاقو سے مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔ مایا متی نے بروقت مجھے خبردار کردیا۔ میں تو ایک طرف لوٹ لگا کر چاقو کی زد میں آنے سے بچ گیا لیکن سام سنگ کا چاقو زمین پر پڑے ہوئے میرے حریف کے سینے میں دستے تک پیوست ہوچکا تھا۔

سام سنگ بد حواس ہوگیا۔ وہ چاقو اس کے سینے میں پیوست چھوڑ کر سیدھا ہوگیا۔ اسی وقت میں نے سنبھل کر اسے زوردار فرنٹ کک لگا دی۔ وہ چیختے ہوئے زمین پر گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھ کر مجھ پر حملہ کرے گا لیکن وہ حملہ کرنے کے بجائے اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ رتنا نے بھی اس کے پیچھے ہی دوڑ لگا دی۔

مایا متی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھی۔

"تم ٹھیک ہو نا مایا۔ زیادہ چوٹ۔۔۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ کراہی "سر پر چوٹ لگی ہے مگر۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔"

اس نے ایک ہاتھ سر سے ہٹالیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے بھی گھوم کر زمین پر پڑے ہوئے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست تھا اور وہ تڑپ رہا تھا۔

اسی وقت سامنے کے موڑ سے گلی میں تین چار افراد داخل ہوئے۔ ان میں کوئی عورت بھی تھی جس کے قہقہے کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی تھی۔

"اس طرف آجاؤ۔ اس گلی میں۔" مایا متی میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑی۔

ہم پہلو کی ایک گلی میں داخل ہوگئے۔ یہ گلی بہت تنگ اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک طرف مندر کی دیوار تھی اور دوسری طرف مکانوں کی عقبی دیوار۔ ان مکانوں کے دروازے دوسری طرف کشادہ گلی میں تھے۔

یہ تنگ اور تاریک سی گلی تقریباً پچاس گز طویل تھی۔ ابھی ہم نے نصف راستہ طے کیا تھا کہ عقب سے ایک خوفناک نسوانی چیخ سنائی دی۔ دوسری گلی میں آنے والوں نے گلی میں پڑے ہوئے اس شخص کو دیکھ لیا تھا جس کے سینے میں چاقو پیوست تھا۔ میں مایا متی کا ہاتھ پکڑ کر دوڑنے لگا۔

ہم ایک کشادہ گلی میں نکل آئے۔ یہاں قدرے روشنی تھی اور کچھ لوگوں کی آمدورفت بھی تھی۔ میں نے مایا متی کی طرف دیکھا۔ رتنا سے دھینگا مشتی میں اس کا بلاؤز پھٹ گیا تھا اور بال الجھے ہوئے تھے۔ میری قمیص کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تھے۔ گریبان نیچے تک کھلا ہوا تھا۔ بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کے یہ حلیئے ہمیں لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنا سکتے تھے۔

مایا متی ایک طرف چلتی رہی۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم گلیوں ہی گلیوں میں چلتے ہوئے کیلا گیل کے مین روڈ پر نکل آئے۔ اس طرف دکانیں بھی اکا دکا ہی تھیں اور زیادہ لوگوں کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔ مایا متی بار بار اپنے جسم کے مختلف حصوں کو سہلا رہی تھی۔ میرا خیال تھا' رتنا نے اس کی اچھی خاصی ٹھکائی کردی تھی۔

مایا متی نے ایک خالی ٹیکسی روک لی۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھے تو ڈرائیور نے گردن گھما کر مشتبہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تھا۔ مایا متی نے ڈرائیور کو باغ بازار کا کہہ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

ٹیکسی کیل ٹول اور آسن ٹول کے علاقوں سے ہوتے ہوئے کانتی پاتھ عبور کرکے رتنا پارک کے ساتھ باغ بازار کی طرف جانے والی سڑک پر مڑ گئی۔ لیو ہوٹل سے ذرا آگے نکل کر مایا متی نے ٹیکسی رکوالی۔ میں نے میٹر دیکھ کر کرایہ ادا کیا اور ہم دونوں پیدل ہوٹل کی طرف چلنے لگے۔ وہ ٹیکسی آگے جاکر بائیں طرف مڑ گئی تھی۔

مایا متی نے ایک اور ٹیکسی رکوالی۔ اس ٹیکسی کے ذریعے ہم رمشا پاتھ پر آگئے اور پھر ایک سائیکل رکشا پر بیٹھ کر کالی کا استھان نامی علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں بڑے بڑے بنگلے بھی تھے اور چھوٹے مکان بھی۔ رکشا چھوڑ کر ہم کافی دیر تک پیدل چلتے رہے اور بالآخر ایک مکان کے سامنے رک گئے۔ بنگلا نما یہ مکان دوسرے مکانوں سے قدرے الگ تھلگ تھا۔ مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔

"دیوار سے کود کر اندر سے چھوٹے دروازے کا کنڈا کھول دو۔" مایا متی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا "یہ کس کا مکان ہے۔ اگر چوری کے الزام میں دھر لیے گئے تو۔۔۔"

"کوئی کچھ نہیں کہے گا۔" مایا متی نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ گلی کافی کشادہ تھی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا۔ اتفاق سے اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ میں اچک کر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف کود کر چھوٹے دروازے کا کنڈا کھول دیا۔ مایا متی نے اندر داخل ہوکر دروازہ بند کردیا اور مجھے اشارہ کرتے ہوئے برآمدے کی طرف چلنے لگی۔

برآمدے میں پہنچ کر مایا متی ایک دیوار کو ٹٹولنے لگی اور پھر "چھن" کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ کوئی چیز نیچے گری تھی۔ مایا متی کے ساتھ میں بھی جھک کر فرش پر ٹٹولنے لگا اور پھر چابیوں کا وہ گچھا میرے ہاتھ میں آگیا جو اوپر سے گرا تھا۔ میں نے گچھا مایا متی کے حوالے کردیا۔

مایا متی نے برآمدے والا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوکر بتی جلا دی اور پھر آگے بڑھ کر دوسری بتیاں بھی جلاتی چلی گئی۔ وہ جس طرح اس مکان میں گھوم پھر رہی تھی اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ مکان اور اس کی کوئی چیز اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

"آؤ نا۔ تم یہاں کیوں رک گئے۔" اس نے برآمدے والا دروازہ اندر سے بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہ مکان۔۔۔"

"اپنا ہی ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی "یہ مکان میرے تاؤ کا ہے۔ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے تھے پھر گاؤں چلے گئے۔ میں صرف ویک اینڈ پر یہاں آجاتی ہوں۔ ایک دو دن بڑے سکون سے گزر جاتے ہیں۔"

یہ مکان دو بیڈ رومز اور ایک مختصر سے لاؤنج پر مشتمل تھا۔ مناسب فرنیچر بھی موجود تھا اور کچن میں بھی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

مایا متی مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ یہاں بیڈ پر کچھ کتابیں اور کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف ڈریسنگ ٹیبل بھی تھی جس پر ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ مایا متی ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

مایا متی کے چہرے اور گردن پر چند خراشیں نظر آرہی تھیں۔ یہ غالباً رتنا کے ناخنوں کا کمال تھا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے پر بھی گومڑا سا ابھر آیا تھا۔ وہ خراشوں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہاتھ سے دائیں طرف سینہ بھی دبا رہی تھی۔

میں نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ میری ناک پکوڑا بن گئی تھی اور بائیں طرف کا جبڑا بھی سوجا ہوا تھا۔ مایا متی نے آئینے میں مجھے دیکھا اور اٹھ کر دیوار کے شیلف پر رکھا ہوا ایک ڈبا اتار کرلے آئی۔ یہ میڈیکل باکس تھا۔ اس نے ایک ٹیوب نکالی اور انگلی پر کریم نکال کر میری پھولی ہوئی ناک اور جبڑے پر لگانے لگی۔ اس نے دوسری ٹیوب سے اپنے چہرے اور گردن کی خراشوں پر کریم لگائی اور پھٹا ہوا بلاؤز اتار دیا۔ وہ جس طرح بار بار اپنا سینہ دبا رہی تھی اس سے پتا چلتا تھا کہ اس کے سینے پر اچھی خاصی ضرب لگی تھی۔ اس نے وہی ٹیوب اٹھائی جس سے میری ناک اور جبڑے پر کریم لگائی تھی اور جب وہ بلاؤز کے نیچے کا اِنرویئر اوپر اٹھانے لگی تو میں وہاں سے ہٹ گیا۔

میں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں جھانکنے لگا۔ چند منٹ بعد مایا متی کمرے سے برآمد ہوئی تو وہ لباس بھی تبدیل کرچکی تھی۔ میں اس وقت لاؤنج میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کچن میں گھس گئی اور چند منٹ بعد چائے بنا کرلے آئی جس میں پاؤڈر ملک استعمال کیا گیا تھا۔

"میں اس کتیا کو چھوڑوں گی نہیں۔" وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی "مجھے خیال نہیں تھا کہ وہ بدمعاشوں کے ساتھ رہ کر خود بھی بدمعاش ہوگئی ہے۔ اس نے پرانی دوستی کا بھی خیال نہیں کیا۔ کم بخت نے اس طرح مارا اور نوچا کھسوٹا ہے کہ میرے بدن کا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا ہے۔"

میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ وہ شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھی جس کا مطلب تھا کہ اب وہ اس گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ میں کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تمہارا ویلٹ کہاں ہے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرے پاس ہے۔" میں نے جیب سے ویلٹ نکال کر اسے دکھایا۔

"اس کا مطلب ہے انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکی۔" وہ بولی۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو؟ انہوں نے ہمیں کیوں گھیرا تھا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں لوٹنے کے لیے۔" مایا متی نے کہا "وہ غنڈوں کے ساتھ مل کر آج کل شاید یہی دھندا کر رہی ہے۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ شاید میں نے کوئی بہت دولت مند گاہک پھانسا ہے۔ چڑیل بھی سات گھر چھوڑ کر واردات کرتی ہے لیکن اس کمینی نے تو حد کردی۔ میں اسے ایسا مزہ چکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔"

مایا متی کی باتوں نے مجھے کسی حد تک چونکا دیا تھا لیکن میں نے اس معاملے میں زیادہ جرح نہیں کی۔

"کیا تم سمجھتی ہو کہ انہوں نے ہمیں لوٹنے کے لیے حملہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اور کیا وجہ ہوسکتی ہے۔" وہ بولی "دولت کی ہوس نے اسے اندھا کردیا ہے۔ کسی دن وہ ماری جائے گی۔"

"اس آدمی کو پہلے بھی کبھی تم نے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔ وہ چپٹی ناک والا' جو ریسٹورنٹ میں اس کے ساتھ آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور یوں بھی رتنا تو بہت دنوں بعد نظر آئی تھی۔" مایا متی نے جواب دیا۔

"تمہیں یاد ہے میں ریسٹورنٹ میں تم سے رتنا کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہا تھا اور تم نے میری اس جرح کا مطلب بھی غلط سمجھا تھا۔"

"تو اب مطلب سمجھا دو۔" اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور اپنا سینہ سہلانے لگی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے چوٹ کچھ زیادہ ہی گہری لگی تھی۔

"وہ آدمی کوئی رہزن نہیں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اس کا تعلق دنیا کی خطرناک ترین مافیا تنظیم ٹریاڈ سے ہے اور وہ راہزنی کی معمولی وارداتوں کے لیے تھائی لینڈ سے یہاں نہیں آیا۔"

"کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑی۔

"تم نے اسپتال میں انسپکٹر اعظم خان اور بریندرا کو باتیں کرتے سنا تھا۔" میں نے کہا "یہاں نیپال میں ایک بہت خوفناک سازش جنم لے رہی ہے بلکہ اس گھناؤنی سازش پر عمل شروع ہو چکا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں؟" اس کی نظریں اب بھی میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"ٹریاڈ ایک بہت بڑی مافیا تنظیم ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر اگرچہ ہانگ کانگ میں ہے لیکن اس کی جڑیں پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ پوری دنیا میں منشیات کی سپلائی پر اس کا کنٹرول ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا اور پھر اسے ٹریاڈ کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا "یہی خوفناک تنظیم ٹریاڈ اب نیپال میں اپنے قدم جمانا چاہتی ہے۔ نیپال کی ایک جرائم پیشہ تنظیم سے اس کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس میں کچھ سیاست داں بھی شامل ہیں۔ یہ لوگ سیاست میں اپنے آدمیوں کو اوپر لا کر اس ملک میں منشیات کی پیداوار پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ قتل و غارت ان کے لیے معمولی بات ہے۔"

"یہ تو بریندرا جیسے پولیس والوں کا درد سر ہے۔ تمہارا ان معاملات سے کیا تعلق؟" مایا متی نے کہا "تم اپنی کسی دوست کو کسی بدمعاش کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے یہاں آئے ہو۔ اس آدمی نے تم پر حملہ کیوں کیا تھا؟"

"ان لوگوں سے میرا کچھ پرانا حساب چل رہا ہے اور آج اتفاق سے وہ شخص میرے سامنے آگیا تھا۔" میں نے کہا اور پھر اسے تھائی لینڈ کے واقعات کے بارے میں بتانے لگا "میں نے گولڈن ٹرائی اینگل میں گھس کر جنرل کھوراٹ کو بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ وہ بہت عرصے تک مجھے تلاش کرتا رہا تھا لیکن میں تھائی لینڈ سے نکل گیا تھا اور مختلف ملکوں میں گھومتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں۔ اس واقعے کو اگرچہ بہت عرصہ بیت چکا ہے مگر ایسی باتیں آسانی سے نہیں بھلائی جا سکتیں۔ یہاں سام سنگ سے آمنا سامنا ہونے اور ہم پر اس حملے کا مطلب یہ ہے کہ پرانا کھیل دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔"

میری باتیں سن کر مایا متی جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

"کیا تمہارا یہ مکان محفوظ ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے بارے میں اور کون جانتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔" مایا متی نے کہا "میں اپنے ساتھ کام کرنے والی دوسری لڑکیوں سے کچھ مختلف واقع ہوئی ہوں۔ دوسری لڑکیاں ویک اینڈ اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتی ہیں اور میں یہاں آرام کرنے آتی ہوں۔ مطالعہ کرتی ہوں۔ یہاں کوئی میری تنہائی میں مخل نہیں ہوتا۔ میرے اس گوشہ عافیت کے بارے میں میری کوئی دوست نہیں جانتی اس لیے تو میں یہاں آئی ہوں۔ مجھے شبہ تھا کہ رات کو کسی وقت رتنا غنڈوں کو لے کر میرے فلیٹ پر پہنچ جائے گی اسی لیے میں یہاں آ گئی۔ یہاں ہم محفوظ ہیں۔ تمہارے لیے بھی فی الحال اس بنگلے میں جانا مناسب نہیں ہے۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ ہم چند روز بڑے اطمینان سے یہاں رہ سکتے ہیں۔"

"اور تمہارے کام کا کیا ہوگا۔ تمہیں تو ڈیوٹی پر جانا ہوگا نا۔" میں نے کہا۔

"کل تو میری چھٹی ہے۔" مایا متی نے جواب دیا "میں اپنی دوست کو فون کر دوں گی کہ وہ میری ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست دے دے۔ اس کے بعد جو حالات ہوں گے ان کے مطابق قدم اٹھایا جائے گا۔"

میں خاموشی سے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ ویسے تو بریندرا والا وہ بنگلا بھی میرے لیے محفوظ تھا لیکن وہاں رہ کر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا جبکہ یہاں مایا متی کے توسط سے حالات سے باخبر رہ سکتا تھا۔ بریندرا اور اعظم خان اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ پچھلے تین دنوں سے انہوں نے میری خبر تک نہیں لی تھی جبکہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے کسی ایسے دوست کی ضرورت بھی تھی جو میری مدد کر سکے اور اتفاق سے مجھے مایا متی مل گئی تھی۔ آج جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مایا متی ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دے گی۔

ہم دیر تک لاؤنج ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مایا متی بار بار بے چینی سے پہلو بدلتی رہی تھی۔

"تمہیں بیٹھنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے بھی ایک بج چکا ہے۔ کمرے میں جا کر سو جاؤ۔"

"دوسرے کمرے میں بستر لگا ہوا ہے۔ تم بھی جا کر سو جاؤ۔" مایا متی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

مایا متی اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ یہاں بیڈ بچھا ہوا تھا اور دو کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں کچھ دیر ایک کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ ناک اور جبڑے میں تکلیف کی وجہ سے بے چینی سی ہو رہی تھی۔ مجھے بلا کے بارے میں بھی پریشانی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ میں جب تک اس سے دور رہوں گا وہ محفوظ رہے گی۔ سام سنگ سے اچانک ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ میں اسپتال میں داخل رہا ہوں اور میری دوست اب بھی اسپتال میں موجود ہے۔

میں دیر تک سام سنگ کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ اسے کھٹمنڈو میں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ وہ اپنے گھناؤنے مشن کے سلسلے میں یہاں آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں گے۔ مجھ سے تو محض اتفاقاً سامنا ہو گیا تھا اور پہلے ہی موقع پر اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ممکن ہے وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتا ہو لیکن اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ مجھے مارنے کے چکر میں اس کا خنجر اپنے ہی ساتھی کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اور اسے سر پر پیر رکھ کر بھاگنا پڑا تھا۔ اب پتا نہیں وہ آدمی زندہ بچا تھا یا مر گیا تھا۔ بہرحال کھیل شروع ہو چکا تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ میں خوابیدہ سی نظروں سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن میں سوچ رہا تھا کہ میری آنکھ بلاوجہ نہیں کھل سکتی تھی۔

اور پھر اچانک کراہنے کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے بستر چھوڑنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ کراہنے کی آواز مایا متی والے کمرے سے آ رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے مایا متی کے کمرے میں پہنچ گیا۔

مایا متی بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا اور وہ بری طرح مچل رہی تھی۔

"ارے! کیا ہوا؟" میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"بہ۔۔۔ بہت شدید درد۔۔۔ ہو رہا ہے۔" مایا متی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھتے ہوئے رک رک کر کہا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے اور وہ ایک ہاتھ سے سینے کو دبائے ہوئے تھی۔

"اگر تم اجازت دو تو میں۔۔۔" میں کہتے کہتے رک گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ ملہم (مرہم) مل دو۔" اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا۔ اسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیوب اٹھالی۔ مایا متی نے اس طرف سے قمیص اوپر اٹھا دی۔ سینے پر نیلا دھبا پڑا ہوا تھا اور سوجن بھی نمایاں تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اسے زوردار ضرب لگی تھی جس سے گوشت پھٹ گیا تھا۔ میں نے ٹیوب سے کریم نکالی اور اس سے ہلکی ہلکی مالش کرنے لگا۔ مایا متی کچھ دیر کراہتی رہی پھر بتدریج پرسکون ہوتی چلی گئی۔ میں نے قمیص درست کر کے کمبل اس پر ڈال دیا اور باتھ روم میں ہاتھ دھو کر بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کچھ سکون ملا۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس کتیا نے کہنی سے ضربیں لگائی تھیں۔ میں چھوڑوں گی نہیں اسے۔"

"فی الحال تو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا "گوشت اندر سے پھٹ گیا ہے۔ تمہیں ٹھیک ہونے میں بھی دو چار روز لگیں گے۔"

"ہاں۔ میں جانتی ہوں اور یہ چند روز تمہیں ہی تکلیف اٹھانی پڑے گی حالانکہ تمہاری حالت بھی اچھی نہیں ہے۔" مایا متی نے کہا "مجھے افسوس ہے۔ تم پہلی مرتبہ میرے گھر آئے اور میں تمہاری خدمت کرنے کے بجائے تم سے خدمت لے رہی ہوں۔"

"دوستی میں کسی پر کوئی احسان نہیں کیا جاتا۔" میں نے جواب دیا "ویسے تمہیں بولنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ آرام سے لیٹی رہو اور سونے کی کوشش کرو۔"

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔" وہ بولی "تم میرے پاس بیٹھے رہو۔ پتا نہیں تم سے اتنی اپنائیت کیوں محسوس ہونے لگی ہے۔"

"یہ تمہارے خلوص کی نشانی ہے۔" میں نے کہا۔ جس انداز سے گفتگو کا موضوع تبدیل ہو رہا تھا اس سے مایا متی کے بارے میں میرے دل میں نئے خدشات جنم لینے لگے۔ مایا متی بھی عورت ہی تھی۔ اس نے اسپتال میں میری بڑی خدمت کی تھی۔ وہ سب کچھ اگرچہ اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا لیکن دل کو پھسلتے ہوئے کتنی دیر لگتی ہے۔ اس وقت مجھے یہی اندیشہ تھا کہ بات کچھ آگے نہ بڑھ جائے اسی لیے میں اسے تلقین کر رہا تھا کہ اسے بولنے میں تکلیف ہوتی ہے اس لیے وہ زبان کو کم سے کم حرکت دے اور آرام سے لیٹی رہے اور سونے کی کوشش کرے۔

مجھے اگرچہ اب نیند نہیں آرہی تھی لیکن میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے ”اونگھتے“ پاکر مایامتی نے بھی آنکھیں بند کرلیں اور پندرہ بیس منٹ بعد وہ واقعی سوگئی تھی۔

میں صبح سویرے شال اوڑھ کر گھر سے نکل گیا۔ رات کو اس طرف آتے ہوئے دوسری گلی کے موڑ پر میں نے ایک ڈھابا دیکھا تھا۔ محلے میں واقع اس قسم کی دکانیں رات کو دیر تک کھلی رہتی ہیں اور صبح بھی جلدی کھل جاتی ہیں۔ اس وقت بھی وہ ڈھابا کھلا ہوا تھا۔ میں انڈے، ڈبل روٹی اور ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں لے کر پیسے دے رہا تھا کہ موٹر سائیکل پر اخبار کا ہاکر آگیا۔ یہ ہاکر اس ڈھابے پر کچھ اخبار دے جایا کرتا تھا جو دن بھر میں بک جایا کرتے تھے۔ اخبار نیپالی زبان میں تھا۔ اس پر لکھا ہوا ایک بھی لفظ اگرچہ میری سمجھ میں نہیں آسکا تھا لیکن صفحہ اول پر ایک تصویر دیکھ کر میں نے ایک اخبار خرید لیا۔

مایامتی ابھی تک سورہی تھی۔ میں نے چائے بنا کر اسے جگایا تو وہ کراہ اٹھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے سینہ دبالیا۔ میں نے اسے سہارا دے کر بیڈ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور چائے کا کپ اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”لو۔ گرم گرم چائے پی لو۔ کچھ سکون ملے گا۔“

”عجیب بات ہے۔“ مایامتی نے مسکرانے کی کوشش کی ”پہلے نرس مریض کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اب مریض نرس کی دیکھ بھال کررہا ہے۔“

”اسی کو تو کہتے ہیں کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔“ میں نے کہا۔ مایامتی نے کپ میرے ہاتھ سے لے لیا۔

چائے ختم کرکے میں نے وہ اخبار اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بھی تصویر پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ وہ ایک ایسے آدمی کی تصویر تھی جو سڑک پر پڑا ہوا تھا اور اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔ یہی تصویر دیکھ کر میں نے اخبار خریدا تھا۔ تصویر کے نیچے کیپشن اور اس کے ساتھ خبر پڑھ کر مایامتی کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔

”میں نے تمہیں یہ اخبار اس لیے نہیں دیا کہ اس تصویر کو دیکھ کر خوف سے کانپنا شروع کردو۔“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ کیا لکھا ہے اس تصویر کے حوالے سے؟“

مایامتی نے ایک بار پھر خبر پڑھی پھر اس نے جو کچھ بھی بتایا وہ بہت دلچسپ تھا ”یہ شہر کے مشہور غنڈے روی کے ایک گرگے یشودھر کی لاش کی تصویر ہے جو گزشتہ رات بنکاک کے ایک مشہور بدمعاش وجدان کے ہاتھوں ایک لڑائی میں مارا گیا۔ یشودھر کا ایک ساتھی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے پولیس کو فون پر بتایا تھا کہ وجدان بنکاک کا بہت بڑا بدمعاش اور منشیات کا اسمگلر ہے۔ نیپال کی پولیس نے کھٹمنڈو میں اس کی موجودگی کو کچھ اچھا شگون قرار نہیں دیا۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اسے تلاش کررہی ہے وغیرہ وغیرہ۔“

خبر واقعی دلچسپ تھی۔ پولیس کو فون پر یہ بیان دینے والا سام سنگ کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا اور اس میں سب سے زیادہ دلچسپی کی بات تو یہ تھی کہ پولیس نے اس گمنام کال پر اعتماد کرتے ہوئے وجدان کی تلاش بھی شروع کردی تھی۔

”رات کو تم نے بتایا تھا کہ تم بہت عرصہ بنکاک میں رہ چکے ہو اور سام سنگ نامی وہ شخص بھی بنکاک ہی کا رہنے والا ہے جس سے رات کو تصادم ہوا تھا۔“ مایامتی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ”پولیس کو ٹیلی فون پر یہ اطلاع بھی اسی نے دی ہوگی لیکن یہ وجدان کون ہے؟ سام سنگ نے اسے پھنسانے کی کوشش کیوں کی ہے؟“

”اس لیے کہ وہ مجھے ہمت سنگھ کے نام سے نہیں جانتا۔“ میں نے جواب دیا ”اس نے پولیس کو وہی نام بتایا جو اسے معلوم تھا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ تم۔۔۔“

”ہاں۔ میں ہی وہ شخص ہوں جسے سام سنگ نے اپنے بیان میں بنکاک کا بہت بڑا بدمعاش اور اسمگلر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح پولیس میرے پیچھے لگ جائے گی اور۔۔۔“

”یہ خبر پڑھ کر میں سمجھ گئی ہوں کہ حالات کا رخ کس طرح موڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔“ مایامتی نے کہا ”میں تو یہ سوچ کر کانپ رہی تھی کہ اس نے اپنا جرم تمہارے سر پر تھوپ دیا ہے اور پولیس تمہاری تلاش شروع کردے گی۔“

”اس نے کوشش تو یہی کی ہے۔“ میں نے کہا ”اور مجھے پولیس پر حیرت ہے کہ انہوں نے اس کے بیان کا یقین کس طرح کرلیا حالانکہ عام طور پر پولیس اس طرح کی گمنام اطلاعات پر یقین ہی نہیں کرتی۔“

”ہوسکتا ہے اس میں بھی پولیس کی کوئی حکمت عملی ہو۔“ مایامتی نے کہا ”ممکن ہے اس طرح وہ اس شخص کو روشنی میں لانا چاہتے ہوں جس نے پولیس کو یہ اطلاعات

کرلیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر پولیس میرے پیچھے لگ گئی تو میرے لیے مشکلات بڑھ جائیں گی اور میں کبھی دیش مکھ تک نہیں پہنچ سکوں گا۔

مجھے بریندرا کے جس بنگلے میں بھیجا گیا تھا وہاں اگرچہ ٹیلی فون موجود تھا لیکن مجھے اس کا نمبر معلوم نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی مجھے غائب پاکر پریشان ضرور ہورہے ہوں گے۔ مجھے تلاش بھی کررہے ہوں گے لیکن میں یہاں چھپا بیٹھا تھا۔

میں نے مایامتی سے بات کی تو اس نے بھی میری تائید کی۔

”بریندرا کا نمبر معلوم کرنا کیا مشکل ہے۔“ اس نے کہا ”میں ابھی پتا کرلیتی ہوں۔“ وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب آگئی۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور ہم لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مایامتی نے فون کا ریسیور اٹھا کر اپنی اسی دوست نرس کا نمبر ملایا اور چند منٹ بات کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے دوبارہ فون کیا اور دوسری طرف سے بتایا جانے والا نمبر ایک کاغذ پر نوٹ کرلیا اور ریسیور رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یہ پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ہے۔ انسپکٹر بریندرا ساڑھے آٹھ بجے اس نمبر پر موجود ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے فون کریں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر ساڑھے آٹھ بجے جب اس نمبر پر فون کیا گیا تو مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ کال کسی اور آفیسر نے ریسیو کی تھی لیکن میں نے اپنا نام (ہمت سنگھ) بتا کر بریندرا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو فوراً ہی اس سے لائن ملادی گئی۔

”ارے مہاشے تم کہاں غائب ہو۔ ہم تو پریشان ہوگئے ہیں۔ پورے شہر میں تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ تم ٹھیک تو ہونا۔“ بریندرا نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا ”معاملہ کچھ ایسا تھا کہ اطلاع نہیں دے سکا۔ انسپکٹر اعظم خان کہاں ہے؟“

”میرے پاس بیٹھا ہے۔“ بریندرا نے کہا اور پھر تھوڑی دیر بعد ریسیور پر انسپکٹر اعظم کی آواز سنائی دی تھی۔

انسپکٹر اعظم خان سے پہلے میں نے ببلا کے بارے میں دریافت کیا اور پھر اس رات کے واقعے کے بارے میں بتا کر اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

”تم اس وقت کہاں ہو؟“ اعظم خان نے پوچھا۔

”صحیح لوکیشن تو مجھے معلوم نہیں لیکن یہ کالی کے استھان کا کوئی علاقہ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کالی کا استھان۔“ دوسری طرف سے یہ نام دہرایا گیا پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انسپکٹر اعظم کی آواز سنائی دی ”اس علاقے میں کانچ اروڑا ہوٹل ہے۔ کیا تم وہاں آسکتے ہو؟“

”یہ ہوٹل میں نے دیکھا تو نہیں ہے لیکن تلاش کرلوں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ دوسری طرف سے کہا گیا ”میں ٹھیک نو بجے اس ہوٹل میں تمہارا انتظار کروں گا۔“

”میں پہنچ جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور چند اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد ریسیور رکھ دیا اور مایامتی کی طرف متوجہ ہوگیا ”انسپکٹر اعظم نو بجے کانچ اروڑا ہوٹل میں میرا انتظار کرے گا۔ یہ ہوٹل اسی علاقے میں ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے۔۔۔“

”یہاں سے کافی فاصلے پر ہے لیکن کوئی بھی رکشا یا ٹیکسی والا ہمیں وہاں پہنچادے گا۔“ مایامتی نے جواب دیا۔

”ہمیں نہیں صرف مجھے۔“ میں نے کہا ”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر وہاں یا راستے میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔“ مایامتی نے گہرا سانس لیتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی اس لیے اس نے میرے ساتھ جانے پر ضد نہیں کی۔

میں پونے نو بجے گھر سے نکل گیا۔ میرا شیو بڑھا ہوا تھا اور ناک ابھی تک کسی حد تک پھولی ہوئی تھی۔ دو تین گلیاں گھوم کر مین روڈ پر آتے ہی مجھے سائیکل رکشا مل گیا۔

میں نے راستوں کو پوری طرح ذہن نشین کرلیا تھا تاکہ واپسی میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ بیس منٹ میں، میں کانچ ہوٹل کے سامنے پہنچ گیا۔ میں اگرچہ پانچ منٹ لیٹ ہوچکا تھا لیکن ہوٹل کے آس پاس ٹہلتے ہوئے میں نے پانچ منٹ اور ضائع کردیے۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں دراصل یہ دیکھ لینا چاہتا تھا کہ آس پاس کوئی مشتبہ آدمی تو موجود نہیں لیکن مجھے ایسا کوئی چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

ہوٹل کے آس پاس کا علاقہ خاصا بارونق تھا۔ یہ رہائشی ہوٹل بھی بہت بڑا تھا۔ گیٹ کے اندر پارکنگ ایریا میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں برآمدے میں پہنچ کر ریسٹورنٹ کی طرف مڑ گیا۔

ریسٹورنٹ میں خاصا رش تھا لیکن انسپکٹر اعظم کو تلاش

کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے ساتھ بریندرا بھی تھا۔ وہ دونوں مجھے دیکھتے ہی اپنی میز سے اٹھ کر میری طرف آگئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہم ریسٹورنٹ سے نکل کر ایک ملحقہ کمرے میں آگئے۔ اس وسیع کمرے میں ایک دوسرے سے فاصلے پر چار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ تین میزوں پر تو کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ناؤنوش میں مصروف تھے۔ چوتھی میز خالی تھی۔ ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے ایک ویٹریس نے اس میز تک ہماری رہنمائی کی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میز خالی رکھی گئی تھی۔ بریندرا نے ویٹریس کو کافی کے لیے کہہ دیا اور ہم میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"سنگھانے بتایا تھا کہ تم اس نرس کے ساتھ کہیں گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ وہ نرس بھی غائب ہے۔" بریندرا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ۔۔۔"

"ہاں۔ کچھ گڑبڑ ہوگئی تھی۔" میں نے انگلی سے ناک سہلاتے ہوئے کہا اور پھر اس رات پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں میں کہہ رہا تھا "آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ ترپاڈ کے لوگ یہاں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سام سنگ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ترپاڈ کا رکن ہے اور ایک موقع پر پہلے بھی میری اس سے جھڑپ ہو چکی ہے۔"

"میں جانتا ہوں مسٹر وجدان۔" اعظم خان نے مسکراتے ہوئے کہا "تم نے گولڈن ٹرائی اینگل میں گھس کر جنرل کھوراٹ کو جو نقصان پہنچایا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دنیا کے آخری کونے تک تمہارا پیچھا کرے گا۔ یہ لوگ آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔"

انسپکٹر اعظم کے منہ سے اپنا اور گولڈن ٹرائی اینگل کا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔" اعظم خان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی "میں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کر چکا ہوں۔" وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "مجھے تم پر اسی وقت شبہ ہوگیا تھا جب تم بملا کے ساتھ ایک ویران جگہ پر بس میں بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم اس لڑکی کو بھگا کر لائے ہو لیکن جب تم نے ہوٹل میں میری جان بچائی تو مجھے اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ اگر تم لڑکی کو بھگا کر لائے ہوتے تو اس قسم کے واقعات سے دور ہی رہتے اور پھر تم نے دلیش مکھ کے بارے میں بتایا تو میں سمجھ گیا کہ تم وہ نہیں جو میں سمجھ رہا ہوں۔ اسی لیے میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"کھٹمنڈو پہنچتے ہی تم لوگوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا۔ اس سے میں پریشان ہوگیا تھا۔ بہرحال' اسپتال میں میں بملا سے تمہارے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ اس سے مجھے جے پور کے حوالے سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ میں نے جے پور میں ٹھاکر بھانوت سنگھ کو فون کر کے تمہارے بارے میں معلوم کیا اور پھر بنکاک پولیس سے بھی فون پر رابطہ کیا۔ وہاں سے تمہارے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا وہ حیران کن ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے حوالے سے بنکاک سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں بتاتا رہا "اس روز اخبار میں تمہارا نام پڑھا تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا "میں نے فوراً ہی متعلقہ پولیس اسٹیشن سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ کسی گمنام آدمی نے فون کر کے پولیس کو تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ تمہیں فریم کیا جا رہا ہے۔ تاکہ ایک طرف پولیس تمہارا پیچھا کرتی رہے اور دوسری طرف وہ لوگ تمہاری تاک میں رہیں۔"

"بالکل یہی بات ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے میرے بارے میں جس طرح تحقیقات کی تھی اس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی "اس رات سام سنگ کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ اس کے ساتھ رتنا نام کی لڑکی مایا متی کی دوست ہے میرا خیال تھا کہ میں بعد میں رتنا سے سام سنگ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اس کے ملا گھنٹوں بعد ہی انہوں نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی۔ سام سنگ نے خنجر سے حملہ تو مجھ پر کیا تھا لیکن اس کا اپنا ہی ساتھی زد میں آگیا۔ اگلے روز اخبار سے پتا چلا کہ مقتول روی کا آدمی تھا۔ اس طرح یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ سام سنگ کے ساتھیوں کو یہاں ناگ پال اور روی جیسے لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔"

"مقامی لوگوں کی حمایت اور تعاون کے بغیر باہر کا کوئی آدمی اپنے گھناؤنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔" انسپکٹر اعظم خان نے کہا "کچھ آدمی ہماری نظروں میں بھی آئے ہیں اور بریندرا کے آدمی ان کے بارے میں معلومات جمع کر رہے ہیں۔ ہم انہیں یہاں قدم جمانے نہیں دیں گے ہمیں صرف موقع کا انتظار ہے۔"

"دلیش مکھ کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس طرف سے غافل نہیں ہوں۔ ایک دو دن میں اس کا پتا چل جائے گا۔" اعظم خان نے جواب دیا "لیکن

مایا متی کہاں ہے؟ وہ بھی اسی روز سے غائب ہے۔"

"وہ محفوظ ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر مایا متی کے بارے میں بتانے لگا۔

انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان ہمارے ٹھکانے کے بارے میں جاننا چاہتے تھے لیکن میں نے بتانے سے انکار کردیا۔

"بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہی رہیں۔" میں نے کہا "میں اپنے طور پر بھی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کے ساتھ رہا تو نہ صرف پابند ہوجاؤں گا بلکہ ان کی نظروں میں بھی آجاؤں گا۔ اسی لیے..."

"سمجھ گیا۔" بریندرا نے میری بات کاٹ دی "لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ہاتھوں کوئی ایسا سنگین جرم نہ ہونے پائے کہ ہم تمہیں تحفظ فراہم نہ کرسکیں۔"

"آپ مطمئن رہیے مسٹر بریندرا۔" میں نے کہا "میری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہوگی کہ قانون کو مجھ سے کوئی شکایت ہو۔"

"اور میرا یہ کارڈ رکھ لو۔" بریندرا نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا "تمہیں فون پر رابطہ کرنے میں آسانی رہے گی۔ اگر میں ان میں سے کسی نمبر پر نہ ملوں تو پیغام چھوڑ دینا۔"

"شکریہ۔" میں نے کارڈ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

باتوں کے دوران میں ہم کافی کی چسکیاں بھی لیتے رہے اور پھر جب میں ہوٹل سے باہر نکلا تو ساڑھے دس بج رہے تھے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہوٹل سے باہر آنے کے بعد میں تقریباً آدھا گھنٹا اس علاقے میں ٹہلتا رہا اور پھر ایک سائیکل رکشا پر سوار ہوکر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

رکشا میں نے دور ہی چھوڑ دیا اور گلیوں میں پیدل چلتے ہوئے مکان تک پہنچ گیا۔

گیٹ کو میں باہر سے کنڈا لگا گیا تھا۔ اندر داخل ہوکر میں نے دروازہ بند کردیا اور برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ پورے گھر کی بتیاں جل رہی تھیں۔ مایا متی نے شاید اکیلی ہونے کی وجہ سے ساری بتیاں جلا رکھی تھیں۔

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو ایک منٹ بعد ہی دروازہ کھل گیا۔ میں جیسے ہی اندر داخل ہوا' دروازہ دھڑ سے بند ہوگیا۔ کوئی نوک دار چیز میری گردن کو چھونے لگی اور اس کے ساتھ ہی ایک غراہٹ میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہاتھ اوپر اٹھالو اور کوئی حرکت مت کرنا۔"

میں پیچھے گھومنا چاہتا تھا لیکن اسی لمحے راہداری میں دائیں طرف سے مایا متی سامنے آگئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے ایک آدمی تھا جس نے بائیں بازو سے مایا متی کو لپیٹ میں لے رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے خنجر کی نوک مایا متی کے گال کو چھو رہی تھی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور میں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے۔

"آگے بڑھو!" میرے پیچھے کھڑا ہوا شخص ایک بار پھر بھیڑیے کی طرح غرایا۔ اس کے ساتھ ہی میری گردن پر نوک کا دباؤ بڑھ گیا۔ اس کی چبھن سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ خنجر یا چاقو تھا "ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی کا گلا کاٹ دیا جائے گا۔"

میں قدم اٹھاتے ہوئے کمرے کے وسط میں آگیا۔ میرے ہاتھ بدستور سر سے اوپر تھے۔ پیچھے کھڑے ہوئے شخص نے میرے لباس کو تھپتھپا کر میری تلاشی لی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرا خنجر بھی اس رات بریندرا کے بنگلے پر ہی رہ گیا تھا جب دلیش مکھ اور اس کے ساتھیوں نے حملہ کیا تھا۔

"تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟ اس طرح کسی کے گھر میں گھسنے کا کیا مطلب ہے۔" میں نے سامنے والے شخص کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا جس نے مایا متی کو دبوچ رکھا تھا۔

مایا متی کے چہرے پر خوف اور کرب کے ملے جلے تاثرات تھے۔

میری گردن پر سے چاقو کی نوک ہٹ گئی اور وہ شخص بھی میرے سامنے آگیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ وہ سام سنگ تھا۔

"اس رات تم بچ گئے تھے۔" سام سنگ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "غلطی میری تھی کہ میں نے اپنے حواس پر قابو نہیں رکھا تھا اور میرا ہی ساتھی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا اور پھر تم گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوگئے۔ ہم پورے شہر میں تمہیں تلاش کرتے رہے لیکن تم لوگوں کا پتا نہیں چلا۔ وہ تو رتنا کی عقل کام کرگئی جس نے بتایا کہ تمہاری یہ دوست مایا متی بھی نرس ہے۔ ہوسکتا ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ کہیں لے گئی ہو اور اس کی کوئی دوست جانتی ہو کہ یہ تمہیں کہاں لے جاسکتی ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہم نے کئی نرسوں سے معلوم کیا۔ سب نے یہی کہا کہ ہوسکتا ہے مایا متی تمہیں ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلی گئی ہو۔

صرف ایک نرس نے یہ انکشاف کیا کہ مایا متی کا یہاں کوئی خفیہ ٹھکانا بھی ہے جہاں وہ ویک اینڈ گزارتی ہے۔ یہ بات ہمیں آج ہی معلوم ہوئی تھی۔

"آج ہم نے مایا متی کے فلیٹ پر ہلّا بول دیا۔ فلیٹ میں اس کے ساتھ رہنے والی لڑکی پہلے تو کچھ بتانے کو تیار نہیں ہوئی لیکن دو ہاتھ پڑتے ہی اس نے زبان کھول دی۔ اس لڑکی کے کہنے کے مطابق مایا متی ہر ویک اینڈ پر غائب ہوجاتی تھی۔ اس نے مایا متی سے کئی مرتبہ پوچھا کہ وہ ویک اینڈ پر کہاں جاتی ہے مگر اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ اس لڑکی کو شبہ تھا کہ مایا متی ویک اینڈ اپنے کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ گزارتی ہے۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک روز اس نے مایا متی کا پیچھا کیا اور اس مکان کو دیکھ لیا لیکن اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ مایا متی ویک اینڈ کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں بلکہ اس مکان میں تنہا رہ کر گزارتی ہے۔ اس طرح ہمیں بھی اس مکان کا پتا چل گیا لیکن وہ لڑکی اب کسی اور کو اس مکان کے بارے میں نہیں بتاسکے گی۔"

"کیا مطلب!" میں نے اسے گھورا۔

"تم تو ہمیں بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ ہم محتاط رہنے کے عادی ہیں۔" سام سنگ نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تو سرنگا سے کہا تھا کہ وہ اس لڑکی کا معقول بندوبست کردے تاکہ وہ کسی اور کے سامنے زبان نہ کھول سکے لیکن اس کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی بھاری ہے۔ اس نے صرف چند سیکنڈ ہی اس کے گلے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اگر وہ لڑکی سانس لینا بھول گئی تھی تو میرے خیال میں اس میں سرنگا کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ ایک بے گناہ لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا لیکن ان لوگوں سے رحم کی توقع نہیں تھی۔ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا ان کی ہابی تھی۔ معمولی سی بات پر کسی کو موت کے گھاٹ اتار دینا ان جیسے لوگوں کے لیے بہت معمولی بات تھی۔

"دیکھو سام سنگ!" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تمہیں میری تلاش تھی۔ میں تمہیں مل گیا۔ مایا متی کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ تو جانتی بھی نہیں کہ میں کون ہوں۔ اسے چھوڑ دو۔ تمہیں جو بھی کھیل کھیلنا ہے میرے ساتھ کھیلو۔ اسے جانے دو۔"

"تمہارے ساتھ تو ہم کسی اور طرح نمٹیں گے۔ کھیل تو اس کے ساتھ کھیلا جائے گا۔" سام سنگ نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا "ایسی حسین لڑکی آسانی سے ہاتھ آجائے تو اس سے دستبردار نہیں ہوا جاسکتا۔ آسانی سے بھی کیوں۔ ہم تو بڑی جدوجہد کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔"

میں چند لمحے سام سنگ کی طرف دیکھتا رہا۔ ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر درندگی نمایاں تھی۔

"جنرل کھوراٹ نے بہت دور تک تمہارا پیچھا کیا تھا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "لیکن تم سنگاپور پہنچ کر فرار ہوگئے۔ تم جس جہاز پر سفر کررہے تھے وہ ہندوستان میں کسی جگہ گر کر تباہ ہوگیا۔ چند مسافر زندہ بچے تھے اور تم ان میں نہیں تھے۔ جہاز کے تباہ ہونے سے بہت سے لوگ زندہ جل گئے تھے جن کی لاشیں بھی شناخت نہیں ہوسکی تھیں اور یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ تم بھی مرجانے والوں میں شامل ہوگے لیکن... اس رات ریسٹورنٹ میں تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے بولا۔

"لیکن تم جیسے لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔ تم واحد شخص ہو جو گولڈن ٹرائی اینگل سے زندہ بچ کر نکل گئے تھے۔ برما اور چین تک تمہارا پیچھا کیا گیا۔ تم پر بار بار حملے ہوتے رہے اور تم ہر بار بچتے رہے۔ تم واقعی بہت ڈھیٹ آدمی ہو۔ ہوائی جہاز کے حادثے میں بھی بچ گئے۔ تمہیں شاید کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ہم لوگ نیپال میں قدم جمانے کی کوشش کررہے ہیں اور تم فوراً یہاں پہنچ گئے۔ تمہیں جنرل کھوراٹ کی طاقت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بڑی بڑی حکومتیں آج تک اس کا راستہ نہیں روک سکیں تو تم کیا تیر مارلو گے۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں ایک لیبارٹری تباہ کرکے فرار ہوجانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم بہت طاقت ور ہو۔ تمہاری موت ہی اب تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔"

"تمہیں اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "میں تو نیپال میں کسی اور مقصد سے آیا تھا لیکن یہ محض اتفاق ہے کہ تم سے سامنا ہوگیا۔ جس طرح تھائی لینڈ میں جنرل کھوراٹ کو میرے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اسی طرح اسے یہاں بھی منہ کی کھانی پڑے گی۔"

"جنرل کھوراٹ کو تو ابھی ہم نے تمہارے بارے میں اطلاع بھی نہیں دی۔" سام سنگ نے کہا "چانگ لی کا خیال ہے کہ جنرل کھوراٹ کو تمہارے بارے میں اطلاع دینے کے بجائے تمہارا سر پلیٹ میں سجا کر اس کے سامنے پیش کیا جائے گا تو وہ زیادہ خوش ہوگا۔ اس لیے ہم نے ابھی تک..."

"چانگ لی کون؟" میں اسے ٹوک کر الجھی ہوئی نظروں

سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی تھی۔ یہ نام مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا۔

"تم شاید چیانگ سائمن کے اس ریٹائرڈ پولیس آفیسر کو بھول چکے ہو جو وہاں جنرل کھوراٹ کے لیے کام کررہا تھا۔" سام سنگ نے جواب دیا "وہ ریڈ کے دوران میں پولیس کی گرفت میں بھی آگیا تھا لیکن رشوت دے کر فرار ہوگیا تھا۔ جنرل کھوراٹ اپنے وفادار کو مایوس نہیں کرتا۔ جنرل نے اسے نیپال کے مشن کا چیف بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ میں جب تمہیں اس کے سامنے پیش کروں گا تو وہ بہت خوش ہوگا۔"

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں اس سے یہ اگلوالیا تھا کہ یہاں ان کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا اور انہوں نے کسی اور کو بتایا بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔

میں نے سام سنگ کے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی مایا متی کو گرفت میں لیے ہوئے تھا اور اس کے خنجر کی نوک مایا متی کے گال میں چبھ رہی تھی۔ مایا متی میری وجہ سے پہلے ہی بہت تکلیف اٹھا چکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی اور نقصان اٹھانا پڑے۔

میری نظریں اس شخص کے خنجر والے ہاتھ پر جم گئیں۔ وہ شخص اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ اس کی انگلیاں خنجر کے دستے پر آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگیں۔

اس کی مٹھی کھلتی جارہی تھی۔ مجھے اس طرف متوجہ پاکر سام سنگ نے بھی اسی طرف دیکھا اور ایک دم چیخ اٹھا۔

"کیا کررہے ہو سرنگا۔ خنجر تمہارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔"

سرنگا کو ایک جھرجھری سی آگئی۔ اسی لمحے اس کی مٹھی پوری طرح کھل گئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر نیچے گر گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی مایا متی بھی تڑپ کر اس کے شکنجے سے نکلی اور جھک کر خنجر اٹھالیا۔ اس سے پہلے کہ میں یا سام سنگ کچھ سمجھ سکتے' مایا متی نے خنجر کا ایک بھرپور وار کیا۔ خنجر سرنگا کے پیٹ میں پیوست ہوگیا۔

سام سنگ بھی جیسے ہوش میں آگیا لیکن اس کے پوری طرح سنبھلنے سے پہلے ہی میں اپنی جگہ پر اچھلا۔ میری کک اس کے خنجر والے ہاتھ پر لگی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں اڑتے ہوئے صوفے کے پیچھے گر گیا۔

سام سنگ ایک دم بدحواس ہوگیا تھا لیکن میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور پے در پے اسے ککس مارتا رہا۔

سام سنگ نے ایک مرتبہ موقع پاکر باہر کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اسے دروازے تک بھی نہیں پہنچنے دیا اور اسے ایک مرتبہ پھر ککس پر رکھ لیا۔

دوسری طرف مایا متی نے خنجر کے پے در پے وار کرکے سرنگا کو بری طرح گھائل کردیا تھا۔ مجھے حیرت ہورہی تھی کہ مایا متی میں اچانک ہی اتنا حوصلہ اور اتنی طاقت کیسے آگئی تھی لیکن سچ ہے کہ کسی بات کا خوف جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو وہ ایک انجانی قوت میں بدل جاتا ہے۔

میں نے سام سنگ کو اٹھا کر پوری قوت سے پٹخ دیا۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ چیختے ہوئے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے ایک پیر اس کے سینے پر رکھ دیا اور اس کا پیر پکڑ کر ٹانگ سیدھی اٹھادی۔

"میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ چانگ لی کہاں ہے اور تم لوگ یہاں کیا کررہے ہو البتہ یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ دلیش مکھ کہاں ہے؟" میں نے اس کی ٹانگ کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"مم۔ میں کسی دلیش مکھ کو نہیں جانتا۔" سام سنگ کراہا۔

"تم جانتے ہو۔" میں نے ٹانگ کو ایک اور جھٹکا دیا "وہی دلیش مکھ جو روی کے پاس انڈیا سے آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ وہ میتی دیوی کے ایک بنگلے میں ہیں۔" اس نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"پورا پتا بتاؤ۔" میں نے اس کی ٹانگ کو ایک اور جھٹکا دیا۔

سام سنگ چیخ اٹھا اور پھر اس نے بنگلے کا پتا بھی بتادیا۔

"تری بھون ائرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر امیگریشن آفس سے ذرا پہلے بائیں طرف ایک سڑک مڑتی ہے۔ اسی سڑک پر بدھ کا ایک چھوٹا سا اسٹوپا ہے۔ اس اسٹوپا کے سامنے گلی میں دائیں طرف تیسرا بنگلا ہے۔ اس کا گیٹ سفید اور سرخ رنگ کا ہے۔ دلیش مکھ اس عورت کے ساتھ وہیں چھپا ہوا ہے۔"

"اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک۔۔۔ صرف ایک۔۔۔" سام سنگ نے جواب دیا۔

میں نے ایک اور زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اس کی ٹانگ چھوڑ دی اور بڑی تیزی سے جھک کر اس کی کنپٹی پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ سام سنگ کراہ کر ایک طرف الٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کم از کم ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں

آسکے گا۔

میں لپک کر مایا متی کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ایک طرف بیٹھی ہانپ رہی تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کا لباس بھی خون آلود تھا۔ سرنگا قالین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے جسم پر دو تین جگہوں سے خون بہہ رہا تھا۔

میں نے مایا متی کے ہاتھ سے خنجر چھین کر ایک طرف پھینک دیا اور اسے وہاں سے اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے حواس کھو بیٹھی ہو۔ اس کا چہرہ بالکل پتھر کی طرح ہورہا تھا۔ تاثرات سے عاری۔

"تم یہاں بیٹھو۔ میں ان لوگوں کو دیکھ لیتا ہوں۔" میں نے مایا متی کو بیڈ پر بٹھانا چاہا تو وہ چیختے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے پتا نہیں کس طرح ہمت کرکے سرنگا پر خنجر سے پے در پے وار کیے تھے لیکن ایک بار پھر خوف عود کر آیا تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ مرگیا۔ میں نے اسے ماردیا۔۔۔" وہ ہکلائی۔

"وہ مرا نہیں زندہ ہے۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "ڈرو نہیں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ ہٹا کر بیڈ پر بٹھادیا اور کمرے سے باہر آگیا۔

سرنگا ابھی زندہ تھا۔ وہ خون میں تر تھا اور اس کے چاروں طرف بھی خون بکھرا ہوا تھا۔ میں چند لمحے صورت حال کا جائزہ لیتا رہا اور پھر میری سمجھ میں ایک ہی بات آئی تھی۔ میں نے جیب سے بریندرا کا دیا ہوا کارڈ نکالا اور فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

کال کسی لڑکی نے ریسیو کی تھی۔

"مسٹر بریندرا ابھی ابھی آئے ہیں اور مصروف ہیں۔ آپ نمبر دے دیجیے۔ وہ فارغ ہوں گے تو میں پیغام دے دوں گی۔" اس نے میری بات سن کر کہا۔

"میرا نام ہمت سنگھ ہے۔" میں نے کہا "ان سے کہنا ایمرجنسی ہے۔ جلدی فون کریں۔" میں نے نمبر بھی لکھوا دیا اور فون بند کردیا۔

"ٹھیک پانچ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھالیا۔ انسپکٹر اعظم خان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"کیا بات ہے وجدان۔ خیریت؟"

"گڑبڑ ہوگئی ہے خان صاحب۔" میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل بتادی۔

"اوہ!" وہ بولا "کہاں ہو تم۔ مجھے پتا بتاؤ۔ ہم فوراً وہاں پہنچ رہے ہیں۔"

میں نے اسے اس مکان کا پتا سمجھادیا اور فون بند کرکے مایا متی کے کمرے میں آگیا۔ وہ بیڈ کی پٹی پر گم صم سی بیٹھی تھی۔

"میں نے بریندرا کو فون کیا تھا۔" میں نے اسے متوجہ کرتے ہوئے کہا "انسپکٹر خان سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ لوگ کچھ دیر میں یہاں پہنچنے ہی والے ہیں۔"

مایا متی کچھ کہنے کے بجائے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

تقریباً بیس منٹ بعد گلی میں گاڑیاں رکنے کی آواز سنائی دی تو میں جلدی سے اٹھ کر باہر آگیا۔ ایک بریندرا کی گاڑی تھی اور دوسری پولیس کی وین۔ پولیس والے اتر کر اِدھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ میں بریندرا اور اعظم خان کو اندر لے آیا۔ بریندرا کے دو ماتحت بھی اندر آگئے تھے۔ سام سنگ ابھی تک بے ہوش تھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پشت پر لے جاکر ہتھکڑی پہنادی۔ بریندرا جھک کر سرنگا کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ ابھی زندہ ہے۔ اسے وین میں ڈال کر اسپتال پہنچادو اور اسے اٹھا کر میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈال دو۔" آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے سام سنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

پولیس والے ان دونوں کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ میں مایا متی کو کمرے سے نکال کر لے آیا۔ وہ اب بھی خوف سے ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

"پریشان مت ہو مایا متی۔" بریندرا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ بلکہ سمجھو کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب آگے جو کچھ ہوگا اسے ہم سنبھال لیں گے۔ تمہارا نام نہیں آئے گا۔"

"اب تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔" اعظم خان نے کہا "اگر تم چاہو تو کل سے اسپتال میں اپنی ڈیوٹی انجام دے سکتی ہو۔"

"میرا خیال ہے ابھی یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "یہاں آنے سے پہلے سام سنگ اور سرنگا مایا متی کی ایک دوست کو بھی گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔ اس کی لاش شاید اب بھی فلیٹ میں پڑی ہوگی یا ممکن ہے اس علاقے کی پولیس کو اس کا پتا چل گیا ہو۔"

"اوہ!" بریندرا اچھل پڑا "یہ کب کی بات ہے اور فلیٹ کہاں ہے؟"

سام سنگ نے مجھے اس لڑکی کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا وہ میں نے بریندرا کو بتا دیا۔ اس نے مایا متی سے فلیٹ کا پتا دریافت کیا اور بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم دیکھ لیتے ہیں۔ تم ایک دو دن یہیں رہ کر آرام کرو۔"

وہ لوگ چلے گئے۔ میں ان کے ساتھ گیٹ تک آیا تھا۔ گلی میں کچھ لوگ جمع ہوگئے تھے۔ ایک دو آدمیوں نے صورت حال معلوم کرنا چاہی تو بریندرا نے یہ کہہ کر ان کی تسلی کروی کہ اس گھر میں ڈاکو گھس آئے تھے اور بروقت اطلاع ملنے پر کارروائی کرکے انہیں پکڑلیا گیا ہے۔

ان کے جانے کے بعد میں گیٹ بند کرکے اندر آگیا۔ سب سے پہلے مایا متی کے خون آلود کپڑے تبدیل کروائے اور پھر لاؤنج والے کمرے سے قالین اٹھا کر باہر ڈال دیا اور فرنیچر پر خون کے دھبے صاف کرنے لگا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک اور عجلت میں ہوا تھا کہ مجھے خود حیرت ہو رہی تھی۔ رات دو بجے کے قریب ہم اس کام سے فارغ ہوئے۔ میں نے کچن میں جاکر خود کافی بنائی اور دونوں مگ لے کر مایا متی والے کمرے میں آگیا۔

اس کے چہرے پر اب بھی سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔ اس نے کافی کا مگ پکڑا تو ہاتھ بھی ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ میں اس کی تسلی کے لیے باتیں کرتا رہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ معاملہ اب بریندرا اور اعظم خان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔

ایک گھنٹے بعد جب میں اپنے کمرے میں جانے لگا تو مایا متی نے مجھے روک لیا۔

"میں کمرے میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ بولی۔

"ڈر کس بات کا۔ اب تو سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔" میں نے کہا "لیکن ٹھیک ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے میں اپنا بستر بھی یہیں لے آتا ہوں۔"

میں دوسرے کمرے سے اپنا بستر لے آیا اور بیڈ کے قریب قالین پر بچھا دیا۔ مایا متی اصرار کرتی رہی کہ میں پلنگ پر لیٹ جاؤں۔ وہ نیچے بچھائے ہوئے بستر پر لیٹ جائے گی لیکن میں اپنے بستر پر لیٹ چکا تھا۔ مجھے نیند صبح چار بجے سے پہلے نہیں آسکی تھی۔

اگلا دن خاموشی سے گزر گیا۔ اخبار میں سرنگا اور سام سنگ کے بارے میں کچھ نہیں چھپا تھا۔ ان دونوں کی گرفتاری کو راز میں رکھا گیا تھا۔

گزشتہ رات سرنگا سے دھینگا مشتی سے مایا متی کے سینے میں ایک بار پھر تکلیف شروع ہوگئی تھی اور مجھے ایک بار پھر اس کے سینے پر مرہم کی مالش کرنی پڑی تھی۔

وہ پورا دن اسی طرح گزر گیا۔ میں ضرورت کی چیزیں لینے کے لیے صرف ایک مرتبہ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس کے بعد میں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔

رات دس بجے کے قریب اعظم خان پہنچ گیا۔

"تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"کیا...؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دلیش مکھ کا پتا چل گیا ہے۔ وہ..."

"وہ میتی دیوی کے علاقے میں ایک مکان میں چھپا ہوا ہے۔ شوبھا بھی اسی کے ساتھ ہے اور ان کے ساتھ صرف ایک آدمی ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ!" اعظم خان نے چونک کر میری طرف دیکھا "تو تمہیں بھی پتا چل گیا ہے۔"

"میں نے کل رات ہی سام سنگ سے معلوم کرلیا تھا۔" میں نے جواب دیا "آپ کے آنے سے پہلے میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اس مکان پر ہلّا بول دینا چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچ کر آیا تھا۔" اعظم خان نے کہا "مجھے سام سنگ نے آج صبح بتایا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک آدمی کو میتی دیوی میں اس مکان کی نگرانی کے لیے بھیج دیا تھا۔ میں خود بھی ابھی اسی طرف سے ہو کر آرہا ہوں۔ دلیش مکھ اسی مکان میں روپوش ہے۔ وہ ایک مرتبہ بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ البتہ ایک نیپالی کو دو تین مرتبہ مکان میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ مکان کی نگرانی کرنے والے نے اسے پہچان لیا ہے۔ وہ روی کا آدمی ہے۔"

"آج دن میں آپ لوگوں نے کیا کیا؟" میں نے پوچھا "سام سنگ کے کسی اور آدمی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"نہیں۔" اعظم خان نے نفی میں سر ہلا دیا "اس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی۔"

"اس کا ایک اور ساتھی بھی یہاں موجود ہے... چانگ لی۔" میں نے کہا "وہ تھائی لینڈ کا ایک سابق پولیس آفیسر ہے۔ ڈیوٹی پر رہتے ہوئے بھی وہ جنرل کھوراٹ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس کے لیے خدمات انجام دیتا رہا۔ ایسے ہی بے ضمیر لوگ اپنے ملک

کی بنیادوں کو دیمک کی طرح چاٹتے رہتے ہیں۔ چانگ لی بہت خطرناک آدمی ہے۔ یہاں روی اور ناگ پال سے ان لوگوں کے رابطے ہیں۔ ناگ پال سے شاید ان کا کوئی معاہدہ بھی ہوا ہے۔"

"کیسا معاہدہ؟" اعظم خان نے پوچھا۔

"جنرل کھوراٹ انہیں برسراقتدار آنے میں مدد دے رہا ہے اور ناگ پال اس کے بدلے میں انہیں پوست کی کاشت والے علاقوں میں قابض ہونے کا موقع دے گا۔ اس علاقے میں ہیروئن تیار کرنے کی دو تین فیکٹری پہلے ہی کام کر رہی ہیں۔ جنرل کھوراٹ ان لوگوں کو بے دخل کرکے اپنی جدید ترین فیکٹریاں لگانا چاہتا ہے۔"

"تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟" اعظم خان نے مجھے گھورا۔

"میں ان لوگوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "سام سنگ نے تمہارے سامنے ابھی تک زبان نہیں کھولی لیکن میں گزشتہ رات اس سے بہت کچھ اُگلوا چکا ہوں۔ آپ کو یہاں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ نیپالی سرکار کے خلاف جو سازش ہو رہی ہے اسے ناکام بنایا جائے۔ میں یہاں کی سیاست کو نہیں سمجھتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اگر ناگ پال کی قوت توڑ دی جائے تو یہ سازش خود بخود ختم ہوجائے گی لیکن اتنا خیال رہے کہ ناگ پال کو جنرل کھوراٹ جیسے شخص کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس نے اس خطے پر قبضہ جمانے کے لیے اپنے خزانے کے منہ کھول رکھے ہوں گے اور آپ جانتے ہیں دولت میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔"

"مجھے ان مشکلوں کا احساس ہے لیکن یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ برائی زیادہ عرصے تک نہیں پنپ سکتی۔" اعظم خان نے کہا "یہاں ناگ پال جیسے زہریلے ناگ ہیں تو بریندرا جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم بہت جلد ان حالات پر قابو پالیں گے۔" انسپکٹر اعظم خان نے کہا۔

"دلیش مکھ کی طرف کس وقت چلنا ہے؟" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"ابھی چلتے ہیں۔" اعظم خان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میں اسی لیے یہاں آیا تھا کہ تمہیں بھی ساتھ لے چلوں گا۔ میں نے یہاں آتے ہوئے اپنے ایک آدمی کو یہاں کا فون نمبر دیا تھا۔ مجھے ایک کال کا انتظار ہے۔"

اور وہ کال ساڑھے گیارہ بجے کے قریب آئی تھی۔ اعظم خان نے صرف دو منٹ بات کی اور فون بند کرکے کھڑا ہوگیا۔

"چلو۔ اب چلیں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

میں نے مایا متی کو ہدایت کردی کہ وہ دروازہ اندر سے لاک کرلے اور میری آواز پہچانے بغیر دروازہ نہ کھولے۔

اعظم خان کی گاڑی میں امیگریشن آفس بلڈنگ والے چوراہے پر پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ہم اس چوراہے سے سیدھا آگے نکل گئے اور اسٹوپا سے تقریباً پچاس گز آگے جاکر اعظم خان نے گاڑی روک لی۔

اس وقت بارہ بجنے والے تھے۔ ہم کار سے اتر کر واپس آرہے تھے کہ ایک آدمی اسٹوپا سے نکل کر ہمارے سامنے آگیا۔ وہ پستہ قامت نیپالی تھا۔ وہ اعظم خان کا وہی آدمی تھا جو مکان کی نگرانی کر رہا تھا۔

"تھوڑی دیر پہلے روی بھی آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" اس آدمی نے بتایا "اس کی گاڑی گیٹ کے سامنے کھڑی ہے۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور تو نہیں آیا؟" اعظم خان نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس شخص نے نفی میں سر ہلا دیا "ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔"

"تم پچھلی گلی میں چلے جاؤ۔ کوئی اس طرف سے فرار ہونے کی کوشش کرے تو گولی مار دینا۔" اعظم خان نے کہا۔

وہ آدمی پچھلی گلی میں چلا گیا۔ میں اور اعظم خان سامنے والی گلی میں داخل ہوگئے۔ تیسرے بنگلے کے سامنے سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ بنگلے کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پہلے میں دیوار پر چڑھ کر بڑی آہستگی سے اندر کودا اور دیوار کے قریب لگے ہوئے پودوں کی آڑ میں دبک گیا۔ ایک منٹ بعد اعظم خان اندر کی طرف کودا تو برآمدے کی طرف سے ایک گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اے۔ کون ہے اُدھر۔ رک جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی فائر کی آواز بھی گونج گئی۔ میں نے برآمدے کی طرف سے شعلہ لپکتے ہوئے دیکھا تھا۔ جواب میں اعظم خان نے بھی گولی چلا دی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی برآمدے کی طرف سے چیخ کی ایک خوفناک آواز ابھری اور ایک آدمی دھڑام سے نیچے گرا۔

میں دوڑتے ہوئے برآمدے میں پہنچ گیا۔ اعظم خان کی گولی اس شخص کی کھوپڑی میں لگی تھی اور وہ فوراً ہی ختم ہوگیا تھا۔ میں نے جھک کر اس شخص کے ہاتھ سے پستول

چھین لیا۔

فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی اور پھر ایک کھڑکی سے فائرنگ شروع ہوگئی لیکن ہم محفوظ ہی رہے۔ اندر جو کوئی بھی تھا' اندھادھند فائرنگ کررہا تھا۔

اعظم خان بھی برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ ہم دونوں ستونوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔

"تم یہیں رکو۔ میں اس طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔" اعظم خان نے سرگوشی میں کہا اور برآمدے سے نکل کر دیوار کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے دوسری طرف دوڑ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور پھر کسی لڑکی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں برآمدے کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اسی لمحے دروازہ کھلا اور اندر سے نکلنے والا شخص مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ پستول بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔ مجھ سے ٹکرانے والا شخص بھی میرے اوپر گرا تھا۔ میں نے اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ مچھلی کی طرح میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا' وہ شخص دوڑتے ہوئے بنگلے کی کمپاؤنڈ وال پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے بھی اسی طرف چھلانگ لگا دی۔

وہ شخص باہر کود گیا تھا۔ میں گیٹ کھول کر باہر نکلا تو وہ شخص گلی کی تاریکی میں غائب ہوچکا تھا۔ اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں بنگلے میں واپس آگیا۔

اندر کا منظر بڑا سنسنی خیز تھا۔ راہداری میں ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ سر میں لگنے والی گولی سے اس کا بھیجا بھی بہہ نکلا تھا۔ اس کے چاروں طرف خون بکھرا ہوا تھا اور پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس سے کچھ دور رتنا ایک کونے میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے بدن پر لباس برائے نام ہی تھا۔ چہرے پر زردی تھی اور وہ خوف سے تھرتھر کانپ رہی تھی۔ میری صورت دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کے سائے کچھ اور بھی گہرے ہوگئے۔

"اگر نایا متی یہاں ہوتی تو تم سے اس رات کا بدلہ ضرور لیتی۔" میں نے رتنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اسے جو چوٹ لگائی ہے وہ اب تک جھیل رہی ہے۔ شکر کرو وہ اس وقت یہاں نہیں ہے۔"

رتنا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ میں اعظم خان کی طرف متوجہ ہوگیا جو راہداری کے عین سامنے لاؤنج میں فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔

"وہ عورت کہاں ہے؟" میں نے ایک بار پھر گھورتی ہوئی نظروں سے رتنا کی طرف دیکھا۔

رتنا نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کردیا اور جب میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

سامنے بیڈ پر شوبھا پڑی ہوئی تھی۔ وہ ہڈیوں کا ڈھانچا بن کر رہ گئی تھی۔ رخسار پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ چند ہفتے پہلے تک وہ کتنی شاندار عورت تھی اور اب نچڑ کر رہ گئی تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کی حالت دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور پھر میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ میں اس سے لپٹ گیا۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ شوبھا کو اس حالت میں دیکھ کر نجانے کیوں مجھے تھائی یاد آگئی اور پھر بے اختیار میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔

شوبھا نے کچھ دیر مجھے اپنے سینے کے ساتھ بھینچے رکھا پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور جب میں سیدھا ہوا تو چادر سے باہر نکلا ہوا اس کا برہنہ بازو دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ بازو پر کئی ایسے نشان نظر آرہے تھے جیسے متعدد انجکشن لگائے گئے ہوں۔ میں نے اس کا دوسرا بازو اٹھا کر دیکھا۔ اس پر بھی ایسے ہی نشانات تھے اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بڑا سنسنی خیز ثابت ہوا کہ اسے دن میں دو مرتبہ مارفین اور پیتھیڈرین کے انجکشن لگائے جاتے تھے۔ گولڈن ٹرائی اینگل میں تھائی کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا تھا۔ اسے ہیروئن استعمال کرائی جاتی تھی۔

میں نے اسے اٹھانا چاہا تو چادر ہٹ گئی۔ اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ اس پر چادر ڈال دی اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شوبھا میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے کچھ کہے بغیر ایک الماری کی طرف اشارہ کردیا۔

میں نے آگے بڑھ کر الماری کھول دی۔ اس میں مردانہ کپڑوں کے ساتھ دو تین زنانہ جوڑے بھی ٹنگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک جوڑا ہینگر سے اتار لیا۔

"تم خود سے پہن لوگی یا۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شوبھا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کردیا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا رہا۔ رتنا اب بھی ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ اعظم خان اب بھی فون پر بات کررہا تھا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف آگیا۔

"یہ کون ہے؟" میں نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"روی!" اعظم خان نے جواب دیا۔

باہر برآمدے میں جو شخص اعظم خان کی گولی سے ہلاک ہوا تھا وہ نیپالی تھا جس کا مطلب تھا کہ جو شخص فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا وہ دیش مکھ تھا۔ اعظم خان کا وہ آدمی' جسے بنگلے کے پچھلی طرف بھیجا گیا تھا' بھی اندر آچکا تھا اور برآمدے والے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔

"میں نے بریندرا کو فون کردیا ہے۔ وہ فورس لے کر پہنچنے ہی والا ہے۔" اعظم خان نے بتایا پھر بولا "وہ کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے۔"

"شوبھا اس کمرے میں ہے۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا "اس کی حالت بہتر نہیں ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال بھجوانا ہوگا۔"

"بریندرا آتا ہے تو اس کا بندوبست کرتے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ دیش مکھ نکل جانے میں کامیاب ہوگیا لیکن بچ کر کہاں جائے گا۔" اعظم خان نے کہا پھر کونے میں بیٹھی ہوئی رتنا کی طرف دیکھنے لگا "چلو اٹھو۔ کپڑے پہنو۔ ابھی تمہارے سسرال والے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ کپڑے کہاں ہیں تمہارے؟"

"اس کمرے میں۔" رتنا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اور جب دوسرے کمرے میں داخل ہو کر رتنا نے دروازہ بند کرنا چاہا تو اعظم خان بڑی تیزی سے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہوگیا اور دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔ اس کے فوراً ہی بعد مجھے رتنا کی چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔

ایک منٹ بعد دروازہ کھل گیا اور پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی کہ اعظم خان نے رتنا کے پیچھے کمرے میں چھلانگ کیوں لگائی تھی۔ کمرے کی عقبی سمت کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور غالباً رتنا نے اس طرف سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

اعظم خان نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا تھا۔ رتنا تھپڑ کھانے کے بعد ایک بار پھر تھرتھر کانپنے لگی تھی۔ اس نے کپڑے پہن لیے اور اعظم خان کے اشارے پر ایک طرف بیٹھ گئی۔

میں نے شوبھا والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ بھی کپڑے پہن چکی تھی اور بستر پر پڑی ہانپ رہی تھی۔ میں اس کے قریب آگیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے بولا۔

"تم نے بہت کشٹ (مشکلات) اٹھایا ہے شوبھا لیکن اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

شوبھا نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ اعظم خان بھی اندر آگیا۔ اس نے ایک دو منٹ شوبھا سے بات کی اور پھر باہر نکل گیا۔

مزید پندرہ منٹ گزر گئے۔ باہر گلی میں بہت سے لوگ جمع ہوچکے تھے۔ شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن اندر داخل ہونے کی کسی نے جرأت نہیں کی تھی۔

اور پھر پولیس سائرن کی آواز سن کر اعظم خان برآمدے میں چلا گیا۔ اس کے ساتھی نے باہر کا گیٹ کھول دیا۔ بریندرا اور کئی پولیس والے اندر آگئے۔ رتنا کو دو پولیس والوں کے حوالے کردیا گیا۔

پندرہ منٹ بعد مجھے اور شوبھا کو ایک پولیس جیپ میں بٹھا کر اسپتال کی طرف روانہ کردیا گیا۔ دو مسلح پولیس والے بھی ہمارے ساتھ تھے۔

اسپتال میں شوبھا کا فوراً ہی ٹریٹ منٹ شروع کردیا گیا۔ کئی روز بعد اس رات مجھے ببلا سے بھی ملنے کا موقع مل گیا۔ وہ سو رہی تھی لیکن ڈیوٹی پر موجود نرس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

ببلا جاگ گئی۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"میں تو سمجھی تھی کہ تم مجھے چھوڑ کر جاچکے ہو۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ وہ پہلے سے بہت بہتر ہوچکی تھی۔

"تمہیں چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں۔ میں تو شوبھا کی تلاش میں تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کچھ پتا چلا اس کا؟" ببلا نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ مل گئی ہے اور اس کو اسپتال لے کر آیا ہوں۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ! کیا ہوا اسے؟" ببلا بولی "کہاں ہے وہ۔ میں ابھی اس سے ملوں گی۔"

"اس کی حالت بہتر نہیں ہے۔ صبح مل لینا۔" میں نے جواب دیا اور بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں تقریباً آدھے گھنٹے تک بلا سے باتیں کرتا رہا اور پھر اچانک ہی مجھے مایا متی کا خیال آگیا۔ میں بلا سے دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے اس کے کمرے سے نکل آیا۔ کچھ دیر شوبھا کے پاس رکا۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن لگایا تھا اور اس پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

میں مایا متی کے مکان پر واپس پہنچا تو تین بجنے والے تھے۔ مایا متی خوف کی وجہ سے ابھی تک جاگ رہی تھی اور اس نے گھر کی ساری بتیاں جلا رکھی تھیں۔ میری آواز پہچاننے کے بعد ہی اس نے دروازہ کھولا تھا۔

کئی روز سے کچھ ایسی ہی سرگرمیاں تھیں کہ رات کے آخری پہر تک بھاگ دوڑ رہتی تھی۔ نیند بھی پوری نہیں ہوتی تھی اور تھکن بھی ہو رہی تھی۔ مایا متی کو میں نے اتنا ہی بتایا تھا کہ میری دوست مل گئی ہے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں بستر پر لیٹا تو مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

○☆○

کئی روز گزر گئے۔ بلا کو اسپتال سے فارغ کردیا گیا تھا۔ اس کا زخم مندمل ہوچکا تھا۔ بس ذرا احتیاط کی ضرورت تھی۔ تاہم شوبھا اسپتال ہی میں تھی۔ اسے کئی روز تک علاج کی ضرورت تھی۔ مایا متی بھی اپنے فلیٹ پر منتقل ہوچکی تھی اور اس نے ڈیوٹی بھی جوائن کرلی تھی۔ بریندرا نے یہ مہربانی کی تھی کہ ایک آدمی اس کی حفاظت پر مقرر کردیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ پولیس کے دو آدمی سادہ لباس میں اس کے لیے وقف کردیے گئے تھے۔ ایک دن میں اس کے آس پاس موجود رہتا اور دوسرا رات کو اس کے فلیٹ کی نگرانی کرتا۔

میں اور بلا آرنیکو روڈ پر دریائے دھوبی کھولا کے کنارے ایک اور مکان میں منتقل ہوگئے تھے (نیپال میں بے شمار چھوٹے بڑے دریا ہیں اور یہاں دریا کو کھولا کہا جاتا ہے) یہ مکان ایک خوب صورت کاٹیج کی طرح تھا اور اس کے گرد ایک وسیع کمپاؤنڈ بھی تھا۔ اس کا بندوبست بریندرا ہی نے کیا تھا اور مجھے بعد میں پتا چلا تھا کہ یہ کاٹیج محکمہ پولیس کی ملکیت تھا جسے کبھی کبھار مہمانوں کے لیے ڈاک بنگلے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور عام طور پر یہ خالی ہی رہتا تھا۔ یہاں بریندرا نے ہمارے لیے ایک آدمی کا بھی بندوبست کردیا تھا۔ ادھیڑ عمر کا شما ایک اچھا خانساماں بھی تھا۔ بریندرا ہی کے توسط سے میں نے ایک چھوٹی کار بھی کرائے پر لے لی تھی۔ ان تمام انتظامات کے علاوہ اگلے ہی روز آسن جمال روڈ پر واقع ایک دکان سے میں نے ایک خنجر بھی خرید لیا تھا۔ خنجر کے بغیر میں اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا تھا۔

ردی کی ہلاکت کے بعد ان لوگوں کی سرگرمیاں کچھ ... ہوگئی تھیں۔ دلیش مکھ' ناگ پال سے جا ملا تھا۔ سام سنگر بریندرا اور اعظم خان نے اس طرح غائب کیا تھا کہ اس کے بارے میں کچھ سننے ہی میں نہیں آرہا تھا۔

گاڑی مل جانے کے بعد مجھے گھومنے پھرنے میں بھی ... آزادی مل گئی تھی۔ میں کبھی بلا کو ساتھ لے کر شہر ... گھومتا رہتا اور کبھی اکیلا ہی نکل جاتا۔ جب میں اکیلا ہوتا ... ان علاقوں میں نکل جاتا جہاں قدم قدم پر غنڈوں ... بدمعاشوں سے سامنا ہونے کا احتمال رہتا تھا۔ مجھے دراصل کچھ ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو ردی اور ناگ ... کے کسی مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی حد ... اپنے وطن سے مخلص بھی ہوں۔

اس رات میں ریڈلائٹ ایریا میں تھا۔ گاڑی میں ... دور ایک کشادہ سڑک پر ایک بڑے شاپنگ سینٹر کے پارکنگ لاٹ پر چھوڑ دی تھی اور اندھیری گلیوں میں پیدل چلتے ہوئے بالآخر ایک تھرڈ کلاس ریسٹورنٹ میں بیٹھ گیا تھا۔

یہ اسکن بزنس کا ایریا تھا۔ منشیات بھی یہاں کھلے ... فروخت ہو رہی تھی۔ بدمعاش اور رہزن بھی شکار کی تلاش میں پھرتے رہتے تھے۔ یہاں معمولی معمولی باتوں پر چاقو ... پستول نکل آتے تھے۔ اس علاقے میں گھومتے ہوئے میں ... بہت جلد اندازہ لگالیا کہ یہاں منشیات فروشوں اور غنڈوں ... کے کئی گروہ سرگرم عمل تھے۔ مجھے بھی منشیات فروش ... ایجنٹوں نے ایک دو جگہوں پر روکنے کی کوشش کی تھی مگر ... کنی کترا کر نکل آیا تھا۔

ریسٹورنٹ میں بھی ایک دو منشیات فروش بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک نوعمر لڑکا میری میز پر آ بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے ہیروئن کی پڑیا دکھا کر سستے داموں خریدنے کی پیشکش کی تھی لیکن میں نے اس کی بات پر توجہ نہیں ...

"شاب جی۔" اس نے آگے جھکتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا "لونڈیا مانگتا ہے تو بھی ہم کو بولنے کا ہے نا۔ ایک دم ... ان ٹچ۔ فسٹ کلاس۔"

میں نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو فر ادھر کیا کرنے کو آیا شاب جی۔" لڑکے نے ... گھورا "نشہ نئیں۔ لونڈیا نئیں۔ تو ادھر کیا لینے کو آیا؟"

وہ لڑکا اٹھ کر چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ بارہ تیرہ سال عمر کے اس لڑکے کا مستقبل کیا ہوگا؟

میں ریسٹورنٹ میں بیٹھا بدمزہ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ باہر دو آدمیوں میں کسی بات پر جھگڑا شروع ہوگیا۔

ایک دوسرے کو گندی گالیاں دیتے ہوئے سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ان کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ دور ہٹنے لگے۔ وہ دونوں صورتوں ہی سے بدمعاش لگ رہے تھے۔ ایک قدرے نکلتے ہوئے قد اور صحت مند جسم کا مالک تھا جبکہ دوسرا درمیانے قدو قامت کا اور دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ اپنے حریف سے زیادہ تیز و طرار لگ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر ان کی لڑائی باتوں سے آگے بڑھی تو وہ پٹ جائے گا۔

لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔ دراز قامت غنڈے نے اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ دبلے پتلے غنڈے نے غفلت میں ایک تھپڑ تو کھالیا تھا لیکن اس کے بعد اس نے اپنے حریف کی جو درگت بنائی وہ قابل دید تھی۔

ہٹا کٹا غنڈا مار کھا کر پسپا ہوگیا اور پھر یہ دھمکی دیتے ہوئے بھاگ گیا کہ وہ اپنے باپ کی حلال کی اولاد ہے تو وہیں کھڑا رہے۔

میں دروازے کے قریب والی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دبلا پتلا غنڈا میری میز پر آکر بیٹھ گیا۔

"بھاگ گیا سالا۔" وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا "ناگ پال کے سائے میں جی رہے ہیں حرامی۔ اپنے اندر اتنا دم خم نہیں کہ ون ٹو ون مقابلہ کرسکیں۔ اب گیا ہے اپنی ماں کے کھسموں کو بلانے۔ اپن بھی آج بوت تپا ہوا ہوں۔ ایک آدھ کا گردن توڑ کر ہی جائے گا ادھر سے۔"

ناگ پال کا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ منحنی سا بدمعاش ناگ پال کا حریف تھا۔ ممکن ہے اس کا اپنا کوئی گینگ ہو یا اکیلا ہی ہو لیکن اس کی دلیری' حوصلہ اور لڑنے کا انداز مجھے پسند آیا تھا اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس جنگ کا آخری مرحلہ دیکھ کر ہی یہاں سے اٹھوں گا۔

"چائے پیو سومبا دادا۔ وہ بھاگ گیا۔ اب نہیں آئے گا۔" ہوٹل کے ویٹر نے اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔

"جب تک وہ حرامی نئیں آئے گا ہم بھی ادھر بیٹھا ہوں۔" سومبا دادا نے کپ اٹھاتے ہوئے کہا "تم لوگ گواہ رہنا۔ سومبا دادا بھاگا نئیں ہے۔ میں سالا ناگ پال حرامی سے نئیں ڈرتا۔"

وہ بولتا رہا اور میں دلچسپ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

اور پھر آدھے گھنٹے بعد اس کا حریف واپس آگیا۔ اس کے ساتھ اس کی طرح کے دو ہٹے کٹے غنڈے اور بھی تھے۔ سومبا اٹھ کر ریسٹورنٹ سے باہر چلا گیا۔ وہ ان لوگوں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر تک گالیوں اور دھمکیوں کا تبادلہ ہوتا رہا اور پھر وہاں ایک خوفناک جنگ شروع ہوگئی۔

میں بڑی دلچسپی سے سومبا کو لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی خوب صورتی سے داؤ پیچ استعمال کر رہا تھا۔ اس کے پہلے حریف نے خنجر نکالا تو پلک جھپکنے کی دیر میں وہ خنجر سومبا کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔

ایک موقع پر سومبا ان کے قابو آگیا۔ دو آدمیوں نے اسے اس طرح گرفت میں لیا کہ وہ تقریباً بے بس ہو کر رہ گیا تھا جبکہ تیسرا آدمی خنجر اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔

مجھے بنکاک کا وہ خوفناک منظر یاد آگیا جب میں تھائی کے ساتھ اندرا ریجنٹ ہوٹل گیا تھا اور ٹائیگر کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ مہاراج کے آدمی ہماری مدد کو پہنچ گئے تھے اور ٹائیگر کے آدمیوں نے ماسٹر پھوپھانگ کو اسی طرح موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ لوگ دور دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی میں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوسکا۔ ایک اچھا اور کارآمد آدمی بے موت مارا جارہا تھا۔

میں ایک ہی چھلانگ میں ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ وہ آدمی سومبا پر حملہ کرنے کے لیے خنجر والا ہاتھ سر سے اوپر اٹھا چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ وار کرتا' میں اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پھیپڑوں کی پوری قوت سے ییل (YELL) کیا تھا۔ مارشل آرٹ میں یہ بھی ایک کمال ہے کہ حریف پر حملہ کرتے ہوئے دہاڑنے کی آواز اس کا حوصلہ پست کردیتی ہے۔

میں پوری قوت سے ہوا میں اچھلا تھا۔ میری فلائنگ کک اس کے منہ پر لگی اور وہ بلبلاتے ہوئے پیچھے الٹ گیا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا تھا۔ میں بھی نیچے گرا تھا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ میرا یہ حملہ اس شخص کے لیے اگرچہ بالکل غیر متوقع تھا لیکن وہ فوراً ہی اٹھ گیا تھا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک اور فلائنگ کک لگادی اور پھر پے درپے اسے ککس لگاتا رہا۔

سومبا اب بھی ان دو آدمیوں کی گرفت میں تھا۔ ان دونوں نے اسے پیچھے سے جکڑ رکھا تھا۔ سومبا آہستہ آہستہ آگے کو جھکنے لگا اور پھر اس نے اپنے آپ کو آگے کی طرف زوردار جھٹکا دیا۔ وہ دونوں اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے پشت کے بل زمین پر گرے۔

سومبا فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ اس کا ایک حریف اٹھنے

کی کوشش کر رہا تھا لیکن سومبا کی زور دار ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر پڑی اور وہ بلبلاتے ہوئے الٹ گیا۔

یہ کھیل چند منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ میں اور سومبا ان تینوں کو بار بار زمین چاٹنے پر مجبور کر رہے تھے۔ سومبا کا اصل حریف، جس سے شروع میں جھگڑا ہوا تھا، زیادہ تر میرے ہتھے چڑھا رہا تھا۔ اس کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ شخص میرے سامنے زمین پر پڑا ہوا تھا۔ سومبا نے آگے بڑھ کر اسے زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

"آج میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔" وہ ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا "اس حرامی ناگ پال سے بھی کہہ دینا کہ آئندہ میرے راستے میں آنے کی کوشش نہ کرے۔ میں اس حرامی کو بھی زمین چٹا دوں گا۔"

وہ شخص اٹھ کر ایک طرف بھاگ گیا۔ سومبا میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"شکریہ دوست۔" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا "تم میرے لیے اجنبی ہو لیکن جس طرح تم نے میری جان بچائی ہے میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا لیکن کیا تم نے بیچ میں کود کر غلطی نہیں کی؟"

"نہیں دوست۔ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔" میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے جواب دیا "تم جیسے دلیر اور حوصلہ مند آدمی کے کام آ کر مجھے خوشی ہوئی۔"

"یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" وہ بولا "ناگ پال اپنے آپ کو اس دیش کا راجا سمجھنے لگا ہے مگر ہے تو وہی اُچکا، جیب کترا۔ دولت آ جانے سے آدمی کی فطرت تو نہیں بدل جاتی۔ بہرحال، آؤ۔ میرے ساتھ ایک کپ چائے پیو۔"

ہم ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ ویٹر نے پوچھے بغیر ہمارے سامنے چائے رکھ دی۔ اب دور دور کھڑے ہوئے لوگ بھی قریب آنے لگے تھے۔ سومبا کو تو تقریباً سب ہی لوگ جانتے تھے۔ بہت سے لوگ مجھے بھی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

ہم ابھی چائے پی رہے تھے کہ بغیر ہڈ کی ایک جیپ ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رکی۔ اس میں آٹھ دس غنڈے بھرے ہوئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں ہاکی تھی کسی کے ہاتھ میں تیغہ اور کوئی لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔

میں محتاط ہو گیا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید یہ انہی لوگوں کے آدمی ہیں جو مار کھا کر بھاگے ہیں لیکن یہ سومبا کے آدمی تھے۔

"میں تو دلّی بازار میں تھا سومبا دادا۔" ایک لمبا غنڈا آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں تیغہ تھا "جیسے ہی اطلاع ملی میں ان لوگوں کو لے کر چلا آیا۔ کون تھے لوگ، کہاں گئے۔ ہمیں بتاؤ۔ ہم ان کے ٹکڑے کر کے پھینک دیں گے۔"

"بھاگ گئے وہ حرامی۔ اس ٹائیگر نے انہیں مار مار بھگا دیا۔" سومبا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر میرے بارے میں بتانے لگا کہ اگر میں مداخلت نہ کرتا تو آج مارا جاتا۔

وہ سب لوگ میرے سامنے جھک گئے۔

"تم لوگ جاؤ۔" سومبا نے کہا "اب کئی روز تک حرامی لوگ اپنے زخم چاٹتے رہیں گے اور اس کے بعد ہی کچھ کرنے کی سوچیں گے اور پھر جو کچھ بھی ہو گا دیکھا جائے گا۔ جاؤ۔ تم لوگ اپنا اپنا کام کرو۔"

وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ہم تقریباً آدھا گھنٹا مزید وہاں بیٹھے رہے اور پھر میں اٹھ گیا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" میں نے سومبا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

ہم ریسٹورنٹ سے نکل کر ٹہلتے ہوئے اس طرف آ گئے جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر سومبا کو پسنجرز سیٹ پر بٹھایا اور پھر اوپر سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

میں سومبا کو مایا متی والے مکان میں لے آیا۔ اس کی ایک چابی میں نے مایا متی سے پہلے ہی لے لی تھی۔

سومبا کو پہچاننے میں، میں نے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ غنڈا ضرور تھا مگر منشیات کی خرید و فروخت سے اسے نفرت تھی۔ کتالی نام کے اس غنڈے سے سومبا کی لڑائی اسی بات پر ہوئی تھی۔ کتالی کا تعلق ناگ پال کے گروہ سے تھا اور ناگ پال کا اصل بزنس منشیات ہی سے متعلق تھا۔ اس کے گروہ کے لڑکے وہاں گھوم پھر کر منشیات فروخت کرتے تھے اور کتالی ان لڑکوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ سومبا نے اسے منع کیا تھا کہ اپنے لڑکوں کو یہاں سے لے جائے اور اسی بات پر جھگڑا بڑھ گیا تھا۔

وہ ناگ پال کے آدمی تھے جو پٹ کر گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ بات یہیں ختم نہیں ہو گئی تھی۔ معاملہ آگے بڑھے گا۔ ناگ پال کو جب پتا چلے گا تو وہ خاموش نہیں رہے گا۔ اتفاق یہ تھا کہ میں بھی اس معاملے میں ملوث ہو گیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ مجھے سومبا جیسا آدمی مل گیا تھا

جس سے میں کام لے سکتا تھا۔

سومبا سے کھل کر باتیں ہوئیں۔ اسے میں نے بتا دیا کہ یہاں کیا سازش ہو رہی ہے اور جنرل کھوراٹ یہاں پوست کی کاشت والے علاقے پر کس طرح قبضہ جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اسے سام سنگ اور چانگ لی کے بارے میں بھی بتا دیا جو ناگ پال کی اس معاملے میں مدد کر رہے تھے۔

"اچھا۔ وہ چینی۔" سومبا نے کہا "مجھے اس پر پہلے ہی شبہ تھا۔ اچھا ہوا تم نے بتا دیا لیکن تمہارا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"میرا بھی ان سے کچھ پرانا حساب چل رہا ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے تھائی لینڈ میں منشیات کی اسمگلنگ کے حوالے سے پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتانے لگا "میں یہاں دیش مکھ کے تعاقب میں آیا تھا۔" میں نے اس تعاقب کا پس منظر بھی بتا دیا اور آخر میں اسے سام سنگ سے آمنا سامنا ہونے کے بعد سے اب تک کے واقعات بتانے لگا۔

"ہم دونوں کا راستہ ایک ہی ہے۔" میرے خاموش ہونے پر وہ بولا "تم جس طرح اس لڑائی میں کود پڑے تھے اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتے۔ ایسے حالات میں ہر کوئی دور بھاگتا ہے لیکن تم نے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔ آج سے ہماری دوستی پکی۔ تم آواز بھی دو گے تو یہ سومبا اپنی جان ہتھیلی پر لے کر پہنچ جائے گا۔"

"مجھے صرف ایک معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"حکم کرو۔" وہ بولا "مجھے کسی آزمائش میں پیچھے نہیں پاؤ گے۔"

"ان کا منصوبہ بہت خطرناک ہے۔" میں نے کہا "گولڈن ٹرائی اینگل کا جنرل کھوراٹ یہاں بھی اپنے قدم جمانا چاہتا ہے تاکہ یہاں بھی ہیروئن کی فیکٹریاں لگا سکے۔ اس نے ناگ پال جیسے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے جو اس کا راستہ ہموار کر رہے ہیں۔" میں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر اسے بتانے لگا کہ وہ لوگ کس طرح یہاں اپنی جگہ بنا رہے ہیں "موت کے یہ سوداگر ہشت پا کی طرح پوری دنیا میں پھیل رہے ہیں۔" میں کہہ رہا تھا "ظاہر ہے ہم پوری دنیا میں اس سیلاب کو نہیں روک سکتے لیکن جس حد تک ممکن ہو اس حد تک کوشش تو کر سکتے ہیں۔ یہ تمہارا دیش ہے۔ تم اور تمہاری طرح کے دوسرے بہت سے لوگ چاہیں گے کہ یہاں کے لوگ اس زہر سے محفوظ رہیں۔ میں اتنا چاہتا ہوں کہ یہاں ان کے قدم نہ جمنے پائیں۔ اگر نیپال میں ان کے قدم جم گئے تو اس کے بعد وہ انڈیا کے شمالی خطے کی طرف بڑھیں گے۔ ہماچل پردیش کا علاقہ بھی پوست کی پیداوار کے لیے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ وہاں بھی چرس وافیون وغیرہ سرعام فروخت ہوتی ہے۔ منشیات کی خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جنرل کھوراٹ اس صورت حال سے فائدہ اٹھائے گا اور نیپال کے بعد اس کے قدم اسی خطے کی طرف اٹھیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ اسے یہیں روک دیا جائے اور آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" سومبا نے کہا "مجھے بتاؤ کیا کرنا ہو گا۔ میرے پاس ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو میرے ایک اشارے پر آگ میں بھی کود پڑیں گے۔ آج سے وہ سب تمہارے ڈسپوزل پر ہوں گے۔ تم حکم کرو۔"

"فی الحال تو ناگ پال اور اس کے غیر ملکی مہمانوں جنہیں تم چینی سمجھ رہے ہو، کی نگرانی کی ضرورت ہے۔ دیش مکھ بھی ناگ پال کے پاس پہنچ گیا ہے۔ وہ میرے سامنے بازی ہار گیا ہے لیکن میں جانتا ہوں وہ چین سے نہیں بیٹھے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ فی الحال ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جائے۔"

"تم فکر مت کرو۔" سومبا نے کہا "میں اپنے سارے آدمیوں کو حرکت میں لے آؤں گا۔"

"اس طرح گڑبڑ ہو جائے گی۔" میں نے کہا "دو چار ذہین آدمیوں کو منتخب کر کے ان کی ڈیوٹی لگا دو جو روزانہ شام کو تمہیں رپورٹ دیتے رہیں۔ میری اور تمہاری ملاقات روزانہ رات گیارہ بجے اسی مکان میں ہو گی اور ہم آپس میں تبادلہ خیال کر لیا کریں گے۔"

سومبا نے میرے اس پروگرام سے اتفاق کیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری اس روز کی ملاقات ختم ہو گئی۔ سومبا کو رخصت کرنے کے بعد میں تقریباً آدھا گھنٹا مزید اسی مکان میں ٹھہرا رہا اور پھر دروازوں کو تالے لگا کر چابیوں کا گچھا میں نے برآمدے میں اسی طاق میں رکھ دیا جہاں سے اس رات مایا متی کو اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا۔

جب میں اپنی گاڑی پر وہاں سے رخصت ہو رہا تھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ دریائے دھوبی کھولا کے کنارے پر وہ ڈاک بنگلا بھی اگرچہ کالی کا استھان کے ہی علاقے میں تھا۔ اس سے ذرا آگے آر نیکو روڈ تھا جس کے دوسری طرف تھاپا تھالی کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ میں اگر چاہتا تو گلیوں ہی گلیوں

میں ہوتے ہوئے ڈاک بنگلے تک پہنچ سکتا تھا لیکن سنگھا دربار (شاہی محل) کے قریب سے میں نے گاڑی کا رخ پر تھوی پاتھ (روڈ) کی طرف موڑ دیا۔

بھورا کالی مندر والے چوراہے پر میں نے ایک دکان سے کچھ پھل خریدے اور... کار کو وہاں سے آر نیکو روڈ کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح مجھے ڈاک بنگلے تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

کار کی آواز پر گیٹ کاشا نے کھولا تھا۔ میں برآمدے کے سامنے کار روک کر اندر داخل ہوا۔ بلا لاؤنج میں ایک صوفے پر نیم دراز اونگھ رہی تھی اور سامنے ٹی وی چل رہا تھا۔ کوئی انڈین فلم چل رہی تھی۔

میں نے پھلوں والی ٹوکری سینٹر ٹیبل پر رکھ دی اور ٹی وی بند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بلا نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹی وی کی آواز شاید اس کے لیے لوری کا کام دے رہی تھی۔ آواز بند ہوتے ہی وہ جاگ گئی تھی۔

"ارے! بہت دیر لگا دی تم نے ہمت سنگھ۔ کہاں رہ گئے تھے۔" بلا انگڑائی لیتے ہوئے بولی "بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔ میں نے تمہارے انتظار میں ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔"

میں نے بلا کو جواب دینے کے بجائے کاشا کو آواز دے کر کھانا لگانے کو کہا اور اپنے کمرے میں گھس گیا۔

باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو کر میں نے کپڑے بھی بدل لیے اور جب لاؤنج میں واپس آیا تو کاشا سینٹر ٹیبل پر ہی کھانا لگا رہا تھا۔

کھانے کے دوران میں، میں بلا کو بازار میں ہونے والی لڑائی اور سومبا سے ملاقات کی تفصیل بتاتا رہا۔

"کیا وہ بھروسے کا آدمی ہے۔ عین وقت پر دھوکا تو نہیں دے گا؟" بلا نے کہا۔

"میں کسی کو پہچاننے میں غلطی بہت کم کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "سومبا کو پہچاننے میں بھی میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی جان تو دے دے گا لیکن مجھ سے دھوکا نہیں کرے گا۔"

کھانے کے بعد ہم دیر تک ٹی وی پر فلم دیکھتے رہے۔ نیپال میں دو طبقے آباد تھے۔ ہندو اور بدھ مت لیکن ہندو نہ صرف مکمل طور پر معیشت پر چھائے ہوئے تھے بلکہ ان کا کلچر بھی نمایاں تھا۔ شہر میں بھی بدھ کے پیروکار کثیر تعداد میں نظر آتے تھے لیکن ان کی اکثریت دیہی علاقوں میں آباد تھی۔ وہ بہت سادہ لوگ تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے۔

سیاست سے بھی انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ ایسی چیزوں سے الگ تھلگ بھی نہیں تھے۔

معاشرے پر عمومی طور پر ہندو ازم کی چھاپ نمایاں تھی۔ ٹی وی پر بھی زیادہ تر انڈین چینلز ہی کے پروگرام دکھائے جاتے تھے اور سینماؤں میں بھی زیادہ تر انڈین فلمیں ہی چلتی تھیں۔

اس وقت ٹی وی پر جو فلم چل رہی تھی، خاصی دلچسپ تھی۔ جب فلم ختم ہوئی تو میں نے گردن گھما کر بلا کی طرف دیکھا تو وہ سو رہی تھی۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ٹی وی بند کیا اور بلا کو کمرے میں لا کر بستر پر گرا دیا اور خود دوسرے کمرے میں آ گیا۔

میں اگرچہ الگ کمرے ہی میں سوتا تھا لیکن صبح جب آنکھ کھلتی تو بلا کو اپنے بیڈ پر پائنتی کی طرف پڑے ہوئے پاتا۔ پتا نہیں وہ کس وقت اپنے کمرے سے نکل کر میرے بیڈ پر آ جاتی تھی۔

شوبھا کے مل جانے کے بعد مجھے ذہنی طور پر سکون نصیب ہوا تھا اور میں نے ایک بار پھر یوگا کی پریکٹس شروع کر دی تھی اور مراقبہ بھی کیا کرتا تھا۔

صبح سویرے اٹھ کر میں کچھ دیر مراقبہ اور یوگا کی پریکٹس کرتا پھر گاڑی پر دربار مارگ کی طرف نکل جاتا جہاں رتنا پارک میں بھی تھوڑی دیر یوگا کی مشق کرتا پھر جوگنگ اور ایکسر سائز کرتا اور سورج طلوع ہونے کے بعد پارک کی دوسری طرف کانتی پاتھ سے ہوتے ہوئے اسپتال پہنچ جاتا۔

شوبھا کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی اور وہ بڑی تیزی سے روبہ صحت ہو رہی تھی۔ اس سے ابھی تک میری تفصیلی بات چیت نہیں ہو سکی تھی لیکن اس روز شام کو جب میں بلا کے ساتھ اسپتال آیا تو گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ شوبھا کو اس بات پر حیرت تھی کہ ہم اسے بچانے کے لیے دلیش مکھ کا پیچھا کرتے ہوئے کھٹمنڈو تک آ گئے تھے اور پھر اسی روز گفتگو کے دوران میں بلا نے سونیا کے بارے میں بتا دیا تو شوبھا کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا۔

"بے چاری۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "بہت اچھی لڑکی تھی۔"

ماحول پر سوگواری سی طاری ہو گئی۔ ہم بہت دیر تک سونیا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

میں اور بلا آٹھ بجے اسپتال سے نکلے۔ ییلو ہوٹل میں کھانا کھایا اور دس بجے کے قریب اپنے ڈاک بنگلے پر واپس پہنچ گئے۔ ہمارے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔

بلا نے ٹی وی آن کر دیا اور ریموٹ کنٹرول کے بٹن دبا دبا کر اپنی پسند کا چینل تلاش کرنے لگی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔

بریندرا اور اعظم خان کی طرف سے پچھلے تین چار دن سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے پولیس ہیڈ کوارٹرز میں ٹیلی فون پر بریندرا سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ دفتر میں موجود نہیں تھا۔ اس کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بختاپور کی طرف گیا ہوا ہے۔ انسپکٹر اعظم خان کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔

پونے گیارہ بجے کے قریب میں مایا متی کے مکان پر جانے کے لیے روانہ ہو گیا اور میں ٹھیک گیارہ بجے وہاں پہنچ گیا تھا۔

سومبا بھی عام طور پر ٹھیک گیارہ بجے ہی وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ سوا گیارہ بج گئے لیکن سومبا نہیں آیا۔

ساڑھے گیارہ بجے فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں اس وقت برآمدے میں کھڑا تھا۔ اندر آیا تو تیسری مرتبہ گھنٹی بج چکی تھی۔ میں نے بلا کو یہ نمبر نوٹ کروا رکھا تھا۔ بریندرا اور اعظم خان کے پاس بھی یہ نمبر موجود تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس کی کال ہو سکتی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو ایک جانی پہچانی سی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ آواز دوبارہ میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں سومبا بول رہا ہوں ماسٹر۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

"ہاں سومبا۔" میں نے جلدی سے کہا "میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تمہیں یہاں کا نمبر کیسے معلوم ہوا؟"

"تم بھول گئے ہو ماسٹر کہ میں روزانہ تمہارے پاس آ رہا ہوں۔" سومبا نے جواب دیا "میں اکثر ٹیلی فون کے قریب والی کرسی پر بیٹھتا رہا ہوں اور ٹیلی فون سیٹ پر نمبر لکھا ہوا ہے۔"

"سمجھ گیا۔" میں اس کے مشاہدے اور قوت حافظہ کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا "کہو۔ خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس وقت کلاک ٹاور کے قریب اناپورنا ریسٹورنٹ سے بول رہا ہوں۔ دلیش مکھ کے ایک آدمی کو میں نے قابو میں کیا ہوا ہے۔ اسے تمہارے مکان پر لانا مناسب نہیں ہے۔ تم یہاں آ جاؤ۔ اس شخص سے کچھ کام کی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا اور برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں کار کو مختلف گلیوں میں گھماتے ہوئے دربار مارگ کی طرف آ گیا۔ دربار پاتھ سیدھی کلاک ٹاور چوک تک چلی گئی تھی۔

اناپورنا ریسٹورنٹ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں کار سے اتر کر ریسٹورنٹ کی طرف چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک آدمی نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک ایک نیپالی تھا۔ سر کے بال بکھرے ہوئے جنہیں تقریباً دو انچ چوڑے الاسٹک بینڈ کے ذریعے سمیٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ نیلی جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں بھی نیلے رنگ کا رومال بندھا ہوا تھا۔ ٹھوڑی پر چند بال تھے اور آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

"میرے ساتھ آؤ ماسٹر۔" اس شخص نے کہا "سومبا یہاں نہیں ہے۔ وہ رتنا پارک میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"رتنا پارک!" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ شکار نے کچھ ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی تھی۔" اس شخص نے جواب دیا "سومبا اسے رتنا پارک کی طرف لے گیا ہے۔ مجھ سے کہہ دیا گیا تھا کہ تمہیں وہیں لے آؤں۔"

میں نے ایک بار پھر غور سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اب میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ان آدمیوں میں سے ایک تھا جو اس رات جیپ پر... ریڈ لائٹ ایریا کے ریسٹورنٹ میں سومبا کے پاس آئے تھے۔

میں نے اسے کار میں بٹھا لیا اور کار کو گھماتے ہوئے دوبارہ دربار پاتھ کی طرف لے آیا۔

رتنا پارک تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے کار سڑک کے کنارے پر کھڑی کر دی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ دوسری طرف سے وہ آدمی بھی اتر چکا تھا۔ ہم دونوں پارک میں داخل ہو گئے۔

اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ دس بجے تک اس پارک میں بڑی رونق رہتی تھی۔ مناسب فاصلوں پر لگے ہوئے کھمبوں پر برقی بلب بھی جگمگاتے تھے لیکن اس وقت تاریکی اور سناٹا تھا۔

میں اس شخص کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ ایک جگہ قد آدم

پودوں کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا اور پھر اچانک ہی اس نے پودوں کی دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ سنائی دی تھی۔

"لعنت ہو تم پر۔" مجھے اپنے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی چٹاخ کی آواز ابھری اور اس مرتبہ ایک آدمی چیخ اٹھا تھا۔

میرا ساتھی پودے پھلانگ کر واپس آ گیا۔

"میں سمجھا تھا شاید کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہے۔" اس نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا "یہ سارے دھندے بھی رات کو پارکوں ہی میں ہوتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کن دھندوں کی بات کر رہا تھا۔

پارک میں کافی آگے جا کر وہ درختوں کے ایک کنج کے قریب رک گیا۔ اس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی کھڑکی سے روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ غالباً پارک کے نگران کا کمرا تھا۔

ہم جیسے ہی آگے بڑھے' ایک آدمی پودوں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا لیکن میرے ساتھی کو پہچان کر وہ راستے سے ہٹ گیا۔ ہم دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک طرف باغبانی میں استعمال ہونے والی چیزیں پڑی تھیں۔ کچھ ٹوٹے پھوٹے گملے بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں سیلن اور کھاد وغیرہ کی ناگوار سی بو بھری ہوئی تھی۔

کمرے میں تین آدمی تھے۔ ایک سومبا' دوسرا اس کا ایک لمبا تڑنگا ساتھی جس کے ہاتھ میں خم دار بلیڈ والا تیغہ تھا اور تیسرا آدمی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کی اچھی خاصی خاطر تواضع بھی کی گئی تھی۔

سومبا مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔

"سوری ماسٹر۔" وہ بولا "اسے تمہارے ٹھکانے پر لانا مناسب نہیں تھا۔ اس وقت یہی مناسب جگہ نظر آئی تھی اسی لیے ہم اسے یہاں لے آئے۔"

"کچھ بتایا اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بکا تو ہے۔ باقی تم پوچھ لو۔" سومبا نے جواب دیا۔

اور پھر اس شخص نے جو کچھ بتایا وہ خاصا سنسنی خیز تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق ناگ پال' ویش مکھ اور چانگ لی نے اپنے خطرناک منصوبے کو حتمی شکل دے دی تھی اور وہ چند روز میں اس پر عمل کرنے والے تھے۔ اس ابتدائی مرحلے میں ہندوستان سے آنے والی ایک شخصیت کو قتل کر دیا جاتا۔ جس شخص کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا وہ اتنا اہم تو نہیں تھا لیکن ہندوستان میں لوک سبھا کا ممبر ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستانیوں نے نیپال کو اپنی کالونی سمجھ رکھا تھا۔ اس قسم کے لوگ آزادی سے یہاں آتے رہتے تھے۔ کئی لوگوں نے تو یہاں جائدادیں بنا رکھی تھیں اور ان کے کاروبار بھی تھے۔

ہندوستان کے بہاری لال نامی جس شخص کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا وہ ایک ہفتے بعد کھٹمنڈو پہنچنے والا تھا۔ کھٹمنڈو کے نواحی علاقے میں اس کی ایک شاندار کوٹھی بھی تھی اور اس نے یہاں بزنس بھی شروع کر رکھا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سومبا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"اس کا کیا کیا جائے؟" سومبا نے زمین پر پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا "کیا اس کی چھٹی کر دی جائے؟" اس نے مخصوص انداز میں گلے پر ہاتھ پھیرا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن اسے کم از کم اس وقت تک منظر عام پر نہیں آنا چاہیے جب تک بہاری لال کھٹمنڈو سے واپس نہیں چلا جاتا۔"

"ٹھیک ہے ماسٹر۔" سومبا نے کہا "اسے اس وقت تک ایسی جگہ پر رکھا جائے گا جس کے بارے میں اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں ہو گا۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ زمین پر پڑے ہوئے اس شخص کو اٹھا کر باہر لے گئے۔ میں اور سومبا بھی کمرے سے باہر آ گئے۔ سومبا نے بتی جلتی رہنے دی تھی۔ البتہ دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈا لگا دیا تھا۔

میں سومبا کے ساتھ چند منٹ وہاں کھڑا رہا پھر سومبا اپنے آدمیوں کے پیچھے کانتی روڈ کی طرف چلا گیا اور میں دربار پاتھ کی طرف آ گیا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔

یہ دربار روڈ اور کانتی روڈ کے درمیان بہت بڑا پارک تھا۔ اس کے سامنے دربار روڈ کی طرف بس اسٹاپ بھی تھا۔ میں چونکہ روزانہ صبح سویرے یہاں آیا کرتا تھا اس لیے اس پارک کے بیشتر حصوں سے واقف ہو گیا تھا۔

میں پختہ روشوں پر چلنے کے بجائے پارک کے اس حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں درختوں کی بہتات تھی۔ میں ابھی درختوں کے قریب پہنچا ہی تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور

میں گرتے گرتے بچا۔ سنبھل کر پیچھے دیکھا تو رک گیا اور مڑ کر اس چیز کو دیکھنے لگا جس سے ٹھوکر لگی تھی۔

چند گز بائیں طرف پارک کے جنگلے کے ساتھ ایک تنگ سی سڑک تھی جو بس اسٹاپ سے کانتی روڈ تک چلی گئی تھی۔ اس سڑک پر بجلی کے کھمبے پر جلنے والے بلب کی بہت مدھم سی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔

میں اس چیز کو دیکھ کر چونک گیا جس سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا تھا۔ وہ چیز ہلکی سی روشنی میں چمک رہی تھی۔ میں جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ ٹھوس کرسٹل کا انسانی مجسمہ تھا بلکہ مجسمے کا پیٹ سے نیچے کا دھڑ تھا۔ میں نے اسے ٹٹول کر دیکھا اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تین چار گز کے فاصلے پر مجسمے کا اوپر کا دھڑ بھی پڑا ہوا تھا۔

یہ کسی عورت کا مجسمہ تھا جو ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کرسٹل کا یہ ٹوٹا ہوا مجسمہ اس جگہ کہاں سے آیا تھا۔ میں اس پارک کے بیشتر حصوں سے واقف تھا۔ پارک میں شاہ نیپال اور ملکہ رتنا کے پتھر کے مجسمے تو دیکھے تھے لیکن کرسٹل کا یہ مجسمہ کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہاں روشنی بہت ہلکی تھی۔ چہرے کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے اس لیے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ یہ ملکہ کا مجسمہ تھا یا کسی دیوی کا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ کرسٹل کا یہ مجسمہ کہیں سے چوری تو نہیں کیا گیا؟ ہو سکتا ہے یہی بات ہو۔ کوئی شخص اسے کہیں سے چرا کر لایا ہو پھر شاید کسی خوف کی وجہ سے اسے یہاں پھینک کر بھاگ گیا۔ پھینکنے سے مجسمہ ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

اس مجسمے کے بارے میں میرے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ اس کا شمار نوادرات میں بھی ہو سکتا تھا۔ اسے یہاں چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ ابھی تو یہ صرف دو ٹکڑے ہی ہوا تھا۔ کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو مزید ٹوٹ پھوٹ ہونے سے ضائع ہو سکتا تھا۔

میں نے جھک کر وہ مجسمہ اٹھا لیا۔ ایک حصہ ایک بغل میں اور دوسرا دوسری بغل میں۔ دونوں حصے خاصے وزنی تھے۔

پارک سے باہر نکلنے سے پہلے میں نے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کار کے قریب آ گیا۔ مجھے یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو چوری کے الزام میں دھر نہ لیا جاؤں۔

میں نے مجسمے کے دونوں حصوں کو کار میں پیچھے رکھ دیا۔ دونوں حصے سیٹ پر پورے نہیں آئے تھے۔ ایک حصہ سیٹ پر رکھا اور دوسرا اس کے آگے فٹ میٹ پر رکھنا پڑا تھا۔

میں بہت ہلکی رفتار سے کار چلاتا رہا تاکہ جھٹکا لگنے سے مجسمے کو ٹھیس نہ پہنچے اور مزید ٹوٹ پھوٹ نہ ہو۔

جب میں نے کار روکی تو چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں ڈاک بنگلے جانا چاہتا تھا جہاں ببلا بھی موجود تھی لیکن میں مایا متی والے مکان پر پہنچ گیا تھا۔ مجھے راستے میں بالکل احساس نہیں رہا تھا کہ کس طرف جا رہا ہوں۔ بہرحال میں نے یہی سوچ لیا کہ اس مجسمے کو یہاں رکھ کر ڈاک بنگلے چلا جاؤں گا اور صبح سب سے پہلے بریندرا سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں بتاؤں گا تاکہ یہ پتا چلایا جا سکے کہ یہ مجسمہ کہاں سے چوری کیا گیا تھا۔ میں نے نیچے اتر کر گیٹ کھولا اور پھر کار کو اندر لے آیا۔

میں نے مجسمے کے دونوں حصے کار سے نکال کر مایا متی والے کمرے میں پہنچا دیے اور انہیں بیڈ پر ڈال کر دونوں حصوں کو آپس میں ملانے لگا۔ وہ مجسمہ اس طرح ٹوٹا تھا جیسے بلیڈ سے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ میں نے انہیں آپس میں ملایا تو وہ بڑی آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔ کہیں اور کوئی خراش تک نہیں آئی تھی۔

میں سیدھا ہو کر اس مجسمے کو دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

وہ ایک بھرپور جوان عورت تھی۔ قد ساڑھے پانچ فٹ کے لگ بھگ۔ اگر وہ زندہ عورت ہوتی تو اس کا بدن بڑا گداز ہوتا۔ چہرے کے نقوش نہایت پرکشش' موٹی موٹی آنکھیں جو پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور لگتا تھا ان میں بے پناہ کرب بھرا ہوا ہو۔ بال لمبے تھے جو پیچھے پشت تک چلے گئے تھے۔ پیر کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک وہ ایک مکمل اور بھرپور عورت تھی۔

لگتا تھا جیسے کرسٹل کی چٹان کو تراش کر یہ مجسمہ تیار کیا گیا ہو۔ مجسمہ ساز نے اس کی تیاری میں بڑی محنت اور مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی نادر شاہکار تھا جسے یقیناً میوزیم سے چرایا گیا تھا اور چور کسی وجہ سے خوف زدہ ہو کر اسے پارک میں پھینک گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ صبح سب سے پہلے بریندرا کو اس کے بارے میں اطلاع دوں گا۔

میں سر سے پیر تک گہری نظروں سے اس مجسمے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا جوڑ اگرچہ آپس میں مل گیا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر جوڑ پر بال سے بھی باریک لکیر سی نظر آ رہی تھی

پھر مجھے نجانے کیا خیال آیا کہ میں مایامتی کا میڈی سن باکس اٹھالایا اور اس میں سے چیزیں نکال نکال کر تلاشی لینے لگا لیکن میری مطلوبہ چیز نہیں ملی۔

ڈریسنگ ٹیبل کی تلاشی لیتے ہوئے مجھے ایک دراز میں سے اسکاچ ٹیپ کا رول مل گیا۔ رول کے اوپر کا کچھ ٹیپ میلا ہوچکا تھا جسے میں نے کاٹ کر پھینک دیا اور بڑی احتیاط سے مجسمے کے جوڑ پر ٹیپ چپکانے لگا۔ جس طرح کوئی ماہر سرجن مریض کا آپریشن کرتے ہوئے احتیاط کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی احتیاط سے میں نے مجسمے کے جوڑ پر چاروں طرف ٹیپ چپکا دیا۔ ٹیپ چپکاتے ہوئے میں عجیب سی کیفیت میں مبتلا رہا اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں طمانیت سی محسوس کرنے لگا جیسے میں نے واقعی کسی زندہ انسان کا آپریشن کرکے اسے موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہو۔

اس کام سے فارغ ہوکر میں نے ایک بار پھر مجسمے کا جائزہ لیا۔ شفاف ٹیپ کے نیچے اب جوڑ کا بال برابر رخنہ بھی نظر نہیں آرہا تھا اور پھر میری نظریں اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار پر جم گئیں۔ یہ ہار بھی مجسمے ہی کا ایک حصہ تھا۔ اس کے عین وسط میں لاکٹ کی طرح انگوٹھے کے ناخن کے برابر ایک چپٹا موتی تھا جو سینے کے عین وسط میں رکھا ہوا تھا۔ اس ہار کو بھی بڑی مہارت اور خوب صورتی سے تراشا گیا تھا۔

میں نے آخری مرتبہ مجسمے کو دیکھا اور پھر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ کچھ دیر پہلے میں نے اس کی آنکھوں میں بے پناہ کرب محسوس کیا تھا لیکن اب ان خوب صورت آنکھوں میں کرب کی وہ کیفیت نہیں تھی۔

میں نے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا اور بتی بجھا کر کمرے سے باہر آگیا۔

برآمدے والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میرے پیر من من کے ہورہے تھے۔ پورے جسم پر عجیب سنسنی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ میں بڑی مشکل سے باہر آسکا تھا۔ دروازے کو تالا لگا کر جیسے ہی پلٹا، آنکھوں کے سامنے دھند سی چھانے لگی۔ سر ایک دم بھاری ہوگیا جیسے اندر غبار سا بھرتا جارہا ہو۔ میں نے سر کو ایک دو جھٹکے دیے اور بڑی مشکل سے چلتے ہوئے برآمدے سے نیچے آگیا۔ ٹانگیں جیسے پتھر کی ہوکر رہ گئی تھیں۔ قدم اٹھائے نہیں اٹھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے پیچھے کی طرف کھینچ رہی ہو۔ ایک دو مرتبہ میں نے اپنی بانہوں پر کسی کی ہلکی سی گرفت بھی محسوس کی تھی اور میں نے مڑ کر بھی دیکھا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یکایک مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں سر کو بار بار جھٹک رہا تھا لیکن دماغ کا خمار کم ہونے کے بجائے بڑھتا جارہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی کار تک پہنچ سکا تھا اور پھر کار کے اگلے پہیے پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ ٹائر فلیٹ ہوچکا تھا۔ میں کار کا سہارا لیتے ہوئے دوسری طرف آگیا۔ دوسرا آگے کا ٹائر بھی فلیٹ تھا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میں کار سے ٹیک لگائے کھڑا ایک بار پھر سر کو ہولے ہولے جھٹکے دینے لگا۔ اسی وقت پانی کی چند بوندیں میرے اوپر پڑیں۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پانی کی موٹی موٹی بوندیں میرے چہرے پر بھی گریں۔

تاریک آسمان پر گھن گرج کی آواز سنائی دینے لگی اور ایک دم تیز بارش شروع ہوگئی۔ میں برآمدے میں آگیا۔ بارش بڑی تیزی سے شروع ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی شکل اختیار کرگئی۔ تند ہوا کے جھکڑ آسمان سے برسنے والی پانی کی بوچھار کو کبھی ایک طرف دھکیلتے اور کبھی دوسری طرف۔ بادلوں کے گرجنے کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

میرے دماغ کا غبار پھیلتا جارہا تھا۔ ایک عجیب سی سنسناہٹ تھی جو مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ میرے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں بھی جیسے سلب ہوکر رہ گئی تھیں۔

اور پھر نجانے کس طرح میں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اب ڈاک بنگلے واپس نہیں جاؤں گا۔ کار کے دونوں اگلے ٹائر فلیٹ ہوچکے تھے۔ اچانک شروع ہونے والی بارش نے طوفانی شکل اختیار کرلی تھی۔ میری اپنی کیفیت کچھ بہتر نہیں تھی۔ ایسی صورت حال میں میرے لیے واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس حالت میں نہ تو میں پیدل ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کرسکتا تھا اور نہ ہی ایسی طوفانی بارش میں کوئی سواری ملنے کا امکان تھا۔

پھر ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی میرے اندر کی بحرانی کیفیت بھی خود بخود بدلنے لگی۔ دماغ پر چھایا ہوا غبار چھٹنے لگا۔ بوجھل پن بتدریج دور ہوتا گیا اور ٹانگیں بھی ہلکی پھلکی محسوس ہونے لگیں۔ چند منٹ بعد میں اپنے آپ کو بالکل پہلے جیسا محسوس کرنے لگا۔

میں تقریباً دس منٹ تک برآمدے میں کھڑا آسمان سے برستے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا پھر اندر آگیا۔ دروازہ بند کرکے

میں سیدھا کچن میں گھس گیا۔
چائے بنا کر میں لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر بلا کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ میں رات کو واپس نہیں آسکوں گا۔

فون بند کرکے چائے پیتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یکایک مجھے کیا ہوگیا تھا۔ کار کے دونوں ٹائر بھی اچانک کیسے فلیٹ ہوگئے تھے؟ میں سوچتا رہا لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی۔

چائے ختم کرکے میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بارش اب بھی ہورہی تھی لیکن اس کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

اور پھر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر مایامتی والے کمرے کی طرف مڑ گیا جہاں میں نے کرسٹل کے اس خوب صورت عورت کے مجسمے کو مایامتی کے بستر پر لٹا دیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بتی جلادی اور مجسمے کی طرف دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔

میں نے ایک گھنٹا پہلے اس مجسمے کو بستر پر لٹا کر اس کی "مرہم پٹی" کی تھی تو گہری نظروں سے متعدد بار اس کا جائزہ بھی لیا تھا۔ کرسٹل کا وہ شفاف مجسمہ بالکل اسی رنگت کا تھا جیسا کہ آپ شیشے کے کسی ٹکڑے کو دیکھتے ہیں لیکن اب وہ مجسمہ ویسا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس میں بہت ہلکے گلابی رنگ کی جھلک نظر آرہی تھی۔

میں اسے اپنا وہم سمجھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ بتی میں نے جلتی ہی رہنے دی تھی اور دروازہ بھی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے کمرے میں آکر میں بستر پر لیٹ گیا اور سرہانے پڑی ہوئی ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ امریکا اور روس کی سرد جنگ کے پس منظر میں انگریزی ناول تھا۔ جن دنوں میں مایامتی کے ساتھ یہاں رہا کرتا تھا یہ ناول ان دنوں بھی پڑھا کرتا تھا اور کبھی بھی دو تین صفحات سے زیادہ نہیں پڑھ سکا تھا۔ وہ صفحہ مڑا ہوا تھا جس کی چند سطریں آخری مرتبہ پڑھی تھیں۔ میں نے صفحہ سیدھا کیا اور اس سے آگے پڑھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن چند سطروں سے زیادہ نہیں پڑھ سکا۔ ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ میں نے کتاب بند کرکے سرہانے رکھ دی اور آج کی صورت حال کے بارے میں سوچنے لگا۔

دلیش مکھ کے پکڑے جانے والے آدمی نے جو انکشافات کیے تھے وہ بڑے تشویش ناک تھے۔ بھارت کے سرحدی قصبے تنک پور کے اس گھٹیا سے رہائشی ہوٹل میں انسپکٹر اعظم خان نے بھی ایسے ہی خدشات کا اظہار کیا تھا اور اب اس کی باتوں کی تصدیق ہورہی تھی۔ نیپال میں ہندوستان کی کسی بھی معزز شخصیت کے قتل سے ہنگامے ہوں گے۔ دونوں ملکوں کے تعلقات میں رخنہ پڑے گا اور جنرل کھوراٹ جیسے لوگ ایسے موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ یہ تو منصوبہ ہی ان لوگوں کا تھا۔ یہاں ناگ پال جیسے اس کے ایجنٹ موجود تھے جو نیپالی حکومت کو ان واقعات کا ذمے دار ٹھہرا کر مزید انتشار پیدا کرنے کی کوشش کریں گے اور اس انتشار میں جنرل کھوراٹ کو یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔ مجھے بہاری لال کے قتل کو ہر صورت میں روکنا تھا۔ یہ تو بہرحال طے تھا کہ صبح ہوتے ہی میں نے انسپکٹر بریندرا کو اس صورت حال سے آگاہ کرنا تھا تاکہ کسی سنگین صورت حال سے نمٹنے کے لیے مناسب بندوبست کیا جاسکے۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

لیکن وہ آواز۔۔۔ میری آنکھ اسی آواز سے کھلی تھی۔ میں گڑبڑا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن کسی عورت کے کراہنے کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس مکان میں اس وقت میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ میں یہاں اکیلا ہی تو آیا تھا۔ میرے ساتھ کرسٹل کے اس ٹوٹے ہوئے مجسمے کے سوا اور کوئی نہیں تھا جسے بستر پر ڈال کر میں نے اسکاچ ٹیپ سے جوڑ دیا تھا اور یہ سوچنا ہی حماقت تھی کہ عورت کا وہ مجسمہ تکلیف سے کراہ رہا ہوگا۔

اچانک ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اندر آنے کے بعد طوفانی بارش سے بچنے کے لیے کوئی عورت بیرونی دیوار کود کر اندر آکر برآمدے میں بیٹھ گئی ہو اور اب کسی تکلیف سے کراہ رہی ہو۔

میرے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ میں نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ میں بستر سے اٹھ کر ننگے پیر کمرے سے باہر آگیا اور لاؤنج کی طرف جانے کے لیے دو ہی قدم چلا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ آواز مایامتی والے کمرے کی طرف سے آئی تھی۔

میں مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔ میرا دماغ الجھ کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کراہنے کی آواز کس طرف سے آئی تھی۔ میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ کراہنے کی وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ سمت کا اندازہ لگانے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ آواز اس کمرے ہی کی طرف سے آئی تھی۔ آواز سے صاف لگ رہا

تھا کہ کوئی عورت کسی تکلیف سے ہولے ہولے کرا رہی تھی۔

میں کمرے کی طرف مڑ گیا اور پہلا قدم اندر رکھتے ہی اس طرح رک گیا جیسے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔ دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ سنسنی کی ایک لہر میرے پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔ گردن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں اور دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ عورت کا وہ خوب صورت کرسٹل کا مجسمہ بیڈ پر پڑا ہوا تھا۔ نہیں... کرسٹل کا مجسمہ نہیں... وہ عورت تھی۔ زندگی سے بھرپور عورت۔ میں نے اس کا کرسٹل کا جسم پہلے بھی دیکھا تھا لیکن اب وہ بے جان کرسٹل نہیں، گوشت و پوست کی زندہ عورت تھی۔ رنگت ایسی جیسے دودھ میں ہلکا سا گلابی رنگ ملا دیا گیا ہو۔ سرخ احمریں ہونٹ اور سینے کا ہلکا سا زیر و بم اس میں زندگی کی گواہی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، چہرے پر کرب کے ہلکے سے آثار تھے اور وہ ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔

وہ بے لباس تھی اور اس طرح پشت کے بل بالکل چت لیٹی ہوئی تھی جس طرح میں نے اس مجسمے کو لٹایا تھا۔ اس کے پیٹ پر ایک طرف سے دوسری طرف تک وہ اسکاچ ٹیپ اب بھی موجود تھا جو میں نے مجسمے کو جوڑنے کے لیے چپکایا تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ شاید میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے یہاں کرسٹل کے ایک ٹوٹے ہوئے مجسمے کو لٹایا تھا اور اس وقت میرے سامنے ایک نہایت حسین و جمیل عورت لیٹی کسی تکلیف سے کراہ رہی تھی۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایسا ملکوتی حسن اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے ایک انگلی دانتوں میں دبائی۔ میں نے انگلی پر دانت کچھ زیادہ ہی زور سے گاڑ دیے تھے۔ میں انگلی کو دوسرے ہاتھ سے سہلانے لگا۔ بہرحال یہ ثابت ہو گیا تھا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔

اس گلابی اور گداز بدن پر نظریں ٹکانا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے بیڈ پر ایک طرف پڑی ہوئی چادر کھول کر اس کے جسم پر ڈال دی۔ اس کا چہرہ نہیں ڈھکا تھا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عورت کی آنکھیں حسین ہوں تو لوگ ہرنی کی آنکھوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہرنی کی آنکھیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں لیکن ان آنکھوں کے سامنے تو جیسے ہرنی کی آنکھیں بھی ہیچ نظر آئیں۔ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں جنہیں بے اختیار چوم لینے کو دل چاہتا تھا لیکن میں اپنی اس خواہش پر عمل نہیں کر سکا تھا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ اداسی اور کرب تھا۔ میں زیادہ دیر تک ان آنکھوں میں جھانکنے کی تاب نہ لا سکا۔

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے شاید کچھ کہنا چاہا تھا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ میں نے اس کے جسم پر پڑی ہوئی چادر کی طرف دیکھا۔ پہلو میں چادر کے نیچے حرکت ہوئی پھر اس کا ہاتھ چادر سے باہر نکل آیا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں ہزار وولٹ کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ میرا جسم جھنجھنا اٹھا۔ یہ کیفیت مرف ایک لمحے کو رہی تھی۔ اس کے بعد میں نارمل ہو گیا تھا۔

میں ہولے ہولے اس کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ لمبی مخروطی انگلیاں، گداز ہتھیلی اور گول کلائی۔ اس ہاتھ میں زندگی کی بھرپور حرارت موجود تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے احمریں ہونٹوں پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

وہ میرا ہاتھ چادر کے اندر لے گئی اور جب اس نے میرا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھا تو مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی اور دل ایک بار پھر کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ میرا واہمہ یا خواب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ کرسٹل کا بے جان مجسمہ تھا۔ وہ زندگی کی حرارت سے بھرپور حسین اور جوان عورت تھی۔ میرا ہاتھ اس کے بدن کا گداز محسوس کر رہا تھا۔

اس نے میری انگلی پیٹ پر اس جگہ رکھ دی جہاں اسکاچ ٹیپ چپکا ہوا تھا۔ وہ میری انگلی کو اپنے بدن کے اس جوڑ پر آگے پیچھے حرکت دینے لگی۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور ٹیپ کے اوپر انگلی سے اس جوڑ کو سہلانے لگا۔ کبھی میری نظریں اس کے چہرے کی طرف اٹھ جاتیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر بھی اب وہ کرب نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ ہاتھ روک لیا تو ایک عجیب سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں بھنبھنا رہی ہوں اور اس بھنبھناہٹ میں نہایت مدھم اور شہد جیسی میٹھی سرگوشی سنائی دی۔

"ہاتھ کیوں روک لیا۔ سہلاتے رہو۔ مجھے بڑا سکون مل رہا ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ ملے ہوئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ شہد کی طرح رس گھولتی ہوئی وہ مدھری سرگوشی میرے کانوں میں اسی کی تھی۔

میرا ہاتھ پھر حرکت کرنے لگا۔ میں اسکاچ ٹیپ کے اوپر ہولے ہولے انگلی پھیرتا رہا اور پھر اس نے چادر اپنے اوپر سے ہٹا دی۔ پیٹ تک اس کا جسم برہنہ ہو گیا۔ میری نظریں جھک گئیں۔

"یہ پٹی اتار دو۔" شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں شہد جیسی میٹھی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی "پٹی اتار دو اور زخم کو سہلاتے رہو۔ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے لب ملے ہوئے تھے۔ البتہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان خوب صورت آنکھوں میں کرب اور اداسی کے بجائے تشکر کے جذبات تھے۔

میں قدرے آگے جھک گیا اور اسکاچ ٹیپ اس طرح ہٹانے لگا جیسے زخم سے پٹی ہٹا رہا ہوں۔ میں بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ ٹیپ ہٹاتا رہا جیسے اندیشہ ہو کہ بے احتیاطی سے زخم نہ چھل جائے۔ پوری طرح ٹیپ ہٹانے کے لیے ایک مرتبہ میں نے اسے اوندھا بھی دیا تھا۔

ٹیپ ہٹانے کے بعد میں نے ایک بار مرتبہ پھر غور سے دیکھا۔ اس کے پیٹ پر یا پچھلی طرف کوئی معمولی سا نشان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ملکوتی حسن کی مالک اس عورت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ کرسٹل کا وہی مجسمہ تھا جسے میں دو ٹکڑوں میں رتنا پارک سے اٹھا کر لایا تھا اور اسے جوڑنے کے لیے میں نے ٹیپ چپکا دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کے جسم پر چادر ڈال دی۔ سینے پر چادر درست کرتے ہوئے دوسری مرتبہ نظریں اس کے گلے میں پڑے ہوئے ہار پر پڑ گئیں۔ پہلی مرتبہ میں نے وہ ہار اس طرح دیکھا تھا کہ وہ مجسمے کے کرسٹل ہی کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ وہ الگ سے کوئی چیز نہیں تھی لیکن اب وہ ہار جسم سے الگ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر چادر درست کی تو میری انگلی سے ٹکرا کر وہ ہار اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ وہ موتی نہیں تھا۔ چپٹے سے پتھر تھے جو سنہری لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً بہت قیمتی پتھر تھے۔ ان کی رنگت اگرچہ سیاہ تھی لیکن ان میں نیلاہٹ کی بھی جھلک تھی۔ درمیان انگوٹھے کے ناخن کے برابر اسی رنگت کا چپٹا پتھر تھا۔ اس پر شاید کچھ لکھا ہوا تھا لیکن وہ تحریر اس قدر باریک تھی کہ اسے پڑھنے کے لیے محدب عدسے کی ضرورت تھی۔

میں اس کے چہرے کو تکنے لگا۔ گلابی رنگت اب سرخی میں بدل گئی تھی اور آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک عود کر آئی تھی۔ وہ براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور اب میں بھی پلک جھپکے بغیر اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ مقناطیسی کشش تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے مقناطیسی لہریں آنکھوں کے راستے میرے پورے جسم میں پھیلتی چلی جارہی ہوں۔ مجھے اپنا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ جسم کا جوڑ جوڑ جیسے بل کھا کر رہ گیا۔ اعصاب میں تناؤ پیدا ہونے لگا جو شدید تر ہوتا جارہا تھا۔ لگتا تھا دماغ کی نسیں جیسے الاسٹک کے تار کی طرح کھنچی چلی جارہی ہوں لیکن میں نے پلکیں نہیں جھپکیں نہ ہی نظریں ہٹائیں۔

اس کی نظریں جیسے میری نظروں میں گڑی ہوئی تھیں۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ حرکت کر رہا تھا اور پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میرے جسم کو زوردار جھٹکا لگا اور پھر میں پرسکون ہوتا چلا گیا۔ دماغ کی نسوں کا تناؤ کم ہو گیا اور اعصاب کی کشیدگی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ تاہم اس دوران

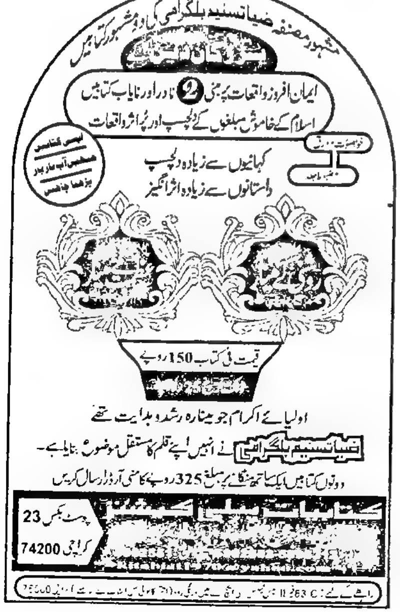

میں میرا جسم پسینے میں تر ہو چکا تھا اور میں اپنے چہرے اور پیشانی پر بھی پسینے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔

"شکریہ میرے دوست!" وہی کانوں میں رس گھولتی ہوئی مدھم سی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی "تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

اس کے ہونٹوں میں ذرا سا خم آگیا تھا اور وہ مسکراہٹ بڑے غضب کی تھی۔ اس طرح مسکرانے سے اس کی ٹھوڑی پر دائیں طرف بہت ننھا سا گڑھا پڑ گیا تھا۔

"میں نہیں جانتا تم کون ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "میں تو پارک سے کرسٹل کا ایک ٹوٹا ہوا مجسمہ اٹھا کر لایا تھا اور یہ جو کچھ بھی ہوا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔ کیا میں اب بھی کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟"

"نہیں یہ کوئی خواب نہیں ہے۔" اس مرتبہ کوئی سرگوشی میری سماعت سے نہیں ٹکرائی تھی بلکہ یہ گنگناتی ہوئی آواز اس کے ہونٹوں سے خارج ہوئی تھی "تم نے مجھے چھو کر دیکھ لیا۔ میں زندہ انسان کی طرح تمہارے سامنے موجود ہوں۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت تم زندہ انسان کی طرح میرے سامنے موجود ہو لیکن۔" میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "میں تو کرسٹل کے مجسمے کے دو ٹکڑے اٹھا کر لایا تھا اور محض تجسس کی وجہ سے انہیں جوڑ کر ٹیپ چپکا دیا تھا لیکن اب بھی یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ کرسٹل کے دو بے جان ٹکڑے اس طرح آپس میں مل جائیں تو وہ ایک زندہ انسان کا روپ دھار لیں گے۔ یہ اسرار۔۔۔"

"یہ اسرار ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا وجدان علی۔"

اس کے منہ سے اپنا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں ایک بار پھر تیز سنسناہٹ ہونے لگی۔ میں بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پا سکا تھا۔

"تت۔۔۔ تم میرا نام۔۔۔"

"میں نام ہی نہیں، تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹ دی "میرے بارے میں جاننے کے لیے جلد بازی سے کام مت لو۔ آہستہ آہستہ سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔ اگر تم مجھے پارک سے اٹھا کر نہ لاتے تو ہماری یہ ملاقات کبھی نہ ہوتی۔ میں فنا ہو جاتی اور میری روح تمہاری تلاش میں بھٹکتی رہتی۔"

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ نام جانتی تھی۔ میرے بارے میں سب کچھ جانتی بقول اس کے، اگر میں اسے پارک سے اٹھا کر نہ لا ہوجاتی اور اس کی روح میری تلاش میں بھٹکتی رہتی دماغ گھوم رہا تھا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ یہ کیا اسرار تھا کہ کرسٹل کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کے آپس میں مل کر جیتے جاگتے انسان میں تبدیل ہو گئے میری نظر کا دھوکا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی حقیقت میرے سامنے موجود تھی جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا کوئی جادو تھا یا میں کسی طاغوتی چکر میں پھنس رہا تھا جیسے سوچتا گیا، میرا ذہن الجھتا گیا۔

اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ جب میں کرسٹل کے اس مجسمے کو یہاں چھوڑ کر جانے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سوچنے صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ ٹانگیں جیسے پتھر تھیں اور قدم اٹھائے نہیں اٹھ رہے تھے۔ اس وقت دو مرتبہ تو مجھے یوں بھی لگا تھا کہ جیسے کوئی غیبی قوت بانہوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچ رہی ہو اور جب میں جیسے تک پہنچ گیا تھا تو کار کے اگلے دونوں ٹائر فلیٹ حالانکہ میں بہت محتاط انداز میں کار چلا کر لایا تھا۔ اور بہت صاف ستھری تھی۔ گھر آنے تک دونوں درست تھے اور پھر اچانک شروع ہونے والی وہ طوفانی حالانکہ مجھے یاد تھا کہ پارک میں جب ان لوگوں کے بعد میں سومبا سے باتیں کر رہا تھا تو ایک مرتبہ آسمان کی طرف بھی دیکھا تھا۔ آسمان چمکتے ہوئے سے بھرا ہوا تھا اور کہیں بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا نہیں آیا تھا لیکن اچانک دھواں دھار بارش۔۔۔! یہ اسرار تھا؟ کیا مجھے روکنے کے لیے۔۔۔

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔" اس نے شاید میرا ذ لیا تھا "وہ سب کچھ تمہیں روکنے کے لیے ہی کیا گیا چلے جاتے تو میں یہاں تکلیف سے تڑپ تڑپ ہو جاتی۔"

یہ گتھی سلجھنے کے بجائے الجھتی جا رہی تھی بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ کون تھی؟ اچانک میرے دماغ اور دھماکا سا ہوا۔ جب میں ہندوستان نہیں آیا تھا کرتا تھا کہ ہندوستان بہت پراسرار ملک ہے ہندوستان آیا تو اس قسم کی باتیں آہستہ آہستہ سا

تھیں۔ ہندو پنڈت اور پجاری پراسرار قوتوں کے حصول کے لیے جاپ کرتے رہتے تھے۔ میں نے جے پور کے شمشان گھاٹ میں ایک ایسے ننگ دھڑنگ پجاری کو دیکھا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ کسی پراسرار شکتی (قوت) کے حصول کے لیے جاپ کر رہا ہے۔ کئی پجاریوں کے بارے میں سنا تھا کہ پراسرار قوتیں ان کے قبضے میں ہیں اور پھر ہردوار اور رشی کیش میں بھی میں نے بہت سے پجاریوں، یوگیوں اور جوگیوں کو بھوک پیاس اور موسم کی شدت سے بے نیاز جاپ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور ہردوار کے پنڈت آشوتوش کو تو میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ جس نے حیات ابدی جیسی پراسرار شکتی حاصل کرنے کے لیے دو کنواری لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور تیسری لڑکی کو عین سورج گرہن کے وقت ذبح کرنے جا رہا تھا کہ میری اور چترا پریتم کی مداخلت سے وہ لڑکی بچ گئی تھی اور آشوتوش بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ رشی کیش میں، میں نے بہت سے یوگیوں کو کسی نہ کسی شکتی پر قابو پانے کے لیے جاپ کرتے دیکھا تھا۔ خود میں نے بھی مار آتشیں FIRE SERPENT یا اگنی ناگ پر قابو پانے کے لیے یوگ کی کنڈلینی کی ریاضت شروع کی تھی۔ میں کسی گھناؤنے مقصد کے لیے یہ پراسرار قوت حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا مقصد نیک تھا۔ میں کسی بھی قوت کو دوسروں کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میری اس ریاضت میں باقاعدگی نہیں رہی تھی لیکن جب بھی موقع ملتا، میں مشق کرتا رہتا تھا اور پچھلے کئی روز سے تو میں باقاعدگی سے مشق کرتا رہا تھا۔ کئی مرتبہ تو مجھے اپنے اندر کچھ عجیب سی تبدیلیاں بھی محسوس ہوئی تھیں لیکن میں نے کبھی ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

تو کیا یہ بھی کوئی ایسی ہی پراسرار شکتی ہے۔ ایک نہایت خوب صورت عورت کے روپ میں؟

"میرے بارے میں جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی "تم انتظار نہیں کر سکتے۔ مجھے سہارا دے کر بٹھاؤ۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔" اس نے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر رک گیا۔

"ایک منٹ!" میں نے کہا "میں تمہیں اس الماری سے کپڑے نکال کر دیتا ہوں۔ وہ پہن لو تو۔۔۔"

"کپڑے تو میں نے پہنے ہوئے ہیں۔" اس نے یہ کہتے ہوئے آہستگی سے اپنے اوپر سے چادر ہٹا دی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے جسم پر اسکن کلر کا لباس تھا اور یہ عجیب لباس تھا۔ سینے پر جسم سے چپکا ہوا اور اس سے نیچے بتدریج ڈھیلا ہوتا ہوا میکسی کی طرح پھیلتا چلا گیا تھا۔ اس میں باریک باریک بے شمار چنٹیں تھیں۔

اس نے ایک بار پھر ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تو وہ بے اختیار کراہ اٹھی۔ میں نے اسے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور کافی دیر تک پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اس میں اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی تھی۔ میرے اپنے حساب میں اس کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ ساڑھے پانچ فٹ قد اور بھرا بھرا گداز جسم۔ میں یہ بھی اعتراف کروں گا کہ اس جیسی حسین لڑکی آج تک میری نظروں سے نہیں گزری تھی۔ دنیا کی حسین ترین لڑکیاں بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتی تھیں۔ اس کے شہد کی رنگت کے بال بہت گھنے اور کولھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔

"تمہارے ذہن میں بے شمار الجھنیں ہیں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم ایسا کرو۔ اپنے لیے چائے یا کافی لے آؤ پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں اور تمہارے ساتھ میری یہ ملاقات کیوں ہوئی؟"

میں اس وقت واقعی چائے یا کافی کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں کمرے سے نکل کر کچن میں پہنچ

اردو زبان کی طویل ترین داستان
دیوتا
43 حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں
تمام حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت -/2300 روپے
یہ رعایت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ منی آرڈر یا
چیک ارسال کرنے پر دی جائے گی
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ
(اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

گیا۔

کافی بناتے ہوئے ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن پھر میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ میں ایسا بزدل بھی نہیں تھا اور پھر وہ کوئی ایسی چیز تو نہیں تھی جس سے ڈرا جائے۔ وہ مافوق الفطرت ہستی ضرور تھی لیکن اس کا انداز دوستانہ تھا۔ میں نے کرسٹل کے مجسمے کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑوں کو جوڑا تھا اور وہ انسان کا روپ دھار گئی تھی۔ وہ میری شکر گزار تھی کہ میری وجہ سے اسے نئی زندگی ملی تھی۔ مجھے اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں تھا اس لیے مجھے اس سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

میں کمرے میں آکر بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگا لیکن وہ اس وقت تک کچھ نہیں بولی جب تک میں نے کپ خالی کر کے میز پر نہیں رکھ دیا۔ اس نے اشارہ کیا تو میں کرسی سے اٹھ کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مجھے اپنے جسم میں برقی لہریں سی کوندتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نظروں کا تصادم ہوتے ہی میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ اس کے لب خاموش تھے لیکن اس کی گنگناتی ہوئی سرگوشی جیسی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

”میں نیلگری ہوں۔“ وہ خاموش زبان سے کہہ رہی تھی ”میں ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی گپھاؤں میں رہتی ہوں۔ وہ برف پوش چوٹیاں ہزاروں سال سے میرا رین بسیرا ہے۔ میں نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی وہ شکتی ہوں جسے ہر کوئی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوششیں ہزاروں برسوں سے ہو رہی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈت، جوگی اور یوگی مجھے حاصل کرنے کے لیے زندگی بھر جاپ کرتے ہیں۔ جیون کا ایک ایک پل بڑی کٹھنائیوں اور تپسیا میں گزارتے ہیں مگر مجھے پانے کی حسرت من میں لیے ہی اس سنسار (دنیا) سے سدھار (رخصت) جاتے ہیں۔ وہ آدھا راستہ بھی نہیں طے کر پاتے۔ کوئی جل کر بھسم ہو جاتا ہے، کوئی پانی میں ڈوب کر مر جاتا ہے اور کوئی خوف سے مر جاتا ہے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کی مقناطیسی لہریں برقی رو کی طرح میرے وجود میں پھیل رہی تھیں۔ میرا رواں رواں اس کی خاموش آواز سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ان کی نیتوں میں کھوٹ تھی۔ وہ مجھے حاصل کر کے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہزاروں برسوں میں کوئی بھی پنڈت، یوگی یا جوگی ایسا نہیں تھا جو کسی نیک مقصد کے لیے مجھے حاصل کرنا چاہتا ہو۔ سب کی نیتوں میں فتور تھا۔ ہر کوئی حکمرانی کے خواب دیکھتا رہا لیکن ان کے سپنے بھی چکنا چور ہو گئے اور وہ خود بھی نشٹ (تباہ) ہو گئے۔

”تم پہلے شخص ہو جو اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے شکتی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا دوسروں کے لیے کیا۔ تم نے تپسیا کی تو دوسروں کے لیے، کٹھنائیاں برداشت کیں تو دوسروں کے لیے اور جب تم نے مجھے حاصل کرنے کے لیے رشی کیش میں جاپ شروع کیا تو اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے۔ تم ایک ودوا (بیوہ) کو شیطان کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگئے۔ تم نے اپنا جاپ بھی جاری رکھا۔

”میں پہلی مرتبہ اپنے ایک چاہنے والے کو دیکھنے کے لیے نیلگری کی برف پوش چوٹیوں سے نیچے اتری ہوں۔ میں تمہیں تلاش کر رہی تھی کہ ایک بیری (دشمن) نے مجھے تاڑ لیا۔ میں اس سے چھپنے کے لیے کرسٹل کے مجسمے میں سما گئی لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ وہ مجھے ٹکڑے کر کے لے جانا چاہتا تھا لیکن پارک میں تمہیں دیکھ کر وہ بھاگ گیا۔ تم اپنی سچائی کی بدولت بہت کم وقت میں ریاضت کے جس مقام پر پہنچ چکے ہو وہ اس سے ابھی بہت دور ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے اسے نہ دیکھا ہو لیکن تمہیں دیکھ کر اس پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ بھاگ نکلا۔

”یہ تمہارے اندر کی لگن تھی کہ تم مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے اور یہ تمہارے من کی سچائی تھی کہ تم نے میرے شریر (جسم) کے دونوں حصوں کو ملا کر ان پر پٹی لپیٹ دی اور میں اس بیری کی دشمنی سے بچ گئی۔“

”وہ بیری کون ہے؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”تم اسے جان لو گے۔“ نیلگری نے جواب دیا۔ ”وہ تمہارے قریب ہے۔ تمہارے آس پاس ہے۔ اس کے من میں کھوٹ ہے۔ وہ مجھے حاصل کرنے کے لیے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔“

”وہ کون ہے؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”تم بہت جلد جان لو گے۔“ وہ بولی ”میں ابھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ تمہارا جاپ ابھی پورا نہیں ہوا۔ تم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے ہو۔ میں تو یہ دیکھنے کے لیے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں سے اتری تھی کہ وہ کون ہے جو مجھے سچے دل سے پکار رہا ہے لیکن وہ بیری۔۔۔ اس نے مجھے بڑا کشٹ (تکلیف) دیا ہے۔ تم اسے تباہ نہیں کرو گے تو وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔ اس کے پاس بہت سی قوتیں ہیں۔ وہ مجھے حاصل کر کے مہان شکتی والا بننا چاہتا ہے۔ وہ میرے لیے جاپ کر رہا ہے پر ابھی تم سے بہت دور ہے۔ اگر اس کا جاپ تم سے پہلے پورا ہو گیا تو وہ مجھ پر قبضہ کر لے گا اور۔۔۔“

”اور کیا۔۔۔؟“ میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

”اور اس سے آگے مت پوچھو۔“ وہ بولی ”اس اور سے آگے تباہی ہے۔ بربادی ہے۔“

”کیا میں اسے روک سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ تم اسے روک لو گے۔ تمہارے پاس اور بھی قوتیں ہیں۔ تم ان قوتوں سے کام لو گے تو اسے روک لو گے اور اگر تم نے غفلت کی تو وہ تمہیں روک دے گا۔ تمہارے پیروں میں زنجیریں ڈال دے گا۔“

نیلگری بولتی رہی اور میں سنتا رہا۔ اس کی باتیں بھی اس کی طرح پر اسرار تھیں۔ اس کی نظریں میرے چہرے سے ہٹ گئیں۔ میں نے بھی گردن گھما کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ دن کا بہت ہلکا سا اجالا پھیل رہا تھا۔

نیلگری نے دوبارہ میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ اس نے میرا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور مجھے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنے لگی۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ سنسناہٹ پورے بدن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ ان دیکھی لہروں کی صورت میں آنکھوں کے راستے میرے اندر سما رہی ہو۔ میں اپنے آپ میں عجیب سی ہلچل محسوس کرنے لگا۔ وہ مجھے اپنی طرف کھینچتی رہی۔ اس کے احمریں ہونٹ میری پیشانی کو چھونے لگے۔ مجھے لگا جیسے میری پیشانی پر دہکتا ہوا انگارا رکھ دیا گیا ہو۔ میرے دماغ پر دھند سی چھانے لگی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

اور جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ وہاں نہ نیلگری تھی اور نہ ہی کرسٹل کا وہ خوب صورت مجسمہ۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ لیکن کرسٹل کا وہ ٹوٹا ہوا مجسمہ تو میں پارک سے اٹھا کر لایا تھا۔ وہ تو خواب نہیں تھا پھر وہ مجسمہ کہاں گیا؟

میں بستر سے اٹھ رہا تھا کہ میرا ہاتھ تکیے کے قریب کسی چیز سے ٹکرا گیا اور جب میں نے گردن گھما کر دیکھا تو میرے دماغ میں زوردار دھماکا ہوا اور شدید سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ سنسناہٹ پورے بدن میں پھیلتی چلی گئی۔ میں متوحش نظروں سے تکیے کے قریب پڑی ہوئی اس چیز کو دیکھ رہا تھا۔

وہ سیاہ چپٹے پتھروں کا ہار تھا جو نیلگری کی خوب صورت گردن کی زینت بنا ہوا تھا!

مضبوط جلد
خُدایانِ سُخن
خوبصورت سرورق
میر غالب مؤمن اور داغ
٭۔ ان چار ”خُدایانِ سخن“ کی زندگی سے وابستہ چونکا دینے والے راز!
قیمت 200 روپے ٭ ڈاک خرچ 25 روپے
٭
طلبہ اور شائقین ادب کے لئے
بے حد دلچسپ اور معلومات افزا کتاب
٭
کتابیات پبلی کیشنز
74200
kitabiat1970@yahoo.com

مجھے اپنا دل ایک بار پھر کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ خون کی گردش تیز ہوگئی اور پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں متوحش نظروں سے اس مالا کو دیکھ رہا تھا جو میرے چہرے کے سامنے میرے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں لٹکی ہوئی تھی۔

یہ وہی مالا تھا۔ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ یہی مالا میں نے نیلگری کی خوب صورت گردن میں دیکھی تھی۔ نیلگری۔۔۔ کرسٹل کا ٹوٹا ہوا مجسمہ جو میں ایک پارک سے اٹھا کرلایا تھا اور وہ مجسمہ ایک حسین انسانی پیکر میں ڈھل گیا تھا اور یہ مالا اس کی گردن میں تھی۔

نیلگری حسین تھی۔ بہت حسین۔ اس نے اپنے بارے میں ایک عجیب انکشاف کیا تھا۔ وہ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کی باسی ایک بہت مہان شکتی تھی جسے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں سال سے پنڈت' یوگی اور بہت سے لوگ جاپ اور تپسیا کررہے تھے لیکن کوئی آج تک آدھا راستہ بھی طے نہیں کرپایا تھا۔

رشی کیش میں بدھ یوگی گوتم بھوش نے اگنی ناگ پر قابو پانے کے لیے مجھے ایک یوگ بتایا تھا اور میں نے تپسیا شروع کردی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ کسی شکتی پر قابو پانے کے لیے پنڈت اور یوگی جاپ کے دوران کیا منتر پڑھتے ہیں۔ مجھے بھی گوتم بھوش نے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن پہلے روز جب میں یوگ کا آسن اختیار کرکے بیٹھا تھا تو میرے دل سے بے اختیار اللہ کا نام نکلا تھا اور پھر میں جب بھی جاپ پر بیٹھتا دل ہی دل میں اللہ کا ورد کرتا رہتا۔ اس کے سوا کوئی اور منتر کبھی میرے دل میں یا میری زبان پر نہیں آیا تھا۔

میرے جاپ میں بھی کبھی باقاعدگی نہیں رہی تھی لیکن شاید یہ اللہ کا پاک نام تھا جو مجھے منزل کے قریب لاتا چلا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں اپنے اندر چھپی ہوئی اگنی ناگ کی شکتی پر قابو پانا چاہتا تھا لیکن میرے دل میں کوئی ہوس نہیں تھی۔ نہ تو مجھے زن کی ہوس تھی نہ زر کی۔ میں کسی حسین عورت کے حصول کے لیے یہ منتر نہیں کررہا تھا نہ ہی میں دنیا پر حکومت کرنے کا خواہش مند تھا۔ میں تو برائیوں کے خلاف ایک جنگ لڑ رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ میں اس دنیا سے برائیوں کا خاتمہ کردوں لیکن میں اکیلا تھا اور دنیا برائیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان خود رو کانٹے دار جھاڑیوں کی طرح جو قدم قدم پر پیروں سے لپٹ کر راستہ روک رہی تھیں لیکن مقام شکر تھا کہ اس خارزار میں چند ایسے لوگ بھی تھے جو میرا سہارا بنتے رہے اور میں آگے بڑھ رہا تھا۔

میں نے جب وہ یوگ شروع کیا تھا تو میرے دل میں ایسی کوئی نیت نہیں تھی کہ میں یہ مہان شکتی حاصل کرکے دنیا کو اپنے قدموں پر جھکنے پر مجبور کردوں گا۔ میری ریاضت اور جاپ میں جس طرح عدم توجہی اور طویل وقفے آرہے تھے اس حساب سے تو مجھے اسی جگہ پر ہونا چاہیے تھا جہاں سے میں نے سفر شروع کیا تھا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا بابرکت نام تھا جو مجھے اس راستے میں آگے لیتا چلا گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگنی ناگ بہت مہان شکتی تھی اور میں نے اب تک لوگوں سے جو کچھ بھی سنا تھا اس کے مطابق باقی تمام شکتیاں اس کے سامنے ہیچ تھیں لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ میں تو اپنے ہی مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ میں تو شوبھا کو چھڑانے کے لیے دلیش مکھ جیسے بدمعاش کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آگیا تھا اور ہمارے حالات کچھ اس قدر پیچیدہ ہوگئے تھے کہ مجھے کسی اور طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ بے چاری میگھنا میری وجہ سے ماری گئی۔ میں خود شدید زخمی ہوا اور بمشکل موت کے منہ سے لوٹ کر آئی۔

حالات کی گمبھیرتا سے مجھے ذرا سا موقع ملا تھا اور میں نے اپنی یوگ کی ریاضت دوبارہ شروع کردی تھی۔ اسی دوران یہاں جنرل کھوراٹ کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوگیا۔ سام سنگ کو انسپکٹر بریندرا نے اپنی تحویل میں لے کر اس طرح غائب کردیا تھا کہ جیسے اس دنیا میں اس کا نام ونشان ہی نہ رہا ہو۔

گزشتہ رات مجھے سوما نے فون کرکے بلایا تھا کہ اس نے دلیش مکھ کے ایک آدمی کو پکڑا ہے۔ دلیش مکھ کے اس آدمی سے کچھ کام کی باتیں معلوم ہوگئی تھیں اور وہاں سے واپس آتے ہوئے مجھے پارک میں کرسٹل کا وہ ٹوٹا ہوا مجسمہ ملا تھا جسے میں اٹھا کر گھر لے آیا تھا اور وہ مجسمہ ایک زندہ عورت کا روپ دھار گیا تھا۔ اس نے اپنا نام نیلگری بتایا تھا اور اس نے جو انکشافات کیے تھے وہ سنسنی خیز تھے۔ نیلگری ہی وہ پراسرار شکتی تھی جس کے حصول کے لیے لوگ ہزاروں سال سے جاپ کررہے تھے۔ تپسیا کررہے تھے اور کٹھنائیاں جھیل رہے تھے لیکن کوئی ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا لیکن گزشتہ رات وہی مہان شکتی ایک حسین ترین عورت نیلگری کے روپ میں میرے گھر میں موجود تھی۔

شاید یہ ایک ایسا حسین سپنا تھا جو ہر شخص دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے بھی رات کو شاید کوئی خواب دیکھا تھا۔ کرسٹل کا بے جان مجسمہ انسانی روپ کیسے دھار سکتا ہے لیکن حقیقت کو جھٹلانا بھی میرے اختیار میں نہیں تھا۔ نیلگری واقعی انسانی روپ میں یہاں موجود تھی۔ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مالا ٹھوس ثبوت فراہم کررہی تھی کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔

وہ مالا میرے ہاتھ میں تھی اور میں متوحش نظروں سے ان چپٹے پتھروں کو دیکھ رہا تھا جن کی رنگت اگرچہ سیاہ تھی لیکن ان میں نیلاہٹ کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ کوئی بھی پتھر ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن سے بڑا نہیں تھا اور ہر پتھر کی موٹائی دو ملی میٹر سے زیادہ نہیں تھی تاہم درمیان کا پتھر ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کے برابر تھا۔ یعنی دوسرے پتھروں سے قدرے بڑا۔ ان سب پتھروں کو بڑی مہارت سے ایک مخصوص انداز میں تراشا گیا تھا اور اس سے بھی زیادہ مہارت کی بات یہ تھی کہ ان تمام پتھروں میں چوڑائی کے رخ پر باریک سوراخ کیے گئے تھے جن میں نہایت باریک سنہری تار داخل کرکے انہیں پرویا گیا تھا۔ ان پتھروں کی تعداد اکیس تھی۔ دس ایک طرف' دس دوسری طرف اور درمیان میں وہ بڑا پتھر تھا جس پر اجنبی زبان کی کوئی تحریر کندہ تھی۔ وہ تحریر اس قدر باریک تھی کہ محدب عدسے کے بغیر اسے نمایاں کرنا ممکن نہیں تھا۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ ہورہی تھی۔ پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ وہ مہان شکتی ایک حسین عورت کے روپ میں رات بھر میرے پاس رہی تھی۔ جسے حاصل کرنے کے لیے دنیا والوں نے سکھ چین تج رکھا تھا۔ مجھے وہ لمحات یاد آگئے جب اس نے مجھے اپنے اوپر جھکا کر اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کردیے تھے۔ میں ایک.... جھرجھری لے کر رہ گیا۔ مجھے پیشانی کا وہ حصہ اب بھی انگارے کی طرح دہکتا ہوا محسوس ہورہا تھا اور پھر میرا ہاتھ بے اختیار پیشانی پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز بکھر گئی جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔

میں اچھل پڑا اور متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر کمرے میں دیکھنے لگا۔ کمرے میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ کھنکتی ہوئی ہنسی کی وہ مدھر سی آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی اور پھر وہ آواز بتدریج تحلیل ہوتی چلی گئی۔

وہ کہاں غائب ہوگئی؟

میرے ذہن میں ایک اور سوال ابھرا۔ کیا وہ واقعی انسان کے اندر کی وہ مہان شکتی اگنی ناگ تھی۔ جو نیلگری کے روپ میں مجھے دیکھنے کے لیے میرے پاس آئی تھی؟ کیا کل رات پارک میں اس ٹوٹے ہوئے کرسٹل کے مجسمے کا میرے سامنے آجانا محض اتفاق تھا؟ کیا یہ سب کچھ حقیقت تھی اور وہ واقعی نیلگری تھی یا میں کسی پراسرار طاغوتی چکر میں پھنس رہا تھا۔

وہ جلترنگ جیسی قہقہے کی مدھر سی آواز ایک بار پھر کمرے کی فضا میں بکھر گئی۔ میں نے ایک بار پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ آواز اس مرتبہ بھی چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور پھر پہلے کی طرح فضا میں تحلیل ہوگئی۔

اس مرتبہ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ باہر تیز دھوپ تھی جس سے ایک لمحے کو میری آنکھیں چکاچوندی ہوگئیں۔ میں نے پردہ برابر کردیا اور کمرے کی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب آخری مرتبہ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تھا تو اس وقت دن کی روشنی پھیلنا شروع ہوئی تھی اور نیلگری نے مجھے اپنے اوپر جھکا کر میری پیشانی پر ہونٹ ثبت کیے تھے تو میرے دماغ پر دھند سی چھانے لگی تھی اور میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئی تھیں۔ میں شاید گہری نیند سو گیا تھا اور اب آنکھ کھلی تھی تو گیارہ بج رہے تھے۔

میں نیلگری کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لاؤنج میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں خواب سے بیدار ہوا ہوں۔

وہ مالا اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اسے تکیے کی طرف اچھالنا ہی چاہتا تھا کہ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں ایک سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

"اس مالا کی حفاظت کرنا۔۔۔"

میرا ہاتھ رک گیا۔ میں نے ایک بار پھر چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا البتہ بہت بھینی بھینی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ عجیب سی مسحور کن خوشبو تھی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ خوشبو شروع ہی سے کمرے کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔

لاؤنج میں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہ مالا میرے ہاتھ میں

تھی۔ میں ٹیلی فون کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور ریسیور اٹھالیا۔

"ہمت سنگھ۔ سو رہے تھے کیا؟" ہیلو کے جواب میں ببلا کی آواز سنائی دی۔

"او۔۔ ہاں۔ میں سو رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ میری آواز میں ہلکی سی ہکلاہٹ تھی۔

"کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" ببلا نے کہا۔

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ شبہ ہے ہمت سنگھ۔" ببلا کی آواز سنائی دی "تمہاری آواز کچھ عجیب سی لگ رہی ہے۔ رات کو تم نے فون کیا تھا تو اس وقت بھی تمہاری بات سن کر مجھے شبہ ہوا تھا کہ کہیں تم نے دارو تو نہیں پی لیا اور۔۔۔"

"تم جانتی ہو مجھے شراب اور کسی بھی قسم کے نشے سے شدید نفرت ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"اچھی طرح جانتی ہوں۔" ببلا نے جواب دیا "لیکن رات کو جب تم نے فون پر یہ کہا کہ بڑی دھواں دھار بارش ہو رہی ہے اور تمہاری گاڑی کے دو ٹائر بھی فلیٹ ہو گئے ہیں تو مجھے تم پر شبہ ہوا تھا کہ شاید تم نے ترنگ میں آکر دارو پی لیا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔" میں نے کہا۔

"گاڑی کے ٹائر فلیٹ ہونے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن بارش اور وہ بھی دھواں دھار بارش۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے اور تم بارش کی بات کر رہے تھے۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ببلا۔" میں نے کہا "گزشتہ رات بارش اتنی زوردار تھی کہ میں باہر نہیں نکل سکا اور اسی لیے میں نے تمہیں فون کردیا تھا تاکہ تم پریشان نہ ہو۔"

"اور اس کے بعد تم نے اپنا فون انگیج رکھا۔" ببلا نے جواب دیا۔ "میں تمہیں بار بار فون کرتی رہی لیکن ہر مرتبہ تمہارا فون انگیج ملا۔ میں نے چھ بجے بھی فون کیا تھا۔ اس وقت بھی۔۔۔"

"ایک منٹ ببلا!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "فون بند مت کرنا۔ میں تھوڑی دیر بعد تم سے بات کرتا ہوں۔"

میں نے فون کا ریسیور میز پر رکھ دیا اور باہر والے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں پہنچا تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ باہر تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ آسمان پر کہیں بادل کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کار کی طرف دیکھا تو سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ اگلے دونوں ٹائر صاف نظر آرہے تھے۔ کوئی بھی ٹائر فلیٹ نہیں تھا۔ دونوں میں پوری ہوا بھری ہوئی نظر آرہی تھی اور کہیں بارش کے نشان بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ رات کو جس طرح دھواں دھار بارش ہوئی تھی اس کے پیش نظر تو آنگن میں گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہونا چاہیے تھا لیکن زمین خشک تھی۔

میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے اندر آکر فون کا ریسیور اٹھالیا۔

"ہیلو ببلا۔ میں آدھے گھنٹے میں آرہا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ ہار اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ کمرے میں آکر میں نے ایک بار پھر اس مالا کو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھنا چاہا لیکن اس پراسرار سرگوشی کا خیال آگیا۔ میں نے وہ ہار گلے میں ڈال لیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

میرا دماغ سلگ رہا تھا۔ پورے بدن میں بھی جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ میں کپڑے اتار کر نل کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ ٹھنڈے پانی کی دھار میرے سر پر پڑ رہی تھی۔ میرے دماغ کی تپش بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔

اس دوران میں رات کے واقعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے یہاں سے جانا چاہا تھا تو میرے پیر من من کے بھاری ہو گئے تھے۔ ایک قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا تھا پھر کار کے اگلے دونوں ٹائر فلیٹ ملے تھے اور پھر دھواں دھار بارش شروع ہو گئی تھی اور میں نے ببلا کو فون کردیا تھا کہ رات کو نہیں آسکوں گا۔

میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ مجھے یاد آگیا کہ نیلگری نے کہا تھا کہ اس نے مجھے یہاں روکا تھا۔ اگر میں چلا جاتا تو وہ رات بھر تکلیف میں رہتی اور فنا ہو جاتی۔ نیلگری شکتی تھی۔ مہان شکتی۔ اس نے یہاں سے میرے جانے کے تمام راستے بند کردیے تھے اور مجھے رات کو یہاں رکنا پڑا تھا لیکن۔۔۔ میں نے ٹیلی فون تو انگیج نہیں رکھا تھا اور ببلا کے کہنے کے مطابق وہ رات بھر فون کرتی رہی تھی اور مجھے چھ بجے بھی فون کیا تھا تو لائن انگیج ملی تھی۔۔۔ لیکن اب لائن مل گئی تھی۔

تو کیا اس میں بھی نیلگری کی شکتی کام کر رہی تھی۔ وہ جب تک یہاں رہی ببلا کو یہاں کا فون انگیج ملتا رہا اور

نیلگری چلی گئی تو شاید پہلی ہی کوشش میں ببلا کو لائن مل گئی تھی۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا میرا ذہن الجھتا گیا۔ باتھ روم سے نکل کر میں نے دوسرے کپڑے پہنے اور باہر آگیا۔ اس کے چند منٹ بعد میں اس کار میں ڈاک بنگلے کی طرف جا رہا تھا جس کے دو ٹائر رات کو فلیٹ نظر آئے تھے۔ مکان کو تالا لگا کر میں نے چابی برآمدے میں اسی جگہ رکھ دی تھی۔ آج ویک اینڈ شروع ہو رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ مایا متی بھی آج یہاں ضرور آئے گی۔

مجھے ببلا کے پاس پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں جیسے ہی کار سے اترا وہ مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں یا اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو رہا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھے پکڑ لیا اور اپنا چہرہ میرے چہرے کی طرف لانے لگی۔ میں گڑبڑا سا گیا۔

"کیا کر رہی ہو۔ کاشما سامنے کھڑا ہے۔" میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میرا خیال تھا اسے آج پھر پرانا دورہ پڑا ہے۔

"ایک منٹ۔ رک جاؤ۔" اس کے لہجے میں درشتی تھی۔ اس نے قدرے آگے جھک کر میرا منہ سونگھا اور پھر مجھے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی "ٹھیک ہے۔ میں سمجھی تھی کہ تم نے پینا شروع کردی ہے۔"

"اوہ!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "اندر چلو۔ میں نے ابھی ناشتا نہیں کیا۔ میں سمجھ گیا تم کیا جاننا چاہتی ہو لیکن معدہ خالی ہو تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔ پہلے ناشتا پھر کوئی اور بات۔"

کاشما لان میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ ببلا نے آواز دے کر اسے ناشتا تیار کرنے کو کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر آگئی۔ وہ لاؤنج میں ہی بیٹھنا چاہتی تھی لیکن میں اسے بیڈ روم میں لے آیا اور اسے بیڈ پر دھکیل کر خود کرسی پر بیٹھ گیا۔

"رات کو بارش کہاں ہوئی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"چند منٹ انتظار کرلو۔ سب بتادوں گا کہ بارش کہاں اور کیسے ہوئی تھی۔" میں نے جواب دیا "کل رات سے اب تک انسپکٹر اعظم یا بریندرا سے تو کوئی رابطہ نہیں ہوا؟"

"ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے انسپکٹر اعظم کا فون آیا تھا۔" ببلا نے جواب دیا "اس کا فون آنے کے بعد ہی تو میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ کوئی خاص بات؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"ہاں۔ بہت ہی خاص بات ہے۔" میں نے جواب دیا "کل رات سومبا نے دلیش مکھ کے ایک آدمی کو پکڑا تھا جس نے ایک بہت ہی خوفناک منصوبے کا انکشاف کیا ہے۔ اگر ان کا یہ منصوبہ کامیاب ہو گیا تو بڑی گڑبڑ ہو گی۔ یہاں خون ریز ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔ بے گناہ لوگ مارے جائیں گے اور اس گڑبڑ کا فائدہ ناگ پال اور جنرل کھوراٹ کے آدمی اٹھائیں گے۔"

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ کاشما ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ ببلا نے سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا اخبار اٹھا کر بیڈ پر بچھا دیا۔ کاشما نے ٹرے اس پر رکھ دی اور باہر چلا گیا۔ ٹرے دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ببلا نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا۔

ناشتے کے دوران گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ ہندوستان کی لوک سبھا کا ایک ممبر بہاری لال چند روز بعد یہاں آنے والا ہے اور یہاں اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ کھٹمنڈو اور دلی میں پہلے ہی ٹسل چل رہی تھی۔ کھٹمنڈو میں ایک ہندوستانی سیاست داں کے قتل کے بعد جو صورت حال سامنے آئے گی وہ خاصی تشویش ناک ہو گی اور اس کے بعد ان کے منصوبے کا اگلا مرحلہ زیادہ خطرناک ثابت ہو گا۔

"یہ سارا منصوبہ جنرل کھوراٹ کا ہے۔" میں کہہ رہا تھا "اس نے یہاں اپنے قدم جمانے کے لیے منصوبے پر عمل شروع کردیا ہے۔ ناگ پال اور دلیش مکھ جیسے بے ضمیر اس کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ ہر ملک میں ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک کی سلامتی کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ انسپکٹر خان اور بریندرا کو اس منصوبے سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہے تاکہ پیش بندی کرکے صورت حال کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی جائے۔"

"اور وہ بارش والی بات؟" ببلا ایک بار پھر مسکراتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے شاید اب بھی شبہ تھا کہ رات کو میں نے شراب پی رکھی تھی۔

"شاید تم میری بات کا یقین نہ کرو لیکن اب میں تمہیں جو کچھ بھی بتانے جا رہا ہوں اس میں ذرا بھی غلط بیانی نہیں ہو گی۔ ایک ایک لفظ سچائی پر مبنی ہے اور گزشتہ رات مجھ پر جو کچھ بیتی ہے وہ ٹھوس حقیقت ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم تجسس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو یا۔۔۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی "تم جانتے ہو میں

نے کبھی تمہاری کسی بات پر شبہ نہیں کیا۔ بہرحال، اب شروع ہوجاؤ۔ میں سننے کو بے چین ہو رہی ہوں۔"

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اسے رتنا پارک میں ملنے والے کرسٹل کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کے بارے میں بتانے لگا۔ میں جیسے جیسے بات کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سنسنی کے آثار نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آرہا ہو لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔

"تمہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آرہا لیکن یہ دیکھو۔" میں نے قمیص کے بٹن کھول کر اسے اپنے گلے میں پڑا ہوا ہار دکھایا "یہ۔۔۔ یہ ہار نیلگری کے گلے کی زینت بنا ہوا تھا۔ صبح جب وہ غائب ہوگئی تو یہ ہار بستر پر پڑا ہوا تھا۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا میں یہ مالا دیکھ سکتی ہوں۔"

میں نے وہ ہار گلے سے اتار لیا۔ یہاں میں آپ کو ایک اور بات بتاتا چلوں کہ جب سے یہ ہار میں نے گلے میں ڈالا تھا مجھے اس کے لمس سے ایک عجیب سی حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت میں نے ہار اتار کر بملا کے ہاتھ پر رکھا تو اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ تو انگاروں کی طرح تپ رہا ہے۔ تم نے گلے میں کیسے پہنا ہوا تھا۔" وہ ہاتھ کو آہستہ آہستہ جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔

"شاید تمہارے من میں کوئی کھوٹ آگئی تھی۔" میں نے مالا اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ میں سوچ رہی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور پتا نہیں یہ مالا کہاں سے اٹھا لائے ہو۔ مجھے زندگی میں پہلی بار تمہاری باتوں پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہی تھی کہ گزشتہ رات تم کسی آوارہ لڑکی کو وہاں لے گئے تھے اور اس کے ساتھ خوب دارو بھی پیا تھا۔ سوری ہمت سنگھ۔" وہ ندامت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "مجھے تمہارے بارے میں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"لو۔ اب اس ہار کو دیکھو۔" میں نے کہا "اب تمہارا من صاف ہوگیا ہے۔ اب یہ تمہیں انگارے کی طرح تپتا ہوا نہیں لگے گا۔"

بملا نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے مالا اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس مرتبہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ مالا کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھنے لگی پھر اسے میری طرف بڑھا دیا۔

"اسے پہن لو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ ایک مہان شکتی کی طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔ بلکہ تمہاری سچائی کا انعام ہے۔ مجھے یقین ہے یہ مالا آگے چل کر تمہارے بہت کام آئے گی۔"

ہم دیر تک نیلگری کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں تقریباً رات بھر جاگا تھا۔ صبح اگرچہ چند گھنٹے سو گیا تھا لیکن میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

میں بستر پر لیٹا تو بملا اٹھ کر باہر چلی گئی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میں شام پانچ بجے بیدار ہوا تھا۔ کچھ دیر تک پلنگ پر پڑا اینٹھتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے ساری کسل مندی دور ہوگئی۔

میں تیار ہو کر کمرے سے نکل رہا تھا کہ بملا سے ٹکرا گیا۔ وہ کمرے میں آرہی تھی۔

"اوہ۔" وہ گڑبڑا سی گئی "میں تمہیں جگانے کے لیے ہی آرہی تھی۔ آؤ۔ لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کاشا چائے بنا رہا ہے۔"

"انسپکٹر اعظم یا بریندرا کا فون تو نہیں آیا تھا؟" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

"دوپہر تین بجے کے قریب بریندرا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ تم سو رہے ہو۔ اس نے جگانے کو منع کردیا۔" بملا نے بتایا۔

"مجھے جگا دیتیں۔" میں نے کہا "تم جانتی ہو میں اس سے ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔"

"اس نے کہا تھا کہ وہ پانچ بجے کے لگ بھگ دوبارہ فون کرے گا۔ اسی لیے تو میں تمہیں جگانے کے لیے آرہی تھی۔ ہوسکتا ہے تھوڑی دیر میں اس کا فون آجائے۔" بملا نے جواب دیا۔

ہم لان میں آکر بیٹھے ہی تھے کہ گیٹ کے سامنے جیپ آکر رکی اور پھر ایک منٹ بعد بریندرا اور انسپکٹر اعظم ہمارے سامنے موجود تھے۔ وہ ہمارے پاس لان ہی میں بیٹھ گئے اور اس کے دس پندرہ منٹ بعد کاشا ہم سب کے لیے چائے لے آیا۔

چائے کے دوران ہی میں نے انہیں دلیش مکھ اور ناگ پال کے منصوبے سے آگاہ کردیا۔

"ہمیں بھی اپنے مخبروں سے کچھ ایسی اطلاع ملی ہے۔" انسپکٹر اعظم نے میری بات سننے کے بعد کہا "لیکن بہاری لال کا نام سامنے نہیں آیا۔ تاہم اطلاع یہ ہے کہ چند روز کے اندر اندر ہندوستان کے ایک ایم پی کو کھٹمنڈو میں قتل کردیا جائے گا۔ جسے بنیاد بنا کر ہنگامے شروع کردیے جائیں گے۔ بہرحال، نام معلوم ہوجانے سے ہمیں گائیڈ لائن مل گئی ہے۔ ہم آج ہی معلوم کرلیں گے کہ بہاری لال یہاں کب آرہا ہے۔"

"اور وہ جیسے ہی ائرپورٹ پر جہاز سے اترے گا ہم اس کی نگرانی شروع کردیں گے۔" یہ بات بریندرا نے کہی تھی۔

"اور دلیش مکھ کے بارے میں کوئی رپورٹ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

"کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔" بریندرا نے جواب دیا "رودی کی موت کے بعد وہ ناگ پال کے پاس چلا گیا ہے۔ ہم نے اس کے بارے میں اپنی وزارت داخلہ کو رپورٹ بھیج دی ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ رپورٹ کل صبح تک وزارت خارجہ کے دفتر میں پہنچ جائے گی اور وزارت خارجہ بھارتی سفیر کو اپنے دفتر میں طلب کرکے اسے دلیش مکھ کی ناپسندیدہ سرگرمیوں سے آگاہ کردے گی۔"

"گڈ آئیڈیا۔" میں نے کہا "لیکن میرا خیال ہے اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔"

"لیکن ہماری حکومت کی طرف سے احتجاج تو ریکارڈ ہوجائے گا۔" بریندرا نے کہا۔

"ہاں۔ یہ بات تو درست ہے۔" میں نے سر ہلا دیا۔

چائے کے دوران اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے انہیں رتنا پارک سے ملنے والے کرسٹل کے مجسمے اور نیلگری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ انہیں ایسی کوئی بات بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب وہ دونوں رخصت ہوگئے۔ اس کے چند منٹ بعد ہم بھی شوبھا سے ملنے کے لیے اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ اسپتال میں مریضوں سے ملنے کے لیے وقت مقرر تھا لیکن ہمارے لیے کوئی پابندی نہیں تھی۔ شوبھا پرائیویٹ روم میں تھی اور اس کی حفاظت کے لیے بھی دو پولیس والے ہر وقت کمرے کے سامنے موجود رہتے تھے۔ ہمارے بارے میں انہیں ہدایت تھی کہ ہم جب چاہیں شوبھا کے پاس جاسکتے ہیں۔

شوبھا کی حالت پہلے سے کافی بہتر تھی اور وہ بڑی تیزی سے روبہ صحت ہو رہی تھی۔ انسپکٹر بریندرا نے اپنے تعلقات سے کام لیتے ہوئے نرس مایا متی کی ڈیوٹی بھی اسی کے کمرے میں لگوا دی تھی۔ مایا متی کی ڈیوٹی اگرچہ شام چھ بجے ختم ہوجاتی تھی لیکن وہ رات دس گیارہ بجے تک شوبھا کے پاس رہتی تھی۔

جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو مایا متی بھی دوسری نرس کے ساتھ کمرے میں موجود تھی۔ وہ اپنی یونیفارم اتار کر گھر کے کپڑے پہن چکی تھی اور اس نے منہ ہاتھ دھو کر چہرے پر ہلکا سا میک اپ بھی کرلیا تھا۔

ہم ساڑھے آٹھ بجے تک شوبھا کے پاس بیٹھے رہے اور جب وہاں سے رخصت ہوئے تو مایا متی بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ہمارا پروگرام یہ تھا کہ دربار مارگ کے علاقے میں رتنا ہوٹل میں کھانا کھا کر مایا متی کو اس کے فلیٹ پر ڈراپ کرتے ہوئے اپنے ڈاک بنگلے کی طرف نکل جائیں گے۔

ہم شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتے ہوئے تقریباً پون گھنٹے میں رتنا ہوٹل پہنچ سکے تھے۔ عام حالات میں یہ فاصلہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں طے ہوسکتا تھا لیکن اس وقت شہر کی تمام سڑکوں پر ٹریفک کی بھرمار رہتی تھی۔ جگہ جگہ ٹریفک جام ہوجاتا تھا۔ بعض اوقات تو چند منٹ کا فاصلہ ٹریفک جام کی وجہ سے گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔

رتنا ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں بھی اس وقت رونق شباب پر تھی۔ کوئی میز خالی نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم ہال کے دروازے کے قریب کھڑے متجسس نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے کہ مایا مجھے اور بملا کو اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے ایک طرف لپکی۔

ایک میز خالی ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور گاہک وہاں تک پہنچ سکے ہم اس میز پر قابض ہوگئے۔ اس طرف سرو کرنے والی ویٹریس بھی ہماری اس پھرتی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

ہم نے ویٹریس کو اپنی اپنی پسند کے کھانے نوٹ کروا دیے اور میں متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہماری میز پر کھانا سرو ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

کھانے کے دوران ایک موقع پر بملا کا ہاتھ منہ کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔ وہ متوحش نظروں سے میری پشت کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں اس کی کیفیت دیکھ کر چونک گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ تمہارے پیچھے تیسری میز پر انسپکٹر پانڈے۔۔۔"

بملا کہتے کہتے رک گئی۔

انسپکٹر پانڈے کے نام پر میری آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ فوری طور پر اس نام کی شناخت میرے ذہن میں نہیں آسکی تھی لیکن جب میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔

اس شخص کو دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ فرنچ کٹ داڑھی' باریک مونچھیں' پیچھے کو بنے ہوئے سر کے بال' آنکھوں پر گولڈن فریم کی عینک اور قیمتی لباس۔ وہ انسپکٹر پانڈے ہی تھا جو عرصہ پہلے راجستھان میں سارسکا کے قریب پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کی نقدی اور مندر پر بھینٹ میں چڑھائے جانے والے طلائی زیورات لے کر فرار ہوگیا تھا اور ہندوستان کی پولیس اس کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ گئی تھی۔

اس نے اگرچہ اپنا حلیہ بدل لیا تھا لیکن ہم اسے کیسے بھول سکتے تھے۔ اس بدلے ہوئے حلیے میں بھی بملا نے فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا۔ بملا جب سارسکا کے جنگل میں ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی تو میں اسے چھڑانے کے لیے جنگل میں گھس گیا تھا اور بعد میں انسپکٹر پانڈے بھی پولیس فورس لے کر جنگل میں داخل ہوگیا تھا اور پھر ڈاکوؤں کے گروہ کے قلع قمع اور اس گروہ کے سرغنہ گنگولی چوہدری کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد انسپکٹر پانڈے دو دن تک ہمارے ساتھ جنگل میں رہا تھا۔ اس کے بعد جب ٹھاکر بھانوت سنگھ اور روپ متی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا تو انسپکٹر پانڈے ہی اس حادثے کی تفتیش کررہا تھا اور ہمارا اکثر اس سے ملنا جلنا رہتا تھا اور پھر اس کے تقریباً ایک ہفتے بعد وہ پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے دولت لے کر فرار ہوگیا تھا۔

اور اب وہ اگرچہ بہت عرصے بعد نظر آیا تھا لیکن ہم اسے کیسے بھول سکتے تھے۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ ہندوستان کی پولیس انسپکٹر پانڈے کو تلاش کیوں نہیں کرسکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ عرصے ہندوستان ہی میں کہیں روپوش رہنے کے بعد نیپال آگیا تھا۔

انسپکٹر پانڈے اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوب صورت لڑکی بھی تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ تھی تو وہ نیپالی لیکن اس کی رنگت نکھری ہوئی اور چہرے کے نقوش بڑے دل فریب تھے۔ اس نے سلیو لیس بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔

وہ دونوں بھی کھانا کھا رہے تھے۔ انسپکٹر پانڈے کے ہاتھ میں نوالہ تھا اور اتفاق سے اسی وقت اس کی نظریں بھی میری طرف اٹھ گئیں۔ نوالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا اور آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر پانڈے کی میز پر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پہ ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔ وہ ایک سابق پولیس آفیسر تھا۔ اس کا بڑا دبدبہ تھا لیکن اس وقت مجھے اپنے سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہوگیا تھا حالانکہ میں قانون کا محافظ نہیں تھا۔ نہ ہی اسے پکڑنے کی مہم پر نکلا ہوا تھا لیکن۔۔۔ احساس جرم ہی بہت بڑا خوف ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک سنگین جرم کرکے بھاگا ہوا ہے اور پکڑے جانے کے خوف نے اس کے دل پر لرزہ سا طاری کردیا تھا۔

"اطمینان سے کھانا کھاؤ۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کوئی پریشانی نہیں۔ بعد میں کسی جگہ بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے اور سنو۔ مجھ سے ملے بغیر جانا مت۔" میرا لہجہ نارمل تھا اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی تھی لیکن اس کی ساتھی لڑکی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی تھی "ہیلو ہنی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم پرانے دوست ہیں۔ بہت عرصے بعد آمنا سامنا ہوا ہے۔ تم لوگ آرام سے کھانا کھاؤ۔ بعد میں ملیں گے۔"

میں اپنی میز پر آگیا اور کرسی پر بیٹھنے سے پہلے میں نے پانڈے کی طرف دیکھا۔ اس کی کیفیت کسی حد تک معمول پر آگئی تھی لیکن آنکھوں میں کسی قدر وحشت بدستور موجود تھی۔ میں نے اس لڑکی کے سامنے اسے اس کے نام سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ وہ یہاں نجانے کس نام سے رہ رہا تھا۔ اس کے اصل نام کا انکشاف اس کے لیے کسی قسم کی الجھنیں پیدا کرسکتا تھا اور پھر میرا لہجہ اور انداز بھی دوستانہ ہی رہا تھا۔ میں دراصل پانڈے کو بھڑکانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر تو اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا تھا۔ پانڈے یہاں میرے کام آسکتا تھا اور میں نے فوراً ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کے بجائے پانڈے کو دوست بنایا جائے۔ دیش مکھ راجستھان سے ایم پی تھا اور پانڈے کا تعلق بھی راجستھان ہی سے تھا۔ اسی حوالے سے وہ میرے بہت کام آسکتا تھا۔

"وہ پانڈے ہی ہے نا؟" بملا نے میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ وہی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کھانے کے بعد کسی اور جگہ پر بیٹھ کر ہماری باتیں ہوں گی۔"

"وہ کون ہے؟" مایا متی نے بھی ایک سوال کر ڈالا۔

"پرانا دوست ہے۔ اتفاق سے آمنا سامنا ہوگیا ہے۔ بہت دلچسپ آدمی ہے۔" میں نے جواب دیا اور پھر ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

ہمارا کھانا ابھی جاری تھا کہ بملا نے آگے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"وہ بل ادا کرکے اٹھ رہے ہیں۔"

"گھبراؤ نہیں۔ وہ کہیں نہیں جائے گا۔" میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

میں نے غلط نہیں کہا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے پانڈے اس لڑکی کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

"ہم کافی شاپ میں جا رہے ہیں۔ تم لوگ وہیں آجانا۔ کافی اکٹھے ہی پئیں گے۔" پانڈے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے آپ پر مکمل طور پر قابو پاچکا تھا پھر اس نے بملا کی طرف دیکھا۔

"ہیلو دیوی جی۔ کیسی ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں مہاراج۔" بملا نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک۔" پانڈے بولا "بہرحال' تم لوگ کافی شاپ میں آؤ تو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔" اور پھر وہ میرے کندھے پر جھک گیا "میرا نام چترنجن ہے۔ بھولنا نہیں۔" اس کی سرگوشی اتنی ہلکی تھی کہ میں بھی بمشکل آواز سن سکا تھا۔

پانڈے اس لڑکی کے ساتھ میزوں کے درمیان چکراتا ہوا ہال سے نکل گیا۔ اس کے تقریباً پندرہ منٹ بعد ہم نے بھی کھانا ختم کرکے بل ادا کیا اور ہال سے باہر آگئے۔ وسیع و عریض لابی کے بائیں طرف ایک کشادہ راہداری تھی جہاں چند گفٹ شاپس بھی تھیں۔ اس راہداری کے بالکل آخر میں کافی شاپ کے الفاظ چمک رہے تھے۔

ہم دکانوں میں سجے ہوئے سامان کو دیکھتے ہوئے کافی شاپ میں داخل ہوگئے۔ یہ بھی خاصا وسیع ہال تھا۔ یہاں کئی میزیں خالی تھیں۔ کافی شاپ میں رش نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈائننگ ہال میں کھانے سے فارغ ہونے والے بیشتر لوگ ہوٹل کے نائٹ کلب کا رخ کررہے تھے۔ اس طرف صرف وہی لوگ آرہے تھے جنہیں بے ہنگم اچھل کود اور پرشور موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

انسپکٹر پانڈے اس لڑکی کے ساتھ کھڑکی کے ساتھ والی ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو ان دونوں نے اٹھ کر ہمارا استقبال کیا تھا۔ پانڈے نے مدھو مالا کے نام سے اس لڑکی کا تعارف کرایا۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ خاصی حسین تھی۔ سلیو لیس بلاؤز اور اسکرٹ بھی گھٹنوں سے اوپر تھا۔ اس کی بائیں کلائی میں سونے کا ایک کڑا تھا اور دائیں کلائی میں ایک خوب صورت اور قیمتی مردانہ گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے بملا کے بعد مایا متی کا تعارف کرایا تو پانڈے مسکراتے ہوئے بولا۔

"دیوی جی سے ملاقات ہوچکی ہے لیکن انہیں شاید یاد نہیں۔"

"مجھ سے!" مایا متی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آپ تو لوگوں کے چہرے یاد نہیں رکھ سکتیں لیکن ہم آپ کو نہیں بھول سکتے۔" پانڈے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں چند مہینے پہلے بیمار ہوا تھا اور پورا ایک ہفتہ اسپتال میں رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹروں کی دی ہوئی کڑوی کسیلی دواؤں سے زیادہ آپ کی مسیحائی مریضوں کے من میں جیون کی جوت جگاتی ہے۔"

پانڈے کی اس بات پر مایا متی نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

ہماری ان باتوں کے دوران ہی ایک سانولی سی ویٹریس نے ہمارے سامنے اسپریسو کافی سرو کردی تھی۔ کافی کی چسکیوں کے دوران گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ میں پانڈے کو چترنجن کے نام سے ہی مخاطب کرتا رہا تھا۔ پانڈے نے روپ متی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم سارسکا میں تھے تو انسپکٹر پانڈے کے ساتھ ہمارے چند روز بڑے اچھے گزرے تھے۔ میں شاید پہلے بھی کہیں یہ بتا چکا ہوں کہ سارسکا میں پانڈے ہی ایک ذمے دار اور فرض شناس پولیس آفیسر نظر آیا تھا لیکن آخر میں اس نے جو حرکت کی تھی اس پر تو میں آج تک حیران تھا اور اب طویل عرصے بعد اس سے سامنا ہوا تھا تو میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اس نے ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی تھی کہ اس کی زندگی بھر کی نیک نامی گندگی میں غرق ہوکر رہ گئی تھی۔ پانڈے نے بھی شاید میری اس بے چینی کو محسوس کرلیا تھا۔

"اگر آپ تینوں خواتین اجازت دیں تو ہم دونوں ذرا الگ بیٹھ کر بزنس کی باتیں کرلیں۔" اس نے باری باری بملا وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جواب میں ان تینوں نے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ ہم نے اپنے اپنے مگ اٹھائے اور ہال کے پہلو کے دروازے

سے نکل کر لان میں آگئے۔ یہاں بھی میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ رنگین چھتریاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ صرف دو میزیں ایسی تھیں جن پر دو جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ باقی چار میزیں خالی تھیں۔ ہم اس کھڑکی سے ذرا ہٹ کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے ہم کھڑکی کے راستے ببلا وغیرہ کو بھی دیکھ سکتے تھے۔

"میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو پانڈے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تم شروع ہوجاؤ۔۔۔ اور یہ بتاؤ کہ تم نے ایسی گھناؤنی حرکت کیوں کی تھی اور اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟"

"گھناؤنی حرکت!" پانڈے کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا "سب سے پہلے تو مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مدھو مالا کے سامنے میری لاج رکھ لی اور کوئی ایسی بات نہیں کی کہ اسے مجھ پر شک کا موقع ملتا۔"

"ظاہر ہے تم نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تھی۔ بلکہ میں تو تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے زخمی جانکی کو شہر بھجوانے کے لیے فوری طور پر جیپ کا بندوبست کردیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ارے! تمہاری اس دوست کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔ کیسی ہے وہ؟" اس نے پوچھا۔

"وہ اب ہمارے بیچ نہیں رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ کیا وہ اس روز۔۔۔"

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اس کے وہ زخم تو ٹھیک ہوگئے تھے۔ کئی مہینوں بعد ہردوار میں اسی شیطان سے تصادم ہوگیا تھا جس کی تلاش میں ہم سارسکا کی پہاڑیوں والے مندر تک گئے تھے۔ بہرحال' یہ ایک لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گا۔"

"مجھے افسوس ہوا۔" پانڈے نے کہا۔

"میں تم سے کچھ سننے کا منتظر ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔" پانڈے مسکرا دیا "ابھی تم نے کہا تھا کہ یہ بہت گھناؤنی حرکت تھی۔ ٹھیک کہا تم نے لیکن بیس سال کی پولیس سروس میں مجھے کیا ملا تھا۔ میں نے کئی بار اپنی زندگی داؤ پر لگائی۔ عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے بدمعاشوں' چوروں' ڈاکوؤں اور قاتلوں سے مقابلے کیے۔ میرے جسم پر گولیوں کے کم از کم نصف درجن نشان ایسے ہیں جو میری فرض شناسی' دیانت داری اور بہادری کا ثبوت ہیں لیکن ان بیس برسوں میں عوام اور حکومت نے مجھے کیا دیا۔ صرف چار ہزار روپے مہینہ تنخواہ۔ میری فرض شناسی اور بہادری کی گواہی تو تم بھی دو گے۔ میں نے کبھی اپنے فرض سے غفلت نہیں برتی۔ میں جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ کسی لڑائی میں مارا جاتا تو میری بہادری اور فرض شناسی کے گن گائے جاتے۔ مجھے بعد از مرگ ایوارڈ دیا جاتا اور اگر خوش قسمتی سے میں موت سے بچ کر اپنی سروس پوری کرلیتا تو ریٹائرمنٹ پر میرے ہاتھ میں چند ہزار روپوں کا چیک تھما دیا جاتا اور بس۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے اگر وہ گھناؤنی حرکت کی تھی تو کیا برا کیا تھا۔ کیا میرے دل میں ارمان نہیں تھے۔ میری خواہشات نہیں تھیں؟ کیا میں چار ہزار روپے مہینے کی تنخواہ میں ایسا قیمتی لباس پہن سکتا تھا۔ کسی ایسے بڑے ہوٹل میں قدم رکھنے کی جرأت کرسکتا تھا۔ نہیں میرے دوست۔" اس نے گہرا سانس لیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ویسے بھی وہ دولت میں نے کسی کے گھر سے نہیں چرائی تھی۔ وہ تو مندر کا مال تھا۔ میں نہ چراتا تو مجھ سے بڑے چور وہاں موجود تھے۔ وہ سب کچھ ہڑپ کر جاتے۔ یہ پنڈت اور پجاری؟ کیا سیوا (خدمت) کرتے ہیں وہ جنتا (عوام) کی؟ بلکہ وہ تو جنتا کو دھرم کے نام پر بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے انہیں لوٹ رہے ہیں۔ عیش کرتے ہیں وہ لوگ۔۔۔ اگر میں نے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیے ہیں تو کیا جرم کیا ہے۔"

"ہاں واقعی تم نے بھگوان کے گھر میں چوری کرکے کوئی جرم نہیں کیا لیکن۔۔۔"

"بھگوان۔" اس نے میری بات کاٹ دی "میں کسی دھرم ورم کو نہیں مانتا۔ میں نے جب یہ منصوبہ بنایا تھا تو میرے ساتھیوں نے مجھے بہت ڈرایا تھا کہ کالی کا غضب مجھے تباہ کردے گا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کالی کا غضب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ میں عیش کررہا ہوں اور تمہیں ایک اور مزے کی بات بتاؤں۔ اس سے تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ یہ پنڈت اور پجاری لوگ دھرم سے کتنے مخلص ہیں۔"

"دھرم سے ان پنڈتوں اور پجاریوں کے خلوص کا مجھے بخوبی اندازہ ہوچکا ہے لیکن میں تمہاری بات ضرور سننا چاہوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سارسکا سے فرار کے بعد میں پورا ڈیڑھ مہینہ گورکھ پور کے ایک مندر میں روپوش رہا تھا۔" پانڈے نے کہا۔

اس انکشاف پر مجھے واقعی حیرت ہوئی تھی۔ پانڈے نے جو واردات کی تھی وہ ایسی نہیں تھی کہ دھرم چاری اور

قانون کے محافظ اسے آسانی سے فراموش یا نظر انداز کردیتے۔ پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے کروڑوں روپے کی نقدی اور زیورات لوٹنے کے علاوہ اس کے ہاتھوں اس مندر کے دو تین پنڈتوں کے قتل بھی ہوئے تھے۔ اس طرح ایک طرف قانون کے محافظ اور دوسری طرف پنڈت پجاری شکاری کتوں کی طرح اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ہندوستان بھر کے چھوٹے بڑے تمام مندروں کو اس واردات سے آگاہ کردیا گیا تھا اور سارے ہندوستان کے پنڈت اور پجاری بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں تھے اور بقول اس کے وہ ایک مندر ہی میں پناہ لیے ہوئے تھا۔

"مجھے مندر میں پناہ دینے والا بھی ایک پنڈت ہی تھا۔" پانڈے کہہ رہا تھا "وہ جان گیا تھا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کی پورے ہندوستان کی پولیس اور پنڈتوں کو تلاش ہے لیکن نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نے اس پنڈت کا منہ بند کردیا تھا۔ اس کا دھرم چار رخصت ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے نہ صرف اپنے مندر میں پناہ دی بلکہ میرے لیے شراب اور لڑکیوں کا بندوبست بھی کرتا رہا۔

"وہ پنڈت مجھے میری تلاش کے حوالے سے خبریں دیتا رہا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے بڑی آسانی سے پکڑوا سکتا تھا لیکن اسے کیا ملتا؟ شاید دس پندرہ ہزار روپے انعام کے طور پر مل جائے لیکن میں نے اسے دو لاکھ روپے دیے تھے۔ چھوٹے سے مندر کے اس پنڈت نے اتنی بڑی رقم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ میرا محافظ بن گیا۔

"اس پنڈت نے نہ صرف میری حفاظت کی بلکہ میرے عیش و آرام کا بھی خیال رکھا۔ ڈیڑھ مہینے بعد جب میری تلاش کا غلغلہ کم ہوا تو اس پنڈت نے ہندوستان سے نکلنے میں بھی میری پوری مدد کی۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گورکھ پور نیپال کی سرحد سے زیادہ دور نہیں۔" پانڈے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "نیپال کی عین سرحد پر لمبین نام کا وہ قصبہ ہے جہاں مہاتما بدھ نے جنم لیا تھا۔ بدھ کی اس جنم بھومی کی زیارت کے لیے بدھ بھکشو بڑی تعداد میں گورکھ پور کے راستے اس طرف آتے رہتے ہیں۔ اس پنڈت نے کچھ رقم خرچ کرکے میرے لیے جعلی کاغذات بنوا دیے اور مجھے بھکشوؤں کے ایک قافلے میں شامل کروایا۔ بدھ بھکشو بننے کے لیے مجھے گنجا بھی ہونا پڑا تھا۔ بہرحال' میں بھکشوؤں کے اس قافلے میں شامل ہوکر بڑی آسانی سے سرحد پار کرکے لمبین پہنچ گیا۔ ایک دن وہاں رہا اور پھر کھٹمنڈو تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یہاں چند روز میں بھکشو ہی کے بھیس میں ایک اسٹوپا میں رہا اور پھر بھکشو والا لبادہ اتار کر شہر کے گنجان اور گھٹیا ترین علاقے میں ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے کر رہنے لگا۔

"میرے پاس بے حساب دولت تھی اور مجھے دولت خرچ کرنے کی کوئی عجلت نہیں تھی۔ کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ شاہ خرچی مجھے لوگوں کی نظروں میں مشتبہ بنا سکتی ہے۔ اس لیے میں بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

"میں ہر چند مہینوں بعد ٹھکانے بدلتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی ان علاقوں کے حساب سے میرے مالی حالات میں تبدیلی آتی گئی اور بالآخر کچھ عرصہ پہلے میں نے بودناتھ میں ایک پرانا حویلی نما مکان خرید لیا جو برسوں سے ویران پڑا تھا۔ اس وقت تک میں شہر میں اپنی حیثیت اور شخصیت مستحکم کرچکا تھا۔ کسی کو مجھ پر شبہ نہیں ہوا کہ میں درحقیقت کون ہوں۔ اس پرانے حویلی نما مکان پر دو لاکھ روپے اور خرچ کرکے میں نے اسے اپنی جنت بنالیا۔ تم دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

"یہ بودناتھ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"شہر سے چند میل دور شمال کی طرف ایک بڑی پرسکون اور خوب صورت جگہ ہے۔" پانڈے نے جواب دیا "وہاں ایک بہت بڑا بدھ اسٹوپا بھی ہے۔ دولت مند لوگوں کا علاقہ ہے۔ حویلی اور محل نما مکانات ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر ہیں کہ کسی کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "تم شاید ابھی تک شہر سے باہر نہیں نکلے۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے۔ کھٹمنڈو ویلی شہر کے اطراف میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ دریا ہیں' گنگناتے جھرنے ہیں' آبشار ہیں۔ یہاں تمہیں فطرت کے ایسے حسین مناظر دکھائی دیں گے کہ تمہیں حیرت ہوگی۔ بدھ لوگ زیادہ تر شہر سے باہر اسی وادی میں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں اور۔۔۔"

"یہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔" میں نے اسے ٹوک دیا "ہندوستان کا قانون تو شاید تمہیں بھول گیا ہو لیکن کیا وہ پنڈت اور پجاری بھی تمہیں بھول چکے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں وہ تمہاری تلاش میں یہاں نہیں آئے ہوں گے؟"

"وہ لوگ مجھے واقعی نہیں بھولے۔" پانڈے نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "یہ پنڈت اور پجاری۔ ان کا تو دھرم ہی پیسہ ہے۔ وہ اس چوٹ کو اتنی آسانی سے کیسے بھول

سکتے ہیں۔ اس واقعے کو اگرچہ کئی ماہ بیت چکے ہیں لیکن انہوں نے میری تلاش ختم نہیں کی۔ بلکہ تلاش کا یہ دائرہ بھارت سے نکل کر دوسرے ملکوں تک پھیل گیا ہے۔ چھ مہینے پہلے برما کے سرحدی علاقے میں میرے ایک ساتھی کو پکڑ لیا گیا تھا۔ کالی کے مندر سے مال لوٹ کر فرار ہونے والے ہم چار آدمی تھے۔ ایک میں۔ دوسرا سب انسپکٹر' تیسرا ایک ہیڈ کانسٹیبل' چوتھا حوالدار تھا۔ فرار کے اگلے ہی روز ہم حصے بانٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل چھ مہینے پہلے برما کے سرحدہ قصبے سے پکڑا گیا۔ اس سے کچھ برآمد نہیں ہوسکا لیکن پجاریوں نے اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کردیا۔ اس کے بارے میں یہ سب کچھ اخبارات میں چھپا تھا۔

"تین مہینے پہلے آسن ٹول کے علاقے میں واقع ایک مندر کے قریب ایک ایسا سادھو میری نظروں میں آیا تھا جسے عرصہ پہلے میں نے سارسکا میں دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں میرا یہ شبہ درست ثابت ہوا کہ وہ میری اور سب انسپکٹر جگدیش کی تلاش میں ہی یہاں آیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی دو پارٹیاں میری تلاش میں یہاں آچکی تھیں۔

"میں اپنی حویلی میں محصور ہو کر رہ گیا۔ انتہائی اہم ضرورت کے وقت ہی باہر نکلتا۔ پندرہ دن بعد جب میرے ایک آدمی نے بتایا کہ وہ سادھو واپس جا چکا ہے تو میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔"

"گویا تمہارے دل میں اب بھی ان کا خوف ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"یہ خوف تو کبھی نہیں نکل سکتا۔" پانڈے نے جواب دیا "تمہیں دیکھ کر بھی میرا دل کانپ اٹھا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید تم بھی میری تلاش میں یہاں آئے ہو لیکن تمہاری باتوں سے مجھے قدرے اطمینان ہوا۔"

"لیکن اگر واقعی ایسا ہوتا۔۔۔؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"ناممکن۔" پانڈے نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا "مجھ سے پہلے تم کالی کے مندر کی اس دولت تک پہنچ چکے تھے اور تمہیں موقع بھی حاصل تھا۔ تم اگر چاہتے تو وہ ساری دولت لے کر فرار ہوسکتے تھے اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا اور ہم بھی ٹاپتے رہ جاتے لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تمہیں دولت کا لالچ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس واقعے سے پہلے کئی روز تک میرا تمہارا ساتھ رہا تھا۔ میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بڑی حد تک سمجھ چکا تھا۔ ہماری یہ ملاقات محض اتفاق ہے اور تمہارے بارے میں تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے دل میں دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ یہاں کس سلسلے میں آئے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "تم اگرچہ اپنے ملک کی پولیس کو بھی مطلوب ہو اور دھرم کے ٹھیکے داروں کو بھی لیکن میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔"

"میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔ کہو۔ کیا معاملہ ہے؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"دلیش مکھ کو جانتے ہو۔ راجستھان کا ایم پی؟" میں نے کہا۔

"اس حرامی کو کون نہیں جانتا۔" پانڈے نے جواب دیا "چند روز پہلے میں نے اسے یہاں دیکھا تھا۔ روی نامی ایک مقامی غنڈے کے ساتھ لیکن ایک روز اخبار میں پڑھا کہ روی ایک جھڑپ میں مارا گیا ہے۔ دلیش مکھ بھی اس کے بعد نظر نہیں آیا۔ شاید انڈیا بھاگ گیا ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ دراصل میں ہر اس شخص سے دور رہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں جس کا تعلق راجستھان سے ہو لیکن تم اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"وہ انڈیا فرار نہیں ہوا کھٹمنڈو ہی میں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اسی کا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ اس نے میری ایک دوست کو ہردوار میں قتل کردیا تھا اور دوسری دوست کو اغوا کرکے یہاں لے آیا تھا جسے میں نے اس کے شکنجے سے چھڑا لیا لیکن دلیش مکھ غائب ہوگیا۔ اس سے ابھی مجھے کچھ حساب کرنا ہے اس لیے اب بھی میں اس کی تلاش میں ہوں اور یہاں کی پولیس بھی اسے ڈھونڈ رہی ہے کیونکہ دلیش مکھ نے کھٹمنڈو آتے ہی اپنا کھاتا کھول لیا تھا۔ اس کے حساب میں کم از کم چار افراد کا قتل ہے۔"

"پولیس کو اس سے نمٹنے دو۔" پانڈے نے کہا "تم نے اپنی دوست کو اس کے شکنجے سے چھڑا لیا۔ یہی غنیمت ہے۔ بہتر ہے کہ اب اس سے دور ہی رہو۔"

"ناگ پال کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

"ہمت سنگھ۔" اس نے مجھے گھورا "معلوم ہوتا ہے یہاں آکر تم نے کچھ زیادہ ہی ہاتھ پیر پھیلا لیے ہیں۔ جانتے ہو ناگ پال کون ہے؟"

"ایک زہریلا سانپ۔" میں نے جواب دیا "مار آستین۔ اس دھرتی نے اسے جنم دیا۔ اسے پالا' اسے زندگی دی۔ عزت دی' دولت دی اور وہ اپنی اس دھرتی ماں کو کیا صلہ دے رہا ہے؟ دھرتی تو ماں سمان ہوتی ہے پانڈے اور وہ ناگ پال غیروں کے ہاتھ اپنی اس ماں کا سودا کر رہا ہے۔"

میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بات جاری رکھی "تم نے بھارت کی سرزمین پر جنم لیا اور تم اس سے انکار نہیں کرو گے کہ اس سرزمین نے تمہیں بہت کچھ دیا تھا۔ تم ایک جرم کرکے وہاں سے بھاگ آئے لیکن تم اپنے وطن کی مٹی کو تو نہیں بھول سکتے۔ تمہاری جڑیں تو اب بھی اسی مٹی میں ہیں۔ تم نے اپنے عیش و آرام اور دولت حاصل کرنے کے لیے ایک جرم تو کیا لیکن تم اس دھرتی کا سودا تو نہیں کرسکتے۔ کیونکہ تم اب بھی اس مٹی سے جڑے ہوئے ہو لیکن یہ ناگ پال۔ یہ تو واقعی آستین کا سانپ ہے۔ جس میں بے پناہ زہر بھرا ہوا ہے۔ یہ دشمنوں کے ہاتھ اپنی ہی ماں کا سودا کر رہا ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے ناگ پال کے بارے میں وہ سب کچھ بتانے لگا جو اب تک مجھے معلوم ہوا تھا "اور یہ دلیش مکھ بھی آج کل اسی کے پاس ہے۔ یہ لوگ نہایت گھناؤنے منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ کیا تمہارے خیال میں انہیں آزاد چھوڑ دینا چاہیے؟"

"میں نے ایک جرم ضرور کیا ہے لیکن اپنے وطن کی مٹی سے ناتا نہیں توڑا۔" پانڈے نے جواب دیا "دلیش مکھ کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ غنڈا گردی اور بدمعاشی کی طاقت پر ایم پی بنا تھا۔ اس کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنا تھا اور وہ ایم پی کے رتبے کی پروا کیے بغیر ایسی گھناؤنی حرکتیں کرتا رہا۔ دولت کے حصول کے لیے تو آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے لیکن دھرتی ماں کا سودا۔ میں تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ایسے بے ضمیر شخص کو تو زندہ زمین میں گاڑ دینا چاہیے۔"

میں گہری نظروں سے پانڈے کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ اس نے کالی کے مندر کی دولت ضرور لوٹی تھی لیکن وہ اپنی دھرتی کا غدار نہیں تھا۔

میں دیر تک اس سے ناگ پال اور دلیش مکھ کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تمہارا ساتھ دوں گا اور مجھ سے جو کچھ ہوسکے گا کروں گا۔ ویسے تمہارے پاس کوئی پلان ہے؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا "تم ڈکیتی اور قتل جیسے سنگین جرم کے بعد انڈیا سے فرار ہو کر آئے ہو اور دلیش مکھ اور ناگ پال کو ایسے ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟" پانڈے نے مجھے گھورا۔

"ان دونوں تک پہنچنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔

"اچھا آئیڈیا ہے۔" وہ بولا "اگر انہیں شبہ ہوگیا تو میری جان بھی جاسکتی ہے لیکن اب مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی۔ میں ایک دو دن بعد تم سے رابطہ کروں گا لیکن کہاں اور کیسے؟"

"میں جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا ہوں انہیں اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ تم مجھے اپنا فون نمبر دو۔ میں وقتاً فوقتاً تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔ ویسے اگر کوئی ایمرجنسی ہو تو تم سوما کو اطلاع دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"سوما۔ وہ ٹیڈی بدمعاش۔" پانڈے بولا۔

"ہاں وہی۔ وہ بھی۔۔۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔" پانڈے نے میری بات کاٹ دی "میرا ان لوگوں سے اگرچہ کبھی کوئی رابطہ نہیں رہا لیکن ایسے لوگوں کے بارے میں معلومات رکھتا ہوں۔ ایسے دو چار آدمی میرے پاس بھی ہیں جو کسی مشکل وقت میں میرے کام آسکتے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے پانڈے جی۔" میں نے کہا "اب ہم مل کر ان شیطانی قوتوں کا مقابلہ کریں گے۔"

پانڈے نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہم دونوں جب اپنی جگہ سے اٹھے تو میری نظریں بے اختیار کافی شاپ کی کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ ٹیبل خالی تھی۔ بملا وغیرہ میں سے کوئی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

"وہ تینوں کہاں چلی گئیں؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے پانڈے کی طرف دیکھا۔

"وہ بیٹھے بیٹھے بور ہوگئی ہوں گی اور میرا خیال ہے اب وہ ہمیں نائٹ کلب میں ملیں گی۔ آؤ۔ دیکھتے ہیں۔" پانڈے نے کہا۔

کافی شاپ والے ہال سے گزرتے ہوئے پانڈے نے کافی کا بل ادا کردیا اور پھر لابی میں سے ہو کر ہم نائٹ کلب کی طرف آگئے۔

نائٹ کلب کی مستیاں عروج پر تھیں۔ ایک نیم عریاں رقاصہ موسیقی کی تیز دھنوں پر میزوں کے درمیان تھرک رہی تھی۔ پانڈے کا خیال درست نکلا تھا۔ وہ تینوں بھی ایک میز پر بیٹھی لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ ہمیں دیکھ کر بملا وغیرہ اٹھ کر

ہماری طرف آنے لگیں۔

"یہ لڑکی کون ہے؟" میں نے پانڈے سے پوچھا۔ میرا اشارہ مدھومالا کی طرف تھا۔

"یہ یہاں کے ایک طاقتور شخص کی بیٹی ہے۔ اس سے ملاقات کی تفصیل... خاصی طویل ہے پھر کسی وقت بتاؤں گا۔" پانڈے نے جواب دیا۔

وہ تینوں ہمارے قریب آگئیں۔ مدھومالا نے پانڈے کا ہاتھ پکڑلیا اور ہم سب لوگ لابی سے ہوتے ہوئے باہر آگئے۔

پارکنگ میں پانڈے کی کار دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی اور ایسی قیمتی کار تو اب اس کے لیے بہت معمولی چیز تھی۔ وہ دونوں ہم سے ہاتھ ملا کر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ میں 'بملا اور مایا متی کے ساتھ پارکنگ کے دوسرے سرے پر کھڑی اپنی کرائے کی کار کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت ہم میں یہی طے پایا تھا کہ مایا متی رات ہمارے ساتھ رہے گی اور صبح وہیں سے اپنی ڈیوٹی پر چلی جائے گی۔

مایا متی کی وجہ سے اس رات ہم دیر تک جاگتے رہے۔ زیادہ تر شوبھا کے بارے میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ مایا متی کے خیال میں شوبھا کو دس پندرہ دن مزید اسپتال میں رہنا پڑے گا۔

مایا متی صبح سویرے ہی اسپتال چلی گئی۔ میں اپنے کمرے میں دیر تک سویا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو بملا حسب معمول پلنگ پر میرے پیروں کی طرف آڑی ترچھی پڑی سو رہی تھی۔

تین روز گزر گئے۔ اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ چوتھے روز صبح اسپتال میں انسپکٹر اعظم سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے ایک دلچسپ انکشاف کیا۔

"ایک ایسا آدمی ہماری نظروں میں آگیا ہے جس کے ذریعے ہم دیش مکھ تک پہنچ سکتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کون...؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ ایک سابق انڈین پولیس آفیسر ونود پانڈے ہے۔" اعظم خان نے جواب دیا "اس کا تعلق راجستھان سے ہے۔ کئی سال پہلے وہ سارسکا کی پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے دولت لوٹ کر بھاگا تھا اور دو تین آدمی بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کل رات اسے کال دھرا کے علاقے میں ایک ایسی عمارت میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے جو ناگ پال کی ملکیت ہے۔ بریندرا کے آدمی کئی روز سے اس عمارت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ بریندرا کو اپنے ایک آدمی سے جیسے ہی پانڈے کے بارے میں اطلاع ملی اس نے پانڈے کی نگرانی کا بھی حکم دے دیا لیکن اس عمارت سے نکلنے کے بعد پانڈے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ اسے بھی شاید اپنی نگرانی کا شبہ ہوگیا تھا۔"

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ انسپکٹر پانڈے کا پولیس کی نظروں میں آجانا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں نے دیش مکھ اور ناگ پال پر پانڈے کے ذریعے ہاتھ ڈالنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں گڑبڑ ہوسکتی تھی لیکن یہ بھی اچھی بات تھی کہ پانڈے کو اپنی نگرانی کا پتا چل گیا تھا اور وہ پولیس والوں کو چکما دے کر غائب ہوگیا تھا۔

اعظم خان کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں بھی بملا کو شوبھا کے پاس چھوڑ کر اسپتال سے نکل آیا اور اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میری کار شہر کے شمالی علاقے میں واقع ٹانگیل دربار کے قریب سے ہوتی ہوئی بود ناتھ کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

مجھے پہلی مرتبہ شہر سے باہر نکلنے کا موقع ملا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ میلوں دور تک پھیلی ہوئی کھٹمنڈو ویلی بے حد حسین تھی۔ جس طرح نیپال قدرتی حسن سے مالا مال ہے اس طرح اس کی تاریخ بھی خاصی دلچسپ ہے۔ دنیا کی بلند ترین پہاڑی چوٹیاں رکھنے والا یہ ملک صدیوں تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہا۔ اس کی جدید تاریخ کا آغاز اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ۱۷۶۹ء میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے شمالی ہند کے راجپوتوں کو ان پہاڑوں میں دھکیل دیا تھا۔ ایک گورکھا سردار نے قبائلیوں کو جمع کرکے اپنی حکومت قائم کرلی اور اس طرح یہاں شاہ خاندان کے دور کا آغاز ہوا۔ اس خاندان نے ایک سو پچیس سال تک یہاں حکومت کی اور بالآخر ۱۹۵۰ء میں ایک انقلاب کے بعد یہاں جمہوریت معرض وجود میں آگئی اور شاہ مہندرا کو نیپال کا آئینی بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔

انقلاب سے پہلے سوا سو سال کی تاریخ اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ یہاں رانا خاندان ہی برسر اقتدار رہے۔ حکمران طبقہ تو بہت دولت مند' مضبوط اور طاقت ور تھا لیکن عوام زبوں حالی کا شکار تھے۔ عوام کی اکثریت کے پاس نہ تن ڈھانپنے کو کپڑے تھے اور نہ پیٹ بھرنے کو کھانا۔ ظلم و تشدد سے کبھی انہیں سر اٹھانے کا موقع نہیں دیا گیا۔ حقوق کا

مطالبہ کرنے والوں کو سرعام تشدد کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ زندگی کی تمام سہولتیں اور عیاشیاں حکمران طبقے کے لیے مخصوص تھیں۔

وزارت عظمیٰ کا عہدہ اے کلاس رانا کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ راجا کی پہلی اور خاندانی بیوی کا بیٹا اے کلاس رانا کہلاتا تھا۔ دوسری بیویوں سے ہونے والے بیٹے بی کلاس میں آتے تھے۔ جبکہ داشتاؤں سے ہونے والی اولاد کو سی کلاس سمجھا جاتا تھا۔ انہیں کسی قسم کی مراعات حاصل نہیں تھیں۔ تاہم اس تیسرے درجے سے تعلق رکھنے والے مرد اپنی محنت اور ذہانت سے فوج میں زیادہ سے زیادہ کرنل کے عہدے تک پہنچ سکتے تھے۔ جبکہ اے کلاس سے تعلق رکھنے والے مردوں کو براہ راست جنرل کے عہدے پر تعینات کیا جاتا تھا۔

دلچسپی کی بات یہ تھی کہ حکمران نہ صرف کئی کئی شادیاں کرتے تھے بلکہ لاتعداد داشتاؤں سے بھی دل بہلاتے تھے۔ ان کی اولاد بھی اسی حساب سے ہوتی تھی۔ رانا جنگ بہادر کی اولاد کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ راناؤں کی اولاد کی اس صورت حال نے بھی عام لوگوں پر مایوسی طاری کر رکھی تھی۔ اتنے لاتعداد راناؤں کے ہوتے ہوئے عام آدمی کو آگے بڑھنے کا موقع ہی نہیں مل سکتا تھا۔

حکمرانوں کی ان جائز اور ناجائز اولادوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تعینات کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں ایک ایسا شخص عدلیہ کا چیف جسٹس تھا جس نے اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی تھی اور اپنا نام لکھنا بھی نہیں جانتا تھا اور اس زمانے میں فوج کا کمانڈر انچیف بھی ایک ایسا ہی شخص تھا جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ فوج کی ٹریننگ کیا ہوتی ہے۔

نیپال میں اکثریت گورکھوں کی ہے۔ بیس فیصد آبادی بدھ کے پیروکاروں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر شہروں سے دور چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے ہیں اور کس مپرسی کا شکار ہیں۔ دھرم کے لحاظ سے یہاں ہندوازم کا غلبہ ہے اور ہندوستان کی بنیا قوم اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھا رہی ہے۔ نیپال کے قانون میں ایک انسان کے قاتل کو تو معافی مل سکتی ہے لیکن گائے کی ہتیا کرنے والے کو موت کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کے لیے معافی یا قید کی سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں بندروں اور ہاتھیوں کی بھی بہتات ہے۔ ہاتھیوں کی افزائش نسل کے لیے تو باقاعدہ نیشنل پارک قائم کیے گئے ہیں اور انہیں بھی پورا تحفظ فراہم کیا جاتا ہے جبکہ بندروں کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہے۔

میں یہی سب کچھ سوچتا ہوا بڑی احتیاط سے کار چلا رہا تھا کیونکہ اس علاقے میں بندروں کی کچھ زیادہ ہی بہتات تھی۔ وہ درختوں پر اچھلتے کودتے' ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے بار بار سڑک پر آرہے تھے۔

پہاڑی پر وہ اسٹوپا دور سے ہی نظر آگیا جس کی پانڈے نے نشان دہی کی تھی۔ اس پہاڑی کے قریب سے گزر کر میں نے کار کو بائیں طرف ایک اور سڑک پر موڑ دیا۔ یہ تنگ سی سڑک بتدریج نشیب کی طرف چلی گئی تھی۔ ایک جگہ میں نے کار روک لی۔ وہاں سے بائیں طرف ایک تنگ سا راستہ ایک سرسبز ٹیلے کی طرف چلا گیا تھا۔ جہاں وہ حویلی نما مکان دور ہی سے نظر آرہا تھا۔

میں نے پھاٹک کے سامنے گاڑی روک کر ہارن بجایا تو تھوڑی ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر نیپالی عورت نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا تو وہ مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کرکے اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی تقریباً پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی اندر لے جاکر روک لی۔

بہت بڑی اور بہت شان دار حویلی تھی۔ پھاٹک سے آگے تقریباً دو ایکڑ پر مشتمل لان تھا۔ جس میں حوض بھی تھا اور اس میں فوارہ بھی لگا ہوا تھا۔ لان کے آخر میں وہ شان دار عمارت تھی جس کے پورچ میں پانڈے کی کار کھڑی تھی۔

ایسی حویلیاں میں نے جے پور میں دیکھی تھیں۔ پانڈے بھی راجستھان ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے بھی ایسی بہت سی حویلیاں دیکھی ہوں گی اور کسی ایسی حویلی میں رہنے کے خواب بھی دیکھے ہوں گے اور اپنے ان خوابوں کی تعبیر اسے نیپال میں ملی تھی۔

نیپالی عورت نے عمارت کے پچھلی طرف اشارہ کردیا۔ میں عمارت کے پہلو سے گزرتا ہوا پچھلی طرف پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ اس طرف بھی بہت بڑا سرسبز لان تھا جس کے وسط میں سوئمنگ پول تھا۔ پانڈے پول سے نکل کر بدن پر ایک بڑا سا تولیا لپیٹ رہا تھا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر گھاس پر مدھومالا پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر دو نہایت مختصر سے چیتھڑے تھے اور میرا خیال ہے وہ کچھ دیر پہلے ہی تالاب سے نکل کر وہاں لیٹی تھی۔ اس کے بدن پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر بھی اس نے وہاں سے اٹھنے یا اپنے بدن پر تولیا لپیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس کے ہونٹوں پر خفیف سی

مسکراہٹ آگئی تھی۔

پانڈے نے بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اسے لیتا ہوا وہاں سے کچھ دور چلا گیا جہاں بانس کی کھپچیوں کی ایک میز اور چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔" پانڈے نے کہا "لیکن میرے خیال میں یہاں تمہاری آمد بلاوجہ نہیں ہوسکتی۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ عمارت کا ایک دروازہ اس طرف بھی تھا جس کے سامنے کشادہ برآمدہ تھا "کل رات۔" میں نے دوبارہ پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کل رات تم کال دھرا گئے تھے۔ شاید دلیش مکھ سے ملنے کے لیے۔"

"اوہ!" پانڈے اچھل پڑا "تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"پہلے میں تم سے کچھ سننا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔

"کل رات دلیش مکھ سے میری ملاقات ہوگئی تھی۔" پانڈے نے جواب دیا "جس رات رتنا ہوٹل میں تم سے ملاقات ہوئی تھی اس سے اگلے ہی روز میں نے دلیش مکھ سے ملاقات کی کوشش شروع کردی تھی۔ میرا پیغام تو اسی روز اس تک پہنچ گیا تھا لیکن ملاقات سے پہلے وہ میرے بارے میں تسلی کرلینا چاہتا تھا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ میں وہی پانڈے ہوں جو ہندوستان بھر کے پجاریوں' پنڈتوں اور پولیس کو مطلوب ہے تو اس نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا۔

"میں نے بھی اسے ایک من گھڑت کہانی سنا دی کہ یہاں بھی میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ کچھ لوگ یہاں بھی مجھے تلاش کررہے ہیں اور مجھے خطرے سے بچنے کے لیے اس کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ دراصل میں اس کی ہمدردیاں حاصل کرکے اسے اس حصار سے باہر نکالنا چاہتا ہوں جو ناگ پال نے اس کے گرد قائم کررکھا ہے اور وہ حصار بہت مضبوط ہے۔ اسے توڑنا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ دو چار روز میں اسے باہر لاسکوں۔"

"لیکن تمہیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔" میں نے جواب دیا "یہ ساری باتیں تم سے ٹیلی فون پر بھی ہوسکتی تھیں لیکن تمہیں خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے میں نے خود یہاں آنا ضروری سمجھا۔"

"میں نے ساری زندگی پولیس میں گزاری ہے اور میں اس قسم کے خطرات سے بخوبی آگاہ ہوں۔" پانڈے نے کہا اور برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔

میری نظریں بھی اسی طرف اٹھ گئیں۔ نیپالی ملازمہ ایک ٹرے اٹھائے اسی طرف چلی آرہی تھی جس میں لیمونیڈ کے تین گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ٹرے ہمارے سامنے میز پر رکھ دی۔

"مدھومالا کا گلاس وہیں لے جاکر دے دو۔" پانڈے نے اشارہ کیا۔ نیپالی ملازمہ نے ایک گلاس اٹھالیا اور مدھومالا کی طرف چلی گئی۔

"میں اس خطرے کی بات نہیں کررہا جو تم سمجھ رہے ہو۔" میں نے گلاس اٹھا کر ایک چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر۔۔۔؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ میں اسے پولیس کے خطرے سے آگاہ کرنے آیا تھا لیکن اس وقت برق کوندے کی طرح یہ خیال آیا تھا کہ اگر میں نے اسے پولیس کے خطرے سے آگاہ کردیا تو شاید وہ کوئی بہانہ کرکے پیچھے ہٹ جائے اور اب جبکہ وہ دلیش مکھ تک پہنچ چکا تھا تو میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور گڑبڑ ہوجائے۔

"کس خطرے کی بات کررہے ہو؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

"وہ بات یہ ہے کہ۔۔۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "دلیش مکھ کو تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ دولت کا پجاری ہے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا اور کیا کچھ نہیں کررہا۔ میری دوست شوبھا جے پور میں بڑے سکون کی زندگی گزار رہی تھی۔ شہر کے وسط میں اس کا ایک بہت بڑا خالی پلاٹ بھی تھا اور دلیش مکھ وہ پلاٹ ہتھیانا چاہتا تھا۔" میں نے مختصر طور پر اسے شوبھا کے بارے میں بتایا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتادیا ہے۔ یہ بات اس کے علم میں آگئی ہے کہ تم کالی کے مندر سے کروڑوں کی دولت لوٹ کر بھاگے ہوئے ہو اور دلیش مکھ اس دولت کو حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" اس نے کہا "لیکن میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ پولیس میں میری زندگی ان جیسے حرامیوں سے نمٹتے ہوئے ہی گزری ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ وہ میرے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اٹھا سکے گا۔"

"ایک بات اور۔" میں نے کہا "یہاں کی پولیس بھی اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ تمہیں بہت محتاط رہنا پڑے گا۔

ایسا نہ ہو کہ تم بھی پولیس کی نظروں میں آجاؤ۔"

"مجھے اس بات کا بھی احساس ہے۔" پانڈے نے جواب دیا "گزشتہ رات میں دلیش مکھ سے ملنے کے لیے ہی کال دھرا کی اس بلڈنگ میں گیا تھا۔ دو گھنٹوں بعد باہر نکلا تو مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا کہ ایک آدمی میری نگرانی کررہا ہے۔ میرے خیال میں وہ پولیس ہی کا آدمی تھا لیکن میں اسے چکما دے کر نکل جانے میں کامیاب ہوگیا۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ گزشتہ رات میں وہاں گیا تھا؟"

"میں بھی سومبا کے آدمیوں کے ذریعے اس عمارت کی نگرانی کروا رہا ہوں۔" میرے ذہن میں فوراً ہی یہ بات آگئی "مجھے رات ہی کو یہ اطلاع مل گئی تھی۔ اس وقت تو میں اسی لیے یہاں چلا آیا ہوں کہ تم سے کچھ گپ شپ ہوجائے گی اور میں تمہاری یہ حویلی بھی دیکھ لوں گا۔"

"بہت اچھا کیا۔" پانڈے نے اپنے گلاس کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "آؤ۔ تمہیں حویلی دکھاؤں۔ میں نے کسی ایسی حویلی کے بڑے خواب دیکھے تھے لیکن پولیس کی نوکری میں رہتے ہوئے تو میں صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔"

"اور کالی دیوی نے تمہارے خوابوں کو تعبیر دے دی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں لان سے اٹھ کر عمارت میں آگئے۔ پانڈے گھوم پھر کر حویلی دکھانے لگا۔ کئی کمرے تھے۔ صرف چند کمرے ایسے تھے جنہیں سازوسامان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ باقی کمرے خالی تھے۔ اوپر بھی کئی کمرے تھے۔ وہاں بھی چند کمرے آراستہ تھے اور باقی خالی تھے۔ حویلی کے اوپر بعض کمرے ایسے تھے کہ ان کی کھڑکیوں سے وادی میں دور دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔

"یہ حویلی مجھے بہت سستی مل گئی تھی۔ صرف پانچ لاکھ میں۔" پانڈے بتا رہا تھا اور اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ اتنی بڑی حویلی صرف پانچ لاکھ روپے میں "یہ حویلی تقریباً تیس سال سے ویران پڑی تھی۔" پانڈے کہہ رہا تھا "اور مشہور تھا کہ یہاں آسیب نے ڈیرا جمار کھا ہے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق یہاں کچھ پراسرار واقعات بھی رونما ہوئے تھے۔ رات کو یہاں سے رونے' بین کرنے اور چیخوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ لوگ دن کے وقت بھی اس طرف سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ جب میں نے اس حویلی کو خریدنے کا فیصلہ کیا تو میرے جاننے والوں نے بہت کوشش کی کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں۔ مختلف پراسرار واقعات کا حوالہ دے کر مجھے ڈرایا گیا لیکن میں نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا اور پانچ لاکھ میں اس کا سودا کرکے دو ڈھائی لاکھ روپے اوپر لگا دیے۔ یہاں کام کے دوران کچھ ایسے عجیب انکشافات ہوئے کہ اگر اس حویلی کے پہلے مالک کو پتا چل جائے تو اسے خالی کرانے کے لیے شاید وہ مجھ پر مقدمہ کردے۔"

"کیسے انکشافات؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"سننے میں آیا تھا کہ تیس سال پہلے ڈاکوؤں نے اس حویلی پر حملہ کردیا تھا۔" پانڈے کہہ رہا تھا "گھر والوں نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کیا لیکن وہ سب کے سب مارے گئے۔ دو ڈاکو بھی ہلاک ہوئے۔ حویلی کے مالک کا نوجوان بیٹا اس رات یہاں نہیں تھا۔ وہ کسی کام سے شہر گیا ہوا تھا اور رات کو وہیں رہ گیا تھا۔

"اس واقعے کے بعد وہ کچھ عرصے تک ذہنی طور پر مفلوج رہا پھر بتدریج نارمل ہوتا چلا گیا لیکن اس نے حویلی میں آنے سے انکار کردیا۔

"دو سال گزر گئے اور پھر رات کے وقت اس حویلی سے عورتوں کے بین کرنے' رونے اور چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور یہ مشہور ہوگیا کہ حویلی پر بدروحوں نے قبضہ کرلیا ہے۔ لوگ دن کے وقت بھی اس طرف آنے سے ڈرنے لگے۔ اس طرح یہ حویلی ویران پڑی رہی۔ اسے بھوتوں کا مسکن قرار دے دیا گیا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس حویلی پر بدروحوں کا نہیں ڈاکوؤں کا قبضہ ہوگیا تھا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس زمانے میں ڈاکوؤں کے ایک خطرناک گروہ نے شہر اور نواحی علاقوں میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ لوٹ مار اور قتل و غارت کے بعد پہاڑوں میں غائب ہوجاتے اور پولیس والے ناپتے رہ جاتے۔ وہ ڈاکو۔" پانڈے ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اور وہ ڈاکو ایک خفیہ راستے سے اس حویلی میں آجاتے۔ پولیس کو کبھی شبہ بھی نہیں ہوا کہ ڈاکو اس آسیب زدہ حویلی میں پناہ لے سکتے ہیں۔"

"اگر کسی اور کو ان باتوں کا علم نہیں ہے تو تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جن دنوں میں یہاں کام کروا رہا تھا تو ایک جگہ ہلکی سی کھدائی کے دوران بجلی کا ایک تار میری نظروں میں آگیا۔ میں زمین میں دفن اس تار کو اکھاڑتا چلا گیا اور پھر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ ان تاروں کے ذریعے حویلی میں چاروں

طرف خفیہ مقامات پر لاؤڈ اسپیکر لگائے گئے تھے اور تہ خانے میں ایک جگہ ٹیپ ریکارڈر پر بین کرنے، رونے اور چیخوں کا کیسٹ لگا دیا جاتا۔ ان لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے یہ آوازیں چاروں طرف گونجنے لگتیں۔

"جب میں نے یہ حویلی خریدی تو اس سے صرف تین مہینے پہلے ڈاکوؤں کا وہ گروہ کسی وجہ سے اپنا یہ ٹھکانا چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ انہی دنوں پولیس کا ڈاکوؤں کے اس گروہ سے تصادم ہو گیا تھا جس نے عرصے سے شہر اور اس کے نواح میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اس مقابلے میں سات ڈاکو مارے گئے تھے۔ حویلی میں ان پوشیدہ تاروں اور خفیہ لاؤڈ اسپیکروں کی دریافت کے بعد مجھے دو اور دو چار کا حساب لگانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں کچھ ڈاکو مارے گئے تھے اور کچھ خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ اس طرح یہ آسیب زدہ حویلی مجھے مل گئی۔ لوگ حیران ہیں کہ بدروحوں نے مجھے کوئی نقصان کیوں نہیں پہنچایا۔ بعض لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں تو میں یہی جواب دیتا ہوں کہ میں ان سے بڑا آسیب ہوں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے کہا "جو شخص کالی کے مندر سے خزانہ لوٹ سکتا ہے اس سے بڑا آسیب اور کون ہوگا۔"

ہم ابھی تک اوپر ہی کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں ایک راہداری سے گزر کر دوسری طرف آگیا۔ یہ عمارت کا عقبی حصہ تھا۔ اس طرف بھی ایک کشادہ ٹیرس بنا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی ٹیرس سے نیچے جھانکا۔ ٹھٹک کر رک گیا۔ مدھومالا تالاب کے نیلگوں پانی میں پشت کے بل تیر رہی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

نیچے آکر بھی کچھ دیر تک میں پانڈے سے باتیں کرتا رہا پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کرکے کار کا رخ گیٹ کی طرف گھما دیا۔ پانڈے نے آگے جا کر گیٹ کھول دیا اور میں اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا گاڑی کو باہر نکال لے گیا۔

جب میں اسپتال واپس پہنچا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور بملا وہیں موجود تھی۔ میں بھی کچھ دیر وہاں رکا اور پھر ہم شوبھا سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔

ڈاک بنگلے پر پہنچتے ہی میں نے ٹیلی فون پر بریندرا یا انسپکٹر اعظم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی دفتر میں موجود نہیں تھا۔ میں نے ان کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔

پانڈے سے ملاقات کے بعد میرا ذہن بری طر[ح] تھا۔ پانڈے دیش مکھ تک پہنچ گیا تھا اور دوسری پولیس کی نظروں میں بھی آگیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کا آپس میں ٹاکرا ہو جائے۔ میں پانڈے کو پولیس میں بتانا چاہتا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر بات بدل دی کہیں بدک نہ جائے لیکن میں سمجھتا تھا کہ اب انسپکٹر اس کے بارے میں بتانا ضروری ہو گیا تھا تاکہ پولیس بھی ناگ پال یا دیش مکھ کا ساتھی سمجھ کر دھر نہ میرے خیال میں اب پانڈے ہی ایسا شخص تھا جو دیش ناگ پال کے حصار سے نکال سکتا تھا۔

شام چھ بجے کے قریب وہ دونوں ڈاک بنگلے پہنچ "تمہارا پیغام ملا تھا۔ کوئی خاص بات؟" انسپکٹر خان نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"ہاں۔" میں نے کہا "صبح اسپتال میں ملاقات تو تم نے پانڈے نام کے ایک آدمی کے بارے میں بتایا گزشتہ رات کال دھرا کے علاقے میں تمہارے آدمی دے کر غائب ہو گیا تھا۔"

"ہاں۔ وہ بھی انڈین پولیس کو مطلوب ہے۔ کل رات نظر آگیا تھا۔ رات کو تو وہ ہمارے آدمی دے کر بھاگ گیا لیکن ایک دو دن میں وہ ہمارے ہاتھ گا۔ آج اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہم جلد ہی اس کے ٹھکانے کا پتا لگالیں گے۔"

"میرا خیال ہے اس پر نگرانی ختم کردی جائے ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر اعظم نے مجھے گھورا اور بھی چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"دیش مکھ، ناگ پال کی پناہ میں ہے اور پولیس ناگ پال کے کسی ٹھکانے پر چھاپا مارنے سے گھبرا رہی میرا خیال ہے پانڈے، دیش مکھ کو ناگ پال کی پناہ نکال سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اعظم خان چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ راجستھان کے شہر سارسکا کی پہاڑیوں میں مندر سے بہت بڑا خزانہ لے کر بھاگا تھا۔ ہندوستان کی اور پنڈت اس کی تلاش میں ہیں؟" میں نے جواب دیا اسے پانڈے کے بارے میں بتانے لگا "چند روز پہلے

ے، رنا ہوٹل میں اس سے سامنا ہو گیا تھا۔ اس سے ملاقات کے بعد ہی میں نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ وہ میری ہدایات پر عمل کر رہا ہے۔"

"اوہ!" انسپکٹر اعظم خان کے منہ سے گہرا سانس نکل گیا اور وہ الجھی ہوئی نظروں سے بریندرا کی طرف دیکھنے لگا۔

اس موضوع پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی اور بالآخر پانڈے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا اور میں نے ان سے وعدہ کیا کہ جیسے ہی محسوس کروں گا کہ معاملہ ہاتھ سے نکل رہا ہے تو پانڈے کو ان کے حوالے کردوں گا۔

ان دونوں کی باتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بہاری لال دو دن بعد انڈیا سے کھٹمنڈو آنے والا تھا۔ پولیس نے اس کی حفاظت کے لیے تمام انتظامات مکمل کر لیے ہیں۔ ان کے پروگرام کے مطابق ہوائی جہاز کے آنے سے ایک گھنٹا پہلے تری بھون ائرپورٹ کو گھیرے میں لے لیا جائے گا اور ان تمام راستوں کی بھی نگرانی کی جائے گی جس طرف سے بہاری لال کو گزرنا ہوگا۔ مہاراج گنج کے علاقے میں بہاری لال کی کوٹھی کے اطراف میں بھی مسلح پولیس والے تعینات کردیے جائیں گے۔

اور پھر اس روز صبح دس بجے میں بھی ائرپورٹ پر موجود تھا۔ انسپکٹر بریندرا میرے قریب ہی تھا بلکہ میں اس کے قریب رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بریندرا کے پاس سیلولر فون تھا اور وہ وقتاً فوقتاً اس فون پر اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔

جہاز آنے میں پندرہ منٹ باقی تھے کہ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کان سے لگالیا۔ چند سیکنڈ تک وہ دوسری طرف کی بات سنتا رہا پھر اس طرح چیخا کہ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا بکتے ہو! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ فون پر کہہ رہا تھا "ٹھیک ہے۔ اس علاقے کو گھیرے میں لے لو۔ میں اعظم خان کو بھیج رہا ہوں۔" اس نے فون بند کردیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بسنت پورہ میں دیش مکھ کو قتل کردیا گیا ہے۔ انسپکٹر اعظم کہاں ہے؟"

"وہ ارائیول لاؤنج کے سامنے کھڑا ہے۔" میں نے اشارہ کیا۔

بریندرا تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف چل پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی تھا۔ بریندرا نے انسپکٹر اعظم خان کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم بسنت پورہ جا کر دیکھو کیا معاملہ ہے۔ میں یہاں موجود ہوں۔"

دیش مکھ کے قتل کی خبر سن کر انسپکٹر اعظم خان بھی اچھل پڑا تھا اور پھر اس نے وہاں رک کر وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ ٹرمنل سے نکل کر پارکنگ ایریا کی طرف دوڑ پڑا۔

بسنت پورہ شہر کا وسطی اور گنجان آبادی کا علاقہ تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کی زیادہ سرگرمیاں بھی ایسے ہی علاقوں میں رہتی تھیں لیکن اس وقت وہ علاقہ اس لحاظ سے سنسان پڑا تھا کہ تمام دکانیں بند تھیں۔ پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور لوگ اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں کھڑے تھے۔

گنگا پاتھ سے بائیں طرف ایک اور سڑک پر مڑتے ہی اعظم خان نے جیپ روک لی۔ یہ قدرے کشادہ سڑک تھی جس کے دائیں بائیں کئی گلیاں پھوٹتی تھیں۔ یہاں لاتعداد ریسٹورنٹس اور شراب خانے تھے۔ ایک دو تھرڈ کلاس قسم کے نائٹ کلب بھی تھے۔ اس علاقے میں اسکن بزنس بھی ہوتا تھا اور منشیات فروشوں کے ایجنٹ بھی گھومتے رہتے تھے لیکن یہاں سڑک پر پولیس والوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم عمارتوں کی بالکونیوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ کئی دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور سامان بکھرا ہوا تھا۔

ایک شراب خانے کے سامنے سڑک پر چار لاشیں پڑی تھیں جن میں ایک لاش دیش مکھ کی تھی۔ دو لاشوں کے جسموں پر پولیس کی وردیاں نظر آرہی تھیں اور چوتھی لاش کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بھی کوئی غنڈا ہی تھا۔

ایک سب انسپکٹر اعظم خان کو دیکھتے ہی قریب آگیا۔ ہم جیپ سے اتر کر لاشوں کے قریب پہنچ گئے۔ دیش مکھ کی لاش گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ سڑک پر چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔

"یہ سب کیا ہوا۔ کیسے ہوا؟" اعظم خان نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

"ہم فریک اسٹریٹ کی طرف گشت پر تھے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ کچھ غنڈوں نے اس طرف لوٹ مار شروع کردی ہے۔ میں اپنے آدمیوں کو لے کر اس طرف آیا تو درجن بھر غنڈے دکانوں میں لوٹ مار کر رہے تھے اور یہ۔۔۔" اس نے دیش مکھ کی لاش کی طرف اشارہ کیا "یہ ایک کھلی جیپ پر کھڑا غنڈوں

کو احکامات دے رہا تھا۔ میں نے ایک دکان لوٹنے والے غنڈوں کو روکنے کی کوشش کی تو اس شخص نے گولی چلا دی۔ میرا ایک سپاہی زخمی ہو کر گرا۔ میں نے بھی اپنے آدمیوں کو فائرنگ کا آرڈر دے دیا۔

"میرے ساتھ چھ آدمی تھے۔ ان سے پہلے لوٹ مار کرنے والے درجن بھر غنڈوں نے ہم پر فائرنگ شروع کردی۔ میرے دو جوان فائرنگ کی زد میں آگئے۔" اس نے سڑک پر فٹ پاتھ کے قریب پڑی ہوئی پولیس والوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کیا "اور پھر انہی کے ایک آدمی کی فائرنگ سے یہ چھلنی ہو کر گر پڑا۔" اس مرتبہ اس نے دلیش مکھ کی طرف اشارہ کیا "اس کے گرتے ہی غنڈے جیپ پر سوار ہو کر زبردست فائرنگ کرتے ہوئے فرار ہوگئے۔"

"اسے جانتے ہوئے یہ کون ہے؟" میں نے دلیش مکھ کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"یس سر۔" سب انسپکٹر نے کہا "یہ انڈیا کا ایک ایم پی ہے جو غیر قانونی طور پر یہاں آیا ہوا ہے۔"

انڈین ایم پی کا لفظ سن کر میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ میں نے اعظم خان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہا تھا جو میرے ذہن میں تھا۔

ناگ پال کا منصوبہ بڑا خوفناک تھا۔ اس رات سومبانے دلیش مکھ کے جس آدمی کو پکڑا تھا اسی نے انکشاف کیا کہ وہ لوگ ہندوستان سے آنے والے ایک ایم پی کو قتل کر کے کھٹمنڈو میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بہاری لال کا نام سننے میں آیا تھا اور اعظم خان اور بریندرا نے اپنی تمام تر توجہ بہاری لال کی طرف مبذول کردی تھی اور جب بہاری لال کا جہاز تری بھون ائرپورٹ پر اترنے والا تھا تو بازار میں دلیش مکھ کو قتل کردیا گیا تھا۔

صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا تھا۔ پولیس کی تمام تر توجہ بہاری لال کی طرف تھی اور ناگ پال نے کسی طرح دلیش مکھ کو باہر نکال کر پولیس سے بھڑا دیا تھا اور اپنے ہی ایک آدمی کے ہاتھوں دلیش مکھ کو گولیوں سے چھلنی کردیا۔ جبکہ ان کا ایک اور آدمی پولیس کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا اور پولیس کے دو آدمی غنڈوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

دلیش مکھ غنڈا' بدمعاش اور قاتل سہی لیکن وہ تھا تو انڈیا کی ایک ریاست کا ایم پی۔ وہ ووٹوں سے منتخب ہو کر اسمبلی میں آیا تھا۔ وہ غنڈا گردی' ڈکیتیوں' اغوا اور قتل کی وارداتوں میں ملوث تھا۔ رشی کیش اور ہردوار میں ایسی وارداتوں کا مرتکب ہوا تھا اور ایک عورت کو قتل کرکے نیپال آگیا تھا۔ یہاں اس کی آمد غیر قانونی تھی۔ انڈیا کا ایک ایم پی تھا جسے یہاں قتل کردیا گیا تھا۔ گورنمنٹ بھی نیپال میں اس کے غیر قانونی داخلے کی تاویلیں پیش کرسکتی تھی۔ نیپالی سرکار کو اس کے قتل کا الزام ٹھہرا سکتی تھی۔

دوسری طرف ناگ پال اس موقع سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ بلکہ اس نے تو جان بوجھ کر یہ موقع پیدا کیا تھا۔ انسپکٹر کے بیان کے مطابق فائرنگ میں پہل دلیش مکھ کے آدمیوں کی طرف سے ہوئی تھی اور بالآخر دلیش مکھ کو بھی اس کے ایک آدمی نے چھلنی کیا تھا۔ گویا یہ سب کچھ پہلے سے طے تھا کہ اگر دلیش مکھ پولیس سے جھڑپ کے دوران بچ جائے تو اسے ہر صورت میں ختم کردیا جائے۔

میں نے اعظم خان کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو تشویش کے سائے لہرا گئے۔ وہ متجسس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کئی دکانیں کھلی تھیں۔ اچھی خاصی توڑ پھوڑ کی گئی تھی اور سامان دکانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر بھی بکھرا ہوا تھا۔

میں نہیں جانتا کہ اعظم خان اس وقت کیا سوچ رہا تھا لیکن میرا خیال تھا کہ دلیش مکھ کی لاش کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اعظم خان سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتا اعظم خان کی جیب میں رکھے ہوئے سیلولر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون جیب سے نکال لیا۔ وہ بریندرا کی کال تھی۔ وہ مہاراج گنج میں بہاری لال کی کوٹھی کے قریب سے بول رہا تھا۔ بہاری لال خیریت سے اپنی کوٹھی پہنچ گیا تھا۔

اعظم خان نے اسے یہاں کی صورت حال سے آگاہ کردیا۔ وہ چار پانچ منٹ تک فون پر بریندرا سے بات کرتا رہا پھر رابطہ منقطع کرکے اس نے دو تین جگہوں پر فون کیے۔ پھر فون بند کرکے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بریندرا یہاں آرہا ہے اور میں نے ایمبولینسز کے لیے بھی فون کردیا ہے۔ ان لاشوں کو فوری طور پر یہاں سے ہٹانا ہوگا۔"

سرکاری اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ چند منٹ میں دو ایمبولینسز پہنچ گئیں۔ چاروں لاشوں کو اسپتال بھجوا دیا گیا۔ چند پولیس والے بھی ان کے ساتھ چلے گئے تھے۔

لاشیں اٹھ جانے کے بعد دکان دار' جو آس پاس کی بلڈنگوں میں چھپے ہوئے تھے' آہستہ آہستہ باہر آنے لگے۔ اور لوگ بھی بلڈنگوں سے نکل رہے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اعظم خان کو گھیر لیا تھا۔ ہر شخص اسے کچھ نہ کچھ بتانے کی کوشش کررہا تھا۔ کچھ دکان دار اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ ریسٹورنٹس بھی کھلنے لگے۔

ہر شخص جانتا تھا کہ یہ ناگ پال کے غنڈے تھے جو دو جیپوں پر لد کر وہاں آئے تھے اور کسی اشتعال کے بغیر انہوں نے توڑ پھوڑ اور لوٹ مار شروع کردی تھی اور دلیش مکھ ایک کھلی جیپ پر کھڑا چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو اشتعال دلا رہا تھا۔

ناگ پال کو نیپال کا بال ٹھاکرے کہا جاتا تھا۔ وہ جب چاہتا شہر کے کسی بھی حصے میں ہنگامے شروع کروا دیتا اور شہر بند کروا دیتا۔ ہنگاموں کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ پولیس اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتی تھی کیونکہ اس کے پیچھے ڈرگ مافیا کی بہت بڑی طاقت تھی۔ غنڈوں کی ایک فوج تھی جو جدید ترین اسلحے سے لیس تھے۔ ماضی میں ایک دو مرتبہ اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس پر اس کے غنڈوں نے پورے شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم کردیا تھا۔ کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔ لوگ بھی اس کے خلاف زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے لیکن آج یہاں پر موجود ہر شخص اس کے خلاف کھل کر بول رہا تھا۔

مزید پندرہ بیس منٹ بعد بریندرا بھی پہنچ گیا۔ بریندرا لوگوں سے پوچھ گچھ کررہا تھا کہ اس دوران اسے فون پر ایک اور سنسنی خیز اطلاع ملی۔

ناگ پال کے مسلح غنڈے اسپتال سے دلیش مکھ کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے اور بھوتا ہیتی کے مرکزی چوراہے پر لوگوں کو جمع کیا جارہا تھا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ دلیش مکھ کی لاش کو جلوس کی صورت میں پورے شہر میں گھمایا جائے گا اور لوگوں کو اشتعال دلا کر ان کے دلوں میں سرکار کے خلاف نفرت کو ابھارا جائے گا۔

بھوتا ہیتی کا علاقہ اگرچہ وہاں سے کافی دور تھا لیکن بسنت پورہ کی دکانیں ایک بار پھر بند ہونے لگیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کا رخ کرنے لگے کیونکہ سب ہی لوگ جانتے تھے کہ ہنگامے شروع ہوگئے تو پورا شہر ان کی لپیٹ میں آجائے گا۔

میں اعظم خان کے ساتھ بھوتا ہیتی کی طرف روانہ ہوگیا۔ رانی پوکھری اور رتنا پارک کے درمیان کانتی پاتھ کا وہ بہت بڑا چوراہا مکمل طور پر مسلح غنڈوں کے قبضے میں تھا۔ اگرچہ پولیس بھی بڑی تعداد میں موجود تھی لیکن میں جانتا تھا کہ جب ہنگامہ شروع ہوگا تو پولیس بھی کچھ نہیں کرسکے گی۔

چوراہے کے وسط میں ایک ٹرک پر مچان بنا کر دلیش مکھ کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس پر پڑا ہوا سفید کپڑا خون سے داغ دار تھا۔ دوسرے ٹرک پر بنے ہوئے ایسے ہی پلیٹ فارم پر ناگ پال کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ نصف درجن گن مین بھی تھے۔ انہوں نے آٹومیٹک رائفلیں اس طرح تان رکھی تھیں کہ کسی بھی لمحہ فائر کھول سکتے تھے۔ ان دونوں ٹرکوں کے آس پاس بھی لاتعداد گن مین موجود تھے۔

ناگ پال کو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ کرتوت تو اس کے بال ٹھاکرے جیسے تھے ہی حلیہ بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ میں نے جے پور میں بال ٹھاکرے کو ٹی وی کے ایک پروگرام میں دیکھا تھا اور اب ناگ پال کو دیکھ رہا تھا۔ اسے بال ٹھاکرے کی ڈپلی کیٹ کہنا غلط نہیں ہوگا۔

چھ فٹ کے قریب قد' اکہرا بدن' پیلے رنگ کا لمبا کرتہ' سفید دھوتی۔ ماتھے پر قشقہ' گلے میں تین لمبی سی مالائیں' ایک مالا تسبیح کی طرح ہاتھ میں تھی۔

ناگ پال اگرچہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں لوگوں سے خطاب کررہا تھا لیکن اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ایک آدمی نے اس کے منہ کے سامنے میگا فون تھام رکھا تھا جس سے اس کی آواز دور تک پھیل رہی تھی۔

زہر آلود تقریر کرنے کے بعد ناگ پال ٹرک سے اتر گیا۔ جلوس آگے بڑھنے لگا تو پولیس نے اسے روک لیا۔ پولیس کے کچھ اور ذمے دار آفیسر بھی وہاں موجود تھے جو بار بار میگا فون پر لوگوں سے منتشر ہونے کی اپیل کررہے تھے لیکن جلوس پولیس والوں کو دھکیلتا ہوا آسن ٹول کے مرکزی چوراہے پر پہنچ گیا۔ اس چوراہے سے مختلف سمتوں میں چھ بازار نکلتے تھے اور یہاں بہت بڑا مندر بھی تھا۔

پورا علاقہ بند تھا۔ بلڈنگوں کی بالکونیوں میں کھڑے ہوئے لوگ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہر چہرہ خوف زدہ تھا۔

پولیس نے ایک بار جلوس کو روکنے کی کوشش کی۔ مظاہرین نے پولیس پر پتھراؤ شروع کردیا۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لیے ہلکا لاٹھی چارج کیا اور آنسو گیس کے گولے پھینکے جانے لگے اور پھر ہجوم میں سے کسی نے پہلی گولی چلائی۔

مظاہرین نے دکانوں کے شٹر توڑ کر لوٹ مار شروع کردی تھی۔ پولیس کو دور رکھنے کے لیے باقاعدہ فائرنگ کی جارہی

تھی اور پھر پولیس نے بھی فائر کھول دیا۔

اعظم خان مجھے کھینچتا ہوا دور لے گیا۔

"اب تمہارا یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔" وہ مجھے ایک گلی کی طرف دھکیلتے ہوئے بولا "تم ڈاک بنگلے پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں بعد میں کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔"

بلوائی تمام بازاروں میں پھیل رہے تھے۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ آنسو گیس فضا میں پھیل گئی تھی جس سے آنکھوں میں مرچیں سی لگ رہی تھیں۔

میں تنگ اور آڑی ترچھی گلیوں میں ہوتا ہوا اندرا چوک کی طرف نکل آیا۔ یہ علاقہ بھی بند ہو چکا تھا۔ اندرا چوک سے اوٹو روڈ پر آتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ پہلے تو وہ کہیں جانے کو تیار نہیں تھا لیکن آرنیکو روڈ کا نام سن کر اس نے مجھے بٹھالیا۔ شہر کی گنجان آبادی سے نکل کر کانتی پاتھ سے آگے پرتھوی پاتھ چوک اور اس سے آگے کا علاقہ عام طور پر ہنگاموں سے محفوظ رہتا تھا اور اسی لیے ٹیکسی ڈرائیور اس طرف آنے پر تیار ہو بھی گیا تھا۔

پستہ قامت نیپالی ڈرائیور اس قدر تیز رفتاری سے ٹیکسی چلا رہا تھا جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو۔ فضا میں خوف و ہراس ضرور تھا لیکن ڈرائیور کی تیز رفتاری کی وجہ کوئی خوف نہیں تھا۔

اگر آپ کو کبھی کھٹمنڈو جانے کا اتفاق ہوا ہو تو نیپالی ٹیکسی ڈرائیوروں کے بارے میں یہ دلچسپ بات آپ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ٹیکسی کی تیز رفتاری سے میٹر بھی تیز چلتا ہے اور زیادہ کرایہ بنتا ہے۔ حالانکہ یہ بات تو ایک بے وقوف بھی سمجھتا ہے کہ کسی مخصوص فاصلے تک ٹیکسی خواہ تیز رفتاری سے چلائی جائے یا ہلکی رفتار سے میٹر اتنا ہی کرایہ بنائے گا۔

پرتھوی چوک سے آگے... بگمتی (دریا) پار کرکے آرنیکو روڈ پر آتے ہی میں نے ٹیکسی رکوالی اور ڈرائیور کو کرایہ ادا کرکے ایک طرف چل پڑا۔ پولیس کا ڈاک بنگلا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

ہنگاموں کی اطلاع یہاں پہنچ چکی تھی اور بملا خاصی پریشان تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر طمانیت سی چھا گئی۔

"ہنگامے کیوں شروع ہوگئے اور تم کہاں تھے؟" بملا نے پوچھا۔

"دلیش مکھ کو قتل کردیا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"دلیش مکھ یا بہاری لال کو۔ پولیس اس کی حفاظت نہیں کر سکی۔" بملا نے کہا۔

"پولیس کو بلف کیا گیا ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتانے لگا "یہ سب کچھ باقاعدہ پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔ یہ آگ ناگ پال نے بھڑکائی ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اتنی آسانی سے ٹھنڈی نہیں ہوگی۔"

ہم دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ دلیش مکھ ختم ہوگیا تھا۔ دھرتی کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تھا لیکن مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ میرے ہاتھ اس کی گردن تک نہیں پہنچ سکے تھے۔

شام کے وقت میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کیا تو پتا چلا کہ ہنگامے شہر کے کچھ اور علاقوں تک پھیل گئے تھے۔ پولیس ناگ پال کو گرفتار کرنے کے لیے چھاپے مار رہی تھی لیکن وہ آگ بھڑکانے کے بعد روپوش ہوگیا تھا۔

رات کو بھی شہر کے مختلف علاقوں میں بلوائیوں اور پولیس کے بیچ آنکھ مچولی جاری رہی۔ وقفے وقفے سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

صبح ہوتے ہی ہنگاموں کا زور بڑھ گیا۔ دس بجے کے قریب کاشا نے بتایا کہ پرتھوی چوک بھی ہنگاموں کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اس چوک کے عین وسط میں کالی کا بہت بڑا مندر تھا۔ بلوائیوں نے اس مندر کو لوٹ کر آگ لگادی تھی۔ یہاں ہنگامے میں ایک پجاری بھی مارا گیا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب بریندرا کا فون آگیا۔ اس نے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے سختی سے ہدایت کی تھی کہ ہم ڈاک بنگلے سے باہر نہ نکلیں۔

میرے ذہن میں اچانک ہی پانڈے کا خیال آگیا۔ پرسوں دوپہر کے بعد سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ میں فون کے قریب آگیا اور ریسیور اٹھا کر اس کا نمبر ملانے لگا۔

لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کال مدھو بالا نے ریسیو کی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرتے رہنے پر مصر تھی اور بڑی مشکل سے اس نے پانڈے کو فون پر بلایا تھا۔

"ارے تم کہاں ہو ہمت سنگھ۔ میں تو تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔ سومبا سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہو رہا۔" پانڈے نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

"میں فی الحال تو محفوظ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن ہنگامے بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہے ہیں۔"

"تم اس وقت کہاں پر ہو؟" پانڈے نے پوچھا۔

میں نے پولیس ڈاک بنگلے کا نام لیے بغیر اسے اپنی لوکیشن کا بتایا تو اس کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"فوراً نکلو وہاں سے۔ سنگھا دربار اور اس کے آس پاس واقع وزارت داخلہ کے دفاتر اور سپریم کورٹ کو گھیرے میں لیا جانے والا ہے۔ اس مرتبہ ناگ پال کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ تم بملا کو لے کر فوراً میری طرف آجاؤ۔"

"لیکن پورا شہر بند ہے اور..."

"تمہیں شہر کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے میری بات کاٹ دی "رِنگ روڈ کی طرف سے نکل کر تری بھون ائرپورٹ کے اوپر سے ہوتے ہوئے تم بودناتھ کی طرف آسکتے ہو۔ یہ راستہ لمبا ضرور ہے لیکن بالکل محفوظ ہے۔ تم فوراً یہاں پہنچنے کی کوشش کرو اور ابھی بہت سی باتیں ہیں جو ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "اگر نکلنے کا موقع نہ ملا تو فون کروں گا۔"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور بملا سے مشورہ کرنے لگا۔ اسے ہنگاموں سے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے جب یہ پتا چلا کہ وہ جگہ شہر سے بہت دور پہاڑیوں میں محفوظ مقام پر ہے تو وہ فوراً ہی جانے کو تیار ہوگئی۔

میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کیا۔ اتفاق سے اعظم وہاں موجود تھا۔ پہلے تو میں اس سے شہر کے حالات کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔ اس کے کہنے کے مطابق صورت حال خاصی تشویش ناک تھی۔ کھٹمنڈو میں بھارتی سفیر کے بیان نے بھی جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں نیپالی سرکار کو دھمکی دی تھی کہ کھٹمنڈو میں پولیس کے ہاتھوں ایک انڈین ایم پی کے قتل پر بھارت سرکار خاموش نہیں بیٹھے گی۔ نیپال سرکاری نے اگرچہ بھارتی سفیر کے اس بیان پر احتجاج کیا تھا اور اس امر کی وضاحت بھی کردی تھی کہ دلیش مکھ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوا تھا۔ یہاں اس کی سرگرمیاں بھی مجرمانہ اور غیر قانونی تھیں اور وہ پولیس کے ہاتھوں نہیں ایک جھڑپ کے دوران اپنے ہی غنڈوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن بھارت سرکار اس وضاحت سے مطمئن نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی نیپال کے احتجاج کو بھی زیادہ اہمیت دی تھی۔ اس کے برعکس بھارتی میڈیا سے اس واقعے کو خوب اچھالا جارہا تھا۔ سٹیلائیٹ چینلز پر بھارتی سیاست دانوں کے بیانات بھی کھٹمنڈو میں ان ہنگاموں کے پھیلاؤ کا باعث بن رہے تھے۔

"ایک خاص بات جس کے لیے میں نے تمہیں فون کیا ہے۔" میں نے اس کی بات ختم ہونے کے بعد کہا "تھوڑی دیر پہلے پانڈے سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کا خیال ہے کہ ہنگامے ہمارے علاقے کی طرف مزید پھیلیں گے اس لیے ہمیں اس کے ہاں شفٹ ہوجانا چاہیے۔ بملا ان حالات سے خاصی پریشان اور خوف زدہ ہے۔ وہ تو یہاں سے جانے کو تیار ہے۔ میں نے سوچا تم سے بھی مشورہ کرلوں۔"

"میں خود تم لوگوں کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔" اعظم خان نے جواب دیا "پرتھوی چوک پر کالی کے مندر کو نذر آتش کیے جانے کے بعد ہنگاموں کا زور اس طرف بڑھ گیا ہے۔ سیکریٹریٹ اور دیگر تمام سرکاری دفاتر بھی اسی طرف ہیں۔ بلوائی ان سرکاری عمارتوں پر حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ پولیس کا ڈاک بنگلا بھی زد میں آسکتا ہے جہاں تم لوگ ٹھہرے ہوئے ہو۔ اگر وہاں سے نکلنے کا موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ اور تم جہاں بھی جاؤ مجھے اطلاع دے دینا یا اس نمبر پر پیغام چھوڑ دینا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں یہاں سے نکل جائیں گے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

بملا کمرے میں تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ اپنے کپڑے سوٹ کیس میں ڈال رہی تھی۔ اس نے میرے بھی تین چار جوڑے ڈال لیے اور چند ضروری چیزیں رکھنے کے بعد سوٹ کیس بند کرتے ہوئے بولی۔

"چلیں!"

"تو گویا تم نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"موقع مل رہا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے نا۔" بملا نے کہا۔

"تو چلو۔ میں بھی تیار ہوں۔" میں نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس اٹھالیا۔

"کاشا برآمدے میں تھا۔ اس نے ٹیلی فون پر اعظم خان سے میری باتیں سن کر اندازہ لگالیا تھا کہ ہم یہاں سے جانے والے ہیں۔ اس لیے میرے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا اور برآمدے سے اتر کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

کاشا نے سوٹ کیس پچھلی سیٹ پر رکھ دیا۔ میں اسے محتاط رہنے کی ہدایات دیتا ہوا ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ بملا بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ

چکی تھی۔

کاشا نے گیٹ کھول دیا۔ میں نے گاڑی باہر نکالتے ہوئے کاشا کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی کو بائیں طرف موڑ دیا۔

آرنیکو روڈ پر آکر میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ یہی سڑک دھوبی کھولا (دریا) پار کرکے سیدھی بھگتا پور کی طرف چلی گئی تھی لیکن ہمیں دھوبی کھولا تک جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دریا سے پہلے ہی میں نے کار کو بائیں طرف والے راستے پر موڑ دیا۔

یہ سڑک تری بھون ائرپورٹ کے پچھلی طرف پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی بودناتھ اور اس سے آگے شمال میں مہادیو مندر کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ وادی میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی اور اس میں چھوٹی چھوٹی کئی بستیاں بھی تھیں۔

دریائے بھاگ متی پار کرکے ہم بائیں طرف مڑ گئے اور پھر بودناتھ میں حویلی کی طرف جانے والا راستہ تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

یہ راستہ اگرچہ بہت طویل تھا لیکن محفوظ بھی تھا۔ ہمیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں راستے میں بار بار ببلا کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ وہ پورے راستے خوف زدہ سی رہی تھی لیکن جب میں نے حویلی کے پھاٹک کے سامنے کار روکی تو اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔

ہارن کے جواب میں پھاٹک میں پہلے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی پھر پورا پھاٹک کھل گیا اور میں گاڑی کو اندر لیتا چلا گیا۔

پانڈے اور مدھومالا ہمارے استقبال کے لیے برآمدے میں موجود تھے۔ مدھومالا نے بھی گرم جوشی سے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا تھا۔ حسب معمول اس کے بدن پر مختصر لباس تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آگیا جب جے پور میں ببلا سے میری نئی نئی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی اسی طرح مختصر لباس پہنا کرتی تھی اور بہت عرصے بعد اس میں یہ تبدیلی آئی تھی کہ وہ ڈھنگ کا لباس پہننے لگی تھی۔ مدھومالا کے دماغ کی بھی شاید کوئی گرہ ڈھیلی تھی۔

اس وقت ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ہم وسیع و عریض لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ پانڈے کے کہنے پر نیپالی خادمہ نے چائے بنا کر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم شہر کی صورت حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ پانڈے کے خیال میں یہ ہنگامے ابھی مزید کئی روز جاری رہیں گے کیونکہ ناگ پال اس بار کھل کر سامنے آگیا تھا۔ وہ خود تو کسی جگہ روپوش تھا لیکن اس کے زہر میں بجھے ہوئے بیان روزانہ اخبارات میں شائع ہو رہے تھے۔

"تم تو ان کے سرکل میں داخل ہو چکے تھے۔ تو شاید معلوم ہو کہ ناگ پال کہاں چھپا ہوا ہے؟" میں نے پانڈے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت لاؤنج میں صرف ہم دونوں رہ گئے تھے۔ مدھومالا' ببلا کو حویلی دکھانے کے لیے لے گئی تھی۔

"نہیں۔" پانڈے نے جواب دیا "اس نے کچھ محفوظ ٹھکانے بنا رکھے ہیں اور اس کے چند خاص آدمیوں کے سوا ان کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ البتہ تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ جس روز یہ ہنگامہ شروع ہوا تھا اس وقت میں بھی دلیش مکھ کے ساتھ تھا۔ ہنگامہ شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ناگ پال کا ایک آدمی مجھے وہاں سے نکال کر لے گیا تھا۔"

"کیا مطلب!" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بعد میں ناگ پال کے اس آدمی دینا ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ یہ منصوبہ ناگ پال ہی کا تھا کہ جس روز ایم پی بہاری لال یہاں پہنچنے والا ہو اسی روز دلیش مکھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے اور اس کے قتل کا الزام پولیس پر تھوپ کر ہنگامے شروع کردیے جائیں۔ تمام تیاری پہلے ہی سے کرلی گئی تھی۔ دلیش مکھ کو ناگ پال ہی نے آمادہ کیا تھا کہ ایک گینگ کے ساتھ بسنت پورہ میں ہنگامہ شروع کرے۔ اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ پولیس کی توجہ بسنت پورہ کے ہنگامے کی طرف مبذول ہوجائے گی تو ان کی پارٹی اس وقت بہاری لال کو موت کے گھاٹ اتار دے گی جب وہ ائرپورٹ سے نکل رہا ہوگا۔

"دلیش مکھ کچھ جز بز سا ہوا تھا لیکن ناگ پال کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ یہ سارا اہتمام اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کیا گیا تھا۔ دراصل۔۔۔" پانڈے چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "دراصل دلیش مکھ' ناگ پال پر بوجھ بن گیا تھا۔ اس کی وجہ سے روی اور اس کے دو تین اور ساتھی بھی مارے گئے تھے۔ ناگ پال اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا اور اس لیے بھی اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ ناگ پال کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ ایم پی بہاری لال نیپال آنے والا ہے۔ اس نے بہاری لال کا نام استعمال کیا۔ اصل منصوبہ یہی تھا کہ پولیس بہاری لال کی حفاظت میں ہوگی اور دوسری طرف دلیش مکھ کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ دلیش مکھ جرائم پیشہ سہی لیکن وہ انڈیا کا ایم پی تو تھا اور ہنگامے شروع کرنے کے لیے یہ بنیاد ہی کافی تھی۔"

"ناگ پال واقعی بہت چالاک آدمی ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر دلیش مکھ' ناگ پال کے ہاتھوں نہ مارا جاتا تو میں کسی وقت موقع پاکر اسے ٹھکانے لگا دیتا۔" پانڈے نے کہا۔

پانڈے کی اس بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں زبان سے کچھ کہنے کے بجائے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"دلیش مکھ واقعی مہاحرامی آدمی تھا۔" پانڈے کہہ رہا تھا "اسے یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ سارسکا کی پہاڑیوں میں کالی کے مندر سے خزانہ لے کر میں ہی بھاگا تھا۔ وہ مجھ سے یہ خزانہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس نے ٹیلی فون پر جے پور میں پنڈت موہن داس سے میرے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں اور پھر موہن داس کو بھی یہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ میں نہیں جانتا موہن داس کون ہے لیکن اس کے نام کے ساتھ پنڈت کا لفظ ہی اس کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ سالا دلیش مکھ مارا گیا ورنہ میرے لیے پریشانیاں پیدا ہو جاتیں۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں دلیش مکھ کی موت کے بعد مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا "پنڈت موہن داس نامی کوئی شخص اگر یہاں آنے والا ہے تو وہ تمہارے لیے مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔"

"مجھے اس کا احساس ہے۔" پانڈے نے جواب دیا "لیکن میں مطمئن اس لیے ہوں کہ میرے اس ٹھکانے کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں۔ نہ دلیش مکھ کے آدمیوں کو اور نہ ہی ناگ پال کے آدمیوں کو۔"

"لیکن تمہارا وہ ہمدرد جس نے تمہیں یہ سب کچھ بتایا تھا؟" میں نے کہا۔

"وہ بھی میرے اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" پانڈے مسکرایا۔

"لیکن تم باہر تو نکلو گے۔ تمہیں آسانی سے شناخت کیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے اس کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔" پانڈے مسکرایا "میں جب باہر نکلنے کے لیے میک اپ کروں گا تو تم بھی مجھے نہیں پہچان سکو گے۔"

ادھر ہم لاؤنج میں باتیں کرتے رہے اور ادھر مدھومالا' ببلا کو حویلی دکھاتی رہی اور پھر اچانک ہی ببلا کی چیخ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ یہ آواز حویلی کے پچھلی طرف سے آئی تھی۔ ہم دونوں اٹھ کر اس طرف دوڑ پڑے۔

حویلی کے عقبی برآمدے میں پہنچتے ہی میں رک گیا اور پھر میرے حلق سے بے اختیار قہقہہ ابل پڑا۔ مدھومالا نے ببلا کو سوئمنگ پول میں دھکا دے دیا تھا اور اب خود بھی پانی میں چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہی تھی۔

میں نے پانڈے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا اور ہم دونوں پھر اندر آگئے۔

○☆○

ہمیں اس حویلی میں رہتے ہوئے چار پانچ روز ہوگئے۔ اس دوران انسپکٹر اعظم خان اور بریندرا سے میرا فون پر مسلسل رابطہ رہا تھا۔ ان سے نہ صرف شوبھا کے بارے میں بلکہ شہر کی صورت حال کا بھی پتا چلتا رہا تھا۔ ہنگامے دم توڑ چکے تھے اور شہر بتدریج سکون پذیر ہو رہا تھا۔

اور پھر اس روز شام سے ذرا پہلے پانڈے نے شہر جانے کا پروگرام بنالیا۔ اس نے جو میک اپ کیا وہ واقعی بڑے کمال کا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس میک اپ میں میں بھی اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ نہ صرف اس کا چہرہ بدل گیا تھا بلکہ وہ حلیے سے بھی نیپالی لگ رہا تھا۔ سفید چوڑی دار پاجامہ اس پر پھولدار کرتہ اور کالے رنگ کا ہاف کوٹ۔ سر پر کالے رنگ کی گول ٹوپی تھی جس پر گولڈن ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ اس نے کانٹیکٹ لینسز لگا کر آنکھوں کا رنگ بھی بدل لیا تھا۔

میں بھی پانڈے کے ساتھ ہولیا۔ یوں تو مدھومالا اور ببلا بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں لیکن ہم نے انہیں ساتھ لے جانا۔۔مناسب نہیں سمجھا۔

پانڈے کی گاڑی بہت شان دار تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ گاڑی اس نے چند مہینے پہلے خریدی تھی۔ اس کا ایک جاننے والا کچھ منافع دے کر یہ گاڑی خریدنا چاہتا تھا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔

شہر کے حالات بڑی حد تک پرسکون تھے۔ ہم ہری گوا ڈسٹرکٹ کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ اس علاقے کی تقریباً ساری دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ریسٹورنٹس بھی آباد تھے۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمدورفت بھی تھی لیکن فضا میں ٹینشن بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔

اس وقت سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ پانڈے نے ہتی سار روڈ سے آگے لال دربار کے قریب یاک اینڈ یتی ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی۔ یہ ایک بڑا

رہائشی ہوٹل تھا۔ اس کا اپنا ایک پارکنگ لاٹ بھی تھا لیکن پانڈے نے گاڑی باہر ہی روکی تھی۔ مجھے گاڑی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرکے وہ خود نیچے اتر کر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

وہ چند منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ وہ بھی نیپالی لباس میں تھا۔ وہ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میں بھی اپنی سیٹ پر اس طرف گھوم گیا۔

وہ دینا ناتھ تھا۔ پانڈے کا وہی دوست یا مخبر جس نے اسے دلیش مکھ کے بارے میں خبردار کیا تھا اور بعد میں بھی ناگ پال کے بارے میں ٹیلی فون پر اسے اطلاعات فراہم کرتا رہا۔ مجھے یاد آگیا کہ سہ پہر چار بجے کے قریب بھی پانڈے ٹیلی فون پر اسی سے باتیں کرتا رہا تھا۔

"فون پر بات نہیں ہوسکتی تھی۔ اب ذرا تفصیل سے بتاؤ وہ کون لوگ ہیں اور کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" پانڈے نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"وہ تین آدمی ہیں۔" دینا ناتھ نے جواب دیا "لیکن ناگ پال سے ملاقات کے لیے ایک ہی آدمی آیا تھا جس نے اپنا نام دین دیال بتایا تھا۔"

"ناگ پال کہاں ہے؟" پانڈے نے اسے ٹوک دیا۔

"تارا دیوی روڈ والی بلڈنگ میں۔" دینا ناتھ نے جواب دیا "دین دیال کو ناگ دیال ہی کا ایک قریبی آدمی لے کر آیا تھا۔ دین دیال نے ناگ پال کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ تمہیں پکڑ کر اس کے حوالے کردے تو وہ مندر سے لوٹی ہوئی دولت کا آدھا حصہ اسے دے دے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر کہنے لگا "دین دیال جب وہاں سے رخصت ہوا تو میں نے اس کا پیچھا شروع کردیا۔ وہ کلاک ٹاور کے قریب ایک تھرڈ کلاس ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی ہیں۔"

"میں ناگ پال کے بارے میں سننا چاہتا ہوں۔ اس نے دین دیال کو کیا جواب دیا تھا۔" پانڈے نے پوچھا۔

"اس کا جواب واضح نہیں تھا۔ اس نے دین دیال کو انتظار کرنے کو کہا تھا۔" دینا ناتھ نے جواب دیا۔

"ان کی ملاقات کب ہوئی تھی؟" پانڈے نے پوچھا۔

"کل رات کو۔" دینا ناتھ نے جواب دیا "دین دیال نے کہا تھا کہ وہ دلیش مکھ کی طرف سے اطلاع ملنے پر یہاں آئے ہیں۔ میں تو تمہیں کل رات ہی بتانا چاہتا تھا مگر میرے پاس تو تمہارا فون نمبر بھی نہیں ہے۔"

"میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔" پانڈے نے کہا۔ پچھلی سیٹ سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ پر آگیا۔ اس نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر بڑی مالیت کے چند نوٹ نکال کر دینا ناتھ کے ہاتھ میں تھما دیے "یہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے کہ ان لوگوں میں کیا ڈیل ہوتی ہے۔ میں کل صبح تمہیں فون کروں گا۔"

دینا ناتھ نے نوٹ جیب میں ٹھونسے اور کار سے اتر گیا۔ پانڈے نے انجن اسٹارٹ کرکے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں گاڑی کے باہر کی طرف لگے ہوئے سائیڈ مرر کو دیکھتا رہا۔ اس میں دینا ناتھ کا عکس نظر آرہا تھا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گاڑی ایک موڑ گھوم کر کانتی پاتھ کی طرف نکل گئی۔

مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں آیا تھا اور جب میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو پانڈے کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

"میرا پولیس کا بیس سال کا تجربہ ہے۔" وہ بولا "میں انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے اندر تک جھانک لیتا ہوں۔ دینا ناتھ کے بارے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ مجھے دھوکا نہیں دے گا۔"

"بعض اوقات چہرے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔ بہرحال، یہاں تمہاری ملاقات شاید پہلے سے طے تھی ورنہ اس نے تمہیں پہچانا کیسے؟"

"میں تو اس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ میں نے ہی اپنی شناخت کرائی تھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پانڈے نے گاڑی ایک دو جگہوں پر روک کر کچھ چیزیں خریدیں۔ ان میں بڑھیا شراب کی دو بوتلیں بھی شامل تھیں۔ جب اس نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے گاڑی اسپتال کی طرف مڑوالی۔

اس وقت آٹھ بجنے والے تھے۔ مایا متی کی ڈیوٹی اگرچہ ختم ہوچکی تھی لیکن وہ اس وقت بھی اسپتال میں موجود تھی۔ وہ مجھے راہداری ہی میں مل گئی تھی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو شوبھا مجھے دیکھ کر کھل اٹھی۔ شہر کے حالات کی وجہ سے پچھلے دنوں وہ بھی خاصی پریشان رہی تھی۔

میں پانڈے کو گاڑی میں چھوڑ آیا تھا اس لیے میں شوبھا کے پاس چند منٹ سے زیادہ نہیں بیٹھا۔

شوبھا ٹھیک اسپتال میں تھی۔ واپسی پر ہم پر تھوی پاتھ کی طرف سے گزرے تو پانڈے نے چوک کے قریب گاڑی

روک لی۔ چوک کے اطراف میں کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ چوک کے وسط میں بھدرا کالی کا مندر جل کر راکھ ہوچکا تھا۔ اس کا ڈھانچا رہ گیا تھا جس میں کہیں کہیں سے اب بھی دھوئیں کی لکیریں اٹھ رہی تھیں۔

ہم شہر میں جس طرف سے بھی گزرے تھے کئی جگہوں پر اس قسم کے مناظر دیکھنے کو ملے تھے اور مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔ چند لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے پورے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ کئی بے گناہ مارے گئے تھے۔

آرنیکو روڈ سے گزرتے ہوئے میں نے کار پولیس کے ڈاک بنگلے کی طرف مڑوالی۔ میں کاشا کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا لیکن قریب پہنچے تو میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ ڈاک بنگلا بھی ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ دو پولیس والے ایک درخت کے نیچے بیٹھے شاید اس ملبے کی حفاظت کررہے تھے۔ میں نے ان سے کاشا کے بارے میں دریافت کیا تو پتا چلا کہ وہ ڈاک بنگلے پر حملے میں زخمی ہوگیا تھا اور پولیس اسپتال میں زیر علاج ہے۔

ہم ٹکو کا کھولا دریا کے ساتھ ساتھ رام شاہ پاتھ پر ہوتے ہوئے جتی سار روڈ پر نکل آئے۔ وہاں سے پانڈے نے گاڑی دوسری طرف موڑ دی اور اس طرح مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے ہم شہر کے نواح میں بودھ ناتھ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑگئے۔ جب ہم حویلی پہنچے تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔

حویلی میں ایک نئے چہرے کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس آدمی کا قد چھ فٹ تو ضرور رہا ہوگا۔ کسرتی بدن، مضبوط ہاتھ پیر اور نکھری ہوئی رنگت۔ اس کے سر کے بال قریب سے تراشے ہوئے اور چہرے کے نقوش میں کسی حد تک چینیوں جیسی مشابہت تھی۔ اس نے پرانی جینز اور چمڑے کی بغیر آستین کی جیکٹ پہن رکھی تھی جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کا سینہ بالوں سے بھرا ہوا تھا اور گلے میں سیاہ رنگ کا ایک دھاگا پڑا ہوا تھا جس میں قریب قریب متعدد گرہیں لگی ہوئی تھیں۔

"یہ کون ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے پانڈے کی طرف دیکھا۔

"شیرپا۔" پانڈے نے جواب دیا "مدھو بالا کے باپ کا ملازم ہے۔ کبھی کبھی یہاں آجاتا ہے۔"

ہم کار سے اتر کر برآمدے میں آگئے۔ شیرپا نے ہم دونوں کو سلام کیا اور ہمارے لیے اندر جانے کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس کا انداز فدویانہ تھا۔ اس سے میں نے فوراً ہی اندازہ لگالیا کہ وہ بڑا نستعلیق اور خدمت گزار قسم کا آدمی ہے۔

مدھو بالا اور بیلا کمرے میں تھیں۔ آواز سن کر وہ بھی لاؤنج میں آگئیں۔ نیپالی ملازمہ نے بتایا کہ کھانا تیار ہوچکا ہے۔ پانڈے نے اثبات میں سرہلا دیا اور نیپالی ملازمہ میز پر کھانا لگانے لگی۔ شیرپا بھی اس کی مدد کررہا تھا۔

جب میں اسپتال میں داخل تھا اور بعد میں بھی مایا متی کے ساتھ رہ رہا تھا تو وہ مجھے نیپال کے بارے میں دلچسپ باتیں بتاتی رہتی تھی۔ اس نے مجھے شیرپا قبیلے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ نیپال کی بارہ ملین آبادی میں شیرپا قبائلیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور یہ نسل رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے شیرپا قبائلی نیپال کے بلند برف پوش پہاڑوں پر آباد ہیں۔ سردیوں کے موسم میں بھی یہ لوگ سطح سمندر سے کم از کم ساڑھے بارہ، تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر رہتے ہیں اور گرمیوں کے موسم میں یہ لوگ نقل مکانی کرکے سولہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی تک چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان خطرناک پہاڑی راستوں پر، جہاں ایک عام آدمی قدم رکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، یہ شیرپا قبائلی بے خوف و خطر بندروں کی طرح اچھلتے کودتے چلے جاتے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں سرایڈمنڈ ہیلری نے ۲۹۰۲۸ فٹ بلند ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کو سر کیا تو اس کے ساتھ نارگائے تینزنگ نامی آدمی ایک شیرپا ہی تھا۔ یہ دونوں دنیا کے پہلے انسان تھے جنہوں نے دنیا کی بلند ترین چوٹی کو پہلی مرتبہ سر کیا تھا۔ آج بھی کوہ پیما ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا عزم کرتے ہیں تو سامان اٹھانے کے لیے شیرپا قلیوں ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس وقت کھانے کے دوران شیرپا قبیلے ہی کے بارے میں باتیں ہورہی تھیں۔ وہ شخص جو اس وقت ہمارے سامنے موجود تھا اس کا اصل نام لاجیوت تھا۔ وہ بھی ہماری باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا اور اپنے قبیلے کی بعض دلچسپ رسموں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"ہم سے زیادہ دلچسپ تو مستانگ قبیلہ ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ قبیلہ تبت کی سرحد کے قریب تقریباً بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر مستانگ نامی علاقے ہی میں آباد ہے۔ یہ لوگ اگرچہ بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی بعض رسمیں بدھ کے پیروکاروں سے بالکل مختلف ہیں۔ مستانگ قبیلے کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی آبادی میں

زیادہ تعداد مردوں کی ہے۔ عورتوں کی تعداد ان کے مقابلے میں بہت کم ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا۔ کن انکھیوں سے بملا اور مدھو مالا کی طرف دیکھا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "یہاں شادی بیاہ کے رسم و رواج دنیا سے بالکل مختلف ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی مرد یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی عورت کسی دوسرے مرد کے ساتھ رات گزارے لیکن متانگ قبیلے کی عورتیں دو دو' تین تین اور بعض اوقات چار چار شادیاں کرتی ہیں لیکن شوہروں کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ وہ بڑے اتفاق سے مل جل کر رہتے ہیں اور مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ متانگ ہی میں آباد بعض قبیلے ایسے ہیں جن کی شادی کی رسمیں ان سے بھی مختلف اور زیادہ دلچسپ ہیں۔"

"وہ بھی بتا دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"اس قبیلے میں ایک لڑکی کی جب شادی ہوتی ہے تو اسے اپنے شوہر کے بھائیوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ شوہر کی طرح اس کے بھائیوں کا بھی لڑکی پر اتنا ہی حق ہوتا ہے۔ لڑکی کوئی اعتراض نہیں کرتی۔ البتہ اسے یہ دھیان رکھنا ہوتا ہے کہ اس کے پیٹ میں پلنے والے بچے کا باپ ان بھائیوں میں سے کون ہے۔"

"خاصا مشکل کام ہے۔" میں نے کہا۔

"عورتوں کے حصے میں تو ہمیشہ مشکل کام ہی آتے ہیں۔ عیش تو مرد کرتے ہیں۔" مدھو مالا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں لاجواب سا ہو کر رہ گیا۔

کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ لاچیوت شیرپا برتن سمیٹنے اور دھونے میں بھی نیپالی ملازمہ کی مدد کرتا رہا پھر وہ ہمارے لیے کافی بنا کر لے آیا۔ اس نے کافی کے مگ ہمارے سامنے رکھے اور خود قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور باتوں کا سلسلہ ایک بار پھر چل نکلا۔ شیرپا نیپال کے اونچے برف پوش پہاڑوں میں آباد مختلف قبیلوں کے بارے میں یہ دلچسپ باتیں بتاتا رہا اور ہمیں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں رہا اور جب گھڑی کی طرف دیکھا تو دو بج رہے تھے۔ مدھو مالا اور بملا تو نجانے کب وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ان دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی تھی اور وہ دونوں رات کو سوتی بھی اکٹھی ہی تھیں۔

مجھے بھی جماہیاں آنے لگی تھیں اور پھر کچھ دیر بعد میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

○☆○

دو دن اور گزر گئے۔ اس دوران صرف ایک بار اعظم خان سے ٹیلی فون پر میرا رابطہ ہوسکا تھا۔ وہ اور ریز ناگ پال والے معاملے میں مصروف تھے اور اعظم خان نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں فی الحال پانڈے کی حویلی ہی میں رہوں۔

پانڈے بھی ٹیلی فون پر دینا ناتھ سے رابطہ رکھے ہوئے تھا لیکن دین دیال وغیرہ کے بارے میں اسے مزید کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

پانڈے خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

اس رات میں اور پانڈے دیر تک لان میں بیٹھے رہے۔ چاندنی میں اردگرد کا ماحول بڑا پراسرار لگ رہا تھا۔ ہماری گفتگو کا موضوع ناگ پال ہی تھا۔ دیش مکھ ختم ہوچکا تھا۔ وہ جس مشن پر اس کے پیچھے آیا تھا وہ پورا ہوچکا تھا۔ شوبھا اس کے چنگل سے چھڑا لیا گیا تھا۔ دیش مکھ بھی اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اصولی طور پر مجھے شوبھا کو لے کر ہندوستان واپس چلے جانا چاہیے تھا لیکن یہاں کچھ اور نئے مسائل سامنے آگئے تھے اور مجھ جیسا خدائی فوج دار ان سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ انسپکٹر اعظم خان نے شوبھا والے معاملے میں میری بڑی مدد کی تھی۔ وہ اپنے ایک مشن پر یہاں آیا تھا۔ مجھے ان سیاسی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ناگ پال یہاں بہت اونچا سیاسی کھیل' کھیل رہا تھا اور مجھے صرف ان معاملات سے دلچسپی تھی جن کے لیے یہ کھیل کھیلا جارہا تھا اور بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا جارہا تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ جنرل کھوراٹ کو کم از کم اس خطے میں اس کے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا جس کے لیے راہ ہموار کی جارہی تھی لیکن ان ہنگاموں کی وجہ سے سارا کام گڑبڑ ہوگئی تھی۔ میں شہر سے دور اس حویلی میں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ سوما وغیرہ سے بھی میرا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ پانڈے کو ناگ پال سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ وہ اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔

چانگ لی کے بارے میں بھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں نے حویلی سے باہر نکلنے کا فیصلہ کرلیا۔

اگلے روز پانچ بجے کے قریب میں اکیلا ہی اپنی گاڑی میں حویلی سے نکل گیا۔ شہر کی رونق لوٹ آئی تھی۔ لوگ سب کچھ بھول گئے تھے۔ سب سے پہلے میں نے اسپتال کا رخ کیا۔ شوبھا اب پہلے سے بہت بہتر تھی۔ اس کے چہرے پر

سی سرخی بھی نظر آنے لگی تھی۔

میں ساڑھے سات بجے تک شوبھا کے پاس بیٹھا رہا اور جب واپسی کے لیے روانہ ہوا تو مایا متی بھی میرے ساتھ تھی۔

ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں چائے پی پھر مایا متی کو اس کے فلیٹ پر چھوڑا اور میں ریڈ لائٹ ایریا کی طرف نکل آیا جہاں پہلی مرتبہ سوما سے ملاقات ہوئی تھی۔ سوما اس علاقے میں نہیں تھا تاہم اس کے ایک اور آدمی سے سامنا ہوگیا جو مجھے گھنٹا گھر چوک پر لے آیا۔

سوما اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ نہایت گھٹیا سا ریسٹورنٹ تھا اس کے اوپر تین منزلہ مکان تھا جس میں رہائشی ہوٹل قائم تھا۔ یوں تو رہائشی ہوٹل میں آمدورفت کے لیے الگ راستہ تھا لیکن ریسٹورنٹ کے اندر سے بھی راستہ موجود تھا۔

میں سوما سے باتیں کررہا تھا کہ زینے سے دو آدمیوں کو اترتے دیکھ کر چونک گیا۔ ایک تو لمبا تڑنگا اور ہٹا کٹا آدمی تھا۔ سر گنجا' آنکھیں سرخ اور مونچھیں اس طرح گچھے دار تھیں جیسے گلہریوں کی دُمیں چپکا رکھی ہوں اور دوسرا آدمی دینا ناتھ تھا۔ پانڈے کا مخبر اور دوست۔ دراصل میں اسی کو دیکھ کر چونکا تھا۔

دینا ناتھ نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس لمبے تڑنگے آدمی کے ساتھ باہر نکل گیا تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ دوسرا لمبا تڑنگا آدمی یا تو دین دیال تھا یا اس کا ساتھی لیکن دینا ناتھ کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ دینا ناتھ واپس آئے تو مجھے دیکھ لے۔ میں سوما کو لے کر اٹھ گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ہم اس علاقے سے بہت دور ایک اور ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔

"اب سب سے پہلے تمہیں چانگ لی کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔" میں نے سوما کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وقت گزر تا گیا تو انہیں یہاں قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔"

"میں نے اس چینی کا ٹھکانا معلوم کرلیا تھا لیکن اسی روز ہنگامے شروع ہوگئے۔ اتفاق سے کل میں اس طرف گیا تھا لیکن وہ کہیں اور چلا گیا ہے۔ میں ایک دو دن میں معلوم کرلوں گا لیکن تمہیں کہاں اطلاع دی جائے۔" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"تم مجھے اپنا کوئی ایسا پتا دو جہاں روزانہ کم سے کم ایک گھنٹا خود موجود رہو۔" میں نے کہا۔

"میں روزانہ شام چھ سے آٹھ بجے کے دوران اس نمبر پر موجود رہوں گا۔" سوما نے ایک کاغذ پر نمبر لکھ کر میری طرف بڑھا دیا "یہ دربار اسکوائر کے ایک ریسٹورنٹ کا نمبر ہے۔ میرا نام بتاؤ گے تو مجھے فوراً ہی بلا لیا جائے گا۔"

"ایک بات اور۔" میں نے کاغذ جیب میں رکھتے ہوئے کہا "دینا ناتھ کو جانتے ہو؟"

"ہم پہلے جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے میں نے اسے وہاں دیکھا تھا اور میرا خیال ہے تم اسی کی وجہ سے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔" سوما نے کہا۔

"ہاں۔ ٹھیک سمجھے۔ وہی دینا ناتھ۔" میں نے کہا "اپنا ایک آدمی اس کی نگرانی پر لگا دو۔ میں اس کی سرگرمیوں سے آگاہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ کام تو میں آج ہی سے شروع کروا دیتا ہوں۔ وہ رات نو بجے کے بعد عام طور پر اندرا چوک کے آس پاس ہی رہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔" میں نے سیٹ چھوڑ دی اور سوما سے ہاتھ ملا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ سوما وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

میری گاڑی شہر سے نکل کر بودناتھ کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ اس وقت نو بج رہے تھے۔ یہ سڑک بالکل سنسان تھی۔ پورے راستے میں صرف ایک گاڑی سامنے سے آتی ہوئی ملی تھی۔

حویلی والے راستے پر مڑتے ہی میں نے کار روک لی۔ چاندنی رات میں اونچے ٹیلے پر حویلی کا ہیولا بڑا پراسرار منظر پیش کررہا تھا۔ اگر ایسے میں اچانک ہی عورتوں کے بین کرنے' رونے اور چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو پتا پانی ہوجائے۔ میں کافی دیر حویلی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس رات میں نے پانڈے کے سامنے دینا ناتھ کے حوالے سے اپنے خدشات کا اظہار کردیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں سی ابھر آئیں۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ دینا ناتھ ہی تھا۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"میں جو چہرہ ایک مرتبہ دیکھ لیتا ہوں اسے کبھی نہیں بھولتا۔" میں نے جواب دیا "دینا ناتھ کو اس شخص کے ساتھ دیکھ کر مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہوگیا ہے کہ وہ تمہارے خلاف

کوئی سازش کر رہا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف تو تم بھی کرو گے کہ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ہر شخص دولت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تم نے دولت کے لیے اپنی ساری زندگی کی نیکیوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ تم جیسا فرض شناس اور دیانت دار شخص دولت کے لالچ میں آسکتا ہے تو دینا ناتھ جیسے شخص کی کیا حیثیت ہے۔ وہ لوگ تو ہیں ہی دولت کے پجاری۔ چرس اور ہیروئن بیچنے والے۔ ایک ایک روپے کے لیے لڑنے والے۔ انہیں صرف اور صرف دولت سے محبت ہے۔ کسی کی زندگی کی انہیں کوئی پروا نہیں۔ پچھلے دنوں اس شہر میں جو کچھ بھی ہوا ہے سب کچھ دولت کی ہوس میں ہی تو ہوا ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا۔

"دینا ناتھ تو ناگ پال کا ایک معمولی سا کارندہ ہے۔ ایسے لوگ تو جلدی لالچ میں آجاتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دین دیال نے دینا ناتھ کو لالچ دیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے کوئی حصہ طے ہوگیا ہو اور دینا ناتھ ان کا ساتھ دینے کو تیار ہوگیا ہو۔ میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تھا تو اپنے خدشات کا اظہار کردیا تھا اور اب پھر تمہیں خبردار کر رہا ہوں۔ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" پانڈے نے گہرا سانس لیا "اس کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ میں کل ہی۔۔۔"

مدھو مالا اور بلا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے جملہ مکمل نہیں کیا اور پھر میں نے بھی موضوع بدل دیا۔

اس رات کھانے کے بعد مدھو مالا پانڈے کو لے کر اپنے کمرے میں گھس گئی اور میں بلا کو لے کر اوپر ایک کمرے میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد شیرپا بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہوگیا تھا اور اس کی زیادہ گپ شپ میرے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ بیڈ کے قریب قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور نیپال کے برف پوش پہاڑوں میں آباد مختلف قبیلوں کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ کرنے لگا۔

بارہ بجے کے قریب شیرپا نیچے چلا گیا تو میں نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر نشیب میں دور تک پھیلی ہوئی وادی کو دیکھنے لگا۔ چاندنی رات میں وادی کا یہ منظر دلچسپ بھی تھا اور دل فریب بھی۔

میں کافی دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر مڑ کر بیڈ کی طرف آگیا۔ بلا سو چکی تھی۔ وہ اس طرح آڑی ترچھی پھیلی ہوئی تھی کہ میں لیٹنا چاہتا تو اسے ایک طرف ہٹانا پڑتا۔ میں نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور سیٹی پر لیٹ گیا اور فوراً ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب ہوئے نیند میں چیخی ہوگی لیکن وہ پر سکون اور گہری نیند تھی۔

میں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف ساڑھے تین بج رہے تھے۔ میرے دماغ میں سنسناہ ہو رہی تھی۔ وہ نسوانی چیخ شاید میرا واہمہ تھی۔ میں لیٹ گیا لیکن اسی لمحے چیخ کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ واہمہ نہیں تھا۔ نچلے ہال سے نیپالی ملازمہ کے چیخنے کی سنائی دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اٹھا پٹخ کی آواز سنائی دینے لگیں۔

میں ایک جھٹکے سے سیٹی سے اٹھ گیا۔ بلا بھی جاگ گئی تھی۔

"کک۔۔۔ کیا ہوا؟" وہ وحشت زدہ سی نظروں سے ادھر دیکھنے لگی۔

"شی!" میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خا رہنے کا اشارہ کیا "پستول کہاں ہے؟" میرا لہجہ بھی سرگ تھا۔

"وہ۔۔۔ وہ تو نیچے ہے۔ سوٹ کیس میں۔" بلا جواب دیا۔

نیچے سے چیخنے اور اٹھا پٹخ کی آوازیں بدستور سنائی رہی تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں کھیل شروع ہوچکا تھا۔ میں نے بلا کو کمرے ہی میں اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آگیا لمحے فائر اور اس کے ساتھ ایک نسوانی چیخ کی آواز نیپالی ملازمہ کی چیخ تھی۔ مدھو مالا کے چیخنے کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھیں۔

میں ہال میں دبے قدموں بالکونی کی طرف بڑھ ریلنگ کے قریب پہنچ کر میں نے نیچے جھانکا لیکن وہاں دکھائی نہیں دیا۔ میں زینے کی طرف آگیا۔ چند سیڑ کر میں نے بالکونی کی چھت کے نیچے جھانکا تو مجھے اپنا کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ تین آدمی تھے اور میرے خدشات بالکل در ثابت ہوئے تھے۔ ان میں ایک دینا ناتھ تھا۔ دوسرا تڑنگا دین دیال جس کے ساتھ دینا ناتھ کو ریسٹورنٹ ہوئے دیکھا تھا۔ تیسرا آدمی بھی لمبا تڑنگا تھا لیکن ا میرے لیے اجنبی تھا۔

ان میں سے ایک نے پانڈے کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ دین دیال نے شیرپا کو پیچھے سے اس طرح گرفت میں لے رکھا تھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر شیرپا کی گردن کو چھو رہا تھا۔ دینا ناتھ نے مدھو مالا کو گرفت میں لے رکھا تھا۔ مدھو مالا کے چہرے پر بے پناہ خوف تھا۔

"تم بہت چالاک بنتے تھے پانڈے۔" دینا ناتھ کہہ رہا تھا "میں تو پورے خلوص سے تمہارے لیے کام کرنے کو تیار ہوگیا تھا لیکن تم نے مجھ پر بھروسا نہیں کیا۔ دین دیال نے جب بتایا کہ معاملہ کروڑوں روپے کے خزانے کا ہے تو میرا ایمان بھی ڈانواں ڈول ہوگیا۔ ہمارا ایمان ہی کہاں ہے۔ ہم تو دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ جہاں چمک دکھائی دی اسی طرف مڑ گئے۔"

"تم پر مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں اپنے اس ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن۔۔۔ تم یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟" پانڈے نے کہا۔

"تھوڑی سی عقل میری کھوپڑی میں بھی ہے جسے میں کبھی کبھی استعمال کرلیتا ہوں۔" دینا ناتھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تم نے مجھے اپنے کسی ٹھکانے کے بارے میں کبھی نہیں بتایا لیکن اس رات میں نے تمہاری گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا تھا اور پھر وہیکل رجسٹریشن آفس سے تمہارا پتا معلوم کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ہم تو کل ہی یہاں آجاتے لیکن یہ مہاشے کچھ اور تسلی کرلینا چاہتے تھے۔"

"تمہارے لیے اب ایک ہی راستہ ہے انسپکٹر پانڈے" دینا ناتھ کے خاموش ہوتے ہی دین دیال بول پڑا "کالی کے مندر سے لوٹی ہوئی دولت ہمارے حوالے کردو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ یہ حویلی، کار اور لونڈیا تمہارے پاس ہی رہے گی۔ ہم تمہیں چند لاکھ کی بھینٹ بھی دے دیں گے تاکہ تمہیں سڑکوں پر ہاتھ پھیلا کر بھیک نہ مانگنی پڑے۔ انکار کی صورت میں پہلے اس لونڈیا کا حشر خراب کیا جائے گا۔ تمہارے سامنے اور پھر تم۔۔۔ تمہیں ہم آسانی سے نہیں ماریں گے۔ اس وقت تک نہیں مرنے دیں گے جب تک تم لوٹا ہوا خزانہ ہمارے حوالے نہیں کردو گے۔"

"تم میرے ٹکڑے بھی کر ڈالو تو میں خزانہ تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔" پانڈے نے جواب دیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک اور آدمی سیڑھیوں کے نیچے والے کمرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس کا چہرہ میں نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ بھی اپنے دوسرے دونوں ساتھیوں کی طرح جسیم تھا۔

"وہ نیچے کسی کمرے میں نہیں ہے۔" اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی "وہ یقیناً مجھے تلاش کر رہا تھا۔"

"اوپر جاکر دیکھ پنڈت موہن۔" دینا ناتھ نے کہا "شام کو میں نے اسے اسی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا۔ [illegible] کے ساتھ رہتا ہے۔ کہیں چھپ گیا ہوگا۔"

پنڈت موہن سیڑھیوں کی طرف گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ اس طرف مڑتے ہی اس کی نظریں اٹھ گئی تھیں۔ میں اس کی نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے اور چیختے ہوئے بڑی تیزی سے ہاتھ اوپر اٹھا کر گولی چلا دی۔ اندھا دھند چلائی گئی گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ [illegible] نے پنڈت موہن کو دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔

میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور زینے کی ریلنگ کے اوپر سے ہوتا ہوا پنڈت موہن کے اوپر گرا اور اسے ساتھ لیتا ہوا قالین پر ڈھیر ہوگیا۔ پنڈت موہن کے منہ سے نہ صرف چیخ نکل گئی تھی بلکہ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

صورت حال ایک دم بدل گئی۔ پنڈت موہن کی چیخ اور فائر کی آواز نے دین دیال وغیرہ کو ایک لمحے کو بدحواس کر دیا تھا۔ شیرپا اور پانڈے نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ پانڈے اپنے حریف پر جھپٹا۔ اس کے پیر کی ٹھوکر حریف کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول ہوا میں اڑتا ہوا سیڑھیوں پر جاگرا۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوگئے۔

شیرپا نے بھی اپنے حریف کو پلٹ دیا تھا۔ دین دیال اس کے اوپر سے قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل دھب سے گرا۔ شیرپا اٹھ کر اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا کہ دینا ناتھ نے مدھو مالا کو چھوڑ کر اس کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ شیرپا لڑکھڑاتا ہوا پیچھے گرا۔ دین دیال کا خنجر اگرچہ اس کے ہاتھ میں نہیں رہا تھا لیکن اس نے شیرپا پر چھلانگ لگا دی۔ اسی لمحے دینا ناتھ بھی شیرپا کی طرف جھپٹا تھا۔ شیرپا بڑی خوبی سے ان دونوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔

میرا حریف پنڈت موہن مجھ سے اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ میں اپنے ہاتھوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے جھکتا چلا گیا۔ پنڈت موہن میرے اوپر سے قالین پر گرا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو موہن نے پڑے پڑے میرے سینے پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ میں پشت کے بل گر گیا۔ موہن نے دین دیال والا خنجر اٹھا کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اس وقت دونوں کہنیاں زمین پر ٹکائے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پنڈت موہن نے خنجر کو تلوار کی طرح پکڑ کر میرے سینے پر وار کیا۔

اور پھر جو کچھ بھی ہوا وہ حیرت انگیز تھا۔ خنجر میرے سینے پر لگا تو چھناکے کی ایسی آواز سنائی دی جیسے لوہے سے لوہا ٹکرایا ہو۔ پنڈت موہن کے ہاتھ کو بھی اسی طرح زوردار جھٹکا لگا تھا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ وہ خود بھی پیچھے الٹ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت ابھر آئی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے گلے کی طرف اٹھ گیا۔ میری انگلیاں اس پراسرار مالا کو چھونے لگیں جو نیلگری اس روز اپنی یادگار کے طور پر چھوڑ گئی تھی۔

پنڈت موہن نے بھی میرے گلے میں سیاہ پتھروں کی وہ مالا دیکھ لی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت پھیلتی چلی گئی۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے بچنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ میں اسے رگیدتا چلا گیا۔

شیرپا نے دین دیال کی گردن اپنے سیدھے بازو کے شکنجے میں دبالی تھی۔ طاقت، قد و قامت میں وہ دونوں ایک جیسے تھے لیکن دین دیال اس کے مقابلے میں کچھ کمزور پڑ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ شراب پینے کا عادی تھا اور شیرپا نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ وہ شراب اور کسی اور نشے کے کبھی قریب نہیں گیا تھا۔ دینا ناتھ بھی شیرپا پر بار بار حملہ کر رہا تھا لیکن شیرپا کی لاتیں بھی چل رہی تھیں جس وجہ سے دینا ناتھ اپنے حملوں میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

پانڈے اپنے حریف سے نمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شراب نے پانڈے کو بھی اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ اس کا حریف اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ پانڈے کو بری طرح رگید رہا تھا لیکن ایک مرتبہ پانڈے کو موقع مل گیا۔ اس نے اپنے حریف کو دور اچھال دیا اور یہ پانڈے کی بدقسمتی تھی کہ اس کا حریف صوفے کے قریب اس جگہ گرا تھا جہاں پستول پڑا ہوا تھا۔ پانڈے نے سنبھل کر اس پر چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن اس کا حریف پستول اٹھا چکا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گولی چلادی۔

شیرپا نے دین دیال کی گردن مروڑ دی تھی۔ وہ ایک طرف پڑا تڑپ رہا تھا۔ اسی دوران پنڈت موہن نے مجھے سر سے اوپر اٹھا کر ایک طرف اچھال دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں دیوار سے ٹکرا کر گروں گا لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے سنبھال لیا ہو۔ میں بڑے آرام سے پیروں کے بل زمین پر آیا تھا جیسے میں نے خود کسی اونچی جگہ سے چھلانگ لگائی ہو اور یہ وہی موقع تھا جب پانڈے کے حریف نے اس کے سینے میں گولیاں اتاری تھیں۔

"خبردار۔" پانڈے کے حریف کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی "کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

میں اس وقت پنڈت موہن کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن اس شخص نے ایک بار پھر چیخ کر مجھے خبردار کیا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کروں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کا رخ میری طرف کردیا لیکن ٹھیک اسی لمحے ہال کی فضا ایک بار پھر فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔

یہ گولی بملا نے چلائی تھی جو بالکونی سے اتر کر زینے پر آگئی تھی اور اس نے زینے پر پڑا ہوا پنڈت موہن والا پستول اٹھا کر فائر کردیا تھا۔ گولی اس شخص کی ٹانگ پر لگی تھی جس نے مجھے پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔ بملا نے ایک اور گولی چلا دی۔ اس مرتبہ اس کا نشانہ خالی گیا۔ وہ شخص لنگڑاتا ہوا کچن میں گھس گیا۔

پنڈت موہن نے بھی اس طرف دوڑ لگا دی تھی۔ دینا ناتھ نے بھی ایک طرف بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن شیرپا نے اسے دبوچ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا ایک صوفے کے پیچھے لے گیا۔

کچن کی طرف سے چلائی جانے والی ایک گولی مدھو مالا کی ٹانگ پر لگی جو ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی میں ایسا وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ ٹانگ پر گولی لگی تو وہ چیختی ہوئی نیچے گری۔

بملا نے بھی سیڑھیوں سے چھلانگ لگا دی۔ بملا بہت عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ پہلے وہ بھی مدھو مالا ہی کی طرح تھی۔ ناز اٹھوانے والی لیکن سارسکا کے جنگل میں پیش آنے والے واقعے کے بعد تو وہ ایک دم بدل گئی تھی۔ رشی کیش سے شوبھا اور سونیا کے اغوا کے بعد ہردوار میں اس نے غنڈوں پر جس طرح گولیاں چلائی تھیں وہ ایک قابل تعریف بات تھی اور اس وقت بھی، گویا وہ فارم میں آگئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں میں پستول تھامے کچن کے عین سامنے آگئی اور پے در پے ٹریگر دباتی چلی گئی۔ اس تابڑ توڑ فائرنگ سے بچنے کے لیے پنڈت موہن نے کچن کا دروازہ بند کردیا تھا۔

کچن میں مٹی کے تیل کا چولھا استعمال ہوتا تھا۔ کیروسین کا ڈرم کچن کے دروازے کے باہر کی طرف دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ بلا کی چلائی ہوئی آخری گولی اس ڈرم میں لگی۔ تیل کی دھار بہہ نکلی جس نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔

کچن کے سامنے آگ بڑی تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ بلا اس آگ کی پروا کیے بغیر دوڑ کر کچن کے قریب پہنچ گئی۔ دروازہ بند ہی تھا۔ اس نے باہر سے کنڈا لگا دیا۔ فرش پر بہتا ہوا تیل دروازے کے نیچے سے کچن کے اندر داخل ہونے لگا۔ اس طرح آگ کے شعلے اندر بھی پہنچ گئے تھے۔ اندر سے دروازہ دھڑدھڑایا جانے لگا۔

شیرپا نے دینا ناتھ کو چھوڑ کر مدھو مالا کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ دینا ناتھ نے ہال کے عقبی دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

شیرپا مدھو مالا کو کندھے پر لاد کر باہر کی طرف دوڑا۔ آگ بڑی تیزی سے پھیلنے لگی تھی۔ میں نے چیخ کر بلا کو باہر نکل جانے کو کہا اور دینا ناتھ کو گھسیٹتا ہوا میں بھی دروازے کی طرف لپکا۔

شیرپا نے مدھو مالا کو عمارت سے دور لے جا کر گھاس پر ڈال دیا اور دوڑتا ہوا پورچ میں پہنچ گیا۔

"صاحب جی۔ اپنا گاڑی نکالو۔ دور لے جاؤ۔ گیٹ کی طرف۔ جلدی کرو۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا اور پانڈے والی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔

میں نے دینا ناتھ کو بلا کے حوالے کر دیا اور دوڑتا ہوا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور انجن اسٹارٹ کر کے اسے ریورس گیئر میں پیچھے گیٹ کی طرف لیتا چلا گیا۔ شیرپا بھی اپنی گاڑی پیچھے لے آیا تھا۔

حویلی کے ہال میں آگ پھیل گئی تھی۔ مٹی کا بہتا ہوا تیل جہاں بھی پہنچا تھا وہاں اس نے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ اندر سے چیخوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ پانڈے اور نیپالی ملازمہ کی لاشیں بھی اندر ہی تھیں۔ انہیں باہر نکالنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ چند منٹ میں پوری حویلی آگ کی لپیٹ میں آجائے گی۔

میری کار کی ڈکی میں ایک رسی موجود تھی۔ میں نے رسی نکال کر دینا ناتھ کے ہاتھ پیر باندھ کر اسے کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس وقت ہم جائیں گے کہاں۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مایا متی کا مکان موجود تھا اور وہ مکان ہمارے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا۔

"صاحب جی!" شیرپا کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ "بلی کا ٹانگ سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے اسے کپڑا سے باندھ دیا ہے لیکن اس کا علاج ضروری ہے۔ آپ اپنا گاڑی پر بیٹھ کر ہمارے پیچھے پیچھے آؤ۔"

میں نے پانڈے والی گاڑی کی طرف دیکھا۔ مدھو مالا سیٹ پر نیم دراز تھی۔ اس نے دانت بھینچ رکھے تھے۔ چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔

"کہاں چلو گے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ ہمارے پیچھے آؤ۔" شیرپا نے یہ کہتے ہوئے حویلی کا پھاٹک کھول دیا اور پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ بلا بھی دوسری سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ حویلی کے اندر آگ پھیل چکی تھی شعلے اب کھڑکیوں سے باہر لپک رہے تھے۔ تپش سے شیشے چیخ چیخ کر ٹوٹ رہے تھے۔ لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازوں اور شعلوں کی بھڑبھڑاہٹ میں پنڈت موہن اور اس کے ساتھی کی چیخوں کی آوازیں دب گئی تھیں یا پھر وہ جل کر بھسم ہو چکے تھے۔

حویلی کے پھاٹک سے باہر نکل کر میں نے شیرپا کی گاڑی کو آگے نکلنے کا راستہ دے دیا اور اپنی گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔

دونوں گاڑیاں پہاڑیوں میں بل کھاتی ہوئی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ان خطرناک راستوں پر شیرپا بڑی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کی وجہ سے مجھے بھی اپنی کار کی رفتار تیز رکھنی پڑ رہی تھی۔ کیونکہ یہ راستہ وہ نہیں تھا جس سے میرا شہر آنا جانا رہتا تھا۔ دائیں بائیں پہاڑیوں میں کئی تنگ سے راستے تھے اور اگر شیرپا کسی ایسے راستے پر مڑ جاتا تو میرے لیے اسے تلاش کرنا مشکل ہو جاتا۔

شیرپا کی گاڑی ایک طویل چکر کاٹ کر دریائے بھاگ متی کی طرف نکل آئی تھی۔ دریا کی طرف مڑتے ہوئے میں نے گردن گھما کر پہاڑیوں کی طرف دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ اس طرف آسمان پر گویا آگ سی لگی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے ان پہاڑیوں کے بیچ میں کسی جگہ آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔ حویلی میں لگی ہوئی آگ کے شعلوں کی سرخی نے اس طرف کی فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

دونوں گاڑیاں بھاگ متی کے کنارے کے ساتھ ساتھ

ایک ناہموار سے راستے پر دوڑتی ہوئی پشوپتی ناتھ ڈسٹرکٹ میں گوری گھاٹ مندر کی طرف نکل آئیں۔ دریائے بھاگ متی رنگ روڈ کے ساتھ ساتھ للت پور کی طرف چلا گیا تھا اور شیرپا کی گاڑی جمسل روڈ کی طرف مڑ گئی تھی اور پھر رائل پیلس کے قریب لازم روڈ سے ہوتے ہوئے ہم سوم ناتھ کی طرف نکل آئے۔

یہ بھی شہر کا پوش علاقہ تھا۔ بڑے بڑے بنگلے تھے۔ ایک بہت بڑے بدھ اسٹوپا کے قریب سے گزرتے ہوئے شیرپا کی کار ایک کشادہ گلی میں داخل ہو کر ایک بنگلے کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ میں نے بھی گاڑی اس کے پیچھے روک لی۔

رات کا آخری پہر تھا۔ ہمیں شہر میں سے گزرتے ہوئے بھی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی اور یہ تو رہائشی علاقہ تھا۔ یہاں تو بالکل سناٹا تھا۔ شیرپا نے دو تین مرتبہ کار کا ہارن بجایا تو تب کہیں ایک بوڑھے نے گیٹ کھولا تھا۔ اس کے جسم پر مخصوص نیپالی لباس تھا۔ وہ گہری نیند سے جاگا تھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

یہ بہت بڑا بنگلا تھا۔ دونوں کاریں آگے پیچھے رک گئیں۔ میں انجن بند کر کے نیچے اتر آیا۔ شیرپا نے مجھ سے پہلے ہی اپنی گاڑی سے اتر کر مدھو مالا کو گود میں اٹھا لیا تھا۔

ہم دونوں اس بوڑھے نیپالی سے پہلے ہی برآمدے سے ہوتے ہوئے ہال میں آگئے۔ شیرپا نے مدھو مالا کو ایک صوفے پر لٹا دیا اور ٹیلی فون کی طرف لپکا۔

میں مدھو مالا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دائیں ٹانگ کو پکڑ رکھا تھا۔ گولی گھٹنے سے چھ سات انچ اوپر ران میں لگی تھی اور گوشت میں پیوست ہو گئی تھی۔ شیرپا نے اس جگہ اگرچہ پٹی باندھ دی تھی لیکن خون رس رہا تھا۔

شیرپا نے فون کا ریسیور پٹخ دیا اور غصے میں کچھ بڑبڑانے لگا۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی ڈاکٹر کو فون کر رہا ہے۔

"وہ ڈاکٹر کم بخت یا تو سو رہا ہے یا گھر پر نہیں ہے۔ کال ریسیو نہیں ہو رہی۔" شیرپا بولا۔

"میری گاڑی سے دینا ناتھ کو اٹھا کر اندر لے آؤ۔ میں ڈاکٹر کا بندوبست کرتا ہوں۔" میں یہ کہتے ہوئے باہر آگیا۔

بلا اس وقت تک گاڑی سے اتر کر برآمدے میں آچکی تھی۔ شیرپا نے پچھلی سیٹ پر بندھے ہوئے دینا ناتھ کو اٹھا لیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو گیٹ کی طرف ریورس گیئر میں ہی لیتا چلا گیا۔

شہر کی سنسان سڑکوں پر تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ وینگال ڈسٹرکٹ میں سپر مارکیٹ کے قریب مایا متی کے فلیٹ تک پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

مایا متی مجھے اپنے سامنے دیکھ کر بدحواس سی ہو گئی۔

"کیا بات ہے۔ خیریت۔ بلا تو ٹھیک ہے نا۔" اس کے لہجے میں نیند کا خمار تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"بلا ٹھیک ہے۔ ایک اور ایمرجنسی ہے۔" میں نے کہا اور مختصر طور پر اسے صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بولا "تمہارے پاس کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں ضرور ہوں گی جس سے گولی نکالنے میں مدد مل سکے۔ اب جلدی سے میرے ساتھ چل پڑو۔"

مایا متی الماری کھول کر ضروری چیزیں بیگ میں رکھنے لگی۔ وہ فلیٹ میں اکیلی تھی۔ اس کے ساتھی کو تو کئی روز پہلے دلیش مکھ کے آدمیوں نے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا تھا۔

ضروری چیزیں بیگ میں ڈالنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں جا کر کپڑے بدلنے لگی اور اس کام میں اسے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے اور اس کے دو تین منٹ بعد ہماری گاڑی تیز رفتاری سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

اس وقت پانچ بج چکے تھے۔ سڑکوں پر اب اکا دکا گاڑیاں بھی نظر آنے لگی تھیں لیکن مجھے شیرپا والی کوٹھی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

مدھو مالا کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ زخم سے خون اگرچہ زیادہ نہیں بہا تھا لیکن خوف زیادہ تھا جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

مدھو مالا بھی اس وقت شب خوابی کے لباس میں تھی۔ یہ میکسی قسم کا لباس تھا جس کا ایک حصہ خون آلود ہو گیا تھا۔ مایا متی نے فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے پاس گھر میں ایسی چیزیں موجود تھیں جو اس وقت کام آرہی تھیں۔ خاص طور پر لوکل انستھیسیا کا انجکشن تو بہت کام دے رہا تھا۔

بلا، مدھو مالا کے پاس اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کی نظریں اپنے زخم کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ جبکہ میں اس آپریشن میں مایا متی کی مدد کر رہا تھا اور شیرپا زخمی بھیڑیے کی طرح غراتا ہوا آس پاس ہی ٹہل رہا تھا۔

مایا متی تیز دھار نشتر کی مدد سے زخم کو اندر سے کریدتی رہی۔ گولی گوشت میں آڑی ہو کر پھنس گئی تھی اور اسے

نکالنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مایا متی تجربہ کار نرس تھی۔ وہ کئی نازک آپریشنوں میں اسپتال کے سرجن کی مددگار رہی تھی۔ اس کا اسپتال کا تجربہ اس وقت کام آیا اور وہ یہ آپریشن کرنے میں بھی کامیاب رہی۔ گولی نکل آئی۔

ڈریسنگ کے بعد مدھومالا کو کمرے میں لے جاکر بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ مایا متی نے اسے ایک اور انجکشن لگا دیا جس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

"اب پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" مایا متی نے کہا "میں شام کو آکر دیکھ لوں گی۔ چند روز آرام کی ضرورت ہے۔ بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔"

مایا متی نے ناشتا ہمارے ساتھ ہی کیا اور جب وہ جانے لگی تو شیرپا تیار ہوگیا۔

"چلو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

شیرپا کو واپس آنے میں تقریباً پون گھنٹا لگا تھا۔ میں اس وقت لان میں درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بہت بڑا بنگلا تھا۔ ایک طرف مصنوعی پہاڑی بنی ہوئی تھی جس پر جا بجا پودے لگے ہوئے تھے اور پانی کا ایک جھرنا بہہ رہا تھا۔ شیرپا نے اندر جاکر مدھومالا کو دیکھا اور پھر میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ہم مدھومالا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ شیرپا اس کے لیے بہت پریشان تھا اور میں اسے تسلی دے رہا تھا کہ اب اس کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ جلد اچھی ہوجائے گی۔

"وہ کون لوگ تھے؟" شیرپا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "تمہاری ان سے کیا دشمنی تھی؟"

"ان کی دشمنی مجھ سے نہیں پانڈے سے تھی۔ وہ تینوں انڈیا سے آئے ہوئے پنڈت تھے۔ ان کے ساتھ دینا ناتھ یہیں کا رہنے والا ہے۔ اس سے میں نے کچھ حساب کتاب کرنا ہے لیکن تم پانڈے کے بارے میں کیا جانتے ہو اور یہ بنگلا کس کا ہے؟"

"یہ بنگلا مدھومالا کے باپ کا ہے۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار ہے۔ پہاڑوں میں اپنے قبیلے کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔ چند مہینے پہلے پانڈے سے اس کی ملاقات ہوئی تھی جو مدھومالا کی وجہ سے دوستی میں بدل گئی اور مدھومالا اس کے ساتھ رہنے لگی۔ پانڈے کو میں بالکل نہیں جانتا۔ وہ کون ہے' کہاں سے آیا تھا؟ مجھے اس کے بارے میں سردار یا مدھومالا نے بھی کبھی نہیں بتایا تھا۔ میں نے کبھی پوچھا بھی نہیں۔ میں تو خدمت گار ہوں۔ سردار کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا لیکن تم شاید پانڈے کو اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ کون تھا اور پنڈتوں سے اس کی کیا دشمنی تھی۔"

"پانڈے انڈیا کا ایک پولیس آفیسر تھا اور کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کے ایک مندر سے خزانہ چرا کر بھاگا تھا اور پورے ہندوستان کے پنڈت اسے تلاش کررہے تھے۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے پانڈے کے بارے میں بتانے لگا۔

"اوہ! اسی لیے سردار اس سے بہت خوش تھا۔ پانڈے نے اسے ایک نئی کار بھی لے کر دی تھی۔" شیرپا بولا۔

"کیا سردار بھی شیرپا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کا تعلق چین کی سرحد کے قریب آباد ایک کوداری قبیلے سے ہے۔ ان کی قدیم رسمیں بڑی عجیب و غریب ہیں۔ یوں تو یہ قبیلہ ان پہاڑوں میں چائے کی کاشت کرتا ہے لیکن ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ان کی عورتیں ہیں۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس قبیلے کی عورتیں بڑی حسین ہوتی ہیں۔" شیرپا نے جواب دیا "یہ عورتیں شادی کے بغیر بھی دوسروں کے ساتھ رہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتیں اور ان کے مرد اس کا معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ ایک عورت کئی دن' کئی مہینے یا کئی سال تک کسی مرد کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ لڑکی کے گھر والوں کو اس کا کرایہ ملتا رہتا ہے۔ یہ کرائے دار پر منحصر ہے کہ وہ کسی عورت کو کتنا عرصہ اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی سمجھ لو جیسے تم نے چھ مہینوں کے لیے کوئی مکان کرائے پر لیا۔ کرایہ پورا ہوگیا تو مکان چھوڑ دیا۔ یہ مرد کی پسند پر منحصر ہے کہ وہ کرائے کی مدت بڑھا بھی سکتا ہے۔"

"حیرت انگیز!" میں نے کہا۔

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔" شیرپا نے جواب دیا "میں نے تمہیں مستانگ قبیلے کے بارے میں بھی بتایا تھا جس کی عورتیں بیک وقت کئی کئی شادیاں کرتی ہیں۔ بہرحال' وہ آدمی کون ہے جسے تم باندھ کر یہاں لائے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ تمہارا ابھی کچھ حساب ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا اور پھر اسے ان لوگوں کے بارے میں بتانے لگا۔ آخر میں' میں کہہ رہا تھا "نیپال کے لوگ بہت سادہ لوح ہیں۔ یہ لوگ محنت و مشقت پر یقین رکھتے ہیں لیکن یہ لوگ ان کے خون میں ہیروئن کا زہر بھر کر ان کی زندگیوں کو نچوڑ لینا چاہتے ہیں۔ دینا ناتھ اسی گروہ کا آدمی ہے۔ جو اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں اسی سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر چلو۔ دیر کیوں کررہے ہو۔" شیرپا ایک جھٹکے سے

اٹھ کر کھڑا ہوگیا "اس سے جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر لاش پہاڑیوں میں پھینک دیں گے۔ کتے اور بھیڑیے دعوت اڑائیں گے۔"

ہم اٹھ کر اندر آگئے۔ مدھومالا سو رہی تھی اور اس کے قریب ہی سیٹی پر بملا بھی پڑی سو رہی تھی۔ ہم اس کمرے میں آگئے جہاں دینا ناتھ بندھا ہوا پڑا تھا۔ اسے ابھی تک کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ شیرپا مجھے وہاں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی پانچ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے دینا ناتھ کے پیر کھول دیے اور زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

"ان پنڈتوں کو حویلی میں لانے والے تم تھے۔ تمہاری ہی وجہ سے ہماری بے بی کو گولی لگی ہے۔ یہ بات کوداری سردار تک ضرور پہنچے گی اور وہ ناگ پال کو زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن اس سے پہلے میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بناؤں گا۔ اٹھو۔ نیچے تہ خانے میں چلو۔"

شیرپا اسے ٹھوکریں مارتا ہوا کمرے سے نکال لایا۔ تہ خانے کا راستہ سیڑھیوں کے نیچے تھا۔ اندر داخل ہو کر اس نے تہ خانے کا راستہ بند کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تہ خانے میں پہنچتے ہی شیرپا نے دینا ناتھ کے کولھے پر ایک اور زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی تھی۔

"صاحب جی۔ اس سے جو پوچھنا ہے جلدی پوچھ لو۔ میں نے بھی اس سے حساب کتاب کرنا ہے۔" شیرپا نے کہا۔

میرے کہنے پر شیرپا نے پشت پر بندھے ہوئے دینا ناتھ کے ہاتھ بھی کھول دیے اور میں نے دینا ناتھ کے سامنے کھڑے ہو کر سوال جواب کا سلسلہ شروع کردیا۔ دینا ناتھ ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔

"چانگ لی کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا۔" دینا ناتھ نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں تم آسانی سے زبان نہیں کھولو گے لیکن تم جیسے بے ضمیر اور بے دین لوگوں کا علاج میرے پاس ہے۔" میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے جبڑے پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔

دینا ناتھ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ وہ آستین سے خون پونچھنے لگا لیکن اسی وقت شیرپا نے اس کی کنپٹی پر گھونسا مار دیا۔ دینا ناتھ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔

"صاحب جی۔ آپ سوال پوچھو' دوسرا کام میں کرتا ہوں۔" شیرپا نے کہا اور دینا ناتھ کے منہ پر دوسرا گھونسا جڑ دیا۔

اور پھر میں سوال پوچھتا رہا اور شیرپا دینا ناتھ کی تواضع کرتا رہا۔ ایک موقع پر دینا ناتھ نے بھی شیرپا کے منہ پر گھونسا رسید کردیا۔ شیرپا کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور خون رسنے لگا۔

"مجھے ہاتھ مار کر بہت اچھا کیا تم نے۔" شیرپا غرایا "اب مجھے غصہ آئے گا اور میں تمہاری کچھ سیوا کرسکوں گا۔"

اور پھر شیرپا کو واقعی غصہ آگیا۔ وہ دینا ناتھ پر تابڑ توڑ حملے کرتا رہا۔ کبھی اسے اٹھا کر پٹخ دیتا اور کبھی اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردیتا۔ دینا ناتھ واقعی بہت سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس کی چیخیں تہ خانے میں گونجتی رہیں اور بالآخر اسے زبان کھولنی ہی پڑی۔

اس نے جو کچھ بھی بتایا وہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق ناگ پال کے دو آدمی ہنگاموں کے دوران جنوبی نیپال کی طرف چلے گئے تھے جہاں بیداوی کے قریب ہندوستان کی شمالی ریاست ہماچل پردیش کی سرحد ملتی ہے۔ وہ لوگ ہندوستان سے ہیروئن کی پہلی باقاعدہ کھیپ لے کر کھٹمنڈو آنے والے ہیں۔ ہیروئن کی یہ کھیپ دھول گری کے پہاڑی سلسلے میں واقع شاہی شکارگاہ رائل دھرچن ہنٹنگ ریزرو کے قریب یدمی کے مقام پر پہنچائی جائے گی۔ جہاں سے اسے قسطوں میں کھٹمنڈو منتقل کیا جائے گا۔

دینا ناتھ کے کہنے کے مطابق ناگ پال کے کچھ آدمی' جن کے ساتھ جنرل کھوراٹ کے بھی دو آدمی موجود ہیں' کئی روز پہلے اس سرحدی علاقے میں پہنچ چکے ہیں۔ جہاں پوست بکثرت کاشت ہوتی ہے۔ وہ لوگ اس علاقے میں ہیروئن کی فیکٹری لگانے کے امکانات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

"ناگ پال اور چانگ لی کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ناگ پال تو یہیں ہے اور چانگ لی دو آدمیوں کے ساتھ یدمی گیا ہوا ہے جہاں وہ ہماچل پردیش سے آنے والی ہیروئن کی کھیپ وصول کرے گا۔"

"کتنی ہیروئن لائی جارہی ہے؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"کم سے کم پانچ سو کلو۔" دینا ناتھ نے جواب دیا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ پانچ سو کلو ہیروئن سے تو کھٹمنڈو کی پوری آبادی کو موت کی نیند سلایا جاسکتا تھا۔

"وہ لوگ ہیروئن لے کر کب یدمی پہنچیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس مہینے کی چھ تاریخ کو۔" دینا ناتھ نے جواب دیا "اس کے دو دن بعد ڈیڑھ سو کلو ہیروئن کی پہلی قسط کھٹمنڈو پہنچا دی جائے گی اور شہر میں ہیروئن کا جو سیلاب آئے گا اسے کوئی نہیں روک سکے گا۔"

"عقل مند لوگ تو وہی ہوتے ہیں جو سیلاب آنے سے پہلے ہی بند باندھ لیں۔" میں نے کہا "ہمیں پتا چل گیا ہے اس لیے اب ہیروئن کا یہ سیلاب کھٹمنڈو کی طرف نہیں آئے گا اور تم۔۔۔"

"اس کے ساتھ اب میرا حساب باقی ہے۔" شیرپا نے میری بات کاٹ دی "کوواری سردار کو اگر پتا چل گیا کہ اس کی بیٹی کو ناگ پال کے کسی آدمی نے گولی مار کر زخمی کیا ہے تو وہ اپنے پورے قبیلے کے ساتھ ناگ پال پر چڑھ دوڑے گا۔ شہر میں ایک بار پھر خونی ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔ کئی بے گناہ لوگ بھی مارے جائیں گے۔ اس لیے میں کوشش کروں گا کہ سردار کو اس واقعے کی اطلاع نہ ملنے پائے۔ بعد میں کسی وقت پتا چلے گا تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔"

"تو پھر اس کا کیا کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ہڈیوں کا سرمہ بناؤں گا۔" شیرپا نے ہنستے ہوئے جواب دیا "تم اوپر چلے جاؤ صاحب جی۔ میں اس کو دیکھ لیتا ہوں۔"

میں چند لمحے شیرپا اور دینا ناتھ کی طرف دیکھتا رہا پھر اوپر آگیا۔ کمرے میں جھانک کر دیکھا تو بملا اور مدھومالا اس وقت بھی سو رہی تھیں۔ میں نے بوڑھے نیپالی کو چائے کے لیے کہہ دیا اور باہر آکر درخت کے نیچے کرسی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد بملا بد حواسی کے عالم میں دوڑتی ہوئی باہر آگئی۔

"یہ۔ یہ چیخوں کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔" وہ وحشت زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے جواب دیا "شیرپا تہ خانے میں دینا ناتھ کے ساتھ باکسنگ کی مشق کر رہا ہے۔"

"اوہ!" بملا یہ کہتے ہوئے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد بوڑھا نیپالی دو کپ چائے لے آیا۔ اس نے غالباً بملا کو بھی آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

تہ خانے سے دینا ناتھ کی چیخوں کی آوازیں میں بھی سن رہا تھا۔ بیس پچیس منٹ بعد آوازیں بند ہو گئیں اور پھر شیرپا برآمدے والے دروازے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے کندھے پر ایک بوری لاد رکھی تھی جس کا منہ رسی سے بندھا ہوا تھا۔ بوڑھا نیپالی بھی دوڑتا ہوا اس کے پیچھے ہی باہر آگیا تھا۔ اس نے کار کی ڈکی کھول دی۔

شیرپا نے بوری ڈکی میں ڈال دی اور بوڑھے سے کچھ کہتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا اس کے لیے بھی چائے لے آیا تھا۔ شیرپا کا چہرہ تاثرات سے بالکل عاری تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ڈکی میں رکھی جانے والی بوری میں کیا ہو سکتا ہے۔

"کہیں جا رہے ہو شیرپا؟" بملا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اس بوری میں کیا ہے جو تم نے کار کی ڈکی میں رکھی ہے؟"

"دینا ناتھ کی لاش۔" شیرپا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

بملا ایک دم اچھلی۔ کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ابکائی روکنے کی کوشش کی مگر اسے قے ہو گئی۔ میں اپنا کپ میز پر رکھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ شیرپا بھی پریشان ہو گیا۔ اس نے بوڑھے کو آواز دے کر ٹھنڈا پانی منگوایا اور بملا کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔

"معاف کرنا میم صاب!" وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا "مجھے آپ کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ پر کیا کروں۔ میں بہت سیدھا آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ نے پوچھا بوری میں کیا ہے۔ میں نے بتا دیا۔ آپ تو بہت بہادر عورت ہو۔ مجھے کیا پتا آپ کا طبیعت خراب ہو جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے شیرپا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار ابھر آئے تھے۔

بوڑھا نیپالی پانی لے آیا تھا۔ بملا نے کلی کی۔ منہ پر چھینٹے مارے اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ شیرپا چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اٹھ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بوڑھے کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ حرکت میں آکر گیٹ سے باہر نکل گئی۔

میں تھوڑی دیر تک بملا کے ساتھ لان ہی میں بیٹھا رہا پھر اسے وہیں چھوڑ کر ہال میں آگیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر پولیس ہیڈ کوارٹر کے نمبر ملانے لگا۔ انسپکٹر اعظم خان کو معلوم تھا کہ میں پانڈے کی حویلی میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ حویلی میں آتش زدگی کی اطلاع تو صبح سویرے ہی شہر پہنچ گئی ہو گی اور ظاہر ہے پولیس بھی وہاں گئی ہو گی۔ اعظم خان کو جب پتا چلا ہو گا تو وہ بہت پریشان ہوا ہو گا۔

اعظم خان چند منٹ پہلے ہی دفتر پہنچا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ چیخ اٹھا۔

"ارے کہاں ہو تم! بملا کہاں ہے؟"

"ہم محفوظ ہیں۔" میں نے جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ بھاگ دوڑ کی وجہ سے تمہیں اطلاع نہیں دے سکا تھا۔"

"کیا ہوا۔ حویلی کو آگ کیسے لگی تھی۔" اعظم خان نے پوچھا۔

"اب صورت حال کیسی ہے۔ میرا مطلب ہے حویلی کی آگ۔"

"بہت خوفناک آگ تھی۔" اعظم خان نے بات کاٹ دی "پوری حویلی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ ابھی تک ملبا نہیں ہٹایا جا سکا۔ شبہ ہے کہ اس ملبے میں کچھ لاشیں بھی دبی ہوئی ہیں۔"

"پانچ لاشیں۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے ان پنڈتوں کے بارے میں بتانے لگا جو پانڈے سے پرانا حساب کرنے آئے تھے "آگ محض اتفاق سے لگی تھی۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "لیکن نیپالی ملازمہ اور پانڈے کو اس سے پہلے ہی گولیاں مار کر ہلاک کیا جا چکا تھا۔ ہم لوگ بروقت حویلی سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہم اس وقت سومبا ناتھ کے علاقے میں اسٹوپا کے آس پاس ایک بنگلے میں موجود ہیں۔ تمہارے لیے ایک اور دلچسپ اطلاع ہے لیکن ایک گھنٹے بعد میں خود تم سے ملوں گا۔"

"تم کانتی پاتھ کے قریب سدھارتھ ہوٹل آجاؤ۔ ایک گھنٹے بعد میں بھی پہنچ جاؤں گا۔ تفصیل سے بات ہو گی۔" اعظم خان نے کہا۔

میں نے فون بند کر دیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد شیرپا واپس آگیا۔ اس کی واپسی پورے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ دینا ناتھ کی لاش کو کہاں پھینک کر آیا تھا۔

مدھومالا بھی جاگ گئی تھی۔ انستھیسیا کا اثر زائل ہوتے ہی ٹانگ میں تکلیف شروع ہو گئی تھی۔ مایا متی ایسے ہی موقع کے لیے کچھ گولیاں دے گئی تھی۔ بملا نے اسے دو گولیاں کھلا دیں۔ جن سے درد میں بتدریج کمی آتی چلی گئی۔

ایک گھنٹے بعد میں کانتی پاتھ سے ملحق ایک ذیلی سڑک پر واقع سدھارتھ ہوٹل میں انسپکٹر اعظم کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بریندرا بھی تھا۔ میں ایک بار پھر انہیں حویلی میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"حویلی کی آتش زدگی کا پچھلے دنوں پیش آنے والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ البتہ میرے پاس ایک اور اطلاع ہے جو ناگ پال وغیرہ کے حوالے سے تمہارے لیے کار آمد ثابت ہو سکتی ہے۔"

"مثلاً؟" اعظم خان نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ناگ پال کے آدمی جنوب کے پہاڑی علاقے میں' جہاں پوست کی کاشت ہوتی ہے' ہیروئن کی فیکٹری لگانے کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ گولڈن ٹرائی اینگل کے جنرل کھوراٹ کے بھی دو آدمی ہیں اور یہ بات میں نے تمہیں شروع میں بتائی تھی کہ جنرل کھوراٹ یہاں پوست کی کاشت والے علاقوں پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے اور ناگ پال جیسے بے ضمیر لوگ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے اس کی مدد کر رہے ہیں۔ اب یہ سوچنا تم لوگوں کا کام ہے کہ ان کے اس منصوبے کو کس طرح ناکام بنایا جا سکتا ہے۔"

"تمہیں یہ اطلاع کہاں سے ملی کہ ناگ پال کے آدمی اس طرف جا چکے ہیں۔" یہ سوال بریندرا نے کیا تھا۔

"کچھ مخلص قسم کے لوگ میرے لیے بھی کام کر رہے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "سومبا کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ ناگ پال کا بد ترین حریف ہے اور اس کی تاک میں رہتا ہے۔ یہ اطلاع مجھے اس سے ملی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔" بریندرا گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "جنوب میں دیپال اور سیل گڑھی میں ہمارے دو بڑے مضبوط پولیس اسٹیشن ہیں۔ پوست کی کاشت بھی زیادہ ترانہی علاقوں میں ہوتی ہے۔ اس سے پچاس ساٹھ کلومیٹر آگے بھارتی ریاست ہماچل پردیش کی سرحد ملتی ہے۔ میں آج رات ہی ان دونوں پولیس اسٹیشنوں کو اطلاع دے کر ان علاقوں کی نگرانی شروع کروا دیتا ہوں۔ تاکہ مشتبہ افراد پر نگاہ رکھی جا سکے۔"

"اگر شروع ہی میں ان پر کاری ضرب لگا دی جائے تو وہ لوگ اپنے قدم نہیں جما سکیں گے۔ ایک بات اور۔۔۔" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں چار تاریخ کو دھول گری رینج میں واقع رائل دھرپتن ہنٹنگ ریزرو کی طرف جا رہا ہوں۔ واپسی میں ایک دو دن لگ جائیں گے۔"

"وہاں تمہارا کیا کام ہے۔" اعظم خان نے مشتبہ نظروں سے میری طرف دیکھا "وہ ہنٹنگ ریزرو تو رائل فیملی کے لیے ہے۔ کسی عام آدمی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں

ہے۔"

"میں جانوروں کا شکار کھیلنے نہیں جارہا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "سنا ہے اس شکارگاہ کے آس پاس بھی کسی جگہ پر کھچڑی پک رہی ہے۔ میں یہی معلوم کرنے جارہا ہوں کہ کیا گڑبڑ ہے۔"

"کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہو؟" اس مرتبہ بریندرا نے مجھے گھورا۔

"بالکل نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جھوٹ بولا "لیکن اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میں تمہیں اطلاع دینے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"میرا یہ کارڈ اپنے پاس رکھ لو۔" بریندرا نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا "کوئی گڑبڑ ہو تو بلا تاخیر وہاں کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کرلینا۔ وہ لوگ تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔"

"لیکن میں دھرچن میں نہیں رہوں گا۔ میری منزل تو اس سے بہت آگے ہے۔ بہرحال' میں کارڈ رکھ لیتا ہوں۔ شاید کہیں اور کام آجائے۔" میں نے جھجکتے ہوئے اس سے کارڈ لے کر جیب میں ڈال لیا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہماری یہ ملاقات ختم ہوگئی۔ میں وہاں سے اسپتال چلا گیا اور تھوڑی دیر شوبھا کے پاس بیٹھ کر واپس آگیا۔ جب میں کمرے سے نکل رہا تھا تو مایا متی نے کہا کہ وہ مدھومالا کو دیکھنے کے لیے شام کو آئے گی۔

اسپتال سے نکل کر میں کافی دیر تک بازاروں میں گھومتا رہا۔ کئی جگہوں پر کچھ دیر کے لیے رکا بھی۔ ہر شخص کی زبان پر بودناتھ میں حویلی کی آتش زدگی کا ذکر تھا لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ حویلی میں آگ کیسے لگی تھی۔ ایک دو جگہوں پر یہ دلچسپ باتیں بھی سننے میں آئیں کہ یہ سب ان بدروحوں کی کارستانی تھی جنہیں اس دولت مند شخص نے کسی طرح وہاں سے نکال دیا تھا اور گزشتہ رات وہ بدروحیں واپس آگئی تھیں اور انہوں نے سب کچھ جلا کر راکھ کرڈالا تھا۔

ہاں۔ وہ پنڈت بدروحوں سے بھی زیادہ خوفناک تھے جو عرصے سے سابق پولیس انسپکٹر پانڈے کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور بالآخر اسے جلا کر بھسم کرڈالا تھا اور خود بھی اس آگ میں بھسم ہوگئے تھے۔

○☆○

چار دنوں میں مدھومالا کی حالت کافی بہتر ہوگئی تھی لیکن وہ ابھی چل پھر نہیں سکتی تھی اور پھر اس روز جب میں نے انہیں بتایا کہ ہم ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف جارہے ہیں تو مدھو مالا کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ شیرپا بھی افسردہ سا ہوگیا۔

"میں ایک بات بتاتا ہوں آپ کو صاحب جی۔" وہ جلدی سے بولا "تم اتنا مشکل سفر مت کرو۔ موسم بھی اچھا نہیں ہے۔ آپ کوداری چلے جاؤ۔ ہمارا بے بی کے قبیلے میں یہ گاؤں چائنا روڈ پر ہے۔ وہاں سے تم ساگر ماتا کا نظارہ کرے گا۔ بہت سے ٹورسٹ ساگر ماتا (ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی) کا نظارہ کرنے ادھر ہی جاتے ہیں۔ آپ بھی ادھر ہی جاؤ۔ سردار کوداری کو پتا چلے گا کہ تم اس کا بے بی کے پاس سے آیا ہے تو وہ بہت خوش ہوگا۔ تمہارا بہت خاطر کرے گا۔"

"نہیں شیرپا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "پہلے ہم دیسولی بازار جائیں گے۔ ایک دن وہاں قیام کرنے کے بعد واپس کھٹمنڈو سے ہوتے ہوئے ایورسٹ کا رخ کریں گے۔"

اور پھر اسی شام میں اور ببلا ان سے رخصت ہوگئے۔ اس وقت مایا متی بھی وہاں موجود تھی۔ میں نے اسے مدھومالا اور شوبھا کا خیال رکھنے کو بھی کہہ دیا تھا۔

اس وقت شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شہر سے نکل کر میں نے گاڑی کا رخ جنوب میں پرتھوی ہائی وے کی طرف موڑ دیا۔ کیونکہ دیسولی کی طرف میرا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پرتھوی ہائی وے پہاڑوں میں بل کھاتی ہوئی گورکھا نامی شہر کی طرف چلی گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آدھی رات سے پہلے ہم دو سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرکے پوکھارا پہنچ جائیں گے اور رات کا باقی حصہ وہاں گزار کر اپنی اصل منزل کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔

آدھے گھنٹے بعد سورج غروب ہوگیا۔ میں نے کار کے ہیڈ لیمپس روشن کردیے اور اس بل کھاتی ہوئی سڑک پر ٹریفک سے بچنے کی کوشش کرتا ہوا مناسب حد تک کار کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

ہم رات گیارہ بجے کے قریب پوکھارا پہنچ سکے تھے۔ کھٹمنڈو کے بعد یہ نیپال کا دوسرا بڑا شہر تھا۔ یہاں ہوائی اڈا بھی تھا۔ بندیا وسن مندر کی وجہ سے بھی یہاں لوگوں کی آمدورفت زیادہ تھی۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی ہندو' مندروں کی یاترا کے لیے پورے ملک میں گھومتے رہتے تھے۔

بازاروں میں اس وقت بھی خاصی رونق تھی۔ بعض علاقے تو ایسے تھے جہاں دن کا گماں ہوتا تھا۔ دولت مند لوگ نائٹ کلبوں اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں رنگ رلیاں مناتے تھے اور محنت کش اور غریب لوگ دن بھر کام کاج کی تھکن اتارنے کے لیے ریستورانوں اور ایسے چھوٹے ہوٹلوں میں جمع رہتے تھے جہاں رقص اور موسیقی کا پروگرام بھی ہوتا

تھا۔ ایک کپ چائے، کافی یا ٹاڑی کے ایک پیگ کے ساتھ یہ لوگ رقص و موسیقی سے بھی لطف اندوز ہولیتے تھے اور اسی کو زندگی کی بہت بڑی عیاشی سمجھتے تھے۔

ہمیں درمیانے درجے کے ایک ہوٹل میں کمرا مل گیا۔ ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کے دوران میں ویٹر سے دھرچن جانے والے راستے کے بارے میں بھی دریافت کرتا رہا۔ ویٹر نے ہمیں یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ کھانے کے بعد ہم تفریح سے لطف اندوز ہونا چاہیں تو تیسری منزل پر واقع نائٹ کلب میں جاسکتے ہیں۔ ہوٹل میں قیام پذیر مہمانوں سے کوئی ایکسٹرا چارجز نہیں لیے جاتے۔

ہمیں رہائش کے لیے جو کمرا ملا تھا وہ ساتویں منزل پر تھا اور ڈائننگ ہال دوسری منزل پر۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ہم تیسری منزل پر آگئے۔ زندگی کے ہنگامے یہاں عروج پر تھے۔ ایک ہال میں جوا ہورہا تھا۔ کوئی بھی میز خالی نہیں تھی۔ ہر میز کے گرد رش لگا ہوا تھا۔ نیم عریاں لباس میں لڑکیاں بھی معقول تعداد میں موجود تھیں۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو شکار کی تلاش میں ایک میز سے دوسری میز کے گرد گھوم رہی تھیں۔

اس ہال میں شور بھی بہت تھا اور سگریٹوں کا دھواں بھی اس طرح بھرا ہوا تھا کہ سانس لینا دشوار ہورہا تھا۔ ہم دوسرے ہال میں آگئے۔ یہاں کی فضا قدرے مختلف تھی۔ میزوں پر گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ خوب صورت ویٹریس گاہکوں کو شراب اور دیگر مشروبات سرو کرتی پھر رہی تھیں۔ تیز موسیقی کی دھنوں میں ایک رقاصہ تھرک رہی تھی۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ ایک میز پر ہمیں بھی جگہ مل گئی۔ ویٹریس جیسے ہی ہماری طرف آئی ببلا نے اسے کافی کے لیے کہہ دیا۔

پہلی رقاصہ اسٹیج کے پیچھے غائب ہوگئی۔ اس کی جگہ ایک اور رقاصہ نے لے لی۔ وہ کچھ دیر تک اسٹیج پر ڈانس کرتی رہی پھر فلور پر آگئی اور میزوں کے درمیان تھرکنے لگی۔ یہ رقاصہ خاصی شوخ و چنچل تھی اور گاہکوں کے دل لبھانے کے گر جانتی تھی۔ وہ کسی کے گال پر چٹکی بھرتی' کسی کی ٹھوڑی کو چھوتی' کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکتی اور کسی کو آنکھ سے اشارہ کرتی ہوئی نکل جاتی۔

کافی ختم ہوتے ہی میں نے ببلا کو اشارہ کیا اور ہم وہاں سے اٹھ کر لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل پر اپنے کمرے میں آگئے۔ ہمارا کمرا راہداری کے آخر میں تھا جس کی کھڑکی سے شہر کے اس طرف کے حصے کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ ببلا کچھ دیر میرے قریب کھڑی رہی پھر بیڈ پر لیٹ گئی اور میں بدستور کھڑکی کے سامنے کھڑا شہر کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔

میں آنے والی صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جنرل کھوراٹ نے یہاں بھی قدم جمانے شروع کردیے تھے۔ وہ اس پرسکون اور پرامن خطے کو بھی گولڈن ٹرائی اینگل بنا دینا چاہتا تھا۔ یہاں کی خوشگوار فضا میں بھی زہر گھول دینا چاہتا تھا۔ اس کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا بھی تو وہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا تھا۔ بڑی بڑی حکومتیں بھی اس کے سامنے بے بس ہوکر رہ گئی تھیں۔ بعض حکومتوں کے مفادات اس سے وابستہ تھے اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی سے ہچکچاتی تھیں۔

موت کے ان ہرکاروں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روکنے والوں کی تعداد تو بہت کم تھی البتہ ناگ پال جیسے بے ضمیر لوگوں کی کمی نہیں تھی۔ ایسے لوگ ہر جگہ بڑی تعداد میں مل جاتے تھے جو چند ٹکوں کے لیے اپنی ماں جیسی دھرتی کا سودا کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

میں عرصے سے موت کے ان سوداگروں سے برسرپیکار تھا۔ میری جنگ کی ابتدا میرے ماں باپ کے قتل سے ہوئی تھی۔ شاید بات وہیں ختم ہوجاتی لیکن دارا جس طرح میرا پیچھا کرتا رہا تھا اس سے میرے دل میں نفرت بڑھتی گئی۔ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے اس نے کئی بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ پہلے میں اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا رہا پھر جب میں پلٹ کر حملہ آور ہوا تو دارا پناہ ڈھونڈنے لگا۔ اسے پناہ بھی ایسے لوگوں کے پاس ملی جو اس سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ انہوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کردیا۔

دارا ختم ہوگیا لیکن برائی ختم نہیں ہوئی۔ اس کی جڑیں تو زمین کے اندر ہی اندر پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس برائی کو ختم کرنا مجھ جیسے اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی اور میں نے بھی تہیہ کرلیا تھا کہ جب تک دم میں دم ہے اس برائی کا مقابلہ کرتا رہوں گا۔ بدی کے ان ٹھیکے داروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں اور میں درندوں کی طرح مار دھاڑ کرتا پھر رہا ہوں لیکن میں ایسے لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی برائی کے خلاف لڑنا بھی بہت بڑا جہاد ہے اور میں نے اس جنگ کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔

میں دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑا یہی سب کچھ سوچتا رہا

پھر مڑ کر دیکھا تو ببلا بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی سو چکی تھی۔ اس بیڈ کے علاوہ کمرے میں دو کرسیاں اور ایک چھوٹی ٹیبل تھی۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے نہیں سو سکتا تھا۔ بیڈ ڈبل تھا۔ دو آدمی آرام سے سو سکتے تھے لیکن ببلا اس طرح پھیل کر سو رہی تھی کہ دوسرے کے لیے جگہ نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے دھکیل کر ایک طرف کر دیا اور بیڈ کے کنارے پر لیٹ گیا۔

صبح سات بجے میری آنکھ کھل گئی۔ ببلا مجھ سے پہلے ہی جاگ چکی تھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اٹھ کر اس کے قریب آگیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی تھی۔ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

نو بجے کے قریب ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ آدھے گھنٹے تک شہر کی سڑکوں پر گھومنے کے بعد ہم کاشا کی طرف جانے والی سڑک پر نکل آئے۔ یہی سڑک بگلانگ اور بینی سے ہوتی ہوئی دھرپتن کی طرف چلی گئی تھی۔

دھرپتن وہاں سے تقریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ سڑک اگرچہ پختہ تھی مگر زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ بعض مقامات پر تو سڑک اس قدر تنگ تھی کہ سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے سڑک کے انتہائی کنارے پر رکنا پڑتا تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس سڑک پر ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ اِکا دُکا پرائیویٹ کاروں اور کبھی کبھار اِکا دُکا بسوں کی آمد و رفت تھی۔

کاشا نامی قصبے کا ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا بھی تھا۔ غربت کے باوجود لوگ دور دراز کے علاقوں تک آمد و رفت کے لیے ہوائی جہاز پر سفر کرنے پر مجبور تھے۔

کاشا میں تھوڑی دیر رکنے کے بعد ہم آگے روانہ ہو گئے اور بگلانگ میں رکے بغیر فاصلہ طے کرتے ہوئے بینی نامی قصبے تک پہنچ گئے۔ یہ قصبہ سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا۔ یہاں سے ایک سڑک تقریباً پچیس ہزار فٹ بلند انا پورنا کی برف پوش چوٹیوں کی طرف چلی گئی تھی۔ انا پورنا کے اس پار چین کی سرحد پر مستانگ نامی وہ قبیلہ آباد تھا جس کی عورتوں کے بارے میں شیرپا نے دلچسپ حکایات سنائی تھیں لیکن ہمیں اس طرف نہیں جانا تھا۔

بینی سے دوسری سڑک رائل ہنٹنگ ریزرو کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ شاہی شکار گاہ میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرف گھنے جنگلات تھے جن میں ہاتھیوں کے علاوہ شیر، چیتے، سانبھر اور دوسرے درندے بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ اس شکار گاہ میں عام لوگوں کے داخلے پر پابندی تھی۔ نیپال کے دورے پر آنے والی اعلیٰ غیر ملکی شخصیات کو شکار کی تفریح کے لیے یہاں لایا جاتا تھا۔

شکار گاہ کے کنارے پر دھرپتن نامی وہ قصبہ تھا جس کے نام سے یہ شکار گاہ موسوم تھی۔ راستے میں کئی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ یہ سب بدھ مذہب کے پیروکار تھے جو ان پہاڑوں میں بڑی کٹھن زندگی گزار رہے تھے۔

دھرپتن زیادہ بڑا قصبہ نہیں تھا۔ اس کی آبادی دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ یہاں ایک پولیس اسٹیشن بھی تھا۔ یہ پولیس اسٹیشن دراصل شاہی شکار گاہ کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ غیر متعلق لوگ اس جنگل کا رخ نہ کر سکیں۔

اس وقت دو بجنے والے تھے۔ میں نے کار ایک ریسٹورنٹ کے سامنے روک لی۔ وہ ایک چھوٹا سا ہال تھا جس میں سالخوردہ سی میزیں اور جھولتی ہوئی بینچ رکھی ہوئی تھیں۔ گاہکوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اس قصبے کی آبادی بھی زیادہ تر بدھ پیروکاروں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ پہاڑوں کے دامن میں چاول کاشت کرتے تھے۔ چاول کی کاشت ہی ان کا ذریعہ معاش تھی۔

اس ہوٹل میں ہمیں بھی دال چاول ہی کھانے کو ملے تھے۔ ابھی ہم کھانا کھا رہے تھے کہ ایک پرانی سی موٹر سائیکل ہوٹل کے سامنے آکر رکی۔ وہ ایک پولیس والا تھا جس کے جسم پر سلوٹ زدہ پرانی سی وردی تھی۔ لگتا تھا یہ وردی کئی روز سے اس کے جسم سے الگ نہ ہوئی تھی۔ وہ موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر کے ہوٹل میں داخل ہوا اور اِدھر اُدھر دیکھے بغیر چلتا ہوا سیدھا ہماری میز کے قریب آگیا۔

پولیس والے کی جرح خاصی تکلیف دہ اور طویل تھی۔ ہمارے پاس کسی قسم کے کاغذات نہیں تھے اور پولیس ہمارے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے بریندرا کا کارڈ استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کھانا ختم کر کے ہم اس پولیس والے کے ساتھ پولیس اسٹیشن آگئے۔ یہ سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی ایک مختصر سی عمارت تھی اور اس پولیس اسٹیشن کا عملہ صرف چھ اہلکاروں پر مشتمل تھا۔ اس تھانے کا انچارج ایک بھاری بھرکم آفیسر تھا جس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔ اس کا چہرہ بڑا کرخت تھا اور لہجے میں بھی درشتی تھی۔ اس نے مجھ سے کاغذات طلب کیے تو میں نے انسپکٹر بریندرا کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

کارڈ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ اس نے نیپالی زبان میں اپنے ایک ماتحت سے کچھ کہا۔ وہ فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ چند سیکنڈ کسی سے بات کرتا رہا پھر اس نے ریسیور آفیسر کی طرف بڑھا دیا۔

آفیسر تقریباً پانچ منٹ تک فون پر بات کرتا رہا۔ اس دوران اس نے دو تین مرتبہ بریندرا کا نام بھی لیا تھا پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اب اس کے چہرے کے تاثرات بدل چکے تھے۔ اس کے لہجے میں ایک دم مٹھاس سی آگئی تھی۔

”لگتا ہے تم لوگ یہاں شکار کھیلنے آئے ہو۔ تمہارے پاس اسلحہ کون سا ہے؟“ اس نے پوچھا اور پھر ببلا کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہمارے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے اور ہمارا شکار کھیلنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا ”ہم ٹورسٹ ہیں اور رکم کوٹ سے ہوتے ہوئے نیشنل پارک کی طرف جانا چاہتے ہیں۔“

آفیسر نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور پھر بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں ہونے لگیں۔ اس نے ہماری خدمت خاطر میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ پانچ بجے کے قریب جب ہم روانگی کے لیے تیار ہوئے تو وہ پریشان سا ہو گیا۔

”ایک ڈیڑھ گھنٹے میں سورج غروب ہو جائے گا۔ راستے بڑے مخدوش ہیں۔ رات کے وقت سفر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ تم لوگ آج رات یہاں آرام کرو۔ صبح سویرے روانہ ہو جانا۔“

”رات ہم رکم کوٹ یا موسی کوٹ میں گزارنا چاہتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہم سورج غروب ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم زیادہ دیر وہاں نہیں رکے۔ ان پولیس والوں نے ہمیں اس طرح رخصت کیا جیسے ہم ان کے بہت قریبی دوست ہوں۔

قصبے سے نکلتے ہی میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور رکم کوٹ کی طرف جانے والی سڑک پر تقریباً بیس کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس کا رخ دائیں طرف ایک کچی سڑک پر موڑ دیا۔ یہ راستہ شکار گاہ کے جنوب کی طرف واقع پدمی قصبے کی طرف چلا گیا تھا۔ یہی وہ قصبہ تھا جہاں چانگ لی چھپا بیٹھا تھا اور اگلے روز اس کے آدمی ہماچل پردیش کی طرف سے پانچ سو کلو ہیروئن لے کر آنے والے تھے اور میں ان کا راستہ روکنا چاہتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ موت کے منہ میں چھلانگ لگانے جا رہا ہوں لیکن میں خطرات سے نہیں ڈرتا تھا۔ میری تو زندگی ہی موت کے حصار میں گزری تھی۔ خطرے کا لفظ میرے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ ببلا کو میں ساتھ نہیں لانا چاہتا تھا لیکن اس نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ مجھے اکیلے مرنے بھی نہیں دے گی۔

پدمی جنگل کے بالکل کنارے پر آباد تھا اور پختہ سڑک سے، جہاں سے ہم مڑے تھے، فاصلہ پینتیس چالیس کلو میٹر کے قریب تھا۔ اس طرف بھی درختوں کی بہتات تھی۔ راستہ پہاڑیوں میں بل کھاتا ہوا اور جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ میں دعا مانگ رہا تھا کہ کار کا کوئی ٹائر جواب نہ دے جائے۔ پیٹرول کی مجھے فکر نہیں تھی۔ میں نے دھرپتن کے پمپ سے ٹینکی فل کروالی تھی اور ڈکی میں بھرے ہوئے دو فاضل کین بھی موجود تھے۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلتا چلا گیا۔ قصبے سے تقریباً دو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بلند جگہ پر میں نے کار روک لی۔ بائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دریا تھا اور دائیں طرف گھنے درخت تھے۔ یہاں سے وہ پُل بھی نظر آرہا تھا جہاں سے دوسری طرف سے آنے والی سڑک قصبے کی طرف چلی گئی تھی۔ یہی وہ سڑک تھی جہاں سے چانگ لی کے آدمیوں کو گزرنا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر وہ لوگ قصبے تک پہنچ گئے تو ان پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے میں نے انہیں قصبے سے باہر ہی روکنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کچھ دیر تک اونچی جگہ پر کھڑا صورت حال کا جائزہ لیتا رہا پھر دوبارہ کار میں بیٹھ گیا۔

دریا کا پل پار کر کے میں نے کار سڑک سے ہٹا کر گنجان درختوں میں روک لی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس علاقے کے نقشے کا بہت باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ قصبے کی طرف جانے والے یہی دو راستے تھے۔ اگر وہ کسی تیسری سمت سے نکل گئے تو پھر مجھے بھی اپنا پروگرام بدلنا پڑے گا۔

ببلا بھی نیچے اتر آئی تھی۔ وہ کار کے آس پاس ٹہلتی رہی۔

اندھیرا جیسے جیسے گہرا ہو رہا تھا وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ ببلا کار کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ میں بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار کی اندر کی بتی جلا دی۔

ہمارے چاروں طرف سناٹا تھا۔ حشرات الارض کی آوازیں واقعی دل پر وحشت سی طاری کر رہی تھیں۔ ہم دونوں وقت گزارنے کے لیے باتیں کرتے رہے لیکن وقت تو کسی طرح کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

اور پھر وہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ ببلا نے بھی وہ

آواز سن لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں غور سے اس آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ لگتا تھا جیسے کوئی دبے قدموں ہماری طرف آرہا ہو۔ پیروں کے نیچے خشک پتے دبنے سے چرچراہٹ کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کار کی اندر کی بتی بھی بجھا دی۔ پتلون کا پائنچہ اٹھا کر خنجر نکال لیا اور گہری نظروں سے کار کی پچھلی طرف دیکھنے لگا۔ گمبھیر تاریکی میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا بہت محتاط انداز میں دبے قدموں کار کی طرف آرہا تھا۔

میں نے بملا کو بے حرکت بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور کار کے ساتھ جھک کر پچھلے پہیے کے قریب آگیا اور گہری نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں کے سامنے روشنی پھیل گئی ہو۔ مجھے دور دور تک صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے اٹھ کر کار کے اندر جھانکا۔ بملا بھی مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ وہ اس وقت پانی کی بوتل منہ سے لگائے ہوئے تھی پھر اس نے بوتل منہ سے ہٹا کر ڈھکنا بند کردیا اور خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی لیکن ٹھیک اسی وقت میں نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔

پتوں کی چرچراہٹ کی آواز سن کر میں اس طرف متوجہ ہوگیا اور پھر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ ایک بھیڑیا تھا جو دبے قدموں کار کی طرف آرہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے دے مارا۔

پتھر بھیڑیے کے سر پر لگا۔ وہ ایک دم اوپر اچھلا اور پھر کتے کی طرح چیاؤں پیاؤں کرتا ہوا ایک طرف بھاگ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی کار سے بملا کے چیخنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ بملا بھیڑیے کی آواز سے ڈر گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ چیخ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"ارے کیوں چیخ رہی ہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "وہ کوئی کتا تھا یا بھیڑیا۔ ایک ہی چوٹ کھا کر بھاگ گیا۔"

میں نے اسے دونوں بانہوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹا دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے منہ سے ایک بار پھر چیخ نکل گئی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے کہا "میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں کیا؟"

"تت۔۔۔ تمہاری آنکھیں۔۔۔" وہ خوف زدہ انداز میں ہکلائی۔

"کیا ہوا میری آنکھوں کو؟" میں نے پوچھا۔

"تت۔۔۔ تمہاری آنکھیں بلی کی طرح چمک رہی ہیں۔" اس کے لہجے میں خوف اب بھی برقرار تھا۔

"اوہ!" میں ایک دم چونک گیا۔ میں ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف اگرچہ گہری تاریکی تھی مگر مجھے ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ میں بلی کے بارے میں جانتا تھا کہ اندھیرے میں اس کی آنکھیں بلور کی طرح چمکتی ہیں اور وہ گہری تاریکی میں بھی دیکھ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تو کیا میرے اندر بھی یہ صلاحیت پیدا ہوگئی تھی کہ میں اندھیرے میں بلی کی طرح دیکھ سکتا تھا۔

بملا اب بھی وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ میری آنکھوں میں اتنی چمک کیسے پیدا ہوگئی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جب شاؤلن ٹیمپل میں مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور ہکسیان کے فرار کے بعد میں اپنے ایک دوست کے گھر میں تھا اور چائے پینے کے دوران میز پر رکھا ہوا کپ میری نظروں کی قوت سے اپنی جگہ سے سرک گیا تھا۔ وہ میری چی کی قوت کا کمال تھا۔ اس کا ایک مظاہرہ اس وقت بھی ہوا تھا جب چیانگ رائے سے واپسی پر بنکاک ائرپورٹ سے بھی ہمیں ایک بند وین میں اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور میری نظر کی قوت سے وین کے دروازے کا تالا ٹوٹ گیا تھا۔

چی میں بڑی پراسرار قوتیں پوشیدہ تھیں لیکن میں نے کبھی ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اپنی قوت بازو پر بھروسا کیا تھا۔ تاہم کبھی کبھار یہ پراسرار قوت از خود میری مدد کو آجاتی تھی۔ جیسا کہ اس وقت ہوا تھا اور میری آنکھوں میں اس قدر قوت پیدا ہوگئی تھی کہ میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ چند روز پہلے نیلگری جیسی مہان شکتی میرے سامنے آگئی تھی۔ ایک حسین عورت کی صورت میں۔ وہ جس طرح پراسرار انداز میں میرے سامنے آئی تھی اسی طرح پراسرار انداز میں غائب

بھی ہوگئی تھی۔ البتہ وہ اپنی مالا کا تحفہ چھوڑ گئی تھی اور یہ سیاہ پتھروں کی مالا اس وقت بھی میرے گلے میں تھی جب پانڈے کی حویلی میں پنڈت موہن نے خنجر سے مجھ پر حملہ کیا تھا اور یہ وار میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا نے روکا تھا۔ یہ پراسرار مالا اب بھی میرے گلے میں موجود تھی۔ میری انگلیاں غیر ارادی طور پر مالا کے پتھروں کو چھونے لگیں اور پھر بملا کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں لیکن کچھ دیر پہلے میری آنکھوں میں پیدا ہونے والی وہ پراسرار روشنی غائب ہو چکی تھی اور میرے چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

میں نے کار کی اندر کی بتی جلا دی۔

"اب میری آنکھیں کیسی ہیں؟" میں نے بملا سے پوچھا۔

"حیرت انگیز۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "اب تو مجھے ان آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔"

بملا کا خوف دور ہوگیا تھا۔ میں نے ہوا کی آمدورفت کے لیے کار کے دونوں طرف کے شیشے گرا دیے تھے لیکن کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں بڑی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

دینا ناتھ نے بتایا تھا کہ چانگ لی کے وہ آدمی آدھی رات اور صبح کے درمیان کسی وقت پدمی پہنچیں گے اور ابھی تو رات کے دس ہی بجے تھے۔ ویسے میرے خیال میں ان لوگوں کی پلاننگ بہت عمدہ تھی۔ سیکڑوں میل دور سے سنسان راستوں پر سفر کرتے ہوئے ہیروئن یہاں تک لے آنا بڑے کمال کی بات تھی۔ راستے میں نہ تو کسی کو شبہ ہو سکتا تھا اور نہ ہی چیکنگ کا اندیشہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں پولیس کی چوکیاں ضرور ہوں گی لیکن چھوٹی چوکیوں پر تعینات پولیس والوں کو رشوت دے کر راستے سے ہٹا دینا بڑی بات نہیں تھی۔

دھرچن کی ایک دکان سے میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے لی تھیں۔ بملا نے وہ تھیلا نکال لیا اور ایک چھوٹا کیک نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ دوسرا اس نے خود لے لیا۔

کھانے کے بعد ہم کچھ دیر تک کار کے آس پاس کھلی جگہ پر ٹہلتے رہے اور پھر کار میں بیٹھ گئے۔

بملا پچھلی سیٹ پر بیٹھی اونگھتی رہی اور میں کبھی نیچے اتر کر ٹہلنے لگتا اور کبھی پھر کار میں بیٹھ جاتا۔

ساڑھے تین بجے کے قریب ایک آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ گرر گرر کی وہ مدھم سی آواز اس ویرانے میں کسی گاڑی کی موجودگی کی نشان دہی کررہی تھی۔ سناٹے میں یہ آواز کبھی قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی اور کبھی بہت دور سے۔

میں نے بملا کو جگا دیا۔ اس نے بھی وہ آواز سن لی۔ میں نے دروازہ کھول کر بملا کو نیچے اتار لیا اور اسے دونوں بانہوں سے پکڑ کر اس کی پشت کار سے لگا دی۔ وہ گھٹنوں تک اسکرٹ اور اوپر بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے بلاؤز کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر زوردار جھٹکا دیا۔ بلاؤز کے سارے بٹن ٹوٹ گئے۔ بملا ایک دم چیخ اٹھی۔

"ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیا بدتمیزی۔۔۔!"

میں نے اس کے چیخنے کی پروا کیے بغیر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا اور بلاؤز کی ایک آستین بھی پھاڑ دی۔ اس کا کندھا بھی برہنہ ہوگیا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے اسکرٹ کے ایک طرف کے چاک کو دونوں کناروں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ چاک اوپر تک کھلتا چلا گیا۔ بملا مجھ پر گھونسے برسا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ چیخ رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔ تم پاگل ہوگئے ہو۔ وحشی ہو تم۔۔۔"

"اس طرح چیختے ہوئے اچھی لگتی ہو۔" میں نے اس کی دونوں بانہوں کو پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

میرے کان اب بھی گاڑی کے انجن کی اس آواز پر لگے ہوئے تھے جو اب بہت واضح ہوگئی تھی۔ میں نے گردن گھما کر اس طرف دیکھا۔ سڑک پر درختوں میں چھنتی ہوئی روشنی بھی نظر آرہی تھی۔

"اب تم اس طرف بھاگنا شروع کردو۔ چیختے ہوئے۔۔۔ تیزی سے۔۔۔" میں نے یہ کہتے ہوئے بملا کو سڑک کی طرف دھکیل دیا۔

بملا نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دحشت تھی لیکن وہ میری بات سمجھ گئی تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح چیختی ہوئی سڑک کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

رات کے آخری پہر آبادی سے میلوں دور جنگل میں ایک جوان اور خوب صورت عورت کا اس طرح نظر آنا کہ اس کا لباس پھٹا ہوا ہو اور وہ خوف سے چیخ رہی ہو، کسی بھی شخص کو متاثر کرسکتا تھا اور وہ شخص فوری طور پر یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ کوئی ناٹک بھی ہوسکتا تھا۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ بملا درختوں سے نکل کر سڑک کی طرف بھاگ رہی تھی اور پھر وہ کار بھی گنجان درختوں سے

نکل کر سامنے سڑک پر آگئی تھی۔
بملا سڑک پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ بملا اب اس گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں تھی۔ اسی لمحے فضا میں بریکوں کی چرچراہٹ کی تیز آواز گونجی۔ گاڑی بملا سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گئی۔ بملا سڑک پر گری اور اٹھ کر ایک بار پھر چیختے ہوئے دوڑنے لگی۔

میں بھی سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ اسی لمحے گاڑی کے دونوں طرف کے دروازے کھلے اور دو آدمی نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک نے لپک کر بملا کو پکڑ لیا اور دوسرا پستول تان کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"اے۔ رک جاؤ۔ گولی مار دوں گا۔" وہ چیخا اور ساتھ ہی اس نے مجھے ڈرانے کے لیے ہوائی فائر بھی کر دیا تھا۔
"تم کون ہو۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ وہ میری پتنی ہے۔" میں نے بھی چیخ کر کہا۔
"یہ جھوٹ بولتا ہے۔" بملا چیخی "یہ مجھے اغوا کر کے لایا ہے۔ ہم رات گزارنے کے لیے یہاں رک گئے تھے۔ میں نے تم لوگوں کی گاڑی کی روشنی دیکھی تو بھاگ کھڑی ہوئی۔ بچا لو مجھے اس شیطان سے۔"
"کیوں مہاشے۔" پستول والا غرایا "یہ کیا کہہ رہی ہے؟"
"ٹھیک ہے، میں اسے اغوا کر کے لایا ہوں۔ تم لوگ مداخلت کرنے والے کون ہوتے ہو۔ اس لڑکی کو میرے حوالے کر دو۔" میں نے کہا۔
"یہ لونڈیا اب تمہارے حوالے نہیں ہوگی۔" دوسرے آدمی نے کہا۔ جس نے بملا کو سنبھال رکھا تھا "یہ لڑکی اب ہماری پناہ میں آگئی ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ چپکے سے یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ یہیں تمہاری لاش گرا دیں گے۔"
"ہاتھ میں پستول ہے۔ اسی لیے بہت بہادر بنتے ہو۔" میں نے کہا "مرد کے بچے ہو تو خالی ہاتھ آؤ۔ تم دونوں کی لاشیں یہاں پڑی ہوں گی۔"
"سندر!" پستول والا طیش میں آگیا۔ اس نے اپنا پستول جیب میں ٹھونس لیا "تم اس لڑکی کا خیال رکھو۔ میں اسے دیکھتا ہوں۔"
میں دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ وہ صرف دو ہی تھے۔ ان کے ساتھ تیسرا کوئی نہیں تھا۔ پستول والا دونوں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس کے سینے پر لگی۔ وہ ڈکراتا ہوا نیچے گرا۔ میں نے سنبھل کر اس پر چھلانگ لگا دی۔ کچھ دیر تک اسے سڑک پر رگیدتا رہا پھر اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی لیکن وہ بھی جلد ہی سنبھل گیا۔
میں اس پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اس میں طاقت بھی تھی اور وہ لڑائی کے فن سے بھی واقف تھا اور وہ بھی بڑے اچھے داؤ پیچ استعمال کر رہا تھا۔ ایک موقع پر اس نے بھی اچھل کر مجھے فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنے آپ کو بچا گیا تھا۔
میرے حریف نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ میں نے بھی بڑی پھرتی سے اپنا خنجر نکال لیا۔ اس نے جیسے ہی پستول والا ہاتھ سیدھا کیا میں ہوا میں اڑتا ہوا اس کے اوپر گرا۔ میرا خنجر اس کے بازو میں پیوست ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی انگلی سے ٹریگر دب گیا تھا۔ گولی میرے سر کے قریب سے گزر گئی۔ میں نے اسے دوسرا فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ بازو پر خنجر کے دوسرے وار سے پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
اس کا دوسرا ساتھی سندر، جس نے بملا کو سنبھال رکھا تھا اسے چھوڑ کر میری طرف لپکا لیکن اسی لمحے بملا کی غراتی ہوئی آواز فضا میں گونجی۔
"رک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گی۔"
بملا کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے بڑی ہوشیاری سے سندر کی جیب سے نکال لیا تھا۔ سندر کے چہرے پر سنسنی سی پھیل گئی۔ اس نے بملا کی طرف چھلانگ لگا دی لیکن بملا یکے بعد دیگرے ٹریگر دباتی چلی گئی۔ تین گولیاں سندر کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔
میرے نیچے دبے ہوئے حریف نے مجھے ایک طرف دھکیل کر اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگا دی لیکن میں نے اسے زیادہ دور نہیں جانے دیا۔ سڑک کے کنارے سے چند گز آگے جھاڑیوں میں اسے جا لیا۔ اس کی گردن میری گرفت میں آگئی اور میں نے اسے اس وقت ہی چھوڑا تھا جب اس کی گردن ڈھلک گئی تھی۔
میں اسے چھوڑ کر بملا کی طرف آگیا۔
"میں اپنی گاڑی لے کر آتا ہوں۔ تم یہیں رکو۔" میں یہ کہتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف دوڑ گیا۔
گاڑی وہاں لانے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے اور پھر میں اور بملا دوسری گاڑی سے ہیروئن کے پیکٹ نکال

نکال کر اپنی گاڑی میں رکھنے لگے۔
دس دس کلو کے پچاس پیکٹ تھے۔ ڈکی بھر جانے کے بعد ہم نے کچھ پیکٹ پچھلی سیٹ پر ڈال دیے۔ بملا نے اپنا بیگ اٹھا کر آگے والی سیٹ پر اپنی گود میں رکھ لیا۔ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار کو دریا کی مخالف سمت میں دوڑا دیا۔
"اگر تم اتنی اچھی اداکاری نہ کرتیں تو۔۔۔"
"میرا گال ابھی تک دکھ رہا ہے۔ بڑے زور کا تھپڑ مارا تھا تم نے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔
"اگر تھپڑ نہ مارتا تو اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ نہ آتا۔ بہرحال مجھے افسوس ہے۔" میں نے کہا۔
بملا نے گود میں رکھا ہوا بیگ کھول کر دوسرے کپڑے نکال لیے۔ بیگ پچھلی سیٹ پر پھینک دیا اور سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کپڑے بدلنے لگی۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد کار دوبارہ پختہ سڑک پر آگئی۔
جس جگہ یہ سارا ڈراما ہوا تھا وہاں سے بڑی بستی تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہوگی۔ چانگ لی وغیرہ کو معلوم ہوگا کہ ان کے آدمی ہیروئن لے کر پہنچنے والے ہیں۔ وہ ان کے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔ رات کے سناٹے میں تو فائر کی آواز دور تک گونجتی ہے۔ ہو سکتا ہے فائرنگ کی آواز انہوں نے بھی سنی ہو۔ اگر وہ صورت حال معلوم کرنے اس طرف آئے تو انہیں دریا کے پل کے قریب دو لاشیں اور ایک خالی گاڑی ملے گی۔ وہ یقیناً ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور میں ان سے پہلے ہی ان پہاڑوں میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔
مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا رخ کس طرف تھا۔ پکی سڑک پر کئی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے کار کو دریا کے ساتھ ایک کچے راستے پر موڑ دیا۔ ایسے ہی راستے ہمارے لیے محفوظ تھے۔
ہم دریا کے ساتھ ساتھ کئی میل دور نکل آئے پھر اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور کار لہرا گئی۔ بملا اونگھ رہی تھی۔ دھماکے کی آواز سے وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔
کار کا اگلا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔ میں کار روک کر نیچے اتر آیا۔ کار کی ڈکی میں ایک فاضل ٹائر موجود تھا اور وہ فاضل ٹائر نکالنے کے لیے پہلے ڈکی میں بھرے ہوئے پیکٹ نکالنے پڑے۔
ٹائر تبدیل کرنے اور ہیروئن کے پیکٹ دوبارہ ڈکی میں رکھنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں نے پانچ گیلن والا پیٹرول کا ایک کین بھی ٹینکی میں انڈیل لیا تھا۔
دریا کے ساتھ ساتھ مزید ایک گھنٹے تک سفر جاری رہا۔ اب دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ وہ تنگ سا راستہ بتدریج بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک طرف عمودی چٹان تھی اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ سامنے سے کوئی اور چھوٹی کار بھی آجاتی تو کراس کرنا مشکل ہو جاتا۔
ایک موڑ کاٹتے ہوئے ایک بار پھر زوردار دھماکا ہوا۔ اس مرتبہ آگے کا دوسری طرف کا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ کار لہرا گئی اور دائیں طرف کی چٹان سے ٹکرا کر پیچھے آنے لگی۔ میں نے بریک پیڈل دبا دیا لیکن یہ جان کر میں کانپ اٹھا کہ بریک کام نہیں کر رہا تھا۔ کار پیچھے ڈھلان کی طرف جا رہی تھی۔
"بملا۔ کار سے اترو۔ چھلانگ لگا دو!" میں چیخا "جلدی کرو۔ کار کھڈ کی طرف جا رہی ہے۔ بریک کام نہیں کر رہے۔"
بملا کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دی۔ میں کار کا رخ سیدھا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کا پچھلا ایک پہیہ کنارے سے اتر گیا اور پھر کار کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں رہا۔ کار کے پچھلے دونوں پہیے کنارے سے اتر چکے تھے۔ میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی لیکن میں بھی کھڈ کے عین کنارے پر گرا۔ میں نے ایک پتھر کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن پتھر اکھڑ گیا۔
کار قلابازیاں کھاتی ہوئی عمودی ڈھلان پر سیکڑوں فٹ نیچے بہتے ہوئے دریا کی طرف جا رہی تھی اور اس کے پیچھے میں ڈھلان پر لڑھکتا ہوا جا رہا تھا۔
میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں بلندی سے پستی کی طرف گرتا جا رہا تھا جہاں موت آغوش وا کیے کھڑی تھی۔

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
طالوت
3 حصوں میں (مکمل)
قیمت فی حصہ 50 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

میرے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ دور کھڑے تھے اور کچھ قریب کھڑے رکوع کے بل جھکے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سب چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ دھند میں لپٹے ہوئے۔

ایک نسوانی چہرہ میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ بہت ہی صبیح و ملیح چہرہ تھا لیکن اس حسین چہرے پر یاس، افسردگی اور آنکھوں میں وحشت سی بھری ہوئی تھی۔

میں بے حس و حرکت پڑا چند لمحے اس کی وحشت زدہ سی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور جب اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تو سر کے پچھلے حصے سے اٹھنے والی درد کی شدید لہر بجلی کی لہروں کی طرح میری پوری کھوپڑی میں پھیلتی چلی گئی اور میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ میرے کراہنے کی آواز اور چہرے پر نمودار ہونے والے کرب سے اس حسینہ کے چہرے پر غم کے سائے کچھ اور بھی گہرے ہوگئے اور تب مجھے احساس ہوا کہ میرا سر اس کی گود میں تھا۔ ایک ہاتھ اس نے میرے سر کے نیچے رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے بار بار میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے میں نے دانت بھینچ لیے اور آنکھیں بند کرلیں۔ سر میں درد کی لہریں اب بھی لپک رہی تھیں اور دماغ میں ہلکے ہلکے سے دھماکے ہو رہے تھے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر دیدے گھما کر اپنے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی اور بچے بھی۔ میری نظروں کے سامنے چھائی ہوئی دھند بتدریج چھٹنے لگی اور ان کے چہرے واضح ہونے لگے۔ ان میں بیشتر کی نظروں میں تجسس تھا جیسے وہ کوئی عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔

میں نے ایک بار پھر اس حسینہ کے چہرے کی طرف دیکھا جس کی گود میں میرا سر رکھا ہوا تھا، اور پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس نے ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر دبا دیا۔

"آرام سے لیٹے رہو ہمت سنگھ۔" اس لڑکی کے لہجے میں افسردگی تھی "تمہارے سر پر چوٹ لگی ہے۔ خون بہت بہہ چکا ہے۔ بستی کا مکھیا دید (حکیم) کو بلانے گیا ہے۔ اس کے آنے تک آرام سے لیٹے رہو۔"

ہمت سنگھ۔۔۔! یہ نام میرے دماغ میں گونج سی پیدا کرنے لگا۔ اس لڑکی نے مجھے ہی مخاطب کیا تھا جس کا مطلب تھا کہ میرا نام ہمت سنگھ تھا لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ واقعی میرا نام تھا۔

میں نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گنجان پتیوں والا بڑا قد آور اور پھیلا ہوا درخت تھا جس کے سائے میں وہ خوب صورت لڑکی مجھے گود میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ میرے اردگرد جو لوگ کھڑے تھے ان کے حلئے بڑے عجیب تھے۔ مردوں کے جسموں پر چوغہ نما لمبے لباس تھے۔ ان کے بال لمبے اور گولڈن کلر کے تھے۔ کسی نے چٹیا بنا رکھی تھی اور کسی کے بال کندھوں پر اور کسی کے پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ کسی نے ناک میں ایک طرف اور کسی نے دونوں طرف بالیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے کانوں میں بھی بالیاں نظر آرہی تھیں۔

عورتوں کے حلئے مردوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کے جسموں پر لباس مختصر تھے۔ بدن کے نچلے حصوں پر گھٹنوں سے اوپر چادر لپٹی ہوئی تھی جس کی سائیڈ میں چاک تھا۔ جسم کے بالائی حصے پر مختصر سا کپڑا کندھے پر ہوتا ہوا اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ سینے کا آدھا حصہ برہنہ ہو رہا تھا اور پشت تو بالکل ہی برہنہ تھی۔ ان کے سروں کے بال قریب سے کٹے ہوئے تھے۔ یہاں کسی حجام کی موجودگی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان عورتوں نے ایک دوسرے کے بال شاید خود ہی قینچی وغیرہ سے کاٹے تھے۔ صرف ایک عورت ایسی تھی جس کے بال کندھوں تک بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بعض عورتوں نے ناک میں نتھنیاں پہن رکھی تھیں اور بعض کے کانوں میں بالیاں تھیں۔ ایک دو عورتوں کی کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ چوڑیاں خاصی موٹی اور بے ڈھنگی سی تھیں۔

بچوں نے بھی ٹخنوں تک لمبے چوغے پہن رکھے تھے اور وہ سب کے سب گنجے تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ ان میں کون لڑکی ہے اور کون لڑکا۔

میں الجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سب لوگ میرے لیے اجنبی تھے اور شاید میں خود بھی اپنے آپ سے اجنبی تھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی جگہ تھی۔ میں یہاں کیسے آیا تھا اور وہ لڑکی کون تھی جس نے میرا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا۔ یہ لڑکی دوسروں سے بالکل ہی مختلف نظر آرہی تھی۔

میں صورتِ حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ سامنے کھڑے ہوئے لوگ ادھر ادھر ہٹنے لگے اور پھر دو آدمی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میرے سامنے آگئے۔ ان میں ایک کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ دراز قامت اور گٹھا ہوا جسم۔ اس نے زرد رنگ کا چوغہ پہن رکھا تھا۔ ناک کے دونوں نتھنوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور دونوں کانوں میں بھی چوڑیوں کی طرح بڑی بڑی بالیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ سر کے گولڈن بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے انہیں سمیٹنے کے لیے دو تین انچ چوڑی کپڑے کی پٹی پیشانی پر بندھی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ دوسرا آدمی عجیب ہیئت کا تھا۔ اس کی عمر ستر کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی۔ اس نے سیاہ رنگ کا چوغہ پہن رکھا تھا۔ چہرے پر جھریاں اس کثرت سے تھیں جیسے مکڑی نے جالا تان رکھا ہو۔ اس جھریوں بھرے چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھیں عجیب پراسرار سا تاثر دے رہی تھیں۔ اس کا گنجا سر انڈے کے چھلکے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر چند بال تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر باریک مونچھیں چوہوں کی دموں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے کندھے پر کپڑے کا ایک میلا سا تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

وہ اس بستی کا وید (حکیم) تھا اور اسے یہاں لے کر آنے والا مکھیا تھا۔ وہ دونوں میرے سامنے بیٹھ گئے۔ وید نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا اور میری پشت پر پہنچ کر میرے سر کے زخم کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے انگلیوں سے سر کو ٹٹولنا شروع کیا تو میرے دماغ میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔

اس نے تھیلے میں سے قینچی نکال کر میرے سر کے بال کاٹ دیے اور پھر ایک ڈبیا میں سے مٹیالے سے رنگ کا مرہم نکال کر زخم پر لگانے لگا اور پھر پٹی اس زور سے باندھی تھی جیسے میرا سر آہنی شکنجے میں کس دیا ہو۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے مکھیا سے کچھ کہا اور اپنا تھیلا کندھے پر لٹکا کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ مکھیا میرے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر نظریں جمائے میرے چہرے کو تکتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے ہموار لہجے میں کچھ کہنے لگا لیکن ان لوگوں کی طرح وہ زبان بھی میرے لیے اجنبی تھی۔ ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ وہ اس لڑکی کی طرف مڑ گیا جو اب تک مجھے سہارا دیے ہوئے تھی۔ وہ لڑکی بھی شاید کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔

مکھیا نے کندھے اچکاتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے زانوؤں پر مارے اور بے بسی سے اپنے اطراف میں کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ پیچھے کھڑا ہوا ایک آدمی دوسروں کو ادھر ادھر ہٹاتا ہوا آگے آگیا۔ اس کے سر کے بال گردن پر پھیلے ہوئے تھے۔ دوسروں کی طرح اس کی ناک میں بالی نہیں تھی البتہ دائیں کان میں چوڑی کی طرح ایک بڑی بالی لٹکی ہوئی تھی۔ وہ بھی مکھیا کے قریب بیٹھ گیا۔ چند لمحے اس سے باتیں کرتا رہا پھر میرے ساتھ بیٹھی ہوئی خوب صورت لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مکھیا کہہ رہا ہے کہ اپنے ساتھی کو بستی میں لے چلو۔ وہاں تم لوگوں کے لیے ایک جھونپڑے کا بندوبست کردیا گیا ہے۔ جب تک تمہارا ساتھی ٹھیک نہیں ہوجاتا، تم لوگوں کو بستی ہی میں رہنا ہوگا۔ تم لوگوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

اس شخص نے یہ الفاظ ٹوٹی پھوٹی انگریزی، نیپالی اور ہندی میں کہے تھے۔ مفہوم بہرحال سمجھ میں آگیا تھا۔ اس لڑکی نے میری طرف دیکھا اور میرا بازو پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہمارے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ بھی ادھر ادھر ہٹنے لگے۔ میں نے اپنے اطراف میں دیکھا۔ ہم اس وقت درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک پہاڑی پر تھے۔ یہ پہاڑی کافی دور تک ہموار تھی اور اس سے آگے عمودی چٹانیں تھیں جو بلندی کی طرف اٹھتی چلی گئی تھیں۔ پہاڑی کی دوسری طرف نشیب میں دریا بہہ رہا تھا اور ڈھائی تین سو گز نیچے دریا کے کنارے پر وہ بستی تھی جو تیں چالیس بے ترتیب جھونپڑوں پر مشتمل تھی۔ پہاڑی سے ایک تنگ سی پگڈنڈی اس بستی تک چلی گئی تھی۔ ہمارے اردگرد جمع لوگ اب اسی پگڈنڈی کی طرف جا رہے تھے۔

مکھیا اور وہ آدمی بھی اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ اس آدمی نے خوب صورت لڑکی سے کچھ کہا اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اس کا نام سمبا ہے ہمت سنگھ۔ یہ پوچھ رہا ہے کہ تم اپنے پیروں پر چل سکو گے یا تمہیں گود میں اٹھالیا جائے۔"

"میں چل رہا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مگر تم مجھے ہمت سنگھ کہہ کر کیوں مخاطب کر رہی ہو۔ کیا میرا نام ہمت سنگھ ہے۔ تم کون ہو۔ تم نے میرا سر اپنی گود میں کیوں رکھا ہوا تھا؟"

"اوہ!" اس لڑکی کا چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا جیسے کوئی شدید ذہنی دھچکا لگا ہو۔ آنکھوں کی وحشت کچھ اور بڑھ گئی "کک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے ہکلائی "مم۔۔۔ میں بملا ہوں اور تم ہمت سنگھ۔ ہم دونوں۔۔۔"

اسی لمحے سمبا نے مڑ کر کچھ کہا اور وہ لڑکی خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم آہستہ آہستہ اس پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ میں اگرچہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا لیکن قدم زمین پر رکھنے سے سر میں دھمک سی پیدا ہو رہی تھی جس سے رہ رہ کر دماغ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

کچھ لوگ ہمارے آگے چل رہے تھے اور کچھ پیچھے البتہ

وہ لڑکی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جس نے اپنا نام بملا بتایا تھا۔ اس نے اب بھی میرا ایک بازو تھام رکھا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی کرب نمایاں تھا۔

بستی کے قریب کچھ اور لوگ بھی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے لیکن ہمیں دیکھ کر ان میں سے کوئی آگے نہیں بڑھا۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور وہ سب عجیب سی نظروں سے مجھے اور میرے ساتھ آنے والی بملا کو دیکھ رہے تھے۔

جھونپڑوں کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی لیکن بستی دریا کے ساتھ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ جھونپڑے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ ہمیں بھی دریا کے رخ پر واقع ایک کشادہ جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ جھونپڑا بھی دوسرے جھونپڑوں کی طرح اوندھائے ہوئے پیالے کی طرح گول تھا۔ اس کے دو دروازے تھے۔ ایک مشرق کے رخ پر اور ایک مغرب کے رخ پر۔ دونوں دروازے کھلے ہوئے تھے اور اندر خاصی روشنی ہو رہی تھی۔

ایک طرف یاک کی کھال کا گدا بچھا ہوا تھا جس میں غالباً درختوں کے خشک پتے بھرے ہوئے تھے۔ مکھیا اور سمبا بھی ہمارے ساتھ ہی اندر آئے تھے۔ سمبا نے مجھے گدے پر لٹا دیا۔ مکھیا نے سمبا سے کچھ کہا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس دوران میں مکھیا جھونپڑے ہی میں موجود رہا تھا۔

سمبا نے ایلومینیم کے دو گلاس اٹھا رکھے تھے۔ اس نے ایک گلاس بملا کے حوالے کر دیا اور دوسرا میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک بازو سے مجھے سہارا دے کر اٹھا رکھا تھا۔

وہ گرم دودھ تھا جس میں غالباً ہلدی کی آمیزش تھی کیونکہ دودھ کی رنگت نہ صرف قدرے پیلی تھی بلکہ اس میں ہلدی کا ذائقہ واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے چند گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس ہونٹوں سے ہٹا دیا لیکن سمبا نے اس وقت تک ہار نہیں مانی جب تک دودھ کا آخری قطرہ بھی میرے حلق میں نہیں ٹپکا دیا تھا۔

"اس سے تمہیں سکون ملے گا۔" سمبا نے انگریزی اور ہندی کے ملے جلے الفاظ میں کہا "اب تم آرام سے لیٹے رہو۔ تمہیں نیند آجائے گی اور جب تم بیدار ہو گے تو اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرو گے۔"

میرے سر میں زخم سے اٹھنے والی ٹیسوں کے علاوہ بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے بری طرح مروڑ کر رکھ دیا ہو لیکن یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ مجھے کیا ہوا تھا؟ میں زخمی کیسے ہوا تھا اور سامنے سب سے بڑا سوالیہ نشان یہ تھا کہ میں کون ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ میرے ساتھ [illegible] ہوئی بملا نامی یہ خوب صورت لڑکی کون ہے؟

میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دماغ کو آزاد چھوڑ دیا۔ کچھ دیر بعد میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ بملا اور سمبا میرے قریب ہی بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بہت دور سے آتی ہوئی مدھم سی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھنا چاہا لیکن پپوٹے بہت بھاری ہو رہے تھے۔ آنکھیں پوری طرح نہیں کھل سکیں اور پھر میرے ذہن پر سناٹا سا طاری ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو جھونپڑے میں مشعل کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تقریباً تین فٹ لمبی وہ مشعل جھونپڑے کی دیوار کے قریب زمین میں گڑی ہوئی تھی۔ اس میں کسی جانور کی چربی جل رہی تھی جس کی ہلکی سی بو جھونپڑے کی فضا میں واضح طور پر محسوس ہو رہی تھی لیکن نہایت حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مشعل کے جلنے سے کسی قسم کا دھواں نہیں پھیل رہا تھا۔

مدھم سی سرگوشیوں کی آواز سن کر میں نے آہستگی سے گردن گھما کر بائیں طرف دیکھا۔ اسی طرح کے ایک گدے پر بملا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی دو زانو بیٹھی ہوئی تھی۔ جسم کے نچلے حصے پر دھوتی کی طرح مختصر سا کپڑا لپٹا ہوا تھا جبکہ جسم کے بالائی حصے پر لپٹے ہوئے کپڑے سے اس کے سینے کا ایک طرف کا بالائی حصہ نمایاں ہو رہا تھا۔

اس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ سرخ و سفید رنگت، صحت مند جسم اور موٹی موٹی آنکھیں۔ چہرے کے نقوش بھی بڑے دلکش تھے لیکن اس نے اپنا حلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ ناک کے دونوں نتھنوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں اور بال اس طرح کٹے ہوئے تھے کہ سر پر کیاریاں اور کھیتیاں سی بن گئی تھیں۔ اس کے بال سلیقے سے کٹے ہوتے اور ڈھنگ کا لباس پہن رکھا ہوتا تو وہ بہت زیادہ پرکشش ہو سکتی تھی۔

مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ خاموشی سے باہر چلی گئی اور بملا اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب بیٹھ گئی۔

"اب کیسے ہو ہمت سنگھ۔" وہ میرا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے نرم لہجے میں بولی "کیا محسوس کر رہے ہو۔ سر کا درد کیسا ہے؟"

"تم کون ہو۔ تمہیں مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

اس کے چہرے پر ایک بار پھر کرب کے تاثرات ابھر آئے "مجھے پہچانو ہمت سنگھ۔ میں بملا ہوں۔ ہم دونوں دوست ہیں اور۔۔۔"

"تم نے اپنا نام پہلے بھی بتایا تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن میں تمہیں نہیں جانتا۔ یہ کون سی جگہ ہے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ میں زخمی کیسے ہوا تھا؟" میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"ہم کھٹمنڈو سے آئے تھے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا پھر آگے کو جھکتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی "پدمی نامی گاؤں کے قریب ہم نے چانگ لی کے دو آدمیوں کو قتل کر کے پانچ سو کلو ہیروئن پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ایک رات پہلے کی بات ہے۔ ہم رات بھر پہاڑوں میں سفر کرتے رہے اور صبح ہماری گاڑی بہت بلندی سے دریا میں جا گری تھی۔"

"گاڑی دریا میں گر گئی تھی!" میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا اور میں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔" بملا نے کہا "گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ تمہارے کہنے پر میں نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی۔ گاڑی کھڈ میں گر رہی تھی اور تم بھی کود گئے تھے لیکن شاید تم اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے تھے اور گاڑی کے پیچھے ہی اس خطرناک ڈھلان پر لڑھکتے چلے گئے تھے۔ گاڑی نشیب میں بہتے ہوئے دریا میں جا گری اور تم۔۔۔ ایک پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔۔۔"

"خطرناک ڈھلان۔ گاڑی۔ دریا۔" میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے "نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" میں سر جھٹکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔

"یاد کرو ہمت سنگھ۔" بملا چیخی "ذہن پر زور دو۔ اوہ!" وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی "کہیں تم یادداشت تو نہیں کھو بیٹھے۔ او بھگوان۔ میں کیا کروں؟"

"تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ تمہارا مجھ سے کیا تعلق ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

"صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرو ہمت سنگھ۔" اس کا لہجہ رو دینے والا تھا۔ "ہم نے چانگ لی کے آدمیوں سے پانچ سو کلو ہیروئن چھین کر انہیں قتل کر دیا تھا۔ چانگ لی اور ناگ پال دنیا کے خطرناک ترین آدمی ہیں۔ وہ یقیناً ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے اور ہم ان اونچے پہاڑوں میں اس اجنبی قبیلے میں۔۔۔ اور۔۔۔ اور تم۔۔۔ تمہیں کچھ یاد نہیں رہا۔ اگر وہ لوگ یہاں پہنچ گئے تو۔۔۔ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یاد کرو ہمت سنگھ' یاد کرو۔ کل رات۔۔۔ پدمی نامی گاؤں سے کچھ دور ہم نے جنگل میں ان کی گاڑی روکی تھی اور۔۔۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔ سر میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔۔۔ لیکن۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں آسکا کہ میں کون ہوں۔

"نہیں۔" میں نے ایک بار پھر سر کو جھٹکا دیا "مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"اے بھگوان۔ میں کیا کروں۔" بملا سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر رونے لگی۔

اسی وقت سمبا اس عورت کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ عورت کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جسے اس نے ہمارے سامنے رکھ دیا اور پھر وہ بملا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں کچھ کہنے لگی۔ بملا یا میں اس کی بات تو نہیں سمجھ سکے لیکن اس کے ہمدردانہ لہجے سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بملا سے اظہارِ ہمدردی کر رہی تھی۔

سمبا بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ چند لمحے میرے چہرے پر نظریں جمائے رہا پھر بملا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"پریشان مت ہو۔ معمولی زخم ہے۔ چند روز میں ٹھیک ہو جائے گا اور پھر تم لوگ یہاں سے جا سکو گے۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"تم اندازہ نہیں لگا سکتے سمبا' ہم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔" بملا نے کہا "میرا یہ ساتھی اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔ اسے کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ خود کون ہے اور یہ حادثہ کیسے پیش آیا تھا۔"

"اوہ!" سمبا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا "اگر ایسا ہے تو یہ واقعی بڑی خوفناک بات ہوگی۔ میں ابھی جا کر وید سے بات کرتا ہوں۔ وہ بہت سیانا آدمی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ تم لوگ کھانا کھاؤ۔

میں وید کے پاس جاتا ہوں۔" اس نے پلیٹ اٹھا کر ہم دونوں کے بیچ رکھ دی۔

اس پلیٹ میں یاک کے بھنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور دو پیالیوں میں قہوہ تھا۔ سمبا اس عورت کو کچھ ہدایات دیتا ہوا جھونپڑے سے چلا گیا۔

تھیوب نام کی وہ عورت ہمارے قریبی دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ کبھی میری طرف دیکھ کر کچھ کہتی اور کبھی بلا کی طرف پھر اس نے قہوے کی ایک پیالی اٹھا کر بلا کی طرف بڑھا دی۔ بلا نے اس کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔ تھیوب نے دوسری پیالی میرے ہاتھ میں تھما دی۔

ہم قہوے کی چسکیوں کے ساتھ یاک کا بھنا ہوا گوشت بھی کھاتے رہے۔ گوشت میں ہلکی سی مہک تھی۔ میں تو بڑی رغبت سے کھا رہا تھا لیکن بلا کو شاید کھانے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ زبردستی زہر مار کر رہی ہے۔

پلیٹ میں گوشت کے ایک دو چھوٹے ٹکڑے بچ گئے۔ خالی پیالیاں ہم نے پلیٹ میں رکھ دیں اور تھیوب پلیٹ اٹھا کر جھونپڑے سے باہر چلی گئی۔

"جانتے ہو یہ کون سی جگہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں پناہ دی ہے؟" بلا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" میں نے بے بسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ تارانگ قبیلہ ہے جو پونگا رینج کے پہاڑوں میں سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر آباد ہے۔" بلا نے کہا "سمبا نے بتایا تھا کہ ان کا قبیلہ صدیوں سے یہاں آباد ہے۔ یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے اور مویشی پالتے ہیں۔ رائی' جو اور کچھ چاول کی فصل بھی ہوتی ہے۔ یاک کی افزائش نسل ان کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ یہ لوگ اس جانور کا دودھ بھی استعمال کرتے ہیں اور گوشت بھی کھاتے ہیں۔ سرد ترین موسم میں رہنے والا یہ جانور سواری اور باربرداری کے کام بھی آتا ہے۔ سال میں ایک مرتبہ یہ لوگ اپنے مویشی اور رائی بیچنے کے لیے قریبی شہروں کی طرف نکل جاتے ہیں جہاں انہیں اپنے مال کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔

"یہ قبیلہ مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہوا ہے اور صدیوں سے انہی پہاڑوں میں آباد ہے۔ یہ اگرچہ بدھ کے پیروکار ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی روایات میں بڑی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ بدھ کا تو اب صرف لیبل ہی رہ گیا ہے ورنہ ان کا کوئی دھرم نہیں ہے۔ ان کی اپنی کچھ روایات ہیں۔ یہ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ مہمان کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ ان کے ہاں شادی کی رسم بڑی دلچسپ ہے۔ سال میں ایک مرتبہ کھلے میدان میں شادی کے قابل ہر لڑکی کے لیے مقابلہ ہوتا ہے۔ مقابلے میں کوئی بھی حصہ لے سکتا ہے۔ جیتنے والا لڑکی کا حق دار بنتا ہے۔ ہاں ایک اور دلچسپ رسم یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دو عورتیں جیتنے کے لیے بھی آپس میں مقابلے کرتے رہتے ہیں۔ ایسے انفرادی مقابلے کسی بھی وقت ہو سکتے ہیں اور فیصلہ بہرحال بستی کا کھیا ہی کرتا ہے۔ مرد کی بہادری اور حیثیت کا اندازہ اس کی عورتوں کی تعداد سے لگایا جاتا ہے۔ کسی مرد کے پاس تو کئی کئی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں اور اگر واحد عورت بھی ہار جائے اسے کمزور اور بہت غریب سمجھا جاتا ہے لیکن قبیلے کا کوئی شخص حسد و رقابت کے جذبات سے آشنا نہیں ہے۔

"ان کی ایک اور دلچسپ رسم یہ ہے کہ شادی شدہ آپس میں اپنی بیویوں کا تبادلہ بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً دو مردوں کو ایک دوسرے کی بیویاں پسند آجائیں تو وہ چند روز کے لیے ان کا تبادلہ بھی کر لیتے ہیں۔"

"بڑی حیرت انگیز رسمیں ہیں۔" میں نے کہا "تمہیں کیا پریشانی ہے۔ تم تو ان میں سے نہیں لگتی۔ تمہارے چہرے کے نقش اور تمہارا حلیہ بھی ان سے مختلف ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟"

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو ہمت سنگھ۔" وہ دبی آواز میں بولی "ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔ اگر وہ لوگ ہمیں تلاش کرتے ہوئے اس طرف آگئے تو ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"کون لوگ؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ ہماری کسی سے کیا دشمنی ہے؟"

"چانگ لی کے آدمی۔" بلا نے کہا "ان کے دو آدمی ہمارے ہاتھوں مارے گئے ہیں اور ہم نے ان کے قبضے سے اربوں روپے کی ہیروئن چھین لی تھی۔ وہ ہیروئن تو دریا میں بہہ گئی لیکن ہم زندہ ہیں۔ ان کے انتقام کا نشانہ بننے کے لیے۔"

"کون دریا میں بہہ گئی۔" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہیروئن۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا "اپنے ذہن پر زور دو ہمت سنگھ۔ یاد کرو کس طرح ان لوگوں سے وہ ہیروئن چھینی تھی۔

رات ہم نے ... ذہن پر زور دے کر سوچو تم کون ہو اور سیکڑوں میل کا سفر طے کر کے تم اس طرف کیوں آئے تھے۔ تم نے چانگ لی کے ڈمپوں سے وہ ہیروئن کیوں چھینی تھی اور پھر ہم رات بھر ان پہاڑوں میں سفر کرتے رہے لیکن صبح ہوتے ہی ہماری کار' گہرائی میں بہتے ہوئے دریا میں گر گئی تھی اور تم۔۔۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"جس جگہ کار گری تھی وہاں عمودی ڈھلان تھی اور دریا تقریباً چار سو فٹ کی گہرائی میں بہہ رہا تھا۔ تم بھی اس ڈھلان پر لڑھکتے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرا کر رک گئے تھے اور بے ہوش ہو گئے تھے۔ میں تمہیں بچانے کے لیے ڈھلان پر اترنا چاہتی تھی لیکن وہ عمودی ڈھلان بہت خطرناک تھی۔ میں راستے کی تلاش میں تقریباً دو سو گز مزید اوپر چلی گئی اور پھر مجھے یہ بستی نظر آگئی۔ میرے چیخنے کی آواز سن کر سمبا اور بستی کے کچھ لوگ اس طرف آگئے۔ انہوں نے تمہیں تو ڈھلان پر اتر کر بچا لیا لیکن وہ کار۔۔۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ مایوسی عود کر آئی تھی "جس جگہ کار گری تھی وہاں دریا بہت گہرا اور پانی کی رفتار بہت تیز تھی۔ کار پانچ سو کلو ہیروئن سمیت اس گہرے تیز رفتار پانی میں غائب ہو گئی۔ سمبا اور اس کے آدمی تمہیں اٹھا کر بستی میں لے آئے۔ تم تقریباً چھ گھنٹے بعد ہوش میں آئے تھے لیکن۔۔۔ تمہیں کچھ یاد نہیں رہا۔ تم مجھے بھی بھول گئے ہو۔ اپنے آپ کو بھی بھول گئے ہو۔ یاد کرنے کی کوشش کرو ہمت سنگھ۔ ذہن پر زور دو۔ اگر تمہیں کچھ یاد نہ آسکا تو میں کیا کروں گی۔ ان اجنبی لوگوں کے بیچ کیسے زندہ رہ سکوں گی۔ یاد کرو ہمت سنگھ۔ ذہن پر زور دو۔ رات کو جب ہم نے جنگل میں اس گاڑی کو روکا تھا تو۔۔۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ میں سامنے جھونپڑی کی دیوار پر نظریں جمائے سوچنے لگا کہ میں کون ہوں۔ بلا نام کی اس خوب صورت عورت کے ساتھ پہاڑوں میں سفر کیوں کر رہا تھا لیکن میرے ذہن میں کوئی بات نہ آسکی۔ دماغ کی نسوں میں تناؤ سا پیدا ہونے لگا۔ اندھیرے کی چادر میری آنکھوں کے سامنے پھیلنے لگی۔ میں نے سوچنا چھوڑ دیا۔

ماحول میں ایک عجیب سی پراسراریت تھی۔ اجنبی لوگوں میں گھرا ہوا میں خود اپنے آپ سے اجنبی تھا۔ میں مشعل کی کپکپاتی ہوئی لو کی طرف دیکھنے لگا۔ ذہن میں ایک بار پھر سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اچانک دماغ کو جھٹکا سا لگا جیسے کچھ یاد آرہا ہو لیکن پھر ایک دم تاریکی چھا گئی۔ کوئی بات ذہن کے تاریک گوشے سے ابھر کر سامنے آنا چاہتی تھی لیکن ہر مرتبہ دماغ پر سوئیوں کی چبھن سی ہونے لگتی۔ میں نے گدے پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دماغ میں کبھی بجلی کے کوندے سے لپکنے لگتے اور کبھی تاریکی چھا جاتی۔

قدموں کی آہٹ سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ بلا بدستور میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ آہٹ کی وہ آواز باہر سے آرہی تھی۔ کسی کے چلنے سے چھوٹے چھوٹے پتھر لڑھک رہے تھے۔ قدموں کی وہ آواز جھونپڑے کے قریب رک گئی پھر دروازہ کھلا اور سمبا اندر داخل ہوا۔ اس نے کندھے پر تہ کیے ہوئے چار کمبل اٹھا رکھے تھے۔ یہ کمبل خاصے موٹے اور وزنی تھے۔ اس نے دو کمبل میرے پیروں کی طرف اور دو سرے گدے پر ڈال دیے تھے۔

اس نے سرسری سے انداز میں باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور پھر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیسی طبیعت ہے اب۔ کیا محسوس کر رہے ہو؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ہمدردانہ لہجے پوچھا۔

"اس کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔" میرے بجائے بلا نے جواب دیا۔

"میں وید کو بلانے گیا تھا۔" سمبا نے کہا "وہ اپنے جھونپڑے میں نہیں ہے۔ پہاڑی کے اس پار دوسری بستی میں گیا ہوا ہے۔ صبح واپس آئے گا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اٹھتے ہوئے بولا "کھیا کو بھی تم لوگوں کے بارے میں تشویش ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے تم لوگ کون ہو اور ان پہاڑوں میں کیا کر رہے تھے۔ بہرحال' اب میں چلتا ہوں۔ صبح وید کو لے کر آؤں گا۔ باہر سردی بڑھ گئی ہے۔ کوشش کرنا کہ کسی اشد ضرورت کے بغیر رات کو جھونپڑے سے باہر نہ نکلنا پڑے۔ ہمارے قبیلے کے لوگ اگرچہ بہت اچھے ہیں لیکن تمہیں دیکھ کر شاید کسی کی نیت میں فتور آجائے۔" آخری الفاظ اس نے بلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

اسی وقت میری نظریں بھی بلا کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں وحشت سی پھیل گئی۔

"اس کے علاوہ!" سمبا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "رات کو اس علاقے میں جنگلی جانور بھی گھومتے رہتے ہیں۔ کوئی جانور خطرناک بھی ہو سکتا ہے اس لیے احتیاط ضروری ہے۔ اچھا۔ اب میں چلتا ہوں۔"

سمبا جیسے ہی باہر نکلا' بلا نے جلدی سے آگے بڑھ کر

دروازہ بند کردیا۔ کنڈے کے ساتھ چمڑے کا ایک لمبا سا فیتہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ اس نے وہ فیتہ کنڈے میں ڈال کر دو تین بل دے کر گرہ لگادی۔ دوسری طرف کا دروازہ بھی اسی طرح بند کیا اور میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ وہ اچانک ہی اسے طرح کپکپانے لگی تھی جیسے سردی چڑھ گئی ہو۔ میں نے اپنے پیروں کی طرف پڑے ہوئے دونوں کمبل کھول لیے اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بملا کمبل میں گھس گئی۔ اس کا بدن واضح طور پر کپکپا رہا تھا۔ میں نے باقی دو کمبل بھی اٹھا کر اس کے اوپر ڈال دیے۔ صرف ایک کمبل ایسا تھا جو میں نے بھی جزوی اوڑھ رکھا تھا۔

بملا کا سر میرے گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا۔ وہ چاقو کی طرح دہری ہو کر کمبلوں میں دبکی ہوئی تھی اور پھر اچانک اس کی سسکیوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ بملا رو رہی تھی لیکن میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

بملا روتے روتے سوگئی۔ میں نے اس پر کمبل درست کردیے اور خود بھی کمبل لپیٹ کر اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔

تین فٹ کی بلندی تک جھونپڑے کی دیوار پتھروں سے بنائی گئی تھی اور اس سے اوپر لکڑیاں کھڑی کرکے درختوں کی خشک شاخوں اور جھاڑیوں سے دیواریں بنائی گئی تھیں۔ ان دیواروں پر اندر اور باہر کی طرف یاک کی کھال ڈال دی گئی تھی اور ان کھالوں کی وجہ سے یہ جھونپڑے بارش اور ہوا سے محفوظ ہوگئے تھے۔

سمبا نے ٹھیک کہا تھا کہ رات کو سردی بڑھ جائے گی۔ جھونپڑے کے دونوں دروازے اگرچہ بند تھے لیکن ان میں کچھ جھریاں سی رہ گئی تھیں جن سے ہوا کی آمدورفت جاری تھی اور اس ہوا سے جھونپڑے کی فضا خاصی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے سرد خانے میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ بملا نے اگرچہ تین کمبل اوڑھے ہوئے تھے لیکن وہ اس طرح سمٹی ہوئی تھی کہ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے اور کبھی کبھی تو وہ سوتے ہی میں کپکپانے لگتی تھی۔

میں جھونپڑے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رات بھر یہی سوچتا رہا کہ میں کون ہوں؟ بملا کون ہے اور میں اس کے ساتھ ان پہاڑوں میں سفر کیوں کر رہا تھا۔ میرے دماغ میں کبھی سنسناہٹ اور کبھی دھماکے ہونے لگتے لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ دماغ میں شدید ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور میں ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے زور زور سے سر جھٹکنے لگتا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت اور سناٹا تھا۔ کمبلوں میں دبکی ہوئی بملا کے بہت ہلکے خراٹوں کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن اچانک ایک آواز سن کر میں چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے چند چھوٹے پتھر کسی کے پیروں سے ٹکرا کر لڑھکے ہوں۔ اس کے بعد یک دم پہلے جیسا سناٹا چھا گیا۔

میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور کسی قسم کی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ دو تین منٹ گزر گئے اور پھر سنائی دینے والی آواز دوبارہ سنائی دی۔ بالکل یوں لگا جیسے زمین پر بکھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر کوئی شخص بہت احتیاط سے چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں سانس روکے بیٹھا رہا۔ وہ آواز جھونپڑے کے مشرقی دروازے کے قریب رک گئی۔ ایک بار پھر خاموشی چھا گئی اور اس مرتبہ مجھے چونک جانا پڑا۔ جھونپڑے کا دروازہ بہت آہستگی سے حرکت کر رہا تھا۔ دروازے کے تختے میں تقریباً ایک انچ کا خلا تھا۔ میرا خیال تھا باہر کوئی جانور ہوگا جو دروازے کے قریب آکر بیٹھ گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے انسانی انگلیاں دروازے کے اس خلا میں داخل ہوتے دیکھ کر میرے پورے جسم میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ باہر کوئی جانور نہیں انسان تھا جو دو انگلیاں دروازے کے خلا میں داخل کرکے چمڑے کا فیتہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنی سیدھی پنڈلی پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور تیز سنسناہٹ ہونے لگی۔ جیسے تیز آندھیاں چل رہی ہوں۔ میرے لاشعور سے کوئی بات ابھر کر سامنے آنا چاہتی تھی لیکن دماغ میں سوئیوں کی چبھن سی محسوس ہونے لگی۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے ہاتھ کی انگلیاں پنڈلی کو ٹٹول رہی تھیں اور پھر میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور آنکھیں کھول دیں۔ میری نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ دونوں انسانی انگلیاں اب بھی دروازے پر چمڑے کا فیتہ کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اے۔ کون ہے۔ باہر کون ہے؟" میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے ان دونوں انگلیوں کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ پیچھے ہٹ گیا اور پھر ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی پتھروں پر دوڑتا ہوا دور چلا گیا ہو۔ چند لمحوں بعد پھر سناٹا طاری ہوگیا۔

بملا میری آواز سے جاگ گئی تھی۔

"کیا ہوا ہمت سنگھ! کون ہے؟" اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"پتا نہیں کون تھا۔ ہاتھ اندر ڈال کر دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

بملا کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے دروازے کے چمڑے کے فیتے کو مزید گرہیں لگا دیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ گدے پر آگئی۔ وہ سردی اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی اور تمام کمبل اوپر ڈال لیے۔

"کوئی جانور ہوگا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "سمبا نے خبردار بھی کردیا تھا کہ رات کو جنگلی جانور اس طرف پھرتے رہتے ہیں۔"

"جانور نہیں، کوئی انسان تھا۔" میں نے جواب دیا "وہ ہاتھ اندر ڈال کر دروازے کا فیتہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"اس قبیلے کے لوگ بظاہر بہت شریف لگتے ہیں لیکن کسی کا بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔" بملا نے کہا "تم کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو ہمت سنگھ۔ میں نے ابھی تک انہیں تمہارے اور اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ لوگ ہمیں ٹورسٹ سمجھ رہے ہیں جو بھٹک کر اس طرف نکل آئے ہیں۔ اگر انہیں ہماری اصلیت کا پتا چل گیا تو نجانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں۔ کسی مہذب آبادی سے سیکڑوں میل دور اجنبی لوگوں میں گھرے ہوئے ہم لوگ کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ اپنی یادداشت کو واپس لانے کی کوشش کرو۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

"مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔" میں نے بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

بملا مجھ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں اسے اپنے سے الگ کرنے کے بجائے اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

"کیا ہوگا ہمت سنگھ؟" اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ میرے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

رات کا آخری پہر بھی بیت رہا تھا۔ بملا کبھی اونگھنے لگتی اور کبھی میرے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگتی۔

باہر لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو بملا بھی اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گئی۔ پہلے اس نے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھا پھر چرمی فیتے کی گرہیں کھول کر دروازہ کھول دیا۔

ہوا کا ایک یخ بستہ جھونکا جھونپڑے میں داخل ہوا اور میں ایک لمحے کو کپکپا اٹھا۔

دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ مشرقی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر سرخی پھیل رہی تھی پھر سورج نکل آیا اور دھوپ کی روپہلی کرنیں جھونپڑے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر تک پہنچنے لگیں۔

بملا ایک کمبل لپیٹ کر دروازے کے سامنے دھوپ میں بیٹھ گئی۔ میں بھی دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ بستی کے لوگ بیدار ہوچکے تھے۔ بستی میں ادھر ادھر لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد تھیوب ہمارے جھونپڑے میں آگئی۔ اس نے وہی رات والا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ گھٹنوں سے اوپر دھوتی کی طرح لپٹی ہوئی چادر جس کے ایک طرف اوپر تک چاک تھا اور جسم کے بالائی حصے پر بھی اس کا لباس مختصر تھا۔ اس وقت میں نے پہلی مرتبہ توجہ سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی جان دار عورت تھی۔

تھیوب نے مسکرا کر پہلے بملا کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہا بھی تھا۔ الفاظ تو میری سمجھ میں نہیں آسکے لیکن مفہوم واضح ہوگیا۔ وہ یقیناً میری خیریت دریافت کر رہی تھی۔ جواب میں، میں نے بھی محض مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔

تھیوب نے بملا کو اشارہ کیا اور بملا اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ جھونپڑے کے کھلے ہوئے دروازے سے وہ کچھ دور تک مجھے نظر آتی رہیں پھر ایک طرف مڑ کر میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تین چار بچے دروازے کے سامنے آکر جھونپڑے میں جھانکنے لگے۔ میں ان کے لیے عجوبہ ہی تھا۔ گزشتہ شام سمبا نے بتایا تھا کہ ان کی یہ بستی کسی بھی مہذب آبادی سے سیکڑوں میل دور ہے۔ قبیلے کے لوگ ان اونچے پہاڑوں سے کبھی باہر نہیں نکلے۔ صرف چند لوگ سال میں ایک مرتبہ مویشی اور اناج وغیرہ لے کر کسی شہر میں جاتے ہیں۔ یہ قبیلہ عام گزرگاہ سے بھی میلوں دور ہے۔ اس طرف سیاحوں کی آمدورفت بھی نہیں ہے۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا سیاح اس طرف آنکلتا ہے تو یہ لوگ اسے عجوبہ ہی سمجھتے ہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد تھیوب اور بملا واپس آگئیں۔ وہ دریا کی طرف سے آئی تھیں۔ بملا نے منہ دھو لیا تھا اور وہ ٹین کے ایک ڈبے میں میرے لیے پانی لے آئی تھی جسے اس نے جھونپڑے کے باہر رکھ دیا تھا۔

تھیوب' ہملا کو جھونپڑے کے سامنے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ہملا کے اشارے پر میں اٹھ کر باہر آگیا اور ڈبے سے پانی لے کر منہ ہاتھ دھونے لگا بلکہ ہملا میرا منہ دھلا رہی تھی۔

ہم وہیں جھونپڑے کے سامنے دھوپ میں بیٹھ گئے۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد تھیوب ہمارے لیے ناشتا لے آئی۔ جو کی روٹی' قہوہ اور یاک کا بھنا ہوا گوشت تھا۔ یہی ان لوگوں کی خوراک تھی۔

ہم ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ سمبا اور مکھیا بھی وید کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ میں نے ناشتا چھوڑ دیا۔ وید نے میرے سر کی پٹی کھولی اور دوبارہ وہی مرہم لگا کر پٹی کس دی۔ سمبا نے شاید اسے میری یادداشت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ پٹی باندھ کر وید' سمبا کے توسط سے مجھ سے کچھ باتیں پوچھتا رہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے نرم لہجے میں کہتے ہوئے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا "اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی حادثے کے باعث یادداشت ختم ہو جاتی ہے لیکن ایسا وقتی طور پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کسی اور معمولی حادثے سے یا کوئی غیر معمولی بات یاد دلانے سے تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔"

وید اور مکھیا چلے گئے البتہ سمبا وہاں بیٹھا رہا۔ وہ مجھے اپنے اس تارانگ قبیلے کے بارے میں بتا رہا تھا جو اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی چند بستیوں کی صورت میں قرب و جوار کی پہاڑیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ قبیلہ صدیوں پہلے تبت سے ہجرت کر کے یہاں آیا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ بنیادی طور پر بدھ کے پیروکار تھے لیکن ان کے دھرم میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں بلکہ بنیادی طور پر کسی دھرم کا وجود ہی نہیں رہا تھا۔ ان کے ہاں کسی عبادت کا تصور نہیں تھا۔

سمبا تقریباً دو گھنٹوں تک وہاں بیٹھا رہا پھر مجھے لے کر بستی کی سیر کرانے لگا۔ زیادہ تر مرد بستی سے باہر پہاڑیوں کے دامن میں کھیتوں پر چلے گئے تھے۔ عورتیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔ تمام جھونپڑوں کے دو دو دروازے تھے۔ ایک مشرق کی طرف اور دوسرا مغرب کی طرف۔ اس طرح جھونپڑوں کے اندر بھی ہوا اور روشنی کا معقول انتظام ہو گیا تھا۔ جھونپڑے بہت صاف ستھرے تھے۔ فرش کی لپائی پوتائی کا بہت خیال رکھا گیا تھا۔ کئی جھونپڑوں میں تو عورتیں اب بھی گارے سے فرش کی لپائی کر رہی تھیں۔

یوں تو تمام جھونپڑے بڑے بڑے اور کشادہ تھے تاہم مکھیا کا جھونپڑا سب سے بڑا تھا۔ بعض جھونپڑے اندر سے دو یا تین حصوں میں تقسیم تھے۔ ہر جھونپڑے کے سامنے ہٹ کر پتھروں سے چولھے بنے ہوئے تھے اور ان کے قریب ہی ڈبوں یا مختلف برتنوں میں پانی بھی رکھا ہوا تھا۔

میں جس طرف سے بھی گزرتا' عورتیں مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھتیں اور بچے تو مستقل ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ سمبا ایک جھونپڑے کے سامنے رک گیا۔

"یہ تھاپا کا جھونپڑا ہے۔" اس نے بتایا "عورتوں کے حوالے سے اسے اس بستی کا سب سے امیر شخص سمجھا جاتا ہے۔ اس کے قبضے میں پانچ عورتیں ہیں اور وہ سب کی سب اس وقت تمہارے سامنے موجود ہیں۔"

میں حیرت سے ان پانچ عورتوں کو دیکھنے لگا جو جھونپڑے کے اندر اور اس کے آس پاس اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں لیکن ان کا مالک تھاپا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے بارے میں سمبا نے بتایا کہ وہ کسی کام سے صبح ہی صبح پہاڑی کی دوسری طرف والی بستی میں چلا گیا ہے۔

وہ پورا دن کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر گزر گیا۔ ہملا زیادہ تر تھیوب اور دوسری عورتوں کے ساتھ رہی تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے تھوڑی دیر پہلے ہملا جھونپڑے میں آگئی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سمبا بھی آگیا۔ وہ ہمیں ایک اور جھونپڑے میں لے گیا۔ ہملا نے آج دن میں اسے بتا دیا تھا کہ گزشتہ رات کسی نے ہمارے جھونپڑے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی اور شاید اسی لیے سمبا نے ہمارا جھونپڑا تبدیل کر دیا ہے۔

ہمارا یہ نیا جھونپڑا قدرے بڑا تھا اور اس کے ارد گرد دوسرے جھونپڑے بھی تھے۔ سمبا کے خیال میں اس "گنجان" آبادی میں ہمیں کوئی پریشان کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اس رات سمبا بھی ہمارے پاس دیر تک بیٹھا رہا۔ جانے سے پہلے اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ آج رات ہمیں کوئی پریشان کرنے کی کوشش نہ کرے۔

سمبا کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔

صبح ناشتے کے بعد میں اکیلا ہی ٹہلتا ہوا دریا کی طرف چلا گیا۔ ہملا حسب معمول تھیوب اور بستی کی عورتوں کے ساتھ تھی۔ دریا بستی سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا۔ کنارے پر پہنچ کر جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کافی دور نکل گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب میں واپس آرہا تھا تو ایک جگہ قد آدم جھاڑیوں میں سرسراہٹ سن کر رک گیا اور متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا' کوئی جانور ہوگا لیکن ایک طرف دو عورتوں کو جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں زیریں لباس پہنے ہوئے تھیں۔ جسم کے بالائی حصے نیم برہنہ تھے۔ ان دونوں کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا لیکن ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بڑی خطرناک تھی۔ وہ دونوں چند لمحے میرے چہرے کو تکتی رہیں پھر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگیں۔ ان کے خطرناک ارادے بھانپنے میں مجھے دشواری پیش نہیں آئی۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ وہ دونوں بانہیں پھیلا کر اور قدرے جھک کر آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگیں۔ ان کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی مرغے کو گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

میں الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ اس وقت میرے دماغ میں سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ سمبا نے مجھے اپنے قبیلے کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس قبیلے کی عورتیں کسی وقت اس قدر خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔

الٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے میرا پیر ایک پتھر سے ٹکرا گیا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ توازن بگڑ گیا تھا' میں نے سنبھلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا اور پشت کے بل زمین پر گرا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ گرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ زمین پر ٹک گئے تھے۔

وہ دونوں خوں خوار بلیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں۔ وہ قہقہے لگا رہی تھیں اور میں چیخ رہا تھا اور پھر اچانک ایک گونج دار آواز سن کر ان دونوں نے مجھے چھوڑ دیا اور اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ ایک جانب سمبا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی کے تاثرات تھے۔ وہ بڑے غصیلے انداز میں ان دونوں عورتوں سے کچھ کہتا رہا۔ وہ خاموش کھڑی رہیں۔ ان کے چہروں سے مایوسی جھلکتی تھی۔ میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کھڑا ہو گیا۔ چند منٹ میں ان کی "وحشت" نے میری قمیص تار تار کر دی تھی۔

سمبا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں تمہاری ہی تلاش میں اس طرف آیا تھا۔ میں اپنے قبیلے کی عورتوں کے اس پہلو کے بارے میں تمہیں بتانا بھول گیا تھا۔" اس نے رک کر ان دونوں عورتوں سے کچھ کہا۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے جھاڑیوں میں غائب ہو گئیں۔ سمبا مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"کیا بات ہے۔ تم میری تلاش میں کیوں آئے تھے؟" میں نے اپنی پھٹی ہوئی شرٹ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بستی میں ایک اجنبی آیا ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" سمبا نے کہا۔

"اجنبی! مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اور پھر ہم دونوں بستی میں آگئے۔ بستی میں داخل ہوتے ہی ہملا دوڑتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

"وہی ہوا جس کا ڈر تھا ہمت سنگھ۔" اس نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی "وہ آدمی اگرچہ ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ چانگ لی یا ناگ پال کا آدمی ہے۔"

"ناگ پال!" میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس نام سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں آسکا۔ میں سر جھٹک کر رہ گیا۔

سمبا کے کہنے کے مطابق وہ اجنبی مکھیا کے جھونپڑے میں میرا منتظر تھا لیکن سمبا پہلے مجھے ایک اور جھونپڑے میں لے گیا۔ یہاں دو عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ سمبا نے ایک عورت سے کچھ کہا جس نے جھونپڑے میں ایک طرف رسی پر ٹنگا ہوا براؤن رنگ کا ایک چوغہ اتار کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے پھٹی ہوئی قمیص اتار کر وہ چوغہ پہن لیا اور سمبا کے ساتھ جھونپڑے سے باہر آگیا۔

جب ہم مکھیا کے جھونپڑے میں داخل ہوئے تو ہملا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ جھونپڑے میں ایک طرف تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جو لمبائی چوڑائی میں ایک پلنگ کے برابر تھا۔ اس چبوترے پر مکھیا اور وید کے علاوہ وہ اجنبی بھی بیٹھا ہوا تھا جو مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ لمبے قد اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ نیپالی لباس اور سر پر گول ٹوپی بھی تھی۔ اس کے گال غیر معمولی طور پر پھولے ہوئے اور آنکھیں چھوٹی تھیں جن میں عیاری کی چمک نمایاں تھی۔ یہ شخص پہلی ہی نظر میں مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ وہ بڑی کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کچھ کہنا چاہا مگر وید نے اشارے سے اسے روک دیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بٹھا لیا اور میرے سر کی پٹی کھولنے لگا۔

زخم کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے تھیلے میں سے ڈبیا نکالی اور زخم پر مرہم لگا کر دوبارہ پٹی باندھ دی اور پھر اس اجنبی کو اشارہ کیا کہ وہ مجھ سے بات کرسکتا ہے۔

"میرا نام یوگندر ناتھ ہے۔" اس نے کوٹ کی جیب سے ایک میلا سا رومال نکالتے ہوئے اپنا تعارف کرایا "میں ٹورسٹ آفیسر ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔ ان پہاڑوں میں سفر کرنے والوں کی دیکھ بھال کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بتاؤ۔ اب تمہیں کچھ یاد آرہا ہے یا نہیں؟"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے نفی میں سرہلا دیا۔ یہ شخص مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا اور میری خواہش تھی کہ اوٹ پٹانگ سوالات سے میرا دماغ خراب کرنے کے بجائے وہ جلد سے جلد یہاں سے چلا جائے۔ چند رسمی سی باتوں کے بعد اس نے بتایا کہ وہاں سے بیس میل دور سڑک کے کنارے نیلے رنگ کی ایک کار کھڑی ہوئی ملی ہے جو ٹورازم کے علاقائی دفتر میں موجود ہے۔ وہ مجھ سے اس کار کی شناخت کرانا چاہتا تھا کہ وہ میری ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے بعد کہ میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں اس کا یہ سوال ہی احمقانہ تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ وید جی نے مجھے آرام کا مشورہ دیا ہے۔" میں نے کن انکھیوں سے وید کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں وید جی سے مشورہ کرلیتا ہوں۔" اس نے کہا اور وید کی طرف دیکھتے ہوئے تبتی زبان میں کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں اس زبان میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر یوگندر ناتھ میری طرف متوجہ ہوگیا "وید جی نے کہا ہے کہ میں تمہیں کل اپنے ساتھ لے جاسکتا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں کل بھی تمہارے ساتھ نہیں جاسکوں گا۔ تم اگر کوئی کار شناخت کرانا چاہتے ہو تو اسے یہاں کیوں نہیں لے آئے؟" میں نے جواب دیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس اجنبی کی نظریں مجھے سوئیوں کی طرح اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔

"کار یہاں نہیں لائی جاسکتی۔ اس کا ٹائی راڈ ٹوٹا ہوا ہے۔ میں پرسوں آؤں گا یا پھر اس سے اگلے دن۔ میں تمہارے صحت یاب ہونے کا انتظار کرسکتا ہوں۔ میں پھر آؤں گا۔" وہ شخص یہ کہتے ہوئے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بلا کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ایک لمحے کو رکا۔ اس نے بڑی عجیب سی نظروں سے بلا کو دیکھا اور پھر جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

یوگندر ناتھ چلا گیا لیکن میرے لیے کچھ اور الجھنیں چھوڑ گیا ہوگئیں۔ نجانے کیا بات تھی کہ میں اس کی موجودگی میں عجیب سی بے چینی محسوس کرتا رہا تھا۔

وید بھی جا چکا تھا اور مکھیا بھی۔ جھونپڑے میں ہم صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ میں' بلا' سمبا اور مکھیا کی بیوی۔ وہ چبوترے پر میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"یہ کون تھا ہمت سنگھ۔" بلا میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "یاد کرنے کی کوشش کرو' یہ کون تھا۔ ہمارے گرد خطرات منڈلانا شروع ہوگئے ہیں۔ اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ اب بھی وقت ہے کہ ہم خیریت سے یہاں سے نکل سکیں۔"

"میں نہیں جانتا یہ شخص کون تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔" میں نے جواب دیا اور اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔

بلا بھی میرے ساتھ ہی جھونپڑے سے باہر نکلی تو لیکن اسے تھیوب پکڑ کر ایک طرف لے گئی اور میں مکھیا کے جھونپڑے سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ گیا۔ میں یوگندر ناتھ نامی اس شخص کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایک آدمی تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب سے گزر گیا۔ اس کے خون آلود ہاتھ دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد دو آدمی ایک اسٹریچر اٹھائے بستی میں داخل ہوئے۔ یہ کوئی باقاعدہ اسٹریچر نہیں تھا۔ لکڑی کی دو موٹی موٹی شاخوں کو ایک دوسرے سے فاصلے پر رکھ کر پودوں کی پتلی اور لچک دار شاخوں سے باندھ کر اسٹریچر تیار کرلیا گیا تھا اور اس اسٹریچر پر ایک آدمی کی لاش پڑی تھی۔ لاش پر کئی جگہ زخم نظر آرہے تھے۔ اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

وہ لوگ لاش کو کہیں دور سے اٹھا کر لائے تھے۔ ان کے ساتھ چار پانچ آدمی اور بھی تھے۔ اسٹریچر مکھیا کے جھونپڑے کے سامنے رکھ دیا گیا۔ بستی میں موجود لوگ وہاں جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ لاش کا چہرہ دیکھتے ہی میں بدحواس سا ہوگیا۔ وہ یوگندر ناتھ تھا جو محکمہ ٹورازم کے آفیسر کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا۔ ابھی میں لاش کو اچھی طرح دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ سمبا بھی وہاں پہنچ گیا۔

"تم اپنے جھونپڑے میں جاؤ۔ میں کچھ دیر بعد تم سے ملاقات کروں گا۔" سمبا نے میرا بازو پکڑ کر مجھے وہاں سے

ایک طرف ہٹا دیا اور آدمیوں کو لاش اٹھانے کا اشارہ کیا۔

میں اپنے جھونپڑے میں آگیا اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ جھونپڑوں کے درمیان مختصر سے میدان میں بہت سے لوگ جمع ہوچکے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں' مرد بھی اور بچے بھی۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ بلا تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی جھونپڑے میں داخل ہوئی۔ وہ خاصی بدحواس اور خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

"تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "تھیوب کہہ رہی تھی کہ ہمیں اب اس بستی سے نکال دیا جائے گا۔"

"کیوں۔۔۔؟ انہوں نے اچانک یہ فیصلہ کیوں کرلیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ یہ خیال ہی وحشت انگیز تھا کہ ہمیں اس بستی سے نکالا جانے والا ہے۔ اجنبی جگہ۔۔۔ اجنبی لوگ۔۔۔ اپنے آپ سے اجنبی۔۔۔! میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

"یوگندر ناتھ مرچکا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے سے پہلے وہ جس آخری انسان سے ملا تھا وہ تم ہو۔" بلا نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔

"میری ملاقات کا اس کی موت سے کیا تعلق؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ بس وہ لوگ کہتے ہیں کہ تم آخری شخص ہو جس سے یوگندر ملا تھا۔ میں تھیوب کے پاس جارہی ہوں۔ کچھ دیر بعد آؤں گی۔" بلا تیزی سے باہر نکل گئی۔

میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ مجھ سے ملاقات کے بعد اگر یوگندر ناتھ مرگیا تھا یا کسی نے اسے قتل کردیا تھا تو اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں اپنی انہی ذہنی الجھنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سمبا کا انتظار کرنے لگا اور سمبا تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔

"کیا یہ درست ہے کہ مجھے اس بستی سے نکالا جارہا ہے؟" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"ہاں ہمت سنگھ۔" وہ بولا "ہمارے قبیلے کے لوگ بہت توہم پرست ہیں۔ یہاں برسوں سے اس قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یہ بہت صلح جو اور امن پسند لوگ ہیں اور۔۔۔"

"اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یوگندر ناتھ اپنی موت سے کچھ دیر پہلے مجھ سے مل کر گیا تھا۔ اس لیے اس کی موت کا ذمے دار بھی میں ہی ہوں۔ گویا میں کسی شیطانی قوت کے زیر اثر ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "یوگندر کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟ اسے قتل کیا گیا تھا یا کوئی حادثہ؟"

"اس کی موت کی وجہ کوئی نہیں جانتا۔ اس کی لاش بستی سے تقریباً ایک میل دور پہاڑیوں میں اس کی جیپ کے قریب پڑی ہوئی پائی گئی تھی جس پر زخموں کے لاتعداد نشان تھے اور زبان بھی کٹی ہوئی تھی۔ آس پاس اس کی جیپ کے پہیوں کے سوا اور کسی قسم کے نشان نہیں ملے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہو کہ اسے کسی نے قتل کیا ہوگا۔ اسی وجہ سے اس کی موت کو پراسرار قرار دیا جارہا ہے اور۔۔۔"

"اور اس کا ذمے دار مجھے ٹھہرایا جارہا ہے کیونکہ وہ آخری مرتبہ مجھ سے مل کر گیا تھا۔" میں نے اس کا جملہ پورا کردیا۔

سمبا نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تمہاری دوست بلا' تھیوب کے ساتھ رہے گی اور تم اپنے جھونپڑے سے باہر نہیں نکلو گے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد تمہیں دوسری بستی میں منتقل کردیا جائے گا۔"

"دوسری بستی میں! کیا مطلب؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ بستی یہاں سے چند میل دور پہاڑیوں میں واقع ہے۔ وہاں تم محفوظ رہو گے۔" سمبا نے جواب دیا۔

"کیا یہاں مجھے کوئی خطرہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اس قبیلے کے لوگ صلح جو اور امن پسند ہیں لیکن اس قسم کا غیر معمولی واقعہ ان کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرسکتا ہے اس لیے مکھیا نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں دوسری بستی میں بھیج دیا جائے۔ تم وہاں محفوظ رہو گے۔"

سمبا چلا گیا اور میں ایک بار پھر الجھن میں مبتلا ہوگیا۔ قبیلے کی توہم پرستی کے بارے میں سن کر میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ بستی کے لوگ مجھے کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیر اثر سمجھ رہے تھے اور ظاہر ہے' وہ یہاں میری موجودگی کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن۔۔۔ میں یہ بستی اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک میری یادداشت نہ لوٹ آئے۔ یہاں سے کہیں اور جانے کے لیے میری یادداشت کا بحال ہونا بہت ضروری تھا۔ آخر میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ اور یہاں کس طرح پہنچا اور بلا سے میرا کیا تعلق ہے؟ ذہن پر بوجھ ڈالنے سے میرا سر دکھنے لگا اور میں کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

میں دن بھر اپنے جھونپڑے سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے منع کردیا گیا تھا۔ ببلا اگرچہ مستقل طور پر میرے جھونپڑے میں نہیں ٹھہری لیکن اس کی آمدورفت جاری رہی۔ وہ بہت بد حواس اور خوف زدہ تھی۔ وہ جب بھی جھونپڑے میں آتی' چند منٹ رکتی اور پھر واپس چلی جاتی۔ اس مرتبہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تھیوب اور دوسری عورتوں کے توسط سے یہ کوشش کررہی ہے کہ مکھیا کو اس بات پر آمادہ کرلیا جائے کہ ہمیں اس بستی سے کہیں اور نہ بھیجا جائے۔

سہ پہر کے قریب میں نے پیشاب کے لیے جھونپڑے سے باہر جانا چاہا تو ایک آدمی نے مجھے روک لیا۔ اس نے کچھ کہا تھا لیکن تبتی زبان کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑسکا جبکہ وہ خود تبتی کے سوا کوئی اور زبان نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے بتایا تو اس نے جھونپڑے کے اندر آکر ایک نکڑ کی طرف اشارہ کردیا اور مجھے مجبوراً اس نکڑ میں جاکر فراغت حاصل کرنی پڑی۔

وہ چاند کی چودھویں شب تھی۔ غروب آفتاب کے فوراً ہی بعد چاند طلوع ہوگیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد سمبا جھونپڑے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ببلا بھی تھی اور پھر صرف دو منٹ بعد میں اور ببلا' سمبا کے ساتھ بستی سے نکل رہے تھے۔

چاندنی رات میں آس پاس بکھری ہوئی وادی کا منظر بڑا دل فریب تھا۔ اگر میں ذہنی طور پر اپ سیٹ نہ ہوتا اور ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار نہ ہوتا تو اس منظر سے لطف اندوز ہونے کی کوشش ضرور کرتا۔

سمبا مجھے اس بستی کے بارے میں بتا رہا تھا جہاں ہم جارہے تھے۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ بستی چٹانی غاروں میں آباد تھی۔ بعض غار قدرتی تھے جبکہ بیشتر چٹانیں کاٹ کر بنائے گئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وہ بستی زیادہ سے زیادہ دو چار میل کے فاصلے پر ہوگی لیکن ہم ان پہاڑوں میں پر پیچ راستوں پر تقریباً چار گھنٹوں تک چلتے رہے اور بالآخر اس پراسرار بستی میں پہنچ گئے۔

میں اسے پراسرار ہی کہوں گا کیونکہ کوئی جھونپڑا یا مکان نظر نہیں آرہا تھا۔ ساری آبادی پہاڑی غاروں میں تھی۔ ان غاروں کے سامنے ایک جگہ چھوٹے سے میدان میں آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن تھا اور کئی لوگ اس الاؤ کے اردگرد جمع تھے۔ ان میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی تھیں اور گیارہ بارہ سال سے اوپر کی عمر کے بچے بھی۔

سمبا ایک لمحے کو ان لوگوں کے قریب رکا تھا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ چاندنی رات میں چٹانی غاروں کی یہ بستی واقعی بہت پراسرار لگ رہی تھی۔

میرے خیال میں یہ غار چٹانوں میں صدیوں کی شکست و ریخت کے بعد معرض وجود میں آئے تھے اور شاید یہ لوگ بھی بہت عرصے سے ان غاروں کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے۔

ایک چٹان پر چڑھ کر ہم ایک غار میں داخل ہوگئے۔ غار جزوی طور پر انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا تھا۔ اندر داخل ہونے کا راستہ ایک مکان کے عام دروازے کی طرح تھا۔ دونوں طرف چٹانوں کو تراش کر ستون بنائے گئے تھے۔

اندر سے یہ غار دس بائی دس فٹ کے ایک کمرے کے برابر تھا۔ اس کی دیواریں کھردری تھیں۔ پیچھے کی طرف بھی ایک تنگ سا راستہ تھا۔ ایک دیوار میں مشعل ٹنگی ہوئی تھی جبکہ دوسری دیوار کے قریب ایک گدا بچھا ہوا تھا۔ اس پر کئی کمبل بھی پڑے ہوئے تھے۔

"یہ تمہارا کمرا ہے۔" سمبا نے کہا "یہاں تم آرام سے رہ سکتے ہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

ببلا کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اچانک میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ذہن پر گہری تاریکی کے بجائے دھند سی محسوس ہورہی تھی۔ اس دھند میں کچھ ہیولے سے ابھر رہے تھے۔ اچانک اپنے بازو پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کرکے میں اچھل پڑا۔ وہ ببلا تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی جیسے کسی بات پر خوف زدہ ہو۔

"تم لوگ تھک گئے ہوگے۔ آرام کرو۔" سمبا نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا "آج پورن ماشی (پورے چاند) کی رات ہے۔ چاند کی چودھویں شب۔ آدھی رات کو یہاں چن گومپا آنے والا ہے۔ بہت دلچسپ آدمی ہے۔ تم لوگ بھی اس سے مل کر خوش ہوگے لیکن اگر نہ بھی ملنا چاہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ آرام سے یہاں پڑے رہنا۔ اب صبح ملاقات ہوگی۔" وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہاں کوئی تم لوگوں کے لیے کھانا لے کر نہیں آئے گا۔ تھوڑی دیر بعد سامنے والے میدان میں یاک کا گوشت بھونا جائے گا۔ تم لوگ بھی وہاں جاکر اپنا حصہ وصول کرلینا۔" یہ بات کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔

سمبا کے جانے کے بعد میں غار کا جائزہ لینے لگا۔ دروازے کی ایک طرف یاک کی کھال کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ ضرورت کے وقت اس پردے کا سرا دوسری طرف کے ستون میں پھنسا کر "دروازہ" بند کیا جاسکتا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ گدا بچھا ہوا تھا جس پر تین چار کمبل پڑے ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب ہی لکڑی کے ایک ٹب میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک پتھر پر ایلومینیم کا ایک میلا سا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ گدا' کمبل اور پانی کا یہ ٹب اس غار کا کل کائنات تھی۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر دیوار میں مشعل ٹنگی ہوئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر وہ مشعل اتار لی اور غار کی پچھلی طرف تنگ سے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ ببلا بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ اب بھی خوف زدہ تھی اور اس نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔

وہ تنگ سا راستہ دراصل ایک دراڑ تھی جو تقریباً پندرہ گز آگے جاکر بائیں طرف مڑ گئی تھی اور اس طرف روشنی نظر آرہی تھی۔

اس طرف بھی ایک قدرے چھوٹا غار تھا۔ اس میں بھی وہی چیزیں تھیں جو ہمارے غار میں تھیں۔ یعنی ایک گدا' کمبل اور دروازے کے قریب پانی کا ایک چوبی برتن۔ تاہم دیوار کے ساتھ دائیں سے بائیں بندھی ہوئی ایک رسی پر کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے تھے اور اس دیوار میں بھی ایک دراڑ نظر آرہی تھی۔ ہم اس دراڑ میں داخل ہوکر ایک تیسرے غار میں پہنچ گئے۔

اب مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ چٹانوں سے اندر ہی اندر یہ قدرتی غار ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ ہوسکتا ہے' چٹانوں کے اندر واقع یہ غار کسی زمانے میں پانی کی گزرگاہ رہے ہوں لیکن پھر پانی نے راستہ بدل لیا اور ان قبائلیوں نے ان غاروں کو اپنا مسکن بنالیا۔

ایک جگہ رک کر میں نے ببلا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی۔ اس نے میرا بازو دبا کر واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے مزید آگے جانا مناسب نہیں سمجھا اور وہیں سے واپس لوٹ آیا۔

اپنے غار میں داخل ہوتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ببلا تو خوف زدہ سی ہوکر میرے ساتھ چپک گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو اور بھی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ سامنے گدے پر اس شخص کو بیٹھے دیکھ کر تو میرا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو میں اندازہ نہیں لگا سکا

تھا کہ وہ کوئی انسان ہے یا جانور۔ اس کے سر کے بال' داڑھی اور مونچھوں کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ پیلے پیلے چوڑے دانت بے حد خوفناک تھے۔ ہمیں دیکھ کر اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ وہ یقیناً مسکرایا ہوگا لیکن اس طرح اس کا چہرہ کچھ اور بھی خوفناک ہوگیا تھا۔ مشعل کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں وہ شخص خاصا پراسرار لگ رہا تھا۔

اس وحشی نما انسان کے جسم پر بھی پیلے رنگ کا چوغہ تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھا دانت نکوستا رہا پھر اٹھ کر ہمارے سامنے آگیا۔ اس کی نظریں ببلا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اور پھر اس نے اچانک ہی وہ حرکت کی جس کی کم از کم مجھے توقع نہیں تھی۔ اس نے اچانک ہی ببلا کو دونوں بانہوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ببلا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ وحشی ببلا کو اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہونٹ اس کے چہرے پر جمانے کی کوشش کررہا تھا اور ببلا مزاحمت کرتے ہوئے چیخ رہی تھی۔

"بچاؤ۔۔۔ ہمت سنگھ اس وحشی سے بچاؤ مجھے۔۔۔!" ببلا چیخی۔

اس وحشی کے حلق سے "خرخراہٹ" کی عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ ایک لمحے کو تو میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے اور پھر صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوتے ہی میں جیسے ہوش میں آگیا۔ میں ایک قدم آگے بڑھا تو وہ شخص ببلا کو کھینچتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں بھی پھرتی سے آگے بڑھ گیا۔ مشعل میں نے ایک طرف پھینک دی۔ ایک ہاتھ سے ببلا کو پکڑ لیا اور دوسرا ہاتھ اس شخص کے سینے پر رکھ کر اسے پیچھے دھکیلنے لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن ببلا کی دونوں بانہیں اب بھی اس کی گرفت میں تھیں۔ میں نے ہاتھ پھیلا کر ہتھیلی سے اس کے چہرے پر ضرب لگائی۔

ضرب خاصی زوردار لگی تھی۔ وہ بکرے کی طرح ڈکراتا ہوا ایک قدم اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ببلا کا ایک بازو چھوڑ دیا۔ میں نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر بالکل اسی انداز میں ایک اور ضرب لگادی۔ اس مرتبہ چوٹ اس کی ناک پر لگی۔ وہ بلبلاتا ہوا کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا اور اس نے ببلا کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرا۔ اپنے ہاتھ پر خون دیکھ کر

اس کے چہرے پر درندگی سی ابھر آئی اور پھر وہ کسی درندے ہی کی طرح غراتا ہوا میری طرف لپکا۔

میں نے بڑی پھرتی سے نیچے جھک کر اسے ٹانگوں سے پکڑ کر اچھال دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا "دھد" کی آواز سے پشت کے بل گرا۔ اس کے منہ سے کراہ خارج ہو گئی تھی لیکن وہ بڑی تیزی سے اٹھ کر میری طرف لپکا۔ میں اس سے بھی زیادہ تیزی سے اپنی ایک ٹانگ پر گھوم گیا۔

میری زوردار اسپن کک اس کے پہلو میں لگی۔ وہ لڑکھڑا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر پھر میری طرف لپکا لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اسے قریب آنے کا موقع نہیں دیا۔ میں کسی طاقت ور اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا۔ اس مرتبہ میری راؤنڈ ہاؤس کک اس کی گردن پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

لیکن وہ بھی اپنی قسم کا ایک ہی ڈھیٹ آدمی تھا۔ گرنے کے فوراً ہی بعد وہ اٹھ گیا۔ اس کا چہرہ کسی خوں خوار درندے کی طرح بہت بھیانک ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک میرے سامنے کھڑا ریچھ کی طرح سینہ کوبی کرتے ہوئے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر منہ سے عجیب سی آوازیں نکالتا ہوا میری طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کو نکال رکھے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی لیکن وہ لڑائی کے فن سے واقف نہیں تھا۔ وہ مجھے بانہوں کے نرغے میں لے کر میری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا تھا۔ میرے بازوؤں اور ٹانگوں کی ہڈیوں کو ماچس کی تیلیوں کی طرح توڑ سکتا تھا لیکن اسے اپنی طاقت کے استعمال کا سلیقہ نہیں تھا۔ وہ مجھے اپنی فولادی بانہوں کی گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گیا تو زندہ نہیں بچ سکوں گا۔

میں ایک بار پھر اپنی جگہ سے اچھلا۔ میری فلائنگ کک اس کے سینے پر پڑی اور وہ بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا اور اس مرتبہ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ میں اس کے جسم پر پے در پے ٹھوکریں رسید کرتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو ایک ٹھوکر سے بھی نہیں بچا سکا تھا اور پھر میں نے بڑی پھرتی سے جھک کر اسے گردن اور ایک ٹانگ سے پکڑ کر سر سے اوپر اٹھا لیا اور غار سے باہر لے جا کر اسے پوری قوت سے اچھال دیا۔

غار کے سامنے ڈھلان تھی۔ پتھریلی زمین پر گرتے ہوئے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش ضرور کی ہوگی لیکن وہ ڈھلان پر لڑھکتا چلا گیا۔

مجھ پر بھی جنون سا طاری ہو گیا تھا اور یہ میرا جنون جس نے حیوان نما اس وحشی کو میرے ہاتھوں بری طرح ... دیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے پیچھے لپکنا چاہا لیکن ... نے مجھے بازو سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے گھوم کر ... طرف دیکھا۔ وہ میرے بازو میں انگلیاں گاڑتے ہوئے ... اشارہ کر رہی تھی اور جب میں نے اپنے آپ پر قابو ... سامنے دیکھا تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ بیس پچیس افراد چند گز کے فاصلے پر غار کے ... کھڑے تھے۔ میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ یہ اس بستی کے لوگ تھے۔ میں ان کے لیے ... تھا اور میں نے ان کے ایک ساتھی کو ادھ موا کر کے ... دیا تھا۔ یہ لوگ اگر حملہ کر دیتے تو چشم زدن میں میری ... کر ڈالتے۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا۔ وہ نجانے کب سے غار کے سامنے کھڑے اپنے اس ساتھی کو پٹتے ہوئے دیکھتے رہے تھے لیکن اس دوران میں کسی نے مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی اور اب وہ لوگ خاموش کھڑے اپنے اس جانور نما ساتھی کو دیکھ رہے تھے جو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

اور پھر دو آدمی میری طرف بڑھنے لگے۔ ان دونوں کے سر گنجے تھے اور ان کے جسموں پر بدھ بھکشوؤں جیسے لباس تھے۔ یہ اس قبیلے کے پہلے دو آدمی تھے جنہیں میں نے گنجا دیکھا تھا۔

ان کے آگے بڑھنے کے انداز میں جارحیت نہیں تھی۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئے۔ ان دونوں نے اپنے بازو سامنے کو بلند کر دیے۔ ہتھیلیوں کے رخ اوپر کی طرف تھے۔ ان میں سے ایک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز میں کچھ کہا لیکن میں ایک لفظ نہیں سمجھ سکا۔ تاہم میں نے اپنا ہاتھ غیر ارادی طور پر اوپر اٹھا دیا۔

وہ دونوں میرے اس اشارے کا نجانے کیا مطلب سمجھے کہ ان کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ ان میں سے ایک میری طرف دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کچھ ... پھر ان دونوں نے ہاتھ گرا دیے اور مڑ کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے قریب چلے گئے۔ اس شخص نے جو مجھ سے مخاطب ہوا تھا، اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ چار ... آگے بڑھ گئے اور زمین پر پڑے ہوئے وحشی کو ہاتھوں ...

... اٹھا کر ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔

غار کے سامنے جمع لوگ دوبارہ میدان میں الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ میں کچھ دیر ان کی طرف دیکھتا رہا پھر بلا کو لے کر غار کے اندر آ گیا۔ میں نے گدا کھینچ کر دروازے کے سامنے ... کو اشارہ کرتا ہوا خود بیٹھ گیا۔

بلا بار بار اپنی پسلیاں سہلا رہی تھی۔ اس کم بخت نے بلا کو کچھ زیادہ ہی دبا دیا تھا۔ میں نے ایک کمبل اٹھا کر اسے ... کے اوپر ڈال دیا۔

"اپنے آپ کو یاد کرنے کی کوشش کرو ہمت سنگھ۔" بلا میری طرف دیکھ کر روہانسی آواز میں بولی "وہ ایک آدمی تھا جسے تم نے مار مار کر ادھ موا کر دیا لیکن اگر چار پانچ آدمی مل کر ہم پر حملہ کر دیتے تو تم کیا کر سکتے تھے۔ سمبا پتا نہیں ہمیں ان وحشیوں کے بیچ کیوں چھوڑ گیا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکلنا ہوگا لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تمہاری یادداشت لوٹ آئے۔ بھگوان کے لیے کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو۔"

"مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔" میں نے کہا "لیکن تم میرے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو۔ میرا پیچھا چھوڑ دو اور چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تمہیں ان وحشیوں سے کب تک بچا سکوں گا۔"

"کیا کہہ رہے ہو ہمت سنگھ۔" بلا نے وحشت زدہ سے لہجے میں کہا "میں بلا ہوں۔ تمہاری بلا۔ پہچانو مجھے۔ اپنے آپ کو پہچانو۔ میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ کہاں جا سکتی ہوں؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ویسے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر وہ پانچ چھ آدمی مل کر بلا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے تو میں اسے بچا نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ہی شیطان تھا جسے میں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جب میں اور بلا اندر ہی اندر غاروں میں گھوم رہے تھے تو یہ شخص میدان میں الاؤ کے پاس سے اٹھ کر ہمارے غار میں آ گیا تھا۔ شاید اپنے ساتھیوں پر اپنی بہادری کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ مجھے مار پیٹ کر بلا کو مجھ سے چھین کر لے جائے گا لیکن وہ خود ہی میرے ہاتھوں بری طرح پٹ گیا تھا اور اس کے ساتھی اسے اٹھا کر بستی سے باہر پھینک آئے تھے۔ گویا بزدلوں کی یہاں کوئی قدر نہیں تھی۔

مجھے بلا پر ترس بھی آ رہا تھا۔ اگر اس وقت میں نہ ہوتا تو وہ وحشی اس کا تیا پانچا کر دیتا۔ بلا بار بار مجھے کچوکے لگا رہی تھی کہ میں اپنے بارے میں کچھ یاد کرنے کی کوشش کروں۔ میں کوشش تو ضرور کرتا تھا لیکن مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہی بھکشو ہمارے لیے یاک کا بھنا ہوا تازہ گوشت لے آیا۔ سمبا نے کہا تھا کہ الاؤ پر جب گوشت بھونا جائے گا تو میں اپنا حصہ لے آؤں لیکن مجھے وہاں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

گوشت کسی قدر نمکین اور بہت لذیذ تھا۔ بھوک مٹانے کے بعد میں نے گدا پیچھے کھینچ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور دروازے پر پردہ کھینچ دیا۔ اب مجھے ان لوگوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ان کے ایک ساتھی کی پٹائی کر کے میں اپنی برتری ثابت کر چکا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اپنے ساتھی کا حشر دیکھنے کے بعد اور کوئی بھی میرے سامنے آنے کی کوشش نہیں کرے گا اور ویسے بھی وہ لوگ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا چکے تھے اور مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

بلا میرے قریب دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ کبھی بڑبڑانے لگتی اور کبھی پلک جھپکے بغیر میری طرف دیکھنے لگتی۔

آدھی رات کے قریب غار کے سامنے قدموں کی آہٹ سن کر میں چونک گیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا کہ دروازے کا پردہ ہٹا اور وہی بھکشو اندر داخل ہوا لیکن وہ زیادہ آگے نہیں آیا تھا۔ وہ کبھی بلا اور کبھی میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا لیکن مجھے صرف ایک لفظ سمجھ میں آ سکا تھا۔۔۔ چن گومپا!

مجھے سمبا کی بات یاد آ گئی۔ اس نے جانے سے پہلے چن گومپا نام کے کسی آدمی کا ذکر کیا تھا جو آدھی رات کے وقت یہاں آنے والا تھا اور اس وقت یہ بھکشو بھی اس کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

میں نے اٹھ کر دروازے سے باہر جھانکا۔ میدان میں جلتے ہوئے الاؤ کے پاس اب دو چار آدمی ہی رہ گئے تھے۔ بھکشو نے سامنے والی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا اور غار کے سامنے ڈھلان اترتا چلا گیا۔

میں غار میں آ گیا۔ بلا سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے چن گومپا کے بارے میں بتایا۔ اس کے چہرے پر وحشت سی ابھر آئی۔

"پتا نہیں وہ کون ہے۔ کیسا آدمی ہو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "کہیں ہمارے لیے کچھ اور مسائل نہ پیدا کر دے!"

"دیکھنا تو چاہیے۔" میں نے کہا "ممکن ہے وہ تمہاری کچھ مدد کر سکے۔"

میری اس بات پر وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف

دیکھنے لگی لیکن بہرحال، وہ میرے ساتھ جانے کو تیار ہوگئی۔

ہم غار سے نکل کر ڈھلان اترنے لگے۔ وہ بھکشو غائب ہوچکا تھا البتہ میدان میں الاؤ کے قریب اب بھی دو تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ایک آدمی نے سامنے والی چٹان کی طرف اشارہ کردیا۔

ہم سامنے والی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ ہمارے غار سے اس پہاڑی کا فاصلہ ایک فرلانگ کے لگ بھگ تھا۔

وہ غار زمین سے تقریباً ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ دہانہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ ایک طرف دیوار میں لگی ہوئی ایک مشعل جل رہی تھی اور غار کے آخر میں ایک اور کشادہ راستہ نظر آرہا تھا۔ ہم دونوں اس طرف بڑھتے رہے۔ بملا نے میرا ہاتھ پکڑلیا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی اور وہ خاصی سہمی ہوئی تھی۔ ہمارے غار میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اسے خوف زدہ کردینے کے لیے کافی تھا۔

وہ سرنگ تقریباً بیس گز طویل تھی۔ اس کے اختتام پر بھی روشنی نظر آرہی تھی اور جب ہم سرنگ کی دوسری طرف پہنچے تو وہ منظر دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

وہ بہت کشادہ غار تھا بلکہ اسے غار کہنا مناسب نہیں تھا۔ چاروں طرف عمودی چٹانیں تھیں اور اوپر چھت نہیں تھی۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند نظر آرہا تھا اور شاید اس قبیلے کی پوری آبادی اس غار میں جمع تھی۔ صرف عورتیں اور مرد تھے۔

ایک دیوار کے ساتھ تقریباً تین فٹ اونچا چبوترہ تھا جس پر دس بارہ افراد بیٹھ سکتے تھے اور قصبے کے سارے لوگ اس چبوترے کے سامنے جمع تھے۔

چبوترے کی پچھلی طرف ایک اور تنگ سی سرنگ تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس سرنگ سے دو آدمی برآمد ہوئے۔ ان کے پیچھے چند عورتیں تھیں اور پھر ان کے بعد جو آدمی نمودار ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

مجھے بنکاک کا پنڈت رگھوناتھ یاد آگیا جس نے بنکاک شہر سے باہر آشرم بنا رکھا تھا جو دراصل عیاشی کا اڈا تھا اور دارا نے اس آشرم میں پناہ لی تھی۔ وہ آشرم جرائم کا اڈا بھی تھا جو ہمارے ہاتھوں جل کر راکھ ہوگیا تھا اور بعد میں پنڈت رگھوناتھ بھی تھائی کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اس شخص کا حلیہ بنکاک کے پنڈت رگھوناتھ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ لمبا قد، بھاری بھرکم جسم، گنجا سر، جس کے پچھلے حصے پر تقریباً ایک بالشت لمبی چٹیا تھی۔ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ داڑھی اور مونچھ [illegible] بال اس طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ [illegible] کر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ سینہ [illegible] کی طرح بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ کندھوں اور بازوؤں [illegible] گھنے بال نظر آرہے تھے۔ اس نے اسکرٹ کی طرح [illegible] نیکر پہن رکھی تھی جو گھٹنوں سے کافی اونچی تھی۔ [illegible] رنگ برنگے موتیوں کی کئی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔

وہ نہایت غلیظ اور گندا آدمی تھا۔ منہ سے [illegible] سے داڑھی کے بال گیلے ہورہے تھے۔ اسے دیکھ کر [illegible] آتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ نیم برہنہ عورتیں [illegible] دائیں بائیں سے اپنی بانہوں کی لپیٹ میں لے کر [illegible] دے رکھا تھا۔ وہ اپنا بوجھ کبھی ایک عورت پر ڈالتا اور [illegible] دوسری عورت پر۔

وہ چبوترے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ دونوں عورتیں اس [illegible] بازوؤں سے لپٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ چبوترے کے سامنے [illegible] ہوئے لوگ بڑی عقیدت بھری نظروں سے اس کی طرف [illegible] رہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں [illegible] وہ اس قبیلے کا کوئی روحانی پیشوا تھا لیکن سمبانے تو ایسی [illegible] بات نہیں کہی تھی۔

چن گومپا کچھ دیر انگاروں جیسی سرخ آنکھوں [illegible] سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے دو عورتوں [illegible] اشارہ کیا۔ وہ دونوں عورتیں اٹھ کر چبوترے پر پہنچ [illegible] چن گومپا نے اپنا ایک پیر آگے کو پھیلا دیا۔ وہ دونوں [illegible] اس کا پیر چاٹنے لگیں۔ اس کا اشارہ پاکر ایک اور [illegible] چبوترے پر آگئی اور اس کا دوسرا پیر چاٹنے لگی اور پھر [illegible] اور عورت۔ وہ اس کی داڑھی کے بال اور بالوں میں [illegible] ہوئے ہونٹ چاٹنے لگی۔

یہ سب کچھ دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہورہی تھی [illegible] گومپا نہایت غلیظ آدمی تھا لیکن یہ عورتیں بڑی عقیدت [illegible] بڑے جوش و خروش سے اس کے پیر اور جسم کو چاٹ [illegible] تھیں۔ اس نے شاید ان کے اذہان کو اس قدر مسخر کر [illegible] کہ وہ اس کے اشاروں پر اس کے سامنے جھک رہی [illegible]

چبوترے کے عقب سے ایک اور آدمی برآمد ہوا [illegible] نے بھنے ہوئے گوشت سے لبریز ایک بڑا سا طشت اٹھا [illegible] تھا۔ چن گومپا پیر سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے [illegible] اس کے سامنے رکھ دیا۔

چن گومپا نے بھنے ہوئے گوشت کا ایک بڑا سا [illegible] اٹھالیا اور دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کھانے لگا۔ اس کا [illegible]

کھانے کا انداز بھی بڑا گھناؤنا تھا۔ اس کے منہ سے "چپڑ چپڑ" کی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے کتا ہڈی چبا رہا ہو۔

گومپا کے اردگرد بیٹھی ہوئی عورتیں بڑی للچائی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ گومپا نے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور اسے چوس کر ایک طرف اگل دیا۔

آس پاس بیٹھی ہوئی عورتیں اگلے ہوئے گوشت کے اس ٹکڑے پر اس طرح جھپٹ پڑیں جس طرح کتا ہڈی پر جھپٹتا ہے۔

گومپا کے منہ سے اگلا جانے والا گوشت کا وہ ٹکڑا کسی کے ہاتھ آیا یا نہیں لیکن وہاں ایک اور دلچسپ صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ وہ چاروں پانچوں عورتیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئیں۔ چند منٹ بعد ہی ان کے لباس تار تار ہوچکے تھے۔

اچانک ہی گومپا کے منہ سے ایک گونج دار آواز نکلی۔ اس نے نجانے کیا کہا تھا کہ وہ عورتیں ایک دم ایک دوسرے سے الگ ہٹ گئیں۔ گومپا تیز لہجے میں ان سے کچھ کہتا رہا پھر طشت میں پڑے ہوئے گوشت کے پارچے اٹھا اٹھا کر چبوترے کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اچھالنے لگا۔ لوگ کتوں کی طرح ان پر جھپٹ پڑے۔

یہ ہنگامہ تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔ میں نے بملا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

اب گومپا شاید کوئی بھاشن (خطبہ) دے رہا تھا۔ ہر شخص بڑی توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ابھی اس کا بھاشن جاری ہی تھا کہ چبوترے کے پیچھے سے برآمد ہونے والے ایک اور آدمی کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے ہمارے غار میں بملا پر دست درازی کی کوشش کی تھی اور میرے ہاتھوں پٹا تھا اور لوگوں نے اسے اٹھا کر بستی سے باہر پھینک دیا تھا۔

اس شخص اور گومپا کے حلیے میں تھوڑا ہی فرق تھا۔ وہ جھک کر گومپا کے کان میں سرگوشی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظریں ہماری طرف اٹھ گئی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ تھا اور گومپا سے ہمارے ہی بارے میں کچھ کہہ رہا تھا۔

گومپا نے بھی ہماری طرف دیکھا۔ اس کی نظریں بملا کے چہرے سے پھسلتی ہوئی میرے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ اس سے نگاہیں ملتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگیں۔ میں زیادہ دیر تک اس کی نظروں کی تاب نہ لاسکا اور رخ بدل لیا۔ اسی لمحے گومپا کی گونجتی ہوئی آواز سنائی دی۔

دو آدمی اٹھ کر ہماری طرف لپکے اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا، وہ بملا کو اٹھا کر چبوترے کی طرف لے گئے۔ بملا اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بری طرح چیخ رہی تھی۔

چبوترے پر وہ جانور نما انسان بملا سے لپٹ گیا اور اسے بری طرح بھنبھوڑنے لگا۔

"ہمت سنگھ!"

بملا کی چیخ سن کر میں جیسے ہوش میں آگیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں دوڑتا ہوا چبوترے پر پہنچ گیا اور اس وحشی کو بالوں سے پکڑ کر ایک طرف کھینچنے لگا۔ اس نے بملا کو چھوڑ کر اچانک ہی میرے سینے پر گھونسا رسید کردیا۔ مجھے یوں لگا جیسے سینے پر وزنی ہتھوڑے سے ضرب لگائی گئی ہو۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا، اس نے میرے سر پر گھونسا مارا۔

میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی رقص کرنے لگیں۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور گھونسوں اور لاتوں سے میری تواضع کرتا رہا۔

بملا ایک طرف کھڑی چیخ رہی تھی۔ چبوترے کے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ بھی چیخ چیخ کر میرے حریف کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے پہلے اس شخص کو میرے ہاتھوں پٹنے کے بعد اٹھا کر بستی سے باہر پھینک دیا تھا اور اب میرے خلاف اسے شہ دے رہے تھے۔

اور پھر مجھے سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون بہنے لگا تھا۔ خون کا ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہورہا تھا اور پھر مجھ پر جیسے جنون طاری ہوگیا۔ میں نے اس وحشی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ پہلے اسے اٹھا کر چبوترے پر پٹخ دیا اور پھر اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔

چبوترے پر موجود ننگ دھڑنگ عورتیں چیختی ہوئی ادھر ادھر بھاگ گئیں اور میں اس وحشی کو پورے چبوترے پر لوٹاتا رہا۔ لوگ اب بھی چیخ چیخ کر میرے حریف کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ چن گومپا بھی چیخ رہا تھا۔ وہ بھی اٹھ کر ریچھ کی طرح ناچ رہا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے موقع مل گیا اور میں نے گومپا کو اٹھا کر چبوترے سے نیچے پھینک دیا۔ اس کی بھیانک چیخ غار میں گونج اٹھی تھی۔

اور پھر ایک دم ایسا سناٹا چھا گیا جیسے وہاں زندگی کا وجود

ہی مٹ گیا ہو مگر یہ سناٹا زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکا۔ دو تین آدمی چیختے ہوئے میری طرف لپکے لیکن گومپا کی دہاڑ سن کر رک گئے۔

میں اس وحشی کو بھی چبوترے سے نیچے پھینک چکا تھا۔ وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ گومپا نے چیخ کر لوگوں سے کچھ کہا اور میری طرف مڑ گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی اور میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔

گومپا کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ اس نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ اس مرتبہ یوں لگا جیسے میرے دماغ میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں۔ میں نے ایک بار پھر سر کو جھٹکے دیئے۔

گومپا پر بری طرح جھنجلاہٹ سی طاری ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا کر چیختے ہوئے کچھ کہنے لگا مگر اس کا ایک لفظ میری سمجھ میں نہیں آسکا۔

ایک ننگ دھڑنگ عورت اپنی جگہ سے اٹھ کر "گومپا۔۔۔ گومپا۔۔" چیختی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ وہ اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی۔ گومپا نے ٹانگ کو زوردار جھٹکا دیا۔ وہ عورت چیختی ہوئی دور جا گری۔

گومپا چیختا دہاڑتا ہوا چبوترے کی پچھلی طرف تنگ سے راستے میں داخل ہو گیا۔ میرے ہاتھوں دوسری مرتبہ پٹنے والا وحشی بھی اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑا۔

گومپا کے جاتے ہی صورتِ حال بدل گئی۔ چند آدمی میری طرف گھونسے تان کر چیخنے چلانے لگے لیکن کوئی آگے نہیں بڑھا۔ تاہم دو ننگ دھڑنگ عورتیں بملا کی طرف لپکی تھیں لیکن ان دونوں بھکشوؤں نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر ان عورتوں کو ایک طرف دھکیل دیا اور مجھے اور بملا کو بانہوں سے پکڑ کر اس طرف دوڑ پڑے جس طرف سے ہم اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے لیکن کوئی آگے نہیں آیا۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔

ہم اس غار سے باہر آگئے۔ میدان میں اب بھی الاؤ روشن تھا اور تین چار آدمی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم ان کے قریب سے گزرتے ہوئے اپنے غار میں آگئے۔ وہ دونوں بھکشو بھی ہمارے ساتھ تھے۔ میں ان سے گومپا کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ دونوں میری زبان نہیں سمجھتے تھے۔

وہ دونوں ہمیں غار میں چھوڑ کر چلے گئے۔

بملا نے کمبل اوڑھ لیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ میں بھی اس کے قریب ہی بیٹھا گومپا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے حلئے سے میں نے یہ تو اندازہ لگا لیا تھا کہ گومپا کا تعلق اس قبیلے سے نہیں تھا۔ وہ بعض پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ ہو سکتا ہے کہ عرصہ پہلے وہ بھی بھٹک کر اس طرف آنکلا ہو اور اپنی ان پراسرار قوتوں کے بل بوتے پر ان لوگوں کو اپنے قابو میں کر لیا ہو لیکن میرا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ قبیلے کے سب لوگ اس کے زیر اثر نہیں تھے۔ ان دو بھکشوؤں کو اس کے مخالفین میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ سمبا بھی تھا جس نے بتایا تھا کہ چن گومپا ایک دلچسپ آدمی ہے جس کا مطلب تھا کہ وہ گومپا کا پیروکار نہیں تھا۔

گومپا نے جس طرح ان لوگوں کے اذہان کو مسخر کر رکھا تھا وہ واقعی حیرت انگیز بات تھی۔ اسے تو دیکھ کر کراہت محسوس ہوتی تھی لیکن عورتیں جس طرح اس کے پیر چاٹ رہی تھیں وہ کم از کم میرے لیے انتہائی تحیر خیز تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ گومپا بعض پراسرار قوتوں کا مالک تھا اور اس نے یہ پراسرار قوتیں مجھ پر بھی آزمانے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اس کا سامنا کرتے ہوئے میرے دماغ کو بار بار جھٹکے لگنا' سوئیوں کی چبھن محسوس ہونا اور دماغ اور پورے جسم میں سنسنی پھیل جانا۔ وہ اپنی کسی پراسرار قوت سے بار بار مجھ پر حملے کرتا رہا تھا لیکن شاید میرے اندر بھی کوئی ایسی قوت موجود تھی جو اس کے ان حملوں کو ناکام بنا رہی تھی۔

میرے اندر وہ کون سی قوت ہو سکتی تھی؟ میرے دماغ میں اچانک ہی جھماکا سا ہوا۔ میں اچھل پڑا۔ مجھے لگا جیسے ذہن کے کسی تاریک گوشے سے کوئی بات ابھر کر سامنے آنا چاہتی ہو لیکن ذہن ایک بار پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔

بملا میرے گھٹنے پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ میں رات بھر جاگتا رہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ گومپا یا اس کے حواری کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کریں لیکن وہ رات کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر گزر گئی۔

صبح ایک بھکشو ہمیں ایک اور غار میں لے گیا۔ وہاں دوسرا بھکشو بھی بیٹھا ہوا تھا۔ یہ غار کافی کشادہ تھا اور چیزوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں پوری گھر گرہستی کا سامان موجود ہے۔

میں اور بملا ایک گدے پر بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ہی ایک عورت غار کے اندرونی حصے سے برآمد ہوئی۔ اس نے ایک پیکٹ ہمارے سامنے رکھ دیا جس میں یاک کا بھنا ہوا

تازہ گوشت اور قہوہ تھا۔ وہ خود بھی دو زانو ہو کر ہمارے سامنے بیٹھ گئی۔ ان دونوں میں سے ایک بھکشو ہمارے قریب بیٹھ گیا اور دوسرا باہر چلا گیا۔

اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ ہم ابھی ناشتا کر ہی رہے تھے کہ سمبا کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔

"ایک آدمی تم سے ملنا چاہتا ہے۔" سمبا نے کہا "وہ صبح سویرے ہماری بستی میں آیا تھا۔ میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ اپنے آپ کو تمہارا آشنا سا بتاتا ہے۔"

"میرا آشنا سا!" میں نے حیرت سے کہا اور پھر بملا کو وہیں چھوڑ کر غار سے باہر آگیا۔

غار کے دہانے سے چند گز دور ایک دراز قامت آدمی ایک درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا جسم قدرے بھاری بھرکم تھا۔ اس نے جینز اور ڈینم کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے اور لباس سے وہ نیپالی نہیں لگتا تھا۔

"میرا نام تری دیو ہے۔" اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا "میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چند ضروری باتیں پوچھنا تھیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم کہیں بیٹھ کر بات کریں۔"

سمبا ہمیں اسی غار میں چھوڑ کر چلا گیا جہاں ہم۔ نے رات گزاری تھی۔

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کچھ بتا سکوں گا۔" میں نے اس کے سامنے گدے پر بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں سمبا اور بستی والوں نے بتا دیا ہوگا کہ ایک حادثے کے بعد میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں۔"

"میں کسی حادثے کے بارے میں نہیں، یوگندر ناتھ نامی اس شخص کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو کل صبح دوسری بستی میں تم سے ملا تھا اور تم سے ملاقات کے کچھ ہی دیر بعد اسے پہاڑیوں میں بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔" تری دیو نے کہا۔

"لل... لیکن میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا اور کسی کار کی شناخت کے سلسلے میں کہیں لے جانا چاہتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ کسی انجانے خوف کی لہر میرے پورے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یوگندر ناتھ کا ٹورازم کے محکمے سے کوئی متعلق نہیں تھا۔" تری دیو نے جواب دیا "میں اس وقت تمہیں زبان کھولنے پر مجبور نہیں کر سکتا لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ یوگندر ناتھ سے تمہاری کیا بات چیت ہوئی تھی؟"

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میں کچھ دیر تک اپنے بے ربط تنفس پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا پھر اسے بتانے لگا کہ یوگندر ناتھ سے میری کیا گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ یوگندر نے دوبارہ آنے کے لیے کہا تھا۔

تری دیو بڑی گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ میرے چہرے کے تاثرات سے شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں غلط بیانی سے تو کام نہیں لے رہا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو، یہ سب کیا ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ضرور۔" تری دیو نے جواب دیا "اس کا اصل نام موتی لال تھا۔ وہ ہندو تھا اور اس کا کسی محکمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دراصل منشیات کا اسمگلر تھا اور اس کی مجرمانہ سرگرمیاں خاصی وسیع تھیں۔ وہ قتل کی کئی وارداتوں کے سلسلے میں بھی کھٹمنڈو پولیس کو مطلوب تھا لیکن اچانک ہی غائب ہو گیا۔ اس کا کھٹمنڈو سے یہاں آنا اور تم سے ملنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ہستی اس کے لیے بہت اہم تھی۔ وہ اب مر چکا ہے اور تمہیں کچھ یاد نہیں لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اس کے لیے اتنے اہم کیوں تھے؟"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔" میرے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کچھ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری لاش بھی یوگندر ناتھ کی طرح پہاڑوں میں کہیں پڑی ہوئی ملے۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھے واقعی اپنی بے بسی پر غصہ آرہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، سمبا غار میں داخل ہوا۔

"تمہارے اس مہمان کا کہنا ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں ہے۔" تری دیو نے سمبا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ درست ہے۔" سمبا نے جواب دیا "اس کی یادداشت کھو چکی ہے اور ہمارے قبیلے کا وید اس کا علاج کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ بملا نام کی ایک لڑکی ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے یا اس کے بارے میں اس وقت تک کچھ نہیں بتائے گی جب تک اس کے ساتھی کی یادداشت نہیں لوٹ آتی۔"

"بہرحال، میں پھر آؤں گا۔" تری دیو یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا "اور مسٹر ہمت سنگھ۔ بہتر ہوگا کہ تم جلد سے جلد اپنی یادداشت واپس لانے کی کوشش کرو۔" تری دیو نے یہ کہتے ہوئے اس انداز میں میری طرف دیکھا جیسے اسے شبہ ہو کہ میں اپنی یادداشت کھو جانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔ وہ عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

سمبا بھی "ابھی آیا۔" کہتے ہوئے غار سے نکل گیا۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تری دیو کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس نے بتایا تھا کہ یوگندر ناتھ منشیات کا اسمگلر تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ منشیات کے ایک اسمگلر کا مجھ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یوگندر ناتھ میرے پاس کیوں آیا تھا؟ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا سر دکھنے لگا اور میں بھی اٹھ کر غار سے باہر آگیا۔

میں بھکشوؤں والے غار میں آگیا۔ بملا وہاں نہیں تھی۔ بھکشو نے بتایا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹا پہلے اس غار سے چلی گئی تھی۔ میں اپنے غار کی طرف واپس آرہا تھا کہ سمبا اور وید آتے ہوئے دکھائی دیے۔

غار میں آکر وید نے میرے سر کی پٹی تبدیل کی اور مطمئن انداز میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ میں سمبا کو یہاں پیش آنے والے رات کے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

سمبا نے جن گومپا کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے میرے خیالات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ واقعی بعض پراسرار قوتوں کا مالک تھا۔ کئی سال پہلے کسی طرف سے بھٹکتا ہوا یہاں آگیا تھا۔ اس نے ایک دو آدمیوں کو اپنی اس پراسرار قوت سے تسخیر کر لیا اور پھر اس کا حلقہ پھیلنے لگا لیکن قبیلے کے زیادہ لوگ اس کے خلاف تھے۔ وہ اسے یہاں سے نکالنا چاہتے تھے لیکن چونکہ اس نے بھی اپنے کچھ حمایتی پیدا کر لیے تھے اس لیے کسی تصادم سے بچنے کے لیے اس معاملے کو جوں کا توں چھوڑ دیا تھا۔ بہرحال، سمبا نے مجھے اور خاص طور پر بملا کو اس سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا۔

سمبا چلا گیا۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ گدے پر لیٹا تو نیند نے دبوچ لیا۔

سمبا نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ غار میں مشعل جل رہی تھی۔ میرے ذہن پر نیند کا خمار تھا لیکن سمبا نے جو خبر سنائی وہ بڑی دھماکا خیز تھی۔

بملا لاپتا تھی!

"بملا لاپتا ہے، کیا مطلب؟" میں بری طرح چونک گیا۔ سمبا کا لہجہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

"میدان کی دوسری طرف درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے سادھو نے دوپہر کے وقت اسے کسی آدمی کے ساتھ درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لباس سے وہ آدمی کوئی ہندو ہی لگتا تھا لیکن وہ سادھو اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے بعد سے بملا کو نہیں دیکھا گیا۔" سمبا نے جواب دیا۔

"تم نے مجھے اس وقت کیوں نہیں جگا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں دن بھر کھیا کے کاموں میں مصروف رہا تھا۔ مجھے بھی ابھی کچھ دیر پہلے ہی معلوم ہوا ہے۔" سمبا نے جواب دیا۔

میری آنکھوں کے سامنے یوگندر ناتھ کی موت کا منظر گھوم گیا۔ کہیں بملا بھی... ! نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ بملا کے بارے میں ایسا نہیں سوچا جا سکتا۔ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی آلہ کار نہیں ہو سکتی۔ اسے یقیناً اس آدمی نے اغوا کیا ہوگا جو مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ وہ بملا کے ذریعے دباؤ ڈال کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا ہوگا۔

"کیا اسے پہاڑیوں کی طرف تلاش کیا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے..." کسی انجانے خوف سے میں اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔" سمبا نے جواب دیا "یہاں چند روز سے کچھ پراسرار قسم کے واقعات رونما ہونے لگے ہیں۔"

"کیا ان پراسرار واقعات سے میرا کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟" میں نے الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صورتِ حال خاصی پیچیدہ ہے۔" سمبا نے جواب دیا "یہاں کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان پراسرار واقعات کے ذمے دار تم ہو۔"

میں ایک بار پھر خیالوں میں کھو گیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے تھے اور اس عرصے میں ایک آدمی پراسرار طریقے سے ہلاک ہو چکا تھا اور میری اپنی ساتھی لاپتا تھی اور بدقسمتی سے وہ دونوں آخری مرتبہ مجھ سے ہی ملے تھے۔ لوگوں کے خیال میں، میں کسی پراسرار شیطانی قوت کے زیرِ اثر تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ ان پراسرار واقعات سے میرا کوئی تعلق ہے۔ وہ مجھے قصوروار سمجھ رہے تھے۔

میں سمبا کے ساتھ غار سے باہر آگیا۔ سامنے ہی وہ دونوں بھکشو چند آدمیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ دو عورتیں بھی تھیں۔ ان سب کے چہروں پر تفکر نمایاں تھا۔ وہ سب ہمدردانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بملا کی پراسرار گمشدگی پر سب ہی پریشان تھے اور پھر بملا کی تلاش شروع ہو گئی۔ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں کی صورت میں پہاڑیوں میں پھیل گئے۔ سمبا اور ایک بھکشو میرے ساتھ

تھا۔

شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ہم ہاتھوں میں مشعلیں لیے غاروں میں گھومتے رہے۔ یہ غار چٹانوں کے اندر ہی اندر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ بعض غار سرنگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور بعض بالکل الگ تھلگ تھے۔ ان غاروں میں رہنے والے کئی اور لوگ بھی بملا کی تلاش میں ہمارے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔

آدھی رات تک تلاش جاری رہی لیکن بملا کو ملنا تھا نہ ملی۔ میں اور سمبا واپس اسی غار میں آگئے۔ سمبا کو شام کو اپنی بستی واپس جانا تھا لیکن بملا کی گمشدگی کی وجہ سے وہ بھی میرے پاس ہی رک گیا تھا۔ ہم رات کے آخری پہر تک بیٹھے بملا ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ تری دیو بھی پہنچ گیا۔ وہ مجھ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا تھا۔ سمبا اٹھ کر غار سے باہر چلا گیا۔ تری دیو میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"مجھے بملا کی گمشدگی کا افسوس ہے۔" تری دیو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "صدیوں پرانے یہ غار بڑے پراسرار ہیں۔ یہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ایک رات پہلے تم چمن گومپا سے مل چکے ہو۔ اس جیسا پراسرار شخص کچھ بھی کرسکتا ہے۔ تم اگر چاہو تو میں اب بھی تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اگر تمہاری یادداشت برقرار ہوتی تو تم مجھے فوراً پہچان لیتے۔ ہماری پہلی ملاقات تقریباً ایک مہینہ پہلے کھٹمنڈو میں ہوئی تھی۔ میں اسے باقاعدہ ملاقات تو نہیں کہوں گا۔ میں اس وقت دلیش مکھ کی طرف تھا اور ہم ایک دوسرے کے حریف تھے لیکن اب ہم میں دوستی ہوسکتی ہے۔"

"کھٹمنڈو۔ حریف۔۔ دلیش مکھ۔" میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

"نہیں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنا ماضی بھول چکا ہوں۔" میں بے بسی سے سر جھٹکنے لگا "مجھے بالکل یاد نہیں۔ ماضی کی کوئی بات میرے ذہن میں نہیں رہی۔"

"میرے خیال میں تمہیں اتنا تو یاد ہوگا کہ چند روز پہلے تمہارے ایک دوست کی حویلی کو آگ لگا دی گئی تھی اور تمہارا دوست، سابق پولیس انسپکٹر پانڈے بھی اس آگ میں جل کر راکھ ہوگیا تھا اور صرف تین چار دن پہلے تم پدمی کے قریب ناگ پال اور چانگ لی کے دو آدمیوں کو قتل کرکے پانچ سو کلو ہیروئن لے اڑے تھے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ گویا اسے شبہ تھا کہ میں اپنی یادداشت کھوجانے کا ڈھونگ رچا رہا ہوں۔

"ناگ پال۔ چانگ لی۔ پانچ سو کلو ہیروئن۔ میں بالکل نہیں سمجھا۔" مجھے اس کی باتوں سے الجھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

"اب مجھے کھل کر بات کرنی پڑے گی۔" تری دیو نے یہ کہتے ہوئے محتاط نگاہوں سے غار کے دروازے کی طرف دیکھا "تم اپنی ایک دوست کو چھڑانے کے لیے دلیش مکھ کا پیچھا کرتے ہوئے ہندوستان سے کھٹمنڈو آئے تھے۔ تم بھی اگرچہ غیر قانونی طور پر نیپال میں داخل ہوئے تھے لیکن دو پولیس آفیسر تمہاری مدد کررہے تھے۔ دلیش مکھ نے ناگ پال کے پاس پناہ لے لی تھی لیکن چند ہی روز بعد ناگ پال اسے اپنے لیے بوجھ سمجھنے لگا۔ اس نے دلیش مکھ کو مروا دیا۔ اس طرح اس کے دو مقاصد پورے ہوگئے۔ اسے دلیش مکھ سے بھی نجات مل گئی اور کھٹمنڈو میں ہنگامے شروع کروا کے اسے اپنے بدیشی آقاؤں کی راہ ہموار کرنے میں بھی مدد ملی۔

"تم اپنی دوست کو دلیش مکھ کی قید سے نجات دلا چکے تھے۔ اصولی طور پر تمہیں ہندوستان واپس چلے جانا چاہیے تھا لیکن تم اس چینی کا قصہ بھی پاک کرنا چاہتے تھے جو ناگ پال کی مدد سے اس دیش میں ہیروئن اور دیگر منشیات کی تجارت پر قابض ہونا چاہتا تھا۔

"تمہیں کسی طرح اطلاع مل گئی کہ ناگ پال کے دو آدمی جنوبی علاقے سے پانچ سو کلو ہیروئن لے کر آرہے ہیں اور ہیروئن کی یہ پہلی بڑی کھیپ وصول کرنے کے لیے چانگ لی اپنے آدمیوں کے ساتھ کھٹمنڈو سے ڈھائی تین، سو میل دور پدمی نامی بستی میں موجود تھا لیکن تم نے پدمی سے آگے نکل کر ان دونوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر پانچ سو کلو ہیروئن پر قبضہ کرلیا۔

"وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح پورے ملک میں تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ سمجھ رہے ہیں کہ شاید تم ہندوستان کی طرف فرار ہونے کی کوشش کروگے اس لیے ان کی تمام تر توجہ سرحد کی طرف ہے۔ یہ بات ابھی تک ان کے ذہن میں نہیں آئی کہ تم پہاڑوں میں کسی دور دراز کی بستی میں پناہ لیے ہوئے ہو۔

"اگر تم یادداشت کھوجانے کا ڈھونگ ختم کردو اور اس ہیروئن میں سے آدھا حصہ دینے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں بحفاظت سرحد پار کرواکر ہندوستان پہنچا سکتا ہوں۔"

"تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے ایک بار پھر بے بسی سے سر جھٹک دیا۔

"ویسے تمہاری یہ کیفیت کب تک درست ہوجائے گی؟" تری دیو نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ویدجی کا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے دو چار روز میں میری یادداشت لوٹ آئے اور اس میں غیر معینہ عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" تری دیو نے کہا "میں پھر کسی وقت تم سے ملاقات کروں گا۔ اپنے ذہن پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرو۔ ہوسکتا ہے تمہیں کچھ یاد آجائے۔"

تری دیو کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد سمبا غار میں آگیا۔ میں اس وقت شدید ذہنی الجھن میں مبتلا تھا۔ دماغ پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں سمبا چہرے کے تاثرات سے میری اندرونی کیفیت کو بھانپ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ بالآخر کئی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے اسے تری دیو سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا جسے سن کر سمبا بری طرح چونک گیا۔

"ہیروئن!" اس نے نظریں میرے چہرے پر جما دیں "صورتِ حال خاصی پیچیدہ ہوگئی ہے۔ میرے خیال میں ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دے دینی چاہیے۔ وہ لوگ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔"

"پولیس!" میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔

"یہاں سے تقریباً تیس میل دور کالی کوٹ نامی گاؤں میں پولیس کی ایک چوکی ہے۔" سمبا نے بتایا "وہ لوگ قبائلی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے اور اس طرف کبھی کوئی پولیس والا آیا بھی نہیں لیکن یہ معاملہ بہت سنگین ہے۔ ہمیں پولیس کو اطلاع ضرور دینی چاہیے۔ میں بھکشو کو یاک (YAK۔۔ لمبے بالوں والا تبتی بیل) پر روانہ کردیتا ہوں۔ تیس میل کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں لیکن ان پہاڑوں میں راستے بہت دشوار اور خطرناک ہیں۔ وہ شام تک وہاں پہنچ جائے گا اور میرا خیال ہے کل صبح تک کسی نہ کسی کو ساتھ لے کر یہاں واپس آجائے گا۔ میں بھکشو کو دیکھتا ہوں۔ اسے ابھی روانہ کردینا چاہیے۔" سمبا تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ میرا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ صورتِ حال نہ صرف پیچیدہ بلکہ نہایت سنگین بھی تھی۔ اگر پولیس کو پتا چل گیا کہ میں ہیروئن کی اسمگلنگ میں ملوث ہوں تو میرا ٹھکانا جیل کے سوا اور کہیں نہیں ہوگا۔ اس تصور ہی سے میں لرز اٹھا۔ بملا لاپتا تھی یا شاید وہ بھی صورتِ حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے غائب ہوگئی تھی۔ میرے لیے بھی بچاؤ کا ایک ہی راستہ تھا۔ فرار!

میں وقت گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی دن بھر بملا کی تلاش بھی جاری رہی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل گیا۔ میں اپنے غار میں آکر لیٹ گیا۔ سمبا آج پھر وہیں رہ گیا تھا لیکن رات کو وہ میرے پاس نہیں رہا تھا۔

میں بار بار اٹھ کر غار سے باہر جھانک رہا تھا اور بالآخر جب سناٹا چھا گیا تو میں غار سے باہر آگیا اور محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا میدان کی طرف چلنے لگا۔

اچانک اسی طرف سے کوئی پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر میں جلدی سے ایک بہت بڑے پتھر کے پیچھے دبک گیا۔ چند لمحے ادھر ادھر دیکھتا رہا لیکن نہ تو کوئی آہٹ سنائی دی اور نہ ہی کوئی نظر آیا۔ میں پتھر کی آڑ سے نکل کر ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی ناچ اٹھیں۔ سر پر لگنے والی ضرب اتنی شدید تھی کہ میں اپنے حواس پر قابو نہ رکھ سکا اور لہراتا ہوا نیچے گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

جہاں میری آنکھ کھلی وہ تقریباً بارہ فٹ طویل اور سات فٹ چوڑا ایک پہاڑی غار ہی تھا۔ چھت اس قدر نیچی تھی کہ قدرے لمبے قد کے آدمی کا سر چھت کو چھو سکتا تھا۔ ایک طرف دیوار کے قریب ایک چبوترہ تھا جس پر ٹین کا بنا ہوا ایک چراغ جل رہا تھا۔ اس چراغ میں بھی کسی قسم کی چربی جل رہی تھی۔ گاڑھے دھوئیں کے ساتھ غار میں ناگوار سی بو بھی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے قریب ہی پانی سے بھرا ہوا ایک برتن بھی پڑا ہوا تھا۔ میری ایک کلائی آہنی کڑے میں جکڑی ہوئی تھی جس سے منسلک زنجیر کا دوسرا سرا دیوار میں لگے ہوئے ایک ہک میں پھنسا ہوا تھا۔

چند لمحوں تک تو کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی پھر رفتہ رفتہ صورتِ حال واضح ہونے لگی۔ رات کو غار کے سامنے والے میدان میں میرے سر کی پشت پر ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کیا گیا تھا اور اب میں ایک قیدی تھا لیکن میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ مجھے قید کرنے والا کون تھا۔

میں کچھ دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا پھر اٹھ کر اس قید

خانے کا جائزہ لینے لگا۔ زنجیر خاصی لمبی تھی۔ میں اس حد تک آگے بڑھتا رہا جس حد تک زنجیر اجازت دے رہی تھی۔

یہ غار شاید پہلے بھی قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تھا۔ ایک طرف کپڑوں کے چند چیتھڑے اور غلاظت کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ جس سے شدید تعفن اٹھ رہا تھا۔

میں دوسری طرف گھومنا ہی چاہتا تھا کہ کونے میں کوئی چیز چمکتی ہوئی دیکھ کر رک گیا۔ میں نے چبوترے پر پڑا ہوا چراغ اٹھالیا اور آگے بڑھنے لگا اور پھر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

روشنی میں چمکنے والی چیز دھوپ کا وہ چشمہ تھا جو گزشتہ روز میں نے تری دیو کی آنکھوں پر دیکھا تھا۔ اس کا ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور فریم درمیان سے مڑا ہوا تھا۔ میرے لیے خوف زدہ ہونے کی بات یہ تھی کہ ٹوٹا ہوا وہ چشمہ ایک انسانی ہاتھ کی گرفت میں تھا جس کا باقی حصہ دیوار کے پیچھے تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بملا تھی۔

دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند لمحوں بعد آنکھیں کھولیں تو حقیقت جوں کی توں میرے سامنے موجود تھی۔ بملا کا مردہ جسم آڑی ترچھی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس تار تار اور جسم پر چھوٹے بڑے زخموں کے لاتعداد نشان نظر آرہے تھے جو اس بات کا ثبوت تھے کہ مرنے سے پہلے اس پر بہت تشدد کیا گیا تھا۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ بملا کی اذیت ناک موت کا ذمے دار صرف اور صرف میں تھا۔

میں ذرا اور آگے بڑھا تو میرے دماغ کو ایک بار پھر شدید جھٹکا لگا۔ اس تنگ سی دراڑ میں بملا کی لاش سے تین چار گز آگے تری دیو کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کا نرخرا کٹا ہوا تھا اور آس پاس خون بکھرا ہوا تھا جو جم کر سیاہ ہوچکا تھا۔

میں اس دراڑ سے باہر آگیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بملا کو بستی سے غائب کرنے والا تری دیو تھا لیکن یہاں کوئی اور بھی تھا جس نے تری دیو کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

میرے دماغ میں تیز سنسناہٹ ہورہی تھی۔ سر پر جہاں ضرب لگائی گئی تھی وہاں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے سر میں دھماکے ہورہے ہوں پھر اچانک ہی میرے دماغ میں روشنی کا ایک کوندا سا لپکا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے ماضی کی طرف لوٹنے لگا۔

میری کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ رہی تھی۔ بیتے ہوئے واقعات تاریکی سے ابھر کر سامنے آنے لگے۔ خیالات اور یادوں کے اس ہجوم میں میرا دماغ دکھنے لگا۔ میں بار بار سر کو جھٹکنے لگا کہ ذہن کا بوجھ کسی طرح کم ہوسکے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ماضی کی ایک ایک تصویر ذہن پر واضح ہوتی چلی گئی۔

آخری بات جو بالکل واضح ہو کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ میں اور بملا' چانگ لی کے دو آدمیوں کو ختم کرکے' پانچ سو کلو ہیروئن پر قبضہ کرکے اپنی گاؤں پریدمی نامی اس گاڑی سے لاور نکل جانا چاہتے تھے جہاں چانگ لی اور اس کے ساتھی موجود تھے۔ رات بھر پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے ہم نجانے کہاں نکل آئے تھے اور پھر کار کا وہ حادثہ بھی واضح طور پر ذہن میں ابھر آیا۔ آخری بات جو مجھے یاد تھی وہ یہ تھی کہ میری کار ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی گہرائی میں بہتے ہوئے دریا کی طرف جارہی تھی اور میں بھی کار کے پیچھے ڈھلان پر لڑھک رہا تھا اور پھر میرا سر کسی پتھر سے ٹکرایا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

تارانگ قبیلے کی اس بستی میں سب سے پہلے یوگندر ناتھ نے اپنے آپ کو ٹورازم کا آفیسر ظاہر کرکے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ وہ کسی کار کی شناخت کے بہانے مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد یوگندر ناتھ کو بے دردی سے قتل کردیا گیا تھا پھر تری دیو سامنے آیا۔ وہ اپنے آپ کو میرا شناسا ظاہر کرکے مجھ سے ہیروئن کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا اور اب بملا اور تری دیو کی لاشیں میرے سامنے تھیں۔ بملا کو میری ساتھی سمجھ کر تری دیو نے اغوا کیا تھا۔ وہ اس پر تشدد کرکے ہیروئن کے بارے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن بملا تشدد کی تاب نہ لاسکی اور ختم ہوگئی اور پھر کسی اور نے تری دیو کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آرہی تھی کہ یوگندر ناتھ اور بملا کو تری دیو نے قتل کیا تھا لیکن یہ سوال بہت اہم تھا کہ تری دیو کو ہلاک کرنے والا کون تھا؟

یوگندر ناتھ اور تری دیو کے بارے میں مجھے یقین ہوگیا تھا کہ انہیں کسی طرح یہ پتا چل گیا تھا کہ میں چانگ لی کے آدمیوں سے ہیروئن چھین کر لے بھاگا ہوں اور وہ لوگ مجھ سے ہیروئن ہتھیانا چاہتے تھے۔

بہت دیر سوچنے کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو میں نے سر جھٹک کر دیوار سے ٹیک لگالی۔ لیمپ میں تیل ختم ہورہا تھا کیونکہ روشنی کم ہوگئی تھی۔ میری کلائی پر پڑی ہوئی ہتھکڑی خاصی تکلیف دہ ثابت ہورہی تھی۔ میں اس

ہاتھ کو کم سے کم حرکت دینے کی کوشش کررہا تھا تاکہ تکلیف زیادہ نہ ہو۔

سناٹا میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کررہا تھا لیکن پھر اچانک باہر کسی جگہ دھمک سنائی دی۔ وہ بھاری قدموں کی آواز تھی جو لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی۔ بالآخر غار کے دہانے کے سامنے پہنچ کر وہ آواز رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں اور میں نے جلدی سے رخ پھیرلیا۔

"بہت بہادر بننے کی کوشش کررہے تھے۔ بستی کے راج کو بھول جاؤ اور ذرا میرے اس مہمان خانے میں بھی رہ کر دیکھ لو۔"

یہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک چن گومپا' دوسرا وہی جانور نما آدمی جو دو مرتبہ مجھ سے پٹ چکا تھا۔ اس نے تیسرے آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ وحشی نے اس آدمی کو زوردار دھکا دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا غار کے وسط میں آن گرا۔

وہ سمبا تھا جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ سمبا کی حالت دیکھ کر میں لرز اٹھا۔ اس کی پیشانی سے بہنے والا خون اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کے ساتھ مار پیٹ بھی کی گئی تھی۔ میں چند لمحے متوحش نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر چن گومپا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"تو مجھے اغوا کرنے والے تم تھے لیکن سمبا کو یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"یہ تمہارا سب سے بڑا ہمدرد ہے۔ اسے یہاں لانا میرے لیے یوں بھی سود مند ثابت ہوسکتا ہے کہ بستی میں اب تمہیں تلاش کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ تمہارے غائب ہونے پر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا۔" گومپا نے جواب دیا۔ اس کے بھدے ہونٹوں پر بڑی کریہہ سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"لیکن بملا نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ اسے اس بے رحمی سے کیوں ہلاک کیا گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"اس پر بومبا کا دل آگیا تھا۔" اس نے اپنے ساتھی اس جانور نما آدمی کی طرف اشارہ کیا "وہ دو مرتبہ تمہاری وجہ سے بچ گئی تھی لیکن بالآخر اس کے قابو آہی گئی۔ ویسے وہ دیکھنے میں تو بڑی نازک سی لگتی تھی لیکن بڑی جان دار نکلی۔ آخر وقت تک مزاحمت کرتی رہی۔ آخر میں تو تری دیو نے بھی اسے بچانے کی کوشش کی تھی۔ بومبا نے اس کا بھی قصہ تمام کردیا کیونکہ تری دیو کا زندہ رہنا بھی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا اور بملا تو ویسے بھی تمہاری ساتھی تھی۔ تمہارے ہر راز سے بھی واقف ہوگی۔ ہم اس سے وہ راز اگلوانا چاہتے تھے لیکن میں پھر کہوں گا کہ وہ بڑی سخت جان تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس نے منہ سے ایک لفظ تک نہیں اگلا۔"

"نہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"تم تو سب کچھ جانتے ہو نا!" چن گومپا نے طنزیہ لہجے میں کہا "ہم تمہارا راز تم ہی سے معلوم کرلیں گے۔"

"مم۔ میں کیسے جانتا ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ تم جانتے ہو میں اپنی یادداشت سے محروم ہوچکا ہوں۔" میں نے چہرہ جھکاتے ہوئے کہا۔ میں گومپا پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میری یادداشت لوٹ آئی ہے۔

"ہوں۔" گومپا نے مجھے گھورا "میں تم سے علیحدگی میں بات کروں گا۔" اس نے بومبا کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سمبا کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکال دیا اور پھر آگے بڑھ کر میری ہتھکڑی بھی کھول دی۔ میں دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی سہلانے لگا۔

"تمہیں یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی گومپا۔" سمبا نے اسے دھمکی دی "بستی کے لوگوں کو ہمت سنگھ اور بملا کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ بملا کو تم نے ختم کردیا ہے۔ ہمت سنگھ کی گمشدگی پر لوگ خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ تم کسی طرح بچ نہیں سکو گے۔ ویسے بھی تمہاری مجرمانہ اور غیر اخلاقی سرگرمیاں جس طرح بڑھ رہی ہیں وہ بھی اب بستی کے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جارہی ہیں۔"

"میری مجرمانہ اور غیر اخلاقی سرگرمیاں۔" گومپا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ابھی تو ابتدا ہوئی ہے سمبا۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس بستی کی عورتیں کس طرح میرے اشارے پر بے لباس ہو کر میرے سامنے رقص کرنے لگتی ہیں اور مرد میرے پیر چاٹنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ابھی تو چند لوگ میرے اشاروں پر ناچ رہے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب بستی کے لوگ مجھے سجدے کریں گے۔ میرے اندر کی شکتی انہیں مجبور کردے گی۔"

اندر کی شکتی کے نام پر میں چونک گیا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ مجھے یاد آگیا کہ ایک رات پہلے اس نے مجھ پر بھی اپنی وہ شکتی آزمانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اس وقت تو مجھے یاد بھی نہیں تھا کہ میرے اندر بھی کوئی شکتی موجود ہے۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ

گومپا کو اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی اور اب میں اپنے حواس میں آچکا تھا۔

"یہ تمہاری خام خیالی ہے گومپا۔" سمبا کے بجائے میں نے جواب دیا "میں نہیں جانتا تم کون ہو لیکن تم نے ان لوگوں کی زندگیوں کو جس طرح جہنم بنا رکھا ہے اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ اب تمہاری کوئی شکتی کام نہیں آئے گی۔"

"اوہو۔" گومپا کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہوگئی۔ اس نے نظریں میرے چہرے پر جمادیں۔

میں بھی اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا اور پلک جھپکے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔

گومپا کھڑے کھڑے لڑکھڑا گیا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔

"بومبا۔" وہ دہاڑا "اسے باہر لے کر چلو۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میرے اندر کتنی شکتی ہے اور میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"تم کچھ بھی نہیں کرسکتے گومپا۔ تم زندگی بھر ہمیں اپنا قیدی بنا کر نہیں رکھ سکتے۔" میں نے کہا۔

"میں یہ روگ نہیں پالوں گا لیکن تم لوگوں کو اس طرح غائب کردیا جائے گا کہ دنیا میں تمہارا نام تک نہیں رہے گا۔" گومپا نے جواب دیا اور بومبا کو اشارہ کیا۔

بومبا نے میرے بازو پر گرفت جما دی۔ ہم مختلف سرنگوں سے ہوتے ہوئے غار سے باہر ایک کھلی جگہ پر آگئے۔ باہر کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چاروں طرف سے عمودی چٹانوں میں گھرے ہوئے ایک چھوٹے سے میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین جھونپڑے بنے ہوئے تھے۔ تین چار جگہوں پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ ایک طرف دہکتے ہوئے کوئلوں کا ڈھیر تھا۔ اس کے دائیں بائیں لکڑیوں کے اسٹینڈ تھے جن پر لوہے کا ایک موٹا سریا رکھا ہوا تھا اور لوہے کے اس سریے پر پہاڑی بکرا یا ایسا ہی کوئی جانور ٹنگا ہوا تھا جو نیچے دہکتے ہوئے کوئلوں پر روسٹ ہو رہا تھا۔

ایک ننگ دھڑنگ عورت تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سریے کو گھما دیتی تھی تاکہ بکرے کا گوشت چاروں طرف سے روسٹ ہوسکے۔ ایک دوسری عورت کسی اور کام میں مصروف تھی۔ ان دونوں کا تعلق تارانگ قبیلے ہی سے تھا اور ان کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے غار میں گومپا نے ایک بار پھر مجھ پر اپنی شکتی آزمانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا تھا اور مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ وہ ہپناٹزم کا ماہر تھا۔ اس نے ہپناٹزم ہی سے ان لوگوں کے اذہان مسخر کر رکھے تھے اور قبیلے کے سیدھے سادے لوگ اس کو اس کی پراسرار شکتی سمجھ بیٹھے تھے اور گومپا کی اسی پراسرار قوت کے بل بوتے پر وہ کتوں کی طرح اس کے پیر چاٹنے پر مجبور تھے۔

"بیٹھ جاؤ۔" گومپا نے ایک اسٹول کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی دوسرے اسٹول پر بیٹھ گیا "میں ایک بات تم پر واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے تعاون کروگے تو فائدے میں رہوگے اور یہ بات ذہن نشین کرلو کہ یہاں نہ تو کوئی تمہاری مدد کو آئے گا اور نہ ہی تم یہاں سے فرار ہوسکتے ہو۔ اگر تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو میں سچ اگلوانا بھی جانتا ہوں۔"

"لیکن مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"تمہیں سب کچھ یاد آجائے گا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے میرے چہرے پر نظریں جمادیں۔

چند لمحے خاموشی رہی اور پھر گومپا نے باتوں ہی باتوں میں اپنے بارے میں جو انکشاف کیا وہ بہت ہی سنسنی خیز تھا۔ وہ کھٹمنڈو کا رہنے والا تھا۔ بدمعاشی اور غنڈا گردی کے حوالے سے شہر کے بعض علاقوں میں اس کی بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہپناٹزم کا بھی ماہر تھا۔ وہ جرائم اور دادا گیری میں اپنے اس علم سے بھی فائدہ اٹھا رہا تھا۔

پانچ سال پہلے اس کا ایک مخالف گروہ سے تصادم ہوگیا۔ اس تصادم میں گومپا کے ہاتھوں تین آدمی مارے گئے۔ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا تھا لیکن وہ بھاگ نکلا۔ کچھ عرصہ وہ شہر کے نواح میں واقع بدھوں کی ایک چھوٹی سی بستی میں روپوش رہا اور جب اسے یقین ہوگیا کہ اب شہر کا ماحول کرنا خطرے سے خالی نہیں تو وہ دھول گری کی طرف فرار ہوگیا اور پہاڑوں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا۔

تارانگ قبیلے کی یہ بستی اس کے لیے ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ شہر کی تہذیب سے قطعی ناآشنا یہ سیدھے سادے لوگ بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے گومپا کو مہان (عظیم) سمجھ کر پناہ دی۔ گومپا کچھ عرصے تک قبیلے کی مختلف بستیوں میں گھومتا رہا پھر غاروں والی اس بستی کو مستقل ٹھکانے کے طور پر منتخب کرلیا اور اپنی ہپناٹزم کی قوت سے ان پر اثر انداز ہونے لگا۔ سب سے پہلے اس نے بومبا کو اپنے

قابو میں کیا۔ دیو قامت بومبا بستی کا سب سے طاقتور آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس کے پاس تین عورتیں تھیں اور اس نے تینوں کو گومپا کی خدمت میں پیش کردیا۔

گومپا آہستہ آہستہ ہاتھ پیر پھیلاتا گیا۔ اس نے ہپناٹزم کے ذریعے کئی لوگوں کو اپنا مطیع بنالیا لیکن بستی کے بہت سے لوگ ذہنی طور پر مضبوط تھے۔ وہ اس کے داؤ میں نہیں آئے۔

کچھ لوگ گومپا کو بستی سے نکالنا چاہتے تھے لیکن بہت سے لوگ اس کے حلقے میں بھی شامل ہوچکے تھے۔ اسے زبردستی بستی سے نکالنے کی کوشش کی جاتی تو ہنگامہ ہوتا، قتل و غارت ہوتی تاہم گومپا پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ پہلے کی طرح آزادی سے قبیلے کی بستیوں میں نہیں گھومے گا۔ غاروں والی بستی میں وہ ہر پونم (پورے چاند) کی رات اس غار میں آتا تھا جہاں دوسرے لوگ بھی جمع ہوجاتے اور رات بھر اخلاق سے گری ہوئی حرکات کا مظاہرہ کیا جاتا۔ گومپا نے ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی تھی کہ یہی اصل زندگی ہے۔ یہ لوگ کسی دھرم یا اخلاقیات کے پابند نہیں تھے اس لیے گومپا انہیں بھٹکانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"میں یہاں بڑے سکون کی زندگی گزار رہا تھا۔" گومپا میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "تم دیکھ چکے ہو کہ یہ لوگ کس طرح کتوں کی طرح میرے پیر چاٹتے ہیں لیکن تری دیو نے یہاں آکر میرے من میں ہلچل مچادی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے گومپا کی طرف دیکھا۔

"تری دیو بھی کھٹمنڈو کا رہنے والا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کئی سال پہلے کھٹمنڈو میں منشیات کو متعارف کرایا تھا۔ اس سے پہلے اس ملک کے لوگ ایسی چیزوں کو جانتے بھی نہیں تھے۔" گومپا نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "میں یہاں تری دیو کو دیکھ کر بہت حیران ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ بھی پولیس سے بچنے کے لیے بھاگا ہے اور پناہ کی تلاش میں بھٹکتا ہوا اس طرف آنکلا ہے لیکن اس نے تمہارے بارے میں جو کہانی سنائی وہ بڑی دلچسپ تھی۔ پانچ سو کلو ہیروئن!" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

عین اسی لمحے ایک جھونپڑے کی دوسری طرف کوئی پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ گومپا کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ ٹارچ اٹھا کر اس کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

اس وقت مجھے بھی پہلی مرتبہ اس جگہ کو غور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں شاید کسی قدیم عمارت کے کھنڈرات تھے۔ کچھ اونچی شکستہ دیواریں تھیں۔ کہیں کہیں کوئی ٹوٹا ہوا ستون بھی نظر آرہا تھا۔

"شاید کوئی جانور تھا۔" گومپا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا "بہرحال، تری دیو نے مجھے تمہارے بارے میں بھی بتایا تھا۔ تم واقعی بہت بہادر آدمی ہو۔ کسی شیر کے منہ سے نوالہ چھین لینا آسان نہیں ہوتا لیکن تم نے واقعی بڑی ہمت کا ثبوت دیا۔ پانچ سو کلو ہیروئن کے لیے تو میں اپنی یہ راجدھانی چھوڑنے پر بھی تیار ہوگیا۔ تری دیو نے مجھے ففٹی ففٹی کا لالچ دیا تھا لیکن مجھے اس کی یہ شرط پسند نہیں آئی۔ تری دیو سے ایک دن پہلے یوگندر ناتھ نام کا ایک اور آدمی بھی تمہاری تلاش میں یہاں آچکا تھا۔ اسے تری دیو نے ختم کردیا۔

"بقول تمہارے، تم اپنی یادداشت کھو چکے ہو۔ تری دیو تم سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ میرے کہنے پر تمہاری ساتھی بملا کو اٹھا لیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زبان کھول دے گی اور بومبا بھی اس سے اپنے من کی آشا (دلی خواہش) پوری کرلے گا لیکن وہ بڑی سخت جان ثابت ہوئی۔ بومبا نے تو اپنی آشا پوری کرلی لیکن ہیروئن کے حوالے سے اس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ وہ ہیروئن کہاں ہے؟؟"

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا۔ میں ابھی تک اندھیرے میں اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے پتھر لڑھکنے کی آواز سنائی دی تھی اور پھر میں نے ایک لمحے کے لیے دو چٹانوں کے درمیان ایک ہیولے کو معلق دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے گومپا کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

"تو پھر مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔" وہ رال سے بھری ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "بومبا دو مرتبہ تمہارے ہاتھوں پٹ چکا ہے لیکن وہ اتنا کمزور اور بزدل نہیں کہ تیسری مرتبہ بھی پٹ جائے۔ یہ جان لو کہ بومبا تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کردے گا۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں!" میں تقریباً چیخ اٹھا "جب میں کچھ جانتا ہی نہیں تو تشدد کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" میں خاموش ہو کر گومپا کے چہرے کو تکنے لگا جہاں درندگی اور بربریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بملا کی مسخ شدہ لاش میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی جو گومپا اور بومبا کی بربریت کا واضح ثبوت تھی لیکن میں نے بھی طے کرلیا تھا کہ خواہ کچھ بھی

ہو، زبان نہیں کھولوں گا۔

"تم نے اس دنیا میں بہت عیش کر لیے۔" گومپا نے کہا "اب تمہاری زندگی کے آخری لمحات آن پہنچے ہیں۔ میں تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کردوں گا لیکن تمہیں اس وقت تک مرنے نہیں دوں گا جب تک تم زبان نہیں کھولو گے۔"

"اگر۔۔۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں کچھ جانتا ہوں تو؟" میں نے کہا۔

"تم مجھے ہر وہ بات بتاؤ گے جو میں جاننا چاہتا ہوں۔" گومپا کی آنکھیں چمک اٹھیں "اور میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ میں بومبا کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے خاموش ہو کر بومبا کو اشارہ کیا۔

سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی۔ میں سمجھ گیا کہ گومپا مجھے کسی بھی حالت میں معاف نہیں کرے گا۔ وہ سچ اگلوانے کے لیے واقعی میرے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کردے گا۔ بومبا دو مرتبہ مجھ سے پٹ چکا تھا۔ وہ میرا لحاظ نہیں کر سکتا تھا۔

دیو قامت وحشی بومبا نے چمڑے کے ایک فیتے سے میری دونوں کلائیاں اس قدر مضبوطی سے باندھ دیں کہ چمڑے کا فیتہ مجھے گوشت میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا پھر اس نے میرا سر پکڑ کر گردن کو ایک طرف موڑا۔ مجھے گردن کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ بومبا نے ایک زوردار جھٹکا دے کر گردن چھوڑ دی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں زور زور سے سر جھٹکنے لگا۔

مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں کوئی مزاحمت کیے بغیر کس قدر آسانی سے ان کا شکار بن گیا تھا۔ وہ تعداد میں صرف دو تھے اور میں بڑی آسانی سے ان دونوں کی گردنیں مروڑ سکتا تھا لیکن میں کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ بومبا نے بڑے اطمینان سے میرے ہاتھ باندھ دیے تھے اور میری گردن کو جھٹکے دے رہا تھا۔ میرے دماغ میں شدید سنسناہٹ ہو رہی تھی اور شاید سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔

"میں تمہیں ایک موقع اور دے رہا ہوں۔" گومپا کی آواز سنائی دی "ہیروئن کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

گومپا نے بومبا کو اشارہ کیا۔۔۔ اور ٹھیک اسی لمحے کسی طرف سے "دھپ" کی آواز سنائی دی۔ گومپا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نجانے کہاں سے اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور نکال لیا اور ٹارچ اٹھا کر آواز کی سمت دوڑ پڑا۔

میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی۔ میں تو بومبا کو دیکھ رہا تھا جو میرے اوپر جھکا جا رہا تھا۔ اس نے میرے ایک ہاتھ کی انگلیاں پکڑلیں اور دوسرے ہاتھ سے زمین پر پڑا ہوا پلاس اٹھالیا۔ میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ میری انگلیوں کے ناخن کھینچنا چاہتا ہے لیکن عین اسی وقت "دھپ" کی ایک اور آواز سنائی دی اور کسی نے جلتی ہوئی ایک مشعل اٹھا کر ایک جھونپڑے پر پھینک دی۔

بومبا مجھے چھوڑ کر اس طرف بھاگا۔ میرا دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اچانک پشت کی طرف سے ایک سرگوشی سنائی دی۔

"ہمت سنگھ۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟"

آواز بلاشبہ سمبا کی تھی۔ میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں اٹھ کر آواز کی سمت دوڑ پڑا۔ اگرچہ جھونپڑے میں آگ لگ چکی تھی لیکن جس طرف سے آواز آئی تھی اس طرف تاریکی تھی۔ میں جیسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے ستون کے قریب پہنچا، کسی نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کھینچتا ہوا ایک اور غار میں داخل ہو گیا۔

وہ سمبا تھا۔ ہم دونوں اندھوں کی طرح غار میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے بالآخر ایک کھلی جگہ پر نکل آئے۔ یہ بھی کھنڈر کا ایک حصہ ہی تھا۔ ہمارے سامنے پتھروں کی کشادہ سیڑھیاں تھیں۔ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی مدھم روشنی میں نیچے ایک جیپ کھڑی نظر آ رہی تھی۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

"ہم ابھی خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ نیچے شاید ترّی دیو کی جیپ کھڑی ہے۔ اگر گومپا یا بومبا ہم سے پہلے جیپ تک پہنچ گئے تو ہمارے فرار کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔"

سمبا میرا بازو پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ ایک جگہ ہم ایک دیوار کی آڑ میں رک گئے۔ سمبا شیشے کے ایک ٹکڑے سے میری کلائیوں پر بندھا ہوا چمڑے کا فیتہ کاٹنے لگا۔ یہ ترّی دیو کی ٹوٹی ہوئی عینک کا شیشہ تھا۔ وہ ٹوٹی ہوئی عینک میں نے ملار کی لاش کے ہاتھ میں دیکھی تھی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ غار کے اندر سمبا نے اپنے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسی کس طرح کاٹی ہوگی۔

چند سیکنڈ بعد ہم دیوار کی آڑ سے نکل کر پھر نیچے اترنے لگے۔ آخری سیڑھی سے زمین کا فاصلہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور وہاں سے پچیس تیس فٹ آگے جیپ کھڑی تھی۔ سمبا سیڑھی سے نیچے کود گیا۔ میں چھلانگ لگانے کے بجائے پتھریلی سیڑھی کا کنارہ پکڑ کر لٹک گیا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاتھ چھوڑتا، فضا دھماکے کی آواز سے گونج اٹھی۔ دائیں طرف بلندی سے آنے والی گولی میرے بالکل قریب پتھر پر لگی۔ پتھر کا ایک ٹکڑا اڑ کر میری گردن پر لگا اور اسی وقت میں نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ سمبا مجھے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا دیوار کے ساتھ چپک گیا۔

دائیں طرف چٹان پر کھڑا ہوا گومپا صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ریوالور سے جیپ پر فائرنگ کر رہا تھا۔ پہلے جیپ کی ونڈ شیلڈ ٹوٹی اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ جیپ کا ایک ٹائر گولی کی زد میں آکر پھٹ گیا تھا۔ اس دھماکے کے فوراً ہی بعد گومپا بھی چٹان پر سے غائب ہو گیا۔

"سمبا۔ تم اس طرف سے جاؤ۔ میں اس طرف سے جاتا ہوں۔ انہیں گھیرنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ دونوں یہاں سے نکل گئے تو بستی والوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

سمبا نے فوراً ہی ایک طرف دوڑ لگا دی اور میں بھی دوڑتا ہوا ایک چٹان پر چڑھ گیا اور کچھ ہی دیر بعد اس طرف نکل آیا۔

گھاس پھونس کا وہ جھونپڑا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ تاہم کہیں کہیں سے اب بھی شعلے اٹھ رہے تھے۔ دوسرے جھونپڑے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے آگ کی زد میں آنے سے محفوظ رہے تھے۔ وہ دونوں ننگ دھڑنگ عورتیں ایک جھونپڑے کی دوسری طرف چٹان کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ شعلوں کی مدھم سی روشنی میں ان کے چہروں پر خوف اور وحشت کے تاثرات صاف نظر آ رہے تھے۔

میں ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ان عورتوں کے قریب ہی چٹان کی ایک دراڑ سے گومپا برآمد ہوا۔ وہ انسان نہیں ریچھ ہی لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور شعلوں کی روشنی میں اس کا چہرہ بہت ہی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر ان عورتوں سے کچھ کہا اور وہ دونوں اس دراڑ میں گھس گئیں۔

گومپا کو دیکھ کر میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا۔ ملار کی مسخ شدہ لاش میری نظروں کے سامنے گھوم گئی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے میں لاوا سا کھولنے لگا ہو۔ میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔

میرے حواس بحال ہو رہے تھے۔ بے بسی اور بے چارگی کی وہ کیفیت ختم ہو گئی تھی جو کچھ دیر پہلے تک میرے اوپر طاری تھی اور جس نے مجھے بکری کے بچے کی طرح بزدل بنا رکھا تھا۔

میں پتھر کی آڑ سے نکل کر چٹان کے کنارے پر آگیا۔ دنیا کا وہ غلیظ ترین آدمی گومپا ریچھ ہی کی طرح چلتا ہوا اس طرف جا رہا تھا جہاں وہ جیپ کھڑی تھی۔ اس نے فائرنگ سے جیپ کو اگرچہ ناکارہ بنا دیا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ شاید ہم پھر بھی جیپ کی طرف جانے کی کوشش کریں گے اور وہ ہمارا راستہ روکنے کے لیے اس طرف جا رہا تھا۔

میں تقریباً دس فٹ کی بلندی پر تھا۔ گومپا ریچھ کی طرح دوڑتا ہوا جیسے ہی میری زد میں آیا، میں نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے دہاڑتے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی۔

گومپا میری دہاڑ سن کر ہی گڑبڑا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں اس کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ میرے دونوں پیر اس کے کندھوں پر پڑے۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل آگے کو گرا۔

گرا تو میں بھی تھا لیکن چونکہ میں نے از خود چھلانگ لگائی تھی اس لیے مجھے سنبھلنے میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا۔ گومپا کی صورتِ حال مختلف تھی۔ وہ منہ کے بل گرا تھا۔ اسے چند معمولی چوٹیں بھی آئی تھیں۔ ویسے بھی وہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ وہ فوری طور پر نہیں اٹھ سکا اور اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اس کی کھوپڑی پر دو تین ٹھوکریں رسید کردیں۔

اور بالآخر وہ اٹھ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ تو اس کے گرتے ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

گومپا کو اٹھ کر سنبھلنے میں ایک سیکنڈ لگا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا۔ میں اسے فلائنگ کک لگانا چاہتا تھا لیکن اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے بے دردی سے پکڑ کر اچھال دیا۔

میں پہلو کے بل پتھروں پر گرا۔ گومپا نے مزید حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔ میں بڑی تیزی سے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو میں گوشت کے اس پہاڑ کے نیچے دب جاتا اور پھر شاید میرا زندہ بچنا مشکل ہو جاتا۔

گومپا اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل گرا۔ اس نے

سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی کہ وہ وزنی ہتھوڑے کی طرح میری گردن پر پڑا اور میں بے اختیار کراہ اٹھا۔

گومپا مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اس کے سر کے پچھلے حصے پر بالشت بھر لمبی بالوں کی چٹیا میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں چٹیا کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ گومپا بری طرح چیخ رہا تھا۔

میں اس کے اوپر سے اٹھ گیا اور چٹیا کو پیچھے کھینچتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی پیچھے کو جھک رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نے کہنی سے میری پسلیوں پر ضرب لگائی اور پھر بڑی پھرتی سے وہ آگے کو جھکتا چلا گیا۔ میں اس کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتے ہوئے سامنے گرا۔

پتھروں پر گرنے سے میری کمر پر چوٹ لگی تھی لیکن میں بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گومپا حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا لیکن میں نے موقع نہیں دیا اور اس پر پے در پے ٹھوکریں برسانے لگا۔

لیکن ایک موقع پر گومپا کا داؤ چل گیا۔ اس نے مجھے بانہوں کے حصار میں لے کر سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اس کم بخت میں بلا کی طاقت بھری ہوئی تھی۔ میں اس کی بانہوں کا حصار توڑنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ لگتا تھا جیسے فولادی شکنجے میں جکڑا گیا ہوں۔

وہ ریچھ کی طرح مجھے اپنے سینے کے ساتھ دباتا رہا۔ میرا سانس گھٹنے لگا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن اس کی بانہوں کا حصار نہیں توڑ سکا۔ میرے دونوں بازو پہلوؤں میں جھول گئے۔ میں اپنے آپ کو بالکل بے بس اور بے دم سا محسوس کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اگر یہ صورتِ حال کچھ دیر اور برقرار رہی تو میری زندگی کا خاتمہ یقینی تھا۔

گومپا نے مجھے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ میرے منہ سے کراہ نکل گئی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے ایک موقع بھی مل گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہتھیلیوں سے اس کی دونوں کنپٹیوں پر زوردار ضرب لگائی۔

یہ ضرب اگرچہ گومپا کی برداشت کے مقابلے میں زیادہ زوردار نہیں تھی لیکن نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ میں نے بلاتوقف ایک اور وار کیا۔ اس مرتبہ گومپا کراہ اٹھا اور پھر تیسری ضرب پر میری پشت پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرایا، دو تین قدم پیچھے ہٹ کر ایک دم ہوا میں اچھلا اور اس کی کھوپڑی پر زوردار کک جما دی۔ وہ چیختا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی سینے پر ہاتھ رکھے جھکتا چلا گیا۔

مجھے سینے پر اب بھی شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا اور سانس گھٹ رہا تھا۔ گومپا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اسے حرکت کرتے دیکھ کر میں سنبھل گیا۔ میرا خیال تھا، وہ مجھ پر حملہ کرے گا لیکن اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی تو میں اچھل پڑا۔

گومپا اگرچہ خاصا بھاری بھرکم تھا لیکن وہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس دراڑ میں گھس گیا جہاں وہ دونوں عورتیں غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اگر ایک مرتبہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو رات کے وقت ان چٹانوں اور غاروں میں اسے تلاش کرنا مشکل ہو جائے گا۔

وہ دراڑ خاصی طویل تھی اور اس کی دوسری طرف وہ چھوٹا سا میدان تھا جہاں جیپ کھڑی تھی۔ اس طرف سمبا اور بومبا ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ وہ دونوں عورتیں بھی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے چیختی ہوئی ایک طرف دوڑی جا رہی تھیں۔

گومپا اب اپنے آپ کو بچا کر بھاگنا چاہتا تھا لیکن میں اسے ایسا کوئی موقع نہیں دے سکتا تھا۔ وہ بلا کا قاتل تھا۔ معصوم اور بے گناہ بلا کو جس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا وہ ایسی بات نہیں تھی کہ اسے آسانی سے فراموش کر دیا جاتا اور اس کے قاتلوں کو معاف کر دیا جاتا۔

گومپا مجھ سے چند قدم آگے تھا۔ میں دوڑتے ہوئے ہوا میں اچھلا اور اس کے اوپر جا رہا۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ میں اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور اس کی چٹیا پکڑ کر زور زور سے جھٹکے دیتے ہوئے اس کا چہرہ پتھروں سے ٹکرانے لگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔

اس نے مجھے ایک طرف گرا دیا اور اٹھ کر ایک بار پھر ایک طرف کو بھاگ نکلا لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اسے چند قدم سے زیادہ دور نہیں جانے دیا اور میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

خون میں تر اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ وہ ہر ٹھوکر پر بلبلا اٹھتا لیکن مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ ایسے بے رحم اور سفاک لوگ کسی رحم اور ہمدردی کے مستحق نہیں ہوتے۔ بلا کی لاش رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی اور میرا جنون بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ میں پے در پے اس پر ٹھوکریں برسا رہا تھا۔

اچانک کسی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا۔ میں تیزی سے گھوم گیا۔ میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا تھا لیکن سمبا کی صورت دیکھ کر میرا ہاتھ مشینی انداز میں رک گیا تھا۔ سمبا مجھے کھینچتا ہوا چند گز دور لے گیا۔

"اگر یہ ختم ہو گیا تو ہم بستی والوں پر کس طرح ثابت کریں گے کہ بلا کو ان لوگوں نے قتل کیا ہے۔" سمبا نے کہا "انہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔ انہیں بستی والے سزا دیں گے۔"

میں بڑی مشکل سے اپنے جنون پر قابو پا سکا تھا۔ میں نے گومپا کی طرف دیکھا۔ وہ ادھ موا سا پڑا کراہ رہا تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر بومبا بھی پتھروں پر پڑا کراہ رہا تھا۔

سمبا ان عورتوں کو بھی تلاش کر کے لے آیا اور پھر ہم بومبا اور گومپا کو بھی ٹھوکریں مارتے ہوئے جھونپڑوں کی طرف لے آئے۔ ایک جھونپڑا تو جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ کہیں کوئلے دہک رہے تھے اور کہیں کہیں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

سمبا نے تبتی زبان میں ان دونوں عورتوں سے کچھ کہا اور وہ ایک جھونپڑے میں گھس گئیں۔ سمبا نے مجھے وہیں رکنے کو کہا اور خود چٹانوں میں ایک تنگ سے راستے پر غائب ہو گیا۔

سمبا کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے کندھے پر بلا کی لاش اٹھا رکھی تھی جسے اس نے ایک جھونپڑے کے سامنے پتھروں پر لٹا دیا۔ میں قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بلا کی لاش کو دیکھنے لگا۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ لاش کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس پر کس قدر تشدد کیا گیا تھا۔

سمبا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور مجھے وہاں سے اٹھا کر کچھ دور لے گیا۔

"ان دونوں آدمیوں کی لاشیں ہم اس غار میں چھوڑے جا رہے ہیں۔" اس نے کہا "بلا کی لاش کو دیکھ کر بستی کے لوگ ان کے خلاف خاموش نہیں رہیں گے اور میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ صبح تک ہم بستی میں پہنچ جائیں گے۔"

"یہ جگہ بستی سے کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا "ہم تو کل سارا دن اور پرسوں رات بھر بلا کو تلاش کرتے رہے تھے۔ اس طرف تو ہم نہیں آئے تھے۔"

"ان پہاڑوں میں ایسی بے شمار جگہیں ہیں جہاں پورا قبیلہ چھپ سکتا ہے۔ ویسے یہ جگہ بستی سے تقریباً دس میل دور ہے۔ اس نے پتا نہیں کہاں کہاں عیاشی کے اڈے بنا رکھے ہیں۔" سمبا نے جواب دیا۔

اس نے ان دونوں عورتوں کو بھی جھونپڑے سے باہر بلا لیا۔ وہ دونوں جھونپڑے میں رکھے ہوئے لباس پہن چکی تھیں لیکن لباس کے باوجود وہ برہنہ تھیں۔

مجھے گومپا کا ریوالور بھی مل گیا تھا جو میں نے سمبا کے حوالے کر دیا۔ بلا کی لاش کو اٹھاتے ہوئے میری نظریں گومپا کی طرف اٹھ گئیں۔ میرے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا۔ میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔ میں ایک دم سیدھا ہو گیا اور گومپا کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر مار دی۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف الٹ گیا۔

"تمہاری شکتی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اگر تم نے دوبارہ ایسی کوئی کوشش کی تو بھیجا نکال دوں گا تمہاری کھوپڑی سے۔" میں اسے پسلیوں پر ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے غرایا۔

سمبا نے بھی اسے دو چار ٹھوکریں رسید کر دی تھیں اور پھر ان دونوں کو ریوالور کی زد پر لے کر ایک طرف کھڑے ہو جانے کا حکم دیا۔

چند منٹ بعد ہی ہمارا یہ مختصر سا قافلہ پہاڑوں میں تنگ سے راستوں پر چلنے لگا۔ سب سے آگے گومپا اور بومبا تھے۔ ان کے پیچھے دونوں عورتیں اور آخر میں، میں اور سمبا چل رہے تھے۔ بلا کی لاش کبھی سمبا اٹھا لیتا اور کبھی میں۔

پہاڑوں میں دس میل کا فاصلہ خاصا طویل ثابت ہوا تھا۔ جب ہم بستی میں پہنچے تو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ بلا کی لاش میدان میں ایک درخت کے نیچے رکھ دی گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بستی کے لوگ غاروں سے نکل نکل کر ہمارے گرد جمع ہونے لگے۔ سمبا چیخ چیخ کر بستی والوں کو گومپا اور بومبا کے کرتوتوں کے بارے میں بتانے لگا۔

بلا کی لاش دیکھ کر لوگ بپھر گئے اور ان دونوں پر ٹوٹ پڑے۔ گومپا اور بومبا پر حملہ کرنے والوں میں گومپا کے وہ چیلے بھی شامل تھے جو اس کے پیر چاٹا کرتے تھے لیکن بلا کی لاش دیکھ کر وہ اس کے سحر سے آزاد ہو گئے تھے۔ میں اور سمبا کوشش کے باوجود گومپا اور بومبا کو بستی والوں کے عتاب سے نہیں بچا سکے۔ کچھ ہی دیر بعد ان دونوں کی بچی ہوئی لاشیں میدان میں پڑی تھیں اور پھر کچھ لوگ وہ لاشیں بھی اٹھا کر لے گئے۔

اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم کھیا کی اس بستی کی طرف روانہ ہو گئے جہاں حادثے کے بعد ہمیں لایا گیا تھا۔ غار والی بستی کے بہت سے لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ بلا کی لاش کو ایک خود ساختہ اسٹریچر پر ڈال دیا گیا تھا۔

ہم دوپہر کے بعد ہی اس بستی میں پہنچے تھے۔ بستی کے سارے لوگ جمع ہوگئے۔ تھیوب اور دوسری عورتیں بلا کی لاش کے قریب بیٹھ کر بین کرنے لگیں اور پھر شام سے ذرا پہلے دریا کے کنارے بلا کی چتا کو نذر آتش کردیا گیا۔

اس کے بعد بھی میں تین دن اس بستی میں رہا۔ ایک روز دوپہر کے وقت اچانک ہی مجھے نیلگری والی مالا کا خیال آگیا۔ وہ مالا نہ میرے گلے میں تھی اور نہ ہی ان گزرے ہوئے دنوں کے دوران میں بلا نے اس کا کوئی ذکر کیا تھا۔ اچانک ہی مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے سمبا سے پوچھا۔

"دریا کے کنارے ڈھلان پر جہاں میں بے ہوش ہوا تھا' وہاں سے مجھے کون اٹھا کر لایا تھا؟"

"میں تھا اور تین چار آدمی اور تھے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" سمبا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میرے گلے میں ایک مالا تھی۔ سیاہ پتھروں کی۔" میں نے کہا۔ میرا ہاتھ بے اختیار گلے پر پہنچ گیا تھا۔

"میں نے سیاہ پتھروں کی کوئی مالا قبیلے کے کسی آدمی کے پاس نہیں دیکھی۔" سمبا نے جواب دیا "اگر کسی نے تمہارے گلے سے وہ مالا اتاری ہوتی تو کسی نہ کسی کے پاس ضرور نظر آجاتی لیکن کیا وہ مالا بہت قیمتی تھی۔ تم اس کے لیے خاصے پریشان نظر آرہے ہو۔"

"ہاں۔ وہ مالا میرے لیے واقعی بہت قیمتی ہے۔ اتنی قیمتی کہ اگر وہ میرے پاس موجود ہوتی تو شاید بلا کی جان نہ جاتی۔ اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔

سمبا الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا جیسے یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو "وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے جہاں سے مجھے بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لایا گیا تھا؟"

"اس طرف۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہے۔" سمبا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"چلو۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میں اور سمبا بستی سے نکل کر دریا کی طرف آگئے اور پھر کنارے کے ساتھ ساتھ پتھروں پر چلنے لگے۔

ایک میل کا وہ فاصلہ طے کرنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ بالآخر ہم ایک جگہ پر رک گئے۔ وہاں ایک طرف نشیب میں دریا تھا۔ اس جگہ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا لیکن گہرائی بہت زیادہ تھی۔ پانی کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ دوسری طرف عمودی ڈھلان تھی جو تقریباً چار سو فٹ اوپر تک چلی گئی تھی۔

"بلا نے بتایا تھا کہ تمہاری کار وہاں سے ڈھلان پر لڑھکتی ہوئی اس جگہ دریا میں گری تھی۔" سمبا نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا "ہم نے تمہاری کار تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں گہرائی کتنی زیادہ اور پانی کی رفتار کتنی تیز ہے۔ تیز رفتار پانی کار کو بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا ہوگا۔"

میں دریا کی طرف دیکھنے لگا۔ پانی طوفانی رفتار سے نشیب کی طرف بہہ رہا تھا۔ اتنے تیز بہاؤ میں تو کوئی چٹان بھی نہیں رک سکتی تھی۔ کار تو نجانے کہاں غائب ہوگئی ہوگی۔

"اور وہ جگہ کون سی ہے جہاں میں بے ہوش پڑا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اس طرف۔۔۔ وہاں۔" سمبا نے بلندی کی طرف اشارہ کیا۔

ہم بڑے بڑے پتھروں پر پھلانگتے ہوئے اوپر چڑھنے لگے اور پھر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک جگہ پتھروں میں کار کا ایک پہیا پڑا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اوپر سے پتھروں پر لڑھکتے ہوئے یہ پہیا الگ ہوگیا ہوگا۔ میں نے وہ پہیا اٹھا کر دریا کی طرف اچھال دیا اور سمبا کے ساتھ پھر اوپر چڑھنے لگا۔

"تم یہاں بے ہوش پڑے ہوئے تھے اور دیکھو' وہ شاید تمہارا جوتا ہے۔" سمبا نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ میرا ہی سیدھے پیر کا جوتا تھا۔ بستی میں جب مجھے ہوش آیا تو اس وقت مجھے احساس نہیں ہوا تھا کہ میرے پیر میں کوئی جوتا تھا یا نہیں لیکن اب میری یادداشت بحال ہوچکی تھی اور میں نے اپنا یہ جوتا پہچان لیا تھا جسے میں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ سمبا نے بتایا کہ میرے دوسرے پیر کا جوتا بھی بستی کے کسی جھونپڑے میں موجود ہے۔

میں متجسس نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں پتھروں میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ اگر وہ مالا کھل کر میرے گلے سے یہاں گر ہی گئی تھی تو اسے تلاش کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھس میں سوئی تلاش کرنے کی کوشش کی جائے لیکن مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی تلاش و جستجو کے بعد میں دائیں طرف مڑا ہی تھا کہ میری آنکھوں پر چمک سی پڑی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا اور اس طرف دیکھنے لگا اور پھر میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ سیاہ پتھروں کی وہ مالا جھاڑیوں میں پڑی تھی اور دھوپ میں اس کا مرکزی پتھر چمک رہا تھا۔ اسی چمک نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

میں نے وہ مالا اٹھائی تو ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے میرے پورے جسم میں سنسنی کی لہریں سی دوڑ گئی ہوں اور پھر مجھے اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس ہونے لگی۔ سمبا بھی میرے قریب آگیا تھا۔ میں اس وقت مالا کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ مالا میرے گلے سے کیوں نکلی تھی۔ اس کا ہک کھل گیا تھا۔ میں نے مالا گلے میں ڈال کر ہک بند کرلیا اور مسکرا کر سمبا کی طرف دیکھنے لگا۔

"اچھا ہوا تمہاری گمشدہ چیز مل گئی۔ اگر نہ ملتی تو تم سے زیادہ شاید مجھے اس کا افسوس رہتا۔" سمبا نے کہا "کیا یہ مالا واقعی بہت قیمتی ہے؟"

"ہاں۔ اتنی قیمتی کہ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔" میں نے جواب دیا اور ہم دونوں پتھروں پر نشیب کی طرف اترنے لگے۔ ایک جگہ میں نے مڑ کر اوپر دیکھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اتنی بلندی سے لڑھکنے کے بعد میں زندہ کیسے بچ گیا تھا۔

دریا کے پاس پہنچ کر میں ایک بار پھر رک گیا اور دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کافی دور تک چلتا رہا۔ پانی بہت تیز رفتار اور بہت گہرا تھا۔ میری کار کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیز رفتار پانی نہ جانے اسے کہاں سے کہاں لے گیا ہوگا۔ کار میں رکھی ہوئی پانچ سو کلو ہیروئن پلاسٹک کے تھیلوں میں تھی۔ وہ تھیلے واٹر پروف نہیں تھے۔ ہیروئن ضائع ہوگئی ہوگی۔

سمبا کے ساتھ واپس آتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کھٹمنڈو میں ناگ پال یا چانگ لی کے ساتھ میرا یہ پہلا باقاعدہ تصادم تھا جس میں انہیں بڑی زبردست چپت لگی تھی۔ پانچ سو کلو ہیروئن۔ یہاں اس کی مالیت پانچ سو کروڑ روپے سے بھی زیادہ تھی اور انٹرنیشنل مارکیٹ میں تو اس کی قیمت کہیں زیادہ رہی ہوگی لیکن اس کے لیے مجھے بھی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ بلا بہت معصوم اور بہت بھولی بھالی تھی۔ میرے عشق میں اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی اور بالآخر اپنی جان لٹا دی تھی۔

میں تین دن مزید تارانگ قبیلے کی اس بستی میں رہا۔ بستی کے لوگوں نے میری خدمت اور دل جوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ واقعی بہت سیدھے سادے لوگ تھے۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ گومپا جیسا بدمعاش ان کے بیچ میں آگیا تھا اور وہ اپنے شعبدوں سے قبیلے کے چند لوگوں کو بہکانے میں کامیاب ہوگیا تھا لیکن اب انہیں گومپا جیسے شیطان سے بھی نجات مل چکی تھی۔ وہ اپنی ہوس کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ تری دیو سے ملاقات کے بعد اس کی باتیں سن کر گومپا کے دل میں لالچ پیدا نہ ہوتا تو شاید اس کا یہ سلسلہ چلتا رہتا لیکن بہرحال' باطل کو ایک دن تو ختم ہونا ہی تھا اور وہ ختم ہوگیا تھا۔

مالا مل جانے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس روز شام کو وید نے میرے سر کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے بالکل تندرست قرار دے دیا تھا حالانکہ صبح جب میں سمبا کے ساتھ دریا کی طرف جارہا تھا تو میرے زخم میں شدید تکلیف تھی۔ چلتے ہوئے اپنے ہی پیروں کی ہلکی سی دھمک سے یوں لگتا تھا جیسے دماغ میں دھماکے ہورہے ہوں۔

سر پر چوٹ لگنے کے بعد سے میں آرام سے تو نہیں بیٹھ سکا تھا۔ وید بھی بار بار تشویش کا اظہار کرتا رہا تھا اور مجھے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیتا رہا تھا لیکن میں تو ایک دن بھی آرام سے نہیں بیٹھ سکا تھا۔ آج صبح بھی میرا خیال تھا کہ اس زخم کی وجہ سے شاید مجھے کئی روز تک اس بستی میں رہنا پڑے گا۔ دریا کی طرف جاتے ہوئے بھی میں سر میں تکلیف محسوس کررہا تھا لیکن نیلگری کی وہ مالا مل جانے کے بعد میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ لگتا تھا جیسے میرے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی ہو۔ مالا کا لمس مجھے زندگی کی حرارت دلا رہا تھا۔

اسی روز شام کو وید جی نے میرے سر کی پٹی کھول کر زخم کا معائنہ کیا تو وہ حیرت زدہ سا رہ گیا تھا۔ اس نے زخم کی جگہ کو ٹٹول کر اور دبا کر بھی دیکھا تھا لیکن مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی اور پھر وید جی نے اعلان کردیا تھا کہ مجھے اب کوئی تکلیف نہیں رہی۔ میرا زخم بالکل ٹھیک ہوچکا ہے۔

میں اس سے اگلے ہی دن بستی سے رخصت ہوجانا چاہتا تھا لیکن مکھیا نے مجھے روک لیا۔ مکھیا کے کہنے کے مطابق میں نے ان کے قبیلے کو ایک شیطان سے نجات دلائی تھی اور وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایک جشن کا اہتمام کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے قبیلے کی تمام بستیوں کو اطلاع دے دی گئی تھی۔

تارانگ قبیلے کی کل آبادی دو ڈھائی ہزار نفوس سے زیادہ نہیں تھی جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی صورت میں ان پہاڑوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہر بستی دوسری سے پانچ دس میل کے فاصلے پر تھی۔ راستے نہایت خطرناک اور دشوار تھے لیکن اس کے باوجود تمام بستیوں کے لوگ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے۔

تیسرے دن صبح ہی لوگ اس بستی میں جمع ہونا شروع ہوگئے۔ دریا کی سمت میدان میں لوگ جمع ہو رہے تھے۔ شام تک وہاں میلے کا سماں پیدا ہوچکا تھا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد میدان میں لاتعداد مشعلیں روشن ہوگئیں اور پھر چاند بھی طلوع ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی مکھیا نے جشن شروع ہونے کا اعلان کردیا۔

یہ جنگ جو قبیلہ نہیں تھا لیکن وہ اپنا دفاع کرنا جانتے تھے۔ آپس کی زور آزمائی گویا ان کی گھٹی میں شامل تھی۔ عورتوں کے حصول کے لیے ان میں دلچسپ مقابلے ہوتے رہتے تھے اور اس وقت بھی ان میں زور آزمائی کے مقابلے ہو رہے تھے۔

تھاپا (پانچ بیویوں کا شوہر، قبیلے کا امیر ترین آدمی) نے دوسری بستی کی ایک خوب صورت لڑکی کے حصول کے لیے اس کے مرد کو چیلنج کردیا۔ تھاپا کے قبضے میں پہلے ہی پانچ عورتیں تھیں لیکن شاید وہ اپنے گھر میں خوب صورت عورتوں کی فوج تیار کرنا چاہتا تھا۔

اس لڑکی کا مرد درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ جبکہ تھاپا اس کے مقابلے میں بہت لحیم شحیم تھا۔ بظاہر مقابلے کے لیے ان کی جوڑی نہیں بنتی تھی لیکن ماٹا نامی اس شخص نے تھاپا کا چیلنج قبول کرلیا اور خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا۔

سب لوگوں کا خیال تھا کہ تھاپا جیت جائے گا لیکن پانچ منٹ میں ماٹا نے تھاپا کو چت کردیا۔ اس طرح تھاپا کو اپنی ایک عورت سے محروم ہونا پڑا اور پھر ایک گھنٹے کے اندر اندر تھاپا اپنی تمام عورتوں سے محروم ہوچکا تھا۔ اس کی پانچوں عورتیں ماٹا کے قبضے میں جا چکی تھیں۔

بہت سے لوگ تھاپا کے گرد جمع تھے۔ وہ اس سے ہمدردی جتلا رہے تھے اور تھاپا منہ لٹکائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی دنیا لٹ چکی تھی اور وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اور پھر ایک عورت میدان میں آکر چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگی۔ اس نے دو مرتبہ میری طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ یہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک تھی جنہوں نے اس روز مجھے دریا کے کنارے پر گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ادھر ادھر گھومتے ہوئے بڑے پرجوش انداز میں کچھ کہہ رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے قریب بیٹھے ہوئے سمبا سے دریافت کیا۔

"یہ تمہارے لیے دوسری عورتوں کو چیلنج کر رہی..." سمبا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے لیے۔" میرے دماغ میں زور دار دھ... "لیکن میں تو کسی کی ملکیت نہیں ہوں۔"

"مقابلے میں جو عورت جیت گئی تم اس کی ملکیت... جاؤ گے اور پھر یہ اس عورت کی مرضی ہے کہ وہ تمہیں... کردے یا اپنے قبضے میں رکھے۔" سمبا نے جواب دیا۔

"عجیب احمقانہ بات ہے۔" میں نے کہا۔ میرے... میں گزرے ہوئے واقعات ابھر آئے جب ہمارا... راجستھان کے ریگستان میں گرا تھا اور وکرم سنگھ نامی ڈاکو... اس کے ساتھیوں نے ہمیں پکڑ کر نیلام کردیا تھا۔ گویا... بھی کچھ ایسا ہی سلسلہ تھا لیکن طریقہ کار مختلف تھا۔

اس عورت کا چیلنج قبول کرتے ہوئے ایک اور... میدان میں اتر آئی اور پھر ان میں مقابلہ شروع ہوگیا... خوں خوار بلیوں کی طرح غراتی ہوئی ایک دوسرے پر حملہ... ہوئی تھیں۔

مقابلہ خاصا دلچسپ تھا۔ وہ دونوں میدان میں... دوسرے کو رگید رہی تھیں۔ ان کے حلق سے عجیب... غراہٹیں خارج ہو رہی تھیں۔

یہ مقابلہ خاصا دلچسپ تھا اور تقریباً آدھے گھنٹے... جاری رہا۔ جیت اسی کی ہوئی تھی جس نے میدان میں... دوسروں کو چیلنج کیا تھا اور پھر چند منٹ بعد وہ ایک بار پھر... کی دوسری عورتوں کو چیلنج کر رہی تھی اور اس مرتبہ جو عورت... میدان میں اتری تھی اسے دیکھ کر قبیلے کے سب ہی لوگ... حیرت زدہ سے رہ گئے تھے۔ مکھیا اور سمبا سمیت بعض لوگ... اٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے اور بڑی حیرت زدہ سی نظروں سے... اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور حقیقت... ہے کہ سب سے زیادہ حیرت مجھے ہوئی تھی۔ میرے دماغ میں... دھماکے سے ہو رہے تھے۔

وہ نیلگری تھی۔ قبیلے کی عام عورتوں کے جیسی... اس کے جسم پر بھی ویسا ہی لباس تھا۔ سر کے بال اسی... بے ترتیبی اور بد سلیقگی سے کٹے ہوئے تھے۔ اس کی... صورت آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ اس نے میری... دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ... تھی۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور میرا ہاتھ بے اختیار... اپنے گلے میں پڑی ہوئی مالا پر پہنچ گیا۔

میں نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی...

...بگڑی ہی تھی۔ اس روز مایا متی والے مکان سے غائب ...نے کے بعد آج وہ قبائلی عورت کے روپ میں میرے ...منے آئی تھی اور میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت ...وس کرنے لگا تھا۔

"یہ۔ یہ کون ہے؟" میں نے سمبا سے پوچھا۔ یہ سوال ...بے ارادی طور پر میری زبان سے نکل گیا تھا۔

"پتا نہیں۔" سمبا نے جواب دیا "اس کا حلیہ اور لباس ہمارے قبیلے کی عورتوں جیسا ہے لیکن یہ ہمارے قبیلے کی ...نہیں ہے۔ میں اپنے قبیلے کی تمام بستیوں میں گھومتا رہتا ہوں لیکن اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

اب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ نیلگری ہی تھی جو میری مدد کے لیے یہاں پہنچ گئی تھی۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ...ور خیال ابھرا۔ کار والے حادثے میں اگر وہ مالا میرے گلے ...سے نہ گری ہوتی تو اس کے بعد ناخوشگوار واقعات بھی پیش نہ ...آتے۔ نیلگری یقیناً میری مدد کو پہنچ جاتی اور ببلا کو بھی اپنی جان ...سے ہاتھ نہ دھونے پڑتے۔

...اپنی اس نئی حریف کو دیکھ کر پہلے مقابلے کی فاتح عورت گندالی کا چہرہ بھی دھواں ہوگیا تھا۔

بہرحال، مقابلہ شروع ہوا۔ پہلے گندالی نے ہی حملہ کیا تھا لیکن نیلگری نے اٹھا کر اسے پٹخ دیا۔ وہ کئی فٹ دور جا کر گری۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ وہ اٹھ کر دوبارہ نیلگری کی طرف لپکی۔

اور پھر لوگوں نے یہ دلچسپ منظر دیکھا کہ گندالی اپنی حریف کو ایک مرتبہ بھی نہیں چھو سکی تھی۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچتی، لگتا کسی غیبی قوت نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔ اس کی چیخیں فضا میں گونجتی رہیں۔ بعض لوگ چیخ چیخ کر اور تالیاں بجا بجا کر نیلگری کو داد دیتے رہے اور بعض وحشت زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

یہ مقابلہ چند منٹ سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا تھا۔ گندالی نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنی شکست کا اعلان کردیا۔ نیلگری نے فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا پھر وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی میرے قریب آگئی۔ چند لمحے میرے سامنے کھڑی رہی پھر ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی پچھلی طرف چلی گئی۔ سمبا اور مکھیا وغیرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور جب ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو نیلگری اندھیرے میں غائب ہوچکی تھی۔

○☆○

دوسرے دن میں تارانگ قبیلے سے روانگی کے لیے تیار ہوگیا۔ میرے ساتھ سمبا، تھاپا اور ایک بھکشو سارانوک کے علاوہ تھیوب بھی جانے کو تیار تھی۔ کوئی بھی مہذب آبادی اس بستی سے کم سے کم ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر تھی۔ راستے نہایت پرپیچ، کٹھن اور خطرناک تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اکیلا کبھی بھی کسی بستی تک نہیں پہنچ سکوں گا اسی لیے یہ لوگ میرے ساتھ جانے کو تیار ہوگئے تھے۔ اس طرح ہماری تعداد پانچ ہوگئی تھی۔

میں ان پہاڑوں سے بالکل واقف نہیں تھا۔ البتہ سمبا سال میں ایک آدھ مرتبہ مہذب بستیوں کی طرف جاتا رہتا تھا۔ اس کے خیال میں واپسی کے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہم ان پہاڑوں میں تقریباً چالیس میل کا سفر کرکے دلی کوٹ پہنچیں۔ یہ بستی پونگا رینج میں بریندرا نگر اور نیشنل پارک کے درمیان واقع تھی۔ دلی کوٹ سے ہم بریندرا نگر کا رخ کرتے اور وہاں سے تقریباً چالیس میل مزید آگے جا کر ہمیں وہی ہائی وے مل جاتی جو کھٹمنڈو سے انڈیا کی سرحد پار کی طرف چلی گئی تھی۔ اعظم خان اور ببلا کے ساتھ میں اسی طرف سے نیپال میں داخل ہوا تھا۔

سمبا کے خیال میں یہ راستہ میرے لیے محفوظ نہیں تھا۔ یوگندرناتھ اور تری دیو اسی طرف سے اس بستی تک آئے تھے جبکہ میری تلاش اب بھی جاری تھی اور چانگ لی یا اس کے آدمیوں سے کہیں بھی آمنا سامنا ہوسکتا تھا اس لیے سمبا کا خیال تھا کہ ہمیں پہاڑوں میں سفر کرتے ہوئے نیشنل پارک کی طرف جانا چاہیے۔ وہاں سے نیشنل پارک کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہم دھول گری کی طرف نکل سکتے تھے۔ اس طرف دھول گری اور اناپورنا کے پہاڑی سلسلے بیس سے چھبیس ہزار فٹ تک بلند تھے۔ راستے نہایت خطرناک تھے لیکن یہ اس لحاظ سے محفوظ تھے کہ میرے دشمنوں کا سامنا نہیں ہوسکتا تھا۔

ہمارے پاس سواری کے لیے پانچ یاک تھے اور چھٹے یاک پر چھولداریاں اور کھانے پینے کا سامان لاد لیا گیا تھا۔ ان تیاریوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ہم کسی بہت طویل سفر پر جا رہے ہوں اور بعد میں ثابت بھی ہوگیا کہ یہ سفر واقعی بہت طویل، تھکا دینے والا اور مشکل تھا۔

ہم صبح سویرے بستی سے رخصت ہوئے تھے۔ دوپہر تک رکے بغیر سفر کرتے رہے اور بالآخر ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹا آرام کیا اور شام کا اندھیرا پھیلنے تک ہمارا سفر جاری رہا۔

پانچویں روز ہم دھول گری کے تقریباً بائیس ہزار فٹ

بلند سلسلہ کوہ کی دوسری طرف دریا کے کنارے پر آباد کا کھوٹ نامی ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بھی بدھوں کی بستی تھی۔ ان لوگوں نے ہماری خاطرمدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

کاکھوٹ گاؤں نامی یہ بستی مستانگ کی طرف جانے والی شاہراہ سے تقریباً ستر میل کے فاصلے پر تھی اور ستر میل کا یہ فاصلہ طے کرنے میں ہمیں دو دن لگے تھے اور بالآخر ہم جوم سون نامی بستی میں پہنچ گئے۔ یہ بستی اس شاہراہ پر واقع تھی جو ایک طرف سرحد کے قریب واقع مستانگ قصبے سے ہوتی ہوئی سرحد پار کرکے تبت میں داخل ہوجاتی تھی اور دوسری طرف پوکھارا تک چلی گئی تھی جہاں سے کھٹمنڈو یا نیپال کے بعض دوسرے شہروں کا رخ کیا جاسکتا تھا۔

جوم سون نام کی یہ بستی سطح سمندر سے تقریباً چوبیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس سے آگے پوکھارا کی طرف سفر کرتے ہوئے ایک طویل درے سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاہراہ اور دریائے گنداکی اس درے میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ درہ نیلا کشادہ وادی کی طرح میلوں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ایک طرف دھول گری اور دوسری طرف انا پورنا کے پہاڑی سلسلے واقع ہیں۔ یہ برف پوش پہاڑی چوٹیاں چھبیس ہزار فٹ کی بلندی تک چلی گئی ہیں۔ بعض مقامات پر یہ درہ اس قدر تنگ ہوجاتا ہے کہ اس پر کسی سرنگ کا گمان ہونے لگتا ہے۔

جوم سون سے روانہ ہونے کے تیسرے دن ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوجاتی تھی۔ ایک سڑک پینی کی طرف اور دوسری پوکھارا کی طرف چلی گئی تھی۔ ہم نے پوکھارا کی طرف جانے والے راستے کا انتخاب کیا تھا۔

اب ہمیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ ہم اونچے پہاڑوں سے نکل کر اس علاقے میں آگئے تھے جہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد لوگ جدید تہذیب سے کسی حد تک آشنا تھے۔

گیارھویں دن ہم پوکھارا پہنچ گئے۔ ہم نے شہر سے دور دریا کے کنارے پر ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ وہ رات ہم نے وہیں بسر کی تھی۔ سمبا تو اگلے روز واپس جانا چاہتا تھا جبکہ میں انہیں کھٹمنڈو تک لے جانا چاہتا تھا لیکن وہ لوگ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب وہ واپس جانا چاہتے تھے۔ گیارہ دن کے سفر نے ہم سب کو بری طرح تھکا دیا تھا۔

میرے لیے اب پریشانی یہ تھی کہ میں کھٹمنڈو تک کیسے پہنچوں گا۔ میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا۔ میں سمبا وغیرہ کو کچھ تحائف بھی دینا چاہتا اور اسی لیے میں اپنے ساتھ کھٹمنڈو تک لے جانا چاہتا تھا لیکن ان لوگوں نے یہیں سے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر شہر چلا گیا۔

پچھلے بیس بائیس دنوں میں میرا حلیہ بڑی حد تک بدل چکا تھا۔ سر کے بال بے تحاشا بڑھ گئے تھے۔ داڑھی جنگلیوں کی طرح بڑھی ہوئی تھی۔

میں شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتا اور راستے پوچھتا پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ میرا حلیہ دیکھ کر پہلے تو مجھے اندر ہی گھسنے ہی نہیں دیا گیا لیکن جب میں نے کھٹمنڈو کے بریندرا کا نام لیا تو کانسٹیبل نے نہ صرف مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی بلکہ ایک سب انسپکٹر سے بھی ملا دیا اور سب انسپکٹر نے مجھے چیف انسپکٹر کے پاس پہنچا دیا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیل سے نہیں بتایا۔ صرف یہ بتایا کہ میں انسپکٹر بریندرا کا دوست ہوں تو وہ عجیب نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ بڑی مشکل سے وہ کھٹمنڈو میں انسپکٹر بریندرا سے فون پر رابطہ کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔

انسپکٹر بریندرا سے تقریباً آدھے گھنٹے بعد رابطہ ہوا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ اچھل پڑا۔

”تم کہاں ہو۔ ہم تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہیں“ وہ کہہ رہا تھا ”پچھلے دنوں پدمی کے قریب جنگل میں دو آدمی قتل ہوگئے تھے اور.....“

”ایک منٹ!“ میں نے اسے ٹوک دیا ”میرے ساتھ کچھ بھی ہوا اس کی تفصیل میں ٹیلی فون پر نہیں بتا سکتا۔ فی الحال مجھے ایک اور مسئلہ درپیش ہے اور مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”کہو۔ کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے ساتھ تارانگ قبیلے کے کچھ لوگ ہیں اور...“

”تارانگ۔“ اس نے میری بات کاٹ دی ”تارانگ قبیلہ تو پوکھارا سے سیکڑوں میل دور اونچے پہاڑوں میں ہے۔ تم وہاں کیسے.....“

”میں نے کہا نا کہ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔“ اس بار میں نے اس کی بات کاٹ دی ”مجھے اس وقت جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ اچھی خاصی رقم.....“

”ٹیلی فون چیف کو دو۔ میں اس سے بات کرتا ہوں“ بریندرا نے کہا۔

میں نے فون کا ریسیور چیف انسپکٹر کو دے دیا۔ وہ تقریباً دس منٹ تک بریندرا سے بات کرتا رہا پھر ریسیور رکھ کر میری طرف متوجہ ہوگیا۔ اس مرتبہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی پھر اس نے ایک انسپکٹر کو طلب کیا۔ اس سے کچھ کہا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آپ انسپکٹر کے ساتھ جاکر اپنے دوستوں کو شہر لے آیئے۔ یہاں ان کی رہائش کا بندوبست کردیا جائے گا۔ وہ ایک دو روز یہاں آرام کریں۔ اس کے بعد انہیں عزت و احترام سے رخصت کردیا جائے گا۔“

میں انسپکٹر کے ساتھ ایک بڑی اسٹیشن ویگن میں دریا کے کنارے پڑاؤ پر پہنچا تو سمبا وغیرہ کچھ حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ ہم انہیں شہر کے ایک ہوٹل میں لے آئے۔ ان کا سامان اور یاک دو کانسٹیبلوں کے حوالے کردیے گئے تھے۔

جس ہوٹل میں ان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا وہ کاروان سرائے قسم کا تھا اس لیے ان کے یاک وغیرہ کا بھی بندوبست ہوگیا۔

انسپکٹر نے ہوٹل کے مالک کو بھی ہدایت کردی کہ ان مہمانوں کے آرام اور طعام کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ میں بھی انہی لوگوں کے ساتھ رہ گیا تھا۔ انسپکٹر ہمیں چھوڑ کر چلا گیا اور اس کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ اس نے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی میرے ہاتھ میں تھما دی اور یہ بھی کہا کہ اگر مزید رقم کی ضرورت ہو تو ہیڈ کوارٹر میں چیف انسپکٹر کو فون کردوں۔

میں نے سمبا وغیرہ کو دو دن مزید وہاں روکا۔ چیف انسپکٹر کی دی ہوئی رقم سے میں نے ان سب کے لیے بہت سے تحائف خریدے۔ بستی کے مکھیا، وید اور بعض دوسرے لوگوں کے لیے بھی تحائف خریدے گئے تھے اور بالآخر چوتھے روز وہ لوگ صبح سویرے دھرچن کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب انہیں دھول گری کی طرف جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دھرچن کی طرف سے وہ پانچ دن میں اپنی بستی پہنچ سکتے تھے۔

ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد میں نے ہیڈ کوارٹر میں چیف انسپکٹر سے ملاقات کرکے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک بس پر بیٹھ کر کھٹمنڈو کے لیے روانہ ہوگیا۔ چیف انسپکٹر نے حالانکہ مجھے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ میں اگر پسند کروں تو وہ پولیس کی جیپ پر مجھے کھٹمنڈو بھیج سکتا ہے لیکن میں نے بس کے سفر کو ترجیح دی تھی۔

تقریباً دو سو کلومیٹر کا سفر چھ گھنٹوں میں طے ہوا۔

بس تھان کوٹ پہنچی تو شام ہوچکی تھی۔ یہ قصبہ کھٹمنڈو سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور زیادہ سے زیادہ چالیس منٹ کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔

شہر سے چھ کلومیٹر دور کیرتی پور میں بس ایک بار پھر رک گئی۔ ایک آدمی بس کے اگلے دروازے سے سوار ہوا اور آگے آنے کے بجائے وہیں کھڑا متجسس نگاہوں سے بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو گھورنے لگا اور میں اس شخص کو دیکھ کر اچھل پڑا تھا۔

وہ یوگی گوتم بھوش تھا۔

وہی یوگی گوتم بھوش جس سے میں نے رشی کیش میں یوگا سیکھنا شروع کیا تھا۔ میں اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کی نظریں بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے چہروں سے پھسلتے ہوئے میرے چہرے پر جم گئیں۔ اس سے نگاہوں کا تصادم ہوتے ہی میرے دماغ کو ایک شدید جھٹکا لگا اور میرا پورا جسم جھنجھنا اٹھا۔

گوتم بھوش کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور میری طرف بانہیں پھیلا کر چیخ اٹھا۔

”مہاراج ہمت سنگھ! میں تمہارے ہی انتظار میں یہاں کھڑا تھا۔ تمہاری منزل آگئی ہے۔ آؤ۔ نیچے اتر آؤ۔“

مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ اس حلیے میں تو شاید میرے اقربا بھی مجھے نہ پہچان سکتے لیکن گوتم بھوش نے پہلی ہی نظر میں مجھے شناخت کرلیا تھا اور مجھے یہ جان کر حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ میرے ہی انتظار میں یہاں کھڑا تھا اور مجھے بس سے اترنے کا حکم دے رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو میرے دماغ کو ایک بار پھر جھٹکا سا لگا اور پھر ذہن پر سناٹا سا چھا گیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ میں یہاں نہیں اتر سکتا۔ بعد میں کسی وقت اس سے ملوں گا لیکن میری زبان جیسے گنگ اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوکر رہ گئی تھیں۔ میں خاموشی سے اپنی سیٹ سے اٹھا اور گوتم بھوش کے پیچھے بس سے اتر گیا۔ بس فوراً ہی آگے روانہ ہوگئی تھی۔

”مجھے تمہاری دوست ببلا کے بچھڑنے کا افسوس ہے۔ اس کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا تھا۔“

گوتم بھوش کی زبان سے ببلا کی دردناک موت کا سن کر میں اچھل پڑا۔ ببلا کی موت یہاں سے سیکڑوں میل دور اونچے پہاڑوں میں اس جگہ واقع ہوئی تھی جہاں جدید تہذیب کی روشنی ابھی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ لوگ غاروں اور جھونپڑوں میں پتھروں کے دور کی زندگی گزار رہے تھے۔

وہاں رونما ہونے والا کوئی معمولی یا غیر معمولی واقعہ دنیا والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہتا تھا۔ میرے یا بملا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں صرف تارانگ قبیلے کے لوگ ہی جانتے تھے اور ہمارے وہاں رہتے ہوئے قبیلے کا کوئی فرد بستی سے باہر نہیں گیا تھا۔ میں سمبا وغیرہ کے ساتھ گیارہ دن میں اس بستی سے پوکھارا پہنچا تھا۔ راستے میں کئی بستیاں پڑی تھیں مگر کسی سے یہ نہیں سنا تھا کہ تارانگ قبیلے میں کیا ہوا تھا لیکن سیکڑوں میل دور گوتم بھوش سب کچھ جانتا تھا۔

”حیران مت ہو۔“ گوتم بھوش نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”تم تھکے ہوئے ہو۔ طویل سفر نے تمہارے ذہن کو بھی متاثر کیا ہے۔ آؤ۔ کہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔“

میں جواب دینے کے بجائے سحرزدہ سے انداز میں گوتم بھوش کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا تھا جیسے میرے بھاگ جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے استخوانی ہاتھ کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ اس کی انگلیاں میری کلائی میں گڑی جارہی تھیں۔

میرے حواس جیسے تحلیل ہو کر رہ گئے تھے۔ مجھے کچھ ہوش نہیں تھا کہ گوتم بھوش مجھے کہاں لے کر جارہا ہے۔ چونکا تو میں اس وقت جب میرے دماغ میں اچانک ہی سنسناہٹ ہونے لگی۔ یہ سنسناہٹ بڑھتی جارہی تھی اور پھر کان کے قریب مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دینے لگی۔

”مالا کی حفاظت کرنا۔ یہ شخص تمہیں بہکا رہا ہے۔ اگر تم اس کے فریب میں آگئے تو برباد ہوجاؤ گے۔“

اس سرگوشی نے میرے دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہی شہد میں ڈوبی ہوئی آواز تھی اور یہ آواز نیلگری کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ مجھے خبردار کررہی تھی۔ میں نے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور لبوں کو حرکت دیے بغیر ذہنی طور پر نیلگری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میرے حواس بالکل کام نہیں کررہے۔ میری مدد کرو نیلگری۔“

”اس کے قبضے میں کئی قوتیں ہیں۔“ نیلگری کی سرگوشی سنائی دی ”میں ابھی تمہاری نہیں ہوسکی ہوں۔ میرے اور تمہارے بیچ ابھی کچھ فاصلہ باقی ہے۔ میں فی الوقت کھل کر اس کے مقابلے پر نہیں آسکتی اور نہ ہی عملی طور پر تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔ اس نے تو میرا ذہن مفلوج کردیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے پاس اور بھی شکتی ہے۔ بہت بڑی شکتی۔“ نیلگری نے پھر سرگوشی کی ”اپنی اسی شکتی سے کام لو جس کے لیے تم نے بہت عرصے تک ریاضت کی ہے اور پھر تمہارے پاس سچائی کی شکتی ہے۔ ہمت سے کام لو۔ اگر یہ تمہیں اپنے استھان پر لے گیا تو میں بھی تم سے رابطہ نہیں کرسکوں گی۔“

میں چلتے چلتے رک گیا۔ گوتم بھوش نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت کچھ اور مضبوط ہوگئی تھی۔ میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا تو اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ مجھے اپنے دماغ میں سوئیاں سی چبھتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ میری مزاحمت دم توڑنے لگی۔

”اوہ..... سمجھ گیا۔“ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی سی آواز نکلی ”سمجھ گیا‘ کیا چیز تجھے روک رہی ہے۔ لا‘ یہ مالا مجھے دے دے جو تو نے اپنے گلے میں پہن رکھی ہے۔“

میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے گلے کی طرف اٹھ گیا۔ میری انگلیاں مالا کے موتیوں کو چھونے لگیں۔ میرے ہاتھ کو اس طرح جھٹکا لگا جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرا دماغ بھی جھنجھنا اٹھا تھا۔

گوتم بھوش بھی اچھل پڑا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ اس مرتبہ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

ہم دونوں کی نگاہوں کا تصادم کئی لمحوں تک جاری رہا۔ گوتم بھوش ایک لمحے کو اس طرح جھرجھری لے کر رہ گیا جیسے شدید سردی کی لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو اور پھر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ نیلگری میری پشت پر کھڑی تھی لیکن میرے اندر ”جی“ کی قوت بھی کام کررہی تھی۔ میں نے ہمیشہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کیا تھا اور برے سے برے وقت میں بھی جی کی قوت سے کام نہیں لیا تھا لیکن اب یہاں صورتِ حال کچھ اور تھی۔ یہاں معاملہ انسانی اختیار سے باہر ہورہا تھا اور گوتم بھوش کسی پراسرار قوت کے ذریعے مجھے قابو میں کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ مجھ سے وہ مالا حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں نیلگری نے پہلے ہی روز خبردار کردیا تھا کہ میں اس کی حفاظت کروں۔ اس نے پہلے ہی مجھے وارننگ دی تھی کہ یہ مالا مجھ سے چھیننے کی کوشش کی جائے گی اور چھیننے کی کوشش کرنے والا میرے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔

اور یوگی گوتم بھوش مجھ سے مالا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے پراسرار علم کے ذریعے یہ معلوم کرلیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کہاں سے آرہا ہوں۔ وہ راستے میں کھڑا میرا انتظار کررہا تھا اور مجھے بس سے اترواکر نجانے کہاں لے جارہا تھا کہ نیلگری نے مجھے خبردار کردیا اور میں نے بروقت

اپنے حواس پر قابو پالیا تھا۔

”یہ مالا مجھے دے دو۔“ گوتم بھوش نے ایک بار پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ”اس کے لیے میں نے بہت کشٹ اٹھائے ہیں۔ بہت لمبا سفر کیا ہے۔ لاؤ‘ یہ مالا مجھے دے دو۔“

”تم میرے استاد ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ تم بہت بے وقوف بھی ہو۔“ میں نے کہا ”اس مالا کو حاصل کرنے کے لیے بڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے اور تم اس کی اہمیت سے بھی واقف ہو۔ اس کے باوجود یہ سمجھتے ہو کہ میں یہ مالا آسانی سے تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اگر تم میں اتنی شکتی ہے تو میرے گلے سے اتار لو یہ مالا۔ میں تمہارا ہاتھ نہیں روکوں گا۔“

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے میرے گلے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میری نظریں اس وقت اس کے پیروں کے قریب زمین پر جم گئی تھیں۔ اس کا ہاتھ میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا سے صرف دو انچ دور رہ گیا تھا کہ وہ اچانک ہی چیختا ہوا اچھل پڑا اور پیروں کو زور زور سے جھٹکنے لگا۔ وہ کسی ایک جگہ کھڑا نہیں رہ سکا۔ اسی طرح اچھلتا رہا جیسے پیروں کے نیچے دہکتے ہوئے انگارے بچھ گئے ہوں۔

وہ مجھ سے کئی گز دور ہٹ گیا تھا۔ اب وہ پیر نہیں جھٹک رہا تھا۔

”میں جارہا ہوں گوتم بھوش اور میرا راستہ روکنے کی کوشش مت کرنا۔“ میں نے کہا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں اس وقت کیرتی پور کی آبادی سے کم از کم دو میل دور ویران پہاڑیوں پر تھا۔ نیچے نشیب میں آبادی کی ٹمٹماتی ہوئی سی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر گوتم بھوش کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں پتھروں کو پھلانگتا ہوا نشیب میں اترنے لگا۔ ابھی میں نے تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک طرف سے غراہٹ کی آواز سن کر چونک گیا۔ وہ شاید کوئی بھیڑیا تھا جو مجھے اپنا شکار سمجھ کر غرا رہا تھا اور پھر اس کے قریب ہی ایک اور بھیڑیا کہیں سے نمودار ہوا۔

میں کانپ اٹھا۔ ویرانے میں بھیڑیے اپنے شکار کو گھیر کر جس طرح اس کے بخیے ادھیڑتے ہیں‘ میں اس کے تصور ہی سے کانپ اٹھا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے دوڑ لگادی۔

وہ بھیڑیے بھی غراتے ہوئے میرے پیچھے لپکے۔ میں ان کی پہنچ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن ان بھیڑیوں نے بھی شاید میرا پیچھا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

ایک مرتبہ مجھے پیچھے مڑکر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ میرا تعاقب دو بھیڑیوں نے شروع کیا تھا لیکن اب ان کی تعداد پانچ یا چھ ہوگئی تھی۔ ان میں ایک بھیڑیا سب سے آگے تھا اور باقی چند گز پیچھے۔ سب سے آگے والا بھیڑیا بھی مجھ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر تھا اور وہ یہ فاصلہ کم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

ایک جگہ مجھے ٹھوکر لگی۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

سینے پر گرا۔ میں نے دوبارہ اس پتھر کو پکڑا۔ ایسا کرتے ہوئے میری انگلیاں بھی مالا سے چھوگئیں۔ وہ بھیڑیا قریب آگیا تھا۔ صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر وہ پتھر پوری قوت سے بھیڑیے کی طرف دے مارا۔

پتھر بھیڑیے کے سر پر لگا۔ ایک خوفناک انسانی چیخ ویرانے میں گونجی اور بھیڑیا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

انسانی چیخ کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ ایک لمحے کو تو میں بدحواس سا ہوگیا تھا کہ شاید میرا مارا ہوا پتھر اس طرف آنے والے کسی آدمی کو لگ گیا ہو۔ ابھی شام کا ابتدائی حصہ ہی تھا اور یہ جگہ بستی سے زیادہ دور بھی نہیں تھی لیکن پتھر تو بھیڑیے ہی کو لگا تھا اور وہ پتھروں پر تڑپ رہا تھا۔

میں نے بھیڑیے کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی سنسنی کی لہر میرے پورے جسم میں دوڑتی چلی گئی۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ زمین پر تڑپتے ہوئے بھیڑیے کی ہیت بدل رہی تھی۔ پہلے اس کا چہرہ بگڑنا شروع ہوا۔ چہرے کے نقش اور ہیئت بتدریج بگڑتی چلی گئی اور پھر وہاں ایک نیا چہرہ ابھرنے لگا۔

وہ انسانی چہرہ تھا۔ مجھے اس کے نقوش کچھ شناسا سے لگے لیکن اس وقت ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا کہ اس چہرے کو شناخت کرسکتا۔ بھیڑیے کے جسم کے دوسرے حصے بھی بتدریج تبدیل ہورہے تھے۔

اس سارے عمل میں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔

پتھروں پر اب بھیڑیے کے بجائے ایک انسان پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑ رکھا تھا جہاں سے

خون کی دھار بہہ رہی تھی اور پھر اس کے ہاتھ جیسے ہی چہرے سے ہٹے‘ میں لرز اٹھا۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ پنڈت دھیراج تھا۔ گوتم بھوش کا چیلا جو رشی کیش میں شوبھا دیجی کو یوگ کی مشق کروایا کرتا تھا۔

یوگی دھیراج زمین پر پڑا بڑی خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے پتھر لگنے

کے بعد دوسرے بھیڑیے بھاگ گئے تھے۔ ان کا دور دور تک کہیں نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

دھیراج نے اپنی جگہ سے اس طرح حرکت کی جیسے مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتا ہو لیکن وہ لڑکھڑا کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب سی آوازیں نکلنے لگیں۔ منہ سے کف بہہ رہا تھا۔ میرا پتھر اس کی پیشانی پر لگا تھا اور پیشانی سے بہنے والے خون نے اس کے چہرے کو بہت بھیانک بنا دیا تھا۔

بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں گوتم بھوش سے اپنے آپ کو چھڑا کر بھاگا تھا اور بھیڑیوں سے بچنے کے لیے میں نے ایک بھیڑیے کو پتھر مار دیا تھا۔ وہ بھیڑیا زخمی ہو کر گرا تھا اور انسانی روپ اختیار کر گیا تھا۔ میں چند لمحے زخمی دھیراج کی طرف دیکھتا رہا پھر ایک طرف سے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز سن کر چونک گیا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگا لیکن تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور بستی کی طرف دوڑ لگا دی۔

بستی تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ میں ایک بارونق بازار میں پہنچ گیا۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہر طرف خوب چہل پہل تھی۔ میرا حلیہ بہت ہی ابتر ہو رہا تھا۔ لمبا سا چوغہ' بے تحاشا بڑھے ہوئے بال اور داڑھی۔ میں جس طرف سے بھی گزرتا' لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھنے لگتے لیکن میں ان کی نظروں کی پروا کیے بغیر ایک طرف چلتا رہا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ میرے چلنے میں میرے ارادے کو بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ میں بازار سے نکل کر گلیوں میں گھومتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔

اس گلی میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ تاریکی اس قدر گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

اچانک اندھیرے میں مجھے کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور میں لڑکھڑا کر گرا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں ٹٹول کر دیکھنے لگا اور پھر دوسرے ہی لمحے اچھل پڑا۔ وہ کوئی مردہ کتا تھا یا کوئی اور جانور۔ میں اٹھ کر پھر آگے چلنے لگا۔

یہ تاریک گلی شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی چلی گئی۔ کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ تاریکی بہت گمبھیر تھی۔ کسی طرف روشنی کی معمولی سی کرن بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جب میں اس گلی میں داخل ہوا تھا تو دونوں طرف مکان تھے لیکن اب مکانوں کے بجائے دونوں طرف سپاٹ اور سیدھی دیواریں تھیں جو اوپر تک اٹھتی چلی گئی تھیں۔

میں اس سرنگ نما گلی میں دوڑتا رہا لیکن یہ سرنگ نما گلی کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ اچانک میں کسی چیز سے ٹکرا کر لڑکھڑا گیا۔ مجھے لگا تھا جیسے اندھیرے میں کسی دیوار نے میرا راستہ روک لیا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھ سامنے کو پھیلا دیے اور اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا لیکن میرے سامنے نہ کوئی دیوار تھی نہ کوئی اور رکاوٹ۔ میں آگے بڑھتا رہا اور پھر رک گیا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ سناٹا تھا جو میرے وجود میں پھیلتا جا رہا تھا۔ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں ایک بارونق بازار سے اس گلی میں داخل ہوا تھا لیکن لگتا تھا جیسے زمین کی گہرائیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ نہ کہیں روشنی تھی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں عجیب سے طاغوتی چکر میں پھنس گیا تھا جس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیطانی قوتیں تھیں جو چاروں طرف سے مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں رک گیا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے میرا دماغ کسی شکنجے سے آزاد ہو گیا ہو۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرے اندر مراقبے اور ارتکاز کی قوت لوٹ آئی۔ میری آنکھیں بند تھیں لیکن میرے اردگرد کا ماحول روشن ہو گیا تھا۔ میرے چاروں طرف ویرانہ تھا۔ آبادی وہاں سے بہت دور تھی۔ میں شاید بدحواسی میں دوڑتا ہوا آبادی کی دوسری طرف بہت دور ویرانے میں نکل آیا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ماحول جوں کا توں برقرار تھا۔ میں مڑ کر آبادی کی طرف دوڑنے لگا۔

اسی بارونق بازار کے قریب ایک گلی تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ سامنے بازار میں لوگوں کی آمدورفت تھی۔ میں بے تحاشا اس طرف دوڑ رہا تھا اور پھر اچانک کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر میں گر پڑا۔

دوسرے ہی لمحے میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ایک عورت کی لاش تھی جس سے ٹکرا کر میں اس کے اوپر گرا تھا اور اتفاق سے میرے ہاتھ اس کے گلے پر پڑے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا' شور کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ شور مچاتے ہوئے لوگ میرے اردگرد جمع ہو رہے تھے۔

صورتِ حال بڑی سنگین تھی۔ میں ایک عورت کی لاش پر پڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر تھے اور لوگوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔

میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔

صورتِ حال کی سنگینی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ سڑک پر پڑی ہوئی نیم برہنہ ایک عورت کی لاش اور میں اس کے اوپر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر تھے اور میرے اردگرد کئی لوگ جمع ہو چکے تھے۔ یہ صورتِ حال مجھے اس عورت کا قاتل ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔

میرے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ شور مچا رہے تھے۔ ان کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں حواس باختہ سا ہو رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی قوتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ انجانے خوف اور دہشت نے جیسے مجھے بے جان سا کر کے رکھ دیا تھا اور میں عجیب سی نظروں سے اپنے اردگرد کھڑے شور مچاتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میرے دائیں طرف کھڑے ہوئے درمیانے قد کے ایک آدمی نے چیخ کر کچھ کہا اور پھر آگے بڑھ کر میری کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

میرا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ میں اچھل کر لاش پر سے ایک طرف گر گیا۔ سر پر ٹھوکر لگتے ہی میں جیسے ہوش میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے صورتِ حال کی نزاکت کا بھی احساس ہو گیا تھا۔ مجھے بڑی آسانی سے قاتل ثابت کیا جا سکتا تھا۔

اس بات کے درجنوں گواہ موجود تھے کہ میں اس عورت کے سینے پر سوار' اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔

میرے دماغ میں اچانک ہی دھماکا سا ہوا۔ میرے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں یہاں سے فرار ہو جاؤں لیکن شاید میں احمقوں کی جنت میں رہتا تھا جو اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا۔ میرے اردگرد درجنوں لوگ جمع تھے اور بعض تو غصے میں بپھرے ہوئے تھے۔ یہاں سے بھاگنا تو درکنار' وہ مجھے ملنے کا موقع بھی نہ دیتے۔

میرا موخرالذکر خیال درست ثابت ہوا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور آدمی نے آگے بڑھ کر میری پسلیوں پر ٹھوکر مار دی۔ میں بے اختیار کراہ اٹھا۔ اس شخص کی دوسری ٹھوکر پڑنے سے پہلے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخ چیخ کر لوگوں کو بتانے لگا کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے اس عورت کو قتل نہیں کیا لیکن میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سب نچلے طبقے کے نیپالی تھے۔ لباس اور حلیوں سے مزدور طبقے سے تعلق رکھنے والے لگتے تھے۔ ان میں کوئی بھی پڑھا لکھا نہیں لگتا تھا جو میری بات سمجھ سکتا کیونکہ میں اپنے دفاع میں جو بکواس بھی کر رہا تھا وہ انگریزی زبان میں تھی۔

ایک سنسنی خیز سرگزشت

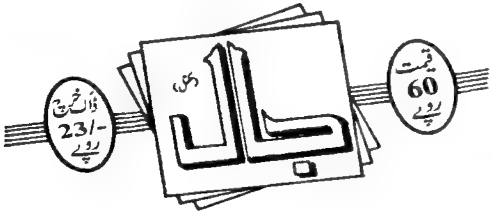

ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز

23 ... آئی آئی چندریگر روڈ کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551 Email: kitabiat1970@yahoo.com

اور پھر ہجوم میں ایک آدمی کو دیکھ کر میری آواز اس طرح ساکت ہوگئی جیسے حلق میں روئی کا گولا ٹھونس دیا گیا ہو۔ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ یوگی دھیراج تھا جس کے سر سے اب بھی خون رس رہا تھا اور اس کا چہرہ بھی خون آلود تھا۔ اس کے بدن پر پیلے رنگ کے لنگوٹ کے سوا لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

یوگی دھیراج لوگوں کو دھکیلتا ہوا آگے گیا اور چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگا۔ ستر سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود وہ تیر کی طرح سیدھا کھڑا تھا اور اس کی آواز بھی بڑی پاٹ دار تھی۔

چیختے ہوئے وہ کبھی اپنے پھٹے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتا' کبھی لاش کی طرف اور کبھی ہاتھ لہرا لہرا کر مختلف سمتوں میں اشارے کر رہا تھا۔ وہ نیپالی اور ہندی زبان میں بات کر رہا تھا۔ تبتی زبان کے ایک آدھ لفظ بھی اس کی زبان سے نکل رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر ہندی زبان کے الفاظ ہی استعمال کر رہا تھا اور اس کا مفہوم سمجھ کر میں کانپ کر رہ گیا۔

دھیراج چیخ چیخ کر لوگوں کو بتا رہا تھا کہ میں اس عورت کو دھوکے سے سنسان جگہ پر لے گیا۔ عورت کو جب صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں نے اسے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اس کے گلے سے سیاہ پتھروں کی قیمتی مالا اتار لی۔ وہ عورت موقع پاکر کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور اس گلی میں آکر اسے پکڑ لیا۔ گلی اس وقت سنسان تھی۔ عورت نے چیخنے کی کوشش کی تو میں نے اسے زمین پر گرا کر اس کا گلا گھونٹ دیا۔

"اس میں شبے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ لوگوں کو اشتعال دلاتے ہوئے کہہ رہا تھا "یہ منظر تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ اس کے سینے پر سوار اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ یہ عورت مر چکی ہے۔ یہ قاتل ہے۔ ہتیارا ہے۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے!" میں نے ہندی زبان میں چیخ کر کہا۔

"جھوٹا میں نہیں یہ ہے۔" یوگی دھیراج بھی چیخا "جب یہ اس عورت کو بہلا پھسلا کر ویرانے کی طرف لے جا رہا تھا تو میں نے اسے بچانے کی کوشش کی تھی جس پر اس نے مجھے پتھر مار کر زخمی کر دیا۔ دیکھو۔ دیکھو۔ یہ رہا وہ پتھر جس سے اس نے میرا سر پھاڑا تھا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خون آلود پتھر بھی لوگوں کو دکھایا "اگر میں جھوٹا ہوں تو اس کی تلاشی لو۔ سیاہ پتھروں کی وہ قیمتی مالا اس کے گلے میں موجود ہے جو اس نے اس غریب عورت سے چھینی تھی۔"

میں لرز کر رہ گیا۔ دھیراج نے بڑی گہری چال چلی ظاہر ہے' وہ مالا میرے گلے میں موجود تھی۔ اب ساری میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میں واقعی طاغوتی چکر میں پھ تھا۔ یوگی گوتم بھوش اور دھیراج مجھ سے نیلگری کی مالا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس مالا کو نیلگری تک پہنچنے بھی کہا جاسکتا تھا اور وہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چا تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مجھ پر کچھ قوتیں بھی آز تھیں لیکن کامیاب نہیں ہوسکے تھے۔ میں ان کی قوتوں حصار سے بھاگ نکلا تھا لیکن انہوں نے ایک بار پھر گھیرنے کی کوشش کی تھی اور اس مرتبہ انہوں نے دو طریقہ استعمال کیا تھا۔ جو ان کی پراسرار قوتوں سے ز خطرناک تھا۔ درجنوں لوگوں نے مجھے اس عورت کے سینے سوار دیکھا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ اس کے گلے پر تھے ا ظاہر ہے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ اس عورت کو میں قتل کیا تھا۔ میرے گلے میں مالا کی موجودگی دھیراج کی کہا تصدیق کردیتی اور لوگ کسی طرح بھی میری بات کا یقین کرتے۔

دو آدمی میری طرف بڑھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے لگا لیکن پیچھے بھی لوگ موجود تھے۔ میرے بچ نکلنے کا امکان نہیں تھا۔ میں نے دھیراج کی طرف دیکھا۔ اس ہونٹوں پر بڑی کریہہ مسکراہٹ تھی۔

آگے بڑھنے والے دونوں آدمیوں نے اچانک ہی میر طرف چھلانگ لگا دی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی لیکن آدمی پیچھے سے بھی مجھ پر جھپٹ پڑے تھے۔ میں اپنے آپ بچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ وحشیوں کی طرح مجھ لپٹ گئے تھے۔ میرا چوغہ تار تار ہوگیا۔ ایک آدمی نے زور دار جھٹکا دیا۔ پھٹا ہوا چوغہ میرے جسم سے الگ ہوگیا میرے گلے میں نیلگری کی سیاہ پتھروں کی وہ مالا اب صاف نظ آرہی تھی۔

"دیکھو۔ دیکھو۔۔!" دھیراج چیخا "یہی ہے وہ مالا جو ا راکشش نے اس غریب عورت سے چھینی تھی۔ اتار لو اسے اس کے گلے سے۔"

ایک آدمی نے مالا کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ ا طرح اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے پوری قو سے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی گئی تھی۔ میں نے دھیراج کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹو کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور آنکھوں میں وحشت سی ابھر

آئی۔

ایک اور آدمی آگے بڑھا لیکن اسی وقت پولیس کی ایک گاڑی گلی میں مڑ کر ہجوم کے قریب رک گئی۔ گاڑی سے اچانک ہی سائرن بھی بجا تھا۔ لوگ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کئی پولیس والے گاڑی سے اتر کر ہماری طرف لپکے۔

تین چار آدمی میرے قریب کھڑے رہے تھے۔ دو نے مجھے بانہوں سے پکڑ لیا تھا تاکہ میں بھاگنے کی کوشش نہ کروں۔ پولیس والے قریب آئے تو مجھے ان کے حوالے کر دیا گیا اور ایک آدمی تیز تیز لہجے میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

لوگ ایک بار پھر جمع ہونا شروع ہوگئے تھے لیکن اس مرتبہ وہ سب دور دور ہی کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کے اس انداز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ ابھی بھی خاصے مشتعل تھے۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دھیراج کہیں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پولیس پارٹی کا انچارج ایک انسپکٹر تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ مشتعل لوگ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اس نے سرسری سے انداز میں سڑک پر پڑی ہوئی عورت کی لاش کی طرف دیکھا۔ دو کانسٹیبلوں کو اپنے پاس روک لیا اور باقی پولیس والوں کو مجھے پولیس اسٹیشن لے جانے کا حکم دے دیا۔

پولیس کی گاڑی میں چار مسلح کانسٹیبل تھے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاکر ہتھکڑی لگا دی گئی تھی۔ پولیس والوں نے مجھے اپنے درمیان بٹھا لیا اور گاڑی حرکت میں آگئی۔

میں قسمت کی ستم ظریفی پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ آج صبح تک میں پوکھارا میں پولیس چیف کا مہمان تھا۔ میری خوب خاطر مدارات کی جاتی رہی تھی۔ ایک دو روز پہلے مجھے پولیس چیف کی طرف سے ایک بھاری رقم بھی دی گئی تھی تاکہ میں اپنے قبائلی مہمانوں کی خاطر تواضع کرسکوں اور ان کے لیے تحائف خرید سکوں اور اب میں پولیس کی حراست میں تھا اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس والوں کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لوگ مجھے کوئی قبائلی سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی کہ میں کون ہوں' کہاں سے آیا ہوں اور وہ عورت کون تھی جسے میں نے قتل کیا تھا لیکن میں نے ان کی کسی بات کا جواب دینے کے بجائے زبان بند رکھی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پولیس اسٹیشن پہنچنے کے بعد ہی پولیس کو بتاؤں گا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس طرح قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

مجھے یہ بھی یقین تھا کہ انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان کو اطلاع ملے گی تو وہ لوگ اس پولیس اسٹیشن پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ میں نے پولیس والوں کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا البتہ اس عورت کے بارے میں ضرور سوچتا رہا جس کی لاش سے ٹھوکر کھا کر میں اس کے اوپر گرا تھا۔

وہ کون تھی' اسے کس نے قتل کیا تھا؟ کیا اس لاش سے میرا ٹکرانا محض اتفاق تھا یا پنڈت دھیراج کی کوئی سازش تھی؟ وہاں اس کی موجودگی اور اس کی باتوں سے تو اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ میرے خلاف ایک جال پھیلایا گیا تھا۔ دھیراج کا خیال تھا کہ شاید اس طرح وہ لوگ مجھ سے نیلگری کی مالا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ یہاں بھی انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ گوتم بھوش اور دھیراج یہ مالا حاصل کرنے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں گے اور کسی اور موقع پر مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

میں یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز سے رک گئی۔ زوردار جھٹکا لگنے سے میں اپنے ساتھ والے کانسٹیبل کے اوپر گرا۔ وہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دوسری طرف الٹ گیا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی ایک طرف الٹ گئے تھے جبکہ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا چوتھا کانسٹیبل میرے اوپر الٹ گیا تھا۔

میں جس کانسٹیبل پر گرا تھا اس نے مجھے دھکا دے کر اٹھا دیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

پولیس وین کا راستہ بغیر چھت والی ایک جیپ نے روکا تھا اور نصف درجن نقاب پوشوں نے جیپ سے اتر کر پولیس وین کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ان سب کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

"خبردار!" ایک نقاب پوش دہاڑا "کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ اپنی رائفلیں پھینک دو۔ کسی نے بہادری دکھانے کی کوشش کی تو چھلنی کر دیا جائے گا۔"

گاڑی کو زوردار جھٹکا لگنے سے کانسٹیبلوں کے ہاتھوں

سے تو پہلے ہی رائفلیں چھوٹ گئی تھیں۔ باقی دو نے بھی رائفلیں گاڑی کے فرش پر پھینک دیں اور ہاتھ اٹھا دیے۔

"اسے نیچے اتارو۔" اس نقاب پوش نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا۔ ایک نقاب پوش رائفل تانے جیپ کے قریب آگیا اور مجھے نیچے اترنے کا حکم دیا۔

میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ کسی سہارے کے بغیر اٹھنے میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔

وہ نقاب پوش مجھے دھکے دیتا ہوا اپنی جیپ کی طرف لے گیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کیرتی پور اگرچہ کھٹمنڈو شہر کا نواحی علاقہ تھا۔ شہر کے مرکز سے اس کا فاصلہ چند کلومیٹر سے زیادہ نہیں تھا لیکن اس علاقے کا پولیس اسٹیشن آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا اور جہاں پولیس کی گاڑی روکی گئی تھی اس سڑک پر تو ٹریفک کی آمدورفت بھی نہیں تھی۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پولیس کی گاڑی مجھے اغوا کرنے کے لیے روکی گئی تھی لیکن یہ نقاب پوش کون تھے اور مجھے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑانا چاہتے تھے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا تھا کہ کیا یہ بھی گوتم بھوش یا پنڈت دھیراج کی کوئی چال تھی؟ لیکن یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ دونوں بعض پراسرار قوتوں کے مالک تھے۔ مجھے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے لیے کوئی اور طریقہ بھی اختیار کرسکتے تھے لیکن اچانک ہی ایک اور خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ اس طرح طاقت کے زور پر مجھے پولیس کی حراست سے چھڑا کر شاید وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہوں کہ میرا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے ہے اور میرے گروہ کے آدمیوں نے مجھے پولیس سے چھڑایا تھا۔

میرے ہاتھ پشت پر ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور کسی سہارے کے بغیر جیپ پر چڑھنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نقاب پوش نے مجھے اٹھا کر جیپ کے فرش پر پٹخ دیا۔ میں پہلو کے بل گرا اور میرے بائیں کندھے پر اچھی خاصی چوٹ لگی تھی۔

میں اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ تڑتڑاہٹ کی اس آواز میں انسانی چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں نے پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھا اور کانپ کر رہ گیا۔

تمام نقاب پوشوں کی رائفلیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے پولیس والوں پر شعلے اگل رہی تھیں۔ چند سیکنڈ کے اندر چاروں کانسٹیبل اور ڈرائیور چھلنی ہوگئے۔

ایک نقاب پوش نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور وہ لوگ جیپ کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈرائیور پہلے ہی اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور جیپ کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ حکم دینے والا نقاب پوش ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور باقی دوڑتے ہوئے جیپ کے پچھلے حصے پر سوار ہوگئے اور جیپ ایک زوردار جھٹکے سے حرکت میں آگئی۔

اس جیپ کی سیٹیں بھی آمنے سامنے تھیں اور میں ان سیٹوں کے بیچ میں فرش پر پڑا تھا۔ دو نقاب پوشوں کے پیر میرے جسم پر تھے۔ میں نے ذرا سی لوٹ لگا کر اٹھنے کی کوشش کی تو ایک نقاب پوش نے رائفل کا بٹ میری کھوپڑی پر رسید کردیا۔

میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں سی حرکت کرنے لگیں اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

میرے دماغ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی تھی۔ مجھے لگا کہ یا تو میری بینائی ختم ہوچکی تھی یا میں کسی قبر میں پڑا تھا لیکن میں مردہ نہیں تھا۔ سر میں اٹھنے والی درد کی ٹیسیں زندگی کا پتا دے رہی تھیں۔

دماغ میں درد کی شدت ذرا کم ہوئی تو میں نے بڑی آہستگی سے اپنے جسم کو حرکت دی اور ہاتھوں پر زور دے کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

دو باتوں کا انکشاف میرے لیے خاصا اطمینان بخش ثابت ہوا تھا۔ ایک تو یہ کہ میں زندہ تھا اور میری یادداشت بھی بحال تھی اور دوسری بات یہ کہ میری بینائی کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میں جس جگہ پڑا ہوا تھا وہاں اندھیرا بہت دبیز تھا۔ لیٹے رہنے کی پوزیشن میں، میں اپنے اطراف کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا لیکن اٹھ کر بیٹھا تو بائیں طرف بہت دور آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستارے دکھائی دے رہے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ میرے ہاتھ بھی آزاد تھے۔

مجھے جسمانی یا ذہنی طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ کیرتی پور میں اس عورت کی لاش کے ہنگامے کے بعد پولیس والے مجھے تھانے لے جارہے تھے کہ راستے میں نقاب پوشوں نے پولیس کی گاڑی پر حملہ کر کے مجھے پولیس سے چھڑوالیا تھا اور میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے

بے ہوش کردیا گیا تھا۔

وہ نقاب پوش کون تھے۔ انہیں مجھ سے کیا ہمدردی تھی اور انہوں نے مجھے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا تھا؟ کئی سوالات میرے دماغ میں چکرا رہے تھے لیکن فی الوقت کسی سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا لیکن ایک بات بہرحال طے تھی کہ یہ لوگ میرے ہمدرد نہیں تھے۔ اگر ہمدرد ہوتے تو اس طرح کسی اندھیری قید میں نہ ڈال دیا گیا ہوتا۔

میں کچھ دیر تک کھوپڑی سہلاتا رہا پھر دونوں ہاتھوں سے فرش کو ٹٹولتا ہوا اس طرف بڑھنے لگا جہاں سے ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔

فرش پر ٹٹولتے ہوئے مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کوئی کشادہ کمرا تھا جس کا فرش پتھریلا اور کھردرا تھا۔ میں کسی چوپائے کی طرح ہاتھوں پیروں کے بل آگے بڑھتا رہا اور پھر میرا سر ایک دیوار سے ٹکرا گیا۔ میرے منہ سے بے اختیار کراہ خارج ہوگئی۔ میں کچھ دیر تک پیشانی سہلاتا رہا اور پھر اندھوں کی طرح ہاتھ آگے کو پھیلا دیے۔

میرے ہاتھ دیوار سے ٹکرائے اور میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اب مجھے اس جگہ کے بارے میں اندازہ لگانے میں مزید آسانی ہوگئی۔ یہ کوئی کمرا تھا اور میں ایک کشادہ کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا جس میں ہر چھ انچ کے فاصلے پر دو دو انچ موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دیوار کو ٹٹولنے سے یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ یہ دیوار یا یہ عمارت بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔

میں آہنی سلاخوں کو پکڑ کر ہلانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ سلاخیں بڑی مضبوط تھیں۔ میں نے کوشش ترک کردی اور باہر دیکھنے لگا۔ تاریکی میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی مدھم سی روشنی میں پہاڑیوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری بھی پیش نہیں آئی کہ یہ عمارت آبادی سے بہت دور ویرانے میں واقع تھی۔

میں کچھ دیر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گہری تاریکی میں اس قید خانے کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرنا بیکار تھا۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے، آگے کی طرف ٹانگیں پھیلائے بیٹھا گزرے ہوئے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اچانک ہی مجھے نیلگری کی مالا کا خیال آگیا اور میرا ہاتھ بے اختیار اپنے گلے پر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

مالا میرے گلے میں نہیں تھی۔

میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پہلی مرتبہ مالا مجھ سے جدا ہوئی تھی تو مجھے بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ مالا مجھ سے چھن گئی تھی اور دوسری بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور اب پھر مالا غائب تھی۔

میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ کیا مالا گوتم بھوش یا پنڈت دھیراج کے قبضے میں چلی گئی تھی؟ وہ اس کے لیے کوشش کرچکے تھے اور پنڈت دھیراج نے مجھے قتل کے چکر میں پھنسانے کی کوشش بھی کی تھی اور پھر نقاب پوشوں نے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا۔

لیکن نہیں۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے نکال دیا۔ اگر مالا ان کے قبضے میں پہنچ چکی ہوتی تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑتے کیونکہ وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ میں وہ مالا واپس لینے کی بھرپور کوشش کروں گا۔

تو پھر مالا کہاں گئی؟

یہ سوال میرے ذہن میں بار بار گونج رہا تھا۔ ممکن ہے نقاب پوشوں کی جیپ میں کہیں گر گئی ہو یا کسی نقاب پوش نے میرے گلے سے اتار لی ہو۔ اس کا پتا تو اسی وقت چل سکتا تھا جب نقاب پوش مجھ سے دوبارہ رابطہ کرتے۔

میرے دماغ میں ایک بار پھر ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا اور پھر پتا نہیں کس وقت میں اونگھ گیا۔

میری پسلیوں پر لگنے والی وہ ٹھوکر بڑی زوردار تھی۔ اس سے نہ صرف میری آنکھ کھل گئی بلکہ میں بری طرح بلبلا اٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا' ایک اور ٹھوکر پڑی اور میں فرش پر لڑھک گیا۔

مجھے اپنے آپ کو سنبھالنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔ تیسری ٹھوکر لگنے سے پہلے میں پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے راستے دھوپ اندر آرہی تھی۔ میرے سامنے دو آدمی تھے۔ ایک تو وہ تھا جس نے مجھے ٹھوکریں ماری تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفل بھی سنبھال رکھی تھی۔ دوسرا دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھی رائفل تھی جبکہ دوسرے ہاتھ میں اس نے پیتل کی ایک گول تھالی اٹھا رکھی تھی جس میں پانی کا گلاس' ایک کپ چائے اور ڈبل روٹی کے تین چار پیس رکھے ہوئے تھے۔

"کب تک سوتے رہو گے نواب صاحب؟" میرے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے مجھے ایک اور ٹھوکر مارنے کی

کوشش کرتے ہوئے غرا کر کہا۔ میں اچھل کر اس کی ٹھوکر سے بچ گیا۔

وہ دونوں نیپالی تھے۔ جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا اس نے چوڑی دار قسم کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اوپر ہاف کوٹ قسم کی کوئی چیز تھی جس کے بٹن شیروانی کی طرح اوپر تک بند تھے۔ سر پر سیاہ رنگ کی گول نیپالی ٹوپی بھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ اس کے چہرے پر بڑی کرختگی تھی۔

دوسرا آدمی بھی نیپالی ہی تھا۔ اس نے جینز ڈینم کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے بٹن بھی کھلے ہوئے تھے۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر تھالی ایک طرف رکھ دی۔

"ہم تیسری مرتبہ یہاں آئے ہیں۔" میرے سامنے کھڑا ہوا شخص غرایا "باس کا حکم تھا کہ تمہیں ناشتا کرا دیا جائے۔ اگر باس کا حکم نہ ہوتا تو تمہیں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیا جاتا۔ ناشتا کرلو۔ ہم آدھے گھنٹے بعد پھر آئیں گے۔"

وہ دونوں باہر چلے گئے اور دروازہ دھڑ سے بند ہو گیا۔ باہر سے کوئی مضبوط کھٹکا لگائے جانے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ یہ خاصا بڑا کمرا تھا اور چھت بھی تقریباً بیس فٹ اونچی تھی۔ میرا یہ اندازہ بھی درست نکلا تھا کہ یہ عمارت بڑے بڑے پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ چھت پر البتہ ٹائلوں کی طرح کے چھوٹے پتھر تھے۔ ہر چھ انچ کے فاصلے پر لکڑی کی بلیاں تھیں جن پر چھت کی ٹائلیں چنی گئی تھیں۔

لکڑی کا دروازہ بہت بھاری اور مضبوط تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک تنگ سا راستہ تھا۔ میں نے اس طرف جا کر اندر جھانکنا چاہا تو ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرف سے شدید تعفن اٹھ رہا تھا۔ یہ تھوڑی سی جگہ غالباً باتھ روم کے طور پر چھوڑی گئی تھی۔

کمرے کا فرش بھی پتھروں کا تھا اور یہ پتھر جگہ جگہ سے ٹوٹ اور اکھڑ چکے تھے۔ ہوا کی آمدورفت کے لیے وہی ایک کشادہ کھڑکی تھی جس میں ہر چھ انچ کے فاصلے پر دو انچ موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

یہ عمارت پہاڑیوں میں کسی ویران جگہ پر واقع تھی۔ ہو سکتا ہے یہ کوئی قدیم حویلی ہو اور یہ کمرا پہلے بھی شاید قید خانے کے طور پر ہی استعمال ہوتا رہا تھا۔

کھڑکی کے راستے تیز دھوپ اندر آرہی تھی۔ میرے پاس اگرچہ گھڑی نہیں تھی لیکن اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ گیارہ بجے کا وقت ضرور ہو گا۔

وہ دونوں آدمی میرے لیے ناشتا رکھ کر چلے گئے میں ان سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا گیا تھا۔ گزشتہ رات پولیس کے خلاف کارروائی کے دوران میں ان سب اپنے چہرے نقابوں میں چھپا رکھے تھے لیکن اس وقت جو آدمی میرے کمرے میں آئے تھے انہوں نے مجھ سے اپنے چہرے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

گزشتہ رات ان نقاب پوشوں نے مجھے چھڑانے کے لیے پولیس کے خلاف جو کارروائی کی تھی اس نے مجھے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے پولیس کے قبضے سے چھڑانے تک کی کارروائی بڑے پرسکون انداز میں ہو گئی تھی۔ وہ اگر چاہتے تو پولیس

والوں کی رائفلیں چھین لیتے اور گاڑی کے ٹائر برسٹ کر دیتے تاکہ تعاقب کا اندیشہ نہ رہتا لیکن انہوں نے تمام پولیس والوں کو جس بے رحمی سے گولیوں سے بھون کر رکھ دیا تھا اس سے تو میں بھی کانپ کر رہ گیا تھا۔

مجھے بھی انہوں نے بے ہوش کر دیا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پولیس والوں کی ہلاکت کے بعد ہم جیپ میں کتنی دیر تک سفر کرتے رہے تھے لیکن یہ بات بہرحال طے تھی کہ یہ عمارت شہر سے میلوں دور پہاڑیوں میں کسی ایسی جگہ واقع تھی جہاں پولیس آسانی سے نہ پہنچ سکتی ہو۔

میں کافی دیر تک دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا یہ سب کچھ سوچتا رہا پھر دروازے کے قریب پڑا ہوئی تھالی اٹھا کر کھڑکی کے قریب لے آیا اور گرد آلود فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

چائے بغیر دودھ کی تھی۔ ڈبل روٹی کے چار سلائس تھے۔ میں نے گلاس اٹھا کر پہلے کلی کی پھر پانی کے ایک دو گھونٹ پیے اور ڈبل روٹی کھانے لگا۔

ناشتا کر کے میں نے تھال دوبارہ دروازے کے قریب رکھ دی اور کھڑکی کے سامنے کھڑا دیر تک باہر کا نظارہ کرتا رہا۔ یہ کمرا عمارت کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ حویلی کی پچھلی طرف تیس چالیس گز کے فاصلے پر پتھروں ہی سے بنی ہوئی فصیل نما اونچی دیوار نظر آرہی تھی اور اس کے پیچھے دور تک برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں تھیں۔

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ انسپکٹر پانڈے سے کئی میل دور بودناتھ کے علاقے میں انسپکٹر پانڈے کی حویلی بھی کسی ایسی ہی جگہ پر واقع تھی۔ کیا یہ عمارت بودناتھ ہی کے علاقے میں واقع ہے؟ میں نے اپنا چہرہ کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ ٹکا دیا اور دائیں بائیں دیکھنے کی کوشش

...نے لگا لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آس ...س کی پہاڑیوں پر کوئی اور عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر ...گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی ...یں دے رہی تھی۔ یہ عمارت غالباً بہت بڑی تھی اور وہ ...ب پوش غالباً اس عمارت کے کسی دور افتادہ حصے میں تھے ...کیونکہ ان کی طرف سے بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ ...میرے محافظوں میں سے کوئی نہ کوئی اس طرف ضرور آئے گا ...لیکن دوپہر ڈھل گئی اور کسی نے اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ ...ان کے باس نے شاید انہیں صرف صبح کے ناشتے کا حکم دیا ...تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی ...تھی کیونکہ ناشتا دینے کے بعد سے اب تک کسی نے اس ...طرف جھانک کر دیکھا تک نہیں تھا۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے ...ڈھ کر تھالی میں رکھا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ اس میں پانی کے ایک ...دو گھونٹ بچے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ہی سانس میں وہ پانی ...حلق میں انڈیل لیا اور دوبارہ اپنی جگہ پر ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔

آدمی کسی کام میں مصروف ہو تو بوریت یا تھکن کا احساس نہیں ہوتا لیکن بیکاری بذاتِ خود بہت بڑی مشقت ...بن جاتی ہے۔ میں بھی کچھ ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ تھکن میرے اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔ میں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا۔

اور پھر اچانک ہی میری آنکھیں کھل گئیں۔ وہ چیخوں کی آواز تھی جو اس عمارت میں کسی طرف سے سنائی دے رہی تھیں۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ پہلے تو ...میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا تھا لیکن دوسری مرتبہ چیخوں کی آواز ...سنائی دی تو میں اچھل پڑا۔ وہ آواز کبھی قریب سے آتی ہوئی ...محسوس ہوتی اور کبھی دور سے۔ مجھے اندازہ لگانے میں ...دشواری پیش نہیں آئی کہ اس عمارت کے کسی حصے میں کسی ...شخص کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا اور ان چیخوں کے ...بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔

باہر شام کا دھندلکا سا پھیلنے لگا تھا جبکہ کمرے میں اندھیرا ...ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی مچھروں نے بھی یلغار

آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟
آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟

ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کے لیے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی طرح مشقیں نہیں کرنا پڑتیں!

آپ کی شخصیت میں انوکھا نکھار پیدا کر دیگی
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کریں گے

اس کتاب کا مطالعہ کیجیے
اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجیے!

قیمت 40 روپے * ڈاک خرچ 23 روپے

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

خط و کتابت کا پتہ

کردی تھی۔ میرے بدن کا بالائی حصہ برہنہ تھا اس لیے مچھر نہایت آزادی سے میرا خون چوس رہے تھے۔

چیخنے کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ پتا نہیں وہ کون تھا جسے تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا اور یہ لوگ کون تھے جنہوں نے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا اور پانچ پولیس والوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ناشتا دینے کے بعد وہ لوگ شاید مجھے بھول چکے تھے۔ اب شام ہورہی تھی اور کسی نے اس طرف جھانک کر دیکھا تک نہیں تھا۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہورہا تھا کہ یہ لوگ کون تھے اور مجھے پولیس کی حراست سے کیوں چھڑایا گیا تھا۔

مجھے مزید انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد باہر قدموں کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر دروازے پر لگا ہوا کھٹکا ہٹا دیا گیا۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ دروازہ کھلا اور اسی نیپالی کی صورت دکھائی دی جس نے صبح مجھ پر ٹھوکریں برسائی تھیں۔ اس کے پیچھے دو اور آدمی رائفلیں سنبھالے کھڑے تھے۔ وہ چہروں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔

"اے اٹھو۔" اس نیپالی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا "چلو۔ تمہارا ایک دوست تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"میرا دوست؟" مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور میں غیر ارادی طور پر اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس نیپالی نے مجھے رائفل کی زد پر لے رکھا تھا۔ باہر کھڑے ہوئے دونوں غنڈوں کی رائفلیں بھی میری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

باہر ملگجا سا اندھیارا تھا لیکن دور تک کی چیزیں ابھی صاف نظر آرہی تھیں۔ اس کمرے کے سامنے جھاڑیوں سے اٹا ہوا وسیع و عریض میدان تھا۔ کئی ایکڑ رقبہ اونچی فصیل میں گھرا ہوا تھا اور میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ یہ کوئی قدیم حویلی تھی۔ حویلی کی عمارت دائیں طرف کافی فاصلے پر تھی۔ بیشتر حصے اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے لیکن اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ بہت شان دار عمارت رہی ہوگی۔

یہ حصہ حویلی کی اصل عمارت سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ پانچ چھ کمرے تھے جن کے سامنے کشادہ برآمدہ بھی تھا جس کا فرش ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔

عمارت کا یہ حصہ غالباً قید خانے کے طور پر ہی استعمال ہوتا تھا۔ میں جس کمرے میں قید تھا وہ اس بلاک کے آخر میں تھا۔ اس کے ساتھ کے دو کمروں کے دروازے غائب تھے۔ آخری کمرے کے سامنے ایک گن مین کھڑا تھا۔ مجھے دھکیلتے ہوئے اسی طرف لے جایا جارہا تھا۔

اس کمرے کے سامنے پہنچ کر نیپالی گن مین نے میری پشت پر زوردار لات رسید کردی اور میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے اندر گرا۔ میرے منہ سے ہلکی سی چیخ بھی نکل گئی تھی۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی دروازہ دھڑ سے بند ہوگیا۔

میں منہ کے بل گرا تھا اور میری پیشانی پتھریلے فرش سے ٹکرائی تھی جس سے کھال پھٹ گئی تھی اور خون رسنے لگا تھا۔ میں ہاتھ کی پشت سے پیشانی پونچھتے ہوئے جیسے ہی سیدھا ہوا، مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

کمرے میں ایک مشعل روشن تھی اور بائیں طرف دیوار کے قریب ایک آدمی اوندھا پڑا ہوا تھا۔ دیوار اور گرد آلود فرش پر خون کے چھینٹے نظر آرہے تھے۔ اس آدمی کے بدن پر جینز تھی جبکہ بالائی حصہ برہنہ تھا اور اس پر بھی خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔

اس آدمی کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں اپنی چوٹ بھول کر چوپائے کی طرح چلتا ہوا تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نیپالی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ مجھے میرے کسی دوست سے ملانا چاہتے ہیں۔ پشت پر بکھرے ہوئے اس شخص کے گولڈن بال دیکھ کر میں الجھن میں مبتلا ہوگیا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔

قریب پہنچ کر میں نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس آدمی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں نے آہستگی سے اسے اپنی طرف پلٹ دیا اور اس کے ساتھ ہی میں لرز اٹھا۔

وہ سمبا تھا۔

اس کے پیروں اور ہاتھوں کے انگوٹھوں کے ناخن اکھڑے ہوئے تھے۔ انگوٹھے سوج رہے تھے اور ان پر خون جما ہوا تھا۔ سینے پر بھی کئی زخم تھے جیسے گوشت کو کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا ہو۔ سمبا کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات جیسے منجمد ہوکر رہ گئے تھے۔

"سمبا۔ سمبا۔" میں اسے کندھوں سے پکڑ کر ہلانے لگا۔ "آنکھیں کھولو سمبا۔ میں ہمت سنگھ ہوں۔ سمبا۔ آنکھیں کھولو۔"

سمبا بڑی مشکل سے آنکھیں کھول پایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ویرانی تھی۔ مجھے پہچاننے میں بھی نا بھی خاصی دشواری پیش آئی تھی۔

"تت... تم ٹھیک... ہمت... سنگھ۔" اس کے

سے یہ الفاظ بھی بمشکل نکل سکے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا "تم ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے۔ یہ لوگ تم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"تت... تم۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ہمت سنگھ۔" وہ بولا "یہ۔ یہ لوگ تمہیں زندہ... نہیں چھوڑیں گے۔"

"میری فکر مت کرو۔" میں نے کہا "تم ان کے ہاتھ کیسے لگے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ تم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"وہ۔ وہ... وہی جو۔ تم سے چاہتے۔ ہیں۔" سمبا نے رک رک کر جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔

سمبا گہرے سانس لیتے ہوئے چند لمحوں تک خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ رک رک کر بتانے لگا کہ وہ ان لوگوں کے ہتھے کیسے چڑھا اور یہ کون لوگ تھے۔ اسے بولنے میں تکلیف ہورہی تھی اسی لیے وہ بہت رک رک کر بات کررہا تھا۔

سمبا نے جو کچھ بھی بتایا اسے سن کر میں کانپ اٹھا۔ اس کے کہنے کے مطابق دو دن پہلے جب وہ پوکھارا میں مجھ سے رخصت ہوئے تھے تو دوپہر کے وقت دریا کے کنارے پر انہوں نے پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد وہ لوگ روانگی کی تیاری کررہے تھے کہ ایک جیپ پر سوار چار پانچ آدمی وہاں پہنچ گئے۔ وہ نیپالی تھے اور ان کے ساتھ تارانگ قبیلے کے بھورین نامی ایک آدمی کو دیکھ کر چونک گئے تھے۔ بھورین گومپا کے چیلوں میں سے ایک تھا جو گومپا اور بومبا کے انجام کے بعد قبیلے سے غائب ہوگیا تھا۔

سمبا کے کہنے کے مطابق یہ خطرناک لوگ میری اور ببلا کی تلاش میں دھول گری کی بکھری ہوئی بستیوں میں گھوم رہے تھے کہ ان کی ملاقات بھورین سے ہوگئی۔ بھورین انہیں تارانگ قبیلے تک لے گیا جہاں کھیا نے انہیں بتایا کہ ببلا تو ہلاک ہوچکی ہے۔ تاہم میں قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ وہاں سے جاچکا ہوں۔ وہ لوگ میری تلاش میں دھول گری کی بستیوں میں ہمارے بارے میں پوچھتے ہوئے دریائے موڈی کھولا کے کنارے پر آباد ہنکو نامی بستی میں پہنچ گئے۔ وہاں سے انہیں پتا چلا کہ چند روز پہلے بستی والوں نے ہمیں ایک قافلے کی صورت میں پوکھارا کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اتفاق سے جس رات یہ لوگ پوکھارا پہنچے اس سے اگلے روز صبح سویرے سمبا اور اس کے ساتھی پوکھارا سے رخصت ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کو بھی صبح ہی پتا چل سکا تھا۔ یہ لوگ فوراً ہی ان کے تعاقب میں روانہ ہوگئے اور دوپہر کے ذرا بعد انہیں دریائے موڈی کھولا کے قریب جالیا۔

ان لوگوں کو میری تلاش تھی۔ مجھے ان کے ساتھ نہ پاکر وہ لوگ سمبا اور اس کے ساتھیوں سے میرے بارے میں پوچھتے رہے۔

سمبا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے تھے کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اور پھر بھورین ان کے ساتھ تھا جو ان کے شک کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔ سمبا اور اس کے ساتھیوں نے انہیں میرے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کردیا۔ ان لوگوں نے انہیں لالچ بھی دیا۔ یہ یقین دلانے کی کوشش بھی کی کہ وہ میرے دوست ہیں لیکن سمبا کو کسی گڑبڑ کا اندازہ ہوگیا تھا کیونکہ بستی میں بھی یوگندر ناتھ اور تری دیو نامی دو آدمی میری تلاش میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے بھی اپنے آپ کو میرا ہمدرد ظاہر کیا تھا۔ یوگندر ناتھ تو بستی سے واپس جاتے ہوئے پراسرار طور پر ہلاک ہوگیا تھا اور تری دیو کو بعد میں گومپا نے ہلاک کردیا تھا۔ ان دو واقعات کے پیش نظر سمبا کو یقین ہوگیا تھا کہ یہ لوگ بھی میرے دوست یا ہمدرد نہیں ہوسکتے۔

سمبا کو پانچ سو کلو ہیروئن کے بارے میں معلوم ہوچکا تھا اس لیے وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ بھی مجھ سے ہیروئن کے بارے میں ہی پوچھنا چاہتے ہوں گے اس لیے سمبا اور اس کے ساتھیوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔

وہ پہلے تو سمبا وغیرہ سے نرمی اور پیار محبت سے میرے بارے میں پوچھتے رہے لیکن جب اس طرح مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو تشدد کا راستہ اپنایا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے تھیوب کو پکڑلیا۔ دو آدمیوں نے اس کے ساتھ زیادتی کرنے کی کوشش کی تو سمبا کے قافلے میں شامل بدھ بھکشو اسے بچانے کے لیے لپکا تو اسے گولیوں سے بھون دیا گیا۔

تارانگ قبیلے کے مرد ایک دوسرے کی عورتوں کو جیتنے کے لیے آپس میں مقابلے تو کرتے ہیں اور عورتیں بھی جیتنے والے مردوں کے ساتھ جانے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ ہارنے والے مرد اپنی عورت کو فاتح کے حوالے کرنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے لیکن قبیلے کی کسی عورت کو اس طرح رسوا کیا جائے یہ ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے۔

سمبا اور تھاپا بھی تھیوب کو بچانے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ تھاپا بھی گولیوں سے چھلنی ہوگیا اور سمبا ان کے قابو میں

آگیا۔ اسے مار مار کر ادھ موا کردیا گیا۔ اس کی موجودگی میں تھیوب کے ساتھ زیادتی کی گئی اور اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور بالآخر اس نے اپنی جان دے دی لیکن میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

بھکشو سارا نوک' تھیوب اور تھاپا کی لاشیں دریا میں پھینک دی گئیں اور سمبا کو وہ لوگ پوکھارا لے آئے۔ پچھلی رات وہ لوگ پوکھارا ہی میں تھے اور آج دوپہر یہاں پہنچے تھے۔ سمبا کو بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔

یہاں آتے ہی سمبا کو پتا چل گیا کہ گزشتہ رات میں بھی ان کے قابو میں آچکا تھا اور یہاں آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کا ایک آدمی سمبا کے قابو میں آگیا اور سمبا نے اس کی گردن کی ہڈی توڑ دی۔ وہ لوگ سمبا پر ٹوٹ پڑے اور اسے مار مار کر ادھ موا کردیا اور پھر انہوں نے سمبا سے ہیروئن کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کردی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ جب میں ان کی بستی میں پہنچا تھا تو پانچ سو کلو ہیروئن میرے پاس موجود تھی جسے میں نے کہیں چھپا دیا تھا اور سمبا کو وہ جگہ معلوم تھی جہاں ہیروئن چھپائی گئی تھی۔

سمبا نے بتایا کہ وہ ہیروئن دریا میں بہہ گئی تھی۔ اس مرتبہ وہ اگرچہ سچ بول رہا تھا لیکن انہوں نے سمبا کی بات کا یقین نہیں کیا اور اسے تشدد کا نشانہ بنانا شروع کردیا۔ پہلے چاقو سے اس کے سینے اور جسم کے دوسرے حصوں پر چرکے لگائے گئے اور پھر زنبور سے اس کے ہاتھوں اور پیروں کے انگوٹھوں کے ناخن اکھاڑے گئے۔

سمبا اگرچہ یہی کہتا رہا کہ ہیروئن دریا میں بہہ گئی تھی اور وہ سچ کہہ رہا تھا لیکن کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور اسے تشدد کا نشانہ بناتے رہے اور پھر مجھے اس کمرے سے نکال کر یہاں لے آیا گیا تھا تاکہ سمبا کا حشر دیکھ کر میں اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرسکوں۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ پہلے یوگندر ناتھ اور تری دیو تارانگ قبیلے کی بستی میں پہنچے تھے۔ وہ دونوں کھٹمنڈو کے غنڈے اور منشیات فروش تھے۔ انہیں کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ میں چانگ لی کے آدمیوں کو قتل کرکے پانچ سو کلو ہیروئن لے اڑا تھا اور وہ لوگ مجھے تلاش کرکے اس ہیروئن پر قبضہ کرنا چاہتے تھے لیکن وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اپنے انجام کو پہنچ گئے تھے اور اب یہ لوگ۔۔۔! میرا خیال تھا کہ یہ بھی کوئی تیسری پارٹی تھی جسے اس ہیروئن کے بارے میں پتا چل گیا تھا اور یہ لوگ بھی ہیروئن حاصل کرنے کے چکر میں تھے۔

پانچ سو کلو ہیروئن۔۔۔ جس کی مالیت کروڑوں ڈالر تھی اور اتنی بڑی رقم کے لیے تو درجنوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا۔ ہیروئن کے اسمگلروں کو تو میں ویسے بھی موت کا سوداگر سمجھتا تھا۔ یہ لوگ موت ہی تو بیچتے تھے۔ انسانی زندگی کی ان کے قریب کوئی قیمت نہیں تھی۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تو ان کرنسی نوٹوں کو حاصل تھی جو ہیروئن کے بدلے ملتے تھے۔ دولت ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا اور دولت ہی ان کا دھرم۔۔۔ یہ دنیا کے سفاک ترین لوگ تھے۔ ان کی سفاکی کے مظاہرے میں تھائی لینڈ میں بھی دیکھ چکا تھا' سنگاپور اور ہندوستان میں بھی کئی ایسی مثالیں دیکھنے میں آئی تھیں اور اب سمبا میرے سامنے تھا۔ اس کے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور اسے جس طرح ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا گیا تھا وہ ان کی بے رحمی اور سفاکی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ سمبا کو اس حالت میں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ دل تو چاہتا تھا کہ ان لوگوں کے ٹکڑے کردوں جنہوں نے سمبا کو اس حالت میں پہنچایا تھا لیکن میں خود بھی ان کا قیدی تھا۔

مجھے سمبا کی حالت پر افسوس ہورہا تھا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ میری ہمدردی میں سچائی کے راستے پر چلنے والے نہ جانے کتنے بے گناہ لوگ ان درندوں کا شکار ہوچکے تھے۔

سمبا کی آنکھیں بند ہورہی تھیں۔ میں نے اسے کندھوں سے ہلایا۔ اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔

"تت۔۔۔ تم بھاگ جاؤ ہمت سنگھ۔" اس نے رک رک کر کہا "یہ لوگ بہت ظالم ہیں۔ انہوں نے سب کو مار ڈالا۔ تمہیں بھی مار ڈالیں گے۔ بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں سمبا۔" میں نے کہا "میں تمہیں اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ میں تم پر ہونے والے ایک ایک ظلم کا حساب لوں گا ان سے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم زندہ رہو گے اور اپنی آنکھوں سے ان کا حشر دیکھو گے۔"

"تت۔۔۔ تم بھاگ جاؤ۔ ہمت۔۔۔"

سمبا کے لب خاموش ہوگئے اور آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔ اس کے سینے کا ہلکا سا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ زندہ تھا۔ تکلیف کی شدت سے وہ بے ہوش ہوگیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے فوری طور پر طبی امداد ملنی ضروری تھی لیکن میں خود قید میں تھا اور اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اسے آہستگی سے گرد آلود فرش پر لٹا دیا۔

ٹھیک اسی وقت باہر قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ میں نے لپک کر دیوار میں پھنسی ہوئی مشعل اٹھالی۔ اس مشعل میں کسی جانور کی چربی جل رہی تھی جس سے ناگوار سی بو اٹھ رہی تھی۔

میں مشعل کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔ قدموں کی آواز دروازے کے قریب آکر رک گئی اور پھر باہر سے بھاری کھٹکا ہٹایا جانے لگا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ میں ایک پٹ کی آڑ میں تھا۔ پہلے ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں رائفل سنبھال رکھی تھی۔ وہ جیسے ہی آگے بڑھا' میں نے مشعل سے اس کے سر پر حملہ کردیا۔

ضرب تو اس کے سر پر نہیں لگ سکی تھی لیکن مشعل کے پیالے میں جلنے والی چربی کے کچھ چھینٹے انگاروں کی طرح اڑ کر اس شخص کے چہرے پر گرے۔ وہ چیختا ہوا لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر پہنچ گئے تھے۔

اس کا دوسرا ساتھی کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر وہ اچھل پڑا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا' میں نے اس پر بھی جلتی ہوئی مشعل سے حملہ کردیا۔

وار اس کے کندھے پر پڑا۔ میں اسے زیادہ نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ وہ اپنے ساتھی سے زیادہ پھرتیلا نکلا تھا۔ اس نے بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔

گولیوں کی بوچھار سامنے والی دیوار پر پڑی۔ میں نے مشعل پھینک دی اور تیزی سے رائفل کو نال سے پکڑ کر اوپر کی طرف اٹھا دیا۔ رائفل کی نال سے نکلنے والی گولیاں چھت سے ٹکرانے لگیں۔

میں نے رائفل پر اس وقت تک گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک اس کا میگزین خالی نہیں ہوگیا۔ رائفل سے گرفت ہٹالینا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے گرفت اسی طرح مضبوط رکھی اور نیچے بیٹھتا چلا گیا اور پھر میں نے پوری قوت سے اپنے آپ کو پیچھے کی طرف گرا دیا۔

میرا حریف میرے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا پشت کے بل کمرے کے وسط میں گرا۔ میں بھی بڑی پھرتی سے لوٹ لگا کر اٹھ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے آدمی کی کھوپڑی پر زوردار ٹھوکر رسید کردی جو اپنی رائفل اٹھانے کے لیے جھک رہا تھا۔

وہ شخص ٹھوکر کھا کر بلبلاتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ میری دوسری ٹھوکر پہلے حریف کو لگی تھی جو رائفل اٹھانے کے لیے لپکا تھا۔ وہ دوبارہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔

میں رائفل کی طرف لپکا لیکن دوسرے حریف نے میری ٹانگ میں ٹانگ پھنسا دی۔ میں منہ کے بل گرا لیکن میں نے جلدی سے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا دیے تھے اور پھر اٹھنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

میرے دونوں حریف بھی کھڑے ہوچکے تھے۔ وہ حملہ آور ہونے والے انداز میں آگے بڑھے اور یہی ان کی غلطی تھی کہ وہ بیک وقت آگے آرہے تھے۔ میں کھڑے کھڑے اپنی جگہ سے اچھلا۔ میں نے ڈبل فلائنگ کک لگائی تھی اور دونوں کو نشانہ بنایا تھا اور مجھے ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ میرا ایک پیر ایک حریف کے سینے پر اور دوسرا پیر دوسرے کے چہرے پر لگا تھا۔ وہ دونوں لڑکھڑا کر پیچھے گرے تھے لیکن جس کے چہرے پر کک لگی تھی وہ تو ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا اٹھا تھا۔

میں بھی نیچے گرا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو فوراً ہی سنبھال لیا تھا۔ جس شخص کے سینے پر کک لگی تھی وہ بھی سنبھل چکا تھا۔ وہ ارنا بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا میری طرف لپکا۔

مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مجھے سر سے ٹکر مارنا چاہتا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ کر اس کی گردن اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لی اور اسے زور سے جھٹکے دینے لگا۔

وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ میرے اس نہایت خطرناک داؤ میں آگیا تھا جس سے آج تک کوئی نہیں بچ سکا تھا۔

میں خود بھی نیچے بیٹھ گیا اور اپنے پیروں کی ایڑیاں ٹوٹے ہوئے فرش میں پھنسا لیں۔ وہ شخص اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے بری طرح مچل رہا تھا لیکن میری گرفت ایسی نہیں تھی کہ اس سے نجات حاصل کی جاسکتی۔

میرا دوسرا حریف جس کے چہرے پر فلائنگ کک لگی تھی' اٹھ کر میری طرف لپکا اور اس نے میرے جسم پر ٹھوکروں کی بارش کردی لیکن ان ٹھوکروں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوسکا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر دوسرا آدمی

دروازے کی طرف لپکا۔ وہ غالباً تین چار آدمی تھے جو فائرنگ کی آواز سن کر حویلی کے دوسرے حصے سے دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

میرے دوسرے حریف نے چیخ چیخ کر ان سے کچھ کہا اور وہ سب کمرے میں گھس آئے۔ ان سب کے پاس اگرچہ رائفلیں تھیں مگر ان میں سے کسی نے بھی رائفل استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ میرے جسم پر لاتیں اور گھونسے برسانے لگے۔ دو آدمی میرے بازو کی گرفت چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیکن مجھ پر بھی جنون طاری تھا۔ جیسے جیسے تشدد بڑھ رہا تھا' میرے جنون میں بھی شدت آرہی تھی۔ میرے جسم کی ساری طاقت جیسے بازوؤں میں سمٹ کر آرہی تھی۔ اس کی گردن پر میری گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کو زور زور سے جھٹکے بھی دینے شروع کردیے تھے۔

ایک بات میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ مجھے جان سے نہیں ماریں گے۔ یہ لوگ جو کوئی بھی تھے انہوں نے بڑی مشکل سے مجھے تلاش کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے یہ لوگ اب تک آٹھ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ پانچ وہ پولیس والے جن کی حراست سے مجھے چھڑایا گیا تھا اور تین سمبا کے ساتھی۔ سمبا بھی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ان لوگوں کے جرائم کی فہرست اس سے بھی کہیں زیادہ طویل ہو سکتی تھی۔ یہ لوگ دولت کے پجاری تھے۔ پانچ سو کلو ہیروئن کے پیچھے بہت بڑی دولت تھی۔ یہ لوگ مجھے اس وقت تک زندہ رکھنے کی کوشش کرتے جب تک انہیں امید کی کوئی معمولی سی کرن بھی دکھائی دیتی رہتی۔

میرے شکار کی مزاحمت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اس کی گردن کو ایک دو مزید جھٹکے دیے اور پھر اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھب سے نیچے گرا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ قیامت سے پہلے نہیں اٹھ سکے گا۔ اسے دوسرے ہی اٹھائیں گے۔

دو جلاد اب بھی میرے جسم پر لاتیں اور گھونسے برسا رہے تھے۔ دو آدمی اس شخص کو گھسیٹتے ہوئے دور لے گئے تھے جس کی میں نے گردن مروڑ دی تھی۔ میں نے اپنے اوپر حملہ کرنے والے ایک آدمی کو بازو سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ چیختا ہوا اپنے ساتھی سے ٹکرایا اور دوسری طرف گر گیا۔ اسی لمحے دروازے کی طرف سے ایک دھاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے پرمل۔ چھوڑ دو اسے۔ اگر یہ ختم ہو گیا تو باس تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"اس نے ہری کیش کو مار دیا ہے۔ گردن توڑ دی ہے اس کی۔" پرمل نامی اس شخص نے بھی چیختے ہوئے جواب دیا۔

"چھوڑ دو اسے۔ میں کہتا ہوں' چھوڑ دو۔" دروازے میں کھڑا ہوا شخص ایک بار پھر دہاڑا۔

اس مرتبہ اس کی دہاڑ کارآمد ثابت ہوئی اور مجھ پر لاتیں اور گھونسے برسنا بند ہو گئے۔ وہ چاروں الگ ہٹ گئے اور مجھ پر رائفلیں تان لیں۔ ان میں سے دو تو بری طرح ہانپ رہے تھے۔

میں فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ ظالموں نے بری طرح دھنائی کر ڈالی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اٹھ کر سیدھا ہو سکا تھا۔

دروازے میں وہی چوڑی دار پاجامے اور ہاف کوٹ والا نیپالی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی آٹومیٹک رائفل تھی۔ اس نے طائرانہ نگاہوں سے کمرے کی صورت حال کا جائزہ لیا اور دو آدمیوں کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم دونوں ہری کیش کی باڈی اٹھا کر باہر لے جاؤ۔ اگر یہ واقعی مر چکا ہے تو اس کی لاش حویلی کے پھاٹک سے باہر لے جا کر جھاڑیوں میں ڈال دو اور اگر زندہ ہے تو۔۔۔"

"یہ مر چکا ہے۔" ان دونوں میں سے ایک نے جواب دیا "اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اس کی آنکھیں اور زبان بھی باہر نکلی ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ لے جاؤ اسے اور وہ۔۔۔؟" نیپالی نے بے حس و حرکت پڑے ہوئے سمبا کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ ابھی زندہ ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"اوکے!" نیپالی بولا "ہری کیش کی باڈی اٹھا کر حویلی سے باہر لے جاؤ اور تم۔" اس نے مجھے اشارہ کیا "ہمارے ساتھ چلو۔ باس تم سے ملنا چاہتا ہے۔ تم دونوں کی وجہ سے آج ہمارے دو آدمی کم ہو گئے ہیں لیکن ہمارے پاس آدمیوں کی کمی نہیں ہے۔ ویسے باس تم سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ وہ تم جیسے بہادروں کی قدر کرتا ہے۔ اگر تم نے تعاون کیا اور اس کی باتیں مان لیں تو ممکن ہے تمہیں اس سینڈیکیٹ میں کوئی بڑا عہدہ مل جائے اور اگر تم نے بات نہ مانی اور باس کے سامنے بھی یہی رویہ اختیار کیا تو یقین کرو' باس تمہارا وہ حشر کرے گا کہ دنیا کانپ اٹھے گی۔"

"کیا کرے گا تمہارا باس۔ مجھے مار ڈالے گا نا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"موت نہیں۔" وہ بولا "باس کے خیال میں کسی انسان کے لیے موت کوئی سزا نہیں ہے۔ موت سے تو مکتی (نجات) ہو جاتی ہے۔ کسی کو سزا دینے کے لیے باس کے پاس بہت سے طریقے ہیں۔ مثلاً اس نے کچھ خوں خوار بھیڑیے بھی پال رکھے ہیں جنہیں عام طور پر بھوکا رکھا جاتا ہے۔ اگر کسی زندہ انسان کو بکری کی طرح کھونٹے سے باندھ کر وہ بھوکے اور خوں خوار بھیڑیے اس پر چھوڑ دیے جائیں تو تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس شخص کا انجام کیا ہو گا۔ مرنا تو اسے بہرحال ہو گا لیکن موت سے پہلے اس پر جو بیتے گی کیا تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو؟"

میں کانپ کر رہ گیا۔ سمبا کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ یہ دنیا کے سفاک ترین انسان تھے۔ ایک شخص کو اذیت پہنچانے کے لیے اس کے جسم پر تیز دھار آلے سے چرکے لگائے گئے۔ اس کے ناخن ادھیڑے گئے اور اب یہ مجھے بھوکے' خوں خوار بھیڑیوں کے سامنے ڈالنے کی دھمکی دے رہا تھا۔

پرمل اور دوسرا آدمی اپنے ساتھی کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ انسان کی ان کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ وہ ان کا ساتھی تھا۔ ان کے لیے لڑتا رہا تھا اور انہی کے لیے میرے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور اس کی لاش اس طرح باہر پھنکوائی جارہی تھی جیسے وہ انسان نہیں کتا ہو۔

"چلو۔" اس نیپالی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اب اگر تم نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔"

میں نے فرش پر بے ہوش پڑے ہوئے سمبا کی طرف دیکھا۔ ایک آدمی نے زمین پر پڑی ہوئی مشعل اٹھا کر دوبارہ دیوار میں لگے ہوئے ہک میں پھنسا دی تھی۔ مشعل کی لرزتی ہوئی روشنی میں سمبا کا خون آلود چہرہ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔

ہم کمرے سے باہر آگئے۔ ایک آدمی نے دروازہ بند کرکے اس میں کنڈا لگا دیا تھا۔ دروازہ پرانی طرز کا بہت مضبوط تھا۔ باہر کی طرف اس کے دونوں پٹوں میں دو لکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور تقریباً چار انچ موٹی ایک اور لکڑی ان میں اس طرح پھنسا دی گئی تھی کہ اسے ہٹائے بغیر اندر سے دروازہ نہیں کھولا جاسکتا تھا۔

حویلی کی اصل عمارت وہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ وہ لوگ مجھے رائفلوں کی زد میں لیے اس طرف چلتے رہے۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ دو تین جگہوں پر مجھے پتھروں سے ٹھوکر لگی تھی اور ایک مرتبہ تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔

حویلی کی عمارت کے بیشتر حصے اگرچہ ٹوٹ پھوٹ چکے تھے لیکن اس کے ڈھانچے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ بہت شاندار عمارت رہی ہو گی۔ سامنے کے رخ پر ایک کشادہ برآمدہ تھا جس کے سامنے ایک کھلی چھت والی جیپ اور دو دیگر شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔

عمارت کے اندر جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ ہم کئی راہداریوں میں سے ہوتے ہوئے بالآخر ایک کشادہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس کمرے کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

یہ کمرا کم سے کم تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا۔ چاروں دیواروں پر دو دو مشعلیں روشن تھیں اور کچھ ایسی چیزیں نظر آرہی تھیں جو اذیت رسانی میں استعمال ہوتی تھیں۔ چھت پر کنڈے لگے ہوئے تھے جن کے ساتھ لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں لٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ جب یہ حویلی آباد تھی تو یہ کمرا عقوبت خانے کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا اور اب بھی اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔

ایک طرف چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی۔ میز پر بھی اذیت رسانی کے کچھ آلات پڑے ہوئے تھے۔

مجھے ایک اسٹول پر بٹھا دیا گیا۔ دو آدمی مجھ پر رائفلیں تانے کھڑے رہے جبکہ نیپالی ایک اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی تھے اور ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ ناگ پال تھا۔

دوسرا چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ وہ دونوں میرے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے ناگ پال کو اب تک صرف اخبار میں شائع ہونے والی تصویروں میں دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ دور سے دیکھنے کا موقع ملا تھا پھر انڈیا میں' میں نے بال ٹھاکرے کو بھی کئی مرتبہ ٹی وی پر دیکھا تھا۔ ناگ پال اور بال ٹھاکرے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ نہ کرداروں میں نہ جسامت میں اور نہ لباس میں۔ ایک لمحے کو تو میرے ذہن میں یہ شبہ بھی ابھرا تھا کہ یہ کہیں بال ٹھاکرے تو نہیں۔

ناگ پال کو اپنے سامنے دیکھ کر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ یہ کوئی تھرڈ پارٹی نہیں تھی جس نے مجھے پولیس کی حراست سے چھڑایا تھا۔

"تمہارے بارے میں سنا تو بہت کچھ تھا لیکن مجھے یقین

نہیں آتا تھا۔" ناگ پال میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھوں میں سانپ جیسی چمک تھی "لیکن تم نے جو کچھ بھی کیا وہ میرے لیے واقعی حیرت انگیز ہے۔ لوگ تو ناگ پال کے راستے میں آتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ اس کا نام سن کر تھر تھر کانپنے لگتے ہیں اور تم۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اور تم نے نہ صرف ناگ پال کے دو آدمیوں کو قتل کردیا بلکہ پانچ سو کلو ہیروئن بھی لے گئے۔ اسے کہتے ہیں شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا۔ کوئی ذی ہوش انسان ایسا سوچ بھی نہیں سکتا لیکن تم نے یہ سب کچھ کر دکھایا۔ بہت بہادری کا ثبوت دیا ہے تم نے۔ تم بہت بڑے سورما ہو اور ناگ پال کو ہمیشہ ایسے سورماؤں کی تلاش رہی ہے جو موت سے پنجہ آزمائی کرنا جانتے ہوں اور ابھی مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے میرے ایک آدمی کی گردن بھی موڑ دی ہے۔ اس قید خانے میں آکر تو بڑے بڑے سورماؤں کا پیشاب خطا ہوجاتا ہے لیکن تم نے نہ صرف اپنے حواس برقرار رکھے بلکہ تم میں اب بھی اتنا ہی دم خم ہے۔"

"مطلب کی بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"چانگ لی نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا لیکن میں اس کی باتوں کا یقین کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔" ناگ پال نے کہا "بنکاک میں ٹائیگر اور پیڈرو کے گینگ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا' تھائی لینڈ سے جنرل کھوراٹ کے قدم اکھاڑ دینا اور گولڈن ٹرائی اینگل میں گھس کر تباہی پھیلانا اور زندہ بچ نکلنا۔ یہ کسی انسان کا کام نہیں ہوسکتا لیکن اب یہاں جو کچھ ہوا ہے اسے دیکھتے ہوئے مجھے چانگ لی کی باتوں پر یقین کرنا ہی پڑے گا۔ ناگ پال کے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر پانچ سو کلو ہیروئن چھین لے جانا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔ کوئی بہت بڑا گینگ بھی یہ کام نہیں کرسکتا لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ کارنامہ تم نے اکیلے ہی انجام دیا ہے۔ میں تمہاری قدر کرتا ہوں۔ میرے آدمیوں نے تمہارے ساتھ جو سلوک کیا اس پر مجھے افسوس ہے۔ میں ایک پیشکش تمہارے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اسے قبول کرلو تو تمہیں سینڈیکیٹ میں ایک بڑا عہدہ مل سکتا ہے۔"

میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس عقوبت خانے میں لاکر سینڈیکیٹ میں کسی بڑے عہدے کی پیشکش کا مطلب میں سمجھتا تھا۔ انکار کی صورت میں اذیت رسانی کے یہ تمام آلات شاید مجھ پر آزمائے جاتے۔

"میں نے تمہاری تمام باتیں سن لی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں جواب دیا "چانگ لی نے میرے بارے میں تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ غلط نہیں ہے لیکن یہاں تم لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ یہاں میرا کسی ایسے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا تم نے ذکر کیا ہے۔"

"کیا یہ غلط ہے کہ تم دیش مکھ کا پیچھا کرتے ہوئے انڈیا سے یہاں آئے تھے؟" اس نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی تردید نہیں کروں گا۔" میں نے جواب دیا "وہ میری ایک دوست کو اغوا کرکے لایا تھا۔ یہاں میں نے اپنی دوست کو اس کے شکنجے سے چھڑا لیا اور وہ بعد میں تمہارے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ میرا اور دیش مکھ کا معاملہ ختم ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ انڈیا کے ایک مفرور پولیس انسپکٹر پانڈے سے تمہارے گہرے رابطے تھے اور تم چند روز اس کی حویلی میں رہے بھی ہو؟" ناگ پال نے کہا۔

"پانڈے سے میری ملاقات اتفاقیہ طور پر ہوگئی تھی۔" میں نے کہا "وہ ایک شریف اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ اس سے ایک غلطی ہوگئی تھی اور وہ ہندوستان سے بھاگ کر یہاں آگیا تھا۔ یہاں اس سے میری ملاقات محض اتفاقیہ تھی۔ اس کے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"سومبا سے بھی تمہارے گہرے تعلقات ہیں۔" ناگ پال نے کہا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے "سومبا ایک سڑک چھاپ غنڈا تھا۔ اسے میں جب چاہتا مچھر کی طرح چٹکی میں مسل سکتا تھا لیکن تم نے اسے بہت بڑا داوا سمجھ لیا اور۔"

"سومبا ایک شریف آدمی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اگر تمہارا اس سے کوئی جھگڑا ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے تو اسے غنڈوں سے بچانے کے لیے اس کی مدد کی تھی۔"

"نہیں۔ بات صرف یہیں تک نہیں ہے۔" ناگ پال بولا "تم نے اس کے ساتھ اور بھی بہت سے منصوبے بنائے تھے اور تمہیں یہ اطلاع بھی سومبا ہی نے دی تھی کہ ہمارے آدمی پانچ سو کلو ہیروئن لے کر آرہے ہیں۔"

ناگ پال کی اس بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا لیکن چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

"جب مجھے اپنے آدمیوں کے قتل اور ہیروئن کے چھینے جانے کی اطلاع ملی تو سب سے پہلے میں نے سومبا ہی کو پکڑا تھا۔ مرنے سے پہلے اسے یہ اگلنا ہی پڑا تھا کہ اس نے تمہیں ہیروئن کے بارے میں بتایا تھا۔ تمہاری تلاش شروع ہوئی تو پتا چلا کہ اس واقعے سے ایک روز پہلے تمہیں پوکھارا کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ مزید تحقیق پر دھرچن میں بھی تمہیں دیکھے جانے کی اطلاع ملی۔ اس سے ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا جس نے ہمارے آدمیوں کو قتل کرکے پانچ سو کلو ہیروئن غائب کردی تھی۔"

وہ خاموش ہوکر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا اس کی ہر بات میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ مجھے یہ جان کر بھی بہت دکھ ہوا کہ سومبا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ان خوں خوار بھیڑیوں نے اسے بھی ختم کردیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دھرچن میں تمہاری موجودگی کا ثبوت ملنے کے بعد ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ہمارا خیال تھا کہ تم جاؤا کوٹ سے ہوتے ہوئے دریائے بھیری کے ساتھ ساتھ رائل نیشنل پارک یا اس کے قریب نیپالی گاؤں سے ہوتے ہوئے کسی جگہ سے انڈیا کی سرحد پار کرنے کی کوشش کروگے۔ ہم نے زیادہ توجہ اس طرف دی اور تمام سرحدی راستوں پر پہرے بٹھا دیے لیکن کئی روز گزرنے کے بعد بھی تمہارا سراغ نہیں ملا۔

"پھر ہمیں یہ دلچسپ اطلاع ملی کہ یوگندر ناتھ اور تری دیو کو بھی پونگا رینج کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ وہ دونوں مہا حرامی آدمی تھے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے مال پر ہی جھپٹتے رہے ہیں۔ یہ اطلاع ملنے کے بعد ہم نے پونگا رینج کی طرف توجہ دی اور ان بلند پہاڑوں میں آباد بستیوں میں پوچھتے ہوئے تارانگ قبیلے تک پہنچ گئے اور وہاں سے پتا چلا کہ تم وہاں سے نکل چکے ہو۔

"ہمیں تمہاری دوست بملا اور یوگندر ناتھ اور تری دیو کی موت کی بھی خبر مل گئی اور اس قبیلے سے نکلنے کے دوسرے ہی دن تارانگ قبیلے کا ایک آدمی مل گیا جسے تمہاری تلاش کے سلسلے میں میرے آدمی ساتھ لے گئے اور پھر میرے آدمی دھول گری کے بلند اور دشوار ترین پہاڑی راستوں سے ہوتے ہوئے پوکھارا تک آگئے۔

"پوکھارا پہنچنے کے اگلے روز میرے آدمیوں کو پتا چل گیا کہ تمہارا قافلہ صبح سویرے ہی وہاں سے جنوب کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ میرے آدمیوں نے سہ پہر کے قریب دریائے موڈی کھولا کے کنارے اس قافلے کو جالیا مگر تم اس قافلے میں نہیں تھے۔

"تارانگ قبیلے سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ بڑے سخت جان ثابت ہوئے۔ تین افراد نے اپنی جانیں دے دیں مگر تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میرے آدمی اس قافلے کے چوتھے آدمی کو لے کر پوکھارا آگئے جہاں انہوں نے یہ معلوم کرلیا کہ اس قافلے کو جنوب کی طرف روانہ کرنے کے بعد تم بھی ایک بس پر سوار ہوکر کھٹمنڈو کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ ہم نے فوراً ہی کیرتی پور میں راستے کی ناکا بندی کردی لیکن ہمیں پتا چلا کہ ایک بدھ یوگی تمہیں بس سے اتار کرلے گیا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ یوگی کون تھا اور تم سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ ہم نے تمہاری تلاش جاری رکھی اور پھر یہ پتا چلا کہ تم بازار میں ایک عورت کو قتل کرنے کے الزام میں رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو اور جب پولیس والے تمہیں تھانے لے جارہے تھے تو ہمارے آدمیوں نے تمہیں پولیس کی حراست سے چھڑا لیا اور اب۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ اس کی نظریں بدستور میرے چہرے پر مرکوز تھیں "میں نے ابھی تک تم سے اس ہیروئن کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تاہم تمہیں ایک پرکشش پیشکش کررہا ہوں۔ اگر تم وہ ہیروئن ہمارے حوالے کردو تو ہم اس کا چوتھائی حصہ تمہیں دینے کو تیار ہیں۔ تم چاہو تو اپنے حصے کی ہیروئن رکھ کر باقی ہمارے حوالے کردو اور جہاں چاہو جاسکتے ہو۔ ہم تمہارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کریں گے اور چاہو تو اپنے حصے کی قیمت لے سکتے ہو۔ نقد۔ اسی وقت۔ میرے آدمی تمہیں بحفاظت تمہاری منزل تک پہنچا دیں گے۔"

ساری باتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور میں جانتا تھا کہ سچ بول کر بھی میری جان چھوٹنے والی نہیں تھی کیونکہ اس ہیروئن کا تو اب کوئی وجود ہی نہیں رہا تھا۔

"میں تمہاری کسی بات سے اختلاف نہیں کروں گا۔" میں نے کہا "یہ بالکل درست ہے کہ تمہارے آدمیوں کو موت کے گھاٹ میں نے ہی اتارا تھا اور ہیروئن بھی میں ہی لے گیا تھا لیکن اس ہیروئن کا اب کوئی وجود نہیں رہا۔ میری کار دریا میں گر گئی تھی اور ساری ہیروئن پانی میں بہہ گئی۔"

"اگر اس ہیروئن کا وجود نہیں رہا تو تمہارا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔" ناگ پال نے کہا "پرانے زمانے کے لوگ تشدد کے بہت سے طریقے جانتے تھے۔ آج کے دور میں کسی کی زبان کھلوانے کے لیے اگرچہ نئے نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں لیکن میرے خیال میں پرانے طریقے اب بھی ان سے زیادہ موثر ہیں۔ یہ چیزیں دیکھ رہے ہو؟" اس نے کمرے میں مختلف چیزوں کی طرف اشارہ کیا "یہ کھوکھتا کی حویلی ہے۔ کھوکھتا اس علاقے کا راجا تھا۔ اسے دنیا کا سفاک ترین انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس نے اپنے دشمنوں کو ایذا رسانی کے ایسے ایسے طریقے ایجاد کیے تھے کہ اس کی عقل اور ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس کا یہ عقوبت خانہ ہی دراصل اس کے راج کی کامیابی کی ضمانت بنا ہوا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا' بڑے دبدبے سے راج کرتا رہا۔ اس کے مرنے کے بعد بیٹے نے سنگھاسن سنبھالا۔ وہ ایک نرم دل اور شریف آدمی تھا۔ اس کے باپ کے دشمنوں نے اسے ایک مہینے سے زیادہ راج نہیں کرنے دیا اور اس کی لاش کے ٹکڑے پوری وادی میں پھیلا دیے۔ اس دنیا میں شریف لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہاں صرف طاقت کے زور پر زندہ رہا جاسکتا ہے۔" وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا "میں اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔ میں تمہیں صرف تین منٹ دے رہا ہوں۔ اگر تمہیں میری پیشکش قبول ہو تو ٹھیک ہے۔ دوسری صورت میں۔۔۔"

"میں نے کہا نا' وہ ہیروئن ضائع ہو چکی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اس لیے اس موضوع پر بحث بیکار ہے۔ تم اپنی جو کارروائی کرنا چاہتے ہو کرلو۔"

"ٹیکو۔" ناگ پال نے چوڑی دار پاجامے اور ہاف کوٹ والے شخص کی طرف دیکھا "وقت ضائع کرنا بیکار ہے۔ اس سے معلوم کرو ہیروئن کہاں ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اسے اس وقت تک نہیں مرنا چاہیے جب تک یہ کچھ بتا نہ دے۔"

ناگ پال دوسرے آدمی کے ساتھ اسی اندرونی دروازے میں غائب ہو گیا۔ ٹیکو چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ کہا اور سر پر سے ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی اور کوٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ اس وقت اس کا رخ میز کی طرف تھا۔ کوٹ اتار کر اس نے میز کے قریب ایک کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔ کوٹ کے نیچے اس نے کوئی قمیص وغیرہ نہیں پہن رکھی تھی۔ وہ جب میری طرف گھوما تو اس کے گلے میں نیلگری کی مالا دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ مالا اس کے پاس کیسے پہنچی تھی!

گزرے ہوئے واقعات میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ نقاب پوشوں نے پولیس کی حراست سے چھڑانے کے بعد مجھے اپنی جیپ میں پھینک دیا تھا اور ایک نقاب پوش نے میرے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔

میں کسی نقاب پوش کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اب مجھے یقین کرلینا پڑا کہ ٹیکو بھی ان میں شامل تھا۔ ممکن ہے جیپ کے سفر کے دوران میں ہی اس کی نظر میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا پر پڑ گئی ہو یا جب مجھے حویلی کے قید خانے میں ڈالا گیا تھا تو یہ مالا اس وقت ٹیکو کی نظروں میں آئی ہو اور اس نے مالا میرے گلے سے اتار کر اپنے گلے میں پہن لی اور وہ یقیناً اس مالا کی اہمیت سے واقف نہیں تھا۔

"اب ساری کہانی تمہارے سامنے آچکی ہے ہمت سنگھ۔" ٹیکو میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "تم یہ بھی جان چکے ہو کہ انسانی زندگی کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہم صرف اور صرف دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ اگر تم شرافت سے وہ پانچ سو کلو ہیروئن ہمارے حوالے کردو تو فائدے میں رہو گے۔ بصورتِ دیگر میں تمہارے شریر (بدن) کی ہیروئن بنا دوں گا۔" بات کرتے ہوئے وہ غالباً غیر ارادی طور پر گلے میں پڑی ہوئی مالا کو بھی چھو رہا تھا اور پھر اس نے وہ مالا بھی گلے سے اتار کر میز پر ٹوپی کے قریب رکھ دی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم لوگ میری کسی بات کا یقین نہیں کرو گے۔" میں نے جواب دیا "اس لیے جو بھی کارروائی کرنا چاہتے ہو' شروع کردو۔"

ٹیکو چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر اچانک ہی اس نے میرے چہرے پر گھونسا مارنے کے لیے اپنے ہاتھ کو حرکت دی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ٹیکو کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے۔ وہ کلائی چھڑانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی حرکت میں آیا لیکن وہ ہاتھ بھی میری گرفت میں آگیا۔

میں اس وقت تک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا لیکن اب اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹیکو اپنے بازو چھڑانے کے لیے زور آزمائی کر رہا تھا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیلتے ہوئے دونوں ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور اسی لمحے اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔

میں ان کی طرف سے غافل نہیں تھا لیکن ان کا یہ حملہ

اس قدر اچانک تھا کہ میں اپنے آپ کو بچا نہیں سکا۔ ان دونوں نے مجھے بانہوں سے گرفت میں لے لیا۔ ٹیکو سنبھل کر تیزی سے میری طرف لپکا۔ پہلے اس نے سر سے میرے سینے پر ٹکر ماری اور پھر میرے پیٹ پر گھونسے برسانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے پیٹ پر ہتھوڑے برس رہے ہوں۔ میں تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میرے دماغ کو اچانک ہی ایک جھٹکا سا لگا اور میں اپنے اندر واضح طور پر ایک تبدیلی محسوس کرنے لگا۔ میرا پیٹ پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا اور ٹیکو کے گھونسے اب مجھ پر کوئی اثر نہیں کر رہے تھے۔

ٹیکو ایک طرف ہٹ گیا۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا اور وہ دونوں آدمی مجھے بانہوں سے پکڑ کر پوری قوت سے کھینچتے ہوئے آگے لے چلے۔ وہ میرا سر دیوار سے ٹکرانا چاہتے تھے۔

جیسے ہی وہ دیوار کے قریب پہنچے' میں نے اپنا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا اور دونوں پیر آگے نکال کر دیوار پر ٹکا دیے اور پوری قوت سے دیوار کو دھکیلتے ہوئے الٹی قلابازی کھا گیا۔

میں ان کی گرفت سے نکل گیا۔ وہ دونوں بدحواس سے ہو گئے۔ ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے ان دونوں کے بال پکڑ کر سر ایک دوسرے سے ٹکرا دیے۔ ایک تو چیختا ہوا نیچے گرا۔ دوسرے نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اسے زوردار سائیڈ کک رسید کردی۔ وہ بھی بلبلاتا ہوا اپنے ساتھی کے اوپر گرا۔ کک لگانے کے بعد میرا پیر اس جگہ پڑا جہاں فرش ٹوٹا ہوا تھا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی ٹیکو نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

ٹیکو مجھے بری طرح رگید رہا تھا لیکن مجھے موقع مل گیا اور میں نے اسے پیروں پر اچھال دیا۔ اس وقت اس کے دونوں ساتھی میری طرف لپکے تھے۔ ٹیکو ان کے اوپر گرا اور وہ تینوں ڈھیر ہو گئے۔

میں نے اٹھ کر میز کی طرف چھلانگ لگا دی۔ ٹیکو کے ایک ساتھی نے میری ٹانگ میں ٹانگ اڑا دی۔ میں منہ کے بل گرا لیکن میں اٹھ کر ایک بار پھر میز کی طرف لپکا۔ اس مرتبہ ٹیکو میرے آڑے آرہا تھا۔

ان کا خیال تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ٹیکو کا ایک ساتھی اٹھ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا تاکہ مجھے اس کمرے سے باہر نکلنے کا موقع نہ مل سکے۔ ٹیکو بھی میرے سامنے بانہیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا تھا لیکن میں دروازے کا رخ کرنے کے بجائے اچھل کر میز کے قریب پہنچ گیا اور ٹوپی کے قریب پڑی ہوئی نیلگری کی مالا اٹھا کر اپنے گلے میں پہن لی۔

مالا میرے گلے میں آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر ایک نئی توانائی بھر گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی نیلگری کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

"تمہیں کتنی بار سمجھانا پڑے گا کہ تمہارے اندر بھی ایک مہان شکتی موجود ہے۔ تم اس سے کام لینا کیوں بھول جاتے ہو۔ اس وقت اگر میں تمہارے اندر اس شکتی کو نہ ابھارتی تو یہ لوگ تمہارا بھرتا بنا دیتے لیکن اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان کی تھوڑی بہت مرمت کردو اور اپنے دوست کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ مالا کی حفاظت کرنا۔ گوتم بھوش اور سادھو میراج فی الحال رشی کیش واپس چلے گئے ہیں لیکن وہ اس مالا کو حاصل کرنے کے لیے تم پر دوبارہ حملہ آور ہوں گے۔ اس وقت تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔"

میرے کان میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ بدستور سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے سمبا والے کمرے میں میری دھنائی ہوئی تھی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن اب اچانک ہی میرے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہو گئی تھی اور میں نے ان تینوں کو اٹھا کر پٹخ دیا تھا۔ مالا میرے گلے میں آجانے کے بعد گویا مجھے ایک نئی شکتی مل گئی تھی۔

نیلگری نے ٹھیک کہا تھا کہ میں اپنے اندر کی شکتی سے کام لینا بھول جاتا ہوں۔ ویسے میں اپنے اندر "چی" کی قوت سے بے خبر نہیں تھا۔ اس شکتی سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے تھے لیکن میں نے پہلے ہی روز فیصلہ کیا تھا کہ اس شکتی سے اس وقت کام لوں گا جب اس کی ضرورت ناگزیر ہوگی۔ اپنی حفاظت کے لیے میں نے ہمیشہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسا کیا تھا۔

ٹیکو اور اس کے دونوں ساتھی حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے خیال میں مجھے موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا لیکن میں نے میز پر پڑی ہوئی مالا اٹھا کر گلے میں پہن لی تھی اور بڑے اطمینان سے وہاں کھڑا تھا۔

ٹیکو نے چیخ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا اور وہ دونوں میری طرف لپکے۔ میں نے بڑی پھرتی سے میز اٹھا کر ان پر دے ماری۔ میز خاصی وزنی تھی۔ ایک کا سر پھٹ گیا۔ وہ چیختا ہوا ایک طرف کر گیا۔ دوسرا میز کے نیچے دب گیا تھا۔

ٹیکو کی آنکھیں وحشت سی پھیلتی چلی گئیں۔ اس نے لپک کر زمین پر پڑی ہوئی ایک رائفل اٹھالی۔ میں چند گز کے فاصلے پر اس کے سامنے تھا۔ ہمارے درمیان کوئی آڑ نہیں

تھی۔ ٹیکو نے ٹریگر دبا دیا۔ ٹھیک اسی لمحے اس کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ رائفل کی نال اوپر کی طرف اٹھ گئی اور لاتعداد گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ٹیکو کی انگلی اس وقت تک ٹریگر سے نہیں ہٹی تھی جب تک میگزین خالی نہیں ہو گیا تھا۔ وہ متوحش نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے جھپٹ کر ٹیکو سے رائفل چھین لی اور اسے نال کی طرف سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما دیا۔ رائفل کے بٹ کی ضرب ٹیکو کے گھٹنے پر لگی اور وہ بلبلاتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ایک ساتھی قریب آیا تو وہ بھی رائفل کی زد میں آ گیا۔ اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی۔ تیسرا آدمی اٹھ کر چیختا ہوا اندرونی دروازے کی طرف دوڑا۔

میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ اس دروازے کی دوسری طرف ایک کشادہ اور طویل راہداری تھی جس سے اور بھی راہداریاں دائیں بائیں کو نکلتی تھیں۔ وہ شخص مدد کے لیے چیختا ہوا ایک اور راہداری میں مڑ کر غائب ہو گیا۔

میں اس کی چیخوں اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازوں کے سہارے اس کا پیچھا کرتا رہا لیکن وہ راہداریوں کی ان بھول بھلیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

میں جیسے ہی ایک راہداری میں مڑا' ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے ہی ناگ پال اور اس کے ساتھ وہ آدمی کھڑا تھا جو اس کے ساتھ عقوبت گاہ میں آیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ اسی دوران میں وہ آدمی بھی ایک دروازے سے برآمد ہوا جو چیختا ہوا عقوبت خانے سے بھاگا تھا۔ وہ اس وقت بھی چیخ چیخ کر ناگ پال سے کچھ کہہ رہا تھا۔

"رائفل پھینک دو ہمت سنگھ اور اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔" ناگ پال نے چیخ کر کہا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ رائفل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی جسے میں نے نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔

"یہ تمہاری بھول ہے ناگ پال۔" میں نے جواب دیا "اپنے آدمیوں کا حشر تم نے دیکھ لیا۔ تم لوگ میرا راستہ نہیں روک سکتے۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنے آپ کو سرنڈر کر دو۔"

"میں سرنڈر کر دوں؟" ناگ پال غرایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ٹریگر دبا دیا۔

میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا بکھر گئی لیکن موتی زمین پر گرنے کے بجائے میرے جسم کے مختلف حصوں پر چپک گئے۔ ناگ پال اور اس کا ساتھی مسلسل فائرنگ کر رہے تھے اور گولیاں میرے جسم پر انہی جگہوں پر لگ رہی تھیں جہاں مالا کے پتھر چپکے ہوئے تھے۔

ناگ پال کا ساتھی تو خوف زدہ انداز میں چیختا ہوا ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا اور ناگ پال اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا وحشت زدہ انداز میں میری طرف دیکھتا رہ گیا۔

میں نے رائفل کو لٹھ کی طرح گھما کر اس کے پہلو میں ایک زوردار ضرب رسید کر دی۔ ناگ پال بلبلاتا ہوا گرا اور میں نے بھی ایک طرف دوڑ لگا دی۔

کئی راہداریوں میں چکرانے کے بعد میں اس عمارت کی پچھلی طرف آیا۔ اس طرف جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور گہری تاریکی تھی۔ میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا اور بالآخر قید خانے والے بلاک کی طرف آ گیا۔ اس بلاک کے اوپر سے گھوم کر سامنے کی طرف آتے ہوئے میں نے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔

سمبا والی کوٹھری کا دروازہ کھولنے میں مجھے زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ اندر مشعل جل رہی تھی۔ میں دوڑ کر سمبا کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا اور گرد آلود فرش پر پشت کے بل پڑا ویران سی نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔

"کیسے ہو سمبا۔ کیا تم اٹھ سکتے ہو؟" میں نے اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔

سمبا کے ہونٹوں پر زخمی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"م۔ مجھے۔ چھوڑ دو ہمت۔۔ سنگھ۔ تت۔۔ تم بھاگ جاؤ۔" وہ رک رک کر بولا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" میں نے کہا اور مزید جھک کر اسے بانہوں پر اٹھا لیا اور دروازے کی طرف لپکا۔

حویلی کی عمارت کی پچھلی طرف شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ناگ پال اور اس کے آدمی مجھے اس طرف تلاش کر رہے تھے۔ میں نے حویلی کے برآمدے کی طرف دوڑ لگا دی جہاں ایک جیپ اور دو کاریں کھڑی تھیں۔

اصولی طور پر مجھے اس علاقے سے دور ہی رہنا چاہیے تھا لیکن میں برآمدے کی طرف جا کر بہت بڑا رسک لے رہا تھا اور یہ رسک لیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ اس پراسرار حویلی اور اس علاقے سے نکلنے کے لیے مجھے سواری کی ضرورت تھی اور برآمدے کے سامنے تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔

میں دوڑتا ہوا سب سے قریب والی سیاہ لینڈ کروزر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ لینڈ کروزر ویگن کی طرح کشادہ تھی اور اس کے دروازے بھی لاک نہیں تھے۔ میں نے بڑی آہستگی سے

پچھلا دروازہ کھول کر سمبا کو سیٹ پر لٹا دیا اور تیزی سے گھوم کر آگے والے دروازے سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے ٹٹولنے لگا۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔

میں چابی گھمانا ہی چاہتا تھا کہ برآمدے کی طرف سے ناگ پال کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اسے بندی خانے کی طرف دیکھو۔ بچ کر جانے نہ پائے۔"

میرا ہاتھ رک گیا اور میں برآمدے کی طرف دیکھنے لگا۔ دو انسانی ہیولے برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک برآمدے سے اتر کر قید خانے کی طرف دوڑ گیا جبکہ دوسرا برآمدے ہی میں کھڑا رہ گیا۔ وہ یقیناً ناگ پال تھا۔

دو منٹ بعد قید خانے کی طرف سے اپنے آدمی کے چیخنے کی آواز سن کر ناگ پال بھی برآمدے سے نکل کر اس طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ جیسے ہی نگاہوں سے اوجھل ہوا' میں نے اگنیشن کی گھما دی اور ریورس گیئر میں ڈال کر گاڑی کو پیچھے لے جانے لگا۔

"وہ بھاگ رہا ہے۔ گولی مار دو۔ روکو اسے۔"

یہ ناگ پال کے چیخنے کی آواز تھی اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ شروع ہو گئی۔

میرے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دینے لگی۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور نیلکری کی مالا مجھے اپنے گلے میں جھولتی ہوئی محسوس ہوئی۔

نیلکری اب تک میری حفاظت کے لیے موجود تھی لیکن اب وہ جا چکی تھی۔ اس کی وجہ سے میں ایک بہت بڑی مصیبت سے نکل تو آیا تھا لیکن ابھی خطرے سے باہر نہیں ہوا تھا۔ میں لینڈ کروزر کو تیز رفتاری سے پیچھے لیتا چلا گیا۔

اسی وقت دو اور انسانی ہیولے برآمدے میں نمودار ہوئے اور ان کی رائفلیں شعلے اگلنے لگیں۔ ایک گولی ونڈ اسکرین کے عین وسط میں لگی اور شیشہ توڑتی ہوئی پچھلی اسکرین میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی۔

میں نے لینڈ کروزر کو روکا اور گیئر بدل کر ایکسلریٹر پر پیر کا دباؤ ڈال دیا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیئرنگ کو بائیں طرف گھماتا چلا گیا۔ گاڑی کا رخ اب حویلی کے پھاٹک کی طرف تھا جو کھلا ہوا تھا۔ میں نے ہیڈ لائٹس بھی آن کر دیں اور رفتار بڑھاتا چلا گیا۔ عقب سے گولیاں برس رہی تھیں۔ عقبی ونڈ اسکرین بھی گولیوں سے چھلنی ہو چکی تھی لیکن یہ غنیمت تھا کہ کوئی گولی کسی ٹائر پر نہیں لگی تھی اور گاڑی کا فیول ٹینک بھی محفوظ ہی رہا تھا۔

پھاٹک سے نکلتے ہی تنگ سا پتھریلا راستہ تھا جو ڈھلان کی طرف چلا گیا تھا۔ گاڑی طوفانی رفتار سے اس ڈھلان پر دوڑ رہی تھی اور میرے ہاتھ سختی سے اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے۔

نشیب میں یہ سڑک کافی دور تک سیدھی چلی گئی تھی۔ میں نے ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ سامنے لگے ہوئے آئینے میں روشنی کی چمک دیکھ کر چونک گیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک گاڑی ہمارے پیچھے آ رہی تھی اور آئینے میں نظر آنے والی چمک اسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی تھی۔

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ نشیب ختم ہو گیا تھا اور اب سامنے چڑھائی تھی جو تقریباً دو سو گز کی بلندی تک چلی گئی تھی۔ چڑھائی کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی کم ہو گئی تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑی سے فائرنگ شروع کر دی گئی۔

چڑھائی کے اختتام پر ایک مسطح میدان سا تھا اور کچھ آگے جا کر وہ پتھریلا راستہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک راستہ سیدھا چلا گیا تھا اور دوسرا دائیں طرف کچھ آگے جا کر چٹانوں میں داخل ہو جاتا تھا۔ میں نے گاڑی اس طرف موڑ دی۔

کسی زمانے میں یہ راستے آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتے ہوں گے لیکن ظاہر ہے اس زمانے میں کاریں نہیں ہوں گی کہ ان راستوں کو پختہ سڑکوں کی طرح ہموار بنانے کی ضرورت پیش آتی۔ پتھریلے راستے پر گاڑی کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے اور مجھے سمبا کی پریشانی تھی۔

"سمبا۔ تم ٹھیک ہو نا؟" میں نے پیچھے گردن گھما کر چیختے ہوئے پوچھا۔ جواب میں سمبا کی صرف کراہیں سنائی دی تھیں جس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ تھا۔

وہ راستہ آگے جا کر چٹانوں میں داخل ہو گیا تھا اور ان چٹانوں میں کئی سمتوں میں راستے نکلتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اصل راستہ کون سا ہے۔ جو راستہ ذرا کشادہ نظر آتا' میں گاڑی کو اس طرف گھما دیتا۔ اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ جس راستے پر میں جا رہا ہوں وہ آگے جا کر بند نہ ہو جائے یا اچانک ہی کوئی ایسا کھڈ نہ آ جائے جس میں گر کر گاڑی کے ساتھ ہمارے بھی پرخچے اڑ جائیں۔

میں تقریباً دو گھنٹوں تک پہاڑوں میں اونچے نیچے اور غیر ہموار راستوں پر گاڑی دوڑاتا رہا۔ کئی مقامات پر میں حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں

کس طرف جارہا ہوں اور یہ اجنبی راستے مجھے کس طرف لے جائیں گے۔ میں کسی آبادی تک پہنچ پاؤں گا یا انہی پہاڑوں میں بھٹکتا رہوں گا۔ ایک موقع ایسا بھی آیا کہ گاڑی کا انجن ہچکولے لینے لگا۔ میری نظریں بے اختیار فیول بتانے والے ڈائل کی طرف اٹھ گئیں اور میں کانپ کر رہ گیا۔ سوئی زیرو پر ساکت ہوچکی تھی۔ ٹینک میں پیٹرول ختم ہوچکا تھا۔ گاڑی اس وقت ڈھلان پر جارہی تھی۔ میں نے انجن بند کردیا۔ یہ ڈھلان کافی دور تک چلی گئی تھی۔ تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد گاڑی خود بخود رک گئی۔ اتفاق سے جس جگہ گاڑی رکی تھی وہاں سامنے ہی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں، کچھ بلندی سے گرتا ہوا پانی کا جھرنا دکھائی دے رہا تھا۔

میں چند لمحے سیٹ پر بیٹھا رہا اور پھر نیچے اتر کر متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ یہ جگہ آبادی سے نجانے کتنی دور تھی۔ میں اکیلا ہوتا تو کسی نہ کسی طرف جاسکتا تھا لیکن میرے ساتھ سمبا تھا جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے لیے چلنا تو کیا، اپنے پیروں پر کھڑے ہونا بھی مشکل تھا۔

میں کچھ دیر تک کھڑا ویرانے میں چاروں طرف دیکھتا رہا پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر سمبا پر جھک گیا۔ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ میں نے گاڑی کی چھت کی بتی جلادی۔

سمبا کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ ہونٹوں پر پیڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔

"کیسے ہو سمبا؟" میں نے پوچھا۔

سمبا نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے پیڑیوں زدہ ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"میرے لیے تم نے بلاوجہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ مجھے چھوڑ دو اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو۔" اس نے رک رک کر جواب دیا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں سمبا۔" میں نے کہا "ہم ان درندوں کی پہنچ سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ اب وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن گاڑی میں پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔ اب ہمیں دن طلوع ہونے تک یہیں رہنا پڑے گا تاکہ پتا چل سکے کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ مجھے صرف تمہاری پریشانی ہے۔ تمہیں جلد سے جلد طبی امداد ملنا بہت ضروری ہے۔"

"اسی لیے تو کہتا ہوں کہ مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔ ان پہاڑوں میں طبی امداد کہاں۔ میرے بچنے کی کوئی امید نہیں۔" سمبا نے کہا۔

"میں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا سمبا۔" میں نے کہا "مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسا ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور مل جائے گا۔ ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے پانی لے کر آتا ہوں۔ مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور آخری سیٹ کی پچھلی طرف جہاں ڈکی کے طور پر استعمال ہونے والی تھوڑی سی جگہ تھی، کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس میں پانی لایا جاسکے اور پھر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس جگہ کچھ اور چیزوں کے علاوہ پیٹرول کے دو کین بھی پڑے ہوئے تھے اور دونوں سر بند تھے۔ وہ قدیم حویلی بھی کسی آبادی سے یقیناً بہت دور تھی۔ انہوں نے اس طرف آمدورفت کے لیے فاضل پیٹرول کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ ایک فاضل ٹائر، ایک رسا اور چند اور چیزوں کے علاوہ شراب کی ایک بوتل بھی پڑی تھی۔

میں بوتل اٹھا کر جھرنے پر آگیا۔ پہلے خود پانی پیا اور پھر بوتل دھو کر اس میں پانی بھرلیا اور گاڑی میں آگیا۔

سمبا دو تین گھونٹ سے زیادہ نہیں پی سکا تھا۔ میں نے بوتل اس کے قریب ہی رکھ دی اور نیچے اتر کر ٹینک میں پیٹرول ڈالنے لگا۔

اور اس کے چند منٹ بعد ہماری گاڑی ایک بار پھر پہاڑوں میں گھوم رہی تھی۔ میرا تعاقب کرنے والے نجانے کہاں رہ گئے تھے لیکن اس بات کا اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ ان پہاڑی راستوں کی بھول بھلیوں میں ان سے سامنا نہ ہوجائے۔ گاڑی میں دس گیلن مزید پیٹرول ڈالا گیا تھا اور یہ پیٹرول ختم ہونے سے پہلے پہلے کسی ایسی جگہ پہنچنا ضروری تھا جہاں ہمیں پناہ مل سکے اور سمبا کی مرہم پٹی ہوسکے۔

دو گھنٹے اور گزر گئے۔ پہاڑوں میں کسی بستی کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ کم از کم تین مقامات پر مجھے راستہ بند ملا تھا اور گاڑی کو واپس موڑنا پڑا تھا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ پیٹرول ختم ہوگیا۔ گاڑی رک گئی۔ میں انجن بند کرکے پچھلی سیٹ پر آگیا۔ بوتل اٹھا کر پہلے سمبا کو پانی پلایا اور ایک دو گھونٹ خود بھی بھرے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ صبح ہونے کا انتظار کیا جاتا۔ آنے والی صبح کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ہمارے لیے اس کے دامن میں کیا تھا۔ میں سمبا سے پیچھے والی سیٹ پر نیم دراز ہوگیا۔ میرا جسم بھی بری طرح دکھ رہا تھا۔ حویلی کے قید خانے میں ان کم بختوں نے دل کھول کر میری دھنائی کی تھی اور اب ان چوٹوں میں تکلیف شروع ہوگئی تھی۔

میں سیٹ پر نیم دراز سمبا سے باتیں کرتا رہا اور پھر میرے دماغ پر بھی غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں اور میں کوشش کے باوجود آنکھیں کھلی رکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

تیز روشنی سے میری آنکھ کھل گئی۔ طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں براہِ راست میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے میں نے دوسری سیٹ پر جھک کر سمبا کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سینے کا ہلکا سا زیروبم اس میں زندگی کا پتا دے رہا تھا۔ وہ سو رہا تھا یا بے ہوش تھا، میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ بوتل اٹھا کر پانی کے ایک دو گھونٹ پیے اور بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

ہماری گاڑی چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے درمیان ایک کشادہ جگہ پر کھڑی تھی اور اس سے آگے گاڑی لے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر پیٹرول نہ بھی ختم ہوتا تو مجھے یہاں سے گاڑی واپس لے جانا پڑتی۔

میں چٹانوں کے درمیان ایک تنگ سے راستے میں داخل ہوگیا۔ دوسری طرف کھلی جگہ پر نکلتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ نشیب میں دریا بہہ رہا تھا جس کی دوسری طرف بہت دور تک ایک سرسبز و شاداب وادی پھیلی ہوئی تھی اور میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ دریا کے کنارے ٹیلا نما ایک اونچی جگہ پر پگوڈا قسم کی ایک عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ اس عمارت کے پیچھے ایک چٹان تھی جو کافی بلندی تک چلی گئی تھی۔

میں غور سے اس طرف دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ یہ بھی کوئی ویران عمارت تھی لیکن چند لمحوں بعد ہی ایک انسانی ہیولا اس عمارت سے نکل کر دوسری طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ ہیولا میں اسی لیے کہوں گا کہ مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ صرف زرد لباس کی جھلک دکھائی دی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ ہیولا بھی دوسری طرف ڈھلان پر غائب ہوگیا۔

زرد لباس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی بدھ بھکشو تھا۔ میں کافی دیر تک وہاں کھڑا دیکھتا رہا لیکن اور کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ وہاں اگرچہ ہمارے لیے خطرہ بھی ہوسکتا تھا لیکن میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں چٹان کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر گھوم کر نیچے اترنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔ بالآخر تقریباً پچاس گز آگے مجھے ایک تنگ سا راستہ نظر آگیا۔ یہ دراصل ایک کٹاؤ سا تھا جو پانی کے بہاؤ سے بن گیا تھا لیکن اس راستے پر آسانی سے اترا جاسکتا تھا۔

میں گاڑی کے پاس واپس آگیا۔ سمبا بھی جاگ چکا تھا۔ میں نے اسے اس پگوڈا کے بارے میں بتایا اور پانی کی بوتل اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگادی۔ ایک دو گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے بوتل ہٹادی۔

میں نے سمبا کو سہارا دے کر سیٹ سے اٹھایا اور کندھے پر لاد کر چٹانوں کے درمیان اس تنگ سے راستے کی طرف چلنے لگا۔

چٹان سے اتر کر دریا کے کنارے پر چلتے ہوئے اونچی جگہ پر واقع اس پگوڈا تک پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ وہ کوئی بہت قدیم بدھ عبادت گاہ تھی۔ عمارت کے بعض حصے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہورہے تھے مگر اس کی حالت ایسی زیادہ خستہ بھی نہیں تھی۔

میں عبادت گاہ کے سامنے کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ میری زیادہ توجہ اس طرف تھی جہاں زرد لباس والے اس آدمی کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

اس طرف درختوں کی بھی بہتات تھی۔ ڈھلان کے اختتام پر ایک چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا جہاں ایک چھوٹی کشتی بھی موجود تھی لیکن وہ آدمی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ آدمی کہاں غائب ہوگیا تھا۔ کشتی کے آس پاس دریا میں بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے؟" میں نے عبادت گاہ کی طرف رخ کرکے پکارا لیکن نہ تو کوئی جواب ملا اور نہ ہی کوئی سامنے آیا۔

میں نے سمبا کو کندھے سے اتار کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اس کی ٹانگیں آگے کو پھیلا دیں۔ اس کے دونوں پیر پھول کر کپا بنے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی بھی یہی صورت حال تھی۔ اس کے سینے پر بھی چھوٹے چھوٹے کئی زخم تھے اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھا۔

"میں نے ایک آدمی کو ادھر دریا کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔" میں نے کہا "تم یہاں بیٹھے رہو۔ میں اسے تلاش کرکے لاتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ ہماری کچھ مدد کرسکے۔"

سمبا نے سر ہلا دیا اور میں ڈھلان پر دریا کی طرف اترنے لگا۔ یہ بھی دراصل ایک سنگلاخ چٹان ہی تھی جو دور سے دیکھنے پر ریت کا ٹیلا لگتی تھی۔ اس میں لاتعداد چھوٹی چھوٹی

دراڑیں تھیں جہاں جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں درخت بھی تھے۔ البتہ دریا والی ڈھلان کی طرف درخت زیادہ تھے۔

وہ چھوٹا سا گھاٹ بھی چٹان کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ جہاں پانچ چھ چھوٹی کشتیاں کھڑی کی جاسکتی تھیں تاہم دریا کے کنارے کے ساتھ دور تک وہ چٹان اس طرح کٹی ہوئی تھی کہ ایک طویل پلیٹ فارم سا بن گیا تھا۔

میں گھاٹ پر کشتی کے قریب کھڑا ادھر ادھر دیکھنے لگا لیکن وہ آدمی مجھے کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ مجھے حیرت تھی، وہ کہاں غائب ہوگیا۔ ایک لمحے کو تو مجھے یہ بھی خیال آیا تھا کہ کہیں وہ میرا واہمہ تو نہیں تھا!

میں واپس لوٹ رہا تھا کہ اوپر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز سن کر چونک گیا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی عورت تھی جو چیخ چیخ کر کسی کو پکار رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا اوپر آگیا اور پھر ٹھٹک کر رک گیا۔

سمبا کے قریب ایک نوجوان لڑکی کھڑی عبادت گاہ کی طرف رخ کیے چیخ چیخ کر کسی کو پکار رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کی ایک چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کی پشت برہنہ تھی اور لمبے سیاہ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی لمحے عبادت گاہ کے برآمدے میں ایک اور عورت برآمد ہوئی۔ اس نے بھی نیلے رنگ کی چادر ساڑی کی طرح لپیٹ رکھی تھی لیکن جسم کا بیشتر حصہ برہنہ تھا۔ وہ اگرچہ ادھیڑ عمر تھی لیکن خاصی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے چیخ کر سمبا کے قریب کھڑی ہوئی لڑکی سے کچھ کہا اور ساتھ ہی ہاتھ سے اشارہ بھی کیا تھا۔

وہ لڑکی تیزی سے گھوم گئی اور مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے۔ میرے اور اس لڑکی کے بیچ آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بھی ذہنی طور پر ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ چہرے کے نقوش اگرچہ تبتی عورتوں جیسے تھے لیکن آنکھیں ہرنی کی طرح موٹی اور سیاہ تھیں۔ نیلی چادر اس نے بھی اگرچہ ساڑی کی طرح لپیٹ رکھی تھی لیکن سینہ پوری طرح نہیں ڈھک پایا تھا۔

وہ چند لمحے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر وحشت زدہ ہرنی ہی کی طرح عبادت گاہ کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی اور برآمدے میں کھڑی ہوئی عورت سے لپٹ کر چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگی۔ وہ سمبا کی طرف ہاتھ سے بار بار اشارے بھی کر رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھا رکھے تھے تاکہ وہ میرے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوسکیں۔

وہ دونوں اپنی جگہ پر کھڑی رہیں۔ قریب پہنچ کر میں نے باری باری ان کا جائزہ لیا۔ ان دونوں کے چہروں میں بڑی مشابہت تھی اور میں دعوے سے کہہ سکتا تھا ان میں ماں بیٹی کا رشتہ تھا۔ میں ہندی زبان میں ادھیڑ عمر کی عورت کو بتانے لگا کہ میرا ساتھی زخمی ہے اور ہمیں ان لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔

ان کی زبان اگرچہ تبتی تھی لیکن وہ عورت تھوڑی بہت ہندی بھی سمجھتی تھی۔ وہ دونوں میرے ساتھ سمبا کے قریب آگئیں۔ سمبا کی حالت دیکھ کر وہ ادھیڑ عمر عورت بھی کانپ اٹھی تھی۔ اس نے لڑکی سے کچھ کہا اور لڑکی دریا کی طرف ڈھلان پر دوڑتی چلی گئی جس طرف سے میں اوپر آیا تھا۔

"اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے اندر لے چلو۔" ادھیڑ عمر عورت نے تبتی اور ہندی کے ملے جلے الفاظ میں کہا۔

میں نے جھک کر سمبا کو کندھے پر لاد لیا اور اس عورت کے پیچھے چلتا ہوا عبادت گاہ میں داخل ہوگیا۔

دور سے یہ عمارت چھوٹی لگتی تھی لیکن اچھی خاصی بڑی تھی۔ ہال بہت وسیع تھا۔ وسط میں ایک چبوترے پر مہاتما بدھ کا سرخ پتھر سے تراشا ہوا تقریباً تین فٹ اونچا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ فاسٹنگ بدھا (فاقہ زدہ بدھا) کا یہ مجسمہ بڑی مہارت سے تراشا گیا تھا۔ پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پسلیاں بڑی آسانی سے گنی جاسکتی تھیں۔

وہ عورت ہال کی دائیں طرف ایک کشادہ راہداری میں مڑ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ایک اور راہداری میں گھوم کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کمرے کا دروازہ محرابی تھا لیکن اس میں کوئی پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ فرش پر ایک طرف یاک کی کھال کا بستر بچھا ہوا تھا اور کچھ اور چیزیں بھی نظر آرہی تھیں۔ پچھلی طرف ایک کھڑکی بھی تھی جس سے روشنی اندر آرہی تھی۔

اس عورت نے اشارہ کیا تو میں نے سمبا کو بڑی احتیاط سے یاک کی کھال کے بستر پر لٹا دیا اور پھر وہ عورت مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ انسان کو کسی بھی حالت میں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے سمبا کے خون آلود بالوں میں

انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "خدا نے ہماری فریاد سن لی۔ اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

جواب میں سمبا نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہ کمرا خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ دو دیواروں کے ساتھ ایک رسی بندھی ہوئی تھی جس پر چند کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ اس کھڑکی میں بھی کوئی چوکھٹ یا پٹ وغیرہ نہیں تھا۔ بس دیوار میں کھڑکی کی جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔

کھڑکی سے باہر دیکھتے ہی میں چونک گیا۔ یہ کمرا عبادت گاہ کی عمارت کے پہلو میں آخر میں واقع تھا۔ عمارت کے ساتھ بالکل عمودی ڈھلان تھی جس کے اختتام پر ایک مختصر سی وادی پھیلی ہوئی تھی جس میں کچھ مویشی چرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور دو افراد تیز تیز چلتے ہوئے دائیں طرف جارہے تھے۔ ان میں ایک تو نیلی چادر والی وہی لڑکی تھی جو ہمیں دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی اور دوسرا زرد چادر والا وہ آدمی تھا جسے میں نے سب سے پہلے چٹان پر سے دیکھا تھا اور پھر وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

وہ دونوں کچھ دیر تک جھاڑیوں میں نظر آتے رہے پھر ایک چٹان کے پیچھے نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ میں کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر دیکھتا رہا اور پھر آہٹ سن کر پیچھے مڑ گیا۔ وہ عورت ایلومینیم کے دو گلاس اٹھائے کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر اس کے قریب آگیا۔

عورت سمبا کے قریب بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں گلاس فرش پر رکھ دیے۔ ان میں دودھ تھا۔ میں بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے کل صبح ناشتے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ گلاسوں میں دودھ دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی۔ سمبا نے بھی نجانے کب سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

میں نے سمبا کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے ایک گلاس اٹھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ آدھا دودھ پی کر اس نے گلاس ہٹا دیا لیکن میں نے زبردستی اسے پورا دودھ پلا دیا۔ اسے بستر پر لٹا کر میں نے دوسرا گلاس اٹھا لیا۔

میں نے گلاس خالی کر کے فرش پر رکھا ہی تھا کہ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں اس وقت بھی وحشت سی بھری ہوئی تھی۔

وہ شخص درمیانے قد اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ سر گنجا اور چہرہ کلین شیو تھا۔ گلے میں سرخ پتھر کے موتیوں والی ایک مالا بھی تھی۔ وہ بھکشو تھا اور یقیناً نیلے لباس والی لڑکی کا باپ اور اس ادھیڑ عمر عورت کا شوہر تھا۔ وہ ہمارے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے سمبا کے چہرے کے نقوش سے غالباً اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ بھی اسی کے قبیل کا ہے۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگا۔

سمبا تبتی زبان میں اسے کچھ بتاتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ سمبا نے بھکشو کو کیا کہانی سنائی تھی۔ وہ جب خاموش ہوا تو بھکشو نے قریب کھڑی ہوئی لڑکی سے کچھ کہا۔ وہ فوراً ہی کمرے سے نکل گئی۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بوتل تھی جس میں میلے سے رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا اور ایک چوڑے منہ والی بوتل تھی جس میں ہرے رنگ کی کریم تھی۔ بھکشو نے لڑکی سے مزید کچھ کہا اور لڑکی نے ٹانگوں کے قریب اپنی چادر اوپر اٹھا کر بالشت بھر چوڑا ایک ٹکڑا پھاڑ کر بھکشو کی طرف بڑھا دیا۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ وہ اگر چاہتی تو کسی اور کپڑے سے بھی اتنا سا ٹکڑا پھاڑ سکتی تھی لیکن یہ شاید اس کا ہمدردی کا جذبہ تھا کہ اس نے اپنے جسم کا لباس پھاڑ دیا تھا۔

بھکشو نے بالشت بھر کپڑے سے کئی ٹکڑے پھاڑ لیے اور سیال والی بوتل کھول کر ایک ٹکڑا اس میں تر کر کے مجھے اشارہ کیا۔ میں نے سمبا کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ بھکشو سیال میں بھیگے ہوئے ٹکڑے سے اس کے انگوٹھے کا زخم صاف کرنے لگا۔ سمبا بری طرح چیخ اٹھا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن میں نے اسے مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔

وہ کوئی بہت ہی تیز قسم کا ٹنکچر نما سیال تھا جس سے سمبا کے زخم صاف کیے جارہے تھے اور سمبا بری طرح تڑپ اٹھا تھا۔ تاہم زخم صاف کرنے کے بعد ہرے رنگ کا مرہم لگایا گیا تو وہ بتدریج پرسکون ہوتا چلا گیا۔

دونوں ماں بیٹیاں چیزیں سمیٹ کر وہاں سے جاچکی تھیں۔ بھکشو ہمارے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔

وہ تھونچی تھا اور کئی سال سے اپنی بیوی بھیرجانی اور بیٹی دھنو کے ساتھ اس پگوڈا میں رہائش پذیر تھا۔ وہ بھکشو نہیں تھا لیکن طویل عرصے سے اس عبادت گاہ میں خدمات انجام دے رہا تھا۔

یہ عبادت گاہ کئی سو سال پرانی تھی۔ پہلے اس طرف تجارتی قافلوں کی باقاعدہ گزرگاہ ہوا کرتی تھی اور یہ عبادت گاہ بھی آباد تھی لیکن پھر اچانک ہی بلندی پر بہنے والے دریا نے اپنا رخ بدل لیا اور پہاڑی کے دامن میں آباد چھوٹی سی بستی کو بھی بہا لے گیا۔ اس کے بعد یہ عبادت گاہ ویران

ہوگئی۔

تھونچی کے کہنے کے مطابق ہر سال جولائی کے وسط میں یہاں ایک میلا لگتا تھا۔ لوگ دور دور سے مہاتما بدھ کے اس مجسمے کے درشن کے لیے آتے تھے جو اس عبادت گاہ کے پیچھے والی چٹان کے اندر چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ میلے کے دنوں میں یہاں چند روز کے لیے رونق ہو جاتی تھی اور کچھ آمدنی بھی ہو جاتی تھی۔

تھونچی کے کہنے کے مطابق وہ تقریباً پندرہ سال پہلے بھیرا گندہ نامی شہر سے بھاگ کر کھٹمنڈو آیا تھا۔ وہ ایک کسان تھا اور بھیرہ گندا میں ایک جاگیردار کے پاس ملازم تھا۔ ایک روز جاگیردار نے اس کی خوب صورت بیوی کو دیکھ لیا اور اسے حکم دیا کہ اگلے روز وہ اپنی بیوی کو اس کی حویلی بھیج دے۔

جاگیردار بہت سنگ دل اور عیاش آدمی تھا۔ اس کے علاقے کی کوئی حسین عورت اس کی دسترس سے محفوظ نہیں تھی۔ وہ اراضی کی طرح حسین عورتوں کو بھی اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

تھونچی جانتا تھا کہ اس کی بیوی ایک مرتبہ جاگیردار کی حویلی چلی گئی تو اس وقت تک اسے باہر نہیں نکلنے نہیں دیا جائے گا جب تک جاگیردار کو کوئی دوسری عورت پسند نہیں آجاتی۔

تھونچی کی بیٹی دھنو کی عمر اس وقت صرف چھ سال تھی۔ وہ اسی رات اپنی بیوی بھیرجانی اور بیٹی کو لے کر بھیرہ گندا سے بھاگ کھڑا ہوا اور کھٹمنڈو پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ کھٹمنڈو ایک بڑا شہر تھا اور یہاں اسے تلاش نہیں کیا جاسکے گا لیکن چند ہی روز بعد اس نے جاگیردار کے دو آدمیوں کو بازار میں دیکھ لیا۔

ان دنوں شہر سے تقریباً تیس میل دور بدھ نیل کنڈ نامی اس عبادت گاہ پر میلا لگا ہوا تھا۔ تھونچی اپنی بیوی اور بیٹی کو لے کر یہاں آگیا۔

میلا ختم ہوگیا۔ لوگ واپس جا رہے تھے لیکن تھونچی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ دریا کے کنارے ایک چھولداری میں ٹھہرا رہا۔ عبادت گاہ کے بوڑھے بھکشو نے انہیں دیکھا تو عبادت گاہ میں لے آیا۔ تھونچی نے اسے اپنی کہانی کہہ سنائی۔ بھکشو نے انہیں عبادت گاہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔

چند مہینوں بعد بھکشو بیمار ہوگیا۔ تھونچی اور بھیرجانی نے اس کی بہت خدمت کی لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا۔ بھکشو کے انتقال کے بعد یہ عبادت گاہ تھونچی نے سنبھال لی۔ میلے میں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ سال بھر بڑی سہولت سے گزارہ ہو سکتا تھا لیکن تھونچی نے وقت گزارنے کے لیے دریا کے کنارے چٹان کی دوسری طرف تھوڑی سی زمین پر کھیتی باڑی شروع کردی اور کچھ مویشی بھی پال لیے۔

بدھ نیل کنڈ کی یہ عبادت گاہ بھاگ متی کی طرف جانے والی سڑک سے تقریباً پانچ میل ہٹ کر تھی اور اس طرف عام لوگوں کی آمدورفت نہیں تھی۔ تھونچی سودا سلف لینے کے لیے مہینے میں ایک بار شہر جاتا تھا۔ اس نے ایک کشتی بھی بنالی تھی۔ پانچ میل کا یہ فاصلہ وہ اس کشتی پر دریا میں طے کرتا۔ ہائی وے کے قریب ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں سے شہر آمدورفت کے لیے بس مل جاتی تھی۔

تھونچی کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یہاں رہتے ہوئے گیارہ بارہ سال ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی بھیرجانی بوڑھی اور بیٹی دھنو جوان ہو چکی تھی۔ یہاں آنے کے بعد دھنو اور بھیرجانی دو چار مرتبہ ہی شہر گئی تھیں۔ دھنو اپنی ماں ہی کی طرح حسین تھی اور تھونچی نہیں چاہتا تھا کہ وہ بھی برے لوگوں کی نظروں میں آجائے۔

تھونچی پہلے تو مجھ سے بھی بدکا ہوا سا رہا لیکن جب میں نے بتایا کہ ہم بھی اپنے دشمنوں سے بچتے پھر رہے ہیں تو وہ ہمیں یہاں اس وقت تک پناہ دینے کو تیار ہو گیا تھا جب تک سمبا چلنے کے قابل نہ ہو جاتا لیکن اس ایک دن بلکہ چند گھنٹوں ہی میں نہ صرف تھونچی بلکہ اس کی بیوی اور بیٹی بھی مجھ سے بے تکلف ہو چکی تھی۔

بھیرجانی کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی لیکن وہ اب بھی بے حد حسین تھی۔ دھنو کو اس کی جوانی کی تصویر کہا جاسکتا تھا۔

صبح سمبا کی مرہم پٹی کے بعد بھیرجانی نے ہمیں تگڑا سا ناشتا بھی کرایا تھا۔ جوار کی روٹی، پہاڑی بکرے (کیپری کورن) کا تلا ہوا گوشت اور چائے۔ گوشت وہ سکھا کر رکھ لیتے تھے جسے ضرورت کے مطابق مختلف طریقوں سے کھانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

ناشتے کے تھوڑی دیر بعد سمبا سو گیا تھا۔ میں اور تھونچی کچھ دیر اس کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے اور پھر ہم دونوں عبادت گاہ سے نکل کر دریا کے کنارے کھیتوں کی طرف آگئے۔ تین چار کھیت تھے جن میں جوار اور سبزیاں وغیرہ لگی ہوئی تھیں۔ عبادت گاہ کے پچھلی طرف والی گھاٹی مویشیوں کے لیے مخصوص تھی۔ کانٹے دار تاروں کی باڑ لگا کر اس گھاٹی کو محصور کر دیا گیا تھا۔ مویشی دن بھر وہاں چرتے

تھے۔ یہ گھاٹی ہی ان مویشیوں کا باڑا بھی تھی۔

شام کو جب میں تھونچی کے ساتھ عبادت گاہ واپس آیا تو سمبا اس کمرے میں نہیں تھا جہاں صبح اسے لٹایا گیا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں تھا اور دھنو اس کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ سمبا نے مجھے بتایا کہ دونوں ماں بیٹیاں اسے اٹھا کر یہاں لائی تھیں۔ اسی کمرے میں میرے لیے بھی الگ بستر بچھا ہوا تھا۔

رات کا کھانا ہم نے سمبا کے پاس بیٹھ کر کھایا اور اس کے تھوڑی دیر بعد تھونچی مجھے عبادت گاہ دکھانے کے لیے لے گیا۔ عبادت گاہ کا بیرونی حصہ تو وہ تھا جہاں فاسٹنگ بدھا کا مجسمہ تھا۔ اس عبادت گاہ کا پچھلا حصہ چٹان سے ملا ہوا تھا۔

باہر سے ٹھوس اور سنگلاخ نظر آنے والی یہ چٹان اندر سے کھلی تھی۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ ہال کی دوسری طرف ایک تنگ سی راہداری سے تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی میں وحشت زدہ سا ہو کر رہ گیا۔ یہ غار یا ہال پچاس ساٹھ فٹ لمبا اور غالباً اتنا ہی چوڑا تھا۔ اس کے عین وسط میں بدھ نیل کنڈ کا وہ مجسمہ تھا جو ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ یہ چٹان تقریباً تیس فٹ اونچی تھی اور اس کا گھیر بھی پندرہ فٹ سے کم نہیں تھا۔

میں نے تھونچی کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور اسے اونچا اٹھا کر غور سے مجسمے کو دیکھنے لگا۔ اس مجسمے کو سنگ تراشی کا ایک نادر شاہکار کہا جاسکتا تھا۔

مجھے حیرت تو اس چٹان پر تھی جس سے مجسمہ تراشا گیا تھا۔ اسے باہر سے اندر لانا تو ممکن نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے یہ چٹان غار کے اندر قدرتی طور پر اسی جگہ موجود ہو۔ غار کی دیواروں پر بھی انسانی ہاتھوں کی صناعی کا دخل نظر آرہا تھا۔

اس بلند قامت مجسمے کو دیکھ کر عجیب سی وحشت طاری ہو رہی تھی۔ غار کی دیواروں پر بھی جگہ جگہ پتھر تراش کر مجسمے ابھارے گئے تھے۔

تھونچی نے میرے ہاتھ سے مشعل لے لی اور اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ غار کے آخر میں ایک تنگ سی راہداری تھی جس میں دو آدمی بمشکل پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے اور تقریباً دس گز آگے چٹان کے اندر راہداریوں کا گویا جال سا بچھا ہوا تھا۔ کوئی اجنبی ان بھول بھلیوں میں داخل ہو کر واپس نہیں آسکتا تھا۔

واپس آتے ہوئے ہم پھر بدھا کے عظیم القامت مجسمے کے پاس رک گئے۔

"بھکشو اپنی زندگی میں کئی بار مجھے ان راہداریوں میں لا چکا ہے۔ ان راہداریوں میں کچھ ایسے راز پوشیدہ ہیں جو میں تمہیں بعد میں کسی وقت بتاؤں گا۔ اس وقت میں تمہیں ایک ایسے راز سے آگاہ کر رہا ہوں جو بھکشو نے اپنی موت سے دو دن پہلے مجھے بتایا تھا۔" تھونچی نے کہا اور پھر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ مشعل کی تھرکتی ہوئی روشنی میں اس کا چہرہ اس وقت بہت ہی پراسرار لگ رہا تھا "تم صبح سے ہمارے ساتھ ہو۔ مجھے یقین آگیا ہے کہ تم ایک شریف النفس انسان ہو اور مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ میں جو راز تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ تمہارے سینے تک ہی محدود رہے گا۔"

"ہاں۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

تھونچی مشعل کی روشنی میں بدھا کے مجسمے کے پچھلے حصے کو غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے نیچے جھک کر مجسمے کے بائیں پیر کی ایڑی کی جگہ پتھر کو دبا دیا پھر یہی حرکت دوسرے پیر کے ساتھ بھی کی اور وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

مجسمے کے دونوں پیروں کے درمیان تقریباً چار فٹ کا فاصلہ تھا اور یہ جگہ بھی ٹھوس چٹانی پتھر پر مشتمل تھی لیکن اب وہاں اتنی چوڑی کھڑکی نظر آرہی تھی جس سے ایک آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ پتھر کے دونوں حصے سلائیڈنگ ڈور کی طرح دائیں بائیں سرک گئے تھے۔

تھونچی اس کھڑکی میں داخل ہو گیا اور مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر داخل ہوا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ بدھا کا مجسمہ بھی اندر سے کھوکھلا تھا اور اتنی جگہ تھی کہ تین چار آدمی ساتھ مل کر آسانی سے کھڑے ہو سکتے تھے جبکہ دائیں طرف نیچے اترنے کے لیے تنگ سی سیڑھیاں تھیں۔

تھونچی نے مجسمے کے اندر لگا ہوا ایک آہنی ہک کھینچ دیا۔ وہ کھڑکی بند ہو گئی جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ باہر کھڑا ہوا کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پتھر کے اس مجسمے کے اندر دو زندہ انسان موجود ہیں۔

بارہ سیڑھیاں اتر کر ہم تہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہ سیڑھیاں سیدھی نہیں تھیں۔ بیچ میں ایک موڑ تھا۔ موڑ گھومنے کے بعد آخری سیڑھی سے جیسے ہی نیچے قدم رکھا، میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔

یہ بھی بہت بڑا ہال بلکہ غار تھا۔ سیڑھیوں سے چند قدم آگے مہاتما بدھ کا کوئی دس فٹ اونچا مجسمہ تھا جو مشعل کی روشنی میں سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ تھونچی نے بتایا کہ یہ

مجسمہ ٹھوس سونے کا تھا۔ غار کی دیواروں پر بھی کہیں کہیں چمک نظر آرہی تھی۔

ہم غار میں دائیں طرف ایک تنگ سی سرنگ میں مڑ گئے۔ تقریباً بیس فٹ آگے جاکر یہ سرنگ اس قدر تنگ ہوگئی کہ جھک کر چلنا پڑ رہا تھا اور جیسے ہی ہم سرنگ کی دوسری طرف کھلی جگہ پر رکے' مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہ خاصا بڑا غار تھا اور اس کی دیواریں مشعل کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔

"یہ ہے وہ راز جو اس عبادت گاہ کے بھکشو نے مرنے سے پہلے مجھے بتایا تھا۔" تھونچی نے کہا۔ وہ غار کے وسط میں رک گیا اور مشعل کی روشنی میں چاروں طرف اشارے کرنے لگا۔

میری حالت واقعی بہت غیر ہو رہی تھی۔ میں نے زندگی میں بہت دولت دیکھی تھی۔ تھائی لینڈ میں بھی اور ہندوستان کے مندروں میں بھی لیکن سونے کا پہاڑ! میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے کوئی ایسی چیز دیکھنے کو ملے گی۔ سونے کی چمک سے میری آنکھیں چکا چوند ہو رہی تھیں۔

میں نے تھونچی کے ہاتھ سے مشعل لے لی اور گھوم پھر کر چمکتی ہوئی چٹانوں کو دیکھنے لگا۔ زمین پر بھی سونے کے لاتعداد چھوٹے بڑے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھا کر دیکھا۔ دیواروں کو بھی چھو کر دیکھا۔ وہ سونا ہی تھا۔ اس میں پتھر کی آمیزش بہت کم تھی۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اگر یہ سونا مارکیٹ میں لے آیا جائے تو دنیا میں طوفان آجائے۔ نیپال دنیا کا امیر ترین ملک بن جائے اور اگر لوگوں کو پتا چل جائے کہ اس عبادت گاہ کے پیچھے سونے کا پہاڑ ہے تو شاید اس چٹان کے دامن میں بہنے والے دریا میں پانی کے بجائے انسانوں کا خون بہنے لگے۔

میں مشعل ہاتھ میں لیے چاروں طرف گھومتا رہا۔ بہت بڑا غار تھا اور چھت بھی زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ دو تین اطراف میں سرنگیں بھی تھیں اور ان سرنگوں کی ناہموار دیواریں بھی سونے ہی کی تھیں۔

"آؤ۔ اب واپس چلیں۔" تھونچی نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے مشعل لے لی۔

ہم اس غار سے نکل کر دوسرے حصے میں آگئے جہاں مہاتما بدھ کا سونے کا مجسمہ استادہ تھا۔

"سونے کا یہ پہاڑ صدیوں پہلے دریافت ہوا تھا اور بدھا کا یہ مجسمہ بھی اسی زمانے میں بنایا گیا تھا۔" تھونچی نے سونے کے مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آخری دو دنوں میں بھکشو نے مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ یہ راز سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ بدھ کے پیروکار بہت صلح جو اور امن پسند لوگ ہیں اور اس دھرم کے سیوک (بھکشو) یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ سونا عام لوگوں کی دسترس میں آجائے تو یہاں خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔ اس سونے کو لوگوں کی بھلائی کے لیے نہیں' دنیا کی تباہی و بربادی کے لیے استعمال کیا جائے گا اس لیے اسے آج تک راز ہی رکھا گیا ہے۔ اس عبادت گاہ کا محافظ بھکشو مرنے سے پہلے کسی ایسے آدمی کو اس راز سے آگاہ کردیتا ہے جو قابلِ اعتماد ہو اور اس راز کو اپنے تک ہی رکھ سکے۔"

"کیا دنیا کا کوئی اور شخص اس راز سے واقف نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہر دور کا دلائی لاما اور اس کے چند بہت قریبی ساتھی اس راز سے واقف ہوتے ہیں۔" تھونچی نے بتایا "تقریباً ساٹھ سال پہلے چند اور لوگوں کو بھی کسی طرح اس راز کا پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے اس عبادت گاہ پر قبضہ کرلیا تھا لیکن انہیں یہاں سے سونے کی ایک ڈلی نکالنے کا بھی موقع نہیں مل سکا۔ وہ کسی بات پر آپس ہی میں لڑ کر ختم ہوگئے۔ ان کی لاشیں عبادت گاہ کے باہر والے میدان میں بکھری ہوئی تھیں جنہیں کئی روز تک بھیڑیے کھاتے رہے۔" تھونچی چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں جب یہاں آیا تھا تو اس کے چند مہینوں بعد بھکشو بیمار ہوگیا۔ اس نے مرنے سے پہلے مجھے یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے انتقال سے چند گھنٹے پہلے دو اور بھکشو یہاں آئے تھے۔ وہ بہت دیر تک بیمار بھکشو سے راز و نیاز کی باتیں کرتے رہے اور جب بھکشو کا انتقال ہوگیا تو مہمان بھکشوؤں نے اس کا کریا کرم کیا تھا۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتے یہاں رہے اور پھر مجھے آشیرباد دے کر چلے گئے۔

"ہر سال میلے پر دو بھکشو یہاں آتے ہیں۔ چند روز رہتے ہیں اور مجھے آشیرباد دے کر چلے جاتے ہیں۔ ہر سال ان بھکشوؤں کا آشیرباد اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ انہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ میں بھکشو نہیں ہوں۔ میں تو اپنی بیوی کی عزت اور اپنی جان بچانے کے لیے بھیرہ گنڈا سے بھاگ کر یہاں آیا تھا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے دنیا کے سب سے بڑے راز کا امین بنا دیا جائے گا۔ اب مجھے اس شخص کا انتظار ہے جس کے سامنے میں اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرسکوں اور یہاں سے چلا جاؤں۔"

"لیکن۔۔۔ تم نے مجھے اس راز سے آگاہ کیوں کیا؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے میں شکل سے بہت شریف نظر آتا ہوں لیکن میرا کردار بہت گھناؤنا ہو اور تم نے مجھ پر اعتماد کرکے غلطی کی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں قتل کرکے لاش اس تہ خانے میں پھینک دوں اور۔۔۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" تھونچی نے مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی "یہ مالا تمہیں کہیں راستے میں پڑی ہوئی نہیں ملی ہوگی۔" اس نے میرے گلے میں پڑی ہوئی مالا کی طرف اشارہ کیا۔

میں اچھل پڑا۔ اس مالا کی حقیقت کے بارے میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

"بارہ سال سے اس عبادت گاہ میں رہتے ہوئے میں نے بھی کچھ حاصل کیا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے یہاں ایسی شکتی ملی ہے کہ میں دوسروں کے اندر جھانک سکتا ہوں۔ صبح جب تم سے سامنا ہوا تھا تو تمہارے گلے میں یہ مالا دیکھتے ہی میرے دماغ کو جھٹکا سا لگا تھا اور میں نے تمہارے اندر بہت دور تک جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ اگر تم پر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو تمہارے دوست کی مرہم پٹی کرنے کے بعد ایک پاک تم لوگوں کے حوالے کرتا اور یہاں سے رخصت کردیتا لیکن یہ مالا کسی دھوکے باز اور بدکردار شخص کو نہیں مل سکتی۔ یہ مالا دو مرتبہ تم سے الگ ہوئی ہے لیکن ہر بار تمہیں واپس مل گئی کیونکہ اس کے حق دار صرف تم ہو۔"

"تمہارے پاس کیا شکتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے پیروں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔" تھونچی نے جواب دیا "آؤ۔ اب اوپر چلتے ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔"

ہم بدھا کے چٹانی مجسمے سے باہر آگئے۔ اس نے وہ خفیہ راستہ اسی طرح بند کردیا جس طرح کھولا تھا۔

سمبا گہری نیند سو رہا تھا۔ ایک کمرے میں بھیرجانی اور دھنو بھی ایک دوسرے سے لپٹی سو رہی تھیں۔ میں اور تھونچی برآمدے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

ہم آدھی رات تک وہاں بیٹھے رہے۔ تھونچی نے مجھ پر بھروسا کیا تھا اور میں نے بھی اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہمارے دشمن کون تھے۔

تھونچی کو نیند آنے لگی تو ہم اٹھ کر اندر آگئے۔ میں سمبا کے کمرے میں دوسرے بستر پر لیٹ گیا۔ تھونچی اس کمرے میں چلا گیا تھا جہاں اس کی بیوی اور بیٹی سو رہی تھی۔

میں دیر تک جاگتا رہا اور ناگ پال وغیرہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ قدیم حویلی یہاں سے کتنی دور اور کس طرف تھی۔ گزشتہ رات ہم گاڑی پر پانچ چھ گھنٹوں تک سفر کرتے رہے تھے۔ میں نے تھونچی کو بھی اس حویلی کے بارے میں بتایا تھا لیکن اسے بھی کوئی علم نہیں تھا کہ وہ حویلی کس طرف اور کتنی دور ہو سکتی ہے۔

گزشتہ رات جب ہم حویلی سے فرار ہوئے تھے تو ایک اور گاڑی بھی ہمارے تعاقب میں نکلی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ رات بھر پہاڑوں میں ہمیں تلاش کرتے رہے ہوں اور دن میں بھی ہماری تلاش جاری رہی ہو لیکن اس طرف ابھی تک کوئی نہیں پہنچا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہ عبادت گاہ اس حویلی سے بہت دور تھی اور ہمارے لیے محفوظ بھی۔ میں نے اس وقت تک یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا جب تک سمبا چلنے پھرنے کے قابل ہوجاتا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

پھر جب مجھے کندھوں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑ دیا گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟" میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے تھونچی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔

"اٹھو۔ جلدی کرو۔" وہ بولا "تمہارے دشمن یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اپنے دوست کو تہ خانے میں لے چلو۔ جلدی۔ وہ لوگ کسی بھی لمحے عبادت گاہ میں پہنچ سکتے ہیں۔"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کھڑکی سے باہر دھوپ نظر آرہی تھی۔ بہت چمکیلی اور روشن صبح تھی لیکن یہ وقت نظارہ کرنے کا نہیں تھا۔ میں سمبا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔

میں نے جھک کر سمبا کو کندھے پر لادا تو وہ کراہ اٹھا۔ اسی وقت بھیرجانی اور دھنو کمرے میں داخل ہوئیں۔ تھونچی نے چیخ کر بیوی سے کچھ کہا اور ہمیں اشارہ کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ بھیرجانی جلدی سے ہمارے بستر سمیٹنے لگی۔

دھنو بھی ہمارے ساتھ تھی۔ عبادت گاہ کے پچھلے حصے میں پہنچ کر تھونچی نے بدھا کے مجسمے کے پیچھے پہنچ کر وہ خفیہ راستہ کھولا اور جلتی ہوئی مشعل دھنو کے ہاتھ میں تھما کر اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔

"اندر سے راستہ بند کرلو ہمت سنگھ۔" تھونچی نے مجھے

مخاطب کرتے ہوئے کہا "اور خود سے باہر آنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ لوگ چلے جائیں گے تو میں خود ہی آ کر بتادوں گا۔"

میں نے مجسمے کے اندر آہنی کنڈا کھینچ دیا۔ راستہ بند ہوگیا میں مڑ کر دھنو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ مجسمے کے اندر اس خفیہ راستے سے وہ بھی پہلی مرتبہ واقف ہوئی تھی۔

"ہم یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔ نیچے اترو۔" میں نے کہا۔

تہ خانے میں بدھا کا سونے کا مجسمہ دیکھ کر دھنو کے چہرے پر دہشت اور سراسیمگی بڑھ گئی۔ اب مجھے یقین کرلینا پڑا کہ وہ اس تہ خانے میں پہلی مرتبہ آئی تھی۔

"یہ۔ یہ؟" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر ہکلا کر رہ گئی۔

"تمہارا باپ بہت پہلے سے اس تہ خانے سے واقف تھا۔ اس نے رازداری کے خیال سے تم لوگوں کو نہیں بتایا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کیا اسے ہم پر اعتماد نہیں تھا؟" دھنو کی بھویں تن گئیں۔

"یہ بات نہیں ہے دھنو۔" میں نے کہا "بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں اپنے آپ سے بھی چھپانا پڑتا ہے۔ یہ راز اگر تم لوگوں سے چھپایا گیا تھا تو اس کی بھی کوئی وجہ ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے سمبا کو بڑی آہستگی سے دیوار کے قریب فرش پر لٹا دیا۔

سونے کا وہ عظیم القامت مجسمہ دیکھ کر سمبا کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس نے لیٹے لیٹے دونوں ہاتھ مجسمے کے سامنے جوڑ دیے۔

دھنو گھوم پھر کر بدھا کے اس طلائی مجسمے کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس سے مشعل لے کر دیوار کے ایک سوراخ میں پھنسا دی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ٹہلتی ہوئی چٹان کے اس حصے میں چلی جائے جہاں سونے کی کان تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔" میں نے کہا اور خود بھی سمبا کے قریب دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا "وہ کون لوگ تھے۔ کیا تم نے دیکھا تھا انہیں؟"

"ہاں۔ پہلے میں نے ہی دیکھا تھا۔" دھنو نے میرے سامنے زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کی نشست کا انداز ایسا تھا کہ مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا "میں نہانے کے لیے دریا پر گئی تھی۔ دریا کی دوسری طرف پہاڑی پر شور مچانے والی اس مشین کو دیکھا تو واپس بھاگ آئی۔" اس نے شور مچانے والی اس مشین کا جو حلیہ بتایا اس سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کوئی ہیلی کاپٹر تھی "میں نے بابا کو بتایا اور بابا ہم لوگوں کو یہاں لے آئے۔"

"کیا پہلے بھی اس طرح لوگ یہاں آتے رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھی۔" دھنو نے اثبات میں سر ہلایا "پہلے دنوں کے علاوہ جب بھی کوئی اس طرف آتا ہے بابا مجھے اسی طرح کہیں نہ کہیں چھپا دیتا ہے۔ پتا نہیں بابا کو کس بات کا خوف ہے؟"

"تمہیں دوسروں کی نظروں سے چھپا کر وہ تمہیں بچانا چاہتا ہے۔" میں نے جواب دیا "تم چیز ہی ایسی ہو کہ تمہیں دیکھ کر کسی کی نیت میں بھی فتور آسکتا ہے۔"

"مجھے کوئی کھا جائے گا کیا؟" اس نے مجھے گھورا۔

"یہی سمجھ لو لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گی۔" میں نے کہا۔

دھنو چند لمحے خاموش رہی پھر سمبا کی طرف جھک کر اس سے باتیں کرنے لگی۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دھنو نے مشعل اٹھالی اور اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ وہ مجسمے کے اطراف میں گھوم پھر کر بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی اور پھر وہ اس طرف چلی گئی جس طرف جانے سے میں اسے روکنا چاہتا تھا۔ میں اس کی چیخ سن کر اس طرف دوڑا تھا۔

دھنو مشعل ہاتھ میں اٹھائے پھٹی پھٹی سی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ۔ یہ کیا ہے؟" اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"اسی راز کی حفاظت کے لیے تمہارا بابا اس عبادت گاہ میں زندگی گزار رہا ہے۔" میں نے کہا "اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اپنے باپ کے اس راز کو راز ہی رکھو گی۔"

میں دھنو کو ہاتھ سے پکڑ کر واپس لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر سنسنی کے تاثرات تھے۔ اگرچہ بہت سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہونے کے باوجود وہ صرف دو چار مرتبہ ہی شہر گئی تھی۔ اس کی زندگی اس عبادت گاہ میں گزری تھی لیکن اس چمک دار دھات کی قدر و قیمت سے وہ بھی واقف تھی۔

میں دھنو کو باتوں میں لگا کر اس کا دھیان اس طرف سے

ہٹانا چاہتا تھا لیکن یہ کوئی ایسی چیز تو نہیں تھی جس سے آسانی سے دھیان ہٹایا جا سکے۔ وہ بار بار اسی موضوع پر بات کرنے لگتی۔ اسے شاید اس بات کا بھی دکھ تھا کہ اس کے باپ نے اسے کبھی اس راز سے آگاہ نہیں کیا تھا اور ایک اجنبی کو (مجھے) پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ تھونجی نے انہیں اس راز سے آگاہ کیوں نہیں کیا تھا۔

ہمیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا لیکن دھنو اچانک ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں اوپر جا کر دیکھتی ہوں وہ لوگ چلے گئے یا نہیں۔"

"نہیں۔ تم اوپر نہیں جاؤ گی۔" میں نے کہا "تمہارے بابا نے کہا تھا کہ ہم خود سے اس تہ خانے سے باہر نہیں نکلیں گے۔"

"لیکن مجھے بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" وہ ٹھنک کر بولی۔

میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے جانکی یاد آگئی۔ وہ بھی بھوک برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

"اچھا۔" میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا "تم یہیں بیٹھو۔ میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔ شاید آوازوں سے کوئی اندازہ ہوجائے۔"

میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دھنو مشعل لیے نیچے کھڑی رہی۔

بدھا کے مجسمے کے پیٹ میں پہنچ کر میں نے دیوار سے کان لگا دیے کہ اگر کوئی اس ہال میں موجود ہو تو شاید کوئی آواز سنائی دے جائے اور پھر ایک جگہ چمک سی دیکھ کر میں چونک گیا۔

وہ بہت چھوٹا سا سوراخ تھا جس سے باہر کی روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے اس سوراخ سے آنکھ لگا دی اور دوسرے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔

تھونجی کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا تھا۔ اس کا نام میں نہیں جانتا تھا لیکن یہ حویلی کے ان آدمیوں میں شامل تھا جنہوں نے میری دھنائی کی تھی۔

تھونجی کے ہاتھ میں مشعل تھی اور ان دونوں کے ہاتھوں میں آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔ تھونجی کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کا ایک جبڑا سوجا ہوا تھا اور بائیں آنکھ کے نیچے بھی سیاہ دھبا نظر آرہا تھا۔

میرا خون کھول اٹھا۔ یہ سوچ کر ہی میں کانپ اٹھا تھا کہ انہوں نے بھیرجانی کا کیا حشر کیا ہوگا۔ وہ اگرچہ ادھیڑ عمر تھی لیکن بڑی حسین عورت تھی۔ ان جیسے بھیڑیوں سے یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ پوچھ گچھ کے لیے مار پیٹ پر ہی اکتفا کیا ہوگا۔ ایسے لوگ تو عورتوں کو مالِ غنیمت سمجھتے تھے اور بھیرجانی بہرحال ایک خوب صورت عورت تھی۔

وہ لوگ صبح آٹھ نو بجے کے قریب یہاں آئے تھے اور میرے حساب سے اب دوپہر ہونے والی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی پر تشدد کے بعد بھی شاید انہیں یقین نہیں آیا تھا کہ ہم یہاں نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ پہلے بھی عبادت گاہ کے اس حصے کی تلاشی لے چکے ہوں لیکن وہ اپنا اطمینان کرلینا چاہتے تھے۔

دس پندرہ منٹ تک باہر مدھم سی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ اس سوراخ سے اب روشنی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں بڑی آہستگی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ دھنو نے کچھ پوچھنا چاہا تھا لیکن میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ہم سمبا کے قریب آگئے۔

"وہ لوگ ابھی تک عبادت گاہ میں موجود ہیں۔" میں نے سمبا اور پھر دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شاید چند گھنٹے یا آنے والی رات بھی ہمیں یہیں گزارنی پڑے۔"

"میں تو بھوک سے مرجاؤں گی۔" دھنو نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "وہ یقیناً شریف لوگ نہیں ہوں گے۔ اگر انہوں نے بابا یا ماں کو کوئی نقصان پہنچایا تو...."

دھنو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میری نظر خود بخود جھک گئی۔ تھونجی کی حالت میں دیکھ چکا تھا لیکن دھنو کو کچھ بتا کر اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میرا یہ اندازہ غلط نکلا کہ ہمیں رات بھی بدھا کے قدموں میں اسی تہ خانے میں گزارنی پڑے گی کیونکہ مزید ایک گھنٹا گزارنے کے بعد تھونجی تہ خانے میں آگیا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر دھنو بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔ میں نے بھی اسے قریب سے دیکھا تو ایک لمحے کو تو کانپ کر رہ گیا۔ اس کی بائیں آنکھ تقریباً بند ہو رہی تھی اور جبڑا سوجا ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔

"وہ لوگ جاچکے ہیں۔ اب تم لوگ اوپر آسکتے ہو۔" تھونجی نے کہا۔ وہ بمشکل بول پا رہا تھا۔

دھنو اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ باپ کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ابھر آئے تھے۔ وہ تیز لہجے میں مسلسل کچھ بول رہی تھی اور تھونچی بار بار اس کا کندھا تھپتھپا رہا تھا۔

میں نے سمبا کو کندھے پر لاد لیا اور ہم تہ خانے سے باہر آگئے۔

سمبا کو عبادت گاہ کے اس کمرے میں لٹا دیا گیا جہاں بھیرجانی نے دوبارہ بستر لگا دیے تھے۔ اس وقت سہ پہر ہو رہی تھی۔ میں سمبا کو لٹا کر دوسرے کمرے میں آیا تو یہاں کا منظر دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر طیش آنے لگا کہ میں بزدلوں کی طرح تہ خانے میں کیوں چھپ گیا تھا۔

بھیرجانی کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ دھنو اس کے ساتھ لپٹی رو رہی تھی۔

ان دونوں میاں بیوی کو ظلم اور زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا لیکن ان میں سے کسی کے لبوں پر حرفِ شکایت تک نہیں آیا تھا۔ اس کے برعکس دونوں میاں بیوی پریشان تھے کہ ہمیں پورا دن فاقے میں گزارنا پڑا۔ تھونچی نے بیوی کو کچھ کھانے کا بندوبست کرنے کو کہا اور ایک کشادہ طاق میں رکھا ہوا مرہم اور سیال کی بوتلیں اٹھا کر سمبا والے کمرے میں آگیا۔ سمبا ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ تھونچی نے اس کے زخم صاف کیے اور مرہم لگانے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دھنو ہمارے لیے کھانا لے کر آگئی۔ وہ تھال ہمارے سامنے رکھ کر واپس چلی گئی۔ کھانے کے دوران میں، میں نے نہایت مناسب الفاظ میں افسوس کا اظہار کیا کہ میری وجہ سے انہیں مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اگر ہم یہاں نہ آتے تو انہیں یہ تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑتی۔

تھونچی نے بتایا کہ وہ تین آدمی تھے جو ہمیں ان پہاڑوں میں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق ہم ان کے تین چار آدمیوں کو قتل کر کے فرار ہوئے تھے۔

"یہ غلط نہیں ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "تم سمبا کی حالت دیکھ چکے ہو۔ کیا اس کے بعد توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی جاتی؟"

"ان کی سفاکی کا مجھے بھی تجربہ ہو گیا ہے۔" تھونچی نے جواب دیا "منشیات کا کاروبار کرنے والے لوگ بے رحم اور سفاک ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو تو میں نے پہلی مرتبہ دیکھا ہے لیکن ان کے گرو گھنثال کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ ناگ پال ایک خوں خوار بھیڑیا ہے جو سیاست کی آڑ لے کر معصوم زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام بھی بہت برا ہوتا ہے۔"

"انہیں یہاں سے گئے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے" میں نے پوچھا۔

"جب میں تہ خانے میں آیا تھا تو انہیں عبادت گاہ سے گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا۔" تھونچی نے جواب دیا "ان کی جیپ دریا کی دوسری طرف پہاڑیوں میں غائب ہو جانے کے بعد ہی میں تہ خانے میں اترا تھا۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چشمِ تصور سے اس جیپ کو پہاڑوں میں تلاش کرنے لگا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا تھا وہ میں برداشت کرتا رہا تھا لیکن تھونچی اور خصوصاً بھیرجانی پر ہونے والے ظلم اور زیادتی پر میرا خون کھول اٹھا تھا اور میں نے اس پر ہونے والی زیادتی کا بدلہ لینے کے لیے اپنے اندر کی شکتی سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی عقاب کی طرح پہاڑوں کے اوپر بہت بلندی پر پرواز کر رہا ہوں۔ ان پہاڑوں کے نشیب و فراز، وادیاں اور کھائیاں میری نظروں کے سامنے تھیں لیکن وہ جیپ ان پہاڑوں میں نظر نہیں آئی۔ میری پرواز کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور بالآخر وہ جیپ مجھے نظر آگئی جو دریا کے اس پار میلوں دور ہائی وے پر کاکانی کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تینوں اس جیپ میں موجود تھے۔

اس ہائی وے پر مخالف سمت سے لکڑیوں سے لدا ہوا ایک ٹرک آ رہا تھا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔

ایک خطرناک موڑ پر وہ جیپ اچانک ہی ٹرک کے سامنے آگئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش کی مگر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ٹرک جیپ کو دور تک گھسیٹتا ہوا لے گیا۔

"کہاں کھو گئے ہمت سنگھ۔ کیا سوچ رہے ہو؟"

تھونچی کی آواز سن کر میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"وہ... وہ ختم ہو گئے۔ تینوں ختم ہو گئے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "جیپ کے ساتھ ان تینوں کے پرخچے اڑ گئے۔ کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ کسی کو زندہ بچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔"

"کون۔ کس کی بات کر رہے ہو؟" تھونچی نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔

"وہ تینوں... جو یہاں آئے تھے۔" میں نے جواب دیا اور میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور میں جیسے ہوش میں

تھونچی بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے آدھے گھنٹے بعد میں کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ سامنے وہ گھاٹی نظر آ رہی تھی جو مویشیوں کے لیے چراگاہ تھی۔ وہاں مجھے تھونچی نظر آیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مویشی دریا کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ قدِ آدم جھاڑیوں میں مجھے نیلی چادر کی جھلک بھی دکھائی دی۔ میرا خیال تھا وہ دھنو تھی جو مویشیوں کو پانی پلانے کے بعد دریا کی طرف سے ہانکتی ہوئی لا رہی تھی۔

جب وہ جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آئی تو میرا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ دھنو نہیں، بھیرجانی تھی۔ اس معصوم عورت کو دیکھ کر میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ بارہ سال پہلے اسی کو زمیندار کی ہوس سے بچانے کے لیے تھونچی نے راتوں رات اپنا آبائی گاؤں چھوڑ دیا تھا اور آج وہ اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی۔

میں بھیرجانی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اپنے دونوں کندھوں پر ہلکا سا بوجھ محسوس کر کے چونک گیا۔ میں بڑی بے ڈھنگی سے پیچھے مڑا۔

وہ دھنو تھی جو اب میرے سامنے کھڑی میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی میرے کندھوں پر تھے۔ اس کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی چمک تھی۔

میں نے سمبا کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بستر پر گہری نیند سو رہا تھا۔ میں نے دھنو کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹا دیے۔ اس نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے کچھ کہنے سے روک دیا۔ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرے گی جو شاید میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو لیکن اس نے اچانک ہی مجھے ہلکا سا دھکا دیا اور مڑ کر تیزی سے باہر دوڑ گئی۔

میں کھڑکی کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے دھنو کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ لڑکی بے حد معصوم تھی۔ میں ایک بار پھر مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مویشی چراگاہ میں چر رہے تھے اور بھیرجانی مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔

نجانے کیا بات تھی کہ میں جب بھی بھیرجانی کو دیکھتا تھا، مجھے شوبھا یاد آجاتی تھی اور اس وقت بھی شوبھا مجھے بڑی شدت سے یاد آنے لگی تھی۔

مجھے کھٹمنڈو سے نکلے ہوئے ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ شوبھا ان دنوں اسپتال میں تھی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں ہوگی؟ اسپتال ہی میں یا کہیں اور؟ میں نے مایا متی کو اگرچہ اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا لیکن وہ کس حال میں تھی؟ کچھ کہنا مشکل تھا۔

تقریباً ایک ہفتہ پہلے پوکھارا سے ٹیلی فون پر انسپکٹر بریندرا سے میرا رابطہ ہوا تھا اور پانچ دن پہلے جب میں پوکھارا سے کھٹمنڈو کے لیے روانہ ہوا تھا تو پوکھارا کے چیف انسپکٹر نے کہا تھا کہ وہ فون پر انسپکٹر بریندرا کو میری روانگی کی اطلاع دے دے گا۔ اس نے یقیناً ایسا کیا ہوگا۔ بریندرا اور اعظم خان کو میرا انتظار ہوگا لیکن میں کھٹمنڈو نہیں پہنچ سکا تھا۔ کیرتی پور میں یوگی گوتم بھوش نے مجھے بس سے اتار لیا تھا۔ گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج مجھ سے نیلگری کی مالا چھیننا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی پراسرار قوتوں سے مجھے کسی مصیبت میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن مالا کی شکتی نے مجھے ان کے طاغوتی حصار سے تو نکال دیا مگر میں ناگ پال کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گیا اور اس کے بعد جو کچھ بھی ہوا وہ آپ جان چکے ہیں۔

اور اس وقت میں کھڑکی میں کھڑا بہت دور برف پوش پہاڑی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا بریندرا اور اعظم خان بھی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے؟

آہٹ پا کر میں ایک بار پھر پیچھے مڑ گیا۔ وہ بھیرجانی تھی جس نے دونوں ہاتھوں میں کچھ پھل اٹھا رکھے تھے۔ میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھ گیا۔

○☆○

تین دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

تھونچی صبح ہوتے ہی اپنے کھیتوں میں چلا جاتا۔ کھانا تیار کرنے اور مویشیوں کی دیکھ بھال کی ذمے داری بھیرجانی کے سپرد تھی۔ وہ اپنے ان کاموں میں مصروف رہتی تھی اور دھنو... وہ سارا دن ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی رہتی۔ کبھی باپ کے پاس کھیتوں میں، کبھی چراگاہ میں، کبھی دریا پر اور کبھی ہمارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ دھنو کبھی سمبا کے پاس بیٹھی ہوتی تو میں بھی کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور تھونچی کے کاموں میں تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتا۔

تھونچی ایک مرہم سے سمبا کا باقاعدگی سے علاج بھی

کر رہا تھا۔ یہ مرہم انہی پہاڑیوں میں پائی جانے والی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا تھا جس کے دو تین مرتبہ لگانے سے ہی زخم بھر جاتے تھے لیکن سمبا کو اس مرہم سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا بلکہ زخم خراب ہوتے جا رہے تھے۔

چوتھے روز میں نے شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر بریندرا سے مل کر سمبا کو شہر لے جانے کا بندوبست کروں گا لیکن تھونچی نے مجھے روک دیا کہ ہر طرف مجھے تلاش کیا جا رہا تھا اور ان حالات میں میرا یہاں سے کسی اور طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ تاہم وہ خود شہر جانے کو تیار ہو گیا۔

تھونچی راشن وغیرہ لینے کے لیے مہینے میں ایک بار شہر جاتا رہتا تھا۔ شہر کے راستوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ میں نے اسے انسپکٹر بریندرا کے بارے میں سب کچھ سمجھا دیا اور صبح آٹھ بجے کے قریب وہ کشتی پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ میں اور دھنو گھاٹ پر کھڑے دیر تک کشتی کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

وہ دن میں نے سمبا کے پاس رہ کر ہی گزارا۔ وہ خاصی تکلیف میں تھا۔ دھنو بار بار ہمارے کمرے کے چکر لگا رہی تھی۔ وہ بھی سمبا کے لیے خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ کبھی وہ ہمارے پاس بیٹھ جاتی اور کبھی باہر چلی جاتی۔

شام سے ذرا پہلے وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ نمایاں تھی۔

"کیا ہوا۔ کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سامنے والی پہاڑیوں پر شور مچانے والی ایک مشین اس طرف آ رہی ہے۔" اس نے اشارے سے بتایا۔

میں اٹھ کر باہر کی طرف دوڑا اور ڈھلان پر درختوں میں چھپ کر سامنے والی پہاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی آواز تو سنائی دے رہی تھی لیکن وہ گاڑی ابھی تک نگاہوں میں نہیں آئی تھی۔ دھنو بھی میرے قریب کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر کوئی مشتبہ گاڑی ہوئی تو دھنو، بھیرجانی اور سمبا کو تہ خانے میں پہنچا دوں گا اور خود صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ گاڑی سامنے آ گئی۔ وہ بغیر ہڈ کی جیپ تھی اور اس پر زرد رنگ کا جھنڈا دیکھ کر میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ تھونچی اور میرے بیچ پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ اگر انسپکٹر بریندرا اس کے ساتھ کسی گاڑی پر آیا تو وہ گاڑی پر زرد رنگ کا کپڑا جھنڈے کی طرح باندھ دے گا۔

پہاڑیوں میں چکراتی ہوئی وہ جیپ کبھی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور کبھی سامنے آ جاتی۔ جیپ میں تین آدمی سوار تھے۔ دو آگے اور ایک پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے والا زرد لباس کی وجہ سے پہچان میں آ رہا تھا۔ وہ تھونچی تھا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ جیپ ڈھلان کے نیچے آ کر رک گئی۔ میں درختوں کی آڑ سے نکل کر تیزی سے اس طرف بڑھا۔ انسپکٹر بریندرا کے ساتھ ڈاکٹر نارائن کو دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ ڈاکٹر نارائن بھی اسی اسپتال میں تھا جہاں پہلے میں زیرِ علاج رہا تھا۔

انسپکٹر بریندرا مجھ سے اس طرح گلے ملا تھا جیسے برسوں سے بچھڑے ہوئے سگے بھائی ملتے ہیں۔ ڈاکٹر نارائن نے بھی بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جیپ میں رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھا لیا۔ تھونچی جیپ سے اتر کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا عبادت گاہ کی طرف چلا گیا۔

دس منٹ بعد ہم سمبا والے کمرے میں موجود تھے۔ ڈاکٹر نارائن نے اس کے زخم صاف کیے۔ تھونچی ایک ماہر کمپاؤنڈر کی طرح اس کی مدد کر رہا تھا۔

"ہاتھوں اور پیروں کے زخم بگڑ چکے ہیں۔ باقاعدہ علاج ہونا ضروری ہے ورنہ....."

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔" انسپکٹر بریندرا نے کہا "میں جانتا ہوں اس کا باقاعدہ علاج اسپتال ہی میں ہو سکتا ہے۔ اس وقت تو تم جو کچھ کر سکتے ہو وہ کرو۔ صبح ہم اسے اسپتال لے چلیں گے۔"

"میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا۔" ڈاکٹر نارائن نے جواب دیا اور زخموں کی ڈریسنگ کرنے لگا۔

اس رات ڈاکٹر نارائن سمبا والے کمرے میں سویا تھا اور میں اور انسپکٹر بریندرا عبادت گاہ کے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

انسپکٹر بریندرا کے کہنے کے مطابق جس روز میں نے دھرچتن نامی قصبے سے وہاں کے پولیس اسٹیشن کے ذریعے ان سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اس سے اگلے ہی روز اس پولیس آفیسر سے اسے پدمی کے قریب دو آدمیوں کے قتل کی اطلاع بھی مل گئی تھی اور پھر اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ وہ ناگ پال کے آدمی تھے جنہیں قتل کر کے پانچ سو کلو ہیروئن چھینی گئی تھی۔

بریندرا کو اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ اس واردات کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔ اس نے [illegible] دھرچتن اور پدمی کے پولیس آفیسروں کو اطلاع دے دی کہ مجھے تلاش کر کے میری حفاظت کی جائے۔

انسپکٹر بریندرا کے لیے یہ اطلاع خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی کہ جس روز پدمی سے دو تین میل دور یہ واقعہ رونما ہوا تھا اس رات چانگ لی بھی پدمی میں موجود تھا لیکن اگلے ہی روز وہ پراسرار طور پر پدمی سے غائب ہو گیا تھا اور پھر بریندرا کے لیے یہ اطلاع بھی بڑی سنسنی خیز تھی کہ ناگ پال بھی اپنے کچھ آدمیوں کو لے کر پدمی کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ علاقہ اگرچہ انسپکٹر بریندرا کے دائرہ کار میں نہیں تھا لیکن وہ مجھے اس طرح بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ موت کے فرشتے میرے تعاقب میں روانہ ہو چکے ہیں۔ اس نے بھی پولیس کی ایک پارٹی تیار کر کے اس طرف روانہ کر دی تاکہ مجھے تلاش کر کے بحفاظت کھٹمنڈو لے آیا جائے۔

پولیس پارٹی بھی مجھے تلاش کرتی رہی۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ شاید میں انڈیا کی سرحد پار کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس تلاش کے دوران جاڑا کوٹ نامی بستی کے قریب ناگ پال کی پارٹی سے تصادم بھی ہو گیا تھا جس میں ایک پولیس والا زخمی ہوا تھا اور ناگ پال کی پارٹی کا ایک آدمی مارا گیا تھا۔

پولیس والے بھی ناگ پال کی طرح میری تلاش سے مایوس ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید میں ببلا کے ساتھ انڈیا کی سرحد پار کر گیا ہوں اور پھر جب پوکھارا کے پولیس چیف کے توسط سے بریندرا سے میری بات ہوئی تو اسے اطمینان ہوا تھا۔

انسپکٹر بریندرا کو ببلا کی موت کا سن کر افسوس ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ پدمی میں دو آدمیوں کے مارے جانے اور پانچ سو کلو ہیروئن چھن جانے سے ناگ پال گویا پاگل ہو گیا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے آدمیوں کو قتل کر کے ہیروئن چھیننے والا کون ہے۔ سومبا چونکہ ناگ پال کی سرگرمیوں کے خلاف میرا ساتھ دے رہا تھا اس لیے ناگ پال نے اسے بے پناہ تشدد کا نشانہ بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کا ایک اور آدمی بھی ناگ پال کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

سومبا کے آدمی بھی خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے۔ اس کا گروہ اگرچہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن وہ ناگ پال کے گروہ سے بھڑ گئے۔ اس طرح شہر میں ایک خوفناک گینگ وار شروع ہو گئی جس میں دونوں طرف کے کم از کم چار آدمی مارے گئے تھے۔ کم از کم پندرہ روز تک شہر تقریباً بند رہا تھا۔ پولیس بڑی مشکل سے اس صورتِ حال پر قابو پا سکی تھی۔ درجنوں غنڈوں اور بدمعاشوں کو پکڑ کر سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا۔

"ناگ پال حسبِ معمول ایک بار پھر روپوش ہو گیا ہے۔" انسپکٹر بریندرا کہہ رہا تھا "چار پانچ روز پہلے کاکانی ہائی وے پر اس کے تین آدمی ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ تباہ شدہ جیپ سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئی تھیں جس سے اندازہ لگایا گیا کہ ناگ پال بھی اس طرف پہاڑوں میں کسی بستی میں روپوش ہے۔ اسے مختلف بستیوں میں تلاش کیا جا رہا ہے لیکن ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"وہ کسی بستی میں نہیں، ایک بہت قدیم حویلی میں ٹھہرا ہوا ہے۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا اور پھر اس حویلی کے بارے میں بتانے لگا۔

"ان پہاڑوں میں جگہ جگہ تمہیں ایسی قدیم حویلیاں ملیں گی۔" انسپکٹر بریندرا نے کہا "یہاں سے تبت تک ان پہاڑوں میں لاتعداد راجدھانیاں ہوا کرتی تھیں۔ جاگیرداروں اور سرداروں کی حکمرانی تھی اس خطے پر۔ عوام تو جھونپڑوں اور کچے گھروں میں رہتے تھے اور سرداروں نے اپنے لیے مضبوط قلعے اور شان دار حویلیاں بنا رکھی تھیں۔ اب تم پتا نہیں، کس حویلی کی بات کر رہے ہو!"

"میں واقعی اس حویلی کی نشان دہی نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا "ہم رات کے وقت وہاں سے فرار ہوئے تھے اور رات ہی رات میں لینڈ کروزر پر سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ وہ گاڑی اب بھی وہاں چٹانوں میں موجود ہے۔ اس میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔" میں نے ان چٹانوں کی طرف اشارہ کیا جہاں اس روز گاڑی چھوڑی تھی اور اس کے بعد سے میں اس طرف نہیں گیا تھا "اور وہ گاڑی ناگ پال کی ہے۔"

"ناگ پال کی!" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں اسے کیرتی پور میں پیش آنے والے واقعے اور اپنے پکڑے جانے کے بارے میں بتانے لگا۔

"پہلے اس حویلی میں ناگ پال کے آدمی مجھے تشدد کا نشانہ بناتے رہے۔ اس وقت تک ناگ پال سامنے نہیں آیا تھا۔ بعد میں وہ سمبا کو بھی پکڑ کر یہاں لے آئے۔ سمبا کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا وہ تم دیکھ چکے ہو اور پھر اس رات ناگ پال کی گاڑی پر مجھے وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کے ایک دن بعد ناگ پال کے تین آدمی ہمیں

تلاش کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ تھونجی نے ہمیں غاروں میں چھپا دیا تھا۔ ان بدبختوں نے میرے بارے میں پوچھنے کے لیے تھونجی پر بھی تشدد کیا اور اس کی بیوی کے ساتھ بھی زیادتی کی۔ وہ تینوں وہی تھے جو واپس جاتے ہوئے کاکانی روڈ پر حادثے کا شکار ہوگئے۔" میں نے کہا لیکن بریندرا نے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے اس حادثے کا پتا کیسے چلا۔

"ناگ پال کی سرگرمیاں اب خطرناک حد تک بڑھ گئی ہیں۔" بریندرا نے کہا "وہ بعض قبائل کو بغاوت پر اکسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے سیدھے سادے ہیں اور اندیشہ ہے کہ ناگ پال کی زہر بھری باتیں ان کے اذہان کو پراگندہ نہ کردیں اس لیے ناگ پال اور اس کے قریبی ساتھیوں کی گرفتاری کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کی تلاش جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک روپوش نہیں رہ سکے گا۔"

ناگ پال! میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ ایسے ہی لوگ اپنے گھر اور اپنے ملک کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی ذات اور اپنے مفاد سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اپنی چوہدراہٹ کے لیے وہ بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ناگ پال کے بارے میں تو پہلے ہی سنا تھا کہ وہ مہا حرامی آدمی ہے اور پھر اسے جنرل کھوراٹ جیسے آدمی کا آشیرباد مل گیا تھا۔ اس کی شہ پر ناگ پال زیادہ پھیل گیا تھا اور اب وہ قبائلیوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قسم کی بغاوتیں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جن کا کوئی کاز نہ ہو لیکن جان و مال کا نقصان تو بہرحال ہوتا ہی ہے۔

میں اور بریندرا دیر تک ناگ پال کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر موضوع بدل گیا۔ میں نے شوبھا کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ شوبھا اب بالکل ٹھیک ہے اور مایا متی کے ساتھ رہ رہی ہے۔

"ہم نے تو اسے کہا تھا کہ وہ انڈیا واپس چلی جائے۔ اب وہاں اسے کوئی خطرہ نہیں ہے لیکن وہ تمہارے اور ببلا کے بغیر واپس جانے کو تیار نہیں۔ ادھر تم دونوں کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ تم لوگوں کے لیے بہت پریشان ہے۔ اسے ببلا کے بارے میں پتا چلے گا تو بہت دکھ ہوگا۔"

ببلا کا دکھ تو مجھے بھی تھا۔ تھائی، جانکی اور ببلا۔ ان تینوں کو شاید میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ کمرے میں اگرچہ بھیرجانی نے ہمارے لیے بھی یاک کی کھالیں بچھا دی تھیں لیکن ہم دونوں برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی بیٹھے رہے ہمارے چاروں طرف سناٹا تھا۔ تاریکی بھی اتنی گہری تھی کہ چند گز آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

بریندرا سیڑھیوں پر ہی دراز ہو کر اونگھنے لگا۔

وقت دھیرے دھیرے رینگ رہا تھا اور پھر میں بھی شاید اونگھ گیا تھا۔

آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ دن کا مدھم سا اجالا پھیل رہا تھا لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا۔ میں کچھ دیر اسی جگہ پر پڑا رہا پھر اٹھ کر ڈھلان پر دریا کی طرف چلنے لگا۔

میں گھاٹ پر پانی میں پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نظریں بائیں طرف اٹھ گئیں۔ تقریباً بیس پچیس گز آگے دریا کے کنارے پر گنجان جھاڑیوں پر نیلے رنگ کا کوئی کپڑا پڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کل شام یا دن میں کسی وقت دھنو یا بھیرجانی نے یہ کپڑا دھو کر یہاں ڈالا ہوگا اور اسے اٹھانا بھول گئی تھی۔

میں اٹھ کر جھاڑیوں کی طرف چلنے لگا۔ قریب پہنچ کر میں نے جھاڑیوں پر پڑا ہوا وہ کپڑا اٹھا لیا۔ وہ دھنو یا بھیرجانی کی ساڑی نما چادر تھی۔ اس سے آگے جھاڑیوں پر ایک اور ویسی چادر پڑی ہوئی تھی۔ وہ چادر اٹھانے کے لیے میں آگے بڑھا ہی تھا کہ جھاڑیوں سے آگے شڑاپ کی آواز سنائی دی۔

میں نے اس طرف دیکھا تو میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ دھنو اور بھیرجانی جھاڑیوں کے قریب ہی دریا کے پانی میں کھڑی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ان کے رخ دوسری طرف تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دونوں چادریں وہیں چھوڑ دیں اور جھاڑیوں میں دبک کر رینگتا ہوا گھاٹ پر واپس آ گیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے لگا۔

پندرہ بیس منٹ بعد دونوں ماں بیٹیاں اس طرف سے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان دونوں نے چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ بالوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ دونوں میرے قریب رک گئیں اور پھر دھنو میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی شوخ سی مسکراہٹ تھی۔

مجھ سے باتیں کرتے ہوئے دھنو نے اچانک ہی مجھے دھکا دے کر پانی میں گرا دیا اور کھڑے ہو کر بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔ اس کے قہقہے بڑے زوردار تھے۔ بھیرجانی بھی ہنس رہی تھی۔

دھنو کی اس معصوم سی شرارت پر میں بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں ہنستی ہوئی چلی گئیں اور میں

دیر تک دریا میں پیراکی کرتا رہا۔

نو بجے کے قریب ہم عبادت گاہ سے رخصت ہو رہے تھے۔ دھنو کی آنکھوں میں اداسی تھی۔ بھیرجانی بھی افسردہ سی نظر آ رہی تھی۔

تھونجی بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اسے اگلی بستی سے اپنی کشتی واپس لانی تھی جو وہ صبح وہاں چھوڑ گیا تھا۔ واپسی پر وہ بریندرا کے ساتھ جیپ پر آیا تھا اور کشتی وہیں بستی کے گھاٹ پر رہ گئی تھی۔

سمبا کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں اور تھونجی اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ نارائن اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور بریندرا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ بریندرا سادہ لباس میں تھا اور جیپ پر بھی پولیس کا کوئی نشان نہیں تھا۔ اس پر زرد رنگ کے کپڑے کا جھنڈا اب بھی لگا ہوا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہاڑی راستوں پر چکرانے کے بعد جیپ ہائی وے پر واقع بستی میں پہنچ کر رک گئی۔ تھونجی نے سمبا کی پیشانی پر بوسہ دیا اور مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ بریندرا نے اس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ دو چار دن میں ہم سے ملنے کے لیے ضرور آئے گا۔ تھونجی کو ڈراپ کر کے جیپ ہائی وے پر آ گئی اور تیز رفتاری سے کھٹمنڈو کی طرف دوڑنے لگی۔

جیپ تقریباً ایک گھنٹے بعد شہری حدود میں داخل ہوئی تھی۔ میں ایک مہینے بعد واپس آیا تھا اور شہر مجھے بدلا بدلا سا لگ رہا تھا حالانکہ میری عدم موجودگی میں یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

جیپ شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی اسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو کر رک گئی۔ سمبا کو ایک اسٹریچر پر منتقل کر دیا گیا۔

"اس کا خیال رکھنا نارائن!" بریندرا نے کہا "ہم شام کو یا کل صبح آئیں گے۔"

میں نے بھی سمبا کو تسلی دی کہ اب وہ بہت جلد اچھا ہو جائے گا۔ میں اس سے ملنے کے لیے آتا رہوں گا۔

جیپ اسپتال سے نکل کر شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی کالی کا استھان ڈسٹرکٹ کی طرف آ گئی اور جب جیپ مایا متی کے مکان کے سامنے رکی تو میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مایا متی سے اپنے اس مکان کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتایا تھا اور پھر اچانک مجھے یاد آ گیا کہ بریندرا نے عبادت گاہ میں مجھے بتایا تھا کہ شوبھا اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد مایا متی کے ساتھ رہ رہی ہے۔

"کوشش کرنا کہ تم گھر سے باہر نہ نکلو۔ میں شام کو کسی وقت آؤں گا۔" بریندرا نے کہا اور جیپ پر لگا ہوا زرد جھنڈا اتار کر میری طرف بڑھا دیا "اور یہ اپنے پاس ہی رکھ لو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جیپ حرکت میں آ کر آگے بڑھ گئی۔ میں اس وقت تک اس کی طرف دیکھتا رہا جب تک وہ اگلا موڑ گھوم کر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ میں گھوم کر مکان کے گیٹ پر دستک دینے لگا۔

گیٹ کا ذیلی دروازہ کھلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا۔ مایا متی کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی لیکن میں جیسے ہی آگے بڑھا وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"اے۔ ہٹو۔ کون ہو تم؟" وہ غصے میں چلائی۔

مجھے مایا متی کے اس طرز عمل پر بڑی حیرت ہوئی لیکن پھر اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ میں تقریباً ایک مہینے تک مہذب دنیا سے دور ایسے لوگوں میں رہا تھا جو جدید تہذیب سے قطعی ناآشنا تھے اور اس ایک مہینے کے دوران میں میں بھی ان جیسا ہی ہو گیا تھا۔ بے حد بڑھے ہوئے سر کے بال، بے ترتیب داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ میں صرف جینز پہنے ہوئے تھا جبکہ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔

"سوری مایا متی۔" میں نے کہا "میرا خیال تھا کہ اتنے عرصے بعد مجھے دیکھو گی تو تڑپ کر سینے سے لگا لوگی لیکن تم نے تو مجھے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ ٹھیک ہے۔ میں۔"

"ارے تم!" مایا متی چیخ اٹھی۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دروازے سے اندر کھینچ لیا اور واقعی میرے سینے سے لپٹ گئی "یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ کہاں غائب ہو گئے تھے اور ببلا کہاں ہے؟ تم دونوں کی وجہ سے ہم تو اس قدر پریشان ہیں کہ۔" وہ رک کر دروازے سے باہر دیکھنے لگی "ببلا کہاں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟"

"ببلا اب ہم میں نہیں رہی مایا متی۔" میں نے افسردگی سے جواب دیا۔

"کیا۔!" وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی "کیا مطلب۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "بعد میں بتاؤں گا۔ اندر چلو۔ شوبھا کیسی ہے؟"

"شوبھا دیدی اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ تم دونوں کے لیے پریشان رہتی ہے۔ وہ ببلا کا سنے گی تو اسے بہت دکھ ہوگا۔"

آؤ۔ اندر آؤ۔" مایا متی کا لہجہ بھی افسردہ تھا۔

ہم برآمدے میں پہنچے ہی تھے کہ شوبھا دروازے میں نمودار ہوئی اور ٹھٹک کر رک گئی۔ چند لمحے بڑی گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"شوبھا دیدی۔ یہ کیا کر رہی ہو۔۔۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ میں اپنے محسن کو نہیں پہچان سکتی۔" شوبھا نے مایا متی کی بات کاٹ دی اور پھر مجھ سے الگ ہٹتے ہوئے بولی "بملا کہاں ہے؟"

مجھے یقین تھا کہ شوبھا بھی سب سے پہلے بملا ہی کے بارے میں پوچھے گی۔ میں نے مایا متی کو بتا دیا تھا تو شوبھا سے چھپانے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے مایا متی کی طرف دیکھا اور مایا متی نے بہت دھیمے لہجے میں شوبھا کو بتا دیا کہ بملا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

شوبھا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ میں اور مایا متی اسے اندر لے آئے۔

ہم بہت دیر تک بملا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ مایا متی چائے بنا کر لے آئی اور اس کے ساتھ ہی ہمارا موضوع بھی بدل گیا۔ میں انہیں اپنے بارے میں بتا رہا تھا کہ میں اتنا عرصہ کہاں غائب رہا تھا اور مجھ پر کیا بیتی تھی۔

میں نے پہلی مرتبہ شوبھا کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر سرخی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کم اور زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

"جاؤ۔ اپنا حلیہ درست کرو۔ دوپہر ہو رہی ہے۔ تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ مایا۔ تم جلدی سے کھانا تیار کر لو۔" شوبھا نے پہلے مجھے اور پھر آخری الفاظ مایا متی کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے۔

"تمہارے کپڑے اور کچھ چیزیں اب بھی میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ آؤ۔ پہلے وہ چیزیں تمہیں دکھا دوں۔" مایا متی کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

وہ مجھے اس کمرے میں لے آئی جہاں پہلے میری رہائش ہوا کرتی تھی۔ یہ کمرا اب شوبھا کے استعمال میں تھا۔ بیڈ پر اس کے کچھ کپڑے بکھرے ہوئے تھے جنہیں مایا متی نے اٹھا کر ایک کرسی پر ڈال دیا اور دیوار کے ساتھ استادہ الماری کا ایک دروازہ کھول دیا۔ اس میں میرے کچھ کپڑے بڑے سلیقے سے تہہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ ایک دراز میں شیونگ کا سامان بھی رکھا ہوا تھا۔ میں شیونگ کا سامان اور کپڑے اٹھا کا باتھ روم میں گھس گیا۔

میں ایک گھنٹے بعد باتھ روم سے نکلا تو اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ داڑھی مونچھیں تو میں نے صاف کر لی تھیں لیکن سر کے بال خود سے نہیں کاٹ سکتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں ہی مسکرا دی تھیں۔

کھانے کے بعد مجھے شوبھا والے کمرے ہی میں آکر بستر پر لیٹ گیا اور جو سویا ہوں تو رات نو بجے سے پہلے میری آنکھ نہیں کھل سکی تھی۔ مایا متی نے بتایا کہ شام کو بریندر اور انسپکٹر اعظم آئے تھے لیکن انہوں نے مجھے جگانے سے منع کر دیا تھا۔

"تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں یہاں آکر بریندر اور اعظم خان جیسے سچے اور مخلص آدمی مل گئے ہیں۔ مجھے بھی ان سے بڑا حوصلہ ملا ہے۔" شوبھا نے کہا۔

"خوش قسمتی تو تمہاری ہے کہ نینی تال سے تنک پور کی طرف آتے ہوئے راستے میں انسپکٹر اعظم خان سے ملاقات ہو گئی تھی۔" میں نے کہا "اگر یہ ہم سے نہ ملا ہوتا تو ہم سرحد پار کر کے نیپال میں داخل نہ ہو پاتے اور دیش مکھ نجانے تمہارا کیا حشر کر ڈالتا۔"

"شکر گزار تو مجھے واقعی تمہارا ہونا چاہیے۔" شوبھا بولی "اگر تم سے رشی کیش میں ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو دیش مکھ میری ساری جائداد اینٹھ کر مجھے واقعی مار ڈالتا۔ تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی اور وہ بے چاری بملا۔۔۔ بھگوان اس کی آتما کو شانتی دے۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی۔

"رشی کیش پر یاد آیا کہ کئی روز پہلے یوگی گوتم بھوش سے ملاقات ہوئی تھی۔ دھیراج اور گوتم بھوش یاد ہیں نا تمہیں؟"

"میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔" میں ان کے تذکرے پر چونک سا گیا تھا "گوتم بھوش سے ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟"

"یہ شاید ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔" شوبھا نے جواب دیا "میں مایا متی کے ساتھ جگن ناتھ مندر گئی تھی۔ واپسی پر ہم جیسے ہی مندر کی سیڑھیوں سے اترے، وہ ہمیں راستے میں کھڑا مل گیا۔ تم سے بہت ناراض لگتا تھا۔ بہت شکایت کر رہا تھا۔"

"میرے بارے میں کوئی خاص بات؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔ کہہ رہا تھا تم راستے سے بھٹک گئے ہو اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ تم نے اس کی کسی مالا پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ مالا اسے واپس کر دی جائے ورنہ وہ تمہیں نہ

رے گا۔" شوبھا چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا "تم تو ایسے نہیں ہو کہ کسی کی چیز پر قبضہ کر سکو۔ وہ کون سی مالا ہے؟"

"یہ۔" میں نے شرٹ کا بٹن کھول کر مالا اسے دکھائی "یہ مالا ہے جس کے پیچھے ایک بہت بڑا راز پوشیدہ ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ان دونوں شیطانوں نے مجھے قتل کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

"میں سمجھی نہیں؟" شوبھا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نہیں سمجھ سکو گی شوبھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن یہ سمجھ لو کہ وہ دونوں یوگی انسان نہیں شیطان ہیں اور وہ ہر قیمت پر مجھ سے یہ مالا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ایک بہت ہی خوفناک قسم کی کوشش کر چکے ہیں جس میں ناکام ہونے کے بعد گوتم بھوش نے تمہیں کوئی پٹی پڑھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ شکر ہے کہ اس نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھے اب اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

"وہ مجھے کوئی نقصان شاید اس لیے نہیں پہنچا سکا کہ اس روز جگن ناتھ مندر میں کوئی منتری بھی آیا ہوا تھا اور لاتعداد پولیس والے وہاں موجود تھے۔" شوبھا نے بتایا۔

"اس جیسے شیطان پولیس کی پروا نہیں کرتے اور شاید پولیس ان کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتی۔" میں نے جواب دیا "بہرحال، تم اپنا ذہن مت الجھاؤ۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔"

اور پھر اسی رات میں نے شوبھا کو مشورہ بھی دیا تھا کہ اس کا دشمن (دیش مکھ) ختم ہو چکا ہے۔ اب اسے ہندوستان میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ جے پور واپس چلی جائے۔ وہاں ٹھاکر بھانوت سنگھ اور روپ متی موجود ہیں اور اسے اپنا کاروبار جمانے میں مدد دے سکتے ہیں لیکن شوبھا اپنی اس ضد پر قائم رہی کہ وہ میرے بغیر ہندوستان نہیں جائے گی اور میرا وہاں جانا ابھی مشکل تھا۔ میرے سامنے ایک بہت وسیع محاذ کھلا ہوا تھا۔ جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جاتا، میں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا تھا۔

اس رات ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مایا متی کی آج چھٹی تھی اور صبح اسے ڈیوٹی پر جانا تھا اس لیے وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شوبھا چاہتی تھی کہ میں اس کے کمرے میں سو جاؤں۔ وہ لاؤنج میں صوفے پر لیٹ جائے گی لیکن میں نے ایسا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

ایک تیسرا کمرا بھی موجود تھا جہاں لکڑی کا ایک تخت اور کچھ فالتو چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔ نیلگری کا کرسٹل کا بنا ہوا مجسمہ میں نے اسی کمرے میں تخت پر لا کر ڈالا تھا۔

میں اس کمرے میں آگیا۔ اس کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میری نظریں تخت کی طرف اٹھ گئیں جس پر بستر بچھا ہوا تھا۔ میں چشم تصور سے تخت پر کرسٹل کے مجسمے کو دیکھنے لگا اور پھر سر جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں حالانکہ دن میں کئی گھنٹے سو چکا تھا لیکن اس وقت بستر پر لیٹتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ سوتے میں مجھے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سینے پر بوجھ سا پڑا ہوا تھا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہوا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ میرے سینے پر سے بوجھ ہٹ گیا۔ میرا خیال تھا شوبھا ہوگی لیکن وہ چہرہ دیکھتے ہی میں اچھل پڑا۔

وہ نیلگری تھی جس کا ہاتھ میرے سینے پر رکھا ہوا تھا لیکن میری آنکھ کھلتے ہی اس نے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا ہٹ کر کروٹ کے بل لیٹی میرے چہرے کو تک رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ اسے دیکھ کر میں بدحواس سا ہو گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور تنفس بے ربط ہونے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن نیلگری اسی طرح کروٹ کے بل لیٹی رہی۔ اس نے سر کسی قدر اوپر اٹھا کر ہتھیلی پر ٹکا رکھا تھا۔ اس کا لیٹنے کا یہ انداز بڑا منفرد تھا۔ مجھے بچپن میں دیکھی ہوئی ایک فلم قلوپطرہ یاد آگئی۔ الزبتھ ٹیلر نے اس فلم میں ملکۂ مصر کا رول کیا تھا اور اس کے لیٹنے کا انداز بھی یہی تھا اور اس انداز کو بڑی شہرت ملی تھی۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔" میں ہکلا کر رہ گیا۔ یہ شاید اس کے حسن کا دبدبہ تھا کہ آواز میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی "تت۔۔۔ نیلگری تم تو واپس چلی گئی تھیں!"

"ہاں۔۔۔ لیکن مجھے تمہاری اس دوست کی وجہ سے واپس آنا پڑا۔"

نیلگری کی رس گھولتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بھی بیڈ سے اٹھ کر سامنے کرسی پر بیٹھ گئی "وہ شیطان رشی کیش سے واپس آگیا ہے۔ اس نے تمہاری دوست شوبھا پر وار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بروقت وہاں پہنچ گئی۔ اس کے بعد میں نے ایک لمحے کو بھی تمہاری دوست کو تنہا نہیں چھوڑا۔ گوتم بھوش اس کے بعد بھی

کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اسے شوبھا کے قریب نہیں آنے دیا۔ وہ بہت جھنجلایا ہوا ہے اور یہ مالا ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ مالا اس کے لیے بہت اہم ہے۔ یہ وہ زینہ ہے جس کے ذریعے وہ آسانی سے مجھ تک پہنچ سکتا ہے۔ جب تک یہ مالا تمہارے گلے میں رہے گی، تم اس کے حملوں سے بھی بڑی حد تک بچے رہو گے اسی لیے تو میں بار بار کہتی ہوں کہ اس کی حفاظت کرو۔ بے پروائی تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"شکریہ نیلگری۔" میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا "کیا اب تم یہیں رہو گی؟"

"نہیں۔ میں واپس جا رہی ہوں لیکن میں نے تمہاری دوست کی حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے۔ وہ شیطان اب اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

نیلگری اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا لیکن میرے جسم میں جیسے اتنی سکت نہیں رہی تھی۔ نیلگری بیڈ کے قریب آ کر میرے اوپر جھک گئی اور پھر اس کے ہونٹ میری پیشانی کو چھونے لگے۔ مجھ پر سرور کی عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ نیلگری سیدھی ہوئی تو میں اس وقت بھی پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی ملکوتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں پراسرار چمک تھی۔ وہ پیچھے ہٹتی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

کمرے میں ایک مسحور کن سی خوشبو رہ گئی تھی۔ میں گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ میرے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور میں جیسے حواس میں آ گیا۔ کمرے کی فضا میں اب بھی مسحور کن سی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑکی کے قریب آ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔

رات کا اندھیرا رخصت ہو رہا تھا۔ بہت مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ میں کافی دیر کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا پھر بستر پر لیٹ گیا۔ نیلگری کے ہونٹوں کا لمس میں اب بھی پیشانی پر محسوس کر رہا تھا۔

دوبارہ نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نیلگری کے بارے میں سوچتا رہا۔ گزشتہ رات جب شوبھا نے گوتم بھوش کے بارے میں بتایا تھا تو اسی وقت مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا کہ گوتم بھوش شوبھا کو قبضے میں کر کے مجھ سے یہ مالا حاصل کرنا چاہتا ہو گا لیکن نیلگری بروقت وہاں پہنچ گئی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

باہر سے آہٹ سن کر میں نے بھی بستر چھوڑ دیا اور کمرے سے باہر نکلا تو مایا متی برآمدے والا دروازہ کھول رہی تھی۔ اس نے کھڑکیاں بھی کھول دیں تاکہ تازہ ہوا آ سکے۔

"ارے! تم جاگ گئے۔" وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے بولی۔

"میں تو بہت دیر سے جاگ رہا ہوں۔ تمہاری آہٹ سن کر کمرے سے باہر آ گیا۔" میں نے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "چائے پلاؤ۔ بہت دیر سے طلب ہو رہی ہے۔"

"ابھی بناتی ہوں۔" مایا متی کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

تقریباً دس منٹ بعد مایا متی چائے بنا کر لے آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس وقت چھ بجنے والے تھے۔ چھٹی والے روز تو مایا متی دیر تک سوئی رہتی تھی لیکن عام دنوں میں ساڑھے پانچ بجے وہ اٹھ جایا کرتی تھی۔

چائے پی کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور چند منٹ بعد تیار ہو کر واپس آ گئی اور کچن میں گھس کر ناشتا تیار کرنے لگی۔ اس نے ناشتے کے لیے مجھ سے بھی پوچھا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

پونے سات بجے مایا متی چلی گئی اور میں برآمدے میں کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔

نو بجے کے قریب شوبھا بھی باہر آ گئی۔ وہ غالباً کافی پہلے جاگ گئی تھی اور تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی تھی۔

"مایا متی تو سات بجے سے پہلے ہی چلی گئی ہو گی۔ تم نے ناشتا کیا یا نہیں؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ابھی نہیں۔ تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

شوبھا اندر چلی گئی اور پھر تقریباً پون گھنٹے بعد اس نے آواز دے کر مجھے بھی اندر بلا لیا۔

کافی ٹیبل پر ناشتا لگا ہوا تھا۔ پراٹھے اگرچہ انڈیا کے نقشے کی طرح آڑے ترچھے تھے مگر پرت دار اور بڑے خستہ تھے۔ ساتھ میں انڈوں کا آملیٹ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چائے بھی بنائی تھی۔

"مایا متی بہت اچھی لڑکی ہے۔" شوبھا کہہ رہی تھی "اس نے میری بڑی خدمت کی ہے۔ اسپتال میں بھی اور یہاں گھر میں بھی۔"

"ہاں۔ مایا متی واقعی بہت اچھی لڑکی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اور پھر ہم مایا متی، انسپکٹر اعظم اور برہندرا کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ دورانِ گفتگو میں موضوع بدلتے بدلتے انسپکٹر پانڈے کا ذکر بھی آیا اور دلیش مکھ کا بھی۔ دلیش کے تذکرے پر رادھیکا کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے اس شخص کی وجہ سے اسے اتنے کشٹ اٹھانے پڑے لیکن بالآخر وہ بدبخت اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔

"تم رات کو گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" شوبھا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "جس انداز میں تم نے اس کا ذکر کیا تھا اس سے لگتا ہے کہ تم سے اس کی ملاقات خوشگوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی اور یہ مالا کیا چکر ہے؟"

"میں تمہیں صورتِ حال سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتا۔" میں نے کہا "اس روز مندر کے سامنے گوتم بھوش سے تمہاری ملاقات محض اتفاق نہیں تھی۔ وہ بڑا شیطان آدمی ہے۔ اس کے پاس کچھ پراسرار قوتیں ہیں۔ وہ تمہیں گرفت میں لے کر مجھ سے یہ مالا حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

شوبھا کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ وہ ہندو تھی۔ یوگیوں اور پنڈتوں کے بارے میں اس نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا کہ کس طرح یہ لوگ پراسرار قوتیں حاصل کر کے اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے دنیا کو تباہی کی طرف دھکیل رہے تھے۔

"تمہارا مطلب ہے یہ مالا بھی..."

"ہاں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "ہندو دیومالا میں نیلگری کو سب سے بڑی شکتی سمجھا جاتا ہے۔ یوگی اور ہندو سادھو ہزاروں سال سے اس شکتی کو حاصل کرنے کے لیے جاپ کرتے آ رہے ہیں لیکن نیتوں کی کھوٹ کی وجہ سے کوئی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا جبکہ ہزاروں لوگ اس راستے میں تباہ و برباد ہو گئے۔

"یوگی گوتم بھوش بھی نیلگری کے حصول کے لیے کوشش کرتا رہا ہے۔ اس نے مجھے بھی رشی کیش میں ایک جاپ بتایا تھا جس پر میں نے عمل بھی شروع کر دیا تھا لیکن اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ وہ میرے توسط سے نیلگری تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس کا پروگرام شاید یہ تھا کہ میں نیلگری کی شکتی حاصل کر لوں اور وہ مجھے دھوکا دے کر وہ شکتی مجھ سے چھین لے لیکن اتفاق سے بیچ میں تمہارا واقعہ پیش آ گیا اور مجھے تمہارے تعاقب میں ہندوستان سے یہاں آنا پڑا اور یہاں ایسا واقعہ پیش آیا جو میرے لیے نہایت پراسرار بھی تھا اور ہولناک بھی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اسے رتنا

پارک میں ملنے والے کرسٹل کے شکستہ مجسمے کے بارے میں بتانے لگا۔ شوبھا بڑی حیرت سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

"اس روز جگن ناتھ مندر کے سامنے نیلگری نہ پہنچ جاتی تو گوتم بھوش تمہیں اپنی قوتوں کے جال میں جکڑ لیتا۔" میں کہہ رہا تھا "اور یہ ہے وہ مالا جسے حاصل کرنے کے لیے گوتم بھوش اتنا بے چین ہو رہا ہے۔" میں نے مالا گلے سے اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"لیکن۔ تمہیں یہ سب کچھ کیسے پتا چلا؟" وہ مالا کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"آج صبح نیلگری یہاں آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ک۔ کیا...؟" شوبھا ہکلا کر رہ گئی "وہ تمہارے پاس آئی ہے؟ لیکن..."

"یہ میری نیک نیتی کا صلہ ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میرے من میں پراسرار قوتیں حاصل کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ عرصہ پہلے میں نے بڑی کٹھن ریاضت سے چی کی قوت حاصل کی تھی۔ میں جانتا ہوں چی کی پراسرار قوت سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں۔ دنیا پر حکمرانی کی جا سکتی ہے لیکن میں نے اپنے ذاتی مقاصد کے لیے اس پراسرار قوت کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ اسے دوسروں کی بھلائی کے لیے ہی استعمال کیا ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ نیلگری جیسی شکتی بھی میرے قریب آ گئی ہے لیکن وہ ابھی میرے تابع نہیں ہوئی۔ اس کے لیے جاپ مکمل کرنا ضروری ہے۔ اتفاق کہہ لو کہ میں نے نیلگری کو گوتم بھوش کے حملے سے بچایا تھا اور اس کا کرسٹل کا ٹوٹا ہوا مجسمہ اٹھا کر یہاں لے آیا تھا اور اسے ٹیپ سے جوڑ دیا تھا۔ اس وقت میں کرسٹل کے اس مجسمے کی حقیقت سے واقف نہیں تھا۔ میں تو محض اسے جوڑ کر دیکھنا چاہتا تھا اور میرا یہی عمل میری نیکی بن گیا اور نیلگری کو نئی زندگی مل گئی۔ وہ مجھ پر مہربان ہو گئی اور میری اس نیکی کے صلے میں وہ میری مدد کر رہی ہے۔"

شوبھا خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے لیے شاید یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو گیارہ بجنے والے تھے۔ باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

"میں اسپتال جا رہا ہوں۔ واپسی میں شاید کچھ دیر ہو جائے۔ تم پریشان مت ہونا۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" شوبھا بھی اٹھ گئی "اکیلی یہاں پڑی بور ہوتی رہوں گی۔ تمہارے ساتھ ذرا گھوم پھر آؤں گی۔ بس تیار ہونے میں تھوڑی دیر لگے گی۔"

شوبھا نے پہلے برتن وغیرہ دھو کر رکھے اور پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ کمرے سے باہر نکلی تو میں اسے دیکھ کر کچھ دیر کے لیے تو سانس لینا بھول گیا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود وہ بے حد حسین تھی۔ دو انچ چوڑے سیاہ بارڈر والی آف وائٹ ساڑی اس پر خوب جچ رہی تھی۔ اگر اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کرلیا ہوتا تو اس کا حسن کچھ اور نکھر آتا۔

شوبھا بیوہ تھی۔ اسے میں نے ہمیشہ سفید ساڑی میں ہی دیکھا تھا اور آج پہلی مرتبہ ساڑی کی رنگت میں بہت معمولی سی تبدیلی نظر آئی تھی۔ رشی کیش میں ایک مرتبہ اس موضوع پر میری اس سے گفتگو ہوئی تھی۔ ہندوستان میں، میں نے بہت سی ایسی بیوہ عورتوں کو دیکھا تھا جو اپنی پسند کے رنگین کپڑے پہنتی تھیں، میک اپ بھی کرتی تھیں اور زیور بھی استعمال کرتی تھیں۔ شوبھا بھی یہ سب کچھ کرنا چاہتی تھی لیکن جھجک مانع تھی۔ وہ لوگوں کی باتوں سے ڈرتی تھی اور آج لباس میں بہت معمولی سی یہ تبدیلی خوش آئند تھی۔

"اس ساڑی میں اچھی لگ رہی ہو بلکہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "زمانہ بہت بدل چکا ہے۔ اب تو بہت کم بیوہ عورتیں سفید لباس پہنتی ہیں۔ وہ زمانہ بیت گیا جب بیوہ ہوجانے والی ہندو عورت شوہر کی لاش کے ساتھ ہی جل کر مرا کرتی تھیں۔ اب تو بیوہ عورتیں دوسری شادی کرکے سکون کی زندگی بسر کرتی ہیں۔"

شوبھا کچھ نہیں بولی۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیلتی رہی۔

کل شام الماری میں سے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے وہاں مجھے تھوڑی سی رقم بھی رکھی ہوئی مل گئی تھی جس کے بارے میں بعد میں مایا متی نے بتایا تھا کہ وہ رقم میری ہی تھی اور اس وقت باہر نکلنے سے پہلے میں نے وہ رقم اٹھا کر جیب میں ڈال لی تھی۔

گلیوں سے نکل کر ہم مین روڈ پر آگئے جہاں کچھ دیر بعد ہی ہمیں ایک سائیکل رکشا مل گیا۔ کھٹمنڈو کے سائیکل رکشے بھی خاصے کی چیز ہیں۔ انہیں بڑی خوب صورتی سے سجایا جاتا ہے۔

اسپتال کے سامنے ہم نے رکشا چھوڑ دیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر سے ہمیں یہ معلوم کرنے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ سمبا کو کہاں رکھا گیا تھا۔

سمبا جنرل وارڈ میں تھا۔ یہ وزیٹنگ آورز نہیں تھے لیے ہمیں وارڈ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا اور اسپیشل وارڈ کی نرس کے ڈیوٹی روم میں آگیا۔ صبح میں نے مایا متی کو سمبا کے بارے میں بتا دیا تھا۔

مایا متی ڈیوٹی روم میں موجود تھی۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"دیدی! یہ ساڑی تم پر کتنی اچھی لگ رہی ہے۔" شوبھا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

جواب میں شوبھا نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"میں صبح سمبا سے ملی تھی۔" مایا متی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اسے اچھا ہونے میں بہت دن لگیں گے۔ تم ملے ہو اس سے؟"

"نہیں۔ ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ شام کو دوبارہ چکر لگاؤں گا۔"

"شام تک اسے اسپیشل وارڈ میں منتقل کردیا جائے گا لیکن تم اگر چاہو تو میں تمہارے ساتھ وارڈ میں چلوں۔" مایا متی بولی۔

"نہیں۔ شام ہی کو مل لیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

ہم کچھ دیر وہاں رکے اور پھر مایا متی سے رخصت ہوکر اسپتال سے باہر آگئے۔

میں شوبھا کے ساتھ مختلف بازاروں میں گھومتا رہا۔ ان علاقوں کی طرف جانے سے گریز کیا جہاں ناگ پال کے غنڈوں سے سامنا ہونے کا احتمال تھا کیونکہ میں شوبھا کو کسی ایسے معاملے میں نہیں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ ہم نے ایک بڑھیا قسم کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر کیل ٹول کے علاقے میں ایک ساڑی ہاؤس میں داخل ہوگئے۔ یہ بہت بڑی دکان تھی اور یہاں صرف ساڑیاں اور متعلقہ ملبوسات تھے۔

شوبھا جھجک رہی تھی لیکن میں نے اپنی پسند سے اس کے لیے دو ساڑیاں خریدلیں۔ اس کے سائز کے میچنگ کے بلاؤز اور پیٹی کوٹ بھی مل گئے تھے۔

بازار میں گھوم پھر کر کچھ اور شاپنگ بھی کی گئی۔ کھانا بھی ہم نے ایک ریسٹورنٹ ہی میں کھایا اور پھر گھر آگئے۔

میں سمبا سے ملنے کے لیے اس روز شام کو بھی نہیں جاسکا۔ تاہم رات نو بجے کے قریب انسپکٹر بریندرا آگیا۔

"ہم نے پہاڑوں میں وہ حویلی تلاش کرلی ہے۔" بریندرا نے گفتگو کے دوران میں کہا "لیکن چند مسخ شدہ لاشوں کے سوا ہمیں وہاں کچھ نہیں ملا اور ہم نے بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ کے عقب میں چٹانوں میں کھڑی ہوئی ناگ پال کی وہ گاڑی بھی منگوالی ہے۔ جس کے بارے میں تم نے بتایا تھا۔"

"اور ناگ پال کا پتا نہیں چلا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شاید انہی پہاڑوں میں کسی اور حویلی میں منتقل ہوگیا ہے۔ بہرحال، اس کی تلاش جاری ہے اور ہم جلد ہی اس کا سراغ لگالیں گے۔" بریندرا نے جواب دیا "شہر میں اس کے کچھ آدمی دوبارہ سرگرم عمل ہورہے ہیں۔ انہیں پتا چل گیا ہے کہ تم واپس آگئے ہو۔ ہوسکتا ہے وہ لوگ تمہیں تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں اس لیے۔"

"اس لیے کیا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں سادہ لباس میں اپنے دو آدمی یہاں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ وہ باہر رہ کر ہی مکان کی نگرانی کریں گے۔" بریندرا نے کہا۔

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "اگر اتفاق سے کوئی ایسی بات ہوئی تو یہاں ٹیلی فون موجود ہے۔ میں فوراً تمہیں اطلاع دے دوں گا۔" دراصل میں نہیں چاہتا تھا کہ پولیس والوں کی موجودگی سے اس علاقے کے لوگ ہماری طرف متوجہ ہوجائیں۔ ویسے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک دو روز یہاں رہنے کے بعد سومبا ناتھ کے علاقے میں واقع مدھومالا والے بنگلے میں منتقل ہوجاؤں جہاں شیرپا بھی موجود تھا اسی لیے میں نے انسپکٹر بریندرا کو اس مکان کی نگرانی کے سلسلے میں ٹال دیا تھا۔

شوبھا کی طرف سے مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ نیلکری نے اس کی حفاظت کا وعدہ کرلیا تھا۔ میں اسے گھر پر چھوڑ کر آزادی سے نقل و حرکت کرسکتا تھا۔ ناگ پال میری تلاش میں تھا اور مجھے چانگ لی کی تلاش تھی۔ میں اگرچہ ہر طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا لیکن میں نے طے کرلیا تھا کہ جب تک چانگ لی کے قدم یہاں سے نہیں اکھاڑوں گا اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ چانگ لی کے یہاں سے بھاگ جانے یا اس کے خاتمے کے بعد جنرل کھوراٹ کو اس طرف کا رخ کرنے کے لیے بہت کچھ سوچنا پڑتا۔ یہاں سے جنرل کھوراٹ کے قدم اکھڑ جانے کے بعد ناگ پال اکیلا رہ جاتا اور یہاں کے لوگ اس سے بخوبی نمٹ لیتے۔

اگلے تین دنوں میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔

ایک روز صبح مایا متی اپنی ڈیوٹی پر جانے لگی تو میں نے اسے کہہ دیا تھا کہ ڈیوٹی سے واپس آنے کے بعد اپنا سامان پیک کرلے اور اپنے فلیٹ پر منتقل ہوجائے۔ ہم بھی رات ہی کو مدھومالا کے ہاں چلے جائیں گے۔

اس رات مایا متی کو اس کے فلیٹ پر چھوڑ کر میں اور شوبھا سومبا ناتھ کے علاقے میں واقع مدھومالا کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ کال بیل کے جواب میں جس شخص نے گیٹ کھولا تھا وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے مدھومالا کا نام لیا۔ وہ چند لمحے الجھی ہوئی نظروں سے ہماری طرف دیکھتا رہا پھر اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

ہمارے اندر داخل ہوتے ہی اس نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا۔ میں اور شوبھا برآمدے میں آکر رک گئے۔ اس شخص نے اشارہ کیا اور ہم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئے۔

ہال میں قدم رکھتے ہی میں اچھل پڑا۔ شیرپا صوفوں کے درمیان قالین پر بندھا پڑا تھا۔ مدھومالا صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر اگرچہ کھلے ہوئے تھے مگر وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ میں تیزی سے پیچھے مڑا۔ ہمارے ساتھ آنے والے آدمی نے مجھے زوردار لات رسید کردی۔ میں کراہتا ہوا لڑکھڑا کر شیرپا کے قریب گرا۔ اسی وقت صوفوں کے پیچھے چھپے ہوئے دو آدمی اٹھ کر سامنے آگئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ تیسرے آدمی نے بھی، جو ہمیں باہر سے لے کر آیا تھا، اپنے لباس میں سے خنجر نکال کر اس کی نوک شوبھا کے پہلو سے لگادی تھی۔

میں قالین پر پڑا متوحش نظروں سے ان تینوں آدمیوں کو دیکھنے لگا۔ چہروں سے وہ تینوں چھٹے ہوئے بدمعاش ہی لگتے تھے اور کسی سے انسانیت اور شرافت کی توقع نہیں کی جاسکتی

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ
مفرور

"اوہو تم!" یہ اس شخص کی آواز تھی جو مدھو مالا والے صوفے کے پیچھے سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خنجر تھا جس کی نوک مدھو مالا کی گردن کو چھو رہی تھی۔ مدھو مالا کا چہرہ خوف سے بالکل زرد ہو رہا تھا۔ وہ کچھ عرصہ پہلے ایسے ہی ایک سنسنی خیز تجربے سے گزر چکی تھی اور اسے ٹانگ پر گولی لگی تھی۔ وہ زخم اگرچہ اب ٹھیک ہو چکا تھا لیکن وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ کہیں ویسا ہی کوئی اور سنگین تجربہ نہ دہرایا جائے۔

"اچھا ہوا تم بھی یہاں آ گئے۔" وہ شخص میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "یہ دونوں ہمارے ہاتھوں مارے جاتے تو مجھے افسوس ہوتا۔ خاص طور پر یہ خوب صورت گڑیا۔ یہ تو کھیلنے کے لیے ہے۔ دل بہلانے کے لیے۔ اس پر تو ہاتھ اٹھاتے ہوئے بھی دل دکھتا ہے۔"

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے پوچھا۔ وہ چہرے سے اگرچہ میرے لیے اجنبی تھے لیکن میں جان چکا تھا کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔

"تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ ہم کون ہو سکتے ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا "ہمیں کئی روز پہلے اطلاع مل گئی تھی کہ تم واپس آ چکے ہو۔ ہمارے آدمی تمہاری تلاش میں تھے لیکن تمہارا سراغ نہیں مل رہا تھا اور پھر مجھے ہی خیال آیا کہ شہر سے غائب ہونے سے پہلے تمہیں اس حسینہ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ہم تمہارے بارے ہی میں پوچھنے کے لیے یہاں آئے تھے لیکن یہ دونوں کچھ بتانے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اچھا ہوا تم یہاں آ گئے اور ان کی جان بچ گئی ورنہ یہ دونوں ہمارے ہاتھوں خرچ ہو جاتے۔"

میں اپنے قریب پڑے ہوئے شیرپا کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور مجھے حیرت تھی کہ وہ اس قدر آسانی سے ان کے قابو میں کیسے آ گیا تھا۔ یہ انکشاف تو بعد میں ہوا کہ وہ تینوں مہمان بن کر آئے تھے اور انہوں نے دھوکے سے شیرپا کو گرفت میں لے لیا تھا۔

"ہم ایک شرط پر ان کی جاں بخشی کر سکتے ہیں۔" وہی شخص میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "تم کوئی گڑبڑ کیے بغیر ہمارے ساتھ چلو گے اور یہ لڑکی بھی ضمانت کے طور پر ہمارے ساتھ جائے گی۔ بعد میں اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ ظاہر ہے ان لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم بلاوجہ کسی کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتے۔ اگر تمہیں ہماری یہ شرط منظور ہو تو۔۔۔"

"نہیں۔ ہمیں تمہاری کوئی شرط منظور نہیں۔"

یہ آواز شوبھا کی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ان غنڈوں کے سرغنہ سے باتیں کرتے ہوئے میں نے وقتی طور پر اسے فراموش کر دیا تھا۔

"اوہو۔ مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا۔" سرغنہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "تمہیں تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ہم نے تمہیں ساتھ لے جانے کی بات نہیں کی۔ ویسے تم بھی اس لڑکی سے کم نہیں ہو۔"

"تم کسی کو بھی ساتھ نہیں لے جا سکو گے۔" شوبھا نے کڑے لہجے میں کہا۔ میں شوبھا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کمزور دل کی عورت تھی۔ لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والی۔ جے پور میں دلیش مکھ کی دھمکیوں سے ڈر کر اس نے شہر ہی چھوڑ دیا تھا لیکن دلیش مکھ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور رشی کیش سے اسے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ وہ طویل عرصے تک اس کی قید میں رہی تھی اور اس نے بڑے دکھ جھیلے تھے۔ پچھلے خوفناک تجربے کے پیش نظر اسے تو خاموشی سے دبکے رہنا چاہیے تھا لیکن وہ ایک دم بدل گئی تھی اور ان بدمعاشوں کو چیلنج کر رہی تھی۔

"اے!" اس کے ساتھ کھڑا ہوا بدمعاش غرایا "تم اپنی زبان بند رکھو ورنہ خنجر اندر کر دوں گا۔"

یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے خنجر پر ہلکا سا دباؤ بھی ڈال دیا تھا۔ خنجر کی نوک شوبھا کے پہلو پر رکھی ہوئی تھی۔ دباؤ پڑنے سے شوبھا کی جلد کا وہ حصہ تقریباً نصف انچ اندر کی طرف دب گیا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اتنے دباؤ سے تو اس کی جلد میں سوراخ ہو جانا چاہیے تھا اور اس سے بھی زیادہ شدید حیرت اس وقت ہوئی جب شوبھا بڑی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے حریف کی خنجر والی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

وہ شخص بری طرح بلبلا اٹھا۔ شوبھا اس کی کلائی کو موڑتی چلی گئی۔ وہ شخص دہرا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر شوبھا کے پیروں کے قریب گر گیا تھا۔

"اے۔ اے۔ چھوڑو اسے۔ یہ کیا کر رہی ہو؟" مدھو مالا کے پیچھے کھڑا ہوا غنڈا چیخا پھر وہ خنجر تان کر شوبھا کی طرف لپکا۔

صورت حال بدل گئی تھی۔ شوبھا نے اپنے حریف کو بے بس کر دیا تھا اور اب مدھو مالا کو بھی فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جس غنڈے نے اسے خنجر کی نوک پر لے رکھا تھا وہ اب شوبھا کی طرف جھپٹ رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ

اٹھاتے ہوئے لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے اچھلا۔ میرے پیر کی ٹھوکر اس شخص کے پیٹ پر لگی جو شوبھا کی طرف لپک رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ میں نے بڑی پھرتی سے اٹھ کر اس پر چھلانگ لگا دی۔

شوبھا کے حریف کا داؤ چل گیا۔ اس نے شوبھا کی ٹانگوں کے بیچ میں گھٹنے سے ٹھوکر مار دی۔ شوبھا بلبلا اٹھی۔ وہ پیٹ پکڑے دہری ہوتی چلی گئی۔ اس کے حریف نے زمین پر پڑا ہوا خنجر اٹھا لیا اور شوبھا پر حملہ آور ہوا لیکن اسی لمحے مدھو مالا اپنی جگہ سے اچھلی اور ہوا میں اڑتی ہوئی اس شخص کے اوپر جا گری۔ وہ شخص منہ کے بل آگے کو گرا۔ اس کا سر آگے پڑی ہوئی کرسی سے ٹکرا گیا تھا۔ پیشانی کی کھال پھٹ گئی اور خون بہہ نکلا تھا۔ خنجر بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

مدھو مالا ایک بار پھر ہوا میں اچھلی اور پیروں کے بل اس شخص کے اوپر گری۔ وہ شخص پھر چیخ اٹھا۔

شوبھا بھی سنبھل چکی تھی۔ اس نے خنجر اٹھا لیا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اس تیسرے بدمعاش کی طرف لپکی جو خنجر تانے مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہا تھا۔ شوبھا کے پیر کی ٹھوکر اس کے پیٹ پر لگی اور وہ ایک ہاتھ سے پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ شوبھا دوڑ کر شیرپا کے قریب پہنچ گئی اور جھک کر ایک ہی جھٹکے سے اس کی کلائیوں پر بندھی ہوئی رسی کاٹ دی۔

شیرپا بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک غنڈے کو سنبھال لیا۔ ایک غنڈا میری گرفت میں تھا اور تیسرے کو شوبھا اور مدھو مالا نے سنبھال رکھا تھا۔ مجھے ان دونوں پر حیرت ہو رہی تھی کہ ان میں اتنا حوصلہ کیسے آ گیا تھا۔

یہ یک طرفہ لڑائی تھی جو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکی۔ ہم نے ان تینوں کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ شیرپا نے ان تینوں کو باندھ کر ڈال دیا۔

اور پھر یہ انکشاف میرے لیے بڑا دلچسپ ثابت ہوا تھا کہ ناگ پال اور چانگ لی نے اپنے گروہ میں یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص مجھے پکڑ کر ان کے سامنے پیش کرے گا یا میرے بارے میں کوئی نشان دہی کرے گا اسے بیس لاکھ روپے انعام دیا جائے گا۔

ناگ پال کے گروہ کے اکثر آدمی میری تلاش میں تھے۔ بعض تو میری تلاش میں پہاڑوں میں آباد چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھٹک رہے تھے اور بعض کو میرے شہر پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی۔

غنڈوں کی اس پارٹی کا سرغنہ روہن تھا۔ اس کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ پدمی کی طرف جانے سے پہلے میں اس بنگلے میں مقیم تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو ساتھ ملایا اور میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے یہاں آ گیا۔ یہ لوگ مہمان بن کر آئے تھے۔ انہوں نے دھوکے سے شیرپا کو بے بس کر دیا اور مدھو مالا کو خنجر کی نوک پر رکھ کر میرے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ سلسلہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ میں شوبھا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

مجھے شوبھا کی جرات پر بڑی حیرت ہوئی تھی لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا اور شوبھا کی باتوں نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔

شوبھا کے کہنے کے مطابق یہاں کی صورت حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا لیکن پھر اچانک ہی اسے یوں لگا جیسے کوئی غیبی قوت اسے اکسا رہی ہو اور پھر اسی نے وہ سب کچھ کر ڈالا جس کی اس جیسی کمزور دل عورت سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

مجھے نیلگری کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس نے شوبھا کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔ نیلگری ہی نے اس کے اندر اتنا حوصلہ پیدا کیا تھا اور اسے جارحیت پر آمادہ کیا تھا اور شوبھا کو دیکھ کر مدھو مالا کو بھی حوصلہ ملا تھا۔

شیرپا کا خیال تھا کہ ان تینوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں صحن میں کسی جگہ دفن کر دینی چاہئیں لیکن میں اس کے حق میں نہیں تھا۔ بلاوجہ کسی کے خون میں ہاتھ رنگنا مناسب نہیں تھا جبکہ انہیں زندہ رکھ کر ان سے کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

میری بات شیرپا کی سمجھ میں آ گئی اور ہم اس کمرے میں پہنچ گئے جہاں ان تینوں کو باندھ کر ڈالا گیا تھا۔ شیرپا نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اور روہن کے ہاتھ کھول دیے۔

"میرا تو خیال تھا کہ تم تینوں کو قتل کر کے لاشیں زمین میں گاڑ دی جائیں لیکن میرا یہ ساتھی بہت رحم دل ہے۔ یہ تم لوگوں کو قتل کرنے کے حق میں نہیں بلکہ زندہ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ بغیر کوئی نقصان پہنچائے۔" شیرپا اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا اور یہ خنجر غالباً روہن ہی کی ملکیت تھا۔

"شرط کیا ہو گی؟" روہن نے الجھی ہوئی نظروں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"شرط زیادہ کڑی نہیں ہے۔" شیرپا بولا "ہمیں ناگ پال اور چانگ لی کے بارے میں بتا دو کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

ہم مزید کچھ کہے بغیر تم لوگوں کو چھوڑ دیں گے۔"

"ناگ پال شہر میں نہیں ہے۔ وہ پہاڑوں میں کہیں چھپا ہوا ہے اور چانگ لی اگرچہ شہر ہی میں موجود ہے لیکن اس کے ٹھکانے کا کسی کو پتا نہیں۔" روہن نے جواب دیا۔

"اگر یہ تمہارے قابو میں آجاتا تو اسے کہاں لے جاتے؟" شیرپا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ.... وہ.... ہم کسی اور کے توسط سے اسے اطلاع بھجوا دیتے۔" روہن نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

"نہیں روہن۔" شیرپا نے اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ "تم سب کچھ جانتے ہو اور تم بتاؤ گے کہ چانگ لی کہاں ہے۔ اگر تم کچھ بتانے سے انکار کرو گے تو میں اپنے ساتھی کی بات نہیں مانوں گا اور تمہارے شریر (جسم) کے ٹکڑے کر کے شہر کی مختلف سڑکوں پر پھینک دیے جائیں گے۔"

"نہیں۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" روہن نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

شیرپا چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک ہی بڑی پھرتی سے خنجر کی نوک سے اس کے بازو پر تقریباً دو انچ لمبا چرکا لگا دیا۔ روہن چیخ اٹھا۔

"میں تمہارے شریر کو پہلے اسی طرح چھلنی کروں گا اور پھر ٹکڑے کروں گا۔" شیرپا نے اس مرتبہ خنجر کی نوک اس کی ٹانگ میں پیوست کر دی۔ روہن کی چیخ پہلے سے زیادہ خوفناک تھی۔

"مزہ نہیں آرہا۔" شیرپا نے یہ کہتے ہوئے خنجر میرے حوالے کر دیا۔ روہن کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔

روہن زیادہ دیر تک یہ تشدد برداشت نہیں کر سکا۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

"ب.... بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" وہ چیخ اٹھا۔

"کم بخت کہیں کا۔" شیرپا اسے آخری ٹھوکر مارتے ہوئے بولا "پہلے ہی قبول لیتے تو تمہاری اتنی ٹوٹ پھوٹ نہ ہوتی۔ اب جلدی بکو۔ ورنہ میرا ہاتھ پھر حرکت میں آجائے گا۔"

"وہ.... وہ ریڈ لائٹ ایریا میں بسنتی بائی کے کوٹھے میں چھپا ہوا ہے۔" روہن نے جواب دیا۔

"بسنتی بائی! تمہارا مطلب ہے وہ کسی طوائف کے ہاں پناہ لیے ہوئے ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ اس کے لیے اس سے زیادہ محفوظ اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔" روہن نے کہا "کوئی شک بھی نہیں کر سکتا کہ چانگ لی کسی ایسی جگہ پناہ لے سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اگر یہ غلط ثابت ہوا تو....؟" میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور شیرپا کو اشارہ کیا۔

شیرپا نے ایک بار پھر اس کے ہاتھ باندھ دیے اور ہم کمرے سے باہر آگئے۔

"اب ان کا کیا کیا جائے؟" شیرپا نے میری طرف دیکھا۔

"ان کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ انسپکٹر بریندرا کا نمبر ملایا اور پھر کچھ سوچ کر ریسیور رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟ کس کو فون کر رہے تھے؟" شیرپا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"انسپکٹر بریندرا کو۔" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے انہیں پولیس کے حوالے کر ہی دینا چاہیے۔ وہ نمٹ لیں گے ان سے۔" میں نے دوبارہ ریسیور اٹھا لیا اور نمبر ملانے لگا۔

انسپکٹر بریندرا آفس میں موجود نہیں تھا۔ اعظم خان بھی اس کے ساتھ ہی کہیں گیا ہوا تھا۔ میں نے بریندرا کے اسسٹنٹ وجے کو بتایا کہ کچھ بدمعاشوں نے ہماری رہائش گاہ پر حملہ کیا تھا۔ وہ مجھے اغوا کرنا چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے وہ ناگ پال کے آدمی ہوں۔ وہ تینوں اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں اور ہم انہیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔

سب انسپکٹر وجے سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ تاہم فون پر اس سے گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔

"میں اس علاقے کے پولیس اسٹیشن کو فون کر رہا ہوں۔" وجے نے جواب دیا "اپنا ایڈریس بتاؤ۔ وہ لوگ تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ ان تینوں کو ان کے حوالے کر دینا۔"

میں نے وجے کو کوٹھی کا پتا سمجھا کر ریسیور رکھ دیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد پولیس کی ایک گاڑی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئی۔ روہن اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ پولیس پارٹی کا انچارج ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ان کا خیال رکھا جائے۔

پولیس کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں اور شیرپا بھی کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ شیرپا کے پاس پستول موجود تھا جبکہ میں نے روہن

والا خنجر اپنے لباس میں چھپا لیا تھا۔

کار ریڈ لائٹ ایریا میں ایک گلی کے موڑ پر روک کر ہم پیدل ایک طرف چلنے لگے۔ طوائفوں کا یہ علاقہ کئی چھوٹی چھوٹی گلیوں پر مشتمل تھا۔ ان گلیوں میں روشنی کا مناسب انتظام بھی نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی لاتعداد کوٹھریاں تھیں۔ ہر کوٹھری کے دروازے کے اندر کی طرف جلنے والے بلبوں کی روشنی اتنی مدھم تھی کہ دروازوں میں کھڑی ہوئی طوائفوں کے چہرے بھی دھندلائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ لاتعداد تماش بین بھی کوٹھریوں میں جھانکتے ہوئے ان گلیوں میں گھوم رہے تھے۔

ایک گلی کے موڑ پر ایک آدمی نے ہمیں روک لیا۔ میرا خیال ہے یہ آدمی کافی دیر سے ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا۔ چوڑی دار لٹھے کا تنگ موری کا پاجامہ' کھدر کا کرتہ جو گھٹنوں سے کافی اوپر تھا' گلے میں سرخ مفلر اور سر پر سیاہ رنگ کی نوک دار ٹوپی۔ اس کے منہ میں پان بھرا ہوا تھا اور وہ بیڑی کے کش بھی لگا رہا تھا۔

گلی کے اس موڑ پر دیوار کے ساتھ مدھم روشنی کا ایک بلب بھی جل رہا تھا اور اس زرد اور مدھم روشنی میں اس شخص کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی تھا۔

"اندگی میں کہاں آگئے سر؟" وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہیرا کو سیوا کا موقع دو نا۔ جگمگاتے ہیرے پیش کروں گا تمہاری خدمت میں۔"

"بسنتی بائی کا کوٹھا کہاں ہے؟" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"دھت تیرے کی۔" اس شخص کے منہ سے بے اختیار نکلا "آگے جا کر سیدھے ہاتھ کی گلی میں مڑ جاؤ۔ پان کے کھوکھے والے سے پوچھ لینا۔"

ہم آگے جا کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر مڑ گئے۔ یہ گلی کسی قدر کشادہ تھی اور اس طرف روشنی کا بھی معقول انتظام تھا۔ یہاں ناچنے گانے والی طوائفوں کے ڈیرے تھے۔ مختلف اطراف سے سازوں اور گھونگروؤں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بعض دروازے بند تھے اور کھلے ہوئے دروازوں والے کمرے تیز روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ بنی ٹھنی طوائفیں گاہکوں کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

پان کے کھوکھے کے سامنے تین چار آدمی کھڑے تھے۔ ان میں ایک فوراً ہی ہماری طرف لپکا۔ میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا۔ بسنتی بائی کا نام سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بھی بگڑ گئے۔ اس نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

"اس ڈیوڑھی میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلے جاؤ۔ دوسری منزل پر۔ بائیں طرف والا دروازہ۔"

ہم اس ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ سامنے بھی ایک دروازہ تھا اور دائیں طرف بھی۔ دونوں دروازے بند تھے اور اندر سے سازوں اور گھونگروؤں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم بائیں طرف سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے۔ سیڑھیاں لکڑی کی تھیں اور تختے ہمارے قدموں کے نیچے چر چرا رہے تھے۔

ہم دوسری منزل پر پہنچے ہی تھے کہ بائیں طرف والا دروازہ کھلا اور دو آدمی برآمد ہوئے۔ صورت سے وہ دونوں شریف ہی لگتے تھے۔ رات کے اندھیرے میں ان گلیوں میں شریف لوگ ہی تو آتے تھے۔ وہ دونوں کسی بات پر قہقہے لگاتے ہوئے نیچے چلے گئے۔

شیرپا مجھے اشارہ کرتا ہوا دروازے میں داخل ہو گیا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈا چڑھا دیا اور جیسے ہی مڑ کر دیکھا' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

یہ خاصا بڑا کمرا تھا۔ فرش پر پلاسٹک کی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ پرانے سے صوفے لگے ہوئے تھے اور ان صوفوں پر زنانہ لباس میں چار عدد ہیجڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان چاروں کی باچھیں کھل پڑیں۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ایک ہیجڑا اٹھ کر شیرپا سے لپٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور شیرپا نے نیپالی زبان میں کچھ چیختے ہوئے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ میری طرح شیرپا بھی خاصا بدحواس ہو رہا تھا۔

اس دوران میں اندرونی دروازے سے ایک اور دراز قامت ہیجڑا برآمد ہوا۔ وہ شکل صورت میں اپنے ساتھیوں سے بہت بہتر تھا۔ ویسے اس میں شبہ نہیں کہ وہ سب کے سب اچھی شکل و صورت کے مالک تھے۔ ان میں دو نے ساڑیاں پہن رکھی تھیں اور تین نیپالی زنانہ لباس میں تھے۔ دراز قامت بھی ساڑی میں ملبوس تھا۔

"پدھاریے مہاراج پدھاریے (تشریف لائیے)۔" دراز قامت نے بڑے چاؤ سے ہاتھ لہراتے ہوئے ہمیں آگے آنے کی دعوت دی۔

"تم میں بسنتی بائی کون ہے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"بسنتی میں ہوں مہاراج۔ آپ لوگ ٹھیک جگہ پر

آ ئے۔ پسند کیجئے۔ بسنتی کی پریاں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ذرا اور پہلے آجاتے تو بہت اچھی چیزیں مل جاتیں۔ پورے کھٹمنڈو میں بسنتی کی شہرت ہے۔ قدر دان تو شام سے پہلے ہی۔۔۔"

"بند کرو بکواس۔" شیرپا نے اسے ڈانٹ دیا "ہم عیاشی کے لیے نہیں آئے۔ یہاں اور کون ہے؟"

"بسنتی کے کوٹھے پر اور کون ہو سکتا ہے مہاراج۔ پر تم ڈانٹتے کیوں ہو۔ پولیس والے ہو کیا؟" بسنتی نے یہ کہتے ہوئے مخصوص انداز میں تالی بجائی۔

"ہاں۔ ہم پولیس والے ہیں اور ہمیں ایک مجرم کی تلاش ہے۔" شیرپا نے کہا "ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ یہیں چھپا ہوا ہے۔"

"ہائے رام!" بسنتی کے منہ سے کراہ سی خارج ہو گئی "دیکھ لو مہاراج۔ خود دیکھ لو۔ یہاں میری پریوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دو کسٹمر آئے تھے۔ وہ بھی بھاگ گئے۔"

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کیا روہن نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ شیرپا کی مزید مار سے بچنے کے لیے ہمیں یہاں کا پتا بتا دیا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ مذاق کیا تھا یا یہاں آکر ہم کسی فریب کا شکار ہو رہے تھے لیکن بہرحال' میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"شیرپا۔ تم یہیں رکو۔ میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر بسنتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "چلو۔ میں تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

بسنتی کے چہرے پر ایک لمحے کو تغیر سا نمودار ہوا پھر اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

یہ پورا فلور بسنتی کے قبضے میں تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پانچ چھ کمرے تھے۔ پچھلی طرف ایک کشادہ بالکونی تھی۔ دائیں طرف ایک راہداری تھی۔ وہاں سے ایک تنگ سا زینہ اوپر جانے کے لیے تھا اور ایک زینہ نیچے جانے کے لیے۔ اس عمارت کے پیچھے تنگ سی گلی تھی۔ راہداری میں دائیں طرف بھی ایک دروازہ تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔

"اس کمرے میں کیا ہے۔ تالا کھولو۔" میں نے بسنتی کو اشارہ کیا۔

"یہ ہمارا کمرا نہیں ہے مہاراج۔" بسنتی نے جواب دیا "یہ زینے کا دروازہ ہے۔ اوپر کوئی اور رہتا ہے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

میں چند لمحے بسنتی کو دیکھتا رہا پھر واپس آگیا۔

میں اور شیرپا باہر نکلے تو بسنتی کی پریوں نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ شیرپا تیزی سے پیچھے مڑا۔ ان کے قہقہوں کو یک دم بریک لگ گیا۔ میں شیرپا کو بازو سے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔

"دھوکا ہو گیا ہمارے ساتھ۔" ان اندھیری اور گندی گلیوں سے باہر آکر میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم نے غلطی کی باس۔" شیرپا بولا۔ وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا "اس کم بخت روہن اور اس کے ساتھیوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔"

"وہ اب بھی ہماری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔" میں نے انجن اسٹارٹ کر کے کار آگے بڑھا دی۔

اس وقت واقعی شدید بوریت ہو رہی تھی بلکہ مجھے اپنے آپ پر تاؤ آرہا تھا کہ میں نے روہن کی بات پر یقین کیوں کر لیا تھا۔

نیا باجار کی طرف گھومتے ہوئے میں نے گاڑی اسٹار ہوٹل کے گیٹ کی طرف موڑ دی۔ میں اس وقت چائے یا کافی کی شدید طلب محسوس کر رہا تھا۔ شیرپا نے بھی ایک کپ کافی کے خیال سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

گرما گرم کافی سے ذہن کو واقعی کسی حد تک سکون ملا تھا۔ کافی پینے کے بعد بھی ہم کافی دیر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے اور جب ہوٹل سے باہر نکلے تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ شیرپا نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ پولیس اسٹیشن کی طرف سے ہوتے ہوئے چلیں۔ خیال برا نہیں تھا۔ روہن کو اس جھوٹ پر کم از کم سرزنش تو کی جا سکتی تھی۔

پولیس اسٹیشن کا راستہ مجھے معلوم نہیں تھا اس لیے اسٹیئرنگ میں نے شیرپا کے حوالے کر دیا۔ پولیس اسٹیشن پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن وہاں کی صورت حال ہماری توقع سے بالکل مختلف تھی۔

تھانے میں پہنچ کر یہ دلچسپ انکشاف ہوا کہ روہن ہنگامے' توڑ پھوڑ اور کم از کم پانچ آدمیوں کے قتل کے الزام میں پہلے ہی سے پولیس کو مطلوب تھا (ناگ پال کے گروہ کے تقریباً ہر آدمی پر اس قسم کے سنگین جرائم کے الزامات تھے) جو پولیس آفیسر روہن اور اس کے ساتھیوں کو مدھومالا والی کوٹھی سے لایا تھا وہ اسے نہیں پہچانتا تھا لیکن تھانے میں آنے کے تقریباً بیس منٹ بعد وہاں آنے والے ایک اور آفیسر نے اسے پہچان لیا۔ اس کا اصل نام روہن بھی نہیں تھا۔ زبانی پوچھ گچھ کے دوران میں ہی روہن نے جیب سے ایک کیپسول نکال کر منہ میں ڈال لیا۔ کیپسول نگلنے کے فوراً بعد ہی اسے خون کی الٹیاں ہونے لگیں۔ اسے فوراً اسپتال لے جایا گیا لیکن اس نے راستے ہی میں دم توڑ دیا۔ اس کی

لاش اس وقت بھی اسپتال میں پڑی تھی جبکہ روہن کے دوسرے دو ساتھیوں کو جامہ تلاشی کے بعد لاک اپ میں بند کر دیا گیا تھا اور کسی بھی شخص کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہمارے لیے صورت حال خاصی مایوس کن تھی۔ تھانے میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں نے اس آفیسر سے ملنے کی کوشش کی جو روہن اور اس کے ساتھیوں کو مدھومالا کی کوٹھی سے لے کر آیا تھا لیکن پتا چلا کہ وہ اسپتال گیا ہوا تھا جہاں روہن کی لاش کے پوسٹ مارٹم کا انتظام ہو رہا تھا۔

ہم کوٹھی پر واپس آگئے۔ اس وقت ڈیڑھ بجنے والا تھا۔ مدھومالا اور شوبھا جاگ رہی تھیں۔ ہم انہیں کچھ بتا کر نہیں گئے تھے اس لیے وہ ہمارے لیے خاصی پریشان ہو رہی تھیں۔

تین بجے تک ہم لاؤنج ہی میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ ہماری عدم موجودگی میں مدھومالا اور شوبھا ایک دوسرے سے خاصی بے تکلف ہو چکی تھیں۔ مدھومالا اسے سلانے کے لیے بھی اپنے ہی کمرے میں لے گئی تھی۔

پدمی کی طرف جانے سے پہلے جب میں اور بملا یہاں رہ رہے تھے تو شیرپا سرونٹ کوارٹر میں سویا کرتا تھا۔ ہمارے جانے کے بعد وہ کوٹھی ہی کے ایک کمرے میں سونے لگا تھا۔ مدھومالا نے کوٹھی کی حفاظت کے لیے اپنے قبیلے سے دو آدمی بھی منگوا لیے تھے۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے۔ پچھلے دنوں گاؤں میں ان کی والدہ کا دیہانت (انتقال) ہو گیا تھا اس لیے وہ واپس چلے گئے تھے اور شیرپا کے کہنے کے مطابق کل پرسوں تک قبیلے سے تین آدمی مزید یہاں آنے والے تھے۔

میں اور شیرپا لاؤنج ہی میں لیٹ گئے۔ میں صوفے پر دراز ہو گیا تھا اور شیرپا قالین پر سو گیا تھا۔

صبح سات بجے شیرپا نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟" میں اس طرح جگائے جانے پر گڑبڑا سا گیا۔

"انسپکٹر بریندرا کا فون ہے۔ وہ پولیس اسٹیشن پر تمہارا انتظار کر رہا ہے جہاں رات کو روہن نے خودکشی کی تھی۔" شیرپا نے کہا۔

مجھے اٹھ کر تیار ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس دوران میں شیرپا بھی نہ صرف تیار ہو گیا تھا بلکہ اس نے چائے بھی بنا لی تھی۔ چائے پینے کے بعد میں نے شوبھا کو جگا دیا اور اسے بتا دیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

پولیس اسٹیشن کی صورت حال بہت تشویش ناک تھی۔ کئی مسلح پولیس اہلکار عمارت کے باہر بھی مستعد اور چاق و چوبند کھڑے تھے۔ عمارت کا گیٹ اور دیواریں اس طرح چھلنی نظر آرہی تھیں جیسے یہاں گولیوں کی بارش کی گئی ہو۔

گیٹ پر متعین پولیس والوں نے ہمیں اندر نہیں جانے دیا۔ انسپکٹر بریندرا کو اطلاع بھجوانی پڑی جو خود باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔

عمارت کے گیٹ کے سامنے سڑک پر اور عمارت کے اندر بھی کئی جگہوں پر خون کے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔

انسپکٹر بریندرا نے جو کہانی سنائی وہ بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز تھی۔ میرے اور شیرپا کے لیے یہ اس لیے بھی زیادہ سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی کہ گزشتہ رات ہم جس بات کو روہن کا مذاق سمجھے تھے وہ حقیقت تھی۔ یعنی چانگ لی' ریڈ لائٹ ایریا میں بسنتی بائی کے کوٹھے پر موجود تھا۔

انسپکٹر بریندرا کے مطابق اسے نہایت خفیہ ذرائع سے وہاں چانگ لی اور اس کے دو ساتھیوں کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ بریندرا نے رات دو بجے پولیس پارٹی کے ساتھ وہاں چھاپا مارا۔ چانگ لی اور اس کے ساتھی بسنتی کے کوٹھے کے اوپر والی منزل پر موجود تھے۔ عقبی راہداری میں جو دروازہ مقفل دیکھ کر میں لوٹ آیا تھا دراصل وہی اوپر جانے کا زینہ تھا۔ انسپکٹر بریندرا نے وہ تالا توڑ دیا اور دوسرے ہی لمحے اوپر سے ان پر فائرنگ شروع کر دی گئی۔ پولیس نے بھی جواب میں فائر کھول دیا۔

چانگ لی کا ایک آدمی مارا گیا تھا جبکہ دوسرا چانگ لی کے ساتھ دوسری چھت پر کود کر فرار ہو گیا تھا۔ بسنتی اور اس کا ایک ساتھی بھی پولیس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

اور پھر صبح چار بجے ناگ پال کے درجن بھر مسلح آدمیوں نے اس پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا۔ ناگ پال کو رات ہی کو بسنتی کے کوٹھے پر چھاپے اور اسپتال میں روہن کی موت کی اطلاع مل گئی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اس کے دو آدمی پولیس کی حراست میں تھے جنہیں چھڑانے کے لیے پولیس اسٹیشن پر حملہ کر دیا گیا تھا۔

اس حملے میں وہ دونوں قیدی مارے گئے تھے۔ ناگ پال کے آدمیوں نے تھانے میں گھس کر انہیں حوالات سے نکال لیا تھا لیکن پولیس نے شدید مزاحمت کی اور ان دونوں قیدیوں کے علاوہ انہیں چھڑانے والوں میں سے بھی تین آدمی ہلاک ہو گئے تھے جبکہ پولیس کے دو آدمی بھی جان ہار گئے تھے اور تین زخمی ہو گئے تھے۔

تھانے پر حملے کی اطلاع ہیڈ کوارٹر کو دی گئی تھی۔ انسپکٹر بریندرا اسی وقت ہیڈ کوارٹر پہنچا تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ بھی

نفری لے کر یہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے ایک اور تھانے کی نفری یہاں پہنچ چکی تھی۔ جب بریندرا یہاں پہنچا تو کھیل ختم ہو چکا تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران بھی آ گئے تھے۔ چھ بجے تک لاشیں بھی اٹھوا دی گئی تھیں اور یہ کیس انسپکٹر بریندرا کو دے دیا گیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ چانگ لی، بسنتی بائی کے کوٹھے میں چھپا ہوا ہے؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"کل دن میں ایک مکان پر چھاپے کے دوران میں ایک ایسا آدمی ہمارے ہاتھ لگا تھا جس نے تھرڈ ڈگری کے استعمال کے بعد یہ راز فاش کیا تھا کہ چانگ لی کہاں ہے۔ میں نے دن ہی میں بسنتی کے مکان کی نگرانی شروع کروا دی تھی۔ رات کو مجھے اطلاع ملی کہ تم اور شیرپا بھی وہاں گئے تھے۔ وہاں جانے کی کوئی خاص وجہ؟" بریندرا نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اس سے پہلے میں نے تمہیں فون کیا تھا مگر تم اپنے آفس میں موجود نہیں تھے۔" میں نے جواب دیا "میں تمہیں چانگ لی ہی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ روہن وغیرہ کو پولیس کے حوالے کرنے کے بعد میں نے خود [illegible] کا فیصلہ کیا اور شیرپا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا لیکن میں نے اس دروازے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی جس پر تالا لگا ہوا تھا اور یہی میری غلطی تھی جس پر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن یہ بسنتی کون تھی؟"

"اسے بہت اونچی چیز سمجھا جاتا تھا۔" بریندرا نے جواب دیا "ہمارے اس چھوٹے سے ملک میں بہت سی برائیاں جنم لے چکی ہیں۔ ہم جنس پرستی بھی یہاں بڑھتی جا رہی ہے۔ اس صورت حال سے تیسری جنس کے لوگ زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ ہیجڑے زیادہ تر انڈیا سے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں انہوں نے یہ دھندا شروع کر رکھا ہے۔

"بسنتی چند سال پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے چند اور ہم جنسوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک گروپ بنا لیا اور خود ان کا گرو بن بیٹھا۔ انڈیا سے بھی وقتاً فوقتاً ایسے لوگ آتے رہے۔ یہاں آتے ہی وہ بسنتی سے رابطہ کرتے۔

"ہمارے بعض سیاست داں، سرکاری افسران اور دولت مند طبقے سے تعلق رکھنے والے با اثر لوگ بھی اس برائی میں مبتلا ہیں۔ بسنتی نے ایسے بہت سے با اثر لوگوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ ان تعلقات سے فائدہ اٹھا کر بسنتی نے منشیات فروشی کا دھندا بھی شروع کر دیا۔ دو سال پہلے پولیس نے اسے پکڑا تھا مگر انہی بڑے لوگوں کی وجہ سے پولیس کو اسے چھوڑنا پڑا لیکن اس کے گروہ کو تتر بتر کر دیا گیا۔

"کچھ عرصے بعد بسنتی نے دوبارہ اپنا اڈا جما لیا۔ اس نے اگرچہ منشیات کا دھندا چھوڑ دیا تھا لیکن ایسے لوگوں سے اس کے تعلقات بدستور تھے۔

"بسنتی تقریباً چار مہینے پہلے میری نظروں میں آیا تھا۔ اسے ناگ پال کی حویلی میں آتے جاتے دیکھا گیا تھا۔ ناگ پال کی سرگرمیاں اس وقت کسی حد تک محدود تھیں اسی لیے میں نے بسنتی پر بھی توجہ نہیں دی۔

"چند روز پہلے مجھے اطلاع ملی کہ ناگ پال کے گروہ سے تعلق رکھنے والے بعض لوگوں کو پراسرار طور پر بسنتی کے کوٹھے پر آتے جاتے دیکھا گیا ہے لیکن اس وقت بھی میں نے یہ سوچ کر زیادہ توجہ نہیں دی کہ یہ لوگ عیاشی کے لیے آتے ہوں گے لیکن کل دن میں یہ انکشاف ہوا کہ چانگ لی بسنتی کے کوٹھے پر پناہ لیے ہوئے ہے۔ روپوشی کے لیے چانگ لی نے واقعی ایسی جگہ کا انکشاف کیا تھا جس پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن بالآخر اس کا راز فاش ہو ہی گیا۔ میرے آدمی اس معاملے کو پوری طرح ہینڈل نہیں کر سکے اور اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔"

"مجھے روہن نے چانگ لی کے بارے میں بتایا تھا۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا "لیکن جب میں شیرپا کے ساتھ وہاں پہنچا تو ہیجڑوں کی فوج دیکھ کر میں سمجھا تھا کہ روہن نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا اور مزید مار سے بچنے کے لیے اس نے ہمیں بسنتی کا پتا بتا دیا تھا اور اسی لیے میں واپس چلا آیا تھا۔ واپسی پر ہم تھانے کی طرف چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ میں روہن سے پھر کچھ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا لیکن وہاں صورت حال بدلی ہوئی تھی اور اب یہ سب کچھ..." میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بولا "ایک رات میں تین خوفناک واقعات رونما ہوئے ہیں۔ میری تو عقل کام نہیں کر رہی کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے!"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" بریندرا نے کہا "ناگ پال کے حوالے سے اب حکومت نے بھی اپنی پالیسی بدل دی ہے۔ اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے۔ اب اسے کوئی رعایت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ ڈراما جلد ہی ختم ہو جائے گا۔"

"مجھے یہاں کس لیے بلایا تھا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی سب کچھ بتانے کے لیے۔" بریندرا نے جواب دیا "تمہیں کچھ عرصے کے لیے پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم اکیلے ہوتے تو میں زیادہ پریشان نہ ہوتا لیکن تمہارے ساتھ شوبھا بھی ہے اور اب تم ایک ایسی جگہ پر چلے گئے ہو جہاں ایک اور عورت بھی موجود ہے۔ مدھو مالا ایک قبائلی سردار کی بیٹی ہے۔ اس نے اگرچہ اپنے تحفظ کے لیے کبھی حکومت سے رابطہ نہیں کیا لیکن اب ہمیں اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔ سادہ لباس میں ہمارے دو آدمی مدھو مالا کی کوٹھی پر پہنچ گئے ہوں گے۔ وہ باہر رہ کر کوٹھی کی نگرانی کریں گے۔ رات کو ان کی جگہ دوسرے آدمی پہنچ جائیں گے۔"

"مدھو مالا کے قبیلے کے کچھ آدمی بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ وہ..."

"اب میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔" بریندرا نے میری بات کاٹ دی "تم ان قبائلی سرداروں کو نہیں جانتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ لوگ حکومت سے بہت مخلص ہیں۔ تعاون بھی کرتے ہیں لیکن جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو حکومت ہی کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں اور پھر آج کل تو ناگ پال جیسے شیطان حکومت کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ عین ممکن ہے ناگ پال ہی مدھو مالا کو کوئی نقصان پہنچانے کے بعد اس کے باپ کو حکومت کے خلاف اکسانے کی کوشش کرے اس لیے ایسی کسی صورتِ حال سے بچنے کے لیے مدھو مالا کی کوٹھی کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

ہماری ان باتوں کے دوران میں شیرپا خاموش بیٹھا رہا تھا۔ میں اور بریندرا کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے اور پھر میں اٹھ گیا۔

جب ہم کوٹھی واپس پہنچے تو گیارہ بج رہے تھے۔ شوبھا اور مدھو مالا لان میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم بھی ان کے پاس کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دو ہی منٹ بعد گیٹ پر دستک ہوئی تو شیرپا اٹھ کر باہر چلا گیا اور پھر اس نے مجھے بھی اشارے سے بلا لیا۔

سادہ لباس میں پولیس کے دو آدمی آئے تھے۔ صرف اپنے آپ کو روشناس کرانے کے لیے انہوں نے ہمیں باہر بلایا تھا۔ چند منٹ ہم سے گپ شپ کرنے کے بعد ان میں سے ایک دائیں طرف چلا گیا اور دوسرا بائیں طرف۔

وہ دن بڑی بوریت میں گزرا۔

رات نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ شیرپا قریب تھا اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ کچھ دیر بات کرتا رہا پھر مجھے اشارہ کیا۔

"تمہاری کال ہے۔"

میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسیور اس سے لے لیا۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر بریندرا ہو گا کیونکہ میرے بارے میں صرف اسی کو معلوم تھا کہ میں یہاں ہوں یا پھر مایا متی ہو سکتی تھی لیکن ریسیور پر سنائی دینے والی وہ آواز میرے لیے قطعی اجنبی تھی۔

"میں گومل بول رہا ہوں۔" وہ شخص کہہ رہا تھا "سومبا کا دوست... تمہیں یاد ہو گا کہ..."

"ہاں ہاں۔ مجھے یاد آ گیا۔" میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟"

"تم پہلے بھی یہاں رہ چکے ہو اور آج دن میں، میں نے تمہیں شیرپا کے ساتھ دیکھا تھا۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

"کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔ کوئی خاص بات؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں اس چینی کی تلاش ہے نا جو گزشتہ رات ریڈ لائٹ ایریا میں پولیس کے گھیرے سے فرار ہو گیا تھا؟" گومل نے کہا۔

"ہاں۔ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"آج شام کو ناگ پال کا ایک بہت قریبی آدمی میری نظروں میں آ گیا تھا۔" گومل نے جواب دیا "مجھے اس پر شبہ ہوا اور میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا جو ہنومانتے کھولا کے کنارے پر واقع ایک پرانے مندر تک جاری رہا۔ وہ چینی بھی اس مندر میں موجود ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے اور کہاں پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مندر بھگتا پور کے راستے میں ہے۔" گومل نے جواب دیا "اس چینی کے ساتھ صرف ایک آدمی ہے جس کا میں نے تعاقب کیا تھا۔ اگر تم چاہو تو میں..."

"تم اس وقت کہاں پر ہو؟" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں آرنیکو روڈ پر بابر محل والے موڑ پر ویرا ریسٹورنٹ سے بول رہا ہوں۔ تم اگر آنا چاہو تو..."

"میرا انتظار کرو۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات

کاٹ دی ”مجھے وہاں تک پہنچنے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔“ گومل نے کہا ”پولیس کو ساتھ لے کرمت آنا۔ زیادہ لوگ ہوں گے تو وہ محتاط ہوجائیں گے اور پولیس کے طریقہ کار سے ویسے بھی تم واقف ہو۔“

”میں اکیلا آؤں گا۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔

گومل کی آخری بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس نے مجھے پولیس کو ساتھ لانے کو منع کیوں کیا تھا؟ میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں کیا جارہا؟ گومل کو میں چہرے سے تو پہچانتا تھا۔ سومبا کے ساتھ کئی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی تھی لیکن ٹیلی فون پر اس کی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ تصدیق کیے بغیر میدان میں کود پڑنا اگرچہ خطرات کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن میں نے رسک لینے کا فیصلہ کرلیا۔

شیربا کو جب میں نے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہوگیا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا۔ ایک سے دو بھلے۔ شیربا ایک دلیر اور حوصلہ مند آدمی تھا۔ آزمودہ کار تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ وقت پڑنے پر پیچھے نہیں ہٹے گا۔

میں نے بھی پنڈلی کے فیتے میں خنجر لگالیا۔ شیربا نے بھی پستول چیک کرکے جیب میں ڈال لیا۔ میں نے شوبھا کو بھی بتا دیا کہ ہم کس مشن پر جارہے ہیں۔ شوبھا اس بات پر بضد تھی کہ میں خود ایسا کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے انسپکٹر بریندرا کو آگاہ کردوں۔ پولیس اس معاملے سے خود ہی نمٹ لے گی لیکن میں اس مہم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھنا چاہتا تھا۔ یہ عہد تو میں نے کر رکھا تھا کہ جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کو یہاں قدم نہیں جمانے دوں گا۔

گومل کی کال نو بجے کے قریب موصول ہوئی تھی۔ ہم شہر کے شمال میں تھے جبکہ ویرا ریسٹورنٹ شہر کے جنوبی حصے میں واقع تھا۔

شیربا ڈرائیونگ کررہا تھا اور میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر زندگی کے ہنگامے شباب پر تھے۔ ہر طرف چہل پہل نظر آرہی تھی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر ہوتی ہوئی رنگ روڈ پر آگئی اور وہاں سے آرنیکو روڈ پر راج مارگ کی طرف مڑگئی۔ یہی سڑک سیدھی بھگتا پور کی طرف چلی گئی تھی۔

شہری حدود سے تقریباً دو کلو میٹر آگے ایک موڑ پر بابر محل نام کی ایک قدم عمارت تھی۔ اس تاریخی عمارت کی وجہ سے آس پاس کچھ آبادی بھی ہوگئی تھی۔ اس طرف کچھ اور پرانی عمارتیں اور کھنڈرات بھی تھے جنہیں دیکھنے کے لیے سیاح اس طرف آتے رہتے تھے لیکن شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد سیاحوں کی آمدورفت بند ہوجاتی تھی۔

ویرا ریسٹورنٹ سڑک کے موڑ پر ہی تھا۔ مقامی آبادی کی وجہ سے اس وقت یہاں خاصی رونق تھی۔ شیربا نے ریسٹورنٹ سے ذرا آگے گاڑی روک لی اور جب میں گاڑی سے اتر کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تو پونے دس بج رہے تھے۔

گومل مجھے دروازے کے قریب ہی ایک میز پر نظر آگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ اس نے اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

ناگ پال کے ہاتھوں سومبا اور اس کے دو تین آدمیوں کے قتل کے بعد اس کا گروہ منتشر ہوگیا تھا۔ بعض لوگ تو یہ شہر ہی چھوڑ کر چلے گئے تھے اور بعض اپنے طور پر زندہ رہنے کی جدوجہد کررہے تھے اور شاید گومل بھی انہی میں سے ایک تھا۔

گومل کے پاس موٹر سائیکل تھی لیکن اسے میں گاڑی کی طرف لے آیا تو شیربا کو دیکھ کر وہ کچھ جز بز سا ہوا تھا۔ میں اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور شیربا گاڑی کو حرکت میں لے آیا۔

گاڑی اس علاقے سے نکل کر مین روڈ پر بھگتا پور کی طرف دوڑنے لگی۔ تقریباً پانچ کلو میٹر آگے دریائے ہنومانتے تھا جو آگے جاکر دائیں طرف پہاڑیوں میں مڑگیا تھا۔

چاندنی رات میں آس پاس کا منظر بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن ایسے دل فریب مناظر سے لطف اندوز ہونا شاید میری قسمت ہی میں نہیں تھا۔ میں شاید جمالیاتی حس سے محروم ہوتا جارہا تھا۔ میرا ذہن تو ہر وقت گنجلک خیالات کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ کسی حسین منظر سے لطف اندوز ہونے کا میرے پاس وقت ہی کب تھا۔

”گاڑی کی ہیڈ لیمپس اور اندر کی بتی بھی بجھا دو شیربا۔“ گومل نے کہا ”اور آگے پل پار کرنے کے بعد گاڑی کو دائیں طرف موڑ لینا۔“

دریا پر یہ پل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پل پار کرتے ہی شیربا نے گاڑی دائیں طرف موڑ دی۔ یہ ایک کچا راستہ تھا جو دریا کے ساتھ ساتھ چلا گیا تھا۔ گاڑی کی رفتار بھی کم کرنی پڑی تھی۔

تقریباً دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مندر کی عمارت کا وہ ہیولا دکھائی دینے لگا۔ چاندنی رات میں عمارت کا وہ ہیولا بڑا پراسرار دکھائی دے رہا تھا۔

”بس۔ اس طرف گاڑی روک لو۔“ گومل نے ایک طرف اشارہ کیا۔

شیربا نے گاڑی کی رفتار کم کرکے اسے گنجان درختوں میں لے جاکر جھاڑیوں میں روک کر انجن بند کردیا اور ہم تینوں گاڑی سے اتر آئے۔ دروازے کھولنے اور بند کرنے میں ہم نے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔

مندر کی وہ عمارت وہاں سے تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر تھی۔ چاندنی رات میں وہ عمارت خاصا پراسرار منظر پیش کررہی تھی۔ ہم گومل کے پیچھے درختوں میں چلتے رہے اور عمارت سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر رک گئے۔

”اس عمارت کا مین گیٹ دریا کی طرف ہے۔“ گومل نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا ”لیکن ایک دروازہ اس طرف بھی ہے۔ جس طرف مندر کے پچھلے حصے میں تہ خانے کا راستہ ہے۔ وہ چینی اس تہ خانے میں ہے۔“

عمارت میں داخل ہوتے ہوئے ہم خاصے محتاط ہوگئے۔ شیربا نے پستول نکال لیا تھا۔ گومل کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آرہا تھا۔

مندر کی ٹوٹی پھوٹی یہ عمارت غالباً صدیوں پرانی تھی۔ اندر وحشت انگیز سناٹا طاری تھا۔ اوپر کی طرف کسی ٹوٹی ہوئی دیوار سے مدھم سی چاندنی عمارت کے اندر بھی پہنچ رہی تھی اور فرش پر چاندنی کا وہ دھبا بڑا پراسرار تاثر دے رہا تھا۔

اس کھنڈر نما عمارت میں کسی طرف آہٹ سن کر میں ٹھٹک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا پتھر لڑھکا ہو۔

”کوئی جانور ہوگا۔“ گومل نے سرگوشی کی ”اس طرف چلتے رہو۔“

گومل آگے اور ہم اس کے پیچھے چلتے رہے۔ آگے ڈھلان تھی۔ صاف لگ رہا تھا جیسے ہم زمین کے سینے میں اتر رہے ہوں۔ گومل نے ایک بار پھر رکنے کو کہا۔ اس وقت ہم تقریباً بیس بائیس فٹ نیچے آچکے تھے۔

ہم تینوں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔ اب آگے راستہ ہموار تھا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک بار پھر رک گئے۔ میں نے دیوار کی دوسری طرف جھانک کر دیکھا۔ آگے کسی جگہ مدھم سی روشنی نظر آرہی تھی۔ اس متحرک روشنی کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس طرف کوئی مشعل جل رہی تھی جس کی لو ہوا سے کپکپا رہی تھی۔

”اس راہداری میں بائیں طرف وہ کمرا ہے جہاں روشنی ہورہی ہے۔“ گومل نے سرگوشی کی ”وہ چینی اسی کمرے میں ہے۔ وہ دوسرا آدمی بھی اسی طرف :ٍ گیا۔“

ٹھیک اسی وقت عقب میں ڈھلان کی طرف سے ایک بار پھر کسی پتھر کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ گومل کے بارے میں بھی میرا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ فون پر اس نے بتایا تھا کہ اس نے جس شخص کا تعاقب کیا تھا اسے اس مندر میں داخل ہوتے دیکھا تھا لیکن.... گومل اس مندر میں داخل ہوکر جس طرح ہمیں یہاں تک لایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مندر کے اندرونی راستوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔

ہم اس راہداری میں مڑگئے۔ میں نے پتلون کے پائنچے سے خنجر بھی نکال لیا تھا اور یہ بھی طے کرلیا تھا کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا تو کم از کم گومل تو میرے ہاتھ سے زندہ نہیں بچ سکے گا۔

ہم اس کمرے کے قریب رک گئے۔ کسی زمانے میں یہاں کوئی مضبوط قسم کا دروازہ بھی رہا ہوگا لیکن اب تو چوکھٹ بھی غائب تھی۔ جے پور میں مجھے کئی مندر دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے نیچے نہ صرف تہ خانے تھے بلکہ ایسے خفیہ راستے بھی تھے جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ یہاں بھی کوئی خفیہ راستے ضرور ہوں گے۔

میں نے دیوار کی آڑ سے جھانک کر دیکھا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یہ کمرا خاصا کشادہ تھا اور بائیں طرف ایک شان دار بیڈ بچھا ہوا تھا۔ اس سے آگے ایک کافی ٹیبل اور تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر چانگ لی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے دوسری کرسی پر نیم عریاں لباس میں ایک عورت تھی۔ میز پر شراب اور سوڈے کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں شراب کے گلاس نظر آرہے تھے۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ پینے پلانے کا دور ابھی شروع ہوا تھا۔

میری آنکھوں میں ایک لمحے کو الجھن سی تیرگئی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اس آدمی کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا گومل نے تعاقب کیا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ باہر میں نے دو مرتبہ پتھر لڑھکنے کی آواز سنی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ شخص باہر کسی جگہ موجود ہو اور اس نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔ بہرحال، اب اوکھلی میں سر دیا جاچکا تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ موسلوں سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

گومل نے مجھے اشارہ کیا تو میں خنجر سنبھالے دروازے

میں داخل ہوگیا۔ شیربا بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ چانگ لی کے سامنے بیٹھی ہوئی عورت نے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ اس طرح اچھلی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ خوف سے اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہوگیا تھا۔ شراب کا گلاس بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شراب اس کے اوپر گری تھی۔

چانگ لی نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل پرسکون تھا۔ لگتا تھا جیسے ہماری آمد اس کے لیے غیر متوقع نہ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر آنے والی خفیف سی مسکراہٹ نے میرے اس خیال کی تصدیق بھی کردی تھی۔ تاہم وہ عورت میرے ہاتھ میں خنجر اور شیربا کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔

"ویل کم۔" چانگ لی میری طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا "مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ بسنتی کے کوٹھے پر میرا اور تمہارا آمنا سامنا نہیں ہوسکا تھا لیکن یہاں سے تم واپس نہیں جاسکو گے۔"

"ہاتھ اوپر اٹھالو چانگ لی۔" میں نے کہا "تمہارے دن پورے ہوچکے ہیں۔ تمہارا کھیل ختم ہو۔۔۔"

میری کمر پر پڑنے والی زوردار ٹھوکر نے میرا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔ میں لڑکھڑا کر آگے گرا۔ شیربا بھی کراہتا ہوا آگے کو گرا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا جو فرش پر لڑھکتا ہوا چانگ لی کے پیروں کے قریب پہنچ گیا تھا۔ چانگ لی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے جھک کر وہ پستول اٹھالیا۔

میں کمرے کے وسط میں منہ کے بل گرا تھا۔ خنجر میرے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے گردن گھما کر دیکھا۔ گومل کے بارے میں میرے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خباثت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس نے شیربا کو پستول کی زد پر لے رکھا تھا۔

"مجھے تم پر پہلے ہی شبہ تھا گومل۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں نفرت نمایاں تھی "افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم نے اپنے گرو سوما سے کچھ نہیں سیکھا جس نے اپنی جان دے دی لیکن سچائی کا دامن نہیں چھوڑا۔"

"وہ بے وقوف تھا۔" گومل نے ہنستے ہوئے جواب دیا "عقل مند تو وہی ہوتا ہے جو حالات کا رخ دیکھ کر قدم اٹھانا جانتا ہو۔ میں نے بھی وہی کیا جو ان حالات میں مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

"تم دنیا کے سب سے بڑے احمق ہو۔" میں نے کہا "تم نہیں جانتے۔۔۔"

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر دائیں طرف دیکھا۔ پہلے میں نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس طرف بھی ایک تنگ سا دروازہ تھا جہاں سے ایک آدمی نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ سامنے والی کھڑکی میں بھی ایک آدمی نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔

ہمارے مخالفین کی تعداد اب چار ہوگئی تھی۔ وہ نیم عریاں لڑکی اور چانگ لی اس تعداد میں شامل نہیں تھے۔ لڑکی تو ویسے ہی خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس سے کسی مقابلے کی توقع نہیں تھی۔

"خنجر پھینک دو اور تم دونوں سامنے والی دیوار کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ۔" چانگ لی نے میری اور شیربا کی طرف دیکھتے ہوئے پستول سے اشارہ کیا "کل رات تمہیں بسنتی کے مکان میں دیکھ کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میں تمہاری ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم نے جس طرح میرے اس ٹھکانے کا پتا لگایا وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گے اور تم سے پیچھا چھڑانا بہت ضروری تھا۔ اس کے لیے میں نے گومل کو چارے کے طور پر استعمال کیا اور تم بڑی آسانی سے یہاں پہنچ گئے اور تم یہ بات بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ پیسے سے ہر چیز کو خریدا جاسکتا ہے۔۔۔۔ انسان بھی۔ ہر انسان کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ میں نے گومل کی قیمت لگائی تو یہ ہمارے ہاتھ بک گیا اور تمہیں یہاں لے آیا۔ تم سے تو بڑا لمبا چوڑا حساب کرنا ہے۔ پانچ سو کلو ہیروئن۔۔۔۔ اپنے آدمیوں کے قتل کو میں بھول سکتا ہوں لیکن پانچ سو کلو ہیروئن کو نہیں لیکن تمہارے ساتھ حساب کتاب شروع کرنے سے پہلے میں گومل کا حساب کردینا ضروری سمجھتا ہوں تمہیں یہاں لا کر اس نے بہت بڑا کام کیا ہے اور یہ انعام کا مستحق ہے۔ جامو!"

اس نے آخری الفاظ گومل کے قریب کھڑے ہوئے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے ادا کیے تھے۔ جامو یقیناً اسی شخص کا نام تھا۔ چانگ لی نے کہا "گومل کو انعام دے کر فارغ کردو جامو۔"

جامو، گومل کی طرف مڑا۔ اس نے بڑی تیزی سے پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا کر ٹریگر دبا دیا۔ کمرا گولی کی آواز اور گومل کی چیخ سے گونج اٹھا۔ گولی گومل کی پیشانی میں لگی۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی پیشانی سے خون کی دھار بہہ نکلی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر قریب ہی گر گیا تھا۔

"غداری کا انعام تو یہی ہوتا ہے نا۔" چانگ لی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس نے اپنے باس سے بھی غداری کی تھی۔ اگر یہ اپنے باس کو دھوکا نہ دیتا تو وہ بھی نہ مارا جاتا۔ اس وقت ہم نے اسے زندہ رکھا تھا کیونکہ اس سے ایک دو اور کام لینا باقی تھے۔ سب سے بڑا کام تو یہ تھا کہ یہ تمہیں یہاں لے آیا۔ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس جیسے لوگوں کا انجام تو یہی ہونا چاہیے نا۔ یہ اپنے دوستوں سے اور اپنے کاز سے وفا نہیں کرسکا، ہمارا وفادار کیسے رہتا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے کہا "اگر تم اسے معاف کردیتے تو میں اسے سزا ضرور دیتا۔"

"اب تم دونوں اٹھ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ۔ جلدی کرو۔" چانگ لی نے پستول سے اشارہ کیا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ یہ جگہ تو ہم نے آج کے اس پروگرام کے لیے منتخب کی تھی۔ ہماری اصل منزل تو ریورویلی میں واقع وہ حویلی ہے جہاں ناگ پال ہمارا انتظار کررہا ہے۔"

میں نے خنجر ہاتھ سے چھوڑ دیا اور اٹھتے ہوئے کن انکھیوں سے شیربا کی طرف دیکھا۔ گومل کی لاش شیربا سے چند فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی اور پستول بھی قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ شیربا کی نظریں پستول پر تھیں۔ مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔

دروازے کے قریب کھڑے ہوئے جامو نے شاید کچھ اندازہ لگالیا تھا۔ وہ گومل کا پستول اٹھانے کے لیے جھکا تو ٹھیک اسی وقت شیربا نے سانپ کی سی سرعت سے اپنی جگہ سے لوٹ لگا دی۔ اس کے پیر کی ٹھوکر جامو کے سینے پر پڑی۔ وہ کراہتا ہوا پیچھے الٹ گیا۔ شیربا نے بڑی پھرتی سے زمین پر پڑے ہوئے پستول پر ہاتھ ڈال دیا۔ پستول ہاتھ میں آتے ہی اس نے ٹریگر دبانے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

میں نے بھی وقت ضائع کیے بغیر اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور ہوا میں اڑتا ہوا چانگ لی کے اوپر جاگرا۔ شیربا والا پستول اگرچہ چانگ لی کے ہاتھ میں تھا لیکن اسے ٹریگر دبانے کا موقع نہیں مل سکا۔

میں چانگ لی کو ساتھ لیتا ہوا کرسی سمیت دوسری طرف الٹ گیا۔ وہ عورت بھی چیختی ہوئی اٹھ کر کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ اسے غالباً چانگ لی کا دل بہلانے کے لیے یہاں لایا گیا تھا لیکن اس خطرناک صورتِ حال نے اسے خوف زدہ کردیا تھا۔

چانگ لی کا یہ کہنا بھی درست ہوسکتا تھا کہ مجھے پھانسنے دینے کے لیے اس جگہ کا انتخاب وقتی طور پر کیا گیا تھا لیکن یہاں کے انتظامات دیکھ کر یہ اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں تھا کہ اس سے پہلے بھی یہ جگہ استعمال ہوتی رہی تھی۔

چانگ لی میرے نیچے دب گیا تھا۔ وہ نکلنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میں نے اسے دبوچ لیا۔ اسی لمحے کھڑکی کی طرف سے غراتی ہوئی آواز ابھری۔

"چھوڑ دو مسٹر۔ باس کو چھوڑ دو ورنہ گولی ماردوں گا۔"

لیکن میں نے چانگ لی کو نہیں چھوڑا۔ میں اسے اس طرح رگید رہا تھا کہ اپنے آپ کو اس کی آڑ میں رکھوں تاکہ اس کے کسی آدمی کی گولی مجھے نشانہ نہ بنا سکے۔

شیربا نے جامو کو پہلے ہی فائر میں ڈھیر کردیا تھا لیکن وہ خود سنبھل نہیں پایا تھا کہ اندرونی دروازے میں کھڑے ہوئے آدمی نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اس نے فائر کرنے کے بجائے پستول سے شیربا کے کندھے پر ضرب لگائی۔ شیربا کراہ اٹھا۔

کھڑکی کے باہر کھڑا ہوا آدمی بھی چھلانگ لگا کر اندر آگیا۔ وہ مجھ پر پستول کے دستے سے وار کرنے کے لیے ادھر ادھر ناچنے لگا لیکن میں اسے موقع نہیں دے رہا تھا۔ میں چانگ لی کو گرفت میں لیے ادھر سے ادھر لوٹ لگاتا رہا۔

اور پھر اچانک فضا تڑتڑاہٹ کی آواز سے گونج اٹھی۔ فائرنگ کی یہ آواز کھڑکی کی طرف سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک بھاری آواز بھی گونج اٹھی۔

"خبردار! پولیس نے اس مندر کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہوجاؤ۔"

چانگ لی کے دونوں ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ کھڑکی کی طرف سے دو آدمی کود کر اندر آگئے۔ میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ دونوں وہی تھے جنہیں مدھو مالا کی کوٹھی کی نگرانی پر تعینات کیا گیا تھا۔ میں نے بھی چانگ لی کو چھوڑ دیا۔ میرا خیال تھا کہ چانگ لی بھی ہاتھ اٹھا دے گا لیکن اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اندرونی دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اچھلا اور دروازے کی دوسری طرف راہداری میں جا گرا۔ اندھیرے میں ایک طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں بھی قدموں کی آواز پر اس طرف دوڑ پڑا۔

ہم دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے مندر سے باہر آگئے۔ چانگ لی مندر کی پچھلی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ مجھ سے دس بارہ گز آگے تھا۔ اس طرف قد آور گنجان جھاڑیاں تھیں

اور مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ ان جھاڑیوں میں غائب نہ ہوجائے۔ میں نے بھی اس طرف دوڑ لگادی۔

میں نے چانگ لی کو جھاڑیوں میں جالیا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کرتا رہا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ میں اسے کچھ دیر تک جھاڑیوں میں رگیدتا رہا لیکن بالآخر وہ میری گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اٹھ کر ایک طرف دوڑ لگادی لیکن اس مرتبہ بھی میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا۔

اس مرتبہ ہم جس جگہ گرے تھے وہاں پانی پھیلا ہوا تھا۔ چانگ لی میرے نیچے دب گیا تھا لیکن اس نے مجھے پیروں سے دور اچھال دیا۔ میں پشت کے بل پانی میں ڈوبی ہوئی جھاڑیوں میں گرا۔ میرا خیال تھا کہ چانگ لی ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کرے گا لیکن اس مرتبہ اس نے میرے اوپر چھلانگ لگادی اور سینے پر سوار ہوکر دونوں ہاتھوں سے میرے منہ پر گھونسوں کی بارش کردی۔

میرے دونوں جبڑوں پر گھونسے ہتھوڑوں کی طرح برس رہے تھے لیکن ایک موقع پر میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑلیے اور اسے نیچے کی طرف کھینچنے لگا۔ چانگ لی میرے اوپر جھکتا چلا گیا۔ میں نے موقع ملتے ہی اس کے چہرے پر سر سے زوردار ٹکر ماردی۔

ٹکر چانگ لی کی ناک پر لگی۔ وہ چیخ اٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اب بھی میری گرفت میں تھے۔ میں نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے ایک اور ٹکر ماری اور اسے ایک طرف اچھال دیا۔

چانگ لی شڑاپ کی آواز سے جھاڑیوں کے اندر پانی میں گرا۔ میں بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور چانگ لی کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس پر ٹھوکروں کی بارش کردی۔

جنرل کھوراٹ کے آدمیوں سے طویل عرصے تک میرا واسطہ رہا تھا۔ پہلے تھائی لینڈ میں اور پھر گولڈن ٹرائی اینگل میں۔ یہ لوگ خوں خوار بھیڑیوں سے کم نہیں تھے۔ تھائی لینڈ کے سرحدی قصبے چیانگ سائین میں تو ایک مرتبہ چانگ لی سے بھی آمنا سامنا ہوچکا تھا۔ اس میں اب بھی بلا کی طاقت بھری ہوئی تھی لیکن گزرے ہوئے وقت نے اس پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ڈالا تھا اور اب اس میں وہ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ اب وہ جم کر مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی جان بچا کر بھاگنے کی فکر میں تھا۔

چانگ لی کو ایک بار پھر موقع مل گیا۔ اس نے مجھے دھکا دے کر گرا دیا اور اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اٹھ کر اس کے پیچھے چھلانگ لگانا چاہی تو پانی میں میرا پیر پھسل گیا۔ میں پشت کے بل گرا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔

چانگ لی اس دوران میں پچیس تیس گز دور نکل چکا تھا۔ اس کے کپڑے اور جوتے بھی پانی میں بھیگے ہوئے تھے اور شاید اسی لیے اس سے بھی زیادہ تیز نہیں دوڑا جارہا تھا۔ میں نے جلد ہی اسے جالیا۔

اس مرتبہ میں نے اسے بھاگنے کا موقع نہیں دیا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کرتا رہا۔ اس دوران میں ایک آدمی دوڑتا ہوا ہماری طرف آیا۔

وہ ان دو پولیس والوں میں سے ایک تھا جو ہماری مدد کے لیے بروقت مندر میں پہنچ گئے تھے۔ اس نے بھی چانگ لی کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ چانگ لی کی چیخیں ویرانے میں گونجتی رہیں اور بالآخر وہ ادھ موا سا ہوکر گرگیا۔

میں نے جھک کر چانگ لی کو گریبان سے پکڑنا چاہا تو اس نے اچانک ہی میرے جبڑے پر زوردار گھونسا رسید کردیا۔ میں کراہتا ہوا لڑکھڑا گیا۔ میرے قریب کھڑا ہوا پولیس والا اس پر پل پڑا اور اس وقت تک چانگ لی پر ٹھوکریں برساتا رہا جب تک وہ ایک بار پھر بے حس و حرکت نہیں ہوگیا۔

پولیس والا چند لمحے کھڑا ہانپتا رہا پھر جھک کر چانگ لی کے لباس کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیکٹ کی اندرونی جیب سے پستول برآمد ہوا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ چانگ لی نے پستول استعمال کیوں نہیں کیا تھا اور پھر یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی۔ مندر کے تہ خانے سے وہ بدحواسی کی کیفیت میں بھاگا تھا اور پھر باہر آکر میں نے اسے زیادہ دور جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ ہوسکتا ہے بھاگ دوڑ میں اسے پستول نکالنے کا خیال نہ رہا ہو یا اسے موقع ہی نہ ملا ہو۔

چانگ لی بے ہوش ہوچکا تھا۔ ہم دونوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال دیے اور اسے جھاڑیوں میں گھسیٹتے ہوئے مندر کی طرف لے جانے لگے۔

دوسرا پولیس والا اور شیرپا' چانگ لی کے دوسرے دو آدمیوں کو مندر سے باہر لے آئے تھے۔ وہ عورت بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ گوپال اور جامو وغیرہ کی لاشیں تہ خانے ہی میں چھوڑ دی گئی تھیں۔

چانگ لی کوئی دس منٹ بعد ہوش میں آسکا تھا۔ ہم ان سب کو پستولوں کی زد پر اس جگہ لے آئے جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ کار سے چند گز کے فاصلے پر جھاڑیوں میں ایک جیپ بھی موجود تھی۔

ان سب کو باندھ کر جیپ میں ڈال دیا گیا۔ اس دوران

میں ایک پولیس والا بتا رہا تھا کہ جب میں اور شیرپا اپنی کار پر کوٹھی سے نکلے تھے تو انہیں کسی گڑبڑ کا شبہ ہوگیا تھا۔ انہوں نے جیپ پر ہمارا پیچھا شروع کردیا اور سیلولر فون پر ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی تاکہ کوٹھی کی نگرانی کے لیے دوسرے آدمیوں کو بھیج دیا جائے۔

چانگ لی اور اس کے ساتھیوں کو جیپ میں ڈالنے کے بعد اس پولیس والے نے سیلولر فون نکال لیا اور ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرکے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ چند منٹ فون پر بات کرتا رہا پھر فون بند کرکے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم انہیں لے کر ہیڈ کوارٹر جارہے ہیں۔ آپ لوگ اپنی کوٹھی پر چلے جائیے۔ انسپکٹر بریندرا بعد میں آپ سے رابطہ کریں گے۔"

"اور ان لاشوں کا کیا ہوگا؟" میں نے مندر کی طرف دیکھا۔

"پولیس کی ایک پارٹی یہاں آجائے گی۔ ان لاشوں کا بندوبست بھی وہی لوگ کرلیں گے۔" پولیس والے نے جواب دیا۔

میں اپنی کار کی طرف بڑھتے ہوئے' جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چانگ لی کے قریب رک گیا۔ اس کے پیر بھی بندھے ہوئے تھے اور ہاتھ بھی پشت پر رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔

"میں نے اپنا وعدہ پورا کردیا چانگ لی۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کو یہاں قدم نہیں جمانے دوں گا۔ پہلے میں نے ہیروئن کی بڑی کھیپ پر قبضہ کیا اور اب تمہیں پولیس کے حوالے کررہا ہوں۔ جنرل کھوراٹ نے اس خطے کے حوالے سے جو منصوبے بنائے تھے وہ خاک میں مل چکے ہیں۔"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔" چانگ لی نے کہا "ہیروئن کی ایک کھیپ پکڑے جانے سے یا دو چار آدمی مارے جانے سے جنرل کھوراٹ کے منصوبے متاثر نہیں ہوتے۔ پانچ سو کلو ہیروئن اس کے لیے ایک چٹکی کے برابر ہے۔ اس ہیروئن کے پکڑے جانے سے نہ تو وہ قلاش ہوا ہے اور نہ ہی اس کے آدمیوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ جب تک ناگ پال جیسے لوگ اس ملک میں موجود ہیں' جنرل کھوراٹ کو اپنے مقاصد میں ناکامی نہیں ہوسکتی۔ میرے پکڑے جانے سے منصوبہ ختم نہیں ہوگیا۔ تم دیکھو گے کہ بہت جلد یہ پورا خطہ ہمارے شکنجے میں ہوگا۔ یہاں کے سیاست داں اور حکمران بھی ہماری مرضی پر چلیں گے۔"

"تم لوگوں کا یہ گھناؤنا منصوبہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔" میں نے جواب دیا "یہاں سومبا جیسے محبِ وطن اور بریندرا جیسے فرض شناس آفیسروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بہرحال' یہ وقت بتائے گا کہ یہاں کامیابی انسانیت کی ہوتی ہے یا تم جیسے شیطان قدم جمانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔"

میں اپنی کار کی طرف آگیا۔ شیرپا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں کیچڑ میں لت پت ہورہا تھا۔ میں نے پچھلی سیٹ پر پڑا ہوا ایک کپڑا اٹھا کر پسنجرز سیٹ پر ڈال دیا اور اس پر بیٹھ گیا۔

پہلے جیپ حرکت میں آئی اور اس کے پیچھے ہماری گاڑی۔

رنگ روڈ سے جیپ ہیڈ کوارٹر کی طرف جانے والی سڑک پر مڑگئی اور شیرپا نے اپنی کار دوسری سڑک پر گھمادی۔

جب ہماری کار کوٹھی میں داخل ہوئی تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میری حالت دیکھ کر مدھومالا اور شوبھا مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ میں لاؤنج میں رکے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور باتھ روم میں گھس گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں جسم پر تولیا لپیٹ کر باتھ روم سے برآمد ہوا۔ الماری سے کپڑے نکال کر پہنے اور لاؤنج میں آگیا۔ شیرپا' مدھومالا اور شوبھا کو اس مشن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ میں بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

مدھومالا چائے بنا کرلے آئی۔ چائے کی چسکیوں کے دوران میں بھی ہم یہی باتیں کرتے رہے اور پھر ڈیڑھ بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اٹھ کر ریسیور اٹھالیا۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے میرا اندازہ تھا کہ یہ انسپکٹر بریندرا کی کال ہوگی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ کال انسپکٹر بریندرا ہی کی تھی لیکن اس نے جو خبر سنائی تھی وہ بڑی خوفناک تھی۔

ناگ پال کے آدمیوں نے رنگ روڈ پر مہاراج گنج کے قریب جیپ پر حملہ کرکے چانگ لی کو چھڑالیا تھا۔ اس جھڑپ میں دونوں پولیس والے مارے گئے تھے۔

میری ساری محنت پر پانی پھر گیا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ ناگ پال کے آدمیوں کو چانگ لی کے پکڑے جانے کی اطلاع کیسے ملی تھی اور انہیں کیسے پتا چلا تھا کہ چانگ لی کو جیپ پر پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ اس جھڑپ میں دونوں پولیس والوں کے علاوہ وہ

عورت اور چانگ لی کا ایک ساتھی بھی مارا گیا تھا جبکہ حملہ آور چانگ لی اور ایک آدمی کو چھڑا کر لے گئے تھے۔ ایک پولیس والا اسپتال جانے تک زندہ رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ فائرنگ کے تبادلے کے دوران میں چانگ لی بھی زخمی ہوا تھا۔ اسے شاید پیٹ اور ٹانگ میں گولیاں لگی تھیں۔

بریندرا سے فون پر بات کرتے ہوئے اچانک ہی مجھے مندر میں چانگ لی سے ہونے والی گفتگو یاد آگئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ریوروبلی جانے والے ہیں جہاں کسی حویلی میں ناگ پال ان کا منتظر تھا۔ میں نے انسپکٹر بریندرا کو اس بارے میں بتادیا۔

"ہوسکتا ہے وہ لوگ چانگ لی کو ریوروبلی میں واقع اس حویلی میں لے گئے ہوں!" میں نے کہا۔

"ریوروبلی میں واقع حویلی..." انسپکٹر نے کہا۔ اس کے لہجے میں سوچ کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "ریوروبلی تو بہت لمبا چوڑا علاقہ ہے۔ اس طرف بھی کئی قدیم حویلیاں ہیں۔ اب یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ چانگ لی کس حویلی کی بات کر رہا تھا۔ بہرحال، میں صبح تم سے بات کروں گا۔"

بریندرا نے فون بند کردیا۔ میں نے بھی ریسیور رکھ دیا اور اٹھ کر شوبھا کے قریب بیٹھ گیا۔

رات ہی کو دو بجے دوسرے سادہ لباس والے کوٹھی کی نگرانی کے لیے پہنچ گئے تھے اور صبح گیارہ بجے کے قریب مدھو مالا کے قبیلے کے چار افراد بھی پہنچ گئے۔ ان میں تین مرد اور ایک عورت تھی۔ عورت نکلتے ہوئے قد اور صحت مند جسم کی مالک تھی۔ اس کے حسین ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ تینوں مرد بھی دراز قامت اور دلکش نقش و نگار کے مالک تھے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ مدھو مالا کے قبیلے کے لوگ بہت حسین اور خوب رو تھے۔

مردوں کو کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں ٹھہرایا گیا جبکہ باندی نام کی اس عورت کو کوٹھی کے اندر جگہ دی گئی تھی۔

آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے اپنی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔ باندی جس طرح کام میں مصروف ہوگئی تھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پہلے بھی یہاں آتی رہی تھی اور اس کوٹھی کے نقشے سے خوب اچھی طرح واقف تھی۔

دو دن بعد میں نے اندازہ لگالیا کہ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں بہت سے لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی اس لیے میں نے مایامتی والے مکان میں واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے مدھو مالا کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم پریشان ہوگئی۔

"اگر تم ان لوگوں کی وجہ سے کچھ الجھن محسوس کر رہے ہو تو میں انہیں واپس بھیج دیتی ہوں۔" مدھو مالا نے کہا۔

"نہیں۔ ان کی وجہ سے مجھے کوئی پریشانی نہیں۔" میں نے جواب دیا "تم میرے حالات سے واقف ہو۔ دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تمہیں یا دوسرے بے گناہ لوگوں کو کوئی نقصان پہنچے اس لیے میں نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ویسے ہم تم سے ملتے رہیں گے اور فون پر بھی ہمارا آپس میں رابطہ رہے گا۔"

شیربا بھی میرے اس فیصلے سے کچھ جز بز سا ہوگیا تھا لیکن اس نے ہمیں روکنے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ میں نے اسپتال فون کرکے مایا متی کو بتادیا کہ دوپہر کے بعد ہم اس کے مکان میں چلے جائیں گے۔ وہ میرے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئی تھی۔ اس نے بتادیا کہ مکان کی چابی وہیں ملے گی جہاں پہلے رکھی رہتی تھی۔

دوپہر کا کھانا ہم نے مدھو مالا وغیرہ کے ساتھ ہی کھایا اور پھر ہمارا سوٹ کیس شیربا نے گاڑی میں رکھ لیا۔ میرے اور شوبھا کے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں ایک ہی سوٹ کیس میں تھیں۔

دلی بازار سے کانیج ہوٹل کی طرف گھومنے کے بعد میں شیربا کو راستہ بتاتا رہا۔ اس طرح مایا متی کے مکان تک پہنچنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

میں نے راستے میں ضرورت کی کچھ چیزیں بھی خرید لی تھیں جو میں نے اور شیربا نے اٹھا کر اندر پہنچادیں۔ شیربا پہلی مرتبہ ہمارے ساتھ یہاں آیا تھا۔ وہ گھوم پھر کر مکان کو دیکھتا رہا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد واپس چلا گیا۔

یہاں آنے کے بعد میں نے فون پر انسپکٹر بریندرا کو بھی اطلاع دے دی۔ اس سے کچھ تازہ خبریں بھی مل گئیں لیکن چانگ لی کے معاملے میں زیادہ پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے ریوروبلی میں اس حویلی کا سراغ تو لگالیا تھا لیکن وہاں انہیں کچھ نہیں ملا تھا۔ چانگ لی کی تلاش کے لیے میں نے ایک بار پھر میدان میں اترنے کا فیصلہ کرلیا۔

اسی شام پانچ بجے کے قریب ہم اسپتال پہنچ گئے۔ اسپتال میں سمبا سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ اسے پرائیویٹ روم میں منتقل کیا جاچکا تھا اور اتفاق سے یہ کمرا بھی مایا متی ہی کے چارج میں تھا۔ سمبا کے ہاتھوں اور پیروں کے زخم بگڑ چکے تھے اور مایا متی کے کہنے کے مطابق اس کے زخم

ٹھیک ہونے کے لیے کم از کم ایک مہینے کا وقت درکار تھا۔

ہم سات بجے تک اسپتال میں رہے۔ مایا متی کی ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ وہ نئی نرس کو چارج دے کر ہمارے ساتھ ہی اسپتال سے نکلی تھی۔ میں نے ان دونوں کو ایک ٹیکسی پر بٹھا کر گھر کی طرف روانہ کردیا اور خود شہر کے وسطی علاقے میں اندرا چوک کی طرف آگیا۔ یہ شہر کے ان علاقوں میں سے ایک تھا جہاں شام ہوتے ہی غنڈا عناصر کی سرگرمیاں شروع ہوجاتی تھیں۔ مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش تھی جو ایسے ہی کسی علاقے میں مل سکتا تھا لیکن ایک دو جگہوں سے پوچھنے پر پتا چلا کہ درگا نام کا وہ شخص دربار اسکوائر کی طرف ملے گا۔ میں ماکھن ٹول کے علاقے سے ہوتا ہوا دربار اسکوائر کی طرف آگیا۔

درگا کماری منڈل کی بدھ عبادت گاہ سے ذرا آگے بسنت پورہ کے ایک تھرڈ کلاس ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ اس نے بھی مجھے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہاں بیٹھ کر اس سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہم فریک اسٹریٹ پر ایک اور ریسٹورنٹ میں آگئے۔ یہ ذرا مہنگا ریسٹورنٹ تھا اور یہاں گاہکوں کی آمدورفت بھی محدود ہی رہتی تھی۔

درگا سے میری پہلی ملاقات سومبا کے توسط سے ہوئی تھی۔ وہ کرنسی کا ناجائز دھندا کرتا تھا۔ اس سے پہلے وہ بھی منشیات ہی کے کاروبار سے وابستہ تھا لیکن سومبا سے ملاقات کے بعد اس نے منشیات کا بزنس چھوڑ کر کرنسی کا دھندا شروع کردیا تھا۔ وہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں تھا۔ ہمیشہ اکیلے ہی کام کرتا تھا۔

"کیا میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں؟" میں نے چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اعتماد پر ہی تو اپنا دھندا چل رہا ہے۔" درگا نے جواب دیا "جرائم پیشہ ہیں تو کیا ہوا۔ پر اپنے بھی کچھ اصول ہیں اور سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کسی کو دھوکا دے کر اس کے اعتماد کو ٹھیس مت پہنچاؤ۔"

"مجھے سومبا جیسا ایک کھرا آدمی ملا تھا لیکن افسوس کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ کومل نے مجھے دھوکا دیا۔ اب مجھے ایک ایسے آدمی کی تلاش ہے جس پر میں بھروسا کرسکوں۔" میں نے کہا۔

"اپنی جان بھی چلی جائے گی تو تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تم کام تو بتاؤ؟" درگا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چہرے ... اس کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر اسے بتانے لگا کہ میں اس ... کیا کام لینا چاہتا ہوں۔

"کام خطرناک ہے۔" درگا نے کہا "کئی آدمی مارے جاچکے ہیں۔ ناگ پال پاگل ہوچکا ہے۔ اس نے اس شہر ... اپنی راجدھانی قائم کر رکھی تھی۔ یہاں اس کا حکم چلتا تھا ... سیاست داں، منتری اور بڑے بڑے سرکاری آفیسر بھی ... کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر شہر بند ہوجاتا تھا لیکن جب سے انسپکٹر اعظم اور ... یہاں آئے ہو اس کے سارے معاملات گڑبڑ ہو رہے ہیں ... سنا ہے اس نے ہیروئن کی سپلائی کا بہت بڑا منصوبہ بنایا تھا ... لیکن تمہاری وجہ سے اس منصوبے کا ستیاناس ہوگیا۔ تم پہلے ... شخص ہو جس نے اسے اتنا نقصان پہنچایا ہے۔ چند روز پہلے تم نے اس کے چینی دوست کو بھی پکڑوا دیا تھا لیکن وہ لوگ اسے چھڑا کر لے گئے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اب تک کیسے بچے ہوئے ہو۔ ناگ پال تو اپنے دشمن کو چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہیں رہنے دیتا۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "ناگ پال جیسے لوگوں کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ ان کے کسی فعل سے کسی اور کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے گرد چار آدمی جمع کرلیتے ہیں۔ دہشت اور مار دھاڑ کے بل بوتے پر دوسروں پر دھاک بٹھا کر اپنا کام نکالتے ہیں۔ ایسے کام عام طور پر بھتا وصول کرنے سے شروع ہوتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں ان کو روکنے کی کوشش نہ کی جائے تو یہ ناگ پال بن جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان لوگوں کو روکنے کے لیے انہی کا طریقہ استعمال کیا جائے۔ شرافت کی زبان تو یہ لوگ سمجھتے نہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھ روکنے کے لیے اپنے ہاتھ استعمال کرنے پڑتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ لوگ اپنی شرافت میں مار تو کھا لیتے ہیں مگر ان غنڈوں اور بدمعاشوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے اور اس طرح ناگ پال جنم لیتے ہیں۔"

"یہی مسئلہ ہے۔" درگا نے کہا "شریف لوگ ڈرتے ہیں۔ وہ۔۔۔"

"میں نے شرافت چھوڑ دی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ بات میں نے بہت عرصہ پہلے محسوس کرلی تھی کہ غنڈوں اور بدمعاشوں کے سامنے شرافت کا مظاہرہ کرنا بین

...گے بین بجانے کے مترادف ہے اس لیے اب میں ...گوں سے انہی کی زبان میں بات کرتا ہوں۔ ناگ پال کا ... تمہارے سامنے ہے۔ وہ چینی چانگ لی اس شخص کا ...ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ ہیروئن سپلائی کرتا ہے۔ ... پال کے توسط سے اس ملک میں بھی یہ زہر پھیلانا چاہتا ... یہاں ہیروئن کی فیکٹریاں لگانا چاہتا ہے لیکن میں نے ... کر رکھا ہے کہ اسے یہاں قدم نہیں جمانے دوں گا۔ ... ڈیڑھ مہینہ پہلے میں نے انہیں تھوڑا سا نقصان پہنچایا ... پانچ سو کلو ہیروئن اس کے آدمیوں سے چھین کر ضائع ... تھی لیکن ہیروئن کی یہ مقدار ان کے لیے چٹکی کے ...ہے۔ گو کہ میں انہیں زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن ... اس بات کا احساس ہوگیا ہے کہ یہاں ان کے قدم ...سے نہیں جم سکتے۔ گزشتہ رات۔۔۔" میں ایک لمحے کو ... ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"گزشتہ رات میں نے اس چینی کو پکڑ کر پولیس کے ... لے کیا تھا لیکن ناگ پال کے آدمی اسے پولیس کی ...ت سے چھڑا کر لے گئے۔ مجھے اسی چینی کی تلاش ہے۔ ...ارا ناگ پال کے آدمیوں سے تعلق رہا ہے اور میرا خیال ...ہے کہ تم کچھ ایسی معلومات حاصل کرسکتے ہو جو میرے لیے ... ثابت ہوں۔ تم پر کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا اور میں ...بس اور بات کی وضاحت بھی کردینا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا۔۔۔؟" درگا نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہوسکتا ہے کہ تمہارے بارے میں پتا چل جانے کے بعد وہ تمہیں راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں یا تمہیں کوئی ...ئی دے کر تمہارا راستہ روک دیں۔" میں نے کہا "لیکن ...یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ سچائی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم ...نہیں ہے۔ اگر تم سچائی کی راہ میں جان دو گے تو امر ہوجاؤ ...گے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" درگا نے کہا "یہی بات مجھے سومبا نے بھی سمجھائی تھی اور میں نے ڈرگس کا دھندا چھوڑ دیا تھا۔ ...تمہارے بارے میں بھی میں سنتا رہتا ہوں۔ تم اس وقت ...ناگ پال کے دشمن نمبر ایک ہو اور مجھے تمہارا ساتھ دے کر ...خوشی ہوگی۔"

"گڈ۔" میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے ...مایوس نہیں کیا۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری ...طرف دیکھا۔

"اس چینی کا سراغ لگانا ہے۔" میں نے کہا "اگرچہ تم پر انہیں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا لیکن اس میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے اس لیے تمہیں بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔"

"میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔" درگا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اگر پتا چل جائے تو تمہیں کہاں اطلاع دی جائے؟"

میں نے مایا متی کے مکان کا فون نمبر بتا دیا اور اس کے کچھ ہی دیر بعد میں اسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ کاؤنٹر کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے کافی کا بل بھی ادا کردیا تھا۔

فریک اسٹریٹ سے نکل کر گنگا پاتھ پر کرسٹل ہوٹل کے قریب مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی پر میں نے دلی بازار تک سفر کیا۔ وہاں سے آگے کچھ دور تک پیدل چلتا رہا اور پھر ایک سائیکل رکشا پر بیٹھ کر گھر پہنچ گیا۔

اس وقت دس بجنے والے تھے۔ شوبھا اور مایا متی کھانا کھا رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔

اس رات مجھے ڈھنگ سے نیند نہیں آسکی۔ مایا متی اور شوبھا ایک ہی کمرے میں سو گئی تھیں اور میں اس کمرے میں لیٹا تھا جہاں پہلے مایا متی سویا کرتی تھی۔

مجھے ڈھنگ سے نیند نہیں آئی تھی۔ کبھی آنکھ لگتی تو چونک کر بیدار ہوجاتا۔ رات کے آخری پہر میری آنکھ کھلی تو یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھا رہی ہو۔

میں کمرے سے باہر آگیا۔ مجھ پر اس وقت عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اس وقت نہ میں جاگ رہا تھا نہ سو رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی نے مجھے ٹرانس میں لے رکھا ہو۔ میں اسی کیفیت میں چلتا ہوا اس کمرے میں آگیا جہاں لکڑی کا تخت بچھا ہوا تھا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اندر قدم رکھتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا اور میں جیسے ہوش میں آگیا۔ سامنے تخت پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اندھیرا ہونے کے باوجود میں اس ہیولے کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ عجیب سا ہیولا تھا جیسے چاند کی دودھیا روشنی سے انسانی پیکر معرض وجود میں آگیا ہو۔ وہ کسی عورت کا ہیولا تھا۔ بدن کے نشیب و فراز بہت واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

میں نے انگلی دانتوں تلے دبائی۔ میرے منہ سے "سی" کی ہلکی سی آواز نکل گئی۔ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا۔ نہایت مدھم روشنی کے اس ہیولے

بت سے بہت مدھم سی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے کے نقوش کبھی ابھر آتے اور کبھی لہریں انہیں مٹا دیتیں لیکن میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نیلگری تھی۔

نیلگری کا چاندنی کے پیکر میں ڈھلا ہوا یہ روپ میں نے پہلی بار دیکھا تھا اور مجھے یہ احساس بھی بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بے چین سی تھی۔ اس کے چہرے کے غیر واضح نقوش بھی اس کی بے چینی کی نشان دہی کر رہے تھے۔

میں تخت کے قریب پہنچ کر آہستگی سے آگے کو جھکا تو میرے گلے میں پڑی ہوئی نیلگری کی مالا نیچے گر گئی اور اس کے ساتھ ہی چاندنی کے پیکر میں ڈھلا ہوا وہ ہیولا کسی پرسکون جھیل کی سطح پر ہلکی سی لہروں کی طرح حرکت کرتے ہوئے سمٹنے لگا اور بالآخر ایک نقطے کی صورت اختیار کر کے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ اتنی دبیز تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں چند لمحے بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑا رہا پھر ٹٹولتے ہوئے دروازے کے ساتھ والی دیوار کے قریب پہنچ گیا اور بتی جلا دی۔

بستر خالی تھا۔ تاہم میری مالا بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر مالا اٹھالی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ہک کھل جانے سے مالا میری گردن سے گر گئی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ ہک کس طرح کھل گیا تھا۔

میں نے مالا گلے میں ڈال لی اور واپس اپنے کمرے میں جانے کے بجائے تخت پر لیٹ گیا۔ میرا ذہن خاصا الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر روشنی کے ہیولے کے روپ میں واقعی نیلگری تھی تو اس نے مجھ سے کوئی بات کیوں نہیں کی تھی۔ پہلے جب بھی کبھی آس پاس نیلگری کے وجود کا احساس ہوتا تھا تو کانوں میں اس کی سرگوشی ضرور سنائی دیتی تھی لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ روشنی کے ہیولے کی صورت میں میرے سامنے آئی تھی اور خاموشی سے غائب ہو گئی تھی۔

صبح میں دیر تک سویا رہا۔ مایا متی تو صبح سویرے ہی ڈیوٹی پر چلی گئی تھی اور شوبھا نے مجھے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دو تین دن گزر گئے۔ چانگ لی کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ ورگا روزانہ ٹیلی فون پر مجھے رپورٹ دیتا رہا۔ میں اور شوبھا شام کے وقت اسپتال کا چکر بھی لگا آتے۔ مجھے دیکھ کر سمبا کے چہرے پر رونق سی آجاتی۔

چوتھے دن میں نے پھر نیلگری کے ہیولے کو دیکھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اتنی بے چین اور مضطرب کیوں ہے۔ اس روز بھی وہ رات کے آخری پہر اس کمرے میں نظر آئی اور کچھ کہے بغیر تاریکی میں تحلیل ہو گئی تھی۔ میں سوچتا کہ کیا کوئی بہت بڑی پراسرار قوت بھی اس طرح بے چین ہو سکتی تھی۔ نیلگری تو بہت بڑی شکتی تھی جسے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں سال سے کوششیں ہو رہی تھیں۔ کیا مہان شکتی اس طرح بے کل ہو سکتی ہے؟

دو دن اور گزر گئے اور پھر اس رات دس بجے کے قریب درگا نے فون پر اطلاع دی کہ چانگ لی دریائے اشنومتی کے اس پار اوبیرائے ہوٹل کے قریب ایک کوٹھی میں مقیم ہے جہاں اس کا علاج ہو رہا ہے۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ چانگ لی ہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سو فیصد۔" درگا نے جواب دیا "شہر کے جس ڈاکٹر سے اس کا علاج کروایا جا رہا ہے اس کا اسسٹنٹ آج شام میرے پاس پانچ ہزار امریکی ڈالر کے کرنسی نوٹ بیچنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا کہ اس نے یہ نوٹ کہاں سے لیے تو اس نے بتایا کہ اس کا ڈاکٹر ایک چینی کا علاج کر رہا ہے جو کسی جھگڑے میں زخمی ہو گیا تھا۔ یہ امریکی ڈالر کے نوٹ اس نے ڈاکٹر کو فیس کے طور پر دیے تھے۔ اس سے میں نے باتوں ہی باتوں میں اس کوٹھی کا پتا بھی معلوم کر لیا اور اس کے جانے کے بعد میں نے موٹر سائیکل پر اس علاقے کا دورہ کیا۔ اس کوٹھی کے سامنے ناگ پال کے دو آدمی پہرا دے رہے ہیں۔ یقیناً اندر بھی کچھ لوگ موجود ہوں گے اس لیے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ چینی اسی کوٹھی میں ہے۔"

"ٹھیک ہے درگا۔" میں نے کہا "اب تم اس کوٹھی کی طرف نہیں جاؤ گے۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ اس اطلاع پر میرے بدن میں سنسنی کی لہریں سی دوڑنے لگی تھیں۔ میں اس وقت اکیلا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بالآخر میں نے فون کا ریسیور اٹھایا اور پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

انسپکٹر بریندرا سے رابطہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور اتفاق سے انسپکٹر اعظم خان بھی وہاں موجود تھا اور جب میں نے چانگ لی کے بارے میں بتایا تو یہ اطلاع میرے لیے خاصی سنسنی خیز ثابت ہوئی کہ انسپکٹر بریندرا کو بھی اس کوٹھی میں چانگ لی کی موجودگی کی اطلاع مل چکی تھی اور کوٹھی پر چھاپا مارنے کی تیاری ہو رہی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ....؟"

"تقریباً ایک گھنٹا پہلے وہ ڈاکٹر ہماری گرفت میں آگیا تھا جو چانگ لی کا علاج کر رہا ہے۔" بریندرا نے میری بات کاٹ دی "تفصیل بعد میں بتاؤں گا لیکن تم اپنے مکان سے باہر نہیں نکلو گے۔"

میں مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن بریندرا نے فون بند کر دیا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا اور لاؤنج سے نکل کر برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد شوبھا بھی میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور ہم مختلف موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ میں نے شوبھا کو اس تازہ صورتِ حال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بریندرا کی طرف سے کسی اطلاع کا منتظر تھا لیکن ایک بجے تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔

شوبھا اٹھ کر جانے لگی تو میں نے اس سے اپنے لیے ایک چائے بنوالی۔ مایا متی پہلے ہی سو چکی تھی۔ میں اکیلا برآمدے میں بیٹھا چائے پیتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔

دو بج گئے۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ بے چینی زیادہ بڑھنے لگی تو میں اندر آگیا اور فون کا ریسیور اٹھا کر ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملانے لگا۔ لائن ملنے میں دیر نہیں لگی لیکن وہاں بھی ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ میں نے ڈیوٹی آفیسر سے کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی کوئی خبر آئے، مجھے فون پر اطلاع دے دی جائے۔

میں اس وقت صوفے پر نیم دراز اونگھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی کی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔ انسپکٹر بریندرا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں سنبھل گیا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم جاگ رہے ہو گے۔" بریندرا نے میری آواز سنتے ہی کہا۔

"مشن اتنا اہم ہو تو مجھے نیند کیسے آسکتی ہے۔" میں نے جواب دیا "میں تو اس کارروائی کا رزلٹ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔ کیا رہا؟"

"چانگ لی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔" بریندرا نے جواب دیا "میں نے تمہاری طرف جیپ بھیج دی ہے۔ اسپتال آجاؤ۔ تمہیں ساری تفصیل بتا دوں گا۔ جیپ تمہارے ہاں پہنچنے ہی والی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، دوسری طرف سے لائن منقطع ہو گئی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنی جگہ پر آکر جوگرز پہننے لگا۔ میں فیتے باندھ رہا تھا کہ باہر کوئی گاڑی آکر رکی۔ میں نے برآمدے میں آکر دیکھا۔ گیٹ کے سامنے پولیس جیپ کھڑی تھی اور ایک باوردی کانسٹیبل جیپ سے اتر کر غالباً کال بیل بجانے کے لیے گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر کال بیل بجانے سے منع کر دیا اور شوبھا والے کمرے میں آگیا۔ شوبھا بستر پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ پہلے میں نے ایک دو مرتبہ ہولے سے پکارا پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔

"میں اسپتال جا رہا ہوں۔ تم اٹھ کر دروازہ بند کر لو۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا....! مایا متی کہاں ہے؟" وہ بدحواس ہو گئی۔

"سب ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "مایا متی اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔ انسپکٹر بریندرا کا فون آیا تھا۔ اس نے مجھے اسپتال بلایا ہے۔"

شوبھا کے دماغ پر اب بھی نیند کا خمار طاری تھا۔ وہ میری بات سمجھ سکی تھی یا نہیں لیکن اٹھ کر میرے ساتھ آگئی۔

پولیس کی جیپ گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور کے علاوہ دو مسلح کانسٹیبل بھی موجود تھے۔ میں اس وقت تک جیپ کے پاس کھڑا رہا جب تک شوبھا نے باہر کا گیٹ بند کر کے اندر جا کر برآمدے والا دروازہ بھی بند نہیں کر لیا۔

اسپتال پہنچنے میں بیس پچیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

اسپتال میں پولیس کی بھاری نفری موجود تھی۔ پولیس کے کئی اعلیٰ افسران بھی نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر بریندرا نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ انسپکٹر اعظم بھی تھا۔ انسپکٹر اعظم سے میری ملاقات کئی روز بعد ہوئی تھی۔

انسپکٹر بریندرا مجھے اس کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ تمام لاشیں سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی تھیں اور تمام چادروں پر خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

بریندرا نے جھک کر ایک لاش کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔ وہ چانگ لی تھا۔ چادر پر کئی جگہوں پر خون کے دھبے تھے۔ میں نے چادر کا کونا پکڑ کر اسے پوری طرح سے ہٹا دیا۔ چانگ لی کی لاش بالکل چھلنی ہو رہی تھی۔ اس کے جسم پر کم از کم بیس گولیاں لگی تھیں۔ باقی چار لاشوں میں سے دو چانگ لی کے ساتھیوں کی اور دو پولیس والوں کی تھیں۔

ہم اس کمرے سے باہر آگئے۔ بریندرا بتا رہا تھا کہ زخمی

ہونے کے باوجود چانگ لی نے پولیس کا مقابلہ کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں ایک کانسٹیبل جاں سے گیا تھا۔ جس پر دوسرے پولیس والوں نے اسے چھلنی کر دیا تھا۔

"فون پر تفصیل سے بات نہیں ہو سکی تھی۔" میں نے کہا "تمہیں اس کوٹھی میں چانگ لی کی موجودگی کی اطلاع کیسے ملی تھی؟"

"ایک مخبر کے ذریعے۔" بریندرا نے جواب دیا "ہمارا ایک مخبر شام کو اندرا چوک کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ درگا بھی وہاں موجود تھا۔ وہ کرنسی کا غیر قانونی کاروبار کرتا ہے۔ ایک آدمی اس سے پانچ ہزار امریکی ڈالر کیش کروا کر لے گیا تو ہمارے مخبر کو اس پر شبہ ہوا۔ ہمارے مخبر نے اس کا پیچھا کیا اور ہمیں اطلاع دے دی۔

"اس کوٹھی پر چھاپا مارا گیا تو پتا چلا کہ وہاں ایک ڈاکٹر کی رہائش ہے اور جو شخص درگا سے کرنسی تبدیل کروا کر لایا تھا وہ ڈاکٹر کا نائب تھا۔ ڈاکٹر سے پوچھ گچھ کے دوران میں یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ ایک زخمی چینی کا علاج کر رہا ہے اور یہ کرنسی نوٹ اسے فیس کے طور پر ملے تھے۔

"پولیس کے طریقہ کار سے تم واقف ہو۔ بعض اوقات تو وہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر تو سیدھا سادا اور شریف آدمی تھا۔ دھمکیوں سے ڈر کر اور بھاری فیس کے لالچ میں آ کر وہ اس زخمی چینی کا علاج کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا کہ وہ زخمی چینی کون تھا اور اس کا علاج کروانے والے کون تھے۔

"چانگ لی کے بارے میں تصدیق ہو جانے کے بعد ہم چھاپا مارنے کی تیاری کر رہے تھے کہ تمہارا فون آ گیا۔ اب میں تم سے معلوم کرنا چاہوں گا کہ تمہیں اس کا پتا کیسے چلا تھا؟"

"درگا سے۔" میرے جواب پر بریندرا چونک سا گیا۔ میں چند لمحے خاموش رہا پھر اسے درگا کے بارے میں بتانے لگا۔

"بہرحال۔ بریندرا گہرا سانس لیتے ہوئے بولا "اس ڈرامے کا ایک سین ختم ہو گیا۔ اب ناگ پال رہ گیا ہے۔ اسے بھی ہم قدم نہیں جمانے دیں گے۔ وہ یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ جائے گا یا اس کا انجام بھی ایسا ہی ہو گا۔"

پانچ لاشوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کوٹھی پر مقابلے کی نوعیت کیا رہی ہو گی۔ کئی آدمی زخمی ہوئے تھے جو پولیس کی نگرانی میں زیر علاج تھے۔

صبح چھ بجے کے قریب میں پولیس جیپ پر ہی واپس آ رہا تھا کہ باغ بازار سے گزرتے ہوئے سڑک کے عین وسط میں یوگی گوتم بھوش کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ گوتم بھوش سڑک کے عین وسط میں کھڑا تھا اور جیپ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"روکو۔ جیپ روکو۔" میں ایک دم چیخ اٹھا۔

میرے اس طرح چیخنے پر ڈرائیور بد حواس ہو گیا۔ اس نے پوری قوت سے بریک لگا دیا۔ جیپ' بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ سڑک پر گھوم کر رہ گئی۔

"کیا ہوا سر؟" ڈرائیور نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں کانسٹیبل بھی زوردار جھٹکا لگنے سے اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرا گئے تھے۔

"وہ۔۔۔ وہ جیپ کے نیچے کچلا جاتا۔" میں نے کہا۔

"سامنے تو کوئی بھی نہیں ہے سر۔ سڑک دور تک خالی پڑی ہے۔" ڈرائیور نے کہا۔

سڑک واقعی دور تک خالی تھی۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے گوتم بھوش کو سڑک کے عین وسط میں کھڑے دیکھا تھا۔ اگر میں جیپ نہ رکواتا تو وہ کچلا جاتا لیکن وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔ سڑک دور تک خالی تھی۔ تاہم تقریباً بیس گز آگے ایک کتا سڑک پر ایک طرف سے دوسری طرف ٹہلتا ہوا جا رہا تھا۔

"وہ۔۔۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ یہیں تھا۔" میں متوحش سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے سر؟" ڈرائیور نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "آپ بھی شاید رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو نیند کا جھونکا آ گیا ہو اور۔۔۔"

عقب سے ہارن کی تیز آواز سن کر ڈرائیور اپنی بات مکمل نہیں کر سکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دودھ کی سپلائی والا ٹرک تھا۔ ہماری جیپ سڑک کے وسط میں آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو حرکت میں لے آیا۔

میں راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ کیا واقعی میں جیپ میں بیٹھے بیٹھے اونگھ گیا تھا اور کوئی سپنا دیکھ رہا تھا لیکن وہ سپنا نہیں تھا۔ میں نے جاگتی آنکھوں سے گوتم بھوش کو جیپ کے سامنے سڑک کے وسط میں کھڑے دیکھا تھا لیکن وہ پلک جھپکنے کی دیر میں کہاں غائب ہو گیا تھا؟

میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ گھر پہنچا تو مایا متی جا چکی تھی اور ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے

تھ میں نے بھی چائے کا ایک کپ پیا اور اس کے جانے ے بعد دروازے بند کر کے اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ شوبھا نے مجھے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ آنکھ کھلتے ہی میں بد حواس سا ہو گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ میں شوبھا کے بستر پر تھا اور وہ مجھے جھنجوڑ کر اپنے آپ سے الگ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دھکا دیا تو میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ شوبھا اچھل کر بیڈ کے دوسرے پر چلی گئی اور اپنے جسم پر شب خوابی کا لباس درست کرتے ہوئے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"کیا بات ہے ہمت سنگھ۔" شوبھا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے آنکھیں کھول دیں "تم تو ایسے نہیں تھے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"کک۔۔۔ کچھ نہیں شوبھا۔" میں ہکلایا "مجھے نہیں معلوم میں یہاں کیسے آیا تھا۔ میں۔۔۔ میں تو اپنے کمرے میں سویا تھا اور۔۔۔"

"شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" شوبھا نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

مجھے نہ تو بخار تھا اور نہ ہی طبیعت خراب تھی لیکن چند روز سے میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا اور کچھ عجیب سے واقعات میرے ساتھ پیش آ رہے تھے۔ پچھلے چند روز کے دوران میں دو تین مرتبہ میں نے نیلگری کا دھندلا سا ہیولا دیکھا تھا اور آج صبح سڑک پر جیپ کے عین سامنے گوتم بھوش کھڑا نظر آیا تھا لیکن درحقیقت' وہاں کچھ نہیں تھا۔ میں نے چیخ کر جیپ رکوائی تھی اور مجھے پولیس والوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا تھا اور اب میں شوبھا کے سامنے شرم و ندامت سے کٹا جا رہا تھا۔

"رات کے آخری پہر تم کہیں گئے تھے۔" وہ کہہ رہی تھی "واپس کب آئے تھے؟"

"صبح چھ بجے۔" میں نے جواب دیا۔

"ناشتا کیا تھا؟" اس نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولی "اب گیارہ بج رہے ہیں۔ تم ذرا کمرے سے نکلو تو میں کپڑے بدل لوں پھر ناشتا تیار کرتی ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے شوبھا۔" میں نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا' یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ میری نظروں میں تمہارے لیے بڑا احترام ہے شوبھا میں۔۔۔"

"میں سمجھ رہی ہوں۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میری بات کاٹ دی "شاید تم نیند میں اٹھ کر آ گئے ہو گے۔ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ مجھے تمہاری نیند پر کوئی شبہ نہیں۔ اب تم باہر جاؤ۔ میں کپڑے بدل لوں۔"

میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ چند لمحے خالی خالی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔

میں دیر تک ٹھنڈے پانی کے شاور کے نیچے کھڑا رہا جس سے میرے دماغ کی تپش کسی حد تک کم ہو گئی۔

میں لاؤنج میں آیا تو شوبھا کچن میں تھی۔ میں وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا ذہن اب بھی الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں پھر کسی طاغوتی چکر میں تو نہیں پھنس گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا ہاتھ بے اختیار اپنے گلے پر پہنچ گیا۔ مالا میرے گلے میں موجود تھی۔

شوبھا ناشتا تیار کر کے لے آئی۔ وہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی جس سے مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔

"رات کو تم کہاں گئے تھے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسپتال۔" میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے یاد تھا کہ صبح چار بجے باہر جانے سے پہلے میں نے اسے جگا کر بتایا تھا کہ کہاں جا رہا ہوں لیکن وہ شاید اس وقت نیند میں تھی اور میری بات کو سمجھ نہیں سکی تھی "چانگ لی گزشتہ رات پولیس مقابلے میں مارا گیا۔" میں نے کہا اور چند لمحوں کی خاموشی سے اسے سب کچھ بتانے لگا۔ آخر میں' میں کہہ رہا تھا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ جنرل کھوراٹ کے یہاں قدم نہیں جمنے دوں گا۔ اس کے آدمی مارے جا چکے ہیں۔ ناگ پال کے قدم بھی اکھڑ گئے ہیں۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے چھپتا پھر رہا ہے۔ جنرل کھوراٹ اگر دوبارہ یہاں قدم جمانا چاہے گا تو اس کے لیے بہت لمبا عرصہ درکار ہو گا۔ اس طرح میرا کام ختم ہو چکا ہے اور اب ہمیں یہاں سے کوچ کی تیاری کرنی چاہیے۔"

"کہاں۔۔۔؟" شوبھا نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہندوستان۔" میں نے جواب دیا "تمہیں جے پور چھوڑ کر میں پاکستان چلا جاؤں گا۔"

"پاکستان کیوں؟" اس نے پوچھا۔

"پاکستان میرے مرحوم ماں باپ کا وطن ہے اور میں

نے بھی اسی مٹی سے جنم لیا تھا اور بدقسمتی سے دو تین ماہ کی عمر میں مجھے اپنے ماں باپ کے ساتھ وہاں سے نکلنا پڑا تھا۔ میں تو پاکستان جانے کے لیے ہی جے پور میں ٹھاکر اور روپ متی سے رخصت ہوا تھا لیکن رشی کیش میں تمہاری وجہ سے حالات کا رخ بدل گیا اور میں یہاں تک چلا آیا۔"

"میں تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔" شوبھا نے کہا "تمہاری وجہ سے مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ تم نہ ہوتے تو وہ راکشش دلیش کھ پتا نہیں میرا کیا حشر کرتا۔"

"یہ بات تو اب پرانی ہو چکی ہے۔ بھول جاؤ اسے۔" میں نے کہا "اب جے پور میں اپنا کاروبار جمانے میں تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اور روپ متی وہاں موجود ہیں۔ ان سے تمہیں ہر قسم کی مدد مل سکتی ہے۔"

"لیکن تم تو نہیں ہو گے نا۔" شوبھا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے اپنے بستر پر پاکر وہ سیخ پا ہو گئی تھی اور اب میرے نہ ہونے کے خیال سے ٹھنڈے سانس بھر رہی تھی لیکن میرے خیال میں اس میں بھی اس کی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔

"میرے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے جواب دیا "میں تو ایک سیلانی آدمی ہوں۔ مجھ جیسے شخص کا کیا بھروسا۔ آج یہاں کل وہاں۔"

ناشتا ختم ہو چکا تھا۔ شوبھا برتن اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔ میں نے پولیس ہیڈ کوارٹر فون کیا لیکن انسپکٹر بریندرا یا اعظم خان سے بات نہیں ہو سکی۔ وہ دونوں رات والے کیس میں مصروف تھے۔ ڈیوٹی آفیسر نے بتایا کہ کچھ اور لوگوں کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے ہیں۔

میں انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا چاہتا تھا لیکن تین دن تک نہ تو ان سے ملاقات ہو سکی تھی اور نہ ہی ٹیلی فون پر بات ہوئی۔

اس سے اگلے روز میں شوبھا کے ساتھ مہاتما بدھ کی طرف سے آتے ہوئے رنتا پارک میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شام ہونے والی تھی۔ پارک میں بڑی رونق تھی۔ ہم مختلف راستوں پر ٹہلتے ہوئے فوارے کے قریب ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ ہمیں اتفاق سے خالی مل گئی تھی۔ ہمارے آس پاس دوسری بینچوں پر اور گھاس پر اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

میں بہت عرصے بعد اپنے آپ کو آزاد اور خوشگوار موڈ میں محسوس کر رہا تھا۔ میں شوبھا کو اشارے سے وہ جگہ بتا رہا تھا جہاں رات کے وقت مجھے کرسٹل کے مجسمے کے دو ٹکڑے ملے تھے اور یہیں سے ایک نئی کہانی شروع ہوئی تھی۔ شوبھا بڑی دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔

نمکین مونگ پھلی بیچنے والا ایک ہاکر آواز لگاتا ہوا ہمارے قریب سے گزرا تو میں نے اس سے دو پڑیاں خرید لیں۔ اب ہم باتوں کے ساتھ مونگ پھلی بھی ٹھونگتے جا رہے تھے۔

کچھ بچے ہمارے آس پاس ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ایک بچہ دوڑتا ہوا شوبھا سے ٹکرا گیا۔ اس کی عمر پانچ چھ سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے بال گولڈن تھے' چہرے پر بے پناہ معصومیت تھی۔ وہ غیر معمولی طور پر صحت مند بچہ تھا۔ شوبھا نے اسے مونگ پھلی پیش کی تو اس نے انکار کر دیا۔ شوبھا نے جھک کر اسے پیار کیا اور پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بگڑ گئے تھے۔ بچے نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور دوڑتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے شوبھا کی طرف دیکھا۔

"عجیب بات ہے۔" شوبھا ساڑی کے پلو سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولی "بچہ دیکھنے میں تو بہت صاف ستھرا لگ رہا تھا لیکن میں نے اسے پیار کیا تو بڑی ناگوار سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی جیسے غلاظت کے ڈھیر سے اٹھنے والا شدید تعفن۔"

"ہو سکتا ہے اسے پائیریا ہو۔" میں نے کہا "دانتوں کی یہ بیماری بہت خوفناک ہوتی ہے۔ منہ سے اس قدر شدید اور ناگوار بو آتی ہے کہ کوئی شخص قریب کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔"

"ابھی تو اس کے دودھ کے دانت ہیں۔" شوبھا بولی "اتنے چھوٹے بچے کو پائیریا جیسی بیماری کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ بچہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

شام ہو چکی تھی۔ پارک میں جا بجا بتی بلب روشن ہو گئے تھے۔ بہت سے لوگ پارک سے اٹھ کر جا رہے تھے۔ ہمارے آس پاس کی بینچیں خالی ہو چکی تھیں۔ اگرچہ شوبھا نے مجھے بھی چلنے کو کہا تھا لیکن میں کھلی اور خوشگوار فضا میں کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتا تھا۔

اچانک وہی بچہ کسی طرف سے نمودار ہوا۔ وہ اکیلا ہی

وہ میرے سامنے آ کر رک گیا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ جوار میں کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے والدین سے بچھڑ گیا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے قریب بلا لیا۔

"تم کون ہو بیٹا۔ کس کے ساتھ ہو تم؟" میں نے پیار سے پوچھا۔

وہ میرے اور قریب آیا تو گٹر جیسی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ شوبھا کی طرح میرے چہرے کے تاثرات بھی بگڑ گئے۔ اس تعفن سے میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اندر سناٹا سا طاری ہونے لگا ہو۔ میں نے دوبارہ اس بچے سے پوچھا تو اس نے ہاتھ سے پارک کے ایک تاریک گوشے کی طرف اشارہ کر دیا۔

میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس طرف درختوں کا کنج تھا اور تاریکی تھی۔ اچانک اس تاریکی میں ایک ہیولا نمودار ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ فاصلہ زیادہ تھا اور تاریکی بھی تھی لیکن گوتم بھوش کو شناخت کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ مجھے اپنے پورے جسم میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔

میرے سامنے کھڑے ہوئے بچے نے جھپٹا مار کر میرے گلے میں پڑی ہوئی نیلگری کی مالا نوچ لی اور ایک طرف دوڑ لگا دی۔ ایک لمحے کو تو مجھے سمجھ میں نہیں آ سکا کہ کیا ہو گیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میرے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور کسی نادیدہ قوت نے مجھے پکڑ کر اچھال دیا۔

میں اس بچے کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ پارک میں موجود لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اس بچے کا رخ اسی تاریک کنج کی طرف تھا جہاں میں نے گوتم بھوش کا ہیولا دیکھا تھا۔ بچے کی عمر اگرچہ پانچ چھ سال تھی لیکن وہ چیتے کی سی تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہیئت بدل گئی۔ میں کسی انسان کے بچے کا نہیں' ایک کتے کا پیچھا کر رہا تھا۔ نیلگری کی مالا اس نے دانتوں میں دبوچ رکھی تھی۔

میری ساری قوت جیسے ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ میرے اور کتے کے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر اچانک وہ اس طرح گرا جیسے سامنے کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ وہ بری طرح "چیاؤں چیاؤں" کر رہا تھا۔ مالا اس کے منہ سے گر گئی تھی۔ میں نے سب سے پہلے مالا اٹھا کر گلے میں ڈالی اور پھر اس کتے کو ٹھوکریں مارنے لگا۔

کتے کی ہیئت ایک بار پھر بدلنے لگی۔ وہ کتا نہیں یوگی دھیراج تھا جس کے بدن پر صرف لنگوٹ بندھا ہوا تھا۔ ایک اور ٹھوکر مارتے ہوئے میں نے تاریک کنج کی طرف دیکھا۔ گوتم بھوش کا ہیولا غائب ہو چکا تھا اور اب اس کنج کے سامنے نیلگری کا ہیولا کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بہت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو یوگی دھیراج بھی غائب ہو چکا تھا۔

میں نے گلے میں پڑی ہوئی مالا کو چھو کر محسوس کیا اور واپس چل پڑا۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ ایک ادھیڑ عمر آدمی نے مجھے روک لیا۔

"کیا بات ہے مسٹر؟" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے اس طرف کیوں بھاگ گئے تھے؟"

"وہ... وہ بچہ میری مالا چھین کر بھاگ گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"بچہ...!" اس شخص کے لہجے میں حیرت تھی "میں نے تو اس طرف کسی کو نہیں دیکھا۔ تم تو اکیلے ہی بھاگ رہے تھے۔ شاید ہوا کے پیچھے۔"

"نہیں نہیں۔ بچہ نہیں۔ وہ کتا تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے مسٹر۔" اس شخص کے لہجے میں تشویش نمایاں تھی "اس طرف نہ تو کوئی بچہ تھا اور نہ کتا۔ نہ ہی کوئی اور آدمی نظر آیا جس سے ہم سمجھتے کہ تم کسی سے ریس لگا رہے ہو۔"

میں بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ دو تین آدمی اور بھی وہاں آ گئے تھے اور ہر شخص یہی پوچھ رہا تھا کہ میں "پکڑو پکڑو" کا شور مچاتا ہوا کیوں بھاگا تھا۔

بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بچہ یا کتا کسی کو نظر نہیں آیا تھا اور ظاہر ہے کسی نے پنڈت دھیراج کو بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ درختوں کے کنج میں گوتم بھوش یا نیلگری کے ہیولوں کے تو دیکھے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں ان لوگوں سے پیچھا چھڑانے کی سوچ رہا تھا کہ شوبھا بھی وہاں آ گئی۔ اس نے صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جانے لگی تو ایک آدمی نے شوبھا کو مشورہ دیا کہ میرا ذہنی توازن شاید درست نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ مجھے کسی اچھے معالج کو دکھایا جائے۔

میں نے لوگوں کی باتیں برداشت کر لی تھیں۔ ظاہر ہے اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ان میں سے کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ اس بچے یا کتے کو دیکھ لیتے تو شاید ان کا

طرز عمل کچھ اور ہوتا۔ اب تو وہ مجھ سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے۔

شوبھا مجھے بازو سے پکڑے پارک سے باہر لے آئی۔ گیٹ سے نکل کر چند قدم چلنے کے بعد ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی جس میں بیٹھ کر ہم گھر آگئے۔

"اس بچے پر مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا جب میں نے اس سے تعفن اٹھتا ہوا محسوس کیا تھا۔" شوبھا نے لاؤنج میں داخل ہو کر صوفے پر گرتے ہوئے کہا "چہرے پر کتنی معصومیت تھی لیکن کتنا خبیث نکلا۔"

"اور کیا دیکھا تم نے؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور کیا دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔" وہ بولی "وہ تمہاری مالا چھین کر بھاگا تھا اور پھر کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر گیا تھا۔ ویسے مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ کس قدر تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ اس کا تعلق یقیناً اچکوں اور جیب کتروں کے گرگوں سے ہے۔ ایسے لوگوں کو تو بچپن ہی سے ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بڑا ہو کر یہ بچہ بہت منجھا ہوا مجرم بنے گا۔"

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ شوبھا نے اس بچے ہی کو دیکھا تھا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں دیکھ سکی تھی اور میں بھی اسے کچھ بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد مایا متی بھی پہنچ گئی۔ اس نے کپڑے بدل کر سب سے پہلے چائے بنائی۔ چائے پیتے ہوئے وہ سمبا کے بارے میں بتانے لگی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے زخم اب بہتر ہونے لگے تھے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سمبا مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔

میری وہ رات بڑی بے چینی میں گزری تھی۔ میں بار بار پارک میں پیش آنے والے اس واقعے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ صبح میں نے گوتم بھوش کو جیپ کے سامنے دیکھا تھا اور اب پارک میں اس کا ہیولا نظر آیا تھا جبکہ اس نے اپنی کسی شکتی کے ذریعے مجھے نیلگری کی مالا سے محروم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن نیلگری ہی نے اس کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔

پے در پے ان پراسرار واقعات کے پیش آنے سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ کوئی بہت ہی غیر معمولی واقعہ رونما ہونے والا ہے اور میں بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکوں گا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ گوتم بھوش کھٹمنڈو میں موجود ہے اور وہ ہر قیمت پر یہ مالا مجھ سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اور پھر اس رات میرے لیے وہ خواب بھی بڑا عجیب ثابت ہوا تھا۔ میں ہمالیہ کی ترائیوں میں بھٹک رہا تھا۔ میرے ساتھ شوبھا بھی تھی، شیریا بھی اور دھنو بھی۔ ہم گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ دونوں ہمیں کبھی ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں پر نظر آتے اور کبھی عمیق ترین گہرائیوں میں۔ ایک موقع پر میں نے گوتم بھوش کو ایک غار میں گھیر لیا۔ وہ غار بہت تاریک تھا اور زمین کی عمیق ترین گہرائیوں تک چلا گیا تھا۔ گمبھیر تاریکی میں اگرچہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا لیکن گوتم بھوش مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ وہ جہاں بھی چھپتا، مجھے صاف نظر آجاتا۔ وہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اور پھر کسی نادیدہ قوت نے میرا راستہ روک لیا۔ میں پیچھے ہٹنے لگا۔

صورتِ حال بدل گئی تھی۔ گوتم بھوش پوری قوت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا تھا اور میں اس سے بچنے کے لیے مسلسل پسپائی اختیار کر رہا تھا۔ میں ایک چٹان پر چڑھتا چلا گیا۔

اچانک ہی کسی طرف سے چند خوں خوار بھیڑیے نمودار ہوئے۔ وہ میری طرف لپک رہے تھے۔ میرے اور بھیڑیوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ نکیلے دانت نکالے میری چیر پھاڑ کرنے کے لیے مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا اور پھر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

میں تاریک خلا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گر رہا تھا۔ اپنی چیخوں کی بازگشت مجھے چاروں طرف سنائی دے رہی تھی۔ میری چیخوں میں شیطانی قہقہوں کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ میں گوتم بھوش کو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے دیکھ رہا تھا۔ وہ میری بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔

اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ کسی نادیدہ قوت نے مجھے گرنے سے روک لیا تھا۔ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ میرے چاروں طرف تاریک خلا تھی۔ اوپر بھی اور نیچے بھی لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پختہ فرش پر کھڑا ہوں۔

میں نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ گوتم بھوش اب بھی پہاڑ کی چوٹی پر موجود تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش ابھر آئی تھی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر وہ ایک بہت بڑے پتھر کو دھکیل کر غائب ہو گیا۔ چٹان نما وہ پتھر بڑی تیزی سے میری طرف آرہا تھا۔

فاصلہ بہت کم رہ گیا تھا۔ پتھر کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے میں نے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ میں لڑکھڑا کر گرا۔

اپنی کراہوں کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ میں متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک تو میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میں کہاں ہوں پھر رفتہ رفتہ حواس بحال ہونے لگے۔ میں اپنے کمرے میں تھا اور تخت سے گر کر پختہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ گرنے سے میرے کندھے پر چوٹ لگی تھی جس میں تکلیف ہو رہی تھی۔

میرا جسم پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ میں زمین سے اٹھ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں نیلگوں روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ اس مدھم سی روشنی میں بھی دیوار پر لگی ہوئی گھڑی صاف نظر آرہی تھی۔ اس وقت صبح کے پانچ بجنے والے تھے۔ کمرے کی کھڑکی بھی کھلی ہوئی تھی لیکن باہر کی فضا میں ابھی تاریکی تھی۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر آگیا۔ فریج میں سے بوتل نکال کر ٹھنڈا پانی پیا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

میں بستر پر نیم دراز دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو بہرحال طے تھی کہ گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کھٹمنڈو میں موجود تھے اور گوتم بھوش ہر قیمت پر مجھ سے نیلگری کی مالا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مالا کی وجہ سے میری اور گوتم بھوش کی دشمنی شروع ہو چکی تھی اور نیلگری نے شروع ہی میں یہ بات مجھ پر واضح کر دی تھی کہ چونکہ میں نے ابھی اپنا جاپ پورا نہیں کیا اس لیے وہ کھل کر میری مدد نہیں کر سکے گی۔ تاہم وہ میری مدد کر رہی تھی اور اسی نے یہ مالا بھی غالباً مجھے اس لیے دی تھی کہ میں گوتم بھوش کے منتر سے محفوظ رہوں۔

نیلگری نے مجھ سے کہا تھا کہ گوتم بھوش بھی دوسرے ہزاروں لوگوں کی طرح اسے حاصل کرنے کے لیے مختلف جاپ کر رہا ہے لیکن نیت میں کھوٹ کی وجہ سے وہ ابھی منزل سے بہت دور ہے جبکہ میں منزل کے قریب پہنچنے والا تھا کیونکہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ میں کوئی شکتی اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں دوسروں کی بھلائی کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ نیلگری نے نہایت واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر وہ گوتم بھوش جیسے بدنیت آدمی کے قبضے میں چلی گئی تو وہ دنیا میں تباہی پھیلا دے گا اور اس لیے اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں اپنی ریاضت مکمل کروں تاکہ وہ میرے قبضے میں آجائے۔ میری حفاظت کے لیے اس نے مجھے اپنی مالا بھی دے دی تھی۔

میں اگرچہ باقاعدہ ریاضت نہیں کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود گوتم بھوش مجھے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ اور اپنے لیے خطرہ سمجھ رہا تھا۔ شاید وہ بھی جانتا تھا کہ میں اس سے پہلے منزل پر پہنچ جاؤں گا اسی لیے وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا تھا لیکن نیلگری کی مالا میرے پاس ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی وار مجھ پر کارگر نہیں ہو سکتا تھا اسی لیے وہ سب سے پہلے مجھے اس مالا سے محروم کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کر رہا تھا۔ پنڈت دھیراج اس کا چیلا تھا اور میں جان گیا تھا کہ اس کے لیے پنڈت دھیراج کی حیثیت پالتو کتے سے زیادہ نہیں تھی۔

میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے یوگا کی مشق اپنے آپ کو تندرست اور چاق چوبند رکھنے کے لیے شروع کی تھی اور یوگی گوتم بھوش نے مجھے شکتیوں کے چکر میں ڈال دیا تھا۔ میں ان معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا لیکن غیر ارادی اور لاشعوری طور پر میرے قدم اس راستے پر اٹھتے چلے گئے تھے اور اب میں شاید اتنا آگے نکل چکا تھا کہ واپسی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گئی تھی۔ ان پنڈتوں اور یوگیوں کو میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ جے پور میں ان سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ لوگ آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ میں جان گیا تھا کہ اب اگر چاہوں بھی تو آسانی سے اس طاغوتی چکر سے نہیں نکل سکوں گا۔ اپنے آپ کو بچانے کا صرف ایک طریقہ تھا کہ میں وہ مالا نیلگری کو لوٹا دوں یا گوتم بھوش کے حوالے کر دوں لیکن میں اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ گوتم بھوش اس کے بعد بھی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ پنڈت قسم کے لوگ اپنے دشمن کو کبھی زندہ نہیں رکھتے۔

دن کا مدھم سا اجالا پھیل رہا تھا۔ میں بستر سے اٹھ کر کھڑکی کے سامنے آگیا۔ کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے اور تازہ ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

مایا متی کی اس روز چھٹی تھی اس لیے وہ بھی دیر تک سوئی رہی۔ میں نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور آٹھ بجے کے قریب اپنے لیے چائے بنا کر برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔

میں نے ابھی چائے ختم نہیں کی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں اٹھ کر لاؤنج میں آگیا اور فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ وہ انسپکٹر بریندرا کی کال تھی۔

"کیا تم ہیڈ کوارٹر آسکتے ہو؟" اس نے میری آواز سن کر کہا۔

”خیریت؟“میں نے دریافت کیا۔
”یہاں آجاؤ۔ اطمینان سے بات کریں گے۔“اس نے مزید کچھ کہے بغیر ریسیور رکھ دیا۔
میں نے فون بند کردیا اور شوبھا کے کمرے میں جاکر اسے جگا دیا اور اسے بتایا کہ بریندرا نے مجھے ہیڈ کوارٹر بلایا ہے۔ شوبھا فوراً ہی اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی تھی۔
میں اپنے کمرے میں آکر باتھ روم میں گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد تیار ہوکر باہر نکلا تو شوبھا ناشتا تیار کررہی تھی۔
ناشتا کرنے کے بعد میں گھر سے نکلا تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ کافی دور تک پیدل چلنے کے بعد ٹیکسی ملی تھی۔ اس طرح جب میں ہیڈ کوارٹر پہنچا تو سوا دس بج رہے تھے۔
بریندرا اپنے دفتر میں موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ گیا اور ہم دفتر سے نکل کر ایک اور کمرے میں آگئے۔
کمرے میں قدم رکھتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ دھنو ایک بینچ پر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے گھٹنوں پر لپیٹ رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے رات بھر جاگی ہو یا دیر تک روتی رہی ہو۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی اور دوڑ کر مجھ سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔
میں اس صورت حال سے بدحواس سا ہوگیا۔ دھنو کو سنبھالنے میں کئی منٹ لگ گئے۔ میں نے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔
”کیا ہوا۔ تم رو کیوں رہی ہو۔ تھونچی اور بھیرجانی کہاں ہیں؟ تم یہاں کیسے آگئیں؟“
میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔
”اس کے ماں باپ کو قتل کردیا گیا ہے۔ ان دونوں کی لاشیں اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی ہیں۔“
انسپکٹر بریندرا کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں نے دھنو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر اس پر سوالات کی بوچھار کرڈالی لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں بریندرا کی طرف گھوم گیا۔
”آج صبح سات بجے کے قریب یہ اپنے ماں باپ کی لاشوں کو کشتی میں ڈال کر عبادت گاہ سے پانچ میل دور ہائی وے پر واقع بستی کے گھاٹ پر پہنچی تھی۔“ بریندرا کہہ رہا تھا ”لوگوں نے پولیس چوکی پر اطلاع دے دی۔ اس بستی کی پولیس چوکی کا عملہ صرف چھ اہلکاروں پر مشتمل ہے۔ لاشوں کو جیپ میں ڈال کر شہر کے اسپتال پہنچا دیا گیا اور ہیڈ کوارٹر رپورٹ دے دی گئی۔
”میں نو بجے کے قریب دفتر آیا تو اسے یہاں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اپنے باپ کے ساتھ آئی ہو لیکن ایک سب انسپکٹر نے مجھے واقعے سے آگاہ کیا تو میں پریشان ہوگیا۔ یہ مسلسل رو رہی ہے۔ ابھی تک کچھ نہیں بتا سکی۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم عبادت گاہ میں ان کے پاس رہ چکے ہو اور یہ تم سے مانوس بھی ہے۔“
”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”میرا خیال ہے اس نے ابھی تک کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔“
”چائے اور ناشتا دیا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں لیا۔“ بریندرا نے کہا۔
”تم چائے وغیرہ بھجوا دو۔ میں معلوم کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
بریندرا کمرے سے چلا گیا۔ دھنو ابھی تک مجھ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور اسے اپنے سے الگ کرکے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور خود بھی دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ دھنو مسلسل رو رہی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آرہے تھے۔
تھوڑی دیر بعد ہی ایک کانسٹیبل ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس میں چائے کے دو کپ اور ڈبل روٹی کے علاوہ پانی کا گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔
”لو۔ پانی پیو اور کچھ کھالو ورنہ تمہاری طبیعت خراب ہوجائے گی۔“
دھنو نے پانی کے چند گھونٹ پیے اور گلاس ہٹا دیا۔ میرے اصرار پر اس نے ڈبل روٹی کا ایک سلائس بھی کھا لیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ پندرہ بیس منٹ بعد اس کی حالت کچھ سنبھل سکی تھی۔ میری موجودگی سے شاید اسے کچھ حوصلہ بھی ملا تھا۔
”ہاں۔ اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”وہ کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے؟“
”وہ تین آدمی تھے۔“ دھنو نے سسکی بھرتے ہوئے جواب دیا ”وہ آدھی رات کو وہاں آئے تھے۔ ان کی موجودگی کی آواز سنتے ہی بابا نے مجھے اور ماں کو ایک غار میں چھپا دیا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بابا کی چیخوں کی آواز سن کر ماں مجھے غار میں چھوڑ کر چلی گئی۔ اس نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں غار سے باہر نہ نکلوں۔
”میں غار میں مزید پیچھے ہٹتی ہوئی بہت دور تک چلی گئی۔ مجھے کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں رات بھر چھپی رہی اور جب میں باہر نکلی تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ گھر کا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ ماں کی برہنہ لاش عبادت گاہ کے برآمدے میں پڑی تھی۔ اس کا شریر زخموں سے چور تھا۔ بابا کی لاش عبادت گاہ کے اندرونی حصے میں بدھا کے بڑے مجسمے کے سامنے پڑی تھی۔ اس کا جسم بھی زخموں سے چور تھا اور شہ رگ کٹی ہوئی تھی۔“ وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
میں اس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ ایسے سنگین لمحات مجھ پر بھی گزر چکے تھے جب میرے ماں باپ کو میری نظروں کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ دھنو بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوئی تھی۔
وہ روتے ہوئے بتا رہی تھی کہ قاتل وہاں سے جا چکے تھے۔ اگر اس وقت تک موجود ہوتے تو اسے بھی زندہ نہ چھوڑتے۔ دھنو نے بڑی ہمت سے کام لیا تھا کہ اپنے ماں باپ کی لاشوں کو کشتی میں ڈال کر بستی تک لے آئی تھی اور اس طرح وہ بھی پولیس ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گئی تھی۔
میں نے انسپکٹر بریندرا کو بلا کر اسے صورت حال سے آگاہ کردیا۔ بدھ نیل کنڈ کی وہ عبادت گاہ شہر کے ایک تھانے کی حدود میں تھی۔ دھنو کے بیان کے بعد پولیس نے اپنی ضابطے کی کارروائی مکمل کرکے ایک تفتیشی ٹیم بھی تشکیل دے دی۔
”یہ اب واپس عبادت گاہ تو نہیں جاسکتی۔“ بریندرا نے کہا ”تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ شوبھا اور مایا متی سے اسے کچھ حوصلہ ملے گا اور اس کا دھیان بٹ جائے گا۔“
”اور اس کے ماں باپ کی لاشوں کا کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔
”لاشوں کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے دوبارہ وہاں لے جانا مناسب نہیں ہے۔“ بریندرا نے جواب دیا ”کسی فلاحی ادارے کے ذریعے ان کی آخری رسومات کا بندوبست کردیا جائے گا۔“
جب میں دھنو کے ساتھ گھر واپس پہنچا تو دوپہر ہوچکی تھی۔ میرے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر شوبھا اور مایا متی کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی۔ ان کی وحشت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دھنو کے جسم پر لپٹی ہوئی چادر پر خون کے دھبے نمایاں ہو رہے تھے۔
میں نے دھنو کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں اور بھی پریشان ہوگئیں۔ بہرحال‘ ان دونوں نے دھنو کو سنبھال لیا۔
میں دھنو کو ان کے حوالے کرکے اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ میں تقریباً رات بھر جاگتا رہا تھا اور نیند پر قابو پانا میرے تو کیا‘ کسی کے بس میں نہیں تھا۔
دو گھنٹوں بعد شوبھا نے مجھے جگا دیا۔ کھانا تیار ہوچکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں سے نکلا تو دھنو کو دیکھ کر اچھل پڑا۔ شوبھا نے اسے نہلا کر اپنا لباس پہنا دیا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی ساڑی میں وہ واقعی قیامت لگ رہی تھی۔
مایا متی بھی بدھا کی پیروکار تھی۔ وہ دھنو کی زبان بھی پوری طرح سمجھتی تھی اس لیے اسے سنبھالنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بہرحال‘ اس وقت بھی اسے تھوڑا بہت کھانا زبردستی ہی کھلایا گیا تھا۔
میں دھنو سے پوچھتا رہا کہ وہ کون لوگ تھے لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکی کہ ان کی تعداد تین تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق آدھی رات کے وقت تھونچی نے انہیں جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔ اس وقت وہ جیپ ٹیلے کے قریب آکر رکی تھی۔ اس میں تین آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ تھونچی ان دونوں کو عبادت گاہ کے عقب میں ایک غار میں لے گیا اور انہیں بہت اندر چلے جانے کو کہا تاکہ ہم اجنبیوں کی نظروں میں نہ آسکیں۔
ایک گھنٹے بعد تھونچی کی چیخیں سنائی دیں تو بھیرجانی اسے مزید غار کے اندر دھکیلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ دھنو ڈر کے مارے غار میں بہت اندر تک چلی گئی تھی۔ وہ رات بھر وہاں دبکی رہی۔ وہ اس خوف سے باہر نہیں نکلی تھی کہ چند روز پہلے آنے والے اجنبیوں کے ہاتھوں اپنی ماں کا حشر دیکھ چکی تھی۔
صبح ہونے پر جب وہ غار سے نکلی تو اپنے ماں باپ کی لاشیں دیکھ کر چیخ اٹھی۔ وہ دیر تک ان لاشوں سے لپٹی روتی رہی لیکن اس ویرانے میں اسے تسلی دلاسا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر بڑی ہمت سے کام لیا اور لاشوں کو کشتی میں ڈال کر بستی کے گھاٹ پر لے آئی۔
”تم نے اس بستی میں کسی کو یا یہاں پولیس والوں کو بدھا کے مجسمے کے اندر خفیہ راستے کے بارے میں تو نہیں بتایا؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا ”میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ صرف تم سے بات کی تھی۔“

"اور بہتر ہو گا کہ اس سلسلے میں خاموش ہی رہنا۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "وہ ایک ایسا راز ہے جس کی حفاظت کے لیے تمہارے باپ نے جان دے دی۔ تمہاری جان بھی جا سکتی ہے اس لیے اس سلسلے میں اپنی زبان بند ہی رکھنا۔"

دھنو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سہ پہر کے قریب انسپکٹر بریندرا نے اطلاع دی کہ دھنو کے والدین کی لاشیں ایک فلاحی ادارے کے حوالے کی جا چکی ہیں۔ سورج غروب ہونے سے پہلے آخری رسومات ادا ہوں گی۔ دھنو اگر چاہے تو ان میں شریک ہو سکتی ہے۔

میں نے دھنو کو بتایا تو وہ فوراً ہی تیار ہو گئی۔ میں وقتِ مقررہ پر اسے بتائی ہوئی جگہ پر لے گیا۔ شہر سے باہر وہ بدھا کے پیروکاروں کا شمشان گھاٹ تھا۔ تین بھکشوؤں کے علاوہ وہاں چند آدمی اور تھے۔ دھنو اپنے ماں باپ کے چہرے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں بڑی مشکل سے اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ دونوں چتاؤں کو آگ دکھانے کے بعد ایک بھکشو نے مجھے اشارہ کیا اور میں دھنو کو لے کر واپس آ گیا۔

شمشان گھاٹ شہر سے کافی دور تھا۔ شہر کی آخری آبادی اور شمشان گھاٹ کے درمیان ایک پتھریلا میدان تھا جہاں جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ تاہم سامنے بہت دور شہر کی عمارتوں کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم اس میدان کے وسط میں تھے کہ اچانک ہی تیز ہوا چلنے لگی۔ دھنو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہوا کی تندی بڑھتی جا رہی تھی۔ آگے چلنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہوا ہمیں پیچھے دھکیل رہی تھی۔

گرد و غبار اڑ کر فضا میں پھیل رہا تھا۔ تاریکی ایک دم گہری ہو گئی۔ شہر کی روشنیاں بھی اب دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سامنے سے ایک بگولا بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود اس بگولے کی چکراتی ہوئی دھول صاف نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا گرد و غبار کا مینار آسمان کی بلندیوں تک چلا گیا ہو۔

میں اس بگولے کی زد سے بچنا چاہتا تھا لیکن دھنو کا پیر جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری۔ اس کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی وقت ہم بگولے کی زد میں آ گئے۔ میں نے دھنو کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن ہوا اسے دھکیلتی ہوئی دور لے گئی۔ میں اس کے پیچھے لپکا لیکن بگولے نے اسے اوپر اٹھا دیا۔

دھنو بری طرح چیخ رہی تھی۔ میں اس سے پہنچ... لیکن تند بگولا اسے بڑی تیزی سے اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ وہ بگولے کے عین بیچ میں پھرکی کی طرح چکراتے ہو... تھی۔

اس تیز اور تند ہوا میں ایک شیطانی قہقہے کی آواز... میں ایک جھٹکے سے رک گیا۔ قہقہے کی آواز اس بگولے کے اندر سے آ رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بگولے کے اوپر بہت بلندی پر گوتم بھوش کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید میری بے بسی پر قہقہے لگا رہا تھا۔

ایک لمحہ — صرف ایک لمحہ گزرا اور میری نظریں اس بگولے پر مرکوز ہو گئیں اور پھر وہ بگولا گردش کرتا ہوا ایک ہی جگہ پر رک گیا۔ اس کے اندر دھنو بدستور پھرکی کی طرح گھوم رہی تھی۔ میں نے اپنی نظریں بگولے پر مرکوز رکھیں۔ دھنو آہستہ آہستہ نیچے آتے ہوئے زمین پر ٹک گئی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ گوتم بھوش کا ہیولا فضا میں تحلیل ہو گیا اور بگولا بھی بتدریج منتشر ہوتا چلا گیا۔

دھنو زمین پر پڑی چیخ رہی تھی۔ میں نے دوڑ کر اس کا بازو پکڑا اور آبادی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دھنو نے ساڑی پہن رکھی تھی جس سے اسے دوڑنے میں خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ بار بار لڑکھڑا رہی تھی لیکن میں اسے کھینچتا ہوا دوڑتا رہا۔

گوتم بھوش کو اس ویرانے میں وار کرنے کا موقع مل گیا تھا اور میں جلد سے جلد ویرانے سے نکل جانا چاہتا تھا۔

گوتم بھوش پے در پے جس طرح مجھ پر حملے کر رہا تھا اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجھے نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اس وقت اس نے شاید جان بوجھ کر دھنو کو ہی نشانہ بنایا تھا۔ شاید اس کا خیال ہو کہ میں ڈر کر یا گھبرا کر مالا اس کے حوالے کر دوں گا لیکن یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ میں بزدل ہوتا تو اس دنیا سے میرا نام و نشان مٹ چکا ہوتا۔ دنیا کے سفاک ترین انسانوں سے میرا مقابلہ ہو چکا تھا اور وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تھے۔ گوتم بھوش مجھے زیر کرنے کے لیے اگر اپنی پراسرار شکتی استعمال کر رہا تھا تو اس حوالے سے میں بھی تہی دامن نہیں تھا۔ میرے اندر بھی ایک شکتی تھی جو میں نے طویل عرصے کی ریاضت اور کٹھنائیوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد حاصل کی تھی۔ جی — یہ کوئی معمولی قوت نہیں تھی۔ انسان کے اندر چھپی ہوئی اس قوت سے تو دنیا تہ و بالا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے کبھی اس قوت کو استعمال نہ...

...لیکن اب اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور اس وقت ...ت کے بل بوتے پر ہی میں نے اس خوفناک بگولے کو ...تھا اور اسے منتشر کر کے دھنو کو اس کی قید سے ...ائی تھی۔

...دوڑتے ہوئے آبادی کے قریب پہنچ گئے۔ دھنو بری ...پ رہی تھی۔ ہم ایک جگہ رک گئے۔ دھنو نے اپنی ...قابو پایا۔ ساڑی درست کی اور ہم آگے چلنے لگے۔ ...در خوف زدہ تھی کہ اس نے اب بھی میرا ہاتھ بڑی ...پکڑ رکھا تھا۔

...بادی میں کوئی بات معمول کے خلاف نہیں تھی اور ...چھی طرح جانتا تھا کہ اس طرف نہ تو آندھی آئی تھی ...بگولے اٹھے تھے۔ وہ تو گوتم بھوش کی حرکت تھی۔ ...لے ہی چوک پر ایک خالی سائیکل رکشا مل گیا۔ دھنو ...اس طرح بیٹھی تھی کہ اس کا سارا بوجھ میرے اوپر ...نے بھی اپنا ایک بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر ...تھا۔ رکشا کے سائیکل ہینڈل پر عقبی منظر پیش کرنے کے ...رائش کے لیے آئینے لگے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے ...طرف کے آئینے اس طرح ایڈ جسٹ کر دیے کہ ہمیں ...ئے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید میں اس خوب صورت لڑکی ...ہیں لے جا رہا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد ہم بہ خیریت گھر پہنچ گئے۔

شوبھا اور مایا متی' دھنو کو دیکھ کر چونک سی گئیں۔ اس ...چہرے پر اب بھی خوف کی زردی کھنڈ رہی تھی۔ میں نے ...بتایا کہ ایک بگولا اسے اڑا کر لے جا رہا تھا تو شوبھا اور ...متی نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

"کیا بات ہے۔ اسے کہاں لے گئے تھے۔ یہ اتنی خوف ...زدہ کیوں ہے؟" شوبھا نے علیحدگی میں موقع ملتے ہی پوچھا۔ ...نظروں میں شک کی جھلک نمایاں تھی۔

"دھنو زندگی میں پہلی بار شمشان گھاٹ گئی تھی۔" میں ...نے کہا "اور تم جانتی ہو ایسی جگہوں پر تو ویسے ہی وحشت ...ہوتی ہے اور اتفاق سے واپسی پر وہ ایک بگولے کی زد میں ...آ گئی۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ بگولا اسے زیادہ اوپر ...تک نہیں لے گیا تھا۔"

شوبھا نے مزید جرح نہیں کی لیکن اس کی نظروں اور ...چہرے کے تاثرات سے میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے میری بات ...یقین نہیں کیا تھا۔

اس رات انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان بھی آ گئے۔

بریندرا نے بتایا کہ صبح پولیس کی پارٹی بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ پر بھیجی گئی تھی وہ واپس آ گئی ہے۔ وہاں سے کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی البتہ عبادت گاہ کے برآمدے اور اندرونی حصے میں مہاتما بدھ کے مجسمے کے اردگرد خون کے دھبے ملے ہیں۔

بریندرا نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ جب تک کوئی اور بندوبست نہیں ہو جاتا' دھنو ہمارے پاس رہے گی۔

مجھے دھنو کو اپنے پاس رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن عبادت گاہ پر کسی کی موجودگی بھی ضروری تھی۔ وہاں تھوپچی کی کھیتی باڑی تھی' مویشی بھی تھے جن کی دیکھ بھال ضروری تھی۔ بریندرا نے وعدہ کیا کہ وہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر لے گا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر عبادت گاہ میں بدھا کے عظیم القامت سونے کے مجسمے اور سونے کی اس کان کی تھی جس کا راز صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آ رہا تھا۔ انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان اگرچہ فرض شناس اور دیانت دار آفیسر تھے لیکن اس راز کے لیے میں ان پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا تھا جو اس راز کو مرتے دم تک اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکے اور میں جانتا تھا کہ ایسا آدمی تلاش کرنا آسان نہیں تھا جو سونے کے پہاڑ کو اپنے سینے میں چھپا سکے۔

دھنو کی وجہ سے میرا سارا پروگرام اپ سیٹ ہو گیا تھا۔ اگر دھنو کے والدین کو قتل نہ کیا گیا ہوتا اور دھنو یہاں نہ آئی ہوتی تو میں شوبھا کے ساتھ ہندوستان جا چکا ہوتا لیکن دھنو کی وجہ سے مجھے اپنا پروگرام بدلنا پڑا تھا۔

ادھر پولیس اور ناگ پال کے بیچ آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔ پولیس کبھی ناگ پال کو گھیرے میں لے لیتی اور کبھی وہ پولیس کو نچا کر رکھ دیتا۔ بہرحال' یہ کھیل جاری تھا لیکن میں اس سے قطعی لاتعلق ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے وعدے کے مطابق جنرل کھوراٹ کے آدمیوں کو یہاں قدم نہیں جمانے دیا تھا۔ چانگ لی کی موت کے ساتھ ہی یہ قصہ ختم ہو گیا تھا۔ ناگ پال اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا۔ جنرل کھوراٹ اگر دوبارہ یہاں قدم جمانا چاہے گا تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہو گا۔ ناگ پال کے ساتھ پولیس کا کھیل جاری تھا اور میں دھنو کی وجہ سے الجھ کر رہ گیا تھا۔

تین چار روز گزر گئے۔ اس دوران میں گوتم بھوش کی طرف سے بھی کوئی غیر معمولی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ میں ایک مرتبہ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا بھی چکر لگا کر آیا تھا۔

مویشیوں کی دیکھ بھال کے لیے انسپکٹر بریندرا نے وقتی طور پر کچھ انتظام کردیا تھا۔ دو آدمی وہاں رہ رہے تھے لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ وہاں کچھ ایسے لوگ رکھے جائیں جو مستقل طور پر وہاں رہائش بھی اختیار کرسکیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ مایا متی ابھی ڈیوٹی سے نہیں آئی تھی۔ میں' شوبھا اور دھنو کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔ میں نے اٹھ کر گیٹ کھول دیا۔

وہ ایک ادھیڑ عمر بدھ بھکشو تھا' ایک ادھیڑ عمر عورت' ایک نوعمر لڑکی اور ایک لڑکا تھا جس کی عمر نو دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کے چہروں سے تھکن ظاہر ہورہی تھی۔ لگتا تھا وہ کوئی لمبا سفر کرکے آئے تھے۔

بھکشو کی بغل میں ایک میلا سا تھیلا دبا ہوا تھا جو خاصا پھولا ہوا تھا جبکہ عورت نے بھی کندھے پر ایک پوٹلی اٹھا رکھی تھی۔ لڑکی کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی۔ اس کے کندھے پر بھی ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔

میں الجھی ہوئی نظروں سے باری باری ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انہیں کہیں اور جانا تھا اور بھول کر یہاں آگئے تھے لیکن اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔

کہیں یہ لوگ تھونچی کے جاننے والے تو نہیں تھے ہوسکتا ہے؟ دھنوا نہیں جانتی ہو۔

"ہم دلائی لاما کے دیش سے آئے ہیں۔ دھرم شالا سے۔ کیا تم ہمیں اندر آنے کو نہیں کہو گے؟" بھکشو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دھرم شالا اور دلائی لاما کا نام سن کر میں چونک گیا۔ تبت سے جلا وطنی کے بعد بدھ مت کے روحانی پیشوا نے ہندوستان میں پناہ لی تھی اور وہ طویل عرصے سے ہندوستان کی شمالی ریاست ہماچل پردیش کے صدر مقام دھرم شالا میں رہائش پذیر تھا۔ یہاں اسے وہ تمام مراعات حاصل تھیں جو کسی جلا وطن ہیڈ آف اسٹیٹ کو حاصل ہوسکتی ہیں۔ دلائی لاما کی وجہ سے تبت سے ہجرت کرکے آنے والے ہزاروں پناہ گزیں بھی دھرم شالا اور اس کے قرب و جوار کے شہروں میں آباد تھے اور اب تو ان کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہوچکا تھا۔

مجھے تھونچی کی باتیں یاد آگئیں۔ جب میں ان کے پاس عبادت گاہ میں رہ رہا تھا تو تھونچی نے بتایا تھا کہ عبادت گاہ کے تہ خانے میں بدھا کے سونے کے مجسمے اور سونے کی کان کا راز دلائی لاما اور اس کے چند قریبی ساتھی جانتے تھے اور بھکشو بھی دھرم شالا سے آیا تھا اور اس نے بھی دلائی لاما کا نام لیا تھا۔

میں نے راستہ چھوڑ دیا اور وہ لوگ اندر آگئے۔ دھنو نے بھکشو کو پہچان لیا۔ اس نے بتایا کہ یہ بھکشو گزشتہ برسوں میں کئی مرتبہ دھرم شالا سے یہاں آچکا ہے۔ وہ ہفتہ دس دن ان کے پاس عبادت گاہ میں رہتا تھا اور پھر واپس چلا جاتا تھا۔ عبادت گاہ میں قیام کے دوران میں وہ اور تھونچی عبادت گاہ کے اندر جاکر کئی کئی گھنٹوں تک غائب رہتے تھے۔

میرے دل میں کچھ عجیب سا خیال ابھر رہا تھا۔ کہیں یہ وہی تو نہیں جس کا مجھے انتظار تھا؟

فوراً ہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا۔ وہ بس سے اتر کر سیدھے یہیں آئے تھے اور ظاہر ہے انہیں رات بھی یہیں گزارنی تھی۔ ان کی شب بسری کا بندوبست بھی کردیا گیا۔ لاؤنج میں سے صوفے اور کرسیاں ہٹادی گئی تھیں۔

مایا متی بھی ان مہمانوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ میرے دل میں بھی اس بھکشو کے بارے میں ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ اپنے آس پاس کسی مشتبہ اجنبی کو دیکھ کر دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگتے تھے۔

اس رات میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے کھڑا باہر دیکھ رہا تھا کہ ہلکی سی آہٹ سن کر پیچھے مڑا۔ وہ بھکشو تھا جو دروازے میں کھڑا مجھ سے اندر آنے کی اجازت طلب کررہا تھا۔ میں نے اسے اندر بلالیا اور ہم دونوں تخت پر بیٹھ گئے۔

"میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

"کہو۔ میں سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"دلائی لاما تمہارا شکر گزار ہے کہ تم نے اتنے عرصے اس راز کی حفاظت کی جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا آرہا ہے۔" اس نے کہا تو میں چونک گیا۔ دلائی لاما کو کیسے پتا چلا کہ میں اس راز سے واقف ہوں لیکن پھر اچانک ہی میرے ذہن میں وہ بہت سی پراسرار باتیں ابھر آئیں جو دلائی لاما سے منسوب کی جاتی ہیں۔ تبت کے پراسرار علوم کا تو ویسے ہی دنیا بھر میں شہرہ ہے لیکن بہت سے علوم ایسے ہیں جو صرف اعلیٰ ترین مذہبی شخصیات تک محدود ہیں۔ صرف ان چند ہستیوں کو یہ پراسرار علوم سکھائے جاتے ہیں جنہوں نے دھرم اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی ہو۔ ان ہستیوں میں دلائی لاما کے علاوہ صرف چند اور لوگ شامل ہوتے ہیں۔ پراسرار علوم اس طبقے تک محدود رہتے ہیں اور انہیں بڑی رازداری سے اگلی نسلوں کو منتقل کیا جاتا ہے۔

"جس روز تھونچی اور اس کی بیوی کو قتل کیا گیا تھا' دلائی لاما کو اسی روز پتا چل گیا تھا۔" بھکشو کہہ رہا تھا "اس کی جگہ کسی ایسے آدمی کو بھیجنے کی ضرورت تھی جو اس راز سے واقف ہو اور اس کی حفاظت کرسکتا ہو۔ میں دلائی لاما کے ایلچی کی حیثیت سے تھونچی سے وقتاً فوقتاً رابطہ رکھتا تھا۔ میں ان دنوں بنکاک میں واٹ ٹریمٹ میں تھا۔ مجھے پیغام ملا تو میں فوراً ہندوستان واپس آگیا اور دھرم شالا پہنچتے ہی مجھے یہاں آنے کا حکم دیا گیا۔"

واٹ ٹریمٹ کے نام پر میں چونک گیا۔ بنکاک میں اس عبادت گاہ سے تو میری بھی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ یہیں تو مہاراج سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی جب چا چار تاپ سنگھ کو اس عبادت گاہ کے اندر گولیوں سے چھلنی کردیا گیا تھا اور قسمت نے مجھے مہاراج کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

مہاراج کا دیہانت (انتقال) ہوئے عرصہ ہوچکا تھا لیکن بہت سے لوگ ابھی وہاں موجود تھے۔ میں نے ان میں سے کچھ کے نام لیے تو بھکشو اچھل پڑا اور پھر ہم بہت دیر تک واٹ ٹریمٹ اور وہاں کے مختلف لوگوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بھکشو کے بارے میں تو میرے دل میں پہلے ہی کوئی شبہ نہیں تھا۔ ان باتوں کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔

"میں اگر چاہتا تو سیدھا وہیں جاسکتا تھا۔" وہ کہہ رہا تھا "لیکن تم سے مل کر تمہارا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا۔ میں یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ اگر پتری ہمارے ساتھ رہنا چاہے تو اسے ساتھ لے چلوں۔"

"اچھا ہوا تم آگئے۔" میں نے کہا "میں بہت فکر مند تھا لیکن اب میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ یہ تو دھنو سے معلوم کرنا پڑے گا کہ وہ کہاں رہنا چاہتی ہے۔ ویسے میرے خیال میں وہ تم لوگوں کے ساتھ ہی رہنا پسند کرے گی۔ اس کا باپ برسوں پہلے کسی دوسرے شہر سے آیا تھا اور یہاں اس کا کوئی نہیں ہے۔ تم لوگوں کی وجہ سے اسے بڑا سہارا رہے گا۔"

لیکن صبح دھنو سے بات ہوئی تو اس نے ان لوگوں کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ پچھلے چند روز میں وہ شوبھا سے بہت زیادہ مانوس ہوگئی تھی اور مستقل طور پر اس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

یہ ایک نئی مشکل آن پڑی تھی لیکن یہ مسئلہ اس طرح حل ہوگیا کہ شوبھا اسے ہندوستان لے جاکر اپنے ساتھ رکھنے کو تیار ہوگئی تھی۔

میں نے صبح سویرے ہی انسپکٹر بریندرا کو بھی بھکشو کے بارے میں اطلاع دے دی اور اسے بتادیا کہ وہ اپنے کنبے کے ساتھ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ پر رہنے کو تیار ہے۔

اس دوپہر ہم لوگ ایک اسٹیشن ویگن پر لد کر بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ پر پہنچ گئے۔ یہاں قدم رکھتے ہی دھنو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شوبھا نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔

انسپکٹر بریندرا بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن وہ وہاں پہلے سے موجود اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ہم سے الگ تھلگ ہی رہا تھا۔ دھنو نے بھکشو کو کھیتوں' مویشیوں اور ہر چیز کے بارے میں سمجھا دیا۔ ان کا سارا سامان یہیں پر تھا۔ دھنو نے کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کردیا اور بھکشو اور اس کے گھر والوں کو اجازت دے دی کہ وہ ہر چیز استعمال کرسکتے ہیں۔

میں اور بھکشو موقع پاکر عبادت گاہ کے پچھلے حصے میں چلے گئے تھے۔ بھکشو نے بدھا کے مجسمے کے اندر خفیہ راستہ کھولا اور ہم تہ خانے میں اتر گئے۔

"دلائی لاما نے اجازت دی ہے کہ تم یہاں سے جتنا سونا چاہو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔" بھکشو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے سونا لے جانا ہوتا تو مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا "یہ سب کچھ میرے اختیار میں تھا۔ میں چاہتا تو..."

"دلائی لاما نے ٹھیک کہا تھا۔" بھکشو نے گہرا سانس لیتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

"کیا...؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کہ تم کچھ قبول نہیں کرو گے۔" بھکشو نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے تک تہ خانے میں رہنے کے بعد باہر آگئے۔ کسی کو ہمارے اتنی دیر غائب رہنے کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔

شام سے ذرا پہلے ہم بھکشو اور اس کی فیملی سے رخصت ہوکر ویگن میں بیٹھ گئے۔ دھنو بڑی حسرت بھری نظروں سے عبادت گاہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زندگی کا طویل عرصہ یہاں گزرا تھا۔ ایک ایک چیز سے اس کی یادیں وابستہ تھیں اور میں جانتا تھا' وہ آسانی سے ان یادوں کو فراموش

نہیں کر سکے گی۔

کئی روز تک دھنو پر اداسی طاری رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ وہ بڑی شوخ و چنچل اور شریر سی لڑکی تھی۔ جب میں چند روز ان کے ساتھ عبادت گاہ میں رہا تھا تو مجھے اس کی شوخیوں اور شرارتوں کا تجربہ ہو چکا تھا۔

ماں باپ کی موت کے بعد اس پر جو قنوطیت طاری ہوئی تھی وہ اب ختم ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ لوٹ رہی تھی۔

دھنو تھی بھی بڑی حسین۔ سڈول جسم اور لمبا قد۔ عبادت گاہ میں تو میں نے اسے جسم پر صرف ایک چادر لپیٹے ہوئے ہی دیکھا تھا لیکن یہاں وہ ہر قسم کا لباس پہننے لگی تھی۔ وہ بڑی جامہ زیب تھی۔ اس پر ہر لباس اچھا لگتا تھا۔ ساڑی تو اس پر خوب بجتی تھی۔

میں نے انسپکٹر بریندرا کو بتا دیا تھا کہ اب میں ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ شوبھا کو ویش مکھ اغوا کر کے لایا تھا۔ میں اور بملا انسپکٹر اعظم کے ساتھ غیر قانونی طور پر اس ملک میں داخل ہوئے تھے۔ میں نے یہاں جرائم پیشہ گروہ کے خلاف قانون سے تعاون کیا تھا۔ میری بات صرف انسپکٹر بریندرا تک ہی نہیں رہی تھی۔ بہت اوپر کے لوگ بھی مجھے جان گئے تھے۔ بریندرا چاہتا تھا کہ ہماری واپسی قانونی طور پر ہو۔ میں نے اسے دھنو کے بارے میں بھی بتا دیا تھا اور ان دنوں وہ ہمارے کاغذات تیار کروا رہا تھا۔

اس دوران میں نہ تو نیلگری سے کسی قسم کا رابطہ ہوا تھا اور نہ ہی گوتم بھوش کی صورت دکھائی دی تھی اور کوئی غیر معمولی واقعہ بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ گوتم بھوش یا تو مجھ سے مایوس ہو کر میرا پیچھا چھوڑ گیا تھا یا وہ کسی موقع کے انتظار میں تھا۔ یہ بات میں جانتا تھا کہ پنڈت لوگ آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

نیلگری تو ایسی شکتی تھی جسے حاصل کرنے کے لیے متعدد لوگ کشٹ اٹھا رہے تھے۔ تپسیا کی جا رہی تھی اور کٹھنائیاں برداشت کی جا رہی تھیں۔ گوتم بھوش بھی نجانے کب سے یہ سارے کشٹ (مشکلات) اٹھا رہا تھا۔ وہ آسانی سے اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا جبکہ اسے یہ توقع بھی ہوگی کہ وہ منزل پر پہنچنے والا ہے لیکن میں بیچ میں ٹپک پڑا تھا۔ اس رات رتنا پارک میں کرسٹل کا ٹوٹا ہوا مجسمہ ملنا ہی غضب ہو گیا تھا۔ نہ وہ مجسمہ ملتا اور نہ میں اس چکر میں پھنستا۔

ہمارے کاغذات مکمل ہو گئے۔ ہمارے لیے دو دن بعد کی تاریخ میں ہوائی جہاز پر دہلی کے لیے سیٹیں بک کروا دی گئیں۔ اس فلائٹ کے شیڈول کے مطابق ہم سہ پہر چار بجے دہلی پہنچ جاتے اور ہم نے پروگرام بنا لیا تھا کہ اسی شام دہلی ریلوے اسٹیشن سے پنک سٹی ایکسپریس پر سوار ہو کر جے پور روانہ ہو جائیں گے۔ (پنک سٹی ایکسپریس روزانہ صبح چھ بجے دہلی ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوتی ہے اور دو سو ستر کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے پانچ گھنٹے بعد دوپہر گیارہ بجے جے پور پہنچ جاتی ہے۔ پھر شام چار بجے جے پور سے روانہ ہو کر رات نو بجے واپس دہلی پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری پنک سٹی ایکسپریس انہی اوقات کے مطابق جے پور سے دہلی اور دہلی سے جے پور کے درمیان چلتی ہے)

اگلا دن ہم نے شاپنگ کرتے ہوئے گزارا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ، راج کماری روپ متی اور دوسروں کے لیے بہت سے تحائف خریدے تھے۔ شوبھا واپس جانے کے خیال سے بہت خوش تھی جبکہ دھنو پر عجیب سنسنی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی ساری زندگی ایک عبادت گاہ میں گزری تھی۔ اس کے لیے تو یہ شہر بھی اجنبی تھا۔ بارہ چودہ برسوں کے عرصے میں وہ صرف چند مرتبہ ہی تو شہر آئی تھی۔ اس کے لیے یہاں کے لوگ بھی اجنبی تھے اور اب وہ ایک نئے دیش جا رہی تھی جہاں کی ہر چیز اس کے لیے اجنبی ہوگی۔

اسپتال میں سمبا سے ہماری ملاقات بڑی جذباتی ثابت ہوئی تھی۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ انسپکٹر بریندرا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا پورا خیال رکھے گا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا تو اسے جیپ پر اس کے قبیلے میں پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ کھٹمنڈو ہی میں رہنا چاہے گا تو اس کے لیے روزگار کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔

اگلے روز جہاز کی پرواز سے ایک گھنٹا پہلے ہم ائرپورٹ پر موجود تھے۔ بریندرا اور انسپکٹر اعظم سادہ لباس میں ہمیں الوداع کہنے آئے تھے۔ وہ ہمیں ائرپورٹ پر چھوڑ گئے تھے۔ تاہم مایا متی اس وقت تک ہمارے ساتھ موجود رہی تھی جب تک ہم ڈیپارچر لاؤنج میں داخل نہیں ہو گئے تھے۔ وہ نہ صرف دھنو اور شوبھا سے گلے ملی تھی بلکہ مجھ سے بھی لپٹ کر اسی نے اس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔

ہم جہاز میں اپنی سیٹوں پر بیٹھ چکے تھے۔ روانگی میں چند منٹ باقی تھے۔ میں کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر دیکھ رہا تھا۔ ایک وین بڑی تیز رفتاری سے ٹارمک (TARMAC) پر دوڑتی ہوئی جہاز کی طرف آ رہی تھی۔ اس وقت جہاز کی سیڑھیاں ہٹائی جا رہی تھیں۔ وین جہاز کے قریب آ کر رک گئی۔ پاس میں نصف درجن آدمی وین سے اترے۔ ان سب کے پاس آٹومیٹک رائفلیں تھیں۔

سیڑھیاں دوبارہ جہاز سے لگا دی گئیں۔ وین سے اترنے والے مسلح آدمی اب میری نظروں میں نہیں رہے تھے لیکن دو منٹ بعد جہاز کا دروازہ کھلا اور دو مسلح آدمی اندر گھس آئے۔ دو آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے آگے والے حصے میں پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں تان لی تھیں۔ دو آدمی وہیں دروازے کے پاس رک گئے۔ دو آدمی آگے بڑھ آئے۔ ساتویں آدمی کے پاس ریوالور تھا۔

مسافروں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ کسی کو سوچنے کا موقع تک نہیں مل سکا تھا۔ اس صورتِ حال نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔

ریوالور والا دو گن مینوں کے ساتھ مسافروں کے چہروں کو گھورتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ مسافروں کو وارننگ دے دی گئی کہ کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔ ہر شخص اپنی سیٹ پر سہما بیٹھا تھا۔

میں، شوبھا اور دھنو ایک ہی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ریوالور والا ہماری سیٹوں کے قریب رک گیا۔ اس نے ایک لمحہ میری طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میری طرف ریوالور تان لیا اور چیخ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ چار گن مین دوڑ کر قریب آ گئے اور انہوں نے ہم تینوں کو رائفلوں کی زد پر لے لیا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ ریوالور والے نے ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ ہم ایک ایک کر کے سیٹوں سے باہر آ گئے۔ ایک گن مین نے ہمارے جسموں کو تھپتھپا کر ہماری تلاشی لی اور پھر رائفلوں کی زد پر ہمیں جہاز سے اتار لیا گیا۔ ہمارا سامان بھی ان لوڈ کر دیا گیا تھا۔

اس صورتِ حال نے مجھے بری طرح بدحواس کر دیا تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن کسی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میرے ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑی لگا دی گئی اور مجھے دھکیل کر وین میں بٹھا دیا گیا۔ دھنو اور شوبھا کو بھی وین میں دھکیل دیا گیا تھا۔ تاہم انہیں ہتھکڑیاں نہیں لگائی گئی تھیں۔ وہ چھ کے چھ مسلح آدمی ہمارے ساتھ اس طرح بیٹھ گئے تھے کہ ہم ان کے درمیان دب کر رہ گئے۔ ہمارا سامان بھی وین کی چھت پر رکھ دیا گیا تھا۔ وین حرکت میں آ کر کچھ دیر تک ٹارمک پر دوڑتی رہی اور پھر ایک گیٹ سے ہوتی ہوئی ٹرمینل کی عمارت سے باہر آ گئی۔ عمارت سے باہر سڑک پر آتے ہی مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنا سر جھکائے رکھوں اور باہر دیکھنے کی کوشش نہ کروں۔

وین تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک دوڑتی رہی۔ آس پاس ٹریفک کا شور سنائی دے رہا تھا جس سے اندازہ ہوا کہ ہم شہر ہی کے کسی علاقے میں سفر کر رہے تھے لیکن پھر ٹریفک کا شور بتدریج کم ہوتا گیا اور بالآخر وین رک گئی۔

ہمیں نیچے اتار لیا گیا۔ یہ کوئی حویلی نما پرانی عمارت تھی۔ اس کی چاردیواری فصیل کی طرح اونچی تھی۔ عمارت اگرچہ بہت شان دار تھی لیکن لگتا تھا برسوں سے اس پر رنگ روغن کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ کچھ لوگوں کو فوجی وردیوں میں دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ اس حویلی نما عمارت میں فوج کا کوئی دفتر قائم تھا۔ باہر سے وقتاً فوقتاً گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ عمارت شہری حدود میں ہی واقع تھی۔

میں نے ایک بار پھر پوچھنا چاہا کہ ہمیں کیوں پکڑا گیا ہے لیکن جواب میں میرے سینے پر ایک زوردار گھونسا جڑ دیا گیا تھا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ میں نے دھنو اور شوبھا کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہرے بھی خوف سے پیلے پڑے ہوئے تھے۔

ہمیں رائفلوں کی زد پر عمارت کے اندر لے آیا گیا۔ کئی راہداریوں میں مڑنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ ریوالور والا ایک دروازے میں داخل ہو گیا۔ اس کی واپسی دس منٹ بعد ہوئی تھی اور پھر ہمیں اندر لے جایا گیا۔

یہ کمرا خاصا وسیع و عریض تھا۔ فرش پر قالین بچھے ہوئے تھے۔ سامنے ایک بہت بڑی آفس ٹیبل تھی جس کے پیچھے درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ سر گنجا اور شکل بل ڈاگ جیسی تھی۔ جبڑوں کے نیچے گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا سوٹ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ چند لمحے کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر شوبھا اور دھنو کی طرف دیکھنے لگا۔ دھنو کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔

اس دفتر میں دو آدمی اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی کرختگی نمایاں تھی۔

میرے ساتھ آنے والے نے گنجے کی طرف دیکھتے ہوئے

کچھ کہا۔ گنجا ایک بار پھر گہری نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحے آپس میں کچھ باتیں کرتے رہے اور پھر گنجے نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ گن مین ہمیں کمرے سے باہر لے آئے۔

ہم ایک بار پھر مختلف راہداریوں میں چلتے رہے اور ایک اور سلاخوں والے دروازے پر رک گئے اور اس وقت یہ جان کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ شوبھا اور دھنو میرے ساتھ نہیں تھیں۔ انہیں غالباً راستے ہی میں کسی اور طرف لے جایا گیا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔

یہ کمرا آٹھ بائی آٹھ فٹ تھا۔ چھت بہت اونچی تھی۔ مدھم روشنی کا ایک بلب چھت سے لٹکا ہوا تھا۔ پچھلی طرف کافی اونچائی پر ایک مختصر سا روشن دان تھا جس میں آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

دو گن مین میرے ساتھ کوٹھری میں گھس آئے تھے۔ ایک نے میری تلاشی لی۔ جیبوں میں جو کچھ تھا وہ نکال لیا اور پھر میرے گلے سے مالا بھی اتار لی گئی۔ اس وقت میں نے گردن جھٹک کر مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔

"یہ ساری چیزیں امانت کے طور پر ہمارے پاس محفوظ رہیں گی۔ اگر تم بے گناہ ثابت ہوئے تو سب کچھ واپس کر دیا جائے گا۔" اس شخص نے کہا پھر میری ہتھکڑی کھول دی اور مجھے جوتے اتارنے کو کہا گیا۔

"میرا جرم کیا ہے۔ آخر ہمیں اس طرح کیوں پکڑا گیا ہے؟" میں نے زمین پر بیٹھ کر جوگرز اتارتے ہوئے پوچھا۔

"بہت بھولے بنتے ہو۔" اس شخص نے کہا "یہ ملٹری انٹیلی جنس کا ہیڈ کوارٹر ہے اور تمہیں جاسوسی کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔"

"جاسوسی!" مجھے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا "شاید تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا ایسے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"انٹیلی جنس بغیر کسی ثبوت کے کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔" اس شخص نے کہا "ساری باتیں جب تمہارے سامنے آئیں گی تو تمہیں بھی پتا چل جائے گا کہ ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔"

وہ دونوں باہر نکل گئے اور کوٹھری کے سلاخوں والے دروازے کو تالا لگا دیا گیا۔ میں نے ان سے شوبھا اور دھنو کے بارے میں پوچھا لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر چلے گئے۔

میں سر پکڑ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔ مجھ پر جاسوسی کا الزام بڑا ہی مضحکہ خیز تھا۔ میں کس کے لیے جاسوسی کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی اور کے دھوکے میں مجھے پکڑ لیا گیا ہے۔ ممکن ہے وہ شخص اسی جہاز میں ہو جسے یہ لوگ پکڑنا چاہتے تھے۔ غلط فہمی کی وجہ سے میں ان کے قابو میں آ گیا اور وہ بچ کر چلا جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ انسپکٹر بریندرا وغیرہ میرے بارے میں بتائیں گے تو ان کی غلط فہمی دور ہو جائے گی اور یہ مجھے چھوڑ دیں گے۔

میں شوبھا اور دھنو کے بارے میں سوچنے لگا۔ انہیں بھی شاید کسی اور کوٹھری میں بند کر دیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے ان سے بھی میرے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ان پر کسی قسم کا تشدد نہ کیا جائے۔

کمرے میں پیشاب کی بو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں دروازے کے قریب بیٹھ گیا تاکہ تازہ ہوا میں سانس لے سکوں۔ میں نے ایک مرتبہ سلاخوں سے منہ لگا کر ادھر ادھر جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں طرف طویل راہداری تھی اور غالباً سنسان پڑی تھی۔

سامنے والی دیوار کے اونچے روشن دان سے دن کی روشنی دکھائی دے رہی تھی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ روشنی بھی مدھم ہوتی چلی گئی۔

شام ہو چکی تھی۔ روشن دان کے باہر اندھیرا تھا۔ چھت پر جلنے والا بلب غالباً ساٹھ واٹ کا تھا۔ اس کی روشنی بہت کم تھی۔

لمحے صدیاں بن کر بیت رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ لوگ مجھے اس کوٹھری میں بند کر کے بھول گئے ہوں۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ کوٹھری شاید عمارت کے کسی آخری حصے میں واقع تھی اور اس طرف کسی کی آمد و رفت بھی نہیں تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری وحشت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ نیلگری کی مالا مجھ سے چھن گئی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ غلط ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔

اگر کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں سب کچھ برداشت کر لیتا لیکن اب قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ اس ملک کے لیے میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ دنیا کے ان سفاک اور خطرناک ترین انسانوں سے انہیں نجات دلائی تھی جو اس ملک اور اس کے معصوم عوام کو تباہی کے غار میں دھکیلنا چاہتے تھے لیکن مجھے اس کا کیا صلہ دیا گیا تھا۔ ایک ناکردہ جرم میں سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد کسی نے

خبر تک نہیں لی تھی۔

اب مجھ میں برداشت کا یارا نہیں رہا تھا۔ مجھے شوبھا اور دھنو کی فکر بھی کھائے جا رہی تھی۔ ان کے ساتھ پتا نہیں کیا سلوک کیا گیا ہو گا۔ ضروری نہیں کہ وہ لوگ انہیں بھی کسی کوٹھری میں بند کر کے بھول گئے ہوں۔ میں نے بالآخر چی کی قوت کو استعمال میں لانے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن..... چند لمحوں بعد ہی میں دہل کر رہ گیا۔ میں اپنے آپ کو اندر سے بالکل کھوکھلا محسوس کر رہا تھا۔ ایک گہرا سناٹا تھا جو میرے وجود کے اندر طاری تھا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے اندر اس پراسرار قوت کو ابھارنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

میری وحشت بڑھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک ہی ایک اور خیال ابھرا۔ کہیں میں اپنے اندر کی اس قوت سے محروم تو نہیں ہو گیا؟ لیکن نہیں۔ یہ کوئی جیب میں پڑا ہوا سکہ تو نہیں تھا جو کہیں کھو گیا ہو۔ یہ قوت تو میں نے بڑی محنت اور ریاضت سے حاصل کی تھی لیکن میں اپنے آپ کو کھوکھلا سا کیوں محسوس کر رہا تھا؟ نیلگری کی مالا بھی میرے پاس نہیں رہی تھی۔ میرے ساتھ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سناٹے میں قدموں کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں دروازے کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ آواز قریب آتی گئی اور ایک منٹ بعد دو گن مین سامنے آ گئے۔ انہوں نے دروازے کا تالا کھولا اور مجھے کوٹھری سے نکال کر دھکے دیتے ہوئے ایک طرف چلنے لگے۔ ان دونوں نے مجھے رائفلوں کی زد پر لے رکھا تھا۔

وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے آئے تھے جہاں ایک میز کے پاس دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی چہروں سے بہت سفاک اور درندہ صفت لگ رہے تھے۔ مجھے ان کے سامنے ایک اسٹول پر بٹھا دیا گیا۔ دونوں گن مین دروازے کے قریب کھڑے ہو گئے۔

اس کمرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ کوئی عقوبت خانہ تھا۔ ایذا رسانی کے جدید آلات نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف دیوار کے قریب بینچ پر ہمارا وہ سامان بھی بکھرا پڑا تھا جو جہاز سے اتارا گیا تھا۔ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ سامان کی تلاشی لی گئی تھی۔ سیاہ رنگ کا ایک بریف کیس جو میں نے ایک دن پہلے ٹھاکر کے لیے خریدا تھا' اندر سے ادھڑا پڑا تھا۔

وہ دونوں انٹیلی جنس آفیسر تھے۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پتھروں کو بھی زبان کھولنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک دراز قامت تھا اور دوسرا درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک۔

"ہم تم سے صرف چند باتیں پوچھیں گے۔" لمبے قد والے نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا تو تکلیف سے بچ جاؤ گے۔ دوسری صورت میں۔۔۔" اس نے کمرے میں سجے ہوئے ایذا رسانی کے آلات کی طرف دیکھا "تم ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہو کہ تمہارا کیا حشر ہو سکتا ہے۔"

"سب سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ہمیں کس جرم میں پکڑا گیا ہے اور میری ساتھی عورتیں کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری ساتھی عورتیں فی الحال تو خیریت سے ہیں۔" دراز قامت والا بولا "لیکن اگر تم تینوں میں سے کسی نے بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ان دونوں کو بھی یہاں لے آیا جائے گا اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہو گا وہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔"

"لیکن ہمیں کیوں پکڑا گیا ہے؟ ہمارا جرم کیا ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"کوئی سوال نہیں۔" اس مرتبہ درمیانے قد والا غرایا "تم صرف جواب دو گے۔ سوال ہم کریں گے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "کیا یہ غلط ہے کہ تمہارا نام ہمت سنگھ نہیں وجدان علی ہے اور تم سنگاپور سے ہندوستان آئے تھے اور وہاں طویل عرصے تک قتل و غارت کرنے کے بعد نیپال آ گئے۔ بظاہر تم پکڑے جانے کے خوف سے ہندوستان سے فرار ہوئے تھے مگر درحقیقت تم ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت یہاں آئے تھے۔ تم بھارت کے ایجنٹ ہو اور بعض اہم راز حاصل کرنے کے لیے یہاں آئے تھے۔ اگر عین وقت پر ہمیں تمہارے بارے میں اطلاع نہ ملتی تو تم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔"

میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کی یہ بات تو درست تھی کہ میں سنگاپور سے ہندوستان آیا تھا (بلکہ حادثاتی طور پر ہندوستان پہنچ گیا تھا) لیکن ہندوستان میں قتل و غارت' وہاں سے فرار اور یہاں انڈیا کے لیے جاسوسی۔۔۔! یہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ مجھے کسی سازش میں پھنسانے کی کوشش کی جا رہی تھی یا انہیں غلط فہمی ہوئی تھی لیکن انہیں میرا اصل نام کیسے معلوم ہوا تھا۔ شوبھا واحد ہستی تھی جو میرے اصل نام سے واقف تھی۔ یہاں تو میں نے کسی کو اپنا اصل نام بتایا ہی نہیں تھا۔

"یہ درست ہے کہ میرا اصل نام وجدان ہے لیکن باقی جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ غلط ہے۔ نہ میں کوئی ایجنٹ ہوں اور نہ ہی کسی منصوبے کے تحت یہاں آیا تھا۔ میں تو اپنی دوست شوبھا کو بچانے کے لیے دلیش مکھ کا تعاقب کرتے ہوئے آیا تھا۔ شوبھا بھی تمہاری تحویل میں ہے۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔ پولیس انسپکٹر اعظم خان بھی میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔"

"ہم بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔" اس شخص نے کہا "یہ کاغذات تمہارے بریف کیس کے خفیہ خانے سے برآمد ہوئے ہیں۔" اس نے میز کی دراز سے کاغذات کا پلندہ نکال کر دکھایا "اس میں شبہ نہیں کہ انڈیا سے ہماری حکومت کے تعلقات دوستانہ ہیں لیکن ہمیں ہندوستان پر کبھی بھی بھروسا نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ دوستی کی آڑ میں ہماری پشت میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اپنی گھناؤنی کوششوں میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ سکم، گوا، آسام سب اس کی دوستی کا شکار ہوئے ہیں۔ ہندوستان ایک ایسا اژدہا ہے جو اپنے دوستوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے لیکن نیپال میں اس کی کوئی سازش کامیاب نہیں ہوگی۔ تم اگر یہ کاغذات لے جانے میں کامیاب ہوجاتے تو ہمیں واقعی ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑتا۔ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہاں تمہارے ساتھ اور کون کون لوگ کام کررہے ہیں۔ اگر تم ٹھیک ٹھیک بتا دو گے تو ہم تمہیں سرکاری گواہ بنا کر تمہاری سزا میں کچھ کمی کرسکتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا "یہ بریف کیس میں نے کل ایک دکان سے خریدا تھا اور ان کاغذات کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔ یہ درست ہے کہ میں غیر قانونی طور پر نیپال میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں میں نے اس ملک کے مفاد میں کام کیا ہے۔ ایک ایسی سازش کو ناکام بنانے میں قانون کی مدد کی ہے جو اگر کامیاب ہوجاتی تو یہاں ایک بہت ہی خوفناک طوفان آجاتا۔ تم لوگ پولیس انسپکٹر بریندرا اور دوسرے حکام سے دریافت کرسکتے ہو۔"

"وہ بھی ہم دریافت کرلیں گے۔" اس مرتبہ لمبے قد والا بولا "یہ کاغذات تمہیں کس نے دیے تھے؟"

"میں ان کاغذات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے جواب دیا "یہ بریف کیس میں نے اپنے ایک دوست کو تحفے میں دینے کے لیے بازار سے خریدا تھا۔ مجھے ان کاغذات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" بات کرتے کرتے اچانک ہی مجھے یاد آگیا کہ کل جب میں ایک دکان دار کو بریف کیس دکھانے کو کہا تھا تو دکان دار کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں بریف کیس اپنے دوست کو تحفے میں دینا چاہتا ہوں۔ اس نے مجھے چند بریف کیس دکھائے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر میں واقعی بہت اچھا بریف کیس لینا چاہتا ہوں تو شام کو آجاؤں اور شام کو جب میں دوبارہ وہاں گیا تو اس نے مجھے یہ بریف کیس دے دیا تھا۔

میں نے انٹیلی جنس آفیسروں کو یہ بات بتا دی لیکن انہوں نے یقین نہیں کیا۔ وہ ایک گھنٹے تک مجھ سے سوالات کرتے رہے اور میں وہی جواب دیتا رہا۔ درمیانے قد والے نے اچانک ہی اٹھ کر میرے منہ پر زوردار گھونسا مار دیا۔ یہ حملہ اچانک ہی ہوا تھا۔ میں چیختا ہوا اسٹول سمیت پیچھے الٹ گیا۔ اس شخص نے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میرے جسم پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بارش کردی اور تھوڑی دیر بعد دوسرا بھی اس "کارِ خیر" میں شامل ہوگیا۔ وہ دونوں حسب توفیق مجھ پر لاتیں اور گھونسے برساتے رہے۔

وہ دونوں شاید تھک گئے تھے۔ انہوں نے دروازے میں کھڑے ہوئے گن مینوں کو حکم دیا۔ انہوں نے رائفلیں میز پر رکھ دیں اور میرے ہاتھ پشت پر لے جاکر ہتھکڑی ڈال دی اور میرے پیروں کو بھی ایک رسی سے باندھ دیا۔ رسی کا دوسرا سرا چھت پر لگے ہوئے ایک کنڈے سے گزر کر ایک دیوار کے ساتھ ہک میں بندھا ہوا تھا۔ دونوں گن مین رسے کو کھینچنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں الٹا لٹکا ہوا تھا۔ میرا سر زمین سے تقریباً تین فٹ اوپر تھا۔

پستہ قامت آدمی ایک بار پھر میرے جسم پر گھونسے برسانے لگا اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی باکسر پریکٹس بیگ پر باکسنگ کی مشق کررہا ہو۔ اس کے گھونسے بھاری ہتھوڑوں کی طرح میرے پیٹ پر برس رہے تھے۔ ہر ضرب پر میں چیخ اٹھتا۔

میں تقریباً بیس منٹ تک الٹا لٹکا رہا پھر مجھے فرش پر ڈال دیا گیا۔ لگتا تھا جیسے جسم کا سارا خون میرے سر میں جمع ہوگیا ہو۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید بینائی ختم ہوگئی تھی۔

چند منٹ بعد میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے بینائی بھی آہستہ آہستہ لوٹ آئی لیکن میں کوئی چیز صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نظروں کے سامنے اب بھی دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

لمبے قد والا پھر اپنے سوالات دہرانے لگا اور میرے جواب بھی وہی تھے۔ اس مرتبہ مجھے اٹھا کر لوہے کے ایک

ایسے اسٹینڈ پر کھڑا کردیا گیا جو صلیب کی شکل کا تھا۔ میرے بازو دائیں بائیں نکلی ہوئی آہنی پلیٹوں پر جکڑ دیے گئے اور پچھلی طرف لگا ہوا ایک بٹن دبا دیا گیا۔ میرے دونوں بازو اطراف میں کھنچنے لگے۔ کچھ دیر تک تو میں برداشت کرتا رہا لیکن پھر میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے کندھوں کے جوڑ اکھڑ جائیں گے۔

دراز قامت انٹیلی جنس آفیسر میرے سامنے کھڑا سوالات دہراتا رہا اور میں "نہیں نہیں" کرتا رہا۔

اس نے مشین میں لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ آہنی پلیٹیں آہستہ آہستہ سمٹنے لگیں اور میری بانہوں کا تناؤ بھی بتدریج کم ہوتا چلا گیا۔

رات بھر وقفے وقفے سے میرے ساتھ یہ ہوتا رہا۔ یہ میری قوتِ ارادی تھی کہ میں سب کچھ برداشت کررہا تھا اور اب تک زندہ تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا جب مجھے ایک ہیلمٹ پہنا دیا گیا۔ مجھے کرسی پر بٹھا کر میرے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تھے تاکہ میں اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکوں۔ ہیلمٹ کے ساتھ بجلی کے تار منسلک تھے۔ اس کا پلگ پچھلی دیوار کے ساکٹ میں لگا دیا گیا۔ سوئچ آن ہوتے ہی ہیلمٹ میرے سر پر تنگ ہونے لگا۔ میرا سر آہنی شکنجے میں کسا جارہا تھا۔ کھوپڑی چٹخنے لگی۔ میں چیختا رہا۔ میری آخری چیخ بڑی خوفناک تھی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کی چادر پھیلتی چلی گئی اور میرا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

ہوش آیا تو میں اسی کوٹھری میں پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی کافی دیر تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا اور پھر دھند سی چھائی رہی۔ کئی منٹ بعد دھند بتدریج چھٹنے لگی اور روشن دان سے چمکتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔

میری کنپٹیوں اور کندھوں کے جوڑ میں شدید درد تھا۔ کھوپڑی بھی چٹختی جارہی تھی۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں شدید ٹیسیں نہ اٹھ رہی ہوں۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ اٹھا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ شدید احتجاج کرنے لگا تھا۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ ترک کردیا اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بے حس و حرکت پڑا رہا۔

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے کھوپڑی اب بھی آہنی شکنجے میں جکڑی ہوئی ہو۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ذہن کو بھی آزاد چھوڑ دیا۔

اگرچہ میری اپنی حالت نہایت ابتر تھی لیکن دھنو اور شوبھا کا خیال بھی مجھے پریشان کیے ہوئے تھا۔ نہ جانے ان دونوں کے ساتھ انہوں نے کیا سلوک کیا ہوگا اور وہ کس حال میں ہوں گی۔ انسپکٹر بریندرا کو ہمارے بارے میں پتا چلا تھا یا نہیں اور کیا وہ اس معاملے میں ہماری کوئی مدد کرسکیں گے۔ میں جانتا تھا کہ میں بے گناہ ہوں۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے پھنسانے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن میرے خلاف ایسی گھناؤنی سازش کرنے والا کون ہوسکتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جنرل کھوراٹ کا نام ابھرا۔ میں نے اسے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ سب سے پہلے تھائی لینڈ سے اس کے قدم اکھاڑے تھے۔ پھر گولڈن ٹرائی اینگل میں اس کی ہیروئن کی ایک لیبارٹری تباہ کرنے کے علاوہ اس کے کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ اس کے آدمی میرے تعاقب میں لگے رہے تھے۔ شاؤلن ٹیمپل میں بھی مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی بار بار کوشش کی گئی تھی لیکن میں ہربار... بچتا رہا تھا اور اب یہاں بھی میں نے اسے بھاری نقصان پہنچایا تھا۔ وہ یہاں جو نیٹ ورک قائم کرنے کی کوشش کررہا تھا اسے میں نے تہس نہس کردیا تھا۔ یہاں بھی اس کے دو آدمی میری وجہ سے مارے گئے تھے۔ سام سنگ اور چانگ لی کا شمار اس کے اہم ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ جنرل کھوراٹ کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اس نے ہشت پا کی طرح پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر جگہ اس کے گرگے موجود تھے۔ یہاں چانگ لی اور سام سنگ ختم ہوگئے تھے تو کیا ہوا۔ ناگ پال تو ابھی زندہ تھا اور آزاد بھی تھا۔ میرے خلاف اس سازش میں یقیناً انہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ یہ لوگ مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ قہقہے کی آواز سن کر چونک گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ روشن دان کی طرف نظر اٹھتے ہی مجھے اپنے سینے میں دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ پنڈت دھیراج تھا جو روشن دان کی دوسری طرف بیٹھا ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے اس طرف کوئی کارنس وغیرہ ہو یا وہ ہوا میں معلق ہو۔ اس کے بدن پر حسب معمول ایک مختصر سا لنگوٹ تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے قہقہے لگا رہا تھا۔

"ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے بانک۔" اس نے کہا "تمہیں کہا تھا نا کہ ہمارے راستے میں مت آؤ۔ گرو نے بھی تمہیں بہت سمجھایا لیکن تم نہیں مانے۔ تمہیں راستے سے

ہٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا بالک۔"

"تو یہ تمہاری شرارت تھی؟" میں نے کہا۔

"گرو تو یہاں سے بہت دور جاپ پر بیٹھا ہے۔ یہ میری ہی شرارت ہے۔ ہاں۔ تم اسے شرارت ہی کہو گے۔ ابھی تو کھیل شروع ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا' بہت بھیانک ہوگا۔"

"یہ پریشانی وقتی ہے پنڈت دھیراج۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "تم دونوں میرے انتقام سے بچ نہیں سکو گے۔ یہاں سے نکلتے ہی سب سے پہلے میں تمہارا ہی بندوبست کروں گا۔"

"اپنے آپ کو بچانے کی سوچو مورکھ۔" پنڈت دھیراج بولا "تمہیں اس مالا پر گھمنڈ تھا نا۔ اب یہ مالا میرے قبضے میں ہے۔ تم کچھ نہیں کرسکو گے۔" اس نے ایک ہاتھ روشن دان کی سلاخوں سے اندر داخل کردیا۔ اس کی استخوانی انگلیوں میں نیلگری کی مالا پھنسی ہوئی تھی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس پنڈت کے ہاتھ میں مالا دیکھ کر میرا دماغ سلگ اٹھا تھا۔

"یہ۔ یہ مالا تم نے کہاں سے لی؟" میں نے کہا۔

"یہ دنیا ہے مورکھ۔ ہر شخص دھن کی پوجا کرتا ہے۔" پنڈت دھیراج نے جواب دیا "میں نے اس آفیسر کو چند سو روپے رشوت دے کر یہ مالا لے لی ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟ تم کچھ نہیں کرو گے مورکھ! جو کچھ کریں گے' ہم کریں گے۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگیں اور پھر اچانک ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ سینے میں لاوا سا کھول رہا تھا۔ میں اپنے آپ میں ایک تبدیلی واضح طور پر محسوس کررہا تھا۔ میری نظریں پنڈت دھیراج کے استخوانی پنجے پر مرکوز ہوگئیں۔ میری آنکھوں میں تپش بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی ہوں۔

پنڈت دھیراج ایک بار پھر قہقہے لگانے لگا۔ شاید وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا لیکن اچانک ہی اس کے قہقہے بھیانک چیخ میں بدل گئے۔ آگ کے ایک شعلے نے اس کے استخوانی پنجے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مالا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اندر کی طرف گر گئی۔ چند منٹ پہلے تک میں اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل بھی نہیں تھا لیکن مالا نیچے گرتے ہی میں حیرت انگیز طور پر اپنی جگہ سے اچھلا تھا۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ روشن دان میں لگی ہوئی آہنی سلاخوں کے باوجود پنڈت دھیراج نے کوٹھری کے اندر چھلانگ لگادی تھی لیکن میرا ہاتھ اس سے پہلے مالا تک پہنچ گیا تھا۔

اب میں مکمل طور پر حواس میں تھا۔ میرے اندر کا کھوکھلا پن ختم ہوگیا تھا اور میرے اندر کی وہ قوت بھی لوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر میرا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور میرے اندر کی اس پراسرار قوت نے شعلہ بن کر پنڈت دھیراج کے ہاتھ کو جھلسا دیا تھا اور نیلگری کی مالا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی جو اب میرے قبضے میں آچکی تھی۔

پنڈت دھیراج کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ میں نے اچانک ہی اسے زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ وہ کتے کی طرح چیخ اٹھا اور دوسرے ہی لمحے اس کی ہیئت بدل گئی۔ وہ کتا بن گیا۔ میں اس پر ٹھوکریں برساتا رہا اور وہ چیختا ہوا کوٹھری میں ادھر ادھر دوڑتا رہا۔ وہ دروازے کی آہنی سلاخوں سے ٹکرایا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر اندرونی حصے کی طرف دوڑے گا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سلاخوں سے باہر نکل گیا۔ سلاخیں چار چار انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ لیکن اس کتے کے باہر نکل جانے سے مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ پنڈت دھیراج تھا۔ پراسرار شکتی کا مالک۔ وہ روشن دان کی تنگ سی سلاخوں سے اندر آگیا تھا تو اس کے لیے اور باتیں کیا معنی رکھتی تھیں۔

وہ کتا راہداری میں "چیاؤں چیاؤں" کرتا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ میں نے مالا گلے میں ڈال لی اور دروازے کے قریب فرش پر لیٹ گیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میں اپنے آپ میں توانائی محسوس کرنے لگا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ ہم کل دوپہر کو کھانا کھا کر ائرپورٹ جانے لگے تھے اور یہ دوسرے دن کی دوپہر ہوچکی تھی۔ گویا تقریباً چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے اور اس دوران میں مجھے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں دیا گیا تھا۔

میں آنکھیں بند کیے فرش پر پڑا رہا اور پھر راہداری میں قدموں کی آواز سن کر چونک گیا۔ قدموں کی ان آوازوں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کئی آدمی تھے۔ میں کسی نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ تفتیش کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگا۔ تفتیش کا مطلب تھا تشدد اور مار پیٹ۔

قدموں کی آواز قریب آتی گئی۔ میرا رخ دروازے کی طرف تھا۔ چند سیکنڈ بعد کئی افراد دروازے کے سامنے آکر رکے۔ ان میں انسپکٹر بریندرا' اعظم خان اور پولیس کے دو اعلیٰ افسروں کو دیکھ کر میں جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اس گروپ میں انٹیلی جنس کے تین افسران بھی تھے۔ ایک تو وہی لمبے قد والا تھا جس نے مجھ پر تشدد کیا تھا۔ دوسرا میرے لیے اجنبی تھا۔ تیسرا بل ڈاگ کی شکل والا وہی بھاری بھرکم گنجا تھا جس کے سامنے مجھے سب سے پہلے پیش کیا گیا تھا اور غالباً اس کے حکم پر مجھے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس گروپ کے پیچھے دو اور آدمی تھے جنہوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔

دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ لوگ اندر گھس آئے۔ انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان تیزی سے آگے بڑھ کر میرے قریب آگئے۔ بریندرا کی آنکھوں میں چنگاریاں سی سلگنے لگی تھیں۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

پولیس کا ایک اعلیٰ آفیسر اور انٹیلی جنس کا سربراہ' تیز لہجے میں کچھ باتیں کررہے تھے۔ پولیس آفیسر خاصے غصے میں تھا۔

اسٹریچر دروازے کے سامنے راہداری میں رکھ دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے پیروں پر چل کر جاؤں گا لیکن جب کھڑے ہونے کی کوشش کی تو بے اختیار کراہ اٹھا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ اعظم خان اور بریندرا نے مجھے سہارا دے کر اسٹریچر پر لٹا دیا۔

مجھے اس پراسرار حویلی (انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر) سے سیدھا اسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہاں مایا متی مجھے دیکھ کر دہشت زدہ سی رہ گئی۔ میرا علاج فوراً ہی شروع ہوگیا تھا۔

اس کے کئی گھنٹوں بعد جب میں مکمل طور پر اپنے حواس میں تھا تو انسپکٹر بریندرا نے مجھے بتایا کہ جس دکان سے میں نے بریف کیس خریدا تھا' گڑبڑ وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ وہ چرائے جانے والے نیپال کے سرکاری راز اسی طرح انڈیا بھیجتے تھے۔ وہ بریف کیس میرے حوالے کیا گیا تھا جس کے خفیہ خانے میں کاغذات چھپے ہوئے تھے۔ انڈیا پہنچتے ہی ان کے آدمی کسی نہ کسی طرح وہ بریف کیس مجھ سے لے لیتے۔

بریندرا نے بتایا کہ وہ دکان دار اور اس کی نشان دہی پر تین اور بھارتی ایجنٹ پکڑے گئے تھے۔ انہوں نے بیان دیا تھا کہ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ تو مجھے بھی اندھیرے میں رکھ کر میرے توسط سے بریف کیس میں چھپے ہوئے کاغذات انڈیا بھیجنا چاہتے تھے۔

انسپکٹر بریندرا کو میری گرفتاری کا پتا آج صبح چلا تھا۔ اس نے اپنے افسرانِ اعلیٰ کو اطلاع دی اور مجھے چھڑانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔

شوبھا اور دھنو کے ساتھ اگرچہ مار پیٹ نہیں کی گئی تھی لیکن انہیں ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ انہیں الگ الگ رکھ کر ان سے بھی میرے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ انہیں طرح طرح کے لالچ بھی دیے گئے تھے کہ اگر میرے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتادیں تو ان کے ساتھ رعایت کی جائے گی لیکن انہوں نے بھی وہی سب کچھ بتایا تھا جو وہ جانتی تھیں۔ انہیں بھی میری طرح بھوکا پیاسا رکھا گیا تھا۔

ان دونوں کو بھی ایک دوسری گاڑی میں اسپتال لے آیا گیا تھا۔ انہیں چونکہ مارا پیٹا نہیں گیا تھا۔ وہ صرف خوف زدہ تھیں اس لیے انہیں مجھ سے الگ رکھا گیا تھا لیکن شام کے وقت انہیں بھی مجھ سے ملنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میری حالت دیکھ کر وہ دونوں دہشت زدہ سی ہوگئی تھیں۔

شام سات بجے مایا متی کی ڈیوٹی ختم ہوگئی تو وہ ان دونوں کو ساتھ لے گئی اور مجھے تو ظاہر ہے کئی روز اسپتال ہی میں رہنا تھا۔

انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان کا بھی یہی خیال تھا کہ ناگ پال کے آدمیوں نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن اس دکان دار کی گرفتاری کے بعد ان کے لیے بات اس طرح واضح ہوگئی تھی کہ یہ انڈیا کے جاسوسوں کا ایک الگ ریکٹ تھا جو طویل عرصے سے یہاں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ ان کا طریقہ کار بڑا مختلف تھا اس لیے کوئی پکڑا نہیں گیا تھا لیکن یہاں بازی پلٹ گئی تھی۔ میرے معاملے میں چونکہ پنڈت دھیراج ملوث ہوگیا تھا۔ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ مجھے پکڑوا دیا جائے تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جاسکے۔ مجھے رات بھر تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ میں نے بریف کیس میں کاغذات کی موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بتا دیا تھا کہ بریف کیس کہاں سے خریدا گیا تھا اس لیے بات کچھ دوسری طرف نکل گئی تھی اور اس طرح انڈین ایجنٹوں کا وہ ریکٹ پکڑا گیا تھا۔ کچھ لوگ روپوش ہوگئے تھے۔

مجھے اسپتال میں دس روز ہوگئے۔ مجھے علاج کی بہترین سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ میں اگرچہ اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کررہا تھا تاہم ڈاکٹر کا خیال تھا کہ مجھے دو چار دن اور اسپتال میں رہنا پڑے گا۔

اس دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ دھنو اور شوبھا بھی روزانہ مجھے دیکھنے کے لیے آتی رہیں۔

مزید تین دن بعد مجھے اسپتال سے رخصت کردیا گیا اور

اس روز ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔

مایا متی ملازمت کے سلسلے میں شہر میں اکیلی رہ رہی تھی جبکہ اس کے والدین گاؤں میں رہائش پذیر تھے۔ کوداری نام کا یہ قصبہ چائنا روڈ پر تبت کی سرحد کے قریب کھٹمنڈو سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔

جس روز میں اسپتال سے گھر واپس آیا اس کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی مایا متی بھی پہنچ گئی۔ وہ بہت بدحواس ہو رہی تھی۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ میرے اسپتال سے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس کے گاؤں کا ایک آدمی آیا تھا جس نے یہ افسوس ناک خبر دی کہ پہاڑ کے دامن میں کھیتوں میں کام کے دوران میں ایک پہاڑی تودہ گرنے سے اس کے باپ کا دیہانت (انتقال) ہو گیا ہے جبکہ اس کی ماں شدید زخمی ہوئی ہے۔ مایا متی اسپتال سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آئی تھی۔ اسے صبح گاؤں جانے کے لیے تیاری کرنی تھی۔

مجھے اس حادثے کا بہت افسوس ہوا۔ زیادہ افسوس اس بات کا بھی کہ میں ابھی ٹھیک طرح سے چل پھر نہیں سکتا تھا ورنہ مایا متی کے ساتھ ضرور جاتا۔

دن کا باقی حصہ مایا متی نے تیاری میں گزارا۔ وہ رات بھر روتی رہی اور اگلے روز صبح کی پہلی بس سے کوداری کے لیے روانہ ہو گئی۔

میں نے دن کا بیشتر حصہ بستر پر لیٹے ہوئے ہی گزارا تھا۔ کسی وقت جسم کے کسی حصے میں اچانک ہی ایسی ٹیسیں اٹھنے لگتیں کہ میں تڑپ کر رہ جاتا۔ میری زندگی بھاگ دوڑ اور مار پیٹ میں گزری تھی۔ میں نے دوسروں پر تشدد کیا بھی تھا اور دوسروں نے مجھے تشدد کا نشانہ بنایا بھی تھا لیکن نیپالی انٹیلی جنس کے آدمیوں نے جس طرح میرے جوڑ ہلائے تھے وہ میرے لیے واقعی عبرت کا مقام تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی طاقت تھی کہ میں نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو اس تشدد کے دوران میں بے گناہی کے باوجود دس مرتبہ اعترافِ جرم کر چکا ہوتا۔ میں بھی بے گناہ تھا۔ میں نے تشدد برداشت کر لیا لیکن کسی ایسے جرم کا اعتراف نہیں کیا جو مجھ سے سرزد ہوا ہی نہیں تھا۔ اگلے روز میرے اندر جی کی قوت لوٹ آئی تھی اور نیلگری کی مالا بھی مجھے واپس مل گئی تھی۔ پنڈت دھیراج کی سازش بھی بے نقاب ہو گئی تھی اس لیے یہ معاملہ ختم ہو گیا تھا اور اگر یہ سازش بے نقاب نہ ہوتی تو نجانے انٹیلی جنس والے میرا کیا حشر کرتے۔

اسی روز شام کو انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان بھی آ گئے تھے۔ رات کا کھانا انہوں نے ہمارے ساتھ ہی کھایا اور گیارہ بجے کے قریب واپس چلے گئے۔

میں نے ایک بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ جب سے ہمارے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا' دھنو کچھ سہمی سہمی سی رہنے لگی تھی۔ اس کے دل میں کوئی خوف بیٹھ گیا تھا۔ وہ کبھی میرے پاس بیٹھی رہتی تھی اور کبھی شوبھا کے ساتھ۔ وہ اکیلی بیٹھنے سے گھبراتی تھی۔

انسپکٹر اعظم اور بریندرا کے جانے کے بعد ہم شوبھا والے کمرے میں آ گئے۔ میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا اور وہ دونوں میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم ایک بار پھر ہندوستان جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ بریندرا اور اعظم خان سے بھی اس موضوع پر باتیں ہوتی رہی تھیں۔ بریندرا کا خیال تھا کہ مجھے آٹھ دس روز مزید آرام کر لینا چاہیے۔

دھنو آڑی ترچھی لیٹ کر اونگھنے لگی تھی۔ ہماری گرفتاری کے موضوع پر اگرچہ کئی مرتبہ بات ہو چکی تھی۔ شوبھا کو اصل صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ وہ یہی سمجھتی رہی تھی کہ ہمیں کسی غلط فہمی کی بنا پر پکڑا گیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے اس موضوع پر بات شروع کر دی تو پہلی مرتبہ میں نے اسے اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

"میں اس پراسرار چکر سے نکلنا چاہتا ہوں۔" میں کہہ رہا تھا "لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ اگر اس مالا سے دستبردار ہوتا ہوں تو نیلگری' گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج جیسے لوگوں کے قبضے میں چلی جائے گی۔ ایک طرف وہ ہمیں انتقام کا نشانہ بنائیں گے تو دوسری طرف دنیا کو تباہی کی طرف دھکیلتے رہیں گے۔"

"اس کا تو صرف ایک ہی طریقہ ہے۔" شوبھا نے کہا۔

"وہ کیا....؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم اپنا جاپ مکمل کر لو۔" شوبھا بولی "اس طرح نیلگری مکمل طور پر تمہارے قبضے میں آ جائے گی اور کوئی دوسرا اسے اس وقت تک حاصل نہیں کر سکے گا جب تک وہ جاپ مکمل نہ کرے اور نیلگری کے قبضے میں آ جانے کے بعد تم گوتم بھوش کو جاپ مکمل کرنے سے روک سکتے ہو۔"

"گویا میرے پاس اس کے سوا اور کوئی کام نہیں رہ جائے گا کہ میں ان پراسرار شکتیوں کے ساتھ لڑتا رہوں۔" میں نے کہا "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ گوتم

بھوش آج کل پھر کسی جاپ پر بیٹھا ہوا ہے لیکن وہ جاپ ایسا نہیں ہے جو ہمارے لیے کسی فوری خطرے کا باعث بن سکے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو مجھے فوراً ہی اس کی خبر ہو جاتی۔"

"جاپ تو کوئی نہ کوئی شکتی حاصل کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔" شوبھا بولی "ہو سکتا ہے گوتم بھوش اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے کوئی چھوٹا موٹا جاپ کر رہا ہو۔ اس طرح اس کے ہاتھ پیر مضبوط ہو جائیں گے۔ وہ اپنے گرد شکتیوں کا حصار قائم کر لے گا اور پھر تم کچھ نہیں کر سکو گے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے اندر کی شکتی سے کام لے کر اسے روکو یا نیلگری سے مدد حاصل کرو۔"

"نیلگری فی الحال اس سلسلے میں میری زیادہ مدد نہیں کر سکتی۔" میں نے جواب دیا "وہ کسی کو جاپ سے روک بھی نہیں سکتی۔"

"لیکن وہ تمہاری مدد تو کر سکتی ہے۔ تمہیں کوئی ایسا جاپ بتا سکتی ہے جس سے تم گوتم بھوش کو روک سکو۔" شوبھا نے کہا۔

"ہاں۔ یہ ممکن ہے' وہ کسی اور طریقے سے میری مدد کر سکے لیکن.... خیر۔ میں نیلگری سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر کا گیٹ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ میں نے دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کا انداز بھی دوستانہ نہیں تھا۔ گیٹ کے شور کی آواز سے دھنو بھی بیدار ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت ابھر آئی تھی۔

میں اٹھ کر باہر آ گیا اور جب میں نے گیٹ کھولا تو آٹھ دس آدمی اندر گھس آئے۔ ان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"مایا متی کہاں ہے؟" ان میں سے ایک نے کرخت لہجے میں پوچھا۔ اس کے چہرے پر بھی بڑی کرختگی تھی۔

"وہ کوداری گئی ہے۔ اپنے گاؤں۔ اس کے باپ کا دیہانت (انتقال) ہو گیا ہے لیکن تم لوگ کون ہو؟" میں نے جواب دیا۔

"میں مایا متی کا باپ ہوں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے سر پر بم پھٹا ہو۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے اور میں وحشت زدہ سی نظروں سے اس پستہ قامت شخص کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

ہزاروں ماہرین طب کی آرا
کی روشنی میں مرتب کردہ کتاب
مٹاپا
اور
اس کا سدباب
قیمت 45 روپے ❖ ڈاک خرچ 23 روپے
مٹاپا......دل سے دشمنی
مٹاپا......زندگی کا خاتمہ
کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔
تو پھر جلدی کیجئے.....
ہماری مرتب کردہ کتاب
"مٹاپا اور اس کا سدباب" کا مطالعہ ضرور کیجئے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں
خط و کتابت کا پتہ
63-C فیز II ایکس ٹینشن D.H.A مین کورنگی روڈ کراچی

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔

مایا متی اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر گاؤں گئی تھی۔ خبر لانے والا اس کے گاؤں کا آدمی تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور نہ ہی کسی سے اس قسم کا مذاق کیا جاسکتا تھا۔ مایا متی نے پچھلی رات روتے ہوئے گزاری تھی۔ اسے اپنے ماں باپ سے بہت محبت تھی۔ وہ اکثر ان کا ذکر کیا کرتی تھی اور ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتے ہی اپنے باپ کے نام کچھ نہ کچھ رقم ضرور بھیجا کرتی تھی اور وقتاً فوقتاً ان لوگوں کے لیے تحائف بھی بھیجتی رہتی تھی۔ گزشتہ روز باپ کی موت کی خبر سن کر گھر آئی تھی تو بہت اپ سیٹ تھی۔ اس کی وجہ سے ہم بھی رات بھر جاگتے رہے تھے۔ دھنو اور شوبھا اسے تسلی دلاسا دیتی رہی تھیں اور صبح ہوتے ہی وہ پہلی بس سے گاؤں روانہ ہوگئی تھی۔

کوداری کھٹمنڈو سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہ صبح چھ بجے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سات یا آٹھ بجے والی بس مل گئی ہوگی۔ فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن پہاڑی راستے بہت پر پیچ اور خطرناک تھے۔ ان بل کھاتے ہوئے راستوں پر بسیں زیادہ تیز رفتاری سے سفر نہیں کرتی تھیں لیکن پھر بھی وہ دوپہر تک تو اپنی منزل پر پہنچ ہی گئی ہوگی۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ اس کے باپ کو زندہ اپنے سامنے دیکھ کر میرے حواس مختل ہو رہے تھے۔ کیا گاؤں پہنچ کر مایا متی کی اپنے باپ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی؟

یہ لوگ گاؤں سے کب روانہ ہوئے ہوں گے؟ نیپال میں عام طور پر رات کے وقت لمبے سفر کی بسیں نہیں چلتیں اور ان لوگوں کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا جیسے لاری اڈے سے سیدھے یہیں آرہے ہوں۔ میرا دماغ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اگر واقعی مایا متی کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا تو یہ شخص کون تھا۔ ایک مرتبہ مایا متی نے مجھے اپنا فیملی البم بھی دکھایا تھا اور مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس کا باپ کچھ ایسا ہی تھا جو اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں کچھ دیر تک پستہ قامت اس شخص کے چہرے کو گھورتا رہا جس نے اپنے آپ کو مایا متی کا باپ بتایا تھا پھر میری نظریں اس کے ساتھ کھڑے ہوئے دوسرے لوگوں کے چہروں پر پھسلنے لگیں۔ طویل سفر سے ان سب کے چہروں پر اگرچہ تھکن کے آثار نمایاں تھے لیکن ان کے ارادے کافی خطرناک نظر آرہے تھے۔

"ہوں۔" وہ شخص خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتا ہوا دو قدم آگے بڑھ آیا "میں مایا متی کا باپ ہوں دھرپندر۔ مرا نہیں ہوں۔ میری جیون ریکھا (زندگی کی لکیر) بہت لمبی ہے پر تو نے اپنی باتوں سے میرے جیون کا انت (اختتام) کردیا۔ سچ بتا کون ہے تو اور میری پتری (بیٹی) کو تو نے کہاں غائب کردیا ہے اور تو نے اس مکان پر قبضہ کیوں کر رکھا ہے؟"

"میں نے مکان پر قبضہ نہیں کر رکھا۔" میں نے صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "مایا متی میری دوست ہے۔ ہم اس کی اجازت سے اس کے ساتھ یہاں رہ رہے ہیں۔ کل شام تمہارے گاؤں کے ایک آدمی نے اسپتال میں بتایا تھا کہ تم کسی پہاڑی تودے کے نیچے دب کر مرگئے ہو۔ مایا متی بہت پریشان تھی۔ وہ آج صبح ہی گاؤں گئی ہے۔"

"جھوٹ بولتا ہے تو۔" دھرپندر غرایا "ہم شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد گاؤں سے چلے ہیں۔ اگر مایا متی صبح یہاں سے روانہ ہوئی ہوتی تو اسے دوپہر تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ بتا۔ تم نے میری پتری کو کہاں غائب کیا ہے؟"

"میں... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میرے حواس ایک بار پھر میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔

"تم لوگ اندر جاکر دیکھو' یہاں اور کون ہے۔" دھرپندر نے اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔

دو کے بجائے چار آدمی دوڑتے ہوئے اندر چلے گئے اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اندر سے دھنو اور شوبھا کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر وہ لوگ دونوں کو گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔

دھرپندر کے اشارے پر دو آدمیوں نے مجھے دبوچ لیا اور میری دھنائی کرنے لگے۔ میں اپنا دفاع کرتا رہا۔ جارحیت اختیار کرنے کی صورت میں معاملہ بگڑ جانے کا اندیشہ تھا جبکہ میرے خیال میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرکے بات کو سنبھالا جاسکتا تھا۔

وہ لوگ میری پٹائی کرتے ہوئے اس طرح شور مچا رہے تھے۔ جیسے بہت بڑا محاذ کھل گیا ہو۔ شور کی آواز سن کر کچھ پڑوسی بھی آگئے۔ کم از کم چار مہینوں سے مایا متی کے ساتھ میرا اس مکان میں آنا جانا تھا۔ میں مایا متی کے ساتھ کئی کئی روز یہاں رہا تھا۔ اس گلی میں رہنے والوں نے کئی مرتبہ مجھے مایا متی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ سب مجھے جاننے اور پہچاننے لگے تھے لیکن اس وقت ہر شخص نے مجھے پہچاننے سے انکار

کردیا۔

دھرپندر مجھے اپنے آدمیوں کے حوالے کرکے اندر چلا گیا۔ اس کی واپسی تقریباً دس منٹ بعد ہوئی تھی۔

"بیٹی نے پولیس کو فون کیا ہے۔" وہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "معاملہ اب بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ پولیس کے آنے سے پہلے بتا دے کہ میری پتری کہاں ہے تو میں تم لوگوں کو چھوڑ دوں گا۔ ورنہ پولیس تم لوگوں سے معلوم کرلے گی اور ایک بات سن!" اس نے میرے بالوں کو پکڑ کر زور دار جھٹکا دیا "اگر میری پتری کو کچھ ہوگیا تو میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔"

"میری بات کا یقین کرو' تمہاری بیٹی تمہاری موت کی اطلاع پاکر آج صبح گاؤں چلی گئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ ایک بات پر بہرحال مجھے اطمینان ہوا تھا کہ اس نے پولیس کو فون کردیا تھا۔ اس تھانے کے پولیس والے ظاہر ہے مجھے نہیں جانتے تھے لیکن اس طرح انسپکٹر بریندرا کو اطلاع ہوسکتی تھی اور وہ اس معاملے میں ہماری مدد کرسکتا تھا۔

دھرپندر میری بات کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس دوران میں کچھ اور پڑوسی جمع ہوگئے تھے۔ انہوں نے بھی مجھے پہچاننے سے انکار کردیا تھا۔

پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی پولیس کی ایک جیپ پہنچ گئی۔ پولیس والوں کی تعداد چار تھی اور وہ چاروں بہت خرانٹ لگ رہے تھے۔

پولیس پارٹی کے انچارج نے پوری توجہ سے دھرپندر کی بات سنی۔ میں نے بھی اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ انسپکٹر بریندرا کا حوالہ بھی دیا لیکن وہ انسپکٹر بریندرا کے نام سے زیادہ متاثر نہیں ہوا۔

ہم تینوں کو دھکے دے کر جیپ میں ٹھونس دیا گیا۔ دھرپندر اور ایک اور آدمی جیپ میں بیٹھ گیا اور چند منٹ بعد ہی ہم تھانے کی حوالات میں بند تھے۔ ممکن ہے دھنو اور شوبھا کو ایک ہی کوٹھری میں بند کیا گیا ہو لیکن مجھے ان سے الگ رکھا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد مجھے آفیسر انچارج کے سامنے پیش کیا تھا۔ اس سے پہلے دھرپندر اپنی باتوں سے اسے میرے خلاف مضبوط کرچکا تھا۔ اس نے اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ شاید ہم نے اس کی بیٹی کو قتل کردیا ہے۔

آفیسر انچارج پہلے تو زبانی طور پر مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا پھر ہاتھوں اور پیروں سے کام لینے لگا۔ اس کا ایک ماتحت بھی اس کی مدد کررہا تھا۔ میری چیخیں تھانے میں گونجتی رہیں لیکن ان کی تفتیش ختم نہیں ہوئی۔ میں بار بار کہہ رہا تھا کہ انسپکٹر بریندرا کو بلایا جائے یا کم از کم اسے اطلاع دے دی جائے لیکن لگتا تھا کہ اس تھانے کا کوئی بھی اہلکار انسپکٹر بریندرا کے نام سے واقف ہی نہیں تھا۔

"ایک بڑے آفیسر کا نام لے کر ہمیں تڑی دیتے ہو۔" سب انسپکٹر نے میرے جبڑے پر ایک اور گھونسا مارتے ہوئے کہا "فکر مت کرو۔ ہم اسے بھی اطلاع دیں گے۔ پہلے ہم اپنی تفتیش تو مکمل کرلیں۔"

اور ان کی یہ تفتیش صبح تک جاری رہی۔ دس بارہ روز پہلے میں انٹیلی جنس کی مار کھا کر اسپتال میں داخل ہوا تھا اور اب یہ ایک نیا چکر شروع ہوگیا تھا۔ ان کم بختوں نے مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا تھا۔

مجھے پھر حوالات میں ڈال دیا گیا تھا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ بائیں طرف کا جبڑا بھی پوری طرح ہل گیا تھا۔

میں حوالات کے گندے فرش پر پڑا اس صورت حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کسی نے مایا متی کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ اس کے باپ کے مرنے کی جھوٹی خبر دی تھی لیکن وہ غائب کہاں ہوگئی؟ اسے تو دوپہر تک اپنے گاؤں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کا باپ شام کو گاؤں سے روانہ ہوا تھا اور اس وقت تک مایا متی گاؤں نہیں پہنچی تھی۔ یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اِدھر مایا متی کو اس کے باپ کے مرنے کی اطلاع دی گئی اور اُدھر گاؤں میں اس کے باپ کو کوئی جھوٹی خبر پہنچائی گئی۔ مایا متی غائب تھی اور ہماری شامت آگئی تھی۔

دوپہر تک کسی نے حوالات میں جھانک کر دیکھا تک نہیں اور پھر چار بجے کے قریب یہ خوفناک اور سنسنی خیز خبر سننے کو ملی کہ کھٹمنڈو سے تقریباً ساٹھ کلومیٹر آگے ڈولو گھاٹ نامی قصبے سے مایا متی کی لاش ملی ہے۔ اسے بہت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ لاش ایک ویران جگہ پر پائی گئی تھی اور اس کے قریب ہی ایک سوٹ کیس بھی ملا تھا جس میں رکھی ہوئی چیزوں اور کاغذات سے مایا متی کی شناخت ہوئی تھی۔

مایا متی کا باپ دھرپندر بری طرح بپھرا ہوا تھا۔ پولیس نے مایا کی موت کی اطلاع دینے اور لاش کی شناخت کے لیے اسے تھانے بلایا تھا۔ اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں لاش رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بھی لاش شناخت کرلی تھی۔ واپس تھانے میں آکر اس نے چیخنا چلانا شروع کردیا تھا۔ وہ مجھے قاتل گردان رہا تھا اور چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے

حوالے کردیا جائے۔

صورت حال اب بدل گئی تھی۔ پہلے ہم پر الزام تھا کہ ہم نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے مایا متی کو کہیں غائب کردیا تھا اور اب سیدھا سیدھا قتل کا الزام آگیا تھا۔ اگرچہ میرے خلاف ابھی تک قتل کی باقاعدہ رپورٹ درج نہیں کی گئی تھی لیکن لگتا تھا کہ مجھے پھانسنے کے لیے جال کو مزید مضبوط کیا جارہا تھا۔

چھ بجے کے قریب مجھے پھر تفتیشی آفیسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ پوچھ گچھ کے بہانے مجھے پھر تشدد کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ میں اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن پولیس والے میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اس مرتبہ تو ایک پولیس والے نے اپنے بیلٹ سے میری کھال ادھیڑ ڈالی۔ ایک بار میں نے اس کے وار سے بچنے کی کوشش کی تو بیلٹ کا بکل میرے سر پر لگا۔ سر پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔

تفتیشی کمرے سے حوالات کی طرف واپس جاتے ہوئے مجھے دوسری طرف سے لایا گیا۔ اس طرف بھی حوالات کی کوٹھریاں تھیں۔ ایک کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں رک گیا۔ شوبھا فرش پر ادھ موئی سی پڑی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ پھولے ہوئے اور بائیں آنکھ تقریباً بند تھی۔ رخسار اور آنکھ کے اوپر پیشانی سوجی ہوئی تھی۔

دھنو بھی اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت بھی شوبھا سے مختلف نہیں تھی۔ اسے بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس کا لباس بھی پھٹا ہوا تھا۔ سینے اور بازوؤں پر سرخ دھبے دکھائی دے رہے تھے جیسے ان جگہوں کو نوچا گیا ہو۔

ان دونوں کی حالت دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ مجھے جان بوجھ کر اس طرف سے لایا گیا تھا تاکہ میں ان کی حالت دیکھ کر اپنی ضد چھوڑ دوں اور قتل کا الزام قبول کرلوں۔

میں اس کوٹھری کے سامنے رکا تو پولیس والے نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شوبھا گندے فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی دھنو کا سر بھی جھکا ہوا تھا۔

"دھنو!"

میں نے ہولے سے پکارا تو دھنو نے جھکا ہوا سر آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا اور پھر مجھے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ میری طرف لپکی تو لڑکھڑا کر گری اور پھر ایک ٹانگ کو گھسیٹتی ہوئی دروازے کے قریب آگئی اور سلاخوں میں سے ہاتھ نکال کر مجھے اپنے ساتھ لپٹانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں بھی سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اس کے شانے تھپتھپانے لگا۔

"یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں۔" وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی "ان درندوں نے کیا حال کردیا ہے تمہارا.....؟"

"دھنو!" میرے ہونٹوں سے سسکاری سی نکلی۔ اس کی حالت مجھ سے بھی ابتر تھی لیکن اسے اپنی نہیں میری فکر تھی۔ آواز سن کر شوبھا نے بھی بمشکل آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکی تھی۔

"میری ایک بات سنو۔" میں نے کہا "تم دونوں میرے خلاف بیان دے دو۔ تم لوگوں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔"

"نہیں ہمت سنگھ۔" دھنو بولی "تم بے گناہ ہو۔ ہم نے بھی کوئی جرم نہیں کیا۔ نہ تو ہم کوئی ناکردہ جرم قبول کریں گے اور نہ تمہارے خلاف کوئی جھوٹا بیان دیں گے۔ ہمیں اگر سچائی کی سزا مل رہی ہے تو ہم کسی سے رحم کی بھیک نہیں مانگیں گے۔ لارڈ بدھا....."

وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کرسکی۔ میرے پاس کھڑے ہوئے پولیس والے نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور مجھے دھکیلتا ہوا میری کوٹھری کی طرف لے آیا۔ دروازہ کھول کر اس نے مجھے زوردار دھکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا منہ کے بل فرش پر گرا۔ اس کے ساتھ ہی دھڑ سے سلاخوں والا دروازہ بند ہوگیا تھا۔

وہ شام بھی گزر گئی۔ میں ادھ موا سا فرش پر پڑا رہا۔ میں بار بار اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ ایک بات تو طے تھی کہ یہ کوئی سازش تھی۔ میرے خلاف نہ سہی' مایا متی کے خلاف۔ ایک طرف اسے اطلاع دی گئی کہ اس کے باپ کا دیہانت (انتقال) ہوگیا ہے۔ دوسری طرف اس کے باپ کو یہ کہہ کر بھڑکایا گیا کہ میں نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے اس کی بیٹی کو غائب کردیا ہے۔ اس کے علاوہ اور نجانے کیا کچھ کہا گیا ہوگا کہ وہ طیش میں آگیا اور درجن بھر آدمیوں کو لے کر ایک ٹرک پر بیٹھ کر طویل سفر کرتا ہوا رات کے پچھلے پہر یہاں پہنچ گیا۔ میں شروع سے ہی سمجھتا رہا تھا کہ یہ کوئی غلط فہمی ہے۔ گاؤں پہنچ کر مایا متی کو صورت حال کا پتا چلے گا تو وہ فوراً

واپس آجائے گی اور اس طرح بات صاف ہوجائے گی لیکن وہ گاؤں پہنچی ہی نہیں تھی۔ بلکہ راستے ہی میں واقع ایک قصبے میں اس کی لاش ملی تھی۔ میں نے اس کی لاش نہیں دیکھی تھی لیکن ایک پولیس والے نے بتایا تھا کہ اسے بہت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ اسے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کسی تیز دھار آلے سے کام لیا گیا تھا۔ اس کا پیٹ چاک کردیا گیا تھا اور گلا بھی ادھیڑ دیا گیا تھا لیکن..... سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا تھا۔ وہ تو بڑی اچھی لڑکی تھی۔ مسیحا تھی۔ دوسروں کے دکھ سمیٹتی تھی۔ اس نے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ سب لوگ اس سے خوش تھے۔ اسے دعائیں دیتے تھے پھر اس کی جھولی میں موت کس نے ڈال دی؟ اس کی تو کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ کیا اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ سچائی کا ساتھ دیا تھا؟

اور دھنو؟ مجھے اس کی باتوں پر بھی حیرت ہورہی تھی۔ ہماری شناسائی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی تو ہوئے تھے اور وہ میرے لیے اپنی جان تک دینے کو تیار ہوگئی تھی۔ پولیس والوں نے مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ پولیس والے اس سے میرے خلاف بیان لینا چاہتے تھے۔ میں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ میرے خلاف بیان دے کر اپنی جان چھڑا لے لیکن اس نے صاف انکار کردیا تھا۔ کتنا عزم تھا اس کے لہجے میں۔ وہ ظلم کے سامنے چٹان بن گئی تھی۔

آدھی رات کے قریب مجھے پھر تفتیشی کمرے میں لے جایا گیا۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ سر سے بہنے والا خون جم چکا تھا اور دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔

اس مرتبہ مارپیٹ کچھ کم اور پوچھ گچھ زیادہ ہوئی۔ پولیس والے مجھ پر دباؤ ڈالتے رہے کہ میں مایا متی کے قتل کا اعتراف کرلوں لیکن میں نے انکار کردیا۔ میں نے کوئی جرم کیا ہی نہیں تھا تو اس کا اعتراف کیسے کرلیتا۔

"تم لوگ غلط رخ پر تفتیش کررہے ہو۔" میں نے کہا "تشدد کے ذریعے مجھ سے اعتراف جرم کرانے کے بجائے تم لوگ کسی اور رخ پر کیوں نہیں سوچتے۔"

"مثلاً؟" پولیس آفیسر نے مجھے گھورا "تم ہی بتا دو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"مجھ پر یہ الزام غلط ہے کہ میں نے مکان پر قبضہ کرنے کے لیے مایا متی کو غائب کردیا تھا۔" میں نے کہا "سب لوگ جانتے ہیں کہ مایا متی میری دوست تھی اور میں کئی مہینوں سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔"

"ایسی باتیں دوستی کی آڑ میں ہی تو ہوتی ہیں۔" آفیسر نے کہا۔

"یہ غلط ہے۔" میں نے جواب دیا "میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں تو چند روز میں ہندوستان جانے والا تھا۔ تم لوگ انسپکٹر بریندرا کو اطلاع کیوں نہیں دیتے۔ میں نے ایسے لوگوں کے خلاف یہاں کے قانون کی مدد کی ہے جو اس ملک کے معصوم عوام کو منشیات کے سیلاب میں غرق کردینا چاہتے تھے۔ انسپکٹر بریندرا سب کچھ جانتا ہے۔ پولیس کے دوسرے اعلیٰ حکام بھی جانتے ہیں۔ تم انہیں اطلاع کیوں نہیں دیتے۔ میرے خلاف اس سازش میں انہی لوگوں کا ہاتھ ہوسکتا ہے جنہیں میری وجہ سے نقصان پہنچا ہے لیکن اب بھی اگر تم لوگوں نے انسپکٹر بریندرا یا دوسرے اعلیٰ حکام کو اطلاع نہ دی تو میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوجاؤں گا کہ تم لوگ بھی اس گھناؤنی سازش میں شریک ہو اور....."

میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی آفیسر کا گھونسا میرے جبڑے پر لگا۔ میں لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔ میرا دماغ جھنجنا گیا تھا۔ آفیسر میری طرف لپکا۔ میں پشت کے بل فرش پر پڑا ہوا تھا۔ وہ مجھے گریبان سے پکڑنے کے لیے جھکا تو میں نے لیٹے ہی لیٹے دونوں پیروں سے اس کے سینے پر زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ وہ چیختا ہوا پیچھے جا کر گرا۔

جو ہونا تھا' ہوچکا۔ ان پولیس والوں سے بھلائی کی توقع نہیں تھی۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں نے مزاحمت کا فیصلہ کرلیا تھا۔

اس وقت کمرے میں دو اور ہٹے کٹے کانسٹیبل بھی موجود تھے۔ میری یہ غیر متوقع حرکت دیکھ کر وہ دونوں میری طرف لپکے۔ میری حالت ایسی نہیں تھی کہ میں کسی بچے کا بھی مقابلہ کرسکتا لیکن اس وقت میرے اندر اچانک ہی ایک نئی طاقت ابھر آئی تھی۔

وہ دونوں کانسٹیبل جیسے ہی قریب پہنچے' میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ میری ڈبل کک نے ان دونوں کو ڈھیر کردیا۔ سامنے کھڑا ہوا آفیسر خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا بیلٹ اتار رہا تھا۔

میں یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ آن ڈیوٹی کسی باوردی پولیس والے پر ہاتھ اٹھانا سنگین جرم ہے لیکن میں بے گناہ تھا اور یہ پولیس والے تشدد کے ذریعے مجھ سے ایک ایسا جرم قبول کروانا چاہتے تھے جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ لوگ میری کوئی بات سننے کو بھی تیار نہیں تھے۔ انہوں نے

صرف مجھے ہی نہیں، دو بے گناہ عورتوں کو بھی تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ مجھے "تنگ آمد بجنگ آمد" ہونے پر مجبور کیا تھا۔

آفیسر نے بیلٹ کا ایک سرا اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا اور بکل والی طرف سے مجھ پر حملہ کیا۔ میں نے اس کا وار اپنے الٹے ہاتھ کی کلائی پر روکا۔ بکل دو بل کھا کر میری کلائی پر لپٹ گیا۔ میں نے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آفیسر ایک قدم آگے آیا تو میں نے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ وہ کراہ اٹھا۔ میں نے بیلٹ کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا اور اس کے ساتھ ہی اس مرتبہ اس کی بغل کے نیچے گھونسا رسید کردیا۔ وہ بلبلا اٹھا۔ بیلٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اب بیلٹ میرے قبضے میں تھا اور وہ تینوں میرے رحم و کرم پر۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کرکے اندر سے بولٹ چڑھا دیا اور ان تینوں کی دھنائی کرنے لگا۔

وہ تینوں چیخ رہے تھے۔ بیلٹ کے بکل نے ان تینوں کی کھال ادھیڑ دی تھی۔ آفیسر کے منہ سے بھی خون بہنے لگا تھا۔ مجھ پر سب سے زیادہ تشدد اسی نے کیا تھا۔

وہ تینوں فرش پر لوٹ لگاتے ہوئے میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہے تھے۔ رحم کی بھیک مانگ رہے تھے لیکن مجھ پر تو جنون طاری تھا۔ میرا ہاتھ نہیں رک رہا تھا۔

باہر شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے خیال میں تھانے کا سارا عملہ اس کمرے کے سامنے جمع ہوگیا تھا۔ پہلے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جاتا رہا پھر اسے توڑنے کی کوشش کی جانے لگی۔

دروازہ ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے آفیسر کو فرش سے اٹھا کر اپنا ہاتھ اس کی گردن پر لپیٹ دیا اور اسے ڈھال بنا کر اپنے آگے رکھ لیا اور دیوار سے پشت ٹکا کر کھڑا ہوگیا۔

دروازے کا پٹ ٹوٹ کر اندر کی طرف گرا۔ وہ کئی پولیس والے تھے۔ دو اندر گھس آئے۔ میں اسی وقت چیخ اٹھا۔

"رک جاؤ۔ آگے مت بڑھنا ورنہ اس کی گردن مروڑ دوں گا۔" پولیس والے رک گئے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ تھانے کا سارا عملہ اس کمرے کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ لوگ پھٹی پھٹی سی نظروں سے کمرے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دو پولیس والے فرش پر پڑے تھے اور ان کا آفیسر میرے شکنجے میں تھا۔

"انسپکٹر بریندرا کو فون پر اطلاع دو۔ اگر وہ آدھے گھنٹے میں یہاں نہیں پہنچا تو میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"تم اپنے جرم کو مزید سنگین بنا رہے۔۔۔"

"بند کرو بکواس۔" میں چیخا "انسپکٹر بریندرا کو فون رو اور میں اسے کوٹھری میں لے جا رہا ہوں جہاں دونوں عورتیں بند ہیں۔ اگر کسی نے کوئی حرکت کی تو اس کی گردن مروڑ دوں گا۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

تمام پولیس والے سامنے سے ہٹ گئے۔ میں آفیسر کو لے کر کمرے سے باہر آگیا اور اسے گھسیٹتا ہوا اس راہداری میں آگیا جس میں قیدیوں کی کوٹھریاں تھیں۔ آفیسر کے گلے پر میری گرفت کچھ زیادہ ہی مضبوط تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں اور اسے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آرہی تھی۔

تمام پولیس والے ہمارے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ دو تین نے تو رائفلیں تان رکھی تھیں۔ میں آفیسر کو الٹے قدموں گھسیٹتا ہوا دھنو اور شوبھا والی کوٹھری کے سامنے رک گیا۔ میرے کہنے پر ایک سنتری نے تالا کھول دیا۔ میں آفیسر کو لے کر اندر داخل ہوا اور دوسرے ہاتھ سے سلاخوں والا دروازہ بند کردیا۔ سنتری باہر سے تالا لگانے لگا تو میں چیخ اٹھا۔

"تالا مت لگاؤ۔ میں بھاگوں گا نہیں لیکن اگر آدھے گھنٹے تک تم لوگوں نے بریندرا اور دوسرے آفیسرز کو نہیں بلایا تو اس کی گردن مروڑ دوں گا۔"

دو پولیس والے رائفلیں تانے راہداری میں کھڑے رہے اور باقی وہاں سے ہٹ گئے۔ میں نے آفیسر کو دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا۔

شوبھا اب بھی بے سدھ پڑی تھی۔ دھنو یہ سب کچھ دیکھ کر وحشت زدہ سی ہوگئی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں اس کا کندھا تھپتھپاتا ہوا شوبھا کے قریب بیٹھ گیا۔

"میں تم دونوں سے شرمندہ ہوں۔" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری وجہ سے تم لوگوں کو یہ تشدد برداشت کرنا پڑا۔ اگر تم لوگ شروع ہی میں۔۔۔"

"آگے ایک لفظ مت بولنا ہمت سنگھ۔" شوبھا نے میری بات کاٹ دی "یہ سب کچھ ہم نے صرف تمہارے لیے نہیں، سچائی کی لاج رکھنے کے لیے برداشت کیا ہے۔ ہماری جان بھی چلی جائے تو ہمیں پروا نہیں ہوگی۔"

"کاش! دوسرے لوگ بھی اس انداز میں سوچ سکیں۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا اور پولیس آفیسر کی طرف دیکھنے لگا جو ایک طرف پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔

میں دھنو اور شوبھا سے باتیں کررہا تھا کہ آفیسر نے ازے کی طرف چھلانگ لگا دی۔ میں نے دروازے کو ے بولٹ لگا دیا تھا۔ آفیسر کا ایک ہاتھ دروازے کی تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ بولٹ کھینچنے کی کوشش تھا کہ میں اپنی جگہ سے اچھل کر اس کے اوپر جا گرا اور ے سر پر گھونسے مارنے لگا۔ یہ آفیسر اس وقت ہم تینوں زندگیوں کی ضمانت تھا۔ اگر یہ ہمارے ہاتھ سے نکل جاتا تو س والے بھوکے بھیڑیوں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑتے۔۔۔اور ہمیں زندہ نہیں چھوڑتے۔"

راہداری میں کھڑے ہوئے پولیس والے بھی دوڑ کر وازے کے قریب پہنچ گئے۔ ایک نے میری طرف رائفل تانلی۔

"چھوڑ دو اسے ورنہ گولی مار دوں گا۔" وہ چیخا۔

"تمہاری گولی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی البتہ ہمارے آفیسر کے جسم میں سوراخ ہوجائے گا۔" میں نے چیخ کر جواب دیا "پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تمہارے گولی چلانے سے پہلے ہی اس کی گردن مروڑ دوں گا۔"

پولیس والے نے رائفل نیچی کرلی۔ آفیسر نے اب دونوں ہاتھوں سے دروازے کی سلاخوں کو پکڑ لیا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی گردن پر لپیٹے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ایک بغل کے نیچے گھونسے مارنے لگا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا دروازے سے دور لے گیا اور فرش پر پٹخ دیا۔ دھنو نے لپک کر اس کے سر کے بال پکڑ لیے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔

"یہی ہے۔" وہ چیخی "اس بدمعاش نے مجھے مارا تھا۔" میں نے دھنو کو پکڑ کر الگ کردیا۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس پر جنون طاری ہوگیا تو آفیسر کو اس سے بچانا مشکل ہوجائے گا۔

اس دوران میں ایک سب انسپکٹر بھی دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔

"تم لوگ اپنے حق میں بہت برا کررہے ہو۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "بہتر ہے کہ ہمارے آفیسر کو چھوڑ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم لوگوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے گا۔"

"میں نے تم لوگوں کو آدھے گھنٹے کا وقت دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر انسپکٹر بریندرا اور دوسرے اعلیٰ پولیس آفیسرز یہاں نہیں پہنچے تو تمہارے اس آفیسر کے جیون کا انت (زندگی کا اختتام) ہوجائے گا۔"

"انسپکٹر بریندرا ہیڈ کوارٹر میں نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر پر بھی نہیں ہے۔ ہم اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس تک ہمارا پیغام پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"کوشش کرو کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس سے رابطہ ہوجائے۔" میں نے کہا۔

سب انسپکٹر واپس چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ سب انسپکٹر ہر آدھے گھنٹے بعد ہمیں صورت حال سے آگاہ کررہا تھا کہ ابھی تک انسپکٹر بریندرا سے رابطہ نہیں ہوسکا۔

اور پھر تین بجے کے قریب انسپکٹر بریندرا دو اور آفیسرز کے ساتھ دروازے کے سامنے نمودار ہوا۔ وہ تینوں اندر آگئے۔ ہماری حالت دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ مجھے نہیں معلوم، پولیس والوں نے انہیں کیا بتایا ہوگا لیکن میری کہانی بہرحال ان سے مختلف تھی۔

اسی دوران میں تھانے میں کھلبلی سی مچ گئی۔ پولیس کمشنر اور چند اور اعلیٰ افسران بھی پہنچ گئے تھے۔

اب صورت حال بالکل پلٹ گئی تھی۔ میں نے پچھلے تین چار مہینوں کے دوران میں چند خطرناک مجرموں کی بیخ کنی کرکے حکومت پر احسان کیا تھا اور اعلیٰ حکام کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ میرے احسانات کا بدلہ اس طرح چکایا جائے۔

ہمیں تین دن تک غیر قانونی طور پر حراست میں رکھ کر تشدد کیا گیا تھا۔ ہمارے خلاف ابھی تک کوئی رپورٹ بھی درج نہیں ہوئی تھی۔ رپورٹ درج ہونے کی صورت میں بھی قانونی طور پر مجھے رات اس تھانے میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

آفیسر سمیت کئی اہلکاروں کو معطل کرکے، ہم پر تشدد کے الزام میں حراست میں لے لیا گیا تھا۔ ہمارے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ہم تینوں کو بھی پولیس کی نگرانی میں اسپتال بھیج دیا گیا۔

اس وقت صبح ہونے والی تھی۔ مجھے دھنو اور شوبھا سے الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ میرے زخموں کی مرہم پٹی کے بعد مجھے ایک انجکشن بھی لگا دیا گیا تھا۔

اس وقت مجھ پر غنودگی سی طاری تھی۔ میرے بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی نرس اٹھ کر کھڑکی کے سامنے چلی گئی۔ اس نے کھڑکی پر پڑا ہوا ہرے رنگ کا دبیز پردہ ایک طرف سرکا دیا۔ تازہ ہوا کا جھونکا کمرے میں در آیا۔

نرس کچھ دیر کھڑکی کے سامنے کھڑی باہر دیکھتی رہی پھر

مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی صورت دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ نرس نہیں.... نیلگری تھی۔ اس کا باریک لباس ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر لگتا تھ جیسے وہ برسوں کی بیمار ہو۔

"مجھے افسوس ہے وجدان۔" وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی "تم پر اتنے کشٹ (تشدد) ہوئے اور میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکی۔"

"تمہیں کیا ہوا نیلگری؟" میں نے اس کی معذرت کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا "تمہارا چہرہ کیوں دھندلایا ہوا ہے۔ بیمار لگ رہی ہو!"

"ہاں۔" اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "گوتم بھوش نے جاپ شروع کر رکھا ہے۔ اس نے میرے گرد حصار قائم کردیا تھا تاکہ میں تمہاری مدد کے لیے نہ آسکوں۔ اس کی توجہ ہٹتے ہی مجھے موقع مل گیا اور میں حصار توڑ کر نکل آئی لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں گوتم بھوش کا جاپ توڑنا ہوگا۔"

"کیا تم سے بڑی شکتی (قوت) بھی کوئی ہے جو تمہیں حصار میں پابند کرسکے؟" میں نے پوچھا۔

"اس دنیا میں بڑی پراسرار قوتیں ہیں۔" نیلگری بولی "میں سب سے بڑی شکتی ہوں لیکن بعض قوتیں ایسی ہیں جو میرے لیے کچھ مشکلات پیدا کرسکتی ہیں اور گوتم بھوش ان قوتوں سے مجھے الجھا کر اپنا وہ جاپ پورا کرنا چاہتا ہے جس سے وہ مجھے اپنے قبضے میں کرلے گا۔ تمہیں اس کو جاپ مکمل کرنے سے روکنا ہوگا۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نیلگری کے ایک غار میں جہاں بُدھا کی ایک قدیم اور ویران عبادت گاہ ہے اور سنو۔" وہ بات کرتے کرتے رک گئی۔ اس کی نہ صرف آواز دھیمی ہو رہی تھی بلکہ چہرہ مزید دھندلا رہا تھا "تمہارے خلاف یہ سازش بھی اسی نے کی ہے۔ وہ اپنی قوتوں سے کام لے رہا ہے۔ مایا متی کا باپ بھی اس سازش میں شریک ہے۔ تم نے تھانے میں اپنے اندر کی شکتی سے کام لے کر صورت حال وقتی طور پر بدل دی ہے لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔ دھرپندر فرار ہوگیا تو تم پھر جال میں پھنس جاؤ گے۔"

"اس صورت حال سے میں نمٹ لوں گا۔" میں نے کہا "مجھے یہ بتاؤ' نیلگری میں بُدھا کی وہ عبادت گاہ کہاں ہے؟"

"وہ.... وہ...." نیلگری کی آواز کچھ اور دب گئی۔ اس کا چہرہ بالکل دھندلا گیا تھا "میں جا رہی ہوں۔ پھچھ.... پھر آؤں گی۔ تم اپنے اندر کی شکتی سے کام...."

نیلگری کی آواز بھی اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی نہایت دبیز دھند میں چھپ گیا تھا۔ وہ میرے اوپر جھک گئی۔ مجھے اپنی پیشانی پر اس کے تپتے ہوئے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا تو میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ میں جیسے اچانک ہی نیند سے جاگا تھا۔ وہ نرس میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت تھے۔ مجھے حرکت کرتے پا کر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوگئی۔ وہ خجل سی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے۔

"تت.... تم۔" میرے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا "وہ.... وہ کہاں گئی؟"

"کون؟" نرس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا "یہاں تو اور کوئی نہیں ہے۔ میں اکیلی ہوں اور مجھے افسوس ہے۔ مم.... میں.... میں دراصل...."

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے مزید شرمندگی سے بچالیا "مجھے پانی پلاؤ۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔"

نرس لپک کر پانی لے آئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میرا حلق واقعی خشک ہو رہا تھا جیسے اُس میں ریت بھر دی گئی ہو۔ میں ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا۔

نرس نے مجھے دوبارہ لٹا دیا اور بیڈ کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے مجھے بہت شدت سے نیند آ رہی تھی لیکن اب نیند غائب ہوگئی تھی۔ اس نرس کا نام میناکشی تھا اور وہ ہندو تھی۔ اسپتال میں مایا متی کے قتل کی خبر اسی روز پہنچ گئی تھی۔ مایا متی بہت اچھی لڑکی تھی۔ اسپتال کے تمام لوگوں سے اس کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ سب کو اس کی موت کا دکھ ہوا تھا۔

"سنا ہے مایا متی کے قتل میں تمہارا نام لیا جا رہا ہے۔" میناکشی کہہ رہی تھی "لیکن اسپتال والوں میں سے کسی کو بھی اس بات کا یقین نہیں آ رہا۔"

"مایا متی میری بہت اچھی دوست تھی۔" میں نے جواب دیا "اس کے قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔ قاتل جو کوئی بھی ہے' جلد ہی پکڑا جائے گا اور ہاں۔ کیا تم پولیس ہیڈ کوارٹر میں انسپکٹر بریندرا سے رابطہ کرسکتی ہو۔ اس سے کہنا میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایمرجنسی ہے۔"

میناکشی نے گھڑی دیکھی۔ سات بج رہے تھے۔ "میں ابھی فون پر اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔

اس کی واپسی تقریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ بریندرا سے اس کے گھر پر رابطہ ہوا ہے اور اسے پیغام دے دیا گیا ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔

آٹھ بجے میناکشی کی ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ وہ دوسری نرس کو چارج دے کر چلی گئی۔

انسپکٹر بریندرا ساڑھے نو بجے کے قریب کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میرے بیڈ کے قریب کھڑا میری خیریت دریافت کرتا رہا پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے تمہارا پیغام ملا تھا۔ کوئی خاص بات؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اسے دھرپندر کے بارے میں بتا دیا۔ "مجھے شبہ ہے کہ اس سازش میں اس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔"

"اس شک کی وجہ؟" اس نے پوچھا۔

"بہت سی وجوہات ہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن کیا بہتر نہیں ہوگا کہ اسے بھی شامل تفتیش کرلیا جائے۔ ہمارے سامنے بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ پولیس کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے...."

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" اس نے کہا "یہ کیس ایک اور آفیسر کو دے دیا گیا ہے۔ میں ابھی دفتر جا کر اس سے رابطہ کروں گا۔ ویسے تم اطمینان رکھو۔ مجھے یقین ہے تم بے گناہ ہو۔ سچائی ایک ایسی قوت ہے جو تمہاری بے گناہی پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

انسپکٹر بریندرا کے جانے کے بعد میں دیر تک دھرپندر کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ مایا متی کا باپ تھا اور نیلگری نے بتایا تھا کہ وہ بھی میرے خلاف اس سازش میں شریک تھا۔ تو کیا مایا متی کو دھرپندر نے قتل کیا تھا یا اس قتل میں اس کا ہاتھ تھا؟ کیا ایک باپ اپنی بیٹی کو قتل کروا سکتا ہے؟ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے' دھرپندر پر شبہ نیلگری نے ظاہر کیا تھا اور نیلگری غلط نہیں ہوسکتی تھی۔

نیلگری کی بعض باتوں نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ وہ خود ایک شکتی تھی لیکن اس کے کہنے کے مطابق گوتم بھوش نے اسے کسی پراسرار حصار میں قید کر رکھا تھا۔ گوتم بھوش نے کوئی ایسا جاپ شروع کردیا تھا جس کی کامیابی سے وہ نیلگری پر قابض ہوسکتا تھا۔ نیلگری پریشان تھی۔ وہ کسی ایسے شخص کے قبضے میں نہیں جانا چاہتی تھی جو اس کے ذریعے دنیا کو تباہی کی طرف دھکیل دے۔ وہ میرے ذریعے گوتم بھوش کو اس جاپ سے روکنا چاہتی تھی۔ گوتم بھوش نیلگری کے برف پوش پہاڑوں میں واقع بدھا کی کسی قدیم عبادت گاہ میں تھا اور اس عبادت گاہ کا پتا بتانے سے پہلے ہی نیلگری کی آواز بند ہوگئی تھی اور اس کا چہرہ دبیز دھند میں چھپ گیا تھا اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

میں جیسے جیسے سوچتا رہا' میری بے چینی بڑھتی گئی۔ مجھے نیلگری جیسی شکتی کو اپنے قبضے میں کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن اسے گوتم بھوش جیسے شخص کے قبضے میں جانے سے روکنا بھی بہت ضروری تھا۔ گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کے بارے میں' میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ یہ دونوں نہایت گندی فطرت کے مالک تھے اور میں جانتا تھا کہ اگر نیلگری جیسی شکتی ان کے قبضے میں چلی گئی تو یہ واقعی دنیا کو تباہی کے دہانے میں دھکیل دیں گے لیکن گوتم بھوش کو جاپ سے کیسے روکا جائے؟ یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ عبادت گاہ کہاں ہے جہاں گوتم بھوش چھپا بیٹھا ہے؟

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا لیکن بالآخر نیند نے مجھے دبوچ ہی لیا۔

جب میں جاگا تو سہ پہر ہوچکی تھی۔ کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ نرس نے میرا منہ ہاتھ دھلا کر مجھے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور میرے لیے چائے لے آئی۔ چائے کے ساتھ سینڈوچ بھی تھے۔ اس نے پہلے مجھے سینڈوچ کھلائے اور پھر اپنے ہاتھ سے چائے پلانے لگی۔

"دھنو اور شوبھا کیسی ہیں؟" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ان کے بارے میں پریشان مت ہو۔" نرس نے جواب دیا "ان کی بہت اچھی دیکھ بھال ہو رہی ہے اور وہ بھی دو چار روز میں اچھی ہوجائیں گی۔"

چائے پینے کے تھوڑی ہی دیر بعد میں پھر سو گیا۔ اس مرتبہ آنکھ کھلی تو رات کے نو بج چکے تھے۔ صبح والی نرس جا چکی تھی اور اس کی جگہ میناکشی نے لے لی تھی۔

"انسپکٹر بریندرا تو نہیں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے صبح اسے تمہارا پیغام تو دے دیا تھا۔ اس نے کہا تھا' ایک گھنٹے تک آجائے گا۔ کیا وہ ابھی تک نہیں آیا؟" میناکشی بولی۔

"میں صبح کی نہیں۔ اب کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے

کہا۔

"اوہ!" میناکشی گہرا سانس لیتے ہوئے بولی "میرے ہوتے ہوئے تو وہ ابھی تک نہیں آیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تمہارے لیے کھانا آگیا ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے کھلا دوں تمہیں؟"

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میناکشی نے مجھے سہارا دے کر بٹھا دیا اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھلانے لگی۔ اس دوران میں انسپکٹر بریندرا بھی آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آفیسر بھی تھا۔

"تمہارا شبہ درست نکلا۔" بریندرا نے بیڈ کے قریب رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہ انسپکٹر رگھوناتھ ہے۔ اس کیس کا انچارج۔"

"تم کس شک کی بات کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں دھرپندر کی بات کر رہا ہوں۔" انسپکٹر بریندرا نے جواب دیا۔ "دھرپندر کو آج دوپہر کے وقت حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا "کیا مایامتی کو اسی نے قتل کیا ہے؟"

"نہیں۔" بریندرا نے نفی میں سر ہلا دیا "وہ قاتل نہیں ہے لیکن تمہارے خلاف جو سازش کی گئی تھی اس میں وہ بھی شریک تھا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر تفصیل سے بتانے لگا۔

بریندرا کے کہنے کے مطابق' یہ سازش دراصل ناگ پال کی تھی۔ میری وجہ سے اس کے سارے منصوبے خاک میں مل گئے تھے۔ اس کے کئی آدمی مارے گئے تھے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے کھٹمنڈو پر اس کا راج تھا۔ وہ یہاں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے ایک اشارے پر پورا شہر بند ہو جاتا تھا۔ اعلیٰ ترین پولیس آفیسر' دیگر سرکاری عہدے دار اور منتری (وزیر) بھی اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہوتے تھے لیکن میرے آنے کے بعد اس کا راج پاٹ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ سب سے زیادہ مطلوب مجرم تھا اور اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا تھا لیکن اسے کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی۔ ایسی صورت میں وہ مجھے کس طرح معاف کر سکتا تھا۔

بار بار کی کوشش کے باوجود وہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم میرے ساتھیوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع اس نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا تھا۔

ناگ پال جانتا تھا کہ مایامتی سے میری دوستی ہو چکی ہے۔ اس نے مجھے پھنسانے کے لیے یہ سازش تیار کی۔

مایامتی ہی کے گاؤں کے ایک آدمی کو کچھ رقم کا لالچ دے کر مایامتی کے پاس بھیج دیا اور اس کے باپ کے مرنے اور اس کی ماں کے زخمی ہونے کی اطلاع دی۔ دوسری طرف کسی بہانے سے اس کے باپ کو بھی کھٹمنڈو کی طرف روانہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

ناگ پال کے آدمی کھٹمنڈو سے ساٹھ کلومیٹر دور ڈولو گھاٹ نامی قصبے میں موجود تھے۔ انہوں نے پہلے مایامتی کو یہ کہہ کر بس سے اتار لیا کہ اسے باپ کے مرنے کی جھوٹی اطلاع دی گئی ہے۔ اس کا باپ زندہ ہے اور اس وقت ڈولو گھاٹ میں موجود ہے۔

مایامتی کو بس سے اتار کر قصبے کے باہر ایک ویران عمارت میں لے جایا گیا جہاں ناگ پال کے آدمی اس کی عزت پر حملے کرتے رہے اور جب مایامتی کا باپ اپنے گاؤں سے کھٹمنڈو جاتے ہوئے ڈولو گھاٹ پہنچا تو اسے بھی بس سے اتار کر اس ویران عمارت میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے چند آدمی اور بھی تھے۔ ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا اور دھرپندر کو اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں اس کی بیٹی تھی۔

دھرپندر کو الگ لے جا کر منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے یہ بھی دھمکی دی گئی کہ اب تک تو اس کی بیٹی کی عزت ہی گئی ہے۔ انکار کی صورت میں اسے بیٹی کی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

بیٹی کو بچانے کے لیے دھرپندر ان کے منصوبے پر عمل کرنے کو تیار ہو گیا اور اسے اس کے ساتھیوں سمیت رات تین بجے کے قریب کھٹمنڈو پہنچا دیا گیا اور دھرپندر نے مجھ پر الزام لگا کر مجھے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

تھانے کے انچارج کی جیب بھی گرم کر دی گئی تھی۔ اس نے میری بات پر کان ہی نہیں دھرے اور مجھ پر تشدد شروع کر دیا گیا۔

اگلے روز ڈولو گھاٹ سے مایامتی کی لاش ملی۔ دھرپندر نے اسپتال میں لاش شناخت کرلی۔ اس وقت ناگ پال کے دو آدمی بھی اسپتال میں موجود تھے۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر حقیقت دھرپندر کی زبان پر آئی تو نہ صرف اسے بلکہ گاؤں میں اس کی بیوی کو بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دھرپندر اپنی اور بیوی کی جان کے خوف سے خاموش رہا اور مجھ پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا۔ پولیس آفیسر دھنو' شوبھا اور مجھ سے اعتراف جرم کروانا چاہتا تھا لیکن ہم تینوں تشدد برداشت کرتے رہے اور جھوٹا الزام قبول نہیں کیا۔

آج دوپہر دھرپندر کو حراست میں لیا گیا۔ دو چار ہاتھ پڑتے ہی اس نے ساری کہانی پولیس کو سنا دی۔ ناگ پال کے ایک آدمی کو بھی حراست میں لیا گیا تھا جو دھرپندر کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے بھی سب کچھ اگل دیا۔ اس کے بیان کے مطابق اس رات مایامتی نے ناگ پال کے آدمیوں کی حراست سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی جس پر اسے بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار کر لاش ویرانے میں پھینک دی گئی اور لاش دریافت ہونے کے بعد مجھ پر قتل کا الزام عائد کر دیا گیا۔

دھرپندر اور ناگ پال کے آدمی کی گرفتاری اور ان کے بیانات سے میری پوزیشن واضح ہو گئی تھی اور اس کے لیے میں دھرپندر اور ناگ پال کے آدمی کا نہیں بلکہ نیلگری کا شکر گزار تھا جس نے آج صبح سویرے مجھے دھرپندر کے بارے میں خبردار کیا تھا۔ بہرحال' مجھے مایامتی کی موت کا بہت افسوس اور دکھ تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

اس مرتبہ مجھے تین چار روز سے زیادہ اسپتال میں نہیں رہنا پڑا۔ دھنو اور شوبھا بھی سنبھل چکی تھیں۔ ہم تینوں کو ایک ہی روز اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ انسپکٹر بریندرا ہمیں [illegible] کوٹ کے اس مکان میں لے آیا جہاں شروع میں مجھے اور بملا کو لایا گیا تھا۔ اس وقت اس مکان میں انسپکٹر بریندرا کی دوست رہا کرتی تھی۔ اس نے میری اور بملا کی بہت خدمت کی تھی اور ایک رات جب دلیش مکھ اور اس کے آدمیوں نے اس مکان پر حملہ کیا تھا تو وہ بے چاری ماری گئی تھی۔

یہاں ہمیں ایک ادھیڑ عمر نیپالی خادمہ بھی دی گئی تھی اور پولیس کے دو سادہ پوش بھی مستقل طور پر تعینات کر دیے گئے تھے۔

دھنو کو میں نے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ بدھ نیل کنڈ مندر میں چلی جائے۔ وہاں بھکشو اور اس کے بیوی بچے اس کا خیال رکھیں گے مگر دھنو کسی طرح میرا ساتھ چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئی۔

یہاں میں زیادہ تر نیلگری اور گوتم بھوش کے بارے میں سوچتا رہتا۔ گوتم بھوش نیلگری کی برف پوش چوٹیوں میں کسی جپ تپ میں مصروف تھا اور نیلگری شاید پھر کسی حصار میں قید ہو گئی تھی۔ پچھلی ملاقات پر میں اس سے بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ کا پتا نہیں پوچھ سکا تھا یا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ بتا نہیں سکی تھی۔ اس عبادت گاہ کا پتا معلوم ہونا بہت ضروری تھا۔

اس روز نیلگری نے ایک بار پھر مجھے اپنے اندر کی شکتی یاد دلائی تھی۔ ہو سکتا ہے' گوتم بھوش کا چیلا پنڈت دھیراج میرے خلاف اب بھی سرگرم عمل ہو مگر میرے اندر کی وہ شکتی مجھے اس کے شر سے بچائے ہوئے تھی۔

میں نے رشی کیش میں شروع کیا جانے والا اپنا مارِ آتشیں (یوگا کی ایک کٹھن اور خطرناک مشق) کا ریاض مکمل نہیں کیا تھا اور سچے دل اور کھری نیت سے جو تھوڑی بہت ریاضت کی تھی اس سے نیلگری میری طرف ملتفت ہوئی تھی۔ اب مجھے فرصت تھی اس لیے میں نے وہ ریاض جاری رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

دن میں مجھے جب بھی موقع ملتا' میں تھوڑی بہت مشق کرلیتا' تاہم آدھی رات کے بعد دھنو اور شوبھا سو جاتیں تو میں مکان کی چھت پر چلا جاتا۔ یہاں میں نے ایک کونے میں جگہ منتخب کرلی تھی۔ میں صبح کی روشنی پھیلنے تک یہاں مخصوص آسن بنائے اپنی ریاضت میں مشغول رہتا۔ پہلے ایک دو روز تو مجھے اس طرح بیٹھنے میں تکلیف ہوئی کیونکہ میں نے بہت عرصے بعد یہ مشق شروع کی تھی لیکن پھر تکلیف کا وہ احساس بھی جاتا رہا۔

چند روز بعد ہی میں اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ میں آنکھیں بند کیے اپنی مشق پر بیٹھا تھا' اچانک یوں لگا جیسے آنکھوں کے سامنے روشنی کا کوندا سا لپک گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ رات بے حد تاریک تھی تاہم آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دے رہے تھے۔ میری نظریں سامنے بہت دور پہاڑ کی برف پوش چوٹی پر مرکوز تھیں۔ اچانک سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا پہاڑی چوٹی کے عقب سے نمودار ہوا اور بتدریج پھیلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس ابر پارے کے اندر بجلی کے کوندے سے لپک رہے تھے۔

سیاہ بادل کا وہ ٹکڑا پھیلتا جا رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا جیسے بارش اور آندھی کا بہت زبردست طوفان آنے والا ہے۔ طوفان کے آثار اگرچہ نمایاں تھے لیکن میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ میں یہاں سے اٹھ کر نیچے چلا جاؤں۔

سیاہ بادل کا وہ ٹکڑا مزید پھیل گیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ایک ٹکڑے کے سوا آسمان پر کہیں اور کوئی بادل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اچانک اس مہیب سیاہ بادل کے عقب میں ایک اور چیز

دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ روئی کے گالے کی طرح سفید بادل کا ایک ٹکڑا تھا۔ سفید بادل کا یہ ٹکڑا بھی برف پوش چوٹی کے عقب سے برآمد ہوا تھا اور اس کا حجم چند فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔

میں اس سفید ابر پارے کو دیکھتا رہا۔ نجانے مجھے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ سفید بادل کا وہ ٹکڑا آگے آنا چاہتا تھا مگر سیاہ بادل نے اسے روک رکھا تھا۔

سفید بادل کا وہ ٹکڑا اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ میں اس وقت اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ میرے اندر کوئی انجانا سا احساس کروٹیں لے رہا تھا۔

اچانک فضا گھن گرج کی آواز سے گونج اٹھی۔ سیاہ بادل سمندر میں اٹھنے والی مہیب لہروں کی طرح پلٹ پلٹ کر سفید بادل کے ٹکڑے کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ سفید ابر پارہ بجلی کے کوندوں کی طرح لپک لپک کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

عجیب صورت حال تھی۔ لگتا تھا جیسے آسمان پر دو مہیب قوتوں میں جنگ چھڑ گئی ہو۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گھن گرج دہشت سی طاری کر رہی تھی۔ مجھے نجانے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ یہ بادل آپس میں نہیں ٹکرا رہے بلکہ نیکی اور بدی کی قوتیں آپس میں متصادم ہو رہی ہیں۔ میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ سیاہ رنگ کا مہیب بادل بدی کی علامت تھا اور چھوٹا سا سفید ابر پارہ نیکی کا مظہر تھا۔ نیکی اور بدی کی ان دونوں قوتوں میں' آسمان کی وسعتوں پر زبردست جنگ ہو رہی تھی۔ وہ سفید ابر پارہ حجم میں اگرچہ سیاہ بادل سے بہت چھوٹا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس جنگ میں فتح بالآخر اسی کی ہوگی۔ نیکی چاہے کتنی بھی چھوٹی ہو' بدی کی بڑی سے بڑی قوت پر حاوی ہو جاتی ہے۔

ان دونوں قوتوں کی جنگ بڑی خوفناک صورت اختیار کر گئی تھی۔ وسیع آسمان میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ گھن گرج اور بجلی کے کڑاکوں سے فضا دہل رہی تھی۔ وہ چھوٹا سا سفید ابر پارہ پلٹ پلٹ کر حملے کر رہا تھا۔ وہ ایک طرف سے حملہ آور ہوتا اور سیاہ بادل میں سوراخ کرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا۔

مہیب سیاہ بادل ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگا۔ وہ بکھر رہا تھا لیکن کچھ دیر بعد ہی وہ بکھرے ہوئے ٹکڑے دوبارہ متحد ہونے لگے۔ اس وقت وہ میرے سر کے عین اوپر تھے اور میں پورے انہماک سے یہ جنگ دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے سیاہ بادل کو برف پوش چوٹی سے بلند ہوتے دیکھ کر میرے ذہن میں طوفان کا جو خیال ابھرا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ تیز ہوا کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جس میں بتدریج شدت آتی گئی۔

باد و باراں کے اس خوفناک طوفان نے کائنات کو لپیٹ میں لے لیا تھا۔ در و دیوار دہل کر رہ گئے۔ ہر چیز خس و خاشاک کی طرح اڑتی ہوئی نظر آنے لگی۔ بڑے بڑے درخت جڑوں سے اکھڑ کر کاغذ کے پرزوں کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ ہوا کے طوفانی جھکڑ مجھے دھکیل رہے تھے لیکن میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں ہلا۔ لگتا تھا مجھے چھت کے ساتھ پلستر سے جوڑ دیا گیا ہو یا کسی غیبی قوت نے مجھے روک رکھا ہو اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے اوپر پانی کا ایک چھینٹا تک نہیں پڑا تھا حالانکہ میرے چاروں طرف پانی کی بوچھاریں گر رہی تھیں اور چھت پر پانی کے ریلے بہہ رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ سفید بادل کا وہ ٹکڑا سیاہ بادلوں میں اس طرح گھرا ہوا تھا جیسے کوئی چھوٹی سی ناؤ سمندر کی طوفانی لہروں میں پھنس گئی ہو۔ سیاہ بادلوں سے اٹھنے والی اونچی لہریں اسے بار بار ڈھانپ رہی تھیں۔

میرے منہ سے بے اختیار "اللہ ہُو" کا نعرہ بلند ہوا۔ یہ آواز بجلی کے کڑاکے کی طرح آسمان کی وسعتوں پر چاروں طرف پھیلتی چلی گئی۔ سفید ابر پارہ بھی جیسے سنبھل گیا۔ اب وہ لپک لپک کر اپنے حریف (سیاہ بادل) پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

طوفان کا زور ٹوٹ گیا۔ ہوا کے جھکڑوں کی شدت میں بتدریج کمی آتی گئی اور موسلا دھار بارش بھی اچانک ہی رک گئی۔ سیاہ بادل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرنے لگا اور چند منٹ بعد ہی اس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ آسمان کی وسعتوں پر ستارے چمکتے ہوئے نظر آنے لگے اور روئی کے گالوں کی طرح وہ چھوٹا سا سفید ابر پارہ ہوا کے جھونکوں پر تیر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر فتح مندی کا احساس ہوتا تھا۔ میرے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے میں چونک گیا۔ سفید بادل کا وہ ٹکڑا ایک انسانی ہیولے کی صورت اختیار کر گیا۔ آسمان پر چاند نہیں تھا لیکن لگتا تھا' دودھیا چاندنی نے انسانی پیکر کا روپ دھار لیا ہو۔

وہ ہیولا تیرتا ہوا میری طرف آنے لگا اور پھر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رک گیا۔ میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ واضح

[ہو گئی۔] وہ ہیولا اگرچہ واضح نہیں تھا۔ چہرے کے نقش نظر [نہیں آ] رہے تھے لیکن میں سمجھ گیا کہ وہ نیلگری تھی۔

میں چھت کے کونے پر اس جگہ بیٹھا تھا جہاں دو طرف [کی] منڈیر آپس میں ملتی تھی اس طرح وہاں ایک تکون بن گئی [تھی] اور نیلگری منڈیر کی دوسری طرف ہوا میں معلق کھڑی [تھی]۔

"وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے۔" کانوں میں رس گھولتی [ہوئی] ایک سرگوشیانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اس [سے] پہلے کہ وہ تمہیں اپنی قوتوں سے مفلوج کر کے مجھ تک پہنچ [جائے]' تم اسے آگے بڑھنے سے روک دو۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے ہیولے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نیلگری کی شمالی چوٹی اور تلکو جھیل کے درمیان پہاڑوں میں بُدھا کی گومپو عبادت گاہ ہے۔" نیلگری نے جواب دیا "اس عبادت گاہ تک پہنچنے کا راستہ بہت کٹھن اور خطرناک ہے۔ اس نے اس جگہ کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ کوئی دوسرا وہاں تک نہ پہنچ سکے لیکن تمہارے پاس شکتی ہے۔ تم وہاں پہنچ سکتے ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "اسے جاپ پر بیٹھے ہوئے چودہ دن ہو چکے ہیں۔ چھبیس روز باقی رہ گئے ہیں۔ تمہیں اس کا جاپ مکمل ہونے سے پہلے پہلے اسے عبادت گاہ سے نکالنا ہوگا۔ اگر اس کا جاپ مکمل ہو گیا تو۔۔۔"

"میں سمجھ رہا ہوں نیلگری۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "اطمینان رکھو۔ میں تمہیں کسی ایسے شخص کی قید میں نہیں جانے دوں گا جو تمہیں مہرہ بنا کر دنیا پر تباہی نازل کرنا چاہتا ہو۔"

"تمہیں جلد ہی کچھ کرنا ہوگا۔" نیلگری بولی "جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے ہیں' میرے گرد حصار مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ آج بھی میں بڑی مشکل سے حصار توڑ کر یہاں آئی ہوں۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ تم نے بھی اپنا جاپ شروع کر دیا ہے۔ وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے۔ اگر تم پر اس بارش کا ایک چھینٹا بھی پڑ جاتا تو تمہارا شریر (جسم) بھسم ہو جاتا۔ تمہیں اپنی حفاظت بھی کرنی ہوگی۔ وہ تمہیں روکنے کے لیے حملے کرتا رہے گا۔" اب میں جا رہی ہوں۔ تمہیں بھی جلد سے جلد یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔"

نیلگری کا چاندنی میں ڈھلا ہوا ہیولا آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہونے لگا۔ میں اسے دور ہٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دور' بہت دور پہاڑ کی برف پوش چوٹی پر پہنچ کر وہ ہیولا میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔ جیسے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہلایا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے آس پاس کوئی نہیں تھا اور پھر اچانک میں چونک گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو میں نے ایک بہت زبردست طوفان دیکھا تھا۔ موسلا دھار بارش اور طوفانی ہوا کے جھکڑ۔ درخت جڑوں سے اکھڑ کر ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھے تھے لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

دن کا مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ نہ کوئی درخت جڑ سے اکھڑا تھا اور نہ ہی کہیں سیلابی پانی نظر آ رہا تھا۔

میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ وہ سب کچھ جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آسمان پر بادلوں میں وہ جھڑپ طوفان باد و باراں اور نیلگری کا ہیولا اور پھر مجھے نیلگری کی باتیں یاد آ گئیں۔ گوتم بھوش اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے مجھے میری ریاضت سے روکنا چاہتا تھا۔ نیلگری میری مدد کو پہنچ گئی تھی اور میرے اندر کی شکتی بھی کام آئی تھی۔ آسمان پر ہونے والی دو پراسرار قوتوں کی خوفناک جنگ اور وہ طوفان میرے لیے تھا۔ دنیا والوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

نیلگری نے مجھے پیغام دے دیا تھا۔ گوتم بھوش کو جاپ پر بیٹھے ہوئے چودہ دن ہو چکے تھے۔ صرف چھبیس دن باقی رہ گئے تھے۔ جاپ مکمل ہونے سے پہلے پہلے اسے اس قدیم عبادت گاہ سے باہر نکالنا تھا۔ اس کا جاپ مکمل ہو جانے کی صورت میں نیلگری اس کے قبضے میں چلی جاتی۔ اس وقت نیلگری نیکی اور بھلائی کی علامت تھی لیکن گوتم بھوش کے قبضے میں جانے کے بعد یہی نیلگری تباہی اور بربادی کی دیوی بن جاتی۔

میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ مشرقی افق پر سپیدی پھیلنے لگی تھی۔ میں نے اپنی ریاضت ختم کر دی اور اٹھ کر کچھ دیر چھت پر ٹہلتا رہا اور پھر نیچے آ گیا۔

چھت پر آنے جانے کے لیے زینہ مکان کے اندر ہی سے تھا اس لیے مجھے نیچے آنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

گھر کے اندر گہرا سناٹا تھا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا لیکن جیسے ہی قدم اندر رکھا' ٹھٹک کر رک گیا۔

دھنو میرے بستر پر سو رہی تھی۔ نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی میں اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر باہر آ گیا اور لاؤنج میں

پڑے ہوئے صوفے پر لیٹ گیا۔

نیلگری کی باتیں اب بھی میرے دماغ میں ہلچل سی مچائے ہوئے تھیں۔ میں نے ہمالیہ میں نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ گوتم بھوش کا جاپ مکمل ہونے سے پہلے اسے گومپو کی بدھ عبادت گاہ سے باہر نکال سکوں۔

یہ فیصلہ کرلینے کے بعد میں اپنے آپ کو پرسکون محسوس کرنے لگا اور پھر میری پلکیں نیند کے بوجھ سے جھکنے لگیں۔

○☆○

رات کے نو بجے تھے۔

میں اس وقت تری ویدی مارگ میں سپر مارکیٹ کے قریب واقع ایشیا ہوٹل کی لابی میں بیٹھا انسپکٹر بریندرا اور انسپکٹر اعظم خان کا انتظار کررہا تھا۔ میں نے دو گھنٹے پہلے ہی ٹیلی فون پر ان سے یہاں ملاقات طے کرلی تھی۔ نو بجے کا وعدہ تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔

جب میں تیار ہو کر گھر سے نکل رہا تھا تو دھنو اور شوبھا نے بھی میرے ساتھ آنا چاہا تھا لیکن میں نے انہیں منع کردیا تھا۔

میرے ساتھ جو پراسرار واقعات پیش آرہے تھے ان کے بارے میں شوبھا کسی حد تک جانتی تھی۔ اس کے سوا اور کوئی ایسی ہستی نہیں تھی جسے کچھ بھنک بھی لگی ہو لیکن اب میں نے انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان کو صورت حال سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ ان کے تعاون کے بغیر میں اپنی مہم پر روانہ نہیں ہوسکتا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں کئی غیر ملکی سیاح بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں زیادہ تر یورپین باشندے تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں جنہوں نے مختصر لباس پہنے ہوئے تھے۔

سوا نو بجے کے قریب انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان ہوٹل کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں سادہ لباس میں تھے۔ میں نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا اور وہ سیدھے میری طرف آگئے۔

انسپکٹر بریندرا نے ویٹریس کو بلا کر کافی کے لیے کہہ دیا اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ چند منٹ بعد ہمارے سامنے کافی سرو کردی گئی۔

"کوئی خاص بات؟ کس لیے بلایا تھا تم نے؟" بریندرا نے کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے انڈیا جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کردیا ہے اور نیلگری کی طرف جانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"نیلگری!" بریندرا کے لہجے میں حیرت تھی "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟"

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں نے کچھ باتیں آج تک تم دونوں سے چھپائی ہیں۔ اس خیال سے کہ تم لوگ میرا مذاق نہ اڑاؤ لیکن اب صورت حال ایسی ہے کہ....."

"گویا اب تم اس موڈ میں ہو کہ تمہارا مذاق اڑایا جائے۔" اعظم خان نے مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

"ہاں۔ یہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہیں رتنا پارک میں ملنے والے کرسٹل کے ٹوٹے ہوئے مجسمے سے لے کر اب تک پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ دونوں خاموشی اور پوری توجہ سے میری باتیں سنتے رہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ اس دوران میں مجھ پر جو مصیبتیں نازل ہوتی رہی ہیں ان میں گوتم بھوش اور اس کے چیلے پنڈت دھیراج کا ہاتھ ہے۔

"نیلگری بہت مہان شکتی ہے۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "گوتم بھوش ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک خاص جاپ شروع کردیا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو....."

"تو کچھ نہیں ہوگا۔" بریندرا نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی "ہندو دیو مالا میں ان پراسرار قوتوں کے بارے میں پڑھا سنا میں نے بھی بہت کچھ ہے لیکن ایسی باتوں پر یقین نہیں کیا۔ یہ تو پنڈتوں، یوگیوں اور سادھوؤں کے دھندے ہیں جو کچھ شعبدے دکھا کر لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ کوئی پڑھا لکھا اور عقل مند آدمی ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میں تو تمہیں بہت ذہین اور عقل مند سمجھتا رہا ہوں لیکن۔"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر اچھل پڑا۔ جب اس نے یقین نہ کرنے والی بات کی تھی تو میں نے اپنا کام شروع کردیا تھا۔ میری نظریں اس کے اس ہاتھ پر مرکوز ہوگئی تھیں جس میں اس نے کافی کا مگ پکڑ رکھا تھا۔ مگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا لیکن وہ زمین پر بھی نہیں گرا۔ ہوا میں تیرتا ہوا آگے کی طرف جانے لگا۔

بریندرا اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحے وہ متوحش نظروں سے فضا میں معلق کافی کے مگ کو دیکھتا رہا پھر اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا لیکن مگ ہوا میں تیرتا ہوا آگے نکل گیا۔ بریندرا ابھی ہاتھ پھیلائے اس کے پیچھے لپکا۔ لابی میں بہت سے لوگ یہ دلچسپ اور حیران کن منظر

دیکھ رہے تھے۔ بریندرا پورے ہال میں اس مگ کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔ وہ جیسے ہی مگ کو پکڑنے کے لیے جھپٹتا، مگ آگے نکل جاتا۔ یہ سنسنی خیز منظر دیکھ کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر دہشت سی ابھر آئی تھی۔ دو یورپین عورتیں تو خوف زدہ ہو کر چیخیں مارتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی تھیں۔

مگ ہماری میز پر آکر ٹک گیا۔ بریندرا نے مگ کو دونوں ہاتھوں سے اس طرح پکڑ لیا جیسے اندیشہ ہو کہ وہ دوبارہ نہ بھاگ جائے۔ وہ خود صوفے پر بیٹھا تو اس کے چہرے پر بھی سنسنی کے تاثرات تھے۔

"میں نے تم جیسے عقل مند آدمی کو بھی کبھی اس طرح فضا میں معلق کسی چیز کے پیچھے بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں کہا۔

بریندرا کا چہرہ ہونق ہورہا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے ہاتھ مگ سے ہٹا لیے۔ شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ بہت سے لوگ اب بھی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

"تو یہ تمہاری حرکت تھی؟" بریندرا نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ شاید تم اسے بھی شعبدہ ہی کہو لیکن وہ سامنے دیکھو اس انگریز عورت کو جو سیڑھیوں سے اتر رہی ہے۔" میں نے آنکھ سے اشارہ کیا۔

بریندرا اور اعظم خان بھی اسی طرف دیکھنے لگے۔ دراز قامت اس انگریز عورت نے اسٹون واش جینز اور سفید سلیولیس ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کندھے پر براؤن لیدر بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا بیگ کے اسٹریپ میں پھنسا رکھا تھا اور بائیں ہاتھ میں کوئی کتاب تھی۔ اس نے جیسے ہی آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھا، اس کے بیگ سے گاڑھا سفید دھواں نکلنے لگا۔ اس عورت نے بیگ کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے بیگ سے آگ کا شعلہ لپکا۔ عورت نے بدحواس ہو کر بیگ کندھے سے گرا دیا اور چیختی ہوئی ایک طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔

لابی میں موجود لوگ بھی اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ دو آدمیوں نے دوڑ کر اس عورت کو تھام لیا جو اب بھی چیخ رہی تھی۔ ایک آدمی بیگ کی طرف لپکا۔ وہ پیر مار کر بیگ کی آگ بجھانا چاہتا تھا۔ اس نے پیر اوپر اٹھایا لیکن پھر اسے نیچے نہیں لا سکا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے گھٹنا تھام لیا جیسے کوئی زوردار چوٹ لگی ہو۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ ایک ٹانگ پر ناچتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

بیگ کی آگ خود بخود بجھ گئی۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر بیگ اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ بیگ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس پر آگ کا معمولی سا اثر بھی نہیں ہوا۔ وہ بیگ کو جھاڑتا ہوا اس انگریز عورت کے قریب آگیا اور بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ انگریز عورت نے ڈرتے ڈرتے بیگ پکڑ لیا۔ پہلے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر اسے کھول کر اندر جھانکا۔ ایک ایک چیز کو ٹٹول کر دیکھا اور پھر بیگ کندھے پر لٹکا کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے چہرے پر ہلکے سے خوف کے تاثرات نظر آرہے تھے۔

انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"یہ۔ یہ سب کچھ تم نے کہاں سے سیکھا؟" بریندرا نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"تم اب بھی اسے شعبدے بازی ہی سمجھ رہے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہیں یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں ایسی پراسرار قوتیں موجود ہیں جن سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ خود انسان کے اندر اتنی قوتیں ہیں جن کے بارے میں جان کر حیرت ہوتی ہے۔ ان قوتوں کو حاصل کرنے کے لیے کٹھن محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں نیت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ پنڈت، سادھو اور یوگی اپنے جیون کٹھنائیوں اور تپسیا میں گزار دیتے ہیں۔ کامیابی لاکھوں میں کسی ایک کو ملتی ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"نیلگری بھی دراصل انسان کے اندر کی ایک شکتی ہے اور بہت مہان شکتی ہے۔ ہزاروں سال سے لوگ اسے حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ لوگوں نے اپنے جیون برباد کردیے لیکن اس کے قریب نہیں پہنچ سکے۔ میں نے کہا تھا ناکہ ایسی کوئی پراسرار شکتی حاصل کرنے کے لیے نیت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ لوگوں کی نیتوں میں کھوٹ ہے جس وجہ سے وہ خود نقصان اٹھاتے ہیں۔ میری نیت میں کوئی فتور نہیں، کوئی برائی نہیں۔ میں نے شاؤلن ٹیمپل میں تھوڑے ہی عرصے کی ریاضت اور لگن سے اپنے اندر کی ایک بہت بڑی شکتی پر قابو پالیا جبکہ دوسرے لوگ برسوں سے اس کوشش میں ہیں اور کامیاب نہیں ہوسکے۔ میں نے اپنے اندر کی اس شکتی کو ہمیشہ انسانیت کی بھلائی کے لیے استعمال کیا۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ جس روز میری نیت

میں کھوٹ شامل ہوگئی... اس روز یہ شکتی مجھ سے چھن جائے گی اور یہ نیلگری۔۔۔" میں ایک بار پھر خاموش ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بعض لوگ اب بھی ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے کافی کا مگ بریندرا کے ہاتھ سے نکلا تھا اور وہ اس کے پیچھے ہال میں بھاگتا پھرا تھا اور بالآخر وہ مگ اسی میز پر آکر ٹک گیا تھا اس لیے بعض لوگ اب بھی ہماری طرف متوجہ تھے۔

"نیلگری بھی ایک ایسی ہی مہان شکتی ہے جو ہمارے اپنے اندر موجود ہے۔" میں کہہ رہا تھا "اسے حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میری یہ ریاضت پوری ہونے سے پہلے نیلگری خود میری طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ گوتم بھوش کی نیت سے بھی پوری طرح واقف ہے۔ میں جس نیلگری کا ذکر کررہا ہوں وہ ایک علامت ہے۔ اصل شکتی تو ہمارے اندر ہے اور میرے گلے میں یہ مالا۔" میں نے گلے میں پڑی ہوئی مالا کو چھوا "یہ کرسٹل کے اس ٹوٹے ہوئے مجسمے کے گلے میں تھی جسے میں اٹھا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ نیلگری نے یہ مالا اپنے گلے سے اتار کر مجھے دے دی۔ لو دیکھو۔" میں نے مالا اتار کر بریندرا کی طرف بڑھادی۔

وہ الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا۔

"ایسا عجیب و غریب پتھر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔" وہ بولا "اور میں حرارت۔۔۔"

"یہ ایک زندہ انسان کی حرارت ہے۔" میں نے کہا "اس مالا میں جب تک یہ حرارت موجود رہے گی، مجھے نیلگری کی آزادی کی خبر دیتی رہے گی۔ جس دن یہ حرارت ختم ہوگئی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کسی اور کے قبضے میں جاچکی ہے۔ ہزاروں لوگ اسے حاصل کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ گوتم بھوش اس دوڑ میں سب سے آگے ہے۔ وہ صرف چوبیس پچیس دن کے فاصلے پر رہ گیا ہے اور مجھے ہر صورت میں اسے روکنا ہے۔ وہ اس وقت نیلگری کی برف پوش چوٹیوں میں گومپو عبادت گاہ کے اندر جاپ میں مصروف ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ گوتم بھوش اس عبادت گاہ میں ہے؟" بریندرا نے پوچھا۔

"نیلگری خود میری رہنمائی کررہی ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا، اس کی قوت سلب ہوتی جائے گی اور اس سے پہلے کہ وہ گوتم بھوش جیسے بدمعاش کے قبضے میں چلی جائے، مجھے وہاں پہنچنا ہے۔"

"نیلگری میں یہ بُدھ عبادت گاہ کہاں پر ہے؟" بریندرا نے کہا "نیلگری دراصل دو چوٹیوں پر مشتمل ہے۔ نارتھ اور ساؤتھ۔ دونوں چوٹیاں ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر واقع ہیں اور ہر چوٹی چوبیس پچیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے جو سال کے بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پہاڑی چوٹیاں ماؤنٹ ایورسٹ سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اس طرف جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور پھر تمہارے ساتھ دو عورتیں بھی ہیں۔"

"یہ بُدھ عبادت گاہ نیلگری نارتھ اور تلکو جھیل کے درمیان کسی جگہ پر واقع ہے۔" میں نے جواب دیا "اور رہا ان دونوں عورتوں کا سوال تو میں ان میں سے کسی کو بھی ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ ایک تو راستہ بہت کٹھن ہے اور پھر نجانے کس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑے۔ اگر میں اس مہم کے دوران میں اپنی زندگی ہار بیٹھا تو مجھے کوئی دکھ نہیں ہوگا لیکن میں نہیں چاہتا کہ ان دونوں کو کوئی نقصان پہنچے۔ میری وجہ سے انہوں نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھائے ہیں اور اب میں یہ چاہتا ہوں کہ وہ ہر بلا سے محفوظ رہیں۔"

"اب تک کی صورت حال کے پیش نظر میں پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی تمہارا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں ہوگی۔" بریندرا نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"میں زیادہ سے زیادہ پرسوں یہاں سے روانہ ہوجانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "میرے بعد تم ان دونوں کو انڈیا بھیجنے کا بندوبست کردینا۔ شوبھا کی وہاں بہت پراپرٹی ہے۔ ایک ہوٹل بھی ہے۔ وہاں میرے کچھ مخلص دوست بھی ہیں جو انہیں سنبھال لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" بریندرا نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "کوشش کروں گا لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ یہ دونوں بلائیں میرے قابو میں آجائیں گی۔ ویسے اس کے علاوہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟"

"مجھے تم جیسے مخلص دوستوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک بات اور۔" اس نے میرے چہرے پر نظریں جما دیں "نیلگری والی کہانی ایک بہت اچھا افسانہ ثابت ہوسکتی ہے لیکن اگر تم۔۔۔"

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "اس کا مطلب ہے کہ تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا!"

"اگر تم نیلگری کی ایک جھلک دکھلا دو تو۔۔۔" وہ بدستور

مسکرا رہا تھا۔

"لاؤ۔ یہ مالا مجھے دو۔" میں نے اعظم خان کی طرف ہاتھ بڑھادیا کیونکہ وہ مالا اس وقت اسی کے پاس تھی۔

میں نے مالا لے کر گلے میں ڈال لی اور غیر محسوس انداز میں انگوٹھے کو درمیان والے پتھر پر مسلنے لگا۔ نیلگری نے جب یہ مالا مجھے دی تھی تو اس وقت یہ بھی بتادیا تھا کہ جب کبھی میں اس کی ضرورت محسوس کروں تو اس پتھر کو انگوٹھے سے ہولے ہولے مسل دوں لیکن آج تک میں نے اسے خود کبھی نہیں بلایا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ آج کل نیلگری خود مصیبت میں گرفتار ہے۔ گوتم بھوش نے اپنی بعض قوتوں کے ذریعے اس کے گرد حصار قائم کررکھا ہے۔ پتھر کو مسلتے ہوئے میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ نیلگری اس وقت وہ حصار توڑنے میں کامیاب ہوجائے۔

نیلگری نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ ہمارے دائیں طرف گول ستون تھا جس کے ساتھ پودوں کے گملے رکھے ہوئے تھے اور مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ اس ستون کے اندر سے برآمد ہوئی ہو۔

وہ نیلگری تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے پہلے روز دیکھا تھا۔ ہونٹوں پر وہی ملکوتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی روشن ستاروں جیسی چمک۔ پہلی ملاقات کے بعد میں نیلگری کے محض ہیولے دیکھتا رہا تھا۔ اس انسانی پیکر میں دوسری بار دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اچھل پڑا اور میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی تھی۔

بریندرا اور اعظم خان اس طرح اچھل پڑے تھے جیسے ان کی سیٹوں کے نیچے کانٹے نکل آئے ہوں۔ ان دونوں کے چہروں پر سنسنی کے عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ نیلگری انہیں نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ مجھے بھی اٹھ جانا پڑا۔

نیلگری ہمارے قریب آگئی۔ وہ جیسے ہوا میں تیر رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے رک گئی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے۔ اس نے بریندرا کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ پھر اعظم خان کی پیشانی پر بھی بوسہ دیا۔ گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ہوا میں تیرتی ہوئی اسی ستون کے قریب پہنچ کر نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ دونوں اب بھی مبہوت سے کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بریندرا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑا۔

"بیٹھ جاؤ۔ وہ جاچکی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ دونوں کے ہاتھ اپنی اپنی پیشانی پر تھے اور دونوں کے چہروں پر سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔ میں چونکہ خود بھی ایسی کیفیت میں مبتلا رہ چکا تھا اس لیے ان کی کیفیت کو سمجھنے میں بھی مجھے دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

"شاید اب تمہیں یقین آگیا ہو کہ میں نے تمہیں کوئی افسانہ نہیں سنایا تھا بلکہ ایک حقیقت بیان کی تھی۔" میں نے بریندرا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بات کا یقین تو مجھے پہلے بھی تھا۔" بریندرا نے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں تو اس شکتی کو دیکھنا چاہتا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے لوگ ہزاروں سال سے اپنی جانوں کی بازی لگا رہے ہیں۔ نیلگری کو دیکھ کر تو میرا بھی دل چاہنے لگا ہے کہ کوئی جاپ شروع کردوں۔"

"ہمت ہو تو ضرور ایسا کرو۔" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"نہیں بھئی۔ ہم سے ایسی کٹھنائیاں برداشت نہیں ہوسکتیں۔" بریندرا نے جواب دیا پھر بولا "مجھے حیرت ہے۔ اس لابی میں موجود لوگوں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا حالانکہ نیلگری کو دیکھ کر تو۔۔۔"

"وہ کسی کو نظر ہی نہیں آئی ہوگی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "وہ میری خواہش پر صرف تم دونوں کے سامنے آئی تھی۔"

"حیرت انگیز۔" بریندرا بولا "بہرحال، اب بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"وہی جو کہہ چکا ہوں۔" میں نے کہا "میں پرسوں صبح سویرے یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔ تم میرے بعد ان دونوں کو انڈیا بھیج دینا۔"

"انسپکٹر اعظم دو چار دن میں واپس جانے والا ہے۔" بریندرا نے کہا "کوشش کروں گا کہ وہ دونوں اس کے ساتھ چلی جائیں۔"

"میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔" میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تو چلو پھر تمہیں چھوڑ آئیں۔" بریندرا یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

اعظم خان اور میں نے بھی اپنی اپنی جگہ چھوڑ دی۔

جب ہم ہوٹل سے نکلے تو بارہ بج رہے تھے۔ شہر کے بیشتر

علاقوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے ابھی شام اتری ہو۔ بریندرا نے ایک جگہ گاڑی روک کر کچھ پھل وغیرہ خرید لیے اور پھر گاڑی مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی تھان کوٹ کی طرف جانے والی شاہراہ پر دوڑنے لگی۔

تھان کوٹ مرکزی شہر سے انتیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ کبھی کبھار سامنے سے آتی ہوئی کوئی گاڑی نظر آجاتی۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں گھر پہنچ گئے۔ بریندرا نے پھلوں کی ٹوکری شوبھا کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ دونوں اسی وقت واپس جانا چاہتے تھے مگر شوبھا نے انہیں زبردستی چائے کے لیے روک لیا۔ ملازمہ اگرچہ موجود تھی مگر وہ خود چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

چائے پینے کے بعد وہ لوگ زیادہ دیر نہیں رکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر شوبھا اور دھنو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں چھت پر آگیا۔

آج آسمان پر شام ہی سے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن یہ وہ بادل نہیں تھے جن سے کسی قسم کا خوف محسوس ہوتا۔ میں کچھ دیر تک چھت پر ٹہلتا رہا پھر اپنی مخصوص جگہ پر آسن جما کر بیٹھ گیا۔

اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ تاہم میں اپنے آپ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرتا رہا۔ بار بار یوں لگتا جیسے کوئی غیر مرئی قوت میری ریاضت میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہی ہو' مجھے وہاں سے اٹھانا چاہتی ہو لیکن میں نے اپنی توجہ نہیں بٹنے دی۔

اگلے روز میں دوپہر تک سوتا رہا اور پھر اکیلا ہی بازار کی طرف نکل گیا۔ یہ وہی قصبہ تھا جہاں سمبا کے قبیلے سے واپس آنے کے بعد گوتم بھوش سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے بس سے اتار لیا تھا۔ وہ مجھے پہاڑوں میں لے گیا تھا اور مجھ سے نیلگری والی مالا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس کے حصار سے بھاگ نکلا تھا اور اس کے چیلے پنڈت دھیراج نے مجھے ایک عورت کے قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ پولیس مجھے تھانے لے جا رہی تھی تو ناگ پال کے آدمی پولیس والوں کو قتل کر کے مجھے چھڑا کر پہاڑوں میں اس پراسرار اور قدیم حویلی میں لے گئے تھے جہاں مجھے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ سمبا کو بھی پکڑ کر وہیں لے جایا گیا تھا اور اگلی رات کو وہاں سے سمبا کو لے کر حویلی سے فرار ہو کر میں نیل کنڈ والی بدھ عبادت گاہ پر پہنچ گیا تھا جہاں دھنو اور اس کے باپ سے ملاقات ہوئی تھی۔

ہاں۔ یہ وہی قصبہ تھان کوٹ تھا جہاں اب میں آزادی سے بلا خوف و خطر گھوم پھر رہا تھا۔

میں نے بازار سے کپڑے کا ایک تھیلا خریدا اور کچھ ضرورت کی چیزیں بھی خرید کر تھیلے میں بھر لیں۔ تھیلا گھر کے قریب ہی ایک جگہ پر چھپا دیا اور گھر آگیا۔ مجھے اگلے روز صبح سویرے یہاں سے نکل جانا تھا۔ دھنو اور شوبھا کو بتائے بغیر۔ اگر میں انہیں بتا دیتا تو ان کے بغیر کبھی بھی گھر سے قدم باہر نہیں نکال سکتا تھا۔

شام کو اعظم خان کا فون آگیا کہ میں کل صبح نہ جاؤں۔ اس کے کہنے کے مطابق بریندرا اور وہ دونوں مل کر کل رات ہماری دعوت کرنا چاہتے تھے اس لیے میں کل کے بجائے پرسوں چلا جاؤں۔ میں نے اعظم خان کی بات مان لی۔

اس رات چھت پر ریاضت کے دوران میں کچھ عجیب و غریب اور غیر معمولی باتیں پیش آئیں۔ یوگا کی یہ ریاضت شروع کرنے میں گوتم بھوش ہی میرا گرو تھا اور اس نے مجھے متنبہ کیا تھا کہ اس جاپ کے دوران کچھ خوفناک اور دہلا دینے والے واقعات رونما ہوں گے۔ کچھ پراسرار قوتیں مجھے اس جاپ سے روکنے کی کوشش کریں گی لیکن میں اپنے آپ کو اکھڑنے نہ دوں اور اب وہ مرحلہ شروع ہو چکا تھا اور میرا خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ بعض پراسرار قوتوں کے ساتھ گوتم بھوش بھی میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس رات میرے ساتھ ایسے ہی عجیب و غریب واقعات پیش آئے تھے۔ کبھی مجھے لگتا' کوئی کتا میرے لباس کو دانتوں میں دبائے پیچھے کھینچ رہا ہے۔ کبھی کوئی بھیڑیا میرے سامنے آکر دانت نکوسنے لگتا اور بار بار مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا۔

ایک بار تو حد ہی ہو گئی۔ وہ ایک بڑھیا تھی۔ بہت ضعیف' اس کی عمر اتنی سے کچھ اوپر ہی ہو گی۔ چہرے پر اتنی جھریاں تھیں کہ مکڑی کے جالے کا گمان ہوتا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچا۔ اس کے جسم پر لباس برائے نام ہی تھا۔ وہ بڑھیا افلاس اور غربت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ فاقوں نے اس کے جسم کو ہڈیوں کے ڈھانچے میں بدل دیا تھا اور ساری توانائی نچوڑ لی تھی۔

وہ زمین پر پڑی ہوئی ایک ٹوکری اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تنکوں کی بنی ہوئی وہ ٹوکری ایک بڑی پرات کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اسے چھابڑی کہا جا سکتا تھا جس میں کچھ

رکھی ہوئی تھیں۔ اوپر کالے رنگ کا ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ بڑھیا بار بار کوشش کرتی لیکن اس سے وہ ٹوکری نہیں اٹھ رہی تھی۔ اس نے مدد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی نظروں کا پیغام پڑھ لیا۔ وہ کہہ رہی تھی یہ ٹوکری اٹھا کر اس کے سر پر رکھوا دوں۔

میں نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے ٹوکری اٹھا لی جو بہت بھاری تھی۔ اس بڑھیا کے ہاتھ بھی ٹوکری پر تھے۔ میں نے ٹوکری اوپر اٹھا کر بڑھیا کے سر پر رکھنا چاہی تو بڑھیا نے ایک دم ٹوکری میرے سر پر پلٹ دی۔ اس ٹوکری میں بدبودار گوشت کے لوتھڑے اور خون بھرا ہوا تھا۔ میرا سر' چہرہ اور سارا جسم بدبودار خون میں لتھڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں اس بڑھیا سے نیکی کے اس صلے کی وجہ پوچھ سکتا' اس نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ میرا دماغ جھنجنا اٹھا۔

میں اپنی جگہ پر ہل کر رہ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ میں بد حواس سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نہ وہ بڑھیا تھی اور نہ وہ ٹوکری۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بادل پھٹ چکے تھے۔ ایک ستارہ ٹوٹ کر روشنی کی لکیر چھوڑتا ہوا دوسری طرف بادلوں میں غائب ہو گیا۔

میرا ایک ہاتھ بے اختیار اپنے گال پر پہنچ گیا تھا۔ اس بڑھیا کے استخوانی ہاتھ میں بے پناہ قوت تھی۔ یہ سب کچھ اگرچہ عالم رویا میں ہوا تھا لیکن اس تھپڑ کا اثر میں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔

رات کے آخری پہر ایک اور خوفناک واقعہ پیش آیا۔ دو خوں خوار کتے آپس میں لڑتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے نکیلے دانتوں اور پنجوں سے ایک دوسرے کو بری طرح ادھیڑ دیا تھا۔ وہ دونوں لہولہان ہو رہے تھے مگر شکست تسلیم کر کے بھاگنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ وہ دونوں لڑتے لڑتے میرے قریب آگئے اور اچانک ہی ان دونوں نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میں چیختا ہوا ان سے بچنے کے لیے پیچھے گرا۔ وہ دونوں خوں خوار کتے میرے سینے پر سوار ہو گئے اور اپنی دشمنی بھول کر نکیلے دانتوں اور پنجوں سے مجھے بھنبوڑنے لگے تھے۔ میں ان سے بچنے کے لیے زمین پر لوٹتا اور چیختا رہا۔

اور پھر دو آدمیوں نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ نسوانی چیخوں کی آوازیں بھی میری سماعت سے ٹکرانے لگیں۔

میرے حواس بحال ہوئے تو میں صوفے پر پڑا تھا۔ دھنو' شوبھا' نیپالی ملازمہ اور مکان کی نگرانی پر مامور دونوں سادہ لباس پولیس والے میرے پاس کھڑے تھے۔

"کیا ہوا۔ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟" میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہم تمہاری چیخیں سن کر چھت پر گئے تھے۔" شوبھا نے جواب دیا "تم چھت پر لوٹتے ہوئے چیخ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اپنے آپ کو کسی سے بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"اوہ!" میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مجھے ریاضت سے روکنے کے لیے کسی پراسرار قوت کا یہ حملہ بڑا زبردست ثابت ہوا تھا۔ میں اس کے داؤ میں آگیا تھا اور مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا۔

میری حالت سنبھل گئی تھی۔ دونوں پولیس والے باہر چلے گئے تھے۔ ملازمہ بھی اس دوران میں چائے بنا کر لے آئی۔ وہ چائے رکھ کر کچھ دیر کھڑی رہی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دھنو سامنے والی کرسی پر تھی اور شوبھا صوفے پر میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میری گردن پر سے ہوتا ہوا کندھے پر ٹکا ہوا تھا۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اس طرح فرش پر لوٹ لوٹ کر کیوں چیخ رہے تھے۔ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے؟"

"یہی سمجھ لو۔ وہ بھیانک خواب ہی تھا۔" میں نے اپنے سامنے رکھا ہوا چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میرے ہاتھ میں اب بھی ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"چھوڑ دو یہ سب کچھ۔" شوبھا نے کہا "یہ سب کچھ پنڈتوں اور یوگیوں کے کھیل ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ جاپ اور جنتر منتر کے چکر بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان میں جان بھی چلی جاتی ہے۔ ذرا سی غفلت سے جاپ کرنے والا بعض اوقات اپنے ہی جاپ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ میں جے پور کے ایک پنڈت کو جانتی ہوں۔ وہ ایک جاپ کے دوران میں ہی پراسرار طور پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے زخمی شریر (بدن) کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے کسی خوں خوار درندے نے چیر پھاڑ ڈالا ہو۔ تم اس چکر میں کیوں پڑ گئے۔ چھوڑ دو یہ سب کچھ اور ہندوستان چلنے کی تیاری کرو۔ ہم وہاں آرام سے زندگی گزاریں گے۔ میرے پاس بہت کچھ ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی ہمیں۔"

"کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں کسی لالچ میں یہ جاپ کر رہا ہوں؟" میں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اس کی طرف

دیکھا۔ وہ میرے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی تھی "مجھے کوئی لالچ یا ہوس نہیں ہے شوبھا۔ میں تو ایک نیک مقصد کے لیے یہ جنگ لڑ رہا ہوں۔ ایک نیکی کو برائی کے قبضے میں جانے سے روکنے کے لیے۔ میں آدھے راستے سے واپس نہیں جا سکتا۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بولا "غلطی میری ہی تھی جس سے میرے دشمن کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔ اب وہ کوئی ایسی کامیاب حرکت نہیں کر سکے گا۔"

شوبھا نے فوری طور پر جواب نہیں دیا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر اس کا لیکچر شروع ہو گیا۔ وہ مجھے سمجھاتی رہی کہ مجھے یہ سب کچھ چھوڑ کر اب ہندوستان چلے جانا چاہیے۔ دھنو اس دوران میں خاموش بیٹھی رہی۔ شاید ہماری باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ وہ تو یہی سمجھتی تھی کہ شاید میں چھت پر بیٹھا رات بھر عبادت میں مشغول رہتا ہوں۔

"جاپ کو ادھورا چھوڑنا زیادہ خطرناک ہوگا۔" میں نے بھی شوبھا کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہندوستان چلے جانے سے دشمن سے ہمارا پیچھا نہیں چھوٹ جائے گا۔ یہ پراسرار قوتیں ارضی سرحدوں کی پابند نہیں ہوتیں۔ میری پسپائی کو بزدلی سمجھا جائے گا اور مجھے نیست و نابود کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے گی۔"

"مجھے تم دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔" شوبھا نے کہا۔

"تو پھر اپنے بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ برائی کے خلاف اس یدھ (لڑائی) میں میرے قدم نہ اکھڑنے پائیں۔" میں نے کہا۔

میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ چار بجنے والے تھے۔ دھنو اپنی جگہ پر بیٹھی اونگھنے لگی تھی۔ میں نے ان دونوں کو ان کی خواب گاہ میں بھیج دیا اور خود بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔

بستر پر لیٹنے کے بعد بھی مجھے دیر تک نیند نہیں آسکی۔ میں آج کی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ ایک ہی رات میں مجھ پر پے در پے تین چار حملے ہوئے تھے اور آخری وار تو بہت ہی خوفناک تھا جس سے وقتی طور پر میرے قدم اکھڑ گئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دشمن کو وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو گئی تھی لیکن میرا حوصلہ تو پست نہیں ہوا تھا۔ میدان چھوڑ کر بھاگنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اب دشمن کے ہتھکنڈوں میں نہیں آؤں گا اور گوتم بھوش کو اس کے ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

میں خواب میں بھی یہی سب کچھ دیکھتا رہا۔ دشمن میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور میں اس سے بچنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ میں ٹھوکر کھا کر گرا۔ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دشمن پوری قوت سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن ٹھیک اسی وقت آسمان سے بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ میرے گرد ایک حصار سا بن گیا۔ ایک چمکتا ہوا رسّا تھا جس نے میرے گرد ایک دائرہ بنا دیا تھا۔ اس رسے میں سے بجلی کے کوندے لپک رہے تھے۔ مجھ پر حملہ آور ہونے والا دشمن کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا کر گرا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور پھر اچانک ہی اٹھ کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میرے اردگرد ایسا شور سنائی دینے لگا جیسے کروڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کوئی مکھی نظر نہیں آئی لیکن بھنبھناہٹ کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ اسی شور میں چند الفاظ میری سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ عجیب و غریب اور ناقابل فہم الفاظ میرے ذہن سے گویا چپک کر رہ گئے تھے۔

میں جب بیدار ہوا تو دوپہر ہو رہی تھی۔ طبیعت میں عجیب بوجھل پن سا تھا۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی۔ میں بار بار اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اچانک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ مجھے دشمن سے بچنے کی راہ دکھائی گئی تھی اور یہ راہ دکھانے والا کون تھا؟ نیلگری یا میرے اندر کی اپنی قوت؟ وہ الفاظ لاشعور سے ابھر کر سامنے آ گئے تھے۔

میں نے شوبھا وغیرہ سے اس خواب کا ذکر نہیں کیا۔ وہ پھر پریشان ہو جاتی۔ میں نے ان دونوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ بریندرا اور اعظم خان سے رات والے واقعے کا تذکرہ نہ کریں۔ دونوں محافظوں کو بھی سمجھا دیا گیا تھا۔

دن اسی طرح گزر گیا۔ شام آٹھ بجے کے قریب گاڑی ہمیں لینے کے لیے پہنچ گئی۔ بریندرا نے فون پر گاڑی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ لینڈ کروزر تھی اور دو سادہ لباس پولیس والے بھی ساتھ تھے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔

ہم نو بجے کے قریب کھٹمنڈو میں کالی ماتی کے علاقے میں واقع جوالا کلب پہنچ گئے جہاں انسپکٹر بریندرا اور اعظم خان ہمارے منتظر تھے۔ یہ کلب اوبیرائے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔

بریندرا نے بڑی پرتکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ڈائننگ ہال کا ایک گوشہ ہمارے لیے مخصوص تھا جہاں دو میزیں ملا کر انتظام کیا گیا تھا۔ خوب صورت ویٹریسوں نے

بریندرا کا اشارہ پاتے ہی کھانا شروع کر دیا۔ کئی ڈشیں تھیں اور کھانا اس قدر افراط سے تھا کہ کم از کم بیس آدمی شکم سیر ہو کر کھا سکتے تھے۔

میں اپنی ریاضت کی وجہ سے خصوصاً رات کو بہت کم کھانا کھاتا تھا لیکن بریندرا کے اصرار پر اس روز کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا۔

کھانے کے بعد ہم کلب والے حصے میں آ گئے۔ نیپال جیسے ملک پر ہندوستان کا اثر تھا اور یہاں بھی بے حیائی عام تھی۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں تو عریانیت اور بے حیائی کے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آئے کہ شیطان بھی شرما جاتا ہوگا۔ ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں پروگرام کرنے والی رقاصائیں فن سے زیادہ اپنے جسموں کی نمائش کرتیں۔ بعض رقاصائیں تو رقص کے دوران بالکل بے لباس ہو جاتیں۔

جوالا کلب میں بھی کچھ ایسی ہی صورت حال تھی۔ کسی کو شرم و حیا کا احساس تک نہیں تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور کبھی کبھی تو کوئی عورت بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر ہیجان خیز موسیقی پر رقص کرنے لگتی۔

جوالا کلب میں یہ ہنگامے صبح تک جاری رہتے تھے لیکن ہم ایک بجے وہاں سے نکل آئے۔ اسی دوران میں موقع پا کر میں نے بریندرا کو بتا دیا تھا کہ آج صبح سویرے میں نکل جاؤں گا۔

دو بجے کے قریب لینڈ کروزر نے ہمیں گھر پہنچا دیا۔ شوبھا اور دھنو نے بھی کلب میں رقص کے ایک دو پروگراموں میں حصہ لیا تھا۔ تھکن ان کے چہروں سے نمایاں تھیں۔ وہ کپڑے بدلے بغیر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں۔

میں چھت پر آ گیا۔ اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر میں نے تین بار وہ الفاظ دہرائے جو گزشتہ رات خواب میں میرے ذہن میں بٹھائے گئے تھے۔

میرے گرد ایک حصار بن گیا۔ وہ آگ کا دائرہ تھا۔ نہیں، آگ نہیں۔۔۔ وہ بجلی تھی جس سے کوندے لپک رہے تھے۔

میں اپنے آسن پر بیٹھ گیا اور تمام تر توجہ اپنی ریاضت پر مرکوز کر دی۔ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا لیکن مجھے عجیب و غریب شکلیں دکھائی دیتی رہیں۔ نہایت خوفناک صورتوں والے عجیب و غریب جانور تھے جو میری طرف لپک رہے تھے لیکن وہ اس روشن دائرے سے دور ہی رہے۔

دن کا مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تو میں نے اپنی ریاضت ختم کر دی۔ کچھ دیر چھت پر ٹہلتا رہا اور پھر نیچے آ گیا۔ شوبھا والے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹی گہری نیند سو رہی تھیں۔

میں کچن میں آ گیا اور برتنوں کی آواز پیدا کیے بغیر چائے بنانے لگا۔ نیپالی ملازمہ بھی اپنے کمرے میں سو رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ نو بجے سے پہلے کوئی بھی بستر نہیں چھوڑتا تھا اور میں اس وقت تک بہت دور نکل چکا ہوتا۔

چائے پینے کے بعد میں ایک بار پھر شوبھا والے کمرے میں آ گیا۔ دیر تک ان دونوں کے چہروں کو دیکھتا رہا پھر باہر آ گیا۔

میں کوٹھی سے باہر نکلا تو دونوں پولیس والوں میں سے ایک سو رہا تھا جبکہ دوسرا جاگ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں بھی مسکرا دیا اور ٹہلنے والے انداز میں ایک طرف چلنے لگا۔

مکان سے تقریباً دو سو گز دور میں نے جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھیلا نکالا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

پوکھارا کے لیے پہلی بس ساڑھے سات بجے روانہ ہوتی تھی اور ابھی سوا چھ بجے تھے۔ گلیوں سے نکل کر سڑک پر آتے ہی مجھے ایک خالی ٹیکسی مل گئی جس نے پون گھنٹے میں مجھے بس اسٹاپ پر پہنچا دیا۔ دور کا سفر کرنے والے لوگ بس اسٹاپ پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے اور اپنی اپنی منزل کی طرف جانے والی بسوں پر سوار ہو رہے تھے۔ نیپال میں ریل نہیں چلتی۔ بسوں پر ہی سفر ہوتا ہے۔ آمد و رفت کے کچھ اور ذرائع بھی ہیں لیکن زیادہ تر لوگ بسوں پر ہی سفر کرتے ہیں۔

پوکھارا کی طرف جانے والی بسیں بھی اپنے اسٹینڈ پر لائن میں لگی ہوئی تھیں۔ سب سے آگے والی بس کی نصف سے زیادہ سیٹیں بھر چکی تھیں۔ میں نے بھی بکنگ سے ٹکٹ خریدا اور بس میں سوار ہو کر کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ دو مسافروں کی سیٹ تھی۔ کچھ دیر بعد ہی ایک عورت میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دراز قامت، صحت مند اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ تیس اور پینتیس کے بیچ لگایا جا سکتا تھا۔ اس نے پنڈلیوں تک لمبا اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کا گریبان اس قدر فراخ تھا کہ میں کسی اضافی کوشش کے بغیر اندر تک جھانک سکتا تھا۔

وہ عورت غالباً بدھ تھی۔ اس کے پاس بھی کپڑے کا

ایک تھیلا تھا جس میں نجانے کیا کچھ بھرا ہوا تھا۔ تھیلا اس نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس سے تھیلا لے کر اوپر ریک میں اپنے تھیلے کے قریب رکھ دیا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ غالباً شکریہ ادا کرنے کے لیے کچھ کہا بھی تھا لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ سکے تھے۔

بس مقررہ وقت سے پہلے ہی بھر گئی لیکن اس کی روانگی مقررہ وقت پر ہی عمل میں آئی تھی۔

شہر کی سڑکوں پر رفتار بہت ہلکی رہی لیکن شہر سے نکل کر پرتھوی ہائی وے پر آتے ہی بس کی رفتار تیز ہو گئی۔

بس جب تھان کوٹ پہنچی تو میں سمٹ کر بیٹھ گیا حالانکہ جانتا تھا کہ شوبھا وغیرہ ابھی گہری نیند سو رہی ہوں گی لیکن نجانے مجھے یہ اندیشہ کیوں تھا کہ وہ میرا راستہ روک لیں گی مگر میرا یہ خدشہ بے بنیاد نکلا۔

بس تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف دوڑتی رہی۔ راستے میں کئی قصبے اور بستیاں آتی رہیں۔ بس ہر بستی میں رکتی رہی اور مزید مسافر اس میں بھرتے رہے۔

بس کے اندر مسافر، ادمنی بس کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ چھت پر بھی کوئی جگہ خالی نہیں رہی تھی۔ اس ہائی وے پر حالانکہ کئی بسیں چلتی تھیں لیکن ہر بس کا یہی حال رہتا تھا۔

سیٹ اتنی کشادہ نہیں تھی کہ دو آدمی سہولت سے بیٹھ سکتے۔ وہ عورت پہلے ہی میری طرف جھکی ہوئی تھی۔ کھڑے ہوئے مسافروں کے دباؤ کی وجہ سے وہ گویا میرے اوپر لدی جا رہی تھی۔ وہ زیادہ دباؤ ڈالتی تو میں گھور کر اس کی طرف دیکھنے لگتا۔ جواب میں وہ مسکرا کر رہ جاتی۔

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ مجھے بڑی شدت سے نیند آ رہی تھی۔ میری آنکھیں زبردستی بند ہوئے جا رہی تھیں۔ میں کھڑکی کے ساتھ دبا ہوا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت بھی اونگھ رہی تھی۔ میری آنکھ جب بھی کھلتی، اسی عورت کا سر میرے کندھے پر ہوتا۔

کھٹمنڈو سے پوکھارا صرف سوا دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو یہ فاصلہ ڈھائی تین گھنٹوں میں طے ہو سکتا تھا لیکن یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک بتدریج بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ جگہ جگہ خطرناک موڑ اور چڑھائی کی وجہ سے بس کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

بس دو بجے کے قریب پوکھارا پہنچی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ بھیڑ بکریوں کی طرح بھرے ہوئے مسافروں کے اترنے کے بعد میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت بھی اٹھ گئی اور جب میں نے کھڑے ہو کر اپنا تھیلا اٹھانے کے لیے اوپر ریک کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ میرا تھیلا وہاں نہیں تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس عورت کو دھکا دے کر سیٹ سے باہر نکلا اور دوسرے مسافروں کو دھکیلتا ہوا بس سے اتر کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بس اسٹاپ پر لاتعداد لوگ سامان اٹھائے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ مجھے کسی کے پاس ایسا سفید تھیلا نظر نہیں آیا جس پر بچھو کا خاکہ چھپا ہوا ہو۔ کوئی ایسا شخص بھی دکھائی نہیں دیا جس پر میں کسی قسم کا شبہ کر سکتا اور پھر ضروری نہیں تھا کہ کوئی شخص میرا تھیلا لے کر یہیں پر اترا ہو۔ میں تو راستے بھر تقریباً اونگھتا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، راستے کی کسی بستی میں اترنے والا کوئی شخص میرا تھیلا لے گیا ہو۔

میں بس سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا متوحش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ میری وہ ہم سفر عورت بھی بس سے اتر کر میرے قریب آ کر رک گئی۔

"کیا بات ہے۔ تم بہت پریشان ہو؟" اس نے ملی جلی ہندی اور نیپالی میں کہا۔

"کوئی مسافر میرا بیگ اٹھا کر لے گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ!" اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے "سفر میں اپنے سامان کا خیال رکھنا چاہیے۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا؟"

"صرف دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پردیسی لگتے ہو۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "ٹورسٹ ہو۔ سیر و تفریح کے لیے آئے ہو۔ کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"اناپورنا۔" میں نے جواب دیا "ہمدردی کا شکریہ۔ ویسے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرا زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

"مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ کورچون میں رہتی ہوں۔ لاچوک تک ہمارا ساتھ رہے گا۔ کیوں نہ ہم یہاں کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اکٹھے ہی کسی بس میں بیٹھ جائیں۔ اکیلا آدمی تو بور ہو جاتا ہے۔ دونوں ساتھ ہوں گے تو باتوں میں وقت کٹ جائے گا۔"

"شکریہ۔" میں نے جواب دیا "میں آج کی رات پوکھارا ہی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ تم اپنا سفر جاری رکھ سکتی ہو۔"

میں ایک طرف چلنے لگا۔ نجانے کیوں اب اس عورت پر مجھے کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ سیاح ہوں' سیاحوں کو لوٹنے کے لیے بھی بڑے عجیب وغریب ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ خوب صورت عورتیں تو بڑا مؤثر ہتھیار ثابت ہوتی ہیں۔ یہ عورت بھی خوب صورت ہی تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے کھٹمنڈو ہی میں مجھے تاڑ لیا ہو اور جان بوجھ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی حالانکہ اس وقت بس میں اور سیٹیں بھی خالی تھیں۔

کھٹمنڈو کے مقابلے میں یہاں کا موسم زیادہ خوشگوار تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں سے بس بدل کر فوراً ہی اگلے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا لیکن تھیلے کی گمشدگی کی وجہ سے آج کا دن اور رات یہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں بس اسٹاپ سے نکل کر کچھ دور تک پیدل ہی چلتا رہا پھر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور دوبارہ شہر کی آوارہ گردی شروع کر دی۔ اس دوران میں' میں نے ایک عدد تھیلا' دو جوڑے کپڑے اور ضرورت کی چیزیں بھی خرید لی تھیں۔ شہر میں گھومتے ہوئے ایک بار میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہاں کے چیف پولیس آفیسر سے ملاقات کر لی جائے۔ سمبا لوگ مجھے یہاں تک چھوڑنے آئے تھے تو ان کی رہائش اور واپسی کے انتظامات کے سلسلے میں اس افسر نے میری بڑی مدد کی تھی۔

میں چیف انسپکٹر سے ملاقات کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا لیکن وہ دفتر میں موجود نہیں تھا۔ میں کوئی پیغام چھوڑے بغیر واپس آ گیا۔

شہر میں گھومتے ہوئے میں نے کچھ معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ تلکو جھیل تک جانے کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میں تتا پانی (جہاں گرم پانی کے چشمے ہیں) کھاسا' سیانگ اور تھینی کی طرف ہوتے ہوئے دریائے کیا کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا تلکو جھیل تک چلا جاؤں لیکن یہ راستہ بہت طویل تھا۔ اس میں کم از کم تین دن لگ جاتے۔ دوسرا راستہ انا پورنا کے پہاڑی سلسلے میں سے ہو کر جاتا تھا۔ ننت پیک تک تو میں آسانی سے بسوں پر سفر کر سکتا تھا۔ اس سے آگے جھیل کی طرف جانے کے لیے مجھے کوئی نہ کوئی قافلہ مل جاتا۔ میں نے یہ دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

شام ہونے سے پہلے پہلے میں نے ایک گیسٹ ہاؤس میں رہائش کا بندوبست بھی کر لیا۔ یہ گیسٹ ہاؤس بندیا دسنی مندر کی طرف دریا کے کنارے پر واقع تھا۔ اس کے قرب وجوار میں چند اور گیسٹ ہاؤسز بھی تھے۔ یہ جگہ پرسکون بھی تھی اور بارونق بھی۔

میں جس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا وہ دو منزلہ بنگلا نما عمارت تھی۔ اس کی مالکہ ایک ادھیڑ عمر عورت تھی اور اس کی رہائش بھی اسی عمارت کے ایک کمرے میں تھی۔ مجھے دوسری منزل پر سامنے کی طرف کارنر کا کمرا ملا تھا۔ سامنے بہت خوب صورت اور وسیع لان تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔

اس وقت شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لان میں جلتے ہوئے برقی قمقموں کی روشنی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ بعض پودوں کی شاخوں میں بھی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی بتیاں جل رہی تھیں۔

میں کچھ دیر تک کمرے میں بیڈ پر لیٹا رہا پھر کھانے کے وقت اٹھ کر باہر آ گیا۔ ڈائننگ روم میں بھی اگرچہ کھانا ہو رہا تھا لیکن میں نے لان میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔

کھانے کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ عجیب سی تھکن ہو رہی تھی۔ کئی روز بعد ایسا ہوا تھا کہ میں گیارہ بجے بستر پر لیٹ گیا۔ اس رات میں نے ریاضت بھی نہیں کی۔ بستر پر لیٹتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ چکا تھا۔

وہ شاید رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہلکی سی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ میں حرکت کیے بغیر آنکھیں پٹ پٹا کر چھت کو گھورتا رہا۔ دماغ پر نیند کا خمار ہونے کے باوجود میری چھٹی حس کسی غیر معمولی بات کی اطلاع دے رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازہ بند تھا۔ میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ کھڑکی کا پردہ پوری طرح ہٹا ہوا تھا اور کھڑکی کے سامنے ایک انسانی ہیولا کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کوئی عورت تھی اور میری طرف پشت کیے کھڑی تھی اور اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

میرے ذہن میں نیلکری کا خیال ابھرا لیکن وہ اس طرح بے لباس ہو کر کبھی میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ تو چاندنی کا پیکر بن کر آتی تھی۔ یہ شاید میرا کوئی واہمہ تھا۔ میں نے دانتوں میں انگلی دبا لی۔ میرے منہ سے ہلکی سی آواز نکل گئی۔

وہ میرا واہمہ نہیں تھا اور نہ ہی میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ دراز قامت عورت کھڑکی کے سامنے میری طرف پشت کیے کھڑی تھی۔ میرے منہ سے "سی" کی ہلکی سی آواز

سن کر وہ میری طرف پلٹ گئی۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ وہی عورت تھی جو بس میں میری ہم سفر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی گہری مسکراہٹ تھی۔

میں نے بیڈ سے اٹھنا چاہا تو میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے۔ شدید سردی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی۔ میرے جسم پر بھی کوئی لباس نہیں تھا۔ میں متوحش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بستر کی چادر مسلی اور سمٹی ہوئی تھی۔ میرے اور اس عورت کے کپڑے پلنگ کی پائنتی کی طرف پڑے تھے۔

وہ عورت نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بھرپور جوان عورت تھی۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔

"ہیلو!" وہ بیڈ کے بالکل قریب آ گئی۔

"تت۔۔۔ تم۔۔۔" میں نے جلدی سے بستر کی چادر اپنے اوپر لپیٹ لی "تم یہاں کیسے۔ میرا مطلب ہے' اندر کیسے آئیں؟" میں بری طرح بدحواس ہو رہا تھا اور میرے منہ سے ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"حیرت ہے۔" اس نے میری طرف جھکتے ہوئے جواب دیا "تم خود مجھے ساتھ لے کر آئے تھے۔ دو گھنٹے میں تمہارے بستر پر لیٹی رہی اور اب تم پوچھ رہے ہو کہ میں اندر کیسے آئی!"

"جھوٹ بکتی ہو تم۔" میں چھلانگ لگا کر بستر سے اتر گیا اور پتلون اٹھا کر پہننے لگا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ بڑی زبردست سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ یہ بس میں میری ہم سفر ضرور تھی مگر سفر کے دوران میں ہم دونوں میں چند عام سے جملوں کے تبادلے کے سوا کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی اور پھر پوکھارا پہنچ کر ہمارے راستے الگ ہو گئے تھے۔ اس وقت جب اس عورت نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کی پیشکش کی تھی تو مجھے اسی وقت اس پر شبہ ہوا تھا اور اب یہ شبہ درست نکلا تھا۔ بس اسٹاپ پر اگرچہ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے مگر اس نے مجھے تلاش کر لیا تھا لیکن مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ میرے بند کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھی اور کیا کہہ رہی تھی؟ وہ دو گھنٹے میرے ساتھ بستر پر لیٹی رہی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ مجھے خود خبر نہیں تھی۔ کیا میں اپنے آپ سے اتنا غافل ہو گیا تھا کہ اپنے اوپر گزرنے والے اتنے بڑے حادثے کی خبر تک نہیں ہو سکی تھی!

نہیں نہیں۔ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ دھوکے باز عورت تھی اور مجھے کسی چکر میں پھنسانا چاہتی تھی۔

میں نے پتلون پہن کر چادر ایک طرف پھینک دی اور بیڈ پر سے اس کے کپڑے اٹھا کر اس کی طرف اچھال دیے۔

"میں نہیں جانتا کہ تم نے میرا سراغ کس طرح لگایا اور کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھیں۔ اب یہ لباس پہنو اور نکل جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

"تم مجھے پولیس کے حوالے کرو گے۔" اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر اچانک ہی مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں اس افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی اور نکیلے ناخنوں سے مجھے نوچنے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے' خود سے الگ ہٹا کر بستر پر پھینک دیا۔ وہ پھر اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔

اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ سناٹے میں چیخوں کی آواز سن کر گیسٹ ہاؤس کے لوگ جاگ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد راہداری میں شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا' اس عورت نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کے بارے میں بتانے لگی۔ دو تین آدمی اندر گھس آئے۔ ایک آدمی نے چادر اٹھا کر عورت پر ڈال دی جسے اس نے اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور رو رو کر اپنی مظلومیت جتانے لگی۔

اور تب یہ انکشاف ہوا کہ پنکھی نامی وہ عورت بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں میرے ساتھ والے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یہ اس وقت گیسٹ ہاؤس میں آئی تھی جب کھانے سے پہلے میں اپنے کمرے میں لیٹا آرام کر رہا تھا۔

پنکھی رو رو کر لوگوں کو بتا رہی تھی کہ وہ آج ہی کھٹمنڈو سے آئی ہے۔ میں بھی اسی بس میں سفر کر رہا تھا۔ میں نے راستے میں بھی اسے پٹانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے مجھے دھتکار دیا تھا۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ بدمعاش بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہے تو میں کبھی یہاں نہیں آتی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی "تھوڑی دیر پہلے کسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے گھٹن سی محسوس ہونے لگی۔ میں تازہ ہوا کے لیے کمرے سے باہر نکلی تو اسی وقت یہ بدمعاش بھی اپنے

کمرے سے نکلا تھا۔ مجھے یہاں دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے پہلے بس میں سفر کے دوران میں اپنے رویے کی معافی مانگی اور مجھے بہلا پھسلا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں اس وقت بد حواسی کا شکار تھی۔ کسی سے باتیں کرکے اپنی گھبراہٹ دور کرنا چاہتی تھی۔ میں اس پر اعتماد کرتے ہوئے کمرے میں آگئی اور اس نے میرا جو حشر کیا ہے وہ آپ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ میں تو اپنے پتی (شوہر) کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔"

"یہ جھوٹ بولتی ہے۔" میں نے چیخ کر کہا "یہ بس میں میری ہم سفر ضرور تھی لیکن میں نے اس سے کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی۔ میں سو رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم' یہ میرے کمرے میں کس طرح داخل ہوئی تھی۔ کسی آہٹ سے میری آنکھ کھلی تو یہ....."

"مار و اسے۔ سالا حرامی۔" ایک آدمی چیخا "یہ باہر سے آنے والے لوگ ہماری عورتوں کو لوٹ کا مال سمجھتے ہیں۔ مار و اسے۔"

اور پھر دو تین آدمی مجھ پر پل پڑے۔ میں اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ کچھ لوگ مجھے بچانے کے لیے بھی لپکے تھے لیکن اس وقت تک میری ٹھیک ٹھاک دھنائی ہو چکی تھی اور پھر کسی نے مشورہ دیا کہ مجھے پولیس کے حوالے کردیا جائے۔

پولیس کو فون کردیا گیا اور ایک گھنٹے بعد میں تھانے میں موجود تھا۔ یہاں بھی ہر پولیس والا حسب توفیق میری تواضع کرتا رہا۔

وہ عورت بھی چند دوسرے لوگوں کے ساتھ تھانے آئی تھی۔ اسے تو گیسٹ ہاؤس واپس بھیج دیا گیا لیکن اس بات کا پابند کردیا گیا کہ پولیس کی اجازت کے بغیر وہ گیسٹ ہاؤس نہیں چھوڑے گی اور مجھے حوالات میں بند کردیا گیا کہ میری قسمت کا فیصلہ آفیسر انچارج ہی کرے گا جو اس وقت اپنے گھر پر سو رہا تھا۔

میں حوالات کی کوٹھری میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا اس نئی صورت حال کے بارے میں سوچتا رہا۔ شاید میری قسمت ہی روٹھ گئی تھی جو کچھ عرصے سے میں اسی طرح مصائب کا شکار ہو رہا تھا۔ پولیس سے پٹنا تو گویا ایک معمول بن چکا تھا۔

میں پنکھی نامی اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ چند گھنٹوں کا سفر ہی قیامت بن گیا تھا لیکن میں نہیں سمجھ سکا کہ پنکھی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ اس قسم کی عورتیں عام طور پر پیسے کے لیے مردوں کو پھانستی ہیں۔ اس نے بھی مجھے تاک لیا تھا اور کسی طرح سراغ لگا لیا تھا کہ میں کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔

کمرے میں میرا رویہ دیکھ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ مجھ سے اسے کچھ نہیں ملنے کا۔ میرے ڈانٹنے پر اس نے شور مچا کر لوگوں کو جمع کرلیا۔ ایک جھوٹی کہانی سنا کر خود تو مظلوم بن گئی اور لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرلیں اور میں سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اپنی تقدیر کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔

انسپکٹر صبح چھ بجے کے قریب تھانے میں آیا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کے سامنے پیش کردیا گیا۔

انسپکٹر کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ وہی انسپکٹر تھا جو سمبا اور اس کے ساتھیوں کی رہائش و خوراک کا انتظام کرنے کے سلسلے میں میرے ساتھ رہا تھا۔ میں نے تو فوراً ہی اسے پہچان لیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا کیونکہ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس وقت میرا حلیہ بہت بگڑا ہوا تھا۔ شیو اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور میرا لباس بھی مختلف تھا۔

میں انسپکٹر کے سامنے کھڑا تھا اور وہ خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ قریب کھڑا ہوا سب انسپکٹر اسے میرے جرم کی تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

"تم نے مجھے پہچانا نہیں آفیسر۔ میں ہمت سنگھ ہوں۔" بالآخر میں نے اسے یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نام سنا ہوا ہے۔" وہ غرایا "پہلے کس جرم میں پکڑے گئے تھے؟"

"میں انسپکٹر بریندرا کا دوست ہوں۔" میں نے کہا "تمہیں یاد ہوگا' چند مہینے پہلے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ میرے ساتھ کچھ قبائلی لوگ....."

"اوہ تم.....!" وہ اچھل پڑا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا "لیکن یہ کیا قصہ ہے۔ کیا واقعی یہ درست ہے؟"

"یہ سب جھوٹ ہے آفیسر۔" میں نے کہا اور پھر اسے پنکھی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"وہ عورت کہاں ہے؟" میری بات ختم ہونے پر اس نے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

"گیسٹ ہاؤس میں سر۔" سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

"اسے لے کر آؤ اور پہلے ٹھنڈا پانی اور چائے بھجواؤ۔" انسپکٹر نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔

سب انسپکٹر سلیوٹ کرکے فوراً ہی باہر نکل گیا۔ انسپکٹر نے مجھے کرسی پر بٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد چائے اور جگ میں ٹھنڈا پانی آگیا۔ میں نے دو گلاس پانی پیا اور پھر بے تکلفی سے چائے کا کپ اٹھالیا۔ انسپکٹر بھی اپنا کپ اٹھا کر چسکیاں لے رہا تھا۔ ہم پہلے بریندرا کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر انسپکٹر نے پہاڑوں میں سمبا اور اس کے ساتھیوں پر حملے کا ذکر چھیڑ دیا۔ میں نے اسے بتایا کہ سمبا زندہ ہے اور کھٹمنڈو میں ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سب انسپکٹر پنکھی کو لے آیا۔ مجھے کرسی پر بیٹھے دیکھ کر اس کا چہرہ دھواں ہوگیا۔

"اس سے پوچھو کیا قصہ ہے؟" انسپکٹر نے اپنے ماتحت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جب تک یہ سچ نہ اگلے اس پنکھی کو پنکھے کے ساتھ الٹا لٹکا کر پنکھا چلائے رکھو۔"

"میں۔ میں بتاتی ہوں سر۔ سب..... سب کچھ بتا دوں گی۔" پنکھی نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ پولیس کی مار کے خوف سے ہی کانپ اٹھی تھی۔

پنکھی کے کہنے کے مطابق وہ ایک طوائف تھی۔ گزشتہ روز صبح پانچ بجے ایک آدمی اس کے گھر پر آیا تھا اور ایک بڑی رقم دے کر اسے اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ مجھے لوگوں کے سامنے ذلیل کرے گی اور مجھے پوکھارا سے آگے جانے سے روکے گی۔ مجھے کسی ایسے معاملے میں الجھا دے گی کہ میں زیادہ سے زیادہ دن یہاں پھنسا رہوں۔

وہ شخص بس اسٹاپ تک اس کے ساتھ آیا تھا اور یہاں آتے ہی اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔ میں اس وقت بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دور سے میری نشان دہی کرکے چلا گیا تھا۔

پنکھی نے بس میں سفر کے دوران میں پہلے میرا بیگ چوری کروایا۔ ایک چھوٹی سی بستی میں بس رکی۔ کچھ مسافر اپنا سامان لے کر اترے تو پنکھی نے میرا بیگ بھی نیچے پھینک دیا۔ لوگ یہی سمجھے کہ وہ بیگ اترنے والے مسافروں کے سامان میں شامل ہے۔

پوکھارا پہنچ کر اس نے مجھ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوسکی اور چھپ کر میرا پیچھا کرتی رہی۔ اس نے بھی اسی گیسٹ ہاؤس میں کمرا لے لیا اور اس خیال سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی کہ میری نظروں میں نہ آجائے۔

اتفاق سے اسے میرے ساتھ والا کمرا ملا تھا۔ آدھی رات کے وقت جبکہ گہرا سناٹا تھا' وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ میں نے سونے سے پہلے دروازے کا ہینضی قفل اندر سے لاک کرلیا تھا۔ اس نے ہیئر پن کی مدد سے باہر سے لاک کھول لیا اور اندر آگئی۔

میں تھکا ہوا تھا اور گہری نیند میں تھا۔ اس نے کلورو فارم میں بھیگا ہوا رومال میری ناک کے سامنے لاکر فوراً ہی ہٹالیا۔ مجھے آہستگی سے ہلا کر دیکھا اور میرے کپڑے اتار کر ایک طرف ڈال دیے اور خود بھی کپڑے اتار کر میرے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔

کلورو فارم کا صرف اتنا اثر ہوا تھا کہ میں تقریباً دو گھنٹوں تک اتنا غفیل رہا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر آہٹ پیدا کی اور کھڑکی کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق میں اسے کمرے میں دیکھ کر بد حواس ہوگیا اور اس کے بعد وہی ہوا جو وہ چاہتی تھی لیکن یہاں بازی پلٹتی دیکھ کر وہ خود بد حواس ہوگئی۔

اس نے اس شخص کا جو حلیہ بتایا تو میں اچھل پڑا۔ اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ وہ پنڈت دھیراج تھا جو خود تو میرے قریب نہیں آسکا تھا لیکن مجھے روکنے کے لیے اس نے ایک طوائف کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ مجھے گومپو بدھ عبادت گاہ جانے سے روکنا چاہتا تھا لیکن شاید میرے اندر کی قوتیں بھی میری حفاظت کر رہی تھیں۔

اس روز بہرحال' میں اپنے سفر پر روانہ نہیں ہوسکا۔ میں سب انسپکٹر کے ساتھ گیسٹ ہاؤس واپس آگیا۔ لوگوں کو جب اصل بات کا پتا چلا تو انہوں نے مجھ سے اپنے رویے کی معافی مانگی اور پنکھی کو برا بھلا کہنے لگے۔

میں ناشتا کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔ کچھ ہی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔

دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ دروازہ اس طرح دھڑ دھڑایا جا رہا تھا کہ اگر کچھ دیر مزید نہ کھولا گیا تو اسے توڑ دیا جائے گا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔

"کوئی نئی مصیبت؟"

میں بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو ایک نہیں' دو مصیبتوں کو دیکھ کر میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ انہیں دیکھ کر حقیقتاً میرے اوسان خطا ہوگئے تھے۔

وہ شوبھا اور دھنو تھیں۔

وہ دونوں مجھے دھکیلتی ہوئی اندر آگئیں اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئیں۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور راہداری میں کھڑے ہوئے لوگ ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"کیا تم ہم سے تنگ آگئے ہو جو اس طرح چوری چھپے وہاں سے بھاگ گئے تھے۔" شوبھا نے میری پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم ہمیں چھوڑنے کا خیال دل میں لا سکتے ہو لیکن ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا؟" دھنو کا لہجہ رو دینے والا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ دیر تک مجھ سے لپٹی رہیں پھر مجھے بیڈ پر دھکیل دیا۔

"دھنو۔ تم اس کی اچھی طرح خبر لو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" شوبھا یہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

اس کی واپسی میں تقریباً دس منٹ لگے تھے۔ اس نے ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا جسے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک کرسی پر ڈال دیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد گیسٹ ہاؤس کی ایک ویٹرلیس چائے لے آئی۔ چائے کے لیے شوبھا کہہ کر آئی تھی۔

وہ دونوں بڑے پرجوش انداز میں گلے شکوے کر رہی تھیں کہ میں انہیں چھوڑ کر کیوں چلا آیا تھا؟

"لیکن تم لوگوں کو میرے بارے میں پتا کیسے چلا اور سیدھی یہاں کیسے آ گئیں؟" میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"عورت کے آنسوؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے ہمت سنگھ جی۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اس رات بریندرا نے دعوت کی تھی۔ اگلے روز تم غائب ہو گئے تو مجھے شبہ ہوا۔ کل رات میں نے بریندرا کو گھیر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تمہارے پروگرام سے واقف ہے۔ پہلے تو وہ انکار کرتا رہا پھر میرے آنسو دیکھ کر وہ پگھل گیا۔ اس نے بتا دیا کہ تم کہاں جا سکتے ہو۔ اس نے ہمارے لیے گاڑی کا بندوبست کر دیا اور صبح سویرے دو آدمیوں کے ساتھ اس طرف روانہ کر دیا۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"ہمارے ڈرائیور نے عقل مندی یہ کی کہ یہاں آتے ہی سب سے پہلے اس نے مقامی پولیس اسٹیشن سے رابطہ کیا۔ وہ کچھ اور معلومات بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اس پولیس اسٹیشن سے تمہارے بارے میں معلوم ہو گیا اور ہم سیدھے یہاں چلے آئے لیکن تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ کس سے مارپیٹ ہوئی تھی؟"

"ایک عورت سے۔" میں نے جواب دیا اور پھر اسے گزشتہ رات کے بارے میں بتانے لگا۔

"کون ہے وہ۔ مجھے بتاؤ۔ میں اس کی ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گی۔ تم پر ایسا شرمناک الزام۔۔۔" شوبھا بھڑک اٹھی۔

"وہ پولیس کی حراست میں ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن قصور اس کا بھی نہیں ہے۔ وہ خود بھی شیطانی قوت کے زیر اثر تھی۔ یہ ساری شرارت دراصل پنڈت دھیراج کی تھی جو مجھے آگے جانے سے روکنا چاہتا تھا۔"

"لیکن تم کون سے خزانے کی تلاش میں جا رہے ہو جو وہ تمہیں روکنا چاہتا ہے؟" شوبھا بولی۔

"وہ خزانہ ہی ہے۔ دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ۔ نیلگری جس کے لیے یہ جنگ لڑی جا رہی ہے۔" میں نے جواب دیا "میں اسی لیے تم لوگوں کو بتائے بغیر گھر سے نکلا تھا۔ یہ ایک خطرناک مہم ہے۔ اس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ تم لوگوں نے میری خاطر پہلے ہی بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ۔۔۔"

"تم ہمیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔" اس مرتبہ دھنو نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے دھنو کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔

میرے لیے اب مجبوری یہ تھی کہ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں ان سے چوری چھپے نکلا تھا اور وہ میرے پیچھے چلی آئی تھیں۔ اگر میں آگے جا چکا ہوتا تب بھی وہ میرا پیچھا کرتیں۔ انہیں کچھ سمجھانے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ پورا دن ہم نے کمرے ہی میں گزارا۔ گیسٹ ہاؤس میں ایک بھی کمرا خالی نہیں تھا۔ میں نے بوڑھی مالکہ سے کہہ دیا کہ ہم تینوں اسی ایک کمرے میں رہ لیں گے۔ وہ اضافی کرایہ وصول کر لے۔

شام کو ہم شہر کی سیر کو نکل گئے۔ اس دوران میں ضرورت کی کچھ اور چیزیں بھی خرید لی گئیں۔ ایک دکان پر خریداری کے دوران میں مجھے ایک بہت اچھا خنجر نظر آ گیا۔ اس خنجر کے ایک طرف دھار تھی اور دوسری طرف باریک دندانے تھے۔ میں نے وہ خنجر خرید لیا۔ پنڈلی پر باندھنے والا چمڑے کا اسٹریپ بھی کہیں کھو چکا تھا۔ ایک جفت ساز کی دکان پر بیٹھ کر میں نے اپنی مرضی کے مطابق اسٹریپ بھی بنوا لیا اور خنجر کو اس میں اڑس لیا۔

رات کا کھانا بھی ہم نے بازار کے ایک ریسٹورنٹ میں کھایا اور دس بجے کے قریب گیسٹ ہاؤس واپس آ گئے۔ اُس پولیس انسپکٹر اور چیف انسپکٹر کو لان میں بیٹھے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ چیف انسپکٹر مجھ سے اس طرح ملا جیسے سگا بھائی برسوں سے بچھڑا ہوا ہو۔ گیسٹ ہاؤس کی مالکہ، ملازمین اور دوسرے

لوگ عجیب سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

"شام کو فون پر بریندرا سے بات ہوئی تھی۔" چیف نے کہا "اس نے بتایا تھا کہ تم لوگ نیلگری کی طرف جانا چاہتے ہو۔ مجھے بتاؤ، میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کی محبت اور ہمدردی کا شکریہ ادا کر کے ٹال دوں لیکن اچانک ہی خیال آیا کہ دن بڑی تیزی سے گزرتے جا رہے ہیں۔ بسوں پر سفر کرنے میں مزید وقت ضائع ہوگا اس لیے اس کی پیشکش سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "ہماری منزل تو بہت دور نیلگری کی برف پوش چوٹیوں میں ہے لیکن تم تنت پیک تک جانے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔"

"تنت پیک۔ تمہارا مطلب ہے 'انا پورنا؟'" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "لیکن اگر کوئی مسئلہ۔۔۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹ دی "تم لوگ کب روانہ ہونا چاہتے ہو؟"

"کل صبح۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ صبح سات بجے گاڑی یہاں پہنچ جائے گی۔" چیف انسپکٹر نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی ہماری گفتگو کا موضوع بھی بدل گیا۔

چیف انسپکٹر، بریندرا کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں پرائمری اسکول سے کالج تک کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ پولیس میں بھی ایک ہی روز بھرتی ہوئے تھے۔ بریندرا کو ترقی کے لیے کئی مواقع ملے لیکن وہ کرسی پر بیٹھ کر کلرک کی طرح کام کرنے کے بجائے عمل و حرکت کو ترجیح دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایکشن میں رہنا پسند کرتا تھا اس لیے ہر مرتبہ اس نے پروموشن حاصل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ دونوں آدھی رات تک ہمارے پاس بیٹھے رہے اور پھر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئے۔

کمرے میں آ کر بھی ہم تینوں دیر تک جاگتے رہے۔ دھنو اور شوبھا پلنگ پر لیٹ گئیں اور میں سیٹی پر دراز ہو گیا اور پھر باتیں کرتے کرتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا تھا۔

صبح چھ بجے ہم اٹھ گئے۔ تیار ہو کر ناشتا کر رہے تھے کہ ہمیں لینے کے لیے گاڑی پہنچ گئی۔ وہ بہت شاندار فور وہیل ڈرائیو لینڈ کروزر تھی۔ پہاڑی اور ریگستانی علاقوں میں لمبے سفر کے لیے ایسی ہی گاڑیاں کامیاب رہتی ہیں۔ ڈرائیور کے ساتھ سادہ لباس میں ایک اور آدمی بھی تھا۔

رخصت ہوتے وقت جب میں بل کی ادائیگی کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو بوڑھی مالکہ نے بل لینے سے انکار کر دیا۔

"ہم چیف کے مہمانوں سے بل وصول نہیں کر سکتے۔" بوڑھی مالکہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میرے اصرار کے باوجود اس نے بل نہیں لیا۔

شوبھا اور دھنو گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی جس پر میں بیٹھ گیا۔ دوسرا آدمی سب سے پیچھے والی سیٹ پر تھا۔

گاڑی حرکت میں آ کر ہلکی رفتار سے شہر کی سڑکوں پر گھومنے لگی۔ دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہمارے محافظ راما نے ایک دو جگہوں پر گاڑی رکوا کر کچھ چیزیں خرید لی تھیں۔ آخری مرتبہ گاڑی شہر کے نواح میں ایک پیٹرول پمپ پر روکی گئی۔ گاڑی کا ٹینک فل کروانے کے علاوہ دس دس لیٹر کے پانچ کین بھی پیٹرول سے بھروا لیے گئے اور پھر گاڑی شہر سے نکل کر ہینگ جا کی طرف جانے والے ہائی وے پر دوڑنے لگی۔

سڑک کشادہ اور پختہ تھی۔ دیگر گاڑیوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ ہینگ جا کا فاصلہ اگرچہ زیادہ نہیں تھا لیکن مسلسل چڑھائی کی وجہ سے یہ فاصلہ دو گھنٹوں میں طے ہوا۔

ہینگ جا ایک بڑا قصبہ تھا۔ وہاں سے پختہ سڑک نوڈنڈا نامی قصبے کی طرف مڑ گئی تھی لیکن ہمیں جس طرف جانا تھا وہاں پکی سڑک نہیں تھی بلکہ اسے سڑک کہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ایک پتھریلا راستہ تھا جو پہاڑوں میں بل کھاتا ہوا بتدریج بلندی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے گاڑی کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں رہی تھی۔

پانچ بجے کے قریب ہم گھانا رنگ نامی بستی میں پہنچ گئے۔ یہاں سے ایک راستہ تنت پیک کی طرف چلا گیا تھا اور دوسرا گورے پانی کی طرف۔۔۔ یہ راستہ پہاڑوں میں بل کھاتا ہوا میلوں آگے گرم پانی کے چشموں کے علاقے سے ہوتا ہوا دھول گری کے پہاڑی سلسلے کی طرف چلا گیا تھا۔

آسمان پر بادل تو صبح ہی سے ہو رہے تھے۔ ہم گھانا رنگ پہنچے تو ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ بستی کے مکھیا نے ہمیں آگے جانے سے منع کر دیا۔ ان پہاڑی علاقوں میں بارش کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ یہ خوشگوار ہلکی بوندا باندی موسلا دھار طوفانی بارش میں بھی بدل سکتی تھی۔ تیز بارش میں پانی سیلابی ریلوں کی طرح بہنے لگتا تھا اور آمد و رفت کے

راستے بھی پانی میں ڈوب جاتے تھے۔ ایسے میں سفر جاری رکھنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

یورپین سیاحوں کی ایک اور پارٹی بھی یہاں رک گئی تھی۔ اس پارٹی میں دو عورتیں اور تین مرد شامل تھے۔ ان دور دراز پہاڑی راستوں پر یا تو وہ لوگ سفر کرتے تھے جو ان پہاڑوں میں واقع چھوٹی چھوٹی بستیوں میں آباد تھے یا مہمات کے شوقین غیر ملکی سیاح اور ان میں بھی زیادہ تر یورپین باشندے ہوتے تھے۔

اس چھوٹی سی بستی میں ظاہر ہے کہ کوئی سرائے یا ہوٹل نہیں تھا۔ یورپین سیاحوں کو ایک مکان میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ہمیں بھی ایک مکان میں پہنچا دیا گیا جو صرف دو کمروں پر مشتمل تھا۔ یہاں ایک بوڑھا کاشت کار اپنی بیوہ بیٹی کے ساتھ رہ رہا تھا جس کی عمر پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔

ایک کمرے میں وہ باپ بیٹی رہ رہے تھے۔ دوسرا ہمیں دے دیا گیا۔ ڈرائیور اور راما نے لینڈ کروزر ہی میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

رات کا کھانا شام ہونے سے پہلے ہی کھالیا گیا تھا۔ بوڑھے کی بیٹی نے چاول ابال لیے تھے۔ کھانے کی کچھ چیزیں ہمارے پاس بھی تھیں۔ ہم نے ان میں سے کچھ چیزیں بوڑھے کے حوالے کردیں اور کچھ پیسے بھی دے دیے تھے۔ بوڑھا خوش ہوگیا۔

رات کو تقریباً دو گھنٹوں تک طوفانی بارش ہوتی رہی اور پھر آسمان اس طرح صاف ہوگیا جیسے کبھی بادلوں کا نام ونشان ہی نہ رہا ہو۔

صبح ہم نو بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوسکے تھے۔ یورپین سیاحوں کی وہ پارٹی ہم سے پہلے ہی روانہ ہوچکی تھی۔

اب ہمارا سفر خاصا دشوار ہوگیا تھا۔ جگہ جگہ برساتی نالے اب بھی زور و شور سے بہہ رہے تھے۔ کئی جگہ سڑک بھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایسی جگہوں پر ڈرائیور بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

ہمارا سفر دریائے موڈی کھولا کے ساتھ ساتھ جاری تھا۔ تقریباً پچاس میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں ہینکو نامی بستی میں ایک بار پھر رک جانا پڑا۔ یورپین سیاحوں کی پارٹی بھی وہاں رکی ہوئی تھی۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ بستی سے تقریباً ایک میل آگے ایک برساتی نالے کا پُل ٹوٹ گیا ہے اور جب تک نالے کا پانی نہیں اترے گا، ہم آگے نہیں جاسکیں گے۔

اس روز ہم ہینکو نامی اس بستی سے آگے نہیں جاسکے تھے۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر پھر بادل نمودار ہونے لگے اور ہم دعا مانگتے رہے کہ مزید بارش نہ ہو۔

شام کے قریب نالے کا پانی اترنا شروع ہوگیا لیکن اس وقت بھی وہ نالا پار کرنے کی کوشش کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

وہ رات بھی ہم نے اس بستی میں گزاری۔ صبح ہم جلدی اٹھ گئے۔ یورپین سیاحوں کی پارٹی بھی روانگی کے لیے تیار ہورہی تھی اور پھر ہم لوگ تقریباً اکٹھے ہی روانہ ہوئے تھے۔ ایک میل آگے وہ نالا تھا جس کا پُل ٹوٹا ہوا تھا۔ پُل سے بائیں طرف تقریباً سو گز کے فاصلے پر نالے کا پاٹ بہت چوڑا تھا جس میں بہت ہلکا پانی بہہ رہا تھا۔

یورپین سیاحوں کی گاڑی نالے میں اتری تو ہم نے بھی اپنی گاڑی اس کے پیچھے ہی ڈال دی۔ اگر میدانی علاقہ ہوتا تو کیچڑ میں نالا پار کرنا مشکل ہوجاتا مگر یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ نالے کی تہ میں بھی پتھر بچھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے یہ راستہ پار کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔

ہم اس وقت دریا کے کنارے کے بالکل ساتھ ساتھ سفر کررہے تھے۔ راستہ بڑا خطرناک تھا۔ ایک طرف ساٹھ ستر فٹ نیچے ڈھلان میں دریا بہہ رہا تھا اور دوسری طرف سڑک کے بالکل ساتھ ساتھ ہزاروں فٹ بلند سنگلاخ چٹانیں تھیں۔ وہ راستہ بھی اتنا چوڑا تھا کہ دو گاڑیاں بمشکل ایک دوسرے کو کراس کرسکتی تھیں۔

یورپین سیاحوں کی ویگن بھی ہم سے تقریباً پچاس گز آگے جارہی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تین فٹ اونچے ستون سے لگے ہوئے تھے۔ ان سے آگے ڈھلان شروع ہوجاتی تھی جو دریا تک چلی گئی تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں اپنی سیٹ پر اچھل پڑا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ ہماری گاڑی کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ آگے جانے والی سیاحوں کی ویگن کا ایک ٹائر برسٹ ہوگیا تھا اور ویگن لہراتی ہوئی چٹان کی طرف کنارے پر رک گئی تھی۔

ہمارے سامنے نشیب تھا۔ اس دھماکے کی پرشور آواز سے ہمارا ڈرائیور بھی اس طرح اچھل کر بدحواس ہوا تھا کہ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ یہ ذرا سی غفلت خطرناک ثابت ہوئی اور گاڑی سڑک پر لہراتی ہوئی کنارے کے ایک ستون سے ٹکرا کر ایک دم مڑ گئی۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دھنو اور شوبھا بری طرح چیخنے

لگیں۔ آخری سیٹ پر بیٹھے ہوئے راما نے پچھلا دروازہ کھول کر چھلانگ لگادی۔

گاڑی، ڈرائیور سے بے قابو ہوکر تیزی سے دریا کی طرف ڈھلان پر اتر رہی تھی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ ڈھلان تقریباً پینتالیس کے زاویے پر تھی۔ اگر زیادہ عمودی ہوتی تو گاڑی اب تک قلابازیاں کھاچکی ہوتی۔

"گاڑی سنبھالو۔ بریک لگاؤ۔" میں چیخ اٹھا۔

ڈرائیور نے اسٹیئرنگ تو سنبھال لیا لیکن وہ اس قدر بدحواس تھا کہ اس نے بریک کے بجائے ایکسلی ریٹر پر پیر رکھ دیا۔ گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔

میں نے سامنے دیکھا اور میرے دماغ کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ پنڈت دھیراج دریا کے پانی پر اس طرح کھڑا تھا جیسے پختہ فرش پر کھڑا ہو۔ اس کے بدن پر مختصر سا لنگوٹ تھا اور سر پر پگڑی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کو اس طرح پھیلا رکھے تھے جیسے کسی کو آغوش میں لینے کو تیار ہو۔

میں نے سر جھکا کر ڈرائیور کے پیروں کی طرف دیکھا۔ میرے پیٹ میں ناف کے قریب گرہیں سی پڑنے لگیں۔ میرے اندر کی شکتی بیدار ہوگئی تھی۔ میری آنکھوں سے مقناطیسی لہریں سی خارج ہونے لگیں۔ ڈرائیور کا پیر ایکسلی ریٹر سے ہٹ گیا اور کلچ پلیٹ خودبخود آہستہ آہستہ نیچے دبنے لگی۔

گاڑی کی رفتار کم ہوگئی لیکن بہت دیر ہوچکی تھی۔ دریا کا پانی اب صرف چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سامنے دیکھا۔ پنڈت دھیراج اب بھی پانی کی سطح پر کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں اب وحشت سی ابھر آئی تھی۔ میں نے اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ہمارے درمیان اگرچہ تیس چالیس فٹ کا فاصلہ تھا لیکن لگتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے ایک ہاتھ کے فاصلے پر کھڑے ہوں۔

پنڈت دھیراج اس طرح لڑکھڑایا جیسے اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں وحشت پھیلتی چلی گئی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نہیں پانی نکل رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پانی میں دھنس رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے چیخ رہا تھا لیکن وہ آہستہ آہستہ پانی میں دھنستا رہا اور بالآخر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی پیلے رنگ کی پگڑی پانی کی سطح پر تیرتی رہ گئی تھی۔

میں نے پنڈت دھیراج کو اگرچہ اس کی شرارت کا مزہ چکھا دیا تھا لیکن وہ اپنا کام بھی کرگیا تھا۔

دھنو اور شوبھا کی چیخوں میں شڑاپ کی پرشور آواز کے ساتھ لینڈ کروزر پانی میں اتر گئی۔ ڈرائیور نے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگادی اور پانی میں ہاتھ پیر مارنے لگا۔

لینڈ کروزر میں پانی بھرنے لگا اور وہ آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگی۔ میں اپنی سیٹ پر سے چھلانگ لگا کر پیچھے آگیا۔

باہر پانی کے دباؤ کی وجہ سے میں بڑی مشکل سے دروازہ کھول سکا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی شوبھا باہر جاگری اور ہاتھ پیر مارتے ہوئے چیخنے لگی۔

شوبھا کو تیرنا نہیں آتا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے ہی چھلانگ لگادی اور شوبھا کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پیچھے دھکیل دیا۔

دھنو بھی گاڑی سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ وہ ایک ماہر تیراک تھی۔ میرے چیخنے پر اس نے شوبھا کو سنبھال لیا اور میں ڈرائیور کی طرف لپکا جو غوطے کھا رہا تھا۔

یورپی سیاحوں نے ہماری گاڑی کو ڈھلان پر اترتے اور پانی میں گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی ڈھلان پر دوڑے آرہے تھے۔ قریب پہنچ کر ایک جوان عورت اور ایک مرد نے دریا میں چھلانگ لگادی۔

وہ دونوں بھی اچھے تیراک تھے۔ ان کی مدد سے ہم ڈرائیور اور شوبھا کو آسانی سے دریا سے نکال لائے۔

شوبھا ٹھیک تھی۔ وہ محض خوف زدہ تھی۔ اسے یورپین عورت اور دھنو نے سنبھال لیا تھا۔ ڈرائیور نے اچھے خاصے غوطے کھائے تھے۔ اس کے پیٹ میں پانی بھر گیا تھا۔ یورپین آدمی جس نے اسے پانی سے نکالنے میں میری مدد کی تھی، اسے اوندھا لٹا کر اس کے پیٹ سے پانی نکالنے کی کوشش کررہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں حواس میں آسکے تھے۔ ڈرائیور کو اب راما نے سنبھال لیا تھا۔ شوبھا، دھنو کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

ہم سب دریا میں اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جہاں ہماری لینڈ کروزر گری تھی۔ گاڑی اب دریا کی تہ میں بیٹھ چکی تھی اور پانی کی سطح بالکل پرسکون تھی تاہم ہماری کچھ چیزیں پانی کی سطح پر تیر رہی تھیں۔ ان میں ہمارے وہ دونوں بیگ بھی شامل تھے۔

میں نے ایک بار پھر دریا میں چھلانگ لگادی اور وہ دونوں بیگ نکال لایا۔

ان سیاحوں کا تعلق فرانس سے تھا۔ وہ کوہ پیما تھے اور انا پورنا کی پہلی چوٹی سر کرنے جارہے تھے۔ انا پورنا بہت طویل پہاڑی سلسلہ تھا۔ اس کی چھ چھ چوٹیاں تھیں جن میں انا پورنا وَن سب سے زیادہ بلند (تقریباً چھبیس ہزار فٹ) تھی۔ اس چوٹی کو سر کرنے کے بعد وہ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کرتے۔

دریا کے کنارے پر کھڑے رہ کر گاڑی کا ماتم کرنا بے کار تھا۔ ہم ان یورپین سیاحوں کے ساتھ سڑک پر آگئے۔ ابھی تک انہوں نے اپنی گاڑی کا ٹائر تبدیل نہیں کیا تھا کیونکہ ٹائر برسٹ ہونے کے فوراً ہی بعد ہماری گاڑی کو حادثہ پیش آچکا تھا۔ سب لوگ اسے حادثہ ہی سمجھ رہے تھے لیکن میں اس کی اصلیت سے واقف ہوچکا تھا۔

گوتم بھوش' نیلگری کو حاصل کرنے کے لیے جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ہر صورت میں یہ جاپ پورا کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں اسے جاپ پورا نہیں کرنے دوں گا۔ اس نے مجھے روکنے کے لیے اپنے چیلے چھوڑ رکھے تھے۔ پنڈت دھیراج اس کا خاص چیلا تھا اور وہ مجھے ہر طرح سے روکنے کی کوشش کررہا تھا اور یہ بھی ایک ایسی ہی کوشش تھی۔ وہ ہمیں دریا میں غرق کردینا چاہتا تھا۔ وہ اگرچہ اپنی اس گھناؤنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا تاہم ہماری منزل کھوٹی کرنے میں کسی حد تک کامیاب ضرور رہا تھا۔

ویگن میں کوہ پیمائی کا سامان بھرا ہوا تھا۔ چھت پر بھی کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ پانچ افراد وہ تھے اور پانچ ہی ہم تھے لیکن کسی نہ کسی طرح ہمارے بیٹھنے کی گنجائش نکل آئی۔ میں نے پانی میں بھیگے ہوئے اپنے دونوں بیگ ویگن کی چھت پر رکھ دیے تھے۔

ہم بتدریج بلندی کی طرف جارہے تھے۔ سطح سمندر سے تقریباً اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع میلوں دور تک پھیلے ہوئے انا پورنا نیشنل پارک سے ہوتے ہوئے سہ پہر کے قریب ہم ٹنٹ پیک پہنچ گئے۔ انا پورنا سلسلۂ کوہ کی یہ پہاڑی چوٹی بھی سطح سمندر سے تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھی۔ اس کے دامن میں وہ بستی تھی جو ہماری منزل ٹھہری تھی۔ یہاں پر وہ سڑک بھی ختم ہوجاتی تھی۔ آگے تلکو جھیل یا نیلگری کی طرف جانے کے لیے کوئی باقاعدہ سڑک یا راستہ نہیں تھا۔

یہ بستی کافی بڑی تھی۔ انا پورنا نیشنل پارک کی سیر کرنے اور اس سلسلے کی بلند ترین چوٹی سر کرنے کے لیے غیر ملکی سیاح اس طرف آتے رہتے تھے اس لیے اس بستی میں سیاحوں کے لیے کچھ سہولتیں بھی موجود تھیں۔

اس بستی میں سرائے نما دو ہوٹل تھے۔ ایک سرائے میں ہمیں دو کمرے مل گئے۔ یورپین سیاح دوسری سرائے میں چلے گئے تھے۔ سرائے میں آتے ہی ہم نے بیگ کھول کر تمام چیزیں کھلی جگہ پر پھیلا دیں۔ کپڑوں سے ابھی تک پانی نچڑ رہا تھا۔

یہاں اچھی خاصی سردی تھی۔ ہمارے پاس وہی کپڑے تھے جو بھیگ چکے تھے لیکن ان میں بھی گرم کپڑا کوئی نہیں تھا۔ مختصر سے بازار کی ایک دکان سے ہمیں یاک کی کھال کی جیکٹس مل گئیں۔

اگلے روز ایک بس واپس جانے والی تھی۔ ڈرائیور اور راما کو واپس بھیج دیا گیا۔ میں نے کل شام ہی کو تلکو جھیل کے لیے کسی قافلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کردی تھی لیکن کوئی امید افزا خبر نہیں ملی تھی۔ صبح سرائے میں ناشتا کرتے ہی میں پھر اپنی اس مہم پر نکل کھڑا ہوا۔

کئی لوگوں سے رابطے کے بعد پتا چلا کہ دو دن بعد ایک قافلہ تلکو کی طرف روانہ ہونے والا ہے۔ مجھے رستوگی نام کے ایک آدمی سے رابطہ کرنے کو کہا گیا جو یہ قافلہ تیار کررہا تھا۔

رستوگی بستی کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھا ہوا مل گیا۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ عقیدے کے لحاظ سے وہ بُدھا کا پیروکار تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ کوئی تجارت پیشہ آدمی ہوگا جو ان اونچے پہاڑوں میں آباد چھوٹی چھوٹی بستیوں میں مال تجارت لاتا اور لے جاتا ہوگا لیکن اس کی باتوں سے انکشاف ہوا کہ وہ صرف رہنما تھا۔ ٹنٹ پیک سے انا پورنا کی بلند ترین چوٹی' تلکو جھیل اور مانانگ میں دریائے مارسیاندی کے کنارے پر واقع بارگو نامی ایک قدیم بُدھ عبادت گاہ تک جانے والے لوگوں کی رہنمائی کرتا تھا جس کے عوض اسے کچھ معقول معاوضہ مل جاتا تھا۔ اب یہ حالات پر منحصر ہوتا تھا کہ کس طرف جانے والا کوئی قافلہ پہلے تیار ہوتا ہے۔

اتفاق سے اس وقت تین افراد ایسے تھے جو تلکو جھیل کی طرف جانے کو تیار تھے۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر امریکی عورت تھی۔ وہ ایک مصنفہ تھی جو دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت پر کئی کتابیں لکھ چکی تھی۔ مارتھا نامی یہ عورت دو مہینوں سے نیپال کی سیاحت پر تھی اور پچھلے تین دنوں سے

اس بستی میں ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ تلکو جھیل سے ہوتے ہوئے مانانگ کی بارگو بُدھ عبادت گاہ جانا چاہتی تھی جہاں سے وہ بس کے ذریعے مکتی ناتھ نامی قصبے کا رخ کرتی۔ وہاں بھی بُدھ کی دو تین قدیم عبادت گاہیں تھیں۔ چند روز وہاں قیام کرنے کے بعد وہ مستانگ چلی جاتی جہاں دلچسپ رسموں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے علاوہ مستانگ کے راجا اور مہارانی سے ملاقات کرکے اپنی کتاب کے لیے مواد جمع کرتی۔

مارتھا کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ وہ ہندوستانی تھے۔ وہ دونوں مہم جو قسم کے آدمی تھے۔ طالع آزمائی ان کا پیشہ تھا۔ وہ ان علاقوں میں گھومتے رہتے تھے جہاں پہاڑوں میں قیمتی دھاتیں ملنے کی کچھ توقع ہوتی۔ ان کے خیال میں جھیل تلکو سے اوپر لوپرا رینج میں سونے کے ذخائر موجود تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کا سراغ لگا کر انہیں دریافت کیا جاتا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے سکم میں بھی سنگ نام کے پہاڑوں میں سونے کے ذخائر دریافت کیے تھے لیکن سکم کے مہاراجا نے انہیں انعام سے نوازنے کے بجائے جیل میں ڈال دیا تھا لیکن تین مہینوں بعد وہ کسی طرح جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔

رستوگی کے علاوہ ان تینوں سے بھی میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھی جلد سے جلد اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجانا چاہتے تھے لیکن رستوگی بضد تھا کہ کم از کم دس آدمی ہوں تو وہ روانگی کے لیے تیار ہوگا۔

وہ لوگ دو چار روز مزید انتظار کرسکتے تھے لیکن میں انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ گوتم بھوش کو جاپ پر بیٹھے ہوئے بائیس روز ہوچکے تھے اور اسے مکمل ہونے میں صرف اٹھارہ روز رہ گئے تھے اور یہ جاپ مکمل ہونے سے روکنا ضروری تھا۔ ایک طرف پنڈت دھیراج اور اس کے بیر (مؤکل' خبیث روح' بھوت وغیرہ) میرے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے اور دوسری طرف قدرتی طور پر بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہورہے تھے جن سے میرا وقت ضائع ہورہا تھا۔

اس رات میں نے مارتھا سے بھی ملاقات کی اور جسونت اور پریم چند نامی ان دونوں انڈین طالع آزماؤں سے بھی۔ جسونت چالیس کے لگ بھگ اور پریم چند پینتالیس کے قریب تھا۔ وہ دونوں دراز قامت اور کسرتی جسموں کے مالک تھے اور ان دونوں کے کردار کے بارے میں میرے ذہن نے کوئی اچھا تاثر قبول نہیں کیا تھا کیونکہ جب میں ان سے ملاقات کے لیے سرائے میں ان کے کمرے میں پہنچا تو دھنو بھی میرے ساتھ تھی۔ ان کے ساتھ اس وقت ایک مقامی قبائلی عورت بھی تھی جس کے بدن پر لباس برائے نام ہی تھا اور وہ دونوں شراب پیتے ہوئے اس کے ساتھ فحش حرکات کررہے تھے۔ دھنو کو دیکھ کر ان کی سرخ آنکھوں کی سرخی کچھ اور بھی گہری ہوگئی۔ میں نے رسمی گفتگو میں زیادہ وقت ضائع نہیں کیا اور دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد ہی اصل موضوع پر آگیا۔

"میری اطلاع کے مطابق آپ لوگ تلکو جھیل کے اس پار لوپرا رینج میں ایک ایسی مہم پر جارہے ہیں جس میں کئی ہفتے یا مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔" میں باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "اور تقریباً ایک مہینے بعد سردیوں کے موسم کا آغاز ہونے والا ہے۔ تند اور تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگتے ہیں جن سے برفانی طوفان کا خطرہ بھی رہتا ہے اس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اس بستی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے آگے جانے کی تیاری کی جائے؟"

"ہماری مہم سے تمہیں کیا دلچسپی ہے بھایا؟" جسونت نے جواب تو مجھے دیا تھا لیکن اس کی نظریں دھنو کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ہم بھی تلکو جھیل کی طرف جارہے ہیں۔" میں نے کہا "لیکن رستوگی کا کہنا ہے کہ جب تک قافلے میں دس افراد نہیں ہوں گے' وہ نہیں جائے گا۔ دو تم لوگ ہو' تین ہم اور ایک وہ امریکی عورت۔ اس طرح ہماری تعداد چھ ہوجاتی ہے۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "مزید چار افراد کے انتظار میں کئی روز بھی لگ سکتے ہیں اور اگر موسم کے تیور بگڑنا شروع ہوگئے تو....."

"حرج تو ہمارا بھی ہوگا۔ پر کیا کیا جائے۔ وہ کم بخت رستوگی تیار ہی نہیں ہوتا۔" پریم چند نے اپنے قریب کھاٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کی کمر میں بازو حمائل کرکے اپنی طرف کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی نظریں بھی دھنو کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"اگر تم لوگ چاہو تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیسے؟" اس مرتبہ جسونت نے پوچھا۔ میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگالیا تھا کہ وہ راجستھانی ہے۔

"اگر ہم لوگ مل کر مزید چار آدمیوں کا خرچ' میرا مطلب ہے فیس برداشت کرلیں تو رستوگی صبح ہی روانگی کے لیے تیار ہوجائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

اور پھر تقریباً آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ دونوں بات کرتے ہوئے بار بار دھنو کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے میری تجویز مان لی لیکن وہ اگلی صبح جانے کو تیار نہیں تھے البتہ اس سے اگلے روز کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔

اس سرائے سے نکل کر ہم مارتھا کے پاس پہنچ گئے جو ایک مقامی فیملی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس نے بھی میری بات سے اتفاق کیا اور اپنے حصے کی رقم دینے پر تیار ہوگئی۔

ایک گھنٹے بعد میں' دھنو اور مارتھا رستوگی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری تجویز سن کر اس نے بھی فوراً ہی آمادگی ظاہر کردی اور روانگی کی تیاری کے لیے کل کے دن کی مہلت مانگی۔

مجھے اطمینان ہوگیا۔ اگر جسونت اور مارتھا وغیرہ میری تجویز سے اتفاق نہ بھی کرتے تو میں اکیلا ہی رستوگی کو چار آدمیوں کی فیس ادا کرنے کو تیار ہو جاتا۔

اس رات کئی روز بعد میں نے نیلکری کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بہت ہی دھندلایا ہوا تھا۔

"وقت گزر رہا ہے۔" اس کی کمزور سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ اس شیطان کے قدم مضبوط ہو رہے تھے۔ میرے گرد بھی حصار مضبوط اور تنگ ہو رہا ہے۔ میری اپنی قوت سلب ہو رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا جاپ مکمل کرلے اور میں تمہاری دسترس سے نکل جاؤں۔"

نیلکری زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ وہ مجھے صرف اتنا یاد دلانے آئی تھی کہ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو اپنی سی بھرپور کوشش کر رہا تھا لیکن گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا تھا تو اس نے مجھے اپنے آپ سے دور رکھنے کے لیے کچھ بندوبست بھی کیا تھا۔ اس کے پاس بھی بہت سی پراسرار قوتیں تھیں اور اس کے بیر میرے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے تھے۔ میں ان رکاوٹوں کو توڑتا اور نقصان اٹھاتا بدستور آگے بڑھ رہا تھا۔

دوسرے دن ہم نے بھی کچھ مزید تیاری کرلی۔ تین عدد سلیپنگ بیگ کی خرید بھی اس تیاری میں شامل تھی۔ یاک کی کھال سے یہ سلیپنگ بیگ مقامی طور پر تیار کیے گئے تھے اور بڑی اچھی کوالٹی کے تھے۔

یہ کوئی بڑی بستی نہیں تھی جہاں سیر و تفریح میں وقت گزارا جاتا۔ زیادہ تر ہم سرائے میں اپنے کمرے تک ہی محدود رہے تھے۔

شام کو رستوگی سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس وقت مارتھا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ رستوگی نے بھی اپنی تیاریاں مکمل کرلی تھیں۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ ہم صبح سات بجے بستی کے مکھیا کے مکان سے ملحق ٹاؤن ہال کے سامنے پہنچ جائیں۔ یہ ٹاؤن ہال بھی دراصل مکھیا کے مکان ہی کا ایک حصہ تھا جہاں وہ اپنے دو نائبین کے ساتھ اس بستی کا نظام چلاتا تھا۔

ہم صبح سویرے ہی ٹاؤن ہال کے سامنے پہنچ گئے۔ اس وقت اچھی خاصی سردی تھی اس لیے ہم نے چمڑے کی جیکٹس بھی پہن لی تھیں۔

مارتھا بھی تقریباً ہمارے ساتھ ہی وہاں پہنچی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک بیگ تھا جسے اس نے اسٹرپ کی مدد سے پشت پر باندھ رکھا تھا۔

جسونت اور پریم چند ابھی تک نہیں پہنچے تھے۔ ان کو بلانے کے لیے ایک آدمی بھیجا گیا۔ ان دونوں کی وجہ سے ہم آدھے گھنٹے کی تاخیر سے روانہ ہوئے۔ ہمارے اس قافلے میں رستوگی کے علاوہ چھ افراد تھے جن کی سواری کے لیے خچروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ سامان کے لیے تین یاک تھے۔ اس سامان میں راشن اور پانی کے مشکیزوں کے علاوہ تین خیمے بھی تھے جو آسانی سے فولڈ ہو گئے تھے۔

اس قافلے میں سب سے آگے رستوگی تھا۔ اس کے پیچھے ہم تینوں کے خچر تھے۔ ہمارے ساتھ ساتھ یاک بھی چل رہے تھے اور آخر میں دو خچروں پر جسونت اور پریم چند تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ وہ مسلسل سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

شروع کے ایک دو میل تک تو ہم ایک ہموار پتھریلے میدان میں سفر کرتے رہے اور پھر چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ راستہ سنگلاخ چٹانوں میں بل کھاتا ہوا جا رہا تھا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف سفر کر رہے تھے۔

رستوگی نے بتایا تھا کہ تلکو جھیل تک دو دن کا راستہ ہے۔ کوئی ناگہانی حادثہ پیش آنے کی صورت میں سفر کی مدت میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔

صبح جب ہم ننٹ پیک سے روانہ ہوئے تھے تو آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن گیارہ بجے کے قریب بادل چھٹ گئے' آسمان صاف ہوگیا اور دھوپ چمکنے لگی۔ ہمارے عین سامنے اناپورنا کی ہزاروں فٹ بلند برف پوش چوٹیاں تھیں۔ دھوپ میں برف آئینے کی طرح چمک رہی تھی

جس سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

دوپہر دو بجے کے قریب ایک جگہ پر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ اس جگہ چند درختوں کا ذخیرہ بھی تھا اور پانی کا چشمہ بھی۔ اس وقت تک ہم نے صرف گیارہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ یاک اور خچروں کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ وہ گھاس چرتے رہے اور ہم بھی کھانا کھانے لگے۔ مارتھا ہمارے ساتھ تھی جبکہ جسونت اور پریم چند الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے بار بار ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

مارتھا بڑی ہنس مکھ اور خوش مزاج عورت ثابت ہوئی تھی۔ سفر کے دوران میں وہ ہمیں اپنی سیاحت کے قصے سناتی رہی۔

مارتھا کی عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ لمبا قد' سڈول جسم' بھوری رنگت کے بال' ہلکی نیلی آنکھیں اور چہرے کے نقوش بھی بڑے دل فریب تھے۔ مارتھا میں اس وقت بھی جوان لڑکیوں جیسی کشش تھی۔

ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ آگے ہم مسلسل نشیب کی طرف سفر کرتے رہے لیکن دو گھنٹوں بعد پھر چڑھائی شروع ہوگئی۔ راستہ بھی خاصا خطرناک تھا۔ ایک موقع پر تو جسونت اور پریم چند نے آگے جانے سے انکار کردیا۔ اس جگہ تقریباً پچاس گز تک راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ایک طرف عمودی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ۔ آٹھ دس فٹ چوڑے اس راستے پر چلنا صراط مستقیم پر چلنے کے مترادف تھا۔ جسونت اور پریم چند کا اصرار تھا کہ کوئی اور راستہ تلاش کیا جائے لیکن رستوگی کے کہنے کے مطابق میلوں دور تک کوئی اور راستہ نہیں تھا۔

اس خوفناک راستے پر چلتے ہوئے ہمیں بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ہم سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے چٹانوں کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خچر کی رسی پکڑ رکھی تھی۔

کسی حادثے کے بغیر ہم نے یہ صراط مستقیم پار کرلیا۔ اس کے بعد ہم مزید دو گھنٹوں تک اپنا سفر جاری رکھ سکے تھے۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا اور شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا۔

اس مرتبہ جس جگہ پڑاؤ ڈالا گیا اس جگہ کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں پہلے بھی کیمپ لگتے رہے ہیں۔ ایک چٹان کے پاس دو جگہوں پر پتھر رکھ کر چولھے بنائے گئے تھے کوئلے اور جلی ہوئی لکڑیاں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ ان چولھوں سے ذرا ہٹ کر سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ایک ڈھیر بھی لگا ہوا تھا۔

چاروں طرف بلند چٹانوں کے درمیان یہ چھوٹا سا میدان پڑاؤ کے لیے بڑی اچھی جگہ تھی۔ یہاں ایک چشمہ بھی تھا۔ رستوگی ایک یاک سے سامان اتارتے ہوئے بتا رہا تھا کہ وہ تلکو جھیل کی طرف جانے کے لیے ہمیشہ یہی راستہ اختیار کرتا ہے اور رات گزارنے کے لیے اس جگہ پڑاؤ ڈالا جاتا ہے۔ آخری مرتبہ وہ تین مہینے پہلے اس طرف آیا تھا۔

خیمے لگانے میں' میں بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ ہمارے اور مارتھا کے خیمے ایک چٹان کی آڑ میں قریب قریب لگائے گئے تھے جبکہ رستوگی اور جسونت وغیرہ کے خیمے وہاں سے کافی ہٹ کر لگائے گئے تھے۔

چاروں طرف بلند چٹانوں کی وجہ سے اگرچہ تیز ہوا رکی ہوئی تھی لیکن جیسے جیسے شام ڈھل رہی تھی' سردی کی شدت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

سامان اتارنے کے بعد یاک اور خچر کھلے چھوڑ دیے گئے۔ رستوگی پتھروں سے بنے ہوئے چولھے کے پاس لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ میں نے جسونت سے ماچس لے کر چولھے میں لکڑیاں جلا دیں اور دوسرے کاموں میں رستوگی کی مدد کرنے لگا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ تین چار مشعلیں جلا کر چٹانوں کی آڑ میں زمین میں گاڑ دی گئی تھیں۔ ان کی لرزتی ہوئی روشنی میں حرکت کرتے ہوئے ہمارے سائے بڑا پراسرار تاثر دے رہے تھے۔

رستوگی کھانا تیار کر چکا تھا۔ ابلے ہوئے چاول تھے اور یاک کا خشک گوشت جسے توے پر تل لیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران میں جسونت اور پریم چند بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ کھانے کے دوران میں' میں وہ بار بار دھنو اور مارتھا کی طرف دیکھتے رہے تھے۔

کھانے کے بعد رستوگی نے برتن وغیرہ دھو کر سمیٹ لیے اور چولھے پر لکڑیوں کا انبار ڈال دیا۔ الاؤ روشن ہوگیا۔ ہم الاؤ کے گرد بیٹھ کر گپیں ہانکنے لگے۔ مارتھا اس وقت بھی اپنی سیاحت کے قصے سنا رہی تھی۔

رستوگی ہم سے کچھ دور ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اونچی آواز میں ایک گیت الاپنا شروع کردیا۔ گیت کا مفہوم تو ہماری سمجھ میں نہیں آسکا لیکن اس کی آواز میں بڑا سوز تھا۔ چٹانوں میں بازگشت سی پیدا کرتی ہوئی اس کی پرسوز آواز بھی بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھی۔

رات گیارہ بجے کے قریب مارتھا اٹھ کر اپنے خیمے میں

چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد دھنو بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ دن بھر کے سفر کے دوران میں ان دونوں میں گہری دوستی ہوگئی تھی۔ مارتھا' دھنو سے اس کے قبیلے کے رسم و رواج کے بارے میں پوچھتی رہی تھی۔

الاؤ کے شعلے ختم ہوگئے تھے۔ اب صرف کوئلے دہک رہے تھے۔ جسونت اور پریم چند بھی اپنے خیمے میں چلے گئے' میں اور شوبھا کچھ دیر اور وہاں بیٹھے رہے پھر اپنے خیمے کی طرف آگئے۔ اپنے خیمے میں آنے سے پہلے میں نے مارتھا والے خیمے میں جھانک کر دیکھا۔ مارتھا مشعل کی روشنی میں ڈائری لکھ رہی تھی اور دھنو نیم دراز اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اپنے خیمے میں آگیا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ شوبھا اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گئی تھی۔ میں بھی اپنے بیگ میں گھس کر اس کے قریب لیٹ گیا۔ یہ سلیپنگ بیگ واقعی بڑے کام کی چیز ثابت ہوا تھا اور میں یہ بات بھی ضرور کہوں گا کہ ایسے شدید موسم میں سلیپنگ بیگ میں سونے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔

خچروں پر دن بھر کے سفر سے ہم سب بری طرح تھک گئے تھے۔ شوبھا تو لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ میری بھی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اور پھر چیخ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ نسوانی چیخ سناٹے میں بازگشت سی پیدا کرتی ہوئی معدوم ہوگئی۔ پہلے میں اسے اپنا واہمہ ہی سمجھا لیکن وہ چیخ دوبارہ سنائی دی تو میں بڑی تیزی سے سلیپنگ بیگ کی زپ کھول کر اٹھ گیا۔ شوبھا اب بھی گہری نیند میں تھی۔ میں خیمے کا پردہ ہٹا کر باہر نکل رہا تھا تو وہ چیخ تیسری مرتبہ سنائی دی۔

میں خیمے سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دائیں طرف چٹان کے قریب کچھ ہیولے ایک دوسرے سے گتھم گتھا نظر آرہے تھے۔ مارتھا والے خیمے کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اندر مشعل جل رہی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

میں نے ان ہیولوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ جسونت اور پریم چند تھے جو دھنو اور مارتھا کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ جسونت شاید دھنو کو گھسیٹتا ہوا چٹان کی دوسری طرف لے گیا تھا۔ میں مارتھا کو چھڑانے کے لیے پریم چند کی طرف لپکا تو فضا اچانک ہی فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی پریم چند کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ۔ آگے بڑھے تو گولی مار دوں گا۔"

میں رک گیا۔ پریم چند مارتھا کو گھسیٹتا ہوا چٹان کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ مارتھا مسلسل چیخ رہی تھی اور چٹان کی دوسری طرف سے دھنو کی چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔

اسی دوران میں رستوگی بھی اپنے خیمے سے باہر آگیا۔

"کیا ہوا۔ یہ کون چیخ رہا تھا؟" اس نے پوچھا۔ وہ پریم چند وغیرہ کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

"وہ دونوں بدمعاش مارتھا اور دھنو کو لے گئے ہیں۔ اس چٹان کے پیچھے۔" میں نے اسے بتایا۔

"تم اِس طرف سے آگے بڑھو۔ میں اُس طرف سے جاتا ہوں۔" رستوگی نے کہا اور چٹان کے ساتھ ایک طرف دوڑ گیا۔

میں بھی چٹان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ آڑ سے جھانک کر دیکھا تو وہ دونوں شیطان دھنو اور مارتھا کو کھینچتے ہوئے آگے والی چٹانوں کی طرف لے جا رہے تھے۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا' پریم چند نے فائر کر دیا۔ گولی میرے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے ایک پتھر کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور پتلون کا پائنچا اٹھا کر خنجر نکال لیا۔

"اگر تم نے آگے آنے کی کوشش کی تو ان دونوں عورتوں میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گی۔" پریم چند نے چیخ کر کہا "تم سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ کوئی آگے آنے کی کوشش نہ کرے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم ان دونوں عورتوں کو چھوڑ دیں گے۔"

میں پتھر کی آڑ میں دیکھتا رہا۔ جسونت کافی آگے تھا۔ پریم چند نے ایک ہاتھ دھنو کے گلے میں لپیٹ رکھا تھا اور وہ اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا الٹے قدموں پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔

چٹان کی دوسری طرف ایک ہیولا سا نمودار ہوا۔ وہ رستوگی تھا جو دوسری طرف سے انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں جسونت کی طرف بڑھ رہا تھا جو مارتھا کو گرفت میں لیے پچھلی چٹان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

رستوگی کا پیر کسی چھوٹے پتھر سے ٹکرایا۔ جسونت نے تیزی سے مڑ کر فائر کر دیا۔ رستوگی کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ وہ نیچے جھکتا چلا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے حیرت انگیز طور پر وہ ہوا میں اڑتا ہوا جسونت اور مارتھا پر گرا۔

مارتھا بھی ان کے ساتھ نیچے گری تھی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔ رستوگی اور جسونت گتھم گتھا ہوگئے۔

پریم چند ایک لمحے کو اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جگہ سے چھلانگ لگا دی۔ پریم چند نے بدحواس ہو کر فائر کر دیا لیکن بدحواسی میں

چلائی ہوئی گولی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔

میں ہوا میں اڑتا ہوا پریم چند سے ٹکرایا۔ وہ دھنو کو ساتھ لیتا ہوا پشت کے بل گرا۔ دھنو تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ پریم چند نے لوٹ لگا کر ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھ سے بچ نہیں سکا۔ سب سے پہلے میں نے اس کے دائیں کندھے کے جوڑ پر کھڑی ہتھیلی کا چوپ مارا۔ وہ چیخ اٹھا اور پستول بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور پھر میں نے اس پر دو تین اور وار کیے جو خاصے کاری ثابت ہوئے لیکن ایک موقع پر اس کا داؤ چل گیا اور اس نے مجھے اچھال کر دور پھینک دیا۔

میں پشت کے بل گرا۔ میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا تھا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا لیکن بالآخر اس کی گردن میری گرفت میں آگئی۔ میں نے سارا دباؤ اس کی گردن پر ڈال دیا۔

پریم چند اپنی گردن چھڑانے کے لیے پوری طاقت استعمال کر رہا تھا لیکن یہ میرا وہ داؤ تھا جس کے بارے میں' میں دعویٰ کر سکتا ہوں کہ کوئی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا۔

میں پریم چند کی گردن کو پے در پے جھٹکے دے رہا تھا لیکن سؤر کی طرح اکڑی ہوئی اس کی گردن میں معمولی سی لچک بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی لیکن میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ بھی آخر انسان ہی تھا اور گردن بھی لوہے کی تو نہیں تھی۔

"کڑک" کی ہلکی سی آواز ابھری۔ پریم چند بری طرح مچلا۔ اس کے حلق سے عجیب سی خرخراہٹ کی آواز نکل رہی تھی۔ میں نے ایک اور جھٹکا دیا اور پھر پے در پے جھٹکے دیتا چلا گیا۔ سؤر کی طرح اکڑی ہوئی گردن میں اب ربر جیسی لچک پیدا ہوگئی تھی۔ چند مزید جھٹکے دینے کے بعد میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ پتھروں پر' پانی سے نکالی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

اور پھر اسی وقت پے در پے فائرنگ کی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ تین گولیاں چلی تھیں اور اس کے ساتھ ہی پتھروں پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز بھی سنائی دی۔

میں نے اس طرف دیکھا۔ جسونت دوڑتا ہوا چٹانوں میں غائب ہوگیا تھا اور رستوگی بھی اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی اسی طرف دوڑ لگا دی۔

رستوگی رک گیا۔ جسونت کا پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"بھاگ گیا کم بخت۔ اب واپس آنے کی جرات نہیں کرے گا۔" رستوگی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "دوسرے حرامی کا کیا ہوا؟"

"ختم ہوگیا۔ اس کی لاش وہاں پڑی ہے۔" میں نے اس طرف اشارہ کیا۔

مارتھا اور دھنو بھی دوڑ کر ہمارے قریب آگئی تھیں۔ دھنو تو مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے مارتھا کو ہاتھ سے اپنی طرف کھینچ کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ خاصی خوف زدہ تھی۔

"وہ... وہ زخمی ہے۔ اسے گولی لگی ہے۔" مارتھا نے رستوگی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تھرتھراہٹ نمایاں تھی۔

میں فوراً ہی رستوگی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کے بائیں بازو میں گولی لگی تھی جو گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ یہ گولی رستوگی کو اس وقت لگی تھی جب اس نے چٹان کی آڑ سے نکل کر جسونت پر چھلانگ لگائی تھی۔

ہم تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کیمپ کی طرف آگئے۔ شوبھا اپنے خیمے کے سامنے بدحواس کھڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ہماری طرف لپکی۔ اس کی آنکھ' آخری تین گولیوں کی آواز سن کر کھلی تھی۔ اسے جب صورت حال کا پتا چلا تو وہ کچھ اور بدحواس ہوگئی۔

رستوگی کے زخم سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اسے مارتھا والے خیمے میں لے آئے۔ رستوگی کے سامان میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ میں دوڑ کر وہ کٹ نکال لایا۔ مارتھا فرسٹ ایڈ کی تربیت یافتہ تھا۔ اس نے زخم صاف کر کے بڑی مہارت سے ڈریسنگ کر دی۔ رستوگی اگرچہ بڑی بے نیازی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اس ٹھنڈے موسم میں کچھ دیر بعد یہ زخم اسے بے حال کر دے گا۔

میں نے اسے بستر پر لٹا کر اس پر تین چار کمبل ڈال دیے۔ مارتھا کے چہرے پر اب بھی خوف کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ بار بار ہمارا شکریہ ادا کر رہی تھی۔ دھنو بھی اپ سیٹ ہوگئی تھی۔ وہ شوبھا کے کندھے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس وقت ہم لوگ ان دونوں بدمعاشوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"یہ ہندوستانی لوگ بہت بُرے ہوتے ہیں۔" مارتھا کہہ رہی تھی "راجستھان میں بھی دو مرتبہ بدمعاشوں نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں مرتبہ تم جیسے شریف لوگوں نے مجھے بچایا تھا۔"

رستوگی نے بتایا کہ تقریباً ایک سال پہلے بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ بھی دو ہندوستانی ہی تھے جو قافلے میں شامل ایک فرانسیسی لڑکی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ ان

کا اگرچہ پیچھا کیا گیا تھا لیکن وہ دونوں مسلح تھے اور لڑکی کو گن پوائنٹ پر لے جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ دوسرے دن اس لڑکی کی لاش پہاڑوں میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اس پر بار بار مجرمانہ حملے کیے گئے تھے اور بالآخر اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کردیا گیا تھا۔ وہ دونوں بدمعاش پہاڑوں میں کہیں غائب ہوگئے تھے اور بعد میں بھی ان کا کوئی پتا نہیں چلا تھا۔

"جسونت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا وہ واپس آئے گا؟" میں نے پوچھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رستوگی بولا "اب وہ ہمارے قریب آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ ہوسکتا ہے، ہم سے دور رہ کر ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا ہو یا ممکن ہے' اکیلا ہی کسی طرف جانے کی کوشش کرے لیکن وہ ان اونچے پہاڑوں میں کھو کر رہ جائے گا۔ کوئی اجنبی ان پہاڑوں میں اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسے اب موت کی آغوش میں ہی پناہ ملے گی۔"

"اور اس کے ساتھی پریم چند کی لاش کا کیا کیا جائے۔" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"پڑی رہنے دو۔" رستوگی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا "اس کے جرم کی سنگینی کے پیش نظر اس کی لاش بھی ہماری کسی ہمدردی کی مستحق نہیں۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ان قبائلی علاقوں میں مرد اور عورت کے تعلقات کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ باہر سے آنے والے مرد بھی یہاں کی عورتوں سے ایسے تعلقات استوار کرتے ہیں تو اس پر بھی کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن ایسے تعلقات میں عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ عورت کی رضامندی کے بغیر اگر شوہر بھی ایسی کوئی کوشش کرتا ہے تو اسے بہت کڑی سزا دی جاتی ہے۔ ان دونوں نے بھی مارتھا اور دھنو کی مرضی کے خلاف ان کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی تھی۔ ایک اپنے انجام کو پہنچ گیا اور دوسرا بھاگ گیا لیکن میں جانتا ہوں' وہ ان پہاڑوں کی قید سے فرار نہیں ہوسکے گا۔ اسے بھی اپنے جرم کی سزا ضرور ملے گی۔"

اس بھگوڑے کے واپس آنے کا اگرچہ کوئی امکان نہیں تھا لیکن ہم بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ طے یہ ہوا کہ رستوگی اس خیمے میں سوجائے۔ مارتھا ہمارے خیمے میں دھنو اور شوبھا کے ساتھ سوجائے گی اور میں خیمے کے باہر بیٹھ کر پہرا دوں گا۔

دھنو تو مارتھا کے ساتھ خیمے میں چلی گئی اور شوبھا تین چار کمبل اٹھا کر میرے پاس آگئی۔ وہ اپنی نیند بڑی حد تک پوری کرچکی تھی اور میرے ساتھ پہرے داری کی ڈیوٹی دینا چاہتی تھی اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

سردی بہت شدید تھی۔ ہم نہ صرف اپنے اپنے سلیپنگ بیگز میں گھسے ہوئے تھے بلکہ اوپر دو دو کمبل بھی اوڑھ رکھے تھے اس کے باوجود سردی ہماری ہڈیوں میں اتری جارہی تھی۔ میں نے شوبھا کو زبردستی خیمے کے اندر بھیج دیا۔ اس نے جاتے ہوئے ایک اور کمبل میرے اوپر ڈال دیا تھا۔

وہ رات کا آخری پہر تھا۔ چٹانوں کی طرف سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ صاف لگ رہا تھا جیسے کوئی دبے قدموں چلنے کی کوشش کررہا ہو۔ رستوگی نے جسونت سے چھینا ہوا پستول مجھے دے دیا تھا۔ میں نے پستول والا ہاتھ سلیپنگ بیگ سے باہر نکال لیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں گھورنے لگا۔ وقفے وقفے سے چھوٹے چھوٹے پتھروں پر دبے قدموں چلنے کی آوازیں تو سنائی دیتی رہیں لیکن کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔ میں ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا کسی کے سامنے آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔

اور پھر ہلکی ہلکی غراہٹوں کی آوازیں سن کر میں چونک گیا۔ وہ آوازیں ایسی تھیں جیسے دو کتے ایک دوسرے پر غرا رہے ہوں۔ غراہٹوں کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دیتی رہیں۔ غراہٹوں کے ساتھ "چپڑ چپڑ" کی آوازیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھیڑیے تھے جو شکار کی بو سونگھ کر اس طرف آگئے تھے اور دعوت اڑا رہے تھے۔

ایک بار تو دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر اس طرف جاؤں لیکن پھر میں نے یہ خیال ذہن سے نکال دیا اور اپنی جگہ پر دبکا بیٹھا رہا۔

میں اگرچہ اپنی ریاضت کے سلسلے میں راتوں کو بھی جاگنے کا عادی تھا لیکن دن کی روشنی نمودار ہونے سے تقریباً ایک گھنٹا پہلے میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے شوبھا نے جگایا تو دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔

"اس طرف سے کچھ آوازیں آرہی ہیں۔" شوبھا نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے چٹان کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں۔ شاید بھیڑیے ہیں۔" میں نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی اچھل پڑا۔ کتوں کے غرانے اور "چپڑ چپڑ" کی آوازیں میں نے پہلے بھی سنی تھی لیکن اس وقت میرے دماغ پر غنودگی سی طاری تھی۔ مجھے یہ خیال تو آیا تھا کہ وہ کسی شکار پر دعوت اڑا رہے ہوں گے لیکن اس شکارے کے بارے

...نا میں نے نہیں سوچا تھا۔

میں نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹا دیے اور سلیپنگ ...گ میں سے نکل آیا اور شوبھا کو وہیں رکنے کا اشارہ کرکے ...ٹان کی طرف دوڑ پڑا۔ جسونت والا پستول میرے ہاتھ میں ...تا۔

چٹان کی دوسری طرف پہنچ کر میں اس طرح رک گیا ...ے زمین نے میرے پیر پکڑ لیے ہوں۔

آٹھ دس بھیڑیے پریم چند کی لاش کو نوچ رہے تھے۔ ...ھروں پر ہر طرف خون بکھرا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر ایک دو ...ھیڑیے خوں خوار انداز میں غرانے لگے۔ میں نے ان پر گولی ...لا دی۔ بھیڑیے چٹانوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے لیکن ...چھ دور جا کر رک گئے اور میری طرف دیکھنے لگے۔

میں چند گز آگے بڑھا تو پریم چند کی لاش دیکھ کر پیٹ پکڑ کر دہرا ہوگیا۔ میں بڑی مشکل سے قے ضبط کرسکا تھا۔ پریم چند کی لاش بری طرح نچی ہوئی تھی۔ چہرہ بھی مسخ ہوچکا تھا۔ پیٹ چاک تھا اور آنتیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔

میں نے لاش سے کچھ فاصلے پر پڑا ہوا پریم چند کا پستول اور اپنا خنجر اٹھایا اور ایک ہاتھ سے پیٹ دبائے دوڑتا ہوا واپس آگیا۔ چٹان کے قریب آکر مڑ کر دیکھا تو وہ بھیڑیے دوبارہ لاش پر حملہ آور ہوچکے تھے۔

میں کیمپ کی طرف آیا تو مارتھا اور رستوگی وغیرہ خیموں کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ فائر کی آواز سن کر جاگ گئے تھے۔

"کیا ہوا۔ گولی کس نے چلائی تھی؟" رستوگی نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"اس طرف کچھ بھیڑیے جمع ہیں۔" میں نے جواب دیا اور خیمے کے سامنے ٹنگا ہوا مشکیزہ پکڑ کر منہ سے لگالیا۔ ٹھنڈے پانی کے چند گھونٹ پینے سے میری حالت کسی حد تک سنبھل گئی۔ میں مشکیزہ بانس کے ساتھ ٹانگ کر خیمے کے اندر آگیا۔ وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی چلے آئے تھے۔ مجھے اچانک ہی سردی چڑھنے لگی۔ میں دو تین کمبل اوڑھ کر بستر پر لیٹ گیا۔

"کیا ہوا ہمت سنگھ۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" شوبھا بھی میرے قریب بیٹھ گئی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔ بس سردی چڑھ گئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اس وقت واقعی مجھے حیرت ہورہی تھی کہ ایک دم سے ایسی سردی کیوں چڑھ گئی تھی کہ میں تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ شوبھا نے ایک اور کمبل میرے اوپر ڈال دیا اور پھر وہ دھنوت پتھ کہتے ہوئے باہر چلی گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد شوبھا سب کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ اس وقت تک میں بھی اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال چکا تھا۔ گرم گرم چائے سے مجھے بڑا سکون ملا تھا۔

اس روز ہم دس بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوسکے تھے۔ اس وقت تک میں نے کسی کو بھی اس چٹان کی طرف نہیں جانے دیا تھا۔ میں اس لاش کے بارے میں جب بھی سوچتا' مجھے ابکائی سی آنے لگتی۔

آگے کا راستہ اور بھی خراب اور خطرناک تھا۔ ہماری رفتار بھی زیادہ تیز نہیں تھی۔ اس وقت ہم تقریباً بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع گنگا پورنا کے درّے میں سفر کررہے تھے۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی جو ہمیں مسلسل پیچھے دھکیل رہی تھی۔

درّے سے نکل کر چار بجے کے قریب ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ یہاں چٹانوں میں کئی چھوٹے چھوٹے غار تھے۔ رستوگی نے بتایا کہ اس طرف سفر کے دوران میں وہ عام طور پر دوپہر بارہ بجے کے قریب یہاں پہنچ جایا کرتے تھے لیکن آج تند و تیز مخالف ہوا کی وجہ سے چار گھنٹوں کی تاخیر سے پہنچے تھے۔

یہاں گھاس اور جھاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ چھوٹی چھوٹی پتیوں اور گنجان شاخوں والے درخت بھی تھے۔ خچروں وغیرہ کو درختوں کی شاخوں سے باندھ دیا گیا اور ہم لوگ ایک کشادہ غار میں آگئے۔

رستوگی کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد آگے روانہ ہوجائیں گے لیکن غار میں آکر ڈھیر ہوجانے کے بعد کسی میں سفر جاری رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی لہٰذا رات اسی غار میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا گیا۔

سردی کی وجہ سے رستوگی کا زخم تکلیف دینے لگا تھا لیکن وہ بڑی برداشت کا مظاہرہ کررہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹا آرام کرنے کے بعد شوبھا' دھنو اور مارتھا نے کھانا وغیرہ تیار کرنے کی ذمے داری سنبھال لی۔ غار میں ایک طرف خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کوئلے اور بجھی ہوئی لکڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ رستوگی نے بتایا کہ اس طرف سے گزرتے ہوئے وہ ہر پڑاؤ پر لکڑیاں جمع کرکے ڈال دیتا ہے تاکہ آئندہ کام آسکیں۔

آگ روشن ہوجانے کے بعد غار کے اندر کا درجہ حرارت بھی تبدیل ہونے لگا۔

کھانا ہم نے شام ہونے سے پہلے ہی کھالیا اور پھر کمبلوں میں دبک کر باتوں میں وقت گزارنے لگے۔ اس ویرانے میں ظاہر ہے چوری وغیرہ کا خطرہ نہیں تھا لیکن اس بھگوڑے جسونت کی وجہ سے ہم کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

جسونت خالی ہاتھ فرار ہوا تھا۔ ان کا سامان بھی ہمارے

ہی قبضے میں تھا۔ میں جسونت کے بارے میں سوچتا تو کانپ کر رہ جاتا۔ اس کے پاس وہی کپڑے تھے جو اس نے پہن رکھے تھے۔ شدت کی سردی میں گرم کپڑوں، جیکٹ اور کمبلوں کے بغیر رات گزارنے کا تصور ہی خوفناک تھا۔ ہو سکتا ہے وہ گزشتہ رات ہی سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا ہو اور اس کی لاش بھی بھیڑیے چٹ کر گئے ہوں۔

یا ممکن ہے اتنا سخت جان ہو کہ شدت کی یہ سردی برداشت کر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے، ہمارے بعد وہ کیمپ والی جگہ پر واپس آیا ہو اور ہمارے نقش قدم پر ہمارے پیچھے پیچھے آرہا ہو۔

انسان ہونے کے ناتے مجھے جسونت سے ہمدردی تھی۔ اس نے جو حرکت کی تھی وہ بہت بری تھی۔ اگر وہ سامنے آجاتا تو ممکن ہے میں اسے معاف کر دیتا لیکن کیا مارتھا اسے معاف کر دے گی جس کے اعتماد کو اس نے ٹھیس پہنچائی تھی اور جس کی عزت نفس کو مجروح کیا تھا؟ کیا رستوگی اسے معاف کر دے گا جس کی اس نے جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کا زخم تو ابھی تازہ ہی تھا۔

رات بیتتی رہی۔ میں کبھی اونگھنے لگتا اور کبھی چوکس ہو کر بیٹھ جاتا۔ جب بھی میری آنکھ کھلی تھی، میں نے رستوگی کو جاگتے ہوئے پایا تھا۔ وہ ایک شریف النفس اور ذمے دار شخص ثابت ہوا تھا۔ کل والے واقعے کے بعد وہ باتوں ہی باتوں میں کئی بار کہہ چکا تھا کہ اسے جسونت اور پریم چند جیسے بدمعاشوں کو قافلے میں شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

اس سفر کے دوران میں، میں گوتم بھوش کی طرف سے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ اس کے بیر اگرچہ راستے میں آتے رہے تھے لیکن اس حوالے سے میں بھی اپنے پیروں پر مضبوط تھا اس لیے کسی کو قریب آنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

اس رات کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ مارتھا وغیرہ بھی سکون سے گہری نیند سوئی رہی تھیں۔ صبح ناشتے کے بعد مارتھا نے سب سے پہلے رستوگی کا زخم چیک کیا۔ ڈریسنگ تبدیل کی اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ہم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب صرف پانچ چھ گھنٹوں کا سفر رہ گیا تھا۔

پہلے چار گھنٹے تو سفر میں بہت دشواری پیش آئی لیکن پھر مشکلیں پیش آنے لگیں۔ ایک موقع پر ہمارا ایک یاک کھڈ میں لڑھک گیا۔ وہ راستہ بہت تنگ سا اور جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا۔ اچانک ہی خرگوش کی طرح کا کوئی چھوٹا جانور جھاڑیوں سے نکل کر بھاگا تو ایک یاک اور دو خچر بدک گئے۔ خچر تو سنبھل گئے لیکن یاک کھڈ کے بالکل کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے پیروں کے نیچے سے پتھر نکل گیا اور وہ عمودی ڈھلان پر لڑھکتا ہوا سیکڑوں فٹ گہرے کھڈ کی تہ میں پہنچ گیا۔

اس یاک پر دو خیمے اور ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں لدی ہوئی تھیں۔ یاک سمیت سب کچھ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہاں کھڑے رہ کر ماتم کرنا بے کار تھا اس لیے ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔

ہم صبح دس بجے روانہ ہوئے تھے۔ دو بجے کے قریب ایک جگہ پڑاؤ ڈال دیا۔ آگے تقریباً دو گھنٹوں کا سفر رہ گیا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ رکے بغیر سفر جاری رکھا جائے لیکن دھنو اور مارتھا وغیرہ خچروں کی پشت پر مسلسل چار گھنٹوں کے سفر سے بری طرح تھک گئی تھیں اور کچھ دیر آرام کر لینا چاہتی تھیں۔

اس پڑاؤ کے دوران میں ہم نے کھانا بھی کھایا اور آرام بھی کر لیا۔ چار بجے ہم نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد چٹانوں میں تنگ اور پر پیچ راستوں سے گزرتے ہوئے ہم جیسے ہی کھلی جگہ پر نکلے، سامنے کا منظر دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔

نشیب میں میلوں دور تک سرسبز وادی پھیلی ہوئی تھی۔ اس وادی کی دوسری طرف بہت دور نیلگری کی فلک بوس چوٹیوں پر جمی ہوئی برف، دھوپ کی الوداعی کرنوں میں شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

وادی میں دائیں طرف بہت بڑی جھیل تھی۔ اس کا نیلگوں پانی بھی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ جھیل کے کنارے پر وہ بستی تھی جو ہماری منزل تھی۔

جھیل اور بستی ہم سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ راستہ تقریباً ہموار اور بالکل ڈھلوان تھا۔ آگے بڑھنے سے پہلے رستوگی نے ایک سفید کپڑا نکال کر ڈنڈے پر باندھ لیا اور اسے پرچم کی طرح لہرانے لگا۔

"یہ سفید جھنڈا لہرانے کا کیا مطلب؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے رستوگی کی طرف دیکھا "کیا اس بستی میں ہمارے لیے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"یہ تلکو قبیلہ ہے۔" رستوگی نے جواب دیا "یہ خطہ اور جھیل انہی کے نام سے موسوم ہے۔ یوں تو یہ بہت امن پسند اور صلح جو قسم کے لوگ ہیں لیکن ماضی میں باہر سے آنے والے لوگوں کی وجہ سے کچھ تلخ تجربات کا شکار بھی ہوتے رہے ہیں۔ جس وجہ سے یہ لوگ بہت محتاط ہو گئے ہیں اور باہر سے آنے والے ہر شخص کو حملہ آور سمجھتے ہیں۔

"ان کے اپنے رسم و رواج ہیں۔ یہ دنیا کے کسی اور قانون کو تسلیم نہیں کرتے۔ سردار کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے لیے قانون اور حکم کا درجہ رکھتا ہے اور دلچسپی کی بات

یہ ہے کہ اس قبیلے کی سردار ہمیشہ ایک عورت ہی ہوتی ہے جسے ہر دو سال بعد ایک دلچسپ مقابلے کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ سرداری کے لیے مقابلے میں حصہ لینے والی عورت کا غیر شادی شدہ ہونا ضروری ہے۔ کوئی شادی شدہ عورت سردار نہیں ہو سکتی لیکن اسے یہ حق حاصل ہے کہ قبیلے کے کسی بھی مرد کو اپنی خلوت گاہ میں طلب کر سکتی ہے۔"

وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر اس قبیلے کے بارے میں مزید معلومات سے آگاہ کرتا رہا اور پھر ہمارا یہ مختصر سا قافلہ حرکت میں آگیا۔

سب سے آگے رستوگی تھا جس نے سفید جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔ اس کے پیچھے مارتھا، دھنو اور شوبھا کے خچر تھے۔ ان کے ساتھ تو دونوں یاک بھی چل رہے تھے۔ سب سے آخر میں، میں تھا۔ ہمارا انداز بالکل ایسا تھا جیسے شکست خوردہ فوج کا کوئی دستہ فاتح کے سامنے ہتھیار ڈالنے جا رہا ہو۔

تلکو قبیلے کی معیشت کا دارومدار کھیتی باڑی پر تھا۔ ڈھلان پر دور تک سیڑھیوں کی شکل میں کھیت تھے جن میں دھان کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز تھی اور پانی کی بھی کمی نہیں تھی۔ یہاں سال میں دھان کی دو فصلیں حاصل کی جاتی تھیں اور درمیانی وقفے میں سبزیاں وغیرہ اگائی جاتی تھیں۔

بستی بہت بڑی تھی جو جھیل کے کنارے پر دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہم جیسے جیسے قریب پہنچ رہے تھے، بستی کے مکان واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ مکان نہیں جھونپڑے تھے۔ بعض جھونپڑے گول تھے اور بعض چوکور۔

ہم ابھی بستی سے تقریباً دو سو گز دور تھے کہ پانچ چھ آدمی اچانک ہی درختوں سے نمودار ہوئے۔ ان کے لباس بڑے عجیب تھے۔ پنڈلیوں تک کسی جانور کی کھال سے بنے ہوئے اسکرٹ اور بغیر آستین کی جیکٹیں جن کے آگے بٹن وغیرہ نہیں تھے۔ بٹنوں کا کام چمڑے کے فیتوں سے لیا گیا تھا۔

وہ تمام آدمی درمیانے قد اور گٹھے ہوئے جسموں کے مالک تھے اور ان سب کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے تھے۔

رستوگی ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ان سب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور وہ ہمارے دونوں طرف اس طرح چلنے لگے جیسے ہمیں اپنی حفاظت میں لے لیا ہو یا انہیں ہماری طرف سے حملے کا خدشہ ہو۔

بستی میں داخل ہوتے ہی کچھ اور لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ اس طرح ہمیں جلوس کی شکل میں جھیل کے عین سامنے ایک بڑے جھونپڑے میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ بچے اور تین چار عورتیں بھی ہمارے ساتھ جھونپڑے کے اندر آگئی تھیں۔ ان عورتوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ تلکو قبیلے کی عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ قد آور، صحت مند اور حسین تھیں۔

مردوں اور عورتوں کے لباس میں بھی زیادہ فرق نہیں تھا۔ ان کے اسکرٹ گھٹنوں تک یا اس سے اوپر تھے اور جسم کے بالائی حصے پر جانور کی کھال ہی کا بالشت بھر چوڑا ٹکڑا تھا جسے سامنے سینے پر لپیٹ کر فیتوں کی مدد سے پشت پر گرہ لگا کر باندھ دیا گیا تھا۔ ان کی سرخ و سفید رنگت ایسی تھی جیسے خون چھلک رہا ہو۔

یہ علاقہ سطح سمندر سے تقریباً چوبیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ اچھی خاصی سردی تھی اور مجھے حیرت تھی کہ اتنی سردی میں یہ لوگ اس مختصر لباس میں کیسے زندہ تھے۔

رستوگی ہمیں اس جھونپڑے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ ایک آدمی نے آکر مشعل جلا دی اور عورتوں اور بچوں سے کچھ کہتا ہوا واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ عورتیں اور بچے بھی باہر چلے گئے۔

میں بھی جھونپڑے سے باہر آگیا۔ ایک آدمی یاکوں پر سے ہمارا سامان اتار رہا تھا۔ خچر وہاں نظر نہیں آرہے تھے۔ مارتھا وغیرہ بھی جھونپڑے سے باہر آگئی تھیں۔ ہم چند قدم آگے بڑھ کر جھیل کے کنارے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ بہت دور دو کشتیاں جھیل کی پرسکون سطح پر تیرتی ہوئی کنارے کی طرف آرہی تھیں۔ جھیل کا دوسرا کنارہ پہاڑوں سے ملا ہوا تھا اور وہ پہاڑی سلسلہ بتدریج بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ انہی پہاڑوں سے بہنے والے پانی سے یہ جھیل معرض وجود میں آئی تھی۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ہمارے آس پاس کھڑی ہوئی عورتیں اور بچے جا چکے تھے اور ہم وہاں اکیلے رہ گئے تھے۔ ہماری جو کیفیت تھی وہ تو تھی ہی لیکن مارتھا کے چہرے پر سنسنی کے عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ مصنفہ تھی۔ اپنی نئی کتاب کے لیے مواد کی تلاش میں نکلی ہوئی تھی اور یہاں شاید اسے کچھ زیادہ ہی سنسنی خیز مواد ملنے کی توقع تھی۔

مارتھا برازیل کی سیاحت بھی کر چکی تھی جہاں صدیوں پہلے انکا قوم آباد تھی۔ برازیل کے خطرناک اور گنجان جنگلوں میں اب بھی ایسے قبیلے آباد تھے جن کے ہاں بڑی عجیب و غریب اور پراسرار رسوم رائج تھیں۔ وہ انکا کی سرزمین سے بہت متاثر ہوئی تھی لیکن نیپال اس کے لیے ایک نئی دنیا تھی۔ یہاں قدم قدم پر اس کا حیرت انگیز واقعات سے سامنا ہو رہا تھا۔

مارتھا یہاں سے مستانگ جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

مستانگ کے بارے میں مجھے شیرپا بہت کچھ بتا چکا تھا اور جب میں نے مارتھا کو بتایا کہ مستانگ قبیلے کی عورتیں تین تین شادیاں کرتی ہیں اور اس قبیلے کی موجودہ مہارانی بیک وقت تین شوہروں کی بیوی ہے تو مارتھا اچھل پڑی۔ اسے میری بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تھوڑے ہی دنوں میں تم وہاں جانے والی ہو۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مستانگ قبیلے کے تین چار مرد تمہیں پسند کرکے بیک وقت تم سے شادی کرلیں اور۔۔۔"

"نہیں۔" مارتھا چیخ اٹھی "پلیز! چپ رہو۔ میں ایسا خوفناک مذاق پسند نہیں کرتی۔"

قریب بیٹھی ہوئی دھنو قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

سورج غروب ہونے پر خنکی بڑھ گئی تھی اور اندھیرا بھی گہرا ہوگیا تھا لیکن ہم لوگ وہیں بیٹھے رہے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد رستوگی واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ رستوگی کے اشارے پر اس شخص نے ہمارا سامان اٹھا کر جھونپڑے کے اندر رکھ دیا۔ ہم بھی جھونپڑے کے اندر آگئے۔

یہ ایک ہی بڑا سا کمرا تھا۔ تین دیواروں کے ساتھ بینچوں کی طرح مٹی کے چبوترے بنے ہوئے تھے۔ ایک طرف اسٹول نما ایک چھوٹے چبوترے پر ایک مٹکا بھی رکھا ہوا تھا جس کے ڈھکنے پر مٹی ہی کا پیالہ بھی موجود تھا۔

فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور ایک طرف یاک کی کھالوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ رستوگی اپنے تندرست ہاتھ سے کھالیں اٹھا کر بچھانے لگا تو میں بھی اس کی مدد کو پہنچ گیا۔

"تم لوگ یہاں آرام کرو۔" رستوگی اپنے سامان میں سے ایک تھیلا اٹھاتے ہوئے بولا "کھانے کے بعد سردار تم لوگوں سے ملاقات کرے گی۔"

"ہم سے ملاقات؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس بستی میں آنے والا ہر شخص سردار کا مہمان سمجھا جاتا ہے۔" رستوگی نے جواب دیا "اور مہمانوں کا سردار کی خدمت میں حاضری دینا بھی ضروری ہے۔ یہاں آنے والے ہر شخص کے لیے بستی کے اصولوں اور قوانین کی پابندی بھی لازمی ہے۔ سردار تمہیں خود بھی بتائے گی۔ یہاں کے لوگ یوں تو بڑے خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں لیکن بعض لوگ اجنبیوں کی آمد کو پسند نہیں کرتے اس لیے میں مشورہ دوں گا کہ سردار سے ملاقات سے پہلے تم لوگ اس جھونپڑے سے نکل کر زیادہ دور مت جانا۔"

رستوگی چلا گیا۔ اس کی باتوں سے میرا ذہن الجھ گیا تھا۔ اس نے جن بعض لوگوں کا ذکر کیا تھا ان کی وجہ سے ہمیں کچھ مشکلات بھی پیش آسکتی تھیں۔

لیکن ہم اس بستی پر قبضہ کرنے تو نہیں آئے تھے۔ نہ ہی ہمارا یہاں حکومت کرنے کا کوئی ارادہ تھا۔ میں تو چاہتا تھا کہ ہم جلد سے جلد یہاں سے نکل جائیں لیکن مجھے لگتا تھا کہ ہمیں کچھ دن یہاں رکنا پڑے گا۔

ہم فرش پر بچھی ہوئی کھالوں پر نیم دراز باتیں کرتے رہے۔ تین دن کے اس طویل سفر نے ہم سب کو بری طرح تھکا دیا تھا۔ باتیں کرتے کرتے میں اونگھنے لگا۔

اور پھر اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی آدمی اٹھ کر جھونپڑے سے باہر گیا تھا۔ وہ دراز قامت آدمی تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کوئی چیز تھی۔ وہ باہر نکل چکا تھا اور میں یہ بھی نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی۔

میں اٹھ کر تیزی سے اس کے پیچھے لپکا۔ میرا خیال تھا' وہ کوئی چور تھا جو کوئی چیز چرا کر لے جارہا تھا۔

میں جھونپڑے سے باہر نکلا تو وہ دراز قامت شخص سیدھا جھیل کی طرف جارہا تھا اور پھر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ جھیل میں اتر گیا تھا اور پانی کی سطح پر اس طرح چل رہا تھا جیسے پختہ سڑک پر چل رہا ہو۔

میں اس کے پیچھے دوڑا۔ وہ شخص پانی کی سطح پر کئی گز آگے جاچکا تھا۔ میرے قدم بھی آگے اٹھتے گئے۔ میں بھی پانی کی سطح پر چل رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے قدم روئی کے نرم گالوں پر پڑ رہے ہوں۔

اچانک وہ شخص رُک گیا۔ وہ میری طرف مڑا تو اس کی صورت دیکھ کر مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ یوگی گوتم بھوش تھا!

اُس کے ہاتھ میں ایک انسانی کھوپڑی تھی جسے اس نے بالوں سے پکڑ کر لٹکا رکھا تھا۔ گردن سے کٹی ہوئی کھوپڑی سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے بھی خون ٹپک رہا تھا اور اس کے چہرے کے نقش دیکھ کر مجھے سینے میں سانس رُکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

وہ میرا چہرہ تھا!

میں کبھی خون ٹپکاتے ہوئے اپنے چہرے کو اور کبھی گوتم بھوش کو دیکھ رہا تھا۔ گوتم بھوش کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ تھی۔

فضا شیطانی قہقہوں کی آواز سے گونج رہی تھی۔

میں متوحش نظروں سے کبھی گوتم بھوش کے ہاتھ میں لٹکے ہوئے اپنے چہرے کو اور کبھی گوتم بھوش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گوتم بھوش کے قہقہے اب تھم گئے تھے۔ اس کی آنکھیں چنگاریاں برسانے لگیں۔

میں ایک سیکنڈ اپنی جگہ پر رکا اور پھر گوتم بھوش کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ میرے اندر ایک نئی توانائی انگڑائیاں لینے لگی۔ کوئی غیر مرئی قوت مجھے آگے بڑھنے پر اکسا رہی تھی۔

گوتم بھوش میری طرف آرہا تھا لیکن پھر یکایک وہ رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کے بجائے وحشت سی ابھرنے لگی۔ خوف اور وحشت کی وجہ سے چہرے کے تاثرات بھی بگڑنے لگے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔ پہلے وہ پانی کی سطح پر تھا لیکن اب اس کے پیر ٹخنوں تک پانی میں دھنس رہے تھے جیسے وہ کسی دلدل میں چلنے کی کوشش کررہا ہو۔

اچانک وہ چیخ اٹھا۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا کر میری کھوپڑی میری طرف کھینچ ماری۔ میں پھرتی سے جھک کر اپنے آپ کو کھوپڑی کی زد میں آنے سے بچا گیا لیکن خون کے چھینٹے میرے چہرے' گردن اور سینے پر پڑے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے اوپر تیزاب انڈیل دیا ہو۔ میں بری طرح چیخ اٹھا۔

مجھے کسی نے بانہوں کی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور میں چیختے ہوئے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کررہا تھا لیکن میری مزاحمت بتدریج کمزور پڑتی گئی۔ ایک آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

"کیا ہوا ہمت سنگھ! آنکھیں کھولو۔ آنکھیں کھولو ہمت سنگھ۔"

یہ الفاظ بار بار دہرائے جارہے تھے۔ یہ مانوس آواز مجھے ہوش میں لے آئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک ہاتھ سے اپنا چہرہ' گردن اور دوسرے ہاتھ سے سینہ سہلا رہا تھا۔

میں بستر پر پڑا تھا۔ شوبھا نے مجھے بانہوں کے حصار میں لے کر اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔ میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ میں متوحش نظروں سے شوبھا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو میں صورتِ حال کو سمجھ نہیں سکا پھر میرے حواس بحال ہونے لگے۔ میں اپنے آپ کو شوبھا کی گرفت سے چھڑا کر بیٹھ گیا۔ دھنو اور مارتھا بھی میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بھی تشویش نمایاں تھی۔ جھونپڑے کے دروازے میں بھی ایک عورت اور دو آدمی کھڑے تھے۔

"م۔ مجھے کیا ہوا۔ تم لوگ میرے گرد کیوں جمع ہو؟" میں نے شوبھا وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے۔" شوبھا نے جواب دیا "تم اس زور سے چیخ رہے تھے کہ میں بھی کانپ کر رہ گئی تھی اور یہ دونوں بھی خوف زدہ ہوگئی تھیں۔" اس نے دھنو اور مارتھا کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "ہاں۔ شاید میں کوئی ڈراؤنا خواب ہی دیکھ رہا تھا۔" میں نے کہا لیکن بتایا نہیں کہ وہ خواب کیا تھا۔

اور وہ خواب میرے ذہن پر گویا چپک کر رہ گیا تھا۔ اس بھیانک خواب کی تعبیر کیا ہوگی؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس خواب نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ گوتم بھوش یہاں میری آمد سے باخبر ہوچکا تھا اور میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جاپ پر بیٹھے ہونے کے باوجود اس نے خود مجھے روکنے کی کوشش شروع کردی تھی اور یہ خواب میرے لیے گویا ایک وارننگ بھی تھا۔

جھونپڑے کے دروازے میں کھڑی ہوئی وہ عورت اور دونوں مرد کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے پھر واپس چلے گئے۔ وہ بھی شاید سمجھ گئے تھے کہ میں خواب میں ڈر گیا تھا۔

چند منٹ بعد رستوگی بھی آگیا۔ وہ بھی کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔ ہم سب کو خیریت سے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت سی آگئی۔ وہ کسی دوسرے جھونپڑے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کسی نے اسے میرے چیخنے کی اطلاع دی تھی اور وہ بدحواس ہوکر بھاگا آیا تھا۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔" شوبھا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "دھنو اور ہمت سنگھ میں کبڈی ہورہی تھی۔ دھنو نے ہمت سنگھ کو لپیٹ لیا تو یہ شکست کے خوف سے چیخنے لگا تھا۔"

"کبڈی کیا ہوتا ہے؟" رستوگی نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پنجاب کا ایک دلچسپ کھیل ہے۔ تمہارے ہاں بھی کھیلا جاسکتا ہے لیکن اس کا طریقہ اور تفصیل پھر کسی وقت بتاؤں گی۔ اس وقت تو بھوک سے جان نکلی جارہی ہے۔ کھانے کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟" شوبھا بولی۔

"کھانا بس تیار ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔" رستوگی یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اس مرتبہ اس کی واپسی تقریباً بیس منٹ بعد ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی بھی تھی جس نے چاولوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا طشت اٹھا رکھا تھا۔ لڑکی نے جھک کر طشت ہمارے درمیان چٹائی پر رکھ دیا۔ گرم گرم چاولوں سے بھاپ اور اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چاولوں میں گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ رستوگی بھی ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا جبکہ وہ لڑکی واپس چلی گئی تھی۔

یاک کے گوشت والے یہ چاول کھا کر مجھے لاہوری پلاؤ یاد آگیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سنگا پور میں میری والدہ پندرہ دن میں ایک مرتبہ بکرے کے گوشت کا پلاؤ ضرور پکاتی تھی۔ یاک کے گوشت کے اس پلاؤ میں اگرچہ مسالے وغیرہ پورے نہیں تھے لیکن پھر بھی بہت مزے دار تھا۔

کھانے کے بعد رستوگی خالی طشت لے کر چلا گیا اور ہم بھی جھونپڑے سے باہر آکر کچھ دیر تک جھیل کے کنارے پر ٹہلتے رہے اور پھر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ مجھے اپنا خواب یاد آگیا اور میں جھیل کی تاریک سطح کو گھورنے لگا۔

خنکی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ دھنو میرے ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی اور شوبھا اور مارتھا ہم سے کچھ دور ایک دوسرے پتھر پر بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔

بستی میں لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ خاصی بڑی بستی تھی اور میرے اندازے کے مطابق اس کی آبادی چار سے پانچ ہزار کے درمیان ضرور ہوگی۔ بستی کے لوگ دیر تک جاگنے کے عادی تھے اور میرے خیال میں یہاں کم از کم تین چار ریسٹورنٹ یا ایسی جگہیں ضرور تھیں جہاں لوگ بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہوں گے۔

باتوں اور قدموں کی آواز سن کر میں ایک طرف دیکھنے لگا۔ دو جھونپڑے آگے کچھ لوگ گلی سے نکل کر جھیل کی طرف آگئے تھے اور اب ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید بستی کے کچھ لوگ ہمیں دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔ یہاں آنے والے اجنبی بستی کے لوگوں کے لیے تماشا ہی تو ہوتے تھے۔

ایک آدمی ان سے الگ ہو کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے آگیا۔ وہ رستوگی تھا۔ اس نے بتایا کہ قبیلے کی سردار کاشی ہم سے ملنے آئی ہے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مارتھا وغیرہ بھی میرے قریب آگئیں اور ہم اپنے جھونپڑے کے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔

میرا خیال تھا کہ ہمیں سردار کے جھونپڑے میں لے جاکر اس کے سامنے پیش کیا جائے گا لیکن وہ خود ہی چلی آئی تھی۔ ہم نے جھونپڑے کے دروازے پر ان کا استقبال کیا اور پھر اندر آگئے۔

کاشی کو دیکھ کر ایک لمحے کو تو میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہوگئی تھی۔ میرا دعویٰ تھا کہ کوئی بھی مرد اسے دیکھ کر ایک لمحے کو تو سانس لینا بھول جاتا ہوگا۔ دراز قامت، سڈول جسم، چہرے کے نقوش نہایت دل فریب اور آنکھیں تو واقعی ایسی تھیں کہ اسے آہو چشم کا خطاب دیا جاسکتا تھا۔ یوں تو اس کے خوب صورت بدن کے ہر حصے سے دلکشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھی لیکن سب سے نمایاں اس کے خدوخال تھے۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا کہ سینے میں بے اختیار گدگدی کا احساس ہونے لگا تھا۔ گھٹنوں سے اوپر تک یاک کی کھال کا اسکرٹ اور بلاؤز بھی چمڑے ہی کا تھا جس سے اس کا سینہ پوری طرح ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ اس کی پشت بالکل برہنہ تھی۔ اس کے بال شہد کی رنگت کے تھے جن میں کئی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں کے ہار تھے۔ کلائیوں میں بھی گجرے تھے اور بالوں میں بھی دو سرخ پھول ٹکے ہوئے تھے۔

اس کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں اور ایک مرد بھی۔ وہ دونوں عورتیں بھی کاشی جیسا ہی لباس پہنے ہوئے تھیں اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہاں کے لوگ شدت کی سردی کس طرح برداشت کرتے تھے لیکن یہ بات بھی تھی کہ یہ لوگ موسم کی شدت کے عادی تھے۔

مرد نے ہاتھ میں ایک لمبی سی لاٹھی سنبھال رکھی تھی جس کے نچلے حصے میں تقریباً چھ انچ لمبی برچھی لگی ہوئی تھی۔ وہ یقیناً کاشی کا باڈی گارڈ تھا جو دروازے کے قریب جم کر کھڑا ہوگیا تھا جبکہ کاشی اور اس کی ساتھی عورتیں ہمارے ساتھ فرش پر بچھی ہوئی یاک کی کھالوں پر بیٹھ گئی تھیں۔ کاشی میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کے بیٹھنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے سینے میں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شوبھا نے کن انکھیوں سے بڑی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔

کاشی کی عمر تیس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے حسین ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت اور پیشانی پر بھی عجیب سی چمک تھی۔ کسی گروہ، قبیلے یا ریاست پر حکمرانی کرنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہانت اور طاقت اور کاشی کے بارے میں، میں پورے وثوق اور دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس کے پاس ذہانت کی کمی نہیں تھی۔ قبیلے میں اس کی سیاسی قوت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن حسن کی طاقت کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے، اسی قوت اور ذہانت کے بل بوتے پر وہ اس قبیلے کی سردار بھی بنی ہو۔

کاشی یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ ہم کون ہیں، یہاں کیوں آئے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ میں نے اسے مارتھا کے بارے میں بتا دیا کہ وہ مصنفہ ہے اور کتاب لکھنے کے لیے اس خطے کی سیاحت کررہی ہے۔

"اور تم لوگ؟" اس نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔

"ہم سیلانی ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ہمارا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ کوئی منزل نہیں ہے۔ جس طرف منہ اٹھتا ہے، چل پڑتے ہیں۔ ایک دو دن یہاں رہیں گے پھر کسی اور طرف چل پڑیں گے۔"

"انسان سوچتا بہت کچھ ہے لیکن اپنی خواہشات کو پورا کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔" کاشی نے کہا۔

کاشی کی اس بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ہم آسانی سے یہاں سے نہیں نکل سکیں گے۔

سفر کے دوران میں رستوگی نے تلکو قبیلے کے بارے میں ہمیں چند اہم معلومات فراہم کی تھیں۔ ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ اس قبیلے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور دوسری اہم بات یہ کہ اس قبیلے کی سردار بھی کوئی عورت ہی بن سکتی تھی۔ سردار کے لیے کنواری ہونا لازمی تھا۔ سرداری ملنے کے بعد وہ قبیلے کے کسی بھی مرد سے اپنی خواہشات پوری کرسکتی تھی۔ کسی عورت کو سرداری دو سال کے لیے ملتی تھی اور سرداری ...... حاصل کرنے کے لیے ایک مقابلے کے مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا اور وہ مقابلہ کس قسم کا تھا؟ اس سلسلے میں رستوگی نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ تاہم میری معلومات میں اتنا اضافہ ضرور کیا تھا کہ سردار کے انتخاب کے بعد دشمنیاں بھی شروع ہوجاتی تھیں۔ شکست کھانے والی عورت بعض لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر سردار کے خلاف سازشیں شروع کردیتی تھی۔ کبھی یہ سازش کامیاب بھی ہوجاتی۔ سردار کو قتل کرکے شکست خوردہ عورت سرداری کا منصب سنبھال لیتی اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ یہ کوئی نئی یا حیران کن بات نہیں تھی۔ دنیا میں ہر جگہ یہی سب کچھ ہورہا تھا۔ اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے گلے کاٹے جارہے تھے۔ کہیں چھوٹے پیمانے پر اور کہیں بڑے پیمانے پر۔

کاشی کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کے حالات بھی سازگار نہیں تھے۔ اسے بھی دشمن کی سازشوں کا سامنا تھا۔

کاشی تقریباً ایک گھنٹے تک ہمارے جھونپڑے میں رکی اور پھر واپس چلی گئی۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک غیر رسمی ملاقات کہا جاسکتا تھا۔ تاہم اس کی بعض باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ وہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ ہم کہیں اس کے دشمنوں کی دعوت پر تو یہاں نہیں آئے اور اس کے خلاف کوئی سازش کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے!

رستوگی بھی کسی اور جھونپڑے میں چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے ایک عورت ہمیں کچھ کمبل دے گئی تھی۔ ہم اپنی اپنی جگہوں پر کمبل اوڑھ کر لیٹے کاشی ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات بیتتی جارہی تھی۔ باہر سناٹا تھا تاہم کبھی کبھی جھونپڑے کے سامنے سے کسی کے گزرنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

شوبھا اور دھنو سو چکی تھیں۔ مارتھا مشعل کے قریب کمبلوں میں لپٹی بیٹھی ڈائری لکھ رہی تھی۔ مزید آدھے گھنٹے بعد اس نے ڈائری بند کردی اور مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

ہم کافی دیر تک سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے پھر مارتھا بھی جماہیاں لینے لگی۔

وہ تینوں سو چکی تھیں۔ میں کمبل میں دبکا صورتِ حال کا جائزہ لیتا رہا۔ گوتم بھوش کا چلّہ پورا ہونے میں چودہ دن رہ گئے تھے۔ اسے بھی پتا چل گیا تھا کہ میں اس کے قرب و جوار میں پہنچ چکا ہوں۔ وہ مجھے روکنے کی بھرپور کوشش کررہا تھا۔ میں جلد سے جلد نیلگری کے پہاڑوں میں پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن کاشی سے ملاقات کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں سے نکلنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ باہر مکمل طور پر سناٹا تھا۔ میں بھی سونے کی تیاری کررہا تھا کہ ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔ یوں لگا تھا جیسے کوئی بہت محتاط انداز میں چلنے کی کوشش کررہا ہو۔ میں نے سرہانے رکھا ہوا پستول اٹھالیا اور اپنی جگہ پر بے حس و حرکت لیٹا جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

قدموں کی دبی دبی سی آواز قریب آتی گئی۔ میری نظریں دروازے پر مرکوز تھیں۔ آواز رک گئی اور دروازہ ایک ایک انچ کرکے آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ میں نے مارتھا وغیرہ کی طرف دیکھا۔ وہ تینوں کمبلوں میں دبکی گہری نیند سو رہی تھیں۔

میں پھر گردن گھما کر نیم وا آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا گیا اور پھر ایک عورت کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اندر آنے کے بجائے باہر ہی کھڑی آگے جھک کر متجسس نظروں سے جھونپڑے کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا نیزہ تھا لیکن اس نے جس انداز سے نیزہ پکڑ رکھا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔

وہ کمرے کے وسط میں رک کر ایک بار پھر متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر میری طرف بڑھی۔ وہ ایک ہاتھ آگے بڑھا کر میری طرف جھکی۔ وہ غالباً میرے پیروں پر ہاتھ رکھ کر مجھے ہلانا چاہتی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔ اس کا چہرہ ایک دم دھواں ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول نے اسے اور بھی خوف زدہ کر دیا تھا لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پا لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ایک انگلی ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک تھی جو کاشی کے ساتھ آئی تھیں۔ اس نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور شوبھا وغیرہ کی طرف دیکھتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں اپنے اوپر سے کمبل ہٹا کر اٹھ گیا اور شوبھا وغیرہ کی طرف دیکھتا ہوا اس عورت کے پیچھے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا ذہن اس وقت بری طرح الجھ گیا تھا۔ رات کے سناٹے میں یہ عورت یہاں کیوں آئی تھی اور مجھے اس طرح رازداری سے جھونپڑے سے باہر کیوں لے جا رہی تھی۔ رستوگی کی باتیں میرے دماغ میں بازگشت سی پیدا کرنے لگیں۔ اس قبیلے میں مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک مرد کے حصے میں تین عورتیں آتی تھیں اور یہاں مخالف صنف سے تعلقات پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ تو کیا یہ عورت بھی اسی نیت سے یہاں آئی تھی اور مجھے کسی ایسی جگہ پر لے جا رہی تھی جہاں کسی دوسرے کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔

وہ جھونپڑے سے دو تین قدم آگے نکل کر رک گئی تھی۔ میں بھی اس کے قریب رک گیا اور الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے ساتھ چلو۔" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ لہجے میں تحکمانہ عنصر نہیں تھا۔ اسے دوستانہ انداز کہا جا سکتا تھا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں کاشی نے طلب کیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس وقت!" میرا دماغ گھوم گیا۔

"کاشی پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی کو بھی طلب کر سکتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھا اور مزید جرح کیے بغیر اس کے ساتھ چل پڑا۔ میرا ذہن ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ کاشی قبیلے کی سردار تھی۔ شام کو وہ ہم سے مل کر گئی تھی۔ وہ مجھے دن میں کسی وقت طلب کر سکتی تھی لیکن آدھی رات کے بعد اس طرح رازداری سے بلانے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔

تقریباً دس منٹ تک تاریک اور سنسان گلیوں میں گھومنے کے بعد ہم بستی کی دوسری طرف ایک بار پھر جھیل کی طرف نکل آئے۔ بستی کے آخری مکان سے تقریباً سو گز آگے ایک بڑے مکان کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ حویلی نما وہ مکان ایک ٹیلے پر بنا ہوا تھا اور اس کی دیواریں بھی کافی بلند تھیں۔

وہ عورت حویلی کے پھاٹک کی طرف جانے کے بجائے فصیل کی بائیں طرف جا رہی تھی جہاں قدِ آدم جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں اس عورت کے پیچھے پیچھے جھاڑیوں میں چلتا رہا۔ وہ دیوار کے قریب ایک جگہ رک گئی جہاں کھڑکی کی طرح کا ایک دروازہ تھا۔ اس نے دروازے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ دوسری مرتبہ ایسا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ پہلی مرتبہ ہاتھ مارتے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔

❖ اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں ❖
جو کہ دسمبر 2003ء میں شائع ہوگا

آتش فشاں
7

اُس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اسے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا تھا اور انہیں "انصاف" کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن ٹیمپل میں فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اُسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اُس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پاؤں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہوگئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا رُوپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور اُنہیں حرفِ غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا

ظلم و جبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک [illegible] کی سرزمین پر ہنگامہ خیز داستان

اس عورت نے پہلے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا اور پھر خود بھی اندر آگئی۔ دروازہ بند ہوگیا۔ اس طرف بھی دیوار کے ساتھ قد آدم جھاڑیاں تھیں اور دروازے کے قریب دیوار کے ساتھ ایک عورت کھڑی تھی۔ ہمارے اندر آنے کے فوراً ہی بعد اس نے دروازہ بند کردیا تھا اور دوسری طرف چلی گئی تھی۔

میرے ساتھ آنے والی عورت نے اشارہ کیا اور میں ایک بار پھر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

حویلی کی عمارت خاصی بڑی تھی۔ آگے کو نکلے ہوئے برآمدے میں ایک مشعل جل رہی تھی اور ایک عورت نیزہ سنبھالے وہاں بھی کھڑی تھی۔

ہم اندر داخل ہو کر ایک راہداری میں مڑ گئے۔ یہ راہداری خاصی طویل تھی۔ اس کے اختتام پر دائیں بائیں دو اور راہداریاں تھیں۔ یہاں بھی ایک عورت نیزہ سنبھالے کھڑی تھی۔ ہم اس کے قریب سے گزرتے ہوئے بائیں طرف مڑ گئے۔

یہ راہداری زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے اختتام پر ایک اونچا دروازہ تھا۔ دائیں طرف دس فٹ طویل ایک اور کشادہ راہداری تھی۔ اس کے اختتام پر بھی ایک محرابی دروازہ تھا۔ ہر راہداری کے موڑ پر مشعلیں جل رہی تھیں۔

ہم اس محرابی دروازے کے سامنے رک گئے۔ اس عورت نے ہلکی سی دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ اسے واپس آنے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔

اندر داخل ہوتے ہی میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

جھونپڑوں پر مشتمل اس بستی کے پہلو میں پکی اینٹوں کی اس حویلی کو دیکھ کر ہی مجھے حیرت ہوئی تھی اور اندر آکر تو یہ حیرت دوچند ہوگئی تھی۔

ہمیں اس بستی میں آئے ہوئے صرف چند گھنٹے ہوئے تھے۔ ہم نے صرف رات ہی چند لوگوں کو دیکھا تھا جو ہم سے ملنے کے لیے جھونپڑے میں آئے تھے۔ میں نے ہر مرد اور عورت کے جسم پر یاک کی کھال کا مختصر سا لباس دیکھا تھا لیکن اس کمرے میں آکر تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں قدیم بغداد کے کسی محل میں آگیا ہوں۔

اس وسیع و عریض کمرے کی بلند دیواروں کے ساتھ رنگ برنگے ریشمی پردے لٹکے ہوئے تھے۔ پچھلی طرف دو بڑی بڑی محرابی کھڑکیاں تھیں۔ ان کے سامنے بھی باریک ریشمی پردے لہرا رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں لہراتے ہوئے رنگ برنگے یہ ریشمی پردے بڑا دل فریب منظر پیش کررہے تھے۔

میں دروازے کے قریب ہی کھڑا متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے کوئی ذی نفس ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ اچانک ایک سریلی آواز سن کر میں اچھل پڑا۔

"میں یہاں ہوں۔"

یہ آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ میں نے گھوم کر اس طرف دیکھا۔ کمرے کا ایک حصہ کشادہ محراب کی طرف پیچھے کو نکلا ہوا تھا جہاں غالباً لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر ریچھ یاک کی کئی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر ہلکے نیلے رنگ کی ایک سلکی چادر تھی۔ کاشی تخت پر نیم دراز تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے وہ فلم یاد آگئی جو میں نے بچپن میں سنگاپور میں دیکھی تھی۔ ملکہ قلوپطرہ کے لیٹنے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

اس محراب کے سامنے ایک باریک سفید پردہ ہوا کے جھونکوں سے ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا اور اس کے ساتھ ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

کاشی نے لباس تو ضرور پہنا ہوا تھا لیکن اس لباس میں بھی وہ برہنہ تھی۔ اسے دیکھ کر میری نظریں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس محراب میں کاشی اکیلی نہیں تھی۔ تخت کی پچھلی طرف دو اور عورتیں بھی کھڑی تھیں جنہیں میں پہلے نہیں دیکھ سکا تھا۔ کاشی نے انہیں اشارہ کیا اور وہ محراب کے پچھلی طرف کسی دروازے میں غائب ہو گئیں۔

"آؤ۔ رک کیوں گئے ہمت سنگھ؟"

کاشی کے منہ سے اپنا نام سن کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ شام کو جب یہ ہمارے جھونپڑے میں آئی تھی تو رستوگی نے اجنبی کہہ کر میرا تعارف کرایا تھا اور یہ مجھے اجنبی کہہ کر ہی مخاطب کرتی رہی تھی اور اب اپنا نام سن کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھا پھر رک گیا۔ یہاں اس تخت کے سوا ایسی کوئی اور جگہ نہیں تھی جہاں میں بیٹھ سکتا اور تخت پر کاشی اس طرح نیم دراز تھی کہ میں اپنے اندر اس کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"سمجھ گئی۔" کاشی اٹھ کر تخت سے اتر آئی "تم یہاں میرے ساتھ بیٹھنے سے ہچکچا رہے ہو۔ آؤ۔ مہمان خانے میں بیٹھتے ہیں۔"

اس نے دائیں طرف کی دیوار کا ایک پردہ ہٹا دیا۔ دوسری طرف بھی ایک وسیع کمرا تھا۔ فرش پر یاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی دیواروں پر ریشمی پردے ٹنگے ہوئے تھے۔ مشعلوں کی کپکپاتی ہوئی روشنی میں یہ منظر بھی بڑا پراسرار اور خواب آگیں سا تھا۔

کمرے کے وسط میں پرانی طرز کی ایک گول میز پڑی ہوئی تھی جس پر خوب صورت طشتریوں میں پھل سجے ہوئے تھے۔ بعض پھل تو ایسے تھے جو اس علاقے (نیپال) اور اس سیزن میں نہیں ہوتے تھے۔ میز کافی بڑی تھی۔ اس کے اردگرد پرانی طرز کی مگر آرام دہ کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

کاشی نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک دیوار کی طرف دیکھ کر تالی بجائی۔ دیوار کے پردے میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک خوب صورت لڑکی ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس میں دو گلاس اور شیشے کی خم دار گردن والی ایک خوب صورت صراحی رکھی ہوئی تھی جس میں عنابی رنگ کا کوئی سیال بھرا ہوا تھا۔ وہ ٹرے میز پر رکھ کر واپس چلی گئی۔ کاشی بھی میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیچ میں میز حائل ہونے کے باوجود کاشی کے بدن کا ایک حصہ مجھے صاف نظر آرہا تھا۔

کاشی نے صراحی اٹھا کر دونوں گلاس لبریز کیے اور ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

"لو پیو اور یہ پھل بھی کھاؤ۔" وہ بولی "مجھے افسوس ہے کہ میں رات کے اس پہر تمہاری زیادہ خدمت نہیں کرسکتی۔"

"مم۔ میں شراب نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔ اس وقت میں اپنے آپ میں عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت شاید میں اپنے حواس ہی میں نہیں تھا۔ اس پراسرار ماحول نے مجھ پر عجیب سا سحر طاری کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر کاشی کے حسن و شباب نے پوری کر دی تھی۔ وہ میرے خرمن ہوش پر بجلیاں گرا رہی تھی اور میں بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

"یہ شراب نہیں ہے۔" کاشی کی شیریں آواز میری سماعت سے ٹکرائی "تمہارے لیے یہ مشروب پینا بہت ضروری ہے کیونکہ تم جس مہم پر جا رہے ہو اس کے لیے تمہارے اندر شکتی ہونی چاہیے۔"

میں ایک بار پھر اچھل پڑا۔ اسے کیسے پتا چلا کہ میں کسی خاص مہم پر جا رہا ہوں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یہ مشروب پی لینے سے تمہارے اندر ایسی شکتی پیدا ہو جائے گی کہ نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی سردی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"تت۔۔۔ تم کون ہو؟" میں ہکلا کر رہ گیا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کی طرف جا رہا ہوں۔"

"میں نیلگری کی محافظ ہوں۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "نیلگری کی برف پوش چوٹیوں کا راستہ اس طرف ہی سے جاتا ہے۔ کوئی شخص ہماری نظروں میں آئے بغیر آگے نہیں جا سکتا۔"

"لیکن ایک آدمی ایسا ہے جو وہاں پہنچ چکا ہے!" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" کاشی نے جواب دیا "وہ مجھے دھوکا دے کر چلا گیا لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں نے ابھی تک اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ان برف پوش پہاڑوں کی ملکہ نے تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں لیکن میرے دشمنوں کو بھی تمہارے ارادوں کا پتا چل گیا ہے۔ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کریں گے۔"

کاشی کی باتیں سن کر میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھی اور اس کے دشمن بھی میرے ارادوں سے واقف ہو چکے تھے۔

"لو۔ یہ پی لو۔ اس کے بعد ہم اطمینان سے وہاں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے دیوار کے ساتھ بچھے ہوئے ایک کاؤچ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہونٹوں سے لگا کر پہلے صرف ایک چسکی لی۔ عناب جیسی خوشبو تھی اور بہت لذیذ مشروب تھا۔ میں نے دوبارہ گلاس ہونٹوں سے لگایا تو پھر اسے اس وقت ہٹایا تھا جب اس کا آخری قطرہ بھی میں نے چوس لیا اور اس کے چند سیکنڈ بعد ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر کھولتا ہوا لاوا بھر گیا ہو۔ میرا جسم پسینے میں شرابور ہونے لگا۔ میں نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی لیکن میں نے جیکٹ اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ قمیص کے نیچے پورے جسم پر مجھے چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اب یہ بات بھی میری سمجھ میں آگئی تھی کہ چوبیس پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر رہنے والے ان لوگوں کو سردی کیوں نہیں لگتی تھی۔ یہ لوگ یقیناً مستقل طور پر یہ مشروب استعمال کرتے تھے۔

"تمہیں کچھ دیر بے چینی ہو گی۔" کاشی اپنے گلاس سے چسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی "یہ مشروب ان پہاڑوں میں پیدا ہونے والی قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے اور ہماری غذا کا ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہماری روزمرہ کی غذا میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہیں جو ہمیں موسم کی شدت سے محفوظ رکھتی ہیں۔ آؤ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" وہ خالی گلاس میز پر رکھ کر اٹھ گئی۔

میں بھی اٹھ گیا۔ پسینے میں بھیگی ہوئی قمیص بھی اب مجھے بوجھل سی لگ رہی تھی۔ میں نے قمیص اتار کر پھینک دی اور کاشی کے ساتھ کاؤچ پر بیٹھ گیا۔

میرے جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے کاشی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے بازوؤں پر رکھ دیے اور انگلیوں سے مسلز ٹٹولنے لگی۔ وہ اپنی انگلیوں کو گوشت میں گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے مسلز گوشت کی طرح نرم نہیں، پتھر کی طرح سخت تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب سی مسکراہٹ آگئی اور آنکھوں میں سرخی کے ڈورے تیرنے لگے۔

مجھے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ مجھے قمیص نہیں اتارنی چاہیے تھی۔ کاشی کی انگلیوں کے لمس سے میرے دماغ میں بھی سنسناہٹ ہونے لگی تھی لیکن میں نے فوراً ہی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور سرک کر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔

"تمہارے دشمن کون ہیں اور میرے بارے میں کیسے جانتے ہو اور تم۔۔۔؟"

"نیلگری نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔" کاشی بھی سنبھل کر بیٹھ گئی "یہ قبیلہ ہزاروں سال سے نیلگری کی حفاظت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ سرداری کے لیے منتخب ہونے والی عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک جاپ مکمل کرے۔ اکیس روز کا یہ جاپ مکمل ہونے کے بعد اس کا نیلگری سے رابطہ ہو جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم نے بھی وہ جاپ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا "لیکن بعض شیطانی قوتیں اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور نیلگری ان کے قبضے میں نہیں جانا چاہتی۔ وہ بہت پریشان ہے۔ اس کا چہرہ دھندلا رہا ہے۔ چند روز پہلے میرا اس سے آخری رابطہ ہوا تھا۔ طاغوتی قوتوں نے اس کے گرد جال بن دیا ہے۔ حصار میں قید کر دیا ہے اسے۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی۔ اگر وہ اس شیطان کے قبضے میں چلی گئی تو وہی کچھ کرے گی جو اسے حکم ملے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہم پر بھی

تباہی نازل ہوجائے گی۔ یہ جھیل ہماری بستی کو نگل لے گی۔"

"وہ کون لوگ ہیں جو تمہاری مخالفت کررہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"شیواگ!" کاشی نے جواب دیا "اس گروہ کا سرغنہ شیواگ ہے۔ اس کے ساتھ اگرچہ چند ہی لوگ شامل ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ ایک مچھلی بھی پورے جل (تالاب) کو گندا کردیتی ہے۔ شیواگ تمہارے ارادوں سے واقف ہوچکا ہے۔ وہ شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے۔ وہ تمہیں روکنے کی کوشش کرے گا بلکہ وہ اپنی کوششیں شروع کرچکا ہے۔ تمہیں روکنے کے لیے پہلے ایسی شرائط عائد کی جائیں گی جنہیں تم پورا نہیں کرسکو گے اور اگر تم نے ان شرائط کو پورا کردیا تو اس کے بعد بھی تمہارے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔"

"اب تک میرے راستے میں کئی رکاوٹیں پیدا کی جاتی رہی ہیں لیکن میں یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور آگے بھی جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔" کاشی نے کہا "تم آگے ضرور جاؤ گے لیکن....."

"لیکن کیا....؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے پاس وقت کم ہے۔ صرف بارہ دن۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔ صرف بارہ دن۔" میں نے جواب دیا "اور مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے ان بارہ دنوں ہی میں کرنا ہے۔"

بات کرتے ہوئے میری نظریں سامنے کھڑکی کی طرف اٹھ گئیں۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ سفید باریک پردے ہوا کے جھونکوں سے اس طرح ہل رہے تھے جیسے سمندر کی پرسکون سطح پر ہلکی ہلکی سی لہریں اٹھ رہی ہوں۔ پردہ اپنی جگہ سے سرکتا تو کھڑکی کی دوسری طرف دن کا ملگجا سا اجالا دکھائی دینے لگتا۔

کاشی نے بھی دیکھ لیا تھا کہ رات دم توڑ چکی تھی اور دن کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ اس نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر تالی بجائی۔ وہی خوب صورت لڑکی برآمد ہوئی۔ اس مرتبہ اس نے شیشے کی خوب صورت طشتری میں صرف ایک گلاس اٹھا رکھا تھا۔ اس میں ہرے رنگ کا شربت بھرا ہوا تھا۔ اس نے قریب آکر کاشی کی طرف دیکھتے ہوئے گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

کاشی نے مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔ اس کا ذائقہ پہلے والے مشروب سے مختلف تھا لیکن یہ بھی بے حد خوش ذائقہ تھا۔

مشروب پینے کے بعد بھی میں کاشی سے باتیں کرتا رہا۔ میرا سر بوجھل ہونے لگا۔ اسی دوران میں کاشی کی وہ خادمہ جو مجھے حویلی میں لے کر آئی تھی، دوڑتی اور چیختی چلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بری طرح بدحواس ہورہی تھی۔

"کیا بات ہے پالا۔ کیوں چیخ رہی ہو؟" کاشی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"شیواگ نے اپنے شیطانوں کے ساتھ حویلی پر حملہ کردیا ہے کاشی۔" پالا نامی اس عورت نے جواب دیا "وہ اس طرف آرہا ہے۔"

"اوہ!" کاشی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی "اس کی یہ ہمت.... میں دیکھتی ہوں اسے۔ تم مہمان کو حویلی کے پچھلے دروازے سے باہر لے جاؤ۔"

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ کاشی مجھے شیواگ کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی اور میں بزدلوں کی طرح منہ چھپا کر یہاں سے بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ پالا نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑلیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچنا چاہتی تھی لیکن میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکلی جارہی ہو۔ گھٹنے دہرے ہوتے چلے گئے اور میں فرش پر ڈھیر ہوگیا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

○☆○

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے جھونپڑے میں بستر پر پڑا تھا اور میرے اوپر کئی کمبل لدے ہوئے تھے۔ میرے بستر کے قریب مارتھا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہی تھی۔ مجھے حرکت کرتے پاکر اس نے ڈائری بند کردی اور میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" میں اپنے اوپر سے کمبل ہٹا کر اٹھ گیا "کاشی اور پالا کہاں ہیں؟"

"کاشی اور پالا۔" مارتھا کے لہجے میں حیرت تھی "اوہ! شاید تم دھنو اور شوبھا کو پوچھ رہے ہو۔ وہ باہر دھوپ میں بیٹھی ہیں۔"

"میں قبیلے کی سردار کاشی اور اس کی خادمہ پالا کو پوچھ رہا ہوں۔ شیواگ نے حویلی پر حملہ کردیا تھا۔ وہ....."

"میری سمجھ میں نہیں آرہا، تم کیا کہہ رہے ہو۔ ایک

منٹ رکو۔ میں شوبھا کو بلا کر لاتی ہوں۔" مارتھا یہ کہتے ہوئے اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے صرف پتلون پہن رکھی تھی۔ جسم کا بالائی حصہ برہنہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا تو میری قمیص اور جیکٹ بھی ایک طرف رکھی ہوئی نظر آگئی۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ شیواگ اور اس کے آدمیوں نے جب حویلی پر حملہ کیا تھا تو میں وہیں تھا۔ میں بھی کاشی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن نجانے یکایک کیا ہوا تھا کہ میں بے جان ہو کر گر پڑا تھا اور بے ہوش ہوگیا تھا۔ مجھے یہاں کون لایا تھا اور کاشی کس حال میں تھی!

میں ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دھنو اور شوبھا، مارتھا کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ وہ تینوں میرے قریب بیٹھ گئیں۔

"رات کو تم جھونپڑے سے نکل کر کہاں گئے تھے؟" شوبھا نے پوچھا۔

میں چند لمحے خاموش رہا۔ ان سے کچھ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے صاف صاف بتا دیا کہ کاشی کی خادمہ مجھے بلا کر لے گئی تھی اور پھر وہاں جو کچھ ہوا میں نے محتاط الفاظ میں بتا دیا۔

"شیواگ اور اس کے آدمیوں نے حویلی پر حملہ کردیا تھا۔" میں آخر میں کہہ رہا تھا "لیکن نجانے مجھے کیا ہوا تھا کہ عین وقت پر میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔ مجھے حویلی سے یہاں کون لایا تھا اور کاشی...."

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" شوبھا نے میری بات کاٹ دی۔ وہ اس طرح میرے چہرے کو گھور رہی تھی جیسے میری دماغی صحت پر کسی قسم کا شبہ ہو۔

"کیوں۔ کیا ہوا؟" میں نے بھی اسے گھورا "کیا تم سمجھتی ہو کہ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں؟"

"ہاں۔ اب تو یہ شبہ کچھ یقین میں بدلتا جارہا ہے۔" شوبھا نے جواب دیا "یہاں نہ کوئی حویلی ہے اور نہ کسی نے حویلی پر حملہ کیا تھا۔ تم یہاں سے تقریباً دو سو گز آگے جھیل کے کنارے جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ تمہارے جسم پر صرف پتلون تھی۔ قمیص اور جیکٹ تمہارے قریب ہی جھاڑیوں میں پڑی ہوئی تھی۔ صبح سات بجے جھیل کی طرف جانے والی ایک عورت نے ہمیں تمہارے بارے میں اطلاع دی تو ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے۔ پتا نہیں تم کب سے وہاں پڑے تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ سردی سے تمہیں نمونیا نہ ہوجائے اس لیے میں نے تمہارے اوپر کئی کمبل ڈال دیئے تھے۔ تمہیں نمونیا تو نہیں ہوا لیکن سردی نے تمہارے دماغ پر اثر ضرور کیا ہے یا پھر ہوسکتا ہے ہمارے سو جانے کے بعد رات کو تم بستی کے کسی قحبہ خانے میں چلے گئے ہو جہاں شراب پی کر تم بہک گئے اور جھونپڑے کی طرف واپس آنے کے بجائے جھیل کی طرف نکل گئے اور رات بھر سردی میں وہاں پڑے رہے۔"

"کیا بک رہی ہو تم؟" میں نے اسے گھورا "تم جانتی ہو، مجھے شراب سے شدید نفرت ہے۔ میں نے کبھی کوئی اور نشہ بھی نہیں کیا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ رات کو مجھے پالا بلا کر حویلی میں لے گئی...."

"یہاں دور دور تک کسی حویلی کا وجود نہیں ہے۔" شوبھا نے میری بات کاٹ دی "اور قبیلے کی سردار کاشی بھی کسی عالی شان حویلی میں نہیں، ایک جھونپڑے میں رہتی ہے جو بستی کے وسط میں واقع ہے اور وہ رات کو اپنے جھونپڑے ہی میں تھی۔"

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں رات کے واقعات کو کیسے بھول سکتا تھا۔ کاشی کی محافظ یہاں آئی تھی اور میں اس کے ساتھ بستی میں سے ہوتا ہوا حویلی گیا تھا جہاں کاشی سے طویل ملاقات ہوئی تھی لیکن شوبھا کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔

اچانک مجھے وہ مشروب یاد آگیا۔ کیا وہ سب کچھ مشروب کی وجہ سے تھا لیکن وہ مشروب بھی تو میں نے حویلی میں جانے کے بعد ہی پیا تھا۔ مجھے رات کی ایک ایک بات یاد تھی۔ کاشی نے نیلگری کے بارے میں بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں اور مجھے یاد دلایا تھا کہ گوتم بھوش کا جاپ مکمل ہونے میں صرف بارہ دن رہ گئے ہیں اور مجھے یہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ مجھے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ یاد تھا لیکن کیا وہ سب خواب تھا؟ شوبھا کا کہنا تھا کہ یہاں دور دور تک کسی حویلی کا وجود نہیں اور کاشی کی رہائش بھی بستی کے ایک جھونپڑے میں ہے اور یہ کہ وہ رات کو اپنے جھونپڑے ہی میں تھی۔

باہر قدموں کی آواز سن کر میرے خیالات منتشر ہوگئے۔

"شاید رستوگی کسی کے ساتھ آرہا ہے۔" شوبھا نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "انہیں ایسی کوئی کہانی مت سنانا ورنہ وہ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے۔"

میں شوبھا کو گھور کر رہ گیا۔

چند سیکنڈ بعد ہی رستوگی ایک اور آدمی کے ساتھ کمرے

میں داخل ہوا اور جب رستوگی نے اس کا تعارف کرایا تو میں اچھل پڑا۔ وہ شیواگ تھا۔

شیواگ کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ درمیانہ قد' گٹھا ہوا جسم' گنجا سر اور کانوں میں چوڑیوں کی طرح بڑے بڑے بالے تھے۔ چہرے پر کرختگی نمایاں تھی۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چھوٹی تھیں۔ اس شخص کو دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بہت کینہ پرور اور نہایت گھٹیا فطرت کا مالک ہے۔ اس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اس کی باتوں سے بھی میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو دوسروں سے خداواسطے کا بیر رکھتا ہو۔

اس کی باتوں سے اندازہ ہوگیا کہ اسے اس بستی میں ہماری' خاص طور پر میری آمد پسند نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ تو اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ میں جلد سے جلد یہاں سے واپس چلا جاؤں۔

میرے ذہن میں کاشی کی باتیں گونجنے لگیں۔ گزشتہ رات پراسرار ملاقات کے دوران میں اس نے بتایا تھا کہ شیواگ مجھے نیلگری کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا اور اب وہ باتیں سچ ثابت ہو رہی تھیں۔

شیواگ کا گفتگو کا انداز دھمکی آمیز تھا۔ اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ کل صبح تک اس بستی سے واپس چلا جاؤں۔ اس کے بعد اگر میں یہاں رہا تو نقصان اٹھاؤں گا۔

"قبیلے کی سردار کاشی نے ہمیں یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا "میں نہیں سمجھتا کہ سردار کے علاوہ کسی اور کو بھی احکامات جاری کرنے کا حق حاصل ہے۔"

"میں ہوں نا۔" شیواگ نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "کاشی نے جس طرح دھوکے سے سرداری حاصل کی ہے وہ سب ہی جانتے ہیں۔ اس کے چند حواریوں نے اسے سردار بنا دیا ہے لیکن میں نے اسے سردار تسلیم نہیں کیا۔ میں جب تک اسے اس منصب سے ہٹا نہیں دوں گا' مجھے چین نہیں آئے گا۔"

"میں نے تو سنا ہے کہ سردار کو ایک مقابلے کے ذریعے منتخب کیا جاتا ہے۔ جہاں مقابلہ ہو وہاں کسی دھوکے کا امکان نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"مقابلے کے علاوہ ایک اور شرط بھی ہوتی ہے۔" شیواگ نے کہا "سرداری کے لیے مقابلے میں شریک ہونے والی ہر عورت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ غیر شادی شدہ ہو اور کسی مرد کے ساتھ نہ رہی ہو لیکن کاشی کے بارے میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ وہ کنواری نہیں تھی۔ اس قبیلے میں ایک ایسا آدمی موجود ہے جو یہ گواہی دے گا کہ مقابلے سے چند روز پہلے کاشی نے اس کے ساتھ رات گزاری تھی۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "ہم لوگ صدیوں سے اپنی رسموں پر کاربند ہیں۔ ان رسموں سے بغاوت یا دھوکا دہی ہمارے قبیلے کی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہماری نسل مٹ جائے گی۔ کاشی نے دھوکا کیا ہے جس کے نتیجے میں ہماری تنزلی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس مرتبہ ہماری دھان کی فصل اچھی نہیں ہوئی اور جھیل کا پانی بھی چڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ اگر ہم نے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ نہ کیا تو یہ جھیل ہماری بستی کو نگل جائے گی اور ہمارا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔"

"لیکن ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بستی میں ٹھہرنے اور نیلگری کی طرف جانے کی اجازت دے کر کاشی نے دوسری بڑی غلطی کی ہے۔" شیواگ نے جواب دیا "یہ قبیلہ نیلگری کا محافظ ہے۔ ہم کسی کو ان برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتے جن کی ہم صدیوں سے حفاظت کر رہے ہیں۔"

"تم شاید بھول گئے ہو کہ ایک شیطان صفت شخص پہلے ہی اس طرف جا چکا ہے اور تم نے اس کی مدد کی تھی۔" میں نے کہا۔

شیواگ ایک دم بھڑک اٹھا۔

"وہ شیطان نہیں' بہت مہاپرش (عظیم انسان) ہے۔ مہان قوتوں کا مالک۔ وہ نیلگری کی مہان شکتی حاصل کرنے کے لیے اس طرف گیا ہے۔ اس نے ہمارے قبیلے کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے۔ اگر اسے نیلگری کی شکتی مل گئی تو ہمارے قبیلے میں خوش حالی آئے گی۔ ہماری نسل بڑھے گی اور۔۔۔"

"اور وہ تمہیں تباہی کے غار میں دھکیل دے گا۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ یہ موضوع چھڑ گیا تھا تو میں نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا "وہ انسان نہیں' شیطان ہے۔ وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے نہیں' تباہی کے لیے نیلگری کی شکتی حاصل کرنا چاہتا ہے اور میں۔۔۔"

"میں تمہیں کل صبح تک کی مہلت دے چکا ہوں۔" شیواگ میری بات کاٹتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا "اگر تم نے کل تک یہ بستی نہیں چھوڑی تو انجام کے

ذمے دار تم خود ہو گے۔"

وہ چلا گیا۔ رستوگی بھی اس کے پیچھے ہی جھونپڑے سے نکل گیا تھا۔ دھنو اور شوبھا پریشان نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ شوبھا تو نیلگری کی حقیقت سے واقف تھی لیکن دھنو اور مارتھا کے لیے یہ نئی باتیں تھیں۔

مارتھا ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے آئی تھی۔ وہاں اس نے پنڈتوں' یوگیوں اور پراسرار قوتوں کے بارے میں بھی بہت کچھ سنا تھا۔ کچھ عرصہ مندروں میں بھی گزارا تھا اور اب یہاں پراسرار قوتوں کی باتیں سن کر وہ چونکے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"کیا تم بھی پنڈت ہو؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس کے خیال میں شاید صرف پنڈت ہی پراسرار قوتوں کے مالک ہو سکتے تھے۔ دھنو بھی الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"نیلگری اس برف پوش چوٹی کا نام ہے جہاں ہم جانا چاہتے ہیں۔" میں نے مارتھا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "میرا ایک دشمن وہاں چھپا ہوا ہے اور میں۔۔۔"

"شاید تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔" مارتھا نے بات کاٹ دی اور میں نے بھی بات آگے نہیں بڑھائی۔

میں نے اٹھ کر قمیص پہن لی اور جھونپڑے سے باہر آگیا۔ جیکٹ پہننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اس وقت مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ یہ شاید اس مشروب کا اثر تھا جو گزشتہ رات کاشی نے مجھے پلایا تھا لیکن اس سلسلے میں میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ پالا رات کو مجھے حویلی میں لے گئی تھی جہاں کاشی سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے وہ خوش ذائقہ مشروب پلایا تھا جس سے میرے اندر لاوا سا کھولنے لگا تھا لیکن شوبھا کا کہنا تھا کہ مجھے جھیل کے کنارے جھاڑیوں میں بے ہوش پڑے ہوئے پایا گیا تھا اور دور دور تک کسی حویلی کا نام ونشان تک نہیں تھا لیکن اگر وہ سب خواب تھا تو وہ ساری باتیں میرے سامنے کیسے آرہی تھیں جو میں نے "خواب" میں دیکھی تھیں۔ شدید سردی سے بچنے کے لیے اس قبیلے کے لوگ خاص قسم کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیا گیا وہ مشروب استعمال کرتے تھے۔ میں نے بھی اس مشروب کا ایک گلاس پیا تھا جس کی وجہ سے مجھے سردی بالکل نہیں لگ رہی تھی۔ کاشی نے بتایا تھا کہ شیواگ بعض شیطانی قوتوں کے زیر اثر ہے اور وہ مجھے نیلگری کی طرف جانے سے روکنے کی کوشش کرے گا اور اس نے اپنی کوشش شروع کر دی تھی۔

گزشتہ رات میرے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اگر خواب تھا تو یہ ساری باتیں حقیقت بن کر میرے سامنے کیوں آرہی تھیں؟ میں جیسے جیسے سوچتا' میرا ذہن الجھتا گیا۔

میں کافی دیر وہاں کھڑا دھوپ میں چمکتے ہوئے' جھیل کے پانی کو دیکھتا رہا پھر کنارے کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔

میں بستی اور جھیل کے درمیان جھاڑیوں میں چلتا ہوا بستی کی دوسری طرف پہنچ گیا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں رات کو پالا مجھے لے کر آئی تھی۔ بستی کے آخری جھونپڑے سے تقریباً دو سو گز آگے ایک بلند ٹیلا تو نظر آرہا تھا لیکن اس طرف حویلی تو کیا' کسی چھوٹے سے جھونپڑے کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ ٹیلے پر اس کے آس پاس قدِ آدم جھاڑیاں تھیں۔

میں اپنی جگہ پر کھڑا ٹیلے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دو عورتوں کو ان جھاڑیوں سے برآمد ہوتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ اسی طرف آرہی تھیں۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

ان کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا پھر بستی کے باہر ہی باہر چلتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس طرف بستی سے آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ پہاڑی علاقوں میں قابلِ کاشت زمین ہموار نہیں ہوتی۔ میں نے تھائی لینڈ میں بھی دیکھا تھا اور یہاں بھی ویسی ہی صورتِ حال تھی۔ کھیت کشادہ سیڑھیوں کی طرح نیچے اوپر دور تک چلے گئے تھے۔

میں باہر ہی باہر گھومتا رہا۔ بستی کے باہر دور تک کوئی عمارت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں بستی میں داخل ہو گیا۔ یہ بستی واقعی بڑی پلاننگ سے بسائی گئی تھی۔ کہیں بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ جھونپڑوں کے درمیان کشادہ گلیاں تھیں۔ گلیوں میں لوگوں کی آمد ورفت تھی۔ زیادہ تعداد عورتوں ہی کی نظر آتی تھی۔ بعض عورتیں مسکراتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں بستی کے مرکزی چوراہے پر پہنچ گیا۔ میرا یہ اندازہ بھی درست ثابت ہوا تھا کہ اس بستی میں ریسٹورنٹ قسم کی ایسی جگہیں ضرور ہوں گی جہاں لوگ بیٹھ کر وقت گزارتے اور گپ شپ کرتے ہوں گے۔

چوراہے پر بڑی رونق تھی۔ ایک طرف جہاں میں کھڑا تھا' ریسٹورنٹ قسم کا ہال نما جھونپڑا تھا جس کے فرش پر ایک

کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور ٹولیوں کی صورت میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ ایک طرف عورتوں کا جمگھٹا سا لگا ہوا تھا اور شور سنائی دے رہا تھا۔

دو جوان عورتیں زمین پر جھکی بیٹھی پنجہ لڑا رہی تھیں۔ میں آگے بڑھ کر یہ دلچسپ منظر دیکھنے لگا۔ ان دونوں کی کہنیاں زمین پر ٹکی ہوئی تھیں اور انہوں نے ایک دوسرے کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا رکھی تھیں۔

دونوں کی کوشش تھی کہ اپنی حریف کا بازو نیچے جھکا کر اس کا ہاتھ زمین سے لگا دے۔ کبھی ایک طرف دباؤ پڑتا اور کبھی دوسری طرف۔ ان کے اردگرد جمع عورتیں چلا چلا کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں۔ اس ہجوم میں دو آدمی بھی تھے۔ وہ بھی چیخ چلا رہے تھے۔

دونوں عورتوں میں پنجہ آزمائی کئی منٹ تک جاری رہی۔ دونوں عورتیں دراز قامت اور صحت مند جسم کی تھیں۔ دونوں کے بازوؤں کے مسلز ابھرے ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ بقول شخصے 'کانٹے کا مقابلہ تھا اور بالآخر یہ مقابلہ ختم ہوگیا۔ ایک عورت کا بازو بائیں طرف جھکا اور پھر جھکتا چلا گیا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی حریف کا دباؤ برداشت نہیں کر سکی اور اس کا ہاتھ زمین پر لگ گیا۔

ایک شور سا اٹھا اور فاتح عورت بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں بازو کا مسل تھپتھپانے لگی۔ اسی دوران میں اس کی نظر میری طرف اٹھ گئی۔ اس نے چیلنج کرنے کے انداز میں مجھے میدان میں آنے کا اشارہ کیا۔

میں گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگا تو کئی عورتوں نے مجھے گھیر لیا اور پکڑ کر زبردستی اس کے سامنے بٹھا دیا۔ وہ عورت دو زانو بیٹھی تھی۔ اس نے آگے جھک کر کہنی زمین پر ٹکا دی اور تاؤ دلانے والی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میرے اردگرد کھڑی ہوئی عورتیں اور وہ دونوں آدمی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہے تھے۔ میں ان کا مطلب سمجھ رہا تھا لیکن میں ایک عورت کا مقابلہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا مگر بالآخر میں نے بھی اپنی کہنی زمین پر ٹکا دی۔ اس عورت نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے میری انگلیوں میں انگلیاں پھنسا دیں۔ اس کا ہاتھ روئی کے گالے کی طرح نرم اور گداز تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا ایک جھٹکا بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔ قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے چیخ کر کچھ کہا اور میری حریف نے زور آزمائی شروع کر دی۔

وہ پورا زور لگا رہی تھی۔ اس کے جبڑوں کے مسل ابھر آئے تھے۔ پہلے وہ گھٹنوں پر جھکی ہوئی تھی پھر نیم دراز ہوگئی۔ اس نے دوسرا ہاتھ زمین پر ٹکا دیا حالانکہ یہ فاؤل تھا مگر میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں اطمینان سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ میرے ہاتھ کو معمولی سی حرکت بھی نہیں دے سکی۔

میرا بازو کھمبے کی طرح اپنی جگہ پر ٹکا ہوا تھا اور پھر میں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔

میری حریف کا بازو آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جھکنے لگا۔ وہ دباؤ کو روکنے کے لیے پوری قوت استعمال کر رہی تھی لیکن اس کا بازو جھکتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ کی پشت زمین سے دو انچ اوپر رہ گئی تھی کہ میری نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کا نیم برہنہ سینہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

میری حریف کو موقع مل گیا۔ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا اور ہمارے بازو ایک بار پھر سیدھے ہوگئے۔

میری نظروں کا زاویہ دیکھ کر اس نے صورت حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پہلو بدل کر اپنے آپ کو کچھ اور نمایاں کیا۔ وہ اس طرح مجھ پر حاوی ہونا چاہتی تھی۔ میں اس کی چال سمجھ گیا اور آنکھیں بند کر کے اس کے بازو کو دبانے لگا۔ اس مرتبہ مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور میں نے بڑی آسانی سے اس کا ہاتھ زمین پر لگا دیا۔

ایک آدمی اس عورت کو ہٹا کر میرے مقابلے پر آ گیا۔ وہ میری ہی طرح قد آور اور صحت مند آدمی تھا۔ اس کے بازوؤں کے مسلز بھی ابھرے ہوئے تھے لیکن وہ دو منٹ میں شکست کھا گیا۔ وہ شرمندہ سا ہو کر پیچھے ہٹا تو اس کی جگہ ایک اور آدمی نے لے لی لیکن وہ بھی دو منٹ سے زیادہ نہیں ٹک سکا۔

یہ خبر پورے چوک میں پھیل گئی کہ اجنبی پنجہ آزمائی میں کئی لوگوں کو شکست دے چکا ہے۔ میرے اردگرد بہت بڑا ہجوم لگ گیا تھا اور مرد بھی اب معقول تعداد میں موجود تھے۔ ایک کے بعد ایک آدمی میرے مقابلے پر آتا رہا اور شکست کھا کر پیچھے ہٹتا رہا۔

اور پھر جو آدمی لوگوں کو دھکے دیتا ہوا آگے آیا اسے دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ شیواگ تھا۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ شیواگ نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"بہت دیر سے تمہارے بارے میں سن رہا ہوں۔" وہ کہنی زمین پر ٹکاتے ہوئے بولا "آؤ۔ دیکھتے ہیں' تم میں کتنی

طاقت ہے۔"

اس نے مجھے چیلنج کر دیا تھا۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں پر سنسنی سی پھیل گئی۔ اس بستی کے لوگ شیواگ کو مجھ سے زیادہ جانتے تھے۔ اس کی فطرت سے بھی واقف تھے اور شاید انہیں کسی ہنگامے کی بھی توقع تھی اسی لیے ان کے چہروں پر سنسنی سی پھیل گئی تھی۔

شیواگ سے اگرچہ آج صبح ہی بدمزگی کی شروعات ہو چکی تھیں اور میں فی الحال اس سے کوئی پنگا نہیں لینا چاہتا تھا لیکن وہ خود ہی پنگے بازی کر رہا تھا تو میں پیچھے ہٹ کر اپنی سبکی کیسے کرواتا اور پھر اسی لمحے مجھے مارتھا' دھنو اور شوبھا کے چہرے بھی دکھائی دیے۔ وہ عورتوں کو دھکے دیتی ہوئی آگے آنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

میں نے بھی اپنی کہنی زمین پر ٹکا دی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں اپنی انگلیاں پھنسالیں۔ شیواگ نے میری انگلیوں پر دباؤ ڈالا تو میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے فوراً ہی طاقت کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ ریفری کے فرائض انجام دینے والا آدمی بھی آگے آگیا تھا۔ اس نے اپنا سیدھا ہاتھ اوپر اٹھا دیا اور پھر چیخ کر ہاتھ نیچے گرا دیا گویا مقابلہ شروع ہوگیا۔

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ شیواگ میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری انگلیاں آہنی شکنجے میں پھنسی ہوں۔

کبھی میرا بازو چند انچ ایک طرف جھکتا اور کبھی شیواگ کا۔ ہم دونوں کے حمایتی چیخ چیخ کر ہماری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ میری حمایت میں دھنو اور مارتھا وغیرہ تو تھیں ہی' بستی کی دوسری عورتیں بھی میری حمایت میں چیخ رہی تھیں جبکہ شیواگ کے حمایتیوں کی تعداد کم تھی۔

تین چار منٹ گزر گئے۔ مقابلہ ابھی تک برابر تھا۔ کبھی شیواگ کا ہاتھ چند انچ جھکتا اور کبھی میرا۔

اچانک میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مجھے اپنی قوت سلب ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ شیواگ میرا ہاتھ دبا رہا تھا۔ میں مزاحمت کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ میرا ہاتھ بدستور جھکتا جا رہا تھا۔

زمین سے میرے ہاتھ کا فاصلہ صرف تین انچ رہ گیا تھا۔ دھنو' مارتھا' شوبھا اور میری حمایتی بستی کی عورتیں چیخ رہی تھیں۔ مجھے سنبھلنے کا مشورہ دے رہی تھیں۔ شیواگ کے حمایتی بھی چلا چلا کر اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

میرے دماغ کو ایک اور جھٹکا لگا۔ مجھے سمجھنے میں دیر

انگریزی سکھانے والی
بہترین کتابیں

HOW TO WRITE A LETTER
خطوط نویسی کے لئے ← 10/-

HOW TO WRITE AN ESSAY.
مضمون نگاری کے لئے ← 10/-

HOW TO WRITE AN EXPLANATION
وضاحت و تشریح کے لئے ← 10/-

HOW TO LEARN CORRECT SPELLING.
صحیح ہجے لکھنے کے لئے ← 10/-

HOW TO DO COMPRIHENSION
ادراکِ فہم کا اظہار کرنے کے لئے ← 10/-

CORRCT POSITION OF PREPOSITIONS
پری پوزیشن کے صحیح استعمال کے لئے ← 15/-

HOW TO PUNCTUATE
رموز و اوقاف جاننے کے لئے ← 10/-

10 DAYS TO TRANSLATION
اردو سے انگلش میں ترجمہ کرنے کے لئے ← 15/-

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس [illegible] 74200
[illegible] 6002561 فیکس: 6002582-6896313
کتابوں کی قیمتیں اور ڈاک خرچ موجود ہیں ان میں کسی بھی وقت تبدیلی ہو سکتی ہے 1-6-2001

نہیں لگی کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کوئی پراسرار قوت شیواگ کی مدد کر رہی تھی۔ میں نے شیواگ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ اس کی پشت پر ایک ہیولا سا نظر آیا۔

میرا ہاتھ ایک انچ کے قریب مزید جھک گیا تھا۔ یہ شیواگ کی جسمانی قوت نہیں تھی جو میرا ہاتھ دبا رہی تھی۔ کوئی اور پراسرار قوت اس کی پشت پر تھی جو مجھے شکست دینے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر اچانک میرے اندر بھی ہلچل سی مچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرے اندر انگڑائی لے رہا ہو۔

میرا ہاتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ شیواگ کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ ہمارے بازو ایک بار پھر سیدھے کھڑے ہو گئے۔ شیواگ پوری قوت استعمال کر رہا تھا لیکن اس مرتبہ وہ میرے ہاتھ کو معمولی سی حرکت بھی نہیں دے سکا۔

"تم اگر چاہو تو اپنے ساتھیوں سے مدد لے سکتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "اگر تم لوگ مل کر بھی اس کھیل میں مجھے شکست دے دو تو میں ایک گھنٹے کے اندر اندر بستی چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

شیواگ نے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں بے پناہ نفرت تھی۔ اس نے چیخ کر اپنے آدمیوں سے کچھ کہا۔ پہلے ایک اور پھر دوسرا آدمی بھی اس کی مدد کے لیے آگے آ گیا۔

وہ تینوں میرا بازو موڑنے کے لیے پوری قوت بروئے کار لا رہے تھے لیکن میرا بازو کھمبے کی طرح کڑا ہوا تھا۔ شیواگ کی پشت پر وہ ہیولا اب بھی موجود تھا اور اب تو وہ ہیولا میری نظروں کے سامنے واضح ہوتا جا رہا تھا۔

جھریوں بھرا چہرہ' سر کے بال لمبے اور برف کی طرح سفید تھے اور چڑیا کے گھونسلے کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سفید تھے۔ مونچھیں بھاری' بہت لمبی اور دونوں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ داڑھی بھی چھاج کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔

میں شیواگ کو نہیں' اس کی پشت پر اس ہیولے کو دیکھ رہا تھا اور پھر میں نے بھی اپنے اندر کی قوت استعمال کرنا شروع کر دی۔ شیواگ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ وہ خود بھی آہستہ آہستہ زمین کی طرف جھکنے لگے۔ وہ پراسرار جھریوں بھرا چہرہ اب کچھ بدحواس سا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں جیسے پھٹی پڑ رہی تھیں۔

میں نے اپنے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ان تینوں کے ہاتھ زمین پر لگ گئے۔ شیواگ کے دونوں ساتھی قلابازی کھا کر دور گرے تھے۔ شیواگ دوسرے ہاتھ سے اپنی انگلیاں سہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت دوچند ہو گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ تو مذاق تھا۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے حقارت آمیز لہجے میں بولا "شام کو مقابلہ ہو گا۔ اگر تم نے "نیلا کوبرا" پکڑ لیا تو میں اپنی شکست تسلیم کر لوں گا۔"

اس کے الفاظ سے مجمع پر ایک لمحے کو سناٹا سا طاری ہو گیا۔ شیواگ اور اس کے ساتھی پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی مجمع میں گویا زندگی لوٹ آئی۔ میری فتح پر لوگ خوشی سے اچھلنے لگے۔ وہ دراز قامت عورت جسے میں نے سب سے پہلے شکست دی تھی' آگے بڑھ کر تیزی سے جھکی اور دوسرے ہی لمحے اس نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا۔ میں ہاتھ پیر مارتا رہ گیا لیکن ان قبائلی عورتوں نے چوک پر میرا جلوس نکال دیا۔ میری فتح پر ان کی خوشی دیکھ کر شیواگ کے بارے میں ان کے جذبات کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

بستی کے لوگ مجھ سے لپٹے جا رہے تھے۔ ہر شخص اس طرح خوشی کا اظہار کر رہا تھا جیسے میں انہی میں سے ہوں اور میں نے ان کے لیے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ دھنو کی خوشی بھی قابلِ دید تھی۔ وہ بار بار مجھ سے لپٹ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ مجھے اپنے اندر سمو لیتی۔

میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے پنجہ آزمائی میں اس قبیلے کے ایک معتبر شخص کو شکست دی تھی۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونی چاہییں تھیں لیکن سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ مقابلے کے درمیان بھی لوگ زیادہ تر میری ہی حوصلہ افزائی کرتے رہے تھے اور میری جیت پر تو وہ ناچ رہے تھے' خوشیاں منا رہے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان کے دلوں میں شیواگ کے لیے کتنی نفرت تھی۔

یہ ہنگامہ ابھی جاری تھا کہ کاشی کی محافظ پالا کسی طرف سے نمودار ہوئی۔ اس کے ساتھ دو نیزہ بردار مرد بھی تھے۔

پالا اور ان دونوں نیزہ برداروں کو دیکھ کر لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے۔ پالا میرے سامنے آ کر رک گئی۔

"تمہیں کاشی نے طلب کیا ہے۔ ابھی' اسی وقت۔"

اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

میں پالا کے ساتھ چل پڑا۔ دھنو وغیرہ بھی آگے بڑھیں تو پالا نے انہیں روک دیا۔

"تم لوگ نہیں۔" اس نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم لوگ یہیں ٹھہرو یا اپنے جھونپڑے میں چلی جاؤ۔ کاشی ضروری سمجھے گی تو تم لوگوں کو بھی بلا لے گی۔"

دھنو کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ میں اور پالا ساتھ ساتھ تھے اور دونوں نیزہ بردار ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

کاشی کا جھونپڑا بستی کے مرکزی چوک سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ جھونپڑا دوسرے جھونپڑوں کے مقابلے میں خاصا بڑا تھا۔ باؤنڈری وال نے اچھی خاصی جگہ گھیری ہوئی تھی۔ ایک محافظ بیرونی دروازے کی اندر کی طرف صحن میں موجود تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے دونوں نیزہ بردار بھی وہیں رک گئے اور میں پالا کے ساتھ تقریباً دس گز کا مزید فاصلہ طے کر کے جھونپڑے کے دروازے میں داخل ہو گیا جس کے سامنے برآمدے کی طرح سائبان بھی بنا ہوا تھا۔

یہ ہال نما کمرا خاصا بڑا تھا۔ اس کی دائیں طرف ایک مختصر سی راہداری تھی جس کے اختتام پر ایک اور کمرا تھا جس کے دروازے پر یاک کی کھال کا پردہ لٹکا ہوا تھا۔ پالا نے پردہ ہٹا کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں رک گئی۔

میرے ذہن میں اس حویلی کا تصور ابھر آیا جس کی سیر میں نے گزشتہ رات کی تھی لیکن یہ جھونپڑا اس حویلی سے بہت مختلف تھا۔

یہ کمرا بھی خاصا وسیع تھا۔ فرش پر یاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سنگل صوفے کی طرح لکڑی کی ایک بھدی سی کرسی پر کاشی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قریب ہی ایسی ہی دو کرسیاں اور بھی پڑی تھیں۔

کرسی کی پشت اونچی تھی اور کاشی دونوں بازو ہتھوں پر ٹکائے بڑی تمکنت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہیں۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ آ گئی تھی۔ مجھے بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ قبیلے کی سردار کے سامنے پیش ہونے کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ تاہم کاشی نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ آگے بڑھایا تو میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا اور مؤدبانہ انداز میں کھڑا ہو گیا۔ کاشی کل صبح ہمارے جھونپڑے میں آ چکی تھی۔ اس وقت اس کا انداز بے تکلفانہ تھا۔ رات کو..... لیکن میں رات کا ذکر بار بار نہیں کروں گا..... نجانے کیا بات تھی کہ اس وقت مجھ پر کاشی کا رعب سا طاری ہو رہا تھا۔

"بیٹھو۔" اس نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں جھجکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کاشی اس کمرے میں اکیلی نہیں تھی۔ دائیں طرف ایک دروازے کے قریب ایک نوجوان خادمہ بھی کھڑی تھی۔ دروازے کے سامنے پردے کے بجائے رنگ برنگے موتیوں کی لاتعداد جھالریں لٹکی ہوئی تھیں اور یہی جھالریں پردے کا کام بھی دے رہی تھیں۔ دروازے سے ذرا ہٹ کر دیوار کے قریب اسٹول کی طرح' چبوترے پر شیشے کا ایک بڑا سا مٹکا رکھا تھا جس میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

کاشی نے دروازے کے قریب کھڑی ہوئی خادمہ کو اشارہ کیا وہ اندر چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد لکڑی کی ایک طشتری میں عنابی رنگ کے مشروب سے بھرے ہوئے دو گلاس لے آئی۔ دونوں گلاس اس نے کرسیوں کے درمیان رکھی ہوئی کافی ٹیبل قسم کی بھدی سی میز پر رکھ دیے۔ کاشی نے ایک گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

"لو پیو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "اس کا ذائقہ تمہارے لیے اجنبی نہیں ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ میرے ذہن میں رات کا منظر ابھر آیا۔ کاشی نے اسی طرح مجھے مشروب پیش کیا تھا۔ گویا گزشتہ رات اس سے میری ملاقات ہوئی تھی لیکن وہ شان دار حویلی' کمروں کی دیواروں اور کھڑکیوں پر لہراتے ہوئے رنگ برنگے وہ ریشمی پردے' وہ سب کچھ کیا تھا؟ اگر وہ خواب تھا تو کیا خواب میں نظر آنے والی ہستی بھی جانتی ہے کہ وہ خواب دیکھنے والے کے روبرو موجود تھی۔ نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ تو پھر کاشی کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہ مشروب پہلے بھی پی چکا ہوں۔

ہم میں ابھی گفتگو کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ کاشی مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس سے نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وجہ اس کا وہ لباس تھا۔ گھٹنوں سے اوپر کھال کا اسکرٹ اور سینے پر سامنے یاک ہی کی کھال کا مختصر سا ٹکڑا۔

اچانک ایک چھناکا سا ہوا اور میں اچھل پڑا۔ کاشی بھی ایک لمحے کو بدحواس سی ہو گئی تھی۔ میں نے آواز کی سمت دیکھا اور مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

دیوار کے ساتھ چبوترے پر رکھا ہوا شیشے کا مٹکا ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ پانی چاروں طرف بہہ گیا اور رنگ برنگی مچھلیاں

زمین پر تڑپنے لگیں۔

میری طرح کاشی بھی اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کو دھواں ہوگیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ میں زمین پر تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو اٹھانے کے لیے لپکا تو کاشی نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور مجھے کھینچتی ہوئی اس کمرے میں گھس گئی جس کے دروازے پر رنگ برنگے موتیوں والی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔

یہ خواب گاہ تھی جس میں دائیں طرف لکڑی کے ایک تخت پر یاک کی کھالوں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ پچھلی طرف ایک کشادہ کھڑکی تھی۔ اس کے سامنے بھی موتیوں والی جھالریں لٹکی ہوئی تھیں۔ پلنگ کے سامنے دو آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے چبوترہ بنا ہوا تھا۔ کمرے میں ضرورت کی اور چیزیں بھی موجود تھیں۔

"بیٹھو۔" کاشی نے چبوترے کی طرف اشارہ کیا اور باہر کھڑی ہوئی خادمہ کو بلا کر دوسرے کمرے سے مٹکے کے ٹکڑے اور مچھلیاں اٹھا لینے کا حکم دیا۔

کاشی پلنگ پر چڑھ کر پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

"اس شیطان کو پتا چل گیا ہے کہ تم یہاں آئے ہو۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن یہ کمرا محفوظ ہے۔ یہاں اس کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب چاہے، تمہیں اس کمرے تک محدود کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسا بھی نہیں ہے۔" کاشی بولی "غلطی میری تھی۔ تمہارے یہاں آنے سے پہلے مجھے بندوبست کرلینا چاہیے تھا۔ بہرحال، اس وقت ہم یہاں محفوظ ہیں اور اطمینان سے باتیں کرسکتے ہیں۔"

"کیا تمہیں یاد ہے کہ اس سے پہلے بھی ہماری کوئی ملاقات ہوئی تھی؟" میں نے نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ دراصل میں گزشتہ رات کی ملاقات کا حال جاننا چاہتا تھا۔

"ہاں۔ کل صبح تمہارے جھونپڑے میں ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔ اس کے علاوہ؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کاشی نے جواب نہیں دیا۔ وہ میرے اس سوال پر محض مسکرا کر رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن ایک بات اور۔" میں نے کہا۔ میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں "شیواگ کو تم سے کس بات پر اختلاف ہے؟"

"وہ نہایت کمینہ اور خبیث شخص ہے۔" کاشی نے جواب دیا "کسی سے اختلاف کے لیے وہ کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں سمجھتا۔ اس کے ساتھ لوگوں کا رویہ تم نے آج دیکھ لیا۔ تم اجنبی ہو اور وہ اس قبیلے کا ایک فرد۔ لوگوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں مگر اس بستی کے لوگوں نے ایک اجنبی کی جیت کا جشن منایا۔"

"اس کی وجہ بھی میں سمجھ سکتا ہوں لیکن وہ تم پر یہ الزام لگاتا ہے کہ سردار منتخب ہونے سے پہلے تم....." میں ایک لمحے کو خاموش ہوگیا۔ میں کھلے الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا "میرا مطلب ہے، تم نے ایک اہم شرط پوری نہیں کی تھی جس کی وجہ سے قبیلے پر عذاب نازل ہورہا ہے یا ہونے والا ہے؟"

کاشی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"وہ شیطان ہر شخص سے یہی کہتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔ اس کا اندازہ تم نے آج لگالیا ہوگا۔ اس کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں۔"

"لیکن اگر ایک جھوٹی بات بھی بار بار دہرائی جائے تو اس پر سچ کا گمان ہونے لگتا ہے اور لوگ اس کا اثر قبول کرلیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"لوگ حقیقت کو سمجھتے ہیں۔" کاشی نے کہا "جس شخص کے حوالے سے شیواگ نے مجھ پر الزام لگایا تھا وہ بار بار اس کی تردید کرچکا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ شخص مردانہ صلاحیتوں سے محروم ہے اس لیے اس الزام میں کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی۔"

"تمہیں کیسے معلوم کہ وہ....." میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"قبیلے کی بہت سی عورتیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔" کاشی نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی "بہرحال، یہ ایک مختلف موضوع ہے اور تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنے مقصد پر توجہ دینی چاہیے جس کے لیے تم اتنا طویل اور کٹھن سفر کرکے آئے ہو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

میرے دماغ میں ایک بار پھر سنسناہٹ ہونے لگی۔ گزشتہ رات کی ملاقات خواب تھی یا حقیقت؟ اب وہ ساری باتیں دہرائی جارہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا تھا۔ بہرحال، میں ان باتوں کو دہرانے کی کوشش

نہیں کروں گا۔ لب لباب یہ تھا کہ کاشی اور اس کا یہ قبیلہ صدیوں سے اس راستے کے محافظ کے فرائض انجام دے رہا تھا جو تیلگری کی طرف جاتا تھا۔ تلکو جھیل کے کنارے پر آباد یہ قبیلہ ان برف پوش چوٹیوں کو بہت مقدس اور پوتر سمجھتا تھا اور ان کے عقیدے کے مطابق ان برف پوش چوٹیوں میں ایک ایسی مہان شکتی خوابیدہ تھی جو اگر کسی غلط آدمی کے ہاتھوں میں چلی جاتی تو جھیل کا پانی اس بستی اور قبیلے کو نگل جاتا۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ شکتی چونکہ مونث تھی اس لیے تلکو قبیلے کی سرداری کے لیے بھی ایک ایسی عورت کو منتخب کیا جاتا تھا جو کنواری ہو۔ سردار منتخب ہونے سے پہلے وہ کسی مرد کے پاس نہ گئی ہو۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا پھر یکایک ایک شیطان فطرت آدمی ان برف پوش چوٹیوں کی طرف جانے میں کامیاب ہوگیا۔ شیواگ نے قبیلے کی رسموں سے بغاوت کرکے اس شیطان کی مدد کی تھی اور اس کی شیطانی قوتوں کے زیر اثر آگیا تھا اور وہ کاشی کی مخالفت کررہا تھا۔

قبیلے کی سردار منتخب ہونے والی عورت کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اکیس روز کا ایک جاپ کرے اور دراصل یہ جاپ ہی کاشی کو اب تک بچائے ہوئے تھا۔

ہماری گفتگو خاصی طویل ہوگئی تھی۔ میں اٹھ رہا تھا کہ اچانک ہی مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔

"یہ نیلا کوبرا کیا ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس نے تمہیں چیلنج کیا ہے۔" کاشی بولی "نیلا کوبرا وہ زہریلا سانپ ہے جس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ اس سانپ کا زہر اس قدر سریع الاثر ہے کہ انسان کے جسم کو چھوتے ہی اس کی موت واقع ہوجاتی ہے اور چند سیکنڈ کے اندر اندر جسم کوئلے کی طرح سیاہ ہوجاتا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "تاہم ایک خاص عمل کے ذریعے زہر کے اثر کو روکا جاسکتا ہے اور شیواگ یہ عمل جانتا ہے۔ اسے جب بھی کوئی مشکل پڑتی ہے وہ اپنے حریف کو یہی چیلنج دیتا ہے۔ حریف یا تو اپنی شکست تسلیم کرلیتا ہے یا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے میرا مشورہ ہے کہ تم....."

"مجھے اس کا یہ چیلنج قبول ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

کاشی کی آنکھوں میں وحشت سی ابھر آئی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

کاشی کے جھونپڑے سے نکل کر میں ٹہلتا ہوا بستی کے مرکزی چوک پر آگیا۔ بہت سے لوگ وہاں موجود تھے مگر شوبھا وغیرہ نظر نہیں آئیں۔ میں اپنے جھونپڑے کی طرف چل پڑا۔ ایک عورت بھی میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

"تم نے شیواگ کا چیلنج قبول کرکے بہت بڑی غلطی کی ہے۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم چاہو تو میں شیواگ کو یہ چیلنج واپس لینے پر آمادہ کرسکتی ہوں۔"

"اس کے لیے شرط کیا ہوگی؟" میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں اس کے حق میں اپنی ایک عورت سے دستبردار ہونا پڑے گا اور شام سے پہلے پہلے یہ بستی چھوڑنی ہوگی۔ اس کے چند آدمی تمہارے ساتھ جائیں گے جو تمہیں یہاں سے دو دن کی مسافت پر چھوڑ دیں گے۔"

"اس بستی میں عورتوں کی کمی تو نہیں پھر اس نے میری ساتھی کسی عورت پر نظریں کیوں گاڑ رکھی ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسے تمہاری وہ عورت پسند آگئی ہے جو آج تمہاری جیت کی خوشی میں ناچ رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔ اس کا اشارہ دھنو کی طرف تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قبیلے کی عورتیں بے حد حسین تھیں لیکن دھنو کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ اس کی معصومیت نے بھی اسے کچھ زیادہ ہی حسین بنادیا تھا۔

"تم شیواگ کی وکالت کیوں کررہی ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"وکالت نہیں کررہی۔ میں نے اس کا پیغام تم تک پہنچایا ہے اور اگر تم چاہو تو اپنی اس عورت کے بدلے تم مجھے اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔" اس نے کہا۔

"شیواگ کو شاید اپنی شکست کا خوف ہے اسی لیے وہ مجھے مقابلے سے دستبردار کرانا چاہتا ہے۔ تم نے اس کا پیغام پہنچادیا۔ شکریہ! اس سے کہنا، میں شام کو چوک پر پہنچ جاؤں گا۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اپنی رفتار تیز کردی۔

وہ عورت وہیں رک گئی۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر تیز تیز چلتا رہا۔

دھنو وغیرہ جھونپڑے میں موجود تھیں۔ وہ مجھ سے کاشی

سے ہونے والی اس ملاقات کے بارے میں سوال کرتی رہیں اور میں نیگری کا ذکر بیچ میں لائے بغیر مناسب انداز میں ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔

دوپہر کا کھانا ہمیں جھونپڑے ہی میں پہنچا دیا گیا۔ کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں سو گیا۔

جب بیدار ہوا تو سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ جھونپڑے میں کوئی نہیں تھا۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ شوبھا اور مارتھا جھیل کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دھنو کہیں نظر نہیں آئی۔

"دھنو کہاں ہے؟" میں نے شوبھا کے قریب رک کر پوچھا۔

"بستی میں کہیں گھوم رہی ہوگی۔" شوبھا نے جواب دیا "آج اس نے یہاں کئی لوگوں کو دوست بنا لیا ہے۔ تمہارے سو جانے کے بعد کونگا نام کی ایک عورت یہاں آئی تھی۔ وہی دھنو کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔"

میں بھی ان کے قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ جھیل میں بہت دور تین چار کشتیاں تیر رہی تھیں۔ یہ بستی کے ماہی گیروں کی کشتیاں تھیں۔ مچھلی بھی قبیلے والوں کی خوراک کا ایک اہم جزو سمجھی جاتی تھی۔

میری نظریں ان کشتیوں سے آگے بہت دور ایک ٹاپو پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے خیال میں وہ کوئی چھوٹا سا جزیرہ تھا جس پر درخت بھی نظر آرہے تھے۔ اس جزیرے کے بارے میں رستوگی نے بھی مجھے بتایا تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی اور بستی کے لوگ اس طرف جاتے بھی نہیں تھے۔

سورج جھیل کے اس پار پہاڑوں پر جھکنے لگا تھا۔ ہمیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔

"ارے یہ دھنو کہاں غائب ہوگئی؟" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیر سپاٹا کر رہی ہوگی۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟" شوبھا نے جواب دیا۔

میں پھر جھیل کی طرف دیکھنے لگا۔ ماہی گیروں کی کشتیاں واپس آرہی تھیں۔

سورج پہاڑی چوٹیوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کچھ دیر تک افق پر سرخی تیرتی رہی اور پھر یہ سرخی شام کے دھندلکے میں ڈھلنے لگی۔ میں بار بار دھنو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بستی تو نہیں تھی جس کی سیر میں کئی گھنٹے لگ جائیں۔ میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ شوبھا اور مارتھا کے چہروں پر بھی اب پریشانی کے [illegible] آئے تھے۔

ہم تینوں وہاں سے اٹھ کر بستی میں آگئے اور مختلف گلیوں میں گھومتے ہوئے مرکزی چوک پر پہنچ گئے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں دھنو کو تلاش کرتا رہا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

مرکزی چوراہے پر چاروں طرف مشعلیں جل رہی تھیں اور چوک کے عین وسط میں بنے ہوئے چبوترے پر ایک صندوق رکھا ہوا تھا جو یاک کی کھال سے ڈھکا ہوا تھا۔ لوگ چبوترے کے ارد گرد جمع ہو رہے تھے۔

"وہ... وہ دیکھو' کونگا کھڑی ہے۔" شوبھا نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف متوجہ کیا "دھنو اسی کے ساتھ آگئی تھی۔ اس سے معلوم کرو۔"

میں نے اس طرف دیکھا تو چونک گیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے دوپہر کو مجھے شیواگ کے حق میں مقابلے سے دستبردار ہونے کو کہا تھا۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر کونگا کو بازو سے پکڑ لیا۔

"دھنو کہاں ہے؟" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کسی قدر کرخت لہجے میں پوچھا۔

مجھے دیکھ کر کونگا بدحواس سی ہوگئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے فوراً ہی اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

"کون دھنو؟" وہ الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میری دوست... جسے تم دوپہر کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"وہ... وہ تو چلی گئی تھی۔ بستی کے باہر۔ اس طرف..." اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا کہ ایک آدمی اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچتا ہوا لے گیا۔

میری پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں دھنو کی تلاش میں کسی اور طرف جاتا ایک شور سا مچا اور ادھر ادھر پھیلے ہوئے لوگ بھی چبوترے کے گرد جمع ہونے لگے۔

شیواگ ڈھکے ہوئے صندوق کے قریب چبوترے پر کھڑا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی بھی چبوترے پر چڑھ کر صندوق کی دوسری طرف کھڑا ہوگیا اور دو منٹ بعد ہی کاشی بھی پالا اور دو محافظ [illegible] کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ قریب کھڑا ہوا ایک آدمی مجھے [illegible] پکڑ کر چبوترے پر لے گیا۔

اس بوڑھے آدمی نے اونچی آواز میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ کہا اور صندوق پر پڑی ہوئی کھال اٹھا دی۔

مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ صندوق نہیں' ایک پنجرہ تھا اس کے چاروں طرف اور اوپر بھی باریک جالی لگی ہوئی تھی۔ اوپر والے حصے پر ایک اتنا بڑا سوراخ تھا کہ ایک ہاتھ اندر ڈالا جا سکتا تھا۔ اس سوراخ پر لکڑی کا ڈھکنا لگا ہوا تھا۔

پنجرے میں کوئی درجن بھر ناگ پھنکار رہے تھے۔ ان میں نیلے رنگ کا ایک کوبرا بھی تھا۔ اس کا چمکتا ہوا نیلا رنگ آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا لیکن اس کے اندر وہ زہر بھرا ہوا تھا کہ اس کے ڈس لینے سے آدمی کو دوسرا سانس لینے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

کوئی بھی سانپ لمبائی میں ڈھائی تین فٹ سے کم نہیں تھا۔ وہ بل کھاتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔ نیلے کوبرے کی لمبائی بھی ڈھائی تین فٹ کے قریب اور موٹائی دو انچ کے قریب تھی۔ وہ ان سب میں نمایاں نظر آرہا تھا۔

"ان میں ہر ناگ اس قدر زہریلا ہے کہ اگر ہاتھی کو ڈس لے تو وہ بھی ڈھیر ہو جائے۔" قریب کھڑے ہوئے بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "نیلا کوبرا ان کا شہنشاہ ہے۔ اس کا زہر آن کی آن میں شکار کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "پہلے شیواگ پنجرے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کوبرے کو باہر نکالے گا۔ اسے دو منٹ اپنے ہاتھوں میں رکھے گا اور پھر پنجرے میں ڈال دے گا۔ اس کے بعد تمہیں پنجرے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کوبرے کو باہر نکالنا ہوگا لیکن اگر تم چاہو تو آخری لمحے پر بھی مقابلے سے دستبردار ہو کر اپنی شکست تسلیم کر سکتے ہو۔"

"میں مقابلے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے کاشی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر سنسنی کے تاثرات واضح طور پر نظر آرہے تھے۔

بوڑھے نے اعلان کیا کہ پہلے شیواگ پنجرے میں ہاتھ ڈال کر نیلے کوبرے کو پکڑے گا اور اس کے بعد اجنبی کی باری آئے گی۔

شیواگ آگے گیا۔ اس نے ڈھکنا اوپر اٹھا کر ہاتھ اندر ڈال دیا۔ پنجرے کے اندر کلبلاتے ہوئے کوبرے اس کے بازو سے لپٹنے لگے۔ اس نے نیلے کوبرے کو پکڑنا چاہا تو وہ مچھلی کی طرح پھسل کر اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن بالآخر اس نے نیلے رنگ کو گردن سے پکڑ کر پنجرے سے [illegible] اور اپنے بازو پر چھوڑ دیا۔ کوبرا... دو شاخہ زبان لہراتا ہوا اس کے بازو کے ساتھ لپٹ کر اوپر کندھے کی طرف جانے لگا اور پھر وہ گردن پر سے ہوتا ہوا دوسرے کندھے پر آگیا۔

ہمارے چاروں طرف بیسیوں لوگ کھڑے تھے مگر خاموشی ایسی تھی جیسے وہاں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ لوگوں کے چہروں پر وحشت اور سنسنی کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے "سانپ سونگھ جانا" کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دو منٹ گزر گئے۔ بوڑھے کے کہنے پر شیواگ نے ناگ کو دوبارہ پنجرے میں ڈال دیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

"اب نیلے کوبرے کو پکڑنے کی تمہاری باری ہے اجنبی۔" بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے اگر تم چاہو تو شیواگ کے پیر چھو کر اب بھی مقابلے سے دستبردار ہو سکتے ہو۔"

میں دو قدم آگے بڑھا کر پنجرے کے پاس گیا۔ سوراخ کا ڈھکنا اٹھا کر کاشی کی طرف دیکھا اور پنجرے میں ہاتھ ڈال دیا۔

کئی سانپ میرے بازو سے لپٹ گئے۔ ایک دو سانپ ایسے بھی تھے جنہوں نے مجھے ڈسنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ بازو پر دو تین جگہوں پر مجھے سوئی کی چبھن کا سا احساس ہوا تھا۔

میں نے نیلے کوبرے کو پکڑنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ پھنکارتا ہوا پھن پھیلا کر میرے سامنے آدھے قد سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے جسم کا باقی حصہ کنڈلی کی طرح بل کھائے ہوئے تھا۔

میں آہستہ آہستہ ہاتھ کو اس کے سامنے ہلانے لگا۔ اس نے حملہ کر دیا۔ ہاتھ کی پشت پر سوئی سی چبھی اور پھر میں نے نیلے کوبرے کو گردن سے پکڑ کر پنجرے سے باہر نکال لیا۔

اس وقت بھی ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ ہر چہرے پر سنسنی کے تاثرات نمایاں تھے۔

میں نے نیلے کوبرے کو گلے میں ڈال کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ایک دم شور سا اٹھا۔ لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ میں نے کاشی کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑی تھی۔ شور سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

نیلا کوبرا ہار کی طرح میرے گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کی دو شاخہ زبان بار بار لپک رہی تھی۔ میں نے اسے گردن سے

پکڑ کر اپنے سے الگ کیا اور اسے گچھا سا بنا کر ہوا میں اچھال دیا لیکن زمین پر گرنے سے پہلے ہی میں نے اسے دوبارہ پکڑ لیا۔

نیلا کوبرا پانچ چھ منٹ تک میری بانہوں گردن سینے اور پشت پر رینگتا رہا اور پھر میں نے اسے پکڑ کر دوبارہ پنجرے میں ڈال دیا اور جب مڑ کر دیکھا تو شیواگ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کاشی نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تیز تیز لہجے میں کچھ کہنے لگی۔ لوگوں نے نعرے لگا کر اس کی باتوں کا جواب دیا اور "شیواگ' شیواگ" کہتے ہوئے ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ شیواگ کو تلاش کر رہے تھے۔

کاشی مجھے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتی ہوئی اپنے جھونپڑے میں لے آئی۔ مارتھا اور شوبھا بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ کاشی کے محافظ باہر ہی رک گئے تھے۔ تاہم پالا اندر آ گئی تھی۔

میرے بازوؤں پر جہاں جہاں سانپوں نے ڈسا تھا وہاں وہاں خون کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔ کاشی نے میری طرف دیکھا' میرا ایک بازو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور ہونٹ اس جگہ لگا دیے جہاں خون کا ایک قطرہ چمک رہا تھا۔

میں نے کاشی کو پیچھے ہٹانا چاہا مگر اس نے میرے تمام زخموں سے خون چوس لیا اور اس طرح لہرانے لگی جیسے شراب کی کئی بوتلیں چڑھا گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک دم سرخی بھر گئی تھی اور پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگی۔ وہ بدمست شرابی کی طرح لہرا رہی تھی۔ میں اسے سہارا دے کر گھسیٹتا ہوا خواب گاہ میں لے آیا اور اسے بستر پر لٹا دیا۔

میرے خون میں ان زہریلے سانپوں کا زہر شامل ہو گیا تھا جسے کاشی نے چوس لیا تھا اور اس پر زہر کا نشہ طاری ہو رہا تھا۔ کاشی کی اس کیفیت سے مجھے اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ زہر خورانی کی عادی تھی اور ناگوں کے زہر نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

شوبھا کو بھی میں نے کبھی نہیں بتایا تھا کہ میرے اپنے اندر اتنا زہر بھر دیا گیا ہے کہ دنیا کا کوئی زہر مجھ پر اثر نہیں کر سکتا اور مارتھا تو یہ سب کچھ دیکھ کر حیرت کے سمندر میں غرق ہوئے جا رہی تھی۔ اسے اپنی کتاب کے لیے بہت سنسنی خیز مواد مل رہا تھا۔

"یہ۔ یہ سب کیسے ہوا؟" شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "سانپ کا زہر تم پر اثر انداز کیوں نہیں ہوا؟"

"یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔" میں نے جواب دیا "اس وقت تو میں دھنو کے لیے پریشان ہوں۔ اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"

کاشی کے جھونپڑے سے نکلتے ہوئے میں نے اس کو بھی بتا دیا تھا کہ دھنو دوپہر سے غائب ہے۔ ہم اسے تلاش کرنے جا رہے ہیں۔

ہم پوری بستی میں گھومتے رہے۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ بستی کے ایک ایک گھر میں جھانک لیا گیا۔ ہر وہ جگہ چھان ڈالی گئی جہاں اس کے ملنے کی توقع ہو سکتی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا اور میرے لیے مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ مقابلے کے بعد سے شیواگ بھی غائب تھا۔

صبح جب کونگا نے مجھے مقابلے سے دستبردار ہونے کے لیے کہا تھا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ میں دھنو کو شیواگ کے حوالے کر کے اس بستی سے چلا جاؤں تو اسی وقت شیواگ کے بارے میں میرے ذہن میں شبہات کے سانپ کلبلانے لگے تھے۔ دوپہر کو دھنو کے غائب ہو جانے کے بعد یہ شبہات قوی تر ہوتے جا رہے تھے اور اب شیواگ کو بھی غائب پا کر میرے شبہات یقین میں بدلتے جا رہے تھے کہ دھنو کی گمشدگی میں شیواگ ہی کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

کئی لوگ جن میں قبیلے کی عورتیں بھی شامل تھیں' آدھی رات تک دھنو کو تلاش کرتے رہے اور جب ہم مایوس ہو کر اپنے جھونپڑے میں آ گئے تو کچھ لوگ اس وقت بھی ہمارے ساتھ تھے۔ وہ لوگ ہم سے اظہارِ ہمدردی کر رہے تھے اور بعض ڈھکے چھپے لفظوں میں اور بعض واشگاف الفاظ میں شیواگ کو ہی دھنو کی گمشدگی کا ذمے دار ٹھہرا رہے تھے۔ شیواگ کی تلاش میں تو کچھ لوگ بستی سے تقریباً ڈیڑھ میل دور شیواگ کی زمینوں پر واقع اس کے جھونپڑے کی تلاشی بھی لے آئے تھے لیکن وہاں نہ شیواگ تھا اور نہ ہی دھنو۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ میں' شوبھا اور مارتھا جھونپڑے میں اکیلے رہ گئے تھے۔ بستی میں ہر طرف سناٹا تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دھنو کی اس پراسرار گمشدگی پر مارتھا تو پریشان تھی ہی' شوبھا کی حالت بھی بہت غیر ہو رہی تھی۔ ان کا بہت طویل عرصے کا ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو سگی بہنوں کی

طرح چاہتی تھیں۔ شوبھا کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔

اچانک وہ آواز سن کر میں چونک گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی ہمارے جھونپڑے کی پچھلی طرف دبے قدموں چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مارتھا اور شوبھا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر محتاط انداز میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا لیکن دروازہ کھولنے میں مجھ سے تھوڑی سی بے احتیاطی ہو گئی۔ میرا پیر فرش پر بچھی ہوئی کھال میں الجھ گیا تھا۔ سنبھلنے کی کوشش میں میرا ہاتھ دروازے سے ٹکرا گیا۔

سناٹے میں دروازے سے ٹکرانے کی آواز دور تک پھیلی تھی اور اسی وقت جھونپڑے کی پچھلی طرف کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور تیزی سے جھونپڑے کے پچھلی طرف پہنچ گیا۔ ایک ہیولا دوڑتا ہوا بائیں طرف تقریباً تیس گز آگے ایک اور جھونپڑے کے اوپر سے گھوم کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں قدموں کی آواز کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ایک موقع پر وہ ہیولہ میری نظروں میں آ گیا لیکن ایک گلی میں گھس کر بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز پر اس کا تعاقب جاری رکھا۔

وہ انسانی ہیولا بستی کی گلیوں سے نکل کر جھیل کی طرف آ گیا۔ جھیل کا یہ حصہ ہمارے جھونپڑے سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے تعاقب کی وجہ سے اسے بستی میں کہیں چھپنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس طرف آ کر شاید وہ جھاڑیوں میں کہیں غائب ہونا چاہتا تھا۔

وہ مجھ سے تقریباً چالیس گز آگے تھا۔ وہ چیتے کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر وہ قدِ آدم جھاڑیوں میں چھپ گیا تو میں اسے تلاش نہیں کر سکوں گا۔ میری ساری قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔

وہ ہیولہ جھاڑیوں کا رخ کرنے کے بجائے جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور پھر اسے ایک جگہ رکتے دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس جگہ جھیل کے کنارے کے بالکل ساتھ ایک کشتی نظر آ رہی تھی جو پانی کی لہروں کے ساتھ ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کشتی کی رسی شاید کنارے پر جھاڑیوں سے بندھی ہوئی تھی اور وہ ہیولا جھک کر وہ رسی کھول رہا تھا۔

میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ وہ ہیولا رسی کھول کر کشتی کو پانی کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ہمارے درمیان دس بارہ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میں پوری قوت سے اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس ہیولے کے اوپر گرا۔

وہ چیخ میرے لیے بڑی حیرت انگیز ثابت ہوئی تھی اور جب پانی میں گرتے ہی میں نے اس ہیولے کو دبوچا تو اس چیخ کے حوالے سے بھی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ میں جس کا تعاقب کر رہا تھا وہ کوئی مرد نہیں عورت تھی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ کوئی عورت اس قدر تیز رفتار بھی ہو سکتی ہے لیکن مجھے زیادہ دیر تک حیران ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس عورت کا بھرپور گھونسا میری کنپٹی پر لگا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچنے لگے۔

ہم اس وقت جھیل کے کنارے کے بالکل ساتھ تھے۔ پانی میری پنڈلیوں تک تھا۔ گھونسا کھا کر میں لڑکھڑا گیا تھا۔ اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ مجھے زوردار دھکا دے کر پشت کے بل پانی میں گرا دیا اور کشتی کی طرف لپکی۔

میں نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ ابھی کشتی سے دو تین فٹ دور تھی کہ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی اور ہم دونوں پانی میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ عورت ہونے کے باوجود کسی مرد کی طرح طاقت ور اور پھرتیلی تھی۔ ہم لڑتے ہوئے پانی سے نکل کر کنارے پر جھاڑیوں میں آ گئے۔

اس قبیلے کی لمبی تڑنگی عورتوں کو دیکھ کر اندازہ تو ہوتا ہی تھا کہ وہ بڑی جفاکش قسم کی ہیں اور یہ پہلی عورت تھی جس سے مجھے اس طرح واسطہ پڑا تھا۔ ایسی مرد مار عورتیں میں نے بہت کم دیکھی ہیں۔ ایک مرتبہ تو اس نے مجھے سر سے اوپر اٹھا کر جھاڑیوں میں پٹخ دیا تھا۔

میں ابھی تک اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن اس کی بہادری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اگرچہ طویل مقابلے کی سکت رکھتی تھی لیکن میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ جم کر مقابلہ کرنے کے بجائے راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس نے ایک بار پھر پانی میں چھلانگ لگا دی لیکن میں نے اسے کشتی کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی دبوچ لیا۔ اس مرتبہ میں نے اسے اس طرح گرفت میں لیا تھا کہ اس کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ تاریکی کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا اور میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

وہ کونگا تھی۔

"تو اس سازش میں تم بھی شریک ہو۔" میں نے کونگا کے دونوں ہاتھ پشت پر موڑ کر گرفت میں لیے "بتاؤ دھنو کہاں ہے؟ اگر تم نے جواب نہیں دیا تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"تمہاری عورت شیواگ کے قبضے میں ہے لیکن میں تمہیں نہیں بتاؤں گی کہ وہ کہاں ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ صبح ہوتے ہی یہ بستی چھوڑ دو۔ ورنہ...."

میں نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع دیے بغیر اس کے کندھے پر دباؤ ڈال کر پانی میں غوطہ دیا۔ وہ جب سیدھی ہوئی تو بری طرح چیخنے لگی۔ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی نرمی اختیار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر اسے موقع مل جاتا تو اب تک مجھے موت کے گھاٹ اتار چکی ہوتی اور پھر یہی وہ عورت تھی جس کی وجہ سے دھنو کسی مصیبت میں مبتلا تھی۔ کونگا ہی دھنو کو کسی طرح بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے گئی تھی اور میں اس کا لحاظ کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"نن.... نہیں بتاؤں گی۔" اس نے چیختے ہوئے کہا۔

میں نے اسے ایک اور غوطہ دیا۔ اس مرتبہ وقت ذرا زیادہ دیا۔ وہ مچلنے لگی تو میں نے اس کا سر پانی سے نکال لیا۔

پانچواں غوطہ کھانے کے بعد ہی وہ زبان کھولنے پر آمادہ ہوئی تھی۔

"وہ... وہ اسے جزیرے پر لے گیا ہے۔" اس نے اپنے سانس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس جزیرے پر کوئی آبادی نہیں ہے۔ اس طرف کوئی نہیں جاتا۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہاں بد روحوں نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ کئی برسوں سے وہ جزیرہ ویران ہے۔ شیواگ اسے وہیں لے گیا ہے۔"

"اس کے ساتھ اور کون کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہینگ کے سوا کسی اور کو میں نے اس کے ساتھ جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔" کونگا نے جواب دیا۔

"ابھی تم بھی وہیں جانے والی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" کونگا نے جواب دیا "اس نے تمہاری نگرانی کی ذمے داری مجھے سونپ رکھی تھی۔ میں اس وقت جزیرے پر جانے کے لیے ہی اپنے جھونپڑے سے نکلی تھی۔ تمہارے جھونپڑے کی طرف سے گزرتے ہوئے اچانک ہی یہ خیال آیا تھا کہ کیوں نہ تم لوگوں کی کچھ باتیں بھی سن لی جائیں اور یہی مجھ سے غلطی ہوگئی۔ نہ میں اس طرف جاتی' نہ تمہیں میرا پیچھا کرنے کا موقع ملتا لیکن.... تم ایک بات ذہن نشین کرلو۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ ایک بہت بڑی شکتی اس کی پشت پر ہے۔ وہ تمہیں تباہ کردے گا۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی اس عورت کو بھول جاؤ اور اپنی کھال بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

باتوں کے دوران میں' میں نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے کیونکہ اب مجھے اس سے کسی شرارت کی توقع نہیں تھی لیکن میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس نے موقع پا کر اچانک ہی کھلی ہتھیلی سے میری ناک پر زور دار ضرب لگائی۔ میں کراہتا ہوا لڑکھڑا کر پشت کے بل پانی میں گرا۔ یہ ضرب کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا اور ناک سے خون بہہ نکلا۔

کونگا نے کشتی کی طرف چھلانگ لگا دی جو اس دوران میں ہلکی لہروں پر بہتی ہوئی وہاں سے تقریباً دس بارہ فٹ دور جا چکی تھی۔ پانی میں ایک چھلانگ لگانے کے بعد وہ مچھلی کی طرح تیزی سے تیرنے لگی۔

میں نے بھی سنبھل کر چھلانگ لگا دی اور بڑی تیزی سے تیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس جگہ پانی میرے سینے کے برابر تھا اور تیرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

ادھر کونگا نے کشتی پر ہاتھ ڈالا' ادھر میں نے پیچھے سے اس کا ایک پیر پکڑ لیا اور اسے پیچھے کھینچنے لگا۔ کونگا کشتی کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے میری طرف پلٹی۔ پانی میں اس کی یہ قلابازی حیرت انگیز تھی۔ وہ میرے اوپر آرہی اور دونوں ہاتھوں سے میرے بال پکڑ کر سر کو پانی میں دبانے لگی۔

میں نے بڑی پھرتی سے اپنے آپ کو پانی سے باہر نکالا۔ میرے اور کونگا کے بیچ ایک بار پھر معرکہ آرائی شروع ہوگئی۔ کبھی وہ مجھے پانی میں دبا دیتی اور کبھی میں.... لیکن بالآخر وہ پوری طرح میری گرفت میں آگئی۔ میں اسے پانی میں غوطے دینے لگا۔ آخری مرتبہ میں نے اس کا سر پانی میں ڈبویا تو پھر نہیں اٹھنے دیا۔ وہ پانی میں بری طرح مچل رہی تھی لیکن میں نے اسے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک وہ بے حس و حرکت نہیں ہوگئی۔

میں اسے بالوں سے پکڑ کر پانی میں کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور اس کی لاش پانی سے نکال کر جھاڑیوں میں ڈال دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس طرح کسی عورت کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی بہادری نہیں لیکن میں اگر اس کا لحاظ کرتا تو وہ میرا یہی حشر کرتی۔

میں چند لمحے کنارے پر بیٹھا رہا پھر پانی میں اتر کر کشتی کے قریب آگیا۔ یہ کشتی درخت کے بہت بڑے تنے کو کھوکھلا

کر کے بنائی گئی تھی اور اس میں تین چار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ کشتی کے اندر چپو بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کشتی میں بیٹھ کر چپو سنبھال لیے اور اسے تیزی سے گہرے پانی کی طرف کھینے لگا۔

تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آج دن میں چونکہ میں نے وہ جزیرہ دیکھا تھا اس لیے محض اندازے کی بنا پر کشتی کا رخ اس طرف رکھے ہوئے تھا۔

مجھے کشتی رانی کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے زندگی میں کبھی شوقیہ طور پر کشتی چلائی ہو لیکن یہ کشتی تو بہت مختلف تھی۔ درخت کا کھوکھلا تنا.... جس کا توازن برقرار رکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کئی مرتبہ تو کشتی الٹتے الٹتے بچی تھی لیکن میں نتائج کی پروا کیے بغیر تیزی سے چپو چلاتا رہا۔

ایک گھنٹے بعد تاریکی میں جزیرے کا ہیولا دکھائی دینے لگا لیکن وہ اب بھی بہت دور تھا اور میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں تک پہنچنے میں کم از کم ایک گھنٹا اور لگتا۔

جھیل کی سطح پر سکون تھی۔ مجھے چپو چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی لیکن اچانک ہوا کا رخ بدل گیا اور اس میں تیزی آتی گئی۔ پہلے تو ہوا پیچھے سے مجھے دھکیل رہی تھی لیکن اب سامنے سے میری مخالفت پر اتر آئی تھی۔ تیز ہوا کی وجہ سے جھیل کی پر سکون سطح پر تیز لہریں اٹھنے لگیں۔ ہوا جیسے جیسے تیز ہو رہی تھی' لہروں کی تندی بھی بڑھ رہی تھی۔

اور پھر وہ ہوا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ جھیل میں اٹھتی ہوئی لہریں بھنور کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ کشتی کے آس پاس جھیل کا پانی دائرے میں گھومنے لگا۔ یہ صورت حال میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں کشتی کو گردش کرتی ہوئی لہروں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا لیکن بھنور خوفناک صورت اختیار کرتا گیا۔

کشتی بہت تیزی سے بھنور میں گردش کر رہی تھی۔ چپو میرے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔ ایک چپو تو کشتی کے اندر گرا تھا اور دوسرا باہر جو دیکھتے ہی دیکھتے لہروں میں غائب ہوگیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے کشتی کے کناروں کو پکڑ رکھا تھا اور کشتی لٹو کی طرح گھوم رہی تھی۔

کشتی الٹ گئی۔ میں پانی میں گر چکا تھا لیکن میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور کشتی کے کنارے کو ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت مجھے پانی کے اندر نیچے کی طرف کھینچ رہی ہو۔ مجھے ایک دو غوطے بھی آئے لیکن میں نے کشتی کے کنارے پر مضبوطی سے گرفت جمائے رکھی۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دو نادیدہ قوتوں میں جنگ ہو رہی ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آیا لیکن یہ احساس بہت قوی تھا کہ میرے آس پاس کسی قسم کی جنگ ہو رہی تھی۔ پھنکاریں اور غراہٹیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں بہت واضح طور پر یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ آپس میں برسرپیکار ان نادیدہ قوتوں میں سے ایک میری مدد کرنا چاہتی تھی جبکہ دوسری میری غرقابی پر تلی ہوئی تھی۔

ان پراسرار قوتوں میں یہ نادیدہ جنگ دیر تک جاری رہی اور بالآخر بھنور کا زور ٹوٹ گیا۔ ہوا تھم گئی اور جھیل کی سطح بھی بتدریج پرسکون ہوتی چلی گئی۔

میں اچک کر کشتی میں آگیا اور تاریکی میں چاروں طرف گھورنے لگا۔ میں اس جگہ سے بہت پیچھے آگیا تھا جہاں بھنور میں پھنسا تھا۔ میں نے کشتی میں پڑا ہوا چپو اٹھا لیا اور اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تیزی سے پانی کو پیچھے دھکیلنے لگا۔ دوسرے چپو کا کہیں نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔

میں ایک ہی چپو سے کام لے رہا تھا۔ کبھی دائیں طرف سے پانی کو پیچھے دھکیلتا اور کبھی بائیں طرف سے اور حیرت انگیز طور پر کشتی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور ہوا بھی اسے پیچھے سے دھکیل رہی تھی۔

جزیرہ اب واضح ہوتا جا رہا تھا۔ کشتی بہت تیزی سے جزیرے کے قریب پہنچ رہی تھی۔

میں نے ہاتھ روک لیے۔ جزیرے کا ساحل چند گز کے فاصلے پر تھا اور کشتی ہموار رفتار سے اس طرف بڑھ رہی تھی جبکہ میں بڑی محتاط نظروں سے ساحل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت بلند اور گنجان درخت تھے جو تیز ہوا سے بد روحوں کی طرح جھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ تیز ہوا اور درختوں کی شاخوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والی آوازیں دل پر وحشت سی طاری کر رہی تھیں۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ یہ جزیرہ کتنا بڑا ہے اور وہ لوگ کہاں اور کس طرف ہوسکتے ہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کشتی کو ایک طرف کھینا شروع کردیا۔

کشتی ساحل کی جھاڑیوں سے ٹکرا کر رک گئی۔ میں نے نیچے اتر کر رسی جھاڑیوں سے باندھ دی اور محتاط انداز میں اوپر کی طرف چلنے لگا۔

میں درختوں میں تقریباً نصف میل دور تک چلتا گیا۔ یہ جزیرہ کسی بڑے ٹیلے کی طرح تھا جیسے کوئی پیالہ اوندھا کر رکھا

گیا ہو۔ یہاں درختوں کی بہتات تھی اور بعض جگہوں پر تو درخت اور قدِ آدم جھاڑیاں اس قدر گنجان تھیں کہ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

میں ایک جگہ رک گیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں اور ان لوگوں کو کہاں تلاش کروں۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کھڑے کھڑے مراقبے کی کیفیت میں چلا گیا۔ ایسے موقعوں پر مجھے مراقبے سے رہنمائی مل جاتی تھی اور اس وقت بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ چند منٹ بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو تاریکی چھٹ گئی تھی بلکہ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ میری آنکھوں میں وہ قوت ابھر آئی تھی جو بلی کی طرح اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ میں اس حیرت ناک تجربے سے پہلے بھی ایک دو مرتبہ گزر چکا ہوں۔

میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور ایک طرف نشیب میں اترنے لگا۔ اب مجھے راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور چلنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میں رک گیا۔ سامنے تقریباً سو گز دور درختوں میں ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ میں چند لمحے اس طرف دیکھتا رہا اور پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

درختوں کے درمیان ایک کھلا میدان سا تھا جہاں حویلی نما ایک عمارت نظر آ رہی تھی اور اس کے پھاٹک کے سامنے ایک مشعل جل رہی تھی۔

میں ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ عمارت کے آس پاس کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پھاٹک کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ آس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں سے اندر داخل ہوا جاسکتا۔ دیوار بھی بہت اونچی تھی جس پر چڑھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے اندر داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک قدِ آدم جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں میں سانپ، بچھو اور دیگر زہریلے حشرات الارض رینگتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن میں ان سے بچ کر چلتا رہا اور بالآخر ایک جگہ رک گیا۔

دیوار میں ایک دروازہ نظر آیا۔ وہ دروازہ کھڑکی سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہاتھ کے معمولی سے دباؤ سے دروازہ کھل گیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ دوسری طرف بھی قدِ آدم جھاڑیاں تھیں۔ میں وہاں رک کر محتاط نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے وہ عمارت تھی جس کے آگے برآمدے کی طرح سائبان بنا ہوا تھا اور وہاں ایک مشعل جل رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ جھینگروں کے سوا کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ ایک عجیب سا احساس تھا جس نے میرے اندر بے چینی سی پیدا کردی تھی۔

میں جھاڑیوں سے نکل کر دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہی راہداریاں، ہر راہداری کے موڑ پر جلتی ہوئی مشعل اور وہی محرابی دروازے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس حویلی میں ہر راہداری کے موڑ پر ایک نیزہ بردار عورت بھی کھڑی نظر آئی تھی مگر یہاں کوئی نہیں تھا۔ کیا یہ وہی حویلی تھی جہاں پالا مجھے لے گئی تھی اور کاشی سے طویل ملاقات ہوئی تھی؟

میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ حویلی بستی کے قریب جھیل کے کنارے پر واقع تھی اور یہاں آنے کے لیے مجھے جھیل کے پانی میں طویل سفر کرنا پڑا تھا لیکن ویسا ہی ٹیلا، دیوار میں کھڑکی نما دروازہ، سائبان نما برآمدہ اور ویسی ہی کشادہ راہداریاں!

میں اس محرابی دروازے کے سامنے کھڑا تھا جس کی دوسری طرف کاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے بھاری دروازے پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے آہستہ آہستہ دھکیلنے لگا۔ سناٹے میں دروازے کے چرچرانے کی آواز بڑی پراسرار لگ رہی تھی۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ دوسری طرف کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دروازہ آہستہ آہستہ کھلتا چلا گیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرا تھا جو خالی تھا تاہم ایک طرف مشعل جل رہی تھی۔ دائیں طرف ایک کمرے سے روشنی جھلک رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس طرف بڑھنے لگا اور پھر اچانک کوئی بھاری چیز میرے اوپر گری۔ میں بری طرح بدحواس ہوگیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر گر گیا۔ وہ بوجھ بھی میرے اوپر ہی گرا تھا۔

وہ کوئی اور چیز نہیں بلکہ ایک آدمی تھا جس نے اوپر سے چھلانگ لگائی تھی۔ میرے اوپر یہ حملہ اچانک ہوا تھا اور میں اس کے نیچے دب گیا تھا لیکن میں نے سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اسے اپنے اوپر سے اچھال دیا اور بڑی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن ٹھیک اسی وقت ایک اور آدمی نے اوپر سے میرے اوپر چھلانگ لگادی۔

میں ایک بار پھر اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ دونوں مجھ سے گتھم گتھا ہوگئے۔ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ دونوں نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر بڑی سختی سے گرفت میں لے لیا تھا۔

اسی وقت سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کے ساتھ ہی میری مزاحمت رک گئی۔ دروازے کے عین سامنے کمرے میں پلنگ پر دھنو پشت کے بل پڑی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پلنگ کی پٹیوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور پیروں کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ اس کا لباس تار تار ہو رہا تھا اور بیشتر جسم برہنہ تھا۔ اس کے چہرے، سینے اور پیٹ پر خراشوں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ وحشت تھی۔ دھنو کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اسے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔

پلنگ کے قریب ہی ایک کرسی نما چبوترے پر شیواگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پہلے سے کچھ زیادہ ہی چھوٹی لگ رہی تھیں۔ بے پناہ کمینگی برس رہی تھی اس کے چہرے پر۔ وہ مجھے دیکھ کر اٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

دھنو نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ بے پناہ کرب کے باوجود مجھے اپنے سامنے پا کر اس کے چہرے پر رونق سی آگئی اور آنکھوں میں وحشت کی جگہ چمک نے لے لی۔

"مارو۔ مار ڈالو ان کو ہمت سنگھ۔ انہوں نے مجھے بہت مارا ہے!" وہ چیخ اٹھی۔ وہ شاید اٹھنے کی کوشش بھی کر رہی تھی مگر اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ وہ محض کسمسا کر رہ گئی۔

"ہمت سنگھ!" شیواگ نے قہقہہ لگایا "وہ تو خود اس وقت بے ہمت ہو رہا ہے۔ تمہیں کیا بچائے گا اور ہمیں کیا مارے گا۔"

وہ کمرے سے باہر آگیا۔ میرے سامنے کھڑے ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر میرے پیٹ پر زوردار گھونسا مارا۔ گھونسا ہتھوڑے کی طرح لگا۔ میں بلبلا اٹھا۔ ان دونوں نے مجھے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے گرفت میں لے رکھا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرسکا۔

شیواگ نے دوسرا گھونسا مارا۔ یہ پہلے سے زیادہ طاقت ور تھا لیکن تیسرا گھونسا مارا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر اپنے ہاتھ کو بری طرح جھٹکنے لگا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس ہاتھ کی انگلیاں سہلاتے ہوئے وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میرے پیٹ کے مسلز پتھر کی طرح سخت ہوگئے تھے۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا اور پھر پے در پے میرے پیٹ پر گھونسے برسانے لگا لیکن اس بار مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس شیواگ بار بار اپنا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔

"اب میری باری ہے شیواگ!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر "یل" (YELL) کرتا ہوا پوری قوت سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ میں اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرے بازوؤں پر ان کی گرفت کچھ اور بھی مضبوط ہوگئی اور ان کی یہ کارروائی میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ میں ان کے سہارے پر اپنے آپ کو اوپر اٹھاتا گیا اور پھر میں نے دونوں پیر پوری قوت سے سامنے کھڑے ہوئے شیواگ کے سینے پر دے مارے۔ وہ بلبلاتا ہوا لڑکھڑا کر پشت کے بل ڈھیر ہوگیا۔

ان دونوں نے میرے بازو موڑنے کی کوشش کی لیکن پیر زمین پر ٹکتے ہی میں نے اپنے آپ کو دوبارہ اوپر اٹھانا شروع کردیا۔ وہ مجھے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اب میں ان کے بس کا نہیں رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو پوری طرح اوپر اٹھالیا اور ان کے اوپر سے الٹی قلابازی کھاتا ہوا ان کے پیچھے جا گرا۔ وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی گرے تھے لیکن میں ان سے پہلے سنبھل گیا۔

وہ دونوں اٹھ کر میری طرف لپکے۔ میں اپنی جگہ سے اچھلا اور میری ڈبل فلائنگ کک نے انہیں پھر ڈھیر کردیا۔ شیواگ میری طرف لپکا۔ اس وقت میں بھی زمین پر پڑا تھا۔ شیواگ نے میرے اوپر چھلانگ لگائی تو میں نے اسے اپنے پیروں پر روک کر پیچھے اچھال دیا۔ وہ "بھد" کی آواز سے گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی تھی۔

شیواگ کے دونوں آدمی ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچے، میں بڑی پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک مجھ سے ٹکرا کر قلابازی کھاتا ہوا دور جا گرا اور دوسرا میری ٹانگ سے الجھ کر

وہیں لڑکھڑا کر رہ گیا اور میں نے پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔

میری ٹھوکریں اسے پورے کمرے میں ناچنے پر مجبور کرتی رہیں۔ ایک موقع پر اس کے دوسرے ساتھی نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں اس شخص کو رگیدتا ہوا دیوار تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں، میں نے شیواگ کو ایک طرف پڑے ہوئے نیزے کی طرف لپکتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنے حریف کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا۔ ایک ہاتھ سے اسے دیوار کے ساتھ دبائے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے چہرے پر گھونسے برسانے لگا اور پھر اچانک ہی شیواگ کی دہاڑ سن کر میں اپنے حریف کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شیواگ کا نیزہ میری پشت میں پیوست ہو جاتا۔

شیواگ پوری قوت سے حملہ آور ہوا تھا۔ نیزہ دیوار سے لگے ہوئے میرے حریف کے سینے کو چیرتا ہوا کئی انچ تک دیوار میں گھستا چلا گیا تھا۔ اس شخص کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی۔

شیواگ کے چہرے پر بے پناہ خوف ابھر آیا۔ وہ بڑی وحشت زدہ سی نظروں سے اپنے ساتھی کو دیکھ رہا تھا جو نیزے کے ساتھ دیوار میں ٹنگ گیا۔ شیواگ کا ہاتھ اب بھی نیزے کے دستے پر تھا۔

شیواگ نے نیزے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور اپنے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے چیخا۔

"ہنگ پکڑو اسے۔ کاٹ ڈالو۔ زندہ مت چھوڑنا۔"

اب تک کی صورت حال سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی کہ حویلی میں ان تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان میں سے ایک ختم ہو چکا تھا اور اب میرے سامنے صرف دو رہ گئے تھے اور وہ دونوں بڑے پرجوش انداز میں میری طرف لپک رہے تھے اور یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جوش میں ہوش کام نہیں کرتا۔ میرے لیے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا بہترین موقع تھا اور میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

وہ جیسے ہی قریب پہنچے، میں نے ڈبل فلائنگ کک سے انہیں ڈھیر کردیا اور پھر انہیں سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ میں لاتوں اور گھونسوں سے انہیں پورے کمرے میں نچاتا رہا۔

ایک موقع پر ہنگ نے مجھے نیچے گرا دیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے پتلون کا پائنچا اٹھا کر خنجر نکال لیا۔ اس پوری مہم کے دوران میں، میں نے پہلی مرتبہ خنجر نکالا تھا۔

ہنگ میرے اوپر چھلانگ لگا چکا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے خنجر والا ہاتھ آگے کردیا۔ ہنگ کی خوفناک چیخ گونج اٹھی۔ خنجر اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اور خون کی دھار نے میرے جسم کو بھی آلودہ کردیا تھا۔

ہنگ تڑپ کر میرے اوپر سے ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ میں نے خنجر کھینچ کر دوبارہ اس پر حملہ کردیا۔ اس مرتبہ بھی خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ شیواگ فرار ہو رہا تھا۔ میں نے ہنگ کے سینے میں پیوست خنجر ایک جھٹکے سے باہر کھینچا اور شیواگ کے پیچھے دوڑ لگا دی۔

میں راہداریوں میں دوڑتے ہوئے حویلی سے باہر آ گیا۔ شیواگ اس دیوار کی طرف دوڑ رہا تھا جس میں واقع کھڑکی نما دروازے سے گزر کر میں اندر آیا تھا۔

حویلی کے باہر قد آدم گنجان جھاڑیاں تھیں۔ میری آنکھوں میں اگرچہ اس وقت بھی وہ روشنی موجود تھی جو تاریکی میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن شیواگ جھاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ میں رک گیا۔ اس کا پیچھا کرنا بے کار تھا اور اس کے واپس آنے کی بھی توقع نہیں تھی۔ میں حویلی میں واپس آ گیا۔

اس کمرے میں دو لاشیں تھیں۔ ایک نیزے کے ساتھ دیوار پر ٹنگی ہوئی تھی اور دوسری زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ میں دوڑتا ہوا سامنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

دھنو کی آنکھوں میں ایک بار پھر وحشت سی بھر گئی تھی لیکن مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ مسکرا اٹھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بندشیں کاٹ دیں۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"تم۔ تم ٹھیک ہو نا.....؟" وہ میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں اور....." اس نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے بڑی مشکل سے اسے خود سے الگ کیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ ویسا ہی کمرا تھا۔ بالکل وہی جہاں پہلی بار کاشی سے ملاقات ہوئی تھی۔

میری سمجھ میں اب بھی نہیں آ رہا تھا۔ اس رات کی ملاقات کوئی خواب تھا یا اس وقت میں کوئی خواب دیکھ رہا

تھا!

میں دھنو کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا باہر لے آیا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد ہم حویلی سے نکل کر جزیرے کے اس ساحل کی طرف دوڑ رہے تھے جہاں میں نے کشتی چھوڑی تھی۔

وہاں پہنچتے ہی میں رک گیا۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ کشتی غائب تھی۔

میری آنکھوں کے دیئے بجھ گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اندھا ہو گیا تھا۔ وہ صلاحیت رخصت ہو گئی تھی جس سے میں بلی کی طرح اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ اب پھر میرے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں میں نے جھاڑیوں کے ساتھ کشتی کی رسی کو باندھا تھا لیکن کشتی آس پاس کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"وہ.....وہ دیکھو کیا ہے؟" میرے قریب کھڑی ہوئی دھنو نے کہتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ کیا۔

کنارے سے تقریباً سو گز آگے ڈرم کی طرح کی کوئی چیز پانی میں تیرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ یقیناً کشتی ہی تھی۔ میں نے دھنو کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ چند سیکنڈ بعد ہی شڑاپ کی ایک اور زوردار آواز سن کر میں چونک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ کنارے پر جس جگہ میں نے دھنو کو چھوڑا تھا وہاں وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"دھنو!" میں نے زور سے پکارا۔

اسی لمحے میرے بالکل قریب ہی دھنو نے پانی سے سر ابھارا۔

"میں یہاں ہوں۔" اس نے میری طرف آتے ہوئے کہا۔

میں بھول گیا تھا کہ دھنو ایک بہت اچھی تیراک تھی۔ اس کی زندگی ایک ایسی عبادت گاہ میں گزری تھی جو دریا کے کنارے پر واقع تھی اور اس نے بچپن ہی میں دریا میں تیرنا سیکھ لیا تھا۔

ہم دونوں گہرے پانی کی طرف تیرتے رہے اور تیرتی ہوئی ڈرم نما اس چیز تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ کشتی ہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہوا کے کسی تیز جھونکے کی وجہ سے جھاڑی کی شاخوں میں بندھی ہوئی رسی نکل گئی تھی اور کشتی ہلکی لہروں پر تیرتی ہوئی کنارے سے اتنی دور نکل آئی تھی۔

میں نے پہلے دھنو کو کشتی پر سوار ہونے میں مدد دی اور پھر خود بھی اوپر چڑھ گیا۔ میں نے چپو سنبھال لیا اور پانی کو تیزی سے پیچھے دھکیلنے لگا۔

دھنو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ کونگا اسے سیر کروانے کے بہانے دوپہر کو جھونپڑے سے لے گئی تھی۔ کچھ دیر وہ بستی میں گھومتی رہیں اور پھر کونگا اسے بستی سے باہر بہت دور کھیتوں میں ایک جھونپڑے میں لے گئی۔ وہاں شیواگ اور اس کے دو ساتھیوں کو دیکھ کر دھنو سمجھ گئی کہ اسے دھوکے سے وہاں لایا گیا ہے۔ اس نے جھونپڑے سے بھاگنے کی کوشش کی مگر شیواگ وغیرہ نے اسے پکڑ لیا۔ اسے مارا پیٹا، ہاتھ پیر باندھ دیے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک طرف ڈال دیا۔

دھنو نے بتایا کہ شام کے بعد کچھ آدمی اس طرف آئے تھے۔ شیواگ وغیرہ نے دور ہی سے ان کی آوازیں سن لی تھیں۔ وہ ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی دھنو کو جھونپڑے سے نکال کر دور کھیتوں میں لے گئے تھے۔

اسے تقریباً دو گھنٹے کھیتوں میں رکھا گیا اور پھر شیواگ وغیرہ اسے جھیل پر لے آئے جہاں کنارے کی اونچی اونچی جھاڑیوں میں ایک بڑی کشتی موجود تھی۔ یہ کشتی دو درختوں کے کھوکھلے تنوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ وہ لوگ دھنو کو اس کشتی پر ڈال کر اس جزیرے پر لے آئے۔

دھنو کے کہنے کے مطابق، اس حویلی میں آنے کے بعد بھی اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی جس پر اسے مارا پیٹا گیا اور پلنگ پر ڈال کر باندھ دیا گیا۔

"شیواگ نے مجھے دھمکی دی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "کہ اگر تم کل دوپہر سے پہلے پہلے بستی سے نہ گئے تو وہ مجھے قتل کردے گا اور لاش کے ٹکڑے کرکے بستی میں پھنکوا دے گا۔"

"اگر وہ ایسا کرتا تو میں قیامت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑتا۔" میں نے جواب دیا۔

میں چپو چلاتے ہوئے بار بار اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شیواگ کی کشتی جزیرے کے ساحل پر کسی اور جگہ کھڑی ہوگی۔ حویلی سے فرار ہو کر وہ جزیرے پر نہیں رکا ہوگا۔ بستی کی طرف جانے کی وہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے، وہ جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف جانے کی کوشش کرے لیکن جھیل کی سطح دور دور تک تاریک اور سنسان تھی۔ کسی اور کشتی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

واپسی پر کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ میں کشتی کو جھیل کے کنارے پر اسی طرف لے گیا جہاں کونگا سے معرکہ ہوا تھا۔ کشتی کی رسی کو میں نے کنارے کی جھاڑیوں سے باندھ دیا اور ہم کنارے کے ساتھ ساتھ بستی کی طرف چلنے لگے۔

آبادی سے دور رہتے ہوئے ہم اپنے جھونپڑے کے سامنے پہنچ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے مارتھا اور شوبھا کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم اندر داخل ہوئے تو وہ دونوں ہمیں دیکھ کر اچھل پڑیں۔

ہم دونوں کے کپڑوں سے پانی نچڑ رہا تھا۔ شوبھا نے بیگ میں سے فوراً ہی ہمارے دوسرے کپڑے نکال دیے۔

"پہلے کپڑے بدل لو پھر بات کریں گے۔" اس نے کہا۔

میں اپنے کپڑے لے کر باہر آگیا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ میں نے جھونپڑے کی آڑ میں کھڑے ہو کر کپڑے بدلے۔ گیلے کپڑوں کو گھاس پر پھیلا دیا اور اندر آگیا۔ اس دوران میں دھنو بھی کپڑے بدل چکی تھی اور شوبھا نے اسے دو تین کمبلوں میں دبا دیا تھا۔ اس کا سر کمبلوں سے باہر تھا۔ دھنو میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ شوبھا ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کرتی تھی۔ اسے ہماری بہت زیادہ فکر رہتی تھی۔ میں بھی شوبھا کے قریب بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ اب بتاؤ تم کہاں غائب ہوگئے تھے اور یہ تمہیں کہاں ملی؟" شوبھا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے جانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد میں اور مارتھا، کاشی کے پاس گئی تھیں۔ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں بتایا تو اس نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا تھا کہ تم خیریت سے ہو اور جلد ہی دھنو کو لے کر واپس آجاؤ گے۔ ہم واپس تو آگئیں لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ہماری پریشانی بھی بڑھتی جارہی تھی۔ میرا خیال ہے، تم کسی کے پیچھے بھاگے تھے۔ کون تھا وہ؟"

"کونگا۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہیں سب کچھ بتانے لگا۔ میں نے مارتھا کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کونگا اور جزیرے کی حویلی میں دو آدمیوں کے مارے جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ دھنو بھی حویلی والے واقعے کے سلسلے میں خاموش ہی رہی تھی۔

مارتھا بڑی دلچسپی سے ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ وہ آدھی سے زیادہ دنیا گھوم چکی تھی۔ خوفناک جنگلوں میں آباد خوں خوار قبائل میں بھی رہی تھی لیکن یہاں، ہمالیہ کی گود میں اسے جو کچھ دیکھنے اور سننے کو مل رہا تھا وہ دنیا کے کسی اور خطے میں اس نے نہیں دیکھا سنا تھا۔

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بڑی تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

دروازے سے نکلتے ہی میں کسی سے ٹکرا گیا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے بانہوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ نسوانی چیخ کی آواز نے مجھے پھر چونکا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت بھی کوئی ہماری جاسوسی کرنے آیا تھا اور میں نے اسے بھاگنے کا موقع دیے بغیر گرفت میں لے لیا تھا لیکن اس مرتبہ مجھے شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ وہ کوئی جاسوس نہیں، قبیلے کی سردار کاشی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی محافظ پالا بھی تھی۔ وہ بھی اس صورتِ حال سے بدحواس ہوگئی تھی۔

وہ دونوں اندر آگئیں۔ پالا تو نیزہ سنبھالے دروازے کے قریب کھڑی ہوگئی اور کاشی بے تکلفی سے ہمارے ساتھ بیٹھ گئی۔ میں نے کاشی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ بولی "کوئی باطل قوت سچائی کے سامنے قدم نہیں جما سکتی۔ تم دونوں کی یہاں موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ شیطان کے پیروکار کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔"

"میں اس حویلی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے کاشی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ضرور بتاؤں گی۔" کاشی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "صدیوں پہلے وہ حویلی تلکو قبیلے کی سردار کا مسکن ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے میں یہ قبیلہ جھیل کے اطراف میں کئی چھوٹی بڑی بستیوں پر مشتمل ہوا کرتا تھا لیکن لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے جھیل کا پانی ان بستیوں کو نگلتا چلا گیا۔ صدیوں پہلے بھی قبیلے کی سردار ایک عورت ہی ہوا کرتی تھی۔ وہی سارے نظام کو چلاتی تھی۔ سردار کے انتخاب کا طریقہ کار بھی وہی تھا جو آج بھی رائج ہے لیکن قبیلے کی بعض بستیوں کے لوگ اپنی اپنی بستی کی عورتوں کو سردار بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے روایات کو نظر انداز کرکے غلط راستے اختیار کیے گئے اور جب بھی ایسا ہوا وہ بستی غرق ہوگئی۔ جھیل کے پانی نے اسے نگل لیا۔" وہ خاموش ہو کر ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"قبیلے کی سردار کو ملکہ کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اس جزیرے پر رہتی تھی جہاں مردوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سارا نظام عورتیں ہی چلاتی تھیں لیکن جیسے جیسی بستیاں جھیل میں غرق ہوتی گئیں، قبیلے کی روایات میں بھی تبدیلیاں آنے لگیں۔ بد اعمالیاں بڑھتی گئیں۔ مرد بھی اجازت کے بغیر اس جزیرے پر جانے لگے۔

"ایک رات وہ سب کچھ ہوا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ چند مرد چوری چھپے جزیرے پر آکر حویلی میں گھس گئے۔ ملکہ کے محافظوں کو قتل کرکے انہوں نے حویلی پر قبضہ کرلیا۔ وہ کئی روز تک ملکہ کو ہوس کا نشانہ بناتے رہے اور بالآخر اسے قتل کردیا۔ اس کے تین دن بعد ان سب مردوں کی لاشیں بھی جھیل میں تیرتی ہوئی ملیں۔ جزیرے پر ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان سب کی موت پراسرار طور پر واقع ہوئی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا، انہیں مارنے والا کون ہے؟

"اس واقعے کے بعد لوگوں میں اتنا خوف و ہراس پھیلا کہ لوگوں نے اس طرف جانا چھوڑ دیا اور وہ جزیرہ ویران ہوگیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہاں بد روحیں قابض ہوگئی ہیں۔

"کبھی کبھی اس جزیرے سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن بستی کے لوگوں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہاں کیا چیز ہو سکتی ہے۔

"میرے سردار منتخب ہونے سے دو ہفتے پہلے رات کی تاریکی میں دو کشتیوں کو جزیرے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ اس وقت کچھ لوگوں نے ہمت کرکے اپنی کشتیوں پر ان کشتیوں کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کشتیاں زور دار آوازوں کے ساتھ آگ کے شعلے اگلنے لگیں۔ ہمارے آدمی خوف زدہ ہو کر واپس آگئے۔ وہ اس قدر بدحواس ہوئے تھے کہ ایک کشتی الٹ گئی اور دو آدمی ڈوب کر ہلاک ہوگئے۔ اس واقعے کے بعد لوگوں کے دلوں میں خوف کچھ اور بڑھ گیا۔ اب تو جھیل میں مچھلیاں پکڑنے والے بھی اس جزیرے سے دور ہی رہتے ہیں۔"

"تم کبھی اس جزیرے پر گئی ہو؟" میں نے اس کے خاموش ہونے پر سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اس رات.... میرا مطلب ہے جب پالا مجھے یہاں سے لے کر گئی تھی....؟"

"یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی "یہاں بعض اوقات ہماری آنکھوں کے سامنے ایسے پراسرار واقعات جنم لیتے ہیں جن پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا اور ہم انہیں جھٹلا بھی نہیں سکتے اور کبھی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ...." وہ خاموش ہو کر مارتھا وغیرہ کی طرف دیکھنے لگی۔ چند لمحوں بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "انسان کے اندر پراسرار قوتوں کے جزیرے آباد ہیں۔ وہ ان پر قابو پا کر کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے لیکن اپنے اندر کی تمام قوتوں پر قابو پانا ممکن نہیں۔ تاہم کبھی کوئی کسی قوت پر قابو پالیتا ہے۔ ان میں ایک قوت ایسی بھی ہے جس کے بل بوتے پر دوسروں کو ایسے مناظر دکھائے جا سکتے ہیں جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"گویا وہ بھی کسی قوت کا کمال تھا؟" میں نے کہا۔

کاشی مسکرا کر رہ گئی۔

باہر شور کی آواز سن کر میں نے دروازہ کھول دیا۔ دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ تقریباً سو گز آگے جھیل کے کنارے پر کھڑی دو عورتیں بری طرح چیخ رہی تھیں۔ وہ عورتیں عین اس مقام پر کھڑی تھیں جہاں گزشتہ رات کونگا سے میرا معرکہ ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ دونوں عورتیں کیوں چلا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص دوڑتے ہوئے ہماری طرف آیا اور کاشی کے سامنے رک کر تیز لہجے میں کچھ کہنے لگا۔ کاشی نے جواب میں اس سے کچھ کہا اور وہ شخص ایک سمت بھاگ گیا۔

"کیا ہوا، کوئی گڑبڑ؟" میں نے سوالیہ نظر سے کاشی کی طرف دیکھا حالانکہ میں حقیقتِ حال سے اچھی طرح واقف تھا۔

"جھیل کے کنارے سے کونگا کی لاش ملی ہے۔" کاشی نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "لوگ خوف زدہ ہیں کہ کئی سال بعد ایسا ہوا کہ قبیلے کے کسی فرد کو اس طرح موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا "انہیں کسی پر شبہ ہے؟"

"شبہ!" کاشی نے مجھے گھور کر دیکھا "ابھی کچھ طے نہیں ہوا لیکن وہ آدمی کہہ رہا تھا شیواگ قبیلے والوں کا جینا حرام کردے گا۔ کونگا شیواگ کی عورت تھی۔ وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔ قبیلے کے لوگ شیواگ کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم سے شکست کھانے کے بعد وہ اگرچہ بستی سے غائب ہوگیا ہے لیکن اس کے کچھ حمایتی اب بھی بستی میں موجود ہیں۔ وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔"

"لوگوں سے کہہ دو کہ اب شیواگ اس بستی کا رخ نہیں کرے گا اور اس کے حمایتی بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" میں نے کہا۔

"اس قبیلے کے لوگ بہت توہم پرست ہیں۔ وہ ہر بات کا مطلب اپنے طور پر اخذ کرتے ہیں۔ انہیں کوئی بات سمجھانا

بڑا مشکل کام ہے۔ بہرحال' تم لوگ اپنے جھونپڑے میں رہو۔ میں جاکر معلوم کرتی ہوں۔" کاشی نے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"نہیں۔" وہ میری طرف مڑگئی "تم یہیں رہو۔ تمہارا اس وقت وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ جو بھی صورتِ حال ہوگی' میں بعد میں تمہیں بتا دوں گی۔"

کاشی چلی گئی۔ میں شوبھا وغیرہ کے ساتھ کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر ہم اندر آگئے۔ دھنو کمبلوں میں دبکی سوگئی تھی۔ میں بھی ایک کمبل اوڑھ کر سوگیا۔ رات بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بھی بری طرح تھکا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں بھی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

میری آنکھ سہ پہر سے پہلے نہیں کھل سکی تھی۔ اس وقت بستی پر سناٹا سا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے قریب ہی دوسرے کمبل میں دبکی شوبھا سو رہی تھی جبکہ مارتھا اور دھنو سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ میں ان دونوں کی طرف دیکھتا ہوا اٹھ کر باہر آگیا۔

موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ عام طور پر اس وقت جھیل کنارے خاصی رونق رہتی تھی لیکن آج دور دور تک کسی ذی روح کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے جھونپڑے کی پچھلی طرف چلا گیا اور ایک دو گلیاں گھوم کر واپس آگیا۔ بستی پر اس طرح سناٹا طاری تھا جیسے یہاں زندگی کا وجود ہی مٹ گیا ہو۔ مجھے کہیں بھی بستی کا کوئی فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے شدید حیرت ہو رہی تھی کہ بستی کے لوگ سب کچھ چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔ میں اپنے جھونپڑے میں واپس آگیا۔

"بستی کے لوگ کہاں غائب ہوگئے۔ سناٹا کیوں طاری ہے؟" میں نے مارتھا اور دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے مدھم لہجے میں پوچھا۔

"آج صبح سے کونگا کی موت کا سوگ منایا جا رہا ہے۔" مارتھا نے جواب دیا "دوپہر کے وقت پالا یہاں آئی تھی۔ اس نے ہدایت کی تھی کہ ہم جھونپڑے سے باہر نہ نکلیں۔"

"لیکن بستی کے لوگ کہاں غائب ہیں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"سب لوگ کونگا کی آخری رسوم میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔" مارتھا نے بتایا "بستی سے باہر تقریباً دو میل دور پہاڑی کے دامن میں کوئی خاص جگہ ہے جہاں مرنے والوں کی آخری رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔"

سورج غروب ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ مارتھا وغیرہ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے بھی بھوک لگ رہی تھی۔ پوری بستی کونگا کی موت کا سوگ منا رہی تھی۔ ہمیں کھانے کو کون پوچھتا!

میرے ذہن میں اچانک ہی یہ خیال آیا کہ بستی کے کسی گھر میں کوئی نہ کوئی تو موجود ہوگا۔ ہوسکتا ہے' کہیں سے کھانے کو کچھ مل جائے۔ میں نے مارتھا اور دھنو کو انتظار کرنے کو کہا اور جھونپڑے سے نکل کر اوپر سے گھومتا ہوا بستی میں آگیا۔ میرا رخ مرکزی چوراہے کی طرف تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہاں قبیلے کے کسی نہ کسی فرد سے ملاقات ہوجائے گی اور ہمیں کھانے کو کچھ مل جائے گا لیکن میرا یہ خیال غلط نکلا۔

مرکزی چوراہا بھی سنسان تھا۔ میں وہاں کھڑا کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا اور پھر میرے قدم خود بخود کاشی کے جھونپڑے کی طرف اٹھنے لگے۔

جھونپڑے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور محافظ بھی موجود نہیں تھے۔ میں جھجکتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ صحن میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی نے مجھے چوروں کی طرح اندر داخل ہوتے دیکھ لیا تو کہیں کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوجائے۔ میں نے کاشی یا پالا کو آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ خیال ذہن سے نکال دیا۔ قبیلے کا ہر فرد بستی سے باہر تھا۔

میں نے برآمدے والا دروازہ کھولا تو دروازے کے چرچرانے کی ہلکی سی آواز سناٹے میں پھیل گئی۔ میں رکے بغیر دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ کاشی والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر داخل ہوا' دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے ایک آدمی نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

یہ افتاد مجھ پر اچانک ہی پڑی تھی۔ میں ایک لمحے کو بدحواس ہوگیا۔ سنبھلنے سے پہلے حملہ آور میری کھوپڑی پر دو چار گھونسے لگا چکا تھا لیکن پھر میں نے اسے حملہ کرنے کا موقع نہیں دیا اور وہ جیسے ہی حملہ آور ہوا' میں نے اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر اچھال دیا۔ وہ کاشی کے پلنگ پر گرا۔ اس کا سر پلنگ کی پشت سے ٹکرایا تھا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی کراہ بھی نکل گئی تھی۔

میں نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ بڑی پھرتی سے لوٹ لگا

کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں منہ کے بل پلنگ پر گرا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل سکتا حملہ آور نے مجھے چھاپ لیا۔ وہ میری پشت پر سوار ہوگیا اور بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میرے سر کو زور زور سے پلنگ کی پٹی پر مارنے لگا۔ میری پیشانی کی کھال پھٹ گئی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔ میں نے دونوں ہتھیلیاں سامنے ٹکا دیں اور پوری قوت سے اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں ٹانگیں بھی سمیٹنے لگا تھا اور بالآخر میں اسے اپنے اوپر سے گرانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس نے ایک بار پھر مجھے گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن میں نے بڑی تیزی سے پلٹ کر اپنی ٹانگیں اس کی گردن پر لپیٹ دیں اور زوردار جھٹکا دیا۔ وہ الٹ کر پلنگ سے نیچے گر گیا۔

میں حریف کی گردن چھوڑ کر تیزی سے چھلانگ لگا کر پلنگ سے نیچے آگیا۔ وہ بھی اٹھ چکا تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی اور میں ابھی تک اپنے حریف کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ شیواگ ہوگا لیکن اب اسے اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ شیواگ درمیانے قد کا مالک تھا جبکہ اس شخص کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ میں نے نہ صرف اس کے حملے کو ناکام بنایا بلکہ اس کے پیٹ میں ایک زوردار کک بھی رسید کردی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر دہرا ہوگیا۔ میں نے جھک کر اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کردیا۔ وہ بلبلاتا ہوا سیدھا ہوا تو میں نے اسے گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ایک زوردار کک اس کے سینے پر لگی تو وہ لڑکھڑاتا ہوا دیوار کے قریب گرا۔ جس جگہ وہ گرا تھا اس کے قریب ہی ایک موٹا سا ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ میں جیسے ہی آگے بڑھا' اس نے بڑی تیزی سے ڈنڈا اٹھا کر حملہ کردیا۔

میں نے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس نے وار تو میرے سر پر کیا تھا لیکن ڈنڈا میرے بائیں کندھے پر لگا۔ میرے منہ سے کراہ نکلی۔ میں نیچے جھکتا چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے میرے سر پر گویا ایٹم بم پھٹ پڑا۔ ڈنڈے کا دوسرا وار میرے سر پر لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے رقص کرنے لگے اور پھر اندھیرے کی چادر پھیلتی چلی گئی۔ میں سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے تیورا کر گرا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے جھونپڑے میں پڑا تھا اور میرے اردگرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ آنکھیں کھولنے کے بعد بھی چند لمحوں تک میری نظروں کے سامنے دھند سی چھائی رہی۔ میں بار بار آنکھیں مچ مچانے لگا۔ دھند چھٹنے لگی اور وہ چہرے واضح ہوتے چلے گئے۔ ان میں ایک چہرہ کاشی کا بھی تھا۔

میں نے ایک جھٹکے سے اٹھنے کی کوشش کی تو دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ تکلیف سے میری آنکھیں خود بخود مچ گئیں اور کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ لٹا دیا۔

سر میں ہونے والے دھماکے کم ہوئے تو تکلیف بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس مرتبہ میری نظر اس بڑھیا پر پڑی جو میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سر کے بال نیلگری کی چوٹیوں پر جمی ہوئی برف کی طرح سفید تھے۔ چہرے پر جھریوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا جیسے مکڑی نے جالا تان رکھا ہوا۔ اس کی گردن میں طوق کی طرح لوہے کا ایک کڑا پڑا ہوا تھا جس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کانوں میں بھی چوڑیوں کی طرح لوہے کے بالے لٹکے ہوئے تھے۔ ماچس کی تیلی سے ذرا بڑی ایک سلاخ ناک کے نتھنوں کے عین بیچ میں پروئی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے بالائی حصے پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس کی جلد کو دیکھ کر صدیوں سے پیاسی چٹخی ہوئی زمین کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ لاتعداد آڑی ترچھی لکیریں تھیں اس کے جسم پر۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر سو کے لگ بھگ ضرور رہی ہوگی لیکن اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حیرت انگیز طور پر زندگی کی بھرپور چمک موجود تھی۔

اس نے ایک ہاتھ میری گردن کے نیچے رکھ کر سر کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا مٹی کا پیالہ میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

مٹی کے پیالے میں ہرے رنگ کا مشروب تھا جس کا ذائقہ کریلے کی طرح کڑوا تھا۔ میں نے وہ پیالہ اپنے ہونٹوں سے دور ہٹانا چاہا لیکن بڑھیا نے میری کوشش اس وقت تک کامیاب نہیں ہونے دی جب تک اس کڑوے مشروب کا آخری قطرہ بھی میرے حلق میں نہیں چلا گیا۔

وہ مشروب اگرچہ خاصا بدذائقہ تھا اور میں نے اسے بڑی مشکل سے حلق سے اتارا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر میں اپنے آپ میں توانائی سی محسوس کرنے لگا۔ اس بڑھیا نے میرا سر دوبارہ نیچے ٹکا دیا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے سر کو ٹٹولنے

لگا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد بھی دیر تک میرے حواس بحال نہیں ہو سکے تھے۔ میں اب بھی متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ میں یہاں کیوں پڑا تھا۔ میرے سر پر پٹی کیوں بندھی ہوئی تھی اور یہ لوگ میرے گرد کیوں جمع تھے؟

"کیسے ہو اب ہمت سنگھ؟"

یہ آواز سن کر میں نے دائیں طرف دیکھا۔ وہ شوبھا تھی جو میرے اوپر جھک رہی تھی اور پھر رفتہ رفتہ میرا ذہن صاف ہوتا گیا اور مجھے سب کچھ یاد آگیا۔

میں بستی میں گھومتا ہوا کاشی کے جھونپڑے میں گھس گیا تھا جہاں کسی نے مجھ پر حملہ کردیا تھا۔ میرے سر پر لگنے والی ضرب نے مجھے بے ہوشی کے اندھیروں میں دھکیل دیا تھا جس سے حملہ آور کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ بعد میں کاشی یا اس کے محافظ جھونپڑے میں آئے ہوں گے تو مجھے اٹھا کر یہاں لے آئے۔

سر کے زخم میں تکلیف اگرچہ بدستور موجود تھی لیکن وہ کڑوا کسیلا مشروب پینے کے بعد میں اپنے آپ کو بڑی حد تک بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ کمبل کے نیچے میرے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ میں نے گردن گھما کر شوبھا کی طرف دیکھا۔

"یہ دیکھنے کے لیے تمہارے کپڑے اتار دیے گئے تھے کہ تمہارے جسم پر کوئی اور زخم تو نہیں ہے؟" شوبھا نے میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"صرف میرے سر پر ضرب لگائی گئی تھی اس کے سوا کوئی چوٹ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "ان لوگوں کو ہٹاؤ یہاں سے۔ میں کپڑے پہننا چاہتا ہوں۔"

شوبھا نے کاشی سے مدھم لہجے میں کچھ کہا اور کاشی نے کمرے میں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ ان میں تین آدمی تھے اور باقی عورتیں ہی تھیں۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی بڑھیا نے میری دائیں کنپٹی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا پھر اپنا میلا سا تھیلا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

کمرے میں اب صرف شوبھا اور کاشی رہ گئی تھیں۔ دھنو اور مارتھا بھی باہر جا چکی تھیں۔ شوبھا نے ایک طرف پڑے ہوئے میرے کپڑے اٹھا کر قریب ڈال دیے۔ میں دیوار کی طرف رخ کر کے کمبل اوڑھے کھڑا ہو گیا۔ پہلے پتلون پہنی اور کمبل ہٹا کر قمیص پہننے لگا۔ پتلون پہنتے ہوئے مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری پنڈلی کے ساتھ خنجر موجود نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر شوبھا کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طرف اشارہ کردیا۔ بیلٹ اور خنجر وہاں رکھا ہوا تھا۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ دھنو اور مارتھا بھی اندر آگئی تھیں اور پالا نے بھی دروازے کے قریب اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ شوبھا نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ سورج غروب ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ کاشی میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"میں یہ جاننا چاہوں گی کہ تم میرے جھونپڑے میں کیسے پہنچے تھے اور تم پر حملہ کس نے کیا تھا؟" کاشی نے میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

میں چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر میری نظریں اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی نیچے آگئیں۔

"توبہ توبہ۔" شوبھا بڑبڑائی "شرم بھی نہیں آتی۔ کس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر گھور رہے ہو۔"

میں نے گھورتی ہوئی نظروں سے شوبھا کی طرف دیکھا پھر کاشی کی طرف متوجہ ہو کر بتانے لگا کہ میں اس کے جھونپڑے میں کیوں گیا تھا۔

"وہ پہلے سے تمہارے کمرے میں موجود تھا۔" میں کہہ رہا تھا "میں جیسے ہی اندر داخل ہوا اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ وہ میرے قابو میں آجاتا لیکن اس نے ڈنڈے سے میرے سر پر حملہ کردیا جس سے میں بے ہوش ہو گیا۔"

"وہ کون تھا۔ شیواگ؟" کاشی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں اندھیرے میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا لیکن وہ شیواگ نہیں تھا۔ شیواگ درمیانے قد کا مالک ہے جبکہ حملہ آور طویل قامت تھا۔" میں نے جواب دیا اور چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا "تمہارے کمرے سے کوئی چیز تو چوری نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔" کاشی نے جواب دیا "وہ جو کوئی بھی تھا چوری کی نیت سے نہیں آیا ہوگا۔ سردار کے جھونپڑے میں اجازت کے بغیر داخل ہونا سنگین جرم ہے اور اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ محض چوری کے لیے کوئی شخص اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے....؟"

"تم ٹھیک سمجھ رہے ہو۔" کاشی نے میری بات کاٹ دی "عام حالات میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر سردار کے جھونپڑے میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے۔ آج چونکہ سب لوگ بستی سے باہر تھے اس لیے اس شخص کو اندر داخل

ہونے کا موقع مل گیا۔"

"کیا وہ تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟" میں نے پوچھا۔ میرے دماغ میں ایک بار پھر دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے۔" کاشی نے کہا "بستی کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ شیواگ میرا دشمن ہے اور پھر میں نے کھل کر اس کے خلاف تمہاری حمایت کی ہے۔ قبیلے کے کسی فرد کے مقابلے میں ایک اجنبی کی حمایت کو اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن شیواگ کے کردار سے سب ہی واقف ہیں اس لیے تمہارے ہاتھوں اس کی شکست پر بھی لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا تھا اور ظاہر ہے 'شیواگ کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے پہلے تمہیں سزا دینے کے لیے تمہاری عورت کو اغوا کیا۔ اس مرحلے پر بھی اسے تمہارے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کونگا اور اس کے دو آدمی تمہارے ہاتھوں مارے گئے۔"

میں اس انکشاف پر اچھل پڑا۔ کونگا کے بارے میں تو کاشی میری باتوں سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ وہ میرے ہاتھوں ماری گئی تھی لیکن جزیرے پر دو آدمیوں کی ہلاکت! ان کا تو میں نے کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا لیکن کاشی سے شاید کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

"جزیرے پر تمہارے ہاتھوں ہزیمت اٹھانے کے بعد اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔" کاشی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "آج کا دن اس کے لیے بہترین موقع تھا۔ وہ خود تو بستی میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کرسکا۔ اپنے کسی گرگے کو بھیج دیا جو میرے جھونپڑے میں چھپ کر میرا انتظار کر رہا تھا لیکن مجھ سے پہلے تم پہنچ گئے۔"

"برے لوگ آسانی سے کبھی اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے۔" میں نے کہا "جب تک ان کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ تک نہ نچوڑ لیا جائے' یہ لوگ...."

"اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔" اس نے میری بات کاٹ دی "یوں تو شیواگ کے کئی آدمی بستی میں موجود ہوں گے لیکن ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ میرے جھونپڑے میں داخل ہونے والا کون تھا۔"

"اس کے آدمیوں میں سے کسی ایک کی نشان دہی کردو۔ میں اس سے معلوم کرلوں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں ایک دو دن آرام کی ضرورت ہے۔ کسی قسم کی بھاگ دوڑ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔" کاشی اٹھتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔ کوئی اہم بات ہوئی تو تمہیں اطلاع دوں گی۔"

کاشی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد دو عورتیں ہمارے لیے کھانا لے آئیں۔ کل رات کے بعد سے کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دھنو زیادہ ہی بے چین تھی۔ اس نے کسی سے پوچھے بغیر فوراً ہی کھانا شروع کردیا۔

اس رات سر میں تکلیف کی وجہ سے مجھے نیند نہیں آسکی۔ اگلے روز صبح سویرے ہی وہ بڑھیا پھر پہنچ گئی۔ اس نے پٹی کھول کر میرے زخم کا معائنہ کیا۔ دوسری پٹی لگائی۔ ایک پیالہ وہی کڑوا کسیلا جوس پلایا اور آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئی۔ اب ظاہر ہے' مجھے آرام ہی کرنا تھا۔ جب تک میرے سر کا زخم ٹھیک نہ ہو جاتا' میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ نہ تو مجھ پر حملہ کرنے والے شخص کا پتا چلا تھا اور نہ ہی شیواگ کا کوئی سراغ ملا تھا۔ تاہم یہ اطلاع میرے لیے دلچسپ ثابت ہوئی کہ شیواگ کے جو دو چار آدمی بستی میں موجود تھے وہ بھی غائب ہو گئے تھے۔

وہ بڑھیا ہر صبح باقاعدگی سے میرے زخم کی پٹی تبدیل کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کریلے کے ذائقے جیسا کڑوا جوس بھی پلایا جا رہا تھا جس کے بارے میں پالا نے بتایا تھا کہ اس سے نہ صرف بدن کو توانائی ملتی ہے بلکہ یہ جوس کسی بھی قسم کا زخم خشک کرنے کے لیے بڑا کارآمد ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ میرا زخم بڑی تیزی سے مندمل ہو رہا تھا۔

وہ چاند کی پہلی رات تھی اور چاند کی ہر پہلی اور چودھویں رات کو قبیلے والے جشن منایا کرتے تھے۔ اس رات بھی جشن تھا۔

غروب آفتاب سے پہلے ہی بہت سے لوگ ہمارے جھونپڑے سے تقریباً سو گز آگے جھیل کنارے ایک کھلی جگہ پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ غروب آفتاب کے فوراً بعد چاند نظر آتے ہی لوگ ناچنے لگے۔ لوگ بستی سے نکل نکل کر اس جگہ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ پالا ہمیں بھی بلا کر لے گئی۔ کھیل تماشے ہو رہے تھے۔ عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر رقص کر رہی تھیں۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے۔ اچانک میں عجیب سی تھکن محسوس کرنے لگا۔ دماغ پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔ میں نے شوبھا وغیرہ سے واپس چلنے کو کہا لیکن وہ لوگ وہاں رکنا چاہتی تھیں لہٰذا میں اکیلا ہی جھونپڑے میں واپس آگیا۔

دن میں بھی زیادہ تر میں سویا ہی رہا تھا لیکن اس وقت

نیند کا شدید حملہ ہوا تھا۔ میری آنکھیں بند ہوئے جا رہی تھیں اور میں بڑی مشکل سے جھونپڑے تک پہنچا تھا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

باہر سے شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے دماغ پر نیند کا بوجھ بڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا' کوئی نادیدہ قوت مجھے زبردستی سوجانے پر مجبور کر رہی ہو۔ لوگوں کے شور کی معدوم ہوتی ہوئی آوازوں میں جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی وہ کسی کنوئیں کی گہرائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ آواز اگرچہ بہت کمزور اور ہلکی تھی لیکن اس میں نجانے کیا تاثیر تھی کہ میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ نیلگری تھی جو دروازے میں سے داخل ہو کر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ اس کا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ چہرہ مرجھا گیا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل پر گھونسا لگا۔

"کیا ہوا نیلگری۔" میں نے پوچھا "تمہاری یہ حالت....؟"

"میری ساری قوتیں سلب ہو رہی ہیں۔" نیلگری کی آواز بھی بے حد کمزور تھی "وہ شیطان میرے قریب آتا جا رہا ہے۔ میرے گرد حصار تنگ ہو رہا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میرے اور اس کے درمیان صرف چھ دن کا فاصلہ رہ گیا ہے اور یہ فاصلہ بھی سمٹ گیا تو میں اس کے قبضے میں چلی جاؤں گی اور سب سے پہلے وہ مجھے تمہارے خلاف استعمال کرے گا۔ میں اس کا ہر حکم ماننے پر مجبور ہوں گی۔"

میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ چھ دن.... صرف چھ دن۔ اس کے بعد سب کچھ بدل جائے گا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میری بیماری اور شیواگ کے چکر میں کافی وقت ضائع ہو گیا تھا اور گوتم بھوش یہی تو چاہتا تھا۔

"نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں بڑبڑایا اور پھر نیلگری کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ایسا نہیں ہوگا نیلگری۔ میں اس شیطان کو مزید آگے نہیں بڑھنے دوں گا۔ میں۔ میں آ رہا ہوں۔"

"جلدی کرو وجدان۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔" نیلگری کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اسی وقت شور کی آواز سنائی دی۔ قہقہے گونجنے لگے۔ قہقہوں کی آوازیں کراہوں اور سسکیوں میں بدل گئیں اور پھر قہقہے... لگتا تھا جیسے سیکڑوں بد روحیں مل کر چیخ چلا رہی ہوں۔ یہ آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے نیلگری کی طرف دیکھا۔ اس کا ہیولا دھندلا رہا تھا۔ چاندنی جیسی دودھیا روشنی کا وہ ہیولا بتدریج تاریکی میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔

نسوانی قہقہوں کی آواز سن کر ایک بار پھر میری آنکھ کھل گئی۔ دھنو' شوبھا اور مارتھا قہقہے لگاتی ہوئی اندر داخل ہو رہی تھیں۔

"ارے۔" شوبھا میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں تو سمجھی تھی کہ تم سو گئے ہو گے!"

"سو گیا تھا۔ تم لوگوں کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر تم کچھ دیر اور وہاں رکتے تو ایک بہت حسین منظر دیکھتے۔" اس مرتبہ مارتھا نے زبان کھولی "کاشی نے کیا خوب رقص کیا تھا۔ میں تو اسے زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ لگتا تھا جیسے ہوا میں تیر رہی ہو۔ زمین پر تو اس کے پیر ٹکتے ہی نہیں تھے۔"

میں نے جواب میں صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔ کاشی بہت حسین تھی اور یقیناً رقص بھی بہت اچھا کرتی ہوگی۔

مارتھا اور شوبھا دیر تک آج کے جشن پر تبصرے کرتی رہیں۔ دھنو لیٹنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سو گئی تھی۔ میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر تک مارتھا اور شوبھا کی آوازیں میری سماعت سے ٹکراتی رہیں اور پھر وہ آوازیں معدوم ہوتی گئیں۔ میں نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا۔

اگلا دن بڑی بے چینی میں گزرا۔ میں بار بار نیلگری کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ وقت واقعی بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نیلگری کی مدد کے لیے ہی تو نکلا تھا۔ یہ سارے کشٹ (مصائب) اسی کے لیے تو برداشت کر رہا تھا لیکن میرے مقابلے پر بھی تو کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا۔ گوتم بھوش ایسا یوگی تھا جس کے قبضے میں کچھ اور قوتیں بھی تھیں اور وہ اپنی قوتوں کے بل بوتے پر نیلگری کو قبضے میں لینے کے لیے جاپ کر رہا تھا اور اس کی وہی قوتیں مختلف صورتوں میں میرے راستے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھیں۔ گوتم بھوش کی کوشش تھی کہ میں اس کا جاپ مکمل ہونے سے پہلے اس تک نہ پہنچ سکوں۔ آج نیلگری کی حالت نے مجھے چونکا دیا تھا اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب دنیا کی کسی طاقت کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں بننے دوں گا۔

اس روز میں نے دن کے وقت کاشی سے ملنے کی کوشش

کی تھی مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ تاہم شام کو جب شوبھا اور مارتھا بستی میں کہیں گئی ہوئی تھیں' میں اور دھنو جھیل کے کنارے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ پالا نے کاشی کا پیغام دیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔

میں نے دھنو کو بستی کے چوراہے پر چھوڑ دیا جہاں مارتھا اور شوبھا بھی موجود تھیں اور خود پالا کے ساتھ کاشی کے جھونپڑے میں پہنچ گیا۔

حسبِ معمول کاشی اپنے کمرے میں اکیلی تھی۔ اس کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک شیواگ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ وہ لاپتا ہو گیا تھا اور قبیلے کے لوگ دور دور تک اس کا سراغ نہیں لگا سکے تھے۔

"تمہیں اب یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔" کاشی نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "وقت بہت کم رہ گیا ہے اور تمہارا راستہ بہت کٹھن ہے۔ مزید تاخیر نہ صرف یہ کہ نیلگری کے لیے بلکہ تمہارے اور ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوگی۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی نیلگری سے رابطے میں تھی۔

"میں نے بھی یہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے جواب دیا "بقول تمہارے' راستہ کٹھن ہے اور...."

"تمہاری وہ تینوں عورتیں یہاں رہیں گی۔" کاشی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ مارتھا بھی چونکہ ہمارے ساتھ آئی تھی اور ہمارے ساتھ ہی رہ رہی تھی اسی لیے شوبھا اور دھنو کی طرح اسے بھی میری عورت ہی سمجھ لیا گیا تھا "تمہیں ان کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ قبیلے کے لوگ ان کی حفاظت کریں گے۔ تم آج رات ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ دو دن کا راستہ ہے۔ تمہارے پاس صرف تین دن باقی بچیں گے۔"

"میں وہاں کس طرح پہنچوں گا۔ راستے کی کوئی نشان دہی...."

"تمہارے اندر کی قوت تمہیں راستہ دکھائے گی۔" کاشی نے ایک بار پھر میری بات کاٹ دی "ویسے تمہاری رہنمائی کے لیے ثوبان تمہارے ساتھ جائے گا۔ آدھی رات کو جب سرخ ستارہ جزیرے کے عین اوپر چمکتا ہوا نظر آئے گا' تم جھونپڑے سے نکل کر بستی کے شمال میں کالی چٹان کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ ثوبان تمہیں وہیں منتظر ملے گا۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ پالا نے آ کر کاشی کے کان میں کچھ کہا۔ کاشی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے ثوبان کو یہاں بلایا تھا۔ وہ آ گیا ہے۔ تم بھی اس سے ملاقات کر ہی لو۔"

کاشی کے اشارے پر پالا کمرے سے نکل گئی۔ تقریباً دو منٹ بعد وہ دوبارہ اندر داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جس کا اس نے ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔

اس آدمی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ وہ دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ بانس کی طرح لمبا قد' گنجا سر' چہرے پر جھریاں اور آنکھیں....!

اس کے چہرے پر آنکھیں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ آنکھوں کی جگہ تو تھی لیکن لگتا تھا نعوذ باللہ' قدرت اس انسان کو تخلیق کرتے ہوئے آنکھیں بنانا بھول گئی ہو۔ آنکھوں کی جگہوں پر گوشت تھا۔ بالکل ہموار جیسے کھڑکیوں پر تختے لگا کر انہیں بند کر دیا گیا ہو اور یہ ستم رسیدہ چہرہ دیکھ کر ہی میں کانپ اٹھا تھا۔ اس کی عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی اور اس کے گلے میں بھی طوق کی طرح آہنی کڑا پڑا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے کاشی نے کسی ثوبان نامی شخص کا ذکر کیا تھا جو نیلگری کی برف پوش چوٹیوں میں واقع اس قدیم بدھ عبادت گاہ تک میری رہنمائی کرنے والا تھا جہاں گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا اس بدھ عبادت گاہ کا نام "گومپو" تھا۔ چند منٹ پہلے ہی پالا نے ثوبان کی آمد کی اطلاع دی تھی اور پالا کے ساتھ بغیر آنکھوں کے اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں ابھرا تھا کہ یہ ثوبان ہو سکتا تھا۔ میرا خیال تھا یہ کوئی اور ہے اور ثوبان باہر کھڑا انتظار کر رہا ہوگا۔ بہرحال میں اس شخص کے لیے دل میں بے حد افسوس محسوس کر رہا تھا۔

"ثوبان سے ملو اجنبی!"

کاشی کی آواز سن کر میں نے دروازے کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ بغیر آنکھوں والا وہ شخص پالا کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ چکا تھا۔ میں مڑ کر الجھی ہوئی نظروں سے کاشی کی طرف دیکھنے لگا۔

"ثوبان تمہارے سامنے کھڑا ہے۔" کاشی نے پالا کے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ سنسنی کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑتی چلی گئی لیکن میں نے فوراً ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ کاشی میرے ساتھ شاید

کسی قسم کا مذاق کر رہی ہے۔ جو شخص خود آنکھوں سے محروم ہو وہ کسی دوسرے کی کیا رہنمائی کر سکے گا!

"ثوبان بیناؤں سے زیادہ بینا اور داناؤں سے زیادہ دانا ہے۔" کاشی کہہ رہی تھی "قدرت نے اسے آنکھوں سے محروم رکھا لیکن اس کے اندر کی آنکھیں بہت روشن ہیں۔ یہ بصیرت کی روشنی میں وہاں تک دیکھ سکتا ہے جہاں تک بصارت کی روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ تم دونوں کا ساتھ خوب رہے گا۔ تم اپنے اندر کی قوتوں سے کام لو گے اور یہ اپنے اندر کی روشنی سے تمہاری رہنمائی کرے گا۔"

ثوبان نے پالا سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیے۔ اس کی بند آنکھیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے ان بند کھڑکیوں سے خارج ہونے والی مقناطیسی لہریں میری آنکھوں کے راستے پورے بدن میں ہلچل سی مچانے لگی ہوں۔

"یہ مالا۔" اس نے سیدھا ہاتھ میرے کندھے سے ہٹا کر گلے میں پڑی ہوئی مالا پر رکھ دیا۔ وہ مالا کے موتیوں کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے ٹٹول رہا تھا "یہ تمہارے لیے نیلگری کا ایک انمول تحفہ ہے لیکن تم اس معاملے میں بھی اجنبی ہی رہے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ اٹھایا ہوتا تو اس شیطان کو نیلگری کی پوتر چوٹیوں کی طرف آنے کی ہمت نہ ہوتی لیکن خیر۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ وقت ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں آج یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ میں کالی چٹان کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ پالا! مجھے باہر چھوڑ آؤ۔" اس نے مڑ کر ایک ہاتھ پالا کی طرف بڑھا دیا۔

میرے دماغ میں اب بھی دھماکے سے ہو رہے تھے۔ گلے میں پڑی ہوئی مالا کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا لیکن ثوبان جان گیا تھا کہ یہ نیلگری کا تحفہ تھا۔ اس نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے تھے اور پھر اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں میرے گلے میں مالا کے موتیوں پر گئی تھیں اور ایک لمحے کو مجھے یوں لگا تھا جیسے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہو لیکن اس کمرے سے باہر جانے کے لیے اس نے پالا کا سہارا لیا تھا۔

عجیب طرح کی سنسنی نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کے بعد میں زیادہ دیر وہاں نہیں رکا۔ اپنے جھونپڑے میں آکر بھی میں بار بار ثوبان کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا وہ واقعی نیلگری کی برف پوش چوٹیوں تک میری رہنمائی کرے گا یا میں اس کے ساتھ زندگی بھر پہاڑوں میں بھٹکتا رہوں گا؟

اس رات مارتھا اور دھنو سے باتوں کے دوران میں، میں بار بار ان کی طرف دیکھتا رہا اور نجانے کیا بات تھی کہ شوبھا بھی میرے چہرے پر نظریں چپکائے بیٹھی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اگر ہم باتیں کرتے رہتے تو رات یونہی آنکھوں میں گزر جاتی جبکہ مجھے آدھی رات کے وقت یہاں سے نکل جانا تھا اس لیے میں نیند کا بہانہ کر کے کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

ان تینوں کی باتوں کی آواز میری سماعت سے ٹکراتی رہی اور بالآخر خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر مزید انتظار کرنے کے بعد میں نے اپنے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ وہ تینوں سو چکی تھیں۔ میں نے آہستگی سے کمبل اپنے اوپر سے ہٹا دیا اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔

بستی پر سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں گلیوں میں چلتا ہوا شمال کی طرف بستی سے باہر آ گیا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلنے لگا۔

کالی چٹان بستی سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھی۔ مجھے اس طرف جانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ کھیتوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی ایک پگڈنڈی اس کالی چٹان تک چلی گئی تھی۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس پگڈنڈی پر چلتا رہا۔ قبیلے کے لوگ اپنے مرنے والوں کی آخری رسوم بھی اس چٹان کے قریب ہی ادا کیا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا، اس طرف کوئی قبرستان ہو گا جہاں مردوں کو دفن کیا جاتا ہو گا یا کوئی شمشان گھاٹ جہاں ہندوؤں کی طرح مردوں کو جلا دیا جاتا ہو گا۔

میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے دھنو اور شوبھا کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔ میرے اس طرح چلے آنے پر وہ کیا خیال کریں گی۔ دھنو تو بچوں کی طرح رونا پیٹنا شروع کر دے گی لیکن یہاں سے آگے میں انہیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ راستہ خطرناک ہونے کے علاوہ یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ آگے کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مجھے اس کالی چٹان تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گہری تاریکی اور سناٹا تھا۔ میں ایک جگہ رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں رک رک کر آگے بڑھتا رہا۔

کسی خچر کے ہنہنانے کی آواز سن کر میں چونک گیا اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی اور میں

اس طرف بڑھتا چلا گیا۔

وہ دو خچر تھے لیکن ان کے آس پاس کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ثوبان!" میں نے خچروں کے قریب رک کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پکارا۔

"میں یہاں ہوں اجنبی۔" دائیں طرف سے آواز سنائی دی اور ایک انسانی ہیولا تاریکی سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔

میرا خیال تھا کہ ثوبان کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا جو اسے ہاتھ سے پکڑ کر یہاں لایا ہوگا لیکن آس پاس کوئی اور نہیں تھا۔

"وقت ضائع مت کرو اجنبی۔" ثوبان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اب ہمیں یہاں سے روانہ ہوجانا چاہیے۔"

میں ایک خچر کی لگام پکڑ کر ثوبان کے قریب لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے سہارا دے کر اس خچر پر سوار کراؤں گا اور خود دوسرے خچر پر سوار ہوجاؤں گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ثوبان اچک کر دوسرے خچر پر سوار ہوگیا تھا۔ میں بھی اپنے خچر پر سوار ہوگیا۔

پگڈنڈی زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ثوبان کا خچر آگے تھا اور میرا خچر سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ آگے کھلا میدان تھا جس سے آگے بہت دور پہاڑوں کے تاریک ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ اس میدان میں آتے ہی ثوبان کے خچر کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ مجھے بھی اپنے خچر کی رفتار بڑھانی پڑی۔ خچر کی ننگی پیٹھ پر سفر کرنا کم از کم میرے لیے بہت کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

مجھے زیادہ حیرت ثوبان پر ہو رہی تھی جس کا خچر مجھ سے کئی گز آگے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے لگام تھام رکھی تھی اور خچر کی پشت پر بالکل سیدھا بیٹھا ہوا تھا۔

خچر تقریباً دو گھنٹوں تک اس پتھریلے میدان میں دوڑتے رہے اور جیسے ہی پہاڑی سلسلہ شروع ہوا، ان کی رفتار خود بخود کم ہوگئی۔ ثوبان کا خچر اب بھی مجھ سے چند گز آگے تھا۔ مجھے قدرت کی اس ستم ظریفی پر ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ایک اندھا آنکھوں والے کی رہنمائی کر رہا تھا۔

ان پہاڑوں میں ہمارا سفر رات بھر جاری رہا۔ ہم نہ صرف بتدریج بلندی کی طرف جا رہے تھے بلکہ راستہ بھی کٹھن سے کٹھن تر ہوتا جا رہا تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو رات کی تاریکی میں خطرناک راستوں پر سفر کرنے کی ہمت کبھی نہ کرتا لیکن ایک ایسا شخص مجھے راستہ دکھا رہا تھا جو آنکھوں سے محروم تھا۔ پورے راستے میں وہ کہیں ایک مرتبہ بھی نہیں ٹھٹکا تھا۔

صبح کا اجالا پھیلنے کے بعد بھی ہمارا سفر جاری رہا۔ ثوبان کا خچر کبھی میرے برابر آجاتا اور کبھی چند گز آگے نکل جاتا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب راستہ زیادہ خطرناک ہوتا ثوبان کا خچر میرے برابر آجاتا تھا۔

سورج نکل آیا۔ دھوپ کی کرنیں مچلنے لگیں۔ تقریباً ایک گھنٹا مزید چلتے رہنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہ چٹانوں کے درمیان بہت کھلی جگہ تھی۔ رات کی تاریکی میں سفر کے دوران میں چٹانوں کے ہیولوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا تھا لیکن دن کی روشنی پھیلنے کے بعد آس پاس کے مناظر دیکھ کر حیرت کے مارے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ان پہاڑوں میں اگرچہ اونچے درخت نہیں تھے لیکن سبزہ بے تحاشا تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ جس جگہ ہم ٹھہرے تھے وہاں بھی شفاف پانی کی ایک چھوٹی ندی کے آس پاس سبز دبیز گھاس اور پھولوں کی چادر بچھی ہوئی تھی۔

ثوبان نے اپنے خچر کی گردن سے بندھا ہوا ایک تھیلا اتار لیا اور خچر کو کھلا چھوڑ دیا۔ رات بھر کے سفر سے خچر بھی تھک گئے تھے اور میری حالت کچھ زیادہ ہی ابتر ہو رہی تھی۔ راجستھان میں، میں نے شوقیہ طور پر گھوڑے کی تھوڑی بہت سواری کی تھی لیکن آرام دہ زین پر تھوڑی دیر کو سواری کرنا اور بات تھی اور خچر کی ننگی پیٹھ پر رات بھر پہاڑی سفر کرنا دوسری بات۔ میرا جوڑ جوڑ ہل کر رہ گیا تھا۔

خچر سے اتر کر میں گھاس پر لیٹ گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ثوبان ندی کے کنارے پر بیٹھ گیا تھا۔ پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد وہ میری طرف گھوم گیا۔

"تھک گئے؟" وہ بولا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا جیسے مجھے دیکھ رہا ہو۔

"گھوڑے یا خچر کی ننگی پیٹھ پر کبھی سفر نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا۔

"کٹھنائیاں بھی زندگی کا حصہ ہیں۔" اس نے کہا "مقصد اگر نیک ہو تو کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ لو۔ تھوڑی پیٹ پوجا کرلو تو ہم آگے چلیں۔" اس نے تھیلا میری طرف اچھال دیا۔

میں نے اٹھ کر پہلے منہ ہاتھ دھویا اور پھر تھیلا کھول کر

اس میں جھانکنے لگا۔ اس میں مٹر کے بھنے ہوئے دانے تھے۔ گزشتہ رات کا کھانا اس سفر کے دوران میں ہضم ہوچکا تھا اور اس وقت مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے ایک مٹھی دانے لے لیے اور تھیلا ثوبان کی طرف بڑھا دیا۔

"لو۔ تم بھی کھاؤ۔"

ثوبان نے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو مجھے شرارت سوجھی اور میں نے تھیلا ایک طرف ہٹا دیا۔ ثوبان کا ہاتھ اس طرف بڑھا تو میں نے تھیلا وہاں سے بھی ہٹا دیا۔

"مذاق کر رہے ہو۔" ثوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ میرے لاشعور میں شاید یہ ہو کہ میں اسے آزمانا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں یہ بھول گیا تھا کہ آنکھوں سے محروم جو شخص رات کی تاریکی میں خطرناک پہاڑی راستوں پر میری رہنمائی کرتا آیا تھا۔ میں اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا، میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ گزشتہ رات سفر کے دوران میں کئی ایسے خطرناک مقام آئے تھے جہاں معمولی سی غفلت کسی کو تحت الثریٰ میں پہنچا سکتی تھی اور ایسے ہر موقع پر ثوبان نے میری رہنمائی کی تھی۔

"مجھے افسوس ہے ثوبان۔" میرے لہجے میں ندامت تھی "مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"میں نے برا نہیں مانا۔" ثوبان نے یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے تھیلا لے لیا اور اس میں سے مٹر کے دانے نکال کر کھانے لگا۔

بھنے ہوئے مٹر کے دانے نمکین تھے جو کھانے میں بہت اچھے لگ رہے تھے۔ مٹر کھانے کے بعد میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ ہم مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ بے حد خطرناک تھا۔ کہیں تنگ سی دراڑوں میں سے گزرنا پڑتا اور کہیں عمودی ڈھلانیں تھیں۔

دن بھر رکے بغیر ہمارا سفر جاری رہا۔ سہ پہر کے قریب ہم تھوڑی دیر کو ایک جگہ رکے اور پھر آگے روانہ ہوگئے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں ہمارے سامنے نشیب میں وسیع و عریض وادی پھیلی ہوئی تھی جس کی دوسری طرف تیلگری کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ برف سے ڈھکے ہوئے انہی پہاڑوں میں کہیں بدھ کی وہ قدیم عبادت گاہ گومپو تھی جہاں گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہی برف پوش چوٹیاں تیلگری کا بھی مسکن تھیں جہاں وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم آج کی رات یہاں آرام کرلیں اور صبح اپنا سفر دوبارہ شروع کریں۔" میں نے ثوبان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" ثوبان نے نفی میں سر ہلا دیا "آدھی رات سے پہلے پہلے ہمیں وادی کی دوسری طرف پہنچ جانا چاہیے۔ اگر تم بہت تھک گئے ہو تو ہم چند منٹ یہاں آرام کرسکتے ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ میں اس ستر سالہ بوڑھے کے سامنے اپنے آپ کو ہلکا ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا جو پچھلے اٹھارہ گھنٹوں سے خچر کی ننگی پشت پر نان اسٹاپ سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔

سورج غروب ہونے میں تقریباً آدھا گھنٹا باقی تھا۔ دس منٹ رکنے کے بعد ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کردیا۔ ہمارے سامنے ڈھلان تھی اور وہ وادی میلوں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہم زیادہ سے زیادہ تین چار گھنٹوں میں اس وادی کی دوسری طرف برف پوش پہاڑ کے دامن میں پہنچ جائیں گے۔

خچر بھی مسلسل سفر سے تھک گئے تھے۔ ان کی رفتار بھی زیادہ تیز نہیں رہی تھی۔

سورج غروب ہوگیا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ سرمئی دھند لکے کی جگہ اندھیرے کی سیاہ چادر پھیلنے لگی اور پھر اندھیرا اس قدر گمبھیر ہوگیا کہ چند گز آگے کی چیز بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن خچر اطمینان سے چلتے رہے۔ لگتا تھا جیسے یہ راستہ ان کا دیکھا بھالا ہو اور وہ پہلے بھی اس طرف آتے رہے ہوں۔

پر ہول سناٹا دل پر وحشت سی طاری کررہا تھا۔ میں نے دھیان بٹانے کے لیے ثوبان سے باتیں شروع کردیں لیکن وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ عجیب آدمی تھا۔ کل آدھی رات کے وقت ہم نے سفر شروع کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک چند جملوں کے تبادلے کے سوا ہم میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی اور اس وقت بھی وہ گفتگو سے اجتناب برت رہا تھا۔ میں بھی خاموش ہوگیا۔

پورے سفر کے دوران میں، میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ ثوبان کبھی کبھی اپنا خچر روک کر اس طرح نتھنے پھلانے پچکانے لگتا جیسے کچھ سونگھنے کی کوشش کررہا ہو۔ اس حرکت کے بعد یا تو وہ اس راستے پر اپنا سفر جاری رکھتا یا مجھے اشارہ کرتا ہوا خچر کو کسی اور راستے پر موڑ دیتا۔ ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ ہم مڑ کر بہت دور تک پیچھے آئے تھے اور پھر راستہ تبدیل کیا تھا۔

اس وادی میں سفر کرتے ہوئے تقریباً چار گھنٹے ہوچکے تھے۔ ڈھلان ختم ہوچکی تھی۔ اب آگے ہموار علاقہ تھا۔ سامنے پہاڑوں کے ہیولے اب بھی اتنے ہی دور تھے جتنے اس وادی کے شروع میں نظر آئے تھے۔

آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کے باعث تاریکی میں اب وہ پہلے جیسی گمبھیرتا نہیں رہی تھی۔ راستہ بھی اب کسی حد تک صاف نظر آنے لگا تھا۔

اچانک ثوبان نے خچر روک لیا اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بھی اپنا خچر روک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ثوبان خچر پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف گھوم کر نتھنے پھلا پچکا رہا تھا پھر اچانک وہ سیدھا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے جیسے اس نے کوئی خوفناک بات محسوس کی ہو۔

"بھاگو یہاں سے اجنبی!" وہ اپنے خچر کی لگام سنبھالتے ہوئے بولا "کھیل شروع ہوگیا۔ بلائیں ہم پر حملہ آور ہونے والی ہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہوسکے، ہمیں اس وادی سے نکل جانا چاہیے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھ سکتا، اس نے اپنے خچر کو ایڑھ لگادی۔ خچر بگٹٹ بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اگرچہ اس کی بات پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا لیکن ایک انجانا سا خوف اچانک ہی ذہن میں ابھر آیا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا لیکن مجھے کوئی بلا نظر نہیں آئی جو حملہ آور ہونے والی ہو لیکن ثوبان بھی غلط نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ آنکھوں سے محروم تھا لیکن قدرت نے اس محرومی کے عوض اسے کچھ اور صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ آنکھوں کے بغیر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اندر کوئی ایسی اضافی حس بھی تھی جس سے وہ فضا میں سونگھ کر صورتِ حال کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہ حس غالباً چھٹی حس سے بھی آگے کی کوئی چیز تھی۔

اچانک میں چونک گیا۔ کچھ ایسی آوازیں میری سماعت سے ٹکرائی تھیں، جیسے چند جانور ریوڑ کی صورت میں دوڑ رہے ہوں۔ یہ پراسرار آوازیں کبھی قریب سے سنائی دیتیں کبھی بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا لیکن کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی۔

"اجنبی! بھاگو۔ وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

ثوبان کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر اس طرف دیکھا تو وہ مجھ سے تقریباً سو گز آگے نکل چکا تھا۔ میں نے بھی اپنے خچر کو ایڑھ لگادی۔

مسلسل سفر سے اگرچہ خچر بھی تھکا ہوا تھا لیکن ایڑھ لگتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ شام سے پہلے ہم نے جہاں تھوڑی دیر کے لیے پڑاؤ ڈالا تھا وہاں میں نے ایک جھاڑی سے لمبی سی ایک شاخ توڑ لی تھی جو اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں تن کر بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ میں لگام تھی اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگا کر خچر کو تیز دوڑنے پر مجبور کررہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں ثوبان کے برابر پہنچ گیا۔ وہ بھی خچر کو تیز سے تیز تر بھگانے کی کوشش کررہا تھا۔ ہماری کیفیت اس وقت ایسی تھی جیسے جہنم کی بلائیں ہمارا پیچھا کررہی ہوں۔

اور پھر میں نے ان بلاؤں کو دیکھ لیا۔ دوڑنے کی آوازیں سن کر ہی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

غولِ بیابانی ہمارا پیچھا کررہا تھا۔ وہ خوف ناک بھیڑیے تھے اور تعداد میں کئی تھے۔ ان کی آنکھیں اندھیرے میں بھی

بلور کی طرح چمک رہی تھیں۔ دوڑنے کے ساتھ ان کی غراہٹوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔

دونوں خچروں نے بھی خطرے کو محسوس کرلیا تھا۔ وہ بھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے لیکن ظاہر ہے، وہ خچر تھے۔ ان کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

ثوبان والا خچر مجھ سے چند گز آگے تھا۔ ثوبان بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا اور "اجنبی تیز۔۔۔ تیز۔" چیختا۔ میں خچر کو تیز تر دوڑانے کے لیے اسے بار بار چابک رسید کررہا تھا۔

دو بھیڑیے میرے بالکل قریب پہنچ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے ایک بھیڑیا خچر کے برابر پہنچ گیا اور اچھل کر میرا پیر پکڑنے کی کوشش کی۔ اگر میرا پیر اس کے منہ میں آجاتا تو وہ اسے چبا ہی ڈالتا۔ میں نے دونوں ٹانگیں خچر کے پیٹ کے ساتھ لپیٹ لیں اور بھیڑیے کے منہ پر چابک رسید کردی۔

چابک کھا کر وہ بھیڑیا تو پیچھے رہ گیا لیکن دوسرا بھیڑیا قریب پہنچ گیا تھا جو خچر کی پچھلی ٹانگ پر دانت گاڑنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے چھڑی سے اس بھیڑیے پر بھی دو تین حملے کیے لیکن اس نے پیچھا نہیں چھوڑا۔

ثوبان بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ بھیڑیے اس سے کافی دور تھے اور جان توڑ کر دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کررہے تھے۔

میرے پیچھے آنے والے ایک بھیڑیے نے عقل مندی یہ کی کہ وہ دوڑتا ہوا میرے خچر سے آگے نکل گیا۔ تقریباً دس گز آگے جا کر وہ رکا، تیزی سے مڑا اور حیرت انگیز طور پر ہوا میں اچھل کر میری طرف حملہ آور ہوا۔

اس بھیڑیے کو سامنے دیکھ کر خچر بدک گیا۔ وہ اگلے پیر اٹھا کر ہوا میں اچھلا۔ اس دوران میں سامنے سے ہوا میں اڑتا ہوا بھیڑیا میرے اوپر حملہ آور ہوچکا تھا۔

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی بھی پھینک دی اور خچر کی لگام بھی چھوڑ دی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بھیڑیے کو اپنے ہاتھوں پر روکا۔

خچر میرے نیچے سے نکل گیا تھا۔ میں پشت کے بل زمین پر گرا۔ بھیڑیا میرے اوپر تھا لیکن میں نے اسے اپنے پیچھے اچھال دیا تھا۔

اس طرح خچر کی پشت پر سے گرنے سے مجھے اچھی خاصی چوٹ لگی تھی لیکن میں نے سنبھلنے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میرے سامنے واقعی جہنم کی بلائیں تھیں۔

ثوبان آگے نکل چکا تھا۔ اس کے پیچھے کوئی بھیڑیا نہیں تھا جبکہ درجن بھر بھیڑیے دانت نکوستے اور غراتے ہوئے مجھے گھیرے میں لینے کی کوشش کررہے تھے۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ یہ بھیڑیے۔۔۔۔ یہ بھی مجھے بدھ کی عبادت گاہ تک پہنچنے سے روکنے کی کوشش تھی۔ یہ بھی کسی طاغوتی قوت کے نمائندے تھے جو صرف مجھے روکنا اور ختم کرنا چاہتے تھے جبکہ انہوں نے ثوبان کا تعاقب ترک کردیا تھا۔

میرے ذہن میں ابھرنے والے صرف اس ایک خیال نے صورتِ حال بدل دی۔ میری اندر کی تمام تر قوتیں میری آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ تین بھیڑیے بڑی شدت سے میرے اوپر حملہ آور ہورہے تھے لیکن اچانک وہ رک گئے۔ مجھے ان کے پیروں کے قریب کچھ چنگاریاں سی ناچتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ چنگاریاں بڑی سرعت سے پھیلتی گئیں۔ بھیڑیے مجھ پر حملہ آور ہونا بھول گئے اور اچھل اچھل کر اپنے آپ کو ان چنگاریوں سے بچانے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

وہ ننھی ننھی چنگاریاں دہکتے ہوئے انگاروں میں بدل گئیں۔ وہ خوں خوار بھیڑیے اچھل رہے تھے۔ ان کے منہ سے اب غراہٹوں کے بجائے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔

میری نظروں کا زاویہ بدل گیا۔ اب میں نے نظروں ہی نظروں سے ان بھیڑیوں کے گرد دائرہ بنانا شروع کردیا۔ وہ آگ کا دائرہ تھا جو ان خوں خوار بھیڑیوں کو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ وہ حصار ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ ایک بھیڑیا باہر

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

بزرگانِ دین کے ایمان افروز واقعات

عظمت کے مینار

قیمت -/150 روپے

ڈاک خرچ -/25 روپے

مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر 1

نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ وہ بھیڑیا تھا جس نے خچر سے آگے نکل کر میرے اوپر حملہ کیا تھا۔ ایک اور بھیڑیے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی آگ کا دائرہ مکمل ہوگیا۔ وہ بھیڑیے آگ کے دائرے میں محصور ہوگئے۔ وہ انگاروں پر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ان کے منہ سے بڑی بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں اس بھیڑیے کی طرف دیکھنے لگا جو فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

وہ بہت دور نکل گیا تھا۔ ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ ستاروں کی روشنی میں اس کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آسمان کی طرف منہ اٹھائے رو رہا تھا۔ سناٹے میں اس کے رونے کی آواز پوری وادی میں پھیل رہی تھی۔

"اجنبی! اب دیر مت کرو۔ نکل چلو یہاں سے۔"

میں نے مڑ کر آواز کی طرف دیکھا۔ ثوبان مجھ سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا لیکن اس کی آواز مجھے اپنے بالکل قریب سے سنائی دی تھی۔

میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خچر بھی تقریباً بیس گز دور کھڑا تھا۔ میں دوڑ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ پھر بدک گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قابو کیا۔ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ پسینے میں بھیگا ہوا ہے۔

میں اچک کر اس کی پشت پر سوار ہوگیا اور اسے ہلکی سی ایڑھ لگا دی۔ ثوبان میرا ہی منتظر تھا۔ اس نے بھی اپنے خچر کو ایڑھ لگا دی۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آگ کا دائرہ روشن تھا اور بھیڑیوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

ہم خچروں کو دوڑاتے ہوئے وہاں سے میلوں دور نکل آئے لیکن اس بھیڑیے کے رونے کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ روتی اور بین کرتی ہوئی یہ آواز وادی میں چاروں طرف سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

ثوبان اب بھی خاموش تھا۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

ہمارا سفر رات بھر جاری رہا اور بالآخر ہم وادی سے نکل کر اونچے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے۔ اب ہم پھر بلندی کی طرف سفر کر رہے تھے۔

رات کی تاریکی دم توڑنے لگی۔ دن کا اجالا پھیلنے لگا۔ ثوبان خچر روک کر ایک بار پھر فضا میں کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد وہ ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اس طرف! وہاں ایک جگہ ہے جہاں ہم کچھ دیر آرام کرسکتے ہیں۔"

میں نے بھی اس کے پیچھے ہی اپنا خچر موڑ لیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک چٹانوں میں گھومنے کے بعد ہم ایک جگہ رک گئے۔ یہاں ساٹھ ستر فٹ کی بلندی سے ایک آبشار گر رہا تھا اور چنار سے ملتے جلتے درختوں کی بہتات تھی لیکن یہ درخت چنار کی طرح قد آور نہیں تھے۔ ان کے پتے پان سے مشابہ تھے لیکن یہ ایک طرف سے سبز اور دوسری طرف سے چاندی کی رنگت کے تھے۔ ہوا سے جھومتے ہوئے یہ دو رنگے پتے بڑا دل فریب منظر پیش کر رہے تھے۔

یہاں بھی ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں رکے تھے۔ مسلسل سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا لیکن ستر سالہ ثوبان اب بھی ترو تازہ نظر آرہا تھا اور پھر یہ جان کر تو میری جان ہی نکل گئی کہ اس سے آگے ہم خچروں پر سفر نہیں کرسکیں گے۔

خچروں کو وہیں چھوڑ دیا گیا۔ ہمارا یہ پیدل سفر پہلے سے زیادہ کٹھن اور خطرناک تھا۔ ثوبان نوجوانوں کی طرح میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے بارے میں تو اب میں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ خدا جانے' وہ کیا چیز تھی! مجھے تو اب اس کے انسان ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا تھا یا پھر کوئی پراسرار قوت اس کے اندر حلول کرگئی تھی۔ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود وہ خطرناک ترین راستوں پر بے دھڑک چل رہا تھا۔ کئی جگہوں پر میں جھجکا تھا لیکن وہ بے دھڑک آگے بڑھ گیا تھا۔

میرا خیال تھا' شاید ہم آسمان کو چھونے جا رہے ہیں۔ اب جمی ہوئی برف اس قدر نرم تھی کہ پیر اندر دھنس رہے تھے۔

سورج غروب ہونے کو تھا۔ دھوپ کی الوداعی کرنوں میں برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

اور بالآخر ہم ایک چٹان پر رک گئے۔ ثوبان نے سامنے اشارہ کیا۔ میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

تقریباً پچاس گز آگے۔۔۔ دوسری چٹان پر بدھ کی وہ قدیم عبادت گاہ "گومپو" نظر آرہی تھی جہاں میری اور گوتم بھوش کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا!

میں پلک جھپکے بغیر اس عبادت گاہ "گومپو" کی طرف دیکھ رہا تھا۔

چٹان کو کاٹ کر بنائی گئی بدھا کی یہ قدیم عبادت گاہ دل پر دہشت سی طاری کر رہی تھی اور اس سے زیادہ دہشت ناک وہ راستہ تھا جس سے گزر کر اس عبادت گاہ تک پہنچا جاسکتا تھا۔

پچاس گز طویل وہ راستہ پل صراط تھا۔ تقریباً چھ فٹ چوڑی جمی ہوئی برف کی وہ دیوار عبادت گاہ والی چٹان تک چلی گئی تھی۔ میں نے ذرا آگے بڑھ کر نیچے جھانکا تو مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دونوں چٹانوں کے درمیان یہ کھڈ تقریباً ڈیڑھ سو فٹ گہرا تھا اور تیز رفتار پانی طوفانی لہروں کی طرح اچھلتا ہوا بہہ رہا تھا۔ برف کی اس دیوار میں بھی جگہ جگہ بڑے بڑے سوراخ نظر آرہے تھے۔ میرے خیال میں دونوں چٹانوں کو ملانے والی برف کی اس دیوار کو ایک پل کہنا ہی مناسب ہوگا۔ ایک جگہ پل کی سطح سے تقریباً آٹھ فٹ نیچے بھی ایک بہت بڑا سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ زیادہ وزن پڑنے سے اس جگہ سے پل ٹوٹ بھی سکتا تھا۔

میں سیدھا ہو کر سامنے بدھ عبادت گاہ کی طرف دیکھنے لگا۔ چٹان کا وہ غار اگرچہ قدرتی ہی تھا لیکن اس میں انسانی ہاتھوں کی صناعی بھی نظر آرہی تھی۔ غار کا دہانہ محرابی تھا۔ اس کا اوپر والا حصہ زمین کی سطح سے تقریباً تیس فٹ بلند تھا اور وہ دہانہ اس قدر کشادہ تھا کہ دو ہاتھی پہلو بہ پہلو بہ آسانی گزر سکتے تھے۔ اس محراب نما دہانے کے دائیں بائیں دیواروں پر چٹان کو کاٹ کر بدھا کے استادہ مجسمے تراشے گئے تھے اور محراب کے اوپر عین وسط میں بھی اسائلنگ بدھا کا تراشا ہوا مجسمہ نظر آرہا تھا۔

غار کے دہانے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہ اندر سے بھی بہت وسیع و عریض ہوگا لیکن اس کے اندر کیا تھا؟ ابھی کا اندازہ لگانا بہت دشوار تھا۔

میں چٹان کے کنارے سے چند فٹ دور کھڑا متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ عبادت گاہ والی چٹان تک پہنچنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ ضرور ہونا چاہیے لیکن دائیں بائیں دور تک ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں دونوں چٹانیں آپس میں ملتی ہوں۔ اس جگہ جہاں میں کھڑا تھا' دونوں چٹانوں کے درمیان فاصلہ تقریباً پچاس گز تھا جبکہ دائیں بائیں کہیں یہ فاصلہ کم ہوجاتا تھا اور کہیں زیادہ۔ درمیانی گہرائی بھی کہیں کم تھی اور کہیں زیادہ۔ گہرائی میں تیز رفتار پانی کو اچھلتے دیکھ کر میری رگوں میں بھی خون اچھلنے لگا تھا۔

"عبادت گاہ تک پہنچنے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے اجنبی۔" ثوبان کی آواز سن کر میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند گز پیچھے کھڑا تھا اور اس نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

"تمہیں اس پگڈنڈی سے گزر کر جانا ہوگا۔" اس نے کہا "یہ راستہ صرف وہی لوگ پار کرسکتے ہیں جو آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور تم میں حوصلے کی کمی نہیں۔ اب دیر مت کرو۔"

میرا خیال تھا کہ ثوبان اس موقع پر بھی میری رہنمائی کرے گا اور برف کے پل پر قدم رکھنے میں بھی پہل وہی کرے گا۔ لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔

"میں یہاں سے آگے نہیں جاسکتا۔" اس نے ایک بار پھر میرے خیالات پڑھ لیے "تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔ جاؤ۔ اب دیر مت کرو۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں نے ثوبان کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر اس پل صراط کی طرف دیکھنے لگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خطرناک راستے کو دیکھ کر میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ پل پر جمی ہوئی برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر ثوبان کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ یہ شخص میرے لیے ایک عجوبہ ثابت ہوا تھا۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس میں بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ وہ خطرناک ترین راستوں پر میری راہنمائی کرتا ہوا مجھے یہاں تک لایا تھا اور اب اس نے آگے جانے سے انکار کردیا تھا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ وہ برف کے اس پل صراط نما راستے سے ڈر گیا تھا۔ یقیناً کوئی اور مصلحت تھی۔

میں نے آخری بار اس کی طرف دیکھا اور مڑ کر اس راستے کی طرف چلنے لگا۔ چٹان پر بکھری ہوئی برف میرے پیروں کے نیچے "کرچ کرچ" کی آواز سے دب رہی تھی۔ میں چٹان سے اس پل پر آگیا۔ پہلا قدم رکھتے ہی میرا دل کانپ اٹھا۔ بے پناہ خوف محسوس ہونے کے باوجود میں نے دوسرا قدم آگے بڑھا دیا۔

چند قدموں تک برف نرم تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ یہاں ہوا براہ راست مار نہیں کر رہی تھی۔ میرے پیر ٹخنوں تک اس برف میں دھنستے رہے۔

اور پھر وہ مرحلہ شروع ہوگیا جسے زندگی کا خوفناک ترین تجربہ کہا جاسکتا تھا۔ آگے برف سخت تھی اور شیشے کی طرح چکنی تھی۔ اگر آپ کو کبھی ایسا تجربہ ہوا ہو تو آپ کو اندازہ

ہوگا کہ چمکتے ہوئے شیشے پر چلنا کتنا دشوار ہوتا ہے اور ستم یہ کہ یہاں تو ہوا بھی مجھے ایک طرف دھکیل رہی تھی۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' ہوا میں بھی تیزی آرہی تھی۔ شیشے کی طرح جمی ہوئی برف پر پیر جمانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک موقع پر تو میرا پیر پھسل گیا۔ سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے میرا توازن بگڑ گیا اور میں پشت کے بل گرا۔ میں بڑی تیزی سے کنارے کی طرف پھسل رہا تھا اور پھر اچانک یوں لگا جیسے میں کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ میں کنارے سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر رکا تھا۔ میں نے متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا لیکن میرے آس پاس کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ یقیناً کوئی پراسرار قوت تھی جس نے مجھے گرنے سے بچالیا تھا۔

میں ایک بار پھر سنبھل کر آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت تک میں تقریباً بیس گز آگے آچکا تھا اور پھر اچانک ہی مجھے ایسے لگا جیسے برف کا وہ پل اپنی جگہ سے حرکت کر رہا ہو۔ میرے لیے قدم جمانا مشکل ہو رہا تھا لیکن میں آگے بڑھتا رہا۔ چند قدم آگے بڑھتے ہی میں پھر رک گیا بلکہ میں نے جھک کر دونوں ہاتھ بھی برف پر جمادیے۔ اس وقت مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے برف ٹوٹ رہی ہو۔ بڑی خوفناک آواز سنائی دی تھی۔ میں چند لمحے بے حس و حرکت چوپائے کی طرح کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

اب میں پل کے وسط میں پہنچ چکا تھا اور اسی جگہ پر تھا جہاں سات آٹھ فٹ نیچے برف کی اس دیوار میں بہت بڑا سوراخ تھا۔ یہاں ہوا بھی بہت تیز ہوگئی تھی اور پھر وہ ہوا جس کی میں توقع نہیں کر سکتا تھا بلکہ ایسی صورت حال کا تصور کرنا بھی محال تھا۔

ہوا میں اچانک ہی تیزی آگئی تھی اور جمی ہوئی برف کا وہ پل رسے کے پل کی طرح زور زور سے ہلنے لگا۔ مجھے تھائی لینڈ کے پہاڑی علاقے میں ایک مرتبہ رسے کے پل پر چلنے کا اتفاق ہوا تھا شاؤلن ٹمپل میں بھی رسے کا ایک پل تھا... جس پر تقریباً روزانہ ہی چلا کرتا تھا لیکن جمی ہوئی برف کا یہ پل...؟ اس کے اس طرح ہلنے پر مجھے بڑی حیرت ہو رہی تھی۔

تیز ہوا سے پل بڑی تیزی سے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں پیر جمائے کھڑا رہا تھا۔ ایک ہی جگہ کھڑے رہنے سے پیروں کی حرارت سے اس جگہ برف میں گڑھے سے پڑ گئے تھے اور میرے پیر ایک طرح سے ان گڑھوں میں جم گئے تھے لیکن پل جس طرح جھول رہا تھا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ میں زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر کھڑا نہیں رہ سکوں گا۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے مجھے کئی فٹ اوپر اچھال دیا اور جب میں دوبارہ پل پر گرا تو ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی چٹان تڑخ رہی ہو۔ بڑی خوفناک آواز تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں دہل کر رہ گیا۔ میرے پیروں کے نیچے پل ٹوٹ رہا تھا۔ برف کی بہت بڑی سل سلوموشن میں نیچے جھک رہی تھی جیسے درخت کی شاخ ٹوٹ کر آہستہ آہستہ نیچے جھک رہی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی آہستہ آہستہ نیچے جارہا تھا اور پھر برف کی وہ سل میرے پیروں کے نیچے سے نکل گئی۔

میں بڑی تیزی سے نیچے جارہا تھا۔ ڈیڑھ سو فٹ نیچے طوفانی لہروں کی طرح مچلتا ہوا پانی مجھے اپنی آغوش میں لینے کو تیار تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی تمام تر توجہ مراقبے پر مرکوز کردی۔ یہ لمحاتی مراقبہ سود مند ثابت ہوا۔ یہ میرا تجربہ تھا۔ میں نے جب بھی مراقبے کا خیال کیا تھا' مجھے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ ہر ایسے موقع پر میرے اندر کی قوت نے میری مدد کی تھی۔

اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور میں فضا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے کھونٹی پر ٹانگ دیا گیا ہو۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں فضا میں معلق گھڑیال کے پنڈولم کی طرح دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میں نیچے طوفانی رفتار سے بہتے ہوئے پانی سے چند فٹ اوپر تھا۔ اچھلتی ہوئی لہریں کبھی کبھی میرے پیروں کو بھی چھولیتی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے پانی کی وہ لہریں آگ کی لپٹوں میں بدل جاتیں۔

وہ آگ کا دریا تھا۔ لہروں کی صورت میں اٹھتے ہوئے مہیب شعلے میری طرف لپک رہے تھے۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور تک چٹانوں کے بیچ آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ مہیب شعلے اچھل اچھل کر میری طرف لپک رہے تھے۔ ان کی تپش سے میں گویا پگھلا جارہا تھا۔ شعلے مجھے نگل لینے کو لپک رہے تھے۔

اب صورت حال میری سمجھ میں آگئی تھی۔ جب میں جمی ہوئی برف کے پل کے اوپر تھا تو ہوا نے مجھے دھکیلنا شروع کیا تھا پھر وہ پل رسے کے پل کی طرح ہلنے لگا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہی خیال آتا تھا کہ تند و تیز ہوا کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے اور جب پل میرے پیروں کے نیچے ٹوٹا تھا تو تب مجھے ذرا سی حیرت ہوئی تھی۔ ایک آدمی کے وزن سے پل کس طرح ٹوٹ سکتا ہے اور اب آگ کا یہ دریا... مجھے نگل لینے کو

لپکتے ہوئے شعلے...؟ یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ طاغوتی قوتیں مجھے تباہ و برباد کردینا چاہتی تھیں۔

میرے اندر کی قوت بیدار ہو چکی تھی۔ مہیب شعلے اب مجھے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے لیکن وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ شعلے میرے بدن سے ٹکراتے تو وہ پانی کی پھوار میں بدل جاتے۔

طاغوتی قوتوں کے حملوں میں تیزی آتی گئی۔ آگ کے مہیب شعلوں نے مجھے گھیرلیا۔ ان سے مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا مگر پل کی جمی ہوئی برف تیزی سے پگھلنے لگی۔

مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھے قمیص کے کالر سے پکڑ کر اوپر اٹھا رہا ہو۔ میں نے گردن گھما کر اوپر دیکھا۔ ثوبان چٹان کے کنارے پر کھڑا کسی قدر آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس نے ایک ہاتھ سے میری شرٹ کا کالر پکڑ رکھا تھا اور مجھے اوپر کھینچ رہا تھا۔

میرے اور ثوبان کے بیچ تقریباً تیس گز کا فاصلہ تھا اور اس کا ہاتھ اتنا دراز ہوگیا تھا کہ اس نے مجھے شرٹ کے کالر سے پکڑ کر نیچے گرنے سے بچالیا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا گیا اور پھر اس ہاتھ نے مجھے ٹوٹے ہوئے پل کے دوسرے حصے پر کھڑا کردیا۔ اس کے بعد وہ ہاتھ میری گردن سے ہٹ گیا۔ آگ کے شعلے اب بہت نیچے رہ گئے تھے۔ وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے تھے لیکن ان کی گرمی سے برف بڑی تیزی سے پگھل رہی تھی اور برف کی دیوار آہستہ آہستہ نیچے بیٹھ رہی تھی۔

میں نے بدھ عبادت گاہ والی چٹان کی طرف دیکھا۔ عبادت گاہ کے دہانے پر قدرے اندر کی طرف ایک روشن ہیولا سا دکھائی دیا۔ اس ہیولے کے چہرے کے نقش واضح نہیں تھے لیکن مجھے اس میں تیلگری کی جھلک دکھائی دی تھی۔

برف کی دیوار میرے پیروں کے نیچے بیٹھی جارہی تھی۔ میں نے کنارے کی طرف دوڑ لگادی۔ کئی مرتبہ میرا پیر پھسلا لیکن میں سنبھل کر دوڑتا رہا۔

دوسری طرف چٹان کا کنارہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ برف کی دیوار میرے پیروں تلے سے نکل گئی۔ میں پوری قوت سے ہوا میں اچھلا اور پرندے کی طرح اڑتا ہوا کنارے کی طرف لپکا۔ ایک دم سامنے سے گرم ہوا کا ایک طوفانی جھونکا آیا جو مجھے پیچھے کی طرف دھکیلنے لگا۔ میں ایک لمحے کو فضا میں معلق سا رہ گیا۔ تپتی ہوئی ہوا کا وہ جھونکا تیز و تند بگولے میں بدل گیا اور میں لٹو کی طرح گھومنے لگا۔

میں نے اپنے حواس برقرار رکھے۔ تپتی ہوئی ہوا میرے بدن کو جھلسائے دے رہی تھی۔ میں اس بگولے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی نادیدہ قوت میرے ہاتھوں اور پیروں کو گرفت میں لے کر انہیں رسی میں باندھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے ہاتھ پیر چھڑانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

اچانک بگولے کا زور ٹوٹ گیا۔ میں بلندی سے پھینکے ہوئے پتھر کی طرح تیزی سے نیچے گرنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میں چٹان کے کنارے کے بالکل قریب گہرائی میں لپکتے ہوئے آگ کے شعلوں کی طرف گر رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر چٹان کی طرف دراز ہوگیا اور کنارے پر میری گرفت جم گئی۔

اب میں ایک ہاتھ کے سہارے چٹان سے لٹکا ہوا تھا۔ جس پتھر پر میرا ہاتھ اٹکا تھا اس پر برف جمی ہوئی تھی اور میری انگلیاں آہستہ آہستہ برف پر پھسل رہی تھیں۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا' ڈیڑھ دو سو فٹ نیچے بدستور آگ کا دریا بہہ رہا تھا اور میری طرف لپکتے ہوئے شعلے بتدریج بلند ہو رہے تھے۔

میں نے دوسرا ہاتھ بھی کنارے پر جمادیا اور اپنے آپ کو اوپر اٹھانے لگا۔ مجھے ناکامی نہیں ہوئی۔ میں آہستہ آہستہ اوپر اٹھتا گیا۔ ایک ٹانگ دہری کرکے پہلے گھٹنا کنارے پر ٹکایا اور اپنے آپ کو ایک جھٹکے سے اوپر کھینچ لیا۔ ابھی میں پوری طرح سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ میرے منہ پر زوردار گھونسا پڑا۔

وہ نادیدہ گھونسا ہتھوڑے کی طرح وزنی تھا۔ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس وقت میں چٹان کے بالکل کنارے پر تھا اور میرا توازن بگڑ چکا تھا۔ میں کسی بھی لمحے نیچے آگ کے دریا میں گر سکتا تھا۔

فضا میں اچانک ہی قہقہوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ خوفناک شیطانی قہقہے چٹانوں میں بازگشت پیدا کر رہے تھے۔ آوازیں سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں۔

میں پیچھے گرنے کے قریب تھا کہ سنبھل گیا۔ جیسے کسی نے مجھے پیچھے سے سہارا دیا ہو۔ پشت پر ہاتھ رکھ کر آگے کو دھکیل دیا ہو۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کئی فٹ آگے جاکر منہ کے بل گرا۔ میں نے دونوں ہاتھ بڑی پھرتی سے زمین پر ٹکا دیے تھے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو یا تو میرے دانت ٹوٹ جاتے یا میرا چہرہ زخمی ہوجاتا۔ میں گرنے کے فوراً بعد ہی سنبھل گیا۔

قہقہوں کی پراسرار آوازیں اب رونے اور بین کرنے کی آوازوں میں بدل گئی تھیں جیسے سیکڑوں بد روحیں ماتم

کررہی ہوں اور بین کررہی ہوں۔ میں نے مڑکر دیکھا۔ ثوبان چٹان کے دوسرے کنارے پر اب بھی اسی جگہ کھڑا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ ہمارے درمیان اگرچہ پچاس گز کے لگ بھگ فاصلہ تھا لیکن مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ میں واضح طور پر محسوس کرسکتا تھا۔

میں عبادت گاہ کے داخلی راستے کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ یہاں زیادہ کشادہ جگہ نہیں تھی۔ چٹان کا کنارہ پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ دوسری چٹان تک جانے والی برف کی دیوار پگھل کرپانی بن چکی تھی۔ میرے اور ثوبان کے بیچ یہ طویل گہری کھاڑی حائل ہوچکی تھی اور اس گہری کھاڑی میں اب بھی آگ کا دریا بہہ رہا تھا۔ شعلے لپک رہے تھے۔ میری واپسی کا راستہ مسدود ہوگیا تھا یا مسدود کردیا گیا تھا لیکن ظاہر ہے' میں بھی ناکام واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ کم از کم اس وقت تک واپس جانے کا خیال دل میں نہیں لاسکتا تھا جب تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوجاتا۔ اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد مجھے واپسی کے راستے بھی مل سکتے تھے۔

میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر عبادت گاہ میں داخل ہونے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ پانچ کشادہ سیڑھیاں بھی چٹان کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔

میری توقع کے مطابق یہ غار بہت وسیع تھا۔ چھت بھی بہت اونچی تھی۔ دیواروں کو تراش کر عظیم بدھا کے لاتعداد مجسمے بنائے گئے تھے۔

غار کے اختتام پر تقریباً دس فٹ چوڑی راہداری تھی اور میرے خیال میں غار اس طرف کافی اندر تک چلا گیا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ اس غار میں اندھیرا نہیں تھا۔ جب میں نے دوسری طرف سے برف کی دیوار پر چلنا شروع کیا تھا تو اس وقت آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ غار کے باہر اب بھی تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ کی وجہ سے غار کے دہانے کے اندر تھوڑی دور تک روشنی تو ہونی چاہیے تھی لیکن پورے غار میں آگے بھی مدھم سا اجالا تھا اور میرے خیال میں اس راہداری کی دوسری طرف بھی کوئی ایسی کھلی جگہ موجود تھی جہاں سے روشنی آرہی تھی۔

میں کچھ دیر اس جگہ پر کھڑا متجسس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں راہداری کی طرف قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ بالکل ایسے ہی لگا تھا جیسے کسی کمرے میں جلتی ہوئی لائٹ بجھا دی گئی ہو۔ میں نے باہر کی طرف دیکھا اور خوف کی شدت سے کانپ کررہ گیا۔

گہری دھند عبادت گاہ کے سامنے جمع ہورہی تھی۔ دھند کا رنگ پہلے سرمئی سا تھا پھر اس میں گہرا پن آتا گیا اور بالآخر یہ دھند سیاہ رنگت اختیار کرگئی۔

سیاہ دھند کے دل ہی دل غار کے اندر آرہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کالی دھند نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شدید سردی میری ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کرتی جارہی تھی۔ میرے اوپر کپکپی سی طاری ہوگئی اور باقاعدہ دانت بجنے لگے۔

میں پیچھے ہٹتا ہوا راہداری کی طرف بڑھتا چلا گیا لیکن نہ تو سردی کی شدت کم ہوئی اور نہ ہی دھند میں کمی آئی۔ میں ٹھٹھرنے سے دہرا ہوا جارہا تھا۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہونے لگی۔ اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کے بجائے میں زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے اپنے بازو بھی سمیٹ لیے تھے اور گھٹنے بھی خود بخود سمٹ کر پیٹ سے لگ گئے تھے۔

شیطانی قہقہوں کی آوازیں ایک بار پھر غار میں گونجنے لگیں۔ طاغوتی قوتیں میری بے بسی پر ہنسنے لگی تھیں۔ وہ مجھے ہر صورت میں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتی تھیں۔ زیر کرنا چاہتی تھیں اور موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتی تھیں۔

یوگی گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چیلا پنڈت دھیراج مجھے زیر کرنے کے لیے اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لا رہا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ میرے پاس بھی ایسی قوتیں ہیں جو اسے شکست سے دوچار کرسکتی ہیں۔

میرے اندر کی سب سے بڑی قوت تو "چی" تھی جسے میں نے شاؤلن ٹیمپل میں بڑی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا۔ سردی کی شدت سے میری قوت برداشت جواب دے رہی تھی۔ میرا سانس رک رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور کوشش کرکے اپنی تمام تر توجہ "چی" کی طرف مبذول کردی۔

میں اب بھی یخ بستہ دھند میں لپٹا ہوا تھا لیکن اب میرے جسم میں حرارت پیدا ہورہی تھی۔ میرے سانس کی رفتار نارمل ہوگئی۔ ٹانگیں اور بازو آہستہ آہستہ سیدھے ہونے لگے۔ میں خوابیدہ شیر کی طرح انگڑائی لے کر سیدھا ہوگیا۔ میرے گرد لپٹی ہوئی کالی دھند پانی بن کر غار کے فرش پر بہنے لگی۔

"بھاگو وجدان..... بھاگو....."

ایک پراسرار سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے میرے نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور یہاں میرا نام صرف نیلگری جانتی تھی۔ میرے کان میں سرگوشی کی بازگشت ختم ہوتے ہی چٹانوں کے ٹوٹنے کی ہیبت ناک آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے اوپر دیکھا۔ غار کی چھت کا ایک حصہ بیٹھ رہا تھا۔ میں نے راہداری کی طرف دوڑ لگادی۔

غار کی چھت کا وہ حصہ بیٹھ گیا۔ غار کے اندر بھی چٹانیں اس طرح ہل رہی تھیں جیسے شدید زلزلہ آگیا ہو۔ میں دوڑتا رہا۔ تقریباً بیس گز آگے جاکر یہ راہداری دائیں طرف مڑگئی تھی۔ اس طرف مڑتے ہی میں ایک بار پھر بدحواس ہوگیا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ نے ایک بار پھر مجھ پر دہشت سی طاری کردی۔ سیکڑوں چمگادڑوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا اور نیچے جھک گیا لیکن چہرہ چھپالینے سے میں محفوظ نہیں ہوگیا تھا۔ چمگادڑوں کا حملہ جاری رہا۔ ان کے نکیلے دانت سوئیوں کی طرح میرے بدن میں پیوست ہورہے تھے۔ میں اپنے آپ کو زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔ کئی چمگادڑ گوشت میں دانت گاڑے میرے جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ میرے اندر کی قوت ایک بار پھر بیدار ہوگئی اور مجھے یوں لگا جیسے میری ساری قوتیں سمٹ کر میری آنکھوں میں آگئی ہوں۔

میں نے چہرے سے ہاتھ ہٹالیے اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے صاف لگ رہا تھا جیسے میری آنکھوں سے لہریں سی خارج ہورہی ہوں۔ میں نہ صرف اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا بلکہ آنکھوں سے خارج ہونے والی لہریں لیزر بیم کی طرح اڑتی ہوئی لاتعداد چمگادڑوں کو شکار کررہی تھیں۔ جو بھی چمگادڑ ان لہروں کی زد میں آتی' راکھ بن کر بکھر جاتی۔ ایک وقت میں کئی کئی چمگادڑ راکھ بن کر ڈھیر ہورہی تھیں۔ میں اپنے بدن پر چپکے ہوئے چمگادڑوں کو بھی نوچ نوچ کر پھینکتا رہا۔

غیر معمولی طور پر ایک بڑی چمگادڑ بار بار مجھ پر حملہ آور ہورہی تھی۔ سیکڑوں چمگادڑ خاک کا ڈھیر بن چکی تھیں لیکن وہ ایک چمگادڑ میری آنکھوں سے خارج ہونے والی لہروں کی زد میں نہیں آرہی تھی۔

وہ چمگادڑ جسامت میں چیل سے بھی بڑی تھی اور بڑی پھرتی دکھا رہی تھی۔ ایک موقع پر وہ میرے اوپر جھپٹی تو میں نے بڑی پھرتی سے ایک طرف جھکتے ہوئے ہاتھ چلا دیا۔ میرا ہاتھ ٹھیک نشانے پر پڑا۔ وہ چمگادڑ "چیں چیں" کی آوازیں نکالتی ہوئی مجھ سے چند فٹ دور زمین پر گری لیکن وہ بڑی پھرتیلی ثابت ہوئی۔ فوراً ہی اڑتی ہوئی دوبارہ مجھ پر حملہ آور ہوئی اور اس مرتبہ اس کا ایک پر' میری آنکھوں سے خارج ہونے والی لہروں کی زد میں آگیا۔ اس کے پر سے شعلے خارج ہونے لگے اور وہ "چیں چیں" کی آوازیں نکالتی ہوئی پلٹ کر ایک طرف غائب ہوگئی۔ اس بڑی چمگادڑ کے غائب ہوتے ہی حیرت انگیز طور پر دوسری بچی کھچی چمگادڑ بھی غائب ہوگئیں اور غار میں گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔

گوتم بھوش اور پنڈت دھیراج کی پراسرار قوتیں مجھے روکنے کے لیے برسرِپیکار تھیں لیکن میں انہیں مات دیتا ہوا مسلسل آگے بڑھتا جارہا تھا۔

اس راہداری کے اگلے موڑ پر ایک اور راہداری تھی جو مسلسل نشیب کی طرف چلی گئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا جیسے میں پاتال میں اترا جارہا ہوں لیکن اچانک ہی ڈھلان ختم ہوگئی اور اب میں راہداریوں کے ایک چوراہے پر کھڑا تھا۔

مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ بدھا کی یہ قدیم عبادت گاہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ پہلے غار میں مجھے دیواروں پر تراشے ہوئے بدھا کے مجسمے نظر آئے تھے۔ اس کے بعد تو غاروں اور سرنگوں کی بھول بھلیاں سی بنی ہوئی تھیں اور اب میں ایک چوراہے پر کھڑا تھا اور میں نہیں سمجھ پارہا تھا کہ مجھے کس طرف جانا چاہیے۔

میں جانتا تھا' یوگی گوتم بھوش عبادت گاہ کے انہی تہ خانوں میں کسی جگہ چھپ کر جاپ پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کی پراسرار قوتیں مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی تھیں لیکن میں یہاں تک آگیا تھا اور یہ طے کرکے آیا تھا کہ اسے جاپ پورا نہیں کرنے دوں گا۔

کوئی غلط راستہ مجھے منزل سے میلوں دور پہنچا سکتا تھا اس لیے میں بہت احتیاط سے راستے کا انتخاب کرنا چاہتا تھا اور میں اس چوراہے پر کھڑا فوری طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

نیلگری بھی انہی برف پوش پہاڑوں کے سینے میں کسی جگہ موجود تھی لیکن گوتم بھوش کے جاپ نے اسے بے بس کردیا تھا۔ اسے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ جیسے جیسے جاپ کی تکمیل کا وقت قریب آتا جارہا تھا.....اس کی قوت کمزور پڑتی جارہی تھی۔

میں اس چوراہے کے وسط میں کھڑا یہ سب کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ وہ آواز مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور جب وہ آواز سمجھ میں آئی تو میں کانپ کررہ گیا۔

وہ پانی کی لہروں کی آواز تھی۔ جیسے بپھری ہوئی موجیں سنگلاخ چٹانوں سے سر ٹکرا رہی ہوں۔ میں متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر وہ خوفناک منظر میرے سامنے آگیا۔

جس سرنگ سے میں یہاں تک آیا تھا وہ میری طرف ڈھلوان تھی اور اوپر کی طرف سے پانی کا ایک زبردست ریلا طوفانی رفتار سے جھاگ اڑاتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ میں جب سے اس چٹان کے سینے میں داخل ہوا تھا' کسی جگہ پانی کا ایک قطرہ تک نہیں دیکھا تھا۔ غار کے باہر دونوں چٹانوں کے بیچ ڈیڑھ دو سوفٹ کی گہرائی میں جو پانی بہہ رہا تھا وہ بھی آگ کے دریا میں تبدیل ہوچکا تھا۔ مان لیا کہ وہ بہتی ہوئی آگ دوبارہ پانی بن گئی ہوگی لیکن اس پانی کے لیے ڈیڑھ دو سوفٹ اوپر آنا ممکن نہیں تھا لیکن یہ پراسرار قوتوں کا کھیل تھا۔ طاغوتی قوتوں نے میرے خلاف محاذ بنا رکھا تھا۔ یہ پراسرار شیطانی قوتیں مجھے نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ گہرائی میں بہتے ہوئے پانی کو اوپر کھینچ لانا ان کے لیے ناممکن نہیں تھا۔

جھاگ اڑاتا اور چٹانی دیواروں سے سر ٹکراتا پانی طوفانی رفتار سے میری طرف آرہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کے بارے میں سوچ سکتا' پانی کا طوفانی ریلا مجھ سے ٹکرا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی نہایت تیز رفتار ٹرین مجھ سے ٹکرا گئی ہو۔ پانی کا ریلا مجھے اپنے ساتھ دھکیلتا ہوا دور تک لے گیا۔ کئی گز آگے جا کر میں سرنگ کی دیوار سے ٹکرایا۔

میرا جوڑ جوڑ ہل گیا۔ پانی کی لہریں مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہی تھیں۔ سرنگ کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ میں سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن نہ تو میرے پیر زمین پر ٹک رہے تھے اور نہ ہی میں کسی دیوار کا سہارا لینے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں میرا ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی نیلگری کی مالا سے ٹکرا گیا اور میں نے غیر ارادی طور پر مالا کا بیچ والا پتھر منہ میں ڈال لیا۔ دو پتھر میری ناک کے نتھنوں پر جم گئے۔ اس طرح میرا سانس گھٹ جانا چاہیے تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ پانی کی لہروں نے مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ میں پوری طرح پانی میں ڈوب گیا تھا اور غوطے کھا رہا تھا لیکن مجھے سانس لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نے چہرے پر گیس ماسک لگا رکھا ہو۔

پانی مجھے مسلسل اٹھا اٹھا کر پٹختا رہا اور بالآخر اس کا جنون کم ہوگیا۔ لہروں کا زور دم توڑنے لگا۔ میرے پیر بھی زمین پر لگ گئے اور میں ایک دیوار کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہوگیا۔

پانی میری گردن سے سینے تک آگیا اور پھر بتدریج نیچے اترتا چلا گیا۔ اس کی پرہول آواز بھی بتدریج معدوم ہوتی چلی گئی۔

ایک بار پھر گہرا سناٹا طاری ہوگیا۔ میں دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے گہرے گہرے سانس لیتا رہا اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ پانی مجھے دھکیلتا ہوا نجانے کہاں سے کہاں لے آیا تھا لیکن اس منظر نے میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑا دی تھی۔

میں اس وقت بھی ایک سرنگ ہی میں تھا۔ میرے سامنے والی دیوار میں زمین کی سطح سے تقریباً چار فٹ اوپر کھڑکی کی طرح ایک راستہ سا بنا ہوا تھا اور اس کی دوسری طرف روشنی میں ایک مجسمے کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔

میں اس کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں کھڑکی پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا۔

یہ بہت بڑا غار تھا جس کے عین اوپر ایک بہت بڑے سوراخ کی طرح کا خلا نظر آرہا تھا۔ سورج اس وقت عین سر پر چمک رہا تھا اور دھوپ اس خلا کے راستے ہال نما غار میں بدھا کے ایک بہت بڑے مجسمے پر پڑ رہی تھی۔ میں آگے بڑھ کر مجسمے کے سامنے آگیا۔

وہ اسمائلنگ بدھا تھا۔ سنگتراش نے ایک سنگلاخ چٹان کو مجسمے میں ڈھالنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا تھا۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ جیتا جاگتا انسان ہو۔

یہ مجسمہ کم از کم تیس فٹ اونچا ضرور رہا ہوگا۔ اس کے محیط کا اندازہ بھی اسی حساب سے لگایا جاسکتا ہے۔ چھت کے خلا سے دھوپ اس کے عین اوپر پڑ رہی تھی۔

میں کچھ دیر اس مجسمے کو دیکھتا رہا اور پھر ایک دم پیچھے کی طرف پلٹ گیا۔ مجھے نقرئی کھنکتی ہوئی ہنسی واضح طور پر سنائی دی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کھنکتی ہوئی دبی دبی ہنسی کی وہ آواز مجھے چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"نیلگری!" میں چیخا "نیلگری... کہاں ہو تم۔ میں آگیا ہوں۔"

نجانے مجھے یہ یقین کیوں تھا کہ دبی دبی ہنسی کی وہ آواز نیلگری کی تھی۔ پہلے وہ آواز چاروں طرف سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی پھر ایک طرف سمٹ گئی اور میں غیر ارادی طور پر اس طرف بڑھنے لگا جس طرف وہ آواز سمٹی جارہی تھی۔

میں بدھا کے مجسمے کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ دھوپ اب بدھا کے مجسمے سے سرک رہی تھی اور پھر اچانک ہی غار میں

اندھیارا سا چھا گیا۔

میں اس آواز کے پیچھے چلتا رہا۔ غار کے اختتام پر ایک موڑ تھا۔ میں جیسے ہی اس طرف مڑا' ٹھٹک کر رک گیا۔ میری آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔

اس طرف بھی ایک کشادہ غار تھا جس کے وسط میں آگ کا ایک دائرہ تھا اور اس دائرے میں یوگی گوتم بھوش جاپ پر بیٹھا ہوا تھا... نہیں... بلکہ کھڑا تھا۔

گوتم بھوش ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اس کی کمر میں معمولی سا خم بھی نہیں تھا۔ اس کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور پسلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ سامنے جوڑ رکھے تھے۔ داڑھی اور مونچھوں کے بال اس طرح بڑھے ہوئے تھے کہ منہ کا دہانہ چھپ کر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم پر ایک مختصر سا لنگوٹ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ زندہ انسان نہ ہو' پتھر کا کوئی مجسمہ ہو۔

پراسرار قوتوں پر قابو پانے کے لیے کیے جانے والے جاپ بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ بڑی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بڑی قوت ہوگی اس کے لیے اتنا ہی کٹھن جاپ ہوگا۔ نیلگری کے حصول کے لیے میں نے بھی ایک جاپ شروع کیا تھا۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ کوئی لالچ نہیں تھا' کوئی اور ہوس نہیں تھی اور قدرت نے میرا جاپ مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے نیلگری کے قریب پہنچا دیا تھا اور گوتم بھوش بھی نیلگری کے حصول کے لیے جاپ کر رہا تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ تھی۔ ہوس تھی اسے طویل اور کٹھن راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ یہ آخری مرحلے کا کٹھن ترین جاپ تھا جس کے مکمل ہونے میں صرف دو دن باقی رہ گئے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ کچھ کھائے پیے بغیر سینتیس دنوں سے اس طرح ایک ٹانگ پر کھڑا رہا ہوگا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس نے پہلے ایسے جاپ کر رکھے تھے جن کی قوتوں نے اسے کھانے پینے اور نیند وغیرہ کی ضرورت سے بے نیاز کر دیا تھا۔

میرے اور گوتم بھوش کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا۔ عام حالات ہوتے تو میں بڑے اطمینان سے اس کی گردن مروڑ دیتا لیکن اب ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ رکھا تھا۔ وہ محض آگ کا دائرہ نہیں تھا۔ طاغوتی قوتوں کا چکر تھا جس نے اسے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور اس چکر کو توڑنا آسان نہیں تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھ گیا اور اسی لمحے "دھب" کی آواز سے کوئی چیز میرے سامنے گری۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میری آنکھوں میں وحشت سی پھیلتی چلی گئی۔

وہ کالی دیوی تھی۔ ہندوؤں کی کالی ماتا۔ جسے تباہی و بربادی کی دیوی سمجھا جاتا ہے۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے' اس کے قہر سے بچنے کے لیے اس کے چرنوں پر انسانی جانوں کی بھینٹ دی جاتی ہے اور گوتم بھوش نے اسے بھی اپنی مدد کے لیے بلا لیا تھا۔

کالی دیوی برہنہ تھی۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے ایک ہاتھ میں تیغہ تھا جس سے خون ٹپک رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک انسانی کھوپڑی تھی جس کے بال اس کی مٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے گلے میں موٹے موٹے سیاہ موتیوں کی ایک مالا اور پیپل کے خشک پتوں کا ایک ہار تھا۔ انہی پتوں کی ایک جھالر اس کی کمر پر بھی لپٹی ہوئی تھی۔ کالی کی پھٹی پھٹی سی آنکھوں میں وحشت تھی اور زبان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے بھی خون ٹپک رہا تھا۔

"واپس چلا جا مورکھ۔ (بے وقوف) میرے پجاری کو تنگ نہ کر۔ اسے اپنا جاپ پورا کرنے دے۔"

یہ سرگوشیانہ آواز بار بار میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ کالی مجھے وارننگ دے رہی تھی۔ خبردار کر رہی تھی۔ مجھے نیست و نابود کردینے کی دھمکی دے رہی تھی لیکن میں کسی کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کے لیے یہاں نہیں آیا تھا۔

میں نے ہندوستان کے مندروں میں کالی کے بہت سے مجسمے دیکھے تھے۔ ہر جگہ اس کا یہی روپ تھا اور اسی خوفناک روپ میں مجھے بھی ڈرانے کے لیے وہ یہاں آگئی تھی۔

"میرے راستے سے ہٹ جا کالی۔" میں نے چیخ کر کہا "میں جانتا ہوں' تمہاری طرح بہت سی شیطانی قوتیں اس راکشش کی پشت پر ہیں لیکن میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تمہاری قوت کو شکست دے کر میں تمہیں شرمندہ نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جا..."

"گستاخ۔" غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "مجھے دھمکی دیتا ہے۔ میں تجھے تباہ و برباد کردوں گی۔ آخری مرتبہ کہتی ہوں' میرے راستے سے ہٹ جا۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ اس کی انگارے برساتی ہوئی سرخ آنکھوں سے بھی خون ٹپکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ منظر بھی بڑا خوفناک ہوسکتا تھا۔ کالی کو اس غضب ناک حالت میں دیکھ کر عام آدمی کا تو کلیجا پھٹ سکتا تھا لیکن میں عام آدمی نہیں تھا۔ میں اپنے اندر حوصلہ پیدا کر کے ایسی ہی طاغوتی قوتوں کا

مقابلہ کرتے ہوئے یہاں تک آیا تھا۔

میں نے اپنے گلے سے نیلگری والی مالا اتار لی اور اس کے دونوں سرے دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ حرکت دینے لگا۔

کالی کا چہرہ غضب ناک ہو کر کچھ اور بھیانک ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے اب باقاعدہ چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور وہ چنگاریاں میری طرف لپک رہی تھیں لیکن میرے اندر کی قوت بھی بیدار ہو چکی تھی۔ کالی کی آنکھوں سے پھوٹنے والی چنگاریاں مجھ سے ایک فٹ آگے کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گر رہی تھیں۔

کالی کے حلق سے خوفناک آواز نکلی۔ یہ آواز بادلوں کی گرج کی طرح غار میں پھیل گئی۔ ایک لمحے کو تو میں بھی دہل گیا لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

کالی کا تیغے والا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس نے پوری قوت سے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بڑی پھرتی سے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی نیلگری کی مالا سامنے کر دی۔ کالی کا تیغہ پوری قوت سے مالا سے ٹکرایا اور فضا تھرا کر رہ گئی۔ لگا تھا جیسے آسمانی بجلیاں آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔ ایسے خوفناک کڑاکے کی آواز میں نے کبھی نہیں سنی تھی اور ایسی چمک بھی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میری آنکھوں میں چکاچوند سی پیدا ہوئی اور پھر تاریکی چھا گئی۔ ایک لمحے کو تو میں یہ سمجھا تھا کہ شاید میری بصارت ختم ہو گئی ہے لیکن میری بینائی متاثر نہیں ہوئی تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا۔

اپنا یہ وار ناکام ہوتے دیکھ کر کالی کچھ اور غضب ناک ہو گئی۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں اور وہ شعلے میرے سامنے تنی ہوئی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر اسی کی طرف پلٹنے لگے۔ کالی نے اچھل کر اپنے آپ کو ان شعلوں سے بچایا اور ایک بار پھر تیغے سے وار کیا لیکن یہ حملہ بھی پہلے کی طرح ناکام ثابت ہوا۔

"بھاگ جا مورکھ۔ (احمق۔ بے وقوف) میں تجھے آخری موقع دے رہی ہوں۔" کالی کی غراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں بھی تجھے آخری موقع دے رہا ہوں۔" میں نے چیخ کر جواب دیا "چلی جا یہاں سے۔ ایسا نہ ہو' تجھے اس یُدھ (لڑائی) میں شرمندگی اٹھانی پڑے اور تو اپنے پجاریوں کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے۔"

"مجھے دھمکی دیتا ہے۔" کالی چیخی اور پھر اچانک ہی اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انسانی کھوپڑی میری طرف دے ماری۔

کسی نادیدہ قوت نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔ میں لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرا۔ وہ انسانی کھوپڑی زناٹے کی آواز سے میرے اوپر سے گزرتی ہوئی سامنے والی دیوار پر لگی۔ ایک کان پھاڑ دینے والا خوفناک دھماکا ہوا اور دیوار کے پتھر ٹوٹ کر گرنے لگے۔ لگتا تھا جیسے کوئی بہت ہی پاور فل راکٹ فائر کیا گیا ہو۔

کالی ایک بار پھر اپنے تیغے سے حملہ آور ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ وہ حملہ نہیں کر سکی۔ اس کا ہاتھ اس طرح رک گیا تھا جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے حملے کو اس طرح ناکام ہوتے دیکھ کر کالی کی آنکھوں میں دہشت کچھ اور بڑھ گئی۔ یہ میرے لیے اچھا موقع تھا۔ میں نے بھی جوابی حملہ کیا۔ میری آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے کسی آٹومیٹک رائفل سے مسلسل فائرنگ کی جا رہی ہو۔ کالی اچھل اچھل کر اپنے آپ کو بچاتی رہی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ کمر پر لپٹی ہوئی پیپل کے خشک پتوں کی جھالر میری آنکھوں سے نکلنے والے انگاروں کی زد میں آ گئی۔ پتوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ کالی ناچنے لگی۔ اس کے منہ سے خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ بھاگنا چاہتی تھی لیکن اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ وہ جس طرف بھی جاتی' کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا جاتی۔ اس کا بدن اب پوری طرح شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اس کا ماس (گوشت) جل رہا تھا۔ گوشت جلنے کی بو پورے غار میں پھیل رہی تھی۔

کالی نڈھال ہو کر گر پڑی۔ اس کے بدن سے اٹھنے والے شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کالی کی ہیئت بھی بدلنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ایک مادہ بھیڑیے کی جلی ہوئی لاش میرے سامنے پڑی تھی۔ اس کے گلے سڑے بدن کو دیکھ کر مجھے کراہیت سی محسوس ہونے لگی۔

اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ کالی نہیں تھی۔ گوتم بھوش یا اس کے چیلے پنڈت دھیراج نے مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے اپنے کسی بیر (موکل) کو کالی کے بھیس میں میرے سامنے بھیجا تھا۔ وہ مجھے تباہ کرنے آیا تھا لیکن خود اس طرح برباد ہو گیا تھا کہ اسے دیکھ کر گھن آنے لگی تھی۔

میں نے نیلگری کی مالا گلے میں ڈال لی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہاں اتنا زبردست ہنگامہ ہوا تھا لیکن چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے گوتم بھوش کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی ایک ٹانگ پر اسی طرح کھڑا تھا۔

اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ اس کی مونچھوں کے بالوں کے نیچے ہونٹوں کی حرکت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

میں دو قدم آگے بڑھا لیکن اس طرح لڑکھڑا گیا جیسے میرے پیر کسی رسی میں الجھ گئے ہوں۔ میرا توازن بگڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں گر پڑتا' کسی نے مجھے سہارا دے کر سنبھال لیا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔۔۔۔ بے حد حسین۔ اس کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ دراز قامت' سڈول اور گداز جسم' اس کا سینہ کڑی کمان بنا ہوا تھا۔ اس کا لباس بھی ایسا تھا جسے لباس نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ستاروں جیسی چمک اور سرخ ہونٹوں پر بڑی دل فریب مسکراہٹ تھی۔

میرے ذہن میں نیلگری کا خیال ابھرا۔ اس کے چہرے کے نقوش تو میرے دل پر نقش تھے۔ یہ چہرہ اس سے مختلف تھا لیکن میں نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ نیلگری ایک مہان (عظیم) قوت تھی۔ کوئی بھی روپ اختیار کرنے پر قادر تھی۔ ہو سکتا ہے اس وقت کسی مصلحت کے تحت وہ اپنی اصل شکل میں سامنے نہ آنا چاہتی ہو اور کسی اور حسینہ کے روپ میں میری مدد کو آ گئی ہو اور اس نے مجھے گرنے سے بچا لیا ہو۔

"آؤ۔ میرے ساتھ آؤ۔ تم تھک گئے ہو۔ تھوڑا آرام کر لو۔ اس طرف۔۔۔ وہاں۔"

ایک سرکی سی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ اس نے میری کمر میں حمائل کر دیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے میرا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے نظریں جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہوش ربا حسن کی مالک تھی۔ ہونٹوں پر بڑی قاتل مسکراہٹ تھی۔ اس کے گداز بدن کا لمس میرے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑا رہا تھا۔ دل و دماغ پر عجیب سا سرور طاری ہونے لگا تھا۔ وہ مجھے کشاں کشاں لیے جا رہی تھی۔ اس کا رخ غار کے ایک تاریک گوشے کی طرف تھا۔

میں آگ کے دائرے میں' جاپ میں مشغول گوتم بھوش سے دور ہو رہا تھا۔ وہ حسینہ مجھے لے کر ایک تاریک کنج میں گھس گئی۔ یہاں سنگلاخ دیوار میں ایک دراڑ سی تھی اور جگہ اتنی کشادہ تھی کہ دو آدمی آرام سے لیٹ سکتے تھے۔

مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے آپ میں نہیں تھا۔ اس حسینہ نے مجھے دونوں بانہوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ میں نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس گپھا میں گھور تاریکی تھی لیکن میں اسے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے حسین و گداز بدن کا ایک ایک خط و خال مجھے نظر آ رہا تھا۔ میرے سامنے اس کے بیٹھنے کا انداز بھی بڑا خوفناک تھا۔

اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ میرے اندر سنسنی کی لہریں پھیلتی گئیں اور خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ دماغ پر خمار سا طاری ہو رہا تھا۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس تاریک گپھا سے باہر دیکھا۔ گوتم بھوش مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہتا تھا مگر اس نے مجھے بانہوں سے پکڑ لیا۔

پہلے وہ سامنے بیٹھی تھی۔ اب میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کی حرارت میرے اندر آگ بھر رہی تھی۔ اس نے ایک بازو میری گردن کے پیچھے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے آہستہ آہستہ پیچھے دھکیلنے لگی۔ میں اس کی آغوش میں دراز ہوتا چلا گیا۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ لگتا تھا' مقناطیسی لہریں آنکھوں کے راستے میرے دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی ہوں۔ میں گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ اس کا گرم گرم سانس میرے ہونٹوں سے ٹکرا رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ خوفناک چیخ مار کر میرے اوپر سے اٹھ گئی اور پشت کے بل پیچھے گری۔

وہ چیخ بہت خوفناک تھی۔ میرا دل دہل گیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔ گردن گھما کر دیکھا تو وہ حسینہ زمین پر پڑی تھی اور ایک عورت اس کے سینے پر سوار تھی۔ اس نے خوب صورت لڑکی کا گلا دبوچ رکھا تھا اور پھر اس حسینہ نے بھی اپنے سینے پر سوار عورت کے گلے پر ہاتھ ڈال دیا۔

ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ ان دونوں کی خونخوار قسم کی غراہٹوں کے علاوہ ایسی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں جیسے سیکڑوں بدروحیں بین کر رہی ہوں۔

میں ابھی تک دوسری عورت کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی نیم برہنہ تھی اور وہ اس حسینہ پر حاوی ہو رہی تھی جو مجھے کسی نئی دنیا کی سیر کرانے لے جا رہی تھی۔ مجھے حملہ آور عورت پر غصہ بھی آ رہا تھا جس نے عین وقت پر مداخلت کر کے کھیل کا رنگ بگاڑ دیا تھا۔

جب میں نے نیلگری کو دریافت کیا تھا تو مجھے وہ لمحات بھی یاد تھے جب اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کا لمس تو اب بھی مجھے یاد تھا۔ میں اس کے لیے خطرات سے ٹکراتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ کسی اور حسینہ کے روپ میں میرے سامنے آگئی تھی۔ شاید مجھے میری اب تک کی خدمات کا صلہ دینا چاہتی تھی لیکن یہ دوسری عورت.... اس نے عین وقت پر کام بگاڑ دیا تھا۔

ان میں دھینگا مشتی جاری تھی۔ دوسری بھاری بھرکم عورت اس حسینہ پر حاوی ہو رہی تھی۔ اس نے حسینہ کے بال پکڑ لیے۔ حسینہ کے منہ سے خوفناک چیخ نکلی۔ دوسری عورت اسے بالوں سے پکڑ کر اپنے سر کے اوپر اس طرح گھما رہی تھی جیسے وہ کوئی بھرپور حسینہ نہیں معمولی سی گڑیا ہو اور پھر اس نے اسے پوری قوت سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔

حسینہ کے منہ سے نکلنے والی چیخ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک تھی۔ اس چیخ کی بازگشت پورے غار میں گونج رہی تھی۔ وہ حسینہ دیوار سے ٹکرا کر "دھد" سے زمین پر گری۔ حملہ آور عورت اس کے سینے پر پیر رکھ کر کھڑی ہوئی اور فاتحانہ انداز میں چیخنے لگی۔ میں اب بھی اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

حملہ آور عورت کچھ دیر بعد حسینہ کے سینے سے اتر گئی اور اس نے بیٹھ کر ایک بار پھر حسینہ کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگی۔

یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ زمین پر پڑی ہوئی حسینہ کا بدن سمٹنے لگا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ہیت بھی بدلتی گئی۔

وہ سیاہ رنگ کی بلی تھی۔ لمبے بالوں والی ایسی بلیاں میں نے تھائی لینڈ میں بکثرت دیکھی تھیں۔ اس کے جسم کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کے منہ سے "میاؤں" کی خوفناک آواز نکلی اور وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔

حملہ آور عورت نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ پلٹ کر میرا ہاتھ پکڑا، ایک جھٹکے سے اٹھایا اور مجھے کھینچتی ہوئی اس گپھا سے باہر لے گئی۔ میں اب تک اس کی صورت نہیں دیکھ سکا تھا لیکن گپھا سے باہر آتے ہی اس کا چہرہ میری نظروں میں آگیا اور میں اچھل پڑا۔

وہ کاشی تھی! تلکو قبیلے کی سردار۔

"تت.... تم....؟" میں ہکلا کر رہ گیا۔

"تم بال بال بچ گئے اجنبی۔" کاشی نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر وہ چڑیل اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو تم جل کر بھسم ہوجاتے اور کسی کو تمہاری راکھ بھی نہیں ملتی۔"

"مگر وہ نیلگری....؟"

"وہ نیلگری نہیں تھی۔" کاشی نے میری بات کاٹ دی "نیلگری اب مکمل طور پر اس کے حصار میں ہے اسی لیے تمہارے گلے میں پڑی ہوئی مالا نے بھی اس وقت کام نہیں کیا۔ وہ بے بس و مجبور بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی ہے اور یہ چڑیل...." وہ ایک لمحے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگی "گوتم بھوش بہت زیادہ خوف زدہ ہے۔ وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہے صرف چند گھنٹوں کا سفر باقی رہ گیا ہے۔ تم اس کے سر پر پہنچ چکے ہو اور تمہیں روکنے کے لیے وہ اپنی تمام قوتوں کو کام میں لا رہا ہے۔ یہ اس کا بہت خوفناک حربہ تھا۔ حسین عورت.... مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں جانتی ہوں عورت کے حوالے سے تمہارے دل میں کوئی میل نہیں ہے لیکن تمہارے ذہن کو مسخر کردیا گیا تھا۔ تمہارے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں سلب کرلی گئی تھیں۔ تم اس کے حسن و شباب کے سحر میں جکڑے گئے تھے۔ تم سفلی جذبات کے سیلاب میں بہنے والے تھے۔ وہ تم پر غالب آرہی تھی۔ اگر اس کے ناپاک ہونٹ تمہارے ہونٹوں کو چھو جاتے تو تمہاری رہی سہی مزاحمت بھی ختم ہوجاتی۔ گوتم بھوش تمہیں اس عورت کے ذریعے ناپاک کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ چڑیل اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی تو تم جل کر راکھ ہوجاتے اور سب کچھ ختم ہوجاتا۔"

میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ جھکڑ سے چل رہے تھے۔ کاشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ عورت کے معاملے میں مجھے اپنے کردار پر فخر تھا۔ صرف ایک مرتبہ مجھ سے غلطی ہوئی تھی جس پر مجھے اب تک پچھتاوا تھا۔ سونیا کے بعد بھی کئی حسین سے حسین تر عورتیں میری زندگی میں آئی تھیں۔ روپ متی، ہلا اور اب دھنو کئی مہینوں سے میرے ساتھ تھی۔ اسے بلاشبہ دنیا کی حسین ترین لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ تلکو قبیلے میں ننگ دھڑنگ حسین عورتیں میرے سامنے پھرتی تھیں۔ کاشی ان میں سب سے زیادہ حسین تھی۔ میں گھنٹوں اس کے ساتھ تنہائی میں بیٹھا رہتا تھا لیکن میرے ذہن میں کبھی ایسا کوئی ناپاک خیال بھی نہیں آیا تھا مگر.... وہ خوب صورت چڑیل مجھے تباہی کے دہانے تک لے جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ صرف ایک ہلکا سا جھٹکا اور لگتا تو میں بقول کاشی، خاک ہوجاتا.... راکھ کا ڈھیر بن جاتا لیکن عین وقت پر کاشی نے مجھے بچالیا اور میرے لیے شدید حیرت کی بات یہ تھی کہ کاشی یہاں کیسے پہنچی!

"مجھے ثوبان کا پیغام ملا تھا۔" اس نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا تھا "وہ تمہاری مدد کے لیے خود اندر نہیں آنا چاہتا تھا۔ عبادت گاہ کے باہر بھی کسی ایک شخص کی موجودگی ضروری ہے اس لیے اس نے مجھے پیغام بھیج دیا اور میں بروقت یہاں پہنچ گئی۔ اگر مجھے...."

کاشی بولتی رہی لیکن اب میں اس کی آواز نہیں سن رہا تھا۔ میں تو حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔ کاشی کی بستی یہاں سے کم از کم دو دن کی مسافت پر تھی۔ میں راستے کی جن کٹھنائیوں کا سامنا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا اس کا اندازہ مجھے تھا اور کاشی کہہ رہی تھی کہ اسے ثوبان کا پیغام ملا تھا اور وہ فوراً ہی یہاں میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔ میں عجیب سے چکروں میں پھنس گیا تھا۔

کاشی مجھے بدھا کے مجسمے کی طرف لے آئی۔ وہ مجسمے کی طرف رخ کرکے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑی ہوگئی اور عجیب و غریب زبان میں چیخ چیخ کر کچھ بولنے لگی۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک بھی لفظ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا پھر اس نے دونوں ہاتھ ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیے۔ چند لمحے بازو پہلوؤں میں لٹکائے کھڑی رہی پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کے نتھنوں سے خارج ہوتی ہوئی بھاپ صاف نظر آرہی تھی۔

کاشی نے ایک دم آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آؤ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس شیطان کو اس کے حصار سے باہر نکال سکیں۔"

میں اس کے ساتھ اس طرف آگیا جہاں گوتم بھوش آگ کے حصار میں کھڑا تھا۔ اس وقت میں نے اس میں پہلی مرتبہ ایک تبدیلی واضح طور پر محسوس کی۔ بالوں میں چھپے ہوئے اس کے ہونٹ پہلے سے زیادہ تیزی سے ہلنے لگے تھے اور چہرے پر بھی تشویش کے آثار نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ اس کے سوا اس کی پوزیشن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے بدستور ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔

کاشی نے مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کیا پھر اس نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ لیے آنکھیں بند کرلیں اور ہونٹوں میں کچھ بدبداتی ہوئی آگ کے حصار کے گرد چکر لگانے لگی۔

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے بھی اپنے اندر کی قوتوں کو مصروف کردیا اور دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے دل سے بے اختیار "اللہ ہو" کی پکار نکلی اور میں انہی مقدس الفاظ کا ورد کرنے لگا۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا جاپ تھا۔ یہی حقیقی طاقت کا سرچشمہ تھا۔ اس کے سامنے دنیا کی ساری قوتیں... ہیچ تھیں۔ میں آنکھیں بند کیے "اللہ ہو" کا ورد کرتا رہا۔

فضا اچانک ہی خوفناک چیخوں اور آہوں سے گونج اٹھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک عجیب منظر میرے سامنے تھا۔ عجیب و غریب قسم کی مخلوق کاشی کو گھیرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ واقعی عجیب مخلوق تھی۔ نہ انسان، نہ حیوان۔ ان کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ کوئی انسان کی طرح دو ٹانگوں والا تھا لیکن اس کا سر کسی جانور کا تھا۔ کوئی جانور کی طرح چوپایہ تھا لیکن سر انسان کا تھا۔ چہروں کے نقش بے حد مکروہ اور خوفناک تھے۔ کسی کا سر اس کے جسم سے مختلف تھا۔ کسی کے بازو بالشت بھر سے زیادہ لمبے نہیں تھے اور کسی کے ہاتھ اتنے لمبے تھے کہ چھت تک پہنچ رہے تھے۔

اگرچہ وہ سب کے سب عجیب الخلقت تھے لیکن ان میں ایک سب سے نمایاں اور الگ نظر آرہا تھا۔ وہ انسان کی طرح دو ٹانگوں پر کھڑا تھا۔ جسم کا بالائی حصہ کسی چھوٹے جانور کی طرح تھا جو لمبے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور سر بیل کی طرح تھا لیکن آنکھیں حیرت انگیز طور پر چھوٹی تھیں جیسے آنکھوں کی جگہ بٹن ٹانک دیے گئے ہوں۔ ٹانگیں غیر معمولی طور پر لمبی لیکن بازو غیر معمولی طور پر چھوٹے تھے۔ میرا خیال ہے اس کا کوئی بھی بازو ایک فٹ سے زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ اس کا ایک بازو بری طرح جلا ہوا تھا۔ اوپر کی کھال تو بالکل ہی جل چکی تھی اور جلا ہوا گوشت دیکھ کر گھن آتی تھی۔ اس کے سر پر بھی بیل کی طرح سینگ تھے۔ ایک ایک فٹ لمبے اور نکیلے یہ سینگ آگے کو نکلے ہوئے تھے۔

یہ تمام حیوان نما انسان اور انسان نما حیوان کاشی کے آگے پیچھے ناچ رہے تھے۔ وہ چیخ رہے تھے، چلا رہے تھے۔ ان کی خوفناک آوازوں سے فضا دہل رہی تھی لیکن کاشی کے استغراق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہونٹوں میں کچھ بدبداتی ہوئی آگ کے دائرے کے گرد چکر لگاتی رہی۔

لمبے سینگوں اور بیل کی شکل والا وہ شیطو نگڑا اچانک ہی سامنے کی طرف سے کاشی پر حملہ آور ہوا۔ وہ بڑی تیزی سے کاشی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں اچانک ہی اپنی جگہ سے اچھلا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس شیطو نگڑے کے اوپر گرا۔ وہ میرے ساتھ ہی گرا تھا لیکن حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ مجھ سے پہلے سنبھل گیا۔ میں نے بھی اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے مجھے کئی شیطونگڑوں نے گھیرلیا۔ وہ قہقہے لگاتے اور چیختے چلاتے میرے گرد گھیرا تنگ کررہے تھے۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ مجھے اپنا حصار نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ یہ کوئی انسانوں سے دو بدو مقابلہ تو نہیں تھا جنہیں میں مار بھگاتا۔ یہ تو شیطانی قوتیں تھیں جو مجھے گھیرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

ان سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اپنے اندر کی قوت سے انہیں زیر کرنے کی کوشش کروں۔ میری کوتاہی سے کاشی کی زندگی بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔

وہ لوگ بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے لیکن کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر رک گئے۔ لمبے سینگوں والا شیطونگڑا بھی نادیدہ دیوار سے ٹکرا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس نے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اس کے جلے ہوئے بازو سے پیپ اور خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس کے منہ سے اچانک ہی بڑی خوفناک چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے نکلنے والے شعلے میری طرف لپکے۔ میں پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ شعلے پیچھے دیوار سے ٹکرائے۔ زوردار دھماکے ہوئے جیسے طاقتور راکٹ داغ دیے گئے ہوں۔

غار کی دیواریں لرز اٹھیں جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ میں نے اس شیطونگڑے کی طرف دیکھا اور مجھے ہنسی آگئی۔ وہ الٹا ہوا میں معلق تھا۔ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ وہ ہاتھوں کو حرکت دیتے ہوئے بری طرح چیخ رہا تھا اور صاف لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جھلا رہی ہو اور پھر وہ ہوا میں اڑتا ہوا کئی فٹ دور دیوار سے ٹکرا کر "بھد" سے نیچے گرا۔

میری نظریں اچانک ہی گوتم بھوش کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے پہلی مرتبہ اس کے جسم کے کسی حصے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ سرخ آنکھوں سے بے پناہ قہر ٹپک رہا تھا۔ اس نے سیدھا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک چھوٹی سی کوری ہنڈیا نجانے کہاں سے اس کے ہاتھ پر آگئی۔ ہنڈیا کے منہ پر کالا کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ گوتم بھوش نے ہنڈیا کو اپنے چہرے کے سامنے کیا۔ اس پر کچھ پھونکا اور اسے پوری قوت سے میری طرف اچھال دیا۔ ہنڈیا بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح میری طرف لپکی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر سیدھا ہاتھ آگے کردیا۔

ہنڈیا میرے ہاتھ سے ٹکرا کر رک گئی۔ میں نے گوتم بھوش کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ وحشت پھیل گئی تھی۔ میری نظریں فضا میں معلق ہنڈیا پر ٹک گئیں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے ہنڈیا کو پکڑ کر پوری قوت سے گوتم بھوش کی طرف اچھال دیا۔

ہنڈیا زوردار دھماکے سے کسی نادیدہ دیوار سے ٹکرائی۔ ایک دم ایسا شور اٹھا جیسے سیکڑوں بد روحیں رو رہی ہوں۔ گوتم بھوش کی آنکھوں میں وحشت بڑھ گئی تھی۔ میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ میری آنکھوں سے نکلنے والی لہریں نادیدہ دیوار سے ٹکراتی رہیں اور اس طرح چنگاریاں نیچے گرتی رہیں جیسے لوہے کی شیٹ پر ویلڈنگ کرتے ہوئے چنگاریاں گرتی ہیں۔

کاشی بدستور اپنے عمل میں مصروف تھی۔ وہ گوتم بھوش کے حصار کو توڑنے کی کوشش کررہی تھی اور شیطونگڑے اسے روکنے کے لیے بار بار اس پر حملہ آور ہورہے تھے۔

لمبے سینگوں والا شیطونگڑا ایک بار پھر اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس مرتبہ اس کے منہ سے نکلنے والے کئی سانپ میری طرف لپکے تھے لیکن یہ ناگ مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہوگئے۔

اچانک مجھے اپنی گردن پر اس جگہ جہاں نیلگری کی مالا میرے بدن کو چھو رہی تھی'..... حرارت کا احساس ہونے لگا۔ اس عبادت گاہ میں داخل ہونے کے کچھ ہی دیر بعد یہ مالا بالکل ٹھنڈی ہوگئی تھی جس کا مطلب تھا کہ نیلگری کو گوتم بھوش کی قوتوں نے مکمل طور پر بے بس کردیا تھا لیکن اب مالا میں یہ حرارت اس میں زندگی کی حرارت کا پتا دے رہی تھی۔

میں نے مالا اتار کر ہاتھ میں پکڑلی۔ پہلے اسے اپنے قریب آنے والے شیطونگڑوں پر کوڑوں کی طرح برساتا رہا۔ وہ مالا جس شیطونگڑے کے بدن کو بھی چھوتی وہ آگ کے شعلوں میں لپٹ جاتا۔

لمبے سینگوں والا شیطونگڑا بھی مالا کی زد میں آگیا۔ پہلی مرتبہ وہ بچ گیا تھا دوسری مرتبہ مالا کڑکتی اور لہراتی ہوئی آسمانی بجلی کی طرح اس کے جسم پر پڑی۔ اس کا جسم بھی آگ کے شعلوں میں لپٹ گیا۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر دوڑ تا رہا پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی خوفناک چیخیں فضا کو دہلا رہی تھیں۔ آگ کے شعلے پوری طرح اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ گوشت جلنے کی بو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ شعلے ماند پڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی شیطونگڑے کی ہیئت بھی بدلنے لگی اور بالآخر اس نے ایک بالکل مختلف شکل اختیار کرلی۔

وہ پنڈت دھیراج تھا جس کی قوتوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور وہ جلی ہوئی لاش کی صورت میرے سامنے پڑا تھا۔

"گوتم بھوش!" میں نے یوگی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارا کھیل ختم ہورہا ہے۔ جاپ ختم کرکے حصار سے باہر آجاؤ ورنہ تمہارا انجام بھی اس پنڈت سے مختلف نہیں ہوگا۔"

گوتم بھوش کا چہرہ قہر و غضب کی علامت بن گیا۔ میں جانتا تھا' اس قسم کے لوگ کبھی شکست تسلیم نہیں کرتے۔ گوتم بھوش نے بھی اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ایک بار پھر مجھ پر بھرپور حملہ کردیا۔ کسی نادیدہ قوت نے مجھے اٹھا کر پٹخ دیا۔ مجھے اپنا دل کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میرا خیال تھا کہ میں سنگلاخ دیوار سے ٹکراؤں گا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہوجائے گی لیکن میں دیوار سے ٹکرانے سے پہلے ہی فضا میں معلق ہوگیا اور پیروں کے بل اس طرح زمین پر گرا جیسے آٹھ دس فٹ اونچی دیوار سے از خود چھلانگ لگائی ہو۔

گوتم بھوش نے ایک بار پھر ہاتھ سامنے کو پھیلا دیا۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں ایک ترشول نمودار ہوا جس کا دستہ اس نے مٹھی میں پکڑلیا اور ہاتھ سر سے بلند کرکے مجھ پر ترشول سے حملہ کرنا چاہا' اس کا ہاتھ تو بڑی تیزی سے نیچے آیا تھا مگر تیر کمان سے نہیں نکلا یعنی ترشول اس کے ہاتھ ہی میں رہا۔

گوتم بھوش نے ایک بار پھر ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا لیکن ترشول اس مرتبہ بھی اس کے ہاتھ ہی میں رہا۔ میری نظریں اس کے ہاتھ پر مرکوز رہیں۔ وہ بار بار ہاتھ کو جھٹکے دے رہا تھا لیکن ترشول اس کے ہاتھ سے نہیں نکل پا رہا تھا۔

یوگی گوتم بھوش کا چہرہ خوف و دہشت سے سیاہ پڑنے لگا۔ اس کے گرد دائرے کی آگ بھی ماند پڑ رہی تھی۔ اس کے حصار میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ حصار ٹوٹ رہا تھا۔ گوتم بھوش کی قوتیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھیں۔

کاشی نے دائرے میں قدم رکھا تو جیسے زلزلہ سا آگیا۔ گڑگڑاہٹ کی مہیب آوازیں چاروں طرف سے سنائی دینے لگیں گوتم بھوش کا چہرہ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ اس نے آخری بار میری طرف دیکھا اور مخالف سمت میں چھلانگ لگادی۔

"اجنبی!" کاشی چیخی "اسے روکو۔ اگر یہ بھاگ گیا تو غضب ہوجائے گا۔ ہم سب اس عبادت گاہ میں دفن ہوجائیں گے۔"

گوتم بھوش غار کی راہداری میں گھوم چکا تھا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے چھلانگ لگادی۔ جب میں راہداری میں پہنچا تو گوتم بھوش غار کے اگلے حصے میں موڑ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے اپنی نظروں کے حصار میں لے لیا۔

گوتم بھوش کی ایک بہت بھیانک چیخ گونجی۔ اس کا شریر (جسم) ایک بہت بڑے شعلے میں تبدیل ہوگیا۔ وہ بری طرح چیخنے لگا۔ وہ چیخیں تھیں یا مہیب بادلوں کی گھن گرج.... اس کے ساتھ ہی ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے چٹانیں ٹوٹ رہی ہوں اور پھر گڑگڑاہٹ کی خوفناک آواز فضا میں ابھری اور گوتم بھوش سے چند گز آگے ایک بہت بڑی چٹان ٹوٹ کر گری۔

اس طرف آگے جانے کا راستہ بند ہوگیا۔ گرد و غبار نے سیاہ بادلوں کی طرح فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریکی اس قدر گہری ہوگئی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دے رہا تھا۔ اس تاریکی میں وہ مہیب شعلہ تھا جو ادھر ادھر ناچتا پھر رہا تھا۔ گوتم بھوش کی بھیانک چیخوں اور بد روحوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں فضا کو دہلائے دے رہی تھیں۔ گڑگڑاہٹ اور چٹانوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مہیب آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

"اجنبی! بھاگو۔ اس طرف...." کاشی کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں پیچھے مڑ کر دوڑا۔ کاشی راستے میں کھڑی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور ہم دونوں دوڑتے ہوئے بدھا کے مجسمے والے ہال میں پہنچ گئے اور چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ سامنے کی چٹان مہیب آواز کے ساتھ چٹخنے لگی۔ چھت سے بڑے بڑے پتھر گرنے لگے۔ کاشی میرا ہاتھ پکڑے اسی طرف دوڑی۔ اس نے شاید یہ سوچا تھا کہ راستہ مکمل طور پر بند ہونے سے پہلے ہم باہر نکل جائیں گے لیکن ہم سے چند گز آگے ایک بہت بڑا پتھر چھت سے ٹوٹ کر گرا۔ اٹھنے والے گرد و غبار سے ایک بار پھر گہری تاریکی چھا گئی۔

کاشی کے ہاتھ سے میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس کی آوازیں مختلف سمتوں سے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔

زمین کانپ رہی تھی۔ کسی جگہ پر قدم جمانا مشکل ہورہا تھا۔ میں کہیں کھڑے ہونے کی کوشش کرتا تو لڑکھڑا جاتا۔

رونے اور بین کرنے کی خوفناک آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اسی لمحے گڑگڑاہٹ کی خوفناک آواز سن کر میں چونک گیا۔ غار کی چھت بیٹھ رہی تھی۔ میں ایک طرف بھاگا لیکن ایک بہت بڑے پتھر سے ٹکرا کر گر گیا۔ میں فوراً اٹھ کر دوسری طرف بھاگا۔ ادھر بھی راستہ بند تھا۔ کاشی کی چیختی ہوئی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔ اس کی آوازیں چاروں طرف سے آتی ہوئی

محسوس ہو رہی تھیں۔ میرے لیے کسی سمت کا تعین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ سمت کا تعین کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ہر طرف راستہ بند تھا۔

چھت سے مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھر گرنے لگے۔ پہاڑ بیٹھ رہا تھا۔ میں نے ایک طرف چھلانگ لگا دی لیکن مجھے یوں لگا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے مجھے تھام لیا ہو۔ میں نے جس طرف چھلانگ لگائی تھی اس کی مخالف سمت ہوا میں اڑ رہا تھا۔

غار کی چھت بیٹھ گئی۔ چاروں طرف سے گڑگڑاہٹ کی خوفناک اور مہیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے ہزاروں فٹ بلند پہاڑ زمین میں دھنس رہا ہو۔ اڑنے والے گرد و غبار سے گہری تاریکی چھا گئی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ نادیدہ قوت مجھے کھینچے لیے جا رہی تھی اور پھر میں "دھب" کی آواز سے زمین پر گرا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور دوسرے ہی لمحے خوف سے کانپ اٹھا۔ ایک بہت بڑی چٹان میرے اوپر آ رہی تھی۔ میرے اور چٹان کے بیچ صرف چند فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ میرے بچنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو تقدیر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور اسی وقت بے اختیار میرے دل سے "اللہ ہو" کی پکار بھی نکلی تھی۔

میں منتظر تھا۔ کسی بھی لمحے اوپر سے گرنے والی چٹان مجھے کچل سکتی تھی لیکن ان نازک لمحات میں کسی نے مجھے ایک طرف کھینچ لیا۔ میرے ذہن میں کاشی کا خیال ابھرا تھا۔ شاید اس نے مجھے پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ لیا تھا۔

گڑگڑاہٹ کی مہیب آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔ میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ خوفناک آوازیں بہت دیر تک سنائی دیتی رہیں اور پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ مہیب اور اعصاب شکن سناٹا جیسے اس دنیا میں زندگی کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ قیامت گزر گئی ہو اور اس نے ہر چیز کو فنا کر دیا ہو۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا ہو۔ بڑا نرم و گداز لمس تھا۔ زندگی کی حرارت سے بھرپور۔ وہ ہستی کون ہو سکتی تھی؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی پیشانی پر تپتے ہوئے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا۔

مجھے وہ رات یاد آ گئی جب کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں مجھے کرسٹل کے مجسمے کے ٹوٹے ہوئے دو ٹکڑے ملے تھے اور میں کرسٹل کے ان ٹکڑوں کو گھر لے آیا تھا اور انہیں جوڑ کر ان کی "مرہم پٹی" کی تھی اور رات کے آخری پہر وہ مجسمہ دنیا کی حسین ترین عورت کا روپ اختیار کر گیا تھا۔ نہیں۔۔۔ وہ اس دنیا کی عورت نہیں تھی۔ وہ نیلگری تھی۔۔۔ ملکوتی حسن کی مالک۔ وہ گوتم بھوش کی قوتوں کا شکار ہو رہی تھی اور میں نے اسے بچا لیا تھا۔ وہ میری شکرگزار تھی اور رخصت ہونے سے پہلے اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ وہ ایسا ہی ناقابلِ فراموش کیف آگیں لمس تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

وہ نیلگری تھی جس نے میرا سر اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور میرے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ وہ زندگی سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہی نہیں' پورا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی ستاروں جیسی چمک تھی۔ اس کے پورے وجود میں زندگی لہریں لیتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں وجدان۔" نیلگری کے ہونٹ ساکت تھے لیکن اس کی سرگوشی جیسی سریلی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی "وہ شیطان ختم ہو گیا۔ تم نے ان طاغوتی قوتوں کو شکست دے کر مجھے بچا لیا۔ تمہاری نیت کے خلوص نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے' میں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔ تمہارے دشمن زیر پا ہوں گے اور فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا نیلگری؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"لیکن تمہاری نیت میں معمولی سی کھوٹ بھی تم سے یہ سب کچھ چھین لے گی۔" نیلگری نے کہا "اور میں جانتی ہوں کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب شیطانی قوتیں پھر تم پر حملہ آور ہوں گی اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں گے۔ میں تمہاری ثابت قدمی کے لیے دعا کرتی رہوں گی لیکن یہ سب کچھ بہرحال تمہارے ہی اختیار میں ہوگا۔"

"تمہیں تو اب کوئی خطرہ نہیں نیلگری؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" نیلگری نے جواب دیا "صدیوں کے فاصلے تک کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جس میں یہ ساری کٹھنائیاں برداشت کرنے کی سکت ہو۔" وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئی پھر بولی "تم اپنا جاپ پورا کر لو۔ میں تمہاری کنیز بن کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاؤں گی۔"

میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ کسی طرف سے کاشی کی آواز سنائی دی۔

"اجنبی۔ اجنبی۔ کہاں ہو تم۔۔۔؟" وہ مجھے پکار رہی تھی۔

"میں جا رہی ہوں۔" نیلگری کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

نیلگری نے میرا سر آہستگی سے زمین پر ٹکا دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ چند لمحے میرے سامنے کھڑی رہی پھر جیسے ہوا میں تیرنے لگی۔ وہ سامنے نیلگری کی برف پوش چوٹی کی طرف جا رہی تھی اور پھر وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

"اجنبی! کہاں ہو تم۔۔۔؟" کاشی کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میں یہاں ہوں کاشی۔ اس طرف۔" میں نے چیخ کر جواب دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں اس وقت بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ کے مرکزی دروازے کے سامنے موجود تھا۔ کاشی دہانے کے اندر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور دوڑتی ہوئی والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ نیم برہنہ' جوان اور حسین عورت مجھ سے لپٹی میری پیشانی اور میرے گالوں کے چٹاپٹ بوسے لیے جا رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے اپنے آپ سے الگ کیا اور بدحواس سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے کسی نے ہمیں یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا۔

میری نظریں دوسری چٹان کی طرف اٹھ گئیں جہاں ثوبان کھڑا تھا۔ آنکھوں سے محروم اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا۔ دونوں چٹانوں کے بیچ برف کا وہ پل اپنی جگہ موجود تھا جو آگ سے پگھل کر بہہ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر نیچے جھانکا۔ گہرائی میں اچھلتا اور جھاگ اڑاتا پانی بھی رواں دواں تھا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میرے دماغ میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ وہ جو کچھ بھی تھا' طاغوتی چکر تھا۔ پراسرار قوتوں کا کھیل تھا۔ مجھے روکنے کی کوشش تھی لیکن کوئی باطل قوت مجھے نہیں روک سکی تھی۔ میں اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گوتم بھوش' نیلگری کو حاصل کرنے کے لیے جاپ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے جاپ سمیت اسے ختم کر دیا تھا۔ اس کی تمام پراسرار قوتیں مٹ گئی تھیں۔ وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ ان طاغوتی اور باطل قوتوں کے خاتمے کے ساتھ ہی ہر چیز معمول پر آ گئی تھی۔ میں نے مڑ کر عبادت گاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دائیں بائیں چٹانوں پر بدھا کے تراشے ہوئے مجسمے جوں کے توں موجود تھے اور اوپر درمیان بدھا کا اسمائلنگ مجسمہ بھی موجود تھا اور لگتا تھا جیسے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا ہو پھر میری نظریں کاشی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بھی سرتاپا پیکرِ مسکراہٹ بنی ہوئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو اجنبی؟" کاشی کے ہونٹ کچھ اور پھیل گئے۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا سا گیا۔

"نیلگری آزاد ہو گئی۔" کاشی کے لہجے سے بے پناہ خوشی کا اظہار ہو رہا تھا "وہ آزاد تھی۔ آزاد رہے گی۔ بستی میں اس کی آزادی کا جشن منایا جائے گا۔ ایسا جشن جو اس سے پہلے کبھی نہ منایا گیا ہو۔ اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ جشن کی تیاری بھی کرنی ہے۔"

کاشی نے' بات ختم کرتے ہی فرطِ جوش میں ایک بار پھر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میری پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر برف کے پل کی طرف چلنے لگی۔

سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ دھوپ کی ترچھی کرنوں میں جمی ہوئی برف شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ کاشی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ہم اس برف پر اس طرح چل رہے تھے جیسے کسی پارک کی پختہ روش پر ٹہل رہے ہوں۔

ثوبان نے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود اس نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ لیا تھا اور ہمیں آغوش میں لینے کے لیے بانہیں پھیلا دی تھیں۔ میں اور کاشی دوڑ کر والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئے۔ ثوبان نے ہم دونوں کی پیشانیوں پر بوسے دیے اور پھر ہمیں اپنے سے الگ کرتے ہوئے بولا۔

"تم مبارک باد کے مستحق ہو اجنبی۔ تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے جو کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ نیلگری کی یہ برف پوش چوٹیاں تم سے بہت خوش ہیں۔ دیکھو۔۔۔ دیکھو۔ یہ برفانی چوٹیاں کس طرح خوشی سے جھوم رہی ہیں۔"

اس نے ہاتھ سے ایک برف پوش چوٹی کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے وہاں کچھ دیکھ رہا ہو۔ میری نظریں بھی اس طرف اٹھ گئیں۔

نیلگری کی وہ برف پوش چوٹی ہم سے اب بھی ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھی اور چوٹی کے عین اوپر ایک دلچسپ منظر ہماری توجہ کا منتظر تھا۔ برف کے سفید گالے اڑ اڑ کر فضا میں پھیل رہے تھے اور اس طرح گردش کر رہے تھے جیسے رقص کر رہے ہوں۔ خوشی سے جھوم رہے ہوں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ برف کے گالے فضا میں ایک محدود حد تک تھے۔ چوٹی پر ہوا حالانکہ بہت تیز تھی لیکن وہ بکھر نہیں رہے تھے۔

وہ اڑتے ہوئے گالے سمٹتے گئے۔ آپس میں جڑتے گئے۔ وہ منظر بہت ہی دلفریب تھا جب ان برف کے روئی جیسے گالوں نے سمٹ کر ایک ہیولے کی صورت اختیار کرلی تھی۔

وہ نیلگری تھی جو برف پوش چوٹی پر والہانہ انداز میں رقص کررہی تھی۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی ملکوتی مسکراہٹ تھی۔

یہ دلچسپ منظر کافی دیر تک میری نظروں کے سامنے رہا اور پھر برف کے' وہ گالے فضا میں بکھرتے گئے۔ نیلگری کا ہیولا بھی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

"اب ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے اجنبی۔"

ثوبان کی آواز سن کر میں اس طرف مڑگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کاشی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

"کاشی کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"آؤ۔ اب چلیں۔" ثوبان نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ میری بات کا جواب نہیں تھا لیکن مجھے صورت حال کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ جس طرح نہایت پراسرار طور پر یہاں آئی تھی اسی طرح واپس چلی گئی تھی۔

میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں نے ثوبان کا ہاتھ پکڑلیا اور ہماری واپسی کا سفر شروع ہوگیا۔

○☆○

شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں خچر چھوڑے تھے۔ وہ خچر بڑے نستعلیق ثابت ہوئے تھے اور اب بھی اس جگہ کے آس پاس چر رہے تھے۔ رات اس جگہ گزارنے کے بعد ہم صبح سویرے ہی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔

واپسی کا سفر زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ ثوبان حسب معمول میری رہنمائی کررہا تھا۔ اس کا خچر مجھ سے چند گز آگے تھا۔ میں کسی وقت برابر پہنچ کر اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو معمول کے مطابق وہ "ہوں ہاں" سے آگے نہ بڑھتا۔

دوسرے دن شام کے وقت ہم اس وادی میں پہنچ گئے جہاں بھیڑیوں کے غول نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میرا خچر بھی بڑے اطمینان سے چل رہا تھا اور میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کہیں پھر کسی طرف سے غولِ بیابانی نمودار ہوکر ہم پر حملہ نہ کردے لیکن میرے یہ خدشات بے بنیاد نکلے۔ وہ ایک طاغوتی چکر تھا جو ختم ہوچکا تھا اور اب اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ایک موقع پر میں اور ثوبان ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں اب بھی ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی سامنے بھیڑیوں کا ایک غول نظر آیا۔ وہ تعداد میں دس بارہ تھے اور ایک ہی جگہ پر جمع تھے۔ میں نے بے اختیار اپنا خچر روک لیا۔

"چلے آؤ اجنبی۔" ثوبان نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں بلکہ ایک دلچسپ منظر تمہاری نظروں کا منتظر ہے۔"

میں نے خچر کو آگے بڑھادیا۔ بھیڑیوں کے اس غول اور ہمارے درمیان تقریباً دو سو گز کا فاصلہ تھا اور جیسے جیسے ہم قریب پہنچ رہے تھے' وہ منظر واضح ہوتا جارہا تھا۔

وہاں کوئی لاش پڑی تھی جسے یہ بھیڑیے نوچ رہے تھے۔ بھیڑیے منہ اٹھا اٹھا کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور ہم جیسے جیسے قریب پہنچ رہے تھے' وہ بھیڑیے ایک ایک کرکے وہاں سے ہٹتے جارہے تھے۔

اور جب ہم قریب پہنچے تو وہ منظر واقعی بڑا خوفناک تھا۔ وہ ایک نہیں' تین لاشیں تھیں۔ انسانی لاشیں جو ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر پڑی تھیں۔ دو لاشیں مردوں کی تھیں اور ایک کسی عورت کی۔

میرا خیال تھا کہ انہیں بھیڑیوں کا شکار ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ بیشتر حصوں کا گوشت کھایا جاچکا تھا تاہم چہرے ابھی تک اس قابل تھے کہ انہیں شناخت کیا جاسکتا تھا۔ ان میں ایک شیواگ تھا۔ دوسرے آدمی کا چہرہ بھی میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسے میں نے بستی میں دیکھا تھا لیکن اس کا نام معلوم نہیں تھا اور وہ عورت..... وہ تو مجھ سے پنجہ بھی لڑا چکی تھی۔ اس شام بستی کے چوک میں مجھ سے کئی عورتوں نے پنجہ لڑایا تھا اور یہ عورت سب سے زیادہ جان دار ثابت ہوئی تھی اور یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے شباب کی جھلک دکھلا کر میرا ہاتھ زمین سے لگانے کی کوشش کی تھی۔

یہ سب بدی کے نمائندے تھے۔ انہوں نے سچائی اور سادگی کا راستہ چھوڑ کر شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع کردیا تھا۔ ان کا انجام دیکھ کر میں کانپ اٹھا۔

آس پاس کی فضا میں شدید تعفن پھیلا ہوا تھا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے بھیڑیے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رو رہے تھے۔ کچھ بھیڑیے ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ جیسے ہمیں وہاں سے چلے جانے کو کہہ رہے ہوں۔

میں نے ثوبان کی طرف دیکھا۔ اس کا خچر مجھ سے کئی گز آگے جاچکا تھا۔ میں نے بھی اپنے خچر کو ہانک دیا۔

خچر کی ننگی پیٹھ پر سفر میری زندگی کا سب سے اذیت ناک تجربہ تھا۔ دو دن پہلے سفر میں گزرے تھے اور آج بھی دوسرے دن کی شام تھی۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ اس کے بعد رات بھر سفر جاری رہا۔

صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے ہم ایک بار پھر رک گئے۔ میں خچر سے اتر کر ندی کے کنارے پر آگیا۔ جی بھر کے پانی پیا اور گھاس پر لیٹ گیا۔

صبح کا مدھم سا اجالا پھیلنے لگا تو میں اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب وہ جگہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ میرے بائیں طرف تقریباً دو سو گز کے فاصلے پر وہ کالی چٹان تھی جہاں نیلگری کے مشن پر روانگی سے پہلے ثوبان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر ٹہلنے والے انداز میں چلتا ہوا کالی چٹان کی طرف آگیا۔ ثوبان بھی میرے ساتھ اس طرف آگیا۔ چٹان کے دامن میں بہت گہرا کھڈ تھا۔ میں نے اس کھڈ میں جھانک کر دیکھا تو کانپ کر رہ گیا۔ وہ کھڈ بہت لمبا چوڑا تھا اور ہزاروں فٹ گہرائی تک چلا گیا تھا اور اس میں لاکھوں کی تعداد میں ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں..... انسانی ہڈیاں۔ کئی ثابت ڈھانچے بھی نظر آرہے تھے۔

"یہ بستی کا قبرستان ہے۔" ثوبان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہا تھا "بستی کا کوئی فرد جب مرجاتا ہے تو اس کی لاش میٹھے مشروب میں نہلا کر اس کھڈ میں لڑھکا دی جاتی ہے۔ لاش پر موجود مٹھاس کی وجہ سے چیونٹیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے اس طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ بستی والوں کا عقیدہ ہے کہ کیڑے مکوڑے جتنی جلدی شریر (جسم) کو کھا جائیں گے' اس کی روح اتنی ہی جلدی عالمِ بالا میں واقع شانتی نگر میں داخل ہوجائے گی۔"

عالمِ بالا کا تصور دنیا کی قدیم قوموں میں بھی تھا اور یہ لوگ بھی اسے مانتے تھے۔ ہڈیوں کا یہ قبرستان دیکھ کر مجھے پارسیوں کا عقیدہ یاد آگیا۔

پارسیوں کا اپنے مرنے والوں کو ٹھکانے لگانے کا طریقہ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ ان کا کوئی باقاعدہ قبرستان نہیں ہوتا۔ زمین سے کئی فٹ اوپر تک دیواریں کھڑی کرکے کنواں سا بنا دیا جاتا ہے جس پر آہنی سلاخوں کی چھت ڈال دی جاتی ہے۔ اسے دخمہ یا سکوت گاہ کا نام دیتے ہیں۔ مردے کو نہلا دھلا کر سلاخوں والے جنگلے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ مردار خور پرندے لاش کا گوشت کھا جاتے ہیں اور مردے کی ہڈیاں نیچے گرتی رہتی ہیں۔ مرنے والے اپنے کسی عزیز کو سفر آخرت پر روانہ کرنے کا یہ طریقہ اگرچہ نہایت ظالمانہ ہے لیکن بہرحال یہ ان کا مذہبی عقیدہ ہے۔ اپنے مردوں کو ٹھکانے لگانے کا یہی طریقہ تلکو قبیلے والوں نے بھی اپنا رکھا تھا۔ وہ اپنے مردوں کو اس گڑھے میں ڈال کر چلے جاتے تھے۔ چیونٹیاں' کیڑے مکوڑے اور جنگلی جانور اس کا گوشت نوچ کر کھاتے رہتے تھے اور ہڈیاں باقی رہ جاتی تھیں۔

اس گڑھے سے شدید قسم کی بو آرہی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ ہوا کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں زیادہ دیر وہاں کھڑا نہیں رہ سکا اور دوبارہ ندی کے کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔

دن کی روشنی اب واضح ہوتی جارہی تھی۔ ثوبان بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جھک کر چلو سے چند گھونٹ پانی پیا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر تک نتھنے پھلا پچکا کر فضا میں کچھ سونگھتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب چلو اجنبی۔ وہ سب لوگ وہاں سے جاچکے ہیں۔"

"کون لوگ کہاں سے جاچکے ہیں؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے ثوبان کی طرف دیکھا لیکن وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے اچھل کر خچر پر بیٹھ گیا۔

میں بھی اپنے خچر پر سوار ہوگیا۔ اب ہماری منزل صرف دو کوس کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ تلکو قبیلے کی وہ بستی جہاں شوبھا اور دھنو میری منتظر تھیں۔ پتا نہیں' مارتھا بھی وہاں موجود تھی یا جاچکی تھی۔

منزل کی قربت کے احساس سے مجھ پر تھکن سی سوار ہونے لگی۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ جب منزل دور ہوتی ہے تو چلتے رہنے کا حوصلہ برقرار رہتا ہے لیکن جیسے جیسے منزل قریب آتی جاتی ہے' یہ حوصلہ بھی دم توڑنے لگتا ہے اور دل چاہنے لگتا ہے کہ پر لگ جائیں اور انسان اڑ کر منزل پر پہنچ جائے۔ میں بھی اس وقت ایسی ہی کیفیت میں مبتلا تھا۔ میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ اڑ کر وہاں پہنچ جاؤں اور گہری نیند سو جاؤں۔

ثوبان کا خچر مجھ سے تقریباً دس گز آگے تھا۔ اس کا رخ بستی کی طرف نہیں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ بستی کے باہر ہی باہر پہلو سے گزر کر جھیل کی طرف جانا چاہتا تھا۔

اس طرف جھیل کے کنارے پر دور تک شاہ بلوط کے درخت تھے۔ ہم بستی سے تقریباً سو گز کے فاصلے سے گزرتے ہوئے جھیل کے کنارے درختوں میں پہنچ گئے۔ گزرتے ہوئے میں بار بار بستی کی طرف دیکھتا رہا۔ بعض جھونپڑوں کے دروازے بھی نظر آرہے تھے لیکن مجھے اس طرف کسی ذی

روح کا نام ونشان تک دکھائی نہیں دیا تھا اگرچہ یہ بہت غیر فطری سی بات تھی کہ بستی کے کسی فرد نے اپنے جھونپڑے سے نکل کر ہماری طرف دیکھا تک نہیں تھا حالانکہ ہماری آمد پر تو بستی میں شور مچ جانا چاہیے تھا لیکن وہاں سناٹا تھا۔ گمبھیر سناٹا...... اس بستی سے زندگی کا نام ونشان تک مٹ گیا تھا۔

بستی بالکل سنسان تھی۔

میں خچر سے اتر کر درختوں میں چلتا ہوا جھیل کے کنارے پر آگیا۔ ثوبان مجھ سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ دائیں طرف تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک بڑی سی کشتی نظر آرہی تھی جس کی رسی کنارے کی جھاڑیوں سے بندھی ہوئی تھی۔ میں ثوبان کے پیچھے پیچھے اس طرف چلنے لگا۔

ہم جیسے ہی کشتی کے قریب پہنچے' نجانے کہاں سے دو جوان لڑکیاں نمودار ہوکر ہمارے سامنے آگئیں۔ ان کے جسموں پر وہی لباس تھا۔ یاک کی کھال کا مختصر سا ٹکڑا سینے کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہا تھا اور زیریں حصے پر مختصر سا چمڑے کا اسکرٹ۔

ان دونوں لڑکیوں کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ ثوبان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی اور مجھے بھی باری باری ان کی طرف دیکھ کر مسکرانا پڑا۔

ثوبان نے اپنا ہاتھ ایک لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کشتی پر سوار کرانے لگی۔ ثوبان نے خطرناک ترین پہاڑی راستوں پر میری رہنمائی کی تھی اور کشتی پر سوار ہونے کے لیے وہ دوسروں کا محتاج تھا۔

دوسری لڑکی نے مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب تو مسکراہٹ سے ضرور دیا لیکن اس کا سہارا لینے کے بجائے خود ہی کشتی پر سوار ہوگیا تاہم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ بستی کے لوگ کہاں غائب ہوگئے تھے اور یہ خوب صورت لڑکیاں ہمیں کشتی میں سوار کراکے کہاں لے جارہی تھیں۔ ثوبان جس طرح بستی سے پہلو بچا کر سیدھا اس جگہ آیا تھا جہاں یہ کشتی ہماری منتظر تھی' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہمیں کہیں اور جانا ہے۔ گویا اسے پہلے سے پروگرام کا علم تھا لیکن میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ پہلے سے کیسے جانتا تھا!

کشتی کافی کشادہ تھی۔ آمنے سامنے دو سیٹیں تھیں اور ہر سیٹ پر تین آدمی آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔ میں اور ثوبان ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں لڑکیاں کشتی کو دھکیل کر گہرے پانی میں لے آئیں اور اچھل کر کشتی پر سوار ہوگئیں۔ دونوں نے ہمارے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر چپو سنبھال لیے۔

انہیں اس طرح اپنے سامنے بیٹھے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کنپٹیاں سلگ اٹھیں اور سینے میں سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسی وقت سورج طلوع ہوگیا۔ جھیل کے پانی میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ جھیل کے پرسکون پانی پر مچلتی ہوئی دھوپ کی سنہری کرنوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے الاؤ دہک رہے ہوں۔

کشتی کا رخ جزیرے کی طرف تھا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ ہم اس ویران جزیرے پر کیوں جارہے ہیں۔ میں ان لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بستی کے بارے میں' بستی کے لوگوں کے بارے میں۔ شوبھا' دھنو اور مارتھا کے بارے میں مگر وہ دونوں لڑکیاں میرے سامنے جس پوزیشن میں بیٹھی تھیں انہیں دیکھ کر میرا پتا بھی پانی ہورہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلینے ہی میں عافیت سمجھی۔

ایک گھنٹا گزر گیا۔ میں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا اور کشتی جھیل کی پرسکون سطح پر بہتی رہی۔ چپوؤں کی شڑاپ شڑاپ کی آوازیں مسلسل میری سماعت سے ٹکراتی رہیں۔

شور کی آوازیں سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منظر میرے لیے واقعی دلچسپ تھا۔ ہماری کشتی جزیرے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ ساحل پر سیکڑوں لوگ کھڑے خوشی سے چیخ رہے تھے۔

کشتی کا رخ چٹان کو تراش کر بنائے گئے اس گھاٹ کی طرف تھا جہاں ہجوم میں سب سے آگے اس قبیلے کی سردار کاشی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ دھنو' شوبھا اور مارتھا کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے سیکڑوں ننگ دھڑنگ عورتیں' مرد اور بچے بھی موجود تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ سب لوگ میرے استقبال کو آئے تھے۔ دو دن پہلے کاشی نے قبیلے کے لوگوں کو بتایا تھا کہ میں نے اس راکشش کو جلا کر بھسم کرڈالا ہے جو ایک خطرناک جاپ کے ذریعے نیلگری کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ کوہسار کی ملکہ نیلگری اب آزاد تھی۔ اسے اب صدیوں تک کوئی خطرہ نہیں تھا۔ کاشی نے' ان پراسرار شیطانی قوتوں سے جنگ کا سارا کریڈٹ مجھے دیا تھا حالانکہ اگر خود کاشی اور ثوبان میری مدد نہ کرتے تو مجھے گوتم بھوش اور اس کی پراسرار قوتوں پر اتنی آسانی سے فتح حاصل نہ ہوتی۔ اس پراسرار جنگ میں میری کامیابی کی خوشی میں کاشی نے تین دن تک جشن کا اعلان کیا تھا اور جشن منانے کے لیے اس جزیرے کا انتخاب کیا گیا تھا۔ قبیلے کی ساری آبادی اس ویران جزیرے پر منتقل ہوگئی تھی لیکن اب یہاں ویرانی

نہیں رہی تھی۔ ہر طرف زندگی بھرپور انداز میں نظر آرہی تھی۔

مجھے جلوس کی شکل میں اس حویلی میں لے آیا گیا جہاں سے میں دھنو کو چھڑا کر لے گیا تھا۔ یہ حویلی اس وقت ویران تھی۔ آسیب کا بسیرا لگتی تھی لیکن اب یہاں زندگی سے بھرپور قہقہے گونج رہے تھے۔ ہر طرف خوشیاں لوٹ رہی تھیں۔

دھنو' شوبھا اور مارتھا بھی میرے ساتھ تھیں۔ ان تینوں کے ساتھ بھی خصوصی مہمانوں کا سا سلوک کیا جارہا تھا۔

میری اور ثوبان کی آمد کے ساتھ ہی جشن شروع ہوگیا تھا۔ جزیرے پر جگہ جگہ کھیل تماشے ہورہے تھے۔ کرتب دکھائے جارہے تھے۔ کہیں پنجے لڑائے جارہے تھے اور کہیں دوسرے طریقوں سے زور آزمائی کے مقابلے ہورہے تھے۔ مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ کوئی بھی ان مقابلوں میں حصہ لے سکتا تھا۔ ہر گروہ کی خواہش تھی کہ میں اور کاشی دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ ان کے ارینا (اکھاڑے) کو رونق بخشیں۔ ہم تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہر جگہ رکتے اور مقابلوں میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ کئی جگہ مجھے بھی پنجہ آزمائی کے مقابلوں میں حصہ لینا پڑا۔

جزیرے پر بڑی رونق تھی۔ ہر طرف دلچسپ کھیل تماشے ہورہے تھے۔ کوئی تنے ہوئے رسے پر چل رہا تھا' کوئی منہ سے آگ کے گولے نکال کر دوسروں کو حیران کررہا تھا اور کوئی بازی گری دکھا رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کو میں نے کانٹوں کی سیج پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ لکڑی کا ایک تخت تھا جس پر لاتعداد کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ ان کی نوکیں اوپر کی طرف تھیں اور وہ عورت نوک دار کیلوں کے بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی جیسے پھولوں کی سیج پر دراز ہو۔ ایک طرف اس سے بھی زیادہ دلچسپ کھیل دیکھنے میں آرہا تھا۔

لکڑی کا ایک چوڑا تختہ سیدھا کھڑا تھا۔ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی اس تختے کے ساتھ اس طرح چپکی کھڑی تھی کہ اس کے دونوں بازو ذرا سے ترچھے دائیں بائیں تختے پر پھیلے ہوئے تھے۔ سامنے تقریباً پندرہ فٹ کے فاصلے پر ایک آدمی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک اور لڑکی کھڑی تھی جس کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے طشت میں تیز دھار خنجر رکھے ہوئے تھے۔ وہ شخص ایک ایک خنجر اٹھاتا' تختے کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی کی طرف نشانہ باندھتا اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل کر لڑکی کے بدن سے ایک انچ کے فاصلے پر تختے میں پیوست ہوجاتا۔ اس طرح خنجر لڑکی کے چاروں طرف تختے میں پیوست ہوتے گئے۔ آخری خنجر تختے پر لگنے کے بعد اس شخص نے آنکھوں سے پٹی کھول دی۔ لڑکی بھی تختے سے ہٹ کر اس کے قریب آگئی اور وہ دونوں ایک ہاتھ اٹھا کر' داد طلب نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ کھیل تماشے دن بھر جاری رہے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ایک جگہ پر آگ کا بہت بڑا الاؤ روشن کردیا گیا۔ مختلف مقامات پر لنگر کا اہتمام بھی تھا۔ لوگ جیسے جیسے کھانا کھاتے جاتے' الاؤ کے گرد جمع ہوتے جاتے۔

ہم نے کھانا حویلی میں کھایا تھا۔ حویلی بھی خوب سجی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن تھیں۔ باہر کا موسم اگرچہ نہایت خوشگوار تھا اور ہلکی سی خنکی بھی ہوگئی تھی لیکن حویلی کے اندر لاتعداد مشعلوں کی وجہ سے کچھ حدت سی ہوگئی تھی۔

جب ہم حویلی سے نکل کر الاؤ کے پاس پہنچے تو وہاں کھیل شروع ہوچکا تھا۔ لگتا تھا جیسے قبیلے کی پوری آبادی اس جگہ پر جمع ہوگئی ہو۔ الاؤ کے گرد بہت بڑا دائرہ تھا اور اس دائرے کے وسط میں تین لڑکیاں رقص کررہی تھیں۔ دو تین آدمی ڈھول بجا رہے تھے۔

رقص کے مظاہرے جاری رہے۔ مختلف لڑکیاں آتیں' اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور پھر ان کی جگہ دوسری لڑکیاں آجاتیں اور بالآخر وہ لمحہ بھی آگیا جس کا لوگوں کو انتظار تھا۔

کاشی اپنی جگہ سے اٹھ کر میدان میں آگئی۔ آج اس کے جسم پر لباس بھی مختلف تھا۔ باریک لباس میں اس کا بدن جھلک رہا تھا۔ اس نے ڈھول کی تھاپ پر رقص شروع کیا تو سناٹا سا چھا گیا۔ ڈھول کی تھاپ کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر شخص کی نظریں کاشی پر مرکوز تھیں۔ رقص میں لمحہ بہ لمحہ تیزی آتی جارہی تھی۔

اچانک میں اپنی جگہ پر اچھل پڑا۔ ایک اور لڑکی ہمارے قریب سے اٹھ کر کاشی کے ساتھ رقص میں شریک ہوگئی تھی اور وہ کوئی قبائلی لڑکی نہیں تھی۔ وہ اپنی دھنو تھی۔

دھنو کو میں نے بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے قریب دریا کے کنارے پر رقص کرتے دیکھا تھا اور اب اسے کاشی کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ قبائلی رقص بہت مختلف تھا لیکن لگتا تھا جیسے دھنو نے بھی اس میں مہارت حاصل کر رکھی ہو۔

کاشی اور دھنو ایک دوسرے کے مقابلے پر تھیں۔ دونوں کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ ان کے رقص میں تیزی آتی جارہی تھی۔

بڑا ہیجان خیز رقص تھا جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا

اور جب رقص ختم ہوا تو فضا لوگوں کے شور سے گونج اٹھی۔ مجھے تو دھنو پر حیرت ہو رہی تھی۔ کاشی کے سامنے اس نے ایک لمحے کو بھی اپنے آپ کو اناڑی ثابت نہیں ہونے دیا تھا۔

رات کے آخری پہر اس روز کی تقریبات ختم ہوگئیں۔ ہماری رہائش کے لیے بھی حویلی ہی میں بندوبست کیا گیا تھا۔ اگرچہ حویلی میں کئی کمرے تھے لیکن میں نے دھنو اور شوبھا کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے کو ترجیح دی تھی اور ظاہر ہے' مارتھا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کمرے میں آکر ہم تو اپنی اپنی جگہ پر ڈھیر ہوگئے اور مارتھا اپنی ڈائری لے کر بیٹھ گئی۔

جشن کے یہ ہنگامے تین دن تک جاری رہے۔ قبیلے والوں نے بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ قبیلوں کی زندگی میں ایسے مواقع کبھی کبھار ہی آتے تھے اور اس جشن کو تو "نیلگری کی آزادی کا جشن" کا نام دیا گیا تھا۔

یہ جزیرہ نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ویران پڑا تھا۔ اس قبیلے کے لوگ اگرچہ توہم پرستی کا شکار تھے لیکن یہ انکشاف ہونے کے بعد کہ شیواگ' دھنو کو اغوا کرکے اس جزیرے پر لے گیا تھا اور شیواگ اور اس کے چند ساتھیوں نے جزیرے کو اپنی بدمعاشیوں کا اڈا بنایا ہوا تھا' ان کے دلوں سے آسیب کا خوف نکل گیا تھا اور انہوں نے جزیرے کو پھر سے آباد کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ کاشی نے بھی اب جزیرے پر واقع حویلی ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میرا کام ختم ہوچکا تھا اور میں اب جلد سے جلد یہاں سے رخصت ہوجانا چاہتا تھا لیکن کاشی اور قبیلے کے لوگ بضد تھے کہ ہم چند روز مزید یہاں رہیں۔

لیکن تابکے! بالآخر ہم وہاں سے رخصت ہونے کے لیے تیار ہوگئے۔ وہ کئی کشتیاں تھیں جن پر قبیلے کے بہت سے لوگ سوار تھے۔ جس بڑی کشتی پر میں تھا اس میں دھنو' شوبھا' مارتھا اور کاشی بھی تھی۔ کشتیوں میں سوار لوگ اونچی آواز میں الوداعی گیت گا رہے تھے۔

میرے لیے حیرت کی ایک بات یہ تھی کہ جزیرے پر آنے کے بعد سے میں نے ثوبان کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ کسی تقریب میں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے ایک آدھ مرتبہ کاشی سے اس کے بارے میں پوچھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ ٹال گئی تھی اور مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس سے نہیں مل سکا تھا۔

کشتیوں کا رخ قبیلے کی بستی کی طرف نہیں' جھیل کے دوسرے کنارے کی طرف تھا۔ بہت بڑی جھیل تھی۔ کشتیوں کی رفتار اگرچہ خاصی تیز تھی لیکن اس کنارے تک پہنچنے میں تقریباً چار گھنٹے لگے تھے۔

جھیل کے اس کنارے پر دور تک گھنا جنگل تھا۔ کشتیوں سے اتر کر ہم جنگل میں پیدل چلنے لگے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو قد آدم جھاڑیوں اور درختوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ہم جیسے ہی ایک پہاڑی کے اوپر سے گھوم کر دوسری طرف پہنچے' میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

سامنے ہی درختوں کے جھنڈ میں ایک چشمہ تھا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر پانچ خچر گھاس چر رہے تھے اور چشمے کے قریب ایک پتھر پر جو شخص بیٹھا ہوا تھا اسے دیکھ کر میں اچھل پڑا۔

وہ ثوبان تھا۔

میں دوڑ کر آگے بڑھا تو ثوبان نے بھی اٹھ کر بانہیں پھیلا دیں۔ میں والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ثوبان نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو نجانے کیوں میرا دل بھر آیا۔ مجھے آنکھوں سے محروم اس شخص پر ترس بھی آیا اور بے حد پیار بھی۔ قدرت نے اسے بے پناہ صلاحیتیں بخشی تھیں لیکن وہ اس دنیا کی رنگینیاں دیکھنے سے محروم تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹا وہاں ٹھہرے رہے۔ کاشی نے ہم سب کو گلے لگایا۔ مجھ سے لپٹ کر اس نے میری پیشانی پر بوسہ دیا تو ایک لمحے کو مجھے یوں لگا جیسے وہ نیلگری کے ہونٹوں کا لمس ہو۔

ہمارے ساتھ آنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں کی تھی۔ ان کے سریلے نغموں کی آواز فضا میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم لوگ خچروں پر سوار ہوگئے۔ ثوبان کا خچر آگے تھا۔ ہم بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے رہے۔ کاشی اور قبیلے کے دوسرے لوگ ایک اونچی جگہ پر کھڑے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا اور بالآخر وہ لوگ ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

مارتھا اور شوبھا' ثوبان کے حوالے سے پریشان تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آنکھوں سے محروم یہ شخص کہیں ہمیں موت کے منہ میں نہ دھکیل دے لیکن میرے دل میں ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا اور جب میں نے انہیں ثوبان کی غیر معمولی صلاحیتوں کے بارے میں بتایا تو انہیں شاید میری باتوں کا یقین نہیں آیا تھا لیکن اس طویل سفر کے دوران میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ خود بھی انگشت بدنداں رہ گئیں۔

ہمارا سفر دن بھر جاری رہا۔ کبھی فلک بوس پہاڑ ہمارا راستہ روک لیتے اور کبھی نشیب میں میلوں دور تک پھیلی ہوئی وادیاں ہمیں دعوت نظارہ دینے لگتیں۔ شام سے ذرا پہلے ہم کمتی ناتھ نامی ایک بستی میں پہنچ گئے۔

یہ بہت بڑی بستی تھی اور یہاں بھی بدھا کی ایک بہت بڑی عبادت گاہ تھی لیکن عبادت گاہوں سے اب مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک عبادت گاہ ہی کے چکر میں کئی روز میری زندگی سے نکل گئے تھے۔ میں اصل راستے سے ہٹ کر کئی روز تک اس جھمیلے میں پڑا رہا تھا جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن مجھے بہرحال خوشی تھی کہ میری تپسیا رائگاں نہیں گئی تھی۔ میں کسی کے کام تو آیا تھا۔

مجھے وہ دن یاد تھا جب کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں کرسٹل کے مجسمے کے دو ٹکڑے ملے تھے اور یہ طاغوتی چکر اسی لمحے سے شروع ہوگیا تھا۔ اس سے اگلے روز گوتم بھوش سے آمنا سامنا ہوگیا تھا اور اس نے اپنی قوتوں کے شعبدے دکھانا شروع کردیے تھے۔ اگر وہ میرے راستے میں نہ آتا تو شاید میں شوبھا اور دھنو کے ساتھ کھٹمنڈو سے جاچکا ہوتا لیکن گوتم بھوش کی اس پنگے بازی سے نیلگری کی کہانی کھل کر سامنے آگئی اور میں نے وہ کام کر ڈالا جو دنیا کا کوئی اور شخص نہیں کرسکتا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا قافلہ ثوبان کی رہنمائی میں بستی میں داخل ہوگیا۔ یہ بدھ مت لوگوں کی بستی تھی اور ثوبان ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جس طرف سے گزرتا' لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا استقبال کرتے۔ ثوبان کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آجاتی اور جواب میں وہ بھی ہاتھ ہلا دیتا۔

دریائے تھونگ کے قریب ہڈن ویلی کی طرف جانے والی پختہ سڑک کے کنارے یہ بستی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایک قصبہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بعض بازاروں کی سڑکیں بھی پختہ تھیں۔ ان بازاروں کو دیکھ کر کسی بہت قدیم بستی کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا اور میرا خیال ہے' یہ بھی کوئی قدیم بستی ہی تھی لیکن اس پر جدیدیت کی ہلکی سی چھاپ بھی نظر آرہی تھی۔ قہوہ خانے یا چائے خانے بکثرت تھے جن میں میزیں کرسیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

شام ہوچکی تھی۔ دکانوں میں لالٹین اور پیٹرومیکس قسم کی بتیاں روشن ہوچکی تھیں۔ بازاروں میں بڑی رونق تھی۔ یہاں ایسے لوگ بھی نظر آرہے تھے جنہوں نے پورے لباس پہن رکھے تھے اور ایسے لوگ بھی دکھائی دیے جن کے لباس تلکو قبیلے کے لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھے۔

یہ قصبہ چونکہ شاہراہ پر واقع تھا اس لیے ہڈن ویلی اور مستانگ کی طرف جانے والے غیر ملکی سیاح یہیں سے گزرتے تھے۔ سیاحوں کی بعض پارٹیاں تو محض ستانے کے لیے گھنٹے دو گھنٹے یہاں رکتیں اور بعض پارٹیاں یہاں رات بھر کے لیے رک جاتی تھیں۔ بستی کے دکان داروں کو ان غیر ملکی سیاحوں کی وجہ سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔

ان علاقوں کی طرف آنے والے سیاح عام طور پر گروپس کی صورت میں سفر کرتے ہیں۔ وہ کھٹمنڈو یا کسی قریبی بڑے شہر سے کوئی کوسٹر یا بس کرائے پر حاصل کرلیتے جس سے انہیں سفر میں بڑی سہولت مل جاتی تھی۔ خچروں پر سفر کرنے والے سیاح بھی اس طرف سے گزرتے رہتے تھے۔ قصبے میں کئی رہائشی ہوٹل اور سرائے تھیں۔ غیر ملکی سیاحوں کو دیکھ کر ہوٹلوں کے مالک ان کی طرف لپکتے تھے۔ انہیں طرح طرح کی ترغیبات دی جاتی تھیں۔

جب ہم قصبے میں داخل ہوئے تو کچھ لوگ ہماری طرف بھی لپکے تھے لیکن ثوبان کو دیکھ کر ایسے لوگوں کے چہروں پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

ثوبان مختلف بازاروں اور گلیوں میں گھومتا ہوا ایک کشادہ گلی میں حویلی نما عمارت کے پھاٹک کے سامنے رک گیا۔ پھاٹک کے سامنے ایک دربان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ثوبان کو دیکھ کر اندر دوڑ گیا۔ اس کی واپسی میں تین چار منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ اس کے ساتھ درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی بھی تھا جس نے افریقہ کے کسی قبائلی جنگ جو کی طرح اپنے جسم پر ہتھیار سجا رکھے تھے۔ اس کا سر گنجا اور کانوں میں بڑے بڑے بالے تھے۔ وہ لام سوم تھا۔ اس بستی کا سردار۔

اس نے آگے بڑھ کر بڑے احترام سے ثوبان کو سہارا دے کر خچر سے اتارا پھر ہماری طرف بڑھا لیکن ہم خود ہی خچروں سے اتر گئے۔ لام سوم نے پھاٹک کے اندر کی طرف منہ کرکے چیخ کر کچھ کہا۔ چار پانچ خادم دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ہم نے خچر ان کے حوالے کردیے اور لام سوم کے ساتھ حویلی کے برآمدے کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بہت بڑی حویلی تھی۔ کئی کمرے تھے۔ ہمیں مرکزی ہال کمرے میں لے جایا گیا جہاں فرش پر یاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور بیٹھنے کے لیے بڑی بھدی سی لیکن آرام دہ بڑی بڑی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

ہمیں بڑے احترام سے کرسیوں پر بٹھا دیا گیا اور پھر کچھ ہی دیر بعد مختلف سمتوں سے لوگ نمودار ہونے لگے۔ ان

میں مرد بھی تھے' عورتیں بھی اور بچے بھی۔ ان کی صورتوں میں چینیوں جیسی کچھ شباہت تھی۔ ان میں عورتیں زیادہ حسین تھیں۔ ان کے لباس بھی ایسے تھے کہ نظریں خود بخود ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ ان سب نے باری باری آگے بڑھ کر پہلے ثوبان کو اور پھر ہمیں گالوں پر بوسے دیے تھے۔ یہ مہمانوں کے استقبال کا ایک انداز تھا جو دنیا کی بیشتر قوموں میں رائج ہے۔

تقریباً دو گھنٹوں بعد فرش پر بچھے ہوئے دسترخوان پر کھانا لگا دیا گیا۔ سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ ملازموں نے دستر خوان سمیٹ دیے۔ قہوے کا دور چلا پھر ثوبان اٹھ کر چلا گیا۔ دن بھر کے سفر سے ہم بھی تھکے ہوئے تھے۔ میزبان لام سوم نے ہماری کیفیت کو محسوس کرلیا۔ اس نے ایک ادھیڑ عمر خادمہ کو اشارہ کیا جس نے ہمیں ایک وسیع و عریض کمرے میں پہنچا دیا۔ یہاں بھی فرش پر یاک کی کھالیں بچھی ہوئی تھیں اور چند کمبل بھی رکھے ہوئے تھے۔

ہم سب نے اپنے لیے جگہوں کا انتخاب کیا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ ہم پر تھکن ضرور سوار تھی لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ ہم کمبلوں میں دبکے لام سوم کے بارے میں باتیں کررہے تھے کہ دو عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہونٹوں پر بڑی پرکشش مسکراہٹ تھی۔ ہمیں اخلاقاً اٹھ کر بیٹھ جانا پڑا۔

وہ دونوں لام سوم کی بیویاں تھیں۔ ایک درمیانے قد کی اکہرے بدن کی مالک تھی جبکہ دوسری خاصی دراز قامت اور صحت مند قسم کی عورت تھی۔ اکہرے بدن والی عورت کا نام شیماتا اور دراز قامت والی کا نام کوری تھا۔ ان سے باتوں کے دوران میں پتا چلا کہ لام سوم کی تین بیویاں اور ہیں جو اسی قصبے میں کسی دوسرے مکان میں رہتی ہیں۔ گفتگو کے دوران میں یہ سنسنی خیز انکشاف بھی ہوا کہ کوری مستانگ کی رہنے والی ہے اور اس کے دو شوہر اور بھی ہیں اور وہ دونوں مستانگ میں ہیں۔ کوری باری باری ایک ایک مہینہ ان تینوں کے پاس رہتی ہے۔

اس انکشاف پر شوبھا اور مارتھا معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ کوری نے اس سلسلے میں کئی سنسنی خیز انکشافات کیے تھے۔ مستانگ کی اکثر عورتیں تین تین چار چار شوہر رکھتی ہیں۔ شوہر آپس میں کبھی نہیں لڑتے تاہم عورت پر سب سے زیادہ حق اس مرد کا سمجھا جاتا ہے جس سے عورت کی پہلی شادی ہوئی ہو۔ کوری نے یہ بھی بتایا کہ وہ تین دن بعد مستانگ جانے والی ہے۔ مارتھا نے فوراً ہی اس کے ساتھ پروگرام بنانا شروع کردیا۔ وہ تو پہلے بھی مستانگ ہی کی طرف جانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اب تو اسے ایک ایسی عورت مل گئی تھی جو اسے مستانگ قبیلے کے رسم و رواج کے بارے میں بہت کچھ بتاسکتی تھی۔

شیماتا اور کوری رات دیر تک ہمارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ ان کے جاتے ہی میں کمبل میں دبک گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

ہم اس قصبے میں دو دن رہے۔ اس دوران میں قصبے کی سیر سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے اور معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔ قصبے کے مرکزی چوراہے پر ایک بہت بڑا اسٹوپا تھا۔ اس کے قریب ہی بسوں کا اڈا بھی تھا۔ سب سے زیادہ رونق اسی چوراہے پر تھی۔ یہاں دن میں دو بسیں مستانگ ہائی وے کی طرف سے آتی تھیں اور دو ہی اس طرف جاتی تھیں۔ ان بسوں کے آمدورفت کے اوقات بھی مختلف تھے۔

تیسرے روز صبح سویرے ہم اس قصبے سے رخصت ہوئے تو کوری بھی ہمارے ساتھ اس بس میں سوار تھی۔ تقریباً بیس میل کے فاصلے پر وہ گاؤں تھا جہاں سے ایک سڑک مستانگ کی طرف اور دوسری تاتا پانی کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں گرم پانی کے چشمے تھے اس لیے اس بستی کا نام بھی تاتا پانی تھا۔

ہم اس وقت سطح سمندر سے تقریباً چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ ہمارے چاروں طرف برف پوش چوٹیاں تھیں۔ سردی کی لہریں ہڈیوں کے گودے تک میں اتری جارہی تھیں۔ کاگ بنی نامی ایک بستی سے ہم نے مارتھا اور کوری کو مستانگ کی طرف جانے والی بس پر سوار کرا دیا اور اس کے ایک گھنٹے بعد ہم دوسری بس میں سوار تاتا پانی کی طرف سفر کررہے تھے۔

مختلف بستیوں میں رکتے اور کھٹارا قسم کی بسوں میں سفر کرتے ہوئے ہم تین دن بعد پوکھارا پہنچ گئے۔ ہم صدیوں پرانی تہذیب سے نکل کر ترقی یافتہ دور میں آگئے تھے جہاں جگمگاتی روشنیاں تھیں' زندگی کے ہنگامے تھے۔ زندگی کے ہنگامے تو وہاں بھی تھے لیکن کتنا فرق تھا دونوں میں۔ جہالت کے اندھیروں میں لپٹے ہوئے وہ لوگ اخلاقی قدروں کے پاسدار تھے اور جدید تہذیب کی جگمگاتی روشنیوں میں سانس لینے والے یہ لوگ اخلاقی اقدار کو پامال کرنے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہیں لگاتے تھے۔

یہاں ایک ہوٹل میں ہمیں ایک بڑا فیملی روم مل گیا۔

ہم دو دن تک اس کمرے تک محدود رہ کر اپنی تھکن اتارتے رہے۔

اس سے اگلے روز صبح سویرے ہم کھٹمنڈو کے لیے روانہ ہوگئے لیکن کھٹمنڈو جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوپہر کے قریب جب بس تھان کوٹ کے اڈے پر رکی تو میں دھنو اور شوبھا کو اشارہ کرتا ہوا بس سے اتر گیا۔

بس اسٹاپ سے انسپکٹر بریندرا کے بنگلے تک کا فاصلہ ہم نے پیدل ہی طے کیا۔ بریندرا کے ملازم نے ہمیں پہچان لیا اور دروازے ہمارے لیے کھول دیے اور ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرنے لگا۔

کھانے کے بعد میں نے کھٹمنڈو میں پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملایا لیکن انسپکٹر بریندرا آفس میں موجود نہیں تھا۔ میں نے پیغام دے کر فون بند کردیا۔

کئی روز بعد مرغن قسم کا کھانا کھایا تھا۔ مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میں اٹھ کر اسی کمرے میں آگیا جہاں پہلے سویا کرتا تھا۔ ان دنوں اگرچہ اس بنگلے میں کسی کی رہائش نہیں تھی لیکن تینوں بیڈ رومز میں بستر بچھے ہوئے تھے اور ہر چیز صاف ستھری تھی۔ گویا ملازم ہڈ حرام نہیں تھا۔

بستر پر لیٹتے ہی میں سو گیا تھا۔

شام سات بجے کے قریب میں خود سے نہیں جاگا بلکہ شوبھا نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا تھا۔

"کیا مصیبت ہے بھئی۔ سونے تو دو۔" میں نے کروٹ بدل لی۔

"انسپکٹر بریندرا ایک گھنٹے سے بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کررہا ہے۔" شوبھا نے جواب دیا۔

بریندرا کا نام سنتے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دماغ پر اب بھی نیند کا خمار طاری تھا۔ میں نے سر کو ایک دو مرتبہ ہولے سے جھٹکا اور اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

ٹھنڈے پانی کے غسل سے میرے حواس ٹھکانے آگئے۔ نہاتے ہوئے میں نے ایک اور بات نوٹ کی تو چونک گیا۔ نیلگری کی مالا میرے گلے میں نہیں تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ نیلگری کی مالا اس وقت سے میرے گلے میں نہیں تھی جب سے ہم گوتم بھوش اور اس کی قوتوں کو تباہ کرکے نیلگری کی برف پوش چوٹیوں سے واپس لوٹے تھے۔ کئی روز سے میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا لیکن اب مجھے یاد آرہا تھا کہ گوتم بھوش کی قوتوں سے مقابلے کے آخری مرحلے میں' میں نے وہ مالا گوتم بھوش پر دے ماری تھی اور اس کے بعد مجھے اس مالا کا ہوش ہی نہیں رہا تھا اور کئی روز بعد اب احساس ہوا تھا کہ وہ مالا مجھ سے جدا ہوچکی تھی۔

میں نے مالا کا خیال ذہن سے نکال کر کپڑے پہنے اور باہر آگیا۔ انسپکٹر بریندرا اور شوبھا وغیرہ لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی وہیں آگیا۔

بریندرا بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملا۔ میں نے شوبھا کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بریندرا کو تلکو قبیلے کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی تھی۔ دھنو بھی خاموش بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ملازم نے ہمارے سامنے چائے سرو کردی میرا خیال تھا کہ وہ میرے ہی جاگنے کا انتظار کررہا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں باتیں ہوتی رہیں۔ انسپکٹر بریندرا بتا رہا تھا کہ ناگ پال بھی ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا۔ اس کے کئی ساتھی پولیس کے ہاتھوں جہنم رسید ہوچکے تھے۔ اس کے گروہ کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا تھا اور جو چینی (جنرل کھورات) کے ایجنٹ نیپال میں قدم جمانے کی کوشش کررہے تھے ان کا بھی مکمل طور پر صفایا ہوگیا تھا۔ منشیات فروشوں کی چند چھوٹی چھوٹی پارٹیاں رہ گئی تھیں۔ انہیں بھی آہستہ آہستہ ختم کیا جارہا تھا۔ ان پارٹیوں میں زیادہ تر انڈیا سے آئے ہوئے ہندو تھے جو نیپال کو منشیات کی نئی منڈی سمجھ کر قدم جمانے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں بھی ناگ پال جیسے لوگوں کی آشیرباد حاصل تھی لیکن ناگ پال کی موت کے بعد یہ لوگ بھی یتیم ہوگئے تھے۔ یا تو یہ ملک چھوڑ کر واپس انڈیا جارہے تھے یا پولیس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے۔

یہ سب کچھ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں شوبھا کو دلیش مکھ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا اور یہاں آکر میں موت کے ان سوداگروں سے الجھ گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو ہیرو تو نہیں کہوں گا لیکن میرے توسط سے ایک ایسے گروہ کا خاتمہ ہوگیا تھا جو اس ملک کے پرسکون' امن پسند اور سیدھے سادے لوگوں کو جہنم میں دھکیلنے کی تیاری کررہا تھا۔

انسپکٹر اعظم خان کے بارے میں بات ہوئی تو بریندرا نے بتایا کہ وہ ایک ہفتہ پہلے انڈیا واپس جاچکا ہے۔

"اب ہماری واپسی کا بندوبست بھی کرو۔" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "میں اب ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں۔ چند روز وہاں رہ کر پاکستان چلا جاؤں گا۔"

"ہندوستان یا پاکستان کیوں؟" انسپکٹر بریندرا نے میرے.

چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا "یہیں رہ جاؤ۔ یہاں تمہیں فرسٹ کلاس شہرت مل جائے گی اور تمہیں وہ ساری مراعات ملیں گی جن کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ زندگی بھر عیش کرو گے یہاں رہ کر۔"

"نہیں دوست۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں سیلانی آدمی ہوں۔ کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہ سکتا اور پھر پاکستان میرا وطن ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں نے پرورش کہیں اور پائی' زندگی کہیں اور گزری لیکن میرا خمیر تو پاکستان کی مٹی سے ہی اٹھا تھا اور اب وہ مٹی مجھے پکار رہی ہے۔ اب میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ خواہ چند روز کے لیے ہی سہی۔" میں چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرے ماں باپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا تھا اور انہیں دیارِ غیر میں بھی نہیں جینے دیا گیا۔ میں ان لوگوں سے حساب برابر کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے پہلے میرے ماں باپ کو اپنے پرکھوں (آباؤاجداد) کی سرزمین چھوڑنے پر مجبور کیا پھر دیارِ غیر میں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں کئی بار پاکستان جانے کی کوشش کرچکا ہوں لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی مجبوری آڑے آتی رہی لیکن اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کسی مجبوری کو اپنے راستے کی دیوار نہیں بننے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" بریندرا نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ یہاں تم نے ہماری بہت مدد کی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں۔"

"نہیں دوست۔" میں نے کہا "یہ میرا بوجھ ہے۔ میں اکیلا ہی اٹھاؤں گا۔ تم نے جس چاہت اور محبت کا اظہار کیا ہے' میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار رہوں۔"

اس کے بعد ہمارا موضوع بدل گیا۔ باتوں میں ساڑھے آٹھ بج گئے۔ بریندرا گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

"چلو۔ کھانا کھانے چلیں۔ ایک نیا ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ بڑے اچھے انڈین اور پاکستانی کھانے ملتے ہیں۔ وہ ریسٹورنٹ دراصل ایک پاکستانی ہی نے کھولا ہے۔"

"اتنی دور جانے کا موڈ نہیں ہورہا۔" میں نے جواب دیا "یہیں کسی ریسٹورنٹ میں چلتے ہیں۔"

"چلو۔ یہیں سہی۔" بریندرا نے کہا۔

اس کے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم بریندرا کی کار میں بیٹھ کر بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔

وہ ریسٹورنٹ بھی بہت اچھا تھا۔ کھانے کے بعد بھی ہم دیر تک وہاں بیٹھے رہے۔

آدھی رات کے قریب بریندرا ہمیں بنگلے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ صبح گاڑی بھیج دے گا۔

صبح نہ صرف گاڑی آگئی بلکہ ڈرائیور نے ایک پھول دار بٹوا بھی میرے حوالے کردیا جو بریندرا نے بھیجا تھا۔ اس میں بڑی مالیت کے کرنسی نوٹ بھرے ہوئے تھے۔

ہم گیارہ بجے کے قریب روانہ ہوئے۔ دن بھر کھٹمنڈو میں پھرتے رہے۔ دوپہر اور رات کا کھانا بھی ہم نے ایک ہوٹل ہی میں کھایا تھا۔ جب ہم بنگلے میں واپس پہنچے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

گھر آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی میں سوچکا تھا۔

دو تین دن گزر گئے۔ بریندرا ہمارے کاغذات تیار کروا رہا تھا۔ میں نے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کے بجائے بائی روڈ روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔

ہم نے رانی روپ متی' ٹھاکر بھانوت اور دوسرے دوستوں کے لیے بہت سارے تحائف خریدے تھے۔ بریندرا نے بھی ہمارے لیے بہت سے تحائف خریدلیے۔ اس نے تحائف سے بھرے ہوئے دو سوٹ کیس ہمارے حوالے کردیے تھے۔

وہ دن بھی آگیا جب ہم نیپال کو الوداع کہنے کے لیے تیار تھے۔ انسپکٹر بریندرا نے ایک ائرکنڈیشنڈ مائیکرو بس کا بندوبست کیا تھا۔ دو مسلح گارڈ بھی ساتھ تھے۔ انسپکٹر بریندرا بھی ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔ صبح چھ بجے کے قریب مائیکرو بس بنگلے سے روانہ ہوئی اور اس کے ایک گھنٹے بعد تیز رفتاری سے پرتھوی ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

ہمارا راستہ وہی تھا جس سے اب تک میں کئی بار گزر چکا تھا۔ پرتھوی ہائی وے۔ یہ نیپال کی سب سے بڑی شاہراہ تھی جہاں ہر قسم کا ٹریفک سب سے زیادہ ہوتا تھا اور زیادہ آبادی بھی اسی ہائی وے کے آس پاس تھی۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹی بڑی لاتعداد بستیاں تھیں جہاں رہنے والوں کی زیادہ تعداد بدھا کے پیروکاروں پر مشتمل تھی۔

ہم گیارہ بجے کے قریب پوکھار پہنچے۔ یہاں پولیس کا سارا ہی عملہ انسپکٹر بریندرا کو جانتا تھا۔ چیف انسپکٹر کو بھی اطلاع ہوگئی اور وہ اس ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں ہم چائے پینے کے لیے تھوڑی دیر کو رکے تھے۔ ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ چائے پی کر آگے روانہ ہوجائیں گے اور دوپہر کا کھانا تان سین میں کھائیں گے لیکن چیف انسپکٹر نے ہمیں دوپہر کے کھانے کے لیے روک لیا اور وہ ہمیں محکمہ پولیس کے ریسٹ

ہاؤس میں لے آیا۔ اس طرح ہمیں کچھ دیر آرام کرنے کا موقع بھی مل گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم تین بجے کے قریب پوکھار سے روانہ ہوئے۔ چیف انسپکٹر نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا تھا۔

اب ہم سدھارتھ ہائی وے پر سفر کررہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کرکے ہم شام سات بجے کے قریب تان سین پہنچ گئے۔ ڈیڑھ سو کلومیٹر کا فاصلہ عام طور پر ڈیڑھ دو گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے لیکن پہاڑی علاقوں میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر گاڑی کی رفتار زیادہ تیز نہیں رکھی جاسکتی اس لیے یہ فاصلہ تقریباً دو گھنٹے میں طے ہوا تھا۔

تان سین میں ہم صرف چائے پینے کے لیے رکے تھے۔ اس کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوگیا۔ بٹوال وہاں سے تقریباً پچاس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا اور یہ فاصلہ ہم نے تقریباً ایک گھنٹے میں طے کرلیا۔

بٹوال پہاڑی سلسلے اور میدانی علاقے کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ خوب صورت قصبہ قدرتی مناظر کا ایک حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔ یہاں سے ایک سڑک پہاڑی اور میدانی علاقے کے درمیان انڈین سرحد کے ساتھ ساتھ سیکڑوں میل کا فاصلہ طے کرتی ہوئی تنک پور سے بھارتی سرحد میں داخل ہوجاتی ہے۔ اس سے آگے کاٹھ گودام اور نینی تال وغیرہ کے جنگلات شروع ہوجاتے ہیں۔ ہم اس راستے سے دلیش مکھ کا پیچھا کرتے ہوئے نیپال میں داخل ہوئے تھے لیکن اب ہمیں ہندوستان میں داخل ہونے کے لیے اتنا طویل راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بٹوال سے ایک سڑک بھیرہوا سے ہوتی ہوئی انڈیا کی سرحد پر واقع لم بین قصبے تک چلی گئی تھی۔ یہ قصبہ مہاتما بدھ کا جنم بھومی (جائے پیدائش) تھا۔ بدھ دھرم میں اسے مقدس ترین مقام سمجھا جاتا تھا۔ بٹوال سے لم بین کا فاصلہ بھی پچاس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ مہاتما کے نام سے موسوم یہ سڑک سدھارتھ ہائی وے کہلاتی تھی۔

بٹوال سے آگے میدانی علاقہ تھا۔ بڑا سرسبز و شاداب خطہ تھا یہاں چھوٹے چھوٹے دریاؤں اور ندی نالوں کی بھی بہتات تھی۔ اس ہائی وے پر اگرچہ اچھا خاصا ٹریفک تھا لیکن انسپکٹر بریندرا کو تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

رات دس بجے کے قریب ہم لم بین پہنچ گئے۔ اس وقت بھی قدیم طرز کے اس قصبے میں بڑی رونق نظر آرہی تھی۔ ہر طرف پیلی چادروں میں لپٹے ہوئے گنجے سروں والے بھکشو نظر آرہے تھے۔

اس قدیم قصبے میں کچھ جدید اور ماڈرن طرز کی عمارتیں بھی نظر آرہی تھیں۔ رہائشی ہوٹلوں کی بھی بہتات تھی۔ زیادہ تر ہوٹل سرائے قسم کے تھے جہاں ایک کمرے میں کئی کئی بھکشو رہائش اختیار کیے ہوئے تھے۔

سرحد یہاں سے چند کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ شام چھ بجے سرحد بند کردی جاتی تھی۔ اس لیے ہمیں رات لم بین ہی میں گزارنی پڑی۔ ہائی وے کے قریب ایک ہوٹل میں دو کمرے حاصل کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک کمرا شوبھا اور دھنو کو دے دیا گیا اور دوسرے کمرے میں بریندرا اور میں آگئے۔

ہوٹل کی عمارت دو منزلہ تھی۔ سامنے کے رخ پر بہت وسیع لان تھا اور پچھلی طرف کچھ فاصلے پر دریا بہہ رہا تھا جس کی دوسری طرف کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ ہمارا کمرا دوسری منزل پر تھا اور اس کی پچھلی طرف بھی ایک وسیع بالکونی تھی جہاں دو کرسیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

دھنو اور شوبھا والا کمرا ہمارے سامنے تھا۔ وہ کھانا کھانے کے فوراً ہی بعد سوگئی تھیں۔ میں اور بریندرا دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر بریندرا بھی سوگیا۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ گزرے ہوئے واقعات فلم کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ انسانی زندگی بھی کیا چیز ہے۔ حضرتِ انسان کو کس مقصد کے لیے زمین پر بھیجا گیا تھا۔ زمین پر تو روزِ اول ہی سے فساد شروع ہوگئے تھے جس کی بنیاد عورت اور زمین ہی بنی تھی اور یہ فساد آج تک جاری تھے۔ یہ دنیا کئی مرتبہ تباہ ہو کر پھر آباد ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ اسے قدرتی آفات نے اجاڑا تھا اور کئی مرتبہ یہ خود انسانوں کے ہاتھوں اجڑی تھی۔

میں یہ سب کچھ سوچتا رہا اور میرا دماغ چکراتا رہا۔ موسم نہایت خوشگوار تھا اور کمرے میں پنکھا بھی چل رہا تھا لیکن مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں بستر سے اٹھا اور آہستگی سے دروازہ کھول کر بالکونی میں آگیا۔ چہرے سے ٹکرانے والا تازہ ہوا کا جھونکا بہت اچھا لگا۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا اور بالکونی میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سرگوشیوں کی آواز سن کر میں چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو ساتھ والے کمرے کی بالکونی میں دو بدھ بھکشو بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی شاید میری طرح نیند نہیں آرہی تھی۔

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور پیر سامنے

دوسری کرسی پر پھیلا لیے۔ سامنے دریا کے کنارے پر چند مکانات تھے۔ ایک دو جگہوں پر روشنی نظر آرہی تھی۔ باقی مکان تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دریا کی دوسری طرف بہت دور کھیتوں میں بھی ایک جگہ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے ویرانے میں کسی مزار پر کوئی دیا جل رہا ہو۔

میں اس ٹمٹماتی ہوئی روشنی پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت اور سناٹا تھا اور اس سکوت میں میری سماعت سے وقفے وقفے سے ٹکرانے والی بھکشوؤں کی آوازیں بڑا پراسرار تاثر دے رہی تھیں اور پھر وہ سرگوشیاں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔

میرے دماغ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ میری نظریں اب بھی کھیتوں میں بہت دور ٹمٹماتی ہوئی اس روشنی پر مرکوز تھیں۔ پتا نہیں، کتنا وقت گزر گیا۔ دماغ پر غنودگی ہونے کے باوجود میں نے ایک مرتبہ بھی پلکیں نہیں جھپکی تھیں۔

دیے کی وہ ٹمٹماتی روشنی پھیلنے لگی۔ اس کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور اس نے تاریکی کے ایک بڑے حصے کو اپنے حصار میں لے لیا۔ روشنی کے اس ہالے کے عین بیچ میں روشنی کا ایک اور نقطہ چمکنے لگا۔ چاندنی جیسی دودھیا روشنی کا یہ نقطہ بھی پھیلتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دودھیا روشنی ایک انسانی ہیولے کی صورت اختیار کر گئی۔

اب میری نظریں روشنی کے اس ہیولے پر مرکوز تھیں۔ میں پلک جھپکے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں تھے۔

چاندنی کا وہ ہیولا ہوا میں تیرتا ہوا میری طرف آنے لگا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے جس کا ڈھیلا ڈھالا لباس ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہا تھا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ ہوا میں اٹھ رہے تھے۔

فاصلہ کم ہوتا گیا اور اس ہیولے کے چہرے کے نقوش بھی واضح ہونے لگے۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

وہ نیلگری تھی۔

نیلگری کے ہونٹوں پر وہی ملکوتی مسکراہٹ اور آنکھوں میں وہی ستاروں جیسی چمک تھی۔ وہ میرے قریب آگئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نیلگری کے دیش میں یہ تمہاری آخری رات ہے۔“ اس کی سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی ”میں تمہیں الوداع کہنے آئی ہوں اور تمہاری یہ امانت....“ اس نے ایک ہاتھ آگے کر دیا۔ مخروطی انگلیوں میں وہی مالا لٹکی ہوئی تھی ”اسے تم بدھا کی اس قدیم عبادت گاہ گومپو ہی میں بھول آئے آؤ۔ میں اسے تمہارے گلے میں پہنا دوں۔ یہ تمہیں یاد دلاتی رہے گی۔ کبھی ملنے کو دل چاہے تو اس کا بڑا پتھر میں ڈال کر چوس لینا۔ ویسے میں تمہارے آس پاس ہی ر گی۔ اچھا ہوگا کہ تم اپنا جاپ مکمل کرلو۔ میں ہمیشہ کے تمہاری ہو جاؤں گی۔ لو.... اب یہ گلے میں پہن لو۔“

میں بے اختیار ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ میں کچھ چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل نیلگری نے وہ مالا اپنے ہاتھوں سے میرے گلے میں پہناد وہ سیدھی ہو کر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی اور پھر میر چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیا اور آگے جھک کر میری پیشا بوسہ ثبت کر دیا۔ ایک عجیب سا سرور مجھ پر طاری چلا گیا۔ نیلگری سیدھی ہو گئی۔

”میں چلتی ہوں۔“ اس کی سرگوشی ابھری اور وہ ا قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔

نیلگری ایک بار پھر روشنی کے اس ہالے میں دا ہو گئی۔ اس کا چہرہ اب بھی مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ اس ہونٹوں پر اب بھی بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ چاندنی وجود سمٹنے لگا اور بالآخر ایک نقطے میں تبدیل ہو کر نگاہوں اوجھل ہو گیا۔ زرد روشنی کا ہالہ بھی سمٹتے ہوئے دیے ٹمٹماتی ہوئی لو میں تبدیل ہو گیا۔

اپنے کندھے پر بوجھ محسوس کر کے میں چونک گیا۔ کو مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔ میں بالکونی میں کر پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا اور انسپکٹر بریندرا مجھے جگا رہا تھا۔

میرے منہ سے بے اختیار گہرا سانس نکل گیا۔ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ دن کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سامنے د تک سرسبز لہلاتے ہوئے کھیت نظر آرہے تھے اور وہ جگ جہاں میں نے دیا جلتے دیکھا تھا، وہاں ایک چھوٹا سا مکان نظ آرہا تھا۔

”چھ بج رہے ہیں۔“ بریندرا کی آواز میری سماعت ٹکرائی ”اٹھ کر تیار ہو جاؤ تو ناشتا کرلیں۔“

کرسی سے اٹھتے ہوئے میرا ایک ہاتھ غیر ارادی طو میرے گلے پر پہنچ گیا اور دوسرے ہی لمحے میں اچھل پڑا نیلگری کی مالا میرے گلے میں موجود تھی۔

ہمیں کوئی جلدی نہیں تھی۔

اطمینان سے تیار ہو کر ہم نے ناشتا کیا اور دس بجے قریب سرحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ بارڈر پر پہنچنے میں ہمیں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

سرحدی چوکی کے محافظ بھی انسپکٹر بریندرا کی جان پہچان کے نکلے۔ چوکی کا انچارج کئی سال پہلے کھٹمنڈو میں رہ چکا تھا۔ اس نے بریندرا کو پہچان لیا اور ہم سب کو گاڑی سے اتار کر چوکی کے ریسٹ ہاؤس میں لے گیا جہاں پہلے مشروبات اور پھر چائے وغیرہ سے ہماری واضع کی گئی۔

ہمارے پاس اچھا خاصا سامان تھا۔ چوکی کے محافظوں ہی نے ہمارا سامان اٹھا کر نو مینز لینڈ پر رکھ دیا۔ انسپکٹر بریندرا نے ہمیں بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا اور ہم اپنا سامان اٹھا کر سرحد کی دوسری طرف آگئے جہاں ہمارا واسطہ بھارتی چوکی کے محافظوں سے پڑا۔ ہمارے سامان میں اگرچہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو قانون کی زد میں آتی ہو لیکن بھارتی چوکی پر امیگریشن اور کسٹمز کے اہلکاروں کا رویہ مختلف تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ہم ان سے جان چھڑا سکے تھے۔

چوکی سے نکلتے ہی ہمیں بس مل گئی جس نے ہمیں گورکھ پور پہنچا دیا۔ ہم نے وہ دن اور اس کے بعد کی رات گورکھ پور ہی میں گزاری اور اگلے روز صبح سویرے اپنے اگلے سفر پر روانہ ہوگئے اور لکھنؤ اور کانپور ہوتے ہوئے شام کے قریب آگرہ پہنچ گئے۔ اگرچہ شام کے بعد بھی آگرہ اور جے پور کے درمیان بسوں وغیرہ کی آمد رفت جاری رہتی تھی لیکن یہ رات ہم نے آگرہ میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

دھنو کے لیے یہ سفر خاصا دلچسپ ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی عمارتیں صرف کھٹمنڈو میں دیکھی تھیں لیکن یہاں بڑے شہروں کے بیچ سفر کرتے ہوئے فلک بوس عمارتیں دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں۔ اس کے لیے سب سے حیرت انگیز چیز ٹرین تھی۔ نیپال میں تو ٹرین کا تصور ہی نہیں تھا۔ گورکھ پور سے لکھنؤ تک ہم نے ٹرین ہی میں سفر کیا تھا اور اس سے آگے آگرہ تک کا فاصلہ بسوں میں طے ہوا تھا کیونکہ ٹرینوں کی آمدورفت کے اوقات مقرر تھے اور بس کسی بھی وقت مل سکتی تھی۔

آئندہ روز ہم آگرہ سے دہلی پہنچ گئے۔ رات دہلی میں گزارنے کے بعد دوسری صبح ہم جے پور جانے کے لیے "پنک سٹی ایکسپریس" میں سوار ہوگئے۔ مذکورہ ٹرین جے پور اور دہلی کے درمیان چلتی تھی اور دو سو ستر کلومیٹر کا یہ فاصلہ پانچ گھنٹے میں طے کرتی تھی۔ پلیٹ فارم پر موجود ایک قلی نے ہمارا سامان ایک بوگی میں پہنچا دیا۔ وہ چھ مسافروں کا کمپارٹمنٹ تھا۔ دو مسافر پہلے سے موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی جس نے دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی جس نے شوخ رنگوں والا راجستھانی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سر پر چنری تھی لیکن اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ بوڑھے نے اس کے پہلو میں کہنی سے ٹھوکا مارا تو اس نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا اور کھڑکی کی طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ بوڑھا بھی سرک کر اس کے ساتھ جڑ گیا۔ میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ جوان لڑکی اس بوڑھے کی بیوی تھی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ میں دوسری سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس طرح وہ لڑکی میرے سامنے تھی۔ بوڑھا اپنی سیٹ پر بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا اور لڑکی کو کہنیاں مار رہا تھا۔ میں اس کی بے چینی کی وجہ سمجھ گیا اور اس سیٹ سے اٹھ کر دوسری سیٹ پر چلا گیا۔ کھڑکی والی سیٹ پر میں نے دھنو کو بٹھا دیا تھا۔

وہ دونوں بھی جے پور ہی جارہے تھے۔ میں نے راستے میں بوڑھے سے دوستی کرلی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ یہ لڑکی اس کی تیسری بیوی ہے۔ دو بیویوں کا وہ اپنے ہاتھوں سے کریا کرم (آخری رسومات) کرچکا ہے اور یہ تیسری شادی اس نے دو مہینے پہلے کی تھی۔ وہ میتھورا بیوی کو اس کے میکے والوں سے ملوانے کے لیے جارہا تھا۔ اس کا پروگرام ایک ہفتہ وہاں رہنے کا تھا اور اس نے بیوی کو اپنے ساتھ ہی لے کر واپس جانا تھا۔ اس بوڑھے کی صحت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ لڑکی ودھوا (بیوہ) نہیں ہوگی بلکہ یہ بوڑھا ہی اپنی اس تیسری بیوی کی چتا کو بھی اپنے ہاتھوں سے آگ لگائے گا۔

ٹرین جے پور پہنچ گئی۔ ٹرین رکتے ہی پلیٹ فارم پر افراتفری سی مچ گئی۔ بہت سے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ بوڑھے اور اس کی نئی نویلی دلہن کے استقبال کے لیے بھی کچھ لوگ موجود تھے لیکن ہمارے استقبال کے لیے کوئی نہیں تھا۔ میں نے روپ متی یا ٹھاکر بھانوت کو اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ بہت عرصے سے میرا ان سے فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ گورکھ پور پہنچنے کے بعد پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ فون پر انہیں اطلاع دے دوں پھر یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ میں اچانک ان کے سامنے آکر انہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

شوبھا کا خیال تھا کہ اس کے مکان پر چلا جائے لیکن میں نے اس کی مخالفت کی کیونکہ اس کا مکان کم از کم چھ مہینوں سے بند پڑا تھا۔ وہاں تو اب مکڑیوں نے جالے تان رکھے ہوں گے۔

"روپ متی کے ہاں چلتے ہیں۔ اس وقت وہ گھر پر ہی

ہوگی۔ ٹھاکر کو بھی ہم وہیں بلالیں گے۔" میں نے کہا۔

اسٹیشن سے باہر آکر سامان ایک ٹیکسی پر لدوا دیا گیا۔ میں نے ڈرائیور کو روپ متی کی حویلی کا پتا دیا اور آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دھنو اور شوبھا پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔

حویلی کے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکی تو اسی وقت گیٹ کا ذیلی دروازہ بھی کھلا۔ وہ مندری تھی جو باہر نکل کر الجھی ہوئی نظروں سے ٹیکسی پر لدے ہوئے سامان اور پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی شوبھا اور دھنو کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر ابھی تک اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ میں دروازہ کھول کر نیچے اترا تو مجھے دیکھتے ہی مندری کا منہ اس طرح کھلے کا کھلا رہ گیا جیسے اس نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو پھر دوسرے ہی لمحے وہ چیختی ہوئی اندر کی طرف دوڑ گئی۔

میں نے دروازے کے اندر قدم رکھ دیا۔ لان میں کرسیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ مندری کو چیختے پاکر وہ سب مڑ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک عورت جھٹکے سے کرسی سے اٹھی۔ اس نے شاندار ساڑی پہن رکھی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے ساڑی سنبھالے دوڑتی ہوئی میری طرف لپکی اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ روپ متی تھی۔

روپ متی کا جوش و خروش قابلِ دید تھا۔ وہ بار بار میرا منہ چوم رہی تھی۔ لان میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی اٹھ کر ہماری طرف آگئے لیکن وہ سب چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

روپ متی نے دھنو اور شوبھا کا استقبال بھی بڑے پرجوش انداز میں کیا تھا۔ دونوں ملازم بھی بھاگے آئے تھے۔ ان میں ایک شنکر تھا جو ٹھاکر کی ٹیلے والی حویلی میں ہماری خدمت پر مامور تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے اچنبھا سا ہوا تھا لیکن جب میں نے دوبارہ روپ متی کی طرف دیکھا تو ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا۔

"میں تمہارے اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ ٹھاکر کہاں ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی فون کرتی ہوں۔ وہ بھاگا ہوا آئے گا۔" روپ متی نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی "بملا کہاں ہے؟"

"بملا!" میرے منہ سے گہرا سانس نکل گیا۔ میں جانتا تھا کہ بملا کو میرے ساتھ نہ دیکھ کر یہ سوال ضرور کیا جائے گا

"مجھے افسوس ہے روپ متی۔ میں بملا کی حفاظت نہیں کرسکا۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔"

"اوہ!" روپ متی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کا چہرہ لٹک گیا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی "تم لوگ اندر تو آؤ۔ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں کہ سب کو یہیں روک رکھا ہے۔ شنکر! سامان اتارو اور ٹیکسی والے کو فارغ کردو۔" اس نے آخری الفاظ شنکر سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔

دوسرا ملازم جسونت تھا۔ ان دونوں نے مل کر سامان اتار لیا ٹیکسی والے کو کرایہ بھی جسونت نے ادا کردیا تھا۔ ہم لوگ لان میں آگئے۔

"میرے دوستو!" روپ متی اپنے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "میں آپ حضرات سے ایک ایسی ہستی کا تعارف کرانا چاہتی ہوں جس کا تذکرہ ہم تھوڑی دیر پہلے بھی کررہے تھے۔ مجھے اور ٹھاکر کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اس ہستی کا بھی بڑا دخل ہے' تو ان سے ملیے۔ یہ ہیں ہمت سنگھ۔ میرے محسن اور مہان دوست!"

سب لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ان میں تین عورتیں اور چار مرد تھے۔ سب نے پہلے ہاتھ اٹھا کر پرنام (مخصوص سلام) کیا پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ایک خاتون تو میرے چرن (پاؤں) چھونے کو بھی جھک گئی تھی۔

ہم وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے شوبھا اور دھنو کا تعارف کرایا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس دوران میں سب لوگ بڑی گہری نظروں سے دھنو کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی۔" روپ متی میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "فی الحال صرف یہ بتاؤ کہ کہاں سے آرہے ہو اور تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"اگر اطلاع دے دیتا تو ملاقات میں اتنا مزہ تو نہ آتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "تم بتاؤ۔ یہ "واردات" کب ہوئی؟" میں نے اس کی مانگ میں بھرے ہوئے سیندور کی طرف دیکھا۔

"اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے دو ہفتے مزید انتظار کیوں نہیں کرلیا۔" روپ متی نے جواب دیا "تم بھی ہمارے بیاہ میں شریک ہوتے تو رونق بڑھ جاتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب رونق میلا کریں گے۔" میں نے کہا۔

مندری ہمارے لیے چائے لے آئی۔ اس کی خوشی بھی قابلِ دید تھی۔ اس نے ہمارے سامنے چائے رکھی اور روپ

متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
"میں نے جیجا جی (بہنوئی) کو فون کردیا ہے دیدی۔ (باجی) وہ آنے ہی والے ہیں۔"
"مندری کی بچی!" روپ متی چیخی "تم نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔ میں ٹھاکر کو فون کرکے کوئی ایسی بات کہتی کہ وہ چکرا جاتا اور یہاں آکر ہمت سنگھ کو دیکھتا تو مارے خوشی کے بے ہوش ہوجاتا۔ چل بھاگ یہاں سے۔ سارا مزہ کرکرا کردیا۔"
مندری ہنستی ہوئی چلی گئی۔ روپ متی پہلے بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اسے چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی تھی اور اب شاید وہ ایک دوسرے کے کچھ اور قریب آگئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ مندری اس کی ملازمہ ہے۔
تقریباً ایک گھنٹے بعد ٹھاکر بھی آگیا۔ اس کے ملنے کے انداز میں بھی گرم جوشی نمایاں تھی۔ وہ بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتانے لگا کہ میں کون ہوں جبکہ روپ متی انہیں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ٹھاکر، شوبھا سے بڑی گرم جوشی سے ملا تھا۔
باتوں میں وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ اب تک کے طویل سفر کی دھول نے ہمارے حلئے بگاڑ رکھے تھے اور کسی کو بھی ہماری حالت کا خیال نہیں آیا تھا۔ بالآخر میں نے ہی ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی۔
"اگر اجازت ہو تو ہم اپنے حلئے درست کرلیں؟"
"ارے۔ مجھے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔" روپ متی ایک جھٹکے سے اٹھ گئی "آؤ۔ آؤ۔ اندر چلو۔ میں تم لوگوں کو غسل خانوں کا راستہ دکھاؤں۔"
ہم روپ متی کے ساتھ حویلی میں آگئے۔ ہمارا سامان پہلے ہی اندر پہنچایا جاچکا تھا۔ شوبھا اور دھنو نے اپنے اپنے بیگ کھول لیے اور میں اپنے بیگ سے کپڑے نکال کر ایک کمرے میں گھس گیا۔
تقریباً پون گھنٹے بعد میں تیار ہو کر باہر نکلا۔ روپ متی اور ٹھاکر اس وقت بھی لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے مہمان جاچکے تھے۔ ٹھاکر اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ایک گھنٹا پہلے کی ملاقات سے شاید اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شوبھا اور دھنو بھی آگئیں۔ ان دونوں نے ساڑیاں پہنی تھیں۔ دھنو سڈول جسم اور دراز قامت کی مالک تھی۔ سرخ و سفید رنگت پر نیلے رنگ کی ساڑی اس پر خوب جچ رہی تھی۔ ٹھاکر بار بار کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے بھی بلا کے بارے میں سوال کرڈالا۔ میرے خیال میں روپ متی اسے بتا چکی تھی کہ بلا اب دنیا میں نہیں رہی۔
"لمبی کہانی ہے۔" میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "بعد میں بتاؤں گا۔ اس وقت میں کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔"
ٹھاکر نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ مندری نے آکر بتایا کہ کھانا لگ چکا ہے۔ ہم لان سے اٹھ کر اندر آگئے۔ لمبی چوڑی میز انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی تھی۔ مندری نے مختصر سے وقت میں بڑا زبردست اہتمام کر رکھا تھا۔
کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں بیٹھ گئے لیکن کچھ ہی دیر بعد ٹھاکر مجھے لے کر اٹھ گیا اور روپ متی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم لوگ گپ شپ کرو۔ ہم ایک گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔"
ہم دونوں حویلی سے باہر آگئے۔ گیٹ کے سامنے ہی ٹھاکر کی شان دار کار کھڑی تھی۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹھاکر نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ کار حرکت میں آکر ایک دو گلیوں میں گھومنے کے بعد مین روڈ پر آگئی۔
میں بہت عرصے بعد جے پور آیا تھا۔ وہی کوچے بازار تھے، وہی رونق تھی، وہی کشادہ سڑکیں اور ان سڑکوں پر وہی گہما گہمی تھی۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا مگر مجھے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔
کار مختلف سڑکوں پر گھومتی ہوئی ایم آئی روڈ پر آکر ایک خوب صورت دو منزلہ بلڈنگ کے سامنے رک گئی۔ گراؤنڈ فلور پر وہی کافی ہاؤس تھا جہاں سونیا سے میری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ یہ شوبھا والا کافی ہاؤس تھا۔ میں نے کار سے اترتے ہوئے بلڈنگ کی طرف دیکھا۔ نیا رنگ و روغن کیا ہوا تھا۔ اوپر کی منزل میں کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔ سامنے کے رخ پر جہازی سائز کے ٹنٹڈ گلاس لگے ہوئے تھے۔ اس شیشے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں صرف ایک طرف سے دیکھا جاسکتا ہے۔
ہم اندر آگئے۔ یہ ہال بھی پہلے سے خاصا وسیع ہوگیا تھا۔ غالباً پچھلا پورشن بھی ہال میں شامل کرلیا گیا تھا۔ داخلی دروازے کی بائیں طرف ذرا آگے اوپر جانے کا زینہ تھا جس پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ہم اوپر آگئے۔
اوپر بھی ایسا ہی وسیع ہال تھا۔ مناسب فاصلوں پر میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ گول میزیں عام میزوں سے اونچائی میں کم تھیں اور ان کے گرد رکھی ہوئی کرسیاں اتنی آرام دہ تھیں کہ گھنٹوں بیٹھا جاسکتا تھا۔ روشنیوں کا انتظام بھی بہت عمدہ تھا۔ کہیں بھی تیز روشنی نہیں تھی۔ دیواروں سے مدھم موسیقی کی لہریں پھوٹتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ یہ ہال بھی نچلے ہال کی طرح ائر کنڈیشنڈ تھا اور زیریں ہال کی طرح یہاں بھی کوئی میز خالی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گاہکوں میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔

ہم زیریں ہال میں آگئے۔ کاؤنٹر پر ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ٹھاکر کو دیکھ کر اٹھنا چاہا لیکن ٹھاکر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا ایک طرف بڑھ گیا۔
"ہم دفتر میں بیٹھ سکتے تھے۔" ٹھاکر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہال کی پچھلی طرف اشارہ کیا "لیکن یہاں بیٹھنا کچھ اچھا لگتا ہے۔"
جب میں پہلی مرتبہ اس کافی ہاؤس میں آیا تھا تو یہاں ویٹریس کام کرتی تھیں لیکن اب کوئی بھی لڑکی نظر نہیں آرہی تھی۔ تمام مرد ویٹر تھے۔ سفید براق ڈریس میں وہ بڑے اسمارٹ نظر آرہے تھے۔ ٹھاکر نے ایک ویٹر کو کافی کے لیے کہہ دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
"یہ شوبھا والا کافی ہاؤس ہے۔ میں نے اس کی اجازت کے بغیر اس میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔"
"وہ تبدیلیاں مجھے نظر آرہی ہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن تم نے تو اس کافی ہاؤس کا سودا کرلیا تھا نا۔ تمہیں تبدیلیاں کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔"
"سودا زبانی ہوا تھا اور میں نے اسے کوئی ادائیگی بھی نہیں کی تھی۔" ٹھاکر نے کہا "دراصل پہلی مرتبہ رشی کیش میں شوبھا سے بات ہوئی تھی تو واپس آتے ہی میں نے اس بلڈنگ پر کام شروع کروا دیا تھا۔ اوپر کی منزل پر فلیٹ کی طرح کمرے تھے جو میں نے تڑوا دیے۔ اس دوران میں اطلاع ملی کہ شوبھا کو دیش مکھ اٹھا کرلے گیا ہے۔ میں اس کے لیے پریشان تو بہت تھا لیکن یہاں میں نے کام جاری رکھا۔"
وہ چند لمحوں کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "میں نے اس کافی ہاؤس کا افتتاح کرکے روپ متی کے نام سے اکاؤنٹ کھلوا دیا۔ یہ منیجر وہی ہے جو شوبھا کے دور میں تھا۔ بینک اکاؤنٹ اگرچہ روپ متی کے نام پر ہے لیکن وہ صرف چیک پر دستخط کرتی ہے جبکہ سارا حساب کتاب سروپ چند کے ہاتھ میں ہی ہے اور میں سارے بزنس کی نگرانی کرتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔ ویٹر نے ہمارے سامنے کافی سرو کردی۔
"مجھے یقین تھا، شوبھا کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ضرور واپس آئے گی۔" ٹھاکر نے اپنے سامنے رکھا ہوا مگ اٹھاتے ہوئے کہا "میں نے اس کا بزنس اور سارا حساب کتاب امانت کے طور پر سنبھالا ہوا ہے۔ اب وہ آگئی ہے۔ اسے صحیح سلامت اور تندرست دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ وہ چند روز آرام کرلے تو میں اس کی امانت اس کے سپرد کردوں گا۔"
"میں نے دنیا میں بہت کم ایسے افراد دیکھے ہیں جو اپنے سینے میں ایسے جذبات رکھتے ہیں۔" میں نے کہا "شوبھا یقیناً یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوگی۔" میں نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے شوبھا کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح مرمر کر بچی ہے۔
اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے لیکن کافی ہاؤس کی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ گاہکوں کی آمدورفت اسی طرح جاری تھی۔ ٹھاکر بتا رہا تھا کہ رات دو بجے جب ریسٹورنٹ بند کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی یہاں اسی طرح گاہک موجود ہوتے ہیں۔ انہیں معذرت کرکے بڑی مشکل سے باہر نکالا جاتا ہے۔
ایک بجے ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ ٹھاکر نے منیجر سروپ چند کو کچھ ہدایات دیں اور ہم کافی ہاؤس سے باہر آگئے۔ اس سے آگے اسٹیشن روڈ پر ٹھاکر کا اپنا وکرم ہوٹل کا ریسٹورنٹ بھی رات دو بجے تک کھلا رہتا تھا۔ واپس آتے ہوئے ہم کچھ دیر وہاں بھی رکے اور جب گھر پہنچے تو دو بج چکے تھے۔
دھنو سو چکی تھی لیکن شوبھا اور روپ متی جاگ رہی تھیں۔
"تم لوگ ایک گھنٹے کا کہہ کر گئے تھے اور اب آرہے ہو؟" روپ متی نے کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت نمایاں تھی۔
"کافی ہاؤس میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے تو وقت گزرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔" ٹھاکر نے جواب دیا۔
ہم بھی وہیں بیٹھ گئے اور جب باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو واقعی وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے اپنی کہانی سنانے کے لیے اگرچہ کئی راتیں درکار تھیں لیکن میں رشی کیش میں شوبھا کے اغوا سے لے کر اب تک کے واقعات نہایت مختصر طور پر بتا رہا تھا۔
اس دوران میں بلا کا ذکر بھی آیا تھا جس سے تھوڑی دیر کے لیے فضا سوگوار ہوگئی تھی۔
صبح چار بجے تک ہماری باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمارے سونے کا بندوبست اوپر کی منزل پر کیا گیا تھا تاہم دھنو نیچے ہی ایک کمرے میں سوگئی تھی اور اس وقت اسے جگانا

مناسب نہیں سمجھا گیا۔

روپ متی ہمیں اوپر لے آئی۔ کئی کمرے تھے اور سب کے سب آراستہ۔ میں نے اس کمرے پر قبضہ کرلیا جہاں پہلے روپ متی رہا کرتی تھی اور میں بھی کئی روز تک اسی کمرے میں سویا تھا۔

شوبھا اتنی بڑی حویلی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"میں نے روپ متی کے بارے میں بہت قصے کہانیاں سنی تھیں لیکن یہ تو بہت مختلف ثابت ہوئی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی رانی روپ متی ہے جس کے بارے میں ہر روز ایک نئی کہانی سنی جاتی تھی۔" یہ بات شوبھا نے اس وقت کہی تھی جب ہم دونوں اوپر والے ہال میں کھڑے تھے اور اسی وقت روپ متی اس کمرے سے برآمد ہو رہی تھی جو شوبھا کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس نے شاید شوبھا کی بات سن لی تھی۔

"روپ متی کی شخصیت میں اس تبدیلی کے لیے مجھے ہمت سنگھ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔" اس نے کہا اور قریب آکر میرے کندھے پر سر ٹکا کر کھڑی ہوگئی "یہ شخص اگر میری زندگی میں نہ آتا تو میں آج بھی گندگی کی دلدل میں پڑی ہوتی۔ میں تو جیون (زندگی) کے آخری لمحوں تک ہمت سنگھ کا احسان نہیں بھول سکتی۔"

بات کرتے ہوئے روپ متی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر کندھا تھپتھپانے لگا۔

"زندگی میں اگر یہ نشیب و فراز نہ ہوں تو جینے کا مزہ نہیں آتا۔" میں نے کہا "مجھے دیکھ لو۔ کیسے کیسے مصائب سے دوچار رہا ہوں لیکن میں نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔"

"اسی لیے تو میں نے تمہارا نام ہمت سنگھ رکھا تھا۔" روپ متی بولی اور مجھے یاد آگیا کہ مجھے یہ نام واقعی روپ متی نے ہی دیا تھا۔

"اب سونے کا ارادہ ہے یا رات کا باقی حصہ بھی یونہی کھڑے کھڑے باتوں میں گزار دو گی۔" میں نے کہا۔

"سوری جی۔" روپ متی مسکرا دی "ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح باتیں ہوں گی۔"

روپ متی نیچے چلی گئی۔ میں شوبھا کے ساتھ اس کے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر وہاں کھڑا اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر اپنے کمرے میں آگیا۔ بستر پر گرتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ باقی سب لوگ مجھ سے پہلے جاگ چکے تھے۔ ٹھاکر تو صبح سات بجے ہی ہوٹل چلا گیا۔ یہ اس کی بڑی اچھی عادت تھی کہ اپنے کام کی طرف سے اس نے کبھی غفلت نہیں برتی تھی۔ وہ کاروبار پر پوری توجہ دیتا تھا۔

میرے جاگنے سے پہلے دھنو اور شوبھا نے گھوم پھر کر پوری حویلی دیکھ لی تھی۔ دھنو کی زندگی تو ایک عبادت گاہ میں گزری تھی۔ شوبھا اگرچہ جے پور میں ہی رہی تھی لیکن اس قسم کی محل نما حویلی میں آنے کا اس کا پہلا موقع تھا اور وہ راجاؤں، مہاراجاؤں کی زندگیوں کے بارے میں بار بار حیرت کا اظہار کر رہی تھی۔ جے پور میں اگرچہ حویلیوں اور محلات کی بھرمار تھی۔ اس نے تفریح کی غرض سے کئی محلات دیکھے بھی تھے لیکن کسی حویلی میں رہنے کی بات دوسری تھی۔

ساڑھے گیارہ بجے ٹھاکر کا فون آگیا۔ کچھ دیر روپ متی اس سے بات کرتی رہی پھر اس نے ریسیور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے تقریباً دس منٹ اس سے بات کی اور پھر ریسیور رکھ دیا۔

"شوبھا۔" میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری عدم موجودگی میں تمہارا کافی ہاؤس بند رہا ہے۔ سنا ہے بلڈنگ کی حالت بھی بہت بری ہے۔ چلو ذرا دیکھ آئیں۔ اسے ٹھیک ٹھاک کرانے میں پیسہ بھی بہت خرچ ہوگا اور وقت بھی بہت لگے گا۔"

شوبھا کی آنکھوں میں تشویش کی لہریں ابھر آئیں۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد ہم سب روپ متی کی چم چماتی ہوئی گاڑی میں سوار ایم آئی روڈ کی طرف جا رہے تھے۔

گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے رکی تو کار سے اترتے ہی شوبھا اس طرح ٹھٹک کر رک گئی جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہوں۔ وہ متوحش نظروں سے بلڈنگ کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

ٹھاکر کافی ہاؤس کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ ہمارے استقبال کے لیے وہ چند قدم آگے آگیا اور جب ہم اس کے ساتھ کافی ہاؤس میں داخل ہوئے تو شوبھا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ منیجر سروپ چند نے بھی چرن (قدم) چھو کر اس کا استقبال کیا تھا۔ کافی ہاؤس میں اس وقت بھی کوئی میز خالی نہیں تھی۔ اوپر سے نیچے تک گھومنے کے بعد ہم دفتر میں آگئے۔ دفتر بھی بہت کشادہ تھا اور شاندار فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہم سب صوفوں پر بیٹھ گئے تو تھوڑی دیر بعد ایک ویٹر نے ہمارے سامنے کافی سرو کردی۔

"آپ کے آجانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی شوبھا دیدی۔" ٹھاکر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ کی اجازت کے بغیر میں نے اس بلڈنگ میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں لیکن یہ آپ کی امانت ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ ابھی اور اسی وقت اپنی یہ امانت سنبھال لیں۔ سارا حساب کتاب سروپ چند کے پاس موجود ہے۔ اکاؤنٹ روپ متی کے نام پر ہے جسے کل آپ کے نام منتقل کیا جاسکتا ہے۔"

"مجھے نہ تو اپنی آنکھوں پر یقین آرہا ہے اور نہ ہی کانوں پر۔" شوبھا بولی "اس کافی ہاؤس کا تو تم سے سودا۔۔۔"

"وہ زبانی بات تھی اور میں نے آپ کو کوئی ادائیگی نہیں کی تھی۔" ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی "میں نے امانت سمجھ کر اس بزنس کو سنبھال رکھا تھا۔ اب یہ آپ کے سپرد ہے دیدی۔"

"نہیں بھیا، نہیں۔" شوبھا گویا پھٹ پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انسان بھی عجیب چیز ہے۔ خوشی بھی ملتی ہے تو دل بھر آتا ہے اور آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ روپ متی اور ٹھاکر اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ روپ متی نے اسے بازو میں لپیٹ کر اپنے اوپر کھینچ لیا اور ٹھاکر اس کا کندھا تھپتھپانے لگا۔

شوبھا کافی دیر بعد اپنی کیفیت پر قابو پاسکی تھی۔

"لیکن شوبھا رہے گی کہاں؟ اس کے گھر کو تو تم نے کافی ہاؤس بنا دیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہمت سنگھ۔" روپ متی نے گھورتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا "اتنی بڑی حویلی کو میں نے اپنا مقبرہ نہیں بنانا۔ شوبھا دیدی ہمارے ساتھ اسی حویلی میں رہے گی۔ اب تم کوئی نیا شوشہ مت چھوڑنا۔ سمجھے۔"

"سمجھ گیا مالکن۔" میں نے جواب دیا۔

"شٹ اپ!" روپ متی چیخی "اب میں تمہارے منہ سے مذاق میں بھی ایسی کوئی بات نہ سنوں۔" سمجھے۔۔۔"

"سمجھ گیا ما۔۔۔" میں نے شرارتاً جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے۔ بالآخر طے یہ ہوا کہ کافی ہاؤس کا نظام جس طرح چل رہا ہے ویسے ہی چلنے دیا جائے اور شوبھا حویلی میں ان لوگوں کے ساتھ رہے گی۔ ظاہر ہے، دھنو کے بارے میں یہی طے ہوا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ رہے گی۔

شوبھا، سروپ چند کے ساتھ ایک بار پھر اوپر سے نیچے تک کافی ہاؤس کا جائزہ لیتی رہی۔ تقریباً دو گھنٹوں بعد ہم کافی ہاؤس سے اٹھ کر وکرم ہوٹل میں آگئے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے یہیں پر کھایا۔ چار بجے کے قریب، ہم دھنو کو شہر کی سیر کرانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ٹھاکر تو ہوٹل ہی میں رہ گیا تھا۔ کار میں شوبھا آگے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اسٹیئرنگ روپ متی کے کنٹرول میں تھا اور میں دھنو کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی ہلکی رفتار سے شہر کی سڑکوں پر گھومتی رہی اور بالآخر آٹھ بجے کے قریب ہم حویلی واپس آگئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ٹھاکر بھی پہنچ گیا۔

تمام معاملات طے ہو چکے تھے۔ میرے جانے کے بعد روپ متی اور میرے تعلقات کے حوالے سے پنڈتوں کے کچھ ہنگامے جاری رہے تھے لیکن ٹھاکر اور روپ متی ان سے نمٹتے رہے اور ان کی شادی کے بعد بالآخر پنڈتوں کی زبانیں بھی بند ہوگئیں۔

میں یہاں سے جانے کا پروگرام بنانے لگا تو دھنو نے ایک اور ٹنٹا کھڑا کردیا۔ وہ یہاں رہنے کو تیار نہیں تھی اور میرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ یہ میرے لیے ایک نیا مسئلہ تھا۔ روپ متی، شوبھا اور ٹھاکر اسے سمجھاتے رہے لیکن وہ مان کر نہیں دی اور بضد رہی کہ میں جہاں جاؤں گا وہ میرے ساتھ رہے گی اور بالآخر مجھے ہی ہتھیار ڈالنے پڑے۔

میں تو فوری طور پر یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا لیکن روپ متی اور ٹھاکر کچھ دنوں کے لیے مجھے روکنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ میں ان کی شادی میں شریک نہیں تھا اس لیے وہ میرے اعزاز میں ایک زوردار پارٹی دینا چاہتے تھے۔ اس سے اگلے ہی روز ٹھاکر کی ٹیلے والی حویلی میں پارٹی کے انتظامات شروع کردیے گئے۔

دعوت کے لیے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ رکھی گئی تھی۔ اس سے پہلے مجھے ٹیلے والی حویلی کی طرف جانے بھی نہیں دیا گیا۔ دعوت والے روز شام کو ہم وہاں پہنچے تو حویلی کو دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ در و دیوار رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ حویلی کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب مہمانوں کی آمد شروع ہوگئی۔ حویلی کے سامنے دور تک چمچماتی گاڑیوں کی قطاریں لگتی گئیں۔ روپ متی بھی ایک راج کماری تھی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ بھی ایک سابق ریاست کے دیوان کا بیٹا تھا۔ اس دعوت میں نہ صرف جے پور بلکہ راجستھان کی کئی سابق ریاستوں کے سابق راجے، مہاراجے، راج کمار، راجکماریاں، بڑے بڑے رئیس اور اعلیٰ سرکاری افسران مدعو تھے۔ یہی سب لوگ ان دونوں کی شادی میں بھی شریک تھے۔

اس وقت بھی شادی کا سا ہی سماں تھا۔ ہر طرف رنگ برنگے زرق برق لباس لہراتے نظر آرہے تھے۔ حویلی کے وسیع

وعریض ہال میں بھی انتظام تھا اور وسیع وعریض لان میں بھی میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ باوردی ویٹر مشروبات سرو کرتے پھر رہے تھے۔

ہوٹلوں اور نائٹ کلبوں میں تو میں کئی مرتبہ جا چکا تھا لیکن اس قسم کی کسی شاہانہ گھریلو تقریب میں پہلی مرتبہ شریک ہوا تھا۔ میں اپنے آپ میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں اسی جے پور میں پولیس کو سب سے زیادہ مطلوب تھا۔ پولیس شکاری کتوں کی طرح میرے تعاقب میں لگی رہتی تھی لیکن وہ سب کنور بلونت سنگھ جیسے بدمعاشوں اور متعصب پنڈتوں کی سازشیں تھیں اور اب روپ متی اور ٹھاکر بڑے فخر سے شہر کے معززین اور اعلیٰ سرکاری آفیسروں سے میرا تعارف کرا رہے تھے۔

"ان سے ملئے۔ یہ ہیں ہمت سنگھ جن کے اعزاز میں آج کی اس دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

جے پور میں میرا نام اجنبی نہیں رہا تھا۔ جے پور میں تو ہمت سنگھ ایک افسانوی کردار بن چکا تھا۔ روپ متی اور ٹھاکر نے بھی اس نام کو افسانوی رنگ دینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ مجھے انسان نہیں دیوتا سمجھتے تھے۔

لوگ مجھ سے ہاتھ ملانے میں بھی بڑا فخر محسوس کر رہے تھے۔ ٹھاکر نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ دلیش مکھ جیسے بدمعاش کو بھی نیپال تک پیچھا کر کے میں نے ہی ختم کیا تھا۔

دعوتِ طعام کے بعد راگ رنگ کی محفل جم گئی۔ اگرچہ جے پور کی چوٹی کی رقاصاؤں اور گانے والیوں کو بلایا گیا تھا لیکن مہمانوں ہی میں درجنوں ایسی خواتین موجود تھیں جو اس فن میں ماہر تھیں۔ انہوں نے پیشہ ور رقاصاؤں کو آگے آنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ خود روپ متی اور مندری کے رقص نے تو رنگ جما دیا۔ دھنو نے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ساری محفل دھنو ہی نے لوٹ لی تھی۔

یہ محفل رات کے آخری پہر تک جاری رہی۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ مجھے آج بھی یاد ہے، مہمانوں کی آخری ٹولی صبح پانچ بجے رخصت ہوئی تھی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ہم جو سوئے ہیں تو شام تک ہوش ہی نہیں رہا۔

دو تین دن اور گزر گئے۔ اس دوران میں ٹھاکر یہ کوشش کرتا رہا کہ ہمارے کاغذات بن جائیں اور ہم قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان جائیں لیکن اس میں کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ کچھ قانونی رکاوٹیں تھیں۔ اگرچہ جعلی کاغذات بڑی آسانی سے بن سکتے تھے لیکن میں نے ٹھاکر کو منع کر دیا اور بالآخر ایک روز ہم نے وہاں سے رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

ٹھاکر نے کچھ لوگوں سے مل کر پورا پروگرام تیار کرلیا تھا۔ پاکستان کی سرحد کی طرف جانے کے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہم مکرانہ، ناگور، پوکھران سے ہوتے ہوئے جیسلمیر جاتے اور وہاں سے چالیس کلومیٹر آگے کسی جگہ سے سرحد پار کرنے کی کوشش کرتے۔ دوسرا راستہ اجمیر، مارواڑ اور دل واڑہ سے ہوتا ہوا ماؤنٹ آبو تک جاتا تھا۔ وہاں سے آگے صوبہ گجرات میں داخل ہو کر رن کچھ کی طرف سے آسانی سے سرحد عبور کی جا سکتی تھی اور ٹھاکر نے جن لوگوں سے بات کی تھی انہوں نے بھی ہمیں یہی راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

روپ متی اور شوبھا بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھیں لیکن ہم دونوں نے ہی انہیں سختی سے منع کر دیا۔ اس روز صبح چھ بجے ہم روانہ ہونے لگے تو بڑا رقت آمیز منظر تھا۔ شوبھا اور روپ متی مجھ سے لپٹ کر اس طرح رو رہی تھیں جیسے ان کا کوئی اپنا، بہت قریبی عزیز ان سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہو۔

ٹھاکر کی ائرکنڈیشنڈ لینڈ کروزر بڑی شان دار تھی۔ دھنو پچھلی سیٹ پر تھی اور میں اگلی سیٹ پر جبکہ ٹھاکر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ٹھاکر نے احتیاطاً جسونت کو بھی ساتھ لے لیا تھا اور وہ سب سے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

گاڑی شہر سے نکل کر اجمیر کی طرف جانے والی ہائی وے پر دوڑنے لگی۔ سڑک پر اچھا خاصا ٹریفک تھا لیکن ٹھاکر کو تیز رفتاری سے گاڑی چلانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔

دھنو کی زندگی پہاڑی علاقوں میں گزری تھی۔ اس نے میرے ساتھ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں سفر کیا تھا اور اب اس صحرائی سفر سے بھی خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اجمیر تک ایک سو دس کلومیٹر کا سفر ہم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں طے کرلیا۔ یہاں ہم تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر آگے روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے کھانے کے لیے ہمیں پالی میں رکنا پڑا۔ یہاں ہم نے کچھ دیر آرام بھی کیا اور پھر رکے بغیر ہمارا سفر جاری رہا۔ پالی سے ڈرائیونگ کی ذمے داری جسونت نے سنبھال لی تھی اور میں اور ٹھاکر بھی پچھلی سیٹ پر آ گئے تھے۔ دھنو اپنی سیٹ پر نیم دراز اونگھنے لگی تھی۔

تقریباً پانچ سو بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ہم سہ پہر چار بجے کے قریب ماؤنٹ آبو پہنچ گئے۔ بڑا خوب صورت ہل اسٹیشن تھا۔ اس طرف سے ٹرین کی آمدورفت بھی تھی لیکن

ریلوے اسٹیشن شہر سے تقریباً تیس کلومیٹر دور تھا۔

ہماری منزل رن کچھ میں واقع "سوئی گام" نامی وہ گاؤں تھا جو پاکستان کی سرحد سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہمیں جس آدمی کے ساتھ سرحد پار کرنی تھی وہ آدمی سوئی گام ہی میں ہمارا منتظر تھا لیکن شام کے بعد اس طرف کا سفر کرنا مناسب نہیں تھا اس لیے رات کو ہم نے ماؤنٹ آبو ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ماؤنٹ آبو میں یوں تو کئی بہت اچھے رہائشی ہوٹل بھی تھے لیکن ٹھاکر نے سرکٹ ہاؤس میں انتظام کیا تھا۔

دن بھر کے سفر سے ہم تھک گئے تھے۔ رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا گیا اور گیارہ بجے کے قریب میں سو چکا تھا۔

صبح ناشتا کر کے ہم نو بجے کے قریب اگلے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ راستہ خاصا دشوار ثابت ہوا تھا۔ سڑک جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ کہیں تو سڑک ہی غائب تھی۔ ریگستان میں بھٹک جانے کا اندیشہ بھی تھا لیکن ایسا کوئی سانحہ پیش نہیں آیا اور ہم دوپہر کے قریب سوئی گام پہنچ گئے۔

دھرم چند کی حویلی گاؤں کے آخری سرے پر آبادی سے ذرا ہٹ کر واقع تھی۔ ہم نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی جس شخص سے دھرم چند کے بارے میں پوچھا تھا وہی ہمیں حویلی تک لے گیا تھا۔

حویلی کے وسیع وعریض کمپاؤنڈ میں چاروں طرف سایہ دار درختوں کی بہتات تھی۔ ظاہر ہے، گاؤں کی یہ حویلی جے پور جیسی حویلیوں سے بہت مختلف تھی لیکن بہرحال دھرم چند گاؤں کا مکھیا بھی تھا اور سب سے دولت مند آدمی بھی اس لیے اس کی حویلی گاؤں کے دیگر مکانات سے مختلف تھی۔

حویلی کے برآمدے میں دھرم چند نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے ساتھ رام نام کا وہ آدمی بھی تھا جس نے ہمیں سرحد پار پہنچانا تھا۔ وہ دبلا پتلا لمبے قد کا آدمی تھا۔

ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ہماری خاطر تواضع کا بندوبست کیا گیا تھا اور کھانے کے بعد ایک نوکر ہمیں مہمان خانے میں لے آیا۔ رام بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر وہ ہمیں پروگرام سمجھانے لگا۔

رام کے جانے کے بعد میں اور ٹھاکر تو باتیں کرتے رہے اور دھنو چارپائی پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی تھی۔

رات کے کھانے کے بعد ہم ایک جیپ میں سوار ہو گئے۔ ٹھاکر بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دھرم چند کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط دے دیا جو سرحد کی دوسری طرف نگرپارکر نامی گاؤں میں پہنچ کر کشوری لال نامی ایک آدمی کو دینا تھا۔ کشوری لال یہ خط دیکھ کر مجھے پچاس ہزار روپے مالیت کی پاکستانی کرنسی دے دیتا۔ اس کے عوض ٹھاکر نے رقم یہاں دھرم چند کو دے دی تھی۔

جیپ ریگستان میں ایک جگہ رک گئی۔ وہاں دس اونٹوں پر مشتمل ایک قافلہ ہمارا منتظر تھا۔ اس قافلے میں تین آدمی تھے۔ ان سب نے کالے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ اسمگلروں کی ایک پارٹی تھی جس کا سربراہ ہربنس نامی ایک آدمی تھا۔ وہ بھی دبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہا تھا اور پھر اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔

دھنو اور میں ٹھاکر بھانوت سنگھ سے گلے ملے۔ یہ ہماری الوداعی ملاقات تھی۔

مجھے اور دھنو کو الگ الگ اونٹوں پر سوار کرا دیا گیا۔ ہمیں اچھی طرح سمجھا دیا گیا کہ ہم اپنے آپ کو اونٹوں پر کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔

میں نے غیر قانونی طور پر دنیا کے کئی ملکوں کی سرحدیں پار کی تھیں لیکن اونٹ پر سرحد پار کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ نیلگری کے پہاڑوں میں خچر کی ننگی پیٹھ پر طویل سفر کرنے کا تجربہ ہو چکا تھا لیکن اونٹ پر سواری کی اور بات تھی۔

اونٹ جب اٹھ کر کھڑے ہوئے تو دھنو بے اختیار چیخ اٹھی تھی۔ ریگستان کے اس جہاز پر سفر کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آگیا جب راجستھان کے صحرا میں ہوائی جہاز کی تباہی کے بعد ہم ڈاکوؤں اور بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئے تھے اور ہمیں اونٹوں پر بٹھا کر غلاموں کی منڈی تک لے جایا گیا تھا۔

ٹھاکر اور رام جیپ کے پاس ہی کھڑے رہ گئے اور ہمارا قافلہ سرحد کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب سے آگے ہربنس کا اونٹ تھا۔ اونٹوں کی رفتار بتدریج تیز ہو رہی تھی۔ میں نے اپنا اونٹ دھنو کے قریب کر لیا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے آگے کو جھک کر کجاوے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے منہ سے ڈری ڈری سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

اچانک ہی کسی طرف سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ فائر کی آواز اگرچہ بہت دور سے سنائی دی تھی لیکن وہ سناٹے میں دور تک پھیل گئی تھی۔

"جلدی۔ تیز..." ہربنس چیخا۔

اونٹ ایک دم بھاگ کھڑے ہوئے۔ دھنو کے منہ سے

خوفناک چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ اچھل رہی تھی اور اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اس نے بڑی مضبوطی سے کجاوے پر گرفت جمار کھی تھی۔

فائرنگ کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو پارٹیوں میں ٹھن گئی ہو اور خطرناک بات یہ تھی کہ فائرنگ کی وہ آوازیں بتدریج ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں۔

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ہم سرحد کے عین اوپر تھے۔ دھنو اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکی اور اچھل کر اونٹ سے گر گئی۔ اس کے منہ سے بڑی خوفناک چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے بھی اپنے اونٹ سے چھلانگ لگا دی۔

دوسرے اونٹ دوڑتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ہربنس یا اس کے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اپنا اونٹ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دوڑتا ہوا دھنو کے قریب پہنچ گیا۔ وہ ریت پر پڑی چیخ رہی تھی۔

میں دھنو کو اٹھانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ دائیں طرف بہت دور کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی چمکتی ہوئی نظر آئی۔ ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں بھی مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ سرحدی محافظوں کی جیپ تھی جن کا غالباً اس طرف اسمگلروں کی کسی اور پارٹی سے ٹکراؤ ہو گیا تھا اور وہ جیپ ٹیلوں میں اچھلتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔ میں نے دھنو کو کندھے پر ڈالا اور اس طرف دوڑ لگا دی جس طرف اونٹ گئے تھے۔

فائرنگ میں شدت آتی گئی۔ وہ جیپ بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ یہاں ریت سخت تھی اور چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ جیپ اچھل رہی تھی۔ اس کی روشنیوں کا رخ بھی بار بار بدل رہا تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم ابھی تک روشنیوں کی زد میں نہیں آئے تھے لیکن پھر اچانک جیپ کا رخ بدل گیا۔ میں نے ایک ٹیلے کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور دھنو کو ساتھ لیے لڑھکتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت وہ ٹیلا جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی گولیوں کی ایک باڑھ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئی۔ میں نے ایک ہاتھ دھنو کے منہ پر رکھ دیا تھا ورنہ عین ممکن تھا وہ چیخ پڑتی۔

جیپ کچھ آگے نکل گئی۔ اس پر شاید لائٹ مشین گن نصب تھی جس سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں دھنو کو گرفت میں لیے ٹیلے کی آڑ میں لیٹا رہا۔

”ہمت سنگھ!“

دائیں طرف سے ایک سرگوشی سن کر میں اچھل پڑا اور مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔

”میں اس طرف ہوں۔“ وہی سرگوشی دوبارہ سنائی دی ”ٹیلے کی آڑ میں رینگتے ہوئے اس طرف آ جاؤ۔ کھڑے ہونے کی کوشش مت کرنا۔“

میں نے اس طرف کسی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ سکا لیکن بہرحال، وہ جو کوئی بھی تھا اس نے میرا نام لے کر پکارا تھا۔ ہو سکتا ہے، ٹھاکر نے ہربنس یا اس کے کسی ساتھی کو میرا نام بتا دیا ہو۔ میں نے دھنو کے کان میں سرگوشی کی اور آہستہ آہستہ آواز کی سمت رینگنے لگا۔ دھنو بھی میرے ساتھ ساتھ سینے کے بل رینگ رہی تھی۔

تقریباً بیس گز پیچھے ایک اور ٹیلا تھا۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا ایک انسانی ہیولے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔

”جیپ مڑ کر واپس آ رہی ہے۔ جلدی سے آگے بڑھو۔“ ہیولے کی طرف سے سرگوشی ابھری۔

میں دھنو کو گھسیٹتا ہوا کہنیوں کے بل تیزی سے رینگنے لگا۔ جیپ لائٹ مشین گن سے فائرنگ کرتی ہوئی واپس آ رہی تھی۔ ہم اپنی جگہ پر بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس کی روشنیاں اور لاتعداد گولیاں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گئیں۔ جیپ تیز رفتاری سے اس طرف چلی گئی جہاں اب بھی دو پارٹیوں میں معرکہ جاری تھا۔

”تم دونوں ٹھیک ہو نا ہمت سنگھ؟“ اس ہیولے نے ہمارے قریب آتے ہوئے سرگوشی میں پوچھا۔ وہ ہربنس ہی تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ میری ساتھی کو اونٹ سے گرنے سے شاید چوٹ لگی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”جلدی سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔“ ہربنس نے کہا ”آدھا میل ادھر شاید دونوں طرف کے سرحدی محافظوں میں جھڑپ ہو گئی ہے۔ اگر پاکستانی محافظ اس طرف آ گئے تو ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہمیں کم سے کم دو سو گز کا فاصلہ طے کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم کسی حد تک محفوظ ہو جائیں گے۔“

”کیا تم چل سکتی ہو دھنو؟“ میں نے دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کو۔۔۔ کوشش کرتی ہوں۔“ دھنو نے جواب دیا۔

دھنو نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کراہ کر رہ گئی۔

”شاید میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ میں کھڑی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں نے جھک کر دھنو کو کندھے پر لاد لیا اور ہربنس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

ہم دور تک ٹیلوں کی آڑ میں بل کھاتے ہوئے دوڑتے رہے۔ پہلے تو ریت سخت تھی پھر آگے نرم ریت آ گئی۔ ہمارے پیر دھنس رہے تھے اور دوڑنا مشکل ہو رہا تھا۔ دو سو کے بجائے ہم تقریباً چار سو گز تک دوڑتے رہے۔ میرا سانس پھول گیا تھا۔ ایک بڑے ٹیلے کے پیچھے پہنچ کر ہم رک گئے۔ وہاں تمام اونٹ اور ہربنس کے دونوں ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ اونٹ بھی سدھائے ہوئے تھے۔ اب تک ان کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی تھی۔ اگر عام اونٹ ہوتے تو انہوں نے بلبلا بلبلا کر آسمان سر پر اٹھا لیا ہوتا۔

دھنو اب اونٹ پر اکیلے بیٹھنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور ہمارا قافلہ رات کی تاریکی میں ایک بار پھر چل پڑا۔ رفتار اس مرتبہ بھی خاصی تیز تھی۔ دھنو میرے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ میرے ساتھ جڑ گئی تھی اور دونوں بازو میرے سینے پر لپیٹ رکھے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک اسی اس رفتار سے دوڑتے رہے اور پھر ہربنس کی ایک آواز پر ان کی رفتار کم ہو گئی۔ میرا انجر پنجر ڈھیلا ہو چکا تھا۔ دھنو بھی بار بار کراہ رہی تھی۔

ہمارا یہ سفر جاری رہا۔ میرا خیال تھا کہ ہم سرحد پار کرنے کے بعد کئی میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ تاریکی بھی اب چھٹنے لگی تھی۔ دم توڑتے ہوئے اندھیرے میں بہت دور کسی بستی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ صبح کا اجالا واضح ہوتا گیا اور ہمارے اور بستی کے بیچ میں فاصلہ بھی سمٹتا گیا۔

بستی سوئی ہوئی تھی لیکن بستی کے کتے جاگ رہے تھے۔ انہوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا۔ ہمارا قافلہ بستی کے وسطی چوک سے گزر کر ایک حویلی کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ وہاں دو آدمی پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی پھاٹک کھول دیا تھا۔

”آچر۔“ ہربنس نے اپنے اونٹ سے چھلانگ لگاتے ہوئے ان دونوں میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”ان دونوں کو کشوری لال کے مکان پر لے جاؤ اور پیر بخش! تم چھوکروں کو بلا کر اونٹوں سے مال اترواؤ۔ جلدی کرو۔“ آخری بات اس نے دوسرے شخص سے کہی تھی۔

آچر نامی شخص نے ہمارے اونٹ کی مہار پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ میں نے اتر کر دھنو کو بھی سہارا دے کر اتار لیا۔ اس کا ایک پیر سوج کر کپا ہو رہا تھا۔ اس سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

”کہاں جانا ہے؟“ میں نے آچر نامی اس شخص کی طرف دیکھا۔

”کشوری لال کے مکان پر۔ دو گلی آگے ہے مگر یہ چھوکری چلے گی کیسے۔۔۔! اس کا تو پیر۔۔۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور جھک کر دھنو کو کندھے پر لاد لیا اور آچر کے پیچھے حویلی سے باہر آ گیا۔

”یہ کون سی جگہ ہے۔ میرا مطلب ہے، یہ گاؤں۔۔۔؟“

”نگر پارکر۔“ آچر نے میری بات پوری ہونے سے پہلے جواب دیا۔

آچر نے بتایا تھا کہ ہمیں دوسری یا تیسری گلی میں جانا ہے لیکن ہم کئی گلیاں گھومنے کے بعد ایک مکان کے سامنے رکے تھے۔

تیسری دستک کے جواب میں دروازہ کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ بھی خاصا بڑا مکان تھا۔ ہمیں ایک الگ تھلگ کمرے میں پہنچا دیا گیا میں نے دھنو کو ایک چارپائی پر لٹا دیا اور آچر کی طرف مڑ گیا۔

”میری ساتھی کے پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ کسی وید یا حکیم کا بندوبست ہو سکتا ہے؟“

”سائیں، ابھی تو صبح بھی نہیں ہوئی۔ یہاں کے سارے لوگ سو رہے ہیں۔“ آچر نے جواب دیا ”ابھی دن چڑھنے دو۔ کشوری لال کسی وید کا بندوبست کر دے گا۔ ابھی تم لوگ ادھر بیٹھو۔ میں جاتا ہوں۔ کشوری لال آئے گا تو اس سے بات کر لینا۔“

آچر چلا گیا۔ میں جھک کر دھنو کا پیر دیکھنے لگا۔ ٹخنا پھولا ہوا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس کے پیر پر ہاتھ رکھا، وہ چیخ اٹھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے۔

دھنو چارپائی پر پڑی کراہتی رہی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے پیر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ آہستہ اسے حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ دھنو نے دانت بھینچ لیے۔

میں نے اندازہ لگا لیا کہ فریکچر نہیں ہوا تھا۔ اونٹ پر سے گرتے ہوئے پیر آڑا پڑ گیا تھا جس سے موچ آ گئی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹا گزر گیا۔ اس کمرے کی ایک کھڑکی گلی کی طرف بھی کھلتی تھی جو اس وقت بند تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی۔ باہر چٹا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ غالباً سورج نکلنے والا تھا۔ گلی میں لوگوں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ عقب سے آہٹ سن کر پیچھے گھوم کر دیکھا۔

درمیانے قد کا ایک بھاری بھرکم آدمی اندرونی

دروازے سے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی توند مٹکے کی طرح باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ عمر کا اندازہ پچاس کے لگ بھگ لگایا جا سکتا تھا۔ اس نے سفید لٹھے کی دھوتی باندھ رکھی تھی اور جسم کے اوپر والے حصے پر پیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی جس پر جگہ جگہ اوم چھپا ہوا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں خون کی طرح سرخ اور سر گنجا تھا لیکن کھوپڑی کے پچھلے حصے پر بالشت بھر چٹیا تھی۔ ماتھے پر قشقہ تھا اور گلے میں رنگ برنگے موتیوں والی کئی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔

وہ اس قصبے کے بڑے مندر کا پنڈت کشوری لال تھا۔

ہندوستان کے پنڈتوں کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کے مندر جرائم اور عیاشیوں کے اڈے تھے۔ انسانیت کے خلاف سازشوں میں ان پنڈتوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور یہ کشوری لال پاکستان کے ایک سرحدی قصبے کے مندر کا پنڈت تھا۔ یہ بھی جرائم میں ملوث تھا۔ کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی تھی کہ وہ اسمگلروں سے ملا ہوا تھا اور اس غیر قانونی دھندے میں ان کا برابر کا شریک تھا۔

چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے اس کی توجہ دھنو کے پیر کی طرف مبذول کرائی تو اس نے آواز دے کر اندر سے ایک لڑکے کو بلا لیا اور اسے وید کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔

"یہ نہیں چلے گا سائیں۔" وہ دھنو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا نہیں چلے گا؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ لباس بدلنا ہوگا۔" اس نے دھنو کی طرف اشارہ کیا جس نے جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی "اس لباس میں یہ چھوکری فوراً لوگوں کی نظروں میں آجائے گی۔ اس کے کپڑے بدلنا ہوں گے۔"

"بدل لے گی۔" میں نے جواب دیا "لیکن کیا تم ہمارے لیے چائے پانی کا انتظام کر سکتے ہو؟"

"ہاں ہاں۔ ابھی سارا بندوبست ہو جاتا ہے۔ تم بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ یہ کہتے ہوئے اندرونی دروازے میں داخل ہو گیا۔

میں چارپائی کے سامنے پڑی ہوئی ایک خستہ حال کرسی پر بیٹھ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک نو عمر لڑکا ہمارے لیے ناشتا لے آیا۔ دو پراٹھے تھے اور دو کپ چائے۔ میں نے دھنو کو سہارا دے کر بٹھا دیا۔ ٹرے اس کے سامنے چارپائی پر رکھ دی اور کرسی کھینچ کر خود بھی قریب ہو گیا۔

ناشتے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد وید آگیا۔ وہ پہلوان ٹائپ ہٹا کٹا آدمی تھا۔ اس نے دھنو کے پیر کو ٹٹول کر دیکھا اور بتایا کہ موچ آگئی ہے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اور جب اس نے موچ نکالی تو دھنو کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی خوفناک تھی۔ وید نے کسی مرہم سے مالش کر کے پٹی باندھ دی۔

وید چلا گیا۔ دھنو بھی بتدریج پرسکون ہوتی چلی گئی تھی۔ پنڈت کشوری لال کرسی پر بیٹھ گیا اور میں چارپائی کی پٹی پر ٹک گیا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے سائیں۔ کہاں جانا ہے تمہیں؟" پنڈت کشوری لال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم کراچی جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی کسی اور طرف جانے کا سوچیں گے۔" میں نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے سائیں۔" وہ میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا "کراچی کے اخباروں میں ہر روز ایسی خبریں چھپتی ہیں کہ انڈیا کی انٹیلی جنس ایجنسی "را" کے ایجنٹ پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کی ایجنسیوں کے ایجنٹ بھی بھیس بدل کر سرحدی بستیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ کسی کے گھر میں مہمان آجائیں تو انہیں شک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ تم لوگ یہاں۔۔۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں خود بھی یہ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤں لیکن۔۔۔"

"اس چھوکری کی وجہ سے تمہیں چند روز یہاں رکنا پڑے گا۔" پنڈت نے کہا "تم لوگوں کو یہاں رکھ کر میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ یہاں ایک چھوٹی سی سرائے ہے۔ میں آج تم لوگوں کے لیے وہاں بندوبست کردوں گا بلکہ آج دوپہر کے کھانے کے بعد۔۔۔"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ کمرا بیٹھک قسم کا تھا جس کا ایک دروازہ گلی کی طرف بھی تھا اور دستک اسی دروازے پر ہوئی تھی۔

پنڈت کشوری لال نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی جو دو آدمی اندر داخل ہوئے انہیں دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔

وہ پولیس والے تھے!

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کوئی عام پولیس والے نہیں تھے۔ ان دونوں کا تعلق پاکستان رینجرز سے تھا۔ اس نیم عسکری فورس کے جوان ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سرحد کے آر پار غیر قانونی نقل و حمل پر نگاہ رکھنا ان کی اوّلین ذمے داری ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنی جان پر کھیل کر اس فرض کو نبھاتے ہیں جو بڑے فخر کی بات ہے۔

صورتِ حال اچانک سنگین رخ اختیار کر گئی تھی۔ ہمارے ساتھ "سر منڈواتے ہی اولے پڑے" والا معاملہ ہو گیا تھا۔ اس افتاد نے دھنو کو بھی اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گزشتہ رات والے "معرکے" میں دھنو کا ٹخنا بری طرح متاثر ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اگرچہ حکیم نے اس کا تسلی بخش معائنہ کرنے کے بعد مرہم لگا دیا تھا تاہم اس کی تکلیف کو چند روز مزید رہنا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر بیٹھی تو ٹخنے سے اٹھنے والی روح کش ٹیس نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔

میں اپنی تمام تر توجہ کھلے ہوئے دروازے پر مرکوز کیے کھڑا تھا۔ دروازے کے اندر، بیٹھک نما کمرے میں پنڈت کشوری لال ہکا بکا کھڑا آنے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پنڈت کی پشت میری جانب تھی مگر مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ پل صراط سے گزر رہا تھا۔ اس بپتا کے بارے میں اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

دروازے میں کھڑے "رینجرز" کے جوانوں نے کشوری لال کے شانوں کے اوپر سے کمرے کا جائزہ لیا پھر ان کی عقابی نگاہیں ہم پر آکر ٹھہر گئیں۔ کشوری لال اس دوران میں صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر آنے والوں کو داخلے کا راستہ دیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"مہاراج! خیریت تو ہے۔ اتنی صبح اس کشٹ (تکلیف) کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔"

وہ دونوں پنڈت کی بات کا جواب دیے بغیر کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے بیٹھک کے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ وہ دونوں مسلح تھے۔ ایک جوان کے شولڈر بیجز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ آفیسر رینک تھا، دوسرے کی حیثیت ایک کانسٹیبل ایسی تھی۔ اسی جوان نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی تھی۔

اندر آتے ہی کانسٹیبل نے ہمیں اپنی گن کے نشانے پر رکھ لیا۔ آفیسر رینک سرحدی محافظ کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ تاہم اس نے اپنا پستول ہم میں سے کسی پر تاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہی شخص پنڈت کشوری لال سے مخاطب ہوتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔

"پنڈت جی! آج تم رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہو۔"

"مہاراج! میں کچھ سمجھا نہیں۔" کشوری لال نے اپنی دانست میں لاعلمی کی بھرپور اداکاری کرنے کی کوشش کی تھی۔

آفیسر نے طنزیہ انداز میں کہا "آج تمہاری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا پنڈت کشوری لال۔ ہم بہت دنوں سے تم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق تم مختلف اشیا کے ساتھ ساتھ انسانوں کی اسمگلنگ میں بھی ملوث ہو۔ لوگوں سے بھاری معاوضہ لے کر تم انہیں سرحد کے اس پار پہنچاتے ہو اور ادھر کے پنچھیوں کو ادھر بلاتے ہو جن میں زیادہ تر بھارتی خفیہ ایجنسی "را" کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"مائی باپ!" پنڈت کشوری لال نے فدویانہ لہجے میں کہا "یقیناً آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس قسم کے دھندے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو ایک سیدھا سادہ پنڈت ہوں۔ یہاں کے بڑے مندر کا پجاری۔ میرا کام پوجا پاٹھ ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔"

پنڈت ابھی تک نہایت معقول انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ دونوں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ٹل جائیں مگر ایسا ہوتا ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔

آفیسر کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی بھرپور کاٹ تھی "پنڈت کشوری لال! پوجا پاٹھ تمہارا فرض اور اسمگلنگ کا دھندا تمہارا پیشہ ہے اور۔۔۔ تم کتنے سیدھے سادے ہو یہ بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے ہماری جانب دیکھا۔ دھنو چارپائی پر ہی بیٹھی ہوئی تھی جبکہ میں پوری حاضر دماغی سے پنڈت اور سرحدی محافظ کے درمیان ہونے والی مکالمت کو سن رہا تھا۔ ہمارا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد وہ پنڈت سے مستفسر ہوا "پنڈت جی! ان دونوں کا تعارف نہیں کرواؤ گے؟"

"یہ۔۔۔ یہ دونوں میرے مہمان ہیں۔" پنڈت لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

آفیسر نے پوچھا "یہ دونوں کہاں سے آئے ہیں؟"

"وہ۔۔۔ جی یہ دونوں مہمان "آدیگاؤں" سے آئے ہیں۔"

پنڈت نے بوکھلاہٹ میں کسی سرحدی گاؤں کا نام لے دیا تھا۔ آفیسر اس کی بوکھلاہٹ سے شیر ہوگیا۔ اگلا سوال اس نے خاصے خوں خوار لہجے میں پوچھا تھا۔

"آدیگاؤں میں یہ لباس کب سے پہنا جانے لگا ہے؟"

اس کے ساتھ ہی آفیسر نے میرے اور دھنو کے لباس کی جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ دھنو جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھی جبکہ میں نے جینز کے اوپر چیک دار ہاف سلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہم دونوں کے پاؤں میں جوگرز تھے۔

آفیسر کے چبھتے ہوئے سوال نے پنڈت کو مزید گڑ بڑا دیا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ یہ صورتِ حال سراسر ہمارے خلاف جارہی تھی۔ ہم اس وقت جس بیٹھک نما کمرے میں تھے اس کا ایک دروازہ گلی کی جانب کھلتا تھا۔ سرحدی محافظوں نے اسی دروازے پر دستک دی تھی۔ دستک کے جواب میں پنڈت کشوری لال نے دروازہ کھول دیا تھا۔ اس سے ایک بات واضح ہوگئی تھی کہ آنے والوں کو وہاں ہماری موجودگی کے بارے میں پکی اطلاع دی گئی تھی ورنہ اگر وہ معمول کی کارروائی کے لیے آتے تو ایک تو اتنی صبح دھاوا بولنے کی ضرورت نہیں تھی' دوسرے اس صورت میں وہ لوگ بیٹھک کے دروازے پر دستک دینے کے بجائے گھر کے داخلی دروازے کا رخ کرتے۔

میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ کوئی معمول کی کارروائی نہیں تھی۔ سرحدی محافظوں کو ہماری آمد اور کشوری لال کے گھر میں قیام کے بارے میں باقاعدہ اطلاع دی گئی تھی۔ میرا ذہن بہت تیز رفتاری سے اس اطلاع دینے والے مخبر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سوچ کی برق رفتاری کو صرف وہی افراد سمجھ اور محسوس کرسکتے ہیں جو غور و فکر سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں۔ انسانی ذہن ایک سیکنڈ میں بے بہا باتیں اور لاتعداد واقعات کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور تصور کی نگاہ سے انسان کو محسوس بھی کرواسکتا ہے۔ میرا ذہن بھی اس وقت انتہائی مصروف ہوگیا تھا' سوچ کا پرندہ اپنی پوری بلندی پر پرواز کررہا تھا۔

انڈیا کی سرحد پر واقع "سوئی گام" نامی گاؤں تک ٹھاکر بھانوت سنگھ خود ہمیں چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ڈرائیور نما گارڈ جسونت بھی تھا۔ سوئی گام میں ٹھاکر نے میرے اور دھنو کے گلے مل کر ہمیں الوداع کہا تھا۔ وہ جسونت کے ساتھ اپنی لینڈ کروزر پر واپس چلا گیا تھا۔

ہمیں بحفاظت بارڈر پار کروانے کے لیے ٹھاکر نے گاؤں کے مکھیا دھرم چند سے معاملہ طے کر رکھا تھا۔ دھرم چند نے مجھے پنڈت کشوری لال کے نام ایک رقعہ بھی دیا تھا جس کو پڑھنے کے بعد کشوری لال مجھے پچاس ہزار روپے کے پاکستانی کرنسی نوٹ دے دیتا۔ اس رقم کے برابر ٹھاکر نے دھرم چند کو انڈین کرنسی دی تھی اور ساتھ ہی اس کی "خدمات" کا بھاری معاوضہ بھی دیا تھا۔ مذکورہ رقعہ ہندی زبان میں رقم کیا گیا تھا جس میں دھرم چند نے ہدایت کی تھی کہ پنڈت ہمارے لیے کراچی پہنچنے کا محفوظ بندوبست بھی کرے۔ دھرم چند اور پنڈت کشوری لال میں اس قسم کی کاروباری "ڈیل" ہوتی رہتی تھی۔ دونوں اپنی اپنی طرف کے لوگوں سے بھاری رقم وصول کرکے انہیں دوسرے کے حوالے کردیتے تھے۔ سرحد کی دوسری جانب ایک دوسرے کے بندوں کو بحفاظت ٹھکانے لگانا ان کی ذمے داری تھی جس کے لیے کسی قسم کے مالی لین دین کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ گویا یہ سب کچھ امدادِ باہمی کے تحت ہورہا تھا۔

دھرم چند نے ہمیں ایک قافلے کے ہمراہ کردیا تھا۔ دس اونٹوں اور تین افراد پر مشتمل وہ قافلہ درحقیقت ایک اسمگلر پارٹی تھا۔ تینوں افراد سیاہ لباس میں ملبوس تھے جن میں ایک کی حیثیت سربراہ ایسی تھی۔ اس دبلے پتلے شخص کا نام ہربنس تھا۔ ہربنس نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر علی الصباح ہمیں پاکستان کی حدود میں واقع نگرپارکر کے اس سرحدی گاؤں میں پہنچا دیا تھا۔

ہربنس اور دھرم چند سے کسی قسم کی غداری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ اس نوعیت کے جرائم پیشہ لوگ زبان' اعتماد اور وعدے کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اس کی خاطر اپنی جان بھی گنوا دیتے ہیں۔

اب آجاکر دو افراد کی طرف شک جاتا تھا۔ ان میں ایک آچر تھا اور دوسرا پیر بخش۔ ہربنس نے گاؤں میں داخل ہوکر بڑی حویلی کے پھاٹک پر ان دو افراد سے پہلی ملاقات کی تھی۔ آچر کو ہدایت کی تھی کہ وہ مجھے اور دھنو کو پنڈت کشوری لال کے گھر پہنچا دے اور پیر بخش سے کہا تھا کہ وہ ملازموں کو بلا کر اونٹوں سے اسمگلنگ کا سامان اتروا لے۔ میرا ذہن کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ آچر اور پیر بخش کی حیثیت ملازمین کی سی تھی۔ ان میں سے کوئی مخبری کرسکتا تھا۔ زیادہ دھیان آچر کی طرف جارہا تھا کیونکہ وہی ہمیں کشوری لال کے مکان تک چھوڑنے آیا تھا۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ سرحدی محافظ کی تیز آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اب اس کے لہجے میں درشتی کے ساتھ ساتھ تندی بھی آگئی تھی۔ وہ کشوری لال سے مخاطب تھا۔

"پنڈت! تمہاری آئیں بائیں شائیں تمہیں ایک بہت بڑی مصیبت میں مبتلا کرنے والی ہے۔" وہ پنڈت کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا "ابھی تک تم نے میرے کسی سوال کا دو ٹوک اور واضح جواب نہیں دیا۔ اگر کچھ بکا بھی ہے تو لولا لنگڑا اور نامعقول۔" آفیسر کا لہجہ زہریلا ہوتا چلا گیا "میں تمہیں آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ ان دونوں کے بارے میں ٹھیک ٹھیک بتادو۔ یہ ادھر سے ادھر آئے ہیں یا ادھر سے ادھر جانے والے ہیں؟"

"آپ یقین کریں مہاراج۔" پنڈت نے گھگیاتے ہوئے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی "یہ دونوں میرے مہمان ہیں اور آدیگاؤں سے..."

پنڈت کی منت آمیز وضاحت ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت آفیسر رینک سرحدی محافظ کا ہاتھ اٹھ گیا تھا۔ ایک زناٹے دار تھپڑ پنڈت کے گال پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی آفیسر کی دہاڑتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"تم نے بہت بک بک کرلی پنڈت۔ اب میری باری ہے۔" آفیسر نے پنڈت کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے کہا "اور میں زبان سے زیادہ ہاتھ پاؤں سے کام لینے کا عادی ہوں۔"

پنڈت دونوں ہاتھ جوڑ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو شاید پنڈت کی حالت اتنی خستہ نہ ہوتی مگر اس وقت وہ واقعی رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ ہمارے بارے میں ایسی کوئی بھی وضاحت کرنے سے قاصر تھا جس سے سرحدی محافظ مطمئن ہوسکتے۔ پنڈت پر بڑا کڑا وقت آن پڑا تھا۔

آفیسر رینک سرحدی محافظ کھا جانے والی نظر سے پنڈت کو گھورتے ہوئے بولا "پھر کیا ارادہ ہے کشوری لال! تمہیں سب کچھ سچ سچ بتادو گے یا ہیڈ کوارٹر..."

آفیسر نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور معنی خیز نظر سے پنڈت کو دیکھنے لگا۔ پنڈت کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا "مائی باپ' جو پوچھنا ہے' یہیں پوچھ لو۔ ہیڈ کوارٹر جانے کی ضرورت نہیں۔"

پنڈت کی سراسیمگی سے میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ آفیسر نے جس "ہیڈ کوارٹر" کا ذکر کیا تھا وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور تکلیف دہ جگہ ہوگی کیونکہ آفیسر کی بات سن کر پنڈت کا چہرہ ہلدی ہوگیا تھا۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔

میں صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرچکا تھا۔ آفیسر کی پراعتماد پیش رفت اور پنڈت کی مجرمانہ پسپائی ہمیں کسی بہت بڑی مصیبت میں ڈال سکتی تھی۔ یہ معاملہ پنڈت کے بس کا نہیں تھا اس لیے میں نے فوری طور پر مداخلت ضروری سمجھی۔

"آفیسر!" میں نے شائستہ لہجے میں سرحدی محافظ کو مخاطب کیا "ہم تمہارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلنے کو تیار ہیں۔"

پنڈت نے چونک کر خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھا' دونوں سرحدی محافظ بھی حیرت آمیز نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ میں ان کی گفتگو میں پہلی مرتبہ شامل ہوا تھا۔ اس شمولیت کا سبب یہ تھا کہ میرا ذہن موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چاق و چوبند ہوچکا تھا۔ میں پنڈت کے بھروسے پر کسی مصیبت کو گلے لگانے کو تیار نہیں تھا۔ آفیسر کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے ایک کہانی گھڑلی تھی۔ یہ فرضی کہانی حقیقت کے بہت قریب بھی تھی۔ ہر بات میرے ذہن میں بہت واضح ہوگئی تھی چنانچہ میرا مطمئن نظر آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

پنڈت کشوری لال نے مریل سی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "مورکھ! دھیان بھی ہے' تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں مورکھ (بے وقوف) کشوری لال!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا "میں پوری طرح دھیان گیان میں ہوں۔ اگر یہ آفیسر اپنی تسلی کے لیے ہمیں ہیڈ کوارٹر لے جائے گا تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔" پھر میں آفیسر کی جانب متوجہ ہوا "کیوں آفیسر! اگر میں یہیں پر آپ لوگوں کے سوالوں کے اطمینان بخش جواب دے دوں تو کیا پھر بھی تم ہمیں ہیڈ کوارٹر لے جاؤ گے؟"

"یہ تو تمہارے جوابات سننے کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔" آفیسر نے کہا۔

کشوری لال بولا "شاید تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

پنڈت کا اشارہ میری جانب تھا۔ دراصل پنڈت کو یقین ہوچلا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گا۔ "پاک رینجرز" والوں نے بڑے نازک موقع پر اس پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں بھی یہ محسوس کرچکا تھا' غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے پاکستان میں ہماری آمد کو سرحدی محافظوں سے چھپایا نہیں جاسکتا تھا۔ اگر وہ ہماری تلاشی لیتے تو میرے لباس سے دھرم چند کا دیا ہوا رقعہ برآمد ہوجاتا جس کی تحریر ہمارے ہر من گھڑت جھوٹ کی قلعی کھول دیتی۔ میں نے ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک فرضی کہانی بنی تھی۔ اس توجیہہ کی میں اس لیے بھی ضرورت محسوس کررہا تھا کہ میں اپنے وطن میں قدم رکھنے کے بعد کسی قسم کی "مارا ماری" نہیں چاہتا

تھا۔ جس تیزی سے سرحدی محافظ ہم تک پہنچ گئے تھے' ان حالات میں مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ تاہم اس صورت میں پنڈت کشوری لال کے خلاف بیّن ثبوت سرحدی محافظوں کے ہاتھ آجاتے اور جان چھڑانے کی اس کی تمام کوششیں ناکامیاب ہوجاتیں۔ اس پاپی پنڈت کی دستگیری کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔

کشوری لال نے بھنّائے ہوئے انداز میں میرے دماغ کے خراب ہونے کی بات کی تھی مگر میں نے اس کی بات پر توجہ دینے کے بجائے آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم سوال کرو آفیسر' میں جواب دیتا ہوں۔"

میرے پُر اعتماد لہجے نے آفیسر کو حیرت زدہ ضرور کیا ہوگا۔ اس الجھن زدہ حیرت کے اثرات اس کے چہرے پر بڑے واضح نظر آرہے تھے۔

اس نے پوچھا "تم دونوں کون ہو' کہاں سے آئے ہو اور تمہارے نام کیا ہیں؟"

"آفیسر! تم نے تو ایک ہی سانس میں تین سوالات کر ڈالے۔" میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔ دراصل میں اپنے طرزِ کلام سے مفاہمت اور بے تکلفی کی فضا قائم کرنا چاہتا تھا جس میں مجھے خاطرخواہ کامیابی ہوئی تھی۔

وہ معتدل لہجے میں بولا "تم بھی چاہو تو ایک ہی سانس میں جواب دے ڈالو۔"

میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "ہم دونوں مسلمان ہیں' ڈھاکا سے آئے ہیں اور ہمارے نام مراد۔۔ اور کلثوم ہیں۔"

میرے اس جواب نے پنڈت کشوری لال کے ساتھ ساتھ دھنو کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تاہم دھنو نے پلک جھپکتے میں اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ وہ اب کافی عرصے سے میرے ساتھ تھی۔ میری ایک ایک ادا اور ایک ایک انداز کو جاننے اور پہچاننے لگی تھی۔ وہ ایک لمحے میں سمجھ گئی کہ میں نے کسی خاص مصلحت کی بنا پر وہ بیان جاری کیا ہے لہٰذا خاموش رہتے ہوئے دھنو نے چہرے پر ایسے تاثرات سجالیے جیسے وہ میری بات کی تصدیق کررہی ہو۔ یہ اس کی سمجھداری تھی۔

پنڈت دیدے پھاڑے مجھے تک رہا تھا۔ اس کی مٹکا نما توند کچھ اور گول ہوگئی تھی۔ سرخ آنکھوں میں سفیدی گھنڈ گئی اور نفی میں گردن ہلانے کے باعث اس کے سر پر موجود بالشت بھر چٹیا عجیب سے انداز میں پھدک رہی تھی۔ لگتا تھا' جیسے کوئی تنہا تتلی مضحکہ خیز انداز میں رقص کررہی ہو۔ بلا مبالغہ اس کے چہرے پر تیرہ بج رہے تھے' گویا اس کے چودہ طبق گل ہوچکے تھے۔

میرے جواب نے سرحدی محافظ کو بھی اچھلنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ محتاط لہجے میں بولا "کیا تم دونوں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے یہاں پہنچے ہو؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے آفیسر۔" میں نے کہا۔ میرا انداز بے باک تھا۔

"مگر کہاں ڈھاکا۔۔ اور کہاں نگرپارکر کا یہ سرحدی گاؤں؟" آفیسر کے لہجے میں الجھن تھی "تمہاری بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "آفیسر' ڈھاکا بنگلہ دیش میں ہے اور نگرپارکر پاکستان میں۔ اس میں سمجھ میں نہ آنے کی کون سی بات ہے؟"

"میرا مطلب ہے' ان دونوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں۔" وہ بولا "پھر تم لوگ۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آفیسر! تمہاری یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ ان دو ملکوں کی سرحدیں آپس میں کہیں نہیں ملتیں مگر ایک تیسرے ملک کی سرحدیں ان دونوں ملکوں سے ملتی ہیں۔ ہم اسی تیسرے ملک میں کٹھن اور مصیبت بھرا سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

کتنے افسوس کی بات تھی کہ ایک جسم کے دو بازو ایک دوسرے سے کتنی دوری پر تھے۔ مشرقی پاکستان جب بنگلہ دیش نہیں بنا تھا اس وقت بھی اور آج بھی دونوں ملکوں کی سرحدیں آپس میں کہیں ملتی ہیں اور نہ ہی یہاں بسنے والے لوگوں کے دل۔ جس کے لیے دونوں طرف کے لوگ قصوروار ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے' مانیں یا نہ مانیں۔

وہ بخوبی سمجھ گیا کہ تیسرے ملک سے میری مراد انڈیا تھی۔ پنڈت کشوری لال کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "اور غیر قانونی طور پر بارڈر عبور کروانے میں تمہاری مدد اسی پنڈت نے کی ہوگی؟"

"تمہاری بات کسی حد تک درست ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں غالب کردار دھرم چند نے ادا کیا ہے جو سرحد کے اس پار سوئی گام نامی گاؤں کا مکھیا ہے۔"

آفیسر اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا "جانتا ہوں' جانتا ہوں۔ ان لوگوں کے کام کرنے کا یہی طریقہ کار ہے۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی آفیسر نے پنڈت کو گھورا۔ وہ جزبز ہو کر رہ گیا۔ ایک ایک کرکے اس کے خلاف ثبوت جمع ہورہے تھے۔ اس کا چھٹکارا کسی بھی طور ممکن نہیں تھا۔

آفیسر نے مجھ سے پوچھا "تمہیں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"مجبوری تھی!" میں نے مختصراً کہا۔

وہ قدرے سخت لہجے میں بولا "کیا مجبوری تھی۔ کیا تم دونوں کسی غیر قانونی دھندے میں ملوث ہو؟"

"قطعاً نہیں۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم بنگلہ دیش سے بھی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے انڈیا میں داخل ہوئے تھے۔"

"مجبوری کی وضاحت کرو۔" آفیسر نے کہا۔

میں نے پہلے سے سوچی ہوئی کہانی کے مطابق جواب دیا "ہماری مجبوری تھی۔۔ "مسلم کش فسادات" ڈھاکا میں ہم جس محلے میں رہتے تھے وہاں کسی مذہبی معاملے پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی تھی جس کے نتیجے میں ہمارے گھر بھی لپیٹ میں آگئے۔ ہم بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوسکے تھے۔ ہمارے گھر کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ ہم دونوں ڈھاکا سے چھپتے چھپاتے کھلنا پہنچے۔ یہاں سے ہم انڈیا کے شہر کلکتہ میں داخل ہوگئے پھر تین ماہ کا تکلیف دہ سفر کرتے ہوئے کلکتہ سے آسنسول' پٹنہ' الہ آباد' کان پور' آگرہ' دہلی' جے پور' اجمیر' ماؤنٹ آبو' رن کچھ سے ہوتے ہوئے انڈیا کے سرحدی گاؤں سوئی گام پہنچ گئے جہاں سے گزشتہ رات اونٹوں کے ذریعے یہاں نگرپارکر کے اس گاؤں میں آپ لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔"

میرا یہ بیان بڑی حد تک مبنی بر سچ تھا۔ مثلاً یہ کہ ہم واقعی کان پور' آگرہ' دہلی' جے پور' اجمیر' ماؤنٹ آبو' رن کچھ' سوئی گام وغیرہ سے گزر کر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے اپنی کہانی کچھ اس طرح سیٹ کی تھی کہ اس پر ہر سننے والا فوراً یقین کرلیتا پھر میرے لہجے کا اعتماد بھی میری سچائی پر دلالت کرتا تھا۔ میری "کوشش" کے بڑے مفید اور حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے تھے۔

آفیسر نے حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری بات پوری سنی اور حتمی لہجے میں بولا "تمہاری کہانی دل کو لگتی ہے جوان۔ تمہاری ایک ایک بات سے سچائی ٹپکتی ہے مگر۔۔!"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور عجیب سی نظر سے دھنو کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں ہوس کے بجائے ستائش تھی۔ دھنو پر حسن اور جوانی کچھ اسی طور ٹوٹ کر برسی تھی کہ دیکھنے والے کی نظر چپک کر رہ جاتی تھی پھر جینز اور ٹی شرٹ میں وہ کچھ زیادہ ہی قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس لیے آفیسر کے عمل کو ردِعمل کہنا چاہیے۔

میں نے آفیسر کی نگاہ کا تعاقب کیا تو وہ جھینپ گیا پھر کھسیانا ہو کر مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا "مگر کیا آفیسر؟"

وہ گڑبڑائے لہجے میں بولا "مگر ابھی بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔"

"وہ بھی پوچھ ڈالو۔" میں نے کہا۔

وہ دھنو کی جانب دیکھتے ہوئے بولا "تم نے کیا نام بتایا تھا اپنی ساتھی کا۔ ہاں یاد آیا۔" اسے دھنو کا فرضی نام یاد آگیا تو کہنے لگا "تمہاری یہ ساتھی کلثوم ابھی تک منہ سے ایک لفظ نہیں بولی۔ ساری گفتگو تم ہی کررہے۔۔۔"

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی اور خود کہا "کلثوم بے چاری پیدائشی گونگی ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے ترحم آمیز نظر سے دھنو کو دیکھا جس کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا تھا۔ تاہم اسی لمحے اس نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔ یہ اچھا ہوا کہ بات کرتے ہوئے آفیسر میری جانب دیکھ رہا تھا ورنہ دھنو کے چہرے کے تاثرات سے وہ ٹھٹک سکتا تھا۔

اس موقع پر پنڈت کشوری لال کی حالت دیدنی تھی۔ وہ میرے اس پُراعتماد جھوٹ پر دل ہی دل میں اش اش کر اٹھا ہوگا تاہم اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی تھی۔ وہ کوئی بھی بات کرکے اپنی راہ کے کانٹوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "آفیسر! ایک گونگا شخص ظاہر ہے' بات چیت نہیں کرسکتا۔ وہ مخصوص اشاروں ہی سے دوسرے کی بات سمجھتا ہے اور اپنی بات دوسرے کو سمجھاتا ہے البتہ کراہنے کی بات دوسری ہے۔"

کراہنے کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لیے بھی کردیا تھا کہ جب سرحدی محافظ کمرے میں آئے تھے تو اس سے پہلے دھنو اٹھ کر بیٹھی تھی اور ٹخنے کی تکلیف کے باعث اس کے منہ سے ایک کراہ خارج ہوئی تھی۔

میں نے دھنو کی جانب بولتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے وہ میری بات اور میرے منصوبے کو اچھی طرح سمجھ گئی ہو۔ اس کی غزالی آنکھوں نے بہ زبانِ خاموشی مجھے بڑے واضح انداز میں بتایا کہ میں جیسا چاہتا ہوں' وہ ویسا ہی عمل کرے گی اور یہ کہ

وہ میرا کہا ہوا ایک ایک لفظ اپنی یادداشت میں محفوظ کرتی جارہی ہے تاکہ اسے عمل کے دوران میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں مطمئن ہو کر آفیسر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مسٹر مراد' تمہارا اس گونگی لڑکی سے کیا ناتا ہے؟"

میں نے جواب دیا "ہمدردی کا رشتہ' انسانیت کا ناتا اور دوستی کا تعلق ہے میرا کلثوم سے۔ میرے خیال میں یہ سب سے زیادہ مضبوط بندھن ہیں!"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" آفیسر تائیدی انداز میں گویا ہوا "میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آیا یہ تمہاری رشتے دار ہے یا۔۔۔" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھا اور بولا "تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا!"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی "بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔"

وہ ایک مرتبہ پھر بڑی شوخ نظر سے دھنو کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی کے ساتھ ساتھ ایک افسوس بھی موجود تھا جیسے گل کے ساتھ خار ہوتا ہے۔ شاید وہ اس بات سے دکھی ہو رہا تھا کہ اتنی دلکش اور پرشباب لڑکی گونگی کیوں تھی!

وہ بے چارہ سولہ آنے درست سوچ رہا تھا۔ دھنو کا گونگا پن' پھول کے ساتھ کانٹے والی بات ہی تھی۔ شاید چاند کا داغ بھی اسی کو کہتے ہیں!

میں نے بے تکلفی کی فضا قائم کرکے ماحول کی شدت کو بڑی حد تک کم کردیا تھا۔ وہ کانسٹیبل جس نے پہلے ہم لوگوں پر گن تان رکھی تھی۔ اب اس نے اپنے افسر کے اشارے پر گن کی نال کا رخ ہماری جانب سے ہٹالیا تھا۔ تاہم وہ اب بھی دروازے سے لگا چوکس کھڑا تھا جیسے اپنے افسر کا اشارہ ملتے ہی وہ ہمیں گولیوں سے بھوننے میں کسی غفلت سے کام نہیں لے گا۔ اس کا آفیسر بھی خاصا مستعد تھا۔

میں نے اس موقع پر ایک اور پھلجھڑی چھوڑی۔ گن بردار کانسٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے آفیسر سے سوال کیا۔ "کیا تمہارا یہ ماتحت بھی گونگا ہے؟"

افسر نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے کہا "جب سے تم لوگ آئے ہو اس نے زبان نہیں کھولی۔ میں سمجھا شاید یہ بھی میری ساتھی کلثوم کی طرح قوتِ گویائی سے محروم ہے۔"

پتا نہیں' کیا بات تھی کہ اپنے وطنِ عزیز کی مٹی چھوتے ہی میرے دل کا کوئی شگفتہ دریچہ وا ہوگیا تھا۔ اپنے ملک کی فضا میں سانس لینا خاصا خوشگوار تجربہ ثابت ہو رہا تھا جس سے طبیعت میں ایک عجیب سی گدگدی کا احساس ہوتا تھا۔ میں ایک طویل عرصے کے بعد پاکستان لوٹا تھا اور طویل عرصے تک قیام کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ آگے جو خدا کی مرضی!

تھوڑی دیر کی ہنسی خوشی کے بعد آفیسر پھر سنجیدہ ہوگیا "مسٹر مراد! تم ڈھاکا میں کہاں کے رہنے والے ہو؟"

میں نے ایک محلے کا نام لے دیا جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دراصل سنگاپور میں ہمارے اسٹور پر کام کرنے والے ایک ملازم کا تعلق ڈھاکا کے اسی محلے سے تھا اس لیے محلے کا نام مجھے یاد رہ گیا تھا جو اس وقت کام آگیا۔

میرے جواب نے آفیسر کو قدرے مطمئن کردیا مگر وہ سوال کرنے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ اس نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور تمہاری ساتھی یہ گونگی لڑکی کلثوم؟"

"یہ میری محلے دار ہے' یعنی پڑوسی۔" میں نے بتایا۔

"تم لوگوں نے بنگلہ دیش ہی میں کہیں پناہ کیوں نہیں تلاش کی۔" آفیسر بال کی کھال اتارنے پر کمربستہ تھا "پہلے انڈیا اور پھر پاکستان کا رخ کیوں کیا؟"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ گزشتہ رات ہم "بی ایس ایف" والوں کے ہتھے نہیں چڑھ گئے تھے ورنہ وہ ہمارا حشر خراب کردیتے۔ "بی ایس ایف" یعنی بارڈر سیکیورٹی فورس بھارت کے سرحدی محافظوں پر مشتمل ایک ادارہ ہے۔ جس طرح پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت "رینجرز" والے کرتے ہیں بالکل اسی طرح بھارت کی سرحدوں کی حفاظت "بی ایس ایف" والے کرتے ہیں۔ ہم ہربنس کی رہبری میں "بی ایس ایف" والوں کی نظروں میں آئے بغیر رات کے اندھیرے میں خاموشی سے ریگستان کا وہ علاقہ عبور کر آئے تھے جو دونوں ملکوں کی سرحدوں کے درمیان واقع ہے۔ البتہ پاکستان میں اپنے پہلے پڑاؤ پر ہی یہاں کے سرحدی محافظ ہمارے سروں پر آن پہنچے تھے اور اب ایک آفیسر مجھ سے' گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوالات کررہا تھا۔

میں نے آفیسر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "جناب! جب انسان پر برا وقت آتا ہے تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوجاتا ہے۔ بس یوں سمجھیں ہم بھی پریشانی میں انڈیا کا رخ کر بیٹھے اور ایک طویل سفر طے کرکے اب یہاں پہنچ گئے ہیں۔"

میں نے اپنے لہجے میں درد اور غم کی کیفیت کو سمو دیا تھا جس سے آفیسر خاصا متاثر ہوا۔ اس نے پوچھا "تم نے بتایا ہے کہ مسلم کش فسادات کے باعث تم لوگوں کو وطن سے بے وطن اور گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ آج کل پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی فضا خاصی گرم ہے۔ تم دونوں کو اس سلسلے میں کافی پریشانیاں اٹھانا پڑی ہوں گی۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہارا تمام تر سفر غیر قانونی ہے؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آفیسر۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "آج کل واقعی انڈیا میں مسلمان دشمنی خاصی عروج پر ہے مگر ہم نے اس آگ سے بچنے کے لیے خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔"

"کیسا انتظام مراد؟" آفیسر نے پوچھا۔

میں نے بتایا "ہم نے اپنے نام ہندوانہ رکھ چھوڑے تھے۔ میں ونود اور کلثوم آشا بن گئی تھی چنانچہ ہمیں مسلم دشمنی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔"

"تم تو خاصے چلتا پرزہ قسم کے بندے ہو مسٹر مراد۔" آفیسر نے مجھے گھورا۔

اس موقع پر پنڈت کشوری لال خاموش نہ رہ سکا' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "چلتا پرزہ قسم کے نہیں بلکہ یہ پکا راکشش ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں والا نام اور پاکستان میں مسلمانوں والا نام۔ مجھے اگر معلوم ہوتا۔۔۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا اور پریشانی سے سرحدی محافظوں کو تکنے لگا۔ شاید وہ کوئی ایسی بات کہنے جارہا تھا جو اسے مزید پھنسانے والی ہوتی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہربنس نے اسے ہمارے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ تاہم میں نے ابھی تک مکھیا دھرم چند کا رقعہ کشوری لال کو نہیں دکھایا تھا۔ البتہ وہ اس رقعے کی' میرے پاس موجودگی سے آگاہ ہوچکا تھا۔ جب ہم ناشتا کررہے تھے تو ہمارے درمیان رقم کے بارے میں مختصر گفتگو ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی' دروازے پر دستک ہونے لگی تھی۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔

آفیسر نے پنڈت کی جانب مڑتے ہوئے کہا "اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ مراد اتنا زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے تو تم اسے اپنے یہاں ٹھہرانے کا رسک نہیں لیتے۔ یہی کہنا چاہ رہے ہو نا تم؟"

پنڈت کشوری لال معاندانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ آفیسر کے سوال کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اچانک بے حد محتاط نظر آنے لگا تھا۔

آفیسر نے اپنے ماتحت سے کہا "تم باہر سے باقی جوانوں کو بھی اندر بلالاؤ اور اس گھر کے چپے چپے کی تلاشی لو۔"

آفیسر کی بات سے پتا چلا کہ سرحدی محافظوں کے کچھ ساتھی باہر گلی میں موجود تھے پھر باتوں ہی باتوں میں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ باہر گلی کے کونے پر ان کی جیپ کھڑی تھی جس میں مزید تین مسلح افراد بیٹھے تھے۔

اگلے چند لمحوں میں وہ کانسٹیبل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر آگیا۔ تیسرا شاید ڈرائیور تھا جو جیپ کے اندر ہی رہ گیا تھا۔ تینوں مسلح سرحدی محافظ پنڈت کشوری لال کے گھر کی تلاشی لینے میں مصروف ہوگئے۔

میں نے آفیسر سے پوچھا "ہمارے لیے کیا حکم ہے آفیسر؟"

"تم ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلو گے۔" اچانک اس کے لہجے میں سختی آگئی "لیکن اس سے پہلے تم دونوں کی مکمل تلاشی ہوگی۔"

"تلاشی!" میں نے متذبذب نظر سے آفیسر کو دیکھا۔

"ہاں' جامہ تلاشی۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا' پھر پوچھا "تم لوگوں کا سامان وغیرہ کہاں ہے؟ پہلے سامان چیک کراؤ پھر جامہ تلاشی ہوگی۔"

جامہ تلاشی کے ذکر پر بے اختیار میرا ہاتھ اپنی گردن پر چلا گیا پھر اس وقت میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ نیلگری کا دیا ہوا تحفہ وہ طلسماتی مالا میری گردن پر موجود نہیں تھی۔ میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ کل رات سے اب تک مجھے اس مالا کا خیال نہیں آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سوئی گام نامی گاؤں سے رخصت ہوتے وقت وہ مالا میری گردن میں موجود تھی۔

ہمارے لیے گزشتہ رات کا دشوار گزار اور تکلیف دہ سفر کسی بھیانک خواب کے مانند تھا۔ اس دوران میں ہمیں اپنا خیال تک نہیں رہا تھا' مالا کی طرف دھیان کیسے جاتا۔ اب دھیان گیا تھا تو مالا میرے جسم پر سے غائب تھی۔ میں نے اضطراری انداز میں اپنے پورے جسم کو ٹٹول ڈالا مگر مالا کی کوئی خبر نہ ملی۔ مجھے ایک لمحے میں یقین ہوگیا کہ وہ نادر الوجود مالا مجھ سے بچھڑ چکی ہے۔ میرے دل سے ایک آہ سی خارج ہوئی۔ مالا سے جدائی مجھے ایک بے نام سی کسک میں مبتلا کرگئی تھی۔ میں اپنی اس وقت کی کیفیت کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔

یہ غنیمت تھا کہ آفیسر اس وقت میری جانب متوجہ نہیں

تھا۔ وہ ہمارے سامان کے بارے میں سوال کرکے کمرے میں متلاشی نظر سے اس سامان کو ڈھونڈنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ میں نے فوری طور پر اپنے اندرونی جذبات اور چہرے پر ابھر آنے والے تاثرات پر قابو پالیا' مبادا آفیسر میری حالت دیکھ کر کسی شک میں مبتلا ہوجائے۔

میرا ذہن مسلسل مالا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نیلگری سے ہونے والی آخری ملاقات کی ایک ایک تفصیل مجھے یاد تھی۔ مالا کی گمشدگی کے بعد میرے تصور کے پردے پر نیلگری کی ایک ایک بات' ایک ایک جملہ روشن ہو رہا تھا۔ مہایوگی گوتم بھوش اور اس کے چیلے پنڈت دھیراج کو شرمناک شکست دینے کے بعد میں نے انہیں عبرت ناک موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ گومپو کی بدھ عبادت گاہ سے واپسی کے سفر میں ہم مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے "لمبینی" نامی قصبے میں بھی رکے تھے۔ اس قصبے کو گوتم بدھ یعنی لارڈ بدھا کی جنم بھومی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

لمبینی میں نیلگری نے مجھ سے آخری بات چیت کی تھی۔ وہ یک طرفہ گفتگو تھی۔ نیلگری خاموش لبوں سے بول رہی تھی اور میں ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کی مدھر آواز سن رہا تھا۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد ملاقات تھی۔ اسی ملاقات کے دوران میں نیلگری نے مجھے وہ مالا دوبارہ دے دی تھی۔ میں اپنی غفلت میں گوتم بھوش سے مقابلہ کرتے ہوئے اس مالا کو گومپو کی قدیم عبادت گاہ ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ ایک موقع پر میں نے یہ مالا کھینچ کر گوتم بھوش پر دے ماری تھی۔

نیلگری نے یہ مالا اپنی مخروطی انگلیوں سے میری گردن میں پہناتے ہوئے کہا تھا "وجدان! یہ مالا تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔ کبھی ملنے کو دل چاہے تو اس کا بڑا پتھر منہ میں ڈال کر چوس لینا۔ ویسے میں تمہارے آس پاس ہی رہوں گی۔ تم اپنا جاپ مکمل کرلو تو میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہوجاؤں گی۔" پھر وہ میری پیشانی پر ایک کیف آور بوسہ ثبت کرکے ہوا میں تحلیل ہوگئی تھی۔

پھر میرا ذہن نیلگری کی یاد میں کچھ اور پیچھے چلا گیا۔ بدھ کی قدیم عبادت گاہ گومپو میں بھی اس نے میری سماعت میں ایک سریلی سرگوشی کی تھی "وجدان' تم نے گوتم بھوش جیسے شیطان کو ختم کرکے مجھ پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ تمہاری نیت کے خلوص نے مجھے ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے' میں تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگتی رہوں گی۔ تمہارے دشمن زیرپا ہوں گے اور فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے گی لیکن..."

وہ اچانک خاموش ہوگئی تو میں نے مضطرب انداز میں پوچھا "لیکن کیا نیلگری؟"

اس نے بوجھل آواز میں جواب دیا تھا "لیکن تمہاری نیت کی معمولی سی کھوٹ بھی تم سے یہ سب کچھ چھین لے گی اور میں جانتی ہوں... کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب شیطانی قوتیں پھر تم پر حملہ آور ہوں گی اور تمہارے قدم لڑکھڑانے لگیں گے۔ میں تمہاری ثابت قدمی کے لیے دعا کرتی ہوں لیکن یہ سب کچھ بہرحال تمہارے ہی اختیار میں ہوگا۔ میں پھر تم سے یہی کہوں گی کہ تم اپنا جاپ مکمل کرلو۔ میں تمہاری کنیز بن کر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاؤں گی۔"

میں نیلگری کے حسین اور دل نشیں تصور میں کھویا ہوا تھا کہ آفیسر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ایک دیوار کی جانب اشارہ کرکے پوچھ رہا تھا "کیا وہ بیگ تمہارا ہی ہے؟"

میں نے آفیسر کے اشارے کا تعاقب کیا۔ اس نے بالکل درست بیگ کی نشان دہی کی تھی۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا وہ سفری بیگ ہمارا ہی تھا جس میں روز مرہ کی چیزوں کے علاوہ ہمارے کپڑے تھے۔ بیگ میں قابلِ اعتراض کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

میں نے آفیسر کے سوال کا مثبت جواب دیا "ہاں' یہ بیگ ہمارا ہی ہے۔"

دس منٹ تک وہ بڑے ماہرانہ انداز میں ہمارے بیگ کی تلاشی لیتا رہا پھر ہماری جانب بڑھتے ہوئے بولا "اب تم دونوں باری باری جامہ تلاشی دو۔"

میں نے کہا "آفیسر! میں مرد ہوں۔ تم بخوشی میری تلاشی لے لو لیکن میری ساتھی کلثوم ایک لڑکی ہے۔ اس کی جامہ تلاشی کے لیے اگر کسی لیڈی سرچر کا انتظام ہوجائے تو..."

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "اس کی ضرورت نہیں۔"

"تو...؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے کہا "تو یہ کہ تمہاری ساتھی اپنے لباس کی تمام جیبیں الٹ کر دکھادے۔ میں مطمئن ہوجاؤں گا۔"

آفیسر کی تجویز سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک معقول اور شریف النفس انسان تھا۔ میرے اشارے پر دھنو نے پہلے اپنی ٹی شرٹ کی ننھی سی اکلوتی جیب میں ہاتھ ڈال کر اسے الٹ دیا۔ یعنی جیب کے کپڑے کو باہر نکال کر الٹا دیا۔ وہ جیب بالکل خالی تھی۔ آفیسر نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

دھنو نے جو جینز پہن رکھی تھی اس کی جیبوں میں بھی

قابلِ گرفت چیز کوئی نہیں تھی۔ تاہم آفیسر کی تسلی کے لیے انہیں الٹا کر دکھانا ضروری تھا۔ جب دھنو نے یہ "کوشش" کی تو ٹخنے کی تکلیف نے اسے باقاعدہ کراہنے پر مجبور کردیا۔

"اس کے پاؤں میں کیا ہوا ہے؟" آفیسر نے پوچھا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دھنو کے ٹخنے پر لگنے والی چوٹ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا پھر کہا "آپ لوگوں کی آمد سے کوئی آدھا گھنٹا پہلے اس گاؤں کا حکیم کلثوم کے ٹخنے کی موچ نکال کر گیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ چند روز تک اسے درد برداشت کرنا ہوگا۔"

دھنو کے جوگرز بھی اتروائے گئے اور موزوں تک کو الٹ کر دیکھ لیا گیا لیکن کوئی ایسی چیز آفیسر کے ہاتھ نہ لگی جو ہمارے لیے پریشانی کھڑی کرتی۔

دھنو کی تلاشی کے بعد آفیسر مطمئن ہو کر میری جانب بڑھا۔ میرے لباس میں بھی ایسی کوئی شے نہیں تھی جسے قابلِ اعتراض کہا جاتا۔ البتہ دھرم چند کا دیا ہوا رقعہ آفیسر کو کسی شک میں ڈال سکتا تھا مگر میں اس رقعے کے حوالے سے اٹھنے والے تمام سوالات کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا اس لیے فکرمندی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم ٹھاکر بھانوت کی ہدایت اور مشورے کے مطابق اپنے ساتھ ایسی کوئی بھی شے لے کر نہیں آئے تھے جو کسی نازک موقع پر ہماری جان کا وبال بن جاتی۔

پہلے میرے جوگرز چیک کیے گئے اور اب آفیسر جامہ تلاشی لیتے ہوئے میرے بدن کو بھی ٹٹول رہا تھا۔ جب اس کے فولادی ہاتھ میری گردن پر پہنچے تو ایک مرتبہ پھر مجھے نیلگری کی مالا کا خیال آگیا۔ مالا کا زیاں میں کسی بھی طور بھول نہیں سکتا تھا۔ اب مجھے یقین ہوچلا تھا کہ وہ مالا ریگستان کے کسی مقام پر میری گردن سے جدا ہوگئی تھی' خاص طور پر اس وقت جب فائرنگ کی آواز سن کر ہم اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوئے تھے... ہم کیا' ہمارے اونٹ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ فائرنگ سرحدی محافظوں کی ایک جیپ سے کی جارہی تھی جن کا غالباً کسی اسمگلر پارٹی سے ٹکراؤ ہوگیا تھا۔ جیپ پر لگی لائٹ مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ نکل رہی تھی جس کی آواز سے ہمارے اونٹ بدک گئے تھے پھر جب دھنو اپنے اونٹ سے نیچے گر گئی تو میں نے بھی اپنے اونٹ سے چھلانگ لگا دی تھی۔ ہم اپنی جان بچانے کے لیے ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں میں گرتے پڑتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ہربنس اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنے اونٹ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ریت کے ٹیلوں میں الٹنے لڑھکنے کے دوران میں وہ قیمتی مالا کسی طرح میری گردن سے نکل گئی تھی جس کا حصول اب تقریباً ناممکنات میں تھا۔ میں واپس ریگستان کے اس خطرناک حصے میں جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ مالا از خود اڑ کر میری گردن تک پہنچ سکتی تھی البتہ نیلگری سے کچھ بھی بعید نہیں تھا مگر میں اس وقت پیش آمدہ صورتِ حال سے برسرِپیکار تھا۔ ہم آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک چکے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" آفیسر کے سوالیہ جملے نے مجھے خیالات کی نگری سے واپس آنے پر مجبور کردیا۔ وہ ایک کاغذ میری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھ رہا تھا "اس کاغذ پر ہندی زبان میں کیا لکھا ہوا ہے؟"

میں نے چونک کر آفیسر کے ہاتھ میں دبے اس کاغذ کو دیکھا۔ وہ پنڈت کشوری لال کے نام دھرم چند مکھیا کا دیا ہوا ہی رقعہ تھا جس کے مطابق پنڈت نے مجھے پچاس ہزار روپے دینا تھے۔ آفیسر وہ رقعہ میرے لباس سے برآمد کرچکا تھا۔

میں نے کہا "آفیسر! میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ انڈیا کے سرحدی گاؤں سوئی گام کے مکھیا دھرم چند نے ہمیں ادھر پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ یہ اسی کا دیا ہوا خط ہے۔ اس کے مطابق پنڈت کشوری لال ہمیں بحفاظت کراچی تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔"

میں نے پچاس ہزار روپے کی رقم کا ذکر دانستہ گول کردیا تھا۔ آفیسر غالباً ہندی تحریر کو پڑھنے سے قاصر تھا۔ وہ ناواقفیت کے انداز میں اس رقعے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد وہ رقعہ پنڈت کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کشوری لال! اسے تم ہی پڑھ کر سناؤ۔"

کشوری لال نے ہچکچاتے ہوئے وہ رقعہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے گریز آمیز انداز کو دیکھتے ہوئے رینجرز آفیسر نے کہا "گھبراؤ نہیں' یہ کوئی زہریلا سانپ نہیں بلکہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جو تمہیں ذرا سی بھی گزند نہیں پہنچائے گا۔"

پنڈت نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "میرے لیے تو کاغذ کا یہ پرزہ کسی خطرناک ناگ سے کم نہیں مہاراج۔"

"ہاں' تم صحیح کہتے ہو۔" آفیسر نے کہا "اس رقعے کی تحریر تمہارے کالے کرتوتوں کا بیّن ثبوت پیش کرے گی۔ واقعی یہ کاغذ تمہارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہونے والا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "لیکن پنڈت! کسی ہیرا پھیری کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ ایک ایک لفظ ٹھیک ٹھاک پڑھنا۔"

میں نے ہندوستان میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا جس کی وجہ سے میں ہندی رسم الخط کو اچھی طرح پڑھنے، سمجھنے اور لکھنے لگا تھا۔ بول چال میں تو ہندی بڑی حد تک اردو کے مماثل ہے اس لیے مجھے بولنے اور سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ میں نے اپنی ضرورت کے تحت ہندی کے ٹھیٹ الفاظ بھی سیکھ لیے تھے۔

کہتے ہیں، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایسا کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ وقت پڑنے پر انسان مشکل سے مشکل کام بھی سیکھ ہی جاتا ہے۔ جو لوگ چٹے ان پڑھ ہوتے ہیں، قسمت کی یاوری جب انہیں یورپ یا امریکا کے کسی ایسے ملک میں سیٹل کردیتی ہے جہاں انگلش بولی جاتی ہو تو وہ تھوڑے ہی عرصے میں فرفر انگریزی بولنے لگتے ہیں۔

پنڈت کشوری لال نے وہ رقعہ پڑھ کر سنا دیا۔ تاہم یہاں اس کی سازشانہ ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ رقم کے معاملے میں ڈنڈی مار گیا تھا۔ میں نے تو کسی مصلحت کی بنا پر پچاس ہزار روپے کا ذکر نہیں کیا تھا مگر پنڈت کی عیاری آمیز بے ایمانی پر میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

"پنڈت! تم نے آفیسر کی تنبیہہ کو نظرانداز کرکے اپنے لیے گڑھا کھودا ہے۔" میں نے کشوری لال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کک... کیوں۔" وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا "مم... میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

میں نے گمبھیر انداز میں کہا "تم نے رقعے کے چند نہایت اہم مندرجات کو حذف کرکے پڑھا ہے۔ یاد ہے، آفیسر نے اس سلسلے میں تمہیں وارننگ بھی دی تھی!"

میرے انکشاف پر آفیسر نے نفرت آمیز نظر سے پنڈت کشوری لال کو گھورا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم بتاؤ مراد، پنڈت نے کہاں گڑبڑ کی ہے؟"

میں نے اسے اصل بات سے آگاہ کردیا۔

اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا اور کہا "کیا تم ہندی تحریر پڑھ لیتے ہو؟"

میں نے مصلحت کے تقاضے کے پیشِ نظر نفی میں گردن ہلا دی ورنہ مجھے انڈیا کا کوئی خفیہ ایجنٹ بھی سمجھا جاسکتا تھا جبکہ میں اب تک کے اپنے بیان میں خود کو بنگلہ دیش کا باشندہ ظاہر کرچکا تھا۔

آفیسر نے سوال کیا "پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ خط میں پچاس ہزار روپے پاکستانی کرنسی کا ذکر موجود ہے۔"

"سیدھی سی بات ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا "دھرم چند نے یہ رقعہ میرے حوالے کرتے ہوئے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگ چونکہ زبان کے دھنی ہوتے ہیں اس لیے میں نے دھرم چند کی بات کا اعتبار کرلیا لیکن۔" میں نے ذرا توقف دے کر پنڈت کو گھورا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن پنڈت کی تازہ ترین چالاکی کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس "شعبے" میں اس جیسی کچھ کالی بھیڑیں بھی ہوتی ہیں۔"

میرے بھرے پر آبنوسی رنگت کا مالک پنڈت کشوری لال پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پچاس ہزار روپے کے ذکر پر آفیسر خاصا چوکنا اور محتاط ہوگیا تھا۔ اس نے ہم سب کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم ہمارے ساتھ ہیڈ کوارٹر چلو گے۔"

پنڈت نے ہاتھ جوڑ کر باقاعدہ منت سماجت شروع کردی مگر آفیسر نے اس کی ایک نہ سنی اور حتمی انداز میں کہا "تمہیں جو بھی رونا گانا اور چیخنا چلانا ہے وہ ہیڈ کوارٹر میں جاکر شوق پورا کرلینا۔"

میں نے معتدل لہجے میں آفیسر سے پوچھا "تم ہمیں کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

"میں تم دونوں کو اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے پیش کروں گا۔" اس نے کہا۔

"مگر میں نے تو تمہارے تمام سوالوں کے جواب دے رہے ہیں۔" میں نے قدرے برہم لہجے میں کہا۔

"اب تمہیں مزید جو کچھ بھی کہنا ہو، اعلیٰ افسر کے روبرو کہنا۔" وہ دوٹوک انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔

"مگر تم..." میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"تو آرگومنٹس۔" اس نے سختی سے میری بات کاٹ دی۔

میں جھنجلا کر خاموش ہوگیا۔ پنڈت کی عیاری سے میں خواہ مخواہ جذباتی ہوگیا تھا۔ مجھے جس بات کا ڈر تھا وہ آخر ہو کر رہی تھی۔ آفیسر اتنی بڑی رقم کے ذکر پر محتاط ہوگیا تھا۔ بہرحال مجھ سے ایک غلطی ہوچکی تھی جس کی کسی موقع پر خوب صورتی سے تلافی کی ضرورت تھی۔ فی الحال آفیسر سے بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔

اسی وقت خانہ تلاشی لینے والے واپس آگئے۔ وہ خالی ہاتھ اور مایوس چہروں کے ساتھ پنڈت کے گھر کے اندرونی حصے سے برآمد ہوئے تھے جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ان کے ہاتھ کوئی قابلِ اعتراض شے نہیں لگی تھی۔

پنڈت کشوری لال واقعی ایک عیار اور چالباز شخص تھا۔ اس نے اسمگلنگ کے مال کو گھر سے دور رکھا تھا۔ علی الصباح جب ہم اپنے راہنما ہرنبس کے ساتھ اس بستی میں پہنچے تھے تو ہرنبس نے پیر بخش نامی ایک شخص کو اونٹوں سے "مال" اتروانے کا حکم دیا تھا۔ اسمگلنگ کا وہ مال یقیناً کسی دوسرے محفوظ مقام پر رکھا گیا تھا۔

"سر! ہم نے اس مکان کا کونا کونا اور چپا چپا دیکھ لیا ہے۔" اس کانسٹیبل نے بتایا جو آفیسر کے ساتھ ہی ہمارے سروں پر نازل ہوا تھا۔

میں اس سرحدی محافظ کا ذکر کانسٹیبل کے طور پر کر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ نیم عسکری فورس یعنی "رینجرز" میں وہ کس عہدے پر فائز تھا البتہ پولیس میں اس حیثیت کے شخص کو کانسٹیبل اور آرمی میں سپاہی یعنی سولجر کہا جاتا ہے۔

آفیسر نے سخت لہجے میں دریافت کیا "تو پھر؟"

کانسٹیبل نے کہا "سر! ہمیں کوئی بھی قابلِ گرفت چیز نہیں ملی۔"

اس موقع پر پنڈت کشوری لال چلایا "مہاراج! دیکھ لیا آپ نے۔ میں نے تو آپ کو بتایا تھا کہ میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں۔ اسمگلنگ کے دھندے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔" پھر وہ میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس بندے کے سلسلے میں مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے وہ آپ معاف کردیں۔ میں آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔"

آفیسر نے پنڈت کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا "ان تینوں کو لے جاکر جیپ میں بٹھاؤ۔ ہری اپ!"

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ ہمیں گنوں کے نشانے پر رکھتے ہوئے جیپ میں سوار کروایا گیا جو گلی کے سرے پر کھڑی تھی۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر رینجرز کا ایک جوان بالکل مستعد بیٹھا تھا۔ آفیسر نے پسنجرز سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے جیپ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوچکی تھی۔

میری معلومات کے مطابق ہماری منزل رینجرز کا ہیڈ کوارٹر تھی۔ دھنو خاصی سہمی ہوئی تھی۔ اب تک اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا تھا۔ خاص طور پر جب سے میں نے اسے گونگا ظاہر کیا تھا، لگتا تھا وہ واقعی گونگی ہوگئی ہو۔

ہمیں جیپ میں اگلے سرے پر بٹھایا گیا تھا یعنی ڈرائیونگ کیبن کے عین پیچھے۔ تینوں مسلح رینجرز کے جوان ہمارے بعد بیٹھے تھے۔ یہ آمنے سامنے کی دو سیٹیں تھیں۔ ایک سیٹ پر دھنو، میں اور ایک کانسٹیبل بیٹھا تھا جبکہ سامنے والی نشست پر پنڈت کشوری لال کے بعد دو کانسٹیبل موجود تھے۔ ہم سب اس ترتیب سے بیٹھے تھے کہ میرے عین سامنے وہ کانسٹیبل تھا جو آفیسر کے ساتھ سب سے پہلے پنڈت کے گھر پہنچا تھا۔ ہمارے سامان والا بیگ جیپ کے فرش پر رکھا تھا تاہم اس پر سرحدی محافظوں ہی کا قبضہ تھا۔

میں نے وقت گزاری اور اپنی معلومات کی خاطر اپنے روبرو بیٹھے کانسٹیبل سے بات چیت شروع کردی۔

"بھائی! یہ تو بتاؤ، تم لوگوں کا ہیڈ کوارٹر یہاں سے کتنا دور ہے؟"

میرا سوال بہت عام سا اور برمحل تھا اس لیے اس نے جواب دینے میں کوئی تردد نہیں کیا، بولا "زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم پندرہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔"

میں نے پوچھا "تمہارا جو آفیسر جیپ کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہے، اس کا عہدہ کیا ہے؟"

"وہ صوبے دار صاحب ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اور تم لوگوں کا اعلیٰ افسر کون ہے؟"

"کپتان صالح رحیم صاحب۔"

"کپتان صاحب کس قسم کے آدمی ہیں؟"

اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور کہا "تم اپنی زبان بند ہی رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔"

میں نے اس کے برابر میں بیٹھے ہوئے کانسٹیبل کی ایک "خفیہ حرکت" کو نوٹ کرلیا تھا۔ مذکورہ کانسٹیبل نے مجھ سے بات کرنے والے کانسٹیبل کی پسلیوں میں اپنی کہنی سے ٹھوکا دیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ مجھ سے زیادہ "فری" ہونے کی ضرورت نہیں۔

میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے سامنے والے کانسٹیبل کو مخاطب کرتے ہوئے لجاجت آمیز انداز میں کہا "اچھا بھائی، بس ایک بات بتا دو۔ ہیڈ کوارٹر کے ذکر پر پنڈت کشوری لال کا پتا پانی کیوں ہوگیا تھا۔ کیا وہ کوئی بہت ہی خطرناک اور ڈراؤنی جگہ ہے؟"

جواب دینے کے بجائے کانسٹیبل نے مجھے بری طرح جھڑک دیا "کیا تم نے میری بات نہیں سنی؟"

"سنی ہے جناب۔" میں سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر اسے دھیان میں رکھو۔" دوسرے کانسٹیبل نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "اگر اب تم نے کوئی سوال کیا تو تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔"

میں اپنے ساتھ کسی برے سلوک کی خواہش نہیں رکھتا تھا اس لیے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دھنو تو گونگی بنی

ہی ہوئی تھی' ناچار میں بھی گونگا بن گیا۔ یہ گونگوں کی ایک ایسی جوڑی تھی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی تھی۔ اچھے خاصے ہنستے بولتے' قہقہے اچھالتے دو انسانوں کو وقت کے جبر اور حالات کی مصلحت نے گونگا بن کر چپ بیٹھنے پر مجبور کردیا تھا۔

کانسٹیبل کی فراہم کردہ معلومات کے بالعکس پندرہ بیس منٹ کے بجائے ہماری جیپ ریت اڑاتی لگ بھگ آدھے گھنٹے میں اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔

رینجرز کا ہیڈ کوارٹر ایک متروک حویلی میں قائم کیا گیا تھا۔ اس حویلی کا بیشتر حصہ اب کھنڈر کی شکل اختیار کرچکا تھا۔ بس دو تین کمرے استعمال کے قابل تھے جنہیں رینجرز والوں نے ٹھیک ٹھاک کرکے اپنی چوکی قائم کر رکھی تھی۔ دراصل اسی چوکی کو ہیڈ کوارٹر کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

ہمیں ایک کمرے میں لے جاکر بٹھایا گیا۔ وہ ایک عام سا کمرا تھا جس میں ایک میز کے سامنے چند آہنی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک آہنی بینچ بھی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے دفتری ضروریات سے زیادہ اٹھنے بیٹھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ہم پر کڑی نظر رکھنے کے لیے ایک مسلح جوان کمرے کے دروازے میں اٹین شن کھڑا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد مجھے اس صوبے دار کی شکل دکھائی دی جو صبح پنڈت کے گھر پہنچا تھا اور ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آیا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر مجھ سے کہا "کپتان صاحب! آپ دونوں کو یاد کر رہے ہیں۔"

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا "پنڈت کا کیا ہوا؟"

"پنڈت کو بھول جاؤ۔" وہ کرخت انداز میں بولا۔

"پھر بھی۔"

میں نے پنڈت کشوری لال کے بارے میں جاننا چاہا مگر صوبے دار نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "تمہیں صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ پنڈت کے ساتھ ہم اس کے "شایانِ شان" ہی سلوک کریں گے مگر تم نے اگر کپتان صاحب کے سامنے اپنی دروغ گوئی جاری رکھی تو سمجھ لو' تمہارا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا۔"

صوبے دار کی دھمکی آمیز گفتگو سے مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا کہ کھیل بگڑ چکا ہے۔ صوبے دار نے میری دروغ گوئی کا حوالہ دے کر مجھے یہ باور کروانے کی کوشش کی تھی کہ اس نے میری کہانی کو یقین کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے دھنو کو اشارہ کیا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر ہم صوبے دار کی معیّت میں چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے جس کے اندر کپتان صالح رحیم موجود تھا۔ صوبے دار نے کمرے کے دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دی اور ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ کردیا۔ ہم نے صوبے دار صاحب کے اشارے کی تعمیل کی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ہمارے عقب میں دروازہ بند ہوگیا۔ یقیناً دروازہ صوبے دار نے بند کیا تھا۔ ہم کپتان صالح رحیم کی جانب متوجہ ہوگئے۔

کپتان صاحب کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ نہایت متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے سے ذہانت اور تجربہ جھلکتا تھا۔ کپتان کی کنپٹیوں کے بال سفید ہوچکے تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک جہاں دیدہ' بردبار اور اپنے پیشے کا ماہر دکھائی دیتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کی شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

کپتان صالح رحیم کے اشارے پر ہم اس کی میز کے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے اپنی میز پر موجود چیزوں کی ترتیب بدلتا رہا پھر ہماری جانب دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں گویا۔

"تم لوگوں نے اپنے نام مراد اور کلثوم ہی بتائے تھے نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا "جی کپتان صاحب۔"

وہ بڑے مشفقانہ انداز میں بتانے لگا "مسٹر مراد! گزشتہ رات سرحد کے اس پار ریگستان میں اسمگلروں کی ایک پارٹی سے ہماری مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔" وہ کچھ اس انداز میں بول رہا تھا جیسے ہم اس کے پرانے شناسا ہوں۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا "ہم نے اپنی جیپ سے ان پر فائرنگ کی تھی۔ لائٹ مشین گن سے برسنے والی گولیوں نے اسمگلروں کو وہیں ریت پر اس طرح ڈھیر کردیا کہ ان کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "یہ ایل ایم جی کی گولیاں اتنی ہی سفاک ہوتی ہیں۔"

ہم خاموشی سے کپتان صالح رحیم کو دیکھ رہے تھے۔ دھنو تو خاموش رہنے پر مجبور تھی کہ اسے گونگا ظاہر کیا گیا تھا مگر میں بھی چپ چاپ بیٹھا کپتان کو سن رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "برخوردار! میں نے جس اسمگلر پارٹی کا ذکر کیا ہے وہ چار افراد پر مشتمل تھی۔ ان چاروں نے ہمارے جوانوں پر جوابی فائرنگ بھی کی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے جوانوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں اٹھانا پڑا۔ اسمگلروں کے دو ساتھی ہماری فائرنگ سے موت کے گھاٹ اتر گئے اور باقی دو۔۔۔!"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے ہمیں دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اسے توقع ہو کہ میں فوراً بول اٹھوں گا لیکن میں نے اس کی توقع کے خلاف زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ میں اپنے اندرونی تجسس کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

"باقی دو میں سے۔" وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "یعنی ایک بندہ اور ایک بندی ابھی تک ہمارے ہتھے نہیں چڑھے۔"

اتنا کہہ کر وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے ایک مرتبہ پھر باری باری ہمارے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ دھنو "گونگی" تھی۔ میں بھی "گونگا" بنا بیٹھا رہا۔

کپتان صالح رحیم نرم آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا "آج صبح ہمیں اپنے خفیہ ذرائع سے اطلاع ملی کہ دو افراد غیر قانونی طور پر سرحد عبور کرکے ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ دونوں پنڈت کشوری لال کے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" ایک لمحے کو توقف دے کر کپتان نے اپنی میز کی دراز کھولی' ایک نظر اندر جھانکا' دراز کو بند کیا پھر ہماری جانب متوجہ ہوکر بولا۔

"میں نے صوبے دار محمد رمضان کو فوراً پنڈت کے گھر کی طرف روانہ کردیا مگر نتیجہ ہماری توقع کے مطابق برآمد نہ ہوا۔ پنڈت کے گھر پر تم دونوں سے صوبے دار کی ملاقات ہوگئی۔ تم ہمارے مطلوبہ بندے تو نہیں ہو لیکن۔۔۔"

کپتان جملے کو نامکمل چھوڑ کر مجھے تکنے لگا۔ اس موقع پر میں نے بولنا ضروری سمجھا۔ میں نے سوالیہ انداز میں کہا "لیکن کیا کپتان؟"

"لیکن۔" وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا "لیکن یہ برخوردار کہ تم دونوں غلط طریقے سے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہو۔ تمہارا یہ جرم نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔"

میں نے بیزاری سے کہا "میں اپنی مجبوری کی وضاحت کرچکا ہوں۔"

"یقیناً۔" کپتان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا "تم سے پوچھ گچھ کی مکمل رپورٹ صوبے دار رمضان مجھے دے چکا ہے جس کے مطابق تم نے متعدد جھوٹ بولے ہیں۔ ہم تمہاری کہانی پر کیسے یقین کرلیں؟"

"میں نے کون سے جھوٹ بولے ہیں؟" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں بتاتا ہوں کیونکہ یہ جاننا تمہارا حق ہے۔" کپتان نے معتدل اور سنجیدہ انداز میں بولنا شروع کیا "تمہارے بیان کے مطابق تم دونوں بنگلہ دیش سے انڈیا اور پھر انڈیا سے پاکستان آئے ہو۔ بنگلہ دیش میں مسلم کش فسادات میں تم دونوں کے گھر والے جان ہار گئے تھے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "برخوردار! میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔ پورے پاکستان کے علاوہ دنیا کے چودہ پندرہ ممالک میں مجھے رہنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے بنگلہ دیش میں بھی تین سال گزارے ہیں۔" ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا پھر گمبھیر لہجے میں بولا "تم دونوں کا رنگ و روپ' قد کاٹھ اور صحت و جسامت بنگلہ دیش سے لگا نہیں کھاتی پھر ہر ملک اور ہر خطے میں بسنے والوں کے کچھ مخصوص خال و خط ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بھی تم دونوں میں بنگالیوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ میرا مشاہدہ اور علم یہ بتاتا ہے کہ تمہارا تعلق پاکستان یا ہندوستان سے ہے جبکہ تمہاری ساتھی تھائی لینڈ' چائنا یا تبت کی رہنے والی ہے۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

سوال کرکے وہ جواب طلب نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ کپتان نے تو ہمارا ایکسرے کر ڈالا تھا۔ اس کی تجربہ کار نگاہ کی داد دینے کو دل چاہ رہا تھا مگر یہ موقع تفریح کا نہیں تھا۔ کپتان کے انکشاف نے ہم دونوں کو پریشان کردیا تھا۔ میں قدرے الجھ گیا۔ دھنو بھی ہراساں نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

جب ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہ بولا تو کپتان نے کہا "مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔ تمہارے چہروں کے تاثرات نے مجھے بتا دیا ہے کہ میرا قیاس صد فی صد درست ہے۔"

وہ چند لمحے اپنے دونوں ہاتھوں کو گھورتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا "مسٹر مراد! مجھے نہیں یقین کہ تمہارا نام مراد اور تمہاری ساتھی کا نام کلثوم ہے۔ اس سلسلے میں بھی تم نے یقیناً دروغ گوئی سے کام لیا ہوگا۔ سچ بتاؤ' تم دونوں کون ہو' کہاں سے آئے ہو اور تمہارے نام کیا ہیں۔ پاکستان میں تمہاری آمد کا مقصد کیا ہے؟"

بات ختم کرتے کرتے کپتان کے لہجے میں خاصی سختی آگئی تھی۔ اب وہ پہلے والا نرم خو اور مہربان افسر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ بڑی حد تک سچ بول کر اس

سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "کپتان صاحب! آپ کا اندازہ بڑی حد تک درست ہے۔ میں پیدائشی طور پر پاکستانی ہوں۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ سنگاپور میں گزرا ہے۔" پھر میں نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میری دوست ہے' اس کے آباؤ اجداد کا تعلق تبت سے تھا۔" اس کے بعد میں نے ناگفتی اور انتہائی ذاتی واقعات کو چھپاتے ہوئے کپتان کو اپنے اور دھنو کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں بعض واقعات پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی تھیں بہرحال' میں نے اسے ایک خاص حد سے آگے کچھ نہیں بتایا تھا۔ میری زندگی کی کہانی کا لب لباب یہ تھا کہ میں شر کے خلاف حق کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ میرے اثر انگیز اور جامع بیان نے کپتان کو مطمئن کردیا۔ اس نے بعض سوالات بھی کیے جن کے میں نے تسلی بخش جواب دیے۔ میں نے کپتان کو اپنے اصل نام بھی بتا دیے تھے۔ ظاہر ہے' دھنو کا "گونگا پن" بھی مجھے "ختم" کرنا پڑا تھا۔ میرے انکشاف پر کپتان نے نرمی سے کہا۔

"اس بات کا ہمیں صبح ہی پتا چل گیا تھا۔"

"صبح ہی؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "ہاں صبح ہی۔ ہمارے مخبر نے ہمیں بتایا تھا کہ زخمی لڑکی نے اپنے ٹخنے کی موچ نکلوانے سے پہلے تم سے اور موچ نکلوانے کے بعد حکیم جی سے کیا باتیں کی تھیں۔"

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ کپتان نے بات ہی ایسی کی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کیا وہی حکیم آپ کے لیے مخبری کرتا ہے؟"

جب پنڈت کے گھر میں حکیم دھنو کا ٹخنا دیکھنے آیا تھا تو اس وقت بیٹھک نما کمرے میں میرے' دھنو اور کشوری لال کے سوا کوئی چوتھا فرد موجود نہیں تھا۔ ہم تینوں میں سے تو کوئی انفارمر ہو نہیں سکتا تھا۔ آجا کر حکیم پر ہی تان ٹوٹتی تھی پھر کپتان نے دھنو کی حکیم سے بات چیت کا حوالہ بھی دیا تھا جس سے سارا شک حکیم کی طرف ہی جاتا تھا۔

کپتان میرا سوال سن کر زیرِ لب مسکرایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "تمہارا یہ سوال مجھ تک نہیں "پہنچا" تم اپنے طور پر جو بھی نتیجہ اخذ کرلو' تمہیں اس کا حق ہے۔ ماشاءاللہ' تم تو خاصے تجربے کار سیلانی اور مہم جو ہو۔"

کپتان نے بڑے مبہم الفاظ میں میری تعریف کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی زبان سے حکیم کے مخبر ہونے کا اقرار نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے اس کا انداز ہی میرے سوال کا مثبت جواب تھا۔ حکیم کے سوا اور کوئی شخص یہ خبر ان تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میں نے اپنے مطلب کی طرف کپتان کی توجہ دلاتے ہوئے پوچھا "اب ہمارے لیے کیا حکم ہے۔ آپ لوگوں نے ہمارے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"تم دونوں کو مزید دو تین گھنٹے ہماری چوکی پر رکنا پڑے گا۔" کپتان نے جواب دیا "محکمہ جاتی ضروری کارروائی کے بعد آپ کو مقامی پولیس کے حوالے کردیا جائے گا۔"

"پولیس کے حوالے کیوں جناب؟"

"ہمارے بعد ان کا کام شروع ہوتا ہے اس لیے۔"

"تو اس کا مطلب ہے' آپ ہم سے مطمئن نہیں ہو!"

"ایک حد تک مطمئن ہوئے ہیں۔" کپتان صالح رحیم نے مضبوط لہجے میں کہا "باقی کا اطمینان مقامی پولیس والے کریں گے۔"

میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا "میں کچھ سمجھا نہیں جناب!"

"دیکھو برخوردار۔" کپتان کا لہجہ پھر مشفقانہ ہوگیا "ہم سرحدی محافظ ہیں۔ ہمارا کام وطنِ عزیز کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ ہم یہ کام نہایت تن دہی اور جوش و جذبے سے کرتے ہیں۔ اپنی ڈیوٹی کے مقام پر ہم بڑی چوکس نظروں سے سرحد کی نگرانی کرتے ہیں۔ ہر قسم کی غیر قانونی نقل و حمل اور آمد و شد کو روکنا ہمارا اولین فریضہ ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے دوران میں جو مجرم ہمارے ہتھے چڑھتے ہیں انہیں ضروری کارروائی کے بعد ہم اپنی رپورٹ کے ساتھ مقامی پولیس کے حوالے کردیتے ہیں اس کے بعد ان کا کام شروع ہوتا ہے۔ وہ معاملے کی نوعیت اور جرم کی سنگینی دیکھتے ہوئے پیش قدمی کرتے ہیں۔ ہمارا دائرہ کار صرف یہیں تک ہے۔ ملک دشمن اور قانون شکن حرکات و سکنات کرنے والوں کو ہم پکڑتے ہیں پھر انہیں مقامی پولیس والوں کے حوالے کردیا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے تو کوئی بھی ملک دشمن حرکت نہیں کی۔"

"تم کسی حد تک درست کہہ رہے ہو۔" کپتان نے تائید کرتے ہوئے بولا "لیکن غیر قانونی طور پر کسی بھی ملک کی

سرحد پار کرنا ایک سنگین جرم ہے چاہے یہ جرم کتنی بھی مجبوری کی حالت میں کیا جائے اس لیے تم دونوں کو پولیس کو فیس کرنا ہوگا۔"

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ایک نوری خیال نے مجھے سکونِ قلب سے نواز دیا تھا اور وہ اچھوتا خیال یہ تھا کہ ہمیں مقامی پولیس کے حوالے کیا جارہا تھا۔ آپ بھی یہ سوچ رہے ہوں گے کہ پولیس کی کسٹڈی میں جانے کو میں اچھوتا اور اطمینان بخش خیال کیوں کہہ رہا ہوں؟

دراصل بات یہ ہے کہ میں نے صبح سے دوپہر تک رینجرز والوں کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور ان کے بارے میں' میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ان سے کسی قسم کی ساز باز ممکن نہیں۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم نے سرحد پار کرکے سرحدی قوانین کی کھلی خلاف ورزی کی تھی جو قانون شکنی کے زمرے میں آتی تھی۔ رینجرز والے نہایت ایمان دار اور فرض شناس ثابت ہو رہے تھے۔ میں ایک غیر قانونی حرکت کرنے کے بعد ان سے کسی قسم کی رعایت کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔

ہاں البتہ' پولیس کا معاملہ دوسرا تھا۔ میں نے برصغیر پاک و ہند کی پولیس کی بہت "تعریف" سن رکھی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے انڈیا پولیس سے تو میرا گہرا واسطہ بھی رہا تھا۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوچکا تھا لہٰذا اس تناظر میں پولیس والوں کے پاس پہنچنے کے بعد ہمارے لیے آسانیاں پیدا ہونے کی امید کی جاسکتی تھی۔

میں نے کپتان صالح رحیم سے پوچھا "پنڈت کشوری لال کہاں گیا؟"

"وہ ہمارے قبضے میں ہے۔" اس نے بتایا "گزشتہ رات تمہارے قافلے والوں نے اونٹوں پر جو مال اسمگل کرکے بستی کے داخلی حصے میں واقع حویلی تک پہنچایا ہے' پنڈت نے اس کے بارے میں سب کچھ قبول کرلیا ہے۔ پنڈت کے دونوں آدمی آچر اور پیر بخش بھی ہماری تحویل میں آچکے ہیں البتہ تمہارے قافلے کا سربراہ ہربنس ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اسمگلنگ کا مال برآمد کرلیا گیا ہے۔ پنڈت کے بارے میں بھی ایک سنسنی خیز رپورٹ تیار ہو رہی ہے۔ اسے بھی تم دونوں کے ساتھ ہی حوالۂ پولیس کیا جائے گا۔"

کپتان کا انکشاف پر از معلومات تھا۔ مجھے اپنی رقم کا خیال آگیا۔

"کپتان صاحب!" میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا "سوئی گام کے مکھیا دھرم چند نے مجھے ایک رقعہ دیا تھا۔ جس میں۔۔۔"

"ہاں' وہ رقعہ میں پڑھ چکا ہوں۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "صوبے دار محمد رمضان نے سب سے پہلے مجھے وہی خط دکھایا تھا۔ صوبے دار ہندی تحریر نہیں پڑھ سکتا لیکن میں اردو' انگریزی کے علاوہ سندھی' پنجابی' گجراتی اور ہندی زبان بھی بہت اچھی طرح لکھ' پڑھ اور بول سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "اگر آپ نے وہ رقعہ پڑھ لیا ہے تو پھر آپ کو یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ پنڈت نے مجھے پاکستانی کرنسی میں پچاس ہزار روپے دینا ہیں۔"

"ہاں' میں نے یہ بھی پڑھا ہے' پھر؟"

کپتان نے سوالیہ انداز میں جملہ ختم کیا تھا' میں نے کہا "آپ یہ تو کرسکتے ہیں' مجھے وہ رقم ہی دلا دیں۔"

"ناممکن!" وہ قطعیت سے بولا "ہمارا کام مجرم کو پکڑ کر مقامی پولیس کے حوالے کرنا ہے۔ تم یہ "فرمائش" پولیس والوں سے کرنا۔ وہاں پنڈت بھی موجود ہوگا۔ ممکن ہے' تمہارا کام ہوجائے۔ ویسے مجھے اس کی زیادہ امید نہیں ہے۔"

میں خاموش ہوگیا۔ کپتان نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا "ٹھیک ہے' اب تم دونوں دوسرے کمرے میں چلے جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے صوبے دار کو بلا کر ہمیں اس کے حوالے کردیا۔

صوبے دار محمد رمضان نے طنزیہ مسکراہٹ سے دھنو کو دیکھا پھر میری جانب تکتے ہوئے پوچھا "مسٹر مراد! کیا تمہاری ساتھی کلثوم ابھی تک گونگی ہے یا اس نے بولنا سیکھ لیا ہے؟"

میں اس کے طنز کو سمجھ رہا تھا۔ صوبے دار کو یہ تو معلوم تھا کہ دھنو قوتِ گویائی سے محروم نہیں لیکن وہ یہ بات ابھی نہیں جانتا تھا کہ ہم مراد اور کلثوم نہیں بلکہ وجدان اور دھنو ہیں خیر' بہت جلد اسے یہ پتا چلنے والا تھا۔

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا "بھئی صوبے دار صاحب! آپ کے کپتان صاحب تو بڑے کمال کے آدمی ہیں۔ انہوں نے میری ساتھی کو فرفر بولنا سکھا دیا ہے۔" پھر میں نے دھنو کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ مار کر کہا "صوبے دار صاحب کو ذرا بول کر دکھاؤ۔" دھنو میرے سہارے چل رہی تھی۔ وہ ابھی اپنے پاؤں پر وزن ڈالنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔

وہ سمجھ گئی کہ میں شرارت کے موڈ میں ہوں۔ وہ کسی تیز رفتار مشین کے مانند اسٹارٹ ہوگئی۔ صوبے دار صاحب

حیرت سے منہ کھول کر دھنو کا منہ تکنے لگا۔ دھنو طبعاً شوخ چنچل اور شریر تھی اور اس وقت تو اس کافی دیر بعد زبان کھولنے کا موقع ملا تھا۔ وہ تبتی اور ہندی الفاظ سے مزین جملے بڑی روانی سے بول رہی تھی۔

صوبے دار نے بالآخر اپنی حیرت کو رفع کرنے کی خاطر پوچھا "بھئی یہ کون سی زبان بول رہی ہے؟"

"یہ بات تو تم اپنے کپتان صاحب سے پوچھو جا کر۔" میں نے مزاح کے رنگ میں کہا "انہوں نے ہی اسے بولنا سکھایا ہے۔"

صوبے دار ہمیں واپس اسی کمرے میں پہنچا کر جانے لگا تو میں نے پوچھا "جناب! صبح سے دوپہر ہو گئی بلکہ اب تو دوپہر بھی ڈھل رہی ہے۔ ہم نے صبح ناشتے میں ایک پراٹھا اور ایک ایک چائے کا کپ پیا تھا۔ اس کے بعد مجال ہے' جو ایک کھیل بھی اڑ کر ہمارے منہ تک پہنچی ہو۔ اگر کھانے وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو سکتا تو اللہ کے بندے پانی کے دو گھونٹ ہی پلا دو۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر اثبات میں سر ہلا کر چلا گیا۔

ہم دونوں اس وقت کمرے میں اکیلے تھے۔ تاہم ایک گن بردار سرحدی محافظ کمرے کے دروازے کے باہر مستعد کھڑا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنے کا واحد راستہ یہی دروازہ تھا جسے وہ مسدود کیے کھڑا تھا۔

ہم دبی دبی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ ہماری یہ پوری کوشش تھی کہ ہمارے الفاظ پہرے دار مسلح شخص کی سماعت تک نہ پہنچنے پائیں۔ ہم احتیاط کے دامن کو بڑی مضبوطی سے تھامے رکھنا چاہتے تھے۔

دھنو نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا "ہمت سنگھ! آج تو تم خاصی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہے ہو!"

"میں ہمت سنگھ نہیں' وجدان ہوں۔" میں نے ٹوکتے ہوئے کہا "اور الحمدللہ مسلمان ہوں۔"

وہ زیر لب مسکرائی "ہاں' اب میں تمہاری حقیقت جان گئی ہوں۔"

دھنو جب مسکراتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے ویرانے میں بہار آ گئی ہو۔ ہم جس قسم کی صورتِ حال میں محبوس تھے اس کے پیشِ نظر کہا جا سکتا تھا کہ دھنو کے مسکرانے سے ریگزار میں ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی تھی۔

یہ حقیقت ہے کہ دھنو کو میری اصلیت کا پتا ابھی چلا تھا۔ ہمت سنگھ کا نام مجھے رانی روپ متی نے دیا تھا۔ دھنو کو میرے اصلی نام اور مذہب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ مجھے تھوڑی دیر پہلے تک ہمت سنگھ ہی سمجھ رہی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میری حقیقت جان گئی ہو تو اسے یاد بھی رکھنا۔"

وہ ایک اندازِ دلربائی سے مسکرائی اور بولی "میں تمہیں بھولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی وجدان۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ تمہارا تعلق مذہب اسلام سے ہے۔ یہ مذہب ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہے۔ اس کی تعلیمات ہمارے مذہب سے بہت ملتی ہیں۔ لارڈ بدھا اگر عظیم تر تھے تو تمہارے پیغمبر عظیم ترین ہیں۔ میں نے اس محسنِ انسانیت کے بارے میں بہت کچھ جان رکھا ہے۔"

ایک غیر مسلم بدھ مت لڑکی کی زبان سے اسلام کی تعریف سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے کی خوشی بھی اس خوشی میں شامل ہو کر میرے اندرون کو باغ باغ کر رہی تھی۔

میں نے کہا "دھنو! تم نے پہلے کبھی اپنے ان خیالات اور احساسات کا اظہار نہیں کیا؟"

"اگر سچ بولوں تو برا تو نہیں مانو گے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"نہیں' نہیں۔ کہو' کیا کہنا چاہتی ہو۔"

اس نے کہا "میں اب تک تم سے جو متاثر ہو رہی ہوں اس کی ایک خاص وجہ تھی۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کسی خاص وجہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی "وجدان! سچی بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے احسانوں تلے دبی ہوئی ہوں۔ تم نے بڑے کڑے وقت میں مجھے سہارا دیا تھا۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میرے باپ تھونجی اور ماں بھیرجانی کو سفاک درندوں نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں بے بس' بے کس اور بے سہارا ہو گئی تھی۔ ایسے موقع پر تم اور تمہارے ساتھیوں نے مجھے پوری طرح سنبھال دیا۔ ناگ پال کے آدمیوں کی بربریت کا شکار ہونے والے اپنے والدین کی لاشیں لے کر جب میں کھٹمنڈو پہنچی تو تم نے قدم قدم پر میری مدد کی۔ میں تمہارے احسانات میں سر تک ڈوبی ہوئی ہوں۔ کون کون سا واقعہ یاد کروں۔"

وہ خاموش ہو کر خیالوں میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔

"وجدان! تنکو قبیلے میں قیام کے دوران میرے ساتھ کیا ہوا تھا' کیا میں اس اندوہناک واقعے کو بھول سکتی ہوں؟" ایک لمحے کو چپ رہنے کے بعد وہ بولی "غنڈا صفت شیواگ نے اپنی رکھیل کی مدد سے مجھے اغوا کروا لیا تھا۔ میں اس حرافہ کونگا کی باتوں میں آ گئی تھی لہٰذا دھوکے سے مجھے ایک پراسرار جزیرے پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں مجھ پر بہت تشدد کیا گیا مگر میری زندگی بچانے والے تم تھے۔"

میں نے کہا "زندگی لینے اور دینے والی صرف خدا کی ذات ہے۔ میں نے اس نازک مرحلے پر جو کچھ کیا' اپنا فرض جان کر کیا۔"

وہ اپنی ہی دھن میں بولے چلی گئی "وجدان' تم نے اس جزیرے پر پہنچ کر شیواگ اور اس کے ساتھی ہینگ کے پنجۂ ستم سے مجھے نجات دلائی تھی۔ میری زندگی اور عزت کو محفوظ رکھنے میں تم نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں' کم ہے۔"

میں نے کہا "دوستوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا دھنو۔"

"میں تمہاری دوستی کے قابل کہاں وجدان۔" وہ وجد کے عالم میں بولی "تم تو بہت مہان ہو' عظیم ہو۔ اگر مجھے تمہارے قدموں میں ہی جگہ ملی رہے تو میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہو گی۔"

میں نے کہا "تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔"

"میں اگر اس بارے میں سوچوں بھی تو مجھے موت آ جائے۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی "تمہاری شرمندگی کسی قیمت پر مجھے منظور نہیں۔"

"دیکھو دھنو!" میں نے اسے شانوں سے تھام کر کہا "دوستوں پر نہ تو احسان کیا جاتا ہے اور نہ ہی کسی معاملے میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ دونوں عمل دوستی کے لیے زہرِ ہلاہل ہیں۔" میں نے تھپک کر اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم نے بھی میری خاطر بہت مصیبتیں اٹھائی ہیں دھنو! ناگ پال کے آدمیوں نے تمہارے ماں باپ کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک کیا' وہ میری جنگ کا ایک منظر تھا۔ وہ جنگ' جو میرے اور ناگ پال کے درمیان جاری تھی۔ اس کے علاوہ نرس مایا متی کے باپ کے قتل اور اس کے گھر پر قبضے کے جھوٹے الزام میں ہم تینوں کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی تو پولیس کسٹڈی میں تم پر بے انتہا تشدد کیا گیا تھا حتیٰ کہ تمہارا لباس بھی پھٹ گیا تھا۔ یہ ظلم و زیادتی سہنے میں تمہارا کیا قصور تھا؟ یہ بھی تو میری ہی جنگ تھی نا! میں نے تم سے اور شوبھا سے کہا بھی تھا۔ تم لوگ میرے خلاف بیان دے کر نجات حاصل کر لو مگر تم نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا "نہیں' لارڈ بدھا کی قسم' میں جان تو دے سکتی ہوں مگر تمہارے خلاف ایک لفظ نہیں بول سکتی۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ انداز میں اپنی بات جاری رکھی "کیا اس واقعے کو بھول گئی ہو جب کھٹمنڈو میں جاسوسی کے الزام میں ہمیں گرفتار کر کے ملٹری ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا تھا۔ اگرچہ وہاں تم پر اور شوبھا پر تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم تم لوگوں کو بری طرح ہراساں کیا گیا تھا۔ تم نے وہ اعصاب شکن لمحات کس کرب میں گزارے ہوں گے' مجھے پوری طرح اس کا احساس ہے۔ تم دونوں کو ڈرایا دھمکایا گیا تھا' خوفناک نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔ اس حساب سے تو مجھ پر تمہارے احسانات کا بوجھ کہیں زیادہ ہے۔ شیواگ والا واقعہ بھی میری ہی وجہ سے پیش آیا تھا۔ وہ مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اور مجھے نقصان پہنچانے کا کوئی بھی موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔"

میں یہ جذبات سے لبریز تقریر کر کے خاموش ہوا تو دھنو نے کہا "تم کچھ بھی کہو مگر میں یہی سمجھتی ہوں کہ میں تمہارے احسانات تلے دبی ہوئی ہوں۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے کہ تم کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہو۔ میں تمہاری نیت کی سچائی اور پرخلوص برتاؤ ہی کی وجہ سے تم سے متاثر ہوئی تھی وجدان۔ بس ایک بات مجھے ہمیشہ بے کل رکھتی تھی مگر اب وہ بھی کانٹا نکل گیا ہے۔"

"ایسی کیا بات تھی دھنو؟" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

دھنو کے جواب دینے سے پہلے ہی صوبے دار محمد رمضان دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ایک چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں دو گلاس پانی کے ساتھ دو روٹیاں اور چھوٹی سی کٹوری میں اچار تھا۔ صوبے دار ٹرے ہمارے حوالے کر کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ دونوں روٹیاں تنوری تھیں اور اچار آم و لیموں کا تھا۔

ہم کھانا کھاتے ہوئے دوبارہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ہم بڑے محتاط انداز میں اس طرح گفتگو کر رہے تھے کہ دروازے پر کھڑے مسلح محافظ کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔ ہمارا انداز سرگوشیانہ تھا۔

میں نے کہا "دھنو! تم کسی خاص بات کا ذکر کر رہی تھیں؟"

"ہاں وجدان! میں سچے دل سے کہتی ہوں' تم پر لاکھ اعتماد کرنے کے باوجود یہ خیال مجھے بے چین رکھتا تھا کہ تم ایک ہندو ہو۔ ہندوؤں نے تبت' نیپال اور بدھ مت کو اپنی فطری مکاری اور چالبازی سے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بس

یہ ایک لاشعوری کھٹکا سا تھا جو اب ختم ہوگیا ہے۔ لارڈ بدھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تم ایک مسلمان ہو۔ اب میرے دل میں کوئی خلش نہیں ہے۔"

میں حیرت اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس کانچ کی گڑیا کو دیکھ رہا تھا۔ دھنو کے چہرے کی معصومیت نے اس کی دلکشی اور نظر فریبی میں چار چاند لگادیے تھے۔ وہ اٹھارہ انیس سال کی ایک دراز قامت، سڈول جسم والی لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی ہرنی جیسی سیاہ آنکھیں خاموشی کی زبان بولتی تھیں۔ سرخ و سفید رنگت نے اس کے حسن میں تازگی بھردی تھی۔ اس پر اس کی شوخی، چنچل اور شرارت آمیز اداؤں نے اس کے شاداب بدن کو پنکھ لگادیے تھے۔

میں نے کہا "دھنو! میں کوشش کروں گا کہ تمہارے اعتماد پر پورا اتر سکوں لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھنا، میرے پاؤں میں بگولے بندھے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جانتا میرا کون سا دن کہاں اور کون سی رات کہاں گزرے گی۔ زندگی مجھ سے ایک کڑا امتحان لے رہی ہے اس لیے تم مجھ سے کوئی بہت بلند امیدیں وابستہ نہ کرلینا۔ آخر کو میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔"

"وجدان! میں نے اپنے روحانی پیشوا دلائی لاما کے اقوال کو اپنی روح میں اتارا ہے، دل میں بسایا ہے اور ذہن پر نقش کیا ہے۔" وہ کھانے سے ہاتھ روکتے ہوئے بولی "وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ انسان کو اپنے عزائم کو بلندی کی انتہا سے زیادہ بلند اور ناممکنات سے زیادہ ممکن رکھنا چاہیے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر اسے کامیابی نہ ہو تو انسان کا دل نہیں ٹوٹتا۔ وہ یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں تھا۔"

"تمہارے دلائی لاما نے بڑی گہری بات کی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "دلائی لاما نے تو تمہارے بارے میں بھی بڑی گہری باتیں کی ہیں وجدان۔ یاد ہے، میرے باپ تھوپجی نے تمہیں عبادت گاہ کے تہ خانے کا راز کیوں بتایا تھا؟ وہ وقت بھی یاد کرو جب میرے ماں باپ کی موت کے بعد دلائی لاما کے بھیجے ہوئے نئے بدھ راہب، بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا چارج سنبھال رہے تھے تو انہوں نے تم سے کیا گفتگو کی تھی؟"

میں دھنو کے اشارے بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ میرے لیے یہ بڑے فخر و انبساط کی بات تھی کہ دلائی لاما نے مجھ پر اپنا بھرپور اعتماد ظاہر کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یقیناً وہ میرے جوہر سے آشنا تھا۔

دھنو نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "تم نے تو ہندوستان اور نیپال میں میری ہر قسم کی مدد کی ہے۔ یہ تو تمہارا اپنا ملک ہے۔ یہاں تو میں زیادہ محفوظ ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو دھنو۔" میں نے کھانے والی ٹرے کو ایک جانب کھسکاتے ہوئے کہا "پاکستان میرا اصل وطن ہے۔ میں یہیں پیدا ہوا تھا۔ تم کپتان کی موجودگی میں میری زندگی کی بیشتر کہانی سن چکی ہو۔ جو باتیں میں نے یہاں مجبوراً چھپائی ہیں وہ رفتہ رفتہ تم پر آشکار ہوتی رہیں گی۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات جاری رکھی "میں اپنے والدین کی گود میں جب اس ملک سے گیا تھا تو میری عمر صرف دو ماہ تھی۔ میرے والدین کو بڑی کسمپرسی کی حالت میں اپنا ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ وہ اپنے گاؤں رکھا والی سے لاہور شہر پہنچے، پھر لاہور سے کراچی اور کراچی سے سنگاپور چلے گئے۔ میں بارہ سال کا ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے بڑی بے دردی سے میرے ماں باپ کو قتل کردیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن، میں مسلسل ایک چکر میں ہوں۔ حالات اور قسمت جہاں لے جائے دوڑا چلا جاتا ہوں۔ میں نے پہلے بھی پاکستان آنے کی کوشش کی تھی مگر ہمارا جہاز ائرپاکٹ میں پھنس گیا اور جہاز کو ہنگامی لینڈنگ کرنا پڑی جس کے باعث میں انڈیا کے وسیع و عریض ریگستان میں پہنچ گیا تھا اور اب..." میں نے ایک لمحے کو رک کر ایک بوجھل سانس خارج کی اور کہا "اور اب اپنے ملک کی دھرتی پر قدم رکھا ہے تو ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

دھنو نے کہا "وجدان، ہم دونوں کی کہانی میں بڑی مماثلت ہے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "ہم دونوں کے والدین کو ہمارے سامنے خاک و خون میں لوٹایا گیا، بس فرق اتنا سا ہے کہ ان اندوہناک دل دوز واقعات کے وقت تمہاری عمر بارہ سال تھی اور میں اٹھارہ سال کی ہوں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو دھنو۔" میرے لہجے میں اداسی آئی۔

وہ بھی دل گرفتہ نظر آنے لگی۔ دھنو بھی ماضی قریب میں ایک صدمہ جانکاہ سے گزری تھی۔ وہ میری کیفیت کو زیادہ اچھے انداز میں سمجھ اور محسوس کرسکتی تھی۔ اس کی یہ بات بڑی حد تک درست تھی کہ ہم کم و بیش ایک جیسے حالات میں والدین سے محروم ہوئے تھے۔

کہتے ہیں، حالات کی کشیدگی کو زبان کی شگفتگی کاٹ دیتی ہے۔ شاید اسی فلسفے کے تحت دھنو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ وہ مزاجاً چنچل اور شریر تو تھی ہی۔ دو چار شرارت آمیز پہیلیوں کے بعد وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"وجدان! ایک بات پوچھوں، صحیح صحیح جواب دوگے؟"

اس کی سنجیدگی میں مصنوعی پن کی جھلک کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہاں پوچھو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

اس نے پوچھا "وجدان! کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

اس کا سوال بہت نازک اور اہم تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا "ہاں، میں نے زندگی میں بہت سے لوگوں سے محبت کی ہے۔"

"میں بہت سے لوگوں کی بات نہیں کررہی۔"

"میں بتا رہا ہوں نا۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "سب سے پہلے میں نے اپنے ماں باپ سے بے انتہا محبت کی، اس کے بعد اپنے تمام دوستوں سے مجھے محبت ہے۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو میرے کام آتے ہیں یا میں جن کے لیے کچھ کرتا ہوں، میں ان کا خیر خواہ ہوں، ہمدرد ہوں۔ میرے دل میں ان کے لیے خلوص ہے، محبت ہے۔ میں ان کے آرام اور سکھ کے لیے اپنی جان کو کسی بھی مصیبت میں ڈال سکتا ہوں اور میں..."

اس نے میری بات کاٹ دی پھر شرارت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "تم بہت خوب صورتی سے میرے سوال سے پہلو تہی کررہے ہو وجدان!"

"میں پہلو تہی نہیں کررہا دھنو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بلکہ تمہارے سوال ہی کا جواب دے رہا ہوں۔"

"پھر میں کہوں گی، تم نے میرے سوال کو سمجھا ہی نہیں۔"

"تم سمجھانے کی کوشش کرو۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگی جیسے میں اسے بنانے کی کوشش کررہا ہوں۔ اس کے اس انداز میں بڑی حد تک سچائی شامل تھی۔

میری عملی زندگی میں بے شمار لڑکیاں اور عورتیں آتی جاتی رہی تھیں۔ ان میں ایک سے ایک طرح دار حسینہ تھی۔

بعض اوقات تو میں ہجوم مہ وشاں میں رات و دن گھرا رہتا تھا۔ دھنو نے میری زندگی کے ایک ایسے گوشے میں جھانک لیا تھا کہ میری یادداشت میں خیالات کا البم کھل گیا تھا اور میں دماغ کی کھڑکی سے ماضی میں دیکھنے لگا تھا۔

تھائی وانگ میری زندگی میں آنے والی پہلی نامحرم تھی۔ میں اس کی دہری محبت سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ ہماری عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا۔ اس نے مجھے ایک محبوبہ اور ایک ماں کے پیار کے امتزاج سے روشناس کرایا تھا۔ میں اس کی آغوش میں جاکر کبھی تو ایک ننھا بچہ بن جاتا تھا اور کبھی بھرپور مرد۔ میں آج تک اس کی محبت کے مزاج اور اسٹائل کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس دو پہلو محبت سے ہمکنار ہوتے ہوئے کبھی میرے پاؤں نہیں ڈگمگائے تھے۔ ہماری طویل رفاقت کے دوران میں ہم دونوں سے کبھی کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوئی جس پر ہمیں بعد میں شرمسار ہونا پڑا ہو۔ تھائی میری سچی دوست تھی۔ اس نے میری خاطر اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ گھربار، کاروبار میری حمایت کی پاداش میں تباہ و برباد کروالیا تھا اور بالآخر میری دوستی کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ بھی دے دیا تھا۔

جانکی دیوی بھی ایک جاں نثار دوست ثابت ہوئی تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھی مگر میری دوستی نے اسے دردر کی خاک چھاننے پر مجبور کردیا تھا اور وہ اسی دربدری میں خوش تھی پھر ایک موقع پر اسے بھی میری جنگ کے شعلوں نے نگل لیا تھا۔ وہ میری جیت کی خاطر اپنی جان ہار گئی تھی۔

نویتا اور رنگولی کا کردار بھی میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتا تھا اور رنگ سنت کی بیٹی کو میں کیسے بھول سکتا تھا؟ سونیا بڑی قیامت خیز اور طوفان آمیز لڑکی تھی۔ اس لڑکی نے میرے زہد کی دنیا میں جزوی سیندھ لگالی تھی جس پر میں ابھی تک نادم تھا۔ گولڈن ٹرائی اینگل کی جانب جاتے ہوئے "چیانگ سائین" کی ایک پہاڑی پناہ گاہ میں، سونیا کے ساتھ قیام کے دوران میں میری زندگی میں وہ لمحات بھی آئے تھے جب میرے پایہ استقامت میں معمولی سی جنبش پیدا ہوئی تھی۔ اس حرکت نے مجھے پورے وجود سے جھنجوڑ ڈالا تھا۔

رانی روپ متی اور شوبھا نے بھی میری دوستی میں بہت مصائب اٹھائے تھے۔ مجھے ہمت سنگھ کا نام روپ متی ہی نے دیا تھا۔ وہ مجھے ایک انسانی نیلام گاہ سے بھاری قیمت میں خرید کرلائی تھی۔ میں قانوناً اس کا زرخرید غلام تھا مگر اس نے مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ میری حمایت اور دوستی کے جرم میں اس نے جے پور کے پنڈتوں کی دشمنی مول لی تھی۔

پھر ہلا اور چترا پریتم تھیں۔ ان دونوں نے بھی میرے لیے بہت قربانیاں دی تھیں بلکہ مجھ پر اپنی جانیں بھی قربان کردی تھیں۔ ایسے جاں نثار دوستوں کا زیاں مجھے بہت ستاتا تھا۔ ان کے بارے میں سوچ کر دل خون ہوجاتا تھا لیکن یہی زندگی ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا عمل دائمی ہے۔ اگر آپ زندہ ہیں اور دنیا میں رہتے ہیں تو اس سے نجات ممکن نہیں۔

دھنو کی شوخ پکار نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "کہاں کھوگئے وجدان؟"

میرے کھوئے ہوئے دھیان کو دھنو کی شیریں آواز نے تلاش لیا تھا۔ میں دماغی طور پر اس کے پاس حاضر ہوگیا۔ وہ میری ذہنی کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے، تم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے!"

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔"

"کس سوچ میں گم تھے؟"

"یادِ رفتگاں میں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "تم مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہی تھیں؟"

"سمجھ دار کو سمجھانا، نا سمجھی ہوتی ہے وجدان۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "اچھا! تم کس سمجھ دار کی سمجھداری کی بات کررہی ہو دھنو؟"

وہ میرے چہرے کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس سمجھدار کو سمجھنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"پھر آیا کچھ سمجھ میں؟"

"بڑی حد تک۔" وہ شرارت سے مسکرائی "باقی بھی رفتہ رفتہ سمجھ ہی جاؤں گی۔"

دھنو جب مسکراتی تھی تو اس کی آنکھوں کی چمک میں کرنوں کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔ تبھی نقوش کی حامل وہ شوخ و شنگ لڑکی بلا کی صفات کی حامل تھی۔ آواز کی شیرینی اور رسیلا پن اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ سے جھلکتا تھا۔ وہ بولتی تھی تو لگتا تھا، شہد ٹپک رہا ہو۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "اس نیک مقصد سے لگی رہو۔"

وہ شاکی لہجے میں بولی "اچھی بات نہیں ہے وجدان!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولی "تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا!"

"اپنے سوال کو دہراؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہاری یادداشت اس قدر کمزور کب سے ہو... وجدان۔" وہ روٹھنے کے سے انداز میں بولی پھر خو... وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ ... نے اپنی زندگی میں کسی لڑکی سے محبت کی ہے۔ محبت ... میری مراد وہ قلبی تعلق ہے جو ایک عاشق اور معشوق ... درمیان ہوتا ہے یا ایک محبوب اور محب میں دیکھنے ... ہے؟"

میں نے بے ساختہ کہا "ایسی محبت کرنے کی تو زندگی ... مجھے کبھی فرصت ہی نہیں دی۔"

اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میری زندگی میں اتنے ... چڑھاؤ اور گھماؤ پھراؤ تھے کہ میں "دل لگی" سے آگے نہ ... بڑھ سکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ "دل کی لگی" کیا ہوتی ... کیونکہ میرے دل کو ابھی لگی نہیں تھی۔

اس سے پہلے کہ دھنو کوئی اور سوال کرتی، ایک ور... پوش سرحدی محافظ کھانے کے برتن اٹھانے آگیا۔ م... خاصا گرم تھا اور پھر ہم ریگزار میں تھے۔ اس وقت میں ا... حالیہ قیام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، بس یہ پتا تھا کہ ... پاکستان کے صوبہ سندھ کے جنوبی ضلع "تھرپارکر" میں نہ... ننگر پارکر اسی ضلع کا ایک سرحدی قصبہ ہے جو بارڈر ... قریب ہونے کے باعث بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔

ہم نے اچار کے ساتھ تنوری روٹیاں کھا کر ایک ... گلاس پانی اپنے حلق میں انڈیل لیا تھا مگر تھوڑی دیر بعد ... دوبارہ پیاس لگنے لگی تھی۔ اچار کے ساتھ روٹی کھانے ... پیاس بڑھ جاتی ہے۔ سرحدی محافظ برتنوں والی ٹرے ... جانے لگا تو میں نے درخواست کی۔

"بھائی! اگر ناراض نہ ہو تو ایک ایک گلاس پانی ... اور پلا دو۔ سندھ کے اس صحرا میں حلق خشک اور زبان ... بن کر رہ گئی ہے۔"

میرا خیال تھا کہ محافظ ہمیں ہمارے بار بار کے "فر... کے پروگرام" پر کھری کھری سنائے گا مگر اس نے چہرے ... کوئی اچھا برا تاثر دیے بغیر دو گلاس پانی مزید لاکر ہم... سامنے رکھ دیا اور خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

دروازے پر کھڑا مسلح محافظ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ... اچٹتی مگر محتاط نگاہ ہم پر ڈال لیتا تھا۔ ہم دونوں ایک دو... سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ پانی پینے کے بعد ... نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ دھنو نے پانی والے گلاس کو ہاتھ ... نہیں لگایا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ... آ گئے۔

میں نے تشویش بھری آواز میں پوچھا "کیا ہوا دھنو؟"

وہ اپنے ٹخنے کو سہلاتے ہوئے بولی "اس میں بہت درد ہورہا ہے۔"

حکیم نے صبح دھنو کے ٹخنے کی موچ نکالنے کے بعد کوئی بدرنگ مرہم لگا کر اچھی طرح مالش کردی تھی اور ایک چھوٹی سی ڈبیا میں وہ مرہم دے بھی دیا تھا جو تین چار روز تک دن میں تین مرتبہ لگانا تھا۔ مذکورہ مرہم وہیں پنڈت کشوری لال کے گھر میں رہ گیا تھا۔ پنڈت کے گھر سے آنے کے بعد دھنو نے میرے کندھے کے سہارے اچھی خاصی چلت پھرت کی تھی جس کی وجہ سے ٹخنے پر ورم آگیا تھا۔ درد کی وجہ یہی ورم تھا۔

میں نے دھنو سے کہا "تم اپنا پاؤں اس کرسی پر رکھ دو۔"

ساتھ ہی میں نے اس کرسی کی جانب اشارہ بھی کیا جو ہمارے درمیان رکھی ہوئی تھی۔ دھنو نے اپنی جینز کا پائنچا ذرا سا اٹھا کر مضروب پاؤں کرسی پر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اس کا پاؤں اپنے ہاتھوں میں لے کر معائنہ کرنے لگا۔

دھنو سرخ و سفید رنگت کی مالک تھی۔ اس کے سڈول بدن کے انگ انگ میں توازن تھا۔ پاؤں خوب صورت اور بناوٹ میں اپنی مثال آپ تھے۔ میں نے ٹخنے کی ہڈی پر اپنے دائیں ہاتھ سے دائرہ وار مساج کیا۔ میرے ہاتھ کی حرکت سے یقیناً دھنو کے درد میں اضافہ ہوا تھا اور اس نے تکلیف برداشت کرنے کے لیے دانتوں کو سختی سے بھینچ رکھا تھا۔

میں لگ بھگ تین منٹ تک کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز مساج کرتا رہا پھر میں نے انگشتِ شہادت کو ٹخنے کی ہڈی کے عین وسط میں پیوست کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور پوری توجہ اس کے ٹخنے پر مرکوز کردی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہو پھر میں نے خاص طور پر اپنے دائیں بازو کو گرم محسوس کیا۔ کوئی غیر مرئی حرارت میرے بازو میں سفر کررہی تھی۔ اس کے سفر کا رخ کندھے سے ہاتھ کی جانب تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے کندھے سے طاقتور حرارتی لہریں نکل کر بازو کے راستے میرے ہاتھ میں پہنچ رہی ہوں اور پھر انگشتِ شہادت سے ہوتے ہوئے وہ دھنو کے ٹخنے میں جذب ہورہی ہوں۔ حرارتی توانائی کی یہ ترسیل مجھے ایک عجیب سا مزہ بھی دے رہی تھی۔ چند لمحات تک یہ سلسلہ جاری رہا پھر میرا بازو نارمل درجہ حرارت پر آگیا۔ میں سمجھ گیا کہ "کام" ہوگیا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کھلی ہوئی آنکھوں کے سامنے دھنو کی آنکھوں میں حیرت ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے لکنت زدہ آواز میں سرگوشی کی۔

"وج... وجدان... تت... تم کوئی جادو... جانتے ہو؟"

"کیوں، کیا ہوا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

وہ لرزاں لہجے میں بولی "لارڈ بدھا کی قسم، تم جادوگر ہو۔ بڑے گنی ہو۔ مہان ہو، عظیم ہو۔ میں... میں..."

جذبات کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا "بات کیا ہے، کچھ منہ سے بھی تو بولو۔"

وہ بولی "وجدان! میرے ٹخنے کا درد بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔" پھر وہ اپنے پاؤں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہیجان خیز لہجے میں کہنے لگی "یہ دیکھو... یہاں کی سرخی اور ورم بھی بہت کم ہوگیا ہے۔ تم نے کیا پڑھ کر پھونکا ہے؟"

"میں نے کچھ بھی پڑھ کر نہیں پھونکا دھنو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "جھاڑ پھونک میرے بس کی بات نہیں۔"

وہ دراصل "چی" کی قوت کا کمال تھا یا آپ اسے "ارتکازِ توجہ" کا کرشمہ کہہ سکتے ہیں۔ میرے بدن کی توانائی نے حرارت کی شکل اختیار کرکے دھنو کے ٹخنے کا درد غائب کردیا تھا اور اس کے ورم میں بھی کمی آئی تھی۔ یہ ایک سیدھا سیدھا فزیو تھراپی کا عمل تھا۔

میرے جواب سے دھنو کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "وجدان! تم بہت گہرے آدمی ہو۔ تمہاری اصلیت پرت در پرت دنیا کی نظر سے اوجھل ہے۔ تم جتنے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ ہو۔"

"تم بھی تو ایسی ہی ہو دھنو۔" میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "کیا تم اس وقت مجھے پوری نظر آرہی ہو؟"

وہ جانے میری بات کا کیا مطلب سمجھی، خود کو سمیٹتے ہوئے جلدی سے بولی "تم بہت ماہر ہو باتیں بنانے کے۔ تمہیں میری بات کا جواب نہیں دینا، نہیں دو گے۔ چاہے میں لاکھ کوشش کرلوں۔ لارڈ بدھا کی قسم، میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی اس لیے تم سے اب تمہاری شکتیوں (قوتوں) کے بارے میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ تم اگر کسی بات کو راز میں رکھنا چاہتے ہو تو میں اسے افشا کرنے کی ضد نہیں کروں

گی۔"

"یہ بات نہیں ہے دھنو۔" میں نے نرمی سے کہا "ابھی جو کچھ تمہارے سامنے پیش آیا ہے اس کی حقیقت کو چھپانے کی میں ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم جسے کوئی جادو یا جھاڑ پھونک سمجھ رہی ہو وہ دراصل "چی" کی قوت کا کرشمہ ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے سوال کیا "کیا تم چی کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟"

اس نے معصومیت سے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا "چی، انسانی جسم میں پوشیدہ ایک پراسرار اور مفید قوت کا نام ہے۔ یہ ہر انسان میں موجود ہوتی ہے مگر خوابیدہ حالت میں۔ اس کا مسکن یا آرام گاہ ناف کے نزدیک ہے۔ جو لوگ اپنی ریاضت اور کڑی مشقوں سے اسے بیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ بڑے خوش نصیب ہیں۔"

"تم اپنی "چی" کو بیدار کر چکے ہو؟" دھنو نے دلچسپی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولی "تو تم نے ابھی اسی "چی" کے ذریعے میرے ٹخنے کے درد کو رفع کیا ہے؟"

میں نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور کہا "یہ تو "چی" کا ایک معمولی سا شعبدہ ہے۔ اس کے بل بوتے پر تو بہت سے ناممکن کام بھی کیے جا سکتے ہیں۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے تکنے لگی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "چی" کو بیدار کرنے والی مشقیں تو انتہائی سادہ اور آسان ہیں لیکن ان کی تکمیل کے لیے کسی عامل کامل استاد کی نگرانی بہت ضروری ہوتی ہے۔ راہبر کے بغیر انسان بھٹک کر تاریکی کے کسی عمیق غار میں بھی کھو سکتا ہے۔ استاد کی راہنمائی حاصل نہ ہو تو یہی سادہ اور آسان مشقیں انتہائی کٹھن اور دشوار گزار ہو جاتی ہیں۔"

دھنو پوری دلچسپی سے میری جانب متوجہ تھی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے سوال کیا "وجدان! تم نے "چی" کی بیداری کی مشقیں کون سے استاد کی نگرانی میں اور کہاں کی تھیں؟"

میں نے جواب دیا "ماسٹر ہنگ پائی کی نگرانی میں۔ یہ میرے دادا استاد بھی تھے۔ اب وہ میرے استاد مہاراج وانگ ونگ یائے کی طرح آنجہانی ہو چکے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "اور تمہارے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے یہ ریاضت "شاؤلن ٹیمپل" میں کی تھی۔"

اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں "کیا تم شاؤلن ٹیمپل بھی جا چکے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے اس کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھا اور کہا "میں ایک طویل عرصے تک بنکاک (تھائی لینڈ) میں مارشل آرٹس کے گرینڈ ماسٹر مہاراج وانگ ونگ یائے سے ان عسکری فنون کی تربیت لیتا رہا ہوں پھر ان کی ہدایت پر میں ان کے استاد یعنی اپنے دادا استاد ماسٹر ہنگ پائی کے پاس مزید ٹریننگ لینے شاؤلن ٹیمپل چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے کنگ فو، یوگا، جمناسٹک اور مراقبے کے علاوہ بہت سی خفیہ روحانی ورزشیں اور مشقیں بھی کی تھیں اور تمہیں ایک بات سن کر بہت حیرت ہوگی دھنو۔"

اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں حیرت اور استعجاب کا سمندر موجزن تھا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے جس یوگی گوتم بھوش سے گومپو کی بدھ عبادت گاہ میں زبردست طلسماتی مقابلہ کیا تھا وہ شیطان صفت یوگی بھی ماسٹر ہنگ پائی ہی کا شاگرد تھا۔"

وہ جلدی سے بولی "یہ واقعی عجیب بات ہے مگر میں سمجھ گئی، ایسا ہوتا ہے۔ ایک ہی استاد کے تمام شاگرد نہ تو اچھے ثابت ہوتے ہیں اور نہ ہی سب کے سب برے نکلتے ہیں۔"

"سارا کھیل ذہنیت کا ہے دھنو۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "انسان کی ذہنیت مثبت یا منفی ہوتی ہے۔ مثبت ذہنیت کے لوگ ہمیشہ کامیاب و کامران رہتے ہیں اور منفی ذہنیت والے افراد وقتی فائدے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے اور ان کا انجام بڑا دردناک اور عبرت انگیز ہوتا ہے جیسا کہ یوگی گوتم بھوش کا حشر ہوا۔ ہم دونوں ماسٹر ہنگ پائی کے شاگرد تھے۔ میں نے نیکی اور اثبات کی راہ اختیار کی اور گوتم بھوش بدی اور نفی کے راستے پر گامزن رہا۔ نتیجے کے طور پر وہ میرے ہاتھوں شکست فاش کھانے کے بعد موت کے گھاٹ اتر گیا۔ فتح ہمیشہ نیکی کی ہوتی ہے دھنو۔ میری یہ بات یاد رکھنا۔ ظلم اور بدی زیادہ دیر تک نہیں پھلتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولی "میری زندگی کا محدود تجربہ بھی یہی ہے۔"

گرینڈ ماسٹر وانگ ونگ یائے، ماسٹر ہنگ پائی اور شاؤلن ٹیمپل کے ذکر نے دھنو کو ایک خاص قسم کے جوش اور ولولے میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی خوشی اور دلچسپی کو دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"دھنو "کیا تم بھی "چی" کی مشقوں میں کوئی دلچسپی رکھتی ہو؟"

شاید میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی، وہ بے دھڑک بول اٹھی "بالکل، مجھے بھی شدید خواہش ہو رہی ہے کہ اپنی "چی" کی قوت کو بیدار کروں۔ ابھی تم نے تھوڑی دیر پہلے میرے ٹخنے پر جو عمل کیا ہے یہ تو سیدھی سیدھی مسیحائی ہے۔ اگر مجھے ایسی قوت حاصل ہو جائے تو میں بہت سے دکھی اور درد میں مبتلا بے کس لوگوں کی تکلیف کو راحت میں بدل دوں گی۔ کسی کے دکھ درد اور غم و الم کو بانٹنا کتنی بڑی نیکی ہے وجدان! پھر اس سے جس قدر سکونِ قلب اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔" ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے اپنی سانس درست کی پھر مجھ سے مستفسر ہوئی "وجدان! کیا اس سلسلے میں تم میری راہنمائی کرو گے؟"

"ضرور۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولی "واقعی، تم ایک عظیم ہستی ہو وجدان! ورنہ اس دنیا کا دستور تو یہی ہے کہ جس کے پاس جو علم اور ہنر ہوتا ہے، وہ اس میں سے کسی کو ذرا سا بھی دینا پسند نہیں کرتا۔ یہ تنگ نظری، کنجوسی اور گھٹیا پن ہے۔"

"ہاں دھنو، اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔" میں نے کہا "حالانکہ علم اور ہنر کا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ ان کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے، یہ اتنے ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں سوچنا چاہیے کہ اگر آپ کسی کو کچھ بتا دیں گے یا کچھ سکھا دیں گے تو اس سے آپ کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی۔ اگر آپ واقعی عالم، ہنرمند اور اپنے فن کے ماہر ہیں تو یاد رکھیے، آپ کا شاگرد ہمیشہ آپ سے پیچھے ہی رہے گا۔ وہ کبھی بھی آپ کو اوورٹیک یا ٹریس پاس نہیں کر سکے گا کیونکہ جتنا وقت اسے ایک چیز کو سمجھنے اور سیکھنے میں لگے گا، اتنے ہی وقت میں آپ اس سے کہیں زیادہ علمی اور فنی راستہ طے کر چکے ہوں گے کیونکہ آپ اس سے زیادہ تجربہ کار اور مشاق ہوتے ہیں۔ بس شرط یہی ہے کہ آپ کے علم کا سفر جاری و ساری ہو۔ آپ کہیں کسی ایک مقام پر تھک کر بیٹھ نہ گئے ہوں۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے، حرکت میں برکت ہے۔ پانی بھی ایک جگہ ٹھہر جائے تو اس میں طرح طرح کی آلائشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ٹھہرا ہوا علم بہت جلد زنگ پکڑ لیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے عالم کو چاٹ کر رکھ دیتا ہے۔"

"تمہاری ذات کا ہر پہلو دلکش و دل نشیں ہے وجدان۔" دھنو نے مسرور لہجے میں کہا "تم اگر ایک مصلح یا مبلغ ہوتے تو تمہاری، شیریں بیانی و شعلہ بیانی کی آمیزش سے وجود پانے والی گفتگو دنیا کا پاسا پلٹ کر رکھ دیتی۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سماعت میں شہد گھولتا ہوا سیدھا دل میں اتر جاتا ہے۔"

"یہ تمہارے نیک جذبات میں دھنو اور پرخلوص خیالات ہیں۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا "ورنہ مجھ میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

وہ مدبرانہ انداز میں بولی "میں جانتی ہوں، ہمیشہ خالی برتن ہی کھنکتا ہے۔ جو لوگ اندر سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں وہ اپنی بڑائی میں لن ترانی نہیں کرتے۔"

"تم تو اس وقت مجھے کوئی دانشور لگ رہی ہو۔" میں نے تیز نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا تمہارے اندر کسی فلسفی کی روح حلول کر گئی ہے؟"

وہ قدرے جھینپ گئی پھر بات بدلتے ہوئے بولی "پکا وعدہ ہے نا! تم "چی" کی قوت حاصل کرنے کے سلسلے میں مجھے گائیڈ کرو گے؟"

"پکا وعدہ۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"اور میں مارشل آرٹس بھی سیکھوں گی!"

"وہ بھی سکھا دوں گا۔"

"اور بھی اچھی اچھی باتیں۔" وہ کسی بچے کی طرح مچل رہی تھی۔

"ہاں بھئی، سب کچھ سکھا دوں گا۔ تم سیکھنے والی تو بنو۔" میں نے کہا "یاد رکھو، جب تک کوئی شخص سیکھنے کی کوشش نہ کرے یا سیکھنا نہ چاہے، دنیا کا بڑے سے بڑا استاد بھی اسے کچھ نہیں سکھا سکتا۔ شاگرد کی لگن سچی اور محنت پکی ہو تو منزل خود چل کر قدموں کے پاس آ جاتی ہے۔"

"میرے اندر بہت لگن ہے۔" وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، وہ تو مجھے نظر آ رہی ہے۔" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ جھینپ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی خفت کو کم کرنے کی خاطر کہا "دھنو! تم بہت حوصلے والی لڑکی ہو۔ مجھے امید ہے، تمہاری لگن تمہیں ایک دن کسی نمایاں مقام تک پہنچا دے گی۔"

"مجھے نہیں کسی نمایاں مقام پر فائز ہونا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولی "میری دنیا تمہارے قدموں سے شروع ہو کر تمہارے قدموں میں ختم ہو جاتی ہے۔"

میں لاجواب سا ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

دھنو بڑی عجیب لڑکی تھی۔ وہ صرف میری قربت اور رفاقت کی خاطر اپنا ملک چھوڑ کر پاکستان چلی آئی تھی حالانکہ وہ اگر چاہتی تو میں نیپالی انسپکٹر بریندرا سے کہہ کر اسے کھٹمنڈو میں کہیں بھی سیٹل کروا سکتا تھا پھر جے پور میں بھی روپ متی نے کوشش کی تھی کہ وہ اس کے پاس یا شوبھا کے پاس رہ جائے مگر دھنو کی سوئی بس ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی... وہ میرے ساتھ جائے گی' چاہے میں اسے جہاں بھی لے جاؤں۔

نتیجے کے طور پر میں اسے اپنے ہمراہ پاکستان لے آیا تھا۔ یہ معصوم صورت' غزالی آنکھوں والی گوری چٹی تبتی لڑکی میرا پیچھا آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس کے عزائم مجھے خاصے خطرناک دکھائی دے رہے تھے حالانکہ اس نے ابھی تک ایسی کوئی جنبش نہیں کی تھی جس سے اس کے دل کا حال اور دماغ کا جال کھل جاتا لیکن وہ کیا کہتے ہیں... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ میں دھنو کی جانب سے خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

پھر ہمارے درمیان زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ دھنو نے مجھ سے پوچھا "وجدان! تم نے بتایا ہے کہ جب تمہارے والدین نے پاکستان چھوڑا تو تم صرف دو ماہ کے تھے۔ تمہارے ماں باپ کو سنگاپور میں تمہاری آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اب دنیا میں تمہارا کوئی رشتے دار نہیں ہے' پھر تم کس غرض سے پاکستان آئے ہو؟"

"سب سے بڑی غرض تو وطن کی محبت ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "کافی عرصے سے میرا دل پاکستان دیکھنے کو مچل رہا تھا۔ ایک مرتبہ کوشش بھی کی لیکن حادثاتی طور پر ہم راجستھان کے صحرا میں پہنچ گئے جس کی داستان میں تمہیں سنا چکا ہوں۔" ایک لمحے کے لیے میں رکا پھر دھنو کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مزید بتایا۔

"میری پہلی خواہش تو یہ ہے کہ میں اپنے وطن عزیز کا چپا چپا دیکھوں' خاص طور پر گاؤں "رکھاں والی" جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ اگرچہ وہ میرے دشمنوں کا علاقہ ہے مگر میں کسی نہ کسی بھیس میں اس گھر کا دیدار کرنا چاہتا ہوں جہاں میں نے آنکھ کھولی تھی۔"

"رکھاں والی گاؤں تمہارے دشمنوں کا علاقہ کیوں ہے؟"

دھنو کے اس سوال پر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح گاؤں کے بڑے چوہدری ملک رمضان نے میرے دادا چوہدری حاکم علی کو کھیتوں میں شوٹ کیا تھا پھر یہ دشمنی نسل آگے بڑھی اور ملک رمضان کا بیٹا ملک نوازش میرے والد عابد علی کا دشمن بن گیا پھر دشمنی نے وہ ... حاصل کیا کہ میرے والد عابد علی اور ماں شگفتہ کو گاؤں ... کر لاہور آنا پڑا مگر وہاں بھی ملک نوازش کا چمچہ خاص دارا کے تعاقب میں تھا۔ لاہور سے چھپتے چھپاتے وہ دونوں ... گود میں لے کر پہلے کراچی پہنچے اور پھر سنگاپور چلے گئے۔ ... نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور ایک رات وہ ان ... خون میں ہاتھ رنگنے میں کامیاب ہو گیا۔ ازاں بعد دارا ... دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا تھا اور آخر کار میں نے اسے عبرت ناک انجام تک پہنچا دیا تھا۔

میری بات سننے کے بعد وہ بولی "وجدان' جیسا کہ ... رہے ہو میں سمجھتی ہوں' اپنے آبائی گاؤں جانا تمہارے ... بہت خطرناک ہوگا۔"

"ہاں خطرناک تو ہوگا۔" میں نے گمبھیر آواز میں ... "میری تو ساری زندگی خطروں سے کھیلتے ہوئے گزری ... دھنو۔ میں نے زندگی سے ایک سبق سیکھا ہے۔ اگر ... خطروں سے نہیں کھیلیں گے تو خطرات آپ سے کھیلنے لگیں گے۔ یہ کھیل تو کسی نہ کسی طور جاری رہنا ہی ہے اس ... میں بالکل مطمئن ہوں۔ وطن کی دھرتی پر قدم رکھنے کے ... میں اس قدر سرشار ہوں کہ بیان سے باہر ہے حالانکہ میں ... چاہتا تو انڈیا سے سیدھا سنگاپور چلا جاتا۔ وہاں ہمارا ... اب میرا ایک بہت بڑا "شعبہ جاتی اسٹور" ہے جو میں نے ... بوٹا سنگھ کے سپرد کر رکھا ہے۔ "عابد علی اینڈ سن" سنگاپور ... علاقے "چائنا ٹاؤن" کا ایک معروف ڈیپارٹمنٹل اسٹور ... جو ساگو اسٹریٹ پر واقع ہے مگر وطن کی محبت مجھے یہاں ... لائی ہے۔ کیا تمہارا' اپنے آبائی علاقے تبت کی جانب جا... کو دل نہیں چاہتا؟"

"بہت دل چاہتا ہے' اس جنت نظیر اور حیرت انگیز ... خطۂ ارض کو دیکھوں۔" وہ پرجوش لہجے میں بولی "میں نے ... بس وہاں کی پراسرار اور تحیر آمیز کہانیاں ہی سنی ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے بھی تبت کے بارے میں بہت ... سن رکھا ہے دھنو۔ میں زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور ... اسراروں کی اس سرزمین کو دیکھنے جاؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی وجدان۔" وہ ... گئی۔

"بشرطیہ کہ اس وقت تم میرے ساتھ ہوئیں تو!" ... نے کہا۔

وہ فرطِ جذبات سے بولی "لارڈ بدھا مجھے زندگی بھر تمہارے ساتھ رکھیں!" اس کا انداز دعائیہ تھا۔ گویا وہ مہاتما بدھ سے درخواست کر رہی تھی کہ ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ہو جائے۔ اس کے دل کی خواہش بے اختیار اس کی زبان سے پھسل گئی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

میں نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ مجھے ایک اور اہم کام نمٹانا ہے۔"

وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا "ملک نوازش علی اور میرے والد عابد علی کی دشمنی کی ایک بنیادی وجہ بھاری مالیت کا سونا بھی تھی۔ میرے والد نے نوازش علی کی سونا اسمگل کرنے کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا اور اس افراتفری میں سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے کینوس کے دو بڑے تھیلے میرے والد کے ہتھے چڑھ گئے تھے جو انہوں نے ایک متروک کنوئیں میں پھینک دیے تھے لیکن نوازش علی کے ہرکارے دارا سے یہ بہانہ کیا کہ انہوں نے سونے والے تھیلے دریائے راوی میں پھینک دیے ہیں۔ یہ دریا پاکستان کے شہر لاہور کے نزدیک ہے۔"

"اچھا' تو تم گڑے مردے اکھاڑنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"کچھ ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"تمہیں یہ ساری اہم باتیں تمہارے والد نے بتائی تھیں؟" دھنو نے پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا "نہیں' والد صاحب کی موت کے بعد مجھے اپنے گھر میں سے ان کی خفیہ ڈائری ملی تھی جس میں یہ تمام واقعات درج ہیں۔"

"وہ ڈائری کہاں ہے؟" دھنو نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا "لاہور میں' میرے ایک محسن کے دوست کے پاس وہ ڈائری محفوظ ہے۔ میں لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسی سے ملوں گا۔"

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی "اور اگر وہ ڈائری یا وہ تمہارے محسن کا دوست اب تک محفوظ نہ ہوا تو؟"

"تو کچھ نہیں۔" میں بے پروائی سے بولا "میں سونے کے حصول کی خاطر لاہور نہیں جا رہا۔ یہ تو ایک طرح کا ایڈونچر ہے۔ یادِ ماضی کا شاخسانہ ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں' میں جانتی ہوں وجدان! تم لالچی یا ہوس پرست نہیں ہو۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں جب نئے بدھ بھکشو نے تمہیں پیشکش کی تھی کہ تم چاہو تو تہ خانے سے کچھ سونا اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو' تو تم نے صاف انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے' ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تمہارے انکار پر نئے بدھ بھکشو نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہارے بارے میں دلائی لاما نے پہلے ہی یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ تم اس قدیم بدھ عبادت گاہ سے ایک تنکا بھی لے کر نہیں جاؤ گے۔"

مجھے یہ بات بھی اچھی طرح یاد تھی۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کا چارج سنبھالنے والے بدھ راہب نے ولائی لاما کے حوالے سے کچھ اسی قسم کا تبصرہ کیا تھا۔ دلائی لاما کو بدھ مت کے پیروکار اپنا روحانی پیشوا مانتے ہیں۔ تبت سے جلاوطنی کے بعد دلائی لاما نے ہندوستان کی شمالی ریاست ہماچل پردیش میں پناہ لی تھی۔ دھرم شالا کو ہماچل پردیش کے صدر مقام کی حیثیت حاصل ہے۔

دھنو نے ڈائری کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایک طرح سے بالکل ٹھیک ہی سوچ رہی تھی۔ ایسا ہو جانا ممکنات میں سے تھا۔ صحیح صورتِ حال اور تازہ ترین حالات کا علم تو لاہور پہنچنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

میرے والدین کی بہیمانہ موت کے بعد مجھے اپنے گھر سے وہ خفیہ ڈائری ملی تھی۔ ان دنوں میرے والد سنگاپور میں فورٹ کیننگ روڈ پر رہتے تھے۔ اسی گھر کے مین گیٹ پر میری ماں اور باپ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ میں ان کی موت کا منظر کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ ازاں بعد میں نے سفاک قاتلوں کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

میرے والد صاحب کے ایک دوست پرتاب سنگھ سنگاپور کے علاقے "لٹل انڈیا" میں رہتے تھے۔ چاچا پرتاب نے جب دیکھا کہ میرے والدین کو قتل کرنے کے بعد قاتل ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ بنکاک (تھائی لینڈ) لے آیا۔ میں نے یہ سفر سنگاپور سے بنکاک تک براستہ ملائشیا کیا تھا لیکن میرے دشمن پیچھا کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ چاچا پرتاب سنگھ نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچایا تھا اور میں مہاراج وانگ ونگ یائے کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تھا۔

سنگاپور سے روانگی سے قبل چاچا پرتاب نے والد صاحب کی خفیہ ڈائری اپنے ایک دوست خشونت سنگھ کے پاس امانتاً رکھوا دی تھی۔ خشونت سنگھ اپنی بیوی رجنی اور بیٹی ارملا کور کے ساتھ سنگاپور ہی میں رہتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب مجھے دوبارہ سنگاپور جانے کا اتفاق ہوا تو اس وقت خشونت سنگھ اور اس کی بیوی رجنی کا انتقال ہو چکا تھا۔

ارملا کور کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اس کے باپو خشونت سنگھ نے اپنی موت سے قبل وہ لاہور میں مقیم اپنے ایک دوست کو بھجوا دی تھی۔ ارملا نے مجھے اس شخص کا پتا بھی بتایا تھا جو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا تھا۔

میرے اور دھنو کے درمیان کافی دیر تک مختلف موضوعات پر بات چیت ہوتی رہی۔ ایک موقع پر میں نے کہا۔

"دھنو! کیا تم اپنا نام تبدیل کر سکتی ہو؟"

"کیوں' میرے نام میں ایسی کیا خرابی ہے؟"

میں نے کہا "خرابی تو کوئی نہیں ہے۔"

وہ بولی "پھر تم مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"بس' مجھے تم پر یہ نام اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

دھنو چند لمحے گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "تو یہ تمہاری خواہش ہے کہ میں اپنا نام بدل لوں؟"

میں نے کہا "ایسا ہی سمجھ لو۔"

"تمہاری خواہش کی خاطر تو میں ہمالیہ سے ٹکرا سکتی ہوں وجدان۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی "ایک نام کی کیا حیثیت ہے۔ تم نے تو میری زندگی بدل دی ہے' نام بھی بدل ڈالو۔"

"ٹھیک ہے' میں اس بارے میں سوچوں گا۔" میں نے کہا۔

"تم میرا کیا نام رکھنا چاہتے ہو؟"

"ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" میں نے کہا "تمہارے ذہن میں کوئی خوب صورت سا نام ہو تو بتاؤ۔"

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی "نہیں وجدان! میں یہ نہیں کروں گی۔"

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی' میں نے پوچھا "تم کیا نہیں کرو گی؟"

"وجدان!" وہ میرے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے بولی "میرے ذہن میں چاہے سیکڑوں خوب صورت نام موجود ہوں مگر میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہی تو بات ہے وجدان۔"

"مجھے بھی تو سمجھاؤ نا!" میں نے حیرت سے اس شرارت کی پڑیا اور موم کی گڑیا کو تکتے ہوئے کہا "تم الجھی ہوئی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی "دیکھو وجدان! تم نے میرا نام تبدیل کرنے کی تجویز دی ہے۔ اب میری یہ خواہش ہے کہ میرے لیے نیا نام بھی تم ہی منتخب کرو۔"

میرے سینے سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ دھنو قد
قدم پر اپنی ذہانت کا ثبوت دے رہی تھی۔ پتا نہیں' وہ مجھ
کیا سمجھ بیٹھی تھی۔ اس کی والہانہ عقیدت میں لمحہ بہ
اضافہ ہوتا جا رہا تھا جو مجھے ذہنی طور پر الجھن میں مبتلا
تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ یہ سب کچھ بے سا
نہ کر رہی ہو بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رفتہ ر
آگے بڑھ رہی ہو۔ صورتِ حال خاصی سنگین شکل اختیار
کرتی جا رہی تھی۔

میں نے کہا "فی الحال تو کوئی مناسب اور منفرد سا نام
سوجھ نہیں رہا۔ میں اس بارے میں غور و فکر کروں گا۔"

"میں انتظار کروں گی وجدان۔"

دھنو نے ایک سادہ سا جملہ بالکل سہل انداز میں کہہ
مجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ وہ بظاہر جتنی سیدھی
آتی تھی' اندر سے اتنی ہی پیچیدہ تھی۔

○☆○

شام سے تھوڑی دیر پہلے ہمیں ہمارے "اعمال نامے"
کے ساتھ اس چوکی سے متعلقہ تھانے پہنچا دیا گیا۔ مقا
پولیس کے حوالے کرنے کے بعد رینجرز والے واپس
گئے۔ ہم دونوں کے علاوہ پنڈت کشوری لال اور اس
دونوں ساتھی آچرا اور پیر بخش کو بھی پولیس کی تحویل میں
دیا گیا تھا۔

میں اور دھنو حوالات کے ایک کمرے میں تھے
پنڈت اور اس کے دونوں بندے دوسرے کمرے میں
تھے۔ رینجرز والوں نے حویلی کے خفیہ گودام سے اسمگل
مال برآمد کرلیا تھا اور ہم پانچوں کے خلاف مکمل رپورٹ
کرنے کے بعد ہی ہمیں اپنی چوکی سے "رخصت" کیا تھا۔

ہمیں حوالات کے جس کمرے میں رکھا گیا تھا' اس
فرش پر کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی ایک مختصر سی چٹائی
تھی۔ کسی زمانے میں وہ چٹائی اپنی اصل شکل و صورت
سائز کے ساتھ وجود رکھتی ہوگی مگر اب امتدادِ زمانہ نے
کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اس کا وجود خاصی حد تک سمٹ چکا تھا
اس کی حالت سے کہنہ سالی جھلکتی تھی۔ جابجا تنکے بھی
ہوئے تھے۔ مذکورہ "چٹائی کی باقیات" پر مشتمل یہ
کمرے کے ایک کونے میں پڑا اپنی بربادی پر اشکبار تھا۔

میں نے اس چٹائی پر بیٹھ کر حوالات کی ٹھنڈی دیوار
ٹیک لگالی۔ دھنو بھی میرے قریب ہی ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ
تھی۔ اس کے چہرے سے اس وقت بھی تکلیف جھلک
اب سورج پوری طرح ڈوب چکا تھا اور فضا میں خنکی در

تھی۔ صحرا کا دن جس قدر جھلسا دینے والا ہوتا ہے' رات اتنی ہی خنک اور جما دینے والی ہوتی ہے۔ ابھی تو رات کا آغاز ہوا تھا۔ فضا میں بڑھتی ہوئی خنکی دھنو کے پاؤں کے درد میں اضافہ کر رہی تھی۔

میں نے اشارے سے دھنو کو اپنا پاؤں نزدیک لانے کو کہا۔ اس نے ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ مضروب پاؤں والی ٹانگ کو سمیٹ لیا۔ اس طرح زخمی ٹخنے والا پاؤں میرے دائیں ہاتھ کے قریب آگیا۔ میں نے اس کے متورم ٹخنے پر ہولے ہولے اپنی انگلیوں سے مساج کرنا شروع کردیا۔ اس طریقہ علاج کو "پاسس" کہا جاتا ہے۔ آج کل یہ عمل "ریکی" کے نام سے بھی متعارف کروایا جا رہا ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ قوتِ ارتکاز کی کرشمہ کاری ہے جس کے پسِ پردہ "چی" کارفرما ہوتی ہے۔ یہ ایک مستند اور موثر دافع درد عمل ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دھنو شانت ہو گئی پھر وہ بھی کھسک کر میرے نزدیک آئی اور حوالات کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اب اس نے اپنی ٹانگوں کو آلتی پالتی کی شکل میں ایک دوسرے کے اوپر چڑھا لیا تھا۔ دھنو کے دائیں ٹخنے میں چوٹ آئی تھی۔ اس حالت میں بیٹھتے ہوئے مضروب پاؤں بائیں ران کے اوپر ٹک گیا تھا۔ دھنو اب اپنے ہاتھ سے دھیرے دھیرے اسے سہلا رہی تھی۔ اس نے اپنی کمر کو سیدھا رکھتے ہوئے آنکھوں کو بند کر رکھا تھا گویا وہ "سیلف پاسس" کے عمل سے گزر رہی تھی۔

میں نے ایک بھرپور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ دھنو کے چہرے کی فطری معصومیت نے میرے دل میں گدگدی سی جگادی۔ بے اختیار مجھے اس پر پیار آنے لگا۔

دو گھنٹے بعد ہماری طلبی ہوئی۔ ایک کانسٹیبل نے آکر حوالات کا دروازہ کھولا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"انچارج صاحب نے تم دونوں کو اپنے کمرے میں بلایا ہے۔"

میں کوئی سوال کیے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اٹھنے میں مدد دینے کے لیے دھنو کی جانب جھکا۔ اس مرتبہ دھنو نے بہت معمولی سا سہارا لیا تھا جس کا مطلب تھا' اس کے ٹخنے کی تکلیف کافی حد تک رفع ہو چکی تھی۔

کانسٹیبل ہمیں تھانہ انچارج کے پاس پہنچا کر واپس چلا گیا۔ ہم دونوں مجرموں کی طرح تھانے دار کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ اس نے تنقیدی نظر سے ہمارا جائزہ لیا پھر اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی فائل پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"بابا' جاسوسی کرتے ہو؟"

اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی۔ میں اس کے سوال پر کھول کر رہ گیا۔ تاہم میں نے ضبط کے دامن کو تھامے رکھا اور معتدل لہجے میں کہا۔

"تھانے دار صاحب! ہم جاسوس نہیں ہیں۔ ایک مجبوری نے ہمیں آپ کے قبضے میں پہنچا دیا ہے۔ آپ اپنی کارروائی جلد از جلد مکمل کرو اور ہمیں جانے دو۔" پھر میں نے دھنو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "میری ساتھی کا پاؤں زخمی ہے' یہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔"

تھانے دار نے دھنو کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "تم بیٹھ سکتی ہو۔"

تھانے دار کی میز کے پاس ہی ایک چوبی بینچ دھری تھی۔ دھنو اس "عنایتِ خسروانہ" سے استفادہ کرتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئی۔ تھانے دار میری جانب متوجہ ہو گیا۔

"بابا' جب کوئی مجرم قانون کی گرفت میں آجاتا ہے تو وہ یہی کہانی سناتا ہے۔ وہ خود کو بے بس' لاچار' مجبور اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ ہم اس کے عادی ہیں۔"

میں نے مضبوط لہجے میں کہا "ہم نہ تو مجرم ہیں اور نہ ہی کسی قسم کی جاسوسی میں ملوث ہیں۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے ہمارے بارے میں۔"

"ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہوتی۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "ہم رینجرز والوں کو مکمل بیان دے چکے ہیں۔ وہ ہم سے مطمئن ہوگئے تھے۔ ہماری تفصیلی رپورٹ آپ کے پاس پہنچ چکی ہے پھر خواہ مخواہ ہمیں کیوں پریشان کیا جا رہا ہے؟"

وہ چند لمحوں تک مجھے ایسی نظر سے دیکھتا رہا جیسے میرے آر پار دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس نے گمبھیر آواز میں کہا "رینجرز والوں نے جو کچھ کیا' اسے تو بھول جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ میں تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔"

"آپ کیا کرنے والے ہو تھانے دار صاحب؟"

"میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو دشمن ملک کے جاسوسوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" وہ کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تم دونوں "را" کے ایجنٹ ہو اور غیر قانونی طریقے سے بارڈر پار کر کے ہمارے ملک میں داخل ہوئے ہو۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے تیز آواز میں کہا۔
وہ دھمکی آمیز انداز میں بولا "بابا" زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری ساتھی کا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ تمہیں ایسی کھری کھری سناتا کہ تمہارا دماغ "روشن" ہو جاتا۔"
"تم وہ کھری کھری سنا ہی دو۔" میں نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا "اس طرح تمہاری یہ کھوٹی کھوٹی تو نہیں سننا پڑے گی۔"
میرے لہجے میں اس نے گستاخی کی بو سونگھ لی۔ اس نے دہاڑتے ہوئے کہا "یہ تھانا ہے بابا۔ اور میں اس تھانے کا انچارج ہوں۔ زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ورنہ۔۔۔"
اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "ورنہ کیا ہوگا؟"
"بہت برا۔" وہ سلگتی ہوئی آواز میں بولا "بابا" تمہارے ساتھ بہت ہو جائے گا۔"
میں نے کہا "ہمارے ساتھ اب تک صبح سے کون سا اچھا ہوتا آرہا ہے۔"
"بابا" تم بولتے بہت زیادہ ہو۔" تھانے دار نے تیز نظر سے مجھے گھورا "اور تمہارا خون بھی بہت گرم ہے مگر تم نے ابھی۔۔۔؟"
ایک مرتبہ پھر اس نے سوالیہ انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے پوچھا "آپ کو ہماری بے گناہی کا یقین کیسے آئے گا؟"
"یقین دلانا چاہتے ہو!" اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔
میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا "آپ نے ہماری رپورٹ تو پڑھ لی ہوگی۔ اس میں ایک رقعے کا ذکر بھی ہے بلکہ میرے خیال میں وہ رقعہ بھی فائل میں موجود ہوگا؟"
ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ نظر سے کرخت صورت تھانے دار کو دیکھا۔ وہ ذومعنی انداز میں گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا "ہاں ہاں' فائل میں رقعہ موجود ہے اور میں نے اسے پڑھا بھی ہے مگر تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"
میں نے کہا "اس رقعے کے مطابق پنڈت کشوری لال مجھے پاکستانی کرنسی میں پچاس ہزار روپے دینے کا پابند ہے۔"
یہاں تک کہہ کر میں نے پھر تھانے دار کی طرف ایک خاص نظر سے دیکھا' وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے دلچسپی نما سنجیدگی جھلک رہی تھی۔
میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا "اگر وہ رقم کشوری لال سے وصول کر کے آپ مجھے دینے کے بجائے۔۔۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!"
میں نے اس مصیبت سے جان چھڑانے کی آسان ترین ترکیب آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا' گویا میں تھانے دار کو سیدھا سیدھا رشوت کی پیشکش کر رہا تھا۔ میں نے برصغیر کی پولیس کے بارے میں بہت سی کہانیاں اور قصے سن رکھے تھے۔ انڈیا کی پولیس کو تو میں اچھی طرح برت اور پرکھ چکا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ پاکستان میں بھی اس محکمے کی وہی حالت ہے جو ہندوستان میں ہے۔
میری پیشکش پر تھانے دار کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ پچاس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ یہ تو مردہ آنکھوں میں بھی زندگی کی چمک اجاگر کر سکتی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تھانے دار مجھے کچھ مضطرب نظر آیا پھر قدرے سخت لہجے میں بولا۔
"تو تم مجھے رشوت پیش کر رہے ہو؟"
"آپ جو بھی سمجھ لیں۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔
وہ سوچ میں پڑ گیا پھر مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "تم کوئی چال چلنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟"
میں نے اسے مکھن لگاتے ہوئے کہا "جناب! آپ کے سامنے میں کیا چال چل سکتا ہوں۔ آپ طاقت ور اور با اختیار ہیں۔ میں آپ کے زیر حراست ہوں۔ یہ آپ کا تھانا ہے۔ آپ یہاں کے مختارِ کل ہیں۔ آپ جو چاہیں' کر سکتے ہیں۔ قید میں رہتے ہوئے میرے لیے وہ رقم کاغذ کے ٹکڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگر مجھے پچاس ہزار روپے کے عوض آزادی مل جائے تو میں خوش خوش یہاں سے جاؤں گا اور آپ کا بھی بھلا ہو جائے گا۔"
ایک لمحے کو توقف کر کے میں نے کھوجنے والی نظر سے تھانے دار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ تذبذب کے عالم میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ گویا وہ اس وقت کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے بھرپور چوٹ لگائی۔
"تھانے دار صاحب! پچاس ہزار روپے اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔ اس سے آپ کے بہت سے دلدر دور ہو جائیں گے۔ گورنمنٹ آپ کو کیا تنخواہ دیتی ہوگی۔ آج کل تنخواہ میں کہاں گزارا ہوتا ہے۔ دو ماہ بعد عید آنے والی ہے۔ کیا اس موقع کو آپ ضائع کر دیں گے۔ گھر آئی ہوئی لکشمی کو

دروازے سے لوٹانا عقل مندی نہیں تھانے دار صاحب!"
میری چکنی چپڑی باتوں کا اس پر خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ مجھے وہ نیم آمادہ نظر آنے لگا۔ میں نے ایک اور ردا چڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم جاسوس نہیں ہیں ورنہ رینجرز والے ہمیں اتنی آسانی سے نہ چھوڑتے۔ ان کی عقابی نگاہیں سامنے والے کا ایکسرے کر دیتی ہیں۔ ہم اپنی بعض مجبوریوں کے باعث غیر قانونی طریقے سے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں۔ رینجرز والے ہمیں کلیئر کر چکے ہیں۔ اب سارا معاملہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ بھی "کلیئر" کر دیں گے تو دونوں فریقوں کا فائدہ ہو جائے گا۔ آپ ہمیں تھوڑا سا زادِ راہ دے دیں تاکہ ہم کراچی تک بہ آسانی پہنچ جائیں۔ باقی ساری رقم۔۔۔"
میں ادھورے جملے پر اپنی بات ختم کر کے زیرِ لب مسکرایا۔
تھانے دار دھیمے لہجے میں کہا "بابا' یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"
"آپ کے لیے آسان اور مشکل کیا ہے سائیں۔" میں نے اس میں ہوا بھرتے ہوئے کہا "کیس اس تھانے میں ہے اور آپ یہاں کے بادشاہ ہیں۔"
وہ نیم رضامند ہوتے ہوئے بولا "وہ تو ٹھیک ہے بابا' پھر بھی بہت سی باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔"
"پوری رات پڑی ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تمام باتوں کو اچھی طرح دیکھ لیں اور صبح ہمیں خوشی خوشی یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔"
"ایک رات میں کیا ہو سکتا ہے!" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔
"پھر کتنا وقت چاہیے تمہیں؟" میں اب کاروباری انداز میں تھانے دار سے بات کر رہا تھا۔
وہ بولا "سب سے پہلے تو پنڈت کشوری لال سے رقم وصول کرنے کا مرحلہ ہے۔"
"آپ کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔" میں نے اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا "پولیس والے تو اگائی کے ماہر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی پنڈت اسمگلنگ کے چکر میں بھی پھنسا ہوا ہے۔ آپ اس پر دباؤ ڈال کر پچاس ہزار تو کیا' کئی پچاس ہزار نکلوا سکتے ہو۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "آپ پتا نہیں' کس قسم کے تھانے دار ہو سائیں! اگر آپ کی کرسی پر میں بیٹھا ہوتا تو کب کی یہ "ڈیل" مکمل کر چکا ہوتا۔"
میری بات نے تھانے دار کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ تعاون آمیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "اچھا' ٹھیک ہے۔ میں پنڈت کو بلا کر اس سے بات کرتا ہوں۔"
میں مطمئن ہو گیا کہ اب "بات بن" جائے گی۔
ہمیں دوبارہ حوالات میں لے جایا جانے لگا تو میں نے تھانے دار سے کہا "سائیں! کیا آپ کی نگری میں ہم بھوکے پیاسے مر جائیں گے!"
اس نے نگاہ اٹھا کر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا اور کہا "کیا مطلب ہے آپ کا بابا؟"
"مطلب یہ ہے سائیں کہ ہم نے دوپہر کے بعد سے کچھ کھایا پیا نہیں۔" میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے پینے کا کچھ بندوبست ہو جائے تو۔۔۔"
وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا "ہاں ہاں' بابا تمہیں رات کا کھانا ضرور دیا جائے گا۔"
ہم مطمئن انداز میں کانسٹیبل کے ساتھ چلتے ہوئے دوبارہ حوالات میں آ گئے۔ کانسٹیبل نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
آدھے گھنٹے کے بعد ہمارا کھانا حوالات میں پہنچا دیا گیا۔ تنوری روٹیوں کے ساتھ مکس سبزیوں کا سالن تھا جو کسی اناڑی باورچی کی "ہنرمندی" کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ منہ بولتا اس طرح بھی کہ اسے کھانے کے بعد کھانے والا منہ سے کچھ نہ کچھ ضرور بولتا تھا۔۔۔ اور یہ بولنا' باورچی کی شان میں "قصیدے" کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ بہرحال' ہم نے صبر شکر کر کے کھانا اپنے معدوں میں اتارا اور پانی پینے کے بعد کھانے کے برتن حوالات کے دروازے کے پاس رکھ دیے۔
میں نے دوبارہ حوالات کی دیوار سے ٹیک لگالی۔ ہمارے پاس گھڑی نہیں تھی تاہم میرا اندازہ تھا کہ اس وقت رات کے دس بجے ہوں گے۔ مجھے امید تھی کہ تھانے دار پنڈت کو پٹانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔
دھنو بھی خود کو خاصا "ریلیکس" محسوس کر رہی تھی۔ اس کی ٹخنے کی چوٹ میں اب درد نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا پھر تھانے دار سے ہونے والی ملاقات بھی خاصی حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھی۔ اسی ذیل میں دھنو نے مجھ سے پوچھا۔
"وجدان! تمہارا کیا خیال ہے' تھانے دار تمہاری تجویز ماننے پر تیار ہو جائے گا؟"
میں نے کہا "مجھے تو پوری امید ہے۔ پنڈت کشوری لال

اس وقت تھانے دار کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ دم نہیں مار سکے گا۔ اس پر اسمگلنگ اور غیر قانونی طور پر لوگوں کو بارڈر عبور کروانے کے سنگین ترین الزامات ہیں۔ ان الزامات کے سلسلے میں ٹھوس ثبوت بھی موجود ہیں۔ اس وقت تھانے دار پنڈت سے ہر بات منوانے کی پوزیشن میں ہے پھر پنڈت کوئی مفلس و نادار یا پھٹیچر قسم کا آدمی بھی نہیں ہے۔ وہ اس گاؤں کی ایک صاحبِ حیثیت شخصیت ہے۔ پچاس ہزار تو وہ خوشی خوشی تھانے دار کی ہتھیلی پر رکھ دے گا بلکہ میرا خیال ہے' تھانے دار اس سے کچھ زیادہ رقم نکلوانے کی کوشش بھی کرے گا۔ یہ پچاس ہزار تو پنڈت کو ہر صورت دینا ہی ہیں۔ اس کے پاس یہ رقم ہماری امانت ہے۔"
دھنو نے کہا "ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔"
"ایسا ہی ہو گا۔ انشاء اللہ۔" میں نے پورے وثوق سے کہا۔
وہ بولی "وجدان! تمہیں کیسا لگ رہا ہے۔ اپنے ملک میں داخل ہوتے ہی تم قدم قدم پر الجھنوں میں گھرتے جا رہے ہو؟"
"یہ وقتی پریشانی ہے دھنو۔" میں نے کہا "ہم بہت جلد اس ملک کی آزاد فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔"
وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "وجدان! میں نے تمہاری دیکھا دیکھی کچھ کوشش کی ہے اور مجھے اس سے فائدہ بھی ہوا ہے۔"
میں نے پوچھا "کیسی کوشش اور کس قسم کا فائدہ؟"
"تھوڑی دیر پہلے جب تم نے میرے ٹخنے کا مساج کیا تھا تو مجھے بڑا سکون ملا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "بعد میں' میں نے بھی آلتی پالتی مار کر آنکھیں بند کرنے کے بعد اپنی ساری توجہ ٹخنے پر مرکوز کر دی تھی اور اس مساج سے مجھے واقعی خاصی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔"
"ہاں' میں نے دیکھا تھا تمہیں ایسا کرتے ہوئے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ارتکازِ توجہ سے ایسے چھوٹے موٹے شعبدے دکھائے جا سکتے ہیں۔ چند روز کی مشق سے یہ صلاحیت اپنے اندر پیدا کی جا سکتی ہے تاہم "چی" کی بیداری اور اس قوت کا استعمال ایک دوسری چیز ہے جس کے لیے باقاعدہ کسی جانکار کی نگرانی میں مشقیں کرنا پڑتی ہیں۔"
وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے دانستہ اس سے یہ بات چھپالی تھی کہ جب وہ آلتی پالتی مارے دھیان گیان میں مصروف تھی تو مجھے بے اختیار اس پر پیار آ رہا تھا۔
میری بات کے مکمل ہونے پر دھنو نے کہا "وجدان! ہم ذرا اس مصیبت سے نکل جائیں پھر میں تمہاری نگرانی میں "چی" کی مشقیں شروع کر دوں گی۔"
میں نے کہا "دھنو! اگر ہم اپنی پوری زندگی کا دیانت داری سے تجزیہ کریں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہماری زندگی کا زیادہ تر حصہ بدامنی' الجھن اور پریشانی میں گزرتا ہے۔ خوشی' آرام' سکون اور فراغت کے بہت کم لمحات ہمارے حصے میں آتے ہیں اس لیے ہمیں کسی تعمیری اور مثبت کام کا آغاز کرنے کے لیے کسی خاص موقع کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم بہت سا وقت ضائع کر دیتے ہیں چنانچہ ایک لمحے کی تاخیر سے تمہیں یہ نیک کام شروع کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے' کل ہم آج سے زیادہ مصیبت زدہ ہوں۔"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو وجدان!" وہ حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ یہاں حوالات میں تم "چی" کی بیداری کی مشقیں نہیں کر سکتی ہو اور خاص طور پر یہ وقت بھی غیر موزوں ہے کیوں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے کھانا کھایا ہے۔ "چی" کی مشقیں ہمیشہ خالی پیٹ کی جاتی ہیں لیکن۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔
"لیکن کسی بھی پریکٹیکل سے پہلے تھیوری پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔"
"ہاں' یہ تو تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" دھنو جلدی سے بولی۔
میں نے کہا "دھنو! جب تک تمہیں پورے سکون سے مشقیں کرنے کا موقع نہیں ملتا' تم تھیوری کو ہی ازبر کر لو۔ میں تمہاری تربیت ابھی سے شروع کر دیتا ہوں۔"
وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور پوری توجہ میری آواز پر مرکوز کر دی۔
اسی وقت حوالات کے دروازے پر وہ کانسٹیبل نمودار ہوا جو ہمارے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولے بغیر خالی برتن حوالات کی سلاخوں میں سے ہاتھ اندر ڈال کر اٹھا لیے۔ جب وہ جانے کے لیے مڑنے لگا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
"سائیں! کیا پوری رات ہم یونہی بیٹھے سردی سے ٹھٹھرتے رہیں گے۔ کوئی چادر یا کمبل وغیرہ نہیں ملے گا

ہمیں؟"
رات جوں جوں بھیگ رہی تھی' فضا کی خنکی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ مجھے اپنی تو پروا نہیں تھی۔ میں ایک لنگوٹ میں برف کی سل پر بیٹھ کر بھی پوری رات نہایت سکون سے گزار سکتا تھا لیکن دھنو اس قسم کی سختی سہنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ اگرچہ وہ سرد پہاڑی علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس نے بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ میں سرد ترین موسم بھی برداشت کیا ہوگا۔ یہ قدیم بدھ عبادت گاہ ایک دریا کے کنارے واقع ہے اور پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ اگر کھٹمنڈو سے بھاگ متی کی جانب جائیں تو یہ بدھ عبادت گاہ ان دونوں مقامات کے درمیان سڑک سے چھ سات کلومیٹر ہٹ کر واقع ہے۔

لیکن یہاں مسئلہ دوسرا تھا۔ دن اور رات میں موسم کے تیور بالکل بالعکس ہوتے تھے۔ صحرا کا دن انتہائی تپتا ہوا اور جھلسا دینے والا ہوتا ہے اور رات کا ابتدائی حصہ معتدل ہوتا ہے مگر جیسے جیسے رات آگے سرکتی ہے' ٹھنڈک بڑھنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ رات کے پچھلے پہر شدید سردی ہوجاتی ہے پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ دھنو کا ایک ٹخنا بری طرح متاثر ہوچکا تھا اور وہ گزشتہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئی تھی۔ میں نے انہی تمام حقائق کی روشنی میں دھنو کے لیے کسی اوڑھنی کا بندوبست کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔

کانسٹیبل نے میری بات کا مثبت ردِعمل پیش کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ چیک دار ایک بوسیدہ سی چادر لے کر میرے پاس آگیا۔

میں نے حوالات کی سلاخوں میں سے وہ چادر پکڑی اور کانسٹیبل سے پوچھا "تھانے دار صاحب کیا کررہے ہیں؟"

اس نے جواب دیا "وہ پنڈت کشوری لال کے ساتھ کسی قسم کے مذاکرات کررہے ہیں۔"

میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا کہ ان "مذاکرات" کی نوعیت کیا ہوگی۔

کانسٹیبل کے جانے کے بعد میں نے وہ خستہ حال چادر دھنو کو اڑھادی اور گفتگو کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جوڑتے ہوئے کہا۔

"دھنو! "چی" کی قوت پیٹ کے زیریں حصے میں 'ناف کے قریب خوابیدہ حالت میں موجود ہوتی ہے۔ اس کو جگانے کے لیے سانس کی مخصوص قسم کی مشقیں کرنا پڑتی ہیں۔ وہ مشقیں میں عملی طور پر تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب تم اس میدان میں باقاعدہ قدم رکھ دوگی۔

"جب "چی" ایک مخمور انگڑائی لے کر بیدار ہوجائے تو پھر سب سے اہم مرحلہ اس کو سنبھالنے کا ہوتا ہے۔ وہ کسی سرکش گھوڑی کے مانند آسانی سے قابو میں نہیں آتی۔ اسے باقاعدہ لگام دینا پڑتی ہے ورنہ وہ دماغ کی طرف سفر کرکے بے انتہا تباہ کاری مچاسکتی ہے جس میں سب سے زیادہ خطرہ مشقیں کرنے والے انسان کی جان کو ہوتا ہے۔"

دھنو نے ایک جھرجھری لی اور بولی "پھر تو یہ بہت خوفناک قوت ہے!"

"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بات جاری رکھی "یہ خطرناک اور نقصان دہ صرف ان لوگوں کے لیے ثابت ہوتی ہے جو بغیر کسی راہنما کے الٹی سیدھی مشقیں کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد ان نوجوانوں اور جوانوں کی ہے جو بازار میں موجود کتابوں کی مدد سے اس قوت کو تسخیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"تم آسانی کے لیے یوں سمجھ لو کہ "چی" کو بیدار کرنے والی مشقیں صرف اور صرف احتیاط اور مناسب راہنمائی کا تقاضا کرتی ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی ماہر کی نگرانی میں یہ مشقیں کرے تو بے شک وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا ہے۔"

"چی کو بیدار کرنے میں کم و بیش کتنا عرصہ لگ جاتا ہے؟" دھنو نے ایک اہم سوال کیا۔

میں نے بتایا "یہ مدت ہر شخص کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ دو ماہ سے لے کر دو سال تک لگ سکتے ہیں اور بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی بھر کوشش کرتے رہتے ہیں اور ہر بار ناکام رہتے ہیں۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟" دھنو نے پوچھا۔

"دھنو! ایک بات ذہن میں بٹھالو۔" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ سارا کھیل لگن اور ارتکاز کا ہے۔ جن لوگوں میں ان دو چیزوں یا ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی فقدان ہوتا ہے' وہ ساری عمر سر پٹختے رہتے ہیں مگر انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

دھنو نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "وجدان! تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے میں کتنا عرصہ لگا تھا؟"

میں نے بتایا "عرصہ پچاس دن۔"

"یعنی دو ماہ سے بھی کم؟" اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

میں نے کہا "دھنو! اس میں مجھ سے زیادہ کمال میرے استاد کا تھا۔ ماسٹر ینگ پائی بہت بلند پایہ روحانی و جسمانی علوم

کا ماہر تھا۔"

"تم کتنے خوش قسمت ہو وجدان۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی پھر پرعزم انداز میں کہا "خیر' میں بھی کچھ کم خوش نصیب نہیں ہوں۔ مجھے تمہارے جیسا دوست اور استاد حاصل ہوگیا ہے۔ میں بھی ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دکھاؤں گی۔"

"انشاء اللہ۔" میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

دھنو کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے۔ یہ نیند اور بے آرامی کا نتیجہ تھا۔ گزشتہ پوری رات ایک قسم کے ایڈونچر میں گزری تھی۔ ہم دونوں ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکے تھے۔ میں خود بھی اپنے جسم میں تناؤ اور تھکن سی محسوس کررہا تھا۔ تاہم میرا جاگتے رہنا ضروری تھا اس لیے میں نے دھنو سے کہا۔

"رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔ تمہیں سوجانا چاہیے۔"

"اور کیا تم جاگتے رہو گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم بھی تو تھکے ہوئے ہو!"

"میری بات دوسری ہے۔" میں نے کہا۔

"دوسری کیوں ہے؟" وہ اپنی فطری شوخی سے بولی۔

"ہر بات بتانا ضروری نہیں ہوتا۔" میں نے میٹھی سرزنش کی۔

اس نے پوچھا "پھر کیا ضروری ہوتا ہے؟"

"تم باز نہیں آؤگی دھنو کی بچی!" میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا "بولنا بند کرو۔"

"بولنا بند کردوں تو پھر کیا کروں؟" وہ شرارت پر تلی بیٹھی تھی۔

میں نے جھلا کر کہا "سوجاؤ!"

اور وہ واقعی سوگئی۔

○☆○

میری نظر دیے کی لو پر جمی ہوئی تھی۔

رات کا اندھیرا ہوتے ہی ایک کانسٹیبل یہ دیا حوالات کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ میں سنگی دیوار سے سر ٹکائے یک ٹک دیے کی لو کو دیکھ رہا تھا۔ میرے نزدیک ہی دھنو بوسیدہ چٹائی پر خستہ حال چادر اوڑھے گہری نیند سورہی تھی۔ اس وقت ہم جس صورت حال سے گزر رہے تھے وہ نہ تو اطمینان بخش تھی اور نہ ہی آرام دہ مگر وہ کیا کہتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔

میری آنکھیں بھی بوجھل ہورہی تھیں۔ مجھے ایک خمار کا سا احساس ہورہا تھا۔ دیے کی لو دیکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے دیے کی حرارت میری آنکھوں کے راستے جسم میں اتر رہی ہو۔ کچھ دیر میں اسی کیفیت میں رہا پھر مجھے اپنا بدن تپتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ واقعتاً دیے کی لو سے خارج ہونے والی "لائٹ انرجی" میرے جسم میں اتر کر اس کا درجہ حرارت بڑھارہی تھی۔

یکایک مجھے یوں لگا جیسے دیے کی لو نے پھیلنا شروع کردیا ہو۔ وہ ننھی سی لو بڑی تیزی سے اپنے حجم میں اضافہ کررہی تھی مگر اس کی شکل و ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ یہی کہا جاسکتا تھا کہ ننھی لو نے دیو قامت اختیار کرلی تھی۔

میں لو کے بڑھتے ہوئے سائز کو بڑی محویت سے دیکھ رہا تھا کہ ایک عجیب تماشا شروع ہوگیا۔ اس دیو قامت لو میں سے ایک انسانی پیکر نمودار ہورہا تھا۔ میں یک ٹک نظر جمائے اس پیکر کو تکے چلا جارہا تھا۔ جب اس کے خدوخال نمایاں ہوگئے تو میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

وہ ملکوتی حسن کی مالک نیلگری تھی!

میں کھلی آنکھوں سے اس مجسم حسن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آمد نے حوالات کے کمرے کو مہکا دیا تھا۔ وہ سبک خرام قدموں سے ہوا میں چلتی ہوئی میرے نزدیک آگئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر وہی دل نشیں مسکراہٹ تھی جس کا مشاہدہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کرچکا تھا۔ میں اس کے کیف آور لمس کو بھی نہیں بھولا تھا۔ اس کے مرمریں بدن کی ایک ایک جنبش میری یادداشت میں نقش تھی۔

میرے قریب پہنچ کر وہ میرے چہرے پر جھک گئی پھر اپنے دودھیا گداز ہاتھوں میں اس نے میرا چہرہ تھام لیا اور میری پیشانی پر اپنے شنگرفی ہونٹ رکھ کر ایک طویل بوسہ دیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

وہ بند آنکھوں کے پیچھے روشن ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے جن سے خارج ہونے والی کرنیں میرے تصور کو جگمگا رہی تھیں۔ میرے تصور کی دنیا اس کے لطیف بدن کی خوشبو سے بس گئی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے کوئی عطردان کھول کر رکھ دیا گیا ہو۔

اپنے گلاب لبوں کی نرمی اور تازگی کو میری پیشانی میں اتارنے کے بعد جب وہ سیدھی ہوئی تو اس کا انگ انگ مسکا رہا تھا۔ میں ان ناقابل فراموش اور انبساط آور لمحوں کی نشاط انگیزی کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

نیلگری کے نورانی پیکر میں زندگی اپنے مدوجزر کے ساتھ

ہلکورے لیتی محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ بولی تو ایسا لگتا جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔

اس کی آواز اپنی تمام ترنغمگی کے ساتھ سماعت کے راستے میری روح میں اتر رہی تھی۔ میں سرشاری کے عالم میں نیلگری کی مدھر آواز پر توجہ مرکوز کیے لیٹا تھا۔ اس نے سریلے لہجے میں کہا۔

"وجدان! ایک مرتبہ پھر میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں کہ تم نے اس خبیث خصلت گوتم بھوش کو ختم کرکے مجھے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا ہے کیونکہ ہزاروں سال تک مجھے کوئی ایسی ہستی دکھائی نہیں دیتی جس میں اس راہ کی دشواریاں اور سختیاں جھیلنے کا یارا ہو۔ اب میں ہزاروں سال کے لیے امن و سکون سے رہ سکتی ہوں لیکن..." وہ یک لخت اداس ہوگئی۔ اب وہ پہلے والی شگفتہ نیلگری نہیں رہی تھی۔

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر جگر پاش نظر سے مجھے دیکھا۔ میں تڑپ کر بولا۔

"لیکن کیا نیلگری؟"

اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میرے لیے یہ حیرت اور دکھ کی بات تھی۔ گوتم بھوش کی موت کے بعد نیلگری بڑی شاداں و فرحاں رہنے لگی تھی اس لیے اس کی یہ دل گرفتگی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

"لیکن وجدان!" وہ دکھی لہجے میں بولی "مجھے لگتا ہے، تم کبھی میری بات نہیں مانو گے۔"

نیلگری جب بولتی تھی تو اس کے ہونٹ ساکت رہتے تھے۔ بس اس کی سریلی سرگوشی میری سماعت تک پہنچتی رہتی تھی۔ آج اس سرگوشی کا سریلا پن اچانک غم و اندوہ میں ڈوب چکا تھا۔

میں نے بے قرار لہجے میں پوچھا "میں سمجھا نہیں نیلگری، تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ میں تمہاری کون سی بات نہیں مانوں گا؟"

"میری دلی خواہش یہ تھی کہ تم اپنا جاپ مکمل کرلو تاکہ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہاری کنیز بن جاؤں مگر تم نے کبھی اس طرف دھیان دینے کی کوشش نہیں کی اور اب تو مجھے یہ اور بھی ناممکن نظر آرہا ہے کیونکہ..."

اس نے ایک مرتبہ پر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "اب ایسی کیا بات ہوگئی نیلگری؟"

"اب تم نے اپنی دھرتی پر قدم رکھ دیا ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"بہت کچھ ہوتا ہے وجدان۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"میں تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں نیلگری۔" میں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا "ذرا وضاحت سے اور آسان الفاظ میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرو۔"

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر ساکت لبوں سے سرگوشیانہ انداز میں بتانے لگی "وجدان! تم مسلمان ہو، تمہاری رگوں میں مسلمان والدین کا خون ہے۔ مسلمان جاپ اور منتر وغیرہ کو اچھا نہیں سمجھتے اور جب سے تم نے اپنے ملک کی زمین پر قدم رکھا ہے، میں محسوس کررہی ہوں، تم اپنے ماضی سے ناتا توڑتے جارہے ہو۔ تمہارے اندر کا مسلمان انگڑائی لے کر بیدار ہورہا ہے۔ اب مجھے نہیں امید کہ تم کبھی اپنا جاپ مکمل کرنے کی کوشش کرو اس لیے میں کلی طور پر تمہارے تصرف میں نہیں آسکوں گی لیکن..."

"تم بار بار اپنی بات کو ادھورا کیوں چھوڑ دیتی ہو نیلگری؟"

"چھوڑو، رہنے دو۔" وہ جان چھڑانے لگی۔

"نہیں، تمہیں بتانا ہوگا۔" میں نے اصرار کیا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "تم نے میری دی ہوئی مالا کی بھی حفاظت نہیں کی۔" اس کی آواز میں شکوہ تھا۔

"وہ بات دراصل یہ ہے نیلگری۔" میں نے جلدی سے کہا "مالا کی گمشدگی میں میرا کوئی قصور نہیں۔ ہم ایک ایسی صورتِ حال سے دوچار تھے کہ ہمیں اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی "میں جانتی ہوں مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ تمہیں اس زیاں پر کوئی افسوس بھی نہیں ہورہا۔ تم نے اس دوران میں ایک مرتبہ بھی شدت سے مالا کی جدائی کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"میں اپنی اس کوتاہی پر نادم ہوں نیلگری۔" میں نے خلوص دل سے کہا "تم تو جانتی ہی ہو، ہم یہاں آتے ہی کن حالات کا شکار ہوگئے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ دوبارہ اس ریگزار میں جاکر مالا کو تلاش کروں۔"

"اس کی ضرورت نہیں وجدان۔" وہ اداس مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی "وہ مالا میرے پاس پہنچ چکی ہے۔ میں اپنی چیزوں کی حفاظت کرنا بخوبی جانتی ہوں۔"

"کہاں ہے وہ مالا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"میں نے بتایا نا، وہ میرے پاس ہے۔"

"مجھے نہیں دوگی؟"

"نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے قطعیت سے بولی۔

"کیوں، ناراض ہو؟"

"میں تم سے ناراضی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔"

"پھر مالا دینے میں تردد کیوں؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "تمہیں اس مالا کی حاجت نہیں ہے۔"

"کیا کسی کو دیا ہوا تحفہ واپس لیا جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "میں نے وہ مالا تم سے واپس نہیں لی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم اس تحفے کی حفاظت نہیں کرسکے۔"

"اس کوتاہی کے لیے میں ندامت کا اظہار کرچکا ہوں نیلگری۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "اگر اس سے تمہاری تشفی نہیں ہوئی تو میرے لیے کوئی سزا مقرر کردو۔"

وہ شاکی لہجے میں بولی "کیسی باتیں کرتے ہو وجدان! میں تمہیں کوئی سزا دینے کے بارے میں بھلا کیسے سوچ سکتی ہوں۔ میری تو شدید ترین تمنا یہ تھی کہ تمہاری کنیز بن کر میں تمہارے قدموں میں رہوں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اب میں کسی دوسرے طریقے سے تمہارا قرب حاصل کرتی رہوں گی۔"

"تم تو بہت ڈرانے والی باتیں کررہی ہو نیلگری۔"

"ڈرو مت وجدان۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی "ڈرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم مرد ہو، مرد کے بچے ہو۔ مردانہ وار حالات کا مقابلہ کرو۔"

"میں نے زندگی بھر مردانہ وار ہی حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت گزارا ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "اور یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہوگی۔ تم مہان شکتی ہو، ہمالیہ کی ترائیوں میں مقیم ایک پراسرار قوت ہو۔"

وہ اپنی صراحی دار گردن کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی "ہاں، میں سب کچھ جانتی ہوں۔ میں ہمالیہ کی شکتی ہوں۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے پنڈت، یوگی اور سادھو اپنی زندگی مشکل اور کٹھن جاپوں کی نذر کردیتے ہیں مگر چونکہ ان کی نیت میں کھوٹ ہوتا ہے، وہ مجھے اپنی برتری منوانے کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں، نوعِ انسانی کو اپنے قدموں میں جھکانے کے خواب دیکھتے ہیں اس لیے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے لیکن تم..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئی پھر چند لحات بعد خود ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تم نے مجھے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تم نے مجھے ایک مکروہ شخص کے قبضے میں جانے سے بچایا ہے۔ میں اس کے لیے زندگی بھر تمہاری شکر گزار رہوں گی۔ تم نے کہا، مجھے تمہاری زندگی کے بارے میں اچھی طرح معلوم ہوگا۔ ہاں، میں تمہاری زندگی کا ایک ایک لمحہ جانتی ہوں۔ تم نے بچپن سے نوجوانی اور پھر جوانی تک ایک جنگ لڑی ہے بلکہ جنگ لڑ رہے ہو اور آیندہ بھی زندگی بھر یہ جنگ لڑتے رہو گے۔ یہ نیکی اور بدی کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں بالآخر فتح نیکی ہی کی ہوتی ہے مگر کٹھنائیوں اور مشکلوں سے گزرنے کے بعد۔ وجدان! تم ایک سچے انسان ہو، نیکی کے علمبردار ہو اس لیے فتح و کامرانی اور نصرت و شادمانی ہمیشہ تمہارے قدم چومے گی مگر..."

وہ ایک مرتبہ پھر بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا وجود ساکت تھا لیکن جب وہ بولتی تھی تو لگتا تھا، اس کے اندر کوئی نادیدہ قوت، کوئی سرگرم حرارت موجزن ہو۔ اس کا ہر ہر عضو خاموشی کی زبان بولتا تھا۔ وہ بات کے مفہوم اور اہمیت کے مطابق اپنے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی لے آتی تھی۔ کبھی وہ بہت غم زدہ اور ملول نظر آنے لگتی، دل گرفتہ اور آزردہ دکھائی دینے لگتی، کبھی وہ سنجیدہ اور شکوہ کناں بن جاتی اور کبھی کھلی کھلی پڑ رہی ہوتی۔ اس کی ملکوتی مسکراہٹ سے پھول جھڑتے تھے، اس کا انداز اپنے اندر گل افشانی کی خاصیت رکھتا تھا، وہ ایک روح پرور نظارہ تھی، حسن کی ہر ہر ادا اس سے آشکارہ تھی۔

اس مرتبہ نیلگری کی خاموشی کو میں سہہ نہ سکا، بے اختیار میں نے پوچھا "تم نے "مگر" پر اپنی بات کو روک دیا ہے۔ کیوں، نیلگری! ایسا کیوں؟"

وہ مدبرانہ انداز میں سنجیدہ ہوگئی پھر کسی مفکر کے سے لہجے میں بولی "وجدان! تم نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں کا تجربہ حاصل کرلیا ہے لیکن ایک شعبے کے بارے میں تمہاری معلومات صفر کے برابر ہیں۔"

"وہ کون سا شعبہ ہے نیلگری؟" میں متعجب نظر سے اسے دیکھنے لگا۔

"وہ شعبہ ہے... عورت!"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں الجھ گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ تم عورت کے مزاج، اس کی فطرت، اس کی سرشت اور اس کی عادت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔

میں نے بدستور الجھے ہوئے لہجے میں کہا "ذرا وضاحت کرو۔"

وہ بولی ”میری ایک بات ذہن میں نقش کرلو وجدان! عورت کے پیچھے جتنا بھاگو گے‘ یہ تم سے دور ہوتی جائے گی اور اگر تم عورت سے بھاگو گے تو یہ تمہارے تعاقب میں لگی رہے گی۔ میں طبعاً‘ مزاجاً اور ساختاً ایک عورت ہوں اس لیے یہ بات میں زیادہ بہتر طور پر جانتی ہوں۔ تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنے رویے میں توازن قائم کرو۔ کائنات کی ہر شے کا وجود توازن پر قائم ہے۔ اگر کسی چیز میں زیادہ عرصے تک توازن کا فقدان رہے تو وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے‘ تباہ و برباد ہوجاتی ہے‘ اس کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اگر تم نے اپنے رویے میں تبدیلی نہ کی تو...“

یہاں تک پہنچ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ ”تو کیا؟“ میں اس کی بات کی گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بہت گہری تھی‘ اسی لیے گہری گہری باتیں کرتی تھی۔ میرے ذہن میں اس رات کا منظر گھوم گیا جب کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں مجھے نیلگری کا ٹوٹا ہوا مجسمہ ملا تھا۔ کرسٹل کا وہ صاف و شفاف مجسمہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ میں ان دونوں حصوں کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا تھا اور انہیں اسکاچ ٹیپ کی مدد سے جوڑ کر مجسمے کو مکمل کردیا تھا پھر رات کے آخری پہر وہ مجسمہ دنیا کی حسین ترین عورت کا روپ اختیار کرگیا تھا۔ نیلگری کا حسن و جمال واقعی لاجواب اور بے مثال تھا۔ وہ اس دنیا کی نہیں لگتی تھی!

میں ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں نیلگری کو دیکھ رہا تھا۔ وہ روشنی کا پیکر تھی اور فضا میں معلق تھی جیسے اڑتے اڑتے ساکت ہوگئی ہو‘ تیرتے تیرتے تھم گئی ہو اور بہتے بہتے رک گئی ہو۔

چند لمحات کے توقف کے بعد اس کے ساکت احمریں ہونٹوں کی خاموش سرگوشی میری سماعت میں گونجنے لگی۔ وہ اپنی شیریں آواز کا رس میری روح پر ٹپکا رہی تھی جس کی مٹھاس سے میرے قلب و نظر پر وجد کا سا عالم طاری تھا۔

”وجدان! قدرت نے انسان کو ایک مخصوص فطرت پر پیدا کیا ہے۔ عورت اور مرد کو ایک جوڑے کی شکل دی ہے۔ فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ عورت اور مرد جوڑے کی صورت میں زندگی بسر کریں۔ یاد رکھو‘ کائنات کی کوئی بھی چیز اپنی فطرت کے خلاف زیادہ عرصے تک پنپ نہیں سکتی۔ اسے نیست و نابود ہونا پڑتا ہے۔ تم میری باتوں کا مطلب سمجھ رہے ہونا وجدان؟“

میں نے کسی سحر زدہ معمول کی طرح اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اپنا شیریں کلام جاری رکھتے ہوئے بولی ”میں نے یہ تمنا کی تھی کہ تمہاری کنیز بن جاؤں مگر اپنی اصلی شکل میں اب مجھے یہ ممکن نظر نہیں آتا‘ مجھے کوئی دوسری صورت اختیار کرنا ہوگی۔ میں مکمل طور پر تمہاری بن جانے سے پہلے تمہیں بے انتہا و بے پناہ شکتیوں کا مالک بنانا چاہتی تھی۔ وہ پراسرار مالا اسی سلسلے کی پہلی کڑی تھی لیکن‘ آہ!“

وہ ایک طویل نرم و گرم سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”وجدان! تم مختلف اور منفرد مرد ہو۔ پراسرار شکتیوں وغیرہ کو تم زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہو بلکہ اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتے ہو۔ تم نے تو ماسٹر ہنگ پائی کی دی ہوئی شکتی یعنی ”چی“ سے بھی خاطر خواہ استفادہ نہیں کیا۔ بس اتفاق ہی سے دو چار مرتبہ اسے استعمال میں لائے ہوگے۔ تم دراصل ایک عملی انسان ہو۔ پریکٹیکل لوگوں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ تم ایک باصلاحیت اور نیک نیت انسان ہو۔ بدی کے خلاف نیکی کا ساتھ دیتے ہو۔ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی دستگیری کرتے ہو۔ بس تمہاری انہی اداؤں نے تو مجھے گھائل کیا ہے وجدان۔ میں تمہاری گرویدہ ہوگئی ہوں۔ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی اور اپنی اصلی شکل و صورت میں تمہارے قریب نہیں آسکتی کیونکہ تم نے اپنا جاپ مکمل نہیں کیا اور نہ ہی کبھی مکمل کرو گے۔ جاپ مکمل کیے بغیر ہمارا ملاپ نہیں ہوسکتا۔ تمہیں میری طلب ہو یا نہ ہو لیکن تم میرا مطلوب ہو۔ میں اپنی اصل شکل میں نہ سہی‘ کسی دوسری صورت میں تو تمہارا قرب حاصل کرسکتی ہوں!“

یہاں تک پہنچ کر نیلگری دل آویز انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کوئی ایسی بات تھی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے لرزیدہ لہجے میں پوچھا ”آخر تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو نیلگری۔ تمہارے عزائم تو مجھے خاصے خوف زدہ کرنے والے محسوس ہورہے ہیں۔“

روشنی کے اس پیکر نیلگری کی آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ وہ خاموش لبوں سے گویا ہوئی تو میری سماعت میں نقرئی گھنٹیوں کی گنگناہٹ بہت دور تک اترتی چلی گئی۔

”وجدان! ساری دنیا کے یوگی‘ سادھو‘ پنڈت اور گیانی مجھے حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں لیکن میں نے خود کو تمہارے لیے مخصوص کردیا ہے۔ میں تمہاری صبحیں مہکاؤں گی‘ راتیں چمکاؤں گی اور خلوتیں گرماؤں گی۔ تم مجھے اپنے بستر کی شکنوں میں پاؤ گے۔ میں لہو بن کر تمہاری نس نس میں دوڑوں گی۔“

میں سراسیمہ نظر سے نیلگری کو دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک انداز دلربائی سے مسکرائی اور بولی ”وجدان! مجھے دیکھ لو‘ بہت اچھی طرح غور سے دیکھ لو۔ میں اپنی اصلی شکل و صورت میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ آج کے بعد تم میری اصل صورت نہیں دیکھ سکو گے اس شکل میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وجدان!“

”ایسا تو نہ کہو نیلگری!“ میں تڑپ کر بولا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی ”وجدان! آج کے بعد میں نئے رنگ و روپ میں‘ نئے بہروپ میں تمہارے سامنے آیا کروں گی۔ جب بھی کوئی عورت تنہائی میں تمہارا قرب حاصل کرنا چاہے گی تو تم اس کے اندر نیلگری کو پاؤ گے۔ ہر عورت میں‘ ہر صورت میں تمہیں حاصل کرتی رہوں گی۔“

میں نے لکنت زدہ لہجے میں کہا ”تم اتنی خطرناک ہوسکتی ہو نیلگری‘ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا!“

وہ خاموش لبوں سے مسکرائی اور ہوا میں تیرتے ہوئے میرے انتہائی قریب آگئی پھر میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے بولی ”جو بات انسان نے کبھی سوچی نہیں ہوتی‘ کبھی نہ کبھی اسے سوچنا پڑتی ہے۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ نہایت آہستگی سے میرے پہلو میں لیٹ گئی۔ میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تم حد سے بڑھ رہی ہو نیلگری!“

”اور تم خواہ مخواہ ڈر رہے ہو وجدان۔“ وہ میری پسلیوں پر اپنا ملکوتی چہرہ رگڑتے ہوئے بولی۔

میں سناٹے میں آگیا پھر کمزور سے احتجاجی لہجے میں کہا۔

”یہ کیا بے ہودگی ہے؟“

”یہ بے ہودگی نہیں‘ خوشنودگی ہے۔“

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں حوالات کی اسی کوٹھڑی میں ننگی دیوار سے سر ٹکائے لیٹا تھا۔ مٹی کے تیل کا دیا اپنی جگہ پر اصلی حالت میں روشن تھا۔ تھوڑی دیر قبل نیلگری سے میں نے جس کیف آگیں اور نشاط انگیز ماحول میں الوداعی مکالمت کی تھی وہ سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے پہلو میں چلا گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے نیلگری دراز تھی۔

میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ میرا ہاتھ نسوانی خطوط سے چھو گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کن انکھیوں سے اپنے پہلو میں دیکھا۔

ایک اطمینان بخش سانس میرے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ دھنو تھی جو نیند کی حالت میں پھسلتے ہوئے میرے پہلو سے آلگی تھی۔ سردی کے باعث اس نے اپنے وجود کو جھینگے کی طرح موڑ رکھا تھا۔ اس کا منہ میری پسلیوں سے ٹکا ہوا تھا اور وہ گہری گہری گرم سانسیں لے رہی تھی۔ اللہ نے عورت کو مرد کی پسلیوں سے تخلیق کیا ہے۔ سب کو اپنی جنم بھومی سے پیار ہوتا ہے!

میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا پھر کھسک کر اپنے اور دھنو کے درمیان کچھ فاصلہ پیدا کیا۔ میرے بدن کی جنبش سے دھنو کسمسائی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔

دھنو کی کھلی ہوئی آنکھوں میں مجھے نیلگری مسکراتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے پورے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں ہڑبڑا کر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہوا وجدان؟“ دھنو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کچھ نہیں۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی ”تم ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کیا بات ہے وجدان‘ مجھے سچ سچ بتاؤ؟“

میں دھنو کو نیلگری کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا لہٰذا خاموش بیٹھا رہا۔ اس وقت سردی ہونے کے باوجود بھی

بابر زمان خان کی آپ بیتی جگ بیتی
دل فگاروں کے لیے سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
بازی گر
کتابی شکل میں چار حصے شائع ہوچکے ہیں
قیمت فی حصہ -/60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

میرا جسم پسینہ اگل رہا تھا۔ نیلگری کی باتوں میں اتنی تپش تھی کہ میرے بدن کا خون' پسینہ بن کر خارج ہو رہا تھا۔ اس نے شاید اپنی تحریک اور گفتگو سے میرے اندر خوابیدہ آتش فشاں کو چھیڑ دیا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے حوالات کے اندر ٹہلنے لگا۔ اپنے دماغ کا درجہ حرارت کم کرنے کے لیے میں نے جو گر بھی آزما دیے تھے۔ چند لمحوں کی چہل قدمی کے بعد میرے حواس قابو میں آ گئے۔ مجھے اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے یوگا کا سہارا لینا پڑا تھا۔

ماسٹر بینگ بائی آنجہانی نے مجھے سانس کی ایک خاص مشق سکھائی تھی جس کے ذریعے ذہنی انتشار اور جذباتی ہیجان سے نجات حاصل کی جا سکتی تھی۔ میں نے حوالات کے ٹھنڈے فرش پر ٹہلتے ہوئے سانس کی وہ مشق کی تھی۔

میں دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھا تو دھنو نے پوچھا "وجدان! تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟"

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ تاہم میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں دھنو۔"

"کیا کوئی بہت ہی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

دھنو کے اس سوال نے میری مشکل آسان کر دی' میں نے جلدی سے کہا "ہاں دھنو' وہ ایک خواب ہی تھا۔ کپکپی طاری کر دینے والا۔"

وہ بولی "ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں اس میں اس قسم کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔" پھر وہ اچانک خاموش ہو گئی۔

میں سمجھ گیا' وہ کچھ کہنے والی تھی مگر دانستہ خاموش ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا "دھنو' کیا تم نے بھی کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں۔" وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی "ایک خوفناک خواب دیکھ رہی تھی۔"

"تم نے خواب میں کیا دیکھا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

وہ جواب دینے کی تیاری کر رہی تھی کہ باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سن کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے خود بھی بہت تعجب ہو رہا تھا۔ رات کے آخری پہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دینا غیر معمولی بات تھی۔ میں نے اپنی پوری توجہ انجن کی آواز پر مرکوز کر دی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک نہیں' دو گاڑیاں تھیں جو لمحہ بہ لمحہ تھانے کے قریب پہنچ رہی تھیں۔ ان کے انجن اپنی آواز سے بتا رہے تھے کہ وہ جیپیں تھیں یا پھر جیپ نما بڑی گاڑیاں تھیں۔

ٹھیک پانچ منٹ کے بعد وہ دونوں گاڑیاں تھانے کے سامنے آ کر رک گئیں۔ رات کی تاریکی اور سناٹے میں گاڑیوں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں پھر میری سماعت نے چلتے ہوئے قدموں کی چاپیں سنیں۔

وہ تین چار افراد کے قدموں کی آوازیں تھیں جو تھانے کے اندر پہنچ کر کہیں معدوم ہو گئی تھیں۔ میرا قیافہ یہ کہتا تھا کہ وہ لوگ تھانے دار کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

دھنو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا "یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟"

"اللہ ہی جانتا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ دعا کے سے انداز میں بڑبڑائی "لارڈ بدھا۔ ہم پر رحم کرے۔"

میں نے غور سے دھنو کو دیکھا۔ اس نے دونوں ہاتھ پر نام کے سے انداز میں جوڑ رکھے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ زیر لب دعائیہ کلمات دہرا رہی تھی۔ ظاہر ہے' وہ اپنے ایشور (گوتم بدھ) سے مخاطب تھی۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی اس لیے میں وقت کا درست اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ تاہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ رات تقریباً اپنا سفر ختم کر چکی تھی اور اب تب میں صبح ہونے والی تھی۔

پھر اس سے پہلے کہ میں نیلگری سے ہونے والی الوداعی خوابناک ملاقات کے بارے میں ذہن کو دوڑاتا' ایک کانسٹیبل آنکھیں ملتا ہوا حوالات کے دروازے پر نمودار ہوا۔ شاید اسے نیند سے جگا کر ہماری جانب بھیجا گیا تھا۔ وہ بے چارہ "حکم حاکم' مرگ مفاجات" کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔

کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور خمار آلود آواز میں ہم سے کہا "تھانے دار صاحب بلا رہے ہیں۔"

میں نے اور دھنو نے الجھی ہوئی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

کانسٹیبل نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "صرف تمہیں بلایا ہے۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کانسٹیبل کے ساتھ تھانے دار کے پاس پہنچ گیا۔

تھانے دار کے کمرے میں چار افراد موجود تھے یعنی ایک تھانے دار اور تین اجنبی افراد۔ ان تینوں میں ایک صاحب حیثیت اور رعب دار شخصیت کا مالک تھا۔ باقی دو اس کے ملازم دکھائی دیتے تھے۔ بارعب شخص تھانے دار کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کے ملازم صورت ساتھی اس کے دائیں بائیں باڈی گارڈز کی طرح کھڑے تھے۔ وہ تینوں اپنی حیثیت کے مطابق سندھ کے روایتی لباس میں ملبوس تھے۔

کانسٹیبل جب مجھے تھانے دار کے کمرے میں پہنچا کر چلا گیا تو تھانے دار نے دوستانہ انداز میں مجھ سے کہا "بیٹھ جاؤ وجدان۔"

میں ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ تھانے دار نے مجھے میرے حقیقی اور اصلی نام سے مخاطب کیا تھا۔ میں نے رینجرز کے کپتان صالح رحیم کو اپنی داستان سناتے ہوئے نام درست بتا دیے تھے۔ ہماری رپورٹ میں ہمارے اصلی نام درج ہو گئے تھے چنانچہ تھانے دار بھی ہمیں وجدان اور دھنو کے نام ہی سے جانتا تھا۔

تھانے دار نے صاحب حیثیت شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "وجدان! یہ اس علاقے کے وڈیرا سائیں ہیں۔ یہ میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ میں نے ان سے تمہاری بات کی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ تمہارا کام بہت اچھے طریقے سے ہو جائے گا۔"

تھانے دار کی باتوں کو میں سمجھ نہیں سکا' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا "سائیں' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔" پھر میں نے وڈیرا سائیں کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔

تھانے دار نے کہا "یہ رئیس خان صاحب ہیں۔ میرے دوست اور اس علاقے کے وڈیرا سائیں۔ میں نے ان سے تمہاری مشکل کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ یہ تمہیں یہاں سے نکال کر کراچی تک پہنچا سکتے ہیں۔"

"کراچی تک ہم خود بھی چلے جائیں گے۔" میں نے تھانے دار کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا "بس سائیں' آپ لوگ ہمیں یہاں سے جانے دیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "کیا آپ نے پنڈت کشوری لال سے بات۔"

تھانے دار نے مجھے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور کہا "کشوری لال سے معاملہ فٹ ہو گیا ہے۔ وہ مجھے پچاس ہزار روپے ادا کرے گا۔ میں تو تمہارے بندوبست کے بارے میں فکر مند تھا۔ وہ انتظام ہو گیا ہے۔" پھر وہ وڈیرا سائیں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "سائیں' آپ خود ہی وجدان کو اپنا پروگرام سمجھائے۔"

"پروگرام بہت سادہ ہے۔" رئیس خان نے کہا "میرے یہ دونوں بندے آج "مٹھی" جانے والے ہیں۔ تم دونوں گاڑی میں ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ "مٹھی" تھرپارکر کا صدر مقام ہے۔ یہاں سے آٹھ نو گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ شام سے پہلے تم مٹھی پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سے تم اپنی مرضی سے جہاں جانا چاہو' چلے جانا۔"

وڈیرا کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔ وہ نہایت دوستانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ تھانے دار نے کہا "وجدان! وڈیرا سائیں صرف میری دوستی کی خاطر تمہارے ساتھ بھلائی کرنے کو تیار ہوئے ہیں۔"

"دوستی اور کاروبار ساتھ ساتھ چلتے رہیں تو کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔" رئیس خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "جوان! تھانے دار صاحب سے ہماری دوستی ذرا کاروباری نوعیت کی ہے۔ میرے علاقے میں تھانے دار صاحب جو بھی کیس "ڈیل" کرتے ہیں اس میں ہم برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ یعنی تمہارے پچاس ہزار روپے سے..... بیس ہزار روپے تھانے دار کی جیب میں جائیں گے اور بیس ہزار میں رکھوں گا۔"

"اور باقی کے دس ہزار روپے؟" میں نے چونک کر

ڈاکٹر جی ایم ناز
کی شہرہ آفاق کتاب
ازدواجی نفسیات
قیمت 40 روپے * ڈاک خرچ 23 روپے
❖ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل
❖ منگنی اور آئیڈیل ❖ ازدواجی ہم آہنگی
❖ ازدواجی زندگی کا جنسی پہلو
اور بہت کچھ!
مکتبہ نفسیات
74200

وڈیرے کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا "وہ تمہارا "زادِ راہ" ہے۔ ہم تمہیں یہاں سے خالی ہاتھ تھوڑی رخصت کریں گے۔"

اس کے ساتھ ہی وڈیرے نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دس ہزار روپے کی ایک گڈی نکالی اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "گن لو' پورے دس ہزار روپے ہیں۔"

وہ سو سو کے نوٹوں والی ایک مکمل گڈی تھی۔ بینک کی مہر کے ساتھ اس میں مخصوص پن بھی لگی ہوئی تھی۔ وہ سب استعمال شدہ نوٹ تھے۔ میں نے گننا ضروری نہ سمجھا اور نوٹوں کی گڈی کو جیب میں رکھ لیا۔

میں ایک بات پر حیران ہو رہا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ جرائم پیشہ لوگ پولیس والوں کو بھتہ دیتے ہیں۔ اپنی "آمدنی" میں سے ایک مخصوص حصہ متعلقہ تھانے میں پہنچاتے ہیں مگر یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی تھی۔ ایک پولیس افسر مجھے چھوڑنے کے لیے جو رشوت وصول کر رہا تھا' اس رقم میں اس علاقے کا وڈیرا بھی حصے دار تھا۔ خیر' دنیا میں ہر طرح کے علاقے اور ہر قسم کے لوگ بستے ہیں اس لیے مختلف جگہوں پر الگ الگ "اصول و قواعد" دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

تھانے دار نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "وجدان! "مٹھی" تک تو تم دونوں بغیر ایک پیسہ خرچ کیے بخیرو خوبی پہنچ جاؤ گے۔ اس کے بعد اگر تم اپنے تئیں آگے سفر جاری رکھو گے تو یقیناً پیسہ خرچ کرنا پڑے گا۔ مٹھی سے کراچی پہنچنے کے دو راستے ہیں یا تو تم میرپور خاص اور حیدر آباد سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچ جاؤ یا پھر مٹھی سے پہلے بدین جاؤ اور پھر ٹھٹھہ سے ہوتے ہوئے کراچی کا رخ کرو۔ ویسے بدین سے حیدر آباد کے راستے بھی کراچی پہنچا جاسکتا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور اگر رقم بچانا چاہتے ہو تو پھر سیدھا سیدھا یہ کرو کہ مٹھی سے ٹرک پر سوار ہو جاؤ۔ وڈیرا سائیں کے آدمی مٹھی میں جس شخص کے پاس جا رہے ہیں' وہ ٹرانسپورٹر ہے۔ پورے سندھ میں بلکہ پورے پاکستان میں اس کے ٹرک چلتے ہیں۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے!"

تھانے دار نے بات ختم کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا "آپ کی یہی بڑی مہربانی ہے کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت مل رہی ہے۔ بس آپ لوگ ہمیں مٹھی تک ہی پہنچا دیں۔ آگے ہم خود سفر کرلیں گے۔"

میں نے تھانے دار کی پیشکش کو یکسر رد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنا فیصلہ واپس نہ لے لے۔ اگر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا تو ہمارے لیے مشکلات میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ پیار محبت اور افہام و تفہیم سے مسئلہ حل ہو رہا تھا تو مجھے مل جل کر چلنا چاہیے تھا۔

اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

تھانے دار کے اس جملے پر وڈیرے نے کہا "سائیں! تم دونوں نے تو سب ٹھیک کرلیا مگر میری تسلی تو ابھی تک کروائی نہیں گئی۔"

"کیسی تسلی؟" میں نے چونک کر وڈیرے کو دیکھا۔

وڈیرے کے بجائے تھانے دار نے کہا "وجدان! بظاہر بات تو بہت احمقانہ اور جاہلانہ سی ہے لیکن تم یقین جانو' پچھلے کچھ عرصے سے تھر کے علاقے میں اس خبیث نے بہت تباہ کاری مچائی ہوئی ہے وہ بھیس بدل بدل کر وارداتیں کرتا ہے مگر کوئی ابھی تک اس کو گرفتار نہیں کرسکا۔ اس کے ساتھ ایک حسین اور نوجوان لڑکی بھی ہوتی ہے۔ وہ صرف انسانوں کی جان لیتا ہے۔ ان کو پہلے بے ہوش کرتا ہے پھر ان کی گردن پر دانت گاڑ کر جسم کا سارا خون چوس جاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ وہ ایک صحرائی عفریت ہے۔ تم میری باتوں کو مذاق تو نہیں سمجھ رہے؟"

میں نے تھانے دار کی تقریر کا یہ مفہوم نکالا تھا کہ کوئی خون آشام قاتل ان کے علاقے میں آگیا تھا جو پے در پے کئی انسانوں کی جان لے چکا تھا اور پورے صحرا میں خوف اور سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ رہی تھی۔ چونکہ میرے ساتھ حسین و جمیل دھنو بھی تھی اس لیے وہ خاصے محتاط ہو گئے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ سب کچھ مجھے بتانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ بالآخر یہی سوال میری زبان پر آگیا۔

"سائیں! آپ کی بات کچھ کچھ میرے پلے تو پڑی ہے لیکن آپ یہ ذکر مجھ سے کیوں کر رہے ہیں؟ رئیس خان صاحب کس قسم کی تسلی کرنا چاہتے ہیں؟"

تھانے دار تامل کرتے ہوئے بولا "میں نے جس عفریت کا ذکر کیا ہے نا' دراصل اسی سلسلے میں رئیس خان تسلی کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر اس عفریت کا مجھ سے کیا تعلق؟"

"تم ہمارے لیے اجنبی ہو۔" رئیس خان براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "ہم صرف اس بات کی تسلی کرنا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ عفریت تم نہ ہو۔ تھانے دار سائیں نے بتایا ہے نا' وہ شیطان روپ بدل بدل کر وارداتیں کرتا ہے۔"

وڈیرا رئیس خان اس وقت خاصا سہما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے حواریوں کی بھی یہی حالت تھی' تھانے دار بھی گہری سنجیدگی لیے ہوئے تھا۔ ان کی کہانی سن کر میں دل میں بہت ہنسا مگر زبان سے میں نے کچھ نہ کہا اور نہ ہی ان کا مذاق اڑایا۔ بس اتنا پوچھا۔

"چلو' مان لیا۔ آپ جو کہانی سنا رہے ہیں وہ صدفی صد سچی ہے اور اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ وہ خون آشام قاتل کہیں میں ہی نہ ہوں مگر یہ بھی تو بتائیں کہ آپ مجھ سے کس طرح اور کس قسم کی تسلی چاہتے ہیں؟ کیا اس عفریت کی کوئی نشانی بھی ہے؟"

"ہاں' اس کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔" تھانے دار نے کہا "اس بھیڑیا صفت شخص کے دائیں کان کے پیچھے چاند کی شکل کا ایک ہلالی نشان ہے۔ بالکل جیسے ابتدائی تاریخ کا چاند ہو۔ اس نشان کی رنگت سرخ ہے۔"

میں نے کہا "لیکن میرے دائیں کان بلکہ کسی بھی کان کے پیچھے اس قسم کا کوئی سرخ ہلالی نشان نہیں ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" رئیس خان نے کہا "مگر میں دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہو سکتا کیونکہ تم میرے دو وفاداروں کے ساتھ سفر کرنے والے ہو۔ میں ان کی زندگی کو کسی قسم کے خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا! یہ دونوں افراد میرے لیے بہت اہم ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے پیشکش کرنے والے انداز میں کہا "آپ چاہو تو میرے دائیں کان کا اچھی طرح معائنہ کرلو۔"

وڈیرا مطمئن نظر آنے لگا پھر وہ اٹھ کر میرے قریب آیا اور میرے کان کو پکڑ کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں ان توہم پرستوں کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم دل ہی دل میں مجھے ان کی اس حماقت پر ہنسی بھی آرہی تھی۔ جسے میں بمشکل ضبط کیے بیٹھا تھا۔

مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ میرے دائیں کان کی لو کی پچھلی طرف' مسور کے برابر ایک سیاہ تل تھا۔ سرخ ہلالی نشان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر کے معائنے کے بعد رئیس خان دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا پھر تھانے دار کی طرف دیکھتے ہوئے پرسکون لہجے میں بولا "سائیں! اللہ کا شکر ہے' یہ وہ خطرناک قاتل نہیں ہے۔ میں نے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر تسلی کرلی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانہ کرنے کو تیار ہوں۔"

تھانے دار کے چہرے پر بھی اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ بولا "اب تو صبح ہونے ہی والی ہے اور کچھ نہیں تو جاتے جاتے یہ لوگ چائے ہی پی جائیں۔"

"یہ تو آپ کی بہت بڑی نیکی ہوگی سائیں۔" رئیس خان نے کہا "میرے بندوں نے بھی ابھی ناشتا نہیں کیا۔ ذرا ان کے لیے بھی چائے وغیرہ کا بندوبست کردو۔"

تھانے دار اپنے ماتحتوں کو مختلف قسم کے احکام دینے لگا۔

اگلے بیس پچیس منٹ میں ہم ہلکا پھلکا ناشتا کر کے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ دھنو کو جب میں نے اپنی معجزاتی رہائی کے بارے میں بتایا تھا تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ جب ہم تھانے سے نکلے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔

باہر دو گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ اگلی گاڑی پجارو تھی جبکہ اس کے پیچھے بڑے سائز کی ایمبولینس ٹائپ ایک گاڑی تھی۔ وڈیرا رئیس خان پجارو کی جانب بڑھتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے بولا۔

"میر بخش! دونوں مہمانوں کو بڑی گاڑی میں بٹھاؤ۔"

میر بخش نامی شخص ہمیں پیچھے کھڑی ایمبولینس ٹائپ گاڑی کی طرف لے جانے لگا تو میں نے پوچھا "کیا وڈیرا

سائیں بھی ہمارے ساتھ جائیں گے؟"

"نہیں' وہ یہاں سے سیدھا اپنے گھر جائیں گے۔" میر بخش نے جواب دیا "مٹھی تک ہم آپ لوگوں کو پہنچائیں گے۔"

میر بخش کا ساتھی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اسے اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اس دوران میں رئیس خان کی پجارو حرکت میں آگئی تھی۔ میں اور دھنو پچھلی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار ہونے کا راستہ بھی عقبی سمت میں تھا۔

ہم گاڑی کے اندر بیٹھ چکے تو میر بخش نے زوردار آواز سے دروازہ بند کردیا اور خود جاکر گاڑی کے اگلے حصے میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور مٹھی کی جانب ہمارا سفر شروع ہوگیا۔

سامان کے نام پر ہمارے پاس وہی سفری بیگ تھا جس میں کپڑوں کے علاوہ ہمارے روز مرہ استعمال کی چند چیزیں تھیں۔ تھانے دار نے یہ بے ضرر سا بیگ ہمیں اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ اگر بیگ نہ بھی دیتا تو ہم خوش تھے۔ آزادی سے بڑی نعمت دنیا میں اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ ہمیں یہ آزادی مبلغ پچاس ہزار روپے کے عوض حاصل ہوئی تھی۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی اور وہ یہ کہ جو رقم مجھے دی گئی تھی وہ رئیس خان نے اپنے پاس سے دی تھی۔ اس سے تو یہی بات ظاہر ہوتی تھی کہ تھانے دار نے ابھی پنڈت کشوری لال سے رقم وصول نہیں کی تھی۔ وڈیرے کو وہ رقم ملنے کی ٹھوس امید تھی جبھی اس نے اپنے پاس سے مجھے رقم ادا کردی تھی۔ بعد میں پنڈت سے پچاس ہزار روپے نکلوا کر وہ بیس ہزار اور تیس ہزار آپس میں بانٹ لیتے۔ تھانے میں بات چیت کے دوران میں میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ اس سلسلے میں تھانے دار سے پوچھوں لیکن پھر میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ دراصل ہمیں اس جھمیلے سے نجات ملنے کی اس قدر خوشی تھی کہ میں کسی تردد میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ جب اوکھلی میں سر دے دیا تھا تو پھر موسلوں کا کیا ڈر!

راستے میں پہلے موڑ پر وڈیرے کی پجارو دائیں جانب مڑگئی۔ ہماری گاڑی کی رفتار میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ میں اور دھنو گزشتہ چھتیس گھنٹوں میں پیش آنے والے واقعات پر گفتگو کرنے لگے۔ یہ وقت ہم پر بہت بھاری گزرا تھا۔ ان لمحوں کی سنگینی اور سفاکی کو ہم کبھی فراموش نہیں کرسکتے تھے۔

بات کرتے کرتے اچانک دھنو کو کھانسی آگئی' پھر اس کی کھانسی طویل ہونے لگی۔ میں نے بھی محسوس کیا جیسے گاڑی کی اندرونی فضا میں گھٹن سی در آئی ہو۔ وہ گاڑی ہر طرف سے بند تھی۔ ائرکنڈیشنڈ ہونے کے سبب اسے ائرٹائٹ کروایا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے مجھے بھی ٹھسکا لگا اور سانس لینا دشوار محسوس ہونے لگا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ہمارے ساتھ کوئی "کارروائی" ہوچکی ہے۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں کوئی زہریلی چیز شامل ہوچکی تھی جو لحہ بہ لحہ ہماری سانسوں کو مشکل سے مشکل ترین کرتی جارہی تھی۔

دھنو کی حالت بہت خراب ہورہی تھی۔ اب وہ باقاعدہ سینہ پکڑ کر اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کیبن والے شیشے کو بجا کر گاڑی کے اگلے حصے میں بیٹھے ان دو افراد کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا لیکن لگتا تھا وہ پتھر کے بت بن گئے ہوں جو پلٹ کر دیکھنا نہ جانتے ہوں۔

مجھے اپنے سینے میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ دھنو بے دم اور بے حواس ہو کر گاڑی کے فرش پر ڈھے گئی۔

میرے اندر مہم جوئی کی جتنی قوت باقی بچی تھی' اس کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے گاڑی کے عقبی دروازے میں نصب ہینڈل پر طبع آزمائی شروع کردی لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ دروازہ لاک ہوچکا تھا۔ دراصل اس دروازے میں کوئی خودکار لاک لگا ہوا تھا۔ جب اس دروازے کو زور سے بند کیا گیا تھا تو وہ آٹومیٹک لاک بند ہوگیا تھا۔

میں نے اپنے جسم و جان کی پوری قوت صرف کرکے دروازے کے ہینڈل کو جھنجوڑ ڈالا مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اب میرے اعصاب اور حواس بھی جواب دینے لگے تھے۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں نفوذ شدہ اس زہریلی گیس نے میرے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھ پاؤں سے جان نکل گئی ہو۔

وہ موت کی پیامبر سیاہ گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور میں زندگی سے دور ہوتا جارہا تھا۔ میرا سفر روشنی سے تاریکی کی طرف تھا۔ ان نازک لمحات میں میرے ذہن میں جو خیال آیا' وہ یہ تھا۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو اس معصوم صورت 'کانچ کی گڑیا' دھنو پر کیا بیتے گی؟

پھر میرا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

تاریکی موت ہی کا ایک روپ ہے۔ موت جتنی بے رحمی سے زندگی کو چاٹ جاتی ہے' اتنی ہی بے دردی سے تاریکی روشنی کو کھا جاتی ہے۔ اندھیرے اجالے کا یہ کھیل درحقیقت زندگی اور موت کا کھیل ہے جس میں جیت ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو دوسرے پر بھاری پڑے' اس پر سبقت لے جائے۔

ہم جس مہلک صورتِ حال سے دوچار ہوئے تھے وہ ہمارے لیے غیر متوقع اور ناگہانی تھی۔ دھنو میری آنکھوں کے سامنے بے دم ہوکر سیاہ گاڑی کے فرش پر ڈھے گئی تھی جب کہ میں نے زندگی کی بازی جیتنے کے لیے آخری حد تک ہاتھ پاؤں مارے تھے لیکن میری پیش نہ چلی اور حالات کے جبر نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کردیا تھا۔

میں نہیں جانتا' یہ بے گانگی کب تک مجھ پر طاری رہی تھی اور اس دوران میں ہمارے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے تاہم ہوش میں آنے کے بعد رفتہ رفتہ میرے ذہن نے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ حواس پر چھائی ہوئی دھند دھیرے دھیرے زائل ہوئی تو میرا ذہن سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور میں اپنے گردوپیش کو محسوس کرنے لگا۔

میرے جسم کو لگنے والے ہلکے ہلکے ہچکولے اس بات کا پتا دے رہے تھے کہ میں کسی گاڑی میں محوِ سفر تھا گاڑی اور سفر کے خیال کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ماضی قریب کا احوال روشن ہوگیا اور پھر یکے بعد دیگرے وہ ناخوش گوار واقعات یاد آنے لگے۔ میں ان ناگہانی واقعات کی ناخوش گواریت اور تلخی کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ ہمارے ساتھ ایک سنگین دھوکا کیا گیا تھا۔ انسان ہمدردی اور سلوک کے واقعات تو بھول سکتا ہے مگر بے رحمی' سفاکی اور دھوکا دہی کے واقعات کو فراموش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

جیسے جیسے میرے حواس بجا ہورہے تھے' میں خود کو پیش آنے والی صورتِ حال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں اور دھنو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے پاکستان میں داخل ہوئے تھے اور سرحدی محافظوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ سرحدی محافظوں نے ضروری کارروائی کے بعد ہمیں ہمارے "میزبان" پنڈت کشوری لال کے ہم راہ مقامی پولیس کے حوالے کردیا تھا۔ پھر تھانا انچارج اچانک... ہم پر مہربان ہوگیا تھا اور ہمیں مبلغ پچاس ہزار کے عوض چھوڑنے پر تیار ہوگیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہمیں بہ حفاظت مٹھی تک پہنچانے کا بندوبست بھی کردیا تھا۔ ایک مقامی وڈیرا رئیس خان' تھانا انچارج کا حصے دار تھا اور ہمیں اسی کے آدمیوں کے ساتھ نگرپارکر سے مٹھی تک جانا تھا۔

ہمیں ایک ایمبولینس نما سیاہ گاڑی میں بٹھایا گیا تھا پھر ہمارے سفر کو شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ہمارے ساتھ وہ کچھ ہوگیا تھا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ وہ سیاہ گاڑی مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ تھی' ہمیں گاڑی کے پچھلے حصے میں سوار کرایا گیا تھا جبکہ وڈیرے کے آدمی اگلے حصے یعنی ڈرائیونگ کیبن میں تھے۔ دونوں حصوں کے درمیان مضبوط شیشے کی دیوار کا انتظام خصوصی طور پر کیا گیا تھا ورنہ عام طور پر ایمبولینس میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ جب ہمیں اس سیاہ گاڑی میں بیٹھایا جارہا تھا تو میرے خواب و خیال میں بھی کہیں یہ بات نہیں تھی کہ ہمیں اس چوہے دان میں قید کیا جارہا ہے۔ عقبی دروازے کے مقفل ہونے کا انکشاف تو اس وقت ہوا تھا جب مجھے زندگی بچانے کی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا' سفر کے دوران میں پہلے دھنو کو ٹھسکا لگا تھا' پھر وہ کھانسنے لگی تھی پھر گاڑی کی اندرونی فضا میں مجھے بھی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی' اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس ائرکنڈیشنڈ فضا میں کہیں سے کوئی زہریلی چیز داخل کی گئی تھی جو ہماری سانسوں کو گھٹا کر مشکل سے مشکل تر بنا رہی تھی۔ ڈرائیونگ کیبن میں موجود وہ دونوں افراد اس زہریلی شے کے مہلک اثرات سے محفوظ تھے اور ہماری کسی پکار' کسی فریاد پر کان دھرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ دراصل یہ انہی کی کارستانی تھی۔ میں جس فضا کو زہر آلود سمجھا تھا وہ درحقیقت ہوش و حواس سے بے گانہ کردینے والی فضا تھی' بے ہوشی طاری کرنے والی فضا' وہ دونوں بدمعاش ہمیں بے ہوش کرنا چاہتے تھے اور اپنی اس مذموم کوشش میں وہ کامیاب بھی ہوگئے تھے۔

اس خوف ناک خیال نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کردیا۔ کھلی آنکھوں سے میں نے جو پہلا منظر دیکھا وہ دھنو کے سراپا پر مشتمل تھا' وہ ہنوز گاڑی کے فرش پر پڑی ہوئی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے اس پر کسمپرسی اتر آئی ہو' دھنو کی کیفیت نے میرے دل میں درد کی ایک لہر جگادی' مجھے یاد آیا' جب میں گاڑی کا عقبی دروازہ کھولنے میں ناکام رہا تھا اور ذہن تیزی سے تاریکی میں ڈوب رہا تھا تو ان نازک ترین لمحات میں' میں دھنو ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا اس وقت میں اس تشویش میں مبتلا تھا کہ اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہوگیا تو دھنو پر کیا گزرے گی۔

میں اب مکمل طور پر ہوش و حواس میں آچکا تھا اور مجھے

یہ یقین ہو گیا تھا کہ خدا کا شکر ہے، مجھے ایسا ویسا کچھ نہیں ہوا تھا، تاہم دھنو کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ ضرور کچھ گڑ بڑ ہے وہ آڑی ترچھی بے سدھ پڑی تھی۔ اسے چھونے کے لیے میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور سکتے میں رہ گیا۔

دھنو کی جانب ہاتھ بڑھانے کی خواہش کو میں عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اس کوشش کے دوران میں مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ میں اپنے ہاتھ کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت نہیں دے سکتا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں مقید ہیں۔

میں نے تشویش ناک انداز میں دھنو کے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کی کارروائی کی گئی تھی تاہم طریقۂ کار زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب نائیلون کی مضبوط رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ انہیں زیادہ خطرہ مجھ ہی سے تھا۔

میرا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ ہماری بے ہوشی کے دوران میں ہمارے ساتھ یہ کارروائی کی گئی تھی۔ جب انہیں یقین ہو گیا ہو گا کہ ہم انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں رہے یا ان کے کسی عمل کا ردِ عمل ظاہر نہیں کریں گے تو انہوں نے گاڑی روک کر مجھے الٹی ہتھکڑی لگائی ہو گی اور دھنو کے ہاتھ نائیلون کی ڈوری میں جکڑ دیے ہوں گے۔ بعد ازاں گاڑی کا عقبی دروازہ دوبارہ مقفل کر کے گاڑی آگے بڑھا دی ہو گی۔

یہ بات تو طے تھی کہ ہمیں اغوا کیا جا رہا تھا۔ اس طے شدہ بات کے ساتھ ہی ذہن میں جو پہلا سوال سر ابھار تا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اس لق و دق صحرا میں ہمارا ایسا کون سا دشمن تھا جس نے ہمیں اغوا کروایا تھا اور کیوں؟

میرا خیال بار بار رئیس خان کی جانب پرواز کر رہا تھا۔ تھانے سے ہمیں اسی شخص نے "نجات" دلائی تھی اور اسی کے آدمیوں کے ساتھ ہم سفر پر روانہ ہوئے تھے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ رئیس خان ہمیں کیوں اغوا کروا رہا تھا وہ تو ہمارے سفر کے آغاز پر ہی ہم سے جدا ہو گیا تھا۔ رئیس کے ایک آدمی میر بخش نے بتایا تھا کہ وڈیرا اپنی رہائش گاہ کی طرف چلا گیا تھا اور ہمیں ان دونوں کے ساتھ تھرپارکر کے صدر مقام مٹھی تک جانا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں مصروف تھا کہ ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند ذہن میں چمکا۔ کہیں ہمارے اغوا میں ان دو افراد ہی کا ہاتھ تو نہیں؟ ممکن ہے، یہ دونوں اپنے طور پر یہ کارروائی کر رہے ہوں جس سے ان کا کوئی خاص ذاتی مفاد وابستہ ہو!

پھر مجھے وہ واقعات یاد آنے لگے جب تھانے میں رئیس خان نے اپنا خوف دور کرنے کے لیے میرا "چیک اپ" کیا تھا۔ وہ میرے دائیں کان کے عقب میں کوئی سرخ ہلالی نشان تلاش کرتا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی خون آشام انسان نما عفریت اس صحرا میں وارد ہو چکا ہے جس کے ساتھ ایک خوب رو اور دل کش حسینہ بھی ہے۔ وڈیرا میرے کان کے عقب میں جھانک کر تسلی کرنا چاہتا تھا کیوں کہ دھنو کی شکل میں میرے ساتھ ایک حسین و جمیل لڑکی موجود تھی۔ وڈیرا میرے کان کے تنقیدی معائنے کے بعد مطمئن ہوا تھا۔ ان لوگوں کی ذہنی پسماندگی اور توہم پرستی کے بارے میں سوچ کر مجھے ایک مرتبہ پھر ہنسی آ گئی۔

میں نے بے اختیار ڈرائیونگ کیبن کی طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ وہ دونوں مردود سامنے دھیان رکھے اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔ میرے اندر بڑی سرعت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے ان دونوں سے بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے، وہ گاہے گاہے بیک ویو مرر میں ہمارا جائزہ لے رہے ہوں!

میں نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کے فرش پر بے سدھ پڑی دھنو کی طرف دیکھا۔ اس کے جسم میں حرکت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میری تشویش دو چند ہو گئی۔ میرے ذہن میں مختلف قسم کے خدشات سر اٹھانے لگے کہ خدانخواستہ دھنو...؟

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ میں اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنی موجودگی میں دھنو کے ساتھ کسی اونچ نیچ کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے ہوتے ہوئے اگر اسے کوئی مہلک گزند پہنچ جاتی تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے کچھ کرنا تھا... بہت کچھ کرنا تھا۔ دھنو کے لیے، اپنے لیے، ہم دونوں کی بہ حفاظت آزادی کے لیے۔ دھنو کی حالت بہت نازک تھی۔ اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سانس لے بھی رہی ہے یا نہیں۔ طویل اور گہری بے ہوشی اس کے ذہن کے نازک اور حساس سیلز (Cells) کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا سکتی تھی۔

میں نے کن انکھیوں سے ڈرائیونگ کیبن کی طرف دیکھا، وہ دونوں بہ دستور ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہے تھے۔ میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں بھی دھنو کی طرح گاڑی کے فرش پر پڑا تھا۔ میں نے اپنے بدن کو لگنے والے ہچکولوں کی آڑ میں دھیرے دھیرے دھنو کی جانب سرکنا شروع کر دیا اور چند لمحات کے بعد میرا جسم دھنو کے بدن کے ساتھ جا لگا۔ میں نے دھنو کے لمس پر اپنی بھرپور توجہ مرکوز کر دی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں اس خوش گوار نتیجے پر پہنچا کہ دھنو میں زندگی کی حرارت موجود تھی۔ اس کی سانس بہت تھم تھم کر چل رہی تھی۔ وہ اس وقت گہری بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ اس خیال نے مجھے قلبی تقویت پہنچائی کہ دھنو زندہ تھی تاہم میری تشویش ابھی پوری طرح رفع نہیں ہوئی تھی۔ دھنو کو بے خبری کی اس حالت میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

میرا ذہن تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ ہمیں جو صورتِ حال درپیش تھی اس سے نکلنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا ضروری تھا اور... "اس عملی قدم" کے لیے میرے ہاتھوں کا آزاد ہونا لازمی تھا۔ میں اپنے ہاتھوں سے پیوست ہتھکڑی سے چھٹکارا پانے کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ باندھ لیا تھا کہ اپنی باطنی اور روحانی صلاحیتوں کا عام استعمال صرف اس وقت کروں گا جب جان پر بن آئے گی اور وہ بھی مثبت انداز میں ورنہ مادی مسائل سے نمٹنے کے لیے میں حتی الوسع مادی کوشش ہی کروں گا۔ سب سے پہلے میں اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو آزماؤں گا۔ جب معاملہ ان صلاحیتوں کے بس کا نہ رہا اور ضروری بھی ہوا تو ٹھیک ہے، پھر میں اپنے اندر موجود پُراسرار قوت "جی" سے ضرور کام لوں گا۔

میرے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے۔ میں اپنی جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس الٹی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں بدل سکتا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں، میں نے کنگ فو کے ساتھ ساتھ یوگا اور جمناسٹک کی تربیت بھی لی تھی۔ جمناسٹک میں جسمانی لچک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاص طور پر "سمر سالٹ" وغیرہ میں تو پورے جسم کو فضا میں ایک گولے کی شکل دینا ہوتی ہے اسی طرح مارشل آرٹس میں بھی جب "رولنگ" کی جاتی ہے تو جسم ایک بال کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ میں نے اپنی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں لانے کے لیے "رولنگ ٹیکنیک" پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرا یہ فیصلہ قدرے رسکی تھا۔ رسکی... ٹیکنیک کے حوالے سے نہیں بلکہ اس میں خطرہ اس بات کا تھا کہ ڈرائیونگ کیبن میں موجود ہمارے اغوا کنندگان کہیں میرے جسم کی حرکات و سکنات کو دیکھ نہ لیں۔

اس واضح خطرے کے باوجود بھی میں نے اپنے فیصلے پر عمل کا ارادہ کر لیا کیوں کہ کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی تھا۔ رسک لیے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ میں اپنی خاطر تو کسی مناسب موقع کا انتظار کر سکتا تھا مگر دھنو کی تشویش ناک حالت کو دیکھتے ہوئے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں اس وقت ایمبولینس نما سیاہ گاڑی کے فرش پر دھنو کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ذہن میں اس کارروائی کو دہرایا جس میں مجھے "رولنگ ٹیکنیک" استعمال کرتے ہوئے..... اپنے ہتھکڑی زدہ ہاتھوں کو سامنے کی طرف لانا تھا۔ سب سے پہلے مجھے سمر سالٹ کے انداز میں اپنے پورے وجود کا ایک گولا سا بنانا تھا۔ گھٹنوں کو پیٹ کے اندر دھنسانا تھا، ایڑیوں کو کولھوں سے پیوست کرنا تھا اور گردن کو جھکا کر سینے میں دبانا تھا۔ اس کے بعد اپنی کمر کی بھرپور لچک کا استعمال کرتے ہوئے ہتھکڑی زدہ ہاتھوں کو کولھوں کے نیچے سے گزارتے ہوئے سامنے کی طرف لانا تھا۔ گویا کندھوں کو محور مان کر جسم کے گولے کو بازوؤں کے درمیان سے گزارنا تھا۔ اس طرح کہ ہتھکڑی والا... ہاتھ میری پشت کے بجائے پیٹ پر سامنے کی طرف آ جائے۔ اس پوزیشن میں، میں ہتھکڑی سمیت بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔

میں نے ایک محتاط نگاہ ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھے ہوئے ان دو افراد پر ڈالی پھر مطمئن ہو کر "ایکشن" کے لیے تیار ہو گیا۔ فرش پر لیٹے لیٹے میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں اور اس سے پہلے کہ میں اس سلسلے میں "ایک قدم" بھی آگے بڑھاتا، ایک زوردار دھماکا ہوا۔

وہ سماعت شکن دھماکا گاڑی کا ٹائر پھٹنے سے ہوا تھا۔ گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے فضا میں اچھلی پھر چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی بریک کی تیز چرچراہٹ بلند ہوئی۔ ٹائر پھٹنے سے گاڑی کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی اس لیے ڈرائیور کو بہ حالتِ مجبوری بریک لگانا پڑے تھے۔

شاید ایسے ہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے، "ہمتِ مرداں، مددِ خدا"۔ میں نے ایک مثبت اقدام کے لیے ہمت سے کام لینے کا آغاز کیا ہی تھا کہ قدرت نے مجھے اس "کام" کو بہ حسن و خوبی انجام دینے کے لیے ایک سنہری موقع فراہم

کردیا۔

گاڑی کچی سڑک سے اتر کر صحرائی جھاڑیوں میں پھنس گئی تھی۔ میں اس دوران میں ہتھکڑی والا "معرکہ" مار چکا تھا اور اب دھنو کے اوپر اس طرح پڑا تھا کہ نہ تو دھنو میرے بوجھ تلے دب سکے اور نہ ہی ڈرائیونگ کیبن میں موجود افراد کو میرے ہتھکڑی والے ہاتھ نظر آئیں۔ میں نے نہایت مہارت سے اپنے وجود کو مطلوبہ زاویے پرسیٹ کر رکھا تھا۔

میری آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ تقریباً ان معنوں میں کہ میں پلکوں کی درز میں سے ڈرائیونگ کیبن پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ جب میں دھنو کے اوپر آیا تھا تو وہ خفیف سا کسمسائی تھی شاید یہ اس جھٹکے کا ردِ عمل تھا جو ٹائر پھٹنے سے گاڑی کو لگا تھا، تاہم اس وقت دھنو دوبارہ ساکت ہو چکی تھی جو کوئی تسلی بخش بات نہیں تھی۔

"میری نگاہ" ڈرائیونگ کیبن کے شیشے پر جمی ہوئی تھی۔ گاڑی رکتے ہی وہ دونوں ڈرائیونگ کیبن سے باہر نکل آئے تھے یعنی وہ گاڑی سے نیچے اتر گئے تھے۔ ایک بات تو طے تھی کہ ٹائر تبدیل کیے بغیر آگے سفر جاری نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

گاڑی سے باہر نکلنے کے بعد وہ دونوں مجھے نظر نہیں آ رہے تھے تاہم ان کے قدموں کی چاپ اور باتوں کی آواز سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ گاڑی کی عقبی جانب آ رہے تھے۔ میں ذہنی طور پر پوری طرح چاق و چوبند ہو گیا اسی وقت میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی رفتار سے پیدا ہوا اور میں نے اپنی سوچ کے نتیجے میں بے اختیار گاڑی کے فرش پر سیٹوں کے نیچے نظر دوڑائی۔ میری متلاشی نظر پلک جھپکتے میں اس چیز تک پہنچ گئی جس کے بارے میں میرے ذہن نے سوچا تھا۔

وہ گاڑی کا ایک فاضل ٹائر تھا جیسا کہ ہر گاڑی میں ایمرجنسی کی صورتِ حال کے لیے ایک اسپیئر ٹائر رکھا جاتا ہے۔ مذکورہ ٹائر اس سیٹ کے نیچے رکھا تھا جس پر بے ہوش ہونے سے پہلے دھنو بیٹھی ہوئی تھی۔ اب ایک بات یقینی تھی کہ گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے کے لیے انہیں گاڑی کے پچھلے حصے کو کھولنا پڑتا جہاں فرش پر ہم دونوں پڑے تھے۔

یہ اچھا موقع تھا۔ وہ جیسے ہی گاڑی کا عقبی دروازہ کھولتے، میں بھرپور "کارروائی" کر سکتا تھا۔ مجھے پورا وثوق تھا کہ میں ہتھکڑی لگے ہاتھوں کے ساتھ بھی بڑا ٹھیک ٹھاک ان سے نمٹ سکتا تھا۔ یہ بات میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا کہ وہ دونوں مسلح تھے۔ تھانے میں جب وہ وڈیرا رئیس خان کے دائیں بائیں کھڑے تھے تو ان کے ہاتھوں میں، میں نے کلاشنکوفیں دیکھی تھیں پھر جب وہاں سے روانہ ہوئے تھے تو بھی یہ ہتھیار ان کے پاس ہی تھے

میں کسی بھی ایکشن کے لیے تیار تھا کہ ایک فوری خیال نے مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سوچا بہتر یہ ہو گا کہ پہلے انہیں گاڑی کا ٹائر تبدیل کرنے دیا جائے تاکہ ازاں بعد مجھے وہاں سے روانہ ہوتے وقت کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں سانس روک کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد میری امید بر آئی۔ دروازے کے لاک میں چابی گھومنے کی آواز آئی پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ میں نے اپنی نیم وا پلکوں کی اوٹ سے دیکھا۔ میر بخش نامی دراز قامت شخص مجھ پر کلاشنکوف تانے کھڑا تھا جب کہ اس کا ساتھی دبلا پتلا آدمی گاڑی کے اندر گھس آیا تھا۔ یقیناً وہ ٹائر نکالنا چاہتا تھا۔ گاڑی میں داخل ہونے سے پہلے ان دونوں نے ہمیں ہلا جلا کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ ہم وہاں ہیں جہاں کی ہم کو بھی اپنی کچھ خبر معلوم نہیں۔ اس موقع پر میں نے اپنی بے ہوشی کی بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر گاڑی کا پھٹا ہوا ٹائر نکال کر اس کی جگہ صحیح سلامت ٹائر فٹ کر دیا گیا۔ اب میرے عمل کا وقت سر پر آن پہنچا تھا۔ جیسے ہی وہ مجروح ٹائر کو گاڑی کے اندر رکھ کر دروازہ بند کرنے لگتے، مجھے حرکت میں آ جانا تھا۔ جو بھی ہو جاتا، اس سے نمٹنا تھا۔

ٹائر کی تبدیلی کے دوران وہ دونوں آپس میں سندھی میں بات چیت بھی کرتے رہے تھے۔ میں سندھی زبان کو پوری طرح نہیں سمجھتا تھا تاہم دس فی صد مفہوم میرے پلے پڑ رہا تھا۔ وہ دونوں اس ناگہانی افتاد پر جھلائے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ مقررہ وقت پر کسی جگہ پہنچنا چاہتے تھے اور ٹائر پھٹنے کی وجہ سے وہ آدھا گھنٹا لیٹ ہو چکے تھے۔

گاڑی کی عقبی سمت چلتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی ایک ہی شخص تھا اس کے ساتھ ہی ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ یہ گاڑی کے بائیں جانب کا دروازہ تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میر بخش کلاشنکوف بردار پسنجر سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس سے ایک اور بات بھی صاف ہو گئی کہ مجروح ٹائر گاڑی میں رکھنے کے لیے ڈرائیور کو آنا تھا اور وہی گاڑی کا عقبی دروازہ بند کرنے والا تھا۔

میرے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ظاہر ہے کسی مسلح شخص کی بہ نسبت نہتے آدمی سے نمٹنا آسان

ہے۔ جیسے ہی ڈرائیور پھٹے ہوئے ٹائر کو سیٹ کے نیچے کھسکا کر سیدھا ہوا، میں نے ہتھکڑی کا ایک بھرپور وار اس کے چہرے پر کیا۔ یہ ایک آہنی دو ہتڑ تھا جس کی طوفانی ضرب نے ڈرائیور کو بلبلانے پر مجبور کر دیا۔

ڈرائیور کی درد میں ڈوبی ہوئی چیخ سن کر میر بخش نے ایک جھٹکے سے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر اس دوران، میں ڈرائیور کو اپنی ٹانگوں میں رکھ کر گاڑی سے اس طرح باہر پھینک چکا تھا جیسے کسی توپ سے گولا داغا جاتا ہے، اس کے ساتھ ہی میں خود بھی اچھل کر گاڑی سے باہر آ چکا تھا۔

گاڑی رکنے سے ائرکنڈیشنر میں کوئی ایسی خرابی واقع ہو گئی تھی کہ اس نے خاموشی سے "چپ" سادھ لی تھی اسی لیے ڈرائیور اپنی سائڈ کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا میر بخش نے بھی اپنی سائڈ کا شیشہ گرا لیا تھا اسی وجہ سے ڈرائیور کی "بلبلاہٹ" اپنے تمام تر صوتی اثرات کے ساتھ میر بخش کی سماعت تک پہنچ گئی تھی۔

میں جب میر بخش کے سر پر پہنچا تو وہ گاڑی سے باہر آ چکا تھا پھر قبل اس کے کہ وہ کلاشنکوف کا رخ میری جانب کرتا، میں نے اسٹیپ لے کر ایک زوردار فرنٹ پنش کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔ وہ چوڑے سینے کا مالک اور دراز قامت شخص تھا۔ پھر اس کے بدن کی مضبوطی میں بھی کوئی کلام نہیں تھا مگر میری کک بھی کوئی عام سی ٹھوکر نہیں تھی۔ اس میں غم و غصہ وافر مقدار میں شامل تھا۔

میر بخش گاڑی کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جا پڑا۔ اس کا سر اسٹیئرنگ وھیل سے ٹکرایا مگر اس کا جسم رکا نہیں۔ میری کک کے زبردست پنش نے اسے لڑھکاتے ہوئے ڈرائیور سائڈ کے کھلے ہوئے دروازے سے گاڑی کی دوسری سمت ریتلی زمین پر پہنچا دیا تاہم اس نے اس دوران میں کلاشنکوف کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

جب میر بخش ڈرائیونگ کیبن میں لڑھک رہا تھا تو گاڑی کے وسیع ڈیش بورڈ پر مجھے ایک کلاشنکوف رکھی نظر آئی۔ یہ یقیناً ڈرائیور کا ہتھیار تھا جسے میں نے گاڑی کے عقب میں لگ بھگ بیس فٹ دور ریت میں اچھال دیا تھا۔

میری نگاہ کے چاروں جانب ریت ہی ریت دکھائی دیتی تھی۔ اس لق و دق صحرا میں کہیں کہیں جھاڑیوں کا وجود بھی نظر آ رہا تھا۔ سر پر آسمان آگ برسا رہا تھا۔ میں نے اپنے تجربے کو کام میں لاتے ہوئے اندازہ لگایا کہ وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ہم علی الصباح تھانے سے روانہ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا، ہم تقریباً سات گھنٹے بے ہوش رہے تھے، اور دھنو تو ابھی تک گاڑی کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔

میں عقابی نظر سے میر بخش کو دیکھتے ہوئے اس کی جانب بڑھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور کلاشنکوف کو میری طرف سیدھا کر چکا تھا۔ یہ بہت نازک لمحات تھے۔ اگر میں ایک لمحے کی بھی کوتاہی کر جاتا تو کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں کی بوچھار مجھے چھلنی کر دیتی۔

میں نے جست بھر کر "ہینڈ اسپرنگ" لگایا پھر فرنٹ سمر سالٹ (FRONT SOMERSAULT) لگاتے ہوئے میر بخش کے اوپر سے گزر کر اس کے عقب میں اپنے قدموں پر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت مجھے اپنے پیچھے گولیوں کی "تڑتڑاہٹ" سنائی دی۔ میں ایڑیوں پر اباؤٹ ٹرن ہوا۔ وہ فائرنگ میر بخش کی کلاشنکوف سے کی گئی تھی۔ اس نے اس جگہ کو نشانہ بنایا تھا جہاں ہینڈ اسپرنگ لگانے سے پہلے میں کھڑا تھا۔ میں نے واضح طور پر نوٹ کیا کہ میر بخش نے میرے قدموں میں گولیاں برسائی تھیں۔ اس مقام کی ریت فضا میں اچھل گئی تھی۔

میر بخش کی اس "حرکت" پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہو رہی تھی کہ وہ مجھے جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ صرف زخمی کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ میری جان کا دشمن ہوتا تو فائرنگ کا رخ میرے سینے یا سر کی جانب ہوتا۔

میر بخش میری قلابازیوں پر محوِ حیرت تھا۔ اس نے میرے قدموں میں فائرنگ کی تھی مگر میں پلک جھپکتے میں اس کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ وہ تیزی سے پیچھے مڑا۔ میں نے اسی وقت ایک لمبا سا اسٹیپ لے کر سائڈ کک اس کے پہلو میں رسید کر دی۔ سائڈ کک کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر یہ مناسب جرک کے ساتھ صحیح ٹارگٹ پر پڑ جائے تو مضبوط سے مضبوط مدِ مقابل کے قدم بھی اکھاڑ دیتی ہے۔

میر بخش اس ناگہانی افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ تو حیرت سے میرا "دیدار" کرنے کی خاطر مڑا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ اسے یہ دیدار بہت "مہنگا" پڑے گا۔ میری سائڈ کک نے اس کے پہلو کی بھرپور مزاج پرسی کی اور وہ زمین پر قلابازیاں کھاتے ہوئے مجھ سے پندرہ قدم دور جا گرا۔

ایک مارشل آرٹسٹ کے مدِ مقابل اگر کوئی مارشل آرٹسٹ ہی ہو تو فنی داؤ پیچ کا مظاہرہ نسبتاً آسان ہوتا ہے اور مقابلے میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے جو دیکھنے والوں کو بھی محظوظ کرتا ہے۔ یہاں میرا مقابلہ ایک جٹ قسم کے پہلوان

سے تھا اس لیے میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا۔ مدِ مقابل کی "حرکات" کے مطابق میں بھی "توڑ" پیش کر رہا تھا۔

اس مرتبہ میر بخش کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ گئی تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔ کلاشنکوف اس کے نزدیک ہی ریت پر پڑی تھی۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھا اور سب سے پہلے کلاشنکوف کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس دوران میں' میں قدرے اس کے قریب پہنچ چکا تھا تاہم ہمارے درمیان اب بھی آٹھ دس فٹ کا زمینی فاصلہ حائل تھا۔

وہ اپنی کلاشنکوف کو مجھ پر تانتے ہوئے پھنکارا "شرافت سے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ ورنہ!" اس کے ساتھ ہی اس نے دھمکی آمیز انداز میں کلاشنکوف کو حرکت دی۔

وہ سندھی لب و لہجے میں اردو بول رہا تھا۔ تھانے میں یہ دونوں افراد بالکل خاموش کھڑے رہے تھے' جب ہم گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو اس وقت میں نے میر بخش سے وڈیرے کے بارے میں ایک سوال پوچھا تھا جس کا اس نے جواب بھی دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اب مجھ سے کوئی لفظ بولا تھا اور خاصا خطرناک بولا تھا۔

میں نے اپنی نظر میر بخش کے شانوں پر ٹکا کر رکھی تھی تاکہ وہ کلاشنکوف کو کوئی مہلک حرکت دینے کا ارادہ کرے تو میں بروقت بچاؤ کر سکوں۔ کسی بھی قسم کی فائٹ کے دوران میں اپنے مدمقابل کے جسم کے دو مقامات کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اول اس کی کمر' دوم اس کے شانے یعنی کندھے۔ پاؤں اور ٹانگوں کی ہر حرکت کو کمر کی بدلتی ہوئی پوزیشن سے قبل از وقت جانا جا سکتا ہے' اسی طرح ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکت کو جاننے کا مرکز کندھے ہیں۔ جو مارشل آرٹسٹ یا فائٹر ان دو مقامات کو نگاہ میں رکھتا ہے' وہ مدمقابل کے حملوں سے محفوظ رہتا ہے کیوں کہ وہ دشمن کے وار سے پہلے ہی سمجھ جاتا ہے کہ وہ کون سی کک مارنے والا ہے یا کون سا ہینڈ اٹیک کرنے والا ہے۔ اس ججمنٹ میں اگر مہارت حاصل ہو جائے تو صرف سیلف ڈیفنس اور بلاکنگ کا سہارا لے کر کوئی بھی میدان مارا جا سکتا ہے۔

میں نے میر بخش کو بہ دستور اپنی نظر میں رکھتے ہوئے اس کی دھمکی کے جواب میں کہا "میر بخش! اگر میں تمہارا حکم ماننے سے انکار کر دوں تو!"

"تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہو گا۔"

"کیا تم مجھے جان سے مار دو گے؟" میں نے پوچھا۔

"جان سے نہ بھی مارا تو تمہارے ہاتھ پاؤں ضرور توڑ دوں گا" وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "پھر ساری عمر محتاجی اور اپاہجی میں بسر کرنا۔"

میں نے اسے تاؤ دلانے کی خاطر کہا "اگر مرد کے بچے ہو تو ہتھیار پھینک دو اور خالی ہاتھ ایک نہتے کا مقابلہ کرو۔"

میر بخش مضبوط جسم کا مالک پہلوان صفت شخص تھا مگر میرے جمناسٹک کے کمالات نے اسے دو مرتبہ ریگستان کی ریت پھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس کو برہم کرنے کے ساتھ ساتھ پوری طرح تول ناپ بھی رہا تھا۔ میں اس قسم کے اسٹانس میں ریڈ الرٹ تھا کہ اگر وہ مجھ پر فائرنگ کرنے کے لیے ذرا سی بھی جنبش کرتا تو میں اس کے نشانے کو شانی خطا کر سکتا تھا۔ اس لیے میں مطمئن تھا۔

وہ میرے طنز پر تلملا کر بولا "وجدان! تم ہمیں غصہ دلا کر کوئی حماقت کرنے پر نہیں اکسا سکتے۔ ہم جانتے ہیں' تم کتنے خطرناک ہو۔ تمہیں اگر ذرا سی بھی ڈھیل دی گئی تو تم سر پر سوار ہو جاؤ گے۔"

"اچھا!" میں نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں "تمہیں میرے بارے میں یہ نادر معلومات کہاں سے حاصل ہوئی ہیں؟"

"زیادہ بکواس نہیں کرو" وہ دہاڑا "اور چپ چاپ جا کر گاڑی میں بیٹھو۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے چونک کر میرے عقب میں دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں اس پوزیشن میں ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے سیاہ گاڑی ہمارے پہلو میں آگے تھی۔ میرا رخ اسی جانب تھا جدھر گاڑی کا رخ تھا یعنی میر بخش کا چہرہ اس طرف تھا جدھر سے ہم آئے تھے گویا وہ گاڑی کے عقب میں دیکھ کر چونکا تھا۔

اس کے چونکنے کے انداز نے مجھے بات کی تہ تک پہنچا دیا۔ میں نے تھوڑی دیر قبل گاڑی کے عقبی حصے میں سے ڈرائیور کو باہر پھینک دیا تھا۔ یقیناً وہ اٹھ کر میری پشت پر پہنچ چکا تھا۔

میں نے ڈرائیور کی آمد کی آواز پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان حائل فاصلے کا محتاط اندازہ لگایا پھر اس کی جانب دیکھے بغیر ایک "بیک فلیک (BACK FLICK)" کرتے ہوئے میں ہوا میں اچھلا اور میری وہ فلائنگ کک ڈرائیور کی پیشانی پر لگی۔ اس کے حلق سے ایک خوف ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔

جب وہ زمین پر گر رہا تھا تو میں نے اس کے ایک ہاتھ میں آہنی راڈ کی جھلک دیکھی تھی جو چہرہ تھامتے ہوئے اس کی پیشانی سے ٹکرا گئی تھی۔ اس دہری چوٹ نے اسے گرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر چیخنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ڈرائیور نے کہیں سے آہنی راڈ نکال لی تھی اور میری بے خبری میں پشت سے حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن میرے بروقت عمل نے اس کے مذموم عزائم کو ریت میں رول دیا تھا۔

"اب تم کوئی حرکت نہیں کرو گے!" میری سماعت سے میر بخش کی سرسراتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

میں نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور کہا "اگر میں حرکت نہیں کروں گا تو پھر برکت کیسے پیدا ہو گی؟"

وہ چڑ کر بولا "تم اپنی ناپاک زبان بند رکھو اور میں نے تم سے جو کہا تھا' اس پر عمل کرو۔"

"میں بھی تو وہی کہہ رہا ہوں میر بخش" میں نے کہا۔

وہ الجھن زدہ انداز میں بولا "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "یہی کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے۔ اگر میں حرکت نہیں کروں گا تو تمہارا حکم کس طرح مان سکوں گا۔ بغیر حرکت کیے میں گاڑی میں کس طرح بیٹھ سکتا ہوں۔"

میں بات کرتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس کی جانب سرک رہا تھا۔ وہ میرے عزائم کو بھانپ گیا اور تنبیہی لہجے میں بولا۔

"تم نے اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا "نہ میں چالاک ہوں اور نہ ہی کسی قسم کی چالاکی دکھانے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھ سے خوف زدہ ہو حالاں کہ تمہارے ہاتھ میں ہتھیار بھی ہے"

"خود کو بے بس اور کم زور ظاہر کرنے میں تمہاری کوئی چال پوشیدہ ہے" میر بخش پھنکارتے ہوئے بولا "ورنہ تھوڑی دیر پہلے میں تمہاری جو پھرتیاں دیکھ چکا ہوں' اس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تم کتنے "سیدھے" ہو۔"

میں نے کہا "اگر میں سیدھا نہیں ہوتا تو کیا تم لوگ اتنی آسانی سے مجھے اور میری ساتھی کو اغوا کر سکتے تھے؟ میں اگر ہوشیار قسم کا بندہ ہوتا تو تم لوگوں کو مصیبت میں ڈال دیتا جب کہ تم لوگوں نے میری کلائیوں میں ہتھکڑی بھی ڈال رکھی ہے!"

"مصیبت میں تو تم نے ہمیں ڈال ہی دیا ہے" وہ کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اس ہتھکڑی نے بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ تم کسی مداری کی طرح ہوا میں کرتب دکھا رہے ہو اور تمہارے ہاتھوں سے زیادہ تمہاری ٹانگیں چل رہی ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ میں نے ہتھکڑی لگی ہونے کے باوجود بھی جمناسٹک اور کنگ فو کے کچھ ہاتھ ان دونوں پر آزما ڈالے تھے۔ میں نے گاڑی ہی میں الٹی ہتھکڑی کو سیدھی ہتھکڑی میں بدل ڈالا تھا۔ اب میرے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب تھے۔ دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی کے مضبوط آہنی کڑے فٹ تھے۔ ان دونوں کڑوں کو ملانے والی زنجیر کی لمبائی اتنی تھی کہ میں پہلو بہ پہلو اپنی دونوں ہتھیلیوں کو کہیں بھی ٹکا سکتا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے "ہینڈ اسپرنگ" اور "بیک فلیک" کا جو مظاہرہ کیا تھا وہ دونوں ہتھیلیاں گرم ریت پر جما کر کیا تھا۔ ویسے یہی کام میں ہتھیلیوں کے بجائے دونوں پنچز سے بھی کر سکتا تھا اور فنگر ٹپس سے بھی۔ مجھے شاؤلن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں انتہائی مشکل اور کٹھن "پش اپس" بھی لگانا سکھایا گیا تھا۔

میں نے میر بخش کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "دیکھو میر بخش! کسی کے ہاتھ چلتے ہیں' کسی کی ٹانگیں اور کسی کی زبان۔ تم کون ہوتے ہو اعتراض کرنے والے۔"

"تمہاری تو یہ تینوں چیزیں چلتی ہیں" وہ جلنے بھنے انداز میں بولا۔

میں نے پُرتمسخر انداز میں اسے دیکھا پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا' اس کی نظر میرے ہاتھوں پر گئی اور وہ اچھل پڑا۔ میں نے بھی اس کی دیکھا دیکھی اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

"یہ... یہ... ہتھ... کڑی تو تمہیں... الٹی لگائی گئی تھی...؟"

"ہاں لگائی تو الٹی ہی تھی تم لوگوں نے" میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ سیدھی کس طرح ہو گئی؟"

"جادو کے زور پر" میں نے کہا۔

"کیا تم جادو بھی جانتے ہو؟"

"ہاں" میں نے متحمل لہجے میں کہا "کہو تو مظاہرہ کر کے دکھاؤں!"

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "نن... نہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہیں کوئی جادو وادو نہیں آتا۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے" پھر اس کا لہجہ سخت ہو گیا "میں تم سے آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں' سیدھی طرح تم گاڑی میں جا کر بیٹھو ورنہ مجھے کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "میر بخش! تم دونوں جس راستے پر قدم رکھ چکے ہو اس کی منزل تو موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ تم اپنی جان کی فکر کرو۔ اگر زندہ بچ پاؤ گے تو راستہ اختیار کرنے کی نوبت آئے گی نا!"

اس قسم کے میرے کاٹ دار جملوں نے میر بخش کی رگ بدمعاشی کو پھڑکا دیا۔ اس کا چہرہ یک دم سرخ ہو گیا، خوں خوار لہجے میں بولا "میں اب تک تم سے رعایت برت رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے آنکھیں دکھانے لگو" پھر اس نے کلاشنکوف کو مخصوص حرکت دیتے ہوئے گاڑی کی جانب اشارہ کیا "چلو، ادھر گاڑی میں بیٹھو۔ ہم پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکے ہیں۔"

اسی وقت گاڑی کے عقبی حصے سے کسی کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ یقیناً وہ دھنو کی آواز تھی جو گرمی کی شدت کے باعث ہوش میں آ رہی تھی۔ اس گاڑی کو صحرا میں کھڑے لگ بھگ ایک گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ گاڑی کے ائرکنڈیشنر نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا پھر عقبی دروازہ بھی کافی دیر سے کھلا پڑا تھا، گاڑی کے اندر کی رہی سہی کولنگ بھی جاتی رہی ہو گی۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ، ریت کی تپش اور آسمان سے برستی آگ نے دھنو کی گہری نیند کو اچاٹ کر دیا تھا۔ وہ گہری نیند جو طویل بے ہوشی کی صورت میں اس کے جسم و جاں میں اُتر آئی تھی۔ دھنو کے کراہنے کی آواز سن کر میر بخش چونک اٹھا تھا۔ اس اثنا میں میر بخش کا دبلا پتلا ساتھی بھی خود کو جھاڑتا سہلاتا ہمارے قریب پہنچ گیا تھا۔ میر بخش نے ڈرائیور ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نواز علی! میں اس کو سنبھالتا ہوں۔ تم گاڑی کے اندر جا کر لڑکی کی خبر لو۔"

مجھے میر بخش کی زبانی اس وقت پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ اس کے ڈرائیور ساتھی کا نام نواز علی تھا۔ میں نے نواز علی کے راستے میں حائل ہوتے ہوئے کہا۔

"رک جاؤ! اگر تم نے میری ساتھی کی سمت ایک قدم بھی بڑھایا تو ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا۔"

میر بخش غصیلے لہجے میں بولا "نواز علی! اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا نا، میں اس کو سنبھال....."

اس کا جملہ مکمل نہ ہو سکا۔ اسی وقت دھنو گاڑی کی عقبی جانب سے نمودار ہوئی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ نائیلون کی ڈوری میں بہ دستور بندھے ہوئے تھے۔

میں نے صورتِ حال کی پروا کیے بغیر چلا کر کہا "دھ... گاڑی کے اندر چلی جاؤ۔ باہر کے حالات سازگار نہیں ہیں..."

اس کے ساتھ ہی میں نے دھنو کی سمت قدم بھی ... دیے۔ مجھے اپنے عقب میں کلاشنکوف بردار میر بخش ... چنگھاڑ سنائی دی "رک جاؤ نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

میں نے میر بخش کی دھمکی کو اہمیت نہ دی اور دھنو... گاڑی کے اندر جانے کا کہتے ہوئے خود بھی اس جانب پیش... قدمی جاری رکھی۔

میر بخش نے مجھے روکنے کے لیے میرے قدموں... کلاشنکوف کا برسٹ مارا۔ تیز رفتار گولیاں ریت اڑانے... سوا کچھ نہ کر سکیں کیوں کہ انہیں کسی کی زندگی چاٹنے یا کر... زخمی کرنے کے احکام نہیں دیے گئے تھے۔ اس سے ای... بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ میر بخش مجھے کوئی گزند نہیں پہ... چاہتا تھا ورنہ اتنے نزدیک سے اس کا نشانہ خطا ہونے... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور وہ بھی برسٹ کی صورت ... میرے بچ نکلنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں فوری طور پر ا... نتیجے پر پہنچا کہ وہ مجھے صحیح و سالم کہیں پہنچانا چاہتے تھے... کلاشنکوفیں اور فائرنگ صرف مجھے کنٹرول کرنے کے ... تھی۔

دھنو نے میرے کہنے کے مطابق گاڑی کی جانب ... شروع کر دیا تھا اور مجھے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ نواز علی ... میر بخش مجھ پر ہتھیار استعمال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ر... چنانچہ میں کھل کھلا کر میدان میں آ گیا۔

میں نے اپنے قریب کھڑے نواز علی کی طرف دیکھا... مجھے روکنے کے لیے دونوں بازو آگے بڑھا چکا تھا۔ اس... انداز ایسا تھا جیسے مجھے دبوچنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے ا... قدم پیچھے ہٹ کر اسے جھکائی دی پھر نیچے بیٹھتے ہوئے ... تیزی سے "فرنٹ سوئپ" مار دی۔

وہ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ میری پنڈلی کے ... نے نواز کی پنڈلی کے گوشت پر ایک قیامت خیز ضرب ... تھی۔ وہ ٹانگ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا اور سندھی زبان میں ... مغلظات میں تولنے لگا۔

مارشل آرٹس کے سینٹرز میں دو کھلاڑیوں کے درمیا... جب فائٹ ہوتی ہے تو پنڈلی کے بلیڈ (پنڈلی کی سامنے ... ہڈی) کی حفاظت کے لیے شین گارڈ ... استعمال کیے جاتے ہیں مگر اسٹریٹ فائٹ میں اس ... ممکن نہیں ہوتا۔ میں تو شاؤلن ٹیمپل کا تربیت یافتہ تھا جہاں ... انسانی جسم کو فولاد میں ڈھالا جاتا ہے۔ میں نے کبھی کسی ...

...استعمال نہیں کیا تھا خصوصاً اسٹریٹ فائٹ میں میرا ... جارحانہ ہوتا تھا اور جب تک کوئی جان ہی کو نہیں آ ... میں اٹیک نہیں کرتا تھا۔ ایک سچے مارشل آرٹسٹ ... کی یہی پہچان بھی ہے۔

نواز علی کو زمین بوس ہوتے دیکھا تو میر بخش آپے سے باہر نکل آیا۔ وہ خوں خوار انداز میں میری جانب بڑھا اور میرے قدموں کا نشانہ لے کر فائرنگ کر دی۔

میں اس کے ٹریگر دبانے سے پہلے ہی ہوا میں اچھل چکا تھا اور "بیک سمر سالٹ" لگاتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ میر بخش کی فائرنگ کا بڑا بھیانک نتیجہ برآمد ہوا۔ نواز علی کی ایک کرب ناک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ وہ میرے قدموں کے نزدیک ہی زمین پر پڑا ہوا تھا۔ جب میرے قدم وہاں نہیں رہے تو وہ براہِ راست گولیوں کی زد میں آ گیا۔ کلاشنکوف کے ہلاکت خیز برسٹ نے نواز علی کا جسم چھلنی کر دیا۔ اس کے مضروب و مجروح بدن نے ایک دو چھوٹے چھوٹے جھٹکے کھائے اور پھر ساکت ہو گیا۔ وہ اب اس تپتے ہوئے صحرا میں نہیں رہا تھا۔ یہ بات صرف خدا ہی جانتا تھا کہ اس کی روح اب کسی ٹھنڈی جگہ پر تھی یا.....!

میر بخش وحشت زدہ نظر سے اپنے ساتھی کی لاش کو تک رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نواز کو اس نے اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا مگر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حقیقتِ حال سے سب کچھ عیاں تھا۔ نواز علی کی خون اگلتی بے گور و کفن لاش سامنے موجود تھی۔ میر بخش اس سچائی کو جھٹلا نہیں سکتا تھا اس لیے سکتے کی کیفیت میں کھڑا ایک ٹک نواز کی لاش کو تک رہا تھا۔

میں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے میر بخش کے قریب پہنچ گیا پھر میری سائڈ فلائنگ کک اس کے سینے پر کسی وزنی ہتھوڑے کے مانند پڑی۔ ایک کرب ناک کراہ کے ساتھ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے اس کے چہرے پر آہنی دو ہتڑ رسید کر دیا۔

وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ گئی۔ اس مرتبہ کلاشنکوف کافی فاصلے پر گری تھی۔ وہ فوری طور پر اسے اٹھا نہیں سکتا تھا۔

وہ کلاشنکوف کو کیا اٹھاتا، اسے تو اپنے اٹھنے کے لالے پڑے ہوئے تھے کیوں کہ اس دوران میں میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس کی اٹھنے کی ہر کوشش کو ناکام یاب بناتے ہوئے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر رہا تھا۔

فائرنگ کی آواز پر دھنو ایک مرتبہ پھر گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ اس بار اس نے دیکھا تو بازی پلیٹ چکی تھی۔ صورتِ حال مکمل طور پر میرے کنٹرول میں تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں دھنو کو سمجھایا کہ وہ ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھ کر باہر کے حالات سے لطف اندوز ہو۔ میں نے ڈیش بورڈ پر رکھی کلاشنکوف کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا تھا۔

اس دوران میں میر بخش اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ آہنی ہتھکڑی کی بھرپور ضرب نے اس کے چہرے کی کھال کو کئی جگہ سے ادھیڑ دیا تھا تاہم وہ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

اس نے دونوں ہاتھ آگے نکال رکھے تھے۔ انداز ایسا تھا جیسا مجھے دبوچنا چاہتا ہو۔ میں کھلے ہاتھ کا وار نہیں کر سکتا تھا مجھے ڈیفنس یا اٹیک دونوں صورتوں میں اپنے دونوں ہاتھ ایک ساتھ استعمال کرنا تھے۔ ہتھکڑی نے میرے دونوں بازوؤں کو قریب سے قریب تر کر دیا تھا۔

حکم ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ بھائیوں کو دو بازوؤں سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ کاش.... اے کاش، اسلامی دنیا کا کوئی عالم، کوئی مفکر، کوئی فلسفی، کوئی لیڈر، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر یا کوئی سائنس داں ایسی ہتھکڑی ایجاد کر دے جو امتِ مسلمہ کے بازوؤں کو قریب سے قریب تر کر دے!

میر بخش نے دونوں ہاتھوں سے جھپٹا مار کر مجھے قابو کرنا چاہا مگر میں بجلی کی سی سرعت سے ہوا میں اچھلا اور "فرنٹ سمر سالٹ" کرتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا تاہم سنبھلنے میں مجھے تھوڑی تاخیر ہو گئی۔

اس دوران میں میری لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھا کر میر بخش عین میرے عقب میں پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی حرکت کرتا، اس نے سندھ کی روایتی کشتی "ملاکھڑا" کے انداز میں مجھے کمر سے دبوچ لیا۔

ملاکھڑا درحقیقت شہ زوری آزمانے کا ایک انداز ہے۔ دونوں پہلوان ایک دوسرے کو شلواروں کے نیفے میں ہاتھ ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اور شہ زوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے حریف کو زمین پر گرانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جو پہلوان دوسرے کو چت کر لیتا ہے، کام یابی اس کے حصے میں آتی ہے۔

میر بخش کے ڈیل ڈول اور جثے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ملاکھڑا کے کئی اکھاڑے جیتے ہوں گے اور اب تو وہ اپنے فن کا عملی مظاہرہ بھی کر رہا تھا۔ میں نے شلوار نہیں

پہنی ہوئی تھی چناں چہ اس نے میری جینز کے بیلٹ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جما لیے تھے اور مجھے نیچے گرانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اس کی شہ زوری میں کوئی کلام نہیں تھا تاہم میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں تمام اسٹوڈنٹس کو مختلف موویز بھی دکھائی جاتی تھیں جن میں دنیا بھر کے ہر علاقے سے متعلقہ فنونِ حرب کی فلمیں ہوتی تھیں۔ اساتذہ کا لیکچر بھی ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا اور ہمیں بتایا جاتا تھا کہ کسی ویسی داؤ کا کیا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ یہ فنی و دستاویزی فلمیں ایک مخصوص ہال میں دکھائی جاتی تھیں۔ یہیں پر میں نے دنیا کے عظیم ترین مارشل آرٹسٹوں کے فن پر مشتمل دستاویزی فلمیں بھی دیکھی تھیں۔

مجھے سب سے زیادہ "بروس لی" کا ذاتی اسٹائل "جیت کون ڈو" پسند آیا تھا۔ بروس لی کی فنی مہارت نے مجھے بہت متاثر کیا تھا اور دل ہی دل میں، میں نے اسے اپنا آئیڈیل مان لیا تھا۔

میر بخش کی زور آزمائی جاری تھی۔ وہ حتی الامکان اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح مجھے زمین پر گرا دے۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونا میرے لیے چنداں مشکل نہیں رہا تھا۔ تاہم میں اسے بھرپور موقع دینا چاہتا تھا تاکہ اس کے دل میں ملال نہ رہے۔

اس نے پورے زور سے مجھے آگے دھکیلا۔ میں اس کی "خواہش" کے مطابق دو قدم آگے کھسک گیا پھر اچانک ہی میں نے اپنے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ میر بخش بھی زمین پر گرتے گرتے بچا تاہم میرے بیلٹ پر اس کی پکڑ سلامت رہی۔ اس کارروائی کے دوران میں اس کی ٹھوڑی میرے سر سے ٹکرا گئی تھی۔ میری کھوپڑی کا تو کچھ نہ بگڑا البتہ ٹھوڑی پر لگنے والی چوٹ کے باعث اس کے منہ سے ایک سسکاری خارج ہوئی۔ پھر آنِ واحد میں اس نے مجھے جھٹکا دے کر فضا میں اٹھا لیا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی بھاری گٹھری کو زمین سے اٹھایا جاتا ہے۔ میں دونوں ہاتھوں کا آزادانہ استعمال نہیں کر سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی مجھے جمناسٹک کی ٹیکنیک کا سہارا لینا پڑا۔

میں میر بخش کے کھاتے میں، ہوا میں بلند تو ہو ہی چکا تھا۔ اس لیے میرا کام کچھ آسان ہو گیا۔ میں نے وہیں اپنی باڈی کو رول کیا اور "بیک سمر سالٹ" کا مظاہرہ کرتے ہوئے میر بخش کے اوپر سے گزر گیا تاہم اس پرواز کے دوران میں، میں نے اپنے بازو اس طرح اس کی گردن میں ڈال دیے تھے کہ ہتھکڑی کی زنجیر اس کے نرخرے پر آن گری تھی۔

وہ مجھے اٹھا کر پٹخنا چاہتا تھا لیکن میرے داؤ میں [...] زنجیر کے دباؤ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے [...] پھنسی پھنسی غراہٹیں برآمد ہونے لگیں۔ اس نے [...] زنجیر پر ڈال رکھے تھے اور اپنی گردن کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اچانک ہتھکڑی کا پھندا اس کی گردن سے [...] اور اس کی "تشریف" پر "فرنٹ جرک کک" رسید کر [...] میری ٹھوکر میں بلا کا پش تھا۔ میر بخش دور تک [...] لڑھکتا چلا گیا۔

میری ہتھکڑی کی آہنی ضرب سے اس کا چہرہ پہلے [ہی] لہولہان ہو چکا تھا اور کئی مقامات سے کھال پھٹ گئی تھی۔ جو وہ گرم ریت پر لوٹ پوٹ ہوا تو خون آلود چہرے پر [ریت] کے ذرات وافر مقدار میں چپک گئے۔ جب وہ اٹھ کر [لڑکھڑاتے] ہوئے قدموں پر کھڑا ہوا تو اس کا چہرہ بھیانک صورت [اختیار] کر چکا تھا۔

میں چاہتا تو دو منٹ میں اس کا قصہ پاک کر سکتا تھا [لیکن] میں خواہ مخواہ کسی انسان کے خون میں اپنے ہاتھ نہیں [رنگنا] چاہتا تھا۔ میر بخش کے ساتھی ڈرائیور نواز کی موت حادثاتی طور پر واقع ہو گئی تھی۔ مجھے ان کی گفتگو سے [اندازہ] ہو چکا تھا کہ وہ میرا اغوا کسی اور شخص کے ایما پر کر [رہے] تھے۔ چناں چہ میرا اصل دشمن کوئی اور تھا۔ یہ بے چارے اس کے چیلے چانٹے تھے یا پھر کرایے کے بندے تھے۔ [میر] بخش کو اس لیے بھی زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کی زبان سے بہت کچھ اگلوانا تھا، اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے تھوڑی بہت "خاطرداری" تو ضروری تھی نا!

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا [وہ] دھندلائی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ریت کے درجنوں ذرات اس کی آنکھوں میں بھی چلے گئے تھے۔ اس کی حالت بڑی وحشت ناک ہو رہی تھی۔

وہ پھولی ہوئی سانس کے درمیان شکستہ لہجے میں بولا "بہت برا کر رہے ہو وجدان۔۔۔ بہت برا!"

میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "میں یہ برا کس کے [حق] میں کر رہا ہوں؟"

"اپنے حق میں۔۔۔ اور کس کے حق میں!"

"تم میری پروا کرنے والے کون ہوتے ہو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا "تمہیں میرے حق کی فکر کیوں ہو رہی [ہے؟"]

وہ غراہٹ آمیز لہجے میں بولا "تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اسی لیے اتنا اکڑ رہے ہو۔ تمہارا بہت برا حشر ہونے والا ہے۔ اب بھی وقت ہے، شرافت سے گاڑی میں۔۔۔"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے ایڑی پر گھومتے ہوئے ایک زوردار وہیل کک اس کے چہرے پر جڑ دی۔ اس کا زخمی چہرہ کچھ اور زخمی ہو گیا۔ وہ ہانپتے ہوئے مجھے مختلف بے لباس گالیوں میں تولنے لگا۔ جب اس کی ناپاک زبان پر میری مرحومہ ماں کا نام آیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔

میں نے طیش کے عالم میں اس پر تابڑ توڑ ٹھوکریں شروع کر دیں۔ میں اسے ٹھوکروں میں اڑا رہا تھا اور اس کے جسم کے مختلف حصوں پر آہنی دو ہتڑ پڑ رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بے بس ہو کر کسی حقیر کیچوے کی طرح میرے قدموں میں پڑا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو شخص میری ماں کو گالی دے رہا تھا۔ اب وہی مجھ سے رحم کی اپیل کر رہا تھا۔ اس کی ساری تن فن غائب ہو چکی تھی۔

وہ منت آمیز لہجے میں گھگیایا "مجھے مت مارو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو!"

"تمہیں کیوں نہ ماروں!" میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "کیا تم زندہ رہ کر کوئی عظیم الشان کارنامہ انجام دینا چاہتے ہو۔ تم جیسے معاشرے کے ناسوروں کو تو ریت کے اندر گاڑ دینا چاہیے اور میں تمہارے ساتھ کچھ اسی قسم کا سلوک کرنے والا ہوں۔ اس صحرا کی تپتی ہوئی ریت تمہارے برہنہ بدن کا مزاج پوچھے گی تو نانی دادی آنکھوں کے سامنے گھوم جائے گی!"

"رحم سائیں، رحم" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ آپ بہت طاقت ور ہو۔ آپ فاتح ہو۔ میں اپنی شکست مانتا ہوں۔ میں آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں" پھر اس نے ہاتھ بڑھانے کا عملی مظاہرہ کیا۔

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنے جوگر سے ایک بھرپور ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ میں نے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"مردود! دوستی ہمیشہ برابری کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ تم اس وقت میرے قدموں میں کسی مریل چوہے کی طرح پڑے ہو، میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟"

وہ فدویانہ انداز میں بولا "سائیں! آپ مجھے دوست نہ بناؤ، کوئی بات نہیں مگر مجھے اپنے قدموں سے دور نہ کرو۔ میں اب آپ کا وفادار بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "وفاداریاں اتنی جلدی تبدیل نہیں ہوتیں!"

"سائیں، میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ کے اندر چھپے ہوئے ایک عظیم انسان کو تلاش کر لیا ہے۔ آپ مجھے وفاداروں میں شامل کر لو گے تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔"

میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقعی میرے وفاداروں میں شامل ہونا چاہتے ہو؟"

"ہاں سائیں" اس کے ہاتھ بہ دستور جڑے ہوئے تھے۔

میں نے کہا "وفادار بننے کے لیے وفاداری کے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے، اپنی وفاداری ثابت کرنا پڑتی ہے!"

"میں ہر امتحان، ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں سائیں!" وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے کہا "اس ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟"

وہ ریگ زار میں اپنے ساتھی ڈرائیور نواز علی کی لاش کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "چابی نواز کی جیب میں تھی۔"

"چلو، تمہاری وفاداری کی آزمائش شروع ہوتی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

بندہ خاصا سمجھ دار تھا۔ وہ میرے لہجے کی معنی خیزی تک بہ آسانی پہنچ گیا۔ وہ گھٹنے ریت پر ٹیک کر کراہتے ہوئے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے نواز علی کی لاش کی جانب بڑھ گیا۔ احتیاطاً میں بھی تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے وہاں پہنچ گیا۔

نواز علی کی جیب سے ہتھکڑی کی چابی نکال کر میر بخش نے میری کلائیوں کو آہنی بندش سے آزاد کر دیا۔ میں نے دونوں کلائیوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اب یہی ہتھکڑی تم اپنے ہاتھوں میں پہن لو۔"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آزمائش میں پورا اترنے کے دعوے دار بھی ہو اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ بھی کر رہے ہو۔ مجھے تو تمہاری نیت میں کھوٹ کی آمیزش لگتی ہے۔"

میرے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ وہ پورے وجود سے کانپ اٹھا۔ لرزتے ہوئے انداز میں بولا۔ "یہ۔۔۔ یہ بات نہیں ہے سائیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں" وہ اٹکتے ہوئے بولا "میں یہ ہتھکڑی

..... پہن رہا ہوں۔"

پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو آہنی ہتھکڑی میں جکڑ لیا۔ میں نے ہتھکڑی کے لاک بند کر کے چابی اپنی جیب میں ڈال لی اور کہا۔ "چلو، اب گاڑی میں چل کر بیٹھتے ہیں ابھی تمہاری وفاداری کو اور بہت سے کڑے مراحل سے گزرنا ہے۔"

وہ میرے حکم کی تعمیل میں گاڑی کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ میں نے ریت میں پڑی ہوئی میر بخش کی کلاشنکوف اٹھالی۔ اسی آتشیں ہتھیار کی مہلک گولیوں نے نواز علی کا جسم چھلنی کر کے اسے فنا کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس کی لاش کسی لاوارث کتے کی طرح تپتی ریت پر پڑی تھی۔

میں نے میر بخش کی کلاشنکوف کو ڈیش بورڈ پر رکھ دیا پھر پہلی فرصت میں دھنو کے ہاتھوں کی نائیلونی بندشیں کھولیں۔ ہاتھ آزاد ہوتے ہی وہ اپنی کلائیوں کو سہلانے لگی۔

صحرا میں پڑنے والی دھوپ نے قیامت مچا رکھی تھی۔ پیاس کی شدت سے میرا حلق سوکھ کر کانٹا بن گیا تھا۔ دھنو کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ میں نے میر بخش سے پوچھا۔

"گاڑی میں پانی وغیرہ کا کیا بندوبست ہے؟"

"پانی بہت سائیں" وہ ہتھکڑی لگے ہاتھ مخصوص انداز میں جوڑتے ہوئے بولا۔ پھر ڈرائیونگ کیبن میں موجود ایک واٹر کولر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تقریباً پورا بھرا ہوا ہے۔"

پہلے یہ کولر میری نظر میں نہیں آیا تھا۔ میں نے دیکھا، واٹر کولر کے ساتھ ہی پھلوں کی ایک ٹوکری بھی رکھی تھی جس میں تازہ انگور، سیب اور سنگترے دکھائی دے رہے تھے۔ گویا وہ کھانے پینے کے مکمل لوازمات کے ساتھ نگرپارکر سے روانہ ہوئے تھے۔

ہم نے پہلے ایک ایک گلاس پانی پیا۔ ٹھنڈا پانی زیادہ مقدار میں ایک ساتھ پینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے پہلے دھنو کو پانی پلایا، پھر پانی کا گلاس میر بخش کی جانب بڑھایا اور سب سے آخر میں خود پانی پیا۔

گاڑی کے باہر تھر کا ریگستان کربلا کا منظر پیش کر رہا تھا۔ میں تقریباً آدھے گھنٹے تک اسی تپتی ہوئی ریت پر نبرد آزما رہا تھا اس لیے اب مزید کھلے آسمان کے نیچے موجود رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے گاڑی کے ائرکنڈیشننگ سسٹم میں تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی تو کام بن گیا۔ اس سے پہلے میرے حکم پر میر بخش گاڑی کی تمام چابیاں میرے حوالے کر چکا تھا۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے ایک مناسب جگہ پر لگا دیا تھا اور اس کے بعد ائرکنڈیشننگ سسٹم کا "معائنہ" کیا تھا اور وہ تھوڑی "منت خوشامد" کے بعد آمادۂ کار ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ ہی رہنے دیا اور کولر سے ٹھنڈا پانی لے کر میر بخش کا ریت میں اٹا ہوا خون آلودہ چہرہ دھلایا۔ اس "ستھرائی" کے دوران میں وہ کئی مرتبہ سسکارا اور کراہا تھا۔

جب اس کی حالت "قابلِ دید" ہو گئی تو میں اسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ اس سے پہلے میں گاڑی کا عقبی دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس وقت ہم تینوں ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اب میں میر بخش سے تسلی بخش پوچھ تاچھ کا ارادہ رکھتا تھا۔

پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے دھنو کو گاڑی کے پچھلے حصے میں آرام کرنے کی خاطر بھیج دیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا، دھنو کسی قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار ہو۔ میر بخش ایک جرائم پیشہ شخص تھا اور اس کی زبان کھلوانے کے لیے مختلف مراحل "پر زور زبردستی" کی ضرورت بھی پیش آ سکتی تھی۔ ان مناظر سے دھنو کا دل اور دماغ متاثر ہو سکتا تھا۔ وہ میری تجویز پر آرام کرنے گاڑی کے عقبی حصے میں چلی گئی۔

پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میر بخش! تمہاری وفاداری اب کڑی آزمائش سے گزرنے والی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔"

"میں تیار ہوں سائیں۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولا۔ آپ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

میں نے پوچھا "تم لوگ ہم دونوں کو اغوا کر کے کہاں لے جانا چاہتے تھے؟"

"عمرکوٹ" اس نے جواب دیا۔

"عمرکوٹ!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "مگر تمہارے وڈیرے سائیں رئیس خان نے تو بتایا تھا کہ تم دونوں تھرپارکر کے صدر مقام "مٹھی" جا رہے ہو اور وہاں تک ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جاؤ گے۔"

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ "آپ سے جھوٹ بولا گیا تھا سائیں۔"

"تو اس کا مطلب ہے، ہم مٹھی نہیں جا رہے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

میں اندرونِ سندھ کے علاقوں سے واقف نہیں تھا اس لیے میں نے پوچھا۔ "کیا عمرکوٹ اور مٹھی ایک ہی سمت میں واقع ہیں؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں سائیں! دونوں کا راستہ جدا جدا ہے اور رخ بھی الگ الگ ہے۔"

"اس وقت ہم عمرکوٹ سے کتنی دور ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "ہم آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ تین چوتھائی سفر کٹ گیا ہے، ایک چوتھائی باقی ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "یہ کون سا مقام ہے جہاں ہم اس وقت موجود ہیں؟"

"یہ کوئی مقام نہیں بلکہ اسے صرف ریگستان کہا جا سکتا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ہم نگرپارکر سے نکل کر ویراواہ، پیلو، تیگو سر، بھگیسل، دھرندرو اور چھاچرو سے ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس سے آگے دھرمسال ہے، پھر ضلع عمرکوٹ کی حدود شروع ہو جائے گی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے وضاحتی انداز میں اضافہ کیا۔ "بس یوں سمجھیں سائیں، ریگستان کا یہ ویران علاقہ چار مقامات کے درمیان واقع ہے۔ اس کے شمال میں "رام سر" ہے، جنوب میں "ننگر تر" ہے، جنوب مشرق میں "چھاچرو" ہے اور شمال مغرب میں "دھرمسال" ہے۔ "تر" کو مقامی لوگ بگاڑ کر "تڑ" بھی بولتے ہیں جیسے "ننگر تر" کے رہنے والے اسے "ننگر تڑ" کہتے ہیں۔"

میر بخش اپنی معلومات سے مجھے حیرت زدہ کر رہا تھا۔ لگتا تھا اسے پورے تھرپارکر کا نقشہ زبانی یاد ہو۔ میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"کیا تم لوگوں نے ہمیں وڈیرا رئیس خان کے ایما پر اغوا کیا تھا؟"

"نہیں" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"پھر؟"

"ہم وڈیرا اکبر سومرو کے آدمی ہیں۔" اس نے بتایا۔ "وہ عمرکوٹ میں رہتے ہیں۔ ہم نے انہی کے حکم پر تم لوگوں کو اغوا کیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "اس سلسلے میں رئیس خان کا کیا کردار ہے؟"

"اس نے ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "تمہارا وڈیرا اکبر سومرو ہمیں کیوں اغوا کروا رہا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کی کیا دشمنی ہے؟"

"وڈیرا سائیں آپ کا دشمن نہیں ہے۔" میر بخش نے جواب دیا۔

"تو گویا وہ ہمیں اغوا کروا کے کسی ان مٹ دوستی کا ثبوت پیش کر رہا ہے؟" میں نے ترشی سے کہا۔

وہ معتدل لہجے میں بولا۔ "یہ بات نہیں ہے سائیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

میر بخش نے بتایا۔ "اصل میں وڈیرا سائیں کے پاس آج کل اس کا ایک دوست مہمان بن کر آیا ہوا ہے۔ وڈیرا سائیں اپنے دوست کو تمہارا تحفہ دینا چاہتے ہیں۔"

اس کے جواب نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے شک آمیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میر بخش! تم میرے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہے ہو؟"

"نہیں سائیں" وہ سراپا التجا بن گیا۔

میں نے کہا۔ "میر بخش! اگر تم نے مجھے چکر دینے کے لیے کوئی جھوٹا سچ یا سچا جھوٹ بولا تو یاد رکھنا میں تمہارے جسم کی بوٹی بوٹی کاٹ کر تپتے صحرا میں پھیلا دوں گا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جب ریگستان میں تمہارے گوشت کے کباب بھونے جائیں گے تو وہ منظر کتنا دل دوز ہو گا۔"

وہ تھر تھر کانپنے لگا پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ "رحم سائیں، رحم۔ آپ نے مجھے سام بنایا ہے۔ میں آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تمہیں کیا بنایا ہے؟"

"سام!"

"یہ "سام" کیا ہوتا ہے بھئی؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارے ہاں جب کوئی شخص کسی کو پناہ دیتا ہے تو پناہ لینے والے شخص کو "سام" کہا جاتا ہے۔ آپ نے مجھے پناہ دی ہے۔ ایک بھوتار کے قبضے سے میری جان چھڑائی ہے، مجھے نجات دلائی ہے۔"

میں میر بخش کی باتوں کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پتا نہیں، اس نے کیوں یہ فرض کر لیا تھا کہ میں نے اسے پناہ دی ہے اور کسی ظالم انسان کے چنگل سے چھڑایا ہے! میں نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا "تم کس "بھوتار" کا ذکر کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں کس کی قید سے آزادی دلائی ہے؟"

"سائیں!" وہ میری جانب دیکھتے ہوئے سادہ سے لہجے میں بولا۔ "بھوتار ہمارے یہاں کا ایک لقب ہے۔ یہ ایسے وڈیروں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو ظالم ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی پرائیویٹ جیلیں ہوتی ہیں۔ وہ چوریاں اور ڈکیتیاں کرواتے ہیں۔ جرائم پیشہ افراد کو اپنے یہاں پناہ دیتے ہیں

اور ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا اور ہاریوں پر بھی ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کو علی الاعلان "بھوتار" کہا جاتا ہے۔ لوگ ان سے ملتے ہوئے "سائیں بسم اللہ بھوتار" اور "حکم سائیں بھوتار" کے جملے ادا کرتے ہیں مگر وہ اس کا برا نہیں مانتے بلکہ فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ "بھوتار" کے لفظ کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔"

میں.... حیرت اور دلچسپی سے میر بخش کی معلومات افزا باتیں سن رہا تھا۔ وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! وڈیرا اکبر سومرو بھی ایک "بھوتار" ہے۔ اس کی اپنی پرائیویٹ جیل ہے۔ وہ ہم لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے۔ جرائم پیشہ افراد سے اس کے رابطے رہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں، اس کا وہ دوست جس کی خدمت میں وہ آپ کا تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے وہ بھی کوئی شریف آدمی نہیں۔ وہ شکل ہی سے کوئی غنڈا اور چھٹا ہوا بدمعاش دکھائی دیتا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "سائیں وجدان! میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔ میں سچائی اور نیکی کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔ اب میں وڈیرے کی جانب پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں عمر بھر آپ کا وفادار رہنا چاہتا ہوں۔

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور امید افزا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میرے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں اکبر سومرو کے کسی بدمعاش، مہمان نما دوست کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وڈیرا میرا تحفہ اس کی خدمت میں کیوں پیش کرنا چاہتا تھا؟ اگر وڈیرے کو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی تو اس کے دوست کو مجھ میں کوئی دلچسپی تھی؟ یہی سب جاننے کے لیے میں میر بخش کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے، میر بخش" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر مجھے یقین ہو گیا کہ تم مجھ سے کوئی دروغ گوئی نہیں کر رہے ہو اور واقعی میرے وفادار بننے کے قابل ہو تو میں تمہیں ضرور "سام" بنا لوں گا۔"

"آپ جس طرح چاہو، اپنی تسلی کر سکتے ہو سائیں۔" اس نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے کہا۔ "مجھے پہلے تو وڈیرا اکبر سومرو کے دوست کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔"

وہ شروع ہو گیا۔ "سائیں! وہ شخص کوئی ہفتہ بھر پہلے پنجاب سے آیا ہے۔ لاہور کے کسی نزدیکی گاؤں سے اس کا تعلق ہے۔ وہ آپ کی تلاش ہی میں یہاں پہنچا ہے۔ اسے آپ کے بارے میں بہت زیادہ جان کاری ہے۔ اس نے وڈیرا سائیں کو بتایا تھا کہ تم آج کل میں غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے پاکستان میں داخل ہونے والے ہو۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ تم یا تو عمرکوٹ کی مشرقی سرحد پر "کھوکھراپار" کے مقام سے سرحد پار کرو گے یا پھر "نگرپارکر" کے مقام پر تھرپارکر کے جنوبی حصے سے ملک میں داخل ہو گے۔ تمہیں گھیرنے کے لیے دو ٹیمیں تشکیل دی گئی تھیں۔ میں اور نواز علی "نگرپارکر" میں موجود تھے۔ "کسو" اور "آدیگاؤں" نامی گاؤں ہماری مکمل نظر میں تھے جب کہ "کھوکھراپار" جانے والی ٹیم "واسراہ" اور "بھٹیالا" پر نظر رکھے ہوئی تھی۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ تم نے نگرپارکر سے سرحد پار کر کے پنڈت کشوری لال کے پاس قیام کیا ہے۔ نواز علی نے فوراً وڈیرا سائیں تک تمہاری آمد کی اطلاع پہنچا دی اور اکبر سومرو نے "نگرپارکر" کے ایک وڈیرے کو ہمارے ساتھ تعاون کرنے کا پیغام بھجوا دیا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمارا منصوبہ تو یہ تھا کہ تمہیں اور تمہاری ساتھی لڑکی کو پنڈت کشوری لال کے گھر سے اٹھا لیا جائے گا لیکن ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی تم لوگ "رینجرز" والوں کے ہتھے چڑھ گئے اور ہمیں تم لوگوں کے تھانے پہنچنے تک انتظار کرنا پڑا۔ وڈیرا رئیس خان نے تھانے دار کے ساتھ "میٹنگ" کر کے تم لوگوں کو آسانی سے حاصل کر لیا تھا۔ اس کے بعد کے واقعات آپ کے سامنے ہیں سائیں۔"

میرا ذہن اس وقت نوع بہ نوع سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان میرے لیے کسی معمے سے کم ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں، وہ کون شخص تھا جو میرے پروگرام سے مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ یہ میرے لیے بہت تشویش کی بات تھی۔ میر بخش نے بتایا تھا کہ اکبر سومرو کے مہمان کا تعلق لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے تھا۔ لاہور کے نواح میں پائے جانے والے گاؤں میں سے صرف ایک گاؤں کے نام سے واقف تھا۔ صرف نام سے واقف تھا، اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں اس گاؤں کی گلیوں اور کوچوں کے دیدار کے لیے تو پاکستان آیا تھا۔ وہ گاؤں میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ مجھے اس کی مٹی، اس کی آب و ہوا اور اس کی کھلی معطر فضا سے محبت تھی۔ یہی محبت مجھے کھینچ کر پاکستان لائی تھی اور میں اپنے آبائی گاؤں، اپنی جنم بھومی "موضع رکھاں والی"

پہنچنے کے لیے بے چین و بے تاب تھا۔

"رکھاں والی" کے خیال سے میرا دھیان اپنے دیرینہ دشمن ملک نوازش علی کی طرف چلا گیا۔ اسی خبیث الاخبث شخص کی وجہ سے میرے والد کو اپنی دھرتی، اپنا گاؤں، اپنا شہر اور اپنا ملک چھوڑنا پڑا تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا.... کہیں ملک نوازش علی ہی تو مجھے گھیرنے کے لیے وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان بنا نہیں بیٹھا؟

میں جانتا تھا، رکھاں والی کے چوہدری ملک نوازش علی کی پہنچ بہت دور تک تھی۔ وہ ایک سکہ بند اسمگلر تھا۔ اس کا باپ بڑا چوہدری ملک رمضان بھی اسی مذموم دھندے میں ملوث تھا گویا نوازش علی کو اسمگلنگ، غنڈا گردی اور بدمعاشی باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ بہ ظاہر وہ ایک بڑا زمیں دار تھا لیکن در پردہ ہر برے کام میں اس کا ہاتھ شامل تھا۔

ملک نوازش کے ایک ہرکارے "دارا" نے کئی سال تک مجھے تگنی کا ناچ نچایا تھا وہ میری جان کا دشمن ہو گیا تھا پھر جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا اور میں نے زمانے کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر جینا سیکھ لیا تو دارا مجھ سے چھپتا پھرنے لگا تھا۔ پہلے وہ میرے تعاقب میں تھا، پھر میں اس کی ناک میں رہنے لگا اور بالآخر میں نے اسے جہنم واصل کر کے دم لیا تھا۔ دارا میرے ماں باپ کا قاتل تھا، اسے دوزخ رسید کر کے مجھے بہت سکون ملا تھا، میرے دل و جگر میں ایک ایسی ٹھنڈک اتر آئی تھی جیسے شبنم کے شفاف قطرے اپنا ٹھنڈا گداز پھول کی پتیوں کے سینے میں اتارتے ہیں۔

یہ ممکن تھا کہ نوازش علی عمرکوٹ پہنچ گیا ہو۔ وہ بہت باخبر آدمی تھا۔ اگر اسے میرے پروگرام سے آگاہی حاصل ہو گئی تھی تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ بھاری مالیت کے سونے کا ٹنٹا ابھی باقی تھا، وہ لالچی فطرت شخص مجھے آسانی سے بھلا نہیں سکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ میر بخش سے اپنے ان اندازوں کی تصدیق کر لوں۔ میں نے ملک نوازش کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب میں نے "رکھاں والی" کو "چھوڑا" تو اس وقت میری عمر صرف دو ماہ تھی لیکن والد صاحب کی ڈائری میں درج معلومات سے میں نوازش علی کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری باتیں اگرچہ بہت معلومات افزا ہیں لیکن تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔" پھر میں نے خود ہی وضاحت کر دی۔ "میں نے تم سے وڈیرا اکبر سومرو کے اس مہمان کے بارے میں پوچھا تھا جو مجھے "حاصل" کرنے لاہور سے یہاں پہنچا ہے؟"

میر بخش نے جواب دیا۔ "وجدان سائیں! میں اس شخص کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ جو مجھے معلوم تھا، وہ میں نے آپ کو بتایا دیا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا سنی سنائی مجھ تک پہنچاتے رہے ہو؟"

"صرف ایک بار دیکھا ہے سائیں۔" اس نے بتایا۔

"اس کی عمر کیا ہو گی؟"

"میرے ہی جتنی ہو گی سائیں۔"

میرے اندازے کے مطابق میر بخش تیس کے اریب قریب تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہاری عمر تو مجھے تیس سال لگتی ہے!"

وہ بولا "جی سائیں، وڈیرا اکبر سومرو کے اس مہمان کی عمر بھی تیس سال کے قریب ہی ہو گی۔"

وہ ملک نوازش علی نہیں ہو سکتا تھا۔ ملک نوازش اس وقت ایک محتاط اندازے کے مطابق لگ بھگ پچاس سال کا ہو گا۔

اب میں ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ شخص اگر نوازش علی نہیں تھا تو پھر کون ہو سکتا تھا۔ کہیں وہ بھی دارا کی طرح ملک نوازش علی کا کوئی "نمک خوار" تو نہیں تھا؟ دارا نے اگر مجھے ایک چوتھائی دنیا میں دوڑایا تھا تو یہ شخص میرے استقبال کے لیے عمرکوٹ پہنچ گیا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ آثار بتا رہے تھے کہ آنے والے وقت میں نت نئے ہنگامے میرے منتظر تھے۔

میں نے میر بخش سے پوچھا۔ "کیا تم اس شخص کا نام جانتے ہو؟"

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "نہیں سائیں۔"

میں نے کہا "میر بخش! تم نے بتایا ہے کہ وڈیرا رئیس خان نے تمہارے وڈیرا سائیں اکبر سومرو کے کہنے پر تم سے بھرپور تعاون کیا تھا ورنہ اس "معاملے" میں رئیس خان کا کوئی ہاتھ نہیں؟"

"جی سائیں، میں نے آپ کو ایک سچی بات بتائی ہے۔"

"کیا رئیس خان اور اکبر سومرو کے درمیان دوستی پائی جاتی ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے سائیں، یہ دونوں ایک ہی قماش کے وڈیرے ہیں یعنی دونوں "بھوتار" ہیں۔ جس طرح ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بہ خوبی پہچانتا ہے اور اس سے بھرپور تعاون کرتا ہے بالکل اسی طرح

ایک بھوتار دوسرے بھوتار کے "کام" آتا ہے۔ اس حوالے سے رئیس خان اور اکبر سومرو آپس میں گہرے دوست ہیں۔"

میر بخش صرف ایک دیسی پہلوان ہی نہیں تھا بلکہ اس میں عقل اور دانش بھی پائی جاتی تھی گویا وہ جسمانی اعتبار سے پہلوان تھا مگر ذہنی طور پر اس سے آگے کی کوئی چیز تھا۔ اب تک اس نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ اس کے کلام سے سچائی کی خوبو اٹھتی تھی۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا تھا کہ میر بخش پر بھروسا کیا جا سکتا تھا تاہم میں مزید تسلی کے لیے ابھی کچھ اور پرکھنا چاہتا تھا۔

"میر بخش!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ "اگر ہمارا اغوا ایک سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھا تو پھر وہ تھانے والا ڈراما کیا معنی رکھتا تھا؟"

"کون سا ڈراما سائیں!" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "رقم کے بٹوارے کا ڈراما۔"

وہ میرے الفاظ کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! وہ سب کچھ تمہیں چکر دینے کے لیے تھا تاکہ تم ہم پر بھروسا کرنے لگو اور بے فکری سے ہمارے ساتھ چلنے کے لیے آمادگی ظاہر کردو۔"

"تو وہ پچاس ہزار روپے کی تقسیم....؟"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "سائیں! تھانے دار اور رئیس خان میں یہ طے پایا تھا کہ پنڈت کشوری لال سے ملنے والے پچاس ہزار روپے سیدھے سیدھے تھانے دار کی جیب میں جائیں گے جس کے بدلے میں وہ تم دونوں کو چھوڑ دے گا۔"

"اور وہ جو مجھے دس ہزار روپے دیے گئے تھے؟"

رقم کا خیال آتے ہی میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا جس میں، میں نے تھانے سے روانہ ہونے سے قبل استعمال شدہ نوٹوں کی وہ گڈی رکھی تھی۔ جیب کو چھوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ گڈی اب وہاں موجود نہیں تھی۔ سو سو روپے والے وہ استعمال شدہ سو نوٹ میری جیب سے نکال لیے گئے تھے۔

میں نے چونک کر میر بخش کی جانب دیکھا۔ وہ میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے بولا۔ "سائیں! وہ دس ہزار روپے وڈیرا رئیس خان نے آپ کو اپنے پاس سے دیے تھے جو وہ واپس لے گیا ہے۔"

"واپس لے گیا ہے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ "کب؟"

میر بخش نے بتایا۔ "سائیں! جب ہم تھانے سے روانہ ہوئے تھے تو رئیس خان کی پیجارو ایک موڑ سے مڑ گئی۔ وہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔ بعد جب آپ لوگوں کو بے ہوش کیا گیا تو وڈیرا پھر ہم سے آ ملا تھا۔ ہم نے آپ دونوں کے ہاتھوں کو پابند کیا اور رقم خان کے حوالے کردی۔ وہ اپنی رقم لے کر واپس چلا گیا، ہم نے گاڑی اپنی منزل کی جانب بڑھا دی تھی۔"

میں حیرت اور دلچسپی سے میر بخش کی انکشاف انگیز باتیں سن رہا تھا۔ اپنی بے ہوشی کے ذکر پر میں نے اس سے پوچھا۔ "تم لوگوں نے ہم پر قابو پانے کے لیے ہمیں گہری بے ہوشی میں اتار دیا تھا۔ اگر اسی بے ہوشی کے دوران ہم ....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں سائیں، ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا بہت سوچ سمجھ کر اور حساب کتاب سے کیا تھا۔ ہم آپ کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جس نیند آور گیس سے آپ دونوں کو بے ہوش کیا گیا تھا اس کا اثر زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے تک رہتا ہے۔ آپ لوگ رات میں کسی وقت ہوش میں آجاتے لیکن۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن سائیں، گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تو گاڑی کو لگنے والے قیامت خیز جھٹکوں سے آپ کی نیند ٹوٹ گئی۔ آپ بے خبری کے عالم سے عالم باخبری میں آگئے۔"

میں نے میر بخش کو یہ بتانا ضروری سمجھا کہ گاڑی کا ٹائر پھٹنے سے کافی دیر پہلے میں بے ہوشی سے نکل آیا تھا اور اپنے ہاتھوں کو نسبتاً آزاد کرنے کا مکمل تصور کر چکا تھا۔ میرے ہاتھ اگر کچھ کرنے کے قابل ہو جاتے تو میں پھر اپنے اور دوست کے لیے بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ٹائر پھٹنے کے باعث گاڑی کو پہنچنے والے جھٹکوں نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو تو ہماری یہ "باخبری" بہت مہنگی پڑی ہے۔ تم دل میں یہ ضرور سوچتے ہوگے کہ کاش! گاڑی کا ٹائر نہ پھٹتا اور نہ تم اس مصیبت میں گرفتار ہوتے۔ کیوں، میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"شروع شروع میں تو میں نے ایسا ہی سوچا تھا سائیں۔" وہ تائیدی انداز میں بولا۔ "لیکن پھر بعد میں میری سوچ بدل گئی، میرے خیالات بدل گئے۔ قدرت کی طرف سے جو ہوا، وہ میرے لیے زیادہ بہتر ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"سائیں! سیدھی سی بات ہے۔" میر بخش نے جواب دیا۔ "میں وڈیرا اکبر سومرو کے پاس دلی طور پر خوش نہیں تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حکم کی تعمیل پر مجبور تھا۔ میں دل سے جرائم کے خلاف ہوں مگر ہم جیسے لوگ من مانی نہیں کر سکتے اگر ہم ذرا سی بھی سرکشی دکھائیں یا ہماری کسی ادا سے بغاوت کی جھلک نظر آ جائے تو بھوتار سائیں ہم پر زمین تنگ کر سکتا ہے، ہم اس کے چنگل سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

وہ تھوڑی دیر رک کر متشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وجدان سائیں! اللہ سائیں نے آپ کی شکل میں مجھے ایک سنہری موقع فراہم کر دیا ہے۔ آپ کی مہربانی سے میں اکبر سومرو کے ظلم و جبر سے نجات پا سکتا ہوں۔ اگر آپ مجھے اپنی چاکری میں لے لیں تو میں آپ کا بے دام غلام بن کر زندگی گزار دوں گا۔ میں جان گیا ہوں، آپ بدی کے خلاف لڑنے والے ایک عظیم انسان ہو، اللہ سائیں آپ کو کامیابی دے گا۔ میرا مرنا جینا اب آپ کے ساتھ ہے سائیں۔ جو حکم ہو آپ کا، میں آنکھیں بند کر کے عمل کروں گا۔"

میں اطمینان بھری نظر سے میر بخش کو دیکھ رہا تھا۔ اس حوالے سے میں ہمیشہ خوش قسمت ثابت ہوا تھا کہ ظلم اور بدی کے خلاف اس کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ میں مجھے مخلص، ہمدرد اور نیک نیت لوگ ملتے رہتے تھے، بعد ازاں جو میرے دوستوں کی حیثیت حاصل کر لیتے تھے۔ مجھے آقا بننے کا شوق تھا اور نہ ہی کسی انسان کو غلام بنانے کی تمنا تھی۔ میں تمام مثبت طرز فکر رکھنے والے لوگوں سے دوستی کی بنیاد پر ملتا تھا اور یہی انسانیت بھی ہے۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کی پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک مرتبہ پھر قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ اس بات کے آثار بہت واضح دکھائی دے رہے تھے کہ میر بخش میرے حلقے میں شامل ہونے والا تھا۔

میں نے میر بخش کی پوری بات سننے کے بعد کہا "ٹھیک ہے، اگر تمہاری باتیں صداقت کے معیار پر پوری اتریں تو میں نہ صرف تمہیں پناہ دوں گا بلکہ ہر ممکن تمہارے کام آنے کی بھی کوشش کروں گا لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی ہے۔"

"وہ کیا سائیں؟" وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "جب وڈیرا اکبر سومرو کو پتا چلے گا کہ تم اس سے غداری کر کے میرے ساتھ مل گئے ہو تو وہ تمہارے اہل خانہ کی زندگی اجیرن کر دے گا۔ وہ جینا چاہیں گے تو جی نہ پائیں گے اور موت کی خواہش بھی بر نہ آئے گی۔"

"آپ اس بات کی فکر نہ کرو سائیں۔" وہ مطمئن لہجے میں جلدی سے بولا۔

"کیوں بھئی؟"

اس نے بتایا۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔ بس اکیلی جان ہوں..... اور اس جان کو آپ پناہ دینے کا وعدہ کر چکے ہو سائیں اس لیے مجھے دنیا کی کوئی فکر نہیں رہی۔ ایک ظالم وڈیرے کی پشت پناہی حاصل ہونے سے ایک نڈر، بہادر.... اور ظلم و ستم کے خلاف کھلی جنگ لڑنے والے انسان کا ساتھ دینا ہزار درجے افضل ہے۔"

میں مطمئن ہو گیا۔ میر بخش کے ادا کیے ہوئے ایک ایک لفظ سے سچائی ٹپکتی تھی۔ میں نے اس پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اچانک میرا خیال اس واقعے کی طرف چلا گیا جب تھانے دار نے مجھے کسی خون آشام بھیڑیا صفت انسان کی کہانی سنائی تھی جس کے ساتھ ایک خوب رو لڑکی بھی دیکھی گئی تھی۔ "وہ جوڑا" اپنے شکار کا خون چوس کر اسے زندگی کی قید سے رہائی دلانے کا "فریضہ" انجام دے رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں میر بخش سے استفسار کیا تو وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"سائیں! اس کہانی میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں۔"

"پھر وہ جھوٹی کہانی مجھے کیوں سنائی گئی تھی؟"

"آپ کی اصلیت کی تصدیق کے لیے۔"

"میں سمجھا نہیں؟"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ "سائیں! آپ کو یاد ہوگا، وڈیرا رئیس خان نے اس خونی قاتل کی ایک واضح نشانی بتائی تھی!"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔ "رئیس خان نے کہا تھا کہ اس خطرناک انسان کے دائیں کان کے پیچھے سرخ رنگ کا ایک ہلالی نشان ہے۔ بعد ازاں اس نے میرے دائیں کان کا تفصیلی جائزہ بھی لیا تھا۔"

"بالکل سائیں، ایسا ہی ہوا تھا۔" میر بخش تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "دراصل رئیس خان کی بتائی ہوئی مفروضہ قاتل کی وہ پہچان ایک جھوٹی کہانی تھی، ایک بہانہ تھا۔"

میں نے کہا "اس کو یہ بہانہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے بتایا نا' وہ آپ کی اصلیت کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن میرے دائیں کلن کے پیچھے سرخ ہلالی نشان نہیں ہے؟"

"مسور جتنا تل تو ہے نا!"

میں نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ سیاہ تل تو ہے۔"

"بس' وہ یہی سیاہ تل دیکھ کر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔" میر بخش نے مجھے حیرت میں مبتلا کرتے ہوئے بتایا۔ "اسے بتایا گیا تھا کہ تمہارے دائیں کان کی لو کے پیچھے مسور کی دال کے برابر سیاہ تل ہے اور تمہیں شناخت کرنے کے لیے یہی سب سے زیادہ مستند نشانی ہے۔"

میں نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔ "وڈیرا رئیس خان کو میرے بارے میں یہ بات کس نے بتائی تھی؟"

"وڈیرا سائیں اکبر سومرو نے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اور وڈیرا سائیں کو یہ بات اپنے مہمان دوست سے پتا چلی تھی۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان اور میرا "طلب گار" وہ شخص میری توقع اور اندازے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ میرے دائیں کان کی لو کے پیچھے واقع سیاہ تل کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے اور میرے دشمنوں میں تو صرف ایک شخص میری اس نشانی سے واقف تھا جو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔

وہ شخص شیطان صفت' کمینہ خصلت' درندہ صفت اور حیوان جبلت دارا تھا۔ دارا کا نام ذہن میں آتے ہی مجھے اس کی عبرت ناک موت کا منظر یاد آگیا۔ میں نے اس قاتلوں کے قاتل اور موت کے سوداگر کو مار کر انسانیت پر احسان کیا تھا وہ نہ صرف میرے ماں باپ کا قاتل تھا بلکہ اس کے ہاتھ سیکڑوں بے گناہوں کے خون میں بھی رنگے ہوئے تھے اور اس کے پھیلائے ہوئے منشیات کے زہریلے جال نے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں کو عبرت نگاہ بنا دیا تھا۔ ان ستم نصیب لوگوں کی گردنیں نشے کے نادیدہ پھندے میں جکڑی ہوئی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہوئی سولی پر لٹکے ہوئے تھے۔

دارا کے بارے میں بڑے وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ دنیا میں پائے جانے والے انسان نما شیطانوں میں وہ اول درجے پر "فائز" تھا۔ میں نے اس معاشرتی ناسور کو فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں اس تاریخ ساز دن کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ رشی کیش قصبے سے کچھ آگے ہمالیہ کی گود میں ایک مقام "گنگوتری" کے نام سے موسوم ہے۔ دریائے گنگا کا آغاز اسی پہاڑی سلسلے سے ہوتا ہے اسی لیے گنگوتری کو "گنگا" بھی کہا جاتا ہے۔ دریائے گنگا اور گنگا جل (گنگا کا پانی) ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس اور متبرک سمجھے جاتے ہیں۔ اسی "گنگوتری" کو (GATEWAY to GOD) بھی کہا جاتا ہے۔

گنگوتری کے "سنکری مندر" میں میرے اور دارا کے درمیان ایک خون ریز معرکہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں' میں نے اسے دو سو فٹ گہرے پہاڑی کھڈ میں پھینک کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس موقع پر میری دو ساتھی عورتیں جانکی اور چترا پریتم بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھیں جب کہ دارا کے علاوہ اس کے دو ہم قماش "تیرو" اور "پنڈت پرگھیاراج" بھی جہنم رسید کر دیے گئے تھے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نے میری پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر ثابت قدمی سے دشمنوں کے دانت کھٹے کیے تھے۔

اور اب ۔۔۔ میرے سامنے بیٹھا ہوا میر بخش یہ انکشاف کر رہا تھا کہ وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان دوست میرے کلن کی اس نشانی سے واقف ہے جس کے بارے میں دارا کے سوا میرا اور کوئی دشمن کچھ نہیں جانتا تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ ... کا وہ "مہمان دوست" لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے آیا تھا۔ دارا اور ملک نوازش علی کا تعلق بھی لاہور کے نواحی گاؤں "رکھاں والی" سے تھا چناں چہ' یہ سوچا جا سکتا تھا کہ اکبر سومرو کے دوست کا ملک نوازش سے کوئی تعلق ہوگا!

اگر یہ فرض کر لیا جاتا تو پھر یہ بات یقینی ہو جاتی تھی کہ دارا نے اپنی موت سے قبل' میری سیاہ تل والی نشانی کے بارے میں ملک نوازش علی کو ضرور بتا دیا ہوگا۔

میں کچھ دیر تک میر بخش کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ "کیا تم واقعی وڈیرے کے مہمان دوست کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں سائیں' مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔" وہ عاجزی سے بولا۔ "میں نے اس کی بس ایک جھلک دیکھی ہے' باقی باتیں سنی سنائی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تم اس شخص کے حلیے کے بارے میں کیا جانتے ہو؟"

میر بخش نے اس شخص کا جو حلیہ بیان کیا اس کے مطابق وہ ایک ہٹا کٹا اور مضبوط جسم کا مالک انسان تھا۔ قد آور تھا' آنکھوں میں ذہانت جھلکتی تھی اور عمر لگ بھگ تیس

سال تھی۔

اس حلیے پر تو میر بخش بھی اسی فی صد پورا اترتا تھا۔ وہ بھی صحت مند جسم کا مالک تھا' طاقت ور بھی تھا۔ قد بھی چھ فٹ کے قریب تھا' عمر میں بھی وہ اس شخص کے برابر ہی تھا۔ میر بخش کے بتائے ہوئے حلیے سے میں اس شخص کے بارے میں کوئی واضح اندازہ قائم نہیں کر سکا۔

میں نے کہا۔ "میر بخش! تمہارے وڈیرے کا دوست تو خاصی اونچی چیز معلوم ہوتا ہے جو میرے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔"

"سائیں! اب میں وڈیرے کا آدمی ہوں' اور نہ ہی وہ میرا وڈیرا سائیں ہے۔"

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے اکبر سومرو سے ہر تعلق توڑ کر آپ کو اپنا آقا تسلیم کر لیا ہے۔ ہاں' یہ بات آپ کی بالکل درست ہے۔ وہ شخص واقعی بہت اونچی چیز ہے۔ اسی لیے تو وڈیرے کے بنگلے پر اس کی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔ "میر بخش! تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ جب تم لوگوں کو پتا چلا کہ ہم بارڈر کراس کر کے "نگرپارکر" کے سرحدی گاؤں میں داخل ہو چکے ہیں تو تم نے وڈیرا اکبر سومرو کو اس بارے میں اطلاع دی تھی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ "تم نے اکبر سومرو تک ہماری آمد کی اطلاع کس طرح پہنچائی تھی؟"

"موبائل فون کے ذریعے۔" اس نے جواب دیا۔

میں اچھل پڑا۔ "موبائل فون!"

پھر اس سے پہلے کہ وہ میری حیرت کو رفع کرنے کے لیے زبان سے ایک لفظ بھی نکالتا' گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں کہیں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی کی آواز چیخ چیخ کر اپنی شناخت پیش کر رہی تھی کہ اس کا مخرج کوئی موبائل فون ہے۔

میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں جو جوابی تاثر ابھرا اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ وڈیرا اکبر سومرو کی کال تھی۔ اسی دوران میں میر بخش نے گاڑی کے ڈیش بورڈ کو کھول کر موبائل فون برآمد کر لیا تھا۔

وہ خاصے بڑے سائز کا موبائل فون سیٹ تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون کو پاکستان میں متعارف ہوئے چند سال ہی ہوئے تھے اور ننھے منے فون سیٹ مارکیٹ میں نہیں آئے تھے جیسا کہ آج کل دکانوں میں اور اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں "سجے" نظر آتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میر بخش فون آن کر کے گفتگو آغاز کرتا' میں نے تنبیہی لہجے میں اس پر واضح کر دیا۔ "سب ٹھیک ہے' تم دونوں ہم لوگوں کو لے کر پہنچ رہے ہو۔"

میرے لہجے میں پوشیدہ دھمکی اور آواز کے اتار چڑھاؤ میں شامل سنگینی نے میر بخش کے ذہن میں میرا مقصد نقش کر دیا تھا۔ •

میر بخش اور اکبر سومرو کے درمیان ٹھیٹ سندھی میں پانچ منٹ تک بات چیت ہوتی رہی۔ بعد میں میر بخش کی زبانی مجھے جو احوال معلوم ہوا اس کے مطابق ان کے درمیان کچھ اس قسم کی گفتگو ہوئی تھی۔ میں سندھی زبان کو پوری طرح نہیں سمجھتا تھا بس کچھ الفاظ کے معنی معلوم ہو جاتے تھے۔

"میر بخش! تم اس وقت کہاں ہو۔ تمہیں "چھاچھرو" سے گزرے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک تم لوگوں کو "دھرمسال" سے آگے نکل آنا چاہیے تھا۔" اکبر سومرو نے بے چین انداز میں پوچھا تھا۔

اس کے بیان سے اندازہ ہوا کہ چھاچھرو میں اس کا کوئی آدمی ضرور موجود تھا۔ جس نے ہماری سیاہ گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا ۔۔۔ اور دھرمسال میں بھی اس کے کسی وفادار کی موجودگی کی بو مل رہی تھی۔

میر بخش نے جواب دیا تھا۔ "سائیں بھوتار! بس ہم دھرمسال پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"نہ بابا' اتنی دیر کیوں ہو گئی۔" وڈیرے نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے نا؟"

"سب خیریت ہے سائیں بھوتار! میر بخش نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "بس چھاچھرو اور دھرمسال کے درمیان ریگستان میں اچانک گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ ہم نے ٹائر تبدیل کر لیا ہے۔ بس اب روانہ ہونے ہی والے ہیں۔"

سائیں نے پوچھا۔ "وہ دونوں کیسے ہیں؟"

"پوری طرح بے ہوش ہیں سائیں بھوتار۔"

"ان پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔"

"ہم پوری طرح محتاط ہیں۔"

"میرے دوست کا دعوی ہے کہ وہ لڑکا وجدان بہت شاطر اور خطرناک ہے۔" وڈیرا اکبر سومرو نے کہا۔ "میں اس "نامی گرامی" لڑکے کو جلد از جلد دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس

طرف سے تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

میر بخش نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔" آپ فکر نہ کرو سائیں بھوتار! ہم ان دونوں کو لے کر آپ کے پاس پہنچنے والے ہیں۔"

وڈیرے نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا تھا۔

میر بخش موبائل فون ایک طرف رکھتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولا۔"اب کیا ہو گا سائیں؟"

"وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ خوف زدہ ہو گیا۔"سائیں! آپ نے ہدایت کی تھی کہ میں وڈیرا اکبر سومرو سے یہ کہوں...... سب ٹھیک ہے' ہم تم دونوں کو لے کر عمر کوٹ پہنچ رہے ہیں۔" وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد الجھن زدہ لہجے میں گویا ہوا۔"میں نے آپ کی تاکید کے مطابق وڈیرے سے گفتگو کی ہے۔ کیا آپ واقعی مجھے عمر کوٹ وڈیرے کے بنگلے پر بھیجنا چاہتے ہو؟"

"ہاں' میرا ارادہ تو یہی ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"مگر سائیں......!"

اس نے پریشان ہو کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے کہا"اگر مگر کچھ نہیں چلے گا میر بخش۔ تمہیں وہی کرنا ہو گا جو میں کہہ رہا ہوں اور میں تم سے ہی کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے تم سیدھے وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر جاؤ گے۔"

"لیکن میں نے تو وڈیرے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میر بخش نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔"سائیں! آپ مجھے "سام" بنا چکے ہو۔ اس کے باوجود بھی......؟"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔" میر بخش! تم میری خدمت میں رہنے کے خواہش مند ہو نا۔ مجھے آقا بنا لیا ہے تم نے اور میرے ہر حکم کی تکمیل تم بے چون و چرا کرنے کا وعدہ کر چکے ہو پھر یہ تردد کیوں؟"

"سائیں! کیا آپ بھی میرے ساتھ چلو گے؟" اس نے ایک اہم سوال کیا۔

میں نے حوصلہ شکن جواب دیا۔"نہیں!"

"آپ کے بغیر میں وڈیرا اکبر سومرو کے پاس پہنچوں گا تو وہ میرا جو حشر کریں گے اس کا تصور ہی کر کے میری روح فنا ہو رہی ہے۔" وہ کپکپاتے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا"میر بخش! میری ایک بات ذہن میں بٹھا لو۔ ظالم اور جابر شخص سے کبھی ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ظلم اور جبر کے خلاف آواز بلند کرنا چاہیے۔ یاد رکھو' ظالم کے سامنے خاموش رہنا مظلوم کے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہے۔ تم تو ماشاء اللہ' اچھے خاصے صحت مند ہو' طاقت ور ہو پھر یہ بزدلوں والی باتیں کیوں کر رہے ہو۔ تم جیسے ڈرپوک لوگوں کے لیے میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"سائیں! میں نہ تو ڈرپوک ہوں اور نہ ہی بزدل" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔"بس بات اتنی سی ہے سائیں کہ میں اکیلا' وڈیرا اکبر سومرو کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

میں نے کہا۔" جب یہ سمجھو کہ سامنے والا تم سے طاقت' اختیار اور اقتدار میں کہیں زیادہ مضبوط ہے تو پھر حکمتِ عملی سے کام لینا چاہیے۔"

"حکمتِ عملی!" وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" دیکھو میر بخش! جس طرح لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے بالکل اسی طرح کسی چال باز کو اپنی چال سے کاٹا جا سکتا ہے۔ اسی کو حکمتِ عملی کہتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا سائیں!" وہ مزید الجھ گیا۔

"میں سمجھاتا ہوں۔ میں نے معتدل انداز میں کہا۔"میر بخش! تم وڈیرا اکبر سومرو کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وڈیرے کی طاقت کا توڑ بھی تمہیں بتاؤں گا۔ تم میری ہدایات پر عمل کرو گے۔ پھر دیکھنا' کس طرح سب بگڑے کام سنور جاتے ہیں۔"

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ یہ میری ذات پر اس کے اعتماد کا نتیجہ تھا۔ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔"سائیں! اس سلسلے میں آپ کی ہدایات کیا ہوں گی؟"

میں نے چند لمحے خاموش رہ کر بولنا شروع کیا۔"جیسا کہ میں نے بتایا ہے' کسی مکار کو مکاری ہی کی مار ماری جا سکتی ہے۔ میں بھی وڈیرا اکبر کو چالاکی اور ہنر مندی سے اپنے دام میں لاؤں گا۔"

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "تم اکیلے ہی وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر پہنچو گے' ایک سنسنی خیز اور خوفناک کہانی کے ساتھ۔ تم نہایت ہی ڈرے سہمے انداز اور خوف زدہ آواز میں اسے بتاؤ گے کہ میں ــــ یعنی وجدان علی کوئی خطرناک قسم کا جادو جانتا ہوں۔ جب تم گاڑی کا ٹائر بدل کر آگے روانہ ہوئے تو اسی وقت مجھے ہوش آ گیا تھا پھر جیسے ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ تم لوگوں نے ہمیں اغوا کر لیا ہے تو میں نے کالے' نیلے یا پیلے... پتا نہیں' کس رنگ اور کے جادو کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ پہلے اس جادو کے زور پر میں نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے پر مجبور کیا۔ جب گاڑی رک گئی تو میں نے تمہیں زبردستی اس بات پر آمادہ کیا کہ تم ہم دنوں کو نہ صرف گاڑی کے پچھلے حصے سے نکالو بلکہ ہمارے ہاتھوں کو بھی بندشوں سے آزاد کر دو۔ تم نے نہ چاہتے ہوئے سحری اثرات کے تحت میرے حکم کی تعمیل کی۔ اس موقع پر ڈرائیور نواز علی نے جواں مردی کا مظاہرہ کرنا چاہا تو میں نے تمہارے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف سے فائر کروا کر نواز علی کا قصہ پاک کر دیا۔ تم نے ہم دونوں کو زیر کرنے کے لیے ہمارے قدموں میں فائرنگ کرنا چاہی تو میں بار بار تمہارا نشانہ خطا کرواتا گیا۔ گولیاں ضائع ہوتی رہیں مگر تم میرا بال بھی بانکا نہ کر سکے۔ اس طرح تم' یہاں ہونے والی فائرنگ میں استعمال شدہ گولیوں کا حساب دینے سے بھی بچ جاؤ گے۔"

میں تھوڑی دیر کو رکا تو میر بخش نے بے یقینی سے پوچھا۔ "کیا وڈیرا میری اس کہانی پر یقین کر لے گا؟"

"اس کے باپ کو بھی یقین کرنا پڑے گا۔" میں نے بڑی سفاکی سے کہا۔"میں اس کے یقین کا مکمل بندوبست کر کے تمہیں رخصت کروں گا۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے کہا"گاڑی سے باہر آ جاؤ۔"

"کہاں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "تم نواز علی کی لاش اٹھانے میں میری مدد کرو گے۔"

"نواز علی کی لاش کو اٹھا کر کہاں لے جانا ہے؟" وہ بھی گاڑی سے باہر آ گیا۔

میں نے کہا"اس گاڑی کے عقبی حصے میں "پٹخنا" ہے' سیٹوں کے درمیان۔"

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے کہا۔"تم وڈیرا اکبر سومرو کو بڑے رقت آمیز انداز میں بتاؤ گے کہ جب میں نے تم لوگوں کو اپنے ٹرانس سے آزاد کیا تو تم پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ ازاں بعد تم نے نواز علی کی لاش کو اپنے کندھے پر اٹھا کر گاڑی میں ڈالا تھا اور سیدھے عمر کوٹ پہنچ گئے تھے۔"

"وڈیرا یہ بھی تو پوچھے گا کہ جب آپ نے ہمیں اپنے ٹرانس سے آزاد کیا تو خود آپ کہاں گئے؟"

"تم کہہ سکتے ہو کہ جب تم اپنے ہوش میں آئے تو ہم "اڑن چھو" ہو چکے تھے۔" میں نے کہا۔"بھئی میں تو جادوگر ہوں۔ کہیں بھی غائب ہو سکتا ہوں اور اپنے ساتھ ساتھ اپنی ساتھی لڑکی کو بھی غائب کر سکتا ہوں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔"کہانی تو خاصی سنسنی خیز ہے۔ اب یہ وڈیرے کے دماغ میں بھی اتر جائے تو اچھا ہے۔"

"اترے گی' ضرور اترے گی میر بخش!" میں نے پُروثوق لہجے میں کہا۔"یہ وڈیرے سائیں اور کسی بھی علاقے کے اندرون میں بسنے والے لوگ بہت توہم پرست ہوتے ہیں۔ جادو ٹونے اور نادیدہ قوتوں پر بہت زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ وہ دونوں دوست مجھے ایک خطرناک شخص تو قرار دے ہی چکے ہیں۔ اب ان پر جب میرا یہ جوہر کھلے گا تو ان کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ پھر میرے "جادوئی کمالات" کے کچھ ثبوت بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اس لیے وڈیرا تمہاری دردناک کہانی پر کان دھرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

میر بخش نے پوچھا۔"کیسے ثبوت وجدان سائیں؟"

"نواز علی کی لاش" میں نے میر بخش کی مدد سے نواز ڈرائیور کی لاش کو گاڑی کے فرش پر پھینکتے ہوئے کہا۔"اور یہ نائیلون کی ڈوری جس سے میری ساتھی کے ہاتھ باندھے گئے تھے اور...... یہ ہتھکڑی!" میں نے اس کے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مگر یہ تو میرے ہاتھوں میں لگی ہوئی ہے۔"

"میں اسے تمہارے ہاتھوں سے نکال دیتا ہوں۔" میں نے چابی سے ہتھکڑی کھولتے ہوئے کہا۔

دھنو اس دوران میں حیرت بھری نظر سے ہم دونوں کو دیکھتی رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس وقت کسی اہم "کارروائی" میں مصروف تھا اس لیے اس کے بولنے کی ضرورت نہیں۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔"کہو' اب تو تم مطمئن ہوئے......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"سائیں! وڈیرا اکبر سومرو نے ہنگامی حالات میں رابطے کے لیے مجھے موبائل فون دے رکھا ہے۔ وہ پوچھ سکتا ہے' میں نے اتنے بڑے واقعے کی اطلاع اسے کیوں نہیں دی تھی۔ اس سوال کا میں کیا جواب دوں گا؟"

میں نے کہا۔"اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے کہا۔"تم کہہ سکتے ہو کہ تم نے پہلی فرصت میں وڈیرے کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہی تھی بلکہ

تم تو اسی وقت اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب میں "جادوئی آپریشن" میں مصروف تھا مگر میں نے تمہاری کوشش کو اپنے سحری اثرات سے ناکامیاب بنا دیا اور ......" میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر میر بخش کو دیکھا اور اپنی بات مکمل کر دی۔ "اور اس موبائل فون کو بے کار یعنی ناکارہ کر دیا۔"

"اوہ!" وہ چونک اٹھا پھر پوچھا۔ "تو کیا آپ واقعی موبائل فون کو برباد کرنا چاہتے ہو سائیں؟"

"ہاں' یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "اور یہ کام تمہارے ہاتھوں سے ہو گا۔ تم کلاشنکوف کا ایک برسٹ مار کر اس موبائل فون کے پرخچے اڑاؤ گے اور اس کی باقیات کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا پھر لرزیدہ لہجے میں بولا۔ "سائیں! یہ موبائل فون تو بہت قیمتی ہے' سائنس کی بالکل نئی ایجاد ہے۔"

میں نے کہا "یہ تمہاری کم علمی ہے میر بخش۔ موبائل فون سائنس کی ایجاد تو ہے بلکہ اسے سائنس کا اعجاز کہنا چاہیے۔۔۔ لیکن یہ ابھی ابھی ایجاد نہیں ہوا۔ پاکستان میں بھی یہ چند سال پہلے متعارف کروایا گیا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اسے دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک تمہارے اس "نکتے" کا تعلق ہے کہ یہ فون بہت قیمتی ہے تو میں یہ کہوں گا کہ بعض اوقات کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے قیمتی چیزوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔" پھر میں نے گاڑی کے فرش پر پڑی نواز علی کی لاش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ موبائل فون اس انسانی جان سے بھی زیادہ قیمتی ہے میر بخش؟"

وہ نواز علی کی خون چکاں لاش کو دیکھ کر ایک جھرجھری لے کر رہ گیا اور بڑی شدت سے انکار میں گردن جھٹکنے لگا۔

میں نے کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ جب نواز علی میرے سحری اثرات سے تمہاری فائرنگ کا نشانہ بن کر موت کے منہ میں جا سکتا ہے تو پھر ایک موبائل فون کی حیثیت ہی کیا ہے!"

بات میر بخش کی سمجھ دانی میں اتر گئی۔ اگلے چند لمحات میں اس نے میرے احکام کی تعمیل کر دی پھر پوچھا۔

"سائیں! اب آپ کہاں جائیں گے اور میری دوبارہ آپ سے ملاقات کب اور کیسے ہو گی؟"

میں نے کہا "ہم فی الحال تو کہیں نہیں جائیں گے۔ یہاں سے تمہارے ساتھ ہی آگے بڑھیں گے۔ ہماری آئندہ ملاقات کب اور کہاں ہو گی' یہ بات میں تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب ہم جدا ہونے لگیں گے۔

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "اب ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ ہمیں فوراً اپنا سفر شروع کر دینا چاہیے۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھو گے سائیں یا میرے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں؟"

"تمہارے ساتھ ڈرائیونگ کیبن میں" میں نے حتمی لہجے میں جواب دیا۔ "اور اب ڈرائیونگ بھی میں ہی کروں گا۔"

پھر میں دھنو کی جانب متوجہ ہو گیا اور نواز علی کی لاش کی سمت اشارہ کرتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔ "کیا تم اس کی موجودگی میں آرام سے رہ لو گی یا میں کسی اور قسم کی "سیٹنگ" کروں؟"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔ "وجدان! تم فکر نہ کرو۔ میں اس قسم کے منظر سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ جب تمہارے قدم میں' میں نے اپنا قدم رکھ دیا ہے تو پھر فکر' ڈر اور خوف کی کیا بات ہے۔ اب تو قدم قدم پر ایسے مناظر کا سامنا ہو گا۔ میں نے اب تک جتنا بھی وقت تمہارے ساتھ رہ کر گزارا ہے اس کی بنا پر کہہ سکتی ہوں کہ تمہاری زندگی بہت ہنگامہ خیز ہے۔ تم ہر وقت خطرات میں گھرے رہتے ہو اور جان ہتھیلی پر رکھ کر ان خطرات کا مقابلہ کرتے رہتے ہو۔ اگر تمہارے ساتھ چلنا ہے تو پھر دل کو مضبوط تو بنانا ہو گا۔"

اس نے ایک عجیب انداز میں میری آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ "وجدان! تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کتنی حوصلہ مند لڑکی ہوں۔ اگر میں کمزور دل ہوتی تو اپنے ماں باپ کی لاشوں کو دیکھ کر وہیں عبادت گاہ میں ہی جان دے دیتی۔ لیکن نہیں' وہ میرا حوصلہ' عزم اور مضبوط دلی ہی تھی کہ میں نے اپنی ماں بھیرجانی اور باپ تھونجی کی خوں چکاں لاشوں کو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ سے کھٹمنڈو شہر تک پہنچایا تھا۔"

دھنو بولتے بولتے جذباتی ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی جس واقعے کا ذکر کیا تھا' اس کی اندوہناکی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ دھنو نے واقعی بہت بہادری اور جرأت مندی کا مظاہرہ کیا تھا اور ازاں بعد بھی وہ میری خاطر کئی بار ظلم و تشدد کی فضا سے گزری تھی۔ اس کی مضبوط دلی اور آہنی اعصابی مجھ پر آشکار ہو چکی تھی۔ میں اس کی قربانیوں کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

والدین کے بہیمانہ قتل کا واقعہ یاد کر کے اس کا دل بھر آیا

تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں واضح طور پر درد کی ایک لہر کو اٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے' اپنے ماں باپ کو خاک و خون میں لوٹتے ہوئے دیکھنا کتنا دل دوز اور جگر پاش منظر ہوتا ہے' یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ تپش وہیں ہوتی ہے جہاں پر آگ جلتی ہے۔

ہمارا یہ صدمہ مشترکہ تھا۔ دھنو کو جذباتی دیکھا تو مجھے بھی اپنے دل میں کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے بے اختیار دھنو کو گلے سے لگالیا۔ اس کے سینے کا تلاطم بتا رہا تھا کہ وہ اس وقت ضبط کی آخری حد سے گزر رہی ہے۔

وہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کے ضبط کا بندھن توڑنے کا سبب بن جاتا۔ میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں اس کے شانے تھپک کر خود سے الگ کر دیا پھر اضطرابی لہجے میں کہا۔

"تم یہیں بیٹھو دھنو' ہم آگے جا رہے ہیں۔"

دھنو نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جو دل کے آرپار ہو گئی۔ ہم دونوں گاڑی کا عقبی دروازہ بند کر کے ڈرائیونگ کیبن میں آ گئے۔ میں نواز علی کی سندھی ٹوپی بھی اپنے ساتھ اٹھالایا تھا۔

"اس ٹوپی کا کیا کریں گے سائیں؟" میر بخش نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کروں گا۔" میں نے وہ ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا اور گاڑی کو چلا کر پکی سڑک پر لے آیا۔ "اب پہلی نظر میں دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ نواز علی ہی ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ اگرچہ میں جثے میں اس جیسا نہیں ہوں تاہم کام تو چلانا ہی پڑے گا۔"

وہ اثبات میں سرہلانے لگا۔ میں نے بتدریج گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جب گاڑی تیزی سے گزر رہی ہو تو دیکھنے والوں کی نظر کسی کے جثے پر کم ہی جاتی ہے۔ سب سے پہلے جو چیز نگاہ میں آتی ہے وہ "گیٹ اپ" ہے۔ ونڈ اسکرین سے جو میرا جو گیٹ اپ دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے مطابق تو میں پہلی نظر میں سندھی ہی لگوں گا نا!"

"آپ بہت عقل مند اور موقع شناس ہیں سائیں" میر بخش نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے یہ بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "عقل مندی اور موقع شناسی وقت خود سکھا دیتا ہے میر بخش! بس اس کا صرف ایک ہی تقاضا ہوتا ہے۔"

"وہ کیا سائیں؟"

"وقت چاہتا ہے' انسان اس کے ساتھ ساتھ چلے۔"

"یہ تو بہت ہی اہم بات بتائی ہے آپ نے سائیں۔" وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ "لیکن اکثر انسان وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ یا تو وقت سے بہت آگے چلنے کی کوشش کرتے ہیں یا پھر بہت پیچھے رہ جاتے ہیں چناں چہ وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ جواباً وہ اپنی ناکامیوں کو قسمت کی خرابی سے منتھی کر کے واویلا مچاتے رہتے ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اپنی بات مکمل کر دی۔ "اور جو لوگ وقت کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہیں' وقت ان کا راستہ بن جاتا ہے جو انہیں ان کی مقصودہ منزل تک لے جاتا ہے۔"

میر بخش چند لمحوں تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "وجدان سائیں! آپ کے ساتھ جو "بی بی" ہے وہ آپ کی کیا لگتی ہے؟"

اس کا اشارہ دھنو کی جانب تھا۔ میں نے کہا "وہ میری دوست لگتی ہے۔"

"میرا مطلب تھا....!"

"میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں میر بخش!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم یہی پوچھنا چاہتے ہو نا' میرا دھنو سے کیا رشتہ ہے؟ تو سنو' یہ میری دوست ہے' ایک مخلص اور بے لوث دوست جو کسی بھی نازک موقع پر میری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہے۔ وہ میرے لیے بڑے سے بڑا دکھ اٹھا سکتی ہے' تکلیف برداشت کر سکتی ہے۔ کیا اس سے زیادہ مضبوط رشتہ بھی کوئی ہو سکتا ہے۔؟"

"نہیں سائیں" وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "واقعی دوستی کا رشتہ تو بہت لاثانی اور قابل تعریف ہے۔"

میں نے کہا "میر بخش! اگر دھنو میرے لیے اتنا آگے جا سکتی ہے تو میں بھی اس کی خاطر بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ہم سب دوست ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ ہماری دوستی حقیقی معنوں میں دوستی ہوتی ہے۔"

وہ کافی دیر تک متاثر کن انداز میں گردن ہلاتا رہا پھر بولا۔

"سائیں! آپ کی دوست دھنو واقعی بہت بہادر ہے ورنہ ایک خون آلودہ لاش کے ساتھ.....!"

اس نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی تشفی کرتے ہوئے کہا۔

"میر بخش! میری دوستی میں بہادری شرط ہے۔ میرے تمام دوست اس وصف سے مالا مال ہیں۔ ہم برائی' ظلم' تشدد

اور معاشرتی ناہمواری کے خلاف بڑی بے جگری سے سینہ سپر ہیں۔ میں کسی شخص کو آنکھیں بند کر کے اپنے دوستوں کے حلقے میں شامل نہیں کرتا بلکہ کسی کڑے امتحان میں ڈال کر اس کی آزمائش کرتا ہوں۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ ہونے والا ہے۔"

"میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے سائیں؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "تم اپنے سابق مربّی وڈیرا اکبر سومرو کے پاس پہنچنے والے ہو' ایک ایسی کہانی کے ساتھ جو میری تخلیق کردہ ہے۔ میں نے اس کہانی کو اسٹیج کرنے کے لیے تمہیں کچھ ہدایات بھی دی ہیں۔ اگر تم نے میری ہدایات پر عمل کر کے دکھایا تو میں سمجھوں گا تم امتحان میں پاس ہو گئے۔"

وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں بولتے بولتے رکا تو اس نے پُرعزم اور ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔ "سائیں! میں سردھڑ کی بازی لگا کر آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"شاباش" میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا۔ "میر بخش! اگر تم اس آزمائش میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر میں تمہیں بھی گلے لگاؤں گا۔ تم میرے دوستوں میں شمار کیے جاؤ گے۔ غلام' نوکر چاکر اور "سام" وغیرہ پالنے کا مجھے شوق نہیں ہے۔"

اس کا سینہ جوشِ جذبات سے پھول گیا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے ونڈ اسکرین کے پار اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"سائیں! اب ہم "دھرمسال" سے گزرنے والے ہیں۔"

میں نے اس کی اطلاع سنتے ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی اور گردوپیش پر اپنی عقابی نگاہ رکھتے ہوئے "زن" سے دھرمسال کو پیچھے چھوڑتا چلا گیا۔

"اللہ سائیں کا شکر ہے سائیں۔" جب ہم کافی آگے آ گئے تو میر بخش کی زبان سے اطمینان بخش کلمہ جاری ہوا۔

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "میر بخش! کیا "چھاچرو" بھی ایسا ہی علاقہ ہے؟"

"میں سمجھا نہیں سائیں!" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا "چھاچرو" کی آبادی بھی "دھرمسال" کی طرح ہے؟"

"ہاں سائیں" وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "کم و بیش یہ دونوں گاؤں ایک جیسے ہی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا تم لوگ "چھاچرو" میں رکے بغیر ہی آگے بڑھ آئے تھے؟"

"وہاں رکنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا سائیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تب پھر وڈیرا اکبر سومرو بکواس کرتا ہے۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی سائیں!"

میں نے کہا "تمہارے ساتھ وڈیرے کی موبائل فون پر جو گفتگو ہوئی تھی اس میں' تمہارے بیان کے مطابق وڈیرے نے کہا تھا.... میر بخش! "چھاچرو" سے گزرے ہوئے تمہیں کافی دیر ہو گئی ہے۔ اب تک تو تمہیں "دھرمسال" سے آگے نکل آنا چاہیے تھا۔ تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میر بخش! وڈیرے کی اس بات سے یہ تاثر ابھرتا تھا کہ "چھاچرو" میں موجود اس کے کسی آدمی نے تمہاری گاڑی کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا جب کہ تم بتا چکے ہو کہ ان دونوں بستیوں کی آبادی ایک جیسی ہے۔ "دھرمسال" کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وڈیرا اکبر سومرو صرف تم لوگوں کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کے کسی آدمی نے تمہیں وہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہو گا۔"

"آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہو گا۔" میر بخش نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ "میر بخش! ہم کب تک عمرکوٹ پہنچ جائیں گے؟"

اس نے بتایا "ضلع عمرکوٹ کی حدود تو آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد شروع ہو جائے گی تاہم عمرکوٹ کا شہری حصہ مزید آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد آئے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے سوال کیا۔ "آپ کا کیا پروگرام ہے سائیں؟"

اس وقت سورج مغربی افق پر جھک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں خاصی کمی واقع ہو گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چمک دار تھال زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں سرخ رنگت اختیار کرنے والا تھا۔ پھر شام ہو جاتی۔ یعنی جب ہم ضلع عمرکوٹ کی حدود کو چھوتے' سورج اپنا آج کے دن کا سفر پورا کر کے مغرب میں منہ چھپا چکا ہوتا۔ میر بخش کی بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ عمرکوٹ کے شہری حصے میں پہنچتے پہنچتے رات بھیگ چکی ہوتی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں تو اپنا پروگرام اس وقت بتاؤں گا جب مجھے یہ پتا چلے گا کہ وڈیرا اکبر سومرو کا بنگلا کس طرف ہے۔ میں وڈیرے اور اس مہمان دوست سے زیادہ دوری پر نہیں جانا چاہتا!"

"سائیں! وڈیرے کا بنگلا اور جاگیر عمرکوٹ شہر کی مشرقی سمت میں ہے" میر بخش نے بتایا "وہاں جانے کے لیے عمرکوٹ کی حدود میں داخل ہو کر مجھے سیدھے رخ پر گاڑی موڑنا ہوگی جب کہ شہر میں داخل ہونے کے لیے سیدھا جانا پڑتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے، شہری حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہی تم دائیں جانب (مشرقی سمت) مڑ جاؤ گے؟"

"جی سائیں" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

میں نے پوچھا "اس موڑ سے وڈیرے کے بنگلے تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے۔"

"اور موڑ سے شہر عمرکوٹ کتنے فاصلے پر ہے؟"

"وہاں سے دس پندرہ منٹ میں شہر کے وسط میں پہنچا جا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم ہمیں شہر کے اندر پہنچا کر واپس آ سکتے ہو؟"

"جو حکم سائیں" وہ فرماں برداری سے بولا پھر پوچھا "کیا آپ شہر میں ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"ہاں، فی الحال تو یہی سوچا ہے۔" اس کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔

"شہر میں کہاں رکیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"کسی ہوٹل وغیرہ میں" میں نے بتایا۔

اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔ میں نے اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"عمرکوٹ شہر میں ہوٹلوں کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"ہوٹل ہیں سائیں مگر آپ کی شان کے مطابق نہیں" اس نے بتایا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ سائیں کہ وہ عام سے ہوٹل ہیں" اس نے جواب دیا "آپ کے حساب سے تھرڈ کلاس کہے جا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "میر بخش! ہم اس وقت نہ تو کوئی حساب کتاب کرنے کی پوزیشن میں ہیں اور نہ ہی میں اپنی کلاس ناپنا چاہتا ہوں۔ بس کسی معقول سے ہوٹل میں ہمیں ایک کمرا مل جائے تو گزارہ ہو جائے گا۔ کیا ایسا کوئی ہوٹل تمہاری نظر میں ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا "ہاں سائیں، ایسے ایک ہوٹل کے بارے میں مجھے معلوم ہے۔ میں آپ کو اس ہوٹل کے قریب چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔"

"بس ٹھیک ہے" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

میر بخش نے پوچھا "سائیں! آپ کے پاس رقم کی کیا پوزیشن ہے؟"

"رقم تو ہمیں تم دو گے میر بخش" میں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔ "ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ضرور سائیں، ضرور" وہ مبنی بر آمادگی لہجے میں جلدی سے بولا۔

میں نے محسوس کیا، وہ ایک مرتبہ پھر کچھ الجھ سا گیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے میر بخش! تم مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"سائیں! میں آپ کی ساتھی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"تو اس میں الجھن یا فکر کی کون سی بات ہے؟"

اس نے سنجیدہ لہجے میں بتایا "سائیں! بی بی کا لباس خاصا ماڈرن ہے۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس ہے۔ عمرکوٹ یا کسی بھی چھوٹے شہر میں لڑکیاں اور عورتیں ایسا لباس نہیں پہنتیں۔"

۔۔۔۔"تو پھر؟" میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

وہ بولا "سائیں! میرا خیال ہے، آپ بہت جلد دوسروں کی نظر میں آ جاؤ گے۔ ان "دوسروں" میں ممکن ہے، وڈیرا اکبر سومرو کا بھی کوئی آدمی ہو۔ اس کے بعد آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ کیا کیا پریشانیاں جنم لے سکتی ہیں۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو میر بخش! بہرحال، فوری طور پر تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہم ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے کے بعد اس مسئلے کو حل کریں گے۔ دھنو کا لبا تبدیل کروا دیا جائے گا۔"

وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ میرے سفری بیگ میں ہمارے چند جوڑے کپڑے موجود تھے۔ اگرچہ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو سندھ کی تہذیب سے لگا کھاتا تاہم دھنو اگر ساڑی زیب تن کر لیتی تو بات بن سکتی تھی۔ بیگ میں اس کی ایک ساڑی رکھی تھی جو رانی روپ متی نے اسے تحفے میں دی تھی۔ جے پور میں قیام کے دوران میں روپ متی اور شوبھا نے دھنو کو زیادہ تر ساڑی پہننے پر ہی زور دیا تھا۔

میر بخش نے اپنی جیب میں سے مبلغ دو ہزار روپے کی رقم نکال کر میرے حوالے کر دی اور کہا "سائیں! فی الحال تو یہی ہیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

"یہ بھی بہت ہیں۔" میں نے وہ رقم اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "سائیں! جب آپ ہوٹل پہنچو گے تو اندھیرا پھیل چکا ہو گا اس لیے زیادہ خطرے کی کوئی بات نہیں مگر دن کے اجالے میں آپ کو بہت احتیاط کرنا ہو گی۔ آپ کی ساتھی اور آپ اس ماحول میں بہت مختلف نظر آتے ہو اس لیے فوراً نظروں میں آ جاؤ گے۔"

میں نے کہا "تم فکر نہ کرو۔ میں کوشش کروں گا، کل ہم بھی اپنا گیٹ اپ تبدیل کر لیں میں مقامی رنگ میں رنگنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کافی عرصے تک یہاں ٹھہرنا چاہتے ہو؟"

"فی الحال تو تین دن کے لیے ہوٹل میں کمرا لوں گا" میں نے کہا "اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس مدت کو بڑھا لوں گا۔"

وہ تجویز آمیز لہجے میں بولا "سائیں! آپ کو اس لمبے چوڑے بکھیڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم گاڑی اور گاڑی میں موجود تمام چیزوں کو یہیں کہیں ویرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس وقت ہم آزاد ہیں، کوئی ہمارا راستہ روکنے والا بھی نہیں ہے۔"

میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم "امتحانِ وفاداری" سے بچنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"نہیں سائیں" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"پھر مجھے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟"

وہ ہکا بکا رہ گیا "کون سا میدان سائیں؟"

میں نے کہا "وہ میدان میر بخش جو وڈیرا اکبر سومرو اور اس کے مہمان دوست نے میرے سامنے پھیلایا ہے۔ میں بھی تو ذرا دیکھوں، وڈیرے کا وہ دوست کتنے پانی میں ہے جس نے مجھے گھیرنے کے لیے یہ لمبا چوڑا جال بچھایا ہے۔۔۔ اور جو یہ بھی جانتا ہے کہ میرے دائیں کان کی لو کے پیچھے مسور کے برابر سیاہ تل ہے" میرا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا تھا "میر بخش!" میں نے ہونٹ بھینچے، ایک گرم سانس خارج کی اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "جو شخص میرے بارے میں اتنی اہم معلومات رکھتا ہے اور میرے استقبال کی خاطر وہ لاہور کے کسی نواحی گاؤں سے چل کر اس تپتے ہوئے ریگستان میں پہنچا ہے اس شخص سے "ملاقات" کیے بغیر میں ایک قدم بھی آگے بڑھانے کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں تو اس کے "دیدار" کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔ تم وڈیرے کے بنگلے میں واپس آ کر کل مجھے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرو گے تو میں آیندہ کا لائحۂ عمل تیار کروں گا۔ کل نہ آ سکو تو پرسوں آ جانا۔ میں پورے تین دن تک ہوٹل کے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا۔

"اگر تمہیں ہم ہوٹل میں نہ ملیں تو تم ہمارا انتظار کر لینا۔ ہم ہوٹل کے آس پاس ہی کہیں ہوں گے۔ زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ ہم ہوٹل میں مراد اور کلثوم کے ناموں سے ٹھہریں گے۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

"میر بخش! ایک وقت تھا، جب میں اپنے دشمنوں کے آگے دوڑا کرتا تھا۔ وہ میری جان کے گاہک بنے ہوئے تھے کیوں کہ میں اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کا عینی شاہد تھا۔ میرے والدین کے قاتل مجھے بھی صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنا چاہتے تھے لیکن میری خوش بختی مجھے بچاتی رہی اور میں حملہ آوروں کے ہر وار سے زندہ بچ نکلا۔ میں اپنے دشمنوں سے بہ خوبی واقف تھا لیکن ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا کیوں کہ میں ابھی معصومیت کے ہنڈولوں میں جھول رہا تھا۔ صغیر سنی نے میرے پاؤں میں بیش وزنی زنجیر ڈال رکھی تھی۔ پھر قدرت نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میری سچائی اور مظلومیت کا مجھے انعام ملا۔ اللہ کی مرضی سے، اللہ کے چند بندوں نے مجھے ایسے کندۂ ناتراش خراش کچھ اس انداز میں کی کہ میں آتش و آہن کا ایک ناقابلِ تسخیر شاہ کار بن گیا۔ وہ دن اور آج کا دن" میں نے رک کر میر بخش کی جانب دیکھا جو بڑی محویت سے میری باتیں سن رہا تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "ہاں میر بخش! وہ دن اور آج کا دن، میں اپنے دشمنوں کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہوں اور وہ کسی "پسپا" حریف کی طرح خود کو چھپاتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہاں سندھ کے ریگستان میں کوئی "جیالا" آگے بڑھ کر "میرا استقبال" کر رہا ہے۔۔۔ اور سیکڑوں میل کا طویل سفر کر کے وہ میری خاطر یہاں رکا ہوا ہے۔ میں اپنے ایسے جوشیلے اور ولولہ انگیز "میزبان" کو کس طرح نظر انداز کر سکتا ہوں۔ ذرا معلوم تو ہو، میری "چاہت" میں بے کل اور میری "جستجو" میں دشت نوردی کرنے والا وہ جی دار، دشمنوں کے کس قبیل سے تعلق

رکھتا ہے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں' اس کے سینے میں کتنا دم ہے؟ میں پرکھنا چاہتا ہوں' اس کے دماغ میں کتنا غصہ و غم ہے؟ میں برتنا چاہتا ہوں' اس کے بازوؤں میں کتنا خم ہے؟"

اگر میر بخش کا بس چلتا تو وہ میرے قدموں میں گر جاتا۔ اس وقت وہ مجھ سے بے انتہا متاثر نظر آتا تھا۔ اس کا اندرون اور بیرون سراپا نیاز بنا ہوا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی' اس کا لہجہ جذبات کی شدت سے بھیگا ہوا تھا۔

"سائیں وجدان! میں اپنے بخت پر بہت فخر محسوس کر رہا ہوں کہ قدرت نے مجھے آپ سے ملوا دیا ہے۔ آپ بہت عظیم انسان ہو" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا "سائیں! آپ بے فکر ہو جاؤ۔ میں جی جان سے کوشش کر کے آپ کی ہدایات پر عمل کروں گا..... اور آپ کی مطلوبہ معلومات جلد از جلد آپ تک پہنچاؤں گا۔"

میں نے کہا "فی الحال صرف اتنا ہی کرو جتنا میں نے کہا ہے۔"

"ٹھیک سائیں' جو حکم سائیں۔"

اسی وقت ہم ضلع عمر کوٹ کی حدود میں داخل ہو گئے۔ میں نے کہا "میں گاڑی ایک طرف روک رہا ہوں۔ آگے ڈرائیونگ تم کرو گے!"

گاڑی روک کر ہم نے اپنی سیٹیں تبدیل کیں۔ اسی موقع پر میں نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر دھنو سے بھی مختصر گفتگو کی اور اسے یہ پُرمسرت نوید سنائی کہ ہم بہت جلد ایک معقول ہوٹل میں پہنچنے والے ہیں اس لیے وہ ذہنی طور پر تیار ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نک سک بھی درست کر لے ہمارا سفر ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔

میں نے پوچھا "کراچی سے عمر کوٹ یا عمر کوٹ سے کراچی جانے میں کتنا وقت لگتا ہے؟"

"مختلف گاڑیاں مختلف وقت لگاتی ہیں" اس نے جواب دیا "جو کوچز حیدر آباد سے ہو کر آتی جاتی ہیں' وہ پانچ سے ساڑھے پانچ گھنٹے میں پہنچا دیتی ہیں جب کہ ڈائریکٹ آنے والی کوچز ساڑھے تین گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کر لیتی ہیں۔"

میں نے پوچھا "عمر کوٹ کی سب سے زیادہ مشہور چیز کون سی ہے؟"

"عمر ماروی!" اس نے جواب دیا۔

"عمر ماروی!" میں نے بڑبڑانے والے انداز میں دہرایا۔

"جی سائیں' عمر ماروی" وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے استفسار کیا "عمر ماروی کیا چیز ہے بھئی؟"

"آپ نہیں جانتے سائیں؟"

میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ معلومات کا دریا بہانے لگا۔

میر بخش نے دس پندرہ منٹ میں "عمر ماروی" کی پوری کہانی تفصیل سے مجھے سنا دی۔ یہ محبت کرنے والے دو دلوں کی ایک لوک کہانی تھی۔ پنجاب اور سندھ کی سرزمین اور آب و ہوا رومان پروری میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ عمر ماروی کی رومانوی داستان نے مجھے بہت متاثر کیا۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک عمر ماروی زیر بحث رہی پھر میں نے میر بخش سے پوچھا۔ "تم ہمیں جس ہوٹل میں پہنچانے جا رہے ہو' کیا وہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی ہے؟"

"نہیں سائیں" اس نے نفی میں جواب دیا "عمر کوٹ شہر میں کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔"

"کیا یہاں ٹرین نہیں چلتی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"چلتی ہے" وہ سرہلاتے ہوئے گویا ہوا "مگر کوئی مین لائن یہاں سے نہیں گزرتی۔ بس ایک چھوٹی ریلوے لائن ہے اور وہ بھی عمر کوٹ شہر سے ذرا ہٹ کر گزرتی ہے۔" پھر وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں نے جس ریلوے لائن کا ذکر کیا ہے "وہ کھوکھرا پار" بارڈ سے شروع ہو کر واسرباہ' جلوجوچوزی' نیا چھور' ہاسیسر' ڈھورونارو' ہیرل' پتھورو اور شادی پلی سے ہوتے ہوئے ضلع "میرپور خاص" میں داخل ہو جاتی ہے۔ عمر کوٹ شہر کو یہ ریلوے لائن ٹچ نہیں کرتی۔"

میر بخش کی اس معلوماتی وضاحت میں صرف ایک ہی کام کی چیز تھی اور یہ تھی کہ عمر کوٹ شہر میں ریلوے اسٹیشن نہیں تھا۔

ہمارے درمیان اسی قسم کی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں اور ہم اس ہوٹل کے نزدیک پہنچ گئے جس کا ذکر میر بخش نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔ وہ ہوٹل بس اسٹینڈ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے نزدیک ایک پیٹرول پمپ بھی تھا۔ وہ عمر کوٹ کا واحد ہوٹل تھا جس میں کمرا بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ورنہ سرائے نما چارپائی ہوٹل تو کافی تعداد میں تھے۔ ہمیں جس ہوٹل میں ٹھہرنا تھا اس کی زیریں منزل پر "طعام" کا شعبہ تھا۔ "قیام" کے لیے اوپر کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں مطمئن تھا کہ ہمیں قیام کے لیے الگ کمرا مل سکتا تھا۔ میر بخش چاہتا تھا کہ خود ہمیں ہوٹل پہنچا کر آئے لیکن میں نے

اسے سختی سے منع کر دیا۔ میں نے گاڑی بھی ہوٹل سے مناسب فاصلے پر رکوائی تھی۔ دراصل میر بخش کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ کسی ہوٹل میں داخل ہوتا۔ تپتے ہوئے صحرا میں' میں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ خاصی حد تک درست کر لیا تھا تاہم چہرے پر لگنے والی چوٹوں کے نشان ایسے نہیں تھے کہ جنہیں آسانی سے چھپایا جا سکتا۔ میں نے آہنی ہتھکڑی کا دوہتڑ اس کے چہرے پر رسید کر کے وہاں کی کھال کو کئی مقامات سے "بغاوت" پر مجبور کر دیا تھا۔

ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے اور میر بخش مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔ اب اسے میری ہدایات کے مطابق سیدھا وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر جانا تھا اور..... وہاں جو حالات "پیش آتے" ان کی روداد کل یا پرسوں یا ترسوں آ کر مجھے سنانا تھی۔

میں اور دھنو سبک قدموں سے چلتے ہوئے ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔

وہ ہوٹل عمر کوٹ کے حساب سے درجہ اول پر فائز تھا تاہم میرے نزدیک وہ ایک ساتویں یا آٹھویں درجے کا ہوٹل تھا۔ ہم استقبالیہ پر پہنچے اور ایک "ڈبل بیڈ" روم کے لیے کلرک سے بات کی۔

استقبالیہ کلرک نے سر سے پاؤں تک ہمارا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں خاص طور پر دھنو کا بصری ایکسرے کرنے کی متمنی دکھائی دیتی تھیں۔ میں خاموشی سے کلرک کی "کارروائی" دیکھتا رہا۔ اچانک اسے احساس ہو گیا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' اس کے فرائض منصبی کا حصہ نہیں ہے۔ شکر ہے' جلد ہی اسے اپنی "اوقات" کا ادراک ہو گیا تھا۔

وہ جلدی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "جی سائیں آپ کو کمرا مل جائے گا۔" پھر اس نے کمرے کا ایک دن کا کرایہ بتایا۔

میں نے میر بخش کی دی ہوئی رقم میں سے تین دن کے کرایے کے پیسے نکال کر کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا "یہ تین دن کا کرایہ ہے۔ اگر اس سے زیادہ ٹھہرنا پڑ گیا تو مزید رقم دوں گا۔"

اس نے پوچھا "آپ دونوں کے نام کیا ہیں؟"

میں نے اپنا فرضی نام "مراد" اور دھنو کا فرضی نام "کلثوم" لکھوا دیا۔ کلثوم لکھتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر دھنو کے سراپا کو تشنہ نگاہی سے ٹٹولا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے کون سی چیز ٹکنے نہیں دے رہی۔

اول تو دھنو کا حسن اور جوانی ہی دیکھنے والی آنکھ کو محو حیرت کرنے کے لیے کافی تھے پھر اس پر اس کے نقش و نگار اسے کسی اور ہی دنیا کا ظاہر کرتے تھے۔ کلرک کن انکھیوں سے دھنو کا جائزہ لیتے ہوئے رجسٹر میں ہمارے فرضی نام درج کرنے لگا۔

جب وہ یہ کام کر چکا تو میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ کا شناختی کارڈ؟"

ہمارے پاس شناختی کاغذات کے نام پر ایک پرزہ بھی نہیں تھا مگر میں نے اس حوالے سے اپنے ذہن کو پوری طرح تیار کر رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ' یہاں اس قسم کی صورتِ حال پیش آ سکتی ہے۔

میں نے کہا "چند روز پہلے میری جیب پر کسی جیب کترے نے ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ وہ میرا پرس اڑا لے گیا۔ شناختی کارڈ پرس میں تھا۔"

"کوئی اور کارڈ؟" کلرک نے دھنو کو دیکھتے ہوئے مجھ سے سوال کیا "جس سے آپ کی شناخت ہو سکے۔"

"کوئی نہیں" میں نے مایوسی سے گردن ہلائی "تمام کارڈز وغیرہ اسی پرس میں تھے۔ اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

اس نے دھنو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کا شناختی کارڈ تو ہو گا؟"

"اس کی عمر ابھی اٹھارہ سال نہیں ہوئی" میں نے جلدی سے کہا "اس لیے کارڈ ابھی بنا نہیں۔"

"تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی سائیں!"

اس مشکل کو کسی اور طریقے سے "آسان" نہیں بنایا جا سکتا؟" میں نے معنی خیز انداز سے کہا اور لفظ "آسان" پر خاصا زور ڈالا۔

وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا' دھیمے لہجے میں بولا "تین دن کے قیام کے لیے پانچ دن کے حساب سے کرایہ دینا ہو گا۔"

"منظور ہے" میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "یقیناً یہ دو دن کا اضافی کرایہ تو تمہاری جیب میں جائے گا۔ ہوں؟"

وہ آنکھ دبا کر بولا "آپ تو خود سمجھ دار آدمی ہو!"

میں اس کی نیت کو سمجھ چکا تھا چناں چہ مزید دو دن کا کرایہ اس کے حوالے کر دیا اور کہا "رجسٹر میں تو تم تین دن کا قیام ہی ظاہر کرو گے نا؟"

"جی سائیں۔"

"اور شناختی کارڈ والی "فارملیٹی" کو کس طرح پورا کرو

گئے؟"

"یہ میرا کام ہے" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں اپنا کام بہت اچھے طریقے سے انجام دے لوں گا۔"

اپنے رجسٹر میں اندراج وغیرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے کمرے کی چابی ہمارے حوالے کی اور بہ نفسِ نفیس ہمیں ہمارے کمرے تک چھوڑنے آیا۔ ہمیں کمرے کا معائنہ کروانے کے بعد اس نے کہا۔

"کسی بھی قسم کی کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے اشارہ کر دیں۔ آپ کا کام سمجھیں ہو گیا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا "اگر تمہاری ضرورت پڑی تو تمہیں ضرور بتائیں گے۔"

وہ ایک مناسب سا "شکریہ" ادا کرنے کے بعد واپس چلا گیا۔

میں نے کمرے کے اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ عام سے سائز کا ایک کمرہ تھا۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بیڈ بچھا ہوا تھا' دوسری دیوار کے ساتھ بیڈ کے سرہانے کی سمت ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ میز اور کرسیاں لکڑی کی بنی ہوئی تھیں تاہم کرسیوں پر کشن اور میز پر میزپوش موجود تھا۔

کمرے کی تیسری دیوار میں باتھ روم تھا اور چوتھی دیوار میں وہ دروازہ تھا جہاں سے ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تھے۔ جس دیوار کے ساتھ کرسیاں اور میز رکھی تھی' وہاں ایک کھڑکی بھی تھی جس سے ہوٹل کی سامنے والی سڑک کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میر بخش کو میں بتا چکا تھا کہ ہوٹل میں ہم کون سے فرضی ناموں سے قیام کریں گے تاکہ اسے ہم تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ بھی میں نے میر بخش کو چند موٹی اور اہم باتیں اچھی طرح سمجھا دی تھیں۔

اس منحوس گاڑی کے ہچکولے دار سفر نے میرا ایک ایک جوڑ' توڑ کر رکھ دیا ہے" دھنو دھڑام سے ڈبل بیڈ پر گرتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنا سفری بیگ چوبی میز پر رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر جوگرز کے تسمے کھولنے لگا۔ دھنو کے جوگرز اس کے پاؤں میں موجود تھے۔ آرام دہ بستر دیکھتے ہی اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا اور وہ خوب پھیل کر ڈبل بیڈ پر دراز ہو گئی تھی۔

میں نے جوگرز اپنے پاؤں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ "دھنو! ہم گزشتہ دو تین روز سے مسلسل سفر میں ہیں اور سفر بھی ایسا تکلیف دہ اور اعصاب شکن کہ ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیں ایک پل بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر سیاہ گاڑی کے اندر ہمیں بے ہوش کرنے کے لیے مخصوص گیس استعمال کیا گیا۔ بے ہوشی کی اس کیفیت نے بھی تمہارے اعصاب کو توڑ پھوڑ دیا ہو گا۔ اب تو دل و دماغ میں صرف ایک خواہش ہو گی کہ کہیں' کسی آرام دہ اور سکون بخش بستر پر گر کر گھنٹوں کی گہری اور بھرپور نیند لی جائے۔"

"وجدان! تم نے میرے دل کی بات کہی ہے" دھنو نے کروٹ بدل کر اوندھے ہوتے ہوئے کہا "واقعی' میں اس وقت یہی سوچ رہی ہوں۔"

میں نے کہا "میرے خیالات بھی تم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں لیکن سونے سے پہلے ہمیں چند ضروری کام کرنا ہوں گے۔"

"کیا تم ہوٹل سے باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"ہرگز نہیں" میں نے کہا۔ "رات کے وقت اس اجنبی جگہ پر مٹرگشت کرنا مناسب نہیں ہو گا۔"

"پھر کون سے ضروری کام کا تم تذکرہ کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو ہمیں خوب اچھی طرح نہا دھو کر لباس تبدیل کرنا چاہیے' اس کے بعد کھانا کھانا چاہیے۔ سونے کا نمبر اس کے بعد آئے گا۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے سفری بیگ کھول لیا۔ اس بیگ میں ہمارے "نائٹ ڈریس" کے علاوہ چند جوڑی دوسرے کپڑے تھے۔ دھنو کی ایک بنارسی ساڑی بھی تھی جس کا رنگ نہایت ہی تیز اور چیختا ہوا سا تھا اور وہ رنگ تھا.....نارنجی!

میں نے بیگ میں سے دھنو کا نائٹ گاؤن اور اپنا سلیپنگ سوٹ نکال کر بستر پر ڈال دیا۔ باتھ روم میں استعمال کے لیے مخصوص چپل باتھ روم کے اندر موجود تھی۔ دھنو خاموشی سے میری یہ کارروائی دیکھتی رہی۔ جب میں نے اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کی جانب دیکھا تو اس نے کہا۔

"وجدان! میں غسل کر کے گاؤن پہن لیتی ہوں مگر کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"وہ کیوں بھئی؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

جب میں نے سہ پہر میں "میر بخش اینڈ کمپنی" پر قابو پا لیا تھا تو گاڑی میں موجود ٹھنڈے پانی اور تازہ پھلوں سے لذتِ کام و دہن کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے اور دھنو نے سیب' سنگترے اور انگور ڈٹ کر کھائے تھے۔ میں نے سوچا' ممکن ہے ابھی دھنو کو بھوک نہ لگی ہو اس لیے وہ کھانے سے انکار

کر رہی ہو۔

اس نے میرے سوال کا جواب دیا "دراصل' بدھ مت کے پیروکار سہ پہر کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔"

"یہ عجیب بات بتائی تم نے" میں نے کہا "وہاں بے پور میں تو تم شام تک بلکہ رات گئے تک کھانا پینا جاری رکھتی تھیں؟"

"وہ سب میں نے اپنے میزبانوں کی خوشی کی خاطر کیا تھا" اس نے بتایا "میں نہیں چاہتی تھی کہ لوگ مجھے عجیب نظر سے دیکھیں۔ وہاں ایک مجبوری تھی۔ تمہارے سامنے نہ تو کوئی مجبوری ہے اور نہ ہی تم سے کسی قسم کا پردہ ہے اس لیے میں نے سوچا ہے آج کے بعد لارڈ بدھا کی تعلیم کا خیال رکھوں گی۔"

میں نے کہا "کھانے پینے کے حوالے سے میں نے یہ بات آج پہلی مرتبہ تمہاری زبان سے سنی ہے ورنہ میں نے بہت سے بدھ مت لوگوں کو اس کی پابندی کرتے نہیں دیکھا۔"

"ہاں' یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو" وہ بولی "دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو' جہاں اس کی پیروی کرنے والے نظر آتے ہیں وہیں اس مذہب کے ماننے والے کچھ ایسے افراد بھی ملیں گے جو اس کے اصولوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہوں گے۔"

میں نے تائیدی انداز میں کہا "تمہاری بات میں وزن ہے دھنو۔ میرا مشاہدہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ چلو' آج تم میرا ساتھ دینے کے لیے کھانا کھا لو۔ کل صبح سے تم اپنا پسندیدہ معمول اپنا لینا۔"

وہ میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے نائٹ گاؤن لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔ میں نے روم سروس سے کہہ کر کھانا کمرے میں ہی منگوا لیا۔ دھنو کے بعد میں نے باتھ لیا پھر ہم دونوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ مجھے تو بہت زور کی بھوک لگی تھی۔ دھنو میرا ساتھ دینے بیٹھی تھی لیکن میری خوشی کی خاطر وہ بھی اچھا خاصا کھا گئی۔

کھانے کے بعد ہم نے چائے پی اور باتیں کرنے لگے۔ ہماری گفتگو میں غالب حصہ سیاہ گاڑی میں ہمارے اغوا سے متعلق تھا۔ دھنو نے کہا۔ "وجدان! مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ وہ سب کچھ ہمارے ساتھ پیش آ چکا ہے۔"

"ہاں' بعض واقعات کا بڑی مشکل سے یقین آتا ہے" میں نے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے' میں نے کوئی خواب دیکھا ہے" وہ آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "دھنو! زندگی میں بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو خواب جیسی لگتی ہیں اور بعض خواب حقیقت کا روپ دھار کر ہمیں گھیرے رہتے ہیں۔"

میں اس وقت چوبی کرسی پر بیٹھا تھا اور دونوں ٹانگیں میں نے بستر پر سیدھی رکھی ہوئی تھیں۔ دھنو ٹیک لگائے بستر پر نیم دراز تھی۔ وہ اچانک سیدھی ہوئی اور میرے پاؤں چھوتے ہوئے بولی۔

"لاؤ' میں تمہارے پاؤں دبا دوں۔ تم تھک گئے ہو گے۔"

میں نے ایک جھٹکے سے پاؤں کھینچ لیے اور کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟"

"بتایا تو ہے' تمہارے پاؤں دبانا چاہتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"تم نے تپتے صحرا میں خوب "مارا ماری" کی ہے" وہ لگاوٹ سے بولی "یقیناً تم بہت تھک گئے ہو گے۔"

میں نے کہا "رات بھر گہری نیند لوں گا تو ساری تھکاوٹ اتر جائے گی۔"

وہ سمجھ گئی کہ میں اس سے ہرگز ہرگز پاؤں نہیں دبواؤں گا۔ سنجیدگی سے بولی۔ "تم رات بھر گہری نیند کس طرح سو سکو گے وجدان!"

"کیوں؟" میں نے الجھی ہوئی نظر سے اسے دیکھا "کیا تم مجھے جگائے رکھنا چاہتی ہو۔"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی "میں کیا جگاؤں گی۔ ایک تہائی رات تو گزر گئی" پھر اس نے وال کلاک کی جانب اشارہ کیا جہاں رات کے دس بج رہے تھے "دو تہائی رات باقی ہے اور تمہاری گفتگو کی جولانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی دور دور تک تمہارے سونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس صورت میں تم رات بھر گہری نیند کیسے سوؤ گے؟"

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا "ہاں' تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے واقعی ابھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ تم سونا چاہو تو سو جاؤ۔

"نیند تو مجھے بھی نہیں آ رہی" وہ شوخی سے بولی "حالاں کہ کمرے میں پہنچتے ہی تھکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ شاید یہ نہانے کی وجہ سے ہوا ہے۔ ایک وجہ یہ چائے بھی ہو سکتی ہے۔ ہم نے جو چائے پی ہے وہ خاصی اسٹرانگ تھی۔"

میں نے کہا "نہانے سے پہلے میں بھی سونے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ چلو کوئی بات نہیں' اگر

غسل اور اسٹرانگ چائے نے ہمیں ہشاش بشاش اور "فریش" کردیا ہے تو جی بھر کر باتیں کرتے ہیں۔ صبح دیر تک سو کر نیند پوری کرلیں گے۔"

دھنو کو یہ تجویز پسند آئی پھر ہمارے درمیان ہمیں پیش آمدہ تازہ ترین حالات کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

دھنو نے کہا۔ "میں سمجھ رہی ہو وجدان! تم نے اس علاقے میں قیام کا فیصلہ کیوں کیا ہے!"

"اگر خود ہی سمجھ رہی ہو تو اچھی بات ہے" میں نے کہا۔ "میں تمہیں سمجھانے کی زحمت سے بچ جاؤں گا۔"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "کیا یہ سب بہت ضروری ہے وجدان؟"

میں جانتا تھا' دھنو بدھ مت تھی۔ اس مذہب میں لڑائی بھڑائی کی سختی سے ممانعت کی جاتی ہے۔ کسی بھی جان دار کو مارنا گناہ عظیم تصور کیا جاتا ہے۔ بعض بدھ بھکشو تو راستہ چلتے ہوئے اپنی راہ کو جھاڑو وغیرہ سے صاف کرتے چلے جاتے ہیں تاکہ کوئی چیونٹی ان کے پاؤں کے نیچے آکر جان نہ گنوا بیٹھے۔ میں دھنو کے مسئلے کو بڑی گہرائی تک سمجھ رہا تھا مگر میری زندگی کی اپنی ایک روش تھی' اپنا ایک مزاج تھا جس میں کسی حتمی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے کہا "دھنو! تم نے اب تک میرے ساتھ رہتے ہوئے یہ جان لیا ہو گا کہ میری زندگی کس ڈھب پر گزر رہی ہے۔ اب تک تو تمہیں ان باتوں کا عادی ہو جانا چاہیے تھا۔"

"میں کوشش تو کرتی رہتی ہوں مگر..." اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے کہا "بس یہ کوشش جاری رکھو۔ انشاء اللہ ایک نہ ایک دن کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔"

وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "دھنو! ہر شخص اپنے مذہب' اپنے عقیدے سے مجبور ہوتا ہے۔ میں تمہاری مجبوری کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن درحقیقت حالات اور دنیا سے نظر چرانے کے مترادف ہے۔ اس دنیا اور دنیا میں بسنے والے لوگوں کی "ڈیمانڈ" کو دیکھنا پڑتا ہے' حالات اور وقت کے تقاضوں کو سمجھنا پڑتا ہے اس لیے انسان اتنا نرم دل بن کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ کبھی نرم' کبھی گرم... ہر رنگ اور انداز کو اپنانا پڑتا ہے۔ یہ تو اپنی بقا کی جنگ ہے۔ اگر آپ کسی موذی کی سرکوبی نہیں کریں گے تو وہ آپ کو شدید ترین نقصان پہنچائے گا۔ میں نے شاؤلن ٹیمپل میں اور باہر بھی بہت سے بدھ بھکشوؤں کو مارشل آرٹس کی تربیت لیتے ہوئے اور ان فنون کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہ "مارشل آرٹس" کیا چیز ہے؟"

میں سانس لینے کے لیے دو پل رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مارشل آرٹس کا سیدھا سیدھا اور واضح مطلب ہے... "جنگی فنون یا فنونِ جنگ"۔ جانتی ہو' جنگ کیا ہوتی ہے اور اس جنگ میں کیا ہوتا ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے دھنو کو دیکھا اور کہا "جنگ دو فریقوں کے درمیان ہونے والی "مار دھاڑ" ہوتی ہے جس میں انسان اپنی زندگی سے ہاتھ دھوتے ہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص کی جان لیتا ہے۔ اس جنگ میں جو شخص حق پر ہوتا ہے اس کے فعل (جنگ) کو سراہا جاتا ہے اور جو شخص ناحق لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد کرتا ہے اس کے فعل (جنگ) کی مذمّت کی جاتی ہے۔ ذرا غور کریں' دونوں فریق ایک ہی عمل (جنگ) سے گزر رہے ہوتے ہیں مگر دونوں کے بارے میں الگ الگ تاثر قائم ہو جاتا ہے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ جنگ کرنا بری بات نہیں بلکہ اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ نے وہ جنگ کس "نیت" سے کی' کسی دوسرے انسان پر ہتھیار کس مقصد سے اٹھایا اور اپنے ہی جیسے کسی انسان کی جان کن حالات میں لی؟"

وہ ایک جذب کے عالم میں مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں نے مزید کہا "بھئی! میرے نزدیک تو سب سے اہم شے "نیت" ہے۔ میں تمہارے مذہب اور عقیدے کے حوالے سے کوئی بحث و مباحثہ یا مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا نقطہ نظر میں نے تم پر واضح کر دیا ہے۔ اگر میرے ساتھ چلنا ہے تو تمہیں ان سب باتوں کی عادت ڈالنا ہو گی اور... تم خود بھی تو مارشل آرٹس سیکھنے کی خواہاں ہو...؟"

"وہ تو میں خود حفاظتی کی خاطر سیکھنا چاہتی ہوں" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

پھر ہمارے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ حائل ہو گیا۔

کافی دیر کے بعد وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی "وجدان! ہم بھی جانے کس قسم کی باتوں میں الجھ گئے۔ تم مجھے اپنی زندگی کی کہانی سناؤ۔ میں تمہارے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ جو مجھے نہیں معلوم' وہ آج تم مجھے بتاؤ گے۔"

اس کی فرمائش پوری کرنے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہ آئی چناں چہ میں اسے اپنی زندگی کے حالات سے آگاہ کرنے لگا۔ اسی قصے کہانی میں رات کے بارہ بج گئے۔ ہم دونوں کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے اور نیند کے خمار سے

پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔

اب مزید جاگتے رہنا اپنی جان اور صحت کے ساتھ عظیم زیادتی کرنے کے مترادف تھا۔ لہٰذا سو جانا ہم پر فرضِ اولین کی طرح عائد ہو گیا تھا۔

میں نے ایک تکیہ اور کمبل نما چادر اٹھا کر چوبی میز کی جانب جاتے ہوئے کہا "دھنو تم آرام سے پھیل کر بستر پر سو جاؤ۔ میں اس میز پر سو جاؤں گا۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی پھر بولی "تم ادھر بستر پر کیوں نہیں سوؤ گے؟"

"بس' وہاں تم اکیلی ہی سو جاؤ" میں نے مبہم سا جواب دیا۔

اس نے پوچھا "مجھ سے ناراض ہو۔"

"نہیں' تم سے خفا ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے" اس نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا "کیا کسی خاص مقصد کے تحت بستر پر سونا نہیں چاہتے؟"

"ہاں' کچھ ایسی ہی بات ہے۔"

"وہ بات مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے' تم جان کر کیا کرو گی" میں نے کہا۔

وہ بولی "میں نے پوچھا' کسی خاص مقصد کے تحت بستر پر سونا نہیں چاہتے تو تم نے "ہاں" میں جواب دیا۔ اب خود ہی کہہ رہے ہو' کوئی خاص یا اہم بات نہیں ہے۔ وجدان! کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں جو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو!"

میں دھنو کو نیلگری کے "مبیّنہ عزائم" کے بارے میں کیا بتاتا! دھنو کیا' میں اس سلسلے میں کسی سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمالیہ کی پراسرار شکتی ایک عجیب و غریب اور رنگین و سنگین چیلنج نما وارننگ دے کر مجھے ایک کڑے امتحان میں ڈال گئی تھی۔ دھنو چوں کہ "تلکو جھیل" والے مشن میں میرے ہم راہ تھی اور "گومپو" کی بدھ عبادت گاہ میں میری سرگرمیوں سے بھی کسی حد تک واقف تھی اس لیے وہ نیلگری کے بارے میں ابتدائی معلومات تو رکھتی تھی مگر اس سلسلے میں وہ خطرناک حد تک نہیں جانتی تھی۔

میں نے دھنو کے شکوے کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم خواہ مخواہ کسی وہم میں نہ پڑو۔ میرا بستر پر نہ سونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ تم اپنے ذہن کو پریشان کرتی پھرو۔"

وہ بولی "ٹھیک ہے' میں اس سلسلے میں اب تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی لیکن اگر تم اس چوبی میز پر بے سکونی کی نیند سوؤ گے تو میں اس آرام دہ بستر پر بے فکری سے نہیں سو سکوں گی۔ مجھے تو محسوس ہو رہا ہے' اس صورتِ حال میں مجھے نیند ہی نہیں آئے گی۔

میں ہرگز بے سکونی میں نہیں رہوں گا" میں نے کہا "میری تربیت اور عملی زندگی بڑے کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے۔ بنکاک میں مہاراج ونگ وانگ پائے کے جمنازیم میں' میں چٹانی بستر پر سوتا رہا ہوں۔ "چٹانی بستر" کا مطلب جانتی ہو؟" وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے خود ہی وضاحت کردی "پتھر کا ننگا فرش اور پتھر ہی کا تکیہ۔ بس یہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ میں تو دو کرسیاں جوڑ کر بھی ان پر مزے کی نیند سو سکتا ہو' میز تو پھر بھی کافی کشادہ ہے۔"

اس نے سمجھ لیا کہ میں نے جو سوچ رکھا ہے اس پر عمل کر کے رہوں گا چناں چہ عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

میں نے میز کے ایک سرے پر تکیہ جمایا اور کمبل اوڑھ کر ٹانگیں پھیلا لیں پھر دھنو کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا' وہ بزدل یا ڈرپوک نہیں تھی۔ اس نے میرے ساتھ رہتے ہوئے بارہا بہادری اور جرات مندی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بنیادی طور پر وہ لڑائی بھڑائی اور خون ریزی کے خلاف تھی اور اس بنیادی سوچ کی وجہ اس کا مذہب تھا۔ بدھ مت میں کسی زندہ چیز کی جان لینا یا اسے ضرر شدید پہنچانا کسی بھی طور جائز نہیں سمجھا جاتا۔ گوتم بدھ برائی کے بدلے میں بھی بھلائی کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ایک رقیق القلب اور ہم درد دل رکھنے والا انسان تھا۔ ظلم' ناانصافی اور تشدد کے خلاف تھا۔ نروان کی تلاش میں گوتم نے تخت و تاج کو پائے حقارت سے ٹھوکر مار دی تھی۔

وہ کپل وستو کے راجا کا بیٹا تھا۔ راج کمار گوتم اگر محل میں رہتا تو اس کی زندگی عیش و آرام سے گزرتی۔ وہ جب تک محل میں رہا' ایسا ہوا بھی۔ مگر جب اس نے محل سے باہر کی تلخ' پرمصائب اور سفاک دنیا کا نظارہ کیا تو اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ اس نے محل کے عیش و سکون کو ٹھوکر ماری اور "سچائی" کی تلاش میں' جنگلوں میں نکل گیا اور اس نے اپنی مطلوبہ سچائی کو پا لیا۔ "سدھارتھ گوتم بدھ" اس نتیجے پر پہنچا کہ انسان کی زندگی دکھوں اور برائیوں سے عبارت ہے۔ ان مصیبتوں اور برائیوں کا سرچشمہ انسان کی "خواہش" ہے۔ انسان کو اگر معلوم ہو جائے کہ کون سی "خواہش" نیک ہے تو وہ برائیوں اور مصیبتوں سے بچ سکتا ہے... اور نیک "خواہش" تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اسے آٹھ چیزوں

کو اختیار کرنا چاہیے۔ نیک خیالات ' نیک ارادہ ' نیک گفتاری' نیک چلن' نیک معاش' نیک عمل ' نیک علم اور نیک تسکین۔ ایسی تسکین۔۔۔ جو دھیان گیان' مراقبے اور تصور سے حاصل ہو اور اپنے اندر بے خودی اور مسرت کا لازوال خزانہ رکھتی ہو۔

گوتم بدھ ایک "عارف" تھا۔۔۔ یعنی سیدھا راستہ تلاش کرنے والا۔ ہندی زبان میں اسے "سدھارتھ" کہا جاتا ہے۔ اس کی تعلیمات میں انسانیت اور انسان کی بھلائی پوشیدہ ہے مگر وہ انسانی فطرت کے عین مطابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ بدھ مت کا آغاز ہندوستان کے شہر بنارس سے سو میل شمال میں واقع ایک قصبے سے ہوا مگر اب یہ ہندوستان میں ناپید ہو چکا ہے البتہ' سری لنکا' تھائی لینڈ' کوریا' جاپان' چائنا' منگولیا اور تبت و نیپال میں اس مذہب کے پیروکار موجود ہیں۔

اس تناظر میں دھنو کی ذہنی کیفیت اور دلی احوال کو بہ خوبی سمجھا جا سکتا تھا کیوں کہ بنیاد طور پر وہ بہرحال "لارڈ بدھا" کی پیروکار تھی۔

پھر میرا ذہن موجودہ حالات کی طرف چلا گیا۔ میں اپنے اس "طلب گار" کے بارے میں سوچنے لگا جو وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے پر مہمان بن کر آیا ہے اور وڈیرے سے اس کا دوستی کا رشتہ ہے۔ یہی سب سوچتے ہوئے جانے کس وقت میں نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ دھنو بستر پر موجود نہیں تھی۔ میں نے اس کی تلاش میں کمرے میں نگاہ دوڑائی تو وہ مجھے اپنے بہت قریب دکھائی دے گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔

دھنو میز کے قریب ہی' پائنتی کی جانب ایک کرسی پر بیٹھی اس طرح سو رہی تھی کہ اس کا سر میرے پاؤں کو چھو رہا تھا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں میرے پاؤں کے اوپر بھی آگئی تھیں۔ وہ اس وقت گہری نیند میں نظر آ رہی تھی۔ جانے کس وقت وہ بستر سے اٹھ کر میرے نزدیک آ گئی تھی!

اس کے چہرے پر معصومیت پوری طرح کھلی ہوئی تھی۔ میں نے بہ آہستگی اپنے پاؤں کو سرکا کر دھنو کی زلفوں کے لمس سے آزاد کیا۔ میں اس کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم وہ جس بے ڈھنگے انداز میں سو رہی تھی وہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اسے جگا کر کہوں' جاؤ بستر پر سو جاؤ۔ پھر میں نے سوچا' یہ تو اس کی نیند توڑنے کے مترادف ہو گا۔

میں چند لمحوں تک شش و پنج میں رہا پھر ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے دھنو کو کرسی سے اٹھا کر بستر پر لٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ سوچتے ہی میں نے کھٹکا کیے بغیر خود کو سمیٹا اور بڑی احتیاط سے میز کے اوپر سے نیچے اتر آیا۔ پھر میں نے دھنو کو کسی نازک آبگینے کے مانند اپنے بازوؤں میں محفوظ کر کے نرم و گداز بستر پر پہنچا دیا۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ دھنو کی کھلی ہوئی آنکھوں کے پیچھے مجھے نیلگری مسکراتی نظر آئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہوں "وجدان! مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟ میں تو آخری سانس تک تمہارے تعاقب میں رہوں گی۔"

میں نے زور سے سر کو جھٹک دیا۔ دھنو نے بوجھل آواز میں پوچھا "کیا ہوا وجدان؟"

"کچھ نہیں" میں بوکھلا گیا پھر کہا "تمہیں کیا ہوا تھا۔ تم اچھا خاصا بستر چھوڑ کر وہاں کرسی پر کیوں سو گئی تھیں؟"

وہ نا آسودہ جماہی لیتے ہوئے بولی "مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو اس کرسی پر جا بیٹھی پھر پتا نہیں' کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔"

"چلو' اب سو جاؤ" میں نے کہا۔

"میں بستر پر اکیلی نہیں سو سکوں گی وجدان۔"

"کیوں؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے" وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا "کس بات کا ڈر لگ رہا ہے' کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔ کمرے میں ایسی تو کوئی شے مجھے نظر نہیں آ رہی!"

"میں نے اپنے ڈر اور خوف کو بیان نہیں کر پا رہی ہوں" وہ عجیب سے' الجھن زدہ انداز میں بولی "تم بھی وہاں میز پر جا کر سو گئے تھے اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

میں نے سوچا' دھنو کو سلانے کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی دینا ہی پڑے گی۔ میں نے اس مصلحت کے تحت کہا "میں اب یہیں بستر کے ایک کونے پر موجود رہوں گا۔ تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔"

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے بستر کی پائنتی پشت گاہ کے ساتھ تکیہ کھڑا کر کے ٹیک لگائی اور نیم دراز ہو گیا پھر میں نے جاگتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی

دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس کا سونے کا ارادہ نظر نہیں آتا تھی۔ وہ بار بار اپنے سر کو چھونے لگتی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کر کہا "اب کیا ہے؟"

"اب ڈر تو نہیں لگ رہا" وہ اپنی فطری معصومیت سے بولی "لیکن ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔"

"کون سا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے بھئی؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "میرے سر میں شدید درد ہونے لگا ہے۔"

اس وقت ہمارے پاس اسپرین یا کوئی بھی درد کش دوا موجود نہیں تھی اور رات کے اس پہر باہر سے منگوانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا جا سکتا تھا۔ میں نے دھنو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارا سر دبا دیتا ہوں' کوئی دوا وغیرہ تو ہے نہیں۔"

"تم وہ کیوں نہیں کرتے!" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"وہ کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ۔۔۔ وہ جو تم نے میرے ٹخنے پر کیا تھا" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"کیا "چی" کی قوت سے سر کے درد میں افاقہ نہیں ہو سکتا؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا" میں نے کہا "لاؤ اپنا سر' میں کچھ کرتا ہوں۔"

پھر میں اٹھ کر بیٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دھڑام سے اس نے اپنا سر میرے پیٹ پر رکھ دیا۔

میں نے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا "دھنو! یہ کیا کر رہی ہو؟"

"جو تم نے کہا' وہی کر رہی ہوں۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک اٹھا۔

"تم نے کہا' لاؤ اپنا سر۔ میں اپنا سر لے آئی۔"

دھنو کی وضاحت پر میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں نے ہتھیار ڈال دیے' پھر اس کے دردِ سر رفع کرنے کے لیے کاکل افشانی کرنے لگا۔ اپنے بدن کی پراسرار حرارت کو اس کے تن میں اتارنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ پرسکون ہو کر آسودگی کی نیند میں ڈوب گئی۔

○☆○

آئندہ روز ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آگیا۔

گزشتہ رات ہم دیر سے سوئے تھے لہٰذا صبح تاخیر سے آنکھ کھلی۔ اس وقت دیوار گیر گھڑی نو بجا رہی تھی۔ گھنٹوں کے حساب سے نیند کے لیے ہمیں مناسب وقت مل گیا تھا اس لیے جب ہم بیدار ہوئے تو ساری تھکن دور ہو چکی تھی۔ جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ غسل نے پوری کر دی۔

ہم نے باری باری ایک طویل باتھ لیا پھر ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد تیار ہو کر ہوٹل سے نکل آئے۔ اس وقت ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ہم ذرا گھوم پھر کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینا چاہتے تھے تاکہ اس اجنبی ماحول سے کچھ مانوسیت پیدا ہو جائے۔ ہم اس ارادے سے باہر نکلے تھے کہ دوپہر کا کھانا کھا کر ہی لوٹیں گے۔ ویسے ہم ہوٹل سے زیادہ دور جانے کا رسک نہیں لے سکتے تھے کیوں کہ میر بخش کی آمد کسی بھی وقت ہو سکتی تھی۔

دھنو نے نارنجی رنگ کی بنارسی ساڑی پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ہیل والی سینڈل تھی۔ میں ڈریس پینٹ اور دھاری دار شرٹ میں ملبوس تھا' پاؤں میں وہی جوگرز تھے۔ دھنو چوں کہ ساڑی کے ساتھ جوگرز استعمال نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے سینڈل پہن لی تھی۔

دھنو کو کسی میک اپ کی ضرورت نہیں تھی۔ قدرت نے بڑی فرصت اور فراغت میں اسے بنایا تھا۔ حسن و جوانی کا خزانہ عنایت کرتے ہوئے بھی دست قدرت نے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس کی ہرنی ایسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کسی کاجل کی محتاج نہیں تھیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو شرمانے والے نازک و گداز ہونٹ قدرتی سرخی سے مزین تھے۔ اس کے سڈول بدن اور طویل قامت پر سج کر ہر لباس اپنی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر لیتا تھا۔ اس کی معصوم صورت میں چھپی شوخی اور شرارت ماحول میں زندگی بھر دیتی تھی اور اس کی مترنم آواز روح میں سرمستی گھول دیتی تھی۔

ہم ٹہلتے ہوئے بس اسٹینڈ کی جانب نکل گئے۔ تھوڑی دیر تک بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے پھر نزدیک ہی ایک معقول سے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑے۔

جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا وہاں موجود ہر شخص گردن گھما کر دھنو کو دیکھ رہا تھا۔ راستے بھر میں یہی کیفیت رہی تھی۔ دھنو تھی ہی ایک قابلِ دید لڑکی۔ وہ ایک ایسا دل خوش کن نظارہ تھی جو دیکھنے والوں کی نظر کو ساکت اور قدموں کو جامد کر دیتا تھا۔

واپسی کے سفر میں مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی ہمارے

تعاقب میں ہو۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا تاہم میرا یہ احساس خالی از علت نہیں تھا۔ جلد ہی ثابت ہو گیا کہ میری چھٹی حس نے مجھے مس گائیڈ نہیں کیا تھا۔

ایک کھلی جیپ دائیں پہلو سے گزر کر ہمارے سامنے سڑک پر رک گئی۔ بریک کی تیز آواز پر ہم نے چونک کر جیپ کی طرف دیکھا۔ جیپ میں تین افراد سوار تھے۔ شکل و صورت سے وہ تینوں چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آ رہے تھے تاہم جلد ہی معلوم ہو گیا ان میں ایک یامین عرف یامی شاہ نامی غنڈا تھا' باقی دونوں اس کے چمچے تھے۔ یامی شاہ جیپ کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈرائیونگ کے فرائض اللہ دتا انجام دے رہا تھا جب کہ پچھلی سیٹ پر براجمان گن بردار شخص کا نام غلام رسول تھا۔

جیپ چوں کہ اچانک روک دی گئی تھی اس لیے ہمارے دو قدم تسلسل میں اسی جانب اٹھ گئے اور ہم عین اس کے قریب پہنچ گئے۔ ہم دونوں پہلو بہ پہلو اس طرح چل رہے تھے کہ دھنو سڑک والی سائڈ پر تھی۔

جیپ میں بیٹھے ہوئے غنڈے یامی شاہ نے ہوس زدہ نظر سے دھنو کو سرتاپا گھورا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! پیدل کیوں چل رہے ہو۔ خود تھک رہے ہو اور ساتھ اس لڑکی کو بھی تھکا رہے ہو۔ گاڑی میں بیٹھ جاؤ' ہم چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "بہت شکریہ' ہم خود ہی چلے جائیں گے۔"

"نہ بابا' اس میں شکریہ کی کون سی بات ہے" یامی شاہ اپنی مونچھوں پر انگشتِ شہادت سے مساج کرتے ہوئے بولا "ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ تم لوگوں کو کہاں جانا ہے۔"

میں نے کہا "ہم نے جہاں بھی جانا ہے' چلے جائیں گے۔"

یامی شاہ نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ وہ اپنی تجربہ کار نگاہ سے مجھے ناپنے تولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سیاہ رنگت والا ایک پستہ قامت شخص تھا۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم اور چہرے پر خباثت' آنکھوں میں کمینگی جھلکتی تھی۔ وہ اپنی وضع قطع اور انداز سے بھی لڑائی بھڑائی کا شوقین لگتا تھا۔ مجھے ان کے قماش کا تو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا تاہم ناموں کے بارے میں بعد میں پتا چلا تھا۔

یامی شاہ جب میرا جائزہ لے چکا تو بولا "اس علاقے کے نہیں لگتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو؟"

"میں تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتا" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے' بابا تم ہمیں جانتے نہیں ہو؟"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔"

"بڑی گرمی ہے تمہارے اندر!" یامی شاہ نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا' پھر دھنو کو تکتے ہوئے بولا "یہ کیوں منہ ٹھار کھڑی ہے سائیں؟"

اس کے ساتھ ہی یامی شاہ نے ایک ایسی حرکت کی جس پر میں ردِعمل ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنی بات کرتے ہی دھنو کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔

میں پھرتی سے آگے بڑھا اور یامی شاہ کے بازو کو کہنی سے پکڑ لیا' منہ سے ایک لفظ ادا کیے بغیر میں نے اس کی کہنی کو اپنے ہاتھ کی جکڑ میں دبانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں چیلنج کرنے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

میرے زور لگانے کے جواب میں وہ بھی زور آزمائی کرنے لگا جس کے نتیجے میں دھنو کا بازو دبنے لگا۔ میں نے دھنو کو تکلیف سے بچانے اور یامی شاہ کو تکلیف میں مبتلا کرنے کی خاطر ایک فوری ایکشن لیا۔ میں نے یامی شاہ کو اچانک چھوڑتے ہوئے' اسی ہاتھ کا ایک میڈیم پنچ اس کے منہ پر جڑ دیا۔

دھنو کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ ڈرائیور سے جا ٹکرایا۔ اس کے چہرے پر مجھے تکلیف کے آثار نظر آئے۔ یامی شاہ نے اپنے ہاتھ سے فوراً چھو کر دیکھا اور جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس کا بالائی ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے رستے ہوئے ہونٹ کو صاف کیا پھر ایک مخصوص انداز میں ڈرائیور اللہ دتا کی طرف دیکھا۔

اللہ دتا ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر جیپ سے باہر آ گیا۔ دھنو نے جب صورتِ حال کی سنگینی کو محسوس کیا تو میرا بازو دباتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں بولا "وجدان! ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ خواہ مخواہ کسی پھڈے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ تو اب آسانی سے نہیں جان چھوڑیں گے" میں نے دھنو کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا "ان کے تیور میرے ہاتھ پاؤں میں سنسنی دوڑا رہے ہیں۔ انہیں شرافت کا ابتدائی قاعدہ پڑھانا ہی پڑے گا۔"

میری بات ابھی ختم ہوئی بھی نہیں تھی کہ اللہ دتا نامی غنڈے نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے سیدھے سادے انداز میں آگے بڑھ کر' اپنے گھونسے سے میرے چہرے کا نشانہ لینے کی کوشش کی تھی۔

میں نے کمر کی لچک کا استعمال کرتے ہوئے اپنے چہرے کو انتہائی پیچھے ہٹا لیا۔ ردِعمل کے طور پر وہ اپنی ہی جھونک میں سیدھا مجھ پر آ رہا۔ میں اس صورتِ حال کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ میں نے پہلو میں سرکتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

نتائج حسبِ توقع برآمد ہوئے۔ اللہ دتا منہ کے بل' لہراتا ہوا جیپ کے بونٹ سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ بلند ہوئی جس کی صدا نے یامی شاہ کو جیپ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اس دوران میں اللہ دتا اپنے چہرے کو ٹٹولتا ہوا سیدھا ہو چکا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا اور بڑے جوش و خروش سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے جھکائی دے کر اس کے پیٹ میں ایک نپی تلی سائڈ کک جڑ دی۔ وہ اچھل کر پیچھے کی جانب گیا اور یامی شاہ سے ٹکرا گیا۔

یامی شاہ نے جھنجلاہٹ کے عالم میں اللہ دتا کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ مارا پھر خوں خوار انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں انتقام نما نفرت کی چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہماری تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے لہٰذا اس تماشے کو ختم کرو' اور ہمیں جانے دو۔"

"دشمنی تو اب پیدا ہو گئی ہے بابا" وہ تیز نظر سے مجھے گھور رہا تھا "یہ تماشا آسانی سے ختم نہیں ہو گا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" میں نے اس کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ دھنو کی جانب جو میری پشت پر کھڑی تھی' اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"کیوں' کیا یہ تمہاری بچھڑی ہوئی کوئی رشتے دار ہے جس کی تلاش میں تم دردر کی خاک چھانتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو یا پھر تم نے اچانک اسے بہن بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

وہ میرے لہجے کی کاٹ سے تلملا کر رہ گیا' بولا "لگتا ہے' شرافت سے لڑکی ہمارے حوالے نہیں کرو گے؟"

"جس شرافت کا مظاہرہ تم کر رہے ہو اس کی دل کھول کر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"

ہونٹ خاصا متورم ہو چکا تھا مگر ذہن کی خباثت اور آنکھوں کی بے حیائی میں فرق نہیں آیا تھا۔

میں نے کہا "تمہارا یہ ناپاک خواب تو مرنے کے بعد بھی پورا نہیں ہو گا۔"

"مرو گے تم!" وہ سلگ اٹھا۔ "اور یہیں سب کے سامنے مرو گے۔"

وہ ایک چلتی ہوئی سڑک تھی۔ ہمیں آپس میں الجھتے ہوئے دیکھ کر بہت سے افراد رک گئے تھے اور دلچسپی سے "تماشا" دیکھ رہے تھے۔ تاہم ان کے "موڈ" سے لگتا تھا کہ اگر وہاں کوئی واقعی مر مرا گیا تو بھی وہ مداخلت یا بیچ بچاؤ نہیں کریں گے۔

میں نے اتمامِ حجت کے طور پر یامی شاہ سے کہا "اچھی طرح سوچ لو۔ اگر ایک مرتبہ یہ میدان جم گیا تو پھر سراسر نقصان ہی ہو گا!"

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے اچھل کر آگے بڑھا اور اپنے بازوؤں کے حلقے میں مجھے جکڑ لیا۔ اس کے بازوؤں میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی تھی جس کا وہ بھرپور استعمال بھی کر رہا تھا۔ میں اس کے اس فوری عمل کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے اس کے دام میں آ گیا۔ اب "جواب" لازم ہو گیا تھا۔ یامی شاہ کی غنڈا گردی زبانی کلامی قابو میں آنے والی نہیں تھی۔

میرے دونوں بازو' اس کی بانہوں کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور وہ اپنے بدن کی پوری قوت سے میرا کچومر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے خاصا کم تھا اس لیے اس کی زور آزمائی کا نشانہ صرف اور صرف میرا پیٹ ہی بن رہا تھا۔ میں نے سڑک چھاپ غنڈوں سے نمٹتے ہوئے حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ کوئی خطرناک "اٹیک" کیے بغیر ہی کام چلایا جائے اس صورت میں' میں "سیلف ڈیفنس" اور "جوڈو" وغیرہ کی ٹیکنیک کا زیادہ استعمال کرتا تھا۔ یہاں بھی میں نے یہی حکمتِ عملی اپنا رکھی تھی۔

میں نے فوراً اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا' نتیجے میں یامی کی گرفت میرے بازوؤں پر کم زور ہو گئی۔ میں ایک جھٹکے سے زمین پر بیٹھا اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ اٹھک بیٹھک میں نے بجلی کی سی سرعت سے لگائی تھی اور یامی کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ وہ حیران نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت کو دوچند کرنے کے لیے اس کے پھیلے ہوئے چٹانی سینے پر "ہینڈ پش" کا بوسہ دیا۔ یہ ایک اوپن ڈبل ہینڈ پش تھا جس کی حقیقت کو صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں جو اسے استعمال میں

لاتے ہوں یا پھر وہ لوگ جنھوں نے اس کا "مزہ" چکھا ہو!

یامی شاہ کے قدم اکھڑ گئے اور وہ چار فٹ پیچھے سڑک کے عین بیچ میں جا گرا۔ اس ذلت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کا غضب آسمان کو چھونے لگا۔ وہ اپنے لباس کو سنبھالتے ہوئے اٹھا اور پھنکار کر میری جانب بڑھا۔

اس نے کسی ارنا بھینسے کی طرح اپنے سر سے ایک زور دار ٹکر میرے پیٹ میں رسید کرنا چاہی' میں اپنے قدموں پر فضا میں اچھلا اور چھے فٹ کی بلندی کو چھو کر واپس زمین پر آگیا۔ اس دوران میں یامی شاہ میرے نیچے سے گزر کر اپنی جیپ کو "سلامی" دے چکا تھا۔ ٹکر مارتے ہوئے اس کا چہرہ چوں کہ زمین کی طرف جھکا ہوا تھا اس لیے اپنی جھونک میں اس کی کھوپڑی ایک زوردار آواز پیدا کرتے ہوئے جیپ سے ٹکرائی تھی۔

چوٹ کھا کر یامی شاہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی مانند ڈکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ اپنے "گرو" کی یہ "عزت" افزائی اس کے چیلوں سے دیکھی نہ گئی اور وہ وفاداری کے جوش میں مجھ پر پل پڑے۔

ڈرائیور اللہ دتا میرے ہاتھوں پہلے ہی خاصی ہزیمت اٹھا چکا تھا لیکن یامی شاہ کا حقِ نمک ادا کرنا بھی ضروری تھا تاہم وہ غلام رسول سے چند قدم پیچھے تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے قریب آنے سے کترا رہا تھا۔

غلام رسول نے کلاشنکوف کو نال کی جانب سے تھام کر کسی لٹھ کی طرح اسے میرے سر پر آزمانا چاہا۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔ میں نے بائیں بازو سے "فیس بلاکنگ" کی میرے بازو کا بیرونی حصہ غلام رسول کی کلائیوں سے ٹکرایا اور کلاشنکوف میرے سر کو چھونے سے پہلے ہی اس طرح ہوا میں معلق ہو گئی جیسے کسی جادوئی بٹن کے ذریعے اسے رکنے کے احکام مل گئے ہوں۔

میں بلاکنگ کی خاطر ایک اسٹیپ اندر آ چکا تھا چناں چہ بلاکنگ کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے ایک دھواں دھار گھونسا غلام رسول کی ناک پر رسید کر دیا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے دھنو کے قدموں میں جا گری۔

دھنو نے پہلی فرصت میں اس مہلک ہتھیار پر قبضہ کر لیا تاہم میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر واضح کر دیا کہ وہ ہلاکت خیز آتشیں ہتھیار کو استعمال کر کے کسی حماقت کا ثبوت دینے کی کوشش نہ کرے۔ ان مقامی غنڈوں کے لیے خالی ہاتھ پاؤں ہی کافی تھے۔ دھنو نے میرا بصری پیغام ریسو کر لیا۔

غلام رسول میرا فولادی پنچ کھا کر زمین پر گرا خاک چاٹ رہا تھا۔ ماں باپ نے کتنے چاؤ سے اس کا نام "غلام رسول" رکھا ہو گا لیکن اس بد قماش نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی پر یامی کی چاکری کو ترجیح دی تھی۔ اس نے اس کی بدبختی پر مہر ثبت کر دی تھی۔ اب خاک ہی اس کا نصیب تھی۔ اسے زندگی بھر خاک چاٹنا تھی اور خاک ہو کر' خاک اوڑھ کر سو جانا تھا۔

جس دوران میں میری نظر غلام رسول پر جمی ہوئی تھی اللہ دتا نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے پیچھے سے "جپھا" ڈال دیا مگر اس سے پہلے کہ وہ زور آزمائی شروع کرتا میں نے کمر کو دائیں پہلو پر ٹوسٹ کیا اور میری ایلبو (کہنی) کسی نوک دار ہتھوڑی کی مانند اس کے گال پر پڑی۔ میری کمر پر اس کے بازوؤں کے حلقے کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی میں نے یہ عمل بائیں پہلو پر جھک کر دائیں کہنی سے دہرایا۔ اللہ دتا اپنے چہرے کو تھام کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا منہ پہلے ہی جیپ کے بونٹ سے ٹکرا کر خاصی تواضع کرا چکا تھا۔ پھر اس کے پیٹ میں لگنے والی سائڈ کک کے اثرات بھی ابھی باقی تھے۔

میں اللہ دتا کو چھوڑ کر غلام رسول کی جانب متوجہ ہو گیا وہ زمین سے اٹھنے کے بعد میرے قریب پہنچ چکا تھا اور حملہ آور ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی طرف بڑھتی ہوئی اس کی ٹانگ کو پاؤں سے پکڑ لیا پھر ایک زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اسے دائیں جانب گھما دیا۔ وہ پھرکی کی طرح گھوم کھا کر دور جا گرا۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ یامی شاہ کوئی خطرناک چال چلنے کا ارادہ رکھتا ہے میں نے اسے دھنو کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یقیناً وہ دھنو کو اپنی گرفت میں لا کر مجھے کمزور بنانا چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمبا اسٹیپ لیا پھر "بیک فلیک" لگاتے ہوئے ہوا میں اچھلا اور "بیک سمر سالٹ" کرتے ہوئے یامی شاہ کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر حیرت سے میرا چہرہ تکنے لگا۔

میں نے اس کی حیرت کو توڑنے کے لیے بہ آسانی دائیں بازو کی لپیٹ میں اس کی گردن کو جکڑ کر نیچے کی طرف جھکایا اور دائیں پاؤں کی ایڑی اس کے زمین کی طرف جھکے چہرے پر رسید کر دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی گردن کو گرفت میں لیے ہوئے میں نے اپنے بازو کو "بیک رول" کیا اور یامی شاہ کو اٹھاتے ہوئے پیچھے "تھرو" کر دیا۔

فضا میں وہ ایک مرتبہ پھر کرب ناک انداز میں چیخ اٹھا۔ وہ سیدھا جا کر اپنی ہی جیپ کی آہنی باڈی سے ٹکرایا تھا اور اس بار چوٹ اس کی کمر پر آئی تھی۔

میں یامی شاہ کے حواریوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ لڑتے پڑتے خود کو سمیٹتے سنبھالتے میرے سر پر پہنچ گئے تھے۔ اس مرتبہ میں نے ان کے ساتھ کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا اور انھیں اپنے کھلے ہاتھ و پاؤں کی ضربات میں نہلا کر رکھ دیا۔ دس منٹ کے اندر ہی وہ دونوں ہانپتے کانپتے زمین بوس ہو گئے تھے۔ اب ان سے کسی قسم کے ضرر رساں ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔

میں ہاتھ جھاڑ کر فارغ ہوا ہی تھا کہ اپنے عقب میں جیپ کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ میں نے آن واحد میں پلٹ کر دیکھا اور میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ جب میں اللہ دتا اور غلام رسول سے نبرد آزما تھا' اس دوران یامی شاہ جیپ میں پہنچ چکا تھا پھر اس کے اندر فطری بزدلی نے اسے وہاں سے سر پر پاؤں (ایکسیلی ریٹر پر پاؤں) رکھ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بزدل انسان نازک موقع پر اپنی جان بچانے کے لیے قیمتی سے قیمتی اور عزیز سے عزیز ترین چیز کو بھی پلک جھپکتے میں قربان کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔ اللہ دتا اور غلام رسول تو اس کے گماشتے تھے۔ وہ اگر انھیں میرے رحم و کرم پر چھوڑ گیا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔

دھنو کلاشنکوف سمیت میرے قریب آ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے گن لے کر اسے ان لوڈ کیا اور خالی ہتھیار کو واپس ان دو "خاک نشینوں" پر پھینک دیا پھر ہم وہاں رکے بغیر واپس اپنے ہوٹل آ گئے وہاں پر موجود لوگوں نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

جب ہم اپنے کمرے میں پہنچے تو دن کے دو بجے تھے۔ میں نے کمرے کو اندر سے لاک کر دیا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ کر اس واقعے پر گفتگو کرنے لگے۔

دھنو نے کہا "جو کچھ بھی ہوا ہے' ٹھیک نہیں ہوا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو" میں نے تائید کی "مگر یہ سب کچھ بہ حالت مجبوری کرنا پڑا ہے۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے تمھارے ساتھ کوئی زیادتی ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا۔"

وہ الجھتے ہوئے انداز میں سر کو جھٹکتے ہوئے بولی "ہم ایک اجنبی جگہ پر ہیں اور ہمارے حالات اس بات کی اجازت

مشہور ترین چور رنگ ڈیلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے۔
ان حیرت انگیز چوریوں کی کہانیاں جو وقتاً فوقتاً ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔
[illegible] شکل میں دستیاب ہیں

وہ دلچسپ کہانیاں جن کو آپ بار بار پڑھیں گے اور لطف اندوز ہوں گے
قیمت فی حصہ -/60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
دونوں حصے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ -/25 روپے
رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیں
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 6802652-6806313 فیکس: 6802551
kitabiat1970@yahoo.com

نہیں دیتے کہ ہم لوگوں سے الجھتے پھریں اور اس طرح زیادہ سے زیادہ افراد کی نظروں میں آجائیں۔ تم نے دیکھا' وہاں سڑک پر کتنے زیادہ افراد جمع ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ بہت جلد گردو پیش میں گشت کرنے لگے گا۔ لوگوں کی زبانوں کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہمارے لیے عن قریب کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے!"

دھنو کی تشویش بجا تھی۔ یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ آج جس نوجوان شخص نے یامی شاہ جیسے بدمعاش کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا وہ کہاں اور کون سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ یہ خاصی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر دھنو نے کہا "وجدان' ہمیں پہلی فرصت میں اپنا ٹھکانا بدل لینا چاہیے۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے لیکن سرِدست یہ ممکن نہیں۔"

"کیوں ممکن نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یوں سمجھ کہ فی الحال ایسا کرنا مناسب نہیں" میں نے کہا۔

وہ بولی "یہی تو پوچھ رہی ہوں۔ مناسب یا ممکن کیوں نہیں؟"

میں نے جواب دیا "ہم یہاں میر بخش کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک وہ ہم سے رابطہ نہیں کر لیتا' یہ جگہ چھوڑی نہیں جا سکتی.... اور تم جانتی ہو' میر بخش سے میری ملاقات کتنی اہم ہے؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں' یہ تو بات ہے" پھر ایک طویل سانس لینے کے بعد اضافہ کیا "دراصل حالات کی افراتفری نے میرے ذہن کو اس طرف سے غافل کر دیا تھا۔"

ہم اس تازہ ترین صورتِ حال پر غور کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھنو نے کہا۔

"وجدان! میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا ہے۔"

اس کے لہجے کی مضبوطی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا "کس قسم کا اہم فیصلہ؟"

وہ بولی "میں جلد از جلد تم سے مارشل آرٹس سیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اپنی حفاظت کے لیے؟" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ میرے سوال کی گہرائی میں پہنچتے ہوئے بولی "خود حفاظتی کے لیے بھی اور سامنے والے کو مزہ چکھانے کے لیے بھی۔"

"اور.... وہ تمہارا نظریہ.... برائی کے بدلے میں بھلائی کرنے اور ظلم سہہ کر خاموش رہنے کا نظریہ کیا ہوا؟" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

"اب چھوڑو نا' ان باتوں کو" وہ عجیب سے انداز میں بولی۔

مجھے اس کے لہجے سے پہلی مرتبہ سرکشی جھلکتی دکھائی دی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سڑک پر پیش آنے والے واقعے نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ میرا خیال تھا' یہ تحریک سبب پیدا ہوئی تھی اس کے اندر۔ میں نے اس نازک موقع پر اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا اور عام سے انداز میں کہا "ٹھیک ہے' جیسے تمہاری خوشی میں نے تو پہلے بھی انکار نہیں کیا تھا اور اب بھی جی جان سے تمہیں فنونِ ضرب و حرب سکھانے کے لیے تیار ہوں۔"

وہ گمبھیرانہ انداز میں گویا ہوئی "وجدان! میں نے سن رکھا ہے' اگر روم میں رہنا ہے تو وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔" پھر وہ میری آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے بولی "میرا روم (ROME) تو تم ہو وجدان! میں تمہارے روم میں رہنا چاہتی ہوں.... اس لیے مجھے وہی کرنا ہے جو تمہیں پسند ہے اور جو تم کرتے ہو" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بڑے مضبوط لہجے میں اضافہ کیا "لہٰذا مارشل آرٹس تو اب مسٹ ہے!"

"مجھے تمہارے اس فیصلے سے خوشی ہوئی ہے" دھنو نے کہا۔

"اسی خوشی میں ملاؤ ہاتھ" وہ اپنا نرم و ملائم دودھیا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

میں نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دھنو کے ہاتھ کا گداز میرے احساس کو گدگدانے لگا۔ اس لطیف لمس نے میرے وجود میں جگنو بھر دیے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں نادیدہ لفظوں میں لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ اس کی جھیل سی آنکھوں میں میرے لیے محبت کی طغیانی تھی۔ محبت جو دبے قدموں انسان کے اندر اتر آتی ہے اور احساس کو پھول کی طرح کومل اور خوش بو کی طرح معطر کر دیتی ہے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں دھنو کی آنکھوں میں نہیں بلکہ نیلگری کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوں۔ اس احساس نے مجھے چوکنا کر دیا۔ ایک طویل جست بھر کر میں اس کے سحر سے باہر آیا اور حتمی لہجے میں کہا۔

"دھنو! آج کے بعد تم ساحل ہو۔"

"ساحل.... کیا مطلب؟" وہ اس اچانک جملے سے الجھ گئی۔

میں نے کہا "ساحل کا مطلب ہے' سمندر کا کنارا.... یعنی کوسٹ.... سی کوسٹ۔"

"وہ تو میں سمجھتی ہوں" وہ جلدی سے بولی "لیکن تمہارا یہ کہنا کہ آج کے بعد میں ساحل ہوں.... کیا معنی رکھتا ہے؟"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں نے تم سے کہا تھا نا' تمہارا یہ نام "دھنو" تم پر بجتا نہیں۔ میں نے کہا تھا کہ تمہارا نام بدل دوں گا اور تم نے مجھے اس کی اجازت بھی دے دی تھی۔"

"اوہ! اب سمجھی" وہ اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "تو دھنو! میں نے ابھی اسی وقت تمہارا نام "ساحل" رکھ دیا ہے۔ آج کے بعد تم ساحل ہو۔ کہو' یہ نام تمہیں کیسا لگا؟"

"تم نے تجویز کیا ہے اس لیے بہت اچھا ہے۔"

"اور ویسے؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"ویسے بھی لفظ "ساحل" اپنے اندر وسیع معانی رکھتا ہے" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے ہر لحاظ سے یہ نام پسند آیا ہے۔ اور خوشی اس بات کی ہے کہ یہ نام تم نے رکھا ہے۔"

"تھینک یو ساحل" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی فطری شوخی سے بولی "شکریہ کس بات کا وجدان! یہ فلسفہ تو تم نے ہی مجھے پڑھایا ہے کہ دوستی میں "تھینک یو" کو کبھی جگہ نہیں دینا چاہیے۔"

میں اس شرارت کی پڑیا کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے حالاتِ حاضرہ کی طرف آتے ہوئے پوچھا "وجدان! تم نے پھر کیا فیصلہ کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں ساحل کو کوئی مناسب سا جواب دیتا' دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ہم دونوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ "کون ہو سکتا ہے؟" ساحل نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

"یہ تو دروازے پر جا کر ہی معلوم ہو گا" میں نے یہ کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔

وہ سنجیدگی سے بولی "ذرا احتیاط سے وجدان۔"

میں نے بند دروازے کے قریب پہنچ کر بہ آوازِ بلند پوچھا "کون ہے؟"

آواز اونچی تھی اس لیے باہر پہنچ گئی۔ دوسری جانب سے جو جواب ملا وہ اطمینان بخش تھا۔ میں نے میر بخش کی آواز کو پہچانتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

جب وہ کمرے کے اندر آ گیا تو میں نے دروازہ بند کر دیا اور ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ساحل اس دوران میں بیڈ پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ میں میر بخش کی رپورٹ سننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے میرے استفسار پر مختصر مگر جامع الفاظ میں وہاں پیش آنے والے حالات کے بارے میں بتا دیا۔

میر بخش کے مطابق' وڈیرا اکبر سومرو اور اس کے مہمان دوست نے اس کی کہانی پر یقین کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے منسوب جادوئی چکر پر ایمان لے آئے تھے تاہم وہ میری تلاش سے دست کش نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے جہاں جہاں میرے پائے جانے کے امکانات موجود تھے' اپنے آدمی پھیلا دیے تھے اور بڑی سرگرمی سے مجھے ڈھونڈا جا رہا تھا۔ یہ تمام ردِعمل میری توقع کے خلاف اور تشویش ناک تھا۔

"سائیں! اللہ سائیں کا شکر ہے' وڈیرے کو میری کسی بات پر شک نہیں ہوا" وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"کیا تم اس بات سے مطمئن ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں سائیں"

جواب دینے کے بعد اس نے میرے چہرے کی گمبھیرتا کو دیکھا اور پوچھا "کیوں سائیں' کوئی گڑبڑ ہو گئی کیا۔ آپ تو مطمئن نظر نہیں آ رہے ہو!"

"کوئی گڑبڑ اگر ہوئی نہیں تو عن قریب ہو جائے گی" میں نے سنجیدگی سے کہا "اور جہاں تک میرا تعلق ہے' میں واقعی مطمئن نہیں ہوں۔"

"سائیں! آپ تو عجیب بات کر رہے ہو!" وہ الجھ گیا۔

میں نے کہا "میر بخش! تمہارے وڈیرے سائیں کا ردِعمل قدرتی نہیں ہے۔ مجھے اس کے پیچھے کسی گہری سازش کے آثار نظر آ رہے ہیں۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کیسی سازش سائیں؟"

میں نے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا "میر بخش! یہاں آتے ہوئے تم نے پوری احتیاط سے کام لیا ہے نا؟"

"جی سائیں' میں پورے راستے چوکس رہا ہوں" وہ بڑے وثوق سے بولا۔

کہیں تمہارا خفیہ تعاقب تو نہیں کیا گیا؟" میں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

وہ ٹھوس لہجے میں بولا "نہیں سائیں' میں نے اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی ہوٹل میں قدم رکھا ہے۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ۔"

میں میر بخش کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے قدرے مطمئن ہو گیا پھر اس سے پوچھا "کیا تم کسی یامی شاہ نامی بدمعاش کو جانتے ہو؟"

وہ چونک اٹھا "ہاں سائیں' اچھی طرح جانتا ہوں"

"کون ہے وہ شخص؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

میر بخش نے بتایا "یامی شاہ یہاں کا بہت بڑا بدمعاش ہے۔ وڈیرا اکبر سومرو سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ وہ کئی مرتبہ وڈیرے کے بنگلے پر جا چکا ہے۔ وہاں میں اس سے مل بھی چکا ہوں" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "لیکن سائیں! آپ یامی شاہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"آج دوپہر میں ہمارا "آمنا سامنا" ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ دتا اور غلام رسول نامی دو افراد بھی تھے۔ میں نے ان تینوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا۔ یامی شاہ اپنے چیلوں کو پٹتا چھوڑ کر جیپ میں فرار ہو گیا۔"

"اوہ! وہ متاسفانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اس دنگا فساد کی نوبت کیوں آئی سائیں؟"

میں نے بتایا "یامی شاہ نے میری ساتھی ساحل سے دست درازی کی کوشش کی تھی مجبوراً مجھے اس کی کوشش ناکامیاب بنانا پڑی۔ اسی پر بات بڑھ گئی اور پھر میدان کارزار گرم ہو گیا۔

میر بخش نے بیڈ پر دراز ساحل کو دیکھا اور الجھے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا "سائیں آپ کی ساتھی کا نام تو دھنو..."

"ہاں' یہ نام تھا اس کا کبھی" میں نے میر بخش کی بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے قطع کلامی کی اور کہا "اب یہ ساحل ہے... صرف ساحل"

وہ اس تبدیلیٔ نام پر کوئی تبصرہ کیے بغیر بولا "سائیں! جو واقعہ آپ نے بتایا ہے' وہ نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے' بنگلے پر آمد و شد کی وجہ سے یامی شاہ بھی وڈیرے کے دوست اور اس کے مشن سے آگاہ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے' کہیں اس نے آپ کو پہچان نہ لیا ہو۔"

"مجھے تو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوا" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میر بخش نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں کہا "سائیں! آپ کو فوری طور پر یہ ہوٹل چھوڑ دینا چاہیے۔"

"ہم بھی یہی سوچ رہے تھے" ساحل نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "بس تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے" پھر وہ بستر سے اٹھ کر ہمارے قریب آ گئی۔

میں نے سفری بیگ کو سمیٹتے ہوئے کہا "میر بخش! تمہارا انتظار تو اب باقی نہیں رہا۔ ہمیں جلد از جلد ٹھکانہ بدل لینا چاہیے۔

میر بخش بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت دروازے پر تیز دستک سنائی دی۔ یہ دستک ایک گھنٹا پہلے میر بخش کی آمد پر ہونے والی دستک سے قطعاً مختلف تھی۔

ہم تینوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمارے ذہنوں میں اس وقت کوئی نہ کوئی سنسناتا ہوا سوال ضرور موجود تھا جس کا مفہوم ایک ہی معنی دیتا تھا کہ ... کون ہو سکتا ہے؟

یہی بات میر بخش کی زبان سے پھسل گئی "سائیں! یہ کون آ گیا؟"

"ہم تمہارے باپ ہیں! باہر سے ایک دہاڑتی ہوئی آواز اندر پہنچی۔

"اگر تم نے دس سیکنڈ کے اندر دروازہ نہ کھولا تو اسی بے ہودگی سے ہم دروازہ توڑ کر اندر آ جائیں گے" اسی گرجدار آواز میں دھمکی دی گئی۔

میں نے دروازے کے بولٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں دروازہ کھول دوں گا۔ تم یہ تو بتاؤ' ہو کون اور یہاں کیوں آئے ہو؟"

"ہمارا تعلق پولیس سے ہے" جواباً بتایا گیا "ہم یہاں کیوں آئے ہیں' یہ بات دروازہ کھلنے پر بتائیں گے۔"

پولیس کا نام سن کر ہم قدرے مطمئن ہو گئے۔ معاملہ ہمارے خدشات سے خاصا مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خوف ناک انداز میں ایک مرتبہ پھر دروازے کو دھڑدھڑاتے' میں نے دروازہ کھول دیا۔

میں ثابت قدمی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اسی دوران میں اسی "معیار" کی ایک دستک مزید دی جا چکی تھی۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں استفسار کیا۔ "کون ہے؟"

میں چکرا کر رہ گیا تھا!

اس مردود کو تو میں نے بدست خود فنا کے گھاٹ اتارا تھا۔ ہمالیہ کی آغوش میں پیش آنے والا وہ خونیں واقعہ میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ میرا حافظہ اس تلخ اور ناقابل تلافی نقصان پہنچانے والے المیے کو کسی بھی صورت رخصت کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس سنسنی آمیز اور ہلاکت خیز معرکے میں اگر میں دارا جیسے معاشرتی ناسور کو جہنم کا ایندھن بنانے میں کامیاب ہوا تھا تو دوسری جانب میری دو عزیز از جان ساتھی عورتوں نے بھی زندگی کی بازی ہاری تھی اور یہ سب کچھ اسی کمینے دارا کا کیا دھرا تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں وہ المناک مناظر میری تصوراتی آنکھ میں گھوم گئے۔ ہمالیہ کے دامن میں 'گنگوتری کے علاقے میں واقع سنگری مندر کی اجاڑ ویران عمارت میں دارا اپنے حواریوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچا تھا۔ ہمارے درمیان ایک کھلی جنگ ہوئی تھی جس میں ہر طرح کا ہتھیار استعمال کیا گیا تھا۔ جانکی اور چترا ریتم کی اندوہناک موت کے بعد مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا اور میں نے اپنا خنجر دستے تک دارا کے سینے میں پیوست کر دیا تھا۔ جب میں نے خنجر کھینچا تو دارا کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹا تھا۔ مجھ پر وحشت سوار تھی اور میں دارا کے جسم کو پے در پے اپنے خنجر کا نشانہ بنا رہا تھا۔ اس کے سینے میں جابجا شگاف پیدا ہو گئے تھے اور اس کا پیٹ بھی کھل گیا تھا۔ کٹے ہوئے پیٹ میں سے آنتوں کا گچھا باہر نکل کر جھول رہا تھا۔ موت دارا سے چند سانسوں کے فاصلے پر کھڑی تھی اور وہ عیار شیطان اس موقع پر بھی ایک چال چل گیا تھا۔ وہ' زخموں سے چور جانکی کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے دو سو فٹ گہرے چٹانی کھڈ میں جا گرا تھا۔ اس کی موت یقینی تھی۔ چھلنی سینے اور چاک شکم کے ساتھ وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

یہ تمام خیالات بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن سے گزرے اور میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ گیا۔ میرے سامنے کھڑا وہ بٹا کٹا دراز قامت شخص ہرگز ہرگز دارا نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی لمحے میرے پہلو میں کھڑے میر بخش کی وحشت بھری سرگوشی نے میرے خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی "وہ جبران سائیں' یہ تو وڈیرا اکبر سومرو کا مہمان دوست ہے"

میر بخش کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اکبر سومرو کا مہمان دوست اور میرا طلب گار وہ شخص انیس بیس کے فرق سے دارا ہی تھا۔ دراز قامت' صحت مند اور مضبوط جسم۔ خال و خط میں دارا سے گہری مشابہت۔ چاق و چوبند اور عقابی نگاہ رکھنے والا۔ اس کی عمر اس وقت لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس نے بلیو جینز پر پولو کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور کھڑے ہونے کے انداز سے لڑائی بھڑائی کا مشاق دکھائی دیتا تھا۔

وہ ہوٹل کے کمرے کے دروازے میں اکیلا نہیں کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ تین افراد اور بھی تھے جو سندھ کے روایتی لباس میں تھے۔ وڈیرے کے مہمان دوست کے دائیں ہاتھ پر یامین عرف یامی شاہ کھڑا معاندانہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ باقی دو افراد میرے لیے نئے تھے جو تھوڑے فاصلے پر پیچھے کھڑے تھے۔ وہ دارا نما آدمی کے ساتھی نظر آتے تھے۔

میر بخش کی سنسنی خیز سرگوشی پر جب میں نے چونک کر اس شخص کو دیکھا تھا تو اس کے لبوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"دماغ کو زیادہ تھکانے کی ضرورت نہیں۔ میں دارا نہیں ہوں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا "تم دارا ہو بھی نہیں ہو سکتے' اس کا مجھے کامل یقین ہے کیونکہ میں نے اس لعین کو اس جگہ بھیج دیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ بہرحال تم بتاؤ' کون ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جبڑوں کی جنبش سے میں نے اندازہ لگایا کہ دارا کے بارے میں میرے اظہار خیال نے اسے سلگا دیا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ وہ دارا کا کوئی بہت ہی قریبی شخص تھا۔ عین ممکن تھا' وہ اس کا جڑواں بھائی ہو۔ دارا سے اس کی عمر قدرے کم تھی۔ اس حساب سے وہ دارا کا چھوٹا بھائی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا ذہن کسی "ہم شکل" کی طرف بھی گیا تاہم میں نے اس خیال کو فی الفور اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ ایسے اتفاقات عام طور پر فکشن فلموں اور کہانیوں میں دیکھنے اور پڑھنے کو ملتے ہیں۔

دروازے میں استادہ قد آور شخص دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھولنے بند کرنے لگا۔ اس عمل کے دوران میں اس کے بازوؤں کے بائی سپس (مچھلیاں) بے قراری سے پھڑکنے لگے۔ وہ کسرتی بدن کا مالک تھا مگر اس میں تحمل کی کمی نظر آتی تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں سانپ کی سی پھنکار

شامل تھی۔

"تم نے دارا کو جہاں پہنچا دیا ہے' میں تمہیں اس سے بھی آگے پھینک کر آؤں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں چوہدری صاحب کے سامنے پیش کرنا ہے۔ پہلے وہ اپنا حساب بے باق کرلیں پھر میری باری آئے گی۔"

میں اس کی بات کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا۔ سوالیہ لہجے میں پوچھا "تم کس چوہدری کا ذکر کررہے ہو۔ میرا اس چوہدری سے کیسا کھاتا چل رہا ہے؟"

"انجان بننے کی کوشش نہ کرو وجدان۔" وہ طیش کے عالم میں بولا "جب میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا کر تمہیں زندہ حالت میں چوہدری صاحب کے قدموں میں ڈالوں گا تو تمہاری ساری لاعلمی دور ہوجائے گی۔"

میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟"

"صرف نام ہی نہیں' میں تمہارا پورا شجرہ بھی گنوا سکتا ہوں۔" وہ زہرخند لہجے میں بولا "تم وجدان علی بن عابد علی بن چوہدری حاکم علی ہو۔ رکھاں والی میں پیدا ہوئے' سنگاپور میں پروان چڑھے' بنکاک اور شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی اور ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں من مانیاں کرتے رہے۔ وہیں تم نے پُرپُرزے نکالے اور خود کو جانے کیا سمجھنے لگے۔"

میں نے مصنوعی حیرت کی اداکاری جاری رکھی اور کہا "تم تو واقعی میری زندگی سے گہری واقفیت رکھتے ہو مگر ابھی تک تم نے اپنا نام نہیں بتایا' نہ ہی یہ وضاحت کی ہے کہ تمہیں کیا دشمنی ہے۔ تم میری تلاش میں یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں تمہاری ماں کا یار ہوں۔" وہ اچانک مغلظات پر اتر آیا "اور تمہاری اس بہن سے عقدِ ثالث کرنے آیا ہوں۔" اپنی بات کے اختتام پر اس نے میری ساتھی ساحل کی جانب اشارہ کیا۔

میں سمجھ گیا' وہ ایسی برافروختہ کرنے والی باتوں سے میرے تحمل میں نقب لگانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے تاؤ دلا کر کسی غلطی کی جانب لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے آگ لگا دینے والے جملوں کے جواب میں نہایت ہی سادہ سے لہجے میں کہا۔

"اگر یہی تمہارا تعارف ہے تو تم نہایت ہی گھٹیا اور ذلیل شخص ہو۔ تم شکل صورت ہی میں نہیں بلکہ سیاہ کاریوں میں بھی دارا کا پرتو ہو۔"

دارا کے ذکر پر وہ تلملا کر رہ گیا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا "اب اپنی گندی زبان پر میرے بھائی کا نام نہ لانا ورنہ ٹانگیں چیر کر بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

اس کا انکشاف میرے اندازے کے عین مطابق تھا۔ وہ دارا کا بھائی ہی تھا۔ یہ تصدیق ہونے کے بعد میں مزید سنجیدہ ہوگیا اور اس کے زخموں پر چاٹ مسالے کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔

"چھوٹے شیطان" میرے انداز.... میں سادگی اور بے پروائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی "اگر تم مجھے کتوں کے آگے ڈال دو گے تو پھر اپنے چوہدری کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے بتایا تھا کہ پہلے تمہارا چوہدری مجھ سے کچھ حساب کتاب کرے گا پھر تمہاری باری آئے گی!"

وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا "بس اسی مجبوری نے میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈال رکھی ہے ورنہ میں تمہیں دن میں تارے نہ دکھا دیتا تو میرا نام بھی تارا نہیں۔"

"تو تمہارا نام تارا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سخت لہجے میں دریافت کیا "تم تینوں شرافت سے ہمارے ساتھ وڈیرا سائیں کے بنگلے پر چلتے ہو یا پہلے تم لوگوں کی کچھ خاطر تواضع کردی جائے۔"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا "تمہارا بھائی بھی ایسی ہی خواہش دل میں رکھتا تھا مگر وہ ہمیشہ مجھ ہی سے "خاطرداری" کرواتا رہا۔ تم ہمیں کسی قسم کی شرافت کے مظاہرے پر مجبور نہ کرو اور خاموشی سے واپس چلے جاؤ۔"

"میں خاموشی سے اور خالی ہاتھ واپس جانے کے لیے نہیں آیا ہوں وجدان۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "میں کافی دنوں سے عمرکوٹ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔ ہمارے آدمیوں نے تمہارے پاکستان آنے کے بارے میں ہمیں پیشگی اطلاع دے دی تھی۔ تم کبھی چوہدری صاحب سے ملے نہیں ہو اس لیے ان کی پہنچ سے آگاہ نہیں ہو۔ جس طرح ہمیں بھائی دارا کے "حالات" کا فوراً پتا چل گیا تھا اسی طرح ہم تمہاری نقل و حمل پر بھی گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے' تمہاری اس ساتھی کا نام دھنو ہے اور اس کا تعلق بدھ مت سے ہے۔"

وہ اپنی دانست میں ان باتوں سے مجھے مرعوب یا متاثر کرنا چاہتا تھا لیکن میں اب وہ پہلے والا بچہ نہیں رہا تھا۔ زمانے کے سرد و گرم نے مجھے پختہ کار بنا دیا تھا۔ دارا کی ماسٹر کاپی "تارا" پر نگاہ پڑتے ہی اور میر بخش کے اس انکشاف

کے بعد کہ وہ وڈیرا سائیں کا مہمان دوست ہے' میں یہی سمجھا تھا کہ وہ شخص یعنی تارا میر بخش کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوگا مگر جب میں نے اس کے دست راست پر یامی شاہ کو دیکھا تو میرا ذہن کسی اور جانب چلا گیا تھا۔ آج دوپہر جب یامی شاہ سے ہماری مٹھ بھیڑ ہوئی تھی تو ایک موقع پر اس نے مجھے میرے اصل نام سے پکار کر کہا تھا۔ "وجدان ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ خوامخواہ کسی پھڈے میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے!"

ازاں بعد میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ یامی شاہ وڈیرا اکبر کے بنگلے پر آتا جاتا رہتا ہے اور وہ وڈیرے کے مہمان کے مشن سے بھی آگاہ ہے۔ ممکن ہے' یامی شاہ ہی نے تارا تک میرے بارے میں اطلاع پہنچائی ہو۔ وہ میرے ہاتھوں بری طرح ذلیل و رسوا ہو کر اپنی جیپ میں موقع واردات سے فرار ہوا تھا۔ اس سے اسی قسم کی حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

یہ تمام خیالات اور امکانی باتیں نہایت ہی سُرعت سے میرے ذہن سے گزر رہی تھیں۔ ظاہری طور پر میں تارا کے دو بدو کھڑا اس سے حریفانہ مکالمت کررہا تھا۔

"تم میرے اور میری ساتھی کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہو' میں اس کی تصدیق یا تردید نہیں کروں گا تارا۔" میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا "مجھے بتاؤ' تمہارا چوہدری مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ وہ میرے فراق میں کیوں گھل رہا ہے۔"

"چوہدری صاحب کا نام ادب سے لو وجدان۔" تارا نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "یہ تم نے کیا "تمہارا چوہدری' تمہارا چوہدری" لگا رکھی ہے۔ چوہدری نوازش علی ہمارے محسن چوہدری صاحب ہیں۔ میں ان کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔"

میں نے ترکی بہ ترکی کہا "وہ میرا نہیں' تمہارا چوہدری ہے۔ اسی لیے میں اسے "تمہارا چوہدری" کہہ رہا ہوں۔ اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "خیر' بتاؤ' چوہدری ملک نوازش علی مجھ سے کیا چاہتا ہے۔"

"وہ تم سے ماضی کا حساب کرنا چاہتے ہیں۔" تارا نے سرد لہجے میں کہا "تم نے اور تمہارے باپ نے ان کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کروڑوں روپے مالیت کے سونے [illegible]

بات ختم کرتے ہوئے اس کا انداز خاصا ترش ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ میرے ذہن پر نقش ہے۔ اگر تمہارا چوہدری مجھ سے کوئی پرانا حساب صاف کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اسی نیت سے پاکستان آیا ہوں۔ چوہدری نوازش علی بھی دشمنی کے کھاتے میں میرا بہت ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ میں اس کے حلق میں انگلی ڈال کر ایک ایک پائی وصول کروں گا۔ میں اپنے والدین کے بہیمانہ قتل کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔" میرا لہجہ جذباتی ہوگیا "یہ ٹھیک ہے' مجھے اور میرے والدین کو در در کی ٹھوکریں کھلانے والا شخص تمہارا بھائی دارا تھا۔ وہی غلیظ انسان میرے والدین کی موت کا سبب بھی بنا مگر وہ تو دشمنی کی بساط کا ایک چھوٹا سا مہرا تھا۔ ان مہروں کی تعداد کم نہیں ہے۔ تم بھی تو ایک ادنیٰ سے مہرے ہی ہو تارا!"

میں نے گھور کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اب تب میں مجھ پر پل پڑے گا۔ خاص طور پر دارا کے ذکر پر اس کے جبڑے بھنچ جاتے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تارا! تم جیسے تمام ناپاک مہروں کو حرکت دینے والا شیطان ملک نوازش علی ابھی زندہ ہے جس نے میرے ماں باپ کو ان کی زمینوں اور گھربار سے بے دخل کیا۔ انہیں گاؤں نہیں' شہر نہیں بلکہ اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں ماضی کے کھاتے میں لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا حساب لے کر پاکستان آیا ہوں... اور میرا پہلا ٹارگٹ چوہدری ملک نوازش علی ہے۔" میں ایک لمحے کو رکا پھر گہری سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا ہوا' تم سے ملاقات ہوگئی۔ تم چوہدری کے گماشتے ہو' اس کے ٹکڑوں پر پلنے والے ایک حقیر کیڑے ہو۔ اس تک میرا پیغام پہنچا دو۔ وہ اپنے اردگرد فولادی دیواریں اٹھوا لے' محافظوں کے مسلح دستے تعینات کردے۔ میں بہت جلد اس کی گردن پر اپنے ناخن جمانے آرہا ہوں۔"

"بند کرو یہ بکواس۔" تارا دہاڑ کر بولا۔ اپنی اور اپنے چوہدری کی شان میں کہے ہوئے میرے الفاظ نے اسے چیخنے پر مجبور کردیا تھا "اگر اب تم نے اپنی زبان سے ایک بھی بے ہودہ لفظ نکالا تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔"

"میری زبان کو گدی ہی سے پیوست رہنے دو اور اپنا راستہ ناپو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "ورنہ میں ہوٹل کے عملے کو بلا کر...."

"ہوٹل کے عملے کو بلاؤ یا مقامی پولیس کو۔" یامی شاہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے پہلی مرتبہ لب کشائی کی "ہم یہاں تمہیں لینے آئے ہیں اور لے کر ہی جائیں گے۔ اب یہ تم پر

منحصر ہے' اپنے قدموں پر چل کر صحیح سلامت جانا چاہو یا پھر...؟"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تارا کی طرف دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ اس نے تارا کے خیالات کی درست ترجمانی کی ہے یا نہیں۔

"یامی شاہ!" میں نے اس کے نحوست مآب سیاہ چہرے پر سلگتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "تمہارے "پھر" کے بعد میں جملہ پورا کرتا ہوں... یا پھر میری طرح ہڈیاں تڑوا کر' دم دبا کر اور پیٹھ دکھا کر موقع سے فرار ہو جاؤ۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ میرے طنزیہ کلمات کو بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ وہ دوپہر کے وقت اپنے دو ساتھیوں کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ کر جس طرح اپنی کھلی جیپ میں فرار ہوا تھا' وہ بزدلی کی ایک عظیم مثال تھی۔ تاہم اس وقت تارا کی موجودگی میں وہ اپنی ہزیمت کو بھول کر خوا مخواہ کی اکڑ دکھا رہا تھا۔

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے وجدان۔" یامی نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "دوپہر کو تمہارا پلڑا بھاری تھا اس وقت ہمارا پلڑا بھاری ہے۔"

"یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ اس وقت تمہارا پلڑا بھاری ہے؟" میں نے تُرش لہجے میں کہا۔

تارا نے کہا "جس پلڑے میں باٹ زیادہ ہوں وہی بھاری ہوتا ہے۔"

"اگر باٹ کھوکھلے ثابت ہو جائیں تو!" میں نے یامی شاہ کی طرف اشاراتی نظر سے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا "میں تمہارے اس باٹ کو تو ٹھوک بجا کر اچھی طرح دیکھ چکا ہوں۔"

میرے اس تبصرے پر یامی شاہ تلملا کر رہ گیا۔ تاہم اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔

تارا نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "زیادہ تقریریں جھاڑنے کا شوق تم بنگلے پر جا کر پورا کر لینا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ چلو' آگے لگو۔ باہر وہی گاڑی تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"وہی گاڑی۔" کے الفاظ پر زور دیتے ہوئے تارا نے میر بخش کی طرف خوں خوار نظر سے دیکھا اور کہا "تم جیسے نمک حرام کا جو حشر وڈیرا سائیں کریں گے اسے دیکھ کر لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے تھے' ہم نے تمہاری بچکانا کہانی پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ بے وقوف انسان! اکبر سومرو کو فوراً شک ہو گیا تھا کہ تم ... سے جا ملے ہو اسی لیے تمہیں آزاد چھوڑ دیا گیا تاکہ ... ذریعے دشمن کا شکار کیا جا سکے۔ ہمیں امید تھی کہ ... فرصت میں اپنے نئے آقا اور ہمارے دشمن سے ملو... ایسا ہی ہوا اور میں تمہاری بے خبری میں تمہارا تعاقب ... ہوئے عمر کوٹ شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ تم نے ... والی ٹریکٹر ٹرالی میں سفر کر کے خود کو محفوظ سمجھ لیا تھا ... تمہیں نہیں معلوم کہ تارا کی آنکھوں میں کتنے کیمرے ... ہیں۔ میں تمہاری دم پر پاؤں جما کر یہاں پہنچا ہوں اور ... تصدیق کے لیے راستے میں مجھے یامی شاہ مل گیا۔ یہ ... سائیں کو وجدان اور اس کی ساتھی دھنو کے بارے ... بتانے جا رہا تھا۔ میں نے کھلی جیپ میں اسے دیکھ کر ... اور جب اس کی بات سنی تو پھر یہاں پہنچنے میں ہم نے ... لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ عمر کوٹ پہنچ کر ہم میر بخش یعنی ... خفیہ تعاقب کرتے ہوئے اس ہوٹل تک پہنچے ہیں۔"

تارا کی وضاحت نے میرے ذہن میں اٹھنے والے ... سے سوالات کے جواب فراہم کر دیے تھے۔ میر بخش ... انکشافات پر انگشت بدنداں تھا۔ تارا خاموش ہوا ... لرزاں لہجے میں بولا۔

"تارا سائیں! آپ بتا رہے ہو کہ وہی گاڑی باہر انتظار کر رہی ہے۔ کیا یہ گاڑی...؟"

تارا نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا "ہاں میر بخش' یہ اسی گاڑی کا ذکر ہے جس میں تم فرضی جادوئی ... کے ساتھ کل رات بنگلے پر پہنچے تھے۔ وہی سیاہ ایمبولینس گاڑی!"

"اوہ!" میر بخش نے متاسفانہ انداز میں کہا "سائیں! اگر آپ اسی گاڑی میں میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں ... تو پھر کیا اس گاڑی نے کوئی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی تھی ... راستے بھر اپنے عقب میں دیکھتا آیا ہوں۔ اگر وہ سیاہ ... گاڑی میرے تعاقب میں ہوتی تو میری نظر میں آئے بغیر ... رہ سکتی تھی۔"

تارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "وہ گاڑی اس ... تمہاری نظر میں نہیں آئی کہ اب وہ سیاہ نہیں بلکہ سرخ ہو گئی ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میر بخش حیرت سے اچھل ... کچھ سوچتے ہوئے بولا "ہاں' ایک سرخ گاڑی کو تو ... وقفے وقفے سے اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی لمبی مونچھوں والا ... شخص بیٹھا تھا۔"

تارا نے اپنے عقب میں کھڑے موٹے تازے میانہ قد ... کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہ وہی شخص ہے جو بڑی ... مونچھیں لگائے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اور ... اس گاڑی کے پچھلے حصے میں تھے۔ نقلی مونچھوں والے ... کا نام موسیٰ ہے اور یہ دوسرا شخص عبداللہ ہے۔ یہ ... افراد تمہارے لیے اجنبی ہیں۔ اس انتخاب کی وجہ بھی ... تمہاری ناواقفیت ہی ہے۔"

میں نے موسیٰ نامی شخص کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے ... باریک مونچھیں نظر آ رہی تھیں۔ یقینی طور پر اس نے نقلی ... سائز مونچھیں اتار دی تھیں اور اب اپنے اصلی حلیے ... میں تھا۔

میر بخش اب حیرت میں غوطہ زن تھا "سائیں! یہ بات ... میں نہیں آ رہی کہ کالی گاڑی سرخ کس طرح بن گئی!"

"جادوئی کمال سے۔" تارا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "تم نے بھی صحرا میں پیش آنے والے ایک "طلسمی ... " کی کہانی ہمیں سنائی تھی۔ ہم نے تم سے کوئی وضاحت نہیں مانگی تھی لیکن اگر تم نہ بھی پوچھو تو میں تمہیں سیاہ گاڑی کے سرخ میں بدلنے کی وجہ ضرور بتاؤں گا۔" تارا نے ایک ... کا توقف دے کر باری باری ہم تینوں کے چہروں کا جائزہ لیا ... میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی "ہم نے عارضی طور پر گاڑی کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے اس کی ... اوپر سرخ کاغذ چسپاں کر دیا ہے۔ یہ کام اتنی مہارت سے ... ہوا ہے کہ پہلی نظر میں اس کارروائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ... دیکھنے والا اسے سرخ گاڑی ہی سمجھتا ہے۔ یہ مجبوری اس ... لیے بھی پیش آ گئی کہ بنگلے پر موجود تمام گاڑیوں کو تم اچھی طرح پہچانتے ہو۔ سرخ رنگ کی بند گاڑی تمہاری نظر میں کسی بھی طور مشکوک نہیں ٹھہر سکتی تھی۔"

"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔" میر بخش نے سہمی ہوئی نظر سے ... دیکھا۔

"برا تو اب ہو گا میر بخش۔" تارا نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "تم یہ بات تو اچھی طرح جانتے ہو گے کہ وڈیرا ... سومرو غداروں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتا ہے۔ ... دردناک عذاب کے لیے خود کو تیار کر لو۔"

اس موقع پر میر بخش نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ... "تارا! تم مجھے وڈیرا سائیں کا ڈراوا مت دو۔ اب میں ... ان کی چاکری میں نہیں ہوں۔ وجدان نے مجھے اپنا دوست ... بنایا ہے۔ اب میرا جینا اور مرنا وجدان کے ساتھ ہے۔ میں ... موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وجدان کا ساتھ دوں گا۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" تارا پھنکارا "جب وجدان کا بخار اترے گا تو وڈیرا سائیں کے خوف سے کپکپاتے پھرو گے اور یہ وجدان..." اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر مجھے حقارت سے دیکھا اور تلخ لہجے میں بولا "میں ابھی تمہاری نظر کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس کے حصول کی خاطر میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ آج بنگلے پر پہنچ کر میں چوہدری صاحب کو فون کروں گا تو وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھیں گے پھر اکبر سومرو کے توسط سے ان دونوں کو لاہور کے نواحی گاؤں "رکھاں والی" پہنچانے کا بندوبست کیا جائے گا اور تم!"

تارا نے میر بخش کو نفرت بھری نظر سے دیکھا اور حتمی لہجے میں بولا "تمہیں بنگلے کے سامنے گردن تک زمین میں گاڑا جائے گا پھر تمہارے چہرے پر شہد مل کر خطرناک موذی مکھیاں تم پر چھوڑ دی جائیں گی جو اپنے سوئیوں سے زیادہ تیز ڈنک بے دریغ تمہارے چہرے کے گوشت میں اتارنا شروع کر دیں گی۔"

میں نے تارا کو منہ توڑ جواب دیتے ہوئے کہا "دھمکی بازی میں تم اپنے بھائی سے کسی بھی طرح کم نہیں ہو مگر میں نے اس بدذات کا جتنا برا انجام کیا تھا' تم اس سے بھی زیادہ عبرت ناک اختتام کو پہنچو گے۔ جب بساط بچھ ہی گئی ہے تو دوبدو مقابلہ ہو گا۔"

"آج پتا چل جائے گا' تم میں کتنا دم ہے!" تارا نے مجھے گہری نظر سے گھورا۔

میں نے چٹانی لہجے میں کہا "میں بھی یہ دیکھنے کے لیے بے قرار تھا کہ تم میں کتنا خم ہے۔ آج میں تمہارے کس بل نکال کر تمہارے ہاتھ میں پکڑا دوں گا۔"

اس دھمکی آمیز گفتگو نے سب سے زیادہ ہراساں ساحل کو کیا تھا۔ وہ سراسیمہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی آنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس ... ان میں ... چار ... اندر داخل ہو چکے تھے۔ عبداللہ نامی شخص نے دروازہ بھی بھیڑ دیا تھا۔ عبداللہ دبلا پتلا اور لمبے قد کا مالک تھا۔ اس نے چھوٹی مگر خاصی دبیز مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کی ناک کے نیچے دو چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں رکھی نظر آتی تھیں۔

"تم میرے کس بل نکالو گے!" تارا تحقیر آمیز انداز میں بولا۔

"کیوں۔" میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا "کیا اس کام کے لیے تم نے کسی اور کو ٹھیکا دے رکھا ہے؟"

وہ میرے کڑوے کسیلے جملوں کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں وجدان۔ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چل پڑو ورنہ مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

میں نے پیش آمدہ صورتِ حال کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تارا! شرافت اور خاموشی کے تمام امکانات تو معدوم ہوچکے ہیں۔ اب جو کچھ بھی ہوگا' ڈنکے کی چوٹ پر ہوگا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم وہ دوسرا طریقہ اختیار کرلو۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے ساحل کو کور کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایک مضبوط اسٹانس بنا کر کھڑا ہوگیا۔ اس موقع پر تارا جیسے لچے ٹچے سے کسی بھی گھٹیا حرکت کی توقع کی جاسکتی تھی۔

تارا نے اچانک ایک ایسی حرکت کی جو مستند طور پر گھٹیا تھی۔ تاہم یہ میری توقع سے کہیں زیادہ پچ تھی۔ کسی بھی مرد' خصوصاً شہ زور کو اس قسم کی ہلکی حرکت زیب نہیں دیتی۔ تارا نے اپنے لباس میں سے اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا ایک پسٹل نکال کر مجھ پر تان لیا پھر یامی شاہ اینڈ کمپنی کو اشارہ کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں دہاڑا۔

"ان دونوں حرام زادوں کو اتنا مارو کہ یہ زندہ رہیں مگر کیچوؤں سے بھی کمتر ہوجائیں۔ ہم انہیں کسمپرسی کی حالت میں بنگلے پر لے کر جائیں گے۔"

"واہ واہ۔" میں نے تالی بجاتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا "تم تو دارا سے بھی گئے گزرے ثابت ہورہے ہو۔ ہم نہتوں پر گن تان کر تم خود کو شہ زور ثابت کرنا چاہتے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایک صحت مند زنخے سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہو۔"

وہ میرے انگارا جملوں سے جل بھن کر سوختہ ہوگیا اور شدید ردِعمل کے طور پر اس نے ساحل کی جانب جست بھری۔

ساحل کو میں نے مکمل اوٹ فراہم کر رکھی تھی۔ لہٰذا اس تک پہنچنے کے لیے تارا کو میرے پاس سے گزرنا تھا۔ میں پہلے ہی فرنٹل ہارس پوزیشن میں اسٹانس بنائے کھڑا تھا۔ میں نے تارا کی جست کے جواب میں ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ کک اس کے سینے پر رسید کردی۔ میری کک میں بے پناہ تھرسٹ تھا۔ تارا ہوا میں بیک ورڈ اچھلا اور پشت کے بل دروازے سے ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ یامی نے بجلی کی سی سرعت سے مذکورہ پستول کمرے کے فرش پر سے اٹھالیا۔

تارا اپنے بڑے بھائی دارا ہی کی طرح قد آور [illegible] کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ میں چھ فٹ دو انچ قد [illegible] تھا۔ وہ کم وبیش میرے برابر ہی تھا تاہم میری بھرپور [illegible] نے اسے تیورا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے سر کو جھٹک کر اپنے حواس بحال کیے [illegible] جانے والی نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ اس دوران میں [illegible] نے حقِ چمچہ گیری ادا کرتے ہوئے پسٹل واپس تارا کو [illegible] اور اس کے اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

میں نے تارا کو مخاطب کرتے ہوئے سمجھانے [illegible] لہجے میں کہا "ہماری آپس میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم اپنے آدمیوں کو کیوں ہاتھ پاؤں سے مجروح کرنا چاہتے ہو؟"

"تم میرے بڑے بھائی کے قاتل ہو۔" وہ غرایا [illegible] دشمنی کسے کہتے ہیں؟"

میں نے کہا "تمہارا بھائی میرے والدین کا قاتل تھا [illegible] کی تباہی و بربادی کا ذمے دار تھا۔ اس نے مجھے [illegible] ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا تھا۔ میرے کئی ساتھی [illegible] مکاری اور عیاری کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سیکڑوں انسانوں [illegible] کا خون اس نے اپنے ہاتھوں پر مل رکھا تھا۔ میں نے [illegible] شیطان کو جہنم رسید کرکے انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان [illegible] ہے اور تم۔"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تارا کی آنکھوں میں [illegible] اور آتشیں لہجے میں کہا "اور تم بھی اگر اپنے مذموم [illegible] سے باز نہ آئے اور میرے کسی ساتھی کا بال بھی بانکا [illegible] سمجھ لینا میں تمہیں بھیانک موت کے حوالے کرنے میں [illegible] لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔"

تارا کی حالت دیدنی تھی۔ اس کا بس چلتا تو مجھے [illegible] ڈالتا۔ اس مرتبہ مجھ پر براہِ راست حملہ کرنے کے بجائے [illegible] نے یامی شاہ اینڈ کمپنی کو تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"اپاہجوں کی طرح کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو [illegible] نے تمہیں اس کی بکواس سننے کے لیے نہیں بلوایا [illegible] اور اس خبیث کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دو۔"

حکمِ حاکم' مرگِ مفاجات کے تحت تارا کے تینوں [illegible] ہماری جانب بڑھے۔ میر بخش اس تیزی سے بدلتی صورتِ حال سے کرنٹ پکڑ چکا تھا۔ وہ مارشل آرٹس [illegible] نہیں تھا تاہم لڑائی بھڑائی کے فن میں طاق تھا۔ وہ [illegible] وقت کسی بھی قسم کے متوقع حملے کے لیے بالکل چاق [illegible] کھڑا تھا۔

میں توقع کررہا تھا کہ یامی شاہ میری طرف آئے لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کترا رہا تھا۔ میں اس کے احتراز کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ دوپہر کو پیٹرول پمپ کے نزدیک عین چلتی ہوئی سڑک پر میں نے اس کی جو گت بنائی تھی' وہ اس کی "یاد" کو ابھی تک اپنے بدن سے "چپکائے" ہوئے تھا۔

یامی شاہ نے میر بخش کا رخ کیا تو موسیٰ اور عبداللہ میری جانب بڑھ آئے۔ میں نے ان کے قدموں کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ بھی دیسی اسٹائل ہی کے لڑاکا تھے لہٰذا میں نے مارشل آرٹس کی مروّجہ تکنیک میں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ عبداللہ دراز قامت اور دبلا پتلا تھا۔ وہ ہوا میں مکا لہراتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے مکے سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے کمر کی لچک کو استعمال کرتے ہوئے چہرے کو لیفٹ جرک دی' عبداللہ کا مکا میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر آگے بڑھ گیا تاہم اس عمل کے دوران میں عبداللہ کا جسم میرے بہت قریب آگیا تھا۔ میں نے اس کی کمر پر ڈبل ہینڈ پس آزمایا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ موسیٰ سے ٹکراتے ہوئے لٹو کی طرح گھوم گیا۔

اسی اثنا میں موسیٰ مجھ پر پل پڑا۔ اس کا قد زیادہ نہیں تھا تاہم جسمانی اعتبار سے وہ خاصا موٹا تازہ اور صحت مند تھا۔ وہ نہایت ہی غصیلے انداز میں اپنے تابڑ توڑ مکوں سے میرے سینے کو نشانہ بنانے لگا۔

میں بیک فٹ پر حرکت کرتے ہوئے اس کے مکوں کو بلاک کرنے لگا۔ اس کوشش میں ایک دو گھونسے میرے جسم پر لگے بھی تاہم وہ زیادہ ضرر رساں ثابت نہیں ہوئے۔ میں نے موسیٰ کی ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے ایک چال چلی۔ حملے کے جوش و خروش میں اس نے اپنی گردن جھکا رکھی تھی جیسا کہ عام طور پر باکسر حضرات دفاعی کھیل کے دوران میں گردن جھکا کر چہرہ چھپا لیتے ہیں تاکہ حریف کے گھونسوں سے محفوظ رہ سکیں۔

یہاں صورت حال قدرے مختلف تھی۔ موسیٰ دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ کھیل کا مظاہرہ کررہا تھا۔ میں نے اس کی کوتاہی نما غلطی سے فائدہ اٹھایا اور ایک "ہیمر پنچ" عین اس کی کھوپڑی کے وسط میں رسید کردیا۔

یہ ایک مخصوص قسم کا مکا ہوتا ہے اور بالکل ایک وزنی ہتھوڑے کے اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ ریڈ برکس اور ٹائلز بریکنگ میں عموماً اس پنچ کی افادیت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے موسیٰ کی کھوپڑی کو نشانہ بناتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اس کا "ناریل" چٹخنے نہ پائے۔ اس احتیاط کے باوجود بھی وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے ایک کربناک چیخ مار کر زمیں بوس ہوگیا۔ شاید میں نے پنچ میں زیادہ توانائی صرف کردی تھی یا پھر موسیٰ ہی کم ہمت واقع ہوا تھا۔ وہ فرش پر پڑا تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔

اس دوران میں میر بخش اور یامی شاہ کے درمیان ایک خوفناک معرکہ جاری تھا۔ وہ دو بے قابو سانڈوں کے مانند ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ بنیادی طور پر وہ سندھ کی روایتی کشتی "ملاکھڑا" کا مظاہرہ کررہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یامی شاہ' میر بخش پر حاوی آرہا تھا۔ یامی شاہ ایک سکہ بند بدمعاش تھا۔ وہ تو میرے مارشل آرٹس اور جمناسٹک نے اس کے حواس مختل کردیے تھے ورنہ وہ کسی سے کم نہیں تھا۔

میں میر بخش کی مدد کو آگے بڑھا تو عبداللہ تاڑ کی طرح میری راہ میں استادہ ہوگیا۔ دبلا پتلا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی لمبا نظر آتا تھا۔ اس مرتبہ عبداللہ نے مجھ پر مکے سے حملہ نہیں کیا بلکہ اپنی ایک بانس ٹانگ کو میرے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے میرے نازک اعضا کو نشانہ بنایا تھا لیکن میں چونکہ اس کی طرف سے غافل نہیں تھا اس لیے میں نے بڑی سرعت سے اوَر بلاکنگ کرتے ہوئے "کراس ہینڈ" پر اس کا وار روکا اور میکانکی انداز میں ایک نپی تلی راؤنڈ ہاؤس کک اس کے چہرے پر جڑ دی۔

عبداللہ اپنے چہرے کو تھامتے ہوئے پیچھے ہٹا اور ایک سسکاری لیتے ہوئے چہرے کو دبانے لگا۔ وہ ٹٹول کر یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ میری کک نے اس کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔ نقصان تو پہنچ چکا تھا' جب اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو وہاں خون موجود تھا۔ اس کا بالائی ہونٹ پھٹ چکا تھا اور وہاں سے بڑی تیزی سے خون رس رہا تھا۔ میں عبداللہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر میر بخش کی جانب بڑھ گیا۔

یامی شاہ نے میر بخش کو زمین پر گرالیا تھا اور اسے بری طرح رگید رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر یامی شاہ کے کالر میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اسے میر بخش کے اوپر سے کھینچ لیا۔ جب یامی شاہ نے گردن سیدھی کرکے صورتِ حال کو جاننے کی کوشش کی تو میں نے ایک فولادی پنچ اس کی ناک پر رسید کردیا۔

اس کی ناک سے لہو جاری ہوگیا۔ شاید اس کا بانسا پھر گیا

تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ میرے دل میں یامی شاہ کے لیے بہت غصہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا اور پسپا کرتے ہوئے دیوار سے لگا دیا۔ دیوار سے پشت ٹکتے ہی وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمیں بوس ہوگیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ بے ہوش ہوگیا ہو۔

اسی لمحے مجھے ساحل کی چیخ سنائی دی۔ میں نے بجلی کی سی رفتار سے مڑ کر دیکھا۔ تارا ساحل کی پشت پر کھڑا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ساحل کے بالوں کو مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی خوفناک نال ساحل کی گردن سے پیوست تھی۔ ساحل یقینی طور پر موت کے دہانے پر کھڑی تھی۔ کسی بھی لمحے اعشاریہ تین آٹھ کی گولی اس کی گردن میں سے گزرتے ہوئے دوسری جانب ایک وسیع شگاف پیدا کرسکتی تھی۔ تارا نے ساحل کو اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ اگر بالفرضِ محال گولی چلانا بھی پڑ جائے تو وہ کلی طور پر محفوظ رہے۔

حالات اچانک سنگین صورت اختیار کرگئے تھے۔ تارا نے گمبھیر لہجے میں مجھے وارننگ دی "وجدان! اگر دھنو کی زندگی تمہیں عزیز ہے تو وہی کرو، جو میں کہہ رہا ہوں۔ تمہیں ہرصورت میرے ساتھ وڈیرے کے بنگلے پر جانا ہوگا۔"

"مجھے اپنی ساتھی کی زندگی اتنی ہی عزیز ہے جتنی کہ خود اپنی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی "تم ساحل کو چھوڑ دو، اس کی گردن سے پسٹل کی نال ہٹا دو۔ ہم دوستانہ ماحول میں بھی معاملات طے کرسکتے ہیں۔"

"تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا "دھنو کو ایک لمحے کے لیے بھی فری نہیں کروں گا اور یہ تم نے دوستانہ ماحول کی کیا بات کی ہے۔ ہم ازلی دشمن ہیں، ہمیشہ دشمن ہی رہیں گے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری اور تمہارے چوہدری ملک نوازش علی کی دشمنی میرے ساتھ ہے۔ تم ساحل کو کیوں بیچ میں لا رہے ہو؟"

"یہ ساحل نہیں، دھنو ہے۔" تارا نے پسٹل کی نال کا دباؤ ساحل کی گردن پر بڑھاتے ہوئے کہا "تم کبھی اسے کلثوم بنا لیتے ہو اور کبھی ساحل لیکن یاد رکھو، اس کستم کی چالیں ہم پر بے اثر ہیں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے، یہ بدھ مت کی پیرو کار ہے اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اسی لیے تم اسے بغل میں دبائے پھر رہے ہو۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "یہ تم نے ٹھیک کہا، ہماری اصل دشمنی تم سے ہے مگر اس دشمنی کے راستے میں تمہارا جو بھی ساتھی آئے گا، وہ ہماری دشمنی کا نشانہ ضرور بنے گا۔ گیہوں کے ساتھ گھن پسنے کی مثال تو تم نے سن رکھی ہوگی!"

میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا تھا۔ میں اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح تارا کو باتوں میں لگا کر ساحل کی نجات کا راستہ نکال سکوں۔ وہ میرے مکالمہ بازی کے پھندے میں پاؤں ڈال چکا تھا۔ میں نے پھندے کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ اس دوران میں، میں اپنے اور تارا کے درمیانی فاصلے کو ذہن میں رکھتے ہوئے کسی فوری کارروائی کے بارے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔

میں نے عام سے انداز میں کہا "مثالیں تو میں نے بہت سن رکھی ہیں تارا لیکن تمہاری بزدلی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ غرایا۔

میں نے کہا "تم ایک لڑکی کو گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے کمزور بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ کوئی جواں مردی تو نہ ہوئی۔ میں نے تمہاری بہادری کے بہت سے غائبانہ قصے میر بخش کی زبانی سنے ہیں مگر اب تمہیں دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے وہ قصے کہانیاں جھوٹ کا پلندا تھیں۔ اگر تم واقعی یا مرد ہو تو پھر ساحل کو چھوڑ دو اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی شہ زوری کو آزماؤ۔ میں بھی تو دیکھوں، دارا کا چھوٹا بھائی کس پائے کا فائٹر ہے!"

وہ میرے چڑھاوے میں کچھ زیادہ نہ آیا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا "وجدان! میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا مگر یہاں نہیں بلکہ بنگلے پر پہنچ کر۔ ابھی میرے پاس کسی قسم کا میدان جمانے کی فرصت نہیں ہے۔"

میں تارا کو مزید باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا تھا کہ میر بخش نے میری اب تک کی "محنت" پر پانی پھیر دیا۔ یامی شاہ کی گرفت سے آزاد کروانے کے بعد میں اس کی طرف سے غافل ہوگیا تھا کیونکہ ساحل کی چیخ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ تارا سے میری مکالمت کے دوران میں میر بخش سنبھل چکا تھا اور اب حق دوستی نبھاتے ہوئے اس نے ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ وہ جوشِ جذبات میں آکر تارا پر چھلانگ لگا بیٹھا تھا۔

میر بخش کی اس اچانک حرکت پر تارا کے ساتھ ساتھ میں بھی بوکھلا گیا تھا۔ تارا نے فطری ردِ عمل کے طور پر ساحل

کی گردن سے پسٹل ہٹا کر میر بخش پر فائر کردیا ایک زوردار دھماکا ہوا مگر میر بخش فضا میں اچھل کر زمین پر گرنے کے بجائے سیدھا تارا پر آیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میر بخش کی قسمت اچھی تھی کہ وہ براہِ راست گولی کی زد میں نہیں آیا تھا ورنہ اعشاریہ تین آٹھ کی ظالم گولی اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتی۔ تاہم وہ بالکل محفوظ بھی نہیں رہا تھا۔ پسٹل سے نکلنے والی گولی اس کے دائیں بازو کو کندھے کے قریب سے چھو کر گزری تھی اور اسے قابلِ تلافی نقصان پہنچا گئی تھی۔ میر بخش اپنا گھائل بازو تھام کر زمین سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں اس موقع کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ہر شے کو فراموش کرتے ہوئے تارا کو اپنی نگاہ میں رکھا اور اس کی "خاطر تواضع" شروع کردی۔ وہ ساحل کے ساتھ ہی زمین پر گرا تھا۔ تاہم پسٹل ابھی تک اس کے ہاتھ ہی میں تھا۔ میں نے زمین پر گرے ہوئے تارا کے پسٹل بردار ہاتھ پر اپنے پاؤں سے ایک بھرپور ٹھوکر ماری۔

پسٹل تارا کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے کونے میں چلا گیا۔ یہ ایک طرح سے اور بھی برا ہوا کیونکہ پسٹل جس مقام پر پہنچا تھا وہاں عبداللہ موجود تھا جو اپنے زخمی ہونٹ کو دبا کر خون بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے پسٹل کو اپنے قدموں کے قریب پایا تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ پسٹل اٹھانے کے لیے فوراً زمین کی طرف جھک گیا۔

میں نے عبداللہ کے عزائم کو بھانپتے ہوئے حلق سے "یا" کی تیز آواز نکالی اور فضا میں پرواز کرتے ہوئے اس کی طرف آیا پھر اس سے پہلے کہ وہ زمین سے پسٹل اٹھا کر کوئی ایسی ویسی "حرکت" کرتا، میری سائیڈ فلائنگ کک اس کے جبڑے پر پڑی۔ یہ عین وہی وقت تھا جب وہ پسٹل اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو رہا تھا۔

عبداللہ پسٹل سمیت ہوا میں اچھلا اور چوبی کرسی پر جا گرا۔ اس کا بالائی ہونٹ میں پہلے ہی زخمی کرچکا تھا، اب میرے پاؤں نے جو اس کے جبڑے کی مزاج پرسی کی تو وہ دہری تکلیف میں مبتلا ہو کر کراہنے لگا۔ میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ کرسی سے الجھا ہوا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ اٹھنے سے پہلے ہی کرسی کے عقب سے مجھ پر فائر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے زمین پر بیٹھتے ہوئے بڑی سُرعت سے بیک سوئپ کی۔ میرے پاؤں کی ایڑی عبداللہ کی کنپٹی پر لگی جب کہ گھٹنے کے اندرونی حصے نے کرسی کو دور دھکیل دیا۔

کنپٹی پر لگنے والی چوٹ نے عبداللہ کو بے حال کردیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اس کا چہرہ پے در پے ٹھوکروں کا نشانہ بن رہا تھا۔ اس مرتبہ لگنے والی ٹھوکر بڑی "کارگر" تھی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار کے پاس جا پہنچا۔ عبداللہ زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

دوسری جانب تارا اور میر بخش میں ٹھن گئی تھی۔ میں نے ان کی جانب متوجہ ہونے سے قبل پسٹل پر قبضہ جمایا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال بہت تیزی سے ابھرا۔ مجھے پسٹل کے بل پر موجودہ صورتِ حال کو اپنے حق میں کرلینا چاہیے۔ میں نے یہ خیال مکمل ہوتے ہی ذہن کو جھٹک دیا۔

میں اپنے دل میں پختہ عزم کرچکا تھا کہ دشمنوں سے نبرد آزما ہوتے وقت میں اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر اکتفا کروں گا اور جہاں یہ صلاحیتیں بالکل ناکامیاب ہوجائیں گی وہاں پھر کسی اور چیز کے بارے میں سوچوں گا۔ کسی اور سہارے میں بھی میری روحانی قوتوں کو اوّلیت حاصل تھی۔ اسلحے وغیرہ کا نمبر تو سب سے آخر میں آتا تھا۔

موجودہ صورتِ حال میں یہ پسٹل ہی سب سے زیادہ خطرناک اور مہلک ثابت ہوسکتا تھا جو اب میرے ہاتھ میں تھا۔ جس طرح سانپ کا زہر نکال دیا جائے تو وہ ایک حقیر کیچوے کی حیثیت اختیار کرجاتا ہے، بالکل اسی طرح اگر کسی گن میں سے گولیاں نکال لی جائیں تو وہ دھاتی کھلونے سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں رہتا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل کا کلپ نکال کر اپنی جیب میں ڈالا اور خالی پسٹل کو ایک طرف پھینک دیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو تارا، میر بخش پر بھاری پڑ رہا تھا۔ میر بخش کے زخمی بازو سے اب باقاعدہ خون جاری ہوگیا تھا اور کندھے پر سے اس کی قمیص سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم وہ تارا کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں دوست! میں تمہاری مدد کو آگیا ہوں۔"

وہ زیادہ جوش و خروش سے تارا پر حملے کرنے لگا مگر میں نے دیکھا کہ میر بخش کے اٹیک میں زیادہ دم نہیں تھا۔ اس کے بالعکس تارا بڑی بے باکی سے اسے چوٹیں پہنچا رہا تھا۔ تارا کا ایک زبردست مکا کھا کر میر بخش ڈگمگا گیا تو میں نے اسے کندھوں سے تھام کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تم ساحل کا خیال رکھو میر بخش۔ میں اس سورنما سورما کو دیکھتا ہوں۔"

میں ٹائیگر اسٹانس میں قدم جما کر تارا کے سامنے کھڑا ہوگیا اور اسی وقت مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ تارا بھی ایک مارشل آرٹسٹ تھا۔ میرے اسٹانس کے جواب میں اس نے فرسٹ ایزی اسٹانس بنایا اور غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"وجدان! میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان یہاں ایک تکنیکی جنگ چھڑ جائے مگر تم نے مجھے مجبور کردیا ہے۔"

"مجبور تو تم اس وقت ہوگے تارا' جب اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔" میں نے اس کے چہرے اور کمر کو بیک وقت نظر میں رکھتے ہوئے کہا "آج میں تمہیں "مجبوری" کا مفہوم بڑی وضاحت سے سمجھا دوں گا۔ بہرحال' مجھے تمہاری ایک ادا نے خوش کردیا ہے۔"

"کون سی ادا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

میری نظر اس کی کمر کی ذرا سی جنبش کو بھی نظر انداز کرنے کے حق میں نہیں تھی کیونکہ فائٹ کے دوران میں کمر کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ آپ کا مدِمقابل اپنے ہاتھ یا پاؤں کو جو بھی حرکت دیتا ہے اس کا براہِ راست تعلق اس کی کمر سے ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کمر کی جنبشوں کو سمجھنا آتا ہو تو پھر آپ فوراً یہ جان سکتے ہیں کہ مدِمقابل آپ پر کس طور حملہ کرنے والا ہے۔ اس طرح آپ کو اپنے حریف پر قابو پانے میں آسانی ہوجاتی ہے۔

میں نے تارا کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مارشل آرٹس جانتے ہو۔ اب تم سے دو دو ہاتھ کرنے میں مزہ آئے گا۔"

"کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں یہ "مزہ چکھنے" کا پورا موقع فراہم کروں گا۔" وہ تیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا "ابھی کیا تم بٹیر لڑا رہے ہو جو تمہیں فرصت نہیں؟"

اس نے خوں خوار نظر سے مجھے دیکھا اور زبان سے کچھ بولنے کے بجائے اپنی بائیں ٹانگ کو حرکت دی۔ وہ لیفٹ راؤنڈ ہاؤس میرے کندھے پر آزمانے کے موڈ میں تھا مگر میں اس کے کولھے کی جنبش کو تاڑ چکا تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے رائٹ کریسنٹ کک اس کے چہرے پر جمادی۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے رائٹ ہینڈ سے اس کی راؤنڈ ہاؤس کک بلاک بھی کردی۔ بلاکنگ اور کاؤنٹر اٹیک میں ایک ردھم کا خیال رکھا گیا تھا چنانچہ میں نہ صرف تارا کی کک سے بچ گیا بلکہ اس کے چہرے پر چوٹ لگانے میں بھی کامیاب رہا۔

تارا ڈگمگایا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ وہ ایک گرم مزاج شخص تھا۔ اس میں تحمل کی خاصی کمی پائی جاتی تھی۔ میں نے تارا کی اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اسے غصہ دلانے والی حرکات اپنا کر اس کے فن اور طاقت کا جلوس نکال دیا۔

تارا کسی زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ وہ اس کا حق بھی رکھتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک درندے کی صفات رکھتا تھا اور تھوڑی دیر پہلے میری کریسنٹ کک نے اسے زخمی بھی کردیا تھا۔

تارا نے میرے چہرے پر ایک پنچ آزمانے کی کوشش کی۔ وہ واضح طور پر میری ٹھوڑی کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے فضا میں اچھل کر اس کے پنچ کو اپنے ہاتھوں کی "ایگل گرپ" میں لیا اور دایاں گھٹنا اس کی ٹھوڑی پر رسید کردیا۔

یہ ایک "جواب آں غزل" تھا۔ تارا نے میری ٹھوڑی کو مجروح کرنا چاہا تھا۔ میں نے جواباً اس کی ٹھوڑی کو "مبارک باد" پیش کردی تھی۔ تارا کی زبان دانتوں تلے دب کر کٹ گئی اور خون نے اس کے دہانے کو سرخ کردیا۔ اس وقت وہ ایک مردار خور گدھ دکھائی دے رہا تھا۔

یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے اپنے دانتوں اور زبان کو پہنچنے والے نقصان کا احساس نہ ہو۔ اس نے حلق سے غراہٹیں خارج کرتے ہوئے مجھے فرنٹ کک ماری۔ اس کے جوتے کا تلوا میرے کندھے پر لگا۔ کک میں زیادہ جان نہیں تھی۔ میں نے بہ آسانی اسے سہا اور اندر آتے ہوئے ایک فولادی پنچ اس کے سینے پر رسید کیا۔

تارا نے مکا کھاتے ہی میری کلائی کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر ایک مروڑا دیا اور میرے چہرے کو کسی حد تک زمین کی جانب جھکانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا اگلا ارادہ میں فوراً بھانپ گیا۔ وہ میرے چہرے پر ایک بھرپور ٹھوکر اپنے پاؤں سے لگانا چاہتا تھا۔

میں نے اچانک جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے خود کو کسی بے جان شے کے مانند زمین پر گرا دیا۔ ردِعمل کے طور پر تارا اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اگر اس موقع پر وہ میرا ہاتھ چھوڑ دیتا تو اپنا توازن برقرار رکھ سکتا تھا لیکن اس نے تو میری کلائی کو اس طرح اپنے ہاتھوں میں دبوچ رکھا تھا جیسے کوئی بھوکا کتا ہڈی کو اپنے جبڑے میں دبا تا ہے۔

تارا لہرا کر مجھ پر آیا مگر میں اسی لمحے رول کر کے تین فٹ آگے نکل گیا۔ میری گراؤنڈ رولنگ سے تارا کے ہاتھوں کو

ایک شدید جھٹکا لگا۔ وہ اس وقت انتہائی غیر متوازن تھا چنانچہ میری کلائی پر سے اس کی گرفت ختم ہوگئی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو تارا بھی پش اپ لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے دائیں پاؤں کو اس طرح حرکت دی جیسے میں اس کے قدموں یا پنڈلی کو ٹھوکر مارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ ایک طرح کی بلف کک تھی۔ میں نے تارا کو ایک خوب صورت جھانسا دیا تھا۔ میرا پاؤں اپنے جسم کے انتہائی زیریں حصے کی جانب جاتے دیکھ کر وہ اپنے چہرے اور جسم کے بالائی حصے کے دفاع کی طرف سے غافل ہوگیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بے اختیار پہلوؤں میں گرگئے تھے۔

اسی لمحے میری رائٹ فرنٹ ٹو سائیڈ کک نے اس کے چہرے پر ایک طوفانی ضرب لگائی۔ اس کے قدموں کی جانب بڑھا ہوا میرا دایاں پاؤں ایک جرک کے ساتھ اوپر اٹھا تھا اور پاؤں کا بلیڈ سیدھا تارا کی ناک پر جا لگا تھا۔

تارا کے دانتوں اور زبان سے تو پہلے ہی خون جاری تھا۔ اس نئی افتاد نے اس کی ناک سے خون کا فوارہ جاری کردیا۔ اب وہ اپنے ناک منہ کا نہیں رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے پیچھے ہٹا تو میں نے ایک طویل اسٹیپ لے کر رائٹ سائیڈ کک اس کی کمر پر رسید کردی۔

تارا توپ سے نکلے ہوئے گولے کے مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے چوبی میز پر جا گرا۔ مذکورہ میز اس کے وزنی جثے کی آمد اور ٹکراؤ کو برداشت نہ کرسکی اور ایک احتجاج آمیز آواز پیدا کر کے چاروں پاؤں سے زمیں بوس ہوگئی۔ اب وہ میز ایک تختے کی صورت اختیار کرچکی تھی جس کے "مجروح پاؤں" اس کے ارد گرد پڑے ہوئے تھے۔ میز کے چوبی تختے پر تارا بے حس و حرکت پڑا نظر آرہا تھا۔ شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کوئی شدید چوٹ آئی تھی جس نے وقتی طور پر اسے "اسٹل" کردیا تھا۔

میں نے طائرانہ نگاہ سے کمرے کی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ وہاں خاصی انھا پتخی ہوچکی تھی۔ ایک گولی بھی فائر کی گئی تھی مگر مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک ہوٹل کے عملے میں سے کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ہوٹل والوں کو اس کمرے میں ہونے والی کارروائی کی کوئی خبر تک نہ ہو۔ ہاں' یہ عین ممکن تھا کہ وہ دانستہ چشم پوشی سے کام لے رہے ہوں اور کسی مصلحت کے تحت خاموش ہوگئے ہوں۔

میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ یامی شاہ وہاں کا معروف غنڈا تھا اور وڈیرا اکبر سومرو سے بھی اس کے گہرے روابط تھے۔ تارا چونکہ وڈیرے کا مہمان تھا اس لیے اس کی اہمیت یامی شاہ سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔ یہ وجہ ہوسکتی تھی کہ تارا اینڈ کمپنی کے معاملے میں ہوٹل والوں نے مکمل چپ سادھ لی تھی۔

تارا کے ساتھ آنے والے تینوں ڈشکروں کو میں نے کاسٹک سودا سے دھو کر کمرے کے فرش پر ڈال دیا تھا اور وہ آڑھے ترچھے' اوندھے سیدھے پڑے اپنے زخموں کی "سنکائی" کر رہے تھے۔ یامی شاہ پہلے بھی میرے ہاتھوں اپنی بے عزتی کروا چکا تھا اور اب ایک دیوار کے ساتھ بے ہوش پڑا تھا۔ باریک مونچھوں والے موٹے تازے موسیٰ کو میرے ایک ہی "ہیمر پنچ" نے لمبا لٹا دیا تھا البتہ عبداللہ زخمی حالت میں ایک طرف پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ اس ٹیم کا سرغنہ یعنی تارا چاروں خانے چت پڑا تھا۔

میر بخش نے نحیف آواز میں مجھ سے کہا "وجدان سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

اس نے ایک ہاتھ سے اپنے زخمی کندھے کو تھام رکھا تھا۔ تارا نے تھوڑی دیر پہلے اسے اچھی خاصی کٹ چڑھائی تھی۔ اگر اس کا بازو زخمی نہ ہوتا تو ممکن تھا' وہ بھی تارا کو دو چار کرارے ہاتھ جڑ دیتا۔ میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر کہا۔

"پہلے میں تمہارے بازو کو دیکھ لوں۔"

"میرے بازو کو کچھ نہیں ہوا۔" میر بخش دانتوں پر دانت جماتے ہوئے بولا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں ورنہ یہ شیطان ہمیں جانے نہیں دیں گے اگر یہ ہوش و حواس میں آگئے تو ہمارے فرار کی ہر راہ مسدود کردی جائے گی۔"

اس کی آواز میں نقاہت اور درد کی آمیزش تھی۔ ساحل نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "میر بخش ہم یہاں سے بہت جلد روانہ ہوجائیں گے مگر پہلے تمہارے بازو کا کچھ بندوبست کرلیں۔ اگر زیادہ خون بہہ گیا تو تمہارے اور ہمارے لیے بہت مشکل ہوجائے گی۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کے زخمی بازو کو قمیص میں سے باہر نکال لیا۔ قمیص کی آستین میر بخش کے لہو میں تربتر ہوچکی تھی۔ میں نے بغور کندھے کے زخمی حصے کا معائنہ کیا اور ایک اطمینان بھری سانس میرے سینے سے خارج ہوگئی۔ اعشاریہ تین آٹھ کی گولی بازو کی جلد کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ تاہم

تشویش کی کوئی بات نہیں تھی۔ اگر اس کے بازو پر کوئی پٹی وغیرہ باندھ دی جاتی تو خون کا رساؤ رک سکتا تھا۔

ساحل نے میکانکی انداز میں حرکت کی اور اپنا اسکارف سفری بیگ میں سے نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ اس نے شاید میرے ذہن کو پڑھ لیا تھا یا یہ اس صورتِ حال کا نتیجہ تھا جس سے ہم اس وقت دو چار تھے۔ کہتے ہیں ’مصیبت کے دوران میں انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں بلکہ جسمانی طور پر تو وہ ناقابلِ یقین کارنامے بھی انجام دے لیتا ہے لیکن یہ سب کچھ اسی طور ممکن ہے جب انسان ان مشکل لمحات میں اپنے حواس کو قابو میں رکھے ورنہ عام طور پر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ کوئی افتاد پڑتے ہی انسان سب سے پہلے اپنے ہوش و حواس کھوتا ہے اور وہ اپنی عام صلاحیتوں کو بھی بروئے کار نہیں لا سکتا۔

میں نے ساحل کے ہاتھ سے اسکارف لے کر میر بخش کے بازو پر ایک پٹی کی صورت باندھ دیا۔ اس عمل سے پہلے میں نے اس کا بازو آستین کے اندر سے گزار دیا تھا۔ میں نے اسکارف لپیٹتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ خون آلود آستین اچھی طرح چھپ جائے۔

اس دوران میں میر بخش ہلکی کراہوں کے ذریعے اپنی تکلیف کا اظہار کرتا رہا۔ میں نے اس کی ”مرہم پٹی“ کے بعد ساحل سے کہا ”تم فوراً وہ بیگ اٹھا کر میر بخش کے ساتھ باہر نکلو۔ میں بھی آتا ہوں۔“

”تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“ وہ متوحش لہجے میں بولی۔

”میرے ارادے نیک ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں بے ہوش موسیٰ کی جانب بڑھ گیا۔

میر بخش نے کہا ”وجدان سائیں! آپ کو جو کرنا ہے‘ جلدی جلدی کرلیں۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ یہاں سے ہم تینوں ایک ساتھ ہی نکلیں گے۔“

میں کسی جرح بحث میں پڑنے کے بجائے بے ہوش موسیٰ کے پاس آگیا۔ میں جانتا تھا‘ ساحل اور میر بخش میرے بغیر وہاں سے نہیں نکلیں گے پھر کسی قسم کی تکرار میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

باریک مونچھوں اور میانے قد کا مالک موٹا تازہ موسیٰ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میرے ہمر پنچ نے شاید اس کے دماغ کے کچھ نقطے گل کر دیے تھے۔ میں بڑی سُرعت سے اس کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ تارا نے کچھ دیر پہلے بتایا تھا کہ ایمبولینس نما گاڑی کو موسیٰ ہی چلا کر وہاں لایا تھا۔ تاہم اس دوران میں اس نے کنگ سائز نقلی مونچھیں لگا رکھی تھیں۔ مجھے ننانوے فیصد امید تھی کہ گاڑی کی چابی اس کی کسی جیب میں ہوگی۔ ہمیں وہاں سے فرار ہونے کے لیے کسی سواری کی ضرورت تھی‘ ایمبولینس نما گاڑی ہمارے لیے بہترین ثابت ہو سکتی تھی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد موسیٰ کی ایک اندرونی جیب سے چابیوں کا گچھا مل گیا۔ رنگ میں موجود چابیوں کو دیکھ کر واضح ہو جاتا تھا کہ یہ اسی گاڑی کی چابیاں تھیں کیونکہ میں ان چابیوں کو پہلے بھی گزشتہ روز اپنے تجربے میں لا چکا تھا۔

میں چابیوں کا گچھا سمیٹ کر سیدھا کھڑا ہوا تو میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ میں نے سوچا‘ ہمیں اپنے تعاقب کی راہ مسدود کر دینا چاہیے اور اس کے لیے ضروری تھا کہ یامی شاہ کی کھلی جیپ کی چابی بھی اڑا لی جائے۔

ایسا سوچتے ہی میں دیوار کے قریب ڈھیر یامی شاہ کے پاس چلا گیا اور اس کی جیب ٹٹول کر جیپ کی چابی نکال لی۔ یامی شاہ اور موسیٰ اگرچہ زندہ تھے۔ تاہم اس وقت وہ گہری بے ہوشی میں تھے۔ انہیں ہوش میں آنے میں کم از کم دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔

کمرے سے رخصت ہونے سے قبل میں نے وڈیرا اکبر سومرو کے دوست مہمان اور ابنِ شیطان تارا کی ”خیریت“ جاننا ضروری سمجھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ہنوز چوبی تختے پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کے وجود میں کسی قسم کی حرکت نہیں پائی جارہی تھی۔ میں نے اس کے سینے پر کان لگا کر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس کا دل بڑی معدوم اور دھیمی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ وہ بے حس و حرکت کیوں ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے سر کے آس پاس کا جائزہ لیا تو میری حیرت دور ہونے کا سامان نظر آگیا۔

تارا میز کی چوبی ”ٹاپ“ پر چت پڑا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے کے نزدیک ہی تازہ تازہ خون کا ایک چھوٹا سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تختے کا کوئی کونا یا پائے کا کوئی سرا اس کے سر کے عقبی حصے سے ٹکرا گیا تھا۔ اس چوٹ کے باعث تارا وقتی طور پر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہمارے فرار کے لیے حالات سازگار تھے۔

میں جیسے ہی تارا کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہوا‘ میر بخش نے اضطراری لہجے میں کہا ”سائیں‘ آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی طاقت سے واقف نہیں۔ اگر ہم نے دیر کردی تو ہمارے لیے بے شمار مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“

”ہاں وجدان۔“ ساحل نے تصدیقی لہجے میں کہا ”میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔“

”اچھا بھئی‘ چلو۔“ میں نے ان دونوں کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

ساحل کے نزدیک پہنچ کر میں نے سفری بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسی وقت میر بخش تیزی سے چلتے ہوئے دیوار کے نزدیک گیا اور خالی پسٹل اٹھا کر اس نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔

”اس کا کیا کرو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بہت کام کی شے ہے سائیں۔“ وہ میرے نزدیک آتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا ”خالی گن کس کام کی؟“

”یہ ابھی خالی ہے‘ بعد میں اسے بھر کر کام میں لایا جا سکتا ہے۔“ میر بخش نے کہا۔

وہ پسٹل کو خالی کرتے ہوئے مجھے دیکھ چکا تھا ورنہ وہ مجھ سے یہ سوال ضرور کرتا کہ میں نے یہ کیوں کہا کہ گن خالی ہے! میں اس خالی پسٹل کو ساتھ لے کر جانے کے حق میں نہیں تھا مگر اس وقت میر بخش کی خواہش کو دیکھتے ہوئے میں خاموش رہا اور ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہم نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکلیں گے اور کسی سے الجھے بغیر گاڑی میں بیٹھ جائیں گے۔“

میر بخش نے کہا ”سائیں! میں تو ڈرائیونگ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ پھر اس نے دائیں بازو کو کندھے کے قریب سے چھوا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ”یہ ڈیوٹی میں سنبھال لوں گا۔ تم دونوں گاڑی کے عقبی حصے میں بیٹھو گے۔“

”ہم کس گاڑی میں جائیں گے وجدان؟“ ساحل نے استفسار کیا ”چابیاں تو تم نے دونوں گاڑیوں کی حاصل کرلی ہیں۔“

میں نے کہا ”ہمارے لیے ایمبولینس نما گاڑی زیادہ محفوظ رہے گی۔ وہ ایک بند گاڑی ہے۔“

”اوہ‘ پھر وہی منحوس سیاہ گاڑی!“ ساحل نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ”اب وہ سیاہ کہاں رہی ہے ساحل!“

”اسے‘ عارضی طور پر سرخ کاغذ چسپاں کر کے سرخ بنا دیا گیا ہے۔“ میر بخش نے کہا ”مگر ہمیں گاڑی کے رنگ اور میک کے چکر اور بحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وجدان سائیں کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ کھلی جیپ کی بہ نسبت وہ بند گاڑی ہمارے لیے زیادہ مفید اور محفوظ ثابت ہوگی۔“

ہم ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے احتیاطاً کمرے کو لاک کر دیا۔ مجھے معلوم تھا‘ ہوٹل کا عملہ اس لاک دروازے کو بہ آسانی کھول سکتا تھا مگر مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ ہمارے جانے کے بعد وہاں کیا ہوگا‘ یہ سوچنا قبل از وقت تھا۔

میں اگر چاہتا تو بے ہوش موسیٰ اور تارا کو زندگی کی قید سے رہائی دلا سکتا تھا اور نیم بے ہوش عبداللہ کو بھی مزید ضرر پہنچا سکتا تھا مگر مجھے ان کی جان لینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں وڈیرا اکبر سومرو کے مہمان دوست یعنی تارا سے ملاقات کا صرف اس لیے مشتاق تھا کہ اس کے بارے میں میر بخش کی زبانی بہت کچھ سن لیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ شخص کس مقصد کی خاطر لاہور کے ایک نواحی گاؤں سے میری تلاش میں سندھ کے ریگستاں کی ریگ چھان رہا تھا۔ لاہور کے کسی نواحی گاؤں کے ذکر پر میرا ذہن فوراً رکھاں والی اور چوہدری ملک نوازش علی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس سے میرے تصور میں کچھ خاکہ سا تو بن گیا تھا لیکن صورتِ حال کی وضاحت نہیں ہوتی تھی مگر تارا سے ”ہنگامی ملاقات“ کے دوران میں سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ چوہدری نوازش علی مجھے کیوں اپنے پاس دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کروڑوں کی مالیت کے سونے کو بھول نہیں سکا تھا۔ باہر کی دنیا سے اس کے گہرے روابط تھے اور وہ پاکستان میں میری آمد سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اس نے تارا کو میرے ”استقبال“ کے لیے عمرکوٹ بھیج دیا تھا۔ مجھے ٹریپ کرنے میں تارا کا ذاتی مفاد بھی پوشیدہ تھا۔ وہ مجھ سے اپنے بڑے بھائی کے قتل کا بھیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔

تارا کی باتوں سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وڈیرا اکبر سومرو اور چوہدری ملک نوازش علی کے درمیان دوستانہ مراسم تھے۔ انہیں ”فیملی ٹرم“ کے کھاتے میں فٹ کیا جا سکتا تھا۔ یہ دونوں اشخاص فیوڈلز تھے۔ دونوں کا مزاج اور زندگی گزارنے کے طور طریقے یکساں تھے اس لیے بھی وہ خاندانی طور پر ایک دوسرے کے بہت نزدیک آگئے تھے۔ انہیں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے بھی کہا جا سکتا تھا۔

یہ سارے حالات جاننے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وڈیرا اکبر سومرو کے بنگلے یا جاگیر پر جانے کی ضرورت

نہیں تھی۔ مجھے تو چوہدری نوازش سے ایک دیرینہ حساب بے باق کرنا تھا اور سونے کا ٹنٹا بھی نمٹانا تھا۔ اس مقصد کی خاطر ہمیں فی الفور لاہور کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے تھا۔ میں نے پاکستان میں داخل ہوتے وقت یہی سوچا تھا کہ کچھ عرصہ کراچی میں گزاروں گا پھر لاہور کا رخ کروں گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ وطنِ عزیز کی سرحد پار کرتے ہی ہم پر پے در پے افتادیں ٹوٹتی رہیں۔ پہلے ہم "رینجرز" کے ہتھے چڑھ گئے پھر نقلی پولیس کا ڈراما چلتا رہا۔ اس کے بعد چوہے بلی کا کھیل شروع ہوگیا اور اب۔ اب ایک مرتبہ پھر ہمیں فرار ہونے کا نادر موقع میسر آگیا تھا۔ میں اس سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

ہم بخیرو عافیت ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ وہاں ہوٹل کے سامنے وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ سرخ بہروپ والی سیاہ گاڑی آگے تھی جبکہ یامی شاہ کی کھلی جیپ اس کے پیچھے کھڑی کی گئی تھی۔ ہمیں کسی نے روکنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ ہوٹل کے سامنے درجن بھر افراد جمع ہوچکے تھے۔ تاہم ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی' وہ یہ کہ جب ہم ایمبولینس نما گاڑی میں سوار ہو رہے تھے تو ہوٹل کے عملے کے کچھ افراد ہمارے کمرے کی جانب دوڑے تھے۔

میں نے تو یہی طے کیا تھا کہ میر بخش اور ساحل کو گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھاؤں گا مگر عین وقت پر میر بخش نے ایک مفید بات میرے ذہن تک پہنچائی۔

"وجدان سائیں! آپ مجھے بھی ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھنے دیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کہا "آپ اس علاقے میں پہلی مرتبہ آئے ہیں اس لیے یہاں کے راستوں اور مقامات کے بارے میں آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ آپ کی راہنمائی کے لیے ڈرائیونگ کیبن میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔"

اس نے پتے کی بات کہی تھی۔ میں نے قائل ہو کر اسے پسنجرز سیٹ پر سوار کیا اور خود دوسری طرف سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ساحل کو میں پہلے ہی گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھا چکا تھا۔ میں نے گاڑی کے اگنیشن میں چابی گھمائی اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بنا گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

یہ وہی بند گاڑی تھی جس میں ہم نگرپارکر سے عمرکوٹ تک پہنچے تھے۔ راستے میں ایک مقام پر گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ وہاں میرے اور میر بخش کے درمیان زبردست معرکہ ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں میر بخش کا ایک ساتھی نواز علی میر بخش کی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا تھا۔ میری جواں مردی اور راہِ راست کی مسافرت نے میر بخش کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ میرا بے دام کا غلام بننے پر تیار ہوگیا۔ تاہم میں نے اسے ایک آزمائش میں ڈال کر اپنا دوست بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ میر بخش اس آزمائش میں پورا اترا تھا۔

گاڑی بڑی تیز رفتاری سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ اس وقت سہ پہر ڈھل چکی تھی اور شام کی آمد آمد تھی۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد رات کا اندھیرا پھیلنے لگتا۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"اس وقت ہم کس طرف جارہے ہیں؟"

وہ بولا "وجدان سائیں! اس وقت ہم عمرکوٹ شہر سے باہر نکلنے والے ہیں اور اتفاق سے گاڑی مین روڈ پر جارہی ہے۔ یہ روڈ عمرکوٹ سے سیدھی میرپور خاص تک جاتی ہے۔"

پھر اس نے وضاحت کی کہ عمرکورٹ کی طرح میرپور خاص بھی سندھ کا ایک ضلع ہے' بلکہ میرپور خاص ڈویژن ہیڈ کوارٹر کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں نے پوچھا "اس سڑک کے علاوہ عمرکوٹ سے کتنی سڑکیں نکلتی ہیں اور وہ کون کون سی سمت کو جاتی ہیں؟"

میں اپنی معلومات بڑھانے کی غرض سے سوال کررہا تھا۔ میر بخش نے جواب دیا "عمرکوٹ شہر سے چھ سات سڑکیں نکلتی ہیں جن میں سے اکثر پختہ اور ایک دو نیم پختہ ہیں۔ ایک نیم پختہ سڑک تو وہی ہے جس پر سفر کرتے ہوئے ہم دھرمسال سے یہاں پہنچے تھے۔ ایک سڑک سیدھی کھوکھراپار بارڈر تک جاتی ہے۔ ایک "ڈھورونارو" سے ہوتے ہوئے ضلع سانگھڑ میں داخل ہوتی ہے۔ ایک عمرکوٹ سے سیدھی مغرب میں "سامارو" سے گزر کر میرپور خاص چلی جاتی ہے اور ایک سڑک جنوبی سمت میں "نبی سر" اور "سینڈو" وغیرہ سے گزرتے ہوئے میرپور خاص کے انتہائی جنوب میں پہنچ جاتی ہے۔"

میر بخش کی فراہم کردہ معلومات نے گرد و پیش کا مکمل نقشہ میرے ذہن میں ابھار دیا۔ میں نے اس سے پوچھا "جس سڑک پر ہم محو سفر ہیں اس پر میرپور خاص سے پہلے کون کون سے مقامات آئیں گے؟"

"ابھی چند منٹ میں ہم "صوفی فقیر" نامی ایک مقام سے گزرنے والے ہیں۔" اس نے بتایا "اس کے بعد "اکڑی" آئے گا پھر "شادی پلی" اور اس کے بعد ہم ضلع میرپور خاص میں داخل ہوجائیں گے۔ شادی پلی نامی قصبہ عمرکوٹ اور میرپور خاص کی ضلعی سرحد کے بہت قریب ہے۔ اگر ہم اسی طوفانی رفتار سے ڈرائیونگ کرتے رہے تو مغرب کے بعد شادی پلی میں ہوں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ بات کرتے ہوئے میر بخش دھیرے دھیرے کراہ بھی رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے بازو میں تکلیف بڑھ رہی ہے۔ میں نے پوچھا "کیا بات ہے میر بخش!"

"کچھ نہیں سائیں۔" وہ پٹی والا بازو دباتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "تم نہ بھی بتاؤ تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ تمہارے زخمی بازو میں تکلیف ہے۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔

میں نے ڈرائیونگ پر نگاہ مرکوز رکھتے ہوئے اس کا دھیان بٹانے کی خاطر پوچھا "میرپور خاص سے کراچی جانے کے لیے ہمیں کون سا روٹ اختیار کرنا ہوگا؟"

وہ بولا "اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم میرپور خاص شہر میں پہنچیں گے جو کہ ضلع کا شمالی حصہ ہے۔ وہاں سے حیدر آباد اور پھر کراچی لیکن۔۔۔"

اس نے اسپیڈو میٹر کی جانب دیکھتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "لیکن کیا میر بخش؟"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری گاڑی میں پیٹرول بہت کم رہ گیا ہے۔" وہ فیول بتانے والے ڈائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "میرپور خاص میں ہمیں ٹنکی فل کروانا ہوگی۔"

"کروالیں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تمہارے پاس کچھ رقم تو ہوگی؟"

اس نے بتایا "ہاں سائیں! میں آپ کی طرف آتے ہوئے اپنی جمع پونجی بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ کم از کم دس ہزار روپے تو ہوں گے اس وقت میرے پاس۔"

"تم نے کل شام مجھے جو دو ہزار روپے دیے تھے ان میں سے کچھ رقم میرے پاس بھی بچی ہوئی ہے۔" میں نے بتایا "میرا خیال ہے' اچھا گزارہ ہوجائے گا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔" پھر اس نے پوچھا "آپ کا آگے کا کیا پروگرام ہے سائیں؟"

میں نے کہا "فی الحال تو ہم کراچی جائیں گے۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد پھر لاہور جانا ہے۔"

"یعنی اب آپ وڈیرا اکبر سومرو کی طرف نہیں جائیں گے!"

"نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا "میں جس مقصد کی خاطر وڈیرے کے بنگلے پر جانا چاہتا تھا وہ مقصد تو پورا ہوگیا۔ اکبر سومرو سے نہ تو میری کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی دوستی۔ میں تو وہاں اس لیے جارہا تھا کہ اس کے مہمان دوست کا "دیدار" کرسکوں۔ وہ بے چارہ لاہور کے ایک نواحی گاؤں سے' مجھ سے ملنے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔ تارا نے ہوٹل تک پہنچ کر میرا کام آسان کردیا۔ میں تارا اور اس کے مشن سے بخوبی آگاہ ہوگیا ہوں اس لیے واپس جانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ وہ بولا "وجدان سائیں! آپ نے تو تارا کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی ہے۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوگا۔"

"وہ نکل کھڑا ہو یا نکل بیٹھ جائے یا پھر نکل لیٹ جائے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے گاڑی کی اسپیڈ کو کچھ اور بڑھاتے ہوئے کہا "جب تک وہ ہمارے تعاقب کے قابل ہوگا' ہم اس کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے ہوں گے۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! ہمیں ہر صورت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یامی شاہ اور تارا جیسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔"

"ان کی ساری خطرناکی تو میں نے ہوٹل کے کمرے میں ناک کے راستے نکال دی ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "اگر آئندہ انہوں نے میرے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تو رہی سہی کسر بھی پوری کردوں گا۔"

میر بخش نے اپنی دانست میں ایک اہم پہلو کی جانب میری توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ "وجدان سائیں! جب ہم ہوٹل کے کمرے سے نکلے تھے تو تارا کا ایک ساتھی نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہ رہا تھا۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد دوسروں کو بھی ہوش میں لانے کی ترکیبیں آزمائے گا اور پھر ہوٹل کے باہر جو لوگ جمع تھے وہ۔۔۔"

"وہ ہمارے وہاں سے نکلتے ہی کمرے کی جانب بڑھ گئے جن میں ہوٹل کے عملے کے لوگ بھی شامل تھے!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "چنانچہ ہمیں اپنے تعاقب سے محتاط رہنا چاہیے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا؟"

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! آپ نے تو ذرا ذرا سی بات پر توجہ رکھی ہے۔"

"رکھنا پڑتی ہے میر بخش!" میں نے کہا "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے' میں نے تو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور خون ریز صورتِ حال کا متعدد بار سامنا کیا ہے اور ہمیشہ حاضر دماغ رہا ہوں۔"

"ہاں سائیں۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا "حاضر دماغی اس قسم کے معاملات میں بہت ضروری ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے امید ہے' تارا' یامی شاہ اور موسیٰ میں سے از خود کوئی ہوش میں آنے والا نہیں۔ وہ مزید دو تین گھنٹے "آرام" فرمائیں گے۔ البتہ نیم بے ہوش یا نیم ہوش مند عبداللہ اور ہوٹل کے عملے سے کچھ بعید نہیں۔ وہ یقیناً بے ہوش افراد کو ہوش میں لانے کی کوشش کریں گے۔ یامی شاہ وغیرہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔" میر بخش تائیدی لہجے میں بولا "میں تو سمجھتا ہوں' ہمیں جلد از جلد بہت دور نکل جانا چاہیے۔"

"ہوں۔" میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ ایک ممکنہ حد تک مزید بڑھادی اور کہا "ہم اس گاڑی کو میرپور خاص پہنچ کر کسی ایسی جگہ چھوڑ دیں گے جہاں سے فوری طور پر نظر میں نہ آسکے۔ میں نے سوچا ہے' آگے کا سفر ہم کسی بس وغیرہ میں کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "سائیں! یہ آئیڈیا بہت اچھا ہے۔" پھر چونکنے والے انداز میں بولا "اگر آپ میری بات مانو سائیں تو ہم اور بھی محفوظ سفر کرسکتے ہیں۔"

"ہاں کہو' تم کیا کہنا چاہتے ہو!"

اس نے کہا "اس لعنتی گاڑی کو تو ہم میرپور خاص میں کہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے پھر پبلک ٹرانسپورٹ سے ہم حیدر آباد تک سفر کریں گے اور حیدر آباد سے آگے ٹرین کے ذریعے کراچی تک چلے جائیں گے۔"

"تمہاری تجویز میں جان ہے میر بخش۔" میں نے اتفاق کرتے ہوئے کہا "لیکن کیا تمہیں یقین ہے کہ اس وقت حیدر آباد سے کراچی کے لیے ہمیں ٹرین مل جائے گی؟"

"سائیں!" وہ پُر یقین انداز میں بولا "کراچی میں داخل ہونے والی آخری ٹرین "شالیمار ایکسپریس" ہے جو لاہور سے علی الصباح چلتی ہے اور لگ بھگ آدھی رات کو کراچی پہنچتی ہے۔ مجھے امید ہے' جب ہم حیدر آباد پہنچیں گے تو اس ٹرین کا وقت ہوچکا ہوگا۔ ہم بہ آسانی حیدر آباد اسٹیشن سے شالیمار پکڑ سکتے ہیں۔"

"چلیں دیکھتے ہیں' آگے کیا صورتِ حال پیش آتی ہے۔" میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "پہلے عمر کوٹ سے تو نکل جائیں۔"

میر بخش ایک مرتبہ پھر اپنے گھائل بازو کو دبانے لگا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس کے درد میں اضافہ ہو رہا تھا اور تکلیف برداشت کی حد سے آگے گزر رہی تھی۔ ہم کافی دیر پہلے "صوفی فقیر" کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور "اکڑی" کے نزدیک پہنچنے والے تھے۔ اکڑی کے بعد "شادی پلی" کا سرحدی سفر تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر بدستور نظر مرکوز رکھتے ہوئے میر بخش سے گفتگو جاری رکھی اور کہا "میر بخش! میں جانتا ہوں' تم بازو کی تکلیف کے باعث بڑی اذیت میں ہو لیکن تم فکر نہ کرو' میرپور خاص پہنچتے ہی میں سب سے پہلے تمہاری مرہم پٹی کرواؤں گا۔ اس کے بعد ہی ہم آگے کا قصد کریں گے۔"

وہ بولا "سائیں! پٹی تو آپ نے کردی ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے زخمی بازو کی طرف اشارہ کیا اور کہا "اگر مزید کچھ ضرورت ہوئی تو کراچی جاکر دیکھ لیں گے۔"

میں نے کہا "میں باقاعدہ مرہم پٹی کی بات کررہا ہوں۔ یہ اسکارف تو ہنگامی حالات میں تمہارا خون روکنے کے لیے باندھا گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے' تم بچ گئے ورنہ گولی اگر تمہارے جسم کے کسی نازک حصے میں پیوست ہوجاتی تو اس وقت تم زندہ حالت میں میرے ساتھ سفر نہیں کررہے ہوتے۔"

"اللہ سائیں کے کام بہت نرالے ہیں وجدان سائیں۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "اللہ جسے رکھے اسے کون چکھے سائیں۔"

میں نے تصدیقی لہجے میں کہا "یہ بات تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو میر بخش! میں بھی بارہا موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا ہوں۔ اس لیے بچا ہوں کہ میری زندگی ابھی باقی تھی۔ زندگی اس لیے باقی تھی کہ مارنے والے سے بچانے والا زیادہ صاحبِ قدرت اور طاقت ور ہے۔ واقعی' جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

میں نے اپنی بات کے اختتام میں میر بخش کے الفاظ دہرائے تو وہ خوش ہوگیا' بولا "وجدان سائیں! وہاں ہوٹل میں جب آپ تارا سے گفتگو کررہے تھے تو چوہدری ملک نوازش علی اور دارا کا ذکر بھی ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بھاری مالیت کے سونے کا تذکرہ بھی میں نے سنا تھا۔ اگر آپ مناسب سمجھتے ہو تو مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتاؤ۔ اب تو سائیں' میرا جینا مرنا آپ ہی کے ساتھ ہے۔"

میں نے میر بخش کو ایک کڑی آزمائش میں ڈال کر آزمالیا تھا۔ اس نے سچا دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا چنانچہ تفصیل کو حذف کرتے ہوئے میں نے میر بخش کو چوہدری نوازش علی سے اپنی اور اپنے والدین کی دشمنی کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔ دارا اور سونے کا ذکر بھی آیا اور میں نے میر بخش کو بتایا کہ چوہدری کے ہرکارے دارا نے کس طرح ایک طویل عرصے تک میرا جینا محال کیے رکھا تھا۔ سنگاپور' بنکاک اور ہندوستان و نیپال وغیرہ میں ہونے والے معرکے بھی زیرِ بحث آئے پھر ہمالیہ کی گود میں واقع سنکری مندر والا واقعہ بھی میں نے میر بخش کو بتایا۔ اس نے میرے جاں نثار ساتھیوں کے بارے میں متعدد سوالات کیے اور میں اسے ڈاکٹر جانکی' چترا پریتم' ٹھاکر بھانوت سنگھ اور دیگر ساتھیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ اسی دوران میں رات کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ ہم "اکڑی" نامی مقام کو پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اب "شادی پلی" ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔

ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر مزید کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی اور ہم "شادی پلی" سے گزر کر ضلع عمر کوٹ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ اس سے آگے ضلع میرپور خاص کی حدود شروع ہوجاتی تھی۔ اس ضلعی سرحد پر ہمیں رکنا پڑا۔ ہم سے آگے بھی آٹھ نو مختلف قسم کی گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ آثار سے یہی لگتا تھا' وہاں کسی قسم کی چیکنگ ہو رہی تھی۔

جیسے ہی میں نے ایک جیپ کے پیچھے اپنی گاڑی روکی' میں چونک اٹھا۔ ضلعی سرحد پر مجھے پولیس کی بھاری جمعیت نظر آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے محسوس ہوگیا کہ وہاں پولیس کا ناکا لگا ہوا تھا۔

میر بخش بھی صورتِ حال کو بھانپ چکا تھا۔ اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی اس نظر میں سیکڑوں سوال تھے اور سب سے اہم سوال یہی تھا کہ آیا یہ ناکا ہمیں گھیرنے کے لیے لگایا گیا تھا!

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "تم گاڑی ہی میں بیٹھو۔ میں نیچے اتر کر سن گن لیتا ہوں۔"

اس وقت تک اندھیرا خاصا گہرا ہوچکا تھا۔ میر بخش چاروں جانب دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "وجدان سائیں! اگر یہ سارا اہتمام ہماری خاطر ہے تو پھر اس صورتِ حال میں آپ کا کیا حکم ہے؟"

"میں فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "ایک بات تو طے ہے' ہمیں پولیس سے کوئی پنگا نہیں لینا چاہیے۔ پہلے کسی طرح میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔ اگر واقعی یہ ہماری خاطر ہے تو پھر پولیس والوں سے بات کرکے دیکھ لیں گے۔ کوئی نہ کوئی صورت تو نکل ہی آئے گی۔"

میر بخش نے کہا "مجھے تو حیرت ہو رہی ہے' پولیس والوں کو اتنی جلدی ہمارے فرار کی خبر کس طرح ہوگئی اور عمر کوٹ سے اتنی دور میرپور خاص کے بارڈر پر انہوں نے ناکا لگالیا ہے۔"

"تمہیں اس سلسلے میں قبل از وقت حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں میر بخش۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "ابھی یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ پولیس والے ہمارے ہی استقبال کے لیے یہاں موجود ہیں اور رہی یہ بات کہ انہوں نے بارڈر پر ناکا کیوں لگایا ہے تو اس کا سبب بھی بہت جلد معلوم ہوجائے گا۔"

میں ڈرائیونگ سیٹ چھوڑنے لگا تو میر بخش نے کہا "سائیں! آپ نے ہوٹل کے کمرے میں پستول کو خالی کرکے میگزین (کلپ) اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اگر آپ وہ میگزین مجھے دے دیں تو میں پستول کو بھر کر "مفید تر" بنا سکتا ہوں۔"

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد گولیوں والا کلپ اپنی جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور تنبیہی انداز میں کہا "ٹھیک ہے' تم پستول کو لوڈ کرلو لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اس کا استعمال انتہائی ناگزیر صورتِ حال میں کیا جائے گا اور وہ بھی ایک حد تک۔ میں خوامخواہ کسی انسان کی جان لینے کے حق میں نہیں ہوں اور خاص طور پر قانون کے محافظوں سے تو ہمیں کوئی دشمنی مول نہیں لینا۔"

"آپ بے فکر رہو سائیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "میں آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ انشاءاللہ' آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

جب سے میں نے گاڑی روکی تھی' ساحل کو میں نے بے قرار پایا تھا۔ بیک ویو مرر میں' میں اس کے چہرے کے تاثرات کو بڑی وضاحت سے پڑھ چکا تھا۔ ہمارے درمیان موجود مضبوط شیشے کی وجہ سے بات چیت نہیں ہوسکتی تھی اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ گاڑی سے اتر کر ساحل کے پاس جاؤں اور اسے ہوشیار رہنے کی تاکید بھی کردوں۔ ڈرائیونگ کیبن اور گاڑی کے پچھلے حصے میں ہلکی لائٹ موجود تھی جس میں گاڑی کے اندرونی ماحول کو بہ آسانی دیکھا اور سمجھا جاسکتا تھا۔

میں نے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور باہر نکلنے کے لیے جیسے ہی گاڑی سے پاؤں باہر نکالا' کسی گن کی سرد نال میرے دائیں کندھے سے پیوست ہوگئی۔ میں ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آگیا پھر اس سے پہلے کہ میں صورت حال کو سمجھ پاتا' نہایت ہی سفاک لہجے میں مجھے حکم دیا گیا۔

"شرافت سے اندر بیٹھو۔"

اس کے ساتھ ہی کندھے کو نال سے ٹھوکا بھی دیا گیا۔ میں نے باہر نکلے ہوئے پاؤں کو واقعی "شرافت" سے گاڑی کے اندر پہنچایا۔ اس کے ساتھ ہی اس شخص نے دھڑ سے گاڑی کا دروازہ بند کردیا جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کا حکم دیا تھا۔

اب میں نے گردن گھما کر بغور اس شخص کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر سجے لباس سے میں نے فوراً سمجھ لیا کہ اس کا تعلق محکمہ پولیس سے تھا۔ وہ اندھیرے سے اچانک ہی نمودار ہو کر میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی جو اب میرے کندھے سے ہٹ چکی تھی۔ تاہم اس کی نال کا رخ ہنوز گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن کی طرف تھا۔

"تم زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو۔" اس مسلح پولیس والے نے تحکمانہ انداز میں کہا "پیچھے دور تک ہمارے مسلح جوان موجود ہیں۔ تم فرار نہیں ہوسکو گے۔"

میں نے اس کے شانے پر سجے "پھولوں" سے اندازہ لگایا کہ وہ اے ایس آئی رینک کا پولیس افسر تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نہایت شائستہ لہجے میں کہا۔

"اے' ایس آئی صاحب! میں کہیں فرار ہونے کی کوشش نہیں کررہا ہوں۔"

"تم مجھے چکر نہیں دے سکتے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"پتا نہیں' تم مجھے شک کی نظر سے کیوں دیکھ رہے ہو۔" میں نے کہا "میں تو باہر نکل کر گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف جارہا تھا۔ وہاں ہماری ایک ساتھی موجود ہے۔ مجھے اس سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

وہ خشک لہجے میں بولا "تمہیں جس کسی سے جو بھی ضروری بات کرنا ہے' وہ چیکنگ کے بعد کرنا۔ فی الحال چپ چاپ گاڑی کے اندر بیٹھے رہو۔"

"ٹھیک ہے سائیں۔" میں نے نہایت فرماں برداری سے کہا "اب میں یا میرا کوئی ساتھی گاڑی سے باہر قدم نہیں نکالے گا لیکن یہ تو بتادو' یہ چیکنگ وغیرہ کس سلسلے میں ہورہی ہے؟"

اے ایس آئی نے میرے برابر میں بیٹھے ہوئے میر بخش کو بغور دیکھا۔ خدا کا شکر ہے' میر بخش نے اس وقت گہرے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ساحل نے اس کے بازو پر باندھنے کے لیے جو اسکارف دیا تھا وہ بھی نیوی بلیو کلر کا تھا۔ چنانچہ پہلی نظر میں یہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کے بازو پر کوئی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

اے ایس آئی نے میر بخش پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر گاڑی کے عقبی حصے میں جھانکنے لگا جہاں ساحل موجود تھی۔ اس سفر کے دوران میں گاڑی کا ائر کنڈیشنر آن نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے حصے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ویسے بھی ہم جن حالات میں ہوٹل سے نکلے تھے اس میں ائر کنڈیشنر کے آن یا آف کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم "جو ہے' جہاں ہے' جیسا ہے" کی بنیاد پر گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے۔ تارا اور اس کے ساتھیوں نے گاڑی کو جیسے وہاں چھوڑا تھا' ہم اسے اسی حالت میں لے کر آگے بڑھ گئے تھے۔

اے ایس آئی گاڑی کے لمحاتی معائنے کے بعد "ریڈ الرٹ" ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک سے میں نے اندازہ لگالیا کہ اس نے ہم میں اور گاڑی میں کوئی خاص بات نوٹ کی تھی جبھی وہ کلاشنکوف کو بھی زیادہ احتیاط سے تھام کر کھڑا ہوگیا تھا۔

میں نے بدستور نرم لہجے میں اپنا سوال دہرایا "سائیں! آپ نے بتایا نہیں' یہ چیکنگ کس سلسلے میں ہورہی ہے؟"

"یہ بات تمہیں ڈی ایس پی صاحب بتائیں گے۔" وہ سپاٹ آواز میں گویا ہوا۔

"ڈی ایس پی صاحب کیوں؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے بتایا "وہ اس لیے کہ یہ چیکنگ انہی کی نگرانی میں ہورہی ہے۔"

"مگر چیکنگ کس بات کی ہورہی ہے؟"

وہ دائیں بائیں محتاط نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "ڈی ایس پی صاحب کو ایک گاڑی کی تلاش ہے۔ ایسی گاڑی جس میں تین افراد موجود ہوں۔ ایک لڑکی دو مرد!"

اتنا کہہ کر اس نے ایک مرتبہ پھر گاڑی کے عقبی حصے میں جھانکا۔ اے ایس آئی کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو مجھے بے چین کررہی تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں کرید جاری رکھی۔ اس دوران میں ایک گاڑی کو

چیک کرکے جانے کی اجازت دی جاچکی تھی۔ چنانچہ مجھے اپنی گاڑی کو تھوڑا آگے بڑھانا پڑا۔ اے ایس آئی اب مائل بہ گفتگو نظر آرہا تھا۔

میں نے دوبارہ گاڑی روکنے کے بعد اے ایس آئی سے کہا "سائیں! اس گاڑی میں ہم بھی تو تین ہی ہیں۔ ایک لڑکی اور دو مرد۔ کیا تمہارے ڈی ایس پی صاحب کو ہماری ہی تلاش ہے؟"

"اگر تم لوگ ڈاکو ہو تو پھر تم ہی ڈی ایس پی صاحب کے مطلوبہ افراد ہو۔" اس نے محتاط لہجے میں بتایا "انہیں دو ڈاکوؤں اور ایک مغویہ کی تلاش ہے۔"

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اے ایس آئی کی بات سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ وہ "ناکا" ہمارے لیے نہیں بلکہ ڈاکوؤں کی گرفتاری اور کسی مغویہ کی دستیابی کے لیے لگایا گیا تھا۔ میری طرح میر بخش نے بھی سکون کی سانس لی۔ اب میں پہلے سے زیادہ پراعتماد ہوچکا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں! آپ بھی عجیب بات کررہے ہو۔ کیا ہم آپ کو ڈاکو نظر آتے ہیں؟"

وہ غصے سے بولا "نہ بابا' اکڑ کیوں رہے ہو۔ اگر تم لوگ ڈاکو نہیں ہو تو آرام سے بیٹھو۔ ڈی ایس پی صاحب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ انہوں نے تو دو خطرناک ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے ناکا لگایا ہے جو بھیس بدل کر فرار ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"اور یہ مغویہ لڑکی کا کیا چکر ہے سائیں؟" میں نے نرم لہجے میں کرید جاری رکھی۔

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا "ممتاز نامی ایک لڑکی کو خطرناک ڈاکو منگل سنگھ نے اغوا کرلیا تھا جس کی رہائی کے عوض اس نے لڑکی کے باپ سے پچاس لاکھ روپے مانگے تھے۔ لڑکی کا باپ ڈاکو کی دھمکیوں میں نہ آیا اور اس نے فی الفور پولیس سے مدد طلب کرلی۔ سننے میں آیا ہے' لڑکی کے باپ کا کوئی رشتے دار پولیس میں ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس نے پولیس میں رپورٹ کردی تھی۔" ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "منگل سنگھ لڑکی کو اغوا کرکے گھنے جنگلات میں لے گیا تھا۔ پولیس نے وہاں پہنچ کر کامیاب چھاپا مارا مگر منگل سنگھ لڑکی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اب پتا چلا ہے' وہ بھیس بدل کر میرپور خاص کی طرف نکلنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک ساتھی بھی ہمراہ ہے اور وہ تینوں ایک گاڑی میں سوار ہیں۔"

اے ایس آئی نے اپنی بے دھیانی میں کافی مفید معلومات فراہم کردی تھیں۔ ہمیں جو شک ہوا تھا' معاملہ اس کے بالعکس نکلا تھا۔ وہ ناکا ہمیں گھیرنے کے لیے نہیں بلکہ کسی منگل سنگھ نامی ڈاکو کو گرفتار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اندرون سندھ میں ہندو اچھی خاصی تعداد میں رہائش پذیر ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کا مکمل دخل ہے۔ خاص طور پر انڈیا اور پاکستان کے بارڈر پر جو علاقے پائے جاتے ہیں وہاں ہندو اور مسلمان لگ بھگ برابر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ بعض جگہ تو وہ مسلمانوں سے زیادہ طاقت میں ہیں۔

میں نے بھولے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "سائیں آپ کا عہدہ تو میں جان چکا ہوں۔ آپ اے ایس آئی ہو۔ ذرا یہ بھی بتادو' آپ کا نام کیا ہے؟" پھر میں نے مکھن لگاتے ہوئے کہا "ویسے آپ کے بدن پر پولیس کی وردی خوب بج رہی ہے۔"

وہ خوش ہوگیا اور جوش بھرے لہجے میں پوچھنے لگا "آپ کو میرے عہدے کا کیسے پتا چلا؟"

"سائیں! آپ کے شولڈر کے پھول بول رہے ہیں۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مجھے گاڑی تھوڑی اور آگے بڑھانا پڑی۔ ہماری گاڑی جس مقام پر کھڑی تھی وہ جگہ اندھیرے میں تھی جبکہ ناکے والے مقام پر کچھ روشنی نظر آرہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اے ایس آئی کو مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔

میں نے اے ایس آئی کو یاد دلاتے ہوئے کہا "سائیں! آپ نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

"میں جمشید ہوں۔" وہ بولا "اے ایس آئی جمشید احمد۔"

میں نے پوچھا "جمشید سائیں! لگتا ہے' پولیس کی خاصی بھاری نفری یہاں موجود ہے!"

"ہاں سائیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "ڈی ایس پی صاحب تو ہیں ہی۔ ان کے علاوہ "شادی پلی" کا تھانہ انچارج' دو اے ایس آئی' ایک ایس آئی اور درجن بھر کانسٹیبل بھی اس مشن میں شامل ہیں جو سب کے سب مسلح اور چوکس ہیں۔ ایس پی عمرکوٹ کی جانب سے بڑے سخت آرڈرز آئے ہیں اسی لیے منگل سنگھ کی گرفتاری کے لیے ڈی ایس پی صاحب خود موقع پر موجود ہیں۔"

میں نے کہا "اس تیاری سے تو لگتا ہے' منگل سنگھ ڈاکو

پولیس کے لیے بہت اہم ہے!"

"بہت اہم سائیں۔" اس نے تائید کی "ممتاز نامی لڑکی کسی صاحبِ حیثیت شخص کی بیٹی ہے اور اس نے پولیس میں بہت اوپر سے سورس لگائی ہے۔ ویسے بھی پولیس منگل سنگھ کو کافی عرصے سے تلاش کر رہی تھی۔ اس کے کھاتے میں ڈکیتی، اغوا اور قتل جیسی کئی سنگین وارداتیں لکھی ہوئی ہیں۔ پولیس نے سرگرمی دکھاتے ہوئے اس کے ڈیرے پر چھاپا مارا تو وہاں اچھی خاصی مارا ماری ہو گئی جس کے نتیجے میں منگل سنگھ کے تین ساتھی پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ منگل سنگھ اپنے ایک ڈاکو ساتھی کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ مغویہ ممتاز اسی کے قبضے میں ہے۔ پولیس نے اپنی خفیہ تحقیق سے یہ معلوم کر لیا کہ منگل سنگھ بھیس بدل کر عمرکوٹ سے میرپور خاص جانا چاہتا ہے چنانچہ ایس پی صاحب کے فوری احکام پر ڈی ایس پی صاحب نے دونوں اضلاع کی سرحد پر ناکا لگایا ہے۔"

اے ایس آئی جمشید احمد ہماری جانب سے مطمئن تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہم منگل سنگھ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اسی لیے وہ مجھ سے گپ شپ کر رہا تھا۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ منگل سنگھ یا اس کے ساتھی سے ہماری آشنائی نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے قبضے میں ممتاز نامی کوئی لڑکی تھی۔ اگر ساحل کو ممتاز فرض کر بھی لیا جاتا تو ایک مغویہ کو اتنی آزادی سے گاڑی میں بیٹھے ہوئے نہیں ہونا چاہیے تھا پھر جب سے ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اس "چیکنگ" کا ہماری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس وقت سے میں بڑے اعتماد کے ساتھ اے ایس آئی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ہمیں ایک شعوری اطمینان حاصل ہو چکا تھا۔

میں نے اے ایس آئی کو ٹٹولنا جاری رکھا اور پوچھا "یہ ڈاکو منگل سنگھ کوئی سکھ ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں، منگل سنگھ ہندو ہے۔" اے ایس آئی نے بتایا۔

میں اور انجان بن گیا اور الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا "سنگھ اور ہندو! یہ کیا چکر ہے جمشید سائیں؟"

اس نے میری معلومات اور توقع کے مطابق جواب دیا "سنگھ ایک کاسٹ (ذات) ہے۔ سنگھ کوئی ہندو بھی ہو سکتا ہے اور کوئی سردار جی بھی۔ منگل سنگھ ہندو ہے۔ ادھر کنری کے جنگلات میں اس نے اپنا ڈیرا بنا رکھا ہے۔ چوری، ڈکیتی اور اغوا جیسے کئی مقدمات میں وہ ملوث ہے اور کبھی پکڑا نہیں گیا لیکن اب بچ کر نہیں جا سکے گا۔ اس کے تین ساتھی ہلاک ہو چکے ہیں جبکہ چوتھا ساتھی اس کے ہمراہ ہے۔"

میں نے پوچھا "سائیں! آپ بتا رہے ہو، منگل سنگھ نے کسی صاحبِ حیثیت شخص کی بیٹی ممتاز کو اغوا کر رکھا ہے۔ لڑکی کا باپ کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟"

میں نے محسوس کیا کہ اب وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے بوریت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا "ممتاز کے باپ کا نام قاضی سلطان ہے اور وہ "نبی سر" میں رہتا ہے۔ ممتاز اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"کیا خیال ہے سائیں۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا "یہ قاضی سلطان نے اس معاملے میں پولیس کو ملوث کر کے بے وقوفی کا ثبوت نہیں دیا۔ اگر وہ صاحبِ حیثیت اور مال دار اسامی ہے تو اسے بیٹی کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے تھا۔ اور وہ بھی اکلوتی بیٹی۔ پچاس لاکھ کی رقم بیٹی سے زیادہ قیمتی تو نہیں تھی؟"

اے ایس آئی جمشید چونکہ پولیس والا تھا اس لیے پولیس سے متعلق میرا اظہارِ خیال اسے کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔ برا سا منہ بناتے ہوئے اس نے کہا۔

"سائیں! یہی بات تو آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"کون سی بات جمشید سائیں؟"

"نہ بابا، آپ لوگوں نے پولیس کو پتا نہیں کیا سمجھ رکھا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا "اگر قاضی سلطان نے بیٹی کی واپسی کے لیے پولیس کی مدد حاصل کی ہے تو اس میں بے وقوفی والی کون سی بات ہے۔ پولیس کا تو کام ہی عوام کی مدد کرنا ہے۔"

میں نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہو سائیں، پولیس کا کام عوام کی مدد بلکہ خدمت کرنا ہے مگر بے وقوفی سے میری مراد یہ تھی کہ اس طرح ڈاکو منگل سنگھ طیش میں آ کر ممتاز کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ آپ بتا چکے ہیں، اس کے کھاتے میں کئی قتل لکھے ہوئے ہیں۔"

اس نے بغور میرا جائزہ لیا اور کہا "لگتا ہے، تمہیں ڈاکوؤں کی اغوا کنندگان کی نفسیات وغیرہ سے زیادہ واقفیت نہیں ہے۔ بابا، اگر قاضی سلطان، منگل سنگھ کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے اسے پچاس لاکھ روپے دے بھی دیتا تب بھی منگل سنگھ ممتاز کو زندہ نہ چھوڑتا۔ تم کو کچھ پتا نہیں ان ڈاکوؤں کے بارے میں۔"

"ٹھیک کہتے ہو سائیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت اے ایس آئی کو ایک ایسی بات یاد آ گئی جو بہت پہلے یاد آنا چاہیے تھی۔ وہ اب تک میرے سوالات کے جواب دے رہا تھا حالانکہ پولیس افسر ہونے کے ناتے اسے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دینا چاہیے تھی۔ پتا نہیں، وہ کس قسم کا اے ایس آئی تھا۔ خیر، باتونی قسم کے افراد اس طرح کی حماقتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ اے ایس آئی بلاشبہ ایک باتونی شخص تھا جو میری باتوں میں لگ کر اپنے مقصد سے ہٹ گیا تھا۔ اب وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہو گیا اور اس نے پوچھا۔

"تم لوگ کدھر سے آ رہے ہو سائیں؟"

میں نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا "ہم عمرکوٹ شہر کی طرف آ رہے ہیں۔"

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"میرپور خاص جائیں گے۔" میں نے بتایا۔

اس نے مزید پوچھا "عمرکوٹ کے رہنے والے ہو یا میرپور خاص کے؟"

میں نے کہا "عمرکوٹ میں میرے رشتے دار رہتے ہیں۔ میں ان سے مل کر میرپور خاص جا رہا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے، میرپور خاص کے رہنے والے ہو؟" اے ایس آئی نے سوال کیا۔

میں نے بتایا "میں دراصل کراچی کا رہنے والا ہوں۔ میرپور خاص میں بھی میرے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ میں آج کی رات میرپور خاص میں ان رشتے داروں کے پاس گزاروں گا۔ کل صبح ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔"

"کراچی میں آپ کیا کرتے ہو سائیں؟"

اے ایس آئی نے ایک خطرناک سوال کر ڈالا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا کوئی تسلی بخش جواب دیتا، اس کی پکار پڑ گئی۔ سندھی لب و لہجے میں کسی نے با آوازِ بلند اس کا نام لے کر پکارا تھا۔ اے ایس آئی جمشید احمد اس پکار کی جانب لپک گیا اور میں نے سکون کی سانس لی۔ اسی وقت مجھے اپنی گاڑی کو تھوڑا اور آگے بڑھانا پڑا۔

میر بخش نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "وجدان سائیں! یہ اے ایس آئی تو خوامخواہ چپک کر رہ گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے، دفع ہو گیا۔ میں تو دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا۔ ویسے سائیں، ایک بات کا تو اطمینان ہو گیا۔"

"کون سی بات؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ یہاں کی "چیکنگ" سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "اے ایس آئی اپنے باتونی پن میں ہمیں بہت مفید معلومات فراہم کر گیا ہے۔ منگل سنگھ اور ممتاز نامی لڑکی کی کہانی خاصی اہم اور سنسنی خیز ہے۔ ایک بات یاد رکھنا میر بخش!" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "اگر تم چاہتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہو تو اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات سے باخبر رہنا بہت ضروری ہے۔ اے ایس آئی نے پندرہ بیس منٹ تک جو بک بک کی ہے اسے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ منگل سنگھ کے بارے میں حاصل شدہ معلومات کسی بھی مرحلے پر ہمارے کام آ سکتی ہیں۔"

وہ پوری بات سننے کے بعد بولا "میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا لیکن اس وقت تو میں اس بات پر خوش ہوں کہ یہاں ہمارے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تارا یا پامی شاہ وغیرہ میں سے کسی کو ہوش آ گیا ہوگا اور انہوں نے فون کے ذریعے یا کسی اور طرح پولیس کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔"

"اس حوالے سے ابھی زیادہ مطمئن ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "ایسا ہونا ممکن نہیں۔ یہ ناکا اگر ہمارے لیے نہیں لگایا گیا تو کسی بھی وقت کسی ناخوشگوار صورت حال سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔"

"آپ کیوں ڈرا رہے ہو سائیں!"

"میں ڈرا نہیں رہا بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

وہ الجھی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا "کبھی بھی اور کسی بھی حال میں مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ ہم جس راہ کے مسافر ہیں وہ اتنی پُرپیچ و پُرخار ہے کہ اس پر چلتے ہوئے کہیں بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں اپنے دشمنوں کی طرف سے ایک لمحے کی غفلت بھی نہیں برتنا چاہیے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو سائیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا "اب چند باتیں نہایت ہی اہم اور موقع محل کی مناسبت سے ہو جائیں۔" میرا جملہ ختم ہوا تو میر بخش نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے پوچھا "میر بخش! اے ایس آئی جمشید احمد کی آمد سے قبل میں نے تمہیں اعشاریہ تین آٹھ کی گولیوں والا کلپ دیا تھا، وہ کہاں ہے؟"

اس نے اپنی دائیں ران کے نیچے ہاتھ گھمایا اور مذکورہ کلپ برآمد کرتے ہوئے بولا "میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اسے چھپا دیا تھا۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا پھر پوچھا "اور وہ خالی پستول کہاں ہے؟"

اس نے اپنے لباس سے وہ پستول نکال کر میرے حوالے کردیا۔ میں نے پستول اور گولیوں والا کلپ ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے دبا دیا اور میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے جمشید کی باتیں سن لی ہیں۔ اس وقت موقع پر ڈی ایس پی صاحب' شادی پلی کا ایس ایچ او' ایک ایس آئی' دو اے ایس آئی اور درجن بھر کانسٹیبل موجود ہیں اور ایک بات ذہن نشین کرلو کہ تمام افراد اے ایس آئی جمشید کی طرح باتونی اور احمق نہیں ہوں گے۔ اس نوعیت کا کوئی ایک "پیس" ہی ہوتا ہے لہٰذا۔۔۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی اور کہا "لہٰذا ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس سے کوئی بھی قابلِ اعتراض یا قابلِ گرفت شے برآمد نہیں ہونا چاہیے۔"

میر بخش نے اثبات میں گردن ہلائی' میں نے کہا "اب میں جو کچھ کہنے جارہا ہوں' اسے غور سے سنو اور ذہن میں نقش کرلو۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میرا نام مراد ہے اور ساحل کا کلثوم اور تم۔۔۔ تم میر بخش ہی ہو۔"

میر بخش نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے اپنا بیان جاری رکھا "ڈی ایس پی اور ایس ایچ او بال کی کھال اتاریں گے اور اگر ہمارے بیان پر انہیں کسی قسم کا شک ہوگیا تو وہ ہماری کھال کے بال بھی اتار سکتے ہیں لہٰذا ہم سب کا بیان ایک جیسا ہونا چاہیے۔"

میر بخش پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں اور ساحل یعنی مراد اور کلثوم آپس میں کزن ہیں اور کراچی میں رہتے ہیں۔ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے میرپور خاص آئے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ وڈیرا اکبر سومرو سے ملنے عمر کوٹ آگئے۔ وڈیرے سے بھی ان کی دور پار کی رشتے داری نکلتی ہے۔ تم یعنی میر بخش وڈیرا اکبر سومرو کے ڈرائیور ہو اور ہم مہمانوں کو وڈیرے کی گاڑی میں میرپور خاص چھوڑنے جارہے ہو۔ راستے میں تمہارے بازو میں اچانک درد اٹھا۔ اس لیے میں بہ حالتِ مجبوری ڈرائیونگ کررہا ہوں۔ تمہارے درد والے بازو پر میں نے کس کر اسکارف باندھ دیا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "سائیں! آپ نے تو فوراً کے فوراً ایک بہت اچھی اور پُر تاثر کہانی تیار کرلی ہے۔ سننے والا فوراً اس پر یقین کرلے گا۔ لگتا ہے' جیسے بالکل سچی کہانی ہو!"

"ہر کہانی سچی ہوتی ہے میر بخش!" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا "واقعات یا تو پیش آرہے ہوتے ہیں یا پیش آچکے ہوتے ہیں یا پھر پیش آنا ہوتے ہیں۔ یہ سب ماضی' حال اور مستقبل کا چکر ہے۔"

میر بخش عقیدت بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اے ایس آئی جمشید پلٹ کر واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے آہستگی سے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر آگیا۔ ساحل کافی دیر سے صورتِ حال کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے "سب ٹھیک ہے" کہہ کر اسے اطمینان تو دلا دیا تھا تاہم زبانی کلامی تسلی بھی ضروری تھی۔

میں گاڑی سے اتر کر عقبی حصے کی کھڑکی کے پاس آیا اور نہایت ہی مختصر الفاظ میں ساحل کو صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ پولیس والوں کی پوچھ تاچھ کے جواب میں ہمیں کیا کہنا ہے۔ وہ بڑی معاملہ فہم اور ذہین لڑکی تھی۔ فوراً میری بات سمجھ گئی۔ میں مطمئن ہوکر ڈرائیونگ کیبن میں آگیا۔

اے ایس آئی جمشید احمد نے جب دھمکی آمیز انداز میں مجھے گاڑی کے اندر بیٹھنے کو کہا تھا تو ساتھ یہ بھی بتایا تھا کہ پیچھے دور تک پولیس کے مسلح افراد موجود ہیں لہٰذا میرے فرار کی ہر کوشش ناکامیاب بنا دی جائے گی۔ میں نے اسی بات کی تصدیق کے لیے چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ اگرچہ ہر طرف اندھیرے کا راج تھا تاہم مجھے ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیے جس سے اے ایس آئی کے دھمکی آمیز بیان کی تصدیق ہوسکتی۔ میں نے یہی سوچا کہ جمشید نے محض رعب میں لانے کے لیے وہ بات کہی ہوگی۔ پولیس والے اس قسم کے جعلی عکس ڈالنے کے عادی ہوتے ہیں۔

میں نے ساحل سے بات کرتے ہوئے اپنی آواز خاصی دھیمی رکھی تھی کیونکہ ہماری گاڑی کے پیچھے بھی دو گاڑیاں آکر رک چکی تھیں۔ ان میں ایک کار تھی اور دوسری پرائیویٹ بس جس میں بہت کم سواریاں تھیں۔ وہ مسافر بس آدھی سے زیادہ خالی پڑی تھی۔

میں نے جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی' مجھے اپنی گاڑی کو مزید آگے بڑھانا پڑا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ اور آئندہ کے پروگرام سے متعلق باتیں ہونے لگیں۔

خدا خدا کرکے آدھے گھنٹے بعد ہماری گاڑی کی چیکنگ کی باری آئی۔ اب ہم اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں اچھی خاصی روشنی تھی۔ میں نے دیکھا' ڈی ایس پی صاحب اپنی سرکاری جیپ کے ساتھ ٹیک لگائے چائے نوش فرما رہے تھے جبکہ ایس ایچ او ۔۔۔ شادی پلی گاڑیوں کی چیکنگ کررہا تھا۔ ہم سے اگلی والی جیپ رخصت ہوئی تو موٹی توند والا ایس ایچ او ہماری جانب بڑھا۔ اس کی چال میں خاصی تیزی تھی اور وہ گہری نظر سے ہماری گاڑی کو اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔

ہمارے قریب آکر اس نے ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی کی جانب قدم بڑھائے اور مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ میں چپ چاپ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

ایس ایچ او (تھانہ انچارج) نے گاڑی کے اندر جھانکا میر بخش کو بھی نیچے اترنے کا حکم دیا پھر اس نے گاڑی کے عقبی حصے میں نگاہ دوڑائی۔ تاہم ساحل کو اس نے گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا۔ اس کے بعد وہ میری جانب متوجہ ہوگیا۔

"گاڑی کے کاغذات اور اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس دوران میں دو مسلح کانسٹیبل ہمیں اپنی گنوں کے نشانے پر رکھ چکے تھے۔ صورتِ حال خاصی نازک تھی۔ میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس تو کیا' کوئی شناختی کارڈ بھی نہیں تھا۔ یہی کیفیت ساحل کی بھی تھی۔ تاہم گاڑی کے کاغذات ڈیش بورڈ میں موجود تھے۔ میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر وہ کاغذات نکال لیے پھر نہایت ادب سے انہیں تھانہ انچارج کی طرف بڑھا دیا۔

وہ گاڑی وڈیرا اکبر سومرو کے نام رجسٹرڈ تھی۔ تھانہ انچارج نے کاغذات کا باریک بینی سے معائنہ کیا پھر میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "تم اکبر سومرو تو نہیں ہوسکتے۔ کیا تم وڈیرے کے ڈرائیور ہو؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "ڈرائیور وہ ہے۔" میں نے میر بخش کی طرف اشارہ کیا "اس کا نام میر بخش ہے۔ یہ وڈیرا اکبر سومرو کا ڈرائیور بھی ہے اور اس کے بنگلے پر چاکری بھی کرتا ہے۔"

میں نے تھوڑی دیر پہلے میر بخش کو جو "کہانی" یاد کروائی تھی' اس میں اسے وڈیرے کا ڈرائیور ہی بتایا تھا۔ ایسا میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ گاڑی وڈیرا اکبر سومرو کے نام رجسٹرڈ تھی' بہ صورتِ دیگر ہم پر اس گاڑی کی چوری کا شک کیا جاسکتا تھا۔

تھانے دار نے میرے جواب کے بعد سوال کیا "اگر میر بخش اس گاڑی کا ڈرائیور ہے تو پھر تم ڈرائیونگ کیوں کررہے تھے؟"

اس موقع پر میر بخش نے جواب دیا "سائیں!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "عمر کوٹ سے اکڑی تک میں ہی گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کے بعد میرے بازو میں اچانک درد اٹھا اور میں ڈرائیونگ کے قابل نہ رہا۔ مجبوراً مراد سائیں کو ڈرائیونگ کرنا پڑی۔ یہ دیکھیں۔" میر بخش نے اپنے بندھے ہوئے دائیں بازو کی طرف اشارہ کیا "مجھے بہت شدید درد ہورہا ہے۔ آپ اگر ہمیں جلدی جانے دو تو مہربانی ہوگی سائیں!"

"یہ کس قسم کا درد ہے میر بخش۔" تھانے دار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا "جس کی تکلیف کے آثار تمہارے چہرے پر نظر نہیں آرہے؟"

"سائیں! برداشت کررہا ہوں۔" میر بخش نے دوبارہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ورنہ میرا حال تو میرے دل کو ہی پتا ہے۔ یہ درد کبھی کبھار ہوجاتا ہے۔ کئی ڈاکٹروں کو دکھایا ہے مگر وقتی فائدہ ہوتا ہے' مرض ختم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ یہ اعصابی درد ہے۔"

تھانے دار نے اس کی وضاحت سننے کے بعد کہا "تمہارے پاس تو ڈرائیونگ لائسنس ہوگا؟"

میر بخش ایک لمحے کے لیے گھبرایا پھر سنبھلتے ہوئے بولا "سائیں! جلدی میں' میں اپنا لائسنس بنگلے پر بھول آیا ہوں۔"

"کوئی اور شناختی کاغذ؟"

"نہیں سائیں۔" میر بخش نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس دوران میں تھانے دار چبھتی ہوئی نگاہ سے ہم تینوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمارے چہروں کے پیچھے کچھ تلاش کررہا ہو۔ مجھے اس کا "دیکھنا" تشویش میں مبتلا کررہا تھا۔ اس کی نظر کا خصوصی مرکز ساحل تھی۔

وہ میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولا "تمہارے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں' اور بھی کوئی شناختی کاغذ نہیں اور تم وڈیرا اکبر سومرو کے ڈرائیور اور چاکر ہونے کے دعوے دار ہو۔ میں تمہاری بات کا کیسے یقین کراوں؟"

میر بخش سے کوئی جواب نہ بن پایا تو میں نے تھانے دار سے کہا "سر! میں مانتا ہوں' میر بخش اپنی کوتاہی سے ضروری کاغذات بنگلے پر بھول آیا ہے۔ آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں تو مہربانی ہوگی۔"

اس نے کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے ٹٹولا پھر سوال کیا "تمہارا کیا نام ہے جوان؟"

میں نے اپنا نام مراد بتایا۔

اس نے پوچھا "وہ لڑکی جو گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھی ہے، تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"وہ میری کزن ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا نام؟"

"کلثوم!" میں نے بتایا۔

"تم دونوں اس علاقے کے نہیں لگتے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر ہمارے چہروں کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کی اور پوچھا "کیا کہیں باہر سے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا "ہم دونوں کا تعلق کراچی سے ہے۔ میرپور خاص میں ہمارے کچھ رشتے دار رہتے ہیں۔ ہم ان سے ملنے آئے تھے۔ یہاں عمرکوٹ کے وڈیرا اکبر سومرو سے بھی ہمارے دیرینہ خاندانی مراسم ہیں اس لیے صبح اس طرف آگئے تھے۔ وڈیرا سائیں کا ڈرائیور میر بخش ہمیں میرپور خاص چھوڑنے جارہا ہے۔ کل صبح ہم واپس کراچی چلے جائیں گے۔"

"میرپور خاص میں کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"رتن آباد میں۔" میں نے بتایا۔

پولیس والوں کے سوالات کا "مقابلہ" کرنے کے لیے میں نے میر بخش سے میرپور خاص کے کچھ علاقوں کے نام اور ان کے بارے میں سرسری معلومات حاصل کرلی تھیں۔ انہی معلومات کی روشنی میں، میں نے ابھی تھانے دار کو جواب دیا تھا۔ "رتن آباد" میرپور خاص شہر کے قریب ہی تھا۔

"تمہارے پاس تو شناختی کاغذات ہوں گے؟" تھانے دار نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

میں نے نفی میں جواب دیا "اتفاق سے نہیں ہیں۔"

"اور تمہاری کزن کلثوم کے پاس؟"

میں نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلادی۔

تھانے دار نے طنزیہ لہجے میں کہا "اور یہ بھی ایک اتفاق ہے؟"

اس موقع پر میں نے صورتِ حال کو سنبھالنا ضروری سمجھا اور نہایت ہی شائستہ لہجے میں کہا "تھانے دار صاحب! ہمارے شناختی کاغذات وغیرہ ہمارے سامان میں رکھے ہیں جو رتن آباد (میرپور خاص) میں ہمارے رشتے داروں کے گھر پڑا ہے۔ ہم صبح جلدی میں وہ کاغذات اپنے ساتھ رکھنا بھول گئے تھے۔"

میری وضاحت پر وہ شانت ہونے کے بجائے ہوگیا اور غصیلے لہجے میں بولا "تم دونوں صبح عمرکوٹ اپنے شناختی کاغذات ساتھ نہ رکھ سکے اور میر بخش سے آتے ہوئے اپنا لائسنس اور دیگر کاغذات بھول یہ سب اتفاق ہے؟"

"آپ بلاوجہ ہم پر شک کررہے ہیں تھانے دار صاحب!" میں نے کہا۔

"بلاوجہ کے بچے!" وہ دہاڑا "یہ کیا ہے؟" اس کے ساتھ ہی اس نے ہماری گاڑی کی باڈی پر ایک زوردار رسید کی۔

"کیا ہے؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

تھانے دار نے گاڑی کی باڈی پر چسپاں سرخ رنگ کے کاغذ کو کھرچا اور چیخ سے مشابہ آواز میں بولا "یہ ہے باپ، ذرا غور سے دیکھو۔"

میں ایک دم سناٹے میں رہ گیا۔ میر بخش اور کی کیفیت بھی مجھ سے ذرا مختلف نہیں تھی۔ گاڑی کی باڈی جہاں سے سرخ کاغذ کھرچا گیا تھا وہاں باڈی کا اصلی سیاہ رنگ جھانک رہا تھا۔ ہم افراتفری میں گاڑی کی اس "تبدیلی" کو ذہن میں نہیں رکھ سکے تھے۔ ہمیں عمرکوٹ سے نکلنے کے بعد چاہیے تھا کہ فوراً پوری گاڑی سے وہ سرخ کاغذ اتار پھینکتے یا کھرچ ڈالتے مگر اپنی چِنتا میں اس طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ اس غفلت نے ہمیں بری طرح دیا تھا۔

تھانے دار نے بھانپ لیا تھا کہ ہماری گاڑی پر کوئی وغیرہ چسپاں کیا گیا ہے اور اس نے اس کی عملی تصدیق بھی کردی تھی۔ اب وہ کھا جانے والی سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھنکارا "اب تم کہ یہ کاغذ بھی ایک اتفاق کے تحت تمہاری گاڑی سے گیا ہے اور اتنی مہارت سے چپکا ہے کہ اس نے پوری کو ڈھک کر سیاہ سے سرخ بنادیا ہے۔ کیوں، میں ٹھیک ہوں نا؟"

تھانے دار کے لہجے میں بڑی کاٹ تھی اور وہ سے مجھے گھور رہا تھا۔

"وہ دراصل۔ بات یہ ہے کہ ہماری گاڑی" میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی ایک اور مگر تھانے دار نے میری بات کاٹ دی اور میں بولا "تمہیں جو بھی بکواس کرنا ہے، ڈی ایس پی

کے سامنے کرتا۔"

پھر اس نے اپنے ماتحتوں کو اشارہ کیا۔ چار پولیس والے مستعدی سے ہمارے اردگرد جمع ہوگئے۔ وہ چاروں اسلحے سے لیس تھے۔ دو گن بردار کانسٹیبل پہلے ہی ہمیں ٹارگٹ بنائے ہوئے تھے۔ بعد میں آنے والے چار میں سے ایک ایس آئی (سب انسپکٹر) اور تین کانسٹیبل رینک کے تھے۔ تھانے دار نے سب انسپکٹر سے کہا۔

"تم اپنی نگرانی میں گاڑی کی مکمل تلاشی لو۔ اس سے پہلے اس لڑکی کو باہر نکال کر ایک طرف کھڑا کردو۔ ہری اپ!"

سب انسپکٹر اپنے سینئر کو سیلوٹ کرکے گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ دو کانسٹیبل بھی گاڑی کی طرف لپکے تھے۔ وہ خاصے جارحانہ موڈ میں تھے۔

تھانے دار نے ایک کانسٹیبل کو حکم دیا "تم میر بخش کے بازو پر بندھا ہوا کپڑا کھلواؤ۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں اسے کس قسم کا درد ہوتا ہے!"

ان احکام کے بعد تھانے دار میری جانب متوجہ ہوگیا "تمہاری تلاشی میں خود لوں گا۔"

میں تلاشی سے نہیں گھبرا رہا تھا۔ میرے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوسکتی تھی جسے قابل دخل اندازی پولیس کہا جاسکتا۔ میرے بٹوے میں کچھ رقم موجود تھی۔ یہ وہی رقم تھی جو کل رات میر بخش نے مجھے دی تھی۔ ان دو ہزار روپوں میں سے میں نے ہوٹل کا کرایہ ادا کیا تھا یا پھر ہم نے کھانے وغیرہ میں استعمال کیے تھے۔

میری اصل پریشانی کی وجہ میر بخش تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری گاڑی کی تلاشی۔ میر بخش کے بازو کی پٹی اگر کھل جاتی تو یہ بات سامنے آنا ضروری تھا کہ وہ اسکارف وہاں کیوں باندھا گیا تھا۔ میر بخش کی قمیص کی وہ آستین شانے کے قریب سے خون میں لتھڑی ہوئی تھی اور دعوت دیتی تھی کہ بازو کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا جائے۔ اگر میر بخش کی آستین الٹ دی جاتی یا اس کا بازو آستین میں سے نکال کر دیکھا جاتا تو گولی کی "کارستانی" روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی۔

گاڑی کی تلاشی اس حوالے سے ہمارے لیے مضر اور خطرناک ثابت ہوسکتی تھی کہ وہاں ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا ایک پسٹل اور لوڈڈ کلپ موجود تھا۔ پولیس والے تلاشی کے دوران میں تمام سیٹوں کو الٹ پلٹ کر ضرور دیکھتے۔ اس کے علاوہ سیاہ گاڑی پر چسپاں سرخ کاغذ کا "عقدہ" کھل چکا تھا۔ اچانک بہت سی مصیبتیں ہم پر ایک ساتھ نازل ہوگئی تھیں جن سے فوری طور پر چھٹکارا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

میں اگر ہر احتیاط اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس صورتِ حال سے دو دو ہاتھ میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا مگر میں اپنی دھرتی پر کسی بھی صورت قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہتا تھا۔

جس دوران میں تھانے دار میری تلاشی لے رہا تھا ساحل کو گاڑی سے باہر نکال کر ایک طرف کھڑا کردیا گیا۔ دوسری جانب ایک کانسٹیبل نے میر بخش کے بازو پر بندھا اسکارف کھلوا دیا۔ اس کے بعد ہی صورتِ حال اچانک سنگین ہوگئی۔ میر بخش کی جامہ تلاشی سے دس ہزار روپے برآمد کرلیے گئے۔

تھانے دار کو میری جامہ تلاشی سے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ تاہم اس کی مایوسی کو اس کانسٹیبل کی آواز نے خوشی میں بدل دیا جس نے میر بخش کے بازو کا اسکارف کھلوایا تھا "سر! یہ بندہ تو زخمی ہے۔" کانسٹیبل نے جوشیلے انداز میں اعلان کیا۔

تھانے دار مجھے ایک مسلح کانسٹیبل کے حوالے کرکے میر بخش کی جانب بڑھ گیا اور اس کے زخمی بازو کا جائزہ لینے کے بعد زہریلے لہجے میں استفسار کیا "تو تمہارے اعصاب سے خون بھی نکلتا ہے؟"

ہمارا جھوٹ کھل چکا تھا اس لیے میر بخش نے کوئی توجیہہ پیش کرنے کے بجائے مکمل خاموشی اختیار کرلی تھی۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

اسی وقت گاڑی کی طرف سے بھی ہمارے لیے بری خبر آگئی۔ تلاشی لینے والے سب انسپکٹر نے مذکورہ پسٹل مع کلپ برآمد کرلیا تھا اور بڑی مسرت کے ساتھ اسے تھانے دار کے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"سر، یہ لوگ بہت خطرناک ہیں۔"

"بہت خطرناک مجرم کہو۔" تھانے دار نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا پھر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا "انہیں فوراً گرفتار کرلو۔"

ہمارے پاس گرفتاری دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہمارے بہت سے جھوٹ پکڑے گئے تھے اور ہماری گاڑی سے چھپایا ہوا آتشیں اسلحہ بھی برآمد کیا گیا تھا۔ راہ پر چلتے ہوئے ہمارے پاس کوئی جائے فرار نہیں تھی۔ بدمعاشی یا سینہ زوری کے حق میں میں اس وقت نہیں تھا چنانچہ ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ ہم ایک مرتبہ پھر گرفتارِ بلا ہوچکے تھے۔

ہماری گرفتاری کے احکام صادر کرتے ہی تھانے دار اپنے سینئر افسر ڈی ایس پی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ یقیناً وہ اس مشن کے کرتا دھرتا کو کوئی سنسنی خیز خبر سنانا چاہتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ ڈی ایس پی فوراً ہی تھانے دار کے ساتھ ہمارے پاس آگیا۔ تھانے دار نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ہمیں جن تین افراد کی تلاش تھی وہ یہی ہوسکتے ہیں!"

اس انکشاف نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ گویا پولیس والے ہم پر ڈاکو منگل سنگھ، اس کے ساتھی اور مغویہ ممتاز کا شک کررہے تھے۔ یہ ایک عجیب سی بات تھی کیونکہ کسی بھی طور ہمارا ڈاکوؤں کے کسی گروہ سے تعلق نہیں تھا۔

ڈی ایس پی کو تھانے دار مختصر الفاظ میں ہماری غلط بیانیوں کے بارے میں بتا چکا تھا لہٰذا اس نے نفرت آمیز نظر سے ہمیں دیکھا اور تھانے دار سے کہا "انہیں فوراً تفتیشی سیل پہنچانے کا بندوبست کرو۔ وہیں پر ان تینوں سے باری باری پوچھ گچھ کی جائے گی۔"

اس موقع پر میں نے احتجاج کرنا ضروری سمجھا اور ڈی ایس پی سے مخاطب ہوتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا "سر! آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، ہم نے آپ لوگوں سے کچھ غلط بیانی کی ہے۔ اس میں بھی ہماری بہت سی مجبوریاں پوشیدہ ہیں۔ اگر آپ ہماری بات تسلی اور اطمینان سے سن لیں تو آپ کو ہماری بے گناہی اور مصیبت زدگی کا یقین آجائے گا مگر ہم ہرگز ہرگز ڈاکو نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارا جرائم پیشہ افراد سے کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ ہے۔ ہم کسی منگل سنگھ یا ممتاز کو نہیں جانتے۔"

"دیکھا آپ نے سر!" تھانے دار جوشیلے لہجے میں ڈی ایس پی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "یہ شخص منگل سنگھ اور ممتاز کا نام لے رہا ہے حالانکہ میں نے آپ سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمیں جن تین افراد کی تلاش تھی وہ یہی ہوسکتے ہیں۔ منگل سنگھ اور ممتاز وغیرہ کا تو کہیں ذکر نہیں کیا گیا پھر یہ شخص خود سے اپنی لاتعلقی پر زور کیوں دے رہا ہے؟"

تھانے دار کی بات ڈی ایس پی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور پوچھا "ہاں بھئی! تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم نے یہاں منگل سنگھ ڈاکو کی گرفتاری کے لیے ناکا لگایا ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "یہ بات مجھے تھوڑی دیر پہلے آپ کے محکمے کے ایک ایس آئی نے بتائی ہے۔"

اس نے چونک کر تھانے دار کو دیکھا اور مجھ سے سوال کیا "کون اے ایس آئی؟"

میں نے اے ایس آئی جمشید احمد کا نام لے دیا۔

ڈی ایس پی نے تصدیقی نظر سے تھانے دار کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "جی سر، اس نام کا ایک اے ایس آئی اس مشن میں شامل ہے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر پوچھنے لگا "اے ایس آئی جمشید احمد نے تمہیں یہ بات کب اور کیوں بتائی تھی؟"

میں نے کہا "جمشید نے مجھے یہ بات کوئی آدھا گھنٹا پہلے یہیں بتائی تھی جب ہماری گاڑی آٹھ نو دوسری گاڑیوں کے پیچھے آکر رکی تھی۔" ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے مزید کہا "اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اس نے مجھے یہ بات کیوں بتائی تھی تو اس کا سیدھا سیدھا جواب یہ ہے کہ میں نے اس سے پوچھا اور اس نے بتا دیا۔ بس!"

ڈی ایس پی نے تھانے دار کو حکم دیا کہ وہ فوراً مذکورہ اے ایس آئی کو وہاں حاضر کرے۔ تھانے دار موٹی توند پر پتلون سنبھالتے ہوئے "یس سر، یس سر" کی گردان کرتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوگیا۔

"تم نے اپنا نام مراد اور اپنی کزن کا نام کلثوم بتایا ہے جبکہ تمہارا ساتھی میر بخش ہے۔ ان ناموں میں کس حد تک صداقت ہے؟"

میں نے ایک حد تک سچ بولتے ہوئے بتایا "میر بخش کا نام بالکل اصلی ہے جبکہ ہمارے نام فرضی ہیں۔ اس فرضیت کی بھی معقول وجوہات ہیں۔ اگر آپ ہماری مجبوریوں کا احساس کرلیں تو ہمیں بے گناہ پائیں گے۔ ہم کسی بھی طور کسی جرم میں ملوث نہیں ہیں۔"

"تمہاری مجبوریوں کی داستان تو میں بعد میں سنوں گا۔" ڈی ایس پی نے سخت لہجے میں کہا "ابھی تو آپ لوگوں کا بہروپ کھولنا ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی بھیس بدل کر فرار ہونے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہوں نے مغویہ ممتاز کے حلئے میں بھی اچھی خاصی تبدیلیاں کررکھی ہیں۔"

ڈی ایس پی کی بچکانا تاویلوں سے مجھے بہت کوفت ہوئی۔ میں نے بیزاری سے کہا "سر! آپ تو ایک ذمے دار اعلیٰ افسر ہیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ ہمارے بارے میں اس قسم

کی بات کریں گے۔"

میرے پُر اعتماد لہجے نے ڈی ایس پی کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس نے گہری نظر سے مجھے گھورا تاہم گمبھیر آواز میں بولا "تم میری کس بات کا ذکر کررہے ہو۔ میں نے تمہارے بارے میں ایسا کیا کہہ دیا ہے؟"

میں نے کہا "سر! ہم تینوں اس وقت آپ کے سامنے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی سوانگ بھر رکھا ہے تو آپ کو نظر آجانا چاہیے اور پھر آپ نے میری ساتھی کلثوم کے رویّے میں "مغویہ" والی کوئی بات دیکھی ہے؟ آپ چاہیں تو اس سے تنہائی میں بات کرسکتے ہیں۔ اگر وہ مغویہ ممتاز ہی ہے تو ضرور آپ کو ہمارے بارے میں بتادے گی۔"

"میں تم سب سے باری باری تنہائی میں ملاقات کروں گا۔" وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "پہلے میں اس چغل خور اے ایس آئی کی تو خبر لے لوں۔"

جب تک تھانے دار اے ایس آئی جمشید احمد کو تلاش کرکے لاتا، میں نے مختلف سوال کرکے ڈی ایس پی سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ منگل سنگھ ڈاکو کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ اس کے نوجوان ساتھی کا نام گنڈا سنگھ تھا جس کی عمر کم و بیش بائیس سال تھی جبکہ مغویہ ممتاز اٹھارہ سال کی ایک دراز قامت لڑکی تھی۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ منگل سنگھ اور اس کے ساتھی گنڈا سنگھ کو کسی نے نہیں دیکھ رکھا تھا اس لیے وہ انہیں صورت شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ میری عمر گنڈا سنگھ کے اریب قریب تھی اور میر بخش منگل سنگھ کے برابر تھا جبکہ ساحل دراز قامت ہونے کے ساتھ ساتھ ممتاز کی ہم عمر بھی تھی۔ اس لیے ان کا شک ہماری طرف جارہا تھا اور خاص طور پر اس صورتِ حال میں کہ ہماری گاڑی کا اصلی رنگ چھپانے کے لیے اس پر سرخ کاغذ چسپاں کردیے گئے تھے، ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے ایک پستول اور گولیوں والا بھرا ہوا میگزین برآمد ہوا تھا اور میر بخش کے بازو کے زخم کو چھپانے کے لیے ہم نے ایک فرضی درد والی کہانی سنائی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں تھانے دار نے اے ایس آئی جمشید کو ڈی ایس پی صاحب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا "سر! جمشید نے اپنی کوتاہی تسلیم کرلی ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ اتنے خطرناک ثابت ہوں گے۔"

تھانے دار واضح طور پر اپنے اے ایس آئی کی حمایت میں بول رہا تھا۔ ڈی ایس پی نے اسے جھاڑا اور غصیلے لہجے میں کہا "اگر یہ لوگ خطرناک ثابت نہیں بھی ہوتے تو کیا اے ایس آئی کو یوں غیر متعلقہ لوگوں سے اس قسم کی اہم باتیں کرنے کا حق حاصل ہے؟"

"نہیں سر، بالکل نہیں۔" تھانے دار نے تیزی سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا "کوتاہی تو بہرحال جمشید سے ہوئی ہے سر۔"

جمشید احمد گردن جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک ناپسندیدہ نظر ہم پر ڈالنے کے بعد اوپر نہیں دیکھا تھا۔ ڈی ایس پی نے سخت لہجے میں تھانے دار سے کہا "جب کوئی شخص کوتاہی کرتا ہے تو اسے اس کی سزا بھی ملتی ہے۔ ملتی ہے یا نہیں؟"

"ضرور ملتی ہے سر!" تھانے دار نے تائید کی۔

ڈی ایس پی نے کہا "میں یہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم اپنے اے ایس آئی کی کوتاہی کے لیے کون سی سزا تجویز کرتے ہو۔" تھانے دار نے یہ الفاظ سنتے ہی سکون کی سانس لی۔ ڈی ایس پی نے مزید کہا "اب تم ان تینوں کو موبائل میں بٹھادو۔ میں انہیں پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور وہاں گاڑی کے باہر مسلح افراد کا پہرا بٹھادو تاکہ یہ کہیں فرار ہونے کی کوشش نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے سر۔" تھانے دار نے فدویانہ لہجے میں کہا اور ہمیں دھکیلتا ہوا ڈی ایس پی کی جیپ کی طرف لے جانے لگا۔ وہ موبائل جیپ کے قریب ہی کھڑی تھی۔

پیچھے سے ڈی ایس پی نے کہا "انہیں گاڑی میں بٹھا کر تم باقی گاڑیوں کو جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کرو۔ سڑک پر زیادہ رش نہیں لگنا چاہیے۔"

تھانے دار ایک مرتبہ پھر "یس سر" کہتے ہوئے ہمارے ساتھ موبائل کی جانب قدم بڑھانے لگا جو وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اس دوران میں سڑک پر، ہماری گاڑی کے پیچھے کار اور پرائیویٹ بس کے عقب میں دو تین اور گاڑیاں آکر رک چکی تھیں۔ میں نے جب اپنی گاڑی کی طرف دیکھا تو وہ مجھے حرکت میں نظر آئی۔ ازاں بعد معلوم ہوا کہ ڈی ایس پی کی ہدایت پر ایک پولیس اہلکار نے ہماری گاڑی کو سڑک سے اتارلیا تھا تاکہ پیچھے والی گاڑیوں کے لیے راستہ ہموار ہوسکے۔ ہماری گاڑی کو ڈی ایس پی والی جیپ سے تھوڑے فاصلے پر روک دیا گیا۔ جب ہمیں موبائل میں بٹھادیا گیا تو ہم خاصے پریشان تھے۔ موبائل میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا تاہم موبائل سے باہر چار مسلح افراد ہماری نگرانی کے لیے مستعد کھڑے تھے۔

ہم تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں پریشان نہیں بلکہ فکر مند تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک نئی مصیبت نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ ساحل اور میر بخش کے چہروں پر فکر کی گہری پرچھائیں تھیں۔ چند لمحے ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر میر بخش نے تشویشناک لہجے اور دھیمی آواز میں کہا۔

"وجدان سائیں! ہماری کہانی تو فیل ہوگئی۔ اب کیا ہوگا؟"

"وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا۔" میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

ساحل اضطراری لہجے میں بولی "وجدان! تمہیں جلد از جلد کوئی نئی اور موثر کہانی سوچنا ہوگی ورنہ ہم خوا مخواہ منگل سنگھ کے شبے میں کسی بڑی مشکل میں پڑجائیں گے۔ پہلے ہی ہمارے حالات خاصے سنگین ہیں۔"

"ہاں سائیں! کچھ سوچو۔" میر بخش نے کہا "آپ ہی کچھ حل نکال سکتے ہو۔"

میں اس بارے میں مسلسل سوچ بچار کررہا تھا۔ اس سلسلے میں میرا ذہن ایک لمحے کے لیے بھی غفلت کا شکار نہیں ہوا تھا۔ پیش آمدہ صورت حال سے نکلنے کے لیے کوئی عمدہ اور نئی بہدف کہانی بننا بہت ضروری تھا ورنہ کسی بھی قسم کی تاخیر ہمیں کسی بہت بڑے وبال میں ڈال سکتی تھی۔

چند منٹ بعد میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میرا ذہن ایک نئی اور زیادہ موثر کہانی تیار کرچکا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور دھیمے لہجے میں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ کسی بھی لمحے یہ لوگ ہم پر نگرانی کو اور زیادہ سخت کرسکتے ہیں لہٰذا ہمیں جو بھی طے کرنا ہے فوراً کرلینا چاہیے۔ ممکن ہے، قدرت نے ہمیں یہ موقع دیا ہو تاکہ ہم اپنی بچت کے سلسلے میں کوئی لائحہ عمل بنالیں۔"

"لائحہ عمل تو آپ ہی بتاؤ گے سائیں۔" میر بخش نے دھیمی آواز میں کہا "ہم تو آپ کی پلاننگ پر عمل کریں گے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! میں تم میں کافی تبدیلیاں محسوس کررہی ہوں۔"

"مثلاً کون سی تبدیلیاں؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ بولی "تم کافی بدلے ہوئے نظر آتے ہو۔ پہلے تو تم بڑے نڈر سے تھے۔"

"پہلے میں کیسا تھا؟" میں نے استفسار کیا۔

"بہت نڈر اور فوراً عملی قدم اٹھانے والے۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب میں بزدل اور غیر عملی ہوگیا ہوں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ گڑبڑا گئی۔

"پھر تمہارا کیا مطلب تھا ساحل؟"

"م۔ میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ۔۔۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی "وہاں ہندوستان اور نیپال میں تو تم بڑے سے بڑے پھڈے میں فوراً کود پڑتے تھے اور پولیس والوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے مگر اپنے ملک میں داخل ہوتے ہی تم بہت زیادہ محتاط ہوگئے ہو اور ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانے لگے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ اگر اسی قسم کی صورتِ حال ہمیں انڈیا یا نیپال وغیرہ میں پیش آئی ہوتی تو کیا تم تب بھی اتنی ہی شرافت کا مظاہرہ کرتے؟"

میں نے ساحل کی پوری بات سنی اور زیرِ لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اس کے احساسات کو غلط ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم میرے خیال میں وہ ایک قسم کی غلط فہمی کا شکار ہورہی تھی۔ شاید وہ میری محتاط روی اور مصلحت اندیشی کو بزدلی کے خانے میں فٹ کررہی تھی یا پھر وہ کسی قسم کی الجھن کا شکار ہورہی تھی۔ میں نے اس موقع پر اس کی الجھن آمیز غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری سمجھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"دیکھو ساحل! زیادہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ تاہم میں یہاں پر یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ پاکستان اور نیپال یا ہندوستان میں بہت فرق ہے۔ ان دونوں ملکوں میں میرا ٹکراؤ اکثر و بیشتر طاغوتی قوتوں سے ہوتا رہا یا پھر جرائم پیشہ پنڈتوں سے۔ وہاں کی پولیس ان لوگوں کے ہاتھوں میں کسی کھلونے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پولیس والے مجرموں کا ساتھ دیتے ہوئے ہماری راہ میں آتے تھے اور مجھے بھی چند مخلص اور ایمان دار پولیس افسروں کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے میں مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے بعض پولیس والوں سے دو دو ہاتھ کرنے سے کتراتا نہیں تھا مگر یہاں پاکستان میں۔۔۔"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ساحل! ہم دونوں غیر قانونی طریقے سے پاکستان میں داخل ہوئے ہیں اور ابھی تک ہمارے پاس اصلی یا نقلی کسی بھی قسم کی کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔ یعنی ہماری پوزیشن بہت نازک اور کمزور ہے۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر ساحل کی جانب دیکھا اور

سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "پاکستان میں داخل ہوتے ہی ہمارا واسطہ پاک "رینجرز" سے پڑگیا۔ وہ تو ہماری خوش قسمتی سمجھ لو کہ کپتان صالح رحیم کو ہماری کہانی پر یقین آگیا اور اس نے ضروری کارروائی کے بعد ہمیں مقامی پولیس کے حوالے کردیا۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گا کہ پولیس کے قبضے سے ہمیں وڈیرا اکبر سومرو کے بندوں نے نکال لیا ورنہ پتا نہیں وہ ہمارا کیا حشر کرتے۔ اس کے بعد ہم عمرکوٹ میں یامی شاہ اور تارا جیسے لوگوں سے نبرد آزما رہے اور بالآخر یہاں ایک مرتبہ پھر پولیس والوں کے "مہمان" بن چکے ہیں۔"

میں نے خاموش ہو کر باری باری ساحل اور میر بخش کو دیکھا پھر کہا "ساحل! پاکستان میں آمد کے بعد جہاں بھی مجھے جرات اور بہادری آزمانے کا موقع ملا' میں نے اس کا مظاہرہ ضرور کیا ہے۔ اب پولیس والوں سے خواہ مخواہ کا ٹکراؤ میری سمجھ سے بالاتر ہے جبکہ وہ ہمیں کسی ذاتی دشمنی یا "پیدا" کے چکر میں بھی پریشان نہیں کررہے۔ اب سیدھی اور سادی بات یہ ہے کہ میں پولیس والوں کو کسی طرح رام کرکے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔"

"وجدان! تم تو دل پر لے گئے۔" ساحل نے اپنے نازک ہونٹوں کو مسکراہٹ کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے کہا "میں نے تو بس ایک بات کہہ دی تھی۔"

"تم نے ایک بات کہہ دی تھی۔" میں نے اسی کے الفاظ دہرائے "اسی لیے میں نے وضاحت ضروری سمجھی۔ میں ان نازک حالات میں کسی قسم کی غلط فہمی کو جنم دینے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"کیا تم میری بات کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہو؟" وہ قدرے شوخ ہوگئی۔

میں نے کہا "میں اپنے ہر ساتھی کی بات کو اہم سمجھتا ہوں۔"

وہ سنجیدہ ہوگئی "آئی ایم سوری وجدان۔ میں نے اپنی بات سے تمہیں دکھ پہنچایا۔ دراصل موجودہ حالات نے مجھے خاصا اپ سیٹ کردیا ہے۔"

"ابھی تک تو تم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے مجھے دکھ پہنچتا۔" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "مگر اب تم۔۔۔"

"میں سمجھ گئی۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولی "تم میری "سوری" کی طرف اشارہ کررہے ہو نا!"

"عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "اگر تم اپ سیٹ ہو تو سمجھ لو کہ ہم بہت جلد سیٹ اپ ہوجائیں گے۔"

میر بخش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "سائیں! آپ کسی لائحہ عمل کا ذکر کررہے تھے؟"

مجھے فوراً یاد آگیا کہ میں اپنے ساتھیوں کو کیا بتانے والا تھا۔ میں نے دھیمی مگر واضح آواز میں انہیں اپنی تازہ ترین پلاننگ کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"میں نے جو سوچا ہے اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلو تاکہ ہمارے بیان میں کسی قسم کا تضاد پیدا نہ ہو۔" وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔ میں نے کہا "اب ہم نے ڈی ایس پی کو یہ بیان دینا ہے کہ میں اور ساحل کراچی کے رہنے والے ہیں۔ میرا نام مقصود احمد اور ساحل کا نام لیلیٰ ہے۔ لیلیٰ بنیادی طور پر چترالی ہے اور ابھی کچھ عرصہ پہلے چترال سے کراچی شفٹ ہوئی ہے۔"

ساحل کے نقش و نگار کے باعث میں نے اسے چترالی بنا دیا تھا کیونکہ چینی' افغانی' چترالی' تھائی اور تبتی افراد کے نقش و نگار میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس طرح ہمارے بیان میں سچائی کا عنصر بڑھ جاتا۔ میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم مجھے کراچی کے چند علاقوں کے نام بتادو۔ کیا تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھے کراچی کے مشہور علاقوں کے نام بتادیے۔ میں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اور ساحل یعنی مقصود اور لیلیٰ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں رہتے ہیں اور ہمارے درمیان کزن کا رشتہ ہے۔ میں اپنے چچا ایوب خان سے ملنے میرپور خاص آیا ہوا ہوں۔ لیلیٰ کو تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے وہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ تم!" میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کیا "تم میرے چچا کے ملازم ہو اور تمہارا نام میر بخش ہی ہے۔ جب میں نے اپنے چچا سے عمر ماروی کا تاریخی قلعہ دیکھنے کی فرمائش کی تو اس نے تمہیں ہمارے ساتھ عمرکوٹ روانہ کردیا۔ ٹھیک ہے؟"

میرا مخاطب میر بخش تھا۔ اس نے میرے "ٹھیک ہے" کا جواب اثبات میں دیا۔ کل شام میر بخش نے مجھے "عمر ماروی" کی رومانی داستان پوری تفصیل سے سنائی تھی۔ شاہ عمر نے "ماروی" کو لگ بھگ ایک سال تک اپنے قلعے میں مقید رکھا تھا تاکہ اسے خود سے رضا و رغبت شادی کے لیے آمادہ کرسکے مگر ماروی اپنے منگیتر کھیت کی یاد میں ایک

پل گزارتی رہی۔ بالآخر شاہ عمر نے ماروی کو واپس اس کے گاؤں بھیج دیا۔ شاہ عمر' ماروی کے حسن و جمال کا چرچا سن کر اس کے گاؤں "بھاول وے کاتر" پہنچا تھا اور ایک پنگھٹ سے اسے اغوا کرکے عمرکوٹ میں واقع قلعے میں لے آیا تھا۔ ماروی کا گاؤں عمرکوٹ سے اسی میل دور تھر کے علاقے میں واقع تھا۔ تاریخی اہمیت کا حامل شاہ عمر کا وہ قلعہ آج بھی عمرکوٹ میں موجود ہے اور "عمر ماروی" کے قلعے کے نام سے مشہور ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے افراد اسے دیکھنے جاتے ہیں۔

میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا بیان جاری رکھا "میر بخش' تم ہمیں عمر ماروی کا قلعہ دکھانے آج صبح میرپور خاص سے عمرکوٹ لے کر گئے تھے۔ دوپہر کے بعد جب ہم واپس آنے لگے تو چند غنڈوں سے ہماری مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس ٹکراؤ کی وجہ ساحل یعنی لیلیٰ تھی۔ وہ لچے لفنگے پیاسے بے ہودہ مذاق کررہے تھے۔ ہم نے انہیں سمجھانے بجھانے کی حتی الامکان کوشش کی مگر وہ اپنی بیچ حرکتوں سے باز نہ آئے۔ بحالتِ مجبوری ہمیں ان سے دو دو ہاتھ کرنا پڑے۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہاں پر ہم یہ ظاہر کریں گے کہ میں یعنی مقصود نے مارشل آرٹس کی باقاعدہ تربیت حاصل کر رکھی ہے اور اس میں کوئی جھوٹ بھی نہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے غنڈوں کے چھکے چھڑا دیے۔ ایک مرحلے پر غنڈوں کے سرغنہ نے پستول نکال کر ہم پر فائر کردیا جس کے نتیجے میں تم زخمی ہوگئے۔ اس بات میں بھی کسی قسم کی غلط بیانی شامل نہیں۔"

میر بخش نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ساحل پوری دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔ اس نے سراہنے والے انداز میں کہا "کہانی تو بہت جان دار ہے۔ اب میں یہ ضرور پوچھوں گی۔۔۔ پھر کیا ہوا؟"

ساحل کے انداز نے مجھے خاصی تقویت پہنچائی۔ اس کے جملے سے زندہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ جس ذہنی دباؤ کا شکار تھی' اب اس سے نکل آئی تھی۔ یہ ایک مثبت اور صحت مند علامت تھی۔

میں نے کہا "میں ضرور بتاؤں گا کہ پھر کیا ہوا۔" میں نے داستان گو کے انداز میں کہنا شروع کیا "میں نے اپنے فن کے بل بوتے پر تھوڑی دیر میں سرغنہ سے پستول چھین لیا اور ان کی ایسی دھنائی اور دھلائی کی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ وہ اس افراتفری میں اپنی گاڑی بھی وہیں چھوڑ گئے۔ ہمیں خطرہ تھا کہ وہ دوبارہ ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے' وہ اپنے اور ساتھیوں کو جمع کرکے وہاں لے آتے چنانچہ ہم نے موقع واردات سے فوراً رخصت ہونے کا فیصلہ کیا اور انہی کی گاڑی میں بیٹھ کر میرپور خاص کی طرف روانہ ہوگئے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ ان لوگوں نے سیاہ گاڑی پر سرخ کاغذ کیوں چسپاں کر رکھا تھا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ میں موجود کاغذات سے ہمیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ وڈیرا اکبر سومرو نامی کسی شخص کی گاڑی ہے۔ ہمیں کسی وڈیرے شڈیرے سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ ہم تو جلد از جلد عمرکوٹ کی حدود سے نکل جانا چاہتے تھے۔ ہم نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میرپور خاص میں داخل ہونے سے پہلے کسی جگہ اس گاڑی کو کھڑا کردیں گے لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہ منحوس گاڑی شادی پلی والے ناکے پر ہمیں اس مصیبت میں گرفتار کروادے گی۔"

میں نے اپنی پلاننگ کی تفصیل ختم کرتے ہوئے ان دونوں کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا تاکہ ان کے ذہن میں اگر کوئی الجھن ہو تو وہ مجھ سے کہہ سکیں۔

"ونڈرفل" ساحل نے توصیفی انداز میں کہا "یہ کہانی ضرور ہٹ ہوگی۔"

میر بخش ابھی تک کچھ نہیں بولا تھا۔ میں نے کہا "تم کیا کہتے ہو' میر بخش؟"

وہ بولا "سائیں! باقی سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر پولیس والوں نے میرپور خاص والے آپ کے فرضی چچا ایوب خان کی تصدیق کرلی تو۔۔۔؟"

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے جلدی سے کہا "اول تو اس کی امید نہیں اور بالفرضِ محال اگر انہوں نے اتنی دور تک جانے کی کوشش کی تو پھر بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ موقع محل کی مناسبت سے کوئی داؤ مارلیں گے۔"

"ٹھیک ہے سائیں' جیسی آپ کی مرضی۔" میر بخش نے فرماں برداری سے کہا "بلکہ مرضی کیا سائیں۔۔۔ جو آپ کا حکم" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

میں نے محسوس کیا' میر بخش کلی طور پر مطمئن نہیں تھا۔ میں نے کہا "فی الحال جو میں نے آپ لوگوں کو کہانی سنائی ہے' اسے ذہن میں بٹھانے کی ضرورت ہے۔ ہماری کسی بات میں اختلاف یا تضاد نہیں پایا جانا چاہیے اور ہاں۔۔۔"

ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "میرا چچا

ایوب خان میرپور خاص شہر میں صرافے کی ایک دکان چلاتا ہے جب کہ اس کی رہائش رتن آباد میں ہے۔ ہم لوگ خاندانی سنار ہیں۔ کراچی میں ہمارا بھی جیولری کا ہی بزنس ہے۔"

وہ دونوں اثبات میں سرہلانے لگے۔ ساحل نے کہا "جس طرح میر بخش نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ پولیس والے تمہارے فرضی چچا کے بارے میں تفتیش کرسکتے ہیں اسی طرح میں بھی یہ کہوں گی کہ وہ کراچی کے علاقے ناظم آباد میں تمہاری رہائش اور تمہارے جیولری کے بزنس کے بارے میں بھی متعدد سوالات کرسکتے ہیں۔"

"امکانات کی کمی نہیں" میں نے کہا "پولیس والوں سے کچھ بعید نہیں۔ وہ کسی بھی قسم کا سوال کرسکتے ہیں۔" پھر میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "تم کراچی آتے جاتے رہتے ہو۔ تمہیں یہ بات ضرور معلوم ہوگی کہ وہاں کی صرافہ مارکیٹ کس علاقے میں ہے۔"

"کراچی بہت بڑا شہر ہے سائیں۔" میر بخش نے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بتایا "انسانوں کا ایک سمندر ہے۔ وہاں کئی صرافہ مارکیٹیں ہیں۔ ویسے وڈیرا اکبر سومرو زیورات اور جیولری کی خریداری ہمیشہ "صدر" کے علاقے سے کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، صدر کی جیولری مارکیٹ چلے گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "کراچی میں صدر کی صرافہ مارکیٹ میں ہماری دکان ہے۔ کیا سمجھے؟"

"بالکل سمجھ گئے۔" دونوں بہ یک زبان بولے۔

اسی وقت ڈی ایس پی وہاں پہنچ گیا۔ تھانے دار اپنی توند کو تھلتھلاتے ہوئے اس کے پیچھے تھا۔

ہماری موبائل سے باہر ڈی ایس پی نے تھانے دار سے مختصر بات کی جس کے بعد تھانے دار ہماری موبائل میں سوار ہوگیا۔ وہ موبائل کے اگلے حصے میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہمیں کنٹرول کرنے کے لیے دو مسلح پولیس اہلکار موبائل کے پچھلے حصے میں ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ اس سیٹنگ سے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہاں سے ہمیں کہیں اور لے جایا جارہا تھا۔ پھر فوراً ہی میری اس سوچ کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ڈرائیور نے موبائل اسٹارٹ کی اور اگلے ہی لمحے وہ حرکت میں آچکی تھی۔

ہم تینوں نے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہمارے درمیان تھوڑی دیر پہلے جو گفتگو ہوئی تھی، وہ بہت اہم تھی۔ اب ہمیں اسی پروگرام کی روشنی میں حرکت کرنا تھی۔

پولیس موبائل کچے سے نکل کر سڑک پر آئی تو میں نے اپنے پیچھے دور تک دیکھا۔ رات کے اندھیرے میں جہاں تک میری آنکھوں نے کام کیا وہاں تک مجھے کوئی گاڑی نظر نہیں آئی، اس کا مطلب یہی تھا کہ ناکے پر موجود تمام گاڑیوں کو نمٹا کر جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ناکا منگل سنگھ نامی کسی ڈاکو کو گرفتار کرنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری سے پہلے ناکا ختم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر پولیس والے میر بخش کو منگل سنگھ اور مجھے اس کا ساتھی گنڈا سنگھ سمجھ رہے تھے تو عنقریب ان کا یہ خیال غلط ثابت ہونے والا تھا۔ یقیناً وہ ہمیں کسی تفتیشی سیل میں لے جانا چاہ رہے تھے۔ میں نے اپنی معلومات کی خاطر مسلح پہرے داروں سے دوستانہ انداز میں بات چیت شروع کردی۔ وہ دونوں موبائل کی دونوں سیٹوں پر بالکل آخر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں گنیں تھامے بالکل چوکس تھے۔

ایک سیٹ پر میں ساحل کے ساتھ بیٹھا تھا جب کہ سامنے والی سیٹ پر میر بخش بیٹھا تھا۔ گویا میر بخش اور ساحل آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے پولیس والے سے پوچھا۔

"سائیں ہمیں کہاں لے جایا جارہا ہے؟"

"تھانے کے علاوہ تمہیں کہاں لے جائیں گے۔" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"متعلقہ تھانا یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"ہم دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"ہماری گاڑی تو وہیں رہ گئی!"

"وہ بھی آجائے گی، تم فکر کیوں کررہے ہو!"

"اور ڈی ایس پی صاحب؟"

"وہ اپنی ذاتی گاڑی میں آئیں گے۔"

میں نے معصومیت سے پوچھا "سائیں، ہمیں تھانے کیوں لے کر جارہے ہیں؟"

وہ چڑ گیا اور قدرے برہم لہجے میں بولا "وہاں تمہاری دعوت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مرغ پلاؤ اور زردے کی دیگیں چڑھائی گئی ہیں۔" "نبی سر" سے کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ وہ تم سے ملاقات کرکے بہت خوش ہوں گے۔"

پولیس والا اپنے رینک کے اعتبار سے اے ایس آئی تھا۔ غالباً وہ ان دو اے ایس آئی میں سے ایک تھا جو اس ناکے پر تعینات کیے گئے تھے۔ ایک اے ایس آئی سے میں

بھرپور معلومات حاصل کرچکا تھا جو ازاں بعد ڈی ایس پی کی برانگی اور برہمی کا نشانہ بھی بنا تھا۔ میں نے اس کے بعد سے اے ایس آئی جمشید احمد کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

میرے سامنے بیٹھا اے ایس آئی شاید جمشید والے واقعے کی وجہ سے بہت محتاط تھا۔ میں نے اس کی باتوں اور انداز سے بھانپ لیا کہ وہ میرے ہتھے میں نہیں آئے گا چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

چند منٹ بعد ہم متعلقہ تھانے کے اندر پہنچ گئے۔ پولیس کے قواعد و ضوابط اور تفتیش کے طریقوں سے مجھے گہری واقفیت تھی۔ ہمیں شادی پلی کے علاقے سے گرفتار کیا گیا تھا لہٰذا تفتیش بھی شادی پلی سے متعلقہ تھانے میں ہونا تھی۔ اگر ہم واقعی منگل سنگھ، گنڈا سنگھ اور ممتاز ثابت ہوجاتے (جس کا امکان صفر کے برابر تھا) تو پھر نبی سر کے تھانے میں اطلاع پہنچائی جاتی کیونکہ ممتاز کے اغوا کی رپورٹ نبی سر کے تھانے میں درج کروائی گئی تھی۔ باقی کارروائی اس کے بعد کی بات تھی۔

ہمیں تھانے کی حوالات میں بند کردیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی کی طلبی پر سب سے پہلے ساحل کو تفتیشی کمرے میں بلایا گیا۔ میں اور میر بخش ساحل کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد ہمیں ساحل کی صورت نظر آئی۔ میں خوش ہوگیا۔ ساحل کی حالت اور چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ سب خیریت گزری تھی۔ میں نے سوچا، اگر اب وہ پوچھ گچھ کے لیے میر بخش کو لے گئے تو مجھے ساحل سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا لیکن میری امید پر اوس پڑ گئی۔

جو پولیس والا ساحل کو لے کر حوالات کی طرف آیا تھا اس نے ہم دونوں کو حوالات سے باہر بلالیا۔ اس دوران میں ساحل اس کے ساتھ باہر کھڑی تھی۔ ہمیں پولیس والے کے اشارے کی تعمیل کرنا پڑی کیونکہ وہاں دم مارنے کی جا نہیں تھی۔ ایک مسلح نگران ہم پر موت کے فرشتے کی طرح تعینات تھا۔

ہم کھلے ہوئے دروازے سے باہر آئے، اسی وقت ساحل کو حوالات کے اندر دھکیل کر دروازے کو لاک کردیا گیا۔ اس کے بعد ہمیں چلنے کو کہا گیا۔

میر بخش اور میں گن پوائنٹ پر چلتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے۔ وہ غالباً ہیڈ محرر کا کمرا تھا۔ مجھے وہیں بیٹھنے کو کہا گیا اور میر بخش کو وہ پولیس والا اپنے ساتھ لے گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ڈی ایس پی ہم تینوں سے باری باری ملیحدہ پوچھ تاچھ

کرے گا اور وہ بھی اس طرح کہ فارغ ہونے والا اپنے دوسرے کسی ساتھی کو کچھ بریف نہ کرسکے۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم تینوں نے پولیس موبائل کے اندر ہی ایک پروگرام طے کرلیا تھا ورنہ اس طریقہ کار سے گزرتے ہوئے ہم کسی بڑی مصیبت میں پڑجاتے۔ تاہم ایک بات میرے لیے اطمینان بخش تھی اور وہ یہ کہ ساحل کی واپسی سے میں سمجھ گیا تھا، ہم پر ڈاکوؤں والا شبہ بہت جلد ختم ہونے والا تھا۔

بیس پچیس منٹ کے بعد میرا بلاوا آگیا۔ پولیس والا مجھے اپنے ساتھ لے کر ٹرائل روم میں پہنچ گیا۔ میر بخش وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، اسے واپس حوالات میں بھیج دیا گیا تھا۔

پولیس والا مجھے ڈی ایس پی کے پاس چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس کمرے میں ڈی ایس پی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے مجرموں کی طرح کھڑا نہیں کیا گیا بلکہ ڈی ایس پی کے اشارے پر میں اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈی ایس پی نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا "میں نے تمہاری ساتھی لیلیٰ کا طویل انٹرویو کیا ہے۔ وہ بہرحال مغویہ ممتاز نہیں ہے۔ اس کی عمر اور قد کاٹھ مغویہ جیسا ہے مگر وہ قاضی سلطان کی بیٹی نہیں ہوسکتی۔ اس سے پوچھ تاچھ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ کسی بھی صورت ہماری مطلوبہ لڑکی ممتاز نہیں۔"

اتنا کہہ کر ڈی ایس پی خاموش ہوگیا۔ میں نے اس کی بات سن کر اطمینان کی سانس لی اور خاموش رہا۔ ڈی ایس پی چند لمحے مجھے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"تمہارا ساتھی میر بخش بھی ہمارے شک پر پورا نہیں اترا۔ ہمیں شبہ تھا کہ وہ منگل سنگھ ڈاکو ہوگا لیکن وہ ہر آزمائش سے گزر گیا۔ ہم نے اس کے چہرے کی جانچ پڑتال بھی کی ہے۔ اس نے کسی قسم کا سوانگ نہیں بھر رکھا۔ وہ جیسا نظر آرہا ہے، اس کی حقیقت بھی وہی ہے یعنی وہ منگل سنگھ نہیں بلکہ تمہارے چچا ایوب خان کا ملازم ہے۔"

ڈی ایس پی اتنی نرمی سے بات کررہا تھا کہ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میرے لیے یہ اطمینان بخش بات تھی کہ میرے دو ساتھی "پاس" ہوگئے تھے۔ میر بخش کو میں نے ٹرائل روم سے نکلنے کے بعد دیکھا نہیں تھا۔ تاہم ساحل کو دیکھ کر مجھے یقین آگیا تھا کہ تھانے کی فضا اب ہمارے لیے خاصی سازگار ہوچکی تھی۔ یہ ایک اچنبھے کی بات تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ

ڈی ایس پی کوئی چال نہ چل رہا ہو۔ پولیس والوں سے اتنے نرم اور شائستہ رویے کی توقع نہیں کی جاتی۔ میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ ڈی ایس پی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"مسٹر مقصود! اب تمہاری باری ہے۔ تمہیں میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا ہوں گے۔"

"میں تیار ہوں جناب۔" میں نے پر اعتماد انداز میں کہا "آپ پوچھیں' کیا پوچھنا چاہتے ہیں!"

اس کے بعد ڈی ایس پی نے جو سوالات کیے' میں نے ان کا جواب سوچی سمجھی اور طے شدہ اسکیم کی روشنی میں دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بیش تر سوالات کے ذریعے وہ میر بخش اور ساحل کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے ہر سوال کا تسلی بخش اور منطقی جواب دے کر ڈی ایس پی کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

وہ خاصا مطمئن نظر آیا بھی تاہم اس نے کہا "اب تمہارے چہرے کا احوال جانا جائے گا۔ ذرا پتا تو چلے' تم نے اپنے حلیے میں کتنی اور کس قسم کی تبدیلیاں کر رکھی ہیں!"

"وہ کس طرح جناب؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا "آپ میرے چہرے کا احوال کس طرح دریافت کریں گے؟"

"اس کام کے لیے ہمارے پاس ماہرین موجود ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "تھوڑی دیر پہلے انہوں نے تمہارے ساتھی میر بخش کے چہرے پر بھی خاصا "غور و خوض" کیا ہے۔"

پھر ڈی ایس پی نے میک اپ جانچنے اور پرکھنے کے دو ماہرین کو اس کمرے میں بلوالیا۔ ڈی ایس پی کی حکم نما ہدایت پر انہوں نے میرے چہرے کو "ٹھونک بجا" کر اور گھس مل کر دیکھا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی ماہرانہ تحقیق کے بعد انہوں نے ڈی ایس پی کو بتایا کہ وہ میرا اصل چہرہ تھا۔ اس پر کسی قسم کا میک اپ یا ماسک میک اپ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی میں نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کے لیے کسی نوعیت کی کاسمیٹک سرجری کروا رکھی ہے۔

اس تسلی بخش رپورٹ کے بعد وہ ڈی ایس پی کے اشارے پر ٹرائل روم سے رخصت ہو گئے اور ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"مسٹر مقصود! یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم درحقیقت وہی ہو جو نظر آ رہے ہو لیکن اب تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہوگا کہ تم گنڈا سنگھ نہیں ہو۔"

"یہ ثبوت میں آپ کو کس طرح دے سکتا ہوں جناب؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں ڈی ایس پی سے پوچھا "آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

اس نے کہا "بالکل اسی طرح جیسے تمہارے ساتھی میر بخش نے ثابت کیا ہے کہ وہ منگل سنگھ نہیں۔"

ڈی ایس پی کے ذو معنی انداز نے میرے جسم میں رینگتی ہوئی چیونٹیاں چھوڑ دیں۔ میں نے الجھن زدہ مگر اضطراری لہجے میں پوچھا "میر بخش نے کس طرح یہ ثابت کیا ہے کہ وہ منگل سنگھ نہیں؟"

"اپنا ستر کھول کر۔" ڈی ایس پی نے سنجیدگی سے کہا اور ایک مخصوص اشارہ بھی کیا۔

میں اچھل پڑا "کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ؟"

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔" ڈی ایس پی نے بدستور سنجیدگی سے کہا "تم کوئی انگوٹھا چوستے بچے نہیں ہو جو میرا مطلب نہ سمجھ رہے ہو۔"

"مگر میں۔ میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟" میرے لہجے میں احتجاج تھا۔

"جیسے میر بخش نے کیا ہے۔" ڈی ایس پی اپنی بات پر اڑا رہا "تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تم گنڈا سنگھ نامی کوئی ہندو نہیں بلکہ مقصود نامی ایک مسلمان ہو۔"

میں متذبذب نظر سے ڈی ایس پی کو تکنے لگا۔

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "اس آزمائش سے تو تمہیں ہر صورت گزرنا ہوگا۔"

مجھے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان کی پہچان کے لیے وہ کڑی آزمائش بڑی مستند تھی۔ وقت کی مصلحت اور حالات کے تقاضے نے مجھے ڈی ایس پی کی بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ آنے والے چند سیکنڈز میں' میں اس امتحان میں سرخ رو ہو چکا تھا۔

اب ایک مرتبہ پھر ہمارے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد میں زچ ہو گیا اور میں نے ڈی ایس پی سے کہا۔

"جب ہر طرح یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم وہ لوگ نہیں جن کی گرفتاری کے لیے آپ نے ناکا لگایا ہوا تھا تو پھر ہمیں جانے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے۔ اب آدھی رات ہونے کو آ رہی ہے۔ ہمارے گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے؟"

ڈی ایس پی نے کہا "اگر تم لوگ ہمارے مطلوبہ مجرم نہیں ہو تو پھر کیا ہوا۔ تمہارے ہاتھ بھی صاف تو نہیں ہیں۔ میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا۔"

"کیا مطلب' ہم نے کون سا جرم کیا ہے؟" میں چیخ کر

"جرم نہیں' جرائم کہو۔" ڈی ایس پی مکاری سے

سمجھ گیا' اب وہ ہم سے کچھ "پیدا" کرنے کے چکر میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا "جناب! کون کون سے جرائم سرزد ہوئے ہیں؟"

سنجیدگی سے گنوانے لگا "تمہاری گاڑی کی ڈرائیونگ کے نیچے سے ایک خطرناک ہتھیار اور گولیوں کا میگزین ہوا ہے۔ تمہارا ایک ساتھی بری طرح زخمی ہے اور تم بات کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے تم ایک مشکوک گاڑی میں عمر کوٹ سے یہاں پہنچے ہو۔ گاڑی جو کسی وڈیرا اکبر سومرو کی ملکیت ہے اور اس کی چھپانے کے لیے اس کی باڈی پر سرخ کاغذ چسپاں کیا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم لوگ عمر میں کوئی سنگین واردات کرکے آ رہے ہو۔" وہ ایک خاموش ہو کر فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا "یہ کافی ہیں یا کچھ اور بھی بیان کروں؟"

میں نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا اور معتدل لہجے کہا "ڈی ایس پی صاحب! میں پستول' گولیوں والے میر بخش کے زخمی بازو اور اس "سیاہ سرخ" گاڑی کے میں آپ کو تفصیل سے بتا چکا ہوں اور ساتھ ہی میں مجبوریوں کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ آپ کو میری بات کا یقین نہیں آتا؟"

حتمی طور پر یہ طے کیے بیٹھا تھا کہ ہمیں آسانی سے چھوڑے گا۔ اس سے اس کی نیت ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ بدنیت پولیس افسر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ ہمیں زیادہ سے پریشان کرکے کسی "فائدے" کی تلاش میں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا "تم نے اپنی اور بے بسی کی جو کہانی سنائی ہے' اس پر میں آنکھ بند کیے یقین کر لوں۔ مجرم تو بہت چالاک اور عیار ہوتا ہے وہ ایک سے ایک متاثر کن کہانی سنا کر پولیس کی سمیٹنا چاہتا ہے۔ اگر ہم اسی طرح مجرموں کی باتوں میں آنے لگیں تو پھر ہو گیا کام!"

بات ختم کرکے میری جانب دیکھا۔ میں نے پوچھا "اگر آپ میری بات پر یقین نہیں کریں گے تو کا ارادہ ہے آپ کا؟"

"میں تمہاری کہانی کی تصدیق کروں گا پہلے تو۔" وہ عیار نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

وہ طنزیہ انداز میں زیر لب مسکرایا اور بولا "میں سب سے پہلے عمر کوٹ میں وڈیرا اکبر سومرو سے رابطہ کروں گا جس کے نام یہ گاڑی رجسٹرڈ ہے۔ ہو سکتا ہے' تم لوگ وڈیرے کو یا اس کے کسی آدمی یا آدمیوں کو ٹھکانے لگا کر آئے ہو۔ کچھ بھی ممکن ہے سائیں۔"

مجھے یقین ہو گیا' وہ ہمیں آسانی سے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے بات کو بڑھانے کے بجائے سمیٹنا چاہا کیونکہ بات اگر بڑھ جاتی تو ہمارے لیے مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو سکتا تھا۔ اس بے ہودہ صورتِ حال سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنا ضروری تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کی طرف دیکھتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر میں یہ چاہوں کہ آپ کسی مزید تفتیش و تحقیق میں نہ پڑیں اور خاموشی سے ہمیں جانے دیں تو اس کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "کافی سمجھ دار لگتے ہو!"

"حالات کی سنگینی انسان کو سمجھ دار بنا دیتی ہے ڈی ایس پی صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "آپ مطلب کی بات کریں۔"

وہ فوراً پٹڑی پر آ گیا اور سادہ سے لہجے میں بولا "تم اپنی "رہائی" کے لیے کیا قربانی دے سکتے ہو؟"

وہ چونکہ کھل گیا تھا اس لیے میں نے بھی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور کہا "ڈی ایس پی صاحب! ہماری جامہ تلاشی سے لگ بھگ گیارہ ہزار روپے آپ برآمد کر چکے ہیں۔ اس رقم کے علاوہ ہمارے پاس وہی گاڑی ہے جو اوپر سے سرخ اور اندر سے سیاہ ہے۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"وہ ریڈ اینڈ بلیک گاڑی تو وڈیرا اکبر سومرو کی ہے۔" ڈی ایس پی نے تیکھی نظر سے مجھے دیکھا "اس کی تو تم بات ہی نہ کرو۔"

میں نے کہا "جناب! گاڑی' گھوڑی اور عورت اسی کی ہوتی ہے جس کے قبضے میں ہو۔ اگر مذکورہ گاڑی وڈیرا اکبر سومرو کی ملکیت ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل کرپشن اور جعل سازی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ کسی بھی گاڑی کا انجن نمبر اور چیسس نمبر باآسانی تبدیل کیا جا سکتا ہے اور ملکیت تبدیل کرنا تو اس سے بھی کہیں زیادہ سہل ہے۔" ایک

لمحے کو رک کر میں نے طویل سانس لی اور کہا "آپ تو ماشاء اللہ کافی بارسوخ اور بااختیار پولیس افسر ہیں۔ آپ کے لیے کون سا کام مشکل ہے!"

"تم مجھے کرپٹ پولیس والا سمجھ رہے ہو؟" وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

مجھے بھی تاؤ آگیا۔ میں نے کہا "آپ ہمیں چھوڑنے کے لیے جس قسم کے معاملات طے کررہے ہیں اور ہم سے کوئی قربانی دینے کی فرمائش کررہے ہیں۔ اس سے میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے' اسی کی روشنی میں' میں نے ایک بات کہہ دی۔ خدانخواستہ میں نے آپ کو بدعنوان افسر کہنے کی جسارت نہیں کی۔" ایسا انداز اختیار کرنا اس وقت میری مجبوری بن گئی تھی۔

میں نے دانستہ محتاط الفاظ استعمال کیے تھے اور کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ بھی دوستانہ رہے۔ میں نے سب کچھ کہہ بھی دیا تھا اور کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا یہی تھا کہ پولیس والوں سے کوئی پھڈا مول نہ لیا جائے۔ جس طرح ہم ان کے چنگل میں آئے ہوئے تھے' اس موقع پر وہ پہلے ڈراتے ہیں پھر "جاں بخشی" کے عوض لمبے چوڑے مطالبے سامنے لے آتے ہیں۔ ڈی ایس پی بھی کسی اونچی "ڈیمانڈ" کے چکر میں تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کرلیا تھا کہ وہ ہمیں کسی مصیبت میں پھنسانے کے بجائے "چھیلنے" کے موڈ میں تھا۔ اگر ہم اس کی بات مان لیتے تو وہ ہمیں خوشی خوشی جانے دیتا۔

اس نے کہا "مجھے گاڑی وغیرہ کے چکر میں نہ ڈالو۔ نقد کی بات کرو۔"

"وہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔" میں نے کہا "ہمارے پاس ان گیارہ ہزار کے سوا اور کوئی رقم نہیں۔"

"تمہارا کراچی میں سونے کا کاروبار ہے۔" ڈی ایس پی طنزیہ لہجے میں بولا "یہاں پر میرپور خاص میں بھی تمہارا چچا ایوب خان صرافے کی دکان کھولے بیٹھا ہے۔ تمہارے ایک فون پر رقم کا بندوبست ہوسکتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس نے مجھے بند گلی میں گھیرلیا تھا۔ مجھ سے ایک فاش غلطی ہوگئی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ خود کو زیادہ سے زیادہ متوسط طبقے کا ظاہر کرتا۔ میں نے اپنے فرضی چچا اور خود کو سونے کے کاروبار سے متعلق ظاہر کرکے بڑی سنگین غلطی کی تھی۔ اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈی ایس پی چھیلنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں واقعی الجھن میں پڑگیا۔

اس نے میرے چہرے کے تاثرات کو پڑھ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری سوچ کی پریشانی بھانپ لی۔ پولیس والے جب کسی بے قصور کو گھیرتے ہیں تو اسے زیادہ سے زیادہ خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے چہرے کے تاثرات نے ڈی ایس پی کو خاصا مسرور کیا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اب میں اس پوزیشن میں آگیا ہوں جہاں وہ مجھ سے اپنی مرضی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ بدعنوانی اور رشوت ستانی میں پاکستانی پولیس بھی انڈیا کی پولیس سے کچھ کم دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ڈی ایس پی میرے چہرے پر بدستور نظر جمائے ہوا تھا۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا "تم کوئی چھوٹی موٹی اسامی نہیں ہو مسٹر مقصود۔ سنار لوگ بھی اصلی میں نقلی اور سونے میں کھوٹ ملانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے' تم نے اور تمہارے چچا نے خوب مال کما رکھا ہوگا اس لیے تم خود کو زیادہ یتیم مسکین ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

میں اس کی نیت تو بھانپ چکا تھا' ٹٹولنے کی خاطر میں نے پوچھ لیا "ہماری آزادی کی آپ کی نظر میں کیا قیمت ہوگی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "تین افراد' تین پیٹی۔"

میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ گیا تاہم انجان بنتے ہوئے پوچھا "میں کچھ سمجھ نہیں پایا ڈی ایس پی صاحب! آپ ہماری رہائی کے بدلے کس قسم کی تین پیٹی کا مطالبہ کررہے ہیں؟"

"تم بھی بہت بے وقوف ہو۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا "تین پیٹی کا مطلب نہیں سمجھتے!"

"میں واقعی نہیں سمجھا جناب۔" میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی حیرت سجالی۔

وہ بولا "پیٹی' پولیس کی ایک پرائیویٹ اصطلاح ہے' اس کا مطلب ہوتا ہے' ایک لاکھ روپے۔"

"اوہ!" میں نے پریشانی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا "تین لاکھ روپے تو بہت بڑی رقم ہے جناب! ہم آپ کا مطالبہ پورا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف گیارہ ہزار۔۔۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "تم صرف ایک فون کرو گے اپنے وارثوں کو۔ میرپور خاص یا پھر کراچی۔ وہ خود ہی بندوبست کرکے دوڑے چلے آئیں گے۔"

ڈی ایس پی اب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ میرا تجربہ اور مشاہدہ تو یہ تھا کہ پولیس افسر عموماً براہ راست رشوت کا معاملہ طے نہیں کرتے بلکہ نیچے کے کسی پولیس اہلکار کو

آگے کرتے ہیں اور وہ شخص "مصیبت زدہ" افراد کو یہ راہ دکھاتا ہے مگر یہ ڈی ایس پی تو مجھ سے کھلم کھلا اور "دبنگ" رشوت کا مطالبہ کررہا تھا۔

میں نے کچھ حیل وحجت کا مظاہرہ کیا تو وہ غصے میں آگیا اور اس لہجے میں فیصلہ سنادیا "باقی کی تفتیش بنگلے پر ہوگی۔"

"باقی کی تفتیش!" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "تمام تفتیش تو ہوچکی جناب۔ اب اور کون سی تفتیش کرنا رہ گئی ہے؟"

وہ مکاری سے مسکرایا اور کہا "ابھی نہایت ہی اہم معاملات باقی ہیں جو یہاں تھانے میں طے نہیں ہوسکتے۔"

میں نے خاص طور پر محسوس کیا کہ اس نے لفظ "اہم معاملات" پر زور دیا تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ڈی ایس پی یا اس سے بڑے رینک کا کوئی بھی افسر مجرموں یا ملزموں کو تفتیش کی غرض سے کہیں بھی لے جاسکتا تھا اور اس سلسلے میں اسے وزیر صاحب کی اجازت بھی حاصل ہوتی ہے۔ پکڑے جانے والوں میں اگر کوئی خوب صورت لڑکی یا عورت شامل ہو تو پھر زیادہ تر کسی بنگلے وغیرہ پر ہی تفتیش کی جاتی ہے۔ الغرض' یہ سب کچھ مجاز افسر کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے مزاج' سرشت' فطرت اور نیت کا اس میں عمل دخل ہے۔

ڈی ایس پی نے بنگلے کا ذکر کیا تو میرے کان کھڑے ہوگئے۔ ہمارے ساتھ ساحل جیسی ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے حسن وجمال اور دلکشی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا' کہیں رشوت خور ڈی ایس پی کی نگاہ بد ساحل پر تو نہیں جمی ہوئی تھی؟ ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔

میں شعوری اور لاشعوری طور پر محتاط ہوگیا اور ڈی ایس پی سے براہ راست پوچھا "جناب! ایسے کون سے معاملات باقی ہیں جن کی تفتیش کے لیے کسی بنگلے پر جانا ضروری ہے؟"

"تم مجرم ہو' تمہیں سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں۔" وہ درشت لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "جناب! اصول تو یہ ہے کہ ملزم یا مجرم جس تھانے کی حدود میں گرفتار ہوں انہیں اسی متعلقہ تھانے میں لاکر تفتیش کے لیے لے جایا جاتا ہے جیسا کہ ہمارے ساتھ ہوا ہے مگر اب آپ ہمیں اس سے آگے کسی بنگلے پر کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟"

ڈی ایس پی نے گھور کر کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا "اب تم مجھے "پولیس' پولیس" پڑھاؤ گے۔ احمق انسان' میں نے اپنی تمام عمر اسی محکمے میں گزاری ہے۔ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش نہ کرو کہ تفتیش کے لیے کس متعلقہ جگہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کون کون سے مقامات غیر متعلقہ ہیں۔"

وہ میرے سوالات سے خاصا برہم ہورہا تھا اور میری کوئی تاویل یا دلیل سننے کے موڈ میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایس آئی کو اپنے پاس بلایا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"مجرموں کو بنگلے پر پہنچانے کا بندوبست کرو۔ گھی سیدھی انگلی سے نکلتا نظر نہیں آتا!"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس موقع پر کسی قسم کا احتجاج یا مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ وہ فوری خیال یہ تھا کہ تھانے کی بہ نسبت کسی پرائیویٹ بنگلے پر مجھے ہاتھ پاؤں کو "کھولنے" کا زیادہ اچھا موقع مل جاتا۔ راستے میں بھی کوئی کارروائی ڈالی جاسکتی تھی۔ جب وہ پولیس افسرانی پیدا کے چکر میں ہمیں پریشان کرنے پر تلا ہوا تھا تو پھر مجھے یہ حق حاصل ہوجاتا تھا کہ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی "گلو خلاصی" کے لیے کچھ بھی کرگزروں۔

ڈی ایس پی کی ہدایت پر ہمیں دوبارہ اسی موبائل میں بٹھایا گیا جس میں ہم ناکا کے مقام سے تھانے پہنچے تھے۔ ہماری گاڑی کو وہیں تھانے میں کھڑا رہنے دیا گیا۔ ہم تینوں کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور مسلح پولیس والوں نے ہمیں باقاعدہ نشانے پر بھی رکھا ہوا تھا۔

سب سے آگے ڈی ایس پی کی جیپ تھی۔ اس کے پیچھے وہ موبائل جس میں ہم تینوں' دو مسلح جوانوں کی نگرانی میں موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک پولیس والا ہی تھا۔ اس مرتبہ تھانے دار ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ اس کا مسلح باڈی گارڈ بھی جیپ میں موجود تھا۔ موبائل کی پسنجرز سیٹ پر سب انسپکٹر موجود تھا۔

میں نے سوچا' اگر راستے میں کوئی سنہری موقع ہاتھ آیا تو کوئی ترکیب آزمانے کی کوشش کروں گا۔ اس خیال پر عمل درآمد کے لیے ضروری تھا کہ وہ "موقع" مجھے کسی ایسی جگہ میسر آئے جہاں ویرانی ہوتی کہ رات کی تاریکی کا بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے۔

پورے راستے میں اپنے خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا کیونکہ مشکل سے پندرہ بیس منٹ بعد ہم اس بنگلے پر پہنچ گئے جہاں ڈی ایس پی تفتیش مزید کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک عام سا بنگلا تھا جو آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ گیٹ پر مسلح گارڈ موجود تھے جن کا تعلق ظاہر ہے' پولیس ہی

کے محکمے سے ہوگا۔ وہ بنگلا دو منزلہ تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہاں کوئی فیملی وغیرہ رہائش پذیر نہیں تھی۔ گیٹ پر متعین مسلح گارڈز کی تعداد دو تھی۔ بنگلے کے اندر بھی ملازم صورت دو افراد موجود تھے۔ وہ دونوں سادہ لباس تھے مگر یہ بات طے تھی کہ وہ بھی محکمہ پولیس کے کانسٹیبل وغیرہ ہی ہوں گے۔

ہمیں بنگلے کی زیریں منزل پر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ کمرا اپنی سیٹنگ کے اعتبار سے ڈرائنگ روم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کمرے کی دیوار پر لگے وال کلاک میں وقت دیکھا، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس وقت دو بجنے والے تھے۔ ڈی ایس پی نے ہمارے ساتھ آنے والے اے ایس آئی سے کچھ کھسر پھسر کی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

یہ اے ایس آئی ان دو افراد میں سے ایک تھا جو موبائل میں ہماری نگرانی پر مامور کیے گئے تھے۔ اس اے ایس آئی کا نام عبدالرزاق تھا۔ موبائل کا ڈرائیور، دوسرا "نگران" اور سب انسپکٹر موبائل لے کر واپس تھانے چلے گئے۔

ڈی ایس پی میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تم آؤ میرے ساتھ۔ ہم دوسرے کمرے میں مذاکرات کریں گے۔"

میں نے کہا "یہاں مذاکرات کرنے میں کیا قباحت ہے؟"

"یہاں ٹیلی فون نہیں۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"تو پھر؟" میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"پھر یہ کہ تم یہاں سے اپنے گھر والوں یا چچا سے رابطہ نہیں کر سکو گے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "میں تمہیں جس کمرے میں لے کر جا رہا ہوں وہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود ہے۔"

میں ڈی ایس پی کی نیت کو بہت وضاحت کے ساتھ جان گیا تھا۔ وہ ہمیں شرافت سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ہمیں خوف و ہراس میں مبتلا کر کے وہ ہمارے لواحقین سے ایک بھاری رقم اینٹھنا چاہتا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ میں نے جو بیان دیا تھا وہ مبنی بر دروغ تھا۔ میرپور خاص یا کراچی میں میرا کوئی رشتے دار تو کیا، جان پہچان کا کوئی آدمی بھی نہیں تھا۔

اس مرحلے پر مجھے ڈی ایس پی کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے میں ایک فائدہ نظر آیا۔ میں مذاکرات کے چکر میں کسی طرح ڈی ایس پی کو پھنسا لیتا تو مجھے سوچنے سمجھنے کا زیادہ سے زیادہ وقت مل سکتا تھا۔ اگر مجھے وہاں اپنی بچت اور چھٹکارے کے لیے مارا ماری بھی کرنا پڑتی تو میں اس سے گریز نہ کرتا۔ ڈی ایس پی کے ساتھ جانے سے مجھے اس بنگلے کے اندرون کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں کہا "جناب! اب تو ہم آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔ آپ جہاں لے جائیں گے، چلے جائیں گے۔"

میں نے دانستہ عجز و انکسار کا رویہ اختیار کیا تھا۔ اے ایس آئی عبدالرزاق وہیں ڈرائنگ روم میں میر بخش اور ساحل کے پاس رک گیا جبکہ ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ ہمارے ساتھ ہولیا۔ وہ ایک صحت منداور چوکس پولیس والا تھا جس کی عمر لگ بھگ تیس سال ہوگی۔ اس نے ایک نئی نویلی کلاشنکوف بڑے ماہرانہ انداز میں تھام رکھی تھی۔

ڈی ایس پی مجھے بنگلے کی بالائی منزل پر لے آیا۔ بنگلے کے اندر سفر کرتے ہوئے میں نے ایک ایک شے کو اپنی نظر میں رکھا تھا۔ تاکہ بوقتِ ضرورت کسی قسم کی کارروائی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس وقت میرے ظاہری اور باطنی حواس پوری طرح متحرک ہو چکے تھے۔

میں ڈی ایس پی کی معیت میں ایک کمرے میں داخل ہوا تو اس کا مسلح گارڈ باہر دروازے پر ہی رک گیا۔ ڈی ایس پی نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ کے علاوہ بیٹھنے کے لیے صوفے وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ ایک سٹنگ کم بیڈ روم تھا۔ ٹیلی فون اسٹینڈ پر فون سیٹ بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک دیوار پر انٹرکام سیٹ بھی لگا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا، انٹرکام سسٹم دونوں منزلوں پر رابطے کے لیے نصب کیا گیا تھا۔ اگر واقعی زیریں منزل پر فون کی لائن موجود نہیں تھی تو اس انٹرکام سے اچھا خاصا کام چلایا جا سکتا تھا۔

ڈی ایس پی نے مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے کے اندر ایک اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد سوال کیا۔

"یہ عجیب سی بات نہیں کہ زیریں منزل پر تو فون کی سہولت موجود نہیں اور یہاں فون سیٹ رکھا ہوا ہے؟"

"تم بولتے بہت ہو۔" اس نے بیزاری سے کہا "خیر میں تمہارے اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔" پھر اس نے معنی خیز انداز میں بتایا "جس چیز کی جہاں ضرورت ہوتی ہے اسے وہیں پر ہونا چاہیے۔ یہ کمرا عموماً میرے استعمال میں رہتا ہے اس لیے ٹیلی فون کی سہولت بھی نظر نہیں آئے گی۔"

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، وہ جھوٹ کا سہارا لے کر

مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ زیریں منزل پر بھی اس فون کی کوئی لائن موجود ہوگی مگر وہ مجھ سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے یہ ڈراما رچا رہا تھا۔ میں فون کے موضوع کو پسِ پشت ڈال کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

جلد ہی وہ اصل موضوع پر آگیا "مسٹر مقصود! پھر کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"میں آپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں جناب۔" میں نے کہا۔

"سائیں، یہ بات تو تم ذہن سے نکال دو۔" وہ حتمی لہجے میں بولا "گیارہ ہزار روپے میں تو میں تم تینوں کو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ تم یہاں سے فون کر کے اپنے لواحقین سے تین پیٹی رقم منگوانے کا بندوبست کرو گے۔ فی بندہ ایک پیٹی۔ کیا سمجھے؟"

میں اسے باتوں میں اُلجھا کر زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی غیر مسلح نہیں ہوگا مگر اس کی وردی کے اوپر کسی قسم کے اسلحے کی جھلک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا، لباس کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے متعدل لہجے میں کہا "ڈی ایس پی صاحب! اگر آپ نے یہی بات کہنا تھی تو یہاں بنگلے پر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تو تھانے میں بھی یہ مطالبہ کر چکے تھے۔"

"دراصل میں تھانے دار کو اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا۔" وہ ایک آنکھ دبا کر بولا "اگرچہ میں نے تھانے دار کو ناکے والے مقام کی نگرانی کے لیے بھیج دیا تھا لیکن اس کے تھانے کا عملہ اسے صورتِ حال سے آگاہ کر سکتا ہے۔ اس لیے احتیاط بہت ضروری ہے۔ یہ بنگلا میرے تصرف میں رہتا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ ہمارے درمیان کیا "ڈیل" ہوئی ہے۔"

وہ مسلسل دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ اس موقع پر میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں، تم اس تھانے کے عملے سے پردہ پوشی کے لیے ہمیں اس بنگلے پر لے آئے ہو مگر اے ایس آئی عبدالرزاق کی یہاں موجودگی کا کیا جواز ہے تمہارے پاس؟ عبدالرزاق بھی تو اسی تھانے کے عملے میں شامل ہے۔

اگر میں واقعی اس سے یہ سوال کرتا تو وہ میری تسلی کے لیے کوئی نہ کوئی جواب بھی دے دیتا چنانچہ میں نے دوسرے زاویے سے اسے کریدا۔

"ڈی ایس پی صاحب! آپ بھی عجیب بات کر رہے ہیں۔ تھانے دار کی نگرانی میں تو ہمیں گرفتار کیا گیا ہے اور وہ تھانے تک بھی ہمارے ساتھ آیا تھا، ازاں بعد آپ کے بیان کے مطابق آپ نے اسے واپس ناکے پر بھیج دیا ہے۔ تھانے دار اس واقعے سے لاعلم کیسے رہ سکتا ہے؟"

"وہ اس واقعے سے واقعی لاعلم نہیں رہ سکتا۔" وہ بولا "مگر میں اس سے صرف یہاں کی "ڈیل" چھپانا چاہتا ہوں ورنہ وہ بھی حصے دار بن جائے گا۔"

وہ مرتشی افسر بہت کائیاں تھا۔ مجھے بے وقوف بنانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا حالانکہ یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ ایسے "معاملات" میں تمام "واقفانِ حال" حصے دار ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، اس جھوٹے ڈی ایس پی کو میں اس کے گھر تک پہنچا کر آؤں گا۔

"فرض کریں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "ہم آپ کی "خواہش" پوری کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد تو آپ ہمیں چھوڑ دیں گے نا!"

"بالکل چھوڑ دوں گا۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔

"اس صورت میں آپ تھانے دار کو کیا جواب دیں گے؟"

"میں اس کا افسر ہوں۔" وہ غراہٹ سے مشابہ لہجے میں بولا "وہ مجھے جواب دینے کا پابند ہے، میں نہیں۔ میں ڈی ایس پی ہوں... ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ کیا سمجھے؟"

اس کی برہمی ظاہر کر رہی تھی جیسے میں نے اس کی دُم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ میں نے معذرت کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہمیں چھوڑنے کے لیے آپ کو اپنے سامنے کوئی نہ کوئی جواز تو رکھنا ہوگا!"

"اس کے سو راستے ہو سکتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "ون سکسٹی نائن زندہ باد۔"

"یہ ون سکسٹی نائن کیا شے ہے جناب!" میں نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا "یہ ایک قانونی دفعہ ہے۔ "ون سکسٹی نائن" یعنی دفعہ ایک سو انہتر (۱۶۹) بہت کام کی چیز ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں اس دفعہ کے تحت رپورٹ بنا کر اپنے سینئرز کو بھیج دوں گا کہ میں نے منگل سنگھ، گنڈا سنگھ اور ممتاز کے شبے میں، ناکے سے جن تین افراد کو گرفتار کیا تھا، کڑی تفتیش کے نتیجے میں یہ اصل مجرم ثابت نہیں ہو سکے۔ میں

نے تصدیق کرلی ہے کہ یہ منگل سنگھ گنڈا سنگھ اور مغویہ ممتاز نہیں ہیں بلکہ یہ علی الترتیب میر بخش، مقصود احمد اور لیلیٰ ہیں۔ ان تینوں کا تعلق معاشرے کے معزز طبقے سے ہے لہٰذا میں انہیں باعزت جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کرکے وہ مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ کو شیطانی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے متاثر ہوتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا "واقعی جناب! ون سیون نائن تو بڑی حیرت انگیز دفعہ ہے!"

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا اور بالکل کاروباری لہجے میں بولا "تم اپنے چچا کو فون کرو گے یا پھر کراچی میں رابطہ کرنا چاہو گے؟"

وہ گھوم پھر کر اسی طرف آگیا تھا جس رخ سے میں بچنا چاہتا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا "میں اس سلسلے میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے دانستہ اپنا رویہ کچھ اس طرح کا رکھا کہ وہ مجھ سے خوش امیدی باندھنے پر مجبور ہوجائے وہ مجھے مائل بہ آمادگی دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے، میں تمہیں مشورے کا موقع دیتا ہوں۔"

"تھینک یو سر!" میں نے اسے مزید خوش کرنے کی خاطر کہا۔

وہ بولا "انہیں اوپر بلاؤں یا تم نیچے جاکر ان سے ملنا چاہتے ہو؟"

میں اپنے ساتھیوں کو گراؤنڈ سے اوپر لاکر اپنے لیے صورت حال کو قدرے مشکل اور پیچیدہ بنانے کے حق میں نہیں تھا چنانچہ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"میں وہیں جاکر ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" ڈی ایس پی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے اپنے کلاشنکوف بردار باڈی گارڈ کے ساتھ مجھے زیریں منزل پر بھیج دیا۔ باڈی گارڈ بہت محتاط اور تجربہ کار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک مناسب اور محفوظ فاصلے سے مجھے گن پوائنٹ پر رکھے ہوئے تھا۔ ویسے بھی میں گارڈ کے ساتھ کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کے موڈ میں نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ ڈی ایس پی تھا۔ اگر وہ کسی طرح میرے شکنجے میں آجاتا تو میں بنگلے کی فضا کو اپنے حق میں ہموار کرسکتا تھا۔ میں جس قسم کی صورت حال سے گزر رہا تھا اس میں ذرا سی غلطی بھی میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوسکتی تھی۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے زیریں منزل کے ڈرائنگ روم نما کمرے میں آگئے۔ وہاں اے ایس آئی عبدالرزاق میر بخش اور ساحل کو اپنی "نظر" میں رکھے ہوئے تھا۔ ڈی ایس پی کے گارڈ نے مجھے ڈرائنگ روم میں پہنچا کر عبدالرزاق سے مختصر بات کی جس کے نتیجے میں وہ گارڈ کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے پاس چلا گیا۔

گارڈ نے تحکمانہ لہجے میں مجھ سے کہا "تمہیں جو بھی مشورہ کرنا ہے، جلد از جلد کرلو۔"

میں اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ دونوں متفکر نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میر بخش نے دھیمی آواز میں استفسار کیا "کیا ہوا سائیں؟"

ساحل بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "خیریت تو ہے وجدان!"

ساحل نے مصلحت کے تقاضے کو پیش نظر رکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز اختیار کیا تھا۔ میں نے انہیں مزید آہستگی سے بولنے کی تاکید کرنے کے بعد کہا۔

"ابھی تک تو سب خیریت ہی ہے اور اس خیریت کو ہم سب نے مل کر مزید بخیریت بنانا ہے۔ میں ڈی ایس پی سے تھوڑی مہلت لے کر آپ لوگوں سے مشورہ کرنے کے بہانے یہاں آیا ہوں۔"

"حکم سائیں۔" میر بخش دروازے میں کھڑے مسلح افراد کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

اس نے آواز اتنی دھیمی رکھی تھی کہ ہم تینوں کے سوا کوئی اور نہ سن سکے۔ اگر واقعی دیواروں کے کان ہوتے ہیں تو مجھے امید تھی کہ وہ بھی ہماری گفتگو کو سن نہیں پا رہی ہوں گی۔

میں نے باری باری دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "ڈی ایس پی کسی بھی طرح جان چھوڑنے پر تیار نہیں۔ اس نے ہماری نجات کے لیے واشگاف الفاظ میں پورے تین لاکھ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔"

"اتنی رقم ہمارے پاس کہاں سے آئے گی؟" ساحل کی پیشانی پر تشویش کی لکیریں نمودار ہوگئیں۔

میں نے کہا "ڈی ایس پی نے اس رقم کی "آمد" کا طریقہ بھی بتایا ہے۔"

"وہ کیا سائیں؟" میر بخش اضطراری لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ میں میرپور خاص میں اپنے چچا ایوب خان کو فون کروں۔" میں نے کہا "یا پھر کراچی اپنے گھر والوں کو فون کرکے اس رقم کا بندوبست کرنے کی تاکید کروں۔

جب تک کسی بھی وسیلے سے تین لاکھ کی رقم اس بنگلے پر نہیں پہنچے گی، ہم یہیں پر یہ آہنی زیور اپنی کلائیوں پر سجائے گن پوائنٹ پر سانس لیتے رہیں گے۔" اپنی بات ختم کرکے میں نے ہتھکڑی زدہ دونوں کلائیوں کو اشارہ کرنے والے انداز میں ہلکا سا جھٹکا دیا۔

ساحل نے مایوسی سے کہا "لگتا ہے، یہ کہانی بھی فیل ہوگئی!"

"ہاں سائیں۔" میر بخش تائیدی انداز میں بولا "میرپور خاص اور کراچی والی کہانی تو سراسر فرضی تھی۔ آپ ان دو جگہوں میں سے کہیں بھی فون کرکے ایک پیسا تک نہیں منگوا سکتے۔"

"اب کیا ہوگا وجدان؟" ساحل نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا "میں تم دونوں کی طرح ابھی اتنا مایوس نہیں ہوا ہوں بلکہ میں نے کسی بھی قسم کی صورتِ حال میں مایوس ہونا نہیں سیکھا۔"

"تو کیا تم یہاں اپنی "چی" کی قوت آزماؤ گے؟" ساحل نے پوچھا۔

میر بخش نے "چی" کے ذکر پر الجھن زدہ نظر سے پہلے مجھے اور پھر ساحل کو دیکھا۔ اس کی الجھن بجا تھی۔ ہم نے اس کے سامنے کبھی "چی" کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور از خود وہ اس پراسرار قوت کے بارے میں بھلا کیا واقفیت رکھ سکتا تھا۔ میں نے ساحل کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"جب تک کوئی بھی صورت حال میرے کنٹرول سے باہر نہیں ہوجاتی، میں کسی بھی پراسرار یا ماورائی قوت کا استعمال نہیں کروں گا۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

وہ مطمئن انداز میں بولی "اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ موجودہ صورت حال تمہارے ہاتھ میں ہے؟"

"اگر ہاتھ میں نہیں تو ہاتھ سے زیادہ دور بھی نہیں۔" میں نے ذو معنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "اگرچہ میری کلائیوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی ہے لیکن ابھی میری "دراز دستی" مفلوج نہیں ہوئی۔ بس میں کسی مناسب موقع کی تاک میں ہوں۔"

ساحل نے پوچھا "اس موقع کے انتظار میں تم ڈی ایس پی کے تین لاکھ روپے کے مطالبے کو کب تک ٹہلاتے رہو گے؟"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔" میں نے کہا "اسی لیے میں مشورے کا بہانہ کرکے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔"

"وہ آئیڈیا کیا ہے؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا "میں ڈی ایس پی سے جاکر کہتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی کو بھیج کر رقم منگوالیتا ہوں۔"

"ساتھی کو بھیج کر؟" ساحل نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "کون سے ساتھی کو بھیج کر تم اتنی بڑی رقم منگوانے کی بات کررہے ہو۔ اور کہاں سے؟"

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "میں میر بخش کو میرپور خاص بھیجنے کی بات کروں گا اور ساتھ ہی ڈی ایس پی سے یہ فرمائش بھی کروں گا کہ وہ اس کی ہتھکڑی کھول دے۔"

"آپ بھی بہت کمال کی باتیں کررہے ہو سائیں۔" میر بخش نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا "میں میرپور خاص جاکر کس سے رقم لاؤں گا۔ اتنی بڑی رقم مجھے کون دے گا اور وہ بھی اس وقت، رات کے تین بجے۔ ناممکن سائیں، ناممکن۔"

میں نے کہا "میری ڈکشنری میں "ناممکن" کا لفظ نہیں ہے میر بخش!"

وہ میرے لہجے میں بھری ہوئی سنجیدگی سے چونک اٹھا۔ تاہم متذبذب لہجے میں پوچھنے لگا "سائیں! آپ خود ہی بتاؤ، میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لے کر آؤں؟"

میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلنے کے لیے وضاحت ضروری سمجھی اور کہا "دیکھو میر بخش! میں بتا چکا ہوں کہ میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے اور "آئیڈیاز" کی خاطر بہت سی بظاہر ناممکن باتوں کو بھی ممکن تصور کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اتنی بڑی رقم کا بندوبست کسی بھی صورت نہیں کرسکتے۔ اس لیے یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہیں رقم کے سلسلے میں چنداں پریشان نہیں ہونا... اور نہ ہی تمہیں واپس آنے کی ضرورت ہے۔"

وہ مزید الجھ گیا، لکنت زدہ آواز میں بولا "پھ... پھ... آپ مجھے کیوں بھیج رہے ہو سائیں۔ مم... میں..."

"تمہیں یہاں سے نکالنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔" میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوئے کہا "اس طرح کم از کم ہمارا ایک ساتھی تو پولیس والوں کی حراست سے نکل جائے گا۔ تم باہر آزاد دنیا میں رہ کر ہمارا انتظار کرنا۔ ہم بھی بہت جلد تم سے آملیں گے۔"

وہ قطعیت سے بولا "سائیں! میں آپ کو ان سنگین حالات میں چھوڑ کر ہرگز ہرگز کہیں نہیں جاؤں گا۔ میری جان آپ پر قربان۔ میں آپ کو رہائی دلانے کے لیے اپنی جان داؤ

پر تو لگا سکتا ہوں مگر پیٹھ دکھا کر اپنی جان نہیں بچا سکتا۔"

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تمہارے اس عمل سے کہیں بھی بزدلی ظاہر نہیں ہوگی۔ اگر تم کسی طرح آزاد ہو کر میرپور خاص پہنچ گئے تو ہمارے لیے زیادہ آسانی سے کچھ کر سکو گے۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "اگر میں تمہیں کسی بھی بہانے یہاں سے جانے کو کہہ رہا ہوں تو اس میں کوئی بھلائی ہی پوشیدہ ہے۔"

وہ تذبذب میں نظر آنے لگا۔ ساحل نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "میر بخش! وجدان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تمہیں فوراً اس کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "تم میرپور خاص میں اپنے قیام کی کوئی جگہ مجھے بتا دو۔ ہم یہاں سے نکلتے ہی سیدھے وہاں آجائیں گے۔"

اسی وقت دروازے میں کھڑے ڈی ایس پی کے مسلح گارڈز نے وارننگ کے سے انداز میں بہ آوازِ بلند کہا "بہت ہو چکے راز و نیاز۔ اب بس بھی کرو۔"

میں نے تحکم آمیز سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا۔ وہ متامل لہجے میں بولا "میں نے آپ کے پوچھنے پر میرپور خاص کے ایک علاقے رتن آباد کا نام بتایا تھا۔ وہاں میرا ایک جاننے والا رہتا ہے۔ اس کا نام اللہ یار ہے۔ سبزی منڈی میں اس کی دکان ہے۔ آپ کسی سے بھی اس کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں۔ اللہ یار خاصا مشہور بندہ ہے۔ میں اس کے پاس رک کر آپ کا انتظار کروں گا لیکن..."

"لیکن کیا؟" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا "ہم پولیس والوں کو بتا چکے ہیں کہ رتن آباد میں آپ کا چچا (فرضی) ایوب خان رہتا ہے۔ اس طرح میرے اور آپ کے لیے کوئی پریشانی پیدا نہ ہو جائے۔ یہ لوگ تو سیدھا میرپور خاص کا رخ کریں گے اور خاص طور پر رتن آباد میں ہمیں تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"بعد میں جو پریشانی پیدا ہوگی' اس کے بارے میں بعد ہی میں سوچا جائے گا۔" میں نے اٹل لہجے میں کہا "فی الحال تم وہی کرو گے جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"جو حکم سائیں!" وہ مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

میں ڈی ایس پی کے مسلح گارڈ کے ساتھ واپس بالائی منزل پر آگیا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہ گارڈ میری جانب سے بہت چوکس چوبند رہا اور مجھے ڈی ایس پی والے کمرے میں پہنچا کر بند دروازے کے باہر متعین ہو گیا۔ اس کی "تعیناتی" کے بارے میں مجھے یقین تھا ورنہ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں اندر آگیا تو ڈی ایس پی نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ پہلے کی طرح اب بھی مجھ سے ایک خاص فاصلہ رکھے ہوئے تھا۔ میں اس کی بتائی ہوئی جگہ پر بیٹھ گیا تو اس نے سوال کیا۔

"ہو گیا مشورہ؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا "پھر کیا طے کیا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "میں آپ کی مطلوبہ رقم دینے کو تیار ہوں مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

وہ میرے اسٹائل سے تاج اٹھا' برہمی سے بولا "تم اس وقت ایک مجرم کی حیثیت سے میرے سامنے بیٹھے ہو اور میں ایک اعلیٰ پولیس افسر ہوں۔ تم میرے سامنے کوئی شرط رکھنے کی بات کر رہے ہو۔ جانتے ہو' تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اسے میری بات بہت زور سے لگی تھی۔ میں اس موقع پر اسے خوامخواہ ناراض کر کے کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے فوراً خوشامدانہ رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"سر! آپ میری بات کو کسی اور انداز میں لے گئے ہیں۔ میری کیا مجال کہ میں آپ سے اپنی کوئی شرط منوا سکوں۔"

"پھر تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" وہ بدستور سخت لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "جناب! میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ رقم کا بندوبست کرنے کے لیے آپ مجھے ایک سہولت دے دیں تو آپ کی مہربانی ہوگی!"

"کس قسم کی سہولت؟" اس کے استفسار میں دلچسپی شامل تھی۔

میں نے نہایت ہی عاجزی سے کہا "جناب! اگر آپ میرے ساتھی میر بخش کی ہتھکڑی کھلوا دیں تو میں اسے میرپور خاص بھیج کر چچا سے تین لاکھ روپے کی رقم منگوا سکتا ہوں۔"

میری تجویز سن کر وہ سٹپٹا گیا اور غصیلے لہجے میں بولا "تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو۔ اگر تم کسی قسم کے چکر میں ہو تو یہ خام خیالی ہے تمہاری۔ رقم لانے کے لیے نہ تو میر بخش کی ہتھکڑی کھولنا ضروری ہے اور نہ ہی اس کا میرپور خاص جانا۔ تم ابھی یہاں سے ایک فون کھڑکا دو اپنے چچا کو۔ وہ علی الصباح رقم لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔"

"سر! آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں"

نے مسکین صورت بنا کر ڈی ایس پی کو شیشے میں اتارنے
سعی کی "میں اپنے چچا ایوب خان کو فون نہیں کر سکتا۔"
میں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ڈی ایس پی
ے ہمکلام تھا۔ وہ ناراضی زدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"تم اپنے چچا کو فون کیوں نہیں کر سکتے؟"

"اس لیے کہ وہ رات کے اس آخری پہر اپنے گھر پر
وگا۔" میں نے بااعتماد لہجے میں کہا "اور چچا کے گھر پر فون کی
سہولت موجود نہیں۔"

اس نے ایک لمحے کے لیے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا
پھر جلدی سے بولا "چلو ٹھیک ہے' تم پھر کراچی میں اپنے
اندین سے با ۔ وہاں تو تمہارے گھر میں ضرور فون
ہوگا!"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی پلاننگ کے مطابق گفتگو کو آگے بڑھا دیا۔

"جناب! میں اس وقت اپنے گھر فون کر کے اس قسم کی خطرناک اطلاع نہیں دے سکتا۔"

"وہ کیوں۔" وہ تلملا کر بولا "اس اطلاع سے وہاں کون سی قیامت آجائے گی؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "قیامت ہی تو آجائے گی جناب۔" پھر میں نے اپنی آواز کو جذبات سے لبریز کرتے ہوئے ڈی ایس پی کو بتایا "سر! میری والدہ دل کی مریضہ ہیں۔ ان کا بائی پاس بھی ہو چکا ہے۔ وہ یہ اندوہناک خبر سنتے ہی برداشت کی آخری حد سے گزر جائیں گی۔ آپ تو ماشاء اللہ خاصے سیانے ہیں۔ برداشت کی آخری حد سے گزرنے کا مطلب جانتے ہوں گے؟"

اس نے شک زدہ نظر سے مجھے گھورا اور ٹیلی فون سیٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "تم مجھے اپنے گھر کا نمبر بتاؤ۔ میں خود تمہارے باپ سے بات کرتا ہوں۔ میں ایسے طریقے سلیقے سے بات کروں گا کہ تمہاری ماں پر کسی قسم کے صدمے کا اثر نہیں ہوگا۔"

"کوئی فائدہ نہیں جناب۔" میں اپنے طریقہ واردات پر ڈٹا رہا "کئی سال پہلے میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں صرف میری والدہ اور چھوٹا بھائی ہے۔ فون ہر صورت میں والدہ ہی انینڈ کریں گی۔ اگر بالفرضِ محال' چھوٹے بھائی نے فون اٹھا بھی لیا تو وہ اپنے بچپنے میں والدہ صاحبہ کو اور بھی ڈرا دے گا۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم کسی بھی طرح میری بات نہیں مانو گے!" وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "اسی طرح باتیں بناتے رہو گے۔"

میں نے التجا آمیز لہجے میں کہا "آپ میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں جناب! میر بخش کی ہتھکڑی کھول کر اسے میرپور خاص جانے دیں۔ انشاء اللہ' وہ کل رقم لے کر آجائے گا۔"

"نہیں سائیں' یہ تو نہیں ہو سکتا۔" وہ نفی میں گردن جھٹک کر ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تم تینوں میں سے کوئی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔ اس بنگلے میں رہتے ہوئے تمہیں تین لاکھ روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔"

میں نے عاجزانہ انداز میں کہا "سر! میں اپنی مجبوری آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"ہوں!" ڈی ایس پی نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا "تم واقعی مجھے مجبور اور بے بس نظر آرہے ہو مگر فکر نہ کرو' میں تمہاری مجبوری رفع کرنے کا کوئی بندوبست کر سکتا ہوں۔ تم تینوں کو کہیں آنا جانا بھی نہیں پڑے گا اور بغیر کہیں فون کیے رقم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

اپنی بات ختم کر کے اس نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ میں اس کے بدلے ہوئے دوستانہ بلکہ ہمدردانہ رویّے کو کوئی مفہوم یا معنی پہنانے سے قاصر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے لہجے سے مجھے کسی گہری سازش کی بُو آرہی تھی۔

میں نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا "جناب! میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا!"

"میں سمجھاتا ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اس کمرے کو دیکھ رہے ہو! میں اکثر و بیشتر یہاں راتیں گزارتا ہوں۔ تم اسے میرا بیڈ روم بھی کہہ سکتے ہو۔"

اس نے تھوڑا توقف کر کے میرے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر تم چاہو تو میں اس کمرے کے اس حصے کو تمہارے لیے بینک میں بدل سکتا ہوں۔" پھر اس نے ڈبل بیڈ کی جانب انگلی سے اشارہ کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم ابھی اور اسی وقت اس "بینک" میں تین لاکھ روپے مالیت کا ایک "چیک" جمع کروا دو۔ صبح تک تمہارا چیک کیش ہو جائے گا پھر تم تینوں ہنسی خوشی یہاں سے روانہ ہو جانا۔"

اس کی باتوں نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ میں نے اس کی کمینگی اور ذلالت کو آخری سرے تک ناپنے کی خاطر چہرے پر نا سمجھی کے تاثرات سجائے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ میرے پاس تو نہ کوئی چیک ہے اور نہ ہی کوئی چیک بک۔ میں آپ کی پیشکش پر بہت حیران بلکہ پریشان ہوں۔"

"تم اب اتنے ننھے بچے بھی نہیں ہو۔" وہ اپنے چہرے پر خباثت کی تہ چڑھاتے ہوئے بولا "تم تو ایک بلینک چیک اپنے ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہو!"

پھر اس نے اپنی ناک پر ایک انگلی رکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کیا اور بے ہودگی سے مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

میرے بدن کا سارا خون دماغ کو چڑھ گیا۔ ساحل کے بارے میں ڈی ایس پی کے مکروہ عزائم نے میرے تن بدن میں شرارے بھردیے۔ میں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر ایک چیتے کے مانند جست بھری اور ڈی ایس پی کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے صوفے کی دوسری جانب پہنچ گیا۔

وہ اس اچانک حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اور میری وحشت اب اسے کسی تیاری کا موقع دینے والی نہیں تھی۔ مجھ پر ایک جنون سا سوار ہوچکا تھا۔ پتا نہیں کیوں۔ ساحل کی ذات سے متعلق ڈی ایس پی کی بدکلامی نے مجھے اچانک بے قابو کردیا تھا۔ میں اپنی' اس وقت کی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

صوفے کی دوسری طرف زمین پر لوٹ پوٹ ہونے کے دوران میں' میں ڈی ایس پی کی پشت پر پہنچ گیا اور اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھوں کو سامنے لاتے ہوئے میں نے اس کی گردن کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی کوئی مزاحمتی کارروائی کرتا' میں نے اپنے دونوں بازو پیچھے کھینچتے ہوئے اس کی چربیلی گردن کو شکنجے میں کس لیا۔

ڈی ایس پی سناٹے میں آگیا۔ وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے دوگنا تھا۔ تاہم طاقت' توانائی' تکنیک اور پھرتی میں مجھ سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ ہتھکڑی کی زنجیر اس کے نرخرے پر فٹ بیٹھ گئی تھی۔ میں نے تھوڑا سا زور لگایا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے بھنچے ہوئے حلق سے "خرخراہٹ" برآمد ہونے لگی۔

میں نے موت سے زیادہ سفاک لہجے میں اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی "ہتھکڑی کی چابی کہاں ہے؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پر اپنے بازوؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کمرے کا فرش قالین پوش تھا اس لیے ہمارے "ٹکراؤ" کی آواز کمرے سے باہر نہیں جاسکی تھی ورنہ دروازے سے باہر کھڑا اس کا باڈی گارڈ ضرور مداخلت کرچکا ہوتا۔

ڈی ایس پی نے پھنسی پھنسی آواز میں بتایا کہ میری مطلوبہ چابی اس کی پتلون کی جیب میں تھی۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ سے مذکورہ جیب کو تھپتھپانے کی ناکام کوشش بھی کی۔

میں نے اپنے ہتھکڑی لگے ہاتھوں سے اس کی جیب سے چابی نکالنے کی ماہرانہ کوشش کی تو ڈی ایس پی کا چربی دار' بے لچک جسم میرا ساتھ نہ دے سکا۔ میں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر اس کی گردن کو پیٹ کی جانب جھکانا چاہا تھا تاکہ میرے ہاتھ اس کی جیب تک رسائی حاصل کرلیں مگر اس کی گردن ایک "ناکافی حد" سے زیادہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔

میں نے غراہٹ آمیز لہجے میں اسے حکم دیا "اپنی جیب سے چابی نکال کر یہ ہتھکڑی کھولو۔" ساتھ ہی میں نے ہتھکڑی کی زنجیر کو اس کے ٹینٹوے پر دبایا۔

میں مسلسل اس بات کو ذہن میں رکھے ہوئے تھا کہ وہ حلق سے کوئی "واویلا" خارج کرکے اپنے باڈی گارڈ کو میری رہائی سے قبل اس طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

اس نے زندگی بھر حکم چلایا تھا' میری زبان سے اپنے لیے حکم سنتے ہوئے اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ تاہم اس وقت اس کی گردن تیشے کی دھار پر تھی۔ اس کی ذرا سی حکم عدولی کسی بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی تھی۔

اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور کچھ کہنا چاہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھے خطرناک نتائج کی سنگین دھمکیاں دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تاہم میں نے اس کی گردن پر آہنی زنجیر کا دباؤ بڑھاتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"[illegible]" میرے چہرے پر برستی وحشت نے اس کی آنکھوں میں دہشت بھردی اور اس کا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب کی طرف رینگ گیا۔ میں نے اس دوران میں احتیاط کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ڈی ایس پی کی کوئی معمولی سی حرکت بھی بازی پلٹ سکتی تھی۔

ڈی ایس پی نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میری ہتھکڑی کھول دی۔ جس چابی سے میری ہتھکڑی کھولی گئی تھی وہ ایک گچھے میں پروئی ہوئی تھی۔ میں نے وہ گچھا بھی اپنے قبضے میں کرکے جیب میں ڈال لیا پھر اس کی گردن کو اپنے بازو کے حلقے میں کستے ہوئے میں اس کے لباس کو ٹٹول کر کسی ہتھیار وغیرہ کا سراغ لگانے لگا۔

جلد ہی میرا ہاتھ ایک ریوالور کے ابھار کو کھوجنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہی لمحہ تھا جب ڈی ایس پی نے ایک ایسی

[ح]رکت کی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا۔

اس نے ٹیلی فون اسٹینڈ کو ایک زوردار لات ماری۔ اسٹینڈ فون سمیت میز پر رکھے کانچ کے جگ سے [جا ٹکرایا]۔ وہ جگ پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس کے قریب ہی بلوری گلاس بھی موجود تھا۔ ٹیلی فون اسٹینڈ کی خطرناک [ٹھوک]ر کا نتیجہ کانچ کا' پانی سے بھرا ہوا جگ دیوار سے جا ٹکرایا۔

ایک زوردار چھناکا ہوا اور جگ کی کرچیاں کمرے میں [بکھر] گئیں۔ یہ آواز ایسی گئی گزری نہیں تھی کہ ڈی ایس پی کا [باڈی گارڈ] ہماری جانب متوجہ نہ ہوتا۔ میں سیکنڈ کا لاکھواں حصہ [بھی] ضائع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے ڈی ایس پی کے لباس سے ریوالور برآمد کرکے [اس کی] نال اس کی کنپٹی سے پیوست کردی۔ اس کی گردن [ابھی تک] میرے بائیں بازو کی گرفت میں جکڑی ہوئی تھی۔ میرے [بازو] کے شانی دباؤ نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ [آہ و] فغاں بھی کرسکے۔

میں بجلی کی سی سرعت سے ڈی ایس پی کو لیتے ہوئے [ایک] ایسی جگہ پہنچ گیا' دروازہ کھلنے کے بعد جو بہترین کمین گاہ [ثاب]ت ہوتی۔

باڈی گارڈ کا مطلب ہے "محافظ جاں" دروازے کے [باہر] موجود مسلح شخص ڈی ایس پی کی جان کی حفاظت کا ذمے [دار] تھا۔ کمرے میں پیدا ہونے والی چھناکے کی تیز آواز نے [اسے] بڑی وضاحت سے بتادیا کہ اس کے ڈی ایس پی کی جان [کو] نہایت ہی سنگین خطرہ لاحق ہوچکا ہے۔

کمرے کا دروازہ "دھڑ" سے کھلا اور کلاشنکوف بردار [باڈی] گارڈ ایک جھٹکے سے اندر آگیا۔ ہم دونوں دروازے کی [اوٹ] میں تھے۔ وہ حیرت سے خالی کمرے کو تلاشنے لگا۔

میں نے اس کی حیرت رفع کرنے کے لیے نہایت [پھر]تی کے ساتھ ریوالور کی نال اس کی گدی پر ٹکادی اور [پھنک]ارتے مشابہ آواز میں کہا۔

"کلاشنکوف دور پھینک دو ورنہ تمہاری کھوپڑی کا بھیجا [ا]س کی دیواروں پر مل دوں گا!"

اس کارروائی کے دوران میں' میں نے ڈی ایس پی کی [گرد]ن کو مسلسل اپنی بانہہ کی گرفت میں دبوچ رکھا تھا۔ کوئی [واویلا] تو درکنار' وہ سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہا [تھا]۔

[...]ن بردار باڈی گارڈ نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور [کلاشن]کوف کو کھڑکی والی دیوار کی طرف پھینکتے ہوئے ہاتھ سر [کے] اوپر اٹھالیے۔ میرے لہجے کی سنگینی نے اسے ہتھیار [پھینک]نے پر مجبور کردیا تھا۔ میرا وہ لہجہ میرے فیصلہ کن خیالات کی عکاسی کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ باڈی گارڈ اگر اس وقت کسی مہم جوئی کے چکر میں پڑجاتا تو اپنے ساتھ ساتھ ڈی ایس پی کو بھی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کرجاتا۔

کمرے کی بازی میرے حق میں پلٹ چکی تھی لیکن کمرے سے باہر حالات تبدیل ہوگئے۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ کچھ لوگ زیریں منزل سے بالائی منزل کی طرف آرہے تھے۔ ظاہر ہے' وہ ساحل اور میر بخش نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے' ڈی ایس پی کے وفادار تھے۔

وہ بہت ہی نازک اور سنگین لمحات تھے۔ میں نے ڈی ایس پی کی گردن کو ایک مخصوص جھٹکا دیا' اس کے ساتھ ہی ایک زوردار فرنٹ پش کک اپنے سامنے ہینڈز اپ باڈی گارڈ کی تشریف پر رسید کی۔ میرے یہ دونوں عمل بیک وقت اور میکانکی تھے۔

ڈی ایس پی کی گردن میرے بازو کی گرفت میں جھول گئی۔ وہ دو تین گھنٹے کے لیے انٹاغفیل ہوچکا تھا۔

باڈی گارڈ اپنی باڈی کے نہایت ہی باآبرو حصے پر میری طوفانی لات کھا کر لڑکھڑایا اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ کھڑکی کی چوبی چوکھٹ سے ٹکرایا۔

میں ڈی ایس پی کے چربی زدہ جسم کو حوالہ فرش کرتے ہوئے باڈی گارڈ کی جانب بڑھا۔ وہ کھڑکی سے ٹکرا کر زمین پر گرنے کے بعد سنبھل چکا تھا۔ میں اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسی لمحے کھلی ہوئی کھڑکی سے میری نگاہ باہر چلی گئی۔

اس کھڑکی سے بنگلے کا مین گیٹ دکھائی دے رہا تھا اور میں نے وہاں جو منظر دیکھا اس نے مجھے بے حس و حرکت ہونے پر مجبور کردیا۔

دو جیپیں آگے پیچھے وہاں آکر رکیں اور ان میں سے کوئی نصف درجن افراد برآمد ہوکر بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ گیٹ پر اگرچہ روشنی بہت زیادہ نہیں تھی تاہم میں ان افراد میں ایک شخص کو بخوبی پہچان گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

اس شخص کے سر پر ایک تازہ پٹی بندھی تھی۔ وہ ایک سو ایک فیصد تارا تھا!

اسی لمحے مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ میری لمحاتی غفلت یا عدم توجہی سے فائدہ اٹھا کر باڈی گارڈ نے اپنی کلاشنکوف پر قبضہ جمایا اور اس کی ہلاکت خیز نال کو میری گردن سے پیوست کرتے ہوئے وہ آتشیں لہجے میں غرایا "ہینڈز اپ!"

میں نے ہاتھ اٹھادیے۔

فیصلے کی گھڑی بڑی کڑی ہوتی ہے اور یہ کڑی گھڑی میرے سر پر آن پہنچی تھی۔ اس کی "ٹک ٹک" میرے دماغ پر دستک دے رہی تھی۔ وجدان! کچھ کرو۔ کچھ کر گزرو۔ اگر وقت گزر گیا تو تمہیں اپنے ساتھیوں سمیت ایک اذیت ناک طوفان سے گزرنا ہوگا۔

میں نے ہمیشہ وقت کی پکار پر کان دھرے ہیں' اس کے تقاضوں کو سمجھا ہے اور ان کے مطابق ہی قدم اٹھایا ہے۔ مجھے بخوبی احساس تھا' میں ان لمحات میں بہت ہی سنگین صورتِ حالات سے دوچار تھا۔ وہ نہایت ہی نازک لمحات تھے جن میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں ایک حتمی فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو گیا تھا۔

ڈی ایس پی کے گارڈ کی کلاشنکوف کی خوفناک نال میری گردن کے عقبی حصے سے پیوست تھی اور اس کے حکم پر میں نے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھا رکھے تھے۔ میرے دائیں ہاتھ میں ڈی ایس پی سے چھینا ہوا ریوالور موجود تھا۔ کچھ دیر پہلے گارڈ کی جان پر بن آئی تھی اور اس نے میرے تحکمانہ جملے کے نتیجے میں اپنی کلاشنکوف کھڑکی کے پاس پھینک دی تھی اور اب اس کا پلڑا بھاری تھا' وہ مجھے بھی کچھ اسی قسم کا حکم دے رہا تھا۔

"ریوالور پھینک کر دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ لو!"

میں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

وہ کلاشنکوف کی قاتل نال سے میری گردن پر ٹھوکا دیتے ہوئے غرایا "گھوم جاؤ۔"

میں نہایت فرماں برداری سے گھوم گیا۔ اب میرا چہرہ کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف تھا۔ اس دروازے کو تھوڑی دیر پہلے گارڈ "دھڑام" سے کھول کر کمرے میں آیا تھا۔ میں اس وقت ڈی ایس پی کو اپنے بازو کی لپیٹ میں دبوچے دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا اور گارڈ ہمیں کمرے میں نہ پا کر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

گارڈ کو ایک مرتبہ پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ کمرے کے قالین پوش فرش پر فربہ اندام ڈی ایس پی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ گارڈ نے میری گردن پر نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پھر ٹھوکا دیا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں آگے بڑھوں۔

میں نے دو قدم آگے بڑھائے اور اپنے ٹارگٹ پر پہنچ گیا۔ اس وقت میں کھلے ہوئے دروازے سے صرف ایک قدم کی دوری پر تھا۔ میری بائیں جانب چند انچ کے فاصلے پر کمرے کی دیوار تھی جس پر سوئچ بورڈ لگا تھا۔ اس وقت بورڈ پر صرف دو سوئچ آن پوزیشن میں تھے۔ ان دونوں میں ایک سیلنگ فین کا اور دوسرا ٹیوب لائٹ کا سوئچ تھا۔ فین کا سوئچ خصوصاً ریگولیٹر کے برابر میں لگایا جاتا ہے۔ مجھے اس سوئچ سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ ٹیوب لائٹ کا سوئچ تھا جو فین والے سوئچ سے دو بٹن کی دوری پر تھا۔

میں نازک ترین لمحات کے جس مرحلے پر پہنچ چکا تھا وہاں سیکنڈ کا کروڑواں حصہ بھی ضائع کرنا انتہائی ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے بجلی سے بھی زیادہ سریع انداز میں اپنے فیصلے پر عمل کر ڈالا۔

میں نے سانس روکی' میرا بایاں ہاتھ ٹیوب لائٹ کے سوئچ پر پڑا اور میں نے بیٹھک لگانے والے انداز میں زمین پر بیٹھ کر بیک رول کیا۔ یہ تینوں عمل اتنے مربوط اور میکانکی تھے کہ گارڈ کے حواس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو گیا۔

سوئچ بورڈ پر پڑنے والے میرے ہاتھ نے ٹیوب لائٹ کو آف کر دیا۔ کمرا اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس دوران میں بیک رول کرتے ہوئے میں گارڈ کی ایسی کم تیسی کر چکا تھا۔ میں نے فرش پر الٹی لوٹ لگاتے ہوئے دونوں پاؤں کو بیک کِکس کے اسٹائل میں گارڈ کی کلائیوں پر مارا' نتیجے میں کلاشنکوف کا ٹریگر دب گیا۔ ایک خوفناک برسٹ نے کمرے کی چھت کو اُدھیڑ کر رکھ دیا۔ اندھیرے میں گارڈ پر اٹیک کرتے ہوئے میں نے ٹائمنگ کا خاص خیال رکھا تھا۔

اگر اس موقع پر میں فرنٹ رول کرتا تو نتیجہ اس کے بالعکس برآمد ہوتا۔ فطری ردِعمل کے تحت گارڈ کلاشنکوف سے فائرنگ کرتا اور میں عین گولیوں کی رینج اور نشانے پر فرش پر موجود ہوتا پھر میرا بھی وہی حشر ہوتا جو اس وقت کمرے کی چھت کا ہوا تھا۔

کمرے کی تاریکی میں گارڈ اپنی نئی نویلی کلاشنکوف سمیت پیچھے کی جانب الٹ گیا تھا۔ میں اپنی بروقت کارروائی کے بعد سائڈ رول کرتے ہوئے گارڈ سے محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا۔ محفوظ ان معنوں میں کہ مجھے بیڈ کی آڑ میسر آ گئی تھی۔ یہی وقت تھا جب نیچے سے آنے والے کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔

کمرے سے باہر برآمدے میں وہ مجھے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں گارڈ اور ڈی ایس پی پر قابو پا چکا تھا تو میں نے ان تینوں کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ زیریں منزل سے

بالائی منزل کی جانب آ رہے تھے۔ ان میں ایک تو ڈی ایس پی کا ذاتی ڈرائیور تھا اور باقی دو افراد سادہ پوش گھریلو ملازم تھے۔

وہ کوئی نہایت ہی اہم اطلاع لے کر نیچے سے اوپر آئے تھے مگر فائرنگ اور کمرے کی تاریکی نے ان کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ وہ ٹھٹک کر حیران اور پریشان نظروں سے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے اندر کی صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر ہیں' انہیں اندر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اگرچہ کمرے سے باہر روشنی کا مناسب انتظام نہیں تھا تاہم میں انہیں واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ان کی آمد کا مقصد کھل گیا۔ ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے کمرے کے اندھیرے میں گھورتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں کہا "سر! آپ کہاں ہیں؟ نیچے بہت گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ گیٹ کے باہر رکنے والی جیپوں سے متعلق کوئی اطلاع فراہم کر رہا ہے۔ میں نے بھی تھوڑی دیر قبل کمرے کی کھڑکی سے ان جیپوں کو گیٹ کے سامنے رکتے دیکھا تھا اور ان میں سے برآمد ہونے والے نصف درجن افراد میں تارا سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

ڈی ایس پی کو میں نے مخصوص داؤ کے استعمال کے بعد دو تین گھنٹے کے لیے اننا غفیل کر دیا تھا۔ ڈرائیور کی پکار اور استفسار کا کوئی جواب دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تاہم اس موقع پر ڈی ایس پی کے گارڈ کو کوئی ردِعمل ضرور ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ اس کی جانب مکمل خاموشی تھی۔

میں نے ٹیوب لائٹ کو آف کرنے کے بعد بڑے جچے تلے انداز میں پوری ایکوریسی کے ساتھ بیک رول کرتے ہوئے اس کی کلائیوں پر ڈبل کک کی بھرپور ضرب لگائی تھی۔ نتیجے میں وہ کلاشنکوف سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا تھا۔ اسی دوران میں اس کی کلاشنکوف نے موت بھی اگلی تھی۔ میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ میں گارڈ کے گرنے کی آواز نہیں سن سکا تھا۔ اب اس کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ پا کر الجھن میں گرفتار ہو رہا تھا۔

ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے کمرے کی تاریکی میں سے کوئی جواب نہ پا کر اضطراری لہجے میں کہا "سر! آپ خاموش کیوں ہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ کمرے میں آپ نے اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟ آپ خیریت سے تو ہیں! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں فائرنگ کی آواز سنی تھی۔"

ڈرائیور کے متعدد سوالات کا اسے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ ڈی ایس پی اس وقت جہاں تھا وہاں سے کوئی جواب ارسال نہیں کر سکتا تھا۔ میں دانستہ خاموش تھا البتہ گارڈ کی خاموشی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے فوری طور پر یہی سمجھا کہ اس کی مسلسل خاموشی کسی چال کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' وہ مجھے شکار کرنا چاہتا ہو اور میری جانب سے کسی حرکت کا انتظار کر رہا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے اور آنے والے کسی بھی سنگین لمحے کے لیے تیار تھے۔

کمرے سے باہر موجود ڈی ایس پی کے ڈرائیور نے دُزدیدہ نظر سے اپنے دونوں ساتھیوں کو دیکھا پھر کمرے کی جانب منہ کر کے فریادی انداز میں بتانے لگا "سر! نیچے والی منزل پر بازی پلٹ چکی ہے۔ اے ایس آئی عبدالرزاق اس وقت بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ گرفتار شدہ بندے نے اس کی کلاشنکوف چھین لی ہے اور اسے بری طرح پیٹ رہا ہے۔ ہتھکڑی کی وجہ سے وہ کلاشنکوف سے فائرنگ تو نہیں کر سکتا مگر وہ گن کو لاٹھی کی طرح استعمال کر رہا ہے۔"

ڈرائیور کی فراہم کردہ اطلاعات نے میرے دل و دماغ کو خوشی سے بھر دیا۔ میرے دل سے بے ساختہ نکلا۔ میر بخش! زندہ باد۔

جب میں ڈی ایس پی کے گارڈ سے اندھیرے میں نبرد آزمائی میں مصروف تھا' اسی دوران میں میر بخش نے نچلی منزل پر کام دکھا دیا تھا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی کہ کلاشنکوف اب نگران اے ایس آئی کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی لیکن میں گیٹ سے باہر کی صورتِ حال کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے باہر جو منظر دیکھا تھا' وہ میر بخش سمیت ہم تینوں کے لیے ہر صورت ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا اور یقیناً میر بخش ابھی تک گیٹ سے باہر کی تازہ ترین پوزیشن سے آگاہ نہیں تھا۔

جب ڈرائیور کے تشویش ناک انکشاف پر بھی گارڈ کی جانب سے کسی ردِعمل کا مظاہرہ سامنے نہیں آیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی مظاہرے و ظاہرے کے قابل نہیں رہا ہوگا۔ میں نے صورتِ حال کو اپنے ہاتھ میں کرنے کے لیے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور ڈی ایس پی جیسا لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے تحکمانہ انداز میں "اپنے" ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں سب خیریت ہے۔ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر چھت پر چلے جاؤ اور گیٹ سے باہر نظر رکھو۔ میں نے کمرے میں دانستہ اندھیرا کر رکھا ہے۔"

وہ میرے داؤ میں آگیا اور دونوں سادہ پوش ملازموں کو ساتھ لے کر چھت کی جانب چلا گیا۔ وہ تینوں کمرے سے باہر ایسی جگہ رکے تھے جہاں سے کمرے کے اندر' قالین پر پڑے بے ہوش ڈی ایس پی کے جسم کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر وہ اپنے "صاحب" کو یوں کسمپرسی کی حالت میں زمین بوس دیکھ لیتے تو کسی بھی قیمت پر میرے حکم کی تعمیل نہ کرتے۔

میں ڈی ایس پی کے گارڈ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کی سمت طاری مکمل خاموشی نے میرے اس خیال کی تصدیق کر دی کہ وہ بھی اپنے "سر" سے ملتی جلتی کیفیت کا شکار تھا۔ تاہم میں نے عملی تصدیق ضروری سمجھی اور اندھیرے میں احتیاط سے رینگتے ہوئے اس طرف پہنچ گیا جہاں گارڈ میری ڈبل بیک کک کھانے کے بعد گرا تھا۔ جلد ہی میرے ہاتھوں نے اس کے بدن کو چھو لیا' یہ سمجھنے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ گارڈ کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ ہو سکتا ہے' پیچھے الٹتے ہوئے اس کا سر کسی شے سے ٹکرا گیا ہو' نتیجے میں وہ فرش پر ڈھیر ہو کر بے ہوش ہو گیا ہو۔ گولیوں کی گونج کی وجہ سے میں اس کے ساتھ ہونے والی "کارروائی" سے بے خبر رہا تھا۔

لائٹ آف ہونا اور فائرنگ کی آواز یقیناً بنگلے سے باہر موجود تارا اور اس کے ساتھیوں سے پوشیدہ نہیں رہی ہو گی۔ زیریں منزل پر ساحل اور میر بخش نے بھی یہ آوازیں سنی ہوں گی۔ مجھے فوری طور پر میر بخش اور ساحل کی مدد کے لیے پہنچنا چاہیے تھا۔ میری جیب میں چابیوں کا وہ گچھا موجود تھا جس سے ان دونوں کی ہتھکڑی کھولی جا سکتی تھی۔ یہ سوچتے ہی میں کمرے سے نکلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے نہ صرف اپنے ساتھیوں کی مدد کرنا تھی بلکہ گیٹ سے باہر موجود افراد سے بھی دو دو ہاتھ کرنا تھے۔

میں جیسے ہی کمرے کے دروازے پر پہنچا' انٹرکام کا مخصوص بزر بج اٹھا۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ ڈی ایس پی نے مجھے بتایا تھا' یہ انٹرکام بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا کام دیتا تھا۔ اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا' زیریں منزل سے کوئی ڈی ایس پی کی "خیریت" دریافت کر رہا تھا۔ میری حالیہ معلومات کے مطابق زیریں منزل پر اس وقت صرف تین افراد موجود تھے۔ ساحل' میر بخش اور نگران اے ایس آئی عبدالرزاق جو اب نگران نہیں رہا تھا۔ کلاشنکوف چھن جانے کے بعد وہ میر بخش کے رحم و کرم پر تھا۔ قوی امکان اسی بات کا تھا کہ ساحل انٹرکام کو استعمال میں لا رہی تھی۔

اس دوران میں ایک مرتبہ پھر انٹرکام کا بزر بجا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر آگے بڑھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے ڈی ایس پی کے انداز میں پوچھا۔

"کیا ہے بھئی؟"

جواب میں جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی وہ ساحل کی تھی اور نہ ہی میر بخش کی۔ وہ یقینی طور پر گیٹ پر متعین گارڈز میں سے کسی کی آواز تھی۔ وہ فدویانہ انداز میں بتا رہا تھا "سر! وڈیرا اکبر سومرو آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"وڈیرا اکبر سومرو؟" میں نے ڈی ایس پی کے لہجے میں گارڈ کے الفاظ دہرائے۔

"جی سر!" اس نے اثبات میں جواب دیا پھر پوچھا "ابھی تھوڑی دیر پہلے اوپر فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی اور آپ کے کمرے کی لائٹ بھی بجھ گئی ہے۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔" میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔

وہ بولا "وڈیرا اکبر سومرو بھی اس فائرنگ سے تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ وہ فوری طور پر بنگلے کے اندر آنا... چاہتے ہیں۔ کیا میں انہیں ان کے ساتھیوں سمیت بنگلے میں آنے دوں؟"

میں نے کھڑکی سے تارا کی جھلک دیکھی تھی۔ گارڈ بتا رہا تھا' وڈیرا اکبر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میں نے کبھی اکبر سومرو کو نہیں دیکھا تھا اس لیے صورت آشنائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وڈیرا اکبر سومرو اپنے بنگلے پر' عمرکوٹ کے ایک دور افتادہ مقام پر تھا۔ یہاں شادی پلی کے مضافات میں اس کی موجودگی حیرت انگیز تھی اور وہ بھی رات کے آخری پہر! بہرحال ایک بات کی تصدیق ہو گئی کہ اس انٹرکام کا براہِ راست تعلق بنگلے کے مین گیٹ پر متعین سیکیورٹی گارڈز سے تھا۔

میں وڈیرا اکبر سومرو کو بنگلے میں داخلے کی اجازت دے کر اپنے ساتھیوں کی خیریت کو کسی خطرے سے دوچار نہیں کر سکتا تھا اس لیے گارڈ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تم انہیں بنگلے میں داخل نہ ہونے دینا جب تک میرا حکم نہ ہو۔"

"سر! وہ اصرار بلکہ ضد کر رہے ہیں۔" گارڈ نے بتایا "وہ گیٹ پر اندر آنا چاہتے ہیں۔"

میں نے ڈی ایس پی کے مخصوص لب و لہجے کی نقالی کو ملحوظ رکھتے ہوئے گارڈ سے پوچھا "کیا تم ذاتی طور پر وڈیرا اکبر سومرو کو جانتے ہو؟"

اس نے انٹرکام پر نفی میں جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے' وہ وڈیرا اکبر سومرو کے علاوہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے!" میں نے ایک خدشے کا اظہار کیا۔

گارڈ نے بتایا "جی سر' ایسا ہونا ممکن ہے۔"

"یہ ہمارے خلاف کسی قسم کی چال بھی ہو سکتی ہے؟"

"بالکل ہو سکتی ہے۔" گارڈ نے تصدیقی انداز میں کہا۔

اسی وقت گارڈ کے نزدیک ہی کوئی گرجدار آواز میں بولا "نہ بابا! تم اپنے ڈی ایس پی سے ہماری بات کرواؤ۔ کیا مہمانوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے؟"

پھر تارا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اپنے میزبان دوست اکبر سومرو سے کہہ رہا تھا "وڈیرا سائیں! اوپر کی منزل پر کوئی گڑبڑ ہے۔ لگتا ہے' وجدان نے یہاں بھی کوئی چکر چلا دیا ہے۔ ہمیں ڈی ایس پی کی اجازت کا انتظار کیے بغیر بنگلے میں گھس جانا چاہیے ورنہ وہ شیطان ایک مرتبہ پھر ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

تارا نے "شیطان" کا لفظ یقیناً میرے لیے استعمال کیا تھا۔ ان کی آوازوں کی صفائی سے لگتا تھا' وہ انٹرکام کے ریسیور کے بہت نزدیک کھڑے تھے۔ ان کے تیور اور عزائم کو بھانپتے ہوئے گارڈ نے مجھ سے پوچھا۔

"سر! یہ لوگ زبردستی بنگلے میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے حتمی لہجے میں کہا "میں خود نیچے گیٹ پر آ رہا ہوں۔ ان سے کہو' میرا انتظار کریں۔ مہمانوں کے استقبال کے لیے میزبان بہ نفسِ نفیس وہاں پہنچ رہا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں ریسیور کریڈل کر کے کمرے سے باہر آگیا۔ کمرا چھوڑنے سے پہلے میں نے ڈی ایس پی والا ریوالور تلاش کر کے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ کسی نازک موقع پر میرے ساتھیوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے دروازے کو اچھی طرح بند کر دیا تھا۔ وہ پرانی طرز کا دروازہ تھا جس کے باہر ایک آہنی کنڈی بھی لگی تھی۔ میں نے اس کنڈی کو چڑھا دیا۔ اب دروازہ توڑے بغیر اندر سے کوئی باہر نہیں آ سکتا تھا اور اندر جو دو افراد موجود تھے' وہ اس حالت اور کیفیت میں نہیں تھے کہ فی الفور دروازہ توڑنے کی جسارت کر سکتے۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق ڈی ایس پی دو تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا اور اس کے گارڈ کی بھی کم و بیش یہی پوزیشن تھی۔ جب "باڈی" بے ہوش تھی تو "باڈی گارڈ" کے ہوش مند رہنے کی کیا ضرورت تھی!

میں نے کمرے سے باہر آ کر چھت کی جانب جانے والے زینے پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں سناٹے کا راج تھا۔ میرے حکم پر ڈی ایس پی کا ڈرائیور اور دونوں گھریلو سادہ پوش ملازم چھت پر چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ باہر کی صورتِ حال پر نظر رکھیں۔ جب تک میں انہیں واپسی کا حکم نہ دیتا' وہ چھت سے نیچے آنے والے نہیں تھے۔ میں نے بڑی مہارت اور خوب صورتی سے ڈی ایس پی کا لب و لہجہ اختیار کر کے صورتِ حال کی سنگینی کو ٹیکل کر لیا تھا۔

میں محتاط مگر تیز قدموں سے زینے اترنے لگا۔ وہاں کی ہر شے پر میری گہری نظر تھی۔ دس سیکنڈ میں' میں اس کمرے کے سامنے پہنچ چکا تھا جہاں کچھ دیر پہلے میں نے ساحل اور میر بخش کو چھوڑا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی میر بخش کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ یہ خوشی مجھے اپنے سامنے زندہ دیکھنے کی تھی۔ بالائی منزل پر ہونے والی فائرنگ نے یقیناً انہیں میری طرف سے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا ہو گا۔ اس نے جوشِ جذبات میں کچھ بولنا چاہا تو میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ ساحل میرے' ہتھکڑی سے آزاد ہاتھوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن اے ایس آئی عبدالرزاق مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔

میر بخش میری متلاشی نظر کا مفہوم سمجھ گیا اور اس نے باتھ روم کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ میں دبی کلاشنکوف کو ہوا میں لہرایا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گن کا مالک باتھ روم میں بند ہے۔ میر بخش کے چہرے کا گہرا اطمینان اس بات کی اطلاع دے رہا تھا کہ باتھ روم میں بند اے ایس آئی کا "شافی بندوبست" اس نے کر دیا تھا جیسا کہ میں ڈی ایس پی اور اس کے باڈی گارڈ کے ساتھ بالائی منزل پر کر آیا تھا۔

وہ کمرا بنگلے کے مین گیٹ سے کافی فاصلے پر واقع تھا چنانچہ وہاں ہلکی آواز میں گفتگو کی جا سکتی تھی۔ میر بخش کی حالت سے لگتا تھا کہ ابھی ابھی وہ اے ایس آئی سے "نمٹ" کر فارغ ہوا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں اپنی جیب سے چابیوں کا گچھا برآمد کیا اور جلدی جلدی ان دونوں کے ہاتھوں کو ہتھکڑی کی گرفت سے آزاد کر دیا۔

ساحل بے تابی سے اپنی کلائیوں کو سہلاتے ہوئے بولی "وجدان! تم خیریت سے تو ہو؟ فائرنگ کی آواز سن کر تو میری جان ہی نکل گئی تھی۔"

اس کی آواز دھیمی اور لہجہ پر تشویش تھا۔ میر بخش نے کلاشنکوف کو ماہرانہ انداز میں دونوں ہاتھوں میں سونتتے ہوئے کہا۔

"مزہ تو اب آئے گا وجدان سائیں!"

اس کے لہجے سے بے نیازی جھلکتی تھی۔ اس وقت وہ اپنے زخمی بازو اور اس میں ہونے والی تکلیف کو یکسر بھول چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ان دونوں کو بنگلے کی چھت اور مین گیٹ سے باہر کی صورت حالات سے آگاہ کیا۔

میری پوری بات سننے کے بعد میر بخش حیرت سے بولا۔

"وڈیرا اکبر سومرو اور یہاں۔ مجھے یقین نہیں آرہا سائیں؟"

"یقین مجھے بھی نہیں آرہا۔" میں نے کہا "لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دو جیپوں میں سے چھ افراد کو نکل کر بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا تھا اور ان چھ افراد میں تارا کو میں نے فوراً پہچان لیا تھا۔ باقی باتیں مجھے گیٹ پر متعین سیکیورٹی گارڈ سے معلوم ہوئی ہیں۔"

ساحل نے کہا "تارا کو تو ہم بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل کے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ کب اور کیسے ہوش میں آیا اور اسے کیونکر پتا چلا کہ ہم یہاں شادی پلی کے ایک بنگلے میں موجود ہیں؟"

میں ساحل کے سوالات کے جوابات دینے سے قاصر تھا۔ میں نے کہا "اس بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو موجودہ صورتِ حال سے نمٹنا ہے۔"

"سائیں! وڈیرا اکبر سومرو تو دوپہر تک اپنے بنگلے پر تھا۔" میر بخش نے الجھن زدہ انداز میں کہا "اس کی یہاں، شادی پلی میں موجودگی سمجھ میں نہیں آرہی۔"

میں نے کہا "جوبات ابھی سمجھ سے بالاتر ہے، وہ بعد میں زیریں ترین ہوجائے گی۔ ان الجھنوں میں وقت ضائع کرنا ہوش مندی کے اصولوں کے منافی ہے۔"

"سائیں! آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر میں جی اٹھا ہوں۔" میر بخش نے کلاشنکوف ہوا میں لہراتے ہوئے کہا "اب سو وڈیرا اکبر سومرو بھی میرے سامنے آجائیں تو پروا نہیں۔ میں آپ کی حفاظت کے لیے لاشوں کے انبار لگا سکتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بڑے سنگین لہجے میں اضافہ کیا "سائیں! اکبر سومرو کی طرف بھی میرا بہت حساب نکلتا ہے۔ آج یہ حساب بے باق ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "میر بخش! جب تک جان پر نہ بن آئے، تم گن کا استعمال نہیں کرو گے۔ ہمیں دوسروں کی جان سے کھیلے بغیر اپنی جان بچا کر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہے۔ تم میری یہ بات ذہن میں رکھو گے۔"

"سائیں!" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا "وڈیرا اکبر سومرو انسان نہیں بلکہ ایک شیطان ہے۔" اس کا انداز بہت خوفناک تھا "وہ خود کو "بھوتار" کہلواتا ہے۔ اس کی اپنی پرائیویٹ جیل ہے۔ وہ لوگوں پر بہت ظلم کرتا ہے، ہزاروں بے گناہوں کا خون اس کے ہاتھوں پر ملا ہوا ہے۔ جرائم پیشہ افراد سے اس کے گہرے رابطے ہیں۔ وہ ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتا ہے۔ اپنی رعایا اور ہاریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتا ہے۔ وہ کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں۔ میں تو کہتا ہوں۔۔۔"

"یہ تقریروں کا وقت نہیں ہے میر بخش!" میں نے ہاتھ اٹھا کر قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "حالات کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا اور فرماں برداری سے بولا "جو حکم سائیں!"

"وجدان! یہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں؟" ساحل نے بیزاری سے کہا۔

میں نے کہا "مصیبت تو مصیبت ہی ہوتی ہے۔ کس اور حس کا کیا سوال ہے!"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے باتھ روم کے دروازے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے میر بخش سے پوچھا "قانون بہادر کا کیا حال ہے؟"

میرا اشارہ واضح طور پر اے ایس آئی عبدالرزاق کی طرف تھا۔ میر بخش میرے سوال کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولا "اس کی پیشانی پر میں نے کلاشنکوف کا بٹ مارا تھا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پیٹ سے فرش پر آگرا۔ میں نے گھسیٹ کر اسے باتھ روم میں پہنچا دیا۔ اب وہ دو تین گھنٹے تک وہاں آرام فرمائے گا۔"

میں نے پوچھا "اس کا سر تو نہیں پھٹا؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا "بس پیشانی پر ایک کنگ سائز آلو نمودار ہوگیا ہے۔" اپنی بات ختم کرکے میر بخش نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں اس کی نظر کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولا "اوپر والوں کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ ڈی ایس پی اور اس کا باڈی گارڈ ایک کمرے میں "محو استراحت" ہیں۔"

اسی وقت بنگلے کے باہر ایک کلاشنکوف گرج اٹھی۔ برسٹ کی تیز تڑتڑاہٹ فضا میں گونجی۔ آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ فائرنگ کا رخ نیچے سے اوپر کی طرف تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں بلکہ اسی وقت میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ فائرنگ کے جواب میں بنگلے کی چھت پر سے انسانی چیخوں کی صدائیں بلند ہوئیں۔

مجھے پورا یقین تھا کہ یہ فائرنگ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب سے کی گئی ہوگی۔ بنگلے کی چھت پر ڈی ایس پی کا ڈرائیور اور دو سادہ پوش گھریلو ملازم اپنے "صاحب" کے حکم پر بنگلے کے گردونواح کی نگرانی پر "مامور" تھے۔ ممکن ہے، تارا یا اکبر سومرو نے ان کی جھلک دیکھ لی ہو اور عین ممکن ہے، وہ سمجھے ہوں کہ وہ تینوں افراد ہم ہیں۔ یعنی میں، ساحل اور میر بخش۔ اسی لیے انہوں نے ہم پر فائرنگ کی تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور جواباً انسانی چیخوں کی آواز نے ساحل کو سراسیمہ کردیا۔ وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"ساحل! تھوڑی دیر پہلے تم نے پوچھا تھا۔ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ بس تو جان لو، ہم "اس" مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ یہ مصیبت انسانوں کی نازل کردہ ہے جو دوسرے انسانوں کی جان لیتی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

آخری جملہ میں نے بیک وقت دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔

میر بخش کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "میں پوری طرح تیار ہوں۔"

میں نے اپنی پتلون کی جیب سے ڈی ایس پی والا ریوالور نکال کر ساحل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ کیا تمہیں اسے چلانا آتا ہے؟"

اس نے میرے ہاتھ سے ریوالور لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

میں نے کہا "جب تک تمہاری جان یا عزت پر نہ بن آئے، تم اسے استعمال نہیں کروگی۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ مجھے اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دیے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا بات ہے ساحل، تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو۔ کیا ریوالور کے استعمال میں کوئی دقت محسوس کررہی ہو۔ تم نے بتایا ہے نا، تم اسے چلانا جانتی ہو!"

"میں وقت پڑنے پر اسے استعمال کرلوں گی۔" اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا "لیکن۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا "لیکن کیا ہے ساحل؟"

"وجدان! تم تو مجھے اپنی جان کی حفاظت کی ہدایات اس طرح دے رہے ہو جیسے مجھ سے دور جانے والے ہو۔" وہ شکایتی انداز میں گویا ہوئی "کیا تم ان نازک لمحات میں میرے ساتھ نہیں ہوگے؟"

میں نے بے ساختہ کہا "میں تو ہر پل تمہارے ساتھ ہوں۔"

"پھر!" اس کی بولتی ہوئی آنکھوں میں بڑا معنی خیز سوال تھا۔

میں نے جلدی سے کہا "یہ تو میں تمہیں حفظِ ماتقدم کے طور پر دے رہا ہوں۔ یہاں سے نکلنے کے بعد جانے ہمیں کس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑجائے۔ ہر قسم کے حالات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہنا چاہیے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "ابھی تو ہم یہاں سے نکلے بھی نہیں۔ کون جانتا ہے، یہاں کتنی خون ریزی ہونا ابھی باقی ہے!"

ساحل نے ایک جھرجھری لی۔ اسی وقت بنگلے کے باہر دوبارہ فائرنگ کی آواز بلند ہوئی، یہ اسٹریٹ فائرنگ تھی۔ یا تو گارڈز نے آنے والوں کو روکنے کے لیے ہتھیار استعمال کیے تھے یا پھر "تارا اینڈ کمپنی" نے گارڈز کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے فوراً بعد جوابی فائرنگ بھی سنائی دی۔ اس دو طرفہ فائرنگ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ بنگلے کے گیٹ پر دونوں پارٹیوں میں ٹھن گئی تھی۔ وہ دونوں پارٹیوں والے فی الحال ہمارے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی باہمی مٹھ بھیڑ ہمارے لیے سود مند ثابت ہوسکتی تھی۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا ہم پر واجب ہوگیا تھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ساحل اور میر بخش کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اس بیٹھک نما کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں سے بنگلے کا مین گیٹ پچاس قدم کی دوری پر تھا۔ گیٹ کے قریب ہی کار پورچ بنا ہوا تھا۔ پورچ میں ڈی ایس پی کی ذاتی گاڑی موجود تھی۔ وہاں سے فرار کے لیے یہ ہمارے کام آسکتی تھی۔

پورچ میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے فوری

طور پر ڈی ایس پی کی گاڑی کو پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر ہم اس گاڑی کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ جاتے تو باہر سے آنے والے ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے جبکہ ہم بہ آسانی ان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس کی ایک واضح وجہ یہ بھی تھی کہ پورچ میں تاریکی تھی اور گیٹ کے نزدیک ہلکی روشنی موجود تھی۔

میں دبے قدموں چلتے ہوئے مذکورہ گاڑی کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ ساحل اور میر بخش نے بھی باآہستگی میری تقلید کی۔ ہم محفوظ پناہ گاہ میں پہنچے ہی تھے کہ بنگلے کے باہر ایک مرتبہ پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔ اس بار گولیوں کی گونج میں انسانی چیخوں کی آواز بھی شامل تھی۔ ان کرب ناک چیخوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ کم از کم چار پانچ افراد اپنی جان ہار گئے تھے یا کم از کم شدید مضروب ہوئے ہوں گے۔

پھر بنگلے کے مین گیٹ پر باقاعدہ بھونچال آگیا۔ میں نے ڈی ایس پی کی گاڑی کی آڑ میں سے دیکھا' بنگلے کا گیٹ زوردار آواز سے کھلا اور تارا کی سرکردگی میں تین افراد بنگلے میں داخل ہوئے۔ تارا کے علاوہ باقی دو افراد میں سے ایک اپنے لباس اور حلیے سے وڈیرا دکھائی دیتا تھا۔ میر بخش نے میرے خیال کی تصدیق کی کہ وہ وڈیرا اکبر سومرو ہی تھا۔ وڈیرے کے ساتھ جو شخص تھا۔ اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔ وہ یقیناً وڈیرے کا باڈی گارڈ قسم کا کوئی جاں نثار تھا۔ تارا کے ہاتھ میں بھی پسٹل دکھائی دے رہا تھا۔ ظاہر ہے' یہ وہ پسٹل نہیں ہو سکتا تھا جو میں نے ہوٹل کے کمرے میں اس سے چھین لیا تھا۔ مذکورہ پسٹل اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کا تھا جو میر بخش ہوٹل سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ازاں بعد ہماری گاڑی (بلیک اینڈ ریڈ) کی تلاشی کے دوران میں وہ پسٹل پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ تارا کی چال میں نقاہت کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔

وڈیرا اکبر سومرو پر نظر پڑتے ہی میر بخش کچھ بے چین ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا' وہ کچھ کر گزرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بڑے بھرپور انداز میں' نفی میں گردن ہلا دی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا۔ اسے میرے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

تارا کے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جس میں' ہم اسے ہوٹل کے کمرے میں بے ہوش چھوڑ آئے تھے۔ وہ ایک ہٹا کٹا اور چاق و چوبند شخص تھا۔ مارشل آرٹس سے بھی اسے گہری آگاہی حاصل تھی تاہم میں نے عمر کوٹ کے ہوٹل میں اس کی خوب گت بنائی تھی۔ میرے گھٹنے کی ضرب نے اس کی ٹھوڑی کی ایسی مزاج پرسی کی تھی کہ اس کی زبان دانتوں تلے آکر کٹ گئی تھی۔ وہ کسی مردار خور جانور کی طرح خون سے لتھڑا ہوا دہانہ کھول بند کرنے لگا تھا۔ ازاں بعد میرے پاؤں کا بلیڈ اس کی ناک پر اس زور سے لگا تھا کہ وہاں سے خون کا فوارہ پھوٹ نکلا تھا' پھر سب سے آخر میں اس کے سر کا عقبی حصہ چوبی میز سے تصادم کے بعد شدید زخمی ہوگیا تھا۔ اسی چوٹ نے تارا کو ہوش و حواس سے بھی بیگانہ کردیا تھا۔ ہم اسے بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ کر آئے تھے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنی جلدی ہم تک کیسے پہنچ گیا تھا۔ بہرحال' وہ اس قسم کی حیرت میں پڑنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم انتہائی سنگین حالات سے دوچار تھے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی فکر کرنا تھی پھر کچھ اور سوچنا تھا۔

تارا اینڈ کمپنی کھلے ہوئے گیٹ سے اندر آئے تو ان کے پیچھے مجھے کسی گاڑی کی صورت دکھائی نہیں دی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' گیٹ پر متعین وہ دونوں مسلح سیکیورٹی گارڈز اب کسی قسم کے تعاقب یا مزاحمت کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ بھی عین ممکن تھا' وہ اب کسی اور جہاں میں پہنچ چکے ہوں!

ہم دم سادھے ڈی ایس پی کی گاڑی کے پیچھے دبکے رہے۔ اس وقت ہم ایسی پوزیشن میں تھے کہ اچانک فائرنگ کرکے ان تینوں کو فنا کے گھاٹ اتار سکتے تھے پھر ہمارے لیے وہاں سے فرار ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ میر بخش کچھ اسی قسم کے عزائم کا اظہار جسمانی حرکات و سکنات سے گاہے بگاہے کر بھی رہا تھا مگر میں خوامخواہ کے خون خرابے کے حق میں نہیں تھا۔ بے مقصد انسانی جان سے کھیلنا کسی طور مجھے گوارا نہ تھا۔

وہ تینوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگے۔ سب سے آگے تارا تھا' اس کے پیچھے وڈیرا اکبر سومرو اور سب سے آخر میں وڈیرے کا مسلح محافظ۔ وہ شخص چوکنا نظر سے اپنے عقب میں بھی دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

میرے ذہن میں انٹرکام پر سیکیورٹی گارڈ سے ہونے والی گفتگو تازہ ہوگئی۔ جب میں اسے بہ حیثیت ڈی ایس پی احکام دے رہا تھا تو پس منظر میں تارا کے جملے بھی مجھے سنائی دیے تھے۔ اس نے اپنے میزبان وڈیرے سے کہا تھا' سائیں ہمیں ڈی ایس پی کی اجازت کے بغیر بنگلے میں گھس جانا چاہیے ورنہ وہ شیطان (یعنی میں) ایک مرتبہ پھر ہاتھ سے نکل جائے گا۔

تارا کے الفاظ سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ وہ باجماعت صرف میری ہی تلاش میں اس بنگلے تک پہنچے تھے اسی لیے اب وہ بنگلے کے اندرونی حصے میں غائب ہوگئے تھے۔

میری سماعت میں میر بخش نے سرگوشی کی "سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ جب تک یہ تینوں مردود بنگلے کی تلاشی لیتے' ہم بہت دور نکل جائیں گے۔"

ساحل ہم دونوں کے درمیان بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کے اوپر سے میر بخش کو جواباً کہا "تجویز تو تمہاری اچھی ہے لیکن میں یہاں سے پیدل جانے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"سائیں! ہم پیدل کیوں جائیں گے۔" میر بخش نے دھیمی آواز میں کہا "آخر یہ کس مرض کی دوا ہے!" بات ختم کرتے ہی اس نے ڈی ایس پی کی گاڑی کو تھپکا۔

جب ہم پورچ میں اس گاڑی کے پیچھے پناہ لے رہے تھے تو میرے ذہن میں بھی کچھ اسی قسم کا خیال آیا تھا لیکن بعد میں مجھے یہ خیال تکنیکی اعتبار سے کچھ زیادہ مناسب اور قابلِ عمل دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں نے اپنے خیالات میر بخش کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا۔

"اس گاڑی کے استعمال میں دو قباحتیں ہیں۔"

"وہ کیا سائیں؟" اس نے پوچھا۔

"نمبر ایک..." میں نے بتایا "اس کی چابی ڈی ایس پی کے ڈرائیور کے پاس ہے جسے میں نے بنگلے پر نگاہ رکھنے کے لیے چھت پر بھیج دیا تھا اور..." ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے اپنا جملہ مکمل کردیا "اور تھوڑی دیر پہلے بنگلے کی چھت کی جانب سے ہم نے جو چیخیں سنی ہیں ان کے پیشِ نظر ڈرائیور کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

میر بخش اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے بولا "سائیں! چابی وغیرہ کی تو آپ فکر نہ کریں۔ میں نے ایک طویل عرصہ ڈرائیونگ کی ہے اور بغیر چابی کے میں ہر قسم کی گاڑی اسٹارٹ کرنے کا ہنر جانتا ہوں۔ اس گاڑی کو یہاں سے نکالنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم اپنے فن میں یقیناً ماہر ہوگے۔ میں تمہارے تجربے کو چیلنج نہیں کر رہا مگر میں اس گاڑی کو لے جانے کے حق میں نہیں ہوں اور یہی دوسری قباحت ہے۔"

میر بخش نے پوچھا "آپ اس گاڑی کے استعمال سے کیوں بچنا چاہتے ہیں؟"

"یہ ایک پولیس افسر کی گاڑی ہے۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اس میں سفر کرنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جلد یا بدیر ڈی ایس پی اور اس کے گارڈ کو پیش آنے والے واقعے سے پردہ اٹھ جائے گا۔ اس کے بعد بڑی شدومد سے ہمیں تلاشا جائے گا اور اس گاڑی کی وجہ سے ہم بہ آسانی گھیرے جا سکتے ہیں۔ یہ بات قطعاً چھپی نہیں رہ سکتی کہ ہم تینوں ڈی ایس پی کی گاڑی میں موقع سے فرار ہوئے ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میر بخش نے تشویش ناک لہجے میں کہا "ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے یہاں بیٹھے تو نہیں رہ سکتے!"

ساحل نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے' ہم یہاں سے اس گاڑی میں نکل جائیں اور کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑا کر اپنے لیے کوئی اور بندوبست کرلیں۔"

"ہاں' یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "مگر میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! آپ کے ذہن میں جو بھی منصوبہ ہے' اس پر فوراً عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں زیادہ دیر تک رکنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"وجدان! تم کیا کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟" ساحل نے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

میں نے بتایا "میں نے بالائی منزل کی کھڑکی سے بنگلے کے باہر دو جیپوں کو آگے پیچھے رکتے دیکھا تھا جن میں سے چھ افراد برآمد ہوئے تھے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحت کی "میرا اشارہ وڈیرا اکبر سومرو اور تارا کی جانب ہے۔ میں ان کی جیپوں میں سے کسی ایک کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

ساحل نے کہا "وجدان! ابھی چند لمحے پہلے ہم نے صرف تین افراد کو بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب جاتے دیکھا ہے۔ تم بتا رہے ہو' دو جیپوں میں سے چھ افراد برآمد ہوئے تھے۔ باقی تین تو باہر ہی ہوں گے نا۔ میں تو..."

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ شاید اسے یاد آگیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے بنگلے کے باہر گیٹ پر سیکیورٹی گارڈز اور وڈیرا اینڈ کمپنی کے مابین فائرنگ کا تبادلہ ہوا تھا۔

میں نے اس کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا "بنگلے کے گیٹ پر اس وقت جو بھی صورتِ حال ہے اس کے بارے میں باہر نکل کر ہی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے' وہاں کی صورتِ حال نہایت سنگین ہوگی۔"

"سائیں! اگر باہر والی کسی جیپ میں یہاں سے روانہ

ہونا ہے تو ہمیں فوراً نکل جانا چاہیے۔" میر بخش نے کہا "یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔"

"مجھے یہاں رکنے کا کوئی شوق بھی نہیں۔" میں نے کہا "تم ساحل کے پاس رکو۔ میں باہر کی پوزیشن دیکھ کر آتا ہوں۔"

میر بخش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "سائیں وجدان! آپ ساحل کے پاس ہی رہو۔ میں باہر جاتا ہوں۔ آپ کا یہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔"

میر بخش اس وقت ایک جاں نثار کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اس کے دلولے کو دیکھ کر میں نے اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا اور نیچی آواز میں اسے تاکید کردی "پھونک پھونک کر قدم رکھنا اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنا۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور اندھیرے میں گیٹ کی جانب رینگ گیا۔ کلاشنکوف اس کے پاس تھی اس لیے میں اس کی طرف سے زیادہ فکرمند نہیں تھا۔

"وجدان!" ساحل نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور میرے پہلو سے جڑتے ہوئے بولی "میں بہت وحشت محسوس کر رہی ہوں۔ یہ تمہارے ملک میں ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "اس میں میرے ملک کا کیا قصور ہے؟ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں، ان میں ہمارے ساتھ یہی ہونا ہے چاہے ملک کوئی سا بھی ہو۔"

"مگر یہ تو تمہارا اپنا ملک ہے، تمہاری اپنی دھرتی ہے!" وہ مجھ سے مزید چپک گئی "میں تو سمجھ رہی تھی یہاں تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ پاکستان کوئی فرشتوں کا دیس نہیں ہے۔" میں نے کہا "دنیا کے ہر ملک میں اچھے برے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ کیا تمہارے ملک نیپال میں تمہارے ساتھ سب اچھا پیش آ تا رہا ہے؟ کھٹمنڈو کی بدھ نیل کھنڈ عبادت گاہ میں پیش آنے والے واقعات کو تو تم نہیں بھولی ہوگی۔ تمہارے گھر، تمہاری رہائش گاہ پر تمہارے ماں باپ کو کس بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ ان کی لاشوں کو تمہی نے تو کشتی میں ڈال کر کھٹمنڈو شہر کے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچایا تھا۔ اس بارے میں تم کیا کہوگی؟"

"سوری وجدان!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی "میں پریشانی میں ایک غلط بات کہہ بیٹھی ہوں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، دنیا کا کوئی بھی ملک یوٹوپیا نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "ساحل! ہم اس وقت اعصاب شکن حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں تمہاری پریشانی کو سمجھ سکتا ہوں اس لیے تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گا۔"

وہ بے ساختہ میرے ہاتھ کو تشکرانہ انداز میں دباتے ہوئے بولی "تھینک یو وجدان!"

"پہلے سوری وجدان اور اب تھینک یو وجدان۔" میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

وہ میری بات کی تہ تک پہنچتے ہوئے بولی "کیا کروں، بھول جاتی ہوں۔ آہستہ آہستہ پریکٹس ہو جائے گی۔ مجھے یاد ہے، تم نے کہا تھا کہ دوستی کے درمیان سوری، پلیز اور تھینک یو کو جگہ نہیں دینا چاہیے۔"

"تم بھولی ہو مگر بھولی نہیں ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" اس نے استفسار کیا۔

اب اس کے لہجے میں مایوسی اور بیزاری کی جگہ فطری شوخی نے لے لی تھی۔ یہ ایک مثبت اور خوش آیند بات تھی۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، وہ کہہ نہ سکا کیونکہ اسی وقت میر بخش واپس آگیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔

"سائیں! باہر تو پوری پانچ لاشیں پڑی ہیں۔"

"یعنی دو سیکیورٹی گارڈز کی اور تین وڈیرے کے ساتھ آنے والوں کی لاشیں؟" میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کے لیے سوالیہ نظر سے میر بخش کو دیکھا۔

وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا "جی سائیں" پھر اس نے اضطراری انداز میں اضافہ کیا "اور دونوں جیپیں بھی وہاں موجود ہیں۔ ایک کے اگنیشن میں چابی بھی لگی ہوئی ہے۔"

"ویری گڈ۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا پھر پوچھا "چابی کون سی جیپ میں موجود ہے۔ آگے والی میں یا پیچھے والی میں؟"

"پیچھے والی میں۔" اس نے بتایا۔

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔" میں نے کہا "وہ جیپ نکالنے میں ہمیں آسانی رہے گی۔"

میر بخش نے مزید بتایا "سائیں! وہ نئی نکور پجارو ہے۔"

"آل رائٹ!" میں نے فیصلہ کُن انداز میں کہا "ہم اسی پجارو میں یہاں سے روانہ ہوں گے، لیکن ہم ایک ایک کرکے

میں سوار ہوں گے۔" میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پہلے تم پجارو میں پہنچو۔"

اس نے تذبذب کے انداز میں مجھے دیکھا اور کہا "سائیں! پہلے آپ دونوں چلے جاؤ۔ میرے پاس کلاشنکوف ہے۔ میں آپ کو کور دیتے ہوئے بعد میں آؤں گا۔"

اس کی تجویز معقول اور برمحل تھی اس لیے میں نے بحث میں وقت برباد کرنا مناسب نہ سمجھا اور ساحل کو ہاتھ پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے ساتھ کھنچتی چلی آئی۔ ہم رکوع کی حالت میں چلتے ہوئے بآہستگی بنگلے سے باہر نکل آئے۔

باہر رات کی تاریکی میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم لاشوں کے درمیان سے بااحتیاط گزرتے ہوئے پجارو کے پاس پہنچے۔ میں نے بڑی احتیاط سے پجارو کا عقبی دروازہ کھول کر ساحل کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے دروازہ بند کردیا اور دوسری جانب سے گھوم کر ڈرائیونگ ڈور کے پاس پہنچ کر آواز پیدا کیے بغیر میں دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے دروازوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ایک ذرا سی آواز بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ ہمارے حق میں سب سے مفید یہ بات تھی کہ پجارو کے دروازے لاک نہیں تھے۔ آنے والوں نے دروازے لاک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ تو اپنی دانست میں مجھے چشم زدن میں وہاں سے اپنے ساتھ لے جانے والے تھے۔ انہوں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ بنگلے پر اس قسم کے حالات پیش آسکتے ہیں۔ تارا اینڈ کمپنی مجھے "حاصل" کرنے کے لیے اس قدر "بے قرار" تھے کہ اپنے ساتھیوں کی لاشیں وہیں چھوڑ کر وہ دندناتے ہوئے بنگلے میں گھس گئے تھے۔

جب تک میں کار پورچ میں موجود تھا، میں نے بنگلے کے اندر سے شور شرابے اور اٹھا پٹخ کی آوازیں سنی تھیں۔ آنے والے ہماری تلاش میں دیوانے ہو رہے تھے۔ زیریں منزل پر جب انہیں اپنے مقصد میں ناکامیابی ہوئی تو وہ بالائی منزل کی جانب چلے گئے۔ میں ساحل کے ساتھ جب بنگلے سے نکل رہا تھا تو میں نے ان کے قدموں کی آوازیں نیچے سے اوپر جاتے ہوئے واضح طور پر سنی تھیں۔

میں پجارو کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بڑی بے چینی سے میر بخش کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے پسنجرز سیٹ کا دروازہ نیم وا کر رکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ وہ تارا اینڈ کمپنی کے اوپر پہنچنے سے پہلے پجارو میں پہنچ جائے۔ وہ لوگ اوپر پہنچ جاتے تو پھر ہم بہ آسانی ان کی نظروں میں آسکتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کو کمرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا، وہ ہمیں دیکھ سکتے تھے۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میر بخش چاروں جانب چوکنا نظر سے دیکھتے ہوئے پجارو کے نزدیک آگیا۔ کلاشنکوف کو اس نے بالکل "ریڈی" انداز میں تھام رکھا تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ پلک جھپکتے میں ایک خوفناک برسٹ فائر کر سکتا تھا۔

میر بخش نے پجارو میں داخل ہونے کے لیے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بنگلے کے اندر فائرنگ ہونے لگی۔ گولیوں کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ کسی کلاشنکوف سے فائر کی گئی ہیں۔ میر بخش نے تشویش ناک نظر سے بنگلے کی طرف دیکھا اور اچک کر پجارو میں سوار ہو گیا۔ اسی وقت بنگلے کے اندر کلاشنکوف کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ ہونے لگی۔ اس دو طرفہ فائرنگ سے لگتا تھا، تارا اینڈ کمپنی کے خلاف مزاحمت پیش کی جا رہی ہے۔

میں نے فائرنگ کی آواز سے فائدہ اٹھایا اور نئی نویلی پجارو کو اسٹارٹ کردیا۔ گاڑی بالکل نیو برانڈ تھی اس لیے اس کا انجن بڑی سبک خرامی سے بیدار ہو گیا۔ میں نے جیپ کو بیک کرنے کے لیے ریورس گیئر میں ڈالا اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ریوالور کہاں ہے جو میں نے تمہیں دیا تھا؟"

"میرے ہاتھ میں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا "ذرا دینا ادھر۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو وجدان؟" اس نے پوچھا۔

"میں جو کچھ بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، تمہاری نظر کے سامنے ہی کروں گا۔" میں نے اس کے ہاتھ سے ریوالور لیتے ہوئے کہا "تم توجہ سے دیکھتی جاؤ۔"

وہ ریوالور میری جانب منتقل کرنے کے بعد الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس وقت میں نے میر بخش کے چہرے پر بھی تذبذب کے آثار دیکھے۔ میں نے ڈی ایس پی والا ریوالور ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی نال کا رخ اپنے سامنے کھڑی دوسری جیپ کی طرف کردیا پھر نہایت مہارت کے ساتھ اعشاریہ تین دو کیلی بر کی دو گولیاں جیپ کے پچھلے ٹائروں میں پیوست کردیں۔

ہوا خارج ہونے کی مخصوص آواز کے ساتھ دونوں

جانب کے ٹائر فلیٹ ہوگئے۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ اب وہ لوگ فوری طور پر اس جیپ کی مدد سے ہمارا تعاقب نہیں کرسکتے تھے۔ جب تک وہ ٹائر تبدیل کرکے ایسے کسی ارادے پر عمل کرنے کی پوزیشن میں آتے' ہم وہاں سے میلوں دور نکل چکے ہوتے۔

اب وہاں ایک سیکنڈ بھی رکنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میں نے ریوالور واپس ساحل کو دے دیا اور پجارو کو ریورس گیئر میں چلاتے ہوئے باقاعدہ راستے پر لے آیا۔ اسی وقت میں نے بنگلے کی چھت پر کسی انسانی ہیولے کو چکراتے دیکھا۔

تاریکی کے باعث اسے پہچاننا مشکل تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آواز نے مجھے بتادیا کہ وہ شیطان کا برادر خورد تارا تھا۔ وہ چیخ کر اپنے ساتھی کو پکار رہا تھا۔ "کلاشنکوف لے کر فوراً ادھر آؤ۔ وہ فرار ہو رہے ہیں۔"

اگلے ہی لمحے چھت پر کلاشنکوف بردار انسانی ہیولا نمودار ہوا پھر تارا کی ہدایت پر اس نے کلاشنکوف سے ہم پر فائرنگ شروع کردی۔

تارا کی آواز اور احکام سنتے ہی میر بخش بھی اپنی کلاشنکوف کا رخ' پجارو کی کھلی ہوئی کھڑکی میں سے بنگلے کی چھت کی جانب کرچکا تھا۔ جواباً اس نے بھی فائرنگ شروع کردی۔ اس دوران میں' میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ پجارو کو محفوظ فاصلے پر پہنچانے کے بعد گیئر تبدیل کیا اور ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھاتے ہوئے ایکسی لریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔

بنگلے کی چھت سے برسائی جانے والی گولیوں میں سے ایک بھی ہمیں یا پجارو کی باڈی میں نہیں لگی تھی۔ البتہ ہمیں عارضی آڑ فراہم کرنے والی دوسری جیپ اس فائرنگ کی زد میں آگئی تھی۔ اس کی باڈی میں متعدد سوراخ بن گئے۔ میں اس کے ٹائروں کو برسٹ کرکے پہلے ہی بیکار کرچکا تھا۔ اب وہ بیکار تر ہوگئی تھی۔

جب ہم کافی دور نکل آئے تو میر بخش نے کہا "سائیں! آپ نے دوسری گاڑی کو بیکار کرکے بہت اچھا کیا ہے' اب تارا وغیرہ ہمارا پیچھا نہیں کرسکیں گے۔"

"شکر ہے' ان جہنمی لوگوں سے پیچھا تو چھوٹا۔" ساحل نے سکھ کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے میر بخش سے کہا "میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ازحد ضروری تھا۔ ہم اسی صورت میں خود کو زیادہ محفوظ رکھ سکتے ہیں کہ وہ ہمارا تعاقب نہ کرنے پائیں۔"

میر بخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں! لیکن بنگلے کے پورچ میں ڈی ایس پی کی گاڑی بھی موجود ہے۔ وہ ہم تک پہنچنے کے لیے اس گاڑی کو استعمال کرسکتے ہیں۔"

"ہاں' کرسکتے ہیں۔" میں نے پجارو کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "وہ اس گاڑی کے علاوہ ایک اور بھی نہایت اہم شے بھی استعمال کرسکتے ہیں۔"

"کیا شے سائیں؟" میر بخش نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

ساحل بھی پوری توجہ سے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے تجسس سے لبریز لہجے میں کہا "وجدان بات کو توڑ توڑ کر سنسنی خیز انداز میں کیوں بتا رہے ہو۔ سیدھی طرح بتاؤ' تم کس چیز کے استعمال کا ذکر کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "تم لوگوں کو بالائی منزل پر جانے کا اتفاق نہیں ہوا نا' اس لیے تم نہیں جانتے کہ وہاں کی سب سے اہم چیز کیا ہے حالانکہ اس کا میں پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں لیکن اس وقت تمہارے ذہن اس طرف نہیں جاسکتے۔"

"پلیز وجدان! اور سسپنس پیدا نہ کرو۔ تم مجھے جاسوسی پر اکسا رہے ہو!" ساحل نے شوخی سے کہا "اس سرگزشت کو الجھن سے پاکیزہ ہی رہنے دو۔"

میر بخش سنجیدگی سے بولا "سائیں! آپ کسی اہم چیز کے بارے میں بتا رہے تھے!"

میں نے ایکسی لریٹر پاؤں کا دباؤ مزید بڑھاتے ہوئے کہا "بالائی منزل پر ڈی ایس پی والے کمرے میں ٹیلی فون موجود ہے۔ تارا یا وڈیرا اکبر سومرو ٹیلی فون کو استعمال کرکے ہمارے لیے مشکلات پیدا کرسکتے ہیں۔"

میر بخش نے ونڈ اسکرین کے پار گہرے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیاں ابھر آئیں۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا بات ہے میر بخش! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"سائیں! اس وقت ہماری گاڑی کا رخ شادی پلی سے اکڑی کی جانب ہے۔" میر بخش نے تشویش ناک لہجے میں بتایا "یہ وہی سڑک ہے جس پر سفر کرکے ہم شادی پلی پہنچے تھے۔"

"تو پھر؟" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"سائیں! ہمیں اکڑی پہنچ کر اپنا رخ تبدیل کرنا ہوگا ہم دوبارہ عمر کوٹ پہنچ جائیں گے۔" میر بخش نے کہا "ٹیلی فون والی بات کے پیش نظر ہمارا عمر کوٹ کی طرف جانا کسی بھی طور مناسب نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "تمہاری تشویش بجا ہے لیکن ہم اس سڑک پر مخالف سمت میں بھی تو سفر جاری نہیں رکھ سکتے نا۔ ادھر شادی پلی اور میرپور خاص کی درمیانی سرحد ہے جہاں پولیس نے خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کرنے کے لیے ناکا لگایا ہے۔ ڈی ایس پی نے مجھے بتایا تھا کہ تھانا انچارج شادی پلی اس نے بنگلے کی جانب روانہ ہونے سے پہلے ناکے کی طرف بھیج دیا تھا۔ ہم بڑی مشکل سے تو ان لوگوں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر دوبارہ اس موٹی توند والے تھانے دار کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ اگلی پچھلی ساری کسر پوری کردے گا۔ جب اسے پتا چلے گا کہ ہم نے اس کے اعلیٰ افسر محترم ڈی ایس پی کے ساتھ کیا "سلوک" کیا ہے تو وہ ہمارا حشر کرے گا۔"

"وجدان! تم خواہ مخواہ بہت دور تک سوچ رہے ہو۔" ساحل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا "تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

وہ بولی "وجدان! تم نے بتایا تھا' ڈی ایس پی اور اس کے گارڈ کو ناکارہ کرنے کے بعد تم نے اس کمرے کو بند کرکے کنڈی لگا دی تھی۔ وڈیرا اکبر سومرو یا تارا کو کیسے پتا چلے گا کہ اس کمرے میں کوئی ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا ہے اور کمرے میں تو اندھیرا بھی ہے۔"

"کمرے کے اندھیرے کو ٹیوب لائٹ کا بٹن آن کرکے دور کیا جاسکتا ہے۔" میں نے کہا "لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

میر بخش نے میرے کلام کے دوسرے جملے پر غور کیے بغیر پوچھا "سائیں! اگر وہ لوگ ڈی ایس پی والے کمرے میں داخل ہوگئے تو گڑبڑ نہیں ہوجائے گی؟ وہاں تو ڈی ایس پی اور اس کا گارڈ بے ہوش پڑے ہیں۔"

"میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا "میرا اندازہ ہے کہ وہ نہ صرف کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں بلکہ وہاں انہیں مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں سائیں!" میر بخش کے انداز میں الجھن تھی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "جب ہم پجارو میں بیٹھ کر وہاں سے نکل رہے تھے تو تم نے بنگلے کے اندر فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں؟" ان دونوں نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اور یہ بات تم لوگوں نے بھی محسوس کی ہوگی کہ وہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے' تارا اینڈ کمپنی کے جواب میں کوئی فائرنگ کر رہا تھا یا پھر تارا اینڈ کمپنی نے کسی کی فائرنگ کے جواب میں فائرنگ کی تھی۔" میں نے ذرا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا "بنگلے میں' تارا وغیرہ کی مزاحمت کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہوسکتا ہے۔"

میرے اس ڈرامائی جملے کے اختتام پر ساحل نے فوراً پوچھا "کون شخص ہے وہ؟"

"ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ۔" میں نے بتایا۔

"مم۔ مگر تم نے تو بتایا تھا' وہ وہاں بے ہوش پڑا تھا؟" ساحل نے کہا۔

میر بخش بولا "ہاں سائیں! بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی؟"

"میں نے امکانات کی بات کی ہے۔" میں نے کہا "اس وقت باہر سے آنے والوں کی مزاحمت کرنے کے لیے بنگلے میں صرف ایک شخص ایسا ہے جس کے پاس ہتھیار موجود ہے یعنی ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ۔ اس کی نئی نویلی کلاشنکوف وہیں کمرے میں پڑی تھی۔ ہوسکتا ہے' جب باہر سے آنے والے اس کمرے میں پہنچے ہوں تو گارڈ کو ہوش آچکا ہو اور اس نے اپنی گن سے ان پر فائرنگ کردی ہو۔" میں نے ایک لمحے کو رک کر مزید کہا "ڈی ایس پی کا ریوالور اس وقت ساحل کے ہاتھ میں ہے۔ اے ایس آئی عبدالرزاق سے چھینی ہوئی کلاشنکوف تمہارے پاس موجود ہے۔" میں نے میر بخش کی طرف اشارہ کیا اور کہا "بنگلے کے دونوں مسلح سیکیورٹی گارڈز کی لاشیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ میں نے جن تین افراد کو بہ حیثیت ڈی ایس پی بنگلے کی چھت پر نگرانی کا فرض سونپا تھا وہ تینوں غیر مسلح تھے اور پھر ان کی چیخوں کی آوازیں ہم نے سنی تھیں جب بنگلے کے باہر سے ان پر کلاشنکوف کا برسٹ مارا گیا تھا۔ ان میں سے اگر کوئی زندہ بچ بھی گیا ہوگا تو وہ مسلح مزاحمت کے قابل کہاں ہوگا۔"

میر بخش نے پوری بات سننے کے بعد کہا "سائیں! اگر ڈی ایس پی کے گارڈ نے واقعی تارا وغیرہ پر فائرنگ کی ہے تو انہیں بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہوگا۔"

"یقیناً پہنچا ہوگا۔" میں نے کہا "اور یقیناً نہیں پہنچا ہوگا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" ساحل نے کہا۔

میں نے ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "اس دو طرفہ فائرنگ کے بعد تارا اور وڈیرے کا محافظ تو زندہ پائے گئے ہیں۔ جب ہم وہاں سے نکل رہے تھے تو تارا کے حکم پر اس محافظ نے ہم پر گولیاں برسائیں تھیں جو زیادہ تر دوسری جیپ کی باڈی میں لگی تھیں اور ہم بہ حفاظت نکل آئے تھے۔"

"اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی نقصان ہوا ہے تو وہ وڈیرے کا ہوا ہے!" میر بخش نے مسرور لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "فی الحال کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے' وہ تینوں محفوظ رہے ہوں اور ڈی ایس پی کا باڈی گارڈ زندگی ہار گیا ہو!"

ساحل ایک جھرجھری لے کر رہ گئی۔ میر بخش معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔

ساحل نے کہا "لگتا ہے' پولیس والوں کا برا وقت چل رہا ہے۔ پے در پے انہیں نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔"

"ان کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ اس وقت میرے ذہن میں ڈی ایس پی کی ہوس ناک گفتگو تازہ ہوگئی تھی۔ وہ "دن سکسٹی نائن" کی آڑ میں ہمیں چھوڑنے پر تیار ہوگیا تھا اور ساتھ ہی اس نے ایک کڑی شرط بھی لگادی تھی۔ ساحل کے بارے میں اس کے مذموم عزائم جان کر میرا دماغ گھوم گیا تھا اور اس کے بعد ہی یہ مارا ماری کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میں نے ساحل یا میر بخش کو ابھی تک اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا "ان کرتوتوں پر ان کے ساتھ اس سے بھی زیادہ برا ہونا چاہیے۔ اس میں وقت کا کوئی قصور نہیں۔ وقت نہیں' انسان اچھا یا برا ہوتا ہے۔"

میر بخش نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا "سائیں! ہم اکڑی کے بہت نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ آگے کیا ارادہ ہے آپ کا؟"

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا پھر میں نے پجارو کو ہوا کا گھوڑا بنایا ہوا تھا اسی لیے بھی ہم بہت جلد اکڑی پہنچنے والے تھے۔ میں نے میر بخش کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"عمر کوٹ جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔"

"پھر کس طرف جائیں گے؟"

میں نے پوچھا "اکڑی سے اور کس طرف کو سڑکیں نکلتی ہیں؟"

وہ بتانے لگا "اکڑی سے بائیں جانب یعنی شمال میں ایک سڑک نکلتی ہے جو پتھورو سے ہوتے ہوئے ضلع سانگھڑ میں داخل ہوجاتی ہے۔"

"مجھے نہیں جانا سانگھڑ وانگھڑ۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

وہ بولا "اور آپ عمر کوٹ بھی نہیں جانا چاہتے اس لیے ہم اکڑی سے گزرنے کے بعد اس سڑک کو چھوڑ دیں گے۔ یہ سڑک سیدھی عمر کوٹ کی طرف جاتی ہے۔"

"میں بنیادی طور پر کراچی جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بدستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا "اس مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے راہنمائی کرو۔"

میر بخش نے حتمی لہجے میں کہا "پھر تو آپ گاڑی کو اکڑی سے دائیں جانب موڑ لیں۔ کراچی جانے کے لیے عمر کوٹ سے میر پور خاص میں سے گزرنا ضروری ہے۔ ایک راستہ وہی شادی پلی والا تھا جس پر ناکا لگا ہوا ہے۔ اب ہم دوسرے اور تیسرے راستے کو آزمائیں گے۔"

میں نے پوچھا "اکڑی سے دائیں طرف گاڑی موڑنے کے بعد کیا صورتِ حال ہوگی۔ میرا مطلب ہے' ہمارا روٹ کیا بنے گا۔"

"وجدان سائیں!" میر بخش نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "چند گز آگے یہ سڑک آپ کو چھوڑنا ہوگی۔" اس کی بات ختم ہونے تک وہ چند گز گزر گئے۔ ہم اکڑی سے گزر کر اس چوراہے پر آگئے جہاں دو سڑکیں ایک دوسرے کو کراس کرتی تھیں۔ میر بخش نے کہا "سائیں! گاڑی کو سیدھے ہاتھ موڑ لیں۔" میں نے اس کے کہنے کے مطابق پجارو کو اکڑی سے جنوب کی طرف جانے والی سڑک پر ٹرن کرلیا۔ میر بخش نے بتانا شروع کیا "وجدان سائیں! اس سڑک پر سفر کرتے ہوئے ہم صالح بھمبرو سے گزریں گے پھر محمد رحیم کلری سے ہوتے ہوئے "سامارو" پہنچ جائیں گے۔ سامارو' میر پور خاص کے بہت نزدیک ہے۔ وہاں سے سیدھی سڑک جیمس آباد (میر پور خاص) کی طرف جاتی ہے۔"

اس کا تفصیلی بیان ختم ہوا تو میں نے پوچھا "اور تیسرا راستہ کون سا ہے؟"

"ہم سامارو میں رکنے یا وہاں سے میر پور خاص میں داخل ہونے کے بجائے سیدھے آگے بڑھ جائیں گے۔" اس نے بتایا "کنری اور "نبی سر" سے ہوتے ہوئے ہم ٹنڈو جان محمد یا "توکوٹ" کے مقام پر میر پور خاص پہنچ سکتے ہیں۔"

میں نے استفسار کیا "کیا یہ وہی "نبی سر" ہے جہاں کے ایک صاحبِ حیثیت شخص قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو منگل سنگھ نامی ڈاکو نے اغوا کر رکھا ہے اور پچاس لاکھ روپے کے تاوان کا مطالبہ کر رہا ہے؟"

"جی سائیں' یہ وہی "نبی سر" ہے۔" میر بخش نے تصدیق کردی۔

ساحل نے کہا "یہ منگل سنگھ تو بہت ہی منحوس آدمی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم بخیریت سفر جاری رکھتے تو پتا نہیں' اس وقت کہاں ہوتے۔ جہاں بھی ہوتے' خیریت سے ہوتے۔"

میر بخش ہوٹل سے نکلنے کے بعد مجھے بتاچکا تھا کہ ہم حیدر آباد سے "شالیمار ایکسپریس" کے ذریعے کراچی جائیں گے۔ مذکورہ ٹرین نصف شب کے قریب کراچی پہنچتی تھی اور اب تو رات تقریباً ختم ہونے والی تھی۔ جس وقت میں نے بنگلے کی بالائی منزل کے کمرے کی کھڑکی سے تارا اینڈ کمپنی کو آتے دیکھا اس وقت ڈی ایس پی کے وال کلاک میں صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اس حساب سے اب لگ بھگ پانچ' ساڑھے پانچ کا وقت ہوگا۔ اس کا مطلب تھا' صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ کچھ ہی دیر بعد سورج طلوع ہونے والا تھا۔

میں نے ساحل کی جھنجلاہٹ کے جواب میں کہا "اگر ہم اپنے پروگرام کے مطابق سفر کرتے رہتے تو یقیناً اس وقت کراچی میں ہوتے۔"

میر بخش نے الجھن زدہ انداز میں کہا "سائیں! ایک بات ابھی تک میرے حلق سے نہیں اتری۔ میں جتنا سوچتا ہوں' الجھتا چلا جاتا ہوں۔"

"کون سی بات میر بخش؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "چلو یہ بات تو ذہن تسلیم کرسکتا ہے کہ ہوٹل کے کمرے میں تارا کو کسی بھی طرح ہوش آگیا ہوگا اور اس نے باہوش ہونے کے بعد وہاں کے لوگوں سے ہمارے بارے میں پوچھا ہوگا۔ جب اسے پتا چلا ہوگا کہ ہم اس کی گاڑی میں عمر کوٹ سے "صوفی فقیر" کی طرف جانے والی سڑک پر گئے ہیں تو وہ ہمارے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا ہوگا۔ ممکن ہے' اکڑی سے اسے معلوم ہوا ہو کہ ہماری ایمبولینس کا ڑی شادی پلی کی جانب گئی ہے چنانچہ وہ سیدھا شادی پلی پہنچا پھر وہاں لگے ہوئے ناکے سے اسے ہمارے بارے میں تفصیل سے بتادیا گیا ہوگا اور تھانے وغیرہ سے ہوتے ہوئے وہ ڈی ایس پی کے بنگلے تک پہنچ گیا تھا لیکن....."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھا اور کہا "لیکن وڈیرا اکبر سومرو تو دوپہر تک اپنی جاگیر پر تھا۔ میں اسے ان کے بنگلے پر چھوڑ کر آپ کی طرف آیا تھا پھر وہ تارا کی معیت میں ڈی ایس پی کے بنگلے پر رات کے آخری پہر کس طرح پہنچ گیا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

میں نے کہا "جس طرح تم نے بہت سی امکانی باتوں کا ذکر کیا ہے' بالکل اسی طرح یہ بھی ممکن ہے' تارا' وڈیرا اکبر سومرو کے ساتھ ہی عمر کوٹ شہر تک پہنچا ہو لیکن اس نے وہاں وڈیرے کی موجودگی کو راز میں رکھا ہو اور جب تارا ہمیں گھیر گھار کر وڈیرے تک پہنچانے میں ناکامیاب رہا تو وڈیرا اس کی خیر خیریت دریافت کرنے ہوٹل پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے بعد ان دونوں کا ایک ساتھ ڈی ایس پی کے بنگلے پر وارد ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہتی۔" میں ایک لمحہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ویسے حقیقت کیا ہے' اس کے بارے میں تو وڈیرا اکبر سومرو اور تارا ہی بتاسکتے ہیں اور ان تک جانے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

وہ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے چوکنا نظر سے عقب کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ اب تک ہمیں اپنے تعاقب میں کسی قسم کی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ میر بخش نے کلاشنکوف کا اسٹریپ کندھے پر چڑھا رکھا تھا اور اس کی نال کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر "فوکس" تھی۔ اس نے اس سفر کے دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ اس نے "جی سائیں" کہہ کر میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "تم اب گن کو کندھے سے اتار کر اپنی گود میں رکھ لو یا پھر گاڑی کے کسی حصے میں ڈال دو۔ تعاقب میں اگر کسی کو آنا ہوتا تو ہمیں متعاقب کی اب تک جھلک نظر آجاتی۔ خوامخواہ اپنے اعصاب کو دباؤ کا شکار نہ بناؤ۔"

اس نے اپنے بائیں بازو کے کندھے سے کلاشنکوف کا پٹا اتار کر اسے گود میں رکھ لیا پھر بولا "یہ تو ٹھیک ہے' ہمارا تعاقب نہیں کیا جارہا لیکن کسی وقت اچانک اس ہتھیار کی ضرورت پیش آسکتی ہے اس لیے میں کلاشنکوف کو اپنی دسترس ہی میں رکھوں گا۔"

میں نے کہا "میر بخش! ہم ابھی تک ایک نہایت ہی اہم کام کو بھولے ہوئے ہیں!"

"وہ کیا سائیں؟" اس نے پوچھا۔
میں نے کہا "ہمیں پہلی فرصت میں پجارو کی تلاشی لینا چاہیے۔"
"کیا آپ گاڑی روک کر یہ کام کرنا چاہتے ہیں؟"
"اس کام کے لیے گاڑی روکنا ضروری نہیں۔" میں نے کہا "میں گاڑی ڈرائیو کررہا ہوں۔ تم گاڑی کا یہ حصہ اچھی طرح چیک کرلو اور تم۔" میں نے عقب نما آئینے میں ساحل کو دیکھتے ہوئے کہا "تم گاڑی کے پچھلے حصے کی تلاشی لو۔ اچھی طرح ایک ایک کونے کھانچے کو دیکھو۔ کوئی چیز تمہاری نظر سے بچنا نہیں چاہیے۔"
وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے مصروف ہوگئے۔ دس پندرہ منٹ کی تلاشی کے بعد کافی خوش آیند خبریں مجھ تک پہنچیں۔ میر بخش نے پجارو کے اس حصے سے ایک بھاری رقم کا سراغ لگالیا تھا۔ وہ رقم ایک خفیہ خانے میں چھپائی گئی تھی۔ میر بخش نے رقم والی گڈی میری نظر کے سامنے لہرائی اور بتایا "سائیں! یہ پورے پچاس ہزار روپے ہیں۔"
وہ پانچ سو روپے والی نوٹوں کی ایک مکمل گڈی تھی جس پر بینک کی تصدیقی مہر بھی لگی تھی۔ گڈی پر لگی پن اور حیث سے ظاہر ہوتا تھا' اس میں سے ایک نوٹ بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ گویا وہ میر بخش کی اطلاع کے مطابق واقعی پچاس ہزار روپے تھے۔ ان حالات میں ہمیں رقم کی سخت ضرورت تھی۔ یہ رقم نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔
میر بخش نے جوشیلے انداز میں کہا "سائیں! میں نے سن رکھا ہے' اس دنیا میں ہمارا جو نقصان ہوتا ہے' وہ آخرت میں ستر گنا ہمیں واپس مل جاتا ہے۔ پولیس والوں نے ہم سے لگ بھگ گیارہ ہزار روپے چھینے تھے۔ پانچ گنا تو ہمیں اسی جہان میں مل گئے' باقی پینسٹھ گنا دیکھیں کہاں ملتے ہیں!"
"میر بخش!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "میں تمہارے اس سود و زیاں کے فارمولے پر یقین نہیں رکھتا۔ اللہ کے ہاں نوازنے اور چھیننے کا دستور اور کلیہ بہت عجیب و غریب ہے۔ اسے اسٹیمیٹ کرنا ہماشما کے بس کی بات نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ رقم ہمیں ان گیارہ ہزار کے بدلے میں ملی ہوگی۔ ہماری رقم کا زیاں ایک سانحہ تھا' اس رقم کا حصول ایک اتفاق ہے۔ بہرحال' یہ رقم بڑے موقع پر ہمارے ہاتھ لگی ہے اس لیے اسے حسین اتفاق بھی کہا جاسکتا ہے۔"
میر بخش نے میرے خیالات پر کسی قسم کا اعتراض یا تنقید نہیں کی۔ پجارو کے عقبی حصے کی تلاشی میں ساحل کو فیول کے دو کین ملے تھے۔ وہ دونوں کین پیٹرول سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے ڈھکنوں کو بہت محفوظ انداز میں بند کیا گیا تھا۔ وہ پانچ پانچ لیٹر والے کین تھے گویا ہمارے پاس اس وقت دس لیٹر فیول اضافی حیثیت میں موجود تھا۔ یہ بھی صحرائی علاقے میں بہت بڑی نعمت تھی۔
پجارو میں کہیں بھی کوئی ہتھیار یا اس کا ایمونیشن نہیں پایا گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں ہمارے لیے سب سے اہم وہ رقم تھی جس کی مدد سے ہم دیگر اشیائے ضرورت خرید سکتے تھے۔ پولیس والوں نے تلاشی کے نام پر ہمیں بالکل ہی خالی کردیا تھا۔ گیارہ ہزار روپے' تارا کا پسٹل مع کلپ' ایمبولینس نما بلیک اینڈ ریڈ گاڑی' ہمارا سفری بیگ وغیرہ سب کچھ ہم سے چھین لیا گیا تھا۔ میں نے عمر کوٹ سے میرپور خاص کی جانب سفر کے دوران میں یامی شاہ کی جیپ والی چابیاں کھڑکی سے باہر پھینک دی تھیں۔ اگر جامہ تلاشی کے مراحل میں وہ چابیاں میرے پاس سے برآمد ہوجاتیں تو ہمارے لیے مصائب میں مزید اضافہ ہوسکتا تھا۔
ہمارے درمیان کافی دیر تک تارا' وڈیرا اکبر سومو اور ڈی ایس پی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیں پیش آمدہ حالات بھی زیرِ بحث آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شروع میں تو ساحل بھی اس بات چیت میں شامل رہی لیکن پھر اس نے خاموشی اختیار کرلی۔ جب میں نے اسے کافی دیر تک کچھ بولتے ہوئے نہ سنا تو مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔
"ساحل! کیا بات ہے' تم چپ کیوں ہو؟"
اس نے فطری ردِ عمل کے طور پر مجھے دیکھا۔ وہ درحقیقت میری پشت کو دیکھ رہی تھی لیکن میں بیک ویو مرر میں اس کا چہرہ بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے اس کی صورت پر تکلیف کے آثار نظر آئے۔ پجارو کے اندر اگرچہ بہت مدھم روشنی تھی تاہم میں نے ساحل کے چہرے کی کیفیت کو کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا۔
وہ جواب دیتے ہوئے بولی "کچھ نہیں ہے وجدان!"
"کچھ تو ہے۔" میں نے پجارو کی رفتار قدرے کم کردی "یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"
وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی "بس ذرا میرے پاؤں میں تکلیف ہورہی ہے۔"
"ذرا سی تکلیف پر چہرہ اس قدر تو نہیں بگڑتا!"
"کیا ہوا ہے' میرے چہرے کو؟" وہ بے ساختہ اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "میں محسوس کررہا ہوں' تم اس وقت شدید تکلیف میں ہو۔"
"ٹخنے میں پھر سے درد جاگ اٹھا ہے۔" اس نے بتایا۔ "بہرحال فکر کی کوئی بات نہیں' میں برداشت کررہی ہوں۔"
انڈیا سے پاکستان آتے ہوئے سرحدی صحرا میں ساحل (جو اس وقت تک دھنو تھی) کے پاؤں میں شدید موچ آگئی تھی۔ ہم بھارتی سرحدی گاؤں "سوئی گام" سے جب پاکستان کے سرحدی گاؤں میں پہنچے تو پنڈت کشوری لال کے یہاں قیام کیا۔ پنڈت نے وید (حکیم) کو بلا کر "دھنو" کے پاؤں کا معائنہ کروایا تو پتا چلا اس کے دائیں ٹخنے میں موچ آگئی تھی۔ وید نے مالش کے لیے اسے ایک مرہم دے دیا تھا۔ ازاں بعد میں نے اپنی "چی" کی قوت سے اس کے ٹخنے کا درد رفع کردیا تھا۔ ساحل خود بھی اس عمل کو کافی حد تک سمجھ گئی تھی تاہم چونکہ اس کی "چی" کی قوت بیدار نہیں تھی اس لیے خاطر خواہ نتائج برآمد کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔
یہ پوری رات ہم نے افراتفری اور بھاگ دوڑ میں گزاری تھی۔ اس بے آرامی نے ساحل کے ٹخنے کے درد کو جھنجوڑ کر جگا دیا تھا۔ ویسے بھی وہ مسلسل ہیل والی سینڈل پہنے ہوئے تھی۔ تھکن اور رت جگا اچھے اچھوں کو پچھاڑ دیتا ہے' ساحل تو ایک نرم و نازک حسینہ تھی۔
میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم تکلیف کو برداشت کرنے کے بجائے دور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی ہو؟"
"کیا کروں میں؟"
"سب سے پہلے تو ہیل دار سینڈل کو پاؤں سے جدا کرو۔" میں نے مشورہ دیا "پھر وہی عمل دہراؤ جو تم نگرپارکر کے تھانے کی حوالات میں پہلے بھی کرچکی ہو۔"
وہ بولی "تم کہہ رہے ہو تو میں ایسا ہی کروں گی۔" پھر اس نے سینڈل کو پاؤں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا "میرے عمل میں وہ تاثیر تو نہیں ہوسکتی جو تمہارے عمل میں ہے۔ تم تو "چی" جیسی عظیم الشان قوت کے مالک ہو۔"
میر بخش نے مجھ سے کہا "سائیں! ایک سوال کرنا چاہتا ہوں اگر آپ برا نہ منائیں تو!"
"ہاں کہو' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"میں نے پہلے بھی آپ دونوں کی زبان سے یہ لفظ دو تین مرتبہ سنا ہے۔" میر بخش نے کہا "چی کی قوت کیا چیز ہے' کچھ مجھے بھی تو اس بارے میں کچھ بتائیں؟"
میر بخش کے سوال کا جواب دینا بہت ضروری تھا۔ وہ میرا ساتھی اور جاں نثار دوست بن چکا تھا۔ میں نے نہایت ہی آسان الفاظ میں اسے اس قوت کے بارے میں بتادیا۔ میری وضاحت سنتے ہوئے اس کے چہرے پر ہیجان خیز تاثرات کا میلا سا لگا رہا۔ جب میں خاموش ہوا تو اس نے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔
"سائیں! آپ تو بہت کمال کے آدمی ہو۔ آپ کے پاس تو بہت حیرت انگیز اور زبردست قوت ہے۔ اس کے بل بوتے پر تو بڑے بڑے کارنامے انجام دیے جاسکتے ہیں۔"
میں نے کہا "ہاں' ہے تو لیکن میں اسے انتہائی جائز اور مثبت کاموں میں استعمال کرتا ہوں۔ شعبدہ بازی مجھے پسند ہے اور نہ ہی میں نے اس کا کبھی مظاہرہ کیا ہے۔"
"آپ بہت عظیم ہیں سائیں!" وہ فرطِ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔
میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا "عظیم صرف اللہ کی ذات ہے۔ باقی سب انسان برابر ہیں۔ بس بعض اوقات کسی شخص کی محنت اسے دوسروں سے ممتاز کردیتی ہے لیکن اس برتری کے سبب اسے دوسروں سے خود کو بڑا یا اعلیٰ و ارفع نہیں سمجھ لینا چاہیے' اللہ انسان کو دو طریقوں سے آزماتا ہے۔ کسی ایسی چیز سے نواز کر جس کا انسان اہل نہیں ہوتا یا پھر کسی ایسی شے سے محروم رکھ کر جس کا وہ استحقاق رکھتا ہو۔ یہ صلاحیتیں' شکتیاں' ہنر اور تجربے کاریاں سب آنی جانی ہیں۔ ہم سب معمولی اور غیر معمولی اداکار ہیں۔ ہمارا ہدایت کار تو وہ ہے' جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے۔"
وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ لرزاں لہجے میں گویا ہوا "سائیں! آپ تو صرف عامل ہی نہیں بلکہ عالم بھی ہیں۔"
"میں کچھ بھی نہیں ہوں۔" میں نے قطعیت سے کہا "بس ایک سیدھا سادہ معمولی سا انسان ہوں۔ میں مثبت سوچ اور مثبت عمل کا قائل ہوں اور منفی سوچ رکھنے والے لوگوں سے نبرد آزما ہوں۔ میں ایک طرح سے حق و باطل کی جنگ میں مصروف ہوں اور مجھے یقین ہے' بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی۔"
وہ سحر زدہ نظر سے مجھے تکے چلا جارہا تھا۔ یہ میرے لیے اس کی والہانہ عقیدت تھی جس نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔
میں نے کہا "میر بخش! میری ایک بات ذہن نشین کرلو۔ یہ دنیا مفید لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے اس لیے ہمیں ہر لمحے خود کو مفید بنانے کی کوشش میں مصروف رہنا چاہیے۔ ہماری

ذات سے کسی دوسری ذات کو فائدہ ضرور پہنچنا چاہیے۔ یہی ایک صحت مند معاشرے کا اصول ہے۔ بے فیض اور غیر مفید شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں۔"

ساحل نے مجھ سے سوال کیا "وجدان! تمہارے نزدیک ایک مفید انسان میں کیا کیا اوصاف ہونا چاہئیں؟"

میربخش کی طرح وہ بھی پوری توجہ سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"میرے نزدیک مفید انسان وہ ہے جس میں تین بنیادی اوصاف میں سے کم از کم ایک وصف ضرور موجود ہو۔ وہ تین اوصاف یہ ہیں۔ نمبر ایک 'مثبت علم۔ نمبر دو 'صحت مند فکر۔ نمبر تین توانائی سے بھرپور دانش۔"

"اور اگر کسی شخص میں یہ تینوں خاصیتیں موجود ہوں تو؟" ساحل نے پوچھا۔

"تو وہ شخص میرے نزدیک الیگزا لیٹڈمین (شرف یافتہ انسان) کہلانے کا حق رکھتا ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "آپ ایسے شخص کو زندہ ولی بھی کہہ سکتے ہیں۔"

میربخش نے شوق سے لبریز لہجے میں پوچھا "سائیں! کیا میں بھی اپنی "چی" کی قوت بیدار کر سکتا ہوں؟"

اسی وقت مجھے پجارو سے باہر آبادی کے آثار نظر آئے۔ میں نے میربخش کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا "یہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں؟"

اس نے بغور پجارو کی ونڈ اسکرین کے پار دیکھا اور مجھے بتایا "ہم اس وقت "صالح بھمبرو" سے گزر رہے ہیں۔ اس سے آگے "محمد رحیم کلری" آئے گا اور پھر اس کے فوراً بعد "سامارو" کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔"

میں نے تسلی آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے میربخش سے پوچھا "ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا، سائیں کہ کیا میں بھی "چی" کی قوت کو بیدار کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں!" میں نے کہا۔

"اس کے لیے کیا کرنا ہوتا ہے؟" اس نے پوچھا "میرا مطلب ہے، اس قوت کی بیداری کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے؟"

"صرف ایک چیز کی۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا سائیں؟"

میں نے بتایا "عزم!"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا!" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "عزم کا آسان مطلب ہے "ارادہ" جس شخص نے کوئی کام کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا، سمجھ لو اس نے وہ کام سرانجام دے لیا۔"

"پھر بھی، چی جیسی عظیم قوت کی بیداری کے لیے کچھ نہ کچھ پاپڑ تو بیلنا ہی پڑتے ہوں گے!" میربخش کے اس اصراری انداز میں بے پناہ دلچسپی شامل تھی۔

میں نے واضح الفاظ میں کہا "کوئی پاپڑ نہیں بیلنا پڑتے بس ایک سیدھی سادی آسان سی مشق ہے۔ اسے باقاعدگی سے کرنا ہوتا ہے۔ اگر آپ کی نیت صاف ہے، ارادہ پختہ ہے اور مقصد نیک ہے تو پھر کامیابی آپ کا مقدر ہے۔ آپ کا جو بھی عمل لگن سے بھرپور ہوگا، وہ مثبت نتائج ضرور لائے گا۔"

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں پوچھنے لگا "سائیں! کیا آپ مجھے "چی" کی بیداری کے لیے مخصوص وہ سادہ سی مشق بتا سکتے ہیں؟"

"بالکل بتا سکتا ہوں۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

اس موقع پر ساحل نے شکایتی لہجے میں کہا "وجدان، تم نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ وہ مخصوص ایکسرسائز مجھے بھی کراؤ گے لیکن ابھی تک تم نے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ مشق کرانے کے لیے مکمل ذہنی سکون اور فرصت کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے کہا "ایسا کہا تھا یا نہیں؟"

"ہاں، تم نے یہی کہا تھا۔" اس نے تصدیق کی۔

میں نے پوچھا "کیا اس کے بعد سے ہمیں ذہنی سکون اور فرصت میسر آئی ہے؟"

اس نے نفی میں جواب دیا۔

میں نے کہا "پھر تمہاری شکایت بے جا ہے۔"

وہ بولی "جب ہمیں فرصت ملے گی اس وقت ہم اس مشق کا عملی مظاہرہ کر لیں گے۔ فی الحال تم ہمیں اس کی تھیوری تو بتا سکتے ہو نا!"

"ہاں، فی الحال یہ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا پھر انہیں "چی" کی حقیقت بتانے لگا۔

میں نے انہیں بتایا کہ "چی" ایک پوشیدہ اور خوابیدہ قوت ہے جو ہر انسان کے پیٹ کے پچھلے حصے میں ناف سے تھوڑا نیچے موجود ہے۔ آپ اس مقام کو ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کا زیریں حصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ چینی فلاسفی میں اسے "چی" کا نام دیا گیا ہے۔ ہندو مائتھالوجی میں یہ قوت "کنڈلینی شکتی" کہلاتی ہے۔ اسلامی روحانیت میں اسے

...رف" کہتے ہیں۔ تینوں تہذیبوں کے عالموں نے اس کی ...اری کے لیے مختلف طریقے، مشقیں، ریاضتیں و مراقبے ...جاپ وغیرہ وضع کیے ہیں۔ راستے الگ الگ ہیں مگر کم و ...منزل ایک ہی ہے۔ جو بھی انسان اس کے حصول کے ...وضع کردہ راستے پر بالکل درست قدم رکھتا ہے، وہ بالآخر ...ی منزل کو پالیتا ہے۔"

میں ان کی طرف دیکھے بغیر بولے چلا جا رہا تھا۔ میری ...ری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ میں نے "چی" کے بارے ...مزید بتاتے ہوئے کہا "جب مخصوص مشق کے ذریعے اس ...بیدہ قوت کو بیدار کیا جاتا ہے تو یہ ریڑھ کی ہڈی کے راستے ...دھی دماغ کی جانب سفر کرتی ہے۔ اس موقع پر بہت سمجھ ...جھ اور احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مشق ...رنے والا کوئی سنگین غلطی کر بیٹھے یعنی اس کے ارتکاز اور ...ہم میں کوئی رخنہ پڑ جائے یا اس کی نیت میں کوئی کھوٹ ...جائے یا وہ کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھے تو پھر یہ ...ت کسی بھی نوعیت کی سرکشی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ یہ ایک ...راستراحت شیر کو جگانے کے مترادف ہے لیکن اس مرحلے ...اگر مشق کرنے والے کو کسی ماہر استاد کی راہنمائی حاصل ...و تو پھر خطرے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔ ویسے بھی یہ قوت ...چانک بیدار ہو کر دماغ کی جانب سفر نہیں کرتی۔ جب آپ ...سے جگانے کے لیے اپنی مشق کے ذریعے اس کو ہولے ...ولے جھنجوڑتے ہیں تو یہ کسمسا کر کروٹیں بدلتی رہتی ہے۔ ...ان مراحل میں مشق کرنے والے شخص پر مخصوص قسم کی ...کیفیات بھی طاری ہوتی رہتی ہیں جن کی بنا پر نگران استاد ...سے مفید مشوروں سے نوازتا رہتا ہے۔ ان مشوروں اور ...تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اس سرکش قوت کو زنجیریں ڈال کر ...دماغ کی طرف لایا جاتا ہے۔

"دماغ میں پہنچ کر یہ قوت فوٹان کی شکل اختیار کر لیتی ہے ...جو دماغ کے ایک مخصوص حصے کو روشن کر دیتی ہے۔ یہ وہی ...حصہ ہے جہاں خیالات نمو پاتے ہیں۔ یہ خیالات کی نشوونما کو ...تقویت دیتی ہے گویا یہ خیالات کی قوت کو بڑھاتی ہے، انہیں ...توانائی ہے۔ یہ ایک طرح سے آٹو جنریٹر کے طور پر کام کرتی ...جب انسان خیال کی قوت سے بڑے بڑے کارنامے انجام ...دے سکتا ہے۔"

ساحل نے پوچھا "فوٹان کیا چیز ہوتی ہے؟"

"یہ لائٹ انرجی کا سب سے چھوٹا اور ناقابلِ تقسیم ذرہ ...ہے، میں نے بتایا "روشنی کا سارا کھیل اسی ننھے منے ...ذرے کا مرہونِ منت ہے۔"

"کیا ہم فوٹان کو دیکھ سکتے ہیں؟"

"کسی ایک فوٹان کو دیکھنا انسانی آنکھ کے بس کی بات نہیں۔" میں نے کہا "فوٹان کا مجموعہ روشنی ہے جسے ہم بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ذرہ الیکٹرون، پروٹان اور نیوٹرون سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔"

میربخش نے پوچھا "سائیں! خیال کی قوت سے کارنامہ کیسے انجام دیا جا سکتا ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "خیال کی قوت بڑی غضب کی چیز ہے۔ اگر انسان پوری لگن سے کسی ایک خیال پر توجہ مرکوز کر دے تو وہ خیال مجسم شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہماری سوچ جتنی مضبوط ہوتی ہے، ہم اتنے ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ خیال کی قوت واقعات کو جنم دیتی ہے۔ ہم گہری توجہ سے جس بات کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں، وہ ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ ایک راگی ملہار گا کر برسات کا سماں پیدا کر سکتا ہے۔ وہ جب دیپک راگ چھیڑتا ہے تو آگ جل اٹھتی ہے۔ یہ سب کیا ہے؟ لوگ اسے گانے والے کا فن کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ اس کا ارتکازِ توجہ ہے۔ وہ اپنے فن میں ڈوب کر خیال کی قوت سے ایک واقعے کو جنم دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ خیالات کا کنسنٹریشن ناقابلِ یقین اور حیرت آفریں مناظر تخلیق کر سکتا ہے۔"

راگ راگنیوں اور گویوں کے بارے میں مجھے جے پور میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ رانی روپ متی گائیکی کے فن میں خاصی دسترس رکھتی تھی۔ اس سے میں گھنٹوں موسیقی پر گفتگو کرتا رہتا تھا۔ اس نے مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی تھیں۔

ساحل اور میربخش پوری دل جمعی سے میری جانب متوجہ تھے اور "چی" سے متعلق باتیں سن رہے تھے۔ اچانک میں نے ساحل سے پوچھا "تمہارے ٹخنے کا درد اب کیسا ہے؟"

"آں۔۔۔ ہاں۔" وہ چونکتے ہوئے بولی "میں نے تو کافی دیر سے یہ درد محسوس نہیں کیا۔" پھر وہ حیرانی سے مجھے تکنے لگی۔

"یہ ہوتی ہے خیال کی قوت!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تم کافی دیر سے مجھے سن رہی ہو۔ تمہاری توجہ میری باتوں پر لگی ہے، گویا اس وقت تم ارتکازِ توجہ کی کیفیت سے گزر رہی ہو۔ میری باتوں کے سوا تمہارا دھیان کسی اور سمت میں نہیں ہے اس لیے تم باقی تمام کیفیات سے بے خبر ہو۔ تمہارے ٹخنے میں درد تو ہو رہا ہوگا لیکن عدم توجہی کی وجہ سے تم اسے محسوس نہیں کر رہی ہو۔ جس طرح

ارتکازِ توجہ سے کوئی واقعہ تخلیق کیا جاسکتا ہے' بالکل اسی طرح عدم توجہی اور بے نیازی سے کسی حقیقت کی نفی بھی کی جاسکتی ہے اور یہ سارے کا سارا کھیل خیال کی قوت کا ہے۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا "اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوگئی کہ تمہارے اندر ارتکازِ توجہ یعنی کنسنٹریشن کی صلاحیت موجود ہے۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! میں بھی کافی دیر سے اپنے بازو کا درد بھولا ہوا ہوں۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ پچھلے پندرہ بیس منٹ سے گھائل بازو میں کوئی ٹیس کیوں نہیں اٹھی۔"

"اب تو تمہاری حیرت دور ہوگئی ہوگی۔" میں نے کہا "تم بھی اپنے اندر توجہ کی قوت رکھتے ہو۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے' میں اپنی "چی" کی قوت کو بیدار کرسکتا ہوں؟"

"یہ ناممکن نہیں ہے۔" میں نے کہا "اگر تمہارا عزم پختہ اور کوشش مثبت ہوئی تو تم یہ قوت ضرور حاصل کرلو گے۔"

ساحل نے کہا "بس بھئی' بہت ہوگئی۔ وجدان! اب جہاں بھی ہمیں کچھ دیر ٹھہرنے کا موقع ملے گا' تم ہمیں "چی" کی مشق کرنا عملاً سکھاؤ گے۔ تھیوری بہت پڑھ لی۔"

"ٹھیک ہے' میں نے کب انکار کیا ہے۔"

"میں تم سے مارشل آرٹس بھی سیکھوں گی۔" وہ مچل کر بولی۔

"وہ بھی ضرور سکھاؤں گا۔" میں نے کہا۔

میر بخش نے کہا "ان فنون کے لیے آپ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں سائیں۔"

"لے لیا۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا "اور کچھ؟"

"بہت بہت شکریہ سائیں۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ساحل سے کہا "تم ذرا میر بخش کو "شکریہ" والا فلسفہ سمجھادو۔"

وہ میری بات کا مقصد سمجھ گئی اور آئندہ پانچ منٹ میں وہ میر بخش کو بتاتی رہی کہ میرے نظریے کے مطابق تھینک یو' سوری اور پلیز جیسے تکلفات کو دوستوں کے درمیان جگہ نہیں پانا چاہیے۔

میر بخش گہری عقیدت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! میں آپ کا دوست بننے کے قابل کہاں ہوں۔ آپ نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا ہے' یہی بڑی بات ہے۔ آپ تو میرے آقا ہیں۔" پھر اس نے دونوں ہاتھ مخصوص انداز میں جوڑ دیے۔

میں نے کہا "میرے سامنے اس طرح ہاتھ نہ جوڑو۔ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہم دوست ہیں۔ مجھ سے بے جھجک بات کیا کرو۔"

"سائیں! مجھ سے یہ نہیں ہوسکے گا۔" وہ عاجزی سے بولا۔ تاہم اس مرتبہ اس نے ہاتھ نہیں جوڑے تھے "سائیں! میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ آپ نے مجھے ساتھی بنالیا' آپ کی بہت مہربانی ہے۔ اب میری یہ زندگی آپ کی امانت ہے۔ میری خواہش ہے کہ اس زندگی کا ایک ایک لمحہ آپ پر قربان ہوجائے۔"

بات ختم کرتے ہوئے وہ خاصا جذباتی ہوگیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اسے مزید روکنا ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ میرے ساتھ رہتے رہتے خود ہی سب کچھ سیکھ جاتا۔ اس کی ساری عمر وڈیرا اکبر سومرو کی چاکری میں گزری تھی۔ اس قسم کے بھوتار وڈیرے صرف حکم چلاتے ہیں اور میر بخش جیسے ادنیٰ چاکر "جو حکم سائیں" کہنے کے لیے پیدا ہوئے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی چاکر اپنے وڈیرے کے سامنے دم مارنے کی جسارت نہیں کرسکتا' دوستی کرنا اور دوستانہ انداز میں باتیں کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ مجھے امید تھی کہ میر بخش تھوڑے ہی عرصے میں ہمارے رویّوں کو بخوبی سمجھنے لگے گا پھر اسے ہمارے ساتھ گھلنے ملنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس میل تال کے لیے کچھ وقت کی ضرورت تھی۔

وہ دونوں اچانک خاموش ہوگئے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت اپنے درد کو محسوس کررہے تھے۔ میں نے دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

"کیسی خوش خبری؟" ساحل نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میر بخش بھی سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں کی تربیت و تعلیم ابھی سے شروع کردوں۔"

"وہ تو تم کافی دیر سے کررہے ہو۔" ساحل نے کہا "تمہارا علمی اور فنی لیکچر ہم پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔"

"میں عملی تربیت کی بات کررہا ہوں۔"

"اس کے لیے تو سکون اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہوگی۔" ساحل نے کہا۔

میر بخش بولا "سائیں! کیا گاڑی میں وہ مشق کرنا مناسب ہوگا۔ آپ تو کہہ رہے تھے۔"

میں نے میر بخش کی بات کاٹتے ہوئے کہا "باقاعدہ عملی

مشق تو گاڑی میں نہیں کی جاسکتی البتہ اس کی ابتدائی تیاری کے لیے ہلکا پھلکا کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" ساحل کی آواز میں دلچسپی شامل تھی۔

میں نے کہا "تم دونوں میں ارتکازِ توجہ کی صلاحیت موجود ہے اور اس صلاحیت کو آزمانے کا موقع بھی ہے۔ ساحل، تم اپنے ٹخنے میں درد محسوس کررہی ہو اور میر بخش، تم اپنے زخمی بازو میں ٹیسیں محسوس کررہے ہو۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "میں نے یہ بات تم دونوں کی اچانک خاموشی سے بھانپ لی ہے۔ ممکن ہے، میرا اندازہ غلط ہو اور تم دونوں کی خاموشی کی کوئی اور وجہ ہو! کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟"

وہ بیک زبان بولے "آپ نے ہمارے بارے میں بالکل درست محسوس کیا ہے۔"

"پھر تم دونوں اپنی توجہ اپنے اوپر جسم کے زخمی حصے پر مرکوز کردو۔" میں نے کہا "اور اس خیال کو ذہن میں جمانے کی کوشش کرو کہ تمہارے زخم تکلیف دہ نہیں رہے۔ تم لوگ ایسا سوچتے ہوئے جسم کے متاثرہ حصوں کو دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ سے سہلاتے بھی جاؤ۔ اس طریقے سے تمہیں یقینی طور پر بہت آرام و سکون ملے گا۔"

اگلے ہی لمحے وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کررہے تھے۔

جب ہم "محمد رحیم کلری" کے نزدیک پہنچے تو رات کی تاریکی چھٹنے لگی۔ آہستہ آہستہ اب سپیدۂ سحر نمودار ہورہا تھا۔ تاریکی کا جتنا حصہ ختم ہوتا، وہ جگہ اجالا لے لیتا۔ وہ ایک بیک وقت عمل تھا۔ غیر محسوس طور پر تاریکی اجالے میں بدل رہی تھی جس طرح انسانی جسم میں خون کی پیداوار ہوتی ہے۔ ایک طرف تازہ خون بنتا رہتا ہے، دوسری جانب ناقابلِ استعمال ڈیڈ بلڈ سیلز ایک قدرتی عمل کے تحت دورانِ خون میں سے خارج ہوتے رہتے ہیں۔ قدرت کا ہر نظام حیرت آفرین ہے اور "آٹو سسٹم" کے تحت کام کرتا ہے۔ جس طرح تاریکی، اجالے کی خوراک بن جاتی ہے بالکل اسی طرح اندھیرا، روشنی کو نگل جاتا ہے۔ شام و سحر کا یہ چکر صدیوں سے چلا آرہا ہے اور صدیوں تک چلتا رہے گا۔ گویا یہ سلسلہ ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے۔

ریگستان میں ایک ہی دن میں موسم کی کئی صورتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ دن کے ابتدائی اور آخری حصے یعنی شام و سحر کے وقت موسم بہت خوشگوار ہوجاتا ہے۔ نہ سردی اور نہ گرمی۔ دوپہر میں آسمان آگ برسانے لگتا ہے گویا جسم کا سا سماں ہوتا ہے۔ بھیگی ہوئی رات اپنے اندر شدید ٹھنڈک رکھتی ہے۔ اگر سردی بہت زیادہ نہ بھی ہو تو پھر بھی موسم سرد ہی ہوتا ہے۔

میں ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہ جمائے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کا منظر ایک مخصوص حد تک روشن تھا۔ اب تو ویسے بھی اجالا کھلنے لگا تھا۔ غور سے دیکھنے پر گرد و نواح کا منظر نگاہ کے سامنے واضح ہوجاتا تھا۔ اس وقت فضا بہت دلکش اور موسم خاصا سہانا ہورہا تھا۔

محمد رحیم کلری سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مجھے پجارو کو روکنا پڑا۔ دراصل اس مقام پر ریلوے کراسنگ تھی۔ ریل کی پٹڑی سڑک کے اوپر سے گزرتی تھی اور اس وقت ریلوے کراسنگ والا پھاٹک بند تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا، وہاں سے کوئی ٹرین گزرنے والی تھی۔

وہ ریلوے کوئی مین لائن نہیں تھی اس لیے زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہاں سے گزرنے والی کوئی پسنجرز لوکل ٹرین ہوگی یا پھر وہ مال گاڑی بھی ہوسکتی تھی۔

ریلوے پھاٹک پر، پھاٹک والا ریلوے ملازم ہاتھ میں سگنل لیمپ لیے کھڑا تھا۔ مزکورہ لیمپ سے پھوٹنے والی سبز روشنی اس بات کی نشان دہی کرتی تھی کہ آنے والی گاڑی کو وہاں سے گزرنے کی اجازت دی جارہی ہے۔ دن کے وقت یہی کام سبز جھنڈی دکھا کر کیا جاتا ہے۔

پھاٹک کے نزدیک ہی کھپریل کی چھت والا ایک کمرا بنا ہوا تھا جو یقیناً پھاٹک والے شخص کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ میں نے نگاہ دوڑا کر دور تک دیکھا۔ ہمارے سامنے اور پیچھے کسی بھی قسم کی کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ علی الصباح کا وقت تھا اور اس غیر مصروف سڑک پر ہمارے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔

ہمیں وہاں رکے ہوئے چند لمحات ہی گزرے تھے کہ پھاٹک والا ہماری جانب بڑھتا دکھائی دیا۔ اس نے چیک دار چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سگنل لیمپ جھول رہا تھا۔ یہ لیمپ بھی عجیب چیز ایجاد کی ہے ریلوے والوں نے جو کبھی سبز اور کبھی سرخ روشنی خارج کرتا ہے۔ درحقیقت ایک ڈبا نما شے ہے جس کی ایک "دیوار" میں سرخ شیشہ اور دوسری دیوار میں سبز شیشہ جڑا ہوتا ہے۔ یہ دونوں دیواریں آمنے سامنے والی ہوتی ہیں اور لیمپ کے ڈبے کے اندر عام روشنی والا ایک چراغ جل رہا ہوتا ہے مگر رنگ دار شیشوں کے سبب اس میں سے پھوٹنے والی روشنی اپنی

ے سبز اور سرخ دکھائی جاسکتی ہے۔

لیمپ بردار پھاٹک والے کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ پھاٹک کو بند کرکے گاڑی کو گزرنے کے لیے پٹڑی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا، گاڑی گزرنے تک اسے وہیں موجود رہنا چاہیے تھا۔ میں نے پھاٹک سے تھوڑا فاصلے پر کھڑا کیا تھا۔ پھاٹک والے کو اپنی طرف قدم اٹھاتے دیکھ کر میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"کلاشنکوف کو گود میں سے اٹھا کر کسی جگہ چھپادو۔ اس کی نمائش کرنا کوئی نئی مصیبت کھڑی کرسکتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے میر بخش کو اشارہ بھی کردیا۔

اس وقت اگرچہ اجالا پھوٹنا شروع ہوگیا تھا۔ تاہم گاڑی کے اندر کی جانے والی حرکت کو پھاٹک والا دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میر بخش نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کلاشنکوف کو گود میں سے اٹھا کر، دامن کے نیچے دونوں ٹانگوں میں پھنسا کر کھڑا کردیا۔ میر بخش نے گہرے نیلے رنگ کا شلوار قمیص زیب تن کر رکھا تھا جو اس ملگجے اجالے میں فاصلے سے سیاہ نظر آتا تھا۔ اس نے کلاشنکوف کو اس انداز میں اپنی دسترس میں استادہ کیا تھا کہ بوقتِ ضرورت اسے آسانی سے نکال کر استعمال میں لایا جاسکتا تھا۔

وہ پجارو سے باہر لیمپ بردار شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ مردود ہماری جانب کیوں آرہا ہے۔ اسے تو بند پھاٹک پر ہی موجود رہنا چاہیے۔ گاڑی کسی بھی لمحے آسکتی ہے۔"

"یہ بات مجھے بھی حیران کررہی ہے۔" میں نے کہا "میں پھاٹک والے کی اس حرکت سے الجھ گیا ہوں۔"

ہمارے درمیان سرگوشیوں میں بات چیت ہورہی تھی۔ ساحل نے اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "وجدان! ہمارے پاس ایک بھاری رقم بھی موجود ہے۔ اسے بھی کہیں چھپا دینا چاہیے۔ پچاس ہزار روپے کوئی معمولی تو نہیں ہوتے!"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا اور بہ نظرت میر بخش کی طرف دیکھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا، بولا "سائیں! میں نے نوٹوں والی گڈی کو ڈیش بورڈ میں رکھ دیا ہے۔ اگر کہیں اور چھپانا ہو تو حکم کریں۔"

"نہیں، وہیں ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور گاڑی کے باہر دیکھنے لگا۔

پھاٹک والا ریلوے ملازم اب ہماری پجارو سے صرف دس گز کے فاصلے پر تھا اور اس کا رخ سیدھا ہماری ہی جانب تھا۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک قد آور صحت مند انسان تھا۔ چادر کی بکل نے اس کے چہرے کا زیادہ تر حصہ چھپا رکھا تھا جس کی وجہ سے میں اس کا حلیہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سگنل لیمپ اس نے بائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ دایاں ہاتھ چادر کے اندر تھا۔ میں محتاط نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ والی کھڑکی کے پاس آیا اور ایک طائرانہ سی نگاہ پجارو کے اندر ڈالنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا "سائیں! ماچس ہوگی آپ کے پاس؟"

چادر کی بکل کی وجہ سے اس کی اصل آواز اپنی اصل حالت میں مجھ تک نہیں پہنچی۔ نہ سلام، نہ دعا۔ اس نے آتے ہی ماچس کی فرمائش کردی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کردیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس ریلوے ملازم کی نیت میں مجھے فتور نظر آرہا تھا۔

میں نے گھور کر اس کے چہرے کو دیکھا اور سخت لہجے میں کہا "یہاں کوئی سگریٹ نہیں پیتا اس لیے تمہیں ماچس نہیں مل سکتی۔"

میری بات مکمل ہوئی ہی تھی کہ بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ بکل پوش شخص نے لیمپ کو ایک طرف پھینکتے ہوئے دایاں ہاتھ چادر سے برآمد کیا اور اس میں موجود ریوالور کی نال کو میری کنپٹی سے لگاتے ہوئے بولا۔

"گاڑی سے باہر آجاؤ۔"

اس کے لہجے میں تحکم پایا جاتا تھا اور وہ بائٹس مرنے مارنے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پہلو میں بیٹھے میر بخش کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

ریوالور بردار بکل پوش نے غراتے ہوئے کہا "کسی قسم کی چالاکی کے بارے میں نہیں سوچنا ورنہ تم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

میں نے اسے باتوں میں لگانے کی خاطر کہا "تم تو گاڑی کو سگنل دینے کے لیے لیمپ تھامے پھاٹک پر کھڑے تھے، تمہیں ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"بکواس مت کرو اور گاڑی سے باہر نکل آؤ۔" اس نے قطعی انداز میں کہا۔

میں نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے ہوئے کہا "اس دوران میں اگر ٹرین وغیرہ آگئی تو تمہاری نوکری بھی جاسکتی ہے۔

پھاٹک والے کو اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتنا چاہیے۔"

اس نے نہایت ہی بے ہودہ انداز میں ریلوے اور پھاٹک والے کو مغلظات میں تولا پھر دھمکی آمیز انداز میں بولا "اگر تم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی چاہتے ہو تو گاڑی سے نیچے اتر جاؤ۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ہمیں صرف تمہاری گاڑی کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا "تم بار بار "ہمیں" کا لفظ استعمال کر رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے، تمہارے کچھ اور ساتھی بھی یہاں موجود ہیں؟"

"تم سوالات نہیں کرو اور میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر فوراً عمل کرو۔" وہ تنبیہی انداز میں پھنکارا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ اگر تم نے کسی قسم کی مزاحمت کی تو پھر مجھے مجبوراً یہ ریوالور استعمال کرنا پڑے گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے ریوالور کی نال کا دباؤ میری کنپٹی پر بڑھا دیا۔

ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ اس شخص کا تعلق محکمہ ریلوے سے ہرگز نہیں تھا۔ اس نے کسی ٹرین کی گزر کے لیے پھاٹک بند نہیں کیا تھا بلکہ محمد رحیم کلری کی جانب سے آنے والی کسی گاڑی کا وہ انتظار کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے تھا جنہیں فوری طور پر ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ ہم اس جگہ پہنچ گئے تھے۔

یہ تمام خیالات چشمِ زدن میں میرے دماغ سے گزرے تھے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اصل پھاٹک والا اس وقت یقیناً ریوالور بردار کے ساتھیوں کے رحم و کرم پر ہوگا۔ وہ اسے قابو میں کیے بغیر وہاں کا نظام اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے تھے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ پھاٹک والے شخص کو اس کے کمرے میں محبوس کیا گیا ہوگا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اس اکلوتے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے کی عقبی جانب دیوار کے ساتھ مجھے ایک چھوٹی جیپ کھڑی نظر آئی۔ وہ ایک "ٹویوٹا فور ویل ڈرائیو" تھی۔

"تم کس سوچ میں پڑ گئے؟" ریوالور بردار شخص نے میری کنپٹی پر ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔

میں نے پوچھا "آخر تمہاری ہم سے دشمنی کیا ہے؟"

جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اسے ہماری جانوں کی نہیں بلکہ اس پجارو کی ضرورت تھی، میں بہت ایزی ہوگیا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے اس شخص سے چھیڑ خانی میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔

"ابھی تک تو کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن اگر تمہارا یہی رویہ رہا تو دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی۔"

میں نے پوچھا "تم اس نئی نویلی دشمنی کا اظہار کس طرح کرو گے؟"

"اس طرح!" اس نے ریوالور کی نال کو میری کنپٹی میں گھسیڑنے کی کوشش کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا "اگر دس سیکنڈ کے اندر تم لوگوں نے میری بات پر عمل نہیں کیا تو پھر اس گاڑی کے اندر تمہاری تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آئیں گی۔"

میں نے ایک مصنوعی جھرجھری لی اور ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے "ہینڈز اپ" ہاتھوں کو کانوں سے لگاتے ہوئے میر بخش کی طرف دیکھ کر کہا "نہ بابا نہ۔ ہمیں مرنے کا کوئی شوق نہیں۔ تم یہ گاڑی لے جا سکتے ہو۔ میں تو نیچے اتر رہا ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے میر بخش کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھول کر باہر آگیا۔

"تم دونوں بھی گاڑی سے باہر نکل آؤ۔" ریوالور بردار نے میر بخش اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

میں نے بدستور ہینڈز اپ رہتے ہوئے اس بکل پوش شخص سے درخواست کی "میرا ساتھی دونوں ٹانگوں سے معذور ہے۔ اس کو گاڑی سے باہر لانے کے لیے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ اگر تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو بلا لاؤ۔ البتہ لڑکی کو میں نیچے اترنے کا کہہ دیتا ہوں۔"

اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا۔ اپنے کسی ساتھی کو بلا لانے والی تجویز نے اسے متاثر نہ کیا۔ غالباً وہ ہمیں چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے بھی وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا! پھر ساتھی کے حوالے سے اس کے ساتھ کوئی اور "ٹیکنیکل پرابلم" تھی۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے کہا۔

"میں اپنے ساتھی کو یہاں نہیں بلانا چاہتا۔ تم میری مدد کے بغیر اپنے معذور ساتھی کو گاڑی سے باہر لاؤ گے۔ میں ریوالور سے تمہاری نگرانی کروں گا۔"

اس نے روانی میں "اپنے ساتھی" کے الفاظ استعمال کر کے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ کل دو افراد تھے جنہیں ہماری گاڑی کی اشد ضرورت تھی۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے پجارو کی پسنجر سیٹ کی جانب

وہ مکاری سے بولا "لیکن اس سے پہلے تمہاری ساتھی کو نیچے اترنا ہوگا!"

میں نے ساحل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "گاڑی سے ... جاؤ لیلیٰ!"

میں نے دانستہ ساحل کو لیلیٰ کے نام سے پکارا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ اب میرا نام مقصود احمد ہے اور میر بخش حسبِ معمول میر بخش ہی ہے۔ میرے اور بکل پوش شخص کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں، وہ میر بخش اور ساحل نے بھی تفصیلاً سنی تھیں مجھے قوی امید تھی کہ میر بخش میری پلاننگ کو سمجھ گیا ہوگا۔ جب میں اسے پجارو سے باہر نکال رہا ہوتا تو اس موقع پر اسے کوئی کارروائی کرنا تھی۔

ساحل میرے اشارے پر پجارو سے باہر آگئی تو میں میر بخش کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس دوران میں ریوالور بردار شخص ہماری نگرانی کرتا رہا۔ میں نے پجارو کا دروازہ کھولتے ہوئے بڑبڑاہٹ کے انداز میں کہا۔

"یہ تو بے رحمی کی انتہا ہے۔ اب میں منہ اندھیرے اپنے اپاہج ساتھی کو کس طرح سامارو تک پہنچاؤں گا!"

وہ ڈانٹ آمیز لہجے میں بولا "یہ منہ اندھیرا سدا نہیں رہے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس سڑک پر بسوں وغیرہ کی آمدورفت شروع ہوجائے گی۔ تم لوگ بہ آسانی کسی بس وغیرہ میں سوار ہو کر سامارو تک جا سکتے ہو۔"

"اچھا بھائی، جیسی تمہاری مرضی۔" میں نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

میں اس قسم کی اداکاری کر رہا تھا کہ ریوالور بردار کو ہمارے عزائم کی بھنک نہ ملے۔ وہ یہی سمجھے کہ ہم اپنی گاڑی چھن جانے پر بہت پریشان ہیں۔ خاص طور پر اپنے معذور ساتھی کی وجہ سے میں جھنجلاہٹ کا شکار ہو رہا ہوں۔

میں نے اپنے اور اپنے عقب میں کھڑے ریوالور بردار کے درمیانی فاصلے کو ذہن میں نقش کیا پھر دونوں بازوؤں کے کلاوے میں میر بخش کو سمیٹتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی "اسے صرف زیر کرنا ہے اس لیے فائرنگ نہیں ہونا چاہیے۔"

میری آغوش میں محصور میر بخش کی گردن نے اثباتی جنبش کی اور میں نے اس کے جسم کو اٹھا کر پجارو سے باہر نکالا۔ ریوالور بردار شخص میری پشت پر صرف تین فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے میر بخش کو پجارو سے برآمد کرتے ہوئے بازوؤں میں اٹھائے اٹھائے ایک زوردار گول چکر میں گھما کر زمین پر رکھ دیا۔

میری اس "حرکت" کا بڑا حیرت انگیز نتیجہ برآمد ہوا۔ میر بخش کی دونوں ٹانگیں ریوالور بردار کے اس ہاتھ پر پڑیں جس میں اس نے ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا اور وہ شخص ہلکی چیخ سے مشابہ آواز نکال کر زمیں بوس ہوگیا۔

یہ سب کچھ برق رفتاری سے پیش آیا تھا۔ میر بخش کسی اسپرنگ کی طرح زمین سے اچھلا اور عقاب کے مانند پرواز کرتے ہوئے زمیں بوس بکل پوش شخص کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں اس شخص کے منہ سے چیک دار چادر ہٹ گئی تھی گویا اب وہ بکل میں نہیں تھا۔ اب میں اس کے حلیے کا مشاہدہ بہ آسانی کر سکتا تھا۔

اس کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ اس نے بیچ کی مانگ نکال رکھی تھی اور بال بھی خاصے بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بڑی بھرپور داڑھی بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی صورت کی سب سے واضح نشانی یہ تھی کہ وہاں بھلبہری کے بڑے بڑے سفید دھبے موجود تھے۔ میری نظر اس کے ہاتھوں پر گئی تو وہاں بھی مجھے اسی قسم کے نشانات دکھائی دیے گویا وہ مکمل طور پر اس خوفناک مرض میں مبتلا ہوچکا تھا۔

زمین پر چت پڑا ہوا وہ شخص پھٹی پھٹی آنکھوں سے میر بخش کو تک رہا تھا۔ آنکھیں موٹی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس کی حیرت کا سب سے بڑا سبب میر بخش تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کسی اپاہج شخص کو اس طرح اچھلتے اور فضا میں پرواز کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس "معذور شخص" کے ہاتھ میں کلاشنکوف بھی موجود تھی جس کی موت اگلنے والی خوفناک نال کو اس نے خاک نشین کے کھلے ہوئے منہ میں گھسیڑ رکھا تھا۔

میں نے اس دوران میں اس کا ریوالور اٹھا کر ساحل کے حوالے کردیا اور میر بخش کے قریب آگیا۔ ساحل میرا اشارہ پا کر دوبارہ پجارو میں جا بیٹھی تھی۔

"کیا حکم ہے سائیں؟" میر بخش نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا "مانو تو ٹھکانے لگا دوں؟"

"اگر ضرورت پڑی تو اسے ٹھکانے بھی لگا دیں گے۔" میں نے اس وحشت زدہ شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "پہلے اس کا انٹرویو تو کرلوں۔ کیا پتا، یہ اس امتحان میں پاس ہی ہوجائے اور ہمیں اس کے خون میں ہاتھ نہ رنگنا پڑیں۔"

وہ شخص کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا "گن کی نال میرے منہ سے نکال دیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتادوں گا۔"

"وہ تو تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔" میر بخش نے خوں خوار انداز میں اسے گھورتے ہوئے کہا "اور اسی حالت میں تمہاری زبان چلے گی۔ ہم سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔"

اس شخص کی وحشت میں اضافہ ہوگیا۔ میر بخش کے اٹل لہجے میں بڑی تاثیر تھی۔ تاہم میں اس وقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی پھیلنا شروع ہوگئی تھی اور ہماری پجارو عین سڑک پر کھڑی تھی۔ پھاٹک چونکہ بند تھا اس لیے ہمارے پیچھے یا پھاٹک کی دوسری جانب گاڑیوں کی "آمدورفت" سے وہاں رش لگ سکتا تھا اس طرح ہماری "کارروائی" پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگرچہ ابھی تک دور دور تک کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ تاہم یہ صورتِ حال مستقل نہیں رہ سکتی تھی۔

میں نے میر بخش سے کہا "تم اس شخص کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے سڑک سے نیچے اتار لو۔ میں گاڑی کو مناسب جگہ پر لگاتا ہوں تاکہ کسی قسم کی "بدمزگی" کا امکان باقی نہ رہے۔"

"ٹھیک ہے سائیں' آپ گاڑی میں جائیں۔" میر بخش پراعتماد لہجے میں بولا "میں اس چت کبرے کو سنبھالتا ہوں۔"

میں نے پجارو کی جانب جانے سے پہلے ریلوے کراسنگ پر موجود پھاٹک کھول دیا۔ اب وہاں کسی آنے جانے والی گاڑی کے رکنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ اس طرح میں تسلی کے ساتھ اس دھبے دار شخص سے پوچھ گچھ کرسکتا تھا۔

پھاٹک کو کھولنے سے خطرے کا ایک امکان پیدا تو ہوگیا تھا مگر مجھے امید تھی کہ وہ خطرہ لاحق ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ اگر کوئی گاڑی یا ٹرین کو اس دوران میں ریلوے لائن سے گزرنا ہوا بھی تو وہ گزر ہی جائے گی۔ اسی طرح اگر سڑک پر سے گزرنے والی کسی کار' بس یا ٹرک نے ٹرین وغیرہ کی جھلک دیکھ لی تو وہ پھاٹک کھلا ہونے کے باوجود بھی کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوگا۔ ویسے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس شخص کو بہت جلد "نمٹا" دوں گا۔

میں پجارو میں آیا اور اسے باآہستگی ڈرائیو کرتے ہوئے سڑک سے اتار کر کچے میں کھڑا کردیا۔ میں گاڑی سے نیچے اترنے لگا تو ساحل نے سوال کیا۔

"وجدان! اس شخص کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"تھوڑی سی پوچھ تاچھ اور بس۔" میں نے کہا۔

"اور میں یہاں گاڑی میں اکیلی رہوں گی؟"

"کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟"

"بات ڈر کی نہیں۔" وہ جلدی سے بولی "میرے پاس دو ریوالور ہیں۔ میں اپنی حفاظت کرسکتی ہوں۔"

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا "پھر کیا بات ہے' تم اس قدر الجھی ہوئی کیوں ہو؟"

"میں تو بس صرف یہ کہہ رہی ہوں' اس پوچھ تاچھ کی ضرورت کیا ہے!"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا!" میرے لہجے میں الجھن تھی۔

وہ بولی "ہم نے اس شخص سے ہتھیار چھین لیا ہے۔ اب وہ ہمارے سامنے کسی حقیر کیچوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار رکھے بغیر آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

"ابھی میں اتنا بے حس نہیں ہوا ہوں۔" میں اچانک سنجیدہ ہوگیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "اس میں بے حسی والی کون سی بات ہے؟"

"شاید تم نے اس شخص کی باتیں غور سے نہیں سنیں۔" میں نے کہا "وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کا ایک اور ساتھی بھی یہیں آس پاس کہیں موجود ہے۔ انہیں ہماری گاڑی کی ضرورت ہے تاکہ فرار ہوسکیں' اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ کسی سنگین جرم میں ملوث ہیں۔"

"ہمیں ان کے جرم سے کیا لینا دینا۔" ساحل نے بیزاری سے کہا "وہ جائیں جہنم میں۔"

"وہ جہنم میں جائیں گے تو اپنے ساتھ اور بھی کئی جانوں کو مصیبت میں ڈال جائیں گے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں نے اس کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک فورو ہیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کھڑی دیکھی ہے اور پھاٹک والا اصل شخص کہیں نظر نہیں آرہا۔ سگنل لیمپ کی اس جرائم پیشہ شخص کے پاس موجودگی تو یہی بتاتی ہے کہ پھاٹک والا شخص اس وقت کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ ممکن ہے' اس شخص کے ساتھی نے پھاٹک والے کو اس کے کمرے میں یرغمال بنا رکھا ہو۔ کچھ بھی ممکن ہوسکتا ہے!"

"ہاں واقعی' کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی "یہ بھی عین ممکن ہے' تارا اور اس کے خیرخواہ ہماری تلاش میں یہاں پہنچ جائیں۔ اس امکان کو نظرانداز تو نہیں کیا جاسکتا نا؟"

میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" پھر پوچھا "تو کیا ہم پھاٹک والے کو اس حال میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں؟"

وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "میں بہت جلد' اس شخص سے "ملاقات" کرکے واپس آتا ہوں پھر ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس شخص کو تم اسی گاڑی میں لے آؤ۔" ساحل نے تجویز دی "ہماری گاڑی سڑک سے ہٹ کر کھڑی ہے۔ گاڑی کے اندر گن پوائنٹ پر اس سے ہر بات پوچھی جاسکتی ہے اور اگر کسی ہنگامی حالت میں ہمیں آگے بھی بڑھنا پڑگیا تو ہمارے لیے بہت آسانی رہے گی۔"

ساحل کی تجویز میرے دل کو لگی۔ اس نے بڑی ذہانت کی بات کی تھی اور یہ ذہانت برمحل تھی۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "تم ایک عقل مند لڑکی ہو!"

"صرف عقل مند؟" وہ شرارت سے مجھے گھورنے لگی۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلا کر کہا "تم عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ عقل بند بھی ہو۔"

وہ چونک کر بولی "یہ عقل بند کیا ہوتا ہے؟"

"دوسروں کی عقل بند کرنے والے کو "عقل بند" کہتے ہیں۔"

"میں نے تو کسی کی عقل' بند نہیں کی۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو؟"

میں نے پوری دیانت داری سے کہا "میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا ساحل! تم اتنی حسین' اتنی متین اور اتنی ذہین ہو کہ کسی بھی عقل مند کے ہوش اڑا سکتی ہو' اس کی عقل کو بند کرسکتی ہو۔ تمہارے پاس حسن کا جادو ہے اور تم اس جادو کا استعمال بھی جانتی ہو۔"

میں روانی میں بتا نہیں کیا کیا بول گیا تھا۔ ساحل نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور شرارت آمیز انداز میں بولی "میں تو اس وقت مانوں گی جب یہ جادو تم پر اثر دکھائے گا!"

"میں اس بندے کو لے کر آرہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں پجارو سے نکل آیا۔

اپنے عقب میں مجھے ساحل کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ہنسی میں بڑی نغمگی تھی' اس کی آواز میں بڑا ترنم تھا۔ وہ بولتی تھی تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ قدرت نے اسے حسن' نزاکت اور ذہانت سے خوب نواز رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چت کبرے چہرے والا دراز قامت شخص ہماری پجارو میں موجود تھا۔ اس مرتبہ ساحل پسنجرز سیٹ پر آگئی تھی اور میر بخش اس شخص کے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں چلا گیا تھا۔ میر بخش نے اس دھبے دار شخص کو پجارو کے فرش پر سیٹوں کے درمیان لٹالیا اور کلاشنکوف کے بجائے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں نے گردن موڑ کر اس شخص سے پوچھا "کون ہو تم؟"

جواب دینے کے بجائے وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مختلف قسم کے تاثرات آپس میں گڈمڈ ہورہے تھے۔ مجھے یوں بھی محسوس ہوا کہ وہ بہت خوف زدہ ہے اور مجھ سے رحم کی اپیل کررہا ہے۔ کبھی ایسا لگتا' وہ عیاری سے بچ نکلنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ کسی موقع کی تاک میں ہے تاکہ بازی پلٹ سکے۔

میر بخش نے اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا "ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم سائیں کے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو ورنہ پھر مرنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"بھگوان کے لیے مجھے زندہ چھوڑ دو۔" وہ لرزیدہ آواز میں بولا "میں یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔"

اس شخص کے پہلے جملے نے ہم تینوں کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اپنی جاں بخشی کے لیے "بھگوان" کا واسطہ دیا تھا۔ یہ اس کا ایک بے اختیاری عمل تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہندو تھا۔

میرا ذہن اس وقت برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میر بخش نے اس کی گردن پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا "ہم یہاں سے بہت دور تو تمہیں پہنچا ہی دیں گے کیونکہ تم سیدھی طرح زبان کھولتے نظر نہیں آرہے۔"

میں نے اپنے خدشات کی تصدیق کے لیے سرسراتی ہوئی آواز میں اس شخص سے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟" میرے لہجے میں اتنی سنگینی اور سفاکی تھی کہ وہ خاموش نہ رہ سکا۔

"میں... بوٹا سنگھ ہوں۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا

"تم بوٹا سنگھ نہیں بلکہ منگل سنگھ ہو۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

میر بخش نے میری بات پر ردا چڑھایا "تم ایک خطرناک ڈاکو ہو۔ تم نے اپنے ساتھی کی مدد سے ایک لڑکی کو اغوا کر رکھا ہے۔"

اندھیرے میں چلایا ہوا میرا تیر تو نشانے پر بیٹھا ہی تھا'

میر بخش کے انکشافات نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں منمنایا۔

"آ... آ... آپ کو ہمارے بارے میں... کیسے پتا چلا؟"

ساحل نے نفرت سے اسے گھورتے ہوئے اس "کارِ خیر" میں اپنا حصہ ملایا "تم لوگوں نے جس لڑکی کو اغوا کیا ہے اس کا نام ممتاز ہے۔ وہ "نبی سر" کے ایک صاحبِ حیثیت شخص قاضی سلطان کی بیٹی ہے۔ تم نے ممتاز کی رہائی کے بدلے قاضی سلطان سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ ہمارے ان پے در پے حملوں سے بوکھلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں موجود وحشت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کچھ کہے بھی یا نہ کہے۔ بالآخر اس نے خوف زدہ نظر سے ہم تینوں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ لوگوں کا تعلق پولیس سے ہے؟"

"ہاں۔" میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلا دیا "ہم پولیس والوں سے گہرے مراسم رکھتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم ڈی ایس پی کے پرائیویٹ بنگلے پر موجود تھے۔ یہ وہی ڈی ایس پی ہے جس کی نگرانی میں تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے "شادی پلی" کی سرحد پر ناکا لگایا گیا ہے۔"

اس کی بلیک اینڈ وہائٹ صورت پر سرسوں پھول گئی۔ میں نے اس کے چہرے کو بلیک اینڈ وہائٹ اس لیے کہا ہے کہ رنگ تو اس کا گندمی تھا تاہم بھلبھری کے سفید دھبوں کی وجہ سے وہ سیاہ نظر آتا تھا۔ یہ بھی ایک بہت عجیب و غریب اور گندا مرض ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ سب سے خطرناک اور کریہہ الذکر وہ قسم ہے جو بالآخر کوڑھ (جذام) میں بدل جاتی ہے۔ انسانی جلد پر نمودار ہونے والے یہ سفید دھبے دبے پاؤں اپنا کام دکھاتے ہیں اور مریض بے خبری میں مارا جاتا ہے۔ ان دھبوں کا پھیلاؤ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے لیکن چونکہ ان میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس لیے مریض زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوتا۔ وہ یہی سوچتا ہے، زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا؟ یہی ہو گا نا کہ میرا پورا وجود سفید ہو جائے گا۔ ہو جائے! وہ جم کر اس مرض کا علاج نہیں کرواتا اور ڈاکٹر تبدیل کرتا رہتا ہے۔ بالآخر ایک روز اسے بڑے بھیانک انجام سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

گزرے زمانوں میں کوڑھ کے مریضوں کو شہر سے باہر ویران کھنڈروں اور غاروں میں چھوڑ دیا جاتا تھا تاکہ صحت مند لوگ کسی قسم کے وبائی حملے سے محفوظ رہیں۔ اس مرض میں مبتلا شخص کی ہڈیاں اندر ہی اندر گھل جاتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔

اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ خطرناک ڈاکو منگل سنگھ اس وقت ہمارے رحم و کرم پر تھا اور ممتاز نامی وہ اغوا شدہ لڑکی منگل سنگھ کے ساتھی گنڈا سنگھ کی کسٹڈی میں تھی۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر منگل سنگھ سے پوچھا۔

"ممتاز کہاں ہے؟"

اس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا تو میر بخش نے اپنے پاؤں کو اس کی گردن پر اس طرح مسلا جیسے کوئی سگریٹ نوش ختم شدہ سگریٹ کے ٹوٹے کو مسلتا ہے۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ تاہم منگل سنگھ کی کراہ پچارو سے باہر نہ جا سکی۔

میں نے میر بخش کی جانب دیکھتے ہوئے آنکھ ماری اور گمبھیر لہجے میں کہا "اگر اب منگل سنگھ نے میرے کسی بھی سوال کا جواب دینے میں پس و پیش سے کام لیا تو تم بے دریغ فائر کر دینا۔"

اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ منگل سنگھ خوف کی شدت سے تھرتھرانے لگا۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "مہاراج! مجھے چھما کر دیں۔ میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں، آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"ہمیں سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے غراتے ہوئے کہا "بس تم سے جتنا پوچھا جائے، اس کا جواب دو۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "اور یہ تم بار بار بھگوان کو بیچ میں نہ لاؤ۔ بہت زیادہ قسمیں کھانے والا شخص مستند جھوٹا ہوتا ہے۔"

"پھر آپ کو میری بات کا یقین کیسے آئے گا؟"

میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا "میں نے بتایا ہے نا، قسم یا سوگند کسی شخص کے سچا ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ عام طور پر وہی افراد زیادہ قسمیں اٹھاتے ہیں جنھوں نے کسی جھوٹ کو چھپانا ہوتا ہے۔ جھوٹے اور مکار افراد اپنے مفاد کی خاطر کھو کھلی قسموں کا سہارا لے کر خدا، بھگوان، ایشور اور لارڈ آف لارڈز کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔"

الحمدللہ میں ایک مسلمان ہوں اور ایک خدا پر یقین کامل رکھتا ہوں۔ وہ خدا جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ منگل سنگھ سے بات کرتے ہوئے میں نے آخری جملہ محض خانہ پری کے لیے ادا کیا تھا۔ اس دنیا میں بسنے والے

انسانوں کے مجموعی اور انفرادی تاثر، نظریات اور خیالات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا!

منگل سنگھ میری ڈانٹ پھٹکار اور میر بخش کی دھونس سے راہِ راست پر آ گیا۔ میں نے اسے آمادہ تعاون دیکھا تو اپنا سوال دہرا دیا "ممتاز کہاں ہے؟"

"وہ گنڈا سنگھ کے پاس ہے۔" اس نے بتایا۔

"اور وہ پاز سنگھ کہاں ہے؟"

"ادھر ریلوے کوارٹر میں۔" اس نے گردن کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے بتایا۔

میں نے پوچھا "اس کوارٹر میں اور کون کون موجود ہے؟"

"گنڈا سنگھ اور ممتاز کے علاوہ پھاٹک والا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

وہ بڑی شرافت سے میرے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ جب کسی کی جان پر بن آئے تو بڑے سے بڑا "غیر شریف" انسان بھی شرافت کے مظاہرے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں نے کہا "پھاٹک والے ریلوے ملازم کو تم لوگوں نے یرغمال بنا رکھا ہے!"

"ہمارے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔" اس نے بتایا۔ میر بخش نے اس کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ قدرے کم کر دیا تھا چنانچہ وہ بہ آسانی بول رہا تھا۔ اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "اچانک ہماری جیپ میں کوئی پیچیدہ قسم کی خرابی پیدا ہو گئی جو باوجود کوشش کے بھی ہم سے دور نہ ہو سکی۔ ہمیں پولیس والوں کی دسترس سے نکلنے کے لیے فوری طور پر کسی گاڑی کی ضرورت تھی۔ ہم نے پھاٹک والے کو زیر کیا پھر پھاٹک بند کر کے کسی شکار کا انتظار کرنے لگے۔ اس کارروائی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے ہاتھ میں سگنل لیمپ بھی اٹھا لیا تھا۔"

"اور پھر تمہیں شکار نظر آ گیا؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا اور پوچھا "تم کتنی دیر سے سگنل لیمپ تھامے پھاٹک کے پاس کھڑے تھے؟"

"میں آپ کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دیکھنے کے بعد ہی وہاں کھڑا ہوا تھا۔" اس نے بتایا "ویسے ہمیں یہاں پہنچے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"

میں نے پوچھا "اس کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ جو فور وہیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کھڑی ہے، تم لوگ اسی میں یہاں تک پہنچے ہو؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

"کوارٹر میں موجود تمہارے ساتھی گنڈا سنگھ کے پاس کس قسم کا اسلحہ موجود ہے؟"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے بتایا "گنڈا سنگھ کے پاس صرف ایک رائفل ہے۔"

"تم جھوٹ تو نہیں بول رہے؟" میر بخش نے اس کی گردن کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"بھگوان کی سو..." وہ کہتے کہتے رک گیا پھر سنبھل کر بولا "میں سچ کہتا ہوں، ہمارے پاس اسلحے کے نام پر بس یہی دو ہتھیار تھے۔ میرا ریوالور تو آپ چھین ہی چکے ہیں۔ رائفل وہاں کوارٹر میں گنڈا سنگھ کے پاس ہے۔"

میں نے ریلوے کوارٹر کی جانب نگاہ دوڑائی اور ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "تم کافی دیر سے ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ گنڈا سنگھ کو تمہاری جانب سے تشویش تو ہو گی؟"

"ہاں جی، وہ پریشان ہو رہا ہو گا۔" منگل سنگھ نے تائید کی۔

میں نے کہا "وہ تمہاری خیر خبر لینے کیوں نہیں نکلا؟"

"ہمارے درمیان یہ طے ہے کہ جب تک میں کوارٹر کے سامنے جا کر مخصوص انداز میں سیٹی نہیں بجاؤں گا، وہ کوارٹر سے باہر نہیں نکلے گا۔" منگل سنگھ نے بتایا "چاہے مجھے کتنی بھی دیر ہو جائے۔ وہ میری ہدایات پر عمل کرے گا۔ میں اپنے گروہ کا سردار ہوں۔ سب کو میری بات ماننا پڑتی ہے۔"

"تم ایک ایسے گروہ کے سرغنہ ہو جو صرف ایک فرد پر مشتمل ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یعنی بائیس سالہ گنڈا سنگھ۔ تمہارے گروہ کے تین افراد تو پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے، جب کنری میں پولیس نے تمہارے ڈیرے پر چھاپا مارا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

وہ حیرت سے بھرپور نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا "آپ کو تو ایک ایک بات معلوم ہے۔"

"ہمیں ایک ایک نہیں بلکہ آدھی آدھی اور چوتھائی چوتھائی بات بھی معلوم ہے۔" میں نے رعب دار لہجے میں کہا "تم کسی غلط فہمی میں رہتے ہوئے غلط بیانی سے کام لینے کی کوشش نہ کرنا منگل سنگھ۔"

اس نے پوچھا "آپ ہیں کون لوگ۔ آپ پولیس والے تو نہیں لگتے!"

میں نے کہا "ہم پولیس والے نہیں لگتے بلکہ ہم پولیس والوں کے بہت کچھ لگتے ہیں۔"

"میں سمجھ نہیں سکا۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"میں سمجھاتا ہوں منگل سنگھ۔" میں نے اس کے غبارے کی ساری ہوا خارج کرتے ہوئے کہا "تم نے قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو اغوا کرکے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کررکھا ہے۔ سلطان نے تمہارے مطالبے اور دھمکی میں آئے بغیر پولیس والوں سے رابطہ کیا۔ ایس پی عمرکوٹ سے اس کی گہری شناسائی بلکہ رشتے داری ہے۔ اسی لیے ایس پی کے حکم پر ایک ڈی ایس پی نے ناکا لگا کر تمہاری گرفتاری کا اہتمام کیا تھا۔ بس تم یوں سمجھو کہ ہم ایس پی عمرکوٹ کے خاص بندے ہیں۔"

اس کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ میں نے اے ایس آئی جمشید احمد' تھانا انچارج شادی پلی اور ہوس پرست مرتضیٰ ڈی ایس پی سے حاصل ہونے والی مفید معلومات سے منگل سنگھ کو مشکل میں ڈال دیا۔ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے بتاچکا تھا کہ جب تک وہ پھاٹک والے کے کوارٹر کے سامنے جاکر مخصوص انداز میں سیٹی نہیں بجائے گا' اس کا ساتھی گنڈا سنگھ اپنے طور پر کوئی کارروائی کرے گا اور نہ ہی وہ کوارٹر سے باہر آئے گا اس لیے میں مغویہ ممتاز اور ریرغمالی پھاٹک والے کی طرف سے بے فکر ہوگیا۔ ہم پجارو میں بیٹھے جس انداز میں گفت و شنید کررہے تھے وہ خاصا محفوظ طریقہ تھا۔ پاس سے گزرنے والی کوئی گاڑی ہماری وجہ سے تشویش میں مبتلا نہیں ہوسکتی تھی۔ ممتاز اور پھاٹک والے کی جان کی سلامتی کا یقین مجھے منگل سنگھ سے بات چیت پر اکسا رہا تھا۔

میں نے سخت لہجے میں اس سے سوال کیا "جو ٹویوٹا جیپ کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ خراب حالت میں کھڑی ہے وہ بھی تم لوگوں نے کسی سے چھینی ہی ہوگی؟"

"آپ نے بالکل درست کہا ہے۔" اس نے تصدیق کی "ایک سال پہلے میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ایک برات کو لوٹا تھا۔ لوٹ کے مال میں یہ جیپ بھی شامل تھی۔ اس وقت سے یہ میرے پاس ہے مگر اس وقت مجھے اس کی اشد ضرورت تھی تو اس نے جواب دے دیا۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا "بس جی' سارا مقدر کا کھیل ہے۔"

"کبھی تھانا' کبھی جیل ہے۔" مہر بخش نے طنزیہ لہجے میں ٹکڑا چسپاں کیا۔

میں نے کہا "منگل سنگھ! میری معلومات کے مطابق تم ممتاز کو اغوا کرکے "نبی سر" سے اپنے ڈیرے واقع کنری لے گئے تھے۔ پولیس والوں نے وہاں ریڈ کیا تو تم ایک خون ریز مقابلے کے بعد کنری سے عمرکوٹ کی طرف نکل گئے پھر پولیس کی ہائی کمان کو خفیہ اطلاع ملی کہ گزشتہ رات (اب چونکہ ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا اس لیے پچھلی شب کو گزشتہ رات کہا جاسکتا تھا) تم مغویہ اور اپنے ساتھی کے ہمراہ ایک جیپ میں عمرکوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانے والے ہو۔ تمہیں ضلعی سرحد کو شادی پلی کے مقام سے عبور کرنا تھا اسی لیے تم لوگوں کی گرفتاری کے لیے وہاں ناکا لگایا گیا مگر تم تو یہاں نظر آرہے ہو۔ یہ کیا ماجرا ہے؟"

منگل سنگھ ایک خطرناک مجرم اور سفاک ڈاکو تھا لیکن اس وقت اس کی گردن تیز دھار تلوار پر دھری تھی اس لیے اپنی جان کی سلامتی کے لیے وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سے تعاون کررہا تھا پھر ہمارے "تعارف" اور "کارکردگی" نے بھی اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ اس کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اس وقت وہ ایک درندہ صفت مجرم نہیں بلکہ رحم کا اپیل کنندہ نظر آرہا تھا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ انسان کو ہیرو سے زیرو ہوتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

منگل سنگھ نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا "ہمارا پروگرام تو یہی تھا کہ عمرکوٹ سے سیدھے میرپور خاص کی طرف نکل جائیں گے لیکن سجن دشمن سبھی کے ہوتے ہیں۔ اگر پولیس والوں کو ان کے کسی مخبر نے ہمارے منصوبے کی اطلاع پہنچادی تھی تو میرے بھی ایک "پولیس والے خیر خواہ" نے شادی پلی والے ناکے کے بارے میں بتا دیا تھا اس لیے ہم عمرکوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانے والے راستے پر نہیں گئے بلکہ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم عمرکوٹ سے پہلے "سامارو" جائیں گے پھر محمد رحیم کلری سے گزرنے کے بعد ایک نیم ہموار کچے راستے پر سفر کرتے ہوئے ضلع میرپور خاص میں داخل ہوجائیں گے لیکن اس ریلوے کراسنگ پر ہماری جیپ میں کوئی خرابی ہوگئی اور ہم نے مجبوراً پھاٹک والے کو زیر کرکے آپ کی گاڑی حاصل کرنے کے بارے میں سوچا اور....."

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مہر بخش بول اٹھا "اور اس سوچ پر عمل کرکے تمہیں منہ کی کھانا پڑی۔ ہے نا؟"

منگل سنگھ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "سائیں! میں اس وقت آپ کے قبضے میں ہوں۔ آپ چاہیں تو میری جان بھی لے سکتے ہیں لیکن میں بنتی کروں گا کہ اگر مصالحت کی کوئی راہ نکل آئے تو....."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تعاون طلب نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوچھا "تم کس قسم کی مصالحت چاہتے ہو؟"

"آپ پولیس والے نہ سہی مگر پولیس والوں کے قریبی ہیں۔" وہ کاروباری انداز میں بولا "یہ سارا کھٹ راگ ممتاز کی تلاش اور رہائی کے لیے پھیلایا گیا ہے۔ آپ لڑکی کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور ہم دونوں کو یہاں سے جانے کی اجازت دے دو۔"

میں نے کہا "اس ڈیل میں تو تمہارا بہت نقصان ہوجائے گا۔"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا "آپ کس نقصان کی بات کررہے ہو؟"

"تم نے مغویہ ممتاز کی رہائی کے لیے اس کے باپ قاضی سلطان سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اگر ہم ممتاز کو یونہی سوکھے سوکھے لے گئے تو یہ تمہارا نقصان ہی ہوا نا؟"

وہ بے بسی سے بولا "سائیں! جان بچی سو لاکھوں پائے۔ زندگی رہی تو میں اور کما لوں گا۔ آپ بتائیں' یہ سودا منظور ہے؟"

"تم خاصی بچکانا باتیں کررہے ہو۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

وہ متعجب انداز میں بولا "میں نے بچوں والی ایسی کون سی بات کہہ دی؟"

"اوئے گھامڑ!" میں نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا "اس وقت تم جس طرح ہمارے چنگل میں پھنسے ہوئے ہو اس پر تمہیں شکر کرنا چاہیے کہ ابھی تک زندہ سلامت ہو۔ ہم تم دونوں کی ٹانگیں توڑ کر ممتاز سمیت اس گاڑی میں ڈال کر پولیس ہیڈ کوارٹر لے جاسکتے ہیں۔ تم بارگیننگ کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہو۔ کیا سمجھے؟"

وہ حالات کی نزاکت کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا اسی لیے زیادہ چون و چرا نہیں کی اور دوستانہ انداز میں بولا "میرے پاس ایک اور پیش کش بھی ہے!"

اب میں نے اسے گھسنے کا ارادہ کرلیا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اس کی باتیں مجھے متاثر کررہی ہوں۔ اس طرح میں اس کی رہی سہی خطرناکی سے بھی آگاہ ہوسکتا تھا۔ ممتاز اور پھاٹک والے کی محفوظ سلامتی کے لیے منگل سنگھ کو ہر زاویے سے ٹھونک بجا کر دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"منگل سنگھ! تم کیا پیش کش کرنا چاہتے ہو؟"

وہ بولا "میں اپنی اور اپنے ساتھی کی جاں بخشی کے لیے مغویہ کے علاوہ آپ کو ایک بھاری رقم بھی دینے کو تیار ہوں۔"

"مثلاً کتنی بھاری رقم؟"

"پورے ایک لاکھ روپے نقد۔" اس نے چارا پھینکنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اپنے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات سجا لیے جیسے اس کی آفر میں مجھے بہت کشش دکھائی دی ہو۔ یہ وہی ڈاکو تھا جو ایک لڑکی کی زندہ واپسی کے لیے اس کے لواحقین سے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کررہا تھا۔ اب اس کی اپنی جان شکنجے میں آگئی تھی تو وہ ان پچاس لاکھ روپوں کے مطالبے سے تو دست بردار ہو ہی رہا تھا' اس کے ساتھ ساتھ مزید ایک لاکھ روپے دینے کو بھی تیار تھا گویا اس طرح وہ بیٹھے بٹھائے اپنا اکیاون لاکھ روپے کا نقصان کررہا تھا.... اور یہ خسارہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے برداشت کرنے کو تیار ہوا تھا۔

حضرت انسان بھی عجیب شے ہے۔ یہ مطلب براری کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔ جانور کو شعور نہیں دیا گیا۔ وہ صرف اپنے پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے جائز و ناجائز تگ و دو کرتا ہے مگر انسان اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود بھی بعض اوقات بہت پستی میں چلا جاتا ہے اور کچھ ایسا کر گزرتا ہے کہ انسانیت کو اس کے کرتوت پر نادم ہونا پڑتا ہے۔

میں نے منگل سنگھ کو بدستور خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا رکھتے ہوئے کہا "مجھے تمہاری یہ پیش کش منظور ہے مگر میں پہلے اپنی تسلی کروں گا۔"

"کس بات کی تسلی؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "صرف دو باتوں کی تسلی۔ نمبر ایک مغویہ صحیح سلامت ہے یا تم لوگوں نے اس کے ساتھ....."

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا "سائیں! فکر نہ کرو۔ لڑکی بالکل صحیح سلامت ہے۔ آپ اس سے بات چیت کرکے یقین کرسکتے ہیں۔ بس اتنے دنوں کی افراتفری میں اس کا لباس خاصا میلا ہوگیا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے فخریہ انداز میں اضافہ کیا "ہم جس لڑکی کو تاوان کی خاطر اغوا کرتے ہیں' اس کی عزت کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ اگر تاوان وصول ہونے کی صورت نظر نہ آئے اور ہماری جان

جانے کا اندیشہ پیدا ہوجائے تو ہم مغوی یا مغویہ کو قتل کردیتے ہیں مگر اس کی عزت سے کھیلنا گوارا نہیں کرتے‘ یہ ہمارا اٹل اصول ہے۔ عیاشی کے لیے ہم دوسرے راستے اختیار کرلیتے ہیں مگر اپنے اصولوں کو نہیں توڑتے۔“

اس ڈاکو نے جو اصول بیان کیا تھا‘ میں نے اس کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث میں پڑے بغیر اس سے استفسار کیا ”کنری میں پولیس مقابلے کے دوران میں تم پر ایسا وقت آیا تھا جب تمہاری جان خطرے میں پڑگئی تھی مگر تم نے مغویہ کو قتل کرنے کے بجائے اپنے ساتھ لے جانا ضروری سمجھا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”ہاں‘ ایک بہت ہی خاص وجہ ہے۔“ چیت کبرے ڈاکو منگل سنگھ نے سنجیدہ لہجے میں کہا ”جو لوگ اپنے تعلقات کے زعم میں ہمارا مطالبہ پورا کرنے کے بجائے پولیس کی مدد حاصل کرتے ہیں‘ وہ بہت جلد پولیس والوں کی جانب سے مایوس ہوکر ہمارے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں کیونکہ پولیس والے ان سے رقم تو اینٹھتے رہتے ہیں مگر کارروائی بالکل کھوکھلی کرتے ہیں۔ ان کے وعدوں سے دل برداشتہ ہوکر مغوی یا مغویہ کے لواحقین ہمارا ہر مطالبہ پورا کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں اور اس موقع پر ہم ان سے دوگنا رقم حاصل کرتے ہیں۔“

”اور اگر لواحقین کے پاس اتنی رقم نہ ہو تو؟“

”اس بات کا خیال ہم اغوا کی واردات کرنے سے پہلے خاص طور پر رکھتے ہیں۔“ منگل سنگھ نے بتایا ”ہم صرف مال دار اور صاحب حیثیت لوگوں پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں۔ میں جانتا ہوں‘ ممتاز کا باپ بہ آسانی ایک کروڑ روپے ادا کرسکتا ہے۔“

میں نے کہا ”پھر تو میں یہ کہوں گا کہ تمہارا ایک کروڑ ایک لاکھ روپے کا نقصان ہوگیا!“

میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس نے پوچھا ”آپ دوسری تسلی کس بات کی کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے اسے بتایا ”میں یہ یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم جو ایک لاکھ روپے مجھے دوگے وہ کہیں نقلی تو نہیں؟“

”ہم کبھی اصلی اور نقلی کے چکر میں نہیں پڑتے سائیں۔“ وہ بے پروائی سے بولا ”ہمارے پاس جو بھی رقم ہے وہ دوسروں ہی سے لوٹی ہوئی ہے۔ اب جو بھی ہو اصلی یا نقلی!“

میں نے پوچھا ”کیا وہ ایک لاکھ روپے کی رقم اس وقت تمہارے لباس میں موجود ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا ”نہیں‘ رقم ہماری جیپ میں رکھی ہے۔“

”اس کی گردن پر سے پاؤں اٹھالو میر بخش!“ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

میر بخش نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی‘ تاہم اس ڈاکو کو ریوالور کے نشانے پر رکھا۔ وہ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ منگل سنگھ نے جب مجھے آمادہ دیکھا تو دوستانہ انداز میں بولا۔

”آپ مجھے اس کوارٹر تک جانے کی اجازت دے دیں۔ میں مغویہ اور رقم کو آپ کے پاس لے آتا ہوں۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں چوٹ کی ”کیا میں شکل سے اتنا ہی احمق نظر آتا ہوں تمہیں؟“

”میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ دھبے دار منگل سنگھ نے کہا۔

”تم نے واقعتاً ایسی ہی بات کی ہے منگل سنگھ!“ میں نے کٹیلے لہجے میں کہا ”کیا میں اتنا ہی بے وقوف ہوں کہ تمہیں بہ آسانی اس کوارٹر تک جانے کی اجازت دے دوں تاکہ تم وہاں موجود رائفل کے بل بوتے پر مجھے کمزور بناسکو۔ تم ممتاز اور پھاٹک والے کی جان بھی لے سکتے ہو یا انہیں گن پوائنٹ پر رکھ کر وہاں سے فرار بھی ہوسکتے ہو!“

”میں نے جو کہا ہے اس پر عمل بھی کروں گا۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولا ”یہ میرا آپ سے وعدہ ہے.... ایک ڈاکو کا وعدہ۔ ہم لوگ اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے گردن تک کٹوا سکتے ہیں۔“

”لیکن میں ہرگز کوئی تجربہ نہیں کرسکتا!“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

وہ بولا ”پھر ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے۔ آپ لوگ مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر اس کوارٹر تک لے جائیں۔ میں محض مخصوص انداز میں سیٹی بجا کر اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کو کوارٹر سے باہر بلاؤں گا پھر آپ کی مرضی‘ جو بھی کرتے پھریں۔“

”ہاں‘ یہ معقول تجویز ہے۔“ میں نے کہا۔

میر بخش نے پوچھا ”سائیں! آپ نے کیا سوچا ہے؟“

میں نے کہا ”ساحل یہیں پجارو میں موجود رہے گی۔ تم منگل سنگھ کو کلاشنکوف کے نشانے پر رکھ کر کوارٹر تک لے جاؤ گے۔ یہ وہاں پہنچ کر مخصوص انداز میں سیٹی بجائے گا پھر اس سیٹی کی آواز سن کر گنڈا سنگھ جیسے ہی کوارٹر سے برآمد ہو‘ تم اسے بھی فائرنگ رینج میں لاسکتے ہو۔ اس دوران میں اگر

منگل سنگھ نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو تم اسے بے دریغ گولیوں سے بھون ڈالنا۔“

یہ بات میں نے منگل سنگھ کو خوف زدہ کرنے کے لیے کہی تھی ورنہ وہ کسی قسم کی مہم جوئی کے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ میر بخش اس عرصے میں میرے مزاج اور طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں خوامخواہ کی خون ریزی کا قائل نہیں۔ منگل سنگھ کو گولیوں سے بھوننے والی بات کو اس نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

اس نے پوچھا ”منگل سنگھ کا سدباب تو آپ نے بتادیا سائیں! لیکن اگر دروازے سے برآمد ہونے والے گنڈا سنگھ نے کسی قسم کی کوئی پھرتی دکھائی تو اس کو کس طرح کنٹرول کرنا ہوگا؟ اس کے پاس بھری ہوئی ایک رائفل بھی ہے!“

میں نے منگل سنگھ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”ویسے تو اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ گنڈا سنگھ کوئی چالاکی دکھا سکے کیونکہ منگل سنگھ کی سیٹی سن کر وہ یہی سمجھے گا کہ سب خیریت ہے۔ بہ فرض محال‘ اگر اس نے اسمارٹ بننے کی کوشش کی تو میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں تم سے پہلے ہی کوارٹر کے دروازے پر پہنچ جاؤں گا۔“

ہم اس پلاننگ کے عین مطابق پجارو سے باہر نکل آئے۔ میں نے ڈی ایس پی والا ریوالور ساحل کے پاس ہی رہنے دیا تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں وہ اسے استعمال کرسکے۔ منگل سنگھ سے چھینا ہوا ریوالور میں نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیا۔ ویسے مجھے امید نہیں تھی کہ اس کے استعمال کی نوبت آئے گی۔ ابھی تک ایک بات سراسر ہمارے حق میں جارہی تھی کہ اس سڑک پر اب تک کسی بھی جانب سے کوئی گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سڑک خاصی غیر مصروف تھی۔ اب صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ کسی ٹرین کی آمدوجامد کے آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

ریلوے ملازم کا وہ کوارٹر پھاٹک کے نزدیک ہی ریلوے کی پٹڑی سے نشیب میں بنا ہوا تھا۔ کمرے کے سامنے ایک چھوٹا سا لان نما احاطہ بھی نظر آرہا تھا۔ کھپریل کی چھت والا وہ اکلوتا کمرا اس وقت ہم سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے کے لیے دوسری جانب گھوم کر جانے کی ضرورت تھی۔ ہماری پجارو جس طرف کھڑی تھی وہاں سے کمرے کی عقبی دیوار نظر آتی تھی اسی لیے میں نے بہ آسانی منگل سنگھ کو ٹویوٹا فور وھیل ڈرائیو جیپ کو دیکھ لیا تھا۔ کمرے کی عقبی دیوار میں کوئی کھڑکی یا روشن دان موجود نہیں

تھا اس لیے امید کی جاسکتی تھی کہ گنڈا سنگھ نے اپنے ”مربی“ کے ساتھ ہونے والی کارروائی نہیں دیکھی ہوگی۔

میں جلد از جلد اس ٹنٹے کو نمٹانا چاہتا تھا۔ اس بات کا خارج از امکان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ تارا اینڈ کمپنی یا کوئی پولیس والا بیدار مغز افسر ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اس طرف آنکلتا۔ اس صورت میں ہماری مشکلات میں اضافہ ہوسکتا تھا۔

مجھے اس لیے بھی کوارٹر والے معاملے سے جلدی فارغ ہونا تھا کہ ساحل کو میں پجارو میں بالکل تنہا چھوڑ آیا تھا۔ اس کے پاس لاکھ ریوالور سہی مگر تھی تو وہ ایک لڑکی ہی۔ ابھی لڑائی بھڑائی کے کھلم کھلا معاملات سے اس کا ڈائریکٹ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس نے مارشل آرٹس اور جمناسٹک وغیرہ سیکھنے کی فرمائش کی تھی اور میں خلوص نیت سے اسے یہ فنون سکھانا بھی چاہتا تھا۔ وہ ایک قد آور اور چست وچوبند لڑکی تھی۔ بہت جلد ان فنون میں مہارت حاصل کرسکتی تھی۔ خاص طور پر مارشل آرٹس میں وہ بہت کامیاب رہتی۔ دراز قامتی اس کے لیے بہت سودمند ثابت ہوتی۔

ہم طے شدہ پروگرام کے تحت اپنی اپنی پوزیشن پر جاکر کھڑے ہوئے۔ میں نے منگل سنگھ کو سیٹی بجانے کا اشارہ کیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی پہلی دو دو انگلیوں کو منہ میں ڈالا اور زبان پر ان انگلیوں کا مخصوص دباؤ ڈالتے ہوئے سیٹی بجادی۔

وہ بہت ہی آزمائشی لمحے تھے۔ منگل سنگھ کا ساتھی گنڈا سنگھ کمرے سے نکلنے کے بعد کس ردعمل کا مظاہرہ کرتا‘ اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ منگل سنگھ نے ہمیں اس سیٹی کے بارے میں غلط اطلاعات فراہم کی ہوں اور اس کی آواز کے کچھ اور ہی معنی ہوں۔ بہرحال کچھ بھی ہوسکتا تھا اور جو کچھ بھی وہاں پیش آتا‘ میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے منگل سنگھ کی زبان پر اعتبار کیا تھا‘ اس کی نیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ نیت کو جاننے کا ابھی تک کوئی طریقہ‘ کوئی فارمولا ایجاد نہیں ہوا۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو دنیا میں کوئی کسی سے دھوکا نہ کھاتا۔ بے شک‘ اللہ ہی نیتوں کے حال جاننے والا ہے!

منگل سنگھ کی مخصوص سیٹی کے جواب میں پھاٹک والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے ایک نوجوان کی صورت دکھائی دی۔ وہ یقیناً گنڈا سنگھ تھا۔ گنڈا سنگھ نے اپنے دائیں ہاتھ میں رائفل تھام رکھی تھی۔ میں پوری

طرح کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے چوکس ہو گیا۔

گنڈا سنگھ نے اپنے سردار منگل سنگھ کو کلاشنکوف کے نشانہ پر بے بس دیکھا تو اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ مجھے محسوس ہوا' وہ کوئی سنگین قدم اٹھانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کے رائفل والے ہاتھ میں' میں نے واضح جنبش محسوس کی تاہم میر بخش اس دوران میں نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گنڈا سنگھ کو بھی کلاشنکوف کی ہلاکت خیز فائرنگ کی رینج میں لا چکا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کر لیا کہ اگر گنڈا سنگھ کا رائفل والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا تو میں اس کا سوا ستیاناس مار کر رکھ دوں گا۔ میں ایسی آڑ میں کھڑا تھا کہ گنڈا سنگھ میری وہاں موجودی سے بے خبر تھا۔

تاہم شانتی خیریت گزری۔ گنڈا سنگھ نے اپنے گرو کو گن پوائنٹ پر فکس دیکھ کر کسی قسم کی حماقت کا ثبوت نہیں دیا' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گنڈا سنگھ پر نظر پڑتے ہی منگل سنگھ نے اس کے لیے احکام جاری کر دیا تھا۔

"گنڈا سنگھ! رائفل پھینک کر باہر آ جاؤ۔"

گنڈا سنگھ کی عمر لگ بھگ بائیس سال تھی۔ وہ جسامت میں میرے اریب قریب تھا شاید اس لیے مجھ پر گنڈا سنگھ ہونے کا شبہ کیا گیا تھا۔ منگل سنگھ عمر اور قد کاٹھ میں میر بخش کے برابر تھا اور ساحل کو ممتاز سمجھا گیا تھا۔ یہ دونوں ڈاکو اور مغویہ ممتاز ہمیں ناکے پر پیش آنے والے حالات سے قطعی لاعلم تھے۔

گنڈا سنگھ نے اپنے پیر استاد کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ہاتھ والی رائفل کو ایک طرف پھینک کر کمرے سے باہر آ گیا۔ میر بخش نے کلاشنکوف کے اشارے سے گنڈا سنگھ کو منگل سنگھ کے قریب آنے کو کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں سنگھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔

اس دوران میں' میں بھی دیوار کی آڑ سے نکل کر سامنے پہنچ گیا۔ منگل سنگھ نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "سائیں! آپ کوارٹر کے اندر جا کر دیکھ لو۔ لڑکی وہاں موجود ہے اور صحیح سلامت بھی ہے۔ رقم میں آپ لوگوں کو ابھی دیتا ہوں۔"

گنڈا سنگھ اس صورتِ حال سے حیرت میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بازی کس طرح پلٹ گئی تھی۔ میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تم کوارٹر کے اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لو اور فوراً آ کر مجھے رپورٹ پیش کرو۔"

"جو حکم سائیں۔" وہ فرماں برداری سے بولا "ان کا کیا کرنا ہے؟" اس نے "سنگھ اینڈ کمپنی" کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے کہا "انہیں میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے منگل سنگھ والا ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ میں ان دونوں کو بغیر کسی ہتھیار' اوزار کے چٹکیوں میں مسل کر رکھ سکتا تھا لیکن خواہ مخواہ کی نمائشی ہنگامہ آرائی کے حق میں' میں کبھی بھی نہیں رہا۔ ریوالور کو بھی میں نے ڈاکوؤں پر رعب طاری کرنے کے لیے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

منگل سنگھ کلاشنکوف بہ دست کوارٹر کے اندر داخل ہونے لگا تو میں نے کہا "تم نے صرف مغویہ ممتاز ہی کی خیریت معلوم نہیں کرنا بلکہ پھاٹک والے ریلوے کے ملازم کی بھی خبر گیری کرنا ہے' ان دونوں کی سلامتی کے بعد ہی ہم ان سنگھوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔"

میر بخش اثبات میں گردن ہلا کر کوارٹر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ ایک بات کا میں نے اندازہ لگایا کہ کوارٹر کے اندر مغویہ اور ریر غمالی آزاد حالت میں موجود نہیں تھے ورنہ گنڈا سنگھ کے کوارٹر سے باہر آتے ہی کوارٹر کے اندرونی حصے میں کسی قسم کی ہلچل کے آثار نظر آ جاتے۔ اندر مکمل سناٹا اور سکون طاری تھا۔

پانچ منٹ بعد میر بخش کمرے سے باہر نکلا اور میرے پاس آ کر بولا "سائیں! اندر وہ دونوں خیریت سے ہیں تاہم ان مردودوں نے انہیں اچھی طرح باندھ کر ڈالا ہوا ہے۔"

میر بخش میرے اندازے کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تم نے جکڑے ہوئے مغویہ اور ریر غمالی کو بتا دیا ہے کہ ان کی مصیبت ختم ہو گئی ہے اور وہ اب رہا کیے جانے والے ہیں؟"

"میں نے انہیں اچھی خاصی تسلی دے دی ہے۔" میر بخش نے بتایا۔

میں منگل سنگھ کی جانب متوجہ ہو گیا "تم نے اپنی پیش کش کی پہلی قسط تو ادا کر دی یعنی ایک کروڑ روپے کا نقصان اٹھایا۔ اب دوسری قسط کے قرض سے بھی سبک دوش ہو جاؤ۔ ایک لاکھ روپے کا بوجھ کب تک ساتھ ساتھ اٹھائے پھرو گے!"

وہ خاموشی کے ساتھ ٹویوٹا جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ گنڈا سنگھ دو قدم کے فاصلے سے اس کی تقلید کر رہا تھا۔ میر بخش نے مسلسل ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا تھا۔ ان کی طرف سے معمولی سی کوئی غلط حرکت بھی انہیں ناقابلِ تلافی

نقصان سے دوچار کر جاتی۔

فور وہیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کے نزدیک پہنچ کر منگل سنگھ نے اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میر بخش نے گرج دار آواز میں کہا "خبردار!"

منگل سنگھ کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ میکانکی انداز میں رک گیا۔ میر بخش نے خوفناک لہجے میں دریافت کیا "کیا کسی چالاکی کا ارادہ ہے۔ یاد رکھو' میں کسی بھی ہوشیاری کے آثار دیکھتے ہی بے دریغ دونوں کو گولیوں میں پرو دوں گا۔ تمہارے جسموں میں اتنے سوراخ نمودار ہو جائیں گے کہ آرپار دیکھنا کچھ مشکل نہیں رہے گا۔"

میں نے منگل سنگھ سے پوچھا "تم اپنی جیب سے کیا نکالنے والے تھے؟"

"چابی۔" اس نے شکست خوردہ انداز میں جواب دیا۔

"چابی!" میں نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا "کیسی چابی۔"

اس نے بتایا "ہماری گاڑی میں ایک خفیہ خانہ ہے۔ ایک لاکھ کی وہ رقم میں نے اسی خانے میں محفوظ کر رکھی ہے۔ وہ خانہ لاک ہے اور چابی سے کھلتا ہے۔"

منگل سنگھ کی اس وضاحت پر اس کا نوجوان ساتھی گنڈا سنگھ حیرت آمیز نظر سے اسے تکنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ خفیہ خانے کے راز سے گنڈا سنگھ واقف نہیں تھا۔ اس خانے کا ذکر اس کے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں تھا۔

میں نے منگل سنگھ کی بات پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کیا تھا۔ وہ اس وقت کسی لٹے پٹے شخص کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے ہارے ہوئے جواری سے بھی تشبیہ دی جا سکتی تھی اور زخمی سانپ کہنا بھی مناسب تھا۔ ایسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ وہ "ہم تو ڈوبے ہیں صنم...." کے مصداق کسی بھی قسم کی کوئی حرکت فرما سکتے ہیں۔

یہ عین ممکن تھا کہ وہ اس خفیہ خانے میں سے ایک لاکھ کی رقم کے بجائے کوئی ہتھیار برآمد کر لیتا اور اچانک ہم پر فائرنگ شروع کر دیتا۔ ایسی صورت میں ہماری جانوں کو بے حد خطرہ لاحق ہو جاتا۔ ویسے یہ تو مجھے یقین تھا کہ وہ چابی کا بہانہ کر کے اپنی جیب میں سے کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں نکال سکتا تھا۔ میں نے اس کا بدن ٹٹول کر اس کے پاس کسی آتشی اسلحے کی عدم موجودگی کا یقین کر لیا تھا۔ یہی کارروائی میں نے تھوڑی دیر پہلے گنڈا سنگھ کے ساتھ بھی کر ڈالی تھی۔

میں نے منگل سنگھ سے کہا "تم چابی میرے ساتھی کو دے دو اور اس خفیہ خانے کی نشان دہی بھی کر دو۔ رقم یہ خود ہی نکال لے گا۔"

کسی قسم کا پس و پیش کیے بغیر منگل سنگھ نے مذکورہ چابی اپنی جیب سے نکال کر میر بخش کے حوالے کر دی پھر اسے بتانے لگا کہ وہ خفیہ خانہ گاڑی کے کس حصے میں واقع ہے۔ میں نے منگل اینڈ گنڈا سنگھ کو کور کر لیا اور میر بخش جیپ کی تلاشی میں مصروف ہو گیا۔

اس تلاشی کا مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔ میر بخش نہ صرف بہ آسانی خفیہ خانے تک پہنچ گیا بلکہ اس نے منگل سنگھ کی بتائی ہوئی رقم بھی دریافت کر لی۔

منگل سنگھ نے کہا "گن کر دیکھ لو سائیں۔ پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔"

وہ استعمال شدہ نوٹ تھے۔ ان میں ایک ہزار' پانچ سو اور سو والے تینوں قسم کے نوٹ شامل تھے۔ میں نے انڈیا میں پانچ ہزار روپے کا نوٹ بھی دیکھا تھا مگر پاکستان میں ابھی تک مجھے ایک ہزار روپے سے بڑا نوٹ نظر نہیں آیا تھا۔ ازاں بعد میر بخش نے مجھے بتایا کہ پاکستانی کرنسی کا سب سے بڑا نوٹ ایک ہزار والا ہی ہے۔

منگل سنگھ نے ہمیں جو رقم فراہم کی تھی یا یوں سمجھ لیں کہ اپنی جان بخشی کے لیے جو نذرانہ پیش کیا تھا' وہ کوئی قرض کی وصولی تو تھی نہیں جو میں ایک ایک نوٹ گن کر شمار کرتا۔ مالِ مفت' دلِ بے رحم کے مطابق اس رقم کو گنے بغیر میں نے منگل سنگھ سے کہا۔

"تم کہہ رہے ہو' ایک لاکھ ہیں تو پھر ایک لاکھ ہی ہوں گے۔"

"تم مسلمان لوگ ہم ہندوؤں پر بھروسا نہیں کرتے نا۔" وہ نیم طنزیہ انداز میں بولا "ہمیں چالاک بنیا کہتے ہو اس لیے رقم گن کر اپنی تسلی کر لیتے تو زیادہ اچھا تھا۔"

میں نے کہا "ہر قوم میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ کسی فردِ واحد کے ذاتی کردار یا اعمال پر اس قوم کے لیے کوئی فارمولا تیار نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ایک طویل عرصہ ہندوستان میں گزارا ہے۔ یہاں مجھے درجنوں بدکردار' کرپٹ اور جرائم پیشہ ہندو پنڈت نظر آئے ہیں۔ چند مخلص' باکردار اور مثالی ہندوؤں سے میری دوستی بھی رہی ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے میری دوستی اور تعلق کی خاطر اپنا لاکھوں کا نقصان کیا۔ اپنے ہی ہندو بھائیوں کی دشمنیاں مول لیں اور وہاں کی جنونی قسم کی مسلم کش طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ میرے نظریات اور خیالات بلکہ تجربات عام قسم کے لوگوں سے خاصے مختلف ہیں۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اچھے یا برے اور یہ اچھے برے انسان دنیا کے ہر خطے میں پائے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر انسان اچھے یا برے ہوتے ہیں اس لیے کسی قوم یا مذہب کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ کوئی بھی مذہب برائی کی تعلیم نہیں دیتا۔ دنیا میں پائے جانے والے تمام مذاہب کی تعلیمات چوری' ڈاکا' قتل و غارت گری' جھوٹ' مکاری' دل آزاری اور تخریبی کارروائیوں سے روکتی ہے۔ امن و سکون' صلہ رحمی' تعاون' مدد' مظلوم کی داد رسی' ظالم کی سرکوبی اور تمام تعمیری کاموں کی تلقین کرتی ہے۔ مذہب کسی بھی صورت انسان کو برا نہیں بناتا۔ اس کے اپنے اعمال و کردار ہی اس کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔"

منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک مسلمان اس قسم کے آزاد خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ بات آزادہ خیالی کی نہیں ہوتی۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی انسان کے دل و دماغ میں کتنی گنجائش ہے۔ تنگ نظر لوگ کسی بھی قوم کی بدنامی کا سبب ہوتے ہیں جب کہ وسیع النظر افراد اپنی قوم اور مذہب کا سربلند کرتے ہیں..... جن قوموں نے دنیا میں فلاح و ترقی پائی ہے ان قوموں میں وسیع دل و دماغ رکھنے والے افراد کی کمی نہیں رہی۔ فتنہ و فساد پھیلانا بہت آسان کام ہے کیوں کہ ہر تخریبی کام سہل ہی ہوا کرتا ہے۔ امن و آشتی اور بھائی چارے کی فضا قائم کرنا محنت طلب کام ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہی ہے اور حقیقت آنکھیں بند کر لینے سے بدل نہیں جاتی۔

اس وقت دنیا میں جتنے مسلمان موجود ہیں' وہ اگر ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر ایک دائرے میں کھڑے ہو جائیں تو ان کے حصار میں دنیا کی باقی تمام اقوام نظر آئیں گی۔ کسی بھی محیط' دائرے' حصار یا حدود میں موجود اشیا اس محیط' دائرے حصار یا حدود سے زیادہ طاقت ور نہیں ہو سکتیں مگر وہ ہاتھ کہاں سے آئیں جو مضبوط کڑیوں کا کردار ادا کر کے ایک سیسہ پلائی ہوئی زنجیر کو تخلیق دے سکیں۔ کسی بھی زنجیر کی تمام کڑیاں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ہم تو پاکستانی ہیں' افغانی ہیں' ایرانی' عراقی ہیں' شامی ہیں' مصری ہیں' عرب ہیں' عجم ہیں' کالے ہیں' گورے ہیں' مفلوک الحال ہیں' مال دار ہیں' ہم سب کچھ ہیں مگر ایک نہیں ہیں۔ ایک نہیں ہیں تو نیک نہیں ہیں۔

کاش' اے کاش! ہم کچھ بھی نہ ہوتے' صرف مسلمان ہی ہوتے!

منگل سنگھ کی حیرت رفع نہ ہو سکی تو اس نے پوچھا "سائیں! آپ اپنے حلیئے سے مولوی تو دکھائی نہیں دیتے مگر باتیں بڑی عالمانہ کر رہے ہیں۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ اپنی وضع قطع سے نظر آنے والے ملّا اور ایک حقیقی عالم دین میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس معاملے میں لب کشائی کی گنجائش نہیں تھی چنانچہ میں نے منگل سنگھ کو کوئی جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب جانا۔

وہ بولا "سائیں! میں نے تو اپنا وچن (وعدہ) پورا کر دیا۔ مغویہ ممتاز' ریغمالی پھاٹک والا اور ایک لاکھ کی رقم میں آپ کے حوالے کر چکا ہوں۔ اب آپ کی باری ہے۔ میں نے سن رکھا ہے کہ مسلمان اپنے وچن کے پالن کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتا ہے؟"

اس نے مجھے ایک بند گلی میں گھیر لیا تھا یا یوں سمجھ لیں کہ اس وقت میں فیصلے کے پھندے میں "ہاں اور "نہ" کے درمیان سوالیہ نشان کی صورت جھول رہا تھا۔ میں نے اس کشمکش میں جو فیصلہ کیا وہ میرے ضمیر کی آواز تھی۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط' اس چکر میں الجھے بغیر میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"منگل سنگھ! تم نے بالکل درست سنا ہے۔ ایک سچا مسلمان اپنے وعدے کو نبھانے کے لیے گردن کٹوا سکتا ہے۔"

"پھر ہمارے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟"

میں نے کہا "تم دونوں یہاں سے جا سکتے ہو لیکن جانے سے پہلے تمہیں ایک چھوٹا سا کام کرنا ہو گا۔"

"وہ کیا سائیں؟" منگل سنگھ نے حیرت سے پوچھا۔

میں نے ٹویوٹا جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم لوگ گاڑی کو دھکیل کر جس طرح یہاں لائے ہو اسی طرح دھکیل کر واپس سڑک پر پہنچاؤ گے۔ میں تمہیں اس کا مناسب معاوضہ بھی دوں گا۔"

میں نے یہ بات ایک خاص مقصد کے تحت کہی تھی۔ میں کسی بھی صورت میں پھاٹک والے غریب انسان کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ گاڑی اس کے کوارٹر کی پشت سے لگی کھڑی رہتی تو اس کی پوزیشن کمزور ہو سکتی تھی۔ گاڑی کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص منصوبہ ترتیب پا چکا تھا۔

منگل سنگھ نے میری بات سن کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "اس سے کیا فائدہ ہو گا؟"

"تم فائدے اور نقصان کے چکر میں نہ پڑو۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "جو میں تم سے کہہ رہا ہوں' اس پر عمل کرو۔"

گنڈا سنگھ نے معلوم کرنا چاہا "آپ ہمیں اس کام کا کیا معاوضہ دیں گے؟"

"یہ کام مکمل ہونے کے بعد پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں ٹویوٹا جیپ کو دھکا لگانے لگے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ کچھ دیر کی مشقت کے بعد وہ گاڑی کو سڑک پر' میرے مطلوبہ مقام تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دراصل سڑک سے نیچے کچا تھا اور جیپ کو میں نے ایسی پوزیشن میں کھڑا کیا تھا کہ دیکھنے میں یوں محسوس ہو' انتہائی مجبوری کی حالت میں اسے سڑک سے نیچے اتارا گیا ہو گا۔

میں جیپ سے نیچے اترا اور منگل سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم نے اپنی ڈیوٹی انجام دے لی۔ اب تمہیں اس کا معاوضہ بھی ملنا چاہیے۔"

وہ پتا نہیں' میری اس معاوضے والی بات کا کیا مطلب نکال بیٹھا' اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ اس دوران میں کلاشنکوف بردار میر بخش بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ جرائم پیشہ افراد عموماً ایسے موقع پر اپنا اس قسم کا کوئی وعدہ "ایفا" کرنے کے لیے سامنے والے کی جان لے لیتے ہیں اور اس پر احسان بھی جتاتے ہیں کہ انہوں نے اس شخص کو ایک کٹھن زندگی سے نجات دلا دی۔

میر بخش کو سامنے دیکھ کر منگل سنگھ بھی یہی سمجھا تھا کہ شاید اب دونوں کو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ ان دونوں کی ساری زندگی جرائم کی دلدل میں گزری تھی۔ وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب بھی تھے مگر میں جرائم پیشہ تھا اور نہ ہی میرا ساتھی میر بخش اس قبیل سے تعلق رکھتا تھا۔

میں نے منگل سنگھ سے لیے ہوئے ایک لاکھ روپے کے نوٹ واپس اسے دیتے ہوئے کہا "یہ تم لوگوں کا معاوضہ ہے۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس نے نوٹ پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ رقم اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "رکھ لو۔ میں مذاق نہیں کر رہا۔ واقعی یہ روپے تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔"

اس نے لرزتے ہاتھوں سے وہ نوٹ پکڑ لیے پھر حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں حیرت' بے یقینی اور تشکر کے جذبات موج زن تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولے۔

جب انسان کی سمجھ میں نہ آئے کہ اسے اپنی زبان سے کون سے الفاظ ادا کرنا چاہئیں تو پھر زبان پر تالا پڑ جاتا ہے' سمجھ سوچ ایک جگہ رک جاتی ہے اور ہونٹ تھرتھرا کر رہ جاتے ہیں۔ منگل سنگھ کے ہونٹوں میں بھی کپکپاہٹ نما جنبش ہو رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "یہ رقم میں تمہیں نئی زندگی شروع کرنے کے لیے دے رہا ہوں اور تمہاری جان اس لیے بخش رہا ہوں کہ تم نئی زندگی شروع کر سکو۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مزید کہا۔

"منگل سنگھ! جس خطرناک مرض میں تم مبتلا ہو اس کا انجام بڑا ہولناک ہوتا ہے۔ اس کے علاج میں توبہ کا بڑا عمل دخل ہے..... برے کاموں سے توبہ! مجھے امید ہے' تم یہ چوری چکاری' ڈاکا زنی اور قتل و غارت گری کو چھوڑ کر ایک سیدھے سادے انسان کی طرح زندگی گزارو گے۔ یاد رکھو! وقت ہر انسان کو اچھا بننے کا کم از کم ایک موقع ضرور فراہم کرتا ہے۔ تم سمجھ لو' وقت میرے توسط سے تمہیں یہ موقع فراہم کر رہا ہے۔ اب اس موقع سے فائدہ اٹھانا یا اسے ضائع کرنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

وہ فرطِ جذبات سے میرے قدموں میں جھک گیا پھر گلوگیر آواز میں بولا "مہاراج آپ تو بھگوان کا اوتار ہو۔ مجھے اپنے چرنوں (قدموں) میں جگہ دے دو۔ میں ہر پاپ (گناہ) سے سچی توبہ کر لوں گا۔"

"مجھے گناہ گار نہ کرو۔" میں نے شانوں سے تھام کر اسے کھڑا کر دیا "میں ایک انسان ہوں' مجھے انسان ہی رہنے دو اور جہاں تک چرنوں میں جگہ دینے کا تعلق ہے تو فی الوقت ممکن نہیں۔ تمہارے لیے میرا یہی مشورہ ہے کہ جلد از جلد یہاں سے دور چلے جاؤ اور شریفانہ زندگی اختیار کرنے کی کوشش کرو۔"

وہ آب دیدہ ہو گیا۔ اس کے چت کبرے ہونٹ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔ وہ اس وقت جذبات کی شدت سے گزر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔

اس وقت ہم دونوں انسان تھے جو انسانیت کے ناتے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میں نے صدقِ دل سے دعا کی۔

"اے میرے پروردگار! اس ڈاکو کو نیک دل انسان

بنادے۔ اس کے دل میں دوسرے انسانوں کے لیے ہمدردی اور محبت کو جگہ دے۔ بے شک تو بہت قدرت والا ہے۔"

پھر ہم جدا ہوگئے۔ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی گنڈا سنگھ ایک کچی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے وجدان؟"

اپنے عقب میں ساحل کی چمک دار آواز سن کر میں چونک گیا۔ وہ ڈاکوؤں کو رخصت کرتے ہوئے ہمیں دیکھ چکی تھی۔ ہماری بے خبری میں وہ پجارو سے نکل کر وہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہو رہا ساحل۔"

"کچھ تو ہو رہا تھا۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی "میں نے تمہیں منگل سنگھ ڈاکو سے بغل گیر ہوتے دیکھا تھا۔ یہ کیا چکر ہے؟"

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "یہ جو بھی چکر ہے اس کی پہلی قسط ختم ہوگئی اور دوسری قسط اس کوارٹر میں ہماری منتظر ہے۔" میں نے کوارٹر کی جانب اشارہ کیا "آؤ وہاں چلتے ہیں۔"

"مگر تم نے ڈاکوؤں کو جانے کیوں دیا؟"

"کیا سارے سوال یہیں کھڑے کھڑے پوچھ لوگی؟" میں نے جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

اس نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "ممتاز تو خیریت سے ہے نا؟"

"ہم اسی کو دیکھنے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا اور کوارٹر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

وہ دونوں بھی میرے پیچھے آنے لگے۔ میر بخش کی زبانی میں مغویہ اور یرغمالی کی خیریت جان کر مطمئن ہوگیا تھا۔ جب ہم کمرے کے اندر پہنچے تو ایک تکلیف دہ منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔

وہ عام سائز کا ایک درمیانہ سا کمرا تھا جس کے ایک کونے میں چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ چھتی نما شیلف بنے ہوئے تھے جن پر چند برتن رکھے نظر آئے۔ دوسری دیوار پر کپڑے ٹانگنے والی تین کھونٹیاں نصب تھیں۔ کمرے کے احاطے میں موجود ایک چولھا میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ ان شواہد سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ پھاٹک والا وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔

کمرے میں بچھی اکلوتی چارپائی کے سرہانے کی جانب دیوار کے ساتھ تھوڑی سی جگہ خالی بچی ہوئی تھی۔ یہ دیوار اور چارپائی کے درمیان لگ بھگ تین فٹ چوڑا ایک خلا تھا اور اس خلا میں مغویہ اور یرغمالی نظر آرہے تھے۔ ممتاز کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں پاؤں میں بھی بندشیں پڑی تھیں اور منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا۔ یرغمالی کے ہاتھ پاؤں بھی رسیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

پھاٹک والے شخص کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ عام سی صحت کا مالک ایک دیہاتی شخص تھا جب کہ مغویہ ممتاز پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ جب میں نے بغور اس کی صورت کا جائزہ لیا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں پھر جلد ہی مجھے اپنی سوچ تبدیل کرنا پڑی۔ میں نے ممتاز کو پہلے نہیں دیکھا تھا بلکہ وہ معروف انڈین اداکارہ مادھوری ڈکشٹ سے گہری مشابہت رکھتی تھی۔ پہلی نظر میں یونہی لگتا تھا' وہ مادھوری ڈکشٹ ہو۔ میں نے انڈیا میں قیام کے دوران میں مادھوری ڈکشٹ کی چند فلمیں دیکھی تھیں بلاشبہ وہ ایک ذہین اور بھرپور اداکارہ تھی جسے اپنے چہرے کے تاثرات پر مکمل کنٹرول حاصل ہے۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ اور رانی روپ متی کی حویلی میں' فارغ اوقات میں' میں مختلف فلمیں وی سی آر پر دیکھا کرتا تھا۔

میں نے میر بخش کی مدد سے مغویہ اور یرغمالی کی بندشیں کھولیں اور انہیں آزاد کردیا۔ پھاٹک والا شخص آزاد ہوتے ہی رونے لگا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے جو بے اختیار اس کی آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ وہ زندہ بچ سکے گا۔

ممتاز کی عمر کا اندازہ میں نے اٹھارہ اور بیس کے درمیان لگایا۔ اس کا قد پانچ فٹ دو انچ ہوگا۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ اسے نہ تو فربہ اور نہ ہی دبلا کہا جا سکتا تھا۔ اس کے بدن میں ایک خاص قسم کا تناسب تھا جو اپنے اندر بھرپور کشش رکھتا تھا۔ وہ گوری چٹی رنگت والی ایک طرح دار حسینہ تھی۔ اس وقت وہ سندھ کے روایتی لباس میں تھی جو خاصا میلا ہو رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں کھلنے کے بعد اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اب وہ خود کو خاصا ایزی فیل کر رہی تھی۔

اب میں وہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا تھا۔ ممتاز کو فی الحال میں اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں یا تو اسے اس کے والدین تک پہنچا دیتا یا پھر اس کی محفوظ واپسی کا کوئی معقول بندوبست کرتا۔ ممتاز کو چونکہ میں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اس لیے پھاٹک والے سے میں نے ضروری گفتگو کرلینا مناسب جانا۔

"چاچو! کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے اپنا نام انور علی بتایا۔ میں نے مزید پوچھا "چاچو انور! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" سندھی زبان میں چچا کو چاچو اور ماموں کو مامو کہا جاتا ہے۔

"سائیں! میں میرپور خاص کے علاقے "ڈگری" کا رہنے والا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

اس نے بلاکم و کاست مجھے منگل سنگھ' گنڈا سنگھ کی کارروائی کے بارے میں بتا دیا۔ اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "چاچو! جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ وہ دونوں آدمی ڈاکو تھے اور اس لڑکی کو اغوا کرکے لے جارہے تھے۔ ان کی گاڑی اچانک خراب ہوگئی تو انہوں نے تمہیں یرغمال بنالیا۔" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا "اگر تم کسی بھی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتے تو وہی یاد رکھو جو میں اب تمہیں بتانے والا ہوں۔ اگر تم نے اپنی عقل استعمال کرنے کی کوشش کی تو سمجھ لینا' پولیس والے تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر اور لٹھ لے کر پڑ جائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ بندہ خاصا سمجھ دار لگتا تھا۔ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "اچھی طرح سمجھ گیا ہوں سائیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں وہی بیان دوں گا جو آپ پڑھائیں گے۔ میں سیدھا سادہ ماتو پولیس کے چکر میں نہیں پڑ سکتا۔" پھر اس نے مخصوص سندھی انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے کہا "میرے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو ذہن میں بٹھالو۔" پھر میں نے تاکید کے انداز میں اسے ایک جھوٹی سچی کہانی سنائی "دو ڈاکو اپنی جیپ میں کسی لڑکی کو اغوا کرکے لے جارہے تھے۔ ان کی گاڑی کے تعاقب میں ایک اور گاڑی بھی پیچھے چلی آرہی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ پچھلی گاڑی میں کون تھا۔ ڈاکوؤں کے بارے میں بھی تم نے اپنے طور پر اندازہ لگایا ہے۔ تم کوئی بھی حتمی بات نہیں جانتے۔ تم نے جو کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے پیش آتے دیکھا' اس کے بارے میں قیاس کرلیا یعنی از خود کوئی نتیجہ اخذ کرلیا۔"

میں نے چند لمحات تک اس کے چہرے پر نظر جما کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا' وہ پوری توجہ سے میری باتیں ذہن نشین کر رہا تھا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "پیچھے آنے والی گاڑی والوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح آگے والی گاڑی کو روک لیں مگر

"خواب" کے موضوع پر

اردو زبان میں اپنی نوعیت

کی

منفرد کتاب

خوابوں کے اسرار

قیمت 25 روپے ❖ ڈاک خرچ 23 روپے

خوابوں کی تعبیر، ان کی حقیقت اور ان کی افادیت کے بارے میں ایک نادر کتاب!

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر ارسال کریں

خط و کتابت کا پتہ

مکتبہ نفسیات

kitabiat@hotmail.com

kitabiat1970@yahoo.com

آگے والے کسی قیمت پر رکنے کو تیار نہیں تھے چنانچہ مجبوراً پچھلی گاڑی والوں نے اگلی گاڑی کی باڈی اور ٹائروں پر گولیاں برسانا شروع کردیں۔ نتیجے کے طور پر آگے والی گاڑی لڑکھڑائی' اس کے ٹائر پھٹ گئے اور ڈرائیور کو گاڑی سڑک سے نیچے اتارنا پڑی...“

”مگر وہ گاڑی تو میرے کوارٹر کی پچھلی دیوار کے ساتھ کھڑی ہے؟“ پھاٹک والے انور علی نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ باہر کے حالات سے یکسر بے خبر تھا۔

میں نے کہا ”وہ گاڑی اب تمہارے کوارٹر کی عقبی دیوار کے ساتھ نہیں بلکہ ادھر سڑک کے کنارے کچے میں آڑی ٹیڑھی کھڑی ہے۔“

اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا ”یہ کب اور کیسے ہوا؟“

”یہ جب اور جیسے بھی ہوا تم اس کے لیے اپنا دماغ نہ تھکاؤ۔“ میں نے کہا ”بہرحال' یہ حقیقت ہے کہ وہ گاڑی اب سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر تحیر آمیز لہجے میں بولا ”وہ دونوں آدمی کہاں ہیں جنہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھ سے سگنل لیمپ چھین لیا تھا اور مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے اپنے منہ سے کوئی آواز نکالی تو وہ مجھے قتل کردیں گے۔ ان میں سے ایک رائفل تانے ہمارے سروں پر سوار رہا اور دوسرا سگنل لیمپ لے کر باہر چلا گیا تھا؟“

”وہ دونوں آدمی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔“ میں نے انور علی کو حقیقتِ حال سے بے خبر رکھتے ہوئے کہا۔

ساحل اور میر بخش سمجھ گئے کہ میں کسی مصلحت کے تحت سچ میں جھوٹ کی آمیزش کررہا ہوں۔ انور علی نے جب سگنل لیمپ کا ذکر کیا تو مجھے کچھ یاد آگیا تھا۔ میں نے پھاٹک والے سے پوچھا۔

”گاڑی کافی دیر سے نہیں گزری۔ کیا اس ریلوے لائن پر بہت کم آمدورفت رہتی ہے؟“

اس نے بتایا ”رات میں آخری گاڑی گیارہ بجے گزرتی ہے۔ اس کے بعد اب نو بجے آئے گی۔ ویسے اس لائن پر زیادہ رش نہیں ہوتا۔“ پھر اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو۔

میں نے پوچھا ”کیا بات ہے انور علی؟“

اس نے سوال کیا ”سائیں! آپ نے بتایا ہے کہ پچھلی گاڑی نے ڈاکوؤں والی گاڑی پر گولیاں برسائی تھیں جس کے نتیجے میں اس کے ٹائر پھٹ گئے اور سڑک سے اتر گئی۔ مگر میں نے تو فائرنگ کی آواز نہیں سنی۔“

”ہم یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں فائرنگ کی آواز بھی سنائیں گے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”اس سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال۔“ میں واپس اپنی کہانی کی طرف آگیا ”جب ڈاکوؤں والی گاڑی رک گئی تو انہوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر فرار ہی میں عافیت جانی اور مغویہ کو چھوڑ کر نو دو گیارہ ہوگئے۔ تعاقب میں آنے والی گاڑی میں موجود افراد نے مغویہ کو اپنی گاڑی میں سوار کرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمہاری نظر سے اوجھل ہوگئے۔“

”میں سمجھ گیا سائیں' بالکل سمجھ گیا۔“ انور علی نے پر اعتماد لہجے میں کہا ”میں پولیس والوں کو یہی بیان دوں گا۔“

مادھوی ڈکشٹ کی کاپی ممتاز نے سوال کیا ”کیا وہ دونوں ڈاکو واقعی فرار ہوئے ہیں؟ ان کے ارادے فرار ہونے والے تو نہیں لگتے تھے۔ وہ دونوں بہت خطرناک لوگ تھے؟“

ممتاز سندھی لب ولہجے میں بہت صاف اردو بول رہی تھی۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ تعلیم یافتہ تھی۔ میں نے اس خوب صورت لڑکی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”ہاں ممتاز' وہ دونوں درحقیقت فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔“ میں نے ممتاز سے دانستہ جھوٹ بولا۔ وہ بھی انور علی کی طرح کوارٹر سے باہر پیش آنے والے حالات سے بے خبر تھی اور میں اسے بے خبر ہی رکھنا چاہتا تھا۔ فی الحال ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا یہی تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”جب انہوں نے دیکھا کہ وہ بری طرح ہمارے چنگل میں پھنس چکے ہیں تو انہوں نے فرار ہی میں عافیت جانی۔“

ممتاز نے استفسار کیا ”آپ ڈاکوؤں کی گاڑی پر فائرنگ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“

”تاکہ یہ بے چارہ انور علی کسی بڑے وبال میں نہ آجائے۔“ میں نے کہا ”اس کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“

”آپ کون لوگ ہو اور مجھے اپنے ساتھ کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“ ممتاز نے نہایت ہی اہم سوال پوچھے۔

میں نے کہا ”ہم خدائی فوجدار ہیں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔“ میں نے ذرا توقف کرکے اضافہ کیا ”ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی ضد نہیں کریں گے۔ تم ازخود بھی اپنے گھر جاسکتی ہو۔ ویسے تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ ہماری حفاظت میں تم اپنے والدین کے پاس

پہنچو۔ تم نے پہلے ہی بہت دکھ اٹھالیے ہیں۔“

وہ احسان مندی سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں تشکرانہ جذبات کا سمندر موجزن تھا۔ ہم نے اسے ڈاکوؤں کے چنگل سے نجات دلا کر واقعی اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں آزاد ہوگئی ہوں۔“

وہ بار بار اپنی کلائیوں کو سہلا رہی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے مضبوط رسی کی بندشیں موجود تھیں۔

میں نے کہا ”تم واقعی آزاد ہوگئی ہو اور اس بات کا یقین تمہیں اس وقت آئے گا جب اپنے گھر پہنچ جاؤگی۔“

”مجھے تو یہ سب کچھ کسی بھیانک خواب کی طرح محسوس ہورہا ہے۔“

”بھیانک خوابوں کو بھولنے کی کوشش کرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ممنونیت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”آپ بتا رہے ہو' وہ دونوں شیطان کہیں بھاگ گئے ہیں مگر مجھے اب بھی ان سے خوف آرہا ہے کہ کہیں واپس نہ آجائیں۔“

”تم نے گزشتہ چند روز بس مصیبت میں گزارے ہیں یہ انہی حالات کا اثر ہے۔“ میں نے کہا ”ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ دونوں ڈاکو اب کبھی پلٹ کر تمہاری طرف نہیں دیکھیں گے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں چند روز سے اس مصیبت میں گرفتار تھی۔ ہماری تو یہ پہلی ملاقات ہے۔ آپ میرے گزرے ہوئے حالات سے کس طرح واقف ہیں؟“

میں روانی میں ایک غلطی کر بیٹھا تھا۔ بہرحال' اب اس غلطی کو نبھانا تھا۔ میں نے بات پلٹتے ہوئے کہا ”واقعی میں نے آج تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ میں نہیں جانتا' تم کون ہو' کہاں سے آئی ہو اور ڈاکوؤں نے تمہیں کیوں اغوا کیا تھا؟“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”آپ وہ نہیں ہیں جو نظر آنے کی کوشش کررہے ہیں۔“

اس کے اس جملے میں بڑی فورس تھی۔ ممتاز بولتی ہوئی آنکھوں والی ایک ذہین لڑکی تھی۔ ویسے بھی وہ ایک صاحب حیثیت شخص کی اکلوتی اولاد تھی۔ حسین وجمیل تھی' تعلیم یافتہ تھی۔ یہ تمام عوامل مل کر انسان کو پُراعتماد بنادیتے ہیں اور ”اعتماد“ ذہین لوگوں کا خاصہ ہے۔ میں نے ممتاز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کے جواب میں کہا۔

”میں کیا نظر آنے کی کوشش کررہا ہوں!“

”جو آپ نہیں ہیں۔“ وہ ٹٹولتی ہوئی نگاہ مجھ پر مرکوز کرکے بولی۔

”میں کیا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ بہت گہرے انسان ہیں۔“

”کسی کی گہرائی ناپنے کے لیے بھی کسی نہ کسی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تم ایک ہنرمند لڑکی ہو! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

میں مسلسل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میرے آخری جملے پر جھینپ کر اس نے نگاہ جھکالی۔ میں پھاٹک والے انور علی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

”چاچو! نو بجنے میں کتنا وقت باقی ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا ”تم نے بتایا ہے کہ نو بجے کوئی گاڑی وہاں سے گزرے گی۔“

ہماری جامہ تلاشی کے نام پر ہمیں ہر شے سے محروم کردیا گیا تھا۔ اس وقت ہمارے جسموں پر لباس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گھڑی کی عدم موجودگی کے سبب وقت کا درست اندازہ نہیں ہوپارہا تھا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ ابھی نو نہیں بجے ہوں گے۔

انور علی نے اپنی میلی کچیلی گھڑی کے ڈائل کو دیکھتے ہوئے کہا ”اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ گاڑی کی آمد میں پورا ایک گھنٹا باقی ہے۔“

بات ختم کرکے وہ سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے پوچھا ”کیا بات ہے چاچو' تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

”سائیں! آپ تو اب یہاں سے چلے جاؤ گے۔“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا ”اگر وہ دونوں ڈاکو پھر اس طرف آنکلے تو میں...؟“

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”وہ اب کبھی اس طرف کا رخ نہیں کریں گے۔ تم بے فکر ہوکر اپنے معاملات کو جاری رکھو۔“

وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ ویسے یہ حقیقت بھی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ منگل سنگھ اور اس کا ساتھی گنڈا سنگھ انور علی کو پریشان کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ میں نے منگل سنگھ کی آنکھوں میں جو تاثر دیکھا تھا' اس کے آئندہ عزائم کی عکاسی کرتا تھا۔ مجھے امید نہیں' بلکہ پورا یقین تھا کہ اب وہ

دونوں سیدھی راہ اختیار کرلیں گے۔ انہیں آسانی سے چھوڑنے کا سبب بھی یہی تھا کہ وہ اپنی اصلاح پر آمادہ نظر آئے تھے ورنہ میں گن پوائنٹ پر انہیں اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ ممتاز کا باپ قاضی سلطان انہیں "پاکر" بہت خوش ہوتا۔ پولیس کے اعلیٰ افسر سے اس کی رشتے داری تھی۔ وہ رشتے داری کی قوت استعمال کرکے منگل سنگھ اینڈ کمپنی کو عبرت ناک سزائیں دلوا سکتا تھا مگر میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اگر کوئی برا شخص برائی کی راہ چھوڑ کر اچھائی کا راستہ اپنانا چاہتا ہو تو اس کی سابق برائیوں کو نظرانداز کرکے اس کو اس کارِ خیر کا موقع ضرور فراہم کرنا چاہیے۔ وہ دونوں بھی مجرمانہ زندگی سے تائب ہونا چاہتے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں ایک موقع دے دیا تھا۔ ویسے نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ مجھے دھوکا دے کر نکل گئے تھے اور آیندہ بھی انہوں نے اپنی روش کو جاری رکھنا تھا تو پھر یہ بھی ضروری تھا کہ وہ عن قریب کسی پولیس مقابلے میں عبرت ناک موت سے دوچار ہوجاتے کیونکہ وقت بڑی ظالم شے ہے۔ یہ اپنے ساتھ مذاق برداشت نہیں کرتا۔

ساحل اور میر بخش بخوبی سمجھ رہے تھے کہ میں نے ان لوگوں (انور + ممتاز) سے کچھ باتیں دانستہ چھپائی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ ایک مناسب وقت تک وہ بھی اس سلسلے میں زبان نہیں کھولیں گے۔ ہم تینوں میں بڑی اچھی انڈراسٹینڈنگ پیدا ہوچکی تھی۔

میر بخش نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "سائیں! یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔ ہمیں فوراً روانہ ہوجانا چاہیے۔"

"میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ساحل نے تائیدی انداز میں کہا "ہمیں ایک لمحہ بھی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے اور اب ہم۔ میرپورخاص کے بجائے "نبی سر" کی طرف جائیں گے۔ پہلے اس لڑکی کو اس کے گھر پہنچائیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا وجدان!"

ساحل سے بھی وہی غلطی ہوگئی جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ ممتاز نے نبی سر کے الفاظ پر چونک کر ساحل کو دیکھا پھر پوچھا "تمہیں کیسے معلوم کہ میں نبی سر میں رہتی ہوں؟"

میں نے تو بہت خوب صورتی سے اپنی غلطی کو نبھالیا تھا لیکن ساحل بوکھلا کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ممتاز کا سوال تھا ہی اتنا بروقت اور چبھتا ہوا۔

میں نے فوراً ساحل کی مدد کرتے ہوئے کہا "ہم کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں جانتے' یہ تمام باتیں گاڑی میں بیٹھ کر بھی ہوسکتی ہیں۔ باہر ہماری پجارو کھڑی ہے۔"

پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے کوارٹر کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ممتاز ہمارے ساتھ چلتے ہوئے بولی "میں آپ دونوں کے ناموں سے تو واقف ہوچکی ہوں۔" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ وجدان ہو۔ آپ کا ساتھی میر بخش ہے اور اس لڑکی کا نام...؟"

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "ہماری ساتھی کا نام ساحل ہے۔"

"میرا نام ممتاز ہے۔" جب ہم کوارٹر سے نکل کر سڑک پر پہنچے تو سابق مغویہ نے اپنا تعارف پیش کیا "میں "نبی سر" کی ایک معروف شخصیت قاضی سلطان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ میرا ماموایک بہت بڑا پولیس افسر ہے۔"

میری معلومات کے مطابق قاضی سلطان کی کسی بڑے پولیس افسر سے رشتے داری تھی۔ اب ممتاز بتا رہی تھی کہ وہ اعلیٰ پولیس افسر اس کا ماموں تھا۔ میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

"کیا تم واقعی کسی بڑے پولیس افسر کی بھانجی ہو؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں' ایس پی صاحب میرے سگے ماموں (ماموں) ہیں۔"

یہ ایک اور انکشاف انگیز بات تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میر بخش سے کہا "میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر پجارو کی طرف جارہا ہوں۔ تم اپنی کلاشنکوف سے اس ٹویوٹا کو ویسا بنا دو جیسا ہم ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے منگل سنگھ والی جیپ کی طرف اشارہ کردیا۔

میر بخش نے سر کو اثباتی جنبش دی اور فوروھیل ڈرائیو ٹویوٹا جیپ کی جانب بڑھ گیا۔ میں دونوں لڑکیوں کے ساتھ پجارو کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ چند لمحات بعد ہمیں اپنے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ میر بخش نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے جیپ کے ٹائروں کو پھاڑ دیا تھا اور ایک طرف سے اس کی باڈی کو بھی چھلنی کردیا تھا۔ منگل سنگھ کا ریوالور اور گنڈا سنگھ والی رائفل کو ہم نے ان کی جیپ ہی میں ڈال دیا تھا تاکہ کہانی میں حقیقت کے کسی رنگ کی کمی باقی نہ رہے۔ جس وقت انسان جان بچا کر بھاگ رہا ہوتا ہے تو اپنی جان کے سوا وہ ہر شے کو بھول جاتا ہے۔

ہم پجارو کے نزدیک پہنچ گئے۔ میں نے ساحل اور ممتاز کو گاڑی کے عقبی حصے میں سوار کرایا اور خود ڈرائیونگ

سنبھال لی۔ میر بخش کے لیے میں نے پسنجرز سیٹ والا ...زہ کھول دیا۔

ساحل نے میر بخش کی فائرنگ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تاہم موقع پر ممتاز خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ...ہوئے پوچھا۔

"وجدان! کیا یہ سب ضروری تھا؟"

"اشد ضروری!" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا ...بے چارہ انور علی ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ...۔"

اس کے بعد ممتاز نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میر بخش اپنا ...نٹا کر پجارو کی طرف واپس آنے لگا۔ میں نے گاڑی کا ...اسٹارٹ کردیا... اور میر بخش کے گاڑی میں بیٹھنے کا ...ار کرنے لگا۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ ہماری جانب بڑھ رہا ...

...جب وہ پجارو سے دس قدم کی دوری پر تھا تو میں نے ...کے چہرے پر کسی طوفان کے آثار دیکھے۔ وہ یک لخت ...کر پجارو کے عقب میں دور کہیں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ رکتا ...از ممکن ہے' میں اس کے تاثرات کو اتنی سنجیدگی سے نہ ...

...میں بغور میر بخش کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے کی ...ی الجھن میں بہت تیزی سے ایک وحشت سی شامل ہوتی ...ی تھی۔ بے اختیار میری نگاہ ریئرویو مرر کی جانب اٹھ ...۔ پجارو کے پہلو میں نصب وہ آئینہ بڑی وضاحت کے ...عقبی منظر کی عکاسی کررہا تھا۔ پلک جھپکتے میں' میں نے ...ش کی الجھن کا سبب جان لیا۔

ہمارے پیچھے اسی سڑک پر ریگ و غبار کا ایک طوفان ...ائی دے رہا تھا پھر کسی گاڑی کے انجن کی آواز میری ...ت سے ٹکرائی' اس کے ساتھ ہی آواز پیدا کرنے والی وہ ...بھی میری نظر میں آگئی۔

وہ ایک ٹویوٹا ہائی لکس تھی جو بڑی تیز رفتاری سے ...ست عقب میں بڑھتی چلی آرہی تھی۔ گاڑی کے پچھلے کھلے ...حصے میں کوئی شخص کھڑا تھا۔ اس شخص نے اپنے ...ہاتھ ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر نصب ایک خوفناک ...شے پر جما رکھے تھے اور وہ دھاتی شے یقینی طور پر ایک ...گن۔ موت تقسیم کرنے والی خطرناک مشین!

ٹویوٹا ہائی لکس جس ہلاکت خیز رفتار سے ہمارے نزدیک ...ہی تھی' اسے نظرانداز کرنا خود کو موت کے حوالے ...کے مترادف تھا۔ اس گاڑی میں جو کوئی بھی تھا' ہمارا دوست یا خیر خواہ نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ بہت جلدی میں نظر آرہا تھا جیسے اسے خدشہ ہو کہ اگر اس نے ایک لمحے کی تاخیر بھی کردی تو بازی ہار جائے گا۔ یہ موت اور زندگی کی بازی تھی' بقا اور فنا کی جنگ تھی جس میں کئی انسانی جانیں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔

میں نے ڈرائیونگ سائیڈ والی کھڑکی سے گردن باہر نکالی اور میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے حلق کی پوری قوت سے چلایا "بھاگو میر بخش... جلدی' ہری اپ!"

مقناطیسیت
اس کتاب کے مطالعے سے اپنی شخصیت کی مقناطیسی قوت کو اجاگر کریں اور کامیاب زندگی گزاریں
قیمت 40 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
مکتبہ نفسیات
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

میری پکار پر میر بخش خیالات کے بھنور سے نکل آیا۔ اس دوران میں ہاتھ بڑھا کر میں نے اس کے لیے پسنجرز سیٹ والا دروازہ کھول دیا۔ وہ کسی گولی کی رفتار سے پجارو تک پہنچا اور بجلی کی سی سرعت سے گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے میں نے ایک جھٹکے سے پجارو کو آگے بڑھادیا۔ چند لمحات میں پجارو ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

پجارو چونکہ ساکن حالت سے حرکت میں آئی تھی اس لیے اونچی رفتار پکڑنے میں اسے جو لمحے لگے اسی وقت میں ٹویوٹا ہائی لکس ہمارے بہت قریب پہنچ گئی۔ وہ اب بھی ہمارے عقب میں تھی تاہم ہمارا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہورہا تھا۔ یقینی طور پر متعاقب گاڑی کی رفتار ہم سے کچھ زیادہ رہی ہوگی۔ میں بیک وقت دو مقامات پر متوجہ تھا۔ بھرپور توجہ کے ساتھ ڈرائیونگ بھی کررہا تھا اور ریئر ویو مرر میں اپنے پیچھے آنے والی گاڑی کو بھی نظر میں رکھے ہوئے تھا۔

ابتدا میں وہ صرف ایک گاڑی تھی' ٹویوٹا ہائی لکس۔ جس کے عقبی کھلے ہوئے حصے میں کوئی شخص گن تھامے کھڑا تھا۔ فاصلے میں تیزی سے واقع ہونے والی کمی کے باعث گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد کے ہیولے دکھائی دینے لگے۔ رفتہ رفتہ ان ہیولوں کے حلئے واضح ہوئے تو مجھے چونکنا پڑا۔ وہ چہرے میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں اِستادہ گن بردار شخص کو بھی میں بخوبی پہچان گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ بے اختیار ایکسی لریٹر پر میرے پاؤں کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے محسوس ہوا' ایک خون ریز معرکے کا وقت آن پہنچا ہے۔

ٹویوٹا ہائی لکس کی ڈرائیونگ سیٹ پر شیطان کا برادرِ خورد تارا موجود تھا۔ اس کے برابر میں پسنجرز سیٹ پر وڈیرا اکبر سومرو نظر آرہا تھا جبکہ عقبی حصے میں گن بردار وہ شخص وڈیرے کا گارڈ تھا۔ وڈیرے کے ساتھ آنے والے چار حواریوں میں سے صرف یہی شخص زندہ بچا تھا' باقی تین ڈی ایس پی کے سیکیورٹی گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ تارا وڈیرے کا مہمان تھا اس لیے میں اسے اس کے حواریوں میں شمار نہیں کررہا۔ اس کے زخمی سر پر پٹی بدستور موجود تھی۔

میری طرح میر بخش نے بھی حالات کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کرلیا۔ یقیناً خون اس کی رگوں میں اچھل کر رہ گیا ہوگا۔ اکبر سومرو ایک طویل عرصے تک اس کا ان داتا رہا تھا تاہم حالات کی بے رحمی نے میر بخش کو وڈیرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ وہ اس وقت انتہائی مستعد نظر آرہا تھا۔

کلاشنکوف کو اس نے بڑے چوکس اور ماہرانہ انداز میں ریڈی کرلیا۔

میری پوری کوشش تھی کہ دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلے میں اضافہ جاری رہے۔ ابھی تک ہم شاید فائرنگ رینج میں نہیں آئے تھے یا ممکن ہے' متعاقب دشمنوں کی کوئی مصلحت ہو۔ بہرحال' اس طرف سے فائرنگ نہیں کی گئی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فائرنگ نہیں کریں گے۔

میں نے میر بخش کے تیور دیکھ لیے تھے اس لیے گاڑی کی رفتار کو مزید بڑھاتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا "ہمارے پاس فاضل ایمونیشن نہیں ہے۔ تم ٹویوٹا فور وھیل پر فائرنگ کرکے اس گن کے میگزین کو خاصی حد تک خالی کرچکے ہو لٰہذا ایک بھی گولی ضائع نہیں ہونا چاہیے!"

"سمجھ گیا سائیں!" وہ کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "ہر گولی رنگ لائے گی۔"

پجارو کے عقبی حصے میں موجود ساحل اور ممتاز اس اچانک افتاد پر سراسیمہ نظر آنے لگیں۔ دونوں لگ بھگ ہم عمر تھیں۔ حسین اور جوان بھی تھیں تاہم دونوں کے حسن اور جوانی میں علاقائی فرق تھا۔ ساحل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

"یہ شیطان یہاں بھی پہنچ گئے!"

اس کی بڑبڑاہٹ میں خوف سے زیادہ جھنجلاہٹ شامل تھی۔ ممتاز نے ساحل سے پوچھا۔

"کیا تم ان لوگوں کو جانتی ہو؟"

ساحل نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ممتاز نے گردن موڑ کر ٹویوٹا ہائی لکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر میری آنکھیں کوئی دھوکا نہیں کھا رہیں تو اس گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ وڈیرا اکبر سومرو بیٹھا ہے۔"

ممتاز کے جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا "تم وڈیرے کو کیسے جانتی ہو؟"

"اکبر سومرو عمر کوٹ کے ایک دور افتادہ علاقے میں رہتا ہے۔" ممتاز نے بتایا "وہ خاصا معروف اور طاقت ور وڈیرا ہے۔ بابا کی طویل عرصے سے' اس سے دشمنی چل رہی ہے۔ میں اپنے دشمن کو نہیں پہچانوں گی تو پھر کسے پہچانوں گی؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا "لیکن اس گاڑی کا ڈرائیور مجھے اس علاقے کا نہیں لگتا۔ پتا نہیں' یہ شخص کون ہے اور وڈیرے کے ساتھ کیوں نظر آرہا ہے؟"

ساحل نے جلدی سے کہا "وہ تارا ہے۔ وہ شخص آج ...ڈیرے کا مہمان بنا ہوا ہے۔"

...ممتاز نے اکبر سومرو سے شناسائی ظاہر کرکے میرے ...ذہن میں ہلچل مچادی پھر یہ خیال اور بھی سنسنی خیز تھا کہ اکبر ...ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا دیرینہ دشمن بھی تھا۔ ...وڈیرا اکبر سومرو اپنے دشمن کی بیٹی کو ہمارے ساتھ دیکھ ...

...میرے خیالات کو ممتاز کی آواز نے تہ و بالا کردیا۔ وہ ...رہی تھی "وجدان! تم وڈیرے کی گاڑی کو اپنے عقب ...دیکھ کر بڑی تیزی سے وہاں سے فرار ہوئے ہو۔ اس سے ...ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تم لوگوں کا بھی دشمن ہے۔ کیا میں ...کہہ رہی ہوں؟"

"اکبر سومرو سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔" میں نے کہا ...ہمارا جھگڑا اس کے مہمان تارا نامی اس شخص سے ہے جو ...ہائی لکس کی ڈرائیونگ سیٹ پر تمہیں نظر آرہا ہے۔"

"تم لوگوں کے درمیان کس قسم کا جھگڑا ہے؟" اس نے ...سوال کیا۔

میں ممتاز کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیونکہ اسی ...متعاقب گاڑی سے ہم پر فائرنگ کی گئی۔ دونوں لڑکیوں ...کی چیخیں نکل گئیں اور فطری ردِ عمل کے طور پر وہ نیچے جھک ...گئیں۔

میں نے پجارو کو فائرنگ سے بچانے کے لیے تھوڑی ...کرتب بازی دکھائی۔ نتیجے میں وہ ذرا سا لہرائی۔ لڑکیاں ایک ...مرتبہ پھر چیخ اٹھیں۔ میں نے اسٹیئرنگ وھیل پر گرفت قائم ...رکھتے ہوئے لڑکیوں سے مخاطب ہوکر کہا۔

"تم دونوں سیٹوں کے درمیان گاڑی کے فرش پر لیٹ ...جاؤ یا دبک کر بیٹھ جاؤ۔ گاڑی کو خطرناک جھٹکے بھی لگ سکتے ...ہیں۔"

ان دونوں نے خاموشی سے میرے احکام کی تعمیل کی۔ میر بخش نے کہا "سائیں!" سامارو" یہاں سے زیادہ دور ...نہیں ہمیں جو بھی کرنا ہے' اس سے پہلے ہی کرنا ہے۔"

"تم ٹویوٹا ہائی لکس کو تعاقب سے روکو۔" میں نے کہا ...میں گاڑی کی رفتار بڑھا کر ان سے دور نکلنے کی کوشش کرتا ...ہوں۔"

"متعاقب خطرناک حد تک رفتار کو بڑھا رہے ہیں۔" ...میر بخش نے کہا "ہم زیادہ دیر تک ان کی فائرنگ رینج سے باہر ...نہیں رہ سکتے۔"

میں نے کہا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' انہیں جلد از جلد تعاقب سے روکنا ہے۔"

"سائیں!" میر بخش سنجیدگی سے بولا "انہیں روکنے کے لیے فائرنگ بہت ضروری ہے۔"

"پروا نہیں۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ناگزیر کام ہر صورت میں ہونا چاہیے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ دنیا کی کوئی دلیل انہیں قائل نہیں کرسکتی۔ وہ صرف جوتے کی زبان سمجھتے ہیں۔"

میر بخش مسرور لہجے میں بولا "یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں۔ وڈیرا اکبر سومرو واقعی ایک بھوت ہے۔ بہت بڑا بھوت اسی لیے وہ خود کو بھوتار کہلاتا ہے۔ اس کو اتنی لاتیں اور جوتے پڑنے چاہئیں کہ وہ باتوں کے قابل نہ رہے۔"

میرا اشارہ درحقیقت تارا کی جانب تھا مگر میر بخش اسے اپنے دل کی بات سمجھتے ہوئے وڈیرے کی طرف لے گیا۔ میں نے کہا "کس کے قابل نہ رہے؟ باتیں کرنے کے یا باتیں سننے کے؟"

"دونوں کے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "میں نے خون خرابے سے بچنے کی حتیٰ الامکان کوشش کرلی مگر یہ حرامی خون تارا اپنی تمام تر خرابیوں کے ساتھ ہمارے تعاقب میں لگا ہوا ہے اس لیے اب خون خرابا تو ہوگا اور بہت ٹھیک ٹھاک ہوگا۔"

میرا اشارہ پاکر میر بخش نے اپنے جسم کو مخصوص زاویے پر موڑا اور کلاشنکوف کو اپنی سائیڈ والی کھڑکی سے تھوڑا باہر نکال لیا مگر ٹریگر دبانے کی نوبت نہ آئی۔ اسی وقت پجارو کا عقبی شیشہ ایک چھناکے بلکہ دھماکے سے چکنا چور ہوگیا۔ جدید محفوظ شیشے بڑے منفرد انداز میں ٹوٹتے ہیں۔

میر بخش کی "حرکت" کو یقینی طور پر متعاقب گاڑی کے گن بردار شخص نے نوٹ کرلیا تھا۔ اس کی کلاشنکوف سے نکلنے والی بیشتر گولیاں ضائع ہوگئیں۔ تاہم ایک آدھ پجارو کی باڈی کے عقبی حصے پر ضرور لگی تھی جس کی وجہ سے وہ شیشہ اب اپنا وجود کھوچکا تھا۔

اس فائرنگ پر دونوں لڑکیاں پھر چیخ اٹھیں۔ تاہم انہوں نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور سیٹوں کے درمیان دبکی بیٹھی رہیں۔ ان کا چیخنا ایک بے ساختہ عمل تھا اور اپنی جگہ پر جمے رہنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے حالات کی سنگینی کو خود پر طاری نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر قسم کی صورتِ حالات کا مقابلہ اور سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھیں۔

میر بخش نے اس موقع پر ذرا بھی سستی نہیں دکھائی۔ کھڑکی سے باہر نکلی ہوئی کلاشنکوف سے اس نے متعاقب ٹویوٹا ہائی لکس پر فائرنگ کردی۔ اس نے یقیناً نشانہ تو وڈیرے کو بنایا تھا لیکن وہ ایک متحرک ٹارگٹ تھا۔ تارا گاڑی کو دائیں بائیں لہراتے ہوئے ڈرائیو کررہا تھا اس لیے وہ فائرنگ سے محفوظ رہے تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ان کی گاڑی کی رفتار قدرے کم ہوگئی جس کی وجہ سے ہمارا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے لہراتے ہوئے اس مختصر سی سڑک پر رواں دواں تھیں۔ ریلوے کراسنگ پر پہنچنے سے قبل ریلوے ٹریک' سڑک کی دائیں جانب ساتھ ساتھ متوازی چل رہا تھا۔ کراسنگ کے بعد یہی پٹڑی سڑک کی بائیں جانب آگئی تھی۔ تاہم اب وہ متوازی نہیں رہی تھی بلکہ بتدریج سڑک اور ریلوے ٹریک میں فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ "سامارو" کے بعد وہ پھر متوازی ہوجائیں گی اور "کزی" کے مقام پر انہیں آپس میں مل جانا تھا۔

پجارو کا عقبی شیشہ ٹوٹنے کے باعث وہاں ایک وسیع خلا نمودار ہوچکا تھا جس کی وجہ سے ہم زیادہ غیر محفوظ ہوگئے۔ میر بخش نے اس خلا کے پار ٹویوٹا ہائی لکس کو نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"سائیں! یہ تعاقب اگر اسی طرح جاری رہا تو کبھی ختم نہیں ہوگا۔" اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

میں نے کہا "میں بھی اس "کارچیزنگ" کے حق میں نہیں ہوں۔ پجارو کے پچھلے حصے میں پیٹرول سے بھرے دو چھوٹے کین موجود ہیں۔ دس لیٹر پیٹرول کا یہ ننھا سا ذخیرہ ہمارے لیے موت کا پیغامبر ثابت ہوسکتا ہے۔ اس ہائی او کٹین گیسولین کو کوئی گولی چھو کر بھی گزر گئی تو یہ گاڑی آگ کا گولا بن جائے گی پھر ہم میں سے کسی کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہو سائیں۔" میر بخش نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

"میں نے ایسی کون سی ناسمجھی کی بات کردی ہے میر بخش؟"

"میں آپ کی بات نہیں کررہا۔" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ڈرائیونگ پر ماہرانہ توجہ مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا "پھر تم کس کی بات کررہے ہو۔ کون سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟"

"سائیں! میں پجارو میں موجود پیٹرول والے چھوٹے کینز کی بات کررہا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "پجارو ایک ڈیزل گاڑی ہے۔ اس کے عقب میں ڈیزل والا کین اپنے مخصوص اسٹینڈ میں موجود ہے۔ دوسری جانب فاضل اسٹیپنی بھی اپنی جگہ پیوست ہے۔ یہ دونوں چھوٹے کین پجارو کا فیول نہیں ہوسکتے پھر انہیں گاڑی میں کیوں رکھا گیا؟"

میر بخش کی الجھن بجا تھی۔ پجارو واقعی ڈیزل سے چلتی تھی۔ میرا دھیان پہلے اس طرف نہیں گیا تھا اور گاڑی میں موجود وہ دونوں کین دیکھ کر مجھے اطمینان سا محسوس ہوا تھا کہ چلو ہمارے پاس فاضل ایندھن تو ہے۔ بہرحال' یہ فیول پجارو میں استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے میر بخش سے کہا "تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ پیٹرول والے چھوٹے کین پجارو میں کیوں رکھے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں بعد میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ فی الوقت ہمیں جلد از جلد ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔"

"اوکے سائیں!" میر بخش گہری سنجیدگی سے بولا "آپ پجارو کی رفتار کو تھوڑا کم کرکے ان کی گاڑی کو فائرنگ رینج میں لاؤ۔ میں ٹویوٹا ہائی لکس کے ٹائروں کو نشانہ بناتا ہوں۔"

میں نے کہا "ٹویوٹا ہائی لکس کو فائرنگ رینج میں لانے کا مطلب یہ ہوگا کہ پجارو بھی فائرنگ رینج میں آجائے گی۔ تمہارے ہاتھ میں کلاشنکوف ہے تو دوسری طرف بھی کلاشنکوف بردار موجود ہے۔ جب دونوں گاڑیوں سے فائرنگ کی جائے گی تو نقصان بھی یقیناً دو طرفہ ہوگا۔"

"یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا سائیں۔"

میں نے کہا "پجارو کی پشت پر ڈیزل والا کین بھی بندھا ہوا ہے۔ ابھی تک وہ فائرنگ سے محفوظ رہا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ آئندہ بھی محفوظ رہے گا۔"

"گولی لگنے سے ڈیزل آگ نہیں پکڑے گا۔" میر بخش نے گمبھیر لہجے میں کہا "اگر پجارو والا کین پھٹ گیا تو ٹویوٹا کے لیے مصیبت بن جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں' کین کو فائرنگ کی زد میں ضرور آنا چاہیے۔"

میں میر بخش کی بات کو پوری وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ پجارو کی پشت پر بندھے ہوئے ڈیزل کین میں اگر فائرنگ سے سوراخ ہوجاتے تو سارا ڈیزل سڑک پر بہہ جاتا جس کے سبب ٹویوٹا ہائی لکس کے ڈرائیور تارا کو محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دن میں تارے نظر آجاتے۔ وہ جس رفتار سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا' چکنی سڑک کے باعث اس کا الٹنا یا کم از کم بری طرح پھسلنا لازمی تھا۔

میں نے پجارو کے عقبی حصے میں "روپوش" دونوں لڑکیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم کسی بھی صورت وہاں سے باہر نکلنے یا سر اٹھانے کی کوشش نہیں کروگی ورنہ پچھلی گاڑی سے آنے والی گولیوں کی بوچھار تمہاری زندگی کو چاٹ جائے گی۔"

"ہم تمہارے حکم کا انتظار کریں گے۔" ساحل نے مضبوط لہجے میں کہا "تم لوگ جو کچھ کرنا چاہتے ہو' کر گزرو۔"

ساحل کی آواز میں بلا کا عزم موجود تھا۔ اس بات نے مجھے بہت سکون بخشا۔ میں اس سے ایسی ہی بہادری اور جرات کی توقع کررہا تھا۔ وہ میری توقع پر پوری اتر رہی تھی۔

ممتاز نے کہا "وجدان! تارا اگر تمہارا دشمن ہے تو وڈیرا اکبر ہمارا دشمن ہے گویا وہ دونوں اجتماعی طور پر ہمارے دشمن ہیں۔ اس معرکے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم نے ڈاکوؤں کے جنگل میں اتنے دن گزار کر بہت بڑا کارنامہ انجام دے لیا ہے۔" میں نے کہا "فی الحال تم آرام کرو۔ ویسے بھی وڈیرے کو ابھی یہ بات معلوم نہیں کہ تم ہماری ہم سفر بنی ہوئی ہو۔"

پھر میں میر بخش کی جانب متوجہ ہوگیا "میں ایک دو تین گنتے ہوئے اچانک پجارو کی رفتار کم کردوں گا۔ اسی مرحلے پر تم ٹویوٹا ہائی لکس کے سامنے والے ٹائروں پر فائرنگ کرنا۔"

اس نے اثبات میں گردن کو جھٹکا دیا۔ وہ اس وقت بے انتہا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

جب میں نے پہلے پہل ٹویوٹا ہائی لکس کو اپنے تعاقب میں بڑھتے دیکھا تھا تو یہی سمجھا تھا کہ ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر کوئی گن نصب ہے لیکن ازاں بعد نزدیک آنے پر معلوم ہوا کہ وہ گن ایک کلاشنکوف تھی جو نصب نہیں تھی بلکہ وڈیرے کے محافظ نے اسے ہاتھوں میں تھام کر کیبن کی چھت پر ٹکا رکھا تھا۔ میر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ "ٹویوٹا ہائی لکس" عام طور پر یہاں "پولیس موبائل" کی صورت میں استعمال ہوتی ہے یا پھر باربرداری کے لیے۔ عموماً باڑے والے دودھ کے ڈرم ڈھونے کے لیے اس گاڑی کو استعمال کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ باربرداری کے لیے اس کے پچھلے حصے کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے جبکہ "موبائل" کی صورت میں اس حصے پر ہڈ لگا کر اندر دو طرفہ نشستیں بیٹھنے کے لیے بنائی جاتی ہیں اور اس کی پیشانی پر سرخ اور نیلی گھومنے والی [illegible] نصب کردی جاتی ہیں۔ ہمارا تعاقب کرنے والی ٹویوٹا ہائی [illegible] کا تعلق کسی بھی طور پر [illegible] سے نہیں تھا۔

میں نے تین تک گنتی گننے کے بعد اچانک پجارو کی اسپیڈ کم کردی۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے گاڑی کو سڑک پر رکھتے ہوئے تھوڑا سائڈ میں نکال لیا تھا۔ میر بخش نے اس موقع پر نہایت ہی پھرتی سے متعاقب گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے فائرنگ کی۔ دوسری جانب سے جوابی فائرنگ کی گئی۔ یہ فائرنگ ہمارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ گاڑی خوفناک انداز میں لہرائی۔

یقینی طور پر پجارو کا پچھلا ٹائر برسٹ ہوگیا تھا۔ اچھلتی کودتی سرکش گاڑی کو میں نے بڑی مہارت سے کنٹرول کیا۔ ٹائر پھٹنے سے ایک زوردار دھماکا ہوا تھا جس نے گاڑی میں موجود دونوں لڑکیوں کو ایک مرتبہ پھر چیخنے پر مجبور کردیا۔ گاڑی کو مزید آگے بڑھانا ممکن نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے بدقت تمام اسے کچے میں ایک طرف روک لیا۔

اسی وقت میر بخش کی خوشی سے معمور آواز میری سماعت سے ٹکرائی "سائیں! وہی ہوا جس کا امکان تھا۔"

"اس میں ایسی خوشی والی کون سی بات ہے؟" میں نے گردن گھما کر عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

میر بخش کے جواب دینے سے پہلے ہی میں اس کی خوشی کی وجہ جان گیا۔ اسی وقت ٹویوٹا ہائی لکس کے بریک چرچرائے۔ میں نے دیکھا' وہ سڑک پر دور تک پھسلتی چلی جارہی تھی اور اس خطرناک پھسلن کا سبب وہ آئل تھا جو سڑک پر جابجا پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے دشمنوں کی فائرنگ سے پجارو کے پیچھے فٹ ڈیزل والا کین پھٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان جو گفتگو ہورہی تھی حالات بالکل اس کے مطابق پیش آئے تھے۔

میں حیرت اور استعجاب سے پھسلتی ہوئی ٹویوٹا ہائی لکس کو دیکھنے لگا۔ وہ سڑک پر رہتے ہوئے ہم سے تھوڑی آگے نکل گئی مگر اس کی اسپیڈ اتنی زیادہ تھی کہ سنبھلنے کے بجائے وہ الٹ گئی۔ اب وہ بھی پجارو کی طرح کچے میں اتر آئی تھی لیکن پجارو کے برعکس الٹی پڑی تھی۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ اس وقت سوچ بچار نہیں بلکہ عمل کی ضرورت تھی۔ دشمنوں کے سنبھلنے سے پہلے ہمیں ان کے سر پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے ساحل اور ممتاز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ہم باہر جارہے ہیں۔ تم دونوں گاڑی میں رہوگی اور اس طرح رہوگی کہ باہر سے نظر نہیں آؤگی۔ سمجھ گئیں؟"

ممتاز خاموش رہی۔ تاہم ساحل نے کہا "وجدان! میں [illegible] کے ساتھ آتی ہوں۔"

"نہیں، تم وہیں زیادہ محفوظ ہو۔"

"میرے پاس بھی ریوالور ہے۔" وہ اصرار کرنے لگی "ضرورت پڑنے پر میں اسے استعمال کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ ضرورت یہاں پجارو کے اندر بھی سامنے آسکتی ہے۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن میں نے حتمی انداز میں اسے خاموش کرا دیا "میں جو کہہ رہا ہوں، بس اس پر عمل کرو۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گی تو ہماری مشکلات میں اضافہ ہوجائے گا۔"

اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولی۔ میں میر بخش کے ساتھ پجارو سے باہر نکل آیا۔ کلاشنکوف بدستور اس کے ہاتھ میں تھی مگر میں جانتا تھا، اس ہتھیار میں بہت کم گولیاں باقی ہوں گی۔ جو ریوالور ساحل کے قبضے میں تھا وہ مرتشی ڈی ایس پی کا تھا۔ یہ اعشاریہ تین دو کیلی بر کا ایک شان دار امپورٹڈ ریوالور تھا جس کی دو گولیاں میں بنگلے سے نکلتے ہوئے، جیپ کو بیکار کرنے میں استعمال کرچکا تھا۔ باقی چار گولیاں اس وقت بھی ریوالور کے چیمبر میں موجود تھیں۔

ہم دونوں دوڑتے ہوئے الٹی ہوئی ٹویوٹا ہائی لکس کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں کی صورتِ حالات خاصی دگرگوں تھی۔ گن بردار محافظ کہیں نظر نہ آیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ اپنی گن سمیت اس وقت گاڑی کے نیچے دبا ہوگا۔ میں نے جھک کر ڈرائیونگ کیبن کا جائزہ لیا۔ وڈیرا اکبر سومرو اور تارا اپنی نشستوں پر موجود تھے۔ تاہم وہ گاڑی میں بری طرح پھنس گئے تھے۔ وہ کسی مدد کے بغیر وہاں سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ وہ زندہ تھے مگر بہت مصیبت میں دکھائی دیتے تھے۔

میر بخش نے کہا "سائیں! یہ اچھا موقع ہے۔ ہمیں فوراً آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

"ہم آگے بڑھیں گے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

"کون سا ضروری کام سائیں؟"

"ٹویوٹا ہائی لکس کو سیدھا کرنا ہے۔"

"مم۔ مگر یہ تو ہمارے دشمنوں کی گاڑی ہے!" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اثبات میں سرہلایا "میں جانتا ہوں۔ یہ دشمنوں کی گاڑی ہے اسی لیے اسے سیدھا کرنا چاہتا ہوں۔ میں دوستی اور دشمنی میں ایک سلیقے کا قائل ہوں۔"

"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں سائیں؟"

"آجائیں گی، گاڑی سیدھی ہونے کے بعد۔" میں نے ذو معنی انداز میں کہا "جب تک ٹویوٹا ہائی لکس الٹی رہے گی، تمہاری کھوپڑی بھی اوندھی ہی رہے گی۔"

میر بخش کی آنکھوں میں الجھن ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا "سائیں! ک۔۔۔ کیا۔ آپ واقعی۔۔۔؟"

"ہاں، میں واقعی۔۔۔" میں نے سر کو اثباتی جنبش دی "اور اس کام میں ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ فکرمند ہوگیا "مگر سائیں! ہم دو افراد اتنی بھاری گاڑی کو کس طرح سیدھا کریں گے!"

میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا "دو نہیں، صرف ایک فرد۔"

وہ مزید حیران ہوگیا اور وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "میر بخش! تم جاکر پجارو کا پچھلا پہیا تبدیل کرو۔ گاڑی کے عقب میں فاضل اسٹپنی موجود ہے۔ میں ٹویوٹا ہائی لکس کو دیکھتا ہوں۔"

میر بخش کی حالت اس وقت دیوانوں ایسی ہورہی تھی۔ وہ میرے حکم کی تعمیل میں وہاں سے جانا بھی چاہتا تھا اور میری کارروائی دیکھنے کے لیے وہاں رکنا بھی چاہتا تھا۔ اس کا ذہن یہ بات تسلیم نہیں کررہا تھا کہ میں تن تنہا اس گاڑی کو سیدھا کردوں گا۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھے بغیر تحکمانہ انداز میں کہا "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم جلدی سے پجارو کو سفر کے قابل بنا دو اور اس سے پہلے سڑک پر موجود آئل کو ریت سے ڈھک دو تاکہ کوئی اور گاڑی اس طرح پھسل کر تباہی کے دہانے پر نہ پہنچ جائے۔"

یہ ایک اتفاق تھا اور خاصا سود مند اتفاق تھا کہ ابھی تک ہمارے سوا وہاں سے کوئی اور گاڑی نہیں گزری تھی۔ ایک تو وہ صبح کا وقت تھا، دوسرے۔۔۔ وہ سڑک بھی کچھ زیادہ مصروف نہیں لگتی تھی۔ اس وقت ہم ریلوے کراسنگ اور سامارو کے درمیان تھے۔

میر بخش کو احکام دینے کے بعد میں "چت" ہائی لکس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ اتنی بھاری گاڑی تھی کہ میں اپنی جسمانی قوت صرف کرکے اسے سیدھا نہیں کرسکتا تھا چنانچہ اس نازک موقع پر میں نے "چی" کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

میر بخش کی طرح ممکن ہے، اور بھی بہت سے افراد یہ سوچ رہے ہوں کہ میں دشمنوں کی مصیبت کو رفع کرنے میں

دلچسپی لے رہا تھا۔ مجھے بچ نکلنے کا ایک اچھا موقع میسر تھا۔ مجھے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ کسی سوچ پر پہرا یا پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ تارا میرا اور اکبر میر بخش کا دشمن تھا۔ وڈیرے کا گارڈ چونکہ اپنے مالک کے حکم کا پابند تھا اس لیے وہ بھی ہمارے دشمنوں ہی میں شمار تھا۔ اگر میں انہیں موجودہ مصیبت سے نجات دلانا چاہتا تو یہ بھی ان پر میرا ایک کاری وار ہی تھا۔ مصیبت زدہ دشمن پر احسان کرنا اسے بھری محفل میں سو جوتے مارنے سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔

دونوں گاڑیوں کے درمیان فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ میں الٹی ہوئی ہائی لکس کے پہلو میں آگیا۔ میں نے دونوں بازو آخری حد تک پھیلا کر اپنے ہاتھ گاڑی کی باڈی پر ٹکا دیے اور اپنی توجہ کو گاڑی کے مرکز پر مرکوز کردیا۔ کئی سال پہلے کسی سائنس داں نے بھاری سے بھاری چیز کو اٹھانے کے لیے ایک فارمولا بنایا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر اسے دنیا سے باہر کھڑے ہونے کی کوئی جگہ دے دی جائے اور ایسی ایک مضبوط سلاخ مہیا کی جائے جو اس کرۂ ارض کا بوجھ سہار سکتی ہو تو وہ دنیا کو اس سلاخ پر اٹھا سکتا ہے، ایک مضبوط فلکرم کی مدد سے۔

اس سائنس داں کے پیش کردہ "قوت، وزن اور فلکرم" کے فارمولے کو آج تک غلط ثابت نہیں کیا جاسکا۔ میں ٹویوٹا ہائی لکس کو "چی" کی قوت کی مدد سے سیدھا کرنا چاہتا تھا۔ "چی" کے استعمال کے لیے کسی سلاخ یا فلکرم کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اس کے لیے بنیادی طور پر صرف دو چیزیں اہم ہیں۔ آپ کا ارتکازِ توجہ اور مرکزِ توجہ!

میں نے ٹویوٹا ہائی لکس کے مرکز پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کے پش سے سیدھا کرنا شروع کردیا۔ میرے ذہن کا روشن حصہ کسی جنریٹر کے مانند توانائی فراہم کرنے لگا۔ یہ میری پختہ سوچ کی توانائی تھی جو میرے بازوؤں سے منتقل ہوتے ہوئے ہاتھوں کے راستے گاڑی میں منتقل ہورہی تھی۔ "چی" کی قوت عملی طور پر اسی طرح کام کرتی ہے۔ اس وقت میرے دونوں بازو کسی کار لفٹر کے انداز میں مصروف تھے۔ چند لمحات بعد گاڑی زمین سے اٹھنے لگی۔ میری جانب والے دونوں پہیے رفتہ رفتہ فضا میں بلند ہونے لگے۔ میں نے ارتکازِ توجہ کا عمل جاری رکھا اور گاڑی کو پہلو کے بل تقریباً عمودی حالت میں کھڑا کردیا۔ اس کے بعد میں نے سانس خارج کرتے ہوئے ہلکے سے پش کے ساتھ گاڑی کو دوسری جانب دھکیل دیا۔

ٹویوٹا ہائی لکس نے ایک دو ہلکے پھلکے ہچکولے کھائے اور اپنے "قدموں" پر کھڑی ہوگئی۔ گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں موجود تارا اور اکبر سومرو "اپ سائیڈ ڈاؤن" کی حالت سے واپس "اپ سائیڈ اپ" کی حالت میں آگئے۔

میں ان دونوں کو نظرانداز کرتے ہوئے وڈیرے کے محافظ کی جانب بڑھا۔ گاڑی الٹنے کے باعث وہ بری طرح نیچے دب گیا تھا۔ میں نے اس کے قریب جاکر بغور جائزہ لیا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھوں میں موجود تھی تاہم وہ چاروں خانے چت بے حس و حرکت پڑا تھا۔ سانس کی آمدورفت جاننے کے لیے میں اس پر جھک گیا اور پلک جھپکتے میں مجھے معلوم ہوگیا، اس کی سانسیں پوری ہوچکی تھیں۔

اسی وقت میں اپنے عقب میں کسی کو موجود پاکر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ میں نے بڑی سرعت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ میر بخش تھا۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی اس نے کہا۔

"لگتا ہے، یہ مانو تو گیا کام سے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے تصدیق کردی "یہ اپنی آخری سانس گاڑی کے نیچے دبے دبے لے چکا۔ یوں سمجھو، دنیا کے غم و فکر سے آزاد ہوگیا۔"

"سائیں! آپ نے اس گاڑی کو۔۔۔؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے میر بخش کو مزید بولنے سے روک دیا۔ وہ یقیناً یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے ٹویوٹا کو کس طرح سیدھا کرلیا تھا۔ اس قسم کی حیرانی آمیز اور تعجب خیز باتوں کا وقت نہیں تھا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا "میں نے تمہیں پجارو کا ٹائر تبدیل کرنے کو کہا تھا اور تم ابھی تک یہیں نظر آرہے ہو؟"

وہ پجارو کی جانب بڑھنے لگا تو میں نے گارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ گن تم اپنے قبضے میں کرلو۔"

میر بخش گارڈ کے ہاتھ سے گن نکالنے کے لیے آگے بڑھا پھر چونک کر میرے عقب میں دیکھنے لگا اس سے پہلے کہ میں اس کی چونکی ہوئی نگاہ کا مطلب سمجھ پاتا، اس نے ایک زوردار دھکا دے کر مجھے نیچے گرا دیا۔

میں ریتیلی زمین سے ٹکرایا ہی تھا کہ فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ میر بخش نے اس نازک موقع پر نہایت عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ مجھے دھکا دیتے ہوئے وہ خود بھی زمین پر لیٹ گیا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں اس گولی کی زد میں آنے سے محفوظ رہے۔

وہ گولی یقینی طور پر ہمارے دشمنوں کی جانب سے چلائی گئی تھی۔ میں نے زمین پر لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے ٹویوٹا کی

نے خود کو پوشیدہ کر رکھا ہے۔ پتا نہیں، تم کون سی دوسری لڑکی کا ذکر کر رہے ہو!"

وڈیرا اکبر سومرو بے یقینی سے پجارو کی جانب دیکھنے لگا۔ جب اسے وہاں کچھ دکھائی نہ دیا تو الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تم ہمیں چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے پجارو کے پچھلے حصے میں دو لڑکیوں کو دیکھا ہے۔ تم مجھے جھٹلا نہیں سکتے۔ میرے سر میں کوئی چوٹ بھی نہیں لگی اور میری نظر بھی سلامت ہے۔"

میر بخش وڈیرے کی جانب سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا' اس نے اکبر سومرو کی جانب دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں کہا "سائیں! تمہاری نظر تو ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ ایسا کون ہے جس کی بہن بیٹی یا بہو تمہاری اس نظر سے محفوظ رہی ہو؟"

اپنے سابق ادنیٰ سے چاکر کا یہ انداز گفتگو وڈیرے کو سخت ناگوار گزرا۔ وہ میر بخش کو نفرت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "کتے! تم ذرا بنگلے پر تو پہنچو۔ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔"

بات ختم کرتے ہی وڈیرے نے کلاشنکوف کا رخ میر بخش کی طرف کردیا۔ تارا مجھے پسٹل کے نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اعصاب شکن لمحات تھے۔ کسی لمحے کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وہ دونوں مسلح افراد میرے حملے کی رینج سے باہر تھے۔ اگر میں انہیں باتوں میں لگالیتا تو "کارروائی" کے لیے کوئی مناسب موقع نکل سکتا تھا۔ یہ بات تو یقینی تھی کہ تارا مجھے جان سے مارنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا البتہ وڈیرے سے کچھ بعید نہیں تھا۔ میر بخش نے اس سے غداری کرکے اس کے غیظ و غضب کو بری طرح للکار دیا تھا۔

وڈیرے کے محافظ کی لاش ہم سے تھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔ میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اکبر سومرو! تمہارا یہ جاں نثار حرام موت مرا ہے جس طرح ڈی ایس پی کے بنگلے پر تمہارے تین ساتھی سیکیورٹی گارڈز کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے ہیں۔ تم یہ پے درپے نقصانات کب تک اٹھاتے رہو گے؟"

"یہ تمام نقصانات میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائے ہیں۔" وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "تم نے ڈی ایس پی کے بنگلے پر میری ایک جیپ کو بھی بیکار کردیا تھا لیکن فکر نہ کرو' میں نے تمہارا بہت خوب صورت بندوبست کردیا ہے۔"

لفظ "بندوبست" پر اس نے خاصا زور دیا تھا۔ میں نے اسے آمادۂ گفتگو دیکھا تو آہستہ آہستہ گھسنا شروع کردیا۔ میں درحقیقت کسی سنہری موقع کی تاک میں تھا جب میں وہاں کی بازی کو پلٹ سکتا۔

میں نے وڈیرے کی جانب دیکھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا "تم نے میرے لیے کون سا خوب صورت بندوبست کیا ہے؟"

وہ فخریہ انداز میں بولا "میں نے بنگلے والی کہانی کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ تم جب بنگلے سے نکل رہے تھے تو ڈی ایس پی کے باڈی گارڈ کو ہوش آگیا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ ہم پر کلاشنکوف تان کر انکوائری شروع کرتا' ہم نے اسے گیٹ پر متعین گارڈز کے پاس دوسرے جہان میں پہنچا دیا۔"

"اور اس سے پہلے تم لوگوں نے دو سادہ پوش گھریلو ملازموں کو ڈی ایس پی کے ڈرائیور سمیت فنا کے گھاٹ اتار دیا تھا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈز بھی تمہاری فائرنگ کا نشانہ بنے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم غلط نہیں کہہ رہے۔" اس نے تائید کی "مگر تمہاری اس درست بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہی تو مزے کی بات ہے بچے۔" وہ معنی خیز انداز میں زیرِ لب مسکرایا "میں نے تمہیں بتایا ہے نا' میں نے تمہارے وہاں سے نکلتے ہی بنگلے والی کہانی کو الٹا کر رکھ دیا ہے۔"

میں نے اسے باتوں میں لگانے کی خاطر پوچھا "میں سمجھ نہیں سکا ہوں' تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا "اور اس لیے بھی بتاؤں گا کہ اب بہت جلد تم پولیس کی تحویل میں جانے والے ہو پھر تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی باقی زندگی جیل کی دیواروں کے پیچھے گزرے گی۔ کیا سمجھے؟"

"وہ کس خوشی میں بھئی؟"

"خوشی میں نہیں بلکہ جرم میں۔ جرم بھی نہیں بلکہ جرائم میں!" وہ ایک مرتبہ پھر معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا "میں نے اور میرے ساتھیوں نے ایسے کون سے جرائم کیے ہیں جو ہمیں جیل کی ہوا کھانا پڑے گی؟"

وڈیرا اکبر سومرو ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا "تم نہایت ہی مشکوک اور خطرناک بندے ہو۔ تم اپنی ساتھی دھنو کے ہمراہ غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرکے پڑوسی ملک بھارت سے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ تم پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا

رف دیکھا۔ اس کا ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھلا تھا اور مجھے تارا کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے پسٹل کی جھلک نے صورتِ حالات کو مجھ پر واضح کردیا۔ اب میں بھی سمجھ گیا کہ میر بخش نے مجھے دھکا کیوں دیا تھا۔ اس نے یقیناً تارا کو پستول بدست گاڑی سے نکلتے دیکھ لیا ہوگا۔

وہ بہت ہی خطرناک لمحات تھے۔ میر بخش اپنی کلاشنکوف کو پجارو میں چھوڑ آیا تھا اور وڈیرے کے گارڈ والی گن اب ہم سے کافی دوری پر تھی۔ میر بخش نے گارڈ والی گن کی جانب "پیش رفت" کی تو اسی لمحے تارا کے پستول نے ایک اور گولی اگل دی۔

یہ ایک تنبیہی فائر تھا۔ وہ محض میر بخش کو کلاشنکوف کی جانب بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں وہ کامیاب رہا۔ اس دوران میں وہ تیزی سے چلتے ہوئے ہمارے سروں پر آپہنچا پھر اس کی زہریلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"تم خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو نا۔ لو دیکھ لو' تمہاری چالاکی کسی کام نہیں آئی۔ میں نے بالآخر تمہیں چھاپ ہی لیا۔ تم کیا سمجھتے تھے' مجھے نچا دے کر غائب ہو جاؤ گے؟"

میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "میں تو اس وقت صرف یہ سمجھ رہا ہوں کہ تمہاری اصل میں کوئی فرق ہے ورنہ تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں جس عذاب سے نجات دلائی ہے' اس کے پیشِ نظر تمہیں اور تمہارے میزبان کو راہِ راست پر آجانا چاہیے تھا مگر تم خود کو نطفۂ ناتصدیق ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔"

"زیادہ "بک بک" نہ کرو اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔" اس نے پسٹل کو ہوا میں لہراتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا "اور تم بھی' وجدان کے چمچے!" اس نے میر بخش کی جانب اشارہ کیا۔

ہم دونوں نے اس کی فرمائش پر عمل کیا اور اس کے سامنے "ہینڈز اپ" ہوگئے۔

وہ پسٹل تھامے ہم سے محفوظ فاصلے پر تھا۔ کسی قسم کی جسمانی کارروائی اس پر کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔ میر بخش نے تیکھے انداز میں کہا۔

"سائیں! میں نے کہا تھا نا' دشمن کسی رحم کے قابل نہیں ہوتے۔ آپ نے ان دونوں کی جان بچا کر اچھا نہیں کیا۔"

دونوں کے ذکر پر مجھے وڈیرے کا خیال آیا۔ میں نے ٹویوٹا کی جانب دیکھا۔ یہ وہی لمحہ تھا جب وڈیرا گاڑی سے باہر نکل رہا تھا۔ اس نے یقیناً میر بخش کی بات سن لی تھی۔ وہ تیزی سے ہماری جانب بڑھتے ہوئے خوں خوار لہجے میں بولا۔

"نمک حرام! تمہیں دوستی اور دشمنی کا مطلب تو میں سمجھاؤں گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے گارڈ والی کلاشنکوف پر قبضہ کرلیا۔ ہمارے لیے صورتِ احوال مزید سنگین ہوگئی۔ وڈیرے کے تیور نہایت ہی خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

وڈیرا اکبر سومرو کی عمر پچپن کے قریب تھی۔ وہ سندھ کے روایتی وڈیروں کے لباس میں تھا۔ وہ دونوں خاصے خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ دونوں کی چال ڈھال اور لب و لہجے سے پتا چلتا تھا کہ اس حادثے میں وہ یکسر محفوظ رہے تھے۔ تارا کے سر پر پٹی بدستور موجود تھی۔ یہ عمرکوٹ کے ہوٹل میں ہمارے درمیان ہونے والے معرکے کی یادگار تھی۔

وڈیرا اکبر سومرو نے پجارو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا "لڑکیاں نظر نہیں آرہیں۔ وہ کہاں ہیں؟"

"لڑکیاں!" وڈیرے کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ تاہم میں نے صورتِ حالات کو سنبھالتے ہوئے کہا "تم کون سی لڑکیوں کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی لڑکیاں جو تھوڑی دیر پہلے پجارو میں موجود تھیں!" تارا نے طنزیہ انداز میں کہا "ہم نے ریلوے کراسنگ سے گزرتے ہی انہیں پجارو میں دیکھ لیا تھا۔ ان میں ایک تو تمہاری ساتھی دھنو (ساحل) تھی۔ دوسری میرے لیے اجنبی ہے۔ تم نے اسے کہاں سے اڑایا ہے اور وہ دونوں اس وقت کہاں ہیں؟"

ممتاز نے مجھے بتایا تھا' وہ اکبر سومرو کو اچھی طرح جانتی تھی لیکن وڈیرے نے اس کے حوالے سے خصوصاً کوئی بات نہیں کی۔ بس دو لڑکیوں کا ذکر کر رہا تھا وہ۔ اس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا۔ یا تو وہ ممتاز کو صورت سے پہچانتا نہیں تھا یا پھر اس نے پجارو میں ممتاز کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ممتاز' وڈیرے اکبر سومرو کے دشمن کی بیٹی تھی۔ اگر وڈیرے کو اس کی یہاں موجودگی کی خبر ہوجاتی تو ہماری مشکلات میں یقیناً اضافہ ہوجاتا۔

میں نے تارا کے طنز کا جواب تمسخرانہ انداز میں دیا "تارا! لگتا ہے' سر کی چوٹ نے تمہارے دماغ پر گہرا اثر کیا ہے' خاص طور پر تمہاری بصری حس بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ تمہیں ایک کے دو دو نظر آنے لگے ہیں۔ ہمارے ساتھ صرف ساحل تھی۔ تم لوگوں کی فائرنگ سے اس کا پاؤں زخمی ہوا ہے۔ وہ پجارو کے عقبی حصے میں لیٹی ہے۔ نظر تمہیں وہ اس لیے نہیں آرہی کہ مزید فائرنگ سے بچنے کے لیے اس

ٹھپا لگانا بہت آسان ہے۔ اس کے بعد تم نے میرے ایک آدمی نواز علی کو صحرا میں قتل کر ڈالا' دوسرے آدمی میر بخش کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔" اس نے نفرت آمیز نظر سے میر بخش کو دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کمتر کمینے کا تو میں جو حشر کروں گا وہ دنیا دیکھے گی۔ نہ صرف دیکھے گی بلکہ کانوں کو ہاتھ بھی لگائے گی۔ کسی کو آئندہ غداری کا حوصلہ نہیں ہو سکے گا۔"

وڈیرے کے چہرے کے عضلات سے اندازہ ہوتا تھا وہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔ یہ میرے لیے خاصا سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ میں غصے کی حالت میں اس سے کوئی ایسی غلطی کروانے میں کامیاب ہو سکتا تھا جس سے مجھے ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع مل جاتا۔

میں نے براہِ راست وڈیرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "تم میرے بلکہ ہمارے جرائم گنوانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ کیا تم نے وہ ارادہ ترک کر دیا ہے؟"

وہ میرے طرزِ تخاطب پر تلملا کر رہ گیا۔ تاہم وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تمہارے جرائم کی کہانی بہت طویل ہے۔ بہرحال۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بتانے لگا "میرے آدمی میر بخش کے ساتھ مل کر تم نے عمر کوٹ میں بدمعاشی اور غنڈا گردی کی کئی وارداتیں کیں جن میں کئی افراد زخمی ہوئے۔ اس کے بعد تم میری ہی چوری شدہ بلکہ چھینی ہوئی گاڑی میں عمر کوٹ سے میرپور خاص کی طرف فرار ہو رہے تھے تو ناکے پر تم لوگ دھر لیے گئے۔ تم پر ڈاکوؤں وغیرہ کا شک کیا گیا۔ اگرچہ تم لوگ ڈاکو نہیں تھے' نہ ہی مغویہ ممتاز سے تمہارا کوئی تعلق تھا مگر تم لوگوں نے اپنی شناخت چھپانے کے لیے نام اور مقامات کے بارے میں متعدد جھوٹ بولے۔ اتنی بھاری تعداد میں جھوٹ وہی لوگ بولتے ہیں جو کسی نہ کسی جرم یا جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا تو میں نے پوچھا "پھر۔ اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو تم؟"

"جو بھی ثابت کرنا ہے وہ تو پولیس ہی کرے گی۔" وڈیرے نے حقارت سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "ہم تو صرف تم لوگوں کو ان کے حوالے کریں گے اور۔ تم لوگوں میں یہ غلیظ اور بدبخت شخص میر بخش شامل نہیں۔" اس نے باقاعدہ انگلی سے میر بخش کی طرف اشارہ بھی کر دیا "اس حرام کے تخم کو تو میں اپنے ساتھ بنگلے پر لے جاؤں گا۔"

میں نے کہا "میں ڈی ایس پی کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کر چکا ہوں۔ وہ تو رشوت کے چکر میں ہمیں اپنے بنگلے پر لے گیا تھا ورنہ ہم قابلِ گرفت نہیں تھے۔"

"یہ تمام باتیں اب ماضی کا حصہ بن چکی ہیں۔" وڈیرے نے تیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "نئی کہانی تمہاری سوچ اور خیال سے بالکل مختلف ہے۔"

اس کے پراسرار انداز نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے پیشانی پر پریشانی کے تاثرات سجاتے ہوئے سوال کیا "اور وہ نئی کہانی کیا ہے؟"

"نئی کہانی یہ ہے وجدان!" تارا نے براہِ راست مجھے مخاطب کیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "ڈی ایس پی کے بنگلے پر تم نے بہت اودھم مچایا ہے۔ تم نے سب سے پہلے محترم ڈی ایس پی کو بے ہوش کر کے اس کا ریوالور چھینا پھر کسی طرح اس کے باڈی گارڈ پر قابو پا لیا۔ تم جیسے بدنام زمانہ مجرم سے کچھ بھی بعید نہیں۔ تم نے گارڈ کو بے بس کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ اس دوران میں تمہارے ساتھی زیریں منزل پر اے ایس آئی عبدالرزاق سے کلاشنکوف چھین کر اسے باتھ روم میں بند کر چکے تھے۔ تم بالائی منزل پر موجود ڈی ایس پی کے ڈرائیور اور دو گھریلو ملازموں کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے اس لیے فوراً ان کا کام بھی تمام کر دیا۔ بنگلے سے فرار ہوتے وقت جب گیٹ پر موجود سیکیورٹی گارڈز نے تمہیں روکنے کی کوشش کی تو تم نے انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ اس فائرنگ کی زد میں ہمارے تین افراد بھی آ گئے۔ وہ وڈیرا سائیں کے بہترین ساتھی تھے۔ تم نے ان کی لاشیں گرا دیں اور ہماری جیپ میں وہاں سے فرار ہو گئے۔"

بات ختم کرنے کے بعد تارا نے بڑے فخر سے مجھے دیکھا۔ میرا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ وڈیرے نے میری کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "تم ہماری ایک جیپ لے کر فرار ہو گئے اور دوسری جیپ کے پچھلے ٹائروں کو بیکار کر دیا۔ اس کے علاوہ تم نے جیپ کی باڈی پر متعدد گولیاں بھی برسائیں تاکہ ہم تمہارا تعاقب نہ کر سکیں۔"

"مگر یہ تو سب جھوٹ ہے۔" میں نے احتجاجی انداز میں کہا "ہم نے کسی ایک فرد کو بھی قتل نہیں کیا۔ بنگلے پر جو ہلاکتیں ہوئیں ان میں سراسر تم لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

تارا نے طنزیہ لہجے میں کہا "یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔ تمہاری بات کا یقین کون کرے گا؟"

"میں جو بھی کہہ رہا ہوں' وہ سچ ہے' صداقت ہے۔"

"تمہارے اس سچ اور صداقت کا کوئی ثبوت نہیں۔" وڈیرا مکاری سے مسکراتے ہوئے بولا "بنگلے پر صرف دو

پولیس والے زندہ بچے ہیں یعنی ڈی ایس پی اور اے ایس آئی عبدالرزاق۔ ڈی ایس پی کو ہم ہی ہوش میں لے کر آئے تھے اور اے ایس آئی کو بھی ہم نے ہی زیریں منزل کے باتھ روم سے برآمد کیا ہے۔ ہم نے انہیں جو کہانی سنائی انہوں نے اس پر یقین کرلیا۔ ڈی ایس پی بڑی سرگرمی سے تمہاری تلاش میں ہے۔ پولیس پر ہتھیار اٹھانا اور انہیں قتل کرنا انتہائی سنگین جرائم میں شمار ہوتا ہے۔ اب تم اپنی پوزیشن کا خود ہی اندازہ لگالو۔"

حالات نے ہمارے خلاف سازش کا ایک ایسا نادیدہ جال بن دیا تھا جس میں ہم بری طرح پھنس کر رہ گئے تھے۔ اگر ہمیں دوبارہ ڈی ایس پی کے حوالے کردیا جاتا تو پھر ہماری جان چھوٹنی مشکل ہوجاتی۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے، کوئی ہماری سچائی کا یقین نہ کرتا۔ ہمارے لیے بہتر یہی تھا کہ ان خبیثوں کے چنگل سے نکل کر آگے بڑھ جاتے مگر کیسے؟ میرا ذہن بڑی تیزی سے اس سوال کا جواب تلاشنے میں مصروف ہوگیا۔

میں نے وڈیرا اکبر سومرو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کیا آپ لوگ واقعی ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ بات سولہ آنے درست ہے۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

"پھر اس کے مشن کا کیا ہوگا؟" میں نے تارا کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے سوال کیا "یہ تو مجھے اپنے چوہدری کے قدموں میں ڈالنا چاہتا تھا؟"

تارا نے کہا "میرا مشن ضرور کامیاب ہوگا۔ ڈی ایس پی کے بنگلے سے میں نے فون پر چوہدری صاحب سے بات کرلی ہے۔ ہم ایک خاص مقصد کے تحت تمہیں پولیس کے حوالے کریں گے۔ تم پر اتنے سنگین مقدمات ڈال دیے جائیں گے کہ جیل سے باہر کبھی نہیں آسکو گے۔ ویسے بھی چوہدری صاحب نے تمہارا اچار یا مربہ تو ڈالنا نہیں۔ وہ صرف تم سے سونے کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ تمہارے باپ نے چوہدری صاحب سے بھاری مالیت کا سونا چھین کر کہیں چھپا دیا تھا اور تم اس خفیہ مقام سے واقف ہو۔ چوہدری صاحب کی پہنچ بہت دور تک ہے۔ ڈی ایس پی سے بھی ان کی بات ہوگئی ہے۔ تم ڈی ایس پی کے چنگل میں پھنسو گے تو ہر راز تمہاری زبان سے اگلوا لیا جائے گا۔ ہمارا مقصد پورا ہوجائے گا۔ تم جاؤ جہنم میں۔ پولیس تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتی ہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں!"

تارا کے انکشافات بڑے تشویش ناک تھے۔ وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب اگر ہم پولیس کے ہتھے چڑھ جاتے تو وہ ہمارا یادگار حشر کرسکتی تھی۔ ڈی ایس پی کے بنگلے پر ہونے والی قتل و غارت گری کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا۔ حالات یکسر ہماری مخالفت میں جارہے تھے۔ میں نے الجھن زدہ نظر سے پجارو کی جانب دیکھا تو وڈیرے نے پوچھا۔

"دو لڑکیاں تو کجا، وہاں ایک بھی نظر نہیں آرہی۔ تمہاری زخمی ساتھی کہیں تکلیف کی شدت سے جان تو نہیں ہار گئی؟"

ممتاز اور ساحل میری ہدایت پر بڑی سختی سے عمل پیرا تھیں۔ ابھی تک ان دونوں میں سے کسی نے بھی اٹھ کر باہر کے حالات جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی یہ فرماں برداری ہمارے لیے کافی سود مند ثابت ہورہی تھی۔ فرماں برداری عموماً نفع بخش ہی ثابت ہوتی ہے!

تارا نے وڈیرے کی تشویش کے جواب میں کہا "سائیں! پجارو کون سی دور ہے۔ وہاں جاکر دیکھ لو، وہ لڑکیاں کہاں اور کس حالت میں چھپی بیٹھی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو تارا۔" وڈیرے نے تائید کی "اس طرح یہ بھی پتا چل جائے گا کہ وہ دوسری لڑکی کون ہے۔"

تارا نے کہا "میں ان دونوں کو نشانے پر رکھتا ہوں۔" اس کا اشارہ واضح طور پر ہماری جانب تھا "آپ پجارو کے اندر کے حالات کی خبر لے لو پھر ہم ان سب کو لے کر یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔"

وڈیرے نے پجارو کی جانب قدم اٹھا دیے۔

میرا ذہن برق رفتاری سے کام کرنے لگا۔ ہم نازک ترین حالات سے گزر رہے تھے۔ تارا اور وڈیرا مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ میں ان پر حملہ آور ہوکر انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میری ایسی کوئی بھی حرکت انہیں فائرنگ پر مجبور کردیتی جس میں یقیناً نقصان ہمارا ہی ہوتا۔

وڈیرے نے پجارو کی سمت دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ میر بخش اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔ وہ کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند اپنے سابق آقا کے سامنے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ وڈیرا اپنے غلام کی اس حرکت پر چراغ پا ہوگیا۔ اس نے دہاڑ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"حرام زادے! ہٹ جا میرے راستے سے۔"

"تمہارا حکم سننے والے کان اب میرے پاس نہیں رہے سائیں۔" میر بخش نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جرات مندی سے کہا "تمہیں پجارو تک جانے کے لیے میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔"

وڈیرا دانت پیستے ہوئے بولا "تمہاری لاش گرانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں ابھی فائرنگ کرکے تمہارا جسم چھلنی کرسکتا ہوں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔" میر بخش عجیب سے لہجے میں بولا "چلاؤ گولی۔"

مجھے میر بخش کی حماقت پر غصہ تو آرہا تھا تاہم میں اسے اس حرکت سے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جو عزم دیکھا تھا اور اس کی آواز میں جو اعتماد شامل تھا وہ کسی طوفانِ بلا خیز سے کم نہیں تھا۔ وہ یقینی طور پر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

وڈیرے نے تلملائے ہوئے انداز میں میر بخش کے سوال کا جواب دیا "ذلیل انسان! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس قسم کی گھٹیا باتیں کرکے تم مجھے طیش دلانے میں کامیاب ہوجاؤ گے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تمہیں یک مشت مارنے کی غلطی نہیں کرسکتا۔ میں تو تمہیں اپنے ساتھ جاگیر پر لے جاؤں گا اور تمہارے بدن کا عضو عضو چھید کر اس میں مرچیں بھروں گا۔ غداروں کو میں اتنی آسان موت دینے کا عادی نہیں ہوں۔"

"میں غدار نہیں بلکہ ہیرو ہوں۔" میر بخش نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"تیرے تو ہیرو کی میں... اوں۔"

وڈیرا کلاشنکوف سے میر بخش پر حملہ آور ہوا مگر اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی "ٹھک" کی آواز فضا میں بلند ہوئی اور وہ "اوں" کرتے ہوئے زمیں بوس ہونے لگا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگری تھی۔

تارا نے چونک کر اپنے میزبان کو دیکھا گویا ایک لمحے کے لیے وہ میری جانب سے غافل ہوگیا تھا۔ اس کی اس غفلت سے فائدہ نہ اٹھانا سب سے بڑی حماقت ہوتی۔ میرے لیے وہ لمحاتی مہلت کافی تھی۔ میں نے فضا میں پرواز کی اور سیدھا تارا کے اوپر پہنچ گیا۔

تارا نے مجھے اپنے انتہائی قریب دیکھا تو ہاتھ میں پکڑا ہوا پسٹل میری جانب سیدھا کرنا چاہا مگر اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل کر میری دسترس میں آچکا تھا۔ میں نے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ایک زوردار جھپٹا مارا اور اسے ساتھ لیتے ہوئے ریت پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

اس دوران میں میر بخش نے وڈیرے والی کلاشنکوف پر قبضہ جما کر اسے نشانے پر رکھ لیا۔ وڈیرا اپنی بائیں کہنی تھامے زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اسی وقت ساحل پجارو سے باہر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ڈی ایس پی والا ریوالور نظر آرہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ساحل ہی نے فائر کرکے وڈیرے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا تھا۔ ساحل کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ساری صورتِ حالات واضح ہوگئی۔ ساحل کی یہ کارروائی بروقت تھی۔ اس نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وڈیرے پر گولی چلائی تھی۔ اس بہادر لڑکی پر میں فخر محسوس کرنے لگا۔

اگرچہ ساحل کی چلائی ہوئی گولی نے بازی پلٹ دی تھی۔ تاہم تارا اب بھی مجھ سے زور آزمائی میں مصروف تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں اس کے پسٹل والے ہاتھ کی کلائی دبوچ رکھی تھی اور وہ اپنا بازو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ وہ اس وقت میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے اس کی بغل میں ایک زوردار گھٹنا رسید کردیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گیا۔ اس کی جگہ اگر کوئی عام سا غنڈا ہوتا تو میرے گھٹنے کی طوفانی ضرب اسے تڑپنے پر مجبور کردیتی۔ تارا میں کسی سانڈ کی سی قوت بھری تھی اور وہ بے پناہ قوتِ برداشت کا بھی مالک نظر آتا تھا۔ عمر کوٹ کے ہوٹل میں، میں نے اسے جو زخم دیے تھے انہیں چاٹنے کے لیے کئی دن درکار تھے مگر وہ آندھی طوفان کی طرح اس صحرا میں میرے پیچھے چکراتا پھر رہا تھا۔

تارا نے میرے گھٹنے کی ٹھوکر کھانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ جواباً مجھ پر حملہ بھی کیا۔ اس نے گھٹنے فولڈ کرتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں میرے پیٹ پر جمائے اور پوری قوت سے مجھے اپنے اوپر سے دور اچھال دیا۔

میں کسی بدنصیب مظلوم کی طرح زمین پر لوٹ پوٹ نہیں ہوا بلکہ میں نے فضا میں رہتے ہوئے اپنے وجود پر توازن حاصل کرلیا اور ہوا میں ردل کرتے ہوئے سیدھا اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔

تارا مجھ سے صرف تین قدم کی دوری پر زمین سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے اس کی یہ کوشش ناکامیاب بنادی۔ میں لیفٹ راؤنڈ ہاؤس کرتے ہوئے دو قدم اندر آیا پھر بجلی کی سرعت سے رائٹ وھیل کک اس کی کھوپڑی پر رسید کردی۔

وہ ابھی پوری طرح سنبھل کر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ میری وھیل کک نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کردیا۔ اس کے ہاتھ کا پسٹل ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا اور وہ اپنے قدموں پر ڈگمگاتے ہوئے دونوں ہاتھ ہوا میں چلانے لگا۔

تارا کے سر کا عقبی حصہ پہلے ہی بری طرح زخمی تھا۔ میری دھانسو کک نے اس کے زخم کی ٹھیک ٹھاک مزاج پرسی کرڈالی۔ اس کے سر پر بندھی ہوئی سفید پٹی عقبی جانب سے سرخ ہونے لگی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اس کے سر کے زخمی حصے سے خون جاری ہوگیا تھا۔

تارا کے ہاتھ سے نکلے ہوئے پسٹل کو ساحل نے اٹھالیا۔ میر بخش نے کلاشنکوف ساحل کے حوالے کی اور وڈیرے پر پل پڑا۔ وہ لاتوں اور گھونسوں سے اپنے سابق آقا کی "خدمت" میں مصروف ہوگیا۔ میں میر بخش کو اس کے حال پر چھوڑ کر تارا کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میر بخش کے سینے میں وڈیرے کے لیے غم و غصے کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا' اچھا تھا وہ غبار نکال کر دل ہلکا کرلیتا۔

تارا بڑا ہمت والا ثابت ہورہا تھا۔ بری طرح پٹنے کے بعد بھی وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے آگے بڑھا۔ اس کے حملے میں وہ پہلے جیسی تیزی و پھرتی نہیں تھی۔ اس کی کسمپرسی دیکھ کر مجھے ترس بھی آیا۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مجھے فرنٹ کک مارنا چاہی۔

میں اچک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا کک والا پاؤں ہوا میں جھولا اور "دھپ" سے ریتیلی زمین پر آٹکا۔ وہ اس وقت واضح طور پر ہانپ رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "تارا! تم تو مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے والے تھے۔ اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

وہ میرے اس ترش انداز پر تلملا کر رہ گیا اور غصے سے بولا "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم خوش قسمت ہو۔ بار بار ہمارے گھیرے سے نکل جاتے ہو لیکن یاد رکھو' قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ دیکھنے والے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔"

"اور تم یہ ساری کارروائی اسی حالت میں کرو گے۔ ہیں؟" میں نے انگلی سے اس کی جانب اشارہ کیا "تم تو اس وقت اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو!"

وہ پھنکار کر آگے بڑھتے ہوئے بولا "میں ابھی تمہیں بتاتا ہوں کہ کس قابل ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے گھٹنے پر اپنے پاؤں سے ٹھوکر مارنا چاہی۔ تارا جو گرز پہنے ہوئے تھا۔ میں نے اس کے پاؤں کے حرکت میں آنے سے قبل اس کا ارادہ بھانپ لیا اور اپنا اسٹانس توڑتے ہوئے اسی پاؤں سے فرنٹ کک ایک جرک کے ساتھ اس کے منہ پر جڑ دی۔ اسٹانس توڑنے کا سراسر فائدہ مجھے پہنچا اور تارا کا ٹھوکر کے لیے آگے بڑھا ہوا پاؤں نہ صرف یہ کہ میرے گھٹنے تک نہ پہنچ سکا بلکہ میری کک نے اس کی ٹھوڑی کا سوا ستیاناس بھی کردیا۔ سوا ستیاناس ان معنوں میں کہ عمرکوٹ والے ہوٹل کے کمرے میں گھٹنے کی بھرپور ضرب سے اس کی ٹھوڑی کا ستیاناس تو پہلے ہی مارا تھا جس کے نتیجے میں دانتوں تلے دب کر اس کی ناپاک زبان لہولہان ہوگئی تھی۔

ٹھوڑی پر لگنے والی میرے پاؤں کی ضرب نے تارا کو پیچھے الٹنے پر مجبور کردیا۔ وہ کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا۔ تاہم وہ اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا یہی تھا۔ میں بہ آسانی اس پر حاوی ہوچکا تھا۔ سر کی عام سی چوٹ بھی انسان کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیتی ہے۔ یہ تارا ہی کی ہمت تھی کہ وہ چاہے لڑکھڑاتے ڈگمگاتے قدموں ہی سے سہی' بہرحال میرے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔

میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی حالت خاصی قابلِ رحم تھی۔ میں نے اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔

"تارا! تم تو مجھے بتانے والے تھے' کس قابل ہو! پھر کیا ہوا؟"

وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے اسے مزید تپانے کے لیے کہا "بھئی' سچی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے کسی قابل بھی نظر نہیں آرہے۔ بہتر یہی ہے کہ چوڑیاں پہن کر "شو" وغیرہ کرنا شروع کردو۔"

اس کے ہونٹ کچھ اس انداز میں ہلے جیسے مجھے گالی دے رہا ہو۔ میں نے جلتی پر تیل کا پورا گیلن انڈیلتے ہوئے کہا "شرم و حیا نے تو تمہاری زبان کو گنگ کردیا ہے۔ ہونٹ ہل رہے ہیں مگر مجال ہے جو آواز نکلے۔ تم تو اچھے خاصے "مشرقی مرد" ثابت ہورہے ہو!"

وہ غصے کی شدت سے کپکپا اٹھا پھر غلیظ گالی میری جانب اچھالتے ہوئے اس نے وحشت ناک انداز میں کہا "آؤ۔ مجھ پر حملہ کرو۔" اس نے ہاتھوں سے باقاعدہ مجھے بلانے کا اشارہ بھی کیا "تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے دو چار چوٹیں پہنچانے کے بعد تسخیر کرچکے ہو۔ تارا اب بھی تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنا سکتا ہے۔ مرد کے بچے ہو تو آگے بڑھو۔"

میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "بیمی جانور کی تو قربانی بھی قبول نہیں ہوتی۔"

"یہ کیا بکواس کررہے ہو تم۔" وہ طیش کے عالم میں ...ڑا "تم نے مجھے جانور کہا ہے؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا "میں نے تو ایک مثال دی ہے۔ ...م اس وقت بری طرح زخمی ہو۔ تم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے مجھے ...شرم آرہی ہے۔"

"بہانے بازی مت کرو۔" اس نے مجھے گھرکا "سیدھی ...طرح اعتراف کرلو کہ تم میرے نزدیک آتے ہوئے ڈر رہے ہو ...یہ تم جانتے ہو' میں تمہیں چٹکیوں میں مسل دوں گا۔"

وہ انتہائی بے وقوفانہ بات کررہا تھا۔ اس وقت میں ہر ...حوالے سے اس پر اپنی برتری ثابت کرچکا تھا لیکن اس کی اکڑ ...فوں کی توں باقی تھی' گویا رسی جل چکی تھی' بل باقی تھے۔ میں ...نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم میں اور مجھ میں یہی فرق ہے تارا۔ تم منفی ذہنیت کے مالک ہو جبکہ میں مثبت طرزِ فکر کا حامل ہوں۔"

وہ اکتاہٹ آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ...تمہاری ہائی لکس الٹ گئی تھی۔ تم دونوں کسی چوہے کی ...طرح گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں پھنس گئے تھے۔ تم ...دونوں کا گن بردار محافظ بھاری گاڑی کے نیچے دبا تھا۔ میں اگر ...چاہتا تو تم سب پر لعنت بھیج کر یہاں سے چلا جاتا۔ تم مرتے یا ...بچتے' مجھے اس کی پروا نہیں ہونا چاہیے تھی مگر میں نے ہائی ...لکس کو سیدھا کرکے تم لوگوں کو جان بچانے کا موقع دیا۔ ...دوستی اور دشمنی کا بھی کوئی قاعدہ' کوئی دستور ہوتا ہے لیکن ...تم؟" میں نے جملہ ادھورا چھوڑنے کے بعد اسے ٹٹولتی ...ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "لیکن تم تو دوستی کیا' دشمنی کے بھی ...قابل نہیں ہو۔ تم نے احسان فراموشی کی وہ مثال قائم کی ہے ...جو مدتوں یاد رکھی جائے گی۔"

"مجھے تمہارے اس لیکچر سے کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ ...ایک ناپسندیدہ نظر مجھ پر ڈالتے ہوئے بولا "میدانِ جنگ میں ...ہر جائز اور ہر تدبیر واجب ہوتی ہے۔ تم میرے دشمن ہو ...ہر دشمن۔ میں تمہیں اور تمہاری دشمنی کو بھول نہیں ...سکتا۔ تم میرے اکلوتے بھائی دارا کے قاتل ہو' یہ بات میں ...اس وقت تک یاد رکھوں گا جب تک تمہیں نیست و نابود ...نہ کردیتا۔" اس نے بڑے زور سے دانت کچکچائے اور ...پھنکارتے ہوئے لہجے میں بولا "تم نے گاڑی کو سیدھا کرکے ...ہماری جان بچائی' یہ تمہاری بے وقوفی تھی۔ اپنی حماقت کو ...احسان کا نام نہ دو وجدان!"

میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "تم بالکل ٹھیک ...کہتے ہو۔ واقعی مجھے تمہارے ساتھ بھلائی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ تم کسی سانپ سے کم نہیں۔ تمہارا کام ڈسنا ہے۔ تم لاٹھی والے ہاتھ اور دودھ پلانے والے ہاتھ میں تمیز نہیں کرسکتے۔ اپنی فطرت سے مجبور ہو۔ تم ہر احسان' ہر بھلائی کو فراموش کرکے اپنی فطرت کے عین مطابق ڈنک مارو گے۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ وہ اچھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ ایک مارشل آرٹسٹ تھا تاہم جوشِ جذبات میں اس وقت وہ بالکل دیسی انداز میں مجھ پر جھپٹا تھا۔ اس نے دونوں بازو آگے پھیلا کر میری گردن کو گرفت میں لینا چاہا۔ میں بیٹھک لگانے والے انداز میں نیچے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں پیٹ کے بل میرے سر پر گرا' اسی لمحے میں تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

تارا فضا میں بلند ہوا' میں نے دونوں ہاتھوں کے پش سے اسے دور پھینک دیا۔ زمین ریتیلی تھی اس لیے وہ کسی خطرناک چوٹ سے محفوظ رہا۔ بصورتِ دیگر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

جس وقت تارا بدقت تمام زمین سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا' میں نے میر بخش کی جانب دیکھا۔ وہ پوری طرح وڈیرے پر قابو پائے ہوئے تھا۔ میر بخش نے اپنے سابق آقا کے ساتھ اتنی بے دردی سے لات مکا کیا تھا کہ وہ چاروں خانے چت ریت پر پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"ہاتھ ہلکا رکھو میر بخش' کہیں اپنے سائیں کو جان ہی سے نہ مار دینا۔" میں نے تارا کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"سائیں وجدان! اس جیسے کمینے اور ڈھیٹ انسان اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔" میر بخش نے ایک جان دار ٹھڈا اکبر سومرو کی پشت پر رسید کرتے ہوئے کہا "ابھی تک تو یہ زندہ ہے۔ اگر آپ حکم کرو تو میں اس کی جان بھی نکال سکتا ہوں۔"

"نہیں!" میں نے قطعیت سے کہا "یہ تمہارے قابو میں ہے' یہی بہت ہے۔ ابھی تو ہم نے اس سے بہت سی کہانیاں سننا ہیں۔ اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے۔"

"پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟" میر بخش نے پوچھا۔

"تم اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر مکمل قابو میں کرلو تاکہ یہ کسی قسم کی "حرکت" کے قابل نہ رہے۔" میں نے کہا "میں اس لعین سے نمٹ کر تمہاری طرف آتا ہوں۔"

لعین سے میری مراد تارا تھی کیونکہ وہ اب میرے سامنے اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ اس وقت جس اسٹانس میں کھڑا تھا اس

میں مجھے کافی کمزوریاں نظر آئیں۔ میں نے اس کے پاؤں پر نظر جماتے ہوئے برق رفتاری سے اس کے ہاتھوں پر ایک راؤنڈ ہاؤس کک ماری۔

ردِ عمل کے طور پر اس نے دونوں ہاتھ پیچھے ہٹائے۔ اس نے اپنے چہرے کو کور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش کے نتیجے میں اس کا سینہ کھل گیا۔ میں نے اس گیپ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور سائڈ کک اس کے سینے پر رسید کردی۔

ٹھوکر کھانے کے بعد وہ لڑکھڑایا تاہم زمین بوس ہونے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔ اس کے بعد تو اس کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ پے درپے ناکامیابی نے اس کا دماغ خراب کردیا تھا۔ وہ کسی جنونی کی طرح مجھ پر پل پڑا۔

اس نے رائٹ پنچ میرے منہ پر رسید کرنا چاہا۔ میں نے گردن کو ایک جانب جھٹکتے ہوئے چہرے کو اس کے وار سے بچایا۔ اس نے لیفٹ گھٹنا میرے پیٹ میں مارنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔ تاہم مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ میں نہایت پھرتی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

تارا نے بڑے دھواں دھار انداز میں مجھے "نی شاٹ" لگانے کی کوشش کی۔ یہ مارشل آرٹس کی ایک ایسی ضرب ہے جو مدِمقابل کے گھٹنے کے جوڑ پر لگائی جاتی ہے تاکہ اس کا توازن بگاڑا جاسکے۔

میں نے بیک اسٹیپ لیتے ہوئے اپنے گھٹنے کو تارا کے وار سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دائیں راؤنڈ ہاؤس کک اس کے چہرے پر رسید کردی۔ اس نے گردن کو پیچھے جھکاتے ہوئے چہرے کو میری کک سے بچایا۔ اس کے ساتھ ہی بے اختیار اس کا دایاں ہاتھ بچاؤ کے سے انداز میں سامنے نکل آیا۔

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور راؤنڈ ہاؤس کک کو ریورس کرتے ہوئے اس کی کہنی پر لاک لگاتے ہوئے زوردار جھٹکا دیا۔ ایک "کڑاکے" کی آواز پیدا ہوئی اور تارا کی فلک شگاف چیخ فضا میں بلند ہوئی۔ یہ تکلیف اس کی برداشت سے باہر تھی۔

یقینی طور پر تارا کا بازو کہنی کے جوڑ سے ٹوٹ چکا تھا۔ میں نے ایک سائڈ کک رسید کرتے ہوئے اسے دور پھینک دیا۔

وہ کچھ دیر تک اوندھا زمین پر پڑا رہا پھر اپنے مجروح بازو کو تھام کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا دایاں بازو اس طرح جھول رہا تھا جیسے کندھے سے اس کا رابطہ نہ رہا ہو۔ وہ کسی مولی کی طرح تارا کے بائیں ہاتھ میں لٹک رہا تھا۔ تارا کا شمار ایسے افراد میں ہوتا تھا جو کسی رحم کے قابل نہیں ہوتے۔ میں نے اس کے "شایانِ شان" سلوک کرنے کا فیصلہ کیا اور اسے ٹھوکروں میں اڑانے لگا۔ اس کی کمزور مدافعت نے میرا "کام" آسان بنادیا۔

دس منٹ بعد وہ زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی ساری تن فن غائب ہوگئی۔ وہ اس وقت کسی کیچوے کی طرح بے بس پڑا تھا۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اب اس کی جانب سے کسی نقصان دہ کارروائی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔

دوسری جانب میر بخش اپنے سابق وڈیرے سائیں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا چکا تھا۔ وہ دونوں شیطان ہمارے رحم و کرم پر تھے۔ میں زیادہ دیر وہاں رکنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے میر بخش سے کہا "تم جلدی سے پجارو کا ٹائر تبدیل کرو۔ میں ان سورماؤں پر نظر رکھتا ہوں۔"

"ان کا کیا کرنا ہے سائیں؟" میر بخش نے سوال کیا۔

"یہ ہمارے ساتھ جائیں گے۔" میں نے کہا "ان کی کھالوں سے بہت مضبوط اور ڈھیٹ قسم کے جوتے تیار ہوسکتے ہیں۔ یہ دونوں خاصی موٹی کھال کے واقع ہوئے ہیں۔"

میر بخش مزید کوئی سوال کیے پجارو کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے ساحل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ریوالور مجھے دو اور ممتاز سے کہو، آرام سے سیٹ پر بیٹھ جائے۔ حالات پوری طرح ہمارے قابو میں ہیں۔"

میں جب تارا سے نبرد آزمائی میں مصروف تھا، اس دوران میں میر بخش نے ہائی لکس میں سے ایک رسی تلاش کرکے وڈیرے کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے تھے۔ ساحل نے اپنے ہاتھ کا ریوالور مجھے دیتے ہوئے کہا "وجدان! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے کہا "میں ان دو باگڑ بلوں کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ انہیں پجارو میں ڈال کر ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

یہی سوال تھوڑی دیر پہلے میر بخش نے بھی مجھ سے کیا تھا اور میں نے اسے خاصا تسلی بخش جواب دے دیا تھا اس لیے ساحل نے مزید جرح نہیں کی اور ممتاز کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے جب ساحل سے ممتاز کو سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تو وڈیرے اکبر سومرو نے چونک کر پجارو کی طرف دیکھا تھا۔ اسے دو لڑکیوں کے بارے میں خاصی تشویش تھی۔

خاص طور پر دوسری لڑکی یعنی ممتاز کے بارے میں۔ وہ اور تارا ریلوے کراسنگ سے ہمارے تعاقب میں تھے۔ انہوں نے ممتاز اور ساحل کو پجارو میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔

میں نے میر بخش سے پوچھا "تمہارے پاس اور رسی تو ہوگی؟"

وہ پجارو کے عقب سے فاضل اسٹپنی اتار کر ٹائر تبدیل کرنے میں مصروف ہوچکا تھا۔ اس نے جواب دیا "سائیں! مزید رسی تو نہیں ہے۔ جو تھی، میں نے اس سے اس مردود کے ہاتھ پاؤں کس کر باندھ دیے ہیں۔"

"دوسرا مردود بھی اسی قسم کی "تواضع" کا حق دار ہے۔" میں نے کہا "میں کسی کے ساتھ "ناانصافی" نہیں کرسکتا۔"

"پھر کیا کیا جائے؟" میر بخش اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "تم جو کررہے ہو، اسے جلد از جلد نمٹالو۔ میں ہی ان کی "خاطرداری" کی کوئی راہ نکالتا ہوں۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت وڈیرے کے پاؤں کی رسی کھول دی۔ مجھے ماننا پڑا کہ میر بخش نے بڑی مضبوط بندشیں لگائی تھیں۔ میر بخش کے اس کارنامے میں سالہا سال کا جمع شدہ غصہ بھی شامل رہا ہوگا جو وہ وڈیرے کے لیے اپنے دل و دماغ میں رکھتا تھا۔

میں نے وڈیرے کے پاؤں سے فارغ ہونے والی رسی سے تارا کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیے۔ ان ہاتھوں میں وہ مجروح ہاتھ بھی شامل تھا جو کسی عضوِ معطل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میر بخش نے وڈیرے کے ہاتھ بھی پشت پر جکڑے تھے۔ میں ان دونوں کو ایک خاص مقصد کے تحت اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ان کے پاؤں آزاد اور ہاتھ جکڑبند ہونا ضروری تھے ورنہ ہم ان گناہ کی پوٹوں کو کہاں کہاں اٹھائے پھرتے۔ انہیں تو اپنے پاؤں پر ہی چلنا تھا۔

میں نے ریوالور کے اشارے پر تارا اور اکبر سومرو کو اٹھ کر کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ انہوں نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے کہا "شرافت سے پجارو کی طرف چلو۔"

وہ نقاہت آمیز قدم اٹھاتے ہوئے پجارو کی جانب بڑھنے لگے۔ اس دوران میں ساحل نے ممتاز کو سیٹ پر بٹھا دیا تھا۔ وڈیرے کی اس پر نظر پڑی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ۔ یہ تو۔ ممتاز ہے۔ قاضی سلطان کی بٹی!"

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" میں نے اسے گھور کر سادگی سے پوچھا۔

"ہاں، میں اسے اور اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" وڈیرے نے جواب دیا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "چلو اچھی بات ہے۔ تمہاری جان پہچان نکل آئی۔ سفر اچھا گزرے گا۔"

"مم۔ مگر یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟" وڈیرے کی حیرت رفع ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی "اسے تو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا تھا۔"

"یہ اس طرح میرے ہاتھ لگی ہے۔" میں نے یہ کہتے ہوئے ایک زوردار تھپڑ وڈیرے کے گال پر رسید کردیا "کچھ آیا سمجھ شریف میں یا تفصیل بھی بیان کروں؟"

وڈیرا اکبر سومرو میرا تھپڑ کھا کر تلملا اٹھا تاہم وہ تلملاہٹ نکالنے کا موقع نہیں تھا۔ اس لیے بے بسی سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ وہ کسی عام آدمی کا تھپڑ نہیں تھا جو صرف آواز پیدا کرکے رہ جاتا۔ وہ میرا تھپڑ تھا۔ وجدان علی کا تھپڑ! جس نے شاؤلن ٹیمپل جیسے عظیم الشان ادارے سے مارشل آرٹس کی تربیت حاصل کی تھی جہاں اس کے ہاتھ پاؤں کو فولادی بنادیا گیا تھا۔

وڈیرے کے گال پر جہاں میں نے طمانچہ رسید کیا تھا وہاں میری انگلیوں کے نشانات ثبت ہوگئے تھے بلکہ چھپ گئے تھے۔ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی قوت صرف کردی تھی اسے وہ تھپڑ مارتے ہوئے۔

تارا نہ تو ممتاز کو جانتا تھا اور نہ ہی اس کے اغوا کی کہانی سے وہ واقف تھا اس لیے اس نے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کی خاموشی اور لاتعلقی تو اس کی ناواقفیت ہی کو ظاہر کررہی تھی۔

میں نے وڈیرا اکبر سومرو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا "تمہارے پاس موبائل فون تو ہوگا؟"

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے اس کے دوسرے گال کو سرخ کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا "جھوٹ مت بولو خبیث انسان۔ میں دروغ گوئی کی بہت عبرت ناک سزا دیتا ہوں۔ جب تمہارے عام سے ملازم مجھے اغوا کرتے ہوئے اپنے پاس موبائل فون رکھ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں رکھ سکتے؟"

میرا اشارہ اس موبائل فون کی طرف تھا جو میں نے تھرپارکر کے صحرا میں سفر کے دوران میں وڈیرے کی ایمبولینس

نما گاڑی سے برآمد کیا تھا۔ ازاں بعد اس کنگ سائز موبائل فون کو تباہ کردیا گیا تھا۔ میر بخش نے میری اس کارروائی پر حیرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

وڈیرا "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" والی کیفیت کا شکار تھا اس لیے اسے زبان کھولتے ہی بنی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بنگلے سے نکلتے وقت موبائل فون اپنے ساتھ لایا تھا۔ تاہم اس کی بیٹری ختم ہوچکی تھی۔ وہ فون اس وقت ٹویوٹا ہائی لکس میں موجود تھا۔

میں نے ان دونوں بدبختوں کو ساحل کی نگرانی میں چھوڑا اور خود ہائی لکس کی جانب بڑھ گیا۔ جاتے ہوئے میں ریوالور بھی ساحل کے حوالے کرگیا تھا۔ وہ پجارو کے اندر تھی جبکہ وہ دونوں زیرِ حراست افراد پجارو کے باہر کھڑے تھے۔ میر بخش اپنے کام کے اختتامی مراحل میں داخل ہوچکا تھا۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی مہم جوئی کی کوشش کرتا تو میر بخش اسے "سنبھال" لیتا۔

میں نے صرف پانچ منٹ کے اندر ہائی لکس کے ڈرائیونگ کیبن کو چھان مارا۔ وڈیرے کا نااہل موبائل فون بہ آسانی دستیاب ہوگیا۔ اس تلاشی کے دوران میں کوئی اور قابلِ ذکر چیز برآمد نہ ہوسکی۔ مجھے سب سے زیادہ کھوج اسلحے وغیرہ کا تھا مگر ہائی لکس میں کسی قسم کا کوئی آتشیں ہتھیار موجود نہیں تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان کے پاس اسلحے کے نام پر صرف وہی کلاشنکوف اور پسٹل تھا جن پر ہم قبضہ جما چکے تھے۔

میں نے وڈیرے کے موبائل فون کو پجارو میں منتقل کیا۔ اس کی بیٹری واقعی ڈاؤن ہوچکی تھی یا اس میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال، وہ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ چنانچہ وہ فی الوقت کسی بیکار شے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

اس وقت تک نہ تو ننھے منے موبائل فون مارکیٹ میں آئے تھے اور نہ ہی ان کے نہایت ہی مختصر سے چارجر۔ کنگ سائز موبائل فون کے ساتھ ساتھ اسی قبیل کی ایک بیٹری کو اٹھائے اٹھائے پھرنا پڑتا تھا۔

میر بخش نے ٹائر کی تبدیلی کا کام تسلی بخش طریقے سے کردیا تو میں نے اس سے کہا "اب ڈرائیونگ تم کرو گے اور دونوں لڑکیاں تمہارے ساتھ آگے پسنجرز سیٹ پر بیٹھیں گی۔"

"دونوں لڑکیاں ایک سیٹ پر؟" میر بخش نے متعجب انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ہاں، دونوں ایک ساتھ۔ سیٹ خاصی کشادہ ہے۔ یہ چھوئی موئی وہاں آسانی سے سما جائیں گی۔"

چھوئی موئی سے میری مراد خدانخواستہ یہ نہیں تھی کہ وہ دونوں ننھی بچیاں تھیں۔ لڑکی یا عورت کو چھوئی موئی اس کی نزاکت اور سکڑنے سمٹنے کی بے پناہ صلاحیت کی بنا پر کہا جاتا ہے۔ یہ بہت جلد کہیں بھی سما جاتی ہیں۔ خاص طور پر مرد کا دل ان کے چھپنے کی پسندیدہ جگہ ہے!

میر بخش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوالیہ نظر سے اکبر سومرو اور تارا کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا "یہ میرے ساتھ گاڑی کے پچھلے حصے میں رہیں گے۔ انہوں نے ہم سے منسوب کردہ قتل و غارت گری کی فرضی جھوٹی کہانی تو سنادی۔ اب کچھ نئی نئی اور دلچسپ کہانیاں میں بھی انہیں سنانا چاہتا ہوں۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین!"

دونوں لڑکیاں پجارو کے عقبی حصے سے نکل کر پسنجرز سیٹ پر آگئیں۔ وہ سیٹ ان کے بیٹھنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ میں دراصل دونوں خبیثوں کے ساتھ پچھلے حصے میں اکیلا رہنا چاہتا تھا تاکہ اگر کسی شدید قسم کی کارروائی کی ضرورت پیش آجائے تو وہ لڑکیوں کی نظر سے پوشیدہ رہے۔ میر بخش نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میرے اشارے پر اکبر سومرو اور تارا پجارو کے عقبی حصے میں سوار ہوئے۔ انہوں نے جیسے ہی سیٹوں پر بیٹھنے کی کوشش کی، میں نے سختی سے ڈانٹ دیا۔

"لاٹ صاحب کے بچو! اپنی اوقات کو نہ بھولو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم کسی دعوت میں شریک ہونے نہیں جارہے۔ تم اس وقت قیدی ہو اس لیے آرام سے پھیل کر سیٹوں پر بیٹھنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ تمہارا ٹھکانا وہ ہے۔" اس کے ساتھ ہی میں نے پجارو کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔

وہ سکڑ سمٹ کر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگے تو مجھے شرارت سوجھی۔ وہ اچھوتا خیال یکدم ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں نے ان دونوں کی بندشیں کھولیں اور انہیں اس طرح ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھنے کو کہا کہ ان کے رخ ایک ہی سمت میں ہوگئے۔ وہ اپنے دائیں اور بائیں پہلو سے جڑے بیٹھے تھے۔ گویا وڈیرے کا بایاں زخمی بازو، تارا کے دائیں مجروح بازو سے دو جسم کی دوری پر تھا اور ان کے صحیح سلامت بازو ایک دوسرے سے لگ گئے تھے۔

میں نے ان دونوں کے ناکارہ بازوؤں کو نظرانداز کردیا اور کارآمد بازوؤں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر اس طرح

باندھ دیا جیسے کسی بانس کی لمبائی بڑھانے کے لیے کوئی دوسرا بانس اس کے اوپر رکھ کر مضبوط رسی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں، جڑواں حالت میں بیٹھے خوں خوار نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

میں نے ان کی نظروں کی پروا کیے بغیر میر بخش کو حکم دیا "گاڑی کو سڑک پر لے آؤ اور جس حد تک ممکن ہو، تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے منزل پر پہنچادو۔"

میر بخش نے کوئی سوال کرنے کے لیے لب کھولنا چاہے تو میں نے دوٹوک انداز میں کہا "گائیڈ تمہارے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے، جو بھی پوچھنا ہے، اسی سے پوچھو۔ ممتاز "مس گائیڈ" ہے مگر تمہیں مس گائیڈ نہیں کرے گی۔ یہ بھی اپنے والدین سے ملنے کے لیے ایک ایک سانس بے چینی سے لے رہی ہے۔ یہ پہلی فرصت میں اپنے گھر پہنچنا چاہتی ہے۔"

میں نے میر بخش کو بڑے واضح انداز میں بتا دیا تھا کہ ہمیں سیدھا "نبی سر" جانا تھا۔ جہاں ممتاز کے والدین بڑی بے قراری سے اس کی واپسی کے منتظر تھے۔ میر بخش نے ایک جھٹکے سے پجارو اسٹارٹ کی پھر اسے سڑک پر لانے کے بعد بتدریج اس کی رفتار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

ہم کچھ دیر بعد "سامارو" کو اپنے پیچھے چھوڑ چکے تھے۔ یہ سڑک سیدھی کنری کی طرف جارہی تھی۔ جہاں سے ہمیں آگے "نبی سر" کی سمت سفر طے کرنا تھا۔ جس سڑک پر اس وقت ہم محوِ سفر تھے وہ کنری سے مشرق کی جانب مڑ کر سیدھی دھرمسال (تھرپارکر) کو جاتی تھی۔

میرے ذہن میں ایک سوال کافی دیر سے چکرا رہا تھا۔ مجھے یہ جاننا تھا کہ وڈیرا اکبر سومرو ہمارے تعاقب میں عمر کوٹ سے سیدھا ڈی ایس پی کے بنگلے واقع شادی پلی کس طرح پہنچ گیا تھا۔ میر بخش جب گزشتہ روز بنگلے سے روانہ ہوا تھا تو وڈیرا وہاں موجود تھا۔ اپنے ذہن کی خلش دور کرنے کے لیے میں نے وڈیرے سے پوچھا۔

"اکبر سومرو! تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ ہم عمر کوٹ سے فرار ہونے کے بعد شادی پلی کی طرف گئے ہیں اور رات کے آخری پہر ہم تمہیں ڈی ایس پی کے بنگلے پر ملیں گے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"تمہارے لیے نہیں ہوگی میرے لیے ہے۔" میں نے کہا "میر بخش تمہیں کل دوپہر کو بنگلے پر چھوڑ کر ہماری طرف آیا تھا۔"

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا "کل رات ساڑھے نو بجے مجھے میرے ایک آدمی نے اطلاع دی تھی کہ تم تینوں شادی پلی والے ناکے سے گرفتار کرلیے گئے ہو۔ میں اپنی جاگیر سے فوراً عمر کوٹ پہنچا۔ اس وقت تک تارا کو ہوش آچکا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لیا اور تھانہ شادی پلی آگیا۔ جب ہم مذکورہ تھانے پہنچے تو صبح کے لگ بھگ تین بج چکے تھے۔ راستے میں تارا نے مجھے عمر کوٹ کے ہوٹل میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کردیا تھا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں جاگیر سے روانہ ہوتے وقت اپنے ساتھ دو جیپیں اور چار محافظ بھی لے آیا تھا۔ اب وہ چاروں اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں اور تارا زندہ ہیں۔"

یہاں تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا "رکو نہیں، بولتے چلے جاؤ۔ اگر تم نے خاموشی اختیار کی تو تم دونوں بھی اپنے چار ساتھیوں کے پاس پہنچا دیے جاؤ گے۔"

میرے لہجے میں چھپی ہوئی سنگینی کو اس نے صاف محسوس کرلیا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ تاہم اپنی آواز میں تھوڑی ہمت بھرتے ہوئے اس نے مجھے تنبیہہ کی "وجدان! یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو۔ یاد رکھو، میں تمہیں عبرت ناک انجام سے دوچار کردوں گا۔ تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

"میں تمہاری طاقت اور ہمت کا بڑی وضاحت کے ساتھ مشاہدہ کرچکا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تم انتہائی بزدل، گھٹیا اور کمینے انسان ہو۔ تمہاری بہادری کا اندازہ مجھے اس وقت ہوگیا تھا جب تم اپنے سابق نوکر اور میرے موجودہ دوست سے لات ٹھڈے کھا رہے تھے۔"

اس نے سلگتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور دوبارہ تنبیہہ کی "میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا وجدان، تم یہ سب اچھا نہیں کررہے۔ اگر اپنے لیے مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں فوراً آزاد کرکے جانے دو۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ اچھا نہیں کررہا تو کیا تم لوگوں نے ہمارے ساتھ اچھا کیا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، تم نے ڈی ایس پی سے ساز باز کرکے ہمیں نو دس افراد کے قتل میں ملوث کرنے کی جو سازش کی ہے، اس میں تمہاری شرافت کی کیا شرح نکلتی ہے؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے

مزید کہا "تم مجھے عبرت ناک انجام کی دھمکی دینے سے پہلے اپنی حالت پر غور کرلو۔ اس وقت تو تم اپنے چہرے پر بیٹھنے والی مکھی کو بھی اڑانے کی سکت نہیں رکھتے۔ اس سے زیادہ افسوس ناک اور قابلِ رحم صورتِ حالات اور کیا ہوگی!"

وہ کینہ توز نگاہ سے مجھے گھورنے لگا۔ اس کے ایک بیان سے یہ بات تو واضح ہوگئی تھی کہ وہ گزشتہ روز تارا کے ساتھ اپنے بنگلے سے روانہ نہیں ہوا تھا بلکہ کسی مخبر کی اطلاع پر اسے رات میں گھر سے نکلنا پڑا تھا۔

میں نے اس کی مجروح کہنی پر اپنے پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ وڈیرے کی بائیں کہنی پر گولی لگی تھی اور یقینی طور پر ہڈی کا حشر خراب کرگئی تھی۔ ساحل نے بروقت فائر کرکے وڈیرے کو حاکم سے محکوم بنادیا تھا۔ اس نے دانتوں پر دانت جمائے اور تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"تم بہت بہادر بنتے ہو مگر تمہارا یہ سلوک بہادری کے منافی ہے۔"

"میں صرف بہادر بنتا ہی نہیں بلکہ میں نے اپنی بہادری ثابت بھی کی ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم جیسے ضمیر فروش' ظالم اور احسان ناشناس افراد تو اس سے بھی زیادہ بدترین سلوک کے مستحق ہیں۔ میں تو تمہارے ساتھ بہت رعایت برت رہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے دکھتے ہوئے بازو پر ایک اور ہلکا سا وار کیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا "تم نے ابھی تک ڈی ایس پی کے بنگلے پر پہنچنے کی کہانی مکمل نہیں کی۔ اگر اب تمہاری زبان کو بریک لگے تو میں تمہاری کہنی کو ٹھوکروں میں اڑا دوں گا۔ شاباش' شروع ہوجاؤ۔"

وہ ناپسندیدہ نظر سے مجھے تکنے لگا مگر جب میں نے اس کی کہنی کو نشانہ بنانے کے لیے اپنے پاؤں کو حرکت دی تو وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگا۔

"ہم تقریباً تین بجے صبح شادی پلی کے متعلقہ تھانے پہنچے۔ اس تھانے کے انچارج سے میری اچھی دعا سلام ہے۔ تھانا انچارج اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ شادی پلی والے ناکے کی نگرانی کرنے گیا ہے۔ میں نے اے ایس آئی جمشید احمد سے تم لوگوں کے بارے میں پوچھا تو پتا چلا کہ ڈی ایس پی تمہیں اپنے بنگلے پر لے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہم سیدھے اس بنگلے پر پہنچے تھے۔ آگے کے حالات وواقعات تمہارے علم میں ہیں۔"

میں نے وڈیرے کی دو جیپوں کو کم و بیش صبح ساڑھے تین بجے ڈی ایس پی کے بنگلے کے گیٹ پر رکتے دیکھا تھا۔ اس حساب سے وڈیرے کا بیان درست نظر آتا تھا مگر کچھ معاملات ابھی حل طلب تھے۔

میں نے اس سے پوچھا "تم نے بتایا ہے' تمہارے کسی آدمی نے تمہیں ہماری گرفتاری کی اطلاع دی تھی۔ ہمیں شادی پلی والے ناکے سے پکڑا گیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے' تمہارے مخبر کا تعلق اسی علاقے سے ہے؟"

وڈیرے نے خاموشی سے اثبات میں گردن ہلادی۔

میں نے تیز لہجے میں سوال کیا "کون ہے وہ شخص؟"

"اے ایس آئی جمشید احمد۔" اس نے بتایا۔

میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی۔ اے ایس آئی جمشید سے ہم نے بلکہ میں نے ناکے کے مقام پر خاصی باتیں کی تھیں۔ وہ ایک باتونی شخص تھا۔ اس کی زبانی مجھے اس ناکے کی حقیقت کے بارے میں پتا چلا تھا۔ منگل سنگھ' گنڈا سنگھ اور ممتاز والی کہانی بھی جمشید ہی نے مجھے سنائی تھی۔ ازاں بعد اس "لوز ٹاک" پر اسے ڈی ایس پی سے ڈانٹ بھی سننا پڑی تھی اور اب وڈیرا بتا رہا تھا کہ اے ایس آئی اس کا خاص آدمی تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ بھی سوچا' ممکن ہے وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کررہا ہو۔

اسی امکان کے پیشِ نظر میں نے اس سے پوچھا "اکبر سومرو! اگر تمہاری بات غلط ثابت ہوئی تو خود سوچ لو' تمہارا کیا حشر ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمہاری مخبر والی کہانی کو ہضم نہیں کرپایا ہوں۔" میں نے آخری جملہ دانستہ اسے گھنے کے لیے کہا تھا۔

وہ بولا "جو حقیقت تھی وہ میں نے تمہیں بتادی ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ تم اس پر یقین کرتے ہو یا نہیں۔"

"اے ایس آئی تمہارا آدمی کس طرح ہوسکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

اس نے بتایا "جمشید ایک طویل عرصے سے میرے لیے مخبری کا کام کررہا ہے۔ اے ایس آئی کے عہدے پر اس کی ترقی بھی میری کوششوں ہی سے ہوئی ہے۔" ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے کہا "تم تو ابھی کل کے بچے ہو وجدان! تمہیں کیا معلوم کہ حکمرانی کے لیے کس طرح ہر محکمے میں اپنے بندے پہنچائے جاتے ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو اکبر سومرو۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا "کل کے بچے کو واقعی یہ بات معلوم نہیں لیکن یہ بچہ برسوں کے بوڑھے کو زیرِ دام لانے کا ہنر جانتا ہے۔ یہ بچہ

کل کا بچہ بخوبی جانتا ہے کہ تم جیسے بڈھے ظالموں کو عبرت ناک سزا کس طرح دی جاتی ہے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے گھائل بازو سے ایک چھوٹی سی "اٹکھیلی" کی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات نمودار ہوئے اور بے ساختہ اس کے لبوں سے میرے لیے ایک بے ہودہ گالی پھسل گئی۔

میں نے اس کی کسمپرسی کی پروا کیے بغیر اس کے فرعون صفت چہرے پر ایک زنانے دار تھپڑ جڑدیا۔ نتیجے کے طور پر اس کی باچھوں سے لہو رسنے لگا۔ وہ اس طوفانی طمانچے سے تھرا کر رہ گیا۔ میں نے کھاجانے والی نظر سے اسے گھورا اور سخت لہجے میں کہا۔

"تم نے پچاس پچپن سال کن جانوروں میں رہ کر گزارے ہیں۔ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ دو لڑکیوں کی موجودگی میں تم کس قسم کی بے ہودہ گوئی کررہے ہو۔ کیا تم اپنے زنان خانے میں بھی ایسی ہی زبان استعمال کرتے ہو؟"

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے خاموش نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے کہا "اکبر سومرو! میں تمہاری نظر میں کل کا بچہ ہوں مگر اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں عقل کا کچا بھی ثابت ہوں گا۔ جو بھی جھوٹ بولو' ذرا سوچ سمجھ کر بولنا۔"

میر بخش گاہے بہ گاہے عقب نما آئینے میں اپنے سابق وڈیرے سائیں کی درگت بنتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس نے زبان سے تو ایک لفظ نہیں کہا تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ مسرت کی انتہا سے گزر رہا تھا۔

میں نے دوبارہ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اے ایس آئی جمشید کو صرف یہ معلوم تھا کہ ہمیں گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارے اصلی ناموں سے واقف نہیں تھا پھر تم نے یہ کیسے جان لیا کہ گرفتار ہونے والے ہم ہی ہوں گے؟"

"یہ تم نے اچھا سوال کیا ہے۔" اس نے کہا "اے ایس آئی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ گرفتار شدگان میں وجدان اور دھنو شامل ہیں کیونکہ تم لوگوں نے پہلے اپنے نام مراد اور کلثوم بتائے تھے۔ بعد میں تھانے جاکر تم مقصود احمد اور لیلیٰ بن گئے۔ البتہ میر بخش کا نام ہر جگہ میر بخش ہی رہا۔ مجھے اے ایس آئی کی جس بات نے تمہاری طرف متوجہ کیا وہ "ریڈ اینڈ بلیک" گاڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی تم لوگوں نے مجھ سے دوریار کی رشتے داری بھی ظاہر کی تھی اور پولیس کو بتایا تھا کہ

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی
علی یار خان کی سرگزشت
مجاہد
کتابی صورت
(گیارہ حصوں میں)
تیار ہے
قیمت فی حصہ 60 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف
کتابیات پبلی کیشنز
5802551 - 5802552-5895313
74200
kitabiat1970@yahoo.com

تم عمرکوٹ کا تاریخی قلعہ دیکھنے میرے پاس آئے تھے۔ چونکہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا اس لیے میرا شک تمہاری طرف گیا اور بالآخر یہ شک سچ بھی ثابت ہوا۔“

وڈیرے کی اس وضاحت میں خاصی جان تھی۔ میرے ذہن نے اس کی بات کو تسلیم کرلیا۔ یقینی طور پر وہ اسی طرح تعاقب کرکے ڈی ایس پی کے بنگلے پر پہنچے ہوں گے۔ اے ایس آئی جمشید نے میری وجہ سے اپنے افسرانِ بالا سے خاصی جھاڑ کھائی تھی اس لیے بھی اس نے خصوصی ایفی شینسی دکھائی ہوگی۔

”تمہارا کیا حال ہے چوہدری کے پالتو بندر؟“ میں نے تارا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تھوڑی دیر تک یک ٹک مجھے گھورتا رہا پھر وارننگ دینے والے انداز میں بولا ”تم ہمارے ساتھ بہت زیادتی کررہے ہو جدان۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔“

”میں تو تمہارے خاندان کا قرض لوٹا رہا ہوں۔“ میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرگئی۔

میں نے کہا ”تمہارے ملعون بھائی دارا نے جو کچھ میرے اور میرے والدین کے ساتھ کیا تھا‘ میں کئی سال سے اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ اب میں جو کچھ تمہارے ساتھ کروں گا‘ وہ قرض کی ادائیگی ہوگی اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے؟“

وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”کہیں تمہیں میری یہ بات تو بری نہیں لگ گئی کہ میں نے تمہیں چوہدری کا بندر کہہ دیا ہے؟“

وہ اب بھی خاموش رہا۔ اس کی خاموشی میں میرے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔

میں نے کہا ”جو کسی کے اشاروں پر ناچتا ہے اسے بندر ہی کہا جاتا ہے۔ کیا تم اپنے چوہدری کے اشاروں پر نہیں ناچتے؟ میں نے تو تمہارے ساتھ بہت رعایت کی ہے۔ میں تمہیں چوہدری کا پالتو کتا کہتا تو یہ ٹائٹل تمہارے لیے زیادہ مناسب ہوتا۔ اسی کے خرچے پر پل بڑھ کر تو تم اس ڈیل ڈول کو پہنچے ہو۔ تمہارا یہ ہٹا کٹا پن چوہدری کے ٹکڑوں کا رہینِ منت ہے۔“

میں مسلسل ایسے جملے ادا کررہا تھا جو اس کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کررہے تھے۔ تاہم وہ کسی قسم کی اشتعال انگیز حرکت سے گریزاں نظر آتا تھا۔ ابھی تک مجھے تارا کا جو تجربہ ہوا تھا اس کے مطابق اس میں تحمل کی کمی تھی اور وہ بہت جلد طیش میں آکر مغلظات پر اتر آتا تھا لیکن اس وقت وہ اپنے مزاج کے خلاف ایکٹ کررہا تھا۔ یہ اس کی مصلحت بھی ہوسکتی تھی‘ مجبوری بھی کہ وہ اس وقت پوری طرح میرے رحم وکرم پر تھا اور یہ خاموشی اور برداشت اس کی چالاکی بھی ہوسکتی تھی۔ وہ اپنے میزبان کا حشر دیکھ چکا تھا۔ تارا کے دائیں بازو کی ہڈی کہنی کے مقام سے ”جواب“ دے گئی تھی۔ اس جواب کی آواز میں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ ہڈی ٹوٹنے کی کڑاکے دار آواز اپنے اندر ایک عجیب سا تاثر رکھتی ہے۔ اذیت رساں افراد اس آواز سے کیف و سرور حاصل کرتے ہیں جبکہ مصیبت زدہ شخص اس آواز کو سنتے ہی دہشت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ تارا نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ اگر اس نے کوئی چون وچرا کی تو میں اس کے گھائل بازو کے ساتھ عملی ”گفتگو“ شروع کردوں گا اور یہ اسے کسی بھی طور گوارا نہیں تھا۔

وڈیرے نے۔ جو اب خاصا چھوٹیرا ہوچکا تھا‘ مجھ سے پوچھا ”تم ہمیں یوں باندھ کر کہاں لے جارہے ہو؟“

میں نے سنجیدگی سے کہا ”نبی سر۔“

”وہاں تو قاضی سلطان کی حویلی بھی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں تشویش ابھر آئی۔

میں نے کہا ”ہاں‘ وہ تو ہے۔ اور اس حویلی میں قاضی سلطان بھی ہے۔“

اس کی تشویش گہری ہوگئی اور وہ ہراساں نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بے پروائی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”روس میں رہنے والے کسی شخص نے کسی دنیا گھومے ہوئے شخص سے کہا‘ میں جاپان جانا چاہتا ہوں۔ جہاں دیدہ شخص نے کہا‘ چلے جاؤ۔ اس میں پریشانی کیا ہے؟ وہ بولا‘ میں نے سنا ہے راستے میں چین بھی پڑتا ہے! جہاں نورد شخص نے اطمینان سے کہا‘ ہاں وہ تو پڑے گا!“

وڈیرا الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا‘ میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوئے کہا ”بھئی‘ اگر ہم نبی سر جائیں گے تو قاضی سلطان سے بھی ملاقات ہوگی‘ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

وہ سراسیمہ انداز میں اپنے مہمان تارا کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی جانب اس کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا ”میں نے سنا ہے‘ قاضی سلطان سے تمہاری دیرینہ دشمنی چلی آرہی ہے؟“

”تمہیں یہ بات میرے دشمن کی بیٹی نے بتائی ہوگی؟“ اس نے پوچھا۔

”سوال نہیں کرو‘ صرف میری بات کا جواب دو۔“ میں نے ڈانٹ کر کہا۔

وہ راہِ راست پر آتے ہوئے بولا ”ہاں‘ ہم ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔“

میں نے کہا ”اپنے دشمن کے سامنے جاتے ہوئے ڈر رہے ہو؟“

”ڈرتی ہے میری جوتی۔“ وہ جوش میں آگیا۔

میں نے تیکھے انداز میں کہا ”پھر تمہاری حالت مردوں سے بدتر کیوں ہورہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے‘ تمہارا پیشاب خطا ہوجائے گا۔ اگرچہ یہ پجارو تمہاری ہی ہے لیکن میں یہاں کسی قسم کی گندگی برداشت نہیں کروں گا‘ یہ بات ذہن میں رکھنا چھوٹیرا سائیں!“

وہ بےبسی اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے لرزنے لگا پھر اپنے خون آلود دہانے کو وا کرتے ہوئے گویا ہوا ”میں کسی قاضی واضی سے نہیں ڈرتا۔ اس کا تو میں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اس کی اتنی ہمت نہیں کہ میرے سامنے آکر وار کرسکے۔ میں تو... میں تو...“

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ممکن ہے‘ وہ ممتاز کے باپ قاضی سلطان کو کوئی گالی دینے کا ارادہ رکھتا ہو اور میرے سابق ”سلوک“ نے اس کی زبان پر تالا ڈال دیا ہو۔ میرے قیامت خیز طمانچے نے اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں کو سرخ کردیا تھا۔ وہ اس تلخ تجربے کو دہرانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے پوچھا ”جب تم اتنے ہی بہادر ہو‘ قاضی سلطان کو خاطر میں نہیں لاتے تو پھر تمہاری جان کیوں نکلی جارہی ہے اس کا سامنا کرتے ہوئے؟“

”میں اپنی اس حالت پر پریشان ہوں۔“ اس نے اپنے وجود پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ”جب قاضی سلطان مجھے اس حال میں دیکھے گا تو میں شرمندگی سے گردن نہیں اٹھاسکوں گا۔“

اس کا کہنا بجا تھا۔ اپنے دشمن کے سامنے کمزور اور افسوسناک حالت میں جانے سے واقعی ناک کٹ جاتی ہے۔ بعض غیرت مند تو اس قسم کی شرم ناک صورتِ حالات پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں نے اکبر سومرو کو مخاطب کرتے ہوئے کٹیلے انداز میں کہا ”تو اس کے لیے اتنا فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہ ندامت اور شرمندگی تمہیں گردن نہیں اٹھانے دے گی تو تم کسی بیمار بکرے کی طرح گردن ڈالے رہنا۔ آخر ہم بھی تو تمہارے دشمن ہیں۔ تم ہمارے سامنے تو گردن اٹھائے بیٹھے ہو؟“

”تمہاری بات دوسری ہے۔“

”دوسری کیوں ہے بھئی؟ دشمن تو آخر دشمن ہی ہوتا ہے۔“

وہ موضوعِ گفتگو کو تبدیل کرتے ہوئے بولا ”قاضی سلطان کی بیٹی تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟ تم ڈی ایس پی کے بنگلے سے تو میر بخش اور دھنو (ساحل) کے ساتھ نکلے تھے؟“

”یہ ہمیں راستے میں ملی ہے۔“ میں نے بتایا۔

اس دوران میں میر بخش‘ ساحل یا ممتاز نے ہماری بات چیت میں مداخلت نہیں کی۔ میر بخش اور ساحل تو میرے مزاج کو بخوبی سمجھنے لگے تھے۔ ممتاز عقل مندی کا تقاضا نبھاتے ہوئے خاموش تھی۔

وڈیرے نے پوچھا ”اس لڑکی کو تو ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا تھا پھر یہ تمہیں راستے میں کیسے مل گئی؟ میں نے تو سنا ہے‘ ڈاکوؤں نے اس کی واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا تھا؟“

”تم خوامخواہ بے خبری کا ڈرامہ رچاؤ اکبر سومرو۔“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”میں کون سی بے خبری کا ڈراما رچا رہا ہوں؟“ اس نے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا ”تم یہ کیا ’تم نے سنا ہے‘ اور ’تمہیں پتا چلا ہے‘ جیسے جملے بول کر حقائق کو چھپانے کی کوشش کررہے ہو۔ جو سچی بات ہے‘ اسے زبان پر کیوں نہیں لاتے!“

میں نے اسے گھیرنے کے لیے ایسا مضبوط جال پھینکا تھا کہ وہ گھبرا گیا۔ جلدی سے بولا ”پتا نہیں‘ تم کس قسم کی باتیں کررہے ہو۔ مجھے ڈی ایس پی کی زبانی معلوم ہوا ہے‘ قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو منگل سنگھ نامی کسی ڈاکو نے اغوا کرلیا تھا۔ ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے ہی تو شادی پلی اور میر پور خاص کی ضلعی سرحد پر ناکا لگایا گیا تھا جہاں سے تم گرفتار ہوئے تھے۔“

”یہ تو تم کہہ رہے ہو نا!“ میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔

”یہی حقیقت ہے بھئی۔“

”تم اداکاری اچھی کرلیتے ہو۔“ میں نے اپنے ”مشن“

پر کام جاری رکھا "لیکن تمہاری یہ اداکاری حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کرسکتی اکبر سومرو!"

وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولا "پھر تم ہی بتادو' حقیقت کیا ہے؟"

میری مبہم اور پراسرار گفتگو نے ان دونوں کو اضطراب میں مبتلا کردیا۔ وہ پہلو تو بدل نہیں سکتے تھے' بس کسمسانے پر اکتفا کرنے لگے۔ پجارو بھی بڑی عجیب گاڑی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متسوبشی والوں نے اس میں بہت سی تجرباتی تبدیلیاں کی ہیں۔ خاص طور پر سیٹنگ اور انٹرنس کے حوالے سے۔ ابتدائی زمانے میں اس کے عقبی حصے کی دو طرفہ سیٹوں کے درمیان اچھی خاصی گنجائش ہوتی تھی۔ ازاں بعد اس حصے میں آگے پیچھے نشستوں کی تعداد بڑھانے کے نتیجے میں یہ گنجائش کم سے کم تر ہوتی گئی۔ ہم جس پجارو میں محو سفر تھے وہ دو طرفہ نشستوں والی تھی جس کے درمیانی حصے میں اتنی گنجائش بہرحال موجود تھی کہ میں نے ان دو سرکاری سانڈوں کو وہاں ٹھونس رکھا تھا۔ ایک تو گنجائش کی کمی' دوسرے ان کے بازوؤں کی بندش نے انہیں "پرپرزے" نکالنے سے روک رکھا تھا۔ وہ بے بسی کی عملی تصویر تھے۔

میں نے اپنی پلاننگ کے مطابق وڈیرے کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "حقیقت یہ ہے کہ تم ایک بھوتار وڈیرا ہو۔ اپنی رعایا پر ظلم کرکے تمہیں ازحد خوشی ہوتی ہے۔ کوئی ایسا جرم نہیں جس میں تم ملوث نہ ہو۔ تم چوری ڈکیتی کرواتے ہو' خطرناک مجرموں کو پناہ دیتے ہو۔ نامی گرامی ڈاکو تمہاری پشت پناہی کے طفیل اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب ہیں۔"

میں سانس لینے کے لیے رکا تو اس کے چہرے کا جائزہ بھی بغور لیا۔ وہ میری باتیں سن کر سلگ اٹھا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ تاہم مجبوری یہ تھی کہ وہ میرا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا' چنانچہ وہ خاموش رہا۔

میں نے اس کے جذبات کے سوڑے میں نمک چھڑکتے ہوئے کہا "قاضی سلطان سے تمہاری دیرینہ دشمنی چلی آرہی ہے۔ تم نے قاضی سلطان کو "چرکا" لگانے کے لیے اپنے پالتو ڈاکو منگل سنگھ سے دشمن کی بیٹی ممتاز کو اغوا کرالیا اور اس کی واپسی کے لیے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کردیا۔"

"یہ سب جھوٹ ہے' بکواس ہے۔" وہ پھٹ پڑا "میں کسی منگل سنگھ نامی ڈاکو کو نہیں جانتا' نہ ہی میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو اغوا کروایا ہے۔"

میں نے اس کا احتجاجی جملہ مکمل ہوتے ہی زخمی کہنی پر پاؤں کی ایک درمیان ٹھوکر رسید کردی۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کے مانند ڈکرا اٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگلی لہراتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔

"اگر مزید تکلیف سے بچنا چاہتے ہو تو زبان کو بند رکھو۔ صرف وہ سنو جو میں بیان کررہا ہوں اور سمجھ لو کہ یہی حقیقت ہے۔"

"ہم تمہاری جھوٹی باتوں کو کس طرح حقیقت سمجھ لیں؟" تارا نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے معترض لہجے میں کہا۔

"اس طرح سمجھ لو بدذات۔" میں نے جملہ پورا کرتے ہی اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کردیا۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ اس کی ناک کو میں عمرکوٹ والے ہوٹل میں بھی خاصی اذیت سے دوچار کرچکا تھا۔ وہ جبڑے بھینچتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

"وجدان! ایک مرتبہ میں اس مصیبت سے نکل آؤں پھر تمہیں بتاؤں گا کہ تکلیف اور اذیت کیا ہوتی ہے۔ تم نے تارا کے اسٹائل کا ابھی مزہ نہیں چکھا۔"

"اوئے کسی رستم خان کی اولاد۔" میں نے اسے گھورا "کل سہ پہر سے تو میں تمہارے مختلف اسٹائلز دیکھتا آرہا ہوں۔ تم ہر اسٹائل میں پیٹنے کی دھمکی دیتے ہو پھر خود پٹنا شروع ہوجاتے ہو۔ تم نے تو مارشل آرٹس کی ناک کٹوادی ہے۔" میں نے تھوڑا توقف کرتے ہوئے اس کو تاکید کی "میں تمہارے میزبان چھوٹیرا سائیں سے بڑی اہم باتیں کررہا ہوں۔ اگر اب تم نے ہماری گفتگو میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کی تو مارشل آرٹس کی ساری بے توقیری کا بدلہ لے لوں گا۔ تم میری بات کا مطلب سمجھ رہے ہو نا!" میں نے اس کی مضروب ناک پر ایک چٹکی بھری اور مضحکہ خیز انداز میں کہا "تم نے اپنی بیچ حرکتوں سے ان فنون کی ناک کٹوائی ہے' میں عملی طور پر تمہاری یہ پکوڑا ناک کاٹ کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ جانتے ہو' کون سے ہاتھ پر؟" وہ غصے کو اپنے معدے میں اتارتے ہوئے کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے کہا "اسی ہاتھ پر جس کی کہنی کی ہڈی سے کڑاکے کی صدا بلند ہوئی تھی!"

پھر میں دوبارہ وڈیرا اکبر سومرو کی جانب متوجہ ہوگیا "ہاں' تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ تم نے منگل سنگھ کی مدد سے ممتاز کو اغوا کروالیا۔ مغویہ کے ماموں کی کارروائی پر پولیس نے ڈاکوؤں کے ڈیرے پر چھاپا مارا تو منگل سنگھ اپنے ساتھی گنڈا

سنگھ کے ہمراہ مغویہ سمیت تمہارے پاس عمرکوٹ پہنچ گیا۔"

اس موقع پر وڈیرے نے کچھ کہنا چاہا تو میرا ہاتھ میکانکی انداز میں اس کے زخمی بازو کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ہونٹ کھلنے سے پہلے ہی بند ہوگئے۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"پولیس کی سرگرمیاں جب عمرکوٹ تک پہنچیں تو تم نے اپنی بچت کے لیے مغویہ کو عمرکوٹ سے میرپور خاص منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن عین موقع پر تمہیں اطلاع ملی کہ شادی پلی سے آگے پولیس نے ناکا لگالیا ہے۔ اس لیے تم نے اپنے ڈاکوؤں کو ٹویوٹا فور وہیل ڈرائیو جیپ میں عمرکوٹ سے سامارو کی طرف روانہ کردیا تاکہ وہ سامارو سے آگے کچا راستہ استعمال کرکے میرپور خاص میں داخل ہوجائیں۔"

"تم نے تو بڑی خوفناک کہانی گھڑلی ہے۔" وڈیرا سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "کہانیاں اسی طرح جنم لیتی ہیں۔ تم نے بھی تو ہم سے منسوب کرکے قتل و غارت گری کی ایک جھوٹی کہانی تیار کی تھی جس کے نتیجے میں تم ہمیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے تاکہ ہماری باقی کی زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے۔ کیا وہ کم خطرناک کہانی تھی۔ میں تو تمہارا ادھار لوٹا رہا ہوں۔ اور کہانی تو ابھی جاری ہے' غور سے سنتے جاؤ۔"

وہ سننے پر مجبور تھا اس لیے ہمہ تن گوش رہا۔ میں نے کہا "پھر تمہیں خبر ملی کہ ہم ناکے پر پکڑے گئے ہیں۔ تم نے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے شادی پلی کا رخ کیا۔ اس طرح تم ایک تیر سے کئی شکار کرنا چاہتے تھے۔ ایک طرف تم پولیس کو اپنے معاملات میں الجھا کر منگل سنگھ وغیرہ کو بحفاظت نکل بھاگنے کا موقع دینا چاہتے تھے اور دوسری جانب ہم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ ڈی ایس پی تمہاری بات پر یقین کرکے ہمارے لیے بے شمار مشکلات کھڑی کردیتا مگر تمہاری چال کامیاب نہ ہوسکی۔ ڈی ایس پی کی رہائش پر ہمارا پلہ بھاری رہا اور ہم وہاں سے بہ حفاظت نکل آئے۔ تاہم ازاں بعد تم نے ایک نئی چال کے تحت ڈی ایس پی کے کان بھر کر ہمیں خطرناک قاتل بنانے کی کوشش کی۔ اور تمہاری یہ کوشش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آرہی۔ اس وقت تم جن حالات کا شکار ہو اور جس حالت میں قاضی سلطان کی حویلی پہنچنے والے ہو' اس کے پیش نظر تمہاری کہانی فلاپ اور میری کہانی ہٹ ہوجائے گی۔"

"تمہاری کہانی ہٹ کیسے ہوسکتی ہے؟" اس نے کمزور سا احتجاج کیا "میرا اغوا اور منگل سنگھ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ڈی ایس پی مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ اس علاقے کے تھانے دار سے بھی میری واقفیت ہے۔ کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔"

"یقین اس کی بات کا کیا جائے گا جس کی کہانی میں جان ہوگی۔" میں نے اپنے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا "اور میری کہانی بہرحال تمہاری کہانی سے زیادہ طاقت ور ہے کیونکہ میں نے قاضی سلطان کی بیٹی کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے!"

میرے آخری جملے پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' لکنت زدہ لہجے میں بولا "تت... تم نے... مم... ممتاز کو منگل سنگھ کی قید سے چھڑایا ہے؟"

"کیا تمہیں یہ بات معلوم نہیں؟" میں نے مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔

"کیا کہہ رہے ہو!" وہ سٹپٹا کر رہ گیا "میں یہ بات کیسے جان سکتا ہوں؟"

"اب اتنے بھولے بھی نہ بنو؟"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"وہ اس لیے کہ تمہاری سمجھ اس وقت پاتال کی سیر کو گئی ہوئی ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "اس لیے اس دنیا کی ہر چیز اور یہاں بسنے والے انسانوں کی ہر بات تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

وہ چڑ کر بولا "تم کیوں میرا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہو؟"

"بخدا' میں تمہارا مذاق نہیں اڑا رہا۔" میں نے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا "مجھے تو تم سے شکایت ہے کہ تم بلاوجہ جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟ اس بات کو تسلیم کیوں نہیں کرلیتے کہ میں نے ڈاکوؤں کے چنگل سے ممتاز کو آزاد کرانے کے بعد تم سے بھی ایک معرکہ کرلیا ہے۔ تم ڈاکوؤں والے واقعے کے گواہ ہو۔ یوں لاعلمی ظاہر کرنے سے بات نہیں بنے گی چھوٹیرا سائیں؟"

"اگر تم اسی قسم کی بے بنیاد باتیں کرتے رہے تو میرا دماغ پھر جائے گا۔" وہ سلامت ہاتھ میں ہلکی سی جنبش پیدا کرتے ہوئے بولا۔

نتیجے میں تارا کے ہاتھ میں بھی حرکت پیدا ہوئی کیونکہ ان دونوں کے صحیح و سالم بازوؤں کو میں نے ایک دوسرے کے اوپر مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔ اس کی جھلاہٹ کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"اگر تمہارا دماغ پھر گیا تو یہ تمہارے لیے بڑی سود مند بات ہوگی۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک اعلیٰ ڈگری مل جائے گی۔ نہ یونیورسٹی جانے کا جھنجٹ اور نہ ہی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے کی مصیبت۔"

وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا تو کوفت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"چھوٹیرا سائیں! شاید تم میری بات کو سمجھ نہیں پائے ہو۔ میں "پی۔ ایچ۔ ڈی" والی ڈگری کی بات کر رہا ہوں۔ کچھ لوگ مذاق میں اسے "پھرا ہوا دماغ" بھی کہتے ہیں۔"

وہ دانت کچکچا کر رہ گیا۔ اس صورتِ حالات سے سب سے زیادہ انجوائے میر بخش اور ممتاز کر رہے تھے۔ ممتاز نے خود کو بہت ہی سمجھ دار اور معاملہ فہم لڑکی ثابت کر دیا تھا۔ میں اس سے منسوب کر کے جھوٹی سچی کہانی سنا رہا تھا لیکن اس نے کسی مرحلے پر مجھے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں دوبارہ اکبر سومرو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں' تو میں بتا رہا تھا کہ منگل سنگھ اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کے ہمراہ ممتاز کو اغوا کر کے "سامارو" سے آگے جا رہا تھا کہ ریلوے کراسنگ پر قاضی سلطان کے آدمیوں سے اس کی مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ زبردست فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور ڈاکوؤں کو جان بچانے کے لیے وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ وہ ٹویوٹا فور وھیل ڈرائیو کو ریلوے کراسنگ پر چھوڑ کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو اپنی گاڑی میں سوار کرایا اور "نبی سر" کی جانب روانہ ہو گئے۔ تمہارے پالتو ڈاکوؤں کی جیپ اسی ریلوے کراسنگ پر کھڑی مل جائے گی۔ اس کے ٹائروں اور باڈی پر گولیاں کے متعدد سوراخ بھی اس کہانی کی سچائی کا ثبوت دیں گے۔" میں نے خاموش ہو کر اکبر سومرو کی جانب دیکھا۔

"ابھی تو تم نے کہا تھا' قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو تم نے ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے۔" وہ سر کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولا۔ اس کی حالت دیوانوں ایسی ہو رہی تھی "اور اب تم بتا رہے ہو' قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو ڈاکوؤں کی حراست سے آزاد کروایا ہے۔ کیا یہ کوئی نئی کہانی ہے؟"

"یہ وہی کہانی ہے لیکن اب ہی سوڈ نیا ہے۔" میں نے مزہ لیتے ہوئے کہا "کہانی کی یہی خاصیت ہوتی ہے کہ اس میں سے ہر لمحے ایک نئی کہانی جنم لیتی رہتی ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے کہا "اوئے گھامڑ چھوٹیرے! تم مجھے ہی قاضی سلطان کا آدمی کیوں نہیں سمجھ لیتے جس نے ممتاز کو تمہارے ڈاکوؤں سے چھڑایا ہے؟"

"تم قاضی سلطان کے آدمی کیسے ہو سکتے ہو؟"

"کیوں' اس میں کیا خرابی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا "تم تو اپنی ساتھی دھنو (ساحل) کے ہمراہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ تمہارا نام وجدان ہے۔ میں ڈی ایس پی کو تمہاری اصلیت بتا چکا ہوں۔ تم پر انڈین ایجنٹ ہونے کا شبہ کیا جا رہا ہے۔ تمہارے نام وجدان سے بھی یہ واضح نہیں ہو ماکہ تم ہندو ہو یا مسلمان!"

"تم تو میری حقیقت بلکہ اصلیت سے واقف ہو نا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے اس مہمان تارا اور اس دوست چوہدری نوازش علی نے تمہیں میرے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' تم قاضی سلطان کے آدمی نہیں ہو سکتے۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا "تم خوامخواہ اپنی شخصیت کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کر رہے ہو!"

میں نے کہا "میں بندہ صرف خدا کا ہوں' آدمی کسی کا بھی ہو سکتا ہوں اور کان کھول کر سن لو۔ میری تندرست اور توانا کہانی کے مطابق میں قاضی سلطان کا آدمی ہوں۔ میر بخش میرا ساتھی ہے۔ ہم دونوں نے ممتاز کو' ڈاکوؤں سے زبردست مقابلہ کر کے حاصل کیا ہے۔ ہم "سامارو" کے قریب پہنچنے ہی والے تھے کہ تم ٹویوٹا ہائی لکس میں ہماری راہ روکنے آن پہنچے۔ ہمارے درمیان ایک زبردست معرکہ ہوا جس کی یادگار کے طور پر تم دونوں کا ایک ایک بازو شدید زخمی ہو گیا۔ تمہاری رف ڈرائیونگ کی وجہ سے تمہارا گارڈ گاڑی الٹنے کے باعث ہلاک ہو گیا۔ بہرحال' میں نے تم دونوں کو اپنی گاڑی میں ڈال کر قاضی سلطان کے پاس پہنچا دیا۔ دی اینڈ! کہو' یہ کہانی کیسی ہے؟"

"مجھے لگتا ہے' تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔

میں نے اس کے مجروح بازو کو یک ٹک دیکھتے ہوئے کہا "مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے اور یاد رکھو' جب میرا دماغ خراب ہوتا ہے تو میں فوراً گھائل اعضا کی تلاش میں نکل جاتا ہوں۔" میری نظر بدستور وڈیرے کے بائیں بازو پر لگی تھی۔

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا "تمہاری کہانی میں ٹویوٹا ہائی لکس الٹ گئی تھی مگر وہ تو وہاں ریت میں سیدھی کھڑی ہے۔ اس کا کیا کرو گے؟"

میں نے خوابناک لہجے میں کہا "جو شخص الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کر سکتا ہے اس کے لیے سیدھی گاڑی کو الٹانا کون سا مشکل کام ہے!"

"وہاں تو تمہاری جسمانی طاقت کام آئی تھی۔" تارا نے کہا "میں نے سنا ہے' شاؤلن ٹیمپل میں تم نے وزنی اشیا اٹھانے کی بہت پریکٹس کی ہے مگر اتنے فاصلے سے تم اس سیدھی ہائی لکس کو کیسے الٹا سکتے ہو؟"

میں نے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں کہا "تمہاری معلومات انتہائی ناقص اور تمہاری سوچ بے حد لاغر ہے۔ تمہیں ایک طویل عرصے تک کسی نفسیاتی اسپتال میں اپنا علاج کروانا چاہیے۔ میں نے تمہاری ہائی لکس کو جسمانی طاقت سے سیدھا نہیں کیا تھا۔"

"پھر تم نے کون سی صلاحیت آزمائی تھی؟" وہ ہونقوں کی طرح منہ کھول کر میرا منہ تکنے لگا۔

میں نے کہا "یہ باریک بات تمہاری موٹی عقل میں نہیں آئے گی۔ تم خوامخواہ اپنے دماغ کو تھکانے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے ہی تمہارے سر پر بہت سی چوٹیں آ چکی ہیں اور تم نہیں جانتے' آئندہ ان چوٹوں کا اسکور کیا ہوگا۔"

اس نے مجھے گھورنے پر اکتفا کیا۔ کچھ بولتا تو سراسر گھاٹے میں رہتا۔

میں نے دانستہ تارا کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر میں چاہتا تو "چی" کی قوت اور اس کی کرشمہ کاریوں پر اسے ایک طویل لیکچر دے سکتا تھا مگر میں خوامخواہ اس قوت کو اپنے دشمنوں کی موجودگی میں زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا تھا۔ مخالفین سے اپنے گن چھپا کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے!

یہ حقیقت ہے کہ میں نے الٹی ہوئی ٹویوٹا ہائی لکس کو "چی" کی قوت کے طفیل سیدھا کیا تھا ورنہ جسمانی قوت کے لیے تن تنہا وہ کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس سیدھی گاڑی کو چھوئے بغیر' دور بیٹھے بیٹھے بھی الٹایا جا سکتا تھا۔ اور وہ بھی "چی" ہی کی مدد سے۔ "چی" بڑی حیرت انگیز اور پراسرار قوت ہے۔ اس کے منتہی کے لیے فاصلے کی کوئی قید نہیں۔ وہ دنیا کے ایک حصے میں بیٹھ کر دوسرے حصے میں واقعات وقوع پذیر کر سکتا ہے۔ میں "چی" کے منتہی کی بات کر رہا تھا۔ اس درجے پر پہنچنے کے لیے کڑی ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی فن کی انتہا تک پہنچنا آسان کام نہیں۔ میں بہرحال اس فن کا منتہی نہیں تھا۔ میں اپنے ہی ماحول میں' چھو کر اور چیزوں کو چھوئے بغیر واقعات تخلیق کر سکتا تھا۔ ویسے شاؤلن ٹیمپل میں ماسٹر ہنگ

ہزاروں ماہرین طب کی آرا
کی روشنی میں مرتب کردہ کتاب

موٹاپا
اور
اس کا سدباب

نیا ایڈیشن

قیمت 45 روپے ✤ ڈاک خرچ 23 روپے

موٹاپا......دل سے دشمنی
موٹاپا......زندگی کا خاتمہ

کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں آپ کے ساتھ نہ ہوں۔
تو پھر جلدی کیجیے.....

ہماری مرتب کردہ کتاب

"موٹاپا اور اس کا سدباب" کا مطالعہ ضرور کیجیے اس کتاب میں وہ سب کچھ ہے جس پر عمل کر کے آپ ایک متناسب اور سڈول جسم کے مالک بن سکتے ہیں۔

کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر/ ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں

مکتبہ نفسیات

kitabiat1970@yahoo.com

رابطہ کا پتا: C-63 فیز II ایکسٹینشن D.H.A مین کورنگی روڈ کراچی

پائی اور ان کے شاگرد ماسٹر لیشی یان نے مجھے "چی" کی ایڈوانس مشقوں کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ جب بھی مجھے وافر مقدار میں فرصت میسر آتی' میں ان مشقوں کو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ کوئی ہنسی کھیل میں کی جانے والی مشقیں نہیں ہیں۔ انسانی دماغ پر پائے جانے والے مخصوص گلینڈز پر باقاعدگی سے ارتکازِ توجہ کی پریکٹس کرنا ہوتی ہے۔ پنیل گلینڈ (PINEAL GLAND) دماغ کے سامنے والے حصے میں پایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین اسے باطنی آنکھ یا تیسری آنکھ بھی کہتے ہیں۔ اس غدود کی مدد سے دماغی صلاحیت اور سوچ کی قوت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ گویا یہ انسانی دماغ کا (SEND) ہے۔ ایک اور اہم غدود پچیوٹری گلینڈ (PITUITARY GLAND) ہے جو دماغ کے عقبی زیریں حصے پر پایا جاتا ہے۔ اس گلینڈ کی مدد سے باہر کی معلومات کو اپنے دماغ تک لایا جا سکتا ہے۔ اسے آپ انسانی دماغ کا (PICK) کہہ سکتے ہیں۔ "PICK" اور "SEND" کے دو بٹنوں کو اگر استعمال کرنا آجائے تو انسان بڑا صاحبِ کمال ہو جاتا ہے... اور یہ دسترس حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچ رکھا تھا' اگر کبھی زندگی نے مہلت دی تو میں ان غدود کی مشقوں کو ضرور کروں گا۔ یہ غدود یا گلینڈز عام حالت میں انسانی جسم کے مختلف افعال کو کنٹرول کرتے ہیں۔

تارا کی بے بسی نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاہم وڈیرا سوال کرنے سے باز نہ آیا۔ اس نے پوچھا "وجدان! ایک طرف تم کہتے ہو' قاضی سلطان کے آدمیوں نے ممتاز کو ڈاکوؤں کی قید سے رہائی دلائی ہے' دوسری جانب تم قاضی سلطان کے آدمیوں کی جگہ خود کو اور میر بخش کو رکھتے ہو۔ تمہاری اس من گھڑت اور جھوٹی کہانی پر کون یقین کرے گا؟"

"تم سمیت سب یقین کریں گے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"مم۔ میں... یہ کیسے ممکن ہے؟"

"جب پولیس والوں کے جوتے پڑیں گے تو یہ بھی ممکن ہو جائے گا چھوٹیرا سائیں!"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "میں ڈی ایس پی صاحب کو تمہاری اصلیت بتا چکا ہوں۔"

"تم اپنے حرامی ڈی ایس پی کو میری اصلیت بتاؤ یا فرضی جرائم گنواؤ' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا "جب "ایس پی" میری کہانی کو مان لے گا تو سب کی چھٹی ہو جائے گی۔ ایس پی' مغویہ ممتاز کا ماموں ہے اور تمہارے دشمن قاضی سلطان کا سالا ہے۔ تم نے سن رکھا ہوگا۔ ساری خدائی ایک طرف' جورو کا بھائی ایک طرف۔ قاضی سلطان کی جورو کا بھائی بہت طاقتور ہے۔ اسی کے احکامات پر ڈاکوؤں کے خلاف کارروائی ہو رہی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ تمہارے مربّی ڈی ایس پی کا بھی "صاحب" ہے۔ وہ لپیٹ کر رکھ دے گا تم سب کو۔ تم ڈاکوؤں کے پشت پناہ ہو' میں اس کیس میں "نجات دہندہ" کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ بولو' ہم میں سے کس کی بات کو توجہ سے سنا جائے گا؟ تمہاری یا میری؟ اور کس کی بات کو رد کیا جائے گا؟ تمہاری یا میری؟"

"تم نے ایک شیطان کا دماغ پایا ہے۔" وہ بے ساختہ میری تعریف کرنے پر مجبور ہو گیا "تمہارے ذہن نے بہت ہی خطرناک کہانی بنی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی کہانی فائنل نہیں ہوئی۔ میں نے تو تمہیں "ون لائن" سنایا ہے۔ ضرورت پڑنے پر حالات کے تقاضے کے مطابق اس میں ترمیم و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور گویا کلین بولڈ کرنے کی کوشش کی "وجدان! ایک بات کو تم بالکل بھولے بیٹھے ہو۔ تمہاری اس فرضی کہانی میں دھنو (ساحل) کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟"

"کچھ تجسس بھی تو رہنے دو۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "قاضی سلطان کی حویلی پر پہنچ کر تمہیں باقی باتیں بھی معلوم ہو جائیں گی۔"

اس موقع پر میر بخش خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے براہِ راست وڈیرے پر حملہ کیا "سائیں! اپنے وجدان صاحب اس کہانی کے لکھاری ہیں۔ وہ کسی بھی کردار کو ان یا آؤٹ کر سکتے ہیں۔ تم کیوں فکر میں پڑتے ہو؟"

اپنے سابق ادنیٰ غلام کی اس جسارت پر وڈیرا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ بجارو کے اندر عملی طور پر میر بخش کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا اس لیے زبان کا استعمال کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔

"تم اپنی چونچ بند رکھو نمک حرام! تم نے ایک بہت پرانی سندھی کہانی کو سچ کر دکھایا ہے۔"

"روایتی کہانیاں اور کہاوتیں سچی ہی ہوتی ہیں۔" میر بخش گویا اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا "بہت سے سچے واقعات اور حقائق کو نچوڑ کر بڑے بزرگ کوئی کہاوت' قصہ کہانی یا روایت بناتے تھے۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے وڈیرا اکبر سومرو سے پوچھا "تم کس سندھی روایتی کہانی کی بات کر رہے ہو؟"

"کلہاڑی اور درخت والی کہانی۔" اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "تم بھی سنو گے؟"

میں نے کہا "سنا دو' کیا حرج ہے۔ آخر میں نے بھی تو تمہیں ایک سنسنی خیز کہانی سنائی ہے نا!"

"تم نے جو کچھ بیان کیا وہ جھوٹ کے پلندے کے سوا کچھ نہیں۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"تمہارا بیان شروع ہو تو اندازہ لگاؤں' تم کیا فرمانے والے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے چند لمحات خاموش رہنے کے بعد مجھے ایک سندھی پرانی روایتی کہانی سنا دی۔ وہ درخت اور کلہاڑی سے منسوب ایک کہانی تھی جس کے مطابق' ایک روز کسی نے درخت سے آکر کہا' لوہار کی دکان میں تمہارا دشمن تیار کیا جا رہا ہے۔ درخت نے پوچھا' کون سا دشمن۔ کیا نام ہے اس کا؟ درخت کو بتایا گیا' وہ دشمن لوہے کی ایک کلہاڑی ہے۔ درخت نے پوچھا' کلہاڑی کو لوہے سے بنایا جا رہا ہے۔ وہ میرا کیا بگاڑ لے گی۔ مجھے کلہاڑی کی پروا نہیں۔ کہنے والے شخص نے کہا' اس کلہاڑی سے تمہیں کاٹا جائے گا۔ درخت بولا' یہ ممکن نہیں۔ تم مجھے خوامخواہ ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ میں کسی کلہاڑی ولہاڑی سے خوف زدہ ہونے والا نہیں۔ چند روز بعد اسی شخص نے درخت کو اطلاع دی' کلہاڑی تیار ہو چکی ہے۔ بس اب تمہاری خیر نہیں۔ درخت نے کلہاڑی کی شکل و شباہت کے بارے میں استفسار کیا۔ اسے یہ معلومات بہم پہنچا دی گئیں۔ درخت نے کہا' کلہاڑی کو خالص لوہے سے تیار کیا گیا ہے۔ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں لوہے سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ دو روز بعد وہ شخص پھر درخت کے پاس آیا اور اسے سنسنی خیز اطلاع دی' کلہاڑی کو چلانے کے لیے اس میں دستہ فٹ کر دیا گیا ہے۔ درخت نے پوچھا' یہ دستہ کیا ہوتا ہے؟ اسے بتایا گیا' دستہ کسی درخت سے کاٹی گئی ایک موٹی شاخ ہوتی ہے۔ دستے کو ہاتھ میں تھام کر کلہاڑی سے وار کیا جاتا ہے۔ اب تم کٹنے کے لیے تیار ہو جاؤ! درخت نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور شکست خوردہ انداز میں بولا' تم ٹھیک کہتے ہو دوست۔ اب واقعی مجھے تشویش میں مبتلا ہو جانا چاہیے کیونکہ میرا اپنا دشمن سے جا کر مل گیا ہے۔ اگر درخت کی شاخ کلہاڑی کا دستہ نہ بنتی تو وہ لوہے کا ٹکڑا میرے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد وڈیرے نے نہایت سنجیدگی سے کہا "وجدان! اگر میرے کیمپ کا آدمی میر بخش تمہارے کیمپ میں نہ چلا جاتا تو اس وقت صورتِ حال بہت مختلف ہوتی۔ تم اور تمہاری ساتھی میرے قدموں پر پیشانیاں رگڑ کر التجائیں کر رہے ہوتے۔" پھر اس نے ایک شکست خوردہ آہ بھری اور بولا "وقت وقت کی بات ہے۔ اس وقت تمہارا پلّہ بھاری ہے۔ کل یہ موقع مجھے بھی مل سکتا ہے۔ میں اس وقت اس تخمِ بد میر بخش کو بھوکے کتوں سے نچواؤں گا اور اس کی کٹی پھٹی لاش کو اپنے بنگلے کے سامنے بانس پر ٹنگواؤں گا تاکہ آیندہ کوئی شخص غداری کی جرات نہ کر سکے۔"

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "تمہاری یہ ناپاک خواہش' حسرتِ ناتمام بن جائے گی۔"

میر بخش نے کہا "وڈیرا سائیں! ہم کنری کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ یہاں سے اپنی منزل "نبی سر" زیادہ دور نہیں۔ تم حوصلہ جمع رکھو۔ وہاں تمہارے ساتھ درخت اور کلہاڑی والی کہانی دہرائی جائے گی۔ تمہارے سر پر اتنے ڈنڈے برسائے جائیں گے کہ کلہاڑی کو بھول جاؤ گے۔"

ساحل نے میر بخش سے کہا "اب تم اس بے چارے کو اتنا بھی نہ ڈراؤ کہ یہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی آخری سفر پر روانہ ہو جائے۔ آخر وہ تمہارا "باس" رہا ہے۔ کچھ تو لحاظ کرو۔"

ساحل کی دیکھا دیکھی ممتاز نے بھی لب کھول لیے۔ وہ ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے بولی "میر بخش بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اکبر سومرو جیسے بھوتار وڈیروں سے جتنا بھی برا سلوک کیا جائے' وہ کم ہے۔ یہ ایک مرتبہ میرے بابا کے پاس پہنچ جائے پھر وہ اسے مزہ چکھائیں گے۔ کیوں وجدان! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

آخری جملہ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ادا کیا تھا اور اس کے لہجے میں خاصی بے تکلفی اور بے باکی پائی جاتی تھی۔ وہ خاصی دیر سے خاموش تھی۔ اچانک اس کے بولنے کا سبب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب اس کی حویلی بہت نزدیک آگئی تھی یعنی ہم بہت جلد اس کے گھر پہنچنے والے تھے۔

میں نے ممتاز کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "بالکل' بالکل۔ تمہارے بابا قاضی سلطان تو وڈیرے کو دیکھتے ہی کھل اٹھیں گے اور جب انہیں میری زبانی یہ پتا چلے گا کہ تمہارے اغوا کے پیچھے اسی مردود کا ہاتھ ہے تو ان کی "خوشی" ہزار چند ہو جائے گی۔ وہ ایک طویل عرصے تک اس کی "خاطر داری" میں لگے رہیں گے۔" پھر میں نے وڈیرے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "سائیں! تمہارے تو مزے آگئے۔

کھلا کھاؤ اور جان بناؤ!"

وڈیرے نے میرے طنز پر کوئی تبصرہ یا تنقید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اسے اپنا اور اپنے مہمان دوست تارا کا انجام صاف نظر آنے لگا تھا۔ دونوں نے چپ سادھنے ہی میں عافیت جانی۔ ممکن ہے' ان کا خیال ہو کہ خاموش رہ کر وہ اپنے بچاؤ کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر سوچ سکتے ہیں۔

ہم کنری سے ہوتے ہوئے نبی سر کی جانب بڑھنے لگے تو ممتاز نے کہا "وجدان! تھوڑی دیر پہلے وڈیرے نے تمہارے بارے میں کہا تھا کہ تم نے شیطان کا دماغ پایا ہے لیکن میں یہ کہوں گی کہ تم بے حد ذہین اور معاملہ فہم ہو۔ تم نے منگل سنگھ وغیرہ سے جس طرح مجھے آزاد کرایا ہے' وہ قابلِ تعریف ہے پھر وڈیرے اور اس کے ساتھی تارا کو تم اب تک جس انداز میں کنٹرول کیے ہوئے ہو وہ بہت بہادری کا کام ہے۔ میں نے وہ منظر نہیں دیکھا جب تم نے ایک بھاری بھرکم الٹی ہوئی گاڑی کو سیدھا کیا تھا لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس کارنامے پر تمہیں ایک غیر معمولی انسان کا ٹائٹل ملنا چاہیے۔"

"تم میری تعریفوں میں اپنی توانائی صَرف نہ کرو۔" میں نے کہا "میں نے وہی کیا جو حالات کا تقاضا تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی ٹائٹل وائٹل کی ضرورت نہیں۔ جب مجھ پر کوئی وقت پڑا تو تم بھی میری مدد کر دینا۔ یہ دنیا "گیو اینڈ ٹیک" کے اصول پر کام کرتی ہے میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اگر تم واقعی ایسا سمجھتی ہو تو یہ تمہارا بڑا پن ہے۔"

وہ میرے منہ سے اپنی تعریف سن کر خوش ہو گئی۔ سنجیدگی سے بولی "اللہ نہ کرے کہ تم پر کبھی برا وقت آئے۔ اگر خدانخواستہ کبھی تمہیں میری مدد کی ضرورت پیش آ گئی تو میں جی جان سے تمہارے کام آؤں گی۔ تم اس مشن کے ہیرو ہو۔"

ممتاز' صاحبِ ثروت شخص قاضی سلطان کی اکلوتی اولاد تھی' تعلیم یافتہ بھی تھی اس لیے اس میں بے پناہ اعتماد موجود تھا پھر میں نے جان پر کھیل کر اسے جس طرح منگل سنگھ اینڈ کمپنی کے چنگل سے نکالا تھا' میرے اس عمل نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ وہ مجھے ہیرو کا درجہ دینے لگی تھی۔ میں اس کے جذبات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ممتاز کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر ساحل اچانک خاموش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"ساحل! تم کافی دیر سے چپ ہو۔ خیریت تو ہے۔ کہیں تمہارے ٹخنے کا درد پھر تو نہیں جاگ اٹھا؟"

میں نے ساحل کو مخاطب کیا تو وڈیرا چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ دھنو کے نام سے ساحل کو جانتا تھا۔ میں نے اس کے چونکنے کی پروا کیے بغیر اپنا دھیان ساحل کی طرف ہی رکھا۔ اس نے کہا۔

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا۔ میں تو اس درد کو بھول ہی گئی تھی۔ واقعی۔۔"

اس نے حیرت بھرے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا "اگر تم خیریت سے ہو تو پھر خاموش کیوں ہو؟"

"کیا جو لوگ ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں وہ مسلسل بولتے رہتے ہیں؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

اس کے انداز میں ناراضی نہیں بلکہ شرارت چھپی تھی۔ ساحل ایک شوخ و چنچل لڑکی تھی۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں' عارضی قیام کے دوران میں ہمارے درمیان بڑی شرارتیں ہوتی رہتی تھیں۔ والدین کی موت نے اسے کچھ عرصے کے لیے دل شکستہ اور ملول کر دیا تھا۔ تاہم اب اس کی فطری شوخی اور چنچل پن دھیرے دھیرے واپس آ گیا تھا۔ آج کل وہ بالکل اپنے فطری مزاج کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے کہا "یہ ضروری نہیں کہ صحت مند لوگ ہر وقت بولتے رہیں مگر یہ ضروری ہے کہ تم بخیریت ہونے کی صورت میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتیں۔"

"میں تو اس لیے چپ تھی کہ ممتاز تم سے بات کر رہی تھی۔"

"ہوں!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ بولی "ایک وقت میں آدمی ایک طرف ہی توجہ دے سکتا ہے نا! اب دیکھو' میں بول رہی ہوں تو ممتاز خاموش بیٹھی ہے۔"

اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو کیموفلاج کرنے کے لیے بڑی برمحل مثال دی تھی جس سے اس کی ذہانت کا اندازہ ہوتا تھا۔ ساحل بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی لیکن میں نے لاشعوری طور پر یہ محسوس کیا تھا کہ ممتاز کا بے تکلفی سے مجھ سے بات کرنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ ممکن ہے' ایسی کوئی بات سرے سے ہی نہ ہو۔

ممتاز نے ساحل کی حمایت کرتے ہوئے کہا "ساحل کی دلیل معقول اور جان دار ہے۔ یہی آدابِ گفتگو کا تقاضا بھی ہے۔"

ممتاز نے یہ بات کہہ کر تصدیقی انداز میں گردن موڑ کر

میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "ہاں ممتاز! تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

چند لمحات تک پجارو میں خاموشی رہی پھر میں نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟ تم نے وہاں سامارو کے نزدیک اپنے سابق آقا سے بھی خاصی "دل لگی" کی ہے۔ کہیں زخم کی تکلیف بڑھ تو نہیں گئی؟"

"ٹھیک ہے سائیں۔" وہ جلدی سے بولا "تھوڑا درد ہے مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔"

میں نے پوچھا "تمہیں ڈرائیونگ میں کوئی دقت تو محسوس نہیں ہو رہی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔ میں نے کہا۔

"کوئی مسئلہ ہو تو بتاؤ۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ جاتا ہوں۔" ان رستم خان کے پٹھوں سے تو جو پوچھنا تھا' وہ میں نے پوچھ لیا۔" اس نے کہا "سائیں! اب تو ہم "نبی سر" کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ آپ اطمینان رکھو۔ میں خیریت سے گاڑی کو ممتاز کی حویلی تک پہنچا دوں گا۔"

میر بخش کے تسلی بخش جواب نے مجھے مطمئن کر دیا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہونے لگی۔ اس بات چیت میں ممتاز نے بھی بھرپور حصہ لیا۔

کچھ دیر بعد ہماری پجارو نبی سر میں داخل ہو گئی۔

قاضی سلطان کی حویلی کے گیٹ پر مسلح محافظوں نے ہمارا "استقبال" کیا۔ وہ تعداد میں دو تھے ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک اجنبی مجروح پجارو کو حویلی کے گیٹ کے سامنے رکتے دیکھ کر ان کے چہرے تن گئے اور وہ بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی کی جانب بڑھے۔ شاید وہ ہمیں اپنا کوئی دشمن سمجھے تھے۔

لیکن پجارو کے نزدیک پہنچتے ہی مسلح محافظوں کے تیور بدل گئے۔ انہوں نے پسنجر سیٹ پر اپنی چھوٹی مالکن ممتاز کی جھلک دیکھ لی تھی۔ ان کے چہروں کے تناؤ نے حیرت آمیز خوشی کی شکل اختیار کر لی۔ وہ چشم زدن میں باادب' باملاحظہ' ہوشیار ہو گئے۔ ممتاز اپنی جانب والی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر احکام صادر کرنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم حویلی کے اندر تھے۔

پجارو سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہماری آمد کی خبر حویلی کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی تھی۔ قاضی سلطان بہ نفسِ نفیس وہاں پہنچ گیا۔ مغویہ بیٹی کو اپنی نگاہ کے سامنے دیکھ کر وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند پجارو کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں ممتاز اپنی جانب والا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گئی تھی۔ فرطِ جذبات سے قاضی سلطان نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔

وہ بڑا جذباتی منظر تھا۔ ایک ان ہونی' ہونی میں بدل گئی تھی۔ قاضی سلطان نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا کہ اس کی گمشدہ بیٹی خود بخود اس کے پاس پہنچ جائے گی۔ بے خودی کے ریلے سے وہ باہر آیا تو ہماری جانب اس نے توجہ کی۔

اس دوران میں' میں' میر بخش اور ساحل پجارو سے باہر نکل آئے تھے۔ البتہ وہ دونوں ابنِ مردود پجارو کے پچھلے حصے میں موجود تھے۔ ہم تینوں قاضی سلطان کے لیے بالکل ناشناسا تھے۔ تاہم وڈیرا اکبر سومرو پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھا۔ اس نے حیرت زدہ سوالیہ نظر سے ممتاز کی طرف دیکھا۔

ممتاز نے کہا "بابا جانی! میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتاتی ہوں۔ پہلے ان محسنوں کو آرام سے حویلی میں پہنچایا جائے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے ہماری جانب اشارہ کیا۔

میں نے اور میر بخش نے آگے بڑھ کر خوش دلی سے قاضی سلطان سے مصافحہ کیا۔ ساحل نے صرف سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ اس سلام سے میری مراد باقاعدہ "السلام علیکم" نہیں بلکہ آپ اسے آسانی کے لیے "آداب" یا "ہیلو ہائے" کہہ سکتے ہیں۔

قاضی سلطان نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ ہمیں عزت و احترام کے ساتھ مہمان خانے میں پہنچایا جائے۔ اس نے ایک بازو میں ممتاز کو لپیٹ رکھا تھا۔ ملازم کو ہمارے بارے میں حکم دینے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر وڈیرا اکبر سومرو اور تارا کی جانب الجھی ہوئی نظر سے دیکھا۔ اس الجھن میں سیکڑوں سوال تھے۔

میں نے اس کی الجھن کو ایک مخصوص راہ پر ڈالتے ہوئے کہا "قاضی صاحب! ان دونوں کی حیثیت اس وقت مجرموں کی سی ہے۔ انہیں گاڑی سے نکلوا کر بحفاظت کسی محفوظ مقام پر بند کروا دیں۔ ان سے بعد میں پوچھ گچھ ہوگی۔"

قاضی سلطان نے اکبر سومرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کو تو میں فوراً پہچان گیا۔ دشمن کو میں بھلا کیسے نہیں پہچانوں گا مگر۔۔" اس نے تارا کی جانب انگلی اٹھائی "مگر یہ شخص کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ اکبر سومرو کا دوست تارا ہے' کئی روز سے اس کے گھر مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ دشمن کا دوست' دشمن ہی ہوتا ہے۔ اس رشتے سے تارا بھی آپ کا دشمن ہے۔ ان دونوں دشمنوں کو آپ فوراً اپنی تحویل میں لے لیں۔"

"یہ دونوں یہاں کس لیے آئے ہیں؟"
"یہ آئے نہیں' لے آئے گئے ہیں۔" میں نے قاضی سلطان کو بتایا۔
اس نے پوچھا "کس سلسلے میں؟"
میرے جواب دینے سے پہلے ہی ممتاز نے اپنے باپ کا بازو کھینچتے ہوئے کہا "بابا جانی! آپ اندر چلیں۔ میں نے کہا نا' میں آپ کو پوری کہانی سناتی ہوں۔"
قاضی سلطان نے متذبذب نظر سے بیٹی کو دیکھا پھر حویلی کے اندرونی حصے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جاتے جاتے وہ اپنے ملازمین کو اکبر سومرو اور تارا کے بارے میں خصوصی احکام دے گیا۔ ہماری پجارو جب حویلی کے اندر پہنچ کر ایک مخصوص مقام پر رکی تھی تو مسلح گارڈز کے علاوہ تین چار ہٹے کٹے ملازم بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کے لیے وہ پجارو کی جانب بڑھے۔
جب اکبر سومرو اور تارا کو پجارو سے باہر لایا جا رہا تھا تو وہ دونوں بڑے خوفناک انداز میں مجھے گھور رہے تھے۔ اگر اس وقت ان کا مجھ پر بس چلتا تو وہ مجھے کچا چبا ڈالتے۔ میں نے انہیں جس مضحکہ خیز انداز میں باندھا تھا' وہ قاضی سلطان کے ملازمین کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے انہیں کھینچ کھانچ کر گاڑی سے باہر نکال لائے۔ ان کے سلامت بازو ایک دوسرے کے اوپر دو بانسوں کے مانند بندھے تھے۔ جو بازو آزاد تھے وہ اعضائے معطل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ دونوں اس وقت بے بسی کی انتہا سے گزر رہے تھے۔
جن دو صحت مند ملازمین نے تارا اور اکبر سومرو کو پجارو سے باہر نکالا' ان میں سے ایک سے میں نے کہا "سائیں! یہ دونوں بہت خطرناک مانو ہیں۔ ان کو بہت ہی حفاظت والی جگہ پر رکھنا۔ کہیں یہ فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو جائیں!"
"جو حکم سائیں!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
دوسرے ملازم نے کہا "سائیں! میں اس خطرناک بھوتار وڈیرے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کرو۔ قاضی سائیں کے دشمن کو ہم گن پوائنٹ پر رکھیں گے۔ ویسے آپ ان دونوں کو جس حالت میں یہاں لائے ہو' اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' یہ فرار ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ تو اپنے ٹوٹے پھوٹے بازوؤں کو حرکت دینے کے قابل بھی نہیں ہیں۔"
"پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔
وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے "تارا اینڈ کمپنی" کو کسی بندی خانے میں لے جانے لگے۔
ہم تینوں قاضی سلطان کے ملازم کی راہنمائی میں مردانے میں واقع ایک سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ اس کمرے کی وسعت اور آرائش و زیبائش سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ قاضی سلطان صاحب ثروت ہی نہیں بلکہ صاحب ذوق بھی تھا۔ اس ڈرائنگ روم کو سجانے کے لیے لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہوں گے اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ تمام سجاوٹ بڑے ماہرانہ اور فنکارانہ انداز سے کی گئی تھی۔ رقم کو خوامخواہ ضائع نہیں کیا گیا تھا۔
وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں چاروں جانب صوفے لگے ہوئے تھے۔ ان صوفوں کو دیواروں سے خاصا ہٹا کر لگایا گیا تھا۔ ہر دیوار میں بڑے سائز کی ایک کھڑکی موجود تھی جس پر قیمتی ریشمی پردے لٹکے نظر آ رہے تھے۔ کمرے کا فرش دبیز' بیش قیمت گلدار قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ صوفوں کے آگے گلاس ٹاپ میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر لگی تصاویر سے اعلیٰ ذوقی جھلکتی تھی۔ الغرض وہ ایک عالی شان نشست گاہ تھی جہاں بیک وقت پچاس افراد بیٹھ سکتے تھے۔
ملازم ہمیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ ہم پھیل کر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس وقت دن کے دو بج رہے تھے۔ دیوار گیر کلاک بھی بہت آرٹسٹک اسٹائل کا تھا۔ ہم لگ بھگ پچھلے چوبیس گھنٹے سے ایمرجنسی کی صورتِ حال سے دو چار تھے۔ اس دوران میں کہیں ڈھنگ سے ہمیں کچھ کھانا پینا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں نے اور ساحل نے کل دوپہر کا کھانا عمر کوٹ کے ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میر بخش ہمارے پاس آ گیا تھا۔ جب سے اب تک ہمیں نہ تو آرام کا موقع ملا تھا اور نہ ہی باقاعدہ کھانا کھانے کا۔ شادی پلی کے تھانے میں اور ڈی ایس پی کے بنگلے پر صرف چائے بسکٹ وغیرہ سے ہماری رسمی تواضع کی گئی تھی۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ ڈی ایس پی اپنی حریصانہ نظر ہم پر لگائے بیٹھا تھا۔ میری دولت اور ساحل کے حسن و جوانی پر!
اس وقت ہم تینوں تھکن کے ساتھ ساتھ بھوک بھی محسوس کر رہے تھے۔ نیند بھی اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمیں پچھاڑنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ گزشتہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی ہماری آنکھ نہیں لگی تھی۔ ہم پچھلے چوبیس گھنٹے میں پیش آنے والے سنسنی خیز حالات کے بارے میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے کہ وہی ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جو ہمیں یہاں پہنچا کر گیا تھا۔
اس نے مخصوص سندھی لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے نیف و نزار اردو میں کہا "سائیں! آپ لوگ نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔"
میر بخش نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "ہمارے پاس تو پہننے کے لیے اور کوئی لباس بھی نہیں ہے۔ کیا نہانے کے بعد ہم یہی میلے کپڑے دوبارہ پہنیں گے؟"
کل رات سے لے کر اب تک میر بخش اور میں خاصی مار اماری میں مصروف رہے تھے اور ہمارے لباس اس قابل نہیں رہے تھے کہ نہا دھو کر انہیں دوبارہ جسم پر سجایا جاتا۔
میر بخش نے سندھی میں اس ملازم سے ڈاک خانہ ملایا۔ دو چار جملوں کے تبادلے کے بعد میر بخش نے مجھے بتایا "وجدان سائیں! ڈرائنگ روم سے تھوڑے ہی فاصلے پر مہمان خانے والا حصہ ہے جہاں مہمانوں کے قیام کے لیے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ یہ ملازم ہمیں ایک کمرے میں لے جانا چاہتا ہے۔ وہاں ہمارے لیے صاف ستھرے لباسوں کا بندوبست کیا جا چکا ہے۔"
میں نے حیرت سے اس ملازم کو دیکھا اور پوچھا "قاضی سلطان کہاں ہے؟"
"وہ حویلی کے اندر ہیں سائیں!" اس نے بتایا۔
"اور ممتاز؟"
"چھوٹی مالکن ان کے ساتھ ہی ہیں۔"
"وجدان سائیں!" میر بخش نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "ملازم نے بتایا ہے کہ ہم نہا دھو کر فارغ ہو جائیں تو ہمارے لیے کھانا لگایا جائے گا۔ اس کے بعد ہی قاضی صاحب سے ہماری ملاقات ہو گی۔"
میں نے کندھے اچکائے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساحل اور میر بخش نے میری تقلید کی اور ہم تینوں ملازم کی پیروی میں ڈرائنگ روم سے نکل کر ان کمروں کی جانب بڑھ گئے' میر بخش نے جن کا ذکر کیا تھا۔ حویلی کا مہمان خانہ ایک ڈرائنگ روم اور چند بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ ہمیں ڈرائنگ روم سے اٹھا کر کسی بیڈ روم کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً میر بخش اور ساحل کا بھی یہی حال ہو گا۔ ہم تینوں حالات کی ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ میں نے سوچا' مذکورہ کمرے میں پہنچ کر ملازم سے پانی کے بارے میں کہوں گا۔
مجھے اس ملازم سے ایک بھی لفظ نہیں کہنا پڑا۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ایک دیوار کے ساتھ موجود ڈریسنگ ٹیبل نما میز پر مجھے پانی کا ایک بلوری جگ رکھا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی تین گلاس بھی موجود تھے۔ گلاسوں کی تعداد سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہمارے لیے ہی وہاں رکھے گئے تھے۔ وہ جگ اور گلاس کسی قیمتی امپورٹیڈ واٹر سیٹ کا حصہ تھے۔ ان کی نفاست اور نزاکت میں کوئی کلام نہیں تھا۔
کمرے میں تھوڑے سے فاصلے پر دو بیڈ لگے تھے۔ گویا وہ ایک بیڈ روم تھا جہاں دو مہمان بیک وقت قیام کر سکتے تھے۔ دیوار کے ساتھ رکھی ڈریسنگ میز کے قریب ایک صوفہ پڑا تھا۔ اس پر تین افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ ملازم ہمیں بیڈ روم میں پہنچا کر واپس چلا گیا۔
"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" ساحل نے ایک دیوار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
اس دیوار میں ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے پوچھا "تمہیں کس بات کا یقین نہیں آ رہا؟"
"اس دور دراز علاقے میں اٹیچڈ باتھ روم کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔" اس نے کہا۔
"تمہیں یقین کر لینا چاہیے۔" میں نے کہا "یہ دروازہ واقعی باتھ روم کا ہے۔" یہ بات میں نے دروازہ کھولنے کے بعد کہی تھی "تم یہ کیوں بھول رہی ہو' یہ گھر گاؤں میں رہنے والے کسی عام آدمی کا نہیں بلکہ ایک طاقت ور شخصیت قاضی سلطان کی حویلی ہے۔"
میر بخش نے کہا "سائیں! سارا پیسے کا کھیل ہے۔ جب شارجہ جیسے ریگ زار میں سرسبز و شاداب اسٹیڈیم بنایا جا سکتا ہے تو یہاں ملحقہ باتھ روم کیوں نہیں بن سکتا۔ پورے سندھ میں جو لوگ دولت مند ہیں انہیں ہر قسم کی آسائشیں حاصل ہیں۔ آپ ٹی وی ڈراموں میں دیکھ لیں۔ جب وڈیروں کی حویلیوں اور بنگلوں کے اندرونی مناظر دکھائے جاتے ہیں تو وہاں کس چیز کی کمی نظر آتی ہے؟ اصل چیز ہے قوت خرید۔ جس کی جیب میں نوٹ ہیں' وہ بازار میں فروخت ہونے والی ہر شے کو خرید سکتا ہے۔ سندھ کے تمام وڈیروں اور صاحبِ حیثیت افراد نے اپنی رہائشوں کو ہر سہولت سے سجا رکھا ہے۔ ملحقہ باتھ روم تو عام سی بات ہے۔"
جس دوران میں میر بخش یہ معلوماتی لیکچر دے رہا تھا' میں نے باتھ روم کے اندر نگاہ ڈال کر وہاں کا سرسری جائزہ لے لیا۔ وہ ایک مکمل واش روم تھا۔ ایک جانب دیوار پر نصب کھونٹیوں پر تین جوڑے کپڑے ٹنگے تھے جن میں دو مردانہ اور ایک زنانہ سوٹ تھا۔ ساحل کے لیے سندھ کا روایتی

لباس مہیا کیا گیا جو یقینی طور پر ممتاز کا ہو سکتا تھا۔ ہم دونوں کے لیے شلوار سوٹ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک بات میں نے ان کپڑوں کو دیکھتے ہی محسوس کرلی اور وہ یہ کہ وہ تینوں جوڑے بالکل کورے تھے۔ ابھی تک انہیں کسی نے استعمال نہیں کیا تھا۔

کپڑوں کے علاوہ بھی ضرورت کی ہر شے واش روم میں موجود تھی۔ ہمارے لیے خصوصی طور پر نئے ٹوتھ برش بھی وہاں رکھ دیے گئے تھے۔ یقیناً یہ سارا انتظام ممتاز کے کہنے پر کیا گیا ہوگا۔ میں نے سندھ کی روایتی مہمان نوازی کے بہت سے قصے سنے تھے‘ عملی مظاہرہ اب دیکھنے میں آرہا تھا۔

میں نے میز کی جانب بڑھتے ہوئے کہا ”ساحل! پہلے تم فریش ہو جاؤ۔ ہم بعد میں نہالیں گے۔“

”میں پہلے ایک گلاس پانی پیوں گی۔“ وہ میری نظر کا تعاقب کرتے ہوئے بولی۔

میں نے جگ میں سے ایک گلاس بھر کر ساحل کی جانب بڑھادیا۔ پانی پینے کے بعد وہ واش روم میں گھس گئی۔ میں اور میر بخش اپنے خشک حلق تر کرنے کے لیے پانی سے انصاف کرنے لگے۔

ایک گھنٹے کے اندر ہم تینوں نہا دھو کر تیار ہو گئے۔ ساحل کے بدن پر سندھی لباس بہت بچ رہا تھا۔ وہ لباس لمبائی کی پیمائش میں معمولی سا چھوٹا تھا۔ ممتاز کا قد پانچ فٹ دو انچ کے قریب تھا جبکہ ساحل کی ہائیٹ پانچ فٹ دس انچ تھی۔ تاہم اس لباس نے ساحل کے حسن کو دوبالا کردیا۔ میر بخش تو شلوار قمیص پہننے کا عادی تھا مگر میرے لیے یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ساری زندگی پینٹ سوٹ‘ پینٹ شرٹ یا جینز وغیرہ استعمال کی تھی۔ مارشل آرٹس کی ٹریننگ کے دوران میں ہمیں جو یونی فارم پہننے کو دیا جاتا تھا‘ وہ بھی خاصا لوز ہوتا تھا مگر شلوار قمیص کی بات دوسری تھی۔

”مجھے تو شدید نیند آرہی ہے۔“ ساحل نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا۔

میر بخش بولا ”میں بھی بہت تھک گیا ہوں سائیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھائل بازو کو آہستہ سے دبایا۔

جب میر بخش نہانے کے لیے واش روم کا رخ کر رہا تھا تو میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے بازو کے زخم کو گیلا ہونے سے بچائے۔ میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا ”تمہارا زخم تو پانی سے بچا ہوا ہے نا؟“

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”میں نے کوشش تو پوری کی ہے سائیں لیکن قمیص اتارتے ہوئے مجھے سخت تکلیف ہوئی ہے۔ قمیص کا کپڑا زخم کے ساتھ چپک گیا تھا۔“

”زخم سے خون تو نہیں نکلا؟“ میں نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

”نہیں سائیں! میں نے بہت احتیاط سے قمیص کا کپڑا الگ کیا ہے۔“

میں نے کہا ”بہرحال‘ تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ اگرچہ تمہارا زخم سنگین نہیں لیکن پھر بھی انفیکشن کا ڈر موجود ہے۔ اس امکان کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ میں قاضی سلطان کے آدمی سے بات کرتا ہوں۔“

”وجدان!“ ساحل بوجھل آواز میں بولی ”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے کوئی نشہ آور شے کھالی ہو۔ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جا رہی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو ساحل۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا ”کم و بیش میرا بھی یہی حال ہے۔ شدید تھکن اور بے آرامی کے بعد اگر گنگنے پانی سے باتھ لیا جائے تو جسم کے تمام مسل ریلیکس ہو جاتے ہیں جن میں دماغ کے مسل بھی شامل ہیں۔ ہماری کیفیات میں تو نیند اور بھوک بھی شامل ہے۔ کھانا کھالینے کے بعد تو نیند سے ہمارا برا حال ہو جائے گا۔“

”وجدان سائیں بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میر بخش نے کہا ”جیسے ہی ہمارے خالی معدوں میں خوراک اترے گی‘ ہم پہلی فرصت میں سونے کی کوشش کریں گے۔“

ایک فوری خیال کے تحت میں نے میر بخش سے پوچھا ”تم نے وہ پچاس ہزار روپے والی نوٹوں کی گڈی پجارو کے ڈیش بورڈ سے نکالی تھی یا...؟“

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میر بخش نے کہا ”سائیں! پجارو میں سے میں نے کوئی بھی شے باہر نہیں نکالی۔ نہ اسلحہ اور نہ ہی رقم کی گڈی۔ سب کچھ وہیں ہے۔“

میں نے استفسار آمیز نظر سے ساحل کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی ”ریوالور وغیرہ بھی وہیں پجارو ہی میں ہیں۔ میں خالی ہاتھ باہر آئی تھی۔“

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”چلو‘ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت ہم دوستوں میں ہیں۔ ہمیں یا ہماری کسی چیز کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔“

میں نے بات ختم ہی کی تھی کہ وہی ملازم ایک مرتبہ پھر

دھمکا۔ اس مرتبہ وہ ایک ہلکی دستک کے بعد کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی اطلاع دی۔

”سائیں! آپ لوگوں کے لیے کھانا لگادیا گیا ہے۔“

میں نے بے اختیار پوچھا ”کھانا کہاں لگایا گیا ہے؟“

”کھانے کے کمرے میں۔“ ملازم نے بتایا۔

ازاں بعد مجھے معلوم ہوا کہ قاضی سلطان کا مہمان خانہ ایک مکمل گھر تھا۔ ڈرائنگ روم‘ ڈائننگ روم اور بیڈ رومز کے علاوہ وہاں ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا تاکہ فوری طور پر اگر کسی چیز کو گرم کرنا ہو تو حویلی کے اندرونی حصے میں نہ جانا پڑے۔ وہ کچن ملٹی پرپز تھا۔

ملازم کی معیت میں ڈائننگ روم کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس سے کہا ”میرا یہ ساتھی میر بخش زخمی ہے۔ اس کے کندھے پر گولی لگی ہے۔ تم ہمیں کھانے کے کمرے میں پہنچا کر فوراً اپنے قاضی سائیں سے کہو کہ میرے ساتھی کی باقاعدہ مرہم پٹی کے لیے کسی ڈاکٹر یا حکیم وغیرہ کو ہمارے پاس بھیجے۔“

”جو حکم سائیں!“ ملازم نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

دونوں ہاتھ جوڑ کر بات کرنے کا انداز اس خطے کی روایت ہے چنانچہ میں ہر کسی کو ٹوکنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ ہر علاقے کی اپنی مخصوص رسوم و روایات ہوتی ہیں جو باہر سے آنے والوں کو عجیب سی لگتی ہیں مگر مقامی لوگ اس کے عادی ہوتے ہیں اس لیے اعتراض برائے اعتراض سے کشیدگی نہیں پیدا کرنا چاہیے۔ البتہ میر بخش اب چونکہ میرے ساتھیوں میں شامل تھا اس لیے میں نے اسے سختی سے منع کردیا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس عادت کو بھولنے کی کوشش کرے گا۔

قاضی سلطان کے مہمان خانے کا ڈائننگ روم جدیدیت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک جہازی سائز ڈائننگ ٹیبل لگی تھی جس کے چاروں طرف ڈائننگ چیئرز بھی نظر آرہی تھیں۔ اس نیم بیضوی ٹیبل پر بیک وقت تیس افراد بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ میز کے اوپر ہمارے لیے کھانا چن دیا گیا تھا۔

ملازم ہمیں ڈائننگ روم میں پہنچانے کے بعد بولا ”سائیں! آپ لوگ آرام سے کھانا کھاؤ۔ میں دروازے کے پاس باہر موجود ہوں۔ اگر کسی شے کی مزید ضرورت ہو تو آپ مجھے حکم کردینا۔“

”ٹھیک ہے‘ ٹھیک ہے۔“ میر بخش نے سندھی میں ملازم سے کہا ”ہم تمہیں بتادیں گے۔“

ہم تینوں ڈرائنگ ٹیبل کے قریب پہنچ گئے۔ ساحل نے اور میں نے کرسی کھینچی تو میر بخش فوراً ہماری مدد کو لپکا۔ اس کا انداز خادمانہ تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”یہ کیا کر رہے ہو میر بخش؟“

”سائیں! آپ دونوں آرام سے بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔“

”کیا مطلب!“ میں نے چونک کر کہا ”صرف ہم دونوں ہی کیوں۔ کیا تم کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

ساحل بھی حیرت بھری نظر سے میر بخش کو دیکھنے لگی۔

وہ سادہ سے لہجے میں بولا ”سائیں! میں بھی کھاؤں گا مگر آپ لوگوں کے بعد۔“

”بعد میں کیوں بھئی؟“

”سائیں! اچھا نہیں لگتا۔“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔

میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا ”کیا اچھا نہیں لگتا؟“

”سائیں! آپ مالک ہو...“

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس وقت مجھے میر بخش کی آنکھوں میں اپنے لیے بے پناہ عقیدت جھلکتی نظر آئی۔ میں اس کے مسئلے کو سمجھ گیا۔ وہ مجھے اپنا آقا سمجھ رہا تھا اور میرے ساتھ بیٹھ کر کھانے کو شاید وہ کوئی گستاخی تصور کرتا تھا اسی لیے ہچکچاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا ”میر بخش! بہتر یہ ہے کہ تم ابھی سے اپنا راستہ الگ کرلو۔“

”سائیں! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ!“ اس کا چہرہ فکرمندی کا اشتہار بن گیا ”مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہوگئی سائیں؟“

میں نے سنجیدگی سے کہا ”میر بخش! تم ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہو رہے ہو۔“

”سائیں! اللہ سائیں کے واسطے‘ مجھے میری خطا بتا دیں۔“ وہ گڑگڑانے والے لہجے میں بولا ”مجھے یاد نہیں آرہا کہ مجھ سے کون سی کوتاہی ہوئی ہے!“

میں چند لمحات تک خاموش نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں کہا ”میر بخش! میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا اور اب بھی تم پر واضح کر رہا ہوں۔ اگر تم نے میرے ساتھ رہنا ہے تو تمہیں اپنی چاکرانہ ذہنیت کو بدلنا ہوگا۔ میں کوئی آقا ہوں اور نہ ہی تم میرے غلام۔ ہم صرف ساتھی ہیں‘ دوست ہیں۔ تمہاری اس قسم کی ملازمانہ حرکتیں مجھے پسند نہیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا

چاہیے۔ نوکر باہر کھڑا ہے۔ اب تم وڈیرا اکبر سومرو کی ملازمت میں نہیں ہو بلکہ میرے ساتھیوں میں شامل ہو چکے ہو۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔"

"سائیں! میں جو کچھ بھی کرتا ہوں' آپ کی عقیدت میں کرتا ہوں۔" وہ جذباتی ہو گیا۔

میں نے کہا "عقیدت کو دل میں دبا کر رکھنا چاہیے۔ اس کا اظہار کسی آزمائشی مرحلے پر کرنا چاہیے۔ دوستوں میں جتنی زیادہ بے تکلفی ہو' محبت اتنی ہی بڑھتی ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے... تکلف علامت ہے بے گانگی کی' نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ۔"

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا "معافی سائیں! آیندہ آپ کو اس سلسلے میں' میں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"وجدان!" ساحل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "بس بہت ہو گئی۔ اب کھانے پر ٹوٹ پڑو۔ میرے پیٹ میں تو چوہے ریس لگا رہے ہیں۔"

اس موقع پر مجھے اپنی ایک آنجہانی ساتھی یاد آ گئی۔ ڈاکٹر جانکی دیوی سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی اور بھوک کی کیفیت میں وہ اسی قسم کی بے تابی کا مظاہرہ کیا کرتی تھی جیسا ساحل نے کیا تھا۔

جانکی کے خیال نے مجھے افسردہ کر دیا۔ اس لڑکی نے میری خاطر بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں' اپنا بہت کچھ قربان کیا تھا اور بالآخر ایک معرکے میں اپنی جان بھی قربان کر دی تھی۔ میری زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں جانکی دیوی خاصے نمایاں مقام پر رہی تھی۔

ساحل کا اشتہا انگیز جملہ مکمل ہوتے ہی ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ڈائننگ ٹیبل پر انواع و اقسام کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ وہ کسی غریب شخص کا دسترخوان نہیں تھا کہ اچانک آجانے والے مہمانوں کی وجہ سے گھر میں افراتفری مچ جاتی اور پر تکلف کھانا دسترخوان تک پہنچنے میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قاضی سلطان اس علاقے کا ایک دولت مند اور بااثر شخص تھا۔ اس کے گھر کے مہمان خانے کو دیکھ کر میں نے اس کی حیثیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ لہٰذا ڈائننگ ٹیبل پر نصف درجن ڈشوں کی موجودگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

وہ مقامی کھانے تھے۔ ان میں سے بیشتر ڈشوں سے میں ناواقف تھا۔ میر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ کھانے میں سندھی بریانی' شامی کباب' جھینگے کا سالن' چکن قورمہ' چپاتی' خوبانی کا میٹھا اور کسٹرڈ وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی ڈش میں مٹر پلاؤ بھی موجود تھا۔

میں یہ بات جانتا تھا کہ انڈو پاک کے لوگ بہت چٹورے ہوتے ہیں۔ وہ کھانے کی اشیا میں بہت تیز مرچ مسالے استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں تو میں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا تھا اور ایک آدھ مرتبہ تجربہ بھی۔ میں نارمل کھانا کھانے کا عادی ہوں۔ نہ ہی روکھا پھیکا اور نہ ہی بالکل دھواں دھار ہندوستان میں زیادہ تر فاسٹ فوڈ یا کین تکی پر گزارہ ہوتا تھا یا پھر میں "انتہائی محفوظ" گھریلو کھانے کا انتخاب کرتا تھا۔

میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے میر بخش سے استفسار کیا "ان میں سب سے زیادہ محفوظ ڈش کون سی ہے؟"

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور بولا "سائیں! یہ سب ہی محفوظ کھانے ہیں۔ قاضی سلطان سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر کھائیں۔"

یہ بات یقینی تھی کہ وہ میری بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ ساحل بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس نے میر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے میرے سوال کی وضاحت کر دی۔

"اچھا اچھا' آپ یہ پوچھ رہے تھے۔" وہ نادم سا ہو کر بولا "وجدان سائیں! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ مٹر پلاؤ اور میٹھے پر ہی گزارہ کریں۔ ہلکے پھلکے اسپائسی کا موڈ ہو تو شامی کباب چکھ لیں۔"

ساحل کے لیے میری بہ نسبت کھانے کا مسئلہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ نیپال چونکہ ہندوستان سے بہت قریب ہے اس لیے وہاں بھی ایک حد تک مرچ مسالے کا استعمال ہوتا ہے۔ میں نے اس روز مٹر پلاؤ اور خوبانی کے میٹھے پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ فروٹ کسٹرڈ بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ملازم نے مودبانہ انداز میں دریافت کیا "سائیں! آپ لوگ چائے یہیں پیو گے یا کمرے میں؟"

ساحل نے دوٹوک انداز میں فیصلہ سنا دیا "میں تو چائے یا کافی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔ اس وقت تو میری شدید خواہش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگا لوں۔ میرے پپوٹے ایک ایک من کے ہو چکے ہیں۔"

"سائیں! میں بھی تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔" میر بخش نے دبی زبان میں کہا۔

میر بخش کے آرام کی بات سن کر مجھے اس کا زخمی کندھا یاد آ گیا۔ میں نے ملازم سے پوچھا "میں نے تم سے ایک

ضروری کام بولا تھا؟"

"وہ ڈاکٹر والا کام سائیں۔" وہ تصدیقی انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا "میں نے قاضی سائیں تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔"

"قاضی سائیں نے کیا کہا ہے؟"

"انھوں نے کہا ہے' ڈاکٹر کا فوراً بندوبست ہو جائے گا۔" ملازم نے بتایا "آپ کھانے سے فارغ ہو جائیں تو ڈاکٹر کو آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ میں ابھی جا کر ان کو بتاتا ہوں کہ آپ لوگوں نے کھانا کھا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا "ہم بیڈ روم میں چلتے ہیں۔ تم قاضی سائیں سے کہو کہ ڈاکٹر کو بھیج دیں۔"

"سائیں! آپ لوگ چائے کمرے میں پیو گے نا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے کہا "چائے صرف میں ہی پیوں گا۔" اس کے ساتھ ہی میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا کیونکہ اس نے واضح طور پر انکار نہیں کیا تھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا اور اس نے چائے پینے سے صاف انکار کر دیا۔

اس ملازم کا نام فقیر علی معلوم ہوا۔ مہمان خانے والے حصے میں اس کے علاوہ بھی کئی ملازم کام کرتے تھے۔ فقیر علی ہمیں کمرے میں پہنچا کر جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

"فقیر علی! قاضی سائیں سے کہنا' میں فوراً ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ "جی سائیں" کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں اب زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ممتاز اپنے ...الدین کے پاس پہنچ گئی تھی۔ قاضی سلطان اپنے دیرینہ دشمن اکبر سومرو سے جو بھی سلوک کرتا' مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں تو پہلی فرصت میں سندھ کے ریگ زار سے جان چھڑا کر کراچی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ آیندہ کے لیے پلاننگ کر سکوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ کراچی پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر ہے۔ میں وہاں آرام و سکون سے کچھ عرصہ قیام کر سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر نے ہمارے کمرے میں آ کر میر بخش کے زخمی بازو کا معائنہ کیا۔ تارا کے پسٹل سے نکلنے والی اعشاریہ تین آٹھ کیلی بر کی گولی نے میر بخش کو سنگین نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ گولی میر بخش کے دائیں کندھے کو چھیلتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے ہنگامی طبی امداد کے طور پر ساحل کا اسکارف اس کے گھائل بازو پر باندھ دیا تھا جو شادی پلی کے پولیس والوں نے اتار دیا۔ اس وقت تک خون کا رساؤ بند ہو چکا تھا ورنہ بہت مصیبت ہو جاتی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد میر بخش کے زخمی بازو پر بڑے ماہرانہ انداز میں پٹی باندھ دی۔ اس سے پہلے اس نے زخم کو صاف کر کے ایک اینٹی سیپٹک' ہیلر آئنٹ منٹ بھی لگا دی تھی۔ مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے میر بخش کو ایک انجیکشن دیا اور ایک خوراک دوا کی دیتے ہوئے بولا۔

"سائیں! اس پڑیا کو ابھی پانی سے نگل لو۔ زخم تشویشناک نہیں۔ بس ایک ہی خوراک کافی ہو گی۔ ویسے میں نے احتیاطاً انجیکشن بھی لگا دیا ہے۔ دو دن کے بعد پٹی تبدیل کروا لینا۔"

میں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا۔ ملازم فقیر علی نے ڈاکٹر کا ایمرجنسی میڈیکل باکس اٹھا لیا پھر جب وہ وہاں سے جانے لگے تو میرے پوچھنے سے پہلے ہی فقیر علی نے کہا۔

"سائیں! میں نے آپ کا دوسرا پیغام بھی قاضی سائیں تک پہنچا دیا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو بلائیں گے۔"

ان کے جانے کے بعد میں ڈریسنگ نما ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تاکہ میر بخش کو پانی سے وہ دوا کھلا سکوں۔ میں ٹیبل پر رکھے ہوئے جگ سے پانی لینے آیا تھا۔ ڈاکٹر کی دی ہوئی پڑیا میں صرف دو گولیاں تھیں۔ میں نے فوراً پہچان لیا۔ ان میں ایک پین کلر اور دوسری کوئی سپلیمنٹ ٹیبلٹ تھی۔ میں نے وہ دوا میر بخش کو کھلا دی۔

وہی ملازم ایک مرتبہ پھر ہمارے کمرے میں آیا۔ اس مرتبہ اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس ٹرے میں چائے کا تھرماس اور تین پیالیوں کے علاوہ کچھ بسکٹ اور اسنیکس بھی نظر آ رہے تھے۔ چائے کا ارادہ صرف میں نے ظاہر کیا تھا مگر ہم تینوں کے لیے بھیجی گئی تھی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "پھر کیا پروگرام ہے۔ ایک پیالی ہو جائے؟"

"نہیں وجدان۔" وہ نفی میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "میں ایک آدھ گھنٹا سونا چاہتی ہوں۔ اس دوران میں تم قاضی سلطان سے ملاقات کر لو پھر آیندہ کا پروگرام بنائیں گے۔ میں اس ریگستان سے بہت دہشت محسوس کر رہی

ہوں۔"

"ٹھیک ہے، تم آرام اور بے فکری سے سوجاؤ۔" میں نے کہا۔

میر بخش بھی چائے سے انکار کرچکا تھا۔ مرہم پٹی کرانے اور دوا کھانے کے بعد وہ آنکھیں بند کرکے نیم دراز ہوگیا تھا۔ میں اور میر بخش اس وقت صوفے پر بیٹھے تھے۔ میں نے اس کا صحت مند کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم دوسرے بیڈ پر آرام سے لیٹ جاؤ۔"

اس نے آنکھیں کھول کر میری جانب دیکھا اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "سائیں! اور آپ۔۔۔"

"میں چائے پینے کے بعد قاضی سلطان سے ملنے جاؤں گا۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "اس دوران میں تم دونوں تھوڑا آرام کرلو۔ پتا نہیں، آنے والے صبح و شام ہمارے لیے کیا لے کر آتے ہیں!"

میر بخش نے متذبذب نظر سے بیڈ پر لیٹی ساحل کی جانب دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے۔ وہ ایک بیڈ روم میں ساحل کے ساتھ تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں دل ہی دل میں میر بخش کی سادگی آمیز معصومیت اور شرافت پر مسکرا اٹھا۔

میں نے کہا "میر بخش! میں تمہارا مسئلہ سمجھ رہا ہوں۔ خیر، میں کوئی اور بندوبست کرواتا ہوں۔"

"بہت مہربانی سائیں۔" وہ ممنونیت آمیز انداز میں بولا۔

مشرق بہت عجیب و غریب دنیا ہے اور خاص طور پر "انڈوپاک"۔ یہاں کی عورتیں اور مرد اپنی ایک مخصوص سوچ رکھتے ہیں۔ وہ مثبت ہوں یا منفی، ان کا انداز جداگانہ ہے۔ یہاں کی روایات، رسوم و رواج اور طرزِ فکر دنیا کے کسی اور خطے سے نہیں ملتا۔

میں یہی سوچتے ہوئے چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔ ملازم جب چائے کے برتن اٹھانے کے لیے آیا تو میں نے اس سے کہہ کر میر بخش کے لیے مہمان خانے کا دوسرا بیڈ روم کھلوا دیا۔ ویسے بھی اس بیڈ روم میں صرف دو بیڈ بچھے تھے یعنی وہ کمرا دو افراد کے قیام کے لیے تھا۔ میر بخش مطمئن ہوکر ملازم کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے سوچا، جب تک قاضی سلطان کا بلاوا آتا، میں بھی ذرا کمر سیدھی کرلوں۔ میں صوفے سے اٹھا اور بیڈ کی جانب قدم بڑھائے تو واش روم کے سامنے سے گزرنا پڑا۔ واش روم کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ غیرارادی طور پر میری نگاہ واش روم کے اندر چلی گئی۔ سامنے وہ دیوار تھی جس پر کپڑے ٹانگنے والی کھونٹیاں نصب تھیں اور ان کھونٹیوں کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

تھوڑی دیر پہلے ہم نے نہانے کے بعد لباس تبدیل کیے تھے اور ہمارے میلے لباس انہی کھونٹیوں پر ٹنگے تھے مگر اب مجھے وہاں ایک بھی کپڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فقیر علی وہاں آن موجود ہوا۔ اس نے مجھ پر نظر پڑتے ہی کہا "سائیں! آپ کو قاضی سائیں نے بلایا ہے۔"

میں نے اثبات میں سرہلا دیا اور فقیر علی سے پوچھا "ادھر باتھ روم میں ہمارے میلے کپڑے ٹنگے تھے۔ وہ نظر نہیں آ رہے۔ کیا کسی نے وہ کپڑے وہاں سے ہٹا دیے ہیں؟"

"جی سائیں! آپ کے کپڑے دھونے کے لیے وہاں سے اتارے گئے ہیں۔" فقیر علی نے جواب دیا "ایک گھنٹے کے اندر آپ لوگوں کے کپڑے صاف ستھرے استری شدہ مل جائیں گے۔"

"صرف ایک گھنٹے میں؟" میں نے حیرت سے دہرایا "کیا اس حویلی میں کوئی کوئیک سسٹم لانڈری بھی موجود ہے؟"

وہ پتا نہیں، کس حد تک میری بات کو سمجھ سکا! اس نے بتایا "سائیں! قاضی سائیں کی حویلی میں ایک بہت بڑی واشنگ مشین ہے۔ وہ صرف کپڑے دھوتی ہی نہیں بلکہ انہیں سکھاتی بھی ہے اور اگر چاہیں تو اس میں استری کا بندوبست بھی موجود ہے۔"

میں سمجھ گیا، قاضی سلطان کی حویلی میں تھری سسٹم واشنگ مشین موجود تھی۔ میں فقیر علی کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت تک ساحل نیند کی وادی میں اتر چکی تھی۔

کمرے سے باہر آکر میں نے فقیر علی سے پوچھا "اب کس طرف جانا ہے؟"

"حویلی کے اندر سائیں۔" اس نے بتایا۔

"میں نے تو سن رکھا ہے، مہمانوں کو مہمان خانے تک ہی محدود رکھا جاتا ہے۔" میں نے کہا "یہ یہاں کی بہت پرانی روایت ہے۔"

وہ بولا "آپ نے بالکل ٹھیک سن رکھا ہے سائیں مگر جو قاضی سائیں کے خاص مہمان ہوتے ہیں ان کا درجہ رشتے داروں کے برابر ہوتا ہے۔ وہ حویلی کے اندرونی حصوں میں بھی آجا سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے، ہم قاضی سائیں کے خاص مہمان

ہیں؟"

"بالکل سائیں! یہ بات تو حویلی کے سارے ملازموں کو معلوم ہو چکی ہے۔" وہ بڑے احترام بھرے لہجے میں بولا "آپ نے چھوٹی مالکن کو بچا کر قاضی سائیں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ ممتاز نے اپنے باپ کو ہمارے بارے میں کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر بتا دیا تھا جبھی ہماری یہ خاطریں ہو رہی تھیں۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچ گئے جہاں قاضی سلطان سے میری ملاقات ہونا تھی۔

میں اس حویلی کو جس حد تک اندر سے دیکھ سکا اس کے لیے صرف ایک لفظ "شان دار" ہی کافی ہے۔ ملازم مجھے قاضی سلطان کے پاس پہنچا کر واپس چلا گیا۔ قاضی سلطان نے ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے مصافحہ کیا اور مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ دوسرے صوفے پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کمرا اپنی ساخت اور ترتیب کے لحاظ سے سٹنگ روم تھا۔

قاضی سلطان کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی رنگت سانولی تھی جس میں گندم کی جھلک پائی جاتی تھی۔ اس نے کلف دار بے داغ سفید شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس پر نیوی بلیو ویسٹ کوٹ کی موجودی اس کی شخصیت کو مزید نکھار رہی تھی۔ گھنی موٹی مونچھیں اور بولتی ہوئی ذہانت سے معمور آنکھیں اس کی شخصیت کا خاصہ تھیں۔ اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی گونج دار رعب و دبدبہ پایا جاتا تھا۔ قاضی سلطان بلاشبہ متاثر کن پرسنالٹی کا مالک تھا۔

ہمارے درمیان چند رسمی باتیں ہوئیں پھر وہ اصل موضوع کی طرف آگیا۔ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "برخوردار!" اتنا کہہ کر اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ کر پوچھا "کیا تمہیں میرا برخوردار کہنا برا تو نہیں لگا۔ اگر میرا اندازہ درست ہے تو تم بیس بائیس سال سے زیادہ کے نہیں ہو اگرچہ تمہاری صحت اور جوانی تمہیں پچیس کا ظاہر کرتی ہے مگر میری تجربہ کار آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا "سائیں! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں آپ سے عمر میں آدھا بھی نہیں ہوں۔ آپ مجھے برخوردار کہہ سکتے ہیں۔"

"تم صرف برخوردار ہی نہیں بلکہ فرماں بردار بھی ہو۔" اس نے توصیفی انداز میں کہا۔

میں نے زیرِلب مسکرانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولا "وجدان! ممتاز نے مجھے اپنے اور تمہارے احسان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے اغوا کی کہانی میں سن چکا ہوں اور جس طرح تم نے اسے ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا ہے وہ بھی میں جان چکا ہوں۔ ممتاز نے تمہارا کارنامہ تو بتا دیا لیکن وہ تمہارے اور تمہاری ساتھی ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی۔ میر بخش کی حقیقت بھی مجھے معلوم ہو گئی۔ وہ پہلے اکبر سومرو کا چاکر تھا، اب تمہارا وفادار ہے۔"

میں پوری توجہ سے اس کی بات سنتا رہا، جب وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "اور اب آپ ہماری حقیقت جاننا چاہتے ہیں، ہماری اصلیت تک پہنچنا چاہتے ہیں؟"

"تم میری بات کو کوئی غلط رنگ نہ دینا۔" وہ متحمل لہجے میں بولا "میں صرف اس لیے تم دونوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں کہ آئندہ کی کہانی مکمل کرنے کے لیے مجھے اس معلومات کی ضرورت ہے۔ تم دونوں میرے لیے عظیم محسنوں کی حیثیت رکھتے ہو۔ کہیں مجھ سے کوئی ایسی حرکت نہ ہو جائے جس سے تم لوگوں کی پوزیشن خراب ہو۔ آخر مجھے

سگریٹ نوشی چھوڑیے
جینا شروع کیجیے
قیمت 25 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
تمباکو نوشی اور دیگر بری عادات سے چھٹکارا حاصل کیجیے
اس کتاب کو پڑھنے کی خواہش ہی
سگریٹ چھوڑنے کی پہلی کڑی ہے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ پیشگی منی آرڈر، ڈرافٹ یا کراسڈ چیک ارسال کریں
خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
Email: kitabiat1970@yahoo.com

اکبر سومرو سے بھی تو نمٹنا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں خود بھی اس سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا تھا کیوں کہ ہم خود کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرنا چاہتے۔ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ آپ جیسے مناسب سمجھیں حالات کو نیکل کریں۔"

"اسی لیے تو میں تمہارے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے بولنے سے پہلے اپنے دماغ میں خیالات کو مجتمع کر رہا ہوں۔ قاضی سلطان پوری دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگا پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا' اس نے چونکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

"وجدان! تم خواہ مخواہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جانا۔" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتائے بغیر تمہاری پجارو کی تلاشی کروائی ہے اور....."

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا "وہ پجارو آپ کے دیرینہ دشمن کی ملکیت ہے۔ میں نے تو اسے ایک نجات دہندہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔"

"اوہ!" اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور بولا "بہرحال' اس گاڑی کی تلاشی کے دوران ہمیں چند اہم چیزیں ملیں ہیں جن میں پچاس ہزار روپے کی رقم' دو کلاشنکوفیں' ایک ریوالور اور ایک پستول شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک بجھا ہوا موبائل فون بھی ملا ہے۔"

میں نے قاضی سلطان کی بات کے جواب میں کہا "پچاس ہزار روپے کی رقم ہماری ہے۔ باقی اسلحہ وغیرہ اکبر سومرو اور تارا کا ہے۔" میں نے اس سے بات لی تھی۔

اس نے کہا "تمہاری وہ امانت میرے پاس محفوظ ہے۔ جب تم یہاں سے جانے لگو تو میں پچاس ہزار روپے کی گڈی تمہارے حوالے کردوں گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ وہ رقم وڈیرا اکبر سومرو کی تھی۔ کلاشنکوفس میں ایک وڈیرے کے محافظ کی تھی اور دوسری اے ایس آئی عبدالرزاق سے میر بخش نے چھینی تھی جب کہ ریوالور ڈی ایس پی کا تھا اور پسٹل تارا کا۔ میں نے نہ جانے جھوٹ دانستہ بولا تھا۔ اگر بعد میں بات کھل جاتی تو میں کوئی اور جواز پیش کر دیتا۔ اس وقت میں برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ساتھ ہی شائع کیا جا رہا ہے

آتش فشاں
حصہ
8

آتش فشاں

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اُسے آتش فشاں بنادیا۔ اُس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دُشمنوں کو خوب جانتا تھا اور اُنہیں "انصاف" کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن ٹیمپل میں فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اُسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اُس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پائوں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہوگئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا رُوپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور اُنہیں حرفِ غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

ظلم و جبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک سراپا انتقام، چھلنی کلیجا شخص کی لرزہ خیز داستان

قاضی سلطان مختفر نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ میں اپنے بارے میں اسے تفصیلاً بتاؤں۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں! جب تک مجھے یہ پتا نہیں چلے کہ آپ کی بیٹی نے آپ کو ہمارے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے اس وقت تک میں کیا کہہ سکتا ہوں!"

وہ چند لمحے سوچتی ہوئی نظر سے مجھے تکتا رہا پھر گھمبیر آواز میں بولا "ممتاز نے مجھے بتایا کہ ڈاکو منگل سنگھ اسے اغوا کر کے کنری میں اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا۔ یہ بات تو تمہارے علم میں بھی آچکی ہے کہ اس خطرناک ڈاکو نے ممتاز کی واپسی کے لیے مجھ سے پچاس لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا تھا۔ بہرحال، کنری میں پولیس آپریشن کے بعد منگل سنگھ اپنے ایک ساتھی گنڈا سنگھ کے ساتھ ممتاز کو کنری سے عمرکوٹ لے گیا۔ ممتاز نے مجھے بتایا ہے کہ ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اس نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے اغوا کی واردات وڈیرا اکبر سومرو کے ایما پر کی تھی۔ اکبر مجھ سے دشمنی نکالنے کے لیے ڈاکوؤں کو استعمال کر رہا تھا۔"

میں نے چونک کر قاضی سلطان کو دیکھا۔ یہ میرے لیے واقعی حیرت کی بات تھی کہ ممتاز نے اپنے باپ کو اس قسم کی معلومات فراہم کی تھیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ اکبر سومرو نہ صرف ڈاکوؤں اور دیگر مجرموں کو پناہ دیتا ہے بلکہ باقاعدہ ان کی پشت پناہی بھی کرتا ہے۔ اس جیسے بھوتار وڈیرے سے کچھ بھی بعید نہیں۔ خیر، منگل سنگھ نے چند روز بعد عمرکوٹ سے میرپور خاص کی طرف جانا چاہا پولیس کو بروقت پتا چل گیا اور انہوں نے شادی پلی کے سرحدی مقام پر ناکا لگالیا۔ ممتاز نے کہا کہ ڈاکوؤں کو اس ناکے کی خبر ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنا روٹ تبدیل کر کے عمرکوٹ سے "سامارو" کی جانب رخ پھیر لیا۔ وہ سامارو سے آگے ایک کچے راستے سے میرپور خاص میں داخل ہونا چاہتے تھے کہ ریلوے کراسنگ کے قریب ان کی جیپ خراب ہو گئی اور یہیں سے تمہارا کردار شروع ہوتا ہے۔"

وہ ایک لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تم نے نہایت جرات مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ممتاز کو ڈاکوؤں کے قبضے سے نکالا پھر تم اسے اپنی گاڑی یعنی وڈیرے کی پجارو میں اس طرف لا رہے تھے تو وڈیرا تمہارا تعاقب میں لگ گیا۔ سامارو کے نزدیک تم لوگوں میں ایک خوفناک معرکہ ہوا اور تم ان دونوں کو باندھ کر یہاں آئے۔ مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تارا نامی اس بدمعاش سے تمہاری کوئی پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ وڈیرا چوں کہ اس کا

دوست ہے اس لیے وہ تمہارا بھی دشمن بن گیا ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا "مگر یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ تم دونوں کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور تارا سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "قاضی سائیں! آپ ایک جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ آدمی ہیں۔ میرے ساتھ آپ کا رویہ مشفقانہ ہے آپ ایک پرخلوص دوست کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ویسے بھی "دوستی دشمنی" کے بین الاقوامی اصولوں کے تحت ہم دوست ہیں کیوں کہ وڈیرا اکبر سومرو ہم دونوں کا مشترک دشمن ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دوں تاکہ دوستی کے اس رشتے کو مضبوط تر بنایا جا سکے۔ میں سندھ کی سرزمین سے اگر کچھ تلخ احساسات لے کر جا رہا ہوں تو اس کے ساتھ ساتھ میرے پاس یہاں کی شیریں یادوں کا سرمایہ بھی ہونا چاہیے۔"

وہ ستائشی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "ممتاز نے بلاوجہ تمہاری تعریف نہیں کی۔ تم اچھے دکھتے ہی نہیں بلکہ بہت اچھا بولتے بھی ہو۔"

قاضی سلطان کے اس جملے میں غور طلب صرف ایک بات تھی اور وہ یہ کہ ممتاز نے اپنے باپ کے سامنے میری تعریف کی تھی مگر کیوں؟ اس وقت میرا ذہن یہ گتھی سلجھانے سے قاصر تھا۔ ممتاز حد سے بڑھ کر ہماری حمایت پر تلی ہوئی نظر آتی تھی۔ میرے حق میں اس کی وکالت بڑی معنی خیز تھی۔ میں یہی سب سوچ رہا تھا کہ قاضی سلطان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وجدان! میں ایک بارسوخ آدمی ہوں۔ صرف اس علاقے میں نہیں بلکہ خیبر سے کراچی تک میرا اثر رسوخ ہے۔ میں پاکستان میں اور پاکستان سے باہر بھی تمہاری ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔ میری دوستی تمام تلخیوں کو صاف کر دے گی۔"

قاضی سلطان کے لہجے سے سچائی ٹپکتی تھی۔ میں نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تاہم اس سلسلے میں میں نے کچھ ایسی باتوں کو چھپا لیا تھا جو سراسر میری ذاتی تھیں اور ان کے کبھی کھلنے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اپنی صلاحیتیں وغیرہ۔

میری کہانی ختم ہوئی تو قاضی سلطان نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا پھر جذبات سے معمور لہجے میں بولا "آج سے تم میرے ایک سچے دوست کی طرح ہو۔"

اس کے جذبات کی سچائی اور خلوص کی گہرائی کو محسوس کر کے مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے دکھتے ہوئے دل سے سوچا میں نے اتنے سچے، پرخلوص اور ایثار پیشہ شخص سے کیوں دروغ گوئی کی؟ مجھے وہ باتیں بھی بتا دینا چاہیے تھیں جو میں نے دانستہ چھپالی تھیں۔ اگر قاضی سلطان کو پتا چل جاتا کہ میں بے پناہ جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کا مالک ہوں تو کون سی قیامت آجاتی۔ یا اسے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں سونے کا ٹنٹا نمٹانے پاکستان آیا ہوں تو کیا وہ مجھ سے وہ سونا چھین لیتا؟ ہرگز نہیں! وہ ایک صاحب ثروت شخص تھا۔

میں کچھ دیر تک اسی طرح جذباتی انداز میں سوچتا رہا پھر معتدل ہو گیا۔ میں نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ مناسب موقع دیکھ کر رفتہ رفتہ اسے سب کچھ بتا دوں گا۔ فی الحال تو مجھے اس تمام کھٹ راگ سے نکل کر کراچی پہنچنا تھا۔ یہ بات میں نے قاضی سلطان کو بڑے واضح الفاظ میں سمجھا دی تھی۔ اسے میرے کراچی جانے پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔

اس نے کہا "میں تمہیں اس کہانی سے بڑی خوبصورتی سے کٹ کروں گا۔ تم کل صبح چاہو تو کراچی جا سکتے ہو۔ ویسے میں تو یہی چاہوں گا کہ تم چند روز کے لیے میرے پاس رک جاؤ تاکہ ہم ایک دوسرے کو اور اچھی طرح سمجھ لیں۔"

"زندگی رہی تو ہماری بہت جلد ملاقات ہوگی۔" میں نے کہا "فی الحال فوری طور پر میرا کراچی جانا ضروری ہے۔ کچھ اہم کام نمٹانے ہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ خوش دلی سے بولا "میں تمہیں اپنے دوست کا پتا دے دوں گا۔ وہ کراچی کا ایک معروف پبلشر ہے۔ وہاں سے شام کا اخبار نکالتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو، اخبار کے مالک کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ کراچی میں تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔ میرا وہ دوست تمہارا ہر مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کر دے گا۔"

میں نے تشکرانہ انداز میں کہا "آپ نے تو میری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔"

"دوست اور کس لیے ہوتے ہیں۔" وہ فراخ دلی سے بولا "سچی دوستی خوشیوں کو ضرب دیتی ہے اور پریشانیوں کو تقسیم کرتی ہے۔ تم قاضی سلطان کی دوستی کو یاد کرو گے۔"

"آپ تو میرے بزرگ ثابت ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"دوست صرف دوست ہوتا ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "دوستی کی کوئی عمر نہیں ہوتی اس لیے بزرگ یا بچے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا "آپ نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اس صحرائی کہانی سے آپ مجھے بڑی خوبصورتی سے کٹ کر دیں گے۔ وہ کس طرح قاضی صاحب؟"

وہ سنجیدگی سے بولا "میری بات دھیان سے سنو وجدان!" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے کہا "میں اپنے سالے کی مدد سے ممتاز کو تلاش کروا ہی رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی میرے آدمی ممتاز کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایس پی صاحب اپنے محکمے کے توسط سے ڈاکوؤں کے قبضے سے ممتاز کو چھڑانے میں مصروف تھے، انہوں نے شادی پلی کی سرحد پر ان کی گرفتاری کے لیے ناکا بھی لگا رکھا تھا مگر ڈاکوؤں کو بروقت خبر ہو گئی اور انہوں نے اس طرف رخ نہیں کیا۔ ڈاکوؤں کی بدقسمتی شروع ہو گئی تھی۔ وہ شادی پلی کی طرف جاتے تو ڈی ایس پی انہیں پکڑ لیتا۔ انہوں نے روٹ تبدیل کر کے سامارو کے راستے میرپور خاص میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو میرے آدمیوں نے انہیں گھیر لیا۔ ریلوے کراسنگ پر میرے آدمیوں نے ڈاکوؤں کی جیپ پر فائرنگ کی۔ ڈاکوؤں کو بہ مشکل اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ وہ اپنی "زخمی" جیپ کو بھی وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ گئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

قصہ ادھورا چھوڑ کر قاضی سلطان نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا "یہ تو وہ کہانی ہے جو میں نے پھاٹک والے بوڑھے ملازم انور علی کو بچانے کے لیے گھڑی تھی۔ سراسر فرضی کہانی!"

"میں تمہاری تیار کی ہوئی کہانی ہی استعمال کروں گا کیوں کہ تم پلاٹ بہت جان دار بُنتے ہو۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "بس فرق صرف اتنا ہوگا کہ تم کہانی میں سے "کٹ" ہو جاؤ گے۔ تمہاری جگہ میرے آدمی آجائیں گے جو قرب و جوار میں تن دہی سے ممتاز کو تلاش کر رہے تھے۔ تم نے پھاٹک والے کو یہی سمجھایا تھا کہ ایک دوسری پارٹی نے فائرنگ کر کے لڑکی کو ڈاکوؤں کے قبضے سے چھڑا لیا تھا۔ سمجھ لو، وہ دوسری پارٹی میرے آدمی ہی تھے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ قاضی سلطان بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اس کے بعد کے واقعات بالکل ویسے ہی رہیں گے جیسے پیش آئے، بس نہ پہلے کہیں تمہارا ذکر آیا ہے اور نہ بعد میں آئے گا۔ تمہاری تو ہو گئی چھٹی۔ میں نہیں جانتا، وجدان اور ساحل کون ہیں!"

"میں آپ کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" میں نے کہا "مگر کچھ باتیں اب بھی الجھی ہوئی ہیں۔"

اس نے پوچھا "مثلاً کون سی باتیں؟"

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "مثلاً یہ کہ ممتاز کی واپسی آپ کے سالے ایس پی صاحب سے پوشیدہ تو نہیں رہے گی۔ وہ لڑکی کا ماموں ہے اور اس کی بازیابی کے لیے چارہ جوئی میں لگا ہوا ہے۔ کیا آپ اس کے سامنے بھی میرا ذکر گول کر دیں گے۔ ایس پی کے عہدے پر فائز شخص بہت ذہین اور قابل ہوتا ہے بلکہ اسے کائیاں کہنا چاہیے۔ وہ آپ کے اس جھوٹ کو پکڑ لے گا یا نہ بھی پکڑ سکا تو بعد میں یہ بات کھلنے کے امکانات بہرحال موجود ہیں۔ اس طرح آپ کی رشتے داری میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تائیدی انداز میں بولا "لیکن میں واضح کر دوں کہ میں اپنے سالے سے جھوٹ نہیں بول سکتا بلکہ تم سمجھ لو کہ میں نے تمہیں یہاں بلانے سے پہلے ایس پی صاحب سے فون پر تفصیلی بات کر لی ہے۔"

یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "آپ نے ایس پی صاحب کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ میرا مطلب ہے، میری کارکردگی کے بارے میں؟"

"میں نے کہا نا میں اپنے سالے سے جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔"

"پھر انہوں نے کیا کہا؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ آج رات کے کھانے پر ہمارے پاس ہوں گے۔" قاضی سلطان نے بتایا "انہوں نے تمہارے کارنامے کو سراہا ہے اور کہا ہے کہ وہ تم جیسے بہادر شخص سے ملے بغیر تمہیں کہیں جانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں تمہیں ان کی آمد تک اپنے پاس روک کے رکھوں۔"

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟" میں نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

وہ بولا "کیسی گڑبڑ؟"

میں نے کہا "ایس پی صاحب ایک اعلیٰ افسر ہیں۔ وہ مجھے آسانی سے جانے نہیں دیں گے۔ اگر وہ بیانات اور گواہیوں کے چکر میں پڑ گئے تو مجھے کئی روز یہاں رکنا پڑے گا۔ میرے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ میں خواہ مخواہ کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"میں نے انہیں تمہاری بہادری کی کہانی سنائی ہے۔" قاضی سلطان نے کہا "وہ رات کو جب یہاں آئیں گے تو انہیں "کٹ والی کہانی" بھی سنا دوں گا۔ وہ میری بات مانتے ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

تمہیں کسی قسم کی قانونی کارروائی کے پیشِ نظر یہاں نہیں روکا جائے گا۔"

مجھے اطمینان ہوگیا۔ میں نے کہا "اگر آپ اپنے سالے صاحب کو یہ نکتہ سمجھا سکیں تو پھر ٹھیک ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے سوال کیا "قاضی صاحب! کیا آپ ایس پی صاحب کو میری حقیقت بھی بتادیں گے؟"

"اگر تم ایسا نہیں چاہتے تو بالکل نہیں بتاؤں گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "ہماری دوستی کا تقاضا تو یہی ہے کہ تمہارے جذبات کا میں احترام کروں۔ دوستی دراصل دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے کا ہی نام ہے۔"

"میں نے کہا "میں چاہتا ہوں' اس موقع پر ایس پی صاحب کو میرے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے پھر بعد میں بھی ان سے تفصیلی بات کی جاسکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' جیسے تمہاری خوشی۔" وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "یہ بات ابھی اپنی بیٹی سے بھی آپ نہ ہی کہیں تو اچھا ہے۔"

"ہاں' میں سمجھ رہا ہوں۔ ممتاز اپنے ماموں کی بہت لاڈلی ہے۔" وہ بولا "میں اس سلسلے میں احتیاط کروں گا۔"

میں نے قاضی سلطان سے پوچھا "آپ ان دونوں "سورماؤں" کا کیا کریں گے؟" میرا اشارہ اکبر سومرو اور تارا کی طرف تھا۔

وہ بولا "ان میں سے ایک تمہارا دشمن ہے اور ایک میرا دشمن۔ ہم چونکہ دوستی کے رشتے میں بندھ چکے ہیں اس لیے وہ ہمارے مشترکہ دشمن ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں مشترکہ طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔"

"مجھے تو ان دونوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے حتمی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "آپ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کریں' مجھے منظور ہے۔"

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا "ممتاز نے مجھے بتایا ہے کہ منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ نے اکبر سومرو کے اشارے پر اسے اغوا کیا تھا اس حوالے سے وڈیرا اکبر سومرو ڈاکوؤں کا پشت پناہ یا سرغنہ ہوا۔ میں نے ایس پی صاحب کو بتایا ہے کہ جب تم نے ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑا لیا تو ان کے باوا آدم اکبر سومرو نے تمہارا تعاقب کیا۔ اس سے وڈیرے کا جرم اور بھی واضح ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اکبر سومرو اور اس کے ساتھی تارا کو پولیس کے حوالے کردوں گا۔ باقی کے جرائم وہ خود اگلوالیں گے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ممتاز نے اتنے حتمی انداز میں قاضی سلطان کو کیوں بتایا کہ منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ وڈیرا اکبر سومرو کے کارندے تھے۔ میں تو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وڈیرے کے رویّے سے میں ضرور بھانپ لیتا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ممتاز نے دانستہ جھوٹ بولا تھا۔ وڈیرے اکبر سومرو کو پھنسانے اور ہماری پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے مگر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اس سوال کا جواب مجھے کہیں نہیں مل رہا تھا۔ میں نے اکبر سومرو کو ڈرانے کے لیے ایک جھوٹی کہانی اسے سنائی تھی جس کے مطابق ممتاز کے اغوا میں اس کا ہاتھ تھا۔ میں نے اکبر سومرو کو خوف زدہ کرنے اور اسی کی جھوٹی کہانی کے جواب میں وہ قصہ گھڑا تھا۔ حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ایک خیال یہ بھی میرے ذہن میں آرہا تھا کہ کیا ممتاز میری باتوں کو بالکل سچ سمجھی تھی اور اس نے اپنے باپ کو بھی وہی کہانی سنادی تھی۔ ایک اور بات قابلِ غور تھی۔ ممتاز نے قاضی سلطان کو جو کہانی سنائی اس میں ٹویوٹا ہائی لکس کے الٹنے اور اسے دوبارہ سیدھا کرنے کا ذکر نہیں تھا۔ وہ میرے اس کارنامے کو اپنے باپ سے چھپا رہی تھی؟ میں جیسے جیسے سوچ رہا تھا' الجھتا جا رہا تھا۔ مدھوری ڈکشٹ سے مشابہ وہ لڑکی بڑی گہری ثابت ہو رہی تھی!

"کس سوچ میں پڑ گئے وجدان!" قاضی سلطان کی آواز نے مجھے چونکا دیا "کیا میرا پروگرام تمہیں پسند نہیں آیا؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کا پروگرام فل اینڈ فائنل ہے۔ اس میں مجھے کوئی خرابی نظر نہیں آرہی لیکن....."

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ قاضی سلطان نے پوچھا "لیکن کیا وجدان؟"

میں نے کہا "میں نے وڈیرا اکبر سومرو کی زبان کھلوانے کے لیے اسے ممتاز کے حوالے سے ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی۔ میں نے منگل سنگھ کو اس کا چیلا گردانتے ہوئے اس پر الزام لگایا تھا کہ ممتاز کو اس کے اشارے پر اغوا کیا گیا تھا۔ کیا آپ کی بیٹی میری انہی باتوں کی بنا پر اکبر سومرو کو قصوروار ٹھہرا رہی ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "ہمیں اس الجھن میں نہیں پڑنا چاہیے کہ ممتاز کے اغوا میں اکبر سومرو کا ہاتھ ہے یا نہیں۔ اس وقت وہ ہمارے قبضے میں ہے اور حالات سراسر اس کی مخالفت میں جا رہے ہیں۔ ممتاز نے مجھے پجارو میں تمہاری اکبر سومرو سے ہونے والی گفتگو کے بارے

میں تفصیلاً بتایا ہے۔ وہ تمہیں آٹھ دس افراد کے قتل میں ملوث کرنا چاہتا تھا' جواباً تم نے ممتاز کے اغوا کا سارا ملبا اس پر ڈال دیا۔ اب جو بھی ہو' ہماری اس فائنل کہانی کے مطابق اصل مجرم وڈیرا اکبر سومرو ہی ہے البتہ اس کے کارندے منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔"

میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ ممتاز کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں نے دونوں ڈاکوؤں کو از خود جانے دیا تھا' وہ فرار نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات صرف میری ساتھی ساحل اور میر بخش کو معلوم تھی اور وہ دونوں بھروسے کے آدمی تھے۔

میں نے کہا "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اکبر سومرو نے ممتاز کو اغوا کروایا تھا یا نہیں۔ اس نے ممتاز جیسی درجنوں لڑکیوں کو اغوا کروایا ہوگا' لاتعداد لڑکیوں اور عورتوں کی عزتوں کو برباد کیا ہے اس نے۔ وہ ایک بھوتار وڈیرا ہے۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ کسی نہ کسی مظلوم کی آہ تو اثر دکھائے گی' کسی نہ کسی بے گناہ مقتول کا خون تو رنگ لائے گا۔ وہ چھری تلے آہی گیا ہے تو اسے پوری طرح "فٹ" کردینا چاہیے۔"

"تم فکر نہ کرو وجدان۔" قاضی سلطان نے گہری سنجیدگی سے بولا "میں اس کا بڑا مناسب "بندوبست" کرنے والا ہوں۔"

میں نے کہا "قاضی صاحب! ایک بات ذہن میں رہے۔ ہم جس گاڑی میں یہاں پہنچے ہیں وہ پجارو وڈیرے کی ہے جب کہ ہماری فائنل کہانی کے مطابق آپ کے آدمی اپنی گاڑی میں دونوں مجرموں کو ڈال کر آپ کے پاس لائے ہیں۔ وڈیرے کے ساتھ ساتھ اس کی "زخم خوردہ" پجارو کا بھی کوئی معقول بندوبست ہونا چاہیے۔"

"ہو جائے گا۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا "ڈاکوؤں کی ٹویوٹا فور وھیل ڈرائیو ریلوے کراسنگ پر کھڑی ہے۔ وڈیرا اکبر سومرو نے جس ٹویوٹا ہائی لکس میں میرے آدمیوں کا تعاقب کیا وہ سامارو کے نزدیک صحرا میں موجود ہے۔ میرے وفادار آدمی اپنی جیپ میں ممتاز اور ان دونوں مجرموں کو بٹھا کر حویلی تک لائے ہیں۔ پجارو بالکل آؤٹ ٹھیک ہے' گاڑی اب کسی کو حویلی کے اندر یا باہر نظر نہیں آئے گی۔ تم اس سلسلے میں مطمئن ہو جاؤ۔"

میں واقعی مطمئن ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد قاضی سلطان سے رخصت لے کر مہمان خانے کی طرف آگیا۔ اس وقت شام ہو چلی تھی۔ میں نے

ڈاکٹر جی ایم ناز کی
شہرۂ آفاق کتاب

ازدواجی نفسیات

قیمت 40 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے

❖ زندگی کے ساتھی کا آئیڈیل
❖ منگنی اور آئیڈیل
❖ ازدواجی ہم آہنگی
❖ ازدواجی زندگی کا جنسی پہلو

کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ
منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال روانہ کریں

خط و کتابت کا پتہ

kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

اپنے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میر بخش کے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمرا ہمارے کمرے کے برابر ہی تھا۔ میر بخش بیڈ پر دراز تھا۔ اس نے ایک بازو اپنی آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ سو رہا ہو گا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

ساحل بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ میرے اندر داخل ہونے پر اس نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا جب میں اس کے بیڈ کے قریب پہنچا تو میں نے اس کی گہری گہری سانسوں کی آواز سنی۔ ہم تینوں گزشتہ پوری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکے تھے۔ نیند تو مجھے بھی آرہی تھی تاہم میں ابھی سونے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ قاضی سلطان نے ایس پی کی متوقع آمد کی اطلاع دے کر مجھے الرٹ کردیا تھا۔ اب میں اس سے ملاقات کے بعد ہی سونے کے بارے میں سوچتا۔

میں ساحل کو سوتا چھوڑ کر واش روم میں گھس گیا اور وہاں نصب کھونٹیوں کو دیکھ کر مجھے چونکنا پڑا۔ قاضی سلطان کے ملازم فقیر علی نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ ساحل کی نارنجی بنارسی ساڑی اور میری پینٹ شرٹ صاف ستھری اور استری شدہ حالت میں ہینگرز پر وہاں ٹنگی نظر آرہی تھی۔ میر بخش کا شلوار قمیص بھی یقینی طور پر اس کے باتھ روم میں پہنچا دیا گیا ہو گا۔

میں واش روم سے فارغ ہونے کے بعد صوفے پر دراز ہو گیا اور خود کو پیش آنے والے حالات پر غور و فکر کرنے لگا۔ قاضی سلطان نے مجھے ایک کاغذ پر اپنے کراچی والے دوست کا پتا لکھ کر دیا تھا۔ اس شخص کا نام منہاس باقر تھا۔ وہ کراچی کے سب سے پوش علاقے کلفٹن میں رہتا تھا۔ ایڈریس والے کاغذ پر اس کے بنگلے اور دفتر کے فون نمبرز بھی درج تھے۔ اسی کاغذ کے ایک کونے میں قاضی سلطان نے اپنا فون نمبر بھی لکھ دیا تھا اور مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میرے یہاں سے رخصت ہوتے ہی وہ منہاس باقر کو میرے بارے میں اطلاع دے دے گا۔

تھوڑی دیر بعد میر بخش میرے پاس آگیا۔ وہ اپنے کندھے کے زخم میں خاصی بہتری محسوس کر رہا تھا۔ میرے نزدیک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا "سائیں! قاضی صاحب کا ڈاکٹر تو کمال کا بندہ ہے۔ درد بالکل غائب ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا بازو زخمی ہوا ہی نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہ اس پین کلر انجیکشن کا کمال ہے۔ ممکن ہے' آٹھ دس گھنٹے بعد تمہیں ہلکا پھلکا درد پھر سے ہونے لگے مگر میں مطمئن ہوں۔ ڈاکٹر نے جس مہارت سے تمہاری مرہم پٹی کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ دو چار دن میں تم بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔ ایک پٹی ہم کراچی پہنچ کر کروا لیں گے۔"

"ہم یہاں سے کب روانہ ہو رہے ہیں؟" میر بخش نے پوچھا۔

"انشاءاللہ کل صبح۔" میں نے بتایا۔

"قاضی سلطان سے آپ کی بات ہو گئی ہے؟"

"صرف بات ہی نہیں ہوئی۔" میں نے کہا "باقاعدہ تفصیلی بات چیت ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم کل صبح کراچی روانہ ہو جائیں۔ وہ یہاں کے حالات کو خود ہی سنبھال لے گا۔"

"آخر کیوں نہیں" میر بخش نے ایک خاص انداز سے کہا "قاضی سائیں کا سالا ایس پی لگا ہوا ہے۔ اس کے لیے کوئی کام مشکل نہیں ہو گا۔ میں نے قاضی سلطان کے بارے میں پہلے بھی بہت کچھ سن رکھا ہے۔ وہ بہت پہنچ والا وڈیرا ہے۔ یہ اچھا ہوا سائیں! آپ سے اس کی دوستی ہو گئی۔ وہ ایس پی سے بات کر کے ہمیں ڈی ایس پی والے چکر سے نکال سکتا ہے۔"

میں نے کہا "ایس پی سے اس کی بات ہو گئی ہے۔ ایس پی آج رات کے کھانے پر یہاں آرہا ہے۔ وہ ہم سے 'خاص طور پر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میری کارکردگی نے اسے خاصا متاثر کیا ہے۔"

میر بخش نے مبہم انداز میں کہا "سائیں! کوئی انعام وغیرہ کا چکر تو نہیں!"

"کیسا انعام؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"سائیں! منگل سنگھ ایک خطرناک ڈاکو ہے۔ حکومت کی جانب سے اس کی گرفتاری پر کوئی انعام تو ضرور مقرر ہو گا نا۔" میر بخش نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

میں اس کی بات کی تہ میں اتر گیا۔ میں نے کہا "میر بخش! اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو ہمیں انعام کیسے مل سکتا ہے۔ ہم نے ڈاکوؤں کو گرفتار کروانے کے بجائے جانے کی اجازت دے دی تھی۔"

"پھر بھی سائیں' ممتاز کی واپسی کے لیے ڈاکوؤں نے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا تھا۔" میر بخش نے کہا "مغویہ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچانے کے سلسلے میں تو ہم نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے نا! ممتاز' ایس پی کی چہیتی بھانجی ہے۔ میں اس حوالے سے بات کر رہا تھا۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "تم کسی بھی حوالے سے کوئی بھی بات کہہ رہے ہو' اس کو بھول جاؤ۔ یاد رکھنے کی صرف یہ بات ہے کہ ہم نے منگل سنگھ اور گنڈا سنگھ کو از خود جانے نہیں دیا بلکہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ ہر جگہ تمہارا یہی بیان ہونا چاہیے' کم از کم جب تک ہم بہ حفاظت کراچی نہیں پہنچ جاتے' اس نکتے کو ذہن نشین رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔"

"سمجھ گیا سائیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "یہ اچھا ہوا' ممتاز اور ریلوے پھاٹک والے انور علی بھی نہیں جانتے کہ ڈاکو فرار ہوئے تھے یا ہم نے انہیں نکلنے کا موقع دیا تھا۔ آپ نے انور علی اور ممتاز کو یہی بتایا تھا کہ وہ دونوں جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔"

"میں نے قاضی سلطان کو بھی یہی کہانی سنائی ہے۔" میں نے کہا "بلکہ ہماری ملاقات سے پہلے ہی ممتاز اپنے باپ کو تمام باتیں بتا چکی ہے۔"

پھر میر بخش کے استفسار آمیز اشتیاق پر میں اسے قاضی سلطان سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل سنانے لگا۔ اس دوران میں ہماری باتوں کی آواز سن کر ساحل کی آنکھ کھل گئی۔ ظاہر ہے' پھر وہ بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گئی۔ میں نے انہیں قاضی سلطان سے ہونے والی بات چیت کا احوال سنانے کے بعد ہر نشیب و فراز سے اچھی طرح آگاہ کردیا۔

ایس پی نے ڈنر پر آنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ نہیں آیا۔ کچھ انتظار کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھا لیا۔ دن کا کھانا خاصی تاخیر سے کھایا گیا تھا اس لیے ڈنر زیادہ رغبت سے نہ کیا گیا۔ ہم ڈرائنگ روم سے واپس اپنے کمروں کی طرف آنے لگے تو ساحل نے کہا۔

"وجدان! تھوڑی دیر تک حویلی کے احاطے میں ٹہلتے ہیں۔"

اس کی تجویز معقول تھی تاہم میر بخش نے کہا کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کرے گا۔ ہم اسے اس کے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر مہمان خانے کے سامنے وسیع و عریض دالان میں چہل قدمی کرنے لگے۔ رات آہستہ آہستہ بھیگنے لگی تھی۔ فضا میں خنکی تھی اور آسمان پر درمیانی تاریخوں کے لگ بھگ پورا چاند طلوع ہو چکا تھا۔ کھلی فضا کا صاف شفاف آسمان تاروں سے بھرا دکھائی دے رہا تھا۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے مجھے تھپکنا شروع کردیا۔ میر بخش اور ساحل تو ایک نیند لے چکے تھے مگر میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہیں لگائی تھی۔ کچھ دیر کی ٹہل قدمی کے بعد میں نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا "ساحل' مجھے تو نیند آرہی ہے۔ آنکھوں میں جلن سی ہو رہی ہے۔"

وہ بولی "یہ مسلسل بے آرامی اور رت جگے کا نتیجہ ہے۔"

"ہاں' اس میں تھکن اور کھانے کا خمار بھی شامل ہو گیا ہے۔" میں نے ایک اور جماہی لی۔

"چلو' کمرے میں چلتے ہیں۔" وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنے ہاتھ کو اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کمرے کی جانب قدم اٹھا دیے۔ ساحل کے ہاتھ کا نازک لمس میرے احساس میں ایک گدگدی سی جگا رہا تھا۔ ہم اپنے کمرے کے نزدیک پہنچے تو قاضی سلطان کا ملازم فقیر علی اچانک اندھیرے سے نمودار ہو کر ہمارے سامنے آگیا۔

اس جگہ اگرچہ اندھیرا نہیں تھا تاہم فقیر علی جس رخ سے ہمارے سامنے آیا' اس طرف گہری تاریکی تھی۔ میں نے فقیر علی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے مودبانہ بلکہ خادمانہ انداز میں کہا۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ

ایک ایسے نوجوان کی داستانِ عبرت
جو حالات کے جال میں پھنس کر جرائم
کی دلدل میں پھنستا چلا گیا

انعام یافتہ مشہور مصنف جبار توقیر کا منفرد انداز تحریر

گمراہ
8 حصے

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

کتابی شکل میں تیار ہے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23
74200

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کے لیے C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کورنگی روڈ کراچی 75500

"سائیں! آپ کو قاضی سائیں نے حویلی میں بلایا ہے۔"

"کیوں، خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "خیریت ہی ہو گی سائیں۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں۔ مالک نے کہا، آپ کو بلا لاؤں میں آپ کے پاس آ گیا۔"

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کمرے میں چلو۔ میں قاضی سلطان کی بات سن کر آتا ہوں۔"

تھوڑے تامل کے بعد وہ کمرے میں چلی گئی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ بھی میرے ساتھ حویلی کے اندر جانا چاہتی تھی مگر سر دست یہ ممکن نہیں تھا اس لیے میں اکیلا ہی فقیر علی کی راہ نمائی میں قاضی سلطان کے پاس پہنچ گیا۔

قاضی سلطان نے مجھے بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے سالے ایس پی کا فون آیا تھا۔ اس نے پہلے تو ڈنر پر نہ پہنچ سکنے کی معذرت کی پھر بتایا کہ کسی محکمہ جاتی مصروفیت کے باعث وہ آج پوری رات مصروف رہے گا اس لیے اب اس سے کل صبح ہی ملاقات ہو سکے گی۔ قاضی سلطان نے مزید بتایا۔

"وجدان! ایس پی صاحب نے تاکید کی ہے کہ ان کے آنے سے پہلے آپ لوگوں کو جانے نہ دیا جائے اس لیے ممکن ہے، تم لوگوں کو رخصت ہوتے ہوئے دوپہر ہو جائے۔"

میری چھٹی حس نے بتایا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ میں نے قاضی سلطان سے اس حوالے سے سوال کیا تو اس نے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "ایس پی صاحب نے اپنی محکمہ جاتی مصروفیت کے بارے میں تو کچھ بتایا ہو گا!"

"نہیں، انہوں نے کسی قسم کی تفصیل نہیں بتائی۔" وہ بولا "بس یہی کہا ہے کہ آج کی رات ان کا عمر کوٹ میں موجود رہنا ضروری ہے۔ اوپر سے احکام آئے ہیں۔" پھر وہ مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا "تم کیوں پریشان ہو رہے ہو وجدان۔ کل صبح اور دوپہر میں کیا فرق ہے۔ تم دوپہر کو بھی یہاں سے نکلے تو بہ آسانی شام سے پہلے کراچی پہنچ جاؤ گے اور ویسے بھی تم نے کون سا پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا ہے۔ میں یہاں سے تمہیں اپنی لینڈ کروزر میں روانہ کروں گا۔ ایک ماہر ڈرائیور اور دو مسلح گارڈز تمہارے ساتھ ہوں گے۔" پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا "قاضی سلطان صرف دوستی کرنا ہی نہیں بلکہ دوستی نبھانا بھی جانتا ہے۔"

"میری یہ خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی شخصیت سے دوستی ہو گئی۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "مجھے امید ہے کہ آپ میرے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے ہیں۔"

"پھر تم پریشان کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے متامل انداز میں کہا "میں ڈی ایس پی کے بارے میں سوچ کر الجھ رہا ہوں۔ ہم نے شادی پلی میں اس کے ساتھ جو "شان دار سلوک" کیا ہے۔ وہ اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارے خلاف کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا ہے۔"

میں نے اپنے اندیشے کا کھل کر اظہار کر دیا۔ قاضی سلطان نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "وہ رشوت خور بدعنوان ڈی ایس پی میرے سالے کے حکم کا غلام ہے۔ میں ایس پی سے کہہ کر اس کی ہر کمینی چال کو اسی پر لوٹا دوں گا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا "پھر میں بھی تو یہاں بیٹھا ہوں۔ کوئی معاملہ مجھ سے باہر تھوڑی ہے۔ تم کمرے میں جا کر آرام سے نیند پوری کرو اور اگر کسی مخصوص شے کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتا دو۔ یہاں تمہیں کوئی بھی کمی محسوس نہیں ہو گی۔"

اس نے "مخصوص شے" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے خاصا زور استعمال کیا تھا۔ میں سمجھ گیا، اس کا اشارہ "ڈرنکس" کی جانب تھا۔ یہ آفر اس نے مجھے اس لیے کی تھی کہ وہ میرا بے تکلف دوست بن چکا تھا مگر میں نے بڑی خوبصورتی سے اس کی پیش کش مسترد کر دیا۔

"قاضی صاحب! اس سلسلے میں تو میں معذرت چاہوں گا۔" میں نے کہا۔

"اس معذرت کی کوئی خاص وجہ؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں نے کبھی اس شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"شاباش!" وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "قاضی صاحب! شاباش کا لفظ ذو معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ میں اسے اپنی تعریف سمجھوں یا آپ کی حیرت... یا پھر...؟"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔

"وجدان! میں نے سچے دل سے تمہاری تعریف کی ہے۔ اگر تم نے ابھی تک اس خانہ خراب کو ہاتھ نہیں لگایا تو تمہارے لیے میرا مشورہ یہ ہو گا کہ آئندہ بھی کبھی اسے ہاتھ

نہ لگانا، اس سے دور رہنے کی کوشش کرنا کیوں کہ یہ کمبخت بہت وفادار ہے، بے انتہا محبت کرنے والی ہے۔ ایک مرتبہ کسی کا ہاتھ تھام لے تو زندگی بھر ساتھ نبھاتی ہے۔ اس سے چاہے جتنی بھی بے وفائی کر لو، یہ جان نہیں چھوڑتی، اس کو ایک بار اختیار کرنے کے بعد چھوڑنا ممکن نہیں۔"

"یا یوں کہہ لیں کہ یہ کمبخت چھوٹتی نہیں؟" میں نے تیکھی نظر سے قاضی سلطان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شدت سے اثبات میں گردن ہلانے لگا "ٹھیک کہہ رہے ہو، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

کچھ دیر بعد میں حویلی کے اندرونی حصے سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

ساحل بستر پر لیٹ چکی تھی تاہم وہ جاگ رہی تھی اور اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ باتوں کے موڈ میں ہے مگر اس وقت میری آنکھیں نیند کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں اور میں فوری طور پر سونے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے کمرے میں آ کر زیرو پاور کا بلب روشن کیا اور ٹیوب لائٹ کا بٹن آف کر دیا پھر بستر کی جانب بڑھتے ہوئے کہا "لگتا ہے، ابھی کا سویا مدت بعد ہی اٹھوں گا۔ تھکن اور نیند سے جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔"

"تم نے صحرا میں مہم جوئی بھی تو بہت کی ہے۔" ساحل نے تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے بستر پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ میرے لائٹ آف کرنے سے ساحل یہ تو سمجھ گئی کہ میں سونے کے موڈ میں ہوں مگر وہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر مجھ سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"وجدان! تم نے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا؟" اس نے پوچھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ہم اس وقت ایک اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان ہیں۔" وہ مدبرانہ انداز میں بولی "ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے اور احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم دروازے کو اندر سے بولٹ ضرور کر لیں۔"

میں نے بہ دستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے کہا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ قاضی سلطان سے میں نے دوستی گانٹھ لی ہے۔ اس وقت ہم اجنبی لوگوں میں نہیں بلکہ ایک دوست کی حویلی کے مہمان خانے میں ہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ سنجیدگی سے بولی "بے شک قاضی سلطان تمہارا دوست بن چکا ہے مگر ابھی دوستی کسی ایک بھی آزمائشی مرحلے سے نہیں گزری۔ ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے ہیں..."

میں نے ساحل سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا "ٹھیک ہے۔ تم آخر دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دو۔"

وہ خاموشی سے اٹھی اور دروازے کو بولٹ کر کے واپس بستر پر آ گئی۔ میں نے کہا "اب تو تمہیں اطمینان ہو گیا ہو گا۔ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں تھوڑی نیند لے لوں؟"

"ضرور... ضرور۔" وہ روا روی میں بول گئی مگر عادت کے مطابق اس نے بات بھی جاری رکھی "وجدان! ہم کس حد تک قاضی سلطان پر بھروسا کر سکتے ہیں؟"

"ان حدود کا تعین صبح اٹھ کر کریں گے۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولی "وجدان! اس وقت ہمیں کہیں ٹھہرنے کا موقع ملا ہوا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم مجھے "چی" کی بیداری کے لیے مخصوص مشق کے بارے میں کچھ بتا دو۔ مجھے تو نیند نہیں آ رہی، سوچ رہی ہوں، کچھ پریکٹس ہی کر لوں گی۔"

"تمہیں نیند اس لیے نہیں آ رہی کہ تم نے تین چار گھنٹے سو لیا ہے۔" میں نے چمک کر کہا "لیکن میں اس وقت نیند کی شدید طلب محسوس کر رہا ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ روٹھنے والے انداز میں بولی "تم سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آ ہی جائے گی۔"

اس کے روٹھنے کی ادا مجھے بھا گئی۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور کہا "منہ کیوں پھلا رہی ہو؟"

"میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا!"

"تم جو بھی کرتی ہو اس سے بے خبری ہی ظاہر کرتی ہو!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا "مگر تمہارا چہرہ چغلی کھا جاتا ہے۔"

وہ اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے بولی "پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟"

"میری باتوں کو سمجھنے کے لیے چہرے کو انگلیوں سے مت ٹٹولو۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "انگلیاں بھی تمہاری ہی ہیں۔ وہ تمہیں کیا بتائیں گی۔"

"پھر کیا کروں؟" وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "آئینے میں جا کر اپنی صورت دیکھو۔ تمہارے چہرے کے تاثرات دل کی کہانی کھول دیں گے!"

"کس کے دل کی؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تمہارے دل کی' اور کس کے دل کی؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

بے اختیار اس کی نظر جھک گئی۔ یہ اس کا عین فطری ردِ عمل تھا۔

میں نے اپنے بستر سے نیچے آتے ہوئے کہا "چی کی باقاعدہ مشق کرنے کے لیے کھلی فضا کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر کوئی ایسا کمرا ہو جس کی کھڑکی شمال کی سمت کھلتی ہو کیوں کہ مشق کے دوران میں ایک مخصوص طریقے سے بریتھنگ کرنا ہوتی ہے جس کے لیے تازہ اور شفاف ہوا زیادہ مفید رہتی ہے۔ اس مشق میں دماغ کے سیلز کو زیادہ سے زیادہ آکسیجن ملنا چاہیے۔"

"یہ بریتھنگ کیا چیز ہے؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا "بریتھنگ (BREATHING) دراصل سانس لینے کا عمل ہے۔ اس میں سانس کھینچنا (INHALE) اور سانس چھوڑنا (EXHALE) دونوں شامل ہیں۔ چی کی مشق کے دوران میں یوگا کی مخصوص تکنیک سے سانس لی جاتی ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور کہا "اور میرے خیال میں یہ کمرا اس مشق کے لیے مناسب ہے اور نہ ہی یہ وقت موزوں۔"

"کمرا تو سمجھ میں آ رہا ہے۔" ساحل نے کہا "مگر وقت موزوں کیوں نہیں' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

اس دوران میں وہ بھی بستر چھوڑ کر نیچے آ گئی تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "بریتھنگ کے لیے سب سے زیادہ مناسب' موثر اور موزوں وقت علی الصباح کا ہے۔ یعنی صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیان کا وقفہ۔ اس دوران میں فضا میں موجود آکسیجن سب سے زیادہ معطر اور صاف شفاف ہوتی ہے۔ لہٰذا فائدہ بھی کئی گناہ زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ ماسٹر ہنگ پائی نے شاؤلن ٹیمپل میں مجھے بتایا تھا کہ فضا میں آکسیجن کا مالیکیول مختلف اوقات میں اپنی طاقت بدلتا رہتا ہے۔ سورج کی موجودی میں یہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ غروبِ آفتاب سے صبح کاذب تک یہ انتہائی کمزور حالت میں رہتا ہے جب کہ صبح کاذب سے صبح صادق کے درمیانی وقفے میں یعنی طلوعِ آفتاب سے چند لمحے پہلے تک یہ اپنی طاقت کے عروج پر ہوتا ہے۔ میں نے کیمسٹری نہیں پڑھی اور نہ ہی میں کوئی سائنس داں ہوں۔ میں اپنے استاد ماسٹر ہنگ پائی کے الفاظ تم تک پہنچا رہا ہوں۔ ویسے یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقفے میں یوگا کی مشقیں کرنے کا ایک اپنا ہی لطف ہے۔ لگتا ہے' کوئی نہایت ہی لطیف قوت قلب و روح کو سرشار کر رہی ہو۔" میں سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس وقت تمہیں اس لیے بھی "چی" کی مشق نہیں کرنا چاہیے کہ کھانا کھائے ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں گزری۔ کھانے کے کم از کم پانچ گھنٹے بعد سانس کی مشق کرنا چاہیے۔"

ساحل خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے پوچھا "وجدان یہ شمال رخ کھڑے ہو کر مشق کرنے کی کیا مصلحت ہے؟"

"یہ پھر کبھی بتاؤں گا۔" میں نے کہا "اس وقت تم صرف مشق کے لیے کھڑے ہونے کا انداز سیکھ لو۔"

پھر میں نے اسے "ہارس پوزیشن" میں کھڑے ہونا سکھایا۔ یہ ایک گھڑسوار کی پوزیشن ہوتی ہے۔ جس طرح گھڑسوار گھوڑے پر بیٹھتا ہے بالکل اسی انداز میں پاؤں پھیلا کر زمین پر کھڑے ہونا ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں پر ایک مخصوص پوزیشن میں رکھا جاتا ہے۔ گھٹنوں میں ہلکا سا خم اور کمر بالکل سیدھی' سینہ باہر کو نکلا ہوا۔

کھڑے ہونے کا یہ انداز اچھی طرح سمجھانے کے بعد میں نے ساحل سے کہا "اب میں سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی جب تھک جاؤ تو سونے کی کوشش کرنا۔"

وہ میرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق پریکٹس کرنے لگی۔

میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا "اور ہاں' ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کمرے میں ہمارے لیے۔ کوئی بھی شے نقصان دہ نہیں ہے۔ خاموشی سے اپنے بستر پر سو جانا۔ شب بہ خیر!"

پھر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ساحل نے کچھ نہیں کہا۔ یقیناً وہ مجھے گھور کر رہ گئی ہو گی۔ میری ہدایت کا مطلب وہ بہ خوبی سمجھ گئی تھی' اور عمر کوٹ کے ہوٹل میں گزاری ہوئی وہ رات اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئی ہو گی جب اس نے ڈر اور رود کی آڑ میں میرا قرب حاصل کیا تھا۔

میں سونے سے پہلے ممتاز کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس لڑکی نے مجھے حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا نام اس کی شخصیت سے لگا کھاتا تھا۔ وہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں خوبصورت لڑکیوں میں ممتاز نظر آنے والی ہستی تھی۔ اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور سامنے والے کو اس کے حسن کی تعریف میں بولنے پر مجبور کرتی تھیں۔ وہ بلاشبہ ایک ذہین اور معاملہ فہم لڑکی تھی۔

ممتاز کی معاملہ فہمی اپنی جگہ لیکن اس نے اپنے بابا کو جو بیان دیا تھا' اس میں سے چند باتیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں مثلاً اس نے قاضی سلطان کو بتایا کہ ڈاکوؤں کی باہمی گفتگو سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اسے اکبر سومرو کے اشارے پر اغوا کر کے اپنے ڈیرے پر لے گئے تھے۔ میں نے پجارو میں وڈیرے کو ڈرانے دھمکانے کے لیے جو جھوٹی کہانی تخلیق کی تھی' وہ ممتاز کے بیان سے مصدقہ ہو جاتی تھی مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وڈیرا اس اغوا میں ملوث نہیں تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ممتاز اس کو پہلی نظر دیکھتے ہی ہمیں بتا دیتی کہ منگل سنگھ وغیرہ نے اسی کے ایما پر اغوا کی واردات کی تھی جب کہ اس وقت ممتاز نے نہایت ہی تحمل سے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ وڈیرے کو اس حوالے سے جانتی ہے کہ وہ اس کے بابا قاضی سلطان کا دیرینہ دشمن ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اکبر سومرو کو دیکھ کر ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ بھی ممتاز کی بہت سی "ادائیں" قابلِ غور اور جواب طلب تھیں۔ میں نے سوچا' صبح ممتاز سے ضرور ملاقات کروں گا تاکہ مجھے میرے سوالوں کے تسلی بخش جواب مل سکیں۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے بدن کو ڈھیلا چھوڑا' دو چار گہری سانسیں لے کر دماغ کو خیالات سے خالی کیا اور بہ آہستگی نیند کی وادی میں اتر گیا۔

رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرا ایک مخصوص مہک میں بسا ہوا تھا۔ مجھے اپنے اوپر کسی بوجھ کا احساس ہوا۔ میں بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ دباؤ کے احساس نے میرے ہاتھوں کو بے اختیار میرے سینے پر پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گردن اٹھا کر اس طرف دیکھا اور میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ ساحل میرے اوپر لدی ہوئی تھی۔

میں نے اسے اپنے اوپر سے اتارنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی تو وہ کسمسائی اور جذبات سے بوجھل آواز میں اس نے صرف اتنا کہا "اوں ہوں۔"

اس کا انداز منع کرنے والا تھا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "یہ کیا کر رہی ہو ساحل!" اس کے ساتھ ہی میں نے اسے ہٹانے کے لیے زور لگایا۔

وہ اسی مخمور آواز میں بولی "میں ساحل نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو؟" غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

"اب پہچاننے سے بھی انکار کرو گے؟" اس کے لہجے میں گہری شکایت تھی۔

میں ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ ملکوتی حسن کی مالک ہمالیہ کی پراسرار شکتی نیلگری کی آواز تھی۔ اب میری سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ اس کمرے میں جو بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی' وہ نیلگری کے دم قدم سے تھی۔ نیند سے اچانک بیدار ہونے کے سبب میں اس کی آواز اور مخصوص مہک کو پہچان نہیں سکا تھا۔

میں نے پوچھا "تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے اسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش بھی جاری رکھی مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہستی ہمالیہ کا وزن لے کر میرے اوپر سوار ہوئی ہو۔ میرے سوال کے جواب میں نیلگری نے کہا۔

"وجدان! میں نے اپنی اصل شکل و صورت میں تم سے آخری ملاقات میں تمہیں بتایا تھا کہ جب بھی کوئی عورت تمہاری تنہائی میں آئے گی تو میں تمہیں اس کے اندر ملوں گی۔ تمہارا قرب حاصل کرنے کے لیے میں یہی راستہ اپنا سکتی ہوں کیوں کہ تم نے اپنا جاپ مکمل نہیں کیا اور...... نہ ہی کبھی کرو گے۔"

میں نے قدرے سختی سے کہا "ساحل تو دوسرے بستر پر تھی۔ تم نے میرے قریب آنے کے لیے اس کا بدن کیوں استعمال کیا؟"

"تمہیں نہیں معلوم کیوں کہ تم اس وقت گہری نیند میں تھے۔" وہ بوجھل آواز میں بولی "تم یہی سمجھتے ہو' ساحل اپنے بستر پر سو رہی تھی لیکن......"

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اپنے ہاتھوں سے میرے چہرے کو ٹٹولنے لگی میرے پورے وجود میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ میں عجیب صورتِ حال سے دوچار تھا۔ جسمانی طور پر وہ سو فیصد ساحل تھی مگر اس کے اندر نیلگری بول رہی تھی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ساحل' نیلگری کی آڑ میں کوئی ڈراما کر رہی ہو۔ میں نیلگری کی آواز' اس کے لب و لہجہ اور اس کے وجود کی مخصوص مہک کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

نیلگری کے ادھورے جملے کے جواب میں' میں نے پوچھا "لیکن کے آگے بھی تو کچھ بولو۔"

وہ اپنی انگلیوں کو باقاعدہ حرکت میں رکھتے ہوئے بولی "ساحل تھوڑی دیر پہلے اپنے بستر سے اٹھ کر تمہارے پہلو میں آ گئی تھی۔ شاید وہ تمہاری پسلیوں کے راستے دل میں گھسنا چاہتی تھی۔"

مجھے ساحل کی اس حرکت پر غصہ تو نہیں آیا تاہم اس کے توسط سے نیلگری میرے ساتھ جو کچھ کر رہی تھی' وہ میرے حواس مختل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے فوری طور پر اس کا کوئی سدِباب نہ کیا تو نیلگری مجھ پر حاوی آجائے گی اور میں..... اس کے سامنے چت نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے حصول کو آسان بنانا مجھے پسند نہیں رہا۔

میں نے نیلگری سے نمٹنے کے لیے جی کی قوت کو آزمانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ وہ خود مجھ سے الگ ہو گئی پھر ہوا میں تیرتے ہوئے وہ جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی دل آویز مسکراہٹ سجی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ میں کیا کرنے والا ہوں!

"وجدان!" اس نے شیرینی سے معمور آواز میں کہا "تم میری اس حرکت کا برا نہ ماننا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

"دل کے ہاتھوں!" میں نے تعجب کا اظہار کیا "نیلگری! تم تو ہمالیہ کی ترائیوں میں بسنے والی ایک عظیم پراسرار قوت ہو۔ یہ دل کے معاملات......؟"

میں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ایک مہان شکتی ہونے کے ساتھ ساتھ میں طبعاً' مزاجاً اور فطرتاً ایک عورت ہوں۔ میرے شریر میں ہر وہ انگ موجود ہے جو کسی عورت میں ہو سکتا ہے۔ جب میرے سینے میں دل ہے تو دل میں جذبات بھی ہوں گے۔ جذبات ہیں تو معاملات بھی ہوں گے۔ میں انہی معاملات کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" اس وقت وہ ایک مکمل عورت نظر آ رہی تھی۔

میں نے نرمی سے پوچھا "مجھ سے تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں تم سے کچھ نہیں چاہتی بلکہ تمہیں چاہتی ہوں؟"

"تمہاری یہ چاہت میری سمجھ سے باہر ہے نیلگری!" میں نے کہا۔

وہ بولی "چاہت سمجھ میں آنے والی شے نہیں۔"

میں خاموشی سے اپنے سامنے بیٹھی ساحل کو دیکھنے لگا جس کے اندر اس وقت نیلگری سمائی ہوئی تھی۔ وہ اچانک بہت افسردہ اور ملول نظر آنے لگی پھر ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔

"وجدان! میری خواہش تھی کہ تم اپنا جاپ مکمل کر کے میرے جسم و جاں کے مالک بن جاتے۔ میں ساری زندگی ایک داسی بن کر تمہارے چرنوں میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر یہ نہیں ہو سکا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں' تم مجھ سے اتنا بھاگتے کیوں ہو؟"

"تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو نیلگری۔" میں نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا "تم سے اس قسم کی قربت سے گریز کی ایک خاص وجہ ہے۔"

وہ شاکی انداز میں بولی "اور وہ وجہ یہ ہے کہ تم نے کبھی مجھے عورت تسلیم نہیں کیا اور اس انداز میں نہیں سوچا۔"

"تم میرے دل کی بات کہہ رہی ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "میں نے ہمیشہ تمہیں ایک مہان شکتی سمجھا ہے' مثبت سوچ رکھنے والی ایک پراسرار قوت۔ میری نظر میں تمہارا مقام بہت بلند ہے۔"

"عورت کا مقام صرف مرد کے دل میں ہوتا ہے!" وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

میں نے قدرے چڑ کر سوال کیا "تم خود کو ایک عورت ثابت کرنے کے لیے اتنی بہ ضد کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ میں بنیادی طور پر ایک عورت ہی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی "میرے سوا کوئی اور عورت تمہاری قربت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جو بھی عورت حدود پھلانگنے کی کوشش کرے گی' پھڑک کر جان دے دے گی۔"

میں نے چونک کر ساحل کے اندر موجود نیلگری کو دیکھا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی کہ مجھے لگا' شاید میری سماعت نے دھوکا کھایا ہے۔ میں نے اضطرابی لہجے میں اس سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو نیلگری۔ ماضی میں بہت سی لڑکیاں میری قربت میں رہی ہیں۔ میری قربت ان کے لیے ہلاکت خیز ثابت نہیں ہوئی؟"

"میں نے حدود پھلانگنے کی بات کی ہے۔" وہ اپنے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ "ایسا موقع تمہاری زندگی میں آج تک نہیں آیا۔ گولڈن ٹرائی اینگل کے سفر کے دوران میں سونیا نامی ایک لڑکی نے یہ خطرناک حدود عبور کرنے کی کوشش کی تھی مگر تم نے اپنی مضبوط قوت ارادی سے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ وہ ایک محفوظ حد تک محدود رہی تھی تاہم تمہیں آج تک اس محدودی کا بھی ملال ہے۔"

میں چشم تصور سے وہ منظر دیکھنے لگا جب گولڈن ٹرائی اینگل کی طرف جاتے ہوئے ایک پہاڑی سلسلے کے چٹانی غار میں سونیا نے مجھے حاصل کرنے کے لیے اپنے جذبات کے سرکش گھوڑے کو بے لگام چھوڑ دیا تھا مگر میں نے اپنے پایۂ استقامت میں جنبش نہیں ہونے دی تھی۔ میں اس منظر کو سوچ کر جھرجھرا جاتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر نیلگری نے کہا "وجدان! تم ابھی تک کورے ہو۔ تمہاری زندگی کی کتاب کا ہر ورق صاف شفاف ہے۔ جو بھی عورت اس پر اپنا نام لکھنے کی کوشش کرے گی۔ اسے جان سے جانا ہو گا۔ وہ گویا اپنے پروانہ موت پر دستخط کرے گی۔"

"کیا اس دشمنی کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہو گا؟" میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا "تم ہر اس عورت کو جان سے مار ڈالو گی جو میری قربت کی حدود کو پھلانگنے کی کوشش کرے گی؟"

"میں نہیں' بلکہ تم اس کی جان لے لو گے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مم..... میں!" میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا "نیلگری! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"تم پوری دنیا کی خبر رکھتے ہو اور خود سے بے خبر ہو!"

"میں سمجھ نہیں پا رہا' تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

وہ گمبھیر آواز میں ٹھہر ٹھہر کر مجھے بتانے لگی "شاؤلن ٹیمپل میں جب تم مارشل آرٹس کی تربیت لے رہے تھے تو ماسٹر ہنگ پائی نے تمہیں اپنی نگرانی میں چند مخصوص مشقیں بھی کروائی تھیں۔ یاد کرو' مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تمہیں مخصوص جڑی بوٹیوں کا رس بھی پلایا گیا تھا۔ انہی بوٹیوں میں ایک ایسی جڑی بھی شامل تھی جس نے تمہیں ہر قسم کے زہر سے محفوظ کر دیا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"تم اس واقعے کو تو نہیں بھولے ہو گے جب گنگولی چوہدری نامی ایک ڈاکو تمہاری ساتھی لڑکی بملا کو اغوا کر کے سارسکا کے جنگلات میں لے گیا تھا۔ تم نے جرات اور بہادری کو کام میں لا کر گنگولی کے قبضے سے بملا کو چھڑا لیا۔ واپسی میں' جنگل ہی میں ایک بلیک کوبرا نے تمہیں ڈس لیا تھا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا مگر وہ کوبرا فوراً مر گیا تھا۔"

نیلگری کی مدھر آواز مجھے تخیلات کی دنیا میں لے گئی۔ ایک ایک منظر کسی فلم کی طرح میری نگاہ کے سامنے روشن ہونے لگا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"وجدان! سارسکا ہی میں تمہاری ساتھی عورت رانی روپ متی کو خون کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ تمہارا اور روپ متی کا بلڈ گروپ ایک ہی ہے۔ تم اس موقع پر روپ متی کو اپنا خون دینا چاہتے تھے مگر تم اس خیال سے باز رہے کیوں کہ تمہارا خون روپ متی کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا۔ راجو نامی ایک غریب شخص نے روپ متی کو اپنا خون دیا

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی
علی یار خان کی سرگزشت
کتابی صورت
مجاہد
(گیارہ حصوں میں)
تیار ہے
قیمت فی حصہ 60 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

تھا۔"

نیلگری پے در پے مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ رہی تھی۔ واقعی اس طرف کبھی میرا دھیان نہیں گیا تھا کہ میں ایک خطرناک آدمی بن چکا ہوں۔ ایسا سوچتے ہوئے میں اپنے وجود میں سنسناہٹ محسوس کرنے لگا۔

نیلگری میرے چہرے کے تاثرات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی "تلکو قبیلے میں شیواگ نامی ایک بدمعاش سے تمہاری ٹھن گئی تھی۔ شیواگ نے تمہاری برتری ماننے کے لیے تمہیں ایک آزمائش سے گزارا تھا۔ کیا تم دوشاخہ زبان والے نیلے کوبرے کا تجربہ بھی بھول گئے۔ یہ تو ابھی تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے؟"

"مجھے یاد ہے' سب کچھ یاد ہے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کہا "مگر کبھی میں نے اس بارے میں غور نہیں کیا تھا۔"

وہ ایک ادائے دل ربائی سے بولی "اسی لیے تو میں تمہیں غور و فکر کا موقع دے رہی ہوں۔ تم سوچو' جب تمہارا خون کسی دوسرے انسان کے جسم میں پہنچ کر اس کی جان لے سکتا ہے اور خطرناک سانپ تمہیں ڈستے ہی ہلاک ہو جاتا ہے تو پھر تمہاری قربت کی نازک حدود کو پھلانگنے والی عورت کا کیا حشر ہوگا؟"

نیلگری کا یہ سوال سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں اس کی بات کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس نے ایک حقیقت بیان کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ابھی تک کسی انسان کی جان لینے کا ذمے دار نہیں ٹھہرا تھا۔ نیلگری کے انکشافات نے میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑا دی تھی۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا "نیلگری! ایک بات تو بتاؤ۔ ہماری پہلی ملاقات کھٹمنڈو کے رتنا پارک میں ہوئی تھی اور میں تمہارے کرسٹل کے مجسمے کو اٹھا کر اپنی ایک دوست نرس مایا متی کے گھر لے گیا تھا۔ اس سے پہلے ہم کہیں نہیں ملے تھے مگر تم تو میری زندگی میں پیش آنے والے اس سے پہلے کے واقعات کو بھی جانتی ہو۔ میں نے تو کبھی تم سے ان واقعات کا ذکر نہیں کیا۔ تمہاری معلومات کا ذریعہ کیا ہے؟"

"مجھے ایک مہان شکتی بھی مانتے ہو اور میرے ذرائع پر بات بھی کرتے ہو۔" وہ شکایتی لہجے میں بولی "میں تو تمہیں وہاں تک جان گئی ہوں جب تم صرف دو ماہ کی عمر کے تھے اور اپنی ماں شگفتہ کا دودھ پیتے ہوئے پاکستان سے سنگاپور پہنچے تھے۔"

میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اور کہا "نیلگری! تم تو بہت خطرناک باتیں کر رہی ہو!"

"جس کو اپنے من میں بسا لیں اس کے بارے میں پوری جانکاری تو رکھنا ہی پڑتی ہے نا!" ساحل کے اندر موجود نیلگری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے اس سے پوچھا "ساحل کو کب آزاد کرو گی؟"

"یہ نام تم نے خوب رکھا ہے' مجھے پسند آیا۔" وہ تبسم ریز آواز میں بولی "اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔۔۔"

میں نے پوچھا "تم رک کیوں گئیں۔ ابھی تمہاری بات تو مکمل نہیں ہوئی۔۔۔"

"کچھ نہیں۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

وہ کوئی نہایت ہی اہم بات کہتے کہتے رک گئی۔ میں سمجھ گیا' اب وہ اس سلسلے میں لب کشائی نہیں کرے گی۔ میں نے کہا "تم نے بتایا نہیں' ساحل کو کب آزاد کر رہی ہو؟"

وہ اضطرابی نظر سے مجھے دیکھنے لگی پھر میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے کہا۔ "وجدان! میں اس وقت تمہارے پاس ایک خاص کام سے آئی ہوں۔ تم نے مجھے باتوں میں لگا لیا۔"

باتوں میں تو اس نے مجھے لگایا تھا تاہم میں نے کوئی جرح کیے بغیر پوچھا "کس کام سے آئی ہو؟"

"تمہیں ابھی اور اسی وقت اس حویلی سے نکلنا ہے۔" اس نے میری سماعت پر دھماکا کیا۔

میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا اور کہا "کیوں نیلگری! کیا یہاں کوئی زلزلہ آنے والا ہے؟"

"زلزلہ نہیں بلکہ قیامت آنے والی ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "یہاں بھی اور ادھر کراچی میں بھی۔"

میں نے کہا "پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو۔ کھل کر بات کرو۔"

"تم نے شادی پلی میں ڈی ایس پی کے بنگلے پر جو کارنامہ انجام دیا ہے' وہ مرتشی توندیلا ڈی ایس پی اس واقعے کو آسانی سے بھولنے والا نہیں۔ وہ تمہاری تلاش میں کسی شکاری کی طرح سرگرداں تھا اور بالآخر اس نے تمہارا سراغ پا لیا ہے" نیلگری نے بتایا "ریلوے کراسنگ پر کھڑی ڈاکوؤں کی جیپ اور ساما رو کے نزدیک پائی جانے والی ہائی لکس نے اس کا کام آسان کر دیا ہے پھر پھاٹک والے انور علی نے بھی اس کی وھونس میں آ کر ڈاکوؤں اور ممتاز والی حقیقت اسے بتا دی ہے۔ ڈی ایس پی اگرچہ مغویہ کے ماموں سے جونیئر ہے مگر وہ ایس پی سے بہت خار کھاتا ہے۔ اس نے اپنے اعلیٰ افسر کو اپروچ کر کے کہانی الٹ دی ہے۔ اس نے ڈی آئی جی کو بتایا ہے کہ تم لوگ ڈاکوؤں کے ساتھی ہو۔ تم پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا بھی الزام ہے۔ ڈی ایس پی براہِ راست ایس پی کے معاملے پر ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا اس لیے اس نے اوپر سے دباؤ ڈلوایا ہے۔ ایس پی اسی لیے رات کے کھانے پر نہیں آسکا۔ اونچے پیمانے پر میٹنگ ہو رہی ہیں۔ کل صبح ڈی ایس پی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اس حویلی میں پہنچ جائے گا' تمہیں اس سے پہلے پہلے وادی سندھ سے نکلنا ہے۔ ایس پی اور قاضی سلطان کی حمایت سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکے گا' البتہ جب تم حویلی میں نہیں پائے جاؤ گے تو تمہاری پوزیشن صاف ہو جائے گی۔ قاضی سلطان اور ایس پی تم سے لاتعلقی اور تمہارے بارے میں اپنی لاعلمی ظاہر کر کے حالات سنبھال لیں گے۔ تارا اور اکبر سومرو قاضی کی قید میں ہیں۔ تمہارے غیاب کی صورت میں سارا ملبا ان دونوں پر آن گرے گا اور تمہاری کہانی کے ہٹ ہونے کے امکانات سو کا ہندسہ کراس کر جائیں گے۔"

نیلگری کی باتوں میں بہت وزن تھا۔ میں خود بھی کل رات سے ایس پی اور ڈی ایس پی کے حوالے سے بہت بے چین اور الجھا ہوا تھا۔ میں نے نیلگری سے پوچھا "تم نے بتایا ہے کہ کراچی میں بھی کچھ ہونے والا ہے؟"

وہ بولی "اس ہونے والے کو تم ہی روک سکتے ہو اور اس کام کے لیے تمہیں دوپہر گیارہ بجے سے پہلے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچنا ہوگا۔"

میں الجھن زدہ انداز میں اسے دیکھنے لگا "وہاں ریلوے اسٹیشن پر ایسا کیا ہونے والا ہے جسے میں روک سکتا ہوں؟"

نیلگری نے ایک گہری سانس خارج کر کے پوچھا "بوٹا سنگھ کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو؟"

بوٹا سنگھ کا نام نیلگری کی زبان سے سن کر میں چونک اٹھا۔ میں نے اس شخص کا نام اور پتا اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھا تھا۔ بوٹا سنگھ لاہور کے ایک محلے اچھرہ میں' سلطان احمد روڈ پر رہتا تھا۔ بوٹا سنگھ' چچا خشونت سنگھ کا دوست تھا۔ خشونت سنگھ نے آنجہانی ہونے سے پہلے میرے والد کی ذاتی ڈائری بوٹا سنگھ کو امانتاً لاہور بھجوا دی تھی۔ اس ڈائری میں گم شدہ بھاری مالیت کے سونے کا راز رقم تھا۔ نیلگری کے سوال نے میرے وجود میں ہل چل مچا دی۔ میں نے بے تابی سے اسے دیکھا اور کہا "ہاں' میں بوٹا سنگھ کو جانتا ہوں۔"

وہ بولی "ملک نوازش علی کے آدمیوں نے بوٹا سنگھ کو ٹریس کر لیا ہے اور یہ خبر ملک نوازش تک پہنچ چکی ہے' تم لاہور میں بوٹا سنگھ کے پاس قیام کرنے والے ہو۔ چودھری نوازش ڈائری کے راز سے بھی واقف ہو چکا ہے' بوٹا سنگھ کی روپوشی نے اسے ریڈ الرٹ کر دیا ہے۔ بوٹا سنگھ اپنی جان اور تمہاری ڈائری کو بچانے کے لیے لاہور سے کراچی آ رہا ہے۔ وہ جس ٹرین میں سوار ہے وہ لگ بھگ گیارہ بجے کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے گی۔ ملک نوازش کو تم کوئی عام سا چودھری نہ سمجھو۔ وہ بہت ہی طاقت ور اور بارسوخ ہے۔ کراچی میں بھی اس کا اپنا ایک نیٹ ورک موجود ہے۔ اس نے اپنے بندوں کو خبردار کر دیا ہے کہ بوٹا سنگھ اسٹیشن سے نکل کر گارڈن کے علاقے تک نہ پہنچنے پائے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "بوٹا سنگھ کراچی میں رہائش پذیر' اپنے ایک دوست کے پاس آ رہا ہے۔ اس کا دوست گارڈن ویسٹ کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ حالات کی سنگینی کس رخ کو جا رہی ہے؟"

میں ہاتھ ملتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ نیلگری کی انکشاف انگیز باتوں نے مجھے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو تشویش ناک صورتِ حال سے دوچار پا رہا تھا۔

نیلگری نے کہا "وجدان! ملک نوازش نے اپنے کارندوں کو صرف دو ہدایات جاری کی ہیں۔ نمبر ایک' سونے کے راز والی ڈائری کو بوٹا سنگھ سے حاصل کر کے فوراً اس کے پاس "رکھاں والی" پہنچایا جائے' چاہے اس ڈائری کے حصول کے لیے بوٹا سنگھ کی جان ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ نمبر دو' وہ لوگ تمہیں لاہور نہیں آنے دیں' کم از کم اس وقت تک جب تک وہ اپنے گمشدہ سونے کو بازیاب نہ کر لے۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ ملک نوازش تم سے سخت خوف زدہ ہے۔"

میں نے نیلگری سے یہ سوال نہیں کیا کہ اس نے یہ ساری معلومات کس طرح حاصل کی ہیں کیوں کہ میں جانتا ہوں' وہ ایسا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ میں پہلے بھی اس کی پراسرار شکتیوں کے کئی مظاہرے دیکھ چکا تھا۔ البتہ میں نے اس سے یہ ضرور کہا۔

"نیلگری! تم تو بہت عظیم شکتی ہو۔ جس کام کے لیے تم مجھ سے کہہ رہی ہو' وہ تمہارے ایک اشارے پر ہو سکتا ہے پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتی ہو؟"

اس کے جواب نے مجھے لاجواب کر دیا۔ وہ گمبھیر آواز میں بولی "میں مانتی ہوں، میں ایک شکتی ہوں مگر میں سب کچھ نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھی کوئی موجود ہے جس کو میں جواب دہ ہوں۔ میں سپر شکتی نہیں ہوں۔ میرے اختیارات کی ایک حد ہے۔ اس جہان کا کاروبار ایک مربوط نظام کے تحت جاری ہے۔ آکاش پر جو فیصلے ہوتے ہیں وہ اٹل ہیں۔ انہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ مقدس چرمی کتابوں کے پتوں پر درج ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے اپنا کام کر دیا۔ اب تم اپنے کام کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وجدان۔ واش روم میں تمہارا لباس موجود ہے، اسے پہن لو۔"

لباس کے ذکر پر میں نے ساحل کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہ نارنجی بنارسی ساڑی میں ملبوس تھی۔ پتا نہیں کیوں، میں اب تک اس کے لباس پر دھیان نہیں دے سکا تھا؟ میں کوئی سوال کیے بغیر واش روم میں گھس گیا۔

میں نے پانچ منٹ کے اندر لباس تبدیل کیا پھر باہر آکر ساحل کے اندر موجود نیلگری سے استفسار کیا "ہم یہاں سے جائیں گے کیسے؟"

اس نے بتایا "حویلی کے گیٹ پر بیدار انجن والی ایک جیپ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

میں چونکے بغیر کمرے سے نکل آیا۔ ساحل بھی میرے ساتھ قدم بڑھا رہی تھی۔ میں نے میر بخش والے کمرے سے جانا چاہا تو نیلگری نے کہا "تمہارا ساتھی اس وقت جیپ میں موجود ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ہمارے اس راز میں شریک ہو اس لیے میں نے میر بخش کو نیند ہی کی حالت میں جیپ میں پہنچا دیا ہے۔ وہ وہاں آرام سے ایک سیٹ پر پڑا سو رہا ہے۔ ساحل کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا سے کیا ہو گیا۔ یہ بھی سارے راستے سوتی رہے گی۔ کراچی کی شہری حدود میں داخل ہونے کے بعد یہ دونوں بیدار ہو جائیں گے پھر تم جس طرح چاہو، ان کی تسلی تشفی کرتے رہنا۔ میں تم سے صرف یہی کہوں گی کہ ہمارا یہ راز ہم دونوں کے بیچ میں رہنا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

آخری جملہ نیلگری نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ میں اس کی بات کی تہ تک پہنچ کر سنسنا اٹھا۔ میرے رگ و پے میں اضطراب چٹکیاں لینے لگا۔ میں نے اس کے استفسار کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کی معیت میں قدم اٹھانے لگا۔

ہم دونوں بہ سہولت حویلی سے باہر آگئے۔ کسی بھی پہرے دار یا مسلح محافظ نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں لگتا تھا نیلگری نے کوئی طلسم پڑھ کر اس حویلی پر پھونک دیا تھا۔ وہاں کا ماحول اور فضا اس کے ٹرانس میں تھے۔ وہ اس وقت ایک ساحرہ لگ رہی تھی۔

مجھے کھٹمنڈو کی وہ رات یاد آگئی جب میں نے رتنا پارک میں ملنے والی نیلگری کے کرشلی مجسمے کے دو ٹکڑوں کو مایا متی کے گھر پہنچایا تھا۔ اس رات میں وہاں رکنا نہیں چاہتا تھا لیکن نیلگری نے مصنوعی بارش برسا کر مجھے رکنے پر مجبور کر دیا تھا، اس نے اپنی شکتی سے میری گاڑی کو بھی فلیٹ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں وہاں رکوں اور اس کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کی "مرہم پٹی" کر دوں۔ وہ جو چاہتی تھی، کر بھی گزرتی تھی۔ بس ایک میں ہی ایسا تھا جس پر اس کا کھلم کھلا بس نہیں چلتا تھا۔ وہ مجھے ایک خاص معاملے میں زیر نہیں کر پائی تھی۔

حویلی کے باہر تھوڑے فاصلے پر سیاہ شیشوں والی ایک ایئر کنڈیشنڈ لینڈ کروزر موجود تھی۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ تھا۔ نیلگری نے مجھ سے پسنجر سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ میں یہی سمجھا کہ ڈرائیونگ وہ خود کرے گی مگر تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے بتا چکی تھی کہ ساحل گاڑی میں پہنچتے ہی گہری نیند میں چلی جائے گی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، جیپ کے اسٹیرنگ پر ڈرائیور موجود ہے۔

نیلگری لینڈ کروزر کے پچھلے حصے میں سوار ہونے لگی تو میں بھی پسنجر سیٹ والا دروازہ کھول کر جیپ کے اندر بیٹھ گیا پھر جیسے ہی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص پر میری نگاہ پڑی، میں چکرا کر رہ گیا۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں تعجب بھری بے یقینی سے اسے تکنے لگا۔

اسی وقت نیلگری کی مدھر سرگوشی نے میری سماعت پر دھیرے سے بوسہ ثبت کیا "وجدان! میں جا رہی ہوں......"

میں نے بے ساختہ پلٹ کر نیلگری کی طرف دیکھا۔ پچھلی نشست پر ساحل بڑی پرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا، وہ کوئی بہت حسین خواب دیکھ رہی ہے گویا وہ اس وقت نیلگری کی تحویل میں نہیں تھی۔ نیلگری اس کے اندر سے نکل کر جا چکی تھی۔ اب وہ صرف اور صرف ساحل تھی۔

میری نگاہ لینڈ کروزر کی آخری نشست کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں میر بخش موجود تھا۔ نیلگری نے غلط نہیں کہا تھا۔ میر بخش گہری نیند میں تھا۔ اس کے مدھم خراٹوں کی آواز وقفے وقفے سے ابھر رہی تھی۔ میں گردن موڑ کر ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"منگل سنگھ! تم یہاں؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ لینڈ کروزر کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "ہاں سائیں۔ میں یہاں۔"

اس کے مختصر سے جواب نے میری تشفی نہیں کی بلکہ تجسس کو مزید بڑھا دیا۔ میں نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا "منگل سنگھ! ہم نے تو تمہیں سامارو سے اس طرف ریلوے کراسنگ پر چھوڑا تھا پھر تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟"

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا "بڑی عجیب کہانی ہے سائیں۔ میں ابھی تک خود بھی سمجھ نہیں پایا ہوں۔"

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ منگل سنگھ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میں کل صبح اس سے اچھی خاصی گفتگو کر چکا تھا اور اس کا انداز و لب و لہجہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ اس وقت وہ چیت کبرا منگل سنگھ جس رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا، وہ اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں ہے۔ ٹرانس کے حوالے سے میرے خیالات کا گھوڑا پلک جھپکتے میں نیلگری کی طرف چلا گیا۔ اس ہستی سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ اس آپریشن کو کمانڈ کر رہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ منگل سنگھ اسی کے "اشاروں" پر ناچ رہا ہو!

میں نے اپنے خیالات کی تصدیق کے لیے پوچھا "تمہاری کہانی جتنی بھی عجیب ہے اس چکر میں نہ پڑو اور مجھے بتاؤ، کل صبح سے لے کر اب تک تمہارے ساتھ کیا حالات و واقعات پیش آئے ہیں۔ جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی، ممکن ہے میرا ذہن اس تک پہنچ جائے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں پر پائی جانے والی سنجیدگی اور گمبھیرتا بدستور موجود تھی۔ میں نے کہا "کل صبح تو اپنے ساتھی گنڈا سنگھ کے ہمراہ تم ہم سے رخصت ہوئے تھے۔ اس وقت تم اکیلے نظر آرہے ہو۔ تمہارا وہ نوجوان ساتھی کہاں ہے؟"

میرے ذہن میں اس قدر تجسس جاگا ہوا تھا کہ میں نے چیت کبرے منگل سنگھ سے کئی سوالات کر ڈالے۔ وہ چہرے کے تاثرات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی لائے بغیر بولا "سائیں! آپ بہت مہان ہستی ہو اس لیے میں آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

وہ خاموش ہو کر لینڈ کروزر کی ونڈ اسکرین کے پار گہری نظر سے دیکھنے لگا۔ گاڑی کے باہر چہار سو اندھیرے کا راج تھا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس ایک مخصوص فاصلے تک سڑک اور اس کے گرد و پیش کو روشن رکھے ہوئے تھیں۔ اس تاریکی میں جس قدر کم رفتار اور محتاط ڈرائیونگ کی ضرورت تھی، منگل سنگھ اس کا خیال نہیں رکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ لینڈ کروزر کی رفتار حد سے زیادہ تھی۔

منگل سنگھ نے ٹرانس کی سی کیفیت میں بولنا شروع کیا "سائیں! یہ سوال آپ نے بہت اچھا کیا کہ میرا ساتھی گنڈا سنگھ کہاں گیا۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اگر وہ میری بات مان لیتا تو شاید آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہوتی۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ ہم نے وہاں سے سیدھا عمر کوٹ پہنچنا تھا لیکن کچھ دور جا کر گنڈا سنگھ نے ایک عجیب بات کی۔

"منگل سنگھ! ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس وقت ہم ایسے راستے سے گزر رہے تھے جو مین روڈ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اس پورے علاقے میں ہماری تلاش کا کام جاری تھا اس لیے ہم کھلم کھلا سفر نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے گنڈا سنگھ سے پوچھا "اگر ہم عمر کوٹ نہیں جائیں گے تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"ہم یہاں سے سیدھے کنری جائیں گے۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کنری کیوں۔" میں نے پوچھا "وہاں اب ہمارے لیے کیا رکھا ہے؟"

"کچھ رکھا ہے اسی لیے تو کہہ رہا ہوں منگل سنگھ۔"

"مجھے بھی تو پتا چلے!" میں نے کہا۔

وہ بولا "میں ایک ضروری کام سے وہاں جانا چاہتا

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

مفرور

kitabiat1970@yahoo.com

ہوں۔"

"مجھے بتاؤ' کیا کام ہے۔"

"وہیں جا کر بتاؤں گا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

گنڈا سنگھ کا انداز مجھے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا۔ گنڈا سنگھ بھی دوسرے ڈاکوؤں کی طرح میرا حکم مانتا تھا۔ سائیں' آپ سے ملاقات کے بعد میں نے اپنا پیشہ ترک کر کے شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس مرحلے پر گنڈا سنگھ میرے سامنے ضدی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ کنری میں ہمارے ڈیرے پر پولیس نے ریڈ کر کے وہاں کی ایسی کم تیسی کر دی تھی۔ میں بھول کر بھی ادھر کا رخ کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا تھا اس لیے میں نے دوٹوک انداز میں گنڈا سنگھ سے کہا۔

"میں تو کسی قیمت پر بھی کنری نہیں جاؤں گا۔"

"تو پھر یہیں سے ہماری راہیں الگ ہو جائیں گی۔" گنڈا سنگھ نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"گنڈا سنگھ!" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا "میں تمہارا سردار ہوں۔ تم مجھ سے کس انداز میں بات کر رہے ہو؟"

وہ بدستور روکھے پھیکے لہجے میں بولا "منگل سنگھ! تم سردار تھے۔ اب نہیں ہو۔"

"کیا مطلب!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "اب میں سردار نہیں ہوں۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ تم نے ایک مُسلے کی باتوں میں آکر اپنا بہت سا نقصان کر لیا ہے۔" وہ برہمی سے بولا "تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ رہا تھا۔ گنڈا سنگھ آپ کی طرف اشارہ کر رہا تھا سائیں۔ میں نے آپ کی باتوں سے متاثر ہو کر جرم اور گناہ کی راہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور نقصان سے اس کی مراد مغوی ممتاز تھی۔ گنڈا سنگھ کا خیال یہ تھا کہ میں نے ممتاز کو آپ کے حوالے کر کے گویا پچاس لاکھ روپے گنوا دیے تھے۔ اس رقم کا مطالبہ ہم نے تاوان کی صورت میں' مغوی کے باپ قاضی سلطان سے کیا تھا۔

میں نے گنڈا سنگھ سے کہا "تمہاری باتوں سے بغاوت کی بو آرہی ہے۔ لگتا ہے' تمہارا دماغ ابھی تک وہیں ہے' لوٹ مار اور ڈاکا زنی میں!"

"ظاہر ہے' ایک ڈاکو لوٹ مار اور ڈاکا زنی ہی کرے گا۔"

"میں نے یہ قبیح پیشہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"تم نے چھوڑا ہوگا' میں نے تو نہیں چھوڑا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے افسوس بھری نظر سے اسے دیکھا اور کہا "پھر تو واقعی ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔ تم کنری جاؤ یا کہیں بھی' مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تو عمرکوٹ جا رہا ہوں۔"

"ایسے کیسے چلے جاؤ گے تم عمرکوٹ' منگل سنگھ؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ بولا "تمہارے پاس ایک بھاری رقم موجود ہے۔ اس رقم پر ہم دونوں کا برابر حق ہے' پہلے رقم کا بٹوارا ہوگا' پھر ہم اپنا اپنا راستہ پکڑیں گے۔"

میں نے اسے یاد دلایا "وجدان سائیں نے یہ رقم ہمیں اس لیے دی تھی کہ ہم اپنی اصلاح کریں۔ برائی کی راہ چھوڑ کر سیدھا راستہ اختیار کریں۔"

"یہ رقم ہمیں اس مُسلے وجدان نے نہیں دی منگل سنگھ'" گنڈا سنگھ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا "یہ رقم تو ہماری ہی تھی۔ ٹویوٹا فور ڈبلیو ڈی کے ایک خفیہ خانے میں تم نے چھپا رکھی تھی۔ مجھے بھی اسی وقت معلوم ہوا تھا۔" وہ تھوڑی دیر تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکتا رہا پھر بولا "اس میں وجدان کا کیا کمال ہے' ہماری رقم ہمارے پاس آگئی۔ تم نے اگر واقعی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے پیشے کو چھوڑ دو گے تو چھوڑ دو۔ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ مجھے اپنے ڈاکو ہونے پر ہی ہے۔ تم آدھی رقم میرے حوالے کرو اور جا کر کسی مسجد میں بیٹھ جاؤ اور اللہ اللہ کرو۔"

گنڈا سنگھ کل تک آنکھ ملا کر مجھ سے بات نہیں کرتا تھا اور آج مجھے ہی آنکھیں دکھا رہا تھا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کی خاطر کہا "تم ایک بات بھول رہے ہو گنڈا سنگھ۔ اور وہ یہ کہ اس رقم پر صرف اور صرف میرا حق ہے' تمہارا اس میں کوئی حصہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ میری ذاتی رقم ہے۔"

"ہم ایک گروہ کی صورت میں لوٹ مار کرتے رہے ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "اس لیے لوٹ کے مال پر ہم سب کا برابر حق بنتا ہے۔ اگر تم نے کچھ رقم چھپا کر جیپ کے خفیہ خانے میں رکھ دی تھی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی تم اب ایک نیک اور پرہیزگار آدمی بننے جا رہے ہو۔ تمہیں دولتِ دنیا سے کیا کام۔ شکر کرو' میں تو آدھی رقم کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ ساری رقم تم سے حاصل کر کے چلتا بنوں۔"

گنڈا سنگھ کے تیور' خیالات اور عزائم نہایت ہی خطرناک نظر آرہے تھے۔ میں نے اس سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور اس رقم میں سے آدھے روپے اس کو دے دیے پھر ہماری راہیں واقعی جدا ہو گئیں۔ وہ کنری گیا یا نہیں گیا' مجھے نہیں معلوم البتہ میں چھپتے چھپاتے عمرکوٹ پہنچ گیا۔

میں نے خاص طور پر یہ خیال رکھا کہ کسی جاننے والے سے ٹکراؤ نہ ہو۔ اس علاقے کے چپے چپے پر ہماری تلاش جاری تھی۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ رات مجھے عمرکوٹ ہی میں گزارنا تھی۔ میں نے خود کو دوسروں کی نظر سے زیادہ پوشیدہ رکھنے کے لیے ایک چارپائی ہوٹل کا انتخاب کیا۔ رات کے کھانے کے بعد میں جلد ہی سو گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں اس وقت گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے چارپائی چھوڑی اور ٹہلنے کے لیے ایک طرف نکل گیا۔

ابھی رات کا پہلا پہر تھا۔ میں ٹہل قدمی کرتے ہوئے کافی دور نکل آیا۔ میں اس سڑک پر اکیلا ہی تھا' میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اندھیرے میں کیوں ٹہل رہا ہوں البتہ میری گھبراہٹ قدرے کم ہو گئی تھی۔ میں اپنی کیفیت پر غور کر رہا تھا کہ مجھے اپنے سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سیاہ گاڑی میرے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

وہ گاڑی یہی لینڈ کروزر تھی' اس وقت ہم جس میں سفر کر رہے ہیں۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی براجمان تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایسا حسن میں نے کہیں سنا نہ دیکھا تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگتی تھی۔ اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی گردن میں پڑی ہوئی مالا تھی۔ میں نے ایسی مالا بھی اپنی زندگی میں کہیں نہیں دیکھی تھی۔"

منگل سنگھ یہاں تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کی کہانی نے مجھے بے چین کر دیا۔ کسی خوب صورت' جوان لڑکی اور نادر الوجود مالا کے ذکر پر یوں آپ میرا دھیان نیلگری کی طرف چلا گیا۔ میں نے منگل سنگھ سے پوچھا "اس مالا کے بارے میں کچھ بتاؤ؟"

وہ بتانے لگا "سائیں! وہ بڑی عجیب و غریب مالا تھی۔ میں نے بڑی توجہ سے اسے دیکھا تھا۔ وہ اکیس سیاہ چمکیلے پتھروں والی مالا تھی جس میں درمیانی پتھر ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن جتنا بڑا تھا۔"

یہ وہی مالا تھی جو کبھی نیلگری نے مجھے تحفتاً دی تھی لیکن پاک بھارت سرحد عبور کرتے ہوئے وہ مالا ریگستان میں کہیں گم ہو گئی تھی پھر ایک ملاقات پر نیلگری نے مجھے بتایا کہ مالا دوبارہ اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔

منگل سنگھ بدستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے مجھے بتانے لگا کہ سیاہ لینڈ کروزر والی اس حسین لڑکی نے اس سے کہا کہ کچھ بندوں کو "نبی سر" سے لینا ہے' تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ منگل سنگھ کسی معمول کی طرح کوئی سوال کے بغیر لینڈ کروزر میں بیٹھ گیا۔ رات کے آخری پہر وہ "نبی سر" پہنچ گئے۔ منگل سنگھ کے بقول' اس حسینہ نے گاڑی ایک حویلی سے کچھ فاصلے پر روک دی اور اس سے کہا کہ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آجائے' وہ حویلی میں سے بندوں کو لینے جا رہی ہے۔ منگل سنگھ نے ان بندوں کو کراچی پہنچانا ہے۔ جیپ اسٹارٹ تھی' منگل سنگھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر "بندوں" کا انتظار کرنے لگا۔ اس حسین ساحرہ نے گاڑی سے نکلتے ہوئے منگل سنگھ کو ہدایت دی کہ جن بندوں کو کراچی پہنچانا ہے وہ اس کے لیے اجنبی نہیں ہیں اور یہ کہ وہ خود ان کے ساتھ نہیں جائے گی۔ منگل سنگھ کو چاہیے کہ وہ ان لوگوں کو کراچی پہنچا کر واپس عمرکوٹ آجائے' پھر وہ اسے ان خدمات کے صلے کے طور پر کوئی انعام دے گی۔ منگل سنگھ اس کے سحر میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ کوئی سوال کیے بغیر اس کے احکام کی تعمیل کرتا چلا گیا۔

منگل سنگھ کی کہانی نے واضح کر دیا کہ نیلگری نے اسے ٹریپ کیا تھا۔ وہ ہمیں قاضی سلطان کی حویلی سے نکال کر کراچی پہنچانا چاہتی تھی۔ اسی مقصد کے لیے اس نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا تھا۔ میں نے منگل سنگھ سے سوال کیا "تم نبی سر کی طرف آنے کے لیے کس طرح تیار ہو گئے۔ یہاں کے قاضی سلطان کی بیٹی کو تم لوگوں نے اغوا کیا تھا؟"

"وجدان سائیں! مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے پوچھا "اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"آپ سے بات چیت کرنے کے بعد میں خود کو خاصا آزاد محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے کہا "لگتا ہے' میں اس لڑکی کے سحر سے نکل آیا ہوں۔"

میں نے نیلگری کے بارے میں اسے بتانا ضروری نہ سمجھا۔ سارا کھیل میری سمجھ میں آچکا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر منگل سنگھ نے پوچھا "سائیں! کیا آپ اس جادوگرنی کو

جانتے ہو؟"

"کون جادوگرنی!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"میں اسی ہستی کا ذکر کررہا ہوں سائیں جس کے حکم پر میں آپ کو کراچی پہنچانے جارہا ہوں۔" منگل سنگھ نے کہا "وہ کسی جادوگرنی سے کم نہیں۔ میں اب تک خود کو اس کے اثر میں محسوس کررہا ہوں۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا "میں نے تمہاری زبان سے پہلی مرتبہ اس کا ذکر سنا ہے۔"

وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ کافی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا "سائیں! آپ بہت گہرے آدمی ہو۔ ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ مجھے تو یہ کوئی بہت بڑا چکر لگتا ہے۔"

"مثلاً کیسا چکر؟" میں نے پوچھا۔

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "آپ نے مغوی ممتاز کو ہمارے قبضے سے چھڑایا اور نبی سر میں آپ کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اس لڑکی کو یہاں پہنچا دیا ہے۔ آپ کے اس کارنامے پر قاضی سلطان کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے لیکن جس طرح آپ اس کی حویلی سے رخصت ہوئے ہیں' اس سے لگتا ہے کہ یہاں کے حالات آپ کے لیے سازگار نہیں رہے پھر اس جادوگرنی کا کردار اور عمل بھی بہت ماورائی سا ہے۔ میں اس کے زیرِ اثر عمرکوٹ سے یہاں پہنچا اور اب آپ کو کراچی پہنچانے جارہا ہوں۔ وہ جادوگرنی ہمارے ساتھ نہیں آئی بلکہ وہیں حویلی میں رہ گئی ہے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے۔"

"اس لیے تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ اس بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "آپ کے دونوں ساتھیوں کا رویّہ بھی سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"انہوں نے کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "پہلے آپ کا ساتھی مرد گاڑی میں داخل ہوا اور آتے ہی پچھلی سیٹ پر سو گیا پھر آپ اس لڑکی کے ساتھ آئے ہو۔ لڑکی بھی گاڑی میں آتے ہی گہری نیند سو چکی ہے۔ صرف آپ جاگ رہے ہو۔ یہ تمام باتیں کچھ عجیب سی نہیں ہیں۔ اس پراسرار ہستی نے آپ لوگوں کو کراچی پہنچانے کے لیے میرا انتخاب ہی کیوں کیا؟ وہ خود بھی تو یہ کام کرسکتی تھی۔ یہ ساری باتیں الجھانے والی ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا سائیں!"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' تم اس معاملے میں سوچ سوچ کر اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔" میں نے کہا "تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہمیں کراچی پہنچانے کے بعد خود سیدھے عمرکوٹ پہنچ جاؤ تاکہ وہ پراسرار جادوگرنی تمہیں کسی انعام سے نوازے۔ اس نے اگر وعدہ کیا ہے تو تمہیں ضرور انعام دے گی۔"

وہ شش و پنج کی کیفیت میں مبتلا نظر آنے لگا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرکے صورتِ حالات پر غور کرنے لگا۔

ہم جن حالات سے گزر کر نبی سر پہنچے تھے' وہ خاصے تشویش ناک تھے پھر ڈی ایس پی اور ایس پی کی باہمی دشمنی اور چپقلش نے انہیں مزید گمبھیر بنا دیا۔ نیلگری نے بروقت مجھے حالات کی سنگینی سے آگاہ کردیا ورنہ صبح ہوتے ہی ہم دھر لیے جاتے۔ ڈی ایس پی کے ساتھ میں نے جو شاندار سلوک کیا تھا' وہ اس کے لیے ناقابلِ فراموش کی حیثیت رکھتا تھا' وہ مجھے بڑی سے بڑی مصیبت میں گرفتار کرسکتا تھا۔

نیلگری نے ایک طرف مجھے حالات کی نزاکت سے باخبر کیا' دوسری جانب وہ منگل سنگھ کو گھیر گھار کر ہمارے پاس لے آئی تاکہ ہم بہ آسانی کراچی پہنچ سکیں۔ منگل سنگھ پر نیلگری کے طلسماتی اثرات بہت واضح تھے۔ وہ پوری طرح اس کا مطیع و فرماں بردار نظر آتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ہمیں کراچی پہنچانے کے بعد سیدھا عمرکوٹ جاتا۔ اس بات میں بھی کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ نیلگری اسے کسی انعام سے نوازتی۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی' پراسرار شکتیوں کی مالک۔ جب جو چاہتی تھی' کر گزرتی تھی۔ پتا نہیں' یہ لینڈ کروزر اس نے کہاں سے حاصل کی تھی۔ گاڑی ائرکنڈیشنڈ اور سیاہ شیشوں والی تھی۔ یہ انتظام ہماری سہولت اور حفاظت کی خاطر کیا گیا تھا۔ مجھے نیلگری کے کمالات کے اتنے تجربے اور مشاہدے ہوچکے تھے کہ میں نے اب اس کی باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اس کے سنسنی خیز انکشافات بھی یاد آنے لگے۔ اس نے میرے زہریلے پن کی طرف توجہ دلا کر مجھے ریڈ الرٹ کردیا تھا۔ زندگی کی ہنگامہ خیزیوں میں اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور شاید کبھی بھی نہ جاتا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے ڈسنے والا زہریلے سے زہریلا جان دار بھی پلک جھپکتے میں موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔ میں کسی ضرورت مند کو اپنا خون نہیں دے سکتا تھا۔ ان حقائق کو جھٹلانا حقیقت کی طرف سے آنکھیں

بند کرلینے کے مترادف تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ پہلی فرصت میں کسی ماہر ڈاکٹر سے اس سلسلے میں مشورہ کروں گا اور اپنے اس زہریلے پن کو ختم کرکے نارمل انسان کی سی زندگی گزاروں گا۔

پھر میرا دھیان نیلگری کی دستگیری کی طرف چلا گیا۔ اس نے نہ صرف ہمیں قاضی سلطان کی حویلی سے نکال کر پولیس والوں سے محفوظ کردیا تھا بلکہ بوٹا سنگھ اور ڈائری کے بارے میں معلومات بہم پہنچا کر میرا کام آسان بنا دیا تھا۔ وہ چوہدری نوازش علی کی نظر میں آچکا تھا۔ ڈائری کے حصول کی خاطر چوہدری کے بندے اسے موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم نامہ وصول کرچکے تھے۔ وہ بے چارہ ہائی رسک پر تھا۔

نیلگری نے میرے اور ساحل کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے اپنا جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ اس کے انداز نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں اس کے جملے کو واضح معنی پہنانے سے ہچکچا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں' میں اس انداز میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ نیلگری نے ساحل کے نام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ یہ نام تم نے خوب رکھا ہے' مجھے پسند آیا۔ اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔۔۔؟

لیکن کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اگر پوری دیانت داری سے اس ادھورے جملے کو مکمل کیا جاتا تو اس میں یہ الفاظ درج کیے جاتے۔۔۔ لیکن تمہارا ساتھ پائیدار نہیں۔ تم جلد یا بدیر جدا ہونے والے ہو۔

اس طرف دھیان جاتے ہی میں ذہن کو جھٹک دیتا۔ شاید میں یہ حرکت کسی لاشعوری جذبے کے تحت کررہا تھا۔ میں ساحل کو خود سے علیٰحدہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے اس بارے میں سوچنے سے گریز کررہا تھا۔ انسانی نفسیات کی گتھیاں بھی عجیب ہیں۔ جتنی کھولو' اتنی ہی بندھتی چلی جاتی ہیں۔ میں اس وقت نفسیات سے زیادہ حالات کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا اس لیے میرا دھیان بوٹا سنگھ کی طرف چلا گیا۔

بوٹا سنگھ کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ یہ نام مسلمانوں اور سکھوں میں مشترک ہے۔ اگر سنگھ ہٹا کر شروع میں محمد کا اضافہ کردیا جائے تو یہ مسلمانوں والا نام ہوجائے گا۔ پاکستان کے دیہاتوں خصوصاً پنجاب کے دیہاتوں میں یہ نام سننے میں آتا ہے۔

بوٹا سنگھ کی رہائش اچھرہ' لاہور میں تھی۔ وہاں اس نے سب کو اپنا نام بوٹا ہی بتایا ہوا تھا۔ بوٹا سنگھ مونا سکھ تھا اس لیے بھی وہاں کی آبادی میں وہ بہ آسانی گھل مل گیا تھا۔ اگر وہ سکھوں کے روایتی حلئے میں ہوتا تو اس کے لیے مشکلات کھڑی ہوجاتیں۔

جب تک خوش قسمتی اس کا ساتھ دیتی رہی' وہ محفوظ رہا اور اب اس کی بدقسمتی کا دور شروع ہوچکا تھا۔ چوہدری نوازش علی کے خوں خوار کتے اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ لاہور میں رہنا اس کے لیے ممکن نہ رہا تو اس نے کراچی کا رخ کیا مگر وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کے "استقبال" کا بڑا "شان دار" بندوبست کیا جاچکا تھا۔

مجھے ہر صورت بوٹا سنگھ کو بچانا تھا۔ میں اس کا احسان مند تھا۔ اس نے میرے باپ کی قیمتی ڈائری کو اپنے پاس محفوظ رکھا تھا اور اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان پر کھیل کر لاہور سے کراچی کی طرف آرہا تھا۔ میں نے بوٹا سنگھ کو کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے حلئے سے واقف تھا۔ بس اتنا جانتا تھا' وہ ایک مونا سکھ ہے یعنی کلین شیو اور مخصوص جوڑے سے بے نیاز۔ سنگاپور میں آں جہانی خشونت سنگھ کی بیٹی ارملا کور کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ میرے باپ کی یادداشتوں والی ڈائری لاہور میں رہائش پذیر بوٹا سنگھ کو امانتاً بھجوا دی گئی ہے۔ میرے ذہن میں بوٹا سنگھ کی لاہور والی رہائش گاہ کا ایڈریس محفوظ تھا لیکن موجودہ صورتِ حالات میں وہ پتا بے مصرف ہو کر رہ گیا تھا۔

نیلگری خلوص نیت سے میری مدد کررہی تھی۔ میں نے اسے گوتم بھوش کے چنگل میں پھنسنے سے بچایا تھا' شاید وہ اس احسان کا بدلہ چکا رہی تھی۔ دوسری جانب وہ مجھ سے محبت کی دعوے دار بھی تھی۔ میں نے نیلگری کا جو روپ انڈیا' نیپال اور رشی کیش میں دیکھا تھا' اب وہ اس سے قدرے مختلف انداز میں پیش آرہی تھی۔ مجھے اس کے رویّے کی تبدیلی پر اعتراض تھا اور نہ ہی اس کے محبت کے دعوے کو میں شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ میرے اندر سے ایک آواز اٹھتی تھی کہ مجھے نیلگری کی مدد کے بغیر اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہیے۔ میں اس کی محبت کی ناقدری نہیں کررہا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کی محبت کے تصور ہی سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اس حوالے سے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پراسرار شکتیوں کی مالک ایک مہان ہستی ہی سمجھا تھا۔

میں اپنی کیفیات کو کوئی نام نہ دے سکا۔ نیلگری سے گریز کی لاشعوری ترغیب کو میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر

تھا۔ بعض نازک معاملات میں ہر شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہوگا۔ اگر میرے ساتھ ایسا پیش آرہا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی!

○*○

ہم دس بجے کے قریب کراچی پہنچ گئے۔

منگل سنگھ نے لینڈ کروزر کو ریلوے اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر روکتے ہوئے مجھ سے پوچھا "سائیں! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "تم وہی کرو جس کی تمہیں ہدایت دی گئی ہے۔"

پھر میں نے عقبی حصے میں موجود ساحل اور میر بخش کو گاڑی سے نیچے اترنے کا اشارہ کردیا۔ نیلگری کے کہنے کے مطابق کراچی کی حدود میں داخل ہوتے ہی وہ دونوں یکے بعد دیگرے بیدار ہوگئے تھے۔ لینڈ کروزر، جگہ کی تبدیلی اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود منگل سنگھ کو دیکھ کر ان کے چہرے حیرت اور استعجاب کا مرقع بن گئے تھے لیکن میری مخصوص سنجیدگی نے انہیں باور کرا دیا کہ انہیں تازہ ترین صورتِ حالات کے بارے میں فی الفور کوئی سوال نہیں کرنا۔ میں بیک ویو مرر میں گاہے بہ گاہے ان کے چہروں کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے ان کی آنکھوں میں لاتعداد سوالات کروٹیں لیتے ہوئے دکھائی دیے۔ ایک آدھ مرتبہ ساحل نے زبان کھولنے کی کوشش کی تو میں نے اسے اشارے سے منع کردیا۔ اس کے بعد وہ چپ سادھ کر بیٹھ گئی تھی۔

ساحل اور میر بخش لینڈ کروزر سے نیچے اتر چکے تو میں نے بھی اپنی سائیڈ کے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آتا منگل سنگھ کی آواز نے مجھے روک لیا۔

"سائیں! یہ تو لیتے جائیں۔" وہ نہایت ہی مودب لہجے میں بولا۔

میں نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ میں نے اس کے، آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوٹ کیسے ہیں منگل سنگھ؟"

"یہ وہ رقم ہے جو میرے حصے میں آئی تھی۔" اس نے بتایا "آدھی رقم میں نے کنڈا سنگھ کو دے دی ہے۔"

میں نے کہا "مگر تم یہ رقم مجھے کیوں دے رہے ہو؟"

"اس پراسرار ہستی کا حکم ہے۔" وہ دھیرے سے بولا "اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ واپسی پر یہ رقم وہ مجھے دے دے گی۔"

منگل سنگھ کا اشارہ نیلگری کی طرف تھا۔ ہمیں وڈیرا اکبر سومرو کی پجارو سے جو پچاس ہزار روپے ملے تھے قاضی سلطان کے پاس رہ گئے تھے۔ اس وقت ہم بالکل خالی ہاتھ تھے۔ نیلگری نے ہمارے لیے ایک معقول رقم کا بندوبست بھی کردیا۔ منگل سنگھ نے ریلوے کراسنگ پر اپنی نجات کے بدلے مجھے ایک لاکھ روپے کی آفر کی تھی تاہم رقم میں نے اسے واپس لوٹا دی تھی۔ یہ اس کا آدھا تھا لیکن پورے پچاس ہزار روپے۔ نیلگری نے ہماری رقم کا حساب برابر کردیا۔ مجھے امید تھی کہ واپسی پر وہ منگل سنگھ کا نقصان بھی پورا کردے گی بلکہ اسے کچھ زیادہ ہی دے گی۔

میں نے منگل سنگھ کے ہاتھ سے پچاس ہزار کے استعمال شدہ نوٹ لے کر اپنی ہپ پاکٹ میں رکھ لیے اور اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "منگل سنگھ! وہ پراسرار ہستی بہت طاقت ور اور بااختیار ہے۔ اس سے راہنمائی ضرور لینا۔ اگر وہ تمہیں کچھ عطا کرنے پر آجائے تو شرم اور جھجک میں اپنا نقصان نہ کر بیٹھنا۔ تمہیں اس کی شکتیوں کا اندازہ نہیں!"

"آپ کو تو اندازہ ہے نا سائیں؟" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے بھی جواباً وہی انداز اختیار کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

منگل سنگھ لینڈ کروزر کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا تو ان دونوں نے مجھے گھیر لیا۔ میر بخش نے تو قدرے تحمل کا مظاہرہ کیا مگر ساحل کی زبان کسی تیز رفتار ٹرین کے مانند چلنے لگی۔ اس نے یکے بعد دیگرے میرے سامنے سوالات کا انبار لگا دیا۔ یہی سوالات میر بخش کی آنکھوں میں بھی مچل رہے تھے مگر اس نے بے صبری نہیں دکھائی۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے ساحل کی زبان کو بریک لگائے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "بتاتا ہوں، سب کچھ بتاتا ہوں۔ چلو کہیں آرام دہ جگہ پر جا کر بیٹھتے ہیں۔"

ساحل اردگرد نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی "اس مقصد کے لیے وہ ہوٹل مناسب رہے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک بلند و بالا براؤن کلر ہوٹل کی جانب اشارہ کیا۔ وہ ایک معقول صورت اور معیاری دکھائی دینے والا ہوٹل تھا۔ اندر کا حال اندر پہنچ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ بہرحال وہ قرب و جوار میں موجود ہوٹلوں میں سب سے زیادہ صاف ستھرا اور پرکشش ہوٹل تھا۔

ساحل کی تجویز سے میر بخش نے بھی اتفاق کیا "ساحل ٹھیک کہہ رہی ہے سائیں۔ یہ ہوٹل بڑا معیاری ہے۔ ناشتا بھی کریں گے اور بات چیت بھی ہوگی۔ آپ کی ذات کے حوالے سے میرے ذہن میں بھی بہت سے سوال شور مچا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہے گا۔ اس سے پہلے ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

"کون سا کام وجدان؟" ساحل نے پوچھا۔

وہ دونوں ابھی تک اس راز سے واقف نہیں تھے کہ ہم ریلوے اسٹیشن کس مقصد کے تحت آئے ہیں۔ انہیں بوٹا سنگھ، ڈاڑی اور چوہدری نوازش کے بندوں کی کہانی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ تو اپنی بے خبری میں قاضی سلطان کی حویلی سے لینڈ کروزر میں لائے گئے تھے اور نیند کی حالت میں کراچی تک پہنچے تھے۔

میں نے ساحل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ہم اس وقت ریلوے اسٹیشن کے قریب کھڑے ہیں اور یہاں اس لیے آئے ہیں کہ گیارہ بجے والی ٹرین سے میرا ایک دیرینہ خیر خواہ یہاں پہنچنے والا ہے۔ ہمیں اس کا استقبال کرنا ہے۔"

میر بخش نے کہا "گیارہ بجنے میں تو ابھی ایک گھنٹا باقی ہے سائیں!"

ہم میں سے کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ تاہم یہاں پہنچتے ہی میں نے منگل سنگھ سے وقت کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے ایک راہ گیر سے معلوم کرکے مجھے وقت بتا دیا تھا۔ اس راہ گیر نے حیرت سے منگل سنگھ کو دیکھا بھی تھا، شاید اس کی حیرت کی وجہ یہ ہو کہ قیمتی لینڈ کروزر میں بیٹھے ہوئے شخص کے پاس گھڑی بھی نہیں ہے۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہمیں پہلے اسٹیشن کے اندر جا کر ٹرین کی آمد کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کرلینا چاہیے پھر کہیں بیٹھ کر ناشتا اور گپ شپ کرتے ہیں۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔" میر بخش نے کہا "میں دو منٹ میں معلوم کرکے آجاتا ہوں۔ آپ مجھے ٹرین کا نام بتائیں!"

"ٹرین کا نام مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا "بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ گیارہ بجے اس اسٹیشن پر پہنچے گی اور میں جس مسافر کو لینے آیا ہوں وہ لاہور سے آرہا ہے۔"

"بس اتنا ہی کافی ہے۔" میر بخش نے کہا "اس سے پتا چل جائے گا۔ ویسے سائیں! ہمارے ملک میں کبھی اتفاق ہی سے ٹرین وقت پر پہنچ پاتی ہے۔ ورنہ گھنٹا، دو گھنٹا تاخیر تو عام سی بات ہے۔"

میں نے کہا "تم معلوم کرکے تو آؤ۔"

جانے سے پہلے وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا "سائیں! آپ کو جس ٹرین کا انتظار ہے وہ اسی اسٹیشن پر آئے گی نا؟"

"کیوں؟ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اسٹیشن ہے؟"

"یہ کینٹ اسٹیشن ہے سائیں۔" اس نے جواب دیا "کراچی میں اس کے علاوہ ایک اور اسٹیشن بھی ہے جو سٹی اسٹیشن کہلاتا ہے لیکن۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا "لیکن کیا؟"

"میرا بھی دماغ خراب ہوگیا ہے۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "کسی بھی ٹرین کا آخری اسٹیشن کینٹ ہویا سٹی، وہ پہلے کینٹ اسٹیشن پر ہی رکے گی۔ یہاں سے گزرنے کے بعد ہی وہ سٹی اسٹیشن پہنچے گی۔" بات ختم کرتے ہی وہ سڑک عبور کرکے اسٹیشن کی جانب بڑھ گیا۔

منگل سنگھ نے ہمیں اگر کینٹ اسٹیشن پہنچایا تھا تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ بوٹا سنگھ اسی اسٹیشن پر ٹرین سے اترنے والا تھا۔ وہ سب کچھ نیلگری کی ہدایت پر کررہا تھا اور نیلگری بخوبی جانتی تھی، ہمیں کہاں پہنچایا جائے۔

پانچ منٹ بعد میر بخش واپس آگیا اور اس نے بتایا "سائیں! گیارہ بجے یہاں پہنچنے والی ٹرین کا نام تیزگام ایکسپریس ہے۔ وہ دراصل پاکستان کے ایک شمالی ضلع راولپنڈی سے چلتی ہے اور لاہور سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچتی ہے۔ لیکن یہیں، کینٹ اسٹیشن پر۔"

میں نے پوچھا "اس کی آمد کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"وہ ایک گھنٹا لیٹ ہے سائیں۔"

"یعنی یہاں وہ بارہ بجے پہنچے گی؟"

"اگر مزید لیٹ نہ ہوئی تو۔" میر بخش نے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ اس وقت وہ حیدر آباد کے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ حیدر آباد سے کراچی تک دو گھنٹے کا رن ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے پاس کم از کم دو گھنٹے ہیں۔" ساحل نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "اس دوران میں ہم خوب تگڑا ناشتا اور ڈھیر ساری باتیں کرسکتے ہیں۔"

ہم تینوں اس ہوٹل کی جانب بڑھ گئے۔ جس کا انتخاب ہم تھوڑی دیر پہلے کرچکے تھے۔ ہم سیدھے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں جا پہنچے۔ ہال میں اس وقت زیادہ رش نہیں تھا۔ بس اِکا دُکا میزوں پر ہی لوگ نظر آرہے تھے۔ ہم نے ہال کے

کونے میں بچھی ایک میز کا انتخاب کیا۔ ڈائننگ ہال صاف ستھرا اور جاذب نظر تھا۔ جب تک ہمارے لیے ناشتا سرو کیا جاتا' ہم باری باری واش روم سے ہو آئے تھے۔ ناشتا شروع کرنے سے پہلے ہم پوری طرح فریش ہوگئے۔

میں کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ساحل اور میر بخش کو حقیقتِ حال سے آگاہ کردوں۔ وہ دونوں میرے قریبی اور جاں نثار ساتھی تھے۔ انہیں بہانوں سے بہلانا مناسب نہیں تھا اور گزشتہ رات حالتِ بے خبری میں ان کے ساتھ جو کچھ ہوچکا تھا' اس کے بعد تو وہ بہانوں سے بہلنے والے تھے بھی نہیں۔

ساحل میرے اعتماد پر پوری اتری تھی اور میں اس پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرتا تھا۔ میر بخش بھی گزشتہ روز سے کئی بار آزمائشی مرحلوں سے گزر چکا تھا لہٰذا اسے بھی اپنے بارے میں کھل کر بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ساحل نیلکری کے بارے میں بہت کچھ جانتی تھی۔ تاہم وہ میرے اور نیلکری کے درمیان تعلق سے واقف نہیں تھی اور نہ ہی اسے فی الحال اس تعلق سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ البتہ وہ سونے کے راز کے بارے میں بھی جانتی تھی۔

میں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی ان دونوں کو تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ ساحل خاموشی اور سنجیدگی سے سنتی رہی لیکن میر بخش کے چہرے پر حیرتوں کا میلا لگ گیا تھا۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"سائیں! آپ آخر چیز کیا ہو؟"

"میں جو کچھ بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا "نہیں سائیں' نہیں۔ اللہ سائیں کی قسم! آپ جو سامنے ہو اس سے ہزار گنا چھپے ہوئے ہو۔ پہلے آپ کا مارشل آرٹس اور "جی" کی قوت ہی کم حیران کرنے والی نہیں تھی۔ اب نیلکری جیسی پراسرار شکتی سے آپ کا رابطہ تو پاگل کردینے والا ہے۔"

"مگر تم پاگل نہ ہوجانا میر بخش۔" ساحل نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "یہ ایک معیاری ہوٹل ہے۔ اگر یہاں تمہارا دماغی توازن بگڑ گیا تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔ مجبوراً تمہیں کسی دماغی اسپتال میں داخل کروانا پڑے گا۔ کیا تم وجدان کو چھوڑ کر کسی اسپتال میں رہنا پسند کروگے؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی "میں اتنے عظیم انسان کا ساتھ چھوڑنے کے بارے میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میں اپنی آخری سانس تک وجدان سائیں کے قدموں میں۔" وہ ذرا سا اٹکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرا مطلب ہے' اب ہمارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔"

اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ ساحل نے کہا "اس زندگی بھر کے ساتھ کو نبھانے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دماغ کو قابو میں رکھو۔"

کچھ دیر تک ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر میر بخش نے پوچھا "سائیں! آپ تو بوٹا سنگھ کو پہچانتے نہیں ہو جب کہ آپ کے دشمنوں کو اس کے حلیے سے آگاہ کردیا گیا ہے۔ اگر وہ خاموشی سے اسے لے اڑے تو پھر کیا ہوگا؟"

"ہاں' یہ مسئلہ تو ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

ساحل بولی "ہمیں جلد از جلد ریلوے اسٹیشن کے اندر داخل ہوجانا چاہیے تاکہ پلیٹ فارم پر موجود لوگوں کی نگرانی کرسکیں۔ ممکن ہے' ہمیں وہاں کچھ مشکوک چہرے نظر آجائیں۔ بوٹا سنگھ سے ڈائری حاصل کرنے کے لیے آنے والے چوہدری نوازش کے بندے یقیناً پلیٹ فارم پر موجود ہوں گے۔ ہم ایک ایک شخص کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیں گے۔ چوہدری کے بندے ہم سے پوشیدہ نہیں رہ سکیں گے۔"

ساحل کی تجویز قابلِ عمل اور معقول تھی۔ چوہدری نوازش کے بندے کوئی عام استقبالی نہیں تھے۔ انہیں ایک نہایت ہی اہم شخص بوٹا سنگھ کی "سرکوبی" کے لیے بھیجا گیا تھا لہٰذا ان کی حرکات و سکنات عام لوگوں سے مختلف ہونا لازمی تھا۔ اگر ہم وہاں موجود افراد کو باریک بینی سے واچ کرتے تو حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوسکتے تھے۔

میں نے کہا "ساحل! ہم یہاں سے اٹھ کر سیدھے پلیٹ فارم پر جائیں گے لیکن مجھے امید ہے' ریلوے اسٹیشن پر کوئی ہنگامہ آرائی نہیں ہوگی۔"

دونوں نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "میرے اندازے کے مطابق وہ اپنی نگرانی میں بوٹا سنگھ کو ریلوے اسٹیشن سے باہر آنے کا موقع دیں گے۔ اسٹیشن سے گارڈن جاتے ہوئے راستے میں وہ اسے گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بوٹا سنگھ بس یا رکشا ٹیکسی میں سفر کرے گا۔ وہ بہ آسانی اس کا تعاقب کرسکتے ہیں۔ اسٹیشن جیسے بھرے پرے مقام پر وہ کسی غیر قانونی کارروائی کا رسک نہیں لیں گے۔"

"تو پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" ساحل نے استفسار کیا۔

"ہمیں فوری طور پر تو پلیٹ فارم پر پہنچنا چاہیے۔" میں نے کہا "آئندہ کا لائحہ عمل وہاں کی صورتِ حالات کو دیکھتے ہوئے ہنگامی طور پر طے کرلیں گے۔ سب سے بڑی کامیابی یہ ہوگی کہ بوٹا سنگھ کو ٹریپ کرنے کے لیے وہاں آنے والے افراد کو ہم ٹریس کرلیں۔ اس کے بعد تمام مرحلے آسان ہوجائیں گے۔"

"ٹھیک ہے' ڈن۔" ساحل نے کہا "یہی فائنل ہے۔"

ہم تینوں اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اس سے قبل میں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا تھا۔ ہوٹل سے باہر آنے کے بعد میر بخش نے کہا "سائیں! اس وقت ہم تینوں نہتے ہیں۔ ہمارے پاس کم از کم ایک آدھ ریوالور تو ضرور ہونا چاہیے۔"

"مگر فوری طور پر گن کہاں سے آئے گی!" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

اگرچہ میں اپنے پاس کسی قسم کا اسلحہ رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ تاہم میر بخش کا کہنا بھی درست تھا۔ اس کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔

میر بخش نے میرے استفسار کے جواب میں کہا "سائیں! ہمارے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو پندرہ بیس منٹ میں کسی ہتھیار کا بندوبست کرسکتا ہوں۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "کیا واقعی؟"

"جی سائیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا "یہاں تو پیسہ پھینک' تماشا دیکھ کا قانون چلتا ہے۔"

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پوچھا "فوری طور پر ایک ریوالور کتنے میں مل جائے گا؟"

مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ پوری دنیا میں اسلحہ اور غیر ملکی کرنسی کا خفیہ لین دین ہوتا ہے اور اگر آپ کی جیب میں رقم ہو تو آپ ہر شے حاصل کرسکتے ہیں۔ میری بے یقینی کا سبب شاید یہ تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا ہوگا! بہرحال' پاکستان بھی اسی دنیا میں تھا اور دنیا کے ہر ملک میں غیر قانونی کاموں کا قاعدہ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔

میر بخش نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "سائیں! میرا خیال ہے' دو ہزار کے اندر اندر ایک اچھا دیسی ریوالور مل جانا چاہیے۔"

میں نے تین ہزار کے نوٹ گن کر اس کے حوالے کیے اور ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم اس درخت کے نیچے کھڑے ہیں۔ تم یوں جاؤ اور یوں آؤ۔" پھر میں نے بائیں ہاتھ سے چٹکی بجائی۔

میر بخش کے جانے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس طرف میں ایک خاص مقصد سے جارہا تھا۔ میں حفظِ ماتقدم کے طور پر ایک ٹیکسی کو انگیج کرنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں' کس وقت کیسے حالات پیش آجاتے۔ اگر ہمیں ان لوگوں کے تعاقب کی ضرورت پیش آتی تو پہلے سے ہمارے پاس سواری کا بندوبست ہونا چاہیے تھا۔

میں ایک یلو کیب کے پاس پہنچا' ٹیکسی کا ڈرائیور اندر موجود تھا۔ وہ ایک نئی اور بڑے سائز کی ٹیکسی تھی۔ تعاقب کے نقطۂ نظر سے یہ نہایت ہی موزوں سواری ثابت ہوسکتی تھی۔ ڈرائیور بھی جوان اور صحت مند تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا تمہاری ٹیکسی خالی ہے؟"

"میں تیزگام کے لیے یہاں آیا تھا مگر وہ تو ایک گھنٹا لیٹ ہے۔" اس نے بتایا "آپ کو کہاں جانا ہے؟"

"فی الحال تو ہمیں کہیں نہیں جانا۔" میں نے کہا "ہم کسی کا انتظار کررہے ہیں۔ ہمارا ایک مہمان تیزگام سے آنے والا ہے۔"

"مگر میں تو ایک گھنٹا یہاں ضائع نہیں کرسکتا۔ اس وقت میں سو روپے کا دھندا تو ہو ہی جائے گا۔" ڈرائیور نے کہا "میں تو اسٹینڈ سے ٹیکسی نکال رہا ہوں۔"

اس کی ٹیکسی' اسٹینڈ میں ایسی جگہ لگی ہوئی تھی جہاں سے اسٹیشن کی عمارت کا "خروج" بہت نزدیک تھا۔ ہمارے لیے وہ ٹیکسی آئیڈیل کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

"اگر میں شام تک کے لیے تمہاری ٹیکسی حاصل کرنا چاہوں تو تم کتنا کرایہ لوگے؟"

اس نے آٹھ سو روپے بتائے۔ تھوڑی بارگیننگ کے بعد وہ پانچ سو میں راضی ہوگیا تاہم ہمارے درمیان گیارہ سے پانچ بجے تک کا وقت طے ہوا۔ میں نے دو سو روپے اسے ایڈوانس دیے اور کہا "تم اسی جگہ ہمارا انتظار کرو' ہم کسی وقت بھی تمہاری ٹیکسی میں آبیٹھیں گے۔ باقی کے تین سو روپے تمہیں شام پانچ بجے ملیں گے۔ ٹھیک ہے!"

اس کے لیے اعتراض کی گنجائش نہیں تھی۔ میں ساحل کے ساتھ واپس درخت کے نیچے آن کھڑا ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں میر بخش بھی آگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے مقصد میں

کامیاب لوٹا تھا۔ میں نے پوچھا "کتنے میں بات بنی ہے؟"

اس نے دھیمے لہجے میں بتایا "سائیں، دو ہزار میں کام ہوگیا۔ بتیس بور کا درہ میڈ دیسی ساخت ریوالور ملا ہے۔ میں نے اسے اپنے نیفے میں لگا رکھا ہے۔ ہتھیار پوری طرح لوڈ ہے۔"

ہم مطمئن انداز میں ٹیکسی اسٹینڈ سے باہر نکل آئے۔ میر بخش نے کہا "آپ دونوں سامنے سے اندر داخل ہوں۔ میں گھوم کر پیچھے سے آؤں گا۔"

"وہ کیوں میر بخش؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "ٹرین کی آمد سے قبل اور رخصت ہونے سے پہلے جو افراد پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہیں گیٹ پر ان کی چیکنگ کی جاتی ہے۔ مخصوص سائنسی آلے کی مدد سے معلوم کیا جاتا ہے کہ آیا ان کے پاس کوئی آتشیں اسلحہ تو نہیں البتہ واپسی پر اتنی افراتفری ہوتی ہے کہ چیکنگ ناممکن ہو کر رہ جاتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اسٹیشن کی عمارت کے نزدیک ہی ایک ریلوے پھاٹک ہے۔ میں وہاں سے پٹڑی پٹڑی چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچ جاؤں گا۔ آپ لوگ تین پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر سامنے سے اندر جائیں۔"

میں اور ساحل اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہوگئے۔ ایک ونڈو سے میں نے تین پلیٹ فارم ٹکٹ خریدے اور ساحل کے ساتھ پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ تیسرا ٹکٹ میں نے احتیاطاً میر بخش کے لیے خریدا تھا۔ اس وقت ٹھیک گیارہ بجے تھے۔ پلیٹ فارم پر اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پاکستان کا کوئی بھی پلیٹ فارم دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں میر بخش بھی ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اسے ٹیکسی کے انتظام کے بارے میں بتایا تو وہ تشویش ناک لہجے میں بولا "سائیں! کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹیکسی والا دو سو روپے لے کر ہی فرار ہو جائے۔"

اس کی تشویش بجا تھی لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے وہ ٹیکسی ڈرائیور بھروسے کا بندہ لگا تھا۔ میں نے کہا "میرا خیال ہے، وہ پوری دیانت داری سے ہمارا انتظار کرے گا۔"

"سائیں! اگر آپ کہہ رہے ہیں تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں۔" وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا "میں تو آپ کو پیر سائیں مان گیا ہوں۔ آج سے آپ میرے مرشد سائیں ہیں۔"

وہ پٹڑی سے اترنے والا تھا، میں نے جلدی سے کہا "میر بخش! اب ہمیں اپنے کام میں مصروف ہو جانا چاہیے۔"

وہ خاموش ہو کر اثبات میں سرہلانے لگا۔

ہم نے ساحل کو پلیٹ فارم کے وسط میں کھڑا کر دیا۔ یہ مقام گیٹ کے نزدیک تھا۔ جس سمت سے ٹرین نے پلیٹ فارم میں داخل ہونا تھا اس طرف کی نگرانی میں نے اپنے ذمے لے لی جبکہ دوسری جانب میں نے میر بخش کی ڈیوٹی لگا دی۔ ہم ایک ایک فرد کو تنقیدی نظر سے دیکھتے۔ اگر ہمیں کسی پر ذرا سا بھی شبہ ہوتا یا دو افراد کو سرگوشی کی صورت بات کرتے دیکھتے تو ہم غیر محسوس طور پر ان کے قریب پہنچ کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتے۔ وقفے وقفے سے ہم ساحل سے بھی بات چیت کر رہے تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے ہمیں پہلی کامیابی حاصل ہوئی۔ میر بخش نے میرے پاس آ کر بتایا "وجدان سائیں! میں نے چوہدری نوازش کے بندوں کا کھوج لگا لیا ہے۔"

یہ ایسی اطلاع تھی کہ میں چونک اٹھا۔ وہ چائے کے ایک اسٹال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہاں جو دو افراد کھڑے ہیں، میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ نہایت ہی دھیمی آواز اور محتاط انداز میں بوٹا سنگھ کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔ تصدیق کے لیے آپ بھی ایک ٹرائی مار لیں۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا اور خاموشی سے چائے والے اس اسٹال کی جانب بڑھ گیا جس کا ذکر میر بخش نے کیا تھا۔ میں نے اسٹال سے ایک کپ چائے کا حاصل کیا اور ان دو افراد کے نزدیک کھڑے ہو کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ وہ دونوں بھی چائے پی رہے تھے۔ میں بظاہر ان کی طرف سے بے نیاز کھڑا تھا مگر میری تمام تر توجہ ان پر لگی تھی۔

میر بخش کی اطلاع سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ وہ دونوں چوہدری ہی کے آدمی تھے اور اس وقت ان کے درمیان بوٹا سنگھ زیر بحث تھا۔ وہ ٹرین کے لیٹ ہونے پر برہمی کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ میں تصدیق کر چکا تو ان سے تھوڑے فاصلے پر چلا گیا پھر بغور ان کا جائزہ لینے لگا۔

ان میں سے ایک کی عمر چالیس کے قریب ہوگی۔ وہ میانے قد کا ایک فربہ شخص تھا۔ اس نے کلف دار شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے ساتھی کی عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ وہ دراز قامت اور متناسب جسم کا مالک تھا۔ اس نے بلیک پینٹ پر بلیو شرٹ پہن رکھی تھی۔ اگر ہم ان دونوں کو نظر میں رکھتے تو بوٹا سنگھ تک رسائی ممکن تھی۔

میر بخش میرے نزدیک آگیا۔ ساحل ہماری کارکردگی کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ ہم کسی سراغ تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے ہمارے پاس آگئی۔ جب ہم نے اسے اپنی کامیابی کے بارے میں بتایا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

میں نے میر بخش سے پوچھا "کیا تیز گام ایکسپریس اسی پلیٹ فارم پر لگے گی جہاں اس وقت ہم کھڑے ہیں؟"

ہم پلیٹ فارم نمبر ایک پر موجود تھے۔ یہ گیٹ کے ساتھ ہی تھا۔ اس کے علاوہ بھی مجھے پانچ چھ مزید پلیٹ فارم نظر آ رہے تھے۔

میر بخش نے بتایا "سائیں! قبل از وقت اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو ٹرین کی "صورت اور چال" دیکھ کر ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ کسی دوسرے پلیٹ فارم پر بھی لگ سکتی ہے؟"

"اس بات کا قوی امکان ہے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ہم اس دوران میں ان دو افراد کو مسلسل اپنی نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لیے ایک گائیڈ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ کچھ دیر غور و فکر کرنے کے بعد میں نے کہا۔

"اگر تو ٹرین اسی پلیٹ فارم پر لگتی ہے تو ٹھیک ہے اور اگر وہ کسی دوسرے پلیٹ فارم پر رکتی ہے تو اس صورت میں ساحل یہیں گیٹ کے پاس موجود رہے گی۔ ہم دونوں ان دونوں کے تعاقب میں بوٹا سنگھ کے پاس پہنچیں گے پھر واپسی میں ساحل کو ساتھ لے کر نکل جائیں گے۔ تم دونوں کا کیا خیال ہے؟"

انہوں نے میرے خیال سے اتفاق کیا۔

میں نے میر بخش سے کہا "اب ہم دونوں باری باری تھوڑے تھوڑے وقفے سے چوہدری نوازش کے آدمیوں کی نگرانی کریں گے اور ایک دوسرے سے زیادہ دور بھی نہیں جائیں گے۔" پھر میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم وہیں گیٹ کے نزدیک چلی جاؤ، اور ہر ممکن حد تک ہمیں اپنی نگاہ میں رکھنے کی کوشش کرو تاکہ اگر ہم کسی موقع پر تمہیں مس کر دیں تو تم ہم تک پہنچ سکو۔"

طے شدہ پروگرام کے تحت ہم نے اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھالی اور تیز گام ایکسپریس کا انتظار کرنے لگے۔ وہ تیز گام جو اپنے مقررہ وقت سے ایک گھنٹا لیٹ تھی۔ پتا نہیں، اس کے کام میں کون سا کانٹا چبھ گیا تھا!

○☆○

تھکن زدہ تیز گام نے پلیٹ فارم نمبر چار پر رک کر ایک طویل سانس لی۔

چوہدری کے بندوں نے چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور برج کی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ اس برج کے ذریعے پلیٹ فارم نمبر چار تک پہنچا جا سکتا تھا۔ میں نے ساحل کو ہائی الرٹ رہنے کا اشارہ کیا اور میر بخش کے ساتھ ان دونوں کے تعاقب میں قدم اٹھانے لگا۔ ہمارے درمیان صرف دو قدم کا فاصلہ تھا۔ وہاں اس قدر رش ہو رہا تھا کہ انہیں اپنے تعاقب کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم چاروں آگے پیچھے تیز گام تک پہنچے۔ وہ دونوں شکاری نگاہوں سے بوٹا سنگھ کو ڈھونڈ رہے تھے اور ہم نے ان پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پانچ منٹ کے اندر اندر ان کی تلاش ختم ہوگئی۔ ٹرین سے باہر آنے والے ایک ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ کر ان دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اثبات میں سرہلا دیا۔ گویا وہ بوٹا سنگھ کو پہچان گئے تھے۔ ان کے چہروں کا اطمینان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اپنے مطلوبہ بندے کو پانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔

میر بخش نے میرے کان کے نزدیک سرگوشی کی "سائیں! یہی شخص بوٹا سنگھ ہو سکتا ہے!"

میں نے اثبات میں سرہلا دیا۔ ادھیڑ عمر بوٹا سنگھ نے کریم کلر پتلون پر چیک دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفری بیگ نظر آ رہا تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی اور سامان نہیں تھا۔ وہ اپنے چہرے سے خاصا ہراساں دکھائی دیتا تھا۔

چوہدری کے بندوں نے بوٹا سنگھ کو اپنے درمیان رکھ لیا۔ پلیٹ فارم پر کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اس لیے بوٹا سنگھ کو کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم ان سے دو قدم پیچھے چل رہے تھے۔

میر بخش نے میرے ساتھ چلتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا "سائیں! کیا ارادہ ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں بوٹا سنگھ کا بیگ اچک کر دوڑ لگا دیتا ہوں۔ وہ قیمتی ڈائری یقیناً اسی بیگ میں ہوگی۔ میں جیسے پلیٹ فارم پر پہنچا ہوں ایسے ہی کوئی چور راستہ اختیار کر کے باہر بھی نکل جاؤں گا۔ آپ دونوں ٹیکسی میں پہنچ جانا۔ میں بعد میں آپ کے ساتھ آ ملوں گا۔ یہاں اس قدر رش ہو رہا ہے کہ چوہدری کے بندے مجھے پکڑ نہیں سکیں گے۔"

اس وقت ہم برج کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ میں نے میر بخش کی بات کے جواب میں کہا "میں مانتا ہوں، وہ اس جرم

غفیر میں تمہیں چھاپنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے مگر اس صورت میں بوٹا سنگھ کی جان خطرے میں آ جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اس محسن کو کوئی جانی نقصان پہنچے پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ڈائری اس بیگ ہی میں ہو۔"

"ہاں' یہ ضروری نہیں ہے۔" میر بخش نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "چوہدری کے بندے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بوٹا سنگھ کو "اپنے ساتھ" لے جا رہے ہیں اس کا مطلب ہے' وہ یہاں کوئی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتے۔ ہمیں بھی اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلنے کے بعد ہی کوئی ایکشن لینا چاہیے۔"

میر بخش میری دلیل سے قائل ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس گیٹ کے پاس پہنچ گئے جہاں سے مسافر باہر نکل رہے تھے۔ گیٹ پر دو ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ چیک کر کے انہیں جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ہجوم اس قدر تھا کہ اِکا دُکا افراد چیکنگ کے بغیر بھی نکل رہے تھے۔ ہمارے پاس پلیٹ فارم ٹکٹ موجود تھے اس لیے ہمیں اس گیٹ سے گزرنے کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

ہم جیسے ہی بوٹا سنگھ اور چوہدری نواز ش کے بندوں کے پیچھے پلیٹ فارم سے باہر آئے' میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی۔ کلف دار سوٹ میں ملبوس فربہ اندام شخص نے اپنی قمیص کی سائیڈ پاکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ہاتھ کو جیب کے اندر ہی رکھتے ہوئے اس نے بوٹا سنگھ کے پہلو سے لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنا چہرہ بوٹا سنگھ کے کان کے قریب لے گیا۔

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا کہ وہاں کیا کارروائی ہو رہی تھی۔ یقینی طور پر اس فربہ شخص نے بوٹا سنگھ کے کان میں سرگوشی کی ہو گی کہ وہ اس وقت ان کے گن پوائنٹ پر ہے لہٰذا شرافت سے ان کے ساتھ چلتا رہے۔ بوٹا سنگھ کے چہرے کے تاثرات میرے اندازے کی گواہی دے رہے تھے۔

میر بخش بھی صورتِ حالات کو بھانپ گیا۔ تشویش ناک لہجے میں بولا "سائیں! بندہ ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔"

"بندہ ہاتھ سے نہیں نکلے گا میر بخش۔" میں نے پُراعتماد انداز میں کہا "میں یہ بندہ تمہارے ہاتھ میں دے رہا ہوں۔"

"کیا مطلب سائیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

ہمارے درمیان بہت دھیمے لہجے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے میر بخش کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم ساحل اور بوٹا سنگھ کو لے کر فوراً ٹیکسی میں پہنچو۔ میں ان سے نمٹ کر آ رہا ہوں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے فربہ اندام شخص کی تشریف پر ایک زوردار لات رسید کی۔ اس وقت ہم اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلنے والے فرشی زینوں پر قدم رکھ رہے تھے۔ میری دھواں دھار کک نے موٹے شخص کو کسی گو... کے مانند لڑھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کا ہتھیار بردار ہاتھ ... پاکٹ سے باہر آ گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پسٹل موجود تھا۔ اسی لمحے میر بخش نے بوٹا سنگھ کا ہاتھ تھاما اور ٹیکسی کی جانب دوڑ لگا دی۔

اس دوران میں موٹے آدمی کے ساتھی دراز قامت شخص نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا' گویا میرے لیے گرما گرم حلوے کی پلیٹ تیار تھی۔ میں نے اس کے حملے کو اپنے بازوؤں پر روکا اور اس کے چہرے پر ایک باقوت پنچ مارا۔

وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر بلبلا اٹھا۔ اس کارروائی کے دوران میں' میں موٹے پستول بردار سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں رہا۔ مرد مذکورہ زینوں کے اختتام پر پہنچ کر سنبھلا اور اس نے پستول والا ہاتھ میری سمت سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن میں پلک جھپکتے میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔

میں نے برق رفتاری سے اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکر رکھ لیا۔ قریب ہی کھڑے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا "بھائی' کیا ہو گیا؟"

میں نے موٹے شخص کی دھنائی کرتے ہوئے کہا "جیب کترا ہے۔ چور لٹیرا ہے۔ میں اس کی مرمت کر رہا ہوں۔"

"شاباش' اور مارو۔" مجھے حوصلہ آمیز انداز میں تلقین دی گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا مقابلہ کرنے کے بجائے فرار کی فکر میں تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ ڈر کر بھاگ رہا تھا۔ دراصل' بوٹا سنگھ ان کے لیے بہت اہم تھا جو اب ان کے گن پوائنٹ پر نہیں رہا تھا بلکہ وہ دونوں میرے کک پوائنٹ پر آ چکے تھے۔

مجھے اپنے عقب میں خطرناک سرگرمی محسوس ہوئی تو میں سُرعت سے پلٹ گیا۔ چوہدری کا دوسرا نمک خوار میری گردن کو دبوچنے کے لیے اپنے بازوؤں کو میری جانب بڑھا رہا تھا۔ میں نے اپنے بائیں ہاتھ کو اس کے گریبان پر جمایا پھر تھوڑا جھکتے ہوئے میں نے اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اس

کو جھٹکا دیا۔ وہ فضا میں بلند ہوا تو میں نے اسے دوسری جانب اچھال دیا۔ وہ اپنے موٹے ساتھی پر گرا۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ وہ ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے پستول کے نشانے پر لا چکا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ٹرین کی آمد کے سبب وہاں رش تو ہو ہی رہا تھا۔ ہمارے اس "اسپیشل شو" کی وجہ سے خاصی افراتفری مچ گئی۔ میں اس معاملے کو طول نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ ریلوے پولیس والے اگر ہماری جانب متوجہ ہو جاتے تو ہمارے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں اور میں پولیس سے "دور دور" ہی رہنا چاہتا تھا۔

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہوئے ہی تھے کہ میرے پہلو میں آ کر رکی پھر میر بخش کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "سائیں! ٹیکسی میں آ جاؤ' جلدی۔" اس کے ساتھ ہی اس نے میری جانب کا دروازہ کھول دیا۔

میر بخش کی عقل مندی پر میں اش اش کر اٹھا۔ اس نے ٹیکسی کو اسٹینڈ سے نکلوا کر موقع کی مناسبت سے بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے چوہدری نوازش کے بندوں کی طرف دیکھا۔ موٹے آدمی کے ہاتھ میں مجھے پسٹل دکھائی نہیں دیا۔ میں اچک کر ٹیکسی کے اندر آ بیٹھا۔

میر بخش نے تحکمانہ انداز میں ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایت دی "فوراً نکلو یہاں سے۔"

ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ وہ دونوں اس کی زد میں آتے آتے بچے۔ مجھے ٹیکسی کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ دونوں میری طرف دوڑے تھے۔ درحقیقت وہ میری نہیں' بلکہ ٹیکسی کی سمت لپکے تھے جس کے اندر ان کا شکار بیٹھا تھا۔ وہ بوٹا سنگھ کو کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے مڑ کر ٹیکسی کے عقب میں دیکھا۔ وہ دونوں پارکنگ کے اس حصے کی جانب دوڑتے ہوئے جا رہے تھے جہاں پرائیویٹ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ اپنی گاڑی میں ہمارا تعاقب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ڈرائیور نے سراسیمہ آواز میں کہا "سرجی! یہ کیا چکر ہے؟"

"چکر کچھ نہیں بھئی۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ دونوں بدمعاشی کر رہے تھے۔ ہمارے مہمان کو لوٹنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں تھوڑا سبق سکھا دیا۔ ایسے اٹھائی گیروں' لٹیروں سے ڈر کر نہیں رہنا چاہیے۔"

ٹیکسی ڈرائیور میری وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "چلنا کہاں ہے سرجی؟"

"ائر پورٹ!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"ائر پورٹ؟" بوٹا سنگھ نے حیرت سے دہرایا اور میر بخش کی طرف دیکھنے لگا "ہم تو گارڈن ویسٹ جا رہے تھے! ...آپ لوگ وجدان کا نام استعمال کر کے میرے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں کرنا چاہتے؟"

بوٹا سنگھ کے ان کلمات سے میں سمجھ گیا کہ میر بخش اسے ہمارے بارے میں مختصراً بتا چکا تھا اسی لیے وہ پُرسکون اور خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"بوٹا جی! ہم گارڈن ویسٹ ہی جائیں گے۔ پہلے ذرا ائر پورٹ پر ایک ضروری کام ہے۔"

میر بخش نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا "ہم نے اگر تمہیں دھوکا دینا ہوتا تو چوہدری نوازش کے بندوں سے چھڑاتے ہی نہیں۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ لوگ یہ بات بھی جانتے ہیں کہ تم اپنے کسی دوست کے پاس گارڈن ویسٹ جا رہے ہو اس لیے بھی ہم براہِ راست ادھر کا رخ نہیں کر سکتے۔"

میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا۔ جلد ہی ایک سفید شیرڈ میری نظر میں آ گئی۔ وہ بہت تیز رفتاری سے ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ایک محدود فاصلے پر پہنچی تو میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے موٹے تازے شخص کو پہچان لیا۔ وہ چوہدری نوازش کے انہی دو بندوں میں سے ایک تھا' ریلوے اسٹیشن پر جن سے میری مڈ بھیڑ ہوئی تھی۔ گویا وہ ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے۔ شیرڈ کی پچھلی نشست پر دراز قامت پتلون قمیص والا شخص بھی موجود تھا۔ ڈرائیونگ ایک دبلا پتلا پستہ قامت آدمی کر رہا تھا۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

میر بخش اور ساحل بھی اس تعاقب سے آگاہ ہو گئے۔ ساحل نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "وجدان! وہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں!"

"آنے دو' پروا نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میر بخش بولا "ہم نے ان کا شکار چھینا ہے' وہ آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی میں یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں۔ اس پر آہستہ آہستہ ہمارے جوہر کھل رہے تھے۔ ہماری مجبوری تھی کہ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے' اس میں ہماری حیثیت ٹیکسی ڈرائیور سے پوشیدہ نہیں

رہ سکتی تھی۔

اس نے بدستور ڈرائیونگ کرتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں کہا "جناب! آپ تو کسی پھڈے کے چکر میں لگتے ہیں۔ وہ لوگ آپ کا تعاقب کر رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا آپ لوگوں کے درمیان کیا دشمنی ہے۔ اور نہ ہی میں جاننا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ میں کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"اتنے ہٹے کٹے ہو کر بھی بزدلی دکھا رہے ہو!" میر بخش نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا "بات بہادری یا بزدلی دکھانے کی نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے مسٹر؟" میں نے پوچھا۔

"میں پرائے پھڈے میں نہیں پڑنا چاہتا۔" وہ بے چارگی سے بولا "آپ اپنے دو سو روپے بھی واپس لے لیں۔ مجھے نہیں چاہیے یہ رقم۔ آپ کوئی اور ٹیکسی کر لیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ٹیکسی کی رفتار کم کرنا چاہی، اسی وقت میر بخش نے اسے ریوالور کی جھلک دکھائی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہ سے ریوالور کو دیکھنے لگا۔

پسنجرز سیٹ پر براجمان میر بخش نے ریوالور پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا "یہ بالکل اصلی ہے اور بھرا ہوا بھی ہے۔ کہو تو چیمبر چیک کرا دوں؟"

"نن... نہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور ہکلایا۔

میر بخش نے پاٹ دار آواز میں کہا "اپنی توجہ کو ڈرائیونگ پر مرکوز رکھو۔ باتیں تم اس طرف دیکھے بغیر بھی کر سکتے ہو۔"

وہ ٹیکسی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہاں چون و چرا کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ شرافت اور فرماں برداری کا مظاہرہ ہی اس کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا "دیکھو مسٹر! ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ اگر تم خاموشی سے ہمارے حکم کی تعمیل کرتے رہے تو ہم بہت جلد تمہیں آزاد چھوڑ دیں گے۔ تمہاری آزادی خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ... کس طرح؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

میں نے کہا "تم اپنی ڈرائیونگ کی مہارت کا مظاہرہ کرو۔ جتنی جلدی تم تعاقب کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو جاؤ، ہم اتنی ہی جلدی تمہیں آزاد کر دیں گے۔ جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ تعاقب کرنے والی سفید شیرڈ سے ہمارا پیچھا چھوٹ گیا ہے، ہم تمہاری ٹیکسی کو چھوڑ دیں گے۔ اپنے لیے ہم کسی اور سواری کا بندوبست کر لیں گے۔"

وہ مزید اسپیڈ بڑھاتے ہوئے بولا "اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے بے سمت سفر کرنا ہوگا۔ موقع محل کی مناسبت سے راستے بدلنا ہوں گے۔"

"تو بدلو راستے، اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میر بخش نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

"مم... مگر آپ لوگ تو ائرپورٹ جانا چاہتے ہو!"

"اس بات کو بھول جاؤ۔" میں نے سختی سے کہا "فی الحال ہمیں کہیں نہیں جانا۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس سمجھ داری میں غالب حصہ اس ریوالور کا تھا جو میر بخش نے اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ پتا نہیں، یہ ہتھیار کیسی عجیب و غریب شے ہے۔ اس کا استعمال تو جو دہشت بٹھاتا ہے وہ بٹھاتا ہی ہے مگر اس کی خالی جھلک بھی بہت سے بگڑے کام بنا دیتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے طاقت کی زبان سمجھتا اور اس کے سامنے جھکتا آیا ہے۔ اگر میر بخش ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے ریوالور کی "نمائش" نہ کرتا تو عین ممکن تھا، وہ اپنی ٹیکسی کو سڑک کے ایک جانب روک کر ہمیں نیچے اتار دیتا۔

ائرپورٹ جانے والی بات میں نے بے ساختہ ہی کہہ دی تھی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جو ہر انٹرنیشنل سٹی میں ہوتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق کراچی پاکستان کا سب سے بڑا اور جدید شہر تھا۔ میں نے یہاں زندگی میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا۔ یہاں کے علاقے، سڑکیں، مختلف مقامات سے میں قطعی ناواقف تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ مجھے یہ ساری معلومات حاصل ہوتی گئیں تاہم واقعات کے تسلسل اور دلچسپی کو قائم رکھنے کے لیے میں ہر شے کا باقاعدہ ذکر کروں گا۔

اس وقت ہم شاہراہ فیصل سے گزر رہے تھے۔ میٹروپول ہوٹل سے شروع ہونے والی یہ کشادہ سڑک سیدھی ائرپورٹ کو جاتی ہے۔ بوٹا سنگھ پچھلی نشست پر میرے اور ساحل کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں تعاقب میں آنے والی سفید شیرڈ پر بڑی ماہرانہ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "اسپیڈ بڑھاؤ۔"

"میں ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں جناب۔" وہ بے چارگی سے بولا "یہ تو شکر کریں، ہمیں سگنل کھلے ہوئے مل رہے ہیں! ورنہ اتنی رفتار قائم رکھنا بھی دشوار ہو جاتا۔"

گویا قبرستان کے بعد اس نے رفتار مزید بڑھا دی۔ ٹنل پر متعاقب گاڑی کو اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے برابر آ گئے تاہم ہمارے درمیان تین لین کا فرق تھا۔ شیرڈ والوں نے گاڑی کو لیفٹ ہینڈ رکھا تھا۔ رفتار زیادہ رکھنے کے چکر میں ٹیکسی ڈرائیور نے پہلی لین پکڑی ہوئی تھی۔

ٹنل کھلتے ہی دونوں گاڑیاں توپ میں سے نکلے ہوئے گولوں کے مانند آگے بڑھیں۔ ساحل نے کہا "یہ جہنم کی بلائیں تو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے لگ گئی ہیں۔"

میں نے کہا "جہنم کی بلائیں تو اپنے ہاتھ دھونے کے لیے بھی آگ ہی استعمال کرتی ہوں گی اس لیے ہمیں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی راستہ ہے۔"

"وہ کون سا راستہ ہے سائیں؟" میر بخش نے پوچھا۔

"ان کو واپس جہنم میں پھینک دیا جائے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "گویا پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "اگر مجھے پتا ہوتا کہ آپ اتنے خطرناک لوگ ہیں تو میں کبھی بھی آپ کو اپنی ٹیکسی میں نہیں بٹھاتا۔ آپ تو مرنے مارنے کی باتیں کر رہے ہیں۔"

بوٹا سنگھ کا سفری بیگ میر بخش نے اپنی گود میں رکھا ہوا تھا اور اس بیگ کی اوٹ ہی سے وہ ریوالور کے ذریعے ٹیکسی ڈرائیور کو کنٹرول کر رہا تھا۔ ڈرائیور کے تبصرے پر اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ "اب تو تمہیں پتا چل گیا نا، ہم کس قسم کے لوگ ہیں پھر کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"کوئی ارادہ ظاہر کرنا میرے اختیار میں کہاں ہے۔" وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے کہا "جب تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم بے اختیار ہو چکے ہو تو پھر شرافت سے وہی کرو جو تم سے کہا جا رہا ہے۔ ہم صرف ان لوگوں کے لیے خطرناک ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ہمارے تعاقب میں آنے والے سماج دشمن عناصر ہیں۔ ہمارے مہمان کو قتل کر کے اس سے بیگ چھیننا چاہتے ہیں۔ ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔" پھر میں نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر ایک آنکھ دبائی اور کہا "کیوں بوٹا جی، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

میں نے بوٹا سنگھ کے بجائے "بوٹا جی" کہہ کر اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ خاصا سمجھ دار آدمی تھا۔ فوراً میرا اشارہ سمجھ گیا کہ اس نے خود کو سکھ ظاہر نہیں کرنا۔ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"وجدان بھائی! آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔"

ساحل نے کہا "وجدان! اگر اسی طرح کار چیزنگ ہوتی رہی تو نتیجہ برآمد ہونے میں بہت وقت لگ جائے گا اور ہمارے پاس بہت کم وقت ہے۔"

ساحل کی بات ختم ہوئی تو میں نے متعاقب شیرڈ اور ٹیکسی کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگانے کے لیے اپنے پیچھے نگاہ دوڑائی اور اسی وقت میں ایک ہائی روف کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ نیلے رنگ کی وہ ہائی روف بہت تیزی سے سفید شیرڈ کے پیچھے لگی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ نیلی ہائی روف، سفید شیرڈ کا تعاقب کر رہی تھی۔

اس وقت ہم کارساز اور ڈرگ روڈ کے درمیان سفر کر رہے تھے۔ یہ کنٹونمنٹ کا علاقہ ہے اس لیے دائیں بائیں خاصا وسیع علاقہ تعمیرات سے خالی ہے۔ اس ٹکڑے میں بڑی فری ڈرائیونگ کی جا سکتی ہے۔

پتا نہیں، نیلی ہائی روف کب سے سفید شیرڈ کا پیچھا پکڑے ہوئے تھی۔ میری نظر... بلکہ ہماری نظر میں تو وہ ابھی ابھی آئی تھی۔ میر بخش سمیت ساحل اور بوٹا سنگھ بھی نیلی ہائی روف کے عزائم کو بھانپ گئے تھے۔

ساحل نے تشویش ناک لہجے میں کہا "یہ شیرڈ والوں کے ساتھی بھی ہو سکتے ہیں!"

"نہیں۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

"وجدان! یہ بات تم اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟"

"اگر نیلی ہائی روف والے چوہدری نوازش کے بندوں کے ساتھی ہوتے تو انہیں ہماری ٹیکسی کے پیچھے آنا چاہیے تھا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وجدان سائیں! مجھے تو یہ لوگ چوہدری نوازش کے مخالفین میں سے لگتے ہیں۔" میر بخش نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "تم بالکل ٹھیک نہج پر سوچ رہے ہو۔"

ہمارے درمیان فاصلہ اب اتنا کم ہو گیا تھا کہ نیلی ہائی روف میں موجود لوگوں کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ جس شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ خاصا مشاق اور تجربہ کار نظر آتا تھا۔ دو افراد ہائی روف کے پچھلے حصے میں تھے۔ ان کی نگاہیں بھی سفید شیرڈ پر جمی تھیں۔

نے میرے بہت سے دوستوں کی جانیں لی ہیں۔ لاشوں کے کچھ نذرانے اس کی خدمتِ چوہدریہ میں بھی پہنچنے چاہییے۔"

"آپ نے دل خوش کردیا سائیں!" میر بخش نے مسرور لہجے میں کہا "اب مجھے کوئی پروا نہیں' میں تو آپ کی وجہ سے ہاتھ روکے بیٹھا تھا۔"

پھر میں نے ایک مقام پر ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کو کہا۔ راشد منہاس روڈ پر اب ہم خاصا آگے آگئے تھے۔ ڈرائیور نے اللہ کا نام لے کر ٹیکسی روک دی۔

اس سے پہلے کہ میں اور میر بخش ٹیکسی سے باہر آتے۔ سفید شیرڈ ہمیں اوور ٹیک کر کے پندرہ بیس فٹ آگے آکے رک گئی۔ چوہدری کے گماشتوں نے گاڑی اس زاویے پر روکی تھی کہ اگر ہم چاہتے تو آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ اسی وقت نیلی ہائی روف نے ہم دونوں کو اوور ٹیک کیا اور شیرڈ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ سفید شیرڈ ٹیکسی اور ہائی روف کے درمیان پھنس کر رہ گئی۔

میں نے ٹیکسی کے دروازے کو کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو ایک منظر نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میر بخش بھی وحشت زدہ انداز میں ہائی روف کی طرف دیکھنے لگا۔ ساحل' بوٹا سنگھ اور ٹیکسی ڈرائیور میری ہدایت پر ٹیکسی رکتے ہی محفوظ پوزیشن میں جا چکے تھے اس لیے وہ اس سنسنی خیز منظر کو نہ دیکھ سکے۔

ہائی روف بریکوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ رکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کا سلائیڈنگ ڈور کھلا اور پچھلے حصے میں سوار دونوں افراد اچھل کر باہر آگئے۔ وہ دونوں مسلح تھے۔

ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کے۔ کے کا رخ سفید شیرڈ کی جانب تھا۔ وہ چیتے کی مانند جست بھر کر شیرڈ کے قریب آگئے پھر ان کی کے کے (کلاشنکوف) شیرڈ پر گولیوں کی برسات کرنے لگیں۔ شیرڈ میں موجود تینوں افراد سکتے کی سی کیفیت کا شکار تھے۔ گنوں سے نکلنے والے برسٹوں نے شیرڈ کا ستیاناس مار دیا۔ ونڈ اسکرین' سائیڈ اسکرین اور گاڑی کی باڈی "لہولہان" ہوگئی۔ جب گاڑی کا یہ حشر ہوا تھا تو اس کے اندر والوں کا کیا حال ہوگا' اس کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے چوہدری کے پالتو کتوں کو تڑپ تڑپ کر ٹھنڈے ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ سب کچھ بہ مشکل پانچ سیکنڈ میں پیش آیا تھا۔ شیرڈ میں موجود تینوں افراد نابود ہوگئے۔ کلاشنکوف بردار افراد نے شیرڈ کے اندر جھانک کر اپنا اطمینان کیا اور ہماری ٹیکسی کی جانب قدم اٹھانے لگے۔

وہ بہت نازک لمحات تھے۔ ہائی روف والوں کی لحا[ظ] کارروائی نے ہمیں ٹیکسی سے نیچے اترنے کا موقع نہیں [دیا] تھا۔ خوفناک برسٹ کی آوازوں نے ہمارے ساتھیوں [کو] سانس روک کر چھپے رہنے پر مجبور کردیا۔ میں اور میر بخش آنے والوں کی جانب متوجہ ہوگئے۔

وہ دونوں ہماری ٹیکسی کے قریب آگئے۔ کسی لمحے [کچھ] بھی ہو سکتا تھا تاہم کچھ بھی نہ ہوا۔ گن بردار افراد نے [ٹیکسی] کے نزدیک پہنچ کر کلاشنکوفوں کا رخ زمین کی طرف کردیا۔ [ان] کے چہروں پر بھی مجھے دوستانہ تاثرات نظر آئے۔ میرے [منہ] سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

ایک گن بردار نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "[ہم] نے انسانیت کے دشمنوں کو نیست و نابود کردیا۔ ہماری گا[ڑی] میں آجاؤ۔ جہاں جانا ہو' ہم چھوڑ دیں گے۔"

"تم کون ہو؟" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہو[ئے] پوچھا۔

اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا "ہم تمہار[ے] دشمنوں کے دشمن ہیں اس رشتے سے تم ہمیں اپنا دوس[ت] سمجھو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پولیس آجائے گی۔ یہ ٹیکـ[ـسی] ڈرائیور ریلوے اسٹیشن سے یہاں تک تم لوگوں کے بچاؤ [کے] لیے کچھ نہیں کرسکا' پولیس والوں سے کیا بچائے گا۔ اگر ہم [پر] بھروسا کرتے ہو تو ہماری گاڑی میں آجاؤ۔ کم آن۔"

میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان کے ساتھ جا[نے] کا فیصلہ کرلیا۔ اس دوران میں ہمارے دیگر دونوں ساتھی [بھی] سیدھے ہو چکے تھے۔ میرے اشارے پر وہ ٹیکسی سے با[ہر] آگئے۔ میں اور میر بخش بھی نیچے اتر آئے۔ ٹیکسی ڈرائیور[کی] جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"اب تم جہاں جانا چاہو' جا سکتے ہو۔ ہم نے تمہیں آزا[د] کیا۔"

پھر ہم سب نیلی ہائی روف میں آبیٹھے۔ ہمارے اند[ر] پہنچتے ہی ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی[۔] دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

کلاشنکوف بردار دونوں افراد ہمارے ساتھ گاڑی [کے] پچھلے حصے میں تھے۔ ان پر اعتماد کر کے میں کسی الجھن [یا] پریشانی میں نہیں تھا۔ بس میرے دل نے کہا تھا' ان لوگوں [پر] بھروسا کرنا چاہیے اسی لیے میں نے ان کے ساتھ جانے [کا] فیصلہ کیا تھا۔ ساحل اور بوٹا سنگھ سراسیمہ نظروں سے بار[بار] اپنے عقب میں دیکھ رہے تھے جب کہ میر بخش خاصا نچ[نت]

صورتِ حال واضح ہوگئی تو بوٹا سنگھ نے کہا "وجدان بھائی! یہ تو کوئی نیا ہی کھیل شروع ہوگیا ہے۔ بیگ میں آپ کی امانت رکھی ہے۔ اسے محفوظ رہنا چاہیے۔"

"بیگ میر بخش کی تحویل میں محفوظ ہے اس لیے اس کے اندر رکھی امانت بھی محفوظ ہی سمجھو۔" میں نے کہا "اب تم اپنی ذمے داری سے آزاد ہو چکے ہو۔ میں نے اپنی ڈائری وصول پائی۔ اس کی حفاظت کرنا اب میری ذمے داری ہے۔"

"شکر ہے' میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔" بوٹا سنگھ نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

میں باریک بینی سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ کچھ آگے ایک سڑک بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ اس طرف کا علاقہ خاصا غیر آباد تھا۔ میں اس بلی چوہے کے کھیل کو اب زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ جو بھی ہونا تھا وہ ہو جاتا۔ چوہدری نوازش کے نمک خوار کسی بھی قیمت پر بوٹا سنگھ اور ڈائری والے بیگ کو چھوڑنے والے نہیں تھے اور ہمارا ٹیکسی ڈرائیور ابھی تک اس تعاقب سے جان نہیں چھڑا پایا تھا۔ اتنی مہلت ہمارے پاس نہیں تھی کہ ڈرائیور کو ہٹا کر میں خود ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھتا۔ اس لمحاتی وقفے سے وہ لوگ ہمارے سر پر پہنچ جاتے۔ جب ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہی تھے تو پھر بھری پُری سڑک کے بجائے بائیں جانب نکلنے والی وہ روڈ زیادہ مناسب تھی۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "وہ آگے بائیں جانب جو سڑک مڑ رہی ہے' تم اپنی ٹیکسی کو اس سڑک پر ڈال دو اور جب میں رکنے کا کہوں تو ٹیکسی روک لینا۔"

"جناب! وہ تو خاصی ویران سڑک ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کہا "اگر کوئی مارا ماری شروع ہوگئی تو چھڑانے والا بھی کوئی نہیں ملے گا۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔" میں نے سفاکی سے کہا۔

"جی۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"تم مطلب وطلب کو چھوڑو سائیں۔" میر بخش نے کہا "وجدان سائیں تم سے جو کہہ رہے ہیں' آنکھ بند کر کے اس پر عمل کرو۔"

ساحل نے کہا "کہیں واقعی آنکھ بند نہ کرلینا' ہمیں نہ سہی مگر تمہارے گھر والوں کو ابھی تمہاری بہت ضرورت ہو گی۔ آنکھیں بند کر کے ڈرائیونگ کرو گے تو سیدھے۔۔۔" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔" وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا "پتا نہیں' آج کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

میں نے کہا "اس مصیبت کا نام ہے۔۔۔ قسمت کا لکھا اور حالات کی مار۔ اگر تم چاہتے ہو' تمہاری شادی ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنا ہوگا۔۔۔ اور زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے تم بے چون وچرا ہماری بات مانتے جاؤ۔"

"مانوں گا سر' آپ لوگوں کی میں ہر بات مانوں گا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مجھے اپنی زندگی پیاری ہے۔ میں آنکھ بند کر کے آپ کے حکم کی تعمیل کا مطلب بھی سمجھتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں آپ لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

آخر کے ایک دو جملے اس نے ساحل کے جواب میں کہے تھے۔

اب تینوں گاڑیاں شاہراہِ فیصل پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے اپنی یلو کیب بائیں جانب موڑی تو اسی وقت میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ سفید شیرڈ تو ریلوے اسٹیشن سے ہمارے تعاقب میں تھی۔ اس نے ہمارے پیچھے ہی مڑنا تھا مگر نیلی ہائی روف نے بھی شیرڈ کے مڑتے ہی شاہراہِ فیصل کو چھوڑ دیا۔

لگ بھگ آدھے کلومیٹر تک یلو کیب' وہائٹ شیرڈ اور بلیو ہائی روف راشد منہاس روڈ پر آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر میں شلوار قمیص والے موٹے کے پاس ایک پسٹل دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کیا اور قسم کا اسلحہ تھا' میں نہیں جانتا تھا۔

میں نے میر بخش سے کہا "کوئی مناسب جگہ دیکھ کر ٹیکسی رکواؤں گا۔ تم موٹے سور کو کور کرنا۔ باقیوں کو میں سنبھال لوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے سائیں۔" وہ چوکنا انداز میں بولا پھر پوچھا "کیا ہم ٹیکسی کے اندر ہی رہیں گے؟"

"تم اور میں ٹیکسی سے فوراً باہر آجائیں گے۔" میں نے کہا "ساحل' بوٹا اور ٹیکسی ڈرائیور ٹیکسی رکتے ہی جھک کر سیٹوں کی آڑ میں چھپ جائیں گے تاکہ باہر سے کسی بھی قسم کی ہونے والی فوری فائرنگ سے محفوظ رہ سکیں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا اور کہا "ہم دونوں ٹیکسی سے باہر آتے ہی ٹیکسی کی آڑ لیں گے۔ تم شلوار قمیص والے موٹے شخص کو اپنی نگاہ میں رکھنا۔ ایک آدھ بندہ پھڑکانا بھی پڑ جائے تو پروا نہیں۔ ذرا چوہدری نوازش کو بھی تو پتا چلے کہ اس کے دشمن کا بیٹا کیا چیز ہے۔ اس کے ہرکاروں

نظر آ رہا تھا۔

"ہمارے "میزبانوں" نے نہایت ہی مہارت کے ساتھ اپنی کے۔ کے سیٹوں کے نیچے چھپا دیں پھر ان میں سے ایک نے پوچھا "تم لوگ کہاں جاؤ گے؟"

سوال کرنے والے کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس نے چلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا دوسرا ساتھی جینز اور ٹی شرٹ میں تھا۔ وہ پچیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے شخص کی عمر پینتیس کے لگ بھگ رہی ہو گی۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔

میں نے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے سوال کرنے والے سے سوال کر ڈالا "پہلے ہمیں تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ جب ہماری تسلی ہو جائے گی تو پھر ہم سے سوال کرنا۔"

"تم کس قسم کی تسلی چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "پہلے تو یہ بتاؤ، تم کون لوگ ہو اور شیرڈ والوں سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟"

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا "تم ہمیں خدائی فوج دار کہہ سکتے ہو اور ہم ہر اس شخص کے دشمن ہیں جو اس شہر کے امن و امان کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"گویا تم اس شہر کے ٹھیکے دار ہو!" میں نے کہا۔

"تم ایسا کہہ سکتے ہو۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا زہریلا پن شامل تھا۔ وہ مجھے بہت گہرا شخص محسوس ہوا۔

میں نے پوچھا "تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ سفید شیرڈ والے ان تینوں افراد کو تم لوگوں نے کیوں قتل کیا؟"

"وہ انسانیت کے دشمن تھے۔" اس نے اپنی کہی ہوئی بات کو دہرایا پھر مزید بتانے لگا۔ "ہم تین چار دن سے انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ دراصل ہمیں اس موٹے شخص کی تلاش تھی۔ اس نے چند روز پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے قتل اور ڈکیتی کی ایک واردات کی ہے۔ اس کے وہ ساتھی تو ہمارے ہاتھ نہیں آ سکے، چلو یہ دوسرے ساتھی ہی سہی۔ متاثرہ خاندان سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ پولیس والے تو اس موٹے تک کبھی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خود ہی انصاف کے تقاضے پورے کر دیے۔ بے کس اور پہنچ سے عاری افراد کی کون سنتا ہے بھائی۔"

میں نے کہا "تمہارا نشانہ تو وہ فربہ شخص تھا۔ باقی دو افراد کا کیا قصور؟"

"گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔" وہ سفاکی سے بولا "اس کے یہ دونوں ساتھی بھی شریف شہری نہیں ہو سکتے۔ ہم ریلوے اسٹیشن سے تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے بلکہ شیرڈ کا پیچھا کرتے ہوئے اسٹیشن تک پہنچے تھے۔ ان پر ... کرنے کا ہمیں موقع نہیں مل رہا تھا۔ ہم نے اسٹیشن ... عمارت کے باہر تمہارا اور ان کا مقابلہ دیکھا ہے۔ تم ... بہت بہادری اور جرات مندی سے ان کی پٹائی کی۔ ... تمہاری کارکردگی دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اسی وقت میں نے ... لیا تھا کہ تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ ضرور بڑھاؤں گا۔"

بات ختم ہوتے ہی اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے دوستانہ ... میں کہا "دوستی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تم ہمار... دشمنوں کے دشمن ثابت ہوئے ہو اس لیے ہمارے دوست ہی ہوئے۔"

پھر اس نے باری باری بوٹا سنگھ اور میر بخش سے ہاتھ ملایا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ ... تک صرف وہی شخص بولتا آیا تھا۔ اس کا نوجوان ساتھی ... ڈرائیور بالکل خاموش تھے اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ... ہمارے ساتھ بات چیت کرنے والا ان کا کوئی سینئر تھا۔ ہم ... ایک دوسرے کو اپنے نام بھی بتائے۔

میں نے اس سینئر کو مخاطب ہوتے ہوئے دیکھا "... ہم دوست بن ہی گئے ہیں تو پھر یہ بھی بتا دو، تم یہ سڑکوں پر ... قسم کا انصاف کرتے پھر رہے ہو۔ کوئی بھی معاشرہ اس قسم ... سماجی ٹھیکے داری کی اجازت نہیں دیتا۔ تم تو لمحہ بہ لمحہ قانون ... ہاتھ میں لے رہے ہو۔ یہ کہاں کی دانش مندی ہے؟"

"یہی تو دانش مندی ہے میرے بھائی۔" وہ معنی ... انداز میں بولا "ہمارے ملک کا مزاج تو جیسا ہے اس ... سب واقف ہیں لیکن اس شہر کا مزاج کچھ عجیب سا ہو ... ہے۔ آئے دن وارداتیں اور ہنگامہ آرائی ہوتی رہتی ... یہاں انصاف حاصل کرنا ناممکنات میں شامل ہوتا جا رہا ... اسی ناانصافی اور معاشرتی دباؤ کے باعث ہماری تنظیم ... ہوئی ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنے کے لیے کسی سماج یا قانون ... اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود مختار اور آزاد لو... ہیں۔ جب کوئی معاشرتی ناسور ہماری نظر میں آ جاتا ہے ... ہم اس کے جرم کی تصدیق کر لیتے ہیں تو پھر اس جرائم ... شخص کو موت کے گھاٹ اتارنا ہمارا اولین فرض بن ... ہے۔ ہم اس شہر کو ہر قسم کے جرم سے پاک کرنے کا عزم ... کر میدان میں اترے ہیں۔"

"تمہارے عزائم تو قابلِ ستائش ہیں۔" میں ... سراہنے والے انداز میں کہا "لیکن ان کاموں کے لیے پولیس اور عدالتیں ہر شہر میں موجود ہوتی ہیں۔ یقیناً کراچی میں بھی یہ ادارے ہوں گے!"

"اگر یہ ادارے دیانت داری سے کام کر رہے ہوتے تو پھر "سی ایف کے" کے قیام کی ضرورت پیش نہ آتی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"سی ایف کے!" میں نے حیرت سے دہرایا "یہ کیا چیز ہے بھائی؟"

اس نے بتایا "سی ایف کے ہماری تنظیم کا نام ہے یعنی۔ کرائم فری کراچی۔"

ہمارے درمیان بات چیت کے دوران میں ہائی روف نیپا چورنگی سے بائیں جانب گھوم گئی۔ اب اس کی رفتار میں قدرے کمی آ گئی کیوں کہ یہاں ٹریفک زیادہ اور بے ہنگم تھا۔

"ہم نے سفید شیرڈ والوں سے اپنی دشمنی کے بارے میں تمہیں بتا دیا۔" اسی شخص نے پوچھا۔ "دوست! تم بھی تو کچھ بتاؤ، وہ لوگ ریلوے اسٹیشن سے تمہارے تعاقب میں کیوں لگ گئے تھے اور تمہارے درمیان اسٹیشن کی سیڑھیوں پر ہاتھا پائی کس ذیل میں ہوئی تھی؟"

میں جس شخص سے باتیں کر رہا تھا، اس نے اپنا نام امتیاز علی بتایا تھا۔ اس کے نوجوان ساتھی کا نام اشتیاق احمد اور ڈرائیور کا نام بابر خان تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ انہوں نے ہمیں اپنے اصلی نام بتائے ہوں گے۔ وہ جس قسم کے کاموں میں ملوث تھے ان میں راز داری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مجھے تو اس بات پر بھی حیرت تھی کہ امتیاز مجھے اپنی تنظیم "سی ایف کے" کے بارے میں بھی بتا رہا تھا۔ اصولی طور پر تو انہیں اپنا کام کر کے جائے واردات سے فوراً فرار ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس کے بالعکس وہ نہ صرف ہمیں بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے بلکہ اپنی تنظیم کے عزائم اور مقاصد سے بھی آگاہ کیا جا رہا تھا۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر لگتا تھا۔ بہرحال، اب تو ہم ان کی گاڑی میں بیٹھ ہی چکے تھے۔ جائے وقوعہ سے فوری فرار ہماری بھی ضرورت تھی۔ اتنا مجھے احساس تھا کہ وہ لوگ ہمارے لیے نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر انہوں نے ہم سے کسی نوعیت کی دشمنی کرنا ہوتی تو وہ موقع عین مناسب تھا جب انہوں نے کے۔ کے کے برسٹ مار کر سفید شیرڈ سمیت تین افراد کو چھلنی کر دیا تھا۔

امتیاز کا سوال ایسا تھا کہ اس کا کوئی تسلی بخش جواب دیا جانا ضروری تھا ورنہ وہ لوگ ہمارے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو سکتے تھے۔ اتنی دیر میں، میں ایک موثر بیان تیار کر چکا تھا جس میں سچ زیادہ اور جھوٹ کم تھا۔

میں نے کہا "امتیاز بھائی! ہم تو بالکل سیدھے سادے لوگ ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔ ٹرین سے اترتے ہی وہ منحوس ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ پتا نہیں، انہوں نے ہمارے پاس ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ ان کی نظر ہمارے بیگ پر تھی۔ انہوں نے بیگ چھیننا چاہا تو ہمارے درمیان تھوڑی سی مارا ماری ہو گئی۔ اس کے بعد کے حالات آپ لوگوں کی نظر میں ہیں۔" ایک لمحے کو میں سانس لینے کی خاطر رکا پھر کہا۔ "بہرحال ہم ان تینوں کو نہیں جانتے۔ ہم نے انہیں زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں۔" امتیاز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہم نے اس دوران میں ان کے بارے میں تھوڑی چھان بین کی ہے۔ ان تینوں کا تعلق ایک جرائم پیشہ گروہ سے ہے جس کا سرغنہ میاں زاہد حسین نامی ایک شخص ہے۔ ان کا ٹھکانا پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کے علاقے گرین بیلٹ کے ایک بنگلے میں ہے۔ ہم براہِ راست ان کے ٹھکانے پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس میں ہماری چند تنظیمی مجبوریاں ہیں۔ تم اسے ہماری مصلحت کہہ لو۔ بہرحال، ہم کھلم کھلا ایکشن میں آ کر دوسروں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ چن چن کر جرائم پیشہ افراد کا خاتمہ کرنا ہماری پالیسی ہے۔ تم یقین کرو وجدان! چار روز قبل اس موٹے نے جس گھر میں ڈکیتی کی ہے وہاں ایک ماہ بعد لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ لڑکی کے والد نے مزاحمت کی تو انہوں نے بے دردی سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ بہت برے لوگ ہیں۔"

میں نے امتیاز سے یہ نہیں کہا، وہ اگر برے لوگ ہیں تو تم بھی کوئی اچھے کام نہیں کر رہے ہو۔ کیوں کہ "سی ایف کے" جو کچھ کر رہی تھی اس پر بحث کا دروازہ کھل جاتا تو بات بہت دور تک جا سکتی تھی اور میں ابھی اس موڈ میں نہیں تھا۔

مجھے سوچ میں مبتلا دیکھ کر امتیاز نے پوچھا "وجدان! تم کراچی میں کس کے پاس آئے ہو؟"

"یہاں کلفٹن کے علاقے میں میرے ایک عزیز رہتے ہیں۔" میں نے سوچے سمجھے پروگرام کے تحت جواب دیا "ہم ان سے ملنے آئے ہیں۔"

جس طرح نیلی ہائی روف والوں میں سے صرف امتیاز علی بات کر رہا تھا ویسے ہی ہماری جانب سے بھی صرف میں ہی بول رہا تھا اور یہ دونوں کے لیے اچھا تھا۔

امتیاز نے کہا "کلفٹن تو کراچی کا سب سے زیادہ پوش

علاقہ ہے۔ تم نے اپنے جس عزیز کا ذکر کیا ہے' وہ کیا کرتا ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"

"میرے عزیز کا نام منہاس باقر ہے۔" میں نے بتایا "وہ پبلشنگ کے شعبے سے منسلک ہے۔"

میں نے دانستہ گول مول جواب دیا تھا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ منہاس باقر ایک اخبار کا مالک ہے تو وہ ہماری طرف سے چوکنا ہو جاتا۔ پبلشنگ کا شعبہ بہت وسیع ہے لہٰذا امتیاز علی میرے جواب سے کسی تشویش میں مبتلا نہیں ہوا۔

اس نے بوٹا سنگھ والے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "وہ لوگ اسی بیگ کو تم سے چھیننا چاہتے تھے نا؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

وہ بولا "لگتا ہے' اس بیگ میں تم لوگوں نے کلو کے حساب سے سونا بھر رکھا ہے جو وہ لوگ اس کے حصول کے لیے ریلوے اسٹیشن سے تمہارا تعاقب کرتے ہوئے اتنی دور نکل آئے تھے!"

امتیاز نے یہ بات مذاق کے انداز میں کہی تھی مگر یہ حقیقت تھی کہ اس بیگ کے اندر واقعی کلو کے حساب سے سونے کا راز پنہاں تھا۔ میں نے اسی کے رنگ میں کہا۔

"امتیاز! وہ لوگ جتنی دور آئے تھے' آئے ہی تھے لیکن تم نے انہیں جتنی دور پہنچا دیا ہے اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ان کی واپسی کے امکانات اب صفر کے برابر ہیں۔"

"انہیں ایک نہ ایک دن حرام موت مرنا ہی تھا۔" وہ سفاکی سے بولا "اور وہ دن آج کا نکل آیا۔ اس میں نہ تو ہمارا کوئی کمال ہے اور نہ ہی ان کی کوئی بے وقوفی۔"

میں نے اس کے بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

وہ دوبارہ بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا تم یہ بیگ کھول کر مجھے دکھا سکتے ہو۔"

اس کے سوال سے واضح تھا کہ دوست کہنے کے باوجود وہ ہم پر شک کر رہا تھا۔ میں نے کہا "اس میں صرف نجی استعمال کی چیزیں ہیں۔ ان لوگوں کو پتا نہیں کیا غلط فہمی ہو گئی تھی جو ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے تھے۔"

"معاف کرنا دوست!" امتیاز ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "میری دوستی کو شک کی نظر سے نہ دیکھنا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے تجسس سے مجبور ہوں۔ اس بیگ کو کھول کر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے خفگی آمیز انداز میں کہا "اگر تمہیں واقعی دوست کی زبان پر اعتبار نہیں تو لو' خود ہی اس کا معائنہ کر لو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے بیگ امتیاز کی جانب بڑھا دیا۔

مجھے یقین تھا کہ اسے بیگ میں سے کوئی بھی اعتراض" شے نہیں ملے گی۔ ڈائری کے مندرجات غور سے نہ پڑھا جاتا تو کچھ پلے نہیں پڑ سکتا تھا۔

میرے تیور سے وہ خجل سا ہو گیا اور اسی خجالت تھا کہ اس نے بیگ کی سرسری تلاشی لے کر اسے حوالے کر دیا اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا "پاگل لوگ احمق کہیں کے۔ گدھے کے بچے!"

میں نے طنزیہ انداز میں کہا "دوست! میری با تصدیق ہو گئی یا کوئی اور ثبوت بھی فراہم کرنا ہو گا؟"

"میں نے کہا تھا نا' میری بات کا برا نہ منانا۔" ا کہا "لیکن لگتا ہے' تم میری اس حرکت پر ناراض ہو۔"

"خیر' چھوڑو اس بات کو۔" میں نے مسکراتے ہو "جب تمہیں دوست کہہ دیا ہے تو پھر برا کیا منانا۔" ایک کو رک کر میں نے استفسار کیا "ہمیں کہاں ڈراپ کرو امتیاز؟"

"تم کہو تو کلفٹن ہی چھوڑ آئیں!" وہ فراخ دلی سے

"نہیں' اتنی زحمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے سے کہا "تم ہمیں جائے وقوعہ سے بہ حفاظت نکال لا یہی تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ اپنے ٹھکانے پر ہم خود جائیں گے۔ تم ہمیں کسی ایسی جگہ اتار دو جہاں سے بہ ٹیکسی مل جائے۔"

وہ گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا "ہم اس وقت منڈی سے گزر رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہیں' ہم آپ لوگ بہادر آباد کے چوراہے پر ڈراپ کر دیتے ہیں۔ اس کے آپ جہاں جانا چاہیں' چلے جائیں۔ ٹھیک ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

دراصل میں جلد از جلد ان سے جان چھڑانا چاہتا وہ اگرچہ بالکل دوستانہ ماحول میں گفتگو کر رہا تھا تاہم میں اس کی کہی ہوئی باتوں پر زیادہ اعتبار نہیں کیا۔ موقع وار سے فوری روپوشی ناگزیر نہ ہوتی تو میں ان کے ساتھ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر واقعی ان کا تعلق کسی ا تنظیم سے تھا تو اب تک امتیاز نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا' وہ اسے ہرگز ہرگز نہیں بتانا چاہیے تھا۔ بھی کھیل' کھیل رہے تھے فی الحال میں اس کی تہ میں نہیں پایا تھا۔

نیلی ہائی روف ایک بارونق چوراہے کے قریب گئی۔ امتیاز نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "وجدان! اگر

سے دوستی کی ہے تو اس کی لاج بھی رکھنا۔"

"تم مجھ سے ایسا اسپیشل کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"راز کی حفاظت۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا "مجھے نہیں لگتا کہ دوبارہ ہماری ملاقات ہو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں تمہاری تنظیم کے بارے میں لوگوں کو بتا دوں۔ کون ہے جو میری بات کا یقین کرے گا؟ "سی ایف کے" کے بارے میں کہی ہوئی میری باتوں کو سپر فکشن سمجھا جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان! کسی کو تمہاری بات کا یقین نہیں آئے گا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "مگر ہماری دوستی میں فرق ضرور آجائے گا۔ میں تم پر بھروسا کر کے تمہیں جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ تم مجھے ایک شریف انسان لگے ہو۔ مجھے امید ہے' تم بھی شرافت کا مظاہرہ کرو گے۔ میں تمہاری دوستی کو کھونا نہیں چاہتا۔ خدا حافظ!"

آخری الفاظ اس نے جذباتی انداز میں ادا کیے اور ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔ ہم تینوں نے اس سے مصافحہ کیا اور گاڑی سے باہر آگئے۔

میں نے امتیاز کی جانب دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا "وش یو گڈ لک!"

سلائیڈنگ ڈور اپنی مخصوص آواز کے ساتھ بند ہوا اور نیلی ہائی روف ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

"یہ کس قسم کے مجرم ہیں سائیں؟" میر بخش نے جاتی ہوئی ہائی روف کی جانب دیکھتے ہوئے تعجب خیز انداز میں کہا۔

میں نے کہا "مجرموں کی ہزاروں اقسام ہیں مگر اتنے شریف النفس مجرم میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے۔ وہ تو انصاف اور امن و امان قائم کرنے کے بھی دعوے دار ہیں۔"

"ان پر ریسرچ بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔" ساحل نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا "فی الحال تو پیٹ پوجا کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ مجھے تو بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔"

اس وقت لگ بھگ دوپہر کے دو بجے ہوں گے۔ یہ لنچ کا وقت تھا اور ساحل تو ویسے بھی بھوک کی کچی تھی۔ میں نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی تو تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک باربی کیو ریسٹورنٹ نظر آگیا۔ میں نے اس سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا "چلو' وہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کھانا بھی کھائیں گے اور گپ شپ بھی ہوتی رہے گی۔"

ہم چاروں چلتے ہوئے مذکورہ ریسٹورنٹ میں آگئے۔ وہ خاصا صاف ستھرا اور معیاری ریسٹورنٹ تھا۔ ایک جانب ڈائننگ ہال بنا ہوا تھا' اس کے علاوہ فیملی کیبن کا انتظام بھی تھا۔ ہم ایک کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ ایک مناسب سی میز کے دونوں جانب صوفہ نما بڑے سائز کی سیٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک سیٹ پر دو افراد بہ آسانی بیٹھ سکتے تھے۔ میں اور ساحل ایک سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ دوسری سیٹ پر میر بخش اور بوٹا سنگھ نے سنبھال لی۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد ہم باتوں میں لگ گئے۔ موضوعِ گفتگو "سی ایف کے" ہی تھی۔

ساحل نے کہا "مجھے تو ایک فی صد یقین نہیں کہ ان کا تعلق ایسی ویسی تنظیم سے ہے۔"

"ہاں سائیں!" میر بخش تائیدی انداز میں بولا "اس قسم کے خطرناک لوگ تو نہ کسی کو لفٹ دیتے ہیں اور نہ ہی اپنے جرم کے عینی شاہدوں کو یوں آسانی سے جانے دیتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ کیا۔"

بوٹا سنگھ بولا "ان کے رویے پر مجھے خود حیرت ہے۔ انہوں نے چوہدری نوازش علی کے تینوں بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ ان کے دشمن ہیں مگر ہم سے دوستی کرنے کے لیے انہوں نے جس طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔"

میں نے اس الجھن کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیا اور بوٹا سنگھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "بوٹا سنگھ! تم نے میرے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ میں تمہارے اس ایثار کا کوئی بدلہ بھی چاہوں تو نہیں دے سکتا۔ البتہ جو کچھ میں تمہارے لیے کر سکتا ہوں مجھے بتاؤ' میں ضرور کروں گا۔"

"وجدان! اچھی بات تو یہ ہے کہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔" وہ معتدل انداز میں بولا "میرے آنجہانی دوست خشونت سنگھ نے یہ ڈائری مجھے بھجوائی اور اس کی حفاظت کی ذمے داری سونپی۔ میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔"

"اس فرض کی ادائی میں تمہیں اپنا گھر چھوڑ کر لاہور سے کراچی آنا پڑا۔" میں نے کہا "اور اس طرح آنا پڑا کہ تمہیں اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔"

"پروا نہیں ہے وجدان!" وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "لاہور میں کرائے کا گھر تھا۔ چھوٹ گیا تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ البتہ یہ ہے کہ میری جمی جمائی لائف ختم ہو گئی۔ اب میں کبھی اس طرف کا رخ نہیں کر سکوں گا۔ چوہدری نوازش کے بندے میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔"

ساحل نے کہا "اور تمہاری بو کا کچھ حصہ چوہدری نے یہاں کراچی بھی بھیج دیا۔ تین سونگھنے والے ریلوے اسٹیشن پر تمہارے استقبال کے لیے موجود تھے۔"

"خدا کا شکر ہے' وہ تینوں شیطان جہنم واصل ہوئے۔" میر بخش نے کہا "مجھے ان کے انجام سے خاصا اطمینان ہوا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی تعداد کچھ تو کم ہوئی۔"

میں نے کہا "ہاں' کچھ کم تو ہوئی مگر ختم نہیں ہوئی۔ نیلگری کی اطلاع کے مطابق چوہدری کا ایک نیٹ ورک کراچی میں سرگرم ہے پھر امتیاز علی نے بھی بتایا ہے کہ وہ تینوں مجرم جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں' اس کا سرغنہ میاں زاہد حسین نامی ایک شخص ہے۔ جس کا ٹھکانا گرین بیلٹ کے علاقے میں ہے۔ شاید اسی نیٹ ورک کا ذکر نیلگری نے کیا تھا۔"

میر بخش نے کہا "سائیں! ہم چوہدری کے خاص بندے میاں زاہد حسین کی سرکوبی کے لیے پی سی ایچ ایس میں اس کے ٹھکانے کا سراغ لگا سکتے ہیں۔"

"بہ وقتِ ضرورت یہ کام ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔

اسی وقت ہمارا آرڈر پلیس کر دیا گیا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بیگ میں سے وہ ڈائری نکال لی جس کی خاطر یہ سارا کھٹ راگ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے ڈائری کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بہ غور دیکھا پھر چوم کر آنکھوں سے لگایا۔ میں اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس ڈائری میں کثیر المالیت سونے کا راز رقم تھا بلکہ میرے جوش اور جذبات کا تعلق ماضی کی یادوں سے تھا۔ وہ ڈائری میرے والد عابد علی سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے باپ نے مجھے کتنی محبت سے پالا تھا' کتنی توجہ دی تھی انہوں نے مجھے۔ اس عرصے کا ایک ایک لمحہ میری نگاہ میں گھوم رہا تھا۔ میں ایک سفید نیپکن میں لپٹا ہوا تھا جب وہ مجھے پاکستان سے لے کر سنگاپور پہنچے تھے۔ دو ماہ کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ چوہدری نوازش علی کے جبر نے میرے والدین کو پاکستان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ ان لمحات میں میری ماں پر کیا گزری ہوگی' انہوں نے کیسے کیسے صدمے اٹھائے ہوں گے' ان کے تصور ہی سے میری روح کانپ اٹھتی تھی۔ چوہدری ہی کے بھیجے ہوئے انٹرنیشنل غنڈے وارا نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ میرے والدین کو ہولناک موت سے دوچار کیا تھا۔ میں اس خوں چکاں واقعے کا عینی شاہد تھا۔ وہ میری باشعور زندگی کا پہلا اپ سیٹ تھا اور ابھی تک میں اس سانحے سے نکل نہیں سکا تھا۔ مجھے سیٹ اپ ہونے میں نہ جانے اور کتنا وقت لگنا تھا!

یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اگر میں ماضی کے اس ریلے میں بہہ جاتا تو پتا نہیں' کہاں سے کہاں پہنچ جاتا لہٰذا میں نے سرخ جلد والی اس ڈائری کو اپنی گود میں رکھا اور بوٹا سنگھ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"بوٹا سنگھ!" میں نے گمبھیر آواز میں اسے مخاطب کیا "آج تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ڈائری والی امانت میرے پاس پہنچ گئی ہے۔ اب تمہارا آئندہ کیا پروگرام ہے؟"

"میں اپنے دوست کے پاس جاؤں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"وہی دوست جو گارڈن ویسٹ کے علاقے میں رہتا ہے؟"

"جی ہاں' میں اس کے پاس آنے کے لیے ہی لاہور سے نکلا تھا۔" اس نے بتایا "میں جب بھی کراچی آتا ہوں تو اسی کے پاس ٹھہرتا ہوں۔ وہ بہت قابلِ بھروسا آدمی ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا تم نے اپنے دوست کو اپنے کراچی آنے کی اطلاع دی تھی؟"

"میں نے جس افراتفری میں لاہور چھوڑا اس میں اطلاع دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔" وہ بولا "میں کئی مرتبہ یہاں آچکا ہوں۔ شمشاد علی کے گھر کا راستہ مجھے معلوم ہے۔ میں بہ آسانی اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "تمہارا یہ دوست شمشاد کرتا کیا ہے؟"

"ایک پرائیویٹ ادارے میں اکاؤنٹنٹ ہے۔"

"اس کے بیوی بچے بھی ہوں گے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "جی' شمشاد کے دو بچے ہیں۔ وہ گارڈن ویسٹ کے علاقے "البیلا" کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا ہے۔ اس کی رہائش تین کمرے والے ایک فلیٹ میں ہے۔"

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "پھر میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اپنے دوست شمشاد کے بیوی بچوں پر رحم کھاؤ اور فی الحال ادھر کا رخ نہ کرو۔ چوہدری نوازش کے بندوں کو یہ بات بتائی گئی تھی کہ تم اپنے کسی دوست کے پاس گارڈن ویسٹ جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ جب وہ یہاں تک معلومات رکھ سکتے ہیں تو پھر ان کے لیے یہ جاننا ہرگز مشکل نہیں ہوگا کہ تمہارا دوست گارڈن ویسٹ میں کہاں اور کس فلیٹ میں رہتا ہے۔ اگر تم وہاں گئے تو شمشاد کسی بہت بڑی مصیبت میں

مبتلا ہو جائے گا۔"

یہ بات مجھے نیلگری نے بتائی تھی کہ چوہدری نوازش نے اپنے بندوں کو احکام صادر کر رکھے ہیں کہ بوٹا سنگھ اسٹیشن سے نکل کر گارڈن ویسٹ نہ پہنچنے پائے۔ فوری طور پر اس سے وہ قیمتی ڈائری چھین لی جائے چاہے اس ڈائری کے حصول کے لیے بوٹا سنگھ کی جان ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ نیلگری کی معلومات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چوہدری کے بندے بوٹا سنگھ سے ڈائری حاصل کر سکے تھے اور نہ ہی اس کی جان لینے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ایک ناگہانی نے ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ اب یہ معاملہ اور بھی زیادہ حساس اور اہم ہو گیا تھا۔ چوہدری نوازش کا جو نیٹ ورک کراچی میں کام کر رہا تھا۔ وہ صرف انہی تینوں افراد پر مشتمل نہیں تھا جو یہ سمجھا جاتا کہ کہانی ختم' پیسا ہضم۔ "سی ایف کے" کے اہل کار امتیاز علی نے مجھے بتایا تھا کہ شیرڈ والوں کا سرغنہ میاں زاہد حسین تھا۔ گویا وہ چوہدری کے نیٹ ورک کا بندۂ خاص تھا۔ میاں زاہد ہی ڈائری کے معالے کو آپریٹ کر رہا ہو گا۔ وہ اپنے بندوں کی ہلاکت پر خاموش نہیں بیٹھ جاتا بلکہ ہمیں گھیرنے' ہم سے ڈائری چھیننے اور اپنے بندوں کا انتقام کی خاطر وہ ہماری تلاش میں کراچی کا چپا چپا چھان سکتا تھا۔ گویا ہمارے لیے بہت ساری ہنگامہ خیزیاں تیار تھیں۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بوٹا سنگھ نے سوال کیا "آپ نے یہاں کے جو حالات بتائے ہیں' وہ بہت تشویش ناک اور گمبھیر ہیں۔ مجھے واقعی شمشاد کے پاس نہیں جانا چاہیے۔" پھر وہ پریشان نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے پوچھا "تمہارے پاس شمشاد کا کوئی کانٹیکٹ نمبر تو ہو گا؟"

"ہاں میرے پاس اس کے گھر اور دفتر کے فون نمبرز ہے۔"

"فی الحال تم شمشاد کے پاس نہیں جاؤ۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "وہاں جانا تمہارے لیے اور شمشاد کی فیملی کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے البتہ تم فون پر اسے اپنی آمد کی اطلاع ضرور دے دو اور اسے واضح الفاظ میں یہ بھی بتا دو کہ تم کسی ناگزیر وجہ کی بنا پر اس سے نہیں مل سکتے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا "کیا تمہارا دوست شمشاد ڈائری کے راز میں تمہارا شریک ہے؟"

"نہیں، قطعی نہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا "یہ راز پاکستان میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ خشونت سنگھ میرا بہت اچھا دوست تھا۔ میں اس کے راز کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے وہ میرا کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "ٹھیک ہے' پھر تم شمشاد کو اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔ تمہاری کسی چتا کے بارے میں سن کر وہ بے چارہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گا بلکہ تم اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہ دو۔ جب تک حالات سازگار نہیں ہو جاتے' تمہیں کوئی سرگرمی دکھانے کی ضرورت نہیں۔"

"اور حالات کے سازگار ہونے تک میں کہاں جاؤں؟" بوٹا سنگھ نے پوچھا "واپس لاہور تو جا نہیں سکتا اور کراچی میں شمشاد کے سوا میرا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔"

میں نے کہا "فی الحال تم کسی درمیانے درجے کے ہوٹل میں ٹھہر جاؤ۔ ہم آپس میں رابطہ رکھیں گے۔ جیسے ہی کوئی مناسب اور موزوں صورتِ حال سامنے آئی' ہم کوئی اہم فیصلہ کر لیں گے۔" پھر میں نے دوستانہ انداز میں اس سے پوچھا "اس وقت تمہاری مالی پوزیشن کیا ہے؟"

"میرے پاس کچھ رقم ہے۔" وہ میرے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولا "پانچ ہزار روپے میں کافی دن تک میں بہت اچھا گزارہ کر سکتا ہوں۔ ادھر صدر میں درمیانے درجے کا ایک ہوٹل ہے جہاں میں پہلے بھی دو مرتبہ ٹھہر چکا ہوں۔ آپ کے مشورے کے مطابق فی الحال وہیں قیام کر لیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا "اس عارضی قیام کے دوران میں تم اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر لو۔ آئندہ زندگی کی پلاننگ کے سلسلے میں تمہیں جہاں بھی میری مدد کی ضرورت پیش آئی' میں تمہارے کام آ کر بہت خوشی محسوس کروں گا۔"

پھر میں نے اس سے اس ہوٹل کا نام و پتا پوچھا جہاں وہ قیام کا ارادہ رکھتا تھا۔ مذکورہ ہوٹل صدر کے قلب میں واقع تھا۔ میر بخش اپنے سابق آقا وڈیرا اکبر سومرو کے ساتھ کئی مرتبہ صدر آ چکا تھا اور اس ہوٹل سے واقف بھی تھا۔

کھانا ختم ہو چکا تو بوٹا سنگھ ہم سے رخصت کی اجازت مانگنے لگا۔ میں نے اپنی جیب میں سے پانچ ہزار کے نوٹ نکال کر بوٹا سنگھ کی طرف بڑھا دیے۔ "یہ رقم بھی اپنے پاس رکھ لو۔ پیسا خرچ ہوتے ہوئے کچھ پتا نہیں چلتا۔ یہ روپے تمہارے کام آئیں گے۔ میں بہت جلد تم سے رابطہ کروں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔"

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے رقم رکھ لی۔ میں نے کہا "احتیاطاً تم مجھے شمشاد کے فون نمبرز اور گھر کا ایڈریس نوٹ کرا دو۔ کسی انتہائی ضرورت کے وقت کام آئے گا۔"

اس نے اپنے سفری بیگ میں سے کاغذ قلم نکال کر میری مطلوبہ معلومات تحریری شکل میں مجھے فراہم کر دیں۔ شمشاد علی جس پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھا' اس کا دفتر آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع تھا۔ تھوڑی دیر بعد بوٹا سنگھ ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! اپنے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے اپنے بارے میں تو کبھی بھی نہیں سوچا۔" میں نے روا روی میں جواب دیا۔

"میں قیام کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "ابھی سہ پہر ہے' یہ سہ پہر ہمیشہ نہیں رہے گی۔ شام آئے گی اور پھر رات ہو جائے گی۔ ہم یونہی مارے مارے تو نہیں پھر سکتے ہمیں اپنے لیے کوئی ٹھکانا کرنا ہو گا۔ جس قسم کے حالات سے ہم گزر رہے ہیں' ان کا تقاضا تو یہی ہے کہ ہمارے پاس ایک محفوظ اور مضبوط قیام گاہ ہونا چاہیے۔"

"محفوظ اور مضبوط قیام گاہ!" میں نے ساحل کے کہے ہوئے الفاظ زیرِ لب دہرائے۔

میر بخش چونک اٹھا' اس نے کہا "سائیں! سب سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ٹھکانا تو ہمیں قاضی سلطان کا دوست ہی فراہم کر سکتا ہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں منہاس باقر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ وہ کراچی کی ایک معروف اور طاقت ور شخصیت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو میر بخش۔" یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"وجدان! تم کہاں جا رہے ہو؟" ساحل نے پوچھا۔

"منہاس باقر سے رابطہ کرنے۔" میں نے جواب دیا پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا "اس ریسٹورنٹ کے برابر میں' میں نے ایک "پی سی او" دیکھا تھا۔ تم لوگ یہیں بیٹھو۔ میں قاضی سلطان کے دوست کو فون کر کے آتا ہوں۔"

پھر میں فیملی کیبن سے نکل کر ریسٹورنٹ سے باہر آ گیا۔ اپنی جیب میں سے میں نے وہ پرچہ نکالا جس پر منہاس باقر کے بنگلے کا ایڈریس' اس کے گھر اور دفتر کے فون نمبرز قاضی نے مجھے لکھ کر دیے تھے۔ اسی کاغذ کے ایک کونے میں قاضی سلطان کا فون نمبر بھی درج تھا۔ اس نمبر پر نگاہ پڑتے ہی میرا دھیان "نبی سر" کی طرف چلا گیا۔

ہم رات کے آخری پہر قاضی کی حویلی سے بڑے پراسرار انداز میں روانہ ہوئے تھے۔ نیلگری کی زبانی وہاں پیش آنے والے حالات کے بارے میں مجھے پیشگی جو معلومات حاصل ہوئی تھیں' وہ بہت سنسنی خیز تھیں۔ موٹی توند والا مرتشی ڈی ایس پی قاضی کی حویلی پر ریڈ کر کے مجھے "رنگے ہاتھوں" پکڑنے والا تھا۔ ہوس پرست بدنیت ڈی ایس پی کا منصوبہ کس طرح خاک میں مل گیا ہو گا' یہ جاننے کے لیے میں بے چین ہو گیا۔ میں تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا' ڈی ایس پی مجھے حویلی میں نہ پا کر اپنے بال نوچ رہا ہو گا۔ میں ایک مرتبہ پھر اسے چوٹ دے آیا تھا۔ وہ اپنے زخم چاٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

نیلگری اگر بروقت مجھے حالات کی سنگینی کے بارے میں آگاہ نہ کرتی تو میں بیٹھے بٹھائے ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ نیلگری کے تعاون اور راہنمائی سے میں نے ڈائری بھی حاصل کر لی تھی اور خود سمیت اپنے ساتھیوں کی جان بچانے میں بھی کامیاب رہا تھا۔

نیلگری نے ہمیشہ مجھے فائدہ پہنچایا تھا لیکن اس کی مدد حاصل کرتے ہوئے میں ایک بے نام سے اضطراب میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا' میں کوئی ننھا بچہ ہوں اور نیلگری کسی تجربہ کار جہاں دیدہ عورت کی طرح مجھے گائیڈ کر رہی ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی ہے اور قدم قدم پر میری مدد کر رہی ہے۔ مجھے لگتا جیسے میں اس کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہوں۔

یہی احساس مجھے بے چین اور مضطرب رکھتا تھا۔ میں ابتدائی عمر ہی سے اپنی مرضی کا مالک تھا۔ من مانیاں کرتا آیا تھا۔ لڑکپن ہی میں دارا جیسے منجھے ہوئے شخص سے میرا پالا پڑا تھا اور میں اس سے نمٹتا رہا تھا۔ میں نے اکثر دوسروں کی مدد کی تھی' ان کے کام آیا تھا۔ شاید خود مختار اور آزاد زندگی گزارنے کے سبب میرا مزاج ایسا بن گیا تھا کہ نیلگری کی مدد اور گائیڈنس سے میں الجھ جاتا تھا اور مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا تھا' نیلگری سے مدد نہیں لوں گا لیکن پھر وہ چھم سے میرے حالات میں اس طرح کودتی تھی کہ میں اس کی بات ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا۔ پتا نہیں' وہ مجھ سے کیا کیا منوانا چاہتی تھی۔ آثار تو بہت سنسنی خیز اور تشویش ناک تھے۔ بعض اوقات میں اس کے عزائم کے بارے میں سوچ کر ایک مخمصے میں پڑ جاتا۔ گزشتہ رات والی ملاقات میں تو وہ کھل گئی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں مجھ سے محبت کا دعویٰ کیا اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ اس کے سوا اور کوئی عورت میری خلوت کی ساتھی نہیں بن سکتی۔ میرے زہریلے پن کے بارے میں اس نے جو

انکشاف کیا تھا اسے رد کرنا حقیقت کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔

میں نیلگری کے سنگین خیالات کو ذہن میں بسائے "پی سی او" میں داخل ہوگیا۔ ساحل اور میر بخش سے میں یہ کہہ کر آیا تھا کہ منہاس باقر کو فون کروں گا لیکن یہاں پہنچ کر میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے آپریٹر سے قاضی سلطان کی حویلی کا نمبر ملانے کو کہا۔ لاشعوری تجسس نے مجھے وہاں کے حالات جاننے کے لیے مجبور کردیا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد آپریٹر نے چھوٹے سے بوتھ میں رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا "آپ کا نمبر مل گیا ہے' بات کرلیں۔"

میں نے بوتھ کا دروازہ بند کرکے ریسیور اٹھالیا۔ "ہیلو" کے جواب میں قاضی سلطان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ فوراً مجھے پہچان گیا اور ہیجان خیز لہجے میں بولا۔

"سائیں! تم کہاں ہو؟"

"میں کراچی میں ہوں۔" میں نے بتایا "اور بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ اپنی سنائیں؟"

وہ پرجوش انداز میں بولا "سائیں! یہاں تو خوب ہنگامہ خیزی رہی۔ شادی پلی والے ڈی ایس پی نے نبی سر کے تھانا اِن چارج کی مدد سے میری حویلی پر دھاوا بول دیا تھا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے پوچھا "مگر تم راتوں رات اپنے ساتھیوں کو لے کر کہاں غائب ہوگئے تھے؟"

"قاضی صاحب! آپ کو بتائے بغیر میرے اچانک چلے آنے سے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

وہ جلدی سے بولا "نن۔۔۔ نہیں بلکہ تم لوگوں کی غیر موجودگی میں حالات کو ہینڈل کرنا میرے لیے آسان ہوگیا تھا۔"

"اسی لیے تو میں وہاں سے نکل آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"او خدا کے بندے۔ اگر تمہیں جانا ہی تھا تو مجھے بتا کر بھی جاسکتے تھے' وہ میٹھی ناراضی سے بولا "میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "قاضی صاحب! آپ کو بتانے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ مجھے ایک بے چینی سی لگی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار وارن کررہی تھی کہ مجھے صبح ہونے سے پہلے وہاں سے نکل آنا چاہیے ورنہ کینہ پرور ڈی ایس پی کوئی بھی مصیبت کھڑی کرسکتا ہے۔ میں نے اپنے خدشات کے بارے میں آپ کو بھی بتایا تھا۔"

"ہاں' مجھے یاد ہے۔ تم نے اس سلسلے میں بات کی تھی۔" وہ تائید کرتے ہوئے بولا "مگر میں سمجھ رہا تھا' میرا ایس پی اس معاملے کو سنبھال لے گا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ وہ بدذات ڈی ایس پی اپنے خیر خواہ ڈی آئی جی تک پہنچ جائے گا۔ ڈی ایس پی کے کمینے پن نے حالات کو بگاڑ دیا۔ میرا سالا بھی اسی وجہ سے رات کے کھانے پر نہیں آسکا۔ وہاں عمر کوٹ میں اونچے پیمانے پر میٹنگز چل رہی تھیں۔"

"بہرحال' یہ بتائیں قاضی صاحب! ڈی ایس پی کے ... کے کیا نتائج رہے۔" اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا

وہ اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولا "سب کچھ خیریت سے نمٹ گیا۔ تم لوگوں کی غیر موجودگی نے معاملہ بالکل صاف اور سیدھا کردیا تھا۔ پولیس کے سامنے میں نے وہی کہانی پیش کی جو ہمارے درمیان طے ہوئی تھی۔ تم اور تمہارے ساتھی "کٹ" ہوگئے۔ میں نے سارا ملبا وڈیرا اکبر سومرو پر ڈال دیا۔ اسی کے ایما پر منگل سنگھ نامی ایک ڈاکو نے میری بیٹی ممتاز کو اغوا کیا تھا۔ مقامی تھانے دار میرے اور سومرو کے درمیان سال ہا سال سے چلنے والی دشمنی سے واقف ہے پھر اس کے تھانے میں ممتاز کے اغوا کی رپورٹ بھی درج تھی۔ میں نے یہی موقف اختیار کیا کہ میرے آدمیوں نے وڈیرا اکبر اور اس کے ساتھی تارا پر قابو پا کر ممتاز کو ان کے قبضے سے نکالا ہے۔ منگل سنگھ ڈاکو اور اس کے ساتھی گنڈا سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔" وہ لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر تم لوگ حویلی میں موجود ہوتے تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ اس صورت میں ڈی ایس پی کی مراد بر آتی اور وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوجاتا گویا اس کی کہانی ہٹ اور میری کہانی فلاپ ہوجاتی۔"

میں نے پوچھا "وڈیرا اکبر سومرو اور تارا کا کیا بنا؟"

"بننا کیا تھا' میں نے انہیں پولیس کے حوالے کردیا۔" قاضی سلطان نے بتایا "اس موقع پر ممتاز کی گواہی بہت کام آئی۔ اس نے تمہاری حمایت میں' میری بیان کردہ کہانی کی تصدیق کردی۔ مغوی نے جب وڈیرا اکبر کو اس اغوا کا ذمے دار ٹھہرادیا تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ واقعات اور شواہد بھی وڈیرے کے خلاف جارہے ہیں پھر ایس پی کی درپردہ حمایت بھی مجھے حاصل ہے۔ جو بھی ہوگا' میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔ وڈیرے کا جو کچھ بھی ہونا ہے وہ پولیس ہی کرے گی۔"

"گویا آپ نے ان دونوں کو آزاد کردیا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

وہ چونک کر بولا "تم کیا کہنا چاہتے ہو وجدان!"

میں نے کہا "اکبر سومرو جیسے بھوتار وڈیرے پولیس کی تحویل میں آزاد ہی تصور کیے جاتے ہیں۔ اس وقت تو حالات پوری طرح اس کی مخالفت پر کمربستہ تھے اس لیے وہ قابو آگیا لیکن مجھے امید ہے' وہ کوئی نہ کوئی ذریعہ استعمال کرکے خود کو اور اپنے مہمان دوست تارا کو بچالے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے ڈی ایس پی کی حمایت بھی حاصل ہے۔"

قاضی سلطان نے کہا "عام حالات میں' کسی عام آدمی کے ساتھ ایسا ہوسکتا ہے' لیکن میں نہ تو عام آدمی ہوں اور نہ ہی موجودہ حالات کو عام کہا جاسکتا ہے۔ میں آسانی سے وڈیرے کو چھوٹنے نہیں دوں گا۔"

"اللہ کرے' ایسا ہی ہو۔" میں نے قاضی سلطان سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ پورے وثوق سے بولا "وجدان! تم دیکھ لینا۔ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔"

میں ٹیلی فون پر بات تو قاضی سلطان سے کررہا تھا لیکن میری چشمِ تصور میں مدھوری ڈکشٹ کے سراپا والی وہ دلکش و دلنشین لڑکی گھوم رہی تھی جس کا نام ممتاز تھا۔ وہ قدم قدم پر میری حمایت پر کمربستہ تھی۔ اس کی صورت تو متاثر کن تھی ہی' اس کا عمل بھی مجھے بہت متاثر کررہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ سامنے آنے کے بعد حویلی کے کسی نہایت خفیہ حصے میں جا چھپی تھی اور وہیں بیٹھ کر میرا کیس لڑرہی تھی۔ عجیب احسان شناس لڑکی تھی وہ!

ریسیور میں ابھرنے والی قاضی سلطان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ "وجدان! ایک بات سچ سچ بتاؤ۔"

"ہاں پوچھیں' آپ سے دوستی کی ہے تو بات بھی بتانا پڑے گی۔" میں نے محتاط انداز میں کہا۔

اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا "کیا تم کوئی جادو وادو بھی جانتے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں' آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں!"

وہ بولا "چلو' یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ تمہیں ڈی ایس پی سے کسی انتقامی کارروائی کی توقع تھی۔ حالات و واقعات سے تم اس قسم کا اندازہ قائم کرسکتے ہو مگر یہ کیسے ممکن ہوا کہ تم میری حویلی سے چپ چپاتے نکل گئے اور میرے ملازمین کو خبر تک نہ ہوئی۔ پہرے دار میرے برسوں کے آزمائے ہوئے ہیں۔ میں ان کی فرض شناسی اور مستعدی کا بھی قائل ہوں۔ اگر تم لوگ ان کی لاعلمی میں حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ایک چمتکار ہی ہے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم کوئی ایسا علم یا عمل جانتے ہو' جس کی مدد سے ناممکن کام ممکن ہوجاتا ہے۔"

میں نیلگری کی ذات کو قاضی سلطان کے سامنے اوپن نہیں کرنا چاہتا تھا اور وہ جہاں دیدہ سرد و گرم چشیدہ شخص کسی بہلاوے میں نہیں آسکتا تھا لہٰذا میں نے اپنا بھرم رکھنے کی خاطر کہا۔

"قاضی صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں چند ایسے شعبدے جانتا ہوں جن کی مدد سے بعض کام بہ آسانی ہوجاتے ہیں۔ آپ اسے ہاتھ کی صفائی یا نظربندی کی تکنیک سمجھ لیں مگر میں نہ تو کسی قسم کا جادو جانتا ہوں اور نہ ہی کوئی عامل کامل ناگی باوا ہوں۔"

دوسری جانب لمحاتی خاموشی رہی پھر قاضی سلطان نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "چلو' میں تمہاری بات کا یقین کرلیتا ہوں لیکن اس واقعے کو کس خانے میں فٹ کروگے؟" پھر خود ہی اس نے اپنے سوال کی وضاحت کردی۔ "میرا اشارہ اس رقم کی جانب ہے جو کل ہمیں اکبر سومرو کی پجارو سے ملی تھی۔ بہ حفاظت رکھنے کے باوجود بھی وہ پچاس ہزار روپے غائب ہوگئے۔"

میں اس کے سوال سے گڑبڑا گیا۔ یہ سب نیلگری کا چلایا ہوا چکر تھا۔ اس نے منگل سنگھ والی رقم مجھ تک پہنچادی اور قاضی سلطان کے پاس موجود رقم کو حاصل کرکے منگل سنگھ کو دے دیا ہوگا۔ اس نے بہ قول منگل سنگھ' وعدہ کیا تھا کہ واپسی پر اسے اس کی رقم مل جائے گی۔ یقیناً نیلگری ہی نے اپنی قوت سے قاضی سلطان کے پاس محفوظ رقم کو غائب کیا تھا۔ میری یہ مجبوری تھی کہ میں قاضی سلطان کو نیلگری کے راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ پھر بحث کے کئی دروازے کھل جاتے اور میری ذات اہم سے اہم تر ہوتی چلی جاتی۔ میں فی الحال کسی نئی مہم جوئی کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے قاضی سلطان کو گول مول جواب دیا۔

"قاضی صاحب! آپ بھی عجیب باتیں کررہے ہیں۔ اگر آپ کے پاس سے پچاس ہزار روپے کی رقم غائب ہوگئی ہے تو اس میں میرا کوئی کمال کس طرح ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے' آپ اور کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ انسان سے بھول چوک تو ہو ہی جاتی ہے۔"

وہ میری وضاحت سے مطمئن تو نہ ہوا مگر بندہ وہ خاصا

سمجھ دار تھا۔ اس نے میرے اسٹائل سے بھانپ لیا کہ میں اس سلسلے میں کھلنا نہیں چاہتا اس لیے وہ بات بدلتے ہوئے بولا۔

"خیر چھوڑو۔ میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ فی الحال اپنے بارے میں بتاؤ!"

"میں بالکل خیریت سے ہوں۔" میں نے کہا "کچھ عرصہ میں کراچی میں قیام کا ارادہ رکھتا ہوں جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔ آپ سے بات کرنے کے بعد میں آپ کے دوست منہاس باقر سے رابطہ کروں گا تاکہ اپنی رہائش کا کوئی معقول بندوبست کر سکوں۔"

قاضی سلطان نے کہا "منہاس باقر سے تو آج تمہارا رابطہ نہیں ہو سکے گا۔"

"کیوں' کوئی خاص وجہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "تمہارے اچانک غائب ہونے کے بعد میں نے کراچی فون کیا تھا' منہاس باقر کو تمہارے بارے میں آگاہ کرنا تھا۔ میں اگرچہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم کراچی ہی جاؤ گے تاہم میں اپنی نئی نویلی دوستی کے تقاضے نبھانا چاہتا تھا مگر منہاس سے میری بات نہیں ہو سکی۔ اس کے گھر سے پتا چلا کہ وہ ایک دن کے لیے اسلام آباد گیا ہوا ہے۔ آل پاکستان پیپرز پبلشرز کی کوئی ضروری میٹنگ ہو رہی ہے وہاں۔ وہ کل دوپہر کے بعد واپس کراچی آئے گا۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

وہ جلدی سے بولا "وجدان! تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے بارے میں کنفرم نہیں تھا ورنہ منہاس کے گھر والوں کو تمہارے بارے میں ہدایات دے دیتا۔ تم اگر کہو تو میں ابھی فون پر ان سے بات کر لیتا ہوں۔ ہمارے درمیان فیملی ٹرمز ہیں۔ تمہیں منہاس کی غیر موجودی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ میں کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں۔ کل منہاس باقر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ویسے آپ اس کے گھر والوں کو ہماری آمد کی اطلاع دینا چاہیں تو کوئی حرج نہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" وہ متحمل انداز میں بولا "میں انہیں فون کر دیتا ہوں۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بے تکلفی سے کہا "وجدان! تم جتنے نظر آتے ہو اس سے کہیں زیادہ چھپے ہوئے ہو۔ انشاءاللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہو گی۔"

میں نے مذاق کے انداز میں کہا "گویا آپ مجھے چھپا رستم کہہ رہے ہیں!"

"بالکل! میں یہی کہہ رہا ہوں۔" وہ قطعیت سے

"اور سنو' جب تک ہمارے درمیان تکلفات کی دیوار حائل رہے گی' تم میرے سامنے کھل نہیں سکو گے لہٰذا اس دیوار کو ابھی اور اسی وقت گرا دو۔ جب میں تمہیں "تم" سے مخاطب کرتا ہوں تو تم مجھے "آپ" کہہ کر کیوں بات کرتے ہو؟"

"میں تو عمر کے تفاوت کی وجہ سے آپ کو احتراماً "آپ" کہتا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کی "ورنہ اس میں تکلف والی تو کوئی بات نہیں۔"

"بس' میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اوکے۔۔۔ میں سمجھ گیا۔"

"صرف سمجھ ہی نہیں گئے' آئندہ اس کا خیال بھی رکھو گے!"

"اوکے۔۔۔ اوکے۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ مزید دو چار باتوں کے بعد ہماری گفتگو ختم ہو گئی۔

O*O

ہم اس وقت بہادر آباد کے سب سے زیادہ بارونق علاقے میں تھے۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکلنے سے پہلے میں ساحل اور میر بخش کو قاضی سلطان سے ہونے والی ٹیلی فونک گفتگو کے بارے میں بتا دیا تھا۔

میر بخش نے کہا "سائیں! اگر اس بات کا پہلے پتا چل جاتا تو ہم بوٹا سنگھ کے ساتھ صدر چلے جاتے۔ اگر ہوٹل ہی میں رات گزارنا ہے تو ہم بھی اپنا انتظام وہیں کر لیتے۔"

"اگر پہلے سے انسان کو ہر بات کا پتا چل جائے تو مسئلہ ہی کیا ہے؟" میں نے سڑک کے کنارے ایک جانب چلتے ہوئے کہا "کیا ہم یہ بات جانتے تھے کہ سفید شیراز سے پیچھا چھڑانے کے دوران میں ہم "سی ایف کے" والوں سے ملاقات کریں گے!"

وہ بولا "سائیں! یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میر بخش اپنے سابق آقا اکبر سومرو کے ساتھ کراچی رہتا تھا۔ وہ اس بارے میں مجھے تفصیلاً بتا چکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "صدر کے علاقے میں بوٹا سنگھ جس ہوٹل میں ٹھہرے گا' کیا اس کے علاوہ بھی وہاں اور ہوٹل ہیں؟"

"بہت سے ہیں۔" اس نے بتایا "صدر میں ہر معیار کے ہوٹل ہیں۔"

ساحل نے پوچھا "کیا اب ہم صدر جائیں گے؟"

"ظاہر ہے' ہمیں پہلے رات گزارنے کا بندوبست کرنا ہے۔" میں نے کہا "اس کے بعد باقی باتیں سوچیں گے۔"

میر بخش نے استفسار کیا "سائیں! کیا آپ اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرنا چاہتے جہاں بوٹا سنگھ گیا ہے؟"

"بات اس ہوٹل یا اس ہوٹل کی نہیں۔" میں نے کہا "میں کسی پرسکون اور صاف ستھری جگہ پر قیام کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر تو بوٹا سنگھ والا ہوٹل مناسب نہیں۔" میر بخش نے تاسفانہ انداز میں کہا "وہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل ہے۔ میں آپ کو ایک انتہائی معیاری اور صاف ستھرے ہوٹل میں لے چلوں گا۔"

میں نے کہا "ہوٹل جانے سے پہلے میں ایک ضروری کام کرنا چاہتا ہوں۔"

دونوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں اس وقت بین الاقوامی معیار کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کو دیکھ رہا تھا۔ بعض کے تو نام بھی انٹرنیشنل تھے۔ ساحل نے پوچھا "وجدان! کیا تم یہ ڈپارٹمنٹل اسٹور خریدنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" وہ باقاعدہ میری نگاہ کا تعاقب کر رہی تھی۔

میں نے کہا "اسٹور نہ سہی مگر اسٹور کے اندر رکھی چیزیں تو خریدی جا سکتی ہیں۔"

"تو تمہارا شاپنگ کا ارادہ ہے؟" وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں' بالکل یہی ارادہ ہے۔" میں نے کہا "ہم تینوں اس وقت خالی ہیں۔ سامان کے نام پر ہمارے پاس کوئی چیز نہیں۔ یہ شاپنگ ناگزیر ہے۔"

پھر ہم تینوں ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں گھس گئے۔ میں نے اپنے' ساحل اور میر بخش کے لیے دو دو جوڑے کپڑے خریدے۔ چند آرام دہ جوتے بھی لیے۔ دو سفری بیگ بھی لیے۔ روزمرہ استعمال کی چند اشیا بھی لی گئیں۔ ہم نے اپنے لیے مناسب قیمت کی دستی گھڑیاں بھی خریدیں۔ میں نے اپنا اور ساحل کا سامان ایک بیگ میں بھر لیا جب کہ دوسرے بیگ میں میر بخش کا سامان رکھ کر وہ بیگ اس کے حوالے کر دیا۔

جب ہم ڈپارٹمنٹل اسٹور سے باہر آئے تو میں نے میر بخش کو الجھن کا شکار پایا "کیا بات ہے میر بخش! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "آپ نے اس بیگ میں جو کپڑے ڈالے ہیں' وہ میرے لیے خریدے ہیں نا!" ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بیگ کو تھپتھپایا۔

"ہاں ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "جب ناپ تمہاری لی گئی ہے تو یہ دونوں جوڑے تمہارے لیے ہی ہوں گے نا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "سائیں! میں نے زندگی میں کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی۔ یہ تو۔۔۔"

وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی الجھن بے جا تھی۔ میں نے اس کے استعمال کے لیے دو پتلونیں اور شرٹس خریدی تھیں۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "میر بخش! تم نے اگر زندگی میں کبھی پینٹ شرٹ نہیں پہنی تو کیا ہوا' اب پہن لو۔ کوئی بھی نیا کام انسان پہلی مرتبہ کرتا ہے' پھر کرتا چلا جاتا ہے۔"

"مم۔۔۔ مگر میں اس لباس کا عادی نہیں ہوں!"

"کبھی تم اس لباس کے بھی عادی نہیں تھے۔" میں نے اس کے بدن پر موجود گہرے نیلے شلوار قمیص کی جانب اشارہ کیا۔ "پیدائش کے وقت انسان بے لباس ہوتا ہے۔ پیدائش کے فوراً بعد اسے نیپکن جیسا لباس میسر آتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کے رنگ ڈھنگ بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ایک اختیاری عمل ہے اور اس میں تبدیلی ناممکن نہیں ہے۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میر بخش! تم نے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا ہے اس لیے تمہیں اپنے اسٹائل میں تبدیلی لانا چاہیے اور اس کے لیے گیٹ اپ کی تبدیلی سرفہرست ہے۔ ٹھیک ہے' تم پینٹ شرٹ جیسے لباس کے عادی نہیں ہو لیکن جب پہننے لگو گے تو رفتہ رفتہ یہی تمہارا پہناوا بن جائے گا۔ دراصل' پتلون قمیص میں بندہ زیادہ اسمارٹ اور چست دکھائی دیتا ہے۔"

وہ میری باتوں سے قائل ہو گیا۔ اس کے بعد ہم نے ایک ٹیکسی پکڑی اور سیدھے صدر پہنچ گئے۔

میر بخش کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا' صدر کراچی کا بڑا گنجان آباد اور مصروف کاروباری علاقہ تھا تاہم اس کی راہ نمائی میں ڈرائیور نے جس ہوٹل کے سامنے ٹیکسی روکی' وہاں رش بہت زیادہ نہیں تھا۔ وہ علاقہ بھی صاف ستھرا اور معیاری تھا۔ ہوٹل کی عمارت متاثر کن اور مناسب تھی۔

ہمارے پاس شناختی کارڈ یا اور کوئی ایسی دستاویز نہیں تھی جس سے ہماری شناخت ہو سکتی لہٰذا ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی کے لیے چند دوسرے ہنر اور کچھ اضافی رقم خرچ کرنا پڑی۔ میں نے اپنے اور ساحل کے لیے ڈبل بیڈ روم اور میر

بخش کے لیے سنگل بیڈ حاصل کرلیا' تاہم ہمارے کمرے دو مختلف فلورز پر تھے۔ میر بخش تیسرے فلور کے کمرا نمبر دو میں تھا اور ہم دونوں دوسرے فلور کے کمرا نمبر ایک میں۔ ہوٹل کے رجسٹر میں' میں نے اپنا نام جاوید' ساحل کا نام بیلا اور میر بخش کا نام فرید درج کروایا تھا۔

جب ہوٹل پہنچے تو سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد شام ہونے والی تھی۔ ہم نے اپنے کمروں میں پہنچ کر لباس تبدیل کیے اور فریش اپ ہو کر ایک ہی کمرے میں بیٹھ گئے۔ میر بخش نے زندگی میں پہلی مرتبہ پتلون شرٹ پہنی تھی اس لیے عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا اور پندرہ بیس منٹ اسے نشست و برخاست کے ادب و آداب سکھاتا رہا۔ شام کی چائے بھی ہم نے روم سروس کے ذریعے کمرے ہی میں منگوا کر پی' پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ اس وقت ہمارے درمیان صرف دو ہی موضوع زیر بحث تھے۔ نمبر ایک چوہدری نوازش علی اور اس کے گرگے۔ نمبر دو خدائی فوج داری کی دعوے دار تنظیم "سی ایف کے"

میرے ذہن میں بار بار نیلگری کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ اس نے مجھے اطلاع دی تھی' چوہدری نوازش علی نے اپنے کراچی کے نیٹ ورک کو سخت ہدایات دی ہیں کہ بوٹا سنگھ سے ہر صورت وہ ڈائری حاصل کی جائے چاہے ڈائری کے حصول کے لیے اس کی جان بھی لینا پڑے۔ وہ کسی بھی طور اسٹیشن سے نکل کر گارڈن ویسٹ تک نہیں پہنچ پائے۔ علاوہ ازیں وجدان کو یعنی مجھے کسی بھی قیمت پر لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔ نیلگری نے آخرالذکر چوہدری کی ہدایت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا' وجدان! اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' چوہدری تم سے بے حد خوف زدہ ہے۔ میں نیلگری کی فراہم کردہ اطلاعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر ساحل نے پوچھا "وجدان! تم کن خیالوں میں گم ہو؟"

میں نے اپنے ذہن میں موجودہ خیالات سے انہیں آگاہ کیا اور کہا "چوہدری نوازش علی تو واقعی بہت پہنچ والا ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی جاری کردہ ہدایات سے ظاہر ہوتا ہے' وہ جانتا ہے' بوٹا سنگھ کراچی میں گارڈن ویسٹ کے علاقے میں قیام کرنے والا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ میں انٹیریئر سے سیدھا کراچی پہنچوں گا اس لیے مجھے کراچی سے لاہور نہ پہنچنے دیا جائے۔"

"ہاں سائیں! چوہدری بڑا باخبر بندہ لگتا ہے۔" میر بخش نے کہا "کیوں کہ کل رات تک تو ہم نبی سر میں قاضی سلطا[ن] کی حویلی میں تھے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے' چوہدری نواز[ش] کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہے جس سے وہ تازہ تر[ین] معلومات حاصل کرلیتا ہے۔"

میں نے کہا "چوہدری تو کوئی جادو جانتا ہے یا نہیں لیکن نیلگری بہت بڑی ساحرہ ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں بھی بہت دور تک جان سکتی ہے۔ وہ بے پناہ شکتیوں کی مالک ہے۔ میں اس کے لاتعداد کمالات کا عینی شاہد ہوں۔ چوہدر[ی] اور اس کے بندوں کے بارے میں فراہم کردہ اطلاعات [میں] نیلگری کی شکتیاں بھی یقیناً کام کر رہی ہوں گی۔ وہ ایک[ی] کرنی والی ہستی ہے۔"

"ویسے بھی جب تمہارا دشمن نوازش علی اتنا [بڑا] سنڈیکیٹ چلا رہا ہے جس کی پہنچ لاہور سے کراچی اور ہا[ں] سنگاپور' بنکاک اور انڈیا و نیپال تک ہے تو پھر اسے انتہائی [باخبر] ہونا ہی چاہیے۔" ساحل نے سنجیدہ لہجے میں کہا "اسے [یہ] معلوم ہو گیا تھا کہ تم غیر قانونی طور پر میرے ساتھ انڈیا [سے] پاکستان میں داخل ہونے والے ہو۔ تارا ہمارے "استقبال" کے لیے ہی لاہور سے عمر کوٹ پہنچا تھا اور ہمارے ہاتھ پاؤ[ں] توڑ کر ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔"

"شاید اسے وجدان سائیں کی طاقت کا پوری طر[ح] اندازہ نہیں تھا۔" میر بخش نے کہا "ورنہ وہ اپنے احکام [میں] تبدیلی نہ لاتا۔ تارا کو اس نے اس لیے عمر کوٹ بھیجا تھا کہ [وہ] آپ لوگوں کو بے بس کر کے اپنے ساتھ "رکھاں والی" [لے] جائے۔ اب وہ کراچی میں موجود اپنے نیٹ ورک کو ہدای[ت] دے رہا ہے کہ وجدان سائیں کو لاہور آنے سے رو[کا] جائے۔"

میں نے کہا "چوہدری دراصل یہ چاہتا ہے کہ جب تک وہ گمشدہ سونے تک نہ پہنچ جائے' مجھے اس وقت تک لاہو[ر] نہ آنے دیا جائے۔ سونے کا حصول اس کے لیے بہت اہمی[ت] رکھتا ہے۔ آج سے لگ بھگ بیس سال پہلے اس سونے [کی] مالیت کم و بیش پانچ کروڑ روپے تھی۔ آج کے نرخ کے مطاب[ق] تو یہ قیمت پچیس کروڑ روپے تک پہنچ جائے گی۔۔۔ یعنی پانچ [گنا] زیادہ۔"

"چوتھائی ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے سائیں!" میر بخش دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے حیرت بھرے لہجے م[یں] بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اور اس بھار[ی] مالیت کے سونے کا راز جس ڈائری میں رقم ہے وہ میرے قبضے

میں ہے اسی لیے تو ڈائری کے حصول کی خاطر چوہدری کی راتوں کی نیند اور دن کا آرام اس سے روٹھ گیا ہے۔"

"میں تو بوٹا سنگھ کے ضبط اور حوصلے کی داد دیتی ہوں۔" ساحل نے کہا "وہ اتنے عرصے سے اس قیمتی راز کی حفاظت کرتا رہا اور اس دوران میں اس کے ذہن میں خیانت کا خیال نہیں آیا وہ چاہتا تو خود بھی اس سونے کے حصول کی کوشش کر سکتا تھا۔"

"اس میں بوٹا سنگھ کے صبر' ضبط یا ایمان داری کا کوئی دخل نہیں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "پہلی بات تو یہ کہ مذکورہ ڈائری کچھ عرصہ پہلے ہی اس کے پاس پہنچی تھی۔ اپنی موت سے چند روز قبل خشونت سنگھ نے ڈائری بوٹا سنگھ کو لاہور بھجوادی تھی۔ اس ریفرنس کے ساتھ کہ میں کبھی لاہور آکر اس سے یہ ڈائری حاصل کرلوں گا۔ گولڈن ٹرائی اینگل سے واپسی پر سنگاپور میں میری ملاقات خشونت سنگھ آنجہانی کی بیٹی ارملا سے ہوئی۔ اسی کی زبانی مجھے ڈائری کے بارے میں پتا چلا تھا۔ ورنہ میری یادداشت کے مطابق تو وہ ڈائری چاچا پرتاب سنگھ نے سنگاپور چھوڑنے سے پہلے اپنے دوست خشونت سنگھ کو دی تھی اور اسی کے پاس ہونا بھی چاہیے تھی۔"

پرتاب سنگھ کے ذکر پر میری آواز بوجھل ہو گئی۔ میں نے اپنے دل میں چاچا پرتاب کے لیے درد کی ایک لہر سی اٹھتی محسوس کی۔ پرتاب سنگھ میرے باپ عابد علی کا سچا دوست تھا۔ والدین کے بہیمانہ قتل کے بعد اسی شخص نے مجھے سنبھالا دیا تھا۔ اس وقت میں بارہ سال کا تھا اور ناپختہ کار بھی۔ دارا اینڈ کمپنی وحشی درندوں کے مانند میرے تعاقب میں تھے۔ وہ سنگاپور کے چپے چپے پر میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ چاچا پرتاب سنگھ نے مجھے سنگاپور سے ملائیشیا اور پھر ملائیشیا سے بنکاک (تھائی لینڈ) پہنچایا تھا۔ وہ مجھے مارشل آرٹس کی دنیا میں ایک دیو مہاراج وانگ ونگ یائے کے جمنازیم تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی بلیک بیلٹ تھا اور چاہتا تھا کہ میں بھی اپنے دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے ان فنون میں مہارت حاصل کروں۔ میرے تعاقب میں آنے والے دشمنوں نے چاچا پرتاب سنگھ کو مہاراج کے جمنازیم "واٹ ٹریمنٹ" کے احاطے میں بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا تاہم چاچا کی خواہش کے مطابق میں نے مارشل آرٹس میں نہ صرف مہارت حاصل کی بلکہ ان فنون کی دنیا کی سب سے بڑی تربیت گاہ "شاؤلن ٹیمپل" میں یادگار ریکارڈ بھی قائم کیے۔ اب نہ چاچا پرتاب سنگھ زندہ تھا اور نہ مہاراج وانگ ونگ یائے اور نہ ہی میرا استاد ماسٹر ہنگ پائی۔ صرف ان لوگوں کی یادیں باقی ہیں۔ یادیں بہت تڑپاتی ہیں' میں بھی اپنے ان محسنوں کے خیال سے خاصا رنجیدہ اور ملول ہو گیا۔

ساحل نے پوچھا "وجدان! تم نے اپنی بات مکمل نہیں کی؟"

میں نے افسردگی کی کیفیت سے باہر آتے ہوئے کہا "میں آپ لوگوں کو بتا رہا تھا' سنگاپور میں' آخری ملاقات کے دوران میں ارملا کور نے بوٹا سنگھ کا لاہور کا ایڈریس مجھے دیتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ خشونت سنگھ نے بوٹا سنگھ کو سونے والے راز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اس لیے بوٹا اس ڈائری کی اصل اہمیت سے آگاہ نہیں۔ وہ اسے میری خاندانی یادداشتوں کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے۔ یہ ممکن ہے' بوٹا نے ڈائری کو کھول کر کبھی پڑھا بھی ہو مگر راز کی باتیں رازدارانہ انداز ہی میں رقم کی گئی ہیں۔ کوئی بھی غیر متعلق شخص اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی مدد سے اس متروک کنوئیں تک پہنچ سکتا ہے جس کے اندر میرے والد صاحب نے سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے کینوس کے دو بڑے تھیلے پھینکے تھے البتہ۔۔۔۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "چوہدری نوازش علی ایسا آدمی ہے' جو مذکورہ متروک کنوئیں کا کھوج لگا سکتا ہے بہ شرطیکہ ڈائری اس کے ہتھے چڑھ جائے۔"

"اور یہ ڈائری اس وقت تمہارے ہتھے چڑھی ہوئی ہے۔" ساحل نے کہا "تم کسی بھی حال میں ڈائری کو چوہدری تک نہیں پہنچنے دو گے۔"

"یقیناً ایسی ہی بات ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

میر بخش بولا "سائیں! سی ایف کے آدمی امتیاز نے بتایا تھا کہ سفید شیرڈ والے موٹے کا سرغنہ کوئی میاں زاہد نامی شخص ہے۔ اگر وہی شخص چوہدری نوازش علی کے نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا ہے تو پھر وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ چوہدری کے احکام بہت سخت ہیں۔ ان لوگوں نے ہر قیمت پر یہ ڈائری حاصل کرنا ہے اور آپ کو لاہور جانے سے روکنا ہے۔ ممکن ہے' میاں زاہد حسین ہمیں ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

"اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ وہ ہمیں ٹریس کر چکا ہو۔" ساحل نے گمبھیر آواز میں کہا "اور اس وقت وہ ہماری کڑی نگرانی کر رہا ہو۔"

میں نے کہا "یہ سب کچھ ممکنات میں سے ہیں۔ ہمیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"ہم سے زیادہ بوٹا سنگھ کو احتیاط کی ضرورت ہے۔" میر بخش نے کہا "چوہدری کے بندوں کا اصل ٹارگٹ تو وہی تھا۔"

میں نے میر بخش کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جرائم پیشہ افراد سے کچھ بھی بعید نہیں ہوتا۔ اگر وہ لوگ ہمیں ٹریس کرنے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں تو پھر بوٹا سنگھ جیسے ہی ان کی نظر میں آئے گا' وہ اس کے ساتھ خاصا "یادگار" سلوک کریں گے۔"

"وجدان! کیا ہم چوہدری کے بندوں کے خوف سے ہوٹل کے اس کمرے ہی میں دبکے بیٹھے رہیں گے؟" ساحل نے اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"یہ بات کس نے کہہ دی؟" الٹا میں نے اس سے سوال کردیا۔

"ہم اس وقت جس نوعیت کی گفتگو کر رہے ہیں اس سے تو ایسا ہی تاثر ملتا ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔

میں نے کہا "ہرگز میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ ہم کان لپیٹ کر ہوٹل کے اس کمرے تک محدود ہو جائیں۔ میری ساری زندگی خطرناک مجرموں سے پنجہ آزمائی میں گزری ہے۔ میں نے کبھی پس پائی اختیار کی ہے اور نہ ہی ڈیفنسیو کھیلا ہے۔ میں نے ہمیشہ آگے بڑھ کر دشمن پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہاں زاہد حسین جیسے دو ٹکے کے مجرم میرے سامنے کیا بیچتے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ "ہم ابھی ہوٹل سے نکلیں گے۔ رات کا کھانا ہم باہر کسی ریسٹورنٹ میں کھائیں گے اور تھوڑی سیر و تفریح کے بعد واپس آ جائیں گے۔"

ساحل نے کہا "اور واپسی میں پکچر بھی دیکھتے ہوئے آئیں گے' ٹھیک ہے؟"

ساحل کی زندگی کا زیادہ حصہ کھٹمنڈو کے ایک دور دراز علاقے میں گزرا تھا اور وہ بھی ایک عبادت گاہ میں۔ اس نے بہت محدود زندگی گزاری تھی۔ میں نے بھی اس بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں چند روز قیام کیا تھا۔ اس علاقے میں دریا پر جانے کے سوا کوئی تفریح نہیں تھی۔ ساحل جب ہمارے ساتھ نیپال سے انڈیا پہنچی تو ایک جہانِ حیرت اس کے سامنے تھا۔ اسی دوران میں چار مرتبہ اسے سینما جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ ہال میں بیٹھ کر پکچر دیکھنے کا تجربہ اسے بھایا اور جب بھی ہم کسی تفریح کا ذکر کرتے تو وہ مچل کر یہی کہتی "پکچر بھی دیکھیں گے۔"

اور ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بچپنا جھلکنے لگتا جیسا کہ اس وقت نظر آ رہا تھا۔ وہ بولتی ہوئی نکھری ہوئی ایک معصوم صورت لڑکی تھی۔ شرارت اور چنچلتا کوٹ کر اس کے انگ انگ میں بھری تھی۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور کہا "ٹھیک ہے' پکچر بھی دیکھیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم تیار ہو کر ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ ہوٹل کے زینے اترنے کے دوران میں میر بخش نے کہا "سائیں! اگر آپ اجازت دیں تو ذرا بوٹا سنگھ کو بھی دیکھ آئیں۔"

"ضرور' ضرور۔" میں نے کہا اور اس کی معیت میں ایک جانب قدم بڑھا دیے۔

جس ہوٹل میں بوٹا سنگھ کو قیام کرنا تھا۔ وہ ہمارے ہوٹل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد ہم اس ہوٹل تک پہنچ گئے۔ استقبالیہ سے بوٹا کے بارے میں استفسار کیا تو پتا چلا' محمد بوٹا نامی ایک مہمان آج ہوٹل آ کر ٹھہرا تو ہے مگر وہ اس وقت کمرے میں موجود نہیں۔ کہیں باہر گیا ہوا ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ بوٹا ہوٹل کے کمرہ ایک سو دو میں ٹھہرا ہے۔ فی الحال بوٹا سنگھ سے ملاقات نہیں ہو سکتی تھی تاہم یہ اہم بات معلوم ہو گئی کہ وہ یہاں محمد بوٹا تھا' نہ کہ بوٹا سنگھ!

میں نے ایک بک اسٹال سے کراچی کا میپ اور ایک گائیڈ بک خریدی۔ یہ دونوں چیزیں انگریزی میں تھیں اور ان میں کراچی کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا تھا۔ میں نے سنگاپور میں اپنی تعلیم کے دوران میں انگلش اور مینڈرن (MANDARIN) زبان سیکھی تھی۔ "مینڈرن" لکھے پڑھے حضرات و خواتین کی زبان ہے۔ آپ اسے تعلیم یافتہ افراد کی زبان سمجھ لیں۔ گھر میں والد اور والدہ اردو اور پنجابی بھی سکھاتے رہتے کہ یہ ہماری روایت اور کلچر کا حصہ ہے۔ ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے دوران میں مجھے بھاشا (ہندی زبان) بھی لکھنا' پڑھنا اور بولنا آ گئی تھی۔ اردو اور ہندی بول چال میں زیادہ فرق نہیں۔ تاہم میں کسی بھی معلومات حاصل کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ انگلش زبان کی کتابوں کو زیادہ معتبر اور مستند سمجھتا تھا۔

ہم صدر کے علاقے میں کافی دیر تک گھومتے رہے۔ کھانا ہم نے ایک چینی ریسٹورنٹ میں کیا اور فلم دیکھنے کے لیے بندر روڈ کے ایک سینما میں گھس گئے۔ مذکورہ سینما میں

"اسپیڈ" دکھائی جا رہی تھی۔ انٹرویل کے بعد پکچر شروع ہوئی تو ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ ہمیں فلم کو بیچ میں چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

ہوا کچھ یوں کہ فلم شروع ہوئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ساحل نے اچانک پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میں نے اس سے پوچھا "کیا ہوا ساحل؟"

"میرے سر پر اس کا پاؤں لگا ہے۔" وہ پچھلی رو میں بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے اپنے دونوں پاؤں کو ساحل والی سیٹ کی پشت گاہ پر لگائے فلم دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس بے ہودہ انداز نے مجھے کھولا کر رکھ دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"مسٹر! یہاں سے اپنے پاؤں ہٹالو۔"

وہ مجھے گھور کر رہ گیا تاہم اس نے پاؤں ہٹا لیے۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ہم دوبارہ فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد عقبی جانب سے عامیانہ قسم کے جملوں کی آوازیں میری سماعت تک پہنچنے لگیں۔ ہم (ROW_B) کی سیٹ نمبر ایک' دو اور تین پر بیٹھے تھے۔ ساحل کی سیٹ کا نمبر ایک تھا اور وہ قطار کے کنارے پر تھی۔ میں دو نمبر سیٹ پر تھا اور میر بخش میرے برابر سیٹ نمبر تین پر بیٹھا تھا۔ میں نے ابھی جس شخص کو تنبیہہ کی تھی وہ (ROW-A) کی سیٹ نمبر ایک پر تھا۔ اب وہ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے افراد سے بڑے گھٹیا انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ نشانہ ساحل کی ذات تھی۔ اس قسم کا تجربہ مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسے بداخلاق تماش بین میری نظر سے کبھی گزرے تھے۔

بات اگر ان کی جملہ بازی تک محدود رہتی تو ممکن ہے' میں برداشت کر جاتا لیکن اس وقت تو میں صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑنے پر مجبور ہو گیا جب ساحل اچانک اپنی سیٹ سے اٹھی اور پیچھے مڑتے ہوئے نہایت ہی سخت الفاظ میں اس نے عقب میں بیٹھے شخص سے کہا "اسٹوپڈ۔"

میں بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بدتمیز شخص کی جانب قہر آلود نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا "لگتا ہے' تم شرافت کی زبان نہیں سمجھتے۔ تمہیں کوئی اور ہی سبق پڑھانا پڑے گا۔"

ساحل نے کہا "وجدان! اس کمینے نے میری گردن پر ہاتھ لگایا ہے۔"

ہماری باتیں سن کر دوسرے تماش بین بھی ہماری جانب متوجہ ہو گئے اور مڑ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔

میں نے اس شخص سے استفسار کیا "تمہیں کون سی چیز ٹکنے نہیں دے رہی ہے؟"

"زیادہ بکواس نہیں کرو۔" وہ الٹا مجھے آنکھیں دکھانے لگا "خاموشی سے بیٹھ کر فلم دیکھو اور ہمیں بھی دیکھنے دو۔"

اس کے رویے نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ میں نے کہا "میں انتظامیہ سے تمہاری شکایت کرتا ہوں۔ پتا نہیں' کیسے کیسے جانوروں کو یہ سینما والے اندر گھسنے دیتے ہیں۔"

"جانور کس کو بولا؟" بدتمیز شخص کے ساتھی نے مجھ پر مُکا تانتے ہوئے کہا۔ وہ بالکل میرے عقب میں تھا۔

میں نے کہا "تم لوگوں کو... اور کس کو؟"

"اس کا مطلب ہے' تمہیں مزہ چکھانا ہی پڑے گا۔" ان کے تیسرے ساتھی نے کہا اور بات ختم کرتے ہی میرے چہرے پر گھونسا مارنے کی کوشش کی۔

کوشش ان معنوں میں کہ جب اس کا گھونسا میرے چہرے کے مقام پر پہنچا تو چہرہ وہاں سے ہٹ چکا تھا ورنہ اس نے نشانہ تو باندھ کر وار کیا تھا۔ میں نے شولڈر ٹرن کا استعمال کرتے ہوئے اپنا چہرہ ایک جانب جھٹک دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی جوابی حملہ ضروری ہو گیا۔

میں نے حملہ آور کے شانے کو گرفت میں لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے گریبان میں ڈال کر' بیک تھرو (THROW BACK) کے انداز میں دور پھینک دیا۔ وہ گیلری کی بالکل اختتامی ROW میں جا کر گرا۔ اس کے بعد تو وہاں ایک ہلچل مچ گئی۔ باقی دو افراد ہم پر پل پڑے۔

میرے حصے میں وہ آیا جس نے دو مرتبہ ساحل سے بدتمیزی کی تھی۔ وہ بالکل دیسی انداز میں مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ دوسرے حملہ آور کو میر بخش نے سنبھال لیا اور اس کی ٹھیک ٹھاک درگت بنانے لگا۔

میں اپنے مدِمقابل کے حملوں کے جواب میں اسٹریٹ فائٹ کے گر آزما رہا تھا۔ بہت ہی محدود جگہ پر اگر بالکل رف فائٹ کرنا ہو تو یہ گر بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ چند ہی لمحوں میں' میں نے اپنے مقابل شخص کے منہ ناک سے خون چھڑا دیا۔ اس کا چہرہ بڑا وحشت ناک منظر پیش کرنے لگا۔ میر بخش نے اپنے حصے میں آئے ہوئے شکار کو کھینچ کر اپنے قدموں میں چت کر ڈالا تھا اور اس کے چہرے و سینے پر گھونسے برسا رہا تھا۔

یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ سینما کی انتظامیہ کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سینما کی لائٹس آن کر دی گئیں۔ فلم کو روک دیا گیا۔ پوری گیلری کے تماش بین ہمیں اپنا مرکزِ نگاہ

بنائے ہوئے تھے۔ انتظامیہ کے چار ہٹے کٹے گراں ڈیل افراد ہمارے پاس آئے اور اس بدامنی کا سبب دریافت کرنے لگے۔

میں نے اور ساحل نے انتظامیہ کو ان لوگوں کی "حرکتوں" کے بارے میں بتایا۔ دو افراد نے ہم سے مار کھانے والوں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ ان کا تیسرا ساتھی کہیں نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کے بعد لگتا تھا، وہ خاموشی سے کہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا یا پھر وہاں سے کھسک لیا تھا۔

ہم تینوں بھی انتظامیہ کے افراد کے ساتھ سینما منیجر کے کمرے میں پہنچے۔ منیجر کو جب صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ ہم سے معذرت کرنے لگا۔

"سر! میں بہت شرمندہ ہوں۔" اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "لیکن یقین جانیں، اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ کسی کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ اندر جا کر شرافت کا مظاہرہ کرے گا یا بدتمیزی پر اتر آئے گا۔ میں ایک مرتبہ پھر اس واقعے پر آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ آپ کو بہت کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ کسی کی پیشانی پر اس کے شریف یا بدمعاش ہونے کا ٹھپا نہیں لگا ہوتا مگر آپ یہ تو کر سکتے ہیں کہ ہال میں موجود لوگوں کو لچر قسم کے فقرے بازی اور ہلے گلے کی حرکتوں سے باز رکھ سکیں۔ یقین کریں، فلم کی آواز کم اور تماشائیوں کے تبصرے زیادہ سننے کو ملتے ہیں۔"

"آپ کا اعتراض اور شکایت جائز ہے سر!" سینما منیجر نے کہا "مگر کیا کریں، اس قسم کے رویّے اور سرگرمیاں یہاں کے لوگوں کا مزاج بن چکا ہے۔ شاید آپ پہلی مرتبہ سینما میں پکچر دیکھنے آئے ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں نے دنیا کے بہترین پکچر ہاؤس میں فلمیں دیکھی ہیں البتہ پاکستان میں یہ میرا پہلا تجربہ تھا جو بڑا تلخ ثابت ہوا۔"

منیجر نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ میں ان بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ آپ اپنی سیٹوں پر جا کر بیٹھیں تاکہ فلم چلائی جا سکے۔ دوسرے تماشائی بھی خاصا شور مچا رہے ہیں اور میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔"

اس واقعے نے طبیعت کو مکدّر کر دیا تھا۔ میں نے بیزاری سے کہا "آپ فلم شروع کر دیں تاکہ دوسرے تماشائیوں کا حرج نہ ہو۔ وہ یہاں تفریح کے لیے آئے ہیں ان کا مزہ کنکریلا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم تو اب واپس جائیں گے۔"

سینما منیجر کوئی بہت ہی شریف النفس انسان تھا۔ ہمارے بار بار منع کرنے کے باوجود بھی اس نے ہمارے ٹکٹ کی ا شدہ رقم واپس کر دی۔ ہم تینوں سینما ہاؤس کی عمارت نکل کر باہر آئے اور پیدل ہی ایک جانب چلنے لگے۔

میر بخش نے کہا "سائیں! لگتا ہے، آج کا دن ایسے واقعات کے لیے ہے۔"

"لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔" ساحل نے اس کی تائید کی۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، رات کے گ بجنے والے تھے۔ اگر ہم سینما کے اندر بیٹھے ہوتے اور ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آتا تو اب تک ہم آدھی سے زیا فلم دیکھ چکے ہوتے۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا۔

"اور گھومنا پھرنا ہے یا واپس چلیں؟"

ان دونوں نے واپس ہوٹل جانے کا ارادہ ظاہر کیا وہاں سے ہمارا ہوٹل زیادہ دور نہیں تھا۔ میر بخش نے پ "سائیں! کسی ٹیکسی کو روکا جائے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے حتمی لہجے میں "ہم ٹہلتے ہوئے چلیں گے البتہ۔" میں نے ساحل کی جانب دیکھا اور پوچھا "تمہیں پیدل چلنے میں کوئی دشواری تو نہیں پیش آ رہی ہے؟"

"بالکل نہیں، میں اپنے پاؤں کو بالکل ٹھیک محسوس رہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے میر بخش کی طرف دیکھا۔ میری نظر کا مطلب سمجھ گیا، جلدی سے بولا "اللہ سائیں لاکھ لاکھ شکر ہے سائیں! میرا بازو بھی بھلا چنگا ہے۔ میں میں کوئی تکلیف محسوس نہیں کر رہا۔"

"ڈاکٹر نے دو دن بعد پٹی بدلنے کو کہا تھا۔" میں نے کے بازو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "کل صبح میں تمہاری ڈریسنگ چینج کر دوں گا۔"

"آپ سائیں؟" وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا "کیا آپ ڈاکٹری بھی جانتے ہو؟"

میرے بجائے ساحل نے جواب دیا "میر بخش! مرہم کے لیے باقاعدہ ڈاکٹری جاننا ضروری نہیں، بلکہ انسان کمپاؤنڈر ہونا بھی شرط نہیں، بس میڈیکل اور فرسٹ ایڈ آگاہی کافی ہے۔ ویسے اپنے وجدان صاحب تو جانے کیا جانتے ہیں!" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آخری جملہ ادا کیا تھا۔ اس کی نظر میں معنی خیزی اور انداز میں شرارت کی جھلک تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔۔۔ نہیں جانتے تو صرف یہ نہیں جانتے کہ میرے دل کا کیا حال ہے؟ اور اگر جانتے ہیں تو اپنے رویّے سے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ یا تو انہیں جذبات کا اظہار نہیں آتا یا پھر جذبات سے خالی ہیں۔ سپاٹ، بے نیاز۔۔۔ پتھر کے صنم۔۔۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا! پتا نہیں، یہ شخص کیا چیز ہے؟

میں نے ساحل کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور ایک میڈیکل اسٹور میں داخل ہو گیا۔ اب ہم صدر کے اندرونی حصے میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے اسٹور والے سے ہائیڈروجن پر آکسائیڈ، کاٹن رول، بینڈیج کا چھوٹا پیکٹ اور ایک اینٹی سیپٹک آئنٹ منٹ خرید لیا۔ ازیں علاوہ پین کلر ٹیبلٹس کا ایک اسٹرپ بھی لے لیا تاکہ کسی بھی ہنگامی ضرورت کے وقت یہ اشیا کام آسکیں۔

میں نے میڈیکل اسٹور سے باہر آنے کے بعد کہا "میر بخش! اپنے ہوٹل میں جانے سے پہلے ہم ایک مرتبہ بوٹا سنگھ کو چیک کر لیں تو اچھا ہے۔"

اس نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور ہم تینوں بوٹا سنگھ والے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں کے استقبالیہ سے معلوم ہوا کہ محمد بوٹا اپنے کمرے میں موجود ہے۔ میں نے اس کے کمرے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو استقبالیہ کلرک نے کہا۔

"میں پہلے ان سے پوچھ لوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

اصلی نام بتانا ضروری تھا ورنہ بوٹا سنگھ الجھن میں پڑ جاتا۔ میں نے اپنا نام وجدان بتایا تو کلرک نے انٹرکام پر بوٹا سنگھ کے کمرے سے رابطہ کیا۔ ایک منٹ تک وہ ریسیور کان سے لگائے رہا پھر قدرے مایوسی سے بولا۔

"جناب! دوسری جانب کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا۔ لگتا ہے، مہمان سو چکا ہے۔"

اس بات کا امکان تو تھا کیوں کہ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے اور بوٹا سنگھ آج جن اعصاب شکن حالات سے گزرا تھا اس نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہوگا، اس پر ٹرین کے طویل سفر کی تھکن! میر بخش کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ لاہور سے کراچی تک پہنچنے کے لیے لگ بھگ بیس گھنٹے سفر کرنا پڑتا ہے۔

میں نے میر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، اسے آرام کرنے دیں۔ صبح ملاقات کر لیں گے۔"

ساحل اور میر بخش نے اثبات میں گردن ہلائی۔

استقبالیہ کلرک بولا "آپ لوگ ایک منٹ سامنے صوفے پر بیٹھیں۔ میں اوپر جا کر دیکھ لیتا ہوں۔"

ہم نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا اور انتظار گاہ نما کارنر میں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ ایک منٹ بعد کلرک نے آکر بتایا۔

"میرا خیال ہے، مہمان واقعی سو چکا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اسے آرام سے سونے دیا جائے۔"

"تمہیں مہمان کی اس خواہش کا علم کیسے ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

وہ بولا "کمرا نمبر ایک سو دو کے دروازے کے ہینڈل میں "ڈو ناٹ ڈسٹرب پلیز" کا مخصوص ٹیگ لٹک رہا ہے۔"

استقبالیہ کلرک کی وضاحت پر ہم بوٹا سنگھ والے ہوٹل سے نکل کر اپنے ہوٹل میں آ گئے۔

ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں اس وقت خاصی گہما گہمی تھی۔ پتا چلا کہ وہ رونق کسی شادی کی تقریب کے سلسلے میں تھی۔ ہم اپنے کمروں کی جانب بڑھ گئے۔ میر بخش کو ایک فلور مزید اوپر جانا تھا۔ وہ تیسرے فلور کے کمرا نمبر دو میں تھا اور ہم دوسرے فلور کے کمرا نمبر ایک میں تھے۔ ہم نے اپنے فلور پر میر بخش کو شب بہ خیر کہا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔

اندر آتے ہی مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا؟ اس کا میں فوری طور پر فیصلہ نہ کر سکا۔ میری چھٹی حس بار بار خبردار کر رہی تھی کہ کمرے میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ساحل کمرے میں داخل ہوتے ہی چینج کے لیے واش روم میں گھس گئی تھی۔ میں نے کمرے کے دروازے کو اندر سے ڈبل لاک لگایا اور اس گڑبڑ کے بارے میں غور و فکر کرنے لگا جس کا احساس میری چھٹی حس دلا رہی تھی۔

جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری موجودگی میں اس کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ ہمارا بیگ، بیڈ، الماری اور ٹیبل کو باریک بینی سے دیکھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کسی خاص چیز کو وہاں ڈھونڈنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے کمرے میں سب سے زیادہ خاص چیز وہ ڈائری تھی جس کے حصول کے لیے خونیں واقعات پیش آ رہے تھے۔

مجھے اپنے پورے بدن میں چونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ میں نے سب سے پہلے اس مقام کا جائزہ لیا جہاں میں نے ڈائری کو چھپایا تھا۔ حفظِ ماتقدّم کے طور پر میں نے اس ڈائری کو بیگ سے نکال کر ایک پردے کے پیچھے کھڑکی کے فریم میں پھنسا دیا تھا۔ وہ سلائیڈنگ ونڈو تھی اور جب تک

اسے کھولا نہ جاتا' ڈائری وہاں محفوظ رہتی۔ میں نے اس بات کا بھی خیال رکھا تھا کہ سلائیڈنگ ونڈو کھلنے پر ڈائری کمرے کے اندر ہی گرے۔ یہ ایک ایسی عام سی جگہ تھی جس طرف کسی کا خیال نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے مصلحتاً اس راز میں ساحل اور میر بخش کو شامل نہیں کیا تھا۔

میری احتیاط پسندی کام آگئی۔ ڈائری اپنی جگہ پر محفوظ تھی۔ میں نے ڈائری کو فریم سے نکالا' اسے چوما اور سلائیڈنگ ونڈو والا پردہ برابر کرکے کرسی پر آبیٹھا۔

ساحل نے واش روم سے باہر آکر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "کیا اس ڈائری کو ہر وقت سینے سے لگائے رہو گے؟"

اس وقت وہ ڈائری میری گود میں رکھی تھی اور میں کرسی میں نیم دراز سا ہو کر بیٹھا تھا۔ میں نے ساحل کے سوال کے جواب میں ڈائری کو تھپکتے ہوئے کہا۔

"یہ چیز ہی ایسی ہے ساحل!"

"یہ ایسی چیز ہے یا ویسی چیز' یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" وہ معنی خیز نظر سے دیکھتے ہوئے بولی "مگر یہ جیسی تیسی اور کیسی بھی ہے۔ ہے بہت لکی!"

"یہ ڈائری کی لک (LUCK) کہاں سے نکل آئی؟" میں نے شوخی سے پوچھا۔

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے پارس پتھر کے بارے میں سن رکھا ہے۔ معلوم نہیں' ایسا کوئی پتھر حقیقت میں وجود رکھتا بھی ہے یا نہیں لیکن اس پتھر کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ یہ جس چیز سے چھو جائے' اسے سونا بنا دیتا ہے۔"

"میں نے بھی سنا تو ہے۔" میں نے کہا "اس کی چھونے کی خاصیت کی بنا پر ہی اسے ٹچ اسٹون (TOUCH STONE) کہا جاتا ہے مگر میں نے خالی سنا ہی سنا ہے۔ اس پتھر کو کبھی دیکھا نہیں۔ اگر یہ واقعی وجود رکھتا ہے تو اس کا شمار طلسماتی اور نایاب اشیا میں ہونا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان!" وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی۔

میں نے پوچھا "ساحل! یہ تو بتاؤ' ڈائری کے لکی ہونے کا تذکرہ کرتے کرتے تم پارس پتھر تک پہنچ گئیں۔ ان دونوں میں کیا تعلق ہے؟ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

اس نے کہا "میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھتے ہو!"

"میں نہیں سمجھتا' اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔"

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکتی رہی۔ اس کی نگاہ میں کھوجی پن پایا جاتا تھا۔ پتا نہیں' وہ میرے اندر کیا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی ایک ٹک گھورتی غزالی آنکھوں نے مجھے مضطرب کر دیا تو وہ بولی۔

"وجدان! معلوم نہیں' تم واقعی بے خبر ہو یا جانتے ہوئے بھی لاعلمی کا اظہار کرتے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "تم کھل کر کہو' کیا کہنا چاہتی ہو۔ جب تک بتاؤ گی نہیں' مجھے کیسے معلوم ہو گا!"

وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی "وجدان! پارس جس چیز کو چھو جائے وہ سونا بن جاتی ہے' اسی طرح تم جس شے کو چھو لو وہ لکی (LUCKY) ہو جاتی ہے۔ تمہارے لیے سوار یہ ڈائری مجھے بہت خوش قسمت نظر آ رہی ہے اور میں اس کی خوش بختی پر رشک کر رہی ہوں۔"

میرے سینے سے ایک طویل بوجھل سانس خارج ہوئی۔ اس خوبصورت لڑکی نے بڑی خوبصورتی سے اظہارِ محبت کیا تھا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ ساحل مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس دلچسپی کو پسندیدگی یا عقیدت تک محدود نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ دلچسپی اس سے آگے کی چیز تھی۔ اسے محبت کے مقام پر فائز کیا جا سکتا تھا اور آج اس نے بڑے موثر الفاظ میں اپنے دلی جذبات کا اظہار بھی کر دیا۔ اس سے زیادہ کھل کر اور وہ کیا کہہ سکتی تھی!

ساحل کسی تیز رفتار میزائل کے مانند میری جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس کا ٹارگٹ میرا دل تھا اور اس کی کوشش سے لگتا تھا' وہ خود کو سچی نشانے باز ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ساحل میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ وہ جوان تھی' حسین تھی' معاملہ فہم تھی' ذہین تھی۔ وہ قدم قدم پر میرا ساتھ دیتی آئی تھی اور میری خاطر بارہا اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیا تھا۔ میں اس کے ایثار اور جذبہ قربانی کو مانتا تھا اور بعض معاملات میں اس کا احسان مند بھی تھا لیکن میں نے کبھی اس کے بارے میں اس انداز میں نہیں سوچا تھا' جو ایک مرد کے سوچنے کا انداز تھا۔

شاید میرے دل کا وہ خانہ ابھی وا نہیں ہوا تھا جس میں محبت کا پودا جڑ پکڑتا ہے اور عشقیہ جذبات نمو پاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے' وہ خانہ تو وا ہو' اس میں محبت کا پودا بھی پروان چڑھ رہا ہو' جذبات بھی موجود ہوں مگر اظہار کی زبان سے عاری ہوں۔ گونگا جذبہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

خود گونگا بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ انتہائی طاقت ور جسم اور بیدار ذہن رکھنے والا کوئی شخص دلی معاملات میں اس قدر کمزور ہو سکتا ہے' اتنا بزدل ہو سکتا ہے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی اور نہ ہی سمجھائی جانے کے قابل!

میں لباس تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ ساحل میرے خیال پر سوار ہو کر اندر آ گئی۔ وہ میرے دماغ میں بیٹھی تھی اور میں دماغ کو کمرے میں رکھ کر واش روم میں نہیں آ سکتا تھا۔ کپڑے بدلنے کے دوران میں مجھ سے کئی غلطیاں ہوئیں۔ میں بار بار خود سے الجھتا رہا۔ پندرہ منٹ بعد جب میں واش روم سے نکلا تو خود کو سنبھال چکا تھا۔

✪✪✪

اس ڈائری کا سائز پانچ بائی نو انچ تھا۔ اس پر پیور لیدر کور چڑھا تھا جس کا رنگ سرخ تھا۔ ڈائری کے صفحات لگ بھگ دو سو ہوں گے۔ جب سے یہ ڈائری میرے ہاتھ چڑھی تھی' میں وقتاً فوقتاً اس میں جھانک رہا تھا تاہم تفصیل سے پڑھنے کا اب موقع ملا تھا۔

اس وقت رات کا ایک بجا تھا یعنی کہ نئی تاریخ شروع ہو گئی تھی۔ ساحل ڈبل بیڈ پر پھیل کر سو رہی تھی۔ اس کی آنکھ تھوڑی دیر پہلے ہی لگی تھی اور پتا نہیں' لگی بھی تھی یا نہیں۔ ممکن ہے' وہ سونے کی اداکاری کر رہی ہو۔ وہ بارہا ایسا کر چکی تھی۔

میں ایزی چیئر پر نیم دراز سرخ جلد والی ڈائری کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔ اپنی دونوں ٹانگوں کو کراس کر کے میں نے پاؤں بیڈ کے ایک کنارے پر ٹکا رکھے تھے۔ وہاں سے ساحل کا بدن صرف دو انچ کی دوری پر تھا۔ مجھے وہ رات کرسی پر نیم دراز سو کر گزارنی تھی یا پھر فرش کے قالین پر بستر لگانا تھا۔ بیڈ پر سونے کا رسک میں کسی قیمت پر نہیں لے سکتا تھا۔

نیلگری نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس نے اصلی صورت میں میرے سامنے نہ آنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور خلوت میں میرے ساتھ کسی عورت کو برداشت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میری یہ مجبوری تھی کہ جن حالات سے اس وقت ہم گزر رہے تھے ان میں ساحل کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا' ورنہ اسے دوسرے کمرے میں رکھ کر میں نیلگری کے سحر سے مکمل آزادی حاصل کر سکتا تھا۔ وہ جلوت میں میرے پاس نہیں آ سکتی تھی اور خلوت میں آنے کے لیے وہ کسی دوسری عورت کی محتاج تھی۔ اس سے بچنا اگر میرے لیے دشواری لا رہا تھا تو نیلگری بھی مجھے حاصل کرنے کے لیے بڑی مشکلات کا شکار تھی۔ گویا دونوں جانب رسا کشی کی سی کیفیت تھی۔

نیلگری نے قاضی سلطان کی حویلی میں ہونے والی گزشتہ ملاقات میں کھل کر اظہارِ محبت کر دیا تھا۔ وہ مجھے اپنا محبوب مانتی تھی اور میرا قرب حاصل کرنے کے لیے جتن میں لگی ہوئی تھی۔ آج ساحل نے بھی بڑے واضح الفاظ میں اپنے دلی جذبات مجھ تک پہنچا دیے تھے۔ میں عجیب و غریب کشمکش میں مبتلا تھا۔ وہ دونوں میری طلب گار تھیں لیکن دونوں کی طلب کا انداز مختلف تھا۔ ایک پراسرار شکتیوں کی مالک بڑی بااختیار تھی مگر میرے معاملے میں وہ بے اختیار ہو جاتی تھی' مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہ دوسری کی محتاج تھی۔ دوسری ایک معصوم صورت اور چنچل مزاج تھی۔ اس کے پاس کوئی اختیار تھا اور نہ ہی کوئی پراسرار طاقت' وہ سادہ اور پُرکار تھی۔ مجھ تک رسائی کے لیے وہ اپنے جذبے کو کام میں لا رہی تھی' گویا وہ اس معاملے میں کسی دوسری کی محتاج نہیں تھی۔ اس حوالے سے ساحل کو نیلگری پر سبقت حاصل تھی۔

میں نے بیڈ پر دراز ساحل کو بھرپور نظر سے دیکھا۔ سوتے میں اس کے چہرے کی معصومیت اور حسن کی سادگی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ تصنع اور بناؤ سنگھار میں وہ کشش نہیں ہوتی جو جاذبیت سادگی میں پائی جاتی ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ خالص ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ سہل اور سادہ نظر آتی ہے۔ اس کی اثر پذیری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے ساحل کے سراپا سے نگاہ ہٹائی اور ڈائری کو پڑھنے لگا۔

رات دبے قدموں گزر رہی تھی اور میں مطالعے میں مگن تھا۔ اس ڈائری کے غالب حصے میں وہ واقعات درج تھے جو آپ میری اس داستان کی ابتدا میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ میرے پیدا ہونے سے لے کر بارہ سال کی عمر تک پہنچنے کی تفصیلی کہانی تھی۔ سب سے آخر میں سونے کا ذکر تھا اور وہ بھی اشاروں کنایوں میں تھا۔ میرے والد صاحب کو ان کے مزارع اکبر نے اطلاع دی تھی کہ چوہدری نوازش علی اپنے چمچۂ خاص دارا کی مدد سے بھاری مالیت کا سونا سرحد پار اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ والد صاحب نے اسمگلنگ کی اس کوشش کو ناکامیاب بنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

وہ سونا بسکٹ کی صورت میں کینوس کے چھ بڑے سائز کے تھیلوں میں بھرا ہوا تھا۔ چار تھیلے اسمگلروں نے کار کی ڈکی میں چھپا رکھے تھے جب کہ باقی دو تھیلے کار کی پچھلی سیٹ پر رکھے تھے۔ والد صاحب کی فائرنگ سے وہ لوگ اپنی گاڑی کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ والد صاحب کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ کار کی ڈکی میں بھی چار تھیلے چھپائے گئے تھے۔ وہ دارا اینڈ کمپنی کے فرار پر کار کی پچھلی سیٹ پر موجود تھیلے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی وقت دارا واپس آ گیا

لہٰذا والد صاحب کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ انہوں نے سونے کے بسکٹوں سے بھرے ہوئے وہ دونوں تھیلے ایک قریبی متروک کنوئیں میں پھینک دیے تھے۔ اس وقت ان دو تھیلوں میں بھرے ہوئے سونے کی قیمت کم و بیش پانچ کروڑ تھی جو بیس برس گزر جانے کے بعد اب پچیس کروڑ تک جا پہنچی تھی۔

بالکل آخری صفحات میں والد صاحب نے رہٹ والے اس متروک کنوئیں کی نشاندہی کی تھی۔ سرحد سے ملی ہوئی زمین میں ایک مقام پر سرخ قلم سے دائرہ بنایا گیا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پر بیس سال قبل وہ متروک کنواں پایا جاتا تھا۔ آج کل وہاں کی کیا صورتِ حال تھی' یہ وہاں پہنچ کر ہی معلوم کیا جا سکتا تھا۔ سمجھنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں تھیں۔

میں اس ڈائری کے مندرجات کا اچھی طرح مطالعہ کر چکا تھا۔ میں نے ڈائری بند کر دی۔ پھر دیوار گیر کلاک کی جانب میری نگاہ اٹھ گئی۔ کلاک تین بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ میں نے ایک جماہی لی اور سونے کے بارے میں سوچنے لگا۔ ساحل ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سو چکی تھی۔ اب مجھے بھی اس سے محدود فاصلے پر سو جانا چاہیے تھا۔

میں نے کمرے میں کوئی "محفوظ" مقام تلاش کرنے کے لیے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اسی وقت ٹیبل پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ رات کے سناٹے میں گھنٹی کی آواز ایک عجیب قسم کا تاثر پیدا کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس آواز سے ساحل کی نیند غارت ہو اس لیے دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری جانب ہوٹل کا آپریٹر تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے اس کے "ہیلو" کے جواب میں کہا۔

وہ منت آمیز لہجے میں بولا "سوری سر! آئی ایم ویری سوری۔ میں آپ کو اتنی رات گئے ڈسٹرب کر رہا ہوں۔"

"آگے بھی کچھ کہو گے یا...." میں نے سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر "سوری" کی گردان کرنے لگا اور اس کے بعد بولا "سر! آپ کے لیے ایک ایمرجنسی کال ہے۔ آپ کے والد صاحب بات کریں گے!"

"واٹ نان سینس؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا "سر! آپ گھر سے ناراض ہو کر آئے ہیں نا' اسی سلسلے میں وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

آپریٹر کی بے سروپا باتیں سمجھ سے بالاتر
وقت وہ مجھے کوئی فاترالعقل شخص لگا۔ والد ص
انتقال کو کم و بیش آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا
آپریٹر سے الجھنا مناسب نہ سمجھا اور کہا "ٹھیک
بات کراؤ۔"

اگلے ہی لمحے اس نے مجھے لائن دے دی۔

"ہیلو!" میں نے گہری سنجیدگی سے ماؤتھ پیس

دوسری جانب سے ایک اجنبی آواز نے میری
دستک دی "جاگ رہے ہو برخوردار!"

اس کی آواز میں بھاری پن اور ایک مخصو
گونج تھی۔

میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا "کون ہو تم؟"

"کیا آپریٹر نے تمہیں میرے بارے میں بتایا؟" اس نے تعجب سے استفسار کیا۔

"کیا تم بھی وہی بکواس کرنا چاہتے ہو جو آپر
ہے؟"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "برخوردار! میں تمہ
میاں زاہد حسین بول رہا ہوں۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس لیے نہیں کہ وہ چ
ایک طاقت ور اور تجربہ کار مہرہ تھا بلکہ اس لیے کہ ا
مجھے ٹریس کر لیا تھا۔ نہایت ہی تشویش ناک صورتِ
ہو گئی۔ میرا ذہن بہ یک وقت کئی محاذوں میں مصروف

"کیا میرا نام سنتے ہی تمہاری جان نکل گئی۔"
سنسناتے لہجے میں پوچھا "خاموش کیوں ہو؟"

میں نے اپنے پاؤں کے پنجے سے ساحل کی پنڈل
کرتے ہوئے ماؤتھ پیس میں کہا "تم بھونکتے جاؤ' میں
ہوں۔"

"کیا اپنے باپ سے بھی تم اس لہجے میں با
تھے۔" وہ دہاڑ سے مشابہ آواز میں مستفسر ہوا۔

میں نے جواباً ٹھوس لہجے میں کہا "میں منہ دیکھ
مارنے کا عادی ہوں۔ جو مجھ سے جس لہجے میں بات ک
میں اسی لہجے میں جواب دیتا ہوں۔ تم ایک ایسے ہی
ہو جس پر بھونکنے کے الفاظ جچتے ہیں۔"

ساحل نے میری "کوشش" کے جواب میں
آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ
مکمل خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور میاں زاہد کی جان
ہو گیا۔ وہ نہایت ہی زہریلے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تمہارے بارے میں جو کچھ سنا تھا' تم ویسے ہی

ہو رہے ہو۔"

"مطلب کی بات کرو!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

اس دوران میں ساحل اشاروں میں مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ فون پر کس سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے ماؤتھ پیس پر اپنی ہتھیلی جما کر اسے دھیمی آواز میں بتایا کہ دوسری جانب میاں زاہد حسین ہے۔ وہ ہراساں دکھائی دینے لگی۔ میں نے اسے تسلی آمیز اشارہ کیا اور اپنی توجہ ائرپیس پر مرکوز کردی۔

وہ کہہ رہا تھا "میرا مقصد اور مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو برخوردار۔ مجھے وہ ڈائری چاہیے جو بوٹا سنگھ نے تمہارے حوالے کی ہے۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولا "میں بات کو گھما پھرا کر کرنے کا عادی نہیں ہوں اس لیے تم بھی سیدھی اور سچی بات کرو۔"

میں نے کہا "مجھے بھی پہیلیاں بجھوانے کا کوئی شوق نہیں۔ تم جس ڈائری کا ذکر کر رہے ہو' وہ میرے پاس نہیں۔"

"پھر وہ ڈائری کہاں ہے؟"

"بوٹا سنگھ ہی کے پاس ہوگی۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ کاٹ دار لہجے میں بولا "وہ ڈائری بوٹا سنگھ کے پاس تو نہیں ہے۔"

"کیا مطلب' کیا تم بوٹا سنگھ سے مل چکے ہو؟" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

وہ سفاکی سے بولا "ایک گھنٹا پہلے بوٹا سنگھ میرے پاس تھا۔ اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ بہادر آباد کے ریسٹورنٹ میں اس نے وہ ڈائری تمہارے حوالے کردی تھی۔"

ایک گھنٹا پہلے بوٹا سنگھ کے' میاں زاہد حسین کے پاس ہونے کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے اس کے ہوٹل سے کہیں لے جایا گیا تھا۔ اسی وقت میری نگاہوں کے سامنے وہ ٹیگ گھوم گیا جس پر "ڈونٹ ڈسٹربنس پلیز" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ بوٹا سنگھ والے ہوٹل کے استقبالیہ کلرک نے ہمیں یہ اطلاع دی تھی کہ اس کے کمرے کے ہینڈل میں یہ مخصوص ٹیگ لٹک رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ میاں زاہد حسین کی کارستانی تھی۔ انہوں نے بوٹا سنگھ کو ٹریس کرنے کے بعد اغوا کرلیا تھا۔ اس خیال سے میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ ہم یہی سمجھے تھے کہ بوٹا سنگھ تھکن کے باعث گہری نیند سو رہا ہوگا۔

میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں میاں زاہد سے پوچھا "اس وقت بوٹا سنگھ کہاں ہے؟"

"اس وقت وہ بہت اچھی جگہ پر ہے۔" وہ گمبھیر... میں بولا "ہر غم و فکر سے آزاد۔"

میں سمجھ گیا کہ انہوں نے بوٹا سنگھ کو قتل کردیا تھا... کی شدت سے میری آواز میں ارتعاش پیدا ہوگیا "تم... درندے ہو!" میں نے خاصی اونچی آواز میں کہا۔

"اور تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔" میاں زاہد پھنکار... نے آج دوپہر کو راشد منہاس روڈ پر میرے تین آدمی... بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ابھی تو ایک... ہوا ہے' باقی دو کا باقی ہے۔ وہ دو تم تینوں میں سے کوئی... ہیں!"

وہ انتہائی بے تکی بات کر رہا تھا۔ شیرڈ نشینوں کی... میں "سی ایف کے" والوں کا ہاتھ تھا۔ میں نے بپھرے... لہجے میں کہا "تم مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ تمہار... آدمیوں کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ انہیں ان... دشمنوں نے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا جو ایک نیلی ہائی روف... ان کا تعاقب کر رہے تھے۔"

"یہ تو تم کہہ رہے ہو نا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا... تو یہ سمجھتے ہیں' تم ہی ان کے قاتل ہو۔ کل صبح کے... اخبارات بھی ہماری بات کی تصدیق کریں گے۔"

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ میں... سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اخبارات والوں کو یہ... خبر کس نے پہنچائی ہے؟"

وہ بولا "میرے آدمیوں میں سے جو ڈرائیونگ کر... اس نے اسپتال میں' مرنے سے پہلے پولیس کو ایک مخ... بیان بھی دیا ہے اور اس بیان کے مطابق وجدان نامی... خطرناک انڈین ایجنٹ نے ان کی شیرڈ پر فائرنگ کی... وجدان نامی یہ شخص "را" کا تربیت یافتہ ایجنٹ ہے اور... روز قبل وہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کرکے انڈیا سے پاک... میں داخل ہوا ہے اور اب کراچی میں دہشت گردی... وارداتیں کر رہا ہے۔ اس کا مشن امن و امان کی صور... حال کو ختم کرکے خوف و ہراس کی فضا کو قائم کرنا ہے۔... ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہو... بولا "باقی کی تفصیل تم صبح کے اخبارات میں پڑھ لینا۔"

میاں زاہد حسین پاؤں تلے سے زمین کھینچ لینے... باتیں کر رہا تھا۔ جواباً میں جو کچھ کہہ رہا تھا' اس نے سا... گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ وہ صرف ایک طرف کی با... سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی فکر مندی... اور بر محل بھی تھی۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے

ناک کے زیریں حصے پر فرضی مونچھوں کو موڑا دیا' پھر اسی ہاتھ کے اشارے سے نچلی منزل کی جانب اس کی توجہ دلائی اور آخر میں بلانے والے انداز میں ہاتھ کی انگلیوں کو حرکت دی۔ میں نے اشاروں میں اسے میر بخش کو اپنے کمرے میں بلانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

اس دوران میں' میں میاں زاہد سے فون پر بات بھی کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "ہم تو یہی سمجھ رہے تھے' تم سندھ کے صحرا میں ریت پھانکتے پھر رہے ہوگے۔ میں نے صرف بوٹا سنگھ کے استقبال کے لیے آدمی بھیجے تھے مگر تمہیں یہاں پاکر مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی' تم نے تارا کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تم سے دو دو ہاتھ کرتے ہوئے بہت مزہ آئے گا۔"

میں نے پوچھا "تم نے یہ نہیں بتایا کہ میری یہاں آمد کے بارے میں تمہیں کیسے معلوم ہوا کیوں کہ تمہارے تینوں ساتھی تو جہنم واصل ہوگئے؟"

"شاید میری دہشت نے تمہارے حواس گم کردیے ہیں۔" وہ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں بتا چکا ہوں کہ شیرڈ کے ڈرائیور نے مرنے سے قبل پولیس کو بیان دیا ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "اس کے علاوہ میرا ایک آدمی بائیک پر شیرڈ والوں کی نگرانی کر رہا تھا اور اس بات سے شیرڈ والے وہ تینوں افراد بھی آگاہ نہیں تھے۔ میرے اسی آدمی نے خفیہ طور پر بوٹا سنگھ کی قیام گاہ اور تمہارے بارے میں مجھے اطلاعات فراہم کی ہیں۔"

"تم خود ہی اپنی باتوں میں پھنس رہے ہو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اگر تمہارا کوئی بندہ بائیک پر شیرڈ والوں کی نگرانی کر رہا تھا تو پھر اس شخص نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ تمہارے تین آدمیوں کو میں نے نہیں بلکہ نیلی ہائی روف والوں نے قتل کیا ہے۔"

دوسری جانب سے قہقہہ لگانے کی آواز مجھ تک پہنچی۔ میاں زاہد نے کہا "میں نہیں بلکہ تم پھنس رہے ہو اور پھنسے ہوئے انسان کا سچ بھی جھوٹ سمجھا جاتا ہے اور پھانسنے والے کا جھوٹ بھی سچ تسلیم کیا جاتا ہے۔ پولیس اسی بات کا یقین کرے گی جو میں کہوں گا کیوں کہ تم کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ تم تو "را" کے ایجنٹ ہو۔ پڑوسی ملک سے دہشت گردی کی خطرناک تربیت لے کر یہاں پہنچے ہو۔ کیا تم میرے دعوؤں کو جھٹلا سکو گے؟ تمہارے پاس اپنی کوئی شناخت نہیں ہے؟"

"تم ایک نمبر کے شیطان ہو۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"چلو' تم نے مجھے ایک طاقت تو مانا' شیطان ہی سہی۔"

میں نے پوچھا "ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت مجھے فون کس مقصد سے کیا ہے؟ اگر تمہاری "بک بک" ختم ہوگئی ہو تو یہ بھی بتا دو۔"

اس نے بڑے مکروہ انداز میں قہقہہ لگایا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "پہلے مجھے شک تھا' اب یقین ہوگیا ہے۔ میری دہشت نے تمہارے اعصاب کو شل اور تمہاری یادداشت کو بالکل ہی بے کار کردیا ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے تمہیں بتا چکا ہوں کہ مجھے وہ ڈائری چاہیے جو بہادر آباد کے ریسٹورنٹ میں بوٹا سنگھ نے تمہیں دی تھی۔"

میں دانستہ زاہد حسین کو باتوں میں لگا کر کچھ وقت حاصل کر رہا تھا۔ مجھے میر بخش کا انتظار تھا۔ میں نے کہا "تم اس ڈائری کی فرمائش کر رہے ہو نا جس کی خاطر تم نے ہمارے کمرے کی تلاشی بھی کرائی ہے؟"

اس کے ساتھ ہی میں نے فون کے ریسیور کو کندھے اور کان کے بیچ دبا کر نہایت ہی مہارت کے ساتھ بہ آہستگی ڈائری کا وہ ورق پھاڑ لیا جس کے دونوں صفحات پر آگے پیچھے سونے والے متروک کنوئیں کی تفصیلات اور مقام کی نشان دہی کی گئی تھی۔ یہ ورق پھٹنے سے ڈائری کے ابتدائی صفحات میں سے بھی ایک ورق آزاد ہو کر باہر نکل آیا۔ جو لوگ ڈائری یا نوٹ بک سے ورق پھاڑنے کا تجربہ رکھتے ہیں' وہ میری بات کو آسانی سے سمجھ جائیں گے۔ میں نے مذکورہ دونوں اوراق کو تہ کرکے اپنی محفوظ جیب میں رکھ لیا۔ گویا میں نے پچیس کروڑ کے سونے کو اپنے پاس محفوظ کرلیا تھا!

میاں زاہد حسین نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہو' اس کے اسٹاف میں میرا ایک آدمی بھی کام کرتا ہے۔ اپنے کمرے کی تلاشی سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کتنی پہنچ والا ہوں!" اس کے لہجے میں غرور شامل تھا۔

"تم نے بھی میرے کمرے کی تلاشی سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تمہاری مطلوبہ ڈائری میرے پاس نہیں۔" میں نے جواباً چوٹ کی "ورنہ وہ ڈائری ضرور تمہارے ہتھے چڑھ گئی ہوتی اور میں رات کے آخری پہر تمہاری منحوس آواز سننے سے محفوظ رہتا۔"

وہ زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا "تم نے یقیناً وہ ڈائری کہیں چھپا دی تھی یا پھر ہوٹل سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے ہوگے۔"

میں نے کہا "جب تم اتنی پہنچ رکھتے ہو کہ میری غیر موجودی میں' میرے کمرے کی تلاشی کروا سکتے ہو تو پھر کسی پردہ دار بی بی کی طرح فون کی اوٹ سے کیوں "ٹیں ٹیں" کر رہے ہو بڈھے طوطے۔ یہاں چلے آؤ' آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔"

وہ بولا "میں اتنا بھی سنگ دل نہیں ہوں۔"

"اس میں سنگ دلی والی کون سی بات ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے بتایا "آج رات اس ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ایک شادی خانہ آبادی کی تقریب ہوئی ہے۔ دلہا اور دلہن اسی ہوٹل میں سہاگ رات منائیں گے۔۔۔ اور وہ بھی بالکل تمہارے سامنے والے کمرے میں۔ ہوٹل میں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی سے ان کی زندگی کی اس منتوں اور مرادوں بھری رات کا سوا ستیاناس ہو جائے گا۔ ویسے تو اس بدبخت دلہا میاں نے شادی جیسا احمقانہ کام کرکے ساری زندگی رونا ہی ہے۔ کم از کم یہ رات تو اسے سکون سے گزار لینے دو۔ شادی کے بعد مرد کے حصے میں صرف ایک رات کی خوشی ہی تو آتی ہے۔ اس بے چارے کو اپنی مختصر سی خوشی کا ایک ایک لمحہ کشید کرنے دو۔"

"پھر تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا "مجھے تمہارے ساتھیوں سے کوئی غرض نہیں۔ صرف تم سے اور ڈائری سے مطلب ہے۔ اگر تم میری بات مانتے ہو تو وہ ڈائری میرے حوالے کردو تو میں تم سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ ڈائری حاصل کرنے کے بعد میں تمہیں آزاد چھوڑ دوں گا۔ تم اگر چاہو تو تمہیں "انڈین ایجنٹ" کے چکر سے بھی نکال دوں گا۔"

وہ [illegible] مکاری سے جھوٹ بول رہا تھا۔ میں اس وقت چوہدری نوازش علی کے لیے حلق کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے [illegible] حاصل کرنے کے بعد مجھے آزاد چھوڑنے کی بات اس طرح کر رہا تھا جس طرح ریپر میں سے چاکلیٹ نکالنے کے بعد ریپر کو پھینک دیا جاتا ہے۔ میں اس کی چال میں آنے کی بے وقوفی نہیں کر سکتا تھا۔

بہرحال اس کی مکاری کی آخری حد تک پہنچنے کے لیے میں نے کہا "ٹھیک ہے' اگر تم مجھ سے لاتعلق ہونے کا وعدہ کرتے ہو تو میں یہ ڈائری تمہیں دینے کو تیار ہوں۔ بولو' میں یہ ڈائری تم تک کیسے پہنچاؤں؟"

دوسری جانب ایک لمحے کے لیے خاموشی طاری ہو گئی پھر میاں زاہد حسین کی مسرور آواز ریسیور میں ابھری۔ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

"تم وہ ڈائری لے کر اپنے ہوٹل سے باہر آجاؤ۔ مین روڈ پر پہنچ کر تم ہائی کورٹ کی جانب مڑ جاؤ۔ الیکشن ہاؤس [illegible] گزرنے کے بعد "ایف آئی اے" کا پولیس اسٹیشن آ[illegible] گا۔ تم تھوڑا اور آگے بڑھو گے تو اس روڈ کے اختتام پر [illegible] لیٹر بکس کے ساتھ تمہیں گرے کلر کی سوزوکی ایف ایکس کھڑی دکھائی دے گی۔ گاڑی کے اندر تمہیں دو پولیس والے بیٹھے نظر آئیں گے۔ دراصل وہ دونوں میرے آدمی ہیں جنہوں نے پولیس والوں کا بھیس بھر رکھا ہے۔ تم ڈائری میرے آدمیوں کے حوالے کردو اور جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ ہمارا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔"

میں اس کی پلاننگ اور "انتظامات" سے آگاہ ہو گیا۔ اسے مزید چکر دینے کے لیے میں نے کہا "تم مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت نہیں دو گے؟"

میں نے ڈائری کی حوالگی کے لیے نیم رضامندی اس لیے ظاہر کی تھی کہ وہ میری بات سے یہ تاثر لے کہ میں اس کے دام میں آگیا ہوں۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا "میں تمہیں صرف دس منٹ دے سکتا ہوں۔ پانچ منٹ سوچ بچار کے لیے اور پانچ منٹ ہوٹل سے نکل کر سوزوکی ایف ایکس تک پہنچنے کے لیے اور میرا فون بند کرتے ہی تم ان دس منٹ کے لیے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دینا۔ یاد رکھو' کسی بھی چالاکی کی صورت میں شاہراہ عراق تمہارے لہو سے بھیگ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے' میں آ رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

فون بے جان ہو گیا۔ میں نے بے ساختہ نظر اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھا۔ کلاک میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا' پورے آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

اسی وقت کمرے سے باہر راہ داری میں دوڑتے قدموں کی آواز ابھری' پھر کسی نے کمرے کے دروازے کو پیٹ ڈالا۔ اس سے پہلے کہ میں دروازے کی جانب قدم اٹھاتا' کمرے کے باہر ایک بلند آہنگ نسوانی چیخ ابھری۔

میں اس چیخنے والی کی آواز کو ہزاروں آوازوں میں بھی شناخت کر سکتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں۔۔۔ میری ساحل تھی!

میں نے کسی زخمی چیتے کے مانند غراتے ہوئے ایک طویل جست بھری اور طوفانی انداز میں دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

ایک وحشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا!

دو وردی پوش افراد نے ساحل کو دبوچ رکھا تھا اور اسے کھینچ کر ایک طرف لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دروازے کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تھی پھر دروازے پر دھواں دھار انداز میں دستک ہوئی تھی' اس کے ساتھ ہی ساحل کی بلند آہنگ چیخ میری سماعت تک پہنچی تھی۔ اب سب کچھ میرے سامنے تھا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں' میں صورتِ حال کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ دونوں وردی پوش افراد ساحل کے تعاقب میں میرے کمرے کے دروازے تک دوڑتے چلے آئے تھے۔ ساحل نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے دروازے پر دستک دی تو اسی دوران میں انہوں نے ساحل کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اب وہ اس سے کھینچا تانی میں مصروف تھے۔

ساحل کو جب میں نے میر بخش کو بلانے کے لیے ہوٹل کی اوپری منزل کی جانب بھیجا تھا تو دروازے کو اندر سے مقفل نہیں کیا تھا۔ ان نازک ترین لمحات میں اسے دستک دیے بغیر اندر گھس آنا چاہیے تھا۔ اس نے ایسا کیوں نہیں کیا' یہ سوچنے کا نہ وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ وہ فوری ردِعمل ظاہر کرنے کے لمحات تھے اور میں نے ایسا ہی کیا بھی۔

وردی پوش افراد کا تعلق ہوٹل اسٹاف سے تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ روم سروس سے متعلق تھے۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بجلی کے کوندے کے مانند لپک کر ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ وہ دونوں ٹھٹک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

انہیں شاید امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی کوئی مداخلت کار ان کے سر پر پہنچ جائے گا۔ انہوں نے ایک ساعت کے لیے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ ساحل کو چھوڑ کر مجھ پر پل پڑے۔ میرے لیے تو یہ "اللہ دے اور بندہ لے" والا معاملہ ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی خوش دلی سے انہیں ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ بری طرح پٹنے لگے۔

ان میں سے ایک لڑائی بھڑائی کا ماہر نظر آتا تھا جب کہ دوسرے کے حملوں میں اناڑی پن کی جھلک تھی۔ وہ شاید مورل سپورٹ کے لیے اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ میں نے دو چار گھونسوں میں اس اناڑی کا اناڑی پن ناک کے راستے باہر نکال دیا۔ وہ راہ داری کے فرش پر لمبا لیٹ چکا تو میں نے چیخ کر ساحل سے کہا "کمرے سے بیگ اٹھا لاؤ۔"

وہ لپک کر کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اس دوران میں دوسرا حملہ آور کام دکھا گیا۔ اس کا ایک زوردار پنچ میرے کاندھے پر لگا۔ اس نے نشانہ تو میرے منہ کو بنایا تھا مگر میں نے جھکائی دے کر اس کا نشانہ خطا کر دیا۔ اس کے پنچ میں خاصی طاقت تھی۔ مجھے اپنے شانے میں درد کی ایک ہلکی سی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ ایسی دردناک لہروں کو میں کبھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بیک اسٹیپ لیا اور بجلی کی سی سرعت سے ایک فرنٹ پش کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

میرا مدِمقابل دیسی انداز کا فائٹر تھا لہٰذا اس نے اپنا دفاع بھی اسی انداز میں کرنے کی کوشش کی جو صد فی صد ناکامیاب رہی۔ وہ میری زبردست کک کھا کر ہوا میں اچھلا اور پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا۔

میرا خیال تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہو گا اور وہ راہ داری کے فرش سے اٹھ نہیں سکے گا لیکن اس کی سخت جانی نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا۔ وہ فرش پر گرتے ہی کسی اسپرنگ کے مانند ہوا میں بلند ہوا پھر زیادہ طراری سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں ان سنگین لمحات کو طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ مارپیٹ اور اٹھا پٹخ چھپی رہنے والی نہیں تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس ہوٹل میں ہمارا مزید قیام انتہائی مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا۔ ہمیں جلد از جلد وہاں سے نکلنا تھا اسی لیے میں نے ساحل کو کمرے سے اپنا بیگ لانے کو کہا تھا۔

مدِمقابل کے جسم میں کسی گینڈے ایسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازوؤں کے حصار میں مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ٹائمنگ اور ٹیکنیک میں کوئی خامی نہیں تھی لیکن میں اس کے عمل سے قبل ہی اس کے عزائم کو بھانپ گیا۔ اس کی کمر کی حرکت نے مجھے بتا دیا کہ وہ کون سا قدم اٹھانے جا رہا تھا چنانچہ اسے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔

اس نے جیسے ہی اپنے بازوؤں کا حلقہ میری کمر کے گرد کسنا چاہا' میں بیٹھک لگانے والے انداز میں تیزی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں بازو میرے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے ایک دوسرے کو کراس کر گئے۔ میں نے اس کی پشت پر اس کے دونوں ہاتھوں کی چپت کی "چٹاخ" بڑے واضح انداز میں سنی۔ یہی لمحہ تھا کہ میں اسی رفتار سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جس تیزی سے میں بیٹھا تھا پھر اس سے قبل کہ حملہ آور کی سمجھ میں کچھ آتا' میرا فولادی پنچ اس کی ناک کا "مزاج"

دریافت کرچکا تھا۔

اس نے ایک دردناک آواز خارج کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی ناک کو تھام لیا۔ اس عمل کے ساتھ ہی میرے لیے اس کی ناپاک زبان سے چند ناقابلِ اشاعت گالیاں بھی برآمد ہوئیں۔ میں گالی کا جواب بھی ہاتھ پاؤں سے دینے کا عادی ہوں۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ پش کک اس کے پیٹ کے بالائی حصے پر رسید کردی۔

میری اس کک میں غصے کی اچھی خاصی مقدار شامل تھی پھر پاؤں بھی عین اس کے "ڈایا فرام" پر پڑا تھا۔ وہ توپ سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند پچھلی جانب اچھلا اور پشت کے بل سامنے والے کمرے کے دروازے سے ٹکرایا۔

یہ ہوٹل کا وہی کمرا تھا جس میں ایک نوبیاہتا جوڑا شبِ زفاف منا رہا تھا۔ معلوم نہیں' دروازے کے قبضے کم زور تھے یا میں نے ہی طیش میں کچھ زیادہ زوردار کک لگا دی تھی۔ ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور وہ شخص سنگل پیس فلش ڈور کے ساتھ کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ دروازے کے پٹ نے فریم سے جدا ہونے میں کسی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

وہ رات کا آخری حصہ تھا۔ دلہا دلہن کو شبِ مراد کے آخری پہر جس حالت میں ہونا چاہیے تھا اس کے بیان کی ضرورت نہیں۔ ان کی بوکھلائی ہوئی تیز چیخیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔ کمرے کے اندر زیرو پاور بلب کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نوبیاہتا جوڑے نے چیختے چلاتے ہوئے خود کو سمیٹا پھر ان کی نظریں اس افتاد کی جانب اٹھ گئیں جس کے سبب وہ دھماکا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی۔ وہ خوف زدہ انداز میں' ٹوٹے ہوئے دروازے کے پٹ کے اوپر ایک شخص کو بے حس و حرکت پڑا دیکھنے لگے۔

"ڈایا فرام" انسانی جسم کا نہایت نازک حصہ ہوتا ہے۔ اس پر لگنے والی ضرب سے موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ فرنٹل باڈی پر پائے جانے والے پریشر پوائنٹس میں سے ایک ڈایا فرام بھی ہے۔ پریشر پوائنٹس مارشل آرٹس میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان پر اٹیک کو جان لیوا تصور کیا جاتا ہے۔

میں اس ساکت شخص کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ساحل بیگ اٹھائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ میں نے اس کا بازو تھاما اور راہ داری میں دوڑ لگا دی۔ میں جلد از جلد ہوٹل کی عمارت سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہاں جس قسم کے حالات پیش آچکے تھے اس کے بعد مزید قیام بڑی موت نما مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

زینے کے نزدیک پہنچ کر میں نے بالائی منزل کا رخ چاہا تو ساحل کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "وہ اوپر نہیں ہے۔"

وہ سمجھ گئی کہ میں میر بخش کی طرف جا رہا ہوں۔ میر بخش کا کمرا ہوٹل کے تیسرے فلور پر تھا جب کہ ہم دونوں دوسرے فلور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں نے الجھن زدہ نظروں سے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ اوپر نہیں تو پھر کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم' وہ کہاں ہے۔" وہ جلدی سے بولی "اس کا کمرا تو بالکل خالی پڑا ہے۔ میں نے خود کمرے کے اندر جا کر دیکھا ہے۔ میں میر بخش کے کمرے سے نکل کر تمہیں بتانے آرہی تھی کہ وہ دونوں مصیبتیں گلے پڑ گئیں۔" پھر اس نے راہ داری میں اس سمت اشارہ کیا جدھر سے ہم آئے تھے۔ ہمارے کمرے کے دروازے کے سامنے ایک باوردی ملازم بے ہوش پڑا تھا۔

میر بخش کا اچانک غائب ہو جانا تشویش میں مبتلا کرنے والی بات تھی مگر یہ ایسے لمحات نہیں تھے کہ میں اس کی تلاش میں اوپر نیچے بھاگتا پھرتا۔ ہم دونوں اگر بہ خیریت ہوٹل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے تو میر بخش کے لیے بھی کچھ کر سکتے تھے۔ اسی خیال کے تحت میں نے ساحل کی کلائی کو ہولے سے جھٹکا دیا اور تیزی سے نیچے جانے والے زینے پر قدم رکھتے ہوئے کہا "ہری اپ' جلدی۔ ہمیں پہلی فرصت میں ہوٹل کی عمارت سے نکلنا ہے۔"

بیگ ابھی تک ساحل کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس سے وہ بیگ لے لیا۔ اس طرح اسے میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں آسانی ہو گئی۔ ہم تقریباً دوڑنے والے انداز میں زینے اتر رہے تھے۔ ساحل نے پریشانی کے عالم میں سوال کیا۔

"وجدان! میر بخش کہاں جا سکتا ہے؟"

"ابھی یہ سب کچھ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولی "میں ڈر رہی ہوں کہیں اسے کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو!"

"اور یہ بھی ممکن ہے' وہ کوئی گڑبڑ محسوس کرتے ہوئے کہیں از خود اِدھر اُدھر ہو گیا ہو۔" میں نے کہا "میر بخش ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم شخص ہے۔ پھر اس کے پاس ایک بھرا ہوا ریوالور بھی ہے۔ وہ آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والا بندہ نہیں۔"

وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولی "ہاں' یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

ہم فرسٹ فلور سے نکل کر ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں پہنچے ہی تھے کہ نیچے دو تین افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ لوگ استقبالیہ کاؤنٹر سے ڈائننگ ہال کی جانب آرہے تھے۔ دوسرے فلور پر میں نے چند لمحے قبل جو مارا ماری کی تھی وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھی۔ یقیناً ہوٹل کے عملے کے کچھ لوگ صورتِ حال جاننے کے لیے اوپر کا رخ کر رہے تھے۔

میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس وقت تین کیا' تیس افراد بھی میرے سامنے آجاتے تو میں انہیں پچھاڑ کر رکھ دیتا لیکن میں اس ہوٹل میں خواہ مخواہ کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے مڈبھیڑ سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی اور اچک کر ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی اوٹ میں ہو گیا۔ ساحل بھی میرے ساتھ ہی کھنچی چلی آئی۔ اس کی کلائی میرے ہاتھ میں تھی' نہ بھی ہوتی تو وہ ایسا ہی کرتی۔

اس وقت ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال کی بتیاں گل تھیں۔ بس ایک آدھ بلب ہی روشن تھا۔ ہم دونوں ایک نیم تاریک گوشے میں خود کو چھپانے میں کامیاب رہے' پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ افراد ہال میں داخل ہوئے' میں نے جن کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ میں نے سانس روک کر ہال کے زینے پر نگاہ جما دی۔

وہ تعداد میں تین تھے اور ان کا تعلق ہوٹل کی سیکیورٹی فورس سے تھا۔ میں نے ان کی مخصوص یونی فارم سے انہیں پہچان لیا۔ وہ تینوں پوری طرح مسلح تھے۔ انہوں نے وہاں رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور تیزی سے اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ یقینی طور پر اوپر کے حالات کا جائزہ لینے گئے تھے۔ میں نے زینے سے نظر ہٹا کر ساحل کو دیکھا۔

"تھینکس لارڈ بدھا!" ساحل کے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی "شکر ہے' یہ مصیبت تو ٹلی۔"

میں نے اس کی کلائی پر اپنی گرفت قدرے سخت کرتے ہوئے کہا "یہ مصیبت عارضی طور پر ٹلی ہے... بلکہ یوں سمجھو کہ یہ اس مصیبت کا پہلا حصہ تھا۔ جب تک ہم اس ہوٹل سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر نہیں پہنچ جاتے' یہ مصیبت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی' ہمارے ساتھ ساتھ چلے گی۔"

"جس طرح ہم ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی اور میرے ہاتھ کی گرفت میں جکڑی اپنی کلائی کی طرف دیکھا پھر بولی "وجدان! کہیں تم مجھے بھی کوئی مصیبت تو نہیں سمجھتے؟"

"کیا کسی مصیبت کو اتنے اہتمام سے پکڑ کر رکھتے ہیں؟" میں نے اس کی کلائی پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ جھینپ گئی۔ میں اس وقت براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ نظر چراتے ہوئے سرسراتی آواز میں بولی۔

"وجدان! میں زبردستی اور اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ انڈیا سے پاکستان چلی آئی ہوں۔ رانی روپ متی اور دیگر افراد نے مجھے ہندوستان میں قیام کا مشورہ دیا تھا۔ تم نے بھی مجھے اپنے ساتھ پاکستان لانے کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ صرف اور صرف میری ضد تھی کہ میں تمہارے ساتھ ساتھ چلوں گی' چاہے تم کہیں بھی جاؤ۔ اس حوالے سے میں کبھی کبھی سوچتی ہوں' کہیں تم مجھے کوئی مصیبت نہ سمجھتے ہو!"

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی بھرپور اور حسین مصیبت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو میں نے اس کی کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "اچھا موقع ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں ہوٹل سے باہر نکل جانا چاہیے۔ اوپر جانے والے سیکیورٹی گارڈز کو جب ہمارے "کارنامے" کا علم ہوگا تو وہ شکاری کتوں کی طرح ہماری بُو سونگھتے ہوئے لپکیں گے۔"

ہم دبے قدموں ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال سے نیچے اتر آئے۔ میں نے زینے کے اختتام پر پہنچ کر استقبالیہ کی جانب محتاط نظر دوڑائی۔ وہاں استقبالیہ کلرک کے سوا اور کوئی مجھے نظر نہ آیا۔ جب ہم ہوٹل میں آئے تھے تو میں نے ہوٹل کی انٹرنس پر بھی ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ کو دیکھا تھا جو اس وقت نظر نہیں آرہا تھا۔ ممکن ہے' وہ بالائی منزل کی طرف جانے والے گارڈز میں شامل ہو۔ بہرحال' اس گارڈ کی عدم موجودی ہمارے حق میں مفید ثابت ہونے والی تھی۔

میں نے ساحل کو اشارہ کیا اور ہوٹل کی لابی میں قدم رکھ دیا۔ استقبالیہ کلرک نے چونک کر ہمیں دیکھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ استقبالیہ چھوڑ کر ہماری طرف بڑھتا' ہم تقریباً دوڑتے ہوئے لابی کا

ایریا عبور کر چکے تھے۔ میں نے عقب میں ریسپشنسٹ کی للکارتی ہوئی آواز سنی لیکن ہم نے اپنے قدم نہیں روکے اور ہوٹل کی عمارت سے باہر آ گئے۔

سامنے ہی مجھے ایک ٹویوٹا ہائی ایس کھڑی نظر آئی۔ وہ کریم کلر گاڑی اسٹارٹ تھی اور ایک باوردی شخص اس کی چھت پر سے سفری بیگ اتار رہا تھا۔ قریب ہی ہوٹل کے دو مہمان بھی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ ان میں ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔ ان کی شکل و شباہت نے مجھے پلک جھپکتے میں بتا دیا کہ ان کا تعلق فار ایسٹ کے کسی ملک سے تھا۔ ٹویوٹا ہائی ایس پر اس ہوٹل کا نام اور مخصوص مونوگرام بھی بنا ہوا تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ گاڑی مہمانوں کو ائرپورٹ سے ہوٹل لانے اور ہوٹل سے ائرپورٹ تک چھوڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ان دو مہمانوں کا ہوٹل کی گاڑی میں یہاں پہنچنا یہ ظاہر کرتا تھا کہ انہوں نے پہلے سے بکنگ لے رکھی تھی' ہوٹل کا ملازم (HIACE) میں انہیں ائرپورٹ سے یہاں لایا تھا۔

میں گاڑی پر نظر پڑتے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ان ہنگامی حالات میں' میں اسے استعمال کروں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ باوردی شخص استقبالیہ کلرک کی چیخ پکار کا مطلب سمجھ پاتا اسے ہم پر توجہ دینے کا موقع ملتا' میں نے اچانک اس پر حملہ کر کے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ساحل کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

"ہائی ایس" میں سے اترنے والے مہمانوں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو دوڑ کر ہوٹل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھے۔ عورت کے حلق سے تو باقاعدہ ایک ڈری سہمی اور طویل چیخ بھی برآمد ہوئی تھی۔ میں نے وردی پوش شخص پر صرف تین سیکنڈ ضائع کیے اور اس کی گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص نس کی "مزاج پرسی" کرتے ہوئے اسے انٹاغفیل کر دیا۔ وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔

اس کارروائی کے بعد میں نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ استقبالیہ کلرک نے خاصی عقل مندی کا ثبوت دیا اور دور کھڑا چلاتا رہا۔ اس نے میرے انتہائی نزدیک آنے کی چنداں کوشش نہیں کی۔ شاید اس نے میرے تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس وقت مرنے مارنے کے فل موڈ میں ہوں۔ اپنی جان سب کو پیاری ہوتی ہے اور کلرک...... چاہے وہ کسی بھی شعبے کا ہو' اسے اپنی زندگی کچھ زیادہ ہی عزیز ہوتی ہے کیوں کہ اس کی ایک مفلس زندگی پر دسیوں دوسری زندگیوں کا بوجھ بھی لدا ہوتا ہے!

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بیدار انجن والی ٹویوٹا ہائی ایس کو اس کے موجودہ رخ پر ڈال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں شاہراہ عراق پر نکل آیا ہوں۔ یہ وہی سڑک تھی جس کو میرے لہو سے سرخ کرنے کی دھمکیاں زاہد حسین نے مجھے دی تھیں۔ اس نے مجھے صرف دس منٹ کا وقت دیا تھا۔ پانچ منٹ سوچ بچار کے لیے اور پانچ منٹ ہوٹل سے نکل کر اس کے بندوں تک پہنچنے کے لیے۔ اس وقت ...... میں سے ایک سیکنڈ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ میں نے ساڑھے تین بجے فون کو بند کر دیا تھا اور اب تین بج کر پندرہ منٹ ہو رہے تھے۔ گزشتہ دس منٹ بہت ہنگامہ خیز اور سنسنی آمیز گزرے تھے۔ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جب میاں زاہد نے مجھے دس منٹ کی مہلت دے دی تھی تو اس مدت گزرنے سے پہلے ہی اس کے آدمیوں نے ساحل کو گھیرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ یہ ممکن نہیں تھا کہ میاں زاہد اس معاملے سے لاتعلق ہو۔

میں ذہن میں ایسے ہی سیکڑوں سوال لیے ڈرائیو کر رہا تھا کہ ایک عمارت پر مجھے پاکستان کا جھنڈا لہراتا نظر آیا۔ اس عمارت کی پیشانی پر مجھے "الیکشن ہاؤس" کے الفاظ لکھے دکھائی دیے تو میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں غیر ارادی طور پر اسی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میاں زاہد کے آدمی میرے انتظار میں' سوزوکی ایف ایکس میں پولیس کی وردیاں پہنے بیٹھے تھے۔ مجھے پیدل چل کر ان تک پہنچنا تھا۔ میں نے میاں زاہد کو یہی راگ سنایا تھا۔

میں نے ہر نوعیت کی صورتِ حال سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ٹویوٹا ہائی ایس الیکشن ہاؤس کے بعد "ایف آئی اے" کے تھانے کے پاس سے گزری۔ سامنے ہی کورٹ کی عمارت تھی۔ میں نے شاہراہ عراق کے اختتام پر لیٹر بکس کے ساتھ ایک گرے کلر سوزوکی ایف ایکس کھڑے دیکھا۔ گاڑی کے اندر مجھے دو پولیس والے بھی نظر آئے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر تھا جب کہ دوسرے نے پسنجرز سیٹ سنبھال رکھی تھی۔

سوزوکی ایف ایکس کچھ اس انداز میں کھڑی تھی کہ گاڑی کا عقبی حصہ شاہراہ عراق پر تھا۔ اس وقت میرے دماغ میں چوہدری نوازش علی اور اس کے کارندوں کے لیے غم و غصے اور نفرت کی شدید ترین لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں نے ٹویوٹا ہائی ایس سے ایک نپی تلی اچھوتی سی ٹکر سوزوکی ایف ایکس کی "دُم" پر رسید کی۔ اس کارروائی میں' میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ دونوں گاڑیوں کو کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ میں اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب رہا۔ گاڑیوں کے معمولی ٹکراؤ نے ساحل کو چیخنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولی "کیا کر رہے ہو وجدان؟"

"ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"آنکھیں تو کھلی رکھو۔" اس کے لہجے میں برہمی نہیں بلکہ سرزنش تھی "تم نے پولیس کی گاڑی کو ہٹ کیا ہے۔ ہم پہلے ہی کم مصیبت میں مبتلا نہیں۔ اب یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔"

میں نے اپنی گاڑی کو بائیں جانب موڑ لیا۔ وہ سوزوکی ایف ایکس بھی ٹکر کھانے سے پہلے اسی رخ پر کھڑی تھی۔ ہائی ایس کی "تھپکی" نے اسے لولا لنگڑا یوٹرن لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ گویا اب وہ ہماری مخالف سمت میں رخ کیے کھڑی تھی۔

میں نے ساحل کی بات کے جواب میں کہا "میں نے آنکھیں کھول کر ہی پولیس والوں کو "سیلوٹ" مارا ہے۔ میں یہی چاہتا ہوں کہ وہ ہمارے تعاقب میں لگ جائیں۔"

میری بات ختم ہونے تک ایف ایکس نے باقاعدہ یوٹرن لے لیا تھا۔ اب اس کا رخ ہماری جانب تھا۔ ان کے عزائم سے لگتا تھا کہ وہ میری خواہش ضرور پوری کریں گے۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لوگ مجھے وجدان کی حیثیت سے پہچان گئے تھے ورنہ وہ کبھی بھی اپنی جگہ چھوڑ کر ہمارے تعاقب میں نہ آتے۔ میاں زاہد نے انہیں ایک خاص مقصد کے لیے وہاں متعین کیا تھا۔

ساحل میری باتوں سے خاصی الجھ گئی تھی۔ اس نے کہا "وجدان! تم بھی عجیب بات کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مصیبت کی ان گھڑیوں میں تم پولیس کو اپنے پیچھے کیوں لگانا چاہتے ہو؟"

"وہ پولیس والے نہیں ہیں۔" میں نے ساحل کی پریشانی دور کرنے کے لیے انکشاف انگیز لہجے میں کہا "پولیس کی وردیاں انہوں نے بھرم بازی کے لیے پہن رکھی ہیں۔"

وہ حیرت سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" پھر اس نے تعاقب میں آنے والی ایف ایکس کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا "وجدان! وہ باقاعدہ پولیس یونی فارم میں ہیں۔ تم کس بنا پر کہہ رہے ہو' وہ پولیس والے نہیں؟"

میں نے کہا "پولیس کی وردی پہننے سے کوئی پولیس والا نہیں ہو جاتا۔ میں نے بتایا ہے نا' یہ بھرم بازی ہے۔"

"پھر وہ کون لوگ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میرے پُراعتماد انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر میں ان لوگوں کو پولیس والا نہیں سمجھ رہا تو اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہو گی۔ میں کوئی بھی بات خواہ مخواہ اور بے مقصد نہیں کہتا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بتایا "وہ دونوں افراد میاں زاہد حسین کے آلۂ کار ہیں جنہوں نے پولیس اہل کاروں کا بھیس بھر رکھا ہے۔"

"تم نے انہیں کیسے شناخت کیا؟" ساحل کے سوالوں میں شک نہیں بلکہ تجسس تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے میں جب ساحل کو میر بخش کی جانب روانہ کیا تھا تو اس کے بعد ہی میاں زاہد حسین سے سوزوکی ایف ایکس اور پولیس والوں کے بہروپ میں اس کے بندوں کے حوالے سے بات ہوئی تھی۔ ساحل اس گفتگو سے آگاہ نہیں تھی اور یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اسے تفصیل سنانے بیٹھ جاتا اس لیے میں نے مختصر الفاظ میں کہا۔

"تمہارے سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا' پہلے ذرا ان حرام زادوں سے نمٹ لوں۔"

ساحل نے خاموشی اختیار کر لی اور گردن موڑ کر عقبی جانب دیکھنے لگی۔ ایف ایکس والے اب باقاعدہ ہمارے تعاقب میں لگ گئے تھے اور دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج کم ہو رہا تھا پھر یہ فاصلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔

میں نے سڑک کے اختتام پر پہنچ کر ہائی ایس کو دائیں جانب موڑ لیا۔ ایف ایکس نے ہائی ایس کی تقلید کی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا نقلی پولیس والا کانسٹیبل کے بہروپ میں تھا جب کہ پسنجرز سیٹ پر براجمان میاں زاہد کے آدمی نے اے ایس آئی کا سوانگ بھر رکھا تھا۔ میں کسی ویران مقام کی تلاش میں تھا جہاں سوزوکی ایف ایکس والوں سے شاندار "ملاقات" کی جا سکتی۔ میاں زاہد حسین کو یہ بتانا بہت ضروری تھا کہ اس کا پالا کس شخص سے پڑا تھا۔ محبت' جنگ اور دشمنی میں سب جائز سمجھا جاتا ہے۔ میرے اور چوہدری نوازش علی کے درمیان دشمنی خاصی "میچور" ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے شکار کرنے کے لیے اپنے ایک سے ایک مہرے آگے بڑھائے تھے جنہیں میں پیٹتا آیا تھا۔ زندگی اور موت کی اس شطرنج میں دونوں جانب اب بہت کم مُہرے بچے تھے گویا کھیل فائنل راؤنڈ میں چل رہا تھا۔

ایف ایکس والوں نے میری مشکل آسان کردی یا یوں کہہ لیں کہ انہوں نے میری خواہش پوری کردی۔ سرور شہید روڈ جیسے ہی آرٹس کونسل والے چوراہے پر ختم ہوا' ایف ایکس نے ہائی ایس کو اوورٹیک کرلیا۔ اب دونوں گاڑیاں ایم۔ آر کیانی روڈ پر آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ بگوڈا طرزِ تعمیر کی عکاس عمارت "شاہین کمپلکس" سے تھوڑا پہلے ایف ایکس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں' میں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا کیوں کہ میرے مطلب کا مقام تھا۔ رات کے لگ بھگ چار بجے اس مقام پر گہرے سناٹے کا راج تھا۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھی ناکافی تھی لہٰذا میرے کام کے لیے راہ ہموار تھی۔

بریکس کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک ساتھ رکیں۔ ایف ایکس کی پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کرباہر آگیا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک پستول واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ والے نے بھی نقلی اے ایس آئی کی تقلید کی پھر وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ہماری گاڑی کے نزدیک آگئے۔ میں اور ساحل ابھی تک ہائی ایس کے اندر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سرگوشیانہ انداز میں ساحل کو سمجھا دیا تھا کہ اسے عملی طور پر کچھ نہیں کرنا' صرف میرے اشاروں پر ناچنا ہے اور پہلا اشارہ یہ ہے کہ جب تک میں اس سے نہ کہوں' وہ ہائی ایس کی پسنجرز سیٹ کو نہیں چھوڑے گی۔

ساحل نے سمجھ داری سے اثبات میں سرہلا دیا۔

پستول بردار نقلی اے ایس آئی میری سائیڈ میں آگیا جب کہ کانسٹیبل کے بہروپ والا ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں نے گاڑی رکتے ہی ساحل کی جانب والا دروازہ اندر سے لاک کردیا تھا۔ دروازے کا شیشہ پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔

البتہ میری سائیڈ والے دروازے کا شیشہ گرا ہوا تھا۔ اے ایس آئی نظر آنے والا پستہ قامت موٹا شخص مجھ پر پستول تانے ہوئے غرایا "ڈائری کہاں ہے؟"

"کون سی ڈائری؟" میں نے جواباً سوال کردیا۔

وہ خونخوار لہجے میں بولا "ہمارے پاس فضول بحث کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو' میں کس ڈائری کی بات کررہا ہوں۔ وہ ڈائری میرے حوالے کردو ورنہ......"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ میاں زاہد کی جانب سے اسے یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ ہماری جان لے لے ورنہ وہ اس موقع پر ڈائیلاگ میں وقت ضائع نہ کرتا اور پہلی فرصت میں ہمیں شوٹ کردیتا۔

میں نے اس سے پوچھا "اگر میں تمہیں وہ ڈائری نہ دوں تو تم کیا کرلوگے؟"

"میں تمہاری ماں......"

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں میری ماں کو کوئی غلیظ گالی دینے کا ارادہ کیا تھا۔ اپنی ماں کے خلاف اس کی ناپاک زبان سے کوئی الٹی بات کیسے سن سکتا تھا۔ وہ ماں جس کا دودھ لہو بن کر رگوں میں دوڑ رہا تھا...... اور جس کو میں نے اپنی بصارت کے ذریعے خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تھا۔

میں پہلے ہی کسی ہنگامی کارروائی کے لیے تیار بیٹھا ایک جھٹکے سے میں نے ہائی ایس کا دروازہ کھولا اور اچھل کر گاڑی سے باہر آگیا۔ نقلی اے ایس آئی کے لیے یہ ایک غیر متوقع حرکت تھی۔ ہائی ایس کا وزنی دروازہ ایک دھماکے سے اس کے منہ پر پڑا۔ وہ ایک دردناک چیخ مارتے ہوئے پیچھے گرا۔ ہائی ایس کا دروازہ اس کے منہ پر ایسے پڑا تھا جیسے کسی بدنصیب پر کوئی افتاد ٹوٹ پڑتی ہے۔ الفاظ اس کے منہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے اور وہ زمین پر ایک جانب پڑا کراہنے لگا۔

اس دوران میں اس کا ساتھی مدد کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ موٹے نقلی اے ایس آئی کو زمین سے اٹھانے کے بجائے آس پاس کچھ تلاش کررہا تھا۔ ایک لمحے میں میرا ذہن اس کی تلاش کی تہ میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھی کے پستول کو ڈھونڈ رہا تھا جو دروازے کے تصادم کے باعث موٹے کے ہاتھ سے نکل کر کہیں اِدھر اُدھر گرگیا تھا۔

میاں زاہد حسین کے ان دو گرگوں سے "کھیلنے" کا یہ کرنے کا وقت تھا اور نہ ہی موقع اس لیے میں ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں فربہ شخص کمر پر ہاتھ رکھ کر زمین سے اٹھ چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے انتہائی قریب پایا تو گھونسا تانتے ہوئے مجھ پر حملہ آور ہوا۔

وہ اگرچہ اچھا خاصا موٹا تازہ تھا تاہم پھرتیلا بھی کم نہ تھا۔ اس کا گھونسا میرے سینے پر لگا۔ میں اس سے پہلے سانس روک چکا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی نے یوگا کی ٹریننگ کے دوران مجھے بتایا تھا کہ انسان اگر بروقت سانس روک لے تو اس کے جسم پر لگنے والی ضرب کم سے کم تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔

جیسے ہی موٹے کے گھونسے نے میرے سینے کو چھوا' میں نے دائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کی گھونسے والی کلائی کو لیا پھر اسے کلاک وائز موڑا دے کر اپنی بائیں کہنی اس کی کہنی پر رسید کردی۔ میری ایلبو کا یہ وار خاصا کاری ثابت ہوا کیوں کہ اس کا بازو مڑنے کے باعث خاصا تن چکا تھا۔ اس ضرب کے طفیل مدِمقابل کی کہنی نے "کڑاکے" کی آواز پیدا کی۔ اس کے ساتھ ہی موٹے نقلی اے ایس آئی کے حلق سے بلبلاہٹ خارج ہوئی۔ اس کا دایاں بازو کہنی کے مقام سے بے کار ہوچکا تھا۔

میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ موٹے کے جھکے ہوئے چہرے پر ایک زوردار ٹھڈا بھی رسید کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کلائی اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کردی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم دور جا گرا۔

اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ موٹے کا ساتھی تھا جس نے مجھے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں کسنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنی اس کوشش میں خاصی حد تک کامیاب رہا۔ اس کی گرفت میں مجھے ایک نیا تجربہ ہوا۔ وہ جتنا دھان پان اور کمزور دکھائی دیتا تھا' ایسا تھا نہیں۔ اس کے سوکھے سڑے بازوؤں میں بجلی بھری تھی اور وہ دائیں بائیں جھٹکے دیتے ہوئے مجھے زمین پر گرانے کی کوشش کررہا تھا۔

جب طاقت اور تکنیک آمنے سامنے ہوں تو جیت ہمیشہ تکنیک ہی کی ہوتی ہے۔ طاقت کی اہمیت سے انکار نہیں مگر جسمانی طاقت ہمیشہ دماغی طاقت (تکنیک + ذہانت) کی غلام رہی ہے۔ اگر طاقت ہی سب کچھ ہوتی تو دنیا کے ہر ملک پر پہلوانوں کی حکومت نظر آتی۔

مدِمقابل نے دائیں بائیں جھٹکے کے بعد مجھے اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ شاید وہ مجھے دھڑام سے زمین پر پٹخنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے ہوا میں بلند کرنے کے لیے اسے تھوڑا نیچے جھکنا پڑا۔ اسی وقت میرا داؤ چل گیا۔ میرے دونوں بازو کہنیوں کے اوپر سے اس کی بانہوں میں قید تھے تاہم میرے ہاتھ آزاد تھے۔ وہ جیسے ہی نیچے جھکا' میں نے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر بجلی کی سی سرعت سے فرنٹ رول کیا۔

میری رولنگ اسے بہت مہنگی پڑی۔ وہ میرے اوپر سے لڑھکتے ہوئے دور جا گرا پھر میں نے اسے اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ وہ جیسے ہی سنبھلا' میں نے اس کے تھوبڑے پر فرنٹ جرک کک رسید کردی۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا تاہم دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے اس کی ہمت کا اندازہ بھی ہوا۔ وہ دونوں مارشل آرٹس سے نابلد تھے اس لیے مجھے اسٹریٹ فائٹر کے اصولوں پر کاربند رہ کر ان سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔

وہ جیسے ہی سیدھا ہوا' میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا دے مارا۔ وہ ردِعمل کے طور پر جھکا تو میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک دھواں دھار اپر کٹ پنچ رسید کردیا۔ وہ کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے مانند ڈکرانے لگا پھر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ مغلظات پر اتر آیا۔

میں اسے نظرانداز کرتے ہوئے موٹے نقلی اے ایس آئی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میرا یہ عمل بروقت تھا۔ وہ خبیث اپنے مجروح بازو کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے لمبی جست بھر کر اسے سوزوکی ایف ایکس کے قریب جالیا پھر اس کے منہ پر ایک چانٹا رسید کرتے ہوئے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا تمہارے میاں زاہد نے تم جیسے زنخے ہی جمع کر رکھے ہیں؟"

وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا "تم ٹھیک نہیں کررہے ہو وجدان!"

"اور وہ تمہارا والد ثانی میاں زاہد سب ٹھیک کررہا ہے؟" میں نے غراتے ہوئے دریافت کیا۔

وہ نحیف سی آواز میں بولا "تم سخت نقصان اٹھاؤ گے۔"

"اچھا۔" میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا "اگر میں نقصان اٹھاؤں گا تو پھر تم یہاں سے بہ خیریت کیوں جاؤ۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے اس موٹے سور کو ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کسی تیز رفتار مشین کے مانند مصروفِ کار ہوگئے۔ وہ قدم قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بری طرح پٹ رہا تھا۔ میرے طوفانی مکوں نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ اس کا چہرہ بھیانک منظر پیش کرنے لگا۔

میں پیٹتے اور وہ پٹتے ہوئے اس شخص کے قریب پہنچ گئے' تھوڑی دیر پہلے میں نے جس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی پھر یہ دیکھ کر میں چونک اٹھا کہ اس دبلے پتلے شخص کے ہاتھ میں ایک پستول موجود تھا۔

یہ وہی پستول تھا جو نقلی اے ایس آئی کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا تھا۔ موٹے کے ساتھی نے اسے پہلے بھی تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک مرتبہ ناکامیاب رہنے کے بعد اس نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔

وہ پستول کا رخ میری جانب کرتے ہوئے شکستہ لہجے میں بولا "اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں تمہیں شوٹ

کردوں گا۔"

اس کی دھمکی میں دم تھا اور نہ ہی آواز میں کوئی خم تھا۔ وہ ہارے ہوئے جواری کی آواز میں بول رہا تھا۔ پستول والے ہاتھ میں، میں لرزش دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے اس ہتھیار کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

"تم مجھے شوٹ کرو گے۔۔۔ اس کپکپاتے ہاتھ کے ساتھ؟"

اس نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی تو لرزے میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا "تم میاں جی کو نہیں جانتے۔ وہ تمہاری کھال نچوالیں گے۔"

میں نے کہا "تمہارے میاں جی نے اپنے تعارف کے لیے دو زنخوں کو پولیس والوں کے بھیس میں میرے پاس بھیجا ہے۔ اس سے میں چوہدری نوازش علی کے تلوے چاٹنے والے میاں زاہد حسین کو بہت دور تک جان گیا ہوں۔ وہ میری کھال کیا نچوائے گا۔ تم دونوں کسی نائی کے پاس جا کر اپنی مونچھیں نچوا ڈالو۔ راستے میں کوئی بنجارن مل جائے تو درجن، دو درجن چوڑیاں بھی چڑھوالو۔۔۔ تاکہ میرے دیے ہوئے "ٹائٹل" پر پورے اتر سکو۔"

وہ میری باتیں سن کر تلملا اٹھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ پستول کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس وقت موٹا نقلی اے ایس آئی ہم دونوں کے درمیان تھا۔ پستول بردار کے عزائم بھانپتے ہوئے میں نے موٹے کی چربیلی توند پر ایک میکانکی جرک کے ساتھ فرنٹ کک جڑ دی۔ یہ ٹھوکر کسی ڈائی مشین کے وزنی ہتھوڑے سے کم نہیں تھی، میری اس غیر متوقع حرکت سے پستول والے نے بے اختیار گولی چلا دی۔

فضا میں فائر کی آواز بلند ہوئی اور موٹا نقلی اے ایس آئی مردہ چھپکلی کے مانند پیٹ سے زمین پر گرا۔ گولی اس کی کھوپڑی کے آر پار ہو گئی تھی۔

میں نے پستول بردار کو دوسرا فائر کرنے کا موقع نہ دیا کیوں کہ اگلی گولی کا نشانہ میں ہی ہوتا۔ میں نے پستول والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی ایک طویل اسٹیپ لے کر سائیڈ کک مدِمقابل کے سینے پر رسید کر دی۔ ہمارے درمیان اس وقت لگ بھگ پانچ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر کسی مارشل آرٹسٹ کو سائیڈ کک پر عبور حاصل ہو تو وہ طویل اسٹیپ لے کر آٹھ سے دس فٹ تک بھرپور کک کا استعمال کر سکتا ہے۔

میری کک کھا کر وہ نقلی کانسٹیبل لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے گیا پھر فٹ پاتھ سے اس کا پاؤں رپٹا اور وہ فٹ پاتھ پر چاروں شانے چت ہو گیا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچا پھر کسی ریسلر کی طرح فضا میں اچھل کر میں پشت کے بل اس کے پیٹ پر گرا۔ اس کے حلق سے "اوں" کی نحیف سی آواز خارج ہوئی اور وہ ہاتھ پاؤں پھیلنے لگا۔

یہ غنیمت تھا کہ وہ ابھی زندہ تھا ورنہ اس قسم کے وار سے اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ جاتی ہے۔ میں زندگی کے حقیقی رنگ کی بات کر رہا ہوں۔ ٹی وی پر دکھائی جانے والی ریسلنگ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں تو نمائشی مار پیٹ کی جاتی ہے۔ ریسلنگ کے مقابلے باقاعدہ انڈسٹری کی حیثیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے اپنے نیچے دبے ہوئے شخص کا پستول والا ہاتھ اپنے قابو میں کیا اور اس کی کلائی کو زبردست جھٹکا دیا۔ پستول ہاتھ کی گرفت سے نکل کر فٹ پاتھ پر جا گرا۔

میں اس کے سینے سے اتر آیا اور اس کے چہرے کو اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس کا خاصا ٹاٹ کر چکا تھا۔ میرے پاؤں کی حالیہ آتش فشاں ضربوں نے اس کا چہرہ مسخ کر دیا۔ جب وہ کسی بھی قسم کی مزاحمت کے قابل نہ رہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ میاں زاہد حسین کے لیے "زندہ بہ دست مردہ" کا یہ پہلا تحفہ اس کی جانب سے خاصی ہلچل مچا دیتا۔ میاں زاہد کا دانت کچکچاتا، تلملاتا اور ناک سے دھواں خارج کرتا چہرہ میرے تصور میں گھوم گیا۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی اور میں نے فٹ پاتھ پر پڑے پستول کو اٹھا کر ٹویوٹا ہائی ایس کی جانب دوڑ لگا دی۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی میں نے گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا "شاہین کمپلکس" سے میں نے گاڑی بائیں جانب ڈاکٹر ضیا الدین روڈ پر موڑ لیا۔ مجھے جلد از جلد جائے وقوعہ سے دور نکل جانا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے فائر کی آواز فضا میں بلند ہوئی تھی، وہ کسی کو بھی اس جانب متوجہ کر سکتی تھی اور ہم تو پہلے ہی اپنے پیچھے جہنم کی بلاؤں کو لگائے ہوئے تھے۔

پولو گراؤنڈ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ساحل نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی۔ اس کی آواز میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔

"وجدان! جس ڈائری کے لیے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا گیا ہے وہ تو۔۔۔"

"ہوٹل ہی کے کمرے میں رہ گئی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہی کہنا چاہتی ہو نا!"

اس نے حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی "تم یہ بات اتنے اطمینان سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں، میں واقعی بہت مطمئن ہوں۔" میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "تم بھی خواہ مخواہ کسی فکر، اندیشے میں نہ پڑو۔ میں نے خود ہی وہ ڈائری ہوٹل میں چھوڑ دی ہے ورنہ تم جب بیگ لے کر کمرے سے نکلی تھیں تو میں تم سے پہلا سوال ڈائری کے بارے میں کرتا۔"

اس کی حیرت دوچند ہو گئی بلکہ اس حیرت نے الجھن اور تذبذب کی شکل اپنا لی تھی۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مم۔۔۔ مگر۔۔۔ وہ ڈائری تو بہت اہم ہے وجدان۔ تم نے اسے ہوٹل کے کمرے میں کیوں چھوڑا؟"

"میاں زاہد کو چکر دینے کے لیے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ اچھل پڑی۔

"مطلب یہ کہ۔" میں نے ہائی ایس کو سگنل سے بائیں جانب موڑا اور اسے "شیرٹن" اور "پی سی" کے درمیان سے گزار کر رفتار بڑھاتے ہوئے ساحل سے کہا "میں چاہتا ہوں، میاں زاہد اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ میں افراتفری میں سرخ جلد والی وہ ڈائری ہوٹل ہی میں بھول کر فرار ہوا ہوں۔"

وہ بولی "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی وجدان۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے تائید کی "یہ بات خاصی پیچیدہ ہے۔"

"میاں زاہد حسین کو اس قسم کی خوش فہمی میں ڈالنے کے لیے تم نے وہ قیمتی ڈائری ہوٹل میں چھوڑ دی۔" وہ متذبذب انداز میں بولی "یہ وہی اہم ڈائری ہے جس کے حصول کے لیے خونی کھیل، کھیلا جا رہا ہے۔ تم نے محض میاں زاہد حسین کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے اتنا بڑا رسک لے لیا؟" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "اور خوش فہمی بھی کیسی! اگر تم ڈائری کی ڈپلی کیٹ یعنی کوئی اور بوگس ڈائری وہاں چھوڑ آتے تو کوئی بات بھی تھی۔ تم تو اصلی ڈائری۔۔۔"

میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "میں نے ہوٹل کے کمرے میں جو ڈائری چھوڑی ہے اسے تم بوگس اور نقلی ہی سمجھو۔ وہ میاں زاہد حسین کے کسی کام نہیں آئے گی مگر وہ اس کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرے گا۔۔۔ اور اس کا پرائیویٹ باپ ملک نوازش علی تو اس ڈائری کو دیکھ کر ایسا گھومے گا کہ زندگی بھر گھومتا ہی رہے گا۔"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی "تمہارا اطمینان بتا رہا ہے کہ تم کوئی گہری چال چل چکے ہو!"

"اب تم بالکل صحیح جگہ پر پہنچ گئی ہو۔" میں نے ہوٹل میٹروپول کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کہا "میری چال اتنی گہری ہے کہ اس کی تہ میں نہ تو میاں زاہد حسین پہنچ سکے گا اور نہ ہی ملک نوازش علی۔ بڈھا چوہدری زندگی بھر سر پٹختا رہ جائے گا مگر وہ اس سونے تک نہیں پہنچ سکے گا جس کی چکا چوند دیکھنے کے لیے برسوں سے اس کی آنکھیں ترسی ہوئی ہیں۔"

وہ سنجیدگی سے بولی "اپنی اس چال کے بارے میں مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے مختصر الفاظ میں اسے سرخ جلد والی ڈائری کے اس ورق کے بارے میں بتایا جو میں نے نہایت صفائی سے پار کر کے اپنی جیب میں منتقل کر لیا تھا۔ اس ورق کے آگے پیچھے دونوں صفحات پر سونے والے متروک کنوئیں کی نشان دہی کی گئی تھی اور بالکل درست مقام پر پہنچنے کے لیے خطوط کی مدد سے ایک نقشہ سا کھینچ دیا گیا تھا۔ وہ دو صفحات اس ڈائری کی روح تھے۔ روح کے بغیر جسم بے معنی ہو جاتا ہے۔ وہ ڈائری بھی اب کسی کام کی رہی تھی اور نہ کاج کی۔ کسی لاش کی طرح وہ بھی ایک بوجھ تھی۔ چوہدری نوازش علی اس ڈائری کو چاہے ایک صدی تک اپنے سر پر اٹھائے پھرتا، وہ مردہ کبھی بولنے والا نہیں تھا۔

پوری بات سننے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! تم نے تو بہت کامیاب چال چلی ہے۔ ایسی ذہانت میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔"

آخری جملہ اس نے بڑی لگاوٹ سے ادا کیا تھا۔ میں نے کہا "انسان اگر اپنی آنکھیں کھلی رکھے تو ایک سے ایک منظر اسے دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ قدرت نے سارے خوب صورت اور حسین مناظر انسان کی آنکھ ہی کے لیے تخلیق کیے ہیں۔ تمہارا مشاہدہ بہت قوی ہے یعنی تم طاقت ور نظر کی مالک ہو۔"

وہ اپنی تعریف سن کر جھکی پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "قدرت نے تو ہر طرف حسن اور دل کشی ہی تخلیق کی ہے لیکن ہماری آنکھوں کو اکثر و بیشتر رنجیدہ اور غم زدہ کرنے والے مناظر ہی دیکھنا پڑتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا

ہے؟"

"یہ حضرت انسان کی کارفرمائی ہے۔ میں نے جواب دیا "وہ اپنے اعمال سے ایسے دل دوز اور جگر پاش مناظر تخلیق کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔"

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی "اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود ہی اپنا سب سے بڑا دشمن ہے!"

"اس میں کیا شک ہے؟" میں نے جلدی سے کہا۔

ساحل گاڑی سے باہر سڑک کو دیکھتے ہوئے چونک کر بولی "وجدان! یہ راستہ تو دیکھا ہوا سا لگ رہا ہے!"

میں نے غور کیا تو ساحل کی بات واضح ہو گئی۔ ٹویوٹا ہائی ایس اس وقت شاہراہ فیصل سے گزر رہی تھی۔ ہم نے گزشتہ روز ریلوے اسٹیشن سے نکلنے کے بعد زیادہ تر سفر اسی سڑک پر کیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ شاہراہ فیصل سیدھی ائرپورٹ کو جاتی ہے۔ اس وقت ہم عائشہ باوانی اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

ساحل نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے وجدان؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے ذومعنی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس وقت ہمارے سامنے کوئی منزل نہیں تھی۔ ہوٹل کو ہم نے نہایت ہی ہنگامی صورتِ حال میں چھوڑا تھا۔ اس شہر ناشناس میں سر چھپانے کا اور کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ قاضی سلطان کا صحافی دوست منہاس باقر دوپہر تک اسلام آباد سے آنے والا تھا۔ اس سے پہلے ادھر کا رخ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" مجھے خاموش دیکھ کر ساحل نے استفسار کیا۔

میں نے جواب دیا "ساحل! اس اجنبی شہر میں میرا ایسا کوئی جانکار نہیں ہے کہ میں رات کے آخری پہر اس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں اور نہ ہی ہم کسی دوسرے ہوٹل میں قیام کا سوچ سکتے ہیں۔"

"پھر کیا ساری رات اسی گاڑی میں سفر کرتے رہیں گے؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ بھاری رات گزارنے کا ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسی گاڑی کو مختلف سڑکوں پر دوڑاتے رہیں..... اس وقت تک، جب تک گاڑی کا ایندھن ساتھ دے یا پھر جب صبح کا اجالا پھیل جائے۔"

وہ معتدل لہجے میں بولی "چلو، ایک طریقہ تو یہ اس کے علاوہ اور کون سا طریقہ ہے تمہارے ذہن رات بتانے کا؟"

"دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم شاہراہ فیصل مانیں۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں!"

میں نے سمجھایا "یہ سڑک ائرپورٹ کی طرف ہے۔ ہمیں اس کی پیروی کرنا چاہیے۔ کراچی ایک الاقوامی شہر ہے۔ اس کا انٹرنیشنل ائرپورٹ چوبیس مصروف رہتا ہو گا۔ ائرپورٹ ہی وہ واحد مقام ہے جہ زیادہ سے زیادہ وقت سکون کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے ہر رنگ و نسل کے موجود ہوں گے۔ کوئی ہماری جانب توجہ نہیں دے بہ آسانی اس ماحول اور ان لوگوں میں رل مل جائیں گے۔"

"ڈن!" اس نے اسٹیئرنگ پر جمے میرے بائیں اپنا دایاں ہاتھ مارتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا ائرپورٹ جائیں گے۔"

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا "لیکن اس میں قباحت ہے۔"

"کیسی قباحت؟"

"اس قباحت کا نام ہے 'لباس'۔" میں نے کہا ہمارے لباس۔"

"کیا ہوا ہمارے لباس کو؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اور میرے لب جائزہ لیا۔ اس کے سینے سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہم دونوں نے سلیپنگ ڈریس پہن رکھے تھے۔

میں نے کہا "ہم اگر اس لباس میں ائرپورٹ کی میں قدم رکھیں گے تو فوراً سب کی نظر میں آ جائیں گے مخواہ مذاق کا نشانہ بنیں گے ہی، اس کے ساتھ ساتھ والی نظریں ہمیں شک کے انداز میں دیکھیں گی۔ اس ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ دوسروں کو اپنے لیں۔"

"پھر کیا کریں؟ کہاں جائیں؟" اس کی الجھن دو گئی۔

"جائیں گے تو ہم ائرپورٹ ہی۔" میں نے اٹل کہا "لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنا لباس تبدیل کرنا ہو گا۔"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "ہم لباس کہاں تبدیل کریں گے؟"

"اسی گاڑی میں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا "ٹویوٹا ہائی ایس خاصی بڑی گاڑی ہے۔ درجن بھر افراد اس میں بہ آسانی سفر کرسکتے ہیں۔ تم گاڑی کے پچھلے حصے میں چلی جاؤ اور اطمینان سے لباس تبدیل کر لو۔ میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے وجدان۔" وہ جلدی سے بولی "میں تم پر اندھا اعتماد کرتی ہوں۔ مجھے یقین ہے' تم میری جانب نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھو گے۔ تم نے قدم بہ قدم میری عزت کی حفاظت کی ہے۔ میں ایسے محافظ پر بے اعتمادی کس طرح ظاہر کر سکتی ہوں۔"

"پھر تمہاری ہچکچاہٹ کی وجہ کیا ہے؟"

"کچھ نہیں!" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی پھر پوچھا "تم گاڑی کو کسی جگہ روکو گے یا یہ کارروائی چلتی ہوئی گاڑی میں ہی کرنا ہوگی؟"

میں نے کہا "چلتی ہوئی گاڑی میں تو یہ مناسب نہیں ہو گا۔ میں کسی تاریک مقام پر گاڑی روکتا ہوں۔ پہلے تم اپنا لباس تبدیل کرو پھر میں کرلوں گا۔"

میں نے ایک "معقول" سی جگہ دیکھ کر ہائی ایس کو شاہراہِ فیصل سے اتار کر سروس روڈ پر ڈال دیا پھر ایک نیم تاریک مقام پر گاڑی کھڑی کردی۔ ساحل کو بیگ کے ساتھ میں نے گاڑی کے پچھلے حصے میں بھیج دیا اور خود گاڑی سے باہر آکر نیچے بیٹھ گیا اور سامنے والے ٹائر کا معائنہ کرنے کی اداکاری کرنے لگا۔

میرا یہ عمل دہرے مقصد کا حامل تھا۔ ایک تو میں مین روڈ سے گزرنے والوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ گاڑی میں کچھ خرابی ہو گئی ہے اور میں اسے چیک کرنے یا ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ دوسرے میں ساحل کی ہچکچاہٹ اور گریز کو رفع کرنے کا خواہش مند تھا۔ گاڑی کی باڈی کے پیچھے میرا جسم چھپ کر رہ گیا۔ مجھے امید تھی کہ اب ساحل کسی فطری دھڑکے کے بغیر لباس تبدیل کرسکے گی۔

پانچ منٹ کے اندر اندر ساحل نے لباس بدل لیا۔ اس نے بلیو جینز پر گرے کلر کی لوزنی شرٹ پہن لی تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ اس کے بعد میں نے بھی سلیپنگ سوٹ سے نجات حاصل کرکے جینز اور دھاری دار ٹی شرٹ زیب تن کر لی۔ پاؤں میں ساحل کی طرح میں نے بھی جوگرز پہن لیے تھے۔ اتارے ہوئے کپڑوں کو ہم نے بیگ میں بھرا اور ٹو... ہائی ایس ایک مرتبہ پھر ائرپورٹ کی جانب رواں دواں ہو گئی۔ اس دفعہ رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

میرے پاس جو رقم بچی تھی' اسے میں نے تین حصوں میں تقسیم کرکے اپنی مختلف جیبوں میں محفوظ کر... کچھ رقم میں نے ساحل کے پاس رکھوا دی۔ دورانِ سفر رقم کو ہمیشہ بانٹ کر مختلف جگہوں پر محفوظ کرنا چاہیے جیب کٹنے یا کسی اور قسم کے زیاں کے سبب کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ڈائری سے نکالا ہوا وہ بیش قیمت... میں نے اپنے لباس کے ایک خاص الخاص مقام پر چھپا... تلاشی لینے والا کوئی بھی شخص اسے بہ آسانی برآمد نہ کر سکتا تھا۔۔۔۔ اور بہ وقت تلاش کرنے والے کو میں کسی... بڑی سے بڑی مشکل میں ڈال دیتا!

O✲O

ٹھیک چار بج کر تیس منٹ پر ہم' بالائی منزل پر وا... ائرپورٹ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی کی چسکیاں... رہے تھے۔ ہم تھوڑی دیر قبل اعصاب شکن لمحات... گزرے تھے ان کے پیشِ نظر بڑی شدت سے کافی کی طل... ہو رہی تھی۔ ہوٹل کی گاڑی ٹویوٹا ہائی ایس کو میں نے پارکنگ لاٹ میں کھڑا کر دیا تھا اور سفری بیگ ہم اپنے ساتھ... آئے تھے۔ میاں زاہد حسین کے گماشتے اس نقلی اے... آئی کا پسٹل اسی بیگ کے اندر کپڑوں کے درمیان رکھا ہو... ہمارے ساتھ بورڈنگ یا امیگریشن والا کوئی معاملہ تو تھا نہ... لہٰذا ہمارے بیگ میں غیر لائسنس یافتہ آتشیں اسلحے... موجودی ہمارے لیے کوئی پریشانی پیدا نہیں کر سکتی تھی۔

کافی پینے کے دوران میں ہمارے درمیان موجودہ حالا... پر گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ ساحل کی سوئی ایک ہی مقام پر ا... ٹھہر رہ گئی تھی۔ اس نے دھیمے لہجے میں اپنی تشویش کا اظ... کیا۔

"وجدان! میری سمجھ میں نہیں آرہا' میر بخش کہاں غائب ہو گیا!"

اس کی تشویش بہ جا تھی۔ میں میر بخش کی طرف... غافل نہیں تھا تاہم گزشتہ ڈیڑھ گھنٹے میں' ہم جن حالات... گزرے تھے' اس میں سب کچھ فراموش کرکے میر بخش... تلاش کے لیے نکل کھڑے ہونا ممکن تھا اور نہ ہی مناسب...

میں نے ساحل سے کہا "تم مجھے تفصیل سے بتاؤ' ب... میں نے تمہیں میر بخش کو بلانے اوپری فلور کی طرف بھیج... تو وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟"

وہ کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی "میں تمہاری اشاراتی ہدایت پر سیدھی ہوٹل کے کمرا نمبر تین سو دو کے دروازے پر پہنچی تھی۔ اس وقت میری گھڑی میں سوا تین بجے تھے۔ رات کے اس پہر میر بخش کو نیند میں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے پہلے ہولے ہولے اس کے دروازے پر دستک دی۔ جب اندر سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا تو میں نے دستک کی قوت بڑھا دی مگر اس دفعہ بھی نتیجہ صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بار بار ناکامیابی کے بعد پتا نہیں' میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر دیکھا اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہلکی سی کلک کے ساتھ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ گویا' میر بخش نے دروازے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا۔"

"حیرت ہے!" میں نے کافی کے ساتھ منگوائے گئے سینڈوچ کا نوالہ توڑتے ہوئے کہا "میر بخش اتنا بے احتیاط تو نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ایک ایک پہلو پر نظر رکھنے والا بندہ ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں بولی "مجھے خود غیر مقفل دروازہ دیکھ کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ لارڈ بدھا اس کی خیر کرے۔ میں تو میر بخش کے لیے بہت پریشان ہو رہی ہوں۔ وہ ہمارا ایک جاں نثار دوست ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میر بخش کی دوستی اور وفاداری کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ خدا اسے سلامت رکھے!" اس وقت میر بخش کے لیے میرے دل سے دعا نکلی تھی۔ میں نے دوبارہ ساحل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "جب تم کمرے مین داخل ہوئیں تو تم نے کیا دیکھا؟ میرا مطلب ہے' وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟"

اس نے بتایا "کمرے کے اندر نائٹ بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی مگر میر بخش کا کہیں نام و نشان نہیں مل رہا تھا۔ میں نے واش روم میں جھانک کر دیکھا اور کمرے کا کونا کونا چھان مارا لیکن میر بخش اس کمرے میں ہوتا تو اس کا کوئی سراغ ملتا۔"

"وہ کہاں جا سکتا ہے!" میں نے پُرخیال انداز میں زیرِ لب کہا۔

ساحل بولی "یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ اس نے کسی قسم کی گڑبڑ کو سونگھ لیا ہوگا۔" میں نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا "اور موقع کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے وہ کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔"

ساحل سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔"

"تم اپنے دل کی گھبراہٹ پر قابو رکھو۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا "اللہ کے فضل سے وہ بہ خیریت ہوگا۔ تم مجھے بتاؤ' جب تمہیں کمرے میں میر بخش نہیں ملا تو پھر تم نے کیا کیا تھا؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "میں تمہیں میر بخش کے غیاب کے بارے میں بتانے آرہی تھی کہ ان دو مردودوں نے مجھے گھیر لیا۔"

"وہ تمہیں کہاں ملے تھے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے میر بخش والے کمرے سے نکل کر جیسے ہی دروازہ بند کیا' وہ دونوں مجھے زینے پر نظر آئے تھے۔" ساحل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "وہ چوتھے فلور سے تیسرے فلور کی طرف آرہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی انہوں نے دوڑ لگا دی۔ میں بھاگتی ہوئی دوسرے فلور پر پہنچی لیکن اپنے کمرے تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے مجھے دبوچ لیا!"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا "ساحل! تمہارے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک نہیں کیا تھا پھر تم نے واپسی پر بے دھڑک کمرے میں داخل ہونے کے بجائے دروازے کو کیوں پیٹ ڈالا تھا؟"

"وہ سب کچھ بوکھلاہٹ میں ہوا تھا۔" وہ معتدل لہجے میں بولی "اس وقت میں اوپر سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اور اس حالت میں کہ دو افراد مجھے قابو کرنے کے لیے میرے پیچھے آندھی اور طوفان کی طرح لپکے چلے آرہے تھے۔ تم اس دستک کو میرا لاشعوری اور اضطرابی عمل کہہ لو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' اس قسم کے سنگین حالات میں انسان اسی نوعیت کی غلطیاں کرتا ہے۔ ان افعال کو غلطیاں کہنا بھی جائز نہیں کیوں کہ اس میں انسان کا ارادہ شامل نہیں ہوتا۔ یہ ایک لاشعوری' بے ساختہ اور فوری عمل ہوتا ہے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! اس وقت ہم بڑی حد تک ایک محفوظ مقام پر بیٹھے ہیں۔ راستے بھر کسی دشمن نے ہمارا تعاقب نہیں کیا جس سے ظاہر ہوتا ہے' ہمارے مخالفین ہمارے فرار ہونے کی سمت سے آگاہ نہیں لہٰذا ہمیں سب سے پہلے میر بخش کو تلاش کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

میں نے ساحل کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "اور

اس تلاش کا آغاز میں اسی ہوٹل سے کروں گا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان۔" وہ بوکھلا گئی "کیا دوبارہ اس ہوٹل میں جانے کا ارادہ ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میر بخش کو ڈھونڈنے کے لیے اس ہوٹل کا رخ کرنا دانش مندی ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔"

"پھر تم کیا کرنے والے ہو؟"

"میں فی الحال یہ کرنا چاہتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر میں نے ریسٹورنٹ کے شفاف اور چم چماتے فرش پر رکھے سفری بیگ کو اٹھالیا۔ گود میں رکھ کر میں نے بیگ کی سائیڈ پاکٹ میں ہاتھ گھمایا تو اپنے مطلب کی شے مجھے مل گئی۔ وہ دراصل ہوٹل کا تعارفی بروشر تھا۔ میں نے بیگ کو دوبارہ فرش پر رکھا اور مذکورہ بروشر ساحل کے سامنے ٹیبل پر ڈال دیا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ کیا ہے؟"

"ہوٹل کا تعارف نامہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ہے۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولی "لیکن اس بروشر کا میر بخش کی تلاش سے کیا تعلق؟"

میں نے کہا "میں ابھی ایک اجنبی بن کر اس ہوٹل میں فون کروں گا۔ فون نمبرز اس بروشر پر موجود ہیں۔ میں خود کو فرید (میر بخش) کا شناسا ظاہر کر کے اس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کروں گا۔ دیکھتے ہیں، ہوٹل والے اپنے کمرے نمبر تین سو دو میں ٹھہرے ہوئے مہمان فرید کے بارے میں کیا رپورٹ دیتے ہیں!"

"ہاں، یہ ترکیب اچھی ہے۔" ساحل نے سراہنے والے انداز میں کہا "اس طرح ہمیں میر بخش کے غیاب کے سلسلے میں ہوٹل والوں کا نقطۂ نظر معلوم ہو جائے گا۔"

ساحل کی مضبوط تائید کے بعد میں کرسی سے اٹھا اور بروشر کے ساتھ ٹیلی فون تک چلا آیا۔ میں نے مذکورہ ہوٹل کے نمبرز ڈائل کیے اور دوسری جانب سے ریسیور اٹھائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

اس وقت تک پاکستان میں "سی ایل آئی" کی سہولت متعارف نہیں ہوئی تھی اس لیے ہوٹل والے مجھے یا اس مقام کو ٹریس نہیں کر سکتے تھے۔ "سی ایل آئی" ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کا تحفہ ہے۔ اس ٹیکنالوجی سے پہلے محکمہ ٹیلی فون جرمن ٹیکنالوجی "اینالوگ" سے استفادہ حاصل کر رہا تھا۔ (ANALOGUE) سسٹم کے تحت اوور سیز کنکٹیوٹی کے لیے بہت دشواری کا سامنا ہوتا تھا اور بعض اوقات کال کروانے کے بعد گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کے مقابلے میں اب وہ سسٹم انتہائی فرسودہ دکھائی دیتا ہے۔

چوتھی بیل پر میری کال ریسیو کر لی گئی۔ میری سماعت سے "ہیلو" کا مخصوص لفظ ٹکرایا پھر آپریٹر نے اس ہوٹل کا نام دہرایا۔

میں نے مطمئن ہونے کے بعد بھاری آواز میں کہا "میں سلیمان شاہ بول رہا ہوں۔ آپ کے ہوٹل میں میرا دوست فرید ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا اس سے بات کروا دیں۔"

"اپنے دوست کا کمرا نمبر بتائیں۔" دوسری جانب سے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا "فرید کمرا نمبر تین سو دو میں ٹھہرا ہوا ہے۔"

دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی پھر نہایت ہی روکھے انداز سے کہا گیا "اس نام کا کوئی آدمی ہمارے ہوٹل میں قیام نہیں اور...... کمرا نمبر تین سو دو تو بالکل خالی ہے۔"

مجھے یہ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ آپریٹر ایک ناقابل یقین سی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک ساعت کے لیے گمان کیا کہیں غلط جگہ تو نمبر نہیں لگ گیا۔ اس غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کیوں کہ مجھے آغاز ہی میں آپریٹر نے ہوٹل کا نام بتا دیا تھا تاہم میں نے پھر بھی اپنی تسلی کی خاطر ہوٹل کا نام واضح الفاظ میں دہرایا اور پوچھا "کیا یہ وہی ہوٹل ہے؟"

"ہوٹل کا نام آپ بالکل صحیح بتا رہے ہیں۔" دوسری جانب سے تصدیقی انداز میں کہا گیا "لیکن آپ کا یہ کہنا غلط ہے کہ ہمارے ہوٹل میں کمرا نمبر تین سو دو میں آپ کا کوئی دوست فرید قیام پذیر ہے۔"

میری الجھن بے انتہا بڑھ گئی۔ میں نے اضطرابی انداز میں کہا "دیکھیں، میں اپنے دوست سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے دو عزیز آپ کے ہوٹل کے کمرا نمبر ایک میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت...... میرا مطلب ہے، لڑکی ہے۔ اس لڑکی کا نام بیلا اور مرد کا نام جاوید ہے۔ آپ ان میں سے کسی کو فون دیں۔"

"شاید آپ کوئی پاگل انسان ہیں۔" دوسری جانب سے کہا گیا "یا پھر آپ کسی شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارے ہوٹل کا کمرا نمبر دو سو ایک گزشتہ ایک ہفتے سے خالی پڑا ہے نہیں، آپ کس جاوید اور بیلا کی بات کر رہے ہیں!"

میں نے ایک اور پینترا بدلا "سنیں، آج شام کو میرا اس سے فون پر بات ہوئی ہے۔ آپ ہی کے ہوٹل میں۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ——"

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس بدتمیز شخص نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ "مسٹر! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم کوئی پاگل ہو جو اس وقت میرا متھا کھانے آ گئے ہو۔ گیٹ لاسٹ۔"

میں خبیث آپریٹر کے رویے پر تلملا کر رہ گیا۔ وہ اس وقت مجھ سے میلوں کے فاصلے پر تھا اس لیے میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں نے تصور میں ریسیور کو اپنا مکا جانا اور اسے آپریٹر کے کریڈل نما منہ پر پٹخ دیا۔

میں نے واپس آ کر ساحل کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ بھی سنتے ہی الجھن کا شکار ہو گئی۔ اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"وجدان! یہ ہوٹل والے ہم سے چار سو بیسی کیوں کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا "ہم سے نہیں، وہ جو کچھ کر رہے ہیں۔ "سلیمان شاہ" سے کر رہے ہیں۔ میں نے فرید (میر بخش) کا دوست بن کر اسی نام سے بات کی تھی۔"

"پھر بھی ان کا رویہ سمجھ سے بالاتر ہے۔"

"میری تو سمجھ میں کچھ کچھ آ رہا ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"تمہاری سمجھ میں کیا آ رہا ہے وجدان؟"

"میاں زاہد حسین کا اثر رسوخ"۔" میں نے معنی خیز انداز میں ساحل کی طرف دیکھا۔

اس سے پہلے میں ساحل کو اپنے کمرے کی تلاشی کے بارے میں بتا چکا تھا۔ جب ہم فلم دیکھنے گئے تھے تو ڈائری کی کھوج میں ہمارے کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ وہ تو میری بروقت حکمتِ عملی کام آ گئی اور قیمتی ڈائری میاں زاہد کے بندوں کے ہاتھ لگنے سے محفوظ رہی۔ فون پر میاں زاہد نے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا تھا کہ ہوٹل کے اسٹاف میں اس کا ایک بندہ موجود ہے۔ میں نے یہ ساری تفصیل ساحل کو بتا دی تھی۔

وہ بولی "وجدان! اگر یہ سب کچھ میاں زاہد کے اشارے پر کیا جا رہا ہے تو پھر میں یہ ضرور کہوں گی، ہوٹل کے اسٹاف میں اس کا صرف ایک بندہ شامل نہیں بلکہ وہاں کا پورا اسٹاف اور انتظامیہ اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں ورنہ ہوٹل کے آپریٹر سے تم نے ابھی بات کر کے مجھے جو کچھ بتایا ہے وہ ناقابلِ یقین حد تک ناممکن ہے۔ اگر ہوٹل والے وہاں ہماری آمد اور قیام سے منکر ہو رہے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ انہیں ایسا کرنے کے لیے اونچی سطح سے احکام موصول ہوئے ہیں۔"

"میں بھی کچھ اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا "میاں زاہد میری توقع سے بڑھ کر بارسوخ ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی خطرناکی سے بچنے کے لیے ہمیں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہو گا۔"

ساحل نے کہا "اس خطرناک شخص کے بھیجے ہوئے دو افراد کے ساتھ تم نے جو عالی شان "سلوک" کیا ہے وہ اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا۔"

ساحل کا اشارہ نقلی کانسٹیبل اور بہروپئے اے ایس آئی کی جانب تھا۔ موٹے "اے ایس آئی" کی لاش ایم آر کیانی روڈ پر بے گور و کفن پڑی تھی۔ اس کے ساتھی کی چلائی ہوئی گولی نے موٹے کی کھوپڑی میں سوراخ کر دیا تھا جب کہ ہم کانسٹیبل کی وردی والے دبلے پتلے شخص کو زخمی حالت میں وہاں چھوڑ آئے تھے۔

میں نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا "ساحل! ہم جس شخص کو زندہ چھوڑ آئے ہیں، وہ ہمارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتا ہے۔"

"وہ تو زخموں سے چور چور تھا۔" وہ سادہ سے انداز میں بولی "تم نے اس کے چہرے پر اتنے ٹھڈے برسائے تھے کہ ممکن ہے، آئینہ دیکھ کر وہ خود کو پہچاننے سے انکار کر دے، وہ بے چارہ ہمارے لیے کیا مصیبت کھڑی کرے گا؟ میرا خیال ہے، وہ تو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل بھی نہیں۔"

"تمہارا خیال صدفی صد درست ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تائید کی "میں نے اس کے جسم کے جوڑ جوڑ کی ایسی خبر گیری کی ہے کہ اسے "فٹ" ہونے میں ہفتہ دس دن تو ضرور لگیں گے لیکن یاد رکھو، دشمن کو کبھی بھی حقیر اور کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ میں نے اس نقلی کانسٹیبل کے حوالے سے مصیبت کھڑی کرنے کی جو بات کی ہے اس سے میرا مطلب کچھ اور تھا۔"

"اپنے اس مطلب کی وضاحت بھی کر دو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا "اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ ان دونوں نے ہمیں ٹویوٹا ہائی ایس میں دیکھا تھا اور یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہائی ایس کا تعلق اسی ہوٹل سے ہے جہاں سے ہم فرار ہو کر ائرپورٹ پہنچے ہیں۔ زندہ بچ رہنے والا وہ نقلی کانسٹیبل اپنے لوگوں کو بتا سکتا ہے کہ

ہم کون سی سواری استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ ہائی ایس کے طفیل ائرپورٹ تک راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔"

ساحل نے کہا "وجدان! تم خواہ مخواہ اندیشوں میں گھر رہے ہو۔ یہ بات تو ہوٹل والے بھی جانتے ہیں کہ ہم نے فرار ہونے کے لیے ان کی مخصوص ہائی ایس استعمال کی ہے۔ وہ لوگ یعنی ہمارے دشمن زیادہ سے زیادہ اس وسیلے سے ائرپورٹ پہنچ جائیں گے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

ساحل نے اپنی بات کا اختتام ایک اچھوتے سوال پر کیا تھا۔ اس کے سوال نے مجھے ایک نئی راہ سجھا دی۔ میں نے مسرور لہجے میں کہا "ساحل! تم قدم قدم پر اپنی ذہانت کو ثابت کرتی رہتی ہو۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہمارے دشمن اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ ہم ائرپورٹ تک آئے ہیں۔"

"میں نے تو ایک سامنے کی اور منطقی بات کی ہے۔" وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی "اس میں میری ذہانت کہاں جھلکتی ہے!"

میں نے کہا "تمہاری اس سامنے کی اور سادہ بات سے میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا ہے۔ تم اس لیے بھی ذہین ہو کہ اس وقت تمہاری بات نے ایک محرک کا کردار ادا کیا ہے۔"

"میری ذہانت کو ایک طرف رکھو اور مجھے اپنے اچھوتے آئیڈیے کے بارے میں بتاؤ۔" وہ اچانک بے حد سنجیدگی سے بولی۔

میں نے نیچے سروں میں کھنکار کر گلا صاف کیا اور اسے بتانے لگا "جب ائرپورٹ کے پارکنگ لاٹ میں ہوٹل کی ٹویوٹا ہائی ایس کھڑی پائی جائے گی تو ہمارے دشمن یہی سمجھیں گے کہ ہم کراچی سے باہر کسی دوسرے شہر یا پاکستان سے باہر کسی دوسرے ملک کی جانب پرواز کر گئے ہیں۔ میرا آئیڈیا یہ ہے کہ اب ہم خود کو مکمل طور پر روپوش کر لیں اور درپردہ اپنے دشمنوں پر کاری ضربیں لگاتے رہیں۔ ان کا دھیان کبھی ہماری طرف نہیں جائے گا۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ ہم کراچی یا پھر پاکستان چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس طرح ہمارا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ ہم بالکل نئی شخصیات کی آڑ میں میاں زاہد حسین کے سینے پر مونگ دلتے رہیں گے۔"

میری بات ختم ہونے پر ساحل نے کہا "وجدان! تمہارا آئیڈیا نہایت ہی دلچسپ اور سنسنی خیز ہے۔ اس قسم کی مہم جوئی میں بے پناہ مزہ آئے گا لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھو کہ میاں زاہد ایک کائیاں اور چال باز شخص ہے۔ اس شہر میں اثر و نفوذ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ وہ آسانی سے یہ بات تسلیم نہیں کرے گا کہ ہم کراچی چھوڑ کر کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔"

"اگر وہ آسانی سے تسلیم نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا؟" میں نے روا روی میں پوچھا۔

وہ بولی "میاں زاہد ہمارے خروج کی تسلی کے لیے "سی ایل" ضرور چیک کروائے گا۔ قریبی پروازوں میں وجدان اور ساحل یا پھر جاوید اور بیلا کے نام نہیں ملیں گے تو ہماری جانب سے وہ مشکوک ہو جائے گا۔ کراچی سے جانے والی پروازوں کے مسافروں کی ای سی ایل (ایگزٹ کنٹرول لسٹ) ہمارے منصوبے کا راز عیاں کر دے گی اور ہماری روپوشی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔"

"تم ایک اہم نکتے کو فراموش کر رہی ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میاں زاہد ایک پیشہ ور شخص ہے، ایک سینڈیکیٹ کا مقامی باس ہے۔ وہ ... کا ایک مربوط نیٹ ورک آپریٹ کر رہا ہے۔ وہ ... مجرموں کی ذہنیت سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ چوہدری نواز ... کی جانب سے اسے اپنے دو دشمنوں (ساحل + وجدان) کی سرکوبی کے احکام ملے ہیں۔ ہم نے ہوٹل میں اپنی ... چھپانے کے لیے (بیلا + جاوید) کے نام استعمال کیے ... پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ہم مزید فرضی ناموں کا ... لے کر شہر سے نکل سکتے ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے ساحل کے چہرے پر پائے جانے والے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا "سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے کمرے سے میاں زاہد کے بندوں کو وہ ڈائری مل گئی ہو گی جس کے لیے اس نے ہمارا پیچھا پکڑا ہوا تھا۔ وہ ڈائری پانے کے بعد میاں زاہد کے لیے ہماری اہمیت خود بہ خود کم ہو جائے گی۔ وہ اس وقت ہماری جانب توجہ دینے کے بجائے پہلی فرصت میں اس ڈائری کو اپنے ولی نعمت ملک نوازش علی تک پہنچانے کی تگ و دو میں لگا ہو گا۔"

ساحل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی "تمہاری وضاحت اور منطق سمجھ میں آ رہی ہے لیکن کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل ہمیں ایک نہایت ہی ضروری کام کرنا ہو گا۔"

"کون سا کام؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

وہ بولی "ہمیں جلد از جلد اپنے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کرنا ہو گا۔ کسی بھی بڑے کام کے لیے ایک فرم فاؤنڈیشن ضروری ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہیے جہاں کھڑے ہو کر ہم پرفارم کر سکیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا وجدان؟"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا "تم سمجھاتی ہی اس طرح ہو کہ کوئی نہ بھی سمجھنا چاہے تو سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

وہ بے چین ہو کر بولی "اس میں مسکرانے والی کون سی بات ہے۔ میں نے تو ایک انتہائی سنجیدہ معاملے کی طرف تمہاری توجہ دلائی ہے!"

میں نے بہ دستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "ساحل! میں تمہاری سنجیدہ بات پر نہیں بلکہ تمہارے اسٹائل پر بے ساختہ مسکرایا ہوں۔"

"کیوں۔ کیا ہوا میرے اسٹائل کو؟" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"ہر گزرتے دن کے ساتھ تمہارے اسٹائل بدلتے جا رہے ہیں۔" میں نے کہا "آج کل تم جتنی میچور اور سوجھ بوجھ کی باتیں کر رہی ہو اسے دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی دھنو ہو جو بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ میں بچوں کی طرح اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ شوخی اور شرارت تمہارے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دنیا کے کسی غم اور فکر سے تمہیں کوئی علاقہ نہیں تھا پھر میں نے تمہارا معصومیت بھرا سوگ وار روپ بھی دیکھا ہے۔ جب تم کھٹمنڈو سے ہندوستان آئیں تو تمہاری سادگی اور بے خبری بھی دیکھنے کی چیز تھی۔۔۔ اور اب تم جتنی بڑی بڑی اور بردباری کی باتیں کرنے لگی ہو، تمہارا یہ انداز یا روپ حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔"

وہ ایک ادا سے بولی "پہلی بات تو یہ کہ میں اب دھنو نہیں رہی لہٰذا دھنو نامی لڑکی سے منسوب ہر اسٹائل ختم ہو گیا۔ تم نے میرا نام ساحل رکھ دیا۔ میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ مجھ میں، تمہیں جو تبدیلی نظر آ رہی ہے وہ اس نام کا اثر ہے۔۔۔ مگر میں ایسا نہیں کہوں گی!"

اس نے بات روک کر سنجیدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا "تم ایسا کیوں نہیں کہو۔۔۔ گی؟"

"کیوں کہ میں ایسا نہیں سمجھتی۔" اس کی سنجیدگی اور گہری ہو گئی۔

"پھر تم کیا سمجھتی ہو؟" میں نے کریدا۔

"یہ سب تمہاری قربت کا اثر ہے وجدان!" وہ بے باکی سے بولی۔

میں اس سے کسی ایسے ہی تیکھے جواب کی توقع کر رہا تھا لہٰذا مجھے حیرت کا جھٹکا لگا اور نہ ہی میں سناٹے میں رہ گیا۔ میرے اور ساحل کے درمیان پائی جانے والی رفاقت کا عرصہ بہت مختصر تھا تاہم اس قلیل مدت میں، میں اسے اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ بڑی عجیب و غریب لڑکی تھی۔ میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئی تھیں اور آ کر چلی گئی تھیں۔ ان میں سے اکثر مجھ سے محبت کرتی تھیں اور بعض تو اپنی محبت میں جان کا نذرانہ دے کر امر ہو گئی تھیں۔ تھائی وانگ، جانکی دیوی اور۔۔۔۔ کون کون سے نام گنواؤں!

کہتے ہیں، دنیا میں جتنے انسان ہیں، اتنے ہی محبت کرنے کے انداز بھی ہیں۔ ہر انسان اپنے اسٹائل سے محبت کرتا ہے۔ جن لوگوں کا اسٹائل قدرے پیچیدہ ہوتا ہے ان کی محبت عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایسے مشکل پسند محبت کرنے والے اپنے محبوب کو بھی مشکلات میں ڈال دیتے ہیں۔ بہرحال، محبت ہر حال میں محبت ہوتی ہے اور جب یہ ہوتی ہے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ سمجھ کر ذہن سے کیا جانے والا فیصلہ نہیں جس میں کوئی مجرب فارمولا استعمال کر کے ضرب، تقسیم سے اپنے حسبِ منشا جواب حاصل کیا جا سکے۔ یہ تو دل کی آواز ہے، الوہی جذبہ ہے۔ جس پر کسی کو اختیار نہیں۔ شاید اسی لیے اکثر محبت کرنے والے بے اختیار نظر آتے ہیں!

ساحل اپنے دل میں میرے لیے جو جذبات رکھتی تھی، میں ان سے بہ خوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ بڑے ضبط اور ربط والی لڑکی تھی۔ میں نے اسے عجیب و غریب کہا ہے تو کچھ غلط نہیں کہا۔ وہ عام محبت کرنے والوں سے بہت مختلف تھی۔ اسے اپنے جذبات اور افعال پر کمال کا عبور حاصل تھا۔ اس کے جذبات میں دیوانگی تھی مگر عمل سے فرزانگی جھلکتی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک حیرت انگیز لڑکی تھی!

"کس سوچ میں ڈوب گئے وجدان؟" مجھے خاموش پا کر اس نے پوچھا۔

"اوں۔" میں چونک گیا پھر بات بناتے ہوئے کہا "میں تمہاری تجویز پر غور کر رہا ہوں وہی مستقل ٹھکانے والی تجویز۔"

اس نے کہا "ہم اس مقصد کے لیے قاضی سلطان کے صحافی دوست منہاس باقر سے مدد لے سکتے ہیں۔ وہ ایک

طاقت ور پبلشر ہے۔ یہ کام اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

"پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" میں نے کہا "لیکن اب ارادہ بدل دیا ہے۔"

"ارادہ بدلنے کی وجہ کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے ساحل کو میاں زاہد کی ان باتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا جو اس نے ہمارے "انڈین ایجنٹ" ہونے کے بارے میں کہی تھیں۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ راشد منہاس روڈ پر ہونے والی قتل و غارت گری کی واردات کو ہمارے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ اخبارات یہی خبریں شائع کریں گے کہ "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹوں نے کراچی کا سکون درہم برہم کرنے کے لیے دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا۔ ان ایجنٹوں کے ذکر میں وجدان اور ساحل کا نام بھی آئے گا۔ اس طرح پورا شہر ان ناموں کی جانب متوجہ ہو جائے گا۔ میاں زاہد نے اپنے جاں بہ لب آدمی سے اپنی مرضی کا بیان دلوا کر بہت گہری چال چلی تھی۔ ہمارے پاس ایسی کوئی شناخت نہیں تھی جس سے خود کو بے گناہ ثابت کر سکتے۔ اہلِ شہر ہمیں انڈین ایجنسی "را" کا ایجنٹ سمجھنے پر مجبور تھے یا یوں کہہ لیں کہ انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میاں زاہد حسین کے جن تین بندوں نے سفید شیر ڈ میں ہمارا تعاقب کیا تھا ان میں سے دو تو موقع پر ہی "سی ایف کے" والوں کی فائرنگ سے ہلاک ہو گئے تھے جب کہ تیسرا آدمی جو ڈرائیونگ کر رہا تھا اسے شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا اور اس نے اپنے باس کی زبان بولتے ہوئے پولیس کو بیان دیا تھا کہ ان کی گاڑی پر "را" کے تربیت یافتہ ایجنٹ وجدان نے گولیاں برسائی تھیں۔ جھوٹا بیان دینے والا شخص تو جہنم واصل ہوا ہی تھا لیکن جاتے جاتے ہمارے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر گیا تھا۔

راشد منہاس روڈ والا خونیں واقعہ اتنا اہم تھا کہ آج کے تمام اخبارات اس کی خبریں لگاتے۔ ان حالات میں یہ سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ منہاس باقر کا اخبار وہ خبر نہیں چھاپے گا۔ وہ تو ویسے بھی شام کا اخبار تھا۔ ایوننگر' اپنی چیٹ پٹی' مسالے دار اور مبالغہ آمیز خبروں کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ہماری خبر کو منہاس باقر کا اخبار پتا نہیں' کس بلندی پر اچھالتا اور ہمیں کس پستی میں گراتا۔ سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ہم سے پہلے ہی ہماری "شہرت" منہاس باقر تک پہنچ جانا تھی لہٰذا اس طرف رخ پھیرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے ساحل کو میاں زاہد حسین سے ہونے والی ... ٹیلی فونک گفتگو کے پس منظر میں صورتِ حال کی نزاکت کا احساس دلایا تو وہ پریشان ہو گئی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ سراسیمہ لہجے میں بولی "اب تو ہمیں کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔ ابھی تک میرے ذہن میں اس کے بارے میں بھی کوئی۔۔۔"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ میں چونکہ اس کی جانب متوجہ تھا اس لیے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تازہ ترین تاثرات مجھ سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ وہ میرے عقب میں دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں نے فطری ردِعمل کے طور پر اس کی نگاہ کے تعاقب میں گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو ساحل کے تذبذب کا سبب سمجھ میں آگیا۔ آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر موجود شخص کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے پہچاننے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔

وہ امتیاز تھا۔۔۔ امتیاز علی۔ "سی ایف اے" نامی تنظیم کا ایک اہم رکن "کرائم فری کراچی" نامی اس ناقابلِ یقین تنظیم کو ابھی تک میرے ذہن نے قبول نہیں کیا تھا۔ میں نے اس نوعیت کے کسی ادارے کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

امتیاز کا رخ ہماری میز کی جانب تھا اور اس کے چہرے پر سجے دوستانہ تاثرات کو بڑی وضاحت سے دیکھا جا سکتا تھا۔ قریب آ کر اس نے ہمیں سلام کیا اور مسکرا کر بولا۔

"جگر! کہاں کا ٹکٹ کٹوا لیا؟"

آج اس کے طرزِ تخاطب میں کل کی بہ نسبت زیادہ بے تکلفی پائی جاتی تھی۔ میں نے گول مول جواب دینے پر اکتفا کیا "ہم کہاں جائیں گے دوست۔ بس ذرا کافی پینے ادھر آ گئے تھے۔"

"کافی پینے!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے نیم طنزیہ دوستانہ لہجے میں بولا "وہ بھی کلفٹن سے اتنی دور۔۔۔ یہاں ایئرپورٹ پر؟" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا "تم تو اپنے کسی رشتے دار سے ملنے لاہور سے کراچی آئے تھے نا جو کلفٹن میں رہتا ہے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے کہا "یار' کیا کھڑے کھڑے ہی انٹرویو کرتے رہو گے۔ آرام سے بیٹھ کر بات کرو۔"

پھر میں نے میز کے گرد پڑی ایک خالی کرسی کی جانب اشارہ کر دیا۔ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

امتیاز پر نظر پڑنے سے قبل میرے اور ساحل کے درمیان اپنے لیے کسی مضبوط اور محفوظ ٹھکانے کے بارے میں تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ امتیاز کی صورت دیکھتے ہی میرے دماغ میں ایک جگنو سا چمک اٹھا۔ بڑی سرعت سے میرے ذہن نے سوچا' میں ذرا سی کوشش کر کے "سی ایف کے" کے درمیان جگہ بنا سکتا ہوں۔ مجھے اس تنظیم کے اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی سروکار۔ میں عارضی طور پر اپنے لیے "سر چھپانے" کا کوئی ٹھکانا کرنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے "سی ایف کے" میرے لیے بہت ہی مفید اور مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے امتیاز سے ہلکی پھلکی گفتگو شروع کر دی۔

"یار! کافی تو ایک بہانہ ہے۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا "دراصل ہمارے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو گئی ہے جو ہم تمہیں یہاں نظر آ رہے ہیں۔"

"کیسی ٹریجڈی؟" اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ہم اپنے جس عزیز سے ملنے آئے تھے۔ وہ اتفاق سے گھر پر نہیں ملا۔ اس لیے ہمیں ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا اور ادھر ہوٹل میں میاں زاہد نے ہمارا جینا حرام کر دیا۔"

وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اگر تمہارا وہ عزیز گھر میں نہیں ملا تو ہوٹل میں ٹھہرنے کی نوبت کیوں آئی۔ تم اس کے گھر میں ٹھہر سکتے تھے۔"

"چند ٹیکنیکل وجوہ کی بنا پر ایسا ممکن نہیں تھا۔" میں نے مبہم سا جواب دیا "فرصت میں تمہیں تفصیلاً بتاؤں گا۔"

وہ کرید سے گریز کرتے ہوئے بولا "یہ میاں زاہد تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گیا ہے؟"

"شاید اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولا "اس کا دماغ خراب ہوا ہے یا نہیں لیکن تم میرا دماغ ضرور خراب کر دو گے!"

اس کا انداز ذو معنی تھا۔ میں نے جلدی سے پوچھا "کیوں' میں نے ایسا کیا کیا ہے؟"

"دیکھو دوست!" وہ یک لخت بے حد سنجیدہ ہو گیا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے نہ تو پہلے تمہاری کہانی پر یقین کیا تھا اور نہ ہی اب اعتبار کر رہا ہوں۔ تم وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو یا جو کچھ اپنے بارے میں بتاتے ہو۔ تم بڑے گہرے آدمی ہو اور میاں زاہد کے لیے تمہاری بہت اہمیت ہے جبھی اس کے بندوں نے ریلوے اسٹیشن سے تمہارا پیچھا کیا اور اب بھی ہوٹل میں وہ تم سے "دل لگی" کر چکا ہے جو تم یہاں بیٹھے کافی پیتے نظر آ رہے ہو۔ یقیناً تمہارے درمیان کوئی دیرینہ دشمنی پھل پھول رہی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

آخری جملہ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا "تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ میری اصل دشمنی لاہور کے ایک نواحی سرحدی گاؤں موضع "رکھاں والی" کے چوہدری ملک نوازش علی سے ہے۔ میاں زاہد حسین' چوہدری نوازش علی کا آلۂ کار ہے اور مجھے لاہور جانے سے روکنے کے لیے اسے سخت ترین احکام موصول ہوئے ہیں۔ وہ اسی سلسلے میں مجھے ٹریپ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے دانستہ سونے کی راز والی ڈائری کا ذکر گول کر دیا تھا۔ امتیاز کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولا "اس کا مطلب ہے' تم لاہور سے نہیں آئے ہو ورنہ تمہیں لاہور جانے سے روکنے کا جواز نہیں بنتا!"

اس نے بڑی جاندار دلیل دی تھی۔ میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں لاہور سے نہیں بلکہ انڈیا سے آیا ہوں۔۔۔ اور اس سے پہلے سنگاپور سے ہندوستان پہنچا تھا۔"

وہ گمبھیر انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے قدرے وضاحت کرتے ہوئے کہا "چوہدری نوازش علی کی اصل دشمنی میرے والد عابد علی سے تھی۔ میرا باپ مجھے بچپن ہی میں سنگاپور لے گیا تھا۔ چوہدری کے آدمیوں نے میرے والدین کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا اور میں ان قاتلوں کا تعاقب کرتے ہوئے پہلے انڈیا پہنچا اور پھر سراپا انتقام بن کر یہاں آیا ہوں۔ چوہدری نوازش مجھ سے خاصا دہشت زدہ ہے اور مجھے خود تک پہنچنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' تم چوہدری نوازش علی کے لیے کوئی توپ قسم کی چیز ہو!" وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "میں نے کہا نا' ذرا فرصت مل جائے تو پھر تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا۔"

"میں نے تمہیں دوست کہا ہے اور دوستی نبھانا بھی مجھے آتا ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "بتاؤ' میں فوری طور پر تمہارے لیے کیا کروں؟"

اس کی پیش کش میں مجھے خلوص کی جھلک نظر آئی۔ میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس کا تقاضا تھا کہ مجھے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی ہو گا۔۔۔ اور وہ امتیاز علی سے بہتر فی الحال اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "مجھے اپنے قیام کے لیے کوئی محفوظ جگہ درکار ہے۔ سردست اتنا ہی ہو جائے تو بہت ہو گا۔"

وہ فراخ دلی سے بولا "سمجھو، تمہارے قیام کا مسئلہ حل ہو گیا۔ آج تم میرے ساتھ، میرے فلیٹ پر رہو گے اور کچھ؟"

میں نے تہِ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا۔ میں نے کہا "دوست! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔"

"دوست بھی کہتے ہو اور احسان مندی بھی ظاہر کرتے ہو۔" وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "امتیاز ہمیشہ بے لاگ اور بے لوث دوستی کرتا ہے۔"

"تم جس مشکل وقت میں میرے کام آ رہے ہو میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں۔" میں نے اسے زیادہ سے زیادہ اعتماد میں لیتے ہوئے کہا "ورنہ آج کل کون کسی کا ساتھ دیتا ہے اور وہ بھی کسی اجنبی کا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "تم ایک اچھے انسان ہو اس لیے میرے تعاون کا بوجھ اپنے شانوں پر محسوس کر رہے ہو مگر فکر نہ کرو، میں تمہیں یہ بوجھ اتارنے کا بہت جلد موقع دوں گا۔۔۔۔ یعنی آج ہی، رات کو!"

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" اس کی مبہم بات کے جواب میں، میں نے کہا۔

وہ بات کرنے سے پہلے بڑے دل آویز انداز میں مسکرایا اور بولا "دوست! آج رات تم مجھے اپنی کہانی سناؤ گے۔ بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں۔"

"اوہ!" میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

وہ مذاق کے انداز میں بولا "تم کیا سمجھے تھے کہ میں تم سے کوئی "فائرنگ" وغیرہ کا کام لینا چاہتا ہوں؟"

"نن۔۔۔ نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "ایسا تو میں نے کچھ نہیں سوچا۔"

اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے اچانک اسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر اس نے پوچھا "دوست، تمہارے دو ساتھی نظر نہیں آ رہے۔ وہ کہاں ہیں؟"

میں جانتا تھا، وہ کسی بھی لمحے بوٹا سنگھ اور میر بخش کے بارے میں سوال کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

"میر بخش تو ہمارے ہی ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور بوٹا نزدیکی ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ میاں زاہد کے آدمیوں نے اسے اغوا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

میں دانستہ بوٹا سنگھ کے بجائے صرف "بوٹا" نام استعمال کر رہا تھا۔ ہم نے اس جمانی کی شناخت کو چھپانے کے لیے یہ راہ نکالی تھی۔

"بہت افسوس ہوا تمہارے ساتھی کی موت کا سن کر۔" امتیاز علی نے رنجیدہ لہجے میں کہا پھر پوچھا "دوسرے ساتھی میر بخش کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔"

میں نے اسے میر بخش کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں مختصراً بتایا۔

وہ میری بات سننے کے بعد اضطرابی لہجے میں مستفسر ہوا "آپ تینوں کراچی کے کس ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتایا اور کہا "یہ ہوٹل صدر کے علاقے میں واقع ہے۔"

"پھر تو میں یہی کہوں گا کہ تمہارے ساتھی میر بخش کے زندہ ہونے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔" وہ تشویش ناک انداز میں بولا "اگر وہ اب تک زندہ بھی ہے تو انتہائی سخت اذیت میں ہو گا۔ تم بتا ہی چکے ہو کہ تمہارے ساتھی کو میاں زاہد کے آدمیوں نے ہلاک کر دیا ہے۔"

میں نے جلدی سے پوچھا "تم میرے ساتھی کی موجودہ مصیبت کے بارے میں اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟"

ساحل بھی امتیاز کی بات سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ میر بخش کے بارے میں پہلے ہی لاتعداد اندیشوں اور ان گنت خدشات میں گھری ہوئی تھی۔

امتیاز نے گمبھیر لہجے میں کہا "وجدان! تم بہ یک وقت خوش قسمت بھی ہو اور بد قسمت بھی مگر تمہاری خوش قسمتی بد قسمتی پر حاوی ہے۔"

"دوست! پہیلیاں نہ بجھواؤ۔" میں نے بے قراری سے کہا "جو بھی کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔"

اس نے کہا "تم بد قسمت ان معنوں میں ہو کہ جس ہوٹل میں تم نے قیام کیا، میاں زاہد حسین اس کے حصے داروں میں سے ایک ہے۔ تم اسے ہوٹل کا مالک بھی کہہ سکتے ہو۔"

ایک لمحے میں مجھ پر بہت ساری حقیقتیں عیاں ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ اس ہوٹل میں میاں زاہد کا اتنا اثر رسوخ کیوں ہے اور ہوٹل کا عملہ اس کے اشاروں پر کیوں ناچ رہا تھا۔

امتیاز علی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "وجدان! خوش قسمت تم اس حوالے سے ہو کہ اس کے چنگل سے زندہ سلامت نکل آئے، گویا تمہاری خوش قسمتی زیادہ طاقت ور نکلی البتہ تمہارا دوست میر بخش۔۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ ساحل نے کہا "وجدان! میں تو تمہیں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں، میر بخش کسی بڑی مشکل میں پھنس چکا ہے۔ لارڈ بدھا اس پر رحم کرے۔"

میر بخش کی سلامتی کے لیے ساحل کی زبان سے بے ساختہ دعائیہ کلمات نکلے تھے۔ امتیاز نے چونک کر ساحل کی جانب دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مجسم سوال کو فوراً پڑھ لیا اور وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میری ساتھی ساحل کا تعلق "بدھ مت" سے ہے۔"

"ہندوستان میں تم لوگوں کا "ساتھ" ہوا ہو گا!" اس کے لہجے میں پُراسرار سوال تھا۔

میں نے جواب دیا "نہیں، یہ کھٹمنڈو سے میری ساتھی بنی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم انڈیا سے پہلے نیپال میں تھے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے پوچھا "تمہارے وہ دونوں ساتھی بوٹا اور میر بخش بھی وہیں سے آئے تھے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا "بوٹا تو واقعی لاہور سے آیا تھا۔ چوہدری کے بندوں نے اس کی زندگی عذاب کر دی تھی اور وہ اپنی جان بچاتے ہوئے کراچی پہنچا تھا البتہ میر بخش عمر کوٹ سے ہمارے ہمراہ ہے۔"

"عمر کوٹ!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا "یہ تو اندرونِ سندھ کا ایک ضلع ہے۔ تم اس ریگستان میں کیا کرتے پھر رہے تھے؟"

میں نے مختصراً اسے غیر قانونی طور پر اپنے بارڈر پار کرنے کا قصہ سنایا۔

"اوہ!" وہ متاسفانہ انداز میں بولا "پھر تو تم دونوں کے پاس پاسپورٹ اور دیگر شناختی کاغذات بھی نہیں ہوں گے؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔" میں نے بد دلی سے کہا پھر اسے میاں زاہد کی چال بازی کے بارے میں بتا دیا کہ وہ کس طرح ہمیں "را" کا ایجنٹ ظاہر کر کے اپنے آدمیوں کی ہلاکت کو ہمارے کھاتے میں ڈالنے کا بندوبست کر چکا ہے۔

"حالانکہ اس کے تینوں بندوں کو ہم نے ختم کیا تھا۔" امتیاز نے کہا۔

میں نے کہا "آج کے اخبارات اس واقعے کی تفصیل شائع کریں گے اور ہمارا باہر نکلنا دشوار ہو جائے گا۔ بیٹھے بٹھائے ہمیں انڈین خفیہ ایجنسی "را" کا ایجنٹ بنا دیا گیا ہے۔"

"حالات سراسر تمہاری مخالفت پر کمربستہ ہیں۔" امتیاز نے پُرتشویش انداز میں کہا "لیکن تم فکر نہ کرو۔ تمہارے پاسپورٹ اور دیگر ضروری شناختی دستاویزات میں تیار کروا دوں گا۔ تم لوگوں کو بس اپنے میک اپ اور گیٹ اپ پر ذرا خصوصی دھیان دینا ہو گا۔ تم بھی یاد کرو گے، کس قسم کے دوست سے واسطہ پڑا تھا!"

"واقعی، تم بہت مختلف قسم کے دوست ہو۔" ساحل نے متشکرانہ انداز میں کہا۔

وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا "پانچ بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ اب میں دو ڈھائی گھنٹوں کے لیے بہت مصروف ہو جاؤں گا۔ تم لوگ یہیں ریسٹورنٹ میں میرا انتظار کرو گے یا میں تمہیں اپنے فلیٹ کا ایڈریس سمجھا دوں!"

ساحل نے کہا "میرا خیال ہے، ہم ریسٹورنٹ میں ہی تمہارا انتظار کر لیتے ہیں۔"

میں نے امتیاز سے پوچھا "تمہاری مصروفیت کی نوعیت کیا ہے؟"

وہ بولا "دراصل میں اپنے باس کے ایک غیر ملکی دوست کو لینے ائرپورٹ آیا ہوں۔ جہاز کو پونے پانچ بجے یہاں پہنچنا تھا مگر وہ آدھا گھنٹا لیٹ ہے۔ اب سوا پانچ بجے وہ لینڈ کرے گا۔ میں نیچے جاؤں گا کیوں کہ "انٹرنیشنل ارائیول" کے لیے نچلی منزل ہی استعمال ہوتی ہے۔ بالائی منزل "انٹرنیشنل ڈپارچر" کے لیے مخصوص ہے۔ میرے پاس کافی وقت تھا اس لیے ریسٹورنٹ میں آ بیٹھا اور یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ تم لوگوں سے ملاقات ہو گئی۔" پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں بھی اس کی تقلید میں کھڑا ہو گیا اور اس سے پوچھا۔ "تمہارے باس کا وہ غیر ملکی دوست کس کنٹری سے آ رہا ہے؟"

"انگلینڈ سے۔" اس نے بتایا "میں مہمان کو باس کے بنگلے پر چھوڑ کر تمہیں لینے آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا۔

وہ جانے سے پہلے کسی الجھن میں نظر آیا پھر کسی فیصلے پر پہنچتے ہی بولا "یار! تم بھی یہاں میرے انتظار میں کیا سوکھتے

پھرو گے۔ مجھے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

اس نے کہا "نیچے پارکنگ میں مہمان کے لیے تو ایک عالی شان گاڑی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس غیر ملکی مہمان کی حفاظت کی خاطر وہ نیلی ہائی روف بھی آئی ہوئی ہے۔ جس میں ہم نے تمہیں کل راشد منہاس روڈ سے بہادر آباد تک پہنچایا تھا۔ ہائی روف میں اشتیاق اور بابر خان بیٹھے ہیں۔ ہائی روف مہمان والی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلے گی اور مہمان کو بہ حفاظت بنگلے تک پہنچانے میں ایک نگراں محافظ کا رول ادا کرے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "مہمان والی گاڑی کو میں ڈرائیو کروں گا۔ تم دونوں ہائی روف کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جانا۔"

ہم دونوں اس کے ساتھ ہو لیے۔ بالائی منزل سے زیریں منزل کی جانب آتے ہوئے میں نے امتیاز سے پوچھا "ان حفاظتی انتظامات کو دیکھ کر لگتا ہے، تمہارے باس کا یہ مہمان کوئی نہایت ہی اہم شخصیت ہے؟"

"وہ اصلی انگریز ہے یار۔" امتیاز نے عجیب سے لہجے میں کہا "اور دولت مند بھی اتنا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ہم پاکستانی تو کسی غریب سے غریب انگریز کو دیکھ کر بھی مرعوب ہو جاتے ہیں، شاید یہ ہماری غلامانہ ذہنیت کا کمال ہے۔ مسٹر نیل آرمر تو ارب پتی انگریز ہے۔ جو اپنی خوب صورت سیکریٹری کے ساتھ باس سے ملنے آ رہا ہے۔"

"اچھا تو تمہارے باس کے مہمان دوست کا نام نیل آرمر ہے!" میں نے دہرانے والے انداز میں کہا "بھئی، اگر وہ انگریز ارب پتی ہے تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارا باس بھی کوئی بہت اونچی شے ہے کیوں کہ نیل آرمر کی ارب پتیت بھی اسٹرلنگ میں ہوگی!"

"ہاں' یہ تو ہے۔" وہ فخر سے سینہ تانتے ہوئے بولا "ہمارا باس واقعی بہت زبردست ہے۔"

میں نے کہا "دوست! میرے دل میں تو تمہارے باس سے ملنے کی شدید خواہش اٹھ رہی ہے۔"

"ملوا دوں گا۔۔۔ بھئی ملوا دوں گا۔" وہ جلدی جلدی بولا "کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر میں تمہیں باس کے بنگلے پر لے چلوں گا۔"

امتیاز کا رویہ کبھی کبھی مجھے کھٹکنے لگتا تھا۔ وہ خود کو جس قسم کی تنظیم کا رکن بیان کر رہا تھا وہاں تو راز کو انتہائی راز رکھا جاتا ہے اور کسی بھی غیر متعلق شخص کو تنظیم کے معاملے میں ہوا بھی نہیں لگنے دی جاتی کجا یہ کہ امتیاز اپنے باس اور اس کے غیر ملکی مہمان دوست کے بارے میں بھی تفصیلاً بتا رہا تھا۔ وہ ہم دونوں کو اپنے فلیٹ پر قیام کی پیش کش کر رہا تھا اور ہائی روف میں ایک مرتبہ پھر ہمیں سفر کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ میری چھٹی حس چپکے چپکے مجھ سے کہہ رہی تھی کہ کہیں کوئی گڑبڑ موجود ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ یہ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں اسی طرح "بھولا شاہ" بنا رہا تو اس تنظیم کی حقیقت بہت جلد مجھ پر آشکار ہو جائے گی۔

ہم امتیاز کی معیت میں نیلی ہائی روف کے پاس آ گئے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے پینتیس سالہ شخص کا نام امتیاز نے بابر خان بتایا تھا۔ کل کی طرح آج بھی اس نے شلوار قمیض ہی زیب تن کر رکھی تھی۔ امتیاز کا دوسرا ساتھی اشتیاق جینز اور ٹی شرٹ میں تھا اور وہ نیلی ہائی روف کے عقبی حصے میں بیٹھا تھا۔

امتیاز نے اشتیاق سے کچھ کھسر پھسر کی اور اشتیاق نے ہمارے لیے ہائی روف کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔ میں نے ساحل کو گاڑی میں سوار کرایا۔ وہ عقبی سیٹ پر براجمان ہو چکی تو میں نے اپنا سفری بیگ اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس بیگ کو دیکھ کر امتیاز چونک اٹھا اور اس نے پوچھا "جگر! یہ کل والا بیگ تو نہیں۔ کیا نیا خریدا ہے؟"

میں دل ہی دل میں اس کی قوتِ مشاہدہ کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جزئیات پر گہری نگاہ رکھتا تھا۔ میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ وہ بیگ بوٹا کا تھا جو ہوٹل چھوڑتے ہوئے ہم نے اس کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ بیگ ہم نے سفر کے لیے نیا خریدا ہے۔"

"کیا تم گاڑی میں نہیں بیٹھو گے؟" مجھے باہر ہی کھڑا دیکھ کر امتیاز نے سوال کیا۔

میں نے کہا "دوست! تمہارے باس کے مہمان کی فلائٹ نے ابھی لینڈ کیا ہے۔ اسے ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلنے میں کم از کم آدھا گھنٹا تو لگے گا۔ اس سے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ اگر تم کوئی حرج نہ محسوس کرو تو اس دوران میں' میں تم سے گپ شپ کر لیتا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے گپ شپ میں۔" وہ عام سے لہجے میں بولا "لیکن میں تمہارے پاس نہیں رک سکتا۔ مجھے ارائیول لاؤنج میں پہنچنا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں تمہیں رکنے کے لیے کب کہہ رہا ہوں۔"

"پھر!" اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

"میں تمہارے ساتھ ارائیوال لاؤنج تک جاتا ہوں۔" میں نے کہا "جب تمہارے باس کا وہ انگریز مہمان اپنی طرح دار سیکریٹری کے ساتھ عمارت کے اندرونی حصے سے نمودار ہوگا تو میں فوراً واپس آ کر ہائی روف میں بیٹھ جاؤں گا۔ تم اپنے مہمانوں کے ساتھ ان کے لیے آئی ہوئی عالی شان گاڑی کی جانب بڑھ جانا۔"

وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تمہاری تجویز معقول اور قابلِ عمل ہے۔"

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ائرپورٹ کے اس حصے میں کھڑے تھے جو انٹرنیشنل فلائٹس سے آنے والے مہمانوں کے لیے مخصوص تھا۔ جگہ جگہ چھت سے لٹکے ہوئے "انٹرنیشنل ارائیول" کے نیون سائن نظر آ رہے تھے۔ ایک مقام پر وہ بورڈ آویزاں تھا جس پر لینڈ کرنے والے جہازوں کی تفصیل تھی اور ان فلائٹس کا بھی اندراج تھا جو ابھی تب میں لینڈ کرنے والی تھیں۔ ارائیوال لاؤنج میں اس وقت استقبال کرنے والوں کا خاصا رش ہو رہا تھا۔

امتیاز نے مذکورہ بورڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک غیر ملکی ائرلائن کا نام اور فلائٹ نمبر دہرایا اور مجھ سے کہا "مسٹر نیل آرمر اس فلائٹ سے آئے ہیں۔"

وہ جہاز لینڈ کر چکا تھا۔ میں نے امتیاز کی بات کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا "کل تم لوگوں نے جس نیلی ہائی روف میں واردات کی تھی آج اسی گاڑی کو ائرپورٹ لے آئے ہو۔ یہ کوئی دانش مندی تو نہیں۔"

وہ بولا "اس گاڑی جیسی کم از کم تین ہزار نیلی ہائی روف کراچی کی سڑکوں پر دندناتی پھر رہی ہیں۔ ہماری گاڑی کی جانب کون توجہ دے گا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا "پھر یہ بھی ہے کہ راشد منہاس روڈ پر ہمیں کسی نے فائرنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی کسی نے ہمارا تعاقب کرنے کی کوشش کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس گاڑی کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کروں گا دوست۔" میں نے کہا "تم اس ییلو کیب والے کو بھول رہے ہو جو ہمیں ریلوے اسٹیشن سے وہاں تک اپنی ٹیکسی میں لایا تھا۔ وہ تم لوگوں کی فائرنگ کا عینی شاہد ہے اور تمہاری نیلی ہائی روف کا نمبر بھی ضرور اس کے ذہن میں کہیں چپک گیا ہوگا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی ایک خاص بات ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔ "میں تمہاری بات یا دلیل سے اس حد تک اتفاق کرتا ہوں کہ ٹیکسی ڈرائیور اس واردات کا عینی شاہد ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے لیے کسی بھی طور خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ اپنی بچت کی خاطر زبان بند رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔" یہاں تک کہہ کر اس نے طویل سانس خارج کی اور پوچھا "اس کے علاوہ وہ خاص بات کون سی ہے؟"

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں امتیاز کو ان معلومات سے آگاہ کیا جو میاں زاہد نے ٹیلی فونک رابطے کے دوران میں مجھے بتائی تھیں۔ اس کے بہ قول' اس کا ایک کارندہ موٹر بائیک پر سفید شیرڈ والوں کی نگرانی کر رہا تھا جس سے شیرڈ والے بھی واقف نہیں تھے۔ اسی نگراں جاسوس نے میاں زاہد کو بوٹا سنگھ اور ہمارے قیام کے بارے میں بتایا تھا۔ نیلی ہائی روف اور اس میں موجود افراد کی "کارروائیاں" بائیک والے جاسوس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں۔

امتیاز نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور تحمل آمیز انداز میں کہا "اول تو مجھے یقین ہے' میاں زاہد نے کسی نگراں جاسوس کے حوالے سے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ ہم بڑی باریک بینی سے اپنے گرد و پیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ایسا کوئی بائیک والا مشکوک بندہ ہماری نظر میں نہیں آیا۔ میاں زاہد نے تم پر رعب گانٹھنے کے لیے تمہیں یہ کہانی سنائی ہوگی۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اور فرض کریں' اگر ایسا ہوا بھی ہو تو دوست' کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس بائیک والے کے ڈر سے یا میاں زاہد سے خوف زدہ ہو کر ہم نظر بند تو نہیں ہو سکتے۔ ہم جتنے بڑے مشن پر سرگرم ہیں اس کا تقاضا ہے کہ ہمہ وقت پاکرم بھی رہیں۔ تم ہماری زندگی کو "ایٹ ہائی رسک" کہہ سکتے ہو۔"

میں نے اس موضوع پر امتیاز سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک موبائل نیوز اسٹینڈ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس اسٹینڈ کو آپریٹ کرنے والا ہماری جانب ہی آ رہا تھا۔ اسٹینڈ پر مختلف رسائل' میگزینز اور آج کے تازہ اخبارات سجے تھے۔ امتیاز فوراً سے پیش تر میرا مطمحِ نظر بھانپ گیا اور اس نے نیوز اسٹینڈ والے سے ایک' اردو کا معروف اخبار خرید لیا۔ میں نے ایک انگلش نیوز پیپر کو ترجیح دی۔ امتیاز نے اس اخبار کی رقم بھی اپنی جیب سے ادا کر دی۔

اس وقت تک ہلکا ہلکا اجالا پھیل چکا تھا۔ ہم دونوں

اپنے اپنے اخبارات کو دیکھنے لگے۔ میری نظر اخبار میں کل والی واردات کو تلاش کر رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میری کوشش بارآور ہو گئی۔ اس دوران میں امتیاز بھی مذکورہ خبر ڈھونڈنے میں کامیاب رہا۔ ہم نے باری باری دونوں اخبارات کی خبروں کا جائزہ لیا۔ کم و بیش ایک جیسی کوریج تھی تاہم زبان اور پیش کش کا انداز مختلف تھا۔ گولیوں سے چھلنی سفید شیرڈ کی تصویر دونوں اخبارات میں ایک ہی جیسی تھی۔

میاں زاہد حسین کا کہا اخبارات کی زینت بن گیا تھا۔ اس خبر کا لب لباب یہ تھا۔۔۔ بدنام زمانہ انڈین خفیہ ایجنسی "را" کے دو تربیت یافتہ ایجنٹ کراچی کا امن و امان درہم برہم کرنے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ خفیہ اور باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ ان خطرناک لوگوں میں ایک وجدان نامی مرد ہے اور دوسری اس کی ساتھی ساحل ہے۔ وہ دونوں مارشل آرٹس کے ماہر اور ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنے پر قدرت رکھتے ہیں' وہ کل صبح اندرون سندھ سے کراچی پہنچے اور پہلی واردات انہوں نے راشد منہاس روڈ پر کی جہاں تین بے گناہ شہریوں کو گولیوں سے چھلنی کر کے وہ فرار ہو گئے۔ پولیس بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ آخر میں ہمارے حلیوں کی کچھ تفصیل بیان کی گئی تھی اور شہریوں سے پُرزور اپیل بھی کی گئی تھی کہ وہ اگر اس حلیے کے کسی مرد یا عورت کو کہیں دیکھیں تو فوراً ایمرجنسی نمبر پر پولیس کو اطلاع دیں۔ اہلِ شہر کا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ تسلی بھی دی گئی تھی کہ وہ "را" کے ایجنٹوں سے ہرگز نہ ڈریں اور انہیں قانون کے حوالے کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ اور پولیس سے بھرپور تعاون کریں۔

امتیاز نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا "جگر! تم دونوں کے لیے صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہو گئی ہے۔ اب تمہیں یوں کھلم کھلا باہر نہیں پھرنا چاہیے۔ میں آج ہی تمہارے گیٹ اَپ اور میک اپ کا کوئی بندوبست کرتا ہوں۔ تم دونوں کے حلیوں کی تفصیل چھپنے کے بعد یہ بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور الجھن زدہ لہجے میں کہا "یہ تو ہو جائے گا مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" ایسا کہتے ہوئے میں اخبار کے اندرونی صفحات میں بھی جھانک رہا تھا۔

"تم کس بات پر الجھ رہے ہو جگر!" امتیاز نے چونک کر پوچھا۔ اس نے مجھے دوست یا یار کے بجائے اب "جگر" کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے اس انداز میں سادگی اور اپنائیت تھی۔

میں نے کہا "پورے اخبار میں کہیں اس ہوٹل کا ہے اور نہ ہی وہاں ہونے والی مارا ماری کا تذکرہ جہاں ہم ٹھہرے تھے۔"

امتیاز نے کہا "اس کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔"

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھنے پر اکتفا کیا۔

وہ بولا "پہلی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ میاں زاہد چونکہ اس ہوٹل کا ایک پارٹنر ہے اس لیے ممکن ہے' اس نے اپنے ہوٹل کو اس معاملے میں ملوث کرنے کو مناسب نہ سمجھا ہو۔ وہ یہاں پر تمہارا دشمن اول ہے۔ وہ اپنے اسٹائل میں تم سے نمٹنا چاہتا ہو گا۔"

میں نے حیرت سے امتیاز کو دیکھا اور کہا "کیا بات کر رہے دوست! ہوٹل والا واقعہ اور اس کے بعد ایم آر روڈ پر جو کچھ پیش آیا وہ چھپنے یا چھپانے والے معاملات نہیں ہیں۔ تمہاری وضاحت سے تو لگتا ہے' یہاں کے اخبارات میاں زاہد کے اشاروں پر خبریں شائع کرتے ہیں۔ کیا پاکستان میں پریس آزاد نہیں؟"

وہ زیرِ لب مسکرایا اور گمبھیر آواز میں بولا "یہاں پریس اور میڈیا کتنا آزاد ہے یہ تو تمہیں رفتہ رفتہ خود پتا چل جائے گا لیکن میں نے اخبارات میں' ہوٹل والے واقعے کی خبر کی غیر موجودی کے سلسلے میں جو بھی وضاحت کی ہے اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ واقعی یہ سب کچھ میاں زاہد کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ میں نے تو ایک امکان کا اظہار کیا ہے۔ بہرحال' یہاں کا میڈیا اور اخبارات مختلف قسم کے دباؤ کا شکار تو رہتے ہیں۔"

اس نے گول مول جواب دے کر بات نبھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا اور پوچھا "امتیاز! ایک وجہ تو تم نے بتا دی۔ اب دوسری وجہ بیان کر دو۔ تم نے کہا تھا' ہوٹل والے واقعے کے غیاب کی دو وجوہ ہو سکتی ہیں!"

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا "دوسری وجہ میرے خیال میں یہ ہو سکتی ہے کہ وہ واقعہ چونکہ ساڑھے تین' چار بجے پیش آیا ہے پریس تک یہ خبر پہنچنے میں مزید دیر ہو گئی ہو گی۔ اس لیے صبح کے اخبارات میں شائع ہونے سے رہ گیا ہو گا۔ ممکن ہے' شام کے اخبارات اس حوالے سے خبریں لگائیں۔"

یہ وجہ قرین قیاس تھی۔ میں قدرے مطمئن ہو گیا۔ اسی وقت امتیاز نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارے مہمان آگئے۔"

میں نے اس کے اشارے کی تقلید میں اس مقام کو دیکھا جہاں سے مسافر ایک ایک کر کے باہر آرہے تھے۔ ہم ریلنگ کا سہارا لیے دس بارہ فٹ دور کھڑے تھے۔

انگریز مہمان نیل آرمر کو دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ جلد ہی مجھے یاد آگیا کہ میں ایسا کیوں محسوس کر رہا ہوں۔ میں نیل آرمر کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور میرے ان محسوسات کا سبب یہ تھا کہ وہ ہالی ووڈ کے فلم اسٹار مائیکل ڈگلس سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ میں نے سنگاپور اور تھائی لینڈ میں مائیکل ڈگلس کی چند فلمیں دیکھی تھیں۔ نیل آمر کی عمر لگ بھگ پچپن سال رہی ہو گی جب کہ مائیکل ڈگلس اس وقت اس سے خاصا کم عمر تھا۔ بس ان میں عمر ہی کا فرق تھا ورنہ صحت اور شکل و شباہت میں انیس بیس کا ہی تفاوت ہو گا۔

نیل آرمر کے ساتھ اس کی سیکریٹری بھی قدم سے قدم ملا کر چل رہی تھی۔ اس نے فل اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا' کھلے بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ اس کی ہائیٹ کسی بھی طور پانچ آٹھ سے کم نہیں رہی ہو گی۔ پاؤں میں موجود پینسل ہیل سینڈل "کھٹ کھٹ" کی مخصوص آواز پیدا کر رہی تھی۔ اس نے بڑی مہارت سے اسکن کلر لیگنگ کا استعمال کر رکھا تھا۔ اس کی چال نرالی' ڈھال متوالی اور انداز میں بے پناہ دل کشی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک حسین و جمیل عورت تھی۔

انگریز۔۔۔ خاص طور پر عورتیں عموماً خوبصورت ہی ہوتی ہیں۔ کسی بدصورت یا کم صورت عورت کو ڈھونڈنے کے لیے خاصی محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاہم ہمارے پاکستانی بھائی جو یورپ کی فرنگنوں سے شادی کرتے ہیں' وہ اس تلاش اور جستجو میں بڑے ماہر اور کامیاب ثابت ہوئے ہیں!"

امتیاز نے دھیرے سے سرگوشی کی "جگر! تم فوراً ہائی روف میں پہنچو۔ میں مہمانوں کو لے کر آ رہا ہوں۔"

پھر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے نیل آرمر اور اس کی سیکریٹری کی جانب بڑھ گیا جو اب خاصے قریب آ چکے تھے۔ میں خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔

O☆O

گزشتہ رات ساحل نے تھوڑی بہت نیند لے لی تھی مگر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ پہلے میں ڈائری کے مطالعے میں غرق رہا۔ ادھر سے فرصت ملی تو میاں زاہد

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے' جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت -/100 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

آدھا چہرہ
محی الدین نواب کا پہلا طویل معاشرتی ناول۔ ان لوگوں کے لیے ایک تازیانہ' جو بگیزگی کے لبادے میں اپنا اصل چہرہ چھپا کر رکھتے ہیں
قیمت -/250 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کالی کہانیاں
جرائم' جادو' شیطان ازم' ارواح' طنز و مزاح' اسرار و خوف' سسپنس اور تجسس پر مبنی ۲۶ کہانیاں
قیمت -/30 روپے ڈاک خرچ -/23 روپے

نک ویلوٹ کی چوریاں
مشہور چور نک ویلوٹ جو بے قیمت چیزیں گراں قدر معاوضے پر چراتا ہے
دو حصے۔ قیمت فی حصہ -/60 روپے
قیمت -/60 روپے ڈاک خرچ -/23 روپے

-/500 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
یہ رعایت پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی حاصل ہوگی

کتابیات پبلی کیشنز
پی او بکس 23 کراچی 74200
فون: 8002502-5060310 فیکس: 8002581
Email: kitabiat@usa.net

کے ٹیلی فون نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد پے در پے ایسے واقعات پیش آتے چلے گئے کہ میں سونے یا آرام کرنے کے بارے میں سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' دشمنوں سے ہلکی پھلکی "اٹکھیلیوں" میں رات کا باقی حصہ بھی بیت گیا! ان حالات میں سکون اور آرام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ائرپورٹ سے نکل کر منزل تک پہنچنے کے دوران میں آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت تھی لہٰذا میں نیند سے لڑتا رہا حالانکہ اس وقت دل تو یہی چاہ رہا تھا' پڑ کر لمبا سو جاؤں اور دو چار دن کے بعد ہی اٹھوں مگر یہ ممکن تھا اور نہ ہی مناسب۔ اس لیے میں نے اس خیال کو ذہن سے اور خواہش کو دل سے باہر نکال پھینکا۔

ہائی روف میں موجود اشتیاق احمد خاصا الرٹ بیٹھا تھا' وہ اپنی عقابی نگاہ سے باہر کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ایک "کے کے" تیار حالت میں اس کے دائیں ہاتھ پر پڑی تھی جسے وہ آن واحد میں استعمال کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ ڈرائیور بابر خان بڑی مشاقی سے ہائی روف کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ غیر ملکی مہمان ہم سے پانچ چھ فٹ آگے ایک چمچماتی نیوی بلیو ہونڈا اکارڈ میں منزل کی جانب رواں دواں تھے۔

سب خیریت گزری اور ہمارا یہ سفر ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے پر ختم ہوا۔ اس عالی شان رہائشی علاقے میں آکر دونوں گاڑیوں میں درمیانی فاصلہ قدرے بڑھ گیا تھا اور جب امتیاز نے ہونڈا اکارڈ کو ایک ذی شان بنگلے کے سامنے روکا تو بابر خان ہائی روف کو اسی اسٹریٹ پر تھوڑا آگے لے گیا اور پھر گاڑی کو ایک جانب روک دیا۔ اس کی محتاط نظر بنگلے کے گیٹ پر ٹکی ہوئی تھی۔

میں نے لب کشائی کی اور اشتیاق سے پوچھا "بھائی! کیا ہم بنگلے کے اندر نہیں جائیں گے؟"

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کوئی جواب نہ دینا چاہتا ہو' تاہم اس نے سنجیدگی سے کہا "تمہارے ہر سوال کا جواب امتیاز ہی دے گا۔"

"اتنا تو بتا دو۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا "ہونڈا اکارڈ جس بنگلے میں داخل ہوئی ہے' کیا تم لوگوں کا باس یہیں رہتا ہے؟"

اس وقت تک نیوی بلیو اکارڈ مذکورہ بنگلے کے اندر غائب ہو چکی تھی۔

اشتیاق نے محتاط لہجے میں کہا "یہ بھی تم امتیاز ہی سے پوچھنا۔"

اس کے بعد مزید کسی سوال کی گنجائش باقی نہ تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اشتیاق دانستہ ہم سے فری ہونے کی کوشش نہیں کر رہا۔ پانچ منٹ کے بعد اسی بنگلے کے گیٹ پر مجھے امتیاز کی صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ بھی تھا۔ امتیاز نے ہماری جانب دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بابر خان نے بڑی سرعت سے گاڑی کو ریورس کیا اور بنگلے کے گیٹ کے سامنے پہنچ گیا۔ ہائی روف جتنی دیر سے کچھ فاصلے پر کھڑی رہی' میں نے اشتیاق کو ہائی الرٹ دیکھا مگر اب وہ خاصا پُرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ تحفظ کے خیال سے اور کسی متوقع خطرے کا پتا چلانے کے لیے بنگلے سے باہر رکا تھا۔ ہائی روف بنگلے کے اندر داخل ہو کر رک گئی تو امتیاز نے ہمیں گاڑی سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

سب سے پہلے اشتیاق اور اس کے بعد میں اور ساحل ہائی روف سے باہر آگئے۔ مسلح گارڈ امتیاز کی ہدایت پر ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے آیا جسے سرونٹ کوارٹر کہنا زیادہ مناسب کی بات تھی۔ ہم وہاں لگ بھگ آدھا گھنٹا رکے۔ اس دوران میں چائے پانی سے ہماری تواضع کی گئی پھر امتیاز ہمیں اپنے ساتھ لے کر بنگلے سے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ ہم امتیاز کی ڈرائیوری میں سفر کر رہے تھے۔

دو چار اسٹریٹ سے گھومنے کے بعد وہ مین روڈ پر آیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "جگر! تمہیں انتظار تو کرنا پڑا مگر میری بھی مجبوری ہے۔ مہمانوں کے لیے انتظامات کرنا تھے۔ اب میں تم لوگوں کو اپنے فلیٹ پر چھوڑ کر واپس اسی مصروفیت میں لگ جاؤں گا۔ رات میں' نشست کریں گے پھر اطمینان کے ساتھ تم سے بات ہو گی۔"

میں نے اشتیاق سے پوچھا ہوا سوال امتیاز سے دہرایا "یار! جس بنگلے میں تم نے غیر ملکی مہمانوں کو پہنچایا ہے' تمہارا باس بھی وہیں رہتا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی "وہ بنگلا مہمانوں کے قیام کے لیے استعمال ہوتا ہے اور وہ بھی وی آئی پی مہمانوں کے قیام کے لیے۔ خاطر داری' دیکھ بھال اور حفاظت کے لیے وہاں نصف درجن ملازم ہیں۔ ایک گارڈ کی جھلک تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

منطقی طور پر میرا اگلا سوال یہ بنتا تھا کہ اگر تمہارا باس اس بنگلے میں نہیں رہتا تو پھر کہاں رہتا ہے؟ مگر میں نے امتیاز سے یہ سوال نہیں کیا۔ اب تک اپنے اور اپنی تنظیم "ایف کے" کے بارے میں اس نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس کا اختیاری عمل تھا' اس میں میری کسی کوشش کو دخل نہ تھا۔

اس وقت ہم کورنگی روڈ سے گزر رہے تھے اور ہمارا رخ گورا قبرستان کی جانب تھا۔ اس روڈ کو نیشنل ہائی وے بھی کہا جاتا ہے۔ امتیاز نے نہایت سنجیدہ اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"جگر! اب میں تمہیں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں اسے دھیان میں رکھنے کی ضرورت ہے۔"

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "میں طارق روڈ کے سنٹرل کمرشل ایریا میں رہتا ہوں۔ میرا فلیٹ ایک عمارت کے سیکنڈ فلور پر ہے۔ تمہیں وہاں قیام کے دوران میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔"

ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا' گاڑی کو گورا قبرستان سے دائیں جانب موڑا اور کہا "بلڈنگ کے لوگ میرے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ میں اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ وہاں رہتا ہوں۔ وہ روزانہ ہمیں آتے جاتے بھی دیکھتے ہیں۔ تم دونوں میرے رشتے داروں کی حیثیت سے وہاں قیام کرو گے۔"

"اور تمہاری بیوی اور چھوٹا بھائی؟" ساحل نے پوچھا۔

"وہ بھی وہیں رہیں گے۔" امتیاز نے کہا "دراصل' اس فلیٹ میں ہماری تنظیم ہی کی ایک رکن روبی نامی لڑکی اور اشتیاق احمد میری بیوی اور چھوٹے بھائی کی حیثیت میں رہتے ہیں۔ سب لوگ ہمیں ایک فیملی سمجھتے ہیں۔"

"جب کہ حقیقت اس کے بالعکس ہے!" میں نے کہا۔

وہ بولا "کسی حد تک کہہ سکتے ہو۔ ایک طرح سے' ہم لوگوں کو جو تاثر دے رہے ہیں اس میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ ہم تینوں ایک ہی تنظیم سے منسلک ہیں' ہمارے اغراض و مقاصد بھی یکساں ہیں۔ اس ناتے سے ہم تینوں "فیملی ممبرز" ہی تو ہوئے! البتہ" وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "ہم آپس میں جو رشتے داری ظاہر کر رہے ہیں اس میں حقیقت کا کوئی دخل نہیں اور ۔۔۔ یہ ہماری مجبوری ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو فوراً لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے لگیں گے۔ تم خاصے سمجھ دار آدمی ہو' میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے!"

"چلو' مان لیا تم جو کہہ رہے ہو وہ ٹھیک ہے اور جو کر رہے ہو' وہ تمہارے معاملات کا تقاضا ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ تو بتا دو' ہم سے تمہاری کیا "رشتے داری" ہو گی۔ اس بات کا تعین کرنا بھی بہت ضروری ہے۔"

"میں یہ تعین کر چکا ہوں۔" وہ گاڑی کو بائیں جانب سندھی مسلم سوسائٹی کی طرف موڑتے ہوئے بولا "جگر! تم روبی کے بھائی ہو اور تمہاری ساتھی ساحل روبی کی بھابی ہے۔ تم دونوں لاہور سے کراچی آئے ہو۔ کچھ عرصہ ہمارے پاس ٹھہرو گے' خوب سیر سپاٹے کرو گے اور واپس چلے جاؤ گے۔ تم کراچی دیکھنے ہی آئے ہو۔ میں روبی کو بھی... تازہ ترین "رشتے داریوں" کے بارے میں سمجھا دوں گا' تم لوگ بھی خیال رکھنا۔ اگر اڑوس پڑوس والے کسی شخص سے تم لوگوں کی براہ راست بات ہو جائے اور وہ تمہارے بارے میں کچھ پوچھ بیٹھے تو تم اسی "سیٹنگ" کی روشنی میں جواب دو گے جو میں نے طے کی ہے۔"

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا "دوست! تم نے ہمارے سارے رشتے روبی ہی سے جوڑ ڈالے ہیں۔ خود کو بڑی صفائی سے بچا لیا ہے۔"

وہ گاڑی کو مین طارق روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا "عورت سے جڑے ہوئے رشتے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں۔" پھر اس نے ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

ساحل نے اس کی بات کی تائید کر دی "امتیاز! میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔"

وہ دوبارہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا "جگر! روبی سے تمہاری رشتے داری جوڑنے کی ایک اور بھی خاص الخاص وجہ ہے۔"

"ایسی کیا وجہ ہو سکتی ہے امتیاز؟" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

وہ سنجیدہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا "دراصل روبی کا تعلق بھی لاہور ہی سے ہے۔ حالات اور گردشِ وقت اسے لاہور سے کراچی لے آئی پھر ایک اتفاق نے اسے ہماری تنظیم میں شامل کر دیا۔ تم بھی چوں کہ بنیادی طور پر لاہور ہی سے تعلق رکھتے ہو اس لیے میں نے تمہیں روبی کا بھائی بنا دیا ہے۔ اب ان رشتوں کا رول ادا کرنا تم دونوں کی ذمے داری ہے۔"

ساحل نے کہا "وجدان! تم اس رشتے داری کو دوسرے رخ سے بھی تو دیکھو۔"

"دوسرا رخ تم ہی دکھا دو۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ بولی "ہم دونوں بالواسطہ اور بلاواسطہ روبی اور امتیاز کے رشتے دار ہیں۔ بھئی' جب تم روبی کے بھائی ہو تو پھر امتیاز کے سالے ہوئے ۔۔۔ اور سالے کی بیوی یعنی میں امتیاز کی بھی بھابی ہی لگوں گی نا!"

اس نے الفاظ "سالے کی بیوی" بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیے تھے۔ میں اس کی شرارت کو سمجھ گیا اور ذو معنی لہجے میں کہا "تمہارے خوب مزے آرہے ہیں ساحل!"

امتیاز نے ایک گلی میں گاڑی روکتے ہوئے کہا "ایک چھوٹا سا کام تم لوگوں کو خود بھی کرنا ہے۔"

ہم دونوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "جس سرگرمی سے تمہیں تلاش کیا جارہا ہے' اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ تم دونوں فی الفور اپنے حلیے اور شخصیت و حیثیت میں تبدیلی پیدا کرو..... میں آج رات تک اس کا انتظام کردوں گا۔ بس تم لوگ اپنی نئی شخصیت کے لیے نئے ناموں کا انتخاب کرلو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے' یہ کام شام سے پہلے ہوجائے گا۔"

ہم گاڑی سے باہر آگئے۔ امتیاز نے گاڑی کو لاک کیا اور ہم اس کی تقلید میں ایک چار منزلہ عمارت کے زینے چڑھنے لگے۔ امتیاز یہ تو بتا ہی چکا تھا کہ اس کا فلیٹ اس عمارت کے سیکنڈ فلور پر تھا۔ اس عمارت کے ہر فلور پر صرف دو دو فلیٹ تھے' آمنے سامنے بنے ہوئے۔ امتیاز نے سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ کے سامنے رک کر جیب ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"اس وقت فلیٹ میں کوئی بھی نہیں' روبی دوپہر کے بعد آئے گی۔ لوگوں کی معلومات کے مطابق وہ کسی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے یہاں کے لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ تم لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے روبی کو فون کرکے تم دونوں کے بارے میں مختصراً بتا دیا ہے۔ وہ جب دو بجے واپس آئے گی تو تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دے گی۔"

اس کے بعد امتیاز نے جیب سے فلیٹ کی چابی برآمد کی اور اگلے ہی لمحے ہم تینوں اس فلیٹ کے اندر تھے۔ دو بیڈ روم' ایک ڈارئنگ روم اور کشادہ لاؤنج پر مشتمل وہ ایک صاف ستھرا اور فرنشڈ فلیٹ تھا۔ وہاں موجود ہر شے معیاری اور سلیقے کی تھی۔

امتیاز نے ایک بیڈ روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم دونوں فی الحال اس کمرے پر قبضہ کرلو' فائنل سیٹنگ رات میں کریں گے۔"

"تم کب تک واپس آؤ گے؟" میں نے امتیاز سے سوال کیا۔

"اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جگر!" وہ چھت کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں شام میں بھی آسکتا ہوں' رات میں بھی' رات گئے بھی اور علی الصباح بھی۔" وہ تھوڑا توقف کرنے کے بعد بولا "تم لوگ بالکل بے فکری سے یہاں روبی کے آنے سے پہلے اگر کوئی ناک کرے تو تم اس حسبِ ضرورت نمٹ لینا۔ ساری باتیں تو ہم طے کر چکے ہیں۔ دوپہر کے بعد تو روبی سب سنبھال ہی لے گی۔"

وہ جانے لگا تو میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا "یہاں فون تو ہوگا؟"

"ہاں' ہاں۔ فون موجود ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اُدھر دوسرے بیڈ روم میں رکھا ہے۔ کہو تو یہ لے آؤں۔" پھر اس نے ذرا توقف کرکے مجھ سے سوال کیا "کیا تم کسی کو فون کرنا چاہتے ہو؟"

"ہاں' چند دوستوں سے رابطہ کروں گا۔" میں نے جواب دیا "کیا تمہارے فون سے سنگاپور کال ہوسکتی ہے؟"

"براہِ راست تو یہ ممکن نہیں۔" اس نے جواب دیا "سنگاپور بات کرنے کے لیے تمہیں کال بک کروانا ہوگی۔ کوئی بات نہیں' تم یہ فون استعمال کرسکتے ہو۔"

پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ ہمارے کمرے میں لاکر رکھ دیا اور انٹرنیشنل کال بک کروانے کے لیے ایکس چینج کا کوڈ بتانے کے بعد بولا "اب میں چلوں گا۔ تم لوگ آرام کرو۔ اگر کہو تو دروازے کو باہر سے لاک کرجاؤں۔ روبی کے پاس اپنی چابی موجود ہے۔ وہ جب آئے گی تو لاک کھول لے گی۔"

میں نے کہا "نہیں' تم دروازے کو باہر سے مقفل نہ کرو۔ میں اندر سے بولٹ کرلیتا ہوں۔ روبی کے آنے پر دروازہ کھول دوں گا۔ اگر تم باہر لاک لگا گئے تو پھر ہم ہنگامی صورتِ حال میں اندر سے دروازہ نہیں کھول سکیں گے۔ یہ رسک لینا ٹھیک نہیں۔ کسی وقت بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے' کوئی ٹریل شوٹنگ ہوسکتی ہے۔ گھر کے اندر اچانک آگ بھڑک سکتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں ہمارے لیے جائے فرار رہنا چاہیے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولا "احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

پھر وہ جانے کے لیے دروازے کی جانب قدم بڑھانے لگا تو میں نے کہا "امتیاز! تمہارے ساتھ تفصیلی میٹنگ تو رات میں ہوگی لیکن ایک سوال نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا رکھا ہے۔ اگر سرِدست اس کا جواب مل جائے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔"

"کیا سوال کا تعلق مجھ سے ہے؟"

"خالصتاً وہ سوال تم سے ہی متعلق ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولا "پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے پوچھا "امتیاز! ہماری ملاقات کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے۔ گزشتہ روز دوپہر کے وقت ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ اس قلیل مدت میں ایک دوسرے کو جان لینا اور دوسرے پر بلائنڈ فیتھ کرنا سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!"

میں نے ذرا توقف کرکے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ بولا "ذرا وضاحت کردو جگر! تم اپنے فیتھ کی بات کر رہے ہو یا میرے فیتھ کی؟"

"خاص طور پر تمہارے فیتھ کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میرا فیتھ تو تمہارے فیتھ سے مشروط ہے۔"

وہ ایک لمحے کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میرے فیتھ کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟"

میں نے مختصر اور جامع الفاظ میں اسے بتایا "دوست! تم انتقامی مقاصد کی حامل ایک خفیہ تنظیم "سی ایف کے" کے آلۂ کار ہو۔ اس نوعیت کی تنظیمیں اپنے رازوں کی حفاظت کو بہت اہمیت دیتی ہیں اور ان کا طریقۂ کار نہایت ہی سیکرٹ ہوتا ہے مگر ہمارے ساتھ تمہارے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم انتہائی بے احتیاطی اور غیر ذمے داری کا ثبوت دے رہے ہو۔"

میں ایک لمحے کو سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "تم لوگوں نے کل دوپہر راشد منہاس روڈ پر میاں زاہد کے تین بندوں کو گولیوں سے چھلنی کردیا۔ ہم اس واردات کے عینی شاہد تھے۔ تم نے ہمیں ختم کرنے کے بجائے اپنے ساتھ ہائی روف میں بٹھالیا اور نہایت شرافت کے ساتھ بہادر آباد کے چوراہے پر اتار کر آگے بڑھ گئے۔ یہ رویہ ناقابلِ یقین ہے۔ یہی نہیں' بلکہ دورانِ سفر میں تم نے اپنی تنظیم کے حوالے سے ہمیں خاصی معلومات بھی فراہم کیں۔"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنے سر کو ہلکی ہلکی اثباتی جنبش دیتا رہا تاہم اس کے لب خاموش رہے۔ شاید وہ میری بات مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے بات کو آگے بڑھایا "اور آج علی الصباح سے تم ہمارے ساتھ جس طرح پیش آرہے ہو' وہ مزید حیرت میں

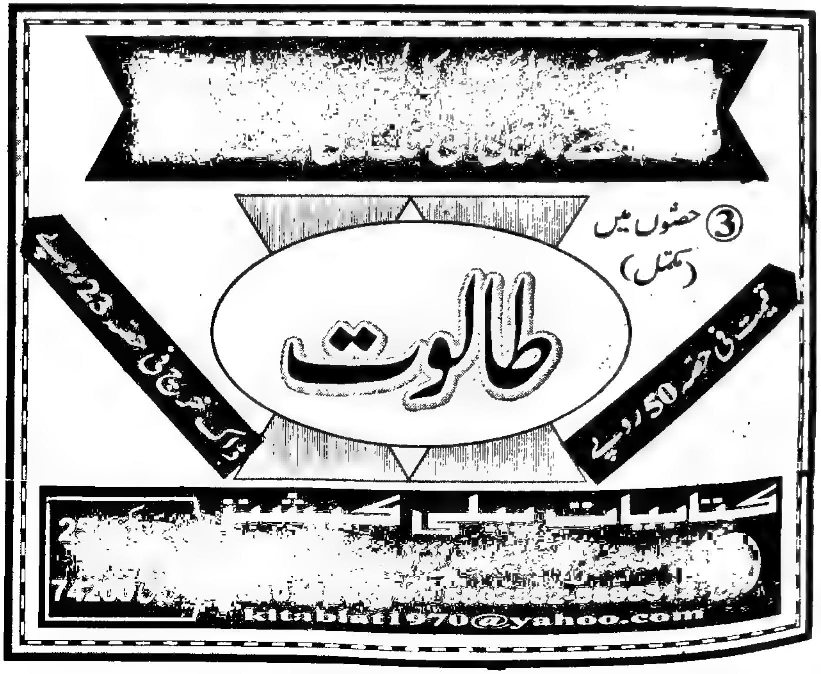

ڈالنے والی بات ہے۔ تم نے ہمیں اپنے باس اور اس کے انگریز مہمانوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا پھر وہ بنگلا بھی دکھایا جہاں نیل آرمر اور اس کی سیکریٹری قیام کریں گے اور اب ہمیں اپنے فلیٹ پر لے آئے ہو۔ کیا کسی اجنبی پر اتنی جلدی اور اس قدر بھروسا کیا جا سکتا ہے..... اور اجنبی بھی ایسے لوگ جن کے پیچھے دشمن لٹھ لے کر دوڑ رہے ہوں اور انہیں خطرناک انڈین ایجنٹ اور وہشت گرد گردانا جا رہا ہو۔ میری اس ذہنی الجھن کو دور کرنے کے لیے تمہارے پاس کیا جواب ہے امتیاز؟"

وہ چند لمحے مجھے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر گمبھیر آواز میں اس نے استفسار کیا "تم نے کبھی پہلی نظر کی محبت کے بارے میں سنا ہے؟"

میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "وہی نا..... جس کے بارے میں کچھ اس قسم کے الفاظ ادا کیے جاتے ہیں..... وہ آیا' اس نے دیکھا اور فتح کرلیا!"

"بالکل' بالکل۔" اس نے پُرزور تائید کی پھر بولا "جس طرح پہلی نظر کی محبت ہوتی ہے' اسی طرح پہلی نظر کی دوستی بھی ہوتی ہے جگر!"

میں نے اور ساحل نے حیرت آمیز نظروں سے اسے دیکھا' وہ مجھ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا "وجدان! میں نے کل ریلوے اسٹیشن پر تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا' میرے دل نے تمہیں پسند کیا' اور دماغ نے دوستی کے لیے منتخب کرلیا۔ یہ سراسر ایک بے اختیاری عمل ہے۔"

"لیکن..."

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بولنے سے منع کردیا اور کہا "میں جانتا ہوں' اب تم پھر "سی ایف کے" کے حوالے سے کوئی سوال کرنے والے ہو۔ وجدان! میں تمہیں اپنی تنظیم کے مقاصد کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ ہم ظالم کا ہاتھ توڑتے ہیں اور مظلوم کو انصاف مہیا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اگر میں تمہاری مدد کر رہا ہوں تو درحقیقت میں اپنے تنظیمی فرائض نبھا رہا ہوں۔ تم سے میری دوستی ایک الگ چیز ہے اور "سی ایف کے" کے معاملات بالکل الگ ہیں۔ میں "سی ایف کے" کے پلیٹ فارم سے تمہاری مدد تو کرتا رہوں گا مگر کبھی تم سے یہ نہیں کہوں گا کہ تم ہماری تنظیم کے لیے کام بھی کرو۔ میری دوستی صرف اور صرف تم سے ہے جو ہر قسم کے مفاد سے بالاتر اور جداگانہ ہے' تم یقین کرو یا نہ کرو!"

اس کے لفظوں سے سچائی اور لہجے سے خلوص ٹپکتا تھا۔

میں نے اس وقت امتیاز کی آنکھوں میں بے لوث دو... جذبات اُمڈتے دیکھے اور بے اختیار آگے بڑھ کر ا... سے لگالیا۔

چند لمحات تک ہم دونوں بغل گیری کی حالت... خاموش کھڑے ایک دوسرے کو بھینچتے رہے پھر امتیاز... میرے دونوں بازوؤں کو اپنے ہاتھوں کی مضبوط گرفت... جکڑتے ہوئے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

"وجدان! میں نے تم سے دوستی کا دعویٰ کیا ہے... قدم پر اسے نبھانے کی کوشش بھی کروں گا۔ تم دیکھ لی... اپنے قول وفعل میں کتنا راست ہوں۔"

میں نے کہا "میں نے بھی دوست مان کر تمہیں گ... ہے۔ تم وجدان کی دوستی کو کبھی فراموش نہیں کرسکو گے"

وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "انشااللہ ہماری یہ دوستی م... ثابت ہوگی۔"

"امتیاز! میری ساری زندگی دشمنوں سے نبرد آزمائی... گزری ہے۔" میں نے کہا "میں نے بھی ہمیشہ کمزور کی... ہے اور طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے... چنے چبوائے ہیں۔ میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا کہ م... ریکارڈ پر کتنے بڑے بڑے خونیں معرکے درج ہیں۔ م... اپنے روز وشب حق کی سربلندی اور باطل کی سرکوبی م... کیے ہیں۔ تم اسے "رائٹ اینڈ رانگ" کی جنگ بھی ک... ہو۔"

"ہماری تنظیم بھی کچھ اسی قسم کی جنگ لڑ رہی ہے"... امتیاز نے کہا۔

"ہاں' اب مجھے کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔"

"رفتہ رفتہ تمہارا یہ اندازہ یقین میں بدل جا... وجدان!" اس نے کہا۔

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "امتیاز! کل جب تم... مجھے اپنی تنظیم سے متعارف کروایا تھا تو مجھے یہ سب ک... عجیب سا لگا تھا اور میں نے "سی ایف کے" کے حوالے... بعض تنقیدی اور طنزیہ جملے بھی کہہ ڈالے تھے۔ درا... اس قسم کی تنظیم کا تذکرہ میں پہلی مرتبہ سن رہا تھا اس... بھی مجھے ہضم نہیں ہوسکا تھا حالانکہ میں بھی گزشتہ کئی... سے وہی کچھ کرتا آرہا ہوں جو تمہاری تنظیم کے مقا... ہیں۔"

"یہ غیر سرکاری انصاف ہے وجدان!" امتیاز نے... "ہماری نیت صاف ہے' اور کہتے ہیں' نیت صاف ہو تو م... آسان ہوجاتی ہے۔ ہم ایک نیک کام کر رہے ہیں اس...

قدرت بھی ہماری مدد کرتی ہے۔"

میں نے کہا "امتیاز! تمہاری "سی ایف کے" کا مشن' میرے عزائم سے لگا کھاتا ہے۔ اگر میں نے تم لوگوں کے طریقۂ کار میں دلچسپی محسوس کی اور تمہارے کام نے مجھے متاثر کیا تو میں بھی حتی الامکان تم لوگوں سے تعاون کروں گا۔"

"وہ دن میرے لیے عید کا دن ہوگا وجدان!" امتیاز نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا "ہم کندھے سے کندھا ملا کر ظلم اور ناانصافی کے خلاف سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوں گے لیکن —"

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے سوال کیا "تم اچانک خاموش کیوں ہوگئے امتیاز؟"

"جگر!" وہ مخصوص انداز میں بولا "مجھے خوشی اس وقت ہوگی جب تم ہمارے کام سے متاثر ہوکر "سی ایف کے" میں شمولیت اختیار کرو گے۔ میں تم سے وعدہ کرچکا ہوں کہ اس سلسلے میں' میں تم سے زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔"

میں نے خاموشی سے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔

تھوڑی دیر بعد امتیاز فلیٹ سے رخصت ہوگیا تو ساحل نے میرے قریب آتے ہوئے کہا "وجدان! کیا تم نے اپنے ساتھ شہد کا چھتا چپکا رکھا ہے؟"

اس نے جتنا عجیب سوال کیا تھا' میں نے اتنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"بھئی! میں نے کوئی اتنی پیچیدہ بات تو کی نہیں جو تمہیں سمجھنے میں دشواری محسوس ہو رہی ہو۔" اس کے انداز میں شرارت عود کر آئی "میں نے یہ سنا تھا اور دیکھا بھی ہے کہ صنفِ مخالف ایک دوسرے پر مرتے ہیں' آپس میں دوستی' محبت اور شادی کرتے ہیں لیکن امتیاز کا تم سے والہانہ لگاؤ دیکھ کر عقل دنگ ہے۔ حضرت کو تم سے پہلی نظر کی دوستی ہوگئی ہے۔"

بات ختم کرکے اس نے معنی خیز انداز میں میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پر دل لگی کی مسکان تھی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ساحل! بہت بری بات ہے۔ کسی کے جذبات کا یوں مذاق نہیں اڑاتے۔ دوستی دراصل محبت ہی کی ایک صورت ہے۔"

"گویا' امتیاز کو تم سے محبت ہوگئی ہے؟"

"یہ تو وقت ثابت کرے گا۔" میں نے کہا "فی الحال نظر تو ایسا ہی آرہا ہے۔"

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے ہم صنف سے محبت پر اسے سخت اعتراض یا حیرت ہو۔ میں نے اس کی نگاہ کا مفہوم جاننے کے بعد ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

"ساحل! سچی اور خالص محبت صنف اور جنس کی محتاج نہیں ہوتی' وہ صرف محبت ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو بکری کے ایک بچے سے بھی محبت کرسکتے ہیں۔"

لاجواب ہوکر اس نے موضوع بدل دیا اور اضطرابی انداز میں بولی "تم سنگاپور میں کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟"

"ہیں میرے چند دوست وہاں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"یعنی ہم صنف دوست یا.....؟"

اس نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "تمہارے سامنے ہی بات کروں گا۔ تم دیکھ لینا' میرے وہ دوست ہم صنف ہیں یا صنفِ مخالف۔" ایک لمحے کا توقف کرکے میں نے کہا "فون بعد میں کریں گے' پہلے ذرا فلیٹ کا تنقیدی جائزہ لے لیں۔"

ہم بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر آگئے۔ جاتے ہوئے امتیاز بیڈ روم میں نصب ائرکنڈیشنر کو آن کر گیا تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر داخلی دروازے کو اندر سے بولٹ کردیا۔ اس کے بعد ہم فلیٹ کے دیگر حصوں کا معائنہ کرنے لگے۔ دوسرا بیڈ روم بھی ائرکنڈیشنر اور اٹیچڈ واش روم کی سہولت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ لاؤنج میں بھی ایک کامن واش روم موجود تھا۔ ڈرائنگ روم کی آرائش میں سادگی اور پُرکاری نظر آتی تھی۔ وہاں بہ یک وقت دس بارہ افراد بیٹھ کر باہم کلام ہوسکتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں واپس بیڈ روم میں آگئے۔

میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ٹیلی فون سیٹ کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ ساحل بھی آکر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کے بدن کا گداز میں اپنے جسم پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ٹیلی فون ایکس چینج میں اوورسیز کال کی بکنگ کے لیے آپریٹر کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے آپریٹر سے سنگاپور کا ایک نمبر مانگ لیا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور مطلوبہ فون نمبر پر میری بات کروادی گئی۔

میں نے دراصل سنگاپور کے سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر ملوایا تھا۔ دوسری جانب سے پوچھا گیا "کس سے بات کرنی ہے؟"

"میں نے کہا "انسپکٹر چیانگ شو سے۔"

"آپ کی تعریف؟" نہایت ہی شستہ انگریزی میں سوال کیا گیا۔

"میں انسپکٹر کا ایک دوست بات کر رہا ہوں۔" میں نے شائستہ انداز میں کہا "میرا نام وجدان علی ہے۔"

دوسری جانب سے مجھے انتظار کرنے کو کہا گیا پھر پندرہ سیکنڈ کے بعد وہی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "انسپکٹر چیانگ شو اس وقت ہیڈ کوارٹر میں موجود نہیں۔ کل رات اس کے ایک عزیز کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اسی عزیز کے گھر پر ہو گا۔"

"کیا مجھے وہاں کا فون نمبر مل سکتا ہے؟" میں نے درخواست آمیز لہجے میں کہا "دراصل میں اس سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔"

فون پر بات کرنے والے نے معذرت کرتے ہوئے کہا "سوری مسٹر! وہاں کا فون نمبر مجھے معلوم نہیں۔ تم اپنا کانٹیکٹ نمبر چھوڑ دو۔ انسپکٹر جب بھی ہیڈ کوارٹر چکر لگائے گا۔ تمہارا پیغام اس تک پہنچا دیا جائے گا۔ وہ ضروری سمجھے گا تو تم سے رابطہ کر لے گا۔"

میں اپنا نام تو بتا ہی چکا تھا' ٹیلی فون سیٹ کی پیشانی سے پیوست فون نمبر بھی نوٹ کروا دیا پھر وہ ٹیلی فونک رابطہ ختم ہو گیا۔

میں نے ریسیور رکھا تو ساحل نے انسپکٹر چیانگ شو کے حوالے سے متعدد سوال کر ڈالے۔ میں اسے اپنی ابتدائی زندگی سے متعلق جستہ جستہ بتا چکا تھا۔ سنگاپور میں گزارے ہوئے وقت میں چیانگ شو نے میری بہت مدد کی تھی۔ وہ میرے والد صاحب عابد علی کا گہرا دوست تھا۔ والد کے انتقال کے بعد چاچا پرتاب سنگھ اور چیانگ شو نے حقیقی معنوں میں میرے سرپرست کا کردار ادا کیا تھا۔ پرتاب سنگھ اب آں جہانی ہو چکا تھا۔

میں ساحل کو چیانگ شو کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا تو وہ اور میرے نزدیک آ گئی۔ وہ تو پہلے ہی مجھ سے جڑی بیٹھی تھی' مزید قربت کا مطلب تھا کہ وہ میرے اندر اترنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئی تھی۔

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ نیلگری کے کہے ہوئے الفاظ میری سماعت میں گونجنے لگے۔ اس نے بڑے واضح انداز میں مجھے باور کرایا تھا جب بھی کوئی عورت تنہائی میں میرا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرے گی تو اس عورت کے جلو میں نیلگری میری خلوت میں اتر آئے گی۔ اس نے ایسا صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ ایک دو مرتبہ تو ثابت بھی کر دکھایا تھا۔ اس کے بعد میں خاصا محتاط ہو گیا تھا۔

اس وقت جانے کیا ہوا کہ میرے ذہن میں ایک ا[illegible] خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا اور میں نے چشم زدن میں فیصلہ کر لیا کہ اس خیال کو عملی جامہ پہناؤں گا۔ اس وقت میری نگاہ ساحل کے چہرے پر جمی تھی۔ میرے ذہن پر ابھرنے والے خیال کو وہ جان نہیں سکتی تھی تاہم میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

چہرے کو دل کی کتاب کہا جاتا ہے۔ ساحل میرے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں مستفسر ہوئی "وجدان! تم کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں ایک ٹیسٹ کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔"

اس کے بدن میں ایک خفیف سی جھرجھری نمودار ہوئی۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا "یہ اچانک تمہیں کس ٹیسٹ کی سوجھی ہے؟"

"میں ایک تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا [illegible]" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کی حیرت استعجاب میں بدل گئی "کس قسم کا تجربہ؟"

"اس قسم کا تجربہ!"

میں نے یہ جملہ ادا کرتے ہی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں گرا لیا پھر میرا چہرہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے یک ٹک مجھے تکنے لگی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں اس نوعیت کی حرکت بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے جذبات اور احساسات کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ہیلو نیلگری! کیسی ہو!"

"نیل۔۔۔ گری۔۔۔؟" ساحل نے جو حیرت اور بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی' اچانک سطحِ آب پر ابھرتے ہوئے سرسراتی آواز میں دہرایا۔

میں نے کہا "ہاں' نیلگری میں تمہی سے مخاطب ہوں۔"

"وجدان! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" ساحل پوری طرح اپنے حواس میں آتے ہوئے بولی "میں ساحل ہوں۔ میرے اندر نیلگری کو کیوں پکار رہے ہو؟"

نیلگری کو وہاں غیر موجود پا کر میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"کیا بس ایسے ہی؟" وہ آسانی سے مطمئن ہونے والی نہیں تھی "تمہیں یہ بیٹھے بٹھائے نیلگری کا خیال کیسے آ گیا؟"

میں نے اس کے سوال کا خاموش جواب دیا۔ اس مرحلے میں الفاظ کو سہارا بنانا حماقت کے مترادف ہوتا۔ اس کے شنگرفی لب کسی انگارے کے مانند دہک رہے تھے۔ میں نے ان گلاب ہونٹوں کی تازگی سے اپنے وجود کو مہکا لیا۔ ساحل نے اس مخملیں گرفت سے آزاد ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ان شبنمی لمحات کی آتشی ساعتوں میں پہلی مرتبہ رچ کر ساحل کو پیار کیا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھ سے جدا ہوتے ہوئے بولی "وجدان! تم پچھلی رات کے جاگے ہوئے ہو۔ تھوڑی نیند لے لو۔ نیند کے خمار سے تمہاری آنکھیں سرخ اور پلکیں بوجھل ہو رہی ہیں۔"

میں اس وقت شدت سے نیند کی طلب محسوس کر رہا تھا۔ کسی فرماں بردار ننھے بچے کی طرح میں نے ساحل کی نصیحت پر عمل کیا اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔

ساحل نے ایک ٹانگ کو فولڈ کر کے گھٹنے کے خمیدہ حصے کو میرے لیے تکیہ بنا دیا پھر وہ کسی ایکسپرٹ مساجر کی طرح اپنی مخروطی انگلیوں سے میرے بالوں کو سہلانے لگی' اس کی ریشمی ہتھیلیوں کا گداز سر کے راستے میرے بدن میں اترنے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے میں نیلگری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آج کے تجربے نے میرے لیے سوچ کے کئی در کھول دیے تھے۔ نیلگری کا سنسنی خیز دعویٰ غلط ثابت ہوا۔ ساحل میری تنہائی میں آنے کے باوجود بھی اول تا آخر ساحل ہی رہی تھی جس کے نتیجے میں' میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا نیلگری نے مجھے بے وقوف بنانے کے لیے وہ طوفان آمیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ اپنے دعوے کی تصدیق کی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہر وقت مجھے اپنی نگاہ میں رکھے اور آج اس خیال کی توثیق بھی ہو گئی۔ میں سمجھ گیا' نیلگری مجھے صرف اپنے لیے مخصوص رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے دوسری عورتوں کو مجھ سے دور رکھنے کے لیے اس نے وہ خطرناک چال چلی تھی اور میں اس پر اعتبار کر کے اس کی چال میں آ گیا تھا۔ وہ پُراسرار ہستی مجھ سے محبت کی دعوے دار تھی اور اس نے مجھے اپنا محبوب تسلیم کر لیا تھا۔ وہ مجھے اپنی جائیداد بنا کر رکھنے کے چکر میں تھی اور مجھے کسی کی ذاتی پراپرٹی بن کر رہنا قطعاً قبول نہیں تھا۔

حالیہ تجربے نے نیلگری کے منصوبے کا راز فاش کر دیا تو مجھے اس کی اس حرکت پر غصہ آنے لگا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے بعض نازک مواقع پر میری بھرپور مدد کی تھی لیکن اس کے ہاتھوں بے وقوف بننے سے مجھے شدید ہتک کا احساس ہوا اور نیلگری کا وہ تعاون اور مدد بھی مجھے خود غرضی کی ایک شکل نظر آئی۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ زیر بار کر کے مجھ پر تصرف حاصل کرنے کے لیے اپنی راہ ہموار کر رہی تھی۔ میں نے اپنے دل میں اسی وقت یہ اٹل فیصلہ کر لیا کہ آئندہ میں آنکھیں بند کر کے نیلگری پر بھروسا نہیں کروں گا اور اگر اس نے کسی چالاکی یا چال بازی کا مظاہرہ کرنا چاہا تو میں بھی جواباً اسی لیول کی عیاری اور شاطری دکھاؤں گا۔ وہ اگر نادیدہ اور پُراسرار قوتوں کی مالک ہے تو میں بھی کوئی ایسا گیا گزرا نہیں تھا کہ اس کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ جاتا۔ میں چند روز تک سنجیدگی سے اگر "جی" کی ایڈوانس مشقیں کر لیتا تو اس باطنی قوت میں بے پناہ استعداد پیدا کر سکتا تھا۔

نیلگری کے خیالوں سے الجھتے ہوئے میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

⁂

جب میری آنکھ کھلی تو شام کے پانچ بج چکے تھے۔ کمرے کے باہر سے مجھے باتوں کی آواز آئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ساحل کسی دوسری عورت سے بات چیت کر رہی تھی۔ اسی وقت میرے ذہن میں روبی کا نام چمکا۔ امتیاز نے بتایا تھا کہ وہ دو بجے تک واپس آئے گی۔ میں گیارہ' ساڑھے گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹا تھا۔ اس کا مطلب تھا' میں نے اچھی خاصی نیند لے لی تھی۔ روبی کی واپسی کا مجھے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

میں نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر بستر چھوڑ دیا۔ بنگلے پر مسلح گارڈ نے ہماری جو خاطر تواضع کی تھی اس کے "اثرات" معدوم ہو چکے تھے اور میں ہلکی ہلکی بھوک محسوس کر رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر لاؤنج میں' میں نے ساحل کو ایک نہایت ہی حسین و جمیل عورت کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے پایا۔ میں نے اس عورت کو سلام کیا تو اس نے میرے لیے بھی ایک کرسی سیدھی کر دی اور نہایت ہی مہذب انداز میں مجھے بیٹھنے کو

کہا۔

روبی اسم بامسمیٰ تھی۔ کبوتر کی آنکھ جیسی سرخی رکھنے والا یاقوت (روبی) اگر اپنی شان.... اور جاہ و جلال میں بے مثال ہے تو گلابی رنگت کے حامل یاقوت کے حسن اور دلکشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ روبی کی جلد شفاف اور رنگت بے داغ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' دستِ قدرت نے میدے میں گلاب کی پتیوں کو گوندھ کر اسے تخلیق کیا ہو۔ وہ بلاشبہ ایک پُرکشش اور جاذبِ نظر شخصیت تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ ستائیس سال رہی ہوگی۔

مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر اس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا "وجدان بھائی! آپ ذرا ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ میں آپ لوگوں کے لیے ناشتا لگاتی ہوں۔ رات کا کھانا ہم امتیاز کے آنے کے بعد کھائیں گے۔"

اس نے اتنی اپنائیت اور محبت سے مجھے بھائی کہا تھا کہ میرا دل مسرت سے بھر گیا۔ میں حقیقی خوشی کی پھوار میں خود کو سرشار محسوس کرنے لگا۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ یہاں مجھے روبی کے بھائی کی حیثیت سے قیام کرنا ہے۔ امتیاز نے مجھے اپنے لیے نئے نام منتخب کرنے کو بھی کہا تھا اور میں نے یہ کام انجام دے لیا تھا۔

میں نے روبی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "امتیاز نے تمہیں ہمارے بارے میں مختصراً بتا دیا ہوگا' کچھ باتیں ساحل کی زبانی تمہیں پتا چلی ہوں گی۔ ایک اہم بات میں بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ.... اب میں وجدان نہیں اور یہ ساحل نہیں " آخری الفاظ میں نے ساحل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ادا کیے تھے۔

"اس کا مطلب ہے تم نے عارضی نام سوچ لیے ہیں؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا "عارضی اور نقلی یہ ہمارے لیے ہوں گے ورنہ دنیا والوں کے لیے تو یہی نام ایک دم اصلی کی حیثیت رکھیں گے۔"

روبی نے پوچھا "وجدان بھائی! آپ نے اپنے لیے کیا نام تجویز کیے ہیں؟"

"میں وجیہ ہوں۔" میں نے جواب دیا "اور ساحل' الماس!"

"ونڈرفل۔" روبی نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "بہت موزوں اور خوبصورت نام ہیں اور تم دونوں پر جچتے بھی ہیں۔"

پھر ہمارے درمیان کافی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ اس دوران میں ہم نے ہلکا پھلکا ناشتا بھی کر آپس میں یوں گھل مل گئے تھے کہ دیکھنے والا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم زندگی میں پہلی مرتبہ ملے واقعی رشتے داروں کی طرح ہی دکھائی دیتے تھے خوش مزاجی نے بہت جلد تکلفات اور اجنبیت کے اٹھا دیا تھا۔

لگ بھگ سات بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میزبان روبی نے فون اٹینڈ کیا پھر لاؤنج میں آ کر مجھے "وجدان! تمہارے لیے کال ہے۔"

میں اٹھ کر اس بیڈروم میں آیا جو ہمارے لیے کیا گیا تھا۔ ریسیور کو میں نے کان سے لگایا اور ماؤتھ کہا "ہیلو۔"

"ہیلو وجدان۔" دوسری طرف سے کہا گیا "میں چیانگ شو بول رہا ہوں۔ تم نے اپنے اس انکل کو نہیں؟"

میں چیانگ شو کی آواز کو بہ خوبی شناخت کر ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر اس نے کیا "مجھے تمہاری کال کے بارے میں پتا چلا تھا۔ خاص بات تھی؟ یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم اپنے پاکستان کے شہر کراچی میں ہو۔"

میں نے کہا "انکل چیانگ شو! بس آپ سے بات کو جی بہت چاہ رہا تھا اس لیے فون کر ڈالا۔" پھر مجھے خاص بات یاد آ گئی اور میں نے پوچھا "میرا فون ریسیو والے نے بتایا تھا کہ کل تمہارے کسی عزیز کی ڈیتھ تھی اور تم اسی عزیز کے گھر گئے ہوئے تھے!"

"ہاں' تمہیں بالکل ٹھیک بتایا گیا تھا۔" وہ غم میں بولا "وہ میرا عزیز تمہارا ابھی بہت کچھ لگتا تھا وجدان

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا۔ میں "انکل! آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں بوٹا سنگھ کا تذکرہ کر رہا ہوں۔" اس نے بتایا

مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ بوٹا سنگھ کو تو کل رات زاہد کے آدمیوں نے اغوا کر کے قتل کر ڈالا تھا اور چیانگ شو سنگاپور میں اپنے کسی عزیز کی حیثیت سے انتقال کی بات کر رہا تھا بلکہ وہ تو بوٹا سنگھ کو میرا ابھی بتا رہا تھا۔ انسپکٹر کے انکشاف نے مجھے الجھا کر رکھ نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"انکل! میں آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکا ہوں"

"وجدان! کیا تم بوٹا سنگھ کو بھول گئے ہو؟"

"میں بوٹا سنگھ کی قربانی کو بھلا کیسے فراموش کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن اس کا قتل تو کل یہاں کراچی میں ہوا ہے اور آپ وہاں سنگاپور میں اس کے گھر تعزیت کے لیے گئے تھے' یہ بات مجھے الجھا رہی ہے۔ پھر آپ نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بوٹا سنگھ میرا ابھی بہت کچھ لگتا تھا۔"

"وجدان! میں نہیں جانتا' تم کس بوٹا سنگھ کے قتل کی بات کر رہے ہو۔" انسپکٹر چیانگ شو نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "البتہ میں جس بوٹا سنگھ کی موت کا ذکر کر رہا ہوں وہ تمہارے کاروبار کا نگرانِ اعلیٰ تھا۔ "عابد علی اینڈ سن" کا منیجر ادھیڑ عمر بوٹا سنگھ جو کل رات ہارٹ اٹیک کے باعث چل بسا۔"

"اوہ!" میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی "تو آپ اس بوٹا سنگھ کی بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں' اب آیا تمہاری سمجھ میں؟" چیانگ شو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

اور واقعی سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا؟ بوٹا سنگھ' انسپکٹر چیانگ شو کا ایک دیرینہ جانکار تھا اور جب میں چاچا پرتاب سنگھ کے ساتھ بنکاک چلا گیا اور ازاں بعد' میں.... ایک طویل عرصہ گولڈن ٹرائی اینگل اور شاؤلن ٹیمپل میں گزارنے کے بعد.... واپس سنگاپور پہنچا تو چیانگ شو کی زبانی مجھے پتا چلا کہ بوٹا سنگھ نامی اس شخص نے اپنی محنت سے میرے والد صاحب کے کاروبار کو بہت ترقی دی ہے۔ انسپکٹر ہی نے بوٹا سنگھ کو "عابد علی اینڈ سن" کا منیجر مقرر کیا تھا۔ ان دنوں سنگاپور کے علاقے چائنا ٹاؤن کی ساگو اسٹریٹ پر میرے والد صاحب کا ایک جنرل اسٹور ہوا کرتا تھا۔ اب یہ اسٹور "عابد علی اینڈ سن" کے نام سے تین بڑی دکانوں پر پھیل چکا تھا۔ اس شعبہ جاتی اسٹور پر درجنوں ملازم بھرتی تھے جو سب بوٹا سنگھ کی نگرانی میں میرے والد کے لگائے ہوئے پیڑ کی آب یاری میں مصروف تھے۔ انسپکٹر چیانگ شو نے فورٹ کیننگ روڈ والے ہمارے گھر کی دیکھ بھال کا بھی مناسب بندوبست کر دیا تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ چاچا خشونت سنگھ نے جس مونے سکھ کو ڈائری کی حفاظت کی ذمّے داری سونپی تھی' اس کا نام بھی بوٹا سنگھ ہی تھا "عابد علی اینڈ سن" کا منیجر بوٹا سنگھ اس وقت میرے دماغ سے نکل گیا تھا جب میں نے انسپکٹر چیانگ شو سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

بہرحال' میں نے اپنے منیجر کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ انسپکٹر سے اس سلسلے میں تعزیت اس لیے بھی ضروری تھی کہ بوٹا سنگھ اس کا دوست اور دیرینہ شناسا تھا۔

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد بولا "وجدان! تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمہارے بزنس کی نگرانی کا کوئی معقول انتظام کر دوں گا۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں انکل۔" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا "میں نے اپنے گھر اور "عابد علی اینڈ سن" کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اسی سلسلے میں' میں نے آپ کو فون کیا تھا۔"

ریسیور میں مجھے انسپکٹر چیانگ شو کی حیرت بھری آواز سنائی دی "وجدان تم کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا کاروبار تو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ اس سنہری موقع پر تم بزنس کو فروخت کرنے کی بات کر رہے ہو۔ یہ تو عقل مندی نہ ہوئی!"

میں نے کہا "انکل! کچھ بھی ہو' میں اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا۔ آپ جلد از جلد میرے گھر اور بزنس کے لیے کسی مناسب خریدار کو تلاش کریں اور اس فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو امریکی ڈالرز میں تبدیل کروا کر مجھے بھجوا دیں۔ میں نے گزشتہ ملاقات پر آپ کو ایک "پاور آف اٹارنی" قسم کی دستاویز بھی تیار کروا کے دی تھی۔ آپ کو کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"تم مالک ہو۔ میں تمہاری بات ماننے سے انکار تو نہیں کر سکتا لیکن اتنا تو بتا دو' مستقبل میں تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" انسپکٹر نے گہری اپنائیت سے پوچھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت تک میرے ذہن میں اس کثیر رقم کے استعمال کا کوئی باقاعدہ منصوبہ موجود نہیں تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر انسپکٹر کو ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

"انکل! میں نے مستقل طور پر کراچی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب جو بھی کاروبار کروں گا' یہیں پر کروں گا۔"

"ٹھیک ہے' جیسی تمہاری مرضی۔" چیانگ شو نے دوستانہ انداز میں کہا "لیکن اس موقع پر تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔ اگر تم اس مشورے پر عمل کرو گے تو اس سے بہت سوں کو فائدہ ہوگا اور تم اپنے استادوں کا کچھ احسان بھی کم کر سکو گے۔ علم' فن اور ترقی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہنا چاہیے۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "انکل! آپ کس قسم کا مشورہ دینا چاہتے ہیں؟"

وہ بولا "تمہارا جو جی چاہے' وہ کاروبار کرنا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنی زیرِ نگرانی "مارشل آرٹس" کا ایک ادارہ

ضرور قائم کرنا تاکہ ان فنون کی منتقلی کا کام جاری رہے۔"

"ایسا ایک مستند اور شان دار "کلب" میرے منصوبے میں شامل ہے انکل۔" میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا "انشااللہ میں فنونِ حرب و ضرب کو پھیلانے کے لیے مؤثر اقدامات کروں گا۔"

انسپکٹر چیانگ شو نے اختتامی گفتگو کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے وجدان! اس وقت رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ میں کل ہی "ساگو اسٹریٹ" والے شعبہ جاتی اسٹور اور (FORT KENNING ROAD) پر' پارک کے سامنے واقع تمہارے گھر کو فروخت کرنے کے لیے چارہ جوئی کرتا ہوں۔"

میں نے مناسب اور بھرپور انداز میں انسپکٹر چیانگ شو کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔ پاکستان کا وقت سنگاپور کے وقت سے تین گھنٹے پیچھے ہے۔ میرے بیڈ روم کا دیوار گیر کلاک اس وقت ساڑھے سات کا وقت بتا رہا تھا۔ میں کمرے سے نکلا اور فلیٹ کے لاؤنج میں بیٹھ کر ساحل اور روبی سے باتیں کرنے لگا۔

❂✫❂

امتیاز رات دس بجے لدا پھندا واپس آیا۔

اس کے ساتھ اشتیاق کو نہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیوں کہ وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اشتیاق اس کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے وہاں رہتا ہے۔ میں نے امتیاز سے پوچھا۔

"اشتیاق کہاں ہے؟"

"وہ آج دبئی چلا گیا ہے۔"

"دبئی!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا "مگر تم نے تو کہا تھا کہ......!"

وہ میری بات کو قطع کرتے ہوئے بولا "میں نے جو پہلے تم سے کہا تھا اسے بھول جاؤ۔ نئی پالیسی یہ ہے کہ اشتیاق کافی عرصے سے روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک جانے کی ٹرائی کر رہا تھا۔ یہاں کے اکثر لوگوں کو بھی میں نے اسی قسم کی باتیں بتا رکھی ہیں۔ آج اشتیاق دبئی روانہ ہو گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔" وہ ایک لمحے کو رک کر میری جانب دیکھنے لگا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اور کل سے روبی کے اسکول میں بھی "سرویکیشن" کا آغاز ہو رہا ہے۔ اب دو ڈھائی ماہ تک یہ اسکول نہیں جائے گی۔ اس فلیٹ میں صرف دو جوڑے رہیں گے۔ ایک میں اور روبی اور دوسرا......"

"وجیہ اور الماس!" ساحل نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"اوہ!" وہ چونک اٹھا پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "آپ دونوں کے نام مجھے پسند آئے۔"

میں نے کہا "جب ایک جوڑے میں روبی موجود ہے تو دوسرے میں کم از کم ڈائمنڈ (الماس) تو ہونا چاہیے نا!"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اور تمہارے اس ڈائمنڈ کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ مسٹر نیل آرمر اس قیمتی پتھر کے بہت بڑے بیوپاری ہیں۔ وہ برطانوی ڈائمنڈ ایکسپورٹ کمپنی کے مالک ہیں جس کی شاخیں دنیا کے بیش تر ممالک میں موجود ہیں۔"

میں نے کہا "اس بیوپار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نیل آرمر کی مالی حیثیت کیا ہو گی کیوں کہ ڈائمنڈ کو پتھروں میں اس وقت وہی ویلیو اور مقام ہے جو پھولوں میں گلاب کا' پھلوں میں آم کا اور جنگل میں شیر ببر کا ہوتا ہے۔"

"تم مثالیں اچھی دیتے ہو وجدان!" روبی نے خوش ہو کر کہا "تمہارے بیان سے جملے میں جان پڑ جاتی ہے۔"

امتیاز بولا "مسٹر نیل آرمر ڈائمنڈ انڈسٹری تک ہی محدود نہیں ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے بینک کے مالک بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کے سیکڑوں بزنس ہوں گے۔ مجھے ان کے بارے میں زیادہ تفصیل معلوم نہیں۔"

ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ امتیاز باتیں کرتے کرتے اچانک نیل آرمر کا تذکرہ لے بیٹھا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو سبب تھا اس کی تصدیق کے لیے میں نے پوچھا۔

"امتیاز! لگتا ہے' آج نیل آرمر سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "پہلے ان کی پاکستان آمد پر کبھی کبھار آدھ بات ہو جاتی تھی مگر آج وہ بہت دوستانہ موڈ میں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے ایک ایسا انکشاف بھی کیا کہ میں دنگ رہ گیا۔"

"کیسا انکشاف؟" ساحل نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوال داغ دیا۔

تجسس تو مجھے بھی تھا تاہم میں نے محض مستفسرانہ نظروں ہی میں امتیاز کو دیکھنے پر اکتفا کیا۔

امتیاز نے بتایا "یہ بات تو مجھے معلوم تھی کہ وہ کسی بینک کے مالک ہیں مگر میں یہ نہیں جانتا تھا' وہ بینک کس نوعیت کا ہے۔ میرا تو یہی خیال تھا' جس طرح دوسرے بینک ہوتے ہیں وہ بھی ویسا ہی ہو گا۔"

"دوست! نیل آرمر کا بینک کس قسم کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اس بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے رقم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہاں سونے سے اکاؤنٹ کھولا جاتا ہے اور اس نوعیت کے بینک کو گولڈ اکاؤنٹ بینک کہا جاتا ہے۔"

میں نے "گولڈ اکاؤنٹ بینک" کا ذکر سنا تھا اس لیے میرے لیے یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس نوعیت کے بینک میں کم از کم پانچ گرام سونے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔

ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک مسٹر نیل آرمر اور اس کی خوبصورت سیکریٹری مس شیبا کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر ہم نے ایک ساتھ مل کر ڈنر کیا۔ کھانے پینے کی بیش تر چیزیں امتیاز اپنے ساتھ باہر سے لایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد روبی اور ساحل تو ایک کمرے میں بیٹھ گئیں۔ میں اور امتیاز دوسرے کمرے میں گپ شپ کرنے لگے۔ وہ اپنے ساتھ جو بڑے بڑے شاپنگ بیگز بھر کر لایا تھا پہلے تو اس کی تفصیل بتانے لگا۔ وہ ہمارے لیے کئی جوڑے کپڑے اور میک اپ کا مکمل سامان اور لوازمات لے کر آیا تھا۔ اس نے کہا۔

"وجدان! تمہارا شیو کافی دنوں سے بڑھا ہوا ہے۔ آج تم شیو تو بناؤ گے مگر مونچھیں چھوڑ دو گے۔ تمہارا شیو خاصا گھنا ہے۔ چند روز میں تمہاری عالی شان مونچھیں تیار ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ تم سر کے بال تھوڑے سے بڑھا کر سائیڈ مانگ نکالنا شروع کرو گے۔ لباس کے سلسلے میں تم ہمیشہ یہ خیال رکھو گے کہ تمہیں اپنی شرٹ کو پتلون کے اندر نہیں کرنا' اوپن اینڈ فری چھوڑ دینا ہے۔ اس طرح تمہارے حلیے اور اسٹائل میں نمایاں تبدیلی آ جائے گی۔ ساحل بھی بدیسی پہناوے کو ترک کر کے شلوار قمیص اور دیگر "ایزی ہینڈل ڈریس" استعمال کرے گی۔ بالوں کو باندھنے کے بجائے کھلا چھوڑا جا سکتا ہے۔ اگر تم لوگ اتنا بھی کر لو تو تمہارے گیٹ اپ میں اتنا فرق آ جائے گا کہ دشمنوں سے اپنی شناخت چھپانے کے لیے تم لوگوں کو کسی قسم کے اسپیشل میک اپ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

میں امتیاز کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ وہ بہت مفید اور موقع کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان چند لمحے تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ اصل موضوع کی طرف آ گیا اور مجھ سے میری کہانی سننے کی فرمائش کرنے لگا۔

میں اپنے ذہن میں ایک مکمل کہانی کا خاکہ تیار کر چکا تھا جس میں مرکزی کردار میں خود تھا۔ ازیں علاوہ میں نے بہت کم کرداروں کو اس کہانی میں شامل کیا تھا یہ کہانی چوہدری نوازش علی اور میرے والد عابد علی کے مابین پیدا ہونے والی دشمنی سے شروع ہوتی تھی۔ میرے والد مجھے اور میری والدہ کو لے کر پاکستان سے سنگاپور جا پہنچے۔ اس کے بعد چوہدری کے بھیجے ہوئے خبیث الاخبیث دارا کا طویل تذکرہ تھا اور ہمارے معرکوں کی تفصیل تھی۔ دوستوں اور دشمنوں کے چھوٹے موٹے کردار بھی آتے جاتے رہے۔ میں دشمنوں کو ختم کرتے ہوئے اپنے والدین کے لہو کا حساب لینے کے لیے پاکستان آیا تھا اور یہاں چوہدری نوازش علی میرا اصل ٹارگٹ تھا۔ میں نے پاکستان میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے سے لے کر اب تک کے حالات واقعات کو من و عن امتیاز کے گوش گزار کر دیا تھا۔ سرِدست میں نے متروک کنوئیں میں دفن لگ بھگ چوتھائی ارب مالیت کے سونے کا راز امتیاز کو نہیں بتایا تھا۔ یہی وہ واحد چیز تھی جو میں نے اس سے چھپائی تھی۔ میں فی الحال احتیاط کے پیشِ نظر ایسا کر رہا تھا۔ اس میں میری کوئی بدنیتی یا چال شامل نہیں تھی۔ میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر امتیاز کو اس راز میں ضرور شریک کر لیتا۔

نصف شب کے بعد روبی ہمارے کمرے میں چلی آئی۔ ساحل اس کے ساتھ تھی۔ روبی نے ہم دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا "کیا آج سونے کا ارادہ نہیں۔ اس کو تو کافی دیر سے جماہیاں آ رہی ہیں۔"

امتیاز اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "اگر تمہیں اس کی ضرورت نہ ہو تو میں اسے اپنے کمرے میں لے جاؤں۔ دراصل مجھے ایک اہم کال کا انتظار ہے۔ جو رات میں کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔"

"تم فون کو بہ خوشی لے جاؤ۔" میں نے کہا "فی الحال میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

وہ کمرے سے جانے لگا تو میری جانب دیکھتے ہوئے بولا "وجدان! ممکن ہے' رات کے کسی پہر میں مجھے تمہارے بیڈ روم کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش آ جائے۔ تم ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہنا!"

"کیوں بھئی!" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ تمہیں اس قسم کی ضرورت کیوں پیش آنے لگی؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "میں نے ابھی جس اہم فون

کال کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق ایک ...ائز سے ہے۔ اگر میرے حسبِ منشا مجھے اطلاع دی گئی تو پھر میں تمہیں ضرور ڈسٹرب کروں گا۔"

"اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے' اس سرپرائز کا تعلق وجدان سے ہے!" ساحل نے ایک اہم نکتے کی جانب اشارہ کیا "کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے کہا "ایسا کون سا سرپرائز ہے میرے دوست؟"

"جگر!" وہ مجھے مخصوص انداز میں مخاطب کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "اگر وقت سے پہلے بتا دیا تو پھر وہ "سرپرائز" کیسے رہے گا؟" پھر اس نے روبی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہم دونوں کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا "گڈ نائٹ مائی ڈیئر فرینڈز!"

ہم نے بھی جواباً انہیں "شب بہ خیر" کہا اور بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا' تاہم میں نے دروازے کو بولٹ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ مجھے یقین تھا کہ ہماری اجازت کے بغیر وہ اس بیڈ روم میں جھانکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

تنہائی میسر آتے ہی ساحل الفاظ کی کدال سے حالات کے گڑے مردے اکھاڑنے لگی۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان! تم نے دوپہر میں مجھے نیلگری کیوں کہا تھا؟"

ہماری دوستی اور تعلق جس مرحلے میں داخل ہو چکا تھا وہاں ساحل سے' نیلگری کے حوالے سے کھل کر بات کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ خاص طور پر جب سے نیلگری کی چال مجھ پر کھلی تھی' میں اپنے دل میں اس کے لیے خفگی کے جذبات رکھتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں ساحل کو نیلگری کے دعوے اور طریقۂ واردات کے بارے میں بتا دیا۔

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی "وجدان' یہ تم کہہ رہے ہو اس لیے میں یقین کر لیتی ہوں ورنہ عقل ان باتوں کو ماننے سے انکاری ہے۔"

میں نے کہا "عقل ایک محدود شے کا نام ہے اور قدرت نے ایسی ایسی قوتیں اور صلاحیتیں پیدا کی ہیں۔۔۔ اور ان قوتوں کے حامل افراد ایسے عجوبۂ روزگار ہیں کہ عقل ان کے کمالات کا احاطہ نہیں کر سکتی اسی لیے انہیں ماورائے عقل اور "مابعد" وغیرہ کے خانے میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔"

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی "کیا یہ سچ ہے کہ نیلگری میرے جسم کے ساتھ تمہاری تنہائی میں آ چکی ہے؟"

"ہاں' یہ صدفی صد سچ ہے۔" میں نے راست... مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہاری خلوت میں کس حد تک داخل ہوئی..." اس نے تیکھے اور معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"جس حد تک میں نے اسے اجازت دی۔" میں... بھی معنی خیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "وہ کبھی مجھ پر... نہیں ہو سکی۔"

وہ متذبذب نظر آنے لگی۔ اس وقت اس کے چہرے... کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے کسی عورت کا شوہر... عورتوں سے مراسم قائم کر لے تو اس بیوی کے چہرے... نمودار ہوتے ہیں۔ ساحل کی یہ کیفیات صرف اس وجہ... تھیں کہ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگی تھی' ظاہر ہے... صورت میں کسی دوسری عورت کا سایہ بھی میرا قرب ا... کرنا چاہتا تو اسے تکلیف پہنچنا لازمی بات تھی۔

"وجدان!" ساحل میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے...

"ایک بات پوچھوں' سچ سچ بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہاں' پوچھو۔ بتانے والی بات ہوئی تو... جواب دوں گا۔"

"گویا تم نے جواب دینے سے پہلے ہی ایک کڑی... عائد کر دی!" وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

"میں نے تو ایک اصولی بات کی ہے ساحل۔" میں... پہلو تہی کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "اور اپنے خود ساختہ اصول کی روشنی میں... فیصلہ بھی تم ہی کرو گے کہ آیا میرا سوال جواب کے قابل... یا نہیں؟"

"اچھا بابا! پوچھو' کیا پوچھنا چاہتی ہو!" میں نے... اختیار کر لی۔

اس نے چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظروں سے م... چہرے کا جائزہ لیا اور مدبرانہ انداز میں بولی "وجدان!... معلومات اور مشاہدے کے مطابق ہر قسم کے لوگ تم... محبت میں گرفتار ہیں۔ ان میں لڑکیوں اور عورتوں کی ت... زیادہ ہے اور اب یہ پُراسرار ہستی نیلگری بھی اسی قط... آن کھڑی ہوئی ہے۔ تم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ' کیا ت... بھی کسی سے محبت ہے؟"

یہ سوال وہ پہلے بھی کئی مرتبہ کر چکی تھی مگر ہر بار... انداز مختلف ہوتا تھا۔ میں نے ڈپلومیسی کا سہارا لیتے... جواب دیا۔

"ساحل! میں اپنے تمام دوستوں اور ساتھیوں...

محبت کرتا ہوں اور ان کی خاطر اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"میں جان دینے اور لینے کی بات کر رہی ہوں اور نہ ہی اس قسم کی محبت میرا موضوع ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "تم ہر دفعہ بڑی خوبصورتی سے میرے سوال کے حصار سے نکل جاتے ہو مگر آج میں تمہاری جان نہیں چھوڑوں گی۔ تمہیں بتانا ہوگا کہ تم نے اپنی زندگی میں کس سے محبت کی ہے اور اس محبت سے میری جو مراد ہے وہ تم بہ خوبی سمجھ رہے ہو!"

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "میری ایسی قسمت کہاں کہ مجھے کسی سے اس قسم کی محبت ہو جائے جس نوعیت کا تم تذکرہ کر رہی ہو۔ یہ تو نصیب والوں کا حصہ ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اس سے پوچھا "ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے کسی حصار کا ذکر کیا تھا۔ کیا تم مجھ پر کوئی بندش وغیرہ کروا رہی ہو؟"

"شروع کر دی تم نے گڑبڑ!" وہ ایک اندازِ دلربائی سے مجھے آنکھیں دکھاتے ہوئے بولی "لیکن میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہوں!"

"میں نے کب چھوڑنے کو کہا ہے!"

"ادھر ادھر کی باتوں میں میرا دھیان نہ بٹاؤ وجدان!"

میں نے کہا "تمہارا دھیان اگر بٹ سکتا ہے تو بہت پہلے تم اپنے سوال کو بھول چکی ہوتیں۔ تم مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہو ساحل!"

"میں اس وقت اپنی تعریف نہیں بلکہ اپنے سوال کا جواب سننا چاہتی ہوں۔"

"جواب تو میں تمہیں دے چکا۔"

"اس کا مطلب ہے' تم شرافت سے نہیں مانو گے!" وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بچوں کی طرح میرا سینہ کوٹتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "اگر میں شرافت سے نہیں مانا تو کیا تم کوئی بدمعاشی وغیرہ بھی دکھا سکتی ہو؟"

"بالکل دکھا سکتی ہوں!"

اتنا کہتے ہی اس نے دھکا دے کر مجھے بستر پر گرا دیا پھر میرے قریب بیٹھتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں بولی "شریف انسان کی بدمعاشی بڑی قیامت خیز ہوتی ہے وجدان! میں وہ پہلے والی چھوئی موئی دھنو نہیں رہی جو ہر وقت بچوں ایسی حرکتوں میں مشغول رہتی تھی۔ تمہارے ساتھ نے مجھے جینے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ تمہیں ابھی میری طاقت کا اندازہ نہیں!"

آخری جملہ اس نے ذومعنی انداز میں ادا کیا تھا۔ ساحل کی بے باکی' بہادری اور جارحیت آمیز انداز کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اور اس کی وجہ سے بھی میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ آج دوپہر والے واقعے کے بعد سے اس کا حوصلہ کھل گیا تھا۔ اس کے انداز میں بے پناہ اعتماد آ گیا تھا اور اس کے عزائم تشویش ناک دکھائی دیتے تھے۔

ساحل کے اندر جو یہ تبدیلی آئی تھی' اس کے لیے اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ موقع تو اسے میں نے ہی فراہم کیا تھا۔ شاید وہ میرے اشارے کی منتظر تھی اور میں۔۔۔ فی الحال کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

ساحل خاموش نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے خیالات کے بھنور سے باہر نکلتے ہوئے کہا "میں تمہیں تفصیل سے بتا چکا ہوں کہ میں ایک زہریلا انسان ہوں۔ تمہیں اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو مجھ سے فاصلے پر رہا کرو۔"

"تمہارا یہ زہریلا پن دوپہر میں کہاں چلا گیا تھا وجدان؟" وہ شرارت آمیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی۔

میں بوکھلا گیا اور لاجواب ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "وجدان! اگر واقعی تمہارے ساتھ کسی قسم کے زہریلے پن کا مسئلہ ہے تو تم بے فکر رہو۔ میں خود تمہارا علاج کرواؤں گی۔"

میں نے شدید حیرت سے اس کی طرف دیکھا "تم میرا علاج کرواؤ گی! مگر کس سے؟"

"ایک لیڈی ڈاکٹر سے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ساحل؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں!" اس نے کہا "میں دن میں اپنے کسی نسوانی مسئلے پر روبی سے بات کر رہی تھی تو اس نے مجھے بتایا کہ ایک نہایت ہی ماہر لیڈی ڈاکٹر اس کی دوست ہے اور وہ خاص طور پر پیچیدہ اور مہلک امراض کا علاج کرنے کے لیے معروف ہے۔ میں کل تمہیں اس لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گی۔"

ساحل تو بہت تیزی سے پیش قدمی پر آمادہ نظر آتی تھی۔ وہ میرے ایک ایک معاملے کو گہری فکر مندی سے دیکھنے لگی تھی جو میرے لیے شدید فکرمندی کی بات تھی۔ اگر میں اس سیلِ آب کے سامنے کوئی مضبوط بند نہ باندھتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بہا لے جانے کے لیے تیار نظر آتا تھا۔

میں نے ایک تکیہ اٹھایا اور بستر سے نیچے اُتر آیا۔ وہ

حیرانی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔
"کہاں جا رہے ہو وجدان؟"
"مجھے نیند آ رہی ہے۔" میں نے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے کہا "میں اب سونا چاہتا ہوں۔"
وہ چمک کر بولی "سونے کے لیے تو یہ بیڈ ایجاد کیا گیا ہے اور تم ادھر قالین پر ڈیرا لگانا چاہتے ہو!"
"بیڈ پر تم سو جاؤ۔" میں نے کہا "میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔"
"نیلگری کی دھمکی سے ڈرتے ہو؟" اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔
"میں نیلگری کی دھمکی سے زیادہ تمہاری بے باکی سے ڈرنے لگا ہوں ساحل!"

اس نے کھلکھلا کر ایک قہقہہ لگایا اور چھیڑنے والے انداز میں بولی "مجھے یقین نہیں آ رہا' تم وہی وجدان ہو جو دس بارہ افراد کو چٹکیوں میں مسل ڈالتا ہے' جرائم پیشہ افراد اس کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں اور چوہدری نوازش علی جیسا طاقت ور شخص اسے خود سے دور رکھنے کے لیے اپنے درجنوں گرگوں کو میدانِ عمل میں اتار چکا ہے۔"

ساحل کے اندازِ وضاحت میں طنز نہیں بلکہ شرارت تھی۔ وہ گویا مجھ سے دل لگی کر رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ "دل لگی" دل کی لگی میں بدل جاتی' میں نے نہایت ہی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے باور کروانا ضروری سمجھا۔
"ساحل!" میں نے اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے کہا۔ "شیر کے منہ کو ایک مرتبہ خون لگ جائے تو پھر اس کی پیاس پانی سے نہیں بجھتی۔ کیا تم خود کو میرے لیے خون کی ندی میں بدلنا چاہتی ہو؟"
میرے اس سنسنی خیز سوال میں بلا کی طاقت تھی۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ بہ یک وقت آ کر گزر گئے پھر وہ سلیپنگ ڈریس پہننے کے لیے واش روم میں گھس گئی۔
میں نے بیڈ روم کے دروازے کے نزدیک قالین پر تکیہ رکھا اور دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے ساحل روشن ہو گئی اور اپنی آتشیں روشنی کی حرارت کو میرے موجود میں اتارنے لگی۔
ساحل کی بے باکی اگر اسی رفتار سے سفر کرتی رہی تو مستقل قریب میں میرے لیے بہت پریشانیوں کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ رنگ سنت کی قیامت سراپا بٹی سونیا سے دس ہاتھ آگے دوڑنے کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔

O☆O

رات کے آخری پہر دروازے پر ہونے والی دستک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی اس وقت صبح کے تین بجے تھے۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔
سامنے امتیاز کھڑا بہت جلدی میں نظر آتا تھا۔
"خیریت تو ہے دوست۔" میں نے چونک کر پوچھا "صبح صبح...!"
وہ بڑی سرعت سے قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتایا تھا نا' مجھے ایک اہم کال کا انتظار ہے۔ ابھی منٹ پہلے وہ کال مجھے موصول ہوئی ہے۔"
"تم نے تو یہ بھی کہا تھا' مجھے کوئی انوکھا سرپرائز دینے والے ہو؟"

"میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔" وہ ہیجان خیز لہجے میں بولا "یہ کال اسی سلسلے کی کڑی ہے۔"
میں نے پوچھا "اور وہ سرپرائز کہاں ہے؟"
"سرپرائز تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس فلیٹ سے کا کچھ فاصلہ طے کرنا ہو گا۔" وہ دبے دبے جوش کے ساتھ "میں تو بالکل تیار ہوں۔ تم بھی فوراً ریڈی ہو جاؤ۔"
"جانا کہاں ہے؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔
"گرین بیلٹ کے ایک بنگلے میں!"

گرین بیلٹ کے نام پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں اضطرابی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اس علاقے میں میاں زاہد حسین کے گروہ کے کچھ افراد بھی ایک بنگلے میں رہتے ہیں!"
"ایگزیکٹلی!" اس کی آواز خاصی بلند ہو گئی "اسی بنگلے میں داخل ہونا ہے جگر!"

میں نے چوکنا نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا "کوئی خاص بات ہے؟"
"تمہارے لیے سرپرائز ہے۔ اس سے زیادہ خاص اور کیا ہو گی!"
"کچھ وضاحت اس سرپرائز کی بھی تو کرو دوست!"
"جگر! میں نے میر بخش کا سراغ لگا لیا ہے۔"
میں بے ساختہ اچھل کر رہ گیا!

میں نے حیرت آمیز خوشی سے اس کی طرف دیکھا "کیا واقعی؟"
"ہاں!" اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔
میں نے ایک نظر بے خبر سوئی ہوئی ساحل پر ڈالی اور دوبارہ امتیاز کی جانب متوجہ ہو گیا "یار یہ اتنی بڑی خبر ہے کہ تیاری میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ بس میں لباس تبدیل کر لوں۔"
"ٹھیک ہے' میں لاؤنج میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" امتیاز نے کہا "ساحل کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے روبی کو ہر بات سمجھا دی ہے۔ ہماری واپسی سے پہلے اگر ساحل بیدار ہو گئی تو روبی اسے پریشانی سے بچا لے گی۔"
میں نے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ دروازے کو کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ کیوں کہ اندر ائرکنڈیشنر چل رہا تھا۔ میں سیدھا واش روم میں گھس گیا۔
میر بخش کو ہم سے جدا ہوئے لگ بھگ چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ میاں زاہد حسین والے ہوٹل میں قیام کے دوران میں وہ گزشتہ رات آخری پہر غائب ہو گیا تھا۔ ساحل کا شک درست ثابت ہوا۔ اسے میاں زاہد کے ایما پر ہی غائب کیا گیا تھا کیوں کہ امتیاز اس کی موجودگی ایک ایسے بنگلے پر بتا رہا تھا جو مبینہ طور پر میاں زاہد حسین کے آدمیوں کے استعمال میں تھا۔
میر بخش کے بارے میں ملنے والی اس اطلاع نے میرے رگ و پے میں مسرت آمیز سنسنی دوڑا دی۔ وہ میرا سچا دوست اور وفادار ثابت ہوا تھا اور اب اسے میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ ہمارے وہاں پہنچنے تک وہ زندہ اور سلامت ہو۔
میر بخش کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے دو منٹ میں کپڑے بدلے اور تیسرے منٹ پر میں امتیاز کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اور پوچھا "کوئی ہتھیار وغیرہ ہے تمہارے پاس؟"
"نہیں!" میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "کہو تو لے آؤں۔ بیگ کے اندر ایک پسٹل رکھا ہے جو میں نے گزشتہ رات "شاہین کمپلکس" کے نزدیک ایک معرکے میں میاں زاہد کے بندوں سے چھینا تھا۔"
امتیاز نے اپنے لباس سے ایک اسٹیل باڈی پسٹل نکالا اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا "اسے اپنے پاس رکھ لو۔ پوری طرح لوڈ ہے۔ ضرورت پڑنے پر بہت کام آئے گا۔"

میں نے پسٹل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور کہا "اور... تم؟"
"میرے پاس ہے اسلحہ۔" وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "چلو آؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"
اگلے ہی لمحے ہم دونوں فلیٹ سے باہر تھے۔ ہم نے نہایت ہی محتاط انداز میں زینے طے کیے اور بلڈنگ کے داخلی گیٹ پر پہنچ گئے۔ اس گیٹ کی ایک ایک چابی بلڈنگ کے تمام مکینوں کے پاس رہتی تھی تاکہ وقت بے وقت اسے اپنی سہولت اور ضرورت کے تحت کھولا جا سکے۔ عموماً رات بارہ بجے یہ گیٹ بند کر دیا جاتا تھا۔ امتیاز نے گیٹ کھولا اور باہر آ کر دوبارہ لاک کر دیا۔
بلڈنگ سے باہر آ کر امتیاز پیدل ہی ایک جانب چل پڑا۔ میں نے اس کی تقلید کرتے ہوئے پوچھا "کیا گرین بیلٹ کا علاقہ یہاں سے قریب ہی ہے؟"
اس نے بتایا "طارق روڈ اور گرین بیلٹ ایک ہی علاقے یعنی "پی ای سی ایچ ایس" میں واقع ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم وہاں تک پیدل جائیں گے۔ دونوں مقامات کے درمیان پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو ہے۔"
"اور ہم تو..." میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
وہ میرے جملے کی تہ تک پہنچ گیا' جلدی سے بولا "ہم احتیاطاً تھوڑا پیدل چلیں گے وجدان۔ تم فکر نہ کرو' ادھر کیفے ڈی خان کے نزدیک ہمارے لیے ایک گاڑی تیار کھڑی ہے۔"
دو گلیاں گھومنے کے بعد ہم کیفے ڈی خان کے پاس پہنچ گئے۔ امتیاز ایک یلو کیب کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "آؤ وجدان۔ ہم اس گاڑی میں جائیں گے۔"
یلو کیب ہمارے اندر بیٹھتے ہی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ڈرائیور صورت شخص موجود تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے یلو کیب آگے بڑھا دی۔
میں نے امتیاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا ہم اس ٹیکسی میں گرین بیلٹ تک جائیں گے؟"
"یہ دیکھنے میں ایک ٹیکسی ہے۔" امتیاز نے بتایا "مگر ہمیشہ پرائیویٹ استعمال میں رہتی ہے۔ جاوید کو اپنا ہی بندہ سمجھو۔" اس نے ڈرائیور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہم جس قسم کے مشن پر جا رہے ہیں' اس میں ٹیکسی کا استعمال زیادہ موزوں رہتا ہے۔"
یلو کیب مین طارق روڈ کو چھوڑ کر شاہراہِ قائدین پر

آ گئی۔ میں نے امتیاز سے پوچھا "یار! تم نے یہ نہیں بتایا' میر بخش کا سراغ تم نے کیسے لگایا ہے؟"

ڈرائیور جاوید کو امتیاز اپنا ہی بندہ کہہ چکا تھا۔ اس لیے اس کی موجودگی میں میر بخش کا تذکرہ کیا جا سکتا تھا۔ امتیاز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا "زیادہ تفصیل سنانے کا تو ابھی وقت نہیں۔ مختصراً اتنا جان لو کہ میں نے آج صبح ہی میر بخش کی تلاش شروع کر دی تھی۔ میاں زاہد حسین اور اس کے گرگے میرا خصوصی ٹارگٹ تھے۔ بالآخر میری یہ تلاش کامیاب رہی۔ میرے ایک ساتھی نے تھوڑی دیر پہلے اطلاع دی ہے کہ میر بخش اس وقت گرین بیلٹ والے بنگلے میں موجود ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے میری جانب دیکھا اور پوچھا "کہو وجدان! یہ سرپرائز تمہیں کیسا لگا؟"

"فنٹاسٹک!" میں نے پُرجوش انداز میں جواب دیا۔

یلو کیب نے شاہراہ فیصل کو عبور کرنے کے بعد ایک سروس روڈ پکڑلی پھر چند گلیوں میں سے گزر کر وہ ریلوے لائن کے قریب پہنچ گئی۔ خلافِ معمول ہماری گاڑی نے ریلوے لائن کو اوپر سے کراس کرنے کے بجائے اس کے نیچے' ایک پلیا میں سے راہ لی اور دوسری جانب پہنچ گئی۔ ہم لوگ "ای مارکیٹ" میں سے گزرے پھر چند لمحے ایک نالے کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ اب ہم گرین بیلٹ کے علاقے میں تھے۔ امتیاز نے ایک گلی کے کونے پر... یلو کیب رکوائی اور جاوید کو وہیں انتظار کرنے کا کہہ کر گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ہم قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے۔ امتیاز نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا "اس بنگلے کا مین گیٹ دوسری گلی میں ہے۔ ہم اس وقت بنگلے کی عقبی گلی میں ہیں۔ تم یہ بات تو سمجھ ہی گئے ہو گے کہ ہمیں بنگلے میں کہاں سے داخل ہونا ہے؟"

"اچھی طرح سمجھ گیا ہوں یار۔"

اس نے کہا "میری آخری اطلاع تک میر بخش زندہ تھا۔ ہمیں اسے یہاں سے زندہ ہی لے کر جانا ہے' وجدان' چاہے اس کے لیے ہمیں میاں زاہد کے آدمیوں کی زندگیوں سے کیوں نہ کھیلنا پڑے۔"

"زندگی اور موت کی بساط میاں زاہد نے بچھائی ہے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا "اور اس بساط پر مجھے کھیلنے کی کھلی دعوت بھی دی ہے۔ کھیلوں گا تو میں ضرور۔۔۔ اور کھل کر کھیلوں گا۔"

"تمہارے عزائم میں خاصی سنگینی محسوس کر رہا ہوں میں۔" امتیاز نے چونک کر کہا۔

"میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں یار!" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

امتیاز۔۔۔ ایک بنگلے کے پچھواڑے رک گیا اور ... جانب دیکھتے ہوئے بولا "ہمیں اس بنگلے کے اندر داخل ... ہے۔ میر بخش یہیں پر ہے۔"

میں نے گلی میں دونوں جانب دور تک نگاہ دوڑائی ... طرف خاموشی کا راج تھا' یہ چوں کہ ایک عقبی گلی تھی ... لیے اسٹریٹ لائٹس کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں ... تھا۔ یہ ایک طرح سے ہمارے لیے خاصا سود مند تھا۔ رات ... کی گہری تاریکی میں ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر اپنا ... خوش اسلوبی سے نمٹا سکتے تھے۔

امتیاز نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ ویسٹ اینڈ واچ ... اندھیرے میں بھی اسے وقت بتا دیا۔ وہ دھیمے لہجے میں ... "ساڑھے تین بجے ہیں۔ بنگلے کے اندر موجود سناٹے سے ... ہے' وہ لوگ سو گئے ہیں۔"

"سو گئے ہیں؟" میں نے حیرت سے دہرایا "رات ... آخری پہر تو یقیناً سب سو ہی رہے ہوتے ہیں یار۔"

امتیاز نے کہا "جگر! یہ رات کا آخری پہر شریف ... کے لیے ہے۔ اس بنگلے کے مکینوں کے لیے تو ابھی ... وقت ہوا ہے۔" پھر اس نے ایک آنکھ دبائی اور بولا "... اطلاعات کے مطابق آج رات یہاں راگ رنگ کی ... بھی تھی۔ چند ماہر ناچنے والیاں بلائی گئی تھیں۔ رات ... تک وہ ناچ ناچ کر خود کو توڑتیں' تھک کر چور ہو جاتیں ... اپنے تماش بینوں کو تھکانے میں مصروف ہو جاتیں ... وقت تک تمام مہمان اور میزبان ایک دوسرے میں ... ہوں گے' ہر کوئی دوسرے میں خود کو ڈھونڈ رہا ہو گا۔ ... کارروائی کے لیے یہ بالکل مناسب موقع ہے۔"

"اور ہمیں اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔" ... نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنے بازوؤں ... بجلی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

امتیاز معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے بنگلے ... باؤنڈری وال کا جائزہ لینے لگا۔ مذکورہ دیوار بہ مشکل پانچ ... اونچی تھی۔ ہم بہ آسانی اچک کر بنگلے کے اندر پہنچ سکتے ... وہ بنگلا گلی کے آخری سرے پر واقع تھا اور خاصا غیر ... معلوم ہوتا تھا۔ آباد بنگلوں سے وہ کافی ہٹ کر تھا۔ شاید ... ایڈوانٹیج کی یہ دولت میاں زاہد کے بندوں نے اسے ... آماج گاہ بنایا ہوا تھا۔ اس گلی کے بیش تر بنگلے خالی ...

تعمیر بھی نظر آئے۔

"کیا خیال ہے جگر!" امتیاز نے سرگوشیانہ انداز میں ... "ادھر سے ادھر ہو جائیں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ سے مخصوص اشارہ بھی کیا۔

میں نے کہا "یہ تو کرنا ہی ہو گا یار لیکن ایک بات مجھے الجھا رہی ہے۔"

"ایسی کون سی بات ہے بھئی؟"

"تم نے ٹیکسی کو گلی کے اس سرے پر کھڑا کر دیا ہے۔" ... یلو کیب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا "جب کہ ... بنگلا گلی کے اس سرے پر واقع ہے۔ اس میں کیا مصلحت ہے بھائی؟"

"مصلحت یہ ہے کہ میں میاں زاہد کے آدمیوں کو کسی قسم کے شک میں مبتلا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔" امتیاز نے بتایا "اگر گاڑی کو اس طرف کھڑا کر دیا جاتا تو وہ ان لوگوں کی نظر میں آ سکتی تھی وہ فوراً یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ اس ٹیکسی میں کون آیا ہے۔۔۔ اور وہ کس بنگلے میں گیا ہے جب کہ گلی کا وہ سرا روشن اور آباد ہے۔ ادھر ایک دو گاڑیاں بھی کھڑی ہیں لہٰذا پریشانی یا تشویش کی کوئی بات نہیں۔"

"رائٹ یو آر!" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

آئندہ دو منٹ کے اندر ہم بنگلے کے اندر تھے۔ بنگلے کے اس عقبی حصے میں ایک چھوٹا سا لان بنا ہوا تھا۔ جس کے وسط میں جزوی گھاس دکھائی دے رہی تھی گویا وہاں گھاس اگانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ساتھ پھولوں کے چند پودے بھی نظر آ رہے تھے۔ بنگلے کے دونوں پہلوؤں میں' اصل عمارت اور باؤنڈری کے درمیان پانچ فٹ کے راستے چھوڑے گئے تھے۔ یہ اہتمام ہوا کی گزرگاہ کے لیے کیا گیا تھا۔ عقبی لان کوئی دس فٹ چوڑا تھا۔

میں نے کہا "امتیاز! اس خاموشی اور سناٹے سے تو لگتا ہے' یہاں کوئی بھی نہیں۔"

"یہ خاموشی نہیں' مدہوشی ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "مدھ' ہوش اڑاتی ہے جگر اور یہاں بھی شباب اور مدھ کا عام استعمال ہوا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

بات اتنی واضح تھی کہ نہ سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے کے بعد پوچھا "کیا پروگرام ہے یار؟"

"ڈبل پروگرام۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"ڈبل پروگرام کا کیا مطلب؟"

"ہم ان دونوں پہلوؤں والے راستوں سے الگ الگ چلتے ہوئے عمارت کے سامنے والے حصے میں پہنچیں گے۔" امتیاز نے پانچ فٹی گزرگاہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس دوران میں ہم بنگلے کے اندرونی حصے کی کیفیت جاننے کی کوشش بھی کریں گے۔"

"اچھا آئیڈیا ہے۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "میں اس پہلو کی طرف جا رہا ہوں۔" یہ بنگلے کا دایاں پہلو تھا تاہم عقبی سمت سے بایاں دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کہا "ہم میں سے جو بھی کوئی خاص بات نوٹ کرے' دوسرے کو بتائے گا۔ اس کے بعد ہی کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔"

"آل رائٹ جگر!" امتیاز نے دو ٹوک لہجے میں کہا اور اپنے لباس میں سے لمبی نال والا ایک ریوالور برآمد کر لیا۔

ایسا خوف ناک ریوالور میں نے شان کونری المعروف بہ جیمس بانڈ ڈبل او سیون کی فلموں میں ہیرو کے پاس دیکھا تھا۔ این فلیمنگ کا یہ جاسوسی کردار عالم گیر شہرت کا حامل ہے۔ شان کونری کے بعد اور بھی بہت سے ہیروز اس کردار میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔

امتیاز کو دکھانے کے لیے میں نے بھی چائنا میڈ اسٹیل باڈی پسٹل ہاتھ میں لے لیا اور اس کی نال کو ایک بوسہ دینے کے بعد میں اپنے منتخب راستے کی جانب دبے قدموں بڑھ گیا۔ امتیاز نے دوسرے پہلو کی جانب قدم اٹھا دیے۔

تاریکی میں چند قدم اٹھانے کے بعد میں نے پسٹل دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا تاہم بہ وقتِ ضرورت میں اسے فوراً استعمال میں لا سکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی احتیاط سے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور ایک ایک کھڑکی کو چیک کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ تمام کھڑکیاں بند تھیں اور اندرونی پردے بھی کھنچے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کے اندر لائٹ کے آثار محسوس ہوئے تو میں نے کان لگا کر اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کی۔ دوسری جانب دیکھنا تو ممکن نہیں تھا۔ میری وہ کوشش ناکامیاب رہی۔

کچھ دیر بعد میں بنگلے کے دائیں پہلو کا سفر پورا کر کے سامنے والے حصے میں پہنچ گیا۔ میں نے غیر ارادی طور پر بائیں جانب دیکھا۔ امتیاز مجھے وہاں نظر نہیں آیا۔ میری نگاہ کے سامنے بنگلے کا مین گیٹ تھا۔ میں نے دائیں بائیں چوکنا نظر سے دیکھا' وہاں کسی ذی روح کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ میں دبے قدموں گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

گیٹ مقفل نہیں تھا' صرف اندر سے کنڈی لگائی گئی تھی۔ میں نے بہ آہستگی گیٹ کی اندرونی کنڈی کھول دی تاکہ بہ وقتِ واپسی ہمیں کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں

واپس مڑا اور اس طرف قدم بڑھا دیے جدھر سے امتیاز کو آنا تھا۔ اس کونے میں ایک پورچ بنا ہوا تھا۔ پورچ کے اندر سلیٹی رنگ کی ایک ٹویوٹا کرولا کھڑی تھی۔

میں بنگلے کے بائیں پہلو کی سمت بڑھا تو امتیاز مجھے ایک جگہ کھڑا نظر آگیا۔ وہ ایک کھڑکی پر آنکھ ٹکائے ہوئے تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب پہنچ گیا۔ جس کھڑکی پر امتیاز نے دونوں ہاتھ رکھ کر چہرہ جما رکھا تھا اس کے پیچھے مجھے روشنی دکھائی دی۔

میں نے امتیاز کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر پیچھے مڑا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔

میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا "دوسری طرف تو کچھ نہیں ملا۔ کیا یہاں کچھ ہے؟"

اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور آواز دبا کر بولا "اندر 'تھری اِن ون' پروگرام چل رہا ہے۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لو۔" امتیاز نے مبہم انداز میں کہا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ میں نے دیکھا' کھڑکی کے اس کونے سے اندرونی پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی کے اس حصے پر آنکھ لگائی تو کمرے کے اندر نظر آنے والے منظر نے مجھے ساکت کر دیا۔ میری کنپٹیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی اور دل کی دھڑکن یک بارگی بے انتہا بڑھ گئی۔

اندر چار مرد و زن فطری لباس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ ان میں ایک عورت اور تین مرد تھے۔ عورت خود کو ان کے چنگل سے نکالنے کی جو بھی کوشش کرتی' وہ مل کر اسے ناکامیاب بنا دیتے۔ بالآخر عورت نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم لوگ انسان ہو یا جانور؟"

وہ بے بس عورت یقیناً چلا کر بولی ہوگی تاہم کھڑکی کے بند ہونے کے باعث اس کی مدھم آواز مجھ تک پہنچی تھی پھر اس عورت کے سوال کے جواب میں ایک مرد نے کہا۔

"ہم انسان ہی ہیں لیکن ہماری جبلت نے اس وقت ہمیں حیوان بنا دیا ہے۔"

"میں نے ایسے بھوکے مرد اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھے۔"

"تو اب دیکھ لو۔" ایک مرد بے ہودگی سے بولا۔

میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکا' نہ سنتا اور نہ ہی دیکھنا۔ اس وقت میرے جسم کا سارا خون دماغ کو چڑھ گیا۔ میں نے نظر ہی نظر میں امتیاز کو اشارہ کیا اور اس کھڑکی کے برابر میں نظر آنے والے دروازے پر ہولے سے دستک دی۔

وہ کمرا عام عمارت سے تھوڑا الگ تھلگ تھا جیسا سرونٹ کوارٹر ہوتے ہیں۔ اس کمرے کے اندر جو کھیل ہو رہا تھا میں اس کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ عورت یقیناً اپنی مرضی سے وہاں پہنچی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کو ان مردوں سے واسطہ پڑے گا۔ بہرحال اس وقت وہ مظلوم تھی۔ شاید وہ انہی ناچنے والیوں میں سے کوئی ایک تھی جو امتیاز کے مطابق' آج رات اس بنگلے کو رونق بخشنے آئی تھیں۔ اب میری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ بنگلے میں مجھے کوئی چوکیدار یا ملازم وغیرہ کیوں دکھائی نہیں دیا تھا!

میری دستک کے جواب میں اندر خاموشی چھا گئی پھر ایک مرد کی آواز ابھری "اس وقت باہر کون ہو سکتا ہے؟"

میں اب دروازے کی چول سے کان لگائے کھڑا تھا۔ دوسرے مرد نے کہا "ابے' ہوگی کوئی بلی ولی۔"

"بلی دستک نہیں دے سکتی!" پہلے مرد نے تشویش ناک انداز میں کہا۔

"کیوں نہیں دے سکتی۔" دوسرا بحث پر اتر آیا "تم بلی کو کوئی احمق جانور نہ سمجھو۔"

تیسرے نے کہا "تم دونوں بلی کی بحث میں پڑ کر اپنا وقت کھوٹا کر رہے ہو۔ صبح ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے گی اور ابھی تو ہم نے۔۔۔"

پہلے نے تیسرے کی بات کاٹی اور بولا "مینا چلی گئی تو دوبارہ بھی آسکتی ہے مگر ہماری جان چلی گئی تو واپس نہیں آئے گی اس دستک کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔"

"ابے بزدل کہیں کے۔" دوسرے نے کہا "مرد ہو کر اتنا ڈرتے ہو۔ پتا نہیں' صاحب نے تمہیں اپنے پاس ملازم کیوں رکھا ہے اور وہ بھی چوکیدار اور گارڈ کی ملازمت پر!"

"اس وقت تو جبار وردی میں ہوتا ہے نا۔۔۔ اور اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف بھی ہوتی ہے۔" تیسرے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اور اس وقت بے چارہ نہ یونی فارم میں ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہے۔" مینا نامی اس پیشہ ور عورت نے گہری چوٹ لگائی "اس کنڈیشن میں تو یہ جبلی بہادری کا مظاہرہ کر سکتا ہے!"

"تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے۔" جبار نامی چوکیدار نے سراسیمہ لہجے میں کہا "میں نے واضح طور پر دستک کی آواز سنی ہے۔ ہمیں پہلے باہر جھانک کر دیکھ لینا چاہیے۔ پورے اطمینان کے بعد ہی۔۔۔"

جبار نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کو بزدلی کا طعنہ دینے والے نے کہا "اس سے پہلے کہ تم ہم میں سے کسی کو دروازہ کھولنے کے لیے کہو' میں تمہاری مشکل آسان کر دیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں' یہ کام تمہارے بس کا تو ہے نہیں!"

اس شخص نے جبار کی مشکل آسان کرنے کی بات کی تھی یعنی وہ خود دروازہ کھول کر باہر جھانکنا چاہتا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر اس نے میری مشکل آسان کر دی تھی۔ اب مجھے نہ تو دروازہ کھولنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی دروازہ کھلوانے کے لیے مزید دستک کی۔

میں تن کر پوری طرح تیار دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی اندرونی کنڈی گرائی گئی پھر ہینڈل گھومنے کی آواز آئی۔ جیسے ہی دروازے کے پٹ نے فریم کو چھوڑا' میں نے ایک ڈبل پینا پش دروازے پر رسید کر دیا۔

دروازے کا پٹ عقب میں موجود شخص کے منہ پر پڑا۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اسی اثنا میں ہم دونوں بھرا مار کر کمرے کے اندر داخل ہو چکے تھے امتیاز نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔

امتیاز کے ہاتھ میں لمبی نال والا ریوالور دیکھ کر عورت کی چیخ نکل گئی۔ اس نے بڑی سرعت سے بیڈ شیٹ کو کھینچا اور ستر پوشی میں مصروف ہو گئی۔

منہ پر دروازے کا پٹ کھانے والے کے ہونٹوں سے خون جاری ہو گیا۔ دوسرے دونوں افراد ڈرے سہمے ایک جانب کھڑے تھے۔ اس وقت وہ اتنے خوف زدہ تھے کہ انہیں اپنی برہنگی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

زخمی ہونٹوں والے نے سرسراتی آواز میں پوچھا "کون ہو تم لوگ۔۔۔ اور بنگلے میں کیسے داخل ہوئے ہو؟"

"اگر یہ تمہارا پہلا اور آخری سوال ہے تو اس کا جواب میں ضرور دوں گا۔" میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے دیکھا "بولو منظور ہے؟"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس سوال کے بعد اسے شوٹ کر دیا جائے گا۔ امتیاز نے اس کی حیرت آمیز پریشانی کو نظر انداز کرتے ہوئے میرا مطمح نظر اس پر واضح کر دیا "ہم خدائی فوج دار ہیں۔۔۔ اور ایسے لوگ کہیں بھی' کسی بھی طرح داخل ہو سکتے ہیں۔ اب تم تینوں اچھے بچوں کی طرح کم از کم ایک ایک چڈی پہن لو تاکہ تمہارا حساب کتاب ہو سکے۔"

"ہم نے ایسا کیا کیا ہے؟" جبار منمنایا۔

امتیاز نے اس کے گال پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا اور خون خوار لہجے میں بولا "تم نے سنا نہیں' باس نے کیا کہا تھا! پہلا اور آخری سوال؟ اور تم نے ایسا ویسا' جیسا تیسا سب کیا ہے۔"

امتیاز نے مجھے باس ظاہر کر دیا تھا۔ وہ تینوں ریوالور کی زد پر اپنے لباسوں کو تلاش کرنے لگے۔ بیڈ شیٹ میں نیم لپٹی ہوئی مینا نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تو سوال کرنے کی اجازت ہے نا؟"

"پوچھو' کیا پوچھنا ہے تمہیں۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

"کہیں تم لوگوں کا تعلق پولیس سے تو نہیں؟"

امتیاز نے اس کی بات کا جواب دیا "تم جیسی عورتوں کا دھندا تو پولیس کے تعاون سے چلتا ہے۔ تمہیں پولیس والوں کی کیوں فکر ہو گئی۔ وہ تو اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ آج کی آمدنی میں سے ان کا حصہ تم نے یہاں آنے سے پہلے پیشگی انہیں پہنچا دیا ہوگا۔"

مینا جزبز ہو کر رہ گئی۔ وہ ڈھلتی ہوئی جوانی کی طوائف تھی۔ عمر لگ بھگ پینتالیس سال رہی ہوگی تاہم اس نے خود کو فٹ رکھنے کے لیے خاصی محنت کی تھی اور پینتیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

اتنی دیر میں امتیاز نے تینوں مردوں کا مختصر انٹرویو لیا۔ ان میں ایک تو وہی بزدل چوکیدار جبار تھا' دوسرا خود کو بہادر ظاہر کرنے والا ڈرائیور تھا۔ اس کا نام حنیف معلوم ہوا۔ تیسرا شخص گھریلو ملازم عثمان تھا۔ بنگلے کے اندر ان چاروں کے علاوہ دو مرد اور دو عورتیں مزید تھیں۔ دونوں عورتیں مینا کے ساتھ آئی تھیں اور بنگلے کے اندر صاحب اور اس کے دوست کی تفریح کا سامان بنی ہوئی تھیں۔ مینا ان کی میڈم تھی جو زیادہ کمانے کے لالچ میں ان تینوں ندیدوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ اندر موجود عورتوں کے نام سویٹی اور رخ معلوم ہوئے۔

مینا بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھاگ عورت میرے اندر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی بالآخر اس نے پوچھا۔

"مان لیا' تم خدائی فوج دار ہو لیکن یہ بھی تو پتا چلے کہ یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

امتیاز نے اسے ڈانٹ پلائی اور کہا "اگر باس نے تمہیں بولنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم سوال پر سوال کیے جاؤ۔ اب اپنی چونچ بند رکھنا' ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"

وہ ہمت کر کے بولی "ان تینوں کی چاہے تم لوگ کھال نوچ ڈالو۔" اس کا اشارہ حنیف' جبار اور عثمان کی جانب تھا "لیکن مجھے اور میری لڑکیوں کو کچھ نہ کہنا ورنہ میرا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ کسی کے روزگار پر لات مارنا اچھی بات نہیں۔"

"کیا تمہاری لڑکیاں بھی یہاں موجود ہیں؟" میں نے بھولے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ جلدی سے بولی "میں سویٹی اور رخ کی بات کر رہی ہوں۔"

"باس! مینا جیسی عورتیں دنیا کی عجیب مائیں ہیں جو اپنی مرضی اور خوشی سے بیٹیوں کو اس راہ پر چلنا سکھاتی ہیں۔" امتیاز نے خیال افروز انداز میں کہا پھر وہ گن پوائنٹ پر کھڑے ان تین افراد کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "تم میں سچ بولنا کس کو آتا ہے۔"

اس نے باری باری تینوں کو گھورا اور اپنی جیب میں سے سا۔۔۔ نکال کر ریوالور کے منہ پر فٹ کرنے لگا جس سے اس ریوالور کی خوف ناکی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ امتیاز کے استفسار میں ایسی وحشت تھی کہ وہ تینوں بہ یک زبان بول اٹھے۔

"مم... میں!" اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا ایک ایک ہاتھ بھی اوپر اٹھا دیا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ تینوں اپنے راست گو ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

امتیاز نے ریوالور کا رخ بزدل چوکیدار جبار کی طرف کیا اور سفاکی سے پوچھا "اس بنگلے میں تم چاروں اور "ان جلووں کے علاوہ بھی ایک شخص موجود ہے۔ اس کا... اصلی نام میر بخش اور فرضی نام فرید ہے۔ بولو' وہ اس وقت بنگلے کے کس حصے میں ہے؟"

جبار کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ وہ اپنے دونوں ساتھیوں کی جانب دیکھتے ہوئے لکنت زدہ انداز میں بولا "مم... میں... کسی میر بخش... کسی فرید کو نہیں جانتا..."

"ٹھک" کی ایک آواز پیدا ہوئی اور جبار اپنا سینہ تھامتے ہوئے پیچھے کی جانب الٹ گیا۔ امتیاز کے سائلنسر لگے ریوالور نے اس کے دل میں چھید ڈال دیا تھا۔

"سچ بولنے کا دعوے دار جب دروغ گوئی کرتا ہے تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔" امتیاز نے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں اور ریوالور کا رخ گھریلو ملازم عثمان کی طرف موڑتے ہوئے غرایا "میر بخش کو کل رات آخری پہر میاں زاہد کے ہاں سے اغوا کیا گیا تھا۔ میں اسی میاں زاہد حسین کی بات کر رہا ہوں جو تم لوگوں کا باس ہے۔ کیا مجھے اپنا سوال دہرانے کی ضرورت ہے؟"

عثمان تھرتھر کانپنے لگا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ امتیاز نے اس کے گھٹنے کو نشانہ بنا کر خاموش فائر کر دیا اور دہاڑا "ہاتھ اٹھانے میں تم تو سب سے آگے تھے مردود!"

عثمان تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا اور اپنے مجروح گھٹنے کو تھام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ مینا نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم لوگ خواہ مخواہ ان کے خون میں ہاتھ رنگ رہے ہو۔ میں رات دس بجے سے اس بنگلے پر موجود ہوں۔ میں نے یہاں کسی میر بخش یا فرید کو نہیں دیکھا۔"

"تم نے زندگی میں صرف اپنے گاہکوں کو دیکھا ہے بائی۔" امتیاز نے طنزیہ لہجے میں کہا "میر بخش جیسے گرفتار افراد تک تمہاری نگاہ کیسے جا سکتی ہے؟"

وہ بولی "میں مینا بائی نہیں... میڈم مینا ہوں۔"

اس کے انداز سے خفگی عیاں تھی۔ امتیاز نے بے پروائی سے کہا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارا پیشہ اور کردار نام کی تبدیلی سے نوعیت نہیں بدل سکتے۔"

میں نے مینا کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا "تھوڑی دیر پہلے تو تم ان تینوں کی کھال نچوانے کا مشورہ دے رہی تھیں اور اب ان کی حمایت کر رہی ہو۔ تمہیں بیٹھے بٹھائے اچانک ان کی جان کی اتنی فکر کیوں پڑ گئی ہے؟"

"انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم ایسے لوگوں سے ہمدردی جتا رہی ہو جو تھوڑی دیر پہلے حیوانوں کا کردار ادا کر رہے تھے!"

"میں ان کی سطح پر تو نہیں آ سکتی۔" وہ گمبھیر انداز میں بولی "ہر شخص کا اپنا اپنا کردار ہوتا ہے۔"

مینا نے مجھے لاجواب کر دیا۔ ایک طوائف کے منہ سے ایسا دانش بھرا جواب سن کر میں بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

ہماری اس گفتگو سے ڈرائیور حنیف نے فائدہ اٹھایا اور اس نے لپک کر امتیاز کے ریوالور والے ہاتھ پر جھپٹا دیا۔ اس اچانک حملے سے ٹریگر پر امتیاز کی انگلی دب گئی

"ٹھک" کی آواز سے گولی چل گئی۔ اس کے ساتھ ہی فرش پر پڑے ہوئے عثمان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ ریوالور کی ہلاکت خیز گولی اس کی کھوپڑی میں جا گھسی تھی۔ اس کے بدن نے دو جھٹکے کھائے اور ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔

"تم لوگ ٹھیک نہیں کر رہے ہو!" مینا چیخ سے مشابہ آواز میں بولی۔

میں نے آگے بڑھ کر امتیاز کی خبر لی۔ حنیف نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا۔ حنیف ڈیل ڈول اور جسم کا خاصا مضبوط تھا۔ میں نے محسوس کیا' امتیاز کو اس وقت میری مدد کی ضرورت تھی۔

میں نے حنیف کی گردن میں ہاتھ ڈال کر نیک لاک لگایا اور ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ اٹھا اور امتیاز کا ریوالور بردار ہاتھ اس کی گرفت سے نکل گیا۔ امتیاز نے حنیف کو گولی کا نشانہ بنانا چاہا تو میں نے اسے روک دیا۔

"ایک آدھ میرے لیے بھی رہنے دو یار۔" میں نے حنیف کے سامنے آتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ بری طرح پچھتاؤ گے۔" حنیف نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا "تم دو بندوں کو قتل کر چکے ہو۔ یہاں سے نکل کر نہیں جا سکو گے۔"

"جو لوگ دو بندوں کو قتل کر سکتے ہیں وہ دو سو اور دو ہزار کو بھی جان سے گزار سکتے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تم سیدھی طرح میر بخش کے بارے میں بتاتے ہو یا تمہیں بھی زمین پر لمبا لٹا دیا جائے۔"

وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر خاصی تقویت محسوس کر رہا تھا' دھمکی آمیز لہجے میں بولا "تم دونوں نے میاں جی کے کچھار میں گھس کر اپنی موت کو آواز دی ہے۔ اب بھی وقت ہے' یہ ہتھیار پھینک کر خود کو میرے حوالے کر دو ورنہ تمہارا حشر بڑا عبرت ناک ہوگا۔"

میں نے اس کی دھمکی کا جواب ہاتھ پاؤں سے دیا۔ ایک دو ہاتھ کے بعد وہ بھی اسٹانس بنا کر میرے سامنے جم گیا۔ اس کے جسم پر اس وقت صرف ایک پتلون تھی۔ میں نے اسے کک مارنے کا جھانسا دیا اور ایک نیچا اسٹیپ لے کر تھوڑا آگے آ گیا۔

وہ بلاک کرنے والے انداز میں تھوڑا پیچھے ہٹا تو میں نے اس موقع کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک کریسنٹ کک جڑ دی۔ وہ چہرے کو تھام کر دو قدم پیچھے گیا پھر ڈگمگاتے ہوئے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اب وہ تمام اسٹانس اور پیترے بھول گیا اور بالکل دیسی انداز میں مجھ پر پل پڑا۔ میں نے بھی جواباً اسٹریٹ فائٹ کے اصولوں کے مطابق اس کی دھنائی شروع کر دی جس کے اختتام پر میری ایک سائڈ کک نے اسے دور اچھال دیا۔

وہ سیدھا میڈم مینا کی گود میں جا کر گرا۔ وہ ایک مرتبہ پھر بہ آواز بلند چیخ اٹھی۔ اسی بوکھلاہٹ میں وہ نیم برہنہ بھی ہو گئی۔

اسی وقت باہر سے کسی کی پکار سنائی دی "حنیف... جبار... تم کہاں مر گئے ہو حرام زادو... میں تمہیں پورے بنگلے میں تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔" اس کی آواز سے خمار جھلکتا تھا۔ وہ اچھی خاصی چڑھائے ہوئے تھا۔

مینا سراسیمہ لہجے میں بولی "یہ تو شاکر صاحب کی آواز ہے۔"

"کون شاکر؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"شاکر صاحب یہاں کے کرتا دھرتا ہیں۔" اس نے بتایا "ہم لوگ انہی کے بلانے پر اس بنگلے میں آئے ہیں۔"

اس دوران میں حنیف ڈرائیور نے جست لگا کر بیڈ سے نیچے اترنے کی کوشش کی۔ اس سے قبل کہ میں اس کی مرمت کے لیے ہاتھ پاؤں کو زحمت دیتا' امتیاز کے ریوالور نے ایک اور گولی اگلی اور حنیف نامی وہ گراں ڈیل شخص مردہ چھپکلی کی مانند دوبارہ بیڈ پر جا گرا۔ اب اس کے اٹھنے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ کیونکہ خاموش موت کنپٹی کے راستے اس کے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔

"تمہارا کیا ارادہ ہے بائی جی؟" امتیاز نے سفاکی سے مینا کی جانب دیکھا۔

وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی "مم... میں... نہیں جانتی' تم کون لوگ ہو... اور ان لوگوں سے تمہاری کیا دشمنی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ تم لوگ جو کہو گے' میں وہی کروں گی... خدا کے واسطے مجھے جان سے نہ مارنا... اور نہ میری لڑکیوں کو کوئی نقصان پہنچانا۔"

وہ باقاعدہ گھگیا رہی تھی۔ امتیاز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے اشارہ کیا۔ میں نے اس کے اشارے کا جواب اشارے میں ہی دیا جس کا مطلب تھا' میڈم مینا کی جان بخش دی جائے۔ امتیاز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاکر نامی اس شخص کی آواز اب بہت قریب سے آ رہی تھی جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ اس کمرے کے نزدیک پہنچ گیا تھا جہاں اس وقت ہم موجود تھے۔

"عثمان۔۔۔ جبار۔۔۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں اپنے ملازمین کو پکار رہا تھا "وہ بڈھی حرافہ مینا کس کونے میں جا چھپی ہے۔ اس سے کہو' جلدی بنگلے کے اندر پہنچے۔ رخ کو کچھ ہو گیا ہے۔"

"ہائے میں مرگئی۔۔۔ میری بچی؟" مینا بے ساختہ سینہ تھام کر بستر سے نکل آئی۔

اس کے بدن پر لباس نامی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ رخ کے بارے میں سنتے ہی وہ بے اختیار ہو گئی تھی۔

امتیاز نے اس کا لباس اس کی جانب پھینکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا' فوراً اسے پہن لو۔ شاکر کے سامنے' یہاں کی صورتِ حال تمہارے چہرے سے نہیں جھلکنا چاہیے۔ اس کی بات غور سے سنو اور بنگلے کے اندر چلی جاؤ۔ اگر تم نے میری ہدایت کے خلاف ایک سانس بھی لی تو سمجھ لینا' اسی وقت ایک بے آواز گولی تمہارے بدن میں اتر جائے گی۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکی ہو' میں کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرتا!"

وہ جلدی جلدی اثبات میں سرہلانے لگی پھر اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

لباس پہننے کے بعد اس نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "شاکر صاحب ان تینوں کے بارے میں کوئی سوال کریں تو کیا جواب دوں؟" اس نے ان تینوں کی لاشوں کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

"تم کہہ سکتی ہو کہ یہ اپنا کھیل مکمل کرنے کے بعد سکون کی نیند سو رہے ہیں۔" امتیاز نے بے پروائی سے کہا "کمرے کے اندر وہ آئے گا نہیں' تم دروازے پر ہی اس سے بات کر لینا اور اس کے ساتھ چلی جانا۔ ویسے تم شاکر سے کچھ غلط بھی نہیں کہو گی۔ یہ تینوں واقعی سکون کی ابدی نیند سو رہے ہیں۔"

اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی پھر شاکر کی چنگھاڑ سے مشابہ آواز اندر پہنچی "عثمان!۔۔۔ اگر تم لوگ بڑھاپے سے جنگ میں مصروف ہو تو تھوڑی دیر کے لیے سیز فائر کر دو۔ یہ نامراد کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ اس وقت تم سے زیادہ رخ کو اس کی ضرورت ہے۔ وہ اندر کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔ شاید اسے کوئی دورہ وغیرہ پڑ گیا ہے۔" شاکر کی آواز نشے سے بوجھل تھی۔

میڈم مینا نے یہ سننا تھا کہ لپک کر دروازے پر آئی اور بجلی کی سی سرعت سے بولٹ گرانے کے بعد اس نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اچک کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئے۔ باہر کھڑا شاکر نامی وہ شخص کوشش کے باوجود بھی اندر ... ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

اس موقع پر مینا نے واقعی سمجھ داری کا ثبوت ... جذبات سے لبریز آواز میں بولی "کیا ہوا ہے رخ کو؟"

"خود ہی آ کر دیکھ لو۔" شاکر سٹپٹائے ہوئے لہجے ... پھر کمرے کے اندر نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے ... سوال کیا "وہ تینوں کہاں ہیں؟"

"تھک کر سو رہے ہیں۔" مینا نے دروازے ... نکلتے ہوئے کہا۔

"سالے۔۔۔ گدھے کے بچے۔" شاکر نے زیر لب ... ملازمین کو ایک کلاسیکل ناقابلِ اشاعت گالی دی اور ... کے لیے مڑ گیا۔

مینا نے پلٹ کر اطمینان بھری نظر سے کمرے ... دیکھا اور شاکر کے پیچھے چل دی۔

میں نے امتیاز سے کہا "یار! ہمیں ان کے پیچھے ... کے اندرونی حصے میں پہنچ جانا چاہیے۔"

"میرا بالکل یہی ارادہ ہے۔" وہ اثبات میں ... ہوئے بولا "مینا پر ہم زیادہ بھروسا نہیں کر سکتے۔ یہ ... عورت کسی بھی وقت ہمارا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ پہلے ... میں ہمیں اس کمرے سے نکلنا ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے کمرے میں موجو... لاشوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ ... اس کی تقلید میں قدم اٹھا دیے۔ شاکر اور مینا ... تھوڑے فاصلے پر آگے جا رہے تھے۔ امتیاز نے میرے ... میں سرگوشی کی۔

"شاکر اس وقت پوری طرح ہوش و حواس ... نہیں آتا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں بنگلے کے حصے میں پہنچنے میں کافی آسانی رہے گی۔"

میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا ... تمہیں صد فی صد یقین ہے کہ میر بخش اس وقت ا... موجود ہے؟"

"صد فی صد نہیں بلکہ ایک سو ایک فی صد ... ہوں۔" وہ چٹانی لہجے میں بولا "مجھے ملنے والی اطلاعا... ہی نہیں سکتیں۔"

ہم ان دونوں کے تعاقب میں انتہائی احتیاط ... بنگلے کی اندرونی عمارت میں پہنچ گئے۔ جب مینا' شاکر ... ساتھ ایک کمرے میں داخل ہو گئی تو میں نے کہا۔

"یار امتیاز! مینا نے بتایا تھا کہ شاکر یہاں کا کر...

ہے۔ اگر ہم اس پر قابو پالیں تو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔"

"جگر! تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔" امتیاز خوشی سے کِھل اٹھا۔

اس وقت ہم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس بنگلے میں مبینہ طور پر صرف دو افراد ایسے رہ گئے تھے جن سے ہمیں نمٹنا تھا۔ ایک نیم مدہوش شاکر اور دوسرا اس کا دوست۔۔۔ جو مینا کی لڑکی سویٹی کے ساتھ مصروف تھا۔ ہمارے لیے یہ ایک انتہائی آسان ٹارگٹ تھا لہٰذا ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ کیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گئے۔

میری نگاہ نے ایک وحشت انگیز منظر دیکھا۔ چاند چہرہ رخ ایک کنگ سائز بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ سینے تک اس کا جسم ایک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس چادر کے نیچے وہ یقیناً بے لباس ہو گی۔ مینا بے تابی سے جھنجوڑ کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وحشی شاکر نے جانے اس کے ساتھ ایسا کیا کر دیا تھا کہ وہ کومل سی لڑکی ہوش و حواس گنوا بیٹھی تھی۔

بیڈ کے نزدیک ہی ٹرالی پر ایک کلر ٹی وی آن تھا جس پر ایک یورپی چینل چل رہا تھا "ووکس" نامی اس چینل پر عریبوں والی فلم دکھائی جا رہی تھی ۔ وہ کوئی تربیتی فلم تھی جس میں ٹاپ ماڈل کال گرلز کو پیشہ ورانہ تعلیم دی جا رہی تھی۔ یورپ اور امریکا میں ایسی فلم بندی اور فلم بینی عام سی بات ہے!

اگر ہم نے کمرے کے اندر کی صورتِ حال کو اس تفصیل سے جان لیا تھا تو ممکن نہیں تھا کہ اندر والے ہمیں نہ دیکھ پائے ہوں۔ ہمارے کمرے میں داخل ہوتے ہی شاکر اور مینا نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا تھا۔ مینا ایک نظر ہم پر ڈالنے کے بعد رخ کی جانب متوجہ ہو گئی تاہم شاکر پھٹی پھٹی سرخ آنکھوں سے ہمیں تکتے ہوئے غصے سے بولا۔

"کون ہو تم لوگ؟"

"تمہاری ماں کے یار۔" امتیاز نے زہرخند لہجے میں کہا اور ریوالور کا رخ شاکر کی جانب موڑتے ہوئے بولا "میر بخش کہاں ہے؟"

"میر بخش!" شاکر نے زیرِ لب دہرایا اور اسے جیسے ہوش آگیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا زیادہ نشے میں نہیں تھا جتنا ہم سمجھ رہے تھے۔ میں نے شاکر کی آنکھوں میں اپنے لیے شناسائی کی چمک دیکھ کر چونک اٹھا۔

اسی لمحے وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے آواز میں بولا "وجدان۔۔۔ اولادِ شیطان۔۔۔ تم یہاں بھی گئے!"

"میں عن قریب تمہارے پرائیویٹ باپ میاں حسین اور ویسی پرائیویٹ دادا چوہدری نواز ش علی کی تک بھی پہنچنے والا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے "مسٹر شاکر! باقی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ فی الحال صرف اتنا بتاؤ' میرا ساتھی میر بخش کہاں ہے؟"

میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اس کا نشہ تقریباً ہوا ہو چکا تھا۔ وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"تو تمہیں میرا نام بھی معلوم ہو چکا ہے۔"

میرے بجائے امتیاز نے اسے لتاڑا "صرف نام نہیں' ہم تمہارا پورا شجرۂ نسب بھی جانتے ہیں۔ تم خبیث بن فلاں مہاخبیث کی اولاد ہو۔"

ہمیں باتوں میں لگا کر شاکر نے ایک چالا کی دکھانے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ بڑی سرعت سے تکیے کے نیچے گیا اور ایک پستول لے کر باہر آگیا۔ اس نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں مجھے نشانہ بنا کر گولی داغ دی۔

فائر کی آواز بند کمرے میں ایک دھماکے کی طرح گونجی لیکن میں کسی بھی قسم کے ضرر سے محفوظ رہا۔ میں اگر اس کے نشانے پر موجود رہتا تو گولی میرا کچھ بگاڑ سکتی تھی۔ اس کا پستول والا ہاتھ سیدھا ہوتے ہی فضا میں پرواز کرتے ہوئے ڈبل فرنٹ سمر سالٹ لگاتے ہوئے عین شاکر کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے بوکھلاہٹ میں پستول کا رخ میری جانب کرنا چاہا لیکن اسی وقت میرے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر اس کی ٹھوڑی پر لگی۔

وہ بلبلاتے ہوئے پیچھے بستر پر الٹ گیا۔ وہ پشت کے بل بے ہوش رخ پر گرا تھا۔ مینا کی "لڑکی" نے حیرت انگیز طور پر آنکھیں کھول دیں۔

میرے حملے نے شاکر کے ہاتھ سے پستول چھڑا دیا تھا۔ اتفاق سے وہ پستول سیدھا مینا کے سامنے جا گرا۔ مینا نے پستول پر قبضہ کیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر ہم سب کو نشانے پر رکھتے ہوئے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"تم سب جہنم میں جاؤ اور وہیں جا کر اپنی دشمنی نکالتے رہو۔ مجھے اور میری لڑکیوں کو ابھی یہاں سے جانے دو۔ ہمارے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

پھر وہ رخ کو پچکارنے لگی "اٹھو میری بچی۔ ہمت کرو۔ میں سویٹی کو بھی بلاتی ہوں۔"

مینا کا فیصلہ میرے دل کو لگا' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "تمہاری بہتری اور بچت اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے چلتر ہو جاؤ۔ اپنی حفاظت کے لیے شاکر کا پستول بھی ساتھ لے جاؤ اور یہ بات تو تمہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے بارے میں تم نے زبان بند رکھنا ہے۔"

"تم کہیں نہیں جاؤ گی مینا۔" شاکر نے مینا کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا "لاؤ' یہ پستول مجھے دے دو۔ یہ دونوں ہمارے دشمن ہیں۔ میں ان پر قابو پا لوں گا۔ تم رخ کو سنبھالو۔"

اسی وقت کمرے کے دوسرے دروازے پر تیز دستک ہوئی پھر کسی نے تشویش بھری آواز میں دریافت کیا "شاکر بھائی! تم خیریت سے تو ہو نا۔ میں نے ابھی ابھی فائر کی آواز سنی ہے؟"

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا۔ اس دروازے کی دوسری جانب وہ کمرا تھا جہاں شاکر کا دوست سویٹی کے ساتھ موجود تھا۔ شاکر نے مجھ پر گولی چلائی تھی تو امتیاز انتہائی ماہرانہ سرعت سے فرش پر رول کرتے ہوئے ایک جانب لڑھک گیا تھا۔ وہ اس وقت اسی دروازے کے نزدیک پوزیشن سنبھالے کھڑا تھا۔

شاکر نے بند دروازے کے پیچھے سے بولنے والے سے چلا کر کہا "یار قوبا! ادھر دو بدمعاش گھس آئے ہیں۔ تم اپنی گن لے کر فوراً یہاں پہنچو۔"

میں نے امتیاز کو اشارہ کیا کہ مذکورہ دروازے کی کنڈی گرا دے۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔

شاکر نے چیخ کر اپنے دوست کو مطلع کیا "قوبا! اس دروازے سے نہ آنا۔ دروازے کے پیچھے ایک بدمعاش ریوالور لیے کھڑا ہے۔"

اس کی سنسنی خیز اطلاع پوری ہونے سے پہلے ہی دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور کلاشنکوف بردار قوبا نامی وہ شخص کمرے کے اندر آگیا۔ یا تو اس نے شاکر کی وارننگ سنی ہی نہیں تھی یا پھر اس کی بات کو اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صورتِ حال اچانک واہیات رخ اختیار کر گئی۔

قوبا نامی اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی شاکر ایک مرتبہ پھر چلایا "یہ وجدان ہے' تمہارے بھائی اسحاق کا قاتل۔ اسے فوراً شوٹ کر دو۔" وہ انگلی سے میری جانب اشارہ کر رہا تھا۔

قوبا نے نفرت آمیز انداز میں مجھے دیکھا اور کلاشنکوف کا ایک برسٹ فائر کر دیا۔

اس موقع پر امتیاز نے برق رفتاری سے ردِعمل کا مظاہرہ کیا اور ٹریگر پر قوبا کی انگلی دبنے سے پہلے ہی وہ اس کی کلاشنکوف کو ایک ٹھوکر مار کر چھت کی جانب موڑ چکا تھا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے کمرا گونج اٹھا۔ تمام گولیاں چھت میں لگی تھیں اور وہاں جا بہ جا پلاسٹر ادھڑ کر رہ گیا۔ اس فائرنگ کے ساتھ ہی دوسرے کمرے سے سویٹی کی انتہائی کریہہ چیخ بھی بلند ہوئی۔

امتیاز کلاشنکوف کو ٹھوکر مارنے کے بعد لوٹ لگا کر ایک چوبی الماری کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ قوبا نامی کلاشنکوف بردار دوبارہ میری جانب متوجہ ہوا تو اس کے چہرے میں ایک شناسا جھلک دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہائٹ شیرڈ میں جن تین افراد نے ریلوے اسٹیشن سے ہمارا تعاقب کیا تھا ان میں کلف دار شلوار قمیص والا ایک فربہ شخص بھی تھا۔ قوبا اس موٹے سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شاکر نے قوبا کو مطلع کیا تھا کہ میں اس کے بھائی اسحاق کا قاتل ہوں۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ قوبا اس موٹے کا بھائی تھا۔ سفید شیرڈ والے تینوں افراد "سی ایف کے" والوں کی فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے لیکن یہ ہلاکتیں وقت کی ستم ظریفی نے میرے کھاتے میں ڈال دی تھیں۔

قوبا (بعد میں اس کا نام یعقوب معلوم ہوا) مجھ پر فائرنگ کرتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچایا کیوں کہ میرے عقب میں مینا اور رخ موجود تھیں اور پہلو میں شاکر بھی بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اسی لمحے سویٹی بھی خوف زدہ انداز میں بھاگتے ہوئے اپنی "ماں" میڈم مینا کے پاس پہنچ گئی۔

یعقوب کی لمحاتی ہچکچاہٹ سے امتیاز نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے الماری کے عقب سے تاک کر یعقوب کے ہاتھوں کا نشانہ لیا اور یکے بعد دیگرے دو بے آواز فائر کر دیے۔

یعقوب عرف قوبا چیختے ہوئے پیچھے ہٹا اور کلاشنکوف اس کی گرفت سے نکل کر دور جا گری۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور کلاشنکوف پر قبضہ کر لیا۔ قوبا اور شاکر وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔

"اب کیا ارادہ ہے شاکر! میر بخش کے بارے میں بتاتے

ہویا تم دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دوں؟"

"میر بخش اس بنگلے میں نہیں۔" شاکر نے کن انکھیوں سے یعقوب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر کہاں ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

امتیاز نے کہا "وجدان! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ فائرنگ کی آواز کسی حد تک باہر بھی گئی ہوگی۔ اگرچہ یہ رات کا آخری پہر ہے۔ لوگ گہری نیند میں ہوں گے لیکن کوئی شب بیدار اس جانب متوجہ ہو سکتا ہے۔ تم ان سب کو کور کرو۔ میں خانہ تلاشی لے کر آتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے کلاشنکوف کو ریڈی آن کرتے ہوئے کہا پھر امتیاز سے پوچھا "ان کا کیا کرنا ہے؟" میرا اشارہ میڈم مینا اور اس کی لڑکیوں کی جانب تھا۔

وہ مینا کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "تم اپنی لڑکیوں کو لے کر واش روم میں.... جاؤ اور ان کے لباس پر توجہ دو۔ تمہارے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے۔" پھر اس نے میری جانب مڑتے ہوئے کہا "انہیں فی الحال جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

بات ختم کرتے ہی وہ مینا کے پاس پہنچا اور اس کے ہاتھ سے شاکر والا پستول جھپٹ لیا۔ امتیاز کے ریوالور کی چھے گولیاں فائر ہو چکی تھیں۔ اب اس کے تمام چیمبرز خالی ہو گئے تھے۔ اسی لیے امتیاز نے وہ پستول اپنے قبضے میں کیا تھا' البتہ میرے پاس فلی لوڈڈ اسٹیل باڈی پنسل خاموشی سے آرام فرما رہا تھا۔

امتیاز کی ہدایت پر مینا' سویٹی اور رخ کے ساتھ ملحقہ واش روم میں گھس گئی اور میں ان دو سورماؤں کی جانب متوجہ ہو گیا جو اس وقت نہ سور تھے اور نہ ماؤں بلکہ صرف "میاؤں میاؤں" ہو کر رہ گئے تھے۔ کلاشنکوف کے نشانے پر وہ بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے۔

شاکر نے مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وجدان! تم ابھی نئے نئے جرم کی دنیا میں آئے ہو اسی لیے میاں جی کی طاقت کا تمہیں اندازہ نہیں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کارروائی سے باز آجاؤ۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم مجھے یہ مشورہ اس لیے دے رہے ہو کہ شاید تمہارا میاں بھی میرے بارے میں تفصیلاً نہیں جانتا۔ میں تو شیر خواری کی عمر ہی سے تمہاری مخصوص دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد تو میں نے دارا جیسے بدنام زمانہ 'شیطان ابنِ شیطان سے پنجہ آزمائی شروع کر دی تھی۔"

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا "کیا ہمارے درمیان نہیں ہو سکتی؟"

میں بہ خوبی اس کی چال سمجھ رہا تھا۔ اس کی یہ کسی بھی اصول پر پوری نہیں اترتی تھی۔ وہ مجھے گم موقع حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جواباً میں نے اسے گھسا دیا۔

"کیوں نہیں' ہمارے بیچ یقیناً دوستی ہو سکتی ہے نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ قدرے مطمئن نظر آیا اور میری جانب ہاتھ بڑھا ہوئے بولا "چلو' پہل میں کرتا ہوں۔ آج سے ہم ہیں۔ کلاشنکوف پھینک کر میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دو۔"

میں نے اس کی مکاری کی تہ میں اترتے ہوئے لفظی جوتا مارا "مسٹر شاکر! تم نے دوستی کے لیے ہاتھ دیا ہے لیکن یہ بھول گئے کہ تمہیں میری دوستی کے لیے اپنے میاں جی کی دشمنی مول لینا ہوگی۔ کیا تم یہ سودا سکتے ہو؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا' آمیز لہجے میں بولا "میں میاں جی کو سمجھانے کی کوشش گا۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ دراصل اس نے میاں زاہد سمجھانے کی بات اس طرح کی تھی جیسے کوئی بیوی اپنے سمجھانے کا ذکر کرتی ہے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا یہ بات پوری سنجیدگی سے کر رہے ہو تو پھر میں یہی کہوں تم الو کے پٹھے ہو۔ کیوں کہ تم مجھے بے وقوف بنا کوشش کر رہے ہو۔ تم میاں زاہد کی کٹھ پتلی ہو' وہ تمہا ہاتھوں کا کھلونا نہیں جو تم اسے ڈکٹیشن دو گے!"

اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار نمودار جیسے اس نے دل ہی دل میں مجھے کوئی طوفانی گالی دی ہو وہ منہ سے کچھ نہیں بولا' صرف دانت کچکچا کر رہ گیا۔

اسی وقت قوبا نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ اپنے کو پکڑ کر دہرا ہوا پھر فرش پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا کے چہرے پر تکلیف کے شدید تاثرات تھے یوں محسوس تھا' اچانک اس کے پیٹ میں کوئی خطرناک قسم کا درد اٹھا شاکر جھک کر اس کے قریب بیٹھ گیا اور تشویش لہجے میں پوچھنے لگا "کیا ہوا قوبا۔ یہ اچانک تم زمین پر

گئے ہو؟"

میں بھی صورتِ حال جاننے کے لیے دو قدم آگے بڑھ آیا۔ قوبا کی کیفیت نے مجھے بھی الجھا دیا تھا۔ جلد ہی اس کی مکاری کا پول کھل گیا۔

میں قوبا کی جانب متوجہ تھا کہ امتیاز جلدی سے کمرے میں داخل ہوا اور مایوسی بھرے لہجے میں بولا "وجدان! میں نے تمام کمرے اور دوسری جگہوں پر چیک کر لیا ہے' میر بخش کا سراغ نہیں مل رہا۔ کہیں ان کمینوں نے اسے جان سے تو...!"

امتیاز نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور قہر آلود نظروں سے شاکر کو تکنے لگا۔

شاکر نے کہا "میں تو تم لوگوں کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ تمہارا مطلوبہ بندہ یہاں نہیں ہے۔ اب تم نے خود دیکھ کر تسلی کر لی نا!"

"تیری تسلی کی تو میں ایسی کم تیسی کروں گا۔" امتیاز نے سفاکی سے کہا پھر میرے ہاتھ سے کلاشنکوف لے کر وہ جارحانہ انداز میں شاکر کی طرف بڑھ گیا۔

یہی لمحہ تھا جب قوبا کے "دردِ قولنج" کی قلعی کھل گئی۔ مجھے نہتا ہوتے دیکھ کر وہ کسی اسپرنگ کے مانند فرش پر اچھلا اور بے قابو گاڑی کی طرح سیدھا میری طرف بڑھا۔

اس کی اس برقی حرکت نے ثابت کر دیا کہ وہ شدید تکلیف کا بہانہ بنا کر زمین پر اسی مقصد کے لیے گرا تھا کہ کسی طرح مجھ تک پہنچ سکے۔

قوبا نے کسی سرکاری سانڈ کی طرح میرے پیٹ میں ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کا نشانہ سچا تھا لیکن میں اس وقت فل ایکشن میں تھا۔ قوبا کا سر "ٹارگٹ" تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

میرا یہ عمل میکانکی تھا' قوبا اپنی ہی جھونک میں میرے قریب سے گزرا پھر اس کا سر ٹی وی ٹرالی سے جا ٹکرایا۔ ٹرالی پر رکھا ہوا واہیات پروگرام دکھانے والا کلر ٹی وی اس ٹکراؤ کے باعث فضا میں اچھلا پھر ایک دو قلابازیاں کھانے کے بعد زمین بوس ہو گیا۔ اس طوفانی بوسے کے نتیجے میں ایک چھناکے سے اس کا اسکرین چکنا چور ہو گیا۔ ٹرالی پر رکھی ہوئی دیگر اشیا بھی اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔

اسی وقت واش روم کا دروازہ کھلا اور "ماں بیٹیاں" چلاتی ہوئی وہاں سے برآمد ہوئیں۔ وہ اس وقت مناسب لباس میں تھیں۔

مینا نے کمرے میں پھیلی ہوئی افراتفری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"تمہاری لڑکیوں کی براتیں آئی ہیں۔" میں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا "اس لیے پٹاخے چھوٹ رہے ہیں۔"

جب ہم اس کمرے میں پہنچے تھے تو ہم پر نظر پڑتے ہی شاکر نے ٹی وی کو ریموٹ کنٹرول سے آف کر دیا تھا مگر اس کی پاور سپلائی جاری تھی۔ قوبا سے ٹکراؤ کے بعد شاید اس کے اندر کوئی شارٹ سرکٹ جیسا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس میں سے ایک دو مرتبہ کچھ آوازیں سی برآمد ہوئی تھیں۔ میرا اشارہ انہی آوازوں کی جانب تھا۔

"ہم تو جا رہے ہیں بھائی۔" مینا دونوں لڑکیوں کو سمیٹتے ہوئے ایک جانب بڑھی۔ اس وقت تک رخ باقاعدہ ہوش میں آ چکی تھی۔

میں نے ڈانٹ کر کہا "کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ تم تینوں واپس باتھ روم میں چلو۔"

انہوں نے مایوسی سے میری جانب دیکھا اور میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں نے ان کے' باتھ روم میں داخل ہوتے ہی باہر سے کنڈی لگا دی۔ اب وہ اس وقت تک باہر نہیں آ سکتی تھیں جب تک وہ کنڈی کھولی نہ جاتی۔

میں نے پہلے رخ کو چاند چہرہ کہا تھا۔ اس وقت تک میں نے پوری طرح اسے دیکھا نہیں تھا۔ اب مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی ادھوری تعریف کی تھی۔ رخ درحقیقت چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں تھی۔

میں اس سے زیادہ رخ کے بارے میں سوچ نہ سکا کیوں کہ زخمی چہرے والا قوبا میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ ٹی وی ٹرالی سے تصادم نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا' تاہم اس کی دانست میں' میں اس کے بھائی اسحاق کا قاتل تھا۔ اس لیے وہ مرنے مارنے پر تل گیا۔

وہ دونوں ہاتھ آگے نکال کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ وہ مجھے اپنے بازوؤں کی گرفت میں دبوچنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے بازوؤں کو بڑی مہارت کے ساتھ اپنی بغلوں میں دبوچ لیا پھر دونوں ہاتھوں سے اس کی کنپٹیوں پر کراس چوپ (CROSS CHOP) رسید کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے ایک دھکا دیتے ہوئے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے کی جانب گیا۔ میں نے شارٹ اسٹیپ کے ساتھ ایک سائیڈ فلائنگ کک اس کے سر پر جڑ دی۔ وہ لڑھکتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مجروح ٹرالی کے پاس پہنچ گیا۔

امتیاز پے در پے کلاشنکوف کے بٹ شاکر کے منہ سر پر

رسید کر رہا تھا۔ شاکر کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا تاہم امتیاز پر اس وقت ایک جنون سوار تھا۔ شاکر کی اس کے سامنے کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ شاکر کا پورا چہرہ لہولہان ہو چکا تھا۔

آنے والے پانچ منٹ میں ہم دونوں نے شاکر اور یعقوب کے سارے کس بل نکال دیے۔ وہ ہمارے قدموں میں پڑے زمین چاٹ رہے تھے۔ اب وہ ہم پر ہاتھ اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے کیوں کہ زمین سے اٹھنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔

امتیاز کی سفاکی اس وقت پورے عروج پر تھی۔ وہ شاکر کے نزدیک ہی ایک کرسی ڈال کر بیٹھ گیا پھر اپنے لباس سے ایک تیز دھار خنجر برآمد کرتے ہوئے غرایا۔

"میر بخش کو تم نے کہاں چھپایا ہے؟"

شاکر جواب دینے سے پہلے تھوڑا ہچکچایا۔

امتیاز نے اس کا ایک پاؤں پکڑ کر اپنے نزدیک کھینچ لیا پھر ٹخنے کے عقبی حصے میں ایڑی سے تھوڑا اوپر خنجر کی نوک دھنسا کر ایک جھٹکا دیا۔ پاؤں کو حرکت دینے والی ایک مخصوص رگ کٹ گئی۔

اس کے ساتھ ہی شاکر کے حلق سے فلک بوس چیخ برآمد ہوئی اور وہ کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کے مانند تڑپنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اب زندگی بھر اس پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا...... امتیاز نے تڑپتے پھڑکتے شاکر کی آنکھوں کے سامنے خنجر لہراتے ہوئے خوں خوار لہجے میں دریافت کیا "میر بخش چاہیے مجھے کہاں ہے وہ؟"

تکلیف کی شدت سے شاکر کے منہ سے گالیوں کا گٹر ابل پڑا۔ امتیاز نے بلا تردد اس کے دوسرے پاؤں کے ساتھ بھی وہی عمل دہرایا جو وہ پہلے کے ساتھ کر چکا تھا۔ شاکر کا حشر دیکھ کر قوبا بے ہوش ہو گیا۔

"اب تمہاری پوری زندگی وھیل چیئر پر گزرے گی شاکر!" امتیاز نے خنجر کی دھار اسی کے لباس سے صاف کرتے ہوئے کہا "اس اپاہج زندگی کی ضمانت بھی اسی صورت میں دی جا سکتی ہے کہ تم مجھے میر بخش کے بارے میں بتا دو۔ ورنہ اب میں تمہاری آنکھوں کا رخ کرنے والا ہوں!"

شاکر کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ گھگیاتے ہوئے بولا "خدا کے لیے مجھے جان سے نہ مارنا۔۔۔ میری آنکھوں کو چھونا بھی نہیں۔۔۔ میں تمہیں بتاتا ہوں میر بخش کے بارے میں۔۔۔ بتاتا ہوں۔۔۔۔"

"بکو بھی!" امتیاز دہاڑا "ہمارے پاس تمہاری فضول تمہید سننے کا وقت نہیں۔"

"وہ۔۔۔ وہ تہ خانے میں ہے۔" شاکر کے ہونٹوں سے بالآخر وہ راز پھسل ہی گیا جس کی حفاظت کی خاطر وہ قدموں سے محروم ہو گیا تھا۔

"تہ خانے کا راستہ کس طرف ہے؟" امتیاز نے پوچھا۔ شاکر نے بڑی شرافت سے تہ خانے تک پہنچنے کا راستہ بتا دیا۔

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر ہم نے بنگلے کے تہ خانے سے میر بخش کو برآمد کر لیا۔ اس کی حالت خاصی تشویش ناک تھی۔ اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر مکمل بے ہوش تھا۔ امتیاز علی یلو کیب کو بنگلے کے دروازے کے سامنے لے آیا اور کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے ہم نے میر بخش کو گاڑی کی ڈکی میں بھر لیا۔ ایک سائیڈ کی ٹیل لائٹ اور انڈی کیٹر کو کھول کر ہوا کی آمد و شد کا بندوبست کیا گیا۔

روانہ ہونے سے قبل یعقوب عرف قوبا اور شاکر کا مناسب انتظام کرنا بھی ضروری تھا۔ اس کے علاوہ میر بخش اور اس کی لڑکیوں کا بھی مسئلہ تھا پھر سرونٹ کوارٹر میں افراد کی لاشیں بھی پڑی تھیں۔

امتیاز کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر میں نے کہا "سب پر لعنت بھیجو یار! بس ان تینوں کو آزاد کر دیتے ہیں جہاں جانا چاہیں، چلی جائیں۔ ان کی طرف سے ہمیں خطرہ نہیں ہو سکتا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو جگر۔" وہ میری تجویز سے متفق ہوتے ہوئے بولا "ویسے ان دو مردودوں کی جانب سے بھی خطرے والی کوئی بات نہیں۔ شاکر تو اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، وہ ہمارا تعاقب کیا کرے گا اور قوبا۔۔۔ وہ تو فرط خوف سے انٹا غفیل ہو چکا ہے۔"

میں نے کہا "ہم احتیاطاً ٹیلی فون کے تار کاٹ دیتے ہیں تاکہ کسی قسم کا اندرونی یا بیرونی رابطہ ممکن نہ رہے۔"

"یہ کام تو نہایت ہی ضروری ہے جگر!" امتیاز نے کہا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد، ہم ہر قسم کی تسلی کرنے کے بعد بنگلے سے روانہ ہو رہے تھے۔ گلی کے سرے پر پہنچے تو بنگلے کے گیٹ پر میں نے ایک پریشان صورت بوڑھے کو کھڑے دیکھا۔ اس نے ہماری گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے ڈرائیور جاوید سے رکنے کو کہا۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

میں نے کھڑکی سے سر نکال کر اس عمر رسیدہ شخص سے پوچھا "فرمائیے بابا جی کیا مسئلہ ہے؟"

"جیتے رہو بیٹا۔" اس نے مجھے دعا دی پھر بولا "کچھ دیر پہلے میں نے اس طرف فائرنگ کی آواز سنی تھی جدھر سے تم لوگ آ رہے ہو۔ کیا کوئی سنگین معاملہ ہو گیا ہے؟"

"ادھر کچھ میتیں ہو گئی ہیں۔" امتیاز نے اس شخص کے سوال کا جواب دیا۔

"میت پر فائرنگ!" اس نے حیرت سے دہرایا۔

امتیاز نے سنجیدگی سے کہا "بس انکل! اس شہر کا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیا ہے۔ خوشی اور غم میں تفریق کرنا ممکن نہیں رہا۔ واقعہ چھوٹا ہو یا بڑا، خوشی کا موقع ہو یا غم کے لمحات، ہم فائرنگ ضرور کرتے ہیں۔ فائرنگ دراصل ہمارے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔۔۔ تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" وہ شخص اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

میرے اشارے پر ڈرائیور نے یلو کیب آگے بڑھا دی۔

ہم نے جاوید کی مدد سے میر بخش کو ٹیکسی کی ڈکی میں پہنچایا تھا لہٰذا حالات کی سنگینی کے پیش نظر اس نے امتیاز سے پوچھا "کس طرف چلنا ہے امتیاز صاحب؟"

"میر بخش کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اسے ہم فلیٹ پر لے چلیں۔" میں نے کہا "اسے کسی اسپتال پہنچانا چاہیے تاکہ فوری طبی امداد دی جا سکے۔ اس کی بے ہوشی کو توڑنا ضروری ہے۔"

امتیاز نے کہا "میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں لیکن اس وقت اور اس کنڈیشن میں ہم اسے جہاں بھی لے جائیں گے، ہم پر سوالات کی بوچھار کر دی جائے گی۔ ہم اس باڑ کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔"

"پھر؟" میں نے تشویش میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔" جاوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میرے ایک ڈاکٹر دوست کا پرائیویٹ اسپتال ہے جہاں ہر قسم کے علاج کی سہولیات میسر ہیں۔ اگر آپ کہو تو میں سیدھا وہاں چلتا ہوں۔"

"کیا تمہارا وہ دوست ہم سے جرح نہیں کرے گا؟" امتیاز نے پوچھا۔

"وہ میرا دوست ہے۔" جاوید نے پُراعتماد لہجے میں کہا "میں سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گا۔ اس کی رہائش بھی اسپتال کی بالائی منزل پر ہے۔ ویسے اس اسپتال میں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کی سہولت موجود ہے۔"

امتیاز نے پوچھا "تمہارے دوست ڈاکٹر کا اسپتال کہاں ہے؟"

"گلشن میں۔" اس نے بتایا۔

"ڈاکٹر کا نام؟"

"فیروز۔" جاوید نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" امتیاز نے مطمئن انداز میں کہا "ہم ابھی اور اسی وقت گلشن اقبال جائیں گے۔"

جاوید نے یک بارگی یلو کیب کی رفتار بڑھا دی۔

○☆○

جب ہم فلیٹ پر پہنچے تو اجالا پھیل چکا تھا۔

دروازے پر آویزاں تالے کو دیکھ کر میں نے حیرت بھرے لہجے میں امتیاز سے پوچھا "یہ دونوں کہاں چلی گئیں؟"

"روبی کو مارننگ واک کی بیماری ہے۔" وہ جیب سے تالے کی چابی نکالتے ہوئے بولا "ساحل کو وہ اپنے ساتھ لے گئی ہو گی۔"

"اوہ!" میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ "روبی جتنی حسین ہے، اتنی ہی خوبصورت اس نے بیماری بھی پال رکھی ہے۔ مارننگ واک کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔"

ہم فلیٹ کے اندر آ گئے۔ امتیاز نے معنی خیز انداز میں کہا "ابھی روبی سے تمہاری کھل کر بات نہیں ہوئی ہو گی۔ اس حسین لڑکی نے واقعی بڑی سنگین بیماریاں پال رکھی ہیں۔ اس کے غم کو محسوس کرنے کے لیے غم خوار دل کا ہونا ضروری ہے۔"

میں نے محسوس کیا، روبی کے حسن کے تذکرے نے اسے خاصا سنجیدہ کر دیا تھا۔ اس سنجیدگی میں افسردگی کا عنصر شامل تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کو زائل کرنے کی خاطر موضوع گفتگو بدل دیا اور پوچھا۔

"کیا یہاں قریب میں کوئی پارک وغیرہ بھی ہے یا وہ مارننگ واک کے نام پر روڈ ناپنے گئی ہیں؟"

امتیاز نے جواب دیا "یہاں کچھ ہی فاصلے پر ایک خوبصورت پارک موجود ہے۔ ایک پہاڑی پر واقع اس صحت افزا مقام کا نام "ہل پارک" ہے۔ یہ کراچی کا سب سے بلند مقام ہے جس سے پورے شہر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔"

"واہ!" میں نے پُرمسرت انداز میں کہا "مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔"

"کیا کرنے کا ارادہ ہے جگر!" اس نے ٹٹولنے والے انداز سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "ساحل کو مارشل آرٹس اور یوگا سیکھنے سے

خاصی دلچسپی ہے۔ اس کی تربیت کے لیے ہل پارک بہت مناسب رہے گا۔"

"جگر! آج میں نے تمہارے آرٹ کا عملی مظاہرہ دیکھا ہے۔" امتیاز نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا "تم نے واقعی شاؤلن ٹیمپل سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اگر موقع ملا تو میں بھی تم سے کنگ فو کی چند ٹیکنیکس ضرور سیکھوں گا۔ پاکستان میں خالص چینی کنگ فو (KUNG-FU) کے ماہرین کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔"

"فکر نہ کرو' اب سمجھو یہ کمی کافی حد تک دور ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنا لگا۔

میں نے بتایا "میں مستقبل قریب میں یہاں کراچی میں مارشل آرٹس کا ایک بہت بڑا کلب کھولنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"ویل ڈن۔" وہ خوشی سے کھل اٹھا "تمہارے عزائم نے مجھے بڑی تقویت دی ہے جگر۔ میں اس سلسلے میں پیش آنے والے فنانشل معاملات کے بارے میں باس سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً اس پروجیکٹ کے لیے ہمیں مالی تعاون دیں گے۔"

"میں نے فنانس کا مسئلہ حل کر لیا ہے۔" میں نے سنگاپور والے معاملات سے اسے آگاہ کرنے کے بعد کہا "مجھے کراچی میں سیٹل ہونے کے سلسلے میں کسی مالی پریشانی سے نہیں گزرنا پڑے گا یار۔"

امتیاز نے کہا "میری دعا ہے' اللہ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔"

میں نے پوچھا "امتیاز! تم نے بتایا تھا کہ تم بھی کافی عرصہ مارشل آرٹس سیکھتے رہو ہو؟"

"ہاں' میں نے بانڈو (BANDO) اسٹائل میں براؤن بیلٹ تک سیکھا ہے۔ اس کے بعد میرا پارٹنر ملک سے باہر چلا گیا اور میں نے بھی ٹریننگ سینٹر جانا چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا "یار! تھوڑی سی محنت اور کر لیتے۔ بانڈو میں براؤن بیلٹ غالباً چھٹا گریڈ ہے۔ اس کے بعد بلیک بیلٹ کا درجہ آتا ہے۔ تم بھی بلیک بیلٹ ہو جاتے۔"

"غالباً نہیں بلکہ یقیناً براؤن بیلٹ کا چھٹا گریڈ ہے۔ وہائٹ' ییلو' اورنج' گرین' بلیو اور پھر براؤن۔۔۔۔ بس میں بلیک بیلٹ سے ایک درجہ پیچھے رہ گیا۔" ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے بے پروائی سے کہا "خیر جگر! کپڑے کی ان رنگ دار پٹیوں میں کیا رکھا ہے۔ اصل چیز ہے ٹیکنیک میں مہارت حاصل ہونا۔ جو کسر رہ گئی ہے۔ وہ میں تم سے پوری کر لوں گا۔"

"ضرور۔۔۔ ضرور۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

پھر ہمارے درمیان "مشن لیٹ نائٹ" پر گفتگو ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ساحل اور روبی بھی واپس آ گئے۔ ہم سب نے نہا دھو کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے اکثر آئٹم وہ بازار سے تیار لے آئی تھیں۔

ناشتے کے بعد امتیاز نے کہا "میں اور روبی آج کا دن مصروف رہیں گے۔ ضروری نوعیت کے چند کام نمٹانے ہیں۔ تم لوگ فلیٹ پر آرام کرو۔ ویسے چاہو تو گھومنے پھرنے کے لیے نزدیکی علاقوں میں جا سکتے ہو۔ فلیٹ کی ایک چابی تمہارے پاس ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

روبی نے خاتونِ خانہ کے فرائض نبھاتے ہوئے کہا "فریج میں کھانے پینے کی ہر چیز موجود ہے۔ تم لوگ یہیں لنچ کر سکتے ہو۔ ویسے یہاں آس پاس ہر قسم کے ہوٹل' ریسٹورنٹ دن بھر اور رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔ فاسٹ فوڈ' باربی کیو اور ہر نوع کے لوکل کھانے بہ آسانی دستیاب ہیں۔"

میں نے امتیاز سے پوچھا "ویسے تم لوگ کب تک واپس آ جاؤ گے؟"

"شام تک۔۔۔ اور رات بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے جواب دیا "باس کو اپنی تازہ ترین کارکردگی کی رپورٹ دینی ہے' اور تمہارے بارے میں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"میں میر بخش کے لیے پریشان رہوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "میر بخش بڑی اطمینان بخش جگہ پہنچ گیا ہے۔ تمہیں اس کے لیے زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے میں اس کے بارے میں معلوم کرتا رہوں گا۔ رات کو میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ آنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔

لگ بھگ دس بجے وہ دونوں فلیٹ سے رخصت ہو گئے۔ تنہائی میسر آتے ہی ساحل نے مجھے اپنے سوالوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ میں اسے بتائے بغیر منہ اندھیرے امتیاز کے ساتھ گیا تھا۔ اس کی تشویش بہ جا تھی۔ اگرچہ روبی نے نہایت موزوں الفاظ میں اسے بریف کر دیا تھا تاہم وہ میرے منہ سے سننے کی متمنی تھی۔

میں آدھے گھنٹے تک اس کے مختلف سوالات کے جواب دیتا رہا۔ میں نے شاکر کے بنگلے پر پیش آنے والے حالات کی سنگینی کو ممکنہ حد تک کم کر کے اس کے سامنے بیان کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے اب اتنی سیانی ہو گئی تھی کہ میرے بیان کی گہرائی تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس پوچھ تاچھ کے اختتام پر اس نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا "لارڈ بدھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ میر بخش زندہ سلامت ہم تک پہنچ گیا۔"

اس وقت ہم لاؤنج میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ گرمی بڑھنے لگی تو میں نے کہا "چلو ساحل اندر کمرے میں جا کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ مجھے گہری نظروں سے دیکھنے کے بعد شرارت سے مسکرائی پھر پوچھا "کیا نیلگری کو ٹیسٹ کرنے کا ارادہ ہے!"

"تم کافی تیز نہیں ہوتی جا رہی ہو؟"

"کس حوالے سے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا "ہر ہر حوالے سے۔"

"میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے میرا کچھ زیادہ ہی تیز ہونا ظاہر ہو۔" وہ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولی "تم نے خود ہی تو بتایا ہے نا' نیلگری نے دعویٰ کیا تھا کہ جب بھی تم کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں جاؤ گے' وہ تمہاری خلوت میں چلی آئے گی۔"

"اس کا دعویٰ کل دوپہر والے واقعے کے بعد غلط ثابت ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے' نیلگری اس وقت کسی ضروری کام میں مصروف ہو اور وہ کام چھوڑ کر یہاں نہ آ سکتی ہو!" ساحل اگرچہ سنجیدہ لہجے میں بات کر رہی تھی تاہم مجھے معلوم تھا' وہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "نیلگری کا دعویٰ کس حد تک غلط ثابت ہوا ہے یہ تو آنے والے دنوں ہی میں پتا چلے گا۔ میں فی الحال آرام کرنے کے لیے کمرے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"وجدان اور آرام؟" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کہا "ہاں' میں اپنے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہا ہوں۔"

"مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔" وہ جلدی سے بولی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی "شاید کافی سے کچھ آرام ملے۔ تم کمرے میں چلو' میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

پھر وہ کچن میں گھس گئی اور میں نے کمرے کا رخ کیا۔

دس منٹ بعد ہم ائرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کافی ختم ہوئی تو ساحل نے کہا "آؤ وجدان! میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"درد میں آرام ملے گا۔"

"درد تو تمہارے سر میں بھی ہو رہا ہے!"

"ہاں' وہ تو ہو رہا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "پھر میں تمہارے نازک ہاتھوں کو تکلیف کیوں دوں؟"

"تم ایک دم اتنے بیگانے سے کیوں ہو جاتے ہو وجدان؟"

"کیوں' میں نے ایسا کیا کیا ہے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی "تمہارا ہی تو قول ہے' فرینڈشپ میں پلیز' سوری' ایکسکیوزمی اور تھینک یو کو جگہ نہیں دینا چاہیے۔ ابھی تم نے میرے نازک ہاتھوں کو تکلیف دینے کی جو بات کی ہے وہ کیا فرینڈشپ کو زیب دیتی ہے۔ اس سے بیگانگی اور تکلف کا اظہار ہوتا ہے۔"

وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی تھی' میں نے معاملے کو سنبھالتے ہوئے کہا "میں نے تو وہ بات محض اس لیے کی تھی کہ تم خود بھی اپنے سر میں درد محسوس کر رہی ہو۔"

"تو کیا ہوا!" وہ کھلکھلا کر ہنس دی "جواب میں تم میرا سر دبا دینا۔ حساب برابر ہو جائے گا۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلائی۔ اس کی نقرئی ہنسی نے فلیٹ کے درودیوار میں تازگی بھر دی۔ کمرے کی فضا معطر ہو گئی۔ وہ بولی تو جیسے سریلی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"وجدان! تم بہت چالاک ہو!"

میں نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کیسے چالاک ہوں' صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا "تم سے زیادہ چالاک نہیں ہوں۔"

"تم جب کسی بحث مباحثے میں نہیں پڑنا چاہتے تو فوراً سامنے والے کی بات مان لیتے ہو۔" وہ لگاوٹ بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "چاہے بعد میں وہ کام کرو یا نہ کرو مگر وقتی طور پر بحث و تکرار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔"

"اس میں ایسی برائی کی کون سی بات ہے!" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

"گویا تم اپنے طریقۂ واردات کو تسلیم کر رہے ہو؟"

"حقیقت کو تسلیم کرنے میں حرج کیا ہے!"

"کوئی حرج نہیں۔" وہ موضوعِ گفتگو تبدیل کرتے ہوئے بولی "فوری حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سر میں درد ہو رہا

ہے۔ پہلے میں تمہارے سر کا درد دور کرتی ہوں پھر تم میرا سر دبا دینا۔"

ہم بیڈ پر آگئے۔ ساحل نے مجھے دراز ہونے کا مشورہ دیا' پھر میرا سر اپنی گود میں رکھ کر پیشانی کو ہلکے ہلکے دبانے لگی۔

میں نے کہا "اس سے تو اچھا ہے' تم مساج کر دو۔"

اگلے ہی لمحے اس کی مخروطی انگلیاں میرے بالوں میں سرسرانے لگیں۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ساحل کی شہد بلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! آج شام ہمیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی' کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"میری طبیعت کو کچھ نہیں ہوا۔" وہ بولی "میں تمہیں دکھانے جا رہی ہوں۔"

"مجھے؟" میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں "میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تمہاری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

"ساحل! تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو!"

"بابا! کیا اتنی جلدی بھول گئے۔" اس نے مجھے ننھے بچوں کی طرح پچکارا "میں نے کل تمہیں بتایا تو تھا' تمہارے زہریلے پن کے علاج کے لیے میں نے ایک لیڈی ڈاکٹر دریافت کر لی ہے۔"

"اوہ!" میرے سینے سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔

ساحل نے بتایا "وہ ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہے اور شام پانچ سے رات نو بجے تک بیٹھتی ہے۔"

"میں نے ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کے بارے میں سن رکھا ہے۔" میں نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں "لیکن آج تک اس سے واسطہ نہیں پڑا۔"

وہ اپنی انگلیوں کو میرے بالوں کے اندر مصروف رکھتے ہوئے بولی "آج واسطہ بھی پڑ جائے گا۔ روبی نے بتایا تھا کہ وہ ہومیوپیتھ ڈاکٹر صرف پیچیدہ امراض کا ہی علاج کرتی ہے۔"

"لیکن روبی تو پتا نہیں کب آئے۔"

"مجھے یقین ہے' وہ ڈاکٹر کے وقت میں آجائے گی۔" وہ پُروثوق لہجے میں بولی "بتا رہی تھی' آج دن میں وہ اس کا اپائنٹمنٹ لے لے گی۔"

ہمارے درمیان' میرے زہریلے پن اور ہومیوپیتھک طریقہ علاج کے بارے میں تھوڑی دیر تک بات چیت رہی۔ روبی نے اس سلسلے میں ساحل کو کافی مفید معلومات فراہم کر دی تھیں۔ وہ بالکل اس طرح بات کر رہی تھی جیسے خود ڈاکٹر ہو یا پھر طویل عرصے تک کسی ڈاکٹر سے علاج کراتی رہی ہو۔ وہ اتنی ہی ذہین تھی کہ بہت جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتی تھی۔

بولتے بولتے ساحل اچانک خاموش ہو گئی۔ میں نے پوچھا "کیا ہوا؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولی "وجدان! بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ میں ہم رہتے تھے وہاں سے تھوڑے فاصلے کی دوسری جانب واقع پہاڑوں میں ایک خطرناک دیو کا ٹھکانا ہے۔"

"پھر؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

"ایک روز میں اپنی ماں بھیرجانی کے ساتھ دریا پر گئی تو وہ دیو مجھ پر عاشق ہو گیا۔" ساحل نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اس کے بعد کیا ہوا۔" میں نے بے یقینی سے پوچھا "کیا وہ دیو تمہیں اٹھا کر پہاڑوں پر لے گیا تھا؟"

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "تھومبا نامی اس دیو نے مجھے ایک دھمکی دی تھی۔"

"مثلاً کیسی دھمکی؟" میں نے اب اس کی بات کو مذاق میں اڑا دیا۔

وہ بولی "تھومبا نے کہا تھا' اگر میں تنہائی میں کسی مرد کے پاس گئی تو وہ مجھے سخت سزا دے گا۔"

میں دل ہی دل میں اس سادہ سی لڑکی کی معصومیت اور پرکاری پر مسکرا اٹھا۔ میں نے بھی خود پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے ساحل سے پوچھا۔

"تو کیا اس دیو نے تمہیں سزا بھی دی۔ تم تو کئی مرتبہ میری تنہائی میں آچکی ہو؟"

"کل سے پہلے تو نہیں دی تھی۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔

"اس کا مطلب ہے' کل اس نے تمہیں سزا دی؟"

"ہاں دی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کل سے اب تک میں بہت بے چین ہوں۔ تھومبا دیو نے مجھے ایک بے نام سی بے کلی میں مبتلا کر دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا' کیا کروں!"

"میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ۔" اس نے میرے کان کے نزدیک

سرگوشی کی۔

میں نے بھی اس کی تفریح میں شریک ہوتے ہوئے پوچھا "ہاں' بولو!"

وہ کچھ نہیں بولی۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دو دہکتے ہوئے انگارے میرے ہونٹوں پر رکھ دیے ہوں۔

میں ایک مسرت آمیز جھرجھری لے کر رہ گیا۔

○✱○

"عنبر ہومیو کلینک" شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ اپنی باری پر ہم ڈاکٹر کے مخصوص چیمبر میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر عنبر کو خدا نے حسن اور شائستگی کی دولت سے نواز رکھا تھا۔ ملاقات پر معلوم ہوا کہ وہ خاصی ذہین اور معاملہ فہم بھی ہے۔ ساحل کی بات سننے کے بعد اس نے سوال کیا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔ روبی بھی ہمارے ساتھ تھی۔

"آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی کہ آپ زہریلے ہیں؟"

جواب میں' میں نے اسے دو خطرناک سانپوں کی ہلاکت کے واقعات سنا دیے۔ وہ گہری تشویش میں مبتلا ہو گئی پھر اس نے کہا "میں آپ کا علاج شروع کرنے سے قبل دو ٹیسٹ کروانا چاہتی ہوں۔"

"کس قسم کے ٹیسٹ؟" ساحل نے استفسار کیا۔

ڈاکٹر عنبر نے کہا "ایک بلڈ کا ٹیسٹ ہے اور دوسرا اسپوٹم کلچر ہے۔ آپ خون اور تھوک کے یہ دونوں ٹیسٹ اس لیبارٹری سے کروائیں گے۔ میں صرف اسی لیب کی رپورٹس پر فیتھ کرتی ہوں۔"

پھر اس نے اپنے لیٹر ہیڈ پر وہ دونوں ٹیسٹ لکھے اور مذکورہ پرائیویٹ لیبارٹری کا نام بھی بتا دیا۔ وہ خاصی مہنگی اور جدید لیبارٹری تھی۔

ٹیسٹ والا یہ پرچہ میری جانب بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا "ان ٹیسٹ کی رپورٹ کے بعد میں آپ کی ہسٹری لوں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی پائزن والا معاملہ ہوا تو اس کا شافی علاج ممکن ہے۔ ہومیوپیتھی بڑا حیرت انگیز طریقۂ علاج ہے۔ آپ اس کی اثر پذیری اور کاملیت کو مان جائیں گے۔"

ہم اٹھ کر آنے لگے تو ڈاکٹر نے کہا "لیبارٹری ٹیسٹ کے ساتھ ساتھ میں آپ کو بھی ایک کام کی ذمّے داری دوں گی۔ یہ بھی ایک طرح کا ٹیسٹ ہی ہوگا۔"

میں ہمہ تن گوش ہو کر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر عنبر کو تکنے لگا۔

وہ بولی "آپ اپنے منہ کا چبایا ہوا نوالہ کسی بلی یا کتے کے آگے ڈالیں۔ یہ تجربہ مرغی کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے لعاب دہن میں زہر کے اثرات موجود ہوئے تو آپ کا جھوٹا کھانے والا فوراً ہلاک ہو جائے گا۔"

ہم ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکل آئے۔ روبی نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "ابھی لیبارٹری کا وقت ختم نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے' یہ ٹیسٹ آج ہی کروا لیتے ہیں۔"

ہم دونوں نے اس کی بات سے اتفاق کیا پھر ہم باجماعت مذکورہ لیبارٹری کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب ہم واپس فلیٹ پر پہنچے تو امتیاز آچکا تھا۔ روبی شام سے کچھ پہلے اکیلی ہی پہنچی تھی۔ ساحل کا یقین سچا ثابت ہوا کہ روبی ہمارے ساتھ ڈاکٹر کے پاس ضرور جائے گی۔

میں نے امتیاز سے پوچھا "میر بخش کی کیا خیر خبر ہے یار۔ میں تو دن بھر تمہارے فون کا انتظار کرتا رہا۔"

"یہ دن بڑا مصروفیت میں گزرا ہے جگر!" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا "تمہارے لیے ایک بہت بڑی خبر لایا ہوں۔"

"پہلے تو مجھے میر بخش کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے کہا۔ "وہ بڑی خبر بعد میں سنا دینا۔"

روبی اور ساحل دوسرے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اس لیے ہم آزادانہ گفتگو کر سکتے تھے۔ امتیاز نے کہا "میر بخش کی حالت تسلی بخش ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ جاوید کے ذریعے اس کی خبر لی ہے۔ وہ ہوش میں آگیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز تندہی سے اس کا علاج کر رہا ہے۔ امید ہے تین چار روز میں میر بخش چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔"

"پولیس وغیرہ کا کوئی مسئلہ تو پیدا نہیں ہوا؟"

"نہیں جگر!" امتیاز نے نفی میں گردن ہلائی "ڈاکٹر فیروز' جاوید کا سچا دوست ثابت ہوا ہے۔ اس نے تمام معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ کوئی پریشانی یا دقت پیدا نہیں ہو سکی۔"

میں نے اضطراری انداز میں کہا "میں میر بخش سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں۔"

"ہم ڈنر کے بعد اس کی طرف جائیں گے۔" امتیاز نے بتایا "ویسے میں نے احتیاطاً جاوید کے ذریعے میر بخش کو یہ اطلاع پہنچا دی ہے کہ اس کے ساتھی ملاقات کے لیے رات میں آئیں گے۔"

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "یہ تم نے بہت اچھا کیا یار! اس سے میر بخش کی ڈھارس بندھے گی۔"

"اب اگر تمہاری اجازت ہو تو میں وہ خبر بھی سنا دوں۔" امتیاز نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں' ضرور سناؤ۔"

"کل تم باس سے ملنے جا رہے ہو۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ پُرجوش انداز میں بولا "میں نے تمہارے اور تمہارے کارناموں کے بارے میں تفصیلاً باس کو بتا دیا ہے۔ انہوں نے خود تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ جگر! تم بہت لکی ہو ورنہ باس آسانی سے کسی کو لفٹ نہیں کراتے۔ وہ پہلی فرصت میں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یار! ابھی تک تو میں تمہارے باس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوا' نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ اور تم نے ملاقات کا بندوبست بھی کر ڈالا!"

آخری جملہ میں نے دانستہ کہا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا' اس ملاقات میں امتیاز سے زیادہ اس کے باس کا ہاتھ ہو گا۔ ویسے میں نے کل ائرپورٹ پر امتیاز کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں اس کے باس سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب سے "سی ایف کے" کے اغراض و مقاصد کے بارے میں سنا تھا' اس تنظیم کے کرتا دھرتا اور روحِ رواں سے ملنے کا اشتیاق میرے دل میں پیدا ہو گیا تھا۔ "کرائم فری کراچی" نامی یہ تنظیم میرے مشن کے بہت قریب تھی۔

امتیاز میری بات کے جواب میں بولا "جگر! ہمارے باس کا نام شعیب غوری ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں بھی اس کی اصلی رہائش گاہ سے آگاہ نہیں۔ ویسے کراچی کے پانچوں اضلاع میں اس کے ٹھکانے ہیں۔ وہ انہی ٹھکانوں پر اپنے ملنے والوں سے ملاقات کرتا ہے اور وہ بھی نہایت احتیاط کے ساتھ۔ کوئی نہیں جانتا' وہ کس وقت کہاں ہو گا۔ اگر تنظیم کے افراد اس کی خبر رکھنے لگیں تو پھر وہ "باس" کس چیز کا ہوا۔ جگر! میں نے کہا تھا نا' میرا۔۔۔ باس بہت اونچی شے ہے۔"

"ہاں' مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے پھر پوچھا "کل تم مجھے اپنے باس سے ملوانے کس ٹھکانے پر لے کر جاؤ گے؟"

"باس نے ڈسٹرک ساؤتھ والے بنگلے پر بلایا ہے۔" امتیاز نے بتایا "تم نے وہ بنگلا کل دیکھا تھا۔"

"یعنی وہ بنگلا جہاں تمہارے باس کا انگریز دوست نیل آرمر اپنی طرح دار سیکریٹری شیبا کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہے۔"

میں نے چونک کر کہا "تم ڈیفنس سوسائٹی والے بنگلے کا ذکر کر رہے ہو نا؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "بالکل وہی بنگلا ہے۔ مسٹر نیل آرمر اور اس کی سیکریٹری آج سہ پہر یہاں سے روانہ ہو گئے ہیں۔"

"واپس انگلینڈ؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا "ہمیں کل صبح ٹھیک دس بجے ساؤتھ والے بنگلے پہنچنا ہے۔ ہم نے۔۔۔ یعنی باس نے کوڈ ورڈز میں ہر ٹھکانے کا ایک نام رکھ دیا ہے جو ڈسٹرکٹ سے منسوب ہے۔ یوں کہو کہ کل صبح ہم باس سے ملنے "ساؤتھ" جا رہے ہیں۔"

"اس وقت ہم کس ڈسٹرکٹ میں بیٹھے ہیں؟"

"یہ ڈسٹرکٹ ایسٹ ہے۔" امتیاز نے بتایا۔

میں نے پوچھا "باقی تین ڈسٹرکٹ کون کون سے ہیں؟"

وہ بولا "ڈسٹرکٹ ویسٹ' ڈسٹرکٹ سنٹرل اور ڈسٹرکٹ ملیر۔"

"اس کا مطلب ہے "سی ایف کے" کا نیٹ ورک پورے شہر میں پھیلا ہوا ہے!" میں نے پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جگر! اس شہر کو "کرائم فری کراچی" بنانے کے لیے فعال نیٹ ورکنگ تو اشد ضروری ہے۔"

ہم کچھ دیر تک "سی ایف کے" اور اس کے طریقۂ کار کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ میں کل اس تنظیم کے باس سے ملنے جا رہا تھا اس لیے بھی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا میرے لیے مفید تھا۔ امتیاز نے اس سلسلے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

اس رات ڈنر ہم نے گھر سے باہر کیا۔ نزدیک ہی ایک صاف ستھرا فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ تھا۔ امتیاز ہمیں وہاں لے گیا۔ آج فلیٹ آتے ہوئے وہ ایک پرانی سی مزدا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ براؤن کلر کی وہ مزدا کار اس کے استعمال میں رہتی ہے۔ پرانی نظر آنے والی وہ گاڑی نہایت ہی طاقت ور انجن کی حامل تھی۔ پچھلے دو دن سے وہ گاڑی مکینک کے پاس گئی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی امتیاز اور روبی کے نجی استعمال میں رہتی تھی۔ روبی بھی ڈرائیونگ کرتی تھی۔

کھانے کے بعد ہم نے بہادر آباد کا مشہور آئس کریم فالودہ کھایا پھر میر بخش سے ملنے گلشن اقبال کی جانب روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر فیروز کا وہ پرائیویٹ اسپتال گلشن کے بارونق علاقے میں تھا۔ اس دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر ڈاکٹر کی اپنی رہائش تھی۔ ڈاکٹر اس وقت اسپتال میں موجود نہیں تھا تاہم ہمیں مریض تک رسائی کے لیے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ امتیاز نے جو ریفرنس استعمال کیا تھا اس کے بعد ہمیں فوراً میر بخش کے پاس' اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر فیروز نے اپنے عملے کو ہماری بابت بتا رکھا تھا۔

وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور اس نے بے اختیار بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی۔

میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے اس کوشش سے روکتے ہوئے سنبھالا "نہیں میر بخش۔ ابھی تمہیں بہت زیادہ حرکت نہیں کرنا۔"

فرطِ جذبات سے اس کے آنسو نکل گئے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "سائیں! انہوں نے میرے ساتھ بہت۔۔۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے کندھا تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی "میر بخش! حوصلہ رکھو۔ ہم نے تمہارا بدلہ لے لیا ہے۔ میاں زاہد حسین اس وقت اپنے بال نوچ رہا ہو گا۔ تمہیں اغوا کرنے والے اور زدوکوب کرنے والے اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گئے ہیں۔"

اس کے جسم کے بیش تر حصوں پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ ایک بازو میں فریکچر بھی ہو گیا تھا۔ زیادہ تر چوٹیں اندرونی تھیں جو بیرونی چوٹوں سے کہیں زیادہ خطرناک تھیں تاہم یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اور فوراً ہی اسے ٹریٹ منٹ بھی دے دیا گیا ورنہ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میر بخش مجھے اور ساحل کو اپنے پاس دیکھ کر کھل اٹھا تھا۔ امتیاز کو بھی اس نے پہچان لیا تاہم روبی کی جانب وہ بار بار سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے اسے روبی کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔

ہم نے بہادر آباد سے میر بخش کے لیے تین چار تازہ موسمی پھل خرید لیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پھولوں کا گلدستہ بھی۔ یہ تمام چیزیں اس کے بیڈ کے نزدیک ایک چھوٹی سی میز پر رکھی تھیں۔ ہم میر بخش سے تسلی تشفی کی باتیں کر ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا' ڈاکٹر فیروز اسپتال میں آ چکا ہے۔ میں نے امتیاز سے کہا "میں ڈاکٹر فیروز سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں وجدان! ڈاکٹر سے ایک تفصیلی ملاقات بہت ضروری ہے۔" وہ بولا "ہم جاتے ہوئے اس کو چیک کر لیتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ہم میر بخش کے پاس سے اٹھنے لگے تو اسی وقت ڈاکٹر فیروز وہاں پہنچ گیا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ ہم مریض سے ملنے آئے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر وہ میر بخش کے چیک اپ میں مصروف ہو گیا۔

ڈاکٹر فیروز کی عمر لگ بھگ چالیس سال رہی ہو گی۔ وہ درمیانے قد کا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ چہرے پر نظر کا چشمہ اس کی شخصیت پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ وہ بہت تیز تیز بولتا تھا۔ اس کی باتیں سمجھنے کے لیے پوری طرح اٹینٹو رہنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر میر بخش کے معائنے سے فارغ ہوا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ ہماری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا "مریض کی حالت تسلی بخش ہے۔ ہم مزید دو دن اسے اسپتال میں رکھیں گے۔ تیسرے روز آپ اسے لے جا سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر!" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہاتھ کا فریکچر کس پوزیشن میں ہے؟"

"صاحب' فریکچر تو فریکچر ہوتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا "یہ دو چار دن میں ٹھیک ہونے والا معاملہ نہیں۔ میر بخش کا دایاں بازو کہنی کے نزدیک سے ٹوٹا ہے۔ اگرچہ یہ ٹوٹ پھوٹ بہت زیادہ خطرناک نہیں تاہم ایک آدھ مہینا تو یہ اس بازو سے کوئی کام نہیں کر سکے گا۔ میں نے بہت اطمینان بخش پلاسٹر چڑھا دیا ہے۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دو روز بعد آپ اسے گھر لے جائیں اور مکمل آرام کرائیں۔ ایک ہفتے بعد چیک اپ کے لیے دوبارہ اسپتال لانا ہو گا۔"

تھوڑی دیر بعد ہم چاروں میر بخش سے رخصت ہو کر اسپتال سے نکل آئے۔ آتے ہوئے میں نے میر بخش سے وعدہ کیا تھا کہ گاہے بہ گاہے میں اسے دیکھنے آتا رہوں گا۔

ہم واپس فلیٹ پہنچے تو رات کے کم و بیش بارہ بج رہے تھے۔ امتیاز نے یاددہانی کے طور پر مجھ سے کہا "وجدان' جلدی۔۔۔ سونے کی کوشش کرنا تاکہ صبح جلدی اٹھ سکو۔ کل ہمیں باس سے ملنے بھی جانا ہے۔"

"تم میرے اٹھنے اور سونے کی فکر نہ کرو۔" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا "میں علی الصباح بیدار ہو جاؤں گا۔ ویسے بھی کل سے مجھے باقاعدگی کے ساتھ ہل پارک جانا ہے۔ ساحل کی ٹریننگ شروع ہونے والی ہے۔"

"جگر' تم اس نیک کام میں روبی کو بھی شریک کر لو تو یہ بہت بڑا کام ہو گا۔" وہ قریب ہی کھڑی روبی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا "شاید یوگا کی مشقیں ہی اس کی قنوطیت کو

دور کر سکیں۔"

"قنوطیت!" میں نے حیرت سے خوش مزاج روبی کی طرف دیکھا "میں نے تو اسے قنوطیت میں نہیں دیکھا۔ کیا تم کوئی دلچسپ مذاق کر رہے ہو؟"

"جگر! یہ مذاق کا کون سا وقت ہے!" وہ دیوار گیر کلاک کی طرف نگاہ اٹھا کر بولا۔ "روبی کی قنوطیت بہت گہرائی میں چھپی ہوئی ہے' اوپر سے نظر نہیں آتی۔ ابھی تم نے اس کی کہانی سنی ہے اور نہ ہی کھل مل کر گفت و شنید کی ہے۔ آہستہ آہستہ تم پر اس کی نظر نہ آنے والی اداسی کا راز کھلے گا۔"

اس دوران میں روبی بالکل خاموش اور سنجیدہ کھڑی رہی۔ امتیاز کی بات پوری ہوئی تو اس نے مجھ سے کہا "وجدان بھائی! یہ سچ ہے کہ میں یوگا کی مشقیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ لوگ مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"تمہاری خوشی مجھے عزیز ہے روبی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگرچہ میں تم سے عمر میں پانچ چھ سال چھوٹا ہوں لیکن تمہارے منہ سے اپنے لیے "بھائی" کا لفظ بہت اچھا لگتا ہے.... شاید اس لیے بھی کہ میری اپنی کوئی بہن نہیں۔"

"بہن بھائی کے رشتے میں عمر کی کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا وجدان۔" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی "تمہیں بھائی کہتے ہوئے مجھے بھی ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوتا ہے اور میں بھی یہ ضرور کہوں گی کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا ابھی کوئی بھائی نہیں ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی تھی۔"

"اکلوتی تھی' کیا مطلب؟" ساحل نے چونک کر روبی کی طرف دیکھا۔

وہ ایک دم اداس ہو گئی "بتاؤں گی.... بتا دوں گی۔"

امتیاز نے مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا' اس وقت اس موضوع کو موقوف کر دیا جائے۔ میں نے ایک طویل مصنوعی جماہی لیتے ہوئے کہا۔

"بھئی' مجھے تو شدید نیند آ رہی ہے۔ باقی باتیں کل کریں گے۔"

ساحل میری بات کو فوراً سمجھ گئی۔ روبی سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا "ٹھیک ہے ڈیئر' ہم تمہارے اکلوتے پن پر بعد میں بات کریں گے' فی الحال تم آرام کرو اور ہم بھی۔"

پھر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

یہ سچ ہے کہ روبی کی زبان سے اپنے لیے "بھائی" سننا مجھے بڑا مسرور کن لگا تھا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے جب ہندوستان کے شمالی قصبے "رشی کیش" میں تھا تو سیتا نامی چودہ سالہ لڑکی نے مجھے "بھیا" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس کی شیرینی کو بھی میں آج تک نہیں بھول سکا تھا۔ بدرینا کی بیٹی سیتا کو میں نے وحشی پنڈتوں کی بربریت سے بچایا پتا نہیں' روبی مجھے بھائی بنا کر کون کون سے امتحانات ڈالنے والی تھی!

ہم کمرے میں آ کر سونے کے لیے لیٹنے لگے تو ساحل کہا "وجدان! تمہیں تو بیٹھے بٹھائے ایک بنی بنائی' پلی خوبصورت بہن بھی مل گئی۔"

میں نے اس کی بات کے آخری حصے پر توجہ دیتے ہو کہا "ہاں' تم ٹھیک کہتی ہو۔ روبی واقعی ایک خوبصورت ہے۔"

"بے چاری بڑی دکھی معلوم ہوتی ہے۔" وہ ہمدر سے بولی۔

میں نے کہا "تم سے وہ کافی کلوز ہو چکی ہے۔ اس کا کریدنے کی کوشش کرنا۔"

"ہاں' میں اس کا مسئلہ جاننے کی پوری کوشش کر گی۔" ساحل نے سنجیدگی سے کہا پھر مجھ سے پوچھا "پارک میں جانے کے لیے کتنے بجے نکلنا ہے؟"

"صبح صادق کا وقت ٹھیک رہے گا۔" میں نے کہا آج صبح ہل پارک جا چکی ہو۔ یہاں سے کتنے منٹ کی ہے؟"

"مشکل سے پندرہ منٹ۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے' پھر ہم پیدل ہی جائیں گے۔" میں "لیکن وقت کے بارے میں روبی کو بتانا ہو گا۔"

وہ بولی "میں ابھی بتا کر آ جاتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک تکیہ اٹھایا سونے کے لیے کمرے کے ایک کونے میں قالین پر لیٹ ساحل واپس آئی تو مجھ پر نگاہ پڑتے ہی مسکرا اٹھی۔ دروا کو اندر سے بند کرنے کے بعد اس نے شوخی سے کہا۔

"نیل گر' نیل گری سے اس قدر خوف زدہ ہے!"

"یہ نیل گر کیا ہوتا ہے؟" میں نے وہیں لیٹے پوچھا۔

اس نے بہ دستور شوخی سے بتایا "نیل گری کا ذکر"

"تم بعض اوقات اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتی ہو"

"صرف باتیں.... یا حرکتیں بھی؟"

میں اس وقت آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ساحل کی

مجھے اپنے قریب ہی محسوس ہوئی تو میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا "کیا مطلب؟"

وہ اس وقت مجھ سے صرف دو قدم کی دوری پر تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ میں بھی ایک تکیہ دبا ہوا دیکھا تو صورتِ حال میری سمجھ میں آگئی۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔

"میں بھی قالین پر ہی سوؤں گی۔"

"یہ کیا حماقت ہے ساحل؟"

"اگر قالین پر سو کر رات گزارنا حماقت ہے تو اس حماقت کا آغاز تمہاری طرف سے ہوا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "میں تو تمہاری پیروی کر رہی ہوں' یہ سوچتے ہوئے کہ جو کام تم کر رہے ہو اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔ یعنی وہ کام اگر تمہارے لیے مفید ہے تو میرے لیے بھی سودمند ہوگا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سمجھانے والے انداز میں کہا "ساحل! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ نیچے سونے میں کون سی مصلحت یا مجبوری پوشیدہ ہے۔ تم جا کر وہاں بیڈ پر لیٹو۔ آرام دہ بستر چھوڑ کر یہاں کیوں بے آرام ہونا چاہتی ہو؟"

"مجھے تمہارے قرب میں آرام ملتا ہے۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی "یا تو تم بھی بستر پر لیٹو گے یا پھر میں تمہارے نزدیک قالین پر رات بسر کروں گی۔"

میں نے کہا "تم خواہ مخواہ کی ضد کر رہی ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔۔۔"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولی "وجدان! نیلگری کا دعویٰ غلط ثابت ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود بھی تم بہت محتاط ہو' کیوں؟"

"میری یہ احتیاط نیلگری کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ کی بنا پر ہے۔" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ بھلا کہاں جان چھوڑنے والی تھی' شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی "تم نیلگری کی پروا نہ کرو۔ اگر اس نے ہماری خلوت میں داخل ہونے کی کوشش کی تو بری طرح پچھتائے گی۔ اس کی اس حرکت کے ساتھ ہی "تھومبا" دیو بھی یہاں پہنچ جائے گا کیوں کہ تھومبا نے بھی نیلگری سے ملتے جلتے دعوے کر رکھے ہیں۔ تھومبا کی موجودگی میں نیلگری کی دال نہیں گلے گی اور اسے مجبوراً یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔"

میں ساحل کی چالاکی کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ مگر ... قدرے سخت لہجے میں کہا "میں اس وقت نہایت ہی ... ہوں ساحل! نیلگری ایک حقیقت ہے' تم بھی اس کے ... دیکھ چکی ہو۔ تھومبا جیسا بچکانا کردار متعارف کروا کر تم ... ساکھیل کھیلنا چاہتی ہو؟"

وہ ایک لمحہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتی رہی پھر ... ہی شریر مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے ... "وجدان! تم مانو یا نہ مانو' نیلگری کی طرح تھومبا بھی ایک حقیقت ہے۔"

میں بے بسی سے نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی پھر بوجھل آواز میں ... "وجدان! پتا نہیں کیوں' مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ... رات ہماری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئے گی۔"

میں نے اچنبھک نظر سے اسے دیکھا۔ وہ اس ... خاصی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سرسری ... لہجے میں کہا "تمہیں اگر ایسا محسوس ہو رہا ہے تو اس ... پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے ... انسان کی زندگی میں جو دن اور جو رات گزر جاتے ہیں ... پلٹ کر واپس نہیں آتے۔ ظاہر ہے' یہ رات بھی کبھی لوٹ کر ... واپس نہیں آئے گی۔"

"تم شاید میرے محسوسات کو سمجھ نہیں سکے۔" ... الجھن زدہ انداز میں بولی۔

اس کی الجھن سے میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ میں ... "تم کھل کر کہو' کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ چند لمحے متذبذب رہنے کے بعد تامل کرتے ... بولی "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے' جیسے۔۔۔ جیسے آج رات ... بعد بہت کچھ بدل جائے گا۔"

اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ... تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ذہنی دباؤ نے اسے اپنی گرفت میں ... رکھا ہو۔ میں نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کو... کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ہوگا ساحل' کچھ بھی نہیں بدلے گا ... ڈیپریس دکھائی دے رہی ہو۔ جا کر آرام سے سو جاؤ۔ نیند ... کے بعد تم بالکل ہلکی پھلکی ہو جاؤ گی۔"

"ہلکی پھلکی!" وہ گمبھیر آواز میں بولی "جب بہت ... جاتا ہے تو انسان خود بہ خود ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔"

اب میں ساحل کے بارے میں تشویش میں مبتلا ... اس کا رویہ اس کے عمومی مزاج سے لگا نہیں کھا رہا ... اور اُداسی سے بھاگنے والی لڑکی تھی مگر اس وقت مایوسی ... اس کی ساری شوخی اور چنچلتا غائب ہو چکی تھی۔

اچانک میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بستر کی جانب لاتے ہوئے کہا "چلو' میں تمہیں سلا دیتا ہوں۔ تم اس وقت ایک غمگین کیفیت سے گزر رہی ہو۔"

وہ ایک ٹرانس کی سی حالت میں بستر تک پہنچی پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی "تم مجھے سلانے کے بعد دور تو نہیں چلے جاؤ گے نا!"

"میں کہاں جا سکتا ہوں؟ زیادہ سے زیادہ وہاں نیچے قالین پر۔ بس۔"

"نہیں!" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور قطعیت سے بولی "تم بھی ادھر بستر پر ہی سو جاؤ نا۔"

"اچھا بابا' تم سونے کی کوشش تو کرو۔" میں نے اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا۔ اس وعدے کے بغیر وہ سونے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

وہ میری یقین دہانی سے قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے سوچا' جب وہ گہری نیند میں پہنچ جائے گی تو میں اٹھ کر نیچے قالین پر چلا جاؤں گا۔

میں اس کے نزدیک ہی بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا اور اس کی گھنیری زلفوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"وجدان! کیا تم مجھے وہ نیند بھی سلا سکتے ہو؟"

"وہ کون سی؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

اس نے سادگی سے کہا "ابدی نیند!"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ساحل۔" میں نے ہلکے سے اسے جھنجوڑ ڈالا "اتنی مایوسی کی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے اس کی کھلی ہوئی غزالی آنکھوں میں کرب کے سائے لہراتے دیکھے۔ وہ مجروح آواز میں بولی "وجدان! تمہاری قسم' میرے پہلو میں بہت شور ہے۔ لو' تم بھی محسوس کر کے دیکھو۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اپنے دل کے مقام پر رکھ دیا۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اس کمبخت نے میرا جینا محال کر رکھا ہے۔ تم اس کی دھڑکن روک کر مجھے اس تکلیف سے نجات دلا دو۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "یا پھر اس درد کو کشید کر کے اپنے پہلو میں بسا لو۔ مجھے اس دردناک زندگی کی ضرورت نہیں۔"

"تم اس وقت ذہنی دباؤ اور خیالی انتشار کا شکار ہو۔" میں نے دوبارہ اس کے بالوں میں مساج کرتے ہوئے کہا "ایک بھرپور اور پُرسکون نیند تمہیں شانت کر دے گی۔ پلیز' سونے کی کوشش کرو۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو۔" وہ خواب ناک لہجے میں بولی۔ "واقعی مجھے سو جانا چاہیے کیوں کہ یہ رات میری زندگی میں دوبارہ پھر کبھی نہیں آئے گی۔۔۔ اور تم نے بھی تو اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ یہ رات کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔"

پھر اس نے زیرِ لب دعائیہ انداز میں کہا "لارڈ بدھا تمہیں بھی اس درد سے آشنا کر دے۔" اور وہ ایک گہری سانس لینے کے بعد خاموش ہو گئی۔

پتا نہیں کیوں' اس وقت آپوں آپ میرا دھیان نیلگری کے ایک ادھورے جملے کی طرف چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی میں پورے وجود سے کانپ کر رہ گیا۔

نیلگری نے نبی سر میں' قاضی سلطان کی رہائش گاہ پر ایک پُراسرار ملاقات کے دوران میں ساحل کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "اس مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساگر اور ساحل کا جنم جنم کا ساتھ ہے لیکن۔۔۔!"

"لیکن" کے بعد نیلگری کی پُراسرار خاموشی کا ایک ہی مطلب تھا کہ میرا اور ساحل کا ساتھ پائیدار نہیں اور عنقریب ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے اور اب ساحل کی باتیں مایوسی کی جس انتہا کو چھو رہی تھیں' نیلگری کے ادھورے جملے کی روشنی میں وہ کچھ اور بھی زیادہ سنگین اور خطرناک محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اچانک لاتعداد اندیشوں میں گھر گیا۔ غیر ارادی طور پر میرے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا۔

"کیا ساحل مجھ سے بچھڑنے والی ہے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا!" بے اختیار میرے دل سے نکلا۔

میں نے اضطراری نگاہ سے معصوم صورت ساحل کو دیکھا۔ وہ بڑے اطمینان سے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کی سانسوں سے اندازہ ہوتا تھا' وہ ہر قسم کے ذہنی انتشار سے نجات حاصل کر چکی تھی۔

میں کافی دیر تک بغیر سوچے اور محسوس کیے اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ ان لمحات میں میری سوچ اور محسوسات جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید میں محویت کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ میں ساحل کے مشاہدے میں غرق ہو گیا تھا۔

جب میں کمرے کے ماحول میں واپس آیا اور میں نے بیڈ سے نیچے اترنے کی کوشش کی تو پتا چلا' میری شرٹ کا

ایک کونا ساحل کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنی شرٹ آزاد کروانا چاہی تو پتا چلا' یہ اتنا آسان نہیں۔۔۔ اور میں نے اگر زبردستی سے کام لیا تو وہ جاگ جائے گی۔ اس کی گرفت بڑی مضبوط اور بے یقینی کی عکاس تھی۔

جیسے اگر کسی معصوم بچے کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کی ماں کہیں جانے والی ہے تو وہ بڑی مضبوطی سے اس کا دامن اپنے ننھے ہاتھ کی گرفت میں جکڑ لیتا ہے۔ ماں لاکھ سمجھانے کی کوشش کرے کہ وہ کہیں نہیں جا رہی مگر بچے کی بے یقینی' اسے بہلنے نہیں دیتی اور وہ ماں کے دامن پر اپنی گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیتا۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور وہیں اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ یہ وہ پہلو تھا جس میں بہت شور سنائی دیتا تھا' ایک درد لادوا نے اس مقام کو اپنا آشیانہ بنا لیا تھا۔ ساحل نے مجھ سے التجا کی تھی کہ اس کسک کو کشید کر کے میں اپنے یہاں پناہ دے دوں۔ وہ لارڈ بدھا سے دعاگو تھی کہ وہ مجھے بھی اس درد سے آشنا کر دے۔

کچھ ہونے والا تھا مگر یہ معلوم نہیں تھا' کیا ہونے والا ہے۔ جب یہ اندازہ نہ ہو' کیا ہو جائے گا تو پھر انسان الجھ کر رہ جاتا ہے۔ میرے خیالات میں پراگندگی اتر آئی۔ میں نے دزدیدہ نگاہ سے ساحل کی جانب دیکھا۔ وہ آسودگی کی نیند سو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا' وہ اپنا سارا انتشار مجھ میں منتقل کر کے بری الذمہ ہو گئی ہو!

وہ میری زندگی کی پہلی بے کل رات تھی۔ میں نے وہ رات سونے کی کوشش میں جاگتے ہوئے گزار دی۔

❂✲❂

میں اس وقت ہل پارک کے سب سے اونچے مقام پر کھڑا تھا۔ یہاں ایک اچھا خاصا گول چبوترہ بنا تھا جس کے اردگرد مضبوط پائپ کی ریلنگ لگائی گئی تھی تاکہ کسی قسم کے حادثے میں جانی نقصان کا سامنا نہ ہو۔ اس چبوترے سے واقعی پورا کراچی شہر دکھائی دیتا تھا۔ فضا شاندار اور منظر جاندار تھا۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ ہم جب فلیٹ سے روانہ ہوئے تو ہلکا ہلکا اندھیرا موجود تھا۔ خوش گلو پرندوں کے چہچہانے کی آوازوں نے معطر فضا میں نغمگی سی گھول دی تھی۔

صبح خیزی کے شوقین مرد، زن کثیر تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ میں نے گھوم پھر کر اس بلند ترین چبوترے کو منتخب کیا تھا مگر اس میں ایک خرابی بہرحال موجود تھی کہ وہاں "چی" کے لیے مخصوص مشق نہیں کی جا سکتی تھی۔ چبوترے کا فرش [illegible] تھا جب کہ مذکورہ مشق کے لیے فرش کا آرام دہ اور [illegible] پاک ہونا ضروری تھا۔

میں نے "چی" کی مشق کے لیے نزدیک ہی واقع [illegible] کے ایک تختے کو منتخب کر لیا۔ اس طرف مختلف [illegible] ورزشیں کرنے کے لیے آہنی پائپ کے جھولے بھی [illegible] ہوئے تھے۔ روبی خاصی پُرجوش دکھائی دیتی تھی جب کہ [illegible] نے ساحل کو انتہائی سنجیدہ پایا۔

میں نے ساحل سے کہا "پہلے تم صرف پانچ منٹ [illegible] "چی" کی ورزش کرو گی۔ اس کے بعد مارشل آرٹس [illegible] ٹریننگ کا آغاز ہو گا۔"

اس کے بعد میں روبی کی جانب متوجہ ہو گیا "ساحل [illegible] مصروف کرنے کے بعد میں تمہیں یوگا کی مشق کے بارے [illegible] بتاؤں گا۔"

روبی تھوڑے فاصلے پر ایک جانب خاموش کھڑی ہو گئی۔ ساحل نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا [illegible] ایک دم سنجیدہ دکھائی دیتی تھی۔

"تم نے ہارس پوزیشن میں کھڑے ہونے کی اچھی خاصی پریکٹس کر لی تھی۔" میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] "اب تم شمال کی سمت رخ کر کے سیدھی کھڑی ہو جاؤ [illegible] آنکھیں بند کر کے آٹھ دس گہری گہری اور ہموار سانس لو۔"

اس نے میری ہدایات پر عمل کیا۔ میں نے کہا "اب [illegible] مشق کے لیے بالکل تیار ہو چکی ہو۔ ہارس پوزیشن میں کھڑی ہو کر تم اپنی آنکھیں بند کر لو گی۔ زبان کو تالو کے ساتھ لگانا ہے' میرا مطلب ہے' زبان کی نوک (ٹپ) کو۔ اپنی پوری [illegible] اور دھیان ناف کے مقام پر مرکوز کرنا ہے۔ اس کے بعد [illegible] کے راستے ایک جھٹکے سے سانس کو اندر کھینچنا ہے اور [illegible] فوراً ہی منہ کے راستے جھٹکے سے سانس کو خارج کرنا [illegible] واضح رہے کہ اس عمل کے دوران میں زبان کی ٹپ [illegible] مستقل تالو سے چپکی رہے گی اور ہونٹ نیم وا رہیں۔ سانس کی آمد و شد کے دوران میں پیٹ پھولتا پچکتا رہے [illegible] یعنی سانس اندر کھینچنے پر پیٹ پھولے گا اور خارج کرنے [illegible] پچک جائے گا۔ اس عمل میں ذہن صرف ایک کام کرے [illegible] اور وہ یہ کہ تمہاری توجہ مستقل مقام ناف پر جمی رہے [illegible] الحال اتنا ہی کافی ہے۔" ایک لمحے کا توقف دے کر [illegible] استفسار کیا "اگر کوئی اسٹیپ تمہاری سمجھ میں نہ [illegible] پوچھ سکتی ہو؟"

"میں ہر بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔" وہ پُراعتماد لہجے [illegible] بولی۔

"ویری گڈ!" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا "آر یو ریڈی؟"

"یس۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اسے مشق کرنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی وہ ہارس پوزیشن میں کھڑی ہوئی اور اس نے آنکھیں بند کیں' میں بے قدموں اس کے سامنے ایک فٹ کے فاصلے پر' زمین پر بیٹھ گیا۔ اس مشق کے دوران میں بعض اوقات مبتدی منہ کے بل زمین پر آن گرتا ہے۔ "سانس" اور "توجہ" کے درمیان جب تک ایک ردھم یا ربط نہیں بن جاتا' دماغ بغاوت پر کمربستہ رہتا ہے جس کے نتیجے میں ایک چکر سا آتا ہے اور مبتدی دھڑام سے منہ کے بل گرتا ہے۔ میں ساحل کو سنبھالا دینے کے لیے اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ وہ وہاں میری موجودگی سے واقف نہیں تھی۔

پورے پانچ منٹ تک ساحل نے بڑے سکون اور اطمینان سے مشق کی اور اسے ایک مرتبہ بھی چکر نہیں آیا۔ یہ اس کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے اس کی مشق ختم کروا کر اسے آرام کرنے کو کہا۔

وہ آنکھیں بند کر کے ایک جانب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

میں روبی کی جانب متوجہ ہو گیا "ایک بات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذہن نشین کر لو روبی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے بولنا شروع کیا "یوگا میں توجہ' لگن اور انوالومنٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ان چیزوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ بنیادی طور پر یوگا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ "ہتھ یوگ" میں کی جانے والی مشقوں کا تعلق انسان کے جسم سے ہوتا ہے۔ اسے باڈی یوگا (BODY YOGA) یا فزیکل یوگا بھی کہتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر "راج یوگ" آتا ہے جس میں ذہنی اور دماغی مشقیں کی جاتی ہیں۔ اسے (BRAIN YOGA) کہا جاتا ہے۔ تیسرے اور آخری نمبر پر "منتر یوگ" ہے۔ یہ خالصتاً روحانی مشقوں اور مختلف جاپ پر مشتمل ہے اور (SPIRITUAL YOGA) کہلاتا ہے۔"

"میں فی الحال جسمانی مشقیں کرنا چاہتی ہوں۔" روبی نے میری بات ختم ہوتے ہی کہا "جیسا کہ ٹی وی وغیرہ پر دکھایا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں ابتدا میں یہی کرنا بھی چاہیے۔ "ہتھ یوگ" کی مشقوں کے اثرات سب سے زیادہ جسم پر ہوتے ہیں اور یہ دوسرے "یوگ" سے نسبتاً آسان بھی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا' یوگا میں سانس کا ایک الگ اور اہم سسٹم ہے۔ اس کے بارے میں تمہیں میں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو کہ "یوگ" چاہے کوئی بھی ہو' اس کی مشق سانس کے ساتھ بھی کی جا سکتی ہے اور بغیر سانس کے بھی۔ سانس کے ساتھ مشق خاصی لطیف اور فرحت بخش ہو جاتی ہے' ظاہر ہے' اس عمل میں اس کی افادیت بھی بڑھ جاتی ہے۔"

وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے اسے یوگا کی ابتدائی معلومات سے روشناس کرواتے ہوئے مزید بتایا "ضروری نہیں ہے کہ دنیا کے تمام یوگا ایکسپرٹ مجھ سے متفق ہوں لیکن اب میں تمہیں جو نکتہ بتانے جا رہا ہوں وہ میرے تجربے کا نچوڑ ہے اور میرے اساتذہ کی تعلیم بھی۔ شاؤلن ٹیمپل میں آں جہانی ماسٹر ہنگ پائی اور بنکاک میں آں جہانی ماسٹر دانگ ونگ پائے نے مجھے یہ گر سکھایا تھا۔ یہ نکتہ تم بھی ذہن نشین کر لو۔ یوگا میں چاہے کوئی بھی مشق کی جائے' یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ جب جسم کا کوئی حصہ زمین کی مخالف سمت میں حرکت کرے گا تو سانس کو اندر کھینچنا یعنی (INHALE) کرنا ہے۔ جب جسم کا کوئی حصہ زمین کی جانب حرکت کرے گا تو سانس کو باہر خارج کرنا یعنی (EXHALE) کرنا ہے۔ اس کے علاوہ یوگا میں آسن یعنی پوسچر کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ آسن یا پوسچر جسمانی نشست کو کہتے ہیں۔"

ایک لمحے کو رک کر میں نے ساحل کی طرف اشارہ کیا اور روبی کو بتایا "ساحل کے بیٹھنے کا جو انداز ہے' اسے "پدم آسن" یا کنول آسن یعنی (LOTUS POSTURE) کہا جاتا ہے۔ عام زبان میں اسے "آلتی پالتی مارنا" بھی کہتے ہیں۔"

پھر میں نے روبی کو یوگا کی ایک آسان سی ابتدائی مشق کرنے کا طریقہ بتایا۔ یہ مشق بالکل سیدھے کھڑے ہو کر بہ آسانی کی جا سکتی تھی اور خاصی مفید بھی تھی۔

اس کے بعد میں ساحل کو مارشل آرٹس کی تربیت کے لیے ابتدائی ایکسرسائز سے متعلق بتانے لگا۔ یہ ہلکی پھلکی جسمانی ورزشیں جسم کو گرم کر کے اس میں لچک پیدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بازوؤں اور ٹانگوں کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دینا آسان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم واپس فلیٹ پر آ گئے۔ اس دوران میں امتیاز بیدار ہو چکا تھا۔

ناشتے کے دوران میں بھی میں نے ساحل کو گم صم پایا۔

وہ بات تو نارمل انداز میں کر رہی تھی مگر کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آتی تھی۔ روبی اور امتیاز نے تو اس کی اس کیفیت کو پتا نہیں‘ محسوس کیا تھا یا نہیں‘ البتہ مجھے یہ تبدیلی بہت محسوس ہو رہی تھی۔

ناشتے کے بعد ہم نہا دھو کر تیار ہو گئے۔ آج مجھے امتیاز کے ساتھ اس کے باس شعیب غوری سے ملنے جانا تھا۔ یہ ملاقات ڈیفنس سوسائٹی والے بنگلے یعنی ساؤتھ میں ہو رہی تھی۔ ہمیں ہر صورت دس بجے وہاں پہنچنا تھا۔

میں نے ساحل سے پوچھا ”چل رہی ہو؟“

”کہاں؟“ الٹا اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”ڈیفنس سوسائٹی!“ میں نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”وہاں کیا ہے؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

ساحل کے بات کرنے کا انداز نارمل تھا تاہم اس کے لہجے میں اس کی مخصوص شوخی مفقود تھی۔ امتیاز کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے وہ بہ خوبی آگاہ تھی لیکن اس وقت وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ کہاں جانا ہے۔ اس بات نے مجھے اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے کہا ”یوگا اور مارشل آرٹس کی مشقیں تو انسانی قوت اور صلاحیت کو بڑھانے کا کام کرتی ہیں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ آج کی محنت کا تم پر الٹا اثر ہوا ہے۔“

اب اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا ”مجھ پر ایسا کیا الٹا اثر ہو گیا۔ وجدان!“

میں نے کہا ”میں محسوس کر رہا ہوں‘ تمہاری یادداشت خاصی متاثر ہوئی ہے۔“

”میری یادداشت تو بالکل ٹھیک ہے“ وہ سادگی سے بولی۔

میں نے کہا ”ساحل! تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو‘ آج میں امتیاز کے باس اور ”سی ایف کے“ کے کرتا دھرتا شعیب غوری سے ملنے جا رہا ہوں اور تم پوچھ رہی ہو‘ جانا کہاں ہے۔“

”اوہ!“ اس نے اپنے چہرے کے عضلات کو اس طرح حرکت دی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر بولی ”سوری وجدان! میں واقعی بھول گئی تھی۔“

”یہ سوری کیا ہوتا ہے؟“ میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

”سو...“ وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔

میں سمجھ گیا‘ وہ ”سوری“ کے استعمال پر سوری کہنے جا رہی تھی۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ سوری‘ تھینک [illegible] پلیز اور ایکسکیوزمی‘ جیسے الفاظ سے حتی الامکان اجتناب برتیں گے۔ اس وقت ہم دونوں اپنے کمرے میں تھے [illegible] خواہ مخواہ اسے الجھن ہوتی۔

میں نے کہا ”ساحل! میں تمہاری ان حرکتوں سے [illegible] تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ تم مجھے کچھ بدلی بدلی سی [illegible] دے رہی ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں وجدان!“ وہ جلدی سے [illegible] ”واقعی میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔“

میں نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا ”[illegible] کیا ارادہ ہے؟“

”تم چلے جاؤ وجدان‘ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”ویسے بھی یہ تمہاری اور شعیب غوری کی ملاقات ہے۔ میرا وہاں کیا کام؟“

میں نے اس کے بعد ساحل پر زیادہ زور نہیں دیا۔ [illegible] سمجھ گیا‘ وہ اس وقت میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی۔ اس [illegible] رویہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا تاہم میں نے [illegible] فی الوقت چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس ٹاپک کو آئندہ [illegible] لیے چھوڑ کر صرف اتنا کہا۔

”ساحل! تم نے آرام کرنے کا فیصلہ بالکل درست [illegible] ہے۔ ”چی“ کی بیداری کے سلسلے میں تم نے سانس کی جو [illegible] کی ہے وہ ذہن و جسم کو تھکا دینے کے لیے کافی ہے۔ ابتدا [illegible] میں اتنی کامیابی ظاہر کر رہی ہے کہ تم بہت جلد اپنی [illegible] قوت کو بیدار کر لو گی ورنہ مخصوص انداز میں وہ سانس کی [illegible] نئے افراد ایک آدھ منٹ سے زیادہ نہیں کر پاتے۔ تم [illegible] واقعی کمال کر دیا ساحل!“

میری اس تعریف سے وہ خوش تو ہوئی تاہم اس [illegible] میں وہ شوخی اور جوش شامل نہیں تھا جو اس کی فطرت کا [illegible] تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہارس پوزیشن میں کھڑے [illegible] سانس کی وہ مشق لگاتار پانچ منٹ تک کرنا خاصا مشکل [illegible] ہے۔ اس مشق کے بعد ذہن کا تھک جانا ایک لازمی [illegible] ہے۔ میں نے سوچا‘ ساحل نے شوق میں ہمت کر کے [illegible] تو ٹھیک ٹھاک کر لی۔ اب واقعی اسے تھکن کا احساس [illegible] ہو گا۔ کچھ دیر آرام کر لے گی تو اس کی ساری تکان [illegible] ہو جائے گی۔ میں اسے فلیٹ پر روبی کے پاس چھوڑ کر [illegible] کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

میری اس سوچ کو دل نے قبول نہیں کیا۔ [illegible] رہے سر اٹھا رہے تھے۔ گزشتہ رات ساحل نے بڑی الجھی ہوئی اور خلاف معمول باتیں کی تھیں۔ اس مبہم اور خطرناک گفتگو کی روشنی میں ساحل کا موجودہ رویہ بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ کیا ساحل نے جو کچھ کہا تھا‘ وہ سچ ثابت ہونے والا تھا؟ کیا واقعی بہت کچھ تبدیل ہونے والا تھا یا تبدیل ہو چکا تھا؟ اگر ان سوالات کے جوابات ”ہاں“ میں فرض کر لیے جاتے تو پھر نیلگری کا وہ ادھورا جملہ اپنی تمام زہرناکی کے ساتھ نگاہ کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔

اچانک مجھے اپنے سینے میں چھناکے کی ایک مدھر آواز سنائی دی۔ مجھے محسوس ہوا‘ دل میں کیف آور درد کی جیسے ایک لہر سی اٹھی ہو اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ میں نے خود کو ایک نادیدہ حصار میں بند پایا۔ اس وقت میری شدید خواہش تھی کہ نیلگری کا کہا ہوا غلط ثابت ہو جائے۔ میں کسی بھی قیمت پر ساحل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

انسان صرف اسی چیز کو کھونا نہیں چاہتا جسے وہ پانا چاہتا ہو۔ شاید لارڈ بدھا نے ساحل کی سن لی تھی۔ اس نے میری تمناؤں دھڑکنوں کے جو ہار بُنے تھے ان کے مہکنے کا وقت آ گیا تھا!

○✲○

”ساؤتھ“ میں پہلے بھی آ چکا تھا لیکن اس وقت وہ میرے لیے ڈیفنس سوسائٹی کا ایک بنگلا تھا جہاں ”سی ایف کے“ کے باس کا انگریز دوست نیل آرمر کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ آج میں باس شعیب غوری سے ملاقات کے لیے وہاں آیا تھا۔

ٹھیک دس بجے مجھے اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں ”سی ایف کے“ کا چیف پہلے سے موجود تھا۔ پتا نہیں‘ اس کا نام شعیب غوری تھا بھی یا نہیں‘ مجھے امتیاز نے یہی نام بتایا تھا اور مجھے امتیاز پر پورا بھروسا تھا۔ اگر وہ شعیب غوری نہیں تھا تو پھر یقیناً امتیاز بھی اس کے اصلی نام سے بے خبر ہو گا۔

شعیب غوری کی عمر پچپن چھپن کے قریب تھی۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا‘ جسم انتہائی متناسب اور سرخ و سفید رنگت۔ وہ سر سے تقریباً گنجا ہی تھا۔ بالوں کی ایک جھالر سی کھوپڑی پر موجود تھی۔ اس نے نفیس اور قیمتی فریم والا نظر کا چشمہ لگا رکھا تھا۔ جسم پر انتہائی عمدہ تراش کا ایک بیش قیمت سوٹ تھا۔ غوری کے بائیں گال پر بھورے رنگ کا ایک مسا موجود تھا جس کا سائز دو کیرٹ کے کسی نگینے کے برابر تھا۔ وہ بھاری اور گونج دار آواز میں بڑی روانی اور فراوانی سے انگلش بولتا تھا۔ اس کے اردو میں بولے جانے والے جملوں میں بھی انگریزی الفاظ کی بھرمار تھی۔ وہ ایک انتہائی پڑھا لکھا اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس کے چہرے سے بردباری اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ کسی بھی تنظیم کے لیے ایک آئیڈیل باس تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد ہمارے درمیان آدھے گھنٹے تک جو گفتگو ہوتی رہی‘ اس کا تعلق نہ تو میری ذات سے تھا اور نہ ہی میرے موجودہ حالات سے۔ غوری نے اپنے اور اپنی تنظیم ”سی ایف کے“ کے بارے میں بھی بات نہیں کی۔ وہ عجیب آدمی تھا‘ صرف اور صرف سیکس کا موضوع لے کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہ بنکاک کی ”پیٹ پونگ اسٹریٹس“ منیلا کی ”مابینی اسٹریٹ“ اور دنیا کے دیگر ”ریڈ لائٹ ایریاز“ کے قصے سنانے لگا۔ حسین ساحلوں پر‘ اپنے ساتھ پیش آنے والے رنگین واقعات کی سنگین تفصیل وہ بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے میرے بارے میں ایک بھی چبھتا ہوا سوال نہیں کیا اور ہماری یہ پہلی ملاقات ختم ہو گئی۔

میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو اس نے ایک فوٹوگراف میری جانب بڑھاتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا ”مسٹر وجدان! یہ اپنے پاس رکھ لو۔ انسان کو اپنے دشمنوں کا چہرہ شناس ہونا چاہیے۔“

غوری کی یہ آخری بات بڑی قابلِ غور تھی اور گزشتہ تیس منٹ تک ہونے والی گفتگو سے انتہائی مختلف بھی۔ میں نے بہ غور اس فوٹوگراف کو دیکھا۔ وہ ایک گروپ فوٹو تھا جس میں ایک پستہ قامت سیاہ رو شخص کسی عورت کو سلائی مشین کا تحفہ یا عطیہ دے رہا تھا۔ اس شخص کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی اور مکاری سے بھرپور تھیں۔ اس کے قریب ہی دو باوردی پولیس والے بھی کھڑے تھے جن میں ایک آفیسر رینک کا تھا۔

میں نے فوٹوگراف سے نگاہ اٹھا کر شعیب غوری کو سوالیہ نظر سے دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں بولا ”مسٹر وجدان! گہرے سانولے رنگ کا یہ شخص میاں زاہد حسین ہے‘ جسے عام طور پر ”میاں جی“ کہا جاتا ہے۔ اس تقریب میں وہ بے کس اور نادار بیوہ عورتوں کو سلائی مشینیں تقسیم کر رہا ہے۔ اس قسم کے سوشل ڈرامے وہ اکثر کرتا رہتا ہے اور...“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”وہ جو تصویر میں پولیس افسر نظر آ رہا ہے نا‘ یہ میاں کا ایک دوست ایس پی ہے جو اکثر تقریبات میں

باوردی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ میاں زاہد کو تصویریں کھنچوانے اور عوام میں مقبول ہونے کا بہت شوق ہے۔ شاید مستقبل بعید میں وہ خود کو چیف منسٹر یا گورنر کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے وہ سیاست میں بھی بڑی سرگرمی دکھا رہا ہے۔"

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور وہ فوٹوگراف شعیب غوری کی جانب بڑھا دیا۔

"اپنے پاس رکھ لو" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "میں نے میاں جی کو اپنے ذہن میں رکھ لیا ہے۔"

"گڈ... ویری گڈ۔ تم میرے اندازے کی تصدیق کررہے ہو مسٹر وجدان!"

"تمہارا یہ اندازہ میرے بارے میں ہے یا میاں زاہد حسین کے بارے میں؟"

وہ بولا "تمہارے بارے میں مسٹر وجدان علی!"

"لیکن تم نے تو میرے بارے میں ایک بات نہیں کی۔"

میں نے کہا "پھر میرے بارے میں لگائے گئے کسی اندازے کی تصدیق یا تردید کیسے ہوسکتی ہے؟"

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے تکتا رہا پھر گمبھیر لہجے میں بولا "جب وقت آئے گا تو تمہارے اور تمہارے معاملات کے بارے میں گفتگو رہے گی جس کے نتیجے میں، مجھے یقین ہے ہم بہت گہرے دوست بن جائیں گے۔"

میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شعیب غوری کی بات اس وقت میرے پلے نہیں پڑی تھی تاہم ازاں بعد اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ہمارے درمیان واقعی بہت گہری دوستی قائم ہوگئی تھی۔

میں امتیاز کے باس شعیب غوری سے ملاقات کے بعد باہر نکلا تو امتیاز نے مجھے گھیر لیا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا کہ ہمارے بیچ کیا باتیں ہوئیں۔ جب میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "کیا واقعی؟"

"ہاں یار!" میں نے کہا "میں خود بھی حیران ہوں۔"

"بات تو حیرانی ہی کی ہے" وہ کسی گہری سوچ میں نظر آنے لگا "باس تو ٹودی پوائنٹ اور نہایت مختصر بات کرنے کا عادی ہے... پھر وہ ایک انتہائی غیر متعلق موضوع کیوں لے بیٹھا۔"

اس کے انداز سے لگتا تھا، وہ خاصا مایوس ہوا تھا۔ میں نے کہا "یار! تمہارا باس تو مجھے عجیب سا لگا ہے۔ پورے آدھے گھنٹے تک وہ مجھے یہ بتاتا رہا کہ دنیا کے ریڈ لائٹ ایریا کہاں واقع ہے اور کس ملک کی نوعیت کیا ہے؟ مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے جیسے تمہارے باس نے دنیا بھر کی کال گرلز پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔ اس کی فراہم کردہ معلومات اور بیان کردہ تجربات حیرت آفرین اور جذبات انگیز ہیں۔"

"جگر! تم کوئی گڑبڑ تو نہیں کررہے ہو؟" وہ شک بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "گڑبڑ... اور وہ بھی تم سے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"لیکن اپنا باس ایسا تو نہیں!" اس کی بے یقینی دیدنی تھی۔

"تم اس سلسلے میں باس سے استفسار کرسکتے ہو۔"

"یہ ناممکن ہے" وہ جلدی سے بولا۔

"پھر مجھ پر اعتبار کرو۔"

"وہ تو کرتا ہوں۔"

"پھر؟"

"جگر! باس کا تمہارے ساتھ رویہ سمجھ سے بالاتر ہے" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "امتیاز! وہ تمہارا باس ہے اور باس از آلویز رائٹ!"

"اوکے... دیٹس اوکے۔ میں سمجھ گیا" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

اس کے اسٹائل پر بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔

پھر ایک مہینا گزر گیا۔ اس عرصے کے دوران ساحل کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بالکل نارمل تھی۔ سب سے اسی طرح مل جل رہی تھی جیسے وہ پہلے ملتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے اندر کوئی بہت بڑی تبدیلی آرہی ہو، وہ پہلے جیسی ہونے کے باوجود بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اس کا کوئی سسٹم آف ہوگیا تھا۔

میرا یہ احساس تنہائی میں اور زیادہ شدت اختیار کرجاتا۔ خلوت میں پہنچتے ہی مجھے یوں لگتا، ساحل بدل گئی ہے۔ پہلے اس کا انگ انگ میرے قرب کا متلاشی تھا، وہ میرے سنگ کے لیے مچلتی تھی اور اس کی وارفتگی خودسپردگی کی حدود کو چھونے لگتی تھی۔ اس کی انہی طرازیوں نے میرے اندر حوصلہ جگایا تھا اور میں نے چند عملی مثالیں قائم کر ڈالی تھیں مگر اب وہی ساحل پیچ در پیچ ساگر جا چھپی تھی۔ وہ جتنی نظر آرہی تھی، اس سے میری تشفی ممکن نہیں تھی۔ میری ہر پیش قدمی کو وہ خوبصورت گریز کے حوالے کرکے صاف نکل جاتی۔ ٹکراؤ نہیں بلکہ ایک سلجھاؤ تھا مگر میری اداؤں میں مجھے الجھاؤ میں ڈال دیتی۔ میں بعض اوقات جھنجھلاہٹ کا شکار ہوجاتا۔ وہ یا تو اپنے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ سجائے میری آنکھوں میں بہت دور تک اور بہت دیر تک تکتی رہتی۔ اس وقت میں خود کو ٹرانس کی سی کیفیت میں محسوس کرتا۔ وہ ایک عامل ہوتی اور میں معمول، وہ ایک ساحرہ ہوتی اور میں مسحور!

ساحل میری توقعات سے بڑھ کر ثابت ہورہی تھی۔ وہ میری زندگی میں آنے والی ہر لڑکی سے مختلف تھی۔ اس کے اندر بڑی گہرائی اور گیرائی تھی۔ وہ تو اپنے وجود میں موج زن ایک بحرِ بےکراں کا تعارف تھی۔ جس طرح ساحل پر بیٹھ کر لہریں گننے والے شخص کو سمندر کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ساحل سے ملنے والا، اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے والا اس کی اصلیت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

دیا سلائی الاؤ بھڑکانے کے بعد خاموش ہوجاتی ہے، اسی الاؤ کا حصہ بن جاتی ہے۔ شعلہ دکھا کر شعلوں کی نذر ہوجاتی ہے۔ ساحل میرے من میں ایک تڑپ جگا کر شانت ہوگئی تھی، وہ میرے احساس کا حصہ بن گئی تھی۔ میری سانسوں کی سرسراہٹ میں وہ خوشبو کی طرح بس گئی تھی۔ لمس کی انتہا سے کشید کیا ہوا کیف وہ آسودگی نہیں دے سکتا جو اس اَن چھوئے سرور میں پنہاں تھی۔

ساحل نے اس ایک ماہ کے اندر عملی میدان میں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ "چی" کی مشق کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ وہ لائٹ ویٹ اشیا مثلاً کاغذ، کولڈ ڈرنک کا اسٹرا اور پانی کی سطح کو حرکت دینے میں ماہر ہوگئی۔ اب ارتکازِ توجہ کے ساتھ پریکٹس کی ضرورت تھی۔ اس کی باطنی توانائی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا، اس کی کارکردگی اور فعالیت بھی بڑھتی چلی جاتی۔

مارشل آرٹس میں ساحل نے اتنی مہارت حاصل کرلی کہ اچھی خاصی فائٹ کرسکتی تھی۔ اس نے یہ فن سیکھنے کے لیے رات دن محنت کی تھی۔ وہ بنیادی تین ککس یعنی فرنٹ کک، سائیڈ کک اور بیک کک بالکل صحیح انداز میں استعمال کرنے پر قادر ہوگئی۔ ازیں علاوہ بلاکنگ اور ... میں بھی پرفیکٹ ہوگئی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ساحل میں سیکھنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی جس میں اس کی سنجیدگی نے مزید اضافہ کردیا۔ اس کے بالعکس روبی نے مجھے سخت مایوس کیا۔ امتیاز نے ایک روز مجھ سے کہا "کیا بات ہے جگر! تم اپنی اس بہن روبی پر توجہ نہیں دے رہے ہو؟"

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "یار! ناسور کے منہ پر مرہم لگانے سے بات نہیں بنتی۔ مجھے یہ سرجری

مقناطیسیت
اس کتاب کے مطالعے سے اپنی شخصیت کی مقناطیسی قوت کو اجاگر کریں اور کامیاب زندگی گزاریں
قیمت 40 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب کی قیمت مع ڈاک خرچ بذریعہ
حصولِ کتابت کا پتہ
kitabiat@hotmail.com
kitabiat1970@yahoo.com

کیس لگتا ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں سرہلانے لگا۔

میں نے مزید کہا "روبی کے علاج کے لیے مجھے پہلے اس کی کہانی سننا ہوگی۔ وہ کہانی جس کا تم نے ابتدا میں تذکرہ کیا تھا۔ اس کی نفسیات میں کوئی گرہ پڑی ہوئی ہے۔ جب تک وہ گرہ نہیں کھلے گی، کوئی مشق اور ایکسرسائز اسے فائدہ نہیں پہنچائے گی۔"

"تم کس گرہ کی بات کر رہے ہو جگر!" وہ پُرسوچ انداز میں بولا "مجھے تو لگتا ہے، اس کی پوری نفسیات ہی گنجلک ہو چکی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "ویسے تو میں بھی تمہیں اس کی کہانی تفصیلاً سنا سکتا ہوں لیکن اس کی تحلیلِ نفسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان سے بتائے۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر اس کا تفصیلی انٹرویو کروں گا۔ ویسے تم نے کبھی اس سلسلے میں کوشش نہیں کی۔"

"ایک آدھ بار کی تھی لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔" امتیاز نے اپنی شکست کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے، اب میں ٹرائی کروں گا۔"

"یہ بہت نیکی کا کام ہوگا جگر!"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

میر بخش کی آمد سے ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

میر بخش اب پوری طرح فٹ ہو چکا تھا۔ ہم نے اس کا فرضی نام سلیمان شاہ رکھ لیا تھا۔ ہم فلیٹ کے اندر صرف وجدان، ساحل اور میر بخش ہوتے تھے ورنہ باہر ہر جگہ ہم وجیہ، الماس اور سلیمان شاہ بن جاتے تھے۔ میر بخش نے اسی فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں ڈیرا جما رکھا تھا۔

فلیٹ پر قیام کے دوران میں، میں نے اس ایک ماہ میں بہت سے مفید کام بھی کیے۔ مثلاً میں نے پورے کراچی کو دیکھ ڈالا، تمام اہم راستے ذہن نشین کرلیے۔ اب میں کہیں بھی تن تنہا آجا سکتا تھا۔ بیشتر بسوں اور ویگنوں کے روٹ اور نمبر بھی مجھے معلوم ہوگئے جو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کرلیے۔ جس طرح ہم نے اپنے گیٹ اپ اور حلیوں میں مناسب تبدیلی کرلی تھی بالکل یہی سلوک میر بخش کے ساتھ بھی کیا گیا۔ اس نے باقاعدہ داڑھی چھوڑ دی تھی، پہلے اس کے چہرے پر صرف بھاری بھرکم مونچھیں ہوا کرتی تھیں۔ ہم پوری طرح اس شہر کے رنگ میں رنگ گئے اور ڈھل گئے گویا ہم بھی "کراچوی" ہوگئے تھے۔

اس عرصے میں اپنی رضا سے، میں نے امتیاز کے مشن میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔ درحقیقت یہ "سی ایف کے" کے پراجیکٹ تھے۔ میری ہمراہی نے امتیاز کو خوشی سے سرفراز کیا۔ وہ اب مجھے اپنا دایاں بازو سمجھتا تھا کیونکہ میں اس کے شانہ بشانہ لڑا تھا۔

پہلا مشن محکمۂ ٹیلی فون کے ایک افسر کی بیٹی کو اغوا کرکے قتل کرنے والوں کے خلاف تھا۔ ڈی ای ٹیلی فون نے لاکھوں کی نادہندہ ایک پارٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی تو اسے نامعلوم افراد کی طرف سے خطرناک دھمکیاں ملنے لگیں۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ فریق مخالف نے اس کی ... سالہ بیٹی کو اغوا کرلیا۔ پولیس نہ تو اس معصوم مغویہ کو بازیاب کرا سکی اور نہ ہی اغوا کنندگان کا کوئی سراغ ملا۔ نادہندہ پارٹی معاملے سے اپنی لاعلمی ظاہر کرتی رہی۔ چند روز بعد اس بچی کی کٹی پھٹی لاش ایک گندے نالے سے مل گئی۔ بربریت اور ظلم کے اتنے بڑے واقعے کے بعد بھی پولیس مجرموں تک رسائی حاصل نہ کرسکی اور کیس دفتر داخل ہوگیا۔ "سی ایف کے" نے اپنی کوشش سے مجرموں کا سراغ لگالیا اور سرکاری انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے چاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

دوسرا واقعہ بہت اندوہناک اور گردنیں جھکا دینے والا تھا۔ یہ ڈکیتی اور آبروریزی کی ایک واردات تھی جس میں ڈاکوؤں نے گھر سے تمام نقدی اور زیورات سمیت سارا سامان سمیٹنے کے بعد اس گھر کی نوبیاہتا بہو کے ساتھ بُرا فعل بھی کیا تھا اور وہ بھی ــــ اس بدنصیب کے شوہر کی آنکھوں کے سامنے! گن پوائنٹ پر پہلے اس شخص کو دست و پا کرکے اچھی طرح رسیوں میں جکڑا گیا پھر اس کی بیوی کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا گیا۔ دوسرے روز وہ ایک ٹرین کے نیچے آکر کٹ مرا۔ خودکشی کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں رہا تھا کیونکہ وہ بدقسمتی سے بلیک بیلٹ بھی تھا اور انتہائی وجیہ اور جوان بھی۔ بے بسی نے اس کے سینے میں جتنے خنجر پیوست کیے تھے، اس کے بعد وہ جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس معمول کے مطابق ڈاکوؤں کی تلاش میں ناکام رہی۔ میں نے "سی ایف کے" کے تلے ان دو مجرموں کو تلاش کرکے غسلِ لہو دینے میں ...

... ثانی ہاتھ بٹایا۔

ہمارا تیسرا شکار بڑے گھرانے کا بگڑا ہوا ایک نوجوان تھا۔ وہ اپنی امارت کی جھلک دکھا کر نچلے طبقے کی لڑکیوں کو پھانستا۔ انہیں شادی کے خواب دکھا کر اپنی مرضی کے سفر پر بہت دور تک لے جاتا اور پھر ــــ اسی دوری پر آنسو بہاتا چھوڑ کر کسی اور میدان کی طرف نکل جاتا۔ اس کے کریڈٹ پر ایسے درجنوں "کارنامے" تھے۔ برباد ہونے والیوں میں سے ایک دو نے پولیس اسٹیشن جاکر فریاد بھی کی تھی مگر پولیس والے اس شیطان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ وہ جن مہاشیطانوں کی اولاد تھا، وہ بڑی پہنچ والے تھے۔ ان کے اشارۂ ابرو پر پولیس افسروں کی تقرریاں اور تبادلے ہوتے تھے۔ "سی ایف کے" نے اس شیطان کو ایک تاریک گوشے میں گھیر کر، ایک صاف ستھری سڑک کو اس کے غلیظ خون سے داغ دار کردیا۔

ان واقعات کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں بلاواسطہ یا بالواسطہ "سی ایف کے" سے منسلک ہوچکا تھا۔

○☆○

میں اس وقت "ایسٹ" میں شعیب غوری کے سامنے بیٹھا تھا۔ ہمارے سوا اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی۔ یہ بنگلا بل پارک کے نزدیک ہی واقع تھا۔ امتیاز کے ذریعے غوری کے پیغام پر میں وہاں پہنچا تھا۔

آج وہ قدرے مختلف موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے گزشتہ ملاقات کی طرح سیکس یا کسی اور غیر متعلقہ بات کو موضوعِ گفتگو نہیں بنایا بلکہ حال چال دریافت کرنے کے بعد اس نے میرے "تعاون" کی تعریف کی اور پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"مسٹر وجدان! پچھلی ملاقات میں، میں نے تم سے ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کی تھی جس پر تمہیں حیران ہونا چاہیے تھا مگر تم نے اپنی کسی الجھن یا حیرانی کا مظاہرہ نہیں کیا۔"

وہ یہاں تک پہنچ کر خاموش ہوا اور ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ نظر کے چشمے کے پیچھے اس کی ذہین آنکھیں ساکت تھیں۔ میں خاموش رہا تو اس نے کہا۔

"دراصل اس وقت تک میں تمہارے بارے میں ادھوری معلومات رکھتا تھا لیکن اب یہ نامکمل معلومات تقریباً مکمل ہوچکی ہیں اس لیے بزنس کی بات ہوسکتی ہے۔"

"کیسا بزنس؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا "سی ایف کے کو چلانے کے لیے مجھے مختلف قسم کے بزنس کرنا پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے، کوئی بھی تنظیم سرمائے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس کو فعال رکھنے کے لیے فنانس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب میں یہ تو کر نہیں سکتا کہ دولت حاصل کرنے کے لیے لوٹ مار شروع کردوں۔ میں نے دولت کمانے کے چند ذرائع وضع کرلیے ہیں اور انہیں میں اپنا بزنس کہتا ہوں۔"

میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا "مجھ سے تم کس قسم کا بزنس کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اسی طرف آرہا ہوں" وہ اپنی مخصوص گونجیلی آواز میں بولا "میں نے ابھی تک یہ فیصلہ تو نہیں کیا کہ تم سے کون سا بزنس کروں گا لیکن میرا خیال ہے، اس ملاقات کے اختتام تک یہ معاملہ طے ہوجائے گا۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کھل کر اور واضح الفاظ میں کہو" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "تمہارا یہ مبہم انداز مجھے الجھا رہا ہے۔"

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا "مسٹر وجدان! مجھے پتا چلا ہے، تمہارے اور چوہدری نوازش علی آف رکھاں والی کے درمیان کوئی دیرینہ دشمنی چل رہی

مشہور ماہرین نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب
احساس کمتری
اسباب — تدارک — علاج
اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ
● احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔
● کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں۔
قیمت 25 روپے — ڈاک خرچ 23 روپے
خط وکتابت کا پتہ
74200 کراچی
kitabiat1970@yahoo.com

ہے۔ اس نے پاکستان سے باہر تمہارے لیے مشکلات کا پہاڑ کھڑا کردیا تھا اور تم نے پاکستان میں داخل ہوتے ہی اس کا خون خشک کردیا ہے۔ وہ مارا ہوا میاں زاہد حسین، تم نے سب کو ناقابلِ یقین نقصان پہنچایا ہے۔ یہ سب چوہدری کے بندے ہیں اور تم سے اس قسم کی جرأت کی توقع نہیں کرتے تھے، بہرحال۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا اور ایک طویل سانس خارج کرنے کے بعد سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "کراچی میں داخل ہوتے ہی تم جس قسم کی صورت حالات سے گزر رہے ہو اور میاں زاہد کا گروہ جس طرح تمہاری تلاش میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ تم سے کچھ حاصل کرنا، کچھ چھیننا چاہتے ہیں۔ اسی ذیل میں تمہارے ایک ساتھی بوٹا سنگھ کو بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ میر بخش کا اغوا بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اسے بری طرح زدوکوب کیا گیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے!" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "تم واقعی ایک بہت اچھے تجزیہ نگار بھی ہو۔"

وہ دوستانہ انداز میں بولا "مسٹر وجدان! تم عمر میں مجھ سے آدھے سے بھی کم ہو۔ میں نے کبھی تمہیں اپنا ملازم یا "سی ایف کے" کا رکن نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ایک دوست خیال کیا ہے۔ کیا اس دوستی کے رشتے کی بنا پر میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ ممکن ہے، میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں؟"

میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ "تم تو مجھ سے کسی بزنس کی بات کررہے تھے پھر بیچ میں میرے مسائل کہاں سے آن ٹپکے؟"

"میں تمہارے مسائل یا مسئلے پر کھڑے ہوکر ہی تو بزنس ڈیل کروں گا، ڈیئر!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت ہوئی تو میں اس مدد کے عوض تم سے ایک سودا طے کرلوں گا۔ یہی میرا بزنس ہے۔ میں لوگوں کے ناممکن اور پیچیدہ کاموں کے عوض اپنا معاوضہ وصول کرتا ہوں اور ان کاموں کو کرانے کے لیے میں مختلف محکموں میں اپنے لنکس کو استعمال کرتا ہوں۔ اب میری بات کچھ کچھ تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

"میں پوری طرح تمہارا بزنس سمجھ گیا ہوں" میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "لیکن میرے مسئلے کا تعلق کراچی سے نہیں جبکہ "سی ایف کے" صرف کراچی میں ... کرتی ہے۔"

"تم اس بات کی فکر نہ کرو" وہ ٹھہری ہوئی آواز میں ... "اپنا مسئلہ بتاؤ۔"

میں گزشتہ ایک ماہ میں شعیب غوری اور اس کے تنظیمی معاملات کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ وہ مجھے ... لحاظ سے قابلِ اعتماد اور بھروسے کا آدمی لگا۔ اس نے اور ... کی تنظیم نے اب تک مجھے ایک مضبوط پناہ گاہ کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی مدد بھی دی تھی۔ میں اس کا ممنونِ احسان ... تھا، پلک جھپکتے میں میرے اندر سے یہ فیصلہ آگیا کہ مجھے شعیب غوری کو اپنے راز میں شریک کرلینا چاہیے۔ وہ راز جس کی قیمت کم از کم چوتھائی ارب روپے تھی۔

میں نے آئندہ ایک گھنٹے میں شعیب غوری کو بلا کم و کاست مدفون سونے کے بارے میں بتادیا۔ وہ میرے لیے قابلِ بھروسا دوست ثابت ہوسکتا تھا۔

"تو ان سب کو اس ڈائری کی تلاش تھی جس میں مدفون سونے والے تھیلوں کی نشاندہی کی گئی ہے؟" پوری بات ... کے بعد اس نے کہا "اور وہ ڈائری اب میاں زاہد حسین کے ہتھے چڑھ چکی ہے بلکہ اب تک اس نے وہ ڈائری اپنے ... چوہدری نوازش کو بھیج دی ہوگی مگر وہ ڈائری ایک خالی ... سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ ایک ایسا ناگ ہے جس کا زہر تم نے نکال لیا ہے۔ وہ ناگ کسی حقیر کیچوے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ چند لمحات تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کاروباری انداز میں بولا "مسٹر وجدان! میں نے بزنس ڈیل کے لیے لائحہ عمل تیار کرلیا ہے مگر اس کے لیے اعتبار شرط ہے۔"

میں نے کہا "میں نے تم پر اعتبار کرکے ہی تمہیں اپنے راز میں شریک کیا ہے۔ تم مجھ سے کس قسم کا اعتبار چاہتے ہو؟"

"بس، میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر مکمل اعتبار کریں" وہ اضطراری لہجے میں بولا "کیونکہ ... بزنس ڈیل کو ہم پیپرز پر نہیں لے سکتے۔ اس قسم کے کاموں میں پارٹی کی زبان پر بھروسا کیا جاتا ہے۔"

"تم میری جانب سے بالکل بے فکر ہوجاؤ" میں نے ... آمیز لہجے میں کہا "میں نے اگر تم پر اعتماد نہ کیا ہوتا تو ... نہیں یا پھر ابتدا ہی میں چھوٹ چکا ہوتا۔ تم ... بتاؤ، بزنس ... قسم کا بزنس ہے تمہارے ذہن میں؟"

وہ مزید سنجیدہ ہوگیا "مسٹر وجدان! میں تمہارے ساتھ پارٹنرشپ بزنس کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اس بزنس میں ففٹی ففٹی ون اور فورٹی نائن کے پارٹنرز ہوں گے۔ تمہیں میں ففٹی ون کی پوزیشن میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

میں خاموشی سے ہمہ تن گوش رہا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم مجھے سونے کے درست مقام کی نشان دہی کرنے والے، ڈائری کے وہ صفحات دے دو۔ میں اپنے بل بوتے پر وہ سونا وہاں سے نکلوالوں گا۔ بعد میں ہم اپنی پارٹنرشپ کے حساب سے وہ سونا بانٹ لیں گے۔ تمہیں سونے کی بازیافت کے لیے ایک تنکا بھی دہرا نہیں کرنا پڑے گا۔ کام میں کروں گا۔ حصہ دونوں پائیں گے۔ بولو منظور ہے؟"

میں نے کہا "تجویز تو اچھی ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ بازیافت کا کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "میں اس متروک کنوئیں میں کس طرح کھدائی کرواتا ہوں، یہ میرا دردِ سر ہے۔ تم اگر اس بزنس ڈیل کے لیے تیار ہو تو ہم اپنی دوستی کو اور مضبوط بنا سکتے ہیں۔"

مجھے بیٹھے بٹھائے ایک آسانی میسر آرہی تھی۔ اس سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔ میں اگر خود رکھاں والی جاکر سونے کو نکالنے کی کوشش کرتا تو چوہدری نوازش علی میرے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کرسکتا تھا۔ میں چوہدری اور اس کے اثر و نفوذ سے خوف زدہ نہیں تھا تاہم اس کے علاقے میں جاکر کھلم کھلا متروک کنوئیں سے وہ مدفون سونا نکالنا عملاً اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر مجھے درپردہ رہ کر یہ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا تو مجھے اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شعیب غوری ایک قابلِ بھروسا دوست ثابت ہو رہا تھا۔ اس کے اثر و رسوخ کو دیکھتے ہوئے مجھے امید تھی کہ وہ اس کام کو کرگزرے گا۔ اس طرح آدھا سونا اس کی طرف چلا جاتا، مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ غوری اس سونے سے حاصل ہونے والی رقم کو "سی ایف کے" پر خرچ کرتا تو یہ رقم نیک مقصد کے حصول پر خرچ ہوتی۔ میرا ذہن و دل ہر حوالے سے مطمئن ہوگیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اپنی رضامندی کے طور پر دوستی کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

غوری نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے کہا "میں کل آپ کو ڈائری کے وہ قیمتی صفحات دے دوں گا۔ آپ اپنے طور پر جیسے چاہو، وہ سونا حاصل کرلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں ایک مرتبہ "رکھا والی" ضرور جانا چاہتا ہوں۔"

"اسی سونے کے سلسلے میں؟" غوری نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "سونے کا معاملہ تو میں نے تمہارے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ وہاں میں کسی اور سلسلے میں جانا چاہتا ہوں۔"

"کیا میں اس سلسلے کے بارے میں کچھ جان سکتا ہوں؟"

"جب تم سے دوستی ہوگئی ہے تو پھر تمہیں اجازت لینے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "تم براہِ راست مجھ سے سوال کرسکتے ہو۔ خیر، میں تمہیں خود ہی بتاتا ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر غوری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا "میں پاکستان کئی مقاصد کے لیے آیا ہوں جن میں سرِفہرست چوہدری نوازش علی اور سونے کے معاملات ہیں۔ سونے کا ٹھیکا تو تم نے لے لیا مگر میں چوہدری

نوازش سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا ہوں۔ حسابِ ماضی کا کچھ حصہ ابھی باقی ہے۔ علاوہ ازیں میں اس دھرتی‘ اس گھر اور اس مقام کو ایک مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں‘ جہاں میں نے جنم لیا تھا۔“

بولتے بولتے میری آواز بھرا گئی۔ غوری نے کہا ”مسٹر وجدان! جہاں تک جنم بھومی کو دیکھنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے تمہیں ایک مرتبہ موضع رکھاں والی بہ نفسِ نفیس جانا ہوگا البتہ چوہدری والا مسئلہ میں کراچی میں بیٹھے بٹھائے حل کرسکتا ہوں۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”وہ کس طرح مسٹر غوری؟“

”ہم جب دوست بن ہی چکے ہیں تو تمہارے تمام دشمن میرے بھی دشمن ہیں“ وہ نہایت ہی سنجیدگی سے بولا ”میں اپنے بندوں کی مدد سے چوہدری کو ٹھکانے لگوا سکتا ہوں۔ میرے لیے یہ اتنا زیادہ مشکل نہیں۔“

میں نے نفی میں گردن ہلادی ”نہیں مسٹر غوری! اگر تم چوہدری کو کسی بھی طرح ختم کروادو گے تو مجھے مزہ نہیں آئے گا۔ میرے سینے میں جو الاؤ روشن ہے‘ اس پر ایک چھینٹا پانی کا نہیں پڑے گا۔ جب تک میں اپنے ہاتھوں سے چوہدری نوازش کو تڑپا تڑپا کر نہیں ماروں گا‘ میرا انتقام پورا نہیں ہوگا۔ تم سینے میں روشن انتقام کی آگ کی تپش سے خوب واقف ہوگے۔ اس قاتل آگ کے لپکتے شعلے زہریلے ناگوں کے مانند اپنی زبانیں لہراتے رہتے ہیں۔ یہ آتش فشاں جب تک پھٹے گا نہیں‘ مجھے قرار نہیں آئے گا۔“

”تمہاری یہ خواہش میں یہاں کراچی میں بھی پوری کرسکتا ہوں۔“ غوری نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں مسٹر غوری!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا ”میں کسی نہ کسی طرح چوہدری نوازش کو کراچی پہنچا کر تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔“

”کیا یہ تمہارے لیے ممکن ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”کوئی حرج نہیں میرے دوست“ میں نے پہلی مرتبہ شعیب غوری کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہرا اور کام کا آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ جبھی تو وہ اتنی اہم تنظیم کو بڑی کامیابی اور خوش اسلوبی سے چلا رہا تھا۔ میں نے اسی کے انداز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”مسٹر شعیب! اگر تم یہ کام کردو تو تمہاری تنظیم ”سی ایف کے“ کو بھاری امداد دوں گا۔“

”اس ریٹرن کی ضرورت نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”اگر میں تمہارے دشمن کو یہاں پہنچا کر تمہارے قدموں میں ڈالنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ ایک دوست کی طرف سے دوسرے دوست کے لیے ایک ادنیٰ سا تحفہ ہوگا۔“

میں اس کے اندازِ دوستی کو سراہے بنا نہ رہ سکا ”مسٹر غوری! تم ایک قابلِ فخر دوست ہو۔ مجھے بھی کبھی آزما کر دیکھنا۔ وجدان کی دوستی تمہیں پسند آئے گی۔“

”مجھے وجدان اور اس کی دوستی پسند آچکے ہیں۔“ وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بولا ”اور میں دوست کی دوستی کو آزمانے کا قائل نہیں۔ دوستی ہر قسم کے ٹرائل سے بے نیاز ہونا چاہیے۔“

”میں خود بھی اسی قسم کے خیالات کا مالک ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا ”پھر تو خوب نبھے گی مائی ڈیئر۔“

”شیور مائی ڈیئر غوری۔“ میں نے کہا۔

”تمہارا یوں بے تکلفی سے مجھے ”غوری“ کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”حالانکہ ہماری عمروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارے اس طرح پکارنے سے مجھے کوئی یاد آجاتا ہے۔“

بات ختم کرکے وہ خیالوں میں گم ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ماضی میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ میں نے بے تکلفی کی فضا کو قائم رکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

”مسٹر غوری! کوئی یاد آجاتا ہے یا۔۔۔ یاد آجاتی ہے؟“

وہ چونک اٹھا پھر اس نے بڑی خوبصورتی سے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے وہ معاملہ رفع دفع کردیا ”مسٹر وجدان! ”یاد“ کا لفظ چوں کہ مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لیے ”یاد آجاتی ہے“ کہہ دینا بھی کچھ غلط نہیں۔ تم جو چاہو سمجھ سکتے ہو!“

مجھے جو سمجھنا تھا‘ وہ میں سمجھ گیا۔

اس نے واپس کرنٹ ٹاپک کی طرف آتے ہوئے کہا ”مسٹر وجدان! اس وقت ہمارے سامنے تین اہم کام ہیں۔ نمبر ایک‘ متروک کنوئیں سے سونے کے بھرے ہوئے بڑے تھیلے برآمد کرنا۔ نمبر دو‘ چوہدری نوازش علی سے بھیانک انتقام۔ نمبر تین‘ تمہاری جنم بھومی کی یاترا۔ میرا یہ خیال ہے‘ ہمیں یہ کام ایک خاص ترتیب اور ٹائمنگ سے کرنے چاہئیں۔“

”تمہارا خیال بالکل درست ہے۔“ میں نے تائید کی ”پلاننگ اور ٹائمنگ ہر کامیاب منصوبے کی شرائط اولین ہیں۔ تمہارے ذہن میں اس بارے میں کیا لائحہ عمل ہے؟“

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ”پہلے میں اس متروک کنوئیں کی تلاش اور کھدائی کا محفوظ بندوبست کروں گا۔ کھدائی سے ایک روز قبل میں چوہدری نوازش علی کو تمہارے پاس پہنچانے کا انتظام کردوں گا۔ میں چاہتا ہوں‘ یہ دونوں کام ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہو جائیں۔ جس روز چوہدری تمہارے ہتھے چڑھے‘ اسی روز کنوئیں کی تہ سے سونے والے تھیلے نکال لیے جائیں۔ میجر کھدائی کا کام میں پہلے کروالوں گا۔“ وہ چند لمحے سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی تجویز کو تکمیل کے مراحل سے گزارتے ہوئے بولا ”ان واقعات کے چند روز بعد تم اپنی جنم بھومی کی یاترا کو جا سکتے ہو۔“

”ویل ڈن۔“ میں نے ستائشی نظروں سے غوری کو دیکھا ”مجھے تمہارا پروگرام پسند آیا۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

”تھینک یو مسٹر وجدان!“ وہ سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولا ”میرے پاس تمہارے لیے ایک اور بھی تجویز ہے۔“ میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا‘ وہ بولا ”اگر تم سونے کا حصہ نہ لینا چاہو تو میں اس سونے کی مالیت کے برابر تمہیں رقم بھی دے سکتا ہوں۔۔۔ جس بھی کرنسی میں تم چاہو۔ یو۔ ایس۔ اسٹرلنگ۔۔۔ یا جو بھی تمہاری خواہش ہو۔ میں وہ تمام سونا اپنے انگریز دوست مسٹر نیل آرمر کے حوالے کر دوں گا۔ تم تو جانتے ہی ہو‘ وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک چلاتے ہیں۔ ہم اس سونے کے عوض کرنسی حاصل کرسکتے ہیں۔“ ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے اضافہ کیا ”ویسے تو عنقریب سنگاپور سے بھی ایک بہت بڑی رقم یو۔ ایس کی شکل میں تمہارے پاس پہنچنے والی ہے۔ مجھے لگتا ہے تم راتوں رات بلینر کیا ٹریلینر ہونے والے ہو!“

آخری جملہ اس نے مذاق کے رنگ میں کہا تھا۔

میں نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”مسٹر غوری! ہماری پارٹنرشپ کا دارومدار اس سونے کے حصول پر ہے۔ اگر بالفرض‘ تم وہ سونا برآمد کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے تو تمہاری اس محنت کو کون ادا کرے گا۔“

”سوال اچھا ہے۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا ”لیکن میں تم سے ضرور پوچھوں گا کہ یہ سوال تمہارے ذہن میں کس بنا پر آیا ہے؟“

میں نے کہا ”اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ سونے کی کھدائی کے سلسلے میں اچانک حکومتی سطح پر کوئی رکاوٹ سامنے آسکتی ہے۔ بہرحال وہ سونا اسمگلنگ کے مال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر حکومتی اداروں کو اس کی کھدائی کی سُن گُن مل گئی تو تمہارا کام کھٹائی میں پڑ جائے گا۔“

”حکومت اور حکومتی اداروں کی تم پروا نہ کرو۔“ وہ بڑا اعتماد لہجے میں بولا ”میرے ذہن میں ایک اچھوتا اور شفاف منصوبہ ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ میں کس مقصد کے لیے وہ کھدائی کروا رہا ہوں۔۔۔ بلکہ میں تو حکومت کی سرپرستی میں وہ کام کروں گا۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ”وہ کس طرح دوست؟“

”میں نے کہا نا‘ یہ معاملہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ وہ ہاتھ کو تسلی کے انداز میں حرکت دیتے ہوئے بولا ”میں جانتا ہوں‘ اس ملک میں قانون کی مدد سے غیر قانونی کام کس طرح کیے جا سکتے ہیں۔ تم اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ ہاں‘ اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور بوجھ ہو تو وہ بھی اُتار دو۔“

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا ”ایک خدشہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے ہی وہ سونا وہاں سے نکالا جا چکا ہو!“

میں نے یہ بات دانستہ صرف غوری کو چیک کرنے کے لیے کی تھی ورنہ میں جانتا تھا‘ اگر صحیح نشاندہی کے بغیر اس مدفون سونے کی بازیابی ممکن ہوتی تو چوہدری اب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہ رہتا۔

شعیب غوری نے کہا ”مسٹر وجدان! اگر وہ سونا متروک کنوئیں سے نکالا جا چکا ہوتا تو یہ بات چوہدری نوازش سے چھپی نہ رہتی۔ یا تو وہ خود سونے کو وہاں سے نکلواتا یا نکالنے والوں کی جان کو آجاتا۔ اس صورتِ حال میں وہ حالات پیش نہ آتے جو پاکستان۔۔۔ خصوصاً کراچی میں داخل ہوتے ہی تمہیں درپیش ہیں۔ چوہدری کے نمک خواروں نے ڈائری کے حصول کے لیے بوٹا سنگھ کو ہلاک کردیا‘ تمہارے ساتھی میر بخش کو بھی اسی سلسلے میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہے کہ وہ بھاری مالیت کا سونا ابھی تک اسی متروک کنوئیں کے اندر‘ کینوس کے ”سلیپنگ بیگ“ میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو اچانک خاموش ہوا پھر مضطرب انداز میں دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا ”مجھے ایک اچھوتا آئیڈیا سوجھ رہا ہے مسٹر وجدان!“

”کیسا آئیڈیا؟“

"میاں جی سے دل لگی کا آئیڈیا۔"
"میں سمجھ نہیں سکا مسٹر غوری!" میں نے کہا۔
وہ بولا "ہم میاں زاہد حسین سے کچھ اٹکھیلیاں کر سکتے ہیں۔"
میں اب بھی اس کی بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا اور پوچھا "کیسی اٹکھیلیاں؟"
وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "مسٹر وجدان! تم "کام" کے دو صفحات نکال کر وہ ڈائری ہوٹل کے کمرے ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ میاں زاہد نے وہ ڈائری فوری طور پر اپنے پاس چوہدری نوازش کو بھجوا دی ہوگی۔ یہ بات صرف ہم جانتے ہیں کہ وہ ڈائری ایک بے کار اور بے مصرف کتاب بن کر رہ گئی ہے۔ ورنہ میاں زاہد اور چوہدری نوازش تو خوشی سے بغلیں بجا رہے ... ہوں گے۔ ہمیں انہیں اسی خوش فہمی میں مبتلا رکھتے ہوئے ان کی خوشی کا سوا ستیاناس مارنا ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا "اب تم اس ڈائری کے حصول کے لیے میاں زاہد کا تعاقب کرو گے۔ یہ تعاقب میاں زاہد اور اس کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے لیے ہوگا۔ آڑ اس ڈائری کی استعمال کی جائے گی۔ اس سے ہمیں دہرا فائدہ پہنچے گا۔ تمہارا ڈائری کے پیچھے بھاگنا ان کی خوش فہمی کو اور زیادہ مضبوط کر دے گا کہ سونے کا راز اسی ڈائری کے اندر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس بھاگ دوڑ میں چند جرائم پیشہ بُرے لوگ بھی اس شہر سے کم ہو جائیں گے۔ خس کم' جہاں پاک.... والی مثال تو تم نے سن رکھی ہوگی مسٹر وجدان!"
میں نے اس کے آئیڈیے کو سراہا پھر ہمارے درمیان باہمی امور پر کچھ باتیں ہوئیں اور جب میں شعیب غوری کے ٹھکانے "ایسٹ" سے رخصت ہونے لگا تو اس نے مجھے ایک مرتبہ پھر حیران کر دیا۔ وہ میری جانب ایک خاکی لفافہ بڑھاتے ہوئے بولا۔
"مسٹر وجدان! یہ تحفہ میری طرف سے رکھ لو۔"
"کیا ہے' اس لفافے کے اندر؟"
"کھول کر دیکھ لو۔"
میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خاکی لفافہ وہیں کھول لیا۔ اندر سے دو کی رِنگ برآمد ہوئے۔ دونوں رنگز میں چند چابیاں جھول رہی تھیں۔ میں نے سوالیہ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔
وہ تبسم ریز لہجے میں بولا "ان میں ایک گچھے میں گاڑی کی چابیاں ہیں' نئی نویلی نیلے رنگ کی شیرڈ۔ دوسرا کی رِنگ فلیٹ کی چابیوں والا ہے۔ یہ فلیٹ ساحلِ سمندر پر ایک کثیر المنزلہ اپارٹمنٹس بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر ہے۔ نیلی شیرڈ اسی بلڈنگ کی پارکنگ میں موجود ہے۔ گاڑی کا نمبر اور فلیٹ کا ایڈریس ایک پرچے پر لکھا ہوا ہے اور وہ بھی اسی بھورے لفافے کے اندر ہے' شاید تم نکالنا بھول گئے!"
میں نے بے اختیار اس خاکی لفافے کے اندر جھانکا اور مذکورہ پرچہ برآمد کر لیا۔ وہ پرچہ غوری کے بیان کی تصدیق کر رہا تھا۔ گاڑی کا نمبر اور فلیٹ کا ایڈریس اس پر درج تھا۔
میں نے ایک مرتبہ پھر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا "یہ سب کیا ہے؟"
"میں بتا چکا ہوں مسٹر وجدان' یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے میری جانب سے۔"
کسی کے پُرخلوص تحفے کو ٹھکرانا نہیں چاہیے جب اس شخص سے نئی نئی دوستی بھی ہوئی ہو۔ میں نے وہ خاکی لفافہ جیب میں رکھتے ہوئے کہا "مسٹر غوری! تمہارے یہ حقیر تحفے خاصے وزنی ہیں!"
انداز مذاق کا تھا' وہ بھی اسی رنگ میں بولا "اگر بوجھ زیادہ محسوس کرنے لگو تو ساتھ ساتھ اتارتے بھی جانا۔ میں دوستوں سے تحفے لے کر بہت خوشی محسوس کرتا ہوں۔"
میں نے کہا "اب تم ہم دوست بن گئے ہیں اس لیے یہ "مسٹر" کا تکلف اچھا نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کو وجدان اور شعیب بھی کہہ سکتے ہیں۔"
"او کے۔" وہ زیرِ لب مسکرایا پھر بولا "وجدان! تم آج ہی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس فلیٹ پر شفٹ ہو جاؤ۔ میں نے بجلی' گیس اور ٹیلی فون کے بل ایڈوانس بھر کر رکھے ہیں۔ ایک سال تک تو یہ بل مائنس میں آئیں گے۔ فلیٹ فُلی فرنشڈ ہے۔ کچن میں فریج سمیت ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس بلڈنگ میں ہر فلور پر صرف دو فلیٹ آمنے سامنے بنے ہوئے ہیں۔ وہاں سب اپنے کام سے کام رکھنے والے رہائش پذیر ہیں۔ کوئی کسی کی ٹوہ میں نہیں ہے اور نہ ہی کسی معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کسی کے پاس فرصت ہے۔ تم نہایت ہی سکون اور آرام سے وہاں وقت گزار سکتے ہو۔"
میں نے شعیب غوری کے اس تحفے کو خوش دلی سے قبول کیا اور "ایسٹ" سے باہر نکل آیا۔

○☆○

روبی اور امتیاز خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔

ان کی خوشی میں حزن کی آمیزش تھی "سی ایف کے" کے باس شعیب غوری سے ہونے والی میری ملاقات اور اس کے نتائج نے انہیں جہاں بے پناہ خوشی دی تھی' وہیں وہ اس احساس سے خاصے رنجیدہ تھے کہ اب ہم ان سے رخصت ہونے والے تھے۔ ہماری رہائش طارق روڈ سے سمندر کے کنارے جانے والی تھی۔ میں نے امتیاز کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "یار! دل چھوٹا کیوں کرتے ہو۔ ہم ایک ہی شہر میں ہیں اور ملنے ملانے پر کوئی پابندی بھی عائد نہیں کی گئی۔"

"جگر! اگر تبدیلیِ رہائش کا فیصلہ باس کا نہ ہوتا تو میں تمہیں کسی قیمت پر جانے نہ دیتا۔" امتیاز نے خلوصِ دل سے کہا۔

"میں تمہارے دلی جذبات کو سمجھتا ہوں یار!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ کسی فوری خیال کے تحت بولا "آج رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے' یہ ایک طرح سے فیئر ویل ڈنر ہوگا۔"

ہمیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا' پھر خود ہی امتیاز نے وینیو کا انتخاب بھی کرلیا۔ کچھ دیر بعد ہم سب امتیاز کی گاڑی میں ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں بوفے ڈنر کرنے جا رہے تھے۔ امتیاز نے بتایا کہ وہ پہلے بھی وہاں کئی مرتبہ آچکا تھا۔ وہاں کا مینیو خاصا صحت مند اور کھانے صحت بخش تھے۔ روبی نے بھی وہاں کے کھانوں کی بہت تعریف کی۔

اس اوپن ائر ریسٹورنٹ کا ماحول مجھے بہت پسند آیا۔ ہم ایک گوشے کی میز پر بیٹھ گئے۔ بوفے ڈنر کے اصولوں اور تکنیک سے میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایسے مقامات پر وقت بہت اچھا گزرتا ہے۔ تھوڑا تھوڑا کھاتے رہو اور انجوائے کرتے رہو۔

ہم کھانے کے دوران میں خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک مجھے اپنے پاؤں کے نزدیک سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اگلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ کوئی جان دار وہاں موجود تھا۔ اس کے مخصوص لمس نے مجھے بتادیا کہ وہ کوئی بلی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے معیاری ریسٹورنٹ میں وہ بلی کہاں سے آگئی تھی۔

میں نے اپنے پاؤں کو تھوڑی حرکت دی تو وہ "میاؤں" کی آواز نکالتے ہوئے دوسری میزوں کی جانب دوڑ گئی۔ سب نے اس بلی کو جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت سفید بلی تھی جو عام بلیوں کی بہ نسبت انتہائی صاف اور خوش نما تھی۔

امتیاز نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "یہ کم بخت کہاں سے آگئی۔ میں اس ریسٹورنٹ کی مینجمنٹ سے شکایت ... گا۔"

"اب چھوڑو بھی" روبی نے بے پروائی سے کہا ... اوپن ائر ریسٹورنٹ ہے۔ اس میں کسی بلی کا گھس ... خاص بات ہے۔ پھر اس نے ہمیں کون سا نقصان ... ہے۔"

ساحل نے بہ ظاہر سنجیدہ رہتے ہوئے ایک خوبصورت ... مذاق کیا "یہ بلی وجدان سے اپنی برادری کا بدلہ لیے ... چھوڑے گی نہیں اسے۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور مسکرا کر خاموش ... امتیاز نے پوچھا "بھئی' یہ بلیوں کی برادری کا کیا قصہ ہے؟"

"پچھلے دنوں وجدان ایک تجربہ کرنے کے لیے ... بلیوں کو اپنا جھوٹا کھلاتا رہا ہے" ساحل نے امتیاز کو بتایا ... اپنے کنبے کی سردار بھی ہے۔ اس نے اپنی تحقیق ... معلوم کرلیا ہے کہ وجدان کتنا خطرناک تجربہ کر رہا تھا ... میں بلیوں کی جان کو صد فیصد خطرہ تھا۔"

اب روبی اور امتیاز بھی بات کی تہ تک پہنچ گئے ... عنبر کی ہدایت پر میں نے چند ایسے تجربات کیے تھے۔ خدا کا شکر ہے' ان تجربات اور لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ تسلی بخش ہوا تھا۔ کسی بھی بلی کو میرے جھوٹے سے کوئی نقصان ... اور ٹیسٹ کی رپورٹس میں بھی ایسی کوئی بات سامنے نہیں ... جس سے پتا چلتا' میں ایک زہریلا انسان ہوں۔

ہومیو ڈاکٹر عنبر نے رپورٹس دیکھنے کے بعد میری ... ایسی نظر سے دیکھا تھا جیسے وہ سمجھ رہی ہو' میں خواہ مخواہ ... الجھانے کے لیے اپنے زہریلے پن کی کہانی لے کر اس کے پاس پہنچا تھا ورنہ میرے بلڈ اور اسپوٹم کی رپورٹ تو کلیئر تھیں۔

میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔ دو مرتبہ انتہائی خطرناک زہریلے سانپ مجھے ڈسنے کے بعد تڑپ تڑپ کر مرگئے ... میں نے دوبارہ ان کا حوالہ دیا تو ڈاکٹر عنبر نے کہا تھا "ہو سکتا ہے' آپ کسی جان دار کو اپنے دانتوں سے کاٹ ... دیکھیں۔ ویسے میرے خیال میں آپ کے ساتھ زہریلے ... کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نہ تو ڈاکٹر کے ساتھ کوئی مباحثہ کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے تجربات کو نظر انداز کر سکتا تھا۔ یہ تو ممکن تھا' ... نے مجھے اپنے لیے مخصوص رکھنے کی خاطر میری توجہ ... زہریلے پن کی طرف دلائی ہو لیکن میں ان دونوں زہریلے سانپوں کی موت کو نہیں بھول سکتا تھا۔ میرے استاد ... ہربنگ پائی نے پتا نہیں' مجھے کون کون سی جڑی بوٹیوں کے ... عرق پلائے تھے کہ میں ہر قسم کے زہر سے محفوظ ہوگیا تھا لیکن میرے وجود کے اندر پایا جانے والا زہر کسی ٹیسٹ کی پکڑ میں نہیں آرہا تھا۔

ایک وقت کا کھانا انسان زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں کھالیتا ہے لیکن بوفے میں جانے والے لوگ بعض اوقات تین چار گھنٹے سے زیادہ لگا دیتے ہیں کیونکہ اس ماحول میں کھانا کم اور باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہم نے بھی اس روز جی بھر کر مختلف موضوعات پر باتیں کیں۔ امتیاز اور روبی ہمارے میزبان تھے تاہم وہاں میزبانی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

جب ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ ہم سروس روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی کے پاس آئے۔ امتیاز کو گاڑی نکالنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ہمارے عقب میں کسی نے اپنی گاڑی بڑے بے ہودہ انداز میں کھڑی کر رکھی تھی۔ امتیاز نے اس گاڑی کے مالک کو کئی صلواتیں بھی سنا ڈالیں تاہم یہ سب اس کے دل کا غبار تھا اور اُڑ کر گاڑی کے مالک کی سماعت تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اس فلیٹ کی جانب روانہ ہوگئے جو شعیب غوری نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ امتیاز نے کہا "جگر! بڑے پوش علاقے میں جا رہے ہو اور وہ بھی سمندر کے کنارے۔ میں نے وہ فلیٹ دیکھ رکھا ہے۔ بہت انجوائے کروگے۔ کنگ سائز سلائیڈنگ ڈور میں سے ٹھاٹھیں مارتا سمندر بڑا سحر کار دکھائی دیتا ہے۔"

روبی بولی "چلیں' ہم بھی ویک اینڈ پر پکنک منانے ان کے پاس چلے جایا کریں گے۔"

اس وقت میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میری راہنمائی کے لیے پسنجر سیٹ پر امتیاز موجود تھا۔ روبی اور ساحل گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھی تھیں اور دھیمی آواز میں مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ میر بخش بھی امتیاز کے ساتھ ہی پھنس کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں امتیاز کی فرمائش پر گاڑی چلا رہا تھا حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ کا کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس نے بے پروائی سے کہا تھا "سب بھگت لیں گے جگر! ویسے بھی ہم جس علاقے میں جا رہے ہیں وہاں ان چھوٹی موٹی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا۔" وہ اس روز خاصا موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

راستے میں ایک دو مرتبہ مجھے یوں محسوس ہوا' کوئی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے بے اختیار اپنے عقبی منظر کا جائزہ بھی لیا۔ اپنے پیچھے خاصے فاصلے پر مجھے ایک گرے جیپ کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ لگ بھگ نصف شب کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام رہ گیا تھا۔

کلفٹن کا برج عبور کرنے کے بعد میں نے اپنے عقب میں اسی گرے جیپ کی جھلک دیکھی تو چوکنا ہوگیا۔ میں نے امتیاز سے کہا "یار! میں محسوس کر رہا ہوں' ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔"

امتیاز نے بھی گاڑی کے عقبی منظر کا جائزہ لیا اور چونک اٹھا "جگر! تمہارا اشارہ اس گرے جیپ کی طرف تو نہیں؟"

"تم بالکل نشانے پر پہنچے ہو" میں نے کہا "میں نے پہلے

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں

روشنی کے مینار
اسلام کے خاموش مبلغوں اولیائے کرام کے دلچسپ اور پُراثر واقعات ضیاء تسنیم بلگرامی کے قلم سے
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

عظمت کے مینار
ضیاء تسنیم بلگرامی کے مضامین کا دوسرا مجموعہ
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

ایمان کا سفر
محی الدین نواب کی معاشرتی کہانیوں کا مجموعہ وہ فن پارے جن کی آپ کو تلاش ہے۔
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

کچرا گھر
محی الدین نواب کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ جسے آپ آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھیں گے۔
قیمت -/100 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے

-/500 روپے کی کتابیں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
یہ رعایت پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی حاصل ہوگی

کتابیات پبلی کیشنز
فون: [illegible]
Email: kitabiat@[illegible]

بھی ایک دو مرتبہ اسے دیکھا ہے تاہم فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث میں نے اس کا خاص نوٹس نہیں لیا۔"

"اب تو وہ بتدریج فاصلہ کم کر رہی ہے" وہ تشویش ناک لہجے میں بولا پھر اس کی چونکی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "ارے جگر! یہ تو وہی گاڑی ہے؟"

عقبی نشست پر موجود روبی اور ساحل بھی ہماری جانب متوجہ ہوگئیں۔

میں نے امتیاز سے پوچھا "تم کون سی گاڑی کا ذکر کر رہے ہو؟"

"وہ... جو ریسٹورنٹ کے سامنے ہماری گاڑی کے پیچھے پارک تھی" امتیاز نے محتاط لہجے میں کہا "اسی گرے جیپ کے باعث تو مجھے گاڑی نکالنے میں خاصی دشواری ہوئی تھی۔"

اب میں نے توجہ سے اس جیپ کو دیکھا تو مجھے یاد آگیا۔ امتیاز واقعی درست کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی قوتِ مشاہدہ کی داد دینا پڑی۔ میں نے عقبی نشست پر موجود اپنی ساتھیوں کو تنبیہہ کی کہ وہ ہرگز ہرگز پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں۔ پھر میں امتیاز کی طرف متوجہ ہوگیا۔

وہ کہہ رہا تھا "جگر! میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں، ریسٹورنٹ پہنچنے سے پہلے ہی ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ کوئی بہت پہلے ہمارے پیچھے لگ گیا تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

سپر مارکیٹ کے چوراہے سے میں نے' امتیاز کی ہدایت پر گاڑی دائیں جانب موڑلی اور اس کے ساتھ ہی اس کی رفتار بھی بڑھا دی۔ امتیاز عقابی نگاہ سے متعاقب گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب گرے جیپ بھی ہماری تقلید میں مڑ گئی تو امتیاز نے گمبھیر آواز میں کہا "ہمارے پاس اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟"

میر بخش نے بتایا "ہمارے پاس جو بھی ہتھیار ہیں' وہ ہمارے بیگ میں بند ہیں اور دونوں بیگز گاڑی کی ڈکی میں ہیں۔"

"پھر تو بے کار ہے" امتیاز نے اضطراری لہجے میں کہا "اتنا وقت نہیں کہ ہم گاڑی روک کر ڈکی سے وہ ہتھیار نکالیں۔ اب تو ہمیں صرف اسی پسٹل سے گزارہ چلانا ہوگا جو میری جیب میں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی امتیاز نے اپنی جیب سے اسٹیل باڈی چائنا میڈ پسٹل برآمد کرلیا۔ یہ وہی پسٹل تھا جو گرین بیلٹ والے بنگلے پر کارروائی کے لیے امتیاز نے مجھے دیا تھا۔ ازاں بعد میں نے یہ پسٹل اسے واپس دے دیا تھا۔

بوٹ بیسن سے گزرتے ہوئے دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ اس حد تک کم ہوچکا تھا کہ تعاقب کے سلسلے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ گرے جیپ سیاہ شیشوں والی پجارو تھی جس کے اندر موجود افراد کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

امتیاز نے کہا "یہ تھوڑا آگے جاکر ہمیں گھیرنے کی کوشش کریں گے۔ بوٹ بیسن کا پُررونق علاقہ گزر گیا تو پھر دور دور تک یہ سڑک تاریک اور ویران ہی ملے گی۔"

"یہ کون ہوسکتے ہیں؟" میر بخش نے سوال کیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "یقیناً ہمارے دشمن!"

پھر جیسے ہی ہماری گاڑی بوٹ بیسن سے خرکار چورنگی کی جانب بڑھی' پجارو نے ہماری گاڑی کو اوورٹیک کیا اور بریک کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ جیپ ہم سے کچھ فاصلے پر رک گئی' مجبوراً مجھے بھی گاڑی روکنا پڑی۔ اگر میں بریک لگانے میں ایک لمحے کی غفلت بھی کرتا تو خطرناک قسم کا حادثہ ہوسکتا تھا۔ پھر پجارو اس زاویے سے رکی تھی کہ سڑک تقریباً بلاک ہوکر رہ گئی تھی۔

جیپ رکتے ہی دھڑا دھڑ اس کے عقبی دروازے کھلے اور دو افراد لپک کر پجارو سے باہر آگئے۔ ان کے ہاتھوں میں "کے کے" دبی ہوئی تھیں جن کی ہلاکت خیز نال کا رخ ہماری جانب تھا۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی خود حفاظتی کارروائی کرسکتے۔ وہ دونوں گن بردار بجلی کی سی سرعت سے ہماری گاڑی کے نزدیک پہنچے پھر اپنے ہاتھوں میں موجود کلاشنکوفز کو بڑے جارحانہ انداز میں ہم پر تان لیا۔ اس کے ساتھ ہی ان میں سے ایک نے غرا کر استفسار کیا۔

"تم میں سے وجدان کون ہے؟"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ سوال کرنے والا مجھ سے صرف ایک فٹ کی دوری پر تھا۔ اس کے ہاتھ میں دبی کلاشن کے بیرل کا رخ میرے سینے کی جانب تھا اور گن بردار مارنے مرنے پر پوری طرح آمادہ نظر آتا تھا۔

ان نازک لمحات میں کلاشنکوف کے آہنی بیرل کے اندر میں نے موت کو بڑے تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھا!

گن بردار کے سوال سے عیاں تھا' وہ میرا صورت شنا نہیں ورنہ وہ میرے بارے میں استفسار نہ کرتا۔ ویسے میں نے گزشتہ ایک ماہ میں اپنے حلیے میں اتنی تبدیلی کرلی تھی کہ وہ پہلے والا وجدان نہیں دکھتا تھا۔

میرا پورا بدن تن کر ریڈ الرٹ ہوگیا اور حواس اپنی مکمل فعالیت کا مظاہرہ کرنے لگے۔ گرے پجارو ریسٹورنٹ سے ہمارے تعاقب میں یہاں تک پہنچی تھی۔ اس تاریک مقام پر ہمیں گھیرنے سے یہی ظاہر ہوتا تھا' ان کے ارادے ہرگز نیک نہیں ہوسکتے تھے پھر جیپ سے برآمد ہونے والے دونوں گن بردار خاصے جارحانہ موڈ میں دکھائی دیتے تھے۔ ان نازک لمحات میں بہت نپے تلے قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

پہلا قدم میر بخش نے اٹھایا اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولنے کے بعد وہ اچھل کر گاڑی سے باہر نکل آیا پھر اس نے گن بردار کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سینے پر زوردار ہاتھ مارا اور بڑے فخریہ لہجے میں بولا۔

"میں ہوں وجدان۔ بولو کیا کام ہے مجھ سے؟"

میر بخش کو اس سوال کا بڑا وحشیانہ جواب موصول ہوا۔ گن بردار نے بجلی کی سی سرعت سے کلاشنکوف کا بٹ میر بخش کے منہ پر رسید کرتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ "ملا! ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔ تم کسی بھی طور وجدان نہیں ہوسکتے۔"

یہ بڑی الجھی ہوئی صورت حال تھی۔ وہ لوگ مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے اور میر بخش کو وجدان ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پتا نہیں' یہ ہمارے کس قسم کے دشمن تھے۔ میں اور امتیاز گاڑی کے اندر کسی ایکشن کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

میں اس وقت اپنے نزدیکی گن بردار کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے اس مرحلے میں "جی" کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن میرے اس فیصلے پر عمل سے پہلے ہی وہ واقعہ پیش آگیا جسے میں نے عجیب کہا ہے۔ میرا ارتکاز پلک جھپکتے میں منتشر ہوکر رہ گیا۔

اچانک تاریکی میں سے کوئی سفید شے اڑتی ہوئی آئی اور کلاشنکوف بردار کے ہاتھوں پر کسی وزنی ہتھوڑے کے مانند لگی۔ گن مین بوکھلاہٹ میں کچھ بڑبڑایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی طرف گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا میں کسی خوں خوار بلی کی غراہٹ ابھری اور وہ سفید شے بھاگتی ہوئی رات کی تاریکی میں غائب ہوگئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی بلی تھی مگر۔ اس کی جسامت عام بلیوں کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی!

یہ بلی کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ان لمحات سے بھرپور استفادہ کیا اور ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آگیا۔ امتیاز نے میری تقلید کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی۔ وہ گاڑی سے نکلتے ہی اس جانب دوڑا جدھر میر بخش موجود تھا۔ میں' لڑکھڑاتے ہوئے کلاشن بردار کی سمت بڑھا۔ وہ زمین پر گرتے گرتے بچا تھا۔

بلی کی جست اور جھپٹنے والا واقعہ سیکنڈ کے دسویں حصے میں پیش آیا تھا۔ لہٰذا میر بخش کو گن کی ٹھوکر لگانے والا مسلح شخص' اپنے بڑبڑاتے ہوئے ساتھی کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ ہم دونوں نے ان دونوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس دوران میں باریش میر بخش بھی سنبھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔

میں نے سنبھلنے کی کوشش میں مصروف گن بردار کے جبڑے پر ایک دھواں دھار گھونسا رسید کیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے آگے بڑھ کر اس کی کلاشن پر ہاتھ ڈال دیا اور ایک مروڑا دیتے ہوئے اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا۔

وہ پہلے ہی اچھی خاصی تکلیف میں مبتلا تھا۔ ناف کے مقام پر گھٹنا کھانے کے بعد وہ ذبح ہوتے ہوئے جانور کے مانند ڈکرانے لگا۔ میں نے اس کی دردانگیز غفلت سے فائدہ اٹھا کر ایک جھٹکے سے کلاشنکوف کو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کرالیا۔ گن پوائنٹ پر آتے ہی وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی مجھے عجیب سا محسوس ہوا۔

"کون ہو تم لوگ؟" میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔

میرے سوال کے جواب میں اس شخص نے ایک ناقابلِ فہم حرکت کی۔ اس نے چونکنے والے انداز میں میرے عقب میں دیکھا اور تیز رفتاری سے ایک جانب دوڑ لگادی۔ ردِعمل کے طور پر میں اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ میں نے مزید اس کے پیچھے جانا مناسب نہ سمجھا اور امتیاز کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میر بخش اور امتیاز اپنے مدمقابل کو رگیدتے اور کھدیڑتے ہوئے کافی دور چلے گئے تھے۔ اس طرف اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ وہ مجھے واضح طور پر نظر تو نہیں آرہے تھے

تاہم ان کی حرکات و سکنات سے میں نے بہ آسانی ان کی سمت کا تعین کرلیا۔

دونوں گاڑیوں کے درمیان دس گز سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سیاہ شیشوں والی پجارو میں مزید کوئی شخص برآمد ہوا تھا اور نہ گاڑی نے کسی قسم کی کوئی حرکت کی تھی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ گرے پجارو آڑی حالت میں خاموش اور ساکن کھڑی تھی' جیسے وہاں ہونے والے ہنگامے سے وہ قطعی طور پر لاتعلق ہو۔

میں نے براؤن مزدا کے نزدیک آکر کلاشنکوف ساحل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے رکھ لو۔ بہ وقتِ ضرورت اس کے استعمال میں جھجکنے کی زحمت نہ کرنا۔"

ساحل نے بڑے ماہرانہ انداز میں کلاشنکوف کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے اسلحے کے ادب و آداب سے خاصی آگاہی حاصل کرچکی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس نے لب کشائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

روبی نے پوچھا "وجدان بھائی! یہ کیا چکر چل پڑا ہے؟"

"ابھی آکر بتاتا ہوں۔" میں نے سرسری انداز میں کہا اور امتیاز وغیرہ کی طرف بڑھ گیا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے جب ان کے نزدیک پہنچا تو امتیاز کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں مجھے کوئی چیز چمکتی نظر آئی۔ میں نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ وہ اسٹیل باڈی جاپانا میڈ پسٹل تھا۔ وہ گویا کسی پر فائر کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں جلدی سے آگے بڑھا۔

پھر اسی لمحے امتیاز نے اندھیرے میں فائر جھونک دیا۔ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ خاموشی اور سناٹے کے باعث گولی چلنے کی آواز کچھ زیادہ ہی گونج پیدا کرگئی۔ میں نے عقب میں پہنچ کر امتیاز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "کیا ہوا یار! تم نے کس پر فائر کیا ہے؟"

"بھاگ گیا سالا۔" وہ اندھیرے میں گھورتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا "بھگوڑا کہیں کا۔"

میں سمجھ گیا' وہ کس کا ذکر کر رہا تھا۔ "میر بخش کہاں ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"آں۔۔۔ میر بخش!" وہ چونک کر بولا پھر اندھیرے میں ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا "وہ وہاں گرا تھا۔"

"گرا تھا۔۔۔ کیا مطلب؟" میں نے امتیاز کے اشارے کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔ "میر بخش کس طرح گر گیا؟"

وہ میرے قدم سے قدم ملاتے ہوئے بولا "وہ ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔ میں اس کے پاس رکنے یا اسے دیکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں اس کم بخت' فرار ہونے والے کے پیچھے لگا ہوا تھا مگر وہ بھی ہاتھ نہ آیا۔۔۔ ایک گولی بھی خواہ مخواہ ضائع کر دی میں نے۔"

امتیاز کے لہجے میں ایک افسوس شامل تھا۔ اس دوران میں ہم دونوں میر بخش کے پاس پہنچ گئے۔ وہ اپنا دایاں بازو تھام کر دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ یہ وہی بازو تھا جس کی کہنی میں ایک ماہ پہلے فریکچر ہو گیا تھا۔ میں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر میر بخش کو کھڑا کیا اور اسے چلاتے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

گرے پجارو پر نگاہ پڑتے ہی امتیاز چونک پڑا "جگر! یہ کیا ماجرا ہے۔ یہ ابھی تک یہاں "بے حس و حرکت" کیوں کھڑی ہے؟"

"مجھے بھی اس کے قیام پر حیرت ہو رہی ہے یار۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

امتیاز نے پوچھا "وہ تمہارے والا کہاں گیا؟"

میں نے اس کے سوال کو سمجھتے ہوئے جواب دیا "وہ بھی بھاگ گیا۔۔۔ تمہارے والے کی طرح۔"

"عجیب بھگوڑے دشمنوں سے واسطہ پڑا ہے جگر؟"

"گرے جیپ کو بھگوڑا نہ کہنا دوست۔" میں نے کہا "دیکھ لو' یہ ابھی تک وہیں کھڑی ہے۔"

"اور یہ بہت تشویش کی بات ہے!" امتیاز نے سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا "تمہارے والے بھگوڑے کی کلاشنکوف کہاں ہے؟"

"چھوڑ کر بھاگ گیا۔" وہ حقارت سے بولا "گدھا' خالی گن سے ہمیں ڈرانے آیا تھا۔ میں نے اس آہنی اوزار کو جھاڑیوں میں پھینک دیا۔"

ہم دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے محتاط قدموں کے ساتھ اپنی براؤن مزدا کے قریب پہنچ گئے۔ میر بخش کی کراہوں میں شدت آگئی۔ اس کی کہنی میں شاید دوبارہ تکلیف جاگ اٹھی تھی۔ یہ بہت برا ہوا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ کی کوشش سے بہ مشکل اس کا فریکچر ٹھیک ہو پایا تھا۔

امتیاز نے سیاہ شیشوں والی گرے پجارو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ کیا معما ہے جگر؟"

"معما حل کرنے سے ہی سمجھ میں آئے گا۔" میں نے کہا "ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ فائر کی آواز بہت دور تک گئی ہے۔ یہ ایسا بھی ویران علاقہ نہیں کہ کوئی ہماری جانب متوجہ نہ ہو۔ پولیس کی کوئی گشتی گاڑی ادھر کا رخ کر سکتی ہے۔"

وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "بات تو تمہاری بالکل ٹھیک ہے جگر لیکن کیا ہم اپنی گاڑی کی جانب بڑھنے کا رسک لے سکتے ہیں۔ وہ جیپ مزدا سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے؟"

"یہ رسک تو ہم کافی دیر پہلے ہی لے چکے ہیں۔" میں نے براؤن مزدا کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے کہا "بلکہ روبی اور ساحل مستقل رسک پر ہیں مگر معلوم ہوتا ہے' گرے جیپ نے مکمل چپ سادھلی ہے۔ اس جانب سے کسی قسم کی پیش رفت سامنے نہیں آئی۔"

"واقعی جگر! یہ تو بڑے انوکھے دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔" امتیاز نے گاڑی کے نزدیک پہنچ کر کہا "میں تو سخت حیران ہوں' ان کی دشمنی کے اسٹائل پر!"

میں نے ساحل سے پوچھا "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

روبی نے کہا "ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"ہم یہی کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

پھر ہم دونوں نے مل کر میر بخش کو سہارا دیا اور بہ آہستگی اسے گاڑی کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا دیا۔ میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ امتیاز نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا۔

"آگے بڑھنے کے لیے ہمیں اس گرے جیپ کی پشت پر ایک ٹکر رسید کرنا ہو گی۔ یہ ایسے بے ہودہ انداز میں کھڑی ہے کہ راستہ بلاک ہو کر رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ گناہِ عظیم ہو گا یار۔ سوئے ہوئے کی نیند میں خلل ڈالنا کہاں کی شرافت ہے۔ تم کسی اور راستے سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"راستوں کی کمی نہیں ہے۔" وہ گاڑی کو اسٹارٹ کر کے ریورس کرتے ہوئے بولا "منزل تک پہنچنے کے دس راستے ہیں یہاں سے لیکن وہ منحوس پجارو۔۔۔؟"

روبی نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا "امتیاز! اب چھوڑو بھی اس جیپ کے ذکر کو۔ وجدان جو کہہ رہا ہے وہی کرو۔ جب اس بے چاری نے ہمیں کچھ نہیں کہا تو تم بھی اسے معاف ہی کردو تو اچھا ہے۔"

"وہی کر رہا ہوں۔" وہ مزدا کو بائیں سمت ایک اسٹریٹ میں داخل کرتے ہوئے بولا "تم واقعی ٹھیک کہتی ہو۔ اس بے چاری جیپ نے ہمیں کچھ کہا ہے اور نہ ہی اس سے برآمد ہونے والے کھوکھلے گن بردار بھگوڑوں نے۔"

لفظ "کھوکھلے" کے استعمال پر مجھے کچھ یاد آگیا۔ تھوڑی دیر پہلے امتیاز نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے مدِمقابل کی خالی کلاشنکوف جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ میں نے ساحل کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ذرا یہ گن مجھے دکھانا۔"

اس نے کلاشنکوف میری طرف بڑھا دی۔

میں نے گن سے میگزین جدا کر دیا اور اسی وقت مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ کلاشنکوف کا میگزین بالکل خالی تھا۔ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔

امتیاز نے کہا "کیا ہوا جگر' کیوں ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو؟"

"بھئی! یہ تو بڑے ہی شریف النفس دشمن واقع ہوئے ہیں۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "خالی ہتھیاروں سے ہم پر چڑھ دوڑے تھے۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ فضا ایک مخصوص قسم کے سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ وہ سائرن یقیناً پولیس کی کسی موبائل پر نصب تھا۔ وہ مخصوص آواز۔۔۔ لحہ بہ لحہ اس جانب بڑھ رہی تھی جدھر اندھیرے شیشوں والی گونگی بہری گرے پجارو کھڑی تھی۔

"ہم بروقت وہاں سے نکل آئے جگر!" امتیاز نے پُرسکون لہجے میں کہا "ورنہ پولیس والے خواہ مخواہ ہمیں پریشان کرتے۔"

میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "اس اسٹریٹ کے راستے ہم کس طرف نکلیں گے؟"

"ہم ایک دو مزید اسٹریٹ گھومنے کے بعد ہیلی پیڈ پر پہنچ جائیں گے۔ یہ مین کلفٹن کا ساحل ہے۔" امتیاز نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا "ہیلی پیڈ سے ایک سڑک خرکار چورنگی کی طرف جاتی ہے۔ ہم وہ راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔"

میں نے بہ دستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے امتیاز سے پوچھا "یہ بورڈز کس چیز کے ہیں۔ کیا اس طرف کوئی آسٹریلین ہوٹل یا ریسٹورنٹ کھلا ہے؟"

اس اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے تھوڑے فاصلے پر مجھے مخصوص بورڈز دکھائی دیے تھے جس پر "آسٹریلین کانسیپٹ" کے جلی حروف درج تھے۔

امتیاز نے بتایا "جگر! یہ ہوٹل یا ریسٹورنٹ نہیں بلکہ

اسے ایک کلینک یا اسپتال سمجھ لو۔ یہاں بے اولاد جوڑوں کا جدید ترین علاج کیا جاتا ہے۔ جس میں "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" بھی شامل ہے۔"

"اچھا اچھا۔ اب سمجھا۔" میں نے جلدی سے کہا "یہ طریقۂ علاج آج کل پوری دنیا میں بہت تیزی سے رائج ہو رہا ہے۔"

ہماری گاڑی ہیلی پیڈ پر پہنچ کر دائیں جانب مڑ گئی۔ بائیں جانب تاحد نگاہ سمندر پھیلا ہوا تھا جو رات کی تاریکی میں بہت بپھرا ہوا تھا اور وحشت ناک دکھائی دیتا تھا۔ اگلے دس منٹ میں ہم خرکار چورنگی سے گزر کر اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں داخل ہو گئے جہاں وہ فلیٹ واقع تھا جو شعیب غوری کی طرف سے میرے لیے ایک تحفہ تھا۔

○☆○

میرا ذہن مختلف سوالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا!

سوالات لاتعداد تھے اور سب کی نوعیت بھی جدا تھی۔ مثلاً گرے پجارو نے ہماری گاڑی کا تعاقب کیوں کیا؟ انہوں نے ہمیں خرکار چورنگی سے تھوڑا پہلے گھیرا مگر خالی کلاشنکوفز سے ہمیں دھمکانے کی کوشش کیوں کی؟ ایک گن بردار نے میرا نام لے کر استفسار کیا لیکن میر بخش کو وجدان ماننے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ اس کی بڑھی ہوئی سندھی اسٹائل کی داڑھی کے باعث گن مین نے اس کے چہرے پر بٹ رسید کرتے ہوئے اسے ملا کہہ کر ڈانٹا تھا' گویا وہ نہ تو میر بخش کو پہچانتے تھے اور نہ ہی میری شکل سے واقف تھے پھر وہ مجھے کیوں پوچھ رہے تھے؟ یہ بات تو طے ہے' وہ ہمارے دوست ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا اچانک سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑے ہونے والا عمل بھی کچھ کم احمقانہ اور حیرت انگیز نہیں تھا اور۔۔۔ گرے جیپ کی مسلسل "خاموشی" بھی کسی معمے کی طرح تھی۔ سڑک پر اس کا "بے حس و حرکت" قیام یہی ظاہر کرتا تھا کہ پجارو میں صرف دو ہی افراد تھے جو کلاشنکوفز اٹھائے ہماری جانب بڑھے تھے۔

یہ بات میرا ذہن کسی بھی طور ماننے کو تیار نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا' جب وہ گرے پجارو ٹائروں کی چرچراہٹ کے ساتھ رکی تھی تو اس کے دونوں طرف کے عقبی دروازے کھلے تھے جہاں سے کلاشنکوف بردار برآمد ہوئے تھے۔ اس کا واضح مطلب تو یہی تھا کہ پجارو میں کم از کم ... ایک شخص اور موجود تھا جو اس جیپ کو ڈرائیو کر کے وہاں تک پہنچا تھا۔ عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے افراد گاڑی ڈرائیو نہیں کر سکتے تھے۔ اگر پجارو کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی ڈرائیور موجود تھا تو پھر اس مارا ماری اور افراتفری کی کارروائی کے دوران میں اس شخص نے کسی قسم کے ردعمل کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا؟ خاص طور پر اس وقت جب ہم صحیح سلامت اور محفوظ انداز میں وہاں سے فرار ہو رہے تھے۔ وہی وقت تھا جب فضا پولیس والوں کے سائرن سے گونج رہی تھی۔ یہ ایسا اطمینان بخش اور سکون آور موقع نہیں تھا کہ چپ چاپ دم سادھے وہ ڈرائیور پجارو میں بیٹھا رہتا۔ اس کا عمل غیر فطری تھا۔۔۔ اور میرے ذہن کو الجھا رہا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے پہلو میں کچھ فاصلے پر ساحل گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اس وقت رات کے لگ بھگ تین بجے تھے مگر انہی سوچوں کے باعث مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں کنگ سائز ڈبل بیڈ سے نیچے اتر آیا' اور سلائیڈنگ ڈور کے قریب کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔

سمندر اس وقت خاصی موج میں تھا۔ رات کی تاریکی میں' سمندر کی سطح پر دور' بہت دور بحری جہازوں کی بتیاں جھلملاتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ جہاز میلوں کے فاصلے پر اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ میں سمندر کی سطح کو کافی دیر تک موجیں اچھالتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس وقت رات کے سناٹے نے ان موجوں کی آواز میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ اگرچہ سلائیڈنگ ڈور بند تھا تاہم پھر بھی پانی کے اچھال کی مہیب آواز ہمارے بیڈ روم میں پہنچ رہی تھی۔ سلائیڈنگ ڈور کھلا ہونے کی صورت میں سونا شاید ممکن نہ رہتا۔ سمندر کی مخصوص آواز اور تیز ہوا کی سرسراہٹ نیند میں خلل کا باعث بن سکتی تھی۔

میں بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آ گیا۔ یہ فلیٹ بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر واقع تھا اور اس کا نمبر آٹھ سو ایک تھا۔ وہاں ہر فلور پر صرف دو فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اس فلیٹ کا رقبہ سو گز سے زیادہ نہیں تھا۔ جس پر دو بیڈ روم' ایک ڈرائننگ روم اور ایک کشادہ لاؤنج بنایا گیا تھا۔ اس لاؤنج میں بیٹھنے کے لیے صوفہ سیٹ اور سینٹر ٹیبل بھی موجود تھی۔ وہ لاؤنج گویا ڈرائنگ روم کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بیڈ رومز میں ایک چھوٹا اور دوسرا قدرے کشادہ تھا جہاں اس وقت ساحل سو رہی تھی۔ کچن' اس بیڈ روم اور ڈرائننگ روم کے درمیان واقع تھا۔ دونوں بیڈ رومز میں سمندر کے سامنے سلائیڈنگ ڈور لگے ہوئے تھے جن سے آگے ایک خوبصورت گیلری بھی بنی ہوئی تھی۔

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی میری نگاہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی

جانب اٹھ گئی۔ میں اسٹینڈ کے نزدیک بچھے صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچانک میرے ذہن میں امتیاز کو فون کرنے کا خیال آیا تھا۔ اس خیال کی تحریک میری یادداشت میں محفوظ ایک منظر نے دی تھی۔ جب میں نے کلاشنکوف بردار شخص سے گن چھین کر اسے ٹارگٹ بنایا تھا تو اس کے چہرے پر ابھرنے والی وحشت نے مجھے چونکا دیا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔ کب؟ کہاں؟۔۔۔ یہ سب کچھ سوچنے اور جاننے کا وہاں وقت تھا اور نہ ہی موقع لیکن اس وقت وہ چہرہ دوبارہ میری یادداشت سے نکل کر سامنے آ گیا تھا اور مجھے شک ہو رہا تھا' میں نے اس شخص کو "ساؤتھ" میں دیکھا ہے۔ اپنے اسی شک کی تصدیق یا تردید کے لیے میں امتیاز کو فون کرنا چاہتا تھا۔

امتیاز اور روبی ہمیں بہ حفاظت فلیٹ پر پہنچا کر واپس چلے گئے تھے۔ میں نے انہیں روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور یہ رات اپنے پاس گزارنے کا مشورہ بھی دیا تھا لیکن امتیاز نہیں مانا۔ اس نے اپنی بعض تنظیمی مجبوریوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جگر! مجھے ہر حال میں اپنے فلیٹ پر پہنچنا ہے۔ رات کے آخری پہر ممکن ہے' باس مجھ سے رابطہ کرے۔ تم تو سمجھتے ہو۔۔۔ باس از باس!"

میں اس کی مجبوری سمجھ گیا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر تم ضرور جاؤ۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اور جاتے جاتے میرا بھی ایک ضروری کام کرتے جاؤ۔"

"حکم کرو جگر! تمہارے لیے دل و جان حاضر ہے۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا تھا۔

میں نے بھی مزاح کے انداز میں کہا "فی الحال تمہارے دل و جان کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں چیزیں کسی جانِ من قسم کی شخصیت کے لیے۔

وہ قدرے جھینپ گیا اور کن انکھیوں سے روبی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے میر بخش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارا ساتھی اس وقت سخت تکلیف میں ہے۔ اس کی کہنی والے فریکچر میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یہاں فوری طور پر اسے طبی امداد بہم نہیں پہنچائی جا سکتی۔ تم ایسا کرو' میر بخش کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ڈاکٹر فیروز کے اسپتال میں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کی سہولت موجود ہے۔ تم اپنے فلیٹ جانے سے پہلے اسے اسپتال دکھا دینا۔ یہ کل آرام سے ہمارے پاس آ جائے گا۔"

"تمہارا مشورہ اور تجویز بالکل درست ہے۔" امتیاز نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

پھر وہ تینوں اس فلیٹ سے رخصت ہو گئے تھے۔

میں یہ سب سوچتے ہوئے طارق روڈ والے فلیٹ کے نمبرز ڈائل کرنے لگا۔ امتیاز وغیرہ لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے فلیٹ سے گئے تھے۔ میرے خیال میں انہیں اب تک اسپتال سے ہو کر واپس فلیٹ پہنچ جانا چاہیے تھا۔

ڈائلنگ مکمل ہونے کے بعد گھنٹی بجنے لگی پھر وہ گھنٹی بجتی چلی گئی۔ دوسری جانب سے کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید میں نے نمبرز ڈائل کرنے میں کوئی گڑبڑ کر دی ہو۔ اس فون میں "ری ڈائل" اور "سی ایل آئی" وغیرہ کی سہولیات موجود نہیں تھیں لہٰذا میں نے سنبھل سنبھل کر وہ نمبرز دوبارہ ڈائل کیے مگر نتیجہ پہلے والا برآمد ہوا۔ آخر مایوس ہو کر میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

امتیاز وغیرہ کی طرف سے ایک بے نام الجھن نے میرے ذہن کو گھیر لیا جس میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ اسے اس وقت گھر پر ہونا چاہیے تھا کیوں کہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ رات کے آخری پہر باس سے اس کی ضروری بات ہونے والی تھی اور اس وقت رات کا آخری پہر ہی چل رہا تھا۔

میرے دل میں ایک مرتبہ پھر ڈائل کرنے کی خواہش نے سر ابھارا۔ میں نے گود میں رکھے ہوئے فون کی جانب ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید دوسری جانب امتیاز ہو' ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

ایک مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! یہ میں ہوں' شعیب غوری۔"

"ہاں' میں نے پہچان لیا۔" میں نے کہا "خیریت' اس وقت فون کی نوبت کیسے آ گئی؟"

"خیریت نہیں ہے وجدان!" شعیب غوری گمبھیر آواز میں بولا "تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔۔۔ بہت ہی بری!"

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا "کیسی بری خبر شعیب؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "امتیاز کو ایک حادثہ پیش آ گیا ہے۔"

"حادثہ۔۔۔ کس قسم کا حادثہ؟" میں بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا "وہ تینوں یہاں سے تو ٹھیک ٹھاک گئے تھے۔"

"مگر اب وہ ٹھیک ٹھاک نہیں رہے۔"
"اس حادثے کی تفصیل کیا ہے شعیب؟"
"ان تینوں کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔"
"کیا؟" میں سناٹے میں رہ گیا۔

دوسری جانب شعیب غوری اس المناک واقعے کی تفصیل سنا رہا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ذہن دھواں دھواں ہو رہا ہو۔ شعیب کی آواز دور کسی گہرے کنوئیں سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میری طرف سے کامل خاموشی پا کر شعیب نے پوچھا "وجدان! تم میری بات سن رہے ہو نا؟"

"ہاں' میں سن رہا ہوں۔" میں نے اپنی جگہ حاضر ہوتے ہوئے کہا۔

وہ بتانے لگا "آج رات دو بجے میں نے چند ضروری امور پر امتیاز سے تفصیلی بات کرنا تھی۔ اس نے تمہارے فلیٹ سے رخصت ہونے کے بعد مجھے فون پر تمہارے یہاں بہ حفاظت پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی لیکن جب میں نے ٹھیک دو بجے طارق روڈ والے فلیٹ پر فون کیا تو وہاں کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس کوشش میں جب مجھے مسلسل ناکامیابی ہوئی تو میں نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے کچھ چھان بین کی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے معلوم ہوا ہے کہ لگ بھگ رات ایک بجے گورا قبرستان کے نزدیک' امتیاز کی براؤن مزدا پر زبردست فائرنگ کی گئی ہے جس کے نتیجے میں وہ تینوں گاڑی کے اندر ہی ہلاک ہو گئے۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر وزنی ہتھوڑے سے ایک شدید ضرب لگائی ہو۔ میر بخش نے بڑے کٹھن اور صبر آزما لمحات میں میرے کندھے سے کندھا ملا کر دشمنوں کا پتا پانی کیا تھا۔ امتیاز اور روبی بھی میری زندگی میں بہت اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ بہت کم عرصے میں وہ بڑی سرعت سے میرے دل میں اتر گئے تھے۔ میں اس جذباتی نقصان کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ نقصان وجدان اور "سی ایف کے" کو مشترکہ طور پر پہنچایا گیا تھا۔

میں نے غم و غصے کی ملی جلی کیفیت کے درمیان کہا "شعیب! تمہاری تفتیش سے حملہ آوروں کے بارے میں بھی کچھ پتا چلا؟"

"میں اپنے ان دشمنوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "فی الحال صرف اتنا ہی پتا چلا ہے' ان پر فائرنگ ایک تیز رفتار جیپ سے کی گئی تھی جس کا رنگ گرے بتایا جاتا ہے۔"

میں گرے جیپ کے ذکر پر اچھل کر رہ گیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "کیا وہ گرے جیپ پجارو تھی؟"

"ہاں' بالکل پجارو ہی سے ان پر گولیوں کی برسات کی گئی ہے۔" شعیب نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا "وجدان! تمہیں کیسے پتا چلا' وہ جیپ پجارو ہو سکتی ہے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "شعیب! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے کہ امتیاز نے میرے فلیٹ سے رخصت ہونے کے بعد تم سے فون پر بات کی تھی؟"

"ہاں' میں نے یہی بتایا ہے۔" وہ بولا "کیوں' کوئی خاص بات ہے؟"

میں الجھ کر رہ گیا۔ شعیب کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا' امتیاز نے اسے بوٹ بیسن والے واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا "ہاں شعیب! بات تو خاص ہی ہے۔"

"کہو۔۔۔ جلدی کہو۔" وہ بے تابی سے بولا "کیا تمہاری بات سے امتیاز' روبی اور میر بخش کے قاتلوں تک پہنچنے میں کوئی راہ نمائی مل سکتی ہے؟"

میں نے ٹھہرے ہوئے مگر غم زدہ لہجے میں کہا "میرے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے۔ دراصل ریسٹورنٹ سے نکل کر اس فلیٹ کی طرف آتے ہوئے راستے میں ہمارے ساتھ ایک سنگین اور ناقابل فہم واقعہ پیش آ گیا تھا۔ جس میں ایک گرے کلر پجارو جیپ نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔" بات کے اختتام پر میں نے اس سے سوال کیا "کیا امتیاز نے فون پر تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے مختصر الفاظ میں شعیب غوری کو اس عجیب غریب واقعے کے متعلق بتایا۔ میری بات مکمل ہونے پر اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے وجدان! اس قسم کے دشمن میں نے پہلے کبھی دیکھے ہیں اور نہ ان کے بارے میں کہیں سنا ہے جو خالی گنوں کے ساتھ یوں کارروائی کریں اور پھر موقع پا کر فرار بھی ہو جائیں۔ خاص طور پر تم نے جیپ کے حوالے سے جو کچھ بتایا ہے' وہ ناقابل یقین لگتا ہے۔" ایک لمحے کو وہ خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ویسے میرے لیے سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امتیاز نے اتنے بڑے واقعے کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ وہ تو معمولی سے معمولی بات بھی مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔"

میں نے کہا "ہاں' یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی!"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "وجدان! میں نے کسی طرح فائرنگ کرنے والی گرے پجارو کا نمبر معلوم کر لیا ہے۔ کیا تمہارے ذہن میں تم لوگوں کا تعاقب کرنے والی جیپ کا نمبر موجود ہے؟"

"ہاں' موجود ہے۔" میں نے بے دھڑک کہا "وہ نمبر تو گویا میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا ہے۔ تعاقب کے دوران میں متعدد بار پجارو کی نمبر پلیٹ پر میری نگاہ پڑی تھی پھر جائے واردات پر خاموش کھڑی اس جیپ کو بھی میں نے بہت غور سے دیکھا تھا۔"

وہ ہیجان خیز انداز میں بولا "وجدان! پہلی فرصت میں اپنے ذہن سے چپکے ہوئے اس نمبر کو کھرچ کر میری طرف اچھال دو۔"

میں نے نہایت ہی سکون سے پجارو کی نمبر پلیٹ پر درج ہندسے زبان سے ادا کر دیے "تھری' ون' فائیو' ون۔"

"ایگزیکٹلی!" وہ پُرجوش لہجے میں تقریباً چیخ کر بولا "یہی نمبر ہے۔ بالکل یہی نمبر ہے اس گرے پجارو کا جس نے ہمارے ساتھیوں پر فائرنگ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ میں چھوڑوں گا نہیں۔۔۔ بڑی عبرت ناک سزا دوں گا انہیں۔ تم دیکھ لینا وجدان! میں بہت جلد اس جیپ کے مالک تک پہنچ جاؤں گا۔ اس بدبخت اور اس کے بدطینت ساتھیوں کی گردنیں آہنی شکنجوں میں کس کر رکھ دوں گا۔"

وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے کہا "شعیب! یہ بھی تو ہو سکتا ہے' وہ پجارو چوری کی ہو اور اس کے اصل مالک کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ اس کی جیپ کس نوعیت کی سنگین وارداتوں میں ملوث ہو چکی ہے؟"

"ہاں' ایسا ممکن ہے۔" وہ قدرے سنبھل کر بولا "حقیقت جو بھی ہے' بہت جلد سامنے آ جائے گی۔ میں کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنے بے گناہ ساتھیوں کے قاتلوں تک پہنچ جاؤں گا وجدان!"

میں نے دکھی لہجے میں اس سے اپنے ساتھیوں کی وقوع پذیری کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا پولیس ان تینوں کی لاشوں کو ایک سرکاری اسپتال میں پہنچا دیا ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد پولیس وہ لاشیں ورثا کے سپرد کر دے گی۔

"ورثا۔۔۔!"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شعیب غوری میری بات کی تہ تک پہنچ گیا' میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے تسلی آمیز انداز میں کہا "تم فکر نہ کرو۔ ان تینوں کی تجہیز و تکفین بڑے مناسب طریقے سے ہو گی۔ میں صبح ہی اس بندوبست میں لگ جاؤں گا۔ ہمارے مخلص ساتھی لاوارث افراد کی طرح دفن نہیں کیے جائیں گے۔"

"میں بھی ان کی تدفین میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

شعیب غوری بولا "ضرور۔۔۔ ضرور۔ میں تمہیں بروقت اس کی اطلاع دے دوں گا۔ میں خود تمہارے ساتھ قبرستان چلوں گا وجدان لیکن ہمیں اپنے حلیوں میں مناسب تبدیلی کرنا ہو گی کیوں کہ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہاں ہمارے دشمنوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور موجود ہو گا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شعیب۔" میں نے اس کی تائید کی "ایسا ہو سکتا ہے۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "تمہیں میں یہی مشورہ دوں گا کہ تم دونوں اپنے فلیٹ سے باہر قدم نہ نکالنا۔ جب تک کہ میرا ڈرائیور تمہیں لینے خود وہاں نہ آ جائے۔ میں عین وقت پر ڈرائیور بھیج کر تم دونوں کو منگوالوں گا پھر ہم ایک ساتھ قبرستان جائیں گے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "وجدان! یہ نہ سمجھنا کہ میں خدانخواستہ تم پر کوئی پابندی عائد کر رہا ہوں۔ میں یہ تمام انتظام حفاظت اور احتیاط کے پیش نظر کر رہا ہوں۔ ان تینوں کے بعد دشمن اب تم دونوں کی تاک میں ہوں گے۔"

میں نے اس کی تجویز پر کوئی اعتراض اٹھائے بغیر ایک اہم نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہا۔ "شعیب! جب ہم اپنے ساتھیوں کے ورثا کی حیثیت سے ان کی تدفین میں شریک ہوں گے تو بھی دشمن ہماری جانب متوجہ ہو سکتے ہیں!"

"میں نے کہا نا' میں اس سلسلے میں بہت محفوظ بندوبست کروں گا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا "ہم دونوں کی شرکت سے یہ ظاہر نہیں ہو گا کہ ہمارا تعلق براہ راست ان تینوں سے ہے۔ تم اس بارے میں ذہن کو نہ الجھاؤ۔ میں ہوں نا!"

شعیب غوری نے اتنی اپنائیت سے "میں ہوں ناں!" کہا کہ میرا ذہن قدرے مطمئن ہو گیا۔ اسی وقت میرے ذہن میں اس گن بردار کا حلیہ بھی روشن ہو گیا جس کے ہاتھوں سے میں نے کلاشنکوف چھینی تھی۔

میں نے شعیب غوری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دوست! میرے ذہن کے جس حصے پر گرے پجارو کا نمبر چپک کر رہ گیا تھا وہیں ایک چہرہ بھی چسپاں ہے۔ اور وقفے وقفے سے میری سوچ کو منتشر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"کیسا چہرہ وجدان؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے بتایا "بوٹ بیسن والے واقعے میں' میں نے جس کلاشنکوف بردار سے اس کی گن چھینی تھی' اس شخص کا چہرہ۔"

وہ زود فہم انسان فوراً میری بات کی تہ تک پہنچ گیا اور پوچھنے لگا "کیا تم نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے؟"

"میں کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟"

"میرا خیال ہے' ساؤتھ میں۔" میں نے بتایا۔

"کیا کہہ رہے ہو وجدان؟" وہ متعجب انداز میں بولا۔

میں نے کہا "مجھے خود حیرت ہے اسی لیے تو سوچ سوچ کر الجھ رہا ہوں۔"

"وجدان! میرے ٹھکانوں کا کوئی آدمی اس قسم کی کارروائی میں شامل نہیں ہو سکتا۔" وہ پُروثوق انداز میں بولا "ممکن ہے' تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو!"

میں نے الجھن آمیز تائیدی انداز میں کہا "خدا کرے' یہ میری غلط فہمی ہی ہو۔ بہرحال' میں نے جو کچھ محسوس کیا وہ من و عن تم تک پہنچا رہا ہوں کیوں کہ میں تمہیں اپنا سچا دوست سمجھتا ہوں۔"

"مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے وجدان!" وہ سنجیدگی سے بولا "اور اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے اپنے دلی جذبات اور محسوسات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔" وہ چند لمحات کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری بات کو نظرانداز کر کے خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔ تم مجھے اس گن بردار کا حلیہ بتاؤ۔ صرف "ساؤتھ" ہی نہیں بلکہ میں اپنے تمام ٹھکانوں کے آدمیوں کو خاموشی سے چیک کروں گا۔ اگر تمہارا مطلوبہ بندہ ہاتھ آ گیا تو اس سے بھی "ڈائیلاگ" کر لیں گے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

شعیب نے لفظ "ڈائیلاگ" پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔

میں نے کہا "اچھی طرح سمجھ رہا ہوں شعیب۔"

وہ بولا "دنیا کا کوئی ایسا ادارہ یا محکمہ نہیں جس میں کالی بھیڑیں موجود نہ ہوں۔ ممکن ہے' میرے کیمپ میں بھی کوئی بچھو پرورش پا رہا ہو۔"

میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے "شعیب' ویسے تمہارے خیال میں ہمارے کس دشمن نے کارروائی کی ہو گی؟"

"مجھے نوّے فیصد تو یہی امید ہے کہ میاں زاہد حسین نے شیر کے جبڑے میں ہاتھ دینے کی کوشش کی ہے" ... سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا "پچھلے دنوں' ہم نے اسے ... سے نقصانات پہنچائے ہیں۔ وہائٹ شیر ڈوالے تین افراد کی عبرت ناک موت' ہوٹل میں ہونے والی مارا ماری ... کے باہر گرے سوزوکی ایف ایکس والے دو نقلی پولیس والوں کا ہولناک انجام' پھر گرین بیلٹ والے بنگلے پر ... کے ساتھ جو "شاندار" سلوک کیا گیا ہے۔ اس میں ... دونوں کا بھرپور ہاتھ رہا ہے۔ چنانچہ یہ عین ممکن ہے' وہ ... شب خون مارنے کی تاک میں رہا ہو اور... آج رات یہ موقع اسے مل گیا۔"

میں نے کہا "میرا ذہن بھی گھوم پھر کر میاں زاہد کی طرف جا رہا ہے۔"

"تم مجھے اس شخص کا تفصیلی حلیہ بتاؤ۔" شعیب نے دوبارہ پوچھا۔

میں نے کہا "قد لگ بھگ پانچ فٹ دس انچ' جسم ... بہ فربہی' چہرہ کرخت' رنگ سانولا اور ہلکی مونچھیں۔"

"یہ ایک عام سا حلیہ ہے۔" وہ سرسری انداز میں ... "بہرحال' میں اسے اپنے کیمپ میں تلاش کرنے کی ... کوشش کروں گا۔" پھر اس نے مجھ سے استفسار کیا "ہم ... کے بارے میں میری تجاویز کو ذہن میں رکھو گے نا!"

"ہاں!" میں نے اثبات میں جواب دیا "جب تک تمہارا ڈرائیور ہمیں لینے نہیں آئے گا' ہم اس فلیٹ سے ... قدم بھی نہیں نکالیں گے۔"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "وجدان! یہ زندگی ... اور خوشی کا مرقع ہے۔ کبھی خوشی' کبھی غم۔ تم تو میری بات ... اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ تم نے بھی بڑی ہنگامہ خیز زندگی ... گزاری ہے۔ آگ کے دریا کو پار کرتے ہوئے یہاں ... پہنچے ہو۔" وہ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد بولا ... اپنے ساتھیوں کی اندوہناک موت کا یقیناً بہت دکھ ... اس صدمے کو اپنی اپنی برداشت کے مطابق ... اس کے ساتھ ہی زندگی کے چکر میں کسی قسم کا ... نہیں ہونے دیں گے۔ کل جب میرا ڈرائیور ... آئے تو ڈائری کے وہ اہم ترین صفحات اپنے پاس ... بھولنا!"

شعیب کی باتوں سے سفاکی ٹپکتی تھی لیکن وہ مجھے باتیں ... ظاہری نہیں لگیں کیوں کہ وہ زندگی کی حقیقت بیان کر رہا ... تو۔ میں بھی اسی سوچ کا حامل تھا کہ سکھ دکھ کے سائے میں زندگی کے پہیے کو مسلسل حرکت میں رہنا چاہیے۔

"تم فکر نہ کرو شعیب۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں نے تم سے یہی کہا تھا نا' کل وہ صفحات میں تمہارے حوالے کر دوں گا تو اس کا ہرگز یہی مطلب تھا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔"

آگے پیچھے کے دو صفحات پر مشتمل ڈائری کا وہ نہایت ہی قیمتی ورق ہر وقت میری پینٹ کی ایک خفیہ جیب میں موجود رہتا تھا۔ میں نے دانستہ شعیب سے دوسرے دن کا وعدہ کیا تھا۔ اگر میں چاہتا تو اسی ملاقات کے دوران میں وہ ورق اس کے حوالے کر سکتا تھا۔

"اوکے!" شعیب ٹیلی فونک گفتگو کو ختم کرتے ہوئے بولا "اب تم سو جاؤ۔ کل کا دن بہت ... ہے ہمارے لیے۔"

"مجھ بھی... اور رف بھی۔" میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

پھر ہمارے درمیان وہ رابطہ ختم ہو گیا۔

٭

حالت نیند میں ساحل کی معصومیت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ میں واپس بیڈ روم میں آیا تو وہ بہ دستور سو رہی تھی۔ وہ لگ بھگ ڈیڑھ بجے سو گئی تھی اور اس وقت چار بجنے والے تھے۔ شعیب سے فون پر ہونے والی گفتگو میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

میں جن جذباتی اور صدماتی کیفیات سے گزر رہا تھا ان میں کسی قسم کے رومانس کی گنجائش نہیں تھی لیکن ساحل کے نزدیک پہنچتے ہی میرا دل بے طرح مچل اٹھا۔ وہ بڑی بے فکری اور سکون کی نیند سو رہی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ جی بھر کر اسے پیار کروں۔ پتا نہیں' پچھلے کچھ دنوں سے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ساحل کے پاس پہنچتے ہی میں بے اختیار ہو جاتا تھا۔ ساحل کے اندر کوئی ایسی شے ضرور موجود تھی جو مجھے کمزور بنا دیتی تھی یا یوں کہہ لیں' وہ دھیرے دھیرے میری کمزوری بنتی جا رہی تھی۔

میں پیشانی چومنے کے لیے اس کے چہرے پر جھکا ہی تھا یک بارگی اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا' وہ پہلے سے جاگ رہی تھی' بس آنکھیں بند کیے سوتی بنی ہوئی تھی یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا' میری گرم سانسوں کے لمس نے اسے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ ان لمحات میں' میرے تنفس میں جہنمی حدت سرایت کر گئی تھی۔

ساحل کی آنکھیں کھولنے پر میں گڑبڑا کر پیچھے ہٹا تو وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "پانی... مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی ہے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر بیڈ سے نیچے اتر آیا پھر فریج میں سے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا کر ساحل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس دوران میں وہ اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

اس نے ایک ہی سانس میں ٹھنڈا پانی اپنے حلق میں انڈیلا پھر میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولی "کیا بات ہے وجدان! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

وہ گہری لڑکی میری فکرمندی کو بھانپ گئی تھی۔ میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "کچھ نہیں ساحل! میں اس وقت بہت زیادہ پریشان ہوں... بلکہ غم زدہ اور دکھی ہوں۔"

"کیا ہوا... کیا ہو گیا وجدان؟" وہ بے پناہ اضطرار کے ساتھ بولی۔

"تمہارے لیے ایک بہت ہی بری خبر ہے میرے پاس۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا "تمہارے لیے اس طرح کہہ رہا ہوں کہ میں وہ خبر پہلے ہی سن چکا ہوں۔"

وہ بے چینی سے بولی "کچھ بتاؤ بھی تو سہی۔" پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "لارڈ بدھا خیر کرے۔"

اگلے دس منٹ میں' میں نے ساحل کو اپنے ساتھیوں کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے کے بارے میں بتایا۔ میر بخش اور روبی سے اس کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ امتیاز بھی ہمارا مخلص دوست تھا۔ ہم درد اور جاں نثار دوستوں کی موت پر جتنا دکھی انسان کو ہونا چاہیے' ساحل اس حقیقی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ میں نے اسے شعیب غوری سے ہونے والی گفتگو اور گرے پجارو کے بارے میں بتایا۔ شعیب کی طرح ساحل کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ حملہ میاں زاہد حسین کی کارستانی ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "زیادہ امکانات تو اسی بات کے ہیں لیکن میرا ذہن گرے جیپ کے غیر منطقی اور ان نیچرل "رویے" پر اٹکا ہوا ہے۔ بوٹ بیسن کے نزدیک جو کچھ ہوا' وہ میرے حلق سے نہیں اتر رہا۔ اگر گرے پجارو والے میاں زاہد کے بھیجے ہوئے تھے تو ان کا بھگوڑا پن سمجھ سے باہر ہے۔"

"وجدان! بوٹ بیسن والی سڑک پر آج رات جو کچھ پیش آیا اس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کی توجیہہ فی الحال نظر نہیں آتی۔" ساحل نے گمبھیر لہجے میں کہا "تم ایک

گرے جیپ پر ہی کیوں الجھ رہے ہو؟"

ساحل نے یہ سوال ایسے انداز میں کیا تھا کہ میں چونک اٹھا پھر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

وہ مزید سنجیدہ ہو گئی "کیا تم اس سفید بلی کو بھول گئے؟"

ساحل کے اس سوال نے میرے رگ و پے میں ایک کرنٹ سا دوڑا دیا اور نگاہ کے سامنے اس جھپٹا مار سفید بلی کا سراپا ابھر آیا جس نے کلاشنکوف بردار کے حواس کی ایسی کم تیسی کر دی تھی۔ وہ آنِ واحد میں تاریکی سے نمودار ہوئی تھی اور اپنا "کام" کر کے پلک جھپکتے میں تاریکی ہی کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کا یہ کام ہمارے لیے نہایت مفید ثابت ہوا تھا۔

ساحل کے یاد دلانے پر مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں اب تک اس غیر معمولی جسامت کی بلی کو کیوں بھولا ہوا تھا۔ ممکن ہے' یہ حالات کا اثر ہو۔ بوٹ بیسن والی اس سڑک پر ہم ہنگامی صورتِ حال سے گزرے تھے اور فلیٹ پر پہنچنے کے بعد بھی میر بخش کی کہنی ہی زیرِ بحث رہی تھی۔۔۔ اور اس کے بعد تو شعیب غوری کی کال نے میرے ذہن کو وہ زیروزبر کیا تھا کہ میں کسی اور شے کے بارے میں سوچنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اسی ذہنی پراگندگی میں وہ فربہ متعاون بلی میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں کہا "ہاں واقعی' میں تو اس بلی کو بھول ہی گیا تھا۔ پتا نہیں' وہ بلی تھی بھی یا۔۔۔!"

میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر اس بلی کے تصور میں کھو گیا۔ وہ مہربان دوست بلی کسی صحت مند کتے کی جسامت رکھتی تھی۔ اس کی جھپٹ میں چیتے کی لپک اور غراہٹ میں شیر کا دبدبہ تھا۔ میں اس عجیب و غریب بلی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ساحل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بلی کے ذکر کو موقوف کر کے اصل موضوع کی طرف آ گئی تھی۔

"وجدان! ہمارے ساتھیوں کی المناک موت کسی جاں گسل صدمے سے کم نہیں۔ آئندہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟"

میں جذباتی ہو گیا "ساحل! میں ان تینوں کے قاتلوں سے بہت بھیانک انتقام لوں گا۔ ایک بار وہ میرے ہتھے چڑھ جائیں پھر تم دیکھنا' میں ان کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"وہ ہتھے کیسے چڑھیں گے؟"

"شعیب گرے پجارو کی مدد سے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔" میں نے کہا "اسے جیپ کا نمبر معلوم ہو چکا ہے۔ بہت جلد وہ اصل مجرموں تک پہنچ جائے گا۔"

ساحل نے پوچھا "وجدان! کیا ہم ان قاتلوں کے سراغ کے لیے شعیب غوری پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں؟"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا "شعیب ایک مخلص دوست ثابت ہو رہا ہے۔ اس شہر میں اس کا ایک فعال نیٹ ورک کام کر رہا ہے۔ ظاہر ہے' وہ ہماری بہ نسبت زیادہ ذرائع کا مالک اور واقف ہے۔ اس کی مدد لینے میں کوئی حرج نہیں۔" میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بولا "ویسے میں بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا نہیں رہوں گا۔ اپنے طور پر بھی بھرپور کوشش کروں گا۔"

ساحل چند لمحات تک خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی "شعیب دوبارہ رابطہ کب کرے گا؟"

"میرا خیال ہے' دس بجے کے بعد۔" میں نے کہا "ابھی تو اس نے مجھے سونے کا مشورہ دیا ہے اور یقیناً وہ خود بھی سو گیا ہو گا۔"

"تو پھر تم سونے کی کوشش کرو۔" وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولی "تھوڑی نیند لے لو تاکہ فریش ہو جاؤ۔ میں نے کافی نیند لے لی۔"

"کافی۔۔۔!" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "ڈھائی گھنٹے میں تمہاری نیند پوری ہو گئی؟"

"ہاں' ہو گئی۔" وہ سنجیدگی سے بولی "تم تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوئے ہو؟"

میں نے بوجھل آواز میں کہا "مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"تم بہت ذہنی دباؤ میں ہو۔" وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

"یہ موقع ہی ایسا ہے ساحل۔" میں نے ملول لہجے میں کہا "میں کوشش کے باوجود بھی سو نہیں پاؤں گا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "اگر تمہیں اب مزید نہیں سونا تو فوراً تیار ہو جاؤ' ہم باہر جا رہے ہیں۔"

"باہر۔۔۔!" اس نے چونک کر مجھے دیکھا "کیا کرنے کا ارادہ ہے وجدان۔ کہیں کوئی الٹا سیدھا قدم اٹھانے کا فیصلہ تو نہیں کر لیا!"

میں نے گہری نظر سے ساحل کو دیکھا۔ کچھ عرصے سے اس کے مزاج اور رویے میں جو تبدیلی آئی تھی' اس میں ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس کا انداز استانیوں والا ہو گیا تھا۔ اس کی ایسی ادائیں میرے دل کو بھاتی تھیں

اس لیے بھی کہ پچھلے چند ماہ سے کوئی مجھے روکنے ٹوکنے والا نہیں رہا تھا۔ بہرحال' اس کی روک ٹوک سے مجھے خاصی تقویت ملتی تھی۔

میں نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا "یہ تو قدم ڈالنے کے بعد پتا چلے گا' وہ الٹا پڑا یا سیدھا۔ فی الحال' میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل نہیں۔ جو بھی سوچنا ہے' باہر جا کر ہی سوچوں گا۔ فلیٹ کے اندر مجھے بہت گھٹن کا احساس ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم تھوڑی دیر باہر ٹہل آتے ہیں۔" وہ نیم رضامند ہوتے ہوئے بولی "ساحل کی ٹھنڈی ریت پر چہل قدمی ہمارے ذہنوں کو سکون دے گی۔"

"ساحل کی ٹھنڈی ریت!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا "ٹھیک کہہ رہی ہو' ساحل کی ٹھنڈک ذہنی سکون کے لیے بہترین شے ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے' دلی سکون کے لیے یہ اس سے بھی زیادہ مفید ہوتی ہے۔"

اس نے ایسی نگاہ سے مجھے دیکھا جیسے بیان کرنے کے لیے دفتر درکار ہیں پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور واش روم میں گھس گئی۔

میں ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بیڈ روم میں آ گیا۔ یہ کمرا نسبتاً چھوٹا تھا اور اس میں بھی اٹیچ باتھ کی سہولت موجود تھی۔ اس بیڈ روم میں سنگل بیڈ بچھا تھا۔ میر بخش نے اپنے لیے اس کمرے کا انتخاب کیا تھا مگر اسے ایک رات بھی یہاں گزارنا نصیب نہیں ہوئی تھی اور وہ دو رہائشوں کے بیچ میں مارا گیا تھا۔ میر بخش کی یاد سے میرا دل غم و غصے سے بھر گیا۔ غم میر بخش کے لیے تھا اور غصہ اس کے قاتلوں پر۔

میں نے ایک جھٹکے سے واش روم کا دروازہ کھولا اور آنکھوں کو نیند سے بچانے کے لیے واش بیسن پر جا کھڑا ہوا۔

جب میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو ساحل کارپٹ پر پدم آسن (لوٹس آسن) جمائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اپنی بالشت کو اس نے ناک اور پیشانی پر اس انداز میں ٹکا رکھا تھا کہ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی' وہ سانس کی مشق میں مصروف تھی جس میں باری باری دونوں نتھنوں کا استعمال کرتے ہوئے "اِن ہیل" اور "ایگز ہیل" کیا جاتا تھا۔ ارتکازِ توجہ کے لیے یہ ایک عمدہ ابتدائیہ ہے۔ اس عمل سے دماغ' جسم اور جاں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

اکثر لوگ یوگا کو باڈی بلڈنگ ویٹ لفٹنگ اور مارشل آرٹس کی طرح ورزشوں اور ریاضتوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اس سوچ کے حامل افراد غلطی پر ہیں۔ اول تو یوگا کوئی کھیل نہیں ہے۔ درحقیقت' یہ ایک آرٹ ہے۔۔۔ "آرٹ آف لائف"۔ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کا فن ہے۔ ہم سب لوگ زندہ ہیں اور کسی نہ کسی طور زندگی گزارتے بھی ہیں لیکن یوگا بہتر انداز میں زندگی گزارنا سکھاتا ہے۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ جو بھی کام بہتر انداز میں کیا جائے اس کی افادیت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ یوگا میں کسی قسم کا جبر' سختی اور زبردستی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ زندگی کے ہر شعبے میں آسانیاں اور فراوانیاں پیدا کرتا ہے۔

ساحل جس لگن اور ثابت قدمی سے یوگا' مارشل آرٹس اور "چی" وغیرہ کو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس سے لگتا تھا' وہ بہت جلد' بہت اوپر تک پہنچ جائے گی۔ "ہتھ یوگ" کے کم و بیش تمام آسن (POSTURES) وہ بڑی سہولت سے لگانے لگی تھی۔ اسی طرح مارشل آرٹس میں وہ ہلکی پھلکی فائٹ تک پہنچ گئی تھی اور "چی" کی مخصوص مشق نے اسے اس قابل کر دیا تھا کہ وہ بہ آسانی پچاس گرام تک کی اشیا کو متحرک کر لیتی تھی۔

ہم فلیٹ سے نکلنے لگے تو میں نے فلیٹ کی چابیوں کے ساتھ ہی گاڑی کی چابیاں بھی اٹھا لیں۔ ساحل نے میرے اس عمل پر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا "میں تو سمجھ رہی تھی' ہم صرف ٹہلنے جا رہے ہیں۔"

"ہم ٹہلیں گے بھی۔" میں نے فلیٹ کو لاک کرتے ہوئے کہا "لیکن مناسب اور موزوں جگہ دیکھ کر ورنہ رات کے اس پہر ہماری چہل قدمی پولیس والوں کو سخت "ناگوار" گزرے گی اور خواہ مخواہ ہمیں ان کے ناقابلِ جواب سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "گاڑی پاس ہو گی تو ہم کہیں بھی جا سکتے ہیں۔"

ساحل نے مزید نہیں پوچھا "کہیں" سے میری کیا مراد ہے اور ہم لفٹ کے ذریعے نیچے آ گئے۔ رات کو اوپر جاتے وقت میں نے اس نئی نویلی شیراڈ کا دیدار کر لیا تھا جو شعیب نے مجھے تحفے میں دی تھی۔ امتیاز نے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے چوکیدار سے بھی میری تعارفی ملاقات کروا دی تھی اور ہمیں شعیب غوری کا مہمان بتایا تھا۔ شعیب کے لیے چوکیدار کے سامنے امتیاز نے صرف "صاحب" کا لفظ ادا کیا تھا۔ چوکیدار کی کھلتی ہوئی باچھوں اور پھیلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ "صاحب" کا بہت احترام کرتا تھا۔

جب ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر بلڈنگ سے نکلے تو

چوکیدار نے ہمیں ایک بھرپور سلام کیا۔ ساحل نے کہا "وجدان! اگر اس دوران میں شعیب غوری کا فون آگیا تو؟"

"میرا خیال ہے' وہ نو بجے سے پہلے فون نہیں کرے گا۔" میں نے گاڑی کو چائنا ٹاؤن کی طرف موڑتے ہوئے کہا "اس وقت تک ہم واپس آجائیں گے۔"

ساحل پر پہنچ کر ہم تقریباً آدھا گھنٹا ننگے پاؤں ریت پر ٹہلتے رہے۔ ذہن تھوڑا پُرسکون تو ہوا لیکن اپنے تین ساتھیوں کی اموات کا صدمہ اتنا بھاری تھا کہ بے کلی میں خاطر خواہ کمی نہ آسکی۔ انتقام ایک لاوے کی صورت میرے رگ و پے کو جلا رہا تھا۔

میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا "ساحل! چلتے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا پھر ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے واپس گاڑی میں آگئے۔ جب میں نے نیلی شیرڈ کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھایا تو ساحل نے پوچھا "وجدان! میرا ذہن ایک مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔ کیا اس سلسلے میں تم میری کچھ مدد کرسکتے ہو؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے دھیمے انداز میں استفسار کیا۔

وہ جواب دینے کے بجائے ہنگامی لہجے میں بولی "ارے۔۔۔ رے! یہ تم کہاں جا رہے ہو۔ ہماری بلڈنگ کی جانب جانے والا راستہ تو پیچھے رہ گیا۔"

"جانتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا "میں ایک بہت خاص جگہ جا رہا ہوں۔ تم اپنا مسئلہ بتاؤ جو تمہارے ذہن کو الجھا رہا ہے۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "وجدان! بوٹ بیسن والی سڑک پر جب پجارو والوں نے ہمیں گھیرا تھا تو گن بردار نے تمہارا مطالبہ کیا تھا جس سے ان کے عزائم کا پتا چلتا تھا۔ انہیں صرف وجدان سے غرض تھی۔ یا تو وہ تمہیں موقع پر ہی شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی "لیکن گورا قبرستان کے نزدیک پیش آنے والا واقعہ اس کی نفی کرتا ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ اس گرے کلر پجارو سے امتیاز وغیرہ پر فائرنگ کی گئی۔۔۔"

"میں نے نہیں' یہ بات شعیب غوری نے بتائی ہے۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولی "جو بھی ہو' براؤن مزدا پر فائرنگ کر کے ہمارے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سیدھا سیدھا مطلب ہے' وہ انہیں قتل کرنا چاہتے تھے جب کہ وہ لوگ تمہارے طلب گار تھے؟"

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "ہاں' یہ معاملہ مجھے بھی الجھا رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آج رات کی بہت سی باتیں ناقابل یقین اور الجھاؤ کا باعث ہیں۔ مثلاً ہمیں گھیرنے والوں کی خالی گنیں' کنگ سائز سفید بلی کا اچانک حملہ اور روپوشی اور یہی الجھن تو تم نے ابھی بیان کی ہے۔ خیر' کل شام تک سب کچھ کھل کر سامنے آ ہی جائے گا۔ فی الحال اس سلسلے میں' میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں۔"

"کیا اس سوال کا جواب بھی کہ اس وقت تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے تیکھی نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس وقت میر بخش وغیرہ کی طرف جا رہا ہوں۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان؟" وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے وضاحت کر دی "میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں' ہم اس وقت اس اسپتال کی طرف جا رہے ہیں جہاں ہمارے ساتھیوں کی لاشیں رکھی ہیں۔"

"اوہ!" وہ قدرے مطمئن ہو گئی پھر پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے' وہ کس اسپتال میں پہنچائے گئے ہیں؟"

"شعیب نے بتایا تھا' انہیں سرکاری اسپتال لے جایا گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوں۔" وہ گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولی "میں تو اس شہر کے دو تین سرکاری اسپتالوں سے ہی واقف ہوں۔ پتا نہیں' وہ کہاں ملیں گے۔ ہمیں اچھی خاصی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی۔"

میں نے قطعیت سے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم سب سے پہلے جائے وقوعہ کے سب سے نزدیک پائے جانے والے اسپتال میں جائیں گے۔ مجھے امید ہے' وہ وہیں ملیں گے۔"

اس دوران میں ساحل گاڑی کے ڈیش بورڈ سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ شیرڈ چونکہ بالکل نئی نکور تھی اس لیے اسے چھونے اور "چیک" کرنے کو خواہ مخواہ دل چاہتا تھا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے وقت صرف "فیول انڈی کیٹر ڈائل" پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور

یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ ڈائل کا کانٹا ٹینکی فل ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

ساحل کی چھیڑ چھاڑ نے رنگ دکھایا۔ اس نے جیسے ہی ایک خانے کو کھولا' ایک بڑے سائز کا لفافہ اچھل کر باہر آگیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "یہ کیا ہے؟"

وہ لفافہ ساحل کی گود میں گرا تھا۔ میں نے کہا "کھول کر دیکھو۔ پتا چل جائے گا۔ تمہاری طرح میں بھی اس گاڑی میں پہلی بار بیٹھا ہوں۔ جتنی اجنبی تم ہو' میں بھی اتنا ہی ہوں۔"

وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے مبہم سے لہجے میں بولی "کیا ہم واقعی اجنبی ہیں؟"

یہ ایک عام سا سوال تھا اور موقع محل کی مناسبت سے بھی تھا لیکن ساحل کے استفسار کا انداز خاص تھا اس لیے مجھے چونکنا پڑا۔ میں کوئی جواب دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بڑبڑاتے ہوئے لفافہ کھولنے میں مصروف ہو گئی۔ "پتا نہیں' ہم کب تک اجنبی رہیں گے!"

میں اس کے اس بہ ظاہر نہ پوچھے گئے سوال کا کیا جواب دیتا!

لفافے کے اندر سے ہمارے لیے حیرت کا سامان برآمد ہوا۔ وہ ہمارے ضروری ڈاکومنٹس تھے جن میں شناختی کارڈز' پاسپورٹس اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ شامل تھے۔ اس کے علاوہ دس ہزار روپے کے استعمال شدہ نوٹ بھی تھے۔ پچھلے دنوں امتیاز نے ہمارے کاغذات کی تیاری کے لیے ہماری تصاویر بنوائی تھیں جو ان دستاویزات پر نظر آرہی تھیں۔ شعیب غوری بڑا سرپرائزنگ فرینڈ ثابت ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے' یہ سب کچھ اسی کے اشارے پر کیا گیا ہو گا۔ ان کاغذات کے مطابق میں وجیہ اور ساحل الماس تھی۔ ہم دونوں کا تعلق کراچی سے تھا۔ گویا ہم قانونی طور پر کراچوی ہو گئے تھے

امتیاز اور روبی ہمارے ان فرضی ناموں سے کتنے خوش ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ہم یہ نام استعمال کرتے' وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ میرے رگ و پے میں ایک آگ سی بھر گئی اور اسٹیئرنگ پر میرے ہاتھوں کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ میرے تین ساتھیوں کے چہرے میرے تصور کو تہ و بالا کرنے لگے اور ذہن میں ایک گونج سی پیدا ہوتی محسوس ہونے لگی۔

"انتقام۔۔۔ انتقام۔۔۔ بھیانک انتقام!"

ساحل نے فوراً میری کیفیت کو بھانپ لیا۔ اس نے جلدی سے تمام کاغذات لفافے میں ڈال کر اسے ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھا اور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

"وجدان! تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نظر نہیں آرہی۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

اپنے لیے اس کی تشویش نے مجھے ناقابل بیان سکون سے گزارا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ساحل! تم بالکل درست کہہ رہی ہو۔ میں اس وقت شدتِ غم کی کیفیت سے گزر رہا ہوں مگر اس کا علاج واپسی میں نہیں بلکہ پیش قدمی میں ہے۔ میں فلیٹ کی طرف نہیں بلکہ اسپتال کی جانب جاؤں گا۔"

اس کی تشویش اور گہری ہو گئی' ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی "وجدان! تم اس وقت ہوش و حواس میں نہیں ہو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ہاں' میرے ہوش و حواس واقعی گم ہو چکے ہیں۔" میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "ان تینوں کی موت کو میں کس طرح بھول سکتا ہوں۔ وہ میری وجہ سے مارے گئے۔ میری بھینٹ چڑھ گئے وہ تینوں۔ گرے پجارو والے میرے طلب گار تھے۔۔۔ مجھے مارنے آئے تھے۔ اپنی ناکامیابی کو مٹانے کے لیے وہ ان تینوں کے خون سے ہولی کھیل کر چلے گئے۔"

"تم جذبات میں غلط سوچ رہے ہو۔" وہ میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے داغِ دل پر ٹھنڈا مرہم رکھا ہو۔ اس نے کہا "ان کی موت میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے اور نہ ہی کوئی دوش۔ تم خود کو موردِ الزام نہ ٹھہراؤ۔ ابھی تک تو یہ بھی تصدیق نہیں ہوئی کہ مزدا پر فائرنگ کرنے والی گرے پجارو وہی تھی جس نے ہمیں بوٹ بیسن کے علاقے میں گھیرا تھا!"

"تصدیق ہو چکی ہے ساحل۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ قدرے چڑ کر بولی "تصدیق کرنے والا شعیب غوری ہے اور یہ ضروری نہیں' اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ حقیقت کا درجہ رکھتا ہو۔ وہ بھی ہماری طرح انسان ہے' اسے اندازہ لگانے یا نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔"

"اس بات میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے ساحل!" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا پھر اسے گرے پجارو کی نمبر پلیٹ کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد کہا "ہمیں گھیرنے والی اور مزدا پر فائرنگ کرنے والی پجارو کا نمبر ایک ہے۔۔۔ تھری' ون' فائیو' ون۔۔۔ اس کا مطلب یہی ہوا نا' کسی

غلط فہمی کی گنجائش نہیں۔ کیا کہتی ہو تم؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی "کچھ بھی ہو۔ میں تمہیں اسپتال کی طرف نہیں جانے دوں گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ کا دباؤ میرے بازو پر بڑھا دیا اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ میں ڈرائیونگ کی وجہ سے اس کی طرف مسلسل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تاہم میں نے چند لمحات میں، اس کی آنکھوں میں اپنے لیے جس "خیال" کی تصویر دیکھی وہ میری زندگی میں اب ناپید ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت میرے تخیل میں اپنی ماں شگفتہ کا چہرہ چمک اٹھا۔ ماں سے زیادہ خیال رکھنے والی کوئی اور ہستی اس دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ پتا نہیں کیوں، ساحل کی اس تیزی سے بڑھتی ہوئی وابستگی سے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

میں نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں کہا "ساحل! میں جاؤں گا، ضرور جاؤں گا اسپتال۔"

"کیوں۔ تم اسپتال کیوں جانا چاہتے ہو؟" وہ بھی ضد پر اُتر آئی۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ان تینوں کو دیکھنے۔۔۔ ان کے چھلنی بدن اور لہولہو تن دیکھنے کے لیے میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے تحریک ملے گی۔" میں اس وقت اچھا خاصا جنونی ہو رہا تھا "بے بسی، بے کسی اور بے رسی کی تصویر وہ تین لاشیں میرے انتقام کو مہمیز کریں گی۔"

وہ ڈانٹنے والے انداز میں بولی "ان تینوں کی ناگہانی موت نے تمہیں خاصا متاثر کیا ہے ورنہ تم ایسے تو نہ تھے وجدان۔"

میں نے پلٹ کر پوچھا "کیا تم متاثر نہیں ہوئی ہو؟"

"ہوئی ہوں۔۔۔ بہت زیادہ ہوئی ہوں۔" وہ شکستہ لہجے میں بولی "لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنی اس شکست و ریخت کا تماشا بنایا جائے۔ ہمیں ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ تمہاری ان جذباتی حرکتوں سے دشمن کوئی مزید نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

میں حیرت سے اس چھوٹی موٹی لڑکی کو سنتا رہا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا، معصوم اور سادہ سی دھنو اس وجود کے اندر سے غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ ایک سمجھ دار اور بردبار ساحل نے لے لی تھی۔ نام کی تبدیلی انسان پر اس قدر اثرانداز ہو سکتی ہے، یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ اس وقت میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی ساحل کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جو بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ میں ایک سادہ، دیہاتی زندگی گزار رہی تھی۔

اپنی اس مختصر سی ناصحانہ تقریر کے اختتام پر اس نے کہا "گاڑی موڑ لو وجدان! میں تمہیں ہرگز اسپتال کی طرف نہیں جانے دوں گی!"

ساحل کا لہجہ اتنا دوٹوک اور مستحکم تھا مجھے اس میں تحکم کا احساس ہوا۔ اس تحکم میں اپنائیت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ میری وحشت اور سرکشی پر جیسے کسی نے منوں یخ بستہ پانی ڈال دیا تھا۔ اپنے اندر دور۔۔۔ کہیں بہت دور مجھے بے بسی کا شدید احساس ہوا۔

میں نے سرایت کرتی ہوئی ایک نگاہ اس پر ڈالی اور کسی الوہی جذبے کے تحت اس کی بات مان لی۔

○☆○

میں نے اپنے انگوٹھے کے ہلکے دباؤ کی مدد سے خنجر کی دھار کو چیک کیا اور تسلی بخش انداز میں گردن ہلا دی۔ یہ وہی ظالم خنجر تھا جس کے لمحاتی کرشمے نے میاں زاہد حسین کے ایک خاص آدمی شاکر علی کی رگِ پا کا "مزاج" پوچھا تھا۔ میں نے خنجر کی کارکردگی کی تعریف کی تو امتیاز نے یہ خنجر مجھے بطور تحفہ دے دیا۔ اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا، ایک روز یہی خنجر امتیاز کے قاتلوں پر آسمانی بجلی بن کر گرے گا اور انہیں اتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر دے گا کہ دنیا کا کوئی کمپیوٹر اس تعداد کو شمار نہیں کر سکے گا۔

امتیاز اور میر بخش کا تصور میرا سینہ سلگا دیتا تھا اور منہ بولی بہن روبی کی یاد مجھے ملول و غم زدہ کر دیتی۔ یہ میرا برداشت تھی کہ میں اپنے پیاروں کے صدمات میں اپنے آنسو روکے بیٹھا تھا ورنہ میری جگہ اور کوئی ہوتا تو شاید دھاڑیں مار مار کر رو دیتا۔ دراصل، میں نے بچپن ہی سے رونگٹے کھڑے کر دینے والی زندگی گزاری تھی جس میں قدم قدم پر مجھے جذباتی دکھ سہنے پڑے تھے۔ اس وجہ سے بھی میں خاصا حوصلہ مند ہو گیا تھا۔

ساحل اس وقت کچن میں ناشتا بنا رہی تھی۔ میں اس کی محبت بھری ضد سے مجبور ہو کر واپس آ گیا تھا اور اسی کی فرمائش پر میں نے دو تین گھنٹے کی نیند بھی لے لی تھی۔ ان صدماتی لمحات میں وہ کسی شفیق اور مہربان نرس کا رول ادا کر رہی تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وال کلاک دس بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "ہیلو۔"

"وجدان مبارک ہو۔" ایئرپیس میں شعیب غوری کی آواز ابھری۔

میں سمجھ نہیں سکا، وہ کس سلسلے میں مجھے مبارک باد پیش کر رہا تھا۔ میں نے کہا "اس مبارک باد کی کچھ وضاحت کرو گے؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں نے ایک خاص معاملے میں تلافی کے لیے فون کیا ہے۔"

"کون سا خاص معاملہ؟"

وہ بولا "میں نے لگ بھگ سات گھنٹے پہلے تمہیں ایک بری خبر سنائی تھی۔۔۔ اپنے تین ساتھیوں کی ہلاکت کی خبر" اس کی آواز میں گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی "اسی سلسلے میں ایک اچھی خبر بھی اس وقت میرے پاس ہے۔"

"تم نے ان تینوں کے قاتلوں کا سراغ لگا لیا ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا "ہے نا، یہی بات؟"

"ویری گڈ!" شعیب نے سراہنے والے انداز میں کہا "تمہاری سوچ بالکل نشانے پر پہنچی ہے۔"

میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا "ہمارے ساتھیوں کا قاتل کون ہے؟"

"میاں زاہد حسین!" شعیب غوری نے سرسراتی آواز میں بتایا۔

"میاں زاہد حسین۔" میں نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا "میں تمہاری شہ رگ کاٹ کر تمہارے وجود میں پایا جانے والا سارا غلیظ خون بہا دوں گا۔" میں تصور میں میاں زاہد سے مخاطب تھا تاہم واقعتاً یہ گفتگو شعیب غوری سے ہو رہی تھی۔ میں نے شعیب سے پوچھا "تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھیوں کے قتل میں میاں زاہد ملوث ہے۔"

"میں یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ظاہر ہے، فائرنگ اس نے خود نہیں کی ہوگی بلکہ یہ آپریشن اس کے ایما پر کیا گیا ہوگا۔"

میری بات پوری ہونے پر شعیب غوری نے بتایا "جس کار سے بکارو "تھری، ون، فائیو، ون" کا معاملہ تو صاف ہو گیا۔ میرے ساتھیوں نے اپنی کوشش سے اس کے مالک کا پتا چلا لیا۔ وہ کار یعقوب عرف قوبا نامی ایک شخص کی ملکیت ہے اور قوبا میاں زاہد حسین کا خاص آدمی ہے۔ اب تم میری بات کو سمجھ گئے ہو گے؟" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا "یہ قوبا تمہارے لیے اجنبی تو نہیں!"

"بالکل نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا "ایک ڈیڑھ ماہ پہلے میں نے گرین بیلٹ والے بنگلے پر اس شخص کی اچھی طرح درگت بنائی تھی۔"

شعیب نے کہا "میرا خیال ہے، قوبا کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ مجھے پتا چلا ہے، قوبا تمہیں اپنے بھائی اسحاق کا قاتل سمجھتا ہے۔"

"حالانکہ۔۔۔" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا "جانتا ہوں، سب جانتا ہوں۔ اسحاق اور اس کے دو شیرڈ نشین ساتھیوں کی موت "سی ایف کے" کے کھاتے پر درج ہے۔ وہ کھاتا۔۔۔ جو میرے پاس ہے ورنہ اس شہر کی عوام کو تو یہی باور کرایا گیا تھا کہ اس خون ریز واقعے میں "را" کے دو خطرناک ایجنٹوں (وجدان + دھنو) کا ہاتھ ہے۔"

"موجودہ واقعے سے تو یہی لگتا ہے، میاں زاہد اور قوبا بھی یہی سمجھتے ہیں۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "گرین بیلٹ والے بنگلے پر شاکر علی نے قوبا سے میرا "تعارف" اسی حوالے سے کرایا تھا جب کہ تم اچھی طرح جانتے ہو، ہمیں اس واردات میں ملوث کرنے والا میاں زاہد ہی ہے۔"

"میاں زاہد بہت ہی کائیاں اور چال باز شخص ہے۔" شعیب نے کہا "کیا حقیقت ہے اور کیا فسانہ یہ بات وہ بہ خوبی جانتا ہے۔ وہ قوبا پر جذباتی دباؤ ڈال کر اسے تمہارے سامنے لے آیا ہے۔ قوبا کو اس نے باور کرا دیا ہو گا کہ تم ہی اس کے بھائی کے قاتل ہو۔ یہ کام میاں زاہد کے لیے چنداں مشکل نہیں۔ آخر کو وہ ان سب کا باس ہے۔"

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ گرین بیلٹ والے بنگلے پر میں اور امتیاز میر بخش کو رہا کروانے گئے تھے۔ یہ دو کردار اب اس دنیا میں نہیں تھے یعنی امتیاز اور میر بخش مگر دو کردار ابھی زندہ تھے یعنی شاکر علی اور قوبا۔ وہ نہ صرف زندہ تھے بلکہ اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل بھی تھے۔ میں ان ناسوروں کو کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو وجدان۔" شعیب کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "کیا کوئی پرابلم ہے؟"

"پرابلم یہ ہے کہ میں جلد از جلد قوبا اور میاں زاہد حسین تک پہنچنا چاہتا ہوں۔" میں نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا "مجھے اپنی پیاس بجھانے کے لیے ان کے خون کی

ضرورت ہے۔"

شعیب نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں تمہیں ان کے زخموں تک پہنچا دوں گا۔ بس ایک دن اور صبر کر لو وجدان!"

"ایک دن بعد کیوں۔" میرے لہجے میں احتجاج شامل ہو گیا "ابھی اور اسی وقت کیوں نہیں؟"

وہ دوستانہ لہجے میں بولا "میں تمہاری جذباتی کیفیت کو سمجھ رہا ہوں۔ تم یہ مت سمجھو کہ مجھے امتیاز' روبی اور میر بخش کی موت سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ میں ان کے غم میں دکھی ہوں اور بہت سوچ سمجھ کر شافی انتقام لینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے' یہ انتقامی کارروائی تمہارے ہاتھوں انجام کو پہنچے گی۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "آج کا دن ہم اپنے ساتھیوں کے سوگ میں گزاریں گے۔ میں نے ان کی لاشیں وصول کرنے اور تجہیز و تکفین کا مکمل بندوبست کر دیا ہے۔ امتیاز علی کا "چھوٹا بھائی" اشتیاق احمد ایک آدھ گھنٹے میں "دبئی" سے آنے والا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"چھوٹا بھائی" اور "دبئی" کے الفاظ پر اس نے قدرے زور ڈالا تھا کہ میں بہ خوبی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"شام کو پانچ اور چھ بجے کے درمیان تدفین کا پروگرام ہے۔ تم چار بجے تک "ساؤتھ" آجاؤ۔ ہم ایک ساتھ قبرستان چلیں گے۔ اوہ "ساؤتھ" کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ میں نے تمہارے شک کی تصدیق یا تردید کے لیے اپنے تمام اسٹاف کو چیک کر لیا ہے۔ تمہارے بتائے ہوئے حلیے کا کوئی شخص ان میں شامل نہیں۔ اب میں یہی کہوں گا' تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ویسے اگر تم کہو گے تو میں اپنے پورے اسٹاف کی شناخت پریڈ کرا دوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔" پھر پوچھا "کیا تم نے صرف "ساؤتھ" کو چیک کیا ہے؟"

"میں کوئی بھی کام کچا نہیں کرتا وجدان!" وہ ٹھوس انداز میں بولا "میں نے پانچوں مقامات کی چھان بین کی ہے۔"

میں مطمئن ہو گیا۔

شعیب نے کہا "تم تو ابھی تک فلیٹ سے باہر نہیں نکلے ہو گے اور ظاہر ہے' کوئی اخبار بھی تمہاری نظر سے نہیں گزرا ہو گا!"

"کیوں' کوئی خاص خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "گورا قبرستان والے اس اندوہ ناک واقع... پولیس والوں نے بڑی آسانی سے جان چھڑا لی ہے۔ ... تقریباً سبھی اخبارات میں اس قاتلانہ کارروائی کی ... چھپی ہیں جسے دہشت گردوں کی معمول کی سرگرمی بتا... ہے۔"

"گویا جو معاملہ سمجھ میں نہ آئے یا جس کو چھپانا مقص... ہو اسے نامعلوم دہشت گردوں کے کھاتے میں ڈال دی... ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے میرے دوست۔" وہ خیال انگ... آواز میں بولا۔

میں نے پوچھا "اپنے ساتھیوں کے خون کا حساب چکانے کے سلسلے میں ہم ایک دن مزید کیوں انتظار کریں... تدفین کا کام تو مغرب سے پہلے ہو جائے گا۔ اس کے بعد پوری رات پڑی ہے' ہمیں اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔"

"کل رات کا انتظار ایک مصلحت کی بنا پر ہے۔" ... نے کہا۔

میں نے استفسار کیا "کیسی مصلحت؟"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "کل رات ... زاہد حسین اپنے بنگلے پر ایک شان دار جشن منا رہا ہے ... میں بہت خاص الخاص لوگ شرکت کریں گے۔ مجھے ... ہے' اس شراب و شباب کی تقریب میں کچھ غیر ملکی مہمان ... موجود ہیں جن میں دو افراد سنگاپور سے آرہے ہیں۔ ... وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں منا رہا ہے۔"

میں نے اس کی فراہم کردہ معلومات پر چونکتے ہوئے سوال کیا "تمہیں یہ تفصیل کیوں کر معلوم ہوئی شعیب؟"

"وری گڈ کوئسچن!" وہ سراہنے والے انداز میں بتانے لگا "وجدان! کسی بھی تنظیم کو کامیابی سے چلا... لیے ضروری ہے کہ اپنے تمام مخالفین کی خبر رکھی ... میری تنظیم "سی ایف کے" اصلاحی اور تعمیری مقاص... حامل ہے چنانچہ تمام منفی افکار کی حامل تنظیموں ... میں مجھے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ مخالف کیمپوں میں موجود ... بندے گاہے بہ گاہے مجھے خاص خاص باتوں سے ... رہتے ہیں۔ یہ تمام معلومات مجھے اس شخص ... ہیں جو میاں زاہد حسین کے نیٹ ورک میں ایک ... وفادار کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے' سی ایف کے میں بھی دوسری تنظیموں کے جاسوس خفیہ طور پر کام کر رہے ہوں گے؟" میں نے ایک خدشے کا اظہار کیا "یہ تو ایک منطقی سی بات ہے!"

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" اس نے کہا "میں اس سلسلے میں کوتاہی نہیں کرتا اور اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ میرے اسٹاف کے ہر ممبر پر کوئی دوسرا ممبر نگراں مقرر ہے۔ اس طرح مجھے نیچے سے اوپر تک ہر سطح پر ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے اور جیسے ہی کوئی شخص میری نظر میں مشکوک ہو جاتا ہے۔ میں اس کے کچے چٹھے کے ساتھ اسے بہت ہی پُرسکون مقام پر منتقل کر دیتا ہوں۔"

"گویا اس کا انتقال ہو جاتا ہے!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کافی سمجھ دار ہو' میں کیا سمجھاؤں!"

میں نے پوچھا "شعیب! میں چوہدری نوازش علی اور اس کے بدطینت باپ چوہدری رمضان کے کرتوتوں سے تو بڑی حد تک واقف ہوں۔ دیگر جرائم کے ساتھ ساتھ وہ اسمگلنگ کے دھندے میں بھی ملوث تھے۔ ملک رمضان تو فنا ہو گیا۔ چوہدری نوازش کا خاص بندہ میاں زاہد حسین یہاں کراچی میں سرگرم عمل ہے۔ وہ ایک فعال نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں' ان کی مصروفیات کی نوعیت کیا ہیں؟"

"میں تمہارا سوال بڑی وضاحت سے سمجھ گیا ہوں۔" شعیب نے میری بات پوری ہونے پر کہا "میاں زاہد درحقیقت منشیات خصوصاً ہیروئن کی اسمگلنگ کا دھندا کرتا ہے۔ اس کا بگ باس موضع "رکھاں والی" میں بیٹھ کر صرف ڈوریاں ہلاتا ہے۔ ملک نوازش کے اشاروں پر یہ منشیات امریکا' یورپ اور جنوبی ایشیا کے ممالک کو بھیج دی جاتی ہے۔ میں اپنی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملک نوازش علی کوئی عام روایتی سا زمیندار یا چوہدری نہیں بلکہ جرائم کی دنیا کا ایک بہت بڑا برج ہے۔"

"یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔" میں نے سلگتے ہوئے انداز میں کہا "میں نے اس کے بچھائے ہوئے انگاروں کی ایک دہکتی راہ گزر پر بہت طویل سفر کیا ہے۔ بلکہ اب تک کر رہا ہوں۔"

شعیب نے توصیفی انداز میں کہا "ملک نوازش اور اس کی طاقت کو جان لینے کے بعد میں یہی کہوں گا کہ تم اور تمہارا عزم ماؤنٹ ایورسٹ سے ایک سوت بھی نیچے نہیں۔"

"اس تعریف کا شکریہ دوست۔" میں نے کہا "اب تو مجھے تم جیسے مخلص دوست کا تعاون بھی حاصل ہو گیا ہے چوہدری نوازش کے دانت کھٹے کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔"

"میرا تعاون تو زندگی بھر تمہیں حاصل رہے گا۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

میں نے ڈاکومنٹس کے سلسلے میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "گاڑی کے ڈیش بورڈ سے برآمد ہونے والا تعاون بھی مجھے پسند آیا۔"

وہ مذاق کے رنگ میں بولا "لیکن یار! وہ دس ہزار روپے کی رقم قرضہ ہے۔ جب سنگاپور سے تمہاری رقم آ جائے تو لوٹانا نہ بھولنا!"

"میں دوستوں اور دشمنوں کا قرض یکساں طور پر یاد رکھتا ہوں۔" میں نے بھی اسی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ دشمنوں کا حساب سود در سود چکاتا ہے اور۔۔۔ حساب دوستاں در دل۔"

"شکر ہے' تمہارے لہجے میں کچھ شگفتگی تو آئی۔" وہ چہک کر بولا "میں نے تمہاری رنجیدگی کو کم کرنے کے لیے قرضے والی بات کی تھی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "ویسے اگر تمہیں مزید رقم کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ یہ بات میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"بتا دوں گا۔" میں نے بھی سنجیدگی سے کہا "فی الحال ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر چار بجے ساؤتھ میں ملاقات ہوگی۔" وہ گفتگو کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا "مجھے خود آنا ہوگا یا تمہاری طرف سے کوئی لینے آئے گا؟"

"کیا تم از خود ساؤتھ پہنچ سکتے ہو؟"

"ڈیفینیٹ لی۔" میں نے پُر وثوق لہجے میں کہا "میں کراچی کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں۔"

وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولا "پھر ٹھیک ہے' تم ٹھیک چار بجے ساؤتھ پہنچ جانا۔ میں تمہیں وہیں ملوں گا۔ دراصل دو بجے دوپہر ٹیلی فون پر نیل آرمر سے میری چند ضروری امور پر تفصیلی بات ہوگی۔ مدفون سونا بھی زیر بحث آئے گا۔"

"تو کیا تم نیل آرمر کو بھی سونے کی بازیابی میں شریک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔" وہ ... انداز اختیار کرتے ہوئے بولا "اس وقت میرے پاس دو ... راستے ایسے ہیں جن کے ذریعے بڑی صفائی سے ہم اس ... تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔۔۔ اور ان دونوں ... میں دو آدمیوں سے واسطہ پڑنا لازمی ہے۔ ایک ... نیشنل ہے اور دوسرا انٹرنیشنل۔ انٹرنیشنل راہ اختیار ... کرتے ہوئے مجھے نیل آرمر کی مدد لینا ہوگی۔"

میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "تمہاری ایک بھی بات میرے پلے نہیں پڑی۔"

"میں سمجھا دوں گا' سب سمجھا دوں گا۔" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا "تم چار بجے ڈائری کے وہ صفحات لے کر ساؤتھ آ جاؤ۔ میں مدفون سونے کی لوکیشن دیکھنے کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچوں گا۔ ویسے تم نے متروک کنوئیں اور سرحدی زمین کی جتنی تفصیل مجھے بتائی ہے وہ میرے ذہن میں نقش ہے۔ مجھے امید ہے' ڈائری کے صفحات میں بنے ہوئے نقشے میں وہ متروک کنواں سرحد سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہوگا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

"اوکے۔" وہ گفتگو ختم کرتے ہوئے بولا "چار بجے ملاقات ہوگی۔ تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ زیادہ سے زیادہ وقت فلیٹ کے اندر ہی گزارنا۔ باہر حالات سازگار نہیں ہیں۔"

"ہاں' تمہارا مشورہ میرے ذہن میں ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا "ذرا یہ بھی بتا دو ساؤتھ میں میرے تنہا آنے کی تو کوئی پابندی نہیں ہے نا؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو یار!" وہ قدرے خفگی سے بولا "تم میرے دوست ہو تو تمہارا ہر دوست میرا دوست ہے۔ ویسے بھی اکیلی ساحل کو تم وہاں کہاں چھوڑ کر آؤ گے۔"

"میں نے بھی اسی خیال سے پوچھا تھا۔" میں نے کہا۔

"موسٹ ویلکم!" وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ میں نے ریسیور کریڈل کیا ہی تھا کہ ساحل کے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ وہ یک طرفہ گفتگو تو سن ہی رہی تھی تاہم جو باتیں ادھوری تھیں' ان کے بارے میں وہ جاننا چاہتی تھی۔ میں نے آئندہ پندرہ بیس منٹ میں اسے تفصیل سنا دی۔ وہ نہایت ہی اطمینان اور سنجیدگی سے میری بات سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وجدان! کیا تم اکیلے ساؤتھ نہیں جا سکتے؟"

"جا سکتا ہوں۔" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا "لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

وہ بولی "میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کیا فلیٹ پر تنہا رہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا اس میں کوئی پریشانی ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے کہا "مجھے تو کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن تمہیں ہو سکتی ہے۔ کیا تمہیں اکیلے فلیٹ پر رہتے ہوئے ڈر نہیں لگے گا۔"

"ڈر کیسا وجدان!" وہ مستحکم لہجے میں بولی "ڈر تو انسان کے اندر ہوتا ہے اور میں نے وہ ڈر نکال دیا ہے۔ ویسے بھی تین چار گھنٹے کی تو بات ہے۔ تم چار بجے جاؤ گے اور سات آٹھ بجے تک لوٹ ہی آؤ گے۔ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے ساتھیوں کی المناک موت نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔ میں ان تین چار گھنٹوں کے دوران میں تمہیں گاہے بہ گاہے فون کرتا رہوں گا۔"

پھر ہمارے درمیان تازہ ترین حالات پر گفتگو ہونے لگی۔ اچانک مجھے انسپکٹر چیانگ شو کا خیال آ گیا۔ پچھلے کئی دنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے بتایا تھا کہ مکان اور اسٹور کے لیے اس نے الگ الگ دو پارٹیاں تیار کر لیں ہیں اور بہت جلد یہ سودا فائنل ہو جائے گا۔

میں نے ساحل سے کہا "سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو سے بات کرتے ہیں۔"

وہ میری سنگاپور والی پراپرٹی کی فروخت کے معاملات سے آگاہ تھی۔ اس نے کہا "ہاں وجدان' تمہارے انسپکٹر دوست نے اب تک وہ کام کر ہی دیا ہوگا۔ اس کے پاس یہاں کا فون نمبر نہیں ہے۔ تم ہی اسے فون کرو تو اچھا ہے۔"

میں نے ٹیلی فون ایکس چینج کی خدمات حاصل کرتے ہوئے سنگاپور پولیس ہیڈ کوارٹر کا نمبر لے لیا۔ اتفاق سے چیانگ شو اس وقت ہیڈ کوارٹر ہی میں موجود تھا۔ مجھے ایئر پیس میں اس کی مخصوص آواز سنائی دی تو میں نے کہا۔

"انکل! یہ میں ہوں' وجدان۔"

"پہچان لیا مائی سن۔" وہ خوش دلی سے بولا "تم ہو کہاں۔ میں نے کل رات تمہیں فون کیا تھا لیکن کسی نے اٹینڈ نہیں کیا۔"

میں نے اسے بتایا "ہاں انکل! بس کل کی رات خاصی افراتفری میں گزری ہے۔ میں گھر پر نہیں تھا اور آپ میرا نیا فون نمبر نوٹ کر لیں۔ میں نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے۔"

وہ تشویش ناک لہجے میں بولا ”افراتفری زیادہ خطرناک تو نہیں تھی۔ کیا تم خیریت سے ہو؟“

”ہاں‘ سب ٹھیک ہے انکل۔“ میں نے گول مول جواب دیا ”آپ کوئی فکر نہ کریں۔“

وہ فوراً اصل موضوع کی طرف آگیا ”وجدان! میں نے تمہاری دکان اور مکان کی فروخت کا معاملہ نمٹا دیا ہے۔ کل دونوں پارٹیاں پے منٹ کر رہی ہیں۔ تین دکانوں پر مشتمل شعبہ جاتی اسٹور اپنے تمام سامان کے ساتھ اٹھارہ لاکھ ڈالر میں گیا ہے۔ میرے خیال میں ”عابد علی اینڈ سن“ کی بہت اچھی قیمت مل گئی ہے۔ دراصل چائنا ٹاؤن اور خصوصاً ساگو اسٹریٹ پر پراپرٹی کی بہت ویلیو ہے اور تمہارا شعبہ جاتی اسٹور تو بہت چلتا تھا۔ اس کی ساکھ بہت مشہور ہے۔“

میں نے پوچھا ”یہ اٹھارہ لاکھ کا ریٹ امریکی ڈالر میں ہے یا سنگاپورین؟“

”مائی سن!“ چیانگ شو نے بڑی محبت سے کہا ”میں یہ ڈیل امریکی ڈالر میں کر رہا ہوں۔ میں نے ”عابد علی اینڈ سن“ کو اٹھارہ لاکھ یو۔ایس میں فروخت کیا ہے۔“

میں نے اطمینان کی سانس لی پھر پوچھا ”میرا مکان کتنے میں فروخت ہوا؟“

”وجدان! تم خوش قسمت ہو۔“ انسپکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تمہارا مکان بھی ایسے علاقے میں واقع ہے جہاں پراپرٹی کی قیمت پچھلے کچھ عرصے سے بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگرچہ فورٹ کیننگ روڈ (FORT KENNING ROAD) والا وہ مکان زیادہ بڑا نہیں لیکن بہ آسانی سات لاکھ یو۔ایس میں بک گیا۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بولا ”اس طرح تمہاری پراپرٹی پچیس لاکھ امریکی ڈالر میں‘ میں نے فروخت کردی ہے جو کہ بہت بڑی رقم ہے۔“

”ہاں انکل‘ رقم تو واقعی بہت بڑی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا پھر پوچھا ”آپ یہ رقم کب تک مجھے بھیج دیں گے؟ ویسٹرن یونین بینک والے تو آپ کے پولیس ہیڈکوارٹر سے زیادہ دور نہیں ہیں۔“

”ہاں‘ وہ تو ہمارے نزدیک ہیں۔“ چیانگ شو بولا ”لیکن میں تمہیں یہ رقم بینک کے ذریعے نہیں بھیجوں گا۔“

میں نے حیرت سے کہا ”کیوں انکل! میں نے تو سنا ہے‘ ویسٹرن یونین بینک والوں کی سروس اور ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔“

”تم نے بالکل درست سنا ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”میں دو اہم وجوہات کی بنا پر منی ٹرانسفر لیے بینک کی خدمات سے بچنا چاہتا ہوں۔“

”وہ دو وجوہات کون سی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

انسپکٹر چیانگ شو نے بتایا ”نمبر ایک۔۔۔ اس طریقے میں اچھی خاصی رقم بینک کمیشن کے طور پر ہمیں ویسٹرن یونین والوں کو ادا کرنا ہوگی۔ نمبر دو۔۔۔“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چند لمحے خاموش رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”وجدان! تم میری اولاد کی طرح ہو اس لیے مجھے امید ہے تم میری بات کا برا نہیں مناؤ گے۔ دراصل پاکستان کے حالات کے بارے میں‘ میں نے جو کچھ سن رکھا ہے وہ انتہائی غیر اطمینان بخش ہے۔ مجھے امید ہے‘ وہاں یہ خبر چھپی نہیں رہ سکے گی کہ تمہارے پاس ایک بہت بڑی رقم آئی ہے۔ چوری‘ ڈکیتی یا اس قسم کی کسی سنگین واردات کے امکانات خاصے قوی ہیں لہٰذا میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔“

میں نے کشادہ دلی سے کہا ”انکل! میں نے آپ کی بات کا ہرگز برا نہیں مانا کیوں کہ آپ میرے ملک کو نہیں بلکہ یہاں پائے جانے والے برے لوگوں کو برا کہہ رہے ہیں۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس ملک کو بدنامی یا نیک نامی ملتی ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے استفسار کیا ”منی ٹرانسفر کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے۔“

”میں ہنڈی کے ذریعے یہ رقم تمہیں بھیج دوں گا۔“ اس نے بتایا۔

”یہ ہنڈی کیا چیز ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”منی ٹرانسفر کا بین الاقوامی‘ غیر قانونی اور محفوظ ترین طریقہ۔“ چیانگ شو نے بڑے پُراعتماد انداز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے انکل! میں نے یہ سارے معاملات آپ پر چھوڑ دیے ہیں۔“ میں نے کہا ”آپ جو مناسب اور موزوں سمجھتے ہیں وہ کریں لیکن۔۔۔“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے پوچھا۔

”لیکن کیا وجدان؟“

میں نے کہا ”میں نے ایک ماہ پہلے جب اس فروخت کے بارے میں آپ سے بات کی تھی تو کہا تھا‘ مجھے رقم امریکی ڈالرز میں چاہیے لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ یہاں نقلی ڈالر بھی گردش میں ہیں اس لیے آپ کچھ ایسا بندوبست کردیں کہ مجھے وہ رقم پاکستانی کرنسی میں مل جائے۔“

”ہو جائے گا مائی سن!“ وہ بڑی شفقت سے بولا ”میں

ہنڈی کا کاروبار کرنے والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہیں پاکستانی کرنسی میں ادائیگی کریں۔ ان کے لیے یہ عام سی بات ہے۔ میں تمہارا فون نمبر اور ایڈریس انہیں بتا دوں گا۔ وہ خود تم سے رابطہ کرلیں گے۔ رقم جیسے ہی تمہارے ہاتھ آئے تم ایک فون مجھے کھڑکا دینا۔ بس معاملہ کلیئر۔“

میں نے اپنے ذہن میں پچیس کو پینسٹھ سے ضرب دی اور پانچ زیرو کو بدستور ساتھ رکھتے ہوئے حساب جوڑ لیا۔ یہ رقم سولہ کروڑ پچیس لاکھ روپے بنتی تھی۔ ان دنوں اوپن کرنسی مارکیٹ میں ڈالر پینسٹھ روپے کا چل رہا تھا۔ پاکستانی کرنسی میں یہ واقعی بہت بڑی رقم تھی۔

میں نے انسپکٹر چیانگ شو سے کہا ”انکل! آپ میرے مرحوم والد عابد علی کے چند اچھے دوستوں میں سے ایک ہیں۔ جب تک والد صاحب زندہ رہے‘ آپ نے ہر ہر قدم پر اپنی دوستی کو نبھایا ہے۔ بعد میں میرے ساتھ بھی آپ کا رویہ بہت مشفقانہ اور تعاون دوستانہ رہا۔ آج میں آپ سے ایک فرمائش کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے‘ آپ یہ فرمائش ضرور پوری کریں گے!“

”بولو مائی سن!“ چیانگ شو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ”تمہاری کیا فرمائش ہے؟“

”آپ کو ہر صورت میں میری ایک بات ماننا ہوگی۔“ میں نے اصراری لہجے میں کہا۔

”میں نے کہا نا‘ بولو۔ میں تمہاری فرمائش پوری کردوں گا۔“

میں نے کہا ”آپ اس رقم میں سے ایک لاکھ یو۔ایس میری طرف سے بہ طور تحفہ قبول کریں گے۔ تمام اخراجات نکال کر باقی جو رقم بچے وہ مجھے ارسال کریں گے۔ دیٹس فائنل!“

”اوہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہو مائی سن؟“ انسپکٹر کی آواز میں لرزش اتر آئی۔

مجھ پر اور میری فیملی پر چیانگ شو کے ان گنت احسانات تھے۔ وہ ایک فرض شناس اور محنتی پولیس آفیسر تھا۔ یہ ایک لاکھ امریکی ڈالر اس کے بہت سے خوابوں کو تعبیر دے سکتے تھے بلاشبہ وہ اس کا حق بھی رکھتا تھا۔

ایک لاکھ امریکی ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ میں نے چیانگ شو کی حیرت نما ہچکچاہٹ کے پیش نظر کہا ”انکل! اگر آپ نے میری یہ فرمائش پوری نہ کی تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔“

وہ اضطراری لہجے میں جلدی سے بولا ”اوکے۔۔۔ اوکے مائی لوونگ سن!“

چند معاملاتی باتوں کے بعد ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

* * *

ساؤتھ میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

شعیب غوری کے کمرے میں جب میں پہنچا تو وہ نیل آرمر سے فون پر اپنی گفتگو سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے کہا ”وجدان! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور کہا ”میں تو ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں!“

”تم لیٹ نہیں ہو۔“ اس نے کہا ”لیکن میں ہی کچھ جلدی میں ہوں۔ آج کی ہنگامہ خیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔“

”اب کون سی نئی بات ہوگئی شعیب؟“

وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملتے ہوئے بولا ”مجھے ایک ایمرجنسی میں فوری طور پر ملک سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ ٹھیک پانچ بجے مجھے ائرپورٹ پہنچنا ہوگا۔ ہمارے پاس باہمی گفتگو کے لیے بس یہی گھنٹا‘ آدھا گھنٹا ہے۔“

میں نے کہا ”شعیب! میں تمہاری ایمرجنسی کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس اتنا بتا دو‘ تم کس ملک کی طرف جا رہے ہو؟“

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ”ماریشس!“

”اوہ!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ”اپنے ساتھیوں کی تدفین میں تو تم کسی طور بھی شرکت نہیں کر سکو گے مجھے تو لگ رہا ہے کہ کل رات والے مشن میں بھی تم میرا ساتھ نہیں دے سکو گے۔“

”میں پوری کوشش کروں گا‘ کل رات کسی بھی وقت واپس آنے کی۔“ وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا ”مجھے بس جانا‘ آنا ہی کرنا ہے۔ ماریشس (MAURITIUS) میں بہ مشکل ایک گھنٹے کا کام ہے۔ جو بھی فرسٹ یا سیبل فلائٹ دستیاب ہوئی‘ میں واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی کل رات والا ہمارا مشن‘ رات کے آخری حصے میں ہی آغاز ہوگا۔“

تھوڑے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا ”ویسے میں نے احتیاطاً کبیر شاہ کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ وہ میرا خاص آدمی ہے اور میری غیر موجودگی میں ساؤتھ کے سارے معاملات کو وہی آپریٹ کرتا ہے۔ خدانخواستہ میں نہ پہنچ سکا تو کبیر شاہ تمہیں میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔ میں

یہاں سے روانہ ہونے سے قبل اس سے تمہاری ملاقات بھی کرا دوں گا۔"

میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے شعیب، تمہاری مجبوری کو میں محسوس کرتا ہوں۔"

"مجھے خود سخت افسوس ہے کہ اپنے ساتھیوں کی تدفین میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولا "کراچی سے ماریشس ہفتے میں چار فلیٹس ہیں۔ اگر میں نے اس فلائٹ کو مس کر دیا تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ تم سمجھ دار ہو۔ میری تنظیمی پیچیدگیوں کو محسوس کر سکتے ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا "یہ لگ بھگ آٹھ گھنٹے کی فلائٹ ہے۔ میں کوشش کروں گا، ادھر سے بھی دوپہر تک مجھے کسی فلائٹ میں سیٹ مل جائے۔"

میں نے شعیب سے پوچھا "مسٹر نیل آرمر سے تفصیلی بات ہو گئی؟"

"ہاں، ہو گئی۔" وہ بولا "مسٹر نیل آرمر نے سونے کی بازیافت میں ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا ہے۔ ویسے تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔ نیل آرمر اگلے ہفتے کراچی آ رہا ہے۔ وہ تم سے بھی چند امور پر بات چیت کرنا چاہتا ہے۔"

"ضرور۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

شعیب نے اپنی میز کی دراز سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور بڑی احتیاط سے اس کی تہیں کھولنے کے بعد میز پر پھیلا دیا۔ میں نے اس بڑے سائز کے کاغذ کو بہ غور دیکھا تو پتا چلا، وہ ایک نقشہ تھا۔ انڈوپاک کا تفصیلی سرحدی نقشہ۔ ایک مقام پر سیاہ مارکر سے بڑا سا دائرہ بنا ہوا تھا۔ میں نے اس دائرے کے اندر نگاہ ڈالی تو مجھے بارڈر کے ادھر اور ادھر لاہور اور امرتسر نظر آیا۔ شعیب نے پاکستانی حدود میں، سرحدی مقام کے قریب انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"وجدان! یہ تمہارا آبائی گاؤں موضع "رکھاں والی" ہے۔"

میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس جگہ کو دیکھا جہاں میرا گاؤں آباد تھا۔ اسی گاؤں کے ایک متروک کنوئیں میں چوتھائی ارب کی مالیت کا سونا دفن تھا۔

شعیب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ سرحد کے اس پار ایک جگہ پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے بتا رہا تھا "اور یہ ہے ضلع امرتسر کا چھوٹا سا گاؤں، رام پور۔"

اپنے باپ کی ڈائری میں لکھی ہوئی تفصیل میرے ذہن میں روشن ہو گئی۔ رام پور کا چوہدری کرم داس، چوہدری محمد رمضان کا گہرا دوست تھا کیوں کہ وہ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ دونوں کا خفیہ پیشہ ایک تھا یعنی وہ اسمگلنگ کے دھندے میں گردن گردن تک دھنسے ہوئے تھے۔

میں نے پرخیال انداز میں کہا "چوہدری نوازش علی کا باپ ملک رمضان تو گھوڑی سے گر کر مر گیا۔ پتا نہیں، رام پور کا چوہدری کرم داس ابھی زندہ ہے یا ختم ہو گیا!"

"پتا ہے۔ کیوں کہ میں نے پتا چلا لیا ہے۔" شعیب نے گمبھیر لہجے میں کہا "کرم داس اب اس دنیا میں نہیں۔ اس کا بیٹا رام داس! آج کل "رام پور" کا چوہدری ہے۔"

"تمہارا کام کرنے کا انداز بہت تیز رفتار ہے شعیب!" میں نے متعجب نظر سے اسے دیکھا۔

"مجبوری ہے۔" وہ خفیف انداز میں مسکرایا "یہ زمانہ ہی تیزی کا ہے۔ جو لوگ زمانے یا وقت کا ساتھ نہیں دیتے بری طرح روند دیے جاتے ہیں۔ وقت اور زمانہ انھیں کچلتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔"

"میں تمہارے خیالات سے صد فیصد متفق ہوں۔" میں نے کہا "میرے تجربے نے بھی مجھے یہی بتایا ہے۔"

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا "وجدان! ڈائری کے وہ اوراق صفحات کہاں ہیں؟"

میں نے اپنی پینٹ کی خفیہ جیب سے دو صفحات پر مشتمل وہ ورق نکال کر شعیب کی طرف بڑھا دیا۔ ڈائری کے صفحات میں مختلف لکیروں کی مدد سے متروک کنوئیں کی، بڑے واضح انداز میں نقشہ بنا کر نشان دہی کی گئی تھی اور دائرے کی شکل میں کنوئیں کے مقام کو سرحد کے قریب دکھایا گیا تھا۔

شعیب غوری ڈائری کے صفحات کو، اپنی میز پر پھیلے ہوئے نقشے سے ملا کر غور و فکر کرتا رہا پھر چٹکی بجاتے ہوئے بولا "بن گئی بات!"

"کون سی بات بن گئی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "دیکھو وجدان!" اس مرتبہ اس نے اپنے نقشے کے ایک مقام پر انگلی رکھی ہوئی تھی "یہ رکھاں والی کی زمین ہے جہاں وہ متروک کنواں واقع تھا۔ تھا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پتا نہیں، اب بھی ہو گا یا نہیں! خیر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا!" وہ کندھے اچکاتے ہوئے دوبارہ اپنے نقشے کی جانب متوجہ ہو گیا اور اِدھر اُدھر انگلی کو حرکت دیتے ہوئے بولا "ہمارا مطلوبہ متروک کنواں سرحد کے بہت قریب واقع ہے اور سرحد کی دوسری جانب چوہدری رام داس کی زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے وضاحتی انداز میں کہا "تم یہ نہ سمجھنا کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہاں باقاعدہ کوئی بارڈر موجود ہے۔ ہرگز نہیں! صرف نگرانی پر مامور افراد ہی جانتے ہیں کہ کہاں پاکستان کی ختم ہوئی اور کہاں سے بھارت کی زمین شروع ہو گئی۔ ورنہ یہ ساری اراضی آپس میں ملی ہوئی ہے اور تاحدِ نگاہ لہلہاتے ہوئے کھیت دکھائی دیتے ہیں۔"

میں کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ایک اور مقام پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہ چوہدری نظام دین کی زمینیں ہیں جو پاکستانی حدود میں ملک نوازش علی کی زمینوں سے ملی ہوئی ہیں لیکن متروک کنوئیں سے ان کا فاصلہ بہت زیادہ ہے۔"

بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا "میں اس ساری تفصیل کا مقصد نہیں سمجھ سکا!"

"مقصد صرف اتنا ہے کہ ہم کھلم کھلا اور علی الاعلان اس متروک کنوئیں کی کھدائی نہیں کر سکتے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اس کام کے لیے ہمیں آس پاس کی کوئی زمین استعمال کرنا ہو گی۔ ظاہر ہے، وہ زمین ملک نوازش کی تو نہیں ہو سکتی!"

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھا اور کہا "کسی سرنگ وغیرہ کا ارادہ ہے؟"

"تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔" وہ تصدیقی لہجے میں بولا "اور یہ آئیڈیا بھی مسٹر نیل آرمر ہی کا ہے۔ کل جب تم "ایسٹ" میں مجھ سے ملاقات کرنے کے بعد روانہ ہوئے تو تمہارے جاتے ہی نیل آرمر کا فون آ گیا تھا۔ وہ میرا اتنا بے تکلف، گہرا اور مخلص دوست ہے کہ میں اپنے اوپن بزنس کے اکثر معاملات اس سے ضرور ڈسکس کرتا ہوں پھر ہم چوں کہ سونے کے سلسلے میں اس کے "گولڈ اکاؤنٹ بینک" کو بھی استعمال کریں گے تو اس وجہ سے بھی میں نے اسے اس نئے پروجیکٹ سے آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے مشورہ دیا کہ کنوئیں کھود کر یہ مقصد حاصل کرنا انتہائی خطرناک ہو گا۔ ملک نوازش علی کوئی بہت بڑا پھڈا کھڑا کر سکتا ہے۔ مجھے بھی نیل آرمر کی یہ بات پسند آئی اور میں نے کھدائی وغیرہ کا پروگرام ختم کر دیا۔ یقیناً تمہیں بھی، نیل آرمر کی سرنگ والی تجویز زیادہ جان دار لگے گی۔"

"ہاں، یہ زیادہ محفوظ اور جان دار ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

وہ بولا "میں نے صبح تمہیں فون پر بتایا تھا کہ دفینے تک رسائی کے لیے ہمارے پاس صرف دو راستے ہیں۔ ایک نیشنل اور دوسرا انٹرنیشنل۔ ان دونوں راستوں پر دو مختلف آدمیوں سے ہمارا واسطہ پڑے گا۔ وہ دو آدمی ہیں، چوہدری نظام دین اور چوہدری رام داس!"

وہ خاموش ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے مدبرانہ لہجے میں کہا "ان دو آدمیوں سے ہمارا واسطہ اس لیے پڑے گا کہ ہمیں متروک کنوئیں تک سرنگ لگانے کے لیے ان میں سے کسی ایک کی زمین استعمال کرنا ہو گی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں، تم بالکل درست کہہ رہے ہو۔" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا "میں اور نیل آرمر اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے رام داس کی زمین کو استعمال میں لانا چاہیے کیوں کہ وہاں سے متروک کنوئیں کا فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں۔ بہت ہوا، بہت ہوا تو آدھا فرلانگ ہو گا جب کہ چوہدری نظام کی زمین سے یہ فاصلہ پندرہ بیس گنا ہو گا۔"

میں نے نقشے کی باریکیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ چوہدری نظام دین کی زمین کو استعمال کرنے کی صورت میں ہمیں کم از کم ایک میل کی سرنگ نکالنا ہو گی جو کہ خاصا مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تم دونوں کا اتفاق بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا!"

"تمہیں کون سی بات الجھا رہی ہے؟" شعیب نے پوچھا۔

میں نے کہا "میری معلومات کے مطابق ملک نوازش علی کا باپ ملک رمضان اور رام داس کے باپ کرم داس میں بڑا گہرا یارانہ تھا لہٰذا ملک نوازش اور رام داس بھی آپس میں دوست ہوں گے۔ چوہدری رام داس ایک دوست کے خلاف ہمیں اپنی زمین کیوں استعمال کرنے دے گا؟ پھر اگر ہم وہ سونا رام پور کی زمینوں کی مدد سے نکالیں گے تو وہ پاکستان کس طرح لایا جائے گا کیوں کہ موضع رام پور تو امرتسر میں ہے اور امرتسر بھارت میں؟"

"تمہارے دونوں سوالات کے جواب ہیں میرے پاس۔" وہ دھیمے انداز میں مسکرایا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ آج کل ملک نوازش اور رام داس میں شدید قسم کی دشمنی چل رہی ہے اور بعض اسمگلنگ کے تنازعات کے سبب وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور جہاں تک سوال ہے، بھاری مالیت کے سونے کو بھارت سے پاکستان لانے کا تو یہ ہمارا دردِ سر نہیں ہے۔ نیل آرمر "برآمدت" کو وہیں، رام پور گاؤں ہی میں اپنی

تحویل میں لے لے گا۔"

"ہوں!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اس کا مطلب ہے، نیل آر مر پوری طرح اس پروجیکٹ میں اِن ہو چکا ہے۔"

شعیب غوری نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "نیل آر مر ایک مصروف بزنس مین ہے۔ وہ اگر ہمارے پروجیکٹ میں اتنی زیادہ دلچسپی لے رہا ہے تو یقیناً اس کے بدلے وہ کوئی مالی فائدہ بھی چاہے گا۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" شعیب نے کہا "سونے کا وہ بیوپاری فائدے کا خواہاں تو ہے لیکن میں اسے کم سے کم پر راضی کر لوں گا۔ تم فکر نہ کرو، ہم دونوں کی بزنس پارٹنر شپ زیادہ متاثر نہیں ہوگی۔ میں نیل آر مر کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ وہ میری بات مان لے گا۔"

"وہ تمہاری بات اس لیے مان لے گا کہ تمہارا دوست ہے۔" میں نے کہا "مگر رام داس کو اتنی آسانی سے نہیں ٹرخایا جا سکے گا۔ وہ بھی اس دفینے میں سے کچھ نہ کچھ ضرور طلب کرے گا!"

"ہاں، یہ اس کا حق ہو گا۔" شعیب نے کہا "ایسے معاملات میں دل اور ہاتھ کو ذرا کھلا رکھنا پڑتا ہے وجدان۔ یہ ایک طرح سے جوائنٹ وینچر ہو گا جس کے مرکزی کردار ہم دونوں ہیں۔"

میں نے پوچھا "سرحد پار کے معاملات تم لوگ خود ہی دیکھو گے نا؟"

"ہاں وجدان!" شعیب نے یقینی لہجے میں کہا "اِدھر اور اُدھر کے تمام مسائل کو حل کرنا میرا کام ہے۔ انٹرنیشنل معاملات میں نیل آر مر نے بھرپور تعاون کا یقین دلایا ہے۔ تم نے یہ پروجیکٹ مجھے سونپ دیا ہے۔ اب تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا۔ یہ ساری باتیں تو میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ایک دوست ہونے کے ناتے تم ہر معاملے سے باخبر رہو۔"

شعیب کی تسلی نے میرے کندھوں کا بوجھ اتار پھینکا۔ میں نے اسے بتایا کہ ایک آدھ روز میں ہنڈی کے ذریعے میری رقم سنگاپور سے کراچی آ رہی ہے۔ میں نے اسے اماؤنٹ کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس نے اتنی بڑی رقم کی خبر پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اتنا زیادہ مال دار بن جانے کے بعد اپنے اس دوست کو بھول نہ جانا۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا دوست۔" میں نے نرم لہجے میں کہا "مگر ہنڈی والا معاملہ مجھے الجھا رہا ہے حالانکہ میرے خیر خواہ چیانگ شو نے ہنڈی کے کاروبار کی خاصی تعریف کی ہے!"...... شعیب غوری نے کہا۔

"تم مطمئن رہو۔ یہ انتہائی ایمان دارانہ کاروبار ہے۔ میں کراچی کے ہنڈی والوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ان میں چند میرے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ تمہاری رقم کی ایک پائی بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو گی۔"

شعیب کے اطمینان دلانے پر میں بالکل بے فکر ہو گیا۔

○*○

میں جب واپس فلیٹ پر پہنچا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سورج غروب ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ساحل ٹی وی کے سامنے بیٹھی کوئی تفریحی چینل دیکھ رہی تھی۔ مجھے سب سے پہلے ساحل کو اپنے ساتھیوں کی تدفین کی تفصیلات سے آگاہ کرنا پڑا۔ قبرستان میں سب خیریت گزری تھی اور کسی بھی قسم کا ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ شعیب غوری مجھ سے ملاقات کے بعد ماریشس روانہ ہو گیا تھا۔ تاہم اس کا نائب کبیر شاہ قبرستان میں قدم قدم پر میرے ساتھ رہا تھا۔ قبرستان سے نکلتے وقت کبیر شاہ نے مجھ سے کہا تھا کہ "کل دن میں کسی وقت مجھ سے رابطہ کرے گا تاکہ رات والے "آپریشن" کا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ شعیب غوری کے پروگرام کے مطابق، میں نے کبیر شاہ کی سنگت میں" معرکہ سر کرنا تھا۔

میری پوری بات سننے کے بعد ساحل نے کہا "وجدان! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ چلو کہیں باہر چل کر ڈنر کرتے ہیں۔"

آں جہانی جانکی دیوی کی طرح ساحل بھی بھوک کی بہت کمزور تھی اور خاص طور پر جب سے اس نے مارشل آرٹس اور یوگا کی پریکٹس شروع کی تھی، اس کی بھوک دو چند ہو گئی تھی تاہم میں اسے گاہے بہ گاہے ٹوکتا رہتا تھا یہ کھاؤ اور یہ نہ کھاؤ۔ مجھے خدشہ تھا کہ اگر اس نے کھانے پینے کے معاملات کو بے قاعدہ اور کھلا چھوڑ دیا تو تیزی سے فربہ ہوتی چلی جائے گی۔ کیونکہ مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں موٹا ہونے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔

پندرہ منٹ بعد ہم دونوں نیلی شیرڈ میں بیٹھ کر کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کی تلاش میں کلفٹن کی سڑکوں کو ناپ رہے تھے۔ ساحل نے کہا "کل رات آتے ہوئے ... راستے

میں کھانے پینے کے کئی مقامات ایک ہی جگہ دیکھے تھے۔"

وہ بوٹ بیسن کا ذکر کر رہی تھی۔ میں نے کہا "اس طرف پھر کبھی چلیں گے۔ فی الحال تو مجھے بھی ٹھیک ٹھاک بھوک لگ رہی ہے۔ آج اسی کو چیک کرتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی سے باہر ایک معقول صورت ریسٹورنٹ کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس وقت ہم زمزمہ کے علاقے سے گزر کر سپر مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ساحل نے میری تائید کی تو ہم اسی ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

وہ ریسٹورنٹ معقول صورت ہی نہیں بلکہ معقول سیرت بھی واقع ہوا۔ ہم دونوں نے پیٹ بھر کر خوش ذائقہ اور معیاری کھانا کھایا۔ جب میں نے ویٹر سے بل لانے کو کہا تو ساحل بولی۔

"تم بل کے معاملات سے نمٹو۔ میں ذرا واش روم ہو آؤں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

پانچ چھے منٹ بعد وہ واپس آ گئی۔ ساحل اکیلی واش روم کی طرف گئی تھی لیکن واپسی میں وہ اکیلی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ دو اور بھی تھیں اور ان دو میں سے ایک کو پہچاننے میں، میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ وہ بلاشبہ ممتاز تھی۔ مدھوری ڈکشٹ کی مماثل وہ حسین و جمیل لڑکی بہت کم وقت کے لیے میرے ساتھ رہی تھی۔ میں نیو سر کے قاضی سلطان کی اس اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

وہ تینوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے میری جانب بڑھ رہی تھیں۔ ممتاز سے میری نگاہ ملی تو اس کے ہونٹ خود بہ خود مسکرانے لگے۔ اس کی ساتھی دوسری لڑکی کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔

"وجدان! تم اس قدر بدل گئے ہو!" ممتاز نے میرے نزدیک آنے پر حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ اس نے اتنی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا کہ رسمی علیک سلیک کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔

میں نے اپنی سیٹ سے کھڑے ہو کر اس کا حال احوال دریافت کیا پھر تینوں اسی میز کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ آج کل میں نے اپنے حلیے میں چوں کہ بہت زیادہ تبدیلی کر لی تھی اس لیے ممتاز نے میرے بدل جانے پر حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"یہ شبانہ ہے۔" ممتاز اپنی ساتھی لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی "انکل باقر کی بیٹی۔ تم منہاس باقر سے تو واقف ہو نا!"

میں نے شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ مطلب یہ تھا کہ میں منہاس باقر سے واقف ہوں۔ وہ شبانہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"وجدان کا ذکر تو میں تم سے اتنی مرتبہ کر چکی ہوں کہ اس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔"

ممتاز کا انداز بہت معنی خیز اور بولڈ تھا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ممتاز کی بے باکی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور خاص طور پر اس نے نیو سر میں پولیس والوں کے سامنے جتنے کھلے ڈُلے انداز میں میری حمایت کی تھی اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ مجھ میں سنجیدہ قسم کی دلچسپی لے رہی ہے۔ میرے تعارف پر شبانہ بھی مجھے ایسی نگاہ سے دیکھنے لگی جیسے دال میں کچھ کالا ہو۔

ممتاز کی ساتھی شبانہ کی عمر پچیس سال رہی ہو گی۔ وہ گداز بدن کی مالک ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ نمکین چہرے والی اس سانولی لڑکی کے نقوش میں ایک تیکھا پن موجود تھا جو بے پناہ کشش پیدا کر رہا تھا۔

میں نے ممتاز سے پوچھا "تم یہاں کراچی میں؟"

"دو دن پہلے آئی ہوں۔" اس نے شوخی سے بتایا "بابا چھوڑ گئے ہیں۔ کم از کم ایک ماہ رہوں گی یہاں۔" پھر وہ شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "دو ہفتے بعد اس کی شادی ہے۔ بس اسی سلسلے میں شاپنگ وغیرہ چل رہی ہے۔" اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے سوال داغ دیا "اور تم تو ایسے بے مروت نکلے کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔"

اس کے انداز میں شیریں شکوہ تھا۔ ساحل جو اس دوران میں بالکل خاموش بیٹھی تھی، اچانک بول اٹھی۔ اس نے ممتاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان نے جب تمہیں ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اپنا تعارف کرواتے ہوئے خدائی فوج دار کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اس سے بے مروتی کا گلہ نہ کرو۔ یہ مشکل وقت میں ہی سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ اب!"

ساحل کے آخری جملے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں یہ بات تو جان گیا تھا کہ ساحل کسی بھی لڑکی یا عورت کو مجھ سے بے باک یا بے تکلف ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ ممتاز کی موجودگی میں وہ جیسے آف ہو جاتی تھی لیکن اس وقت ممتاز کے حوالے سے اس نے جس طرح اپنی بات کو ختم کیا تھا اس کے پیشِ نظر میں ممتاز سے پوچھنے پر مجبور ہو گیا۔

"اس وقت کون سی افتاد آن پڑی ہے؟"

ممتاز کے بجائے ساحل نے میرے سوال کا جواب دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میز پر پہنچنے سے پہلے ممتاز کی موجودہ صورت حال سے آگاہ ہو چکی تھی۔

"وجدان! دو غنڈے ان کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔"

میں فوراً الرٹ ہو گیا "کیا وہ دونوں اس وقت ریسٹورنٹ میں موجود ہیں؟" میں نے بہ دستور شبانہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "وہ اندر داخل نہیں ہوئے بلکہ ہمارے باہر نکلنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ جیسا پہلے کرتے رہے ہیں۔"

"یہ کس قسم کے غنڈے ہیں بھئی۔" میں نے شبانہ سے استفسار کیا "اور کب سے تم لوگوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟"

اس نے بتایا "ہم تین چار گھنٹے سے نکلے ہوئے ہیں۔ مختلف اسٹورز سے شاپنگ کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ میں ٹھیک ٹھیک تو نہیں بتا سکتی کہ وہ کب سے ہمارے تعاقب میں ہیں لیکن گزشتہ ایک گھنٹے سے ہم نے انہیں مسلسل تعاقب میں دیکھا ہے۔ ہم جس بھی دکان یا اسٹور کے اندر جاتے ہیں' وہ ہمارے پیچھے اندر داخل نہیں ہوتے بلکہ باہر ہی ہمارا انتظار کرتے رہتے ہیں اور جیسے ہی ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آگے بڑھتے ہیں' وہ ہمارے تعاقب میں لگ جاتے ہیں۔"

"کیا ان کے پاس بھی گاڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں موٹر سائیکل پر ہیں۔" شبانہ نے کہا "ان کے پاس ہنڈا ون ٹو فائیو ہے۔"

میں نے پوچھا "کیا انہوں نے ابھی تک آپ سے کوئی بات کی ہے یا کسی قسم کی اور کوئی حرکت؟"

شبانہ نے نفی میں گردن ہلا دی۔

ممتاز نے کہا "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ ہمارے ٹھکانے کا سراغ لگانا چاہتے ہوں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم کہاں رہتے ہیں۔"

"بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا "خیر' دیکھ لیتے ہیں ان سراغ رسانوں کو بھی۔"

شبانہ بے پروائی سے بولی "مجھے تو اس ایڈونچر میں بہت مزہ آ رہا ہے لیکن ممتاز خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ اسی کے اصرار پر میں اس ریسٹورنٹ کے اندر آئی ہوں۔ یہاں سے ہم ڈیڈی کو فون کر کے ان دونوں غنڈوں کے بارے میں اطلاع دینا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ہماری ساحل پر نظر پڑ گئی اور ہم فون کرنے کے بجائے تمہارے پاس آ گئے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "ویسے اگر انہیں ہمارے بنگلے کا پتا چل بھی جائے تو وہ ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ اس شہر کے ہزاروں لوگ میرے ڈیڈی اور ہمارے گھر سے واقف ہیں۔"

میں نے محسوس کیا' شبانہ خاصی پُراعتماد اور بے پروا لڑکی تھی اور اس کی وجہ بھی صاف ظاہر تھی۔ وہ اخبار کے مالک اور ایڈیٹر کی بیٹی تھی۔ پریس والوں سے تو اچھے اچھے بارسوخ لوگ بھی ڈرتے ہیں۔ اور جن لوگوں سے دوسرے ڈرتے ہوں' ان میں خود اعتمادی تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔

ممتاز نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں ان موٹر سائیکل سوار غنڈوں سے خوف زدہ نہیں ہوں بلکہ احتیاط میں کیا حرج ہے۔ انجوائے کرنے کے لیے زندگی میں اور بہت کچھ پڑا ہے۔"

میں نے کہا "اب تم دونوں اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں ان دونوں سے خود ہی نمٹ لیتا ہوں۔"

"تم نے اس سلسلے میں کیا سوچا ہے وجدان؟" ساحل نے پوچھا۔

میں نے بتایا "ممتاز اور شبانہ معمول کے انداز میں اس ریسٹورنٹ سے نکلیں گی اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو جائیں گی۔" اتنا کہہ کر میں نے شبانہ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا اور پوچھا "آپ لوگوں کو مزید کوئی شاپنگ تو نہیں کرنا؟" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "حسبِ معمول وہ دونوں ان کے تعاقب میں لگ جائیں گے اور اگر وہ واقعی ان کا ٹھکانا جاننا چاہتے ہیں تو انہیں بنگلے کے دروازے تک چھوڑ آئیں گے۔" میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر کہا "ہونڈا ون ٹو فائیو کے پیچھے ہم اپنی گاڑی لگا دیں گے۔ مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے ہم ان کا تعاقب کریں گے۔ جب آپ دونوں گھر پہنچ جائیں گی تو میں ان کی "خیر خیریت" [illegible]شائی طریقے سے پوچھ لوں گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" شبانہ نے سراہنے والے انداز میں کہا "لیکن وجدان! اس کے لیے تمہیں ہم سے ایک وعدہ کرنا ہو گا!"

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ساحل نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کس قسم کا وعدہ شبانہ؟"

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی "جب تم ان غنڈوں کو

چھٹی کا دودھ یاد دلا کر فارغ ہو جاؤ تو سیدھے ہمارے گھر آ جانا۔" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

میں نے کہا "تمہارا بنگلا یہاں سے کتنی دور ہے؟"

ممتاز بولی "بابا نے تمہیں باقر انکل کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دیا تھا۔ شاید تم بھول گئے ہو۔"

"میں کچھ بھی نہیں بھولا ہوں۔" میں نے شوخ نظر سے ممتاز کی طرف دیکھا۔

ساحل کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے اسے میری وہ شوخ حرکت پسند نہ آئی۔ تاہم وہ بدستور خاموش رہی۔

شبانہ نے بتایا "ہمارا بنگلا یہاں نزدیک ہی ہے۔ عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے جو راستہ "سی ویو" کی طرف جاتا ہے' یہ بنگلا اسی راستے پر واقع ہے۔"

"تم آج کل کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟" ممتاز نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے اپنی اپارٹمنٹس بلڈنگ کا نام' فلیٹ کا نمبر اور فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔ میری اس جسارت کو ساحل کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ وہ کسی روایتی بیوی کی طرح میرے معاملات پر نظر رکھے ہوئے تھی!

شبانہ نے پُرجوش انداز میں کہا "تو ایڈونچر شروع کیا جائے؟"

بل میں ادا کر چکا تھا اس لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ممتاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ دونوں نکلو۔ ہم ایک منٹ بعد باہر آتے ہیں۔ جب تک آپ ہماری جھلک نہ دیکھ لو' گاڑی کو آگے نہ بڑھانا۔"

"ٹھیک ہے' میں سمجھ گئی۔" شبانہ نے پُراعتماد انداز میں کہا۔

جب وہ دونوں ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کو پار کر گئیں تو ساحل نے گہری سنجیدگی سے کہا "وجدان! لگتا ہے' تم کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کا فیصلہ کر چکے ہو!"

"غنڈوں سے نمٹنے کے لیے ناصحانہ لیکچروں سے کام نہیں چلتا ساحل۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہنگامہ پرور لوگوں کو قابو کرنے کے لیے ہنگامہ آرائی ہی کی ضرورت ہوتی ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "تمہیں تو خوش ہونا چاہیے ساحل۔ قدرت نے تمہیں بہت اچھا موقع دیا ہے۔"

"کیسا موقع؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "اپنی محنت کو آزمانے کا موقع۔ تم نے بھی تو مارشل آرٹس میں خاصی مہارت حاصل کر رکھی ہے۔ اس فن کو کب کام میں لاؤ گی؟"

وہ اپنی مٹھیوں کو اضطراری انداز میں کھولنے بند کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ساحل کے چہرے پر دبا دبا جوش بھی نظر آنے لگا۔ مجھے اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی۔

میں نے حتمی لہجے میں کہا "چلو ساحل! وہ دونوں باہر اپنی گاڑی میں بیٹھی ہماری جھلک دیکھنے کی منتظر ہوں گی۔"

ہم دونوں ریسٹورنٹ سے باہر نکلے اور بڑے نارمل انداز میں چلتے ہوئے اپنی شیروڈ میں آ بیٹھے۔ میں نے دیکھا' اس وقت شبانہ کی کریم کلر ٹویوٹا کرولا حرکت میں آئی اور ایک جانب بڑھ گئی۔ تقریباً پچاس گز کا فاصلہ رکھتے ہوئے ہونڈا ون ٹو فائیو بھی ان کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ شبانہ اپنے بنگلے کی لوکیشن مجھے بتا چکی تھی اس لیے میں نے شیروڈ اور ون ٹو فائیو کے درمیان اتنا فاصلہ رکھا کہ وہ دونوں غنڈے اپنے تعاقب کو محسوس نہ کر سکیں۔ اس تعاقب کے دوران میں اگر یہ فاصلہ بڑھ بھی جاتا تو میں انہیں بہ آسانی ٹریس کر سکتا تھا۔ کیوں کہ یہ تمام راستے اچھی طرح میرے دیکھے بھالے ہوئے تھے۔

موٹر سائیکل پر سوار وہ دونوں افراد اپنے حلیے اور صورت ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے بلیو جینز پر ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک کی شرٹ گرے اور دوسرے کی بلیک تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے ٹویوٹا کرولا کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

ساحل نے مجھ سے پوچھا "وجدان! ان دونوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ظاہر ہے' وہ کوئی اچھے لوگ نہیں ہیں۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" وہ الجھ کر بولی "دراصل میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں' شبانہ کے بنگلے پر پہنچ کر ان کا رویہ کیا ہو گا؟"

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "وہ دو قسم کا رویہ ظاہر کر سکتے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی "نمبر ایک' وہ اپنی موٹر سائیکل کو روکے بغیر آگے نکل جائیں گے اور کسی دوسرے راستے سے اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں گے۔ ایسا اس صورت میں ہو گا' اگر وہ صرف منہاس باقر کا بنگلا دیکھنا چاہتے ہوں گے یا شبانہ اور ممتاز کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے ہوں۔"

"اور دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟"

"دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ وہ بنگلے سے تھوڑا آگے جا کر واپس لوٹ آئیں۔" میں نے گمبھیر انداز میں کہا "اس صورت میں وہ کسی کارروائی کا پروگرام بھی رکھتے ہوں گے۔ واپس آ کر وہ اس بنگلے اور بنگلے کے مکینوں کے خلاف کوئی بھی سنگین قدم اٹھا سکتے ہیں۔"

"ہوں۔" ساحل نے بوجھل لہجے میں کہا "اس کا مطلب ہے' کوئی بڑا پھڈا بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ہو سکتا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "انہوں نے خواہ مخواہ صرف منہاس باقر کا گھر دیکھنے کے لیے اتنا کھٹ راگ نہیں پھیلایا ہو گا۔ باقر اس شہر کا معروف صحافی' پبلشر اور ایڈیٹر ہے۔ اسے لاکھوں افراد جانتے ہوں گے اور شبانہ کے بہ قول' ہزاروں لوگوں نے ان کا بنگلا بھی دیکھ رکھا ہو گا۔"

ساحل اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہمیں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"وہ تو ہم ہیں۔" میں نے کہا "بلکہ میں تو ایور ریڈی قسم کا بندہ ہوں۔ ہر وقت کسی بھی سنگین اور رنگین مسئلے کے لیے بالکل تیار رہتا ہوں۔"

"صرف مسئلے کے لیے یا معاملے کے لیے بھی؟" وہ چبھتے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"معاملے" سے اس کی مراد کو میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کا واضح اشارہ ممتاز کی طرف تھا۔

میں نے مصنوعی سنجیدگی چہرے پر طاری کرتے ہوئے کہا "بھئی! معاملہ ہو یا مسئلہ' احتیاط اور تیاری میں کیا قباحت ہے۔ محتاط اور تیار آدمی کم سے کم نقصان اٹھاتا ہے بلکہ میرا خیال ہے' نقصان اٹھاتا ہی نہیں۔"

وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی "ہاں وجدان! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مسئلے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں' تم معاملے کے سلسلے میں کبھی نقصان نہیں اٹھاتے ہو' ہمیشہ فائدے ہی میں رہتے ہو۔"

"میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا ساحل۔" میں نے بہ دستور ون ٹو فائیو کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا "ایک معاملے میں تو میں ابھی تک کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ میں جتنا اس معاملے کی طرف بڑھتا ہوں' وہ اتنا ہی مجھ سے دور ہو جاتا ہے۔ ہم بہ ظاہر ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں لیکن ریل کی دو پٹڑیوں کی طرح ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ حائل ہے۔ پتا نہیں' میں اپنے معاملے کو کب اور کیسے سود مند بنا سکوں گا۔"

"فلسفہ اچھا بول لیتے ہو۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی' پھر پوچھنے لگی "تمہارے اور تمہارے معاملے کے درمیان یہ فاصلہ کس نے حائل کیا ہے؟"

"وقت نے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"وقت تو اسی کا غلام ہے جو اس کی قدر کرتا ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں وقت کی ناقدری کرتا ہوں؟"

"میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی!"

"پھر تمہارا مطلب کیا تھا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے محسوس کیا' اس کے وجود میں بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ اندر ہی اندر اپنے آپ سے الجھ رہی تھی۔ ہم اس وقت جس قسم کی مہم پر پیش قدمی کر رہے تھے' اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ ہم ذہنی طور پر بالکل پُرسکون رہیں تاکہ ہمارے اعصاب اور ہاتھ پاؤں حالات کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں۔

میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ کو سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ ساحل کے ہاتھ پر رکھ دیا اور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بہت بدلے ہوئے اور خوشگوار لہجے میں کہا "ساحل! تم نے دیکھا' موسم کتنا حسین ہو رہا ہے۔ لگتا ہے' تھوڑی دیر میں بارش شروع ہو جائے گی۔"

وہ شانت لہجے میں بولی "ٹھیک کہتے ہو' سنگین موسم کے بعد حسین موسم آتا ہے اور پھر بارش بھی ہوتی ہے جس میں دھل کر ہر شے نکھر جاتی ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں ساحل کی بات کے جواب میں کچھ کہتا' کریم کلر ٹویوٹا کرولا اس اسٹریٹ میں داخل ہو گئی جہاں منہاس باقر کا بنگلا واقع تھا۔ میں پوری طرح اس طرف متوجہ ہو گیا۔

شبانہ کی گاڑی اپنے عالی شان بنگلے کے گیٹ پر رکی تو موٹر سائیکل سوار نہایت ہی دھیمی رفتار سے آگے بڑھ گئے۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ معمول کے مطابق وہاں سے گزرے ہوں۔ میں اس اسٹریٹ کی ابتدا ہی میں اپنی گاڑی کو روک چکا تھا۔

ساحل نے کہا "وجدان! وہ تو آگے نکل گئے!"

"میرا خیال ہے' وہ پلٹ کر ضرور آئیں گے۔" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے پُرتشویش انداز میں کہا "اگر نہ آئے تو تمہارا تعاقب کا مقصد ادھورا رہ جائے گا۔"

میں نے شبانہ کی ٹویوٹا پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "اس گاڑی کو اندر جانے دو۔ مجھے امید ہے' وہ بنگلے کا نمبر وغیرہ نوٹ کرنے کے لیے ضرور ایک چکر ادھر کا لگائیں گے اور۔" میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا "اگر وہ سیدھے نکل گئے تو ہم ان کے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ اسٹریٹ خاصی طویل ہے۔ میں انہیں نظر سے اوجھل نہیں ہونے دوں گا۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ون ٹو فائیو واپس پلٹ آئی۔ میری پیش گوئی کے مطابق وہ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے چند ساعت کے لیے رکے۔ گیٹ کے پہلو میں آویزاں نیم پلیٹ کو بہ غور دیکھا اور موٹر سائیکل گھما کر بالکل نارمل انداز میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی نیلی شیرڈ کو ان کے پیچھے ڈال دیا تاہم اتنا فاصلہ رکھا کہ انہیں تعاقب کا احساس نہ ہو۔

"تمہارے اندازے اتنے درست کیوں ثابت ہوتے ہیں؟" ساحل نے سرسری سے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا "کیوں کہ وہ منطقی ہوتے ہیں۔"

وہ بولی "اس اندازے میں کیا منطق پوشیدہ تھی؟"

میں سمجھ گیا' وہ مجھے چھیڑنے کے لیے اس قسم کے سوالات کر رہی تھی ورنہ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ موٹر سائیکل سوار اگر ان دونوں کے تعاقب میں تھے تو یقیناً وہ اس وقت تک واپسی کا قصد نہ کرتے جب تک کہ وہ ان کے پتے ٹھکانے سے آگاہی حاصل نہ کر لیتے یا پھر کسی قسم کی کارروائی نہ ڈال دیتے۔ یہ اتنی پیچیدہ اور پوشیدہ بات نہ تھی جو ساحل کی سمجھ میں نہ آ سکے۔ میں جانتا تھا' وہ کتنی ناسمجھ تھی!

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "ساحل! میری زندگی کا زیادہ حصہ جرائم پیشہ افراد سے دست و پنجہ کرتے ہوئے گزرا ہے۔ میں ان کی نفسیات پر اتھارٹی ہو چکا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔"

اسی دوران میں موٹر سائیکل ایک دو گلیاں گھوم کر سڑک پر آ گئی جو ساحل کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ سمندر کا یہ کنارہ "سی ویو" کہلاتا ہے۔ ساحل نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں یہ دونوں کس کے تعاقب میں ہوں گے۔ شبانہ یا ممتاز؟"

میں نے کہا "زیادہ امکان تو اسی بات کا ہے کہ وہ شبانہ کا ٹھکانا معلوم کرنے ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ممتاز تو چند روز پہلے یہاں پہنچی ہے۔ کراچی میں اس کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔" ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد میں نے مزید کہا "اس سلسلے میں اپنے ذہن کو زیادہ نہ تھکاؤ۔ بلی تھیلے میں سے باہر آنے ہی والی ہے۔"

"کہیں یہ وہی بلی تو نہیں جو بوٹ بیسن والے واقعے میں انٹری مار کر غائب ہو گئی تھی!"

ساحل نے مزاح کے رنگ میں کہا اور دھیرے سے مسکرا دی۔

اس کی مسکراہٹ سے گاڑی جگمگا اٹھی۔ بڑی فورس تھی اس مسکراہٹ میں۔ ایک تازگی اور فرحت کا احساس ہوتا تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے وہ غیر معمولی سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ میں اس کی اس خود اختیاری سنجیدگی سے سخت پریشان تھا۔ خود اختیاری اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بہ ظاہر اس کا سبب نظر نہیں آتا تھا ورنہ وہ تو ایک چنچل اور شوخ لڑکی تھی۔ ساحل ایک ایسی ساتھی تھی جس کی ہمراہی میں' ویرانے میں بھی بہار اتر آتی تھی۔ اس کی اداسی آمیز سنجیدگی نے میری بہاروں کو خزاں کے سپرد کر رکھا تھا۔

یہ سارے خیالات و احساسات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ میں نے اس کے جواب میں اسی کا رنگ اختیار کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے' یہ وہ بلی نہیں ہو گی۔ وہ سفید تھی' یہ کالی ہو گی۔"

ہم موٹر سائیکل والوں کا تعاقب کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے "کنارہ" اور "دی ولیج" جب پیچھے رہ گئے تو ساحل نے پُرتشویش لہجے میں دریافت کیا "ان کو کہاں گھیرنے کا ارادہ ہے؟"

"گھیرنے کے لیے مناسب مقام کا آغاز تو ہو چکا ہے۔" میں نے گاڑی سے باہر اندھیرے میں گھورتے ہوئے کہا۔ جس سڑک پر ہم جا رہے تھے وہ آگے جا کر کہیں کورنگی کے اریب قریب نکلتی تھی۔ یہ علاقہ تقریباً سنسان ہی تھا اور رات کی تاریکی نے اس کے سنسان پن میں رچ کر اضافہ کیا تھا۔ میں نے اچانک گاڑی کی رفتار بڑھا دی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا "ہم انہیں نہیں گھیریں گے بلکہ یہ دونوں ہمیں گھیریں گے۔"

"کیا مطلب؟" ساحل کے سوال میں حیرت آمیز الجھن تھی۔

"دیکھتی جاؤ' آگے کیا کیا ہوتا ہے۔" میں نے کہا "اپنے ہاتھ پاؤں اور دماغ کو فائٹا فائی کے لیے تیار کر لو۔ دماغ کو اس لیے کہ ہاتھ پاؤں اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں تیز رفتاری سے موٹر سائیکل کو اوورٹیک کر کے بہت آگے نکل گیا جب ہمارے درمیان حائل فاصلہ ایک فرلانگ سے بڑھ گیا تو میں نے نیلی شیرڈ کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ ساحل کو میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود گاڑی سے باہر آکر اس کے انجن سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہو۔

تھوڑی ہی دیر میں میری توقع کے عین مطابق ون ٹو فائیو ہمارے پاس آکر رک گئی۔ میں نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ڈرائیو کرنے والے نے خاصے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

"کیا ہو گیا ہے بھائی؟"

"انجن میں کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔" میں نے کہا "گاڑی اچانک بند ہو گئی ہے۔ اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ اگر تمہیں انجن کے معاملات سے کچھ واقفیت ہے تو مدد کر دو۔"

وہ دونوں موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر کے نیچے اتر آئے۔ ان میں ایک دراز قامت تھا اور دوسرا متناسب القد۔ وہ جب شیرڈ کے نزدیک آئے تو انجن کو فراموش کر کے گاڑی کے اندر دیکھنے لگا۔ ان کی نظر میں حریصانہ چمک کو میں نے تاڑ لیا۔ وہ نہایت ہی عامیانہ انداز میں ساحل کو گھور رہے تھے۔ میں نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے ان سے کہا۔

"بھائی! انجن اس طرف ہے۔" ساتھ ہی میں نے انجن کی جانب اشارہ بھی کر دیا "پہلے ذرا اسے دیکھ لو۔"

"گاڑی کے انجن کو تو ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔" دراز قامت بولا "پہلے ذرا تمہارے انجن کا معائنہ کر لیں۔" اس کی بھوکی نگاہ ساحل پر جمی ہوئی تھی۔

اب مزید کسی ڈائیلاگ کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "حرام زادے! ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔ میرا انجن تو اس طرف ہے۔"

وہ غصے سے میری جانب پلٹا تو میں نے ایک دھواں دھار پنچ اس کی خبیث صورت پر رسید کر دیا۔ وہ چلاتے ہوئے دو قدم پیچھے گیا اور حیرت آمیز نفرت سے مجھے تکنے لگا۔ شاید میری طرف سے اسے اس قسم کے ردِ عمل کی توقع نہیں تھی۔

وہ خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا اور پینترے بدل بدل کر مجھ پر وار کرنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مارشل آرٹسٹ تھا۔ اس احساس نے مجھے خوشی دی کیوں کہ اب مقابلہ کرتے ہوئے کسی مزے کی توقع کی جا سکتی تھی۔

وہ ابتدا میں کراٹے کی تکنیک آزماتا رہا۔ میں نے اس کے ہر ہاتھ کا جواب دیا۔ اس کی پیش نہ چلتی دیکھ کر اس کا ساتھی بھی میدان میں اتر آیا۔ اسی وقت شیرڈ کا دروازہ کھلا اور ساحل بھی باہر آکر اس "تماشے" میں شامل ہو گئی پھر ہمارے درمیان باقاعدہ گروپ فائٹ شروع ہو گئی۔ ساحل نے دراز قامت کو سنبھال لیا اور میں اس کے ساتھی پر "توجہ" دینے لگا۔

وہ بھی مارشل آرٹسٹ تھا اور اچھل اچھل کر مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ میں نے دو چار خوفناک کِکس میں اس کی ترکی تمام شد کر دی۔ زخمی ہونے کے بعد وہ اچانک کسی بندر کے مانند اچھلنے لگا پھر بندر ہی کی طرح اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا وہ "منکی اسٹائل" کے مظاہرے کا ارادہ رکھتا تھا۔

کنگ فو (KUNG-FU) میں مختلف جانوروں کے لڑنے کے انداز کو باقاعدہ شکل دے کر طویل ایکسر سائز پر مشتمل "فارم" بنائے گئے ہیں۔ کراٹے میں جو اہمیت "کاتا" کی ہے۔ وہی اہمیت کنگ فو میں "فارم" کی بھی ہے۔

منکی اسٹائل (بندر کا انداز) میں سب سے زیادہ استعمال پنجوں اور کندھوں کا کیا جاتا ہے۔ میں نے مدِ مقابل کے اسٹانس سے بھانپ لیا کہ وہ پنجوں کا کچا تھا، یہی ناپختگی مجھے اس کے کندھوں کے زاویے میں بھی نظر آئی۔ گویا اس نے باقاعدہ کسی چینی کنگ فو ماسٹر سے وہ اسٹائل نہیں سیکھا تھا بلکہ فلمیں دیکھ دیکھ کر کچھ پریکٹس کر لی ہو گی۔ وہ ایسا موقع اور وقت نہیں تھا کہ میں فائٹ کو طول دے کر انجوائے کرتا۔

میں نے "نی شاٹ" اور "سوئپ" مار مار کر مدِ مقابل کا منکی اسٹائل اس کی ناک کے راستے نکال باہر کیا۔ وہ لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش ہی میں تھا کہ میری پریشر کک نے اس کا ایک کندھا بیکار کر دیا۔

ساحل ڈٹ کر اپنے مدِ مقابل کا مقابلہ کر رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص ساحل پر بھاری پڑ رہا تھا۔ میں لپک کر اس جانب بڑھا اور ایک بھرپور سائیڈ کک دراز قامت شخص کی پشت پر رسید کر دی۔

وہ تھوڑا لڑکھڑایا اور ڈگمگاتے قدموں سے پیچھے چلا گیا۔ میں نے فضا میں پرواز کی اور میرے پاؤں کا بلیڈ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ یہ ایک بھرپور فلائنگ کک تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے زمین چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔

اسی وقت مجھے عقب میں ساحل کی چیخ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' وہ "بندر کا بچہ" ساحل کو اپنے ناقص فن سے ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک کندھا بیکار ہو جانے کے سبب اس کی اچھل کود کچھ زیادہ ہی مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔

میں نے لپک کر ساحل کی مدد کی اور منکی اسٹائل کا مظاہرہ کرنے والے غنڈے پر اسنیک اسٹائل کے دو چار اسٹیپ آزما کر اسے لمبا لٹا دیا۔ شاؤلن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں' میں نے ووشو کنگ فو (WU-SHU-KUNGFU) کے مروج پانچ قدیم اسٹائل بھی سیکھے تھے۔ جن میں ڈریگن' ٹائیگر' لیپارڈ' کرین اور اسنیک اسٹائل شامل ہیں۔ اژدہا' شیر' چیتا' کونج اور سانپ کے لڑائی کے انداز میں "چی" بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔

موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ بندر کے بچے سے میری "مصروفیت" کے دوران میں' مجھ سے بری طرح پٹنے والا وہ دراز قامت سنبھل کر موٹر سائیکل پر سوار ہو چکا تھا اور اپنے ساتھی کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ ہونڈا ون ٹو فائیو کے انجن کی خوبیوں سے واقف افراد جانتے ہیں کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ بڑی بڑی وارداتوں میں فرار کے لیے "یہ گاڑی" بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

میں بھگوڑے موٹر سائیکل سوار کے تعاقب کو ذہن سے جھٹک کر بندر کے بچے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ سڑک کے کنارے پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں نے اپنی پنڈلی پر چرمی کیس میں موجود خنجر کو نکالا اور شکست خوردہ شخص کے پاس بیٹھ گیا پھر دہاڑ سے مشابہ لہجے میں پوچھا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے آٹھ انچ پھل والے ہلاکت خیز خنجر کو بھی لہرایا۔

وہ گھگیا کر بولا "خدا کے لیے مجھے جانے دو۔"

"تمہارا ساتھی دُم دبا کر بھاگ گیا۔" میں نے خنجر کی نوک کو اس کے گال پر چبھوتے ہوئے کہا "تم بھی سر پر پاؤں رکھ کر نکل جانا۔ میں تمہیں روکوں گا تھوڑا ہی۔ بس جاتے جاتے میرے چند سوالات کے جواب دیتے جاؤ۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھا دیا۔ وہ تکلیف زدہ لہجے میں بولا "اس قاتل خنجر کو ہٹا لو پلیز۔ تم جو پوچھو گے' میں بتاؤں گا۔"

"یہ خنجر تو فی الحال نہیں ہٹ سکتا۔ پہلے تم سچ بول کر خود کو قابلِ اعتماد ثابت کرو۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ کوئی جائے فرار نہ پا کر منمنایا "پوچھو' کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"میں سوال کر چکا ہوں۔" میں نے خنجر کے دستے پر کچھ اور دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "تم کون ہو اور کس کے لیے کام کرتے ہو؟"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولا "ہم فری لانسر ہیں۔ جو بھی ہم سے کام لینا چاہے' ہم معقول معاوضے پر اس کا کام کر دیتے ہیں۔"

"فری لانسر!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "گویا کرائے کے غنڈے ہو؟" میں نے غصیلی نظر سے اسے دیکھا۔ "تم معاوضے پر جو کچھ بھی کرتے ہو' اس میں کون کون سے کام شامل ہیں؟"

"ہر قسم کے کام۔" اس نے بتایا "جیب تراشی سے لے کر قتل تک ہر نوعیت کا کام!"

"ماشاءاللہ!" میں نے زہرخند انداز میں کہا "تمہارا پیشہ نہایت معزز اور قابلِ فخر ہے۔"

وہ بولا "کیا کریں۔ پیٹ کا دوزخ تو کسی نہ کسی طور بھرنا ہی پڑتا ہے نا!"

"پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے خود کو جہنمی کیوں بنا رہے ہو؟" میں نے خنجر کی نوک سے اس کے گال پر خون کی ایک لکیر کھینچتے ہوئے کہا "اپنی ان سیاہ کاریوں میں مارشل آرٹس کو کیوں بے حرمت کر رہے ہو؟"

وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے جیسے اس کے گال میں مرچیں سی بھر دی تھیں۔ وہ لکنت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا "تت۔۔۔ تم۔۔۔ کون ہو؟"

"اگر میں تمہارے سوال کے جواب میں کہوں' تمہارا باپ۔۔۔ تو تمہیں قطعاً یقین نہیں آئے گا۔" میں نے بات کے اختتام پر اس کے دوسرے گال کو بھی رنگین کر دیا اور سخت لہجے میں بولا "اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھ سے کوئی سوال نہ کرو۔۔۔ اور اچھے بچوں کی طرح شرافت سے میرے سوالوں کے جواب دیتے جاؤ۔"

میرے وحشیانہ انداز و اطوار دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہو گیا اور میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی "نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن" جیسی صورتِ حال میں بڑے سے بڑا پھنے خان بھی تعاون پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

زیرِ دام آئے ہوئے انسان نما اس بندر کے بچے نے بتایا کہ اس کا نام وقار ہے اور جو آدمی فرار ہوا تھا اس کا نام

عارف تھا۔ وہ دونوں کورنگی کے علاقے میں رہتے تھے اور "آرڈر" پر مختلف قسم کے جرائم کرتے رہتے تھے۔ یہی ان کا روزگار تھا اور وہ اپنے کام سے کام رکھنے کے عادی تھے۔ اپنے فائدے نقصان پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے وہ یہ دھندا کر رہے تھے۔

میں نے پوچھا "تم دونوں کریم کلر ٹویوٹا کرولا کا تعاقب کیوں کر رہے تھے؟"

ٹویوٹا کرولا کے ذکر پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ میں کس حوالے سے اس کی جان پر عذاب بنا ہوا ہوں۔ اس کی وحشت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ نحیف آواز میں بولا۔

"ہم۔۔۔ اس لڑکی کا ٹھکانا معلوم کرنا چاہتے تھے۔"

"کون سی لڑکی؟" میں نے پوچھا "ٹویوٹا کرولا میں تو دو لڑکیاں تھیں؟"

"وہ۔۔۔ وہ جو انڈین ہیروئن مدھوری ڈکشٹ جیسی ہے۔"

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ ممتاز کا ذکر کر رہا تھا۔ ہمارا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا تھا۔ ہمارا خیال تھا' وہ دونوں منہاس باقر کی بیٹی شبانہ کا تعاقب کر رہے ہوں گے۔

میں نے وقار سے پوچھا "تم انڈین ہیروئن کی کاپی کا ٹھکانا کیوں معلوم کرنا چاہتے تھے۔ میرا مطلب ہے' یہ کام تم کس کے ایما پر کر رہے تھے؟"

مجھے گہری تشویش ہونے لگی تھی کہ کراچی میں ممتاز کا ایسا کون سا دشمن پیدا ہو گیا تھا جو اس کی قیام گاہ کا پتا چلانے کے لیے کرایے کے غنڈوں کی خدمات حاصل کر رہا تھا۔

"اصل آدمی سے نہ تو ہم ملے ہیں اور نہ ہی اسے جانتے ہیں۔"

"تم سے یہ ڈیل کس نے کی تھی؟"

"اس شخص کا نام شاہد ہے۔" اس نے بتایا "یہ کام اس کے "صاحب" کا تھا۔ شاہد کا صاحب کوئی بہت بڑا سیاست داں ہے۔ شاہد اس سیاست داں کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔"

"اور اس سیاست داں کا بنگلا کہاں ہے؟"

وہ متامل نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے غرا کر کہا "اگر تم نے چکر دینے کی کوشش کی تو اس دنیا سے رفوچکر کر دوں گا۔ تمہاری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں' تم سیاست داں کے بنگلے کا ایڈریس جانتے ہو بلکہ وہاں جا بھی چکے ہو۔ مجھ سے جھوٹ بول کر تم اپنی مصیبتوں میں اضافہ کرو گے۔"

وہ فوراً پٹڑی پر آ گیا "تم سچ کہتے ہو' میں ایک مرتبہ عارف کے ساتھ اس بنگلے پر جا چکا ہوں۔ ہم اس "کام" کا ایڈوانس پکڑنے وہاں گئے تھے۔ شاہد نے وہاں کے کسی بااختیار شخص سے ملوا کر ہمیں مذکورہ رقم دلوائی تھی۔"

"تم نے یہ کیس کتنے میں ڈن کیا تھا؟"

"دس ہزار میں۔" اس نے بتایا "پانچ ہزار ہم ایڈوانس لے چکے ہیں' پانچ ہزار باقی ہیں جو کام کی تکمیل پر ملنا تھے لیکن اب تو لگتا ہے۔۔۔!"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مایوسی سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ پانچ ہزار کی رقم بھی تمہیں مل جائے گی۔ تم اس سیاست داں کو مدھوری ڈکشٹ جیسی لڑکی کے بنگلے کا پتا بتا دینا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"یہ تو میں اس وقت کروں گا نا جب تم مجھے یہاں سے جانے دو گے۔"

"اگر تم میرے سوالوں کے جواب میں شرافت کا مظاہرہ کرو گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" میں نے کہا "تمہارا ساتھی عارف تو فرار ہو ہی چکا ہے۔ کیا میں تمہارا اچار ڈالوں گا۔"

اس قسم کی حوصلہ افزا باتیں میں اسے چکر دینے کے لیے کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے بولا "اگر تم مجھے بہ حفاظت جانے دو تو میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ بتا دوں گا جو تم پوچھنا چاہو گے۔"

"یہ اگر مگر کی شرائط لگانے کی احمقانہ کوشش نہ کرو۔" میں نے خنجر کی دھار کو اس کی گردن پر ٹکاتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "میری بات کو غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے یہ کہا ہے کہ اگر تم مجھے سب کچھ سچ بتاؤ گے تو اس کے بعد میں تمہیں جانے کی اجازت دوں گا۔"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "اس بنگلے کی لوکیشن اور ایڈریس بتاؤ جہاں وہ سیاست داں رہتا ہے جس کے ایما پر تم لڑکی کی قیام گاہ کا سراغ لگانے نکلے تھے؟"

"وہ بنگلا ڈیفنس میں واقع ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں نے لوکیشن اور ایڈریس بھی پوچھا ہے؟"

لوکیشن کی وضاحت کرنے کے بعد اس نے کہا "بنگلے کا نمبر بی۔ اڑتیس ہے۔ بنگلے کے بالکل سامنے ایک انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکول ہے۔ بنگلے کے گیٹ کا رنگ سیاہ ہے۔"

اس کی بیان کردہ لوکیشن بہت آسان تھی۔ خاص طور پر اسکول والی نشانی بہت اہم تھی۔ میں نے استفسار کیا۔

"بنگلے کے باہر کوئی نیم پلیٹ بھی لگی ہوگی؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں پلکیں جھپکائیں "نیم پلیٹ پر "محمود لاثانی" کا نام لکھا ہوا ہے۔"

میں نے محمود لاثانی اور B-38 کو اپنے ذہن میں نقش کر لیا اور وقار کو گھورتے ہوئے کہا "اگر تمہاری فراہم کردہ معلومات میں سے کوئی بات بعد میں غلط ثابت ہوئی تو۔۔۔"

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی گھگیا اٹھا "میں اپنے خدا کو حاظر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اب تک میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اب اسی خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں، میری جان بخش دو۔"

اس کے لہجے سے سچائی جھلک رہی تھی۔ موت کو سامنے دیکھ کر وہ جھوٹ بولنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کے نرخرے سے خنجر ہٹالیا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ہم جا رہے ہیں۔" میں نے گاڑی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا "تم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ گھر جا کر اپنے ساتھی عارف کو بھی یہ بات سمجھاؤ اور تم دونوں معمول کے مطابق اس سیاست داں تک اس کی مطلوبہ معلومات پہنچا کر اپنے بقایا پانچ ہزار بھی کھرے کرلو۔"

وہ حیران اور ویران نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید اسے ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے سچ بولا ہو گا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپسی کے راستے پر ڈال دی۔

جب ہم "و۔یج" اور "کنارہ" کے درمیان تھے تو ساحل نے کہا "وجدان! میں نے آج کی فائٹ میں محسوس کیا ہے کہ ابھی میرا فن کچا ہے۔"

"جو رفتہ رفتہ پک رہا ہے۔" میں نے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا "میں اپنی محنت کے نتائج سے مطمئن ہوں۔ تم نے بہت ڈٹ کر ایک باقاعدہ مارشل آرٹسٹ کا مقابلہ کیا ہے۔"

"میرا دل رکھنے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میں نے سادگی سے پوچھا "کیا تم اپنا دل کہیں رکھوانا چاہتی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔ اس کی خاموشی میں ایک مضطرب طوفان چھپا ہوا تھا۔ کبھی وہ پورے سازوسامان سے لیس ہو کر مجھے "ہراساں" کرنے پر کمربستہ رہتی تھی۔ اب میں اس کی جانب راغب ہوا تو وہ کنّی کاٹنے لگی تھی۔ جلوت میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور نارمل رہتا تھا لیکن خلوت میسر آتے ہی اس کے ناز و انداز ہی بدل جاتے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا میں ایک کنوئیں سے دو ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا ہوں مگر مجھے اپنی حرکات و سکنات پر اختیار نہیں۔ میں اپنی پیاس بجھانے کے لیے دو ہاتھ کا فاصلہ طے نہیں کر پاتا تھا۔ پیاسے کو تو ریگ زار کی چمکتی ہوئی ریت بھی پانی ہی نظر آتی ہے، میرے سامنے تو ایک 'جیتا جاگتا محبت کا ساگر ٹھاٹیں مار تا رہتا ہے۔ جس کے ساحل پر 'ساحل کا رویہ کسی کوسٹ گارڈ کا کردار ادا کر رہا تھا۔

وہ ساحل ہی تھی جس نے میرے دل میں محبت کی تڑپ جگائی تھی۔ میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئیں اور چلی گئیں۔ میں ابتدا میں ساحل کو بھی انہی لڑکیوں میں سمجھ رہا تھا لیکن یہ 'آئی ضرور' پر گئی نہیں۔ ساحل میرے اندر ہی کہیں کھو گئی تھی۔ پتا نہیں' یہ ساحرہ میری تڑپ کو کس ڈگری تک پہنچانے کا ارادہ رکھتی تھی؟

ساحل کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں اس کے تصور سے حقیقت کی طرف لوٹ آیا۔ وہ پوچھ رہی تھی "وعدہ پورا نہیں کرو گے؟"

فوری طور پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا "کون سا وعدہ؟" میں نے کہا۔

وہ اپنے لہجے کی شرارت آمیز سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولی "وہی وعدہ جو تم نے ریسٹورنٹ میں "ان" سے کیا تھا!"

میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور اسی وقت مجھے یاد آگیا کہ میں نے واپسی پر منہاس باقر کے گھر آنے کی ہامی بھری تھی۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے گاڑی سے باہر کے منظر کا جائزہ لیا۔ اس وقت ہم عبداللہ شاہ غازی کے مزار سے گزر کر ہیلی پیڈ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ساحل نے بروقت مجھے یاد دلایا تھا۔

میں نے گاڑی کو واپسی کے راستے پر موڑنے کے دوران میں کہا "انسان کو ہر ممکنہ حد تک وعدہ پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم منہاس باقر کے بنگلے پر جا رہے ہیں۔"

وہ زیرِ لب خفیف سا مسکرائی مگر زبان سے ایک لفظ نہ بولی۔

بنگلے پر ممتاز اور شبانہ ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ہمیں گھر کے افراد کی طرح ٹریٹ کیا گیا۔ منہاس باقر' ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا گہرا دوست تھا۔ جب میں نبی سر سے کراچی کی طرف آ رہا تھا تو قاضی سلطان نے مجھے منہاس باقر کا پتا اور فون نمبر دیا تھا تاکہ مجھے کراچی میں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے لیکن یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ یہاں پہنچتے ہی میں پے در پے مسائل میں الجھتا چلا گیا اور منہاس باقر سے کوئی سنجیدہ رابطہ نہ کر سکا۔ جب کچھ فرصت میسر آئی تو میں اس وقت تک "سی ایف کے" سے وابستہ ہو چکا تھا اور رہائش وغیرہ کا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔

بنگلے کی جانب آتے ہوئے میں نے ساحل کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے کسی بھی طور سی ایف کے کا ذکر نہ کرے۔ یہ راز صرف ہم دونوں تک محدود رہنا چاہیے۔ سب کو یہی بتایا جائے کہ یہاں مجھے ایک دیرینہ دوست مل گیا تھا اور ہم اسی کے ایک فلیٹ میں رہ رہے ہیں۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ شبانہ اور ممتاز نے موٹر سائیکل والوں کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے انہیں "چور اچکے" کا خطاب دے کر معاملہ رفع دفع کردیا۔ دراصل میں ممتاز کو کسی قسم کے خوف و ہراس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہوتی رہتی۔ البتہ جب مجھے منہاس باقر سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملا تو میں نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔ یہاں میں نے مصلحتاً یا دانستہ کہہ لیں، تھوڑی کی ڈنڈی ماری تھی اور اس سیاست داں کا ذکر گول کردیا تھا۔ جو "بی۔ تھری ایٹ" میں رہتا تھا۔ پہلے میں اپنے طور پر محمود لاثانی نامی اس شخص کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ منہاس سے میں نے یہی کہا تھا کہ وہ دونوں غنڈے اچھی خاصی مار کھانے کے بعد اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور میں ان کا تفصیلی "انٹرویو" نہیں کر سکا۔

منہاس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ اپنے دوست کی بیٹی ممتاز کی حفاظت کا معقول بندوبست کرے گا۔ اگر اسے گھر سے باہر جانا ہوا تو وہ مسلح گارڈ کے ساتھ نکلے گی۔ اس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ قاضی سلطان کا کوئی دشمن ممتاز کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہا ہو گا۔

میں نے منہاس باقر کو بہت گہرا آدمی پایا۔ وہ اپنے چہرے سے اندرونی کیفیت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ نو ائ پوائنٹ اور پُراعتماد بات کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو موٹر سائیکل والوں کا تعاقب سن کر پریشان ہو جاتا۔ منہاس تشویش میں مبتلا ہوا تھا مگر ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے ردِ عمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

منہاس باقر ایسا آدمی نہیں تھا کہ بیٹھ کر اس کے ساتھ طویل گپ شپ کی جاتی۔ جب کام کی دو چار باتوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ اٹھنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں نے اپنے ذہن میں کلبلاتے ہوئے ایک سوال کو اس کے سامنے رکھ دیا۔

"باقر صاحب! آپ تو ماشااللہ ایک سینئر صحافی اور ایڈیٹر و پبلشر بھی ہیں۔ شہر کے حالات کے بارے میں آپ سے زیادہ باخبر اور کون ہو گا۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں یہ "نامعلوم دہشت گرد" کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"بہت ہی نازک سوال کر دیا ہے تم نے!" وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "اس نازک سوال نے میرے ذہن پر بہت بوجھ ڈال رکھا ہے۔"

وہ اپنی پیشانی کو کھجانے کے بعد بولا "یہ لوگ دراصل کرایے کے قاتل ہوتے ہیں۔ جو ملک دشمن تنظیموں کے آلۂ کار کا کردار ادا کرتے ہوئے شہر میں خوف و ہراس پھیلاتے ہیں جس سے ہمارا ملک عالمی برادری میں بدنام ہوتا ہے۔"

"ان مذموم سرگرمیوں کا کوئی مقصد تو ہوتا ہو گا؟"

"مختلف قسم کی تنظیمیں مختلف نوعیت کے مقاصد رکھتی ہیں۔" منہاس باقر نے بتایا "یہ کوئی چھوٹی موٹی تنظیمیں نہیں ہوتیں بلکہ بین الاقوامی اثر و رسوخ کی حامل ہوتی ہیں جس کی پشت پناہی سپر طاقتیں کرتی ہیں۔ جب کسی بڑی طاقت کو کسی کمزور ملک سے کوئی بات منوانا ہوتی ہے۔۔۔ تو زبانی کلامی کوشش کے بعد وہ یہ راستہ اختیار کرتی ہے جس ملک کا کرتا دھرتا ان کے عزائم پر صاد نہیں کرتا۔ وہ اس کے ملک میں ایسے واقعات کو جنم دیتے ہیں جس سے حکومت کی نااہلی ثابت ہوتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں یا تو وہ ملک بڑی طاقت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے یا پھر اس کی ثابت قدمی اس کے لیے وبالِ جان بن جاتی ہے۔ پے در پے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ حکومت' عوام کی نظر میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"آج کل اس شہر میں ایک بہت بڑی یہودی قوت سرگرمِ عمل ہے۔ فائرنگ اور قتل و غارت گری کی یہ وارداتیں وہی لوگ کر رہے ہیں۔ اس طرح عوام کے مختلف

طبقوں میں بھی منافرت پھیل رہی ہے۔ نامعلوم افراد کی فائرنگ سے متاثر ہونے والے لوگ اپنے مخالفین کو اس کا ذمّے دار قرار دینے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔ یہ شہر اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارا پورا ملک پوری دنیا میں بدنام ہو رہا ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار کمپنیاں یہاں سرمایہ کاری کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاتیں۔ عجیب واہیات اور افسوس ناک صورتِ حال ہے۔"

میں نے پوچھا "اس کا کوئی نہ کوئی سدِباب تو ہونا چاہیے نا۔ ایسی تخریبی غیر ملکی قوتوں کو بے نقاب کرنے کے لیے حکومت کو سخت اقدامات کرنا چاہئیں تاکہ عوام میں' اس کی توقیر میں اضافہ ہو۔"

منہاس باقر نے کہا "اگرچہ حکومت ایسی کوششیں کرتی رہتی ہے لیکن یہ اتنا بھی آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ دراصل پرابلم یہ ہے کہ غیر ملکی خود یہاں آکر ہمارے سر پر ڈنڈا نہیں مارتے بلکہ ان کے آلۂ کار ہمارے ہی بھائی بند ہیں۔ اسی ملک' اسی شہر میں رہنے والے مگر غیروں کے ہاتھوں میں بکے ہوئے۔ وہ جس ملک کی فضا میں سانس لیتے ہیں' جس زمین کا اگلا ہوا اناج کھاتے ہیں اور جو ملک ان کی شناخت کا باعث ہے وہ اسی کے سینے کو گودنے میں مصروف ہیں۔ اغیار کے اشاروں پر وہ اپنے بہن بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔ مسٹر وجدان! ایسے دشمن کو تلاش کرنا آسان نہیں ہوتا جو آپ کے خیر خواہوں کی فہرست میں شامل ہو اور خود کو' آپ سے زیادہ آپ کے دشمن کا دشمن ظاہر کرتا ہو۔ بہرحال۔" وہ گمبھیر انداز میں بولا "امید ہے' عن قریب سب ٹھیک ہو جائے گا!"

منہاس باقر کی لاتعلقی اور بے پروائی میں ایک گہرا کرب پوشیدہ تھا جو اس کے چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ ایسے افراد اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں جو کمال ضبط سے دل کے حال کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

ممتاز اور شبانہ کا تو اصرار یہ تھا کہ ہم دونوں بھی رات وہیں' اسی بنگلے پر بسر کریں لیکن میں واپس فلیٹ پر آنا چاہتا تھا لہٰذا انہوں نے میری مرضی کو دیکھتے ہوئے زیادہ ضد نہیں کی اور ہم رات ایک بجے منہاس باقر کے بنگلے سے نکل آئے۔

ہماری اپارٹ منٹس بلڈنگ میں انتظامی سہولیات بہت عمدہ تھیں۔ سیکیورٹی کا نظام بہت فعال تھا۔ مین گیٹ پر انٹرکام سسٹم موجود تھا۔ کوئی بھی ملاقاتی اپنی مرضی سے منہ اٹھائے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ چوکیدار نما مسلح گارڈ پہلے متعلقہ فلیٹ سے رابطہ کر کے اس ملاقاتی کے بارے میں تصدیق کرتا پھر اسے داخلے کی اجازت ملتی تھی۔ گویا حفاظتی اقدامات کے حوالے سے وہ آئیڈیل رہائش گاہ تھی۔

فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد جب ہم اپنے بیڈ روم میں پہنچے تو وہاں ہمارے لیے حیرت کا سامان موجود تھا۔ ہم دونوں نے بیک وقت چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر کنگ سائز بیڈ کی طرف تکنے لگے۔

بیڈ کے عین وسط میں ایک خوبصورت سفید بلی لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ وہ کچھ اس انداز میں مجھے گھور رہی تھی جیسے دیر سے گھر آنے پر کوئی بیوی اپنے شوہر کو دیکھتی ہے۔

"یہ کہاں سے آگئی وجدان!" ساحل نے اچنبھے کی نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی ہوگی۔" پھر میں نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

ساحل بولی "اب اس بدبخت کو بھگاؤ بھی۔ دیکھو تو کتنی ڈھٹائی سے تمہیں دیکھے جا رہی ہے۔"

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے اسے بستر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔

"میاؤں۔" بیڈ روم میں ایک مخصوص آواز ابھری۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بلی دھیرے سے مسکرائی ہو۔ بے اختیار میں بھی زیرِ لب مسکرانے لگا۔ اسی وقت اس سفید بلی نے چھلانگ لگائی اور بستر کے نیچے گھس گئی۔

"وجدان! اس چلتر کو فلیٹ سے باہر نکالو۔ ورنہ میں سو نہیں سکوں گی۔" ساحل نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

میں جھک کر بیڈ کے نیچے سے بلی کو نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ لگ بھگ پانچ منٹ تک میری یہ کوشش جاری رہی بالآخر بلی کو ہار ماننا پڑی اور وہ احتجاجی انداز میں "میاؤں' میاؤں" کرتے ہوئے بیڈ روم سے نکل کر کچن کی جانب دوڑ گئی۔

میں اس کے پیچھے لپکا۔ کچن میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ وہاں کھڑکی ادھ کھلی تھی۔ بلی اس ادھ کھلی کھڑکی میں بیٹھی تھی۔ میں کچن میں داخل ہونے کے بعد اس کی جانب بڑھا تو وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الوداعی انداز میں مسکرائی اور باہر کود گئی۔

کھڑکی بند کرنے سے قبل میں نے باہر جھانکا۔ ہمارا فلیٹ آٹھویں فلور پر تھا۔ یہ اچھی خاصی بلندی ہوتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کچن کی کھڑکی کے باہر کوئی ایسی جگہ نہیں

تھی جہاں کودنے کے بعد وہ ٹھہر سکتی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ کیا وہ بلی آٹھویں فلور سے براہِ راست سڑک پر کود گئی تھی؟

بظاہر یہ ناممکن سی بات نظر آتی تھی۔ میں نے ایک انگلش فلم میں بلی کے ایسے کمالات دیکھے تھے جو بلند ترین عمارتوں سے بہ سہولت کود کر بہ حفاظت زمین پر پہنچ جاتی تھی مگر وہ فلمی بلی تھی اور ہم جیتی جاگتی زندگی میں سانس لے رہے تھے۔

میں اس حیرت انگیز بلی کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر واپس بیڈ روم میں آگیا۔ اس دوران میں ساحل بیڈ کے نزدیک ہی کارپٹ پر ایک شیٹ بچھا چکی تھی۔ جب سے اس نے یوگا کی باقاعدہ پریکٹس شروع کی تھی' سونے سے قبل وہ ایک دو آسن ضرور لگاتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پوچھا "اس دیدہ دلیر بلی کو نکال دیا نا؟"

"ہاں' اب تم اطمینان سے سو سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

وہ قالین پر بچھی ہوئی چادر پر چت لیٹ گئی۔ میں خاموشی سے واش روم میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد جب میں واش روم سے نکلا تو وہ یوگا کا ایک نہایت ہی مفید انداز' ہل آسن (PLOUGHPOSTURE) لگائے ہوئے تھی۔

میں ساحل کے پوسچر کی طرف سے نظر چرا کر بستر پر آگیا!

❂❂❂

شعیب غوری کے دستِ راست اور ساؤتھ کے عبوری نگران کبیر شاہ نے دوپہر کے وقت مجھ سے رابطہ کرنے کو کہا تھا لیکن اس کا فون آنے سے پہلے ہی ممتاز کی کال آگئی۔ وہ شام میں ہم سے ملنے آنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ تھوڑی دیر بعد میں اسے فون کروں گا۔ اگر ہمیں شام میں کہیں جانا نہ ہوا تو مل بیٹھنے کا پروگرام رکھ لیں گے۔ دراصل جب تک کبیر شاہ سے میری بات نہ ہو جاتی' میں شام یا رات کی کوئی مصروفیت کنفرم نہیں کر سکتا تھا۔

آج رات ہم میاں زاہد حسین کے ساتھ جو کچھ کرنے والے تھے اس مشن میں' میں ساحل کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا تھا اور یہ اچھا ہی تھا کہ ممتاز ہمارے فلیٹ پر آ جاتی۔ اس طرح ساحل کو تنہائی کا احساس نہ ہوتا حالانکہ مجھے امید نہیں تھی' وہ مجھے اکیلا جانے دیتی۔ وہ میرے ساتھ جانے کی ضد ضرور کرتی۔

ہم لنچ سے فارغ ہوئے تو کبیر شاہ کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ چند منٹ پہلے شعیب غوری سے اس کی بات ہوئی ہے۔ وہ مجھے بھی فون کرے گا۔ کبیر شاہ کی زبانی پتا چلا کہ شعیب غوری آج رات واپس نہیں آئے گا لہٰذا ہمیں خود ہی اپنے پروگرام پر عمل کرنا تھا۔ شعیب واپسی پر ہم سے کوئی بڑی خوش خبری سننا چاہتا تھا۔

میں نے کبیر شاہ سے پوچھا "تم کسی محمود لاثانی کو جانتے ہو؟"

"کون محمود لاثانی؟"

"کوئی سیاست داں ہے۔"

وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اس کی آسانی کے لیے کہا "یہ محمود لاثانی ڈیفنس کے بنگلا نمبر "بی تھرٹی ایٹ" میں رہتا ہے۔" پھر میں نے اسے مذکورہ بنگلے کی لوکیشن سمجھائی اور کہا "اس بنگلے کے سامنے ایک پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکول بھی ہے۔"

وہ پھڑک اٹھا "تمہیں اس بنگلے کے بارے میں کس نے بتایا ہے؟"

"کیوں کیا ہوا؟" الٹا میں نے اسی سے سوال کر ڈالا "تم محمود لاثانی سے اپنی ناواقفیت ظاہر کر چکے ہو!"

وہ سنسنی خیز لہجے میں بولا "وجدان! تم نے جس بنگلے کا ذکر کیا ہے' وہی تو ہمارا ٹارگٹ ہے۔ میاں زاہد ہمیں وہیں ملے گا۔"

میں اچھل پڑا "کیا واقعی؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"ہاں وجدان۔" کبیر شاہ تصدیقی لہجے میں بولا "اس بنگلے کے سامنے جو پرائیویٹ اسکول ہے وہ ہمارا مورچا ہوگا۔ میں نے اسکول کے چوکیدار کی مٹھی گرم کر کے اسے اس بات کے لیے آمادہ کر لیا ہے کہ وہ رات بھر کے لیے ہمیں اسکول کی عمارت کو استعمال کرنے دے گا۔ وہ لالچی شخص اس بات پر فوراً تیار ہو گیا ہے۔ ویسے بھی آج کل اسکول کی چھٹیاں ہیں اس لیے چوکیدار کو زیادہ پروا نہیں ہوگی۔"

"اگر وہ میاں زاہد حسین کا بنگلا ہے تو اس کے گیٹ پر محمود لاثانی کے نام کی نیم پلیٹ کیوں نصب ہے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

کبیر شاہ نے بتایا "اب مجھے یاد آیا۔ محمود لاثانی نامی ایک سیاست داں میاں زاہد کا رشتے دار ہے۔ ممکن ہے' میاں زاہد نے کسی مصلحت کی بنا پر اس کی نیم پلیٹ لگا رکھی ہو۔"

"یہ نیم پلیٹ تمہاری نظر سے نہیں گزری تھی؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔" وہ کھسیانا انداز میں بولا "ہم اس بنگلے کو لوکیشن کے اعتبار سے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "تمہارا باس شعیب غوری تو آ نہیں رہا۔ تم نے رات والے مشن کے بارے میں کیا لائحۂ عمل بنایا ہے؟"

وہ بولا "لائحۂ عمل میں نے باس کے مشورے سے ہی ترتیب دیا ہے۔ تم شام میں ساؤتھ آ جاؤ۔ پھر میں تمہیں تفصیلات سے آگاہ کر دوں گا۔ ہم رات کے پہلے پہر ہی اس اسکول میں ڈیرا جما کر بیٹھ جائیں گے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ وغیرہ کا بندوبست کر لیا ہے۔ ہم اسکول میں رہتے ہوئے پہلے خاموشی سے "بی۔ تھرٹی ایٹ" والوں کی گہما گہمیوں کا نظارہ کرتے رہیں گے پھر مناسب وقت پر اپنی کارروائی کریں گے۔ تم آ جاؤ تو تفصیلاً بات کرتے ہیں۔"

مزید دو چار منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

ساحل کو میں بتا چکا تھا کہ آج رات دشمنوں پر بہت بھاری ہے۔ امتیاز، روبی اور میر بخش کے قاتلوں کو اس رات روئے زمین پر کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں ان کو اس طرح تڑپا تڑپا کر ماروں گا کہ ہمارے ساتھیوں کی روحیں بے پناہ سکون محسوس کریں گی اور... یہ ساری کارروائی چوں کہ میاں زاہد کے زیرِ سایہ ہوئی ہے اس لیے میاں جی کی تو میں ایسی کم تیسی کر کے رکھ دوں گا۔

ساحل نے پوچھا "ابھی تم نے فون پر شعیب کے خاص آدمی کبیر شاہ سے گفتگو کرتے ہوئے محمود لاثانی اور "بی تھرٹی ایٹ" کا ذکر کیا تھا۔ کیا کچھ معلوم ہوا، ممتاز کا تعاقب کروانے والا یہ سیاست داں محمود لاثانی کون ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟"

میں نے جواب میں جب ساحل کو یہ بتایا کہ مذکورہ بنگلے میں میاں زاہد حسین کی رہائش ہے جہاں آج رات وہ اپنی کامیابی پر جشن منا رہا ہے تو میری طرح اسے بھی شدید حیرت ہوئی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے، ہم سب کے دشمن ایک ہی چھت کے نیچے جمع ہیں۔" پھر اس نے پوچھا "کیا تم نے کبیر شاہ سے محمود لاثانی کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟"

"میں نے دانستہ اسے اس حوالے سے زیادہ نہیں کریدا۔" میں نے کہا "جواب میں وہ مجھے بھی کرید سکتا تھا اور میں فی الحال ممتاز کے معاملات اور سی ایف کے کو الگ الگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"مگر یہ معاملات تو اب یک جا ہو چکے ہیں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

"وجدان! یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ میاں زاہد حسین یا اس کا کوئی آدمی ممتاز میں کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ ان لوگوں کی ممتاز سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"یہ بات غور طلب اور فکر انگیز ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر، آج کی رات تمام سوالات کے جواب مہیا کر دے گی۔ سب معلوم ہو جائے گا، اس بنگلے کے اندر کون کیا کھچڑی پکا رہا ہے!"

پھر ہمارے درمیان کافی دیر تک حالاتِ حاضرہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں نے ساحل سے کہا کہ اس مشن میں، میں اسے اپنے ساتھ رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا اور نہ ہی ضد۔ نہایت ہی سنجیدگی سے بولی۔

"اگر ممتاز یہاں آ جاتی ہے تو میں رات بھر کے لیے اسے روک لوں گی۔ بہ صورتِ دیگر تم مجھے منہاس باقر کے بنگلے پر چھوڑ دینا۔"

اس نے کتنی سادگی سے اس مسئلے کا حل پیش کر دیا تھا۔ میں نے حیرت، دلچسپی اور لگاوٹ کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "میرا تو خیال تھا، تم ساتھ جانے کی ضد کرو گی!"

اس وقت میں ساحل کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے نظر چراتے ہوئے بولی "میں تمہارے ساتھ جانے کی ضد کروں گی تو میری وجہ سے خواہ مخواہ تمہاری جان مصیبت میں پڑ جائے گی۔ میری حفاظت کے خیال سے تم ٹینس رہو گے۔ میں اپنی ذات سے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ اس لیے میں فلیٹ پر ہی رہوں تو زیادہ اچھا ہے۔"

وہ اپنی ذات سے مجھے تکلیف نہ پہنچانے کی بات کر رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا، اس کی ذات اب میری ذات میں شامل ہو چکی ہے۔ میں نے کہا "میں کوشش کروں گا، ممتاز رات بھر کے لیے تمہارے پاس رک جائے مگر مجھے امید نہیں ہے، اس کا انکل منہاس باقر اس بات کے لیے تیار ہو۔ خصوصاً تعاقب والے واقعے کے بعد سے وہ لوگ بہت محتاط ہو گئے ہوں گے۔"

ساحل نے دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "میرا خیال ہے، ممتاز تمہاری بات نہیں ٹالے گی چاہے اس کے لیے اسے اپنے میزبان انکل کی ناراضی ہی کیوں نہ مول لینا پڑے!"

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، وہ اس وقت کس قدر

دشمنی پر بول رہی تھی۔ ممتاز کی مجھ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی ساحل کو اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے کھل کر اگرچہ اس کی شکایت نہیں کی تھی تاہم اس قسم کے جذبے چھپائے چھپتے ہیں اور نہ ہی زبان سے بیان کیے جاتے ہیں۔ انسان کا رویہ اور طرزِ عمل ہر بات کی وضاحت کے لیے کافی ہوتا ہے۔

میں نے اس موضوع کو پھیلانا مناسب نہ سمجھا اور منہاس باقر کے بنگلے کے نمبر ڈائل کرنے کے لیے فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا پھر اس سے پہلے کہ میں ریسیور اٹھاتا، فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے اپنے "ہیلو" کے جواب میں ایک مانوس آواز سنی "وجدان! آئی ایم رئیلی سوری۔ تمہیں کبیر شاہ سے معلوم ہو چکا ہو گا، میں اس مشن میں تمہارے پاس موجود نہیں ہوں۔"

"ہاں، کبیر شاہ نے مجھے بتا دیا ہے۔" شعیب غوری کی معذرت کے جواب میں، میں نے کہا "تم ٹھیک ٹھاک تو ہو نا؟ جس کام سے ماریشس گئے تھے، وہ ہوا یا نہیں؟ واپسی میں تاخیر کا سبب کیا ہے؟"

"ایک سانس میں تین سوال!" شعیب غوری نے ایک گہری سانس لینے کے بعد کہا "میں بالکل خیریت سے ہوں۔ جس کام سے یہاں آیا تھا وہ ہو گیا۔ واپسی میں تاخیر کا سبب آج کا موسم ہے۔ اس اچانک موسمی تبدیلی کی وجہ سے اکثر فلائٹس کینسل کر دی گئی ہیں۔ جو جا بھی رہی ہیں اور وہ اپنے مقررہ وقت سے گھنٹوں لیٹ ہیں۔ آج کے دن میں کسی فلائٹ میں سیٹ نہیں مل سکتی۔ میں ان شاء اللہ کل رات میں تمہارے پاس ہوں گا، کراچی میں۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "لیکن تم نے آج کی رات کو ضائع نہیں کرنا۔ میں نے کبیر شاہ کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ ویسے مخالف کیمپ میں موجود میرا بندہ تم لوگوں کی مدد اور راہ نمائی کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہو گا۔ میں نے کبیر شاہ کو فرخ سے کنکٹ کر دیا ہے۔ اپنی واپسی پر میں بہت بڑی خوشخبری سننا چاہتا ہوں وجدان!"

"تم فکر نہ کرو شعیب۔ اس رات کا ایک ایک لمحہ کیش ہو گا۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ مجھے محسوس ہوا، میرے لہجے میں سفاکی اتر آئی تھی۔ "تم کل یہاں پہنچ کر خوشخبری نہیں بلکہ خوشخبریاں سنو گے!"

"تمہارے اس پُرعزم اور بااعتماد لہجے نے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی ہے۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولا "ویسے تو تم اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہو، میں تمہیں سمجھانا اچھا نہیں لگتا لیکن اس لیے محتاط رہنے کی ہدایت ضرور کروں گا کہ یہ پاکستان ہے۔ یہاں کی پولیس بے گناہوں سے زیادہ مجرموں کا ساتھ دیتی ہے اس لیے پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے، تم میری بات کو سمجھ گئے ہو گے؟"

"بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اگر تم نے میاں زاہد کو عبرت ناک انجام سے دوچار کر دیا تو سمجھ لو، تم نے چوہدری نوازش علی کی کمر توڑ دی۔ وہ میاں زاہد کی کارکردگی سے بہت خوش ہے۔ اس نے کراچی کے نیٹ ورک کو بڑی مشاقی سے کنٹرول کر رکھا ہے۔"

میں نے کہا "میں عملاً بھی نوازش علی کی کمر توڑ کر رکھ دوں گا۔"

"ان شاء اللہ! ایک دن ایسا ضرور ہو گا۔" شعیب نے معتدل انداز میں کہا "میاں زاہد کا خاتمہ چوہدری نوازش کی دُم پر پاؤں رکھنے کے مترادف ہے۔ وہ اپنے ایک بہترین اور مفید آدمی کی موت پر چکرا کر رہ جائے گا اور پہلی فرصت میں کراچی کا رخ کرے گا۔ گویا شکار خود چل کر شکاری کے پاس آ جائے گا۔" ایک لمحے کے لیے اس نے توقف کیا پھر نہایت ہی سنجیدہ انداز میں بولا۔

"وجدان! شکار کرنے کے دو بڑے طریقے ہیں۔ نمبر ایک، شکاری کیل کانٹے سے لیس ہو کر شکار کے تعاقب میں لگ جائے۔ جب شکار دوڑ دوڑ کر تھک جائے، رک کر ہانپنے لگے اور گر کر کانپنے لگے تو اسے اپنی مرضی کے مطابق شکار کر لے۔

نمبر دو، شکاری ایک مقام پر مناسب بندوبست کے ساتھ شکار کے انتظار میں سکون سے بیٹھ جائے۔ اس کا بندوبست شکار کو مذکورہ مقام تک لے آئے تو وہ شکار کر لے۔ آج رات کا مشن ایسا ہی طریقہ ہے۔ زاہد حسین کا "بندوبست" چوہدری نوازش کو کراچی پہنچا دے گا جہاں شکاری پہلے سے گھات لگائے بیٹھا ہو گا۔ میں شکار کا یہ طریقہ اپناتا ہوں۔"

اس کی پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا "میرے نزدیک یہ تن آسانی اور سہل پسندی ہے۔ مجھے تو شکار کو دوڑا دوڑا کر گرانے میں مزہ آتا ہے۔ میں چوہدری کی آخری سانس تک اس کے تعاقب میں رہوں گا۔ اسے تڑپا تڑپا کر، سسکا سسکا کر مارنے میں مجھے بہت مزہ آئے گا۔ اتنے بڑے شیطان کو یوں آسانی سے گھیر کر شکار کرنا اس کے شایانِ شان نہیں شعیب!"

"ایزیوش وجدان۔" شعیب غوری نے کشادہ دلی سے کہا "میں ہر صورت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ وش یو گڈ لک۔"

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہوگیا۔

میں نے اگلے ہی لمحے منہاس باقر کے بنگلے کا نمبر ملایا اور تھوڑی دیر بعد ممتاز لائن پر آگئی۔ میں نے کہا "ٹھیک ہے ممتاز، تم شام سے تھوڑا پہلے آجاؤ اور کوشش کرو کہ آج کی رات ہمارے پاس رک جاؤ۔"

"تو تم کیا سمجھ رہے ہو، میں دو چار گھنٹوں کی گپ شپ کے لیے آ رہی ہوں!" وہ اٹھلا کر بولی۔ اس کے لہجے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "میں نے انکل باقر سے اجازت لے لی ہے۔ آج کی رات میں تمہارے فلیٹ پر ہی گزاروں گی۔ وہ میری حفاظت کی طرف سے خاصے فکر مند ہیں لیکن میری ضد کے سامنے انہوں نے زیادہ مخالفت نہیں کی۔ وہ تمہارے اس کارنامے سے بہ خوبی آگاہ ہیں جب تم نے مجھے خطرناک ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑا کر بابا کے پاس پہنچایا تھا۔"

ممتاز کی بے باکی اور خود اعتمادی میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ میرے بارے میں اس کا رویہ فکر انگیز تھا۔ مدھوری ڈکشٹ سے مشابہ وہ لڑکی اپنے انداز سے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ نئی سر میں ممتاز کے باپ قاضی سلطان کا رویہ بھی پُر معنی تھا۔ وہ مجھے برخوردار کی طرح ٹریٹ کرتا تھا اور ہر لمحے مشفق و مہربان نظر آتا تھا۔

چاہت ایک ایسا جذبہ ہے جو پہلی نگاہ ہی میں نظر میں آ جاتا ہے۔ ممتاز کے جذبات کو مجھ سے زیادہ ساحل نے محسوس کیا تھا جیسے کسی گھر کا پہرے دار اس گھر کے مکینوں سے پہلے کسی بیرونی خطرے کو بھانپ لیتا ہے۔ ساحل کسی چوکیدار سے کم نہیں تھی!

ممتاز میری معیت میں رات گزارنے آ رہی تھی۔ وہ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی، میری یہ رات دشمنوں کی میت کے ساتھ گزرنے والی تھی!

○*○

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

میں اس وقت کبیر شاہ کے ساتھ انگلش میڈیم اسکول کی بالائی منزل پر تھا۔ یہاں سے ہم ٹیلی اسکوپ کی مدد سے میاں زاہد کے بنگلے کی ممکنہ حد تک تفصیلات دیکھ سکتے تھے۔ میں اپنی نیلی شیرڈ ساؤتھ ہی میں چھوڑ آیا تھا اور یہاں تک ہم دونوں طاقت ور انجنوں والی دو موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر پہنچے تھے جو اس وقت زیریں منزل پر اسکول کے احاطے میں کھڑی تھیں۔ کبیر شاہ نے لالچی چوکیدار کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ ایک رات کے لیے وہاں سے غیر حاضر رہنے پر تیار ہوگیا تھا۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس دو کلاشنکوف، ایک ایک پستول اور میری پنڈلی پر موجود وہ خنجر بھی شامل تھا جو امتیاز کے قاتلوں کے خون کا پیاسا تھا۔

ہم نے ٹیلی اسکوپ کو ایک ایسی کھڑکی میں سیٹ کیا تھا کہ باہر سے یا سامنے والے بنگلے سے ہمیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا تاہم ہم سب کو بڑی وضاحت سے دیکھ پا رہے تھے۔ اس اسکول میں ٹیلی فون بھی تھا جو زیریں منزل پر آفس میں رکھا تھا۔ کبیر شاہ نے اس کا تار بڑھا کر اسے بالائی منزل پر پہنچا دیا تھا تاکہ کسی قسم کی ہنگامی صورتِ حال میں امداد و کمک کے لیے ساؤتھ سے رابطہ کیا جا سکے۔ میں نے اسکول میں آنے کے بعد اپنے فلیٹ پر فون کر کے ممتاز اور ساحل کی خیر خیریت دریافت کرلی تھی اور ساحل کو اس ٹیلی فون کا نمبر بھی لکھوا دیا تھا تاکہ کسی ایمرجنسی میں وہ مجھے اطلاع دے سکے۔

اب تک سامنے والے بنگلے میں، میں نے جن لوگوں کی آمد و شد دیکھی تھی ان میں میرے کام کے صرف تین ہی افراد تھے۔ اول پستہ قامت میاں زاہد حسین جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مکاری اور سفاکی ٹپکتی تھی۔ دوم یعقوب عرف قوبا جس کی ملکیت گرے پجارو والوں نے میرے ساتھیوں پر فائرنگ کر کے انہیں مجھ سے چھین لیا تھا اور سوم شاکر علی جو وہیل چیئر پر تھا۔ گرین بیلٹ والے بنگلے پر ڈیڑھ ماہ پہلے مرحوم امتیاز علی نے ایک ہلاکت آب خنجر سے اس کے قدموں میں "زنجیریں" ڈال دی تھیں۔

ان تینوں شیطانوں کے لیے میرے دل و دماغ میں حد درجہ نفرت اور غصہ بھرا ہوا تھا اور آج ان تینوں کو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہونا تھا۔

میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ کبیر شاہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! میں نے دوپہر میں فون پر تم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ اب میں اسی سوال کو دہرا رہا ہوں کیوں کہ تم نے جواب نہیں دیا تھا۔"

میں ٹیلی اسکوپ کی مدد سے سامنے والے بنگلے کا جائزہ لیتے ہوئے کبیر شاہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "وجدان! تمہیں اس بنگلے کا ایڈریس کس نے بتایا تھا؟ میری معلومات کے مطابق بابر نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"تمہاری معلومات درست ہیں کبیر شاہ۔" میں نے بنگلے کی جانب متوجہ رہتے ہوئے کہا "دراصل بات یہ ہے کہ کل رات دو غنڈے میری ایک ساتھی کا تعاقب کر رہے تھے۔ میں نے انہیں گھیر کر جب مرمت کی تو ان میں سے ایک نے بتایا کہ وہ محمود لاثانی کے ایما پر تعاقب کر رہے تھے جو ڈیفنس سوسائٹی کے بنگلہ نمبر "بی۔ تھرٹی ایٹ" میں رہتا ہے۔ اسی حوالے سے میں نے تم سے محمود لاثانی کا پوچھا تھا۔"

"کیا وہ دونوں غنڈے تمہاری ساتھی ساحل کا تعاقب کر رہے تھے؟"

"نہیں، وہ کوئی اور ساتھی تھی۔" میں نے بتایا۔

کبیر شاہ نے اس سلسلے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہمارے درمیان چند لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں، میں بدستور بنگلے کے احاطے، پہلوؤں اور گیٹ کے سامنے والے تمام مناظر کو باریک بینی سے واچ کر رہا تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص ٹیلی اسکوپ سے استفادہ کر سکتا تھا لہٰذا کبیر شاہ کلاشنکوف کے میگزینز کی چیکنگ میں مصروف تھا۔

میری اس دوربینی (ٹیلی اسکوپک) تاک جھانک میں اچانک ایک گاڑی نے تہلکہ ڈال دیا۔ وہ لمبی چوڑی چمچماتی گاڑی بڑے اسٹائل سے سیاہ گیٹ کے سامنے آکر رکی تھی اور اس سے پہلے کہ چوکیدار اس کے لیے بنگلے کا گیٹ کھولتا، گاڑی کی پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں اس دراز قامت شخص کو پہلی نظر میں پہچان گیا۔ وہ تارا تھا!

"یہ شیطان یہاں کیسے؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

کبیر شاہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کس شیطان کی بات کر رہے ہو؟"

میں کبیر شاہ کے سوال کا جواب نہ دے سکا کیوں کہ باہر کے منظر میں سنسنی خیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں جیسے گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں سے دو سوٹڈ بوٹڈ افراد برآمد ہوئے اور ان کے چہروں پر نگاہ پڑتے ہی میں کئی سال پیچھے ماضی کی بھول بھلیوں میں پہنچ گیا۔ میری نگاہیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ میں نے ان دونوں کو بھی ٹھیک ٹھیک پہچان لیا تھا لیکن حیرت اس بات کی تھی کہ وہ ہزاروں میل دور یہاں کراچی میں کیسے پہنچے تھے۔

اسی وقت مجھے اپنے کندھے پر دباؤ محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کبیر شاہ کی آواز میری سماعت میں داخل ہوئی "لگتا ہے، میاں زاہد کے غیر ملکی مہمان آگئے ہیں!"

میرے ہاتھ میں تو ٹیلی اسکوپ تھی۔ میں گاڑی کی ڈکی سے برآمد ہونے والے سوٹ کیسوں کو واضح طور پر دیکھ رہا تھا جن پر لگے سنگاپور ائرلائن کے ٹیگ بتا رہے تھے کہ وہ دونوں سنگاپور سے پاکستان آئے تھے "مگر وہ... وہ تو سنگاپور کی جیل میں تھے!"

یہ جملہ بڑبڑانے والے انداز میں میرے ہونٹوں سے جدا ہوا تھا اور اس بڑبڑاہٹ میں تشویش ناک حیرت شامل تھی۔

"تم نے پہلے کسی شیطان کا ذکر کیا اور اب سنگاپور کی کسی جیل کا تذکرہ کر رہے ہو۔" مجھے اپنی پشت پر کبیر شاہ کی آواز سنائی دی "وجدان! یہ کیا قصہ ہے؟"

تارا کو کراچی میں دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی تھی لیکن اس سے "ممتاز کے تعاقب" والا معاملہ صاف ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ تارا ہی نے ممتاز کا سراغ لگانے کے لیے وہ حرکت کی ہوگی کیوں کہ ممتاز کی مضبوط گواہی پر تارا اور وڈیرا اکبر سومرو کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ تارا عمر کوٹ پولیس

اے جی اقبال کے قلم سے
گانا سیکھنے کے لیے نہایت موزوں کتاب ہے
امجد موسیقی
یہ کتاب موسیقی کی کلید ہے، موسیقی کا قاعدہ ہے، یہ موسیقی کی تمہید بھی ہے، تعارف بھی۔ اس کی سادگی اسے موسیقی پر لکھی جانے والی دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔
قیمت 150/- روپے + ڈاک خرچ 25/- روپے
برصغیر کے نامور گلوکاروں کے سدا بہار گیتوں کا
نوٹیشن
اس نوٹیشن کی مدد سے ان گیتوں کی صرف دھن ہی کسی بھی ساز پر بجائی جاسکتی ہے
سُر کے گیت
موسیقی کے دیوانوں کے لیے ایک منفرد تحفہ اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
Email: kitabiat1970@yahoo.com

کی تحویل میں تھا اور وہ دونوں سنگاپور کی جیل میں۔ میں نے سنگاپور میں انسپکٹر چیانگ شو کی مدد سے دارا کے سنڈیکیٹ کو تہ وبالا کر دیا تھا۔ دارا تو اس آپریشن میں ہاتھ نہیں لگا تھا لیکن اس کے سنڈیکیٹ کے تین عہدے داروں کو چیانگ شو نے چھاپ لیا۔ ایک یوریشین عہدے دار پولیس مقابلے میں مارا گیا جب کہ انڈین بھولا ناتھ اور پاکستانی جمال کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ بھولا ناتھ کے قبضے سے دس کلو ہیروئن برآمد ہوئی تھی۔ جمال' اس سنڈیکیٹ کے روحِ رواں دارا کا فرسٹ کزن تھا۔ یہ دونوں سزا پا کر جیل چلے گئے تھے۔ یہ تمام خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزر گئے۔

اس الجھی ہوئی صورتِ حال کو میں خود کچھ سمجھ نہیں پایا تھا' کبیر شاہ کو اس بارے میں کیا بتاتا۔ اس سے پہلے کہ کبیر شاہ دوبارہ اس سلسلے میں استفسار کرتا' فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ کبیر نے لپک کر ریسیور اٹھا لیا۔

دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس نے کہا "وجدان! تمہارے لیے کال ہے۔"

میں نے یہاں کا فون نمبر صرف ساحل اور ممتاز کو دیا تھا۔ یہ انہی کی کال ہو سکتی تھی۔ الجھے ہوئے ذہن اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھا۔ ٹیلی اسکوپ میں نے کبیر شاہ کو تھما دی۔

"ہیلو۔" میں نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف سے ساحل بولی "وجدان! لائٹ چلی گئی ہے۔"

"اس میں ایسی پریشانی کی کون سی بات ہے۔" میں نے اس کے لہجے میں موجود گھبراہٹ کے پیشِ نظر کہا "بلڈنگ میں اسٹینڈ بائی جنریٹر موجود ہے۔ وہ اسے آن کر دیں گے۔"

وہ تشویش ناک انداز میں بولی "پورے فلیٹ میں اندھیرے کا راج ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے سلائیڈنگ ڈور کے پاس جا کر تمہیں فون کیا ہے۔"

میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم ممتاز کی مدد سے دونوں کمروں کے سلائیڈنگ ڈور کھول دو۔ اس کے علاوہ کچن میں جا کر چولھا بھی آن کر دو۔ کچھ نہ کچھ اجالا ہو ہی جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' میں کچن میں جا رہی ہوں۔" وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولی "تم ممتاز سے بات کر لو۔ یہ خاصی سہمی ہوئی ہے۔ اس پورے علاقے کی لائٹ ایک ساتھ چلی گئی ہے شاید کوئی ٹیکنیکل فالٹ پیدا ہو گیا ہے۔"

ساحل کا جملہ ختم ہوا تو ممتاز کی آواز میرے کان میں پہنچی "وجہ۔۔۔ ن! کیا تم کسی بہت ہی اہم کام میں مصروف ہو۔ جلدی سے یہاں نہیں آ سکتے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی ریسیور میں ساحل کی چیخ ابھری۔ میں نے تڑپ کر ممتاز سے پوچھا "کیا ہوا؟"

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اس کی آواز میں بے پناہ خوف شامل ہو گیا۔

میں نے کہا "وہ' وہ سے آگے بھی تو کچھ بولو۔ ساحل کیوں چیخی تھی؟"

ممتاز نے بہ مشکل اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے بتایا "وجدان! فلیٹ میں ایک۔۔۔ سفید چیتا۔۔۔ گھس آیا ہے۔۔۔ وہ کچن میں۔۔۔ ساحل بھی کچن۔۔۔"

اس کے بعد ممتاز کی آواز معدوم ہو گئی۔ میں پہلے ہی ذہنی طور پر بری طرح الجھا ہوا تھا' یہ ایک نئی افتاد آن پڑی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ میں نے چیخ کر ریسیور میں کہا۔

"تم یہ کیا بکواس کر رہی ہو ممتاز۔ کوئی سفید چیتا فلیٹ میں کیسے آ سکتا ہے؟"

دوسری جانب خاموشی رہی۔ مکمل خاموشی۔

میری وحشت جنون کی شکل اختیار کر گئی "تم بولتی کیوں نہیں ہو۔ میری بات کا جواب دو۔ ہیلو ممتاز! تم میری بات سن رہی ہو نا؟ ہیلو۔۔۔ ہیلو؟"

میری اس "ہیلو ہیلو" کی تکرار کے جواب میں جو آواز ایئرپیس میں ابھری اسے سن کر میں پسینے میں نہا گیا۔ جسم کا سارا خون دماغ کو چڑھ کر کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ میری سماعت کو دھوکا نہیں ہوا تھا۔ میرے کان نے یہی مخصوص گونج دار لفظ سنا تھا۔۔۔ "میاؤں"۔

میرے تصور میں وہ غیر معمولی جسامت کی سفید بلی گھوم گئی جس کی برقی جست نے کلاشنکوف بردار کو بے بس کر دیا تھا۔

میں آخری کوشش کے طور پر حلق کی پوری قوت سے چلایا "ممتاز۔۔۔ ساحل۔۔۔ تم تک میری آواز پہنچ رہی ہو' تم لوگ خاموش کیوں ہو؟"

میرے اس سوال کا جواب کون دیتا۔ ٹیلی فون کی لائن بے جان ہو چکی تھی۔

میں اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا تھا!

وہ دوراہا جو ہینگنگ گارڈن ایسے عجوبے کی مانند ہوا معلق تھا۔ اس کے نیچے آگ کا دریا بہہ رہا تھا جس میں ڈوب کر پار اترنا پڑتا ہے۔ اس دوراہے کی ایک طرف میرے جانی دشمن تھے جنہیں سنگین اتفاق نے یک جا کر دیا تھا۔ دوسری جانب ساحل اور ممتاز تھیں۔ میں انہیں کوئی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میری ان چاہنے والیوں پر اچانک ایک افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ انہیں فوری طور پر اس مصیبت سے نکالنا ضروری تھا کیوں کہ ان کی پتا حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین تھی۔۔۔ اور دشمنوں پر قہر بن کر نازل ہونے کا سنہری موقع بھی بار بار ہاتھ نہیں آتا' میں ہاتھ آئے اس موقع کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا' انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانا اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ سانس لینا۔

سیکنڈ کے ہزارویں حصے تک میں ادھر اور ادھر کے بیچ لٹکا رہا پھر ایک پُرعزم نتیجے پر پہنچ گیا۔ میرے قدم مضبوطی سے زمین پر آ گئے تھے۔ میں نے اپنے فلیٹ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ جان لینے سے جان بچانا زیادہ اہم ہوتا ہے۔

اسی لمحے میرے عقب میں کبیر شاہ کی آواز ابھری۔ وہ مجھے فون پر چیختے ہوئے سن چکا تھا۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا "کیا ہوا وجدان' تم اس قدر چلا کیوں رہے ہو۔ خیریت تو ہے نا' کس کا فون تھا؟"

"ساحل کا فون تھا۔" میں اس وقت تک ذہنی طور پر سنبھل چکا تھا "وہاں فلیٹ میں لائٹ چلی گئی ہے۔ وہ سو رہی تھی' گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور پریشانی میں مجھے فون کر ڈالا۔"

وہ شک آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تمہاری بوکھلائی ہوئی گفتگو میں کسی سفید چیتے کا ذکر بھی آیا تھا۔ یہ کیا سلسلہ ہے وجدان؟"

کبیر شاہ کا شک اور تشویش بجا تھی لیکن میں بھی ایسے سوالوں کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے متحمل انداز میں کہا "شاہ جی! بتایا تو ہے' ساحل سو رہی تھی۔ اس نے خواب میں کسی سفید چیتے کو فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھلی تو لائٹ جا چکی تھی۔ اس نے سمجھا' واقعی کوئی درندہ فلیٹ میں گھس آیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"یہ لڑکیاں بہت ہی جذباتی اور ڈرپوک ہوتی ہیں۔" وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا پھر پوچھا "کیا اب ساحل نارمل ہو چکی ہے؟"

میں نے اندرونی کیفیات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے کہا "نہیں شاہ جی! وہ سخت خوف زدہ ہے۔ مجھے جانا ہو گا۔"

"کہاں جانا ہو گا؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"فلیٹ پر۔" میں نے قطعیت سے کہا "میں بس آنا جانا ہی کروں گا۔ تم فکر نہ کرو' میں جلدی لوٹ آؤں گا۔"

وہ بولا "تم نے تو بتایا تھا' کوئی اور لڑکی بھی وہاں فلیٹ پر موجود ہے؟"

"ہاں' ہے تو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "مگر وہ بھی ساحل کی طرح ایک لڑکی ہے اور تم تو جانتے ہو۔۔۔ لڑکیاں کتنی ڈرپوک ہوتی ہیں!"

میں نے کبیر شاہ کے الفاظ اسی پر لوٹا دیے تو وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے کے بعد گویا ہوا "تو کیا تم ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آ رہے ہو؟"

"یہ رسک تو میں کسی قیمت پر نہیں لے سکتا شاہ جی۔" کبیر شاہ کو عام طور پر "شاہ جی" کہا جاتا تھا اس لیے میں نے بھی یہی اندازِ تخاطب اختیار کیا "یہ اسکول اور وہ سامنے والا بنگلہ کسی بھی وقت میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر سکتے ہیں۔"

"پھر؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا "میں انہیں کہیں اور چھوڑ کر آؤں گا۔ یہ بھی ممکن ہے' ساحل کی ساتھی کے گھر ہی پہنچا آؤں۔"

میں نہیں جانتا تھا' وہاں فلیٹ پر پہنچ کر مجھے کس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا۔ میں تو کبیر شاہ کے اطمینان کے لیے اس طرح کی باتیں کر رہا تھا تاکہ جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو سکوں۔ میں فی الحال کبیر شاہ کو کھل کر کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کہا "تم چاہو تو انہیں ساؤتھ بھی چھوڑ کر آ سکتے ہو!"

"دیکھتا ہوں۔" میں نے مبہم انداز میں کہا "جو بھی مناسب ہو گا' کروں گا۔"

آئندہ دو منٹ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے میری موٹر سائیکل فلیٹ کی سمت اڑی جا رہی تھی۔ اس وقت میرا ذہن صرف ایک ہی شے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور وہ شے تھی سفید بلی۔ اس بلی کی انٹری اوپن ائر ریسٹورنٹ سے ہوئی تھی۔ وہ میرے قدموں کا مزاج پوچھ کر کھسک گئی تھی پھر قدرے بڑی جسامت کے ساتھ بوٹ بیسن والے واقعے میں اس نے ہماری مدد کی۔ ازاں بعد گزشتہ رات وہ ہمارے بیڈ روم میں بھی پائی گئی تھی مگر جب میں نے اسے کھدیڑا تو وہ کچن کی کھڑکی کے راستے نیچے کود گئی تھی۔ مجھے

اس کی "کود" پر شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔ آٹھواں فلور اچھی خاصی بلندی پر تھا۔ بلی کا وہاں سے چھلانگ لگانا خاصا خطرناک تھا جب کہ وہ کہیں آس پاس بھی نظر نہیں آئی تھی۔ کھڑکی سے نیچے سڑک تک اس کے "قیام" کے لیے کوئی "مقام" بھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور اب۔۔۔ فلیٹ میں کسی سفید چیتے کی آمد۔۔۔ اور وہ بھی کچن کی کھڑکی کے راستے؟

یہ ایک عجیب و غریب معمّا تھا۔ چیتا۔۔۔ اور وہ بھی سفید! سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ شہر کے انتہائی پوش اور محفوظ حصے میں جنگلی درندے کا کیا کام' پھر میں نے آج تک سفید چیتے کے بارے میں کہیں سنا تھا اور نہ پڑھا تھا۔ انہی سوچوں میں الجھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز سوال نے سر ابھارا۔

"کہیں یہ سارے روپ ایک ہی بلی کے تو نہیں! وہ موقع اور وقت کی مناسبت سے اپنی جسامت میں کمی بیشی کر لیتی ہو؟"

اس خیال کے ساتھ ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بہ ظاہر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کوئی بلی اپنی جسامت میں تبدیلی پر کیسے قادر ہو سکتی ہے۔۔۔ اور اگر یہ حقیقت تھی پھر وہ بہت ہی پُراسرار بلی تھی۔ پتا نہیں' وہ بلی تھی بھی یا نہیں!

ڈرائیونگ کے دوران میں وہ عجوبۂ روزگار بلی میرے تصور میں سمائی رہی۔ کبھی وہ نوازئیدہ بلونگڑے کی شکل اختیار کر لیتی اور کبھی اس کی جسامت اس قدر بڑھ جاتی کہ غراتا' دھاڑتا چیتا دکھائی دیتی۔ میں انہیں پراگندہ خیالات کے ساتھ اپارٹ منٹس بلڈنگ تک پہنچ گیا۔

وہ بلڈنگ اور گرد و نواح کا سارا علاقہ روشن تھا۔ یعنی لائٹ آ گئی تھی۔ میں نے سیکیورٹی گارڈ کے سلام کا جواب دیا اور اس سے کسی قسم کا استفسار کیے بغیر لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچ گیا۔ ڈور بیل کے جواب میں ممتاز نے دروازہ کھولا۔

اس کا چہرہ خوف اور تشویش کی دبیز چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا "کیا ہوا تھا؟"

"اندر تو آ جاؤ' سب بتاتی ہوں۔" وہ اضطراری انداز میں بولی۔

میں نے فلیٹ کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور ممتاز کے ساتھ چلتے ہوئے استفسار کیا "ساحل کہاں ہے۔۔۔ اور وہ چیتا۔۔۔؟"

میری بات ختم ہونے تک ہم بیڈروم میں پہنچ گئے۔ ساحل بیڈ پر نیم دراز تھی اور اس کی سنجیدگی پہلے سے ہزار گنا بڑھ چکی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی' ساحل کی اس سنجیدگی میں خوف کے بجائے متانت تھی جس نے اس کی گہرائی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

میں نے جب ان سے سفید چیتے کے حوالے سے پوچھ تاچھ کی تو انہوں نے باری باری مجھے اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ساحل نے بیچ میں کہیں کہیں گرہیں لگائی تھیں ورنہ زیادہ تر باتیں ممتاز کی زبانی مجھ تک پہنچیں۔

ان کے مطابق' وہ دونوں ٹی وی کے سامنے بیٹھی کوئی دلچسپ گیم شو دیکھ رہی تھیں کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ اس پورے علاقے کی لائٹ غائب ہو گئی تھی اس لیے فلیٹ کے اندر گھپ اندھیرے نے ڈیرا جما لیا۔ اسٹینڈ بائی جنریٹر کی سہولت کے باعث چوں کہ اطمینان تھا اس لیے ہم نے فلیٹ کے اندر کسی ایمرجنسی لائٹ کا بندوبست بھی نہیں کیا تھا۔ فلیٹ کے باہر لوگوں کی باتوں سے پتا چلا کہ جنریٹر میں کوئی فالٹ ہو گیا ہے چنانچہ ساحل نے فوراً مجھے فون کر دیا اور جب وہ میرے مشورے پر چولھا جلانے کچن کی طرف گئی تو اسی وقت کچن کی کھڑکی میں سے ایک سفید چیتا جست بھر کر اندر گھس آیا تھا جسے دیکھ کر ساحل کی چیخ نکل گئی اور شدید خوف کے باعث ممتاز کو سانپ سونگھ گیا۔ وہ میرے ٹیلی فونک سوالات کے جوابات نہ دے سکی۔

ان کی فراہم کردہ معلومات سے میری تشفی نہ ہوئی۔ میں نے ممتاز سے پوچھا "تم فون چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھیں؟"

میری آمد کے بعد اس کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے جیسے ہی اس چیتے کو ساحل کی طرف بڑھتے دیکھا تو میرے اعصاب مفلوج ہو کر رہ گئے۔ میں تمہارے سوالات کے جواب میں بھی کچھ نہ بول سکی۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔"

میں نے پوچھا "اس سفید چیتے نے تم میں سے کسی کو نقصان تو نہیں پہنچایا؟"

دونوں نے باری باری نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "وہ چیتا اب کہاں ہے؟"

اس سوال سے پہلے میں نے فلیٹ کے کونے کونے میں اچھی طرح جھانک لیا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "شاید تمہیں ہماری بات کا یقین نہ آئے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب میں نے چیتے کو دیکھ کر بے ساختہ چیخ ماری تھی اس کے فوراً بعد لائٹ آ گئی اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ فلیٹ

روشن ہوتے ہی سب کچھ معمول پر تھا۔ میں نے محتاط قدموں سے بیڈروم میں آ کر دیکھا۔ ممتاز قالین پر خوف زدگی کے عالم میں پڑی تھی۔ مجھے صحیح سالم دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ہم نے ہمت کر کے ہر کمرے میں جا کر دیکھ لیا مگر وہ خوں خوار جانور ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔

ساحل مجھ سے جھوٹ بول سکتی تھی اور نہ ہی فیکٹ میں فکشن کی آمیزش کر سکتی تھی' اس نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا وہی بیان کر رہی تھی۔ سفید چیتے کی آمد اور شُد واقعی حیرت ناک اور ناقابلِ یقین تھی۔ میں نے ممتاز کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جب تم دونوں ٹی وی دیکھ رہی تھیں تو فلیٹ کا داخلی دروازہ بند تھا؟"

یہ سوال میں نے اس امکان کے پیشِ نظر کیا تھا کہ اگر دروازہ کھلا تھا تو چیتا وہاں سے "رخصت" ہو سکتا تھا اگرچہ مجھے اس امکان کی قطعی کوئی امید نہیں تھی۔

ممتاز نے جواب دیا "مجھے اچھی طرح یاد ہے تمہارے جاتے ہی ہم نے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا تھا۔ یہ بات میں اتنے وثوق سے اس لیے بھی کہہ رہی ہوں کہ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے دروازہ بند کیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے' چیتا دروازے سے باہر نہیں گیا۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

ساحل گمبھیر انداز میں بولی "ممکن ہے' وہ کچن کی کھڑکی میں سے واپس چلا گیا ہو!"

"ہاں' یہ ممکن ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "جیسے وہ بلی گزشتہ رات اس کھڑکی سے باہر کود گئی تھی۔"

ساحل نے چونک کر مجھے دیکھا اور پیشانی سہلاتے ہوئے بولی "وجدان! مجھے یاد آ رہا ہے۔ اس سفید چیتے کی شکل بلی ہی کی طرح تھی۔"

میں ساحل کی بات کو یہ سوچ کر نظرانداز نہیں کر سکتا تھا کہ بلی اور چیتے کی صورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور خوف و دہشت کے عالم میں تو یہ فرق اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ میں نے ٹیلی فون پر اپنے کان سے ایک مخصوص قسم کی گونج دار "میاؤں" سنی تھی۔ یہ معاملہ اتنا سیدھا اور آسان نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ اس واقعے میں بہت سارے پُراسرار عوامل بھی شامل تھے۔ میں نے ہندوستان سے نیپال اور نیپال سے ہمالیہ کی گود تک سفر کے دوران میں سفلی اور علوی علوم و فنون کے اتنے کمالات دیکھے تھے کہ میری نگاہ میں بہت سے اسراروں سے پردے اٹھ گئے تھے۔ یوگی گوتم بھوش اور اس کا چیلا پنڈت دھیراج واہمے تخلیق کرنے کے ماہر تھے۔ وہ اپنی پُراسرار شکتیوں سے محیّر العقول واقعات کو جنم دیتے تھے۔ کومپو کی عبادت گاہ میں کیسا کیسا طلسم میری نظر سے گزرا تھا۔ تلکو قبیلے کی سردارنی کاشی' اندھا راہ نما ثوبان اور ہمالیہ کی سپر شکتی نیلگری میری چشمِ تصور میں گھوم گئے۔

نیلگری کے لمحاتی خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں اپنے اس اندرونی اضطراب کو فوری طور پر کوئی نام نہ دے سکا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔ میرا یہ عمل میکانکی تھا۔ ساحل نے چونک کر پوچھا۔

"کہاں جا رہے ہو وجدان؟"

"میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

"کیا تم فلیٹ سے باہر جانا چاہتے ہو؟" ممتاز نے سوال کیا۔

"ہاں' میں ذرا سیکیورٹی گارڈ کے پاس جا رہا ہوں۔"

ساحل نے کہا "سیکیورٹی گارڈ سے تو یہاں بیٹھے بیٹھے بھی بات ہو سکتی ہے۔ فلیٹ میں انٹرکام سسٹم موجود ہے۔"

"ہاں' سسٹم کی موجودگی میرے علم میں ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "میں گھوم پھر کر کچھ اور بھی دیکھنا چاہتا ہوں' محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارے غیاب میں اگر دوبارہ لائٹ چلی گئی تو؟"

ممتاز نے سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

"اب لائٹ نہیں جائے گی۔" میرے لہجے میں بلا کی سختی اور تیقن تھا۔

ممتاز نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا تھا۔

میں نے ایک نظر ساحل کی طرف دیکھا اور فلیٹ سے باہر آ گیا۔

میں مختلف فلورز پر لفٹ سے باہر نکلتا رہا' سوار ہوتا رہا پھر ایک چکر کار پارکنگ کا لگایا اور کوشش کی وہاں سے گزروں جہاں دو چار افراد کھڑے ہوں۔ یہ ساری مشقت میں اس لیے کر رہا تھا کہ اگر واقعی اس بلڈنگ میں کوئی سفید چیتا گھس آیا تھا تو آیا کسی اور نے بھی اسے دیکھا تھا! چیتے کی آمد پر جو افراتفری اور کھلبلی مچنا چاہیے تھی وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ "چیتے کی کہانی" میرے فلیٹ کے اندر سے شروع ہو کر اندر ہی ختم ہو گئی تھی۔ بلڈنگ کی "سیر" کے بعد میں سیکیورٹی گارڈ کی طرف چلا گیا اور اس سے جنریٹر کے فالٹ سے متعلق پوچھا۔

"صاحب! مشین تو پھر مشین ہے نا۔" وہ فلسفیانہ انداز

کرو دروغ گو اور دو نمبر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے۔
ممتاز نے میری تاکید کے جواب میں کہا "ٹھیک ہے‘ یہ کہانی صرف میرے ذہن کے اندر محفوظ رہے گی لیکن وعدہ کرو‘ تم بعد میں مجھے اس سفید چیتے کی حقیقت سے آگاہ کرو گے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے پُر اعتماد انداز میں کہا "مجھے یقین ہے‘ تمہارے پاس اس کہانی کی بھرپور توجیہہ موجود ہے!"
اس کے لہجے میں شامل اعتماد کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کے سلسلے میں اسے تفصیل سے آگاہ کرنے کی ہامی بھرلی اور کہا "اب تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"
دیوار گیر کلاک کی سوئیاں نصف شب گزرنے کا اعلان کر رہی تھیں۔ ساحل نے مجھ سے پوچھا "کیا تم واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟"
"ہاں‘ میں جس کام سے گیا تھا‘ وہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔" میں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں کہا تاکہ ساحل میری بات سمجھ جائے۔
وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "تم تو ممتاز کو بھی فوراً تیار ہونے کو کہہ رہے ہو۔ کیا یہ بھی تمہارے ساتھ جائے گی؟"
"تم دونوں میرے ساتھ چلو گی۔" میں نے کہا "میں تمہیں منہاس باقر کے بنگلے پر چھوڑ کر اپنے دوستوں کی طرف چلا جاؤں گا۔"
ممتاز نے کہا "اگر تم یہیں ہمارے پاس رک جاتے تو زیادہ مناسب تھا۔ کیا تمہارا اپنے ان دوستوں کے پاس جانا بہت ضروری ہے؟"
"بہت ضروری۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔
وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "پھر تو مجبوری ہے۔"
ممتاز لباس تبدیل کرنے کے لیے واش روم میں گئی تو میں ساحل کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے پُرسوچ انداز میں کہا "وجدان! مجھے تو لگتا ہے‘ تمہارے ساتھ پھر کوئی پُراسرار چکر شروع ہونے والا ہے۔"
"اور میرا خیال ہے‘ یہ چکر شروع ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔
ہم دونوں دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میرے انداز کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا "مجھے یقین ہے‘ وہ سفید چیتا ہمارے سوا کسی اور کو دکھائی نہیں دیا ہو گا۔ اس سلسلے میں میرا ذہن بار بار اسی کم بخت بلی کی طرف جا رہا ہے۔ وجدان! وہ کوئی عام سی بلی نہیں تھی۔"
"تم بھی بالکل میرے ہی انداز میں سوچ رہی ہو۔" میں نے تائیدی لہجے میں کہا "اگر یہ سب چکر اسی بلی کا چلایا ہوا ہے تو پھر ماننا ہو گا‘ وہ کوئی طلسماتی جانور ہے۔ وہ بہ وقتِ ضرورت اپنی جسامت میں کمی بیشی کرنے پر قادر ہے لیکن اس کا رویّہ مجھے الجھا رہا ہے۔"
"مثلاً تمہارے ذہن میں کس قسم کی الجھن ہے؟"
میں نے کہا "بوٹ بیسن والے واقعے میں اس نے ایک دوست کا کردار ادا کیا تھا اور اب اس نے تم دونوں کو خوف زدہ کر کے ثابت کیا ہے کہ اس کا انداز معاندانہ ہے۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے وضاحتی لہجے میں کہا "ہمارے سارے اندازے اور قیاسات کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وقتاً فوقتاً یہ سارے کردار ایک ہی حیرت انگیز بلی نے ادا کیے ہوں۔"
وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی "وجدان! اس معمے کو جلد از جلد حل کرنے کی کوشش کرو۔ میں اپنے اندر بہت اضطراب اور بے کیفی محسوس کر رہی ہوں۔"
"تم فکر نہ کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "بہت جلد سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ پہلے میں وہ کام نمٹا لوں جو اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ آج کی رات بہت اہم ہے ساحل‘ بہت اہم۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو‘ میاں زاہد حسین کے بنگلے پر کیسے کیسے "پیس" اکٹھا ہو چکے ہیں۔"
"لارڈ بدھا تمہاری حفاظت کرے۔" وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔
اسی وقت ممتاز واش روم سے نکل آئی۔ اگلے پانچ منٹ میں ہم تینوں اپارٹ منٹ بلڈنگ سے باہر تھے۔ میری نیلی شیرڈ تو ساؤتھ میں کھڑی تھی۔ یہاں میں موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ چائنا ٹاؤن کے کارنر سے میں نے ان دونوں کو ایک ییلو کیب میں بٹھایا اور خود موٹر سائیکل پر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
جب ہم بنگلے پر پہنچے تو منہاس باقر وہاں موجود تھا۔ میں نے راستے میں اس اچانک "آمد" کا جواز سوچ لیا تھا۔ باقر کے استفسار پر میں نے بتایا "انکل! ادھر تو لائٹ چلی گئی اور جنریٹر خراب پڑا ہے۔ یہ دونوں بہت بوریت محسوس کر رہی تھیں۔ بجلی کی واپسی کا انتظار کرنے کے بجائے میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔"
"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔" وہ معتدل انداز میں بولا

میں بولا "اور الیکٹریکل مشین تو کچھ زیادہ ہی ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے حالانکہ میں روزانہ اسے چیک کرواتا ہوں۔ پتا نہیں‘ اسے کیا ہو گیا تھا!" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے معذرت خواہانہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا "بہرحال‘ میں نے دو تین منٹ میں اس کا نقص ٹھیک کروا دیا تھا اور اس سے پہلے کہ جنریٹر کو آن کیا جاتا‘ لائٹ آ گئی۔ بہ مشکل دس منٹ تک بلڈنگ میں اندھیرا رہا ہو گا۔"
میں اپنی تفتیش مکمل کر کے واپس فلیٹ میں آ گیا۔
ممتاز نے پوچھا "کچھ پتا چلا اس درندے کے بارے میں؟"
"اس بلڈنگ میں تم دونوں کے سوا کسی تیسرے شخص نے کوئی درندہ نہیں دیکھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کیوں کہ چیتا نامی کوئی جنگلی حیات نہ تو بلڈنگ میں داخل ہوئی ہے اور نہ ہی یہاں سے رخصت ہوئی۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔
میں نے کہا "میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں ممتاز۔"
"مگر میں نے خود..... میرا مطلب ہے‘ ہم دونوں نے اپنی آنکھوں سے ایک جیتے جاگتے سفید چیتے کو دیکھا ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو ساحل سے....."
"مجھے تمہاری بات کا صدفی صد یقین ہے ممتاز۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم دونوں نے جو کچھ بتایا ہے وہ غلط نہیں لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ بھی سچ ہے۔"
"وجدان! یہ کیسے ممکن ہے؟" ممتاز کی الجھن بڑھ گئی۔
اس کے بالعکس ساحل کا چہرہ پُرسکون تھا تاہم وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے ممتاز کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
"انسانی آنکھ بعض اوقات دھوکا کھا جاتی ہے۔ وہم کو حقیقت سمجھ لیتی ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ بھی دھوکا ہوا ہے۔ تم جس شے کو سفید چیتا‘ سمجھ رہی ہو وہ چیتا نہیں‘ کچھ اور تھا۔"
"کچھ اور تھا..... کچھ اور کیا؟" ممتاز کی الجھن اضطراب میں بدل گئی۔
ساحل نے سمجھانے والے انداز میں کہا "ممتاز! تم اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالو اور فی الحال اس "چیتے" کی سوچ کو جھٹک دو۔ یہ پُراسرار چکر تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"
ساحل کی بات سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس معاملے کی تہ میں اتر چکی تھی۔ میں نے ممتاز سے کہا "کل میں نے ریسٹورنٹ میں تم سے ایک وعدہ کیا تھا‘ واپسی میں تمہارے انکل کے بنگلے پر آنے کا۔ آج تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔"
"وعدے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ سادگی سے بولی "تم جو کہو‘ میں کرنے کو تیار ہوں۔ ویسے کل رات والا وعدہ تم نے شبانہ سے کیا تھا!"
"بہ ظاہر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "لیکن درحقیقت وہ وعدہ میں نے تمہاری وجہ سے کیا تھا۔"
وہ خوش ہوتے ہوئے بولی "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اگر تم نے میری خاطر شبانہ سے وعدہ کیا تھا تو پھر میں آنکھیں بند کر کے تمہارا ہر حکم ماننے کو تیار رہوں۔ بولو کیا چاہتے ہو مجھ سے؟"
میں نے ممتاز کو خوف و دہشت کی کیفیت سے نکالنے کے لیے وہ وعدے کا چکر چلایا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا‘ میری یہ کوشش خاصی حد تک کامیاب رہی تھی۔ وہ اب نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔
میں نے کہا "ممتاز! اس فلیٹ میں جو کچھ ہوا‘ اسے ذہن سے جھٹک دو۔ چیتے والی حیرت انگیز کہانی صرف اور صرف تم تک محدود رہے گی۔ تم اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کرو گی‘ خصوصاً اپنے اخباری انکل (منہاس باقر) کے سلسلے میں تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"
میں نے منہاس باقر کا تذکرہ خاص طور پر اس لیے کیا تھا کہ وہ ایک شام کے اخبار کے ایڈیٹر و پبلشر تھے۔ شام کے اخبارات چٹپٹی اور مسالے دار خبروں کے حوالے سے بہت مشہور ہیں۔ معمولی سی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا اور بعض اوقات بے بنیاد خبریں شائع کرنا ان کے معمول میں شامل ہوتا ہے۔ اگر منہاس باقر تک سفید چیتے کی کہانی پہنچتی تو وہ فوری طور پر میرے کندھوں کو استعمال میں لے آتا۔ اس مرچ مسالے والی خبر سے خواہ مخواہ ہماری تشہیر ہوتی اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اس اپارٹ منٹ بلڈنگ میں ممتاز اور ساحل کے سوا کسی اور شخص نے اس طلسماتی چیتے کو نہیں دیکھا تھا۔ میرے حوالے سے ممتاز اور ساحل کے بیان کے ساتھ ایسی کوئی ناقابلِ یقین خبر اخبارات کی زینت بنتی تو اس بلڈنگ میں ہماری حیثیت خاصی متاثر ہوتی۔ لوگ تمسخرانہ نظروں سے ہمیں دیکھ

"لائٹ سخت ناقابلِ اعتبار چیز ہو کر رہ گئی ہے مگر افسوس اس بات کا ہے کہ لگژری اپارٹ منٹس بلڈنگ والوں کے اسٹینڈ بائی جنریٹر بھی ایسے مواقع پر اکثر دھوکا دے جاتے ہیں۔ خیر تمہارا فیصلہ مجھے پسند آیا۔ تم لوگ یہاں آرام سے رہو گے۔"

منہاس باقر مختصر اور ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کا عادی تھا اس لیے اس سے زیادہ دیر گفتگو ممکن نہیں تھی ویسے بھی میں اپنے پیچھے جو صورتِ حالات چھوڑ آیا تھا' اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں جلد از جلد وہاں سے روانہ ہو جاؤں۔ منہاس باقر کے بنگلے سے نکلنے سے قبل مجھے چند لمحات کے لیے ساحل سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا۔

وہ موجودہ حالات کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ تھی۔ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی "اپنا خیال رکھنا وجدان!"

اس کی انتہائی گہری سنجیدگی میں چھپے ہوئے جذبات کو میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ جذبات میرے لیے تھے اور اتنے بھرپور تھے کہ اس کا گریز اور بے اعتنائی بالکل مصنوعی ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ذو معنی انداز میں کہا۔

"گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ اب تم میرا خیال نہیں رکھو گی؟"

اس کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے وہ اندر سے تڑپ کر رہ گئی ہو پھر وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی "مم ــ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ظاہر ہے' تم وہاں اکیلے جا رہے ہو۔ تمہیں خود ہی اپنا خیال رکھنا ہوگا۔"

"میں تمہیں اس آگ میں نہیں جھونک سکتا ساحل!" میں نے چٹانی لہجے میں کہا "وہاں کچھ بھی پیش آسکتا ہے۔ تم میرے لیے بہت اہم ہو۔ میں تم پر آنچ آتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ تم یہاں محفوظ ہو' یہ خیال مجھے بہت تقویت دے گا اور پوری حاضر دماغی سے میں اپنے دشمنوں سے نمٹ سکوں گا!"

"لارڈ بدھا تمہاری حفاظت کرے گا" وہ یہ کہتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھ آئی۔

ہمارے درمیان فاصلہ صفر کے برابر ہوگیا۔ ہم ایک دوسرے کی سانسوں کی تپش اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ بہت ہی جذباتی اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ ہم دونوں ہی سنجیدہ تھے اور ہماری سنجیدگی میں طلب کی تڑپ موجود تھی۔ میں کسی پیش رفت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پہل کر دی۔

ساحل نے دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو تھام کر تھوڑا نیچے جھکایا پھر یکبارگی اپنے احمریں ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔ اس کی یہ حرکت میکانکی اور غیر متوقع تھی۔ ردِعمل کے طور پر میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں باندھ لیا۔ میرے سینے میں اس کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ اس سرکش سمندر کی بے تاب لہریں ساحل سے ہم کنار ہونے لگیں' اس کے سینے پر سر پٹخ کر اپنے دل کا احوال سنانے لگیں۔

ساحل اور موجوں کا ملن بڑا لمحاتی اور عارضی ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہہ کر واپس سمندر میں جا ملتی ہیں۔ مجھے بھی ساحل سے جدا ہونا پڑا۔ میں نے اس کے بوسے کی گنگنی شیرینی کو اپنے تن بدن میں اتارا' اسے ایک بھرپور الوداعی نظر سے دیکھا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔

میں اس بنگلے سے اس طرح نکلا تھا جیسے جسم سے جان نکلتی ہے۔

○*○

انگلش میڈیم پرائیویٹ اسکول میں آمد و شد کے لیے ہم عمارت کا عقبی گیٹ استعمال کر رہے تھے۔ اسکول کے سامنے وہ بنگلا تھا جہاں اچانک میرے کئی دشمن جمع ہوگئے تھے لہٰذا ان سے شانی نمٹاؤ کے لیے احتیاط کی ضرورت تھی۔ جب میں کبیر شاہ کے پاس پہنچا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"شاہ جی! کیا خبریں ہیں؟"

"یہاں تو ابھی تک سب خیریت ہے' سوائے ایک دو تبدیلیوں کے" اس نے کہا "تم سناؤ' ادھر کی کیا رہی' تم بڑی افراتفری میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے؟"

میں نے کہا "وہی ہوا جو میرا اندازہ تھا۔ ساحل نے خواب میں ایک چیتے کو فلیٹ میں گھس کر اودھم مچاتے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال میں ان دونوں کو اپنے ایک کرم فرما کے گھر چھوڑ آیا ہوں" پھر میں نے اس سے پوچھا "تم نے یہاں ہونے والی ایک دو تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے' ایسا کیوں ہو گیا؟"

"وجدان! تم نے کسی شیطان کی آمد کا ذکر کیا تھا؟" کبیر شاہ نے بتایا "وہ شیطان اس بنگلے سے رخصت ہو چکا ہے"

میں چونک اٹھا۔ کبیر شاہ تارا کا ذکر کر رہا تھا۔ ایک گاڑی میں تارا اور دو غیر ملکی مہمان بھولا ناتھ و جمال اس بنگلے پر پہنچے تھے۔ میں خود ان کی آمد پر سخت حیرت زدہ تھا۔ تارا عمر کوٹ پولیس کی تحویل میں تھا اور سنگاپور وا

وہ دونوں افراد جیل میں تھے۔ اچانک ان تین افراد کو ایک ساتھ یہاں کراچی میں دیکھنا انتہائی پُرتجسس اور حیران کُن تھا اور اب کبیر شاہ مجھے بتا رہا تھا کہ تارا وہاں سے رخصت ہوچکا تھا۔ تارا کو دیکھ کر میرے منہ سے "شیطان" کا لفظ ادا ہوا تھا اسی لیے کبیر شاہ بھی اسے شیطان ہی کہہ رہا تھا۔

کبیر شاہ کے انکشاف نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "کہاں چلا گیا وہ شیطان؟"

"یہ بتانا تو فی الحال میرے لیے ممکن نہیں وجدان؟"

"کیا وہ اکیلا ہی گیا ہے یا غیر ملکی مہمان بھی اس کے ساتھ ہی چلے گئے ہیں؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا اور ٹیلی اسکوپ سے سیاہ گیٹ والے بنگلے کا جائزہ لینے لگا۔

کبیر شاہ نے بتایا "وہ اکیلا گیا ہے اور نہ ہی غیر ملکی مہمان اس کے ہمراہ گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

کبیر شاہ بولا "وہ شیطان۔ نام کیا ہے' اس شخص کا؟"

"تارا" میں نے بتایا۔

"ہاں' تارا کے ساتھ ایک نوجوان بھی یہاں سے گیا ہے" وہ جواب دیتے ہوئے بولا۔ "اور وہ دونوں لگ بھگ آدھا گھنٹا پہلے ایک سیاہ لینڈ کروزر میں یہاں سے رخصت ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ گاڑی میں ڈرائیور بھی تھا۔"

میں نے مذکورہ نوجوان کا حلیہ دریافت کیا۔ کبیر شاہ کے جواب پر میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا مگر اس وضع قطع کا کوئی شخص مجھے یاد نہ آسکا۔ میں نے پوچھا "اور ان سنگاپورین مہمانوں کی کیا خبر ہے جو تارا کے ساتھ گاڑی میں یہاں پہنچے تھے؟"

"وہ جب سے بنگلے میں گئے ہیں' ان کی جھلک دکھائی نہیں دی۔"

میں اس نوجوان کے بارے میں سوچنے لگا جو تارا کے ساتھ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر گیا تھا۔ اسی سوچ کے دوران میں مجھے شعیب غوری کے اس آدمی کا خیال آگیا جو مخالف کیمپ میں ہمارے لیے کام کررہا تھا۔ فرخ خان نامی وہ شخص سامنے والے بنگلے میں موجود تھا۔

میں نے کبیر شاہ سے پوچھا "فرخ کی جانب سے کیا اطلاعات ہیں؟"

"تمہارے جانے کے بعد اس کا فون آیا تھا" کبیر شاہ نے بتایا "اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس وقت بنگلے میں میاں زاہد حسین' شاکر علی' قوبا' دو سنگاپورین مہمان کے علاوہ دو گھریلو ملازم اور دو سیکیورٹی گارڈز موجود ہیں۔ ازیں علاوہ تین ایسی عورتیں بھی بنگلے میں بلائی گئی ہیں جو شہر کی معروف کال گرلز ہیں۔ یہ رات وہ بنگلے پر ہی گزاریں گی۔ تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ وہ تینوں رات بھر کس قسم کی مصروفیات میں مشغول رہیں گی۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ میں ٹیلی اسکوپ کو ہاتھ میں تھامے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ہے' فرخ کا فون تارا اینڈ کمپنی کی روانگی کے بعد آیا تھا کیونکہ اس بیان میں ان لوگوں کا کوئی ذکر نہیں!"

"ہاں' ان کے روانہ ہونے کے فوراً بعد۔" اس نے تصدیق کی۔

"دوبارہ وہ کب کال کرے گا؟"

"اب وہ کال نہیں کرے گا" کبیر شاہ نے بتایا "پہلے بھی اس نے بہت بڑا رسک لے کر وہ معلومات دی ہیں۔ اس نے کہا ہے' جیسے ہی بنگلے کی صورتِ حال ہماری "کارکردگی" کے لیے "سازگار" ہوگئی' وہ ہمیں اس طرح فون کرے گا کہ بس پہلی گھنٹی بجتے ہی رابطہ منقطع کردے گا۔ یہ اس کی طرف سے ایک سگنل ہوگا۔ اس کے بعد ہمیں فوراً حرکت میں آنا ہوگا۔"

رات دو بجے تک ہمارے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔ کبیر شاہ نے شعیب غوری کے لیے بہت سے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ وہ مجھ سے بھی مختلف سوالات کرتا رہا جن کے میں مناسب اور محتاط جواب دیتا رہا۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم دونوں نے چونک کر ٹیلی فون سیٹ کی جانب دیکھا۔

ایک گھنٹی کے بعد فون خاموش ہوگیا۔ ہمارے عمل میں آنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ آئندہ پانچ منٹ میں ہم اسکول کی عمارت سے نکل کر سیاہ گیٹ والے بنگلے کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس طرف رات کے سناٹے کا راج تھا۔ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ عقبی دیوار پھاند کر ہم بنگلے کے اندر داخل ہوں گے اور سب سے پہلے سیکیورٹی گارڈز پر قابو پایا جائے گا' اس کے بعد گھریلو ملازموں کی باری آئے گی۔ ہم نے اپنی موٹر سائیکلز کو عقبی دیوار کے ساتھ ایک درخت کے نیچے کھڑا کیا اور یکے بعد دیگرے بنگلے کے اندر کود گئے۔

اسلحے اور دشمنوں کو ہم نے بڑی خوبصورتی سے تقسیم کرلیا تھا۔ امتیاز' روبی اور میر بخش کی موت کی ذمے داری گرے پجارو کا مالک یعقوب عرف قوبا وہاں موجود تھا۔ میں نے قوبا اور میاں زاہد حسین کو اپنے حصے میں لے لیا جبکہ شاکر علی' جمال اور بھولا ناتھ سے کبیر شاہ کو نمٹنا تھا۔ اسلحے میں سے ایک کلاشنکوف اور پستول ہم نے موٹر سائیکلز پر ہی چھوڑ دیے تھے جو ایک کینوس کے تھیلے میں محفوظ تھے۔ یہ ہمارا ریزرو ایمونیشن تھا جو واپسی میں کسی ہنگامی صورتِ حال میں ہمارے کام آتا۔ ٹیلی اسکوپ کو بھی میں نے تھیلے میں ڈال دیا۔ باقی اسلحے میں سے ایک کلاشنکوف کبیر شاہ نے اپنے پاس رکھ لی جبکہ ایک پسٹل میں نے اپنے لباس میں محفوظ کرلیا تھا۔ ازیں علاوہ' امتیاز اینڈ کمپنی کے قاتلوں کے خون کا پیاسا خنجر میری پنڈلی پر بندھا تھا جو کسی بھی وقت تڑپ کر اپنے چرمی کیس سے باہر آسکتا تھا۔

ہم نے بنگلے کی باؤنڈری کے اندر آتے ہی سب سے پہلے ٹیلی فون کے تار تلاش کرکے انہیں "معذور" بنادیا۔ اب اس بنگلے کے اندر سے کہیں فون کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی باہر سے کوئی کال وہاں آسکتی تھی۔ اس نیک کام سے فارغ ہوکر ہم سیکیورٹی گارڈز کی جانب متوجہ ہوگئے۔

دونوں سیکیورٹی گارڈز بنگلے کے سامنے والے حصے میں گیٹ کے نزدیک ہی بنے ہوئے گارڈ روم میں تھے۔ میں نے ایک گملے کے قریب ہی پڑے ہوئے پتھر کو اٹھایا اور بنگلے کے گیٹ کا نشانہ لے کر اسے اپنے ہاتھ سے "روانہ" کردیا۔

پتھر زیادہ بڑا نہیں تھا تاہم اس نے گیٹ کی فولادی چادر سے ٹکرا کر اتنی آواز ضرور پیدا کردی کہ دونوں سیکیورٹی گارڈز چونک گئے۔ وہ محتاط نظروں سے گیٹ کو تکنے لگے پھر ان میں سے ایک نے اس جانب اندھیرے میں دیکھا جس طرف ہم موجود تھے۔ اسی وقت میں نے اپنے منہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔

اس آواز پر دوسرا گارڈ بھی ہماری جانب متوجہ ہوگیا پھر انہوں نے دھیمے لہجے میں آپس میں کوئی بات کی۔ گیٹ پر چونکہ روشنی ہورہی تھی اس لیے ہم اندھیرے کی آڑ سے انہیں بہ آسانی دیکھ رہے تھے۔

مختصر سی باہمی مشاورت کے بعد ایک گارڈ دبے پاؤں ہماری جانب بڑھنے لگا۔ گویا اس نے ہمارا مقصد پورا کرنے کے لیے پیش قدمی شروع کردی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے سائز کی کلاشنکوف بہت واضح دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کبیر شاہ کے کان کے پاس سرگوشی کی "یہ میرا شکار ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گن بردار گارڈ محتاط قدموں اور چوکنا نگاہ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں' دو دیواروں کے ایک کونے کی آڑ میسر تھی۔ جیسے ہی وہ گارڈ مجھ سے دو فٹ کی دوری پر پہنچا' میں نے اچھل کر اس پر حملہ کردیا۔

میرا یہ عمل اتنا برق رفتار تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور جتنی دیر میں وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوتا' میں اسے اپنے شکنجے میں پوری طرح فٹ کرچکا تھا۔

میرا بایاں بازو کسی زہریلے ناگ کے مانند اس کی گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ سے میں نے اس کا کلاشنکوف بردار بازو جکڑ لیا تھا۔ میں نے اس فوری حملے کے بعد گارڈ کو کھینچ کر دیوار کی آڑ میں کرلیا۔

گارڈ کے بدن میں کسی سانڈ کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ خود کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے زور مارنے لگا لیکن میں نے اس خیال سے اسے نہیں دبوچا تھا کہ وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر میرے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس سانڈ سے اٹکھیلیوں کا وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے اپنے بائیں بازو کو ایک مخصوص جھٹکا دے کر اسے شانت کردیا۔ اب وہ کم از کم دو گھنٹے کے لیے انٹاغفیل ہوگیا تھا۔

میں نے سیکیورٹی گارڈ کو اسی اندھیرے کونے میں لمبا لٹادیا اور اس کی کلاشنکوف کو گملے میں چھپادیا۔ اس دوران میں گارڈ کا ساتھی اسے آوازیں دیتا ہوا ہماری جانب آنے لگا۔

"طفیل! کہاں ہو تم' ادھر کوئی گڑبڑ تو نہیں؟"

کبیر شاہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دھیمے لہجے میں غرایا "اب میری باری ہے۔"

میں خاموشی سے ایک جانب تن کر کھڑا ہوگیا۔

طفیل کا ساتھی گارڈ جیسے ہی اس کونے پر نمودار ہوا' کبیر شاہ نے اپنی کلاشنکوف کا بٹ پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رسید کردیا۔ گارڈ کے حلق سے "اوں" کی ایک ہلکی آواز برآمد ہوئی اور وہ تیورا کر زمین بوس ہوگیا۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اب اس گارڈ کو کبھی اپنے قدموں پر کھڑا ہونا نصیب ہوگا بھی یا نہیں۔ اس عمل نے مجھے کبیر شاہ کے مزاج کی جارحیت اور سفاکی سے آشنا کردیا۔

دونوں گارڈز سے نمٹنے کے بعد ہم نے گھریلو ملازموں کا رخ کیا اور صرف پانچ منٹ کے اندر ہم نے فرخ خان سمیت دیگر دو افراد کو زیر کرکے ایک باتھ روم میں بند کردیا۔ اس معرکے میں پروگرام کے مطابق فرخ نے تھوڑی مزاحمت بھی پیش کی تاکہ اس پر کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ان تینوں افراد کو باتھ روم میں بند کرنے سے پہلے ہم نے یہ اطمینان ضرور کرلیا

تھا کہ وہ کسی قسم کی گڑبڑ نہ کرسکیں۔

فرخ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق شاکر علی اور قوبا بنگلے کی زیریں منزل پر تھے جب کہ غیر ملکی مہمان جمال اور بھولا ناتھ کو بالائی منزل پر ٹھہرایا گیا تھا۔ میاں زاہد حسین بھی بالائی منزل کے ایک وی آئی پی کمرے میں رات گزار رہا تھا۔ فرخ کے مطابق' بنگلے پر پہنچنے والی تینوں کال گرلز بالائی منزل پر ٹھہرنے والوں کے لیے تھیں جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ بالائی منزل پر موجود چھ افراد اس وقت جاگ رہے ہوں گے اور باہمی تعاون کے ذریعے ایک دوسرے کو جگا رہے ہوں گے۔

ہمیں صرف آٹھ افراد سے نمٹنا تھا۔ دو زیریں منزل پر اور چھ بالائی منزل پر۔ دونوں منزلوں پر مزاحمت کا امکان ففٹی پرسنٹ تھا۔ یعنی بالائی منزل والی تینوں کال گرلز سے ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی اس لیے وہ ہماری راہ میں آنے کی کوشش نہ کرتیں۔ اسی طرح زیریں منزل پر شاکر علی وہیل چیئر کا محتاج ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

میں نے اس آپریشن میں اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ کوئی بے گناہ خواہ مخواہ زندگی نہ ہار جائے اسی لیے ملازمین اور گارڈز کو ہم نے کچھ عرصے کے لیے "آوٹ آف اسکرین" کردیا تھا۔

میں نے کبیر شاہ سے کہا "شاہ جی! ہمارے بانٹے ہوئے بندے تو اوپر نیچے ہوگئے ہیں۔"

"ہم بھی اوپر نیچے ہوجاتے ہیں" وہ کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ہاں' یہی مناسب رہے گا" میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کرلیا "اب ہمیں جو بھی کارروائی کرنا ہے' ایک ساتھ کرنا ہے۔ تم بالائی منزل کا رخ کرو۔ میں نیچے والوں کو دیکھتا ہوں لیکن ایک بات کا خیال رکھنا!"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے کہا "میاں زاہد حسین ہم دونوں کا مشترکہ دشمن ہے۔ جمال اور بھولا ناتھ بھی جرائم پیشہ افراد ہیں اور ہمارے دشمنوں کے دوست کی حیثیت سے یہاں آئے ہیں۔ ان تینوں کے ساتھ سخت ترین سلوک کیا جاسکتا ہے مگر وہ پیشہ ور عورتیں ہماری دشمن ہیں اور نہ ہم ان کے دشمن۔ ان کے خون میں ہاتھ رنگنے سے گریز کرنا۔"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بالائی منزل کی جانب بڑھ گیا۔

میں نہایت محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس کمرے کے دروازے پر آیا جس کے بارے میں فرخ خان کی اطلاعات یہ تھیں کہ وہاں شاکر علی اور قوبا کو ٹھہرایا گیا ہے۔ قوبا کا خیال آتے ہی میرا سارا خون دماغ کی طرف دوڑنے لگا۔ اسی شیطان صفت شخص کی ملکیت گرے پجارو سے میرے ساتھیوں پر گولیوں کی بارش برسائی گئی تھی۔ امتیاز علی' روپالی' میر بخش۔ ایک ایک خون آلود چہرہ میرے تصور میں نمودار ہونے لگا۔ میں نے ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھاما اور اس دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے پوچھا گیا۔

میں نے آواز بدل کر کہا "جی' میں ہاشم ہوں۔"

جن دو ملازمین کو ہم نے فرخ کے ساتھ بے بس کرکے باتھ روم میں مقید کیا تھا ان میں ایک ہاشم علی اور دوسرا مجیب اللہ تھا۔ فرخ خان کی فراہم کردہ معلومات قدم قدم پر ہمارے کام آرہی تھیں۔ دروازے کا بولٹ گرنے کی آواز آئی اور دوسرے ہی لمحے قوبا میرے سامنے تھا۔

وہ میرے سامنے تھا تو اس کا یہی مطلب تھا' میں بھی اس کے سامنے ہوں۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ یک بہ یک وحشت میں مبتلا ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتا' میں نے اس کے سینے پر ایک زوردار پریشر فرنٹ کک رسید کردی۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند عقب میں اچھلا اور سیدھا بیڈ پر پہنچ کر چاروں خانے "دراز" ہوگیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا' اس کا بولٹ چڑھایا اور خوں خوار نظر سے قوبا کو گھورتے ہوئے آتشیں لہجے میں دریافت کیا "وہ گرے پجارو تمہاری ہی ملکیت ہے نا؟"

"گرے پجارو؟" وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"ہاں وہی منحوس جیپ' جس کا نمبر تھری' ون' فائیو' ون ہے" میں کسی درندے کے مانند غرایا "اسی جیپ سے فائرنگ کرکے گورا قبرستان کے نزدیک میرے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔"

"تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے" وہ بیڈ پر سے اٹھتے ہوئے بولا "میرے پاس نہ تو کوئی پجارو ہے اور نہ ہی میں یا میری کوئی گاڑی تمہارے ساتھیوں کی موت کی ذمے دار ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے باتھ روم کے دروازے کی جانب دیکھا۔ باتھ روم کے اندر سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی اور دوسرے بیڈ کے نزدیک ہی ایک وہیل چیئر بھی نظر آرہی تھی' اس کا ایک ہی مطلب تھا' قوبا کا ساتھی شاکر علی اس وقت باتھ روم کے اندر تھا۔

میں نے قوبا کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے دھاڑ کر کہا "غلط فہمی کے بچے! آج میں تمہیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ دیکھنے والے عبرت پکڑیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اس پر چھلانگ لگادی۔ وہ بستر سے اٹھ کر پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ میں اسے لیتے ہوئے دوبارہ بستر پر آگیا اور اس طرح کہ اب وہ میرے نیچے دبا تھا اور اس کی گردن میرے آہنی ہاتھوں کی گرفت میں تھی۔

"بتاؤ' میرے ساتھیوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا" میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "کیوں تم نے انہیں موت کے گھاٹ اتارا؟"

وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا "میں پھر یہی کہوں گا' تم کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہو۔ تمہارے ساتھیوں کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ تم نے جس گرے پجارو کا نمبر بتایا ہے' وہ میری ملکیت نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' تم شرافت سے زبان نہیں کھولوگے" میں نے انگلیوں کے شکنجے میں اس کی تنومند گردن اکڑتے ہوئے کہا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا اور میری لمحاتی غفلت سے قوبا نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس نے میرے نیچے رہتے ہوئے اپنی ٹانگوں کو فولڈ کیا اور میرے پیٹ پر پاؤں ٹکا کر اپنے اوپر سے مجھے دور اچھال دیا۔

میں قالین پوش فرش پر چت گرا مگر اگلے ہی لمحے میں بیک ہینڈ اسپرنگ لگا کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ اسی وقت دوبارہ دستک ہوئی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ دستک کمرے کے دروازے پر نہیں بلکہ باتھ روم کے دروازے پر ہورہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی باتھ روم کے اندر سے شاکر کی آواز سنائی دی۔

"قوبا! کمرے میں کیا ہورہا ہے۔ تم کس کے ساتھ دھینگا مشتی کررہے ہو؟"

"یہ شیطان پتا نہیں' کیسے ہمارے کمرے میں گھس آیا ہے۔"

"کون شیطان؟" شاکر نے فکر مندی سے پوچھا۔

"وہی جس کا نام وجدان ہے اور ۔۔۔ جو میرے بھائی کا قاتل بھی ہے۔"

شاکر نے پوچھا "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

اس سے پہلے کہ قوبا اسے بتاتا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا' میں نے آگے بڑھ کر بڑی سرعت سے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے بولٹ کردیا۔ شاکر علی اپنی "معذوری" کے باعث اب کمرے کے اندر نہیں آسکتا تھا۔ باتھ روم کے اندر اس کی چیخ و پکار کو میں سننے والا نہیں تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' قوبا پوری طرح تن کر میرے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی قوبا تھا جو مجھے اپنے بھائی کا قاتل سمجھتا تھا حالانکہ قتل کی اس سنگین واردات میں "سی ایف کے" والوں کا ہاتھ تھا یعنی امتیاز علی اور اشتیاق احمد کا۔ شعیب غوری کی تحقیق کے مطابق امتیاز اور اس کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے والوں کا تعلق گرے پجارو سے تھا جو قوبا کی ملکیت تھی مگر وہ کسی ایسی حقیقت سے انکاری تھا۔

یہ خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ اس وقت میں پوری طرح قوبا کی جانب متوجہ تھا۔

"اس روز تو تم بچ کر نکل گئے تھے" وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "لیکن آج میں تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنادوں گا۔ تمہاری بدقسمتی گھیر کر تمہیں یہاں لے آئی ہے۔ آج میں اپنے بھائی کے خون کا حساب بھی چکادوں گا۔"

"اس سے بھڑنے کے بجائے ہاشم اور مجیب کو آواز دو" باتھ روم کے اندر سے شاکر علی کی آواز آئی "یہ بدبخت تمہارے اکیلے کے بس کا نہیں۔ خواہ مخواہ کوئی نقصان نہ اٹھالینا۔"

شاکر علی کا مشورہ بروقت اور درست تھا مگر ہاشم علی اور مجیب اللہ کسی کی پکار سننے اور احکام کی تعمیل کے قابل نہیں تھے اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت تھا کہ قوبا سے فضول قسم کی ڈائیلاگنگ کرتا لہٰذا میں نے قوبا پر ایک زوردار حملہ کیا۔ میری راؤنڈ ہاؤس کک اس کے جبڑے پر پڑی۔ وہ چہرہ تھام کر ایک قدم پیچھے ہٹا تو میں نے ایک کریسنٹ کک اس کے دوسرے جبڑے پر رسید کردی۔

وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر زمین بوس نہیں ہوا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھا کر میں نے سائڈ کک اس کی پسلی پر جمادی۔ اس کک میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا اور سیدھا دیوار سے جاکر ٹکرایا۔ اس کی بدقسمتی کہ دیوار سے ٹکراؤ کے دوران میں اس کی کھوپڑی نے پہل کی جس کا خمیازہ اسے فوری طور پر بھگتنا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر نیچے بیٹھ گیا۔

گرین بیلٹ والے بنگلے پر میں نے اس کی اچھی خاصی دھنائی کی تھی۔ اس وقت مجھے مرحوم امتیاز کا ساتھ حاصل تھا اور آج میں اس کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام سے

دو چار کرنے کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

میں نے قوبا کے نزدیک آکر اسے سر کے بالوں سے جکڑ لیا پھر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کرتے ہوئے پوچھا "بتاؤ' تمہاری گرے بچارو میں سے کن لوگوں نے میرے ساتھیوں پر فائرنگ کی تھی۔ مجھے ان کے نام اور ٹھکانے کا پتا چاہیے؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس کا ایک گھٹنا بڑی سرعت سے حرکت میں آیا۔ وہ میرے جسم کے نازک حصے کو نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اپنی اس حرکت میں کیسے کامیاب ہو جاتا۔

اس کے گھٹنے کو میں نے اپنے گھٹنے سے بلاک کیا اور اس کے ساتھ ہی میرا طوفانی پنچ اس کی ناک پر پڑا یہ ایک خوفناک پنچ تھا۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ میں نے اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ اسے ہاتھ پاؤں کی مسلسل ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

وہ پٹتا رہا اور جواباً ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں کچھ زیادہ ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ اس کی ایک پیش نہ چلی اور میں نے اسے چت کر دیا۔ وہ فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ میں دو چار ہاتھ میرے جسم پر بھی جمائے تھے مگر وہ ایک ناقابلِ ذکر جسارت تھی۔

باتھ روم کے اندر سے شاکر علی مسلسل چیخ رہا تھا۔ وہ ہاشم علی اور مجیب اللہ کو آواز دے رہا تھا' کبھی وہ سیکیورٹی گارڈز کو پکارنے لگتا۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے فرخ خان سے بھی وہاں جلدی پہنچنے کو کہا مگر اس کی چیخ پکار اور احکام کو سننے والا وہاں کوئی نہیں تھا بالآخر اس ناکامی کے بعد اس نے باتھ روم کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

اس سے قبل کہ قوبا اٹھ کر کھڑا ہوتا' میں اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی ساری تن فن کسی نہ کسی راستے خارج ہو چکی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان دبوچا اور اس کی خون آلود آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں نے جو پوچھا ہے' جلدی سے بتا دو۔ ورنہ آج تمہیں میرے ہاتھ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ تمہارے بھائی کو تو میں نے قتل نہیں کیا لیکن میں یہ اعزاز تمہیں ضرور دوں گا۔"

وہ کمزور سی آواز میں کراہا "مجھے جو معلوم تھا وہ بتا چکا ہوں۔ تم بالکل غلط سوچ رہے ہو۔ تمہارے ساتھیوں پر ہونے والی فائرنگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔"

"تم لوگوں کا فائرنگ سے تعلق ہو نہ ہو لیکن میرے مکوں کا تمہارے چہرے سے ایک گہرا تعلق ضرور ہے" میں نے غصیلے لہجے میں کہا اور دو چار تابڑ توڑ پنچ اس کے تھوبڑے پر رسید کر دیے۔

وہ تکلیف کی شدت سے چلا اٹھا۔ اس کا چہرہ پہلے ہی میری ککس اور پنچز سے بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ ان طوفانی مکوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا۔ اس کا خون آلود چہرہ بڑا ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ کہیں بے ہوش نہ ہو جائے۔ وہ گرین بیلٹ والے بنگلے پر بے ہوشی کا مظاہرہ کر چکا تھا۔ وہاں تو وہ شاکر علی کے ساتھ ہونے والے "شان دار" سلوک کو دیکھ کر بے ہوش ہوا تھا اور وہ بے ہوشی بھی عارضی تھی لیکن مجھے یقین تھا' یہ بے ہوشی اس کے لیے دائمی ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے اس کے گالوں پر تھپڑ رسید کر کے اسے جھنجوڑ ڈالا اور دانت کچکچاتے ہوئے کہا "تمہارا آخری وقت آن پہنچا ہے قوبا! سچ کا اقرار کر لو ورنہ۔۔۔"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا اور پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کیس میں سے باہر نکال لیا پھر اسے قوبا کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "اس جادوگر کو پہچانتے ہو نا۔ اس نے اپنے چمتکار سے تمہارے دوست شاکر علی کو وہیل چیئر کا تحفہ دیا ہے۔ آج یہی جادوگر تمہیں کفن کا نذرانہ پیش کرے گا۔"

میرے لہجے میں اتنی سنگینی تھی کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ مجھے اپنے نیچے اس کا وجود پھڑپھڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لبوں کو حرکت دی تو خون کے چھینٹے اڑے جو میری شرٹ کو داغ دار کر گئے۔ اسی دوران میں میری سماعت سے قوبا کی لرزتی ہوئی "خون آلود" آواز ٹکرائی۔

"تمہیں خدا کا واسطہ ہے' میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں' تمہارے ساتھیوں کے قتل میں ہمارا کوئی ہاتھ۔۔۔"

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی خوں خوار لہجے میں کہا "قسمیں تو شاکر علی نے بھی بہت کھائی تھیں کہ وہ میر بخش کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن اس جادوگر کو اپنا کمال دکھانا ہی پڑا تھا۔ شاکر پر اس نے پاؤں کی جانب سے عمل شروع کیا تھا' تمہاری باری سر کی طرف سے آئے گی اور خنجر کی نوک سب سے پہلے تمہاری آنکھوں کا مزاج پوچھے گی۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی نوک کو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان چبھویا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اسی وقت بالائی منزل سے اٹھا پٹخ کی آوازیں آنے لگیں گویا وہاں بھی کارروائی کا آغاز ہو گیا تھا۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تم زبان کھولتے ہو یا میں اپنا کام شروع کروں؟"

بالائی منزل پر ابھرنے والی آواز وہ بھی سن چکا تھا' اس نے تھرتھراتے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا تمہارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

"سوال نہیں' صرف جواب!" میں نے خنجر کے دستے پر دباؤ بڑھاتے ہوئے غرا کر کہا۔

اس نے جبڑے بھینچ کر خنجر سے پہنچنے والی تکلیف کو برداشت کرنے کی کوشش کی لیکن اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ مجھے ایک لمحے کو شک گزرا۔ موت کو سامنے دیکھ کر زبان بے ساختہ سچ بولنے لگتی ہے۔ سچویشن کے مطابق موت قوبا سے زیادہ دور نہیں تھی بلکہ اس کے سینے پر سوار تھی۔ اگر ابھی تک وہ میرے ساتھیوں کے قتل سے انکاری تھا تو اس کا مطلب کہیں یہ تو نہیں تھا کہ وہ واقعی اس معاملے سے لاتعلق ہو! اس نے تو ابھی تک یہ بھی تسلیم نہیں کیا تھا کہ گرے بچارو اس کی ملکیت ہے۔ ممکن ہے' شعیب غوری کی تحقیق میں کوئی سقم رہ گیا ہو! قوبا حقیقت کو تسلیم کر کے اپنی جان بچا سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہیں کر رہا تھا تو پھر یا تو اسے اپنی جان پیاری نہیں تھی یا پھر وہ یا اس کے ساتھی میرے ساتھیوں کی موت کے ذمے دار نہیں تھے۔ جان تو البتہ سب کو پیاری ہوتی ہے۔ اپنی جان بچانے کے لیے انسان دوسروں کی جان لے لیتا ہے۔

میں قوبا کے ساتھ مزید "سلوک" کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ بالائی منزل سے نسوانی چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی کلاشن گرج اٹھی۔ اس صورتِ حال میں' میں قوبا کے ساتھ مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا لیکن میرے کسی عملی اقدام سے پہلے ہی اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ میں نے پوری شدت سے اسے جھنجوڑ ڈالا لیکن اس میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ وہ گہری بے ہوشی میں چلا گیا تھا یا پھر۔۔۔؟

اس سے آگے سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ بالائی منزل پر پھر فائرنگ ہونے لگی تھی۔ میں نے قوبا کو اس کے حال پر چھوڑا اور بالائی منزل کی جانب دوڑ پڑا۔ جب میں باتھ روم کے دروازے کے نزدیک سے گزرا تو شاکر علی کی شکست خوردہ جھنجلاہٹ آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ فائرنگ کیسی ہو رہی ہے؟ کوئی دروازہ تو کھولے۔ میں بھی تو دیکھوں' باہر کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟"

"اس قیامت کو دیکھنے کے لیے تمہیں قیامت کا انتظار کرنا پڑے گا" میں نے چیخ کر کہا "اور اس فائرنگ کو تم کوئی عام سی فائرنگ مت سمجھو۔ یہ "نامعلوم" دہشت گردوں کی فائرنگ ہے جو پتا نہیں' کہاں سے آتے ہیں اور اپنا کام کر کے پتا نہیں' کہاں چلے جاتے ہیں۔ کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا اور نہ ہی جان سکتا ہے کیونکہ جاننے والے سب جانتے ہیں۔"

میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے دروازے کو باہر سے بولٹ کر دیا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے زینوں کی جانب بڑھ گیا۔ میں ابھی نصف زینے ہی طے کر پایا تھا کہ اوپر سے ایک انسانی جسم لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ میں اپنے پنجوں پر فضا میں اچھلا۔ وہ گولا نما جسم میرے نیچے سے گزر گیا۔ اسی وقت' کبیر شاہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"وجدان! اسے روکو۔ یہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے کبیر شاہ سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ہوا میں پرواز کی اور اس شخص کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

وہ بھولا ناتھ تھا۔ میرا نام کبیر شاہ کی زبان سے وہ سن چکا تھا' اب مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ بوکھلا گیا۔ میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے پیٹ میں ایک فرنٹ پش کک ماری۔ وہ پیٹ پکڑ کر تکلیف کی شدت سے دُہرا ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنبھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کے حملے میں خاصی تیزی تھی۔

اس کی راؤنڈ ہاؤس کک کو میں نے اوپن آرم بلاک کیا۔ اسی دوران میں اس نے دوسری راؤنڈ ہاؤس کک آزمائی۔ میں اسے بلاک کرنے کے بجائے ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھا اور تیزی سے بیک سوئپ کر دی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا لیکن حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خاصا چاق و چوبند دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اسے نی شاٹ (KNEE SHOT) کا ڈاج

دیا۔ اس نے تیزی سے اپنی ٹانگ پیچھے کھینچی۔ اسی وقت میں نے برق رفتاری سے ایک سوئپ (SWEEP) اس کی پنڈلی پر رسید کردی۔ نتیجے کے طور پر وہ ایک مرتبہ پھر پشت کے بل پڑا آسمان کو تک رہا تھا۔

میں ایک قدم آگے بڑھا اور اس کے تھوبڑے کو اپنے پاؤں سے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ بھولا ناتھ نے کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے پاؤں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے کر بڑی سرعت سے ایک موڑا دیا۔ میری جگہ اگر کوئی عام سا مارشل آرٹسٹ ہوتا تو منہ کے بل نکی فرش پر گرتا لیکن میرے ذہن نے بروقت فیصلہ کیا تھا۔

میں نے اپنی باڈی کو ہوا میں ٹوئسٹ (TWIST) کیا اور آزاد پاؤں سے بھولا ناتھ کے چہرے کا کباڑا کرتے ہوئے فرنٹ رول کرکے دور پہنچ گیا۔ میں نے اپنے عقب میں مدمقابل کی کراہ سنی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے میرے لیے ایک ناقابلِ اشاعت گالی بھی پھسل گئی۔ یہ اس کی جھنجلاہٹ کی انتہا تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا' بھولا ناتھ اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوچکا تھا۔ میں نے بیک فلیک (FLICK BACK) لگائی اور اس سے دو فٹ کے فاصلے پر پہنچ گیا پھر اس سے پہلے کہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا' میں ہوا میں اچھلا اور وہیل فلائنگ کک اس کی کنپٹی پر ثبت کردی۔ یہ ایک جھٹکے دار وھانسو قسم کی کک تھی۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے پیچھے کی طرف گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا کوئی موقع نہ دیا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ دس فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ میں نے فرنٹ سمرسالٹ لگایا اور اس کے روبرو پہنچ گیا۔

وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ اسی سٹپٹاہٹ میں اس نے غیر ارادی طور پر مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑلیا۔ اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ مجھے پہلی مرتبہ اس کی جسمانی طاقت کا اندازہ ہوا۔ وہ بے طرح زور لگا رہا تھا اور جھٹکے دے دے کر میری کمر کا کڑا نکالنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے گھٹنوں کی یکے بعد دیگرے ضربوں سے میرے پیٹ کو نشانہ بنانے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے گھٹنوں سے بلاکنگ کرتے ہوئے اپنے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نتیجے میں میرے بازوؤں پر اس کی گرفت بھی ڈھیلی ہوگئی۔ اسی لمحے میں نے ایک جھٹکے سے اپنے بازو اوپر کھینچ لیے۔ وہ حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت میں تڑکا لگایا۔ میرے آزاد ہاتھوں نے چوپ (CHOP) کی شکل اختیار کی اور بجلی کی سی رفتار سے ہاتھوں کے بلیڈ بھولا ناتھ کی کن پٹیوں پر پڑے۔ یہ ایک مہلک اور خطرناک وار تھا۔

مجھے یقین ہے' اس اٹیک نے اس کے دماغ میں زلزلہ پیدا کردیا ہوگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر جھومنے لگا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائڈ کک اس کی پسلی پر رسید کی اور اسے کئی فٹ پیچھے اچھال دیا۔

اسی وقت زینوں کے اوپری حصے سے کبیر شاہ نے مجھے پکارا "وجدان! اگر اس مردود سے نمٹ چکے ہو تو اوپر آجاؤ۔ یہاں حالات بگڑ گئے ہیں۔"

حالات تو پوری طرح ہمارے قابو میں تھے پھر کیسے بگڑ گئے۔ یہ سوچتے ہوئے میں زینوں کی جانب بڑھا تو بھولا ناتھ اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر حملہ کردیا۔ اس کے ہاتھ میں آہنی راڈ کو میں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے وہ مجھے کوئی شدید نقصان پہنچانے میں ناکام رہا۔

اگر انسان کے ہاتھ مضبوط اور بازو طاقت سے بھرپور ہوں تو پھر کسی ہتھیار یا اوزار کے بغیر بھی وہ بہت کچھ کرکے دکھا سکتا ہے لیکن جب بازو و دست کم زور پڑنے لگیں تو اسلحہ بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ بھولا ناتھ کی میں اتنی درگت بنا چکا تھا کہ وہ آہنی راڈ اس کے ہاتھ میں انتہائی مضحکہ خیز لگ رہی تھی پھر جب اس نے راڈ سے مجھ پر حملہ کیا تو اس مضحکہ خیزی میں کئی چند اضافہ ہوگیا۔

میں نے اس کے راڈ والے بازو کو ہوا ہی میں اوپر بلاک کیا پھر ایک اسٹیپ اندر آتے ہوئے خطرناک سولر پنچ (SOLAR PUNCH) اس کے سینے کے وسط میں رسید کردیا۔ وہ "اونہہ" کی آواز نکالتے ہوئے کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہوگیا۔ اب اس زمین سے اس کے اٹھنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

میں بالائی منزل پر پہنچا تو ایک کمرے میں وحشت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ جمال اور دو عورتیں خون میں لت پت کمرے کے فرش پر پڑے تھے۔ جمال کے ہاتھ میں ایک ریوالور دبا ہوا تھا۔ وہ تینوں زندگی سے بہت دور۔ موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے کبیر شاہ کی طرف دیکھا۔ جب میں زیریں منزل پر تھا سے دست و پنجہ کررہا تھا تو میں نے بالائی منزل پر دو مرتبہ فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ ایک بار فائرنگ کے ساتھ نسوانی چیخیں بھی شامل تھیں۔

"میں کیا کرتا' یہ سب کچھ مجبوری میں کرنا پڑا۔" کبیر شاہ نے کلائی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "اگر میں برسٹ نہ مارتا تو جمال مجھے گولی کا نشانہ بنادیتا۔ ان دونوں کی کم بختی کہ یہ خوف زدہ ہوکر جمال کے پیچھے جا چھپی تھیں اس لیے جان سے گئیں" بات ختم کرکے اس نے جمال کے نزدیک مردہ حالت میں پڑی ہوئی دونوں عورتوں کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے اس سے مزید سوال جواب کرنے کے بجائے میاں زاہد حسین کے بارے میں استفسار کیا۔

وہ بولا "میں نے حالات بگڑنے والی بات میاں زاہد حسین حوالے ہی سے کی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کو اندر سے لاک کردیا ہے اور کمرے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔"

میں بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ ہمارا سب سے "وی آئی پی" شکار تو میاں زاہد ہی تھا۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو ہمارے پاس ہاتھ ملنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہ جاتا۔

میں کبیر شاہ کی معیت میں اس دروازے کے سامنے پہنچا جس کے پیچھے میاں زاہد بند ہوکر رہ گیا تھا۔ دو عورتوں کی لاشیں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا لیکن میری معلومات کے مطابق اس بنگلے میں تین پیشہ ور عورتوں کی انٹری ہوئی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ تیسری میاں زاہد کے ساتھ ہوگی۔

"ہمیں ہر صورت میں اس دروازے کو کھولنا ہے" میں نے جنونی انداز میں کہا۔

کبیر شاہ حتمی لہجے میں بولا "اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ دروازے کے لاک پر فائرنگ کی جائے۔"

"تو کرو... فوراً کرو شاہ جی!" میں تحکمانہ لہجے میں بولا "تم پہلے بھی دو مرتبہ فائرنگ کرچکے ہو۔ اس بات کی پروا مت کرو کہ فائرنگ کی آواز سن کر کوئی اس طرف متوجہ ہوجائے گا۔ اگر کسی کو یہ نیک کام کرنے کا اتنا ہی شوق ہوگا تو اب تک وہ کرچکا ہوگا۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کاٹتے ہوئے انداز میں کہا "آج کسی بھی قیمت پر میاں زاہد حسین کو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جانا چاہیے' اس کے لیے ہمیں خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہانا پڑیں۔"

میری بات ختم ہوتے ہی کبیر شاہ نے ایک ورنکل برسٹ مارا اور دروازے کی لاک والی سائڈ کو ٹاپ ٹو باٹم برسٹ سے ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اسی لمحے میں نے برق رفتار تھنگ پاور کا استعمال کرتے ہوئے ڈبل ہینڈ پش دروازے کے تختے پر مارا۔ دروازہ "دھڑ" سے کھل گیا۔

ہم بھرا مار کر کمرے میں داخل ہوئے تو ایک خوف زدہ نسوانی چیخ نے ہماری سماعتوں کو کھرچ ڈالا۔ پھر اگلے ہی لمحے چیخنے والی کی صورت بھی نظر آگئی اور وہ صورت خاصی خوب صورت تھی۔

وہ جو کوئی بھی تھی' اس وقت اپنے لباس کو پہننے کی کوشش کررہی تھی۔ فائرنگ اور پھر دروازے کے اچانک کھلنے سے وہ بری طرح بدحواس ہوگئی تھی اور اسی بدحواسی میں اس کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی تھی جبکہ ہاتھ سے لباس چھوٹ گیا تھا۔ اس کے بدن پر انڈر گارمنٹس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ تکلفاتی لباس اس کے کندن وجود کی پردہ پوشی کے لیے انتہائی ناکافی تھا اس لیے وہ دونوں ہاتھوں کی مدد سے جسم ڈھانپنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

ہمیں اپنے سامنے موت کے فرشتوں کے روپ میں کھڑا دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولی "تت... تم... کک... کون لوگ ہو؟"

"ہمارے بارے میں تمہیں "پی ایچ ڈی" کرنے کی ضرورت نہیں" میں نے غرا کر کہا "اگر زندگی چاہتی ہو تو فوراً بتاؤ' میاں جی کدھر ہے؟"

میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی یہ اندازہ کرلیا تھا کہ میاں زاہد حسین وہاں موجود نہیں تھا۔ اس عورت کے حلق سے میرے سوال کے جواب میں ایک سراسیمہ آواز برآمد ہوئی۔ "وہ... وہ... اس طرف گیا ہے۔"

ساتھ ہی اس نے مغربی دیوار میں موجود ایک بند دروازے کی سمت اشارہ کیا۔

میں نے کبیر شاہ سے کہا "تم اس عورت پر توجہ رکھتے ہوئے اسے لباس پہننے کی مہلت دو۔ میں اتنی دیر میں اس دروازے کا حال احوال معلوم کرتا ہوں" پھر میں نے خوف زدہ کال گرل سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"رخشی!" اس نے بتایا۔

"تمہارے ساتھ آنے والی دوسری دو "گرلز" تو اپنی سانسیں پوری کرچکیں۔ اگر تم مزید جینے کی خواہش مند ہو تو کسی قسم کی غلط بیانی کرنا اور نہ ہی کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرنا۔"

"تت... تو کیا نازش اور ثمرلا...؟" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے متذکرہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ہلاک ہونے والی پیشہ ور عورتوں کے نام مجھے معلوم ہوگئے تھے۔ ان میں نازش جمال کے لیے

اور سُرلا انڈین بھولا ناتھ کے لیے بلوائی گئی تھی۔ ایک ہندو غیر ملکی مہمان کے لیے میاں زاہد نے ہندو عورت کا ہی بندوبست کیا تھا۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا' وہ اندر سے لاک کیا گیا تھا۔ اس کا ہینڈل بھی اسی وجہ سے گھومنے سے انکاری تھا۔ میں نے مزید فائرنگ کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے یہاں بھی برِیتھنگ ٹیکنیک کو آزمایا۔ میں نے دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھوں کو سر سے بلند کیا اور ایک طویل سانس اندر کی جانب کھینچی' پھر سانس چھوڑتے ہوئے بازوؤں کو کلائیوں کے مقام پر کراس (CROSS) کرتے ہوئے پشت پر لے گیا۔ اس کے بعد واپس پہلوؤں کی جانب ہاتھوں کو لاتے ہوئے میں نے اپنے پھیپھڑوں کو پوری طرح سانس سے بھرلیا۔ اب میں ایک کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ سانس کو ایک تھرسٹ (THRUST) کے ساتھ باہر خارج کرتے ہوئے میں نے دونوں ہتھیلیوں کو ایک زوردار جھٹکے سے دروازے پر لاک کے نزدیک استعمال کیا۔ ہتھیلیوں کے اس پش میں اتنی قوت تھی کہ دروازہ ایک مخصوص آواز کے ساتھ کھل گیا۔ اس قسم کے برِیتھنگ پش (BREATHING PUSH) کی مدد سے بعض اوقات ایک دیوار کو بھی بہ آسانی گرایا جاسکتا ہے۔ اس ٹیکنیک میں مارشل آرٹس اور یوگا ایک ساتھ کارفرما نظر آتے ہیں۔

میں کھلے ہوئے دروازے سے گزر گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں لائٹ آن تھی۔ اس کمرے میں مجھے ایک چکردار زینہ نظر آیا۔ جگہ کی تنگی کے باعث اس ساخت کے زینے بنائے جاتے ہیں جو ایک گول چکر کی صورت میں سیدھے نیچے سے اوپر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ ان دائرہ وار اسٹیپس (STEPS) کے سہارے کے لیے درمیان میں ایک مضبوط ستون کھڑا کردیا جاتا ہے جو زمین اور چھت کے دو مقامات پر مضبوطی سے نصب ہوتا ہے۔

میاں زاہد حسین کمرے میں موجود نہیں تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ نیچے جاچکا تھا۔ میں غیر ارادی طور پر زینہ اترنے لگا۔ اس زینے کے گرداگرد ایک سنگی خول بھی تعمیر کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس "حفاظت" کے سبب باہر سے یہ زینہ نظر نہیں آتا ہوگا۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں ایک کیپسول میں قدم بہ قدم اوپر سے نیچے اتر رہا ہوں۔

اس کورڈ (COVERED) چکردار زینے کا اختتام بھی ایک دروازے پر ہی ہوا۔ اس کے ہینڈل نے مجھے بتادیا کہ دروازے کو باہر سے لاک کردیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس دروازے کی دوسری جانب بھی کوئی چھوٹا سا کمرا ہوگا۔ اسی لمحے ایک تشویش ناک خیال نے میری سوچ پر دستک دی ـــ کیا میاں زاہد حسین بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے؟

اس خیال نے میرے حلق میں کڑواہٹ بھردی۔ میں تیز رفتاری سے زینہ چڑھتے ہوئے اوپر جانے لگا۔ زیریں دروازے کو توڑ کر یا کھول کر باہر نکلنا بے کار تھا کیونکہ اگر میاں زاہد واقعی وہاں سے فرار ہوگیا تھا تو پھر وہ بنگلے کی زیریں منزل پر کہیں نہیں مل سکتا تھا۔

میں جب واپس میاں زاہد کے کمرے میں پہنچا تو رخشی نامی وہ پیشہ ور عورت مکمل لباس میں آچکی تھی۔ وہ ایک خوش شکل اور دعوت انگیز بدن کی مالک تھی جس کا سراپا دیکھنے والے میں سنسنی دوڑا دیتا۔ اس کی عمر تیس کے اریب قریب ہوگی۔ میں نے چھوٹتے ہی رخشی سے سوال کیا۔

"وہ خبیث کتنی دیر پہلے اس کمرے میں گیا تھا؟"

میرا اشارہ اس دروازے کی جانب تھا جسے میں نے برِیتھنگ ٹیکنیک کے ذریعے کھولا تھا۔ رخشی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

"جب پہلی مرتبہ فائرنگ ہوئی تو میاں جی مجھے یہیں ٹھہرنے کا کہہ کر اس دروازے میں غائب ہوگیا تھا۔"

گویا یہ پندرہ بیس منٹ پہلے کی بات تھی۔ یہ وقفہ اس کے فرار کے لیے کافی تھا لیکن اس دوران میں' میں نے بنگلے کے اندر یا باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں سنی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' میاں زاہد علی وہاں سے کوئی گاڑی نہیں لے کر گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ تھوڑی دیر پہلے جب میں بھولا ناتھ کو "لپکنا جھپٹنا" سکھا رہا تھا' اس وقت میں نے بنگلے کے گیٹ کو بند دیکھا تھا۔ میاں زاہد کی اچانک روپوشی نے معاملات کو سرِدست الجھا دیا تھا۔

میں نے کڑے لہجے میں رخشی سے سوال کیا "تم فائرنگ کی آواز اور اپنی ساتھی کال گرلز کی چیخیں سن کر کمرے سے باہر کیوں نہیں نکلی تھیں؟"

"میں ڈر گئی تھی ـــ سخت خوف زدہ ہوگئی تھی میں" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی "مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لے سکوں۔"

"کیا تم جانتی ہو' اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟" میں نے زینوں والے کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے میری حسبِ توقع جواب دیا "نہیں' میرا خیال ہے کوئی واش روم ہوگا۔ میں اس بنگلے پر پہلی مرتبہ آئی ہوں۔"

"اور تمہاری وہ دونوں ساتھی گرلز!"

"وہ بھی یہاں پہلے کبھی نہیں آئیں۔"

میں نے پوچھا "ان کے نام تم نے نازش اور سُرلا بتائے ہیں۔ سُرلا نام سے تو ظاہر ہوتا ہے' وہ کوئی ہندو عورت تھی۔"

"سُرلا واقعی ہندو تھی" رخشی نے افسوس ناک انداز میں کہا۔ اسے اپنی پیشہ ور ساتھی کی موت سے دھچکا پہنچا تھا "میاں جی نے اپنے ہندو مہمان بھولا ناتھ کے لیے سُرلا کو بلوایا تھا" پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو' پوچھنے لگی "دوسرے کمرے میں بھولا ناتھ اور جمال نامی دو غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے' وہ کہاں ہیں؟"

میں نے ذو معنی انداز میں کہا "وہ بے چارے مفقود الخبر ہوچکے ہیں۔"

کبیر شاہ نے رخشی سے پوچھا "کیا واقعی وہ غیر ملکی مہمان ایک ہی کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے؟ میں ان چاروں کو ایک ہی کمرے میں' ناقابلِ بیان حالت میں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ اس حوالے سے میرا دماغ ابھی تک چکرا رہا ہے۔"

رخشی نے بڑے کھلے ڈلے انداز میں بتایا "ہاں یار! وہ دونوں بہت گہرے دوست ہیں۔ مجھے معلوم ہے' وہ اچھا برا ہر کام ایک ساتھ مل کر کرتے ہیں۔"

رخشی کے لہجے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ یا جھجک موجود نہیں تھی۔ اس نے جمال اور بھولا ناتھ کے لیے حال کا صیغہ استعمال کیا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مفقود الخبر کی حقیقت سے آشنائی حاصل نہیں کرسکی تھی۔

کبیر شاہ نے رخشی سے سوال کیا "تم لوگوں کا تعلق کس کے اڈے سے ہے؟"

"میڈم روزی!" اس نے دو لفظی جواب دیا۔

"وہ درخشاں والی میڈم روزی؟"

"بالکل وہی۔"

میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے رخشی سے پوچھا "کیا تمہاری میڈم کے پاس ہندو لڑکیاں اور عورتیں بھی ہیں؟"

"سب ہیں جناب!" وہ ایک ادا سے بولی "ہر رنگ اور نسل کے نگینے مل جائیں گے میڈم روزی کے اڈے پر' آپ تشریف لا کر دیکھیں۔"

کبیر شاہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "وجدان! یہ پیشہ بہت ترقی کرچکا ہے۔ لگتا ہے' اس سلسلے میں تمہاری معلومات محدود ہیں۔"

"میری معلومات تو محدود نہیں ہیں" میں نے کہا "لیکن پاکستان میں اس قسم کے کاروبار کے بارے میں اور اتنی وسعت کے ساتھ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔"

"بھولے بادشاہ!" کبیر شاہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس قسم کے کاروبار ملک نہیں' بلکہ لوگ کرتے ہیں جو کہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ پاکستان بھی اسی دنیا کا ایک ملک ہے۔"

کبیر شاہ کی بات پوری ہوئی ہی تھی کہ رات کے سناٹے میں کسی گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی مہیب آواز ابھری۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اسی لمحے بنگلے کے زیریں حصے میں گاڑی کے ٹائروں کی مخصوص "چرچراہٹ" سنائی دی۔

ہم دونوں لپک کر کمرے سے باہر آئے۔ کسی سوال جواب کا وقت تھا اور نہ ہی موقع۔ یہ بات طے تھی کہ کوئی اس بنگلے سے بڑی جلدی میں روانہ ہورہا تھا اور وہ "کوئی" میاں زاہد حسین کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہاں موجود باقی تمام افراد کو ہم نے مناسب طور پر "فٹ" کردیا تھا۔

بالائی منزل کی بالکونی سے جھک کر جب نیچے دیکھا گیا تو ایک افسوس ناک منظر سے سامنا ہوا۔ بنگلے کا گیٹ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور اس گیٹ میں سے ایک قیمتی گاڑی باہر نکل کر سڑک پر چڑھ چکی تھی۔ ہماری بے خبری میں اس نے بڑی خاموشی سے گیٹ کھول لیا تھا۔

کبیر شاہ نے ایک جھٹکے سے کلاشنکوف سیدھی کی مگر اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ کرتا' وہ قیمتی گاڑی ایک موڑ کاٹ کر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

"وجدان! وہ کمینہ بھاگ گیا" کبیر شاہ نے ہیجانی لہجے میں کہا "ہمیں اس کا پیچھا کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "تعاقب زیادہ مفید ثابت نہیں ہوگا۔ جب تک ہم بنگلے کے عقب میں پہنچ کر اپنی موٹر سائیکلز کو سنبھالیں گے' میاں زاہد کہیں سے کہیں نکل چکا ہوگا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اسے خاموشی سے جانے دیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ان زینوں کی جانب دوڑ لگادی جو ہمیں زیریں منزل پر پہنچا سکتے تھے۔ ہم پہلو بہ پہلو دوڑتے ہوئے نیچے آئے پھر بنگلے کے عقبی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ گیٹ میں سے نکل کر بنگلے کے عقب میں پہنچنے کے لیے

ہمیں کم از کم دس بنگلے گھوم کر آنا پڑتا جبکہ ہم جو راستہ اختیار کر کے بنگلے میں "داخل" ہوئے تھے اسی راہ سے فوری واپسی ممکن تھی۔

ہم جیسے ہی بنگلے کی عمارت کے پہلو سے گزر کر عقبی حصے میں پہنچے' ایک غراتی ہوئی آواز نے ہمیں رکنے کا حکم دیا۔ "تم دونوں اس وقت میری گن کے نشانے پر ہو۔ اگر ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں فائرنگ کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔"

بنگلے میں داخل ہو کر ہم نے دو سیکیورٹی گارڈز کو "ناقابلِ استعمال" بنایا تھا۔ کبیر شاہ نے تو اپنے حصے کے گارڈ کی کھوپڑی چٹخادی تھی۔ اس کے ہوش میں آنے کی امید نہیں تھی' البتہ وہ میرے حصے والا گارڈ ہو سکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اسے دو تین گھنٹے کے لیے انٹاغفیل کردیا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ اپنی سخت جانی کے سبب قبل از وقت ہوش میں آگیا ہوگا۔

میں نے کبیر شاہ کے کان میں سرگوشی کی "تم دوسری طرف سے گھوم کر اس کے عقب میں پہنچو میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

یہ بات میں نے اس بنیاد پر کہی تھی کہ وہ شخص ہمیں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن اس کا دعویٰ تھا کہ ہم دونوں اس کے گن پوائنٹ پر ہیں۔ میں اس کی دھمکی کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ اگر واقعی ہم اس کی نگاہ میں تھے تو وہ کبیر شاہ کی حرکت کو نوٹ کرلیتا۔

کبیر شاہ نے جیسے ہی اپنی جگہ سے جنبش کی' دکھائی نہ دینے والے شخص نے وارننگ دی ""خبردار! جو کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ میں تمہاری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا ہوں۔"

آواز ایک اندھیری اوٹ سے ابھر رہی تھی۔ یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ وہ ہمیں بہ خوبی دیکھ رہا تھا۔ ہم بھی اندھیرے میں تھے مگر ہم دونوں کے زاویے میں فرق تھا۔ میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"تم ہمیں آگے بڑھنے سے بھی روک رہے ہو اور پیچھے جانے پر بھی تمہیں اعتراض ہے۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"فی الحال تم لوگ اپنے ہتھیار میری جانب پھینک دو۔"

میں نے ذرا غور کیا تو اس آواز کو پہچان گیا۔ یہ طفیل نامی گارڈ کی آواز تھی۔ اس سیکیورٹی گارڈ پر میں نے طبع آزمائی کی تھی۔ مجھے واقعی حیرت ہوئی کہ وہ اتنی جلدی کس طرح ہوش میں آگیا تھا۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"طفیل! بنگلے کے اندر بازی پلٹ چکی ہے۔ اس وقت ہمارا ہولڈ ہے۔ تمہارا باس میاں زاہد دم دبا کر یہاں سے فرار ہو چکا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم گن پھینک کر خود کو ہماری تحویل میں دے دو ورنہ ہم تمہارا بڑا عبرت ناک حشر کریں گے۔"

"تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ حیرت سے متفسر ہوا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "ہم تمہارے نام کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتے ہیں تمہاری نجی اور پرائیویٹ زندگی کے بارے میں۔"

"تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

"بالکل درست۔" میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا "اس لیے نہیں بنا سکتے کہ تم تو آل ریڈی بے وقوف ہو۔"

وہ غصے سے بولا "میں ایسا مذاق پسند نہیں کرتا۔ بہتر ہوگا کہ تم میرے تین گننے سے پہلے ہتھیار پھینک دو۔" ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا "میں گنتی شروع کرنے والا ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ "ون ٹو تھری" کا آغاز کرتا' میں نے کبیر شاہ کو ایک فوری عمل کا مخصوص اشارہ دیا اور سیکیورٹی گارڈ کی طرف منہ کر کے تیز آواز میں کہا۔

"مسٹر طفیل! تمہیں ایسا مذاق پسند نہیں اور میں ویسا مذاق کرنے کا عادی نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ہمارے "ہولڈ" پر ایمان لانا چاہتے ہو تو نگاہ اٹھا کر ذرا چھت کی طرف دیکھو۔ ہمارا ایک مسلح ساتھی اس وقت تم پر گن تانے وہاں کھڑا ہے۔"

میرا جملہ آخری الفاظ تک پہنچا ہی تھا کہ کبیر شاہ نے آگے بڑھ کر آواز کی سمت ایک برسٹ فائر کردیا۔ اس کے ساتھ ہی سیکیورٹی گارڈ کی آخری چیخیں فضا میں بلند ہو کر ہوا میں منتشر ہو گئیں۔

انسانی نفسیات کے عین مطابق میرے انکشاف پر سیکیورٹی گارڈ نے بنگلے کی چھت کی طرف دیکھا تھا۔ اس دوران میں وہ یقیناً ہماری جانب سے غافل ہو گیا تھا اور اس کی اس لمحاتی غفلت سے کبیر شاہ نے ماہرانہ انداز میں بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔

اس پے در پے فائرنگ کے بعد وہاں رکنا ہمارے لیے انتہائی پُرخطر ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہے' ہم نے اس عمارت کا ٹیلی فونک رابطہ منقطع کردیا تھا لیکن آس پاس کے کسی بنگلے سے

ونی شب بیدار شخص قریبی تھانے فون کر کے اس غیر معمولی رنگ کی اطلاع دے سکتا تھا۔

کبیر شاہ نے مجھے بازو سے تھامتے ہوئے کہا "وجدان! یاں زاہد حسین کے پیچھے جانا اب بھُس کے ڈھیر میں سے سوئی لاش کرنے کے مترادف ہے۔ وہ ہماری پکڑ اور پہنچ سے ت زیادہ دور جا چکا ہو گا۔ ہمیں فوراً یہاں سے فرار ہو جانا ہیے۔"

"ہم یہاں سے جا رہے ہیں لیکن واپسی سے قبل ایک روری کام باقی ہے۔"

"کون سا ضروری کام؟" وہ متعجب لہجے میں بولا۔

میں نے بنگلے کے سامنے والے حصے کی جانب قدم ھاتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم س (بھوسے) کے ڈھیر میں سے ایک ننھی سی سوئی تلاش یں کر سکتے لیکن اس بھوسے میں ایک ننی سی چنگاری تو ال سکتے ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے لا۔

"دیکھتے جاؤ۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

جب ہم اس مقام پر پہنچے جہاں بھولا ناتھ ٹھنڈا ٹھار پڑا ا تو سامنے سے رخشی آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ ہمیں دیکھ کر ٹک گئی۔ میری "فرمائش" پر کبیر شاہ نے اسے گن پوائنٹ رکھ لیا پھر وہ دونوں میری تقلید میں اس کمرے میں پہنچے ماں میں یعقوب عرف قوبا کو لمبا لٹا گیا تھا۔

قوبا ہنوز دنیا و مافیہا سے بے خبر سکھ کی دائمی بانسری بجا ہا تھا۔ میں نے اس باتھ روم کا دروازہ کھولا جہاں شاکر علی کو ند کیا تھا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی دہشت زدہ ہو گیا۔ پھر ت آمیز لہجے میں گڑگڑانے لگا۔

"خدا کے لیے مجھے نہ مارنا۔ میں نے تمہارا کچھ نہیں اڑا۔"

"تم نے قادرِ مطلق کا واسطہ دیا ہے تو میں تمہیں جان ے نہیں گزاروں گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا "لیکن ں کے بدلے تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینا ہوں ے مجھے امید ہے' اس جان بخشی کے بدلے تم شرافت کا ہرہ کرتے ہوئے سچ بولو گے۔"

"میں ایک ایک بات سچ بتاؤں گا۔" وہ گھگیایا "تم پوچھو' پوچھنا چاہتے ہو؟"

میں نے پوچھا "تمہارے باس میاں زاہد حسین کا اصل ٹھکانا کہاں ہے؟"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں' اس کے اصل ٹھکانے سے میں واقف نہیں۔ میں کیا بلکہ کوئی بھی واقف نہیں۔ وہ بہت محتاط اور کائیاں شخص ہے' مختلف ٹھکانوں پر پایا جاتا ہے۔ کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا' وہ کس وقت کہاں ہو گا۔"

"تم مجھے چکر دینے کوشش تو نہیں کر رہے؟"

"میں پیدا کرنے والے کی قسم کھا کر کہتا ہوں' اس میں ذرہ برابر جھوٹ نہیں۔"

میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس وقت وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ وہ گرین بیلٹ والے بنگلے پر ہماری سفاکی اور مشاقی کا ٹریلر دیکھ چکا تھا جس کے نتیجے میں اپنے قدموں کا نہیں رہا تھا۔ مجھے امید تھی' وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کو کسی رسک کی بھینٹ چڑھانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کے جواب پر یقین کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' میں تمہارے بیان کو بعد میں چیک کروں گا اور بیان غلط ثابت ہونے پر تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا' میں نے پوچھا "رات کو یہاں دو اور افراد بھی موجود تھے جن میں ایک کا نام تارا ہے۔ وہ نصف شب کے بعد ایک سیاہ لینڈ کروزر میں بنگلے سے کہیں چلے گئے تھے۔ تارا کے ساتھ وہ دوسرا پستہ قامت نوجوان کون تھا؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں سمجھ گیا' کوئی خاص بات ہے اسی لیے وہ جواب دینے میں تامل کا اظہار کر رہا تھا۔ میں نے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"تمہارے جواب سے میں تمہاری سچائی کو بھی پرکھ لوں گا کیونکہ میں مذکورہ نوجوان کو اچھی طرح جانتا ہوں" یہ جھوٹ میں نے اس سے سچ اگلوانے کی خاطر بولا تھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "وہ فیصل صاحب ہیں۔ چوہدری نوازش علی صاحب کے صاحب زادے' کچھ دنوں سے وہ یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

شاکر علی کے جواب نے میرے وجود میں سنسنی دوڑادی۔ وہ ایک بہت ہی اہم انکشاف کر رہا تھا۔ ملک نوازش علی کا سپوت چھوٹا چوہدری کراچی میں موجود تھا۔ گویا چوہدری نوازش علی اور چوہدری عابد علی کی جوان اولاد آپس میں ٹکرانے والی تھی۔ فیصل میری جانب پیش قدمی نہ بھی کرتا تو میں اسے ضرور ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کرتا۔

اپنے اندرونی جذبات کو چہرے کے تاثرات سے ظاہر

نہ کرتے ہوئے میں نے شاکر علی سے سراہنے والے انداز میں کہا۔ "تم نے سچ بول کر میرا اعتماد حاصل کرلیا ہے۔ میں فیصل کی کراچی میں آمد سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ اب تم یہ بھی بتادو' فیصل اور تارا سیاہ لینڈ کروزر میں کہاں گئے ہیں؟"

"وہ دونوں گلشن والے بنگلے پر گئے ہیں" اس نے بتایا "ان کی شب بسری کا وہیں بندوبست کیا گیا ہے۔"

میں نے پوچھا "گلشن میں وہ بنگلا کس جگہ واقع ہے؟"

اس نے بنگلے کا نمبر بتانے کے بعد لوکیشن کی جو وضاحت کی اس کے مطابق وہ بنگلا حسن اسکوائر اور نیپا چورنگی کے درمیان واقع تھا۔ میں نے یہ معلومات اپنے ذہن میں محفوظ کرلیں۔ وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔

شاکر علی نے سماجت آمیز انداز میں کہا "میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر آپ کو یہ معلومات فراہم تو کردی ہیں لیکن میری ایک درخواست ہے۔"

میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا' وہ بولا "اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہیں آنا چاہیے۔ آپ میری مجبوری کو سمجھ رہے ہیں نا۔"

"تم اس حوالے سے بے فکر ہو جاؤ" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ کہیں دور ایک مخصوص سائرن کی آواز سنائی دی' اس قسم کا سائرن یا تو پولیس موبائل سے خارج ہوتا تھا یا پھر کسی ایمبولینس سے' میں نے کبیر شاہ سے کہا۔

"شاہ جی! رخشی کو شاکر کے پاس بھیج دو۔ اب ہم یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتے۔"

کبیر شاہ نے گن کی نال سے ٹھوکا دے کر رخشی کو باتھ روم میں "منتقل" کردیا۔ شاکر نے حیرت بھری آواز میں پوچھا۔

"آپ اس کو میرے پاس کیوں بھیج رہے ہیں؟"

"تاکہ رات کے باقی حصے کو تم یادگار بنا سکو" میں نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

وہ بوکھلا گیا "میں۔۔۔ میں اس کا کیا کروں گا؟"

"تم اس کے پیشے کا تقاضا پورا کروگے؟" میں نے کہا "یعنی اپنے باس کے پیسے پورے کروگے؟"

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا' میں نے ایک دھڑاکے سے باتھ روم کا دروازہ بند کرکے باہر سے بولٹ کردیا۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کس طرح نمٹیں گے۔ میں نے تو صرف رخشی کو اس مقصد کے لیے مقید کیا تھا کہ وہ ہمارے پیچھے وہاں کوئی گند نہ کرسکے۔

مخصوص قسم کے سائرن کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھی۔ آواز کا رخ اور زاویہ بتارہا تھا کہ وہ گاڑی ہماری ہی سمت میں رواں دواں ہے۔ ہم نے ایک دوڑ لگا کر بنگلے کی عقبی دیوار پھاندی اور اپنی موٹر سائیکلز کے پاس پہنچ گئے اس مقام پر اندھیرے اور سناٹے نے ڈیرا جمار کھا تھا۔ "سامان" سمیت موٹر سائیکلز محفوظ تھیں۔

ہم نے آن واحد میں اپنی "گاڑیاں" اسٹارٹ کیں اور سائرن کی مخالف سمت میں روانہ ہوگئے۔ ایک منٹ بعد وہ مخصوص آواز ہماری سماعت کے دائرہ کار سے باہر ہوگئی گویا ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تھے۔

میری شرٹ قوبا کے خون سے بری طرح آلودہ ہوگئی تھی۔ ہم زیادہ دیر تک سڑکیں ناپنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے چنانچہ جب ہمیں اطمینان ہوگیا کہ ہمارا تعاقب نہیں کیا جارہا تو ہم نے موٹر سائیکلز کا رخ "ساؤتھ" کی جانب موڑ دیا۔ جب ہم ساؤتھ پہنچے تو فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

O☆O

سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ اس پارک میں لگ بھگ دو درجن افراد سحر خیزی میں مصروف تھے جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ مذکورہ پارک "ساؤتھ" سے واکنگ ڈسٹنس پر تھا اور ایک جدید ترین خوبصورت مسجد سے ملحق تھا یعنی مسجد پارک ہی کے ایک کونے میں بنی ہوئی تھیں۔ ڈیفنس سوسائٹی کے اہل ثروت حضرات نے عبادت کے لیے مسجد بھی شاندار اور دلکش بنوائی تھی تاکہ یادِ الٰہی میں مصروفیت کے دوران میں بھی ان کا احساس تفاخر کی منزلوں کو چھوتا رہے۔ یہ ایک طرح سے مثبت طرزِ فکر تھا کیونکہ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے سلسلے میں لوگ سب سے زیادہ کنجوسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بعض تو اچھے خاصے ہوتے ہوئے بھی مفلس و نادار بن جاتے ہیں۔

میں اس وقت نیوی بلیو ٹریک سوٹ (TRACK SUIT) میں تھا اور پارک کے ایک کونے میں سانس کی مشق کی تیاری کر رہا تھا۔ ساؤتھ پہنچ کر سب سے پہلے میں نے باتھ لے کر لباس تبدیل کیا تھا۔ کبیر شاہ نے جب سونے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے فی الحال نیند نہیں آرہی لہٰذا میں ایکسرسائز کے لیے نزدیکی پارک جاؤں گا۔ یہ پارک اسی وقت میری نگاہ میں سما گیا تھا۔ جب امتیاز کے ساتھ میں پہلی مرتبہ ساؤتھ آیا تھا۔ امتیاز نے مسٹر نبل

...کو ائرپورٹ سے ساؤتھ پہنچایا تھا۔ جب میں نے ...سائز کا ارادہ ظاہر کیا تو کبیر شاہ نے مجھے یہ نیو برانڈ ٹریک ...ٹ فراہم کردیا تھا۔

یہ پوری رات جس کی اب صبح ہو رہی تھی' میں نے ...افراتفری اور ٹینشن میں گزاری تھی اس لیے یوگا کی ...مخصوص مشق کے ذریعے میں اپنے حواس اور اعصاب ...سکون پہنچانا چاہتا تھا۔ میں پارک کے کونے میں شمال رخ ...آسن (LOTUS POSTURE) جما کر بیٹھ گیا۔ ...آنکھیں بند کرکے میں نے چند ہموار اور گہری گہری سانسیں ... اس کے بعد میں نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور ...انگشتِ شہادت کو ملا کر ایک چٹکی بنائی اور اپنی ناک کو اس ...کے اندر جکڑ لیا۔ یہ جکڑ بہت نرم خو تھی۔ پھر میں نے یوگا ...اس مخصوص مشق کا آغاز کردیا جو پرانایام (PRANAYAM) کہلاتی ہے۔ میں نے اپنے تجربے اور ...مہارت کے پیشِ نظر اس مشق میں کچھ ترمیم و اضافہ کرلیا تھا ...اس طرح یہ زیادہ مفید اور سود مند ہوگئی تھی۔

میں نے انگشتِ شہادت سے بائیں نتھنے کو دبائے رکھا ...اور دائیں نتھنے پر سے انگوٹھے کی گرفت ڈھیلی کردی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دھیرے دھیرے سانس کو اندر کھینچنا یعنی (INHALE) کرنا شروع کیا۔ میرا تصور اس نکتے پر جما ہوا تھا ...اس کائنات کی سب سے بڑی سچائی نورِ الٰہی اس سانس کے ساتھ ہی میرے نتھنے کے راستے پھیپھڑوں میں بھر رہا ہے۔ ...اور دل فلٹریشن (FILTRATION) کی غرض سے جو خون ...پھیپھڑوں میں پمپ کررہا ہے یہ نور اس خون میں شامل ...ہو کر میرے پورے بدن میں گردش کررہا ہے۔ (INHALE) ...کی تکمیل تک میں اس تصور پر قائم رہا پھر میں نے انگوٹھے ...سے دائیں نتھنے کو دبا کر بائیں نتھنے کو آزاد کردیا۔ اس کے ...ساتھ ہی سانس خارج کرنے کا عمل یعنی (EXHALE) ...شروع ہوگیا۔ میں دھیرے دھیرے سانس چھوڑتے ہوئے یہ ...سوچتا رہا تھا۔ اس سانس کے ساتھ میری تمام ذہنی' جسمانی ...اور روحانی خرابیاں بھی میری ذات سے خارج ہو رہی ہیں۔ ...اس تصور کے ساتھ ہی خارج ہوتی ہوئی سانس مجھے آلودہ اور ...بوجھل سی محسوس ہونے لگی جبکہ (INHALE) کرتے وقت ...سانس انتہائی لطیف اور نور سے معمور تھی۔

میں نے نتھنوں کی تبدیلی کے ساتھ یہ عمل چھ مرتبہ ...دہرایا۔ گویا میں نے اس مشق کے چھ چکر پورے کرلیے تھے۔ ...میرا ذہن' جسم اور روح بالکل تروتازہ ہوگئے۔ مجھے اپنے ...احساسات میں ایک ٹھنڈک اور جذبات میں خوش بو اترتی محسوس ہوئی۔ میری ذات معطر ہوگئی۔ اگر بھرپور تصور کے ساتھ "پرانایام" کی یہ سادہ سی مشق کی جائے تو یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

مشق کے اختتام پر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلیں تو میری نگاہ ایک مسکراتے ہوئے حسین چہرے سے ٹکرائی۔ وہ ایک سنگی بینچ پر بیٹھی تھی اور بڑے دل آویز انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ سجی تھی۔ جواباً میں زیرِ لب مسکرایا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس پارک کے گرداگرد' گھاس کے مستطیل قطعے کے چاروں جانب جوگنگ اور واکنگ کرنے والوں کے لیے ایک پختہ ٹریک بنا ہوا تھا۔ میں گھاس سے اٹھ کر جب اس ٹریک پر آیا تو اسی حسین چہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر کیوں مسکرا رہی تھی' میری یادداشت نے پلک جھپکتے میں مجھے بتادیا' یہ چہرہ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اس کی دلکش مسکراہٹ کیا معنی رکھتی تھی؟

میں انہی سوچوں میں غلطاں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اپنے عقب میں مجھے ایک مترنم نسوانی آواز سنائی دی "ایکسکیوز می مسٹر۔!"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو اسی حسین چہرے سے آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ مجھ سے پانچ فٹ کی دوری پر تھی اور بڑی گہری نظر سے میرے خال و خط کو کھوج رہی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"سوری۔ آپ نے مجھے آواز دی ہے؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا پھر بولی "میرا نام صدف ہے۔ میں اس سامنے والے بنگلے میں رہتی ہوں" پھر اس نے پارک کے باہر ایک بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ بنگلا جس کا گیٹ محرابی شکل کا ہے۔ اس پر نیلا رنگ ہوا ہے اور ہینڈل پیتل کے ہیں۔"

میں نے غیر ارادی طور پر نگاہ اٹھا کر مذکورہ بنگلے کے گیٹ کو دیکھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ وہ مجھے اپنے بارے میں اس تفصیل سے کیوں آگاہ کر رہی تھی جبکہ میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ اس نے میرے چہرے کی الجھن پڑھ لی۔

"آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ میں آپ سے خواہ مخواہ کیوں فری ہو رہی ہوں" وہ تبسم ریز انداز میں بولی "دراصل آپ کو یہاں دیکھ کر مجھے شدید حیرانی ہو رہی ہے۔ آپ تو انڈیا میں تھے۔"

حیران تو میں پہلے ہی تھا۔ اب اس حیرت میں کئی چند اضافہ ہو گیا۔ وہ میری ذات سے انڈیا کو منسوب کر رہی تھی۔ میں فوراً ریڈ الرٹ ہو گیا۔ اپنے اندرونی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا اور قدرے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟"

"اگر میری آنکھیں اور یادداشت دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو آپ کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔" وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی "انڈیا کی پنک سٹی یعنی جے پور میں۔"

جے پور کے ذکر پر میں چونک اٹھا۔ پنک سٹی کے نام سے معروف ہندوستان کا یہ شہر ایک طویل عرصے تک میری آماجگاہ رہا تھا۔ اسی شہر میں صدف نامی یہ لڑکی مجھے دیکھنے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ میں نے اپنے جذبات اور چہرے کے تاثرات کو حتی المقدور چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو کبھی انڈیا گیا ہی نہیں، پھر جے پور اور پنک سٹی میں میرے پائے جانے کا کیا سوال؟" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس سے پوچھا "آپ نے وہاں کس جگہ مجھے دیکھا تھا۔ کیا ہماری ملاقات بھی ہوئی تھی۔ اگر ہوئی تھی تو مجھے کیوں یاد نہیں؟"

میں نے دانستہ اس قسم کا انداز اپنایا تھا کہ وہ میرے چور خیالات کو نہ سمجھ سکے۔ اس نے مجھے بھرپور نظر سے دیکھتے ہوئے وضاحت کی۔

"ہماری وہاں ملاقات ہوئی ہے اور نہ ہی میں نے آپ کو براہِ راست دیکھا ہے" اس نے بدستور گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "جے پور میں میرے ماموں سرفراز خان رہتے ہیں۔ وہاں ان کا لیدر کا بزنس ہے۔ کچھ عرصہ پہلے میں ان کے پاس جے پور گئی ہوئی تھی۔ میں نے جے پور کے اخبارات میں آپ کی تصویریں دیکھی تھیں۔ آپ نے اس شہر کے پنڈتوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ نامی ایک مقامی طاقت ور شخص آپ کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ آپ کے معرکوں کی خبریں جے پور کے اخبارات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ آپ نے کسی ہندو ناری رانی روپ متی کو بھی اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ ایک مسلے کے ہندو ناری سے تعلقات پر وہاں کے پنڈت اور پجاری سخت مشتعل تھے۔ آپ کا نام وجدان ہی ہے نا؟"

صدف نے جو کچھ بیان کیا، وہ مبنی بر حقیقت تھا مگر میں اتنی جلدی ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ایک اجنبی لڑکی سے پہلی ہی ملاقات میں، میں کھل نہیں سکتا تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ میں آگ اور خون کے دریا سے گزر رہا تھا۔ گزشتہ رات والا واقعہ اس کی مثال کے لیے کافی ہے۔

میں نے کامیاب اداکاری کا مظاہرہ جاری رکھتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بڑے ٹھہراؤ سے کہا "میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ اس وقت کسی سخت قسم کی غلط فہمی یا مغالطے کا شکار ہو رہی ہیں۔ میرا نام وجدان نہیں بلکہ وجیہ ہے اور میں کبھی انڈیا نہیں گیا۔ ممکن ہے، آپ کے بیان کردہ وجدان کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہو جس کی وجہ سے آپ مجھے وجدان سمجھ رہی ہیں۔"

اس نے توجہ سے میری بات سنی اور بے یقینی سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "اگر آپ کی مانگ کو ختم کر کے چہرے سے مونچھوں کو ہٹا دیا جائے تو آپ وہی وجدان بن جائیں گے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں۔ خیر۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اپنے حلیے میں مونچھوں اور ہیئر اسٹائل کی تبدیلی میں نے امتیاز علی کے مشورے پر کی تھی۔ صدف کا مشاہدہ بہت قوی تھا۔ یہ تو میری خود نمائی کاری تھی کہ میں اس سے اتفاق نہیں کر رہا تھا ورنہ وہ تو صد فی صد مجھے پہچان گئی تھی۔

صدف کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ گداز بدن کے ساتھ یہ قامت قیامت میں بدل گئی تھی۔ اس پر چہرے کی دلکشی اور مخصوص ملکوتی مسکراہٹ نے اس کی شخصیت کو انفرادیت دے کر ایک حسین نکھار سے نواز دیا تھا۔ مجھے اپنے سراپا سے نگاہی تعارف میں مصروف پا کر اس نے پوچھا۔

"وجیہ صاحب! میں نے آپ کو وجدان سمجھ کر خواہ مخواہ زحمت دی۔ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔"

"نو مینشن پلیز۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پوچھا "کیا آپ یہیں قریب ہی رہتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں کراچی میں نیا ہوں۔ ایک دوست کے ہاں مہمان ٹھہرا ہوا ہوں۔" پھر میں نے اسے فلیٹ کا ایڈریس دیا۔ "میرا دوست اسی فلیٹ میں رہتا ہے۔ دو چار دن بعد میں واپس اپنے شہر لاہور چلا جاؤں گا۔"

"اوہ! تو آپ کا تعلق لاہور سے ہے۔" وہ چونکی اور مسکراتے ہوئے بتایا "میری مما بھی لاہور کی رہنے والی ہیں، پاپا مقامی ہیں۔ میری ننھیال لاہور میں شادمان کالونی میں ہے۔ آپ وہاں کس جگہ رہتے ہیں؟"

"اچھرہ!" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

جب میں دو ماہ کا تھا تو میرے والد صاحب چوہدری نوازش کے بہ توغنڈے وارا سے مجھے بچاتے ہوئے لاہور کے کئی علاقوں میں روپوش ہوئے تھے۔ موضع "رکھاں والی" سے گلشن راوی اور پھر اچھرہ میں ان کا قیام رہا تھا۔ ازاں بعد وہ کراچی آگئے پھر ایک دوست کے توسط سے سنگاپور چلے گئے تھے۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر وجیہہ۔" صدف کی آواز نے مجھے خیال سے چونکا دیا۔ "میں ڈاؤ میں میڈیکل پڑھ رہی ہوں۔ یہ میرا فائنل ائیر ہے۔ ایک سال بعد انشااللہ میں ڈاکٹر بن جاؤں گی۔ آپ کیا اسٹڈی کر رہے ہیں؟"

میں نے سرسری انداز میں بتایا "میں گریجویشن سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ والد صاحب کا سونے کا بزنس ہے۔ انہی کا ہاتھ بٹاتا ہوں۔ انارکلی میں ہماری جیولری کی بہت بڑی دکان ہے۔"

یہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے دل میں سخت افسوس ہو رہا تھا لیکن مجھے حالات اور مصلحت کا تقاضا نبھانا بھی ضروری تھا خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ جے پور میں میری ماضی کی سرگرمیوں سے پوری طرح آگاہ تھی۔ میں نے سوچا' بعد میں کبھی اگر ملاقات کا موقع ملا تو میں اس غلط بیانی کے لیے معذرت کرلوں گا۔

اسی لمحے صدف نے مجھے پکارا "اوکے مسٹر وجیہہ! زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ میرے پاپا نماز ادا کر کے مسجد سے نکل آئے ہیں۔ اب میں ان کے ساتھ واک کروں گی۔ میں یہاں روزانہ مارننگ واک کرنے آتی ہوں۔"

آخری جملہ صدف نے کچھ اس انداز میں ادا کیا تھا جیسے مجھے کوئی خاص قسم کی اطلاع دے رہی ہو۔ میں اس کو سی آف کر کے پارک سے نکل آیا۔

واپس ساؤتھ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ بہ ظاہر یہ دنیا بہت بڑی نظر آتی ہے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک ہزاروں میل پھیلی ہوئی۔ لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو یہ بہت چھوٹی سی دنیا ہے۔ یہاں ہم بار بار ایک دوسرے سے سامنا کرتے ہیں۔ کبھی پہچان کر آگے بڑھتے ہیں اور پُرجوش انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور کبھی۔۔۔ پہچان کر بھی نہیں پہچان پاتے' چند رسمی جملوں کا تبادلہ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں کیفیات کے بیان کے لیے میری اور صدف کی ملاقات کی مثال کافی ہے۔ وہ مجھے پہچان کر آگے بڑھی تھی لیکن میں کترا کر نکل آیا تھا۔

ساؤتھ میں' واپسی پر اشتیاق احمد سے ملاقات ہوئی۔ اشتیاق میری کراچی میں آمد اور "سی ایف کے" میں شمولیت سے قبل امتیاز کے ساتھ اس کے چھوٹے بھائی کی حیثیت سے طارق روڈ والے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا۔ "کبیر بھائی تو سو چکے ہیں۔ انہوں نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں اور آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھوں۔"

میں نے کہا "اشتیاق! فی الحال میں بھرپور ناشتا کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آرام کا ارادہ ہے۔ تمہاری یہ ڈیوٹی بہت آسان ثابت ہوگی۔"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے میرے لیے ناشتے کا بندوبست کرنے چلا گیا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں' میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ گزشتہ پوری رات میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھ نہیں لگائی تھی۔ پیٹ میں خوراک گئی تو مجھ پر کسل مندی سوار ہونے لگی۔ رات والے خونچکاں آپریشن نے مجھے جسمانی اور اعصابی طور پر تھکا دیا تھا۔ یوگا کی مشق نے جہاں مجھے مکمل سکون بخشا تھا وہیں میری بھوک کو بھی بھڑکا دیا تھا جس کے نتیجے میں' میں تین افراد کا ناشتا معدے میں اتار چکا تھا۔ اسی اوور ایٹنگ نے مجھے ایک خمار کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں اپنے لیے مخصوص کمرے میں آگیا۔

جب میں بستر پر دراز ہوا تو صدف چپکے سے میری سوچ میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی دیر پہلے پارک میں اس سے جو ملاقات ہوئی تھی' میں اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں نے فرض کیا' اگر میں اس کی بات کی تصدیق کر دیتا' خود کو وجدان تسلیم کر لیتا تو اس کا ردِ عمل کیا ہوتا؟ اور اب جب کہ میں نے اس کی بات کی تردید کرتے ہوئے خود کو وجیہہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی تو اس سے وہ کیا تاثر لے گی؟

یہ دونوں سوالات ایسے تھے کہ میں اپنے ذہن میں ان کا کوئی حتمی جواب تلاش نہیں کر سکا۔ صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خیال آپوں آپ ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں گزشتہ رات اس کے پاس سے بڑے جذباتی انداز میں رخصت ہوا تھا۔ اپنی پیشانی پر اس کے بوسے کی خوشبو میں ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ ساحل ایک مہکتا ہوا بھبکا تھی۔ اس کا قرب میرے تن بدن کو اپنی مہک سے بسا دیتا تھا۔ جب سے اس نے گریز کی "پالیسی" اپنائی تھی' میری

طلب میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس حرارت ... سے قبل' میں ہفتوں سے اس کے لمس و ... تھا۔ اگر مجھے ہنگامی حالات کے پیش نظر ... جانا ہوتا تو میں اس کے یاقوتی لبوں کو اپنی پیشانی ... نہ ہونے دیتا۔

حرارت زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ساحل کے شنگرفی ... کسی انگارے سے کم نہیں تھے۔ وہ انگارا جو جلاتا ... جلاتا ہے۔ اپنی کیف آور آنچ سے جی کو برماتا ہے' ... کو گرماتا ہے اور احساسات کو مہکاتا ہے۔۔۔ اس کا ... دل کو تڑپاتا ہے!

... میں تڑپ کر بستر سے اٹھا میرا ہاتھ میکانگی انداز میں بے ... بیڈ سائیڈ پر رکھے ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ... مجھے بے طرح یاد آنے لگی تھی۔ ہمیں جدا ہوئے بہ ... ساتھ گھنٹے ہوئے تھے لیکن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ... صدیاں بیت گئی ہوں۔

میں نے منہاس باقر کے بنگلے کے نمبر ڈائل کیے اور ... دوسری جانب سے فون ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دو ... گھنٹیاں خالی گئیں۔ اس وقت دیوار گیر کلاک سوا آٹھ بجا ... رہا تھا۔ منہاس باقر علی الصباح گھر سے نکل جاتا تھا۔ اخبار کی ... کاپی وہ اپنی نگرانی میں ہی پریس بھیجتا تھا۔ اس وقت وہ ... گھر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا بیٹا واجد منہاس بھی کالج کے ... لیے نکل چکا ہوگا۔ منہاس کی بیوی فرحت بیگم گزشتہ دس ... سال سے فالج زدہ زندگی گزار رہی تھی۔ اس کے فون اٹینڈ ... کرنے کا امکان صفر کے برابر تھا۔ اب آجا کر بنگلے میں شبانہ' ... ممتاز اور ساحل ہی بچتی تھیں۔ جب چوتھی گھنٹی پر بھی ... دوسری جانب سے کال ریسیو نہیں کی گئی تو میں نے یہ سوچ کر ... فون بند کر دیا کہ ممکن ہے' وہ تینوں اس وقت گہری نیند میں ... ہوں۔ میں نے نصف شب کو ممتاز اور ساحل کو وہاں پہنچایا ... تھا۔ اس کے بعد بھی ان میں گفتگو ہوتی رہی ہوگی۔ وہ دیر ... سے سوئی ہوں گی لہٰذا جلدی اٹھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ... انہیں فون کی گھنٹی سے جگانا ٹھیک نہیں تھا۔

ساحل سے بات نہ ہو سکی تو میری بے قراری میں ... اضافہ ہو گیا۔ تو نہ سہی' تیری تصویر ہی سہی۔۔۔ کے مصداق ... میں نے اپنے دل کو بہلایا۔ میں نے اس کی یاد کو بچھایا' خیال ... کو اوڑھا اور اس کے تصور سے لپٹ کر خود کو نیند کی دیوی ... کے حوالے کر دیا۔

... میں نے ایک بھرپور اور گہری نیند لی۔ جب میں بیدار ... ہوا تو سہ پہر کے دو بج رہے تھے۔ میں کمرے سے باہر آیا تو کبیر شاہ پر نظر پڑ گئی۔ وہ برآمدے میں ایک کرسی پر نیم دراز تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھ کر اس نے کہا۔

"اچھا ہوا' تم خود ہی اٹھ گئے ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں جگانا پڑے گا۔"

"کیوں' کوئی خاص بات؟" میں یہ کہتے ہوئے اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ کھانے کا وقت ہے اور مجھے ٹھیک ٹھاک بھوک بھی لگ رہی ہے۔ کھانے کے دوران میں دوسری خاص باتیں بھی ہو جائیں گی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "ویسے تمہارے لیے سب سے خاص اطلاع یہ ہے کہ آج شام چھ بجے غوری صاحب یہاں پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے وہاں سے روانہ ہونے سے پہلے فون کیا تھا۔ تم اس وقت سو رہے تھے۔ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے میں نے غوری صاحب کو گزشتہ رات والی کارروائی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ وہ ہماری کارکردگی پر بہت خوش ہیں البتہ میاں زاہد کے نکل جانے کا انہیں خاصا افسوس ہے۔"

"ہاں شاہ جی! افسوس تو مجھے بھی بہت ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور میرے تصور میں وہ تمام مناظر گھوم گئے جو ڈیفنس کے بنگلا نمبر "بی۔ تھری ایٹ" میں دیکھنے کو ملے تھے۔

کبیر شاہ نے کہا "تم فکر نہ کرو وجدان! وہ زیادہ دیر تک ہم سے دور نہیں رہ سکے گا ہمیں زاہد حسین کے گلشن والے ٹھکانے کا پتا چل چکا ہے۔ آج رات ہم وہاں ریڈ (RAID) کریں گے۔ باس بھی جب تک یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔ ان کا مشورہ اس سلسلے میں ہمارے لیے مفید ثابت ہوگا۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "شعیب ہماری بہتر طور پر راہ نمائی کر سکتا ہے۔ میں میاں زاہد حسین کی تلاش میں ایک نہیں' ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ اڈوں اور ٹھکانوں پر یلغار کر سکتا ہوں۔ وہ پاتال میں بھی چھپ بیٹھا تو میں اسے دم سے پکڑ کر کھینچ نکالوں گا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا "میں تمہارے جذبات کو محسوس کر سکتا ہوں۔"

"شاہ جی!" میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا "بی۔ تھری ایٹ میں ہم اپنے آدمی فرخ خان کو بھی باندھ کر چھوڑ آئے ہیں۔ اس کا پتا نہیں' کیا بنا ہوگا؟"

وہ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کا ماہر ہے۔" وہ بولا "وہاں سے ہماری روانگی کے بعد فرخ اور دیگر ملازمین نے

کسی نہ کسی طرح خود کو ان بندشوں سے آزاد کرا لیا ہوگا۔ میرا خیال ہے' شاکر علی کی چیخ پکار پر وہ ان دونوں کو باتھ روم سے باہر لے ہوں گے۔" کبیر شاہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر معنی خیز انداز میں بولا "پتا نہیں' شاکر علی نے اپنے باس کی پیشگی ادائی کا حق وصول کرلیا ہوگا یا نہیں!"

میں سمجھ گیا' اس کا اشارہ حشر خیز بدن کی مالک کال گرل رخشی کی جانب تھا۔ میں نے رخشی کو معذور شاکر کے ساتھ باتھ روم میں بند کردیا تھا۔ رخشی اور اس کی دونوں ساتھیوں نازش اور ثمرلا کو ایڈونس پے منٹ پر وہاں لایا گیا تھا۔

کبیر شاہ کے ساتھ میں نے واجبی سا لنچ کیا۔ اس کی وجہ صبح والا تگڑا ناشتا تھی۔ اس وقت مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا پھر میں کبیر شاہ سے آرام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

آرام تو میں اچھا خاصا کر چکا تھا۔ اس وقت میں دراصل ساحل کو فون کرنا چاہتا تھا۔ کمرے کے اندر مجھے مکمل پرائیوسی میسر آجاتی۔ ساؤتھ میں شام سے پہلے میرے لیے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ شعیب غوری شام چھ بجے آ رہا تھا جس کا مطلب تھا' وہ پاکستانی وقت کے مطابق صبح دس بجے کے قریب جہاز میں سوار ہوا ہوگا۔ کراچی اور ماریشس (Mauritius) کے درمیان کم و بیش آٹھ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔

میں نے منہاس باقر کے بنگلے کا فون نمبر پنچ کیا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔ وہ واجد تھا۔ میں نے رسمی علیک سلیک کے بعد اس سے' ساحل سے بات کرانے کو کہا۔

وہ بولا "مسٹر وجدان! وہ تینوں نکلی ہوئی ہیں' شاپنگ وغیرہ کے چکر میں۔"

"ان کی واپسی کا امکان کب تک ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا "اگر آپ کہتے ہیں تو ممی سے پوچھ کرتا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا' وہ کب سے گئی ہوئی ہیں؟"

"نہیں' یہ بھی نہیں معلوم۔" اس نے معذرت آمیز انداز میں جواب دیا "میں ابھی تھوڑی دیر پہلے کالج سے آیا ہوں۔ وہ میری آمد سے پہلے ہی جا چکی تھیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے' میں بعد میں فون کرلوں گا۔" میں نے کہا۔

"کوئی خاص بات تھی مسٹر وجدان؟"

"نہیں' بس ایسے ہی ساحل کی خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔"

"خیریت کے سلسلے میں تو آپ بالکل بے فکر رہیں۔ یہ منہاس باقر کا بنگلا ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"ہاں' وہ تو ہے۔" میں نے کہا اور اختتامی کلمات ادا کرنے کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

واجد نے بڑے فخریہ انداز میں مجھے بتایا تھا کہ وہ منہاس باقر کا بنگلا تھا۔ یہ ایک بیٹے کا اپنے باپ پر مضبوط اعتماد تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کیوں کہ آج کل کی اولاد کے رویے بہت بدل گئے ہیں۔ وہ اپنے والدین پر فخر کرنے کے بجائے اعتراضات کرتے ہیں اور ہر لمحے ان کی غلطیاں اور کوتاہیاں گنوانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان دنوں منہاس باقر کے گھر میں شبانہ کی شادی کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ دو ہفتے بعد اس کی شادی تھی۔ ممتاز اس کی شادی میں شرکت کے لیے ہی "نیو سر" سے کراچی پہنچی تھی۔ جب ہماری اس سے ایک ریسٹورنٹ میں اتفاقیہ ملاقات ہوئی تو وہ اس وقت بھی شبانہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی ہوئی تھی۔

ایسا سوچتے ہوئے میرا دھیان ان دو لفنگوں کی طرف چلا گیا جو خود کو فری لانسر کہلاتے تھے اور کرایے پر مختلف جرم کرتے تھے۔ بی۔ تھرٹی ایٹ کے کسی محمود لاثانی نامی سیاست دان نے انہیں ممتاز کا کھوج لگانے پر مامور کیا تھا۔ ازاں بعد مجھے پتا چلا' بی تھرٹی ایٹ میں میاں زاہد حسین رہتا تھا۔ گزشتہ رات ہم نے مذکورہ بنگلے پر حملہ کرکے اپنے دشمنوں کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا تاہم میاں زاہد بھی جل دینے میں کامیاب رہا تھا۔

فری لانسر غنڈے وقار نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں محمود لاثانی کے ایما پر مدھوری ڈکشٹ (ممتاز) کا تعاقب کر رہے تھے تو میں اس معاملے کو سمجھ نہیں سکا تھا پھر گزشتہ رات میں نے بی۔ تھرٹی ایٹ میں تارا کی جھلک دیکھی تو ساری بات پوری وضاحت کے ساتھ میرے ذہن میں اتر گئی۔ تارا ممتاز کی جانب سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کا کھوج نکلوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ممتاز کی مضبوط گواہی پر ہی وہ اور اس کا جوڑی دار وڈیرا اکبر سومرو پولیس کی تحویل میں گئے تھے۔ تارا کو کراچی میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کیوں کہ ان کا جرم ایسا نہیں تھا کہ اتنی جلدی چھوٹ جاتے۔ بہرحال یہاں کی پولیس اور قانون کے چنگل میں قدم قدم پر دیکھ رہا تھا!

ارا کا خیال آتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ گزشتہ رات تھرٹی ایٹ سے گلشن اقبال چلا گیا تھا اس لیے میرے بچ گیا اور سب سے اہم بات جو مجھے معلوم ہوئی وہ یہ اس کے ساتھ چوہدری نوازش علی کا بیٹا فیصل بھی تھا۔ کو زخمی حالت میں پولیس کے حوالے کیا گیا تھا لیکن میں نے اسے بالکل ٹھیک ٹھاک اور چاق و چوبند دیکھا اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ پوری طرح فٹ ہو کر ان میں اتر آیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک سنسنی خیز اطلاع

میں بستر پر نیم دراز یہ باتیں سوچ رہا تھا لیکن دل ساحل ہی طرف لگا ہوا تھا۔ جب بے کلی بڑھی تو میں کمرے سے نکل آیا۔ میں نے ساؤتھ کے قائم مقام کرتا دھرتا کبیر شاہ کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتا ہوں۔

"کیا تم اکیلے ہی جانا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کیا میرے تنہا جانے میں کوئی قباحت ہے؟"

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر بولا "میں تو ہماری حفاظت کے خیال سے پوچھ رہا تھا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "شکریہ دوست۔ میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ اور میں اکیلے ہی جانا چاہتا ہوں۔"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "واپسی کب تک ہو گی؟"

"جلدی آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں یہ تو یاد ہی ہوگا کہ باس چھ بجے کی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔ سات ساڑھے سات بجے وہ بنگلے پر ہوں گے۔ میں انہیں لینے ائرپورٹ جاؤں گا۔" کبیر شاہ نے دہانی کے طور پر کہا "جب تک تم واپس آ ہی چکے ہوگے؟"

آخری جملہ اس نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ میں نے کہا "شیئور۔ ساڑھے سات بجنے میں ابھی کم از کم چار گھنٹے باقی ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی تمہیں ساؤتھ میں موجود ملوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ مطمئن ہو گیا۔ میں اپنی نیلی شیرڈ میں ساؤتھ سے روانہ ہوگیا۔ یہ گاڑی شعیب غوری نے مجھے دوستی کی خوشی کے طور تحفہ دی تھی جس کا نمبر انتہائی آسان اور مرتب تھا یعنی ون' ٹو' تھری' فور۔ اس نمبر کا مجموعہ دس بنتا تھا جس کا مفرد عدد ایک ہوتا ہے۔ یہ عدد میرے نام کے عدد سے ہو بہو میچ کرتا تھا۔ وجدان کا مجموعہ انیس بنتا ہے اور اس کی مفرد عدد بھی "ایک" ہی ہے۔ نمبر کی میچنگ ایک اچھا شگون تھا۔

میں نے مسجد والے پارک سے شیرڈ کو ٹرن کیا اور نیشنل ہائی وے (مین کورنگی روڈ) پر آگیا۔ اس وقت میں ڈیفنس فیز ون اور ٹو کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ کشمیر کالونی کے سگنل سے میں نے گاڑی کو مین اتحاد پر ڈال دیا۔ یہ خیابان سید می سی ویو کو جاتی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد میں منہاس باقر کے بنگلے پر پہنچ گیا۔

منہاس اس وقت گھر پر ہی تھا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ وہ تینوں (ساحل + ممتاز + شبانہ) ابھی تک شاپنگ سے واپس نہیں آئی تھیں۔

میں نے منہاس سے پوچھا "وہ کتنے بجے کی گئی ہوئی ہیں؟"

"میری وائف بتا رہی ہیں' وہ لگ بھگ گیارہ بجے گھر سے نکلی تھیں۔"

"گیارہ بجے!" میں چونک اٹھا پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "اس وقت چار بجنے والے ہیں۔ اس کا مطلب ہے' وہ کم و بیش پانچ گھنٹے سے باہر ہیں۔" پھر میں نے منہاس کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا "اٹ از ٹو مچ منہاس صاحب!"

"ہاں' اب تو مجھے بھی تشویش ہو رہی ہے۔" وہ تفکر آمیز انداز میں بولا "خاص طور پر اس صورت میں کہ شبانہ نے اس دوران میں کوئی فون بھی نہیں کیا۔ اگر اسے گھر سے زیادہ دیر باہر رہنا پڑتا ہوتا ہے تو گھنٹے دو گھنٹے میں وہ ایک آدھ بار رنگ ضرور کرلیتی ہے۔"

میں ساحل کے لیے سخت فکر مند ہوگیا۔ اس وقت گھر میں منہاس اور اس کی مفلوج بیگم کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ واجد تھوڑی دیر پہلے اپنے دوستوں کے ساتھ کہیں نکل گیا تھا۔

میں نے منہاس باقر سے کہا "ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کے انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیے۔ میرا خیال ہے' ہمیں ان کی تلاش شروع کردینا چاہیے۔"

"میں نے تلاش شروع کردی ہے مسٹر وجدان!" منہاس باقر نے گمبھیر لہجے میں کہا پھر بتایا "میں نے ڈیفنس اور کلفٹن کے بڑے بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹورز پر فون کرکے ان کے بارے میں معلوم کیا ہے خاص طور پر ان اسٹور سے میں نے رابطہ کیا ہے جہاں شبانہ اکثر شاپنگ کے لیے جاتی ہے۔"

"پھر ادھر کی کیا رپورٹ ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "دو اسٹورز نے اس بات کی تصدیق کی

ہے کہ بارہ اور ایک بجے کے درمیان انہوں نے کچھ خریداری کی ہے۔ اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

"بارہ اور ایک بجے کے درمیان!" میں نے پُرخیال انداز میں دہرایا "اس بات کو بھی اب تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ کیا شبانہ پہلے بھی کبھی بغیر اطلاع اتنی دیر کے لیے گھر سے غائب رہی ہے؟"

منہاس باقر نے نفی میں سر ہلایا "ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا اور آج کل تو میں نے اسے خاص طور پر منع کر رکھا ہے۔ چند روز بعد اسے مایوں بیٹھنا ہے۔ اس کا گھر سے زیادہ باہر نکلنا ویسے بھی اچھا نہیں۔"

میں صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

منہاس نے کہا "میں مزید پانچ بجے تک انتظار کروں گا۔ اس کے بعد عملی طور پر انہیں تلاش کیا جائے گا" ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا "میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔ اس شہر کی پولیس اور انتظامیہ مجھ سے بھرپور تعاون کرے گی۔ انشاء اللہ ان بچیوں کو کچھ نہیں ہو گا۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے" میں نے دل سے کہا۔

اسی وقت بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے ہارن کی تیز آواز ابھری پھر یہ ہارن بجتا ہی چلا گیا۔ منہاس باقر نے اپنے بنگلے کی حفاظت کے لیے ایک چاق و چوبند اور صحت مند سیکیورٹی گارڈ رکھا ہوا تھا۔ میری آمد پر نذر محمد نامی اسی گارڈ نے گیٹ کھولا تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ اسی وقت منہاس باقر نے کہا "لگتا ہے، وہ واپس آ گئیں۔"

ہم بے اختیار ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں آ گئے۔ اسی لمحے کریم کلر ٹویوٹا کرولا بنگلے میں داخل ہوئی۔ یہ گاڑی شبانہ کے استعمال میں رہتی تھی اور اس وقت بھی وہ اسی کے استعمال میں تھی... یعنی وہ گاڑی میں اکیلی ہی تھی!

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ منہاس باقر پریشانی سے آگے بڑھا۔ اتنی دیر میں گاڑی پورچ میں آ کر رک چکی تھی اور شبانہ بڑے تشویش ناک انداز میں اس سے برآمد ہو رہی تھی۔ منہاس باقر نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"کیا ہوا شبانہ؟ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"ڈیڈی! اندر چلیں" شبانہ نے روہانسی آواز میں کہا "غضب ہو گیا ڈیڈی!"

ہم اس کے پیچھے چلتے ہوئے اندر پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد شبانہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "مسٹر وجدان! تم نے پہلے ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ ایک مرتبہ پھر وہی وقت آن پڑا ہے۔ اس بار تم نے ایک نہیں، دو لڑکیوں کو واپس لانا ہے جن میں ایک تمہاری ساتھی ساحل بھی ہے۔"

"تم کیا کہہ رہی ہو، میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا" میں مضطرب لہجے میں بولا "سکون سے بتاؤ، آخر ہوا کیا ہے؟ تم ان دونوں کو کہاں چھوڑ آئی ہو؟"

"میں نے انہیں کہیں نہیں چھوڑا بلکہ وہ مجھ سے چھین لی گئی ہیں۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی پھر اس کے آنسو نکل آئے۔

منہاس باقر نے ایک اونچی کوالٹی کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا نام لیا اور کہا "بیٹی! ایک بجے تو تم وہاں شاپنگ کر رہی تھیں۔ اس کے بعد کہاں چلی گئی تھیں؟"

وہ نمناک آواز میں بتانے لگی "کلفٹن کی مارکیٹ سے ہم طارق روڈ کی طرف نکل گئے تھے۔ کچھ دیر وہاں شاپنگ کرتے رہے پھر ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے بعد ہم بہادر آباد چلے گئے۔ وہاں بھی چند قابلِ ذکر بین الاقوامی معیار کے اسٹور کھلے ہیں۔ بس وہیں یہ حادثہ پیش آ گیا۔"

میرے استفسار پر شبانہ نے بتایا کہ وہ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھی ہی تھیں کہ دو ڈھاٹا پوش افراد نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ ان کے ہاتھوں میں خوفناک نال والی کلاشنکوفز تھیں جن کا رخ گاڑی کی عقبی نشست کی طرف تھا جہاں ساحل اور ممتاز بیٹھی تھیں۔ ایک گن بردار نے انہیں فوراً گاڑی سے نیچے اترنے کو کہا۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی تو ایک نے مجھے غلیظ گالی دیتے ہوئے پھنکار کر کہا۔ چپ چاپ بیٹھی رہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم تمہیں زندہ سلامت چھوڑ کر جا رہے ہیں ورنہ تارا کے دشمنوں کو پناہ دینے والوں کو بھی ہم حقیر چیونٹیوں کی طرح مسل دیا کرتے ہیں۔"

تارا کے نام نے میرے ذہن میں سنسنی مچا دی۔ میں نے اضطراب کی انتہا کو چھوتے ہوئے کہا "کیا... انہوں نے واقعی تارا کا نام لیا تھا؟"

"مجھے اپنی سماعت پر پورا بھروسا ہے" وہ تیقن سے بولی پھر کہا "وجدان! کیا یہ وہی تارا تو نہیں جسے ممتاز کے والد نے پولیس کے حوالے کیا تھا؟"

"بالکل وہی ہے" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

...رات جن دو موٹر سائیکل سواروں نے تمہارا تعاقب ...تھا وہ تارا ہی کے ہرکارے تھے۔ وہ خبیث خصلت ممتاز ... تلاش میں ہی کراچی آیا ہے اور اس رات وہ ممتاز کی قیام ...ہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

"تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟"

"میرے اپنے ذرائع ہیں، معلومات حاصل کرنے کے" ...ں نے کہا۔

منہاس نے پوچھا "مسٹر وجدان! جب تمہیں اتنی اہم ...یں معلوم تھیں تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں اپنے ...دست قاضی سلطان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" اس کے انداز ...یں اچانک برہمی اتر آئی۔

میں نے اس کی ناراضی کا برا منائے بغیر کہا "انکل! پہلی ...ات تو یہ کہ یہ معلومات مجھے آج ہی صبح حاصل ہوئی ہیں" میں ...نے دانستہ اس سے یہ چھوٹا سا جھوٹ بولا تھا "اور دوسری ...ات یہ کہ آپ ممتاز کے سلسلے میں بالکل پریشان نہ ہوں۔ ...متاز کے ساتھ ساتھ میری عزیز ترین ہستی بھی اغوا ہوئی ...ہے۔ میں ان دونوں کی تلاش کے لیے اپنی ہستی داؤ پر لگا دوں ...گا۔ تارا مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

پھر میں شبانہ کی جانب متوجہ ہو گیا "تم تارا کے بھیجے ہوئے ڈھاٹا پوش اغوا کنندگان کے بارے میں بتا رہی تھیں؟"

اس نے بتایا "مجھے خاموش رہنے کی دھمکی دینے کے بعد انہوں نے ممتاز اور ساحل کو گن پوائنٹ پر گاڑی سے نیچے اتار لیا پھر بڑی تیزی سے وہ انہیں، میری گاڑی کے آگے کھڑی سیاہ لینڈ کروزر میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ لینڈ کروزر کے تمام شیشے سیاہ تھے۔ میں دیکھ نہیں سکی، جیپ میں اور کون موجود تھا۔ ونڈ اسکرین اس زاویے سے مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔"

سیاہ لینڈ کروزر نے تارا پر میرا شک اور پختہ کر دیا۔ وہ گزشتہ رات ایک سیاہ لینڈ کروزر ہی میں فیصل کے ساتھ بی ...ٹرنی ایٹ سے روانہ ہوا تھا۔ ان کی منزل شاکر علی کی زبانی مجھے گلشن اقبال کا ایک بنگلا معلوم ہوئی تھی۔

منہاس باقر نے اپنی بیٹی سے پوچھا "بہادر آباد میں یہ واقعہ کس جگہ پیش آیا ہے؟"

"مین بہادر آباد میں" وہ شکستہ لہجے میں بولی پھر لوکیشن کی وضاحت کرنے لگی۔ وقوعہ کا وقت اس نے لگ بھگ سوا تین بجے بتایا تھا۔

میں نے کہا "انکل! میں بہادر آباد کئی مرتبہ جا چکا ہوں۔ ...علاقہ تو خاصا بارونق ہے پھر دن میں تین سوا تین بجے تو ...اس کی رونق بھیڑ کا منظر پیش کر رہی ہوتی ہے۔ دن دہاڑے اغوا کی واردات کا مطلب تو یہی ہے کہ..."

"میاں! تم نے دنیا دیکھی ہوئی لیکن پاکستان کو پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہو" منہاس باقر نے گہری سنجیدگی سے کہا "یہاں دن دہاڑے اور رات پچھاڑے میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں کا قانون اور جرائم کی نوعیت بہت انوکھی اور نرالی ہے۔"

پھر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا اور نہایت ہی تحمل کے ساتھ بڑے بڑے پولیس آفیسرز سے رابطے کرنے لگا۔ اس کے انداز کا یہ ٹھہراؤ شاید اس لیے بھی تھا کہ اس کی اپنی بیٹی بہ خیریت واپس گھر پہنچ گئی تھی یا ممکن ہے، وہ ہر قسم کے کرائسس میں اسی صبر و برداشت کا مظاہرہ کرتا ہو لیکن میں اس جیسا نہیں ہو سکتا تھا۔ ساحل کے اغوا کا سنتے ہی میرے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ مجھے اپنا وجود بھنتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اطمینان سے بیٹھ کر ٹیلی فونک رابطوں کے اثرات اور نتائج کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

"میں جا رہا ہوں انکل!" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "انشاء اللہ بہت جلد میں آپ کو ایک بہت بڑی خوش خبری سناؤں گا۔"

"تم جا کہاں رہے ہو؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا" میں نے گول مول جواب دیا اور اس کی بات سنے بغیر بنگلے سے باہر نکل آیا۔

یہ سوال و جواب کا وقت نہیں تھا کہ میں وہاں بیٹھ کر منہاس باقر سے طویل مناظرہ کرتا۔ عمل کے اس وقت کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی میرے نزدیک گناہِ کبیرہ سے کم نہیں تھا۔

○☆○

وہ بنگلا نیپا چورنگی اور حسن اسکوائر کے درمیان پوش علاقے میں واقع تھا۔ میں آندھی اور طوفان کی رفتار سے شیرڈ کو دوڑاتے ہوئے یہاں پہنچا۔ اگر میرے پاس کوئی ہوائی سواری ہوتی تو میں بلا دریغ اس کا استعمال کرتا۔ ساحل کے اغوا نے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اس وقت خود کو جنونی کیفیت میں محسوس کر رہا تھا۔

گاڑی کو میں نے بنگلے کے سامنے سڑک کے کنارے روکا اور گیٹ کے پہلو میں نصب اطلاعی گھنٹی پر انگلی رکھ کر بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک باوردی گارڈ نے گیٹ کے پیٹ میں بنے ہوئے ایک بچہ گیٹ کو کھول کر باہر جھانکا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟"

وہ یقیناً سیکیورٹی گارڈ تھا۔ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "بات بہت خطرناک ہے۔"

"کس سے ملنے آئے ہو؟" اس کے تیور بھی بدل گئے۔

میں نے کہا "سیف اللہ سیال سے۔"

میں نے گھنٹی بجانے سے قبل نیم پلیٹ کو بہ غور پڑھ لیا تھا۔ وہاں کسی ریٹائرڈ پولیس آفیسر سیف اللہ سیال کا نام لکھا تھا۔

سیکیورٹی گارڈ نے جواب دیا "سیال صاحب اپنی فیملی کے ساتھ یورپ کے تفریحی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ تم کون ہو؟ اور ان سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

میں نے سیکیورٹی گارڈ کے سوالات کے جواب میں زبان کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہ کی اور عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ایک زوردار فرنٹ کک اس کے چہرے پر رسید کر دی۔

اس کا اوپری دھڑ گیٹ سے باہر تھا اور دونوں ہاتھ پچھ گیٹ کے پٹ پر ٹکے تھے۔ میرے اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے نتیجے میں وہ حلق سے ایک چیخ برآمد کرتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے میں پختہ فرش پر گرا۔ اسی اثنا میں، میں نے بنگلے کے اندر داخل ہو کر چھوٹا گیٹ اندر سے بند کر دیا۔

پختہ فرش سے شرفِ ملاقات کے دوران میں گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ وہ میری پھرتی پر پوری طرح حیران بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر پاؤں سے ایک ٹھوکر ماری۔

وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ میں نے خوں خوار لہجے میں کہا "میں تمہارا باپ ہوں اور سیال اینڈ کمپنی سے ایک پرانا حساب بے باق کرنے آیا ہوں۔ اب بتاؤ، تم نے ان کے بارے میں کتنے فیصد سچ بولا ہے؟"

"مم... میں نے اس سلسلے میں کوئی جھوٹ نہیں بولا" وہ اپنی گن کی طرف رینگتے ہوئے بولا "وہ لوگ واقعی ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی حرکات کو نظر میں رکھتے ہوئے سوال کیا "اس وقت بنگلے میں اور کون کون ہے؟"

"میرے علاوہ دو ملازم اور ہیں" اس نے بتایا۔

بات ختم کرتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے گن کی جانب بڑھنے والے اس کے ہاتھ کو بری طرح کچل دیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں اس کو واچ کر رہا ہوں۔

"اٹھ کر شرافت سے کھڑے ہو جاؤ" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے اسے "ہینڈز اپ" کروا کے اس کی تلاشی لی۔ اس گن کے سوا اس کے پاس اور کوئی اسلحہ نہیں تھا۔

اسی وقت بنگلے کے اندرونی حصے سے کسی نے پوچھا "کیا ہوا خاور! تم چیخے کیوں تھے؟"

اس سے قبل کہ خاور نامی وہ سیکیورٹی گارڈ اس سوال کا کوئی جواب دیتا، میں نے عقب سے اپنا ایک بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کر دیا اور ہاتھ سے گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو دبا کر گارڈ کو اٹا غفیل کر دیا۔

میں اس کام سے فارغ ہی ہوا تھا کہ وہ شخص بنگلے کے اندر سے نکل کر میرے سامنے آگیا، جس نے تھوڑی دیر پہلے خاور کو پکار کر اس کا حال دریافت کیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونکا۔ اسی لمحے اس نے فرش پر پڑے بے سدھ سیکیورٹی گارڈ کو بھی دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور وحشت ابھر آئی۔ پھر اچانک اس نے ایک عجیب حرکت کی۔

میں توقع کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہوگا یا پھر میری طرف بڑھے گا لیکن اس اللہ کے بندے نے "نجیب، نجیب" پکارتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی طرف دوڑ لگا دی۔ جواباً میں بھی اس کے تعاقب میں لپک پڑا۔

اس کی پکار سے مجھے اندازہ ہو گیا، وہ نجیب نامی اپنے ساتھی کو حالاتِ حاضرہ سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔ گارڈ نے بنگلے میں دو ملازمین کی موجودگی ظاہر کی تھی۔ میری اطلاعات کے مطابق تارا اور چوہدری نوازش علی کا بیٹا فیصل گزشتہ رات اس بنگلے پر پہنچے تھے۔ بنگلے کے باہر نصب نیم پلیٹ مجھے الجھا رہی تھی اور اس الجھن کو نجیب اور اس کا ساتھی ہی سلجھا سکتے تھے۔

میں نے اس "مفرور" کو ایک کمرے کے دروازے کے سامنے جا لیا۔ اس کا ہاتھ دستک کے لیے دروازے کی جانب اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔ وہ دروازے سے پانچ فٹ دور جا گرا۔ وہ شام سے پہلے کا وقت تھا مگر مجھ پر ایک وحشت سوار تھی اور میں ہر مصلحت، ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔

میرا دھکا کھانے والا اپنی کوشش میں تو کامیاب نہ ہو سکا البتہ وہ زمین پر گرنے سے قبل تیز چیختی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی نجیب کو پکار چکا تھا۔ اس کی پکار نے رنگ دکھایا اور کمرے کے اندر سے ایک بوجھل آواز برآمد ہوئی۔

"مشتاق! تم حلق پھاڑ کر کیوں چلا رہے ہو؟"

اس دوران میں مشتاق نامی وہ شخص زمین سے اٹھ چکا تھا۔ میں نے اسے بالوں سے دبوچا اور گھسیٹ کر دروازے کی طرف لاتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی "اپنے ساتھی سے کہو، اس کا باپ اس سے ملنے آیا ہے لہٰذا دروازہ کھولنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لے کہ وہ کس پوزیشن میں ہے۔"

مشتاق کے لحاتی رویے نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی سے دور رہنے والا ایک عام گھریلو ملازم ہے ورنہ وہ اتنی آسانی سے میرے قابو میں نہ آتا۔ اس نے میرے احکام کی تعمیل کی تو ایک جھٹکے سے وہ دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے ایک طویل قامت تنومند باڈی بلڈر کھڑا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا اور اس کے باڈی بلڈر ہونے کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ اس نے صرف جینز پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم کا اوپری حصہ بالکل کھلا تھا اور چہرے پر پھول مارکا صحت مند مونچھیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اس کا ایکس رے کر لیا۔

ہماری نگاہیں ملیں، میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت ابھرتے دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتا، میں نے مشتاق کو ایک دھکے سے اس کی جانب پھینک دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے کمرے کے فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اسی لمحے واش روم کے اندر سے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ نجیب اپنی جزوی برہنگی کے توسط سے وہاں کیا گل کھلا رہا تھا۔ سینٹرل میز پر کھلی ہوئی بوتل اور اس کے گرد رکھے جام بھی اس کارفرمائی کی تصدیق کر رہے تھے۔ جتنی دیر میں، میں دروازے کو اندر سے بولٹ کرتا، نجیب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

اس نے حقارت سے مجھے دیکھا اور آتشیں لہجے میں بولا "تم کون ہو اور بنگلے کے اندر کس طرح داخل ہوئے؟"

"تمہارے پہلے سوال کا جواب دروازہ کھلنے سے قبل مشتاق نے دے دیا تھا" میں نے اس پر نظر رکھتے ہوئے کہا "دوسرے سوال کا جواب تمہارا سیکیورٹی گارڈ دے گا۔"

اس نے سیکیورٹی گارڈ کے ذکر پر مشتاق کو دیکھا جو سہما ہوا ایک کونے میں کھڑا تھا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ میں نے خاور کو لمبا لٹا دیا ہے۔ یہ سنتے ہی نجیب نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں چونکہ پہلے سے محتاط تھا اس لیے میں نے اس کا وار خالی کر دیا۔

وہ اپنی پہلی ہی ناکامی پر جھنجلا گیا اور اسٹانس (STANCE) بنا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اس "حرکت" سے مجھے خوشی ہوئی۔ میں بھی جواباً ٹی اسٹانس میں آ گیا۔ (T-STANCE) میں فرنٹ فٹ، بیک فٹ کی لوکیشن پر نوے درجے کا زاویہ بنا کر اسٹانس کو "ٹی" کی شکل دیتا ہے۔ تنگ جگہ پر فائٹ کے لیے ٹی اسٹانس بہت کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

نجیب نے حملے میں پہل کی۔ فرنٹ اسٹیپ کے ساتھ اس کا پنچ میرے چہرے کی جانب آیا۔ میں نے نیک جرک (NECK JERK) سے اپنے چہرے کا دفاع کیا۔ اسی لمحے اس نے دوسرا پنچ آزمایا جو میرے شانے پر لگا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنے مضروب کندھے کو ایک دائرے کی شکل میں حرکت دینے لگا۔ نجیب کے پنچ میں بلا کی قوت تھی۔ اس نے اس قوت کے حصول کے لیے کافی محنت کی ہوگی۔

وہ ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا "نجیب کے دشمن اپنے قدموں پر چل کر اس تک رسائی تو حاصل کر لیتے ہیں مگر جاتے وہ دوسروں کے کندھوں پر ہیں۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھے ایک راؤنڈ ہاؤس کک ماری۔ میں ایک اسٹیپ پیچھے ہٹا، اس نے دوسری راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ اسی لمحے میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک وہیل کک (WHEEL KICK) اس کے جبڑے پر رسید کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامتے ہوئے کراہا اور لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے کہا "میں کسی نجیب وجیب کا دشمن نہیں بلکہ تارا کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ میری اس تلاش کے راستے میں جو بھی آئے گا، میرے دشمنوں میں شمار ہوگا۔ بتاؤ وہ شیطان کا چیلا کہاں چھپا ہے؟"

تارا کے ذکر پر اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا اور جلدی سے بولا "یہاں کوئی تارا نہیں رہتا، تم کسی غلط فہمی کی بنا پر یہاں آ گئے ہو۔"

"مجھے غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔" میں نے شعلہ بار لہجے میں کہا "وہ نطفۂ ناتحقیق اپنی بے بے کے یار فیصل کے ساتھ رات کو یہاں آیا تھا، کالی لینڈ کروزر میں۔ میرے پاس پکی انفارمیشن ہے۔ تم مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔"

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں بیک فلیک لگاتے ہوئے چھ فٹ دور چلا گیا۔ نجیب سیدھا جا کر مشتاق سے ٹکرایا اور جھنجلاہٹ میں اس کے سر کو پکڑ کر دیوار سے ٹکرا دیا۔ مشتاق ایک خوفناک

آواز نکالتے ہوئے زمین بوس ہوگیا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا' وہ یومِ حشر سے پہلے اٹھ بھی سکے گا۔ نجیب کے ایک ہی پنچ نے مجھے اس کی سانڈ ایسی طاقت سے روشناس کرادیا تھا۔

واش روم کے اندر سے نظر نہ آنے والی نے نجیب سے پوچھا "ڈارلنگ! تم کمرے میں کس سے الجھ رہے ہو' یہ کون شخص تمہیں دھمکیاں دے رہا ہے؟"

"ہے ایک بدبخت!" نجیب نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگادی۔

اس مرتبہ اس کے ہاتھ سیدھے میری گردن پر آئے۔ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرا گلا دبانے لگا۔

مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ہاتھوں کی گرفت سے میرا گلا تو دباہی رہا تھا' اس کے ساتھ ہی وہ مجھے اٹھاکر فرش سے بلند بھی کرتا جارہا تھا۔ اسے اپنے قد اور طاقت کا ایڈوانٹیج حاصل تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سینے پر جمائے اور ٹانگوں کو رول کرتے ہوئے ایک جرکی ڈبل فرنٹ فلائنگ کک اس کے پیٹ میں رسید کردی۔

میری گردن پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت چھوٹ گئی اور وہ کسی طوفان کے مانند باتھ روم کے دروازے سے جا ٹکرایا۔ یہ ٹکراؤ اتنا شدید تھا کہ باتھ روم کا دروازہ قبضوں سے نکل گیا۔ چوبی پٹ اندر موجود' وجودِ زن سے جا ٹکرایا جس کے نتیجے میں ایک سریلی مگر وحشت زدہ چیخ سننے کو ملی۔

میری نگاہ نے اس کرب ناک آواز کا تعاقب کیا اور باتھ روم کے اندر اس کے ماخذ و مخرج تک جا پہنچی۔ ایک اوسط شکل کی لڑکی بدن پر تولیا لپیٹے باتھ روم کے فرش سے اٹھنے کی کوشش کررہی تھی اور اس مضطرب کوشش میں وہ تولیا اس کے بدن پر سے باربار پھسل رہا تھا۔ وہ بائیس تئیس سال کی بھرے بھرے جسم کی لڑکی تھی۔ صورت کی کمی کو اس کے بدن نے پورا کردیا تھا۔ اس پر زیادہ دیر تک نظر جمائے رکھنا آسان کام نہیں تھا۔

لڑکی سے پہلے نجیب سنبھل گیا اور ایک دھکے سے اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے وہ باتھ روم سے باہر آگیا۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ مار کھانے کے بعد اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑدیا اور وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں اس کے فائٹنگ اسٹائل سے سمجھ گیا تھا کہ وہ سیم کمبی نیشن (SAME COMBINATION) کا عادی تھا۔ یعنی یکے بعد دیگرے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کے اٹیک دہراتا تھا۔ لیفٹ راؤنڈ ہاؤس کے بعد رائٹ راؤنڈ ہاؤس اور رائٹ پنچ کے بعد لیفٹ پنچ۔ اس مرتبہ اس نے مجھے بیک کک ماری۔ میں نے ذہن میں کیلکولیٹ کیا' لیفٹ بیک کے بعد وہ رائٹ بیک مارے گا چنانچہ اس کے عمل سے پہلے ہی میں نے اس کی پشت پر فرنٹ تھرسٹ (FRONT THRUST) کک جڑدی۔ اس کک میں بے پناہ پش (PUSH) شامل تھا۔ وہ کسی میل ٹرین کے انجن کی طرح روانہ ہوا اور کمرے کی دوسری دیوار سے جا ٹکرایا۔

اس کی جگہ اگر کوئی عام جثے کا فائٹر ہوتا تو کمر پکڑ کر بیٹھ جاتا لیکن وہ کسی گینڈے سے کم نہیں تھا۔ دیوار سے ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ کیرم کے اسٹرائیکر کے مانند واپس پلٹا اور جنگلی بھینسے کی طرح پھنکارتا ہوا میری جانب آیا۔ میں اس کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔ وہ میرے نزدیک آکر ایک لمحے کو رکا پھر اس نے ایک لوئر کک ماری۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹایا۔ اس نے اچانک راؤنڈ ہاؤس (ROUNDHOUSE) اٹھادی۔ میں ایک قدم آگے آیا۔ نتیجے میں اس کی کک میرے کندھے پر ہولڈ ہوکر رہ گئی۔ میں نے اس کی ران پر دونوں ہاتھوں کا پش آزمایا۔ وہ پشت کے بل زمین پر جاگرا۔

اس مرتبہ اسے اٹھنے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس دوران میں باتھ روم والی لڑکی مناسب لباس پہن کر باہر آگئی تاہم وہ اس افراتفری سے بری طرح خوف زدہ تھی۔ میں نے غراتے ہوئے اسے حکم دیا "ایک طرف آرام سے خاموش ہوکر بیٹھ جاؤ۔ تم سے میں بعد میں بات کروں گا' پہلے اس سورما سے نمٹ لوں۔"

اس نے :۔ فرمانبرداری سے میرے حکم کی تعمیل کی۔

میں نجیب کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس نے میز پر سے پیتل کا ایک گل دان اٹھالیا اور حملہ آور ہونے والے انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ میں پلک جھپکتے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے کو جھک گیا۔ اس کا جھکا ہوا بدن میرے سر کے اوپر تھا۔

میں نے اس کی جینز کے بیلٹ میں ہاتھ ڈالا' دوسرا ہاتھ میں نے اس کی بغل میں دیا اور کسی اول درجے کے ویٹ لفٹر کی طرح ایک جھٹکے سے اٹھاکر اسے سر سے بلند کردیا۔ وہ فضا میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا اور مجھے مغلظات میں تولنے لگا۔ میں نے اسے پنکھے کی پنکھڑیوں کی طرح گول گھمانا شروع

کردیا۔

مجھے گالیاں دیتے ہوئے اس نے ایک زنانہ حرکت کی۔ اپنے سر کو جھکاکر اس نے بغل میں موجود میرے ہاتھ کی کلائی پر دانت جمادیے۔ تکلیف کی شدت ایک لہر بن کر میرے وجود میں تیر گئی۔ میں نے اس کم ظرف کو سینٹرل ٹیبل پر پٹخ دیا۔

چھناکے کی ایک تیز آواز کے ساتھ گلاس ٹاپ ٹیبل چکناچور ہوگئی۔ اس پر رکھے جام ومینا بھی کرچیوں میں بدل گئے۔ نجیب ٹیبل کے فریم میں کسی گھائل تصویر کے مانند فٹ ہوگیا۔ شیشے کے تیز اور نکیلے ٹکڑے اس کے برہنہ وجود میں' درجنوں کی تعداد میں پیوست ہوگئے۔ جسم کا زیریں حصہ بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ سب سے زیادہ قیامت اس کے چہرے پر گزری تھی۔ متعدد مقامات سے خون رسنا شروع ہوگیا۔

میں نے چند لمحے نجیب کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن میرا یہ انتظار بے سود ثابت ہوا' وہ زندہ تھا مگر ہمت اور حوصلہ ہار بیٹھا تھا۔ کسی فائٹر اور جنگ جو کے پاس سب سے قیمتی سرمایہ اس کی ہمت اور حوصلہ ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ بھی ہار بیٹھے تو پھر جسمانی طاقت' اسلحہ اور فائٹنگ ٹیکنیک سب بے کار ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے اکھڑی اکھڑی سانس لیتے ہوئے نجیب کو میز کے بھاری فریم سے کھینچ کر باہر نکالا اور فرش کے قالین پر چاروں شانے چت ڈال کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ پھر میرا ہاتھ اپنی پنڈلی کی جانب رینگ گیا جہاں چرمی کیس میں آٹھ انچ طویل پھل والا ایک قاتل خنجر ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ یہ امتیاز کی نشانی تھی۔ اس کی ایک یاد تھی۔

میں نے خنجر کو برہنہ کرکے نجیب کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور غراکر کہا "تمہاری زندگی اور موت کے درمیان حائل فاصلے کو اس خنجر کی دھار کے نیچے جگہ ملی ہے۔ اب تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا۔ سچ بول کر زندہ رہنا ہے یا جھوٹ بول کر زندگی کو الوداع کرنا ہے؟"

میرے لہجے میں دنیا جہان کی سفاکی سمٹ آئی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے رنگ میں ایک واضح تبدیلی آتے دیکھی۔ اس تبدیلی میں خوف اور سراسیمگی کی آمیزش تھی۔ اس کے بدن میں ہلکی سی جنبش ہوئی تاہم وہ زبان سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے خنجر کی نوک کو اس کے نرخرے پر چبھوتے ہوئے کہا "تارا اور فیصل کہاں ہیں؟"

اب تک کی کارروائی سے مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ دونوں اس بنگلے میں موجود نہیں تھے۔ خرخراہٹ سے مشابہ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میں کسی فیصل اور تارا کو نہیں جانتا۔"

"وہ تمہاری ماں کے خصم ہیں" میں دہاڑا "کیا تم اپنے دو عدد والد صاحبان کو جاننے سے انکاری ہو؟" اس کے ساتھ ہی میں نے خنجر کی نوک پر دباؤ بڑھادیا۔

وہ تلملا کر رہ گیا "تت... تم... اچھا نہیں کررہے ہو۔"

"انہوں نے بھی کچھ اچھا نہیں کیا" میں نے پھنکار کر کہا "میری دو ساتھیوں کو آج تین بجے اغوا کیا ہے انہوں نے۔"

"دو ساتھیوں کو؟" اس کی الجھی ہوئی آواز کے ساتھ ہی چہرے پر حیرت بھی نمودار ہوئی "مگر وہ تو ایک لڑکی..."

اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ متوحش نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کا یہ احساس اور احتیاط بعد از وقت والی بات تھی۔ میں اس کی غلطی پکڑ چکا تھا۔ کوئی چور جب رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تو اس سے اقبالِ جرم کروانا آسان ہوجاتا ہے۔ وہ تو رنگی زبان میری گرفت میں آگیا تھا۔

میں نے خنجر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "خاموش کیوں ہوگئے؟ یہی کہنا چاہ رہے تھے نا' وہ تو ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے۔ وہی... مدھوری ڈکشٹ کی صورت والی؟"

میرے سوالات میں بہت فورس تھی اور آخری جملہ میں نے اپنے اندازے کی بناپر ادا کیا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ تامل کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"تم کون ہو؟"

"پہلے میرے سوالات کے جواب دو" میں نے وحشت بھرے لہجے میں کہا۔

اسے یقین ہوگیا کہ آج گلوخلاصی ممکن نہیں۔ میں اپنے سوالات کے جواب لے کر رہوں گا۔ اگر وہ جواب نہیں دے گا تو اس کے بدلے اسے جان دینا ہوگی۔

"تم... میری گردن سے خنجر ہٹاؤ تو میں کچھ بولوں بھی" وہ جھنجلا کر بولا۔

میں نے سختی سے کہا "خنجر کی نوک تمہارے حلق میں پیوست نہیں۔ تم اسی حالت میں بولوگے ورنہ اس خنجر کی دھار وہ فاصلہ مٹادے گی جو تمہاری زندگی اور موت کے درمیان واقع ہے اور سینڈ واچ (SAND WATCH) کے چیمبر کی طرح رفتہ رفتہ کم ہورہا ہے... ہمیشہ کے لیے ختم ہوجانے کے لیے۔"

میری سفاکی' ثابت قدمی اور وحشت کو دیکھ کر وہ تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں حسبِ منشا جواب نہ پاکر اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا' میں نے خنجر پر دباؤ قدرے کم کرتے ہوئے پوچھا۔

"تارا اور فیصل کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں سے آج دوپہر کو چلے گئے تھے" اس نے رک رک کر بتایا "ابھی تک واپس نہیں آئے۔"

"کب واپس آئیں گے؟" میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

"وہ اب یہاں نہیں آئیں گے۔"

"کہاں جائیں گے؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا "کشمیر روڈ والے بنگلے پر جائیں گے۔"

"یہ بنگلا کشمیر روڈ پر کس جگہ واقع ہے؟" میں نے پوچھا "مجھے اسپورٹس کمپلیکس کے ریفرنس سے لوکیشن سمجھاؤ۔"

وہ بنگلے کا نمبر بتانے کے بعد اس کی لوکیشن کی وضاحت کرنے لگا۔

میں نے یہ ضروری معلومات اپنے ذہن میں نقش کیں اور نجیب سے پوچھا "تم کچھ بتا رہے تھے' وہ دونوں ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے؟"

"ہاں' ان کا پروگرام تو یہی تھا" وہ اثبات میں سر کو نا کام جنبش دیتے ہوئے بولا "وہ اندرونِ سندھ سے آئی ہوئی ممتاز نامی ایک لڑکی کو اغوا کرنے گئے تھے جس کی شکل کسی انڈین اداکارہ سے خاصی حد تک ملتی جلتی ہے۔"

میرا اندازہ صدفیصد درست ثابت ہوا۔ تارا ساحل کی یہاں موجودی سے اگر واقف تھا بھی تو وہ اس کے ٹھکانے سے آگاہ نہیں تھا۔ وہ ممتاز کے تعاقب میں یہاں تک پہنچا تھا اور اسی کو اغوا کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا مگر بد قسمتی سے ساحل بھی اس لپیٹے میں آگئی۔

میں نے اپنے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس کی اور نجیب سے پوچھا "کشمیر روڈ والا یہ بنگلا جس کا تم نے ایڈریس مجھے سمجھایا ہے' کس کی ملکیت ہے؟"

"میاں زاہد حسین" اس نے جواب دیا "دراصل پہلے پروگرام کچھ اور تھا۔ میاں جی کے فون نے ساری گڑبڑ کردی۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا "ابتدائی پروگرام کے مطابق تارا نے اغوا کرکے ممتاز کو ڈیفنس کے ایک بنگلے بی تھرٹی ایٹ میں پہنچانا تھا لیکن آج صبح چار بجے میاں جی کا فون آگیا کہ مذکورہ بنگلے کے حالات دگرگوں ہیں لہٰذا لڑکی کو کشمیر روڈ والے بنگلے پر پہنچایا جائے۔ میاں جی خود بھی اسی بنگلے پر جارہے تھے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے' تارا اینڈ کمپنی کشمیر والے روڈ والے بنگلے پر ہی گئے ہوں گے؟"

"وہ میاں جی کے حکم سے انکار کیسے کرسکتے ہیں۔"

"اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں بھی انہی کا وفادار ہوں۔"

"اس وقت تم خوب وفاداری نبھا رہے ہو!" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

وہ خجل سا ہوکر بولا "مجبوری کی بات دوسری ہے۔ جان بچانے کے لیے حرام بھی حلال ہوجاتا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجبوری کی بات دوسری ہوتی ہے۔ میں بھی اس وقت بہت مجبور ہوں اس لیے تم سے دوسری بات پوچھ رہا ہوں۔"

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا پھر بولا "تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"بہت سمجھ دار ہو" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "جب تارا نے میری دو ساتھیوں کو کشمیر روڈ والے بنگلے میں پہنچادیا ہے تو تم یہاں کیا کررہے ہو؟ تمہیں بھی تو کہیں نہ کہیں پہنچ جانا چاہیے نا؟" اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔ میں نے ایک جنون کی سی کیفیت میں کہا "سب سے پُرسکون جگہ اگلا جہان ہے جہاں کسی قسم کا کوئی بکھیڑا نہیں ہوگا۔ نہ باس میاں جی کا حکم ماننا ہوگا اور نہ ہی وجدان سے لات جوتا کھانا پڑے گا۔"

"وج... وجدان... کیا تم وجدان ہو؟" وہ لکنت زدہ آواز میں بولا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ امتیاز کی نشانی نے میرے سفیر کا کردار ادا کیا۔ وہ برق کی طرح چمکا اور نجیب کی شہ رگ سے خون کا ایک فوارہ پھوٹ پڑا۔ میں نے بیک رول کرتے ہوئے اپنے لباس کو اس کے گندے خون سے آلودہ ہونے سے بچایا۔

میں نے زندگی میں انسانی جان لینے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کی تھی مگر ساحل کے ساتھ پیش آنے والے واقعے نے مجھے ہوش و حواس سے بے گانہ کردیا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے خون رنگ چادر سی تن گئی تھی۔ میں اپنی

ساحل تک پہنچنے کے لیے ہزاروں' لاکھوں انسانی جانوں سے کھیل سکتا تھا۔ اب تک میں اپنی زندگی جیتا آیا تھا' ساحل کا وجود اس طرح میرے معمول میں داخل ہوا تھا کہ وہ میری ذات کا حصہ بن گئی۔ کوئی اپنی ذات سے جدا نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اپنی ذات کے ایک حصے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اپنی زندگی کی تلاش تھی جو ساحل کی شکل میں اچانک مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

○*○

سرمئی شام دھیرے دھیرے رات کے اندھیرے میں بدل گئی تھی۔

یہ رات کا آغاز تھا۔ روشنیوں کا شہر اپنی پوری آن بان کے ساتھ جگمگا رہا تھا لیکن میرے اندر ایک مستقل اندھیرے نے جگہ بنانا شروع کردی۔ ان روشنیوں کی آب و تاب میرے من کی بے کلی کو کم کرنے میں ناکام ہورہی تھی۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے پڑتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ میں ڈرائیونگ کے دوران میں مسلسل ساحل اور ممتاز کے بارے میں سوچنے لگا۔

شبانہ کے بیان کے مطابق ان دونوں کو آج سہ پہر تین بجے بہادر آباد چورنگی سے اغوا کیا گیا تھا اور اب کم و بیش آٹھ بجنے والے تھے۔ پانچ گھنٹے ان مصیبت زدہ لڑکیوں نے کس طرح گزارے ہوں گے' یہ خیال مجھے بہت پریشان کررہا تھا۔ خاص طور پر ساحل کے حوالے سے میرا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ ساحل اب پہلے والی ساحل نہیں رہی تھی۔ اس نے میرے قرب میں بہت کچھ سیکھا تھا مگر مجھے رہ رہ کر نیلگری کی پیش گوئی یاد آرہی تھی اور میری اصل پریشانی کا سبب بھی یہی تھا۔ نیلگری نے بڑی سفاک اور دل چیر پیش گوئی کی تھی۔ نبی سر کی ایک بنگلا نما حویلی میں اس کی زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ مجھے یاد تھا۔ اس نے ساحل کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "وجدان! ساحل کی مناسبت سے تم اپنا نام ساگر رکھ لو۔ ساحل اور ساگر کا جنم جنم کا ساتھ ہے مگر۔" اس "مگر" کے بعد اس نے جملہ ادھورا چھوڑدیا تھا۔ میرے پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر سمجھ دار کے لیے اس ادھورے جملے میں بہت کچھ پنہاں تھا۔

پچھلے دنوں نیلگری کا میرے ساتھ جو رویہ رہا تھا' اس کے پیش نظر مجھے ہروقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ مجھے یہی شک تھا کہ ساحل کو مجھ سے جدا کرنے میں نیلگری کوئی بہت بڑا رول پلے کرے گی۔ وہ میرے لیے اپنی چاہت کا کھل کر اظہار کرچکی تھی اور میرے نزدیک کسی اور عورت کو دیکھنا اسے گوارا نہیں تھا لیکن پھر وہ اچانک غائب ہوگئی۔ لگ بھگ گزشتہ دو ماہ سے اس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں ازخود اس سے رابطہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ جب چاہتی تھی' چھم سے میری تنہائی میں چلی آتی تھی۔ اسے لانے بلانے پر مجھے اختیار نہیں تھا۔

نیلگری کے تصور نے میری نگاہ میں اس کے منفرد حسن کو اجاگر کردیا مگر دوسرے ہی لمحے ساحل کی یاد نے اس تصور کو آف کردیا۔ میری سوچ پلٹ کر ساحل پر مرکوز ہوگئی۔ جب دل پر بوجھ ہو تو کوئی شے اچھی نہیں لگتی۔ میرے اندر کا موسم بگڑ گیا تھا۔ ساحل موسمِ بہار کے مانند میرے اندر اتر چکی تھی۔ وہ میری نس نس میں لہو بن کر دوڑتی تھی۔ میری اس بہار کو خزاں کی نظر لگ گئی۔ نیلگری کی پیش گوئی بالآخر پوری ہوکر رہی' ساحل مجھ سے بچھڑ گئی۔ تارا نے ایک شیطانی چال چل کر مجھے ساحل سے جدا کردیا تھا۔

میری نیلی شیرڈ کسی بے لگام گھوڑی کے مانند عروس البلاد کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میری منزل کشمیر روڈ کا ایک بنگلا تھی۔ وہ بنگلا' جہاں تارا' ممتاز اور ساحل کو لے گیا تھا۔ مجھے اپنی ساتھیوں کو اس خبیث کے چنگل سے نکالنا تھا۔ میں کسی بھی قیمت پر نیلگری کی پیش گوئی کو پورا نہیں ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے ساحل تک پہنچنا تھا' اسے واپس لانا تھا۔ ہر قیمت پر' ہر طوفان سے گزر کر' چاہے اس مقصد کے لیے مجھے اپنی جان بھی قربان کرنا پڑتی یا دشمنوں کی جانیں نکالنا پڑتیں!

میں نے کشمیر روڈ پر پہنچ کر مذکورہ بنگلے کو تلاش کیا۔ اس تلاش میں مجھے تھوڑا بھٹکنا پڑا۔ راستہ آسان اور سادہ تھا لیکن میں اس وقت ذہنی طور پر بہت زیادہ منتشر تھا اس لیے ان دو چار گلیوں نے مجھے گھما کر رکھ دیا۔ میں نے اپنے ٹارگٹ بنگلے کے سامنے سے گاڑی گزارتے ہوئے سوچا' مجھے سب سے پہلے اپنے ذہن کو قابو میں رکھنا چاہیے۔ دھیان ٹھکانے پر ہوگا تو میں اپنے دشمنوں سے نمٹ سکوں گا۔ مجھے خود پر حیرت بھی ہورہی تھی۔ میں اتنا جذباتی پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ پہلے میرا اس نوعیت کا کوئی عزیز مجھ سے بچھڑا بھی نہیں تھا۔

میں نے اپنی شیرڈ بغلی گلی میں تھوڑے فاصلے پر کھڑی کردی۔ یہ بنگلے کا پہلو تھا۔ دوسری جانب ایک الٹرا ساؤنڈ کلینک تھا۔ میں نے گاڑی اسی کلینک کے سامنے کھڑی کی تھی۔ وہ کوئی عام سا دکان نما کلینک نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع و عریض بنگلے پر پھیلا ہوا خاصا معروف الٹرا ساؤنڈ کلینک تھا۔ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بات

خاص طور پر نوٹ کی تھی۔ اندر کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اس وقت اندر کوئی بھی موجود نہ ہو۔ یہ حیران کن بات تھی۔ نجیب نے زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا تھا کہ تارا نے اغوا کی واردات کے بعد اسی بنگلے پر آنا تھا اور یہ کہ میاں زاہد بھی یہیں موجود تھا۔ میں تو یہاں خاصی گہما گہمی کی توقع کر رہا تھا لیکن ایسی کوئی بات کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لمحے کو میرے ذہن میں خیال آیا' کہیں نجیب نے مجھے مس گائیڈ تو نہیں کر دیا۔ موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر انسان عموماً جھوٹ بولنے سے پرہیز کرتا ہے لیکن نجیب تو ایک شیطان تھا۔ ممکن ہے' اس نے مجھے غلط راہ پر ڈالنے کے لیے اس بنگلے کا تذکرہ کیا ہو۔ اس کا خیال ہو کہ اس طرح میں اس کی جان بخشی کر دوں گا۔ بہرحال' میں نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا تھا۔

میں یہاں تک آ گیا تھا تو بنگلے کو چیک کیے بغیر واپس چلے جانا ممکن نہیں تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے بنگلے کے پہلو سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ الٹرا ساؤنڈ کلینک کے سامنے میری گاڑی کے سوا اور کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہاں اچھا خاصا سناٹا تھا۔ جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ کلینک مارننگ کی شفٹ میں چلتا ہو گا۔

میں نے گلی میں دونوں جانب دور تک نگاہ دوڑائی اور بنگلے کی سائڈ وال پھلانگ کر اندر پہنچ گیا۔ میرے پاؤں میں جوگرز تھے اس لیے ہلکی سی "دھپ" کی آواز کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ میں دبے قدموں بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔

میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا' میری حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بنگلے کا ہر دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے وارن کرنے لگی کہ اس بنگلے میں کوئی گڑبڑ ہے۔۔۔ اور گڑبڑ کہاں ہے' یہ معلوم کرنے کا تجسس' مجھے بے اختیار آگے بڑھا رہا تھا۔ میں نے ایک کے بعد ایک بنگلے کی زیریں منزل کے تمام کمرے دیکھ لیے مگر کسی ذی نفس کے آثار نہیں ملے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا' نجیب نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا!

میں محتاط قدموں سے بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ یہاں ایک کمرے میں مجھے روشنی دکھائی دی۔ میں یک بہ یک رک گیا۔ باہر سے میں نے بنگلے کو ٹاپ ٹو باٹم دیکھا تھا اور اس کے کسی بھی ظاہرہ حصے میں مجھے روشنی نظر نہیں آئی تھی۔ بنگلا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن اب یہ روشنی! اور وہ بھی ایک ایسے کمرے میں جس کی کھڑکیوں کا رخ بنگلے کے فرنٹ کی جانب تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ لائٹ ابھی ابھی جلائی گئی تھی۔ وہاں یقیناً کوئی موجود تھا۔

میں جو ٹھٹک کر رک گیا تھا' دوبارہ محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ میں ہر قسم کی صورت حالات کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو چکا تھا۔ میں نے روشن کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ذرا سا دباؤ ڈالا تو میری حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

میں نے دروازے کے پٹ کی آڑ لیتے ہوئے ہینڈل کو گھما کر آہستہ آہستہ دروازہ کھولنا شروع کر دیا۔ ابھی میں نصف دروازہ ہی کھول پایا تھا اور جھانک کر اندر دیکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ میری سماعت سے ایک گمبھیر آواز ٹکرائی۔

"ڈرو نہیں وجدان! میں تمہارے استقبال کے لیے یہاں موجود ہوں۔"

سیکنڈ کے سوویں حصے میں' میں نے اس آواز کو پہچان لیا۔ وہ تارا کی آواز تھی۔ میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "اندر آجاؤ۔ آج سارے حساب بے باق ہو جائیں گے۔"

میں ایک دھکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ خاصا کشادہ ہال نما کمرا تھا جس کے فرش پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ پہلو بہ پہلو صوفہ سیٹ لگے تھے اور آخری سرے پر تارا بہ نفس نفیس ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہلکی کلیپنگ کرتے ہوئے بولا۔

"ویل کم مسٹر وجدان' سن آف شیطان!"

میں نے دانت کچکچا کر اسے خوں خوار نظر سے گھورا اور سلگتے ہوئے لہجے میں سوال کیا "ساحل اور ممتاز کہاں ہیں؟"

"میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا" وہ اپنے مخصوص بے رحمانہ انداز میں بولا "لیکن اس سے پہلے میں کچھ باتوں کی وضاحت کر دوں۔ تمہارا ذہن الجھ رہا ہو گا کہ یہاں تمہارا استقبال کس انداز میں ہو رہا ہے؟ مجھے تمہاری آمد کی خبر کیسے ہوئی؟" وہ ایک لمحے کو خاموش ہو کر میرے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تم نے گلشن والے بنگلے پر جو "کارنامہ" انجام دیا ہے' مجھے اس کی خبر ہو چکی ہے اور یہ خبر کچھ دیر پہلے مجھے مشتاق نے دی ہے' ٹیلی فون کے ذریعے۔"

"مشتاق!" میں چونک اٹھا "وہ تو بے ہوش ہو گیا تھا؟"

"سنتے جاؤ' بیچ میں مت بولو۔" وہ سخت لہجے میں گویا ہوا "مشتاق نامی اس گھریلو ملازم کو تمہارے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل ہوش آ گیا تھا۔ یہ وہی وقت تھا جب نجیب تمہیں میرے اور اس بنگلے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مشتاق ہوش میں آنے کے باوجود بھی بے ہوشی کی اداکاری کرتا رہا۔ اسے اپنی جان عزیز تھی۔ اس نے تمہارے ہاتھوں نجیب جیسے گراں ڈیل اور فائٹر کا حشر دیکھ لیا تھا۔ وہ چوں چرا کر کے خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ تم نے نجیب کو قتل کرنے سے پہلے اپنا نام اس کے سامنے لیا تھا۔ مشتاق نے مجھے فون پر بتایا کہ وجدان نامی کسی شخص نے خاور اور نجیب کو قتل کر دیا ہے۔ مشتاق تمہارے نام اور صورت سے آشنا نہیں البتہ نجیب نے تمہاری شہرت سن رکھی تھی مگر دیکھا پہلی مرتبہ تھا۔ یعنی آخری مرتبہ۔"

وہ آہستہ آہستہ دھیمے لہجے میں بات کر رہا تھا مگر میں اس کی آواز میں شامل غم و غصے کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ خاور کی موت میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں نے تو اسے دو گھنٹوں کے لیے انٹا غفیل کیا تھا۔

میں نے تارا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "مگر یہ ساری تفصیل تم مجھے کیوں سنا رہے ہو۔ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

وہ پھنکارا "تمہارے سوال کا جواب اس تفصیل کے بدلے گا۔ میں چاہتا ہوں' مرنے سے پہلے تمہارے ذہن میں کوئی الجھن نہ رہے۔ آج ہمارے درمیان آخری معرکہ ہو گا۔ ہم میں سے کوئی ایک ہی اس بنگلے سے زندہ سلامت جا سکے گا۔ تم نے مجھ پر بہت قرض چڑھا دیا ہے' میں یہ قرض سود در سود تمہیں لوٹانے والا ہوں۔"

"میں بھی اپنے دل میں تمہارے لیے کچھ اسی قسم کے جذبات رکھتا ہوں" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "تمہاری بکواس اگر ختم ہو چکی ہو تو میرے سوال کا جواب دے دو!"

اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور بپھرے ہوئے لہجے میں بولا "جیسے ہی مجھے تمہارے بارے میں اطلاع ملی' میں نے سب کو یہاں سے ہٹا دیا۔ اس بنگلے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔"

"ساحل اور ممتاز کو تم نے کہاں شفٹ کیا ہے؟"

"فی الحال میں ان کے بارے میں نہیں جانتا' وہ اس وقت کہاں ہوں گی" وہ مکاری سے زیر لب مسکراتے ہوئے بولا "وہ جہاں بھی ہیں' زندہ ہیں۔"

میں نے دہاڑ کر کہا "تم جھوٹ بول رہے ہو' تمہیں سب معلوم ہے۔"

"تمہارے سر کی قسم' میں غلط نہیں کہہ رہا" وہ بدستور زہریلی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا "تمہاری آمد سے آدھا گھنٹا پہلے میاں جی ان دونوں کو اپنے ساتھ کسی دوسرے ٹھکانے پر لے گئے ہیں۔ جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آئے تو پورے بنگلے کی تلاشی لے لو۔ ویسے میں ایک بات جانتا ہوں' ساحل اور ممتاز کو بڑی مناسب جگہوں پر پہنچایا جانے والا ہے۔"

میں نے تڑپ کر پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"ویری سمپل!" وہ شیطانی انداز میں مسکرایا "ان کو ان کے طلب گاروں کے پاس پہنچایا جائے گا۔ تم جانتے ہو' ان کی طلب' کس کس کو ہے؟"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا "تمہارے مذموم عزائم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ بہتر ہو گا کہ اپنی ناپاک زبان سے خود ہی بتا دو۔"

تارا نے کہا "ابھی تھوڑی دیر بعد ممتاز کو عمر کوٹ روانہ کر دیا جائے گا۔ اس کا طلب گار میرا یار وڈیرا اکبر سومرو ہے۔ ممتاز اور اس کے ماما ایس پی نے اکبر کو بہت نقصان پہنچایا ہے' وہ اپنا سارا نقصان اس نوجوان حسینہ سے پورا کرے گا۔ کس طرح' یہ صرف اکبر سومرو ہی جانتا ہے۔۔۔ اور کسی کو جاننے کا حق بھی نہیں۔"

وہ بہت ہی خطرناک عزائم کا اظہار کر رہا تھا تاہم یہ معلومات میرے لیے بہت اہمیت کی حامل تھیں۔ میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا "ساحل کو تم لوگوں نے کہاں چھپایا ہے اور اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے؟"

"اوہو!" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا "تم اس بدیسی لڑکی کے لیے بڑے بے چین ہو رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے' وہ تمہاری محبوبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب کہیں جا کر تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ مجھے تمہاری اس بے قراری سے بہت لطف محسوس ہو رہا ہے۔"

اس کی ہنسی مجھے زہر لگی۔ میں نے برہمی سے کہا "تم یونہی بک بک کرتے رہو گے یا ساحل کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ گے؟"

اس نے بتایا "تم نے ہمارے چودھری صاحب کی محبوب ڈائری کا ایک قیمتی ورق چرا لیا ہے۔ ہم تمہاری محبوبہ ساحل کو چودھری نوازش کی حویلی میں پہنچا دیں گے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں تلملا اٹھا "تم کس ڈائری کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی تمہارے باپ کی رقم کردہ ڈائری جس میں کثیرالمالیت سونے کا راز تحریر کیا گیا تھا" وہ بے پناہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا "تم جس ڈائری کا ذکر کر رہے ہو' وہ چند ماہ پہلے میاں زاہد حسین نے میرے ہوٹل کے کمرے سے چوری کروائی تھی۔ وہ اب تک تمہارے چوہدری تک پہنچ چکی ہوگی۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے" وہ اثبات میں سہلاتے ہوئے بولا "ڈائری تو چوہدری صاحب تک پہنچ ہی گئی ہے مگر اس ڈائری کے دو صفحات یعنی ایک ورق اس کے اندر سے تم نے بڑی صفائی سے پار کر لیا ہے۔ اس ایک ورق کے بغیر بات نہیں بن سکتی۔ وہ ڈائری ادھوری اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے جس طرح تم ساحل کے بغیر ادھورے اور اجاڑ بن کر رہ گئے ہو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تمہیں شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے اور تمہارے چوہدری کو بھی" میں نے اسے چکر دیتے ہوئے کہا "میں نے اس ڈائری میں سے ایک صفحہ بھی الگ نہیں کیا۔"

وہ میرے چکر میں نہ آیا۔ میرا جملہ ختم ہوتے ہی اس نے کہا "تم مجھے کوئی سبق پڑھانے کی کوشش نہ کرو۔ ڈائری کے بارے میں میرا اور چوہدری صاحب کا موقف اٹل ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ وہ قیمتی صفحات میرے حوالے کردو۔ میں وعدہ کرتا ہوں' تمہاری محبوبہ کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ بہ صورتِ دیگر' ہمارے درمیان آج خون ریز معرکہ ہوگا۔ اگر بدقسمتی سے تم مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بھی ساحل کو پانے کے لیے وہی شرط ہوگی۔ یہ چوہدری صاحب کا ناقابلِ تبدیل فیصلہ ہے۔ جب تک تم انہیں ڈائری کے وہ صفحات نہیں دو گے' ساحل چوہدری نوازش کی حویلی میں رہے گی اور زندہ رہے گی۔" وہ ایک لمحے کا توقف کر کے بڑے معنی خیز انداز میں بولا "مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ چوہدری صاحب کی مرضی ہے کہ وہ کب تک تمہیں چھوٹ دیتے ہیں۔"

وہ پتا نہیں' کب تک اسی قسم کی بکواس جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں جو جاننا چاہتا تھا' وہ مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ آخری سوال کے طور پر میں نے پوچھا "کیا ساحل ابھی تک کراچی ہی میں ہے یا اسے لاہور کے لیے روانہ کروا گیا ہے؟"

"تم سوال ہی کرتے رہو گے یا وہ صفحات میرے حوالے بھی کرو گے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں سمجھ گیا' اب وہ مجھے مزید کچھ نہیں بتائے گا۔ میں نے کہا "میں تمہیں ان صفحات کے بارے میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے' گھی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا ہی کرنا پڑے گا۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ یہ حملہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے بیک جمپ کی اور دو فٹ پیچھے چلا گیا۔ وہ منہ کے بل زمین کی طرف آیا مگر نیچے گرنے کے بجائے اس نے ہاتھوں کے پنجوں کا استعمال کرتے ہوئے فرش پر ایک قلابازی لگائی اور میرے پہلو میں پہنچ گیا۔ ہمارے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر پنچ مارا۔ اس نے گردن جھکا کر میرا وار خالی دیا۔ میں نے ایک اسٹیپ اندر آکر اس کی جھکی ہوئی گردن پر رائٹ ایلبو رسید کردی۔ اس کا سر ایک جھٹکے سے مزید جھک گیا۔ اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی کراہ برآمد ہوئی اور اسی لمحے اس نے ایک پیچ حرکت کی۔

وہ اچانک زمین پر بیٹھا اور بجلی کی سی سرعت سے اس نے میرے ٹانگوں کو ٹخنوں سے جکڑ کر مجھے ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کا وار چل گیا اور میں پشت کے بل پیچھے جا گرا۔ تارا اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ میری ایلبو (ELBOW) نے اسے اذیت میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ کسی ریچھ کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے اس کے گرتے ہوئے جسم کو اپنے پاؤں پر روکا اور ایک جرک کے ساتھ اپنے سر کے عقب میں اچھال دیا۔ وہ ایک صوفے کے ہتھے پر جا کر گرا۔ میں نے فٹ اسپرنگ لگایا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

تارا اپنی کمر کو سہلاتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ وہ اس وقت ایک زخمی کوبرے کے مشابہ نظر آرہا تھا۔ اتفاق سے اس نے بلیو جینز پر جو بلیک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی' اس پر بھی ایک کوبرے کی سفید رنگ میں تصویر بنی ہوئی تھی۔

میں ہر قسم کے حملے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ چار فٹ کی دوری پر پہنچ کر اس نے ہوا میں جمپ کی اور رائٹ سائڈ فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی۔ کوشش ان معنوں میں کہ اس کی کک میرے وجود کو ٹچ نہ کر سکی' ہٹ کرنا تو دور کی بات ہے۔ میں نے تیزی سے اپر سائڈ بلاک کیا۔ تارا کے

جسم نے ہوا میں ٹوئسٹ کیا اور وہ تین فٹ دور اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کے زمین پر آتے ہی ایک سلانٹ کک ماری۔ وہ بلاک نہ کرسکا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرنٹ فلائنگ کک ماری۔ میرا پاؤں تارا کی ناک پر پڑا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامتے ہوئے پیچھے ہٹا۔ یہ وہی ناک تھی جس کی میں نے عمرکوٹ کے ہوٹل میں اچھی خاصی "خاطرداری" کی تھی۔

جب تارا نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے تو ایک وحشت ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا تھا جو اس کے ہونٹوں اور ٹھوڑی کو رنگین کرتا جا رہا تھا۔ تارا بار بار ہاتھ کی پشت سے اپنے چہرے کو صاف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس منظر نے میرے اندر ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے ایک عجیب سا سرور محسوس کیا۔ تارا کو کس مپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ساحل کے غم نے مجھے جنونی بنا دیا تھا اور یہ غم دینے والا تارا ہی تھا۔

میں نے اس کے سنبھلنے کا انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ کر اسے لاتوں مکوں پر رکھ لیا۔ وہ اپنے چہرے کو کور کرتے ہوئے پیچھے ہٹتا رہا اور مار کھاتا رہا۔ بالآخر اس کی پشت دیوار سے جا لگی۔ اس دیوار میں ایک دروازہ بھی تھا لیکن یہ وہ دروازہ نہیں تھا جس سے گزر کر میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔

ایک لمحے کو میں نے محسوس کیا جیسے وہ فرار کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس نے اچانک دروازے کو دیکھا تھا لیکن یہ اس کی چالاکی تھی۔ اس نے میری توجہ بٹانے کے لیے وہ حرکت کی تھی۔ میری لحاتی غفلت کا نتیجہ فوراً ہی برآمد ہو گیا۔

تارا نے کسی ارنا بھینسے کی طرح میرے پیٹ میں ایک زوردار ٹکر ماری اور اپنے سر کے زور سے پانچ فٹ مجھے عقب میں دھکیلتا چلا گیا۔ اس کی ٹکر میں کسی سانڈ کی قوت تھی۔ مجھے اپنے پیٹ میں مروڑ سا اٹھتا محسوس ہوا۔ میں نے نرم سانس روکی اور اس کے سر پر رائٹ ایلبو سے ہٹ کیا۔

تارا ایک دردناک آواز کے ساتھ منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں نے اس کی پشت پر سوار ہو کر گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں کسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے سر کو آزاد کرانے کے لیے زور لگانے لگا تاہم یہ زور بے سمت اور خواہ مخواہ نہیں تھا۔ تارا ایک اچھا مارشل آرٹسٹ تھا۔ یہ بات اسے معلوم تھی کہ اپنی اس کوشش میں اگر اس نے ذرا سی بھی نان ٹیکنیکل حرکت کی تو اس کی گردن کا کڑا کا نکل جائے گا۔

ہمارے درمیان باقاعدہ ریسلنگ کی طرح زور آزمائی ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں اس کا داؤ چل گیا اور اس نے بیک پش (BACK PUSH) کا استعمال کرتے ہوئے مجھے اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ اس جسارت کے نتیجے میں اس کی گردن کو ایک جھٹکا لگا تھا تاہم یہ زیادہ خطرناک اور ضرر رساں نہیں تھا۔

ہم ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس مرتبہ حملے میں پہل میں نے کی۔ میں نے نی شاٹ کا جھانسا دے کر ایک فرنٹ ٹو سائڈ کک اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دی۔ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرتے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔

اس نے ڈبل پنچ سے میرے چہرے کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں نے گردن کو بیک جرک دی۔ اس کے ساتھ ہی میری کمر کسی کمان کی طرح پیچھے کو جھک گئی۔ تارا نے دونوں بازو کھول کر مجھے دبوچنا چاہا مگر میں اس کے بازوؤں کے حلقے میں آنے سے پہلے ہی فضا میں سائڈ ٹوئسٹ کرتے ہوئے دور جا چکا تھا۔ البتہ اس فضائی پرواز کے دوران میں میرے جوگرز پوش پاؤں تارا کے چہرے کو ایک شاندار "سلامی" پیش کر چکے تھے۔

وہ کسی پٹتے ہوئے کتے کی طرح حلق سے "چیاؤں چیاؤں" کی آواز نکالتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا' میں تیزی سے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ آج میرے اندر کوئی اور ہی وجدان سما گیا تھا۔

اس نے اٹھتے ہی مجھے غلیظ گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ ایک مارشل آرٹسٹ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مغلظات پر اتر آئے۔ یہ ایک کمزوری اور بداخلاقی سمجھی جاتی ہے۔ تارا کو میں نے شروع ہی سے گرم مزاج اور غصیلا پایا تھا۔ یہ اس کے کمزور اعصاب کی دلیل تھی۔ اس کے بالعکس دوزخ مکانی دارا میں خاصا تحمل اور تدبر پایا جاتا تھا۔ دونوں بھائیوں میں مزاج کا بہت بڑا فرق تھا ورنہ اعمال دونوں کے متوازی تھے۔

وہ جھنجلاہٹ اور ناکامی کے ملے جلے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اس کی جھنجلاہٹ سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کی رائٹ راؤنڈ ہاؤس کو میں نے بڑی صفائی سے بلاک کیا۔ اس کے ساتھ ہی اندر آکر میں نے اس کے سینے پر پنچ مارا۔

اس نے میرے مکے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کلائی

کے مقام پر جکڑ لیا اور نیچے کی جانب ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اگر میں کسی قسم کی مزاحمت کرتا تو میری کلائی چٹخ سکتی تھی۔ اس کے جھٹکے کے ساتھ ہی میں بھی زمین کی طرف جھک گیا۔

میری اس حرکت پر تارا اگر میری کلائی کو چھوڑ دیتا تو اس کا فائدہ تھا مگر اس نے کلائی کو دبوچے رکھا اور نتیجے میں وہ خود بھی میرے اوپر کھنچا چلا آیا۔ میں نے اچانک اٹھ کر اسے اپنے اوپر سے دور پھینک دیا۔ میرے اوپر گرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے کلائی چھوٹ گئی تھی۔

اس نے پلٹ کر مجھ پر ایک کک چلائی مگر اس کک میں فورس برائے نام تھی۔ میں نے اس ڈھیلی ڈھالی کک پر کھڑے ہاتھ کا چوپ رسید کردیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی اور ایک لوئر سائڈ کک اس کی مضروب ٹانگ پر رسید کردی۔ بڑی چیخنے کی آواز ابھری اور تارا زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ بے کار ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ لنگڑاتے ہوئے اٹھا۔ اس حالت میں مجھے اس پر رحم آنا چاہیے تھا مگر آج تو میں رحم وکرم سے بہت دور نکل آیا تھا۔ میرے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جو انسانیت کے نام پر بدنما دھبا تھا۔ اس نے میری عزیز ترین ہستی کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ میں اس سے ہمدردی کس طرح کرسکتا تھا!

وہ اپنی دائیں ٹانگ کو ہوا میں اٹھائے ہوئے تھا۔ یہ پاؤں زمین پر لگاتے ہوئے اسے شدید تکلیف سے گزرنا پڑتا اور میں اسے ہر قسم کی تکلیف سے گزارنا چاہتا تھا۔

میں نے بڑی سفاکی سے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اس کی گھائل ٹانگ کو ایک مرتبہ پھر نشانہ بنایا۔ جواب میں اس کی چیخیں ابھریں اور میرے دل کو وافر مقدار میں سکون بخش گئیں۔

تارا خاصا سخت جان تھا۔ لوٹ پوٹ کر پھر کھڑا ہوگیا۔ میں اس کے نزدیک آیا تو اس نے مجھے پنچ ماردیا۔ یہ ایک رائٹ اسٹریٹ پنچ تھا۔ میں نے بلاکنگ کے بعد اس کی کلائی کو گرپ (GRIP) میں لے کر ٹوسٹ (TWIST) کیا۔ وہ جھکا تو میں نے اس کی کہنی پر اپنی بائیں کہنی کا وار کیا۔ تارا کے منہ سے ذبح ہوتے ہوئے جانور جیسی آواز پیدا ہوئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

مجھے یاد آیا 'اندرونِ سندھ کے ریگزار میں ایک معرکے کے دوران میں' میں نے تارا کی اس کہنی کا جنازہ نکالا تھا۔ چوٹ پر چوٹ کیا قیامت ڈھاتی ہے' اس کا احساس انھی لوگوں کو ہوسکتا ہے جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

مجھے امید نہیں تھی کہ تارا اب مزید مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ اس کا دایاں پہلو بالکل ہی بے کار ہو کر رہ گیا تھا لیکن میں نے دیکھا' وہ ڈھیٹ ابن ڈھیٹ ایک مرتبہ پھر ڈگمگاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں اس پر نظر جمائے صرف چار فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

اس مرتبہ تارا نے ایک غیر متوقع حرکت کی۔ بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے وہ دیوار پر نصب سوئچ بورڈ کی جانب بڑھا اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ اس کی اس شاطرانہ حرکت سے میں یہ تو سمجھ گیا کہ اس نے کوئی نئی چال چلی تھی لیکن فوری طور پر میں اس کی چال کو سمجھ نہ سکا۔ پھر اس سے قبل کہ میں غور وفکر کرتا' مجھے اپنے عقب میں دھڑ سے ایک دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جہاں سے میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے چار گن بردار بھرا مار کر کمرے کے اندر آئے اور آتے ہی انہوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کردی۔

ان کا ٹارگٹ صرف اور صرف میں تھا۔ میں اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا تاہم میرے دماغ نے بروقت میری راہنمائی کی۔ میں اپنی جانب چار گنوں کی نالوں کو اٹھتے دیکھ کر ہوا میں اچھلا۔ شاؤلن ٹیمپل میں ٹریننگ کے دوران میں مجھے ہائی ورٹیکل جمپ کی خصوصی مشق کروائی گئی تھی اور میں بہ آسانی دس بارہ فٹ تک ہوا میں اچھل سکتا تھا۔

میری جمپ کے نتیجے میں کمرا تارا کی آخری چیخوں سے گونج اٹھا۔ میری جانب آنے والی درجنوں گولیوں میں سے کسی نے یا کئی نے اس کے وجود کو چھید ڈالا۔ حملہ آور افراد نے اپنی گنوں کا رخ چھت کی جانب کیا اور برسٹ فائر کیے۔ لیکن میں وہاں ہوتا تو فائرنگ کی زد میں آتا۔ میرا احساس ذہن مجھے "آٹو" پر سیٹ کرچکا تھا۔ ورٹیکل جمپ کرتے ہی میں نے بلندی پر پہنچ کر اپنی باڈی کو سمرسالٹ (SOMER SAULT) کے انداز میں رول کیا اور ڈبل اسٹیپ کرتے ہوئے سوئچ بورڈ کے پاس پہنچ گیا۔

چار گنوں سے خارج ہونے والی مہلک گولیوں نے کمرے کی چھت کو ادھیڑ ڈالا۔ اسی وقت مجھے اپنے بائیں کندھے میں آگ سی اترتی محسوس ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ گن بردار میری جانب فائرنگ کرتے' میں ہاتھ مار کر کمرے کی لائٹ آف کرچکا تھا۔

میں تاریکی چھاتے ہی جس مقام پر گرا تھا' وہاں سے

تھوڑا آگے رینگ گیا۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا ورنہ وہ اندھیرے میں بھی اگر میری سمت فائرنگ کرتے تو مجھے شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔

حیرت انگیز طور پر مزید فائرنگ نہیں ہوئی اور وہ چاروں یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئے۔ یقینی طور پر وہ اپنی گنوں" کو ری لوڈ (RELOAD) کرنے گئے تھے۔ برسٹ فائرنگ نے گنوں کے میگزین خالی کردیے تھے۔ میں ان کی واپسی تک وہاں رکنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ کوئی گولی ری باؤنڈ ہو کر میرے کندھے میں آ دھنسی تھی جس سے میں شدید تکلیف محسوس کررہا تھا۔

میں نے زخمی کندھے کو ایک ہاتھ سے تھاما اور دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے کے نزدیک آگیا۔ مجھے اپنے ہاتھ پر خون کا رساؤ محسوس ہوا۔ کندھا ٹھیک ٹھاک زخمی ہوچکا تھا۔ چند لمحات تک جب باہر خاموشی رہی تو میں احتیاط سے باہر نکل آیا۔ وہاں کسی ذی نفس کے آثار نہیں تھے۔

میں نے ایک لمحے کو سوچا اور گولی کی رفتار سے بالائی منزل کی بالکونی کے پاس پہنچ گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ چاروں میری طرف آرہے تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں ری لوڈ کرلی ہوں گی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں اس وقت ہائی رسک پر تھا اور اس قسم کی صورتِ حالات میں ہنگامی اور فوری فیصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں نے سانس روکی' بالکونی کی ریلنگ پر چڑھا اور ڈائیونگ بورڈ سے جمپ لگانے کی طرح خود کو فضا کے حوالے کردیا۔

میرے پاؤں میں جوگرز تھے۔ اتنی بلندی سے نیچے آنا کوئی آسان کام نہیں لیکن جو لوگ "فری فال" کی تھیوری اور ٹیکنیک سے آگاہ ہیں' انھیں یہ ناممکن نظر نہیں آتا۔ مشاق لوگوں کے لیے یہ ایک کھیل ہے۔

زمین پر میرے پاؤں اور ہاتھ ایک ساتھ عمل میں آئے اور میں فرنٹ رول کرتے ہوئے دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میرے زخمی کندھے کی تکلیف اس حرکت سے کئی گنا بڑھ گئی مگر میں بازو کو تھام کر "ہائے ہائے" نہیں کرسکتا تھا۔ میرے عقب میں چار خطرناک گنوں کی سفاک نالیں اٹھی ہوئی تھیں جیسے چار توپیں دہانے کھولنے کو بے قرار ہوں۔

رولنگ ختم ہوتے ہی میں اٹھ کر اپنی گاڑی کی جانب دوڑ گیا۔ اسی وقت بنگلے کی بالائی منزل سے گولیوں کی ایک بوچھار میری جانب آئی مگر خوش قسمتی سے ایک بھی گولی میرے وجود کو چھو نہ سکی۔

وہ بڑے قیامت خیز لمحات تھے۔ میرے پاس سوچنے' رکنے یا پلٹ کر پیچھے اپنے دشمنوں کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھائی ہی تھی کہ عقبی نشست سے کوئی سفید شے پرواز کرتے ہوئے آئی اور "دھپ" سے میری گود میں گری۔ ہڑبڑاہٹ میں اسٹیئرنگ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اسی لمحے میری سماعت سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔

"میاؤں...!"

وہ نرم و ملائم سفید شے ایک بلی تھی۔ ''میاؤں'' کی آواز نکالتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر اچھلی اور پسنجرز سیٹ پر پہنچ گئی۔ میری گردن بے ساختہ اس کی جانب مڑ گئی۔ ہماری نگاہیں ملیں تو وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مخصوص ادا سے سر کو جھٹکا اور اس کے حلق سے بڑی کراری آواز برآمد ہوئی...... ''میاؤں!''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے وہاں سے جلد از جلد نکلنے کا مشورہ دے رہی ہو۔ وہاں تو میں خود بھی ایک لمحے کو نہیں رکنا چاہتا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے آگے بڑھا دیا۔ دو تین گلیاں گھومنے کے بعد میں مین کشمیر روڈ پر آ گیا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ یہ رش کا وقت تھا۔ کشمیر روڈ سے میں جیسے ہی شاہراہِ قائدین پر پہنچا، اس رش میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ میں مسلسل بیک ویو پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا، ایک موٹر سائیکل میرے تعاقب میں تھی۔ اس موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے۔ ایک ڈرائیو کر رہا تھا، دوسرا اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ اس تعاقب کے سلسلے میں، میں کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں، میں نے نورانی چورنگی پر پہنچ کر گاڑی کو شاہراہِ قائدین پر رکھنے کے بجائے بائیں جانب موڑ لیا۔ اب میری گاڑی خالد بن ولید روڈ پر دوڑ رہی تھی اور یہ دیکھ کر کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ موٹر سائیکل میرے ہی تعاقب میں آ رہی تھی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہمارا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک تشویش ناک صورتِ حالات تھی۔

میں اس وقت بہت نازک اور سنگین حالات سے گزر رہا تھا۔ اپنے روٹ کو میں نورانی چورنگی پر چھوڑ چکا تھا۔ مجھے اصولی طور پر شاہراہِ قائدین پر رہتے ہوئے نرسری تک پہنچنا تھا پھر شاہراہِ فیصل پر سفر کرتے ہوئے گورا قبرستان اور وہاں سے نیشنل ہائی وے کے ذریعے ڈیفنس میں ''ساؤتھ'' تک جانا تھا۔ روٹ کی تبدیلی سے میری مشکلات میں اضافہ ہوگیا، خاص طور پر اس صورت میں کہ میرا بایاں کندھا بھی زخمی تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا، گولی نے مجھے کس قدر نقصان پہنچایا تھا، البتہ میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ خون کے رساؤ میں تیزی آتی جا رہی تھی۔

خالد بن ولید روڈ پر زیادہ رش ویگنز وغیرہ کا تھا۔ متعاقب موٹر سائیکل کسی دُم کے مانند میری شیرڈ کے ساتھ بندھی چلی آ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس طرح اس کے دونوں ہاتھ اور بالائی دھڑ نظر سے اوجھل ہوگیا تھا۔ میں ڈرائیونگ کے دوران میں گاہے بہ گاہے بیک ویو میں موٹر سائیکل سواروں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ پر نگاہ جمائے آگے بڑھ رہے تھے۔ رش کی وجہ سے انہیں اوورٹیک کرنے یا میرے برابر میں آنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

ہم آگے چلتے ہوئے سگنل کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں پر علامہ اقبال روڈ، خالد بن ولید روڈ کو کراس کرتی ہے۔ جیسے ہی ہم سگنل کے قریب پہنچے، سگنل کی سرخ لائٹ روشن ہوگئی۔ میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا ان کا تقاضا یہی تھا کہ فوری طور پر تعاقب کرنے والوں سے جان چھڑا لی جائے۔ میں انہیں اپنے پیچھے لگا کر آگے بڑھنے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ دونوں انہی چار افراد میں سے تھے جنہوں نے بنگلے میں مجھ پر بے دریغ فائرنگ کی تھی۔

میں نے سرخ لائٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی شیرڈ کو آگے بڑھا دیا۔ میں سگنل توڑ کر قانون شکنی کا مرتکب ہو رہا تھا لیکن اس لمحے یہ سب سوچنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ جو بھی کرنا تھا، ہنگامی اور جنگی بنیادوں پر کرنا تھا۔ میں نے محبت اور جنگ کے اصول پر عمل کر ڈالا۔

میرے پیچھے کئی گاڑیوں کے ٹائروں کی چرچراہٹ گونجی۔ یقینی طور پر یہ وہ گاڑیاں تھیں جو علامہ اقبال روڈ کا سگنل کھلنے پر آگے بڑھی تھیں، میں نے بیک ویو پر نگاہ ڈالی تو اس گونج کا سبب نظر آ گیا۔ میں تو زن سے سگنل توڑ کر آگے بڑھ آیا تھا، موٹر سائیکل والوں نے بھی میری تقلید میں وہی قانون شکنی کی تھی اور اس موٹر سائیکل کو بچانے کے لیے ہی متعدد گاڑیوں نے بریک لگائے تھے۔ یہ ان کا ایک فطری ردِعمل تھا۔

اس لمحاتی واقعے نے میرے تعاقب پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ میں نے ریڈ الرٹ ہوتے ہوئے ایکسلی ریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا لیکن عقبی سگنل بند ہونے کے باعث روڈ کی یہ سائیڈ بالکل خالی پڑی تھی چنانچہ شیرڈ کی بڑھتی ہوئی اسپیڈ کوئی کام نہ دکھا سکی اور آن واحد میں موٹر سائیکل گاڑی کے پہلو میں آ گئی...... اور اسی لمحے میری آنکھوں نے ایک دہشت ناک منظر دیکھا۔

موٹر سائیکل ڈرائیونگ سائیڈ سے شیرڈ کے برابر آئی تھی اور اس وقت موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا شخص بالکل میرے متوازی محوِ سفر تھا۔ اب چادر کے اندر سے اس کے ہاتھ باہر نکل آئے تھے اور نظر آنے والے ان ہاتھوں میں ایک مختصر الوجود کلاشن دکھائی دے رہی تھی جس کا بیرل ایک سوا انچ کے زاویے پر میرے سر کی جانب اٹھا ہوا تھا۔ کوئی لمحہ تھا کہ وہ مہلک بیرل میری طرف موت اچھالنے والا تھا۔ موت کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق مجھے کئی مرتبہ ہوا تھا ''قربت'' کا یہ والہانہ پن میں نے ازیں قبل ملاحظہ نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا...... یہ خدا نہیں جانتا کہ وہ وہ فیصلہ میں نے کب اور کیسے کیا؟ سوچ کر عمل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ مجھے یاد نہیں، وہ کیا تھا اور کیا نہیں تھا!

اچانک میرے قدموں میں سرسراہٹ ہوئی اور میں نے پوری قوت سے بریک پیڈل دبا دیا۔ ٹائروں کی چرچراہٹ سے فضا گونج اٹھی پھر اس گونج میں کلاشن کے برسٹ کی مخصوص تڑتڑاہٹ بھی شامل ہوگئی۔ میں نے ساکن شیرڈ کی ونڈ اسکرین کے پار موٹر سائیکل کو سڑک پر لہراتے ہوئے دیکھا۔ وہ خطِ منحنی میں سفر کرتے ہوئے سڑک سے اتری اور گاڑیوں کے ایک شوروم کے آہنی گیٹ سے جا ٹکرائی۔

اس ٹکراؤ کے نتیجے میں دونوں موٹر سائیکل سوار دھڑام سے نیچے جا گرے۔ اسی لمحے میں نے اپنے پاؤں میں کوئی نرم و نازک چیز محوِ حرکت محسوس کی اور میرے کانوں تک یہ مخصوص آواز رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ''میاؤں......''

وہ آفت کی پرکالہ اس نازک مرحلے پر کسی وقت پسنجرز سیٹ سے نقل مکانی کر کے میرے قدموں میں پہنچ گئی تھی۔ میری پوری توجہ کلاشن کے بیرل پر مرکوز تھی لہٰذا میں اس کی اس حرکت کو دیکھ نہیں سکا تھا۔

اسی وقت فضا میں ایک مخصوص سائرن کی آواز گونجنے لگی۔ میں نے میکانکی انداز میں بیک ویو پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے کہ عقبی سگنل کھل چکا تھا اور میری جانب بڑھنے والے ٹریفک کے ریلے میں سب سے آگے ایک پولیس موبائل تھی۔ یہ مخصوص سائرن کی آواز اسی موبائل سے خارج ہو کر فضا میں منتشر ہو رہی تھی۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں اپنے بچاؤ کی مناسب کوشش کر سکتا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں نے نیلی شیرڈ کو آگے بڑھا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ نئی نویلی گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

میرے عقب میں آنے والی گاڑیاں پولیس موبائل کو آگے بڑھنے کا پورا پورا موقع دینے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ موبائل میرے قریب ہونے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ فی الفور پولیس موبائل سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ میں شیرڈ کو مختلف سڑکوں پر موڑتے ہوئے شہیدِ ملت روڈ پر لے آیا۔ اتفاق اور خوش قسمتی سے اس وقت اس روڈ پر زیادہ رش نہیں تھا۔ میں ایکسلی ریٹر پر دباؤ بڑھاتے ہوئے اپنے اور پولیس موبائل کے درمیانی فاصلے کو بہ تدریج طول دینے لگا۔ اس کوشش میں مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

سفید بلی دھیرے سے کھسکتے ہوئے میرے قدموں سے نکلی اور اُچک کر دوبارہ پسنجرز سیٹ پر براجمان ہوگئی۔ یہ ہو بہ ہو وہی بلی تھی جو پہلی مرتبہ اوپن ائر ریسٹورنٹ میں دکھائی دی تھی، دوسری بار بوٹ بیسن پر، تیسری دفعہ فلیٹ کے بیڈ روم میں اور اب ان حالات میں وہ بلا مبالغہ میری دست گری کر رہی تھی۔ اگرچہ تمام بلیاں کم و بیش ملتی جلتی صورت و شکل کی ہوتی ہیں لیکن میرا دل کہہ رہا تھا...... یہ ایک ہی بلی ہے جو مختلف ناز و اطوار سے میری زندگی میں آ رہی ہے۔ یہ ایک بے اختیار خیال تھا جس کی طاقت کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

میں نے شیرڈ کی اسپیڈ میں مزید اضافہ کرتے ہوئے اپنے ''پڑوس'' میں فروکش اس عجوبۂ روزگار بلی کو دیکھا۔ وہ اس اعصاب شکن ماحول سے بے نیاز، اپنے پاؤں کے پنجے سے گردن کو کھجا رہی تھی۔ مجھے اس کی بے نیازی پر رشک محسوس ہونے لگا۔ اللہ ایسی بے فکری سب کو دے! اس حالت میں دیکھ کر بلی کی معصومیت پر ایمان لانے کو جی چاہتا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ قائم رکھتے ہوئے بیک ویو میں پولیس جیپ کو دیکھا۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا کہ پہلی نظر میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا، وہ موبائل میری شیرڈ کے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی ہے مگر بلوچ کالونی والے پل سے ایک سگنل پہلے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خطرناک حادثہ پیش آ سکتا تھا۔ جب سگنل کراس کر کے میں نے دوبارہ رفتار بڑھائی تو پولیس موبائل ایک مرتبہ پھر میرے بہت قریب پہنچ گئی۔ میں نے شیرڈ کو برج پر چڑھانے کے بجائے سروس روڈ پر ڈالا اور تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے شاہراہِ فیصل پر آ گیا۔ اس وقت میرا رخ ائرپورٹ کی جانب تھا۔ میں نے کشادہ سڑک پر آتے ہی بیک ویو پر نگاہ ڈالی اور یہ دیکھ کر میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی کہ پولیس موبائل مجھ سے بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

میں نے پولیس موبائل کو ڈاج دینے کے لیے اپنی شیرڈ کو ایک مرتبہ پھر سروس روڈ پر ڈال دیا۔ شاہراہِ فیصل جیسی مصروف، سیدھی اور کشادہ روڈ پر میں زیادہ دیر تک پولیس والوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا لہٰذا رہائشی علاقے کی گلیوں میں گھما پھرا کر اس موبائل سے نجات حاصل کی جا سکتی

تھی۔ اسی حکمتِ عملی پر قدم بڑھاتے ہوئے میں نے اپنی گاڑی کو ''لال قلعہ'' کے پہلو سے بائیں جانب اندر لے لیا۔

اب میں میراں محمد شاہ روڈ پر سفر کر رہا تھا۔ پولیس موبائل جس طرح میرے تعاقب میں چلی آ رہی تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا تھا، وہ مجھے کوئی ڈاکو یا قاتل قسم کی چیز سمجھ رہے ہیں، علامہ اقبال روڈ والا سگنل توڑ کر ہم نے انہیں اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا پھر موٹر سائیکل سے جو میری جانب برسٹ فائر کیا گیا تھا۔ اس نے ہمیں مزید مشکوک کر دیا۔ پتا نہیں، ان دونوں موٹر سائیکل سوار افراد کا کیا ہوا ہوگا۔ میں اس لمحے کے بارے میں سوچ کر لرز اٹھا جب جدید ترین کلاشن کا بیرل میری جانب اٹھا ہوا تھا اور اب تب میں مجھ پر فائرنگ ہونے والی تھی۔ اگر میں بریک لگانے میں سیکنڈ کے دس ویں حصے کے برابر بھی تاخیر کر دیتا تو آج اپنی داستان بیان کرنے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ اتنے نزدیک سے کلاشن کوف کا برسٹ میرے بھیجے کو گاڑی کے اندر چاروں طرف اڑا دیتا۔ حملہ آور کلاشنکوف بردار کی ٹائمنگ میں کوئی فرق تھا اور نہ ہی اس کا نشانہ کچا تھا۔ اگر میں ذرا سی بھی کوتاہی کر دیتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اچانک شیرڈ رک جانے سے موٹر سائیکل کئی فٹ آگے نکل گئی اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ اسی ''خطا'' کے نتیجے میں ان کی موٹر سائیکل لہرا کر ایک شوروم کے گیٹ سے جا ٹکرائی تھی۔

میں نے بے ساختہ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی سفید بلی کو ممنونیت آمیز نظر سے دیکھا۔ اس نے میرے قدموں میں سرسراہٹ پیدا کر کے غیر ارادی طور پر مجھ سے بریک لگوا دیے تھے۔ گویا میری جان بچانے کا سہرا اسی کے سر بندھتا تھا۔

میراں محمد شاہ روڈ کے دو تین کٹ گزرنے کے بعد میں نے بیک ویو میں دور تک دیکھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا، لال قلعہ والے کارنر سے پولیس موبائل مڑ کر میری جانب سیدھی ہو چکی تھی۔ رہائشی علاقے کی سڑک پر آ کر میری اسپیڈ کم ہو گئی تھی جس کا فائدہ پولیس والوں نے اٹھایا البتہ ان کی ایک ''مہربانی'' میرے حق میں جاتی تھی اور وہ یہ کہ اب موبائل کا سائرن خاموش تھا۔ پتا نہیں، اس میں ان کی کیا مصلحت تھی!

موبائل کو ایک مرتبہ پھر اپنے تعاقب میں دیکھ کر میرے اعصاب تن گئے۔ رہائشی علاقے میں موبائل سے جان چھڑانے کے لیے چور سپاہی والا کھیل ضروری ہو گیا۔ میں نے ایک ذیلی اسٹریٹ میں شیرڈ کو موڑتے ہوئے اچانک اسپیڈ بڑھا دی۔ اس اسٹریٹ کے اختتام تک پہنچتے ہوئے میں موبائل سے اچھے خاصے فاصلے پر آ گیا۔ وہ جیسے ہی مذکورہ اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ میں ایک اور اسٹریٹ پر مڑ چکا تھا۔ میں اس وقت نہایت مہارت کے ساتھ ''کے ڈی اے اسکیم نمبر ون'' کی کشادہ اسٹریٹس پر پولیس والوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں انہیں گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ گزشتہ دو تین ٹرننگ کے وقت مجھے اپنے عقب میں پولیس موبائل دکھائی نہیں دی تھی۔ پہلے میرا ارادہ تھا، گھما پھرا کر اپنی گاڑی کو کارساز والی سڑک پر لے جاؤں گا لیکن پھر ایک صاف ستھری گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنا ارادہ فوراً ترک کر دیا۔

اس فوری اور حتمی تبدیلی کا سبب وہ گیٹ تھا جس کے اندر میں نے ایک چمچماتی بلیک ہونڈا سوک کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک خوبصورت عورت موجود تھی جو بہ آہستگی گاڑی کو بنگلے کے اندر لے گئی۔

مجھے یقین تھا، اس عورت نے میری شیرڈ کو نہیں دیکھا ہو گا۔ بہ فرضِ محال اگر دیکھا بھی تھا تو اس نے میری جانب دھیان نہیں دیا ہو گا۔ اس اسٹریٹ میں آغاز سے اختتام تک خاموشی اور سناٹا تھا۔ میں نے ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں اپنی شیرڈ کو اس کھلے ہوئے گیٹ سے بنگلے کے اندر داخل کر دیا۔

بلیک ہونڈا سوک ایک مخصوص راستے پر سفر کرتے ہوئے اپنے پورچ میں پہنچ چکی تھی۔ میں نے گیٹ کے اندر پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ طے کر کے شیرڈ کو بائیں جانب موڑ کر روک دیا۔ بنگلے کے سامنے والے حصے میں ایک خوبصورت سرسبز لان بنا ہوا تھا۔ میں نے لان کا حصہ گزرنے کے بعد ہی گاڑی کو بائیں جانب پختہ فرش پر روکا تھا۔

غالب امکان یہی تھا کہ میری اس ''جسارت'' پر وہ ہونڈا سوک والی بہت واویلا مچائے گی۔ میں اس کی اجازت حاصل کیے بغیر بڑی بے جگری سے اس کے بنگلے میں گھس آیا تھا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ عورت بڑے اطمینان سے اپنی گاڑی سے نکلی اور مجھ پر، یعنی میری گاڑی پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اس کا یہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر اور غیر فطری تھا۔ یہ سوچنا بے وقوفی کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ اس نے میری شیرڈ کو دیکھا نہیں ہو گا اور وہ میری وہاں موجودگی سے بے خبر ہوگی۔ میں نے اپنے زخمی کندھے کو مضبوطی سے تھاما اور بیک ویو میں بنگلے کے گیٹ کا جائزہ لینے لگا۔ جس جگہ میں نے شیرڈ کو روکا تھا

وہاں سے وہ گیٹ بالکل عقب میں پڑتا تھا۔ اس عورت نے بڑے سلیقے اور تحمل کے ساتھ گیٹ کو بند کر کے اندر سے بولٹ کیا اور نپے تلے قدموں سے میری جانب بڑھنے لگی۔

عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں، میں نے اس کا جائزہ لیا۔ وہاں اگرچہ زیادہ روشنی نہیں تھی لیکن میں اس کے سراپا کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا قد کسی بھی طور پانچ فٹ آٹھ انچ سے کم نہیں تھا وہ متناسب جسم کی مالک ایک پرکشش عورت تھی جس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے قریب لگایا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا، رنگت سانولی تھی جس کی وجہ سے اس کی کشش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک جاذبِ نظر اور خوبصورت عورت تھی جس کے حسن کی دلکشی میں کسی کلام کی گنجائش نہیں تھی۔

''کیا ساری رات اسی گاڑی میں گزار دو گے؟''

اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں اس کے سراپا میں اس قدر محو ہو گیا تھا کہ مجھے پتا ہی نہیں چل سکا، وہ کب میرے قریب پہنچ گئی تھی۔ میں نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر آ گیا۔

''اوہ! تم تو زخمی ہو۔'' اس نے میرے خون آلود کندھے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولی ''اندر آ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر کھڑے رہنا مناسب نہیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ مڑ کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کا یہ رویہ میری حیرت میں مزید اضافہ کر گیا۔ میں جس قسم کی صورتِ حال میں اس کے بنگلے میں وارد ہوا تھا، اس کے پیشِ نظر اسے کسی اور نوعیت کے ردِعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ میں اس سمجھ میں نہ آنے والی مہربان عورت کی راہنمائی میں بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ مختلف راہداریوں سے گھما کر وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی جو اپنی بیٹنگ سے بیڈروم نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک جہازی سائز بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سریلی آواز میں کہا۔

''تم یہاں آرام کرو۔ میں تمہارے زخمی کندھے کا کوئی بندوبست کرتی ہوں۔''

''تم کون ہو؟'' بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا۔

وہ زیرِ لب مسکرائی ''یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا۔ اگر نہیں پوچھا تو اس کا یہی مطلب ہے، میں تمہاری دشمن نہیں بلکہ دوست ہوں۔ ویسے میرا نام لیلیٰ ہے۔''

''لیلیٰ!'' میں نے دھیمی آواز میں دہرایا ''اگر تم میری دوست ہو تو پھر میں تمہیں یہ ضرور بتاؤں گا کہ اس وقت پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ تم مجھے پناہ دینے کے جرم میں کسی مصیبت میں بھی مبتلا ہو سکتی ہو۔''

وہ پُراعتماد لہجے میں بولی ''پناہ میں نے نہیں دی بلکہ تم از خود میرے بنگلے میں آئے ہو، بہرحال اٹ ڈزنٹ میٹر'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور کہا ''اس بنگلے میں تم بالکل محفوظ ہو۔ پولیس کا باپ بھی یہاں ناک نہیں کر سکتا۔ شاید تم نے بنگلے کے باہر نصب نیم پلیٹ کو نہیں دیکھا؟''

اس کے اعتماد سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی توپ قسم کی شے ہے۔ میں نے واقعی نیم پلیٹ کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ میں نے لیلیٰ کے سوال کے جواب میں نفی میں گردن ہلائی اور پوچھا ''نیم پلیٹ پر کیا لکھا ہوا ہے؟''

''بتا دوں گی۔'' وہ بے اعتنائی سے بولی ''پہلے تمہارے کندھے کے علاج معالجے کے سلسلے میں کچھ کوشش کر لوں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم آرام سے بستر پر لیٹ جاؤ۔''

میں نے لیلیٰ سے زیادہ جرح نہ کی اور اس کے مشورے کے مطابق بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ بیڈ سائیڈ پر ایک خوبصورت جدید قسم کا ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں تمہارا فون استعمال کر سکتا ہوں؟''

''میں تمہاری دوست ہوں۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی ''تم اس بنگلے کی ہر چیز کو بے دریغ استعمال کر سکتے ہو۔''

اس کی مسکراہٹ بڑی دل آویز اور دل نشین تھی۔ اس نے پیازی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو اس کی سانولی رنگت کی دلکشی کو مہمیز کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نمک کی کان نے لباس پہن کر لیلیٰ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ مجنوں کی لیلیٰ تو سیاہ رات کے مانند کالی تھی لیکن میرے سامنے جو لیلیٰ کھڑی تھی وہ اپنی رنگت اور سنگت سے کسی بھی ذی ہوش کو مجنوں بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

میں اس وقت لیلیٰ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ان آنکھوں میں بے پناہ لپک تھی۔ یوں لگتا تھا وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ آنکھوں کے مقام پر دو طاقت ور مقناطیس فٹ کر دیے گئے ہوں۔ وہ کسی ساحرہ کی آنکھیں تھیں جو اپنے سامنے موجود ہر شے کو مسخر کرنے پر قدرت رکھتی تھیں۔ میں نے ایسی آنکھوں والی عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میں شاید اس کی آنکھوں میں دیکھتا چلا جاتا کہ وہ اچانک مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں بیڈروم میں اکیلا رہ گیا۔ اس اکیلے پن نے مجھے احساس دلایا کہ تھوڑی دیر پہلے میں

جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا، کسی ان دیکھی، ان جانی قوت کے زیرِ اثر عمل کر رہا تھا۔ لیلیٰ کا رویہ حیرت انگیز اور پراسرار تھا۔ کسی غیر شخص کو اس طرح اپنے بنگلے میں گھستے دیکھ کر اسے جو فطری ردِ عمل ظاہر کرنا چاہیے تھا، اس نے اس کے بالعکس کیا تھا اور میں...... میں بھی اس کے مشورے کو بلا چون و چرا مان کر بیڈ روم تک چلا آیا تھا۔

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے پچاسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے پھر میں پیش آمدہ صورتِ حال میں لوٹ آیا۔ ساحل سے جدائی کے تصور نے لیلیٰ کا سراپا اور اس کا طرزِ عمل دھندلا دیا اور میں نے کندھے کی تکلیف کو فراموش کر کے ٹیلی فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ سب سے پہلے میں نے ''نبی سر'' میں قاضی سلطان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری گھنٹی پر ادھر سے ریسیور اٹھایا گیا۔ میرے ''ہیلو'' کہنے کے جواب میں ایک نسوانی آواز ائرپیس میں ابھری۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''میں وجدان بات کر رہا ہوں کراچی سے۔ قاضی صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ ابھی ابھی حویلی سے نکلے ہیں۔'' دوسری جانب سے جواب ملا ''میں ممتاز کی اماں رخسانہ بیگم بول رہی ہوں۔'' لہجہ سندھی انداز کا تھا تاہم وہ بات اردو میں کر رہی تھی ''کراچی سے منہاس باقر کا فون آیا تھا۔ انہوں نے فوری طور پر قاضی سلطان کو بلایا ہے۔''

اس کی بات سے ظاہر ہو رہا تھا، منہاس باقر نے انہیں ممتاز کے اغوا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا یا اگر کچھ بتایا بھی تھا تو وہ قاضی نے خود تک محدود رکھا تھا، اپنی بیگم کو اس سانحاتی اطلاع کی ہوا بھی لگنے نہیں دی تھی۔

میں نے سوال کیا ''منہاس باقر نے قاضی صاحب کو کس سلسلے میں کراچی بلایا ہے؟''

''سلسلہ تو مجھے پتا نہیں۔'' وہ فکرمندی سے بولی ''کسی ضروری کام ہی سے بلایا ہوگا۔''

میں نے پوچھا ''قاضی صاحب کو حویلی سے نکلے ہوئے کتنی دیر ہوئی ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ! پھر تو ممکن ہے، وہ ابھی وہاں سے روانہ ہوئے ہوں۔''

''اگر تم کہو تو میں ملازم کو بھیج کر پتا کرواتی ہوں۔'' رخسانہ بیگم نے کہا ''خیریت تو ہے نا؟''

میں نے پہلے رخسانہ بیگم کو دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آواز سنی تھی۔ یہ ہمارے درمیان پہلا صوتی رابطہ تھا۔ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''فوراً کسی کو دوڑائیں۔ یہ بے حد ضروری ہے...... اشد ضروری!''

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔ وہاں خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے۔'' میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

وہ تڑپ کر بولی ''میری ممتاز تو ٹھیک ہے نا؟''

''آپ وقت ضائع کر رہی ہیں خاتون۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''اچھا، اچھا۔'' وہ بے تابی سے بولی ''تم ہولڈ کرو۔ میں بھیجتی ہوں کسی ملازم کو۔''

دو منٹ بعد قاضی سلطان لائن پر موجود تھا۔

''ہیلو'' کے بعد اس کی گھبرائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ''وجدان! یہ کیسے ہو گیا۔ ممتاز کے تعاقب میں وہ سور کا تخم کراچی کیسے پہنچ گئے۔ میں نے تو اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھنکوا دیا تھا۔''

میں نے کہا ''ان معاملات کی تفصیل میں جانے کا وقت ہے اور نہ ہی موقع۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب آپ کو میری ہدایت پر فوراً عمل کرنا ہے...... اگر ممتاز کی بہ خیریت واپسی چاہتے ہیں تو!''

''ہاں، ہاں۔'' وہ جلدی سے بولا ''میری ممتاز کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ تم کیا مشورہ دیتے ہو۔ منہاس نے تو مجھے فوری طور پر کراچی آنے کو کہا ہے۔''

''خدا کا شکر ہے، آپ حویلی سے روانہ نہیں ہوئے تھے ورنہ آپ سے رابطہ نہ ہو پاتا۔'' میں نے کہا ''آپ ہرگز ہرگز کراچی نہیں آئیں۔ ممتاز یہاں سے روانہ ہو چکی ہے۔''

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا ''کہاں کے لیے روانہ ہو چکی ہے؟''

''عمرکوٹ کے لیے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا واقعی!'' اس کی آواز میں بے پناہ حیرت تھی ''تمہاری فراہم کردہ اس اطلاع کی صحت میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تو نہیں؟''

''ناٹ ایٹ آل!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اس نے پوچھا ''وہ کراچی سے کب روانہ ہوئی ہے؟''

تارا نے کشمیر روڈ والے بنگلے پر مجھے بتایا تھا کہ تھوڑی دیر بعد ممتاز کو عمرکوٹ روانہ کر دیا جائے گا۔ جب وہ مجھے یہ اطلاع

[...]ے رہا تھا اس وقت لگ بھگ رات کے آٹھ بجے تھے۔ اس [...]ہی مطلب تھا، وہ آٹھ اور نو بجے کے درمیان وہاں سے عمر[...]ٹ بھیجی جانے والی تھی۔ قاضی سلطان کے سوال و جواب [...]، میں نے کہا۔

''میری معلومات کے مطابق ممتاز کو ساڑھے آٹھ بجے [...]اں سے عمرکوٹ کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔ اسے سیدھا [...]را اکبر سومرو کے بنگلے پر پہنچایا جائے گا؟''

''تو وہ خبیث بھی آزاد ہو گیا!'' قاضی نے نفرت آمیز [...]از میں کہا۔

میں نے کہا ''قاضی صاحب لگتا ہے، آج کل آپ [...]لاتِ حاضرہ سے زیادہ باخبر نہیں ہیں، یہ دونوں شیطان کچھ [...]صہ پہلے جوڑ توڑ اور مک مکا کر کے قانون کے شکنجے سے نکل [...]ئے تھے۔ تارا نے اسی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے ممتاز کو اغوا [...]رنے کا پروگرام بنایا تھا۔ بدقسمتی سے میری دوست ساحل [...]ل اس لپیٹے میں آ گئی۔''

''مجھے منہاس باقر نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' وہ گہری [...]ردگی سے بولا ''مجھے ساحل کے اغوا کا دکھ ہے وجدان۔ [...]ؤ، میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے سنجیدگی سے کہا ''فی الحال آپ ساحل کو بھول [...]ائیں۔ اس کی تلاش اور واپسی کا بیڑا میں نے اٹھا لیا ہے۔ [...]ب اپنی بیٹی ممتاز کی صحیح سالم واپسی کے لیے فوراً حرکت میں [...] جائیں۔ اس سلسلے میں آپ اپنے ایس پی سالے سے مدد [...]ل۔ وہ عمرکوٹ میں خاصا اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ وڈیرے کی [...]یلی اور بنگلے کی جانب جانے والے ہر راستے کی سنجیدہ [...]کابندی کی جائے تو مغوی ممتاز کو بہ آسانی بازیاب کیا جا سکتا [...]ہے۔ عمرکوٹ تک پہنچنے میں انہیں ابھی کافی وقت لگے گا، گویا [...]پ کے پاس ہاتھ پاؤں، اور ذہن کو کام میں لانے کے لیے [...]اصا وقت ہے۔ آپ چاہیں تو یہ بازی آپ کے حق میں [...]لٹ سکتی ہے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کرتے ہوئے [...]ضافہ کیا ''ویسے آپ کے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔ میں [...]نے دوزخ مکانی تارا کو اپنی آنکھوں کے سامنے جہنم واصل [...]ہوتے دیکھا ہے۔ اس کی آخری چیخوں نے میرے آبلہ جگر کو [...]بہت سکون پہنچایا تھا۔''

''تم فکر نہ کرو وجدان۔'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں [...]بولا ''میں بھی عن قریب تمہیں ایک عظیم خوش خبری سناؤں [...]گا...... جب اکبر سومرو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی کی بھیک مانگے [...]گا اور زندگی کے نام پر اسے کچھ نہیں ملے گا...... اور اگر اسے [...]کچھ ملے گا بھی تو وہ ہوگی موت، ایک دردناک موت......

ایک عبرت انگیز اور نفرت آمیز موت!''

''انشا اللہ!'' میں نے تیقّن سے کہا۔

قاضی سلطان بولا ''میں ابھی منہاس باقر کو فون کر کے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔'' پھر کسی فوری خیال کے تحت اس نے پوچھا ''تم نے منہاس کو تو اس سلسلے میں سب کچھ بتا دیا ہے نا؟''

میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ''آپ نے فون کرنا ہی ہے تو اپنے سالے سے رابطہ کریں اور ممتاز کو بہ حفاظت دشمنوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیں۔ منہاس باقر کو میں خود ہی سب سمجھا دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ جلدی سے بولا پھر پوچھا ''تم نے ممتاز کی اماں کو تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا نا؟''

''میں نے کہا'' واضح طور پر کچھ نہیں۔''

''اب اسے حقیقتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا ''ابھی تک میں نے ممتاز کے اغوا کے سلسلے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اس وقت بھی دوسرے کمرے میں ہے۔''

پھر ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ ختم ہو گیا۔

میں نے دوسرا فون منہاس باقر کے بنگلے پر کیا۔ جلد ہی وہ فون پر آ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد میں نے اسے حالاتِ حاضرہ کے بارے میں بتایا اور تھوڑی دیر پہلے قاضی سلطان سے ہونے والی گفتگو سے بھی آگاہ کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

''وجدان! میں تمہاری حاضر دماغی اور معاملہ فہمی کو مان گیا ہوں۔ تم نے قاضی سلطان کو وہاں روک کر بہت سمجھ داری کا ثبوت دیا ہے۔ اس طرح ممتاز کی بازیابی زیادہ آسان ہو جائے گی۔''

''یہ وقت کا تقاضا تھا منہاس صاحب!'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''تم یہ نہ سمجھنا مجھے تمہاری دوست ساحل کے اغوا کا افسوس نہیں۔ یقین جانو، وہ بھی میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے ممتاز یا جیسے شبانہ۔''

''میں آپ کے جذبات اور احساسات کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔''

''تم مجھے بتاؤ، میں تمہاری دوست کے حصول کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''میں آپ کی پیش کش کی قدر کرتا ہوں۔'' میں نے کہا ''مجھے جب بھی آپ کی مدد یا تعاون کی ضرورت ہوئی، میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔ فی الحال موجودہ حالات جو رخ

اختیار کر چکے ہیں۔ اس کے پیشِ نظر مجھے خود ہی اپنے دشمنوں سے نمٹنا ہے۔ میں آپ کو یہ بتا ہی چکا ہوں، اغوا کنندگان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

میں نے منہاس باقر کو نہایت ہی محفوظ اور چیدہ چیدہ باتیں بتائی تھیں۔ یہ حالات کا تقاضا اور میری مجبوری بھی تھی۔ میں نہ تو کھل کر اس کے سامنے آسکتا تھا اور نہ ہی مکمل پردہ پوشی ممکن تھی۔ وہ بہت سمجھ دار اور بردبار شخص تھا۔ جہاں دیدہ اور سرد و گرم چشیدہ۔ اس سے بات کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا تھا۔

میری بات سننے کے بعد اس نے کہا "میری دعا ہے، اللہ تمہیں جلد از جلد کامیاب کرے۔ تم اس مشن سے سرخ رو ہو جاؤ تو پھر میں بھی تمہیں ایک نہایت ہی اہم ذمے داری سونپنا چاہتا ہوں۔"

"کیسی ذمے داری؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ بولا "ابھی میں خود اس سلسلے میں بہت الجھا ہوا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا، ایک بہت ہی منظم گروہ کراچی میں کام کر رہا ہے۔ مقامی افراد کے اس گروہ کے پیچھے درحقیقت یہودی لابی اپنا کام کر رہی ہے۔ میں اسی گروہ سے متعلق تحقیقاتی کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے، تم وہ کام کر گزرو گے جو دوسروں کے لیے ناممکن ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ جس گروہ پر کام کر رہے ہیں اس کی سرگرمیاں کس نوعیت کی ہیں؟"

"بہت ہی پراسرار نوعیت کی۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "ان کے کام اور کردار کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ یہودیوں کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ اس گروہ کے تمام اراکین ہم میں سے ہیں، ہمارے ہی بھائی بند ہیں اس لیے عام لوگ ان کے درپردہ عزائم تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ ان کے ظاہرہ مثبت اور تعمیری کاموں پر نظر رکھتے ہیں مگر میں کسی بہت بڑے طوفان کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں، میں نے کچھ شواہد بھی جمع کیے ہیں لیکن ابھی تک کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اگر تم میرے ساتھ مل کر کام کرو تو ہم بہت جلد کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ یہودی لابی بہت ہی مکاری اور عیاری دکھا رہی ہے۔"

"آپ نے جو شواہد جمع کیے ہیں اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کہ شہر میں دہشت گردی اور بدنظمی کی جو وارداتیں آئے دن سننے اور دیکھنے میں آرہی ہیں، اس کے پیچھے اسی گروہ کا ہاتھ ہے۔ وہ یہودیوں کے کسی نہایت ہی خاص مقصد کے لیے، ملک اور حکومت کو بدنام کرنے کے لیے اس قسم کی سنگین وارداتیں کرتے پھر رہے ہیں۔ انشاء اللہ بہت جلد میں اس گروہ کو بے نقاب کر کے ان کا کچا چٹھا کھول دوں گا۔ یہودیوں کے ناپاک عزائم کبھی پورے نہیں ہو سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے، اس موضوع پر فرصت سے بات کریں گے۔" میں نے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد میں نے ساؤتھ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہونے پر میں نے ائرپیس میں کبیر شاہ کی آواز سنی۔ وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا "تم کہاں رہ گئے بھئی؟"

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے اب تک کی کارروائی کی مختصر کہانی سنائی جہاں اسے میرے کارناموں پر خوشی ہوئی، وہیں ساحل کے اغوا والے واقعے نے اسے شدید رنج بھی پہنچایا۔ اس نے مناسب الفاظ میں مجھے دلاسا دیا اور دشمنوں کے دانت کھٹے کرنے بلکہ دانت توڑنے کے عزائم کا اظہار کیا۔ میں نے اس کے اظہارِ خیال کے اختتام پر پوچھا "شعیب صاحب آگئے ہیں نا؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا "میری ان سے بات کراؤ۔"

"شعیب صاحب اس وقت ساؤتھ میں نہیں ہیں۔"

"پھر کہاں ہیں؟"

"انہیں ایک ضروری کام کے سلسلے میں سینٹرل جانا پڑ گیا۔" کبیر شاہ نے بتایا "ایک گھنٹا پہلے وہ یہاں سے گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "سینٹرل میں ان سے رابطہ ہو سکتا ہے؟"

"آں...... ہاں......" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "ہو تو سکتا ہے لیکن...... میں پہلے ان سے پوچھ لوں۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ......"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے، فی الحال رہنے دو شاہ جی۔ صبح دیکھیں گے۔" میں نے گویا اس کی مشکل آسان کر دی۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" کبیر شاہ نے پوچھا۔

"سمجھ لو، ایک دوست کے پاس ہوں۔" میں نے کہا "اور محفوظ ہوں۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا "رات میں اگر باس کا فون آگیا تو میں انہیں تمہارے بارے میں تفصیلاً بتا دوں گا۔ تم صبح سیدھے ساؤتھ چلے آؤ۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے یہ کہہ کر ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

میرے مرحوم دوست امتیاز کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ کراچی کے پانچ اضلاع میں شعیب غوری نے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے جو انہی اضلاع کے نام سے منسوب تھے۔ "ساؤتھ" اور "ایسٹ" میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایسٹ والا ٹھکانا ہل پارک کے نزدیک تھا اور "ساؤتھ" ڈیفنس میں پارک والی مسجد کے قریب۔ "سینٹرل" نارتھ ناظم آباد میں تھا۔ "ویسٹ" اور "ملیر" کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر تھیں۔ یعنی ان ٹھکانوں کے بارے میں!

کبیر شاہ عرف شاہ جی ساؤتھ کا قائم مقام تھا اور اس کی تنظیمی مجبوریوں کو میں بہ خوبی سمجھ سکتا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اس سے زیادہ جرح، کرید یا اصرار نہیں کیا۔ میں یکے بعد دیگرے اسی ٹیلی فونک گفتگو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ لیلیٰ بیڈروم میں داخل ہوئی۔ وہ ابھی تک اسی پیازی رنگ کے لباس میں تھی۔

اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس دیکھ کر میں سمجھ گیا، وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میرے نزدیک آ کر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ فرسٹ ایڈ باکس کو اس نے سائیڈ میں رکھ دیا۔ میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں ایک والہانہ نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں کوئی بجلی بھری تھی۔ مجھے اپنے تن بدن میں ایک سنسنی سی اترتی محسوس ہوئی۔ وہ میری کیفیت کو تاڑتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور تبسم ریز انداز میں مستفسر ہوئی۔

"اگر تم ٹیلی فون سے فارغ ہو چکے ہو تو میں اپنا کام شروع کروں؟"

میں نے کہا "ٹیلی فونک معاملات سے تو میں نمٹ چکا ہوں مگر تم کون سا کام شروع کرنے والی ہو؟"

جواب دینے کے بجائے اس نے فرسٹ ایڈ باکس کو تھپتھپایا اور مخصوص انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کلیوں کے چٹخنے کا تاثر پایا جاتا تھا۔

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے پوچھا "کیا تم ڈاکٹر ہو؟"

"ڈاکٹر تو نہیں ہوں مگر تمہاری مشکل کو بہ آسانی حل کر سکتی ہوں۔" اس نے فرسٹ ایڈ باکس کو کھولتے ہوئے کہا "ویسے کسی زمانے میں، میں نے نرسنگ کا کورس بھی کیا تھا۔"

میں نے اپنا گھائل بازو اس کے سامنے رکھ دیا اور آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا "میرا ذہن تمہارے بارے میں سیکڑوں سوالات تیار کر چکا ہے۔ تمہاری ان مہربانیوں کو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ تمہاری ہر ہر ادا، ہر ہر رویہ سیکڑوں ہزاروں سوالات کو جنم دیتا ہے۔"

"فی الحال تم اپنے ذہن کو نہ تھکاؤ۔ تمہارے ہر سوال کا منطقی جواب تمہیں مل جائے گا۔" وہ میرے زخمی کندھے کا معائنہ کرتے ہوئے بولی "تم اطمینان سے ایک مہربان، قدر دان دوست کی مہربانیوں سے استفادہ کرو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

اس کے بعد میں نے خاموشی اختیار کر لی۔ تھوڑی دیر کے معائنے کے بعد اس نے بتایا "شکر کرو، گولی تمہارے کندھے کا گوشت پھاڑتے ہوئے گزر گئی۔ اگر وہ کندھے کے اندر گھس کر بیٹھ جاتی تو پھر آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس صورت میں ہڈی کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ بہرحال" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بولی "تم اپنی شرٹ اتار دو، تاکہ میں بہ آسانی تمہاری مرہم پٹی کر سکوں۔"

میں ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ گولی میرے کندھے کے اندر دھنسی ہوئی ہے۔ دراصل پچھلے دو گھنٹے میں، میں جن جان لیوا اور سنسنی خیز حالات سے گزرا تھا ان میں، میں صحیح طور پر اپنے گھائل کندھے کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ مجھے اتنا موقع اور فرصت میسر نہیں آئی تھی کہ میں کندھے کا معائنہ کر سکوں۔ کشمیر روڈ والے بنگلے پر جب میں نے اپنے بائیں کندھے میں آگ سی اترتی محسوس کی تھی تو یہی سمجھا کہ چھت سے ری باؤنڈ ہو کر کوئی گولی میرے کندھے میں گھس گئی ہے۔ لیلیٰ کی اطلاع میرے لیے خاصی حوصلہ افزا تھی۔ گولی میرے کندھے سے "بغل گیر" ہو کر رخصت ہو گئی تو اس میں میرا ہی فائدہ تھا ورنہ اگر وہ وہاں "سکونت" اختیار کر لیتی تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔ پہلے ہی کچھ کم مصیبتیں کھڑی تھیں جو ایک کا مزید اضافہ ہو جاتا!

میں نے لیلیٰ کی ہدایت پر اپنی خون آلود شرٹ اتار دی۔ وہ بڑے انہماک سے میرے کندھے کی "خاطر داری" میں مصروف ہو گئی۔ اس کی کارروائی کے دوران میں، میں اپنے کندھے میں خاصا درد محسوس کر رہا تھا۔ بعض اوقات تو تیس ناقابلِ برداشت حد کو چھونے لگتی مگر میں اپنے دانتوں پر دانت جمائے وہ تکلیف سہتا رہا۔ آدھے گھنٹے کی ڈاکٹری کے بعد لیلیٰ نے اپنے کام سے فارغ ہو کر فرسٹ ایڈ باکس بند کر دیا پھر کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"تمہاری خون آلود شرٹ تو میں نے اتروا دی لیکن میں

...ہ رہی ہوں، تمہاری پتلون کی حالت بھی خاصی ناگفتہ بہ ہے۔" پھر اس نے بیڈروم کے اٹیچڈ واش روم کی جانب ...ارہ کیا اور بولی "وہاں ایک نیو برانڈ سلیپنگ سوٹ ٹنگا ہے۔ ...فریش ہو کر وہ لباس پہن لو۔ میں تمہارے لیے پین کلر دوا ...لے کر آتی ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑا ہوتا، وہ ...ٹ ایڈ باکس اٹھا کر بیڈروم سے نکل گئی۔ میں اس مہربان ...ہی دوست کے بارے میں سوچتے ہوئے واش روم میں ...ھس گیا۔ وہ ایک معما ثابت ہو رہی تھی۔ سوچنے سے مزید ...ہو جاتی تھی۔

واش روم میں ایک نیا نکور سلیپنگ سوٹ موجود تھا۔ وہ ...ٹ مردانہ تھا جس سے ظاہر ہوا، اس بنگلے میں لیلیٰ کے علاوہ ...وئی مرد بھی رہتا تھا لیکن میں جب سے اس بنگلے میں آیا تھا ...لیٰ کے سوا کسی کو دیکھا تھا اور نہ ہی سنا تھا۔ اس سلیپنگ سوٹ یا ...رد کے بارے میں لیلیٰ ہی کوئی وضاحت کر سکتی تھی۔

دس منٹ کے بعد میں تر و تازہ ہو کر واش روم سے نکل ...یا۔ لیلیٰ بیڈروم میں موجود تھی اور بیڈ شیٹ کو درست کر رہی ...ی۔ ایک ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس نے بستر کی ...چادر کو بدل دیا تھا۔ میرے زخمی کندھے نے پہلے والی چادر کو جا ...بجا داغ دار کر دیا تھا۔

کمرے میں میری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے لیلیٰ ...نے کہا "دراصل وہ شیٹ خاصی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے نئی ...شیٹ بچھا دی ہے۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں ابھی آتی ...ہوں۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ میری بات سنے بغیر ایک مرتبہ ...ھر کمرے سے نکل گئی۔ میں بستر کی اجلی مخملیں چادر پر نیم دراز ...ہو کر خود کو پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں ...سوچنے لگا۔ میرے لیے یہ لمحات موت اور زندگی کے کھیل میں ...گزرے تھے اور خالد بن ولید روڈ پر تو موت مجھ سے چند انچ ...کی دوری پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ اگر وہ محسن سفید بلی میرے ...قدموں میں نہ کسمساتی تو میں بے اختیار بریک لگانے پر مجبور ...نہ ہوتا۔ میرا وہ عمل غیر ارادی اور اچانک تھا جس نے مجھے ...موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا تھا...... اور اس عمل کا محرک ...و سبب وہ سفید بلی تھی۔ گویا اس مرحلے پر سفید بلی نے مجھے ...موت کے جبڑوں سے کھینچ کر نکالا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ ...کر بیٹھ گیا۔

میرا ذہن تیزی سے اس دست گیر بلی کے بارے میں ...سوچنے لگا۔ میں کافی دیر سے اس بلی کو بھولا بیٹھا تھا۔ کیوں؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک اس بلی کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ جب میں لال قلعہ کے پہلو میں میراں محمد شاہ روڈ پر مڑا تھا تو وہ بلی میری شیرڈ کی پسنجر سیٹ پر بے نیازی سے بیٹھی اپنا سر کھجا رہی تھی۔ اس کے بعد پولیس والوں سے آنکھ مچولی کے دوران میں میرا دھیان اس طرف سے ہٹ گیا تھا اور اب...... وہ اچانک ہی میری سوچ کا مرکز بن گئی تھی۔ میں اس بلی کے بارے میں پریشان ہو گیا۔

میں نے سوچا، لیلیٰ سے اس سفید بلی کے بارے میں پوچھوں گا۔ شیرڈ سے نکل کر میں لیلیٰ کے ساتھ ہی اس بیڈروم تک پہنچا تھا۔ اس بلی سے متعلق وہی مجھے کوئی تسلی بخش بات بتا سکتی تھی۔ میں بے چینی سے لیلیٰ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

میرا یہ انتظار جلد ہی ختم ہو گیا۔ لیلیٰ ایک بدلے ہوئے روپ کے ساتھ بیڈروم میں داخل ہوئی۔ اس نے گلابی رنگ کی نائٹی پہن رکھی تھی جس کا کپڑا بہت نفیس اور مہین تھا۔ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں والی صورت حال تھی۔ اس حریری لباس میں وہ کسی قیامت سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ ملکوتی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بڑی سبک خرامی سے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ ہاتھ میں اس نے ایک قیمتی طشتری اٹھا رکھی تھی جس پر ایک بلوری گلاس دکھائی دے رہا تھا۔ اس گلاس میں مشروب ٹائپ کوئی شے نظر آ رہی تھی جس کا رنگ کندنی تھا۔

میرے پاس آ کر اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی طشتری آگے بڑھائی پھر بڑے دل آویز انداز میں بولی "یہ پی لو۔ اس سے تمہارے زخم کی تکلیف جاتی رہے گی اور انفیکشن کا بھی کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔"

"مگر تم تو کوئی پین کلر میڈیسن لینے گئی تھیں۔!" میں نے اس کے سراپا سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔ اس پر نظر ٹکائے رکھنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

وہ دل بریں لہجے میں بولی "اس مشروب کو تم پین کلر ہی سمجھو۔ یہ تمہاری تمام تکالیف دور کرنے کے ساتھ ساتھ تمہارے دل و دماغ اور جسم کو تقویت بھی دے گا۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ بلوری گلاس اٹھایا اور اس میں موجود کندنی مشروب کا ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ مشروب انتہائی شیریں، خوش ذائقہ اور خوشبودار تھا۔ مجھے اپنے جسم و جان میں ایک سکون بخش ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی۔ اس ٹھنڈک میں ایک ناقابلِ فہم سی آنچ بھی شامل تھی۔ شاید میں اس کیفیت کو صحیح طور پر بیان نہیں کر پا رہا۔ وہ مشروب اتنا پُراثر تھا کہ میری قوتِ بیان کو بھی متاثر کر رہا تھا۔

میں اس کی کیف آوری کو بہ خوبی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے مزید دو گھونٹ لینے کے بعد پوچھا ”کیا یہ مشروب بازار میں عام فروخت ہوتا ہے؟“ میری آواز میں سرور کی آمیزش تھی۔

جواب دینے سے پہلے وہ مخصوص انداز میں مسکرائی پھر نفی میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے بولی ”یہ مشروب تمہیں پوری مارکیٹ میں نہیں ملے گا کیوں کہ اسے میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ دنیا کا کوئی مشروب اس سے زیادہ فرحت بخش نہیں ہوسکتا۔“

”وہ تو میں محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور گلاس میں بچے ہوئے مشروب کو ایک ہی بڑے گھونٹ سے اپنے اندر اتار لیا۔ اس کے بعد میں نے خالی گلاس کو واپس طشتری میں رکھتے ہوئے پوچھا ”اس ہوم میڈ مشروب کا تم نے کوئی نام تو رکھا ہوگا؟“

وہ ہاں میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”اس کا نام جامِ اُمید“ رکھا ہے لیکن یہ نام صرف مجھ تک محدود ہے یا پھر میں تمہیں بتا رہی ہوں۔“

”اچھا ہے...... بہت اچھا ہے۔“ میں نے گلابی نائٹی کے اندر جھلملاتی ہوئی لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بے مثال...... لاجواب ہے...... باکمال ہے۔“

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”تم اس مشروب کے نام کی تعریف کر رہے ہو یا میری؟“

اس کا یہ پُرمعنی سوال برمحل تھا۔ میں اس وقت بے ساختہ اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ”دونوں کی۔“

وہ میرے بیڈ کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھی تھی، کرسی کو بیڈ کے مزید قریب کرنے کے بعد اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے ایک نرم سی گرماہٹ اپنے سر میں اترتی محسوس ہوئی۔ اس گرماہٹ میں لذتِ حیات شامل تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ میں نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔ میری آواز میں خمار شامل تھا۔

”نرسنگ۔“ اس نے یک لفظی جواب دیا۔

”نرسنگ!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”آپریشن کے بعد آپریٹیڈ باڈی کو ریکوری روم میں رکھا جاتا ہے۔ جب متعلقہ شخص ہوش میں آجاتا ہے تو اسے روم یا وارڈ میں شفٹ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد نرسنگ شروع ہوجاتی ہے۔“ اس نے تھوڑا توقف کر کے میری آنکھوں میں جھانکا پھر سلسلۂ کلام کو اپنی مخصوص مسکراہٹ کی آمیزش سے جاری رکھتے ہوئے بولی ”تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے کندھے کی ہلکی پھلکی سرجری کی ہے۔ چوں کہ اس عمل کے دوران میں تمہیں بے ہوش نہیں کیا گیا۔ اس لیے ریکوری روم میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تم براہِ راست اپنے بیڈ پر ”منتقل“ کیے جاچکے ہو لہٰذا نرسنگ کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔“

بات ختم کرتے ہی وہ کرسی سے اٹھی اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھ کر ہولے ہولے میرا سر دبانے لگی۔ اس کی سانولی ہتھیلی کی حرارت بخش گداز میرے تن میں اترنے لگا۔ میں بھول گیا کہ اس سے سفید بلی کے بارے میں استفسار کرنا تھا۔ اس وقت میں پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ وہ ”نرسنگ“ کے دوران میں مجھے اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے بیان میں اتنی کشش تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان اسے چھوڑ کر کہیں ادھر ادھر بھٹکنے کے لیے نہ جا سکا۔ وہ دل نشیں آواز میں کہہ رہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔

”میں ایک ممتاز سیاست داں کی بیوہ ہوں۔ ایک سال پہلے میرے شوہر سعید خان کا انتقال ہوگیا تھا۔ سعید خان میرے لیے اتنا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوا کہ مجھے معاش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بنگلا، گاڑی اور بینک بیلنس، سب کچھ ہے میرے پاس۔ میں نے مختلف جگہوں پر بہت بھاری اور محفوظ انویسٹمنٹ کر رکھی ہے جس سے مجھے لگ بھگ تین لاکھ روپے ماہانہ پرافٹ مل جاتا ہے۔ یہ رقم میرے پورے مہینے کے اخراجات کے لیے بہت کافی ہوتی ہے۔“

میں نے پرافٹ کی رقم پر حیرت کا اظہار کیا اور کہا ”تمہارا شوہر تو جاتے جاتے تمہیں ہر معاشی اور مالی غم سے آزاد کر گیا لیکن تم جو کچھ کر رہی ہو کبھی اس کے بارے میں سوچا ہے؟ اس وقت تمہارے مرحوم شوہر کی روح کو کس قدر اذیت پہنچ رہی ہوگی!“

میں نے الفاظ ”جو کچھ“ پر زور دیا تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی ”تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ سب کچھ پہلی اور آخری مرتبہ ہے۔“

”پہلی مرتبہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔“ میں نے کہا ”آخری مرتبہ کیوں کر؟“

وہ قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی ”اب ضروری نہیں کہ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں۔ کچھ ان کہی اور ان سنی بھی رہنے دو۔“

بات ختم کرتے ہی وہ مجھ سے صفرانچ کے فاصلے پر آگئی۔ ...نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اس کوشش میں ...ی کامیابی ہوئی۔ میں آنکھیں نیم وا کر کے رہ گیا۔ اس ...م امید نامی مشروب کے اثرات اب کھل کر سامنے آگئے ...ے۔ یقیناً اس میں دردکش اجزا کے ساتھ ساتھ کچھ مسکّن اشیا ...ی شامل کی گئی تھیں۔ مجھے خمار کی سی کیفیت محسوس ہوئی لیکن ...ی دوران میں لیلیٰ اپنا رنگ دکھا چکی تھی۔

سیاہ رات، دن کے اجالے کو نگل جاتی ہے۔ لیلیٰ کے ...ولے پن میں سرے ایسی جاذبیت تھی۔ میں سرے کی اس ...ن میں بھٹک کر رہ گیا۔ وہ کسی سیاہ ریشمی تھان کی طرح مجھ ...لتی اور مجھے کھولتی چلی گئی۔ احتیاط اور تکلف کے سارے بند ...وئے تو میں بےخودی اور خود فراموشی کی منزل پر کھڑا تھا۔

☆☆☆

علی الصباح میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک طویل ...ڑائی لیتے ہوئے بدن کو کھینچا اور گہری سانس لیتے ہوئے ری...س ہوگیا۔ میرا جسم پھول کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا ...زشتہ ساری کلفت، الفت میں بدل گئی تھی لیکن اب وہ ...یت جاتی رہی تھی۔ میں ٹرانس اور بےخودی کی حالت سے ...ر آیا تھا۔ جب میرے حواس بہ جا ہوئے تو میں نے خود کو ...قت کی اذیت ناک دنیا میں پایا۔ مجھے درپیش حالات رہ ...کر ستانے لگے۔ ساحل کی یاد ایک کسک بن کر میرے دل ...ں جاگزیں ہوچکی تھی۔ اس کی جدائی نے میرے جگر میں جو ...اؤ ڈالا تھا۔ وہ زمانے کی کسی بھی شے سے بھر نہیں سکتا تھا۔ ...کی، اس کجی اور اس خلا کو صرف اور صرف ساحل کی ذات ...ور کر سکتی تھی۔

گزشتہ رات کے ”واقعات“ کے بارے میں سوچتے ...ئے مجھے خود پر حیرت ہونے لگی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ...ان منازل سے گزر گیا! پھر میری یہ حیرت افسوس میں ...نے لگی۔ وہ سب کچھ غیرارادی طور پر محسوس ہوگیا تھا۔ پتا ...نہ، لیلیٰ نے مجھے کیسا طلسمی مشروب پلایا تھا کہ میں بے چون ...و چرا اس کے اشاروں پر عمل کرتا گیا، اس کے کنایوں کو سمجھتا ...گیا اور اس کی اداؤں کو محسوس کرتا گیا۔

پھر مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ تھوڑی دیر قبل تو حیرت ...اس میں بدلی تھی۔ اب یہی افسوس، پشیمانی کی شکل اختیار کر ...۔ مجھے اپنے عمل پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ اس شرمندگی ...نے شدت پکڑی تو میں لیلیٰ کے بارے میں سوچنے لگا جس کے ...سبب یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ اگرچہ میں بھی برابر کا حصے دار تھا، ...مگر تحریک کی ذمے دار وہی تھی۔

لیلیٰ کے بارے میں سوچتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے اپنے پہلو میں دیکھا۔ وہ آسودگی کی گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کا بےترتیب بدن کسی زیرِ مرمت گاڑی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہلکے سبز رنگ کی بیڈ شیٹ پر پنک نائٹی میں وہ اینٹی منی مائن (ANTI MONY MINE) کسی کھلتے ہوئے گلاب کا منظر تخلیق کر رہی تھی۔

میں اس کی آسودگی میں مخل ہوئے بغیر بہ آہستگی کنارِ شوق سے ...ن آیا۔ واش روم میں ایک حیرت میری منتظر تھی۔ اپنے خون آلود لباس پر نظر پڑتے ہی میں چونک اٹھا اور چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ لباس بے داغ، صاف اور استری شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے گزشتہ رات سلیپنگ سوٹ پہنتے ہوئے اپنی پتلون اور شرٹ کھونٹی پر لٹکائی تھی اور ان کی حالت خراب ہو رہی تھی مگر یہی پتلون اور شرٹ اب ہینگر پر سجی تھیں اور لگتا تھا، جیسے ابھی ابھی کسی نفیس لانڈری سے دھل کر آئی ہوں۔

فریش ہو کر لباس پہننے کے دوران میں، میں مسلسل لیلیٰ کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہمارے دونوں کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی نہیں تھا۔ اگر میں نے اپنے آلودہ لباس کو صاف نہیں کیا تھا تو پھر یہ کارنامہ لیلیٰ ہی کا ہوسکتا تھا۔ آج کل جدید قسم کی واشنگ مشینز آگئی ہیں۔ جن میں دھونے، سکھانے اور استری کرنے کی سہولت موجود ہوتی ہے۔ اس کا مطلب تھا، میری نیند کے دوران میں لیلیٰ نے میرے لباس کو بھی ”فریش اپ“ کر دیا تھا۔ وہ بڑی حیرت انگیز اور پراسرار ہستی ثابت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے عمل سے میری یادداشت میں نقش ہوتی چلی جا رہی تھی۔

میں تازہ دم ہو کر واش روم سے نکلا تو مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ لیلیٰ بستر پر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ ہلکی سبز بیڈ شیٹ پر ایک ننھا سا موتیے کا پھول نظر آ رہا تھا۔ مجھے اپنے وجود میں سنسناہٹ سی اترتی ہوئی محسوس ہوئی کیوں کہ اس لمحے موتیے کے پھول میں حرکت پیدا ہوئی تھی پھر وہ ”پھول“ میری جانب دیکھ کر مسکرایا، اس نے اپنے حلق سے مخصوص آواز خارج کی اور اچھل کر بیڈ سے نیچے اتر آیا۔

”میاؤں“ کی تیز آواز نے میرے جسم و جان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ موتیے کا پھول نظر آنے والی وہ سفید بلی پلک جھپکتے میں بیڈ روم سے نکل گئی۔

اب میں اس آفت کی پرکالہ، شیر کی خالہ کا صورت آشنا ہوچکا تھا۔ ویسے تو تمام بلیوں کی شکلیں آپس میں ملتی جلتی ہوتی ہیں لیکن مجھے یقین ہے، میں اس سفید بلی کو ہزاروں لاکھوں

بلیوں میں بھی الگ شناخت کر سکتا ہوں۔ اس نے مجھ پر جو احسانات کیے تھے انہیں فراموش کرنا ممکن نہیں تھا...... لیکن یہ گزشتہ رات کہاں غائب ہوگئی تھی؟

میں رات لیلیٰ سے اس بلی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر لیلیٰ اور کچھ جامِ اُمید کی اثر پذیری نے اس کا موقع نہیں دیا۔ ابھی بلی کو دیکھ کر یہ تو تسلی ہوگئی کہ وہ بنگلے ہی میں موجود ہے...... مگر لیلیٰ کہاں چلی گئی! تھوڑی دیر پہلے تو وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

لیلیٰ کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے، وہ کسی دوسرے واش روم میں ہو۔ میں نے ڈریسنگ کے سامنے پہنچ کر اپنے بال سنوارے پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر میں نے اپنے جوگرز پہنے اور لیلیٰ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

جب اس انتظار نے طول پکڑا تو مجھے وحشت ہونے لگی۔ اب تک لیلیٰ کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ باہر اب اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ ایک گھنٹا گزرنے کے بعد بھی جب مجھے لیلیٰ کی صورت دکھائی نہ دی تو میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ اس تلاش کے دوران میں، میں مسلسل لیلیٰ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میں نے آئندہ پندرہ منٹ میں اس بنگلے کا ایک ایک کمرا، ایک ایک واش روم اور ایک ایک کونا جھانک لیا لیکن لیلیٰ کہیں نظر آئی اور نہ ہی اس کا کوئی آثار دکھائی دیا۔ لگتا تھا، وہ جیسے یہاں آئی ہی نہ ہو، یہاں رہی ہی نہ ہو۔ یہاں اس کی موجودگی کا کوئی نشان ڈھونڈنے میں، میں ناکامیاب رہا۔

میں واپس اسی بیڈروم میں آیا جہاں شب بسری کا مجھے موقع ملا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر اس اسرار اور طلسم کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں جوں جوں سوچتا جا رہا تھا، میرا تجسس اور الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ لیلیٰ کا سابق سلوک اور موجودہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ ایک بجھارت کی طرح میری زندگی میں داخل ہوئی، ایک یادگار لمحاتی رفاقت کا تحفہ دے کر کسی پہیلی کے مانند غیر حل شدہ ہوگئی تھی۔ میں سرِدست اسے حل کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اسم بامسمّٰی ثابت ہو رہی تھی۔ لیلیٰ...... سیاہ رات کی پہلی کرن کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی۔

یہی سب سوچتے اور الجھتے ہوئے بے اختیار میرا ہاتھ اپنے زخمی کندھے پر چلا گیا اور میں اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ گھائل کندھے پر پٹی موجود تھی، یہ تو میں تازہ دم ہوتے ہوئے دیکھ چکا تھا مگر اب پٹی پہ ہاتھ پڑتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میرا وہ کندھا دوسرے کندھے کی طرح انتہائی صحت مند ہو۔ درد اور تکلیف سے بے نیاز!

میں نے بے یقینی کی سی کیفیت میں گھائل کندھے کو ٹٹولا اور بار بار دبا کر دیکھا لیکن حقیقت بدل نہ سکی۔ مجھے وہاں شمہ برابر تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ ناممکن تھا...... انتہائی ناممکن! میرا وہ کندھا گولی لگنے سے بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ مانا، لیلیٰ بہت اچھی نرس رہی ہوگی، اس نے نہایت مہارت سے میرا زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی تھی مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا، ایک ہی ڈریسنگ سے زخم بھر جائے۔ نہ صرف زخم بھر جائے بلکہ اس میں تکلیف کا احساس تک نہ رہے!

میرا ذہن تیز رفتاری سے ان واقعات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے فوراً ڈریسنگ کے سامنے جا کر اپنی شرٹ اتار دی پھر کندھے پر بندھی پٹی کو کھولنے لگا۔ اس دوران میں، میں ''جامِ اُمید'' نامی اس حیرت انگیز اور سرور بخش مشروب کے بارے میں بھی سوچتا جا رہا تھا۔ لیلیٰ نے کندن رنگت والے اس مشروب کی بہت تعریف کی تھی۔ ممکن ہے، اس مشروب کے گہرے اثرات نے میرے کندھے کی تکلیف کو اُڑن چھو کر دیا ہو...... لیکن یہ کیا؟ کندھا پٹی کی بندش سے آزاد ہوا تو میں چونک اٹھا۔

ڈریسنگ کا آئینہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ آئینہ کہیں کا بھی ہو، وہ جھوٹ سے ناآشنا ہوتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ میں جس آئینے کے سامنے کھڑا تھا اس کی راست گوئی نے مجھے چکرا کر رکھ دیا۔ میں چند فٹ کے فاصلے پر آئینے میں اپنے بائیں کندھے کو دیکھ رہا تھا۔ پٹی کھل چکی تھی اور میرے اس کندھے پر زخم تو کیا، ایک خراش تک نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا کوئی نرس یا کوئی ڈاکٹر اتنا صاحبِ کمال ہو سکتا ہے کہ ایک ہی پٹی سے زخم کا نام و نشان مٹا ڈالے؟ نہیں، ایسا صاحبِ کمال اور ہنرمند ڈاکٹر ممکن نہیں اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی مرہم یا دوا اتنی زوداثر ہو کہ زخم کو چند گھنٹوں میں بھر کر اس کے آثار تک ناپید کر دے...... تو پھر یہ سب کیا تھا؟ میں آنکھوں سے جس حقیقت کو دیکھ رہا تھا اس سے انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

اسی وقت میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوندگئی۔ اس بجلی کی چمک نے میرے خیالات میں ایک انتہائی خطرناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے سوال کو اجاگر کر دیا۔ میں نے سوچا، کہیں یہ سب نیلگری کا کیا دھرا تو نہیں؟

اس سوال نے میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ نیلگری بہت ہی پراسرار اور مہا شکتیوں کی مالک تھی۔ وہ بہت کچھ کرنے پر قادر تھی۔ گزشتہ رات جو کچھ ہوا، وہ تو اس کے لیے بائیں ہاتھ کا چمتکار تھا۔ اس سے بڑے بڑے

...ئے وہ میری نگاہ کے سامنے دکھا چکی تھی۔ میں اس کی ...تدار اور قوت کو تسلیم کرتا تھا۔

پھر مجھے نیلگری کی دلچسپ دھمکی بھی یاد آئی۔ پاکستان کی ...حدود میں داخل ہونے کے بعد جب پاک رینجرز نے ہمیں ...مقامی پولیس کے حوالے کیا تھا تو تھانے کے حوالات میں اس ...کی پراسرار ہستی نیلگری نے مجھ سے الوداعی ''ملاقات'' ...کی تھی۔ الوداعی اس حوالے سے کہ اس نے کہا تھا، آئندہ وہ ...اپنی اصل شکل میں کبھی میرے سامنے نہیں آئے گی بلکہ جب ...بھی کوئی عورت میری خلوت میں پہنچے گی تو وہ اس عورت کے ...اندر رہتے ہوئے میرا قرب حاصل کرتی رہے گی۔ یہ ایک ...نہایت ہی خطرناک دھمکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ نیلگری ایسا ...کرنے پر قدرت رکھتی ہے اور ازاں بعد اس نے ایک دو ...مراحل پر ایسا ثابت بھی کیا تھا۔ ساحل (دھنو) کی صورت میں ...وہ میرے بہت قریب رہ کر وقت گزار چکی تھی۔ وہ اپنے جن ...عزائم کا کھل کر اظہار کر چکی تھی، میں اب تک ان سے بچتا چلا ...آیا تھا۔ وہ میرے حصول میں ناکامیاب رہی تھی مگر......

گزشتہ رات کے واقعات ایک مرتبہ پھر میرے ذہن ...میں کسی فلم کے مانند چلنے لگے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا، ...نیلگری اپنی شاطرانہ چال سے مجھے ٹریپ کرنے میں کامیاب ...ہوگئی تھی۔ وہ کافی عرصے سے غیر حاضر تھی۔ میں سمجھا، وہ مجھ ...سے مایوس ہو کر ہمالیہ کی گود میں جا بیٹھی ہے۔ یہ سمجھنا میری ...نادانی ثابت ہوئی۔ وہ مایوس یا بددل نہیں ہوئی بلکہ گھات لگا ...کر مجھے شکار کرنے کے انتظار میں تھی...... اور بالآخر اس نے ...مجھے شکار کر لیا تھا۔ یہ سوچنا اور معلوم کرنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ...تھا کہ لیلیٰ میرے نزدیک آئی تھی یا میں لیلیٰ کے قریب پہنچا تھا؟ ...حقیقت یہ تھی کہ نیلگری نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔

وہ جتنی حسین و جمیل تھی اس سے کہیں زیادہ خوبصورتی سے ...اس نے مجھے شکست دی تھی۔ اس دل فریب و دل کش شکست کو ...میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

لیلیٰ کو میں تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے میں تلاش کر چکا تھا۔ ...وہ کہیں نہیں ملی تھی۔ گویا نیلگری اس بنگلے سے رخصت ہو چکی ...تھی۔ وہاں مزید رک کر وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ...تھا۔ لہٰذا میں بیڈروم سے نکل آیا۔

بنگلے کی عمارت سے باہر آتے ہوئے متلاشی نظر سے سفید ...بلی کو بھی دیکھتا رہا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ پتا نہیں، وہ کس ...مزاج اور فطرت کی بلی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک ...خاص قسم کا موڈ پایا جاتا تھا۔ نیلگری کی ''کارروائی'' کے ...دوران میں وہ منظر سے غائب رہی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا

کہ نیلگری ہی نے اسے اپنی کسی شکتی کے زیرِ اثر ''دخل در معقولات'' سے باز رکھا ہوگا۔ نیلگری ہزار ہا نادیدہ قوتوں کی مالک تھی اور جانور، خصوصاً بلی نادیدہ قوتوں اور ہوائی مخلوق کو بہت جلد دیکھ لیتی ہے۔

میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں گزشتہ رات میں نے اپنی شیرڈ کھڑی کی تھی۔ یہاں مجھے استعجاب کے ایک اور جھٹکے سے گزرنا پڑا۔ نیلی شیرڈ وہاں سے غائب تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ کار پورچ میں بلیک ہونڈا سوک بھی موجود نہیں تھی۔ میں پریشانی کے عالم میں کھڑا شیرڈ اور لیلیٰ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بنگلے کے گیٹ کے اوپر وہی سفید بلی نمودار ہوئی اور گیٹ کے ستون پر سے ہوتے ہوئے وہ باہر کود گئی۔ اس چھلانگ سے قبل اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے ایک خاص ادا سے ''میاؤں'' بھی کیا تھا۔

مجھے یوں لگا، وہ اس ''میاؤں'' کے ذریعے مجھے کوئی پیغام دے گئی ہو۔ رات اس گیٹ کو لیلیٰ نے بند کر کے بولٹ چڑھا دیا تھا۔ میں تیزی سے چلتے ہوئے گیٹ کے پاس آیا۔ گیٹ کی اندرونی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ میں نے دھکیل کر گیٹ کو کھولنا چاہا تو معلوم ہوا، وہ باہر سے بند ہے۔ اس کوشش کے دوران میں میری نگاہ بھٹک کر گیٹ کے درز سے باہر چلی گئی اور میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ گیٹ کے سامنے، باہر سڑک پر میری نیلی شیرڈ کھڑی تھی۔

سفید بلی کا اشارہ میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ بند گیٹ کے باہر پہنچنے کا طریقہ مجھے بتا گئی تھی، گویا مجھے بھی دیوار پھاند کر یا اُچک کر گیٹ کے اس پار جانا تھا۔ میں نے اس محسن بلی کی خفیہ ہدایت پر عمل کیا اور اپنی شیرڈ تک پہنچ گیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے گیٹ کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہاں گیٹ کی کنڈی میں مجھے ایک بڑا سا تالا جھولتا نظر آیا۔ میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور میں نے ایک جھٹکے سے شیرڈ آگے بڑھا دی۔

حیران ہونے کے لیے اتنا کچھ تھا کہ میں نے حیرت کا اظہار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ گزشتہ رات اس بنگلے کا گیٹ کھلا دیکھ کر میرا وہاں داخل ہونا، لیلیٰ کی معیت میں بے چون و چرا اس کے بیڈروم میں پہنچنا، پھر وہاں پیش آنے والے واقعات...... میرے لباس کا صاف ستھرا ہو جانا، میرے کندھے کا زخم سرے سے غائب ہو جانا، سفید بلی کی حرکات و سکنات کا ساکت و جامد ہو جانا، لیلیٰ کا غیاب اور اب میری گاڑی کا بنگلے سے باہر پہنچ جانا، گیٹ کا باہر سے لاک ہونا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام ایسے

واقعات تھے جن کی کوئی عقلی توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ ماورائی اور روحانی ذیل میں یہ تمام ڈانڈے نیلگری سے جا ملتے تھے...... آہ نیلگری!

واپسی کے سفر کے دوران میں، میں نے شکایتی نظر سے سفید بلی کو دیکھا۔ وہ حسبِ معمول پسنجرز سیٹ پر براجمان مجھے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہ میں موجود شکایت کو اس نے محسوس کرلیا اور گردن جھکا کر بیٹھ گئی۔

میں نے اس سے پوچھا "ڈھائی ماہ پہلے اوپن ائر ریسٹورنٹ میں تم ہی میری میز کے نیچے سرسرا رہی تھیں نا؟"

"میاؤں" اس نے یک لفظی جواب پر اکتفا کیا۔

"اور اسی رات بوٹ بیسن کے مقام پر ہمارے دشمن گن بردار پر بھی تم ہی نے جست لگائی تھی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

اس نے اپنے جواب کو دہرایا "میاؤں۔"

میں نے سوال کیا "گن بردار پر چھلانگ لگاتے وقت تمہاری جسامت میں اچھا خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ تم کسی صحت مند کتے کے جثے کو پہنچ گئی تھیں؟"

ایک مرتبہ پھر مجھے "میاؤں" سننے کو ملی۔

میں نے فلیٹ کے بیڈروم میں بیڈ کے اوپر اس کی موجودگی کا حوالہ دے کر سوال کیا اور اس نے ایک بار پھر "میاؤں" کی آواز نکالی۔

میں نے ایک منٹ تک خاموش رہنے کے بعد اس سے پوچھا "تم اس بات سے انکار تو نہیں کرو گی نا کہ جب ساحل اور ممتاز سی سائیڈ والے فلیٹ میں تنہا تھیں تو تم نے ایک سفید چیتے کا روپ دھار کر انہیں ڈرانے کی کوشش کی تھی؟"

یہ سوال بہت اہم تھا لیکن حسبِ سابق اس سفید بلی نے اس کا جواب بھی اپنی مخصوص "میاؤں" میں دیا تو میں جھلا کر رہ گیا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ اس کی کون سی "میاؤں" کا مطلب "ہاں" ہے اور کس "میاؤں" کا مطلب "نہ"۔ مجھے تو وہ تمام میاؤں ایک ہی جیسے لگ رہے تھے۔ کچھ بھی ہو، یہ بلی کوئی عام بلی نہیں تھی۔ اس نے اب تک دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا تھا، سوائے چیتے والے واقعے کے۔

ایک فوری خیال کے تحت میں چونک اٹھا۔ یہ خیال نیلگری کے بارے میں تھا۔ گزشتہ رات اس کی پُراسرار شکتیوں کے سبب سفید بلی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ سفید چیتے والے واقعے میں بھی نیلگری ہی کا ہاتھ ہو؟ اگر ایسا تھا تو پھر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ نیلگری نے ساحل اور ممتاز کے اغوا کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ نیلگری مجھے اپنی پراپرٹی بنا کر رکھنا چاہتی تھی اور میرے نزدیک آنے والی ہر عورت سے ایک مخصوص قسم کی دشمنی رکھتی تھی...... ساحل تو اس حوالے سے سرِفہرست تھی!

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اپنے دل و دماغ پر بہت بوجھ محسوس ہوا۔ تارا کی باتوں سے یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ ساحل کی زندگی کو فی الفور کوئی خطرہ لاحق نہیں اور میں اس "فی الفور" کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اس تک پہنچنا اور اسے بحفاظت واپس لانا چاہتا تھا۔ سفید بلی کے بارے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ جب تک اس کا اسرار میری سمجھ میں نہیں آجاتا، میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ خاص طور پر اس کی جسامت میں کمی بیشی والی مسٹری کو جاننا بہت ضروری تھا۔ وہ میرے قریب رہتی تو میں زیادہ بہتر طور پر اس کا مشاہدہ کرسکتا تھا۔

میں نے ڈیفنس سوسائٹی کی حدود میں داخل ہونے کے بعد سفید بلی کی جانب دیکھا اور سوال کیا "کیا تم ہمیشہ میرے پاس رہ سکتی ہو؟"

ناقابلِ فہم اور رٹا رٹایا جواب موصول ہوا "میاؤں"۔

میں نے ایک نیا تجربہ کیا "ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا تم مستقل طور پر میرے ساتھ رہنے کے لیے آمادگی ظاہر کررہی ہو چنانچہ اب ضروری ہوگیا ہے، میں تمہارے لیے کسی موزوں سے نام کا انتخاب بھی کرلوں۔ میں تمہاری طرح "میاؤں میاؤں" کرنے سے تو رہا!"

اتنا کہہ کر میں خاموش ہوگیا۔ اس مرتبہ اس نے "میاؤں" نہیں کیا بلکہ منتظر نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرے منہ سے اپنا مجوزہ نام سننے کا انتظار کر رہی ہو۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"آج سے تمہارا نام ڈارلنگ ہے۔"

وہ پُرمسرت انداز میں دہانہ کھول کر بولی "میاؤں!"

میں نے کہا "ڈارلنگ! صرف "میاؤں" سے کام نہیں چلے گا۔ اگر تمہیں یہ نام پسند آیا ہے اور تم میری بات سمجھتی ہو تو تمہیں اس کا ثبوت دینا ہوگا۔"

وہ سنجیدہ ہو کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ وہ کسی سمجھ دار اور بردبار شخص کی طرح ہمہ تن گوش ہوگئی تھی جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ میری باتوں کو پوری طرح سمجھ رہی ہے۔

میں نے کہا "ڈارلنگ! ثبوت کے طور پر تمہیں ابھی اور اسی وقت میری گود میں آنا ہوگا!"

میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک منی سے

چھلانگ لگا کر میری آغوش میں پہنچ گئی پھر بڑے رومانٹک انداز میں اس کے حلق سے آواز نکلی "میاؤں!"

میں متعجب نگاہ سے اس عجوبۂ روزگار کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

"ساؤتھ" میں کبیر شاہ سمیت سبھی نے مجھ سے افسوس کا اظہار کیا پھر کبیر شاہ اپنے ساتھ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا۔ یہ وہی بیڈروم تھا جہاں کل کا بیشتر دن میں نے آرام کرتے ہوئے گزارا تھا۔ کبیر شاہ نے پہلے میرے لیے ناشتے کا بندوبست کیا۔ میں نے رسماً ہلکا پھلکا ناشتا کیا۔ دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے زہر مار کرتا رہا۔

ناشتے کے دوران میں کبیر شاہ نے کہا "وجدان! تمہاری وجہ سے گزشتہ رات مجھے باس کی ڈانٹ سننا پڑی۔ اچھا ہوتا، تم سینٹرل میں تمہارا ان سے رابطہ کروا دیتا۔"

"ایسا کیا ہوگیا شاہ جی؟" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بولا "آدھی رات کے وقت باس کا فون آیا تھا۔ میں نے انہیں تمہارے اور تمہیں پیش آنے والے حالیہ واقعات کے بارے میں بتا دیا۔ وہ اس پر خاصے برہم ہوئے کہ میں نے ان سے تمہاری بات کیوں نہیں کروائی۔ خاص طور پر ساحل والے سانحے نے انہیں بہت دکھ پہنچایا ہے۔ وہ دس بجے تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔ اچھا ہوا، تم ان سے پہلے ہی آگئے۔" ایک لمحے کا توقف کرکے اس نے اضافہ کیا "تم نے بتایا تھا کہ اپنے کسی دوست کے پاس ہو مگر وہاں کا پتا اور فون نمبر نہیں بتایا تھا ورنہ میں رات ہی تم سے رابطہ کرلیتا۔" اس کے لہجے میں معذرت شامل تھی۔

میں نے فراخ دلی سے کہا "چلو، کوئی بات نہیں۔ میں باس شعیب سے تفصیلی ملاقات کرلوں گا۔" پھر میں نے دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت نو بجنے والے ہیں۔ سر شعیب کے آنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ جب تک میں ایک ضروری فون کرلوں۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور مجھے آرام کرنے کا کہہ کر بیڈروم سے نکل گیا۔

گزشتہ رات جب میں نے کبیر شاہ کو فون کرکے اپنے حالات سے آگاہ کیا تھا تو اس بات کا خیال رکھا تھا کہ بات یا تفصیل میں نہ جاؤں۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ چوہدری ارشد علی اینڈ کمپنی نے میری دوست ساحل کو اغوا کرلیا ہے لیکن ساحل کی تلاش میں پہلے گلشن اقبال والے بنگلے اور پھر کشمیر روڈ والے بنگلے پر زبردست مارا ماری کر کے اپنے دوست کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ میں نے اسے تارا کی موت کے بارے میں بھی بتا دیا تھا تاہم وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ ساحل کے ساتھ ممتاز نامی ایک لڑکی بھی اغوا ہوئی تھی اور یہ کہ کشمیر روڈ والے بنگلے پر میرے بائیں بازو میں کوئی گولی بھی لگی تھی۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا اور میں نے اس پر خدا کا شکر ادا کیا ورنہ اگر کبیر شاہ میرا زخمی کندھا دیکھنے کی فرمائش کر بیٹھتا تو میرے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ میں جن طلسماتی اور ماورائی حالات سے گزرا تھا ان کی وضاحت یا توجیہ بہت مشکل تھی۔ میرے بیان کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا...... اور یہ کچھ غلط بھی نہ ہوتا!

گزشتہ رات لگ بھگ ساڑھے نو بجے میں نے "نبی سر" میں قاضی سلطان سے بات کی تھی۔ اس بات کو تقریباً بارہ گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ اتنے وقت میں کراچی سے عمر کوٹ جا کر واپس بھی آیا جا سکتا تھا، اس کا مطلب یہی تھا، ممتاز کو وہاں پہنچایا جا چکا ہوگا۔ اس سلسلے میں قاضی سلطان نے بیٹی کے حصول کے لیے کیا "بندوبست" کیا تھا یہ اسی سے معلوم کیا جا سکتا تھا۔

میں نے نبی سر میں قاضی سلطان سے حویلی میں رابطہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد میں قاضی سے ہمکلام تھا۔ اس نے رسمی علیک سلیک کے بعد بڑے پُرجوش انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس نے اپنے ایس پی سالے اور پولیس کی بھاری جمعیت کے تعاون سے ممتاز کو اغوا کنندگان کے قبضے سے آزاد کرلیا ہے۔ کراچی سے عمر کوٹ کی طرف جانے والے راستے کی ناکا بندی کر کے پولیس نے بہت خطرناک آپریشن کیا تھا جس کا نتیجہ کامیابی کی صورت میں برآمد ہوا۔ ممتاز واپس اپنے والدین کے پاس پہنچ چکی تھی۔

قاضی سلطان مجھے اس کارروائی کی تفصیل سنانا چاہتا تھا جو یقیناً بہت ہی سنسنی خیز ہوتی لیکن فی الحال میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ممتاز بخیر و عافیت اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ میں نے قاضی سے کہا۔

"ان شاءاللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی پھر میں آپ سے یہ تفصیل سنوں گا۔ فی الحال آپ ممتاز کا خیال رکھیں۔ وہ بڑے اذیت ناک لمحات سے گزر کر آپ کے پاس پہنچی ہے۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" قاضی نے تائید کی "وہ بہت سہمی ہوئی ہے۔ تمہارا ایک مرتبہ پھر تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ دوسری مرتبہ ہے، جب تم نے ممتاز کو بچایا

ہے۔" پھر اسے کچھ یاد آ گیا، پوچھنے لگا "ساحل کا کچھ سراغ وغیرہ ملا؟"

میں نے کہا "ساحل میرے جانے پہچانے دشمنوں کے پاس ہے۔ تارا نے اپنی موت سے قبل اسے زاہد حسین نامی ایک شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ میاں زاہد حسین، چوہدری نوازش علی کا خاص آدمی ہے جو کراچی میں اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرتا ہے۔ میں بہت جلد میاں زاہد کے سر پر عتاب بن کر نازل ہونے والا ہوں...... بہت جلد!"

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میرے لہجے میں سنگین اور سفاکی در آئی۔ قاضی سلطان نے کہا۔ "میں نے گزشتہ رات ہی منہاس باقر کو یہ خوش خبری سنا دی تھی۔ تمہارا کوئی رابطہ نمبر میرے پاس نہیں تھا اس لیے تمہیں فون نہ کر سکا بعد میں منہاس باقر سے تمہارے فلیٹ کا جو فون نمبر مجھے مل سکا، میں نے اس پر فون کیا لیکن وہاں سے کسی ردِعمل کا اظہار نہ ہوا۔ بہر حال، میں ایک مرتبہ پھر تمہارے اس تعاون کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

"آپ مجھے بار بار شرمندہ نہ کریں۔" میں نے کہا "ملاقات ہونے پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔"

پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔ ممتاز کی بازیابی سے مجھے دلی سکون حاصل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ساحل کا تصور بھی ابھر آیا۔ ممتاز کی واپسی نے ساحل کی یاد دلا دی تھی۔ وہ دونوں کل سہ پہر بہادر آباد چورنگی سے اغوا ہوئی تھیں۔ چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے ایک کو برآمد کر لیا گیا مگر دوسری ابھی تک مفقود الخبر تھی۔ اس خیال نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ میں دکھی دل سے ساحل اور اس کی سلامت واپسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

تارا نے اپنی موت سے قبل مجھ سے جو مکالمہ بازی کی تھی اس میں تو چوہدری نوازش علی کی طرف سے یہی مطالبہ دہرایا گیا تھا، اگر میں ڈائری کے وہ دو قیمتی صفحات ان کے حوالے کر دوں تو وہ میری ساحل کو میرے سپرد کر دیں گے۔ تارا نے باقاعدہ مجھ سے وہ صفحات مانگے تھے۔ اس کا تقاضا ظاہر کرتا تھا، وہ لوگ مجھ سے ہر صورت میں وہ صفحات نکلوانا چاہتے ہیں۔ تارا اب باقی نہیں رہا تھا چنانچہ لامحالہ یہ کام اب میاں زاہد حسین کو کرنا تھا اور اس لیے یقیناً وہ مجھ سے رابطہ کرتا۔ رابطے کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ چوہدری نوازش علی پچیس کروڑ روپے مالیت کے سونے کو ہر طور حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس حصول کے لیے وہ قیمتی صفحات ازحد ضروری تھے...... گویا میاں زاہد حسین نے ہر صورت مجھ سے رابطہ کرنا تھا اور اس سے پہلے اسے میرا سراغ لگانا تھا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ساحل کے بارے میں اگر کوئی شخص مجھے درست معلومات فراہم کر سکتا تھا تو وہ میاں زاہد حسین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میاں زاہد کراچی کے نیٹ ورک کو آپریٹ کر رہا تھا۔ تارا نے اغوا کے بعد دونوں لڑکیوں کو میاں زاہد کی تحویل میں دیا تھا۔ اسی نے ممتاز کو وڈیرا اکبر سومرو کی حویلی میں پہنچانے کا بندوبست کیا تھا۔ ساحل کے بارے میں بھی اسی کو قدم اٹھانا تھا۔ تارا مجھے یہ بتا چکا تھا کہ ساحل کو بالآخر چوہدری نوازش کی حویلی واقع موضع رکھاں والی میں پہنچا دیا جائے گا لیکن اس کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ مجھ سے ڈائری کے صفحات حاصل کرنے کی مہم کے دوران میں وہ لوگ ساحل کو کراچی کی حدود سے باہر نہیں لے جائیں گے۔ مجھے جو بھی تگ و دو کرنا تھی، فوراً سے پیشتر کرنا تھی...... اور اس سلسلے میں، میں نے پہلی فرصت میں ایک ہنگامی فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا، میاں زاہد حسین کا بے دریغ تعاقب کرنے کے بجائے میں اسے اپنے قریب آنے کا موقع دوں گا۔ کس طرح؟ اس بارے میں، میں مسلسل سوچ بچار کرنے لگا۔

ٹھیک دس بجے مجھے اطلاع ملی کہ شعیب غوری ساؤتھ میں داخل ہو چکا ہے۔ آئندہ پندرہ منٹ بعد میں شعیب کے ساتھ ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں بند ہو گیا۔ ہمارے درمیان واجبی سی "ہیلو ہائے" ہوئی۔ اس نے ساحل والے واقعے پر گہرے رنج کا اظہار کیا اور مجھے یقین دلایا کہ وہ بہت جلد ساحل کو ڈھونڈ نکالے گا بلکہ اس نے بتایا کہ رات ہی اس نے اس سلسلے میں کچھ پیش رفت بھی کر ڈالی ہے جس کے نتیجے میں وہ میاں زاہد کے ایک ایسے ٹھکانے کا پتا چلانے میں کامیاب ہو گیا ہے جس کے بارے میں اس کی تنظیم کے بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اس سے پہلے میں نے ممتاز اور ساحل کے اغوا سے لے کر تارا کی موت تک کے تمام واقعات تفصیل سے اسے سنا دیے تھے۔ کے ڈی اے اسکیم نمبر ون کے بنگلے اور لیلیٰ کا قصہ میں نے دانستہ گول کر دیا۔ مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا ورنہ مجھے بہت سی باتوں کی وضاحت کرنا پڑتی اور قصہ بہت دور تک جا پہنچتا۔

شعیب نے کہا "وجدان! میرے غیاب میں تم جن الم ناک حالات سے گزرے ہو ان کا مجھے پوری طرح احساس ہے اور انشاء اللہ میں اس سلسلے میں تمہاری بھرپور مدد بھی کروں گا۔ تمہارے بیان سے میں نے اندازہ لگایا ہے، تمہارے دشمن چند روز تک ساحل کو کراچی ہی میں رکھیں گے۔ میاں زاہد حسین ڈائری کے دو قیمتی صفحات حاصل کرنے کے لیے تمہیں ضرور ٹچ کرے گا۔ وہ صفحات جو تم میرے حوالے کر چکے ہو۔"

میں توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا، چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا "میں سب سے پہلے میاں زاہد کے اس خفیہ ٹھکانے کو چیک کرواتا ہوں جس کا میں نے تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا ہے۔ مجھے امید ہے، وہاں ساحل کا سراغ ہمیں مل جائے گا۔ بس اس کے لیے بڑی احتیاط اور سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔"

"یہ بات میں بھی جانتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن ساحل تک پہنچنے کے لیے میں بہت بے چین ہوں۔"

"میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "دنیاداری اور دلداری ایک ساتھ جاری رہنا چاہیے۔ ساحل کی تلاش اور میاں زاہد کی کھنچائی کے ساتھ ساتھ ہمیں سونے والے معاملے کو بھی دیکھتے رہنا ہے۔" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"سونے والے معاملے کو کیا ہوا ہے؟" میں نے چونک کر اس سے پوچھا۔

ساحل کے تذکرے میں سونے والے معاملے کی "آمد" نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا۔ بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا تھا، شعیب غوری کوئی انسان نہ ہو، مشین ہو۔ احساسات اور جذبات سے عاری۔ وہ انتہائی نازک حالات میں بھی اپنے کاروباری منصوبوں سے غافل نہیں رہتا تھا۔ شاید اس کی کامیابی کی وجہ یہی تھی۔ جذبات سے مغلوب لوگ دنیاوی اور مادی ترقی میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ شعیب ایک فعال تنظیم کا روحِ رواں تھا۔ دل کے بجائے دماغ سے سوچنا اور جذبات کو ایک طرف رکھ کر فیصلے کرنا اس کی مجبوری تھی...... اور یہ مجبوری ایک عادت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا "سونے والے معاملے کو یہ ہوا ہے کہ مسٹر نیل آرمر اپنے طے شدہ پروگرام سے قبل ہی یہاں آ رہا ہے۔ رات فون پر میری اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ کل کراچی پہنچ جائے گا۔ وہ جلد از جلد اس مدفون خزانے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"پھر؟" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"پھر یہ کہ اس سلسلے میں وہ تم سے ایک بھرپور میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔" شعیب نے بتایا "تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔"

ساحل کی جدائی نے میرے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا "شعیب! نیل آرمر سے ہر قسم کے معاملات تم خود ہی طے کر لو۔ میں نے یہ پروجیکٹ جب

جاسوسی ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ

انسان کی ترقی و تہذیب کے حیات افروز واقعات
صدیوں سے زندہ ایک پُراسرار شخص کی آپ بیتی، ہَوا جس کی دوست تھی، سمندر جس کے لیے آغوشِ مادر تھا، آگ اس کے بدن کو نمو دیتی تھی۔
☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
وہ کہانی جس نے اپنے وقت میں مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے

صدیوں کا بیٹا

پانچ حصّوں میں مکمّل

قیمت فی حصہ -/60 روپے ★ ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے

مکمل سیٹ منگانے پر رعایتی قیمت -/300 روپے ڈاک خرچ معاف
-/300 روپے کا منی آرڈر پیشگی روانہ فرمائیں۔
یہ رعایت صرف منی آرڈر ارسال کرنے پر ہی مل سکے گی۔

Kitabiat1970@yahoo.com

تمہارے سپرد کر دیا ہے تو پھر تم مجھے بار بار اس میں نہ گھسیٹو۔ میں اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہارے احساسات کو بخوبی سمجھ رہا ہوں۔" وہ خیر خواہانہ انداز میں بولا "ساحل سے بچھڑنے کے واقعے نے تمہیں بری طرح توڑ کر رکھ دیا ہے لیکن اول آخر تم سونے والے اس معاملے سے الگ نہیں ہو۔ تم سے کوئی مشورہ صلاح کے بغیر آگے کیسے بڑھا جا سکتا ہے!"

میں نے چند لمحے سوچا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "شعیب! ہمارے درمیان، سونے والے معاملے پر جب پہلی مرتبہ بات ہوئی تھی تو ہم نے ایک پارٹنرشپ بزنس کا فیصلہ کیا تھا۔ تم نے مجھے ففٹی ون اور خود کو فورٹی نائن کا حصے دار قرار دیا تھا جب کہ سونے کی بازیابی تمہارے ہی ذمے تھی چاہے تم اس کے حصول کے لیے کوئی بھی راہ اختیار کرو۔"

"میں اب بھی اپنے وعدے پر قائم ہوں۔" اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

میں نے واضح الفاظ میں اسے بتایا "اس وقت میں اور اب میں تھوڑی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ اس مہم میں تمہارے علاوہ مسٹر نیل آرمر، رام داس وغیرہ بھی شامل ہو چکے ہیں۔ اس شمولیت کا مطلب ہے، انہیں بھی حصہ دینا ہوگا۔" میں چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس دوران میں شعیب بڑی توجہ سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "ان حالات کے پیشِ نظر ہمیں اپنے معاہدے کو "ری نیو" کر لینا چاہیے۔"

اس نے پُرمعنی انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور پوچھا "تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "اگر واقعتاً سونے کی وہی مقدار برآمد ہوتی ہے جس کا ہم اندازہ لگائے بیٹھے ہیں تو اس وقت مذکورہ سونے کی مارکیٹ ویلیو لگ بھگ چوتھائی ارب روپے ہے یعنی پچیس کروڑ روپے۔ ففٹی ون کی پارٹنرشپ کے حساب سے میرے حصے میں کم و بیش تیرہ کروڑ روپے آئیں گے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"تمہارا رف اندازہ تقریباً درست ہے۔" اس نے تائید کی۔

میں نے کہا "میں چاہتا ہوں، سونے کی بازیابی کے تمام بکھیڑے تم خود ہی اپنے طور طریقے سے نمٹاؤ۔ مجھے اس کھٹ راگ سے الگ ہی رکھو۔ میں اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرے حصے کے حوالے سے ایک لم سم رقم طے کر لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تمہارے خیال سے اتفاق کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "تم بتاؤ مجھے، تمہیں کتنی رقم درکار ہے؟"

میں نے کہا "دس کروڑ روپے۔"

اس نے چند لمحے سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا "مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط کے ساتھ!"

"کیسی شرط؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "اگر اس متروک کنوئیں سے اتنا ہی سونا برآمد ہوا جتنا ہم سوچ رہے ہیں!"

"بالکل، یہ تو بنیادی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر تم اس معاملے کو ڈن سمجھو۔" وہ بولا "میں نیل آرمر اور دیگر متعلقہ افراد سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ سونے کی بازیابی کے سلسلے میں یہ ہماری آخری میٹنگ ہے۔"

"او کے۔" میں نے مطمئن انداز میں کہا "سونے کی برآمد، اس کی ترسیل اور فروخت وغیرہ سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ اس مشن کے اختتام پر مجھے دس کروڑ روپے مل جانا چاہئیں۔"

"مل جائیں گے۔" وہ پُریقین لہجے میں بولا "کل مسٹر نیل آرمر یہاں آتے ہیں تو میں آئندہ کے لیے لائحۂ عمل تیار کر لوں گا۔ وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک کے مالک ہیں۔ سونے کی فروخت کے سلسلے میں ہمیں آنا جانا نہیں ہوگا۔ برآمد شدہ سونے کے بسکٹ ڈائریکٹ نیل آرمر کے بینک میں چلے جائیں گے۔" ایک ذرا توقف کے بعد اس نے کہا "تم بے فکر ہو جاؤ وجدان۔ میں اس سلسلے میں اب تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔"

مزید چند ضروری باتوں کے بعد ہماری میٹنگ ختم ہو گئی۔ شعیب غوری "ساؤتھ" سے رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا "تم نے میاں زاہد حسین کے جس خفیہ ٹھکانے کا ذکر کیا ہے، میں وہاں دھاوا بولنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں تم نے کچھ سوچ رکھا ہے یا......!"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انداز سوالیہ تھا چنانچہ اس نے کہا "میں نے تو سوچ تو بہت کچھ رکھا ہے لیکن اس کے لیے تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا، کم از کم ایک دن کا وقت دے دو مجھے۔ میں پہلے یہ معلوم کر لوں کہ ساحل کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اسی خفیہ ٹھکانے پر یا کہیں اور......"

"ٹھیک ہے، تم اپنے طور طریقوں سے معلوم کرو۔ میں اپنی نئی حکمتِ عملی آزماتا ہوں۔" میں نے کہا "میں اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میری بات کو سمجھ رہے

ہوتا؟"

"اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "اس سلسلے میں تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، کبیر شاہ سے کہہ دینا۔ وہ ہر وقت تمہاری مدد کے لیے یہاں ساؤتھ میں موجود رہے گا۔ میں اسے خصوصی ہدایات بھی دے دوں گا۔"

میں نے کہا "تمہارے اس تعاون کا بہت بہت شکریہ لیکن میں ساحل کی تلاش کے سلسلے میں اکیلا ہی نکلنا چاہتا ہوں۔ ہاں، البتہ اگر کسی مرحلے پر مجھے کبیر شاہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں فوراً اس سے رابطہ کروں گا۔"

"تمہاری باتوں سے لگتا ہے، تم ساؤتھ میں بھی مستقل نہیں ٹھہرنا چاہتے؟"

"ہاں، میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔"

"کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"فی الحال تو ساحل سمندر والے فلیٹ پر جاؤں گا۔" میں نے کہا "لیکن کسی نہ کسی طور ساؤتھ سے بھی ٹچ میں رہوں گا۔ میں تھوڑا وقت تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

شعیب نے کہا "تم اس کے لیے آزاد ہو مگر کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے کبیر شاہ کو کم از کم مطلع ضرور کر دینا۔ تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت کسی وقت بھی پڑ سکتی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

دوپہر کا کھانا میں نے ساؤتھ ہی میں کھایا اور نیلی شیرڈ میں اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں ایک دو ذیلی سڑکوں سے گھوم کر نیشنل ہائی وے (مین کورنگی روڈ) پر آیا تو سگنل بند تھا۔ میں نے شیرڈ کو روک لیا۔ اسی وقت میری نگاہ ایک شناسا چہرے پر پڑی۔

وہ صدف تھی جو دہائٹ سنی میں نیشنل ہائی وے کو چھوڑ کر اندر کی جانب آ رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملی تو اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ میں نے بادلِ ناخواستہ خوش دلی سے اس کی مسکراہٹ اور ہلتے ہوئے ہاتھ کا جواب دیا۔ اتنی دیر میں سگنل کھل گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

صدف ایک روز پہلے پارک میں مجھ سے ملی تھی۔ وہ میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھی اور مستقبل قریب میں ڈاکٹر بننے والی تھی۔ گزشتہ روز ہمارے درمیان مختصر مکالمت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ پر جس شک کا اظہار کیا، وہ جینون تھا لیکن میں نے بڑی شدت سے اس کی تردید کر دی۔ میں نہیں چاہتا تھا، کسی انجانی لڑکی پر میرا ماضی اس طرح کھل جائے کہ میرے لیے مسائل کھڑے ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ یہ "مسائل" مثبت اور منفی، کسی بھی نوعیت کے ہو سکتے تھے۔

میں اپنے فلیٹ کی جانب سفر جاری رکھے ہوئے صدف کے بارے میں سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اپنی سوچ کو ختم کرنا پڑا کیوں کہ میرے "پڑوس" میں براجمان اس سفید حسینہ نے اپنی مخصوص آواز میں "میاؤں" کیا تھا۔ اس کے اسٹائل سے ظاہر ہوتا تھا، اسے میرا کسی اور کے بارے میں

سوچنا پسند نہیں آیا۔ اگر وہ واقعی میرے خیالات تک رسائی رکھتی تھی تو اس کا یہ انداز محبوبانہ اور بیویانہ تھا۔ وہ میرے نزدیک تو کیا، ذہن میں بھی کسی دوسری کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے اس کا نام ڈارلنگ رکھا تھا جو اس پر بڑا فٹ بیٹھتا تھا۔

جب میں ساؤتھ پہنچا تو وہ گاڑی میں میرے ساتھ تھی لیکن وہ بنگلے میں میرے ساتھ ساتھ نہیں لگی رہی بلکہ مجھے تو اس نے محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ کب مجھ سے جدا ہوئی اور کیسے دوبارہ گاڑی میں آموجود ہوئی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں ساؤتھ سے نکلا تو وہ شیرڈ میں مجھے دکھائی نہیں دی تھی لیکن جس وقت میں مسجد والے پارک کے پاس سے گزر رہا تھا، وہ جھپاک سے کودی اور عقبی نشست سے پسنجر سیٹ پر پہنچ گئی۔ میں اس کے اتنے چمتکار دیکھ چکا تھا کہ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ایک پُراسرار بلی تھی۔ وہ حالات اور موقع کی مناسبت سے ''حاضر غائب'' کے اصول پر عمل پیرا تھی۔ جب چاہتی، میرے قریب چلی آتی اور جب محسوس کرتی کہ مجھے دوسرے لوگوں سے ملنا ہے تو طرح دے جاتی۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی، وہ جب میری تنہائی میں ظاہر ہوتی تھی تو اس کا انداز دلبرانہ ہو جاتا۔ یہ ایک خطرناک اور جواب طلب صورتِ حال تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی خاص مشن پر ہو!

جب کوئی زندگی آپ کے ساتھ ساتھ ہو اور آپ اس کے مقاصد سے ناواقف ہوں تو ایک عجیب سی بے چینی گھیرے رکھتی ہے۔ میں بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت سے دوچار تھا چنانچہ میں نے ڈارلنگ کو اپنے قریب رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ اس کے اسرار کا پردہ چاک کرسکوں۔ مجھے یقین تھا کہ بہت جلد، میں اس کی حقیقت کو پہنچ جاؤں گا۔ جب میں فلیٹ کے اندر داخل ہوا تو ساحل کی یاد نے میرے دل ودماغ کو تڑپا کر رکھ دیا۔ اس فلیٹ کے در و دیوار اور ہر ہر شے سے ہم دونوں کی مختصر اور مشترک یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے اندر قدم رکھا تو ایک معطر جھونکے نے میرا اندرون مہکا دیا۔ مجھے اپنی کس کس میں ساحل کی خوشبو دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ظاہر ہے، یہ سب میرا احساس تھا۔ ساحل کا طاقت ور تصور اس کی موجودگی کو محسوس کروا رہا تھا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ جدائی کے کرب کی سنگینی کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو کبھی اس کیفیت سے گزرے ہوں۔

شام چھ بجے انسپکٹر چیانگ شو (Chyang Chow) کا فون آگیا۔ سنگاپور میں اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ انسپکٹر نے بتایا کہ وہ کل صبح ایک کثیر رقم مجھے ہنڈی کر دے گا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا۔

''انکل! آپ نے مجھ سے کیا ہوا وعدہ تو پورا کردیا ہے نا!''

''یس مائی سن۔'' وہ سنجیدگی سے بولا ''تم میرے مرحوم دوست کے بیٹے ہو۔ میں تمہاری خوشی کی خاطر سب کچھ کرسکتا ہوں۔ تمہاری خواہش کے مطابق میں نے کل رقم میں سے ایک لاکھ یو۔ ایس منہا کر لیے ہیں۔ اب چوبیس لاکھ ڈالرز میں تمہیں بھجوا رہا ہوں۔ جو پاکستانی کرنسی کی صورت میں تمہیں کل مل جائیں گے۔ یہ رقم لگ بھگ ساڑھے پندرہ کروڑ ہو گی۔ میں رقم کی وصولی کی تصدیق بعد میں تم سے کرلوں گا۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا شکریہ ادا کیا پھر ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھا ''انکل! آپ دارا کو تو نہیں بھولے ہوں گے؟''

''نو مائی سن! میں اس شیطان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔'' چیانگ شو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اس وقت دارا تمہیں کیوں یاد آگیا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا ''دارا کے حوالے سے دراصل میں جمال اور بھولا ناتھ کا ذکر چاہتا ہوں۔ یہ دونوں افراد دارا کے سینڈیکیٹ سے وابستہ تھے اور آپ نے انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیجا تھا۔ بھولا ناتھ سے آپ نے دس کلوگرام ہیروئن بھی برآمد کی تھی جو وہ سنگاپور سے یورپ کی طرف اسمگل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔''

''ہاں، یہ واقعات مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔'' چیانگ شو نے کہا پھر بتایا ''جمال اور بھولا ناتھ کو چند روز قبل رہائی ملی ہے۔ وہ اپنی سزا کاٹ کر آزاد ہو چکے ہیں۔''

میں نے کہا ''انکل! اب وہ واقعی ہمیشہ کے لیے آزاد ہو چکے ہیں۔ انہیں ہم نے زندگی کی قید سے رہائی دلوادی ہے۔''

''مائی سن! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اس کی حیرت کو رفع کرنے کے لیے ''بی۔ تھری ایٹ'' پر پیش آنے والے واقعات تفصیل سے سنا ڈالے۔ دارا کا فرسٹ کزن جمال، کبیر شاہ کی فائرنگ سے ہلاک ہوا تھا جب کہ بھولا ناتھ میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ اسے میرے سامنے مارشل آرٹس دکھانے کا شوق چرایا تھا، اسی شوق نے بھولا ناتھ کو آنجہانی بنا دیا۔

پوری بات سننے کے بعد چیانگ شو نے کہا ''یہ دونوں خبیث پاکستان کیا لینے گئے تھے؟''

میں نے بتایا ''میرے دشمنوں سے گٹھ جوڑ کرنے۔'' پھر میں نے انسپکٹر کو دارا کے برادر خورد تارا کے ''کارناموں'' اور عبرت ناک موت کی تفصیل سنائی۔

اس نے زہریلے لہجے میں کہا ''خس کم، جہاں پاک!''

چیانگ شو کے اس مختصر سے تبصرے کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ ختم ہوگیا۔

میں نے ریسیور کو کریڈل کیا اور ڈارلنگ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ اس دوران میں وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ اس کا انداز خالصتاً بیویانہ تھا۔ نہایت ہی تیز وطرار بیویاں جس طرح اپنے شوہروں کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتی ہیں، بالکل ویسے ہی وہ مجھے بھی واچ کر رہی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ڈارلنگ! میرے پاس آؤ۔''

وہ سبک قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاؤں کے نزدیک آگئی۔

میں نے اسے بلانے کے لیے صرف ہونٹوں اور زبان کو حرکت دی تھی، باقاعدہ کوئی اشارہ وغیرہ نہیں کیا تھا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی تھی، وہ میری بات کو سمجھتی ہے۔ میں نے اس کی جانب بازو دراز کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ، میری آغوش میں بیٹھ جاؤ۔''

وہ ''میاؤں'' کی آواز نکالتے ہوئے اُچک کر میری گود میں آگئی۔ میں نہایت ہی شفقت سے اس کے ریشم ایسے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور خود کو ری لیکس ظاہر کرنے لگی۔ میری انگلیاں دھیرے دھیرے اس کے بدن کو ٹٹولتی رہیں۔ ان انگلیوں کے لمس میں ایک جذبہ تھا، ایک محبت تھی اور ایک انسیت تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے، جانور محبت کی زبان سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں۔ میری انگلیاں اس وقت محبت کی زبان بول رہی تھیں۔ ڈارلنگ آنکھیں بند کیے بڑی مطمئن اور آسودہ نظر آرہی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے محسوس ہوا، وہ میری گود میں سو چکی ہے۔ میں نے آزمانے کے لیے اسے پیار بھری ایک چپت رسید کردی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میں نے اس عمل کو دہرایا۔ وہ بدستور آسودہ اور بے حس وحرکت پڑی رہی۔ اس کا جسم صرف زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔ سانس کی آمد وشد سے پتا چلتا تھا، وہ زندہ ہے۔ شاید وہ گہری نیند میں چلی گئی تھی!

میں بہ آہستگی صوفے سے اٹھا۔ ڈارلنگ میری گود میں تھی۔ میں نے لاؤنج کے ایک کونے میں اسے قالین پر رکھ دیا۔ اس کے نزدیک ہی اسٹینڈ پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ میرا خیال تھا، میں جیسے ہی ڈارلنگ کو نیچے رکھوں گا، وہ بیدار ہو جائے گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ آسودگی کی نیند سو رہی تھی۔

میں ٹیلی فون کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گیا اور دلچسپی سے پُراسرار ڈارلنگ کو تکنے لگا۔ چند لمحات کے بعد آپوں آپ میرا خیال ڈارلنگ سے پرواز کرتے ہوئے لیلیٰ کی جانب چلا گیا پھر مجھے اس کی ''کارروائی'' یاد آنے لگی۔ گویا میں نیلگری کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیلگری نے مجھے ایسی چوٹ دی تھی جو کسی بھی طرح ایک شکست سے کم نہیں تھی۔ میرے ذہن نے نیلگری کے بارے میں جو اندازے قائم کیے تھے، وہ ان پر پوری اتری تھی۔ وہ اپنی ضد کو پورا کرنے کے لیے مجھے الجھنوں کے جال میں باندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک میں اسی ادھیڑبُن میں رہا پھر لیلیٰ کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ لیلیٰ سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیے۔ نیلگری نے اسے واسطہ بنایا تھا۔ اس کا مطلب تھا، لیلیٰ اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس سے بات کرکے بہت سے سوالات کے جواب مل سکتے تھے۔

میں نے لیلیٰ کے بیڈروم سے گزشتہ رات تین فون کیے

تھے۔ پہلا قاضی سلطان کو، دوسرا منہاس باقر کو اور تیسرا کبیر شاہ کو۔ ان تینوں فونز کا دورانیہ دس منٹ سے زیادہ تھا اور اس دوران میں میری نگاہ ٹیلی فون سیٹ پر جمی رہی تھی۔ سیٹ کی پیشانی پر موجود چھوٹی سی ٹرانسپیرنٹ پاکٹ میں فون نمبر درج تھا۔ یہ نمبر میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اب تک اس فون نمبر کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟

بے اختیار میرا ہاتھ ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے لیلیٰ کے بنگلے کا فون نمبر ڈائل کیا۔ چوتھی گھنٹی پر دوسری جانب کال ریسیو کر لی گئی۔ ایک مانوس نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''ہیلو!''

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، دوسری طرف لیلیٰ تھی پھر بھی میں نے بے ساختہ پوچھ لیا ''کیا تم لیلیٰ بات کر رہی ہو؟''

اس نے تصدیق کی اور پوچھا ''تم کون ہو؟''

''اتنی جلدی بھول گئیں!'' بے اختیار میرا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''میں واقعی تمہیں نہیں جانتی۔''

''میں وجدان بات کر رہا ہوں۔ کچھ یاد آیا؟''

اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''میں کسی وجدان کو نہیں جانتی۔ سوری...... رانگ نمبر......''

پھر اس سے پہلے کہ وہ ریسیور کو کریڈل کر دیتی۔ میں نے جلدی سے کہا ''پلیز فون بند نہ کرنا، میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جب میں تمہیں جانتی ہی نہیں تو پھر باتوں کا کیا سوال ہے؟''

''سوال ہے۔'' میں نے قطعیت سے کہا ''اور یہ سوال اس لیے ہے کہ میں کل رات تم سے ایک بھرپور ملاقات کر چکا ہوں۔''

''وہاٹ نان سینس!'' وہ برہمی سے بولی ''لگتا ہے، تم کوئی پاگل ہو۔ کل رات تو میں اپنے بنگلے پر اکیلی تھی۔''

اس کی باتیں میرے شک بلکہ یقین کی تائید کر رہی تھیں۔ میں نے کہا ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو میں تمہیں یاد دلانے کے لیے چند حوالے دیتا ہوں۔''

''جو بھی کہنا ہے، جلدی کہہ ڈالو۔'' وہ بیزاری سے بولی ''فضول باتیں سننے کا میرے پاس وقت نہیں۔''

میں نے کہا ''ابھی جن باتوں کو فضول کہہ رہی ہو بعد میں انہیں تسلیم کرتے ہی بنے گی۔''

''اس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔'' وہ اکتاہٹ آمیز انداز میں بولی ''تم جو بھی انکشاف کرنا چاہتے ہو، اس میں تاخیر نہ کرو۔''

میں نے استفسار کیا ''کیا کل رات تم لگ بھگ ساڑھے نو بجے اپنے بنگلے پر پہنچی تھیں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے کہا ''تمہارے پاس بلیک ہونڈا سوک ہے؟''

''ہاں ہے...... پھر؟''

''جب تم نے پورچ میں اپنی گاڑی کھڑی کی تو لان کے قریب ہی ایک نیلی شیرڈ بھی آ کر رکی تھی؟''

''بالکل غلط۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''نیلی شیرڈ میں، میں زخمی حالت میں تھا۔ تم مجھے اپنے ساتھ بنگلے کے اندر لے گئی تھیں۔'' میں نے کہا ''اور بیڈروم میں جا کر تم نے میری مرہم پٹی بھی کی تھی؟''

''اب مجھے یقین ہو چلا ہے، تم کوئی دماغی مریض ہو۔'' لیلیٰ نے چڑ کر کہا۔

میں نے پوچھا ''کسی زمانے میں تم نے نرسنگ کورس کیا تھا؟''

''یہ بات درست ہے۔''

''تمہارے شوہر سعید خان کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعید ایک ممتاز سیاست داں تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''اس نے اپنے پیچھے اور تمہارے آگے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ تم نے جو رقم انویسٹ کر رکھی ہے اس سے تمہیں ماہانہ تین لاکھ کے قریب پرافٹ مل جاتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔ یہ باتیں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ تمہیں بھی کہیں سے معلوم ہو گئی ہوں گی لیکن تمہاری اس جانکاری سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے، کل رات ہماری ملاقات ہو چکی ہے اور میں نے تمہاری مرہم پٹی کی تھی؟''

میں نے مصلحتاً گزشتہ رات کے ''اہم واقعات'' کو گول کر دیا اور لیلیٰ سے پوچھا ''کیا تمہیں یقین ہے کہ کل رات تم اپنے بنگلے پر اکیلی ہی تھیں؟''

''میں تمہارے اس قسم کے سوالات کے جواب دینے کی پابند نہیں ہوں۔'' وہ جھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''اس سے پہلے کہ میں فون بند کر دوں، تمہارا منہ بند کرنے کے لیے تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں، گزشتہ رات ہی نہیں بلکہ میں ہر رات اپنے بنگلے پر اکیلی ہی رہتی ہوں اور میں نے کل رات کسی وجدان ـے ملاقات کی ہے اور نہ ہی میں اس نام کے کسی شخص سے ـف ہوں۔ تم کوئی پاگل ہو یا تم نے جاگتی آنکھوں سے کوئی ـواب دیکھ لیا ہے۔ بس یا اور کچھ؟''

''بس ایک بات اور۔'' میں نے جلدی سے کہا ''کیا آج ـں بھر تم اپنے بنگلے پر ہی رہی ہو؟''

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''تم نے ـپنے اس سوال کو آخری بات کہا ہے تو سنو، میں آج کا دن ـراچی سے باہر گزار کر آئی ہوں۔ علی الصباح ایک ضروری ـام سے مجھے حیدرآباد جانا پڑ گیا۔ میں لگ بھگ چھ بجے ـنگلے سے نکل گئی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میری واپسی ـوئی ہے۔'' اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات ختم کرنے ـالے انداز میں بولی ''اگر اب تم نے دوبارہ فون کر کے مجھے ـریشان کرنے کی کوشش کی تو میں سمجھ لوں گی، تم کوئی نفسیاتی ـریض ہو چنانچہ تمہیں پولیس کے حوالے کرنا میرا فرض بن ـائے گا...... اور تم جانتے ہو، میں ایک ممتاز سیاست داں کی ـوی ہوں۔ تم یہ بھی بخوبی جانتے ہو گے اس ملک میں سیاست ـاں اور اس کے اہلِ خانہ کس طاقت اور قدرت کے مالک ـوتے ہیں!''

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔ دوسری ـانب سے لیلیٰ نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ خاصی پُراعتماد اور نڈر ـارت معلوم ہوتی تھی ورنہ وہ اتنی دیر مجھ سے گفتگو نہ کرتی۔

ـں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ میں نے ـہلے بھی نیلگری کی افسوں گری کے کئی واقعات اپنی آنکھوں ـے ملاحظہ کیے تھے۔ وہ بڑی کرنی والی تھی۔ گزشتہ رات کم و ـبیش ساڑھے نو بجے میں لیلیٰ کے بنگلے پر پہنچا تھا۔ اسی وقت وہ ـبھی کہیں باہر سے آئی تھی۔ نیلگری نے اپنی شکتی سے، رات ـساڑھے نو بجے سے صبح چھ بجے تک کے واقعات لیلیٰ کی زندگی ـسے خارج کر دیے تھے کیوں کہ ان اوقات کے درمیان وہ خود ـاس کی زندگی میں دخیل رہی تھی۔ گویا اس نے لیلیٰ کی زندگی کی ـایک رات چرالی تھی۔ وہ بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ، اس ـنے یہ رات سو کر گزاری ہوگی!

لیلیٰ سے ہونے والی اس گفتگو نے نیلگری کی ''کارکردگی'' پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اس حسین ساحرہ نے ـتدنی مشروب ''جامِ اُمید'' کا سہارا لے کر لیلیٰ کی بے بسی ـاور میری بے کسی سے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ میں ایک ـٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھلے ہوئے سلائیڈنگ ڈور سے کمرے کے اندر پہنچ رہے تھے۔ میں قالین پر یوگا کی مختلف مشقیں کر رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ سپیدۂ سحر ظاہر ہونے لگا تھا۔ وہ بہت خوشگوار اور سہانا سماں تھا۔ چاروں جانب پھیلی خاموشی اور سناٹے نے مشق کا لطف دوبالا کر دیا۔

یوگا کی مشقوں کو ایک ترتیب سے کیا جاتا ہے۔ ایک سے زیادہ شعبوں کو آزمانا ہو تو ان میں بھی ترتیب کا خیال رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے ہتھ یوگ (باڈی یوگا) پر راج یوگ (برین یوگا) اور آخر میں منتر یوگ (روحانی یوگ) کی مشقیں کی جائیں تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ ویسے تو کوئی بھی مشق، کسی بھی طور کر لی جائے اس کا فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔

میں نے اپنے دماغ اور روح کو ''وارم اپ'' کرنے کے لیے ہتھ یوگ کے چند آسن لگائے جن میں اونٹ آسن (Camel Posture) مین آسن (Fish Posture) اور ہل آسن (Plough Posture) شامل تھے۔ اس کے بعد میں کنول آسن میں بیٹھ کر سانس کی ایک مخصوص مشق کرنے لگا۔ کنول آسن یعنی لوٹس پوسچر (Lotus Posture) کو یوگا میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس آسن یا انداز کو پدم آسن، سکھ آسن اور آلتی پالتی مار کر بیٹھنا بھی کہتے ہیں۔ منتر یوگ کی اکثر مشقیں اسی آسن میں کی جاتی ہیں۔

میں شمالی رخ بیٹھ کر سانس کی مشق کرنے لگا۔ سانس کھینچنے، روکنے اور چھوڑنے کی مشقوں کو مجموعی طور پر پرانایام (Pranayam) کہا جاتا ہے۔ عموماً سانس کو روکنے کے تین طریقے رائج ہیں۔ دو جسم کے اندر اور ایک بدن سے باہر۔ جسم کے اندر یا تو سانس پھیپڑوں میں روکی جاتی ہے یا پھر پیٹ میں جب کہ بدن سے باہر سانس روکنے کے لیے اپنے پیٹ اور پھیپڑوں کو خالی کرنا پڑتا ہے یعنی اتنا گہرا (Exhale) کرنا ہوتا ہے کہ جسم کے اندر خصوصاً پیٹ اور پھیپڑوں میں سانس باقی نہ رہے۔ سانس روکنے کا یہ طریقہ خاصا مشکل اور صبر آزما ہے اگر اس میں مہارت حاصل ہو جائے تو انسان اپنے دل کی دھڑکن کو روک کر خود کو مردہ ظاہر کر سکتا ہے۔ جو شعبدہ باز یوگی گھنٹوں سانس روکنے کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ اسی طریقے کو اپناتے ہیں۔ نہ صرف سانس بلکہ ایک مخصوص عمل سے معدے کو ہر قسم کی نمی اور خوراک سے خالی کر لیا جاتا ہے۔

شاذمن ٹیمپل میں قیام اور تربیت کے دوران میں میرے

دادا استاد ماسٹر ہنگ پائی (Hang Pai) نے مختلف مشقوں سے میرے اندر ''چی'' کی قوت کو بیدار کیا تھا اور اس قوت کے مزید حصول کے لیے مجھے ایڈوانس ایکسر سائز بھی بتائی تھیں۔ اب تک مجھے ان مشقوں کے لیے مناسب وقت نہیں ملا تھا لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میں ان کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور پر گزشتہ رات نیلگری کے حوالے سے جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اس میں مجھے اپنی بے بسی کا گہرا احساس ہوا تھا۔ میں ''چی'' کی ایڈوانس ایکسر سائز سے اپنی باطنی قوت کو بڑھانا چاہتا تھا تا کہ نیلگری جیسی نادیدہ اور پُراسرار شکتیاں مجھے اپنا آلۂ کار نہ بنا سکیں۔ کوئی انسان چاہے کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، آلۂ کار بننا پسند نہیں کرتا۔ انسان کی خودی ہر حال میں اسے طاقت اور اختیار حاصل کرنے کے لیے اُکساتی رہتی ہے۔

میں نے آنکھیں بند کیں، چند گہری سانسیں لے کر اپنے ذہن کو ٹیون کیا پھر سانس کی ایک مخصوص مشق (Stroke Breathing) کرنے لگا اس مشق کے دوران میں مختلف وقفوں سے سانس کو کھینچا اور چھوڑا جاتا ہے۔ سانس اندر کھینچتے (Inhale) کرتے ہوئے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رک کر سانس کی ڈور پر گرہ لگائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جب سانس کو چھوڑا جاتا ہے یعنی (Exhale) کرتے وقت بھی انہی مقامات پر رک کر ان گرہ کو کھولتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی سادہ اور آسان عمل ہے لیکن اس میں ردھم اور تناسب پیدا کرنے کے لیے خاصی مشق اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے کہ (Inhale) کرتے وقت ہم نے جہاں جہاں گرہ لگائی تھیں، (Exhale) کرتے ہوئے وہیں سے گرہ کھولی جائیں مگر ترتیب الٹ جائے یعنی آخری گرہ کو پہلے کھولا جائے گا اور پہلی گرہ کو سب سے آخر میں۔ گرہ کھولنے اور لگانے کا عمل تصوراتی ہے۔ اس تصور کو خیال کی قوت سے روشن اور واضح کیا جاتا ہے۔ اس مشق کے دوران میں ارتکاز بہت ضروری ہے۔ سانس کھینچتے اور چھوڑتے وقت یعنی گرہ لگاتے اور کھولتے وقت تمام تر توجہ ناف کے مقام پر مرتکز رکھنا ضروری ہے۔

میں دس منٹ تک یہ مشق دہراتا رہا پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے بعد آرام کی غرض سے سکھ آسن کو ختم کر کے قالین پر چت لیٹ گیا۔

آئندہ دو روز تک کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میرے لیے قابلِ ذکر واقعہ وہ ہوتا جس میں کسی نہ کسی حوالے سے ساحل موجود ہوتی۔ اس کی وجودگی کے بغیر میں خالی ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے میں اپنے جسم کا ایک حصہ ہی سمجھنے لگا تھا۔ وہ کیا جدا ہوئی تھی، گویا میں کہیں کھو گیا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے، میں ساحل کو تلاش کر رہا ہوں لیکن میں ''تیری تلاش میں نکلے اور خود کھو گئے'' والی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

تیسرے روز میں نے شعیب غوری سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ''میں لاہور جا رہا ہوں۔''

شعیب نے میاں زاہد کے جس خفیہ اڈے کا سراغ لگایا تھا، وہاں ساحل کی موجودی ثابت نہ ہو سکی۔ ان حالات میں میرا ذہن بار بار اس طرف جا رہا تھا کہ اسے ان بدبختوں نے لاہور بھیج دیا ہو گا۔ عین ممکن تھا، ساحل اس وقت چوہدری نوازش علی کی حویلی میں ہو...... اس کی قید میں۔ میں نے لاہور جانے کا ارادہ ظاہر کرنے سے پہلے شعیب کو اپنے اندازے کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا ''میں بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہوں۔ خیر، میں کل کی کسی فلائٹ سے تمہارے لاہور جانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کبیر شاہ کو تمہاری ضرورت کے بارے میں بریف کر دوں گا۔''

میں نے کہا ''شعیب! کل صبح میں ساؤتھ جا کر کبیر شاہ سے مل لوں گا۔ تم اسے بتا دینا، میرے ساتھ ایک بلی بھی جائے گی۔ اس کے سفر کے انتظامات بھی کرنا ہوں گے۔''

''بلی!'' شعیب کی حیرت بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس وقت ہم ٹیلی فون کے ذریعے گفتگو کر رہے تھے۔

میں نے زور دے کر کہا ''ہاں بلی۔ اس کا نام ڈارلنگ ہے۔ لائیو اسٹاک کی بکنگ کے لیے اس کے نام کی ضرورت پڑے گی۔ وہ سفید رنگ کی ایک خوبصورت بلی ہے۔''

''یہ بلی تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟'' اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی۔

میں نے بتایا ''بس نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔''

وہ میرے اس گول مول جواب سے سمجھ گیا، میں بلی کے سلسلے میں کسی وضاحت میں نہیں جانا چاہتا لہٰذا اس نے بھی زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا اور جلدی سے بولا۔

''او کے، او کے۔ بلی کی بکنگ بھی ہو جائے گی۔'' پھر اس نے پوچھا ''لاہور میں کس ہوٹل میں قیام کرنا پسند کرو گے؟ میں تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا ''میں اپنی شعوری زندگی میں پہلی مرتبہ لاہور جا رہا ہوں۔ اس لیے وہاں کے ہوٹلز کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تم جو مناسب اور موزوں جانو، اسی ہوٹل میں کمرا بک کروا دو۔ میں ہوٹل کی بکنگ اور ہوائی سفر کے اخراجات کی کل رقم کل کبیر شاہ کو دے دوں گا۔''

''خواہ مخواہ مجھے شرمندہ نہ کرو دوست۔'' شعیب نے کہا ''میں بھلا یہ چھوٹی سی رقم تم سے وصول کرتا اچھا لگوں گا؟''

''بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں شعیب۔'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا ''ہم صرف دوست ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے بزنس پارٹنر بھی ہیں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ میرے پاس رقم تھی اور نہ ہی کوئی محفوظ ٹھکانا۔ تم نے مجھے متذکرہ سہولیات فراہم کر دیں لیکن اب صورتِ حال خاصی حوصلہ افزا اور صحت مند ہے۔ اس وقت میرے مختلف اکاؤنٹس میں لگ بھگ ساڑھے پندرہ کروڑ روپے موجود ہیں لہٰذا لین دین کی عادت مجھے بھی ڈالنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔

دو روز قبل سنگاپور سے آنے والی ہنڈی کی رقم میں نے وصول کر لی تھی اور اسی روز شعیب غوری کی راہ نمائی اور تعاون سے میں نے تین مختلف بینکوں میں اکاؤنٹس بھی کھول لیے تھے۔ ان میں ایک غیر ملکی اور دو ملکی بینک تھے۔ غیر ملکی میں شعیب کے مشورے کے مطابق میں نے ''ڈالر اکاؤنٹ'' کھولا تھا جب کہ دو مختلف ملکی بینکوں میں ''روپی اکاؤنٹس'' کھولے گئے۔ ان دونوں ملکی بینکوں میں ''آن لائن بینکنگ'' کی سہولت موجود تھی۔ مجھ ایسے تگڑے اکاؤنٹ ہولڈر کو پا کر تینوں بینکوں کے منیجر زخوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔

ایک گھنٹے بعد کبیر شاہ کا فون آ گیا۔ اس نے پُرمسرت لہجے میں بتایا ''وجدان! میں نے کوشش کر کے کل صبح تمہاری روانگی کا بندوبست کر دیا ہے۔ آٹھ بجے والی فلائٹ میں تمہاری اور ڈارلنگ کی بکنگ ہو گئی ہے۔ تم سات بجے سے تھوڑا پہلے ائرپورٹ پہنچ جانا بلکہ ایسا کرو۔'' وہ ایک لمحے کا توقف کر کے بولا ''تم رات کو ساؤتھ ہی کیوں نہیں چلے آتے۔ میں صبح خود تمہیں ائرپورٹ چھوڑ آؤں گا۔''

''نہیں شاہ جی! اتنے تکلفات میں نہ پڑو۔'' میں نے کسی اندرونی جذبے کے تحت کہا ''تم ہمارے ٹکٹ وغیرہ یہاں بھیج دو۔ میں کل ٹھیک وقت پر ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔''

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ''چلو ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ میں آدھے گھنٹے کے اندر تمہارا ٹکٹ بھجوا رہا ہوں۔ تمہاری ڈارلنگ کے سلسلے میں، میں نے ائرپورٹ کے متعلقہ کاؤنٹر سے فون پر بات کر لی ہے۔ وہ ڈارلنگ کے لیے اسپیس چھوڑ دیں گے۔ تم ائرپورٹ پہنچ کر ''لائیو اسٹاک'' کاؤنٹر سے رابطہ کرنا۔ وہ تمہیں بلی کے لیے ایک چھوٹا سا کیج (Cage) مہیا کریں گے۔''

''ہاں، میں اس پراسس سے واقف ہوں۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''ڈارلنگ کے لائسنس کی ضرورت تو پیش نہیں آئے گی؟ بیرونِ ممالک میں تو پالتو جانوروں کے باقاعدہ لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔ بغیر لائسنس آپ نہ تو اپنے پاس کوئی پالتو جانور رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ سفر پر کہیں لے جا سکتے ہیں۔''

کبیر شاہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا ''یہاں اس قسم کی ''پریشانیوں'' نے ابھی رواج نہیں پایا۔ کراچی سے لاہور تک بائی ائر سفر کرنے کے لیے تمہاری بلی کا نام ہی کافی ہے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

وہ کریدنے والے انداز میں بولا ''یار وجدان! یہ بلی کا کیا چکر ہے۔ جب تم ساؤتھ سے گئے تھے تو ایسی کوئی شے تمہارے ساتھ نہیں تھی، نہ ہی پہلے میں نے اسے تمہارے آس

پاس دیکھا ہے۔ کیا حال ہی میں یہ تمہارے ہتھے چڑھی ہے؟"
اس فلیٹ میں پیش آنے والے سفید چیتے کے واقعے سے کبیر شاہ واقف تھا۔ ازاں بعد جسے میں نے ساحل کے خواب سے تعبیر کر کے بات بنالی تھی۔ بلی کو واقعی اس نے میرے پاس نہیں دیکھا تھا۔ جب میں ڈارلنگ کے ساتھ لیلیٰ کے بنگلے سے ساؤتھ آیا تھا تو اس شیطان کی خالہ نے بڑی مہارت سے خود کو روپوش کر لیا تھا۔ کبیر شاہ کے سوال کے جواب میں، میں نے مختصراً کہا۔

"ہاں، شاہ جی! ڈارلنگ سے نئی نئی دوستی ہوئی ہے۔"

"آخر یہ ہے کون؟"

"ڈارلنگ کے معنی نہیں جانتے ہو؟"

"محبوبہ!" اس نے کہا۔

"بالکل درست۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "ڈارلنگ نامی یہ سفید بلی میری محبوبہ ہے۔"

"میاؤں!" میرا جملہ ختم ہوتے ہی لاؤنج میں ایک مخصوص آواز ابھری۔

کبیر شاہ نے حیرت آمیز لہجے میں کہا "اوہو! تو موصوفہ تمہارے آس پاس ہی ہے؟"

"ڈارلنگ اس وقت میری گود میں بیٹھی ہے۔" میں نے کہا۔

"محبوبہ کو ہر وقت، چاہنے والے کی آغوش ہی میں رہنا چاہیے۔" وہ چہک کر بولا پھر ہمارے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

کبیر شاہ نے یہ جملہ روا روی میں ادا کیا تھا مگر اس کا یہ سرسری انداز مجھے جھنجوڑنے کے لیے کافی تھا۔ یک بہ یک میرا خیال ساحل کی جانب پرواز کر گیا۔ میں پچھلے کچھ عرصے سے ساحل کو چاہنے لگا تھا، کجا یہ کہ کبھی وہ مجھے اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش میں رہتی تھی اور میں دانستہ اسے نظر انداز کرتا چلا آیا تھا۔ مجھے بہت بعد میں یہ احساس ہوا کہ میں اسے چپکے چپکے چاہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری چاہت اس پر کھلتی، ساحل کے رویے میں اچانک ایک ناخوشگوار تبدیلی واقع ہو گئی۔ وہ بڑی خوبصورتی سے گریز کی راہ پر چلنے لگی۔ ہم دونوں ریل کی پٹریوں کی طرح پہلو بہ پہلو محوِ سفر تھے اور ہمارے درمیان حائل چند فٹ کا فاصلہ برقرار تھا۔ یہ فاصلہ ایک بے رحم زنجیر کے مانند تھا۔ ایک ایسی نادیدہ زنجیر جو بڑے کر و فر سے تنی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی لچک تھی اور نہ ہی کوئی بچک۔ یہ سفاک اور سخت گیر زنجیر بڑی ستم گر تھی۔ ہمیں ملنے دیتی تھی اور نہ ہی بچھڑنے دیتی تھی۔ اس نے ہمیں پاس پاس رکھ کر دور دور کر دیا تھا۔

زندگی کا یہ سفر چلتے چلتے جاری تھا کہ اچانک یہ ظالم زنجیر ٹوٹ گئی، گویا پٹریوں کا ناتا ٹوٹ گیا۔ پہلے ہم ایک فاصلے پر رہتے ہوئے بھی ایک ہی سمت میں سفر کر رہے تھے لیکن وقت کے ظالم تازیانے نے ہمیں جدا کر دیا۔ اپنے مدار سے ہٹے والے اجسام کی طرح ہمارے رخ بدل گئے تھے۔ ساحل تو پھر بھی ایک "طے شدہ" سمت میں آگے بڑھ رہی تھی مگر میں بے سمت ہو کر رہ گیا تھا۔

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے میں ہیجانی کیفیت سے گزرنے لگا۔ اس وقت میری دونوں مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، دانتوں پر دانت جمے ہوئے تھے اور بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، اگر میں کچھ دیر مزید اسی حالت میں بیٹھا رہا تو اپنے ہوش و حواس گم کر بیٹھوں گا۔ پتا نہیں...... معلوم نہیں...... میں نہیں جانتا، وہ کس طرح میرے اندر سما گئی تھی کہ میں اس کے لیے بے اختیار ہو جاتا تھا۔ میری سوچ اور جذبے کنٹرول میں نہیں رہتے تھے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں "سیلف کنٹرول" پر عبور رکھتا ہوں لیکن ساحل کے معاملے میں، میں بے بسی کا شکار ہو جاتا تھا۔ یہ بے بسی، بے چارگی اور بے اختیاری مجھے مار ڈالے گی، اگر میں نے جلد از جلد ساحل تک پہنچنے کی کوشش نہ کی تو!

یہ آخری جملہ ایک سوال بن کر میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ ایک خوفناک وارننگ تھی، ایک کھلا چیلنج تھا اور میں ہمیشہ سے چیلنج قبول کرتا آیا ہوں۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے لاؤنج میں ٹہلنے لگا۔ ساحل کے بارے میں جذباتی انداز سے سوچتے ہوئے میں نے اپنے اندر کسی اور وجود کو بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ وجدان انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا جو بہت ہی سرکش اور ضدی تھا۔ وہ ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر سوچتا تھا اور مقصد کے حصول کے لیے ہر معاملے میں بے خطر کود پڑتا تھا۔ میں نے اس وجدان کے معرکہ آرا کارنامے بھی دیکھے تھے اور بعد میں خود ہی حیران بھی ہوا تھا کہ کیا واقعی یہ سب کچھ میں نے کیا ہے؟

اس وقت میرے ذہن میں سرکش اور انتقامی خیالات کا میلا لگا ہوا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کیا، کوئی ضروری نہیں کہ میں قدم قدم پر شعیب غوری اور "سی ایف کے" کی انگلی پکڑ کر چلوں۔ دوستوں سے مشورہ اور مدد لینا اچھی بات ہے لیکن میں ساحل کی تلاش کو صرف اور صرف خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا، اس سلسلے میں ہر اقدام میں

ن تنہا کروں گا۔ ان نتیجہ خیز اور ولولہ انگیز خیالات کی روشنی میں، میں نے اپنے ذہن میں ایک فوری اور اٹل ارادہ باندھ یا۔ یہ کہ...... کراچی چھوڑنے سے قبل میں میاں زاہد حسین کو برت ناک انجام سے دوچار کروں گا۔ اس کے انگشت بہ دان حشر کو دیکھ کر کراچی سرکٹ میں کھلبلی مچ جائے گی اور ہنگامہ ہو گا جس کی گونج کراچی سے "رکھاں والی" تک نائی دے گی۔ یہ ایک طرح کا ٹیلی گرام ہو گا جو میں رکھاں الی میں اپنی آمد کی اطلاع کے طور پر چوہدری نوازش علی کو انہ کروں گا۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور میاں زاہد کو تلاش کرنا ت مشکل! مگر ان لمحات میں میرے دماغ کی ڈکشنری بدل ئی تھی۔ نئی ڈکشنری میں "مشکل" اور "ناممکن" کے الفاظ رج نہیں تھے۔ میں نے اس ڈکشنری کے اوراق الٹتے ہوئے تی کامیابی یعنی "فتح" کو سرکل کیا اور ڈکشنری بند کر دی۔

اس وقت شام ہو رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک ات کی مہلت تھی۔ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے مضبوط اور مربوط پلاننگ کرنے لگا۔ سب سے پہلا مرحلہ یاں زاہد کی تلاش کا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً اس مسئلے کا حل ش کر دیا، گویا میرا ذہن پوری طرح فعال ہو چکا تھا۔ اپنی انگ کے مطابق مجھے کچھ ابتدائی انتظامات کرنا تھے جن کے لیے دو ڈھائی گھنٹے کافی تھے۔ حسبِ وعدہ کبیر شاہ نے ٹکٹ اور روری کاغذات مجھے بھجوا دیے تو میں انتظامات میں جت گیا۔

میں نے شیرڈ نکالی اور ڈارلنگ کی ہمراہی میں مارکیٹ کا یک چکر لگایا۔ ضروری خریداری کے بعد میں نے ایک ہیئر ڈریسر سے کٹنگ کروائی۔ میری ہدایت پر اس نے مجھے سولجر بنا یا۔ اس کے ہاتھوں کی جنبش، انگلیوں کی حرکات و سکنات اور ئینے میں ابھرنے والے اپنے عکس کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا وہ ہیئر ڈریسر "سولجر کٹ" میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں اپنے فلیٹ پر موجود تھا۔ میں نے پہلے اپنا سفری بیگ تیار کیا۔ تمام ضروری سامان اور کاغذات س میں رکھے۔ آن لائن بینکنگ سے استفادہ کرنے کی چابی" بھی میرے پاس موجود تھی۔ اس کے علاوہ کیش کی صورت میں بھی اچھی خاصی رقم میرے پاس تھی۔ اس کے بعد میں نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ آئینے کے سامنے جا کر میں نے اپنا جائزہ لیا تو حیران رہ گیا۔ حلیے کے اعتبار سے اب میں چند

گھنٹے پہلے والا وجدان نہیں رہا تھا، ویسے مزاج اور ارادوں کے حوالے سے بھی میں بہت بدل چکا تھا۔ یہ سب آثار تھے کسی بہت بڑے طوفان کے۔

میں نے بلیو جینز پر سرخ رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بھاری بھر کم آرمی شوز تھے۔ گزشتہ چند ماہ میں میری مونچھیں اچھی خاصی بڑی ہو گئی تھیں۔ سولجر کٹ کی وجہ سے بھی

محی الدین نواب کی دس شاہکار کہانیوں کا مجموعہ
ایمان کا سفر
نیا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے
مضبوط جلد
کمپیوٹرائزڈ کتابت
قیمت -/150 روپے ڈاک خرچ -/25 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
kitabiat@yahoo.com

مقبول ترین مصنف محی الدین نواب جن کی کہانیاں آنکھوں سے نہیں دلوں سے پڑھی جاتی ہیں
8 بہترین کہانیوں کا مجموعہ
کچا گھر
کا نیا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے
کمپیوٹرائزڈ کتابت
قیمت 100 روپے
ڈاک خرچ 25 روپے
خوبصورت گیٹ اپ
محی الدین نواب کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ایمان کا سفر" بھی دستیاب ہے
کتابیات پبلی کیشنز
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
Email: kitabiat1970@yahoo.com

میرے حلیے میں اچھی خاصی تبدیلی آ چکی تھی۔ آنکھوں پر میں نے سیاہ شیشوں والا ایک اسمارٹ سا چشمہ لگا لیا تھا اور گلے میں طلائی چین بھی ڈال لی تھی۔ یہ ایک بدلا ہوا وجدان تھا...... جو بہت کچھ بدلنے جا رہا تھا۔

آئندہ دس منٹ بعد میں اپنے فلیٹ میں نہیں تھا۔ نیلی شیرڈ کے ذریعے میں صدر کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے گاڑی کو عبداللہ ہارون روڈ کے ایک مناسب مقام پر چارجڈ پارکنگ میں کھڑا کیا اور اپنا بیگ اٹھا کر اس ہوٹل کی جانب بڑھ گیا جہاں چند ماہ قبل میں ساحل اور میر بخش کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ میاں زاہد حسین اس ہوٹل کے حصے داروں میں سے ایک تھا۔

میں نے ہوٹل کے ریسیپشن پر پہنچ کر اپنا تعارف کروایا۔

''میرا نام موہن ہے۔ میں میاں زاہد حسین سے ملنا چاہتا ہوں۔''

استقبالیہ کلرک نے پوچھا ''تم کس سلسلے میں میاں جی سے ملنا چاہتے ہو؟''

میں نے گفتگو کا آغاز چوں کہ انگلش میں کیا تھا اس لیے جواباً وہ بھی اسی زبان میں بول رہا تھا۔ اس کی انگلش خاصی ''صحت مند'' تھی...... یعنی کہ موٹی تھی!

میں نے کہا ''مجھے میاں جی سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ پلیز، تم اس سے میری بات کروا دو۔''

''دیکھو مسٹر موہن!'' استقبالیہ کلرک نے کہا ''میاں جی ہوٹل میں نہیں ہوتے۔ اس لیے ان سے ملاقات ممکن نہیں۔''

میں نے برہمی سے کہا ''یہ بات میں بھی جانتا ہوں، میاں زاہد چوبیس گھنٹے اس ہوٹل میں بیٹھا نہیں رہتا ہوگا۔ وہ ہوٹل کا حصے دار ہے، کبھی کبھار ہی یہاں کا چکر لگاتا ہوگا۔ تم فون پر اس سے میری بات کروا دو۔''

''مجھے معلوم نہیں، میاں جی سے اس وقت کہاں فون پر بات ہو سکتی ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ میرے جارحانہ رویے نے اسے خاصا نرم کر دیا تھا۔

میں نے چاروں جانب دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا ''تم مجھے کسی ذمے دار شخص سے تو ملوا سکتے ہو نا۔ مثلاً ہوٹل منیجر......؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''یس سر! آپ اس طرف چلے جائیں۔'' پھر اس نے ایک جانب اشارہ کیا ''منیجر صاحب اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔''

میں فوراً ہوٹل منیجر چوہدری تجمل کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے بتایا کہ میں دراصل بھولا ناتھ کا دوست ہوں۔ چند روز قبل سنگاپور سے آیا ہوں یہاں میں اپنے ایک دوست امرناتھ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں جو گارڈن ویسٹ میں رہتا ہے۔ بھولا ناتھ نے مجھے میاں زاہد سے ملنے کو کہا تھا مگر باوجود کوشش کے ابھی تک میری میاں زاہد سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ کل صبح کی فلائٹ سے میں واپس سنگاپور جا رہا ہوں۔ میرے پاس صرف آج رات کا وقت ہے، اگر میاں زاہد سے چند منٹ کی ملاقات ہو جائے تو اس میں ہم دونوں کا ہی بھلا ہے۔ بصورتِ دیگر دونوں شدید نقصان اٹھائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

پوری بات سننے کے بعد منیجر نے کہا ''تم کس سلسلے میں میاں جی سے ملاقات کرنا چاہتے ہو؟''

''یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔'' میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا ''معاملہ بہت ہی سنگین اور رازداری کا ہے۔ پلیز، آپ اصرار نہ کریں اور فوراً میاں جی سے میرا رابطہ کروا دیں۔''

ہوٹل منیجر ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''مسٹر موہن! تم نے بتایا ہے کہ کوشش کے باوجود بھی ابھی تک میاں جی سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکی۔ تم نے انہیں کہاں تلاش کیا تھا؟ کیا تم اس سلسلے میں پہلے بھی ہوٹل آ چکے ہو؟''

''اس ہوٹل میں، میں پہلی مرتبہ آیا ہوں۔'' میں نے پراعتماد لہجے میں کہا ''بھولا ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ڈیفنس سوسائٹی کے ایک بنگلے ''بی۔تھری ایٹ'' میں قیام کرے گا اور یہاں پہنچتے ہی وہ مجھ سے رابطہ کرے گا۔ واضح رہے کہ میں بھولا ناتھ سے تین روز پہلے یہاں آیا تھا۔ جب بھولا ناتھ نے مجھ سے کوئی کانٹیکٹ نہیں کیا تو میں مذکورہ بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ آ کر کہیں جا چکا ہے۔ مجھے یہ جواب سن کر حیرت بھی ہوئی۔ بھولا ناتھ نے تو مجھے میاں جی سے ملوانا تھا۔ وہ کہیں جا نہیں سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی سنگاپور سے یہاں آیا تھا جس کا نام جمال تھا۔'' میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''میرا واپس جانا بھی ضروری ہے اور اگر میں میاں زاہد سے ملے بغیر واپس چلا گیا تو شدید نوعیت کا نقصان ہو سکتا ہے۔ مجھے بھولا ناتھ کی زبانی پتا چلا تھا کہ یہ ہوٹل میاں زاہد کی ملکیت ہے۔ امید کی آخری کرن کے سہارے یہاں آیا ہوں۔ اب تو آپ میری مجبوری اور ضرورت کو سمجھ گئے ہوں گے؟''

میں بات ختم کر کے سوالیہ نظروں سے ہوٹل منیجر چوہدری تجمل کو دیکھنے لگا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ وہ ایک جہاندیدہ شخص دکھائی دیتا تھا لیکن میں نے بھی اتنی بھرپور کہانی اسے سنائی تھی کہ وہ میرے لیے کچھ کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے مجھے ہوٹل کی لابی میں انتظار کرنے کو کہا اور خود ٹیلی فون کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

یہ ''مصروفیت'' وہ میری موجودگی میں بھی جاری رکھ سکتا تھا۔ اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میاں جی کو ٹریس کرنے کی کارروائی کو وہ مجھ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دانستہ اسے ایسی مبہم اور چکردار کہانی سنائی تھی کہ وہ میری حیثیت کا اندازہ نہ لگا سکے مگر میاں زاہد سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جائے۔ مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی دکھائی دے رہی تھی۔ جب میں نے چوہدری تجمل کے سامنے ''بی۔تھری ایٹ'' اور جمال کا ذکر کیا تو اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی تھی تاہم زبان سے اس نے کوئی اظہار یا استفسار نہیں کیا۔ میں اسے اپنی اہمیت کا احساس دلانے میں کامیاب رہا تھا۔

دس منٹ کے بعد ہوٹل منیجر نے مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ میں وہاں پہنچا تو اس نے کہا ''ایسا ہے کہ میاں جی سے میری بات ہو گئی ہے۔ وہ تمہیں صرف آدھا گھنٹا دینے کو تیار ہیں۔''

''کیا وہ یہاں آ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' منیجر تجمل نے نفی میں گردن ہلائی ''انہوں نے ایک ڈینٹل کلینک پر بلایا ہے۔'' پھر اس نے مذکورہ کلینک کا ایڈریس بتانے کے بعد کہا ''ٹھیک نو بجے تم وہاں پہنچ جاؤ۔ ساڑھے نو بجے میاں جی کا ڈینٹسٹ سے اپائنٹمنٹ ہے۔ وہ نو اور ساڑھے نو بجے کے درمیانی آدھے گھنٹے میں تم سے ملاقات کر لیں گے لیکن وقت کا خیال رکھنا۔ وہ بہت ہی پنکچوئل ہیں۔''

''میں خود بھی ایسا ہی ہوں۔'' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''اس وقت آٹھ بجے ہیں۔ نو بجنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ میں بہ آسانی اس کلینک پر بروقت پہنچ سکتا ہوں۔''

چوہدری تجمل نے پوچھا ''وہاں جانے کے لیے تمہارے پاس سواری کا بندوبست ہے یا میں ٹیکسی منگوا دوں؟''

میں نے دانستہ جھوٹ بولا ''میرے پاس سواری وغیرہ نہیں ہے۔ میں ٹیکسی میں وہاں جاؤں گا لیکن اس سلسلے میں آپ زحمت نہ کریں۔ میں خود چلا جاؤں گا۔ ابھی میں صدر میں بھی تھوڑی خریداری بھی کروں گا۔''

''ایز یو لائیک'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا پھر پوچھا ''تم نے بتایا ہے کہ میاں جی سے یہ تمہاری فرسٹ میٹنگ ہوگی۔ تم کلینک میں انہیں کیسے پہچانو گے؟''

میں نے اسے یقین دلانے کے لیے اپنے چہرے پر پریشانی کے آثار تخلیق کیے تا کہ وہ مجھے میاں زاہد کا صورت ناآشنا ہی سمجھتا رہے ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ میں میاں زاہد کے نقش و نگار اور حلیے کو اپنے ذہن میں ''لاک'' کر چکا تھا۔ شعیب غوری نے پہلی ملاقات میں مجھے اس کی تصویر بھی دکھائی تھی۔ اگرچہ میں نے اس سے پہلے میاں زاہد کو نہیں دیکھا تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ میں اسے پہلی ہی نظر میں بخوبی پہچان لوں گا۔ میں نے کہا ''ہاں، یہ پرابلم تو ہوگی!''

میری الجھن کے پیشِ نظر چوہدری تجمل نے کہا ''ویسے تو میں نے میاں جی کے حکم پر انہیں تمہارا حلیہ تفصیلاً نوٹ کروا دیا ہے۔ وہ تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیں گے لیکن انہوں نے جو مشورہ دیا ہے تمہیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔''

''کیا مشورہ دیا ہے میاں زاہد نے؟'' میں نے پوچھا۔

تجمل نے بتایا ''ڈینٹل کلینک کی ریسپشنسٹ کا نام حنا ہے۔ وہ دبلی پتلی لڑکی میاں جی کو اچھی طرح جانتی ہے۔ تم اس سے ان کے بارے میں پوچھ لینا۔ میاں جی ٹھیک نو بجے کلینک کے ویٹنگ روم میں موجود ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں میاں زاہد کے مشورے پر عمل کروں گا۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا اور منیجر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ جب میں ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر پہنچ چکا تو ڈارلنگ اچانک ایک طرف سے نمودار ہو کر میرے پاس آ گئی۔ وہ گاڑی سے ہوٹل تک بھی میرے ساتھ آئی تھی مگر ہوٹل کے اندر داخل ہونا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میں دو چار گلیوں میں گھومنے کے بعد اپنی شیرڈ کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ ہوٹل سے نکلنے کے بعد کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ میں نے ڈارلنگ کو پسنجرز سیٹ پر سوار کرایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں عبداللہ ہارون روڈ سے نکل کر کلفٹن کی جانب جا رہا تھا۔ مذکورہ ڈینٹل کلینک کلفٹن ایسے پوش اور بارونق علاقے میں واقع تھا۔

اس وقت میں بڑے تسلسل کے ساتھ میاں زاہد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑی چالاکی کے ساتھ چوہدری تجمل سے میرا حلیہ معلوم کر لیا تھا لیکن مجھے اس کے حلیے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، میاں زاہد اچھی طرح دیکھ بھال کر مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر اسے میرے بارے میں کسی قسم کا شبہ ہو جاتا تو وہ پردے میں

رہ کر کوئی بھی خطرناک چال چل سکتا تھا۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں نے فیصلہ کیا کہ میں قبل از وقت اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاؤں گا اور نو بجنے سے پہلے میں وہاں کا تنقیدی جائزہ بھی لے لوں گا۔ کلینک میں داخل ہونے اور ریسپشنسٹ سے میاں زاہد کے بارے میں استفسار کرنے کے بارے میں حالاتِ موجودہ کے مطابق ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ بہت ہی نازک سچویشن تھی اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔

صدر سے اس ڈینٹل کلینک تک بہ سہولت پچیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ میں نے تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے یہ فاصلہ پندرہ منٹ میں طے کرلیا۔ جب میں مطلوبہ کلینک پہنچا تو میری رسٹ واچ آٹھ بیس کا وقت بتا رہی تھی گویا میاں زاہد کی آمد میں ابھی چالیس منٹ باقی تھے۔ اگر وہ دس منٹ پہلے بھی آ جاتا تو پھر بھی آدھا گھنٹا پڑا تھا۔

میں نے کلینک کے سامنے گاڑی روکی نہیں بلکہ دھیمی رفتار سے آگے بڑھا لے گیا۔ اس دوران میں، میں گرد و نواح کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ کلینک کے سامنے، سڑک کی دوسری جانب ایک بہت بڑا ڈپارٹمنٹل اسٹور تھا۔ وہ اسٹور مجھے آئیڈیل جگہ لگی۔ اس کے اندر رہتے ہوئے میں بہ آسانی کلینک میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ اس وقت کلینک کے آگے تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں جو ظاہر ہے وہاں آنے والے مریضوں ہی کی ہو سکتی تھیں۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے شیرڈ کو واپس موڑ لیا اور ڈپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے سے گزر کر دوبارہ کلینک والی سمت میں آ گیا۔ میں نے سوچا، ابھی کافی وقت ہے لہٰذا ایک نظر اندر جھانک کر دیکھ لینا چاہیے کہ وہاں کا لے آؤٹ کیا ہے...... اور وہاں موجود افراد میں کہیں میاں زاہد حسین تو شامل نہیں! کلینک کی نگرانی سے قبل یہ جاننا بہت ضروری تھا۔

میں نے شیرڈ کو کلینک کے آگے کھڑی گاڑیوں کے ساتھ پارک کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہنگامی صورتِ حال میں مجھے وہاں سے فوراً نکلنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

چند سیکنڈ میں، میں کلینک کے اندر سے راؤنڈ لگا کر باہر آ چکا تھا۔ کلینک کے ویٹنگ روم میں میاں زاہد موجود تھا اور نہ ہی مجھے کوئی مشتبہ چہرہ نظر آیا۔ ڈارلنگ شیرڈ کے اندر بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی پشت کو پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''ڈارلنگ! تم اس مشن میں میرے ساتھ رہو گی یا گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرو گی؟''

اس نے بڑے سُریلے انداز میں آواز نکالی ''میاؤں''۔

میں اس آواز کو ''ہاں یا ''نہ'' میں سے کسی بھی خانے میں فٹ نہ کر سکا۔ اس سے درست جواب کے لیے تھوڑی سی ذہنی جمناسٹک کرنا پڑتی تھی۔ میں نے بدستور اس کے نرم و ملائم اور گداز بدن کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''ڈارلنگ! تمہاری ''میاؤں'' خاصی معنی خیز ہوتی ہے۔ میری بات دھیان سے سنو۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میں گاڑی کو یہاں چھوڑ کر سامنے والے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جا رہا ہوں۔ اگر تم گاڑی کے اندر ہی میرا انتظار کرنا چاہتی ہو تو آرام سے سیٹ پر بیٹھی رہنا...... اور اگر میرے ساتھ جانا چاہتی ہو تو گاڑی سے باہر آ جاؤ۔''

بات ختم کرتے ہی میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ڈارلنگ نے اپنی مخصوص آواز میں ''میاؤں'' کیا اور چھلانگ لگا کر میرے قدموں کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں سڑک پار کر کے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے نزدیک آ گیا۔ ڈارلنگ کو اس طرف پہنچانے کے لیے مجھے کوئی کوشش نہیں کرنا پڑی۔ وہ ایسے مواقع پر مجھے کسی قسم کی زحمت نہیں دیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے ایک جانب چلی گئی۔

میں اس کی اداؤں کو اب خاصا سمجھنے لگا تھا۔ وہ مجھ سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر میرے قریب رہتی تھی جیسے کوئی سراغ رساں نگرانی پر مامور ہو۔ وہ ''حاضر غائب'' کی فلاسفی سے بھی بخوبی واقف تھی۔ جب مناسب سمجھتی، میرے نزدیک آ جاتی اور جب نامناسب خیال کرتی، میری نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ ایسی سمجھ دار بلی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ڈپارٹمنٹل اسٹور خاصا کشادہ تھا لہٰذا وہاں اچھا وقت گزارا جا سکتا تھا۔ میں نے وہاں رکھی اشیائے بے بہا کا اس طرح جائزہ لینا شروع کیا کہ شیشے کے پار کلینک کا منظر مجھے واضح نظر آتا رہے۔ مجھے وہاں ''مصروف'' دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کلینک کی نگرانی کر رہا ہوں۔

پونے نو بجے میری مراد بر آئی۔ میں نے چونک کر اس سیاہ لینڈ کروزر کو دیکھا جو میری شیرڈ کے برابر آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نئے ماڈل کی ایک ہیوی گاڑی تھی جس کے شیشے بھی سیاہ ہی تھے۔ میں تن کر پوری توجہ سے جیپ کو دیکھنے لگا۔

لینڈ کروزر کے دروازے کھلے اور تین افراد آگے پیچھے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک باس ٹائپ شخص تھا لیکن وہ میاں زاہد حسین ہرگز ہرگز نہیں تھا۔ میاں زاہد پستہ قامت اور سیاہ رو

تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی، مکاری سے بھری ہوئی اور جسم مائل بہ فربہی تھا مگر میں نے جس باس ٹائپ شخص کا ذکر کیا ہے، وہ دراز قامت، گندمی رنگت اور موٹی آنکھوں کا مالک تھا۔ اس کا جسم بھی بالکل فٹ تھا۔ اس نے سیاہ رنگ کا پرنس سوٹ پہن رکھا تھا جس پر گولڈن کڑھائی واضح نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ باقی دو افراد تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی جب کہ دوسرا نہتا دکھائی دیتا تھا۔ کلاشنکوف بردار شخص لینڈ کروزر کے نزدیک ہی رک گیا جبکہ پرنس سوٹ والا دوسرے شخص کے ساتھ کلینک کے اندر داخل ہو گیا۔ میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ میرے ہی استقبال کے لیے وہاں پہنچے تھے۔

میں اپنی جگہ موجود رہا اور گہری نظر سے لینڈ کروزر کو دیکھتا رہا۔ کلاشنکوف بردار کی حیثیت گارڈ کی سی تھی اور وہ اس وقت جیپ کے ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔ مزید پندرہ منٹ بھی گزر گئے مگر زاہد حسین کی صورت مجھے نظر نہ آئی۔ نو پانچ پر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ نہیں آئے گا۔ اس نے مجھے چکما دینے اور میری حقیقت جاننے کے لیے آدمی بھیج دیے تھے۔

میں ڈپارٹمنٹل اسٹور سے نکل آیا اور ایک لمبا چکر کاٹ کر کلینک کے سامنے پہنچ گیا۔ چوہے بلی کے اس کھیل میں، میں پوری طرح اِن ہو گیا۔ میں نے اپنے ذہن کو ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار کیا اور پُراعتماد قدم اٹھاتے ہوئے ڈینٹل کلینک میں داخل ہو گیا۔

تھوڑی دیر پہلے میں جھانک کر جا چکا تھا۔ اس وقت ریسپشنسٹ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ میں سیدھا حنا نامی اس دبلی پتلی لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ذرا چونکی، اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ مجھے شک گزرا کہ اسے میرے حلیے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔

میں نے حنا سے کہا ''میں موہن ہوں اور میاں زاہد حسین سے ملنے آیا ہوں۔'' میں نے دانستہ اپنی آواز بہت دھیمی رکھی ''مجھے بتایا گیا ہے، وہ ٹھیک نو بجے یہاں موجود ہوں گے۔ کیا میں ان سے ملاقات کر سکتا ہوں؟''

''وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' حنا نے جواب دیا پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ''میاں جی وہاں تشریف رکھتے ہیں۔''

میں نے اس کے اشارے کا نگاہی تعاقب کیا اور میری نظر پرنس سوٹ والے دراز قامت شخص پر جا کر رک گئی۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھی نے بھی اس کی تقلید کی۔ میں اس دوران میں ان کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ میں نے باری باری ان سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام موہن ہے۔ میں سنگاپور سے آیا ہوں۔''

پرنس سوٹ والے نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا ''جب تم کلینک میں داخل ہوئے تو میں سمجھ گیا تھا، تم ہی موہن ہو۔ تجمل نے مجھے تمہارا حلیہ بڑی تفصیل سے بتا دیا تھا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا ''میں میاں زاہد حسین ہوں۔''

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ ایک فیصد بھی میاں زاہد حسین نہیں تھا، گویا میاں زاہد نے مجھے اُلو بنانے کے لیے اپنا کوئی نمائندہ بھیج دیا تھا۔ ایک دوسرے کو بنانے کے اس کھیل میں بازی اسی کے ہاتھ آتی جو زیادہ کامیاب اداکاری کا مظاہرہ کرتا۔ میاں زاہد کی معلومات کے مطابق میں اس کا صورت آشنا نہیں تھا لہٰذا یہ کھیل بہت مزے دار ثابت ہوتا۔

میں نے پرنس سوٹ والے سے کہا ''مجھے یہاں پہنچنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔ خیر کوئی بات نہیں، میں نے اپنا وقت ہی کم کیا ہے۔ میرا خیال ہے، ہمیں اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیے۔''

''اصل موضوع یہاں ڈسکس نہیں ہو سکتا مسٹر موہن۔'' اس نے کہا ''میرا خیال ہے، کسی پُرسکون جگہ پر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ''لیکن ساڑھے نو بجے کا تو تمہارا ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے!''

''وہ معاملہ میں نے نمٹا دیا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میں نے ڈاکٹر سے بات کر کے اپنا نمبر آگے لکھوا لیا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے سے نو بجے تک دوسرا مریض آیا نہیں تھا اس لیے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں اس کلینک میں لگ بھگ سوا آٹھ بجے پہنچ گیا تھا۔''

وہ کھلم کھلا جھوٹ بول رہا تھا۔ سیاہ لینڈ کروزر انہیں لے کر پونے نو بجے کلینک پہنچی تھی۔ میں نے اس جھوٹ کو اس کے گھر تک پہنچانے کی خاطر کہا۔

''یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ اب سکون سے بات ہو سکے گی۔ جانا کہاں ہے؟''

وہ بولا ''میرا خیال ہے، بنگلے پر چلتے ہیں۔ تم میرے مہمان ہو۔ آج رات کا کھانا میری طرف سے ہو گا۔ وہیں چل کر بات بھی کر لیں گے۔''

میں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے جو سنا تھا، تم اس کے بالعکس ثابت ہو رہے ہو میاں زاہد! تجمل نے مجھے بتایا تھا کہ تم بہت مصروف آدمی ہو، وقت مقررہ سے ایک سیکنڈ زیادہ مجھے نہیں دے سکو گے۔''

''تم نے میرے بارے میں بالکل درست سنا ہے۔ میں ایسا ہی بندہ ہوں۔'' وہ کلینک سے باہر نکلتے ہوئے بولا ''لیکن تم اتنی دور سے آئے ہو اور تمہارے ذہن میں میرے فائدے کا کوئی آئیڈیا بھی ہے لہٰذا تمہارے لیے تو میں وقت نکال سکتا ہوں۔ ویسے بھی تم کل واپس جا رہے ہو، آج کا ڈنر تو میرے ساتھ ہوگا۔'' ذرا سا توقف کر کے اس نے کہا ''مجھے حیرت ہے، بھولا ناتھ نے تمہارا ذکر کیوں نہیں کیا؟''

''اس سلسلے میں، میں بھی الجھا ہوا ہوں۔'' میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی پریشانی طاری کرتے ہوئے کہا ''بی۔تھری ایٹ سے مجھے پتا چلا ہے، وہ لوگ واپس سنگاپور چلے گئے ہیں۔''

اس نے کہا ''ہاں، بھولا ناتھ اور جمال دو دن بعد واپس چلے گئے تھے۔''

وہ ان لوگوں کی واپسی کا ذکر کر رہا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ وہ سنگاپور نہیں بلکہ عدم پور روانہ ہو چکے تھے لیکن اس موقع پر مجھے اپنی معلومات کا دریا نہیں بہانا تھا لہٰذا خاموش رہا۔ ہم سب چلتے ہوئے سیاہ لینڈ کروزر کے قریب آ گئے۔ گن بردار ڈرائیور فوراً مستعد ہو گئے۔ میری نیلی شیرڈ، لینڈ کروزر کے قریب برابر میں کھڑی تھی۔ میں نے اس کو نظر کی زبان میں ''اللہ حافظ'' کہا اور نقلی میاں زاہد کے ساتھ لینڈ کروزر کے اندر بیٹھ گیا۔

گن بردار نے پسنجر زسیٹ سنبھال لی۔ میں اور نقلی میاں زاہد درمیانی سیٹ پر تھے جب کہ ان کا تیسرا ساتھی عقبی نشست پر خاموش بیٹھا تھا۔ جیپ میں ہم پانچوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ لینڈ کروزر نے بڑے دھواں دھار انداز میں اپنے سفر کا آغاز کیا اور صاف ستھری سڑکوں پر پھسلتی ہوئی منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی۔

اس سفر کا اختتام ڈیفنس سوسائٹی کے ایک ایسے فیز میں ہوا جو ابھی پوری طرح آباد نہیں تھا۔ یہ فیز سمندر سے بہت قریب تھا۔ اسے ''سی سائیڈ'' کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس علاقے میں زیادہ تر بنگلے زیرِ تعمیر تھے اور ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر واقع تھے۔ تمام تر تعمیری مراحل سے گزرنے والے بنگلوں کی تعداد بہت کم تھی۔ سیاہ لینڈ کروزر جس بنگلے کے سامنے جا کر رکی وہ پوری طرح تیار تھا۔ اس کے آس پاس کافی دور تک کوئی بنگلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سیٹنگ سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ کسی سخت قسم کے ''انٹرویو'' کے لیے مجھے یہاں لائے ہیں اور عین ممکن تھا، میاں زاہد حسین بھی اسی بنگلے کے کسی کونے کھدرے میں چھپا بیٹھا ہو۔ پتا نہیں کیوں، میرا دل کہتا تھا کہ یہاں میاں زاہد سے ضرور سامنا ہوگا۔ یہ میری چھٹی حس کا پیغام تھا یا پھر ''چی'' کی کارفرمائی، یہ فیصلہ کرنے سے میں قاصر تھا۔ جب ڈینٹل کلینک پر لینڈ کروزر آ کر رکی تھی تو بھی میرے اندر سے یہ آواز آئی تھی کہ اس جیپ میں میاں زاہد کے آدمی آئے ہیں حالانکہ ایسا کوئی ثبوت سامنے موجود نہیں تھا۔ میرے ذہن نے بڑی درست اطلاع دی تھی۔

میں ان دنوں ''چی'' کی ایڈوانس مشق بڑی باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ ممکن ہے، اس مشق کی وجہ سے میرے کسی باطنی حواس میں تحریک پیدا ہو گئی ہو! بہرحال، یہ جو کچھ بھی تھا، میرے لیے سودمند ثابت ہو رہا تھا۔ اگر میری اس صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا تو ساحل تک پہنچنا میرے لیے بہت آسان ہو جاتا۔

ساحل کے تصور نے میرے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اگر مزید کچھ لمحے مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی تو میں ڈھے جاؤں گا...... اور مجھے اس نازک مرحلے پر پوری طرح ہوش و حواس میں رہنا تھا۔ میاں زاہد نے ساحل کو مجھ سے جدا کیا تھا۔ میں اس وقت میاں زاہد کے بہت قریب پہنچ چکا تھا...... اور یہ ''قربت'' مجھے ساحل تک پہنچا سکتی تھی۔

نقلی میاں زاہد نے مجھے ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ میں نے ایک دبیز و آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر اپنا سفری بیگ کارنر ٹیبل پر رکھ دیا۔ نقلی میاں زاہد ایک منٹ کے لیے باہر گیا پھر واپس آ کر میرے سامنے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ہمارے درمیان سینٹرل ٹیبل موجود تھی جس پر ایک نفیس قسم کی کرسٹل ایش ٹرے رکھی تھی۔ ہمارے ساتھ آنے والے دیگر افراد بنگلے کے اندرونی حصے میں کہیں غائب ہو گئے۔ ڈرائنگ روم میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

نقلی میاں زاہد حسین نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''کھانا آدھے گھنٹے کے بعد لگا دیا جائے گا۔ میں نے اس کے لیے خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ اس وقفے میں ہم کچھ بات چیت کر لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے مسٹر موہن؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے ڈرائنگ روم کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا ''پہلے اہم باتیں، پھر کھانا چلے گا۔''

میرے دائیں ہاتھ پر ڈرائنگ روم کی دیوار میں ایک

کھڑکی موجود تھی جس پر قیمتی دبیز پردہ لٹک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ کی دیوار میں وہ دروازہ تھا جس سے گزر کر میں اندر آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں آمد و شد کے لیے وہی واحد دروازہ تھا۔ سامنے والی دیوار میں واش روم کا دروازہ تھا۔ واش روم کمرے کے ایک کونے میں واقع تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے وقت وہ بائیں ہاتھ پر پڑتا تھا۔

نقلی میاں زاہد نے مجھ سے پوچھا ''مسٹر موہن! اب بتاؤ، تم مجھ سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟''

میں نے فوری طور پر سوچی ہوئی ایک فرضی اور پُر اثر کہانی اسے مختصر الفاظ میں سنا ڈالی جس کے مطابق، میں اس کے لیے سنگاپور میں ایک زبردست سینڈیکیٹ کے قیام کا منصوبہ لے کر آیا تھا۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہاں کا نظم و نسق میں بہت اچھے طریقے سے سنبھال لوں گا۔ ایک اسمگلر اور جرائم پیشہ کو کسی مجرمانہ کام کی پیشکش کر کے ہی شیشے میں اتارا جا سکتا تھا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بولا ''تمہارا آئیڈیا تو اچھا ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف کر کے اس نے اچانک پوچھا ''تم سنگاپور میں کس جگہ رہتے ہو مسٹر موہن؟''

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا ''لٹل انڈیا۔''

''اوہ!'' اس نے ایک طویل سانس خارج کی ''میں نے اس علاقے کے بارے میں سنا ہے۔ وہاں ہندوستانیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔''

''جبھی تو اسے چھوٹا ہندوستان (لٹل انڈیا) کہا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس دوران میں، میں چاق و چوبند بیٹھا تھا اور پوری توجہ سے نقلی میاں زاہد اور ڈرائنگ روم کی ایک ایک شے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس شخص نے مجھ سے پوچھا۔

''مسٹر موہن! تم کتنے عرصے سے سنگاپور میں رہ رہے ہو؟''

جواب دینے سے قبل میں تھوڑا سا چونکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، کھڑکی پر لٹکے ہوئے پردے میں جیسے ہلکی سی حرکت ہوئی ہو۔ میں نے اس چونکنے کو اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور کہا۔

''ایک طویل عرصے سے۔ بلکہ میں تو پیدا ہی سنگاپور میں ہوا ہوں۔ میرے ماتا پتا بہت پہلے ہندوستان سے کوچ کر کے سنگاپور چلے گئے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم وہاں کے نیشنل ہو!''

''ایگزیکٹلی'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحے گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا ''مسٹر موہن! تم سنگاپور سے یہاں آئے اور کل واپس بھی جانے والے ہو۔ تمہارے بیگ میں اس وقت تمہارا پاسپورٹ تو ہوگا؟''

اس کا سوال بڑا قیامت خیز تھا لیکن میں ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ میں نے برجستہ کہا ''پاسپورٹ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ وہ گھر میں رکھا ہے۔ میں اپنے ایک دوست امرناتھ کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں جو گارڈن ویسٹ کے علاقے میں رہتا ہے۔''

''تمہارے اس بیگ میں کیا ہے؟'' اس نے کارنر ٹیبل پر رکھے سفری بیگ کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے صدر کے علاقے میں، میں نے کچھ شاپنگ کی ہے اس بیگ میں وہی سامان بھرا ہوا ہے۔''

''کیا میں تمہارے بیگ کی تلاشی لے سکتا ہوں؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس سوال پر میں نے اپنے چہرے کو برہمی کے تاثرات سے سجا لیا اور الجھن زدہ انداز میں کہا ''میں سمجھا نہیں مسٹر زاہد حسین!''

''ویری سمپل'' وہ بولا ''میں اس بیگ کے اندر جھانکنا چاہتا ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔

اسی لمحے کھڑکی کے پردے میں دوبارہ حرکت پیدا ہوئی۔ میں فوراً سے پیشتر سمجھ گیا، کھڑکی کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ وہ پردے کی اوٹ سے مجھے دیکھ رہا تھا اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو بھی سن رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں، میرا خیال میاں زاہد حسین کی سمت پرواز کر گیا...... اور ایسا سوچتے ہوئے میں نے اپنے وجود میں ایک تناؤ سا محسوس کیا۔ میں اپنے شکار کے انتہائی نزدیک پہنچ چکا تھا۔ لپکنے اور جھپٹنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

نقلی میاں زاہد نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں تلاشی دینے پر اعتراض کیا ہے؟''

''یہ میری انسلٹ ہے مسٹر زاہد۔'' میں نے کہا۔

''اس میں بے عزتی والی کوئی بات نہیں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''تمہارے لیے نہیں ہوگی۔'' میں بھی ہتھے سے اکھڑ گیا

''لیکن میں تمہارے اس مطالبے سے بہت سُبکی محسوس کر رہا ہوں۔'' پھر میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ''میرا خیال ہے، مجھے چلنا چاہیے۔''

''تم ایسے نہیں جاسکتے مسٹر موہن۔'' وہ غرایا ''یا تم جو کوئی بھی ہو! بیگ کی تلاشی تو تمہیں دینا پڑے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی۔ اگلے ہی لمحے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور گن بردار شخص اندر آ گیا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی کلاشنکوف کی نال کا رخ میرے سینے کی جانب کر دیا۔

''کیا ارادہ ہے مسٹر! شرافت سے بیگ میری طرف پھینکتے ہو یا میں اسلم کو زحمت دوں؟'' اس کا اشارہ کلاشنکوف بردار کی طرف تھا۔

میں نے کھڑے ہوتے ہی کارنر ٹیبل سے اپنا سفری بیگ اٹھا لیا جو اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے نقلی میاں زاہد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔

''کسی کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے رضا کارانہ طور پر ہینڈز اپ ہوتے ہوئے کہا ''مجھے نہیں معلوم تھا، یہاں اس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑے گا۔ میں تم سے مل کر مایوس ہوا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے بیگ کو اس کی طرف پھینکنے کا جھانسا دیتے ہوئے کہا ''تم خود دیکھ لو، اس بیگ کے اندر میں نے کون کون سے سانپ بند کر رکھے ہیں؟''

وہ میرے جھانسے میں آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بیگ کو کیچ کرنے کے ارادے سے بے اختیار آگے بڑھے لیکن اس دوران میں، میں بیگ کو گن بردار کی سمت پوری قوت سے اچھال ... چکا تھا۔

گن بردار اس غیر متوقع حرکت سے بوکھلا گیا۔ میرا سفری بیگ سیدھا اس کے ہاتھوں پر جا کر لگا تھا۔ اسی اثنا میں، میں فرنٹ رول کر کے سینٹرل ٹیبل کے اوپر سے نقلی میاں زاہد کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کے دراز بازوؤں کے درمیان نمودار ہو کر میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار پنچ رسید کر دیا۔

وہ میری جانب سے ایسے حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ بیگ کے بجائے ایک کرنٹ دار پنچ کا تحفہ اسے ملا تو وہ چکرا کر رہ گیا۔ میں اس دوران میں گن بردار کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

بیگ کا اسٹریپ جانے کس طرح گن کی نال سے الجھ گیا تھا کہ گن بردار کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ایک بھرپور سائیڈ کک اس کی تشریف پر جڑ دی۔ وہ بیگ اور گن سمیت سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اسے شدید قسم کی چوٹ پہنچی اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ یعنی بیگ بھی اس سے خاصے فاصلے پر پہنچ گیا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی۔

میں نے بیگ اور گن کی جانب قدم بڑھایا تو نقلی میاں زاہد حسین میرے راستے میں آ گیا۔ وہ میرے پنچ سے سنبھل چکا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے کلاوے میں کسنے کی کوشش کی۔ میں اس کے ہاتھوں کے ملاپ سے پہلے ہی اس کی بانہوں کے گھیرے سے نکل گیا اور جواب آں غزل کے طور پر ایک جھٹکے دار بیک کک اس کے سینے پر ماری۔ وہ الٹے قدموں گن بردار پر سے جا ٹکرایا۔

میں نے لپک کر بیگ اٹھایا، اس کے اسٹریپ میں سے ایک بازو اور گردن کو گزار کر اسے اپنے جسم پر سوار کر لیا۔ اگلے ہی لمحے کلاشنکوف میرے ہاتھوں میں آ چکی تھی۔ میں نے میکانکی انداز میں گن کا رخ ان دونوں کی طرف کیا اور دہاڑ کر نقلی میاں سے کہا۔

''جس طرح شیر کی کھال پہن لینے سے گیدڑ شیر نہیں بن جاتا بالکل اسی طرح باس کی اداکاری کرنے سے کوئی چمچہ باس نہیں بن سکتا۔ بتاؤ، اصلی میاں جی کہاں ہے؟''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''اس کا مطلب ہے، تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں؟'' میں نے سفاکی سے گن کی نال کو ہلکی سی جنبش دی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت بھر گئی۔

''تم کون ہو؟'' وہ تھرتھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے زہریلے لہجے میں کہا ''تمہارا باپ ہوں میں اور تمہارے سیکنڈ فادر بلکہ گاڈ فادر کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میاں زاہد حسین کے بارے میں بتاؤ، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!''

میرے لہجے میں موت کی سی سنگینی سمٹ آئی تھی۔ اس شخص نے بے اختیار چونکی ہوئی نگاہ سے پردہ پوش کھڑکی کی جانب دیکھا۔ وہ کھڑکی میری پشت پر تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ اس لیے بھی کہ تھوڑی دیر پہلے میں کھڑکی کے پردے میں مشکوک قسم کی حرکت نوٹ کر چکا تھا۔

کھڑکی خاموش اور اس پر پڑا ہوا پردہ ساکن تھا۔ جتنی دیر میں میری نظر کھڑکی سے پلٹ کر واپس نقلی میاں زاہد تک

پہنچتی، اسے مہم جوئی کا موقع مل گیا۔ اس نے مجھ سے گن چھیننے کے لیے چھلانگ لگا دی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے قالین پوش فرش پر دور تک لڑھک گئے۔ وہ میرے ہاتھوں سے گن نکالنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس شخص کے جسم میں کسی گینڈے جیسی طاقت بھری ہوئی تھی۔ وہ بڑے بھرپور جھٹکے مار رہا تھا مگر میں بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اسی چھینا جھپٹی میں ایک مرحلے پر وہ میرے نیچے آ گیا۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہو کر اچانک کلاشنکوف پر اپنی گرفت ختم کر دی۔

گن میرے ہاتھوں سے کسی طوفان کے مانند نکلی اور اس کا دھاتی جسم، میرے نیچے دبے ہوئے شخص کے چہرے سے ٹکرایا۔ ایک کربناک چیخ ڈرائنگ روم کی فضا میں گونجی اور وہ کسی ذبح شدہ جانور کی طرح ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا۔ گن ایک مرتبہ پھر دور جا گری۔

میں نے اس کے سینے سے اٹھنے سے قبل دو چار ''شافی'' پنچ اس کے مضروب چہرے پر ثبت کیے۔ وہ تکلیف کی شدت سے چلانے لگا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔

میں نے بجلی کی سرعت سے پلٹ کر دیکھا۔ زخمی ''گن مین'' سنبھل چکا تھا اور کلاشنکوف کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے اس نے اس طرف چھلانگ لگائی تھی جہاں گن پڑی تھی مگر اس سے پہلے کہ کلاشنکوف اس کے ہاتھ آتی، میں نقلی زاہد حسین کے سینے پر کسی طاقت ور اسپرنگ کے مانند اچھلا اور اسلم نامی اس شخص کے سر پر پہنچ گیا۔ اس دوران میں وہ گن کو اٹھا کر میری جانب سیدھا کر چکا تھا۔ میں نے ہوا میں رہتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ایک بھرپور ضرب لگائی اور بیک کرسالٹ (Back Somer Sault) لگاتے ہوئے کمرے کے کونے میں پہنچ گیا۔

اسی وقت فائرنگ کی مخصوص آواز گونجی۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر کے سبب گن کا ٹریگر دب گیا تھا لیکن اس ظالم ضرب نے گن کی نال کا زاویہ بگاڑ دیا۔ اس کا رخ فرش کی جانب ہو گیا تھا چنانچہ فائرنگ کی آواز میں انسانی چیخوں کا اضافہ ہو گیا۔ کلاشنکوف کے اس برسٹ نے نقلی میاں زاہد کو چھلنی کر دیا۔ میرے وہاں نہ ہونے کے سبب وہ براہِ راست فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا۔

یہ ایک بے ارادہ عمل تھا۔ اسلم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی اور نشانہ کوئی دوسرا بن گیا۔ اسلم گن تھامے وحشت زدہ نظر سے اپنے ''باس'' کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اسلم کی وحشت ٹوٹنے سے قبل ہی میں نے اس پر وار کر دیا۔

میں نے ایک لانگ اسٹیپ (Long Step) سائیڈ کک اس کی کمر پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے چند قدم دور چلا گیا تاہم اس نے گن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا۔ میں آگے بڑھ کر اس پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ وہ خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش کے دوران میں اسے فائرنگ کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں اسے گن سیدھی کرنے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔

اسی اثنا میں دروازے کے باہر دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ کوئی بھاگتے ہوئے اس طرف آ رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور وہ مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اسلم کو لمبا لٹانے کے لیے اس پر دو چار خطرناک ہاتھ آزمائے۔ وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں سے کلاشنکوف نکالی اور ایک لمبی جست بھر کر کھلے دروازے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ اگر مجھے اس عمل میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو آج میں یہ داستان سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کے مصداق میرا بال بھی بانکا نہ ہوا۔

میں نے جن دوڑتے قدموں کی آواز سنی تھی، ان قدموں کا مالک کھلے ہوئے دروازے میں نمودار ہوا اور اس نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ میں تھمی کلاشنکوف نے ایک مہلک قہقہہ لگایا۔ اس کا نشانہ میں تھا مگر میں نشانے پر نہیں تھا۔ لہٰذا اس فائرنگ نے اسلم کے زمین بوس وجود کو چھید ڈالا۔

نووارد حملہ آور حیرت زدہ نظر سے چاروں جانب دیکھنے لگا۔ اس کی متلاشی نگاہ کو میری تلاش تھی۔ میں نے اس کی حیرت اور تلاش کو ختم کرنے کے لیے دروازے کی اوٹ سے نکل کر بڑی پھرتی سے کلاشنکوف کی نال اس کی کنپٹی سے ٹکا دی پھر بے رحم لہجے میں غرایا۔

''گن کو پھینک دو!''

مجھے خود اپنی آواز انجان سی لگی۔ اس وقت سفاکی اور وحشت نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ یہ گن بردار وہی شخص تھا جو ڈینٹل کلینک میں نقلی زاہد حسین کے ساتھ داخل ہوا تھا اور زیادہ تر اس نے گونگا کردار کیا تھا۔

میرے حکم کی تعمیل میں اس نے پس وپیش سے کام لینا چاہا تو میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی کھوپڑی پر کلاشنکوف کا

بٹ رسید کر دیا۔ وہ ڈگمگایا اور تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ غصیلے انداز میں اپنے ہیوی فوجی بوٹ سے اس کے چہرے پر دو تین بھرپور ٹھوکریں بھی لگا دیں۔ کھوپڑی پر پڑنے والی ضرب نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ کلاشنکوف بدستور اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی لیکن اس ''غافل'' شخص کے ہاتھوں میں وہ گن اب ایک لاٹھی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے اندھا دھند فائرنگ کر کے اس کا میگزین خالی کر دیا تھا۔ میں نے اسے گن پھینکنے کا حکم محض اس احتیاط کی بنا پر دیا تھا کہ وہ کوئی چالاکی دکھا کر گن کو ری لوڈ نہ کر لے۔

اسی وقت کھڑکی کے پردے میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کی دوسری طرف دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ وہاں کھڑکی کے پیچھے جو کوئی بھی موجود تھا، فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا......اور وہ میاں زاہد بھی ہو سکتا تھا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، فرار ہونے والے کم از کم دو افراد تھے۔ میں لپک کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ جب میں نقلی میاں زاہد سے گفتگو کر رہا تھا تو اس وقت میں نے کھڑکی کے پردے میں پُراسرار حرکت کو نوٹس کیا تھا۔ پردے کی حالیہ سرسراہٹ نے یہ بات ثابت کر دی کہ اس پردے کی اوٹ سے کوئی مسلسل اندر جھانک رہا تھا۔

میں تیزی سے دوڑتے ہوئے اس جانب پہنچا جدھر وہ کھڑکی کھلتی تھی۔ وہ ایک برآمدہ نما جگہ تھی۔ جس کے سامنے سرسبز لان اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ میری عقابی نگاہ برآمدے کے آخری سرے تک جا پہنچی اور میں نے وہاں کسی کو مڑتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس شخص کی صرف پشت نظر آئی تھی اور میں نے اس کے لباس سے پہچان لیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا جو لینڈ کروزر کو چلا کر ڈینٹل کلینک سے یہاں تک لایا تھا۔

میں چیتے کی رفتار سے اس کے عقب میں لپکا۔ چند سیکنڈ میں، میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمبی جست بھر کر اس کی یہ کوشش ناکامیاب بنا دی۔ میرا آہنی ہاتھ اس کی گردن پر پڑا اور میں نے کالر دبوچ کر اسے ایک جھٹکے سے اپنی جانب کھینچا۔

وہ زوردار آواز کے ساتھ راہ داری کے پختہ فرش سے ٹکرایا پھر اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا، میں نے کلاشنکوف کی خوفناک نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ میں نے خونخوار لہجے میں دریافت کیا۔

''تمہارے ساتھ اور کون تھا اور وہ کہاں ہے؟''

میرے ہاتھ میں تھمی کلاشنکوف کی ساری گولیاں فائر ہو چکی تھیں۔ اسلم نے ایک طویل برسٹ مار کر گن کو خالی کر دیا تھا مگر زمین پر پڑا ہوا وہ ڈرائیور اس ''راز'' سے واقف نہیں تھا لہٰذا اس کی خوفزدگی اور سراسیمگی جینوئن تھی۔ اس نے دہشت آمیز انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا، وہ گن کی نال کو منہ سے نکلنے کے لیے التجا کر رہا تھا تاکہ میرے سوالوں کا جواب دے سکے۔

میں نے خوفناک انداز میں کہا ''جواب دینے کے لیے تمہاری زبان کا آزاد ہونا ضروری نہیں تم اشاروں میں بھی بتا سکتے ہو۔'' پھر میں نے اس کے حلق میں ٹھنسی ہوئی کلاشنکوف کی نال پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا اور پوچھا۔

''کیا وہ میاں زاہد حسین ہے؟''

اس کی گردن میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔

میرے سینے سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ میں نے کہا ''وہ کس طرف گیا ہے؟''

اس نے ہاتھ سے ایک کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کر دیا۔ اس کے اس جنبشی جواب کے بعد مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا تھا۔ اس شخص سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی مگر میں اسے آزاد بھی چھوڑنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا لہٰذا میں نے اسے دنیائے غفلت میں پہنچانے کا فیصلہ کیا۔ نال کو اس کے منہ سے باہر نکال کر میں نے اپنے ہاتھوں کی مشاق انگلیوں کو اس کی گردن پر ''آزمایا'' اور اسے دو تین گھنٹے کے لیے اٹا غفیل کر دیا۔ یہ کام میں نے چند سیکنڈ میں انجام دے لیا تھا۔ خالی گن کو بھی میں نے وہیں پھینک دیا۔

پھر میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسی دروازے کی جانب رینگ گیا جدھر ڈرائیور نے اشارہ کیا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہینڈل کو گھما کر چند جھٹکے دیے مگر دروازہ کھل نہ سکا۔ مجھے ''بی۔ تھری ایٹ'' کے وہ لمحات یاد آئے جب میں نے میاں زاہد کے کمرے کے دروازے کو کھولنے کے لیے ''چی'' کی قوت کو آزمایا تھا۔ میں ان لمحات کو بھی نہیں بھول سکتا تھا جب وہ شیطان صفت انسان مجھے چکما دے کر بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

آج میں اسے ایسا کوئی موقع دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ بنگلے میں اس وقت ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ اب قصۂ پارینہ اور صدائے ماضی قریب میں بدل چکی تھی۔ میں نے کمرے کا

دروازہ کھولنے کے بجائے اس سے بھی زیادہ ضروری کام پہلے کرنا مناسب سمجھا اور ڈرائیور کے بے حس و حرکت جسم کے اوپر سے پھلانگ کر مین گیٹ کی جانب دوڑ لگا دی۔

گیٹ اندر سے بند تھا مگر اس میں تالا نہیں لگا تھا۔ گیٹ کا تالا کنڈی کے ہک سے لٹک رہا تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے وہ تالا بند کر دیا۔ اب چابی کے بغیر اس تالے کو کھولا نہیں جا سکتا تھا...... اور تالا کھلنے سے پہلے وہ گیٹ وا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ساری کارروائی چند سیکنڈ میں ہوئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں گیراج کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں دو گاڑیاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ ان میں ایک تو وہی سیاہ لینڈ کروزر تھی جس میں سوار ہو کر میں اس بنگلے تک پہنچا تھا اور دوسری ایک وہائٹ ہونڈا اکارڈ تھی۔ مجھے یاد آیا کہ بنگلا نمبر ''بی۔ تھری ایٹ'' سے فرار ہونے کے لیے میاں زاہد نے ایک سفید ہونڈا اکارڈ ہی کا سہارا لیا تھا، گویا اس بنگلے میں اس مردود کی موجودگی مسلم ہو گئی تھی۔

میں نے چند سیکنڈ میں دونوں گاڑیوں کے انجنوں سے معمولی چھیڑ چھاڑ کر کے انہیں ایسا بنا دیا کہ وہ مکمل چیک اپ کے بغیر اسٹارٹ ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو گئیں۔ کوئی بھی شخص افراتفری کے عالم میں انہیں استعمال کر کے بنگلے سے ''رخصت'' نہیں ہو سکتا تھا۔ گویا میں نے میاں زاہد کے فرار کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ میں مطمئن ہو کر بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔ میری متلاشی نظر کسی معقول گوشے کو ڈھونڈ رہی تھی۔

اس مرحلے پر میں نے کسی کمرے میں داخل ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں ایک ستون کی آڑ میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے بنگلے کا مین گیٹ، گیراج اور ان دونوں مقامات کا درمیانی راستہ واضح طور پر نظر آتا تھا۔ جلد یا بدیر میاں زاہد کو اس بنگلے سے نکلنا تھا اور وہ میری نگاہ میں آئے بغیر کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ بنگلے کے کمروں میں اندھادھند چکرانے سے بہتر تھا کہ اسے گھات لگا کر شکار کیا جائے۔

اس وقت رات کے لگ بھگ گیارہ بجے تھے۔ ڈیفنس کا یہ فیز ابھی زیادہ تر غیر آباد پڑا تھا اس لیے وہاں سناٹے کا راج تھا۔ مجھے اس گوشے میں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے کسی کے دبے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے اپنی حسیات کو سماعت میں بدلا اور اس آہٹ پر توجہ مرکوز کر دی۔ لمحہ بہ لمحہ قدموں کی دھیمی چاپ نزدیک آتی چلی گئی۔ میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت میں نے ایک انسانی جسم کو بنگلے کی عمارت سے نکل کر گیراج کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ شخص اندھیرے کی آڑ لے کر محتاط قدموں سے، دائیں بائیں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پسٹل بھی موجود تھا۔

اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میرے دل نے گواہی دی، وہ میاں زاہد حسین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اندھیرے کے باعث میں اس کے چہرے کی سیاہی اور آنکھوں کی مکاری کو تو نہیں دیکھ سکا تاہم اس کے بھاری جسم اور پستہ قامتی نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ وہ اس وقت ایک سوٹ میں ملبوس تھا۔

میں نے شکاری چیتے کے مانند اپنے اور میاں زاہد کے درمیانی فاصلے کو نگاہ میں ناپا اور اس حساب کو ضرب تقسیم کر کے اپنے قدموں کے سپرد کر دیا۔ آئندہ دو سیکنڈ کے اندر میں کسی بلٹ ٹرین کی طرح سفر کرتے ہوئے میاں زاہد کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔

اس موقع پر اس کی مکاری کھل کر سامنے آ گئی۔ اس نے اپنے عقب میں میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔ نہ صرف محسوس کر لیا بلکہ اس کا فوری ردِعمل بھی سامنے آ گیا۔ اس نے اچانک پلٹ کر مجھ پر فائر کر دیا تھا۔

اگر میں میکانکی انداز میں بروقت نیچے نہ بیٹھ جاتا تو گولی میری کھوپڑی کے پار ہو جاتی۔ میں نے نیچے بیٹھتے ہی وہاں رکے رہنا خطرناک جانا اور فرنٹ رول کر کے اس کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

میری یہ پھرتی آمیز احتیاط بہت سودمند ثابت ہوئی کیوں کہ میاں زاہد نے دوسرا فائر اسی جانب کیا تھا جہاں پر بیٹھ کر میں نے پہلی گولی کو خالی دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے تیسرے فائر کا اسے موقع نہ دیا اور اس کے پسٹل والے ہاتھ پر ایک راؤنڈ ہاؤس (Round House) کک ماری۔

پسٹل اس کے ہاتھ ہی میں رہا لیکن وہ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے دو قدم پیچھے چلا گیا پھر اس سے قبل کہ وہ دوبارہ پسٹل کا رخ میری طرف کرتا، میں نے ایک بھرپور سائیڈ کک اس کی کمر پر رسید کر دی۔

اس کک کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہوا جس کی میں توقع کر رہا تھا جس سے ظاہر ہو گیا کہ میاں زاہد بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ میرے پاؤں کی ٹھوکر کھا کر وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا اور اس کے منہ سے میرے لیے ایک گالی نکل گئی۔ اس ناقابلِ اشاعت گالی کے اختتام پر اس نے کہا۔

''وجدان: ابنِ شیطان! آج تم یہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاؤ گے۔ تمہاری جانب بہت سا حساب نکلتا ہے۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے مجھ پر گولی چلانا چاہی مگر میں اس کی اس جسارت کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ اس کا پسٹل والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں نے ہوا میں جمپ کی اور فرنٹ سمر سالٹ لگاتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں موجود پسٹل نے گولی اگلی لیکن جہاں کا نشانہ لیا گیا تھا، میں اب وہاں موجود نہیں تھا۔

میں نے جیسے ہی زمین پر پنجے ٹکائے، وہ میری طرف گھوما لیکن میں اس دوران میں پنجوں سے فرش کو پش (Push) کر کے دوبارہ ہوا میں اچھل چکا تھا جیسے ہی میاں زاہد کا چہرہ میری سمت ہوا، میں نے ایک دھانسو قسم کی (Wheel Flying Kick) اس کے تھوبڑے پر رسید کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو تھامے ہوئے کراہا اور الٹے قدموں پیچھے چلا گیا۔ بیک گیئر میں دو قدم کا فاصلہ طے کر کے رکا پھر وہ اندھادھند مجھ پر فائرنگ کرنے لگا۔

اس کی اس ''اندھادھندی'' سے میں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بہ یک وقت ٹرپل بیک فلیک (Back Flick) کرتے ہوئے گیراج میں پہنچ گیا۔ اپنے پسٹل کی تین گولیاں وہ پہلے ہی فائر کر چکا تھا۔ اس مسلسل فائرنگ نے پسٹل کا کلپ خالی کر دیا۔ میں نے فائرنگ کے اختتام پر ''کھٹ کھٹ'' کی آواز سنی تھی۔

میاں زاہد نے جھنجلا کر خالی پسٹل کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نیا کلپ لوڈ کرتا، میں گیراج کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ میری یہ ''آمد'' بڑی دھواں دھار تھی۔ میں نے دو قدم کی مختصر دوڑ لگانے کے بعد ایک سائیڈ فلائنگ کک اس کے سینے پر رسید کر دی پھر جیسے ہی میرے قدم زمین پر آئے، میں نے لیفٹ راؤنڈ ہاؤس گھما دی۔

میاں زاہد نے میری کک کو بلاک کرنے کے لیے پسٹل والا ہاتھ بے ساختہ آگے کر دیا۔ میری کک نے وہ خالی پسٹل اس کے ہاتھ سے چھڑا کر کہیں دور اندھیرے میں پہنچا دیا۔ میں نے ایک اسٹیپ اندر آ کر اس کے چہرے پر فرنٹ پنچ مارا۔ اس نے جھکائی دے کر اپنے چہرے کو بچا لیا۔ میں نے ڈبل ہینڈ پش اس کے سینے پر رسید کر دیا۔ عقب میں جھکائی دینے کے سبب اس کا سینہ ایک بہترین ٹارگٹ کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

وہ اس دھکے کو سہہ نہ سکا اور پشت کے بل زمین پر جا رہا۔ میں نے اس کے قریب آ کر نہایت ہی کٹیلے لہجے میں کہا۔

''میاں جی! میری جانب تمہارا جو حساب نکلتا ہے، وہ میں گاہے بہ گاہے اتارتا رہا ہوں مگر تم بری طرح میرے مقروض ہو چکے ہو۔ آج میں تم سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہوں گا۔ بتاؤ، میری ساحل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

''ساحل تک پہنچنے کے لیے تمہیں ہماری بات ماننا ہو گی۔'' وہ لباس جھاڑتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''ڈائری کے دو صفحات ہمارے حوالے کر دو۔ تمہاری محبوبہ تمہیں دے دی جائے گی۔''

''دو صفحات کیا، پوری ڈائری تم پہلے ہی حاصل کر کے اپنے والدِ محترم ملک نوازش علی کو پہنچا چکے ہو۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

والدِ محترم کے الفاظ نے اس کا چہرہ متغیر کر دیا تاہم وہ مغلظات کا سہارا لینے کے بجائے نہایت ہی ترش الفاظ میں بولا ''ان دو صفحات کے بغیر وہ ڈائری ایسے ہی ہے جیسے گولی کے بغیر گن یا زہر کے بغیر سانپ۔ اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئے تو تمہاری محبوبہ کا وہ حشر کیا جائے گا جسے دیکھ کر تم خودکشی پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''میں تمہاری ناپاک زبان کو گدی سے کھینچ کر باہر نکال لوں گا۔'' میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا ''خودکشی کرے گا تمہارا باپ نوازش علی۔ اگر میری ساحل کا ایک بال بھی بانکا ہوا تو میں تم سب کو زندہ گاڑ دوں گا۔''

وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا ''تم شدید قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ تمہیں ہماری طاقت کا اندازہ نہیں۔''

''تو ساحل کے بارے میں تم زبان نہیں کھولو گے؟'' میں پوری سفاکی سے بولا۔

وہ نفرت آمیز انداز میں گویا ہوا ''تمہارا تو باپ بھی میری زبان نہیں کھلوا سکتا۔ تم میاں زاہد کو کیا سمجھتے ہو؟''

میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا ''میں تمہیں بھگوڑا، بزدل، ذلیل، کمینہ اور دنیا کا گھٹیا ترین انسان سمجھتا ہوں۔ میری نظر میں تم یہی ثابت ہوتے رہے......''

میری پوری بات ہونے سے پہلے ہی وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے ایک زوردار مکا میری ٹھوڑی پر مارنے کی کوشش کی۔ آج میں اپنے دشمن کی کسی کوشش کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اس کے پنچ کو رائٹ آؤٹ (Right Out) بلاک کیا۔ اس نے پھرتی سے لیفٹ پنچ مجھ پر آزمایا۔ میں نے نیک جرک (Neck Jerk) سے اپنے چہرے کو بچا لیا۔ اس کے دونوں بازو اس حملوں کے نتیجے میں ایک دوسرے کے اوپر کراس ہو چکے تھے۔ میں نے اچانک مڑ کر اس کے چہرے پر ایک پنچ رسید کر دیا۔

اس کی ناک سے خون رِسنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھ کی پشت سے ناک کو صاف کرتے ہوئے غصیلے انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس کی عمر پچاس کے قریب تھی تاہم وہ جسمانی طور پر انتہائی فٹ تھا۔ اب تک میں نے میاں زاہد سے جتنی فائٹ کی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدہ مارشل آرٹسٹ تو نہیں تھا تاہم لڑائی بھڑائی کے معاملات میں اسے خاصی مہارت حاصل تھی...... اور کیوں نہ ہوتی؟ آخر کو وہ ایک سینڈیکیٹ کا پروگرام کنٹرولر تھا۔ اسے جرائم کے دنیا کا ایک بہترین ڈائریکٹر مانا جاتا تھا۔ اسی کی ڈائریکشن پر پرنس سوٹ والے نے اس کا کردار نبھانے کی کوشش کی تھی اور بہ زعم خود مجھے گھیر کر اس بنگلے تک لے آیا تھا۔ وہ لوگ میری اصلیت جاننا چاہتے تھے اور اس جاننے کے چکر میں ایک بہت بڑی مصیبت کو گلے لگا بیٹھے تھے۔

میاں زاہد نے بڑے جارحانہ انداز میں میرے پیٹ پر لات مارنا چاہی، میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ پر پوری قوت سے پریشر کک رسید کر دی۔ میرا دایاں پاؤں کسی ڈائی مشین کے ہیمر کی طرح اس کے گھٹنے پر پڑا۔ وہ ردِعمل کے طور پر نیچے جھکتا چلا گیا۔ میں نے اسی وقت لیفٹ فرنٹ جرک کک اس کے منہ پر مار دی۔ زمین پر بیٹھتے بیٹھتے وہ پیچھے کی جانب الٹا اور کافی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

میں تیز قدموں سے چل کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سنبھلتے ہی میں نے اس پر تابڑتوڑ لات مکے برسانا شروع کر دیے۔ وہ پٹتا رہا اور قدم قدم پیچھے سرکتا رہا۔ ہم فائٹ کرتے ہوئے ایک برآمدہ نما راہداری میں آ گئے۔ یہاں تھوڑے فاصلے پر ڈرائیور بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے اسلم نامی گن بردار سے چھینی ہوئی خالی کلاشنکوف ڈرائیور کے نزدیک ہی پھینک دی تھی۔ زاہد حسین نے چالاکی دکھاتے ہوئے وہ گن اٹھالی اور اس کی نال کا رخ ... میری جانب اٹھاتے ہوئے غرایا۔

''کھیل ختم، پیسا ہضم۔ لاؤ، یہ بیگ مجھے دے دو۔''

اس کا اشارہ اس بیگ کی طرف تھا جو میں نے اپنی گردن میں ڈال رکھا تھا۔ میاں زاہد کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ خالی گن کے بل پر مجھے دھمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو یوں ظاہر کیا جیسے اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے چنگھاڑتے ہوئے ایک طوفانی سائیڈ کک اس کے پیٹ میں جڑ دی۔

وہ مجھ سے اس قسم کے ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا لہٰذا میری اس کک نے اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند ہوا میں اچھلا اور بیک گیئر میں نیچی پرواز کرتے ہوئے پشت کے رخ پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس دیوار کے قریب ہی دھاتی فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ وہ دیوار کو زوردار سلامی دینے کے بعد آہنی کرسیوں پر گرا۔ رہی سہی کسر اس نئے ٹکراؤ نے نکال دی۔ میں اس کی کسمپرسی پر اَش اَش کر اٹھا۔

میاں زاہد کا وجود ان کرسیوں میں پھنس کر رہ گیا تھا اور وہ خود کو آزاد کرانے کے لیے ہاتھ پاؤں کو بڑے احمقانہ انداز میں حرکت دے رہا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر ذرا ترس یا رحم نہ آیا اور میں نے اپنے وزنی فوجی بوٹ سے ایک کرسی کے پائے کو خوف ناک ٹھوکر مار دی۔

دونوں کرسیوں کا فاصلہ مزید کم ہو گیا جس کے نتیجے میں میاں زاہد کا آفت زدہ وجود بھنچ کر رہ گیا۔ میری سماعت تک، اس کے حلق سے خارج ہونے والی ایک کرب ناک چیخ نے رسائی حاصل کی تو مجھے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ میں نے ترنگ میں آ کر ایک کرسی کی پشت کو بڑی حقارت سے ٹھڈا مارا۔ اس ٹھڈے کے نتیجے میں دونوں کرسیاں ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے الٹ گئیں۔ کرسیوں کے ''الٹاؤ'' سے میاں زاہد کی جو حالت ہوئی ہو گی، بیان سے زیادہ اس کے تصور میں مزہ ہے۔

چند لمحات بعد وہ ہانپتا، لنگڑاتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے قریب آ کر پنچ مارنے کا ڈاج دیا۔ وہ دھڑام سے فرش پر جا گرا۔ اس کے اس عمل نے مجھے بتا دیا کہ ہمت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔

میں نے چند لمحے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا لیکن جب باوجود کوشش کے بھی وہ اٹھنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو میں اچھل کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی بے بسی سمٹ آئی تھی۔ وہ اس وقت انڈر ورلڈ کا باس نہیں بلکہ ایک حقیر کیچوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے اشارۂ ابرو پر انسانی جان کو اس جہاں سے اس جہاں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ساری سفاکی اور درندگی پتا نہیں، کس کس راستے اس کے جسم سے خارج ہو چکی تھی۔

کسی بے بس اور لاچار انسان کو دیکھ کر خوش ہونا اچھی بات نہیں لیکن میں اس وقت بہت مسرور تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میاں زاہد حسین کوئی انسان نہیں بلکہ شیطان صفت انسان نما جانور تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی رو رعایت کا حق دار نہیں تھا۔ اگر میں اس پر رحم کھا کر اسے آزاد کر دیتا تو اس کی بے بسی اور لاچاری پلک جھپکتے میں غائب ہو جاتی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ انسان دشمن اور شیطان دوست ثابت ہوتا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں استفسار کیا ''ساحل کہاں ہے؟''

وہ خاموش رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی کو کروٹ لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کی ڈھٹائی نما خاموشی نے میرے جنون میں اضافہ کر دیا۔ میں نے اس کے منحوس چہرے کو مکوں کی برسات سے لہولہان کر دیا پھر اسے گریبان سے جھنجوڑتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

''میری ساحل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

وہ بدستور خاموش رہا جیسے اس نے زبان نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ اس کے عمل نے میری جھنجلاہٹ میں اضافہ کر دیا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

''میں یہ سوال تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں میاں زاہد۔ اگر مجھے جواب نہ ملا تو میرے کیے کا تمھیں کوئی جواب نہیں ہوگا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

اس کے ہونٹوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی مگر آواز پیدا نہ ہو سکی۔

میں نے دوٹوک لہجے میں پوچھا ''ساحل اس وقت کہاں ہے؟''

''آج صبح...... میں نے اسے...... لاہور بھیج دیا...... ہے۔'' وہ ہکلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا ''لاہور...... یا رکھاں والی؟''

''رکھاں والی۔''

''اگر میری ساحل ''رکھاں والی'' روانہ ہو چکی ہے تو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا ''تمھیں تو اس وقت رکھاں والی میں ہونا چاہیے۔''

اس کی آنکھوں میں وحشت ابھر آئی۔ میں نے پوچھا ''وہ کس ذریعے سے لاہور بھیجی گئی ہے اور کب تک رکھاں والی پہنچ جائے گی؟''

''بائی روڈ...... پرائیویٹ جیپ میں......'' اس نے رک رک کر نحیف آواز میں بتایا ''وہ کل صبح لاہور پہنچے گی اور دوپہر میں رکھاں والی۔''

میں نے اپنا ہاتھ بے ساختہ اپنی پنڈلی کی جانب بڑھا دیا۔ اس پنڈلی پر امتیاز علی کی یادگار، میرا ساتھی، میرا یار مستقل سکونت رکھتا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس قاتل خنجر کو چرمی کیس سے جدا کیا۔ مہلک خنجر کا پیاسا پھل میاں زاہد کی نگاہ میں چمکا تو اس کے رہے سہے حواس پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں جاگزیں وحشت میں ہزار گنا اضافہ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر موت کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ مردہ آواز میں گھگھیایا۔

''مم...... مجھے...... معاف کر دو...... وجدان......!''

معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کو کون واپس لا سکا ہے؟...... کوئی نہیں، کبھی نہیں! میں نے اپنے خنجر کے تشنہ لبوں کو میاں زاہد کی شہ رگ کے گھاٹ پر رکھ کر سیرابی کا موقع فراہم کر دیا۔

اسی وقت میں نے بنگلے کے باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، وہ ایک نہیں بلکہ دو گاڑیاں تھیں جو بڑی تیزی سے بنگلے کی جانب آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھل کر کسی محفوظ مقام تک پہنچ جاتا، دونوں گاڑیاں بنگلے کے گیٹ کے سامنے آ کر رک گئیں۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، لپک کر اس برآمدہ نما راہداری میں دوڑ گیا۔ اپنے عقب میں، میں نے گاڑیوں کے بھاری دروازے کھلنے اور بہت سے لوگوں کے، ان گاڑیوں سے اترنے کی آوازیں سنیں۔ وہ جو کوئی بھی تھے، میاں زاہد کے دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر وہ دوست ہوتے تو ان کی گاڑیاں بنگلے کے اندر آتیں اور انہیں احترام وکشادہ دلی سے ویلکم کہا جاتا۔ ان کا انداز تو ایسا تھا جیسے پولیس نے ریڈ کیا ہو!

اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ میری سماعت سے میگافون کی آواز ٹکرائی۔ وہاں سے بنگلے کے مکین کو کھلی دھمکی دی جا رہی تھی۔

''ملک رؤف! ہم نے تمہارے بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اس وقت تم مکمل طور پر پولیس کے نرغے میں ہو لہٰذا کسی قسم کی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے ساتھیوں سمیت خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔ تمہیں صرف پانچ منٹ کی مہلت دی جاتی ہے۔ فرار کی کسی بھی صورت کا نتیجہ موت ہے...... بھیانک موت!''

میرا ذہن میاں زاہد حسین اور ملک رؤف کے درمیان سوالیہ نشان پر اٹک کر رہ گیا۔

میں دوڑتے ہوئے برآمدہ نما راہداری کے آخری سرے پر پہنچا تو میری سماعت سے میگافون کی آواز ٹکرائی۔ پولیس والے اپنی دھمکی کو دہرا رہے تھے۔ اس بنگلے کے مالک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جا رہا تھا۔

''ملک رؤف! ہم نے تمہیں جو مہلت دی تھی اس کا ایک منٹ گزر چکا ہے۔ اب تمہارے پاس صرف چار منٹ بچے ہیں۔ یہ آخری وارننگ ہے، اس کے اختتام پر سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے ہاتھ میں تین منٹ کا وقت ہوگا۔ اس وقفے میں ہماری ہدایت کے مطابق اگر تمہاری جانب سے مثبت ردِ عمل دیکھنے میں نہ آیا تو ہم بنگلے کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ ایک بات کان کھول کر سن لو، فرار کی ہر کوشش خودکشی کے مترادف ہوگی۔ تمہارے بنگلے کو پولیس کے مسلح جوانوں نے پوری طرح گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اگر کسی شخص نے بنگلے سے باہر قدم رکھا تو اسے بے دریغ گولیوں سے بھون دیا جائے گا!''

میگافون اس اعلان کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس خاموشی کی مدت تین منٹ مقرر کر دی گئی تھی۔ ٹھیک تین منٹ بعد پولیس اندھا دھند بنگلے میں گھس آتی۔ میں نے اندر سے گیٹ کو تالا لگا دیا تھا مگر ایسے مواقع پر پولیس ناک کرنے یا گیٹ کھلوانے کے تکلف میں نہیں پڑتی۔ ریڈ کا مطلب ہے...... ریڈ! وہ بہ آسانی دیوار پھاند کر بنگلے کے اندر پہنچ سکتے تھے۔ وہ بہت نازک لمحات تھے اور...... اس دوران میں مجھے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا تھا۔ بنگلے سے باہر نکلنا انتہائی خطرناک ثابت ہوتا۔ پولیس والے یہی سمجھتے کہ میں ملک رؤف کا کوئی ساتھی ہوں۔ وہ کوئی سوال کیے بغیر مجھے شوٹ کر دیتے۔ فی الحال مناسب یہی تھا کہ میں خود کو بنگلے ہی میں کہیں روپوش کر لوں اور جیسے ہی موقع ملے، یہاں سے نکل جاؤں۔

ایک بات طے تھی۔ بنگلے کے اندر پولیس کی مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پرنس سوٹ میں ملبوس نقلی میاں زاہد، گن بردار اسلم اور بالکل اصلی میاں زاہد حسین اپنی طبعی عمر پوری کر کے کسی اور جہان میں سکونت اختیار کر چکے تھے جبکہ نقلی میاں زاہد کا خاموش ساتھی اور ڈرائیور دونوں شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے تھے۔ میرے وزنی بوٹ کی ضربوں نے خاموش ساتھی کا چہرہ مسخ کر دیا تھا اور ڈرائیور بھی تین گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ اس صورتِ حال میں پولیس باہر کا گھیرا توڑ دیتی اور مجھے وہاں سے نکلنے میں آسانی ہو جاتی۔

میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس دروازے کے پاس پہنچا جس کے پیچھے کچھ دیر پہلے میاں زاہد روپوش ہوا تھا۔ ڈرائیور نے اشارے سے مجھے بتایا تھا کہ میاں زاہد نے وہاں پناہ لی تھی۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر پہنچ کر میں نے دروازے کو بند کرنے کی غلطی نہیں کی اور اپنے چھپنے کے لیے کوئی موزوں مقام تلاش کرنے لگا۔ وہ کمرا ایک شاندار بیڈ روم تھا۔ تمام لائٹس آن تھیں۔ پانچ سیکنڈ میں، میں نے ایک دبیز پردے کا انتخاب کر لیا۔ پردے کے اختتام پر کمرے کے کونے میں ایک طویل و عریض چوبی الماری رکھی تھی۔ میں نے الماری کے قریب سے پردہ ہٹایا اور بڑی مہارت سے اس کے عقب میں چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے سامنے پردہ اس طرح برابر کر لیا تھا کہ الماری اور پردے کے درمیان بننے والی ایک سلوٹی جھری سے میں بیڈ روم کے بیشتر حصے کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

اس وقت میرا ذہن ملک رؤف اور میاں زاہد حسین کے درمیان جمناسٹک کے کرتب دکھا رہا تھا۔ پولیس کی دھمکی کے مطابق وہ بنگلا کسی ملک رؤف نامی شخص کی ملکیت تھا جسے چھاپنے کے لیے وہ باجماعت وہاں پہنچے تھے۔ میرا دھیان آ جا کر اسی پرنس سوٹ والے دراز قامت شخص پر ٹک جاتا تھا جس نے مجھے گھیرنے کے لیے نقلی میاں زاہد کا رول کیا تھا۔ اپنے رعب داب اور حرکات و سکنات سے وہ بنگلے کا مالک نظر آتا تھا۔ میرے خیال میں وہی ملک رؤف ہو سکتا تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوئی تھی کہ پولیس والے میاں زاہد حسین کی وہاں موجودگی سے آگاہ نہیں تھے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔ صبح آٹھ بجے میری فلائٹ تھی۔ مجھے ساڑھے چھے بجے ائرپورٹ پہنچنا تھا اور اس وقت میری رسٹ واچ میں رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ جب میں آج شام میاں زاہد کی تلاش میں نکلا تھا تو مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی، اس تلاش کے دوران میں، میں کن کن کٹھنائیوں سے گزروں گا۔ اسی لیے میں مکمل تیاری سے نکلا تھا۔ میرے بیگ میں ہر وہ شے موجود تھی جس کی مجھے ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اگر مجھے براہِ راست ائرپورٹ بھی جانا پڑتا تو پروا نہیں تھی۔

پولیس کی دی ہوئی مہلت گزر گئی۔ بنگلے کے اندر بدستور خاموشی اور سناٹے نے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ میں بنگلے کے مکینوں پر گزرنے والے حالات کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے بنگلے کے احاطے میں ''نقل و حمل'' محسوس ہوئی پھر راہداری میں بھاری بھرکم بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا

واضح مطلب یہی تھا کہ پولیس نے اپنی دھمکی کے مطابق ''آپریشن ارلی نائٹ'' شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ بیرونی گیٹ کو بند پا کر اندر کود آئے تھے۔ ان کا یہ عمل بہت ہی نپا تلا اور پریکٹیکل تھا۔ اس بیڈ روم کا دروازہ کھلا رکھنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ باہر کی حرکات و سکنات کی صوتی اثرات بہ آسانی مجھ تک پہنچ رہے تھے۔ میں نے کم از کم چار افراد کو باہر چکراتے ہوئے سنا۔ چند لمحات کے بعد ان میں سے دو افراد ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گئے۔ دو اس راہداری کے آخری سرے کی طرف بڑھنے لگے۔ میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ راہداری کی اس سمت پہلے انہیں بے ہوش ڈرائیور کا وجود ملتا اور اس کے بعد میاں زاہد حسین کی خون آلود لاش۔ میں نے بڑی بے دردی اور پوری سفاکی سے اس ننگِ انسانیت کو ذبح کر ڈالا تھا۔

میرے اندازے کے عین مطابق پولیس نے متذکرہ بالا دونوں افراد کو ''دستیاب'' کر لیا۔ اسی وقت ڈرائنگ روم کی طرف جانے والے بھی واپس لوٹ آئے۔ ڈرائنگ روم میں دو لاشیں اور ایک فرد بے ہوش پڑا تھا۔ وہاں سے لوٹنے والے پولیس مین بڑی سنسنی خیز خبریں لائے ہوں گے۔ میں نے ان چاروں کو تیز آواز میں باتیں کرتے ہوئے سنا وہ بنگلے میں موجود صورتِ حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان میں سے جو سینئر تھا اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''پورے بنگلے کی تلاشی لو۔ ممکن ہے، ملک رؤف کا کوئی آدمی کہیں چھپا بیٹھا ہو!''

ان احکام سے ظاہر ہو گیا کہ وہ ملک رؤف کا سراغ لگا چکے ہیں۔ زندہ، بے ہوش اور مردہ پائے جانے والوں میں سے کوئی ایک ملک رؤف تھا اور وہ یقیناً میاں زاہد نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، پرنس سوٹ والا ہی ملک رؤف تھا۔ اگر اس نے نقلی میاں زاہد کا کردار ادا کیا تھا تو اس کا مطلب تھا، وہ میاں زاہد حسین کا بہت ہی خاص آدمی تھا۔ اب وہ میاں جی اور اس کا خاص آدمی دونوں بہت عام ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر تک باہر خاموشی رہی پھر دو افراد اس بیڈ روم میں داخل ہوئے جہاں میں ایک دبیز پردے کے پیچھے دبکا کھڑا تھا۔ انہوں نے پہلے متلاشی نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لیا پھر ڈریسنگ کے نزدیک رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اتفاق سے یہ بیڈ روم کی وہ دیوار تھی جو میری نظر کے عین سامنے تھی۔ میں بڑی وضاحت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک کی توند خاصی صحت مند تھی اور عہدے کے لحاظ سے وہ انسپکٹر تھا۔ دوسرا اے ایس آئی تھا جو خاصا چاق و چوبند اور اسمارٹ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔ انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور نظر آ رہا تھا۔

بیڈ روم میں انسپکٹر کی گمبھیر آواز ابھری ''سرفراز!'' اس کا مخاطب اے ایس آئی تھا ''صورتِ حال کو بڑی خوبصورتی سے ٹیکل کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

سرفراز نامی اے ایس آئی نے پُرزور انداز میں گردن ہلائی اور کہا ''یہاں جو کچھ بھی ہوا ہے وہ ملک رؤف کے کسی دشمن کا کارنامہ ہے۔ ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ کام دکھا کر چلا گیا لیکن سر۔'' اس نے بڑے شیطانی انداز میں اپنے آفیسر کو دیکھا اور بولا ''یہ کارنامہ اب ہمارے کھاتے میں لکھا جائے گا۔''

''تم بہت ترقی کرو گے سرفراز!'' انسپکٹر نے دھیمی آواز میں کہا ''موقع شناس ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کو موقع پرست بھی ہونا چاہیے۔ دنیا داری کا یہی اصول ہے۔ اس اصول کو نظر انداز کر کے کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا!''

اے ایس آئی نے ایک آنکھ دبائی اور معنی خیز لہجے میں بولا ''اب کہانی کچھ اس طرح بنے گی کہ ہم نے منشیات کے اسمگلر ملک رؤف کے اڈے پر چھاپا مارا۔ ملک رؤف اور اس کے ساتھیوں نے گرفتاری دینے کے بجائے ڈٹ کر پولیس کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں ملک رؤف اور اس کے دو ساتھی ہلاک ہو گئے۔ دو ساتھی شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ سر! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟'' بات ختم کر کے اس نے سوالیہ نظر سے اپنے آفیسر کو دیکھا۔

''تم بالکل ٹھیک سمت میں جا رہے ہو۔'' انسپکٹر نے تائیدی انداز میں کہا ''لیکن اس کہانی میں رنگ بھرنے کے لیے بہت سے پہلوؤں کو جاندار بنانا ضروری ہے۔ ہمیں اس بنگلے کے مختلف مقامات پر ''ضروری'' فائرنگ کرنا ہوگی تاکہ پولیس مقابلے کا صحیح نقشہ نکل کر سامنے آئے۔ اس فائرنگ سے باہر موجود درجن بھر کانسٹیبلز کی تسلی بھی ہو جائے گی۔ ہمارے ساتھ بنگلے کے اندر جو دو کانسٹیبلز آئے ہیں، انہیں ''سمجھانے'' کی ضرورت ہے پھر اس بنگلے سے کچھ منشیات وغیرہ بھی برآمد کرنا ہے...... اور سب سے اہم بات۔'' انسپکٹر چند لمحے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''باہر راہداری میں جو گردن کٹی لاش پڑی ہے، شاید تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا سرفراز!''

''سر، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اے ایس آئی بولا ''میں واقعی افراتفری میں اس پر زیادہ دھیان نہیں دے

سکا۔"

انسپکٹر نے سنسنی خیز انداز میں انکشاف کیا "وہ اس شہر کی ایک مشہور سیاسی اور سماجی شخصیت میاں زاہد حسین کی لاش ہے۔ میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی پہچان لیا تھا۔ میاں جی کو بھی اس کہانی میں بڑی خوبصورتی اور کاری گری سے فٹ کرنا ہوگا۔"

"سر! آپ بہت منجھے ہوئے "کہانی کار" ہیں۔" اے ایس آئی نے مسکا لگایا "آپ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ یہ تو آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے جسے آپ چٹکیوں میں انجام دے لیں گے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے چٹکی بجانے کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا۔

"کچھ کرتے ہیں!" چربیلی توند والا انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا "آؤ میرے ساتھ۔"

پھر وہ دونوں تیزی سے بیڈ روم سے نکل گئے۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور تازہ ترین صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔ یہاں تو ایک نیا اور سنسنی خیز کھیل شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے ملک کی پولیس کے "کارناموں" کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ جس پر یقین کرنے کی جی نہیں چاہتا تھا لیکن جب اس قسم کے واقعات سامنے آتے تو شرم سے میری گردن جھک جاتی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پولیس کا پورا ڈیپارٹمنٹ ہی کرپٹ ہے۔ یقیناً اس محکمے میں بھی ایماندار، فرض شناس اور قانون پرور لوگ موجود ہیں مگر بحیثیتِ مجموعی عوام میں اس محکمے کے حوالے سے تاثر کچھ اچھا نہیں پایا جاتا۔ اچھے پولیس والوں کی محدود تعداد میں اچھائیاں، برے پولیس والوں کی لامحدود برائیوں میں کہیں خلط ملط ہو کر غلط سلط ہو جاتی ہیں جو کہ افسوس ناک بات ہے!

انسپکٹر کی باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ وہ میاں زاہد حسین کو ایک سماجی اور سیاسی شخصیت کے طور پر جانتا تھا مگر اس مردود کی اصل حیثیت سے ناواقف تھا۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ پولیس والے تو ان چیزوں سے بھی واقف ہوتے ہیں جو سرے سے اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوتیں! انسپکٹر ایک فعال سنڈیکیٹ کے روحِ رواں سے ناآشنا تھا، یہ بات ناقابلِ یقین اور سمجھ میں نہ آنے والی تھی؟

اسی وقت بیڈ روم سے باہر بنگلے کے احاطے میں کلاشنکوفز کے موت بردار قہقہے گونجنے لگے۔ میں سمجھ گیا، اب وہاں کون سا ڈراما کھیلا جانے والا تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ میرے حق میں جاتا تھا۔ مجھے کسی کارنامے کا کریڈٹ نہیں لینا تھا۔ اگر یہ سب کچھ انسپکٹر اور اے ایس آئی کے کھاتے میں درج ہونے والا تھا تو میری بلا سے! میرے لیے خوش آئند بات تو یہ تھی کہ اب فوری طور پر اس بنگلے کا محاصرہ ختم ہونے والا تھا لہٰذا میرے وہاں سے نکلنے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔

کلاشنکوفز کے مزید دو تین برسٹ سنائی دیے پھر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد بنگلے کے اندر درجن بھر افراد کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ محاصرہ توڑ دیا گیا تھا۔ میں نے پردے کے پیچھے رہتے ہوئے چند لمحے انتظار کیا۔ میری جانب خاموشی کا راج تھا۔ پولیس والوں کی آوازیں ڈرائنگ روم کی طرف آ رہی تھیں۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اب وہاں کون کون سا ڈراما رچایا جانے والا تھا۔ میں پہلی فرصت میں اس بنگلے سے نکلنا چاہتا تھا لہٰذا دبے قدموں چپکے سے پردے سے باہر آ گیا۔

اگلے پندرہ منٹ میں نہایت احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں عقبی دیوار پھاند کر بنگلے سے نکل چکا تھا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں اور بنگلے سے باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ لہٰذا مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

نثار شہید پارک تک میں نے پیدل سفر کیا پھر ڈیفنس کلب کے نزدیک سے مجھے ایک ٹیکسی مل گئی۔ اس ٹیکسی کے ذریعے میں ڈینٹل کلینک پہنچا جہاں میری نیلی شیرڈ کھڑی تھی۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بجے تھے۔ مذکورہ کلینک کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے گاڑی میں سوار ہونے کے لیے دروازے کے لاک میں چابی لگائی تو اپنے قدموں کے انتہائی قریب کسی نرم و ملائم شے کی موجودگی نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بے ساختہ میں نے اپنے پاؤں کو جھٹکا۔

اسی وقت ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی

"میاؤں!"

اگلے ہی لمحے ڈارلنگ میرے سامنے موجود تھی۔ میں بے اختیار مسکرایا۔ وہ جانے کب سے وہاں میری واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ وفا شعار اور فرماں بردار و اطاعت گزار بیویاں اسی طرح اپنے شوہروں کی راہ دیکھتی ہیں۔ اس وقت مجھے ڈارلنگ پر بہت پیار آیا۔ میں ایک مشن سے کامیاب لوٹا تھا۔ شاید اسی خوشی کا اثر تھا کہ میں نے فرطِ جذبات میں جھک کر ڈارلنگ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وہ "میاؤں میاؤں" کرتے ہوئے بڑے معشوقانہ انداز میں میرے بازوؤں میں اپنا منہ رگڑنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، کسی کارنامے پر ڈارلنگ مبارک باد پیش کر رہی ہے!

☆☆☆

میں نے فلیٹ میں قدم رکھا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد میں نے سفری بیگ کو صوفے پر پھینکا اور آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا "ہیلو" کے جواب میں مجھے دوسری جانب شعیب غوری کی آواز سنائی دی۔ اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"وجدان! تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں آدھے گھنٹے سے نہیں ٹرائی کر رہا ہوں۔"

"کیوں، خیریت تو ہے؟"

"سب خیریت ہے۔" اس نے جلدی سے کہا "وجدان! تمہارے لیے میرے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے...... بلکہ یہ خوش خبری ہمارے لیے مشترکہ اہمیت کی حامل ہے۔" اس کے لہجے میں خاصی سنسنی پائی جاتی تھی۔

میں نے کہا "میرے پاس بھی تمہارے لیے ایک اعلیٰ کوالٹی کی نیوز موجود ہے۔ یہ ویری ہپی اینڈ گڈ نیوز بھی ہم دونوں کے لیے بہت امپارٹنٹ ہے۔"

وہ اضطراری انداز میں بولا "بتاؤ، کیا خوش خبری ہے؟"

"پہلے تم بتاؤ گے۔" میں نے کہا "خوش خبری کا ذکر تم نے چھیڑا تھا۔"

"او کے...... او کے۔" وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا پھر اس نے بتایا "وجدان! مسٹر نیل آرمر نے متروک کنویں کا دفینہ برآمد کر لیا ہے!"

"کیا واقعی؟" میں بے ساختہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"بالکل، ایسا ہو چکا ہے۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"تفصیل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ بتانے لگا "جیسا کہ تم جانتے ہو، دو روز قبل مسٹر نیل آرمر مجھ سے ایک نہایت ہی اہم میٹنگ کر کے رام پور (امرتسر) روانہ ہو گیا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ موضع رام پور کے چوہدری رام داس سے تمام معاملات طے کر آیا تھا۔ آج شام میں نیل آرمر نے مجھے اطلاع دی ہے، وہ لوگ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے۔ پاک بھارت سرحد پر رام داس کی زمین سے متروک کنویں کا فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں تھا پھر مسٹر نیل آرمر اپنے ساتھ بہترین ٹیم لے کر گیا تھا جس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت کثیر المالیت سونے کی بازیابی ہے۔"

"یہ تو واقعی بہت بڑی خبر ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا "کیا اتنا ہی سونا برآمد ہوا ہے جتنی ہم توقع کر رہے تھے؟"

"مسٹر نیل آرمر کے مطابق بازیاب ہونے والے سونے کی قیمت ہماری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔" شعیب غوری نے بتایا "اور یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو، گولڈ کے معاملے میں نیل آرمر کی رائے کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک معروف گولڈ اکاؤنٹ بینک کا مالک ہے!"

"ہاں، یہ تو ہے۔" میں نے کہا "میں تو سمجھ رہا تھا، اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پتا نہیں، اس دفینے کی کیا حالت ہو گی۔ بیس سال کوئی کم مدت نہیں ہوتی۔"

شعیب نے کہا "خدا کا شکر ہے، وہ سونا اپنی اصلی حالت میں ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔ ویسے کینوس کے ان دو تھیلوں کی نیل آرمر نے بہت تعریف کی ہے جن میں سونے کے بسکٹ بھرے گئے تھے۔ وہ دہری نہیں بلکہ تہری تہہ والے تھیلے ہیں جس کی وجہ سے امتدادِ زمانہ نے خزانے کا کچھ نہیں بگاڑا۔ وہ جس طرح متروک کنوئیں میں پھینکا گیا تھا بالکل اسی محفوظ حالت میں ہم نے حاصل کر لیا ہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤ وجدان! متروک کنوئیں کے مقام پر اس وقت سرسبز کھیت لہلہا رہے ہیں۔ وہ تمہارے دشمنِ دیرینہ چوہدری نوازش علی کی زمین ہے جس میں فصل سر اٹھا رہی ہے۔"

چوہدری نوازش علی کے ذکر پر میں نے چونک کر پوچھا "شعیب! اس دفینے تک رسائی کے لیے نیل آرمر نے اپنی ٹیم سے جو زیرِ زمین کھدائی کروائی ہے وہ نوازش علی کی نظر سے تو اوجھل ہے نا؟"

"ایک دم اوجھل۔" وہ قطعیت سے بولا "وہ ہماری اس کامیابی سے یکسر بے خبر ہے۔"

میں نے خیال افروز لہجے میں کہا "تمہاری بات دل کو لگتی ہے۔ اگر ملک نوازش علی کو تمہارے مشن کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ ہر قسم کی بڑی سے بڑی رکاوٹ کھڑی کر سکتا تھا۔ سونے کی تلاش نے اسے نیم دیوانہ بنا رکھا ہے۔ وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ازاں بعد جب بھی اسے معلوم ہوگا کہ اس کی بے خبری میں وہ سونا اس کی زمین کے نیچے سے پُراسرار انداز میں کہیں اور منتقل ہو چکا ہے تو ممکن ہے، اس پر دل کا دورہ پڑ جائے۔"

"میں کسی بھی صورت اس "واردات" کی خبر اس تک نہیں پہنچنے دوں گا۔" شعیب نے سنجیدہ لہجے میں کہا "ابھی تو تم نے ملک نوازش سے دو دو ہاتھ کرنا ہیں۔ میں چاہوں گا، وہ دل کے دورے سے نہیں بلکہ تمہارے ہاتھوں اپنے انجام کو

پہنچے۔''

چوہدری نوازش علی کے تذکرے نے میرے ذہن میں ساحل کا سراپا روشن کر دیا۔ جہنم مکانی میاں زاہد حسین کے آخری بیان کے مطابق آج صبح ساحل کو بائی روڈ لاہور روانہ کر دیا گیا تھا۔ وہ کل صبح لاہور پہنچ جاتی۔ اس کے بعد دوپہر تک وہ موضع رکھاں والی میں ہوتی۔ ہم تقریباً ساتھ ساتھ لاہور پہنچنے والے تھے۔ میری فلائٹ آٹھ بجے کی تھی جو زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو بجے لاہور پہنچ جاتی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس پرائیویٹ جیپ میں یہاں سے روانہ کی گئی تھی اور اس کی نگرانی کے لیے میاں زاہد حسین نے کتنے بندوں کو ساتھ بھیجا تھا۔ جب میں میاں زاہد حسین سے آخری مکالمت کر رہا تھا، مجھے جوشِ جذبات میں یہ اہم باتیں جاننے کا خیال نہیں رہا تھا۔ ویسے ایک بات تو طے تھی، دیگر افراد کے ساتھ نوازش علی کا بیٹا فیصل ضرور اس جیپ میں موجود ہوگا۔ پچھلے دنوں کراچی میں اس کے بڑے واضح آثار ملے تھے پھر اچانک وہ خبروں میں نہ رہا۔ میں امید کر رہا تھا، گلشنِ اقبال والے بنگلے میں اس سے ملاقات ہو جائے گی مگر وہ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی تارا کے ساتھ نکل گیا۔ نتیجے میں، میں نے پہلے نجیب اور بعد میں تارا کو ان کے جائز ''انجام'' سے ہمکنار کر دیا۔

ہمارے درمیان مزید کچھ دیر تک سونے کے بسکٹس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی پھر میں نے پوچھا ''مسٹر نیل آرمر کب تک واپس آ رہا ہے؟''

''ابھی میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' شعیب نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا ''نیل آرمر نے مجھے آئندہ کا پروگرام نہیں بتایا۔ وہ اس کثیر المالیت سونے کو کس طرح ٹھکانے لگائے گا، میں نہیں جانتا۔ ویسے میں نیل آرمر کی جانب سے مطمئن ہوں۔ وہ میرا برسوں کا آزمایا ہوا ہے۔''

''اگر تم مطمئن ہو تو پھر مجھے بھی کوئی فکر نہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ بولا ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم مجھ پر اس قدر اعتبار کرتے ہو۔ یقین کرو وجدان!'' اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی در آئی ''اگر کسی مرحلے پر خدانخواستہ کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہو گئی تو میں تم سے کیا ہوا وعدہ اپنی جیب سے پورا کر دوں گا۔ تم سے جو طے ہو گیا ہے، وہ بہر صورت کیش کی صورت میں تمہیں ضرور ملے گا۔''

''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے شعیب۔'' میں نے پوری سچائی کے ساتھ کہا ''ان شاء اللہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ بالفرض کوئی اپ سیٹ ہو بھی جاتا ہے تو میرے نزدیک یہ اتنا بڑا ایشو نہیں ہوگا کہ ہماری دوستی کو کسی امتحان سے گزرنا پڑے۔ دوستی، ہر فائدے نقصان پر فوقیت رکھتی ہے۔''

''یار، تم دل موہ لینے والی باتیں کرتے ہو۔'' وہ ایک نپا تلا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ''سود و زیاں کے اس قصے کو ایک طرف رکھو اور جلدی سے بتاؤ، تمہارے پاس کون سی خوش خبری ہے؟ باتوں میں لگا کر تم نے اس طرف سے میرا دھیان ہٹا دیا ہے۔''

میں نے ایک طویل سانس خارج کی پھر شعیب غوری کے سوال کے جواب میں آج شام سے لے کر تھوڑی دیر پہلے تک پیش آنے والے واقعات کی تفصیل اسے سنا دی۔ میری بات کے اختتام پر وہ چلا اٹھا۔

''بریوو...... یو آر گریٹ۔ وجدان! تمہارے اس کارنامے نے میرے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی ہے...... ویری نائس...... خس کم، جہاں پاک!''

پھر میں نے شعیب کو پولیس والوں کے اس ''کارنامے'' سے بھی آگاہ کیا جس میں تو ند مار کا انسپکٹر، اپنے اے ایس آئی کو اعتماد میں لے کر، ان واقعات کو پولیس مقابلہ کا رنگ دے کر اپنے کریڈٹ پر درج کروانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد شعیب نے کہا۔

''ہوتا ہے...... ایسا بھی ہوتا ہے یہاں چلتا ہے...... چلنے دو، وجدان میاں! کس کس کی اصلاح کرتے پھرو گے۔ ہم بحیثیتِ مجموعی ایک کرپٹ معاشرے کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ دوا سے علاج ممکن نہیں، اب سرجری کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر زبان کلامی اور اصلاحی باتوں سے سدھار ممکن ہوتا تو پھر ''سی ایف کے'' کے قیام کی کیا ضرورت تھی؟ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا وجدان!''

یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا۔ آج شعیب بڑے مختلف انداز میں بات کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا، میں بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک حقیقت بیان کر رہا تھا جسے سمجھنے کے لیے بہت زیادہ عقل و دانش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شعیب! تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا ''وجدان! اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ کل صبح تمہیں بہت جلدی اٹھنا ہوگا اس لیے اب کچھ نیند بھی لے لو۔ پچھلے چند گھنٹوں میں تم نے بہت مارا ماری کی ہے۔ تم آرام کی ضرورت محسوس کر رہے ہوگے!''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' میں نے کہا ''میں فریش ہونے کے بعد سو جاؤں گا۔''

''تمہارا ٹکٹ اور دیگر کاغذات تو تم تک پہنچ گئے ہیں نا؟''

''ہاں، کبیر شاہ نے اس سلسلے میں بہت مستعدی دکھائی ہے۔''

''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو؟'' وہ دوستانہ انداز میں مستفسر ہوا۔

میں نے کہا ''سب ٹھیک ہے۔ تم مطمئن رہو۔''

شعیب غوری نے کسی فوری خیال کے تحت پوچھا ''وجدان! تم نے جس خنجر کے توسط سے میاں زاہد کو جہنم رسید کیا ہے وہ ہر وقت تمہارے پاس رہتا ہے نا!''

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بتایا ''یہ خنجر میرے مرحوم دوست امتیاز علی کی نشانی ہے۔ یہ نشانی ایک یادگار...... ایک مددگار کی حیثیت سے میری پنڈلی پر بندھے چرمی کیس میں موجود رہتا ہے۔''

''تم اتنے سمجھدار ہو کہ ایک چھوٹی سی بات کی طرف توجہ دلاتا میں اچھا نہیں لگتا لیکن پھر بھی یہ بات ابھی ابھی میرے ذہن میں آئی اس لیے ضرور کہوں گا۔'' اس نے اتنا کہہ کر ذرا توقف کیا پھر بولا ''ائرپورٹ پر تمہاری اور تمہارے سامان کی چیکنگ ہوگی۔ تم اس ہتھیار کو اپنے ساتھ نہ لے جاؤ تو اچھا ہے۔ عام استعمال کی چھری چاقو کی بات دوسری ہے مگر یہ ظالم تو اپنی شکل ہی سے انتہائی خطرناک اور سفاک نظر آتا ہے۔ تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟''

میں نے کہا ''میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ اس خنجر کے سلسلے میں تمہاری ہدایت کو یاد رکھوں گا۔''

''وش یو گڈ لک اینڈ اللہ حافظ!'' شعیب نے الوداعی انداز میں کہا۔

میں نے ''خدا حافظ'' کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی پورے طمطراق سے دوبارہ بج اٹھی۔ اس کا مطلب یہی تھا، کوئی پہلے سے میرے نمبر کو ٹرائی کر رہا تھا اور جیسے ہی میں نے ریسیور رکھا، اس کی بن آ گئی۔

تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں ''ہیلو'' کہا۔

''یار وجدان! تم خیریت سے تو ہو نا؟'' منہاس باقر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''مگر آپ کی آواز سے گھبراہٹ جھلکتی ہے۔ خدانخواستہ کوئی اور گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟''

وہ قدرے سنبھل کر بولا ''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں شام سے لے کر اب تک بیس پچیس مرتبہ تمہیں ٹریس کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ تم سے رابطے کے لیے میرے پاس یہی ایک فون نمبر ہے۔ پہلے تو بیل جا رہی تھی، کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا اور اب کافی دیر سے تمہارا فون انگیج مل رہا تھا۔ کیا تم گھر میں نہیں تھے؟''

میں نے مصلحت کے تقاضے کو نبھاتے ہوئے ہلکا سا جھوٹ بولا ''منہاس صاحب! میں آج شام پکچر دیکھنے نکل گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔ فلیٹ میں قدم رکھتے ہی ایک دوست کا فون آ گیا جس سے فارغ ہوا تو آپ کا فون لگ گیا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''آپ کس قسم کی گڑبڑ کا ذکر کر رہے ہیں؟ آپ کی بیٹی شبانہ تو خیریت سے ہے نا؟ اب تو اس کی شادی میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا ہے!''

''شبانہ اور گھر کے دیگر افراد بخیریت ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا پھر اصل موضوع کی جانب مڑتے ہوئے اس نے کہا ''وجدان! میں نے چند روز قبل تم سے ایک جرائم پیشہ گروہ کا تذکرہ کیا تھا جو یہودی لابی کے زیرِ اثر اس شہر میں سرگرمِ عمل ہے۔ وہ لوگ دہشت گردی اور بدامنی کے واقعات میں اس طرح ملوث ہیں کہ کسی کو ان پر شک نہیں ہو سکتا۔ مقامی افراد پر مشتمل یہ گروہ بظاہر بہت سے سماجی اور فلاحی کام کرتا ہے۔ عوام ان کے چہروں کے پیچھے پوشیدہ یہودی عزائم کو نہیں پڑھ پا رہے ہیں اس لیے وہ کامیابی سے اپنا مشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔''

منہاس باقر سانس لینے کو رکا تو میں نے کہا ''ہاں، آپ نے ایسے کسی گروہ کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ آپ ان لوگوں کے خلاف کسی خفیہ قسم کی تحقیق میں لگے ہوئے ہیں جس میں کسی مرحلے پر آپ کو میری مدد کی بھی ضرورت ہوگی۔''

''وہ مرحلہ آ گیا ہے وجدان!'' وہ پرجوش انداز میں بولا ''میں اس وقت بڑی شدت سے تمہاری ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔''

''اس وقت؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

''میں جانتا ہوں، رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔'' ایئر پیس میں منہاس باقر کی آواز ابھری۔ ''یہ کسی شریف آدمی کے آرام اور نیند کا وقت ہے لیکن میں تمہیں ضرور زحمت دوں گا...... اس زحمت کے لیے پیشگی معذرت قبول کر لو۔''

میں نے جلدی سے کہا ''منہاس صاحب! اس قسم کی باتیں کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ میرے بزرگوار، ایسے

ہیں۔ حکم کریں، میں آپ کے کون سے کام آ سکتا ہوں۔ ویسے آپ کی اضطراری حالت کو دیکھ کر لگتا ہے، آپ نے اس یہودیت نواز جرم پیشہ گروہ کے بارے میں کوئی نہایت ہی اہم راز پالیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''یو آر ایبسولیوٹلی کرکٹ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا ''میں نے اس خبیث گروہ کے دو افراد کو ٹریس کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں میرے اخبار کے کرائم رپورٹر نے بہت تعاون کیا ہے۔ شہزاد علی صرف کرائم رپورٹر ہی نہیں بلکہ میرے اعتماد کا آدمی ہے۔ تم اسے میرے ان تعلق داروں میں شمار کر سکتے ہو جو بیک وقت دوست بھی ہوتے ہیں اور ملازم بھی۔ ان کی ملازمت، معاونت سے کہیں آگے کی چیز ہوتی ہے۔''

میں ریسیور کان سے لگائے خاموشی سے منہاس باقر کی بات سن رہا تھا۔ وہ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''وجدان! اگرچہ شہزاد علی لڑائی بھڑائی کے کاموں کا ماہر ہے۔ کرائم رپورٹر ہونے کے ناتے وہ کافی چابک دست اور سمجھ بوجھ کا مالک بھی ہے مگر اس مرحلے پر میں چاہتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ رہو...... بلکہ وہ تمہارے انڈر کام کرے۔ میں تمہاری معاملہ فہمی اور دوری اندیشی کا قائل ہو چکا ہوں۔ تم نے جس بہادری، سمجھ داری اور جرأت مندی سے میرے دوست سلطان کی اکلوتی بیٹی ممتاز کو ڈاکوؤں کے چنگل سے نہ صرف چھڑایا تھا بلکہ اس کے اغوا کے ذمے داروں کو عبرت ناک انجام سے دو چار کیا تھا، یہ قصہ تو میں نے ممتاز اور قاضی سلطان کی زبانی سنا تھا مگر تم نے جس حکمتِ عملی سے کام لے کر دوسری مرتبہ ممتاز کو بچایا ہے وہ سب تو میرے سامنے کے واقعات ہیں۔ مجھے تم جیسے کسی جوان ہی کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین ہے، اب میرا مشن پایۂ تکمیل کو ضرور پہنچے گا۔''

منہاس باقر بہت ہی جوش و جذبے کے ساتھ لگاتار بول رہا تھا۔ اسے سن کر مجھے حیرت ہونے لگی۔ میں نے اب تک اسے انتہائی کم گو اور غیر جذباتی پایا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ کسی بھی موضوع پر طویل گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ دو اور دو چار کی طرح ٹو دی پوائنٹ بات کر کے معاملہ نمٹا دیتا تھا۔ ایسے شخص کا روانی کے ساتھ نان اسٹاپ بولنا خلافِ معمول تھا۔ اس سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ موجودہ معاملے سے اس کی گہری جذباتی دلچسپی تھی۔ میں نے منہاس کو ایک سچا اور محبِ وطن پاکستانی پایا تھا جو ملک دشمن عناصر سے شدید نفرت کرتا تھا۔

جذباتی وابستگی سخت سے سخت انسان کو بھی اس کے خول سے باہر آنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شاید، منہاس باقر کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا معاملہ تھا۔

میں نے اس کی پوری بات توجہ سے سننے کے بعد کہا ''منہاس صاحب! اس سلسلے میں آپ مجھ سے کیا تعاون چاہتے ہیں؟''

وہ بولا ''میں نے جن دو افراد کا ذکر کیا ہے وہ گلستان جوہر کے ایک فلیٹ میں مقیم ہیں۔ یہ اپارٹمنٹس بلڈنگ گلستان جوہر کے آخری سرے پر واقع ہے جس کے زیادہ تر فلیٹس ابھی غیر آباد ہیں۔ میں چاہتا ہوں، تم شہزاد علی کے ساتھ وہاں پہنچو اور ان لوگوں سے اس گروہ کے بارے میں مزید ''اگلوانے'' کی کوشش کرو۔ زبان کھلوانے کے سلسلے میں تم پولیس والوں سے چار ہاتھ آگے ہو۔ میں جلد از جلد اپنے شہر سے یہودی لابی کے قدم اکھاڑنا چاہتا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا ''ان دو افراد کے نام جہانگیر اور فواد معلوم ہوئے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیا یہ آپریشن آج ہی رات ہونا ضروری ہے؟''

''بے حد ضروری!'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''ہوں!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ جلدی سے بولا ''ان جرائم پیشہ لوگوں کے مزاج اور پروگرام کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ پل پل اپنے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ آج جہانگیر اور فواد گلستان جوہر کے اس فلیٹ میں ہیں، ممکن ہے کل کسی ایمرجنسی میں وہ کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔ میں اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اگر یہ سراغ ہاتھ سے نکل گیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں منہاس صاحب!'' میں نے متذبذب انداز میں کہا تو وہ میرے لہجے میں چھپی الجھن کو فوراً محسوس کرتے ہوئے بولے۔

''تم کس سوچ میں ڈوب گئے وجدان؟''

''آں...... کچھ نہیں۔''

''کوئی پرابلم ہے اس وقت آنے میں؟''

''آنے میں کوئی دشواری نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا پھر پوچھا ''مجھے کہاں پہنچنا ہوگا اور کتنے بجے تک پہنچنا ہوگا میں چاہتا ہوں، ایک دو گھنٹے میں سب نمٹ جائے۔''

وہ جہاں دیدہ آدمی تھے۔ میرے لہجے میں شامل گریز نما تذبذب نے اسے بتا دیا کہ میں اس وقت کسی نہایت ہی پیچیدہ معاملے میں الجھا ہوا ہوں۔ وہ نہایت ہی مشفقانہ انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''مجھ سے کھل کر بات کرو وجدان! میں نے محسوس کیا

ہے، تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو!''

میں نے خود کو پیش آمدہ صورتِ حالات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ''منہاس صاحب! تازہ ترین معلومات کے مطابق میری ساتھی ساحل کو آج صبح کراچی سے لاہور روانہ کر دیا گیا ہے جہاں سے وہ میرے دیرینہ دشمن ملک نوازش علی کی حویلی میں پہنچا دی جائے گی۔ میں کل صبح آٹھ بجے کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہوں۔ یہ پروگرام فل اینڈ فائنل ہے۔''

''اوہ!'' منہاس باقر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''آپ مایوس نہ ہوں منہاس صاحب۔'' میں نے جلدی سے کہا ''آپ کا مشن ادھورا نہیں رہے گا۔ مجھے امید ہے، ہم دو گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے۔''

اب اس کے انداز میں مجھے تذبذب محسوس ہوا۔ میرے حالات جاننے کے بعد وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے اس کی الجھن کو سلجھن میں بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں منہاس صاحب! میں نے آج دن میں تین چار گھنٹے کی نیند لے لی تھی۔ اس وقت میں بالکل فریش اور چاق و چوبند ہوں۔ آپ بتائیں، میں کہاں پہنچوں؟''

تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے کہا ''تم میرے اخبار کے دفتر ہی آ جاؤ۔ میں اس وقت دفتر میں موجود ہوں۔ تمہیں اس گروہ کے حوالے سے کچھ بریف بھی کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

میرے فلیٹ سے منہاس باقر کے دفتر کا فاصلہ صرف تیس منٹ کا تھا۔ نصب شب کے بعد روڈ خالی ملتیں اور میں بہ آسانی بیس منٹ میں وہاں پہنچ جاتا۔ ایک گھنٹے کا وقت میں نے اس لیے لیا تھا کہ میں تھوڑا فریش ہونا چاہتا تھا۔ گزشتہ چار گھنٹے میں نے افراتفری اور مارا ماری میں گزارے تھے۔ میں ایک بھرپور شاور کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں بیگ سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گیا۔

دورانِ غسل میں مجھے بھوک کا احساس ہوا۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے آج دوپہر کے بعد سے ابھی تک باقاعدہ کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام میں، صدر کے علاقے میں، میں نے لائٹ ریفریشمنٹ ضرور لیا تھا مگر اسے کھانے میں شمار نہیں کیا جا سکتا پھر ملک رؤف کے بنگلے پر جن حالات سے نبرد آزما رہا، انہوں نے میری بھوک کو چمکا دیا تھا۔ میں نے سوچا، منہاس باقر کی طرف جاتے ہوئے، راستے میں بوٹ بیسن سے کچھ کھا لوں گا۔ اس علاقے میں رات گئے ریسٹورنٹ کھلے رہتے تھے۔ وہ علاقہ ایک طرح سے فوڈ مارکیٹ کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں نہا دھو کر تیار ہوا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا پھر اس سے پہلے کہ میں فلیٹ سے باہر نکلتا، گھنٹی بج اٹھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس وقت دروازے پر کون ہو سکتا ہے۔ اس علاقے میں تو ویسے بھی پرائیویسی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اور پھر آدھی رات کے بعد بیل کا بجنا خالی از علت نہیں ہو سکتا تھا۔

ڈور بیل ایک طرح کا سوال ہوتا ہے جس کے جواب میں شرفا دروازے کھولتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی دروازہ کھولنے ہی والا تھا لہٰذا یہ جواب اور بھی آسان ہو گیا۔

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے آٹھ سو دو والی پڑوسن کھڑی تھی۔ میں اسے اس وقت وہاں دیکھ کر چونکا۔ اس نے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس میں دو تین برتن ڈھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنی پڑوسن انیلا کو دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی ''آج کل آپ کی مسز دکھائی نہیں دے رہی!''

اس کا اشارہ ساحل کی جانب تھا۔ ہم اس فلیٹ میں دنیا والوں کی نظروں میں، میاں بیوی کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ اس رشتے کی آڑ میں سماجی زندگی بڑی سہل اور پُرسکون ہو جاتی ہے۔ ورنہ جس کی بھی نگاہ اٹھتی ہے، شک سے لبریز ہوتی ہے۔

میں نے اس کے ہاتھ میں موجود ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وہ چند روز سے اپنے میکے، لاہور گئی ہوئی ہے۔ میں کل صبح اسے لینے جا رہا ہوں۔''

''دراصل آج میں نے اپنے گھر میں میلاد کروایا تھا۔'' انیلا نے مجھے بھرپور نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا، میں اسی وقت لے کر آ گئی۔'' اس نے ٹرے میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا ''ورنہ صبح تو آپ پھر غائب ہو جاتے۔ یہ آپ کے حصے کا کھانا ہے۔''

میں جس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا تھا اس کے ہر فلور پر صرف دو فلیٹ آمنے سامنے بنے ہوئے تھے۔ میں آٹھ سو ایک میں تھا اور انیلا آٹھ سو دو میں۔ اس کے شوہر کا نام طفیل تھا جو کسی بینک میں معزز عہدے پر فائز تھا۔ فیصل اور اسد نامی دو بچوں کے ساتھ وہ ایک خوش باش اور مطمئن فیملی کا نقشہ پیش کرتے تھے۔ انیلا سے ایک دو مرتبہ لفٹ میں آتے جاتے

میری ''ہیلو ہائے'' ہوئی تھی اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی تعریف میں صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی ہوگا کہ وہ ایک بھرپور عورت تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور پوچھا ''کیا طفیل صاحب اس وقت گھر میں نہیں ہیں؟''

یہ سوال میں نے اس غرض سے پوچھا تھا کہ اتنی رات کو اسے خود کھانا دینے آنا پڑا تھا۔

وہ بولی ''طفیل سرگودھا گئے ہوئے ہیں اور دونوں بچے سو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کی فلیٹ میں لائٹ دیکھی تو اس لیے خود ہی چلی آئی۔ آج کا کھانا کل دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔''

''آپ کو برتن ابھی واپس کردوں یا......''

''برتن بعد میں آجائیں گے۔'' وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور کھانے کی ٹرے لے کر اندر آگیا۔

اس وقت مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔ یہ کھانا بروقت پہنچا تھا۔ میں نے ٹرے میں موجود مختلف برتنوں کے ڈھکن اٹھا کر دیکھے۔ ایک ڈش میں گرما گرم چکن بریانی تھی جس سے ہیمی دھیمی بھاپ بھی اٹھ رہی تھی۔ لگتا تھا، ابھی ابھی دیگ کے اندر سے نکالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ قورمہ تھا، تافتان تھے اور دیگر لوازمات کے ساتھ سوئٹ ڈش بھی تھی جس کے عناصرِ ترکیبی میں خوبانی کو اولیت اور مرکزیت حاصل تھی۔ یہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں پیٹ بھر کر کھانا کھاتا۔ میں جس مشن پر روانہ ہورہا تھا اس کا تقاضا تھا کہ ہلکا پھلکا کھاؤں چنانچہ دس منٹ میں، میں نے آتشِ شکم کو سرد کیا اور فلیٹ سے باہر آگیا۔

جب میں منہاس باقر کے دفتر پہنچا تو رات کے ٹھیک دو بج رہے تھے۔

منہاس نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس سے پوچھا ''آپ تو علی الصباح دفتر آیا کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کو یہاں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے!''

''مجھے ایک ایمرجنسی میں آدھی رات کو دفتر آنا پڑا ہے۔'' اس نے اضطراری لہجے میں بتایا ''یہاں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی تم سے فون پر رابطہ ہو پایا تھا، خیر۔'' وہ جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے بولا ''تم سناؤ، کیا حال چال ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا پھر پوچھا ''آپ کس ایمرجنسی کا ذکر کررہے ہیں؟''

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ''ابھی دو گھنٹے پہلے پولیس نے ڈیفنس میں ایک کامیاب آپریشن کیا ہے۔ مجھے باخبر ذرائع سے جیسے ہی اس آپریشن کی اطلاع ملی، میں دفتر چلا آیا۔ میرے اخبار کی ایک ماہر ٹیم جائے وقوعہ پر پہنچ چکی ہے۔ صبح تک سنسنی خیز خبروں کی توقع ہے۔''

پولیس آپریشن کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ آج رات ساڑھے دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک میں ملک رؤف کے بنگلے پر بہت ''مصروف'' رہا تھا۔ ازاں بعد وہاں پولیس کی ''مصروفیت'' شروع ہوگئی تھی۔ منہاس باقر نے پولیس آپریشن کا تذکرہ کیا تو لامحالہ میرا ذہن اس طرف چلا گیا۔

''پولیس نے کس قسم کا آپریشن کیا ہے منہاس صاحب؟'' میں نے استفسار کیا۔

تھوڑے تامل کے بعد اس نے بتایا ''ڈیفنس کے ایک بہ نسبت کم آباد فیز میں ملک رؤف نامی منشیات کا ایک اسمگلر رہتا تھا۔ پولیس نے اس کے بنگلے پر کامیاب چھاپا مارا ہے۔ وہاں پولیس کو شدید نوعیت کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مار دھاڑ میں ملک رؤف کے علاوہ دو مزید افراد کی ہلاکت واقع ہوئی ہے۔ دو ملازم شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ہلاک ہونے والے تین افراد میں ملک رؤف، اس کا مسلح باڈی گارڈ اسلم اور ایک معروف سماجی و سیاسی شخصیت میاں زاہد حسین بھی شامل ہے۔ یہ پتا نہیں چل سکا کہ میاں زاہد ایک اسمگلر کے بنگلے میں کیا کررہا تھا؟ پولیس نے بھاری جمعیت کے ساتھ کارروائی کرکے نہ صرف اسمگلرز کو کچل ڈالا بلکہ اس بنگلے سے منشیات کی بھاری مقدار برآمد کرلی ہے۔'' وہ ایک لمبے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''یہ آپریشن انسپکٹر قادر بخش کی نگرانی میں ہوا ہے۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک اخبار کا پبلشر اینڈ ایڈیٹر بالکل اسی انداز میں سوچ رہا تھا جیسا پولیس چاہتی تھی۔ گویا موٹی توند والا انسپکٹر قادر بخش اپنی ''اسکیم'' میں کامران رہا تھا۔ اس پورے آپریشن کا سب سے اہم کردار میں تھا۔ اس واقعے کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا، مگر میں منہاس باقر کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا...... کچھ بھی نہیں!

''ویسے ایک بات طے ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میاں زاہد حسین کسی چکر میں وہاں پھنس گیا ہوگا اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ پولیس مقابلے میں نہیں مارا گیا بلکہ

پولیس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسے موت کے گھاٹ اتارا جاچکا تھا۔ اس کی گردن کٹی لاش ایک برآمدے میں پڑی ملی ہے جب کہ پولیس نے اس آپریشن میں گن فائرنگ سے کام لیا ہے۔ بہرحال، صبح تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔''

میاں زاہد حسین اس شہر کے معزز افراد میں شمار ہوتا تھا۔ عوام کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ ایک فعال سنڈیکیٹ کا باس تھا بلکہ خواص کی اکثریت بھی اس راز سے بے خبر تھی جن میں منہاس باقر بھی شامل تھا۔ میں نے آج تک میاں زاہد کے حوالے سے اپنے معاملات کے بارے میں منہاس باقر کو کبھی کچھ نہیں بتایا تھا...... اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر منہاس باقر نے کہا ''کس سوچ میں ڈوب گئے ہو وجدان؟''

''کچھ نہیں...... کچھ نہیں۔'' میں نے چونکنے کی اداکاری کی ''بس ذرا ساحل کی طرف دھیان چلا گیا تھا۔''

وہ یک دم سنجیدہ ہوگیا پھر مجھے جہانگیر اور فواد کے بارے میں بتانے لگا۔ اس نے اب تک یہودی تنظیم کے آلۂ کار گروہ کے بارے میں جو تحقیق کی تھی اس سے مجھے آگاہ کیا، چند ہدایات دیں اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

''یہ راز ہمارے درمیان رہنا چاہیے وجدان۔''

''یعنی میرے اور آپ کے درمیان؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا ''اور وہ آپ کا کرائم رپورٹر شہزاد علی؟''

''وہ میرے بھروسے کا آدمی ہے۔'' منہاس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''گویا یہ راز ہم تینوں کے بیچ ہوا نا؟''

''ہاں، بالکل۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا ''اور اگر کسی مرحلے پر ہمیں پولیس کی مدد کی ضرورت پیش آئی تو اس کا بندوبست بھی موجود ہے۔ ایک دو بااختیار پولیس آفیسر میرے گہرے دوستوں میں ہیں۔ میں انہیں اعتماد میں لے کر بڑے سے بڑا کام نکلوا سکتا ہوں۔'' وہ چند لمحات کا توقف کرنے کے بعد گویا ہوا ''ویسے تمہاری موجودگی میں مجھے یقین ہے، کسی اور سے کسی قسم کی مدد نہیں لینا پڑے گی۔ تم اکیلے ہی تمام معاملات سے نمٹ لوگے۔''

''یہ تو آپ کی محبت ہے جو مجھ پر اتنا اعتبار کررہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا ''تم کسی حد تک ٹھیک کہتے ہو۔ اس اعتماد میں ایک حد تک میری محبت اور شفقت بھی شامل ہے مگر غالب عنصر تمہاری کارکردگی ہے۔ اب تک کے تمہارے تمام کارنامے میرے سامنے ہیں۔''

میں نے موضوع کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا ''وہ آپ کا کرائم رپورٹر شہزاد نظر نہیں آرہا؟''

''وہ اس وقت دفتر ہی میں ہے۔'' منہاس باقر نے بتایا ''میں ابھی اسے اپنے کمرے میں بلا کر تم سے متعارف کرواتا ہوں۔'' پھر ذرا توقف کے بعد اس نے کہا ''میں نے اپنے اخبار کے لیے ایک فل ٹائم الگ کرائم رپورٹر بھی رکھا ہوا ہے جو اس وقت اخباری ٹیم کے ساتھ ڈیفنس گیا ہوا ہے۔ شہزاد علی کو میں خاص الخاص معاملات میں استعمال کرتا ہوں۔ اخبار کے حوالے سے اس پر کوئی لوڈ نہیں ہے۔''

پھر وہ مختصر الفاظ میں شہزاد کے بارے میں بتانے لگا جس کے مطابق دس سال پہلے وہ جہلم سے کراچی آیا تھا۔ اس نے انٹرنس تک تعلیم کر رکھی تھی۔ ہنر کے نام پر اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ ابتدا میں اسی ہنر کو ذریعۂ معاش بنایا۔ منہاس نے دیکھا کہ بندہ پڑھا لکھا اور چابک دست ہے تو اس نے شہزاد کو رپورٹنگ سائیڈ میں آزمایا اس شعبے میں وہ خاصا نمایاں رہا اور آگے چل کر اخبار کے لیے کرائم رپورٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتا رہا۔ آج کل وہ مکمل طور پر منہاس باقر کے اشاروں پر ناچتا تھا۔ منہاس باقر اسے پھڈے والے معاملات میں استعمال کرتا تھا کیوں کہ شہزاد دنگا فساد میں مہارت رکھتا تھا۔

آئندہ چند لمحات میں، میں شہزاد علی سے بالمشافہ متعارف ہوچکا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کا قد چھے فٹ کے قریب اور عمر لگ بھگ تیس سال رہی ہوگی۔ اس سے مصافحہ کرنے میں مجھے بہت مزہ آیا۔ اس کی ہتھیلی خاصی کشادہ، انگلیاں آہنی سلاخوں کی مانند اور گرفت مضبوط تھی۔ اس نے جس گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا تھا، اس سے میں نے فوراً اندازہ لگالیا کہ وہ یاروں کا یار اور لڑنے مرنے کو تیار رہنے والا بندہ ہے۔ ایسے افراد اپنے مقصد اور دوستوں کے لیے جان کی بازی لگانے میں کسی سوچ بچار سے کام نہیں لیتے۔

یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ شہزاد علی سے مل کر میں نے دلی مسرت محسوس کی تھی۔ ٹھیک ڈھائی بجے ہم منہاس باقر کے دفتر کی ہائی روف میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

گلستانِ جوہر کا یہ حصہ اس وقت رات کی تاریکی میں ڈوبا

ہوا تھا۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ہمیں اپنے مطلوبہ فلیٹ تک آنے کے لیے خاصا لمبا سفر کرنا پڑا۔ دن کے وقت یہ فاصلہ پونے گھنٹے سے پہلے طے نہیں ہو سکتا تھا مگر رات کے آخری پہر سڑکیں سنسان پڑی تھیں پھر شہزاد نے اچھی خاصی تیز رفتاری کا مظاہرہ بھی کیا چنانچہ ہم صرف بیس منٹ میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ بلاشبہ، شہزاد ایک مشاق ڈرائیور ثابت ہوا تھا۔

شہزاد نے جس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے پچھواڑے گرین ہائی روف کھڑی کی وہ گلستانِ جوہر کے بالکل آخری سرے پر واقع تھی۔ اس بلڈنگ کے بہت کم فلیٹس ابھی آباد ہوئے تھے۔ یہ بلڈنگ چار بلاکس اے، بی، سی اور ڈی پر مشتمل تھی۔ ہر بلاک کے چار فلور تھے...... یعنی کل پانچ منزلیں۔ فلیٹس سسٹم میں پہلی منزل کو ''گراؤنڈ'' کا نام دے کر گنتی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ کوئی بھی پانچ منزلہ عمارت، فور فلور بلڈنگ ہو کر رہ جاتی ہے۔

میرے مطلوبہ دونوں افراد بلاک ڈی کے فلیٹ نمبر تین سو آٹھ میں تھے۔ وہ ایک کارنر فلیٹ تھا۔ جو تیسرے فلور پر واقع تھا۔ اس بلڈنگ کے ہر فلور پر آٹھ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا بڑا رہائشی پروجیکٹ ہوگا! ویسے گلستانِ جوہر کے اکثر پروجیکٹس دیوہیکل اور ہیبت ناک ہیں۔ اس رہائشی منصوبے کی عمارتوں کو منڈی کہا جا سکتا ہے۔

ہم گاڑی سے باہر آئے اور محتاط قدموں سے چلتے ہوئے بلڈنگ کی باؤنڈری وال تک پہنچ گئے۔ میرے پاس اپنا مخلص اور آزمودہ خنجر تھا جب کہ دورانِ سفر میں شہزاد علی مجھے بتا چکا تھا، وہ اپنے ساتھ ایک پسٹل لایا تھا۔ ہم نے چوکیدار کی نظر بچا کر باؤنڈری وال کراس کی اور عمارت کے اندر پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہمیں اپنے ٹارگٹ فلیٹ تک رسائی حاصل کرنے میں صرف تین منٹ لگے تھے۔

کارنر فلیٹ ہونے کے باعث داخلے کے لیے دو دروازے مل گئے تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ ڈرائنگ روم میں اور دوسرا لاؤنج میں کھلتا تھا۔ میں تھوڑا ہٹ کر زینے کے پاس کھڑا ہو گیا اور شہزاد علی کو میں نے اشارہ کیا کہ وہ دروازے پر دستک دے۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجانے سے اسے خاص طور پر منع کر دیا تھا۔

اس نے ہولے سے دستک دی۔ اندر نیچی آواز میں ٹی وی چل رہا تھا۔ دستک کے بعد ٹی وی کی آواز معدوم ہو گئی۔ اس کا یہی مطلب تھا، دستک کو اندر والوں نے سن لیا تھا۔ ویسے ٹی وی کی آواز ہمیں بتا چکی تھی کہ وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک ضرور جاگ رہا تھا۔ ہم دروازہ کھلنے کا انتظار کر رہے تھے کہ مجھے اپنے دائیں جانب کوئی شے حرکت کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس طرف کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی جو یقینی طور پر فلیٹ کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی تھی۔

میں نے بے اختیار اس کھڑکی کی سمت دیکھا اور یہ اندازہ لگانے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ کھڑکی کے پیچھے موجود پردے میں حرکت ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس پردے کے پیچھے سے کسی نے چھپ کر ہمیں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں زینے کی چھت پر روشن ٹیوب لائٹ کی روشنی بڑی وافر مقدار میں پہنچ رہی تھی، گویا مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ ویسے آج شام سے میں نے اپنے حلیے میں بڑی تسلی بخش تبدیلی کر لی تھی۔

میں نے بروقت اپنی جگہ سے حرکت کی اور ڈرائنگ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ میرا یہ عمل بے آواز تھا۔ اس دوران میں میرے اشارے پر شہزاد علی دوبارہ دستک دے چکا تھا۔ یہ دستک پہلے کی بہ نسبت تیز اور زیادہ شدت لیے ہوئے تھی۔

تھوڑی دیر بعد، اندر سے کسی نے بھاری بھرکم آواز میں پوچھا ''کون ہے؟''

''ہم اس بلڈنگ میں نئے آئے ہیں۔'' میں نے اپنی آواز میں پریشانی بھرتے ہوئے کہا ''سیکنڈ فلور پر...... فلیٹ نمبر دو سو چار میں۔''

شہزاد علی کی معلومات کے مطابق دو سو چار میں چند روز پہلے ایک فیملی آ کر آباد ہوئی تھی۔ منہاس باقر کے دفتر سے یہاں تک پہنچنے کے دوران میں، میں نے شہزاد سے اچھی خاصی معلومات حاصل کر لی تھیں اور اب ان کو استعمال کر رہا تھا۔

اندر سے اسی بھاری آواز والے نے سوال کیا ''اس بلڈنگ میں نئے آئے ہو تو ہم کیا کریں؟''

''میرے بھائی!'' میں نے اپنے لہجے میں مصنوعی لجاجت شامل کرتے ہوئے کہا ''بات دراصل یہ ہے کہ میری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ پورے دنوں سے ہے۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا ہوگا۔ میرے پاس کنوینس کا بندوبست نہیں اور رات کے آخری پہر ٹیکسی بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ آپ لوگوں کے پاس ایک سوئفٹ گاڑی موجود ہے۔ اگر آپ مصیبت کے وقت میں میری تھوڑی مدد کر دیں تو اللہ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔ میری بیوی کی حالت ایسی ہے کہ اگر اسے بروقت اسپتال......''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ''میں نے پہلے تمہیں دیکھا نہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے، نیچے کوئی نئی فیملی آئی ہے۔''

میں اس سے پوچھ سکتا تھا، پہلے مجھے نہیں دیکھا تو اس وقت کیسے دیکھ لیا۔ اگر اس وقت نہیں دیکھا تو پھر تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہے ہو؟ میں جانتا تھا، اس شخص نے کھڑکی کے پردے میں درز پیدا کر کے مجھے زینے کے پاس کھڑے دیکھ لیا تھا اور یہ حلیہ اس کے تئیں یقیناً اجنبی تھا۔ میں اس سے سوال و جواب کر کے وقت ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میری پہلی ترجیح دروازہ کھلوانا تھی۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ وہ شہزاد کی وہاں موجودگی کو محسوس نہیں کر سکا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا، دستک بھی میں نے ہی دی ہوگی۔

میں نے شہزاد علی کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے، دروازے کے پیچھے موجود شخص سے کہا ''بھائی! تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے مجھے پہلے اس بلڈنگ میں نہیں دیکھا ہوگا۔ میں آج رات ہی آیا ہوں۔ میرا کام کچھ اس نوعیت کا ہے کہ زیادہ تر شہر سے باہر ہی رہتا ہوں۔ شفٹنگ میرے چھوٹے بھائی نے کروائی تھی اور اسی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ آپ کے پاس سوئفٹ (SWIFT) گاڑی ہے۔''

میں نے دروازہ کھلوانے کے لیے بڑے مضبوط دلائل دیے تھے لیکن اندر موجود شخص بھی بہت چھٹا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے کہا ''تم تھوڑا انتظار کرو۔ میں اپنے ساتھی سے مشورہ کرتا ہوں۔''

ہمارے اندازے کے مطابق اس فلیٹ میں جہانگیر اور فواد نامی دو افراد مقیم تھے جن کا تعلق ایک ایسی تنظیم سے تھا جو یہودی لابی کے اشاروں پر کٹھ پتلی کے مانند ناچتی تھی۔

ہمیں صرف ایک منٹ انتظار کرنا پڑا۔ دروازے کی دوسری جانب قدموں کی آواز سنائی دی، پھر میں نے دروازے کا ہینڈل گھومنے اور اندر کی کنڈی گرائے جانے کی آواز سنی۔ وہ بہت نازک لمحات تھے۔ گزشتہ ایک منٹ میں، اشاروں کی زبان میں، میں نے شہزاد کو آئندہ کی حرکات و سکنات کے بارے میں سمجھا دیا تھا اور اس نے اثبات میں گردن ہلا کر مجھے مطمئن کر دیا تھا، گویا اس کے دماغ نے میرے سگنلز کو پوری طرح ریسیو کر لیا تھا۔

میں فوری حملے کے لیے اسٹانس (STANCE) بنائے، سانس روکے کھڑا تھا۔ جیسے ہی اندر موجود شخص نے دروازے کے سنگل پٹ کو چوکھٹ سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی، میں نے پوری قوت سے ڈبل ہینڈ پنچ دروازے کے پٹ پر رسید کر دیا۔ نتیجے میں دروازہ پوری طرح کھل گیا اور اس کے پیچھے موجود شخص دیوار اور پٹ کے درمیان دب کر رہ گیا۔ بے اختیار اس کے حلق سے ایک کراہ برآمد ہوئی۔

میں نے فلیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی دروازہ بند کر دیا۔ میرے اس عمل سے پہلے ہی شہزاد بھی جھرا مار کر اندر داخل ہو چکا تھا۔ میں نے چشمِ زدن میں دروازے کو اندر سے بولٹ کر دیا۔ اس دوران میں شہزاد نے اس شخص کو اپنے پسٹل کے نشانے پر رکھ لیا۔

''کک...... کون ہو...... تم لوگ؟'' اس شخص نے وحشت زدہ نظر سے، شہزاد کے ہاتھ میں موجود پسٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے شہزاد سے کہا ''تم دوسرے کو دیکھو۔ اسے میں بتاتا ہوں، ہم لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس ارادے سے یہاں پہنچے ہیں۔''

شہزاد پستول بدست ایک کمرے میں گھس گیا۔ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ڈرا سہما ہوا وہ شخص اچانک شیر ہو گیا۔ وہ پگلا یہ نہیں جانتا تھا، میں نہتا کسی مسلح سے کتنا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہوں۔

اس نے بڑی سرعت سے میرے پیٹ میں ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش جزوی طور پر کامیاب ہوئی۔ اس کا مینڈھے کی طرح جھکا ہوا سر میرے پیٹ کی جلد سے ٹکرایا مگر میرے اندرونی اعضا پر کاری ضرب نہیں لگا سکا۔ میں نے اس عمل پر فوراً ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے اپنے پیٹ کو کمر سے لگا لیا تھا۔ سانس کی مشقوں نے مجھے اس فن میں خاصی مہارت بخشی تھی۔

میں نے خود کو بچانے کے ساتھ ہی اس شخص پر جوابی حملہ کر دیا۔ اس کی پشت میرے سامنے ایک میز کی صورت موجود تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اپنی دونوں کہنیاں اس کی کمر پر رسید کر دی۔ وہ ایک خوفناک آواز خارج کرتے ہوئے دھڑام سے منہ کے بل زمین پر گرا۔ میں اچھل کر اس کے اوپر سے آگے بڑھ گیا۔ اسی لمحے فلیٹ کے کسی حصے سے یہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''فواد! یہ کیا ہو رہا ہے۔ تم نے تو بتایا تھا، کسی کی بیوی......!''

بولنے والے کی زبان کو بریک لگ گئے۔ میں سمجھ گیا، اس کی آنکھوں نے اپنے سامنے ایک پستول بردار شخص کو دیکھ لیا تھا۔ اس دوران میں فواد نامی وہ شخص اٹھ کر دوبارہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو چکا تھا۔

ہماری معلومات کے مطابق اس فلیٹ میں فواد اور جہانگیر نامی دو افراد ٹھہرے ہوئے تھے۔ مجھ سے پٹنے والے فواد نامی شخص کو مخاطب کرنے والا جہانگیر ہی ہو سکتا تھا۔ فواد نے جہانگیر کے ادھورے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ پر حملہ کر دیا۔

اس نے بڑی تیز رفتاری سے رائٹ پنچ میرے چہرے پر آزمانے کی کوشش کی۔ میں نے دائیں ہاتھ کی گرفت میں اس کا مکا دبوچ کر بڑی سرعت سے ایک مروڑ دیا۔ ردِعمل میں اس کی کمر ٹوسٹ (TWIST) ہوئی اور چہرہ آگے کی جانب جھک گیا۔ میں نے اس کے خمیدہ کمر پر بائیں گھٹنے سے ٹھوکر لگائی۔ وہ منہ کے بل دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس تصادم میں اس کے حلق نے ایک کربناک آواز خارج کی۔

فواد کی طویل، دردناک چیخ کے دوران میں، میں نے شہزاد علی کو سنا۔ وہ غالباً جہانگیر کو پستول کے بل پر دھمکا رہا تھا۔ اسی لمحے ایک نسوانی چیخ بھی اس دھمکی میں شامل ہو گئی۔ گویا ان دونوں کے علاوہ کوئی سریلی چیخ خارج کرنے والی بھی موجود تھی۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے میں مجھے ذہن کو زیادہ تکلیف دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

نسوانی چیخ کی آواز نے مجھے ایک لمحے کے لیے فواد کی جانب سے غافل کر دیا تھا۔ اس نے سنبھل کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا حملہ بڑا دیسی قسم کا تھا۔ میں یہ اندازہ تو کر چکا تھا، فواد باقاعدہ مارشل آرٹس سے نابلد تھا۔ وہ مقامی انداز کا فائٹر تھا۔

فواد نے مجھے دھکا دے کر گرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی یہ کوشش جزوی طور پر پوری ہوئی۔ میں اس کا پش (PUSH) لے کر تھوڑا سا لڑکھڑایا لیکن اسی لڑکھڑاہٹ کے دوران میں میری وھیل کک (WHEEL KICK) چل گئی جو فواد کی کنپٹی پر لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے قبل ایک زبردست سائیڈ کک اس کے سینے پر رسید کر دی۔

اس کے حلق سے ''غوں'' کی آواز برآمد ہوئی اور وہ ہوا میں بیک فلائی کرتے ہوئے عقبی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کا جسم ''دھپ'' سے فرش پر آ گرا۔

اسی لمحے میں نے اندر کمرے میں دھینگا مشتی کی سی آوازیں سنیں۔ ظاہر ہوتا تھا، جہانگیر، شہزاد سے بھڑ گیا تھا۔ میں نے فواد کے ساتھ لاؤنج میں معرکہ آرائی کی تھی جب کہ شہزاد فلیٹ کے ایک کمرے میں گھسا ہوا تھا۔

میں نے فواد کو تجزیاتی نگاہ سے دیکھا۔ وہ فوری طور پر اٹھنے کے قابل نظر نہیں آتا تھا۔ دیوار سے ٹکراؤ میں، شاید اس کی کھوپڑی پر کوئی شدید نوعیت کی چوٹ آ گئی تھی۔ وہ لاؤنج کے فرش سے پڑا دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔ میں اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

اندر پہنچ کر ایک دلچسپ اور حیرت ناک منظر نے میرا استقبال کیا۔ شہزاد اور جہانگیر آپس میں گتھا گتھم تھے۔ ایک ماہ جبیں بیڈ شیٹ کو ہنگامی انداز میں لپیٹے بیڈ پر بیٹھی کپکپا رہی تھی۔ اس کی کپکپی کسی ٹھنڈک کی مرہونِ منت نہیں تھی بلکہ اس کی آنکھوں میں جمی وحشت اس بات کا اعلان کر رہی تھی کہ وہ اچانک پیش آمدہ حالات سے بری طرح خوف زدہ ہو چکی ہے۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بڑی سہمی ہوئی نظروں سے دو انسانوں کو جانوروں کے مانند گتھم گتھا ہوتے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس ڈری سہمی حسینہ کی نشست سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل اس فلیٹ میں ''کیا کچھ'' ہو رہا تھا۔ میں اسے نظر انداز کر کے شہزاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شہزاد نے جہانگیر کو نیچے گرا رکھا تھا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر زور آزمائی کر رہا تھا۔ شہزاد کچھ اس طرح جہانگیر پر چھایا ہوا تھا کہ جہانگیر کا چہرہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہانگیر کے بدن پر اس وقت صرف ایک پاجامہ تھا اور اس نے شہزاد کے پستول والے ہاتھ کو بڑی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ شہزاد کی زور آزمائی کا سبب فوراً میری سمجھ میں آ گیا پھر اس سے قبل کہ میں شہزاد کی کوئی مدد کرتا، ایک فوری واقعہ پیش آ گیا۔

شہزاد کے نیچے دبے ہوئے، شخص نے اپنے جسم کو ایک مخصوص انداز میں زوردار جھٹکا دیا۔ شہزاد اس کے اوپر سے اچھل کر دور جا گرا، پسٹل جہانگیر کے ہاتھ میں رہ گیا۔ اس نے بیک پش (BACK PUSH) لگایا اور سر کو جھٹکتے ہوئے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ پڑی تو میں اچھل پڑا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اسے پہچان لیا۔ میری سانس گویا ایک جگہ ٹھہر کر رہ گئی۔ میں نے اپنے تن بدن میں ایک خوشگوار سنسنی کو دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ حالات کی اس کروٹ نے مجھے میرے شکار تک پہنچا دیا تھا۔

میری نگاہ اس وقت کوئی وہم پی سکتی تھی اور نہ ہی کوئی دھوکا کھا سکتی تھی۔ وہ جہانگیر نامی اس شخص کے لہو کی پیاسی تھی۔ سانولا رنگ، ہلکی مونچھیں، کرخت چہرہ، جسم مائل بہ فربہی اور قد پانچ فٹ دس انچ...... اس بدبخت نے میرے تین پیاروں کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا تھا۔ وہ میر بخش، امتیاز علی اور روبی کا قاتل تھا...... گرے پجارو سے برآمد ہونے والا گن بردار...... وہ گرے پجارو جس کا نمبر ''تھری، ون، فائیو، ون'' تھا۔ اس کے شیشے سیاہ تھے اور اسی سیاہ شیشوں والی گاڑی میں

سے سیاہ بخت جہانگیر نے گولیاں برسا کر گورا قبرستان کے نزدیک میرے تین اہم ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا!

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ میرے من میں روشن خوفناک آگ کے انتقامی شعلوں میں اچانک بلا کی بھڑک پیدا ہو گئی۔ جہانگیر نے، میرے چہرے پر تیزی سے پھیلتی ہوئی سفاکی اور درندگی کو پڑھ لیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر رہا۔

جہانگیر نے شہزاد سے چھینا ہوا پسٹل مجھ پر تانتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا ''وجدان! میں جانتا ہوں، ایک دن تم سے سامنا ضرور ہو گا لیکن یہ معلوم نہیں تھا، ان حالات میں ہماری ملاقات ہو گی۔ مرنے سے پہلے کی دعائیں دہرا لو۔ اب تمہاری زندگی کے چند لمحات باقی بچے ہیں۔''

''تمہارے لیے بھی میرا یہی پیغام ہے۔'' میں نے پسٹل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ''تمہاری تلاش میں، میں نے ایک ایک لمحہ بڑی اذیت سے گزارا ہے۔''

''چلو خوش ہو جاؤ۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا ''اب تمہاری اذیت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔''

میں نے اپنی توجہ کو اس کے کندھوں پر مرکوز کر رکھا تھا۔ انسانی جسم کی حرکات وسکنات کو ٹریس کرنے کے دو اہم ٹرمینل کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بالائی جسم کی حرکات کو کندھوں سے پکڑا جا سکتا ہے اور زیریں جسم کی حرکات کمر سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کمر اور کندھے انسانی جسم کی حرکات وسکنات کے معاملے میں ''چغل خور'' ثابت ہوتے ہیں۔

اس وقت سب سے اہم شے اعشاریہ تین آٹھ کیلی برکا وہ پسٹل تھا جو جہانگیر نے بڑے خطرناک انداز میں مجھ پر تان رکھا تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل چار فٹ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ اس محدود فاصلے کو میری ایک سائیڈ کک چشم زدن میں پاٹ سکتی تھی۔ میں اسی لمحے کی تلاش میں تھا جب مذکورہ کک کا استعمال انتہائی محفوظ ہوتا!

میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا ''میرے ساتھیوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ تم نے انہیں جان سے کیوں مارا؟''

''یہ سوال تم انہی سے پوچھنا۔'' وہ پستول والے ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے بولا ''میں تمہیں ان کے پاس پہنچانے والا ہوں۔''

''ہم سے تمہاری دشمنی کیا ہے؟ میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔'' میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو!''

وہ متذبذب انداز میں اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اسی لمحے جہانگیر کی نگاہ میرے عقب میں اٹھ گئی۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے (YELL) کرتے ہوئے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اگلے ہی لمحے میری رائٹ سائیڈ کک اس کے پیٹ پر کسی وزنی گولے کی مانند لگی۔ اس ضرب میں میرا بے پناہ غصہ بھی شامل تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور وہ ریورس گیئر میں سفر کرتے ہوئے عقبی دیوار سے جا ٹکرایا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر بیڈ کے اوپر جا گرا۔ بیڈ شیٹ میں سکڑی سمٹی حسینہ نے وحشت زدہ نظر سے پسٹل کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ پسٹل کی جانب بڑھ گیا۔

یہ ایک فطری عمل تھا۔ اس نے اپنی حفاظت کی خاطر پسٹل کو قابو میں کرنے کی کوشش کی تھی اس کوشش کے نتیجے میں بیڈ شیٹ نے اس کی ستر پوشی سے انکار کر دیا۔ اس کا بے لباس بدن اچانک ہی بیڈ شیٹ کی اوٹ سے باہر آ گیا۔

اس حسینہ کے ساتھ...... نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم، جیسی صورتِ حال ہو کر رہ گئی تھی۔ پسٹل اس کے ہاتھ کی پہنچ سے چھ انچ کے فاصلے پر رہ گیا۔ وہ ''اِدھر'' اور ''اُدھر'' کے درمیان ساکت ہو کر رہ گئی۔ اس کی ندامت آمیز بے بسی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں!

اس دوران میں شہزاد لپک کر پسٹل تک پہنچ گیا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر جہانگیر کا جائزہ لینا چاہا تو عقب سے ایک ٹھوکر میری کمر پر پڑی۔ میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا، وہ فواد تھا جو سنبھل کر مجھ پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ جہانگیر نے چونک کر یقیناً اسی کو دیکھا تھا اور مجھے اس پر وار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہ تمام حالات مشکل سے تین سیکنڈ میں رونما ہوئے تھے۔ انہی لمحات میں فواد نے مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اپنے عقب میں موجود فواد پر بڑی سرعت سے ایک بھرپور کریسنٹ کک (CRESCENT KICK) آزمائی۔ کریسنٹ کک ہلالی شکل میں ایک قوس بناتی ہوئی جاتی ہے۔ اس قوس کے راستے میں آنے والی ہر شے کو ایک عظیم نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ فواد کے تھوبڑے پر میرا دایاں پاؤں کسی ہتھوڑے کے مانند لگا اور وہ الٹ کر بیڈ پر جا گرا۔

بیڈ پر موجود ہکا بکا حسینہ کی حیرت ''چکنا چور'' ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔

اپنی برہنگی کا احساس ہوتے ہی اس نے جلدی سے خود کو بیڈ شیٹ میں لپیٹ لیا۔

میں نے شہزاد کو فواد کی طرف بڑھتے دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور میں نے دیکھے بغیر اپنا الٹا ہاتھ چلا دیا۔ میرا ہاتھ جہانگیر کے منہ پر پڑا۔ اس کے حلق سے خوفناک غراہٹ خارج ہوئی۔

میں اس کی جانب مڑا تو وہ اسٹانس بنا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے انداز سے مارشل آرٹ جھلک رہا تھا۔ میرے سینے سے ایک مطمئن سانس خارج ہوئی۔ میں نے اسے غصہ دلانے والے انداز میں کہا۔

''اس رات تو تم نے خالی کلاشن کے زور پر مجھے زیر کرنے کا ڈراما رچایا تھا۔ اگر تمہیں مارشل آرٹس میں مہارت حاصل ہے تو موقع سے فرار کیوں ہو گئے تھے؟'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے چوٹ کی ''تمہارا دوسرا بھگوڑا ساتھی کہاں ہے؟''

وہ پھنکارا اور اس نے میرے سوالات کا عملی جواب پیش کیا۔ اس کی تیز رفتار راؤنڈ ہاؤس کک (ROUNDHOUSE KICK) میرے کندھے پر لگی۔ اس کک نے مجھے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا کیوں کہ میں بلاکنگ کے لیے ہاتھ اٹھا چکا تھا۔ میرے کندھے کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ میں نے جواباً اسپن ایک کک (SPIN KICK) اس کے منہ پر ماری۔

میرا وار خالی گیا۔ جہانگیر نے بروقت اپنے سر کو ایک جرک (JERK) دے کر چہرے کو بچا لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیک اسٹیپنگ کرتے ہوئے مجھ سے چند فٹ کی دوری پر چلا گیا۔ میں نے لپک کر اس کمرے کا دروازہ لاک کر دیا پھر میری نظر شہزاد کی جانب اٹھ گئی۔ وہ اپنے مدِمقابل سے بڑا شاندار سلوک کر رہا تھا۔ پسٹل کو اس نے اپنے لباس میں چھپا لیا تھا اور فواد کی مرمت کے لیے وہ صرف ہاتھ پاؤں کو زحمت دے رہا تھا۔ اس کی ضربیں بڑی جچی تلی تھیں۔

جہانگیر پلٹ کر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ اس نے لیفٹ فرنٹ کک کا جھانسا دے کر رائٹ فرنٹ کک میرے چہرے پر مارنے کی کوشش کی۔ میں اس کے جھانسے پر ایک قدم پیچھے ہٹ چکا تھا۔ اس عمل کی تکمیل پر میں نے بڑی تیز رفتاری سے رائٹ بیک سوئپ (RIGHT BACK SWEEP) ماری۔ میری پنڈلی کی طوفانی ضرب اس کی ''جھانسا کک'' والی ٹانگ پر لگی۔ اسی لمحے جہانگیر کی ہائی فرنٹ کک بھی ناکامیاب ہو کر نیچے آئی تھی۔ وہ بری طرح الجھا اور منہ کے بل کمرے کے پختہ فرش پر آ رہا۔

جہانگیر کے حلق سے ایک پُرتکلیف آواز خارج ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ہینڈ پش (HAND PUSH) لگا کر قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بڑی خونخوار نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب اور غراہٹ آمیز تھیں۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس کے حملہ آور ہونے سے قبل ہی شروع ہو گیا۔

میں نے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک سائیڈ فلائنگ کک ماری۔ میرے پاؤں کا بلیڈ اس کی ٹھوڑی پر لگا۔ یہ پاؤں چونکہ ایک فوجی بوٹ میں قیام پذیر تھا اس لیے یہ ضرب قیامت خیز ثابت ہوئی۔ وہ چہرے کو پکڑ کر زمین کی طرف جھکنے لگا۔ میں نے اسی لمحے ایک لوئر بیک کک اس کے منہ پر جڑ دی۔ بیک کک کو (REAR KICK) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کک اپنے ٹارگٹ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے، خاص طور پر (LOWER) بیک کک!

جہانگیر کے جھکتے ہوئے سر کو ایک جھٹکا لگا اور وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں اچھل کر اس کے قریب آیا اور رائٹ پریشر کک اس کے سینے پر رسید کرنا چاہی۔ وہ تیزی سے رول ہو کر ذرا فاصلے پر چلا گیا۔ اسی لمحے اس کے اوپر دھڑام سے فواد کا جسم گرا۔ شہزاد نے فواد کو سر سے بلند کر کے دور اچھال دیا تھا۔

اس معرکے میں شہزاد بھرپور میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کی فائٹ کا انداز بڑا منفرد تھا۔ اس نے مارشل آرٹس سے چنیدہ ٹیکنیکس لے لی تھیں۔ جوڈو اور سیلف ڈیفنس کو ملا کر اس نے چند کمبینیشن تیار کر لیے تھے جو اسٹریٹ فائٹ اور روم فائٹ میں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

جہانگیر اس افتاد سے جھنجلا کر رہ گیا۔ میں نے اس کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ وہ فواد کو اپنے اوپر سے نیچے گرا کر کھڑا ہو گیا۔ جھنجلاہٹ میں اس نے ایک لات بھی فواد کو رسید کر دی جیسے وہ دانستہ اس پر اچھلا ہو۔ اس کے بعد وہ بڑے دھواں دھار انداز میں میری جانب بڑھا۔

اس نے سر کو ٹکر مارنے والے انداز میں جھکا کر اچانک دوڑ لگائی تھی۔ میں اس ارنا بھینسے کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس کا سر جیسے ہی میرے نزدیک پہنچا، میں نے دائیں گھٹنے کی ایک بھرپور ضرب اس کی کھوپڑی پر آزمائی۔ ''ٹھک'' کی آواز پیدا ہوئی اور وہ ایک مرتبہ پھر منہ کے بل زمین پر گرا۔

اس بار جب اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو ایک وحشت ناک منظر دیکھنے کو ملا۔ گھٹنے کی ضرب کے باعث شاید اس کی زبان دانتوں تلے دب کر کٹ گئی تھی۔ اس کا دہانہ لہولہان ہو رہا تھا۔ اس نے پھنکارتے ہوئے، منہ میں جمع ہونے والے خون کو ایک جانب تھوک دیا۔ اس تھوک میں اس کا ایک دانت بھی موجود تھا۔

جہانگیر نے وحشت زدہ نظر سے اپنے تازہ بہ تازہ اکھڑے ہوئے دانت کو دیکھا، پھر اس مقام پر ہاتھ لگایا جہاں تھوڑی دیر پہلے دانت جما ہوا تھا، اس کے بعد وہ کسی خونی درندے کی مانند میری جانب بڑھا۔

اس نے میرے نزدیک آ کر چہرے پر رائٹ پنچ مارنے کی کوشش کی۔ میں نے سائیڈ اسٹیپ لے کر اس کے بازو کو بلاک کیا۔ وہ اپنی ناکامیابی پر جھنجلایا اور باڈی کو گھما کر لیفٹ پنچ مارنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی ایک اضطراری اور جھنجلاہٹ آمیز حرکت تھی جس کا نتیجہ اس کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔ باڈی کو گھمانے کے بعد اس کی پشت میری طرف ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو کلائیوں کے مقام سے گرفت میں لے لیا اور اس کی ''تشریف'' پر ایک تیچی فرنٹ کک جڑ دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے بازوؤں کو آزاد کر دیا۔ فرنٹ کک کے پش نے اس کے اندر میل ٹرین کا انجن فٹ کیا اور وہ تیز رفتاری سے سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

اس شخص کی طرف سے میرا دل غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ میں میر بخش جیسے جاں نثار، امتیاز علی جیسے جاں بہار اور روبی جیسی جاں نکھار ساتھیوں کی المناک موت کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا۔ ان تینوں کی بربادی کا سبب یہی شخص جہانگیر تھا۔ میں تو اس کو پہچانتے ہی وہ مقصد بھی فراموش کر بیٹھا تھا جس کی خاطر ہم یہاں گلستانِ جوہر کے دور دراز علاقے میں پہنچے تھے۔ اس شخص کی شکل دیکھتے ہی، میرے دماغ میں اپنے پیاروں کے چہرے روشن ہو گئے تھے۔ ان کی اجاگر صورتیں صرف ایک ہی لفظ کی تکرار کر رہی تھیں......

انتقام...... انتقام...... انتقام!

میں اپنے عزیز ساتھیوں کی اس پکار کو نظر انداز کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی موت کا انتقام تو مجھ پر ایک قرض کی صورت لدا ہوا تھا...... ایک ایسا بوجھ، جس کو اتارے بغیر سانس لینا بھی محال ہو۔ یہ میں ہی جانتا تھا، اب تک میں نے کس دشواری سے اپنے تنفس کو بحال کر رکھا تھا۔

جہانگیر کسی بہت ہی ڈھیٹ مٹی سے بنا تھا۔ اس کی قوتِ برداشت قابلِ ذکر تھی۔ وہ جس حد تک مجھ سے پٹ چکا تھا، اس کے بعد تو اسے لمبا لیٹ جانا چاہیے تھا لیکن وہ ایک مرتبہ پھر خم ٹھونک کر میرے سامنے استادہ تھا۔

میں نے شعلہ بار نظر سے اسے دیکھا تو وہ سنگ اٹھا پھر بڑے وحشیانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے نی شاٹ (KNEE SHOT) کا ڈاج دیا اور پلک جھپکتے میں ایک فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔ اس کی کک میرے شانے پر لگی۔ میں ردِعمل کے طور پر، بیک فٹ پر آ کر اپنی گردن کو پیچھے کی طرف جھکا چکا تھا، پھر اس کی کک میں کوئی خاص فورس بھی نہیں تھی۔ میں بس ایک ہلکا سا جھٹکا محسوس کر کے رہ گیا۔

جہانگیر نے اپنی اس نیم کامیاب کوشش کو اوور اسٹیمیٹ کیا اور بڑے فخریہ انداز میں میری جانب بڑھا۔ اس نے تیز رفتاری سے لیفٹ راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ میں ایک اسٹیپ پیچھے چلا گیا۔ اس نے زیادہ پُرجوش انداز میں رائٹ راؤنڈ ہاؤس ماری۔ میں نے اس کے جوش سے فائدہ اٹھایا اور سرعت سے نیچے بیٹھتے ہوئے ایک بیک سوئپ مار دی۔ وہ پشت کے بل فرش پر گرا۔

رائٹ راؤنڈ ہاؤس کک نے اس کا توازن بگاڑ دیا تھا کیوں کہ وہ نشانے کو ٹچ نہیں کر پائی تھی۔ میں اسی لمحے نیچے بیٹھ گیا تھا۔ جب کوئی کک اپنے نشانے پر نہ لگے تو حملہ آور کا توازن برقرار رکھنا بہت کٹھن کام ہوتا ہے۔ جہانگیر پر ایک وحشت سوار تھی اس لیے بھی وہ سنبھل نہ سکا۔ سوئپ ویسے بھی مدِمقابل کو زمین بوس کرنے ہی کے لیے لگائی جاتی ہے۔ خاص طور پر بیک سوئپ (BACK SWEEP) کسی جھاڑو کے مانند، اپنی راہ میں آنے والے ہر شے کا صفایا کرتی چلی جاتی ہے۔

اس مرتبہ جہانگیر نے اٹھنے میں تھوڑی تاخیر سے کام لیا۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے ایک اسٹیپ لے کر اسنیپ کک (SNAP KICK) چلائی۔ وہ لڑکھڑایا اور ایک قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر فرنٹ پریشر کک اس کے شانے پر جڑ دی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر زمین پر آ گرا۔ اس نے بائیں شانے کو تھام رکھا تھا اور اس کا چہرہ اذیت کی آماجگاہ کا منظر پیش کر رہا تھا...... وہ چہرہ جو پہلے ہی لہولہان ہو رہا تھا۔ اس ابتر تر صورت میں، اذیت کے تاثرات نے ایسا نکھار لگایا کہ جہانگیر کا چہرہ بھیانک شکل اختیار کر گیا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو جھوم رہا تھا۔ اس کا مضروب بازو، شاخ پر لٹکی ہوئی کسی مُردی کے مانند جھول رہا تھا۔ میری پریشر کک (PRESSURE KICK) نے اس کے

شانے کا کباڑا کر دیا تھا۔ بادی النظر میں یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے بائیں شانے کا جوڑ اپنی جگہ سے کھسک گیا ہو۔

جہانگیر نے کینہ توز نظر سے مجھے دیکھا پھر دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں ناکارہ بازو کو سہلاتے ہوئے بولا ”دیکھ لینا...... تمہارا حشر بہت برا ہوگا!“

”فی الحال تو میں تمہارا حشر برا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ میں نے دہاڑ کر کہا ”بتاؤ، تم نے میرے ساتھیوں کو......؟“

وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی پھٹ پڑا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا گٹر ابلنے لگا یہ ایک طرح سے اس کی شکست کا اعلان تھا۔ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو مغلظات میں تولنے لگا۔ بہادر انسان ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور بزدل شخص کمزور پڑنے پر گالیوں کا سہارا لیتا ہے۔ وہ اب تک میرے سامنے بڑی جواں مردی سے ڈٹا ہوا تھا لیکن اس آخری مرحلے پر اس کی بزدلی اچانک ابھر کر سامنے آ گئی تھی۔

میں نے ایک لانگ اسٹیپ (LONG STEP) سائیڈ کک اس کے سینے پر ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں اچک کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا پھر اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر میں نے اس کے چہرے پر مکوں کی برسات کر دی۔ وہ مزاحمت کی پوزیشن میں تھا اور نہ ہی اس میں اتنی سکت باقی بچی تھی۔ چند ہی لمحات میں اس نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔

میں نے اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ”تمہاری باتوں سے یہ تصدیق ہو چکی کہ تم میرے ساتھیوں کے قاتل ہو۔ اب شرافت سے یہ بھی بتا دو کہ تم یہودی لابی کے لیے کس قسم کے خدمات انجام دے رہے ہو؟“

اس کی آنکھوں میں دہشت ہی بھر گئی، لکنت زدہ لہجے میں بولا ”مم...... میں...... کسی یہودی لابی...... کو نہیں...... جانتا!“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں کستے ہوئے کہا ”یہودی لابی اور اس کے مقاصد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگ کسی ایسی مقامی تنظیم سے وابستہ ہو جو یہودی لابی کے مفاد کی خاطر ان کے اشاروں پر ناچتی ہے۔ میرے سامنے تمہاری دروغ گوئی نہیں چل سکے گی۔ تم دونوں کو کافی دنوں سے واچ کیا گیا ہے۔ تم اگرچہ اس مقامی تنظیم کے آلۂ کار ہو لیکن میں تمہارے ذریعے یہودی لابی تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر تمہارے اندر زندگی کی خواہش مر نہیں گئی تو زبان کھول دو۔“

”مم...... میں نے بتایا ہے نا، میں ایسی کسی لابی سے واقف نہیں ہوں۔“ اس نے نگاہ چراتے ہوئے کہا ”تم...... خواہ مخواہ مجھ پر شک...... کر رہے ہو۔“

میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا پھر غرا کر کہا ”مجھے تشدد کے لیے مجبور نہ کرو۔ میں کم وقت میں زیادہ کام نمٹانے کے موڈ میں ہوں۔ اگر تم نے میرا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کی تو مجھے مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔“

اپنی بات ختم کرتے ہی، میں نے پنڈلی پر موجود خنجر کو ایک جھٹکے سے باہر کھینچ لیا، پھر اس کے برہنہ پھل کو اپنے نیچے دبے ہوئے جہانگیر کی آنکھوں کے سامنے چمکایا۔ امتیاز علی کی یادگار، اس خنجر کا پھل پورے آٹھ انچ طویل تھا۔ پھل کے اختتام پر پانچ انچ کا دستہ تھا۔ تیرہ انچ طویل یہ تشنہ لب، خونخوار ہتھیار ہر وقت میری پنڈلی سے چمٹا رہتا تھا اور میرے اشارۂ ابرو پر چیر پھاڑ کے لیے پیش قدمی کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی اسے برداشت نہیں تھی!

اسی دوران میں شہزاد علی بھی ہمارے قریب آ گیا۔ اس نے اپنی ”ہنرمندی“ سے فواد کو چاروں خانے چت لٹا دیا تھا۔ وہ بے چارہ اس وقت گہری غفلت میں تھا، اس کا بے حرکت جسم کمرے کے فرش پر، بیڈ کے کنارے ہی پڑا تھا۔ بیڈ پر موجود حسینہ بڑی وحشت ناکی سے ہماری ”کارروائی“ دیکھتی رہی تھی۔ وہ خاصی ذہین اور موقع شناس معلوم ہوتی تھی۔ اس دوران میں اس نے چیخنے چلانے یا وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی البتہ بیڈشیٹ کے اندر سے اس کا خوفزدہ چہرہ مسلسل اس کھیل کو دیکھ رہا تھا جو پچھلے پندرہ منٹ سے وہاں جاری تھا۔

میں نے اپنے خنجر کو بڑے خوفناک انداز میں حرکت دی اور جہانگیر سے استفسار کیا ”زبان کھولتے ہو یا میں اس کی دھار کا مظاہرہ پیش کروں؟“

”تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرنے لگا حالانکہ اس کی آنکھیں چیخ چیخ کر پکار رہی تھیں، میں نے بالکل ٹھیک بندے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ یہ آنکھیں بڑی چغل خور ہوتی ہیں، ہر بات بتا دیتی ہیں!

”کس قسم کی غلط فہمی؟“ میں غرایا۔

”ہم کسی...... یہودی لابی کے لیے کام نہیں کرتے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولا۔

”تم جس تنظیم کے آلۂ کار ہو وہ یہودیوں کی ناؤٹ ہے۔“ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا ”بتاؤ، تم کس تنظیم سے وابستہ ہو...... اور تمہارے باس کا کیا نام ہے؟“

وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں تامل کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ مجھے ”ہاں“ اور ”نہ“ کے بیچ میں لٹکا ہوا دکھائی دیا۔

شہزاد علی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”وجدان! لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے تمہیں سختی کرنا ہوگی۔“

”یہ لاتوں کا بھوت نہیں شہزاد!“ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا ”اس کے ساتھ تو لات مکا بہت ہو چکا پھر بھی خاموش ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے پہلے اس کی فصد کھولنا ہوگی! یہ بھی تو دیکھے میری فصادزنی!“

بات ختم ہوتے ہی میں نے اپنے خنجر کی دھار کو اس کے بدن کے ایک نہایت ہی نازک حصے پر آزمایا۔ یہ ایک معمولی سا چرکا تھا لیکن میرے نیچے دبا ہوا شخص تکلیف کی شدت سے چیخ اٹھا۔ تیز دھار خنجر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے اس کی چلاہٹ کی پروا کیے بغیر ایک انچ کے فاصلے پر دوسرا چرکا لگایا۔ وہ ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند ہاتھ پاؤں پھینکنے لگا۔ میں نے خنجر کی نوک کو اس کی شہ رگ پر چبھوتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”میں تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں جہانگیر!“ میرے انداز میں سفاکی کی کوئی کمی نہیں تھی ”تمہارا تعلق کس تنظیم سے ہے؟ اور تمہارے باس کا کیا نام ہے؟ اگر میری بات کے اختتام پر تم نے ان سوالات کا جواب نہ دیا تو ہر پانچ سیکنڈ میں تمہیں ایک اذیت ناک چرکے کا تحفہ پیش کروں گا...... اور بالآخر تمہاری شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔ تم جانتے ہو، شہ رگ پر لگنے والا کٹ (CUT) کتنا جاں گسل ہوتا ہے!“ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

”اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ زبان کھول دو...... یا حرام موت مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!“

اس کی ایک بلند آہنگ چیخ کمرے کی فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ اس مرتبہ میرے خنجر نے کچھ زیادہ ہی (DEEP CUT) لگا دیا تھا۔ وہ بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوشش ان معنوں میں کہ وہ میرے نیچے بری طرح دبا ہوا تھا اور ”دبا ہوا“ شخص کسی بھی کام کی کوشش ہی کر سکتا ہے۔ وہ کام اپنی مرضی سے تکمیل تک پہنچانا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ جہانگیر کی بے اختیاری نے اسے تڑپنے، پھڑکنے پر مجبور کر رکھا تھا، وہ بے آب مچھلی کی مانند اچھل کود مچا کر اپنی جگہ تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے اس کی آہ و بکا کی پروا کیے بغیر چرکا بازی جاری رکھی تو اسے گھٹنے ٹیکنے پڑے اور جب کوئی انسان گھٹنے ٹیکتا ہے تو پھر اسے ہتھیار پھینکنا پڑتے ہیں۔ وہ نہتا ہو جاتا ہے۔ جہانگیر نے اپنے نہتاپن کا اعلان کرتے ہوئے زبان کھول دی۔

”میں بتاتا ہوں...... سب کچھ بتاتا ہوں۔“ وہ سراسیمہ لہجے میں بولا ”خدارا، اس موذی خنجر کو میری گردن سے ہٹاؤ۔“

میں نے گمبھیر آواز میں کہا ”یہ خنجر تمہاری گردن سے ہٹ رہا ہے...... اور صرف...... اس لیے ہٹ رہا ہے کہ تم میرے سوالات کے تسلی بخش جواب دے سکو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ اس نے اپنی وحشت زدہ آنکھوں کو بند کر کے کھول دیا۔ یہ اس کا اثباتی جواب تھا۔ میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ”اگر تمہارے جوابات سے میری تشفی نہ ہوئی تو بس سمجھ لینا، تم نے زندگی بچانے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیا۔“

پھر میں اس کے سینے سے نیچے اتر آیا۔ اس کی اتنی درگت بن چکی تھی کہ وہ فرار ہونے یا حملہ آور ہونے کا خیال دل میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں نے شہزاد کو اشارہ کیا۔

”شہزاد! تم اس مردود کو اپنے پسٹل کے نشانے پر رکھ لو۔ اگرچہ مجھے امید تو نہیں کہ یہ کوئی شیطانی کرے گا لیکن پھر بھی اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس نے میرے کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے گڑبڑ کی تو میں صرف تمہارا نام پکاروں گا۔ تم ”شہزاد“ کا لفظ سنتے ہی بے دریغ اسے شوٹ کر دینا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

یہ بات میں نے محض جہانگیر کو دہشت زدہ کرنے کے لیے کہی تھی تاکہ وہ کوئی منفی خیال دل میں نہ لائے اور اگر اس کا ذہن کسی سرکشی کا سگنل دے بھی تو وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کا رسک نہ لے، اس سگنل کو خیال انداز کر دے۔

اس کے بعد میں نے دوسری کرسی سنبھالی اور بیڈشیٹ میں ملفوف حسینہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ خوفناک پھل والا خنجر بدستور میرے ہاتھ میں تھا۔ حسینہ کی دہشت زدہ نگاہ اسی خنجر کی دھار پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بغیر نام کے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ چونکی جیسے سکتے سے باہر آئی ہو پھر اس کے ہونٹ کپکپائے ”تا...... بندہ!“

’’یہ کیا نام ہوا؟‘‘ میں نے اسے گہری نظر سے گھورا ’’تا...... بندہ...... اگر تم تا...... بندہ ہو تو پھر از...... بندہ کون ہے؟‘‘ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی، اس الجھن میں سراسیمگی شامل تھی۔ ’’یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی......از کراچی تا حیدر آباد۔‘‘

میری بات ختم ہونے پر اس نے قدرے سنبھل کر کہا ’’میرا نام تابندہ ہے۔ تمہیں سمجھنے میں غلطی لگی...... نہیں، نہیں۔‘‘ اس نے بڑی سرعت میں گردن کو نفی میں جھٹکا اور لجاجت آمیز لہجے میں بولی ’’مم...... میرا مطلب ہے، اپنا نام بتانے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔‘‘ وہ بری طرح ڈری ہوئی تھی اور یہ اس کا عین فطری عمل تھا۔

اس کی خوفزدگی بڑی قابلِ رحم اور مضحکہ خیز تھی۔ میں نے بے پروائی سے کہا ’’تم تابندہ ہو یا شرمندہ، اس بات سے مجھے کوئی غرض نہیں اور نہ ہی اس بات سے کوئی سروکار ہے کہ تم ان دوشیطانوں کے بیچ رات کے آخری پہر کیا کررہی تھیں۔ اگر مزید شرمندگی سے بچنا چاہتی ہو تو لباس پہن کر اپنے حواس میں آنے کی کوشش کرو۔‘‘ پھر میں نے کمرے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا ’’تمہارا لباس کہاں ہے؟‘‘

اس نے جواب دینے کے بجائے واش روم کے بند دروازے کو دیکھا۔ اس کا یہ خاموش جواب میری سمجھ میں آگیا۔ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

’’تابندہ بصورتِ شرمندہ! تم فوراً اس بیڈشیٹ میں لپٹی لپٹائی واش روم میں پہنچو اور تسلی سے اپنا لباس پہن لو...... اور اس وقت تک واش روم سے باہر نہ آنا جب تک میں تمہیں اس بات کی اجازت نہ دوں۔‘‘

میرا جملہ مکمل ہوتے ہی وہ چادر بردار، اپنے بدن کو سمیٹتے ہوئے واش روم کی طرف چلی گئی۔ میں دوبارہ جہانگیر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ بہت سہما بیٹھا تھا۔

’’میں دیکھ رہا ہوں، تمہارے حواس بجا ہوچکے ہیں۔‘‘ پھر میں نے شہزاد کی سمت دیکھتے ہوئے پوچھا ’’اگر تم ریڈی ہو تو میں اس بدبخت کا ’’انٹرویو‘‘ شروع کروں؟‘‘

’’میں ایور ریڈی ہوں وجدان!‘‘ وہ پسٹل کو ایک مخصوص جنبش دیتے ہوئے بولا ’’جیسے ہی تمہاری زبان پر میرا نام آیا، میں ٹریگر دبادوں گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

جہانگیر کی آنکھوں میں موجود وحشت کئی گنا بڑھ گئی۔ اس وحشت میں دہشت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ میں نے اس کی انہی آنکھوں میں گھورتے ہوئے استفسار کیا۔

’’اب تو تمہارا ذہن یہودی لابی کی کارفرمائی سے انکاری نہیں؟‘‘

اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلائی۔ اس کا مطلب تھا، اس نے اقرار کرلیا۔

’’زبان سے بولو۔‘‘ میں دہاڑا ’’بیمار بکرے کی طرح گردن کو مت جھٹکو!‘‘

وہ بولا ’’اس شہر میں یہودی لابی اپنا کام دکھارہی ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’یہودی لابی کسی مقامی تنظیم کے پلیٹ فارم سے اپنے مقاصد حاصل کررہی ہے اور تم اس تنظیم کے آلۂ کار ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟‘‘

’’نہیں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘ وہ کمزور آواز میں بولا۔

’’تم کس تنظیم سے وابستہ ہو۔‘‘ میں نے پوچھا ’’اور تمہارے باس کا کیا نام ہے؟‘‘

’’کیا دونوں سوالوں کے جواب دینا ضروری ہیں؟‘‘ اس نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

’’اس میں قباحت کیا ہے؟‘‘ میں نے غصیلی نظر سے اسے دیکھا۔

’’میرا خیال ہے، ایک سوال کا جواب دوسرے سوال کو کھول دے گا۔‘‘

’’تم کہنا کیا چاہتے ہو؟‘‘ میں نے تیکھی نظر سے اسے دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ’’میں جس تنظیم سے منسلک ہوں، وہ تمہارے لیے اجنبی نہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ میں نے تیز آواز میں کہا۔

’’سی ایف کے‘‘ وہ شکست خوردہ آواز میں بولا۔

میں اپنی جگہ سے اچھل پڑا ’’یہ کیا بکواس ہے؟‘‘ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

’’یہ بکواس نہیں، حقیقت ہے۔‘‘ وہ مضبوط لہجے میں بولا ’’میں ’’سی ایف کے‘‘ کے لیے کام کرتا ہوں جس کا بگ باس شعیب غوری ہے۔ ہم سب اسی کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ یہ اشارے ہمیں اپنے باسز کی طرف سے ملتے ہیں۔ ہر ضلع میں بگ باس کا ایک نائب باس موجود ہے۔‘‘

جہانگیر کے انکشاف نے میرے دماغ میں ہلچل مچادی۔ میں اس کی بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شعیب غوری اور اس کی تنظیم ’’سی ایف کے‘‘ سے میں بخوبی واقف تھا بلکہ ’’غیر سرکاری‘‘ طور پر اس سے منسلک بھی تھا۔ میں نے سوچا، شاید جہانگیر مجھے غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کررہا ہو۔ وہ جھوٹ بول کر اپنی جان بچانا چاہتا ہو۔ میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

’’میں شعیب غوری اور اس کی تنظیم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم غلط بیانی کرکے اپنی جان نہیں چھڑا سکتے۔‘‘

’’میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔‘‘ وہ تیقن سے بولا۔

میں نے کہا ’’سی ایف کے ایک اصلاحی اور مثبت طرزِ فکر کی تنظیم ہے۔ تم یقیناً کوئی گڑبڑ کررہے ہو۔‘‘

’’میں نے کوئی گڑبڑ نہیں کی اور نہ ہی اس پوزیشن میں ہوں کہ جھوٹ بول سکوں۔‘‘ اس نے کن انکھیوں سے پسٹل بردار شہزاد کو دیکھا ’’زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ میں بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں اور تم نے وعدہ کیا ہے، اگر میں سچ بولوں گا تو تم مجھے جان سے نہیں مارو گے۔‘‘

’’میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔‘‘ میں نے کہا ’’لیکن تمہارے جواب سے میری تسلی نہیں ہورہی۔‘‘

’’وہ اس لیے کہ تم شعیب غوری کو ایک فرشتہ صفت انسان سمجھتے ہو۔‘‘ وہ قدرے بہادری سے بولا ’’تم اس تنظیم سے سطحی طور پر منسلک ہو اس لیے پوری طرح باخبر نہیں۔ شعیب غوری تمہیں جس طرح بے وقوف بنارہا ہے، تم بن رہے ہو۔‘‘

اس کی باتوں سے مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے کہا ’’کیا تم یہ تمام حقائق شعیب غوری کے سامنے بھی بیان کرسکتے ہو؟‘‘

’’یہ ممکن نہیں ہے۔‘‘ وہ جلدی سے گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا ’’تم تو سیدھے سادے شریف آدمی ہو۔ مجھے امید ہے، تم میری جان بخشی کردو گے لیکن شعیب غوری کو اگر اس سلسلے میں ذرا سی بھنک بھی پڑگئی تو وہ میرا جو حشر کرے گا اس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا۔‘‘

’’پھر تمہاری باتوں کی تصدیق کس طرح ہوسکے گی؟‘‘

’’تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا۔‘‘

’’تم نے جو کچھ کہا ہے، ذہن اسے تسلیم نہیں کرتا۔‘‘

’’وہ اس لیے کہ تمہارا ذہن اس وقت ’’سی ایف کے‘‘ کے کیمپ میں بیٹھا ہوا ہے۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ’’جب کبھی تمہاری آنکھ کھلے گی تو تمہیں میری باتوں کا یقین آجائے گا لیکن اس وقت تک پتا نہیں، میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ مجھے لگتا ہے، میری زندگی کے دن گنے جاچکے ہیں۔‘‘ وہ اچانک بے حد سراسیمہ نظر آنے لگا ’’بگ باس شعیب غوری کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اس کی اتنی ہی آنکھیں ہیں جتنے اس کی تنظیم کے ورکر ہیں۔ وہ اپنے ہر بندے پر ایک نگاہ رکھتا ہے۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ وہ اس وقت بھی مجھے دیکھ رہا ہے...... وہ میری غداری کا عینی شاہد ہے اور میری اس غلطی کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ مجھے مرنا ہوگا، بہت جلد مرنا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ بھی دیا تو بگ باس نہیں چھوڑے گا۔‘‘ وہ پٹڑی سے اترنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موت کے سائے ناچتے ہوئے دیکھے۔ وہ خوفزدگی کے عالم میں بولا ’’وجدان! تم اسی وقت مجھے جان سے گزار دو۔ اپنی زبان سے ’’شہزاد‘‘ کا لفظ خارج کردو تاکہ تمہارا ساتھی مجھے شوٹ کردے۔ یہ فوری اور کم اذیت ناک موت ہوگی ورنہ بگ باس مجھے جس طرح فنا کے گھاٹ اتارے گا اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ابھی سے میری روح فنا ہورہی ہے۔ پلیز وجدان! میری مشکل آسان کردو۔ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لو۔‘‘

وہ باقاعدہ گڑگڑانے لگا۔ میرے لیے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ میں نے بہت سے لوگوں کو زندگی کی بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن جہانگیر عجیب بھکاری تھا۔ یہ مجھ سے موت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ منت سماجت کررہا تھا کہ میں اسے جلد از جلد زندگی کی قید سے آزاد کردوں۔ میں غیر یقینی نظر سے یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گھگھیایا ’’وجدان! میں تمہارے تین ساتھیوں کا قاتل ہوں۔ اگرچہ میں نے اپنے ہاتھوں سے انہیں نہیں مارا لیکن گرے بچارو سے، میرے حکم ہی سے فائرنگ کی گئی تھی۔ میرے آلۂ کاروں نے کلاشنکوفز کے برسٹس سے تمہارے ساتھیوں کو بھون ڈالا تھا۔ کم از کم تم اپنے ساتھیوں کا انتقام لینے کے لیے ہی مجھے قتل کردو۔‘‘

اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے فرش پر بے سدھ پڑے فواد کو دیکھا اور جہانگیر سے پوچھا ’’اس فلیٹ میں اور کتنے کمرے ہیں؟‘‘

اس نے حیرت سے میرا یہ غیر متوقع سوال سنا اور بولا ’’اس کے علاوہ ایک بیڈروم اور ایک ڈرائنگ روم ہے۔‘‘

میں نے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ’’تم یہیں رک کر اور فواد اور تابندہ پر نظر رکھو۔ میں جہانگیر کو دوسرے کمرے میں لے جارہا ہوں۔ باقی پوچھ تاچھ وہاں ہوگی۔‘‘

شہزاد نے کوئی سوال کیے بغیر شانے اچکادیے۔ گویا اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔

میں نے خنجر کے اشارے سے جہانگیر کو آگے لگایا اور ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ وہ میری اس حرکت پر سخت پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں ایک خیال یہ بھی ہو کہ میں اسے خاموشی سے ٹھکانے لگانے کے لیے وہاں لایا ہوں۔

میں نے ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ بند کیا اور ہم آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ میں فلیٹ میں داخل ہونے سے قبل ہی باہر سے بولٹ

کر چکا تھا۔ اب میں نے اپنے اچھوتے خیال پر عمل شروع کر دیا۔

وہ گہری حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا ''لوگوں کو زندگی کی خاطر گھگیاتے، روتے گڑگڑاتے تو دیکھا گیا ہے لیکن تم واحد آدمی ہو جو موت کے لیے التجا کر رہے ہو۔ اس حوالے سے تم اپنی نوعیت کے منفرد آدمی ہو۔''

''تم نے شعیب غوری کا مثبت چہرہ دیکھا ہے اس لیے یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا ''میں جانتا ہوں، وہ مجھے کتنے بھیانک انجام سے دوچار کرے گا۔ یہ زندگی میرے لیے موت سے بھی زیادہ بدتر ہو جائے گی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے جبڑوں کو بھینچا۔ وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے باوفا خنجر کے چرکوں نے اس کی گردن کو متعدد مقامات سے خون آلود اور خونریز بنا دیا تھا۔ میں نے انسانی ہمدردی کے ناتے وہاں موجود ایک کپڑا اٹھا کر اس کی گردن پر لپیٹ دیا تاکہ خون کا اخراج رک جائے۔

اس نے تشکر آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ''تھینک یو وجدان!''

میں نے اپنے منصوبے کے تحت اس کا خوف کم کرنے کی خاطر کہا ''شعیب غوری تو تمہارے خلاف اس وقت کوئی قدم اٹھائے گا نا جب اسے یہاں کے حالات کی خبر ہوگی۔ تم اس سلسلے میں پیش بندی کر سکتے ہو!''

اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ اطمینان کی جھلک دکھائی دی مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سراسیمہ نظر آنے لگا، بولا ''میں پھر بھی کہوں گا، تم شعیب غوری کی گہرائی کو نہیں ناپ سکتے۔ وہ اپنے ورکرز کے ایک ایک معاملے سے آگاہ رہتا ہے۔ یہ واقعہ جلد یا بدیر اس کے علم میں آ جائے گا اور وہ میری کھال کھنچوا کر جسم میں سمندری نمک بھروا دے گا۔''

''مگر کیسے۔ اس تک یہ خبر کیسے پہنچے گی؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا ''میرے فرائض میں ایک بات یہ بھی شامل ہے کہ میں فواد کی غیر نصابی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھوں۔ اسی طرح مجھے یقین ہے، میرے بارے میں بھی فواد کو کچھ اسی قسم کے احکام ملے ہوں گے۔'' وہ ذرا توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا ''فواد تم دونوں کی یہاں آمد اور ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کو من و عن ہمارے باس تک پہنچا سکتا ہے اور باس فوراً اس معاملے کو بگ باس کے پاس لے جائے گا۔''

''تمہارے باس کا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''سلیم واسطی۔ یہ ''ملیر'' کا کرتا دھرتا ہے...... اور یہ بات تم جانتے ہی ہو کہ ''سی ایف کے'' نے کراچی کے ہر ضلع میں ایک ٹھکانا بنا رکھا ہے جو اسی ضلع کے نام سے موسوم ہے۔ میں پہلے ''ساؤتھ'' میں تھا جہاں کا باس کبیر شاہ ہے۔ مگر اوراقبرستان والے واقعے کے بعد مجھے ''ساؤتھ'' سے ''ملیر'' شفٹ کر دیا گیا تھا۔''

اس کی بات نے فوراً مجھے کلک کیا۔ خرکار جورنگی سے تھوڑا پہلے پوٹ بیسن کے علاقے میں جب کرے پجارو والوں نے ہمیں گھیرا تھا تو ایک گن بردار کو دیکھ کر میں چونکا تھا اور مجھے شک گزرا تھا کہ میں اس صورت کو پہلے ''ساؤتھ'' میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ صورت اسی جہانگیر کی تھی۔ ازاں بعد جب میں نے شعیب غوری کی اس جانب توجہ دلائی تو وہ بڑی چالاکی سے مجھے مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جہانگیر کی بات کے اختتام پر میں نے کہا ''تمہارے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فواد اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھے تو معاملات تمہارے ہاتھ میں رہ سکتے ہیں۔''

''مگر وہ اپنی زبان بند کیوں رکھے گا؟''

''وہ نہیں...... بلکہ تم اس کی زبان بند کر سکتے ہو...... ہمیشہ کے لیے!''

میں نے کہا ''انسان کی بقا اور فنا کا یہی دستور ہے، خاص طور پر جرائم کی دنیا میں تو یہ مسلم فارمولا ہے۔ انسان اپنی بقا کے لیے دوسرے کی فنا کا سامان کرتا رہتا ہے۔''

''لیکن تم میری بقا کیوں چاہتے ہو؟'' اس کی حیرت دور ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی ''میرے اشارے پر تمہارے تین بہترین ساتھیوں کو خاک رزق میں......؟''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''وہ اشارہ تمہارے دل کی آواز نہیں تھا۔ تمہیں اپنے سابق باس کبیر شاہ کی طرف سے حکم ملا تھا...... اور کبیر شاہ اپنے باس اور تمہارے بگ باس کے حکم کا پابند ہوگا۔ اس حساب سے میرے ساتھیوں کا اصل قاتل تمہارا بگ باس ہے۔ میں ان کے قتل کا انتقام شعیب غوری سے لوں گا۔ تم بے گناہ ہو، اس لیے تمہیں زندہ رہنا چاہیے۔''

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو کہ ستمبر 2004 میں شائع ہوگا

جاسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 10

آتش فشاں

راوی: وجدان علی
: حُسام بٹ

...کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے ...ے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دشمنوں کو خوب جانتا ...ا اور انہیں "انصاف" کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اسے ایک ایسی تربیت ...ہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن ٹمپل میں فنونِ حرب و ضرب ... ماہر ہاتھوں نے اس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اُسے آتش و آہن کا ایک بے ...ثال شاہ کار بنادیا۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پاؤں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہوگئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی۔ تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور انہیں حرف غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

ظلم و جبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک سراپا انتقام، چھلنی کلیجا شخص کی لرزہ خیز داستان

خوف اور ڈر بڑے عجیب احساسات ہیں۔ خطرہ جتنا دور ہو یہ اسی قدر زیادہ ستاتے ہیں۔ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہوا سزائے موت کا مجرم شاید اسی لیے نڈر اور بے خوف دکھائی دیتا ہے خطرے اور اس کے درمیان فاصلہ صفر کے برابر رہ جاتا ہے۔ جب انسان یہ سوچ لے کہ جو ہوتا ہے ہو جائے تو پھر کچھ نہیں ہوتا۔ ہر شے غیر اہم ہو کر رہ جاتی ہے!

میں ذہنی طور پر ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس "تیاری" نے میرے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ پولیس والوں سے خواہ مخواہ ٹکر لی جاتی۔ کسی چالاکی ہی سے ان سے نجات حاصل کی جاسکتی تھی۔

ہم سے آگے پانچ چھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پولیس والا نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے کرولا کے قریب آگیا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ اس نے میری سائیڈ کا شیشہ ...نے کے بعد مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

موسم کی مہربانی کے طفیل ہم نے گاڑی کے تمام شیشے ...ھا رکھے تھے اور علی الصباح کی دھند نے انہیں دھندلا کر دیا ...۔ میں نے گردن گھما کر عقبی نشست پر بیٹھی ہوئی صدف اور ...گل کی طرف دیکھا اور سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

"پریشان یا فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، دیکھو میں اس سے کیسے نمٹتا ہوں۔"

پھر میں نے اپنی سائیڈ کا شیشہ گرایا اور گاڑی کے اندر ہی رہتے ہوئے پولیس والے سے استفسار کیا "کیا بات ہے بھئی؟"

میرے انداز اور لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا۔ اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ شاید وہ توقع کر رہا تھا، اس کے اشارے پر میں فوراً گاڑی سے باہر نکل آؤں گا۔ جب میرے رویے نے اس کی توقع کا جنازہ اٹھا دیا تو وہ حیرت سے مجھے تکنے لگا۔ اس حیرت میں ایک احتیاط بھی پائی جاتی تھی۔

اس نے کہا "آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔"

اس کے انداز میں تحکم یا بداخلاقی نہیں تھی اور یہ میرے اسٹائل کا ثمر تھا ورنہ پولیس والوں سے کوئی یہ نہیں پوچھتا...... کیا بات ہے بھئی!

میں نے گمبھیر آواز میں پوچھا "تمہارا صاحب مجھے کیوں اور کہاں بلا رہا ہے؟"

میرے اس انداز کے استفسار پر وہ مزید الجھ گیا۔ اس نے لگ بھگ سو گز دور ایک جانب اشارہ کیا اور بولا "صاحب وہاں چیکنگ کے لیے سب کو اپنے پاس بلا رہے ہیں۔"

میں نے سوال کیا "کیا یہ لوگ تمہارے صاحب کے

پاس پہنچ گئے ہیں؟''

میرا اشارہ اپنے سامنے کھڑی گاڑیوں کی طرف تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہنے لگا ''آپ بھی جلدی آجائیں ورنہ مجھے ڈانٹ سننا پڑے گی۔''

میں نے اس کی ''مجبوری'' کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''اس کا مطلب ہے' تمہارا صاحب گاڑیوں کی نہیں بندوں کی چیکنگ کر رہا ہے!'' میرے سوال میں افسرانہ شان تھی۔

وہ میرے تیور اور اپنے صاحب کے لیے طرزِ تخاطب دیکھتے ہوئے ''آپ'' سے ''سر'' پر اتر آیا۔ بڑے عجلت بھرے میں لہجے میں بولا ''سر! وہاں کاغذات اور بندوں کی چیکنگ ہوگی۔ بعد میں گاڑیوں کو بھی چیک کیا جائے گا۔ پلیز آپ گاڑی سے باہر آجائیں۔''

''میں گاڑی سے باہر تو نہیں آسکتا!'' میں نے قدرے جارحانہ انداز اختیار کیا۔

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا ''سر! صاحب کا یہی حکم ہے۔''

''اپنے صاحب سے کہو' وہ یہاں آکر ہماری چیکنگ کرلے'' میں نے برہمی سے کہا۔

''آپ دیکھ رہے ہیں سر! وہ ادھر مصروف ہیں۔''

''وہ مصروف ہیں تو میں کیا کروں!'' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا ''اگر انہیں چیکنگ کی بہت زیادہ جلدی ہے تو یہاں آجائیں ورنہ میں نے تو قطار میں گاڑی کھڑی کر رکھی ہے۔ جب نمبر آئے گا تو چیکنگ بھی ہوجائے گی۔''

پولیس والے کے لیے وہ سب کچھ نیا' انوکھا اور ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے سنا تھا اور پچھلے کچھ عرصے سے دیکھ بھی رہا تھا کہ پاکستان اور انڈیا میں کمزور اور طاقتور کے لیے الگ الگ قانون تھا۔ قانون کے رکھوالے تو ایک ہی تھے لیکن وہ ان دونوں معاشرتی طبقوں کے ساتھ بالکل مختلف اور جداگانہ سلوک کرتے تھے' گویا طاقتور لوگ قانون کے ساتھ کسی کھلونے کی طرح کھیلتے تھے اور قانون نے کمزور' بے بس اور لاچار کو کھلونا بنایا ہوا تھا۔ قانون سے یہاں میری مراد خاص طور پر پولیس اور عام طور پر عدالتی نظام ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ڈیپارٹمنٹس کلی طور پر کرپٹ تھے تاہم ان کی کارکردگی جو ہونا چاہیے' وہ بہرحال نہیں تھی۔

میرے انداز نے پولیس والے کو باور کرادیا کہ میں توپ قسم کی چیز ہوں جو اس کے صاحب کو خاطر میں نہیں لا رہا۔ میں گزشتہ تین منٹس سے اس سے مغز ماری کر رہا تھا اور شاید یہ بات اس کے صاحب نے نوٹ کرلی تھی۔ وہاں سے ایک پولیس والے نے اسے پکارا۔

''رجب علی! کیا بات ہے۔ تم وہاں اتنی دیر سے کیا کر رہے ہو؟''

اس نے ہچکچاہٹ آمیز نظر سے مجھ دیکھا اور اپنے ساتھیوں کی جانب منہ اٹھا کر بلند آواز میں بولا ''سر گاڑی سے باہر نہیں آرہے۔''

اس کا مجھے ''سر'' کہنا اس بات کا غماز تھا کہ وہ مجھ سے اور میری شخصیت سے پوری طرح متاثر ہوچکا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو یہ بات سمجھادی تھی کہ میں اس کے صاحب سے بڑا کوئی آفیسر ہوں۔ یہ میری چال کے ساتھ ساتھ اس کے کمزور دماغ ہونے کی بھی دلیل تھی۔

پولیس والے نے ایسی بات کی تھی کہ اس کے صاحب کا چونکنا لازم ہوگیا۔ وہ جگہ مجھے نظر آرہی تھی جہاں پر ان سب کا صاحب چیکنگ کے نام پر قانونی کارروائی میں مصروف تھا۔ میں نے واضح طور پر دیکھا کہ ان کے صاحب نے لوگوں کو اپنے سامنے سے ہٹایا اور پولیس والے سے ازخود مخاطب ہوا۔

''کیا کہا تم نے رجب علی؟'' اس کے سوال میں حیرت سے زیادہ بے اعتنائی تھی۔

رجب علی نے کہا ''صاحب جی! سر کہتے ہیں' آپ کو چیکنگ کی اگر اتنی ہی زیادہ جلدی ہے تو یہاں آکر چیک کرلیں' سر گاڑی سے باہر نہیں آئیں گے۔''

اس کے صاحب نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے ٹویوٹا کرولا کو ایک نظر دیکھا پھر اس کی نگاہ گاڑی کی عقبی نشست کی طرف اٹھ گئی' اس کے بعد اس نے پولیس والے کو اپنے ہاتھ سے ایک مخصوص اشارہ کیا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ انہیں جانے دو۔

اس جنبشی کارروائی کے بعد اس کا صاحب اپنے ماحول میں مصروف ہوگیا۔ پولیس والے نے مجھے نگاہی سلیوٹ کیا اور بڑی لجاجت سے بولا ''سر! آپ جاسکتے ہیں۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔''

میں نے بڑی رعونت سے سر کو خفیف سی جنبش دی اور ایک جھٹکے سے کرولا کو آگے بڑھادیا۔ میری اس نمائشی رعونت میں کامل اداکاری کا ہاتھ تھا۔ جب ہم ناکے سے کافی آگے نکل آئے تو زرگل نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''وجدان! کیا تم کوئی جادو جانتے ہو؟''

''نہیں تو'' میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''مجھے تو یہ ''چی'' کا کمال لگتا ہے۔'' صدف بولی ''جو کسی

جادو سے کم نہیں۔''

''یہ ''چی'' کیا ہوتی ہے؟'' صدف کے اظہارِ خیال نے زرگل کو چونکنے پر مجبور کردیا۔

اس سے پہلے کہ چی کے حوالے سے گفتگو کا کوئی نیا در کھل جاتا' میں نے جلدی سے کہا ''اس میں کسی جادو کو دخل ہے نہ ہی چی کی کارفرمائی۔ یہ ایک کھیل تھا...... اعتماد کا! اور میں یہ کھیل بڑی کامیابی سے کھیل کر جیت چکا ہوں۔''

''اعتماد کا کھیل!'' زرگل نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

تاہم صدف نے اس موقع پر مکمل خاموشی اختیار کرلی۔

میں نے زرگل کی تشفی کے لیے کہا ''بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی پولیس با اثر اور پر اعتماد لوگوں پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ڈرتی ہے۔ میرے انداز نے اس پولیس آفیسر کو یقین دلا دیا کہ ہم کوئی عام لوگ نہیں ہیں بلکہ بہت ہی طاقتور اور بااثر ہیں۔ ہوسکتا ہے' سیاست میں بھی ہمارا عمل دخل ہو اور برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کی حمایت ہمیں حاصل ہو ورنہ پولیس والوں کے سامنے اتنی اکڑ کون دکھا سکتا ہے۔ میں نے اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بازی پلٹ دی۔''

زرگل نے کہا ''اگر وہ پولیس آفیسر تمہارے اعتماد کی دھونس میں نہ آتا تو صورتِ حالات کی سنگینی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔''

''ہاں' ایسا ممکن تھا۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''اگر ایسے حالات پیدا ہوجاتے تو پھر میں ہر نوعیت کا ہنگامی قدم اٹھالیتا۔ یہ بات بہرحال طے ہے۔'' میں نے ڈرائیونگ پر توجہ کو مرکوز رکھتے ہوئے ذرا توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا ''میں کسی بھی صورت میں ان پولیس والوں کو کرولا کی ڈکی کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔''

''میرا خیال ہے' اس کی نوبت نہ آتی۔'' صدف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''پولیس والوں کے آفیسر نے گہری نظر سے ہمارے گاڑی کو دیکھنے کے بعد ہمیں چھوڑنے کا اشارہ کیا تھا۔''

زرگل نے صدف سے پوچھا ''اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟''

''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔'' صدف ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی ''انہیں جس گاڑی اور جن افراد کی تلاش ہے وہ ہم ہیں اور نہ ہی ٹویوٹا کرولا۔ سو گز کا فاصلہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں پہچان نہ پاتا۔ اگر آفیسر کو کسی خاص شخص یا چند افراد کی تلاش تھی تو یہ بات طے ہے' ہم ان کے مطلوبہ بندے نہیں تھے ورنہ اگر شک کی ذرا سی بھی گنجائش ہوتی تو وہ ہمیں اتنی آسانی سے نہ چھوڑتے۔''

زرگل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''ہاں' ہوسکتا ہے۔ پولیس والے تو اپنے باپ کو بھی نہیں چھوڑتے۔ میں بڑے تلخ تجربات سے گزر چکی ہوں۔ یہ صرف ڈنڈے کے سامنے جھکتے ہیں ورنہ شریف اور کمزور لوگوں پر تو انہیں ڈنڈا چلانا ہی آتا ہے۔''

''اگر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تو پھر کوئی بھی نظام چل نہیں سکتا۔'' صدف فلسفیانہ انداز میں بولی ''ڈیپارٹمنٹ پولیس کا ہو یا عدالتوں کا' ہر جگہ چند اچھے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ میرے ماموں کی ایک مثال روشن اور زندہ ہے۔''

وہ اپنے ڈی ایس پی ماموں اورنگ زیب خان کی بات کر رہی تھی۔ میں نے بھی اس شخص کو کھرا اور دیانت دار پولیس آفیسر پایا تھا۔ بہرحال اس قسم کے فرض شناس پولیس والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ زرگل نے شاید میرا ذہن پڑھ لیا' صدف سے مخاطب ہوتے ہوئی بولی۔

''ایسے ایمان دار لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے جو ذائقے سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے لیکن اس کی کارکردگی آٹے کے مقابلے میں کہیں نظر نہیں آتی۔ سب کہتے ہیں' ہم نے روٹی کھائی...... آٹے کی روٹی!''

زرگل نے بڑی گہری بات کی تھی لیکن صدف بھی خاصی تیار بیٹھی نظر آتی تھی۔ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے اس نے کہا ''ساری خرابی سسٹم کی ہے۔ انصاف کے تقاضے صرف پولیس تک ہی محدود نہیں بلکہ ان تقاضوں کی تکمیل عدالتی نظام کی مرہونِ منت ہے۔ اگر کوئی سچا اور کھرا پولیس والا انصاف اور فرائض کے تقاضے پورے کرنے پر کمر بستہ ہوجائے لیکن عدالت اس سے تعاون نہ کرے تو پولیس والے کی ساری محنت اندھے کنوئیں میں جاگرتی ہے اور اس کی دل شکنی الگ ہوتی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''اس سلسلے میں ماموں نے ایک نہایت ہی دل چسپ قصہ سنایا تھا جو سچا ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا مضحکہ خیز اور افسوس ناک بھی ہے۔''

''ہمیں بھی سنادو وہ قصہ!'' میں نے حالات کی کلفت کو دور کرنے کی خاطر کہا۔

وہ بولی ''چھوڑو۔ خواہ مخواہ تم دونوں ہنسو گے۔ ہوسکتا ہے' تمہیں یقین ہی نہ آئے۔''

''یقین آنے یا نہ سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' میں نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا ''البتہ اہم بات یہ ہے کہ

ہم دونوں ہنسیں گے' چاہے خواہ مخواہ ہی سہی۔"

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "چلو تم ضد کررہے ہو تو سنا دیتی ہوں۔"

پھر صدف نے بتایا کہ اورنگ زیب خان کی زبانی اسے معلوم ہوا' ان کے محکمے کے ایک فرض شناس اہلکار نے ایک کار لفٹر کو پکڑ لیا۔ اس کار لفٹر کا تعلق ایک با اختیار اور صاحبِ حیثیت خاندان سے تھا اور وہ اپنے من چلے دوستوں کے ساتھ مل کر اس قسم کی وارداتیں کرتا تھا۔ مقصد کاروں کا حصول نہیں بلکہ صرف "سنسنی خیزی" ہوتا۔ وہ چھینی ہوئی گاڑی کو ازاں بعد کہیں بھی چھوڑ دیتے لیکن اس کی حالت خراب کرنے کے بعد۔ وہ اپنے مہم جوئی کے جذبات کی تسکین کے لیے مسروقہ گاڑی کو کسی کھمبے یا ایسی ہی کسی جگہ ٹکرا کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتے۔ بڑے گھروں کے بچوں کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔

بہرحال جب وہ بگڑا ہوا امیرزادہ ایمان دار پولیس والے کی گرفت میں آ گیا تو پہلے اس نے دھونس دھمکی سے کام چلانے کی کوشش کی۔ اپنے باپ کے وسیع تر تعلقات اور اختیارات سے اسے متاثر کرنے لگا لیکن پولیس والا اس کی کسی تعلی یا دھمکی سے مرعوب نہ ہوا اور اسے اپنے ساتھ تھانے لانے پر مصر رہا۔ ان حالات کے پیش نظر اس کار لفٹر نے پولیس والے کو رشوت کی پیش کش کر دی۔ اس کی نظر میں یہ ایک ایسا حربہ تھا جو پولیس پر فوراً کارگر ثابت ہوتا ہے لیکن اس روز اس کا تجربہ غلط ہو گیا۔ پولیس والے نے اس کی ایک نہ سنی اور ضروری کارروائی کے بعد اسے عدالت میں پیش کر دیا۔

جس نے بھی سنا' اسے خوب برا بھلا کہا بہ الفاظِ دیگر اس کے ساتھیوں نے اچھی خاصی لعنت ملامت کر ڈالی کہ اس نے اپنی فضول فرض شناسی میں ایک تگڑی رقم گنوا دی تھی۔ اس کار لفٹر امیرزادے نے پولیس والے کو بیس ہزار روپے کی رشوت آفر کی تھی جو اس وقت اس کے پرس میں موجود تھے۔

اس واقعے کا سب سے تکلیف دہ پہلو اس وقت سامنے آیا جب چند روز بعد اس امیرزادے نے پولیس والے کو فون کیا اور یہ خوشخبری سنائی کہ عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا ہے۔ اس نے حیرت سے دریافت کیا' وہ کیسے؟ اسے جواب ملا تم تو احمق تھے۔ اپنی ایمانداری کے چکر میں تم نے میری پیش کش ٹھکرا دی لیکن وہ مجسٹریٹ بہت عقل مند ثابت ہوا' جس کی عدالت میں میرا کیس لگا تھا۔ پولیس والے نے پوچھا۔ تم نے کتنی رشوت دے کر جان چھڑائی؟ اسے بہت ہی دل شکن جواب سننے کو ملا۔ کار لفٹر نے ایک تمسخرانہ قہقہہ لگایا اور کہا "صرف بریانی کی چار دیگیں۔ مجسٹریٹ کے گھر پر کوئی تقریب تھی۔ اس نے ایک چھوٹی سی فرمائش کی جو میں نے آنکھ بند کر کے پوری کر دی۔

صدف نے اس شرم ناک واقعے کو اختتام تک پہنچایا تو گاڑی میں گہری خاموشی نے قبضہ جما لیا۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی کہتا بھی تو کیا کہتا؟ صدف نے ایک حقیقت بیان کی تھی اور حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کوئی بھی معقول آدمی حقائق کو جھٹلانے کے لیے خواہ مخواہ زبان درازی کرتا ہے اور نہ ہی کٹ حجتی!

ہم تھوڑی دیر کے بعد اک موریا اور دو موریا پل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بادامی باغ کے علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔

☆☆☆

عنایت اللہ باجوہ بھاری جثے کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ دراز قامتی نے اس کے ڈیل ڈول میں ایک جناتی منظر بھر دیا تھا اس کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ہم اس کے اڈے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے اڈے کے باہر بہت سے ٹرک کھڑے تھے۔ دیلکم گڈز فارورڈنگ کمپنی عرفِ عام میں ٹرکوں کا اڈا کہلاتی تھی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد وہ یک ٹک مجھے تکتا چلا گیا۔ مجھے اس کی اس ادا پر حیرت بھی ہوئی اور قدرے عجیب سا بھی محسوس ہوا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ جب مزید چند لمحات تک اس کی محویت نہ ٹوٹی تو میں نے کھنکار کر اسے مخاطب کیا۔

"باجوہ صاحب! کیا بات ہے۔ مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

اس وقت ہم اس کی کمپنی کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہ چونکا اور زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "جناب! میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آخر آپ میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟"

"پھر کچھ نظر آیا؟" میں نے استفسار کیا۔

اس نے ہاں یا نہ میں جواب دینے کے بجائے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور کہا "فرید پاشا کوئی معمولی آدمی نہیں۔ اگر اس نے آپ لوگوں کی سفارش کی ہے تو ضرور آپ بھی غیر معمولی ہی ہوں گے۔ فرید پاشا کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو میں اتنی صبح گھر سے نہ نکلتا بلکہ یوں سمجھو کہ جب اس نے فون کیا اس کے بعد میں ایک لمحے کے لیے نہیں سویا اور...... پچھلے ایک گھنٹے سے میں آپ لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔" اس کا انداز

ایسا تھا جیسے ہمیں بہت دیر ہو گئی ہو۔

میں نے کہا "میں تمہاری آمد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہمیں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ دراصل ہمیں راستے کا اندازہ نہیں تھا۔" ہم جب باجوہ کے اڈے پر پہنچے تو سات بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ "بہرحال ہمارے کام کا کیا ہوا؟" میں نے بات کے اختتام پر اس سے استفسار کیا۔

"میں نے پاشا کی ہدایت کے مطابق انتظام کر لیا ہے۔" اس نے بتایا "کیا آپ اس بندے کو ساتھ لائے ہیں جسے کراچی پہنچانا ہے؟"

میں نے کہا "وہ بدبخت ہماری گاڑی کی ڈکی میں ہے۔"

ٹویوٹا کرولا باہر ٹرکوں کے پاس کھڑی تھی۔ عنایت اللہ نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی گاڑی کو اڈے کے اندر لے آؤں۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی اندر پہنچا دی۔

عنایت باجوہ نے کہا "کیا آپ اس بندے کو چھوڑ کر واپس چلے جاؤ گے یا اس کی روانگی تک یہیں ٹھہرو گے؟"

میں نے پوچھا "اسے کتنے بجے یہاں سے بھیجا جائے گا؟"

"جس ٹرک میں' میں اسے بھیجوں گا وہ دوپہر گیارہ بجے تک اڈے سے نکلے گا۔" اس نے بتایا۔

"ہم اتنی دیر تو یہاں نہیں رک سکتے۔" میں نے کہا "ہمیں ایک ضروری کام کے لیے فوراً نکلنا ہوگا۔"

وہ حتمی لہجے میں بولا "ٹھیک ہے تو پھر آپ اسے میرے حوالے کر کے جا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنی معلومات کے لیے پوچھا "تمہارا یہ ٹرک کراچی کب پہنچے گا؟"

"کل شام چھے یا سات بجے۔" اس نے بتایا "آٹھ بھی بج سکتے ہیں کیوں کہ مال سے لدے ہوئے ٹرک کی رفتار عام گاڑیوں سے کم ہوتی ہے۔"

پھر اس نے میرے استفسار پر مزید بتایا کہ وہ چاول کی بوریوں سے بھرے ہوئے ٹرک میں فیصل کو لاہور سے کراچی پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اسے فیصل کے فنِ حرب و ضرب اور خطرناکی کے بارے میں بتایا تو اس نے سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"یار! تم فکر ہی نہ کرو۔ میں نے بڑا محفوظ اور مضبوط بندوبست کیا ہے۔ آؤ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں نے اس کی تقلید کی۔ صدف اور

سدا بہار فلمی گیتوں کا نوٹیشن

سُر سنگ گیت

موسیقی کے دیوانوں کے لئے ایک منفرد تحفہ!

اس کتاب میں دیئے گئے گیتوں کا نوٹیشن ایسا ہے جس پر عمل کر کے گلوکاروں کی گائیکی کے مخصوص انداز بھی اپنائے جا سکتے ہیں۔ "سُر نویسی" میں نئی علامات اختراع کر کے گلوکاروں کے ہر انداز کو اجاگر کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ اپنی طرز کی ایسی کتاب پہلے کبھی شائع نہیں ہوئی۔

صفحات 208

ڈاک خرچ 25 روپے

قیمت -/200

کتاب کی قیمت بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز کراچی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون 021-5804300

kitabiat1970@yahoo.com

سول ڈسٹری بیوٹر: رحمان بک ہاؤس اردو بازار کراچی' فون 021-7766751

زرگل دفتری حصے میں بیٹھے رہے اور ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اڈے کے اس حصے میں آ گئے جہاں لوڈنگ وغیرہ کی جاتی تھی۔ ادھر ایک طرف گودام نما چند کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ باجوہ نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کرنے کے بعد مجھے اندر لے لیا۔

کمرے کے اندر فرش سے چھت تک چاول کی بوریاں رچی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کا تین چوتھائی حصہ انہی بوریوں نے گھیر رکھا تھا۔ عنایت باجوہ نے کہا ''ان بوریوں کے ساتھ ہی تمہاری ''امانت'' لاہور سے کراچی پہنچ جائے گی۔ آٹھ بجے تک مزدور آ جائیں گے پھر میں ایک ٹرک اندر منگوا کر بوریاں لدوانا شروع کر دوں گا اور یہ کام میں اپنی نگرانی میں کرواؤں گا۔''

''کیا تم چاولوں کی یہ بوریاں دکھانے کے لیے مجھے یہاں لائے ہو؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا پھر ایک بوری پر پڑی چادر کو کھینچنے کے بعد بولا ''یہ دیکھو!'' میں نے دیکھا اور چونک اٹھا۔ وہاں مجھے ایک مضبوط آہنی صندوق رکھا نظر آیا جس میں ہوا کی آمد و شد کے لیے جا بہ جا چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے۔ میں نے سوالیہ نظر سے باجوہ کو دیکھا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''پاشا نے مجھے ''مال'' کی خطرناکی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسی احتیاط کے پیشِ نظر میں نے یہ مناسب بندوبست کیا ہے آپ کے مال کو میں اس صندوق میں بند کر دوں گا بلکہ'' وہ کسی فوری خیال کے تحت چونکا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا ''اگر آپ میری تھوڑی مدد کر دو تو ہم یہ نیک کام ابھی کر لیتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے بندہ بے ہوش ہے!''

''تمہیں بالکل درست بتایا گیا ہے۔'' میں نے کہا'' لیکن وہ زیادہ عرصے تک بے ہوش نہیں رہے گا۔''

وہ بے پروائی سے بولا ''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ابھی سب کچھ دکھاتا ہوں۔ تم میرے ساتھ تو آؤ۔''

''ساتھ آؤ'' سے اس کی مراد تھی ہاتھ بٹاؤ۔ میں نے عنایت اللہ باجوہ کا ہاتھ بٹایا اور فیصل کا بے ہوش جسم کرولا کی ڈکی سے اس آہنی صندوق کے اندر پہنچ گیا۔ باجوہ نے جس پھرتی کا مظاہرہ کیا اسے دیکھ کر مجھے ماننا پڑا کہ اس عمر میں بھی وہ خاصا طاقتور اور مستعد تھا۔ وہ اناج سے بھری ہوئی کسی بوری کے سائز کا صندوق تھا۔ عنایت باجوہ نے اس ہوادار صندوق کا ڈھکنا بند کیا پھر اس کی کنڈی میں تالا لگا دیا اور بولا۔

''لو بھئی۔ اب تو تمہاری تسلی ہو گئی ہو گی۔ یہ تالا کراچی جا کر ہی کھلے گا اور......'' اس نے ذرا رک کر صندوق کی جانب اشارہ کیا اور کہنے لگا ''اس طویل سفر کے دوران میں اگر اس بندے کو ہوش آ بھی گیا تو یہ ہزار کوشش کے باوجود بھی صندوق سے باہر نہیں آ سکے گا۔ تم نے اس کے ہاتھ پاؤں بہت تشفی بخش انداز میں باندھ رکھے ہیں۔''

میں نے ذہن میں چکرانے والے ایک سوال کے پیش نظر پوچھا ''ٹرک میں چاولوں کی بوریوں کے درمیان اس کا دم تو نہیں گھٹ جائے گا۔ میرا مطلب ہے تم نے ہوا کی آمد و رفت کے بارے میں سوچ لیا ہے نا؟''

''اچھی طرح سوچ لیا ہے۔'' وہ پر اعتماد انداز میں بولا ''میں نے بتایا ہے نا' میں اپنی نگرانی میں لوڈنگ کرواؤں گا۔'' ساری سیٹنگ میرے ذہن میں ہے، تمہاری امانت کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہو گا۔'' وہ ایک لمحے کو رک کر بڑے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر بولا'' ویسے میں احتیاطاً ڈرائیور کے ساتھ دو ہٹے کٹے اور چاق و چوبند کلینرز کو بھیجوں گا۔''

چوہدری نواز علی کے لیے میرے ذہن میں بہت زیادہ غم و غصہ اور نفرت بھری ہوئی تھی۔ فیصل اسی چوہدری کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس وقت میری چھری کے نیچے آیا ہوا تھا۔ ایک فوری اور شریر خیال نے میری سوچ میں جگہ بنائی اور میں باجوہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''عنایت اللہ!'' میں نے پوری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا'' کیا یہ صندوق تھوڑی دیر کے لیے کھل سکتا ہے؟''

''اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا'' ہاں کھل سکتا ہے مگر کیوں؟''

''میں اس کے اندر چند ضروری چیزیں رکھوانا چاہتا ہوں۔''

''مثلاً کس قسم کی چیزیں رکھوانا چاہتے ہو؟'' اس کی الجھن دو چند ہو گئی۔

میں نے سفاکی سے کہا'' امرود کے چند ٹکڑے دو چار کیلے' کلو بھر گاجریں اور ایک پانی کا پیالہ۔ ان پھلوں اور سبزیوں کا موسم تو ہے نا؟''

''موسم ہے اور میں یہ کام کر دوں گا لیکن پانی کا پیالا!'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''سفر کے دوران میں پانی' پیالے کے اندر نہیں ٹھہر سکے گا اور چاولوں کے بھیگنے کا اندیشہ الگ ہے!''

میں نے گھمبیر آواز میں کہا'' تو خالی پیالہ ہی رکھ دو۔ لوازمات پورے ہونا چاہئیں۔ ذرا دیکھنے والوں کو پتا تو چلے یہ

بندر کس شاندار انداز میں ''ایکس پورٹ'' کیا جا رہا ہے۔ ویسے تو اس کے ہاتھ پاؤں اس انداز میں جکڑے ہوئے ہیں کہ پھل اور سبزی تک پہنچے...... بلکہ اپنا منہ پہنچانے کے لیے اسے دانتوں پسینا آ جائے گا۔''

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر اس نے میری ننھی سی ''فرمائش'' پوری کر دی اور صندوق کو تالا بند کرنے کے بعد چابی میرے حوالے کر دی تو میں نے پوچھا۔

''باجوہ! تمہاری منصوبہ بندی اور مہارت کو دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے' جیسے تم اس نوعیت کے کام کرتے رہتے ہو؟''

وہ منہ کھول کر ہنسا تو اس کی توند بھی رقص کرنے لگی پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا'' ایسی کوئی بات نہیں یار۔ یہ تو پاشا کا حکم تھا اس لیے میں تیار ہو گیا ورنہ ایسے کاموں کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ اس منصوبہ بندی کے پیچھے پاشا کے مشورے بھی چھپے ہوئے ہیں۔'' پھر وہ گہری نظر سے مجھے تکتے ہوئے مستفسر ہوا'' کہیں تم مجھے کوئی اسمگلر یا بردہ فروش تو نہیں سمجھ رہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا'' بس ایسے ہی ایک خیال میرے ذہن میں آ گیا تھا۔''

وہ مطمئن ہو گیا پھر اس نے پوچھا'' کراچی میں اس بندے کو کہاں پہنچانا ہے؟''

''فی الحال تو اسے اپنے اڈے تک بہ خیریت پہنچاؤ۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا'' اس بات کا فیصلہ بعد میں کریں گے کہ ہم اسے تمہارے اڈے سے اٹھواتے ہیں یا تمہیں کسی خاص مقام پر پہنچانا ہے' میرا مطلب ہے اس بندے کو!''

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ میں نے اس کے لاہور اور کراچی کے اڈوں کے فون نمبرز اپنے پاس نوٹ کر لیے۔ باجوہ کے لیے میں نے منہاس باقر کے نمبرز لکھوا دیے پھر کہا۔

''تمہارا چاولوں والا ٹرک تو کل شام کو کراچی پہنچے گا لیکن میں آج دوپہر کے بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں نے کراچی والے اڈے کا پتا اور فون نمبرز نوٹ کر لیے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں رابطہ کر کے معاملہ طے کر لوں گا۔''

ہمارے درمیان مزید پندرہ منٹ تک ضروری امور پر بات چیت ہوتی رہی پھر میں نے اسے احتیاط سے کام کرنے کی ہدایت کی' خاص طور پر لوڈنگ کے وقت اس آہنی صندوق کی ''باربرداری'' کا راز عام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جس طرح دیواروں کے کان ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ہوا کا منہ بھی ہوتا ہے۔ اگر اس ہوا کو کسی معاملے کی ہوا لگ جائے تو یہ جگہ جگہ سرگوشیاں کرتی پھرتی ہے۔

عنایت اللہ باجوہ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کام انتہائی تسلی بخش اور میرے حسبِ منشا ہو گا۔ میں مطمئن ہو کر دیکلم گڈز فارورڈنگ کے دفتر سے نکل آیا۔ آج یہ کمپنی ایک ایسے آہنی صندوق کو فارورڈ کرنے جا رہی تھی۔ جو گڈز کی دنیا میں انقلابی حیثیت کا حامل تھا۔

☆☆☆

میری رسٹ واچ آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھی۔

وہ دونوں عقبی نشست پر خاموش بیٹھی تھیں۔ میں بہ دستور ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد صدف نے پوچھا'' وجدان! تم نے فیصل کو لاہور سے کراچی پہنچانے کے انتظامات کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے نا! کسی گڑبڑ کے امکانات تو نہیں ہیں؟''

ہمارا رخ بادامی باغ سے ائرپورٹ کی جانب تھا۔ ریلوے اسٹیشن کو پیچھے چھوڑ کر ہم گڑھی شاہو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں صدف اور زرگل کی مشترکہ ہدایات پر کرولا کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ آگے چل کر ہم نہر کو عبور کرتے پھر کچھ دیر تک شاہراہِ قائداعظم (مال روڈ) کا سہارا لینا پڑتا اور ہم ائرپورٹ کے نزدیک تر پہنچ جاتے۔ ہمارے درمیان طے یہی ہوا تھا کہ ناشتا ائرپورٹ پر ہی کیا جائے گا۔ کہیں اور کسی ہوٹل میں بیٹھنے کا وقت نہیں تھا۔ ٹھیک نو بجے مجھے اور صدف کو ''ان'' ہونا تھا اور میری کوشش یہ تھی کہ میں تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے ساڑھے آٹھ بجے تک ائرپورٹ پہنچ جاؤں تاکہ آدھے گھنٹے میں ہم تسلی سے ناشتا کر سکیں۔

گڑھی شاہو سے گزرتے ہوئے میں نے صدف کے سوال کا جواب دیا'' عنایت باجوہ بہت کام کا بندہ ثابت ہوا ہے۔ اس نے بڑا تسلی بخش بندوبست کیا ہے۔ مجھے امید ہے راستے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہو گی۔''

پھر میں نے انہیں آہنی صندوق والے اس ''بندوبست'' کی تفصیل بتائی تو زرگل حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی'' اتنی جلدی اس گوشت کے پہاڑ نے یہ انتظام کیسے کر لیا۔ اس قسم کا سوراخ دار صندوق تیار کرنے میں وقت تو لگتا ہے!''

گوشت کے پہاڑ سے اس کی مراد عنایت اللہ باجوہ تھی۔ وہ اپنے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے سبب واقعی ایک پہاڑ نظر آتا تھا۔ چونکہ وہ گوشت و پوست سے بنا ہوا تھا اس لیے زرگل کا دیا ہوا ٹائٹل اس پر فٹ بیٹھا تھا۔

میں نے کہا'' زرگل! تمہاری حیرت بجا ہے لیکن آپ دونوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ وہ بندہ رات چار بجے سے جاگ رہا ہے جب فرید پاشا نے اسے فون کرکے یہ فرض سونپا تھا۔ ویسے میں نے وہ صندوق اچھی طرح دیکھا ہے۔ ہنگامی ضرورت کے تحت اس میں صرف متعدد سوراخ نکالے گئے ہیں ورنہ وہ صندوق پہلے سے باجوہ کے گودام میں موجود تھا اور میرا خیال ہے کہ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔''

زرگل میری اس وضاحت پر خاموش ہوگئی۔ میں ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ گوری چٹی دراز قامت پشتون دوشیزہ انتہائی نازک حالات میں مجھ سے ٹکرائی تھی اور اس واقعے کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ مجھے اس سے تفصیلی بات چیت کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ مجھے اپنی سنسنی خیز کہانی سنانا چاہتی تھی بلکہ میں اس کے حالات جاننے کا متمنی تھا۔ اس کا دشمن چاچا حکمت یار ہاتھ دھوکر اور گن اٹھا کر اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لیے مردانہ لباس پہن کر زخمی حالات میں زندگی کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔

میں نے نہ صرف اس کے زخمی کندھے پر مرہم پٹی کی تھی بلکہ اسے ایک محفوظ پناہ بھی فراہم کی تھی جو منشا اور اس کے ساتھی درندوں کے ہاتھوں گذشتہ رات انتہائی غیر محفوظ اور تباہ حال ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں زرگل ایک مرتبہ پھر میرے ساتھ نظر آرہی تھی۔

میں نے زرگل کو وقتی پناہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ حکمت یار کا خطرہ فی الحال ٹل چکا تھا۔ لہٰذا میں اپنے وعدے اور فرض سے آزاد ہوچکا تھا لیکن زرگل کی معنی خیز باتیں اور الجھے ہوئے انداز مجھے تشویش میں مبتلا کررہے تھے۔ خاص طور پر جب سے اسے معلوم ہوا تھا' میں اور صدف کراچی جارہے ہیں اس وقت سے وہ خاصی بجھ گئی تھی اس کی دو ہی وجوہات ہوسکتی تھیں۔ یا تو اسے ہمارا کراچی جانا پسند نہیں آیا تھا یا پھر وہ بھی ہمارے ساتھ کراچی جانا چاہتی تھی۔ ساحل والا معاملہ اب اس سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا اس لیے وہ مجھے کراچی جانے سے روکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

میں زرگل کے بارے میں جس قدر سوچ رہا تھا' میری الجھن میں اضافہ ہورہا تھا۔ پھر مجھے اس کے تشویشناک اور جواب طلب جملے یاد آئے۔ اس نے میرے مختلف سوالوں کے جواب میں بڑے گھمبیر انداز میں کہا تھا...... مجھے امید ہے تم لوگوں کے کراچی رخصت ہونے سے پہلے میں کوئی حتمی فیصلہ کرہی لوں گی یا پھر ...... لگتا ہے تمہارے رخصت ہونے سے پہلے میں بھلی چنگی ہوجاؤں گی اور ...... مجھے یقین ہے میں تمہارے رخصت ہونے سے پہلے اپنی داستان مکمل کرلوں گی!

اور اب ...... اس کی مکمل داستان سننا تو درکنار اس کا خلاصہ سننے کا وقت بھی نہیں بچا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہورہا تھا کہ حالات کی تیزی سے بدلتی ہوئی کروٹ نے مجھے اتنی مہلت نہ دی کہ میں زرگل کا دکھ سن سکتا۔ بہرحال اس کی تشویش بھری باتوں نے مجھے اکسایا اور میں اس کے دل کا حال جاننے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''زرگل!'' میں نے عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں اسے مخاطب کیا'' تمہارے پاؤں کا درد اب کیسا ہے؟''

وہ شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے بولی'' موچ نکل گئی ہے تو درد بھی جاتا رہا۔''

اس کے لہجے میں بے پناہ سنجیدگی بھری ہوئی تھی اور آواز میں واضح طور پر میں نے بھراہٹ بھی محسوس کی۔ میں نے اس سے پوچھا'' اور شولڈر کا کیا حال ہے؟''

''وہ بھی ٹھیک ہے۔'' وہ بدستور باہر دیکھتے ہوئے بولی'' سمجھو سب ٹھیک ہے۔''

اس کے انداز میں ایک عجیب سی بے رخی پائی جاتی تھی جو ناپسندیدگی نہیں بلکہ خفگی سے میل کھاتی تھی۔ میں نے اس رویے کا سبب جاننے کی خاطر سوال کیا۔

''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

اس کی نظر چشم زدن میں باہر سے اندر پلٹی پھر عقب نما آئینے میں ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس نے پوچھا'' میں تم سے کیوں ناراض ہوں گی وجدان! تم نے مجھے پناہ دے کر جو نیکی کی ہے' میں اس کے لیے تمہاری شکرگزار ہوں۔''

''میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے احسان نہیں' نیکی کی بات کی ہے۔''

''چلو' تم اسے نیکی ہی سمجھو۔'' میں نے کہا'' لیکن اتنا تو بتادو کہ تمہارا انداز کیوں بدلا ہوا ہے؟''

وہ ٹالنے والے لہجے میں بولی'' وجدان! میرے انداز کو کچھ نہیں ہوا۔ شاید یہ حالات کا اثر ہے۔ گزشتہ رات فرید پاشا کی کوٹھی پر جو کچھ پیش آیا' میرے ذہن میں اس کی خونچکاں یاد ابھی تک بسی ہوئی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' میں نے جب دیکھا کہ وہ کچھ بتانے کو تیار نہیں تو تائید ہی ضروری سمجھی'' میں بھی ان مناظر کو بھول نہیں پایا ہوں۔ ظلم و بربریت کی اس مثال کو بھلانا آسان نہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا'' اور یہ سب کچھ اصلی کرداروں کے ساتھ ایک ایسے شخص کی کوٹھی میں پیش آیا جو فلم انڈسٹری کا ایک معروف اور کامیاب پروڈیوسر ہے۔''

اس دوران میں صدف بالکل خاموش بیٹھی رہی میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب میں زرگل کے ساتھ گفتگو کررہا ہوتا تو صدف بیچ میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔

علامہ اقبال روڈ پر گاڑی آئی تو نہر ہمارے پیچھے رہ گئی۔ میں نے زرگل سے کہا'' قسمت کی ستم ظریفی بھی بعض اوقات رنگ دکھاتی ہے۔ میں تمہارے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا لیکن باوجود کوشش کے بھی میں اس کام کے لیے موقع نہ نکال سکا۔''

''وہ ذومعنی لہجے میں بولی'' وجدان! تم اس سے کہیں زیادہ ضروری کام میں جو مصروف ہو!''

میں اندازہ نہ کرسکا کہ وہ طنز کررہی تھی یا حقیقت بیان کررہی تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا'' پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے زرگل؟''

اس نے [illegible] نظر سے آئینے میں مجھے دیکھا اور بولی ''[illegible]''

ہمارا سفر [illegible] منٹ سے آدھے پونے گھنٹے کا باقی رہ گیا ہے۔ [illegible] بجے ہم ائرپورٹ کے اندر داخل ہوجائیں گے۔ تم نے کہاں جانے کے بارے میں سوچا ہے؟''

وہ عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا اس کی آنکھوں میں سنگینی اتر آئی ہو' وہ ایک لمحاتی نظارہ تھا کیوں کہ میں ڈرائیونگ پر بھی توجہ دے رہا تھا۔ دوبارہ جب میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ سنگین تاثر غائب ہوچکا تھا۔ وہ ایک عام سے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''کیا تم دونوں واقعی کراچی جارہے ہو؟''

''اگر تمہیں یقین نہ ہو تو میں ٹکٹ دکھادیتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولی'' مجھے تمہاری زبان پر بھروسا ہے دراصل یہ سوال میں نے کسی اور مقصد سے کیا تھا۔''

میں نے پوچھا'' کس مقصد سے؟''

اس کا بدلا ہوا انداز اور تیور مجھے الجھن میں ڈال رہے تھے۔ اس نے جواب دیا'' میں بھی تم لوگوں کے ساتھ کراچی جانا چاہتی ہوں اس لیے تصدیق کررہی تھی۔''

بالآخر اس کے دل کی بات زبان پر آہی گئی تھی۔ میں کافی دیر سے یہ محسوس کررہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش کو پورا کرنا میرے بس میں نہیں تھا اس لیے میں سوچ میں پڑگیا۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا'' کیا ہوا وجدان! تم چپ کیوں ہوگئے کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟''

''نہیں تمہاری بات تو غلط نہیں۔'' میں گڑبڑا گیا'' لیکن میں ...... بھلا تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔''

''گویا دوسرے لفظوں میں تم یہ کہنا چاہتے ہو مجھے اپنے ساتھ لے کر نہیں جاسکتے؟''

''اس میں میرا کوئی اختیار نہیں زرگل۔'' میں نے کہا ''جس فلائٹ سے ہم جارہے ہیں اس میں تمہارا جانا ممکن نہیں۔''

''اس ناممکن کی کیا وجہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاز اوورلوڈ ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

میں نے کسی بہانے یا غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ جس فلائٹ سے ہم جارہے تھے وہ واقعی اوورلوڈ تھی۔ بکنگ ایجنسی والے نے مجھے صورت حال سے پوری آگاہ کردیا تھا۔ نئے ٹکٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' بہت سے چانس ٹکٹ بھی ڈراپ ہوجاتے زرگل کو ہم اپنے ساتھ لے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ اِلاّ یہ کہ صدف اس سفر سے باز آجاتی تو زرگل اس کے ٹکٹ پر سفر کرسکتی تھی۔ ڈومیسٹک فلائٹس میں نام کی تبدیلی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اور ہماری سیٹیں بھی کنفرم تھیں لیکن صدف کیوں کر ڈراپ ہوتی! یہ ناممکن سے بھی زیادہ ناممکن بات تھی۔

میرے جواب نے زرگل کو گہری سوچ میں پہنچادیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اس سوچ میں ادھیڑبن کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ اس سے قبل کہ میں اس سے کوئی بات کرتا' اس نے مجھے مخاطب کرلیا۔

''وجدان! گاڑی روکو!''

یہ جملہ اتنا اچانک اور خلاف توقع تھا کہ میں اور صدف بہ یک وقت حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا'' تم گاڑی کیوں رکوارہی ہو زرگل؟''

''میری منزل آگئی ہے!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''منزل!'' میں سٹ پٹا گیا'' کیا یہ کوئی پہیلی ہے یا تفریحی مذاق؟''

وہ سپاٹ لہجے میں بولی'' میں نے اپنی منزل کی بات کی ہے' اینڈ آئی مین اٹ۔''

جملے کا آخری حصہ اس نے انگریزی میں ادا کیا تھا اور اس میں ایک تحکم پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے گریجویٹ ہونے کے بارے میں مجھے پہلے بتا چکی تھی۔ بیٹھے بٹھائے زرگل نے جو تیور بدلے تھے وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''تمہاری منزل اچانک کہاں سے آگئی؟''

''زندگی میں سب کچھ ترتیب وار یا منصوبہ بندی سے نہیں آتا وجدان!'' وہ خواب ناک لہجے میں بولی ''بلکہ زیادہ تر واقعات اچانک ہی رونما ہو جاتے ہیں۔ پلیز' گاڑی روک دو مجھے جانا ہوگا میری منزل مجھے پکار رہی ہے۔''

اس کی بے سر و پا باتیں سن کر میں جھنجلا گیا اور میں نے ٹویوٹا کرولا سڑک کے کنارے روک دی۔ زرگل نے ہمیں ''اللہ حافظ'' کہا اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل گئی پھر پلٹ کر پیچھے دیکھے بغیر وہ ایک سمت میں تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

اس کا رخ فورٹریس اسٹیڈیم کی جانب تھا۔

''عجیب لڑکی ہے!'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ صدف نے کہا ''لڑکیاں تو عجیب ہی ہوتی ہیں وجدان!''

''کیا تم بھی کوئی ایسا ہی سین دکھانے والی ہو؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''اگر تم میرے ساتھ وہی سلوک کرو گے جو زرگل کے ساتھ کیا ہے تو میں بھی اس بارے میں سوچ سکتی ہوں۔''

''کمال ہے بھئی۔'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا ''میں نے زرگل کے ساتھ کون سا برا سلوک کیا ہے؟''

''وہ کراچی جانا چاہتی تھی۔'' صدف نے کہا ''چلو ہماری فلائٹ سے نہ سہی بعد والی کسی فلائٹ سے آجاتی لیکن تم نے تو اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کیا!''

''میں نے نکال باہر نہیں کیا۔'' میری جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو گیا ''گاڑی اس نے رکوائی تھی۔ نادر شاہی حکم سے۔ پتا نہیں اسے کون سی منزل لب سڑک نظر آگئی تھی اور دیکھا تم نے'' میں نے ایک لمحے کو توقف کیا اور اسی تپے ہوئے انداز میں کہا ''وہ نواب زادی گاڑی سے اتر کر فورٹریس اسٹیڈیم کی طرف گئی ہے۔ معلوم نہیں وہ وہاں اپنے کون سے فن کا مظاہرہ کرنے گئی ہے!''

زرگل کے انتہائی نامعقول رویے نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا تھا اور میں اس وقت خاصا غصیلا ہو رہا تھا۔ صدف نے کہا ''وجدان! تمہارے کھرے جواب کے بعد تو وہ یہی کر سکتی تھی۔ اللہ کے بندے، کسی کی امید کو اس بری طرح سے ذبح نہیں کرنا چاہیے۔''

''امید!'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا ''تم کس امید کی بات کر رہی ہو؟''

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولی ''وہ امید جو زرگل نے تم سے لگائی تھی۔ وہ کسی سیر و تفریح کے لیے تو کراچی نہیں جا رہی تھی۔ وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہے وجدان' تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے بڑے انوکھے جذبات دیکھے ہیں۔''

''اور ان جذبات کو اب تم زبان دے رہی ہو!''

''میں حقیقت بیان کر رہی ہوں۔''

''تو مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟''

''تم اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔'' صدف اتنی سنجیدگی سے بات کر رہی تھی کہ میں جانچ نہ سکا وہ واقعی سنجیدہ تھی یا یہ بھی مذاق کا کوئی انداز تھا ''چلو اس فلائٹ سے نہ سہی کسی اگلی فلائٹ سے وہ کراچی آجاتی۔ تم اسے کچھ رقم فراہم کر سکتے تھے کراچی میں اپنے ٹھکانے کا پتا بتا سکتے تھے تاکہ اسے تم تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور کم از کم اسے منہاس باقر کے تمام فون نمبرز تو نوٹ کروا ہی دیتے تاکہ وہ تم سے بہ آسانی رابطہ کر سکتی لیکن......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر عقب نما آئینے میں مجھے دیکھنے لگی اور کہا ''تم نے تو اس بری طرح اس بے چاری کی دل شکنی کی ہے کہ وہ کسی ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے اپنے گھائل دل کی کرچیاں شمار کر رہی ہوگی اور اگر وہ آنے والی رات تک زندہ رہی تو پھر آج سے اختر شماری کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''

''بس بس صدف!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا ''میرے پاس ان چونچلوں کی فرصت ہے اور نہ ہی میں ایسا شوق رکھتا ہوں'' پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا ''مجھے یہ کرنا چاہیے تھا' مجھے وہ کرنا چاہیے تھا......اونہہ!''

صدف نے ہمت نہ ہاری اور کہا ''وجدان! یہ فرصت اور شوق کی بات نہیں بلکہ عجیب لڑکیاں تو یہی چاہتی ہیں اور زرگل کو تم عجیب لڑکی نامزد کر چکے ہو!''

صدف کے پیہم اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کے چٹکی لی ''کیا میں نے واقعی زرگل کے ساتھ بدسلوکی کی ہے؟''

''اور نہیں تو کیا!'' اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔

''تمہیں اس پشتون دوشیزہ سے بڑی ہمدردی ہے!''

''پشتون دوشیزہ کا کیا سوال!'' اس نے کہا ''دنیا کی ہر

عورت کو دوسری عورت سے ہمدردی ہوتی ہے۔''

''یہ میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' میں نے متاملانہ انداز میں کہا ''پھر تو واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ اس صورتِ حال میں مجھے زرگل کا دل توڑنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے تھا۔''

وہ چونکا نظر سے مجھے دیکھنے لگی ''یہ کیا وجدان؟''

میرے ادا کیے ہوئے لفظ ''یہ'' نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ میں نے کہا ''اس مسئلے کا آسان اور سیدھا حل یہ تھا کہ میں تمہارے ٹکٹ پر زرگل کو کراچی لے جاتا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' بے اختیار اس کی زبان سے پھسل گیا۔

میں نے کہا ''دنیا کی ہر عورت' دوسری عورت کی ہمدرد ہوتی ہے۔ پھر ممکن اور ناممکن کیا ہوتا ہے۔ کیا تم زرگل کے زخمی دل پر مرہم لگانے کے لیے اسے اپنا ٹکٹ نہیں دے سکتی ہو؟......اور تم تو ایک ڈاکٹر بھی ہو۔ تمہیں ایسی مسیحائی زیادہ زیب دیتی ہے!''

''گاڑی روکو وجدان!'' وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔

میں نے پوچھا ''کیا تمہیں بھی سرِ راہ کوئی منزل نظر آگئی ہے؟''

''ایسی ہی بات ہے۔'' وہ جلدی سے بولی ''گاڑی کو روک دو۔''

میں نے حیرت اور الجھن کے ملے جلے احساسات کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ٹویوٹا کرولا کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ صدف نے اپنی جانب کا دروازہ کھولا۔ گاڑی سے باہر جانے کے بعد اس نے بڑے اطمینان سے دروازہ بند کیا۔ میں سانس روکے اس کی ایک ایک جنبش کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ وہ بڑی نفاست سے چلتے ہوئے ایک ادا کے ساتھ گاڑی کی دوسری جانب پہنچی اور پھر ایک جھٹکے سے پسنجرز سیٹ والا دروازہ کھول کر میرے پہلو میں آبیٹھی۔

''اب میں اپنی منزل کے بہت قریب آگئی ہوں۔'' اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔

میں متعجب نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کسی سنگی بت کے مانند گاڑی سے باہر سڑک کو تک رہی تھی۔ بالآخر میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''اب سمجھا' دنیا کی ایک عورت دوسری عورت سے کس طرح اظہار ہمدردی کرتی ہے!''

''میں اس وقت فلسفے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

میں نے ریسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا ''صدف! تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جو اعلان فرمایا ہے اس کی اہمیت کا احساس ہے تمہیں؟''

''پوری طرح احساس ہے۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی ''میں نے یہ اعلان بہت پہلے فرما دیا تھا۔ خیال کو احساس میں اور احساس کو الفاظ میں اب ڈھالا ہے۔''

تھوڑی دیر پہلے میں زرگل کے رویے پر خاصا جھنجلایا ہوا تھا۔ صدف کے اس نئے پینترے نے مجھے صد درجہ سنجیدہ کر دیا۔ میں نے سوچا آج اس سے دوٹوک بات ہو ہی جائے۔ میں نے حتی الامکان اس موضوع سے بچنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا خیال ہے اب وقت آگیا تھا۔ میں بعد میں کوئی بات اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتا تھا۔

''صدف! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ''تم ایک سچی اور جاں نثار دوست ہو' تم نے بارہا ثابت کیا ہے کہ میری خاطر تم بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کر سکتی ہو۔ یقین جانو تمہیں زندگی کے کسی مرحلے پر اگر میری جان کی ضرورت پیش آگئی تو میں ایک لمحے کی دیر نہیں کروں گا لیکن......''

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنے سامنے پھیلی ہوئی وسیع و عریض سڑک کو دیکھنے لگا۔ اس نے میری جانب دیکھے بغیر پوچھا۔ ''تو؟''

اس ''تو'' میں ان گنت سوال پوشیدہ تھے۔ میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کیا اور کہا ''تمہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ میری منزل کون ہے!''

وہ ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر مجھے تکنے لگی ''جانتی ہوں' تمہاری منزل کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔''

''پھر بھی؟'' میں نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

''ہاں پھر بھی!'' اس کے لہجے میں کسی چٹان ایسی سختی تھی ''وجدان! اگر اس وقت تمہاری منزل تم سے دور ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''میں نے تمہیں کب قصوروار ٹھہرایا ہے صدف؟''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی ''کیا میں نے کبھی کوئی ایسی کوشش کی کہ تم اپنی منزل تک نہ پہنچ سکو۔ بتاؤ میں نے تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالی؟''

''تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔'' میں نے اس کی کیفیت کے پیشِ نظر کہا ''میں نے تم سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''پھر اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تم مجھے قدم قدم پر یہ احساس دلاتے پھرو' تم کس کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ اس حوالے سے میں تم سے زیادہ لکی ہوں وجدان۔'' اچانک اس کی آواز میں تفاخر کا احساس شامل ہو گیا۔

میں نے چونک کر ایک نظر اسے دیکھا اور دوبارہ ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

صدف نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا ''تم کافی دنوں سے اپنی منزل کی تلاش میں ہو اور اس تلاش میں' میں بھی تمہارا بھرپور ساتھ دے رہی ہوں۔ ہماری کوششوں میں کسی کمی یا کوتاہی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تمہیں ابھی تک کوئی واضح کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ دوسری طرف میں ہوں......!''

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی ''میں نے اپنی منزل کو تاکا اور اس کے تعاقب میں لگ گئی۔ نتیجہ خاصا مفید اور حوصلہ افزا برآمد ہوا۔ اس وقت میں اپنی منزل پر پہنچ چکی ہوں۔''

وہ جس قسم کی باتیں کر رہی تھی اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں تھی لہٰذا مجھے خاموش رہنا پڑا۔ صدف نے جتنے واشگاف الفاظ استعمال کیے تھے اس کے بعد کسی ابہام یا غلط فہمی کی کوئی جگہ نہیں نکلتی تھی۔ سمجھنے والے کے لیے تو صرف ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ نہ تو میں ناسمجھ تھا اور نہ ہی صدف نے محض ایک اشارے پر اکتفا کیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فریدہ پاشا اور منہاس باقر کے الفاظ حقیقت کا روپ دھار کر عملی میدان میں اتر آئے ہوں۔ خاص طور پر پاشا کی پیش گوئی عملی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ایک ہیرو اور دو ہیروئن والی فلم کا آئیڈیا!

میں اس وقت ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک عجیب سی صورتِ حالات سے گزر رہا تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں صدف کو ناپسند کرتا تھا۔ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی' بہت پیاری اور نازنین۔ صدف میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ وہ خوب صورت اور خوب سیرت تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مستقبل کی ڈاکٹر تھی۔ ایک معزز اور صاحبِ ثروت خاندان سے اس کا تعلق تھا لیکن میرے گریز کے صرف دو اسباب تھے اور ان اسباب میں سے صدف نے ازخود ایک کو ختم کر ڈالا تھا۔ میں ساحل پر کسی کو فوقیت دے سکتا تھا اور نہ ہی اس کی برابری مجھے گوارا تھی۔ میرے دل کا خانۂ عشق صرف اور صرف ساحل کے لیے مختص تھا۔

انسان زندگی میں کسی ایک ہستی سے صرف ایک مرتبہ ہی عشق کرتا ہے' محبت ایک سے زیادہ افراد سے بھی کی جا سکتی ہے۔ صدف نے تو مجھے ہر قسم کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ تو اپنی چاہت کے بدلے مجھ سے چاہت کی طلب گار بھی نہیں تھی۔ ایسے کھرے جذبات اور سچے احساسات کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ اپنی محبت میں کچھ مانگتے نہیں' ان کے جذبے سے ٹکرانے والا پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ایسے ایثار پیشہ اور قربان فطرت لوگ قابلِ ستائش ہوتے ہیں!

صدف کو خود سے دور رکھنے کا دوسرا سبب بالکل سامنے کی بات تھی۔ زندگی کے عملی تجربے نے مجھے بتایا تھا' آج تک جو بھی لڑکی میرے قریب آئی' اس کا سکھ چین چھن گیا۔ میری خاطر اور مجھ سے دوستی کی پاداش میں اسے زیست کی ہر تکلیف سے گزرنا پڑا۔ اس سلسلے میں ایک طویل فہرست ہے' تھائی وانگ' جانکی دیوی' سونیا' رانی روپ متی' کوشلیا' ساحل' ممتاز اور......ان میں بعض تو میری دوستی کے جرم میں جان سے گزر گئیں۔ ساحل ایک ایسی لڑکی تھی جیسے میں بھی ٹوٹ کر چاہنے لگا تھا' مجھے اس سے سچا عشق تھا۔ اس کا حصول میری زندگی کا نصب العین تھا۔ ساحل کی جدائی نے میرے اندر اتنا دھواں بھر دیا تھا کہ سانس لینا دوبھر ہو کر رہ گئی تھی۔

صدف میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھی۔ چند ماہ بعد وہ ڈاکٹر بن جاتی لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا اگر وہ مجھ سے الگ ہو کر پڑھائی پر توجہ دیتی جس کے امکانات ہر گزرتے دن کے ساتھ معدوم سے معدوم تر ہوتے جا رہے تھے۔ اگر میں اس کی خواہش کی خاطر یا اپنے کسی مقصد سے اسے ساتھ لگائے رکھتا تو یہ میری خود غرضی ہی نہیں بلکہ بہت بڑی حماقت بھی ہوتی۔ اسے ہر حال میں اپنی تعلیم کو مکمل کرنا چاہیے تھا۔

صدف خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے احساسات سے آگاہ نہیں تو تم غلطی پر ہو۔ چلو' میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ میں تمہاری منزل ہوں تو کیا تم ہر وقت اپنی منزل پر ہی ٹھہری رہنا چاہتی ہو؟''

''ہر انسان کی یہی خواہش ہوتی ہے!'' وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ''میں نے تمہاری بات کی ہے صدف!''

''اتفاق سے میں بھی ایک انسان ہی ہوں۔''

میں اس مشکل لڑکی کے جواب میں پھنس کر رہ گیا۔ منطقی طور پر اور فلسفیانہ انداز میں اسے کوئی بات سمجھانا ممکن نہیں تھا۔ وہ صرف جذبات کی چال میں آ سکتی تھی۔ میں نے اس کی بہتری اور بھلائی کی خاطر آخری کوشش کی اور کہا۔

''صدف! کیا تم واقعی مجھے اتنا چاہتی ہو؟''

میرا لہجہ اتنا تیکھا تھا کہ اس نے چونک کر مجھے دیکھا ''تمہیں کوئی ثبوت چاہیے؟''

''تم کیا ثبوت دے سکتی ہو؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ بولی ''جو بھی تم مانگو۔ میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔''

''جان دینے سے بات نہیں بنے گی۔'' میری سنجیدگی برقرار رہی۔

''پھر تمہیں کس قسم کا ثبوت درکار ہے؟''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''صدف! اس بات کو جھٹلایا یا ٹھکرایا نہیں جا سکتا کہ محبت فرماں برداری کا درس دیتی ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے' اس کے حکم کی تعمیل کو اپنی معراج سمجھتا ہے اور اس سلسلے میں کسی قسم کا سوال نہیں کرتا کیوں کہ یہ توہینِ محبت ہے۔''

''میں تمہارا لیکچر سن رہی ہوں۔'' میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا ''تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو' کیا میں نے تم سے کسی نوعیت کی نافرمانی کی ہے؟''

''نافرمانی کی نوبت تو اس وقت آتی جب میں تمہیں کوئی حکم دیتا۔'' میں نے معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''تو یہ نوبت کب آئے گی جب میں اپنی چاہت کو ثابت کر سکوں گی؟''

''تم چاہو تو کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔''

''میں چاہوں گی' ابھی آ جائے!''

صدف کا انداز دوٹوک تھا۔ جذبات کی شدت کے سبب اس کی آواز میں لرزش کی آمیزش تھی۔ میری دانست میں لوہا گرم ہو چکا تھا۔ اور چوٹ لگانے کے لیے یہ مناسب وقت تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا۔

''وجدان! کس سوچ میں پڑ گئے۔ حکم دو تاکہ میں اپنی فرماں برداری کا ثبوت پیش کر سکوں۔''

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''صدف! میں چاہتا ہوں تم سب سے پہلے اپنی تعلیم کو مکمل کرو۔''

وہ شک زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ''یہ کہیں تمہاری کوئی چال تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں!'' میں نے قطعیت سے کہا۔

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''وجدان! چوہدری نوازش علی نے تمہاری منزل' ساحل کو تم سے دور کر رکھا ہے اور تم اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے کس طرح کشت و خون کے بازار گرم کیے ہوئے ہو اس کا اندازہ تمہیں بہ خوبی ہو رہا ہوگا۔ میاں زاہد حسین' منشا کے متعدد آدمی' کبیر شاہ' فیصل اور چوہدری دلدار عبرت ناک انجام سے دوچار ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولی ''وجدان! میں اس وقت اپنی منزل پر کھڑی ہوں۔ ایک بات ذہن میں اچھی طرح بٹھا لو' اگر کسی نے فریب یا چال بازی سے مجھے منزل سے یا منزل کو مجھ سے دور کرنے کی کوشش کی تو میں قہر بن کر اس پر ٹوٹ پڑوں گی......اور تم جانتے ہو میں جو کہہ رہی ہوں ایسا کر کے بھی دکھا سکتی ہوں!'' اس کے الفاظ سے سنگینی ٹپکتی تھی۔

''میں جانتا ہوں' اچھی طرح جانتا ہوں۔'' میرے دل میں کوئی چور تھا اور نہ ہی نیت میں کوئی فتور اس لیے میں نے بڑے پُراعتماد انداز میں کہا ''تم فکر نہ کرو صدف۔ میری طرف سے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی جائے گی اور اگر کسی دوسرے نے یہ جرأت کی تو ہم دونوں مل کر اس کا تیا پانچا کر دیں گے۔''

گاڑی ائرپورٹ کی عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج کر پینتیس منٹ ہوئے تھے۔ میرے پاس صرف پچیس منٹ کا وقت بچا تھا اور اس دوران میں ہلکا پھلکا ناشتا کیا جا سکتا تھا۔ ہم ائرپورٹ کے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

ناشتے کا آرڈر دینے کے بعد میں سنجیدہ نظر سے صدف کو دیکھنے لگا۔ میں اس مشکل لڑکی سے گفتگو کا ایک نازک مرحلہ طے کر چکا تھا۔ اب بس اختتامیہ مکالمے باقی تھے جن کے لیے میں ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ناشتا آ گیا۔ صدف نے مجھ سے پوچھا۔

''وجدان! تم اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہو؟''

''تو کیا اس موقع پر مجھے قہقہے لگانا چاہئیں؟'' میں نے خالی خالی نگاہ سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں' میں نے ہلکی سی شرارت چمکتے دیکھ لی تھی۔

''قہقہے نہ بھی لگاؤ تو تمہیں خوشی کا اظہار ضرور کرنا چاہیے۔'' وہ اپنی شرارت کو بڑی سنجیدگی سے پیش کرتے ہوئے بولی'' اور یہ بتا دوں کہ خوش کیوں ہونا چاہیے۔ بھئی' میں تمہاری جان جو چھوڑ رہی ہوں۔ چاہے چند

ماہ کے لیے ہی سہی۔ کراچی پہنچتے ہی میں تم سے الگ ہوجاؤں گی اور اس وقت تک تم سے ملنے کی کوشش نہیں کروں گی جب تک میرے فائنل ایگزامز ختم نہیں ہوجاتے لیکن!'' وہ لیکن پر رک کر چند لمحے خاموش رہی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگی ''لیکن تم گا ہے بہ گا ہے فون پر مجھ سے رابطے میں رہوگے۔ میرے گھر کا فون نمبر تمہارے پاس ہے' تم مجھے منہاس باقر صاحب کے تمام نمبرز نوٹ کروادو۔ مجھے امید ہے' تم کراچی میں منہاس باقر کے پاس ہی رکو گے یا جہاں کہیں بھی ٹھہرو گے' اسے خبر ہوگی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''میرا خیال ہے' تم بالکل ٹھیک کررہی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''میں ابھی تمہیں اپنے رابطے کے تمام ممکنہ نمبرز نوٹ کروادیتا ہوں لیکن ایک بات واضح کردوں کہ میں نے ملاقات پر پابندی نہیں لگائی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے مشن میں شمولیت کے بجائے یک سو ہو کر اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ میل ملاقات اگر ہوجاتی ہے تو کوئی حرج نہیں البتہ۔'' میں نے ذرا رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔

''کراچی پہنچ کر نہیں بلکہ ہم یہیں سے الگ ہوجائیں گے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

میں نے کہا ''اگر تم حقیقت پسندی سے کام لو تو اس طرح چھپ چھپاتے تمہارا کراچی چلے جانا کسی بھی طور مناسب نہیں۔ تم یہاں اپنے ماموں کے پاس رہنے آئی ہو جن کے حساب سے اس وقت تم کسی گاؤں کی سیر کو گئی ہوئی ہو۔ نادیہ کی بات الگ ہے وہ تمہارے رازوں کی امین ہے لیکن گھر کے دوسرے افراد تمہارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ تمہیں یہاں کے معاملات صاف کرنے کے بعد کراچی جانا چاہیے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' اس کے الفاظ سے الجھن جھلکتی تھی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''صدف! تم ائرپورٹ سے سیدھی اپنے ماموں اورنگ زیب خان کے گھر شادمان کالونی جاؤ گی۔ انہیں بتاؤ گی کہ تم گاؤں سے واپس آگئی ہو۔ پھر جب اور جیسے تمہارا دل چاہے' تم کراچی چلی آنا۔ کل' پرسوں یا جیسا تم مناسب سمجھو۔''

''تمہاری بات سمجھ میں آرہی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ''اور تم ٹویوٹا کرولا اپنے ساتھ لے جاؤ گی، یہ شادمان کالونی والی کوٹھی میں کھڑی رہے گی۔ میں فرید پاشا کو فون کر کے گاڑی کے بارے میں بتادوں گا۔ وہ خود ہی اسے منگوا لے گا۔''

''نادیہ تو میری جان کھا ڈالے گی۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''جواباً تم اس کا دماغ کھا جانا!'' میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔

ناشتا ختم ہوگیا۔ نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جب ہم ریسٹورنٹ سے اٹھ گئے۔ ہم نے اپنا اپنا بیگ تھاما اور اس جانب بڑھ گئے جہاں سے مجھے ان ہونا تھا۔ ہم چند روز' چند ہفتے یا چند ماہ بعد دوبارہ ملنے والے تھے لیکن رخصت کے وقت ہمارا یہ حال تھا جیسے ہم برسوں سے ساتھ رہ رہے ہوں اور...... شاید صدیوں بعد دوبارہ ملیں!

غم اور خوشی کی طرح ملنا اور بچھڑنا بھی زندگی کا حصہ ہے لیکن غم اور بچھڑنا کسی کو پسند نہیں آتا۔ انسان ملے رہنا چاہتا ہے اور ہمیشہ خوش بھی جو کہ ممکن نہیں۔ صدف سے میری رفاقت زیادہ پرانی نہیں تھی۔ ہمارا چند روزہ ساتھ رہا تھا لیکن ان چند دنوں میں ہم نے ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھا تھا' پرکھا اور جانچا تھا اور کس حد تک سمجھا تھا' اس کے بارے میں' میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

جو آپ کو سمجھ جاتا ہے وہ آپ کو غلام بنالیتا ہے' آپ اس کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔ مجھے غلام بنانے کا شوق ہے اور نہ ہی ایسا کوئی دعویٰ کہ میں نے صدف کو مکمل طور پر سمجھ لیا تھا۔ عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کرنا حماقت کے مترادف ہے!

میں نے فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کی چابیاں بھی کرولا کے کی رنگ میں ڈال کر صدف کے حوالے کردی تھیں۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا' کراچی ائرپورٹ کے ڈیپارچر لاؤنج میں ہماری باقاعدہ ملاقات ہوئی اور لاہور ائرپورٹ پر ہم بے قاعدہ جدا ہوگئے۔ کراچی میں جب میں صدف سے ملا تو میرے ساتھ ایک اور پراسرار ہستی بھی تھی لیکن ڈارلنگ اب ختم ہوچکی تھی۔ ڈارلنگ کا خیال آتے ہی نقلی وجدان کی طرف دھیان چلا گیا پھر اس نے خیر خواہانہ کارنامے یاد آنے لگے۔

یہ ٹھیک ہے' اس بہروپیے نے بارہا میری مدد کی تھی اور اس کی صلاحیتیں بھی خاصی سمجھ میں نہ آنے والی تھیں لیکن ایک بات میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ بہروپیا بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔ میری طرح اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ ساحل' چوہدری دلدار کی کوٹھی میں موجود ہے یا اسے کراچی روانہ کیا جاچکا ہے۔ قرائن بتاتے تھے کہ اس نے کوٹھی والوں کی توجہ ہٹانے اور میری راہ ہموار

کرنے کے لیے اس کوٹھی میں انٹری دی تھی۔ اس کا یہ عمل ظاہر کرتا تھا' اس کے مطابق ساحل کو اس کوٹھی میں ہونا چاہیے تھا جب کہ ایسا نہیں تھا ورنہ میں کامیاب ہوجاتا۔ یا تو نقلی وجدان سے سنگین غلطی ہوئی تھی یا پھر اس کا دائرہ کار محدود تھا۔ یہ شخص میرے لیے ایک مسلسل الجھن کا سبب بن کر رہ گیا تھا۔

بورڈنگ کے بعد میں جہاز میں پہنچ کر جب اپنی سیٹ پر بیٹھا تو یک بارگی میرا دھیان صدف کی طرف چلا گیا۔ میرے برابر میں ایک موٹا تازہ ہٹا کٹا شخص سیٹ پر پھنس کر بیٹھا تھا۔ اگر صدف کا سفر جاری رہتا تو اس موٹے کی جگہ وہ نظر آتی۔ شاید وہ کوئی چانس ٹکٹ والا تھا' صدف کے ڈراپ نے جسے وہ موقع فراہم کردیا تھا۔

لاہور سے کراچی کے درمیان لگ بھگ اسی منٹ کی فلائٹ ہے۔ میں نے اس وقت کا بیش تر حصہ آنکھیں بند کر ساحل' فیصل اور صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے گزارا۔ فیصل ایک ایسا مہرہ تھا جس کی جچی تلی چال مجھے ساحل تک پہنچا سکتی تھی اور یہ شخص بلاشبہ صدف کی کوشش سے میرے ہاتھ آیا تھا۔ یہ لڑکی اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر مجھے اتنا زیر بار کررہی تھی کہ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے ڈر لگنے لگا۔

صدف ایسی ضدی' مستقل مزاج اور شدت پسند لڑکیاں بڑی ثابت قدم اور پرعزم ہوتی ہیں۔ وہ کچھ بھی کرسکتی ہیں...... کچھ بھی!

☆☆☆

شبانہ کی شادی اتوار کی رات ایک مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں بہ خیر و خوبی انجام پاگئی۔ میں اس شادی میں پوری طرح شریک تھا۔ گھر کے دیگر افراد کے ساتھ ممتاز سے بھی گپ شپ ہوئی تاہم میں نے اس سے کسی بھی موضوع پر تفصیلی بات نہ کی۔ منہاس باقر نے کراچی پہنچنے سے پہلے ہی میری رہائش کا بندوبست کروادیا تھا۔ میں ہوٹل سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا اس فلیٹ پر پہنچ گیا۔ منہاس باقر کا معتمدِ خاص شہزاد علی مجھے چھوڑنے آیا تھا۔ یہ وہی چاق و چوبند شخص تھا جس کی معیت میں' میں نے گلستانِ جوہر میں ایک کامیاب آپریشن کیا تھا۔

جب ہم مذکورہ فلیٹ پر پہنچے تو رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گزشتہ رات مجھے سونے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اگرچہ آج شام کے وقت میں نے ایک جھپکی لگائی تھی تاہم وہ بات پیدا نہ ہوسکی جو گہری نیند کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔ شہزاد علی مجھ سے دوبارہ مل کر بہت خوش تھا۔ میں نے محسوس کیا' وہ مجھ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہے لیکن میری آنکھوں میں بھری نیند نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا اور وہ یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

''اچھا وجدان! میں اب چلتا ہوں' تم آرام کرو کل تفصیلی بات کریں گے۔''

میں خود بھی سونا چاہتا تھا مگر فطری تجسس کے پیشِ نظر پوچھ بیٹھا ''شہزاد! تمہارا چہرہ بتا رہا ہے' تم کوئی اہم بات مجھ سے کرنے والے ہو!''

''ہاں' بات تو اہم ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا ''ابھی تک میں نے اس بارے میں منہاس صاحب کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ دراصل وہ شادی کے ہنگاموں میں اس قدر مصروف ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ورنہ میں انہیں اس سلسلے میں بے خبر نہ رکھتا۔ تم سے بھی تھوڑی دیر پہلے ہی ملاقات ہوئی ہے۔''

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ شہزاد کے ساتھ میں نے گزشتہ دنوں گلستانِ جوہر میں ایک ''لاسٹ نائٹ آپریشن'' کیا تھا۔ ممکن ہے شہزاد نے جس اہم بات کا تذکرہ کیا اس کا تعلق اسی واقعے سے ہو۔ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''تم کون سی اہم بات ابھی تک منہاس صاحب سے نہیں کرسکے؟''

''وجدان! میں نے ہفتے کی شام فواد کو دیکھا تھا۔'' شہزاد نے نہایت ہی سنجیدگی سے بتایا۔

''فواد!'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ''وہی شخص نا جسے ہم گلستانِ جوہر کے فلیٹ میں بے ہوش چھوڑ آئے تھے؟''

''ہاں ہاں وہی'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''منہاس صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارے آنے کے بعد کسی وقت فواد کو ہوش آگیا تھا اور وہ جہانگیر کو جل دے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔''

میرے ذہن میں اس رات کا آخری پہر تازہ ہوگیا جب منہاس باقر کی نشان دہی پر میں نے اور شہزاد نے گلستانِ جوہر کے اس فلیٹ پر دھاوا بولا تھا۔ ہمارے ہاتھوں فواد اور جہانگیر نامی ان دو افراد کی اچھی طرح درگت بنی تھی۔ ازاں بعد میں جہانگیر کو اپنے حق میں ہموار کر کے چھوڑ آیا تھا۔ اس نے میری وفاداری اور دوستی میں سی ایف کے کے بہت سے اہم رازوں کو بے نقاب کردیا تھا۔ میں نے بعد میں منہاس سے درخواست کی تھی کہ وہ جہانگیر کو اپنے پاس پناہ دے کیوں کہ فواد کی روپوشی کے بعد اس کی جان کو ہزارہا خطرات لاحق ہوگئے تھے۔ وہ دونوں سی ایف کے کے لیے کام کرتے تھے اور ''ملیر'' کے باس سلیم واسطی سے انہیں ہدایات ملتی تھیں۔

میں نے ٹیلی فون پر منہاس باقر کو جہانگیر کے تازہ ترین حالات کے بارے میں بتایا تو فواد کا تذکرہ بھی ہوا تھا یہ الگ بات ہے کہ جہانگیر اس تک پہنچ ہی نہیں سکا۔ میرا اور منہاس کا مشترکہ خیال یہی تھا کہ سی ایف کے نے جہانگیر کو ٹھکانے لگوا دیا ہوگا۔ جہانگیر نے مجھے تنظیم کے بارے میں جتنا کچھ بتا دیا تھا اس کے بعد وہ سی ایف کے کے لیے کسی خالی کارتوس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اسے پہلی فرصت میں ختم کر دیتے کیوں کہ اس وقت شعیب غوری میرا سچا ہمدرد اور گہرا دوست بنا ہوا تھا' جہانگیر نے شعیب غوری اور اس کی سازشی تنظیم سی ایف کے کو بری طرح بے نقاب کر کے اپنے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی لیکن اب تو حالات خاصے بدل گئے تھے۔ شعیب غوری کھل کر میرے دشمن کی حیثیت سے سامنے آچکا تھا۔ بہرحال' فواد کا منظر پر آنا واقعی بہت اہم تھا۔ میں اس کی دم سے نادیدہ ڈور باندھ کر پہلے سلیم واسطی اور پھر ان کے بگ باس شعیب غوری تک رسائی حاصل کر سکتا تھا جو اس وقت میرا خصوصی ٹارگٹ تھا کیونکہ میری رگِ جان اس کے خنجر کی دھار تلے دبی ہوئی تھی۔

شہزاد علی یک ٹک مجھے سوچتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے لمحاتی ذہنی کرتب بازی کے بعد اس سے سوال کیا'' تم نے فواد کو کہاں دیکھا ہے؟''

'' گارڈن ایسٹ کے علاقے میں۔'' اس نے جواب دیا '' وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی سیڑھیوں میں مجھے دکھائی دیا تھا۔ اتفاق سے میں بھی اسی بلڈنگ سے نکل رہا تھا۔ اس وقت لائٹ گئی ہوئی تھی اس لیے لفٹ کے بجائے آمد ورفت کے لیے زینے کا راستہ استعمال ہو رہا تھا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا'' کیا اس نے بھی تمہیں دیکھا تھا؟''

'' میرا خیال ہے' نہیں۔'' وہ پورے وثوق سے بولا '' میں ایسے رخ پر تھا کہ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑ سکی ورنہ وہ مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک جاتا۔ گلستانِ جوہر والے علاقے کے بعد وہ میرا صورت آشنا ہو چکا ہے۔''

میں نے پوچھا'' تم نے جس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا ذکر کیا ہے' فواد اس میں رہائش پذیر ہے یا وہ کسی سے ملنے کے لیے وہاں گیا تھا؟''

'' ابھی تک یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔'' شہزاد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا'' دراصل شادی کی مصروفیات نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔ مجھے امید ہے ایک آدھ دن میں' میں تفصیل جان لوں گا۔ اس بلڈنگ میں میرا ایک دوست رہتا ہے جس سے ملنے اس روز میں وہاں گیا تھا اور فواد کی مجھے ایک جھلک نظر آگئی۔''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا'' تم یہ کام پہلی فرصت میں کر لو۔ فواد ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ اگر ہمارے قبضے میں آجائے تو ہم سی ایف کے کے اندر گھسنے کے لیے بہ آسانی راستہ بنا سکتے ہیں۔''

شہزاد نے مجھے بتایا کہ وہ صبح ہی اس مشن پر لگ جائے گا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ گارڈن ایسٹ میں' بریٹو روڈ پر واقع تھی۔ یہ کراچی کا ایک پوش علاقہ ہے اور زیادہ تر یہاں ایک خاص کمیونٹی کے لوگ آباد ہیں۔ شہزاد رخصت ہو گیا تو میں اس فلیٹ کا سرسری جائزہ لینے لگا' جہاں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔

یہ فلیٹ مین طارق روڈ پر واقع تھا جو دو بیڈ' ایک ڈرائنگ اور ایک لاؤنج پر مشتمل تھا۔ اس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر متعدد شاپس تھیں جن میں ہوزری' گارمنٹس' ملبوسات' پرفیومری اور جیولری وغیرہ فروخت ہوتی تھی۔ طارق روڈ شاپنگ کے لحاظ سے کراچی کا خاصا بارونق علاقہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے بھی مجھے یہاں قیام کا موقع ملا تھا لیکن وہ فلیٹ مین روڈ سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس فلیٹ کے تصور کے ساتھ ہی امتیاز علی' روبی اور میر بخش بھی میرے ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ان دنوں میں سی ایف کے کے پلیٹ فارم پر کام کر رہا تھا اور کچھ عرصہ امتیاز کے اس فلیٹ پر رکا تھا۔ اب وہ رات و دن خواب وخیال ہو کر رہ گئے تھے۔

میں نے لباس تبدیل کیا اور سونے کے لیے بستر پر آگیا۔ میں نے گھوم پھر کر اچھی طرح فلیٹ کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں رہائش کی ہر سہولت موجود تھی۔ منہاس باقر نے مجھے بتایا تھا کہ اس بلڈنگ کے مکین ایک دوسرے سے کوئی سروکار رکھتے ہیں اور نہ ہی کسی کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔ یہ میرے جیسے بندے کے لیے ایک مفید اور موزوں رہائش گاہ تھی کیوں کہ عام طور پر اکیلے رہنے والوں کو نظر میں رکھا جاتا ہے اور ان کی سرگرمیوں کو بھی کھوجنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

میرا خیال تھا' بستر پر گرتے ہی میں گہری نیند میں پہنچ جاؤں گا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور میرا دھیان آپوں آپ رکھاں والی کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ رات کے آخری پہر میں نے وہاں کے جابر حکمراں چوہدری نوازش علی کو پہلا ڈوز دیا تھا۔ اس بات کو لگ بھگ بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ چوہدری کو جو خطرناک ''مرض'' لاحق تھا اس کا تقاضا تھا کہ اسے دوسرا ڈوز دے دیا جائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑا اور ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھ گیا پھر میری انگلی رکھاں والی میں چوہدری نوازش علی کے نمبرز ڈائل کرنے لگی۔

پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹینڈ کر لیا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس طرف کوئی میرے فون ہی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ پھر ایئرپیس میں مجھے ایک بھاری بھرکم ''ہیلو'' سنائی دی تھی۔ اس آواز میں اتنی تشویش' اتنی تڑپ اور اتنی دیوانگی تھی کہ میں پلک جھپکنے میں سمجھ گیا' میرا دشمنِ دیرینہ اس وقت انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ فون چوہدری نے خود ریسیو کیا تھا۔

'' اوہو!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا'' سارا گاؤں گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہے اور چوہدری ابھی تک جاگ رہا ہے۔ بھئی ایسے رکھوالے چوہدری تو اللہ ہر گاؤں گوٹھ کو دے!''

'' تو یہ تم ہو'' وہ پھنکار'' وجدان! تم تصور بھی نہیں کر سکتے' میں تمہارے کتنے ٹکڑے کر دوں گا اور......''

'' یہ مت بھولو چوہدری کہ تمہارا نوجوان لختِ جگر اس وقت میرے رحم وکرم پر ہے۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا'' تمہاری یہ بدزبانی اس کے لیے انتہائی خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔''

وہ قدرے معتدل لہجے میں بولا'' فیصل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟''

'' میں نے گزشتہ رات تمہیں بتایا تھا کہ میں کراچی میں ہوں۔'' میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا '' اس کا یہی مطلب ہے تمہارا سپوت بھی کراچی میں ہے لیکن پتا نہیں' تم سٹھیا گئے ہو یا بیٹے کی فرقت نے تمہارا دماغی توازن بگاڑ دیا ہے کہ تمہیں میری بات کا یقین ہی نہیں آرہا۔''

میرے لہجے سے چوہدری کے لیے انتہائی نفرت اور حقارت ٹپکتی تھی۔ وہ خود کو مضبوط ظاہر کرتے ہوئے سنبھلے ہوئے انداز میں بولا'' میرا دماغی توازن اپنی جگہ پر ہے۔ تم جیسے کل کے لونڈے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور میں تمہیں بتاؤں گا' چوہدری نوازش کس آفت کا نام ہے۔''

غصے کی شدت سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا'' چوہدری! میں تمہارا کچھ نہیں بلکہ سب کچھ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔ تم تباہ وبرباد ہو جاؤ گے۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم خود کو بھی پہچان نہیں پاؤ گے'' میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا'' اور مجھے مت بتاؤ کہ تم کون سی آفت ہو۔ میں تمہیں اور تمہارے خاندان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم لوگوں کے خمیر میں گندگی بھری ہوئی ہے جو نسل در نسل فیصل تک پہنچی ہے لیکن فکر نہ کرو' میں اس غلاظت کو مزید پھیلنے کا موقع نہیں دوں گا۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہاری نسل یہیں اسٹاپ ہو جائے گی۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا'' تم بہت برا کر رہے ہو وجدان!''

'' میں اچھوں کے ساتھ اچھا اور بروں کے ساتھ ہمیشہ برا کرتا ہوں چوہدری!'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا'' تم اچھے بچے بن کر ساحل کو میرے حوالے کر دو' میں تمہاری نسل کے جھنڈا بردار کو چھوڑ دوں گا۔''

'' میں...... میں تمہیں بتا چکا ہوں' وہ لڑکی اب میرے پاس نہیں'' وہ بڑی سرعت سے بولا۔'' تم شعیب غوری سے رابطہ کرو۔''

'' میں اس ننگِ انسانیت کو تو دیکھ لوں گا چوہدری لیکن ساحل تم ہی میرے حوالے کرو گے'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا'' دس کروڑ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ میں تمہیں اتنا بڑا اماؤنٹ آسانی سے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔ اس وقت تمہاری آنتیں میرے ہاتھ میں ہیں۔ یاد رکھو' یہ الٹ کر تمہارے گلے کو بھی آسکتی ہیں۔ میں فیصل کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ اس رقم میں اتنے پیسے بھی نہیں ہوں گے۔ کیا تمہیں پتا ہے' دس کروڑ میں کتنے پیسے ہوتے ہیں؟''

'' تم مجھے پہلے ہی بہت نقصان پہنچا چکے ہو'' وہ غرایا '' ڈیفنس سوسائٹی والی کوٹھی پر جو کچھ ہوا' میں اسے بھولنے کو تیار ہوں۔ تم جلد از جلد فیصل کو میرے حوالے کر دو۔ میں تمہیں معاف کر دوں گا'' وہ چالاک بڈھا مجھے شکار کرنے کے لیے چارا پھینک رہا تھا۔

میں نے ایک مضحکہ خیز قہقہہ لگایا'' چوہدری! اس وقت تم معاف کرنے کی نہیں بلکہ بھیک مانگنے کی پوزیشن میں ہو۔ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے' تم نے ڈیفنس سوسائٹی والی کوٹھی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اس کوٹھی کے حشر سے تمہیں میری طاقت اور آئندہ عزائم کے بارے میں پتا چل گیا ہوگا۔''

'' کبیر شاہ کو میں نے ایک پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا ہے'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا'' باقی اس کوٹھی میں کچھ بھی نہیں بچا۔ ملازم ہماری نظر میں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہم نہیں ہوتے۔''

اس پھنسی ہوئی صورتِ حالات میں بھی اس کا تکبر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا'' اس کا مطلب ہے' چھوٹا چوہدری دلدار بھی......''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

چوہدری نوازش علی کے جواب نے چوہدری دلدار کی موت کی تصدیق کر دی۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ''وجدان! دیکھ لو تم، میں کتنے بڑے نقصان کو برداشت کر رہا ہوں۔ تم اس تباہ کاری اور ہلاکت خیزی کے بدلے میرے فیصل کو......''

''بکواس بند کرو'' میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی ''تمہیں تو یہ سب کچھ برداشت کرنا ہی ہوگا۔ جب اتنی موٹی رقم وصول کی ہے تو اپنے اندر نقصان سہنے کا حوصلہ بھی پیدا کرو۔ ویسے ایک بات ہے، تم شعیب غوری سے جڑنے والی دوستی کو خوب نبھا رہے ہو۔ کیا یہ بھی اس تگڑی رقم ہی کا کوئی کرشمہ ہے؟''

وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''تم نے کبیر شاہ کو کسی پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا ہے'' میں نے اس کی حالت سے کھیلتے ہوئے کہا ''لگتا ہے، یہ سب کچھ شعیب غوری کی خوشنودی کے لیے کیا گیا ہے ورنہ اس لولے لنگڑے کبیر شاہ کو تو تم خاموشی سے ٹھکانے لگوا سکتے تھے۔ اس کی موت میرے کھاتے میں رقم ہو جاتی اور تم بھی پرائیویٹ اسپتال کے خرچے سے بچ جاتے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تم سراسر بکواس کر رہے ہو'' وہ تیز آواز میں چیخ کر بولا ''مجھے کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں اور ...... یہ کیا تم نے دس کروڑ روپے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اتنی معمولی رقم تو میرے موزوں میں رکھی رہتی ہے۔''

''جس رقم کو تم اس وقت معمولی گردان رہے ہو'' میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور کہا ''گزشتہ رات تم اس رقم کے حصول پر بغلیں بجا رہے تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ دس کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ ساحل والی ڈیل میں تمہیں بہت زیادہ منافع ہوا ہے۔ کاش! تمہیں پتا ہوتا کہ یہ معمولی یا غیر معمولی رقم کہاں سے آئی ہے۔''

''میں آم کھاتا ہوں، پیڑ نہیں گنتا'' وہ بے پروائی سے بولا ''شعیب غوری نے وہ رقم کہیں سے بھی حاصل کی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

میں نے دل کا غبار نکالتے ہوئے کہا ''تمہارے لیے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ تم بے غیرت درجۂ اول ہو۔''

''کیا بک رہے ہو؟'' میرے لہجے نے اسے تلملا کر رکھ دیا۔

میں نے کہا ''چوہدری! شعیب غوری تمہارا جوتا تمہارے سر میں مار کر چلا گیا اور تمہیں خبر بھی نہ ہوئی، بے غیرتی اور بے حیائی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی؟''

میں اس موقع پر چوہدری اور شعیب میں پھوٹ ڈال سکتا تھا۔ اپنے دو دشمنوں کو آپس میں لڑانا عین کارِ ثواب ہوتا۔ میری مبہم بات نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا، پوچھنے لگا۔

''وجدان! تم بہت گستاخ ہو بلکہ اپنے باپ سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہی ہو لیکن میں تم سے یہ ضرور پوچھوں گا، تم شعیب غوری کے حوالے سے کیا کہہ رہے ہو۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا ''میں تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا اور اس طرح دوں گا جیسے شوز کی دکان میں جوتا پہنانے والا دیتا ہے لیکن اس سے پہلے میں وضاحت کر دوں کہ تم بہت بڑے شیطان ہو یعنی اپنے باپ چوہدری محمد رمضان سے بھی آٹھ دس گز آگے کے شیطان!'' میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے اپنی سانس درست کی پھر بات کی تکمیل کرتے ہوئے کہا ''جوتے کی دکان میں جوتا پہنانے کے لیے چمچہ نما ایک چھوٹا سا آلہ استعمال کیا جاتا ہے تاکہ پاؤں کو بہ سہولت جوتے کے اندر بٹھایا جا سکے۔ تمہارا دماغ اور اس میں پائی جانے والی سمجھ بہت چھوٹی ہے اس لیے میری بات تمہاری عقل میں نہیں اتر رہی ......تو لو سنو!''

میں نے چند لمحات کے توقف کے بعد بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''شعیب غوری نے تمہیں جو دس کروڑ روپے ادا کیے ہیں وہ ان پچیس کروڑ یعنی چوتھائی ارب روپے کا ایک حصہ ہیں جو سونے کی فروخت سے شعیب نے حاصل کیے ہیں۔ درحقیقت یہ میرا حصہ تھا جو اس نے تمہارے حوالے کر کے ساحل کو ہتھیا لیا تم سے۔''

میں تصور کی نگاہ سے چوہدری کی کیفیت کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری سماعت سے اس کی لرزتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''تم کس سونے کی بات کر رہے ہو؟''

''جس کے لیے تم باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔''

''تت......تم......ڈائری والے راز......'' وہ حیرت اور صدمے کی شدت سے اپنی بات کو پورا نہ کر سکا۔

میں نے چرکا کاری کا کام جاری رکھا اور کہا ''اب آئی نا تمہاری بڈھی مت میں میری بات۔ میں بالکل اسی سونے کا ذکر کر رہا ہوں جس کے بارے میں والد صاحب نے اپنی ڈائری میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ انہوں نے سونے کے بسکٹس سے بھرے ہوئے دو تھیلے کہاں چھپائے تھے۔ تم اس ڈائری کے حصول کے لیے سرتاپا زور لگاتے رہے

اور اس کوشش میں تم نے متعدد قتل بھی کروائے بالآخر شیطان شیطان کر کے وہ ڈائری تمہارے پاس پہنچا دی گئی لیکن اس میں سے سونے کے راز والے اہم صفحے پھاڑ لیے گئے تھے۔ تم نے اپنے سر سمیت نہ جانے کیا کیا پیٹ ڈالا ہوگا چوہدری!''

میں نے ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد چوہدری کو حیرت زدہ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ''ان دنوں شعیب غوری کے ساتھ میری گاڑھی چھن رہی تھی اور میں اس کی مدد سے سونے تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا لہٰذا میں نے وہ صفحے شعیب کے حوالے کر دیے۔ ہمارے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ وہ سونا چاہے کتنے کا بھی فروخت ہو، میں دس کروڑ روپے لوں گا۔ آج سے بیس سال پہلے وہ سونا پانچ کروڑ روپے مالیت کا تھا جو اب کم از کم پچیس کروڑ کا ہو چکا ہے۔ شعیب نے میرے حصے کی رقم تمہیں دی ہے چوہدری۔ اب آئی سمجھ میں کہ اس نے تمہارا جوتا کس طرح تمہارے سر پر برسایا ہے۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا ''تم ہماری دوستی کو اپنی کسی چال سے خراب کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہاری یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا وجدان!''

''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو تو میں ثبوت فراہم کرنے کو تیار ہوں۔''

''تم اس سلسلے میں کیا ثبوت دے سکتے ہو؟''

''میرے والد صاحب نے سونے سے بھرے ہوئے کینوس کے وہ دو تھیلے ایک متروک کنوئیں میں پھینکے تھے'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا ''مذکورہ کنواں ''پاک بھارت'' سرحد کے نزدیک تمہاری زمینوں میں واقع ہے۔ شعیب غوری نے اپنے ایک انگریز دوست مسٹر نیل آرمر کے توسط سے اس کنوئیں سے یہ سونا حاصل کیا ہے۔ اس کنوئیں کے اوپر اب کھیت لہلہاتے ہیں۔ میں تمہیں کنوئیں کی درست لوکیشن بتاتا ہوں۔ تم میرے بیان کی تصدیق کے لیے اس مقام کو چیک کر سکتے ہو۔''

''تم بہت مکار ہو وجدان!'' وہ پھنکارا ''میں آج شام کو اپنے کھیتوں میں تھا۔ اگر میری زمینوں میں کھدائی کی گئی ہوتی تو یہ بات مجھ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک لمحے میں اس واقعے کی مجھے خبر ہو جاتی۔ تم مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔''

میں نے اس کی بے اعتباری کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے متروک کنوئیں کا محلِ وقوع بتایا اور کہا ''شاید تم نے میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے بتایا ہے نا اب اس مقام پر سرسبز کھیت لہلہاتے ہیں۔ وہ متروک کنواں تو بہت نیچے کہیں غائب ہو چکا ہے۔ سونا کینوس کے مضبوط تھیلوں کے اندر محفوظ کیا گیا تھا اس لیے وہ میلا تک نہیں ہوا۔''

''اوئے جھوٹوں کے سردار!'' چوہدری نے سخت لہجے میں کہا ''اگر وہ کنواں زمین کے نیچے کہیں غائب ہو چکا ہے اور اس کے اوپر کھیت لہلہاتے ہیں تو پھر شعیب یا نیل آرمر نے وہ سونا کس طرح حاصل کیا۔ بغیر کھدائی کے یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو، وہ لوگ کوئی جادو وغیرہ جانتے ہیں؟''

میں نے اس کے گھائل حصوں پر لیموں نچوڑتے ہوئے کہا ''چوہدری! جو بات عقل میں نہ آئے اسے جادو کا نام دے دیا جاتا ہے۔ میری وضاحت تمہاری کھوپڑی میں اس لیے نہیں آ رہی کہ شاید وہاں دماغ نام کی کوئی شے وجود ہی نہیں رکھتی'' میں چند لمحے کے لیے رکا پھر انتہائی تحقیر آمیز انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''اوئے لکڑی کے بندر! اس متروک کنوئیں میں کھدائی تو کی گئی ہے لیکن چھپ چھپا کر۔ اس کے لیے سرحد پار تمہارے دشمن کی زمین استعمال کی گئی ہے۔ رام پور (امرتسر) کے رام داس کو تو تم اچھی طرح جانتے ہو نا؟ اس کا باپ چوہدری کرم داس تمہارے باپ چوہدری رمضان کا گہرا دوست تھا اور اسی دوستی کے نتیجے میں وہ کثیر المالیت سونا ادھر سے ادھر اسمگل کیا جا رہا تھا لیکن تمہاری بدقسمتی کہ......خیر چھوڑو۔ اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔''

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا۔ یہ خاموشی اس بات کی دلیل تھی کہ میری بات چوہدری کی بدھی میں بیٹھ گئی تھی۔ رام پور سرحد پار امرتسر کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں پر رام داس نامی ایک چوہدری کی عمل داری تھی۔

''تمہیں سانپ کیوں سونگھ گیا چوہدری!'' میں نے کٹیلے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے ہیجانی انداز میں بولا ''کہیں تم یہ تو نہیں کہنا چاہتے کہ وہ گم شدہ سونا سرنگ لگا کر اس متروک کنوئیں سے نکالا گیا ہے؟''

''میں بالکل یہی کہنا چاہتا ہوں'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''اب مزید تصدیق کے لیے تم میری بتائی ہوئی جگہ کی کھدائی کروا کے دیکھ لو۔ تمہارے پاس بندوں یعنی کیڑے مکوڑوں کی کمی تو نہیں ہوگی۔''

وہ میرے طنزیہ وار کو سہتے ہوئے بولا ''تم یہ نہ سمجھو، میں تمہاری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں گا۔ میں اپنی زمین میں کھدائی تو بعد میں کراؤں گا، اس سے پہلے میں شعیب

غوری سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

”میں اس کوشش کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ شعیب غوری اس معاملے میں خاصا فعال نظر آتا ہے۔“ میں نے چوٹ کی ”اور یہ تم نے عقل مندی کی بات کی کہ آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔ خدا کے بندے اور شیطان کے چیلے! اگر تمہاری آنکھ بند ہو گئی تو پھر اپنے نوجوان فرزندِ ارجمند کو کیسے دیکھ سکو گے۔ میں نے سن اور دیکھ رکھا ہے‘ جس کی آنکھ بند ہو جاتی ہے اسے منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے...... کروڑوں کی مالیت کے سونے کی طرح!“

”نے...... فیصل کہاں ہے؟“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ”ابھی تک تم نے اس سے میری بات نہیں کروائی“ وہ ادھر ادھر کے انتہائی اہم معاملات کو فراموش کر کے اپنے بیٹے کا قصہ لے بیٹھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ فیصل چوہدری کی کمزوری تھا جو صدف کی مہربانی سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔ چوہدری کے پلڑے کا سب سے زیادہ بھاری باٹ اس وقت میری جانب تھا لہٰذا میرا پلڑا جھک رہا تھا۔ میں اس جھکے ہوئے پلڑے کی بدولت بہ آسانی چوہدری کو جھکانے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

میں نے نہایت ہی مستحکم لہجے میں کہا ”چوہدری! اگر اپنے بیٹے کی صورت دیکھنا چاہتے ہو تو ساحل کو میرے حوالے کر دو۔ دس کروڑ جیسی معمولی رقم تو تمہارے موزوں میں اڑسی رہتی ہے۔ تم یہ رقم...... حقیر رقم شعیب غوری کے منہ پر دے مارو اور......“

”تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو وجدان!“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا ”کل رات کو فیصل سے تمہاری بات کروا دوں گا۔“

”کل رات!“ وہ مچل گیا ”میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔“

”میں اس انتظار کی کوفت سے بچنے کے لیے تمہیں ایک آسان ترکیب بتاتا ہوں“ میں نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ”تم ابھی سے ایک ٹوکرے کے نیچے بیٹھ جاؤ اور پوری توجہ اس نقطے پر مرکوز کر دو کہ تم ایک دیسی مرغی ہو جو انڈا دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ انڈا دینا چونکہ مرغی کا فریضہ ہے اس لیے باوجود زور لگانے کے بھی تمہاری کامیابی کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ اس ”تخلیقی مصروفیت“ میں تمہارا دل لگ جائے گا اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ کیسا آئیڈیا ہے؟“

اپنی بات کے اختتام پر میں نے استفسار کیا تو وہ بھڑک اٹھا ”وجدان! انڈے مرغی کا کھیل تو میں تمہارے ساتھ کھیلوں گا اور ایسا کھیلوں گا کہ تمہاری آنے والی نسل ہاتھ لگا لگا کر دیکھے گی۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں‘ ساحل کو مجھے لوٹا دو“ میں نے برجستہ کہا ”میری نسل اسی سے چلے گی...... لیکن تم میری بات کو سمجھ ہی نہیں رہے ہو۔ کہیں تم مجھے اپنی فرزندی میں لینے کے خواب تو نہیں دیکھ رہے؟“

”او یو بلڈی......“ غصے کی انتہا کو پہنچ کر وہ انگلش پر اتر آیا ”میں تمہیں بھوکے کتوں کے سامنے ڈال دوں گا۔“

”بشرطیکہ میں تمہارے قابو آ گیا۔“

”اپنی ناپاک زبان بند کرو۔“

”اوکے!“ میں نے معتدل انداز میں کہا ”وش یو بیڈ لک چوہدری!“

پھر اس کا جواب سنے بنا میں نے ریسیور کو کریڈل کر دیا۔

شعیب کے حوالے سے چوہدری کو بھڑکانا سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر چوہدری واقعی میری توقع کے مطابق سوچنے لگتا تو ان میں پھوٹ پڑ سکتی تھی لیکن میں اس سلسلے میں زیادہ پر امید نہیں تھا۔ وہ دونوں شیطان کے چیلے تھے اور بدی کے علم بردار۔ مجھے کچلنے اور نقصان پہنچانے کے لیے وہ ہر محاذ پر کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو سکتے تھے۔ میں ان کا مشترکہ دشمن تھا۔ وہ دونوں اتنی آسانی سے میری باتوں میں آنے والے نہیں تھے لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

کوشش بڑا اطمانیت بخش اور امید افزا لفظ ہے جو بجھے ہوئے دلوں کو بھی حوصلہ بخش دیتا ہے۔ کینسر کے آخری اسٹیج میں جب مریض کی زندگی کے دن نہیں بلکہ گھنٹے بھی گنے جا چکے ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر پھر بھی اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے حالانکہ اسے صد فیصد یقین ہوتا ہے کہ وہ مریض بچے گا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر یہ بھی دیکھ رہا ہوتا ہے کہ علاج پر لواحقین کے لاکھوں روپے خرچ ہو رہے ہیں لیکن وہ اپنی کوشش کو جاری رکھتا ہے کیونکہ یہی اس کا فرض ہے۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن کوشش کرنا انسان پر لازم۔ خدا کی اس امانت کو بچانے کے لیے آخری سی کوشش کرنا چاہیے۔

میں نے چوہدری نوازش کو ذہن سے جھٹکا اور بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ چند لمحات کے بعد مجھے محسوس ہوا‘ تھوڑی دیر پہلے چوہدری سے ہونے والی ٹیلی فون گفتگو نے میرے اعصاب میں اچھا خاصا تناؤ پیدا کر دیا تھا۔

میں نے بستر کو چھوڑ دیا اور قالین پر آ گیا۔ وہ بیڈ روم ہموار تھا۔ میں نے اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے یوگا کا سہارا لیا۔ اس وقت سانس کی کوئی مشق کرنا تو مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے پرانایام کو ٹچ نہیں کیا اور ہتھ یوگ کو آزمانے لگا۔ کنول آسن اور مین آسن کے بعد میں نے ہیڈ اسٹینڈ لگایا اور دس منٹ بعد میں دوبارہ بستر پر دراز ہو چکا تھا۔ اس وقت میرے اعضا اور اعصاب خاصے فرمانبردار ہو گئے تھے۔ میں نے دو چار گہری سانسیں لیں اور اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دینے لگا۔

”میں نہایت ہی پرسکون‘ گہری اور میٹھی نیند سوؤں گا لیکن اس دوران میں تم جاگتے رہو گے اور ٹھیک چھ بجے صبح تم مجھے ہشاش بشاش بیدار کر دو گے لیکن میری نیند کے وقفے میں اگر اس فلیٹ کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے آثار پیدا ہوئے تو وقتِ مقررہ سے پہلے ہی تم مجھے اٹھا دو گے؟“

اس ہدایت کے اختتام پر میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

انسانی دماغ سب سے بڑا عجوبہ ہے۔ اگر یہ آپ کی ہدایات پر کان دھرنے لگے تو آپ حیرت انگیز کارنامے انجام دینے لگتے ہیں اور مجھے یقین ہے بلکہ میرا تجربہ ہے کہ تھوڑی سی پریکٹس کے بعد یہ آپ سے اور آپ کی ہدایت سے مانوس ہو جاتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد یہ آپ کی ہدایت پر عمل بھی کرنے لگتا ہے۔ خاص طور پر اس نوعیت کی ہدایت کہ میں سو رہا ہوں اور میرا دماغ جاگتا رہے گا‘ بڑے عجیب و غریب اور حیرت آفرین مناظر سے روشناس کراتی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو آزما کر دیکھ لیں۔ لاشعور کی کرشمہ کاری آپ پر آشکار ہو جائے گی۔

☆☆☆

میرے دماغ نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ میری ہدایت پر عمل نہ کرے۔ میں نے سونے سے قبل اسے تاکید کی تھی کہ وہ چھ بجے صبح مجھے بیدار کر دے لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا‘ کچھ گڑبڑ ہے۔ یکبارگی میری نگاہ دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔

کلاک میں سوئیاں چار بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ فلیٹ میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا تھا یا پھر پیش آنے والا تھا۔ میں نے اس خیال کے ساتھ ہی ایک جھٹکے سے بستر چھوڑ دیا اور بیڈ روم میں چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن وہاں مجھے کسی بھی غیر معمولی واقعے کے آثار نظر نہ آئے۔ اس کا یہی مطلب تھا‘ فلیٹ کے کسی دوسرے حصے میں کوئی گڑبڑ تھی۔

میں بیڈ روم سے باہر نکل آیا۔ دونوں بیڈ روم ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے مختصر سا لاؤنج تھا۔ پھر ڈرائنگ روم آتا تھا۔ میں نے سونے سے قبل دوسرے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا تھا جو ہنوز بند تھا۔ میں نے احتیاطاً اس دروازے کو کھول کر اندر جھانکا‘ اس سے پہلے میں نے اندر کی لائٹ آن کر دی تھی لیکن مجھے وہاں کچھ بھی خلافِ معمول دکھائی نہ دیا۔ لاؤنج پر بھی میں ایک طائرانہ نظر ڈال چکا تھا۔ یاالٰہی! یہ کیا ماجرا ہے؟

اب آ جا کر ایک ڈرائنگ روم ہی بچا تھا۔ ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے کے ساتھ ہی لاؤنج کے کنارے پر فلیٹ کا مین دروازہ تھا۔ یہ دروازہ بھی میں نے شہزاد علی کے جانے کے بعد اندر سے لاک کر دیا تھا اور وہ ابھی تک بدستور لاک ہی تھا۔ میں محتاط قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ گیا اور پھر جیسے ہی میں نے دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں قدم رکھا‘ مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میری نگاہ نے ایک حیرت ناک منظر دیکھا۔

ڈرائنگ روم کے بڑے صوفے پر نقلی وجدان پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے غصہ بھی آیا اور جھنجلاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ اس بات پر حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ بند فلیٹ کے اندر کیسے گھس آیا تھا۔ اس سے پہلے وہ بہروپیا جن کمالات کا مظاہرہ کر چکا تھا یہ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔

جلد ہی میری جھنجلاہٹ اطمینان میں بدل گئی۔ میرے جی میں آئی کہ اچھا ہے‘ یہ ہاتھ آ گیا۔ اب اس سے بھی حساب کتاب ہو ہی جائے۔ دیکھتا ہوں‘ یہ کیا بیچتا ہے!

زیرِ لب اس کی مسکراہٹ قدرے وسیع ہوئی اور آنکھوں میں بھی ایک بردبار چمک نے جگہ بنا لی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرا دماغ پڑھ رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے اس خیال کا ثبوت پیش کر دیا۔

”میں خرید و فروخت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا“ میری سماعت میں خود میری آواز نے سرگوشی کی ”اس لیے تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ میں کیا بیچتا ہوں؟“

اس کے انداز نے مجھے اکتاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا ”کون ہو تم؟“

وہ بدستور دھیمی مسکراہٹ کو ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا

’’میرا نام وجدان ہے...... اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو۔‘‘

’’تم جھوٹے ہو‘فریبی ہو‘بہروپیے ہو‘‘ میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا ’’تم وجدان کس طرح ہو سکتے ہو جبکہ اصلی وجدان تو میں ہوں۔‘‘

وہ یکدم سنجیدہ ہوگیا ’’نہ تم نقلی ہو اور نہ ہی میں کوئی بہروپیا ہوں۔ ہم دونوں ہی اصلی وجدان ہیں۔‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم بہ یک وقت اصلی ہوں‘‘ میرے لہجے میں درشتی اتر آئی ’’ہم میں سے کوئی ایک اصلی ہے اور مجھے یقین ہے‘ میں ہی اصلی ہوں۔‘‘

وہ ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ بولا ’’چلو‘ میں تمہاری بات تسلیم کرلیتا ہوں۔ تم ہی اصلی وجدان ہو لیکن یہ راز میرے اور تمہارے درمیان دفن ہے‘ دوسرے اس سے آگاہ ہیں اور نہ ہی کوشش کے باوجود بھی اس سے آگاہی حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ مجھے دیکھیں گے تو اصلی وجدان میں ہوں گا اور جب تم پر نظر جائے گی تو تمہیں اصلی وجدان سمجھیں گے۔ میں وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اپنی پہچان میں بھی تبدیلی کرتا رہوں گا۔ دیکھ لو‘ آج میرا لباس وہ نہیں جو تم پہلے دیکھتے آئے ہو۔‘‘

میں نے اس کے لباس پر ابھی تک توجہ نہیں دی تھی۔ اب غور کیا تو وہ واقعی مجھے دوسرے لباس میں نظر آیا۔ آج وہ سفید سوٹ میں نہیں تھا‘ نہ ہی اس نے سفید بوٹ پہن رکھے تھے۔ وہ سیاہ پتلون اور اسکائی بلیو شرٹ میں تھا۔ اس کی آنکھوں پر نظر آنے والا سیاہ چشمہ بھی غائب تھا۔ یہ بھی عین ممکن تھا‘ وہ فورڈ بلیو ڈی سرخ لینڈ کروزر میں بھی نہ ہو!

’’تم بالکل درست سوچ رہے ہو‘‘ وہ میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے بولا۔

’’آج میں بائیک پر ہوں۔ میری ’’جی پی۔ ہنڈریڈ‘‘ نیچے کھڑی ہے۔ تم چاہو تو کھڑکی سے جھانک کر دیکھ سکتے ہو۔‘‘

میں بے اختیار کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ پھر جب میں نے نیچے جھانکا تو اس کے انکشاف کی تصدیق ہوگئی۔ مین طارق روڈ پر اس کی نیلی بائیک جی پی ہنڈریڈ کھڑی تھی جس کے ہینڈل پر ایک ہیلمٹ بھی ٹنگا نظر آرہا تھا۔ وہ رات کا آخری پہر تھا۔ روڈ غیر آباد تھی۔ اس کی بائیک سے تھوڑے فاصلے پر دو تین گاڑیاں اور بھی کھڑی تھیں جو یقیناً اسی اپارٹ منٹ بلڈنگ کے مکینوں کی ہوں گی جس کے سیکنڈ فلور پر میں مقیم تھا۔

میں واپس اس بہروپیے کی طرف پلٹا اور ایک صوفہ سنبھالتے ہوئے مین نے اس سے پوچھا ’’کیا تم سوچ پڑھنا جانتے ہو؟‘‘

’’میں قیافہ شناس اور فیس ریڈر ہوں‘‘ اس نے جواب دیا ’’چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لیتا ہوں اور حتی الامکان درست اندازے لگاتا ہوں۔ کسی کے خیالات یا سوچ پڑھنے پر میں قدرت نہیں رکھتا۔‘‘

میں نے توصیفی انداز میں کہا ’’اگر تم محض قیافہ شناس ہو تو واقعی حیرت انگیز ہو۔‘‘

’’گویا تم اپنی تعریف کررہے ہو‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ’’نہیں بھئی! میں تمہاری طرح فیس ریڈر یا پُراسرار صلاحیتوں کا مالک نہیں ہوں۔ تم نے پچھلے چند دنوں میں مجھے جس طرح چکرایا ہے‘ اس سے میں واقعی الجھا ہوا ہوں۔‘‘

’’کیا میں نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا ہے؟‘‘

’’ہرگز نہیں‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

’’پھر تم مجھ سے اتنے شاکی اور برگشتہ کیوں ہو؟‘‘

’’میں تم سے شاکی نہیں بلکہ تمہاری حرکتوں کے طفیل میں ایک عجیب سی کوفت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔‘‘ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ’’میں اپنے فطری تجسس سے مجبور ہوں۔ جب تک تمہاری اصلیت نہیں جان لوں گا‘ مجھے قرار نہیں آئے گا۔‘‘

’’اپنی اصلیت کے بارے میں‘ میں تمہیں بتا چکا ہوں‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ’’میں وجدان ہوں۔ تم میرے اندر کوئی خامی تلاش کرو۔‘‘

میں نے اسے ٹٹولنے والی نظر سے دیکھا اور گمبھیر آواز میں کہا ’’تمہارے اندر کی خامی پکڑنے کے لیے تمہیں اندر تک کھولنا ہوگا۔ فکر نہ کرو‘ میں بہت جلد تمہاری حقیقت تک پہنچ جاؤں گا۔ تم زیادہ دنوں تک مجھے فریب نہیں دے سکو گے۔‘‘

اس کا چہرہ بجھ سا گیا اور آنکھوں میں دکھ لہرانے لگا۔ وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا ’’وجدان! تمہارا رویہ ٹھیک نہیں۔ میں نے ابھی تک تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی بلکہ تمہیں فائدہ ہی پہنچایا ہوگا‘‘ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ’’میں نے تمہیں ڈارلنگ نامی اس بلی کے شر سے بچایا‘ ساحل کی نشاندہی کی‘ پھر ڈیفنس والی کوٹھی پر تمہارے لیے راہ ہموار کی۔ تم میرے خلوص کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے‘ الٹا مجھ پر شک کررہے ہو؟‘‘

’’تم نے جو کچھ کیا‘ اپنی مرضی سے کیا‘‘ میں نے کہا۔

وہ بولا ’’میں نے جو کچھ کیا‘ تمہاری بھلائی کے لیے کیا۔‘‘

’’اگر تم میرے اتنے ہی خیر خواہ ہو تو پھر مہربانی فرما کر مجھے اپنی اصلیت کے بارے میں صحیح صحیح بتادو‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا ’’کیا تم کوئی اورا یا نسمہ ٹائپ شے ہو؟ ویسے میری معلومات کے مطابق تم اورا‘ نسمہ‘ ہم زاد یا پیکرِ لطیف کی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔‘‘

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ’’تمہاری معلومات بالکل درست ہیں۔ میں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوں۔‘‘

’’پھر تم کیا ہو؟‘‘ میں نے چڑ کر پوچھا۔

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ’’میں تمہارا پرتو ہوں۔‘‘

’’پرتو!‘‘ میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا ’’تم کہاں سے آگئے بھئی؟‘‘

وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ’’تم نے خود مجھے بیدار کیا ہے‘ اپنی یوگا اور چی کی مشقوں سے۔ تم مجھے چی کی ایک مادی شکل سمجھ لو۔‘‘

میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اس پرتو کو دیکھ رہا تھا۔ پچھلے چند روز سے میں اپنے ساتھ عجیب و غریب کیفیات کو محسوس کررہا تھا اور اسے چی کی ایڈوانس مشقوں کا ثمر سمجھتا تھا اور اب...... یہ پرتو بھی میرے احساسات کی تصدیق کررہا تھا۔

میں نے اسے چند واقعات کے بارے میں مختصراً بتایا اور پوچھا ’’کیا اس میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے؟‘‘

’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو‘‘ وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ’’میں بعض اوقات تمہارے بہت قریب آجاتا ہوں لیکن تم مجھے دیکھ نہیں پاتے اور کبھی میں تم سے کچھ فاصلے پر چلا جاتا ہوں‘ جیسا کہ اس وقت میں یہاں موجود ہوں اور تمہیں نظر آرہا ہوں کیونکہ اس وقت میں مکمل مادی شکل میں ہوں۔ جب میں مادی شکل میں نہیں ہوتا‘ تمہیں دکھائی نہیں دیتا‘ تم صرف مجھے محسوس کرسکتے ہو۔‘‘

’’تم کب تک مجھ سے چمٹے رہو گے؟‘‘ میں نے بیزاری کا اظہار کیا۔

وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھنے لگا ’’تم بہت سنگ دل ہو وجدان‘ میرے لیے ایسے سخت الفاظ استعمال کررہے ہو جیسے میں خوامخواہ تمہارے پیچھے پڑ گیا ہوں حالانکہ میں تمہاری چی کی مشقوں کے نتیجے میں نمودار ہوا ہوں۔ میں تو ایک ایسی ڈھال ہوں جس سے تم بہت سے فائدے اٹھا سکتے ہو۔‘‘

’’مجھے ایسی ڈھال کی ضرورت نہیں جس کے اندر وار روکنے کی مکمل قدرت نہ ہو‘‘ میں نے ایک خاص حوالے سے اس پر طنز کیا ’’ایسی لنگڑی ہمدردی سے میں ایسے ہی اچھا ہوں۔‘‘

وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا ’’تم چوہدری دلدار کی کوٹھی پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں مجھے تنقید کا نشانہ بنا رہے ہو نا؟‘‘

’’کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے؟‘‘ میں نے ترشی سے کہا ’’اگر تمہیں معلوم تھا کہ ساحل اس کوٹھی پر موجود نہیں تو پھر ڈرامے کی کیا ضرورت تھی اور اگر تم اس حقیقت سے واقف نہیں تھے تو پھر تمہاری اس معذور دوستی کا مجھے کیا فائدہ؟‘‘

’’میں واقعی یہ نہیں جانتا تھا کہ ساحل کو اس کوٹھی سے کراچی روانہ کیا جاچکا ہے‘‘ وہ ندامت آمیز انداز میں بولا ’’ابھی میں پکا نہیں ہوا ہوں۔ تم باقاعدہ کسی استاد کی نگرانی میں چی کی مشقیں نہیں کررہے ہو اس لیے میں بعض معاملات میں امیچور ہوں اور تمہیں بھی مجھ پر تصرف حاصل نہیں۔‘‘

’’کیا کہنا چاہتے ہو؟‘‘ میں نے اسے گھورا ’’تصرف سے تمہاری کیا مراد ہے؟‘‘

وہ سادگی سے بولا ’’یہی کہ تم اپنی مرضی سے مجھے اپنے پاس نہیں بلا سکتے اور نہ ہی اپنے حسبِ منشا مجھ سے کام لے سکتے ہو۔ میں ایک ایسا چینل ہوں جو کسی بھی وقت تمہارے ٹی وی پر ٹیون ہوجاتا ہوں اور اپنی بساط کے مطابق تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔‘‘

میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے مشتاق لہجے میں استفسار کیا۔ ’’تم پر مکمل تصرف حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟‘‘

’’کسی ماہر استاد کی زیرِ نگرانی اگر تم چی کی ایڈوانس مشقیں کرو تو یہ اختیار تمہیں حاصل ہوسکتا ہے‘‘ وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولا ’’ورنہ تم اور میں اس معاملے میں یونہی ادھورے بھٹکتے رہیں گے۔‘‘

’’کیا تم اپنی مرضی سے مادی اور ماورائی حالت میں آسکتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’نہیں‘‘ وہ قطعیت سے بولا ’’مجھے اس کا اختیار نہیں ہے البتہ اگر تم میرے مشورے پر عمل کرلو تو یہ قدرت حاصل کرسکتے ہو۔‘‘

میں نے حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا ''میرے پاس سونے اور کھانے کا وقت نہیں' کسی کامل استاد کو کہاں سے تلاش کروں اور پھر اس کی نگرانی میں کب چی کی ایڈوانس مشقیں کروں' کاش میرے استاد محترم ماسٹر ہنگ پائی آج زندہ ہوتے تو وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ میں نے چی کے بارے میں جو کچھ سیکھا' ماسٹر ہنگ پائی ہی سے سیکھا تھا۔''

''آج کے انسان کے پاس ہر کام کے لیے وقت ہے لیکن عبادت' ریاضت اور محبت کے لیے اسے فرصت میسر نہیں'' میرے سامنے بیٹھا ہوا' بہ قول خود میرا پرتو برہمی سے بولا ''وہ اگر یہ تینوں یا ان میں سے کوئی ایک یا دو کام کرتا بھی ہے تو ریاکاری اور منافقت کے ساتھ۔ دنیا والوں کو دکھانے کے لیے' معاشرے کی نظر میں محترم اور معزز نظر آنے کے لیے جبکہ عبادت' ریاضت اور محبت کو کبھی ناپ تول کر اور خانہ پُری کے لیے نہیں کرنا چاہیے۔ ان کاموں کی روح سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں اختیار کرنا پڑتا ہے' پوری سنجیدگی اور ذمے داری کے ساتھ۔ پھر کہیں جا کر فیض حاصل ہوتا ہے۔''

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا ''میرے ساتھ نتھی ہونے سے پہلے کیا تم کسی یونیورسٹی میں لیکچرر تھے؟''

''کیا میں نے کبھی تم پر اعتراض کیا کہ تم مارشل آرٹس اور یوگا پر لمبے لمبے بھاشن کیوں اور کیسے دے لیتے ہو؟'' وہ میرے سوال کی تہ میں پہنچتے ہوئے بولا ''مسٹر وجدان! میں تمہارا پرتو ہوں۔ تمہاری شکل وصورت' خوبو اور عادات و اطوار کی مکمل جھلک مجھ میں موجود ہے۔''

''یار مسٹر پرتو!'' میں نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا ''تم میرا ایک کام کردو تو میں زندگی بھر تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا گویا اس وقت وہ فیس ریڈنگ نہیں کررہا تھا ورنہ وہ میرے عزائم تک پہنچ جاتا۔ میں نے اسے گومگو کی کیفیت میں دیکھا تو وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''تم میرا پیچھا چھوڑ دو اور جہاں سینگ سمائیں' ادھر کا رخ کرلو۔ مجھے تمہاری مدد یا ہمدردی کی ضرورت نہیں۔''

اس نے برا سا منہ بنایا اور گہری سنجیدگی سے بولا ''تم نے مجھے اپنی بے سمت مشقوں سے ادھورا تخلیق کیا ہے۔ میں درمیان میں لٹک کر رہ گیا ہوں۔ نہ بااختیار رہوں اور نہ ہی بے اختیار۔ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ اگر میں کچھ عرصہ اسی طرح معلق رہا تو بہت برا ہو جائے گا جس کا سب سے زیادہ نقصان صرف اور صرف تمہیں ہی پہنچے گا' وجدان!''

''مثلاً ایسا کیا ہو جائے گا؟'' میں نے متاسفانہ انداز میں پوچھا۔

وہ گمبھیر لہجے میں بولا ''اس کائنات میں نیکی اور بدی' دونوں قسم کی قوتیں کارفرما ہیں۔ سب سے زیادہ غیر محفوظ وہ ہوتا ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی' میری طرح معلق ہوتا ہے۔ اگر تم نے پوری سنجیدگی سے باقاعدہ چی کی ایڈوانس مشقیں کرکے مجھے حاصل نہ کیا تو اس بات کے امکانات ہیں' بدی کی کوئی قوت مجھے اپنے چنگل میں جکڑ لے۔ پھر میں اس قوت اور حاملِ ہذا کی مرضی اور اختیار کے مطابق استعمال ہونے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تمہارے دشمن مجھے تمہاری مخالفت میں بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے' تم نیکی اور سچائی کی نشانی ہو جبکہ تمہارے دشمن بدی اور ظلمت کی علامت ہیں۔''

''تم تو بہت خطرناک باتیں کررہے ہو؟'' میں واقعی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میں حقیقت بیان کررہا ہوں جو سنگین اور تلخ ہی ہوتی ہے۔''

اچانک دل کی بات میری زبان پر آگئی ''کیا تم مجھے ساحل کے بارے میں بالکل درست معلومات فراہم کرسکتے ہو؟''

''تمہاری محبوبہ کے بارے میں' میں بھی اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ تم۔ اس لیے آئی ایم سوری!'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے خفگی آمیز نظر سے اسے دیکھا اور بیزاری سے کہا ''تم بالکل بے کار آدمی ہو۔ میں اگر چی کی ایڈوانس مشقیں باقاعدگی کے ساتھ کرکے تمہیں اپنے قابو میں نہ لا سکا تو پھر ان مشقوں کو ترک کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے نجات حاصل کرلوں گا۔ میں اس متذبذب اور غیر یقینی فضا میں رہ کر یکسوئی سے کوئی کام بھی نہیں کرسکتا۔''

اس نے اپنے ہونٹوں کو کچھ اس انداز میں حرکت دی جیسے میری کسی بچکانا بات یا حرکت پر طنزیہ مسکرایا ہو۔ میں گہری نظر سے اسے مسلسل دیکھے جارہا تھا۔ اس کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''ذرا اپنے عقب میں تو دیکھو!''

میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بہروپیے کی اس ہلکی حرکت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں ایک جھٹکے سے اس کی جانب مڑا تاکہ اسے کھری کھری سنا سکوں لیکن میری یہ خواہش حسرت میں بدل کر رہ گئی۔

وہ صوفہ میرا منہ چڑا رہا تھا جہاں ایک لمحہ پہلے میرا پرتو وہ نقلی وجدان بیٹھا مجھ سے مکالمہ کررہا تھا۔ میں نے بے اختیار پورے ڈرائنگ روم کو اپنی نظر سے چھان مارا۔ وہ صوفہ ہی نہیں بلکہ وہ کمرا بھی اس کے وجود سے خالی ہو چکا تھا۔

اسی وقت نیچے مین روڈ پر کسی موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری۔ میں لپک کر ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکی میں پہنچا اور میری نگاہ نے اس کی رخصت کا منظر کیپچر کرلیا۔ وہ آفت زادہ اپنی نیلی جی پی ہنڈریڈ پر سوار ہو کر بڑی تیزی سے میرے وژن سے نکلتا چلا گیا۔

میں اپنے ہاتھوں میں سر کو تھام کر ایک صوفے پر ڈھے گیا۔

میں نے کوئی سیدھی سادی اور پُرامن زندگی نہیں گزاری تھی۔ آنکھ کھولتے اور ہوش سنبھالتے ہی ہنگاموں سے میرا واسطہ پڑ گیا تھا۔ جن قارئین نے ابتدا سے میری داستانِ حیات پڑھی ہے' وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ سنسنی خیزی اور ہنگامہ آرائی ہمیشہ میرے ہمرکاب رہی ہے۔ کیسا کیسا فائٹر اور اپنے فن کا ماہر میرے مدِمقابل آیا۔ بھانت بھانت کے غنڈوں کو میں نے برتا اور پرکھا۔ زندگی کے اس کٹھن اور سنگین سفر میں بعض پُراسرار شخصیات سے بھی میرا تعلق رہا جو بے پناہ شکتیوں کے مالک تھے۔ گرینڈ ماسٹر ہنگ پائی' یوگی گوتم بھوش' پنڈت دھیراج اور نیلگری! لیکن اس نقلی وجدان نے مجھے گھما کر رکھ دیا تھا اور یہ کم بخت اپنی تخلیق کا ذمے دار بھی مجھے ہی ٹھہرا رہا تھا۔ اپنے بہ قول وہ میرا پرتو بن بیٹھا تھا۔

بہروپیے وجدان کے بارے میں سوچتے ہوئے ازخود میرا دھیان نیلگری کی طرف چلا گیا.... میرے بیان کردہ' حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک افراد میں نیلگری ہی باقی بچی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نقلی وجدان کے پیچھے کہیں نیلگری کا ہاتھ نہ ہو۔ جب ڈارلنگ چھم سے میری زندگی میں داخل ہوئی تھی تو اس وقت بھی ڈارلنگ کی پُراسرار حرکات کو دیکھتے ہوئے میں نے نیلگری کے بارے میں سوچا تھا لیکن ازاں بعد نیلگری نے اس کی تردید کردی تھی۔

نقلی وجدان کے حوالے سے نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے جلد ہی اپنا خیال رد کرنا پڑا۔ نیلگری نے ہمیشہ مجھے ساحل سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی جبکہ نقلی وجدان اس کے بالعکس عمل کررہا تھا۔ اس کے افعال میں نیلگری کا دخل نہیں ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی پربتوں کی شاہ زادی نیلگری نے آخری ملاقات میں مجھ سے دھمکی نما وعدہ کیا تھا کہ وہ اب ازخود میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کردے گی۔ مجھے ہمالیہ کی گود میں اس کے مسکن تک جانا ہوگا۔

نقلی وجدان کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے اکتاہٹ سی ہونے لگی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں نے یہی سوچا کہ آیندہ چی سے متعلق کوئی مشق نہیں کروں گا۔ اسی طرح خود ہی اس سے جان چھوٹ جائے گی لیکن اسی وقت پرتو کے کہے ہوئے سنگین الفاظ خطرے کی گھنٹی بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر واقعی وہ کسی بدی کی قوت کے ہتھے چڑھ گیا تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ بدی کی قوت کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے دشمنوں کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتا اور میرے سامنے مصائب کا ایک وسیع و عریض در کھل جاتا پھر میں ساحل اور اس کی تلاش پر توجہ مرکوز رکھنے کے قابل نہ رہتا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور ایک جھٹکے سے صوفہ چھوڑ دیا۔ یہ آرام کرنے یا سوچوں میں گم رہنے کا وقت نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیوار پر نصب کلاک صبح کے سوا پانچ بجا رہا تھا۔ میں اس مصمم ارادے سے اٹھا کہ آج ہی سے چی کی ایڈوانس مشقوں کو باقاعدگی سے کروں گا تاکہ جلد از جلد پرتو میرے تصرف میں آجاتا۔ میں اس سے کوئی کام لیتا کہ نہیں' یہ تو بعد میں سوچنے کی بات تھی۔ فوری طور پر کم از کم اتنا تو ہو جاتا کہ وہ دشمنوں کے کیمپ میں پہنچنے سے بچ جاتا۔

میں نے واش روم میں دس منٹ صرف کرکے خود کو فریش اپ کیا اور سانس کی مشق کے لیے تیار ہو گیا۔ فضا میں ابھی تک تاریکی کا بسیرا تھا۔ ان دنوں لگ بھگ سوا سات بجے صبح سورج طلوع ہوتا تھا۔ یہ وقت سانس کی مشق کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ اس بیڈ روم کی ایک کھڑکی شمال کے رخ گیلری میں کھلتی تھی۔ میں نے وہ کھڑکی وا کی اور بیڈ روم کے قالین پوش فرش پر آلتی پالتی مار کر یعنی کنول میں بیٹھ گیا جو پدم آسن یا سکھ آسن بھی کہلاتا ہے۔

پرانایام کے فریم کو استعمال کرتے ہوئے میں سانس کی ابتدائی مشقیں کر چکا تھا جن میں اسٹروک بریتھنگ بھی شامل تھی۔ اب مجھے کچھ اور آگے بڑھنا تھا۔ ماسٹر ہنگ پائی کی تعلیمات میرے ذہن میں نقش تھیں۔ سانس کی نئی مشق میں مجھے اپنے ایک مخصوص غدود کو بھی کام میں لانا تھا۔ دماغ کے اگلے حصے میں' پیشانی کے عین وسط میں پایا جانے والا یہ

مخصوص غدود دپنیل گلینڈ کہلاتا ہے جسے بعض لوگ تیسری آنکھ کا نام دیتے ہیں۔ یہ غدود خیالات کی ترسیل کے لیے..... بٹن کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر عین اسی مقام پر بندیا لگاتی ہیں جس کے عقب میں یہ غدود پایا جاتا ہے۔ اس مخصوص مقام پر لیا گیا بوسہ کیف آور اور نشاط انگیز احساس کو جنم دیتا ہے۔

پرانا یام کے فریم میں کی گئی مشقوں میں سانس کھینچنا اور سانس چھوڑنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے پدم آسن میں رہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں اور دو چار گہری سانسوں کے بعد مخصوص مشق شروع کردی۔

''چی'' کا خفیہ قیام ناف کے عقب میں ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کے قریب ہے۔ میں نے اس مقام کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور سانس کھینچ کر اپنے پیٹ کو ہوا سے بھرلیا' اس کے بعد میں نے مقام چی پر ایک بھرپور اسٹروک لگا کر سانس کو خارج کردیا۔ متعدد بار یہ عمل دُہرانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چی کے مقام سے حرارت خارج ہورہی ہو۔ یہ کچھ اس قسم کا احساس تھا جیسے کسی بھٹی کے اندر رکھا ہوا لوہا گرم ہورہا ہو۔ جب اس ''لوہے'' کی تپش مجھے پورے پیٹ میں محسوس ہونے لگی تو میں نے سانس کا متبادل نظام قائم کردیا۔ اب میں ہوا کو پیٹ میں بھرنے کے بجائے پھیپڑوں میں روک رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی یہ تصور کررہا تھا کہ پیٹ کے زیریں حصے میں دہکتی ہوئی آگ کی آنچ دھیرے دھیرے سفر کرکے میری تیسری آنکھ یعنی پنیل گلینڈ کی جانب بڑھ رہی ہے۔ جیسے ہی وہ مخصوص تپش اس گلینڈ کو چھوتی' میں آہستہ آہستہ سانس خارج کرتے ہوئے بریتھنگ کا ایک سائیکل مکمل کرلیتا۔

اس عمل کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ میں نے اپنی پیشانی کو تپتا ہوا محسوس کیا۔ گویا چی اپنے پوشیدہ مسکن سے نکل کر دھیرے دھیرے پنیل گلینڈ کی سمت بڑھ رہی تھی......اور اسے متحرک کررہی تھی۔ پانچ چکر لگانے کے بعد میں نے مشق ختم کردی۔ ابتدائی طور پر زیادہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ ماسٹر ہینگ پائی کے مطابق' تیز دوڑنے سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوسکتا تھا۔

میں ابتدائی مشقوں سے اپنی خوابیدہ چی کو بیدار کرچکا تھا۔ اب اسے آہستہ آہستہ دماغ کی طرف لاکر پنیل گلینڈ کو متحرک کرنا تھا تاکہ اپنی مرضی کے احکام کی ترسیل کو موثر اور یقینی بنایا جاسکے۔

میں نے مشق ختم کی تو بہت تھکاوٹ محسوس ہورہی تھی۔ آنکھوں میں نیند کا خمار بھی بھر چکا تھا۔ میں نے ایک بھرپور نیند لینے کا فیصلہ کیا اور بستر پر گر کر آنکھیں موندلیں۔ اس قسم کی دماغی اور روحانی مشقوں کے بعد آرام بہت ضروری ہوتا ہے۔

جلد ہی نیند کی مندلیں اور گداز بانہوں نے مجھے اپنی ریشمی گرفت میں جکڑلیا۔

☆☆☆

وہ ایک چھوٹی بند وین تھی۔ چھوٹے ٹرک سے مشابہ وہ وین باربرداری کے لیے استعمال ہوتی تھی جس کے سینے پر سرخ رنگ کے بڑے الفاظ میں ''PRESS'' لکھا ہوا تھا۔ مذکورہ وین منہاس باقر کی ملکیت تھی اور طبع شدہ اخبار کو پریس سے اخبار مارکیٹ تک لانے کا فریضہ انجام دیتی تھی لیکن اس وقت وہ ایک خاص مشن پر جارہی تھی۔

اس وین کے ڈرائیونگ کیبن میں صرف دو افراد موجود تھے۔ پسنجرز سیٹ پر میں براجمان تھا جبکہ اسٹیئرنگ شہزاد علی نے سنبھال رکھا تھا۔ تھوڑی دیر قبل میں نے فون کے ذریعے اس بات کی تصدیق کرلی تھی کہ میری امانت کو لاہور سے کراچی پہنچادیا گیا تھا۔ اتفاق سے میری بات کراچی میں عنایت باجوہ سے ہوئی اور اسے یہاں پاکر مجھے شدید حیرت بھی ہوئی۔ میں نے جب حیرت کا اظہار کیا تو اس نے بے تکلفی سے کہا' یار تم جلدی سے آجاؤ۔ پھر تم ساری تفصیل جان لوگے......اور میں جلدی سے اس گڈز فارورڈنگ ٹرانسپورٹ سروس کی جانب جارہا تھا جہاں عنایت باجوہ اور میری امانت فیصل موجود تھے۔

اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ بند وین کا بندوبست منہاس باقر نے کیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے فیصل کو ''ٹھہرانے'' کا بھی خاصا معقول اور تسلی بخش انتظام کردیا تھا۔ فیصل کو لاہور سے کراچی لانے میں اس کا مشورہ بھی شامل تھا۔ فیصل کو ایک زیر تعمیر بنگلے میں رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ مذکورہ بنگلا منہاس کی ملکیت تھا جس کا تعمیری کام بہ وجوہ کچھ عرصے سے رکا ہوا تھا۔ یہ بنگلا اسی علاقے میں واقع تھا جہاں میں نے میاں زاہد حسین کو اناللہ کیا تھا۔ شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت تھی کہ چوہدری نوازش علی کے خاص بندوں سے نمٹنے کے لیے ڈیفنس سوسائٹی کا وہ غیر آباد فیز مختص ہوچکا تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ٹاور کی سمت بڑھ رہے تھے۔ مذکورہ فارورڈنگ ایجنسی اسی علاقے میں واقع تھی۔ شہزاد خاصا پُرجوش اور خوش نظر آتا تھا۔ اس نے کہا ''وجدان! تم کراچی آئے ہو تو لگتا ہے' زندگی میں ایک نئی حرارت دوڑنے

لگی ہے۔ میں تو کافی دنوں سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا' یقین جانو میں نے تمہاری وجہ سے اپنا پروگرام منسوخ کردیا ہے۔''

میں چونک اٹھا ''کون سا پروگرام؟'' میں نے استفسار کیا۔

''منہاس صاحب کی بیٹی کی شادی کے فوراً بعد یعنی آج میں جہلم جانے والا تھا'' اس نے بتایا ''کئی برسوں سے میں نے ادھر کا رخ نہیں کیا لیکن تمہاری اچانک آمد اور فیصل کے حوالے سے ہونے والی کارروائی نے مجھے یہیں روک لیا۔ مجھے امید ہے' یہ مشن بہت ہی سنسنی خیز ثابت ہوگا اور ہاتھ پاؤں کھولنے کا بھرپور موقع ملے گا۔''

''حالات تو کچھ اسی قسم کی صورت دکھارہے ہیں'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

یہ بات مجھے معلوم تھی کہ شہزاد علی کا تعلق ضلع جہلم سے تھا۔ وہ دس سال پہلے کراچی آیا اور پھر یہیں کا ہوکر رہ گیا۔ اس کے دیگر عزیز رشتے دار وہیں آبائی علاقے میں تھے۔

''وجدان! میں نے سنا ہے' فیصل مارشل آرٹس کا بھی ماہر ہے؟'' شہزاد نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا ''تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ اس نے اس میدان میں لگ بھگ دس سال لگائے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق وہ بلیک بیلٹ سیکنڈ ڈان ہے۔''

''کسی زمانے میں مجھے بھی جوڈو کراٹے سیکھنے کا بہت شوق تھا۔'' شہزاد نے بتایا ''میں نے ایک کلب میں داخلہ بھی لیا اور ان فنون میں خاصی حد تک مہارت بھی حاصل کرلی لیکن بلیک بیلٹ تک نہ پہنچ سکا۔ کراچی آنے کے بعد معروفیت نے کسی طرف دھیان دینے کی فرصت .دی البتہ کبھی کبھار ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع ضرور مل جاتا ہے'' وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا پھر پوچھنے لگا ''بلیک بیلٹ تو ماسٹرز کو دی جاتی ہے نا؟''

''ہاں' یہ ماسٹر بیلٹ کہلاتی ہے'' میں نے کہا ''اس کے بعد ڈان شروع ہوجاتے ہیں۔''

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے خیال افروز لہجے میں بولا۔ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا ''وہائٹ' یلو' اورنج' گرین' بلیو' براؤن' گولڈن براؤن اور بلیک ......لیکن میں تو گرین بیلٹ سے آگے نہ جاسکا۔''

''یہ بھی بہت ہے'' میں نے کہا ''شہزاد! مارشل آرٹس عمل کا نام ہے۔ جو شخص جتنی زیادہ پریکٹس کرتا ہے' وہ اتنا ہی پرفیکٹ ہوجاتا ہے۔ بیلٹ وغیرہ سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔'' پھر چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد میں نے اس سے استفسار کیا ''تم نے فواد کے معاملے میں کیا پیش رفت کی ہے؟''

وہ خیالات کی دنیا سے باہر آگیا ''میں نے اپنے جس دوست کا ذکر کیا تھا نا' اس کا نام سرمد ہے۔ میں آج دن میں اس سے جاکر ملا تھا اور مجھے معلوم ہوا ہے' فواد اس بلڈنگ کے فلیٹ نمبر چار سو دو میں غلام جیلانی نامی ایک شخص کے پاس آتا ہے......اور آج کل وہ روزانہ ہی وہاں جارہا ہے۔''

یہ ایک اہم اطلاع تھی۔ میں نے شہزاد سے پوچھا ''تمہارا دوست سرمد کس فلیٹ میں رہتا ہے۔''

''تین سو دو میں۔'' اس نے بتایا۔

''یعنی سرمد والا فلیٹ، غلام جیلانی کے فلیٹ کے عین نیچے ہے؟''

''بالکل یہی بات ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر چند لمحات کے بعد کہا ''اگر فواد روزانہ ہی وہاں جارہا ہے تو پھر اسے شکار کیا جاسکتا ہے۔ گھات کے لیے سرمد کا فلیٹ خاصا موزوں ثابت ہوگا۔''

شہزاد نے ایک مرتبہ پھر میری تائید کی۔

میں نے کہا ''تم غلام جیلانی نامی اس شخص کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اگر فواد وہاں آرہا ہے تو عین ممکن ہے، غلام جیلانی بھی سی ایف کے سے وابستہ ہو!''

سی ایف کے (کرائم فری کراچی) نامی وہ ڈھکوسلا تنظیم شہزاد سے خفیہ نہیں رہی تھی۔ گلستان جوہر والے مشن میں وہ شعیب غوری اور اس کی تنظیم کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ مزید منہاس باقر نے بتادیا تھا کیونکہ وہ شہزاد پر بہت بھروسا کرتا تھا۔

ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ عنایت باجوہ ایک دبلے پتلے دراز قامت شخص کے ساتھ ایجنسی کے باہر ہی کھڑا نظر آگیا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ سیدھا میرے پاس آگیا۔ اس دوران میں ہم گاڑی سے باہر آگئے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا ''باجوہ جی! آپ یہاں کراچی میں؟''

''میں تمہاری حیرت ابھی دور کردیتا ہوں، بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب فرید پاشا کا کیا دھرا ہے۔'' وہ اپنی توند کو تھرتھراتے ہوئے بولا پھر میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہنے لگا ''اس وین کی چابیاں دو۔ جب تک تمہاری امانت اس وین میں منتقل ہو، ہم تھوڑی گپ شپ کرلیتے ہیں۔''

میں نے شہزاد کو اشارہ کیا تو اس نے چابیوں والا گچھا باجوہ کو دے دیا۔ باجوہ نے وہ چابیاں اپنے قریب کھڑے لمبے تڑنگے شخص کی جانب بڑھا دیں۔ وہ وہاں سے جانے لگا تو میں نے پوچھا۔

''کیا میری امانت کو کہیں اور رکھا گیا ہے؟''

''ہاں۔'' باجوہ نے اثبات میں گردن ہلائی ''احتیاط کے پیشِ نظر ایسا کیا گیا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو، سوراخ دار صندوق کا معاملہ کتنا حساس ہے۔ کسی کو اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو ہم سب کے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ آدمی امانت کو تمہاری وین میں رکھ کر لے آئے گا۔ یہ تم نے اچھا کیا۔'' اس نے جاتی ہوئی وین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ایسے کاموں کے لیے بند گاڑی ہی مناسب رہتی ہے پھر تمہاری وین پر تو ''پریس'' کا لفظ کسی گارڈ کے مانند موجود ہے۔ مجھے امید ہے، تم اپنی امانت کے ساتھ بحفاظت منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ ادھر نزدیک ہی ایک دیئر ہاؤس میں تمہاری امانت کو رکھوا دیا تھا میں نے ایسے معاملات میں اس قسم کی احتیاط تو کرنا ہی پڑتی ہے نا۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن آپ کس چکر میں یہاں موجود ہیں؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے سوالیہ نظر سے شہزاد علی کی طرف دیکھا۔ میں نے سر کی مخصوص جنبش سے باجوہ کو باور کرایا کہ شہزاد بھروسے کا آدمی ہے۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''یہ سب فرید پاشا کی مہربانی سے ہوا ہے۔ آؤ، میں تمہیں کچھ اور بھی دکھاؤں!''

بات ختم کرتے ہی اس نے ایجنسی کے دفتر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ مجبوراً ہمیں بھی اس کی تقلید کرنا پڑی پھر جیسے ہی میں نے دفتر میں قدم رکھا، میں اچھل کر رہ گیا۔ ایک کرسی پر زرگل بیٹھی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ کھل اٹھی۔

''زرگل...... تم یہاں......؟'' میں نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

زرگل کے بجائے عنایت اللہ باجوہ نے کہا ''بتاتا ہوں، سب بتاتا ہوں یار۔ ذرا آرام سے بیٹھ تو جاؤ۔''

میں نے اور شہزاد نے کرسیاں سنبھال لیں۔ اس دوران میں وہ گوری چٹی پشتون دوشیزہ بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کے منہ میں زبان نہ ہو۔ باجوہ نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

''تفصیلی باتیں تو تم اس لڑکی ہی سے پوچھنا۔ میں تو پاشا کی فرمائش پر اسے لاہور سے کراچی لایا ہوں اور اس کے لیے مجھے اپنی گاڑی میں ایک لمبا چوڑا سفر کرنا پڑا ہے۔ یقین جانو، میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا ''چلو، ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ اس طرح میں کراچی میں بہت سے لوگوں سے کاروباری ملاقاتیں بھی کرلوں گا۔ یہاں آنے کا بہانہ بن گیا ورنہ نکلنے کا موقع کہاں ملتا ہے......''

''آپ فرید پاشا کی کسی مہربانی کا ذکر کر رہے تھے؟'' میں نے باجوہ کو پٹری سے اترتے ہوئے دیکھا تو یاددہانی کے انداز میں کہا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' وہ باتونی شخص جلدی سے بولا ''تمہارے جانے کے کچھ ہی دیر بعد زرگل میرے دفتر میں آئی اور مجھ سے کہنے لگی، میں بھی کراچی جاؤں گی۔ میں نے پوچھا، اس سلسلے میں، میں کیا کرسکتا ہوں؟ اس نے کہا، مجھے اناج والے ٹرک کے ساتھ جانے دو۔ یہ ایک عجیب اور ناممکن سی بات تھی۔ میں نے اسے ٹالنا چاہا تو اس نے کہا کہ میں فرید پاشا سے اس کی بات کرادوں۔ یہ پہلے تمہارے ساتھ میرے دفتر سے ہو کر جا چکی تھی اور بھائی...... آپ نے جس طرح مجھے آدھی رات سے گھما کر رکھا ہوا تھا اس سے آپ لوگوں کی اہمیت کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے...... سید پور میں فرید پاشا سے اس کی بات کرادی۔ اس نے پاشا سے پتا نہیں، کیا گٹ پٹ کی کہ اس نے مجھے کہا، میں بھی ٹرک کے ساتھ کراچی جاؤں گا اور اس لڑکی کو اپنے ہمراہ لے کر جانا ہوگا۔ بس یہ ہے سارا قصہ!'' باجوہ نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بولا ''اب تم اپنی صندوق بند امانت کے ساتھ ساتھ اس زبان بند امانت کو بھی وصول کرلو۔''

میں نے زرگل کو حیرت سے دیکھا اور پوچھا ''تم نے فون پر فرید پاشا سے کیا گٹ پٹ کی تھی؟''

''بتادوں گی، ذرا فرصت تو میسر آنے دو۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی ''ابھی تو تمہیں بہت سے قصے سنانا ہیں۔ میں اپنی داستان سنائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی!''

میں اس گلاب رنگت پشتون دوشیزہ کے بارے میں سوچنے لگا۔ ابھی یہ کل صبح ہی کی تو بات تھی جب میں لاہور میں تھا۔ زرگل نے ہمارے ساتھ کراچی آنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور جب ہم نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا تو اس نے انتہائی غیر متوقع رویّے کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گئی تھی، مجھے جانا ہوگا۔ میری منزل مجھے پکار رہی ہے!

میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی کراچی میں زرگل سے دوبارہ ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے اس کے تیور سے بھانپ لیا کہ سرِدست وہ میرے کسی استفسار کا جواب نہیں دے گی لہٰذا میں نے سوال کرنے سے اجتناب برتا اور موجودہ صورتِ حالات پر غور کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اطلاع دی گئی کہ میری امانت کے ساتھ بند وین ایجنسی کے دفتر کے باہر پہنچ گئی ہے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر ہم سب دفتر سے نکل آئے۔ عنایت اللہ باجوہ نے اپنی ذمے داری نبھاتے ہوئے مجھے امانت چیک کروائی اور کہا۔

''اس صندوق کی سیلنگ سے پہلے میں نے احتیاطاً اس کے اندر کھانے پینے کی چند اشیا بھی رکھ دی تھیں تاکہ اگر یہ بندہ ہوش میں آ جائے تو ان اشیا پر منہ مار سکے۔ میرے خیال میں اس نے کچھ ''منہ ماری'' کی کوشش تو کی ہے!''

میں نے بغور اس صندوق کے اندر موجود فیصل کا جائزہ لیا اور باجوہ کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود بھی اس نے منہ کے ذریعے اپنے معدے میں کچھ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ باجوہ نے مذکورہ اشیا اس کی ''پہنچ'' میں رکھی تھیں۔ اس وقت فیصل نیم بے ہوش تھا۔ اس تالا بند صندوق کی چابی میرے پاس محفوظ تھی۔

میں نے عنایت اللہ باجوہ کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اس سے ایک بھرپور مصافحہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا آیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ واپسی کے سفر میں زرگل بھی ہمارے ساتھ تھی۔ وین کا ڈرائیونگ کیبن خاصا کشادہ تھا۔ زرگل کھڑکی یعنی شیشے والی سائیڈ میں میرے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بدستور خاموش اور سنجیدہ تھی۔

میں نے محسوس کیا، شہزاد کن انکھیوں سے کئی بار الجھن زدہ انداز میں زرگل کو دیکھ چکا تھا پھر اس کی تشویش زبان پر آ گئی۔ مجھ سے کہنے لگا۔

''وجدان! میں ان محترمہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میری بات کو محسوس نہ کرنا۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کیا انہیں اس بنگلے پر لے جانا مناسب ہوگا؟''

بنگلے سے اس کی مراد وہ زیرِ تعمیر عمارت تھی جہاں ہم نے فیصل کو رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے کہا ''ان محترمہ کے بارے میں جان لو کہ یہ بڑی دشمن دار اور جنگ جو خاتون ہیں لہٰذا اس مشن میں ان کی موجودگی سے کوئی حرج نہیں ہوگا۔ ویسے بھی یہ فیصل والے معاملے سے اچھی طرح واقف ہے۔ تم اسے اپنا بااعتماد ساتھی بھی سمجھ سکتے ہو۔''

شہزاد نے ایک گہری سانس خارج کی اور مطمئن انداز میں گردن ہلانے لگا۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے ہم بنگلے پر پہنچ گئے۔

وہ بنگلا ڈیفنس سوسائٹی کے ایک ایسے فیز میں تھا جو ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ مکمل اور رہائش کے قابل بنگلوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور جو بنگلے واقعی تیار تھے ان میں بھی ضروری نہیں تھا، رہائش اختیار کر ہی لی گئی ہو۔ منہاس باقر والا بنگلا ابھی تعمیر کے آخری مراحل میں تھا۔ نہ میں نے پوچھا اور نہ ہی منہاس نے بتایا کہ اس بنگلے کی تعمیر کا کام کیوں روک دیا گیا تھا۔

شہزاد نے بنگلے کے گیٹ کے نزدیک وین روکی اور ایک مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔ اس کے بعد گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ لگ بھگ پندرہ سیکنڈ بعد ایک گن بردار شخص گیٹ پر نمودار ہوا اور اس نے ہمارے لیے گیٹ وا کر دیا۔ ہم وین سمیت بنگلے کے اندر پہنچ گئے۔ گیٹ دوبارہ بند ہو گیا۔

منہاس باقر نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اس بنگلے کا انتخاب کیا ہوگا۔ شہزاد نے مجھے بتایا کہ وہ پہلے بھی وہاں آتا رہا تھا۔ میں نے شہزاد اور گن بردار شخص کی مدد سے فیصل والے سوراخ دار صندوق کو بنگلے کے ایک دور افتادہ کمرے میں پہنچایا۔ اس کمرے کے ایک حصے میں فرش سے چھت تک پرانے اخبارات کے بنڈل رکھے ہوئے تھے۔ منہاس باقر شاید اسے گودام کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا، بنگلے کے مزید دو کمرے اخبارات کے بنڈلوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ہم نے صندوق کھول کر فیصل کو باہر نکالا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ اب وہ پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا لیکن اس کی کسمپرسی مثالی تھی۔ وہ جتنے طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد وہاں پہنچا تھا اس نے فیصل کی مت ماردی تھی اور...... صندوق نشین ہونے سے پہلے بھی اس کے ساتھ خاصا شان دار سلوک ہو چکا تھا۔

جتنی دیر میں، میں فیصل کی بندشیں کھولتا، شہزاد نے بنگلے کے اندر سے ضروری سامان مہیا کر دیا جس کا پہلے سے بندوبست کیا گیا تھا۔ اس دوران میں گن بردار رکھوالا مسلسل فیصل کو اپنے نشانے پر رکھے رہا تاکہ وہ کسی مہم جوئی کے خیال سے باز رہے۔

میں نے شہزاد کے فراہم کردہ سامان میں سے ایک ہتھکڑی نکالی اور فیصل کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر اسے یہ آہنی زیور پہنا دیا۔ وہ اگرچہ ہوش میں تھا لیکن گن پوائنٹ پر

اس نے کسی جرأت مندی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم اس نے ہاتھ پاؤں جھٹک کر کمزور سا احتجاج ضرور کیا۔ بہرحال، وہ صندوق والی زندگی کی بہ نسبت اب خاصے اچھے حال میں تھا۔ میں نے تھوڑی سی کوشش کر کے اس کے پاؤں میں بیڑی پہنا دی پھر ایک مضبوط آہنی زنجیر کو ہتھکڑی اور بیڑی کے ساتھ باہم منسلک کرنے کے بعد اس زنجیر کا دوسرا سرا چھت میں لگے ہوئے کنڈے میں پھنسا دیا۔ اس زنجیر کی لمبائی اتنی تھی کہ فیصل اس کمرے میں دو چار قدم چل سکتا تھا۔

گن بردار شخص نہایت ہی چوکنا نظر سے مجھے یہ کارروائی کرتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب میں اس کام سے فارغ ہوا تو اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''سر جی! آپ نے تو اس نوجوان کو ایسا فٹ کر دیا ہے کہ اس کی نگرانی کی ضرورت بھی نہیں رہی۔''

''لیکن اس کے باوجود بھی تم اس کی طرف سے کسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔'' میں نے تنبیہی انداز میں کہا ''تم نہیں جانتے، یہ کتنا خطرناک ہے۔ اسے بے دست و پا دیکھ کر کسی خوش فہمی میں نہ پڑ جانا۔''

''اوکے سر!'' وہ فرماں برداری سے بولا ''آپ فکر ہی نہ کریں۔ میں اپنے کام کے ساتھ پورا انصاف کرتا ہوں۔''

شہزاد نے کہا ''وجدان! سہیل اپنے فن کا ماہر ہے۔ مجھے امید ہے، امن و امان کی کوئی صورت حال پیش نہیں آئے گی، ویسے میں بھی بیشتر وقت اسی بنگلے پر گزاروں گا۔ یہ سورما کوئی غلط حرکت نہیں کر سکے گا۔'' اس کا اشارہ واضح طور پر فیصل کی جانب تھا۔

''تم ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ لے آؤ۔'' میں نے شہزاد سے کہا ''تاکہ ہم اپنا اہم کام شروع کر سکیں۔ میرے خیال میں اب یہ بولنے کے قابل ہو گیا ہے۔''

اس بنگلے میں فون تو موجود تھا لیکن میں دانستہ چوہدری نوازش علی کو فیصل کی آواز براہِ راست سنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے لیے یہ ''ریکارڈڈ'' جھلکیاں ہی کافی ہوتیں اور اگر وہ زیادہ ہی ضد کرتا تو پھر بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ اس بنگلے کے آس پاس دور دور تک کوئی اور بنگلا نظر نہیں آتا تھا لیکن منہاس باقر نے اپنے تعلقات اور اختیارات استعمال کر کے اس ادھورے بنگلے میں بھی فون کی سہولت حاصل کر لی تھی۔ تعلقات اور اختیارات ایک طرح سے حل المشکلات ہوتے ہیں جو ہر ناممکن کو چٹکی بجاتے میں ممکن کر دکھاتے ہیں!

عنایت اللہ باجوہ نے مجھے بتایا تھا، کراچی پہنچنے کے بعد اس نے فیصل کو چند گھونٹ پانی بھی پلایا تھا۔ میں نے دوبارہ اسے تھوڑا کھلایا پلایا تاکہ وہ بات کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس میں ذرا توانائی آئی تو وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اس کے پوری طرح بحال ہونے کا انتظار کیا پھر ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر ریکارڈنگ کا بٹن دبا دیا۔

فیصل بے بسی اور لاچاری کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ تاہم اس کی رگوں میں چوہدری نوازش علی کا خون دوڑ رہا تھا لہٰذا اس کی پھنکار میں کوئی کمی نہ آئی۔ آواز دھیمی مگر تنتناہٹ وہی تھا، فرعونیت کا غماز! اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنے والا۔ وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''تمہیں اندازہ نہیں وجدان، تمہاری اس حرکت کا کتنا بھیانک نتیجہ سامنے آئے گا۔''

میں نے کہا ''میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے، حرکت میں برکت ہے اس لیے مصروف رہنے کی کوشش کرتا ہوں اور جہاں تک کسی بھیانک نتیجے کی برآمد کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے، وہ صرف اور صرف تمہارے لیے ہی بھیانک ہوگا۔''

وہ چند لمحے کینہ توز نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر غصے سے بولا ''میں نے تمہاری بہادری اور شجاعت کے بہت قصے سنے ہیں لیکن تمہارے رویّے کو دیکھ کر لگتا ہے، وہ سب جھوٹے فسانے تھے۔ تم درحقیقت بہت ہی بزدل ہو، بالکل اپنے باپ کی طرح!''

وہ والد صاحب کا ذکر چھیڑ کر مجھے تاؤ دلانا چاہتا تھا لیکن میں اس کی چال میں نہ آیا اور کہا ''تم نے میرے کس رویّے سے اندازہ لگایا کہ میں بزدل ہوں؟''

''کیا تم اسے بہادری سمجھتے ہو کہ مجھے آہنی زنجیروں میں جکڑ کر خود کو فاتح تصور کر رہے ہو؟'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا ''اگر تم نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے تو پھر میرے ہاتھ پاؤں کھول کر دیکھو، میں تمہیں بتاؤں گا کہ اصل بہادری کیا ہوتی ہے۔ تمہیں چیر پھاڑ کر نہ رکھ دیا تو میرا نام فیصل نہیں۔''

اس نے مجھے غصہ دلانے کے لیے والد صاحب کے بعد میری والدہ کا تذکرہ کیا تھا لیکن میں اس کی چال سمجھ رہا تھا اس لیے کہا ''میں تمہیں اپنی بہادری آزمانے کا پورا موقع دوں گا فیصل لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں۔ دراصل میرے نزدیک عیبی جانور کی نہ تو قربانی جائز ہے اور نہ ہی لاچار دشمن پر ہاتھ اٹھانا۔''

''میں لاچار اور بے بس نہیں ہوں۔'' وہ پوری ڈھٹائی سے بولا ''مجھے آزاد کر کے دیکھ لو۔ میں دو منٹ میں تمہیں چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔''

میں نے متحمل لہجے میں کہا ''اگر تم بے بس اور مجبور نہیں

ہوتو پھر خود ہی آزاد ہو جاؤ۔"

اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ اس کی اس حرکت پر شہزاد نے اسے دھنک کر رکھ دیا۔ میں نے فوراً شہزاد کا ہاتھ روک لیا اور فیصل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفاکی سے کہا۔

"میں نے تمہاری یہ تعلیاں اور گیدڑ بھبکیاں سننے کے لیے ریکارڈنگ شروع نہیں کی۔ اگر تم اس کیسٹ کے ذریعے اپنے باپ کے لیے کوئی پیغام ریکارڈ کروانا چاہتے ہو تو مختصر الفاظ میں بک دو ورنہ میں ٹیپ بند کر رہا ہوں۔"

وہ ایک مطلق العنان چوہدری کا اکلوتا بیٹا تھا۔ آج تک کسی نے اس لہجے میں اس سے بات نہیں کی ہوگی۔ میرے انداز پر وہ تلملا کر رہ گیا اور بے دریغ مغلظات پر اتر آیا۔ میں نے پندرہ بیس سیکنڈ تک اس کی بے ہودہ گوئی کو ریکارڈ کیا اور ریکارڈنگ ختم کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے اس مہلت کو اپنے خاندانی پس منظر کو اجاگر کرنے میں ضائع کر دیا۔ تمہاری یہ بکواس جو بھی سنے گا، یہی کہے گا کہ تم بہت ہی گھٹیا اور کمینے ہو۔" میں نے چند لمحات کے لیے توقف کیا پھر سنجیدگی سے کہا "میں اس پندرہ بیس سیکنڈ کی ریکارڈنگ کو چھوڑ کر باقی کیسٹ صاف کر دوں گا اور تمہارے باپ کو یہی حصہ سناؤں گا۔ ہوسکتا ہے، ذلالت کے میدان میں وہ تمہیں انڈر اسٹیمیٹ کر رہا ہو۔ اس کیسٹ کو سننے کے بعد اسے پتا چلے گا کہ تم اس سے چار ہاتھ آگے ہو اور...... میں چوہدری کو یہ باور کرانے میں خاصی آسانی محسوس کروں گا کہ اگر اس نے میرا مطالبہ پورا نہ کیا تو اس کے بیٹے کو کس دردناک عذاب سے گزرنا ہوگا۔ ابھی تو تم نے صرف بھونکنا شروع کیا ہے۔ میں تمہیں اس قدر عاجز کر دوں گا کہ تم کاٹنے پر اتر آؤ گے اور کاٹو گے بھی خود کو، نوچو گے بھی خود کو۔"

اس کے منہ سے ایک مرتبہ پھر گالیوں کا گٹر ابلنے لگا۔ میں اسے گارڈ سہیل کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شہزاد کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔ ایک دوسرے کمرے میں آنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"شہزاد! میں نے فیصل کو آہنی زنجیر کا پابند بنا کر بے بس کر دیا ہے۔ وہ اس کمرے میں دو چار قدم سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا اور وہ بھی ایک محدود حصے میں۔ اس بات کی امید تو نہیں کہ وہ خود کو آزاد کرا لے گا یا کسی قسم کی گڑبڑ پھیلائے گا لیکن میں صرف ایک گن بردار پر تکیہ نہیں کر سکتا جبکہ میں سہیل کی صلاحیت سے پوری طرح واقف بھی نہیں۔ میں یہ چاہوں گا، تم ہمہ وقت یہاں موجود رہو کم از کم اس وقت تک جب تک میں چوہدری نوازش علی سے مذاکرات نہیں کر لیتا۔"

"ٹھیک ہے، یہ میں کر لوں گا" شہزاد نے کہا "ہم فیصل کے سلسلے میں کسی قسم کا کوئی رسک نہیں لیں گے۔"

میں نے کہا "آج کی رات میں طارق روڈ والے فلیٹ پر گزاروں گا اور تمہیں ریلیف دینے کے لیے کل یہاں آجاؤں گا۔ تم کل کا پورا دن آزادانہ گزارنا اور اس دوران میں زیادہ وقت اس کام کو دینا جو فواد سے متعلق ہے۔"

شہزاد کو میری یہ تجویز پسند آئی۔ پوچھنے لگا "فیصل کے بارے میں کوئی خاص ہدایت؟"

میں نے تاکیدی انداز میں کہا "اسے کبھی بے بس اور کمزور نہ سمجھنا۔ بلیک بیلٹ سیکنڈ ڈان کسی بھی وقت کوئی چمتکار دکھا سکتا ہے۔ تمہیں ہر وقت چوکنا اور چوکس رہنا ہوگا۔ یہ الٹی سیدھی بکواس کر کے تمہیں طیش دلا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں تحمل اور برداشت سے کام لینا اور اس کے قریب جانے کی کوشش نہ کرنا، یہی ہدایت گارڈ سہیل کے لیے بھی ہے۔ فیصل سے ہر چال کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

میں چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا۔ شہزاد پوری توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا "بس آج کی رات اہم ہے۔ کل رات سے پہلے پہلے میں بازی کو پلٹ دوں گا۔ چوہدری نوازش علی کو میرے سامنے گھٹنے ٹیکنا ہوں گے۔ اگر اس نازک موقع پر اس نے کسی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو وہ اپنے بیٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔"

پھر میں نے شہزاد کو فیصل کے کھانے پینے کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائیں اور گہری سنجیدگی سے کہا "فیصل ہمارے لیے اور چوہدری نوازش کے لیے بہت قیمتی ہے، اس لیے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اگر چوہدری کی عقل میں میری بات آجاتی ہے تو ہمیں فیصل کو صحیح و سالم واپس کرنا ہوگا۔ اس کی تندرست واپسی سے ساحل کا حصول منسلک ہے۔ میں اپنی ساحل کو کوئی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

شہزاد معنی بھرے انداز میں سر کو اثباتی حرکت دینے لگا۔ وہ منہاس باقر کا معتمدِ خاص تھا اور اس کے بہت قریب بھی اس لیے ساحل والا معاملہ اس سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ مزید چند منٹ وہاں گزارنے کے بعد میں زرگل کے ساتھ اس بنگلے سے نکل آیا۔

شہزاد نے بہت اصرار کیا کہ وہ مجھے فلیٹ پر چھوڑ آتا ہے لیکن میں نے اس کی بات نہ مانی اور کہا "ہم دونوں میں سے کسی ایک کا ہر وقت یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ میں تھوڑا پیدل چل لوں گا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ یہ علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ تھوڑے فاصلے سے مجھے ٹیکسی مل جائے گی۔"

میں ڈیفنس سوسائٹی کے اس غیر آباد فیز میں صرف ایک مرتبہ پہلے آیا تھا لیکن اس علاقے کا نقشہ بڑی حد تک میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں زرگل کے ساتھ چلتے ہوئے ایک کشادہ سڑک پر نکل آیا۔ اس دوران میں ایک دو خالی ٹیکسیاں ہمارے قریب سے گزریں لیکن میں نے کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی تو زرگل خاموش نہ رہ سکی۔

"کہاں تک پیدل چلاؤ گے وجدان؟" اس نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے بڑی گہری نظر سے اسے دیکھا اور کہا "کیوں، کیا پیدل چلنے میں تمہیں کوئی دقت محسوس ہو رہی ہے؟"

"ایسی بات نہیں" وہ جلدی سے بولی۔

میں نے پوچھا "کیا تم پہلے کبھی کراچی آئی ہو؟"

اس نے نفی میں جواب دیا "یہ پہلا موقع ہے اور خاصا ہنگامہ پرور موقع ہے۔"

"تو پھر یہاں کے علاقوں اور راستوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کرو" میں نے اندھیرے میں دور تک دیکھتے ہوئے کہا "میں بھی یہ چہل قدمی اسی مقصد سے کر رہا ہوں۔"

وہ چند لمحے میرے ہم قدم خاموشی سے چلتی رہی پھر اس نے پوچھا "کیا طارق روڈ تک ہم یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے جائیں گے؟"

ٹاور سے ڈیفنس سوسائٹی کے اس بنگلے تک آنے کے دوران میں ہمارے درمیان ابتدائی گفتگو ہو چکی تھی اور میں نے زرگل کو بتایا تھا، میں طارق روڈ پر ایک فلیٹ میں رکا ہوا ہوں۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "طارق روڈ یہاں سے خاصا دور ہے۔ وہاں تک پیدل جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ اب جو بھی ٹیکسی نظر آئے گی، ہم اس میں بیٹھ جائیں گے۔"

آئندہ دس منٹ میں کوئی ٹیکسی ہماری نگاہ میں نہ آسکی اور چہل قدمی کا شوق جی بھر کر پورا ہو گیا۔ پھر ہم ایک یلو کیب میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔

جب ہم طارق روڈ پہنچے، رات کے سوا نو بجے تھے۔ فلیٹ پر جانے سے پہلے میں نے ڈنر کرنا ضروری سمجھا اور زرگل کو لے کر ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ اس وقت طارق روڈ پوری طرح جاگ رہا تھا اور ہر طرف رنگ و روشنی کا ایک سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ طارق روڈ بنیادی طور پر شاپنگ ایریا ہے۔ یہ مارکیٹ خاصی دیر سے کھلتی ہے، اسی لیے رات گئے تک کھلی رہتی ہے۔ جن علاقوں میں شاپنگ کے لیے آنے والوں کا رش ہو وہاں ریسٹورنٹس اور کھانے پینے کے دیگر اسپاٹس کی بہتات ہوتی ہے۔ کراچی والوں کا یہ مزاج ہے کہ وہ شاپنگ کو ایک تفریح سمجھ کر کرتے ہیں اور خورونوش ہر تفریح کا لازمی جز ہے۔

ہم جس ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے آئے تھے، وہاں سیلف سروس کا سسٹم تھا چنانچہ میں نے زرگل سے اس کی پسند دریافت کی اور اسے ایک میز پر چھوڑ کر خود کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

کاؤنٹر پر لوگوں کے جمِ غفیر کو دیکھ کر لگتا تھا، آج پورا کراچی یہیں ڈنر کرے گا۔ میں اپنا آرڈر نوٹ کروانے کے لیے ادائی کاؤنٹر کی جانب آیا تو لوگوں کے ہجوم میں ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر چونک اٹھا۔

وہ فواد تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک مہ جبیں بھی تھی اور وہ ابھی ریسٹورنٹ میں داخل ہی ہوئے تھے۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا، فواد کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ وہ اتنے اطمینان میں نہ رہتا۔ گلستان جوہر والے فلیٹ میں جس طرح میں نے اس کی درگت بنائی تھی وہ اس کے لیے ناقابلِ فراموش تھی۔ شہزاد کی تحقیق کے مطابق آج کل وہ گارڈن ایسٹ کے ایک فلیٹ کے چکر لگا رہا تھا اور ریسٹورنٹ میں آنے کا صرف ایک ہی مقصد تھا، وہی جس مقصد سے ہم وہاں پہنچے تھے۔

فواد اپنی ساتھی سے سرگوشیاں کرنے لگا تو میں انہیں نگاہ میں رکھتے ہوئے زرگل کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر چونکی لیکن اس کے کسی سوال سے پہلے ہی میں نے کہا۔

"ہم اس ریسٹورنٹ کے اندر بیٹھ کر نہیں کھا سکیں گے۔"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے اپنے پرس میں سے کچھ رقم نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید کہا "میں ریسٹورنٹ سے باہر فٹ پاتھ پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم مطلوبہ کھانا پیک کروا کے باہر آجاؤ۔ پروگرام میں اس تبدیلی کی وجہ بعد میں بتاؤں گا۔ ہری اپ، سمجھ لو...... ایک ایمرجنسی ہے۔"

میرے اسٹائل نے اسے باور کرا دیا کہ کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی تھی یا ہونے جا رہی تھی۔ وہ رقم پکڑ کر فوراً کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ میں محتاط نظر سے فواد کو تکتے ہوئے ریسٹورنٹ سے باہر آگیا۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکا تھا ورنہ صورتِ حال خاصی تبدیل ہو جاتی۔

ریسٹورنٹ سے باہر آنے کے بعد میں نے داخلی دروازے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کسی ٹیکسی کی تلاش شروع کردی۔ جلد ہی مجھے اس کوشش میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ میرے نزدیک ہی ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ اس نے تین مسافروں کو ڈراپ کیا۔ میں فوراً آگے بڑھ کر ڈرائیور سے مذاکرات کرنے لگا۔

''مجھے چند گھنٹوں کے لیے تمہاری ٹیکسی چاہیے'' میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''کہاں جائیں گے؟'' ادھیڑ عمر ٹیکسی والے نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا ''اس کا فیصلہ میں نے ابھی نہیں کیا۔ کہیں بھی چلے جائیں گے۔''

میں ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرتے ہوئے چوکنا نظر سے ریسٹورنٹ کے دروازے کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے جواب نے ٹیکسی والے کو الجھا دیا۔ اس نے کہا ''کہیں بھی چلے جائیں گے' کیا مطلب؟''

میں نے ایک فوری بہانہ تراشا ''وہ دراصل بات یہ ہے کہ اس وقت میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ہوں۔ وہ ریسٹورنٹ سے کھانا لینے گئی ہے۔ ہم تمہاری ٹیکسی میں بیٹھ کر کچھ کھائیں پئیں گے اس کے بعد سڑکوں کی سیر کریں گے اور بس!''

ٹیکسی ڈرائیور نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور کہا ''ٹھیک ہے' میٹر سے جو بنے، دے دینا'' وہ مجھے کوئی من چلا سمجھا ہوگا جو گرل فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر ہو۔

میں نے کہا ''میٹر کے حساب سے تمہارا نقصان ہو جائے گا۔ ممکن ہے' راستے میں ہم کہیں رک بھی جائیں۔ اس صورت میں تمہیں ٹیکسی روکنا ہوگی اور تمہارا میٹر بھی رک جائے گا کیونکہ اس کا چلنا اور رکنا تو پہیے کا مرہونِ منت ہے۔''

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''ٹھیک ہے' پھر ہم فی گھنٹا طے کر لیتے ہیں لیکن ایک بات بتا دوں' آپ مجھے کسی سنسان یا اندھیری جگہ پر ٹیکسی روکنے کو نہیں کہو گے۔''

میں اس کی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ وہ ہمیں کوئی ایسا جوڑا تصور کر رہا تھا جو ڈیٹ پر ہوں اور راز و نیاز کے لیے انہیں کوئی مناسب جگہ میسر نہ ہو، وہ اس مقصد کے لیے ٹیکسی کو استعمال کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

''تم جو کچھ سمجھ رہے ہو' ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں ٹیکسی کو بارونق اور روشن مقام پر رکواؤں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ جی! ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا پڑتا ہے نا'' ٹیکسی ڈرائیور اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولا ''آج کل بڑی سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔ آپ لوگ تو کچھ دے دلا کر جان چھڑا لو گے' میں غریب بے چارہ مارا جاؤں گا۔ وہ میری دن بھر کی کمائی پر ہاتھ صاف کر جائیں گے'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''آپ بیٹھو' اللہ مالک ہے۔''

ڈرائیور کے اس مختصر سے تجربے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک باتونی شخص تھا۔ بہرحال' ہمارے درمیان دو سو روپے فی گھنٹا پر معاملہ ٹھہر گیا۔ اسی وقت میں نے زرگل کو ریسٹورنٹ سے نکلتے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ وہ پیک کھانا اٹھائے تیزی سے میری طرف بڑھنے لگی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں ٹیکسی کی عقبی نشست پر بیٹھے ڈنر فرما رہے تھے۔ میں نے ڈرائیور کو صلح ماری تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ وہ رات کا کھانا کھا چکا تھا۔ میں نے کھانے کے دوران میں یہ محسوس کیا کہ وہ عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں حیران نظر سے چپکے چپکے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اسے حیران ہونا بھی چاہیے تھا۔ ہم ایک معزز اور آرام دہ ریسٹورنٹ کے ماحول کو چھوڑ کر اس کی ٹیکسی میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

اس دوران میں' میں ایک لمحے کے لیے بھی فواد کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ابھی تک ریسٹورنٹ سے باہر نہیں آئے تھے جس کا مطلب تھا' وہ کھانے کے لیے اندر ہی بیٹھ گئے تھے۔ ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ فواد اپنی ساتھی کے ہمراہ ریسٹورنٹ سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا ''اس جوڑے کو دیکھ رہے ہو؟'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے مزید کہا ''تمہیں ان کا تعاقب کرنا ہے لیکن تھوڑا فاصلہ رکھ کر' انہیں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے۔''

ابھی تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ فواد وہاں سے اکیلا ہی رخصت ہوگا یا وہ حسینہ بھی اس کے ساتھ جائے گی اور اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا' وہ کیسے واپس جائیں گے۔ اپنی گاڑی میں' کسی ٹیکسی میں یا پھر پبلک ٹرانسپورٹ کا سہارا لیں گے۔ تعاقب والی بات نے ٹیکسی ڈرائیور کو چونکا دیا۔ اس نے بھاؤ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

''جناب! یہ تو آپ ایک نئی بات بتا رہے ہیں۔ اس حساب سے تو دو سو روپے فی گھنٹا کم ہیں'' وہ صرف ٹیکسی

ڈرائیور ہی نہیں بلکہ خاصا کاروباری بھی تھا۔

میں اس کی نیت کو سمجھ رہا تھا اور حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں دس پچاس کے لیے بات کو خراب نہ کروں۔ سو' ڈیڑھ سو اگر زیادہ دینا پڑتے تو مجھے کوئی فرق نہ پڑتا' البتہ وہ جی جان سے خوش ہو کر میرے احکام کی تعمیل کرتا۔

میں نے کہا ''تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ناراض نہیں جانے دوں گا'' پھر میں نے اس کے دلی اور ذہنی اطمینان کی خاطر اضافہ کیا ''بات دراصل یہ ہے کہ وہ لڑکی میرے ایک عزیز کی بیٹی ہے جو اس کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ اس نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ میں معلوم کروں' فرزانہ کس کے ساتھ اور کہاں جاتی ہے'' پھر میں نے زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا ''آج اس ڈرامے کا ڈراپ سین بھی ہو جائے گا۔''

زرگل نے اس موقع پر عقل مندی کا ثبوت دیا اور مجھ سے یہ نہیں پوچھا' کون سا ڈراما اور کیسا ڈراپ سین! میں نے ابھی تک اسے پروگرام کی تبدیلی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ فرزانہ کے حوالے سے میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے جو گفتگو کی تھی اس پر وہ چونکی ضرور تھی تاہم اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ مصلحت اور حالات کے تقاضوں کو نبھانا جانتی تھی۔ وہ سمجھ گئی ہوگی' میں کسی خاص مشن پر ہوں۔

تھوڑی ہی دیر بعد یہ تعاقب شروع ہو گیا۔ فواد سفید شیرڈ میں ہماری ٹیکسی کے آگے جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی کو محدود اور محتاط فاصلے پر رکھا ہوا تھا تاکہ شیرڈ نگاہ سے اوجھل ہو سکے اور نہ ہی انہیں تعاقب کا احساس ہو۔

فواد میرے لیے امید کی کرن کے مانند تھا۔ میں اس کرن کی روشنی میں شعیب غوری کے قریب پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ شعیب نے دوستی کی آڑ اور دشمنی کے بھاڑ میں مجھ پر جو قرض چڑھایا تھا اسے سود در سود واپس لوٹانا ضروری تھا اور میں اس ادائی کا آغاز کر چکا تھا۔ کبیر شاہ شعیب کا دستِ راست سمجھا جاتا تھا' میں نے اسے اپاہج کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا اور اب فواد کی باری تھی۔ اگر وہ مجھے شعیب تک پہنچانے کا وسیلہ ثابت نہ ہو سکا تو اس کا حشر کبیر شاہ سے زیادہ بھیانک ہوتا۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ شعیب غوری اور اس کی نام نہاد اصلاحی تنظیم سی ایف کے، یہودی لابی کے اشاروں پر ناچتی ہے' میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ ان لوگوں کو تباہ و برباد کر دوں گا۔ ایسے ملک دشمن اور یہود نواز لوگوں کو نیست و نابود ہو جانا چاہیے۔ شعیب غوری ایک نازک معاملے میں بھی میرا کھلا دشمن تھا۔ اس نے مجھے کمزور بنانے اور جھکانے کے لیے ساحل کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ اسے یقین تھا' میں ساحل کو ڈھونڈتا ہوا اس کے پاس ضرور آؤں گا اور وہ مجھے شکار کر لے گا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی فیصلہ کرتا کہ شکاری کون ہے اور شکار کس کا ہوا!

ٹیکسی ڈرائیور نے بڑی مہارت سے تعاقب جاری رکھا اور ہم بریو روڈ (گارڈن ایسٹ) کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ کے پاس پہنچ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی سفید شیرڈ سے خاصے فاصلے پر ایک گاڑی کے عقب میں روکی تھی۔ میں نے دیکھا' فواد شیرڈ کو اس بلڈنگ کے اندر لے گیا۔ یہ ایک تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا' وہ وہاں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہے بہ صورتِ دیگر وہ گاڑی کو باہر ہی چھوڑ کر اندر جاتا۔ خیر' جب ہم اس کے تعاقب میں تھے تو انتظار بھی کر سکتے تھے۔ اس طرح تو ہوتا ہے' اس طرح کے کاموں میں۔

میں نے تنقیدی نگاہ سے اس عمارت کا جائزہ لیا۔ وہ ایک چھ منزلہ لگژری اپارٹمنٹس بلڈنگ تھی۔ شہزاد علی مجھے بتا چکا تھا' فواد یہاں کسی غلام جیلانی نامی شخص سے ملنے آتا تھا جو فلیٹ نمبر چار سو دو میں رہتا تھا۔ فواد کے ساتھ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کو دیکھ کر میں مخمصے میں پڑ گیا۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ اس لڑکی کا فواد سے کا تعلق تھا تو حالات زیادہ واضح ہو جاتے' بہرحال میرے لیے فواد اس لڑکی سے زیادہ اہم تھا۔

آدھے گھنٹے تک ہم ٹیکسی میں بیٹھے انتظار کرتے رہے پھر ہمارا انتظار رنگ لے آیا اور فواد کی سفید شیرڈ بلڈنگ سے نکلتی ہوئی نظر آئی۔ گاڑی کے اندر فواد اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو تعاقب کا اشارہ دیا تو اس نے ٹیکسی کو شیرڈ کے پیچھے لگا دیا۔

میں گہری سوچ میں تھا۔ لڑکی کو وہاں چھوڑنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ اس لڑکی کا تعلق چار سو دو نمبر فلیٹ میں رہنے والے غلام جیلانی سے تھا اور فواد اسے ڈراپ کر کے واپس جا رہا تھا۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا کہ فواد کی وہاں آمد و شد کا کیا سبب تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور کی آواز پر میں خیالات سے چونک اٹھا۔ وہ پوچھ رہا تھا ''آپ کے عزیز کی لڑکی فرزانہ تو اپنے گھر پہنچ گئی لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ آدمی اسے چھوڑنے کے لیے اندر کیوں گیا...... اور نہ صرف اندر گیا بلکہ اس نے وہاں اچھا خاصا وقت بھی گزارا ہے جبکہ آپ نے بتایا تھا' فرزانہ چوری چھپے......''

''تمہیں یہ کس نے کہہ دیا کہ فرزانہ اپنے گھر پہنچ گئی

ہے؟'' میں نے درشتی سے کہا۔ اس کا دخل درمعقولات مجھے ناگوار گزرا تھا اس لیے سرزنش ضروری ہوگئی تاکہ وہ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھے۔ میں نے برہمی سے کہا ''اس بلڈنگ میں فرزانہ کی ایک دوست رہتی ہے۔ وہ اسی دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ ہمیں شک ہے' وہ دوست بھی اس سازش میں شریک ہے۔''

ٹیکسی ڈرائیور کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ اس کے بعد اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور سفید شیرڈ کا تعاقب کرتے ہوئے ہم گلشن اقبال کی حدود میں داخل ہوگئے۔ حسن اسکوائر سے تھوڑا آگے آنے کے بعد فواد نے گاڑی کو دائیں جانب موڑلیا اور سروس روڈ پر آنے کے بعد وہ مسجد بیت المکرم کے قریب سے ایک گلی میں داخل ہوگیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بھی بیت المکرم والی گلی میں داخل ہوکر تعاقب کے سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ پھر جب سفید شیرڈ اس گلی کے تقریباً آخری سرے پر واقع ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں داخل ہوئی تو میں نے زرگل کے کان میں سرگوشی کی۔

''سفید شیرڈ والا مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے'' اس کے بعد میں نے قدرے بلند آواز میں کہا ''دردانہ! میں یہاں ٹیکسی میں بیٹھا ہوں۔ تم دیکھ کر آؤ' وہ شخص کس فلیٹ میں جاتا ہے۔''

زرگل نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور کوئی سوال کیے بغیر ٹیکسی سے باہر نکل گئی۔ چند لمحات کے بعد وہ بلڈنگ میں داخل ہوگئی۔ میرے خیال میں فواد کو گاڑی پارک کرنے میں جتنا وقت لگتا' اس مہلت میں زرگل اس کے انتہائی قریب پہنچ جاتی۔

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی موجودی میں زرگل کو دردانہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ایسا میں نے محض احتیاط کے پیش نظر کیا تھا تاکہ بعد میں کوئی پے چیدگی پیدا نہ ہو۔ مجھے زیادہ دیر تک زرگل کا انتظار نہیں کرنا پڑا' دس منٹ بعد وہ دوبارہ میرے پہلو میں ٹیکسی کے اندر موجود تھی۔ میں نے استفساریہ نگاہ سے اسے دیکھا تو اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

ٹیکسی ڈرائیور باتونی ہونے کے ساتھ ہی سمجھ دار بھی تھا۔ میرے رویے سے اس نے اندازہ لگالیا کہ اس کی بے جا مداخلت مجھے پسند نہیں آئی اس لیے اس نے فواد کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی اور پوچھنے لگا ''یہاں رکنا ہے یا واپس چلیں؟''

میں نے ٹیکسی والے کو جواب دینے سے پہلے زرگل کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی

''میرا خیال ہے' وہ اب گھر سے نہیں نکلے گا۔ وہ ایک بند فلیٹ کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا ہے جس کا مطلب ہے' وہ اسی فلیٹ میں رات گزارے گا۔''

زرگل کا تجزیہ کسی تجربے کا محتاج نہیں تھا تاہم میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا ''ہم یہاں دس منٹ تک رکیں گے' پھر واپس چلیں گے۔''

پھر آیندہ دس منٹ تک کوئی غیر معمولی بات سامنے نہ آئی تو میرے حکم پر ڈرائیور نے ٹیکسی کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا۔

حسن اسکوائر سے طارق روڈ زیادہ فاصلے پر نہیں۔ ہم دس منٹ میں طارق روڈ پر تھے۔ ڈرائیور نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خاموشی سے ٹیکسی اسی ریسٹورنٹ کے سامنے لے جاکر روک دی جہاں سے اس نے ہمیں اٹھایا تھا۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ رات کے دس بج کر پچاس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا ''ہاں بھئی' تمہارا کیا حساب بنا؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی میلے ڈائل والی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا ''میں نے آپ کے لیے ڈیڑھ گھنٹا ٹیکسی چلائی ہے۔ اس کے تین سو روپے بنتے ہیں۔ آپ نے اوپر سے بھی دینے کا وعدہ کیا تھا' اب آپ کی جو مرضی!''

اس نے گیند میری کورٹ میں پھینک دی تو میں اس کی چالاکی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ میں نے سن رکھا تھا اور کسی حد تک مجھے اس کا تجربہ بھی تھا کہ بیشتر ٹیکسی ڈرائیور بے ایمان ہوتے ہیں۔ ہم نو پچیس پر اس کی ٹیکسی میں بیٹھے تھے اور دس پچاس پر ہمارا سفر ختم ہوگیا تھا۔ اس حساب سے اس کی ٹیکسی میں گزارا ہوا کل وقت ایک گھنٹا پچیس منٹ بنتا تھا۔ اگر وہ ڈیڑھ گھنٹا بتا رہا تھا تو اس میں بے ایمانی والی کوئی بات نہیں تھی اور پھر اس نے معاملہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اپنی خوشی سے اسے پانچ سو روپے دیے اور ہم ٹیکسی سے باہر آگئے۔ جو لوگ بے ایمان نہ ہوں' ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

فلیٹ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے زرگل کو فواد کے بارے میں مختصراً بتایا تاکہ اس کا ذہن صاف ہوجائے۔ وہ ساحل اور شعیب غوری کے حوالے سے' چوہدری نوازش علی سے ہونے والی میری گفتگو سن چکی تھی کیونکہ لاہور میں' میں نے صدف اور زرگل کی موجودی ہی میں چوہدری کو فون کیا تھا اس لیے اسے فواد اور سی ایف کے کی بات سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ آخر میں' میں نے اس سے

پوچھا۔

''تم نے فواد کو جس فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا ہے اس کا نمبر وغیرہ تمہیں یاد ہے نا؟ میں نے ٹیکسی والے کی موجودی میں تم سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا' تمہاری احتیاط پسندی مجھے اچھی لگی'' وہ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی پھر بتایا ''وہ بندہ فلیٹ نمبر ''تیرہ۔ ڈی'' میں داخل ہوا تھا۔ میں بغیر کسی راہنمائی کے اس فلیٹ کے دروازے تک پہنچ سکتی ہوں۔''

''اور تم نے بتایا ہے' وہ لاک فلیٹ کو کھولنے کے بعد اندر داخل ہوا تھا؟'' میں نے اپنا اطمینان کرنا ضروری جانا۔

زرگل نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا ''میں زینے کی آڑ میں چھپ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ فواد نامی اس شخص نے فلیٹ نمبر تیرہ۔ ڈی کے دروازے پر پہنچ کر پہلے چوکنا نظر سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جیب سے چابی نکال کر اس نے فلیٹ کا لاک کھولا تھا'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی ''میں نے اس کے اندر داخل ہونے کے بعد فلیٹ کے دروازے پر جاکر اس کا نمبر دیکھا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے' وہ اس فلیٹ میں اکیلا ہی ٹھہرا ہوا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''اور یہ بھی کہ وہ رات وہیں گزارے گا۔''

''لگتا تو ایسا ہی ہے'' وہ میری تائید کرتے ہوئے بولی پھر پوچھا ''کیا آج ہی اس کی گردن ناپنے کا ارادہ ہے؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی باتوں سے بڑی سرگرم اور ولولہ انگیز لگتی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں کے تجربے نے زرگل کو میرے ساتھیوں میں شمار کردیا تھا۔ اگر ہمارے ساتھ سیٹوں والا مسئلہ پیش نہ آجاتا تو میں اس کی کراچی آنے والی فرمائش پر ضرور غور کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات کے تقاضے نے ازاں بعد صدف کا سفر بھی ملتوی کردیا۔

میں نے زرگل کے سوال کے جواب میں کہا ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو یہ کام بھی کرنا ہی ہوگا۔ فی الحال میں سب سے پہلے چوہدری نوازش علی سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔''

منہاس باقر نے مجھے جس فلیٹ میں ٹھہرایا تھا' وہ مذکورہ ریسٹورنٹ سے زیادہ دور نہیں تھا لہٰذا چند منٹ ہی میں ہم اس فلیٹ تک پہنچ گئے۔

فلیٹ کے اندر آکر میں نے داخلی دروازے کو لاک کیا پھر فریش ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ اسی کام کی غرض سے زرگل نے دوسرے واش روم کی راہ لی۔ جب ہم تازہ دم ہوکر وہاں سے نکلے تو میں نے زرگل سے کہا۔

''میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں' تمہیں نیند خوب ستا رہی ہے'' ٹیکسی سے اترنے کے بعد وہ کئی بار جماہیاں لے چکی تھی اور ابھی چند ساعت پہلے بھی اس نے اسی عمل کو دہرایا تھا ''اس لیے بہتر ہوگا' تم دوسرے بیڈروم میں جاکر آرام سے سوجاؤ۔ تم سے میں تفصیلی بات صبح کروں گا۔''

اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا' جس میں شکایت اور خفگی بہ یک وقت شامل ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ منہ کو ڈھانپنے کے لیے اٹھ گیا۔ اسے ایک زبردست جماہی نے ایسا کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

''ٹھیک ہے وجدان! میرا خیال ہے' میں سو ہی جاتی ہوں'' وہ مخمور لہجے میں بولی ''لیکن اگر رات کے کسی وقت تمہارا مہم جوئی کا کوئی پروگرام بن جائے تو مجھے ساتھ لے جانا نہ بھولنا۔''

''اچھا' میں اس بارے میں سوچوں گا'' میں نے کہا ''تم پہلے سو تو جاؤ' بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔''

وہ مجھ پر ایک بھرپور اور معنی خیز نظر ڈالنے کے بعد بولی ''کیا تم ہمیشہ اتنے ہی مصروف رہتے ہو؟''

''ہاں، اتفاق سے میں نے ایسی ہی قسمت پائی ہے۔'' میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے' تم خاصے خوش قسمت ہو!''

میں نے چونک [illegible] طرف دیکھا۔ اس نے بڑی گہری بات کی تھی۔ [illegible] مجھے [illegible] دیکھ کر پوچھنے لگی ''وجدان! تم مجھ [illegible] ہو؟''

میں نے پوچھا ''[illegible] تک کھڑے کھڑے تمہیں میری خفگی کا خیال کیوں [illegible]؟''

''میں نے کل صبح لاہور میں جس رویے کا مظاہرہ کیا تھا اس پر تمہیں ناراض ہونے کا حق ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی ''اچانک میں نے گاڑی رکوائی اور تم لوگوں کو چھوڑ کر ایک طرف چل دی۔''

میں نے کہا ''اچھا کیا تم نے یاد دلا دیا۔ مجھے تو تم سے واقعی ناراض ہونا چاہیے تھا۔ یہ کیا حرکت کی تھی تم نے اور...... اور اس سے بڑی حرکت یہ کہ لاہور سے کراچی پہنچ گئی ہو؟''

''حرکت میں برکت ہے۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولی ''تھوڑی دیر پہلے یہی سبق تم فیصل کو بھی پڑھا رہے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

وہ جو حوالہ دے رہی تھی اس میں کچھ بھی غلط نہیں تھا۔ میں نے کہا ''اب خود ہی وضاحت بھی کردو کہ تمہاری ان حرکات میں کون کون سی برکات پوشیدہ ہیں؟''

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”وجدان یہ تو ہوسکتا ہے، تمہیں میری کہانی سننے میں کوئی خاص دلچسپی نہ ہو لیکن یقین جانو، میں تمہاری داستان سننے کے لیے بہت بے تاب ہوں اور تم نے اس کا مجھ سے وعدہ بھی کر رکھا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوکر ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جیسے نگاہی زبان میں پوچھ رہی ہو...... اپنا وعدہ یاد ہے نا! پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”لاہور میں میری زندگی ان گنت خطرات میں گھری ہوئی ہے۔ میرا دشمن نمبر دن، حکمت یار شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتا پھر رہا ہے۔ تمہارے دوست فرید پاشا کی کوٹھی میں روپوش تھی تو قدرے اطمینان تھا لیکن وہاں جو خونچکاں واقعات پیش آئے اور ازاں بعد تم صدف کے ساتھ کراچی چلے آئے، ان حالات نے مجھے انتہائی غیر محفوظ کردیا تھا۔ آ جا کر میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں بھی کراچی چلی جاتی ہوں۔ اس کے بعد ہی عنایت اللہ باجوہ کے پاس جانے کا آئیڈیا میرے ذہن میں آیا۔ بھلا ہو، فرید پاشا کا۔ اس نے میری بات سن لی اور مجھے باجوہ کے ساتھ کراچی آنے کا موقع مل گیا۔“ بات کے اختتام پر اس نے اپنے لبوں اور آنکھوں کو ایسی جنبش دی جس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ اپنے دلی تاثرات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔

میں نے پہلے بھی محسوس کیا تھا، وہ ویسی نہیں تھی جیسی نظر آتی تھی۔ وہ بہت گہری لڑکی تھی۔

میں نے کہا ”فرید پاشا ایک یار باش آدمی ہے اور میرے لیے جان چھڑکتا ہے۔ اس سے تم نے کیا باتیں کیں یہ تو میں اس سے پوچھ لوں گا۔ بہرحال، تم اتنی سیدھی اور بھولی نہیں ہو جیسی صورت اور باتوں سے نظر آتی ہو۔“

وہ میری توجہ ہٹانے کے لیے موضوع کو بدلتے ہوئے بولی ”تمہاری وہ ڈاکٹر دوست نظر نہیں آ رہی۔ کیا کراچی پہنچنے کے بعد اس نے اپنی راہ الگ کرلی ہے۔ وہاں تو وہ بہت چپکی چپکی چل رہی تھی!“

زرگل کی باتوں میں صدف کے لیے ایک واضح حسد جھلکتا تھا اور میرے لیے یہ خاصی تشویشناک بات تھی۔ میرے ساتھیوں کو ایک دوسرے پر رشک کرنا چاہیے تھا، حسد نہیں!

حسد اور رشک میں بہت معمولی سا فرق ہے۔ دونوں کے اظہار کے لیے انسان کا لہجہ بدل جاتا ہے، الفاظ وہی رہتے ہیں۔ بہرحال، حسد کرنے والا محض اپنا خون جلاتا ہے کیونکہ یہ ایک منفی جذبہ ہے جبکہ رشک کرنے والا اپنے مثبت جذبات کے اظہار سے حقیقی مسرت سے روشناس ہوتا ہے۔

میں نے اس معصوم صورت، شریر پشتون دوشیزہ کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا اور اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے، صدف میرے ساتھ کراچی نہیں آئی۔ وہ لاہور ہی میں رک گئی ہے۔“

پھر قبل اس کے کہ وہ کسی سوال کے لیے لب کشا ہوتی، میں نے تنبیہی لہجے میں کہا ”اب اس بحث میں نہ پڑ جانا کہ وہ لاہور میں کیوں رک گئی۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا، فوراً دوسرے بیڈروم میں جا کر گہری نیند کے مزے لوٹو۔“

”او کے۔ میں جارہی ہوں!“ وہ دل آویز انداز میں مسکرائی اور ”شب بخیر“ کہہ کر ملحقہ بیڈروم میں چلی گئی۔

زرگل کو میری عملی زندگی میں شریک ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ اب تک اس نے ایک اچھے اور وفادار دوست کی طرح ایکٹ کیا تھا لیکن میں لاشعوری طور پر اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ یہ بات نہیں کہ میں اس کی دوستی یا وفا پر شک کررہا تھا بلکہ میرے احساسات مجھے صرف اس لیے الجھا رہے تھے کہ میں اس کے پس منظر سے واقف نہیں تھا اسی لیے وہ کبھی مجھے کچھ نظر آتی اور کبھی کچھ اور دکھائی دیتی۔ اگر میں اس کی داستان کو تفصیل سے سن لیتا تو میرا یہ متاملانہ احساس زائل ہوسکتا تھا۔

میں نے سوچا، کچھ بھی ہو میں کل اتنا وقت ضرور نکال لوں گا کہ زرگل کے ماضی اور حال سے آگاہی حاصل کرلوں۔ مستقبل کا حال صرف خدا جانتا ہے...... اور کسی انسان کو اس جانکاری کے چکر میں پڑ کر اپنے ماضی اور حال کو داؤ پر نہیں لگانا چاہیے!

☆☆☆

یہ ایک بہت بڑی بازی تھی جس میں میری اور چوہدری نوازش علی کی متاع عزیز داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے لیے فیصل اور میرے لیے ساحل کی اہمیت ہر شے سے زیادہ تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے پیاروں کو حاصل کرنے کے لیے زندگی کی بساط پر اپنی اپنی چال چل رہے تھے۔

اس بساط پر ایک اور کھلاڑی بھی ہمارے ساتھ شامل تھا مگر ہم دونوں ہی اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ تقدیر نامی اس نادیدہ کھلاڑی کے بارے میں ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس وقت، کون سا مہرہ آگے بڑھائے گا اور ہمیں کتنا پیچھے دھکیلنے میں کامیاب ہوجائے گا! ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم دونوں میں سے ہار کس کے حصے میں آئے گی اور جیت کس کی پیشانی پر سجے گی! لیکن تقدیر، تیسرا کھلاڑی...... اس کھیل کے تمام نشیب و فراز اور عواقب و جوانب سے آگاہ تھا۔ اس کی آگاہی اور واقفیت مسلم تھی کیونکہ ہار اور جیت اسی کے طفیل تھی۔ گویا اصل کھلاڑی وہی تھا...... ہماری حیثیت اس کے آگے مہروں سے زیادہ نہیں تھی!

چوہدری نوازش علی سے رابطہ کرنے سے پہلے میں نے دو ضروری فون کیے۔ سب سے پہلے میں نے زیرِ تعمیر بنگلے میں شہزاد علی کو فون کیا اور فیصل کے بارے میں اس سے دریافت کیا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے اور امن و امان میں ہے۔“ شہزاد نے بتایا ”تم اس کی طرف سے مکمل اطمینان رکھو۔ جب تک میں یہاں موجود ہوں، اسے کسی ”خرمستی“ کا موقع نہیں دوں گا۔ ویسے بھی وہ اس حالت میں نہیں کہ زیادہ ایفی شنسی دکھا سکے۔“

میں نے شہزاد کو تازہ ترین واقعے سے آگاہ کیا اور بتایا ”میں نے فواد کے ٹھکانے کا سراغ لگالیا ہے۔ اب اسے چھاپنے کے لیے ہمیں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔“

”یار! یہ تم نے بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے۔“ وہ مسرت سے لبریز آواز میں بولا ”بہرحال، میں کل اس لڑکی کی کہانی بھی معلوم کرلوں گا، فواد نے جسے غلام جیلانی کے فلیٹ پر ڈراپ کیا ہے اور گلشن میں اس کی رہائش کی تفصیل بھی مجھے مل جائے گی۔“ پھر اس نے ذرا رک کر مجھ سے سوال کیا ”ویسے تمہارا کیا ارادہ ہے۔ فواد پر کب ہاتھ ڈالنا ہے؟“

”تم کب تک جاگ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”تم کہو تو ساری رات جاگتا رہوں گا۔“ وہ جاں نثاری کے انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”خیر، اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں ایک دو ضروری فون کرلوں پھر تم سے رابطہ کرتا ہوں۔ ہوسکتا ہے، آج ہی رات کے آخری پہر ادھر جانے کا موڈ بن جائے، کل کس نے دیکھی ہے!“

”ٹھیک ہے، میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“ وہ پُرجوش لہجے میں بولا ”تمہارے کراچی آنے سے میری رگوں میں خون کی گردش خاصی تیز ہوگئی ہے۔ امید ہے، مستقبل قریب میں بہت سی کامیابیاں ہماری قدم بوسی کرنے والی ہیں۔“

شہزاد کی جیدارانہ باتیں سن کر مجھے امتیاز علی کی یاد آ گئی۔ وہ بھی ایسا ہی نڈر اور دلیر مرد تھا اور شجاعت کے کاموں میں پیش پیش رہتا تھا۔ شاید یہ ان کے ناموں کے آخری حصے کا کمال تھا۔ خود میرے نام میں بھی یہ بابرکت لفظ موجود تھا۔ نام کے انسان کی ذات پر کتنے اثرات ہوتے ہیں، اس بحث میں پڑے بغیر اللہ کے شیر کی بہادری اور شجاعت سے انکار ممکن نہیں۔

میں نے شہزاد کے جذبات کے اظہار میں جواباً کہا ”خدا تمہاری زبان مبارک کرے!“

پھر ہمارے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوگیا۔

دوسرا فون میں نے منہاس باقر کو کیا اور اسے آج شام سے لے کر اب تک کی مصروفیت کے بارے میں بتایا۔ فیصل کی بہ حفاظت ”منتقلی“ سے متعلق اسے شہزاد سے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ فواد کے بارے میں سن کر اس نے مجھے مبارک باد دی۔ میں نے کہا۔

”منہاس صاحب! مجھے فوری طور پر دو تجربہ کار اور آزمائے ہوئے سیکیورٹی گارڈز کی ضرورت ہے۔ میں شہزاد کو اپنے ساتھ رکھ کر فواد کی طرف جانا چاہتا ہوں۔ یہ دونوں مسلح گارڈز وہاں فیصل کو دیکھیں گے۔“

وہ بولا ”اس بنگلے پر پہلے سے ایک تربیت یافتہ گن بردار موجود ہے۔“

”ایک سے تین بھلے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”میں فیصل کے سلسلے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔“

”ہوں۔“ اس نے متاسفانہ انداز میں کہا ”میں تمہاری فرمائش پوری کردوں گا۔ تم کب تک شہزاد کو اپنے پاس بلانا

چاہتے ہو؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد۔" میں نے اندازے سے اسے وقت بتا دیا۔

"ٹھیک ہے، اور کچھ؟"

"اور مجھے اپنے استعمال کے لیے ایک مستعد گاڑی بھی چاہیے۔" میں نے کہا "کل آپ مجھے کوئی اچھی سی گاڑی بھی خرید وا دیں۔ ادائیگی میں کردوں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میرے پاس ایک بالکل نئی ہنڈائی بالکل فارغ پڑی ہے۔ "ییلو کیب اسکیم" سے فائدہ اٹھا کر میں نے اس گاڑی کو حاصل کیا تھا لیکن اسے ٹیکسی نہیں بنایا۔ میں وہ گاڑی تمہارے لیے بھیج دیتا ہوں۔ دور سے وہ ٹیکسی ہی نظر آتی ہے مگر اس پر ٹیکسی والا مخصوص نیون سائن نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے حقیقی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "ایک ٹیکسی چلاتے ہوئے میں بہت لطف محسوس کروں گا اور نت نئے تجربات بھی ہوں گے۔ ویسے اس گاڑی کی کنڈیشن کیسی ہے؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس!" اس نے بتایا۔

"تو پھر ڈن!" میں نے کہا۔

اختتامی رسمیات کو نبھانے کے بعد میں نے رابطہ ختم کردیا۔

اس کے بعد میں نے رکھاں والی کے فرعون صفت چوہدری نوازش علی کے فون کی گھنٹی کھڑکا دی۔ یہ اس سے میرا تیسرا ٹیلی فونک رابطہ تھا۔ وہ لائن پر آیا تو میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"کہو چوہدری! کیسا مزاج ہے؟ تمہاری تن فن اور کلف لگی گردن میں کوئی نرمی آئی یا ابھی تک اسی طرح اکڑے ہوئے ہو؟"

"کیا تمہارے پاس بکواس کے سوا کہنے کو کچھ نہیں ہے؟" وہ پھنکارا۔

میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "بہت کچھ ہے میرے پاس، تمہارے سننے اور میرے کہنے کے لیے لیکن میں اپنی بعد میں کہوں گا، پہلے تم وہ سن لو جس کی خاطر میں نے آدھی رات کو تمہارا سکون برباد کیا ہے۔ میں نے سنا ہے، تم خاصے آرام طلب ہوگئے ہو!"

وہ میرے طنز کی کاٹ کو بمشکل برداشت کرتے ہوئے بولا "تم مجھے ایسی کون سی خاص چیز سنانا چاہتے ہو؟"

"ارے بھئی، تمہارے لمڈے کی آواز ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "کیا اپنے لختِ جگر کی پیاری پیاری باتیں نہیں سنو گے؟"

پھر اس سے قبل کہ وہ مجھے کسی ناقابلِ اشاعت خطاب سے نوازتا، میں نے فون کے ریسیور کو ٹیپ ریکارڈر کے اسپیکر کے سامنے رکھ کر پلے کا بٹن دبا دیا۔ کیسٹ کا ریکارڈ کیا ہوا آخری حصہ بذریعہ فون، کراچی سے لاہور کے ایک دور دراز گاؤں رکھاں والی میں نشر ہونے لگا۔

میں نے کیسٹ اور ٹیپ ریکارڈ کو پہلے ہی سیٹ کر کے رکھ دیا تھا، اس کے بعد ہی چوہدری نوازش علی کا نمبر ملایا تھا۔

پندرہ بیس سیکنڈ کی ریکارڈنگ پلک جھپکتے میں پلے ہوگئی۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر کو اسٹاپ کیا اور ریسیور کو کان سے لگاتے ہوئے چوہدری سے دریافت کیا۔

"اب تو تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ تمہارا سپوت میرے قبضے میں ہے اور زندہ بھی ہے۔"

"تم نے اس کی ریکارڈ کی ہوئی آواز مجھے سنائی ہے۔" وہ غصے سے بولا "میں براہِ راست فیصل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے پوری سفاکی سے کہا "فی الحال یہ ممکن نہیں۔ تم اسی ریکارڈڈ آواز سے گزارہ چلاؤ اور اس بات کو ذہن میں نقش کرلو کہ جب تک تم میرا مطالبہ پورا نہیں کرو گے، تمہارا بیٹا میرے ہاتھوں مشکل سے مشکل ترین حالات سے دوچار ہوتا رہے گا۔ تم نے اس کی آواز کا کرب تو محسوس کیا ہوگا!"

"وحدان! اولادِ شیطان!" وہ اپنے اعصاب پر قابو نہ رکھ سکا اور گرجدار آواز میں بولا "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ساحل اب شعیب غوری کے پاس پہنچ چکی ہے اور......"

"اور میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ تمہارا بیٹا اس وقت تو میرے پاس ہے لیکن یہ سدا میرے پاس نہیں رہے گا۔" میں نے اس کا جملہ اچکا اور ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "میرے ہاتھ سے نکل کر یہ "مصیبت زدہ" جہاں بھی جائے گا وہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہیں ہو سکے گی کیونکہ اس جہاں میں پہنچنے والوں کے نام اور پتے سنگی تختیوں پر کندہ کیے جاتے ہیں اور وہ بھی ایسے افراد کے جن کے لواحقین انہیں باقاعدہ اپنے ہاتھوں سے سپردِ زمین کرتے ہیں ورنہ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"ورنہ بے شمار ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی بوریوں میں بند لاشیں اخبارات کی شہ سرخیاں بنتی ہیں یا پھر گندے نالوں اور گٹرز میں سے برآمد ہونے والے ان کے تعفن زدہ

وجود معاشرے میں سنسنی اور سراسیمگی پھیلاتے ہیں میں......"

وہ میری بات کی تکمیل سے پہلے ہی پھٹ پڑا "مم...... میں...... میں نے کراچی نیٹ ورک کو پوری طرح...... سرگرم کردیا ہے......" اس کی آواز میں لرزش اور گھبراہٹ کی آمیزش تھی "تم فکر نہ کرو، میں بہت جلد تمہیں کھوج لوں گا۔"

"میں نے تمہاری دھمکیاں سننے کے لیے فون نہیں کیا چوہدری!" میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا "میں تمہیں اور تمہارے نیٹ ورک کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے کراچی اور لاہور نیٹ ورک کو میں تار تار کر چکا ہوں۔ کیا تم چوہدری دلدار اور میاں زاہد حسین کی لرزہ خیز اموات کو بھول گئے ہو؟"

وہ جواب میں کپکپاتی ہوئی آواز میں مجھے مغلظات میں تولنے لگا۔ یہ اعصاب شکنی کا بین ثبوت تھا۔ کمزور اور بے بس انسان اگر ساتھ ہی کم ظرف بھی ہو تو وہ گالم گلوچ پر اتر آتا ہے۔ چوہدری کمزور تو نہیں تھا تاہم میرے شکنجے نے اسے بے بس ضرور بنا دیا تھا اور اس کی کم ظرفی میں دو آرا نہیں ہو سکتی تھیں۔

میں نے دوٹوک انداز میں اسے مخاطب کیا اور کہا "میں تمہیں کل شام سات بجے تک کی مہلت دیتا ہوں۔ اس وقت تک تمہارا بیٹا میرے پاس محفوظ رہے گا لیکن اگر کل کا سورج غروب ہوگیا تو پھر فیصل کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو جائے گا!"

میں نے تھوڑا توقف کیا اور لہجے کی سنگینی کو برقرار رکھتے ہوئے مزید کہا "میں کل دن میں کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔ اس وقت تک تم یہ فیصلہ کرلو کہ ساحل کو کس جگہ اور کب میرے حوالے کر رہے ہو۔ یہ ایک ہاتھ لو، ایک ہاتھ دو والی ڈیل ہوگی اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلو کہ اس معاملے میں کسی لچک کی گنجائش ہے اور نہ ہی تمہیں دی ہوئی مہلت میں، میں کوئی توسیع کرسکتا ہوں...... کل سات بجے شام...... سورج غروب ہونے سے چند لمحات پہلے...... اور بس!"

پھر میں نے چوہدری کی کسی بھی نوعیت کی بکواس سنے بغیر فون بند کردیا۔

میرا دل اس وقت حقیقی اطمینان اور سچے سکون کی کیفیت سے آشنا ہو رہا تھا۔ میں نے چوہدری نوازش علی جیسے درندہ صفت اور ظالم و جابر شخص کو بڑی مضبوط نکیل ڈال دی تھی۔ اس کی ساری سرکشی اور درندگی جسم کے مختلف حصوں سے دھواں بن کر خارج ہو رہی ہوگی۔ کاش! وہ اس وقت میری نگاہ کے سامنے ہوتا تو میں اس کی حالت سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتا!

میں نے آج تک چوہدری نوازش علی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی، صرف اس کا نام ہی سنا تھا یا پھر "کام" دیکھا تھا جو بہت ہی شرمناک اور قابلِ ملامت تھا۔

میں نے چوہدری اور اس کی ذات سے متعلق ہر قصے کو ذہن سے جھٹکا تو بے اختیار دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھ گئی۔ کلاک آدھی رات یعنی بارہ بجے کا وقت بتا رہا تھا، اسی لمحے کلاک کا گھنٹا اپنا فریضہ پورا کرنے لگا۔

جب وہ خاموش ہوا تو میں نے شہزاد کو فون کرنے کے لیے ریسیور کی جانب ہاتھ بڑھایا لیکن میرا ہاتھ ریسیور تک نہ پہنچ سکا۔ برابر والے بیڈروم سے ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی اور میں گڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بیڈروم میں زرگل سو رہی تھی۔ میرا دل ایک بارگی اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس کے ساتھ کوئی سنگین صورتِ حال پیش آ گئی تھی۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے بیڈروم سے نکل آیا پھر اس سے پہلے کہ میں زرگل والے بیڈروم میں قدم رکھتا، فلیٹ کے داخلی دروازے پر تیز دستک ہونے لگی۔

بے اختیار میری نگاہ اس دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ دستک کا انداز بتاتا تھا، اگر میں نے دروازہ کھولنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کی تو دستک دینے والا اسے توڑ کر اندر گھس آئے گا۔

ان نازک لمحات میں میرا ذہن دروازے اور بیڈروم کے درمیان سوالیہ نشان پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ فیصلے کی سولی شاید ایسے ہی وقت کو کہا جاتا ہے!

اردو زبان کی طویل ترین داستان
دیوتا
46 حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں
تمام حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت -/2300 روپے
یہ رعایت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ منی آرڈر یا
چیک ارسال کرنے پر دی جائے گی
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ
(اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500
رابطے کے لیے
kitabiat1970@yahoo.com

وہ کڑے وقت کے آزمائشی لمحات تھے!

سوالیہ نشان کا کانٹا میرے حلق میں پیوست ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا، زمین نے میرے پاؤں میں آہنی زنجیر ڈال دی ہو۔ مصیبت کی گھڑی اجازت لے کر آتی ہے اور نہ ہی کسی ایک سمت سے وار کرتی ہے۔ زرگل کی وحشت ناک چیخ اور دروازے پر ہونے والی خوف ناک دستک دوطرفہ یلغار تھی۔ میرے دماغ نے زرگل کے حق میں فیصلہ دیا اور میں بیرونی حالات کو نظر انداز کر کے بیڈروم کی جانب لپکا۔

بیڈروم کی لائٹ آن تھی۔ زرگل نے سونے سے قبل لائٹ آف کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میری نگاہ اس پر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ وہ بیڈ پر اکڑوں بیٹھی ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر بے پناہ خوف زدگی کے آثار تھے۔ مجھ سے نظر ملی تو وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''وجدان!......وہ میرا اگلا دبار رہا تھا......''

''وہ کون؟'' میں نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

اسی لمحے ایک مرتبہ پھر دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی ''وجدان وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ دیکھو، وہ دروازے پر دستک دے رہا ہے!''

اس کی باتیں بے ربط اور خوف میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جب میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس کا ذکر کر رہی ہے تو میں نے اسے شانوں سے جھنجوڑ ڈالا ''زرگل! کیا بے وقوفی کی باتیں کر رہی ہو۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ کون تمہارا اگلا دبار رہا تھا۔ کہیں تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ لیا۔''

ایک مرتبہ پھر دروازہ پیٹا جانے لگا۔ زرگل نے سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا اور بولی ''وجدان میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ حکمت یار میری جان لینا چاہتا ہے۔ تم دروازہ نہ کھولنا۔ اگر وہ اندر آ گیا تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کسی درندے سے کم نہیں۔''

بات کے اختتام پر اس نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑنے کی کوشش کی۔ اس کی اضطرابی حرکت میں خوف پنہاں تھا۔ میں نے اس حرکت کو جزوی طور پر کامیاب ہونے دیا پھر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میں جا کر دیکھتا ہوں، دروازے پر کون ہے!''

اس کی بانہوں کی ڈھیلی ہوتی ہوئی گرفت میں ایک مرتبہ پھر سختی آ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اسے خود سے الگ کروں لیکن حالات تقاضا کر رہے تھے کہ میں فوری طور پر باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لوں ورنہ عین ممکن تھا، دستک دینے والا دروازے کو چوکھٹ سے اکھاڑ پھینکتا۔ یہ بات طے تھی کہ زرگل نے حکمت یار سے متعلق کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو ورنہ اس فلیٹ کے اندر ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

میں اسے تشفی بخش تھپکی دینے کے بعد داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسی وقت ایک بار پھر دستک کے عمل کو دہرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی بہ آواز بلند للکارا بھی گیا۔ آواز مردانہ تھی۔

''ڈاکٹر! شرافت سے دروازہ کھول دو۔ مجھے دروازہ توڑنے پر مجبور نہ کرو!''

پتا نہیں، یہ کون سا واہیات معاملہ تھا۔ کوئی کسی ڈاکٹر کو دھمکی دے رہا تھا۔ ایک بات تو واضح ہو گئی کہ آنے والا ہم سے متعلق نہیں تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے دروازے کے وسط میں نصب، آئی گلاس پر آنکھ جمائی اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔

اس گلاس نے مجھے ایک غصیلے شخص کو دکھایا۔ وہ دروازے کے عین سامنے تھوڑے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں اندازہ لگا لیا، وہ شخص ہمارا دشمن نہیں تھا۔ اگر وہ ہمارے مخالف دھڑے سے ہوتا تو دروازے کے سامنے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہوتا تاکہ آئی گلاس کی مدد سے اسے دیکھا نہ جا سکے۔ علاوہ ازیں اس صورت میں وہ بلند آواز میں بولنے کی حماقت بھی نہ کرتا۔ رات کے اس پہر حملہ آور ہونے والے دشمن اس انداز میں انٹری نہیں دیتے۔ وہ کوئی دوسرا ہی معاملہ تھا......اور اس معاملے کی تہ میں اترنے کے لیے دروازہ کھولنا ضروری تھا۔

یہ بات تو طے تھی، اگر میں دروازہ نہیں کھولوں گا تو وہ ایک مرتبہ پھر اسے پیٹ ڈالے گا لہٰذا میں نے اس کی سُن لینے کا فیصلہ کیا اور لاک ہٹا کر بہ آہستگی دروازہ کھول دیا۔ اس عمل کے دوران میں، میں نے یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ باہر موجود شخص آناً فاناً مجھ پر ٹوٹ پڑے تو میں اپنا مناسب بچاؤ کر سکوں۔ دروازہ کھولتے ہوئے میں نے اس کے سنگل پٹ کو اوٹ بنا لیا۔

جیسے ہی فلیٹ کے دروازے کا سنگل پٹ وا ہوا، ایک پستہ قامت شخص آندھی اور طوفان کی رفتار سے دندناتا ہوا... اندر گھس آیا۔ میں جو دروازے کی اوٹ میں کھڑا تھا، ایک جھٹکے سے باہر آیا اور دھڑ سے میں نے دروازہ بند کر دیا۔

اس شخص نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی پائی جاتی تھی۔ شاید وہ اس فلیٹ میں کسی

اور کی توقع کر رہا تھا......کم از کم میری نہیں!

''کون ہو تم؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے استفسار کیا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا ''ڈاکٹر کہاں ہے؟''

پھر وہ بیڈروم کی جانب چوکنا نظر سے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا ''تم کس ڈاکٹر کا پوچھ رہے ہو؟''

''ڈاکٹر فضیلہ شریف!'' وہ برہمی سے بولا پھر متلاشی نگاہ سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا ''جو اپنے نام کے بالعکس فضیلہ بدمعاش ہے......ایک نمبر کی حرافہ!''

میں نے کہا ''یہاں ڈاکٹر فضیلہ کیا، کوئی بھی ڈاکٹر نہیں رہتی۔ تم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' وہ دہاڑا ''میں بالکل ٹھیک جگہ پہنچا ہوں۔ ڈاکٹر فضیلہ اسی فلیٹ میں رہتی ہے۔ تم نے اسے کہیں چھپا دیا ہے۔ میں اس حرافہ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ بتاؤ، کہاں گئی وہ؟'' اس کی آنکھوں میں اس نامعلوم ڈاکٹر کے لیے نفرت کی چنگاریاں تھیں۔

''میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، تمہیں کوئی زبردست قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''یہاں میں رہتا ہوں اور مجھے آئے ہوئے بہ مشکل دو دن ہوئے ہیں۔ جذبات اور غصے نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ تم غیر متعلقہ فلیٹ پر آ گئے ہو۔''

''تم مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟'' وہ شکی لہجے میں بولا۔

اسی وقت زرگل بیڈروم سے برآمد ہوئی۔ اس شخص کا ہاتھ بے اختیار جیب کی جانب بڑھا اور اگلے ہی لمحے ایک ریوالور اس کے ہاتھ میں نظر آیا۔ اس نے پلک جھپکتے میں زرگل کو اپنے ریوالور کے نشانے پر رکھ لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا ریوالور بردار ہاتھ جھک گیا۔ وہ زرگل کو شاید ڈاکٹر فضیلہ سمجھا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا، وہ کسی زبردست غلط فہمی کا شکار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں اس سے پوچھا ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''مشتاق حیدر!'' اس نے جواب دیا پھر اس کی نگاہ اندرونی کمروں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگی۔ شاید اسے میری بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی ڈاکٹر فضیلہ کی توقع کر رہا تھا۔

''مسٹر مشتاق!'' میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''اگر تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں تو تم اس فلیٹ میں جہاں چاہو، اپنی مطلوبہ ڈاکٹر فضیلہ کو تلاش کر سکتے ہو۔ یہ پیش کش بھی میں تمہاری پریشانی کو دیکھتے ہوئے کر رہا ہوں ورنہ میں اگر چاہوں تو اسی وقت ایک فون کر کے تمہیں پولیس کے حوالے بھی کر سکتا ہوں......اور میرے لیے یہ بھی ممکن ہے، میں خود ہی دھکے دے کر تمہیں یہاں سے نکال باہر کروں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''ریوالور کو جیب میں رکھ لو۔''

میرے آخری جملے میں تحکم پایا جاتا تھا۔ میری بات اس کی عقل میں آ گئی۔ اس نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد ریوالور کو وہیں ٹھکانے لگا دیا جہاں سے اسے برآمد کیا تھا۔ آئندہ تین منٹ کے اندر وہ فلیٹ کی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ بالآخر ناکامیاب ہونے کے بعد اس نے مایوسی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ فلیٹ تو یہی ہے۔ میں پہلے بھی دو تین مرتبہ یہاں آ چکا ہوں اور ڈاکٹر فضیلہ شریف سے ملاقات بھی کر چکا ہوں لیکن......آج وہ غائب ہے۔''

میں نے خیال افروز انداز میں کہا ''ہو سکتا ہے، وہ ہم سے پہلے یہاں رہتی ہو۔ بہرحال، تمہارا مسئلہ کیا ہے۔ تم ریوالور سونتے خوں خوار انداز میں ڈاکٹر فضیلہ کو کیوں ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔ آخر اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''کیا بگاڑا ہے؟'' وہ منہ بگاڑ کر بولا ''یہ پوچھو، کیا نہیں بگاڑا۔ وہ ایک قاتل ہے۔ میرے بچے کو اس نے قتل کیا ہے......وہ بچہ جو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔''

مشتاق حیدر نامی اس شخص کی آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ میں نے تھوڑی ہمدردی جتائی تو اس نے مجھے ایک عجیب و غریب واقعہ سنایا۔ اس کی بیوی دس سال کے بعد امید سے ہوئی تھی لیکن اس فلیٹ پر رہنے والی کسی ڈاکٹر فضیلہ شریف نے اس کا ابارشن کر دیا تھا۔ اس کے مطابق، یہ ایک گہری سازش تھی جس میں اس کی سالی نورین اور اس کی خالہ فاخرہ شامل تھیں۔ باوجوہ وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ مشتاق کی بیوی کلثوم کسی بچے کو جنم دے۔ ڈاکٹر فضیلہ، نورین کی دوست تھی اور اس قسم کے کیس کرنے کے لیے خاصی بدنام بھی تھی۔ مشتاق ان دنوں شہر میں نہیں تھا اور اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر نورین اپنی چھوٹی بہن کلثوم (مشتاق کی بیوی) کو ڈاکٹر فضیلہ کے پاس لے گئی اور ڈی این سی کے ذریعے اس کا ابارشن کروا دیا۔ وہ تفصیل بتانے کے بعد طیش کے عالم میں گویا

ہوا۔
''اگر میں کراچی میں موجود ہوتا تو کلثوم کو کبھی بھی اس قاتل ڈاکٹر کے پاس نہ جانے دیتا۔'' مشتاق نے زہر خند لہجے میں کہا ''بچے کے حوالے سے علاج معالجے کے سلسلے میں نورین کی فرمائش پر دو تین مرتبہ ڈاکٹر فضیلہ سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور میں نے اسے خاصا مشکوک پایا۔ بعد میں جب میں نے اس کے بارے میں تحقیق کی تو اس کی شہرت مجھ پر کھل گئی۔ بہر حال، میں نے سختی سے کلثوم کو منع کر دیا تھا کہ بھی فضیلہ کے کلینک کا رخ نہ کرے لیکن میری غیر موجودگی میں یہ غضب ہو گیا!''

یہ ایک انتہائی غیر متعلقہ قصہ نکل آیا تھا لیکن مشتاق کی بے بسی اور تکلیف کو دیکھ کر میں اس کی کہانی میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے ساتھ واقعی بڑا ظلم ہوا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا ''جب تم نے اپنی بیوی کو تنبیہہ کر دی تھی تو پھر وہ ڈاکٹر فضیلہ کے پاس کیسے چلی گئی جبکہ دس سال کے بعد اس کی گود ہری ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی؟''

''وہ خود نہیں گئی تھی بلکہ اسے بے ہوشی کی حالت میں لے جایا گیا تھا۔'' مشتاق نے بتایا ''کلثوم زینہ اتر رہی تھی کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ بری طرح گر گئی۔ ان دنوں وہ اپنے میکے میں تھی چنانچہ نورین فوراً اسے ٹیکسی میں ڈال کر ڈاکٹر فضیلہ کے پاس لے گئی اور علاج کے نام پر میرے بچے کو قتل کروا دیا!''

''تم نے نورین سے باز پرس نہیں کی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے اسے کھری کھری سنائی ہیں۔'' وہ نفرت سے بولا ''اس کا کہنا ہے، سب کچھ ڈاکٹر کے مشورے پر کیا گیا۔ ڈاکٹر فضیلہ نے چیک اپ کے بعد ان پر واضح کر دیا تھا کہ پریگنینسی بری طرح متاثر ہو چکی ہے۔ اگر فوری طور پر ابارشن نہ کیا گیا تو زچہ کی جان کو سخت خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''میں ابھی نورین کے پاس سے ہی آ رہا ہوں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ ڈاکٹر فضیلہ کی ''خبر گیری'' کروں گا مگر وہ یہاں موجود ہی نہیں۔ میں جاننا چاہتا تھا، نورین کے بیان میں کس حد تک سچائی ہے۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ''یہ ابارشن والا واقعہ کب کا ہے؟''

''بیس پچیس دن ہو گئے ہیں۔'' اس نے بتایا ''لیکن مجھے آج شام ہی پتا چلا ہے، میں آج دوپہر کو کراچی پہنچا ہوں۔'' پھر خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا ''میرے کام کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے کہ بعض اوقات ایک ماہ تک بھی شہر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔''

''یہ لوگ تمہیں فون یا کسی اور ذریعے سے بھی تو اطلاع دے سکتے تھے!'' میں نے کہا۔

''میری سسرال والوں نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔''

میں نے متاسفانہ انداز میں کہا ''پھر تو واقعی یہ ایک جرم ہوا۔ تمہاری سسرال والوں کا رویہ نارمل نہیں ہے۔''

''ان سے تو میں اچھی طرح نمٹ لوں گا۔'' وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا ''پہلے ذرا ڈاکٹر فضیلہ کا حشر خراب کرلوں۔ اگر وہ زندہ رہی تو پتا نہیں، کتنی جانوں کو وہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم کر دے گی۔ اس قاتل ڈاکٹر کو میں معصوم زندگیوں سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

اس کا طیش اور لہجے میں چھپی ہوئی سنگینی بتاتی تھی، اگر ڈاکٹر فضیلہ اس کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ اسے کچا چبانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کرے گا۔ وہ اس وقت جنونی ہو رہا تھا۔

میں نے اسے اطمینان سے بٹھایا اور کہا ''مسٹر مشتاق! تمہاری بیوی کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ بہت افسوسناک ہے۔ ٹھہرو، میں ڈاکٹر فضیلہ کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں مسرت ہلکورے لینے لگی۔ میں نے پوچھا ''کیا ڈاکٹر فضیلہ اسی فلیٹ میں کلینک چلاتی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا ''میں کلثوم کے علاج کے سلسلے میں یہیں پر ڈاکٹر سے ملا تھا۔''

میں نے کہا ''یہ فلیٹ میرے ایک دوست کا ہے۔ میں اسے فون کر کے ڈاکٹر فضیلہ کے بارے میں پوچھتا ہوں۔''

''تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔'' وہ متشکرانہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔

میں نے منہاس باقر کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے ندامت آمیز لہجے میں کہا ''منہاس صاحب بار بار تکلیف دینے پر معذرت چاہتا ہوں۔ دراصل یہاں ایک ایسا واقعہ ہوا ہے کہ آپ سے رابطہ کرنا ضروری ہو گیا۔''

''خیریت تو ہے وجدان۔'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔
''تمہارے ساتھ ایسی کیا گڑبڑ ہو گئی؟''

''گڑبڑ میرے ساتھ نہیں بلکہ مشتاق نامی ایک شخص کے ساتھ ہوئی ہے۔''

''وجدان! یہ مشتاق کون ہے؟'' منہاس کی گمبھیر آواز

میری سماعت سے ٹکرائی۔

اس کے سوال کے جواب میں، میں نے مختصراً اسے حالات سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''ہاں وجدان! میں نے بھی اس ڈاکٹر کے حوالے سے کافی قابل اعتراض قصے سنے تھے اسی لیے میں نے اس سے فلیٹ خالی کروالیا تھا۔ یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میں نے چند روز قبل کلینک کی سیٹنگ ختم کر کے اس فلیٹ کو دوبارہ رہائشی انداز دیا ہے۔''

میں نے کہا ''منہاس صاحب! اگر ڈاکٹر فضیلہ ایسی ہی بدنام زمانہ تھی تو پھر مشتاق حیدر کی طرح اور لوگ بھی اسے پوچھتے ہوئے یہاں دستک دے سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اور بھی بہت سے لوگوں کو ڈاکٹر سے شکایت ہو!''

''میرا خیال ہے، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔'' وہ اپنی بھاری اور سنجیدہ آواز میں بولا ''میں نے ڈاکٹر سے فلیٹ خالی کروانے کے بعد دروازے پر ایک نوٹس چسپاں کروا دیا تھا۔ اب یہ قصہ پرانا ہو چکا۔ جن کو ڈاکٹر کے پیچھے آنا تھا، وہ مایوس ہو کر جا چکے ہوں گے۔ میں نے اس نوٹس میں وضاحت کر دی تھی کہ اس ڈاکٹر کے ساتھ فلیٹ کے مالک کا کسی قسم کا کوئی تعلق واسطہ نہیں لہٰذا اس کو تلاش کرنے والے یہاں دستک دینے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''شاید مشتاق نامی یہ احمق شخص کافی دنوں بعد وہاں آیا ہے اسی لیے پریشان ہو رہا ہے۔''

''کوئی ایسا ویسا پریشان جناب!'' میں نے اپنے سامنے موجود شخص کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''یہ تو اس وقت اتنا جنونی ہو رہا ہے کہ اگر ڈاکٹر فضیلہ اسے مل جائے تو یہ اس کا لہو پی جائے گا۔ یہ ڈاکٹر کو اپنے بچے کا قاتل سمجھتا ہے۔''

منہاس باقر نے کہا ''وجدان! ڈاکٹر فضیلہ کے گھر کا ایڈریس تو مجھے معلوم نہیں لیکن میں اس پراپرٹی ایجنٹ سے رابطہ کر کے معلوم کر سکتا ہوں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں، فضیلہ بہادر آباد میں رہتی ہے لیکن تم مشتاق کو ایڈریس کے سلسلے میں مایوس کر کے وہاں سے رخصت کر دو۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''وجدان! تعلیم اور صحت کسی بھی معاشرے کے سب سے اہم شعبے ہیں۔ اگر ان شعبوں کی نمائندگی کرنے والے غلط راہوں پر نکل جائیں تو وہ معاشرہ اخلاقی اور معاشرتی طور پر تباہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ افسوس! ڈاکٹر فضیلہ جیسی ڈاکٹرز کے خلاف قانونی اور عدالتی طور پر چارہ جوئی بہت مشکل ہے۔ ڈاکٹر کے جرم کی گواہی کوئی ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے اور...... تم اندازہ لگا سکتے ہو، یہ کام آسان نہیں۔''

''اسی لیے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''مشتاق جیسے متاثرہ افراد کو جب انصاف کے لیے قانونی تعاون اور مدد نہیں ملتی تو وہ گن اٹھا کر اپنا غبار نکالنے چل پڑتے ہیں۔''

منہاس نے کہا ''میں بھی اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں، تم اسے بہلا پھسلا کر وہاں سے رخصت کر دو۔ اگر یہ ڈاکٹر فضیلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ اس کے خون میں ہاتھ رنگ لے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بولا ''یہ سیدھا سیدھا قاتل کے کیس میں جیل چلا جائے گا۔ اس کی بیوی کو زندہ رہنے کے لیے پتا نہیں، کیا کیا جتن کرنا پڑیں گے۔ کسی اپنے کسی پرائے کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑیں گے۔ زندگی بڑی دردناک ہے وجدان!''

میں کلی طور پر منہاس باقر سے اتفاق نہیں کر سکتا تھا لیکن مشتاق کی موجودگی میں بات کو بڑھانا بھی ٹھیک نہیں تھا لہٰذا میں نے ٹیلی فونک گفتگو ان الفاظ پر ختم کر دیا۔

''منہاس صاحب! میں اپنے ذاتی معاملات کے سلسلے میں تھوڑی دیر بعد آپ کو فون کرتا ہوں۔ اللہ حافظ۔''

ریسیور کریڈل کرنے کے بعد میں مشتاق حیدر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ہماری گفتگو کو اس نے پوری توجہ سے سنا تھا اور بیشتر باتیں اس کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ میں نے بڑی تفصیل میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور تسلی تشفی کے علاوہ اظہارِ افسوس کے ساتھ اسے فلیٹ سے رخصت کر دیا۔

جانے سے پہلے اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا ''جناب! آپ خاصے بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں نے آدھی رات کو یہاں آ کر آپ کو بہت پریشان کیا ہے۔ میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''میں نے تمہیں معاف کر دیا۔'' میں نے فراخ دلی سے کہا پھر پوچھا ''تم کہاں رہتے ہو؟''

اس نے جواب دیا ''محمود آباد میں۔''

''تم مجھے اپنا مکمل پتا نوٹ کروا دو۔'' میں نے کہا ''اگر کبھی مجھے ڈاکٹر فضیلہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہوا تو میں تمہیں اطلاع دوں گا۔''

اس کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی جس نے اس کے چہرے پر بچی خوشی بکھیر دی۔ بڑی سرعت سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس نے مجھے اپنے گھر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر نوٹ کروا دیا پھر متشکرانہ لہجے میں بولا۔

''میں ایک مرتبہ پھر اپنے رویے اور عمل کے لیے

معذرت خواہ ہوں۔"

میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا "اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو مشتاق! طیش اور غصے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔ سمجھ داری سے کام لو اور اپنے مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرو۔ اپنی بیوی کا بہت خیال رکھو۔ اس وقت اسے تمہاری بہت ضرورت ہے۔"

اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نمی میں ممنونیت کا سمندر موج زن تھا۔ میں نے مزید کہا "کیا تمہاری بیوی کو یہ بات معلوم ہے، تم ریوالور اٹھائے ڈاکٹر فضیلہ کو تلاش کرتے پھر رہے ہو؟"

"نہیں، میں نے اس بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔"

"اور بتانا بھی نہیں۔" میں نے تاکیداً کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

مشتاق حیدر کے جانے کے بعد میں نے منہاس باقر کو دوبارہ فون کیا "ہاں منہاس صاحب!" میں نے رابطہ ہونے پر کہا "مشتاق کی موجودگی میں حساس موضوعات پر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے چوہدری نوازش کو ایک اوپن وارننگ دے دی ہے۔"

"میں سمجھ گیا تھا۔" وہ مشتاق کی موجودگی کے حوالے سے بولا پھر پوچھا "چوہدری نوازش سے کیا ڈائیلاگ ہوئے؟"

میں نے اسے، چوہدری سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرتے ہوئے کہا "اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کتنا با اختیار اور سمجھ دار چوہدری ہے۔ اپنی طاقت اور اختیار کے زعم میں وہ میری وارننگ کو کوئی اہمیت دیتا ہے یا نہیں۔ اس سے اس کی سمجھ داری اور سوجھ بوجھ کا بھی پتا چل جائے گا۔ بیٹے کا رشتہ بہت اہم ہوتا ہے منہاس صاحب!"

"رشتہ بیٹے کا ہو یا بیٹی کا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" منہاس نے گمبھیر آواز میں کہا "اولاد کا غم اور خوشی دنیا کے ہر غم اور خوشی سے مختلف اور نرالے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے، وہ فیصل کے سلسلے میں گھٹنے ٹیک دے گا۔ تمہاری وارننگ بے لچک اور خاصی سنگین ہے!"

"سمجھ داری اور حالات کی نزاکت تو اسی طرف اشارہ کر رہی ہے۔" میں نے کہا "آنے والا وقت ہی بتائے گا، چوہدری اس بازی کو کس انداز میں کھیلتا ہے۔ اگر اسے اپنے چہیتے کی زندگی عزیز ہے تو پھر ساحل کو میرے حوالے کرنا ہوگا۔ شعیب غوری کسی بھی صورت چوہدری نوازش سے زیادہ طاقت ور اور بارسوخ شخص نہیں۔ میں نے چوہدری کو پاکستان اور پاکستان سے باہر کئی محاذوں پر پرکھا اور برتا ہے۔ اگر چوہدری، شعیب سے ساحل کی واپسی کی فرمائش کرے گا تو مجھے یقین ہے، شعیب اس سے انکار نہیں کرے گا۔"

منہاس باقر کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی "بظاہر تو ایسا ہی نظر آ رہا ہے۔"

"اور در پردہ کیا ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم صرف امکان کی بات کر سکتے ہیں۔" منہاس نے کہا "بالفرض، چوہدری تمہاری بات ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے یا یوں کہہ لو، مجبور ہو جاتا ہے لیکن کل شام سے پہلے کا وقت وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں گزارے گا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ کسی طرح فیصل کا سراغ مل جائے تاکہ تم سے ڈیل کی نوبت ہی نہ آئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

میں نے کہا "بڑی وضاحت سے سمجھ رہا ہوں جناب۔ جس طرح چوہدری اپنے بیٹے تک پہنچنے کے لیے اپنے کراچی نیٹ ورک اور شعیب غوری کی سی ایف کے کو استعمال میں لا رہا ہوگا، دوسری طرف بالکل اسی طرح ہم بھی ساحل کو کھوجنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں۔ کامیابی جس کا مقدر ہوگی وہ پہلے اپنے مطلوبہ بندے تک پہنچ جائے گا۔ سی ایف کے بہت ہی منظم اور فعال تنظیم ہے۔ شعیب نے لاہور میں میری قیام گاہ کا سراغ لگا لیا تھا اور فرید پاشا کی کوٹھی میں فون پر ہماری بات بھی ہوئی تھی۔ شعیب بہت ظالم اور سفاک شخص ہے۔ ساؤتھ والے مشن میں شامل ہمارا ایک بندہ امجد اس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس نے امجد کی زبان کھلوانے کے بعد اسے ٹھکانے لگوا دیا۔ اس طرح شعیب پر یہ حقیقت کھل گئی کہ کراچی میں آپ اور لاہور میں فرید پاشا میری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ آپ نے اس فلیٹ کے بارے میں تو مجھے مطمئن کر دیا کہ شعیب کا اس طرف دھیان نہیں جا سکتا۔ بہرحال، شہزاد کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ خاص طور پر اس فلیٹ کی طرف آتے جاتے ہوئے بے حد چوکنا رہنا ہوگا...... اور آپ تو خاصے معروف آدمی ہیں۔ شعیب غوری براہِ راست یا چھپ کر آپ پر وار کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"ہمیں اپنی حفاظت کی طرف سے ہر وقت بہت الرٹ رہنے کی ضرورت ہے۔" منہاس باقر نے کہا "فیصل تک رسائی سے پہلے وہ کسی پر بھی کوئی اوچھا وار کر سکتے ہیں۔ کھلی جنگ میں سب کچھ ممکن ہے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "میں اپنے دشمنوں کی طرف سے غافل نہیں رہتا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے استفسار کیا "میرے کام کا کیا ہوا جناب؟"

وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولا "تمہارا کام ہو گیا ہے۔ میں نے دو تجربہ کار اور مستعد مسلح افراد کو ہنڈا ئی میں اس بنگلے کی طرف روانہ کر دیا ہے جہاں فیصل کو رکھا گیا ہے۔ وہ دونوں میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔ وہ جیسے ہی وہاں پہنچیں گے، شہزاد یلو کیب لے کر تمہاری جانب روانہ ہو جائے گا۔ ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"فائنل پروگرام تو شہزاد کے آنے کے بعد ہی بنے گا۔" میں نے کہا "لیکن ایک بات طے ہے کہ صبح ہونے سے پہلے فواد کا چھاپا ضروری ہے۔ ممکن ہے، اس کی زبان کھل جانے کے بعد شعیب کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل ہو سکیں۔ اس موقع کو ضائع کرنا عقل مندی نہیں ہوگی۔"

"فواد سی ایف کے میں کوئی اونچی حیثیت نہیں رکھتا۔" منہاس باقر نے مربیانہ لہجے میں کہا "اس قسم کے کارکن اپنے باس یا بگ باس کے معمولات یا ذاتی زندگی کے بارے میں صفر کے برابر معلومات رکھتے ہیں۔ میں ساحل کے سراغ کے سلسلے میں فواد کی طرف سے زیادہ پُرامید نہیں ہوں۔"

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "فواد اور جہانگیر ایک ہی رتبے اور حیثیت کے مالک ہیں۔ جہانگیر سے میں نے نہایت ہی اہم راز اگلوا لیے تھے۔ میرا خیال ہے فواد کا سینہ بھی خالی نہیں ملے گا۔ بعض اوقات اس قسم کے معمولی کارندے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔"

"میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کروں گا وجدان!" اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں جو محسوس کر رہا ہوں وہ میں نے بیان کر دیا۔"

میں نے کہا "میں فواد کو نچوڑنے کے بعد کسی اور طرف کا رخ کروں گا۔ ہو سکتا ہے، وہ جہانگیر سے متعلق ہی کوئی سنسنی خیز انکشاف کر دے۔ ابھی تک ہم جہانگیر کی زندگی یا موت کے بارے میں پُریقین نہیں ہیں۔"

پھر چند منٹ تک ہمارے درمیان چوہدری نوازش، شعیب غوری، ساحل اور فیصل کے بارے میں انتہائی اہم باتیں ہوتی رہیں۔ سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ فیصل کی حفاظت اور "راز" کو اہمیت دی جائے۔ فیصل میری بساط کا ایک ایسا مہرہ تھا جو میرے پاس رہتا تو چوہدری کی شکست یقینی تھی لیکن اگر وہ بدقسمتی سے میرے ہاتھ سے نکل جاتا تو پھر میں ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ منزل پر پہنچ کر ملنے والی مات ہوتی...... ساحل ایک مرتبہ پھر مجھ سے اتنے فاصلے پر چلی جاتی کہ میں......

اس سے آگے میں کچھ سوچ نہ سکا۔ یہ سوچ کی ایک ایسی بند گلی تھی جس میں قدم رکھنا مجھے گوارا نہ تھا۔ میرے خیال کا پرندہ اپنی پرواز بھول کر زمین بوس ہو جاتا۔ ساحل سے دوری، زندگی سے دوری تھی اور...... زندگی سے دور رہ کر کوئی کیوں کر زندہ رہ سکتا ہے!

فون بند کرنے سے پہلے میں نے منہاس باقر سے کہا "میری ایک چھوٹی سی فرمائش ہے۔ کیا آپ اپنے پرائی ایجنٹ سے معلوم کر کے ڈاکٹر فضیلہ شریف کی رہائش گاہ کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔"

"یہ عین ممکن ہے اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا "لیکن تم اس کے گھر کا پتا جان کر کیا کرو گے؟" اس کے سوال میں گہری تشویش تھی۔

میں نے کہا "منہاس صاحب! جیسا کہ مشتاق نے بیان کیا ہے اور آپ بھی اس کی تصدیق کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر فضیلہ غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف تھی۔ اگر اس کی ان مجرمانہ حرکتوں کی تصدیق باضابطہ طور پر ہو جاتی تو اس کو تھوڑی بہت سزا ملنا چاہیے نا۔ انسانی زندگی سے کھیلنا کوئی مستحسن کھیل تو نہیں!"

"اوہ!" اس کی فکر آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی "کہیں تم ڈاکٹر کو کوئی عبرت ناک سزا تو نہیں دینا چاہتے؟"

"عبرت ناک نہیں، سبق آموز!" میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا "وہ بھی کوئی فوری طور پر نہیں۔ ابھی تو میں اپنے انتہائی ضروری مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ ذرا فرصت مل جائے پھر اس مجرم ڈاکٹر کو دیکھوں گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے گمبھیر آواز میں اضافہ کیا "منہاس صاحب! مشتاق کی بیوی دس سال بعد امید سے ہوئی تھی اور یہ ان کا پہلا بچہ تھا۔ ذرا سوچیں، اس امید کے پیدا ہو جانے کے بعد انہوں نے کتنے حسین سپنے بُنے ہوں گے، اپنے آنے والے بچے کے بارے میں کیا کیا پلاننگ کی ہوگی۔ اولاد کی محرومی کا دکھ کوئی لاولد ہی محسوس کر سکتا ہے۔ میں نے مشتاق کی آنکھوں میں دھوئیں کا غبار دیکھا ہے۔ ایسا کڑوا اور کسیلا دھواں جو ہزاروں روشن دیپوں کے یکبارگی بجھنے سے اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر فضیلہ کی نام نہاد مسیحائی نے ایک زہر آلود پھونک مار کر ان کی روشن زندگی کو تاریکی کے عمیق غار میں پھینک دیا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی!"

"ہاں، واقعی یہ کوئی بات نہ ہوئی۔" وہ تائیدی مگر خشک لہجے میں بولا "بلکہ اسے سراسر زیادتی کہنا چاہیے اور وجدان!" اچانک اس کا انداز ناصحانہ ہو گیا "تمہیں اس ملک

کے طول و عرض میں ایسی ہی ہر قسم کی زیادتیوں کی ہزاروں لاکھوں مثالیں ملیں گی، کس کس کا مداوا کرو گے۔''

منہاس باقر کی آواز سے دکھ...... گہرا صدمہ جھلکتا تھا۔ وہ اس صورتِ حال پر کبیدہ خاطر اور بے حد ملول تھا لیکن وہ جذباتی آدمی نہیں تھا اس لیے رنج کے اظہار میں جوش کہیں نظر نہیں آتا تھا، گہری سنجیدگی اور بردباری نے اس کے جذبات کو مضبوط لگام دے رکھی تھی۔

میں نے کہا ''منہاس صاحب! ہزاروں لاکھوں نہ سہی لیکن میں کسی ایک فریادی اور کچلے ہوئے انسان کی دادرسی تو کرسکتا ہوں۔ اگر میرے پاس چٹکی بھر مرہم ہے تو میں اس سے کسی گھائل شخص کا ایک زخم تو ڈھانپ سکتا ہوں۔ کہتے ہیں، ایک انسان کو بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے...... تو کیا ایک مظلوم کی مدد کرنا یا ایک ظالم کا ہاتھ توڑنا، دکھی انسانیت کی تیمارداری نہ ہوگی؟...... ایک ظالم کی سرکوبی نہ ہوگی؟''

''بے شک ہوگی!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''میں کل ہی تمہیں اس ڈاکٹر کا پتا معلوم کرکے بتادوں گا لیکن میری ایک بات ذہن نشین کرلو بلکہ تم اسے میری نصیحت بھی سمجھ سکتے ہو۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح تصدیق کرلینا کہ ڈاکٹر واقعی قصوروار ہے کیونکہ عموماً ڈاکٹرز ایسے کیس مریض یا مریض کے لواحقین کے ایما پر کرتی ہیں۔''

''آپ اس سلسلے میں اطمینان رکھیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''میں مطمئن ہونے کے بعد ہی کوئی کارروائی کروں گا اور وہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ میں اسی وقت نکل کھڑا ہوں۔ ساحل کا معاملہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ میں اسے پس پشت ڈال کر کسی اور سرگرمی میں ملوث نہیں ہوسکتا۔ ویسے آپ ایک بات تو بتائیں؟''

''ہاں پوچھو!'' منہاس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا ''آپ ایک اخبار کے ایڈیٹر و پبلشر ہیں۔ آپ اس آرگن کے توسط سے ان معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کیوں نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے، اگر ایسے جرائم پیشہ معزز افراد کی نقاب کشائی کی جائے تو اس کے بہت سے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔''

''اس نوعیت کے مضامین اور فیچرز میرے اخبارات میں بلکہ کم و بیش ہر اخبار میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں سنگینی برقرار رہی ''میں اس فریضے سے غافل نہیں ہوں۔''

''آپ نے اس فرض کی ادائی کے اثرات بھی دیکھے ہوں گے!''

''کچھ زیادہ...... حوصلہ افزا نہیں۔'' وہ مایوسی سے بولا۔

''بھئی اخبارات میں ایسے مضامین پڑھ کر لوگوں کا شعور تو بڑھتا ہوگا۔'' میں نے کہا ''عوام ان سے سبق سیکھتے ہوں گے۔ آپ کی یہ کوشش اصلاحِ معاشرہ کے لیے خاصی سنسنی خیز ثابت ہوتی ہوگی اور آپ بڑے حوصلہ شکن انداز میں کہہ رہے ہیں کہ......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ''وجدان! بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قوم کا مجموعی مزاج بڑا افسوس ناک بن کر رہ گیا ہے۔ اس قوم میں ہم سب شامل ہیں اور میں اکثریت کی بات کررہا ہوں...... ہم صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہیں یا پھر مصیبت کی گھڑی کو یاد کرتے ہیں ورنہ اپنی اصلاح اور بہتری کے لیے کیا کچھ نہیں کرسکتے۔ کون سی ترکیب اور تدبیر ایسی ہے جو ہمارے پاس لکھی ہوئی موجود نہ ہو مگر عمل کرنے سے ہماری جان جاتی ہے ورنہ ہمارے درمیان تو ایک ایسا نسخۂ کیمیا موجود ہے جو مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مقدس کتاب ہر گھر میں پائی جاتی ہے لیکن ایسے گھر کتنے ہوں گے جہاں یہ باقاعدگی سے کھلتی بھی ہوگی اور...... ان لوگوں کو شمار کرنا ہی آسان کام ہے جو اس کے فراہم کردہ تعلیمات کو سمجھتے ہوں گے اور پھر اس کے مطابق اپنی زندگی کو بھی ڈھالتے ہوں گے!''

منہاس باقر ایک تلخ سچائی بیان کررہا تھا جس سے انکار ممکن نہیں۔ کوئی منافق ہی اس انکار کی جرأت کرسکتا ہے۔ یہ آسمانی کتاب ایک کامل راہِ نجات ہے اگر اسے سوچ سمجھ کر پڑھا جائے اور پھر خلوص سے اس پر عمل بھی کیا جائے۔ پوری دنیا میں اس وقت مسلمانوں پر بڑا کڑا وقت ہے اور انہیں نت نئے طریقوں سے ذلیل و خوار کیا جارہا ہے کیونکہ انہوں نے بہ حیثیت مجموعی فرقانِ حمید کی پکار پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے چند بالغ عاقل اور وسیع نظر افراد کے علاوہ اور یہ چند افراد...... درجنوں ہوں یا سیکڑوں اپنا خون جلانے اور اچھے وقت کے انتظار کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔

خوش امیدی سے بڑا اور کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ ایک ناامید بے آسرا شخص اس سہارے کی بہ دولت اپنی مایوسی پر قابو پاسکتا ہے۔ خوش امیدی انسان میں جینے کی امنگ اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتی ہے!

منہاس باقر سے گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا تو میں زرگل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اس دوران میں خاموش بیٹھی بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔ اس وقت ہم دونوں میرے بیڈ روم میں تھے۔ زرگل کا خوف بڑی حد تک زائل ہوچکا تھا اور وہ قدرے نارمل نظر آتی تھی۔

''تمہیں کیا ہوگیا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ رسانیت سے بولی ''اب تو میں بھی یہی محسوس کررہی ہوں کہ وہ کوئی خواب تھا...... بہت ہی ڈراؤنا خواب!'' اس نے ایک جھرجھری لی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی ''وجدان! حکمت یار بڑی بے دردی سے میرا گلا دبا رہا تھا۔ میں تمہیں متوجہ کرنے کے لیے آواز دینا چاہتی تھی، تمہیں چیخ کر پکارنا چاہتی تھی لیکن اس کم بخت نے اتنی سختی سے میری گردن کو دبوچ رکھا تھا کہ بے بسی نے میری قوتِ گویائی گویا سلب کر ڈالی تھی۔''

''اب ایسا تو نہ کہو زرگل!'' میں نے اس کا رہا سہا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا ''میں تمہاری وحشت ناک چیخ سن کر ہی تو ادھر لپکا تھا اور تم کہہ رہی ہو......''

اسے فوراً اندازہ ہوگیا کہ میں اس سے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کرنے کے موڈ میں ہوں، بات کاٹتے ہوئے بولی ''شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا اس لیے مذاق کی سوجھ رہی ہے؟''

زرگل ایک تعلیم یافتہ پشتون دوشیزہ تھی اور اس کے انداز گفتگو سے جھلکتا تھا، وہ پڑھی لکھی ہے۔ وہ صحیح تلفظ اور لب و لہجے کے ساتھ اردو بولتی تھی جو ایک حیرت انگیز بات بھی تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''زرگل! میں تم سے کسی قسم کا مذاق نہیں کررہا ہوں۔ واقعی میں تمہاری چیخ سن کر بوکھلا گیا تھا۔ لگتا ہے اپنے چاچا کو تم نے کچھ زیادہ ہی ذہن پر سوار کرلیا ہے۔''

''حکمت یار کوئی انسان نہیں بلکہ ایک آسیب ہے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولی ''اس نے پچھلے دنوں جس شیطانی انداز میں میری زندگی کا تعاقب کیا ہے...... اور یہ تعاقب ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے، حکمت یار جب تک میری جان نہیں لے لے گا' اسے سکون نہیں آئے گا۔'' بات کے اختتام پر اس نے ایک مرتبہ پھر جھرجھری لی۔

''کیا وہ پہلے بھی تمہارے خواب میں آتا رہا ہے؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''نہیں وجدان! ایسا آج پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ میں اپنے خیالوں میں ہمہ وقت اس سے خوف زدہ تو رہتی ہوں لیکن ایسا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا...... اور میرا خیال ہے یہ کوئی اچھی علامت نہیں!''

''تمہارے خیال کی تائید کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میں محسوس کررہا ہوں' حکمت یار کی دہشت تمہارے اعصاب کو بری طرح متاثر کررہی ہے' وہ تمہارے شعور سے آگے بڑھ کر لاشعور پر بھی حاوی ہونے لگا ہے۔ تمہارا دن کا سکون تو برباد تھا ہی۔ اگر یہی صورتِ حال زیادہ عرصے تک برقرار رہی تو راتوں کی نیند بھی غارت ہوجائے گی۔ تم کبھی ہڑبڑا کر اور کبھی چلا کر اٹھو گی اور حکمت یار کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگو گی۔ میں کل تمہاری کہانی ضرور سنوں گا اور ہر ممکن تمہاری مدد کرنے کی کوشش بھی کروں گا۔ ویسے ایک بات کا تم اطمینان رکھو۔'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور تشفی آمیز لہجے میں کہا ''تمہارا چاچا حکمت یار یہ نہیں جانتا کہ تم لاہور سے کراچی منتقل ہوچکی ہو لہٰذا فی الحال تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں۔''

''میں مانتی ہوں وجدان!'' وہ شکر گزاری کے احساسات کے ساتھ بولی ''تم نے اب تک میری بھرپور مدد کی ہے اور آئندہ بھی اس سلسلے میں تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں کوئی سوال کیے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ چند لمحات کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا ''میری کہانی تو تم بعد میں سنتے رہو گے۔ ابھی فوری طور پر تم مجھے کوئی ایسا ٹوٹکا بتاؤ جس سے میں اپنے دماغ اور سوچ کو قابو میں رکھ سکوں۔ تم نے میرے پاؤں کی موچ نکالتے وقت کوئی جادو کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اعصاب کو پُرسکون رکھنے کے لیے بھی تم مجھے گر کی کوئی بات ضرور بتاؤ گے!''

وہ سرخ و سفید پشتون دوشیزہ اس وقت بہت ہی سادہ اور معصوم نظر آرہی تھی۔ اس کی سادگی اور معصومیت میں شمہ بھر ملاوٹ نہیں تھی۔ اس قسم کے خالص اور سچے تاثرات اسی وقت نمودار ہوتے ہیں جب انسان اپنے کسی قابلِ اعتماد اور خیرخواہ کے سامنے ہو' وہ سامنے والے سے ہمدردی' خلوص اور تعاون کی امید رکھتا ہو اور اسے یقین ہو' سامنے والا اس کی بات اور معاملات کو اپنی ذات تک محدود رکھے گا۔

اس بات میں تو کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ زرگل مجھے پُرخلوص اور قابلِ بھروسا سمجھتی تھی۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ فاضلیہ کالونی والی کوٹھی سے میرے ساتھ نہ جاتی' گلبرگ تھری والی کوٹھی میں قیام سے انکار کردیتی اور یوں ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لاہور سے کراچی نہ پہنچ جاتی! زرگل کا یہ بھروسا' اعتماد اور مدد کی توقع اپنی جگہ لیکن اس کے کھلتے اور نکلتے ہوئے پر پُرزے کسی وارننگ سے کم نہیں

تھے...... کوئی سنگین وارننگ!

میں زرگل کے بارے میں نہیں جانتا تھا بلکہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا' سوائے اس کے چاچا حکمت یار...... اور ان کی دشمنی کے۔ اس کی داستان حیات سننے کے بعد ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ یا لائحہ عمل طے کیا جا سکتا تھا۔ میں اس کی کتنی اور کیسی مدد کر سکتا ہوں اس سلسلے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اپنی جانب سوالیہ نظر سے اسے دیکھتے پا کر میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا ''زرگل! تمہارا یقین بے جا۔ میں اس سلسلے میں ٹپ دے سکتا ہوں لیکن مصیبت یہ ہے کہ جسے بھی کوئی گر کی بات بتاؤ وہ گرو سمجھنے لگتا ہے...... اور مجھے گرو بننے کا شوق ہے' نہ ہی چیلے چیلیاں پالنے کی فرصت!''

''میں ایسا نہیں سمجھوں گی۔'' وہ خفیف سا مسکرا کر بولی۔ ''ویسے بھی گرو تو بہت ہی عمر رسیدہ اور کمر خمیدہ شخص کو کہا جاتا ہے جب کہ تم تو ماشاء اللہ ابھی بھرپور جوان ہو!''

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی تیز نگاہ سرتاپا میرے وجود میں بہت گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگی تو مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''زرگل! گرو یا چیلے کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے ایسے گرو بھی دیکھے ہیں جن کے چیلے عمر میں ان سے دوگنا اور تین گنا تھے۔''

میں نے محض اس کی توجہ بٹانے کے لیے بات برائے بات وہ ڈائیلاگ بولا تھا۔ وہ گہری دلچسپی سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

''وجدان! تم نے بہت کچھ دیکھ رکھا ہے۔ پچھلے چند دنوں کے تجربے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔''

''اللہ نے یہ دو آنکھیں دیکھنے کے لیے ہی دی ہیں۔'' میں نے انگلی کی مدد سے پہلے اپنی اور پھر اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا ''اگر انسان ان کا بھرپور استعمال کرے تو دنیا میں نظاروں کی کمی نہیں۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ بدستور تکتے ہوئے بولی ''یہ الگ بات ہے کہ ان مناظر میں بعض خوش گوار اور بعض بہت ہی تلخ اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا ''یہ تو ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ یہ شر اور خیر کے مختلف عناصر سے ترتیب پاتی ہے۔ ترش اور شیریں کا ملاپ ہی کسی شے کا وجود قائم رکھتا ہے' جیسے برقی رو کی ترسیل کو برقرار رکھنے کے لیے مثبت اور منفی پولز کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اسی طرح انسانی زندگی بھی خوش گوار اور ناخوشگوار یادوں کا سرمایہ ہے اور یہ خوشگوار و ناخوشگوار یادیں' تلخ اور شیریں مناظر کی رہین منت ہوتی ہیں۔''

زرگل نے پُرسوچ انداز میں کہا ''انسان کی آنکھیں اگر متعدد خونچکاں نظاروں کے بعد صرف ایک دل خوش کن منظر دیکھ لیں تو ماضی...... گزرے ہوئے وقت کی ساری کلفت اور کدورت دور ہو جاتی ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''تصویر کا دوسرا رخ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ لگاتار اور مسلسل خوشیوں کے بعد اگر انسان اچانک کسی گہرے صدمے سے دوچار ہو جائے تو اگلی پچھلی ساری مسرتیں خاک میں مل کر رہ جاتی ہیں اور متاثرہ شخص کو سنبھلنے میں مہینوں بلکہ بعض اوقات کئی سال بھی لگ جاتے ہیں۔''

''ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''اس لیے کہ غم اور خوشی انسانی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔''

''کیا ہم غم سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل نہیں کر سکتے؟''

''اس کے لیے زندگی کو خیرباد کہنا پڑے گا!''

''پھر کیا فائدہ۔'' وہ ہاتھ لہرا کر بولی ''جب زندگی نہ رہی تو پھر غم اور خوشی کی کیا اہمیت؟''

''اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ زندگی غم اور خوشی کا مرکب ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں کم' کہیں زیادہ۔ کہیں رنگین' کہیں سنگین!''

''تم یقین جانو۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی ''میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جنہیں دنیا میں کوئی غم و فکر نہیں۔ وہ ہر وقت خوش اور خوش حال دکھائی دیتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سرہلایا اور کہا ''ایسے افراد کو موٹی کھال والا کہا جاتا ہے...... بے حس اور سفاک لوگ۔ وہ خوش اور خوش حال اس لیے نظر آتے ہیں کہ یہ دونوں نعمتیں انھوں نے دوسروں سے چھینی ہوتی ہیں ورنہ انسان کتنا بھی بااختیار یا اقتدار اور صاحب ثروت کیوں نہ ہو' یہ ممکن نہیں کہ اسے کوئی غم نہ ہو۔ اصول تو یہ ہے کہ انسان زندگی کے مختلف شعبوں میں جس قدر پھیلا ہوا ہے' اس کی پریشانی' فکر اور مسائل اسی قدر وسیع ہوتے ہیں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اس وضاحت کو مکمل کرتے ہوئے کہا ''ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی پریشانیوں اور غموں کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے اور ہر حال میں مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بہت باکمال' اعلیٰ ظرف اور قابل ستائش لوگ ہیں۔ ان کی ایک خاص پہچان ہے۔ یہ ہر حال میں آپ کو ''خوش'' تو نظر آئیں گے مگر کسی بھی حال میں آپ انہیں ''خوش حال'' نہیں دیکھیں گے۔ تم سمجھ رہی ہونا' خوشحالی سے میری کیا مراد ہے؟''

اس نے اثبات میں سرہلا دیا اور ایک گہری طویل سانس لیتے ہوئے بولی ''وجدان! تم مجھے کوئی گر بتانے والے تھے!''

''ہاں گر!'' میں نے مخصوص انداز میں گردن کو جنبش دی اور کہا ''میں تمہیں ایک نہایت ہی مختصر اور آسان سی مشق بتاتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں اسے مکمل کیا جا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر اس ننھی منی مشق کو کچھ عرصے ...... تک باقاعدگی سے جاری رکھا جائے تو نہ صرف شکستہ اعصاب کی مرہم پٹی ہو جاتی ہے بلکہ یہ قابو میں بھی آ جاتے ہیں۔''

''میں اس مفید مشق کو اپنی زندگی کا حصہ بنالوں گی۔'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولی۔

پھر اس سے قبل کہ میں زرگل کو مذکورہ مشق کے بارے میں کچھ بتاتا' ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری گھنٹی پر میں نے فون ریسیو کر لیا۔ دوسری طرف شہزاد تھا۔

''ہیلو وجدان! منہاس صاحب نے ہیلو کیب اور دو مسلح سکیورٹی گارڈ یہاں بھیج دیے ہیں۔ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ جب تم نے رنگ نہیں کیا تو سوچا' میں ہی تم سے رابطہ کر لیتا ہوں۔''

''بہت اچھا کیا تم نے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''پروگرام وہی ہے۔ صبح سے پہلے پہلے فواد پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ اس بھروسے پر نہیں بیٹھا جا سکتا کہ فرصت ملے گی تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔ میرا سابق تجربہ یہی ہے کہ مجھے کبھی فرصت نہیں ملے گی۔ تم ہیلو کیب میں میری طرف آ جاؤ۔ یہاں بیٹھ کر پروگرام کو فائنل کرتے ہیں۔''

''اوکے' میں نکل رہا ہوں۔'' وہ مستعدی سے بولا۔

میں نے کہا ''شہزاد! اس وقت ملبوسات کی کوئی دکان کھلی ہوگی؟''

''اس وقت!'' اس نے الجھن زدہ انداز میں دہرایا ''رات کا ایک بج رہا ہے۔ مجھے نہیں امید ایسی کوئی دکان کھلی ہو۔ گارمنٹس اور بوتیک والے زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے تک اپنا کاروبار سمیٹ لیتے ہیں۔ ویسے مسئلہ کیا ہے؟'' بات کے اختتام پر اس نے پوچھا۔

''مجھے ایک لیڈیز سوٹ چاہیے۔'' میں نے زرگل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ''اگر شلوار قمیص مل جائے تو زیادہ اچھا ہے۔''

زرگل نے ابھی تک نائلہ کا وہی گلابی لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ میں اسے لباس تبدیل کرنے کے لیے کہتا اور از خود اس نے نائلہ کے وارڈروب میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

شہزاد نے میرا مقصد سمجھ لیا' بولا ''آپ کو زرگل کے لیے لباس چاہیے نا؟''

''ہاں ہاں' اسی کے لیے۔'' میں نے جلدی سے کہا ''تم نے اسے دیکھا ہے۔ اس ناپ کا ایک لباس فوراً مہیا کر دو تو اچھا رہے گا۔ کل میں یہیں طارق روڈ سے اس کی مرضی کی شاپنگ کروا دوں گا۔''

شہزاد نے پوچھا ''لباس نیا ہونے کی شرط ہے یا دُھلا ہوا استعمال شدہ بھی چلے گا!''

''صاف ستھرا استعمال شدہ بھی دوڑے گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

پھر میں نے امجد مرحوم کا حوالہ دیتے ہوئے شہزاد کو بے حد محتاط رہنے کی تاکید کی۔ ساؤتھ والی کارروائی میں شہزاد علی بھی امجد کے ساتھ تھا لیکن خوش قسمتی سے شعیب کے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا۔

شہزاد سے رابطہ ختم ہوا تو زرگل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''وجدان تمہاری باتوں سے پتا چلا ہے' تم فواد کو آج رات ہی چھاپنے کا فیصلہ کر چکے ہو' تم نے کہا تھا' اس مشن میں مجھے بھی اپنے ساتھ رکھو گے!''

''ہاں' کہا تو تھا!'' میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں بھی ڈوبا ہوا تھا۔ حالات کی بساط پر میرا ذہن مہروں کی پلیسنگ کر رہا تھا ''کیا تم واقعی اس مشن میں عملاً حصہ لینا چاہتی ہو یا فلیٹ پر اکیلے رہنے سے ڈر رہی ہو؟''

یہ سوال میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا ورنہ میں نے اسے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فواد مجھے اور شہزاد کو چہروں سے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کو گلشن والے فلیٹ سے باہر لانے میں زرگل بہت معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہم نے فواد کے ساتھ جو بھی کارروائی کرنا تھی وہ اس اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر کہیں کرنا تھی۔ وہ ایک رہائشی عمارت تھی۔ اگر ہم فواد کے فلیٹ پر کوئی غیر نصابی مضمون کھول بیٹھتے تو ایک مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی!

میں نے سوالیہ نظروں سے زرگل کو دیکھا تو وہ دیانت

داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی'' دونوں ہی باتیں ہیں وجدان۔ مجھے یہاں تنہا رہتے ہوئے واقعی ڈر محسوس ہوگا۔ اس فلیٹ پر کھنے اور خوف زدہ ہونے سے تو یہ اچھا ہوگا' میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں۔''

اس کے لہجے سے اپنائیت اور خلوص ٹپکتا تھا۔ ''ہاتھ بٹاؤں'' کے الفاظ اس نے اتنی سادگی اور سچائی سے ادا کیے تھے کہ میں اس کی پیش کش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اسے ساتھ لے جانے کے بارے میں سوچ ہی چکا تھا، فراخ دلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے زرگل! تم بھی ہمارے ساتھ ہی جاؤ گی۔''

''بس تو پھر جلدی سے مجھے وہ مختصر مشق بتا دو۔'' وہ کسی ننھے بچے کی طرح مچل کر بولی'' تاکہ جب ہم اس مشن سے کامیاب لوٹیں تو میں اپنے بکھرے ہوئے اعصاب کو سمیٹ کر چین کی نیند سو سکوں۔''

میں چند لمحات تک خاموش رہ کر اپنے خیالات کو ایک نقطے پر مجتمع کرتا رہا پھر زرگل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''کشیدہ اعصاب کسی تنی ہوئی ڈوری کے مانند ہوتے ہیں۔ ڈوری کو چاہے جتنا بھی کھینچ کر تان لیا جائے' اس میں مزید کی گنجائش موجود رہتی ہے۔ اس کی فطرت میں لچک ہوتی ہے جو اسے ٹوٹنے سے بچائے رکھتی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب اس کی فطری لچک کا اختتام ہو جاتا ہے اور ڈوری کے بل کھلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ کھلنے سے پہلے ٹوٹتے ہیں پھر بکھرتے ہیں۔ ان بلوں کے نازک ریشے شکست و ریخت کا شکار ہو کر اپنی سالمیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ڈوری کا وجود انہی ریشوں کی صحت پر منحصر ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی صورت شکل کو برقرار نہیں رکھ سکتے تو ڈوری کا وجود کب تک قائم رہ سکتا ہے۔

''انسان کے اعصاب کی طاقت اور ضعف کا دارومدار بھی لچک پر ہے جس شخص کے اعصاب میں جتنی زیادہ لچک موجود ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ برداشت کا مالک ہوتا ہے۔

''تنے ہوئے اور مشتعل اعصاب اپنی لچک کو کھو دیتے ہیں جس کے نتیجے میں انسان ڈھے جاتا ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اعصاب میں لچک پیدا کرے تاکہ اس کی ذہنی اور جسمانی صحت بہ حال رہ سکے۔ تفکرات اور پریشانیاں اس لچک کے دشمن ہیں۔ آپ کی صحت کے یہ دونوں دشمن اگر ختم نہیں ہو سکتے تو نہ ہوں۔ انہیں اپنا کام کرنے دیجیے اور آپ اپنا کام جاری رکھیں...... اعصابی لچک کو بڑھانے کا کام اپنی برداشت تحمل اور صبر کو آزمانے کا کام!''

وہ ہمہ تن گوش یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا'' یہ مشق اعصاب میں لچک پیدا کر کے تمہیں ذہنی سکون فراہم کرے گی، کسی بھی آرام دہ جگہ پر بیٹھ جاؤ' لیٹ جاؤ یا کھڑی ہو جاؤ۔ آرام دہ جگہ سے میری مراد ایک ایسی جگہ ہے جہاں تازہ ہوا کا گزر ہو اور کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ ہو تاکہ تم پوری توجہ سے یہ مشق کر سکو۔ بیٹھ کر' لیٹ کر یا کھڑی ہو کر جیسے بھی تمہیں سہولت ہو' اپنی آنکھیں بند کر لو۔ اس کے بعد تین چار گہری اور ہموار سانسیں لو تاکہ پھیپھڑے تازہ ہوا سے معطر اور ذہن منور ہو سکے۔ اس مختصر سی تیاری کے بعد اپنے ذہن میں کسی کلف دار کپڑے کا تصور کرو۔ کھڑکھڑاتا' سرسراتا اور کڑک کپڑا۔ یہ ناراض اور غصیلا کپڑا تمہارے اعصاب ہیں۔ تم نے اس میں لچک اور نرمی پیدا کرنا ہے...... اور تم یقیناً ایسا کر کے دکھاؤ گی۔

''ایک گہری سانس کھینچو۔ دھیرے دھیرے ناک کے راستے تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھرنے دو۔ جب سانس کی آمد مکمل ہو جائے تو پھر منہ کے راستے سیٹی بجانے والے انداز میں' ہونٹوں کو سکیڑ کر اس سانس کو آہستہ آہستہ خارج کرو۔ تصور یہ قائم کرو کہ تم اس اکڑے ہوئے کپڑے پر پھونک مار رہی ہو۔ تمہاری پھونک میں بڑی تازگی اور فرحت ہے' بڑی نرمی اور لوچ ہے۔ اس پھونک کی ٹھنڈک اور ملائمت کپڑے پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس کی اکڑفوں نکل رہی ہے جس کی جگہ نرمی اور گداز پیدا ہو رہا ہے۔ وہ کلف دار کپڑا رفتہ رفتہ ریشم میں بدل رہا ہے۔ اس کے اندر اتنی لچک اور لوچ پیدا ہو چکا ہے کہ یہ زمانے بھر کی تلخیوں' سختیوں اور کرختگی کو اپنے دامن میں سمو سکتا ہے...... ان منفی عناصر کی ہستیوں کو نیست و نابود کر کے راحت اور آرام کی فضا تخلیق کر رہا ہے!

''یاد رکھو! نرمی سے زیادہ کوئی شے سخت نہیں ہو سکتی۔ خطرناک سے خطرناک تلوار کا وار روکنے کے لیے ڈھال بنائی جا سکتی ہے' اپنے جسم کو فائرنگ سے محفوظ رکھنے کے لیے بلٹ پروف ہیلمٹ اور جیکٹ تیار کی جا سکتی ہے لیکن نرمی کا وار روکنے کے لیے آج تک کوئی ڈھال' کوئی روک ایجاد نہیں ہو سکی کیوں کہ یہ جسم پر نہیں' دل پر وار کرتی ہے' ذہن کو مسخر کرتی ہے۔ انسان کے دل و دماغ کو تسخیر کرنا ہی اصل حکمرانی ہے۔ اپنی طاقت کے بل پر مخلوقِ خدا کو ہراساں کر کے انہیں اپنے اشاروں پر نچانا اور اپنے احکام کی بجا آوری پر مجبور کرنا ایک ناٹک ہے' اپنی برتری جتانے کا ایک کھوکھلا مظاہرہ۔ ایسے جھٹ بھیوں کی دنیا میں کمی نہیں!''

میری تقریر ختم ہوئی تو زرگل کو جیسے ہوش آ گیا۔ اس نے

چونک کر مجھے دیکھا اور ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی'' پھر کیا ہوا؟''

''اور پھر دروازے پر دستک ہونے لگی۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

اگلے ہی لمحے واقعی دستک ہونے لگی۔

زرگل نے دیدے پھیلا کر مجھے ناپنے کی کوشش کی۔ میں خاموشی سے اٹھا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ شہزاد علی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا!

☆☆☆

کرم اپارٹمنٹس سے چند گز پہلے ہی شہزاد نے ہیلو ہنڈائی روک لی۔ اس مقام پر نیم تاریکی تھی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ ہم جس قسم کی کارروائی کرنے وہاں پہنچے تھے' اس کے لیے مناسب وقت یہی تھا۔ کرم اپارٹمنٹس ایک بہت بڑا رہائشی منصوبہ ہے جس میں سیکڑوں فلیٹس ہیں جن میں بسنے والوں میں سے اکثر سو رہے تھے۔

شہزاد بہت موقع شناس اور با تدبیر بندہ تھا۔ میں نے زرگل کے لیے ایک لباس کی فرمائش کی تو وہ تین لباس اٹھا لایا۔ وہ میری طرف آنے سے پہلے منہاس باقر کے بنگلے پر گیا تھا اور زرگل کے لیے شبانہ کا ایک نیا لباس وہاں سے حاصل کر لیا۔ مذکورہ لباس شبانہ نے چند روز پہلے ہی خریدا تھا اور ابھی اس کے استعمال میں نہیں آیا تھا۔ شبانہ اور زرگل کی فزیک میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے زرگل کے بدن پر وہ لباس بڑا فٹ بیٹھا تھا۔

دوسرے دو لباسوں کو دیکھ کر میں چونک اٹھا تھا اور میں نے حیرت بھرے لہجے میں شہزاد سے پوچھا تھا'' یہ وردیاں تم کیوں اور کہاں سے لائے ہو؟''

وہ دو پولیس یونی فارمز تھیں۔ شہزاد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا'' ایک لانڈری والے سے میری اچھی یاد اللہ ہے۔ اکثر پولیس والوں کی یونی فارمز اس کے پاس دھلنے کے لیے آتی ہیں۔ میں نے اس وقت اسے تھوڑی تکلیف دی اور وہ میرا مسئلہ حل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ ہم اپنا کام نکالنے کے بعد یہ وردیاں لانڈری والے کو لوٹا دیں گے۔ وہ انہیں دوبارہ دھو کر سیٹ کر دے گا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا'' وجدان! فواد کو کرم اپارٹمنٹس سے باہر لانے کے لیے ہمیں پولیس والوں کا سوانگ بھرنا ہوگا ورنہ اس رہائشی علاقے میں کارروائی خاصی مشکل ہو جائے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!''

میں نے پُرمعنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا'' لیکن یہ محض وردیاں ہیں۔ مخصوص قسم کے بیلٹس اور بیجز کے بغیر کہیں وہاں کا چوکیدار کسی شک میں مبتلا نہ ہو جائے!''

''میرا خیال ہے' ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ یقینی لہجے میں بولا'' اس شہر میں پولیس کی وردی دہشت اور خوف کی علامت بن گئی ہے' چوکیدار فروعی معاملات پر توجہ نہیں دے گا۔ پھر ہمارے پاس ہتھیار بھی ہوں گے تو وہ دم نہیں مار سکے گا۔ اس پر ہم خالص پولیس والوں کا سا انداز اختیار کریں گے تو انگلی ٹیڑھی کیے بغیر گھی نکل آئے گا۔'' ذرا رک کر اس نے کہا'' تم اس مشن میں سینئر اور میں جونیئر پولیس والا ہوں۔ میں کلاشنکوف اٹھاؤں گا اور تم یہ پسٹل اپنے پاس رکھو گے۔ باقی کا کام ہم اپنی بھرپور اداکاری سے چلا لیں گے۔ کیسا آئیڈیا ہے؟''

''آئیڈیا اچھا اور قابلِ عمل ہے!'' میں نے پُرسوچ انداز میں عندیہ دے دیا۔

شہزاد دو پولیس یونیفارمز کے ساتھ اسلحے کے نام پر ایک کلاشنکوف اور ایک نائن ایم ایم پسٹل بھی لایا تھا۔ آئندہ چند منٹ میں ہم نے لباس تبدیل کیے اور کارروائی کے لیے لائحہ عمل طے کر لیا تھا۔ اب ہم دو پولیس والوں کے بھیس میں ہیلو ہنڈائی میں عملی میدان میں کودنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں نے احتیاطاً فلیٹ سے روانہ ہوتے وقت اپنا سول ڈریس گاڑی میں رکھ لیا تھا۔ شاید یہ میری چھٹی حس کا کمال تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا یہ بھی دیگر ضروری لوازمات کا حصہ ہے اور کسی بھی وقت اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ زرگل چاق و چوبند عقبی نشست پر براجمان تھی۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا تھا' میں نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور کہا۔

''زرگل! ہم اندر جا رہے ہیں۔ تم گاڑی میں بیٹھ کر ہمارا انتظار کرو!''

''ٹھیک ہے' مجھے امید ہے تم لوگ اندر زیادہ دیر نہیں لگاؤ گے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ شہزاد نے زرگل سے پوچھا'' تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا؟''

زرگل نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ ہم دونوں گاڑی سے باہر آ گئے۔ میں نے زرگل سے کہا'' تم آگے پسنجر سیٹ پر آ جاؤ۔ تاکہ واپسی کے سفر کو آسان بنایا جا سکے۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں مطمئن ہونے کے بعد شہزاد کے ساتھ کرم اپارٹمنٹس کی جانب قدم اٹھانے لگا۔ میں نے پہلے یہی سوچا تھا کہ فواد سے باہر لانے کے لیے زرگل کا سہارا لوں گا۔ ایک مرتبہ وہ احاطے سے نکل آتا تو پھر ہم اس کے ساتھ ہر سلوک کے لیے تیار تھے مگر شہزاد کے آئیڈیا میں

زیادہ جان تھی لہٰذا اسے آزمانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پولیس والوں کے روپ میں ہم فلیٹ کے اندر اور باہر فواد کے ساتھ ہر قسم کا سلوک کر سکتے تھے، کسی بھی شخص کو ہمارے رویے پر حیرت یا اعتراض نہ ہوتا۔ پولیس کے بارے میں معاشرے کی عموی سوچ اس وقت میرے لیے خاصی آسانیاں فراہم کرنے کا وسیلہ بن گئی تھی۔ عوام آئے دن پولیس والوں کے ایسے ”کارنامے“ دیکھتے رہتے ہیں!

چوکیدار ہمیں دیکھتے ہی الرٹ ہوگیا۔ وہ چالیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ جس کے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نظر نہیں آرہی تھی۔ لباس کے اندر کچھ چھپا رکھا ہو تو الگ بات ہے۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے تحکمانہ انداز میں سوال داغ دیا ”تیرہ ڈی میں کون رہتا ہے؟“

میرے اکھڑے ہوئے لہجے نے اسے باور کرادیا کہ کوئی سنگین گڑبڑ ہے۔ اس نے کہا ”سر! اس فلیٹ میں ایک جوڑا رہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی چند دن پہلے ہی آئے ہیں۔ جہانگیر کی بیوی بےچاری گونگی ہے۔“

چوکیدار کی فراہم کردہ اطلاعات چونکا دینے والی تھیں۔ ہماری معلومات کے مطابق اس فلیٹ میں صرف فواد کو ہونا چاہئے تھا۔ شہزاد نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا، میں خود بھی الجھ گیا تھا۔ ہماری لمحاتی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر چوکیدار نے پوچھا۔

”سر! خیریت تو ہے نا......“

میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ”خیریت بالکل نہیں ہے۔“ پھر میں نے اسے چکر دیا ”تم نے جس شخص کا نام جہانگیر بتایا ہے اس کا حلیہ یہ ہے نا؟“ اس کے بعد میں نے فواد کا تفصیلی حلیہ اور قد کاٹھ اس کے سامنے بیان کیا۔

وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل...... بالکل...... میں اسی جہانگیر کی بات کررہا ہوں۔“

مجھے بس اتنا ہی موقع درکار تھا، میں چوکیدار کے ذہن پر سوار ہوگیا ”تم جسے جہانگیر سمجھ رہے ہو اس کا نام فواد ہے اور وہ ایک خطرناک دہشت گرد ہے۔ ہم کافی دنوں سے اس کے تعاقب میں تھے۔ آج رات ہی اس کا سراغ ملا ہے وہ دس اور گیارہ بجے کے درمیان یہاں آیا ہے۔“

”سر! جہانگیر کے ساتھ تو اس کی گونگی بیوی......“

”سب بکواس ہے، ایک ڈراما ہے۔“ میں نے چوکیدار کی بات مکمل نہیں ہونے دی۔ ”ابھی دیکھنا تم، ہم کس طرح اس خطرناک مجرم کو بے دست و پا کر کے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ قانون کی نگاہ سے بچنے کے لیے یہ لوگ آج کل اسی طرح رہائشی علاقوں میں پناہ لے رہے ہیں اور خود کو فیملی والا ظاہر کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ گونگی عورت بھی اس کی ساتھی ہوگی...... اور عین ممکن ہے وہ گونگی بھی نہ ہو۔“

چوکیدار تفکر اور سنسنی آمیز تاثرات کے ساتھ دیکھنے لگا۔ شہزاد نے کہا ”سر! جلدی کریں۔ اگر فواد کو پولیس کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ فرار ہوجائے گا۔ کئی ماہ کی کوشش کے بعد تو اس کی گرفتاری کے آثار پیدا ہوئے ہیں۔“

میں نے چوکیدار کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا ”تم شکل سے خاصے فرض شناس اور مستعد نظر آتے ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟“

”داؤد!“ اس نے جلدی سے جواب دیا۔

”تم ادھر گیٹ پر ہی رہنا داؤد۔“ میں نے تحکمانہ انداز میں کہا ”ہم اوپر جارہے ہیں۔ اگر فواد کسی طرح ہمیں جُل دینے میں کامیاب ہوجائے اور فرار ہونے کی کوشش کرے تو تم اسے کوئی موقع نہ دینا...... بلکہ تم یہ چھوٹا گیٹ بھی بند کردو۔“ میں نے مین گیٹ کے اندر واقع چھوٹے گیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ ”اسے روکنے کے لیے تم ہر سختی کرسکتے ہو!“

یہ ساری مکالمہ بازی، میں ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی خاطر کررہا تھا اور مجھے اپنی اس کوشش میں حد درجہ کامیابی حاصل ہوئی۔ چوکیدار اس طرح میرے احکام کی تعمیل کرنے لگا جیسے اس نے میری باتوں کو من و عن درست مان لیا ہو۔ دہشت گرد کا حوالہ خاصا موثر ثابت ہورہا تھا۔

میں نے شہزاد کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے تیرہ۔ڈی کی طرف بڑھنے لگے۔ چوکیدار نے مجھے مذکورہ فلیٹ کی لوکیشن بتادی تھی۔ ڈیسے زرگل کی فراہم کردہ اطلاعات بھی میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ تیرہ۔ ڈی سیکنڈ فلور پر واقع ایک بی۔ کیٹگری فلیٹ تھا۔ چوکیدار کے مطابق جہانگیر (فواد) ایک کرائے دار کی حیثیت سے وہاں رہ رہا تھا۔

شہزاد نے کہا ”پہلا مرحلہ بہ آسانی طے ہوگیا۔ لگتا ہے فواد نام بدل کر یہاں رہ رہا ہے لیکن گونگی بیوی کا قصہ سمجھ میں نہیں آرہا!“

ہم تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ میں نے اس کے جواب میں کہا ”گونگی بیوی والا قصہ لوگوں کو دکھانے کے لیے ہے۔ خود کو معزز اور شریف شہری ظاہر کرنے کے لیے اس نے تنظیم ہی کی کسی عورت کو اپنے ساتھ رکھ لیا ہوگا اور مجھے یقین ہے، وہ عورت قوتِ گویائی سے مالا مال ہوگی!“

شہزاد نے ترنگ میں آتے ہوئے کہا ”وجدان! تم اس گونگی کی زبان کھلوانا، میں فواد کی زبان بند کرنے کا کام کروں گا۔ کم بخت نے نام بھی بدلا تو اپنے ہی ایک باغی ساتھی کا نام اسے پسند آیا۔“

شہزاد کا اشارہ اس جہانگیر کی طرف تھا جو سی ایف کے سے انحراف کے بعد مجھ سے آملا تھا لیکن پھر اچانک منظر سے غائب ہوگیا۔ اغلب امکان اسی کا تھا، شعیب غوری نے اسے ٹھکانے لگوادیا ہوگا۔ سی ایف کے ایسی تنظیموں میں راز اور راز داری کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور جہانگیر نے فواد کی موجودگی میں گلستان جوہر والے فلیٹ پر جو انکشاف کیے تھے، اس کے بعد تنظیم کے لیے جہانگیر کی حیثیت کسی خالی کارتوس کی سی تھی اور...... خالی کارتوس کو بیلٹ میں پرو کر سینے پر سجایا جاتا ہے، نہ ہی رائفل کی زینت بنایا جاتا ہے۔ اس کھوکھلی شے کو حقیر اور بے وقعت جان کر پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے!

ہم مطلوبہ دروازے پر پہنچ کر رکے تو میری نگاہ میں چند روز پہلے کا ایک منظر گھوم گیا۔ ایک رات میں اور شہزاد اسی طرح جہانگیر اور فواد کی سرکوبی کے لیے گلستان جوہر کے فلیٹ نمبر ڈی۔ تین سو آٹھ پر پہنچے اور چند خوش گوار و ناخوش گوار یادیں رقم کر آئے تھے۔

میرے اشارے پر شہزاد نے فلیٹ کے دروازے پر ہلکی دستک دی۔ ڈور بیل کو ہم نے دانستہ نظر انداز کردیا تھا۔ پہلی دستک بے اثر ثابت ہوئی۔ دوسری مرتبہ شہزاد نے قدرے زیادہ قوت صرف کی تو اندر سے کچھ اس قسم کی آوازیں ابھریں جیسے وہ لوگ دروازے کی طرف متوجہ ہوگئے ہوں اور اب تب میں دروازہ کھلنے ہی والا ہو۔

اسی کیفیت میں دس سیکنڈ گزر گئے اور دروازہ نہ کھلا تو ایک مرتبہ پھر دستک کا عمل دہرایا گیا۔ اس دروازے میں آئی گلاس نصب نہیں تھا۔ میری چھٹی حس مجھے آگاہ کررہی تھی، دروازے کے پیچھے کوئی موجود ہے اور دروازہ کھولنے میں پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔ وہاں یقیناً فواد ہوگا یا اس کی ”بیوی مارکا“ ساتھی یا پھر وہ دونوں بھی ہوسکتے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں شہزاد کو ایک مرتبہ پھر دستک کا اشارہ کرتا، دروازے کی اندرونی کنڈی گرنے کی آواز آئی۔ میں نے اپنے لہجے میں حسبِ ضرورت تبدیلی کرتے ہوئے کہا ”جہانگیر! دروازہ کھولو۔ میں داؤد ہوں۔ یہاں کا چوکیدار!“

چند لمحات کی خاموشی کے بعد دروازہ نیم وا ہوا اور نیند میں ڈوبی نسوانی آواز میں ”غوں غاں“ ابھری۔ وہ میری اس وقت آمد کے بارے میں استفسار کررہی تھی۔ گویا فواد نے گونگی چال چلی تھی!

شہزاد نے پلک جھپکتے میں، میرا اشارہ پا کر دروازے کو ایک زوردار دھکا دیا۔ دروازے کا پٹ، گونگی کے منہ پر لگا اور وہ الٹے قدموں کئی فٹ پیچھے جاگری۔ ہم بھرا مار کر فلیٹ کے اندر داخل ہوگئے۔ اس عورت کی دردناک گونگی کراہیں ابھرنے لگیں۔ اس کے ساتھ بری ہوئی تھی۔

اسی لمحے کھلے ہوئے دروازے کے پٹ کے پیچھے سے، ایک سایہ نمودار ہوا اور اس نے بڑی پھرتی سے شہزاد کی کمر پر لات رسید کی۔ وہ فواد کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا جو دروازے کی اوٹ میں چھپ کر صورتِ حال کو بھانپنے کی کوشش کررہا تھا۔ جب اس کی صورت میری نظر میں آئی تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ وہ فواد ہی تھا۔

میں نے ایک جھٹکے سے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور فواد کی جانب لپکا جو زمین پر گرے ہوئے شہزاد کو دبوچنے کی کوشش کررہا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں، میں نے اندازہ لگالیا کہ فواد شہزاد سے زیادہ اس کی کلاشن کوف میں دلچسپی لے رہا تھا تاکہ پاسا پلٹ سکے۔

میں نے آگے بڑھ کر اپنے وزنی بوٹ سے فواد کے تھوبڑے پر ایک کاری ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا اور کلاشنکوف پر سے اس کی گرفت ختم ہوگئی۔ میں نے کالر میں ہاتھ ڈال کر اسے جھٹکا دیا اور اٹھا کر دوسری طرف پھینک دیا۔ وہ زمین بوس گونگی پر جاگرا۔ میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”ہیلو مسٹر فواد! تم جہانگیر کب سے بن گئے؟“

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اس کے چہرے پر خوف و ہراس کو منڈلاتے دیکھا، وحشت بھری آواز میں بولا ”وجدان...... یہ تم ہو!“

وہ شاید اب تک ہمیں پولیس والے ہی سمجھ رہا تھا۔ شہزاد کے نام سے وہ واقف نہیں تھا اس لیے مجھے مخاطب کررہا تھا۔ ہم جس دھواں دھار انداز میں فلیٹ کے اندر داخل ہوئے تھے، اس سے فوری طور پر فواد کو ہماری صورتوں پر دھیان دینے کا موقع نہیں دیا تھا۔

میں نے فواد کو اپنی نگاہ میں رکھتے ہوئے تحقیر آمیز لہجے میں کہا ”تم کیا سمجھ رہے تھے، یوں چلمن نشین ہو کر میرے ہاتھ سے بچ جاؤ گے۔ میں تمہیں، تمہارے باس اور بگ باس کو قبر کے کنارے تک ہراساں کروں گا۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ اس نے میرے چہرے کو دیکھتے

ہوئے پوچھا۔
میں نے کہا "میں تم سے جو کچھ بھی جاننا چاہتا ہوں، وہ یہاں ممکن نہیں، خاص طور پر تمہاری گونگی بیوی کی موجودگی میں تو یہ انتہائی واہیات ہوگا۔ یہ بے چاری کیا سمجھے گی، ہم زبان والے اتنے ہی بے ہودہ ہوتے ہیں اور پھر...... میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے۔"
اس دوران میں شہزاد نے گونگی کے دوپٹے کو رسی کی شکل دے کر اس کے دونوں بازو، کلائیوں کے مقام سے پشت پر باندھ دیے اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "وجدان! یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔"
میں نے فواد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہاں بھئی! شرافت سے ہمارے ساتھ چلو گے یا پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دوں؟"
"تم لوگ ہمیں کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" اس نے ہراساں لہجے میں دریافت کیا۔
فواد اتنا بزدل یا گیا گزرا نہیں تھا لیکن گن پوائنٹ نے اسے بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ شہزاد نے گونگی کو جکڑنے کے بعد فواد کو کلاشن کوف کے نشانے پر رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غیظ وغضب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ شاید یہ اس کِک کا نتیجہ تھا جو تھوڑی دیر پہلے فواد نے اس کی کمر پر رسید کی تھی۔ اس کے سوال پر شہزاد نے پھنکار کر کہا۔
"ہم تم دونوں کو اپنی لیبارٹری میں لے کر جائیں گے جہاں تمہارا میڈیکل ٹیسٹ ہوگا۔ تم نے پہلے بھی کئی لولی لنگڑی اور اندھی بہری لڑکیوں کو شادی کے نام پر بہت دھوکے دیے ہیں۔ دیکھنا ہوگا، تم اس گونگی کا شوہر بننے کے قابل بھی ہو یا نہیں؟" بات ختم کرتے ہی اس نے زیرِ حراست عورت کی جانب اشارہ کیا۔
گونگی نے جھکی ہوئی نظر سے شہزاد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔ شاید شہزاد کی بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک میانہ قد اور دبلی پتلی سانولی عورت تھی۔ اس کے گونگی ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں حتمی طور پر فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔
مجھے شہزاد کی اس بات سے صد فیصد اتفاق تھا کہ ہمیں اس فلیٹ یا اس عمارت میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میں نے فواد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہم پولیس والے ہیں، یہ بات ذہن میں بٹھالو۔" میرے لہجے میں سنگینی جھلکتی تھی "تم دونوں کو اپنے ساتھ تھانے لے کر جائیں گے۔ باہر ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ ضروری تفتیش کے بعد تمہیں چھوڑ دیا جائے گا لہٰذا......"
میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں بڑی دور تک جھانکا اور سفاکی سے کہا "تم لوگ شرافت کا مظاہرہ کرنا۔ اس بلڈنگ والوں کو میں تمہارے بارے میں بتاؤں گا ہوں کہ تم ایک خطرناک دہشت گرد ہو چنانچہ اگر تم نے کسی مہم جوئی کی کوشش کی تو "پولیس مقابلے" میں مارے جاؤ گے۔ میں تمہیں شوٹ کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"
میرے انداز میں بھری ہوئی سفاکی اور وحشت نے فواد کو باور کرا دیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس پر بلا تاخیر عمل بھی کر ڈالوں گا۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں سر کو تفہیمی جنبش دی۔ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر مزید کہا۔
"اگر میری ہدایات پر من وعن عمل کرو گے تو تمہاری زندگی سلامت رہے گی۔ میں ضروری پوچھ تاچھ کے بعد تمہیں چھوڑ دوں گا۔"
اس نے بے اعتباری سے مجھے دیکھا۔ اس کا یہ ردِعمل عین فطری تھا۔ اصولی طور پر اسے میری بات کا یقین نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شعیب غوری اور میرے درمیان دشمنی کی جو بساط بچھی ہوئی تھی، اس پر حریف کے کسی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ مہرے کے لیے بھی چھوٹ نہیں تھی۔ فواد کے پاس کوئی جائے فرار نہیں تھی اس لیے وہ ہماری بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔
ہم سب آگے پیچھے چلتے ہوئے مین گیٹ پر پہنچ گئے۔ میں نے گونگی کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دوپٹے کی گرہ سے تھام رکھا تھا۔ فواد، شہزاد کی گن کے ٹہوکے پر چل رہا تھا۔ گیٹ کے نزدیک چوکیدار کے علاوہ بھی تین چار افراد کھڑے نظر آئے۔ وہ وہیں کے رہنے والے دکھائی دیتے تھے۔ ان لوگوں کی سرگوشیوں سے اندازہ ہوا کہ ہماری اس "کارروائی" کی خبر چوکیدار تک محدود نہیں رہی تھی اور...... ایک خطرناک صورتِ حال تھی! کسی وقت کوئی بھی اپ سیٹ ہو سکتا تھا۔ وہاں موجود افراد میں سے کسی کا دھیان ہمارے کندھوں یا کمر وغیرہ کی طرف چلا جاتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ اس کے بعد ہمارے "نقلی" ہونے کا راز کھل جاتا۔
میں نے چوکیدار کے پاس پہنچ کر سب کی طرف دیکھتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا "تم لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا کر آرام سے سو جاؤ۔ ہم نے اس دہشت گرد کو گرفتار کر لیا ہے۔ اب تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔"

قسمت مہربان تھی کہ کسی نے ہم سے کوئی ٹیڑھا یا تیکھا سوال نہیں کیا۔ چوکیدار نے بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر ہمارے لیے گیٹ کھول دیا۔ ہم گیٹ عبور کرکے اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔ فواد نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس دوران میں اپنی گردن جھکا رکھی تھی لیکن نیم تاریکی میں آتے ہی اس کی شرافت کا پول کھل گیا۔

وہ کسی عمدہ موقع کی تلاش میں تھا اور ایسا موقع نیم تاریکی نے اسے فراہم کردیا۔ ہم یلو ہنڈائی سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ فواد نے گن کی پروا کیے بغیر اچانک ایک جانب دوڑ لگادی۔ اس صورتِ حال نے ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا۔

میں نے گونگی کو ایک جانب دھکا دیا اور ترش لہجے میں شہزاد سے کہا "تم گاڑی لے کر مین روڈ کی طرف آؤ۔ میں اس سورما کے بچے کو دیکھتا ہوں۔"

بات ختم کرنے سے پہلے میں فواد کے پیچھے لپک چکا تھا۔ فواد نے اسی اسٹریٹ پر دوڑ لگائی تھی جو آگے جاکر مین روڈ سے مل جاتی تھی۔ وہ چاہے کتنا بھی تیز رفتار ہوتا لیکن میرا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے چیتے کی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، مسجد بیت المکرم کے نزدیک اسے جالیا۔ اس دوران میں شہزاد نے عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے گن کو زحمت سے بچائے رکھا ورنہ رات کے آخری حصے میں ہونے والی فائرنگ کی تڑتڑاہٹ وہاں کے خوابیدہ لوگوں کی نیند خراب کردیتی۔ ہم کسی قسم کی بدمزگی سے گزرے بغیر وہ مشن پورا کرنا چاہتے تھے۔

فواد نے "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" والی صورتِ حال دیکھی تو مقابلے کے لیے تن کر میرے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت شہزاد بھی گاڑی لے کر وہاں پہنچ گیا۔ فواد کی گونگی ساتھی کو شہزاد نے ہنڈائی کی عقبی نشست پر ڈال دیا تھا۔ زرگل پسنجر سیٹ پر موجود تھی۔ شہزاد نے سچویشن کی مناسبت سے بڑی عمدہ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے گاڑی اس طرح روکی کہ فواد گاڑی اور میرے درمیان پھنس کر رہ گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر دیکھا جیسے وہ ایک مرتبہ پھر بھاگنے کی تیاری کررہا ہو۔ میں نے اسے کوئی موقع نہ دیا اور قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہناتا، میں حرکت میں آچکا تھا۔ میری برق رفتار فرنٹ پش کک اس کے سینے پر پڑی۔ یہ ایک طوفانی ٹھوکر تھی۔ وہ ہوا میں پرواز کرتے ہوئے عقبی سمت گیا اور گاڑی کے بونٹ سے ٹکرایا۔

ٹکراؤ خاصا شدید تھا۔ اس کی کمر پر خطرناک چوٹ آئی اور وہ بہ آوازِ بلند چیخنے پر مجبور ہوگیا۔ میں آنِ واحد میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے اس کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کردیا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب گھوم گیا۔ میں نے اس کی گردن پر بازو لپیٹا اور اسے نیچے جھکاتے ہوئے، الٹی ایڑی کی ایک ٹھوکر اس کے چہرے پر ثبت کردی۔

فواد چلاتے ہوئے مغلظات بکنے لگا۔ میرے پاس کھیل کود کی فرصت نہیں تھی لہٰذا میں نے اس کی مزاحمت کو نیست و نابود کرنے کے لیے تین چار نپے تلے وار کیے اور وہ سڑک پر گر کر ہانپنے لگا۔ اس کی حالت خاصی دگرگوں تھی۔ آئندہ ایک منٹ کے اندر میں نے شہزاد کی مدد سے فواد کو ہنڈائی کی عقبی نشست پر پہنچا دیا جہاں اس کی نام نہاد بیوی پہلے سے موجود تھی۔ مزید "پیکنگ" کے لیے میں بھی گھس کر اسی نشست پر بیٹھ گیا۔ میرے اشارے پر شہزاد نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

گونگی کے ہاتھ اس کی پشت پر بڑی مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس بات کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے کہ وہ اپنی جانب کا لاک ہٹا کر گاڑی سے باہر کودنے کی کوشش کرتی۔ اس کی طرف سے چیخنے چلانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ فواد کو میں نے پوری طرح فٹ کر رکھا تھا۔ اس کے ذہن پر مزید دہشت بٹھانے کے لیے میں نے پسٹل کی بے رحم نال کو اس کی پسلیوں میں چبھویا ہوا تھا۔

شہزاد بڑی مشاقی سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا۔ جب ہم نے حسن اسکوائر کا سگنل عبور کیا تو اس نے مجھ سے پوچھا "وجدان! جانا کہاں ہے؟"

اس کے لہجے میں حددرجہ احتیاط اور سنجیدگی تھی۔ میں نے گمبھیر آواز میں کہا "جہاں سے تم آئے ہو، وہاں تو ہرگز نہیں جانا۔"

میں فیصل والے معاملے کو ہر قسم کے مسائل سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ شہزاد نے بدستور سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا "تو کیا وہاں چلیں جہاں سے تم آئے ہو؟"

"یہ بھی کسی طور مناسب نہیں۔" میں نے حتمی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟" شہزاد کے استفسار میں استعجاب اتر آیا۔

میں نے کہا "کیا تمہارے پاس کوئی اور ٹھکانا نہیں...... تسلی بخش ٹھکانا!"

شعیب غوری پر یہ راز کھل چکا تھا کہ منہاس باقر میرا پشت پناہ بنا ہوا ہے لہٰذا ایسی کسی بھی جگہ پر فواد اور اس کی گونگی ساتھی کو لے جانا مناسب نہیں تھا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ منہاس باقر سے تعلق رکھتی ہو۔ اس طرح شعیب غوری یا چوہدری نوازش کا نیٹ ورک مجھ تک...... اور فیصل تک پہنچنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ کم از کم کل رات تک تو میں اس نوعیت کا کوئی رسک لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

شہزاد نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ "میرے پاس دو محفوظ ٹھکانے ہیں جن میں ہلکے پھلکے ٹارچر کا مناسب سامان بھی موجود ہے۔" ذرا سا توقف دے کر اس نے اضافہ کیا "ایک سیل سرجانی ٹاؤن میں ہے اور دوسرا بھٹائی کالونی میں۔ یہ دونوں اڑے آباد علاقے سے کافی ہٹ کر ہیں۔ وہاں کی جانے والی "کارروائی" کسی کی نظر یا سماعت تک نہیں پہنچتی۔ فواد تو حیوان ناطق ہے ہی، مجھے یقین ہے ٹارچر سیل میں پہنچ کر اس کی گونگی بیوی قوتِ گویائی سے مالا مال ہوجائے گی!"

شہزاد کے لہجے سے عیاں سنگینی نے فواد کو ایک جھرجھری لینے پر مجبور کردیا۔ وہ میری جانب گردن گھمانے کے بعد بولا "آ...... آپ لوگ...... بہت پچھتاؤ گے......"

"اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا کہ ہم میں سے کون پچھتائے گا۔" میں نے پسٹل کی نال پر دباؤ بڑھاتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا "فی الحال تو تم اس بات کو ذہن میں بٹھالو کہ اگر تم نے اب بولنے کی کوشش کی تو میں تمہاری پسلیوں میں ہوادان بنانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔ زندگی سے ذرہ بھر بھی دلچسپی ہے تو زبان پر تالا ڈال لو۔ جب تک تم سے کوئی سوال نہ کیا جائے تمہیں خاموش رہنا ہے۔"

وہ بےبسی سے گردن جھٹک کر رہ گیا۔ میں نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سرجانی ٹاؤن تو بہت دور ہے۔ میرے خیال میں بھٹائی کالونی والا ٹھکانا ہمارے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ مناسب رہے گا۔"

شہزاد نے سر کو اثباتی جنبش دی اور گاڑی کو بھٹائی کالونی کی جانب دوڑانا شروع کردیا۔ اس وقت تک بھٹائی کالونی ابھی اتنا آباد نہیں تھا، پھر یہ باقی شہر سے بھی خاصا کٹا ہوا تھا اس لیے رات کے آخری پہر وہاں اندھیرے اور سناٹے کی مکمل عمل داری تھی۔ قیوم آباد اور کراسنگ کے درمیان سفر کرتے ہوئے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم تاریکی کے کسی عمیق غار سے گزر رہے ہوں۔ میں نے احتیاطاً اپنے شکاروں کو ہیڈ ڈاؤن کے احکام دیے تاکہ وہ شہزاد کے اس خفیہ ٹھکانے کا محلِ وقوع ذہن نشین نہ کرسکیں۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد میں نے انہیں سر اٹھانے کی اجازت دی تھی۔

شہزاد کا ٹھکانا بھٹائی کالونی کے آباد حصے سے کافی آگے تھا۔ ہم گاڑی سمیت ایک احاطے میں داخل ہوگئے۔ وہ لگ بھگ ایک سو بیس گز کا پلاٹ تھا جس میں چار دیواری کے اندر بڑے سائز کا صرف ایک ہی کمرا بنا ہوا تھا۔ گاڑی کو احاطے میں چھوڑنے کے بعد ہم اس کمرے میں آگئے۔ داخلے سے پہلے شہزاد نے کمرے کی واحد لائٹ آن کردی۔

اس کمرے میں سامان کے نام پر ایک سنگل بیڈ، ایک چھوٹی میز اور چار آہنی کرسیوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں توقع کررہا تھا، دیواروں پر ٹارچر کے آلات نظر آئیں گے لیکن وہاں ایسی کوئی شے موجود نہ تھی۔ ممکن ہے، شہزاد نے ان لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ٹارچر والی بات کی ہو...... اور یہ بھی ہوسکتا ہے، مذکورہ آلات کہیں چھپا کر رکھے گئے ہوں۔ بیڈ کے نیچے ایک پرانا سا جستی صندوق رکھا تھا۔ ایذا رسانی میں استعمال ہونے والے مخصوص آلات اس صندوق میں بھی ہوسکتے تھے۔

ہم نے فواد کی گونگی کو ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کردیا اور خود آہنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے پسٹل جیب میں رکھ لیا تھا۔ تاہم شہزاد نے ان دونوں کو کلاشنکوف کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ میرے استفسار پر جب شرافت کی زبان فواد کی سمجھ میں نہیں آئی تو شہزاد نے اس کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ وہ پہلے ہی بری طرح زخمی تھا، شہزاد نے اسے دُھنک کر رکھ دیا۔

دو منٹ بعد فواد کمرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس طرح کہ...... اس کے دونوں ہاتھ زمین پر پھیلے ہوئے تھے، ہتھیلیوں کا رخ اوپر کی جانب تھا۔ ان ہتھیلیوں کے عین وسط میں آہنی کرسی کے پائے پیوست تھے اور...... مذکورہ کرسی پر شہزاد بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان! ابھی میں نے پورا زور نہیں ڈالا اور اس ناپاک جانور کی حالت غیر ہورہی ہے۔ تم نے جو پوچھنا ہے، پوچھ لو۔ اگر اس نے کسی غلط بیانی سے کام لیا یا تمہیں مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تو میں آرام سے پھیل کر بیٹھ جاؤں گا...... کرسی کے پائے اس مردود کی ہتھیلیوں میں گڑیں گے تو اس کی ترکی تمام شد ہوجائے گی۔"

فواد صورتِ حال کی سنگینی اور ہمارے بے رحم ارادے سے پوری طرح آگاہ ہوچکا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے سائے لہرانے لگے۔ اسے یقین ہوگیا، اس کی جان چھوٹنے والی نہیں لہٰذا اس نے تعاون پر آمادگی ہی میں عافیت جانی اور اچھے بچے کی طرح میرے سوالات کے ٹھیک

ٹھیک جواب دینے لگا۔

اس کی گونگی ساتھی عورت کا نام عطیہ تھا اور وہ واقعی گونگی تھی۔ عطیہ کا سی ایف کے سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ فواد اس خطرناک تنظیم کے لیے کام کرتا ہے۔ فواد نے چند روز پہلے عطیہ کو پھنسایا تھا اور اس سے شادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ پتا نہیں، عطیہ کی کیا مجبوری تھی کہ وہ اس کے ساتھ رہنے کے لیے آمادہ ہوگئی۔ فواد جیسے لوگ بے سہارا اور مجبور لڑکیوں کو اونچے خواب دکھا کر اپنے جال میں پھانسنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ عطیہ کے ساتھ میاں بیوی کی حیثیت سے رہتے ہوئے فواد نے بڑا معزز مقام حاصل کرلیا تھا۔ بہرحال، عطیہ ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے فواد سے پوچھا ''تمہیں رہائشی علاقے میں اس طرح چھپ کر رہنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ تم لوگوں کا رہن سہن اور طرزِ زندگی تو بہت مختلف ہے؟''

''آج کل بہت سختی ہو رہی ہے۔'' وہ ناپسندیدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''تم نے ہمارا جوہر والا ٹھکانا دیکھ لیا تھا اور بگ باس کے حوالے سے بہت سارے راز جہانگیر کی حماقت سے تمہارے سامنے کھل گئے تھے۔ پھر یورپی سفیر جم براؤن والا مشن بھی تمہاری وجہ سے ناکام رہا اور نجیب اللہ و سراج احمد وغیرہ، پولیس کے ہتھے چڑھ گئے۔ بعد ازاں ساؤتھ والے آپریشن میں بھی ہمارے تین بندے گرفتار ہوگئے اس لیے اوپر سے خاصی سختی کی جا رہی ہے۔ خاص طور پر مجھے کسی سرگرمی کی اجازت نہیں۔ تم یوں سمجھ لو، میں ان دنوں چھٹی پر ہوں۔''

''بکواس مت کرو چھٹی کے بچے!'' میں نے دھاڑ کر کہا ''تمہاری کوئی سرگرمی مجھ سے پوشیدہ نہیں۔ تم بڑی باقاعدگی سے گارڈن ایسٹ کے چکر لگاتے ہو!''

وہ چونک کر سراسیمہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اسی لمحے شہزاد نے کرسی کے پایوں پر وزن بڑھا دیا، فواد کے حلق سے ایک وحشت ناک چیخ بلند ہوئی۔ میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔

''فواد، تمہاری ذرا سی غلط بیانی بھی قیامت ڈھا سکتی ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری طرف سے یا شعیب غوری کی جانب سے یا سی ایف کے سے متعلق کسی معاملے سے غافل ہوں۔ تم فلیٹ نمبر چار سو دو گارڈن ایسٹ میں غلام جیلانی نامی ایک شخص سے ملنے جاتے ہو۔ کیا تم میری بات کو جھٹلانے کی پوزیشن میں ہو؟''

''تت...... تو تم اس حد تک مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے ہو......''

''تمہاری توقع سے کہیں زیادہ۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی شہزاد کو دباؤ کم کرنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ فواد کی طرف متوجہ ہوگیا ''آج رات لگ بھگ ساڑھے نو بجے تک تم نے ایک حسینہ کے ساتھ طارق روڈ کے ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا ہے پھر اس حسینہ کو چھوڑنے کے لیے تم برنیو روڈ پر واقع ایک لگژری اپارٹمنٹس بلڈنگ میں پہنچے جس کے فلیٹ نمبر چار سو دو میں غلام جیلانی نامی ایک شخص رہتا ہے۔ بتاؤ، غلام جیلانی اور اس خوب صورت لڑکی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔ میرے اشارے کے بغیر ہی شہزاد نے اس کی دکھتی ہوئی انگلیوں کو دبا دیا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے مانند ڈکرایا۔ میں نے کہا ''فواد، میں محسوس کر رہا ہوں، تمہیں اپنی زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ٹھیک ہے، ہم تمہارا کام تمام کیے دیتے ہیں۔''

میرے لہجے میں جھلکتی سنگینی نے اس کی رہی سہی ہمت بھی ہوا کردی۔ وہ لجی انداز میں بولا ''میرے ہاتھوں کو اس مصیبت سے نکالو۔ میں سب کچھ سچ سچ تمہیں بتا دوں گا۔''

میں نے ایک لمحے میں محسوس کرلیا کہ وہ تعاون کے لیے انتہائی سنجیدہ تھا لہٰذا میں نے اس کی رہائی کے لیے شہزاد کو اشارہ کردیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھ جھٹکتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ کرسی کے پایوں نے اس کی ہتھیلیوں میں ننھے ننھے گڑھے بنا دیے تھے۔ تکلیف کی شدت اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ میں نے اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے دباتے ہوئے وہ کرسی پر ٹک گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا تو وہ کسی پس و پیش یا تامل کے بغیر بولا ''زندگی ہے تو سب کچھ ہے۔ میں بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لیے تمہیں سچ ضرور بتاؤں گا۔'' اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا ''غلام جیلانی ہماری تنظیم کا ایک اہم رکن ہے۔ یوں سمجھ لو کہ وہ ''ایسٹ'' کے باس سراج الدین کو اسسٹ کرتا ہے۔ تم خود بھی سی ایف کے میں کافی عرصہ کام کرچکے ہو۔ یہ سسٹم تمہارے لیے نیا نہیں۔''

''بے شک! میں سی ایف کے کے سسٹم سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ڈبل پارک کے نزدیک واقع تنظیم کا وہ ٹھکانا میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں شعیب غوری سے بھی ایک مرتبہ وہاں ملاقات کرچکا ہوں لیکن تم تو ''ملیر'' سے وابستہ تھے۔ پھر ''ایسٹ'' میں کیسے نظر آ رہے ہو؟''

''تم نے جوہر والے فلیٹ پر جو کارروائی کی تھی اس کو دیکھتے ہوئے مجھے ملیر سے ایسٹ میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ اب میں غلام جیلانی کے احکام کی تعمیل کرتا ہوں۔''

وہ نہایت ہی اہم انکشافات کر رہا تھا۔ اگر میں غلام جیلانی پر قابو پا لیتا تو وہ مجھے سراج الدین تک پہنچا سکتا تھا اور اس طرح ممکن تھا، میں شعیب غوری تک رسائی حاصل کرلیتا ''ایسٹ'' اور سراج الدین سے میں ناواقف نہیں تھا لیکن وہاں براہِ راست کوئی کارروائی کرنا سودمند ثابت نہیں ہوتا اس لیے سیڑھی کا سہارا لینا ضروری تھا۔

میں نے پوچھا ''گلستان جوہر والے فلیٹ پر جہانگیر بھی تمہارے ساتھ تھا۔ تم دونوں ملیر سے وابستہ تھے جہاں کا باس سلیم واسطی ہے۔ جہانگیر کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا؟''

''جہانگیر کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو کسی غدار کا حق ہوتا ہے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا ''جہانگیر سی ایف کے سے غداری کے بعد تم سے جا ملا تھا اس لیے تنظیم کے نزدیک وہ گردن زدنی تھا۔ وہ تو اس کی بدقسمتی اور میری خوش قسمتی کہ اس کی ''غفلت'' میں مجھے ہوش آ گیا۔ وہ رقم وصول کرنے کے چکر میں تابندہ نامی اس لڑکی کے ساتھ ''مصروف'' تھا کہ میں خاموشی سے اس فلیٹ سے نکل آیا۔ ظاہر ہے، اس کے بعد میں سیدھا سلیم واسطی کے پاس پہنچ گیا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سفاکی سے بولا ''پھر جہانگیر کو اس فلیٹ سے زندہ نہیں نکلنے دیا گیا۔ وہ غداری کی سزا کو پہنچ گیا۔''

میں ایک طویل اور بوجھل سانس لے کر رہ گیا۔ فواد نے ہمارے اندازے کی تصدیق کردی تھی۔ میں اور منہاس باقر بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جہانگیر، منہاس کے دفتر نہ پہنچ پاتا۔ سی ایف کے سے اسی قسم کی سفاکیت کی توقع کی جاسکتی تھی۔ میں نے فواد کو مخاطب کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اس ایفی شینسی پر تنظیم میں تمہارا رتبہ تو بلند ہوا ہوگا؟''

''ہاں، اس کارنامے نے مجھے خاصی ترقی دی ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا ''اب میں ایک ایسے آدمی سے احکام لیتا ہوں جو باس کا اسسٹنٹ ہے۔ یہ میرے لیے خاصا اہم ہے۔''

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ''اس وقت تم خود کو کس خانے میں فٹ کرتے ہو۔ غدار یا وفادار؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''مطلب صاف ظاہر ہے۔'' میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا ''جہانگیر نے مجھ سے الحاق کرتے ہوئے تنظیم کے رازوں پر سے پردے اٹھا دیے۔ اس بات سے غرض نہیں کہ اس نے یہ کام میری دوستی یا تنظیم کی دشمنی میں کیا تھا۔ بہرحال، سی ایف کے کی نظر میں وہ ایک غدار تھا جو موت کا حق دار تھا اور تم بھی اس وقت یہی حرکت کر رہے ہو......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سرد نگاہ سے اسے دیکھا ''تم بھی تو مجھے تنظیم کے اہم رازوں سے آگاہ کر رہے ہو۔ اگر اس کی بھنک سی ایف کے تک پہنچ گئی تو وہ تمہارا کیا حشر کریں گے، اس کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہوگا؟''

وہ مایوسی سے گردن جھٹکتے ہوئے بولا ''ہاں، ان معاملات کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن میرے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں۔'' اس نے تھوڑا توقف کرکے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا اور رسانیت سے بولا ''اگر میں تم سے تعاون نہیں کرتا تو تمہارے ہاتھوں حرام موت مرنا ہوگا۔ میرے لیے تو آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ ہے البتہ جہانگیر کے مقابلے میں، میں خاصا سیف سائیڈ ہوں۔ میری تنظیم سے اس غداری کا کوئی گواہ نہیں۔ جہانگیر کی بدبختی کہ میں نے اس کے خلاف مخبری کردی۔ اب اگر تم مجھے چھوٹ دینا چاہو گے تو میرا جرم تنظیم کی نظر میں نہیں آئے گا۔ اس طرح میں اور میری غداری بھی پوشیدہ رہے گی۔'' پھر وہ عطیہ کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ''یہ بے چاری سی ایف کے یا اس کے کسی رکن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ اس لیے اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں، ویسے بھی اگر یہ کسی سے کچھ کہے گی تو کیا کہے گی۔ اس کی سمجھے گا کون؟''

فواد ایک کھلی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ واقعی وہ جہانگیر کے مقابلے میں خاصا خوش قسمت واقع ہوا تھا۔ میں نے اس کے کان کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا ''تم اس گونگی عورت کو اتنا بے خبر اور بے بس نہ سمجھو۔ ابھی شعیب غوری، غلام جیلانی اور سی ایف کے سے متعلق ساری گفتگو اس کے سامنے ہوئی ہے۔ یہ اب تمہارے ساتھ تو ہرگز نہیں رہے گی اور الگ ہوکر تمہارے لیے کوئی مصیبت کھڑی کرسکتی ہے۔''

''یہ صرف گونگی ہی نہیں بلکہ بہری بھی ہے۔'' فواد بے پروائی سے بولا ''عطیہ صرف اشاروں کی زبان میں بولتی اور سمجھتی ہے۔ مجھے ایک فیصد بھی خدشہ نہیں کہ یہ میرے لیے کوئی پرابلم پیدا کرے گی اور بالفرض، اس نے اس قسم کی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو میں اس کا معقول بندوبست

کردوں گا۔''

بات کے اختتام پر اس کے لہجے میں سفاکی در آئی۔ یہ سمجھنے میں مجھے قطعاً کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ ''معقول بندوبست'' سے اس کی کیا مراد تھی۔ فواد جیسے سنگ دل اور قاتل لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ یہ اپنی مطلب براری کے لیے سنگین سے سنگین تر قدم اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتے۔

میں آئندہ دس منٹ تک فواد سے شعیب غوری کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ وہ اپنے بگ باس کے بارے میں مجھ سے کم ہی جانتا تھا۔ میں نے ساحل کے حوالے سے بھی کئی سوال کیے لیکن یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ میری ساتھی کو لاہور سے کراچی پہنچایا گیا تھا اور وہ شعیب کے قبضے میں تھی۔ فواد کو صرف اتنا پتا تھا کہ میں کراچی آ چکا ہوں۔ تنظیم کے دیگر کارکنان کی طرح فواد کو بھی میری طرف سے ہوشیار رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی گرم تھی کہ مجھے پکڑنے کے لیے شعیب غوری نے کوئی بہت ہی خفیہ منصوبہ بنایا تھا جو چندہ چنیدہ افراد تک ہی محدود تھا۔ میں نے ہر طرح کا دباؤ ڈال کر فواد کو گھسنے کی کوشش کی لیکن کوئی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

میں نے ایک نفسیاتی چال چلی اور فواد سے کہا ''اگر تم مجھے پکڑ کر شعیب غوری کے حوالے کردو تو اس کارنامے پر وہ تمہیں کسی بھی ضلع کا باس بنا دے گا۔ اس کوشش کے بارے میں تم کیوں نہیں سوچتے؟''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر شکایتی لہجے میں بولا ''کیا تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ میں تو اس وقت خود تمہارے رحم و کرم پر ہوں، تمہیں پکڑ کر بگ باس کے حوالے کیسے کرسکتا ہوں!''

''اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کروں گا۔'' میں نے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا ''اگر تم عندیہ دو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ سی ایف کے اس وقت تمہارے لہو کی پیاسی ہو رہی ہے اور تم از خود میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو۔ کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری فرمائش تو خودکشی کے مترادف ہے۔''

''تم کوئی خواب دیکھ رہے ہو اور نہ ہی میرا دماغ اپنی جگہ سے سرکا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''اگر تم مجھے سیدھا شعیب غوری کے پاس لے چلو تو میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ یہ کوئی مذاق ہے اور نہ ہی خودکشی کی کوشش۔''

''یہ کیسے ممکن ہے!'' وہ بدلے ہوئے انداز میں بولا ''میں نے آج تک بگ باس کو دیکھا ہے اور نہ ہی اس کے پتے ٹھکانے سے واقف ہوں۔ تم اس تنظیم کے فعال رکن رہ چکے ہو، اس کا طریقۂ کار تم سے ڈھکا چھپا نہیں۔ میں تو براہ راست ''ایسٹ'' کے باس سراج الدین سے بھی رابطہ نہیں کرسکتا، بگ باس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''اگر کسی طرح تم میرے قابو آ جاتے تو میں پہلی فرصت میں تمہیں غلام جیلانی کے حوالے کرتا۔ غلام جیلانی ایسٹ کے کرتا دھرتا سراج الدین تک یہ خوش خبری پہنچاتا۔ اس طرح سراج الدین کے ذریعے تمہاری اسیری کی اطلاع بگ باس تک پہنچ جاتی۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''تو پھر بے کار ہے۔ تم کسی کام کے بندے نہیں ہو!''

شہزاد نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''وجدان! اگر یہ منحوس ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا تو پھر سی ایف کے کے لیے بھی کیوں مفید رہے۔ اس کی بقا کی کیا توجیہہ باقی رہ جاتی ہے۔'' شہزاد کے الفاظ کی سنگینی بہت واضح تھی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو شہزاد۔'' میں نے شہزاد کی بات کی تائید کی تو فواد کے چہرے پر موت کا خوف ہلکورے لینے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''غلام جیلانی کا فون نمبر کیا ہے؟''

تھوڑے تامل کے بعد اس نے مذکورہ فون نمبر مجھے بتا دیا۔

میں نے استفسار کیا ''رات کے پہلے حصے میں تمہارے ساتھ جو حسین و جمیل لڑکی تھی، ابھی تک تم نے اس کا تعارف نہیں کرایا؟''

''اس لڑکی کا نام شازلین ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم نے شازلین کو غلام جیلانی کے فلیٹ پر چھوڑا ہے۔'' میں نے کہا ''کیا وہ غلام جیلانی کی کچھ لگتی لگاتی ہے۔''

''تم جو بھی سمجھ لو۔'' وہ مبہم انداز میں بولا ''ماشاءاللہ کافی سمجھ دار ہو!''

میں نے کہا ''تمہارا اشارہ تو یہ بتاتا ہے کہ شازلین، غلام

جیلانی کی داشتہ ہے۔''

''میں نے کہا نا، تم سمجھ دار ہو۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''غلام جیلانی کی داشتہ تمہارے ساتھ کیا کرتی پھر رہی تھی؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا ''شازلین بھی تنظیم سے وابستہ ہے۔ ہم ایسٹ سے آ رہے تھے۔ راستے میں وہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ پڑا۔ شازلین کی فرمائش پر مجھے وہاں رکنا پڑا۔ شازلین کی عمر اور تجربہ تو زیادہ نہیں لیکن غلام جیلانی کی چہیتی ہونے کے سبب اس سے خاصا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس کی حکم نما خواہش سے انکار ممکن نہیں۔'' تھوڑا تامل کرتے ہوئے اس نے مزید بتایا ''یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ شازلین کو اصل میں غلام جیلانی پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ اس کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتی ہے اور ایسٹ میں اس کی رپورٹ بھی کرتی ہے۔''

''کیا یہ بات غلام جیلانی کے علم میں نہیں؟''

''ہو سکتا ہے، اسے حقیقت کا پتا ہو اور وہ اس سلسلے میں محتاط رہتا ہو۔''

''ویسے ایک بات ہے۔'' میں نے کہا ''شازلین تم دونوں سے زیادہ اہم ثابت ہو سکتی ہے۔ میں اسی کو اپروچ کروں گا۔''

میں نے شازلین کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس رہی ہوگی۔ بلاشبہ وہ حسن کا مرقع تھی۔ اس کے نقوش بڑے جاذب اور تیکھے تھے۔ ایسی عورتیں ناممکن کو ممکن کر دکھانے کی اہلیت سے مالا مال ہوتی ہیں۔ فواد نے شازلین کے بارے میں جو سنی سنائی بتائی تھی، مجھے اس میں حقیقت دکھائی دینے لگی۔ سی ایف کے جیسی دہشت گرد تنظیموں میں کسی بھی کارکن پر اندھا اعتماد نہیں کیا جاتا۔ ہر شخص کی نگرانی کا فریضہ کسی دوسرے کے سپرد ہوتا ہے، جیسے فواد اپنے ساتھی جہانگیر پر متعین تھا۔ اسی طرح یقیناً غلام جیلانی بھی کسی سینئر پر نگاہ رکھے ہوئے ہوگا اور شازلین پر بھی کسی جونیئر کی نظر گڑی ہوگی۔

فواد سے مزید کوئی مفید بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا میں نے اسے نمونۂ عبرت بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے کمرے کے ایک کونے میں سرگوشیوں میں شہزاد کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ اس نے میری تائید کی اور پوچھا ''اس گونگی کا کیا کرنا ہے؟''

''یہ بے چاری غیر متعلق اور بے قصور ہے۔'' میں نے کہا ''واپسی میں اسے کسی بہ نسبت روشن جگہ پر ڈراپ کر دیں گے۔ اس سے ہماری کوئی دوستی ہے نہ ہی دشمنی۔ ایک تجربے کے بعد شاید اسے کچھ عقل آ جائے۔ مجھے نہیں پتا، یہ کس حد تک بول اور سن سکتی ہے البتہ میں اسے رخصت کرنے سے پہلے یہ نصیحت ضرور کردوں گا کہ اس نے آج کی رات جو دیکھا، سنا اور بھگتا، اسے اپنی یادداشت سے صاف کردے ورنہ اس کی زندگی عذاب بن کر رہ جائے گی۔''

اگلے چند منٹ میں ہم نے گونگی کے ہاتھوں کو دوپٹے کی بندشوں سے آزاد کیا، میں نے لمبائی کے رخ دوپٹے کو پھاڑ کر دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا۔ ایک ٹکڑے سے فواد اور دوسرے سے عطیہ کی آنکھوں پر دبیز پٹی باندھی گئی تاکہ وہ شہزاد کے اس ٹھکانے کا اتا پتا یاد نہ رکھ سکیں۔ آتے وقت بھی میں نے گاڑی سے باہر انہیں دیکھنے نہیں دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم اس نیم مکمل مکان سے نکل کر سمندر کی جانب جا رہے تھے۔ مکان چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنا لباس تبدیل کرلیا تھا۔

سمندر کا وہ حصہ بہت ہی ویران، بدبودار اور عجیب و غریب تھا۔ شہزاد نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ میں نے زرگل سے پوچھا ''تم عطیہ کو سنبھال لو گی؟''

اس نے پُراعتماد انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''اس کی طرف سے تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اس جیسی درجن بھر کو سنبھال سکتی ہوں۔''

ہم دونوں آنکھیں بندھے فواد کو اپنے ساتھ لے کر سمندر کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ وہ بے حد سہما نظر آتا تھا۔ ہم نے اس سے کیا سلوک کرنے کا فیصلہ کیا ہے، اسے مطلق خبر نہیں تھی تاہم وہ سو فیصد یقینی انداز میں صرف اور صرف اپنی موت کے بارے میں سوچ رہا ہوگا... اور ایسا سوچنے میں وہ حق بہ جانب بھی تھا۔ سی ایف کے اس سوچ کی حامل تھی!

جب ہم کافی آگے نکل آئے تو میں نے سمندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ شہزاد خاموشی سے میری تقلید کرنے لگا۔ فواد ہم دونوں کے بیچ میں تھا۔ شہزاد کو میں اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا تھا۔ اس لیے اس نے کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے فواد کی آنکھوں کو پٹی کی بندش سے آزاد کردیا۔ چاروں جانب چوکنا نظروں سے دیکھنے کے بعد اس نے خوف میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وجدان! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، اگر میں تمہارے ساتھ تعاون کروں تو تم میری جان بخش دو گے۔ کیا تم اپنے وعدے سے پھر جاؤ گے؟''

"میں زبان کا دھنی ہوں۔" میں نے سرسراتی آواز میں کہا" مجھے اپنا وعدہ اچھی طرح یاد ہے۔"

"پھر...... پھر یہ سب کیا ہے......؟" اس نے میرے ہاتھ میں دبے پسٹل کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا" یہ پستول ہے...... اور بس!"

"تمہارے تیور اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔" وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اس میں تمہاری نظر کا قصور ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا" کل تم کسی اچھے آئی اسپیشلسٹ سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کروانا۔"

وہ بے یقینی سے بولا" کل تک میں زندہ رہوں گا تب نا!"

"میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تم اگر کل تک زندہ نہ رہے تو اس موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوگا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا" پھر...... تم...... مجھے اس طرف...... کیوں لائے ہو؟"

"تمہاری تسلی بخش جاں بخشی کے لیے!"

"تت...... تم مجھے بہلا رہے...... ہو۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"اب تم اتنے ننھے بچے بھی نہیں ہو۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

فواد نے چلتے چلتے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے وہ اپنے کسی اچھوتے خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے ارادے کو بھانپتا، اس نے بجلی کی سی سرعت سے شہزاد کو دھکا دیا اور اندھیرے میں ایک سمت دوڑ لگادی۔

جب انسان کو موت یقینی نظر آئے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ فواد کو ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ میں اسے زندہ چھوڑوں گا لیکن اس کی جان لینے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ فواد نے ایک منطقی ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں اس کا کھلا دشمن تھا...... اور جرائم کی دنیا میں اپنے دشمن پر بھروسا کرنا خودکشی کرنے کے مترادف ہوتا ہے!

شہزاد دھکا کھانے کے بعد پشت کے بل زمین پر گرا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے فواد کا نشانہ لیا اور ایک محفوظ فائر کردیا۔ اگلے ہی لمحے وہ چھپاک سے منہ کے بل گرا۔ میں نے پلک جھپکتے میں جان لیا، چھپاک کی وہ آواز پانی کے سبب پیدا ہوئی تھی۔ فواد نے اپنی جان بچانے کی کوشش میں کھلے سمندر کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

میں نے گولی چلانے کے بعد اس کی جانب پیش قدمی جاری رکھی اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ کولھا تھام کر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں اندازہ لگالیا کہ میری چلائی ہوئی گولی اس کی تشریف کے ایک پورشن میں پیوست ہوگئی تھی۔ میں نے توازن کی فلاسفی پر عمل کرتے ہوئے انصاف کا تقاضا پورا کردیا۔ پسٹل ایک مرتبہ پھر گرجا اور تشریف کے دوسرے پورشن میں بھی دور تک ایک آتشِ سرنگ سی بنتی چلی گئی۔

رات کی تاریکی میں ایک دردناک چیخ نمودار ہوئی لیکن ٹھاٹھیں مارتے سمندر نے اس فریادی چیخ کو اپنے مہیب وحشت ناک شور میں گم کردیا۔ اس چیخ کے ساتھ ہی فواد ایک لمحے کے لیے فضا میں اچھلا پھر دھڑام سے گیلی ریت پر زمین پر تشریف فرما ہوگیا۔

میں فواد کے سر پر پہنچا تو شہزاد بھی کلاشن کوف تھامے میرے عقب میں حاضر ہوگیا۔ اس نے برق رفتاری سے گن کا رخ زمین پر پڑے ہوئے فواد کی جانب موڑا۔ اس کے انداز میں بے حد خطرناکی پائی جاتی تھی۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوجاتی تو شہزاد کلاشنکوف کا پورا میگزین فواد کے سینے میں انویسٹ کردیتا۔

میں نے ہاتھ مار کر گن کے مہلک بیرل کو نیچے جھکادیا پھر شہزاد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا" تم اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے مجھے عہد شکن نہ بناؤ۔ طے شدہ پروگرام سے ہٹ کر کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے معذرت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا" سوری وجدان! میں جوش میں آگیا تھا۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ جوش میں ہوش رخصت ہوجاتا ہے؟"

"پتا نہیں، مجھے کیا ہوگیا تھا۔" وہ نفی میں سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

میں نے رسانیت سے کہا" اس کا پتا بعد میں کرلیں گے۔ چلو، پہلے ضروری کام کرلیں۔ تم فواد کے ہاتھ کو پکڑو!"

شہزاد، فواد کی جانب لپک گیا۔ عہد شکنی کے حوالے سے میں نے شہزاد سے جو بات کی تھی، اس میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ یہ واضح تھا کہ میں فواد کو جان سے نہیں مارنا چاہتا۔ فواد کو بھی اس حقیقت کا احساس ہوگیا تھا ورنہ میں شہزاد کو فائرنگ سے ہرگز نہ روکتا۔ فواد کے لیے بے یقینی اور الجھن کا باعث میرا

سمجھ میں نہ آنے والا رویہ تھا۔

شہزاد نے یکے بعد دیگرے فواد کے ہاتھوں کو زمین پر پھیلایا، اس طرح کہ اس کی ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف ہوگیا۔ یہ ہتھیلیاں تھوڑی دیر پہلے آہنی کرسی کے پایوں تلے دبی رہی تھیں۔ عملی طور پر نہ سہی لیکن درد کی شدت نے انہیں بہت دور تک چھید ڈالا تھا۔ میں نے تیموری کو ریکٹیکل سے گزارا اور پسٹل کی دو گولیاں چند سیکنڈ کے وقفے سے ان ہتھیلیوں کے پار اتر گئیں۔ فواد تکلیف اور بے بسی کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس کی حالت دیدنی بلکہ عبرت انگیز تھی۔ وہ اپنی زندگی کے مایوس کن لحات سے گزر رہا تھا۔

میرے پسٹل میں دو گولیاں باقی بچی تھیں۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر دو کلوز فائر کیے اور فواد کے تلوے سوراخ دار ہوگئے۔ اس کارروائی کے بعد میں نے خالی پسٹل شہزاد کی طرف بڑھایا اور فواد کو مخاطب کرتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔

"میں نے تم سے جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا۔ دیکھ لو، میں زبان کا کتنا دھنی ہوں۔ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جارہا ہوں۔ مجھے امید ہے، تم کسی نہ کسی طرح سی ایف کے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاؤ گے اور اپنے بڑوں کو بتا سکو گے کہ تمہارا یہ حشر کس نے کیا ہے۔ میں تمہاری زبان کو اسی لیے سلامت چھوڑے جارہا ہوں کہ تم میرے بارے میں گل افشانیاں کرسکو تا کہ...... سی ایف کے اور شعیب غوری پر میری دھاک بیٹھتی چلی جائے۔"

میں نے چند لمحے رک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ تکلیف کی شدت اور زخموں کی حدت سے بری طرح تڑپ رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس نے میری دھمکی کو توجہ سے سنا ہوگا۔ مصیبت کے وقت انسان سب سے پہلے اپنی تکلیف پر توجہ دیتا ہے۔ تقریریں اور بھاشن کوئی نہیں سنتا۔

میں نے اس پر آخری نظر ڈالتے ہوئے کہا" میں اگر اس مرتبہ تمہیں زندہ چھوڑ کر جارہا ہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ آئندہ بھی میں اس روایت کو نبھاؤں گا۔ اب اگر تم کبھی میرے راستے میں آئے تو میں ایک لفظ کہے سنے اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر تمہیں جہنم واصل کردوں گا۔ گڈبائے!"

وہاں مزید رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لہٰذا ہم نے واپسی کی راہ اختیار کی اور ہیلو ہنڈائی کے پاس پہنچ گئے۔ گاڑی کے اندر صورت حال نارمل تھی۔ عطیہ نامی اس گونگی عورت نے زرگل کے لیے کوئی پرابلم پیدا نہیں کی تھی، اس کی آنکھوں پر ابھی تک وہ پٹی موجود تھی۔ میں نے زرگل کو اشارہ کیا کہ وہ گونگی کی آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دے دے۔ اس غیر متعلق مظلوم عورت سے ہمیں کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا تھا۔

شہزاد نے گاڑی اسٹارٹ کرکے واپسی کا سفر شروع کیا تو زرگل نے مجھ سے استفسار کیا" وجدان! کیا تم لوگوں نے فواد کا کام تمام کردیا۔ میں نے چھ گولیاں فائر ہونے کی آواز سنی تھی؟"

"تمہارے شمار میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا" میں نے لمحاتی فرق سے پسٹل کا کلپ خالی کردیا ہے لیکن جہاں تک" کام تمام" کا تعلق ہے تو میں یہی کہوں گا کہ تمہارا اندازہ درست نہیں۔ میں مارنے سے ڈرانے کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔"

"وجدان!" شہزاد نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا" تم نے فواد کو ڈرانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے تو وہ کھلی آنکھوں بھی تمہارے ہی سپنے دیکھے گا...... بے حد خوف ناک اور ڈراؤنے سپنے!"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا" تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ کسی دشمن کو ایک ہی بار میں جان سے مارنے میں وہ لطف نہیں آتا جو اسے ایسی حالت میں پہنچا کر حاصل ہوتا ہے جہاں وہ پل پل مرتا ہے اور اچھے برے الفاظ میں آپ کو یاد کرتا رہے۔ لحہ بہ لحہ مرنا جینا دشمن کے لیے سب سے عمدہ سزا ہوتی ہے۔"

گونگی عطیہ نے ایک جھرجھری لی اور وحشت بھری نظر سے سائیڈ اسکرین کے پار گہری تاریکی میں گھورنے لگی۔ شاید وہ اپنے مقدر کا اس تاریکی سے موازنہ کررہی تھی۔ میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد روئے سخن عطیہ کی جانب کیا اور کہا۔

"تم اگر سن سکتی ہو تو میری بات کو توجہ سے سنو۔ زندگی میں سیکھنے کے لیے ایک تلخ تجربہ کافی ہوتا ہے۔ بار بار ایسے تجربات سے بے وقوف ہی گزرا کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا تم کون ہو، کہاں سے آئی ہو، کہاں جاؤ گی...... اور نہ ہی میں یہ سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ بس میری ایک نصیحت پلے باندھ لو...... اور وہ یہ کہ اپنی حیثیت اور حلقے میں کسی ساتھی کو تلاش کرو۔" ہر چمکیلی شے سونا نہیں ہوتی۔ فواد کے تجربے سے تم نے اگر کچھ نہیں سیکھا تو پھر قدم قدم پر تمہیں ٹھوکریں ہی ملیں گی۔"

وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم، وہ میری باتوں کو کس حد تک سمجھ رہی تھی۔ میں نے اپنا فرض پورا کرتے ہوئے کہا" میں تمہیں کسی روشن مقام پر گاڑی سے

اتار دوں گا۔ مجھے امید ہے، تم میری نصیحت پر عمل کر کے اپنی باقی ماندہ زندگی کو سنوارنے سجانے کی کوشش کرو گی۔"

تھوڑی ہی دیر بعد ایک ایسی جگہ نظر آ گئی جہاں عطیہ کو ڈراپ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے شہزاد کو گاڑی روکنے کے لیے کہا۔ اس نے فوراً میری فرمائش پوری کردی۔ وہ خیابانِ اتحاد اور ڈیفنس موڑ کے درمیان کا علاقہ تھا۔ رات کے آخری لمحات میں وہاں کسی بندے بشر کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے اپنی جیب میں سے والٹ نکالا اور اس میں سے گن کر ہزار والے پانچ نوٹ الگ کر لیے پھر رخصت کرنے سے پہلے میں نے وہ رقم عطیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ لو۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے تمہیں اس رقم سے بہت سہارا ملے گا۔ یہ سکہ رائج الوقت ہے اور آج کل کا ہر بند دروازہ اسی جنس سے کھلتا ہے۔ یہ تمہارے بہت کام آئیں گے۔"

اس نے وہ رقم لینے کے سلسلے میں تامل کیا تو میں نے واضح الفاظ میں کہا "یہ نہ تو قرض ہے اور نہ ہی میں تم پر ترس کھا کر خیرات دے رہا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو، زندگی کے ایک کٹھن مرحلے پر کبھی کسی نے میری مدد کی تھی۔ میں اس احسان کو آگے بڑھا رہا ہوں۔ اگر اللہ نے تمہیں توفیق اور استطاعت دی تو تم بھی کسی ضرورت مند کے کام آ جانا۔"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور کپکپاتی انگلیوں نے رقم کو چھو لیا۔ پھر اگلے ہی لمحے پانچ ہزار کے نوٹ گونگی عطیہ کے ہاتھ میں منتقل ہو چکے تھے۔ وہ ہم تینوں کو ممنونیت بھری نظر سے دیکھتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر گئی۔ شہزاد نے ایک جھٹکے سے ہنڈائی کو آگے بڑھا دی۔

زرگل نے پُراستعجاب لہجے میں کہا "کیسا مذاق ہے۔ ہم نے عطیہ کو جس جگہ ڈراپ کیا ہے وہیں سڑک کے کنارے گونگے بہرے بچوں کا ایک اسکول بھی ہے۔ میں نے ایک عمارت پر اس قسم کے اسکول کا بورڈ لگا دیکھا ہے۔"

میں نے سرسری انداز میں کہا "زندگی میں بہت کچھ اتفاقاً ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوگا!"

شہزاد نے اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی وہاں گونگے بہرے بچوں کا ایک اسکول واقع تھا پھر مجھ سے پوچھنے لگا "میں تم دونوں کو فلیٹ پر چھوڑ دوں یا تم مجھے بنگلے پر ڈراپ کر کے واپس جاؤ گے؟"

جواب دینے سے قبل میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "تم ڈیفنس موڑ سے گاڑی کو لیفٹ ٹرن دو۔ ہم پہلے بنگلے پر جائیں گے۔ مجھے فیصل کی یاد ستا رہی ہے۔ اسے ایک نظر دیکھ لوں گا تو مجھے قرار آ جائے گا۔ پھر میں پُرسکون نیند سو سکوں گا۔ تم وہیں بنگلے پر رہ جانا، ہم فلیٹ پر چلے جائیں گے۔ کل دن میں کسی وقت میں تمہیں ریلیف دینے آ جاؤں گا۔"

شہزاد نے کوئی اختلاف کیے بنا گاڑی کو موڑ لیا اور تھوڑی ہی دیر بعد ہم مذکورہ نامکمل تعمیر شدہ بنگلے پر پہنچ گئے۔ بنگلے کی اندرونی صورتِ حال تسلی بخش تھی۔ سہیل کے علاوہ دیگر دو سیکیورٹی گارڈز بھی نہ صرف جاگ رہے تھے بلکہ پوری طرح چوکس بھی تھے۔ نئے آنے والے گارڈز میں سے ایک کا نام عباس اور دوسرے کا زمرد خان تھا۔ وہ دونوں پوری طرح مسلح تھے۔ میں شہزاد کے ساتھ اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں فیصل کو "ٹھہرایا" گیا تھا۔

اس کمرے کے ایک حصے میں فرش سے چھت تک پرانے اخبارات کے بنڈل بھرے ہوئے تھے۔ فیصل کو میں نے بڑے تشفی بھرے انداز میں "پابند" کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ الٹی ہتھکڑی کی جکڑ میں تھے۔ پاؤں میں بیڑی موجود تھی۔ اس بیڑی اور ہتھکڑی کو باہم منسلک کرنے والی زنجیر کا دوسرا سرا چھت میں نصب کنڈے میں پھنسا دیا گیا تھا۔ اس آہنی زنجیر میں صرف اتنی "گنجائش" تھی کہ فیصل اس کمرے میں دو چار گام تک حرکت کر سکتا تھا یا پھر اخبارات کے بنڈلز سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو سکتا تھا۔ بیٹھنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔

اس وقت فرعون صفت چوہدری کا سپوت پشت کے بل بنڈلز کے ساتھ ٹکا کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا، وہ واقعی سو رہا تھا یا سوتا ہوا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں نیند مشکل ہی سے آتی ہے۔

شہزاد نے مجھ سے استفسار کیا "وجدان! اگر گفتگو کا موڈ ہو تو میں اسے جگا دیتا ہوں۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن کو جنبش دی "یہ بے چارہ نیند کا ماتا ہے۔ اسے سونے دو۔" میرے لہجے میں طنز کی کوئی کمی نہیں تھی "پتا نہیں، اس بدبخت کو پھر کبھی آنکھ لگانے کا موقع ملے یا نہیں۔"

شہزاد نے کہا "میں نے اسے تھوڑا بہت کھلانے پلانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کسی حد تک تعاون کیا ہے۔"

"یہ تم نے ...... اور اس نے بہت اچھا کیا ہے۔" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ پھر سیکیورٹی گارڈ سہیل کی جانب

متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا "شہزاد کے جانے کے بعد اس بندے نے کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟"

وہ میرے نزدیک آ کر نہایت ہی فرمانبرداری سے بولا "کوئی گڑبڑ تو نہیں کی جناب لیکن مجھے لالچ دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔"

میں نے چونک کر سہیل کو دیکھا اور پوچھا "کس قسم کا لالچ؟"

اس نے بتایا "اس نے اپنی رہائی کے بدلے مجھے ایک کروڑ روپے دینے کی پیش کش کی ہے۔ کہہ رہا تھا۔ اس کا باپ بہت بڑا اور طاقت ور چوہدری ہے۔ اگر ایک کروڑ کم ہوں تو وہ رقم بڑھا بھی سکتا ہے۔"

"کہہ تو یہ بالکل ٹھیک رہا ہے سہیل۔" میں نے زیرِلب طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے فیصل کی طرف دیکھا "اس کا باپ واقعی بہت مال دار ہے۔ ایک کروڑ کی رقم ان لوگوں کے لیے بالکل ایسے ہی ہے جیسے تمہارے لیے سو روپے کا ایک نوٹ!"

سہیل حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مجھے تکنے لگا۔

میں نے ازراہِ مذاق اس سے پوچھا "سہیل! تقدیر نے تمہیں زندگی سنوارنے کا ایک سنہرا موقع دیا تھا۔ کیا تم نے اس کی پیش کش پر ذرا بھی غور نہیں کیا؟"

وہ یک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا پھر جذبات سے معمور لہجے میں بولا "جناب! یہ موقع تقدیر نے نہیں بلکہ شیطان نے فراہم کیا تھا۔ میں اپنے بڑے سے بڑے فائدے کے لیے بھی شیطان کا آلہ کار نہیں بن سکتا۔ رزقِ حلال کی روکھی سوکھی، رزقِ حرام کے عیش و آرام سے زیادہ سکون بخش اور باعثِ عزت ہے۔"

میں.... تحریفی نظر سے سہیل کو دیکھنے لگا پھر توصیفی لہجے میں کہا "تمہارے خیالات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ مجھے امید ہے، تم جس راہ پر چل رہے ہو وہ تمہیں تمہاری منزل تک لے جائے گی۔ میں نے تو تمہیں محض آزمانے کے لیے وہ بات کی تھی۔"

"اللہ کا شکر ہے جناب!" وہ تیقن سے بولا "میں بہت پُرسکون اور خوش گوار زندگی گزار رہا ہوں۔ منہاس صاحب دوسرے مالکان سے بہت مختلف ہیں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت سہیل سے پوچھا۔ "اس بندے نے ایک کروڑ کے عوض تم سے رہائی کی جو بات کی تھی اس بارے میں کوئی تفصیل بھی بتائی تھی؟"

میں نے بات ختم کرتے ہی فیصل کی جانب دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کسی قسم کا تغیر و تبدل نظر نہ آیا۔ اس کا یہی مطلب تھا، کھڑے کھڑے اس کی آنکھ لگ گئی تھی یا پھر وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانے کا ماہر تھا، ہماری باتیں سن رہا تھا اور ظاہر یہی کر رہا تھا کہ وہ اپنے ماحول سے لاتعلق گہری نیند میں ہے!

سہیل نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا "اس نے کہا تھا، یہ اپنے فرار کو بالکل قدرتی رنگ دے گا۔ میں اسے آہنی بندشوں سے آزاد کردوں۔ یہ مجھے زخمی کر کے ایسا تاثر دے گا جیسے اس نے مجھ سے گن چھین کر خود کو آزاد کروایا ہو۔ پھر یہ مجھے بے ہوش کر کے یہاں سے نکلے گا۔ باقی دو گارڈز کو یہ موت کے گھاٹ اتارے گا اور یہاں سے رفوچکر ہو جائے گا۔"

"کیا اس نے یہ پیش کش ان دو گارڈز کے سامنے کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

سہیل نے جواب دیا "نہیں، عباس اور زمرد اس وقت بنگلے کے بیرونی حصے میں پہرا دے رہے تھے۔ میں اس کے پاس یہاں کمرے میں تھا۔"

"تم نے اس کی پیش کش کا کیا جواب دیا؟"

"میں نے اسے کھری کھری سنائیں اور یہ غصے سے مجھے گھور کر رہ گیا۔"

میں نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور شہزاد کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ سہیل کو ہم نے فیصل والے کمرے میں چھوڑ دیا تھا۔ ہم گاڑی کے قریب آ گئے تو میں نے شہزاد سے کہا۔

"میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آیا ہے۔ اس آئیڈیا کی بنیاد اس نکتے پر ہے کہ فیصل اس وقت سو رہا ہے اور اس نے ہماری باتیں نہیں سنیں۔"

شہزاد الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تم عباس اور زمرد کو بنگلے کے بیرونی حصے تک ہی محدود کردو اور انہیں سختی سے ہدایت کردو کہ وہ بہت ہی توجہ سے پہرا دیں۔ خاص طور پر انہیں فیصل والے کمرے کی طرف پھٹکنے بھی نہ دینا۔"

شہزاد پوری توجہ اور دلچسپی سے مجھے سن رہا تھا۔ میں نے مزید کہا "فیصل کی نگرانی کے لیے تم سہیل کو کمرے میں چھوڑ دو اور تم اپنی شکل بھی فیصل کو نہ دکھاؤ۔ وہ یہی سمجھے کہ تم واپس نہیں

آئے ہو لیکن کمرے سے باہر رہ کر تم پوری طرح چوکنا اور محتاط رہو گے۔"

شاید میری بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے شہزاد کے چہرے پر دبا دبا جوش انگڑائی لے کر بیدا ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"فیصل کو یہ احساس ہے کہ تم میرے بہت قریب ہو اس لیے وہ تمہیں کسی قسم کی کوئی آفر نہیں کر سکتا۔ وہ منہاس باقر سے بھی ناواقف نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سہیل کو ایک عام گارڈ سمجھتے ہوئے ٹارگٹ بنانے کی کوشش کی ہے...... اور وہ آئندہ بھی یہ کوشش کر سکتا ہے۔ تم اس کوشش کے لیے اسے موقع فراہم کرو گے۔"

"میں تمہاری بات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" شہزاد نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "اب اس آئیڈیا کی تہ بالکل واضح ہو چکی ہے۔ تم سہیل کو سمجھا دو کہ وہ فیصل والے کمرے میں رہتے ہوئے خود کو کسی کشمکش میں مبتلا ظاہر کرے۔ فیصل اس کو دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ وہ اس کی ایک کروڑ والی پیش کش میں الجھا ہوا ہے لہٰذا وہ دوبارہ ٹرائی کرے گا۔ اس موقع پر ہمارے منصوبے کے عین مطابق سہیل تھوڑے پس و پیش کے بعد اس کی بات ماننے کو تیار ہو جائے گا لیکن رقم کی وصولی کے لیے وہ بے یقینی ظاہر کرے گا۔ وہ فیصل سے یقین دہانی چاہے گا کہ ایک کروڑ روپے اسے کب اور کیسے ملیں گے۔ فیصل اس سوال کا کوئی نہ کوئی جواب تو دے گا۔ سہیل اسے امید دلائے کہ وہ کل دوپہر تک اسے بنگلے سے نکالنے کی کوشش کرے گا لیکن اس سے پہلے وہ اس کے بتائے ہوئے، رقم کی وصولی کے ذرائع کی تصدیق ضرور کرے گا۔ عین ممکن ہے، فیصل اپنے کراچی نیٹ ورک کے کرتا دھرتا کا نام اور پتا بتا دے۔ وہ اس وقت اپنی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت میں گرفتار ہے۔ اپنی آزادی اور بقا کے لیے وہ نیٹ ورک کے ہیڈ کو سامنے لانے میں کوئی حرج نہیں سمجھے گا کیونکہ وہ "ہیڈ" اس کے باپ چوہدری نوازش علی کا ایک آلۂ کار ہوگا۔"

"آئیڈیا واقعی اچھوتا اور منفرد ہے۔" شہزاد کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی۔ "اس وقت تو چوہدری کے کراچی نیٹ ورک کا روحِ رواں بھی بڑی کڑی آزمائش سے گزر رہا ہوگا۔ فیصل کی تلاش کے سلسلے میں چوہدری نوازش نے اس کی زندگی خراب کر رکھی ہوگی۔"

"فیصل کی تلاش اور میری سرکوبی کے لیے!" میں نے تھوڑا اضافہ کر دیا۔

شہزاد نے کہا "ٹھیک ہے، تم پوری طرح مطمئن ہو کر جاؤ۔ میں سہیل کو ایسا فیڈ کر دوں گا کہ فیصل اس کی اداکاری کو حقیقی جذبات کی عکاسی سمجھے گا جیسے ہی مجھے کوئی خاص بات معلوم ہوئی، میں تمہیں مطلع کر دوں......" اس نے بے ساختہ جملہ ادھورا چھوڑا پھر الجھن زدہ لہجے میں پوچھنے لگا "اگر تم سو رہے ہوئے تو......"

اس مرتبہ میں نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "میرے سونے اور جاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی اہم بات اور نازک معاملے کے لیے تم مجھے کسی بھی وقت کال کر سکتے ہو۔"

"ایس او کے!" وہ اپنی گردن کو مخصوص انداز میں جھٹکتے ہوئے بولا۔

اختتامی رسمیات کے تبادلے کے بعد میں نے ہنڈائی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی، زرگل پسنجر سیٹ پر آ گئی اور ہم طارق روڈ والے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔

طارق روڈ پر آنے کے بعد میں نے یلو ہنڈائی کو ایک چار منزلہ شاپنگ آرکیڈ کے نیچے سڑک کے کنارے پارک کیا اور زرگل کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اس اشارے کی تعمیل کر دی۔ میں گاڑی کو لاک کرنے کے بعد زرگل کے ساتھ سڑک پار کرنے لگا۔

میں نے جس شاپنگ آرکیڈ کے سامنے یلو ہنڈائی کو چھوڑا تھا۔ وہ میرے فلیٹ سے لگ بھگ پانچ سو گز کے فاصلے پر تھا اور میرے بیڈ روم کی کھڑکی سے نظر بھی آتا تھا۔ میں بیڈ روم کے اندر رہتے ہوئے گاڑی پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ ویسے میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ کل کسی وقت آمد و شد کے اس وسیلے کو چھوڑ کر کوئی دوسری گاڑی اپنے استعمال میں لے آؤں گا۔ جب تک ساحل اور فیصل والا معاملہ نمٹ نہ جاتا، بے حد احتیاط کی ضرورت تھی!

زرگل جب کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہی تو میں نے وضاحتی انداز میں کہا "فواد چاہے کسی بھی حالت میں ہو، یہ گاڑی اس کی یادداشت میں محفوظ ہو چکی ہے۔ مجھے یقین ہے، اس نے ہنڈائی کا نمبر حفظ کر لیا ہوگا لہٰذا اس کو استعمال میں رکھنا خطرناک ہے اس لیے میں نے اسے اپنی اقامت گاہ سے کافی فاصلے پر کھڑا کیا ہے تاکہ اگر کوئی اس گاڑی کی بو سونگھتا ہوا ادھر آ نکلے تو میرا سراغ نہ لگا سکے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا "ویسے میں کل پہلی فرصت میں اس گاڑی سے نجات حاصل کر لوں گا۔"

"میں سمجھ گئی تھی۔" اس نے صرف ایک جملہ بولنے پر

اکتفا کیا۔

اس ایک جملے میں زرگل نے "سمجھ گئی" کی ادائی کچھ اس ڈھب سے کی جیسے وہ بہت سمجھ دار ہو۔ میں اس پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر رہ گیا۔

جب ہم فلیٹ کے اندر داخل ہوئے تو صبح کے پونے پانچ بج رہے تھے۔ مجھے سخت نیند آ رہی تھی۔ میں نے زرگل سے کہا "تم اپنے کمرے میں جا کر اعصاب کو پُرسکون بنانے والی مشق کرو۔ میں تو سو رہا ہوں۔ تمہیں جب نیند آئے، سو جانا۔"

اس نے شاکی انداز میں مجھے دیکھا۔ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے میں اس سے بے مروتی برت رہا ہوں۔ میں نے اس کے اطمینان اور تسلی کی خاطر مزید کہا۔

"کسی فکر اور اندیشے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس فلیٹ میں تم محفوظ اور مامون ہو۔ حکمت یار کو ذہن سے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنا۔"

وہ کوئی سوال و جواب کیے بغیر سر جھکا کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایات دیں اور آنکھیں بند کر کے خود کو نیند کے حوالے کر دیا لیکن چند لمحات کے بعد ہی اس حوالگی میں رخنہ پڑ گیا۔

زرگل کی پکار نے مجھے گہری نیند میں پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، وہ میرے بیڈ روم میں، بیڈ کے نزدیک کھڑی تھی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے زرگل؟"

وہ الجھن زدہ انداز میں بولی "مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

بے اختیار مجھے ہنسی آ گئی "کیسا ڈر؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اتنی بزدل یا کمزور لڑکی تو نہیں ہو!"

"مجھے خود حیرت ہو رہی ہے۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی۔

میں نے پوچھا "کیا تم نے وہ مشق کر لی؟"

"بہت کوشش کی لیکن دل نہیں لگا۔" وہ بتانے لگی "پھر میں سونے کے لیے لیٹ گئی مگر نیند بھی نہیں آ رہی۔ عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔"

وہ اس وقت انتہائی سنجیدہ تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا "تم اپنی کیفیت کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتاؤ۔"

میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ وہ دھیرے سے بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی پھر کہا "مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اس فلیٹ میں ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہو!"

میں نے چونک کر اسے دیکھا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"میں نے اپنے محسوسات سے تمہیں آگاہ کر دیا۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں، ہم دونوں کے سوا یہاں کوئی اور موجود نہیں۔"

میں نے کہا "یہ تمہارے محسوسات نہیں بلکہ وہم ہے۔ لگتا ہے، حکمت یار کا خوف آسانی سے تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ خیر، تم میرے ساتھ آؤ۔" میں نے بیڈ سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ہم بیڈ روم سے نکل کر اس کے بیڈ روم میں آ گئے۔ میری متلاشی نظر ایک ایک شے کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے زرگل سے کہا "تم بھی اچھی طرح دیکھ لو تاکہ تمہارا وہم نما شک رفع ہو سکے۔"

ہم نے زرگل والے بیڈ روم کا تفصیلی معائنہ کیا، پھر ڈرائنگ روم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کے بعد کچن اور واش رومز میں جھانکا گیا۔ سب سے آخر میں، میں نے داخلی دروازے کے لاک اور کنڈیاں چیک کیں پھر زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تو تمہاری تسلی ہو گئی ہوگی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "میں اپنے وہم کو سمجھ رہی ہوں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ شاید میں نے چاچا حکمت یار کو زیادہ ہی ذہن پر سوار کر لیا ہے جو مجھے لاشعوری طور پر ایک انجانے سے خوف میں مبتلا کر رہا ہے۔"

ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دوبارہ بیڈ روم میں آ گئے۔ میں نے زرگل سے کہا "ایسا کرو، تم میرے بیڈ پر سو جاؤ۔ اگر ہم لوگوں نے بھرپور نیند نہ لی تو کل کا دن بڑا اضمحلال مندی میں گزرے گا جبکہ یہ دن میری زندگی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔"

وہ متاملانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی "اور تم؟"

میں اس کے دو لفظی جملے کی تہ تک پہنچ گیا اور کہا "ظاہر ہے، مجھے بھی اسی بیڈ روم میں سونا ہوگا ورنہ تم بار بار ڈرتی رہو گی اور......" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں ادھر کارپٹ پر سو جاؤں گا۔ تم پورے اطمینان کے ساتھ اس بستر پر سو سکتی ہو۔"

اس کے چہرے پر طمانیت کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے لائٹ کو جلتا چھوڑ دیا اور سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ شاپنگ آرکیڈ کے سامنے میری ہنڈائی جوں کی توں کھڑی تھی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے چار پانچ گہری اور جاذب سانسیں لیں پھر زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''گڈ نائٹ! میں تو اب سوؤں گا۔'' پھر میں قالین کی جانب بڑھ گیا۔

''مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''کیا اچھا نہیں لگ رہا؟''

''میں بستر پر آرام سے سوؤں اور میرا محسن ادھر زمین پر پڑا رہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی ''تم بستر پر آ جاؤ، میں نیچے سو جاتی ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے، اس سے فرق کیا پڑے گا!''

''بہت فرق پڑے گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''اگر تم نیچے لیٹے تو میں ایک لمحے کے لیے سو نہیں سکوں گی۔ ندامت کا احساس مجھے شدت سے ستاتا رہے گا۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے، میں پہلے تمہیں گہری نیند میں پہنچاؤں۔ اس کے بعد ہی خود سونے کے بارے میں سوچوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں قالین سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ خاصی بدکی ہوئی نظر آنے لگی۔ پتا نہیں، اس نے میرے اقدام کا کیا مطلب نکالا تھا۔ میں نے اسے اپنے وجود میں سمٹتے ہوئے دیکھا تو وضاحت ضروری ہو گئی۔

میں نے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر تحکمانہ انداز میں کہا ''بستر پر چت لیٹ جاؤ، آنکھیں بند کر لو اور اپنی توجہ میری آواز پر مرکوز کر دو۔''

اس کی جان میں جان آئی، ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے محتاط لہجے میں دریافت کیا ''کیا تم مجھ پر کوئی عمل وغیرہ کرنا چاہتے ہو؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا ''اسے تنویمی عمل کہتے ہیں۔ میں مخصوص لب و لہجے میں تمہیں ترغیبات دوں گا۔ تم پورے انہماک سے میرے الفاظ کو اپنے ذہن میں اتارو گی۔ اگر تمہاری توجہ میری آواز پر مرکوز رہی تو بہت جلدی تم نیند کی گداز بانہوں میں سمٹ جاؤ گی۔ کیا تم اس عمل کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو؟''

''ایک منٹ!'' اس نے سرسری انداز میں کہا پھر چاروں خانے چت ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں پانچ سیکنڈ تک اس خاموش طوفانی پیکر حسن و جما[ل] تکتا رہا۔ پشتون دوشیزہ میں جوانی کوٹ کوٹ کر بھری ہ[وئی] تھی۔ اس کے چہرے کی رعنائی کو انجانے خوف کی آم[یزش] نے خاصا سہا دیا تھا جس سے اس کی جاذبیت میں ا[یک] معصومیت در آئی تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسی ڈری سہمی ک[...] دکھائی دیتی تھی جسے کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش ہو!

میں نے ترغیبات کا سلسلہ شروع کیا ہی تھا کہ [بند] آنکھوں کے پیچھے اس نے سوال کیا ''وجدان! تم اتنے گہر[ے] کیوں ہو؟''

''یہ بات تم پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکی ہو۔'' پہلے [...] مرحلے پر اس کی مداخلت مجھے پسند نہ آئی۔ اس لیے میر[ے] لہجے میں اچھی خاصی سختی تھی۔

وہ بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے بولی ''پہلے کی با[ت] اور تھی۔ اس بار میں ایک خاص وجہ سے کہہ رہی ہوں۔''

''اب وہ خاص وجہ بھی خود ہی بتا دو۔'' میں نے رکھا[ئی] سے کہا۔

''میں محسوس کر رہی ہوں، تمہاری گہرائی [...] پُراسراریت بھی شامل ہے۔''

''پھر میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''کیا تم میری بات سے اتفاق کرتے ہو؟''

''اتفاق اور اختلاف بعد میں ہوتا رہے گا۔'' میں نے [...] کر کہا ''فی الحال اگر تم واقعی سونا چاہتی ہو تو خاموش رہ کر م[یری] باتیں توجہ سے سنو اور انہیں اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوش[ش] کرو۔''

''جب تک تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے، میر[ے] اندر ایک بے چینی سی پھیلی رہے گی۔'' وہ آنکھیں وا کر[تے] ہوئے بولی ''اور اس اضطراری کیفیت میں، میں تمہار[ی] ترغیبات پر دھیان نہیں دے سکوں گی۔

میں نے بے بسی سے ایک طویل سانس خارج کی او[ر کہا] ''ٹھیک ہے، تم ایک سوال جلدی سے پوچھ لو...... صرف ا[یک] سوال!''

اس نے پوچھا ''تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی [کہ] دروازے کے باہر شہزاد علی موجود ہے۔ کیا تم غیب داں ہو[؟]''

میں اس کا اشارہ پلک جھپکتے میں سمجھ گیا۔ آج رات [کے] درمیانی حصے میں جب شہزاد ہمارے فلیٹ پر پہنچا تھا، اس و[قت] میں ایک مشق کے سلسلے میں زرگل کو ضروری ہدایات دے [رہا] تھا۔ وہ اتنی محویت سے مجھے سن رہی تھی کہ ایک مرحلے پر [میں]

خاموش ہوا تو اس نے بے ساختہ پوچھا تھا، پھر کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب میں، میں نے بے اختیار کہہ دیا تھا اور پھر دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میری بات ختم ہوتے ہی شہزاد نے دروازہ ناک کیا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا لیکن زرگل کا متجسس ذہن بال کی کھال اتارنے پر تُلا ہوا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''غیب کا علم صرف خدا کی ذات تک محدود ہے۔ کوئی انسان اس کا دعوے دار نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی اس زعم میں مبتلا ہے تو سمجھو، اس کی بربادی قریب آ پہنچی ہے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر گمبھیر لہجے میں اضافہ کیا ''دستک کے حوالے سے جو کچھ ہوا اسے تم ایک اتفاق کہہ سکتی ہو۔ اس میں میرے کسی علم یا شکتی کو دخل نہیں۔''

''چی کو بھی نہیں؟'' اس نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

''میرا خیال ہے، نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے، تم پُریقین نہیں ہو!''

وہ ایک نہایت ہی اہم نکتے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ اگرچہ میں نے اس وقت محض بات برائے بات دستک کا ذکر کیا تھا لیکن یہ امر خارج از امکان نہیں تھا کہ وہ خیال چی کی کارفرمائی کے سبب میرے ذہن میں آیا ہو۔ بعض اوقات ہر انسان تھوڑا بہت مستقبل بین ہو جاتا ہے۔ چی کی قوت ظاہر ہے، اس کی صلاحیت میں اضافہ کر سکتی ہے۔ لاہور میں تو زرگل سے چی کے بارے میں زیادہ بات نہیں ہوئی تھی لیکن کراچی پہنچتے ہی اس نے اس سلسلے میں مجھے کافی کرید ڈالا تھا اسی لیے وہ ایک اتفاقی بات چی کے کریڈٹ پر ڈال رہی تھی۔

میں اگر چی کی اثر پذیری پر اس سے گفتگو شروع کر دیتا تو پھر سونا نصیب نہ ہوتا کیونکہ یہ ایک انتہائی دلچسپ اور طولانی باب ہے، لہٰذا میں نے اپنے لہجے میں رکھائی کا عنصر شامل رکھتے ہوئے کہا۔

''زرگل! اگر تم واقعی سونے کا ارادہ رکھتی ہو تو پھر غیر متعلقہ باتوں کو کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دو۔'' میں نے ذرا رک کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا ''لیکن اگر تم ابھی سونا نہیں چاہتی ہو تو پھر شب بخیر!''

بات ختم کر کے میں پلٹنے لگا تو وہ جلدی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی ''ٹھیک ہے، میں اب کوئی سوال نہیں کروں گی۔ تم اپنا عمل شروع کرو۔''

میں نے ترغیبات کا آغاز کیا اور زرگل کو گہری نیند میں پہنچانے کے لیے ہپناٹزم کی مخصوص ٹیکنیک سے کام لینے لگا۔ پانچ منٹ بعد وہ ڈریم لینڈ کے ایک پُرسکون اور کیف آور گوشے میں پناہ گزیں ہو چکی تھی!

☆☆☆

رات کو دیر سے...... بلکہ صبح سے پہلے سوئے تھے اس لیے دوپہر کے قریب بیدار ہوئے۔ چھ گھنٹے کی نیند نے بڑی حد تک تھکاوٹ کو دور کر دیا۔ فریش اپ ہونے کے بعد ہم فلیٹ سے نکل آئے۔ ناشتے کا وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا لیکن لنچ کے انتظار میں بھوکا نہیں رہا جا سکتا تھا۔ مین طارق روڈ پر آنے کے بعد میں نے زرگل سے کہا۔

''پہلے ہم بھرپور ناشتا کریں گے۔ اس وقت تک مارکیٹ پوری طرح کھل جائے گی پھر میں تمہیں ضروری شاپنگ کرا دوں گا۔''

''آج کے دن کا تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' اس نے میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا ''میرا پروگرام زیادہ تر میں نہیں بناتا ہوں۔ حالات میرے لیے اسکرپٹ تحریر کرتے ہیں۔ میں تو اپنی مرضی کی لائنیں بول کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ بہرحال......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا اور مزید کہا ''ناشتے کے بعد میں شہزاد سے رابطہ کروں گا۔ وہاں کی صورتِ حالات جاننے کے بعد ہی کوئی منصوبہ ترتیب دیں گے۔''

ہم ایک ایرانی ریسٹورنٹ کی بالائی منزل پر آ بیٹھے۔ ریسٹورنٹ کا یہ حصہ ''فیملی ہال'' کے نام سے معروف تھا جہاں پرفیملیزم اور فیملی کی تگ و دو میں مصروف جوڑے زیادہ وقت گزارتے تھے جن میں سے پانچ فیصد ہی فیملی بنانے میں کامیاب ہوتے۔ باقی ایک دوسرے سے گلے شکوے کرنے کے بعد راہ بدل کر کسی اور سمت قسمت آزمائی میں لگ جاتے!

ناشتے کے بعد میں نے زرگل کو بھرپور شاپنگ کرا ڈالی۔ مختلف قسم کے ملبوسات، سینڈلز، پرس، رسٹ واچ، ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اور میک اپ کی مکمل رینج۔ میک اپ کے سامان میں بعض آئٹم ایسے بھی تھے جو زرگل کی سمجھ میں نہیں آئے۔ میں نے انہیں الگ پیک کروا لیا تھا۔ وہ ''نہ نہ'' کرتی رہی لیکن میں نے ''ہاں ہاں'' کرتے ہوئے اسے لاد پھاند دیا۔ جب وہ سوالات پر سوالات کرنے لگی تو میں نے کہا۔

''میں نے کچھ زیادہ نہیں کیا۔ موقع محل کی مناسبت سے یہ اشد ضروری تھا۔''

''موقع محل!'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''آج رات تم ایک دعوت ولیمہ میں جانے والی ہو۔ کیا روکھی سوکھی گھر کے کپڑے پہن کر دعوت میں شرکت کرو گی؟''

''کون سی دعوتِ ولیمہ؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔

میں نے اسے منہاس باقر کی بیٹی شبانہ کی شادی کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ پرسوں رات کو شبانہ کی شادی ہوئی تھی۔ وہ بیاہ کر کراچی سے حیدرآباد گئی تھی اور آج یعنی منگل کو حیدرآباد میں ولیمے کی تقریب تھی۔ بات پوری کرنے کے بعد میں نے کہا ”منہاس صاحب کی فیملی کے ساتھ آج رات تم حیدرآباد جاؤ گی۔ اب آئی سمجھ میں بات۔“

”تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے میں اکیلی جاؤں گی۔“ وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”کیا تم وہاں جانے کا ارادہ نہیں رکھتے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا ”میں نہیں جاسکوں گا۔ یہاں کا مشن دعوتِ ولیمہ سے زیادہ اہم ہے۔ میں نے منہاس صاحب سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں اس لیے ہم سیدھے ان کے بنگلے پر جائیں گے۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔ تم شاپنگ کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لے لو۔ کوئی شے کم ہو تو بتاؤ تاکہ اس کمی کو ابھی پورا کرلیا جائے؟“

”میرا خیال ہے، ہم نے ضرورت سے زیادہ خریداری کرلی ہے۔“ وہ سامان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ”ایک نہایت ہی اہم شے باقی ہے اور مجھے حیرت ہے، تم اسے ابھی تک بھولے بیٹھی ہو!“

”ایسی کیا چیز ہے!“ زرگل نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”جیولری۔“

”اوہ!“ وہ چونکی ”شاید اس طرف میرا دھیان اس لیے بھی نہیں گیا کہ مجھے زیورات وغیرہ پہننے کا شوق نہیں۔“

”بات شوق کی نہیں، موقع کی ہوتی ہے۔“ میں نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”زیادہ نہ سہی، بندے، پینڈنٹ اور ایک آدھ رنگ تو چلے گی۔“

میرے خواہش نما اصرار کے سامنے اس نے ہتھیار پھینک دیے۔ میں نے زرگل کی جیولری کے ساتھ ہی شبانہ کے شوہر کے لیے بھی ایک قیمتی طلائی گفٹ پیک کروالیا۔ پھر زرگل سے کہا ”میری طرف سے تم یہ تحفہ دولھا کو دے دینا۔“

منہاس باقر کے ساتھ میرے مراسم جس نوعیت میں بدل چکے تھے اس کے پیشِ نظر سلوک کے موقع پر بہت کچھ سوچنے سمجھنے کی ضرورت تھی۔ خدا نے مجھے بہت کچھ دے رکھا تھا اور میں کھلے دل اور ہاتھ کا مالک بھی تھا۔ شبانہ کو میں نے ایک جڑاؤ طلائی سیٹ شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ منہاس کے ساتھ ساتھ شبانہ کو بھی وہ سیٹ بہت پسند آیا تھا۔

منہاس باقر اخبار کی کاپی پریس بھیجنے کے بعد گھر آجاتا تھا لہٰذا ہم سیدھے اس کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ زرگل پہلی مرتبہ وہاں آئی تھی چونکہ میرے ساتھ آئی تھی اور ایک دوست کی حیثیت سے آئی تھی اس لیے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ میں نے اسے منہاس کی فیملی کے حوالے کیا اور خود منہاس کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہوگیا۔

اب تک کے تمام واقعات سے میں نے منہاس باقر کو پوری طرح آگاہ رکھا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”میں چوہدری نوازش سے فائنل گفتگو آپ کی موجودگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تو شام ہوتے ہی ولیمے اور حیدرآباد کے معاملات میں مصروف ہوجائیں گے لہٰذا آئندہ کے لیے جو بھی لائحہ عمل تیار کرنا ہو اس کے بارے میں ابھی فیصلہ ہوجائے۔ میں آپ کو بالکل فری رکھنا چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحات تک گمبھیر انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر اپنی مخصوص آواز میں بولا ”کیا یہاں سے فون کرنا مناسب ہوگا؟“

”میرے خیال میں عین مناسب ہوگا۔“ میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا ”چوہدری نوازش اور شعیب غوری کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ کراچی میں آپ میری پشت پناہی کر رہے ہیں۔ اگر میں آپ کے کسی بھی پلیٹ فارم سے موو کروں گا تو یہ بالکل فطری عمل ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا، وہ ٹیلی فون ایکس چینج کے تعاون سے یہاں کا نمبر ٹریس کرلیں گے اور انہیں معلوم ہوجائے گا، میں نے آپ کے بنگلے سے رابطہ کیا ہے۔ یہ ایسی کوئی خاص یا خطرے والی بات نہیں ہوگی۔ آپ کا تعلق صحافت سے ہے اور آپ بڑے بااثر شخص ہیں۔ شعیب غوری یا چوہدری کا نیٹ ورک براہِ راست آپ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ ان کو مجھے آپ کے مضبوط ٹھکانوں سے باہر ہی کہیں گھیرنا چاہیں گے۔ خیر۔“ میں نے ایک لمحے کا توقف دے کر کہا ”اب تو میں نے خود کو کسی حد تک روپوش رکھنے کا بھی عارضی بندوبست کرلیا ہے۔“

پھر میں نے منہاس باقر کو میک اپ کے سامان اور دیگر ضروری اشیا کے بارے میں بتایا جن کے استعمال سے حلیے میں بڑی حد تک تبدیلی پیدا کی جاسکتی تھی۔

”یہ اچھا آئیڈیا ہے۔“ وہ سراہنے والے انداز میں بولا ”اس سلسلے میں، میں تمہاری مزید مدد کرسکتا ہوں۔“ وہ گہری سوچ میں بول رہا تھا ”ایک بہت ہی ماہر میک اپ مین سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ ٹی وی کے اکثر اسٹارز کا میک اپ وہی کرتا ہے۔ شبانہ کو دلہن بنانے کے لیے میں نے کسی بیوٹی پارلر میں نہیں بھیجا بلکہ وہ میک اپ ماسٹر یہاں گھر پر آگیا تھا۔ تم کہو تو میں اسے بلوالیتا ہوں۔ وہ انکار نہیں کرے گا چونکہ اس کا تعلق شوبز سے ہے اس لیے حلیے میں تبدیلی کا اسے زیادہ تجربہ ہوگا!“

”آپ کی باتوں سے لگتا ہے، وہ ماہر میک اپ آپ کے بھروسے کا آدمی ہے!“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا ”میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آرہا ہے۔“ واقعی میرا ذہن بہت تیز جا رہا تھا۔

منہاس نے گہری سنجیدگی سے کہا ”اس پر میرے بھروسے کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ میں نے شبانہ کی تیاری اس کے ہاتھوں سے کروائی ہے۔ میں اس پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔ وہ تمہارے حلیے کی تبدیلی کے سلسلے میں کہیں زبان نہیں کھولے گا۔“ ذرا رک کر اس نے پوچھا ”ویسے تمہارے ذہن میں کون سا اچھوتا آئیڈیا آیا ہے؟“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے فیصل اور سہیل کے بارے میں بتایا اور کہا ”مجھے امید ہے، فیصل سہیل کو دوبارہ پیش نہیں دے گا۔ سہیل ہماری ہدایت کے مطابق عمل کرے گا اور مجھے یقین ہے، اب تک خاصی پیش رفت ہوچکی ہوگی۔“ میں چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”سہیل کا قد کاٹھ اور صحت بڑی حد تک میرے قریب ہے، انیس بیس کا فرق تو چل جائے گا۔ میں نے سہیل کی بول چال اور نشست و برخاست کو بھی ذہن میں محفوظ کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے، تھوڑی سی پریکٹس کے بعد میں سہیل کی حیثیت سے ایکٹ کرنے لگوں گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کا میک اپ ماسٹر کتنی مہارت سے میرے چہرے کو سہیل کے چہرے سے میچ کرتا ہے!“

”میں تمہارے منصوبے کو بڑی حد تک سمجھ رہا ہوں۔“ منہاس نے گمبھیر آواز میں کہا ”تم سہیل کی جگہ لے کر ایک خوب صورت کھیل کھیلنا چاہتے ہو۔ مجھے امید ہے، میک اپ مین بڑی آسانی سے یہ کام کردے گا۔ بعض مشہور شخصیات کے خاکے پیش کرنے کے سلسلے میں اس نے کئی اداکاروں کو میک اپ کے ذریعے نقل بہ مطابق اصل بنا کر ناظرین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔“

”بس تو پھر آپ فوراً کام کے اس بندے کو یہاں بلوالیں۔“ میں نے کہا ”اس کے ساتھ ہی شہزاد سے بھی میری بات کروادیں تاکہ سہیل کو یہاں بلوایا جائے۔ میں اگر سہیل بن کر فیصل کے قریب پہنچ جاتا ہوں تو دشمنوں کی نظر میں آئے بغیر میں اپنے مشن میں زیادہ آزادی سے حصہ لے سکتا ہوں۔ سہیل یہاں آئے گا پھر میں سہیل کی جگہ یہاں سے جاؤں گا اور بس......“

منہاس باقر نے اس آئیڈیے کو سراہا اور اگلے ہی لمحے میں شہزاد سے بات کر رہا تھا۔ پہلے میں نے وہاں کی رپورٹ لی اور

گریٹ کرکٹرز

عمران خان

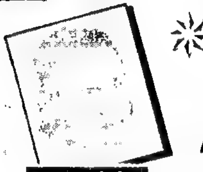
حنیف محمد

جاوید میانداد

ظہیر عباس

قیمت فی حصہ: 250 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ: 25 روپے

دنیائے کرکٹ کے سپر اسٹارز کی داستانِ حیات خود ان کی زبانی

کرکٹ کی اس جگمگاتی دنیا کے چونکا دینے والے انکشافات اور لاتعداد کہانیاں، چار عظیم کھلاڑیوں کی زندگی کے پوشیدہ اور سربستہ راز جو کبھی منظرِ عام پر نہیں آئے۔ اردو زبان کی اپنی نوعیت کی واحد کتاب جس میں ان کھلاڑیوں کی زندگی کا ہر پہلو اور ہر دور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

منگوانے کیلئے آج ہی فون کریں

کتابیات پبلی کیشنز۔ کراچی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 021-5804300

kitabiat1970@yahoo.com

C-63 فیز III ایکس ٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے)

بہت سی چونکا دینے والی باتیں معلوم ہوئیں۔ میں نے اپنے منصوبے کے بارے میں سرسری طور پر اسے بتایا اور کہا۔

"تم پہلی فرصت میں سہیل کو منہاس باقر صاحب کے بنگلے پر بھیج دو۔ کچھ ہی دیر بعد میں سہیل کے روپ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ باقی معاملات وہیں طے کرلیں گے۔"

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے منہاس باقر کو ادھر کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔ فیصل نے سہیل کو شیشے میں اتارنے کے لیے ایک چال چلی تھی۔ منہاس معنی خیز انداز میں گردن ہلاتا رہا پھر اس نے میک اپ کے ماہر کو فون کھڑکا دیا اور تاکید کی کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے، وہ وہاں پہنچ جائے۔ ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوگیا۔

"اب تم جلدی سے چوہدری نواز سے فائنل راؤنڈ کھیل لو تاکہ صورتِ حال کی وضاحت ہوسکے۔"

اگلے ہی لمحے میں نے رکھاں والی میں چوہدری نوازش سے رابطہ کرلیا۔ پانچ سیکنڈ بعد وہ آن لائن ہوگیا۔ میں نے اخلاقی رسمیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بڑے کھردرے لہجے میں کہا۔

"منگل کا سورج اپنا آدھا فاصلہ طے کرچکا چوہدری...... باقی فاصلہ بھی طے ہو ہی جائے گا۔ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ منگل میں دنگل کا ارادہ تو نہیں!"

انداز دوٹوک اور خالی از مصلحت تھا لہٰذا چوہدری نے مجھے گھمانے پھرانے کی زیادہ کوشش نہیں کی اور زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں نے فیصل کو حاصل کرنے کے لیے شعیب سے بات کی تھی۔ وہ ساحل کی واپسی کے لیے دگنی رقم مانگ رہا ہے۔" ہیرا پھیری اس کی گھٹی میں تھی۔

"تو دے دو۔ تمہارے پاس کون سی کمی ہے۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا "ویسے مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آیا۔"

"کس بات کا یقین نہیں آیا؟" اس نے دریافت کیا۔

"یہی کہ برے وقت میں تمہارا نیا نویلا دوست بلیک میلنگ کی راہ اختیار کررہا ہے۔" میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا "تم نے پچھلی گفتگو میں شعیب کے حوالے سے بڑے بڑے دعوے کیے تھے۔ اب تمہارے دعوؤں کی حقیقت کھل رہی ہے۔ ویسے مجھے یقین ہے، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ شعیب گھٹیا پن کی اس سطح پر فائز نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہے کہ اپنے دس کروڑ روپے واپس لے لے۔ ڈبل واپسی والی بات تمہارے پستہ ذہن کی پیداوار ہے۔ بہرحال، مجھے تم دونوں کی دوستی اور کاروبار سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے تو تم سیدھا سیدھا یہ بتاؤ، ساحل کو کہاں اور کس وقت میرے حوالے کررہے ہو؟"

اس سے قبل میں نے جب بھی ساحل کے حوالے سے بات کی، اس نے اپنی معذوری ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن میرے مسلسل اور سنگین انداز نے اسے باور کرادیا کہ وہ اس محاذ پر مجھے پسپا نہیں کرپائے گا۔ گھٹنے اسی کو ٹیکنا ہوں گے۔ فیصل کی سلامت واپسی کے لیے ساحل کو میرے حوالے کرنا ہوگا...... چاہے شعیب ایک پیسا لیے بغیر واپس کردے یا دس کروڑ کے بدلے دس ارب مانگ لے۔ چوہدری کو ہر حال میں شعیب غوری سے ساحل کو واپس لینا ہوگا!

میرے سوال کے جواب میں چوہدری نے کہا "تم فیصل کی وجہ سے مجھے مجبور کررہے ہو ورنہ میں تم جیسے پلوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کچل کے رکھ دیتا ہوں۔ تم نے......"

"ذلیل خاندان کے سیکنڈ لاسٹ ٹمٹماتے چراغ!" میں نے غصیلے لہجے میں کہا "میں نے یہ تمہاری آخری گالی سن لی اور اس کے ساتھ ہی تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ آئندہ میرے لیے تمہاری زبان سے کوئی نازیبا لفظ خارج نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمہاری یہ ناپاک زبان منہ سے خارج ہوجائے گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وہ جواباً کچھ نہ بولا۔ ائرپیس میں اس کی خاموش پھنکاریں ابھرتی رہیں۔ وہ اس وقت چڑھی ہوئی سانسوں کے ان جانے طوفانوں سے گزر رہا تھا۔ زندگی میں اتنا برا وقت اس پر پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ میں نے اپنے سوال کو دہراتے ہوئے کہا۔

"ساحل کو کس وقت اور کہاں میرے حوالے کررہے ہو چوہدری؟"

شکست خوردہ لہجے میں بولا "تم اس بنگلے کا راستہ تو نہیں بھولے ہوگے؟"

اس کے سوال پر میرے ذہن میں دو بنگلے گھوم گئے۔ نمبر ایک شعیب غوری کا ٹھکانا ساؤتھ اور نمبر دو ڈیفنس سوسائٹی کا غیر آباد بنگلا جہاں میں نے میاں زاہد حسین کی مشکل آسان کی تھی۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی اشارہ دیے بغیر ڈانٹ کر کہا۔

"چوہدری! میرے پاس پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں۔ تم خواہ مخواہ اپنے بیٹے کے لیے مشکلات پیدا کررہے ہو!"

بیٹے کے حوالے سے وہ تڑپ اٹھتا تھا جیسے ہاتھا پائی کے دوران میں کوئی شخص اپنے حریف کے جسم کے نازک حصے پر ہاتھ ڈال دے تو سامنے والا سر جھکانے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت چوہدری کی بھی ہورہی تھی۔ فیصل اس کی زندگی کا نازک ترین شعبہ تھا۔

وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا "میں اس بنگلے کی بات کررہا ہوں جہاں تم نے زاہد حسین کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا!"

وہ نہایت ہی محتاط الفاظ کا استعمال کررہا تھا۔

میں نے کہا "مجھے اس بنگلے کا راستہ ازبر ہے۔ بولو، کیا کہتے ہو؟"

"تم فیصل کو لے کر وہاں آجاؤ۔" اس نے کہا "میرے آدمی ساحل کو وہاں پہنچادیں گے۔ تبادلے کا مرحلہ بہ خیر و خوبی انجام پاجائے گا۔ کیا کہتے ہو؟"

"چوہدری!" میں نے اسے تحقیر آمیز انداز میں مخاطب کیا "میں نے تو تمہاری بہادری کے بہت سے قصے سن رکھے ہیں لیکن تجربے نے باور کرایا ہے کہ وہ قصے کہانیاں خوب صورت دھوکا ہے۔ تم انتہائی بزدل اور ڈرپوک انسان ہو۔ تم مردوں کی طرح کھل کھلا کر نہیں بلکہ مستورات کی طرح پردے میں رہ کر معاملاتِ زندگی نمٹاتے ہو۔ پردے داری بی بیوں کی طرح بنگلوں کے اندر آنے جانے کا چکر نہ چلاؤ۔ میں تمہارے کسی ٹریپ میں آنے والا نہیں!"

چوہدری کے لہجے میں، میں نے کسی سازش کی بو سونگھ لی تھی۔ وہ ایک غیر آباد بنگلے کے اندر بلا کر کوئی بھی منافقانہ چال چل سکتا تھا۔ میں نے اس کے ایک نہایت ہی اہم مہرے کو اس بنگلے میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہ میرے لیے وہاں ایک شاندار مدفن تیار کرواسکتا تھا۔

اس نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا "پھر تم ہی بتادو، بندوں کا تبادلہ کہاں کرنا ہے؟"

"کسی پُرفضا اور عوامی جگہ پر۔" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر اس سے پوچھا "تم نے نثار شہید پارک میں کچھوے کا سر دیکھا ہے؟"

"میں نے یہ پارک دیکھا ہوا ہے اور نہ ہی تمہارے بیان کردہ کچھوے کا سر۔" وہ اکتاہٹ بھرے لہجے میں بولا "تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کررہے ہو؟"

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "تم نے ڈیفنس سوسائٹی والے جس بنگلے کا ذکر کیا ہے، اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر نثار شہید پارک ہے۔ سرسبز و شاداب اس خوب صورت پارک میں شام کے وقت اچھی خاصی چہل پہل ہوتی ہے۔ یہ ایک صحت افزا پبلک پلیس ہے۔ اس پارک کے وسط میں قدرے بلندی پر کسی بڑے درخت کے تنے کو اس طرح تراش خراش کر زمین میں گاڑا گیا ہے جیسے کوئی کنگ سائز چوبی کچھوا زمین سے گردن اور سر باہر نکالے، انسانوں پر ہنس رہا ہو۔ کچھوے کا منہ کھلا ہوا ہے اور دہانے کے اندر اس کے دانت بہ آسانی گنے جاسکتے ہیں۔ بعض لوگ اسے کچھوے کے بجائے ڈائنوسار سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں

انسانیت کے ان دشمنوں کی داستان عبرت جو اپنے

موت کے سوداگر

13واں اور 14واں حصہ شائع ہوگیا ہے

مصنف: اقلیم علیم

قیمت فی حصہ -/60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے

ٹیلی پیتھی کے فسوں گر فرہاد علی تیمور کی جادو اثر سرگزشت

46واں حصہ شائع ہوگیا ہے

دیوتا

46 حصے کتابی شکل میں دستیاب ہیں

قیمت فی حصہ -/60 روپے ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے

معیاری نفسیاتی و علمی کتابیں

ٹیلی پیتھی مستقبل بینی	40/-	دست شناسی کے نئے رخ	40/-
ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات	45/-	تحریر اور شخصیت	30/-
ہپناٹزم	30/-	مسائل اور حل	40/-
ہپناٹزم کے عملی طریقے	50/-	باخبری	25/-
ہپناٹزم کی جدید تحقیقات	60/-	چھ حیرت انگیز علوم	25/-
ذاتی ہپناٹزم	25/-	احساسِ کمتری	30/-
خوابوں کے اسرار	30/-	سگریٹ نوشی چھوڑیے	25/-
عورتوں کی نفسیات	60/-	کامیابی	25/-
مقناطیسیت	50/-	کراٹے	50/-
ازدواجی نفسیات	60/-	مٹاپا اور اس کا سدباب	45/-
خوف و شرم اور اس کا سدباب	50/-	امتحان میں کامیابی	30/-

کتابیات پبلی کیشنز

فون: 021-5804300

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

kitabiat1970@yahoo.com

پڑتا۔“

”تم یہ تفصیل مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

میں نے کہا ”اس لیے کہ فیصل اور ساحل کے تبادلے کے لیے میں نے اس مقام کا انتخاب کیا ہے۔“

”اوہ!“ اس نے ایک تکان زدہ سانس خارج کی ”ٹھیک ہے، میں اپنے آدمیوں کو اس پارک کے بارے میں بتادوں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔“ وہ پھنکارا پھر ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا ”اگر تمہارے ذہن میں کوئی الٹی سیدھی منصوبہ بندی ترتیب پارہی ہو تو اسے فوراً جھٹک دو۔ اگر مجھے تمہاری طرف سے ذرا بھی شک ہوگیا تو پھر ساحل کو تم زندہ نہیں دیکھ سکو گے!“

میں نے مضبوط لہجے میں کہا ”تم سب کو اپنی طرح سازشی فاؤل پلیئر نہ سمجھو۔ میں زبان کا دھنی ہوں جو کہہ رہا ہوں وہ کرکے بھی دکھاؤں گا۔ اس لیے ایسی فضول دھمکیوں میں اپنی توانائی ضائع نہ کرو۔ بتاؤ، ساحل کو کتنے بجے پارک میں پہنچاؤ گے؟“

”میرے خیال میں نو بجے کا وقت ٹھیک رہے گا؟“ وہ مکاری سے بولا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ”سات بج کر ایک سیکنڈ بھی نہیں!“

میرے انداز میں ایسی قطعیت تھی کہ موضع رکھاں والی میں وہ بری طرح تلملا کر رہ گیا ہوگا۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا ”تم میں ذرا سی بھی کاروباری سوجھ بوجھ اور مصلحت نہیں۔ سات اور نو.... میں آخر فرق ہی کیا ہے؟“

”یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا کہ مجھ میں کاروباری سوجھ بوجھ نہیں۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا ”اور وہ اس لیے کہ میں تم سے کوئی بزنس ڈیل نہیں کر رہا جس میں مجھے اپنے فائدے نقصان کی خاطر تمہاری مرضی اور خواہش کا خیال رکھنا ہو۔ ساحل کی واپسی میرا مطالبہ ہے اور یہ مطالبہ تمہیں ہر صورت میں پورا کرنا ہے، بشرطیکہ تمہیں اپنے بیٹے کی زندگی عزیز ہو!“ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ”سات اور نو میں تمہارے نزدیک کوئی فرق نہیں ہوگا مگر میں ایک ایک سیکنڈ کو شمار کرتا ہوں۔ میں نے تم پر واضح کردیا تھا کہ میری دی ہوئی مہلت میں توسیع کی توقع نہ رکھنا۔ اگر آج کا سورج غروب ہوگیا تو تمہارے لختِ جگر کی زندگی کا چراغ بھی گل ہوجائے گا۔ میں ابھی تک اپنے فیصلے پر ثابت قدم ہوں لہٰذا تمہارے پاس چھ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ہٹ بٹائے ہوئے لہجے میں بولا ”سات بجے شام ڈن!“

میں نے اس کی شکست خوردگی اور بے بسی پر محظوظ ہوتے ہوئے کہا ”ٹھیک سات بجے شام تمہارا اسپوت صحیح و سالم مذکورہ کچھوے سے ٹیک لگائے کھڑا ہوگا لیکن کئی خفیہ آنکھیں اس پر نظریں گاڑے ہوں گی تاکہ تمہاری جانب سے کسی بے ایمانی کی صورت میں فیصل کو چھلنی کردیا جائے......“

”ایسے...... ایسا کچھ نہیں...... ہوگا۔“ وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ”تو سمجھو پھر تمہارا بیٹا بھی محفوظ رہے گا۔ کوئی اس کی جانب میلی نگاہ سے بھی نہیں دیکھے گا۔“ میں نے تھوڑا توقف کیا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جس طرح ٹھیک سات بجے فیصل مذکورہ مقام پر موجود ہوگا، بالکل اسی طرح تم ساحل کو بھی وہاں پہنچاؤ گے۔ میرا مطلب ہے، اپنے نمک خواروں کو ایسے احکام صادر کروگے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہیں گے اور اگلے ہی لمحے وہ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں چہل قدمی کرتے نظر آئیں گے۔ تمہارے آدمی فیصل کو اور میرے آدمی ساحل کو اپنے کور میں لے لیں گے۔ نہ کوئی بدنظمی اور نہ کوئی ہنگامہ آرائی۔ نہایت ہی پُرامن انداز میں بندوں کا تبادلہ ہوجائے گا۔ پارک میں موجود افراد کو ذرا بھی احساس نہیں ہوگا کہ وہاں ان کی نظروں کے سامنے کتنا بڑا معاملہ سیٹل ہوگیا۔ چوہدری!“ میں نے چٹانی لہجے میں اسے مخاطب کیا اور کہا ”میری طرف سے یہ فیئر ڈیل ہوگی لیکن اگر تمہاری جانب سے کسی چالاکی یا ہوشیاری کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا تو پھر بھیانک ترین نتائج کے لیے تیار رہنا!“

وہ میرے لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے بولا ”میں فیصل کے معاملے میں کسی قسم کا رسک نہیں لے سکتا۔ تم اس سلسلے میں بےفکر رہو۔“

”یہ تمہاری دانش مندی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”تم بھی کسی چھل فریب سے کام نہیں لینا!“

”میں الفاظ سے نہیں بلکہ عمل سے اپنا زبان کا دھنی ہونا ثابت کروں گا۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ”آج شام سات بجے تمہیں یقین آجائے گا کہ وجدان کتنا بڑا فیئر ڈیلر ہے۔“

”دیکھوں گا!“ وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

میں نے ٹیلی فونک سلسلہ منقطع کردیا اور سوالیہ نظر سے منہاس باقر کو دیکھنے لگا۔

وہ معنی بھرے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تم نے بڑے اچھے طریقے سے معاملات طے کرلیے ہیں۔ نثار شہید پارک میں مجھے بھی کئی مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ شام کے وقت وہاں بڑی چہل پہل اور رونق دیکھنے میں آتی ہے۔ مجھے امید ہے، کسی قسم کی بدمزگی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ پارک انتظامیہ کی طرف سے مسلح سیکیورٹی گارڈز تھوڑے فاصلے پر بڑے چوکس انداز میں ٹہلتے رہتے ہیں جو ہر قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے مجاز ہوتے ہیں لہٰذا وہاں کے ماحول کو دیکھتے ہوئے چوہدری کے بندے بہت محتاط رہیں گے البتہ پارک سے باہر کسی قسم کی بھی ناگفتہ بہ صورتِ حالات سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔“

”یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”ساحل کو بہ حفاظت پارک سے نکال کر لانا اور پھر کسی محفوظ مقام پر پہنچانا ایک اہم مرحلہ ہوگا اور...... ابھی تک یہ بھی طے نہیں ہوا کہ بازیابی کے بعد ساحل کو کہاں رکھا جائے گا؟“ میں نے ذرا رک کر منہاس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا ”پہلے میرے ذہن میں آپ کے بنگلے کا خیال تھا۔ ساحل سب سے زیادہ محفوظ یہیں رہ سکتی ہے لیکن آپ لوگ تو حیدرآباد جارہے ہو۔ ایسی صورت میں......“

”ایسی صورت میں یہ بنگلا اور بھی زیادہ محفوظ اور مفید ہوجاتا ہے۔“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ”ہماری حیدرآباد جانے والی بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ تمام حلقے یہ جانتے ہیں کہ پرسوں میری بیٹی کی شادی ہوئی ہے اور آج حیدرآباد میں ولیمہ ہے۔ تم نے شادی کے موقع پر ہوٹل میں دیکھ ہی لیا ہوگا، زندگی کے ہر شعبے سے بڑے بڑے لوگ وہاں موجود تھے۔ مجھ جیسے معروف لوگوں کی سماجی سرگرمیاں پوشیدہ نہیں رہتیں لہٰذا ہمارے دشمن بھی بےخبر نہیں ہوں گے۔“

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا ”اگر تم ساحل کو لے کر یہاں آجاؤ گے تو کسی کا اس طرف دھیان نہیں جائے گا۔ ہم بنگلے کو لاک کرکے جائیں گے اور سیکیورٹی گارڈز وغیرہ کو بھی وہاں سے ہٹادیا جائے گا تاکہ یہی محسوس ہو، بنگلے کے اندر کوئی بھی موجود نہیں۔ ویسے بھی تم اندرونی لائٹس کو آف ہی رکھنا تاکہ کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔ بنگلے کی عقبی گلی میں ایک چھوٹا دروازہ کھلتا ہے، وہ اندر سے کھلا چھوڑ دیا جائے گا۔ تم اسی دروازے کو استعمال میں لاکر بہ آسانی بنگلے کے اندر آجانا۔ میں اپنے ڈی ایس پی دوست خورشید شاہ سے کہہ کر چند سادہ لباس پولیس والوں کو بنگلے کی نگرانی پر مامور کروادیتا ہوں تاکہ تمہارے دشمنوں میں سے اگر کوئی ادھر کا رخ کرے تو اس سے نمٹا جاسکے۔ ویسے تو رات گئے ہم واپس آ ہی جائیں گے۔“

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا ”میرا خیال ہے، پولیس والوں کو اس معاملے میں ملوث کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حلیہ تو ویسے بھی بدلا ہوا ہوگا۔ وجدان کی حیثیت سے کسی کا دھیان میری طرف نہیں جائے گا اور جہاں تک ساحل کا سوال ہے تو اس کو میں کسی نہ کسی طرح کور کرہی لوں گا۔ آپ اس سلسلے میں زیادہ پریشان نہ ہوں۔“

”ہوں!“ اس نے ایک ہنکاری بھری اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ”ٹھیک ہے، تم اپنے طور پر جیسے مناسب سمجھو، پلان بنالو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم شہزاد اور میرے سیکیورٹی گارڈز کو اپنی مرضی سے استعمال کرسکتے ہو!“

میں نے کہا ”شہزاد علی تو اس مشن میں میرے ساتھ رہے گا۔ اس سے میرا ذہن مل گیا ہے۔ سہیل یہاں پہنچنے والا ہے۔ اسے بنگلے کے اندر ہی رہنے دیں۔ جب ہم فیصل کو لے کر پارک کی جانب روانہ ہوں گے تو وہاں موجود دونوں گارڈز کو یہاں بھیج دیں گے۔ بنگلے کی حفاظت کے لیے یہاں پہلے سے دو گارڈز موجود ہیں۔ یہ چاروں افراد دور رہ کر بنگلے کی نگرانی کرتے رہیں بس اتنا ہی کافی ہے۔ بنگلے کے نزدیک کسی قسم کی بھیڑ لگانا ٹھیک نہیں۔ مین گیٹ پر جھولتا تالا دشمن کو گم راہ کرنے کے لیے کافی ہوگا!“

”میں تمہارے منصوبے میں تھوڑی تبدیلی کررہا ہوں۔“ منہاس باقر نے بزرگانہ انداز میں کہا ”بنگلے والے گارڈز منظر علی اور آفتاب احمد کو تو میں تمہاری خواہش کے مطابق نگرانی پر مامور کردوں گا لیکن عباس اور زمرد خان کو یہاں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ تم انہیں سات بجے سے پہلے ہی پارک کی طرف روانہ کردینا۔ وہ طے شدہ مقام سے تھوڑے فاصلے پر موجود رہیں گے۔ جب تم ساحل کو لے کر پارک سے نکلو گے تو وہ دونوں تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے تاکہ کسی نوعیت کی بدمزگی میں تمہاری طاقت بڑھا سکیں۔ پھر جب تم بہ حفاظت اس بنگلے تک پہنچ جاؤ گے تو وہ واپس چلے جائیں گے...... وہیں جہاں سے آئے تھے!“

”آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔“ میں نے کہا ”میں اس سلسلے میں زمرد خان اور عباس کو اچھی طرح بریف کردوں گا۔“

”کسی مزید گاڑی یا اسلحے کی ضرورت محسوس کرو تو شہزاد سے کہہ دینا۔“ منہاس نے دوستانہ انداز میں کہا ”وہ فوراً بندوبست کردے گا۔ میں نے تمہارے سلسلے میں اسے خصوصی ہدایات دے رکھی ہیں۔“

”میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے کہا ”شہزاد بہت جی دار اور مخلص آدمی ہے۔ مجھے امید ہے، ہمیں کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ویسے آپ لوگ

حیدرآباد کے لیے کتنے بجے تک روانہ ہوں گے۔"

منہاس باقر نے جواب دیا "اگرچہ کراچی میں موسم سرما اپنی بہار دکھانے میں اکثر ناکامیاب رہتا ہے لیکن حیدرآباد کا حال اس سے بہت مختلف ہے۔ وہاں آج کل شام اور خصوصاً رات میں اچھی خاصی سردی ہو جاتی ہے۔ لڑکے والوں نے بھی قدرے جلد فارغ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ دو گھنٹے کا فاصلہ ہے۔ میرے خیال میں ہم شام ساڑھے چھ بجے نکلیں گے یا زیادہ سے زیادہ سات بج سکتے ہیں۔"

"یہ بالکل مناسب پروگرام ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "میں بھی فوراً پارک سے نہیں نکلوں گا۔ کم از کم ....آدھا گھنٹا وہاں رک کر دشمنوں کی کسی بھی ممکنہ چال کو سمجھنے اور اس سے نمٹنے کی کوشش کروں گا۔ اگر سب خیریت رہی تو ہم ساڑھے سات بجے تک وہاں سے روانہ ہوں۔ اس وقت رات کا آغاز ہو چکا ہوگا۔"

ہمارے درمیان منصوبہ سازی جاری ہی تھی کہ سہیل بنگلے پر پہنچ گیا۔ اسے شہزاد نے کچھ نہیں بتایا تھا لہٰذا میں نے مختصر الفاظ میں اسے آئندہ فرائض سے آگاہ کیا۔ میک اپ کے ذریعے عارضی شخصی تبدیلی اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ بہت دلچسپی اور سنسنی خیزی سے مجھے تکنے لگا پھر مضطرب لہجے میں بولا "سر! آپ تو کمال کے آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ اس بندے کے بڑوں تک ضرور پہنچ جائیں گے۔" بندے سے اس کی مراد فیصل تھی۔

میں نے کہا "شہزاد نے مجھے تمہارے اور فیصل کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں مختصراً بتایا ہے۔ اب تم اپنی زبان سے تفصیل سناؤ تا کہ فیصل کو ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئے۔"

سہیل نے کم و بیش وہی باتیں بتائیں جو اس سے قبل میں شہزاد کی زبانی سن چکا تھا۔ اس کے مطابق اس نے ہماری ہدایات پر عمل کرتے ہوئے فیصل کو یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ اس کی پیش کش پر غور کر رہا ہے لہٰذا فیصل تھوڑا اور کھل گیا۔ سہیل نے خدشہ ظاہر کیا کہ فیصل اپنا کام نکلوانے کے بعد رقم سے انکاری ہو جائے گا۔ فیصل نے اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر سہیل اسے ایک فون کرنے کا موقع دے تو وہ اپنے کسی خاص آدمی سے بات کرے گا۔ سہیل اس آدمی سے جا کر مل لے، اسے مذکورہ رقم دے دی جائے گی۔ جب رقم سہیل کے قبضے میں چلی جائے تو وہ بنگلے پر آ کر فیصل کو فرار ہونے کا موقع فراہم کرے۔ سہیل نے اپنی کتھا سنا دی تو میں نے اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ نہایت ہی سیکرٹ اور پرائیویٹ گفتگو سے اسے دور رکھنا ضروری تھا۔ میک اپ والی بات اس سے چھپ نہیں جا سکتی تھی کیونکہ بعد میں بھی میرا اس سے واسطہ پڑنے والا تھا۔ پھر میک اپ ماسٹر ہم دونوں کو ساتھ بٹھا کر ہی اپنے فن کا مظاہرہ کرتا۔

فیصل نے نہایت ہی ہوشیاری کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس ایک بات یہ بھی ثابت ہو گئی کہ گزشتہ رات اس نے ہماری گفتگو نہیں سنی تھی ورنہ وہ پیش قدمی کی غلطی نہ کرتا۔ جب میں اور شہزاد اس کے نزدیک کھڑے باتیں کر رہے تھے تو وہ واقعی نیند میں تھا اور اسے مطلق خبر نہیں تھی، ہم نے اور سہیل نے اس کے بارے میں کن خیالا ، کا اظہار کیا تھا۔

فیصل نے سہیل کو جو نیا راگ سنایا تھا اس سے اس کی ذہانت جھلکتی تھی۔ وہ سہیل کو بے وقوف بنا کر چوہے دان میں دھکیلنا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً اس شخص کو فون کرتا جو میاں زاہد حسین کی جہنم روانگی کے بعد کراچی نیٹ ورک کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اگر اس کے منصوبے کے مطابق سہیل ایک کروڑ روپے کی رقم وصول کرنے اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جاتا تو یہ گویا اس کے پروانۂ موت پر دستخط کرنے کے مترادف ہوتا۔ وہ لوگ سہیل کو قابو کر کے جبراً اس کی زبان کھلوا لیتے کہ فیصل کو کہاں رکھا ہے۔ اس کے بعد چوہدری کے نمک خواروں کے لیے بازی پلٹنا آسان ہو جاتی۔ ٹارگٹ نگاہ میں آ جانے کے بعد ایک بہت سہل ہو جاتا ہے۔ وہ فیصل والے بنگلے پر ہلا بول دیتے اور آگ اور خون کے دریا سے گزر کر اسے چھڑانے کی کوشش کرتے۔ فیصل کو فرار ہونے کے لیے ہاتھ تک ہلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

میں نے تشویش ناک نظر سے منہاس باقر کو دیکھا۔ وہ بھی میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ اس نے گمبھیر آواز میں کہا "وجدان! چوہدری کا بیٹا اپنے باپ سے چار ہاتھ آگے ہی نظر آتا ہے۔ اس نے بڑی خطرناک چال چلنے کی کوشش کی ہے۔"

"لیکن میں اس کی چال اسی پر لوٹا دوں گا منہاس صاحب!" میں نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ "اگر چوہدری اور اس کے نیٹ ورک کو دانتوں پسینہ نہ آ گیا تو میرا نام بھی وجدان نہیں!"

منہاس نے کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "اس کا مطلب ہے، تم کھیلنا چاہتے ہو؟"

"بالکل!" میں نے قطعیت سے کہا "یہ ایک شاندار اننگز ہوگی۔"

"کیا تم واقعی فیصل کو فون کرنے کا موقع فراہم کر دو گے؟" اس نے پوچھا "یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہاں پہنچ کر تم سہیل کا رول کرو گے۔"

میں نے جواب دیا "فون کا کارڈ میں ضرور کھیلوں گا لیکن اپنی مرضی سے۔" "اس وقت میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ "میں فیصل پر بے اعتباری ظاہر کرتے ہوئے اس سے فون نمبر اگلواؤں گا اور کہوں گا، ڈائلنگ میں خود کروں گا، مجھے اندیشہ ہے، وہ اپنے لوگوں کو کوئی خاص اطلاع نہ دے دے۔ میرا خیال ہے، فیصل کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے لیے یہی بڑی بات ہوگی کہ میں اسے فون پر بات کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کر رہا بلکہ اس کے بچھائے ہوئے نادیدہ جال میں بھی قدم رکھ چکا ہوں۔ وہ زیادہ سوچ بچار نہیں کرے گا۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے۔" منہاس باقر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا "بالفرض، فیصل تمہاری بات مانتے ہوئے تمہیں اپنے کسی طاقت ور اور بااختیار بندے کا فون نمبر بتا دیتا ہے۔ کیا تم وہاں اس کی بات کروا دو گے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "اگر اس کا رابطہ کروانا ہوتا تو پھر خود ڈائلنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی!"

"تو پھر؟" اس مرتبہ منہاس کے لہجے میں قدرے الجھن تھی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "جیسے ہی فیصل کی زبان سے وہ فون نمبر ادا ہوگا، میرے ذہن کی یادداشتی خانے میں نوٹ ہو جائے گا۔ میں اس کی نظر بچا کر آپ کا نمبر ڈائل کر دوں گا۔"

"میرا نمبر!" منہاس باقر اچھل پڑا "تم نے آخر کیا سوچ رکھا ہے بھئی؟"

میں نے کہا "منہاس صاحب! تھوڑی اداکاری آپ بھی تو کریں۔ آپ کی آواز "باس" کی تعریف پر پوری اترتی ہے۔ آپ کے لہجے کا اتار چڑھاؤ، فوری طور پر فیصل کو کسی شک میں مبتلا نہیں ہونے دے گا۔ میں چونکہ اس کے سر پر کھڑا رہوں گا اس لیے وہ نہایت ہی مختصر اور محتاط الفاظ استعمال کرے گا۔ میں فون لگتے ہی آپ سے کہہ دوں گا...... صاحب! فیصل صاحب آپ سے ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بڑی رقم کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد آپ اسے ہینڈل کر لیجیے گا۔ اسے زیادہ بولنے کا موقع ہی نہ دینا۔ آپ اپنی بھاری بھرکم آواز میں اس کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے تسلی دیجیے گا کہ آپ اس کا اشارہ سمجھ گئے ہیں۔ وہ فوراً رقم کی وصولی کرنے والے کو بھیج دے۔ آپ اس سے "نمٹ" لیں گے۔ اگر فیصل نے فون نمبر کے ساتھ کوئی نام بھی بتایا تو میں آپ کو اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ اس طرح کم از کم ہم میاں زاہد حسین کی جگہ لینے والے نئے باس کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر وہ کوئی اور شخص بھی ہوا تو نہایت ہی اہم ہوگا۔ ممکن ہے، وہ باس سے زیادہ اہم ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!"

منہاس باقر چند لمحات تک توصیفی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے کہا "کیا تمہیں کچھ عرصہ الفریڈ ہچکاک کے ساتھ رہنے کا موقع بھی ملا ہے؟"

"آپ یہ غیر متعلقہ بات کیوں پوچھ رہے ہیں؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ غیر متعلقہ سوال نہیں۔" اس نے کہا "تم بہت اچھی کہانی بُن لیتے ہو!"

"گویا آپ تصدیق کر رہے ہیں، میرا منصوبہ بے داغ اور قابلِ عمل ہے؟"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اپنے حصے کا رول بہ خوبی نبھاؤں گا۔"

"باقی تمام معاملات میں دیکھ لوں گا۔" میں نے کہا۔

پھر میری فرمائش پر منہاس نے سہیل کو بلا لیا۔ میں نے اس سے پوچھا "تم نے فیصل کو کیا جواب دیا تھا؟"

اس نے بتایا "میں نے شہزاد صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد فیصل سے کہا تھا، میں تین بجے اس کے مطلوبہ نمبر پر بات کروا دوں گا۔ اس نے پوچھا، تین بجے کیوں، فوراً کیوں نہیں؟ میں نے شہزاد کے مشورے کے مطابق جواب دیا کہ تین بجے شہزاد تھوڑی دیر کے لیے بنگلے سے چلا جائے گا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اس پر فیصل نے پوچھا "اگر شہزاد نامی وہ طرم خان یہاں موجود ہے تو صبح سے اس نے مجھے شکل کیوں نہیں دکھائی؟ میں نے اسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ شہزاد دیگر ضروری کاموں میں الجھا ہوا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "سر! آپ تو جانتے ہیں، شہزاد صاحب آپ کی ہدایت پر ہی فیصل کے سامنے نہیں گئے۔"

"فیصل نے تم سے میرے بارے میں استفسار کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا "ہاں، وہ تین چار بار آپ کا پوچھ چکا ہے اور میں نے اسے ہر دفعہ یہی بتایا کہ آپ اسے ورثا سے معاملات طے کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور شام کو ہی بنگلے پر آئیں گے۔ اس سے فیصل نے خاصی طمانیت محسوس کی اور کرید کرید کر مجھ سے دیگر سیکیورٹی گارڈز اور وہاں کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں پوچھنے لگا لیکن میں نے یہی ظاہر کیا کہ جب تک ایک کروڑ روپے کی رقم میری جیب میں نہیں آ جاتی، میں اسے چھوٹی

سے چھوٹی بات بھی نہیں بتاؤں گا۔‘‘

’’یہ تم نے بہت اچھا کیا۔‘‘ میں نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا ’’تم کافی سمجھ دار ہو۔ میں منہاس صاحب سے تمہاری تنخواہ میں اضافے کے لیے سفارش کروں گا۔‘‘

اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اس تمتماہٹ میں اپنی تعریف اور آمدنی میں اضافے کی خوشی یکساں طور پر شامل تھی۔ منہاس صاحب نے سہیل کو دوبارہ دوسرے کمرے میں بھیج دیا اور ہم ضروری امور پر بات کرنے لگے۔ دس منٹ بعد میک اَپ کا ماہر وہاں پہنچ گیا۔

اس فنکار کا نام نسیم جوہر تھا۔ اس سے مصافحہ کرنے کے بعد مجھے عجیب سا احساس ہوا پھر جب علیک سلیک ہوئی تو اس عجیب احساس میں مزید اضافہ ہوگیا۔ نسیم جوہر کی آواز، انداز اور اعضا میں ایک خاص قسم کی نرمی اور نزاکت پائی جاتی تھی جسے عرفِ عام میں نسوانیت کا نام دیا جاتا ہے۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ لہٰذا منہاس باقر کی خواہش پر ہم سب نے پیٹ پوجا کی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے بھرپور ناشتا کیا تھا اس لیے دوسروں کا ساتھ دینے کے لیے ہاتھ چلاتا رہا۔ جب ہم کھانے سے فارغ ہوگئے تو منہاس باقر نے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

’’تم چاہو تو اپنی ساتھی سے مل لو۔ میک اپ کے بعد تو تم بڑی حد تک بدل جاؤ گے۔‘‘

’’اچھا یاد دلایا آپ نے۔‘‘ میں نے چونک کر کہا ’’حلیے کی تبدیلی کا راز میں فی الحال زرگل سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔‘‘ پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا ’’کیا ممتاز واپس چلی گئی؟‘‘

’’وہ تو شادی کے دوسرے روز یعنی کل صبح ہی اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔‘‘ اس نے بتایا ’’ہاں، البتہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ولیمے میں ضرور آئے گی لیکن اتفاق دیکھو کہ تم وہاں نہیں جاسکو گے ورنہ میرے دوست اور ممتاز کے باپ قاضی سے تمہاری ملاقات ہو جاتی۔ وہ بہ وجوہ شادی میں نہیں آسکا اور تم ولیمے کی تقریب میں شرکت نہیں کر سکو گے۔ تمہیں بہت یاد کرتا رہتا ہے۔‘‘

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور کہا ’’زندگی نے وفا کی تو بہت جلد میں قاضی صاحب سے ایک بھرپور ملاقات کروں گا۔‘‘

زرگل کے ساتھ پندرہ منٹ گپ شپ کرنے کے بعد میں نسیم جوہر کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ منہاس نے میک اپ ماسٹر کو سب کچھ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ انسان کے حلیے میں بالوں کے اسٹائل کی بہت اہمیت ہوتی ہے، نسیم جوہر بیوٹیشن کے ساتھ ہیئر ڈریسر بھی تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے اپنے فن کا کمال دکھا کر انیس بیس کے فرق سے مجھے سہیل بنا دیا۔ رہی سہی کسر گارڈ کی وردی نے پوری کر دی۔ اگر میں سہیل کے لب و لہجے اور نشست و برخاست کی نقالی کر لیتا تو فیصل کا باپ مجھے بھی پہچان نہیں سکتا تھا اور مجھے اپنی کارکردگی پر پورا بھروسا تھا...... جیسے نسیم جوہر کو اپنے فن پر بھروسا تھا۔

ایک ساتھ گزارے ہوئے اس ایک گھنٹے کے اندر ہمارے درمیان اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ نسیم نے مجھے میک اپ کے حوالے سے بہت سی مفید ٹپس بھی دیں۔ میں نے یہ فن سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا کہ مکمل مہارت کے لیے تو برسوں درکار ہیں تاہم وہ ایک دو سٹنگ میں مجھے اتنا طاق کر دے گا کہ میں اپنی مرضی کے مطابق حلیہ تبدیل کرنے پر قادر ہو جاؤں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں پہلی فرصت میں اسے سٹنگ کی زحمت دوں گا۔ نسیم جوہر بہت ہی نستعلیق اور نفیس انسان تھا۔

ییلو ہنڈائی کو میں نے منہاس باقر کے بنگلے پر ہی چھوڑ دیا۔ منہاس نے مجھے لائٹ گرین کلر کی ایک ہونڈا سوک فراہم کر دی۔ تھوڑی دیر بعد میں اس سبک رفتار گاڑی میں بیٹھ کر بنگلے سے رخصت ہوگیا۔ یہ میرے نئے رول کا پہلا سین تھا!

☆☆☆

شہزاد بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔

میں پونے تین بجے وہاں پہنچا اور دس منٹ کے اندر نہایت ہی جامع اور مختصر الفاظ میں، میں نے شہزاد کو آیندہ کی پلاننگ سے آگاہ کر دیا۔ نثار شہید پارک والے منصوبے کو اس نے سراہا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار کیا کہ میں سہیل بن کر اس مشن میں حصہ لوں گا۔ میں نے بات کے اختتام پر اس سے کہا ’’عباس اور زمرد خان کو بھی میرے بارے میں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ میں ان سے بھی سہیل کی حیثیت سے ملوں گا۔ ویسے وہ ڈیوٹی کیسی دے رہے ہیں؟‘‘

’’ایک دم اطمینان بخش۔‘‘ اس نے جواب دیا پھر پوچھا ’’انہیں کب تک یہاں سے روانہ کرنا ہے؟‘‘

’’اس بارے میں بعد میں فیصلہ ہوگا۔‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ’’پہلے میں فیصل سے ’’ملاقات‘‘ کر لوں۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے مزید کہا ’’سہیل کے جانے کے بعد تم فیصل کی طرف تو نہیں گئے؟‘‘

’’ایک مرتبہ اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔‘‘ اس نے بتایا ’’لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں دراصل اس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کسی اہم نوعیت کے کام میں مصروف ہوں۔‘‘

میں نے کہا ’’یہ تم بہت اچھا کر رہے ہو۔ اب تم مجھ سے سینئر ہو یوں کہ میں سہیل ہوں۔ میں ابھی فیصل کے پاس جا کر اسے یہ خوش خبری سناؤں گا کہ تم کسی کام سے بنگلے سے باہر چلے گئے ہو۔ ایک بات کا خیال رکھنا شہزاد! فیصل کو اس کی ’’ڈلیوری‘‘ کے بارے میں بھنک بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ نثار شہید پارک کی طرف لے جاتے ہوئے ہم اس پر یہی ظاہر کریں گے کہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے آزاد فضا میں لائے ہیں۔ تفصیلی پروگرام ہم تھوڑی دیر بعد طے کریں گے۔ ذرا میں دیکھ لوں، فیصل ایک کروڑ روپے کے سلسلے میں کیا ہنر دکھاتا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ وہ پُرخیال انداز میں بولا ’’نثار شہید پارک کے حوالے سے اس وقت مجھے بنات خان یاد آرہا ہے۔ کافی دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ بنات خان سے میری اچھی یاد اللہ ہے۔ وہ پارک میں سکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے ملازم ہے۔‘‘

’’یہ تم دور کی کوڑی لائے ہو۔‘‘ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا ’’آن ریکارڈ تم کسی ضروری کام سے تھوڑی دیر کے لیے اس بنگلے سے باہر تو جا ہی رہے ہو۔ میرا خیال ہے، تم آف دی ریکارڈ چلے ہی جاؤ، اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ آیا بنات خان آج کل بھی پارک کے اندر ڈیوٹی انجام دے رہا ہے! ہم اس مشن میں اسے استعمال کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے!‘‘

’’تمہیں فیصل کو سنبھالنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟‘‘

’’قطعاً نہیں۔‘‘ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’ٹھیک ہے، پھر میں بنات خان کا کھوج لگاتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا ’’اور لنچ وغیرہ سے بھی نمٹ آتا ہوں۔‘‘

میں نے سوال کیا ’’کیا تمہیں سونے کا تھوڑا بہت موقع ملا تھا؟‘‘

’’ہاں، میں نے تین گھنٹے نیند لے لی ہے...... اور یہ کافی ہے۔‘‘

’’اگر بنات خان دستیاب ہو جاتا ہے۔‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ’’تو کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ وہ تعاون کے لیے تیار ہو جائے گا۔‘‘

وہ پُراعتماد انداز میں بولا ’’میرا خیال ہے، وہ میری بات سے انکار نہیں کرے گا اور ویسے بھی ہم اس سے کوئی غیر قانونی یا مجرمانہ کام تو نہیں لیں گے نا!‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ میں نے قطعیت سے کہا۔

شہزاد تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ کر بنگلے سے رخصت ہوگیا۔ مذکورہ نثار شہید پارک اس بنگلے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ مجھے امید تھی، شہزاد ایک گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔ میں نے سہیل کے لب و لہجے کو ذہن میں تازہ کیا اور فیصل والے کمرے میں پہنچ گیا۔ میری اداکاری کا امتحان شروع ہوگیا۔

’’تم کہاں غائب ہوگئے تھے؟‘‘ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی فیصل نے تیکھی آواز میں استفسار کیا۔

میں نے اس کے قریب آکر سرگوشیانہ لہجے میں کہا ’’میں شہزاد سے ہدایات لے رہا تھا۔ اس نے کافی وقت لے لیا......‘‘

’’کیا وہ چلا گیا؟‘‘ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے سوال کر دیا۔

میں نے اسے خوش کرنے کے لیے کوئی جھوٹ نہیں بولا بلکہ حقیقت بیان کر دی ’’ہاں، وہ ابھی بنگلے سے نکلا ہے۔‘‘ میں بڑی کامیابی سے سہیل کا رول ادا کر رہا تھا۔

’’اور باقی دونوں گارڈز؟‘‘ فیصل نے اپنے اندرونی جوش کو دباتے ہوئے دریافت کیا۔

’’وہ حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔‘‘ میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

’’یہ اچھا موقع ہے۔‘‘ اس نے چارا پھینکنے والے انداز میں کہا ’’اگر تم مجھے ان آہنی بندشوں سے آزاد کر دو تو میں تمہیں زخمی کر کے بنگلے سے نکل جاؤں گا۔ اگر ان گارڈز نے میرے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی تو میں ان کی لاشیں گرانے میں ایک لمحہ نہیں سوچوں گا۔‘‘

’’تم ایسے ہی خالی خولی کیسے چلے جاؤ گے۔‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا ’’میرے ایک کروڑ کا کیا بنے گا؟‘‘

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ اس دیکھنے میں عیاری اور چالبازی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ مجھے بے وقوف بنا کر چکما دینے کے موڈ میں تھا لیکن میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میں اس کے چکر میں آنے والا نہیں۔ میں ایک لالچی مگر محتاط آلۂ کار کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ فیصل نے فوراً پینترا بدلا اور بولا۔ اس کے انداز میں برہمی پائی جاتی تھی۔

’’میں نے تو تمہیں رقم حاصل کرنے کا آسان راستہ بتایا تھا لیکن ابھی تک تم نے فون پر میری بات ہی نہیں کرائی۔ تم

نے حالانکہ وعدہ کیا تھا، تین بجے مجھے ایسا موقع دو گے!''

''میرا وہ وعدہ شہزاد کے جانے سے مشروط تھا۔'' میں نے وضاحت کی'' وہ ابھی ابھی نکلا ہے تو میں تمہاری طرف آیا ہوں۔ تم نہیں جانتے، شہزاد اور وجدان کتنے سفاک ہیں۔ ان کی موجودگی میں سانس بھی سنبھل سنبھل کر لینا پڑتا ہے۔ میں اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر تمہارے کام آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا'' تمہیں اپنے اس فیصلے پر کبھی پشیمانی نہیں ہوگی۔ میں تمہیں اتنی دولت دلواؤں گا کہ تمہاری آنے والی سات نسلوں کو کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' اس نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر مضطربانہ لہجے میں اضافہ کیا'' یہ نہایت ہی موزوں وقت ہے۔ وجدان صبح سے ادھر نہیں پھٹکا اور شہزاد بھی اس وقت بنگلے میں موجود نہیں۔ تم مجھے آزاد کر دو تاکہ میں فون پر تمہارے لیے رقم کا بندوبست کر سکوں۔''

میں نے اسے شک زدہ نظر سے دیکھا اور کہا'' جب تک رقم کے سلسلے میں مجھے اطمینان نہ ہو جائے، میں تمہیں ان بندشوں سے آزاد نہیں کر سکتا۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں۔''

''اگر میرے ہاتھ پاؤں یونہی بندھے رہیں گے تو میں فون کیسے کروں گا۔'' وہ خفگی بھرے انداز میں بولا'' تم میری حالت دیکھ رہے ہو؟''

میں واقعی اس کی حالت بلکہ بدحالت دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں محظوظ بھی ہو رہا تھا۔ میں نے چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور ٹھوس لہجے میں کہا'' تمہیں فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں ٹیلی فون سیٹ یہاں لے کر آ رہا ہوں۔ تم مجھے نمبر بتاؤ گے۔ ڈائلنگ میں کروں گا اور متعلقہ آدمی سے رابطہ ہونے پر میں ریسیور تمہارے کان سے لگا دوں گا۔ تم جو بھی بات کرنا چاہو، کر لینا۔''

پھر فیصل کا جواب سنے بغیر میں وہاں سے ہٹ گیا۔ میں اس کمرے میں پہنچا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ سیٹ کے نزدیک ہی تار کا ایک بڑا سا لچھا رکھا تھا۔ یہ اسی ٹیلی فون کے تار کا بنڈل تھا۔ میں نے اس لچھے کو کھول کر فون کے تار کو کافی طویل کر لیا، پھر ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر فیصل والے کمرے میں آ گیا۔

وہ تذبذب بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ شاید اسے فون سے متعلق میری اسکیم پسند نہیں آئی تھی لیکن اس کے پاس ویٹو پاور نہیں تھی لہٰذا حالات کی مجبوری اور مصلحت کے تقاضے نے اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ میں اس کی بے بسی پر اش اش کر اٹھا۔

میں نے اس کے قریب آ کر کہا'' فیصل! نمبر بتاؤ؟''

اس نے تامل کرتے ہوئے مطلوبہ نمبر اگل دیا۔

میں نے پوچھا'' کس سے بات کرو گے؟''

'' تم نمبر ملا کر مجھے دے دو۔ میں بات کر لوں گا۔'' وہ چالاکی دکھانے لگا۔

میں نے سختی سے کہا'' فیصل! میں جان کی بازی لگا کر کام کر رہا ہوں لہٰذا اپنے تحفظات میں کوئی رخنہ نہیں پڑنے دوں گا۔ تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ اگر نہیں تو پھر میں فون واپس لے کر جا رہا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے الٹے قدموں جنبش کی۔ وہ سٹپٹا کر بولا'' رک جاؤ، میں بتا رہا ہوں۔ واپس جانے کی ضرورت نہیں۔''

میں رک گیا اور گہری نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے چشمِ تصور میں فیصل کو بری طرح ہانپتے کانپتے دیکھا۔ وہ مجھے ایک ایسا پیاسا نظر آیا جو زبان باہر لٹکائے پانی کی ایک بوند کو ترس رہا ہو۔ وہ ایک بااثر اور طاقت ور چوہدری کا بیٹا تھا۔ ایسا چوہدری جو کراچی میں اپنا ایک مضبوط نیٹ ورک رکھتا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر درجنوں، سیکڑوں انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح تلف کر دیا جاتا تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی نے فیصل کو میرے پنجۂ جبر میں کس کر بے چارگی کی افسوس ناک تصویر بنا دیا تھا۔ وہ بڑی امید بھری نظر سے مجھے تک رہا تھا۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے فون سیٹ کی جانب اشارہ کیا اور ریسیور اٹھا کر سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ تھوک نگلتے ہوئے گویا ہوا۔

'' جے۔ ڈی ملک!''

میں اس مختصر جملے سے سمجھ گیا، وہ جے ڈی ملک نامی کسی شخص سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا، یہ جے ڈی ملک میاں زاہد حسین کی جگہ لینے والا باس ہو۔ میں نے اثبات میں گردن ہلا کر فیصل کو اطمینان دلایا اور اس کا بتایا ہوا نمبر پسِ پشت ڈال کر منہاس باقر کے بنگلے کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

ڈائلنگ کی تکمیل پر رابطہ ہو گیا اور دوسری گھنٹی پر فون اٹینڈ کر لیا گیا۔ میں نے جانی پہچانی'' ہیلو'' کے جواب میں کہا۔

'' میں سہیل بول رہا ہوں۔ جے ڈی ملک سے بات کرا دیں۔''

منہاس باقر کی ستائشی آواز میری سماعت سے ٹکرائی

'' ویل ڈن مائی سن!''

میں نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے فیصل کی طرف دیکھا اور ماؤتھ پیس میں کہا'' چوہدری نوازش علی کا صاحب زادہ فیصل رقم کے سلسلے میں جے ڈی ملک سے بات کرے گا۔''

پھر اگلے ہی لمحے میں نے آگے بڑھ کر ریسیور فیصل کے کان سے لگا دیا اور کہا'' تمہارا جے ڈی آن لائن ہے۔''

میں نے منہاس باقر کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ فیصل کی نگاہ کی پکڑ پر نہ پڑ سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا، اسے کسی قسم کا شک ہو۔ پتا نہیں، دوسری جانب سے منہاس نے اس سے کیا کہا ہوگا، وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

'' میں سہیل نامی اس بندے کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ آپ پہلی فرصت میں اسے ایک کروڑ روپے کی رقم دے دیں۔ یہ شخص مجھے رہائی دلانے میں بہت تعاون کرنے والا ہے۔'' پھر اس کا انداز معنی خیز ہو گیا۔'' آپ میری بات سمجھ رہے ہیں......''

میں نے فیصل کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ریسیور اس کے کان سے ہٹا کر کریڈل کر دیا۔ اس کی بات پوری تو ہو گئی لیکن دوسری طرف پہنچ نہ سکی۔ وہ برہمی آمیز نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سنگین لہجے میں کہا۔

'' فیصل! تمہاری ہدایت جے ڈی ملک تک پہنچ گئی۔ اب مجھے وہاں پہنچنا ہے۔ وہاں کا ایڈریس بھی تم ہی بتاؤ گے؟''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے جے ڈی ملک کا پتا بتا دیا۔ وہ ڈیفنس فیز ون کے ایک بنگلے کا ایڈریس تھا۔ مذکورہ بنگلا ڈیفنس مارکیٹ کی عقبی سمت تین چار گلیاں چھوڑ کر واقع تھا۔ ٹیلی فون نمبر کی طرح وہ پتا بھی میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

میں نے فیصل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا'' جیسے ہی شہزاد واپس آئے گا، میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر ایک کروڑ روپے مجھے مل گئے تو میں تمہاری رہائی کے لیے اپنی جان لڑا دوں گا...... چاہے اس کے لیے مجھے شہزاد ہی سے کیوں نہ ٹکرانا پڑے۔''

بات کے اختتام پر میں نے اپنے لہجے میں اچھا خاصا جوش بھی شامل کر لیا تھا۔ فیصل میری جذبات نگاری سے متاثر ہوا اور معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا۔ میں نے صاف محسوس کر لیا، وہ اس وقت سوچ رہا تھا...... بچے! تم ایک مرتبہ جے ڈی ملک کے پاس تو پہنچو۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ ایک کروڑ روپے حاصل کرنے کے لیے کتنے ارب عذابوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فون پر اضطراری جملے بولنے کے بعد وہ خاصی طمانیت محسوس کر رہا تھا جیسے اسے یقین ہو چلا ہو، اب تب میں جے ڈی ملک کے بندے اس کی رہائی کے لیے اس بنگلے پر ہلا بولنے والے ہوں۔ میں نے اسے خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور ٹیلی فون سیٹ کے ساتھ دوسرے کمرے میں آ گیا۔

اس کمرے کے اندر رہتے ہوئے فیصل والے کمرے کے دروازے پر کڑی نگاہ رکھی جا سکتی تھی مگر فیصل کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہزاد واپس آ گیا۔ میں نے اسے اور اس نے مجھے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔

'' وجد...... سوری!'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔ پھر سنجیدگی سے کہنے لگا۔'' مجھے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ سہیل! تمہاری چال کامیاب رہی۔ فیصل کو تم نے خوب الو بنایا ہے۔ چلو، اس طرح اس کے ایک اہم آدمی کا پتا اور فون نمبر تو ہاتھ آیا۔''

'' اور تم کیا کر کے آ رہے ہو'' میں نے پوچھا'' بنات خان سے رابطہ ہو سکا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا'' میں اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ آج کل اسی پارک میں متعین ہے۔ آج اس کی ڈیوٹی بھی ہے۔ اس نے وعدہ کیا ہے، اگر کوئی غلط کام نہ ہوا تو وہ ہم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے، وہ پچھوے والے مقام کے اریب قریب رہے۔ میں اسے بتا دوں گا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں اس سے رابطے کے لیے فون نمبر لے آیا ہوں۔''

'' ٹھیک ہے، ہم پہلے اپنے طور پر لائحۂ عمل ترتیب دے لیں'' میں نے کہا'' اس کے بعد بنات خان کے لیے رول نکالیں گے۔''

اس وقت چار بجنے والے تھے۔ شہزاد نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا'' اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے ایک آنکھ دبائی اور کہا'' میں فیصل کو اشارہ کر کے آتا ہوں پھر جے ڈی ملک کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔''

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلانے لگا۔ میں نے پوچھا۔

'' تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

'' میں......'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا پھر اس کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا'' یار! کیا یہ بدبخت فیصل یہاں سے سوکھا سوکھا چلا جائے گا؟''

'' تم کیا کہنا چاہتے ہو شہزاد!'' میں نے حیرت سے اسے

دیکھا۔
''یار! میرے ہاتھ پاؤں میں بہت چُل ہو رہی ہے۔''
''تو تم فیصل سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟''
''اسے صحیح سلامت واپس کرنا ہے تو آہنی بندشوں کو کھولنا ہوگا'' شہزاد نے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے ایک منطقی راہ نکالی ''وہ بھی ذرا ہاتھ پاؤں کھولے گا تو نارمل نظر آنے لگے گا۔ اسے ہم اسٹریچر پر ڈال کر تو پارک میں لے جانے سے رہے۔ اسے اپنے پاؤں پر چل کر وہاں پہنچنا چاہیے۔''
میں نے تائیدی انداز میں کہا ''بات تو تمہاری معقول ہے شہزاد!''
''پھر کیا ارادہ ہے؟'' وہ انگلیوں کے پٹاخے نکالتے ہوئے بولا۔
میں نے کہا ''اس معرکے کے لیے میں تمہیں صرف آدھا گھنٹا دے سکتا ہوں اور وہ بھی پانچ سے ساڑھے پانچ بجے کا وقت۔ ہم ٹھیک چھ بجے اس بنگلے سے نکل جائیں گے۔''
''تو کیا اس وقت تک ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے؟'' شہزاد نے کہا ''پانچ بجنے میں تو ابھی ایک گھنٹا باقی ہے۔''
میں نے کہا ''میں فیصل کو ذرا شکل دکھا آؤں تاکہ وہ مطمئن ہو جائے کہ میں نے اس کے بچھائے ہوئے نادیدہ جال میں قدم رکھ دیا ہے۔ اس کے بعد ہم اپنے پروگرام کو فائنل ٹچ دیں گے۔ اس ضروری کام سے نمٹنے کے بعد تم اپنے ارمان نکال لینا لیکن'' میں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔
''لیکن کیا؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔
میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''فیصل کی کنڈیشن ایسی نہیں کہ وہ جم کر تمہارا مقابلہ کر سکے اس لیے ذرا ہلکا ہاتھ رکھنا۔ بس سمجھ لو، اس کی مشق کروانا ہے۔ جیسے اکھاڑے میں ایک پہلوان دوسرے پہلوان کو زور کراتا ہے۔''
''تم فکر نہ کرو، میں اسے کوئی خطرناک چوٹ نہیں لگاؤں گا۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا ''میں دراصل یہ دیکھنا چاہتا ہوں، ایک بلیک بیلٹ مارشل آرٹسٹ کمزوری اور بے چارگی کی کیفیت سے گزرنے کے بعد کس طرح اپنا دفاع کرتا ہے!''
''میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، تم کیا دیکھنا چاہتے ہو!'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔
شہزاد کے لبوں پر بڑی سنگین مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔
میں فیصل کو اپنی ایک معنی خیز اور مطلب انگیز جھلک دکھا کر واپس شہزاد کے پاس آ گیا پھر ہمارے درمیان فیصل اور ساحل کے تبادلے کے سلسلے میں سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو ہونے لگی۔
میں نے چوہدری نوازش علی کو نثار شہید پارک اور متوقع کچھوا کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا، اس نے شعیب غوری کو اس راز میں شریک نہ کیا ہو۔ میں شعیب غوری اور اس کی تنظیم کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ''سی ایف کے'' کے پلیٹ فارم سے کام کرتے ہوئے مجھے ان لوگوں کی پہنچ اور طاقت کا اندازہ ہو چکا تھا۔ شعیب اور چوہدری نوازش میں نئی دوستی ہوئی تھی۔ شعیب اس مشن میں خاموش تماشائی کا رول ادا نہیں کر سکتا تھا۔ چوہدری سے میری بات لگ بھگ تین گھنٹے قبل ہوئی تھی۔ شعیب کے لیے یہ بہت زیادہ وقت تھا۔ وہ پارک کے اندر اور باہر ایسا ''بندوبست'' ضرور کر سکتا تھا کہ مجھے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس کے پاس مرنے اور مارنے والے بندوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر قدم پھونک کر اٹھانے کی ضرورت تھی!
میں نے اپنے ذہن میں پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ سات بجے سے بہت پہلے میں اس علاقے میں پہنچ جاؤں گا لیکن پارک میں قدم رکھنے سے قبل میں اپنی تسلی ضرور کر لوں گا۔ بے دھڑک کوئی قدم اٹھا کر میں ٹریپ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے مجھے امید تھی، جو بھی ہنگامہ آرائی ہوگی وہ پارک کے باہر ہی ہوگی خصوصاً پارک سے نکل کر منہاس باقر کے بنگلے کی سمت آنے کے دوران میں، میں نے پارک میں کچھ وقت گزارنے کا اسی لیے فیصلہ کیا تھا۔
میں نے شہزاد سے کہا کہ وہ اپنے دوست بنات خان کو فون کر کے کہہ دے کہ ہمارے دو بندے اس کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ عباس اور زمرد نامی یہ دو افراد پارک کے اندر چکراتے رہیں گے اور اگر کوئی بھی غیر معمولی سرگرمی انہیں نظر آئی تو وہ فوراً ہمیں اطلاع دیں گے۔ اس سلسلے میں بنات خان ان سے تعاون کرے گا۔ فی الحال وہ ہمیں اتنا فیور دے۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔
شہزاد نے میری ہدایت کے مطابق بنات خان کو فون کر دیا۔ میں نے زمرد خان اور عباس کو اپنے پاس بلا لیا۔ ممتا چونکہ سہیل کے سوانگ میں تھا اس لیے میں نے شہزاد کو بریف کر دیا کہ انہیں کیا سمجھانا ہے۔ شہزاد نے میری پلاننگ کے مطابق انہیں سادہ لباس میں پارک کی جانب روانہ کر دیا۔ زمرد خان کے پاس ٹی ٹی پستول تھا۔ عباس کو ریوالور سے لیس کر دیا گیا۔ انہوں نے یہ ہتھیار اپنے لباس میں چھپا لیے اور ہماری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلانے کے بعد وہاں سے

رخصت ہو گئے۔ وہ شہزاد کے اعتماد کے بندے تھے اس لیے میں مطمئن ہو گیا۔
عباس کی کلاشنکوف شہزاد کے پاس پہنچ گئی۔ سہیل والی کلاشن کوف میرے قبضے میں تھی۔ وہ دونوں ساڑھے چار بجے بنگلے سے نکلے تھے۔ پانچ بجے تک ہم نے آیندہ کا مکمل پروگرام ترتیب دے لیا۔ ہم نے چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظرانداز نہیں کیا تھا۔ اس پلاننگ میں ہم دونوں کے مشورے اور اعتراضات شامل تھے۔ جب بنگلے میں فیصل کے علاوہ ہم دونوں باقی رہ گئے تو شہزاد نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''پانچ بج گئے۔ تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟''
بات کرنے کے دوران میں وہ مسلسل انگلیاں چٹخا رہا تھا۔ اس کی بے قراری دیکھنے کے قابل تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''میں فیصل کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ اپنے سامنے سہیل کو زندہ سلامت دیکھ کر چونک اٹھے گا۔ میں اس کی پریشانی سے لطف اٹھانے کے لیے تھوڑا ڈراما کروں گا۔ اس دوران میں تم بھی سر پر پہنچ جانا اور اپنے سنیئر ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے لتاڑنا شروع کر دینا کیونکہ میں اس وقت فیصل کی آہنی بندشیں کھول رہا ہوں گا۔''
''یہ اچھی اور پُرمزہ ترکیب ہے۔'' وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔
میں کلاشنکوف سمیت فیصل کے پاس پہنچ گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا ''تت...... تم......؟'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔
فیصل کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ میں نے اس کے حواس باختہ بشرے پر نظر جماتے ہوئے کہا ''تم واقعی وعدے کے پکے ہو فیصل۔ تمہارے جے ڈی ملک نے پورے ایک کروڑ روپے مجھے دے دیئے۔ اب میں بھی اپنا وعدہ پورا کروں گا۔''
وہ ہتھکڑی کی چابی میرے ہاتھ میں دیکھ کر اور بھی بوکھلا گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی اسے آزاد کرنے والا ہوں۔ وہ شک زدہ لہجے میں مستفسر ہوا ''کک...... کیا تم نے رقم وصول کر لی؟''
''تمہیں میری بات کا اعتبار کیوں نہیں فیصل؟'' میں نے اس کی پشت پر جا کر ہتھکڑی کے لاک میں چابی گھماتے ہوئے کہا ''میں تم سے جھوٹ بولوں گا کیا؟''
وہ بے ربط اور یقین سے عاری الفاظ میں بولا ''نن...... نہیں...... میرا مطلب ہے......''
''یہ کیا ہو رہا ہے سہیل؟'' یہ گرج دار آواز شہزاد کی تھی۔
فیصل اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر متوحش نظر سے شہزاد کو دیکھنے لگا۔ شہزاد کلاشنکوف سونتے، پاؤں پھیلائے دروازے میں کھڑا تھا۔ میں نے نارمل انداز میں اسے مخاطب کیا اور بے تکلفی سے کہا۔
''کم آن شہزاد! قسمت بار بار دروازے پر دستک نہیں دیتی۔ تم بھی چاہو تو تمہاری لائف بن جائے گی۔''
بات ختم کرتے کرتے میں ہتھکڑی کا لاک کھول چکا تھا۔ شہزاد نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا اور پوچھنے لگا ''کیا فیصل کو آزاد کرنے سے لائف بن جاتی ہے؟''
''اور نہیں تو کیا؟'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا ''فیصل نے مجھے اس نیکی کے عوض پورے ایک کروڑ روپے دلوائے ہیں۔ اگر تم میرا ہاتھ بٹاؤ گے تو میں تمہیں اس بزنس میں ففٹی پرسنٹ کا پارٹنر بنا لوں گا۔ کیا ارادہ ہے؟ وجدان تو سوکھے وعدوں پر ٹرخاتا رہتا ہے لیکن...... تمہاری جان کی قسم، میں بالکل پکا وعدہ کر رہا ہوں!''
شہزاد کسی لالچی انسان کی اداکاری کرتے ہوئے آگے بڑھا ''میں بھی امیر بنوں گا۔ مجھے بھی دولت چاہیے...... بہت سی دولت!'' وہ ان الفاظ کی تکرار کرنے لگا۔

فیصل ہکا بکا ہم میں سے ایک ایک کی صورت دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، یہ ہمیں اچانک بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، ہم اس طرح دل و جان سے اس کی مدد میں جت جائیں گے۔ اس کے ذہن نے یہی فیصلہ دیا ہوگا کہ ہمارے دماغ چل گئے ہیں۔ بہرحال، وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ اس کی فیور میں تھا اس لیے وہ خاموش تماشائی بنا اپنی بندشیں ختم کرواتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہاتھ پاؤں سے آزاد ہو گیا۔ آہنی زنجیر، ہتھکڑی اور بیڑی اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئیں۔

میں دبے قدموں سے چلتے ہوئے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا اور شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میں اس کروڑ روپے میں سے تمہیں ایک پیسا نہیں دوں گا۔''

''اگر تم مجھے رقم نہیں دو گے تو میں اس میں سے وصول کروں گا!'' اس کا اشارہ فیصل کی طرف تھا ''تم نے اکیلے اسے آزاد نہیں کیا۔ میں نے بھی خاصی کسرت کی ہے۔''

میں نے بے اعتنائی سے کہا ''میں نے وصول کرنے سے کب منع کیا ہے۔ تمہیں تو ویسے بھی کسرت کی بہت عادت ہے۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔ تمہارا شکار بھاگ کر کہیں نہیں جائے گا۔ تم اس کے اندر سے جتنی رقم نکال سکتے ہو، نکال لو۔ اس وقت تم فیصل کو ایک انسان نہیں، بلکہ آٹو میٹیڈ ٹیلر مشین سمجھ لو۔ جو مختلف بٹن دبانے پر کرارے نوٹ فراہم کرتی ہے۔''

''کرارے نوٹوں کے بدلے میں کرارا مکا!'' شہزاد نے وحشیانہ انداز میں کہا اور فیصل کے منہ پر ایک طاقت ور پنچ جڑ دیا۔

فیصل لاکھ مارشل آرٹسٹ سہی لیکن وہ شہزاد کی طرف سے ایسے رویے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا ذہن تو ہماری بے سر وپا اور فاتر العقل باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ شہزاد کا مکا کھانے کے بعد وہ دھڑام سے پشت کے بل زمیں بوس ہو گیا۔

شہزاد کسی باکسر کے مانند اسٹانس بنا کر قدموں پر اچھلنے لگا۔ فیصل زیادہ دیر تک بے وقوف نہیں بن سکتا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کو سونگھتے ہی وہ سمجھ گیا، ہم نے اس کے ساتھ بھرپور ڈراما کھیلا تھا۔ وہ دانت پر دانت جما کر زمین کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بدن میں لاکھ نوعیت کی کمزوریاں سہی مگر بنیادی طور پر وہ ایک مارشل آرٹسٹ تھا اس لیے خم ٹھونک کر وہ مقابلے پر اتر آیا...... کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا!

شہزاد اپنے قدموں پر اچھلتے ہوئے ہوا میں مکے برسانے لگا۔ وہ ایک طرح سے فیصل کو اشتعال دلا رہا تھا تاکہ وہ اس پر حملہ آور ہو۔ فیصل نے ایک سے پہلے پینترا بدلا پھر اس کی کک ہوا میں بلند ہوئی۔ اس کک میں وہ دم نہیں تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، رگ پٹھوں کی اینٹھن اور کمزوری نے فیصل کو غیر مستعمل بنا دیا تھا۔ اس حالت میں اسے زدوکوب کرنا فیصل کی نہیں، اس کے فن کی بے عزتی ہوتی۔

''رک جاؤ شہزاد! کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے باآوازِ بلند کہا۔

شہزاد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، ہمیں چونک جانا پڑا۔ بنگلے کے بیرونی حصے میں درجن بھر افراد کے کودنے کی آوازیں ابھری تھیں۔ ہماری نگاہیں ابھی چار ہی تھیں کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ہماری سماعتوں پر دستک دینے لگیں۔ اس سے قبل کہ ہم کوئی جنبش کرتے، بنگلا بے دریغ فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھا۔ لگتا تھا، درجنوں گنوں کے دہانے بیک وقت کھول دیے گئے ہوں!

فیصل بھی اس صورتِ حال سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے بے ساختہ دروازے کی جانب دوڑ لگا دی لیکن میں اسے چھوڑنے والا کہاں تھا۔ وہ میرا ایک زوردار دھکا کھا کر منہ کے بل کمرے کے پختہ فرش پر گرا۔

میں نے ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ بند کیا اور فیصل کو گھسیٹتے ہوئے شہزاد سے کہا ''اخبارات کے بنڈل ہٹا کر چھپنے کی جگہ بناؤ۔ جلدی...... ہری اپ!''

ان لمحات میں بنگلے سے فرار ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ وہ پتا نہیں کون لوگ تھے اور کس مقصد سے وہاں چڑھ دوڑے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ سر سے کفن باندھ کر تقسیمِ اجل کرنے نکلے ہوں۔ بہرحال، وہ دوست نہیں ہو سکتے تھے۔ دوست اور خیر خواہ دستک دے کر آتے ہیں، گولیوں کی برسات کرتے ہوئے نہیں۔ حملہ آوروں کی گنیں مسلسل موت اگل رہی تھیں۔

جس کمرے میں ہم موجود تھے وہ بنگلے کے دور افتادہ حصے میں واقع تھا۔ لہٰذا موت کے ہرکاروں کو وہاں تک پہنچنے میں چند سیکنڈ لگے۔ ہم ابھی پوری طرح سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ دروازے پر ایک زوردار ٹھوکر پڑی۔

اس کمرے کا دروازہ بے چون و چرا کھلتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے، بے رحم اور سفاک موت بھرا مار کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی!

میں نے زندگی میں بارہا موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ یہ بھی ایسے ہی سنگین اور ہلاکت خیز لمحات تھے۔ شہزاد کی پھرتی کام آ گئی ورنہ درجنوں گولیاں ہمارے اجسام کو چھلنی بنا چکی ہوتیں۔ ان لوگوں کے کمرے میں داخلے سے قبل ہم اخبارات کے بنڈلز کے پیچھے پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ اس حادثاتی پناہ گاہ میں پہنچتے ہی شہزاد نے فیصل کو اپنے بازو کی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا اور میں ایک درز سے کھلے ہوئے دروازے کے فریم میں سجا وحشت ناک منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ تین افراد تھے۔ دو آگے اور ایک قدرے پیچھے۔ آگے والوں کے ہاتھوں میں کلاشن کوف نظر آ رہی تھیں جب کہ ان کا تیسرا ساتھی پستول بردار تھا۔ میں افراتفری کی کیفیت میں صرف دروازہ ہی بند کر پایا تھا، اگر اسے لاک بھی کر دیتا تو وہ لوگ اتنی آسانی سے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان تینوں نے چوکنا نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر ایک کلاشن کوف بردار نے کہا۔

''یہاں تو کوئی بھی نہیں!'' اس کے لہجے سے حیرت عیاں تھی۔

''انہیں یہیں ہونا چاہیے تھا۔'' پستول بردار شخص نے آگے بڑھ کر کہا ''یہ دیکھ رہے ہو تم دونوں۔'' اس نے کمرے کے فرش پر پڑی آہنی زنجیر، ہتھکڑی اور بیڑی کی جانب اشارہ کیا ''فیصل کو اسی کمرے میں قید رکھا گیا تھا لیکن ان چیزوں کی موجودگی ظاہر کر رہی ہے، اسے آزاد کر کے کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔''

''اگر وہ لوگ اسی بنگلے میں کہیں چھپ کر بیٹھے ہیں تو ہماری نگاہ سے بچ نہیں سکیں گے۔'' دوسرے کلاشنکوف والے نے کہا ''ہمارے ساتھی بنگلے کا کونا کونا چھان ماریں گے۔''

ہم تینوں دم سادھے حملہ آوروں کی باہمی گفتگو سن رہے تھے۔ میں نے اور شہزاد نے تو از خود سانس روک رکھی تھی جب کہ فیصل کے ساتھ نیک لاک کی مجبوری تھی۔ شہزاد نے اس کی گردن کو اپنے بازو میں اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ زبان کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اسی لمحے چار پانچ مزید افراد اس کمرے میں پہنچ گئے۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو اس بنگلے کے مختلف حصوں میں ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کلاشنکوف پر میری گرفت اور مضبوط ہو گئی اور میں دو بنڈلز کے درمیان والی درز سے آنکھ جمائے تازہ ترین سنگین صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس مشکل وقت میں وہ جھری کسی ٹیلی اسکوپ کا کام کر رہی تھی۔

پستول بردار شخص نے سوالیہ نگاہ سے آنے والوں کو دیکھا۔ وہ اپنی اداؤں سے ان کا سرغنہ دکھائی دیتا تھا ''ان کا کوئی سراغ ہاتھ لگا؟'' اس نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

اسے نفی میں جواب موصول ہوا ''ہم نے پورے بنگلے کی اچھی طرح تلاشی لے لی ہے باس! یہاں، ہمارے سوا اور کوئی انسان موجود نہیں۔''

''دو کمرے تو اخبارات کے بنڈلز سے بھرے ہوئے ہیں۔'' تلاش کنندگان میں سے ایک نے کہا ''جیسے یہ کمرا آدھا بھرا ہے۔''

''تم لوگ ایک مرتبہ پھر بنگلے کی تلاشی لو۔'' باس ٹائپ شخص نے گرج کر کہا ''مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ ابھی بنگلے سے نکلے نہیں ہیں۔ باہر کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ اگر وہ لوگ یہاں سے رخصت ہو چکے ہوتے تو گاڑیاں نظر نہ آتیں۔ ہمیں ہر حال میں فیصل کو حاصل کرنا ہے، چاہے اس کے لیے درجنوں افراد کو خون میں نہلانا پڑے۔ او کے...... کوئیک......!''

وہ باس نما شخص گاڑیوں کے حوالے سے بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس نے دو مرتبہ فیصل کا نام لیا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا، وہ کوئی بہت ہی اہم آدمی تھا۔ اسے فیصل کی یہاں موجودگی کی خبر تھی اسی لیے وہ اتنا پُراعتماد تھا۔ اس کا حکم سنتے ہی وہ لوگ تیزی سے کمرے سے خارج ہو گئے، صرف ایک کلاشنکوف بردار اس کے پاس رہ گیا۔ وہ دونوں کمرے کے فرش پر پڑی آہنی بندشوں کا جائزہ لینے لگے۔ ان کے انداز میں بڑی تشویش پائی جاتی تھی۔

میرے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ انہیں ہمارے خفیہ ٹھکانے کا پتا کیسے چلا۔ یہ کام تو کسی بھی طرح ہو چکا تھا اسی لیے وہ دندناتے ہوئے اس بنگلے میں گھسے تھے اور شکرے کے مانند ہمیں شکار کرنے کے لیے وہ مختلف کمروں میں چکرا رہے تھے۔

آہنی زنجیر، ہتھکڑی اور بیڑی کو باریک بینی سے دیکھنے کے بعد باس نے اپنے ساتھی سے کہا ''نادر! میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں، اغوا کنندگان نے مغوی فیصل کو اپنی مرضی سے آزاد کیا ہے۔ اور...... وہ لوگ اس بنگلے سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔'' اس کے لہجے میں بڑا وثوق پایا جاتا تھا ''تم یہ بنڈل ہٹاؤ!'' اس نے سنسناتی ہوئی نظر سے اخباری بنڈلز کو دیکھا۔

باس نما شخص کے آخری جملے نے میرے بدن کے سارے خون کو دماغ میں پہنچا دیا۔ وہ نادر نامی اپنے ماتحت کو نہایت ہی خطرناک حکم دے رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، وہ

اخبارات کو نہیں بلکہ براہِ راست ہمیں دیکھ رہا ہو۔ دراز قامت اس شخص کی آنکھوں میں بے پناہ سفاکی پائی جاتی تھی۔ اگر اخبار کے وہ بنڈلز وہاں سے ہٹائے جاتے تو ہماری روپوشی کا راز عیاں ہو جاتا۔ اس نازک موقع پر میں جیتی ہوئی بازی کو ہارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کن نظر سے شہزاد کی آنکھوں میں جھانکا' اس نے کسی یارِ غار کی طرح گردن کو اثباتی جنبش دی۔ وہ میرے عزائم کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔

نادر نامی کلاشنکوف بردار اپنے باس کا حکم پا کر بنڈلز کی جانب پیش قدمی کر چکا تھا۔ ان بنڈلز کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے دونوں ہاتھوں کا استعمال ضروری تھا لہٰذا اس نے کلاشن کو پٹے کی مدد سے کندھے پر لٹکا لیا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔

میرے اعصاب تن گئے۔ اگر وہ ہمارے سامنے سے ایک بنڈل بھی اٹھا لیتا تو ہم ان دونوں کے ٹارگٹ بن جاتے۔ میرے ذہن نے فیصلہ دیا' یہ کسی صورت نہیں ہوگا! نادر نے جیسے ہی بنڈل اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے' وہ بنڈل توپ سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند اس کے سینے پر لگا۔ میرے طوفانی ہینڈ پش نے بنڈل کو راکٹ بنا دیا تھا۔ نادر بنڈل سمیت چار فٹ پیچھے' فرش پر جا گرا۔ یہ ایک جناتی وار تھا جس نے نادر کو چاروں خانے چت کر دیا۔

میں نے بیلی کرتے ہوئے برق کی رفتار سے ہائی جمپ لگائی اور کلاشنکوف سونتے بنڈلز کے عقب سے نکل کر پختہ فرش پر پہنچ گیا۔ دراز قامت باس کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورتِ حالات تھی۔ اسے ہماری روپوشی کا یقین تو تھا لیکن یہ امید نہیں تھی کہ کوئی چھلاوے کے مانند نکل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔ فطری ردِعمل کے طور پر اس نے مجھ پر گولی چلا دی۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے لیفٹ ڈائیو کیا اور ہوا میں تیرتے ہوئے ایک کونے میں پہنچ گیا۔ میرے جسم پر ایک سیکیورٹی گارڈ کی یونیفارم تھی اور میں مکمل طور پر سہیل کے میک اپ میں تھا لہٰذا وجدان کی حیثیت سے مجھے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ پستول بردار باس نے مجھے صحیح سلامت دیکھ کر اپنی گن کو ایک مرتبہ پھر زحمت دی لیکن اب میں اس کی ایک دیکھنے والا نہیں تھا۔ ہمارے درمیان بہ مشکل تین فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ جیسے ہی اس کا پستول والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا' میں نے ایک لیفٹ کریسنٹ کک اس کے تھوبڑے پر جڑ دی۔

میری تیز رفتار کک ''شائیں'' کی آواز پیدا کرتے ہوئے چہرے پر مہلک بوسہ ثبت کرنے سے پہلے اس کے کندھے سے ٹکرائی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں دبے پستول نے گولی اگلی لیکن ٹھوکر کھانے کے بعد اس کا زاویہ بدل گیا اور میرا ایک بال بھی بانکا کیے بغیر مشرقی دیوار میں جا لگی۔ پھر میں نے باس نما شخص کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

وہ کریسنٹ کک کھا کر لڑکھڑاتے قدموں سے چند قدم پیچھے چلا گیا تھا۔ میں نے ایک طویل اسٹیپ لے کر اس کی پسلیوں میں سائیڈ کک ٹکا دی۔ وہ ایک دھماکے کی آواز کرتے ہوئے اخبارات کے بنڈلز سے ٹکرایا۔ اگر چہ اسے کوئی مہلک چوٹ نہیں لگی تھی تاہم وہ طیش کے عالم میں گالیاں بکنے لگا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک دو بنڈل اس کے اوپر آن گرے تھے۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں غیر معمولی سرگرمی محسوس ہوئی' میں ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔ اس دوران میں نادر اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا اور بڑے خطرناک انداز میں کلاشنکوف کے برسٹ میں مجھے نہلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا ارادہ تکمیلی مراحل سے نہ گزر سکا اور وہ کمرا اس کی کرب ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

شہزاد اخبارات کے بنڈلز کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا تھا۔ اس کی کلاشنکوف سے نکلنے والی گولیوں نے نادر کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کسی گردن کٹے جانور کی طرح فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے بڑی وحشت ناک کراہیں خارج ہو رہی تھیں۔ میں نے ایک لمحے میں اندازہ لگا لیا' شہزاد کی فائرنگ نے اسے زخموں سے چور کر دیا تھا۔ اس کے زخم شدید نوعیت کے تھے...... بہت ہی شدید!

شہزاد کی نموداری نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا تھا' وہ فیصل کو ''سنبھالے'' گا۔ مجھے اپنی جانب الجھن زدہ نظر سے دیکھتے پا کر اس نے جلدی سے کہا۔

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ وہ جہانِ بے خبری میں ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے اپنی گردن کو سہلایا۔ یہ ایک مخصوص اشارہ تھا۔

میں فوراً سے پیش تر سمجھ گیا' اس نے فیصل کے ساتھ کیا کیا ہوگا۔ یہ میرا پسندیدہ حربہ تھا جو میں اپنے دشمنوں کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے کے لیے آزماتا تھا۔ میری آنکھوں میں تائیدی تاثرات کی جھلک دیکھ کر شہزاد اچھل کر باہر آ گیا۔

اس اثنا میں باس سنبھل چکا تھا اور متوحش نگاہ سے نادر کے چھلنی وجود کو تک رہا تھا جس کی تڑپ اور پھڑک میں... بتدریج کمی آ رہی تھی۔ شاید وہ ٹھنڈا ہونے جا رہا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا۔

''تم بدمعاشوں کے اس باپ لم ڈھینگ کو سنبھالو۔ میں دوسروں کی خبر لے کر آتا ہوں۔'' لم ڈھینگ میں نے اسے دراز قامت کے حوالے سے کہا تھا۔

بات ختم کرتے ہی میں کلاشنکوف کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے اندازے کے مطابق پانچ چھ حملہ آور ابھی باقی تھے جو اپنے باس کے حکم پر ہمیں کھوجنے میں مصروف تھے۔ ان پر قابو پانا بہت ضروری تھا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لیے میں کسی قسم کی آنکھ مچولی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان خبیثوں سے نمٹنے کے بعد مجھے ساحل کی طرف جانا تھا۔ ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انسان کو بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور میں تو اس وقت بیچ سمندر میں کھڑا تھا!

میں جیسے ہی کمرے سے نکل کر راہ داری میں آیا' دو حملہ آوروں سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ اچانک ہی سامنے آ گئے تھے اور ان کے انداز سے گواہی ملتی تھی کہ ہمارے کمرے میں ہونے والی فائرنگ نے انہیں اس طرف متوجہ کیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھے۔ مجھے سیکیورٹی گارڈ سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنی گنوں کا رخ میری جانب پھیر لیا۔ ایک کے ہاتھ میں کے کے اور دوسرے کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ وہ مجھے مارنا نہیں بلکہ زخمی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے میرے قدموں میں فائرنگ کرنے کے لیے اپنے گنوں کے ٹریگرز دبا دیے۔ میں ان کی ابتدائی جنبشوں سے ان کا ارادہ بھانپ چکا تھا لہٰذا پلک جھپکتے میں' میں نے اپنے جسم کو ہوا میں اٹھایا اور فرنٹ سمر سالٹ کرتے ہوئے ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا۔ فائرنگ کی آواز گونجی مگر میں محفوظ رہا۔ ان کا نشانہ خطا گیا۔

فطری ردِعمل کے طور پر انہوں نے بیک وقت اوپر کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گنوں کا زاویہ بھی عمودی ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھ پاتے یا مجھے پر فائرنگ کرتے' ان پر قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ سمر سالٹ کی تکمیل پر میں ہوا میں رہتے ہوئے ان کے وسط میں پہنچ چکا تھا پھر زمین پر آنے سے پہلے ہی میں نے ڈبل سائیڈ فلائنگ کک چلا دی۔

میرے بوٹوں کی وزنی ٹھوکروں نے ان کی کھوپڑیوں پر دستک دی اور وہ دو مخالف سمتوں میں لڑھک گئے۔ گنیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گریں پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے' مجھے ایک اور مشکل سے دوچار ہونا پڑا۔ مزید تین افراد وہاں پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور اور دوسرے کے ہاتھ میں کلاشن تھی۔ تیسرا نہتا تھا۔

انہوں نے حیرت بھری نظروں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا پھر مجھ پر بے دریغ فائرنگ کرنے لگے۔ میں ان نازک لمحات میں انہیں آسانیاں فراہم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ان کے ٹریگرز دبنے سے پہلے ہی میں نے خود کو باؤنسنگ بال بنا لیا۔ فرنٹ سمر سالٹ' بیک سمر سالٹ' سائیڈ سمر سالٹ اور بیک فلپک کی آمیزش سے میں راہ داری میں اچھلتا پھر رہا تھا۔ ان کی گنیں گولیاں اگل رہی تھیں لیکن ان کا نشانہ دیواریں اور چھت بن رہے تھے۔ چند سیکنڈ میں ان کے ہتھیار خالی ہو گئے۔ اس بے سمت فائرنگ کے نتیجے میں ان کے دو ساتھی لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ دو افراد ہی تھے جو ان سے پہلے راہ داری میں داخل ہوئے تھے۔ مکمل شکست کی صورتِ حالات کو دیکھ کر وہ تینوں الٹے قدموں فرار ہونے لگے۔

میں نے کلاشنکوف کو سیدھا کیا اور ان کے دوڑتے ہوئے قدموں میں ایک شارٹ برسٹ مارا۔ تیز چیخوں کی آواز کے ساتھ ان میں سے دو منہ کے بل پختہ فرش پر گرے۔ تیسرا راہ داری سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی نہتا شخص تھا جو تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ میں شامل نہیں تھا۔ میں لپک کر آگے آیا اور فرش پر پڑے زخمیوں کا سرسری جائزہ لیا۔ ان کے پاؤں اور پنڈلیاں بری طرح گھائل تھے۔ وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کی خالی گنیں بھی خطرناک نہیں رہی تھیں۔ لہٰذا میں ان کے اوپر سے پھلانگ کر اس جانب دوڑ گیا جدھر ان کا نہتا ساتھی فرار ہوا تھا۔

وہ راہ داری تین مختلف کمروں کو آپس میں ملاتی تھی جن میں دو کمرے اخبارات کے بنڈلز والے تھے۔ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ ان دونوں کمروں میں کہیں دستیاب نہ ہوا۔ اس مفرور شخص کو بنگلے کے اندر گھیرنا ضروری تھا۔ اگر وہ یہاں سے نکل جاتا تو صورتِ حال ہمارے لیے زیادہ سنگین ہو جاتی۔ میرے اندازے کے مطابق حملہ آوروں میں وہ آخری آدمی تھا جو اس وقت ہمارے قابو میں نہیں تھا۔ باہر پہنچ کر وہ مزید کمک لا سکتا تھا جس کے نتیجے میں ہماری دشواریوں میں لامحدود اضافہ ہو جاتا۔

میں نے مفرور حملہ آور کو چاروں طرف دیکھ لیا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں اضطراری قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے مین گیٹ کی طرف آ گیا۔ وہ گیٹ نیم وا تھا۔ میں سمجھ گیا' جب میں اور شہزاد اس دور افتادہ کمرے میں فیصل کے ساتھ ''اٹکھیلیوں'' میں مصروف تھے' حملہ آوروں

میں سے کسی نے دیوار پھلانگ کر اس گیٹ کو کھولا تھا' پھر باقی مسلح افراد بھی اندر آ گئے تھے۔

اچانک بنگلے کے عقب میں مجھے کسی موٹر سائیکل کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک اٹھا اور برق رفتاری سے خود بہ خود میرے قدم گیٹ کی جانب اٹھ گئے۔ میں گیٹ کھول کر باہر نکل آیا اور بنگلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ موٹر سائیکل سوار میری فائرنگ رینج سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کا تعاقب کیے بغیر میں اسے پکڑ نہیں سکتا تھا اور ظاہر ہے' میں اس پوزیشن میں نہیں تھا۔ ویسے میں نے موٹر سائیکل پر فرار ہونے والے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی تلاش میں' میں بنگلے سے نکل کر گیٹ کی طرف آیا تھا۔ شکار ہاتھ سے نکل جانے کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔

میں تشویش ناک انداز میں بنگلے کے عقب کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مجھے دو گاڑیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان میں ایک ہیوی انجن والی موٹر سائیکل ''جی ٹی او'' تھی جب کہ دوسری ایک بڑی جیپ تھی۔ رینج روور نامی اس جیپ میں خاصے آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ نامعلوم حملہ آور انہی گاڑیوں میں سوار ہو کر ہمارے بنگلے کی طرف آئے تھے۔ نامعلوم کو معلوم بنانے کے لیے میں دوبارہ بنگلے کے اندر آ گیا۔ آتے ہوئے میں گیٹ کی کنڈی لگانا نہیں بھولا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد میں اسی راہ داری میں پہنچ گیا جہاں میں دو زخمیوں کو چھوڑ کر گیا تھا مگر اب مجھے وہاں ایک ہی نظر آیا۔ میری نگاہ راہ داری کے دوسرے سرے تک رینگ گئی۔ وہاں مجھے کچھ گڑبڑ نظر آئی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ دوسرا زخمی خود کو فرش پر گھسیٹتے ہوئے ادھر جا نکلا تھا اور اس کی یہ کوشش خالی از مقصد نہیں تھی۔ وہاں دو افراد مردہ حالت میں پڑے تھے جو انہی لوگوں کی بے دریغ فائرنگ کا نشانہ بنے تھے۔ مذکورہ زخمی مرنے والے ایک شخص کی گن تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا میں دوڑ کر اس کے سر پر جا پہنچا۔ اسے اس مکاری کی سزا ملنا چاہیے تھی۔

رینگتے ہوئے گھائل شخص نے کلاشنکوف پر ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ میں نے اس کی کلائی پر بوٹ کی زوردار ضرب رسید کی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ گن کا خیال دل سے نکال کر وہ فرش پر تڑپنے لگا۔ میرے بوٹ کی ضرب نے اس کی کلائی کا کچومر نکال دیا تھا۔

میں نے زہر خند لہجے میں کہا ''لگتا ہے' زندگی تمہیں راس نہیں آئی۔ تمہیں بھی تمہارے مرحوم ساتھیوں کے پاس ہی پہنچانا پڑے گا۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے چہرے کو نشانہ بنایا اور ایک دھواں دھار ٹھوکر رسید کر دی۔ یہ ضرب پہلے والی ضرب سے زیادہ خوفناک تھی۔

راہ داری اس کی وحشت ناک چیخوں سے گونج اٹھی۔

اسی لمحے شہزاد کمرے سے نکل آیا۔ کلاشنکوف ہنوز اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا ''اندر کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''تسلی بخش ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا ''میں نے اس کے لم ڈھینگ باس کو بھی لمبا لٹا دیا ہے لیکن لگتا ہے.....'' اس نے راہ داری کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی جانب نگاہ دوڑائی اور بولا ''تمہارے حصے میں زیادہ کام آیا ہے۔''

میں نے گمبھیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''یہ کام اور کارکردگی کو ناپنے کا وقت نہیں۔ ان نامعلوم نامرادوں کا ایک ساتھی بنگلے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہمیں فوراً نکلنا ہوگا۔'' ایک لمحے توقف دے کر میں نے پوچھا ''فیصل کا کیا حال ہے؟''

''وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے گہری تشویش سے کہا ''اس کی بے ہوشی کو طول نہیں کھنچنا چاہیے۔ اس کی ڈلیوری میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔''

''لگتا ہے' میں نے کچھ زیادہ ہی دباؤ ڈال دیا ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''یہ غلطی سنگین صورت بھی اختیار کر سکتی ہے!'' میں نے ہونٹ سکیڑے۔

''اب تو جو ہونا تھا' وہ ہو چکا!''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے عقب میں کھڑی گاڑیوں کے بارے میں بتایا پھر کہا ''تم فوراً باہر جا کر اس جیپ کی مکمل تلاشی لو۔ مجھے امید ہے' رینج روور میں سے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہاتھ آ جائے گا جس سے حملہ آوروں کی شناخت میں مدد مل سکے۔ یہ فیصل کو آزاد کرانے یہاں آئے تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے' یا تو یہ چوہدری نوازش علی کے آدمی ہیں یا پھر شعیب غوری کے۔ کسی تیسری سمت ذہن دوڑانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

میں نے سب سے پہلے فیصل کا جائزہ لیا۔ وہ اخبارات کے بنڈل کے عقب میں بے سدھ پڑا تھا۔ شہزاد نے صورتِ حال کا تقاضا نبھایا تھا لیکن فیصل کی یہ بے ہوشی اگر طویل ہو جاتی تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ فیصل کے علاوہ اس کمرے میں دو افراد اور موجود تھے جن میں سے نادر زندگی

ہار گیا تھا جب کہ ان سب کا باس وہ دراز قامت شخص عالمِ غفلت میں پڑا تھا۔ راہ داری کی صورتِ حالات مکمل طور پر ہمارے حق میں تھی۔ وہاں دو افراد کی لاشیں اور دو زندہ شدید زخمی پڑے تھے۔ اس لمحاتی معرکے میں دشمن کے تین افراد کام آئے تھے۔ اور ایک فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شہزاد واپس آگیا۔ اس نے آ کر مجھے بتایا کہ رینج روور میں سے کام کی کوئی شے نہیں ملی تھی۔ گاڑی کے کاغذات وہ اٹھالایا تھا۔ رینج روور کسی یوسف ہمدانی کے نام رجسٹرڈ تھی۔ پتا ناظم آباد کا تھا۔ میں نے ان کاغذات پر سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد شہزاد سے کہا۔

''تم ان دونوں زخمیوں کو پابند بنانے کے لیے آہنی زنجیر' ہتھکڑی اور بیڑی کو استعمال میں لاؤ۔ اس کے بعد فیصل اور ''باس'' پر گہری نظر رکھو۔ میں منہاس صاحب کو فون کرنے جارہا ہوں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے مزید کہا ''باس سمیت ان شیطان زادوں کی جامہ تلاشی بھی لے لینا۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر سر کو اثباتی جنبش دی اور میری خواہش کی تکمیل کے لیے چل پڑا۔

پھر میں ٹیلی فون والے کمرے میں آگیا۔ منہاس باقر نے مجھے بتایا تھا' وہ حیدرآباد جانے کے لیے ساڑھے چھ سے پہلے نہیں نکلیں گے۔ اس وقت شام کے پانچ چالیس ہورہے تھے اس کا مطلب یہی تھا' وہ ابھی گھر پر ہی ہوگا۔ کوئی بھی ہنگامی قدم اٹھانے سے پہلے اسے مطلع کرنا ضروری تھا۔

فون منہاس باقر ہی نے ریسیو کیا۔ میرے ''ہیلو'' میں پائی جانے والی گمبھیرتا نے اسے پوچھنے پر مجبور کردیا ''خیریت تو ہے وجدان؟''

''سمجھیں خیریت نہیں ہے!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ یک دم بے حد مستعد ہوگیا۔

میں نے نہایت ہی مناسب الفاظ میں اسے پیش آمدہ صورتِ حال سے آگاہ کیا اور تشویش بھرے لہجے میں کہا ''ہمیں فوری طور پر اس بنگلے کو خیرباد کہنا ہوگا!''

''یہ تو ہے!'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا ''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا ''آپ بتائیں۔ میں طارق روڈ والے فلیٹ پر نہیں جاسکتا۔ وہ نثار شہید پارک سے خاصے فاصلے پر ہے اور فیصل کی ڈلیوری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہیں آس پاس ہی کہیں موجود رہیں۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''میرا بنگلا مذکورہ پارک سے زیادہ دور نہیں لیکن ان حالات میں ادھر کا رخ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ تمہیں کسی غیر معروف یا نئی جگہ پر پناہ لینا ہوگی۔''

''میں فیصل کے ساتھ حملہ آوروں کے ممکنہ باس کو بھی اس بنگلے سے نکال لے جانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا ''ہوش میں آنے کے بعد وہ شخص مفید معلومات اگل سکتا ہے۔''

''تمہارا آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اگر میری مانو تو اس ''باس'' پر لعنت بھیجو۔'' منہاس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''ہم جانتے ہیں' وہ لوگ یا تو چوہدری نوازش سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر یہود نواز تنظیم سی ایف کے کے بھیجے ہوئے ہیں اس لیے باس پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تم لوگ فیصل کو لے کر فوراً وہاں سے نکل جاؤ۔''

''لیکن جائیں کہاں؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔

''تم شہزاد کو فون پر بلاؤ۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''کوئی حل نکالتا ہوں میں اس مسئلے کا بھی' کچھ تو کرنا پڑے گا نا!''

میں نے کہا ''حملہ آوروں کا مسئلہ حل طلب ہے۔ آپ کے اس بنگلے میں تین لاشیں اور دو شدید زخمی پڑے ہیں بے ہوش باس ان کے علاوہ ہے۔ اگر ہم ان لوگوں کو یونہی چھوڑ کر چلے گئے تو بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوجائیں گی۔''

''ان کا بھی کچھ کرتے ہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''شہزاد سے میری بات کرادو۔''

میں نے منہاس کو ہولڈ آن کرنے کو کہا اور شہزاد کو بلانے چلا گیا۔ اس دوران میں وہ دونوں زخمیوں کو آہنی بندشوں کے ذریعے بے دست و پا کرچکا تھا۔ وہ پہلے ہی بری طرح زخمی تھے۔ ان سے مزید کسی شیطانی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ شہزاد کو فون کی طرف بھیجنے کے بعد میں اپنے اصل شکار کی طرف بڑھ گیا...... چوہدری نوازش علی کے فرزندِ ارجمند کی طرف!

فیصل ہنوز بے ہوش تھا۔ میں نے اسے مختلف زاویوں سے ٹٹول کر اس بات کا اندازہ لگالیا کہ وہ آئندہ ایک گھنٹے میں کسی بھی وقت عالمِ ہوش و حواس میں داخل ہوجائے گا۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ سات بجے تک اسے نارمل ہوجانا چاہئے تھا۔

فیصل کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے مبینہ باس کا جائزہ لیا۔ اس کی بے ہوشی اور زخم بڑے ''تسلی بخش'' تھے۔ شہزاد نے اپنا سارا غم و غصہ اسی دراز قامت پر خارج کیا

تھا۔ آئندہ پانچ چھ گھنٹوں تک اس کی ''بیداری'' کا امکان نہیں تھا۔

میں ہر طرف سے اطمینان پانے کے بعد ٹیلی فون والے کمرے میں آگیا۔ اس دوران میں شہزاد' منہاس سے ضروری ہدایات حاصل کرچکا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے ریسیور میری طرف بڑھادیا۔ مطلب یہی تھا' اب میں بات کروں۔ میں نے ریسیور کان سے لگالیا۔

''ہاں وجدان!'' منہاس کی بھاری بھرکم آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''تمہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے فوری نوعیت کے مسائل کا حل نکال لیا ہے۔ شہزاد تم سے تفصیلی بات کرے گا۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اور جب تم اپنی ساحل کو حاصل کرلو تو مطمئن ہونے کے بعد میرے بنگلے پر ہی آنا' جیسا کہ پہلے ہم طے کرچکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب رات گئے ہم لوگ حیدرآباد سے واپس لوٹیں گے تو تم اپنی ساحل کے ساتھ ہمارا استقبال کروگے۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے!'' بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

''وِش یو گڈ لک!'' اس نے خلوصِ دل سے کہا۔

ٹیلی فونک رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے شہزاد کو دیکھا ''ہاں بھئی! منہاس صاحب نے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں؟'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بولا ''ہمیں فوری طور پر اس بنگلے سے نکلنا ہے۔ ہم فیصل کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ باقی سب کو یہیں چھوڑ دیں گے۔''

''لیکن جائیں گے کہاں؟''

''تفصیل میں تمہیں یہاں سے نکلنے کے بعد بتاؤں گا۔'' وہ افراتفری کی کیفیت میں بولا ''ہم بند وین میں جائیں گے۔ ہونڈا سوک اسی بنگلے پر کھڑی رہے گی۔'' ذرا رک کر اس نے اضافہ کیا ''میں فیصل کو لا رہا ہوں وجدان! تم وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالو۔ چابیاں وہ رکھی ہیں۔'' اس نے میز کی جانب اشارہ کیا۔

اگر ہم بڑے ایزی حالات سے گزر رہے ہوتے تو میں پوری بات سنے اور اپنی تسلی کیے بغیر وہاں سے قدم نہ نکالتا۔ ایک تو شہزاد میرے بھروسے کا آدمی تھا' دوسرے وہاں رکنا انتہائی خطرناک تھا اس لیے میں چابیاں اٹھا کر وین کی طرف بڑھ گیا۔ ویسے اس بات کا مجھے اطمینان تھا' منہاس باقر نے شہزاد کو جو بھی اسکیم بتائی ہوگی، وہ میرے فائدے کے لیے ہی ہوگی۔ اب تک منہاس نے ایک مخلص اور پُرخلوص بزرگ کا رول ادا کیا تھا۔

میں ایک مرتبہ پھر اسی وین میں آبیٹھا جس میں فیصل کو اس بنگلے تک پہنچایا گیا تھا۔ وہ وین ایک چھوٹے ٹرک سے مشابہ تھی جو بار برداری کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ نیلے رنگ کی اس وین کے سامنے والے حصے پر سرخ رنگ سے بڑا بڑا ''پریس'' لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اس وین کے عقبی بند حصے پر فیصل والے صندوق کو ٹاور سے یہاں تک پہنچایا تھا۔ میں سیکیورٹی گارڈ سہیل کی یونیفارم اور حلیے میں تھا۔ شہزاد کی بہ نسبت میرا ڈرائیونگ کرنا زیادہ محفوظ ہوتا۔ شاید اسی خیال کے پیشِ نظر شہزاد نے مجھے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا مشورہ دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شہزاد' فیصل کو لے کر بنگلے کے بیرونی حصے میں آگیا۔ فیصل کو اس نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ میں اس کی مدد کے لیے وین سے باہر آگیا۔ اسی وقت میں نے دیکھا شہزاد نے فیصل کی کلائیوں کو دوبارہ الٹی ہتھکڑی میں جکڑ دیا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر مغوی چوہدری زادے کو وین کے بند حصے میں منتقل کیا اور دروازے کو بند کرکے لاک کردیا۔ چند لمحات کے بعد ہماری وین بنگلے سے نکل کر مصروف سڑک پر آگئی۔

شہزاد نے بنگلا چھوڑتے وقت مین گیٹ کو پوری طرح کھول دیا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے شہزاد سے پوچھا۔

''کس طرف جانا ہے؟''

''سیدھا منہاس صاحب کے دفتر!''

''تفصیل کیا ہے؟'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں استفسار کیا۔

وہ بتانے لگا ''نثار پارک کے نزدیک ہی ایک نئی اپارٹمنٹس بلڈنگ تیار ہوئی ہے۔ اس بلڈنگ میں ''ڈی ایچ اے'' کے ملازمین کو مفت رہائش دی جارہی ہے۔ ہمارے اخبار میں ایک صاحب فوٹو گرافر ہیں۔ ان کی اہلیہ کسی کالج میں لیکچرر ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک فلیٹ انہیں بھی الاٹ ہوا ہے۔ ان لوگوں نے ابھی وہاں شفٹ نہیں کیا۔ ویسے بھی بلڈنگ میں ابھی تک آٹھ دس فلیٹ ہی آباد ہوئے ہیں۔ مذکورہ فوٹو گرافر کا نام طارق وسیم ہے۔ جو ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کو گیا ہوا ہے۔ منہاس صاحب

نے مجھے بتایا ہے' ان کے فلیٹ کی چابیاں اُدھر دفتر میں رکھی ہیں۔ ہم وہاں اسی مقصد سے جارہے ہیں۔ یہ اپارٹمنٹس بلڈنگ ایک طرح سے ابھی غیر آباد ہی ہے۔ لہٰذا ہماری طرف کسی کا دھیان نہیں جائے گا۔ ویسے بھی ہمیں بہ مشکل ایک گھنٹے کے لیے کسی محفوظ پناہ گاہ کی تلاش ہے۔ اس فلیٹ سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

میں نے پوچھا'' اور اس بنگلے کا کیا ہوگا جسے ہم جوں کا توں چھوڑ آئے ہیں؟''

''منہاس صاحب بہت دور اندیش اور سمجھدار آدمی ہیں۔'' شہزاد نے سنجیدگی سے کہا'' انہوں نے بنگلے کا مسئلہ بڑے منطقی انداز میں حل کردیا ہے۔''

''وہ منطقی حل مجھے بھی تو بتاؤ۔'' میری آواز میں تشویش تھی۔

اس نے بتایا'' انہوں نے کہا ہے' وہ ہمارے بنگلے سے نکلنے کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد متعلقہ تھانے میں فون کر کے اطلاع دیں گے کہ ان کے نامکمل بند بنگلے میں چند شرپسند دہشت گرد گھس آئے ہیں اور پتا نہیں وہ لوگ وہاں کیا کررہے ہیں لہٰذا پولیس کو چاہیے کہ وہ موقع پر پہنچ کر تفتیش کرے اور جرائم پیشہ افراد کو حراست میں لے کر ان کے ساتھ قرار واقعی انصاف کرے۔''

شہزاد سانس لینے کے لیے چند ساعت کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا'' پولیس والوں کے لیے منہاس صاحب کوئی اجنبی نہیں ہیں اس لیے فوری کارروائی کی توقع کی جاتی ہے۔ منہاس صاحب نے اپنے جنرل منیجر بختیار کامل کو خصوصی ہدایات دی ہیں کہ ان کی غیر موجودگی میں وہ پولیس والوں سے نمٹیں۔ پولیس والوں کو بھی بختیار صاحب کے بارے میں بتا دیا جائے گا۔ میں نے بنگلے سے باہر آتے وقت دونوں زخمیوں کو بندشوں سے آزاد کردیا ہے۔ ان لوگوں کا باس مطلق بے ہوش پڑا ہے۔ مردے تو کچھ بول نہیں سکتے البتہ پولیس زخمیوں کی زبان کھلوانے کے لیے اپنا پورا زور مارے گی اور تم جانتے ہو' وہ یہ تو نہیں کہیں گے کہ انہوں نے کسی فیصل کی تلاش میں اس بنگلے پر چڑھائی کی تھی۔ منہاس صاحب نے پولیس کو بتانا ہے کہ وہ بنگلا بند تھا۔ اس صورتِ حال میں حملہ آوروں کو کوئی جواب نہیں بن پائے گا۔ وہاں کا نقشہ دیکھ کر پولیس پر واضح ہوجائے گا کہ دو مخالف پارٹیوں میں کوئی زبردست معرکہ ہوا ہے۔ پھر بنگلے کے عقب میں حملہ آوروں کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ رینج روور اور'' جی ٹی او'' ون ٹو فائیو ان لوگوں کے لیے بہت مشکلات پیدا کردیں گی۔

اوپر سے منہاس صاحب اپنے تعلقات کا بھی استعمال کریں گے۔ بختیار صاحب بڑے تیز آدمی ہیں۔ نامعلوم حملہ آوروں کو مصیبت پڑ جائے گی۔''

''اور یہ بھی ممکن ہے' پولیس کی آمد سے پہلے ان میں سے کوئی بنگلے سے نکلنے کی کوشش کرے۔'' میں نے بند وین کو کھلی سڑک پر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''ایسی صورت میں وہ لوگ اور زیادہ مشکل میں پھنس جائیں گے۔'' شہزاد نے خیال آرائی کی'' اس نوعیت کی کوشش ان دو زخمیوں میں سے کوئی کرسکتا ہے۔ وہ بالفرض بنگلے سے باہر آ بھی جاتے ہیں تو موٹر سائیکل یا جیپ ڈرائیو کرنا ان کے بس کا کھیل نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایسی کسی سعی کے دوران ہی میں پولیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا'' اور اگر وہ مفرور کسی قسم کی بیرونی مدد لے کر واپس لوٹتا ہے تو یہ سونے پر سہاگے والی بات ہوگی۔ پولیس کو ان لوگوں کے خلاف ایک مضبوط کیس بنانے میں آسانی ہوجائے گی۔ پولیس ان بدمعاشوں کے مقابلے میں منہاس صاحب کی بات کو زیادہ معتبر جانے گی کیوں کہ واردات ان کے بند بنگلے میں ہوئی ہے۔ وہ لوگ کسی فیصل یا وجدان کا تذکرہ اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔ ایسی صورت میں نہ صرف پولیس بلکہ ان کے بڑے بھی ان کے دشمن ہوجائیں گے۔ لہٰذا ہم ہر حوالے سے سیف سائیڈ پر ہیں۔''

شہزاد کی باتوں میں بہت وزن تھا اور منہاس صاحب نے بھی ایک بھرپور حکمتِ عملی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن میرا دل جانے کیوں مطمئن نہیں تھا۔ میں کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے تیزی سے سوچنے لگا۔ ساحل اور فیصل والا معاملہ اتنا نازک ہوچکا تھا کہ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میرے اور چوہدری نوازش کے حساس گوشوں کے تبادلے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا' اس قلیل مدت کے لیے میں کسی اور پناہ گاہ میں جا بیٹھوں!

مجھے سوچ میں ڈوبا اور خاموش دیکھ کر شہزاد نے پوچھا'' وجدان! تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' شہزاد! میں منہاس صاحب کے منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' چھ کب کے بج چکے' سات بجنے میں زیادہ وقت نہیں۔ میں کسی فلیٹ میں چھپ کر بیٹھنے سے بہتر سمجھتا ہوں' گھوم پھر کر یہ وقت گزار لیا

جائے۔ ویسے بھی ہمیں طے شدہ وقت سے تھوڑا پہلے ہی پارک کے اندر ہونا چاہیے لہٰذا طارق وسیم کے فلیٹ کو تم بھول جاؤ لیکن ہم منہاس صاحب کے دفتر ضرور جائیں گے۔''

''جب اس فلیٹ کو استعمال نہیں کرنا تو پھر وہاں جانے کی بھی کیا ضرورت ہے؟'' اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔ ''دفتر تو ہم فلیٹ کی چابی لینے ہی جارہے تھے!''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا'' اب ہم وہاں گاڑی بدلنے جائیں گے۔''

''گاڑی بدلنے! میں سمجھا نہیں؟''

میں نے کہا'' یہ مت بھولو کہ حملہ آوروں میں سے ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ وہ اس بات کا چشم دید گواہ ہے کہ ہمارے بنگلے پر ایک لائٹ گرین ہونڈا اسوک اور ایک یہ نیلی وین کھڑی تھی۔ اس نے واپس اپنے کیمپ میں پہنچ کر ان گاڑیوں کے بارے میں ضرور بتایا ہوگا لہٰذا وین میں سفر ہمارے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے!''

''اوہ! اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔'' شہزاد نے تشویش بھرے لہجے میں کہا'' ہمیں پہلی فرصت میں اس نیلی وین سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔''

''اور اس سے پہلے فیصل کو ہوش میں لانا ضروری ہے۔'' میں نے مربیانہ لہجے میں کہا'' اسے حواس میں آجانا چاہیے تاکہ تبادلے کے وقت وہ نارمل نظر آئے۔ ہم منہاس صاحب کے دفتر سے گاڑی تبدیل کریں گے اور واپس مذکورہ پارک کی طرف چل پڑیں گے۔ کیا فوری طور پر ہمیں وہاں سے کوئی گاڑی مل جائے گی؟''

''یقیناً مل جائے گی۔'' وہ پُروثوق لہجے میں بولا'' اور کوئی نہ بھی دست یاب ہوئی تو دفتر کی ہائی روف ضرور موجود ہوگی۔ ہم اس گاڑی میں پہلے بھی ایک مشن سر کرچکے ہیں۔''

''تم گرین ہائی روف کی بات کررہے ہو!''

''بالکل وہی۔'' اس نے میرے خیال کی تائید کی۔

میں نے کہا'' ٹھیک ہے' وہ ایک مبارک اور خوش بخت گاڑی ہے' ہم نے اسے استعمال کرتے ہوئے گلستان جوہر والی کامیابی حاصل کی تھی۔'' پھر میں نے وین کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا'' میں وہاں میڈیکل اسٹور کے سامنے گاڑی روک رہا ہوں۔ تم منرل واٹر کی دو بوتلیں لے آؤ۔ اور وین کے عقبی حصے میں پہنچ کر فیصل کو بیدار کرنے کی کوشش کرو۔ اس کی ہتھ کڑی کھولنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ دفتر پہنچنے سے پہلے اسے باقاعدہ ہوش و حواس میں آجانا چاہیے۔ میں بہ دستور ڈرائیونگ جاری رکھوں گا۔''

پھر میں نے سڑک کے کنارے ایک محفوظ مقام پر وین روک دی۔ شہزاد نے میری ہدایت پر عمل کیا اور میڈیکل اسٹور سے منرل واٹر کی دو بوتلیں خرید لایا۔ میں نے وین کو اس زاویے سے روکا تھا کہ شہزاد کے عقبی حصے میں سوار ہونے کی طرف کسی کی نگاہ نہ جاتی۔ جب شہزاد نے وین کے اندر پہنچنے کے بعد عقبی دروازہ بند کردیا تو میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں ہم نے گاڑیوں کی تبدیلی والا مرحلہ طے کرلیا۔

☆☆☆

ثار شہید پارک ایک پُرفضا تفریحی مقام ہے۔ شام کے وقت وہاں خوش حال اور صحت افزا چہروں کی بہتات دیکھنے میں آتی ہے۔ ذوقین افراد حسین اور دل کش صورتوں کے نظارے سے تسکین پاتے ہیں۔ متلاشی طبع لوگوں کے لیے وہاں بہت کچھ ہے۔ اسی پارک کے ایک کونے میں بچوں کی تفریح طبع کے لیے ایک صاف ستھرا'' سندباد'' بھی موجود ہے جہاں کا سیکیورٹی نظام تسلی بخش ہے۔ پارک میں داخلے کے وقت بھی گارڈز باقاعدہ تلاشی لیتے ہیں۔

اس وقت شام کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ گرین ہائی روف تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ شہزاد ڈرائیونگ کررہا تھا۔ فیصل ہم دونوں کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔ اس کی کلائیاں ہتھ کڑی کی گرفت سے آزاد نہیں کی گئی تھیں۔ یہ نیک کام اس وقت سرانجام دیا جاتا جب گاڑی سے نکال کر اسے پارک میں لے جایا جاتا۔ ہتھ کڑی کی چابی میری جیب میں محفوظ تھی۔ جب سے میں نے اسے بتایا تھا' ہم اسے چوہدری نوازش کے بندوں کے سپرد کرنے جارہے ہیں' وہ خاصا شانت ہوگیا تھا۔ ویسے بھی ہم نے اس کے ساتھ کوئی مس بی ہیو نہیں کیا تھا اس لیے وہ ہماری بات پر یقین کرنے کے لیے مجبور تھا۔ البتہ ساحل کے حوالے سے میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اس خیال سے مطمئن تھا کہ ہم اس کی جان چھوڑنے والے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم اس کی طرف سے بے احتیاط نہیں تھے۔ وہ کسی وقت بھی گل کھلا سکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا پروجیکٹ تھا جسے میں کسی بھیڑ بھاڑ کے بغیر نہایت ہی خاموشی سے پایۂ تکمیل کو پہنچانے نکلا تھا۔ زیادہ پھیلاؤ سے یہ معاملہ بگڑ جاتا!

منہاس باقر کے دفتر سے روانہ ہونے سے قبل میں نے شہزاد کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل طے کرلیا تھا۔ اسے پارک سے باہر گاڑی میں موجود رہنا تھا۔ جب کہ میں فیصل کو اپنے ساتھ پارک کے اندر لے جاتا۔ اس پارک میں داخلے کے

لیے کئی گیٹ ہیں۔ ہم نے ایک ایسے گیٹ کا انتخاب کیا' جدھر نہ ہونے کے برابر رش ہوتا۔ زیادہ ہجوم "سندباد" والے حصے میں ہوتا ہے۔ ویسے کسی بھی گیٹ سے داخل ہوں' چونکہ کچھوے کا کنگ سائز سر تقریباً پارک کے وسط میں واقع ہے' اس لیے فاصلہ کم وبیش ایک جتنا ہے۔ میں ایک سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں تھا اس لیے سہیل کے حلیے میں میری شناخت کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

شہزاد پارک کے باہر میرا انتظار کرتا۔ اگر مغوی افراد کا تبادلہ بہ سہولت ہوجاتا تو میں آدھا گھنٹا پارک میں گزارنے کے بعد شہزاد کے پاس آجاتا پھر ہم ساحل کے ساتھ منہاس صاحب کے بنگلے کی جانب روانہ ہوجاتے۔ کسی اپ سیٹ کی صورت میں شہزاد کو فوراً پارک کے اندر پہنچنا تھا۔ لیکن مجھے امید تھی کہ پارک کے اندر کسی ہنگامی صورتِ حال کا امکان پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ وہاں کا سیکیورٹی نظام قابلِ تحسین تھا۔

اسلحے کے نام پر ہمارے پاس دو کلاشن تھیں جو گرین ہائی روف ہی میں چھوڑنا تھیں یہ واپسی کے سفر میں کسی ایمرجنسی کی صورت میں ہمارے کام آتیں۔ پارک کے اندر اسلحہ لے جانے کی ممانعت تھی۔ ہم نے سہ پہر میں دو سادہ لباس سیکیورٹی گارڈز کو پارک روانہ کردیا تھا جن میں سے عباس کے پاس ریوالور اور زمرد خان کے پاس ٹی ٹی پستول تھا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد شہزاد کے پاس بنات خان کا فون آگیا کہ وہ اسلحہ اندر نہیں لے جانے دیں گے۔ یہ دونوں ہتھیار لائسنس یافتہ تھے جو سیکیورٹی گارڈ بنات خان نے اپنے پاس جمع کرلیے تھے تاہم پارک کے اندر اس نے ہر نوعیت کے حفاظتی تعاون کا یقین دلایا تھا اور ہماری ضرورت کے مطابق اس نے پارک کے متعلقہ حساس حصے کو اپنی نگاہ کا مرکز بنالیا تھا۔ گویا پارک کے اندر ہمیں افرادی قوت پر ہی بھروسا کرنا تھا' یقیناً یہی صورتِ حال دوسری پارٹی کے لیے بھی ہوگی!

چھ پینتالیس پر میں نے پارک سے تھوڑے فاصلے پر گاڑی رکوائی۔ شہزاد نے گاڑی روکنے کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میرا یہ اقدام اس کے لیے خلافِ توقع تھا۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا" وہ سامنے پبلک کال آفس ہے' میں وہاں سے وجدان کو فون کروں گا۔ چوہدری نوازش کو اطلاع تو دے دیں کہ ہم اس کے لختِ جگر کو لے کر آگئے ہیں۔ وجدان نے مجھے ہدایت کی تھی کہ مطلوبہ مقام پر پہنچنے سے پہلے میں اسے فون کردوں۔ میری کال کے بعد وجدان موضع رکھاں والی میں چوہدری نوازش سے رابطہ کرے گا۔"

میں چونکہ سہیل کے روپ میں تھا اس لیے فیصل کے سامنے وجدان کی حیثیت سے بات نہیں کرسکتا تھا تاہم شہزاد اپنی زود فہمی کے بل پر میری بات کی تہ تک ـــ پہنچ گیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ذرا جلدی آجانا سہیل ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"ابھی پانچ منٹ میں آیا۔" میں یہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا۔

فیصل نے نفرت آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی اس نگاہ کے دو اسباب تھے۔ نمبر ایک شہزاد نے گاڑی کے اندر رہتے ہوئے فیصل کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی کہ اسے الٹی ہتھ کڑی لگی ہوئی تھی۔ نمبر دو وہ میرے حوالے سے بہت خار کھائے بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ایک کھیل کھیل کر اس سے ان کے ایک اہم آدمی کا نام پتا اور ٹیلی فون نمبر اگلوالیا تھا۔ اپنی رہائی کے جھانسے میں آکر اس نے مجھے کسی جے۔ ڈی ملک کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کردیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھے کچا کھا جاتا۔ ہم نے پچھلے کچھ عرصے سے اسے بے بس بنا رکھا تھا۔ اس کی رہائی میں اب چند منٹ باقی رہ گئے تھے' یہ تکلیف دہ اسیری اسے جھنجلاہٹ میں ڈال رہی تھی۔

میں نے پی سی او میں آنے کے بعد رکھاں والی کے چوہدری نوازش علی کو فون کھڑکا دیا۔ چوہدری کے لیے میرے دل میں بہت غصہ تھا۔ تھوڑی دیر پہلے منہاس باقر کے نامکمل بنگلے پر جو واقعات پیش آئے تھے، میں اس کا ذمے دار بالواسطہ یا بلاواسطہ چوہدری ہی کو سمجھتا تھا اس لئے اس کی گوشمالی ضروری تھی۔

چوہدری جب آن لائن ہوا تو میں نے نان اسٹاپ اسے کھری کھری سنائیں پھر اس کے تازہ ترین "کرتوت" کا ذکر کیا اور کہا" چوہدری! تمہیں احساس نہیں تم سے کتنی سنگین غلطی سرزد ہوئی ہے!"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی......" اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"غلط فہمی کے بچے!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا" میں نے تمہاری منافقانہ بکواس سننے کے لیے فون نہیں کیا۔"

وہ پھنکارا لیکن اس پھنکار میں وہ تیزی اور تندی ناپید تھی جو ہمیشہ سے اس کا خاصہ رہی تھی۔ چڑھی ہوئی سانس کے درمیان اس نے کہا" میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں مجھے اس واقعے کا علم نہیں۔"

"پھر تم اپنے اس ناجائز اڈے سے پوچھو" میرا اشارہ شعیب غوری کی طرف تھا" اگر اس واقعے کے پیچھے تمہارا ہاتھ نہیں تو پھر وہ لوگ سی ایف کے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ ان کے سرغنہ نے دو تین بار فیصل کا ذکر کیا تھا۔ فیصل کا طلب گار تم دونوں کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟"

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا" میں ابھی شعیب کو فون کرتا ہوں۔"

"یہ تمہارا مسئلہ ہے!" میں نے بے رخی سے کہا۔

اس نے پوچھا" میں فیصل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں؟"

"فیصل گزشتہ آدھے گھنٹے سے پارک کے اندر موجود ہے۔" میں نے اسے چکر دیا" لیکن ٹھیک سات بجے اسے طے شدہ مقام پر لایا جائے گا۔ تمہیں شعیب غوری یا جے۔ ڈی ملک سے اطلاع مل جائے گی۔"

"جے ڈی ملک!" اس نے اس انداز میں دہرایا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو" تم اس شخص کو کیسے جانتے ہو؟"

چوہدری کے اضطراب سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ مذکورہ شخص اس کے لیے بہت اہم تھا۔ میں توقع بھی یہی کررہا تھا۔ میں نے اسے اندھیرے اور تشویش میں رکھنے کی خاطر کہا۔

"چوہدری! میں حرام زادوں کی ایک طویل فہرست ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ تم میری معلومات کو چیلنج کرنے کے چکر میں نہ پڑو۔"

اسے جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پانچ سیکنڈ کے وقفے کے بعد وہ کمزور سی آواز میں مستفسر ہوا" پھر...... بھی......!"

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہیں فیصل کے پارک میں پہنچنے کی خوش خبری سنا چکا ہوں۔ تم میری ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے؟"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ٹیلی فونک سلسلہ منقطع ہوگیا۔ یہ سلسلہ میں نے ختم نہیں کیا تھا۔ میں کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے تو چوہدری سے ایک ایسا سوال کیا تھا، جس کا جواب سنے بغیر میں فون بند کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یقیناً چوہدری ہی نے ریسیور کریڈل کردیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک خلافِ توقع اور آؤٹ روٹ بات تھی۔

میں نے چشم زدن میں دوبارہ اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن انگیج ٹون سے واسطہ پڑا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب ریسیور ہٹا کر رکھ دیا گیا تھا...... یا پھر اس کے فون میں کوئی فالٹ پیدا ہوگیا تھا۔ بہرحال یہ ایک پریشان کن صورتِ حال تھی۔

میری جھنجلاہٹ کو دیکھتے ہوئے پی سی او والا میری طرف متوجہ ہوگیا اور شائستگی سے بولا" سر! کیا مسئلہ ہے؟"

"لائن کٹ گئی ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا" بات پوری نہیں ہوسکی۔"

"کوئی بات نہیں سر! آپ دوبارہ ٹرائی کرلیں۔"

وہ میری سیکنڈ ٹرائی سے واقف نہیں تھا شاید اسی لیے یہ مشورہ دے رہا تھا۔ میں نے اکتاہٹ آمیز انداز میں رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ سات بجنے میں صرف آٹھ منٹ باقی تھے۔ اب مزید کسی ٹرائی کے لیے گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ ٹھیک سات بجے مجھے پارک کے اندر مقررہ مقام پر ہونا چاہیے تھا۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے بٹوے سے کال کی ادائی کی اور پی سی او والے کے مفید مشورے کے جواب میں صرف اتنا کہا" اٹس او کے!"

پی سی او سے نکل کر گاڑی کی طرف آتے ہوئے میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ چوہدری کے حالیہ رویے نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ جو بھی گڑبڑ ہوئی تھی، اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ وہ میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا لیکن کیوں؟

یہ سوال کسی ناگ کی طرح پھن پھیلائے میری سوچ کے مختلف زاویوں کو ڈس رہا تھا اور بار بار ایک ہی جواب ابھر کر سامنے آرہا تھا اور وہ یہ کہ چوہدری کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہوگیا تھا۔ کیا فتور؟ یہ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اب مجھے یقین ہوچلا تھا کہ از خود ریسیور کریڈل کردیا گیا تھا۔ میرے ذہن نے مجھ سے پوچھا" اگر چوہدری خلافِ معمول جارہا ہے تو کیا مجھے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنا چاہیے؟ اس خطرناک سوال کا جواب یہی تھا......نہیں!

میں اسی اُدھیڑ بُن میں گاڑی کے نزدیک آگیا اور پھر گاڑی کے اندر بیٹھنے سے قبل میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے فیصل کے برابر والی سیٹ سنبھال کر دروازہ بند کیا تو شہزاد نے مستفسرانہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا" کیا پروگرام ہے سہیل! آگے بڑھیں یا......؟"

وہ میرے چہرے سے ہویدا الجھن تک پہنچ گیا تھا اسی لیے اس نے سوالیہ انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا" وجدان سے میری بات ہوگئی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے چوہدری نوازش سے رابطہ کیا تھا۔ ہمیں آگے تو بڑھنا ہے لیکن پروگرام میں تھوڑی تبدیلی ہے۔"

شہزاد نے گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا ''مثلاً کیسی تبدیلی؟''

میں نے معنی خیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ''تازہ ترین ہدایات کے مطابق، فیصل کو پارک کے اندر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے پاس گاڑی میں رہے گا اور مجھے امید ہے، شرافت سے رہے گا۔'' میں نے لمحہ بھر کو رک کر فیصل کی طرف دیکھا پھر شہزاد کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی ''میں اکیلا پارک کے اندر جاؤں گا پھر جب چوہدری نوازش کے بندے طے شدہ مقام پر پہنچ جائیں گے تو میں ان سے معاملات طے کروں گا۔ اس کے بعد میں ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آؤں گا اور فیصل کو ہتھکڑی سے آزاد کرنے کے بعد ان کے حوالے کردیا جائے گا۔ وجدان نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ میں اپنی تسلی کیے بغیر ان لوگوں کو فیصل کے پاس نہ لے کر آؤں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا ''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ وجدان بہت ہی ٹیڑھا آدمی ہے۔ وہ جب تک اپنے مطالبے کی عملی شکل کو آنکھوں سے نہیں دیکھ لے گا، اس کی تسلی نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے، وہ چوہدری پر پوری طرح بھروسا نہیں کررہا!''

''وجدان نے ابھی مجھے بتایا ہے کہ چوہدری ہاتھ پاؤں جوڑ کر اس کا مطالبہ ماننے کو تیار ہے۔'' میں نے کہا ''فیصل کو وہ زندگی کے ہر مسئلے پر فوقیت دے رہا ہے لہٰذا کسی بدمزگی کا اندیشہ نہیں۔ ادھر چوہدری کے بندوں نے ساحل کو وجدان کے حوالے کیا، ادھر ہم فیصل کو ان کی تحویل میں دے دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا!''

شہزاد نے کہا ''سہیل! تم بے فکر ہوکر جاؤ، میں فیصل کو سنبھال لوں گا۔ ویسے یہ خاصا سمجھ دار بندہ ہے۔ خوش اسلوبی سے نمٹتے ہوئے اس معاملے کے اختتام پر یہ کوئی گند نہیں کرے گا اور اگر...... اس نے ایسی کوئی کوشش کی تو میں اسے پچھتانے کا موقع بھی نہیں دوں گا۔'' بات کے اختتام پر شہزاد کا لہجہ خاصا سنگین ہوگیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ایسی کوئی صورتِ حال پیش نہیں آئے گی۔'' پھر میں نے خاص طور پر فیصل کو سنانے کی غرض سے کہا ''پارک کے اندر اور باہر چاروں طرف ہمارے مسلح آدمی پھیلے ہوئے ہیں جو کسی بھی ہنگامی صورتِ حال میں بے دریغ فائرنگ شروع کرسکتے ہیں، بس ہمارے ایک اشارے کی ضرورت ہے۔ فیصل خاصا عقل مند نظر آتا ہے۔ موت کے منہ میں جانے والی کوئی حماقت نہیں کرے گا۔''

ہم مذکورہ پارک پہنچ گئے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ سات بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ شہزاد نے ایک گیٹ کے قریب گاڑی روک دی۔ اس گیٹ کے بارے میں ہم پہلے ہی فیصلہ کرچکے تھے۔ اس طرف زیادہ رش نہیں تھا۔ شہزاد نے سڑک پر گاڑی اس انداز میں کھڑی کی کہ کسی اچانک صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمیں وہاں سے نکلنے میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں نے فیصل کو راہ مستقیم پر رکھنے کی خاطر ونڈ اسکرین کے پار دور تک نگاہ دوڑائی اور پھر سر کو ایسے انداز میں تفہیمی جنبش دیتا چلا گیا جیسے وہاں کے خفیہ بندوبست کا جائزہ لے رہا ہوں۔ پوری طرح مطمئن ہونے کی اداکاری کرنے کے بعد میں نے شہزاد سے کہا۔

''تم گاڑی میں میرا انتظار کرو۔ میں اندر کی صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

ہم دونوں کے درمیان زبان سے کم اور آنکھوں سے زیادہ باتیں ہورہی تھیں۔ ہمارا یہ انداز فیصل سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ میں گاڑی سے نکلنے لگا تو اس نے بے یقینی سے کہا۔

''تم لوگ پھر کوئی چکر چلانے کے موڈ میں تو نہیں ہو؟'' کافی دیر کے بعد اس نے لب کشائی کی تھی۔

''کیسا چکر؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ برہمی سے بولا ''سہیل! تم پہلے بھی بے وقوف بنا کر مجھ سے ایک آدمی جے ڈی ملک کا ٹھکانا اور فون نمبر معلوم کرچکے ہو۔ اب بھی تم کوئی چال تو نہیں چل رہے؟''

''میں تم سے غلط بیانی نہیں کروں گا فیصل!'' میں نے متحمل لہجے میں کہا ''میں تو ہر وقت کوئی نہ کوئی چال چلتا رہتا ہوں، یہ الگ بات ہے، وہ چالاکی کسی کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتی۔ ہاں، البتہ اگر سامنے والا سیانا کوا بننے کی کوشش کررہا ہو تو میں اسے گو کے ڈھیر پر پٹخنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرتا۔ تم نے مجھے ایک کروڑ روپے کا لالچ دے کر موت کے منہ میں دھکیلنے کی سازش کی تھی۔ میں جیسے ہی تمہارے جے ڈی ملک کے پاس پہنچتا، وہ مجھے بے بس بنا دیتا پھر وہ لوگ مجھے ایسی اذیتوں سے گزارتے کہ میں تمہارا اپنا ٹھکانا اگلنے پر مجبور ہوجاتا لیکن میں نے تمہاری سازش کامیاب نہیں ہونے دی اور تمہاری چال تمہی پر لوٹا دی۔'' جملے کے اختتام پر میں نے دھمکی آمیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے کہا ''وجدان کے ساتھ کام کرنے والوں کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہ سمجھنا! اگر میری یہ نصیحت تمہیں یاد رہی تو زندگی بھر عیش کرو گے۔''

بنگلے پر پیش آنے والے ہنگامی حالات کے بارے میں فیصل کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس دوران میں وہ گہری بے ہوشی میں رہا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا، ہم نے ڈیلیوری کے لیے اسے بنگلے سے نکالا ہے۔ اس نصیحت کے جواب میں وہ مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اگر فیصل کسی قسم کی کوئی گڑبڑ پھیلانے کا ارادہ ظاہر کرے تو تم بے دریغ اسے بھون کر رکھ دینا۔ جب کوئی خود ہی زندہ نہ رہنا چاہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں!''

میرے الفاظ میں سفاکی اور سنگینی بھری ہوئی تھی۔ شہزاد بڑی وضاحت سے میری بات کو سمجھ گیا اور بولا ''سہیل! تم مطمئن ہوکر جاؤ، مجھے امید ہے، بدامنی کی نوبت نہیں آئے گی۔''

میں گرین ہائی روف سے نکل کر پارک کے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ جب میں ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد پارک کے اندر داخل ہوا تو چھ بج کر اٹھاون منٹ ہورہے تھے۔ بندوں کے تبادلے میں صرف دو منٹ باقی تھے۔ میں تیز قدموں سے مطلوبہ مقام کی طرف بڑھنے لگا۔

اس وقت میرے ذہن و دل کی عجیب کیفیت ہورہی تھی۔ دل ساحل کی جھلک دیکھنے کو مچل رہا تھا اور ذہن میں ایک ایسی بساط بچھی تھی جس کا ہر مہرہ لحہ بہ لحہ اپنی صورت بدل رہا تھا۔ چوہدری سے فون پر ہونے والی گفتگو نے میرے اندر کھلبلی مچا رکھی تھی۔ بار بار میرے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا تھا کہ چوہدری کی نیت میں کوئی فتور پیدا ہوگیا ہے۔ فون میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی بلکہ چوہدری نے ازخود ریسیور رکھا ہے، پھر جب میں نے دوبارہ رنگ کرنے کی کوشش کی تو اس نے اس سے پہلے ہی ریسیور ہٹا کر رکھ دیا۔

انہی متضاد سوچوں کے ساتھ میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر مجھے وہ مقام دکھائی دینے لگا جہاں پر ایک کنگ سائز چوبی کچھوے کی گردن استادہ ہے۔ وہاں مجھے چند بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ ایک بچہ کچھوے کے سر کو تھام کر اس کی گردن پر چڑھ بیٹھا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے کسی کو اپنے پاس بلا رہا تھا۔ اسی وقت نزدیک ہی گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک کیمرا بردار شخص بچے کے قریب آیا اور اس کی تصویر بنادی۔ بچے پھر کھیل کود میں مصروف ہوگئے۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ رسٹ واچ کو دیکھا۔ میری گھڑی کی سوئیوں نے سات بجنے کا منظر دکھا دیا۔

میں نے بے قراری سے کچھوے کی سمت نگاہ دوڑائی لیکن وہاں ساحل کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہی بچے آپس میں اٹکھیلیاں کررہے تھے۔

میں گہری تشویش کے گھیرے میں آگیا۔ اس وقت ساحل اور فیصل کو اس مقام پر ہونا چاہیے تھا۔ فیصل کو تو میں گاڑی میں چھوڑ آیا تھا لیکن ساحل کہاں گئی؟

میں نے بے چینی سے گردوپیش میں نگاہ دوڑائی۔ اگلے ہی لمحے عباس اور زمرد خان میری نظر میں آگئے۔ وہ مطلوبہ مقام سے چند گز کے فاصلے پر ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں محدود فاصلہ رکھا ہوا تھا تاکہ کسی کو شک نہ گزرے۔ میں شہزاد کے دوست بنات خان کو نہیں جانتا تھا۔ ممکن ہے، وہ بھی کہیں آس پاس ہی ہو!

زمرد خان اور عباس مجھے دیکھ نہیں پائے تھے۔ میں فوارے کے نزدیک بنے ہوئے ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ وہ اگر مجھے دیکھ بھی لیتے تو میں ان کے لیے سہیل تھا...... ان کا ایک ساتھی سیکیورٹی گارڈ! شہزاد نے ان دونوں کو بنگلے سے روانہ کرتے وقت سختی سے ہدایت کی تھی کہ اگر وہ پارک کے اندر کوئی غیر معمولی سرگرمی نوٹ کریں تو ہمیں فوراً اطلاع دیں۔ پتا نہیں، انہوں نے بنگلے پر کوئی فون کیا تھا یا نہیں۔ وہاں جو حالات پیش آئے، انہوں نے ہمیں کسی اور طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

میں اس ستون کی آڑ میں کھڑا چوکنا نظر سے آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب مزید دو منٹ تک مجھے ساحل کی صورت نظر نہ آئی تو میں نے میدانِ عمل میں کودنے کا فیصلہ کیا اور ستون کی آڑ سے نکل کر اپنے آدمیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

چوہدری نوازش علی کی کمینگی اور درندگی مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ اس سے کسی وقت کسی بھی چال کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کی طرف سے میرا ذہن منفی خیالات سے اٹا پڑا تھا۔ اس ذخیرے میں ایک امکانی خیال قدرے بہتر کنڈیشن میں تھا۔ میں اسے اپنی خوش گمانی بھی کہہ سکتا تھا...... اور وہ یہ کہ ممکن ہے، چوہدری بھی میری طرح احتیاط سے کام لے رہا ہو۔ وہ فیصل کو صورتِ حال دیکھے بغیر ساحل کے سامنے نہ لانا چاہتا ہو! چوہدری نوازش سے میری مراد اس کے احکام سے تھی۔ وہ شیطان صفت جاگیردار خود تو اس وقت موضع رکھاں والی میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہاں جو کچھ بھی ہونا تھا، اس کی ہدایت کے مطابق ہونا تھا۔ چوہدری کا نیٹ ورک اس کی مرضی کے خلاف کیسے جاسکتا تھا۔

عباس سے نظر ملی تو میں نے اشارے سے اسے اپنے

پاس بلالیا۔ تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں جاننا بہت ضروری تھا۔ اس نے میرے نزدیک آکر پوچھا ”سہیل! شہزاد نظر نہیں آرہا...... اور اب تو سات سے اوپر کا وقت ہوگیا ہے؟“

میں نے کہا ”شہزاد یہیں قریب میں ایک خفیہ مقام پر موجود ہے۔ تم اپنی رپورٹ پیش کرو۔“

اس نے قدرے خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ شاید رپورٹ والی بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ وہ رتبے کے اعتبار سے مجھے (یعنی سہیل کو) اپنے برابر سمجھتا تھا، جبھی چھوٹتے ہی اس نے شہزاد کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ میں نے اس کی الجھن کو دور کرنے کی غرض سے کہا۔

”مجھے شہزاد ہی نے یہ بات معلوم کرنے کے لیے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔“

وہ قدرے مطمئن ہوتے ہوئے بولا ”یہاں پر سب خیریت ہے۔“

”کیا تم نے یا زمرد نے اس دوران میں بنگلے پر فون کیا تھا؟“

اس نے نفی میں گردن ہلادی ”اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔“

”بنات خان کہاں ہے؟“

اس نے ایک وردی پوش سیکیورٹی گارڈ کی طرف اشارہ کردیا۔

میں نے اس لمحاتی گفتگو میں عباس کو مزید چوکنا اور محتاط رہنے کی تاکید کی اور صحت مند سیکیورٹی گارڈ بنات خان کی جانب بڑھ گیا۔ اس دوران میں، میں مسلسل چوبی کچھوے اور اس کے گردونواح کو بھی نگاہ میں رکھے ہوئے تھا۔ میں نے بنات خان کے پاس پہنچنے کے بعد شہزاد کے دوست کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا اور پارک کی صورتِ حال کے بارے میں استفسار کیا۔

اس نے جواب دینے سے قبل سوال کر ڈالا ”وہ شہزاد کدھر ہے؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے عقب میں دور تک نگاہ دوڑائی۔

میں نے کہا ”وہ پارک کے باہر گاڑی میں موجود ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اندر بھی آجائے گا۔“ اس کے بعد میں نے اپنا سوال دہرایا۔

وہ چند لمحے مجھے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بتانے لگا ”کوئی بڑی بات تو دیکھنے میں نہیں آئی۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہے لیکن میری عقابی نظر نے دو افراد کو تاڑ لیا ہے۔ وہ وقفے وقفے سے اس کچھوے کے پاس آتے ہیں اور خاموشی سے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ ان کی اس حرکت کو کسی اور نے نوٹ نہیں کیا ہوگا۔ وہ دونوں افراد بظاہر یہی شو کررہے ہیں کہ دوسرے افراد کی طرح وہ بھی وہاں تفریح کی غرض سے آئے ہیں لیکن میں نے ان کی حرکات و سکنات میں خاصی تشویش اور سنسنی پائی ہے۔“

بنات خان ایک نہایت ہی اہم انکشاف کررہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، ہمارے دونوں سادہ پوش گارڈز بھی ان دو افراد کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہے ہوں گے کیونکہ وہ بھی مذکورہ مقام ہی کی نگرانی کررہے تھے۔ بنات خان کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا کیونکہ وہ پارک کے سیکیورٹی گارڈ کی یونی فارم میں تھا۔ اس حوالے سے مجھ پر بھی کوئی توجہ نہ دیتا، میں بھی اس وقت سیکیورٹی گارڈ کی وردی میں تھا۔

میں نے بنات خان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو وہ تائیدی انداز میں گردن ہلانے لگا۔ پھر میں نے نگرانی کرنے والے پُراسرار دو افراد کے بارے میں پوچھا تو اس نے خاموشی سے دو جانب یکے بعد دیگرے اشارہ کردیا۔ میں نے تجاہلِ عارفانہ سے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا تھا اور اس نے نیلے رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ دوسرا قدرے فربہ تھا۔ وہ سیاہ پتلون اور گرے شرٹ میں نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی ان کی ”اداؤں“ سے اندازہ لگالیا کہ وہ ہمارے دشمن کے آدمی تھے۔ گویا دوسری جانب سے بھی ملتی جلتی چال چلی جارہی تھی!

میں نے بنات خان سے کہا ”اگر میں زمرد خان یا عباس سے کھسر پھسر کروں گا تو یقینی طور پر ان مشکوک افراد کی نگاہوں میں آجاؤں گا لہٰذا تمہیں موقع پاکر ایک کام کرنا ہے!“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا ”کیسا کام؟“

”کام بہت آسان ہے۔“ میں نے مشکوک افراد اور مقام کچھوا کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا ”اور اس کام کے بعد سمجھو، تمہاری چھٹی۔ تم نے ہماری جتنی مدد کی اس کا شکریہ۔ اب ہمیں تمہارے تعاون کی مزید ضرورت نہیں۔ بعد میں شہزاد تمہیں فون پر تفصیل سے آگاہ کردے گا۔“

وہ ہکا بکا مجھے تکنے لگا پھر بولا ”بولو، کیا کام کرنا ہے؟“

میں نے کہا ”تم ان دونوں مشکوک افراد کی نظر بچا کر عباس یا زمرد خان سے کہو کہ اب ان کی نگرانی کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ کام میں خود کرلوں گا۔ وہ حساس مقام سے فاصلے پر

چلے جائیں اور فرنٹ میں آئے بغیر اپنے دشمن پر نگاہ رکھیں۔ میرا اشارہ اس پتلون قمیص اور شلوار سوٹ والے کی طرف ہے!“

”سمجھ گیا سہیل صاحب!“ اس نے فرمانبرداری سے کہا پھر مجھے ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے پوچھا ”تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

بنات خان نے ہچکچاتے ہوئے کہا ”میں نے شہزاد سے کسی قسم کی تفصیل نہیں پوچھی تھی۔ اس نے صرف اتنا بتایا تھا، اس کے چند آدمیوں کو تحفظ کی ضرورت ہوگی۔ میں ایک سیکیورٹی گارڈ ہوں اور پارک میں آنے والے ہر شخص کو تحفظ فراہم کرنا میری ذمے داری ہے مگر شہزاد نے جس انداز میں تعاون کی درخواست کی تھی، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ کوئی بہت ہی خاص واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن ابھی تک تو سب کچھ پُراسرار اور سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔ آپ ہم کو اس کے بارے میں کچھ بتاؤ؟“

میں نے ٹالنے کے لیے اسے ایک الٹی سیدھی مختصری کہانی سنادی جس میں اس کا فائدہ تھا اور نہ میرا کوئی نقصان۔ وہ مطمئن ہوکر ایک طرف بڑھ گیا۔ میں ایک چوبی بینچ پر بیٹھ کر اس مقام کا جائزہ لینے لگا جہاں چوہدری کے بندوں نے ساحل کو اور میں نے فیصل کو پہنچانا تھا۔ وہاں کھلنڈرے بچوں کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اب مجھے تشویش ہونے لگی۔

میں نے چوہدری نوازش کو کڑی تاکید کی تھی کہ ٹھیک سات بجے ساحل کو پارک میں پہنچ جانا چاہیے اور اس نے وعدہ بھی کیا تھا مگر لگتا تھا، وہ وعدہ خلافی پر اتر آیا تھا۔ ایک طرح سے وعدہ خلافی میں بھی کررہا تھا۔ ہوسکتا ہے میری طرح دوسری پارٹی بھی بے حد محتاط ہو......!

آئندہ دو منٹ کے اندر عباس اور زمرد خان میری نگاہ سے اوجھل ہوگئے۔ بنات خان نے انہیں میری ہدایات پہنچا دی تھیں۔ ایک منٹ بعد دشمن کے نگران بھی غائب ہوگئے۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس بھرے پرے پارک میں میرے سوا اور کوئی بھی نہ ہو۔ میں نے خود کو اندر سے تنہا پایا۔ مجھے سمجھنے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگی کہ وہ احساسات ساحل کے وہاں نہ پہنچنے کی وجہ سے تھے۔ میں بے چین ہوکر یک لخت بینچ سے اٹھ گیا۔

مجھے اپنے پورے وجود میں ایک انجانا سا اضطراب پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ میری چھٹی حس بتارہی تھی، کوئی بڑی گڑبڑ ہوچکی ہے۔ ساحل کا وہاں نہ پہنچایا جانا خالی از علت نہیں تھا۔ ان حالات میں، میں پارک میں زیادہ دیر رک کر انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پارک کے باہر فائرنگ کی آواز گونجی۔

میں نے بے ساختہ پلٹ کر اس سمت میں دیکھا۔ یہ وہی حصہ تھا جہاں گرین ہائی روف میں شہزاد، فیصل کے ساتھ موجود تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہاں کوئی سنگین واقعہ پیش آگیا تھا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر پارک کے گیٹ کی طرف دوڑ لگادی۔

فائرنگ کی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کسی گاڑی کے تیزی سے آگے بڑھنے کی صدا بھی بلند ہوئی۔ میں ممکنہ تیزی سے بھاگتے ہوئے پارک سے باہر نکل آیا۔ اسی لمحے میری نگاہ گرین ہائی روف پر پڑی۔ شہزاد بیک گیئر میں اسے گیٹ کی طرف لارہا تھا۔ میں نے گولی کی رفتار سے دوڑ کر گیٹ اور ہائی روف کا درمیانی فاصلہ طے کیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر گاڑی کے اندر پہنچ گیا۔

شہزاد نے ایک تشویش ناک نظر مجھ پر ڈالی اور ایک جھٹکے سے گرین ہائی روف کو آگے بڑھادیا۔ اس وقت وہ کسی عقاب کے مانند فعال دکھائی دیتا تھا۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ فیصل وہاں موجود تھا۔

شہزاد نے اضطراری لہجے میں مجھ سے کہا ”گن اٹھالو۔ وہ لوگ ہمارا تعاقب کررہے ہیں۔ میں ڈرائیونگ سے فاصلہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں، تم فائرنگ سے انہیں روکو۔ اگر وہ لوگ ہمارے قریب پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔“

میں نے کلاشنکوف کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے عقب میں نگاہ دوڑائی۔ ایک نیلی پجارو بڑی تیزی سے ہمارے تعاقب میں تھی۔ اس کی تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار بتارہی تھی، وہ پہلی فرصت میں ہمیں چھونا چاہتی ہے۔

میں نے پجارو کے اگلے پہیوں کو نشانہ بناکر نیچی فائرنگ کی۔ اس عمل کے لیے مجھے ہائی روف کی کھڑکی سے اوپری دھڑ باہر نکالنا پڑا۔ یہ فائرنگ بے نتیجہ رہی مگر حیرت انگیز طور پر پجارو میں سے ہم پر گولیاں نہیں برسائی گئیں۔

میں نے شہزاد سے کہا ”وہ لوگ براہِ راست ہمیں نشانہ نہیں بنائیں گے کیوں کہ فیصل ہم دونوں کے بیچ موجود ہے۔ وہ اس کی زندگی کا رسک نہیں لے سکتے۔ تم ڈرائیونگ اور اسپیڈ پر توجہ دو۔ پجارو والے ہائی روف کے عقبی ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں گے تاکہ ہم رکنے پر مجبور ہوجائیں۔“

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ پہلے بھی انہوں نے ہوائی فائرنگ ہی کی ہے یا پھر گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے۔'' شہزاد نے رفتار بڑھاتے ہوئے میری تائید کی ''میں فیصل کو بھی دیکھ رہا ہوں۔ تم گاڑی کے عقبی حصے میں چلے جاؤ تاکہ انہیں روکنے میں آسانی ہو۔''

میں نے سیٹ کے اوپر سے سلائیڈ کیا اور بہ مشکل ہائی روف کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چوہدری نے میرے ساتھ کھلا دھوکا کیا تھا۔ ساحل کو میرے حوالے کرنے کے بجائے اس نے فیصل کو چھیننے کی پلاننگ کی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے یقیناً پارک کے باہر اپنے بندوں کا جال پھیلا دیا ہوگا اور انہی میں سے کسی کی نظر گرین ہائی روف میں بیٹھے فیصل پر پڑ گئی ہوگی۔

شہزاد کا ذہن بھی میرے انداز میں سوچ رہا تھا' گمبھیر آواز میں اس نے بتایا ''ہمارے دشمن خفیہ طریقے سے پارک کے بیرونی حصوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ میں نے غیر معمولی نوعیت کی سرگرمی دیکھی تو ہوشیار ہو گیا۔ پھر اس سے قبل کہ میں تم تک کوئی اطلاع پہنچاتا' وہ لوگ مجھے گھیرنے لگے۔ مجھے روکنے کے لیے انہوں نے باقاعدہ فائرنگ شروع کر دی۔''

''اسی فائرنگ نے مجھے تمہاری طرف متوجہ کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے' وہ ایک پجارو پر اکتفا نہیں کریں گے!'' شہزاد کے لہجے میں تشویش تھی۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے عقبی منظر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''اس نیلی پجارو کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر مجھے دو اور گاڑیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔ ان کے تیور بھی بڑے خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔''

فیصل نے غصیلے لہجے میں کہا ''تم لوگ اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو۔ میرے آدمی جہنم تک تمہارا تعاقب کریں گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً گاڑی روک دو۔''

''ہمارا جہنم کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' میں نے سفاکی سے کہا ''اور اگر تم نے زبان بند نہ رکھی تو تمہیں اس جانب پارسل کرنا پڑے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ کینہ توز نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ شہزاد نے کہا ''چلو یہ اچھا ہوا...... تم نے اپنی زبان سے اقرار کر لیا' متعاقب گاڑیوں میں تمہارے بندے ہیں۔ اب یہ بھی بتا دو' وہ جے ڈی ملک کے بھیجے ہوئے ہیں یا پھر ان کا تعلق شعیب غوری کی تنظیم سی ایف کے سے ہے؟ تو لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو!''

اس سے پہلے کہ فیصل کوئی جواب دیتا' گرین ہائی روف بڑے خطرناک انداز میں لہرائی عقب سے ایک مرتبہ پھر ہماری گاڑی کو فائرنگ کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہائی روف کے ٹائرز تو برسٹ ہونے سے محفوظ رہے تاہم چند گولیاں اس میں لگیں اور ایک اچٹتی سی گولی نے بیک اسکرین کی خاصی مزاج پرسی کر ڈالی۔ شیشے کے درجنوں محفوظ ٹکڑے میرے اوپر بھی آن کر گرے۔ میں نے گردن کو جھکاتے ہوئے کلاشنکوف سیدھی کی اور پجارو کے اگلے ٹائروں کو ایک مرتبہ پھر نشانہ بنایا۔

میری یہ کوشش کسی حد تک کامیاب ہوئی۔ پجارو کا سامنے والا ایک ٹائر ناکارہ ہو گیا۔ وہ سڑک پر بری طرح لہرائی اور ڈرائیور نے اسے سائیڈ پر روکنے کی کوشش کی۔ ایک ''ٹانگ'' تڑوانے کے بعد پجارو والے ہمارا تعاقب جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ میں عقب میں نظر جمائے ریڈ الرٹ ہو گیا تھا۔ پجارو کے پیچھے آنے والی دو گاڑیوں میں سے ایک وہاں رک گئی اور دوسری نے تعاقب کا فریضہ سنبھال لیا۔ سوزوکی جیپ پجارو کی مدد کے لیے ٹھہری تھی جب کہ ٹویوٹا ہائی لکس نے ہماری گرد پانے کے لیے اندھا دھند دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

ہم اس وقت ڈی ایچ اے کے قلب میں ''آنکھ مچولی'' کھیل رہے تھے۔ اس علاقے کی سڑکیں کم مصروف اور زیادہ صاف ہیں لہٰذا اس خونی دوڑ کے نتیجے میں کوئی بدامنی پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ ٹویوٹا ہائی لکس کی طوفانی رفتار کے سامنے ہائی روف زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکتی تھی اس لیے شہزاد اسے مسلسل کسی ایک سڑک پر رکھنے کے بجائے بار بار ''پٹڑی'' بدل رہا تھا۔ جن حالات سے گزر رہے تھے' ان میں کسی فیصلے تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ فوری طور پر یہ نہیں سوچا جا سکتا تھا کہ ہمیں کس منزل پر پہنچنا ہے۔ ہماری حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ کسی طرح متعاقبین کو ڈاج دینے میں کامیاب ہو جائیں...... اور یہ کوشش کچھ زیادہ بار آور ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

ہائی لکس بتدریج فاصلہ کم کرتے ہوئے ہمارے قریب سے قریب تر پہنچ رہی تھی۔ مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد شہزاد ہائی روف کو گزری کی طرف لے آیا۔ اب ہم خیابانِ حافظ پر دوڑ رہے تھے۔ سعودی ایمبیسی خیابانِ شمشیر اور تنظیم پیچھے چھوڑ کر ہم خیابانِ بحریہ سے آگے بڑھتے گئے۔ خیابانِ ہلال کو عبور کرنے کے بعد ہمارا رخ سمندر کی طرف ہو گیا۔ یہ علاقہ کم آباد اور خاصا کھلا تھا۔ اس وقت ہلکا ہلکا اندھیرا

ہونے لگا تھا۔

میں نے شہزاد سے کہا ''یہ اچھا موقع ہے یہ علاقہ اور ملگجا اندھیرا ہمارا ساتھ دے گا۔ تم کسی طرح ان شیطانوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔ اگر ہم نے......''

میری بات ادھوری رہ گئی' اسی وقت ہائی لکس سے ہم یعنی ہائی روف کے عقبی ٹائروں پر ایک برسٹ فائر کیا گیا جواباً میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فائرنگ کر دی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی رکنے پر مجبور نہ ہوا۔

میں دوبارہ فائرنگ کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ہائی لکس کے عقب میں مجھے ایک پولیس موبائل دکھائی دی۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے ہمیں چیز کر رہی تھی۔ پتا نہیں پولیس والے کب ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ میری نگاہ میں وہ ابھی آئے تھے۔ یہ ایک خطرناک اور سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔

شہزاد بھی پولیس موبائل کو دیکھ چکا تھا' تشویش ناک لہجے میں بولا ''ہم تو برے پھنس گئے۔ یہ الو کے پٹھے کہاں سے نازل ہو گئے؟''

''ہم جس قسم کے کارنامے انجام دے رہے ہیں، وہ انہیں دعوت دینے کے مترادف ہے۔'' میں نے عقبی صورتِ حال کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کہا ''اوکھلی میں سر ڈال دیا ہے تو موسلے بھی آئیں گے!''

''وجدان! ہمیں سب سے پہلے پولیس والوں سے پیچھا چھڑانا ہوگا!'' شہزاد کی آواز میں بوکھلاہٹ تھی۔ میں سر پیٹ کر رہ گیا' بے دھیانی میں وہ بہت غضب ڈھا گیا تھا۔

فیصل نے چونک کر مجھے دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا ''تت...... تم...... سہیل ہو یا وجدان؟''

شہزاد سے بوکھلاہٹ میں جو غلطی سرزد ہوئی تھی' اس کی تلافی ممکن نہیں تھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں فیصل کو ایک طویل انٹرویو دینے بیٹھ جاؤں۔ میں نے اسے جھاڑ پلاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''تم سہیل اور وجدان کے چکر میں نہ پڑو۔ میں ہر صورت میں تمہارا باپ ہوں!''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

میں نے اس کے گال پر الٹا طمانچہ رسید کیا اور خون خوار لہجے میں کہا ''میں نے تمہیں نصیحت کی تھی' اپنی ناپاک زبان کو بند رکھنا لیکن لگتا ہے کسی اور سے نمٹنے سے پہلے تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کرنا پڑے گا!''

''تم اچھا نہیں کر رہے ہو وجدان!'' اس کے الفاظ میں دھمکی کا شائبہ تھا۔

میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا ''تم اور تمہارا باپ کسی بھی اچھے سلوک کے مستحق نہیں ہو۔'' ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر میں اس سے بہ حیثیت وجدان بات کر رہا تھا ''میں نے تو یہی چاہا تھا' تمہیں چوہدری نوازش کے حوالے کر دوں لیکن تم لوگوں کی گھٹی میں عہد شکنی اور دغابازی شامل ہے۔ دیکھ لو' تمہارے باپ نے میری بات نہ مان کر تمہیں کس عذاب میں دھکیل دیا ہے۔ اب تم پوری طرح میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں تمہیں پارچہ جات میں تقسیم کر کے کسی تکے کباب والے کے ہاتھ فروخت کروں گا۔''

اس نے مجھے گالی دینا چاہی لیکن الفاظ ہونٹوں سے جدا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے تھوبڑے پر کلاشن کوف کا بٹ مارا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اب مجھے اس کے حلیے اور صحت کی ذرا بھی پروا نہیں رہی تھی۔ جب میری ساحل مجھے نہیں ملی تھی تو پھر میں اس حرامی پلے کو کیوں سینت سینت کر رکھتا؟ میں فیصل کا وہ حشر کرنے والا تھا جسے دیکھ کر چوہدری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے!

رائفل کا بٹ کھانے کے بعد فیصل کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پشت پر آہنی گرفت میں تھے اس لیے اس کا بس صرف زبان تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی بولتی بند کرنے کے لیے اس کی ناک کو نشانہ بنایا اور ایک زوردار پنچ ٹارگٹ پر جڑ دیا۔ فیصل کے لیے میرے دل میں بہت غصہ بھرا تھا۔ وہ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکا اور بری طرح چلانے لگا۔

میں نے نمک پاشی کرتے ہوئے کہا ''تم کیسے مارشل آرٹسٹ ہو۔ یہ ذرا سی تکلیف نہیں سہہ سکے۔ میں نے تو سنا ہے تم نے بلیک بیلٹ حاصل کر رکھی ہے اور کئی غیر ملکی ٹورنامنٹس بھی جیت چکے ہو۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں تم نے بلیک بیلٹ اپنی محنت سے نہیں بلکہ......'' میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ خالی جگہ پُر کر کے اس نامکمل جملے کو اپنی ضرورت کے مطابق سنگین سے سنگین تر بنایا جا سکتا تھا۔

وہ بھرے ہوئے لہجے میں غرایا ''تم مجھے آزاد کر کے دیکھو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا' میں نے بلیک بیلٹ کہاں سے اور کیسے حاصل کی تھی!''

''میں تمہاری یہ حسرت ضرور پوری کروں گا' پہلے تمہارے ان متعدد والد صاحبان سے نمٹ لو۔'' میں نے گن کی نال سے عقب میں اشارہ کیا۔

ادھر میری بات ختم ہوئی' ادھر پولیس موبائل پر گولیوں کی برسات کر دی گئی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ موبائل کے پیچھے مجھے وہی سوزوکی جیپ نظر آئی جو زخمی پجارو کی "عیادت" کے لیے رک گئی تھی۔ اس جیپ اور ہائی لکس سے بے دریغ پولیس موبائل پر فائرنگ کی جارہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' دشمن پولیس والوں کو ہمارا ساتھی سمجھ رہے تھے اور ہم سے پہلے انہیں نیست و نابود کرنے پر تل گئے تھے۔ یہ ایک کھلی قانون شکنی تھی!

پولیس والے بھی چوڑیاں پہن کر موبائل دوڑانے نہیں نکلے تھے۔ وہ اپنی دانست میں خطرناک مجرموں کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہوں نے دو کے بجائے ایک محاذ پر لڑنے کا فیصلہ کیا اور موبائل کی رفتار گھٹا کر سوزوکی جیپ پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس طرح وہ لوگ ہائی لکس سے ہونے والی فائرنگ سے محفوظ ہوگئے۔ ہائی لکس والوں نے عقبی "معاملات" کو یک سر نظر انداز کر کے ہمارا تعاقب جاری رکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ ہم سے خاصے فاصلے پر رہ گئے۔

یہ صورتِ حال ہمارے لیے خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اب ہمیں صرف ایک ہائی لکس سے نمٹنا تھا۔ پولیس والوں سے پیچھا چھوٹنے کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر قسم کی جواب دہی سے بچ گئے تھے۔ ہماری گاڑی میں ایک ہتھ کڑی لگا زخمی موجود تھا۔ جسے ہم اپنی مرضی سے کہیں لے جارہے تھے۔ اگر ہم پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جاتے تو کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہوسکتے تھے۔ پولیس والوں نے جیپ والوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ہی وائرلیس پر ہائی روف اور ہائی لکس کے بارے میں اپنے مرکز کو بتا دیا ہوگا لہٰذا اس بات کے قوی امکانات تھے' ہمیں چاروں جانب سے گھیرا جائے گا۔

میں نے شہزاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم اچانک گاڑی کی رفتار کم کرو مگر اس طرح کہ ہائی لکس والوں کو فائرنگ کرنے کا موقع نہ ملے۔ میں اس لمحاتی فرصت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ اگر کچھ دیر مزید یہ چیزنگ جاری رہی تو ہم متعدد پولیس موبائلز کے نرغے میں آجائیں گے۔ پیچھے آنے والی پولیس موبائل نے یقیناً ہمارے بارے میں اپنے لوگوں کو فوری مطلع کر دیا ہوگا!"

میری ہدایت کے اختتام پر شہزاد نے ہائی روف کو سڑک پر بری طرح لہرایا اور لیفٹ ٹرن کے لیے اسٹیرنگ گھما دیا۔ موڑ کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑی ورنہ ہائی روف کو خطرناک حادثہ بھی پیش آسکتا تھا۔

ہائی لکس والوں نے بھی ہماری تقلید میں گاڑی موڑ لی۔

اس دوران میں مجھے ہائی لکس کے پہلو میں فائرنگ کر[نے] کا موقع مل گیا۔ کاشنکوف کی مہلک گولیوں نے ہائی لکس [کی] باڈی کو چھید ڈالا لیکن سوئے اتفاق کہ اس کے ٹائرز محفو[ظ] رہے۔ البتہ ہمارے درمیان فاصلہ خاصا بڑھ گیا۔ سنبھلنے [کے] ساتھ ہی ہائی لکس سے بھی ہم پر فائرنگ کی گئی۔ ہم فائرنگ [کی زد] سے باہر تھے چنانچہ ہمیں اور ہماری گاڑی کو کوئی نقصان نہ[یں] پہنچا۔

"یہ تو جہنم کی بلاؤں کی طرح ہمارے پیچھے لگ [گئے] ہیں!" شہزاد عقب نما آئینے پر نگاہ ڈالتے ہوئے بڑبڑایا۔

فیصل زہر خند لہجے میں بولا "میں نے تو پہلے ہی [کہا] تھا' میرے آدمی جہنم تک تمہارا تعاقب کریں گے۔ اب [بھی] وقت ہے۔ اگر میری بات سمجھ میں آرہی ہے تو گاڑی روک [دو]۔ میں اپنے آدمیوں سے تمہاری سفارش کر دوں گا۔"

فیصل کے آخری جملے سے اعتماد جھلکتا تھا۔ لگتا تھا کہ ا[س] نے صورتِ حال سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو سنبھال لیا [تھا] اور اس وقت اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں [نے] غصیلی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔

"اپنے وعدے سے پھر تو نہیں جاؤ گے؟"

"کون سا وعدہ؟"

"سفارش والا وعدہ!"

وہ شک آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کیا تم [مجھے] بے وقوف سمجھتے ہو؟"

شہزاد کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔ وہ ڈرائیونگ پر تو[جہ] مرکوز رکھتے ہوئے سڑکیں بدل رہا تھا۔ جب وہ خیابانِ اتح[اد] پر آیا تو میں نے کہا "اس سڑک کو نہیں چھوڑنا۔ میں تمہیں د[یگر] ہدایات بعد میں دوں گا۔"

خیابانِ اتحاد خاصی وسیع اور کم مصروف سڑک ہے۔ ا[س] پر مجھے بارہا سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ ڈی ایچ اے سے کشمیر کال[ونی] تک اس پر بے دریغ گاڑی دوڑائی جاسکتی ہے۔ میں [نے] اپنے عقب میں ہائی لکس کا جائزہ لیا۔ وہ لحہ بہ لحہ مابین فاص[لہ کم] کرتے ہوئے ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہز[اد] بھی ہائی روف کو اڑانے کی کوشش میں تھا۔

متعاقب گاڑی پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے میں فیصل [سے] مخاطب ہوا اور اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا [تم] اور تمہارا باپ کتنے بے وقوف ہو' یہ بات تم لوگوں کو زیادہ [اچھی] طرح معلوم ہوگی۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ تم لوگ اول در[جے] کے عیار اور وعدہ خلاف ہو۔ تمہارے باپ سے جو ڈیل ہو[ئی] والی تھی۔ اس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر تمہارا اور سا[حل]

کا تبادلہ دیانت داری سے ہو جاتا تو اس کار چیزنگ کی نوبت ہی نہ آتی۔" میں ایک لمحے کو متوقف ہوا اور عواقب و جوانب کا جائزہ لینے کے بعد کہا "لیکن تمہارا باپ خود کو زیادہ سیانا اور طاقت ور ثابت کرنا چاہتا ہے۔ وہ مقررہ وقت پر ساحل کو پارک میں پہنچائے بغیر تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم اس وقت میرا نوالہ بنے ہوئے اور تمہارے باپ نے یہ نوالہ چھیننے کے لیے جبڑوں میں ہاتھ ڈال دیا ہے اس لیے......" میں نے کلاشن کی نال سے اس کے سر کے عقبی حصے پر دستک دی اور بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا "میں تم لوگوں کی کسی بات پر بھروسا نہیں کرسکتا۔"

"تمہاری مرضی ہے ورنہ میں تو اپنے وعدے پر قائم ہوں" وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ میں نے اس اعصابی کھیل کو جاری رکھتے ہوئے کہا "یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو اگر ہم گاڑی روک دیں تو تم اپنے لوگوں سے ہماری سفارش کرو گے۔ وہ ہمیں ٹیڑھی نظر سے بھی نہیں دیکھیں گے اور یہ خوشی جانے کی اجازت دے دیں گے؟" اسے گھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ ہو تو گاڑی رکوا کر دیکھ لو!" فیصل نے کہا۔

"کیا خیال ہے شہزاد!" میں نے اپنے عقب میں ہائی لکس پر نگاہ جماتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا "اس کے باپ کو تو آزما لیا' اسے بھی آزما کر دیکھ لیتے ہیں؟"

"وجدان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" شہزاد کے لہجے میں الجھن تھی۔

میں نے کہا "اچھا! تو تم یہ کہنا چاہتے ہو' اس کی باتوں میں نہ آؤں؟"

"ظاہر ہے' فیصل کی بات ماننا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے!"

"لو بھئی فیصل! میرا ساتھی نہیں مان رہا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا "میں سب سمجھ رہا ہوں' تم لوگ مجھے اعصابی طور پر کمزور کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں ایک ایک کو دیکھ لوں گا!"

"تم ذہنی' جسمانی اور اعصابی طور پر بری طرح متاثر ہو۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "لہٰذا ایسی کوشش میں ہمیں وقت برباد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر شہزاد مان جاتا تو تم میری بات کا ثبوت بھی دیکھ لیتے۔"

وہ زبان سے کچھ نہیں بولا' بس خون خوار نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

"او مائی گاڈ!" اسی وقت شہزاد کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

میں نے بے اختیار پلٹ کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھا اور پریشان ہو کر رہ گیا۔ سامنے سڑک پر ایک گمبھیر الجھن پیدا ہوگئی تھی۔ بائیں جانب والی سائیڈ اسٹریٹ سے ایک واٹر ٹینکر نکل کر روڈ پر آگیا تھا اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ وہ ٹینکر روڈ پر رک گیا تھا...... اس طرح کہ ہم وہاں سے گزر نہیں سکتے تھے۔ ٹینکر کا عقبی حصہ سائیڈ اسٹریٹ کو اس طرح گھیرے ہوئے تھا کہ گاڑی کو اس اسٹریٹ پر موڑا نہیں جاسکتا تھا۔ ہمیں ہر صورت میں رکنا تھا یا پھر ہائی روف کو ٹینکر سے ٹکرانا تھا۔ اسی لمحے میری چھٹی حس نے پکار کر کہا' وہ واٹر ٹینکر کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سڑک پر لا کر ہماری راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا' بڑے وسیع پیمانے پر ہمیں چھاپنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ہمارے لیے آگے کنواں پیچھے کھائی والی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور اس سے پہلے کہ ہائی روف اور واٹر ٹینکر کے درمیان حائل فاصلہ صفر کے برابر رہ جاتا' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"شہزاد! گاڑی کو روک لو۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے بڑی سرعت سے اپنی جیب سے ہتھکڑی کی چابی نکالی۔ اس وقت میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے عقب میں آنے والی دشمن ہائی لکس کو یک سر نظر انداز کر دیا۔ اس طرف سے ہمارے رکنے کی صورت میں فائرنگ کا خطرہ نہیں رہا تھا۔ وہ ہمیں روکنے کے لیے ہی اپنی گنوں کو زحمت دے رہے تھے' قتل و غارت گری ان کا مقصد اول نہیں تھا۔ اس طرح فیصل کی جان کی ضمانت نہ رہتی۔ ایسی حماقت وہ کسی صورت نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے ہائی روف رکنے سے قبل چند سیکنڈ کے وقفے میں فیصل کی ہتھ کڑی پر پلک جھپکتے میں کارروائی کی اور ایک ہاتھ کی آہنی کڑی سے آزاد کر دیا۔ اگلے ہی لمحے فارغ ہونے والی کڑی کو میں نے سیٹ کے عقب میں نصب ایک پائپ سے منسلک کر کے لاک کر دیا۔ اب فیصل ایک طرح سے اس پائپ سے بندھا ہوا تھا اور اپنی مرضی سے گاڑی کو چھوڑ کر باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ یہ کام میں نے حفظِ ماتقدم کے طور کیا تھا تاکہ پیش آمدہ افراتفری میں وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔

ٹائروں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ ہائی روف رک گئی۔ عقب میں آنے والی ہائی لکس نے ہماری تقلید کی اور چند گز کے فاصلے پر ٹھہر گئی۔ فضا میں چند لمحات کے لیے سناٹا چھا گیا۔ لگتا تھا وقت چند ثانیوں کے لیے تھم گیا ہو۔ وہ بڑی ہی مہلک اور نازک ساعت تھی۔ شہزاد نے اسٹیرنگ چھوڑ کر دوسری کے کے سنبھال لی اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سفاکی سے کہا" تم اس حرام زادے کو گن پوائنٹ پر رکھو۔ جب تک یہ ہمارے قبضے میں ہے' وہ لوگ ہمیں فائرنگ کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ میں ان سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"تم اکیلے ہی کیوں کوشش کرو گے!" شہزاد نے جی داری سے کہا" یہ نامراد تو گاڑی کے اندر فکس ہو چکا۔ میں بھی کیوں نہ تمہارا ساتھ دوں؟"

"اس کا موقع آیا تو ضرور اپنی خواہش پوری کرنا۔" میں نے کہا" فی الحال فیصل پر توجہ مرکوز رکھو۔"

فضا پر طاری ہونے والا سکوت لمحاتی ثابت ہوا۔ ہماری اس گفتگو کے دوران ہی میں ہائی لکس کے عقبی حصے میں سے چار گن بردار اچھل کر نیچے اتر آئے پھر وہ ہائی روف کو نشانے پر رکھتے ہوئے چند قدم آگے آنے کے بعد رک گئے۔ اسی وقت ہائی لکس کے اگلے حصے میں سے ایک لحیم شحیم شخص برآمد ہوا۔ دراز قامت اور گورے چٹے اس شخص کے ہاتھ میں پسٹل نظر آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی سے باہر آنے کے بعد اپنے مسلح ساتھیوں کو ایک مخصوص اشارہ کیا' پھر ہماری جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

ہائی لکس میں سے نمودار ہونے والوں کے اسٹائل سے لگتا تھا' وہ اپنی دانست میں ہمیں زیر کر چکے تھے۔ میں نے انہیں اسی خوش فہمی میں مبتلا رکھا اور شہزاد کے نزدیک چہرہ لے جاتے ہوئے کہا۔

"میں اس موٹے کو باتوں میں لگاتا ہوں۔" میرا انداز سرگوشیانہ تھا" اس دوران میں تم گاڑی کو بیک گیئر میں ڈال کر تیزی سے پیچھے لانے کی کوشش کرو۔" یہ آئیڈیا فوراً ہی مجھے سوجھا تھا۔

"یہ بہت خطرناک ہوگا وجدان!" وہ دوبارہ اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا" خطرناک اور مفید سوچنے کا وقت نہیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں' تم وہی کرو۔ جیسے ہی میں موٹے سے بات چیت شروع کروں' تم گاڑی کو اس انداز میں پیچھے لانا جیسے ان سب کو روند ڈالنے کے بعد ڈائریکٹ ہائی لکس کو ہٹ کرنا چاہتے ہو!" وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ میں نے گن کا رخ موٹے کی طرف کرتے ہوئے کہا" پھر تم ہائی روف کو طوفانی انداز میں موڑتے ہوئے واپسی کے راستے پر ڈال دو گے!"

"او کے باس!" شہزاد نے چٹانی لہجے میں کہا۔

یہ ایک خطرناک چال تھی جو انتہائی مہلک ثابت ہو سکتی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس بات کا میں بہ خوبی اندازہ لگا چکا تھا' فیصل کی وجہ سے وہ ہمیں اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ نہیں بنانا چاہتے تھے ورنہ وہ اب تک ہمیں گولیوں کی باڑ پر رکھ چکے ہوتے۔ وہ فیصل کی سلامتی کے لیے ہمیں گریز دے رہے تھے۔

ابھی وہ موٹا پستول بردار ہائی روف سے چند قدم دور ہی تھا کہ فیصل نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر موٹے کو خبردار کرنے لگا" گاڑی کے نزدیک نہ آنا' یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ ان کی گاڑی کو روکنے کی کوشش کرو!"

میں نے حالات بگڑتے دیکھے تو شہزاد کو آنکھوں میں ایکشن کا اشارہ دے دیا۔ وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں ڈالے تیار بیٹھا تھا۔ فیصل کی چیخ پکار پر موٹا چونکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا' رکی ہوئی ہائی روف کو وہ کس طرح روکنے کی کوشش کریں۔

پھر جب تک وہ فیصل کی بات کے مفہوم تک پہنچتا' شہزاد ان پر چڑھائی کر چکا تھا۔

ہائی روف توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کی طرح پیچھے کو بڑھی۔ اس کا پہلا نشانہ وہ موٹا ہی بنا۔ میں نے چار گن بردار افراد کے قدموں میں فائرنگ کی۔ وہ اس غیر متوقع صورتِ حال پر گڑبڑا گئے اور جواباً بے دریغ ہم پر گولیاں برسانے لگے۔ ہائی روف حرکت میں تھی لہٰذا ان کی گنوں سے فائر ہونے والی گولیاں گاڑی کی باڈی میں لگیں۔

شہزاد نے کسی بات کی پروا کیے بغیر حیران و پریشان افراد کو روند ڈالا اور ہائی لکس کو ایک زوردار ٹکر مارنے کے بعد اسٹیرنگ کو واپسی کے لیے گھما دیا۔ میں اس دوران میں چوکنی نظر سے میدانِ جنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا' ہماری راہ کھوٹی کرنے والے واٹر ٹینکر میں سے بھی دو گن بردار نکل کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شامل ہو گئے...... اور ہم پر فائرنگ کرنے لگے۔ وہ ہر ممکنہ طور پر ہمیں روکنے کی کوشش کرنے لگے۔

ہائی لکس طوفانی ٹکر کھانے کے بعد اپنے قدموں پر تھم سی گئی تو شہزاد کے لیے آسانی پیدا ہو گئی۔ اسی وقت میں نے ہائی لکس کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے فائرنگ کر دی۔ گاڑی کو فلیٹ ہونے میں دیر نہیں لگی' اب وہ ہمارے تعاقب کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں دیکھتے ہوئے دشمنوں پر گولیاں برسائیں۔ مقصد انہیں ہلاک کرنا نہیں تھا۔ میں انہیں شدید زخمی کر کے تعاقب سے روکنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں نے گن کی نال نیچے رکھتے ہوئے ان کے جسموں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجے میں کربناک انسانی چیخوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہماری ہائی روف نے پہلے ہی دشمنوں کو بڑی بے دردی سے روند ڈالا تھا۔ اس فائرنگ نے قیامت برپا کر دی۔ موٹے اور اس کے چاروں گن بردار ساتھیوں پر برا وقت آن پڑا۔ واٹر ٹینکر سے نمودار ہونے والوں نے انہیں کور دیا اور ہماری گاڑی کو نشانہ بنانے لگے۔ میں انہیں روکنے کی کوشش میں تھا تاہم مدِمقابل میں سے جو قدرے سنبھلے ہوئے تھے' وہ ہم پر فائرنگ کر رہے تھے پھر اس سے پہلے کہ شہزاد گاڑی کو واپسی کی راہ پر ڈالتا' ایک خوفناک دھماکے سے فضا لرز کر رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی فیصل کی تیز چیخ بھی سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر عقب میں دیکھا تو ایک دہشت ناک منظر سے سامنا ہوا۔

ہائی لکس آگ کا گولا بنی نظر آئی۔ شاید اس اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں کوئی من چلی گولی اس کے فیول ٹینک سے جا لگی تھی یا ممکن ہے گاڑی کا کوئی اور حساس حصہ فائرنگ کی زد میں آ گیا ہو۔ ایسی ہی ایک شریر گولی نے فیصل کے کندھے پر بھی بوسہ دیا تھا۔ وہ اپنا بازو جھٹکتے ہوئے ہولے ہولے کراہنے لگا۔ افسوس کہ اس وقت وہ اپنے آزاد زخمی بازو کو تھامنے کی پوزیشن میں نہیں تھا' تھامنے والا ہاتھ آہنی جکڑ میں تھا!

آتش و آہن کے اس خونیں منظر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم کافی دور نکل آئے۔ اس لمحاتی کارروائی کے دوران میں تین گاڑیاں ہمارے پیچھے خاصے فاصلے پر رک گئی تھیں اور خاصی "دشش و پنج" میں تھیں لیکن ان لوگوں میں سے کسی نے کوئی مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پرائی آگ میں کودنا کسے اچھا لگتا ہے!

شہزاد اس وقت رانگ سائیڈ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا" گاڑی کو کسی سائیڈ اسٹریٹ میں موڑ لو اور راستہ بدل کر بنگلے پر پہنچنے کی کوشش کرو۔"

وہ میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بولا" کون سا بنگلا؟"

"جہاں ہمیں مشن کی تکمیل کے بعد جانا تھا!"

اس کے بعد شہزاد نے کوئی سوال نہ کیا۔

فیصل کی دبی دبی کراہیں گاڑی میں ابھر رہی تھیں۔ میں نے اس کے زخمی کندھے کا جائزہ لیا۔ شریر گولی ٹرائی سیپ مسل میں گھسی بیٹھی تھی۔ ٹرائی سیپ کندھے کا بہت ہی اہم حصہ ہوتا ہے۔ اس کے عقب میں جوڑ کی ہڈی واقع ہوتی ہے۔ مجھے خدشہ تھا' گولی نے اس کے بازو کی ہڈی کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ شروع میں اس نے زخمی بازو کو ایک دو مرتبہ جھٹکا تھا لیکن اب وہ کسی ترئی کے مانند لٹکا ہوا تھا...... بے جان اور معطل سا!

میں نے نمک پاشی کرتے ہوئے کہا" او مسٹر بلیک بیلٹ! تم تو بہت ہی بودے ثابت ہو رہے ہو۔ ایک ذرا سی چوٹ پر عورتوں کی طرح ٹسوے بہانے بیٹھ گئے!"

وہ کوئی جواب دینے کے بجائے ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

میں نے زہریلے لہجے میں کہا" تم اپنے انہی آدمیوں سے ہماری سفارش کرنے والے تھے نا۔ دیکھ لو' انہوں نے تمہیں گولی مار دی۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے پیارے!"

میں اسے تنگ کرنے کے لیے چھیڑ چھاڑ سے کام لے رہا تھا۔ وہ میرے انداز کو سمجھ گیا اس لیے کسی قسم کی بحث و تکرار کے بجائے وہ نفرت آمیز اور انتقام انگیز نگاہ سے مجھے تکتا چلا گیا۔ اس کی بے بسی اور بے کسی پر مجھے ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ رکھاں والی کے مطلق العنان چوہدری نوازش کا فرزندِ ارجمند اپنی زندگی کے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا۔ اور آگے چل کر ان حالات کی نزاکت میں مزید اضافہ ہونے والا تھا۔ چوہدری نے اپنی چالاکی نما حماقت سے بیٹے کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔

شہزاد گاڑی کو ڈیفنس فیز ٹو کی مختلف سڑکوں پر گھمانے کے بعد اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ کسی دوست یا دشمن نے ہمارا تعاقب نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

رات کا ایک بجا تھا۔ میں اس وقت منہاس باقر کے ساتھ ایک کمرے میں بند نہایت ہی اہم امور پر بات کر رہا تھا۔ وہ پانچ منٹ پہلے حیدرآباد سے لوٹا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ گہری سنجیدگی سے میری بات سننے کے بعد بولا۔

"چوہدری نے اپنی چالاکی دکھانے کے لیے جو رسک لیا

ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے' اسے اپنے بیٹے فیصل سے وہ محبت نہیں جس کا وہ دعوے دار ہے!''

میں نے کہا'' منہاس صاحب! شاید آپ کا واسطہ نوازش علی جیسے چوہدریوں یا وڈیروں سے نہیں پڑا۔ یہ لوگ انتہائی سنگ القلب اور سفاک ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اتنی خطرناک بازی کھیلتے ہیں کہ اپنے پیاروں کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔''

''جیسا کہ چوہدری نوازش نے فیصل کے معاملے میں ثبوت دیا۔''

''میں اس چوہدری کے بچے کی زندگی خراب کر دوں گا۔'' میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا'' یہ آخری دھوکا ہے جو میں نے اس سے کھایا ہے۔ میرا ردِعمل اسے بہت مہنگا پڑے گا۔''

منہاس نے کہا'' میں اسے تمہاری جزوی کامیابی ہی کہوں گا کہ تم نے فیصل کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔ جب تک وہ تمہارے قبضے میں ہے' تمہیں چوہدری پر برتری حاصل رہے گی۔''

ہم نے بنگلے پر پہنچتے ہی فیصل کو دوبارہ الٹی ہتھ کڑی پہنا دی تھی۔ اس موقع پر شہزاد نے اس کی اچھی خاصی مرمت بھی کر ڈالی۔ ازاں بعد ہم نے اسے ایک باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ میں نے منہاس کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔ فیصل کو مستقل طور پر اس بنگلے میں رکھنا مجھے مناسب نہیں لگ رہا تھا لہٰذا میں نے منہاس سے کہا۔

''جناب! یہ بنگلا آپ کی رہائش گاہ ہے۔ آپ یہاں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس بنگلے کو ہم اپنی کارروائیوں میں کسی حوالے سے استعمال کریں۔ میرے خیال میں فیصل کو کہیں اور منتقل کر دینا چاہیے۔''

''تمہارا خیال بالکل درست ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا'' تمہارے دونوں دشمن چوہدری اور غوری یہ بات جانتے ہیں کہ میں تمہیں مکمل سپورٹ دے رہا ہوں۔ تم ان لوگوں کو فیصل کی جھلک دکھا کر غائب ہو گئے ہو۔ اس بات سے بحث نہیں کہ پارک سے مین اتحاد تک تعاقب کرنے والوں کا تعلق چوہدری نوازش سے تھا یا شعیب غوری سے یا پھر دونوں کے مشترکہ آدمیوں سے! ہر صورت میں وہ لوگ آپس میں دوست اور ہمارے دشمن ہیں۔ وہ لوگ اپنی ناکامیابی اور جھنجلاہٹ کو مٹانے کے لیے ادھر کا رخ کر سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں فوری طور پر سیکیورٹی گارڈ کو الرٹ کر دیتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی فیصل کے کسی مناسب بندوبست کے بارے میں بھی سوچتا ہوں۔''

میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا'' منہاس صاحب ایک بات تو طے ہے' میری ساحل یہیں کراچی میں مو... ہے۔ میں اپنی کوششوں سے اس تک پہنچنا چاہتا ہوں... وقت میری نگاہ میں دو ٹارگٹ ہیں۔ میں باری باری ان... ہٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا'' کون سے ٹارگٹ؟''

''جے ڈی ملک...... اور...... غلام جیلانی!''

ان دونوں افراد کے بارے میں منہاس بھی میرے... ہی جانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر تفکر کے آثار پیدا ہوئے۔... نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا'' تمہارے دونوں ٹارگٹ نہایت ہی اہم ہیں۔ ایک کا تعلق شعیب غوری سے ا... دوسرے کا چوہدری نوازش علی سے ہے۔ تم پہلے کسے ہٹ... چاہتے ہو؟''

میں نے جواب دینے سے پہلے اسے چوہدری... ہونے والی آخری مختصر گفتگو کے بارے میں بتایا... کہا'' چوہدری نے جے ڈی ملک کے ذکر پر جس حیرت... اظہار کیا ہے، اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ شخص... کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ واثق توقع یہی ہے کہ جے... ملک جہنم مکانی میاں زاہد حسین کی جگہ کام کر رہا ہے۔''... نے سانس لینے کے لیے ذرا توقف کیا پھر بات کو آ... بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں پہلے جے ڈی ملک کی گردن ناپنا چاہتا ہوں... دشمنی کے حوالے سے اس کا پہلا ''حق'' بنتا ہے۔ اگرچہ... نوازش علی نے شعیب غوری سے ساحل کو واپس لے لیا... اس بات کے قوی امکانات ہیں' وہ جے ڈی ملک کی تو... میں ہو۔ غلام جیلانی میرا سیکنڈ آپشن ہے!''

چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد منہاس نے مجھ... استفسار کیا'' اس معرکہ آرائی سے واپس لوٹنے کے بعد... نے چوہدری سے رابطہ کیا ہے؟''

''ابھی نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہو... جواب دیا۔

''پہلی فرصت میں اسے فون کرو اور اس کھلی بدعہد... اسے بے نقط سنا ڈالو۔ ممکن ہے کوئی نئی بات سامنے آجا...'' منہاس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا'' ... دیر میں' میں فیصل کی منتقلی کے بارے میں کچھ سوچتا ہوں...'' پھر وہ اس کمرے میں رکھے فون کی طرف اشارہ کرتے ہو... بولا'' تم اسے استعمال میں لاؤ۔ میں دوسرے فون سے کام چلا لوں گا۔''

پھر وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ دوسرا فون مذکورہ کمرے میں تھا۔ میں نے منہاس کے مشورے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے موضع رکھاں والی میں چوہدری نوازش کا نمبر ڈائل کیا۔ ڈائلنگ مکمل ہوئی تو پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹینڈ کر لیا گیا۔ اس عجلت کے نتیجے میں لائن کٹ گئی۔ لگتا تھا' دوسری طرف کوئی فون کے ریسیور پر ہاتھ رکھے بیٹھا گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہا تھا۔

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن دوبارہ ڈائلنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا میں نے اس کوشش کو دہرایا۔ اس مرتبہ دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھایا گیا۔ پھر میری سماعت پر ایک بوکھلائی ہوئی آواز نے دستک دی۔ میں نے اس پریشان حال آواز کو پلک جھپکنے میں پہچان لیا۔ وہ موٹی کھال والے چوہدری نوازش علی کی آواز تھی جس کی حالت اس وقت خاصی پتلی ہو رہی تھی۔

اس کی بکھری ہوئی ''ہیلو'' کے جواب میں' میں نے زہریلے لہجے میں کہا'' چوہدری! خود کو سنبھالو۔ ابھی تو کھیل کی ابتدا ہوئی ہے۔ اگر تم اتنی جلدی ہانپنے لگے تو مقابلہ جاری کیسے رہ سکے گا؟ تم پہلے راؤنڈ میں ڈھے جاؤ گے جب کہ میں آخری راؤنڈ تک جانا چاہتا ہوں......''

''تم اپنی ناپاک زبان کو بند کرو۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے دہاڑا'' بتاؤ میرا فیصل کہاں ہے؟''

''دردناک عذاب میں!'' میں نے پوری سفاکی سے کہا۔

''میں پوچھتا ہوں' تم نے اسے کہاں چھپایا ہے؟'' وہ عالمِ وحشت میں گرجا۔

میں نے متحمل لہجے میں کہا'' تم یہ سوال کرنے کا حق کھو چکے ہو۔ عہد شکن لوگ گردن جھکا کر ندامت کا اظہار کرتے ہیں' یوں چلا کر استفسار نہیں کرتے۔ لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے!''

''میں تمہاری فضول بکواس نہیں سن سکتا۔'' وہ مجروح لہجے میں بولا'' مجھے فیصل کے بارے میں فوراً بتاؤ۔''

''تم اپنے بیٹے کو کھو چکے ہو چوہدری!...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' میں نے چٹانی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا'' اب تم بھی اس کی صورت نہیں دیکھ سکو گے۔ وہ زندہ رہے گا لیکن ہر لمحہ مرنے کی دعائیں مانگے گا۔ عہد شکنی کی بڑی سزا ہوتی ہے۔ چوہدری نوازش علی! تم نے اپنی ہوشیاری میں بیٹے کو ناقابلِ بیان مشکل میں ڈال دیا ہے۔''

''عہد شکنی تو تم نے بھی کی ہے!'' وہ زہر خند لہجے میں بولا'' ہمارے درمیان ہونے والے عہد کے مطابق ٹھیک سات بجے شام فیصل کو پارک کے اندر طے شدہ مقام پر ہونا چاہیے تھا!''

میں نے کہا'' وہ پارک کے اندر نہ سہی مگر پارک کے باہر ضرور موجود تھا اور یہ بات ثابت بھی ہو چکی ہے۔ تمہارے بندوں نے اسے مجھ سے چھیننے کی بھرپور کوشش کی لیکن میں نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی...... اور یہ بھی سن لو میں نے یہ احتیاط کیوں برتی تھی!''

''سنا دو'' وہ پھنکارا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' میں نے پارک میں داخل ہونے سے پہلے تمہیں فون کیا تھا۔ ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ تم نے فون بند کر دیا۔ میں نے دوبارہ تمہارا نمبر ملایا مگر تم نے ریسیور ہٹا کر فون انگیج کر دیا۔ تمہاری بدنیتی مجھ پر کھلی تو میں بدک گیا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا'' جب تم نے فون کے ساتھ وہ گندی حرکت کی' اس وقت ہمارے درمیان ساحل پر بات ہو رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تم ساحل کو میرے حوالے نہیں کرنا چاہتے بلکہ تمہارے ذہن میں کوئی اور خطرناک پلاننگ ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب تک ساحل کو اپنی آنکھوں سے پارک میں دیکھ نہیں لوں گا' فیصل کو اندر لانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ دیکھ لو چوہدری' میرا اندازہ کتنا درست نکلا؟ تم نے ساحل کو پارک میں پہنچانے کے سلسلے میں کوئی مثبت احکام نہیں دیے بلکہ فیصل کو مجھ سے چھیننے کے لیے تم نے پارک کے باہر اپنے خطرناک پالتو کتوں کا جال بچھا دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

دوسری جانب گمبھیر خاموشی طاری ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی اور شخص سے کھسر پھسر کر رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، اس نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

''اگر تم مجھ پر بے اعتمادی ظاہر کر رہے ہو تو میں کیسے یقین کر لوں کہ تم فیصل کو میرے بندوں کے حوالے کرنے کے لیے نیک نیت تھے۔ تمہارا جھوٹ تو اسی بات سے پکڑا جا رہا ہے کہ تم نے پارک کے اندر جا کر ساحل کو چیک کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری معلومات کے مطابق تم نے اس پارک کے اندر قدم بھی نہیں رکھا۔''

میں آج دوپہر کے بعد سے سہیل کے حلیے میں سرگرم عمل

تھا اسی لیے چوہدری کے آدمی مجھے پہچان نہیں پائے تھے۔ یہ ایک خوش کن خبر تھی البتہ گاڑی میں شہزاد کی بوکھلاہٹ نے فیصل پر میرا راز کھول دیا تھا۔ فی الحال یہ زیادہ تشویش کی بات نہیں تھی۔ فیصل جب تک ہماری تحویل میں تھا' گویا حلیے کی تبدیلی والا راز بھی میری مٹھی میں تھا۔

میں نے چوہدری کی بال پر ایک بھرپور شاٹ لگاتے ہوئے کہا "تمہاری معلومات انتہائی ناقص اور فرسودہ ہیں چوہدری! لگتا ہے تمہارے نیٹ ورک میں کام کرنے والوں کے لیے عقل کا اندھا اور بصیرت سے پیدل ہونا شرط ہے!"

مجھے یقین تھا' وہ اس "چوٹ" پر بلبلا اٹھا ہو گا۔ میں نے حملہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اوئے اندھوں میں کانا راجا! میں تو پورا وقت پارک میں موجود رہا ہوں۔ کیا تمہارے آدمی اس سیکیورٹی گارڈ کو نظر انداز کر گئے جو پارک کے گارڈز کی مخصوص یونیفارم میں تھا اور بیش تر وقت کچھوے کے سر کے اریب قریب ٹہلتا رہا تھا۔ میں نے پارک کے ایک گارڈ کو اغوا کر کے اس کی جگہ لے لی تھی۔" میرا اشارہ بنات خان کی طرف تھا اور چوہدری سے میں نے دانستہ یہ جھوٹ بالا تھا تاکہ وہ چکرا کر رہ جائے "تم اپنے آدمیوں سے پوچھنا' وہ تمہیں مذکورہ سیکیورٹی گارڈ کے بارے میں تفصیلاً بتائیں گے۔ میں تمہیں چند اشارے دیتا ہوں۔ تمہارے دو بندے کچھوے کے سر کے قریب ٹہل رہے تھے جن میں سے ایک نے نیلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جب کہ دوسرا سیاہ پتلون اور گرے شرٹ میں ملبوس تھا۔ انہوں نے ضرور اس سیکیورٹی گارڈ کو دیکھا ہو گا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔"

میرا یہ انکشافی بیان چوہدری کو چکرانے کے لیے کافی تھا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا "اگر تم کسی سیکیورٹی گارڈ کے بہروپ میں پارک میں موجود تھے تو پھر فیصل کو کس طرح بچا لے گئے؟"

اس کا سوال اہم تھا تاہم میں اسے کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے کہا "تم وہاں لاہور کے ایک نواحی گاؤں رکھاں والی میں بیٹھے ہو اور یہاں کراچی میں تمہارے سب کام ہو رہے ہیں۔ کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں کہ پارک میں رہوں اور پارک سے باہر میرے کام نہ ہوں؟"

وہ کسی بحث و تکرار میں پڑے بغیر مطلب کی بات پر آ گیا "مجھے فیصل کی آواز سناؤ۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم سے بڑا احمق اس دنیا میں نہیں ہو گا۔" میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا "اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی کیا تم یہ سمجھتے ہو میں فیصل سے تمہاری بات کرا دوں گا؟ کیا میں نے ایک مرتبہ بھی ساحل کے بارے میں بات کی؟ جو لوگ کے ہیجڑے ہوتے ہیں' میں ان کے ساتھ بڑا ہی سلوک کرتا ہوں۔ جھوٹی آن بان اور شان والے زنخے چوہدری میں تمہاری اصلیت کو نشر کر کے دم لوں گا۔ اے مردود! تمہیں اندازہ نہیں وجدان کس طوفان کا نام ہے!"

میرے الفاظ میں ایک سنگین دھمکی پوشیدہ تھی۔ اس نے پوچھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کچھ عرصے سے میں تمہارے پیچھے بھاگتا آیا ہوں۔ اب ر عمل شروع ہو گیا ہے۔ میں تم سے ساحل کے بارے سوال کروں گا اور نہ ہی مطالبہ۔ اسے اپنی حکمت عملی اور زور سے حاصل کر لوں گا۔ تم جیسے پشت دکھانے والے چوہدری سے کیا کلام کرنا لیکن......" میں نے دانستہ جملہ چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑ ہوئے کہا "آج کے بعد تم میری تلاش میں مارے مار پھرو گے کیوں کہ فیصل تک پہنچنے کے لیے تمہیں میری ضر ہو گی اور میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ اس کا م ہے' فیصل تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ تم اس کی ایک دیکھنے کے لیے رو رو کر بینائی کھو دو گے اور میری وجہ سے پے نقصانات اٹھاتے رہو گے۔ میں تمہیں' تمہاری چودھ اور تمہارے نیٹ ورک کو تار تار کر دوں گا۔ یہ وجدان کا وعد !"

"یہ مت بھولو کہ تمہاری ایک عزیز ترین ساتھی میری ......"

"اب اس بکواس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔" میں نے کی بات کاٹ کر کہا "جو ایک بار دھوکا کرے' وہ بار بار بھی ہے۔ تم میری نظر میں دنیا کے گھٹیا اور ذلیل ترین انسان میں نے کہا نا ساحل کو حاصل کرنا میری ذمے داری اسے کہیں بھی چھپا لو' میں اسے پاتال سے بھی کھینچ لاؤں

ایک مرتبہ پھر مجھے محسوس ہوا' وہ اپنے پاس موجود کسی سے مسکوٹ کر رہا ہو۔ میرے ذہن میں خدشہ پیدا ہوا کہ وہ مجھے ٹریس کروانے کی مہم میں نہ لگا ہو۔ میں نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خواہ مخواہ اس تگ و دو میں وقت برباد نہ کرو۔ وقت کراچی کے ایک معروف پبلشر کے گھر سے بات کر رہا ہوں اور فون رکھنے کے بعد یہاں سے نکل جاؤں گا۔ میں نے پہلے ہی ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دیا ہے۔ آئندہ

......باقر سے بھی کوئی رابطہ نہیں رکھوں گا۔ تم اس طرف کا رخ کر کے بھی کچھ حاصل نہیں کر سکو گے...... کچھ بھی نہیں!"

"وجدان! فون بند نہ کرنا۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا "میں فیصل کے سلسلے میں تم سے......"

"سلسلہ منقطع ہو چکا ہے چوہدری!"

"تم سنو تو......" وہ پھڑک اٹھا۔

"نو...... نیور...... ناٹ ایٹ آل!" میں نے حتمی لہجے میں فیصلہ سنا دیا۔

وہ ہکلایا۔ جذبات کی شکست و ریخت میں الفاظ زبان کا اور زبان الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی "تت...... تب...... تم......"

"وش یو بیڈ لک فار ایور!"

دوسری جانب وہ تو تلاتا ہی رہا۔ میں نے پوری سنگ دلی سے ریسیور کریڈل کر دیا۔

چوہدری جیسے زبان اور معاملات کے چوہے شخص سے مذاکرات کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اس سے لاتعلق رہ کر اسے زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اگر میں اس کے رابطے میں نہ رہتا اور اس کے نیٹ ورک کو مسلسل کچوکے لگاتا رہتا تو یہ اس کے لیے ناقابل برداشت اذیت ہوتی۔ وہ جھنجلاتا' کڑھتا اور رفتہ رفتہ نفسیاتی مریض بنتا چلا جاتا۔ اپنے دشمن کو یک مشت مارنے سے بہتر ہوتا ہے' اسے قسطوں میں ہلاک کرتے رہو۔ قطرہ قطرہ مل کر سمندر بن جاتا ہے۔ میں بھی چوہدری کو ہلکان کرنا چاہتا تھا حتیٰ کہ اس کی زبان نکل آتی اور وہ بے دم ہو کر منہ کے بل گرتا۔

تھوڑی دیر بعد منہاس باقر میرے پاس آ گیا اور سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے چوہدری سے ہونے والی اپنی گفتگو سے اسے آگاہ کیا تو وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"ویل ڈن!" پھر اس نے پوچھا "کیا تم واقعی اب چوہدری سے رابطہ نہیں کرو گے؟"

میں نے جواب دیا "فی الحال تو یہی فیصلہ کیا ہے۔"

"میں تمہارے فیصلے کو سراہتا ہوں۔" اس نے کہا "بلی چوہے والا یہ کھیل زیادہ دل چسپ اور سنسنی خیز ہو گا لیکن ایک بات مجھے الجھن میں ڈال رہی ہے!"

"کون سی بات؟" میں نے استفسار کیا۔

"مجھ سے رابطہ بہ حال نہ رکھنے والی بات!" اس نے بتایا۔

"وہ تو میں نے چوہدری کو گم راہ کرنے کے لیے کہا تھا!"

"وہ تو پہلے ہی کچھ کم گمراہ ہے؟"

منہاس کی اس بات پر مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ ایک سنجیدہ طبع شخص تھا اور ہنسی مذاق کی بات بہت کم ہی اس کی زبان سے سننے میں آتی تھی لہٰذا میرا حیران ہونا فطری بات تھی۔ میں نے اس تبصرے پر محظوظ ہوتے ہوئے منہاس باقر سے پوچھا۔

"آپ نے کیا بندوبست کیا ہے فیصل کے سلسلے میں؟"

"بہت ہی جان دار انتظام کر کے آ رہا ہوں بھئی۔" وہ اپنی مخصوص سنجیدگی سے بولا "ہم چوہدری لمڈے کو ایسی جگہ شفٹ کریں گے جدھر بھولے بھٹکے سے بھی دشمنوں کا دھیان نہیں جا سکتا!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "ایسی جگہ کون سی ہو سکتی ہے جناب؟"

"وہی بنگلا جہاں فیصل کو آج شام تک رکھا گیا تھا!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب؟"

"تم کیوں الجھ رہے ہو؟"

منہاس باقر مختصر سا جملہ بول کر چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے بالکل درست کہا تھا' بنگلے والی بات پر میں واقعی الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ بات ہی ایسی تھی۔ کچھ پوچھنے کے بجائے میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے ابھی بختیار کاٹل سے بات کی ہے۔ اس نے مجھے رپورٹ دی ہے کہ پولیس نے اس نامکمل بنگلے پر پہنچ کر کارروائی مکمل کر لی ہے۔ تمہارے بیان کے مطابق وہاں تین لاشیں دو زخمی اور ایک شخص بے ہوش پڑا تھا لیکن پولیس نے وہاں سے پانچ لاشیں برآمد کی ہیں۔ بے ہوش شخص وہاں کہیں نہیں پایا گیا۔ اسی طرح بنگلے کے باہر بھی عقب میں وہ رینج روور دکھائی نہیں دی۔ صرف وہاں "جی ٹو او" ون ٹو فائیو کھڑی ملی ہے اور......"

میں نے منہاس کی بات کاٹتے ہوئے ہیجانی لہجے میں کہا "اس کا مطلب ہے' بے ہوش شخص کو خلافِ توقع قبل از وقت ہوش آ گیا تھا اور وہ باس نما دراز قامت اپنے دو شدید زخمی ساتھیوں کو شوٹ کرنے کے بعد رینج روور میں وہاں سے فرار ہو گیا ہے؟"

"ایگزیکٹلی!" منہاس باقر نے کہا "یہی بات قرین قیاس ہے۔"

میں نے کہا "جناب! یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اگر وہ دراز قامت بے ہوش شخص پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو ہماری پوزیشن زیادہ صاف رہتی۔ اب پتا نہیں پولیس والے ان پانچ لاشوں سے کیا مطلب اخذ کریں۔"

"ہماری پوزیشن اس صورت میں بھی بہت صاف ہے

وجدان!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا ''میں نے بختیار کامل سے رپورٹ لینے کے بعد متعلقہ تھانے بھی فون کیا ہے۔ اس معاملے کی تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر سے میری بات ہوچکی ہے۔ اس کا کہنا ہے دو مخالف مجرمانہ گروہ اس بنگلے میں ٹکرائے ہیں۔ ہم کسی بھی طور اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھے جارہے۔ بے ہوش شخص کے غائب ہونے سے اس لیے بھی فرق نہیں پڑتا کہ وہاں کی دیواریں اور چھت ہماری غیر متعلقی کی گواہی دے رہی ہیں۔ ان مقامات پر فائرنگ نے اپنے ان مٹ اور بین ثبوت چھوڑے ہیں اس لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''اوہ!'' میں نے ایک مطمئن سانس خارج کی ''یہ بہت اچھا ہوا!'' پھر میں نے پوچھا ''کیا پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد بنگلا ہمارے تصرف میں دے دیا ہے؟''

''ان کا تو لمبا چوڑا پروگرام تھا۔'' منہاس باقر نے بتایا۔ ''لیکن میں نے اپنے تعلقات اور صحافتی حوالہ استعمال کیا۔ وہ لوگ کل فائنل وزٹ کریں گے۔ میرا خیال ہے دوپہر کے بعد ہمیں اس بنگلے کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کی اجازت مل جائے گی۔''

''اس کا مطلب ہے کل شام تک ہی فیصل کو وہاں شفٹ کیا جاسکتا ہے!''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا ''لیکن اس مرتبہ وہاں زیادہ رش نہیں لگایا جائے گا۔ فیصل کے لیے کوئی ایک نگران کافی ہوگا۔ تم جلد از جلد اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرلو۔ بہر حال اسے زیادہ عرصے کے لیے اس طرح قید و بند میں نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ تمہارا شکار ہے۔ اس کے مستقبل کا فیصلہ بھی تم ہی کروگے!''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''میں دو چار روز میں اس کی قسمت کا فیصلہ کرلوں گا۔ ذرا میں جے ڈی ملک اور غلام جیلانی کی ''خیر و عافیت'' جان لوں۔''

''جتنی جلدی ممکن ہوسکے' فیصل والے معاملے کو نمٹالو۔'' منہاس نے کہا ''تمہارے سر کرنے کے لیے ابھی بہت سے پہاڑ باقی ہیں۔''

''فیصل کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے لیے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہی ضروری ہے۔'' میں نے کہا ''چوہدری نوازش نے مجھ سے جتنا بڑا دھوکا کیا ہے اس کا ایک خطرناک پس منظر ضرور ہے۔ میں اس پس منظر کو جاننا چاہتا ہوں۔ اگر ساحل کو میرے حوالے کیے بغیر فیصل کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی گئی ہے تو اس کا یہی مطلب ہے انہوں نے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ بہت کچھ طے کر رکھا ہے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''چوہدری نوازش ہو یا شعیب غوری ان لوگوں کا نیٹ ورک بہت فعال ہے۔ اس نیٹ ورک کے کرتا دھرتا لوگوں سے کچھ بعید نہیں۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا ''منہاس صاحب! آپ کے دفتری استعمال والی گرین ہائی روف شام والے معرکے میں بڑی سرگرم رہی ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ چیزنگ میں تھوڑے وقفے کے لیے ایک پولیس موبائل بھی شامل رہی ہے۔ ممکن ہے ہماری ہائی روف کا نمبر وغیرہ پولیس کے ریکارڈ پر آچکا ہو۔ لہٰذا کچھ عرصے کے لیے اس گاڑی کو منظرِ عام پر نہیں آنا چاہیے۔ مجھے خدشہ ہے' کہیں پولیس والے بنگلے پر ہونے والی چاند ماری کو اس کار چیزنگ سے منسلک نہ کردیں۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''اگر ایسا ہوا تو گرین ہائی روف ہمارے لیے مشکلات کھڑی کرسکتی ہے!''

''تمہاری بات میں وزن ہے لیکن یہ بھی تو سوچو! اگر واقعی ہماری گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا گیا ہے تو اس نمبر کے ذریعے بھی ہمارا سراغ لگایا جاسکتا ہے بہر حال۔'' وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا ''میں چند روز کے لیے گرین ہائی روف کو منظر سے ہٹادوں گا۔ ویسے بھی اس میں خاصی ٹوٹ پھوٹ ہوچکی ہے۔ اسے بھرپور آرام اور ماہرانہ مرمت کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی......'' وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''میں سہیل کو کچھ عرصے کے لیے چھٹی دے رہا ہوں تاکہ تم اس کے روپ میں آزادانہ گھوم پھر سکو۔ اس نے پچھلے دنوں مجھ سے چھٹی کے لیے کہا بھی تھا۔''

پھر منہاس باقر نے بتایا کہ سہیل کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ اس کے والدین وہاں رہتے تھے البتہ فیملی کے بہت سے لوگ کراچی میں بھی سیٹل تھے۔ اس ہنگامی ملاقات کے اختتام پر میں نے کہا۔

''اس وقت فیصل آپ کے بنگلے کے ایک باتھ روم میں بند ہے۔ کیا کل دوپہر یا شام تک وہ یہیں رہے گا؟''

''مجبوری ہے!'' اس نے کندھے اچکائے ''نامکمل کی کلیئرنس کے بعد ہی اسے وہاں منتقل کیا جاسکتا ہے۔'' پھر گمبھیر لہجے میں بولا ''فیصل والا معاملہ ابھی تک میری فیملی کے علم میں نہیں آیا۔ اگر گھر کے افراد میں سے کسی کو معلوم ہو گیا کہ گھر میں ایک شخص کو ہتھ کڑی لگا کر باتھ روم میں بند کیا گیا ہے تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ میں سوچ رہا ہوں......''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں اس کی پریشانی کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا۔ فیصل کو بنگلے کے اندر قید رکھنے والا معاملہ واقعی بہت نازک تھا۔ منہاس نے میری دوستی میں کہہ تو دیا تھا کہ کل شام تک فیصل کو یہیں رکھیں گے لیکن تکنیکی طور پر یہ درست نہیں تھا۔

میں نے اس کی مشکل آسان کرنے کی خاطر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''منہاس صاحب! ایسا کرتے ہیں' فیصل کو کورنگی شفٹ کردیتے ہیں۔ کل شام کو اسے بنگلے پر منتقل کردیا جائے گا۔''

''کورنگی کیوں اور کس جگہ؟'' اس نے سوال کیا

میں نے بھٹائی کالونی کے آخری حصے میں واقع شہزاد کے خفیہ ٹھکانے کا ذکر کیا اور کہا ''ہم گزشتہ رات پوچھ گچھ کے لیے فواد کو وہیں لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ شہزاد کے پاس سرجانی ٹاؤن میں بھی ایک ایسی ہی محفوظ جگہ ہے' بس ایک رات...... بلکہ آدھی رات اور آدھے دن کی بات ہے۔'' فواد والا واقعہ اس کے علم میں تھا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''شہزاد خاصا چلتا پُرزہ قسم کا بندہ ہے۔ میں نے اسی لیے اسے تمہارے ساتھ لگایا تھا۔'' وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا ''سرجانی ٹاؤن تو شہر کو دوسرا کنارہ ہے۔ اس وقت ہم ڈسٹرکٹ ساؤتھ کے اختتام پر بیٹھے ہے البتہ بھٹائی کالونی یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ ادھر کا رخ کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں شہزاد سے بات کرتا ہوں۔''

پھر اگلے ہی لمحے اس نے شہزاد کو بھی وہیں بلالیا۔ اور اس مسئلے پر تبادلہ خیال ہوا جس کے نتیجے میں یہی طے پایا کہ فیصل کو سردست بھٹائی کالونی والے ٹھکانے پر منتقل کردیتے ہیں اور اس کی نگرانی کے لیے شہزاد خود وہاں موجود رہے گا۔ واضح رہے کہ اس وقت آج کل کی طرح بھٹائی کالونی میں اس قدر وسعت نہیں آئی تھی...... اور شہزاد کا وہ خفیہ ٹھکانا آبادی سے خاصے فاصلے پر سمندر کے نزدیک تھا۔

فیصل والا معاملہ طے پاگیا تو منہاس باقر نے مجھ سے پوچھا ''تم تو یہ رات یہیں گزاروگے نا؟''

اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ شہزاد فیصل کو تھوڑا کھلانے پلانے کی غرض سے وہاں سے ہٹ گیا تھا۔ فیصل کا بایاں کندھا شدید زخمی تھا۔ میرے اندازے کے مطابق گولی گوشت کے اندر تھی۔ گولی کو برآمد کرنے کے بعد مناسب ٹریٹ منٹ ضروری تھا ورنہ خطرناک نتائج کا سامنا ہوسکتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی میں نے شہزاد کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں۔ فیصل کی ''تیمارداری'' کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پیش آسکتی تھی' وہ میں نے اسے بتادیں۔ وہ لاکھ دشمن سہی اور کروڑ دشمن کا بیٹا سہی لیکن جب تک وہ میری کسٹڈی میں تھا' انسان ہونے کے ناتے اس کی انتہائی ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض بنتا تھا۔

سوال کرنے کے بعد منہاس جواب طلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ''میری تو یہ خواہش ہے' میں طارق روڈ والے فلیٹ پر چلا جاؤں۔''

''میں تمہاری خواہش کے راستے میں دیوار نہیں بنوں گا۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔

''میں تو یہ بات اس لیے پوچھ رہا تھا کہ وہ بہت بے چین ہورہی ہے۔ دو تین مرتبہ وہ تمہارے بارے میں مجھ سے استفسار کرچکی ہے۔''

''وہ کون؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''میں زرگل کی بات کررہا ہوں۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کرکے رہ گیا۔

زرگل آج شام منہاس باقر کی فیملی کے ساتھ ولیمہ کی تقریب میں شرکت کے لیے حیدرآباد گئی تھی اور جب سے یہ لوگ واپس آئے تھے میری اس سے ملاقات نہیں ہوسکی زرگل کی بے قراری بے جا اور برمحل تھی۔ وہ میری مہم کے بارے میں جاننے کے لیے بھی مضطرب ہوگی۔

منہاس نے مزید کہا ''اگر آپ لوگ یہاں رکنا چاہتے ہوں تو میں آپ دونوں کے لیے شب بسری کا الگ بندوبست کرواتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے' ہمارا فلیٹ پر جانا ہی زیادہ مناسب ہوگا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''لیکن جب تک میں فیصل کو بھٹائی کالونی والے ٹھکانے پر چھوڑ نہیں آتا' زرگل یہیں رہے گی۔ واپسی میں' میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

منہاس باقر نے میری بات سے اتفاق کیا پھر ضروری امور نمٹانے کے لیے ہم اپنی اپنی جگہ پر مصروف ہوگئے۔

گرین ہائی روف کو فی الحال باہر نکالنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لائٹ گرین ہونڈا سوک ہم نامکمل بنگلے پر چھوڑ آئے تھے البتہ معلوم کرنے پر مجھے پتا چلا کہ ییلو ہنڈائی یہیں بنگلے پر موجود تھی۔ فیصل کی منتقلی کے لیے ٹیکسی نما اس گاڑی کو استعمال کرنا زیادہ مناسب اور محفوظ تھا۔

ٹھیک دو بجے رات...... ہم منہاس باقر کے بنگلے سے روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شہزاد موجود تھا۔ میں فیصل

کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ فیصل کو کنٹرول کرنے کے لیے نیند کا انجیکشن دے دیا گیا تھا۔ اس سے قبل اسے تھوڑا کھلا پلا بھی دیا۔ ہم نے بھی چند لقمے ڈنر کے نام پر اپنے معدوں میں اتار لیے تھے۔ فیصل کی آنکھوں پر پٹی باندھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ وہ آنکھیں موندے خاموش بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی گردن کو نشست کی پشت گاہ سے ٹکانے کے بعد اس کے کندھے پر اپنا بازو چڑھا دیا تاکہ دور سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو کہ ہم بے تکلفی سے بیٹھے ہیں۔ کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے شہزاد نے ایک لوڈڈ کلاشنکوف اور ایک پستول بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ ازیں علاوہ ہلکی سرجری اور مرہم پٹی کا ضروری سامان بھی ہم ساتھ لے آئے۔ فیصل کے کندھے میں سے گولی نکالنا بے حد ضروری تھا۔

ییلو ہنڈائی نے بھی کیا قسمت پائی تھی۔ وہ جب سے میرے تصرف میں آئی' اس کے ''نصیب'' کھل گئے۔ پہلے ہم نے اسے استعمال کرتے ہوئے کرم اپارٹمنٹس میں فواد والا معاملہ نمٹایا۔ بعد ازاں اسی گاڑی میں فواد کو بھٹائی کالونی والے ٹھکانے پر لے جایا گیا اور اب...... فیصل بھی اس پیلی سواری کی مسافرت کا لطف اٹھا رہا تھا۔

اس سفر کے دوران میں میرا ذہن برق رفتاری سے ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں امید کر رہا تھا کہ آج کی رات ہم دونوں ایک ہی چھت کے نیچے گزاریں گے۔ گزشتہ چند روز ہم نے جس کرب ناک ہجر میں گزارے تھے وہ کئی صدیوں پر بھاری تھے۔ جدائی میں بیتے ہوئے ایک ایک لمحے کو میں شمار کرنا چاہتا تھا' وصل کی گھڑیوں میں یک ٹک میں ساحل کا دیدار کرنا چاہتا تھا لیکن سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا...... چوہدری کی دغابازی نے میری امید اور آس پر پانی پھیر دیا۔ یہ ایک ایسی شکست تھی جس کا داغ میں چوہدری کے خون سے دھونا چاہتا تھا' چاہے وہ خون فیصل کی ہی شکل میں کیوں نہ ہو۔ چوہدری نوازش علی نے یہ شکست بیٹے کو داؤ پر لگا کر میرے حصے میں ڈالی تھی' گویا فیصل کی بھینٹ چڑھا کر اس نے مجھے توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دنیا میں ایسے باپ بھی ہوتے ہیں جو اپنی اولاد کو فیصل کی طرح داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت تھی اور آنکھوں دیکھے اس المیے کو جھٹلانا ممکن نہیں تھا۔

ہم کسی بدمزگی کے بغیر شہزاد کے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ گزشتہ رات بھی دو بجے کے بعد ہی ہم یہاں آئے تھے۔ فواد نے اس ٹھکانے پر نہایت ہی اہم راز اگلے تھے۔ ایسٹ کے باس سراج الدین اور غلام جیلانی کا تعلق میرے لیے بہت معلومات افزا تھا' پھر شاز لیکن بھی ایک دلچسپ اور سنسنی خیز کردار ثابت ہونے والی تھی۔

ایک سو بیس گز رقبے پر مشتمل شہزاد کے اس ٹھکانے میں صرف ایک ہی کمرا بنا ہوا تھا جس میں ایک سنگل بیڈ' دو کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ بیڈ کے نیچے ایک پرانا سا صندوق بھی موجود تھا۔ اس صندوق کو دیکھ کر میں نے اندازہ قائم کیا تھا کہ اس کے اندر ٹارچر کا سامان ہوگا۔ گزشتہ رات اس صندوق کو کھولنے کی نوبت نہیں آئی تھی مگر آج سب سے پہلے شہزاد نے اسی صندوق کو کھولا۔

صندوق کسی پنڈورا بکس سے کم نہیں تھا۔ شہزاد نے اس کے اندر سے ایک طویل آہنی زنجیر برآمد کی اور فیصل پر مختلف آہنی پابندیاں عائد کرنے کے لیے مختلف کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔ اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچتے ہی ہم نے فیصل کو بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھا۔ چند لمحات کے بعد فیصل کو آہنی بندشوں سے آراستہ کرنے کے بعد اس بیڈ تک محدود کر دیا گیا۔ پھر میں اس کے زخمی کندھے کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

فرسٹ ایڈ اور مائنر سرجری کا سامان ہم بنگلے سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس بات کی تصدیق ہونے کے بعد کہ گولی فیصل کے جسم میں موجود ہے' شہزاد کی تشویش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

''وجدان! گولی نکالنے سے پہلے اسے نیند کا ایک اور انجکشن نہ دے دیں؟'' وہ فیصل کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا ''سرجری کے دوران اسے بے پناہ تکلیف ہوگی' اس کی نیند ٹوٹ جانا لازمی ہے۔ پھر یہ جس طرح ڈکرائے گا وہ ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے!''

میں نے فرسٹ ایڈ کٹ کھول کر اس کے اندر نگاہ دوڑائی پھر مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''مزید کسی انجکشن کی ضرورت نہیں۔ اسے بہت زیادہ گہری نیند میں پہنچانا بھی خطرناک ہوگا۔ اس کی تکلیف کا بندوبست میں لوکل سے کر لوں گا۔''

''لوکل؟'' شہزاد نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''لگتا ہے میڈیکل کے بارے میں تمہاری معلومات زیادہ نہیں ہے!'' پھر میں نے اسے زائلوکین انجکشن کی وائل دکھاتے ہوئے کہا ''اس شیشی میں گوشت کو سُن کرنے کی دوا ہے۔ میں فیصل کے کندھے کے متاثرہ حصے کو اس انجکشن کی مدد سے سُن کر دوں گا یعنی لوکل کر دوں گا' پھر سرجری

کے دوران اسے تکلیف کا احساس نہیں ہوگا۔''

''اوہ!'' اس نے ایک متاسفانہ سانس خارج کی ''تم تو ایک مستند ڈاکٹر کی طرح مجھے اس عمل کے بارے میں بتا رہے ہو۔ کیا تم میڈیکل کے اسٹوڈنٹ بھی رہ چکے ہو؟''

''باقاعدہ نہیں بلکہ بے قاعدہ!''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکا۔

میں اس گفتگو کے دوران میں اپنا کام بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ شہزاد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''میں نے باقاعدہ کسی میڈیکل انسٹیٹیوٹ سے یہ تعلیم حاصل نہیں کی لیکن میرے حلقہ احباب میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ڈاکٹر ضرور رہا ہے۔ ان لوگوں کی صحبت نے مجھے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا ہے۔''

اس نے اچانک پوچھا ''ان دنوں تم کس ڈاکٹر سے وابستہ ہو؟''

''ڈاکٹر صدف!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''صدف...... میں نے تو اس نام کی کوئی لڑکی تمہارے آس پاس نہیں دیکھی!''

میں نے اسے صدف کے بارے میں کچھ تفصیل بتائی پھر فیصل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ شخص صدف ہی کی مہربانی سے میرے ہتھے چڑھا ہے۔''

اس کے بعد میں نے شہزاد کو صدف کے عسکری فن کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری بات سنتا رہا پھر جوشیلے لہجے میں بولا ''میرے اندر صدف سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے۔''

''انسان کے اندر اگر کسی شے کا شوق پیدا ہو جائے تو پھر وہ جلد یا بدیر اپنے مقصد کو حاصل بھی کر لیتا ہے۔'' میں نے اپنے ہاتھوں کو مصروف رکھتے ہوئے کہا ''انشاء اللہ بہت جلد تم صدف سے ملاقات کرو گے۔''

یہ بات میں نے بے دھیانی میں ایسے ہی کہہ دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا' مستقبل میں' میں صدف سے کب اور کہاں ملوں گا۔ صدف کے تذکرے نے میرے ذہن میں اس کے خیال کو اجاگر کر دیا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی جھونکے کی طرح آئے اور گزر جائے۔ وہ بڑی جاذب اور تاثر انگیز شخصیت کی مالک تھی۔ ذہن میں اس کا تصور روشن ہوا تو پھر اس کی باتیں اور گھاتیں یاد آنے لگیں۔ اگر وہ اس موقع پر یہاں موجود ہوتی تو مجھے کسی ماہر سرجن کی طرح کام کرتے دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتی' پھر میرے لیے جواب دہی مشکل ہو جاتی کہ میں نے فن یہ کہاں سے حاصل کیا ہے! وہ شہزاد کی طرح آسانی سے مطمئن نہ ہوتی۔ اس کی تسلی کے لیے مجھے خاصی کرتب بازی کا مظاہرہ کرنا پڑتا۔ جمناسٹک کی کرتب بازیوں نے اس کے دماغ کو الٹا سیدھا کر دیا تھا۔ اسے قائل کرتے ہوئے ذہن کی چولیں ہل جاتیں!

بیس منٹ کی حساس کوشش کے بعد میں نے فیصل کے زخمی کندھے کی سرجری کر ڈالی۔ اندر دھنسی گولی کو میں نے بڑی احتیاط سے باہر نکال لیا۔ ابتدائی معائنے سے مجھے اندازہ ہو گیا' جوڑ کی ہڈی کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ زخم کو اچھی طرح صاف کرنے کے بعد میں نے اسٹیچ لگائے اور ڈریسنگ کر دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے فیصل کو ایک پین کلر انجکشن بھی دے دیا۔ تاکہ ہوش میں آنے کے بعد وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہ کرے۔

''اب میں چلوں گا شہزاد!'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔'' اس نے پر اعتماد لہجے میں کہا ''کل دوپہر سے پہلے اس طرف چکر لگا لینا۔ یہاں فون کی سہولت میسر نہیں اور میں فیصل کو تنہا چھوڑ کر باہر سے کال کرنے کا رسک نہیں لے سکتا۔''

میں نے کہا ''میں ییلو ہنڈائی اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ کل صبح تم سے ملاقات ہوگی۔ اس ٹھکانے کے بارے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا لہٰذا مجھے ہی تمہارے پاس آنا ہوگا۔ یہ رات تم جیسے تیسے اس ''مریض'' کے ساتھ یہاں گزار لو۔''

وہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ میں نے لوڈڈ کلاشن کوف اس کے حوالے کر دی اور کہا ''مجھ سے زیادہ تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔''

اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا پھر میں اس ٹھکانے سے رخصت ہو گیا۔ شہزاد پچھلے کچھ دنوں سے میرے تجربے میں تھا اور میں نے اسے قابل بھروسا پایا تھا لہٰذا فیصل کے سلسلے میں اس پر اعتماد کرنا قباحت آمیز نہیں تھا۔

لگ بھگ تین بجے میں منہاس باقر کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اس کے سوا گھر کے باقی افراد سو چکے تھے۔ میں نے اسے فیصل کے تازہ ترین حالات کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کیا تو وہ مجھے ایک الگ تھلگ کمرے میں لے آیا اور بولا ''تمہاری ساتھی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کئی مرتبہ پوچھ چکی ہے۔ کہو تو اسے یہاں بلا لوں تمہیں دیکھ کر اس کی تسلی ہو جائے گی!''

میں نے کہا ”کیا آپ نے زرگل کو میرے بدلے ہوئے حلیے کے بارے میں بتا دیا ہے؟“

”اوہ!“ وہ چونکا ”اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ تم تو اس وقت سہیل کے میک اپ میں ہو۔ وہ تمہیں دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔ کیا تم میک اپ صاف کرنے کے بعد اس کے سامنے آنا چاہتے ہو؟“

میں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا ”میں فی الحال حلیہ تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس میک اپ میں رہتے ہوئے مجھے موو کرنے میں زیادہ مزہ آئے گا۔ آپ اور سہیل کے سوا کوئی اس راز سے واقف نہیں کہ سہیل کے بہروپ میں وجدان چھپا بیٹھا ہے...... یا پھر فیصل پر یہ راز عیاں ہو چکا ہے۔ وہ جب تک ہماری کسٹڈی میں ہے' فکر کی کوئی بات نہیں بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ابھی تو میں نے آپ کے میک اپ ماسٹر نسیم جوہر سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”آپ زرگل کو یہاں لے آئیں' دیکھتے ہیں' وہ کیا ردعمل ظاہر کرتی ہے!“

چند لمحات کے بعد زرگل میری نظر کے سامنے آ گئی۔ منہاس اسے مجھ سے ملوانے کا کہہ کر لایا ہوگا جبھی وہ الجھن زدہ انداز میں کبھی مجھے اور کبھی منہاس باقر کو تک رہی تھی۔ میں نے اس کے استعجاب کو ختم کرنے کی خاطر کہا۔

”بیٹھ جاؤ زرگل! یہ میں ہی ہوں...... وجدان!“

آواز کی مانوسیت سے اس کا چہرہ کھل اٹھا' تحیر آمیز آواز میں اس نے کہا ”یہ...... یہ تم نے اپنے حلیے کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”جو بھی کیا ہے' کیسا ہے؟“ میں نے استفسار کیا ”تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

”ونڈرفل!“ اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا ”اگر تم آواز بدل کر بولتے تو یقین جانو میں تمہیں پہچان نہ پاتی۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے ایسے حربے آزمانا پڑتے ہیں۔ اب میں دوسروں کے لیے سہیل ہوں مگر اپنوں کے لیے وجدان ہی ہوں۔ تم اس فرق کو ذہن میں نقش کر لو۔“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ”دشمنوں کے ذکر پر یاد آیا کہ تم آج شام چوہدری نوازش علی سے ایک بہت بڑی ڈیل کرنے والے تھے۔ اس کا کیا بنا؟“

میں نے کہا ”اس کے بارے میں' میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔“

وہ باز نہ آئی اور پوچھ بیٹھی ”تمہارے لہجے سے جو شکستگی جھلک رہی ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے' ساحل معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

زرگل نے میرے چہرے کو بڑے واضح انداز میں لیا تھا۔ ساحل کا قصہ اب اس سے ڈھکا چھپا نہیں رہا تھا۔ باتیں میں نے اسے بتائی تھیں اور بہت سی اس نے حالات واقعات سے اخذ کر لی تھیں۔ زرگل کا شمار میرے ساتھیوں میں ہونے لگا تھا لہٰذا اسے کوئی چکر دینا مناسب نہیں تھا۔

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”تم اندازہ بالکل درست ہے!“

اس سے پہلے کہ زرگل اس سلسلے میں مزید کوئی کرتی' منہاس باقر نے کہا ”وجدان' اگر تم نے جانے کا کر ہی لیا ہے تو پھر دیر نہ کرو۔ رات کا بہت کم حصہ باقی ہے' تمہیں سونا بھی ہوگا!“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہا ”ییلو ہنڈائی کے علاوہ کوئی گاڑی مل جائے تو زیادہ اچھا ہوگا۔“ پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اور ہاں...... کل آپ مجھے ایک نئی گاڑی دلوائیں گے!“

”میں تمہارا مقصد سمجھ رہا ہوں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ”تم میرے ذاتی استعمال والی سفید ٹیوٹا لے جاؤ۔ میں ییلو ہنڈائی میں دفتر چلا جاؤں گا۔“

منہاس باقر علی الصباح اپنے اخبار کے دفتر جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس کے بنگلے سے رخصت ہو کر طارق روڈ والے فلیٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے بھر زرگل ولیمے کی تقریب کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ ابھی تک ڈریس ہی میں تھی اور ہلکی پھلکی جیولری کے ساتھ وہ کسی اور دیس کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس کے حسن اور جوانی میں کلام نہیں تھا۔ سلیقے کے بناؤ سنگار نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ صحیح معنوں میں اس پر نظر نہیں ٹک رہی تھی۔ اگر اور موقع ہوتا تو اس کے ساتھ بھرپور دل لگی کی جا سکتی تھی لیکن اس وقت میرا دل بہت بوجھل تھا اس لیے ”ہوں' ہاں“ کرتا رہ گیا۔

اس نے جلد ہی میری کیفیت کو بھانپ لیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی ”سوری وجدان! میں پتا نہیں کہاں کا ذکر لے بیٹھی۔ مجھے تمہارا خیال کرنا چاہیے۔“

آخری جملہ اس نے بڑی محبت اور خلوص سے ادا کیا۔

میں خاموش رہا تو وہ شام والے واقعے کے بارے میں کریدنے لگی۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور محتاط الفاظ میں اسے وہ روداد سنا دی۔ یہ حقیقت جاننے کے بعد وہ خاصی افسردہ ہو گئی۔

باقی کا سفر خاموشی میں طے ہوا۔ میں کچھ بولا اور نہ ہی زرگل نے کوئی بات کی۔ گاڑی کے اندر مضمحل سکوت طاری رہا۔ اس جذبات شکن فضا میں سفر کرتے ہوئے ہم فلیٹ پر پہنچ گئے۔ جب ہم نے فلیٹ کے اندر قدم رکھا تو رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔

آج کا پورا دن ہنگامہ خیز گزرا تھا اور ایک لمحے کو بھی آرام نہیں ملا تھا۔ میدان عمل میں آگے بڑھنے کے لیے تھوڑا آرام ناگزیر تھا۔ لباس تبدیل کیے بغیر میں نے زرگل سے کہا۔

”مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔ تم بھی سونے کی کوشش کرو۔ باقی باتیں صبح ہوں گی۔“

”اگر تم فریش اپ ہو جاتے تو اچھا تھا!“ وہ یک ٹک مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

زرگل نے یہ جملہ بڑی اپنائیت سے ادا کیا تھا۔ میں پلٹ کر سنجیدگی سے اسے تکنے لگا۔ وہ بھی اس وقت براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر تک مجھ سے نگاہ نہ ملا سکی اور متذبذب لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی۔

”کل رات تم نے مجھے سلایا تھا۔ آج یہ فریضہ میں ادا کروں گی۔“

پھر میرا جواب سنے بغیر وہ دوسرے بیڈ روم میں چلی گئی۔ مجھے اس کی اس ادا پر حیرت ہوئی گزشتہ رات وہ بڑی ڈری سہمی تھی لیکن آج خاصے اعتماد کا مظاہرہ کرتی نظر آ رہی تھی۔ میں چپ چاپ واش روم میں گھس گیا۔ مجھے یقین تھا' وہ بھی اس وقت دوسرے بیڈ روم میں فریش ہو رہی تھی!

پندرہ منٹ بعد میں جب لباس تبدیل کر کے اور تر و تازہ ہو کر بیڈ روم میں نمودار ہوا تو زرگل پہلے سے وہاں موجود تھی۔ اس کے شہابی بدن پر مجھے گلابی نائٹی نظر آئی۔ آج دوپہر میں' میں نے طارق روڈ سے اسے بھرپور شاپنگ کرائی تھی' یہ نائٹی اسی شاپنگ کا ایک حصہ تھی۔

زرگل ایک دراز قامت اور گوری چٹی پشتون دوشیزہ تھی۔ گلابی رنگ اس کے حسن میں چار چاند لگا دیتا تھا۔ لاہور میں فرید پاشا کے بنگلے پر جب اس نے نائلہ کا گلابی لباس زیب تن کیا تھا تو میں اس کے حسن سے نظر چرا کر زیریں منزل پر اتر آیا تھا۔ اس وقت بھی گلابی نائٹی میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ گزشتہ رات والا ڈر' خوف اور اندیشہ ہائے دور دراز کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کی جون بدل گئی ہو۔

وہ بیڈ کے ایک کنارے پر بیٹھی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے معنی خیز نظر سے اسے دیکھا۔ اس کے لبوں پر بڑی شیریں مسکراہٹ کھیل رہی تھی' آنکھوں میں ان گنت طلسماتی کہانیوں کا نشہ تھا۔ میں زیادہ دیر اس سے نگاہ نہ ملا سکا اور اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متلاطم لہجے میں پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”کوکونٹ آئل ہے۔“ وہ دل آویز انداز میں بولی پھر ہاتھ میں موجود نیلے رنگ کی ایک چھوٹی بوتل کو مجھے دکھاتے ہوئے کہا ”یہ واش روم کے کیبنٹ میں رکھی تھی۔ میں اٹھا لائی ہوں۔“

میں نے اچنبھے انداز میں اسے دیکھا۔ رات کے آخری پہر زرگل مجھے کسی معمے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ شاید یہ اس کا رعب حسن تھا جو میری قوت مشاہدہ کو مفلوج کر رہا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا' اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا اور جو کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اسے بیان کرنا آسان نہیں تھا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ زرگل نائٹی میں جھلک رہی تھی یا وہ نائٹی اس گل بدن پر چھلک رہی تھی۔

میں نے اس کے ملکوتی سراپا سے توجہ ہٹانے کے لیے سر کو جھٹکا اور قدرے مضبوط لہجے میں پوچھا ”کیبنٹ میں رکھی تھی تو رکھی رہنے دیتیں' یہاں کیوں اٹھا لائی ہو؟“

زرگل بڑے دل کش انداز میں ہنسی۔ اس کی ہنسی میں بڑی معصومیت تھی۔ پھر اس کی سریلی آواز میری سماعت میں رس گھولنے لگی ”وجدان! تمہاری طرح مجھے کوئی تنویمی عمل تو آتا نہیں۔ میں اس آئل سے تمہارے سر میں مساج کروں گی۔ دیکھنا تم کتنی جلدی نیند کی حسین وادی میں اتر جاؤ گے۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ میں سبک خرامی سے بیڈ پر آ گیا ”تم نے میرے سلوک کو قرض سمجھا ہے...... اور اس قرض کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر واپس لوٹانا چاہتی ہو۔ اس کا مطلب ہے' میں نے جو کچھ سنا تھا' ٹھیک ہی سنا تھا!“

وہ بستر پر بیٹھے ہوئے بولی ”تم نے کیا سنا تھا؟“

”یہی کہ تم لوگ قرض کی وصولی اور ادائی میں بہت اصول پابند ہوتے ہو!“

”کیا یہ کوئی غلط بات ہے؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال

کر ڈالا۔

میں نے روا روی میں کہہ دیا ”نہیں ایسا کچھ غلط بھی نہیں ہے۔“

”وجدان!“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی ”میرے اس فعل میں روایتی اصول اور ضابطے کا کوئی دخل نہیں۔ یہ نہ کوئی بدلہ ہے اور نہ ہی کوئی قرض۔ میں تمہاری حالت اور کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں‘ تم ایک بھرپور اور سکون آور نیند لو۔ کوکونٹ آئل کا مساج تمہیں گہری نیند میں اتار دے گا۔ بس اتنی سی بات ہے!“

”یہ جتنی سی بھی بات ہے‘ بڑی اچھی بات ہے!“ میں نے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں ”تم کوکونٹ آئل کو میرے سر میں اتارو‘ میں نیند کی وادی میں اترنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی...... میں نہایت ہی پرسکون میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی۔ ایک گھنٹے کی یہ نیند میری ذہنی اور بدنی تھکاوٹ کو زائل کر دے گی......!

میری یہ ہدایت ختم ہوئی تو مجھے اپنے سر میں نغمگی سی اترتی محسوس ہوئی۔ زرگل کی مخروطی مومی انگلیوں کا ترنم بڑے دھیمے اور رومانی انداز میں آئل کے ساتھ چھیڑ خانی میں مصروف تھا۔ اس کی انگلیوں کی چلبلی جنبشوں میں ایک جادو سا تھا۔ یوں لگتا تھا‘ وہ میرے سر میں مساج نہ کر رہی ہو بلکہ کوئی سحر پھونک رہی ہو۔

اس جادوگری کی یہ سحرکاری جاری رہی اور پتا نہیں‘ میں کب نیند کی گداز آغوش میں جا چھپا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری ہدایت کے اثرات تھے یا زرگل کی کیف آور کوشش کے ثمرات! حسن کی فسوں گری‘ عقل کی چارہ گری پر ہمیشہ حاوی رہی ہے۔

☆☆☆

ٹھیک پانچ بجے صبح میری آنکھ کھل گئی۔

کمرے کی لائٹ آن تھی۔ پلک جھپکتے میں مجھے کسی خوش گوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ ایک گھنٹا پہلے میں تکیے پر سر رکھ کر سویا تھا لیکن اب میرا سر زرگل کے زانو پر ٹکا ہوا تھا۔ میری قوت لامسہ نے گداز کی اس تفریق کو محسوس کیا تو میرے رگ و پے میں بجلی سی کوندگئی۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

زرگل نے میری نیند کے دوران میں تکیے کو اپنی تھائی سے بدل لیا تھا۔ وہ میرے پہلو میں اس طرح نیم دراز تھی کہ اس کی ایک ٹانگ دراز اور دوسری فولڈ تھی۔ اس نے تکیہ کھڑا کر کے بیڈ کے سرہانے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس نیم درازی کی حالت میں اس کی آنکھیں بند تھیں۔

میں جب یک لخت اٹھ کر بیٹھا تو میں نے واضح طور پر محسوس کیا‘ زرگل کو میری بیداری کا پتا چل گیا تھا لیکن وہ آنکھیں موندے یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے گہری نیند میں ہو۔ میں چند لمحات تک یک ٹک اس ”خوابیدہ“ مرقع حسن کو دیکھتا رہا اور بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ میری اس مسکراہٹ میں حیرت اور استعجاب نہیں بلکہ ایک ناقابل بیان سی معنی آفرینی تھی‘ زرگل کے اس انداز میں بڑی سنگینی تھی۔ میں فیصلہ نہ کر پایا‘ وہ زرگل تھی یا گل کا زر!

میں نے ایک بھرپور نگاہ اس کے مجسم سراپا پر ڈالی اور بستر چھوڑ دیا۔ دس منٹ بعد میں اپنی ابتدائی ضروریات سے نمٹ کر فارغ ہوگیا۔ پھر میں نے سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی وا کر دی ان دنوں موسم خاصا گلابی ہو رہا تھا۔ خنک ہوا نے میرے چہرے پر بوسہ دیا۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے چند گہری اور متوازن سانسیں لیں پھر قالین پوش فرش پر آسن جما کر یوگا کی نہایت ہی اہم مشقیں کرنے لگا۔

نقلی وجدان کے نصیحت آمیز الفاظ میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر میں ”جی“ کی مشقوں کی طرف سے غافل ہو جاتا تو وہ نقلی وجدان یعنی میرا پرتو کسی بدی کی قوت کے قبضے میں چلا جاتا......اور یہ مجھے کسی طور منظور نہیں تھا ”جی“ کی ان ایڈوانس مشقوں کو بڑے انہماک سے کیا جاتا ہے‘ اس دوران میں‘ میں اپنے گردوپیش سے یکسر بےگانہ ہو جاتا تھا۔

میں نے مخصوص مشقوں سے فارغ ہونے کے بعد آنکھ کھولی تو زرگل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ بڑی محویت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہیں چار ہوئیں تو وہ دھیرے سے مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔

”تم کب اٹھی ہو؟“

”تم اتنی جلدی کیوں بیدار ہو گئے؟“

”مجھے تو ایک گھنٹے بعد اٹھنا ہی تھا......اس لیے......لیکن تم؟“

ہم جواب دیے بغیر ایک دوسرے سے سوال پوچھ جا رہے تھے۔ بالآخر اسے ہار ماننا پڑی۔ بولی ”پتا نہیں کیوں تم اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں لائٹ جل رہی تھی میں نے دیکھا‘ تم بستر پر موجود نہیں تھے پھر تم مجھے ادھر قالین پر نظر آ گئے جب سے اب تک تمہیں ہی دیکھے جا رہی ہوں۔ معلوم نہیں کیسی عجیب و غریب اور الٹی سیدھی مشقیں کیے جا رہے ہو۔ کبھی سر نیچے‘ کبھی ٹانگیں اوپر اور کبھی گھمن گھیا!“

اس کی حیرت اور الجھن پر میں مسکرا اٹھا۔ مشقوں کے حوالے سے اس کا بیان درست تھا مگر میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھلی ہو۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یا تو وہ ابھی تک سوئی ہی نہیں تھی یا پھر میرے اٹھنے سے اس کی آنکھ کھلی تھی لیکن اس نے مجھ پر خود کو سوتا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ عورت کی فطری چالاکی کا مظاہرہ کر رہی تھی جسے بھولے پن نے ڈھانپ رکھا تھا۔

میں نے اس کی خوش فہمی برقرار رکھتے ہوئے کہا ”مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ تم میرے سر میں کوکونٹ آئل کا مساج کر رہی تھیں اور میری آنکھ لگ گئی۔ شاید تم بھی میرے قریب ہی سو گئی تھیں‘ میری آنکھ کھلی تو تم بے خبر سو رہی تھیں۔ میں دھیرے سے اٹھا اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔“

”میں تو یہی سمجھ رہی تھی‘ تم صبح دیر تک سوؤ گے لیکن ابھی تو صبح ہونے میں بھی دیر ہے۔“ وہ ایک انگڑائی لے کر بدن کو توڑتے ہوئے بولی ”تم نے بتایا ہے‘ تمہیں تو ایک گھنٹے بعد ہی اٹھنا تھا اور میں دیکھ رہی ہوں‘ تم تو تیار بھی ہو چکے ہو۔ کیا کوئی خاص پروگرام ہے؟“

”ہاں خاص ہی پروگرام ہے۔“ میں نے جھلملاتی نائٹی سے نگاہ چراتے ہوئے کہا ”میں ایک دو گھنٹے کے لیے فلیٹ سے باہر جاؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔ میں فلیٹ کی ایک چابی ساتھ لے جاؤں گا۔ واپسی پر میں خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ جاؤں گا۔ اس دوران میں تم اپنی نیند پوری کر لو۔ تمہارے حالیہ تیوروں سے مجھے یقین ہو گیا ہے‘ اب تم نے ڈرنا چھوڑ دیا ہے‘ تم خاصی بے باک ہو گئی ہو!“

آخری جملہ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ ذرا سا جھینپی اور نگاہ چراتے ہوئے بولی ”واقعی میں محسوس کر رہی ہوں کہ ڈر اور خوف بڑی حد تک زائل ہو چکا ہے۔ میں اپنے اندر ایک کانفیڈنس محسوس کر رہی ہوں۔“

”اگر تم اسی طرح نڈر بننے کی کوشش کرتی رہیں تو مجھے یقین ہے تمہارا کانفیڈنس اور بڑھے گا۔ ٹرائی اٹ اپ!“

وہ اچانک موضوع بدلتے ہوئے بولی ”تم ایک دو گھنٹے کے لیے کس خاص پروگرام سے جا رہے ہو؟“

میں نے سردست اور قبل از وقت اسے تفصیل بتانا ضروری نہ سمجھا ورنہ یا تو وہ میرے ساتھ جانے کی ضد کرتی یا پھر متعدد سوالات نکال کر بیٹھ جاتی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ”مجھے کسی شخص سے ملنے جانا ہے۔ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے۔ اسے سی آف کرنے ڈیفنس سوسائٹی تک جاؤں گا۔“

اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا لیکن کوئی اعتراض نہ کیا‘ بس اتنا ہی کہا ”ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ میں اب اتنی بھی نڈر اور بے خوف نہیں ہوئی!“

”تم فکر نہ کرو‘ رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا ”میں واپس آؤں گا پھر ناشتا کریں گے۔“

وہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس دوران میں دو تین مرتبہ اس نے خاصی کشادہ جماہیاں بھی لیں۔ میں نے فلیٹ سے رخصت ہونے سے پہلے اسے ہدایت کی کہ وہ آرام سکون سے سو جائے۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں‘ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا۔

اس نے مجھے ”خدا حافظ“ کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

میں اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ سورج نکلنے میں ابھی کم و بیش ایک گھنٹا باقی تھا۔ میں نے وھائٹ شیر ڈ کو ٹچ نہیں کیا اور پیدل ہی لبرٹی کی جانب بڑھ گیا۔ لبرٹی سگنل کے قریب رات بھر دو تین ٹیکسیاں کھڑی رہتی تھیں۔ میں ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنی منزل کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

ڈیفنس‘ کلفٹن اور انہی جیسے دوسرے پوش علاقوں میں لوگ دیر تک جاگتے ہیں اسی لیے صبح جلدی اٹھنے کا رواج نہیں۔ ان علاقوں میں عموماً دس بجے سے پہلے صبح نہیں ہوتی اسی لیے میں نے علی الصباح کارروائی کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایسا وقت تھا جب میرے شکار کی نیند اپنی گہرائی کی انتہا پر ہوتی۔ میں جے ڈی ملک کو صبح دم شکار کرنا چاہتا تھا۔

لبرٹی سے میں نے ٹیکسی کی اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے میں جے ڈی ملک کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس شخص کی اہمیت مجھ پر واضح ہو چکی تھی۔ چوہدری نوازش اس کا نام سن کر جس طرح چونکا تھا، وہ نظرانداز کیے جانے کے قابل نہیں تھا‘ پھر فیصل نے اپنی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے جے ڈی ملک تک ہی رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کی کوشش سے فائدہ اٹھا کر میں نے جے ڈی ملک کا پتا اور فون نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔

اپنے پروگرام کے مطابق میں پہلے جے ڈی ملک کو چھاپنا چاہتا تھا۔ ساحل کے بارے میں اس سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ شخص چوہدری کے کراچی نیٹ ورک کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس وقت میں اپنے اصل حلیے میں تھا۔ سہیل والا میک اپ دو بار کے فریش اپ نے ختم کر دیا تھا۔ میں نے سوچا پہلی فرصت میں نسیم جوہر سے مل کر اس فن میں اتنی مہارت حاصل کرلوں گا کہ حلیے کی تبدیلی کے لیے میں کسی کا محتاج نہ رہوں!

ٹیکسی کو میں نے ڈیفنس مارکیٹ کے سامنے چھوڑ دیا۔ پھر دو طرفہ سڑک عبور کر کے مارکیٹ کے کونے پر آ گیا۔ یہاں سے ایک سیدھا راستہ مارکیٹ کی عقبی سمت جاتا تھا جدھر ڈیفنس فیز ٹو کے عالی شان بنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ مجھے اسی طرف جانا تھا۔ جے ڈی ملک کا بنگلا اسی علاقے میں واقع تھا۔ اس بنگلے کا نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

فلیٹ سے نکلتے ہوئے احتیاطاً میں نے ایک بھرا ہوا پستول اپنے ساتھ رکھ لیا تھا تاکہ کسی انتہائی ناگزیر صورت حال میں اس کا استعمال کیا جا سکے۔ ویسے اسلحے کے استعمال سے حتی الامکان بچنے کی کوشش ہی کرتا ہوں۔

پوسٹ آفس کے قریب سے گزر کر میں بنگلوں والے حصے میں داخل ہو گیا۔ پھر ٹھیک پانچ منٹ بعد میں جے ڈی ملک کے بنگلے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے گھوم پھر کر اس بنگلے کا جائزہ لیا۔ اس کی سامنے والی اور عقبی گلی میں سناٹے کا بسیرا تھا۔ بنگلے کے گیٹ سے ملحق ایک چھوٹا سا گارڈ روم بنا ہوا تھا۔ جس کا دروازہ مجھے بند نظر آیا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا' اندر گارڈ موجود ہوگا یا نہیں! ایک امکان یہ بھی تھا کہ چوکیدار یا سیکیورٹی گارڈ نماز پڑھنے گیا ہو۔ اس وقت نماز فجر ادا کی جا رہی تھی۔

بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے میں نے عقبی گلی کا انتخاب کیا۔ یہ ایک گندی گلی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ بنگلا چھ سو گز پر بنا ہوا تھا۔ بنگلے کے گیٹ پر جے ڈی ملک کی نیم پلیٹ دیکھ کر میں مطمئن ہو گیا تھا کہ میں بالکل درست جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔

یہ سوچنا ایک حماقت ہوتی کہ جے ڈی ملک اس بنگلے میں تن تنہا رہتا ہوگا۔ اس جیسے جرائم پیشہ لوگ اپنے ارد گرد محفوظ اور مضبوط حفاظتی حصار رکھتے ہیں۔ مجھے اس حصار سے بچ کر یا اسے توڑ کر اپنے مطلوبہ شکار تک پہنچنا تھا۔

میں نے محتاط نظر سے بنگلے کی عقبی دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار لگ بھگ آٹھ فٹ بلند تھی اور دیوار کی اس بلندی کے اوپر خاردار تار کا جنگلا نصب تھا تاکہ وہاں سے دیوار پھلانگ کر اندر داخل نہ ہو سکے۔ اسی عقبی دیوار میں مجھے ایک چھو... آہنی دروازہ بھی نظر آیا جو اندر سے بند تھا۔ زیادہ امید ... وہ لاک ہوگا۔

اپنی حفاظت کے خیال سے جو لوگ بنگلے کی دیوار کے اوپر خاردار تار کی باڑ لگواتے ہیں وہ رات کے وقت ... اس باڑ میں کرنٹ بھی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ مہم جوئی کے شوقین ... افراد کو لگ پتا جائے۔ میں نے پہلے اس تار کو چیک کیا ... معلوم ہوا' اس میں کسی قسم کا کرنٹ نہیں دوڑ رہا تھا۔

دیوار کے اوپر تین تین فٹ کے فاصلے پر اینگل آئرن ... عمودی شکل میں نصب تھے جن میں موجود سوراخوں کے ... خاردار تار کو پرو کر وہ باڑ تیار کی گئی تھی۔ مذکورہ اینگل آئرن ... بلندی کم و بیش دو فٹ رہی ہوگی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد ... اس آہنی جنگلے میں بجلی موجود نہیں' میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

میرے پاؤں میں سبک خرام اور آرام دہ جوگرز تھے ... میں ایک اسٹیپ لے کر اپنے قدموں پر اچھلا اور ایک پاؤں ... دیوار کے ساتھ ٹکا کر اپنے جسم کو بڑی سرعت سے اوپر اٹھا ... اگلے ہی لمحے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں اچک کر ایک اینگل آئرن کو تھام چکا تھا۔

اس ابتدائی کامیابی کے بعد میں نے جھولتے ہو... اپنے جسم کو ایک اور جھٹکا دیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔ میں نے اینگل آئرن کو پکڑتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ خاردار تار میرے کپڑوں میں الجھ ... میرے جسم کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ ویسے میں نے اس وقت ... بلیو جینز پر چست سیاہ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی لہٰذا اس نوعیت کے الجھاؤ کا امکان نہیں تھا۔

اب میرے سامنے دو فٹ اونچی کانٹے دار باڑ ... رکاوٹ تھی جسے بڑی ٹیکنیک سے عبور کرنے کی ضرورت تھی ... میں نے شاؤلن ٹیمپل میں ہائی جمپ اور فری فال کی ... پریکٹس کی تھی اور ان فنون میں مہارت بھی حاصل کرلی تھی ... اب اس ٹیکنیک کی آزمائش کا وقت تھا۔

میں نے ایک اینگل آئرن کو دو مختلف جگہوں سے تھام ... دیوار کے اوپر پاؤں پھیلا لیے۔ پاؤں کا یہ پھیلاؤ لگ بھگ ... فٹ تھا جیسا کہ پوزیشن یا اسٹانس کے وقت ہوتا ہے ... کے کانٹے دار تار پانچ انچ کے فاصلے سے پروئے ... تھے۔ میں نے اینگل آئرن کو تھامے تھامے ایک گہری سانس لی اور ہاتھ پاؤں کی مخصوص جنبشوں کی مدد سے ایک ...

لگائی۔ پلک جھپکتے میں' میں سب سے اوپر والے تار پر کھڑا تھا۔ میرے پاؤں میں مضبوط جوگرز تھے لہٰذا مجھے کانٹے دار تار نے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ اس تنے ہوئے تار پر میرا قیام مشکل سے ایک سیکنڈ رہا ہوگا' اگلے ہی لمحے میں نے فضا میں فرنٹ سمر سالٹ لگا دیا۔ تنی ہوئی اس آہنی سپورٹ نے میرے لیے جمپنگ پیڈ کا کام کیا۔ جیسے ہی میرے قدموں نے تار کو چھوا' مجھے ایک زبردست پش ملا جو سمر سالٹ لگانے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ میری باڈی نے ہوا میں رول کیا اور سمر سالٹ کی تکمیل پر میرے قدموں نے ایک ہلکی ''دھپ'' کے ساتھ لان کی نرمی پر دستک دی۔ لان میں موجود گھاس خاصی دبیز تھی لہٰذا اس ''دھپ'' کی آواز بھی وہیں دم توڑ گئی۔ میں کسی بدمزگی کے بغیر بنگلے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

میں نے اپنے قدموں پر رہتے ہوئے چاروں جانب محتاط نگاہ دوڑائی۔ اندھیرا اب آہستہ آہستہ اجالے میں بدلنے لگا تھا۔ میری ''آمد'' نے بنگلے کے مکینوں میں سے کسی کو اس طرف متوجہ نہ کیا۔ میں دبے قدموں لان سے نکل آیا۔

اس وقت میں بنگلے کے عقبی حصے میں تھا۔ تعمیری حصہ اس کے بعد آتا تھا۔ میں نے اندر داخلے سے پہلے حفاظتی انتظام کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ بنگلے کی پہلو والی دونوں دیواروں کے ساتھ پانچ چھ فٹ چوڑی گزرگاہیں تھیں جو سیدھی بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچتی تھیں۔ میں ایک دیوار کے ساتھ محتاط روی سے قدم اٹھانے لگا۔

وہ بنگلا ایک منزلہ تھا اور میں نے اس کی چھت پر کسی قسم کی حفاظتی تدبیر نہیں دیکھی۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ میں انہی خیالات کے ساتھ سامنے والے حصے کی طرف آ نکلا۔ ادھر برآمدے میں مجھے ایک محافظ نظر آ گیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی گن کرسی کے ساتھ ہی ٹکی کھڑی تھی۔ میں اس شخص کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ گارڈ روم میں سے ایک شخص نکل کر سامنے آ گیا۔ وہ یقینی طور پر گیٹ والا چوکیدار تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف بھی نظر آ رہی تھی۔

میں گن بردار کو دیکھتے ہی اچھل کر دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ہوگی۔ اگلے ہی لمحے میری سماعت میں اس کی آواز گونجی۔ وہ کرسی پر سوئے ہوئے محافظ کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''نذیر علی! اٹھ جاؤ' صبح ہو گئی ہے۔''

گارڈ کی اس پکار نے ثابت کر دیا کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا ورنہ وہ سب سے پہلے میری جانب بڑھتا۔ میں اسی دیوار سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد گارڈ نے نذیر نامی اس محافظ کو جگا دیا اور دوبارہ اپنے گارڈ روم کی طرف چلا گیا۔

میں نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے گارڈ روم کی طرف نگاہ دوڑائی۔ مسلح چوکیدار اپنے مخصوص کمرے میں پہنچ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور اس کا رخ گیٹ کی جانب تھا۔ داخلی گیٹ ہنوز بند تھا۔ میری نظر برآمدے کی طرف لوٹ آئی۔ وہاں رکھی کرسی خالی دکھائی دی البتہ گن ابھی تک وہیں موجود تھی۔ اس کا مطلب یہی تھی' نذیر علی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔

ابھی تک میں نے ان دو افراد کے سوا کسی اور انسان کے آثار نہیں دیکھے تھے۔ لگتا تھا، بنگلا سناٹے اور خاموشی میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا' جے ڈی ملک سے کن حالات میں سامنا ہوگا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا' یہاں کتنے آدمیوں سے مجھے نمٹنا ہوگا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' جلد از جلد ہی کرنا تھا۔

میں دبے قدموں برآمدے کی طرف رینگ گیا۔ اس گن کو وہاں سے ہٹانا ضروری تھا۔ میں ان دونوں سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر بنگلے کے اندرونی حصے تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں جیسے ہی کرسی کے پاس پہنچا' کسی شے سے میرا پاؤں الجھ گیا۔ نیم تاریکی کے باعث میں دیکھ نہ پایا کہ وہ کیا چیز تھی۔ بہرحال اس کی آواز نے مجھ پر حقیقت کھول دی۔

چھناکے کی تیز آواز نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا اور کانچ کا کوئی برتن چکنا چور ہو گیا۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ کوئی پانی والا جگ وغیرہ رہا ہوگا! میں بجلی کی سی سرعت سے اچھل کر ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔

یہ ایسا واقعہ نہیں تھا کہ چوکیدار اپنے کیبن میں خاموش بیٹھا رہتا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی آواز میری سماعت تک پہنچی ''کیا ہوا نذیر۔ تم نے کیا توڑ ڈالا؟''

میں سانس روکے ستون کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ اگر نذیر چوکیدار کے سوال کا جواب دیتا تو بات آئی گئی ہو جاتی۔ جب چوکیدار کو جواب نہیں ملا تو وہ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے دوبارہ اس طرف آ گیا۔

یہ بڑے اہم لمحات تھے۔ مسلح چوکیدار نے میرا کام کافی آسان کر دیا۔ اگر وہ اس طرف پیش قدمی نہ کرتا تو مجھے اس تک پہنچنے کی زحمت کرنا پڑتی۔ میں ستون کے پیچھے اس زاویے سے چھپا کھڑا تھا کہ چوکیدار مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ میرے انتہائی قریب آ گیا۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ پھر اس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

”نذیر تو یہاں موجود نہیں پھر یہ جگ کیسے ٹوٹ گیا!“
”ایسے ٹوٹ گیا!“ میں نے گمبھیر سرگوشی کی۔

وہ یک بارگی اچھل کر ایسے پلٹا جیسے زہریلے بچھو نے اچانک اسے ڈنک مار دیا ہو۔ نیم تاریکی میں ہماری آنکھیں ایک لمحے کے لیے چار ہوئیں پھر اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کی زبانی یا عملی کارروائی کرتا‘ میں نے جھٹکے سے ایک فرنٹ پش کک اس کے سینے پر رسید کردی۔

وہ ”اوں“ کی آواز نکالتے ہوئے برآمدے کے پختہ فرش پر گرا۔ اتفاق سے یہ وہی جگہ تھی جہاں کانچ کی کرچیاں پڑی تھیں۔ چوکیدار تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ کوئی آواز پیدا کیے بغیر مجھے اس سے نمٹنا چاہیے تھا۔ بہرحال اب تو یہ غلطی ہوچکی تھی۔

میں بڑی تیزی سے ستون کی آڑ سے نکل آیا۔ چوکیدار نے زمین پر پڑے پڑے اپنی کلاشن کا رخ میری سمت پھیرنا چاہا مگر میں نے اسے اس ”حرکت“ کا موقع نہیں دیا۔ میرے جوگر پوش پاؤں کی ایک طوفانی ٹھوکر اس کے گن والے ہاتھ پر پڑی۔ گن اس کی گرفت سے چھوٹ کر دور جاگری۔ ویسے بھی ایک ہاتھ سے وہ کلاشن کو پوری طرح سنبھال نہیں پایا تھا‘ یہ اس کا خود حفاظتی میں کیا گیا ایک فطری عمل تھا۔

میری توقع کے برخلاف زمین پر گرے ہوئے غیر مسلح چوکیدار نے ایک لمبی لوٹ لگائی اور دوبارہ گن تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں اس سے پہلے گن تک پہنچا اور اس کے چہرے پر ایک تیچی کک ماری۔ وہ اس تکلیف کو برداشت نہ کرسکا اور بے طرح بلبلا اٹھا۔

اسی لمحے ایک گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی ”فریاد خان! کیا ہورہا ہے؟“

اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھری۔ اس سے پہلے کہ فریاد نامی چوکیدار کو پکارنے والا موقع واردات پر پہنچ جاتا‘ میں نے فریاد کی فریاد کا راستہ روکنے کے لیے ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جمادیا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹتے ہوئے ایک تاریک گوشے میں لے گیا۔ وہ اپنے منہ پر سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب بس نہ چلا تو اس نے ایک خالصتاً زنانہ حرکت کی۔ اس نے اپنے ناخنوں سے میرا چہرہ نوچنا چاہا تھا‘ میں نے ایک زوردار جھٹکا دے کر اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔

اسی لمحے ملگجے اجالے میں مجھے نذیر کی صورت دکھائی دی۔ وہ سیدھا میری طرف ہی آرہا تھا اور غالباً اس نے مجھے فریاد کے ساتھ گتھم گتھا دیکھ بھی لیا تھا۔ میں نے فریاد کی گردن میں ہاتھ ڈال کر ایک نپا تلا مخصوص جھٹکا دیا۔ وہ میری بانہوں میں جھول گیا۔ کم از کم دو گھنٹے تک وہ ”واپس“ آنے والا نہیں تھا۔

اس کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ نذیر میرے روبرو پہنچ گیا۔ ہم اتنے فاصلے پر تھے کہ ایک دوسرے کو بہ خوبی دیکھ رہے تھے۔ اس نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم اور اس بنگلے میں کیسے داخل ہوگئے؟“

”میں تمہاری موت ہوں۔“ میں نے سرسراتی آواز میں کہا ”اور موت کو کہیں بھی آنے جانے کے لیے اجازت کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ تم نے……“

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے مجھ پر وار کردیا۔ یہ ایک دیسی قسم کا جارحانہ اٹیک تھا۔ میں نے ایک جانب ہٹ کر اس کا وار خالی دیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں آگے جاگرا‘ میں نے پلٹ کر دیکھا تو چونک اٹھا۔ نذیر فریاد والی کلاشنکوف کے بہت قریب جاکر گرا تھا۔ اس نے ایک لحہ میری جانب دیکھا اور گن کی طرف ہاتھ بڑھا کر مسلح ہوگیا۔ پھر اس سے قبل کہ وہ مجھ پر فائرنگ کرتا‘ میں نے فرش پر سائیڈ رول لیا اور کرسی کی طرف نکل گیا۔

اسی لمحے فائرنگ کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ نذیر نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے بروقت سائیڈ رول نے اس کا نشانہ خطا کردیا‘ نتیجے میں اسے ایک ناقابل تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی گن سے خارج ہونے والی گولیوں نے انشاءغفیل فریاد خان کے بدن کو چھید ڈالا۔ نذیر علی سناٹے میں آگیا۔

اس کا سناٹا ٹوٹنے سے پہلے میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو گن کے استعمال کا وقت بیت چکا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر ایک زبردست ڈبل پش کک رسید کردی۔ وہ پشت کے بل برآمدے کے پختہ فرش پر گرا اور کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ نہ صرف کھڑا ہوا بلکہ اس نے جواباً مجھ پر حملہ کردیا۔ وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہورہا تھا۔

اس نے ایک تیچی راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ یہ نی شاٹ سے مشابہ ایک ”بیلو دی بیلٹ“ کک تھی۔ اس کی اس جسارت سے اندازہ ہوا، وہ مارشل آرٹس سے بھی واقف تھا۔ میں نے بڑی چابک دستی سے اس کے کک والے پاؤں کو پکڑا اور مروڑ دے کر اسے دور اچھال دیا۔ وہ برآمدے سے باہر گرا۔ اگر اور کوئی موقع ہوتا تو میں اس کے فن کو ناپنے کی کوشش کرتا۔

اس نے فائرنگ کرکے میرے لیے تشویش کی فضا تخلیق کردی تھی۔ کسی بھی لمحے بنگلے کے اندر موجود افراد اس طرف متوجہ ہوسکتے تھے!

نذیر جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا‘ میں نے اسے ایک سائیڈ کک ماردی۔ وہ سنبھلنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دور لڑھک گیا۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا اور اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر پے در پے اس کے چہرے پر چار پانچ ٹھوکریں رسید کردیں۔

وہ دونوں ہاتھوں سے خود کو بچانے کی کوشش کرنے لگا اور اس کوشش کے دوران ہی میں اس نے میرا پاؤں پکڑ لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پختہ فرش پر پڑے پڑے رولنگ کرنے لگا۔ یہ دوطرفہ رولنگ تھی۔ میں الجھ کر گر پڑا۔ اسی لمحے دروازہ کھلنے کی آواز آئی پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا‘ بنگلے کے اندر موجود افراد ہماری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

میں نے ایک لمبی لوٹ لگائی اور کلاشنکوف تک رسائی حاصل کرلی۔ وہاں ایک کنگ سائز سنگی گملا رکھا تھا‘ میں نے سمٹ کر اس گملے کے عقب میں پناہ لے لی۔ اسی وقت دو افراد میری نگاہ میں آگئے۔ وہ بنگلے کے اندرونی حصے سے نکل کر برآمدے میں ظاہر ہوئے تھے۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے جب کہ میں ایک خاص زاویے سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں بھی مسلح تھے اس دوران میں نذیر اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔ ان میں سے ایک نے نذیر سے پوچھا۔

”یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟“

”کوئی دشمن اندر گھس آیا ہے۔“ نذیر نے بتایا ”اس نے چوکیدار فریاد کو قتل کردیا ہے اور مجھے بھی مارنے کی کوشش……“ وہ سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔

”کیا بک رہے ہو؟“ دوسرے شخص نے دہاڑ سے مشابہ آواز میں کہا۔

”آپ خود دیکھ لیں۔“ نذیر نے کہا ”ادھر فریاد کی لاش پڑی ہے اور وہ دشمن بھی یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔“

وہ لوگ نذیر کی بات کو یک سر نظر انداز نہیں کرسکتے تھے کیوں کہ فریاد کا بے جان جسم ان کی نگاہ میں آچکا تھا۔ ان دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے نذیر سے استفسار کیا۔ اس کے استفسار میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔

”وہ شیطان کہاں چھپا ہے؟“

”ادھر!“ نذیر نے گملے کی جانب اشارہ کیا ہوگا کیوں کہ اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنا زاویہ تبدیل کرلیا تھا۔

میں دم سادھے ان کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے اپنے قریب ان کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں الرٹ ہوگیا۔ پھر جیسے ہی وہ سنگی گملے کے پہلو میں پہنچے، میں اچانک اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ بوکھلا گئے۔ میں نے اس بوکھلاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور انہیں گنیں سیدھی کرنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے کلاشنکوف کو تھامے ہوئے گملے کے عقب سے بانی جمپ لگائی پھر اڑتے ہوئے ان کی طرف آیا۔ وہ دونوں میرا دھکا کھا کر زمین بوس ہوگئے۔ میں نے ہینڈ اسپرنگ لگایا اور اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

ان دونوں نے بھی فرش پر قیام کی ضرورت محسوس نہیں کی اور فوراً اٹھ کر میرے مدمقابل جم گئے‘ ہتھیار ابھی تک ان کے ہاتھوں سے یاری نبھا رہے تھے۔ میں نے انہیں ڈاج دینے کے لیے ایک بیٹھک لگائی۔ انہوں نے بڑی سرعت سے اپنی گنوں سے مجھ پر فائرنگ کی لیکن میں ان کے ٹارگٹ پر موجود ہوتا تو وہ مجھے گولیوں کا نشانہ بناتے۔

میں نے بیٹھک کی تکمیل کے ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر ہائی جمپ لگائی اور ان کے اوپر سے گزرتے ہوئے عقب میں پہنچ گیا پھر ان کے پلٹنے سے قبل ہی میں نے ان کی پشتوں پر ڈبل فرنٹ فلائنگ ککس جڑ دیں۔

وہ دونوں ایک جھٹکے سے منہ کے بل پختہ فرش پر گرے۔ میں اچک کر ان کے قریب پہنچا اور انہیں ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ زمین بوس ہوتے وقت گنیں ان کے ہاتھوں سے نکل گئی تھیں۔ میں نے دوبارہ انہیں مسلح ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دونوں تابڑتوڑ مجھ پر حملے کررہے تھے اور میں جواباً انہیں بری طرح پیٹ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہانپنے لگے۔ میں نے ہاتھ پاؤں کے ساتھ کلاشنکوف کا بٹ بھی استعمال کیا تھا۔ تاہم فائرنگ سے میں نے اجتناب ہی برتا۔ جب تک انتہائی ناگزیر نہ ہوجاتا‘ مجھے ہاتھ پاؤں ہی سے کام چلانا تھا۔

یہ کسر نذیر نے پوری کردی۔ اس دوران میں اسے اپنی کلاشن تک پہنچنے کا موقع مل گیا تھا جو کرسی کے ساتھ ٹکی کھڑی تھی اور اب وہ مجھ پر فائرنگ کررہا تھا۔ اگر وہ ہوش مندی سے نشانہ لیتا تو شاید مجھے شکار کرنے میں کامیاب ہوجاتا مگر وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بے دریغ فائرنگ کررہا تھا پھر ہمارے درمیان فاصلہ اور اینگل بھی حائل تھا۔ میں نے اس کی فائرنگ سے محفوظ رہتے ہوئے ایک طویل برسٹ مارا۔ جواب میں نذیر کی چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ میری فائرنگ کی زد

میں آ گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

اسی لمحے عقب سے کسی نے مجھے جکڑ لیا۔ وہ ان دونوں میں سے ایک تھا۔ میں نے اپنے قدموں پر رہتے ہوئے باڈی کو ٹوئسٹ کیا اور ایک جھٹکے سے گھوم گیا۔ اگر دبوچنے والا مجھے آزاد کر دیتا تو اس کے ساتھی کی بچت ہو جاتی لیکن اس کے بالعکس نتائج برآمد ہوئے۔ میرا جھٹکا کھا کر وہ بھی گھوم گیا اور اس کی ٹانگیں دوسرے شخص کے منہ پر لگیں۔ یہ کسی ہائیڈرولک مشین کے ہینڈل کی ٹھوکر تھی۔ متاثرہ شخص بلبلاتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے الٹی جمپ لگائی اور پشت کے بل زمین پر گرا۔

یہ ریسلرز کا ایک مخصوص داؤ ہوتا ہے۔ وہ اپنے اوپر لدے ہوئے شخص سے اسی طور نجات حاصل کرتے ہیں۔ زمین سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس شخص کے حلق سے ''غوں'' جیسی ایک مبہم آواز خارج ہوئی۔ اسی لمحے میں نے اپنی دونوں کہنیاں اس کے پیٹ میں رسید کیں اور بیک رول کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے قدموں کے نزدیک ہی دوسرا شخص چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کے وجود میں مجھے موہوم سی جنبش محسوس ہوئی۔

میں نے اس کے سینے پر ایڑی کی ضرب لگائی۔ اس کے وجود نے ایک زبردست جھٹکا کھایا پھر ساکت ہو گیا۔ میں نے جھک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ زندہ تھا تاہم اس کے فعال ہونے کا فوری امکان نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھی کو چیک کیا۔ وہ بھی میرے ''رویے'' سے ناراض ہو کر عارضی خاموشی اختیار کر چکا تھا۔ ان کی طرف سے ''مطمئن'' ہونے کے بعد میں کھلے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا...... وہ دروازہ جس میں سے تھوڑی دیر پہلے یہ دونوں برآمد ہوئے تھے۔

میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے دروازے کے پاس پہنچا پھر میں نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے اندر قدم رکھ دیا۔ اندرونی حصے میں ہنوز خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا' پتا نہیں وہاں کوئی موجود بھی ہے یا نہیں! اگر کوئی وہاں موجود تھا تو پھر وہ گہری نیند میں ہوگا!

میں نے جے ڈی ملک کی تلاش میں ابتدائی دو کمرے اور لاؤنج دیکھ ڈالا لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اس سے میری تشویش میں اضافہ ہو گیا۔ اگر جے ڈی ملک میرے ہتھے نہ چڑھتا تو پھر یہ ساری محنت بے کار چلی جاتی۔ میں وہاں سے ناکامیاب نہیں لوٹنا چاہتا تھا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے اس سنگل اسٹوری بنگلے کا کونا کونا جھانک ڈالا لیکن جے ڈی ملک یا کوئی اور شخص مجھے نظر نہ آیا۔ میری تشویش انتہا کو پہنچ گئی۔ اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے اپنے مطلوبہ مقام پر ہی چڑھائی کی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں باہر موجود افراد سے جے ڈی ملک کے بارے میں استفسار کروں۔

ان چار میں سے دو افراد انا اللہ ہو چکے تھے۔ باقی دو کو میں گہری نیند ''سلا'' کر اندرونی حصے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے باہر جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر بنگلے کی تلاشی لی لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر برآمدے میں نکل آیا۔ نذیر علی اور فریاد خان سوال و جواب کی دنیا سے بہت دور جا چکے تھے۔ میں نے دوسرے دونوں افراد کا تنقیدی معائنہ کیا۔ ان میں سے ایک کی ''حالت'' مجھے بہتر لگی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میں اسے ہوش میں لا کر جے ڈی ملک کے بارے میں استفسار کر سکتا تھا لیکن یہ ''کوشش'' کھلے عام کرنا مناسب نہیں تھا کیوں کہ اب باقاعدہ اجالا پھیل چکا تھا۔

میں نے اچھی حالت والے شخص کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھسیٹنا شروع کیا اور تھوڑی سی کسرت کے بعد میں اسے کچن تک لانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہی پروسیجر میں نے دوسرے کے ساتھ بھی دہرایا۔ وہ کام کا نہ سہی لیکن میں اسے اپنی نگاہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ نذیر علی اور فریاد خان کی طرف سے ہر خطرہ ٹل چکا تھا۔

میں نے اپنے مطلوبہ بندے پر تھوڑی محنت کی۔ پانی کے چھینٹے جب کارگر نہ ہوئے تو میں نے چمٹا گرم کر کے اس کے تلوؤں کی ''سنکائی'' شروع کر دی۔ میری یہ ''خدمت'' اسے ''راس'' نہ آئی اور اس نے پاؤں جھٹکتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ مزید دس منٹ کی کوشش کے بعد وہ بولنے کے قابل ہو گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

تھوڑے تامل کے بعد اس نے جواب دیا ''سکندر!''

''جے ڈی ملک کہاں ہے؟''

اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا، وہ جواب دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا ''مجھے نہیں پتا ملک صاحب کہاں گئے ہیں...... تم کون ہو؟''

''میں تمہارا مجازی باپ ہوں'' میں نے خون خوار لہجے میں کہا ''اور لگتا ہے تم میرے سوال کا جواب نہیں دو گے۔ مجھے تمہارے حقیقی باپ سے پوچھنا پڑے گا۔ کیا تمہارا باپ زندہ ہے؟''

سوال ختم کرتے ہی میں نے چولھے پر سے گرم چمٹا اٹھا لیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے دائیں سے بائیں لہرانے لگا۔ وہ خوف زدگی کے عالم میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے باپ کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔''

''تم اب تک زندہ کیوں ہو بے غیرت'' میں نے گرم چمٹا اس کے تلوے کی طرف لے جاتے ہوئے سفاکی سے کہا ''میں تم سے آخری مرتبہ جے ڈی ملک کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ آخری مرتبہ اس لیے کہ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں یہ چمٹا تمہاری ناپاک زبان پر رکھ دوں گا' پھر تم زندگی بھر بولنے کے قابل نہیں رہو گے۔ کیا ارادہ ہے؟''

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''تم میری بات کا یقین کرو......''

جملہ ادھورا رہ گیا' سکندر کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی انسانی گوشت کے جلنے کی مخصوص بو کچن کی فضا میں نفوذ کر گئی۔ میں نے گرم چمٹے کو سکندر کے تلوے سے ہم کنار کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تم اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہاری باتوں کے چکر میں آ جاؤں گا۔ میں پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں۔'' پھر میں نے اسے قدموں سے نکالنے کے لیے مصلحتاً ایک جھوٹ بولا ''میری معلومات کے مطابق رات بارہ بجے تک جے ڈی ملک اسی بنگلے پر موجود تھا۔ اب وہ یہاں سے غائب ہے۔ وہ کہاں گیا ہے' یہ تمہیں پتا ہونا چاہیے...... اور کتنے بجے گیا ہے یہ بھی! کیوں کہ تم لوگ اس کی غیر موجودگی میں اس بنگلے کی رکھوالی کر رہے ہو؟''

پھر میں نے اسے دکھاتے ہوئے چمٹا ایک مرتبہ پھر چولھے پر چڑھا دیا۔ خوف کی شدت سے وہ تھر تھر کانپنے لگا پھر لرزیدہ آواز میں بولا ''تم مجھ پر مزید ظلم نہ کرنا میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔''

گرم چمٹے کی دہشت فرضی نہیں تھی بلکہ وہ اس کی کارکردگی کا عملی مزہ چکھ چکا تھا اس لیے اس کا پتا پانی ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنگین لہجے میں دریافت کیا ''بتاؤ تمہارا جے ڈی ملک کہاں گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟''

وہ بیٹھے بٹھائے ایک اچنبھک مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مجھ سے پُرخلوص تعاون حالات کا جبر اور مصلحت کا تقاضا تھا۔ اپنے جسم کے نازک حصوں کو بہ قائمی ہوش و حواس جلتے ہوئے دیکھنا اور محسوس کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اسے جواب دیتے ہی بنی۔

''ملک صاحب...... رات کے آخری پہر اپنے چار کمانڈوز کے ساتھ کسی دوست کے پاس گئے ہیں۔'' اس نے اٹک اٹک کر بتایا ''وہ وہاں رکیں گے اور ان کے کمانڈوز کسی خاص مشن پر روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وہ لوگ سیدھے اسی بنگلے پر آئیں گے۔''

سکندر کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا ''وہ لوگ کتنے بجے واپس آئیں گے؟''

''صحیح وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' اس نے کمزور سے لہجے میں کہا ''ملک صاحب نے کہا تھا، سات بجے کے بعد کسی بھی وقت ان کی واپسی ہو سکتی ہے۔''

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ وہاں سات دس کا وقت ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، وہ لوگ اب تب میں آنے ہی والے تھے۔ میرے ظاہری اور باطنی حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ میں نے تپتے ہوئے چمٹے کو سکندر کی آنکھوں کے نزدیک پہنچایا اور سفاکی سے پوچھا۔

''تمہارا ملک اپنے چار کمانڈوز کے ساتھ کہاں اور کس نوعیت کے مشن پر گیا ہے؟''

چمٹے کی تپش نے اسے چہرہ پیچھے ہٹانے پر مجبور کر دیا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا اور غصیلے لہجے میں کہا ''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟''

وہ میری جانب رخ پھیرتے ہوئے لکنت زدہ لہجے میں

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں
بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات
روشنی کے مینار
قیمت 225/- روپے
ڈاک خرچ 25/- روپے
مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر 1

بولا ''ایک شیطان نے ملک صاحب کے آدمیوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے، اس بدبخت نے ملک صاحب کے ایک خاص بندے فیصل کو اغوا کر لیا ہے۔ ملک صاحب کے کمانڈو فیصل کو چھڑانے گئے ہیں۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے رگ و پے میں بجلی سی کوند گئی ہو۔ سکندر کا انکشاف سنسنی اور تھرل سے لبریز تھا۔ وہ بے خبری میں میرے سامنے میرا ہی قصہ چھیڑ بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے ہیجان خیز لہجے میں دریافت کیا۔ میرا استفسار بے ساختہ تھا۔

''فیصل کو کس نے اغوا کیا ہے؟''

''اس شخص کا نام وجدان سننے میں آیا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''کیا تم نے وجدان کو دیکھ رکھا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''میں نے اس مردود کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے، وہ کسی چھلاوے سے کم نہیں۔ پل میں اِدھر اور پل میں اُدھر نظر آتا ہے لیکن مجھے امید ہے، ملک صاحب کے کمانڈوز اسے زیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ بہت ہی مشاق اور تربیت یافتہ ہیں۔''

اگر سکندر کو یہ معلوم ہو جاتا کہ میں ہی وجدان ہوں جسے وہ چھلاوے کا نام دے رہا ہے تو پتا نہیں، اس کی کیا حالت ہوتی۔ میں اس وقت حیرتوں کے حصار تخلیق کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے سکندر سے پوچھا۔

''تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا، وجدان نے فیصل کو کہاں چھپا رکھا ہے۔ میرا مطلب ہے، ملک صاحب کے کمانڈوز کہاں سے اسے حاصل کریں گے؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے دہکتا ہوا چمٹا ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے کے قریب پہنچایا تو لمحاتی تامل کے بعد اس نے جواب دیا۔

''مجھے وجدان کے ٹھکانے کا تو علم نہیں لیکن اتنا جانتا ہوں..... کسی اخبار کا مالک اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ ملک صاحب کے کمانڈوز اسی اخبار والے کے بنگلے پر آپریشن کریں گے۔ ملک صاحب کا خیال ہے، وجدان نے فیصل کو اسی بنگلے میں......''

''فون کس طرف ہے؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چیخ کر کہا۔

میری یہ چیخ غیر ارادی تھی۔ سکندر کے جواب نے میرے دماغ کو آگ کا گولا بنا دیا۔ وہ سہم کر رحم طلب نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اچانک ہیجان میں کیوں مبتلا ہو گیا ہوں مگر میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ ان نازک ترین لمحات میں مجھے کیا کرنا ہے۔

''میں نے فون کا پوچھا ہے!'' میں گرم چمٹا اس کے ہونٹوں کے نزدیک لاتے ہوئے دہاڑا۔

''بتاتا ہوں..... تم میرے ساتھ آؤ......'' وہ جاں کنی جیسی کیفیت میں بولا ''فون اُدھر دوسرے کمرے..... میں ہے......''

میں سکندر کو دھکیلتے ہوئے آنِ واحد میں فون والے کمرے میں پہنچا پھر اسے اپنی گرفت میں جکڑ کر میں نے منہاس باقر کے بنگلے کا نمبر ڈائل کیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے جسم کا سارا خون دماغ میں سرایت کر گیا ہو۔ میری کن پٹیوں پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔

ڈائلنگ کی تکمیل پر دوسری جانب گھنٹی بجی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، وہ گھنٹی ایک سال بعد بجی ہو۔ میں اس وقت انتظار کی انتہائی اذیت سے گزر رہا تھا۔ میرے انتظار نے ایک سال مزید طے کیا اور دوسری گھنٹی بجی پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ دوسری کے بعد تیسری..... چوتھی..... پانچویں..... چھٹی

دوسری طرف کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ میری وحشت عروج کو پہنچ گئی۔ اس طرف خاموشی کا ایک ہی مطلب تھا..... اور وہ یہ کہ اس بنگلے کے مکینوں کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیا گیا تھا۔ میں نے اپنے سینے میں درد کا ایک طوفان سا اٹھتے محسوس کیا۔ غم و اندوہ کی منہ زور آندھی میری نس نس میں چیخنے لگی۔

وہ بہت ہی آزمائشی لمحات تھے۔ جے ڈی ملک نے میرے گرد و پیش زہریلی آتش کا حصار سا کھینچ دیا تھا۔ مجھے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اس حصار کو بکھیرنا تھا اور اپنے دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتارنا تھا۔ میں نے دانت کچکچا کر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔

اسی لمحے بنگلے کے باہر کسی ہیوی انجن والی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ میں نے چوکنا نظروں سے اپنی گرفت میں پھنسے ہوئے سکندر کی طرف دیکھا۔ اس کے منحوس لب وا ہوئے اور اس نے بڑے ہی واہیات انداز میں سرگوشی کی۔

''لگتا ہے، ملک صاحب کے کمانڈوز واپس آ گئے!''

اس سے پہلے کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا، گیٹ پر موجود گاڑی کا ہارن صبح کی خاموش اور پُرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگا! *

گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی میرے کانوں میں لالاں کی کراہ آمیز چیخ بھی سنائی دی تھی، میں متوحش انداز میں پلٹی۔ کیا دیکھتی ہوں، لالاں اپنے خون آلود ہاتھ کو تھامے ہوئے کراہ رہی تھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گولی لگتے ہی کہیں دور جا پڑا تھا اور..... میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اچانک تاریکی کی اوٹ سے چند ہیولوں نے شکاری کتوں کی طرح ہمیں گھیر لیا۔ دھندلی روشنی کے باوجود میں ان لوگوں کو پہچان گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کے چہروں کے نقوش ہنوز میرے اور لالاں کے ذہن سے محو نہیں ہوئے تھے۔

یہ کل پانچ افراد تھے۔ پھوٹا خان اور اس کے چار حواری۔ چونکہ سرِدست میری ان سے کوئی ''نسل'' نہ تھی اس لیے وہ پانچوں بڑی زہرخند نظروں سے لالاں کو گھور رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں دبی ہوئی گنوں کا رخ اس کی طرف کر رکھا تھا۔ لالاں کے پستول والے ہاتھ پر انہی میں سے ہی کسی ایک نے گولی چلائی تھی۔

''لالاں......! خبردار......کوئی غلط حرکت کی تو...... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔''

پھوٹا خان نے غراتی ہوئی آواز میں لالاں سے کہا۔ لالاں کے چہرے سے اذیت کے آثار یک لخت چھٹ کر قہربار تاثرات میں بدل گئے اور وہ مغلوب ہونے کے باوجود پھوٹا خان کو زخمی نظروں سے گھورتی ہوئی ناگن کی طرح پھنکاری۔

''پھوٹا خان! تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ یہ مت بھولو کہ تمہارا بیٹا میرے قبضے میں ہے۔''

پھوٹا خان اس کی بات پر ہتھے سے اکھڑ گیا اور آگے بڑھ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر رسید کر دیا۔

''میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ اگر میرے بچے کا تم لوگوں نے بال بھی بیکا کیا تو......'' یہ کہہ کر اس نے فوراً لالاں کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے اور اسے جھٹکا دیتے ہوئے دوبارہ قہر آلود لہجے میں بولا ''بتا! تو نے میرے بچے کو کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ بول ورنہ ادھر ہی تیرا برا حشر کر ڈالوں گا۔''

مگر لالاں جواباً بدستور اسے شعلہ فشاں نظروں سے گھورتی رہی۔ اس کی زہرخند خاموشی پر پھوٹا خان ایک بار پھر غصے سے کھول اٹھا اور پستول کی سیاہ نال اس کی کنپٹی سے لگا دی ''بتاتی ہے یا...... ابھی تیرا بھیجا پار کر ڈالوں؟'' اس کی زہر آلود اور منتقمانہ دھمکی پر لالاں کے سانولے چہرے پر بڑے خوفناک تاثرات ابھرے اور وہ بلاخوف بولی۔

''پھوٹا خان! اگر تو نے میرا قصہ پاک کر ڈالا تو تیرا بیٹا کبھی زندہ نہیں بچے گا کیونکہ میری زندگی ہی تیرے بیٹے کی زندگی کی ضامن ہے'' اس کے بے پروا لہجے پیسنے لگا۔ پھر جیسے زچ ہو کر بولا۔

''چل پھر...... ہمیں وہاں لے چل جدھر تو نے میرے بیٹے کو یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''ہرگز نہیں'' لالاں بلاخوف قطعیت سے انکار کرتے ہوئے بولی۔ ''اس طرح تم کبھی بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ پھوٹا خان! تمہیں اپنے پہلے والے معاہدے پر قائم رہنا پڑے گا اور مجھے کونجاں سمیت یہاں سے جانا دیا جائے ...... میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمہاری اس غلطی کو معاف کر دوں گی'' لالاں کی بات سن کر پھوٹا خان ایک بار پھر چراغ پا ہو گیا اور اس نے بے دردی سے لالاں کی تھپڑوں، گھونسوں اور لاتوں سے تواضع کرنی شروع کر دی۔ لالاں بہرحال ایک عورت تھی، تنومند پھوٹا خان کے قیامت خیز اور بے رحم مکوں اور لاتوں نے لالاں کو چیخنے چلانے پر مجبور کر ڈالا۔

وہ بولا ''بتا' مانتی ہے ہماری بات...... یا باری باری ہم پانچوں...... تیرا منہ کالا کریں۔''

پھوٹا خان نے ذرا رکتے ہوئے ہانپتی آواز میں غرا کر کہا۔

میں نے دیکھا' لالاں بری طرح مضروب ہو چکی تھی۔

پھوٹا خان کے تھپڑوں اور مکوں نے اس کے چہرے کی حالت بگاڑ کر رکھ دی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑے بڑے نیل ابھر آئے تھے۔ ہونٹوں اور ناک سے خون کی پتلی لکیر جاری ہو گئی تھی اور وہ زمین پر پڑی بری طرح کراہنے کے انداز میں ہانپ رہی تھی۔ میں ایک طرف خاموش کھڑی لالاں کی یہ درگت بنتے دیکھ رہی تھی۔ تبھی پھوٹا خان نے اپنے دو حواریوں کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ کر فوراً آگے بڑھے اور لالاں کو بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ لالاں کا زخم آلود چہرہ خراشوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ مگر مجھے اس پر بالکل ترس نہیں آ رہا تھا۔ پھوٹا خان اپنے ایک ہاتھ کے پنجے سے اس کے گال دبوچ کر زہرناک لہجے میں غرایا ''کیا کہتی ہے اب...... بول......؟'' لالاں زخمی ناگن کی طرح اسے خونیں نگاہوں سے گھورنے لگی۔

پھوٹا خان نے اس کا چہرہ جھٹک کر اپنے چاروں حواریوں سے کہا۔

''اڑے...... یہ ایسے نہیں مانے گی' تم لوگ ذرا اس کو اپنے انداز میں سمجھاؤ۔'' اس کے حواری جارحانہ انداز میں لالاں کی طرف بڑھے۔ تبھی لالاں گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

''ٹھہرو...... میں...... میں چلنے کو تیار ہوں'' اس کی بات پر پھوٹا خان نے اپنے حواریوں کو ہاتھ کے اشارے سے روک دیا پھر لالاں کو گھورتے ہوئے بولا۔

''اگر تو نے ہمارے ساتھ ذرا بھی دھوکا کرنے کی کوشش کی تو یاد رکھنا' میں اپنا بچہ تو ڈھونڈ ہی لوں گا مگر تیرا وہ حشر کردوں گا کہ تیری روح بھی مجھ سے پناہ مانگے گی۔ چل آگے بڑھ......'' یہ کہہ کر پھوٹا خان نے اسے آگے کی طرف دھکیلا۔ لالاں خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔ پھوٹا خان نے مجھے اپنے چاروں حواریوں کے گھیرے میں دے دیا تھا۔ اب ہم سب لالاں کے عقب میں چلنے لگے۔

رات کا اسرار بھرا سناٹا میرے اعصاب چٹخا رہا تھا۔ مجھے ایک بار پھر پریشان کن گھبراہٹ نے آن لیا تھا۔ پھوٹا خان اور اس کے حواریوں کے سر پر اس وقت خون سوار تھا۔ اگرچہ ان پانچوں خونخوار بھیڑیوں کی توجہ لالاں پر مرکوز تھی مگر وہ میری طرف سے بھی غافل نہ تھے۔ میں یہ بات بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر میں نے ذرا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو یہ لوگ مجھ سے ذرہ برابر بھی رعایت نہیں کریں گے۔ اس لیے میں موجودہ حالات کی سنگینی کا ادراک رکھتے ہوئے سردست کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جو انہیں مشتعل کرڈالتا۔ تاہم میرا دل کہہ رہا تھا کہ لالاں اور پھوٹا خان کے درمیان ہونے والی متوقع خوں ریز جنگ' ہوسکتا ہے میرے لیے فرار کا باعث بن جائے چنانچہ میں بدستور کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔

دل و دماغ بری طرح ہول رہے تھے۔ میرے ذہنِ رسا میں ایک بات یہ بھی آئی تھی کہ پھوٹا خان نے شاید جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لالاں پر غلط وقت پر ہاتھ ڈالا تھا جو خود اس کے بیٹے مراد علی کی جان کے لیے خطرہ بن سکتا تھا۔ میرے محتاط خیال کے مطابق پھوٹا خان کو اپنے چاروں حواریوں سمیت پہلے خاموشی کے ساتھ لالاں کا تعاقب کرنا چاہیے تھا اور لالاں کے اصل ٹھکانے تک پہنچتے ہی اس پر ہاتھ ڈالتے تو زیادہ بہتر تھا کیونکہ اس طرح قبل از وقت لالاں کو قابو کرنے سے وہ انہیں بھٹکا بھی سکتی تھی جس کا مجھے سو فیصد یقین تھا کیونکہ اس جان لیوا حقیقت کا یقیناً لالاں اور اس کے منگیتر' کوڑل کو بھی بہ خوبی ادراک ہوگا کہ اگر ایک بار پھوٹا خان کو اس کا بیٹا مل گیا تو وہ ان دونوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بہرحال اندیشناک اور وسوسہ انگیز لمحات میں ہمارا پیدل سفر جاری تھا۔

پھوٹا خان کے پوچھنے پر لالاں نے اسے یہی بتایا تھا کہ اس کا بچہ مراد علی اس کے منگیتر کوڑل کے قبضے میں ہے اور وہ مقام یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جہاں کوڑل نے مراد علی کو یرغمال بنا رکھا تھا' وہ ایک جنگلی علاقہ تھا' جس کے آغاز ہی میں مٹی کے اونچے نیچے ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ حالانکہ پھوٹا خان کے پاس جیپ بھی تھی مگر اس نے شاید کچھ سوچ کر ہی جیپ کے بجائے پیدل سفر کو ترجیح دی تھی۔ ہم سب خاموشی سے.... آگے بڑھ رہے تھے۔

جنگل کے قریب پہنچتے ہی پھوٹا خان نے گمبیھر لہجے میں لالاں سے پوچھا۔

''لالاں...... میں ایک بار پھر تم کو آگاہ کر.... رہا ہوں۔ ہم سے کسی بھی قسم کی چالاکی کرنے کی کوشش کی تو بلا تاخیر تمہیں گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا'' اتنا کہہ کر وہ ذرا تھما پھر لالاں کی بدستور بھیدوں بھری خاموشی پر دوبارہ بولا ''اب تو ہمیں بتائے گی کہ ہم کس راستے سے اس جنگل میں داخل ہوں کہ ہمارا مطلوبہ علاقہ وہاں سے نزدیک پڑے'' اس بار اس کی بات پر لالاں کے قدم رک گئے۔ وہ چند ثانیے کچھ سوچنے کے انداز میں کھڑی رہی پھر اس نے دائیں طرف یعنی جنگل کے متوازی چلنا شروع کردیا۔ جنگل کے قریب پہنچنے پر میں نے محسوس کیا تھا کہ پھوٹا خان سمیت اس کے چاروں مسلح حواری مستعد ہوگئے تھے۔

پھر اچانک ایک مقام پر لالاں نے جنگل کی طرف اپنا رخ موڑا تو یکایک پھوٹا خان کے دو حواری اس کے دائیں بائیں ہوکر چوکنا انداز میں چلنے لگے۔ میرے دل کی دھڑکنیں فزوں تر ہونے لگیں۔ کسی بھی لمحے کچھ ہوجانے کا تصور میرے رونگٹے کھڑے کررہا تھا۔ اب ہم لالاں سمیت جنگل میں داخل ہوچکے تھے۔

پورا جنگل سائیں سائیں کرتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ پھوٹا خان نے اپنے دو حواریوں کو چند ہدایات دے کر انہیں دو مخالف سمتوں میں سامنے ٹیلوں کی طرف روانہ کردیا۔ ایسے میں' میں نے کن انکھیوں سے لالاں کے خاموش چہرے کی طرف دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر دور دور تک کسی تفکر یا پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ شکست خوردگی کی ایک ذرا سی بھی رمق وہاں موجود نہ تھی۔ اس کی یہ اسرار بھری غیر متوقع ''بے نیازی'' اس کے کسی اچانک گل کھلانے کا پتا دے رہی تھی۔

بہرطور اپنے ان دونوں حواریوں کو روانہ کرنے کے ذرا ہی دیر بعد پھوٹا خان نے ہمیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اب اس کے باقی دونوں حواریوں نے حسبِ معمول دائیں بائیں سے مجھے گھیر رکھا تھا جبکہ خود پھوٹا خان لالاں کی پشت سے اپنا پستول لگائے ہمارے پیچھے چل رہا تھا۔ اب سامنے جابجا چھوٹے بڑے مٹی کے تودہ نما قدرتی ٹیلوں ٹبوں کے خاکے واضح ہونے لگے تھے۔ ان کے قریب پہنچتے ہی لالاں نے ٹیلوں کے متوازی ایک طرف ہوکر چلنا شروع کردیا۔ بالخصوص یہ میرے لیے بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ اب کسی بھی لمحے اعصاب شکن حالات کا شکنجہ جیسے ہمیں جکڑنے والا تھا۔ آئندہ کے کسی بھی

متوقع اور خوں ریز حالات میں خود میری جان کو بھی خطرہ درپیش ہوسکتا تھا۔ دم بہ خود اور تاریک ماحول میں اس قدر ہولناک سناٹا طاری تھا کہ...... پتا کھڑکا اور دل دھڑکا والا معاملہ تھا۔

پھر ایک مقام پر جہاں دو نسبتاً بلند ٹیلے شانہ بشانہ دکھائی دے رہے تھے، لالاں ان کے درمیانی اور بل کھاتے دراڑ نما راستے کے آغاز میں رک گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو سا بنا کر پکارنے کے انداز میں زور سے اپنے ساتھی کوڑل کو آواز دی۔ ایسا اس نے پھوٹا خان کی درشت مگر سرگوشیانہ ہدایت پر کیا تھا۔ لالاں کے ''کوڑل'' پکارنے کی آواز' خاصی دور تک گونجتی چلی گئی۔ میرا متوحش دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ آواز کی بازگشت چند ثانیے ہلکورے لینے کے بعد معدوم ہوگئی۔ لالاں نے دوسری بار پھر کوڑل کو پکارا۔ رات کے سناٹے میں لالاں کی آواز خنجر کی طرح پیوست ہوتی چلی گئی مگر پھر بھی جواباً خاموشی چھائی رہی۔

پھوٹا خان کے چہرے پر طیش اور پریشانی کے تاثرات مزید گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک ٹیلوں کی طرف ذرا دور گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ ہم سب بری طرح چونک پڑے۔ میرا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز یک دم ہی معدوم ہوگئی تھی' جس سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ اچانک فائرنگ ابھی یک طرفہ ہی تھی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے دوبارہ گولیوں کی تڑاتڑی ابھری ۔ مجھے تو البتہ اندازہ نہ ہوسکا تھا لیکن شاید پھوٹا خان اور اس کی حواریوں کو دوسری بار ہونے والی فائرنگ سے یہ اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ یہ جوابی فائرنگ تھی۔ جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ پھوٹا خان کے ان دونوں حواریوں اور کوڑل کے بیچ ٹھن گئی تھی۔ لیکن میں نے دیکھا کہ پھوٹا خان اب بری طرح پریشان اور متفکر نظر آنے لگا تھا۔ ان حالات میں اس کا یک دم پریشان اور بے چین ہوجانا پُرمعنی تھا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر ہونے والی ''دوطرفہ'' انداز کی فائرنگ سے پتا چلتا تھا کہ کوڑل کو ''معاملے'' کی خطرناک کایا کلپ کا اندازہ ہوچکا تھا اور وہ یقیناً طیش میں آکر مراد علی کو جانی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ اب بذاتِ خود مجھے بھی پھوٹا خان کے اس معصوم بچے کی جان کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ معصوم بے چارہ بہرحال بے گناہ تھا اور میں بھی یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کے کرتوتوں کی بھینٹ چڑھ جائے۔ پھوٹا خان کی حالت پتلی ہونے لگی۔ وہ شدید مضطرب نظر آنے لگا۔ لالاں کے چہرے پر البتہ اب بھیدوں بھری گہری سنجیدہ خاموشی کھنڈ آئی تھی۔

''لگتا ہے...... سائیں بخش اور سوڈھل نے کام بگاڑ دیا ہے۔'' معاً پھوٹا خان کی پُرتفکر آواز ابھری'' حالانکہ میں نے ان دونوں کو سمجھایا بھی تھا کہ اگر کوڑل انہیں نظر آ بھی جائے تو اس پر ہاتھ ڈالے بغیر ایک ادھر ہی اس کی ٹوہ لگائے اور دوسرا فوراً ادھر آکر مجھے خبر کرے مگر اب......'' وہ دانت پیس کر اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا۔

سائیں بخش اور سوڈھل یقیناً اس کے ان دونوں حواریوں کے نام تھے جنہیں ذرا دیر پہلے ہی پھوٹا خان نے کوڑل کی ٹوہ لینے کے لیے ٹیلوں کی طرف روانہ کیا تھا۔

''سائیں میرا خیال ہے...... آپ اور بچل ادھر ہی رکو' میں آگے جاکر دیکھتا ہوں'' پھوٹا خان کو سخت متفکر پاکر اس کے ایک کارندے نے پُرجوش ہوکر کہا تو پھوٹا خان نے اس کی بات جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے لالاں سے درشت لہجے میں پوچھا۔

''تیرا وہ یار...... یہاں سے کتنے فاصلے پر موجود ہے؟''

''مجھے لگتا ہے اسے گڑبڑ کا احساس ہوگیا ہے'' جواباً لالاں نے گومگو سے لہجے میں کہا حالانکہ اس نے پھوٹا خان کا سوال گول کردیا تھا۔ وہ دوبارہ بلا تعویق پھوٹا خان کو تجویز دیتے ہوئے بولی ''پھوٹا خان! تمہارے ان دونوں ساتھیوں نے جوش میں آکر جلد بازی سے کام بگاڑ دیا ہے۔ اس طرح تمہارے بچے کی زندگی کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ کوڑل کو اب تک یہ نہیں معلوم کہ میں اس وقت تمہارے رحم وکرم پر ہوں۔ اگر تم اجازت دو تو خود جاکر اپنے ساتھی سے بات کروں؟''

پھوٹا خان اس کی بات پر بہ مشکل اپنے غیظ کو دباتے ہوئے پھنکار کر بولا ''نہیں...... تمہیں ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا' چلو آگے بڑھو۔'' یہ کہہ کر اس نے لالاں کو آگے دھکیلا اور وہ خود اس کے عقب میں پستول تانے چلنے لگا۔ چنانچہ مجھے بھی ساتھ کھڑے اس کے دونوں حواریوں نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

ہم سب چہروں پر سنسنی خیز خاموشی طاری کیے آگے بڑھ رہے تھے۔ ٹیلوں کے درمیان بنی یہ گزرگاہ بل کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً سناٹے میں ایک بار پھر گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ اس بار یہ آواز خاصی قریب سے سنائی دی تھی۔ لگتا تھا' ہم جائے وقوعہ کے خاصے قریب پہنچ چکے تھے۔ مگر اس بار پھوٹا خان کے قدم نہیں رکے تھے۔ وہ بدستور لالاں کے عقب میں اسے گاہے بہ گاہے آگے دھکیلتا ہوا چلا جارہا تھا۔ میرا دل متواتر بری طرح دھڑکے جارہا تھا۔ پھر اچانک ہمیں سامنے نسبتاً ایک کم بلند ٹیلے کی ڈھلان پر ایک سایہ دکھائی دیا۔ جسے دیکھ کر ہم سب ٹھٹک کر رک گئے۔ اس نے بھی شاید ہمیں دیکھ لیا تھا اور اب وہ تیزی کے ساتھ مذکورہ ٹیلے کی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ وہ خاصا زخمی معلوم ہورہا تھا۔ وہ ڈھلان سے تقریباً لڑکھڑاتا ہوا

سیدھا راہ گزر میں عین چھوٹا خان اور لالاں کے قدموں میں آ گرا۔ اس کا وجود خاصا زخمی دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شاید گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ چھوٹا خان اور اس کا ایک حواری فوراً اس کی طرف لپکے۔

''اڑے سوڈھل! بابا کیا ہوا تجھے؟ سائیں بخش کدھر ہے؟'' چھوٹا خان نے اس کے ذرا قریب پہنچ کر کھڑے کھڑے اس سے پوچھا۔ سوڈھل نامی زخمی شخص بری طرح نڈھال تھا۔ وہ کھنچی کھنچی سی سانسیں لے رہا تھا۔ میں اور دوسرا حواری بھی ذرا آگے بڑھ آئے تھے۔ چھوٹا خان اپنے زخمی حواری کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اسے گویا جھنجوڑ کر دوبارہ بولا۔

''اڑے...... کچھ بول تو سہی...... ہوا کیا ہے؟''

''سس...... سائیں...... بخش...... مم...... مر چکا ہے...... ک...... کوڑل نے ...... مم...... مجھے بھی زخمی کر ڈالا''

زخمی سوڈھل نے بہ مشکل ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتایا اور پھر اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ یہ ایک ایسا لمحہ تھا کہ ہم سب ہی چند ثانیے کے لیے لالاں سے غافل ہو چکے تھے اور شاید یہی وہ لمحہ تھا جس کی وہ کافی دیر سے منتظر بھی تھی۔ ہم چوں کہ اس وقت راہ گزر کے ایک موڑ والے حصے پر کھڑے تھے۔ لہٰذا لالاں نے کسی چھلاوے کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کی اور راہ گزر کے موڑ کے عقب میں تیزی سے غائب ہو گئی۔ چھوٹا خان کا وہ حواری جو میرے ساتھ چپکا کڑا تھا۔ اس کی البتہ لالاں پر نظر پڑ چکی تھی اور اس نے بھی اپنی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لالاں پر اپنی گن سیدھی کرنی چاہی تھی۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی ٹیلے کے عقب میں غائب ہو چکی تھی اس لیے اسے لالاں پر فائر کرنے کا موقع تو نہ مل سکا تھا البتہ...... اس نے جوش میں آ کر تیزی سے حرکت کی اور لالاں کے عقب میں دوڑ گیا۔ چھوٹا خان اور اس کا بجل نامی حواری...... سوڈھل کے قریب سے فوراً مضطربانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر لالاں کی جرأتِ رندانہ نے میری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو بھی جیسے پارہ بننے کی ترغیب دی اور میرے جی میں بھی اس موقع سے فی الفور فائدہ اٹھانے کی تمنا جاگی تھی لیکن چھوٹا خان نے غراہٹ آمیز آواز میں بجل کو مجھ پر نظر رکھنے کی ہدایت دے کر خود تیزی سے آگے بڑھ کر موڑ کی دوسری طرف غائب ہو گیا۔ بجل نے فوراً مجھ پر اپنی رائفل تان لی تھی مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ اپنے سوڈھل اور سائیں بخش نامی دونوں ساتھیوں کی عبرت ناک موت نے اسے خاصا متفکر اور پریشان سا کر دیا تھا۔ اس پر مستزاد ان کا شکار لالاں بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلی تھی۔ یہی سبب تھا کہ بجل کے چہرے پر اس بار درشتی یا کرختگی کے بجائے رنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ میرا دل بھی اب خون کے بجائے مفر کی راہ کا منتظر تھا۔ دفعتاً مجھے جیسے اپنی سماعتوں کے بالکل قریب گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ بے اختیار میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ مجھ پر رائفل تانے کھڑا بجل تیورا کر گرا۔ ایک لمحے کو تو میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا تھا کہ یہ سب کیا اور کیسے ہوا تھا؟ مگر میں ایسے اچانک اور غیر متوقع حالات کی عادی ہو چکی تھی اور بوکھلانے یا ڈرنے کے بجائے میں ایکا ایکی اپنے مختل حواسوں پر قابو پانے کی بھی صلاحیت رکھنے لگی تھی۔ چنانچہ جیسے ہی میں نے سامنے گن تانے پہاڑ کی طرح کھڑے بجل کو سرمہ بنتے زمین پر ڈھیر ہوتے دیکھا تو فوراً میری نگاہیں فائرنگ کی سمت میں اٹھ گئیں۔ یہ میرے بائیں جانب ٹیلے کی وہ اونچی سمت تھی جدھر سے سوڈھل...... زخموں سے چور ہو کر لڑکھڑاتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اب عین اس سمت پر مجھے ایک انسانی ہیولا ہاتھ میں گن پکڑے دکھائی دیا۔ میرے وجود میں ایکا ایکی اضطراری جنبش ابھری۔ اور جوش کی ایک جارحانہ لہر بجلی کی طرح میری رگوں میں سرایت کرتی چلی گئی۔ تب میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنے بالکل قریب ساکت پڑے بجل کی لاش پر جھپٹی اور اس کے مردہ وجود کے قریب پڑی رائفل اچک لی اور پشت کے بل لیٹے لیٹے ذرا کروٹ بدل کر ٹیلے کی چوٹی پر کھڑے اس پُراسرار ہیولے پر ایک برسٹ فائر کر دیا۔ ٹیلے پر گرد و غبار کا طوفان اٹھا اور پھر اپنے نشانے کی ''تسلی'' کیے بغیر مخالف سمت کی طرف دوڑ لگا دی۔ اگلے ہی لمحے مذکورہ ٹیلے کی سمت سے برسٹ چلنے کی گھن گرج سنائی دی۔ مگر اس وقت تک میں بل کھاتی راہ گزر کے موڑ کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرے جی میں جانے کیسی ''مہم جوئی'' سمائی کہ میں ایک ٹیلے کی آڑ سے چپک کر بیٹھی رہی۔ اس وقت میرے رگ و پے میں عجیب سے جوش کی لہر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پُراسرار ہیولا کوڑل کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ جو چھوٹا خان کے دو حواریوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد زخمی سوڈھل کا پیچھا کرتا ہوا اس طرف نکل آیا تھا اور اپنی جنگجوانہ اور مکارانہ چابک دستی سے وہ چھوٹا خان کے تیسرے حواری بجل کو بھی اب ختم کر چکا تھا اور بڑی آسانی کے ساتھ مجھ تک بھی آ پہنچا تھا لیکن میری بروقت ہوش مندی نے اب اس کے لیے میرا حصول مشکل بنا ڈالا تھا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہی تھی کہ کوڑل جیسے مکار دشمن سے میں خود بھی بری طرح خائف تھی۔ اگرچہ میں نے اس خوف کو اپنے اعصاب پر سوار کرنے کے بجائے اس کا ڈٹ کر سامنا کرنے کی ٹھان لی تھی اور میں نے اس بار اپنے دل میں یہ تہیہ کر لیا تھا کہ میں اب اپنے چھوٹا خان اور لالاں وغیرہ جیسے دشمنوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی کیونکہ یہ

میرے دشمنوں کا وہ گروہ تھا جو بار بار میرے اہم مقاصد کے آڑے آ کر میرا جینا دوبھر کیے ہوئے تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ سب سے بڑی اور اہم بات یہ بھی تھی کہ ان کے نرغے میں آ کر بارہا میری زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوا تھا چھوٹا خان اور لالاں وغیرہ کے دونوں مخالف ٹولوں کا مقصد مشترکہ تھا اور وہ تھا میرا حصول تاکہ وہ لوگ اس بیش قیمت ”راکاس مورتی“ کے مدفن تک پہنچ سکیں اور یہی وجہ تھی کہ میرے حصول کی خاطر ان دونوں ٹولوں کے درمیان خطرناک رسا کشی جاری تھی۔

ٹیلے کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ جانے کا میرا ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ کوڑل یقیناً میرا تعاقب کرتا ہوا ضرور ادھر آنے کی کوشش کرے گا۔ میری ان حالات میں اس جرأت کا مظاہرہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں اچھی طرح جانتی تھی۔ چھوٹا خان اور لالاں سمیت کوڑل ...... بہر صورت میری موت کے متمنی نہ تھے۔ جب تک کہ وہ میرے ذریعے ”راکاس مورتی“ تک نہیں رسائی حاصل کر لیتے' اس کے بعد یقیناً میری زندگی ان کے لیے کانٹے کی طرح کھٹکتی۔ اور تب یہ لوگ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک پل کی بھی دیری نہیں لگائیں گے۔ لہٰذا یہی سبب تھا کہ میں اب ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی کہ میں چھوٹا خان سمیت لالاں اور کوڑل کو جہنم واصل کر کے ہی دم لوں۔

میں دم سادھے ٹیلے کی آڑ میں جھک کر اکڑوں بیٹھی تھی۔ میرے چہار اطراف سناٹے پھیلے ہوئے تھے۔ پُرسکوت فضا میں مجھے اپنی سانسوں کی بازگشت بھی چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی چہ جائیکہ جسے سن کر میرے دشمن میری یہاں موجودی سے واقف نہ ہو جائیں۔

معاً مجھے اپنے عقب میں آہٹ سی سنائی دی۔ میں جنگلی بلی کی طرح رائفل تانے پلٹی۔ کسی نے مٹی کا ڈھیلا اچھالا تھا۔ یہی وہ جان لیوا لمحہ تھا جب بجلی کی سرعت کے ساتھ میرے دماغ میں دشمن کی اس چالاکی کا عقدہ کھلا اور جب تک میں دوبارہ پلٹتی' مجھے دیر ہو چکی تھی۔ ایک ہیولے نے میرے رخ پھیرنے پر عقب سے مجھ پر چھلانگ لگا دی تھی۔

☆☆☆

میرے حلق سے اضطراری چیخ سی نکل گئی۔ بدبخت کوڑل نے مجھے گردن سے دبوچنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے پشت کے بل گرتے ہی .... اپنے ہاتھ کی مٹھی مضبوطی سے جکڑتے ہوئے ایک گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ رائفل چونکہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی لیکن میرا مکا کوڑل کے لیے غیر متوقع ثابت ہوا تھا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ جھنجلا سا گیا۔

میں نے فوراً مچھلی کی طرح تڑپ کر قریب دھری اپنی رائفل پر ہاتھ جمایا تو کوڑل اپنے مضروب چہرے کی تکلیف کو بھلا کر میرے رائفل والے ہاتھ کو پکڑنے کی سعی کرنے لگا۔ میں نے پشت کے بل لیٹے لیٹے اپنی دائیں ٹانگ اس کے سینے پر جما کر اور اسے پرے دھکیل دیا۔ مگر اس کوشش میں وہ میرے ہاتھ سے رائفل کھینچنے میں کامیاب ہو چکا تھا چنانچہ اگلے ہی لمحے وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور میری رائفل ایک جانب پھینک کر اپنی رائفل مجھ پر تان لی اور زہرخند لہجے میں بولا۔

”خبردار...... کونجاں! اب کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ......“ اس نے شعلہ اگلتی نظروں سے مجھے گھورا اور میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرا دل متوحش انداز میں تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”چھوٹا خان کے اور کتنے ساتھی باقی ہیں“ اس نے درشتی سے پوچھا۔

”ایک...... دوسرا وہ خود ہے اور لالاں کے تعاقب میں دونوں گئے ہیں“ میں نے مصلحتاً صاف گوئی سے جواب دیا تو اس نے دوبارہ پوچھا ”کس طرف گئے ہیں وہ دونوں مردود!“

”اس طرف......“ میں نے اس بار دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے بالکل مخالف سمت میں اشارہ کیا۔

وہ چند ثانیے دانت پیستے ہوئے کچھ سوچتا رہا پھر اس کے بعد مجھے مذکورہ سمت میں آگے بڑھنے کو کہا۔ میرے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔ تاہم میں نے ایک قدم بھی آگے بڑھائے بغیر چالاکی سے کہا۔

”چھوٹا خان کے سر پر اس وقت خون سوار ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم میری فکر چھوڑ کر اپنی لالاں کو ان دونوں کے خونی پنجے سے بچاؤ۔ میں بھلا کہاں جا سکتی ہوں' تمہاری تو مجھ ...... سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔“ میں یہ کہتے ہوئے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے پر اپنی بات کی اثر پذیری بھانپنے کی کوشش کرنے لگی۔ میں نے فوراً یہ بات محسوس کر لی کہ وہ میری بات پر چند ثانیے کے لیے تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ پھر معاً رات کے پُرہول سناٹے میں ہمیں دھواں دھار فائرنگ کی گھن گرج سنائی دی۔ ہم دونوں ہی بری طرح ٹھٹکے تھے۔ کوڑل البتہ زیادہ پریشان دکھائی دینے لگا تھا۔ فائرنگ کی آواز اس سمت سے ابھری تھی جدھر تھوڑی دیر پہلے چھوٹا خان اور اس کا چوتھا ساتھی' لالاں کا تعاقب کرتے ہوئے نکلے تھے۔ یہ مخالف سمت تھی' جو میرے جھوٹ کا پول کھولنے کے لیے کافی تھی۔ شاید یہ بات کوڑل نے بھی فوراً محسوس کر لی تھی' وہ اب میری طرف سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورنے لگا مگر میں نے اپنے چہرے سے ذرا بھی گھبراہٹ ظاہر ہونے نہیں دی تھی۔

”تو' تو کہہ رہی تھی کہ وہ دونوں مردود...... اس سمت گئے ہیں...... جبکہ فائرنگ کی آواز تو عقب سے آ رہی ہے؟“

”میں نے بالکل درست کہا تھا“ میں نے ڈھٹائی سے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے جواباً کہا۔

”لالاں موقع پاتے ہی اس طرف دوڑی تھی۔ ہو سکتا ہے' اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر بعد میں اپنا رخ تبدیل کر لیا ہو۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تم اس طرف موجود ہو گے۔“ میری توجیہہ نے اس کی آتشِ غیظ کو ذرا کم کیا تو وہ بولا۔

”کونجاں! تمہاری بات بالکل درست ہے۔ ہماری واقعی تم سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے لیکن کونجاں' تو اگر راکاس مورتی تک ہماری راہنمائی کر دے تو یہ میرا وعدہ ہے' پھر ہم تیرا پیچھا چھوڑ کر واپس اپنی دھرتی راجھستان کی طرف لوٹ جائیں گے۔“

”اس رذیل چھوٹا خان کو بھی یہی غلط فہمی ہے' وہ یہ سمجھتا ہے' میں راکاس مورتی کے راز سے واقف ہوں“ اس کی بات کے اختتام پر میں نے بھی مکارانہ حکمتِ عملی سے اپنے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

• ”جبکہ حقیقت یہی ہے کہ...... مجھے خالقو چاچا نے اس مورتی کے بارے میں صرف اس قدر ہی بتایا تھا کہ وہ کندھ کوٹ کشمور کے صحرائی علاقے میں کہیں دفن ہے۔“

”تو ایک چالاک بلی بننے کی کوشش مت کر کونجاں!“ معاً کوڑل نے دانت پیستے ہوئے جیسے میری مکارانہ حکمتِ عملی پر پانی پھیر دیا۔ ”اتنا تو ہم بھی جانتے ہیں کہ راکاس مورتی کشمور کے صحرائی علاقے میں کہیں دفن ہے اور ہمارے پاس اتنے وسائل ہیں اور نہ ہی اتنا وقت کہ کشمور کے صحراؤں کو کھنگالتے پھریں مجھے پورا یقین ہے کہ خالقو دھاڑیل نے جس مقام پر وہ مورتی دفن کی ہے' اس سے تجھے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا اور تو راکاس مورتی کے مدفن سے بہ خوبی آگاہ ہو چکی ہے۔ ورنہ وہ رذیل اور دغاباز چھوٹا خان ہرگز تجھے یرغمال نہ بناتا۔“

اس کی گفتگو نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت دوبارہ فائرنگ کی گھن گرج ابھری۔ کوڑل یک بیک ٹھٹکا اور پھر اپنی رائفل کی مہیب نال لہراتے ہوئے مجھ سے تحکمانہ کرختگی سے بولا ”چلو آگے بڑھو۔ اب کوئی بات نہیں ہوگی“ اس کے خونخوار لہجے کی قطعیت کو محسوس کر کے میں سر جھکا کر اس جانب چل پڑی جدھر چھوٹا خان اپنے ایک اکلوتے حواری کے ساتھ لالاں کے تعاقب میں دوڑا تھا۔

کوڑل میرے پیچھے پیچھے تھا۔ میں جان بوجھ کر آہستہ روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ معاً کوڑل نے میری پشت میں اپنی رائفل کی نال چبھوتے ہوئے دھکیل کر کہا ”جلدی چلو...... ورنہ گولیوں سے بھون دوں گا۔“

ناچار میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔ فائرنگ کا انداز یک طرفہ محسوس ہو رہا تھا۔ جس کا بدستور اور واضح مطلب یہی تھا کہ لالاں ابھی نہتی تھی' چھوٹا خان جیسے عفریت سے اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ کوڑل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح' لالاں کی مدد کو لپکے۔ مگر وہ مجھے بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ شدید تذبذب کا شکار نظر آ رہا تھا۔ وہ اس وقت کئی قسم کے حالات کا شکار تھا۔ چھوٹا خان کے تین حواریوں کو بڑی سفاکی ...... سے قتل کر چکا تھا۔ اور نہ جانے اس نے اب تک چھوٹا خان کے بیٹے مراد علی کو کہاں چھپا رکھا تھا۔ فائرنگ کی آواز پھر گونجی۔

”کونجاں! میں کہتا ہوں ...... دوڑو' تیز دوڑو۔ جلدی کرو“ مجھے عقب سے کوڑل نے جنونیوں کے سے انداز میں ٹھوکا مارتے ہوئے کہا اور پھر میں نے ٹیلوں کے درمیان بل کھاتی راہ گزر پر بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ فائرنگ کی آواز اب بالکل قریب سے آتی ہوئی سنائی دینے لگی تھی۔ یہ میرے لیے بڑے سنگین لمحات تھے جو جان لیوا بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ کیونکہ اس وقت چھوٹا خان کے سر پر اپنے بیٹے کے سوا اور کوئی دھن سوار نہ تھی۔ وہ مشتعل ہو کر مجھے بھی ہلاک کر سکتا تھا یا پھر دو خونخوار اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دشمنوں کے بیچ میں بھی پس سکتی تھی۔ مگر میں نے باوجود اس کے اپنے حواس قابو میں رکھے تھے اور میرا دل متوحش ہونے کے باوجود ”فرار“ کی راہ کا متلاشی تھا۔ میں اب کوڑل کی ہدایت کے مطابق دوڑے جا رہی تھی۔ دائیں بائیں ٹیلوں کا سلسلہ اب مزید گنجان ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر اچانک ایک مقام پر میں بے دم ہو کر گر پڑی اور بری طرح ہانپنے لگی۔ دھواں دھار گولیاں چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ کوڑل نے میرے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور غرا کر بولا۔

”میرے ساتھ مکر مت کر چل اٹھ“ مجھے غصہ تو آیا مگر میں اسے دبانے پر مجبور تھی۔ ناچار اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور نڈھال سی آگے بڑھنے لگی۔ مگر میرا چلنے کا انداز سست ہی تھا۔ کوڑل اس وقت پائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ مجھے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا اور میرے ہوتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر اپنی لالاں کو دشمنوں کے اندھا دھند حملوں سے بھی بچانا چاہتا تھا۔ وہ تنہا ہوتا تو شاید اب تک قہر و غضب بن کر دشمنوں پر ٹوٹ چکا ہوتا۔ لیکن مجھے یرغمال رکھنے کی .... ذمے داری اس

کے جارحانہ عزائم میں آڑے آرہی تھی۔ میری سست رو چال پر بالآخر وہ تلملا گیا اور ایک زوردار لات اس مردود نے میری کمر پر رسید کردی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور میں چیختی ہوئی منہ کے بل زمین پر جاگری۔ اب تو میں بالکل ہی ڈھے کر رہ گئی تھی۔ تب پھر مجھے کوڑل کی آواز سنائی دی۔

''حرام زادی! تو جائے گی کدھر آخر ہم سے بچ کر۔ میں پہلے دشمنوں سے نمٹ لوں۔ پھر تجھے بھی دیکھ لوں گا۔''

یہ کہہ کر وہ آندھی طوفان کی طرح' میرے قریب سے گزرا۔ میرا دل بے پایاں مسرت سے جھوم اٹھا۔ میرے ذہنِ رسا نے برمحل یہ ترکیب سوچی تھی' جو کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ میں نے تھکاوٹ اور نڈھال کی اداکاری چھوڑ کر' زمین پر پڑے پڑے سر اٹھا کر سامنے تاریک راہ گزر میں رائفل بدست کوڑل کو گم ہوتے دیکھا تو پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ' عقب میں دوڑ لگادی۔

☆☆☆

میرے دو دشمن مجھے بھول کر آپس میں ہی نبرد آزما ہو چکے تھے اور میرے فرار کا یہ بہترین موقع تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اپنی چال میں اتنی آسانی کے ساتھ کامیاب ہو چکی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہی رہی تھی کہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ کم از کم پھوٹا خان یا کوڑل ..... مجھے قتل کر کے اپنے ''بیش قیمت'' مقصد کو ''ختم'' کرنا بہرحال نہیں چاہتے تھے۔ ویسے بھی میرا ان سے کوئی خونی یا سنگین جھگڑا تو نہیں تھا۔ وہ اپنے حصولِ مقصد کی خاطر مجھے اس وقت تک زندہ رکھنے پر مجبور تھے جب تک کہ وہ دونوں میرے ذریعے اس منحوس ''راکاس مورتی'' کو نہ حاصل کر لیتے۔

بہرطور میں اب دونوں پر مٹی ڈال کے بے تحاشا دوڑی چلی جارہی تھی۔ ٹیلوں کے درمیان مجھے دائیں بائیں مزید چوڑی گزرگاہیں بھی نظر آئی تھیں۔ اور جب میں نے ایک موڑ کاٹا تو اچانک میں ایک نیم اندھیرے مقام پر ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب میرے دائیں بائیں بلکہ چہار اطراف گزرگاہوں کی بھول بھلیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ میں پریشان سی ہوگئی۔ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کون سی راہ گزر میں داخل ہونے کی کوشش کروں؟ پھر اللہ کا نام لے کر اپنی دائیں جانب والی راہ گزر میں داخل ہوگئی۔

بالآخر میں دوڑتے دوڑتے ایسے مقام پر پہنچ کر رک گئی جدھر ٹیلوں کا سلسلہ یک لخت معدوم ہو چکا تھا۔ ذرا ستانے اور اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے کے بعد میں نے جنگل کے بالکل مخالف سمت میں بڑھنا شروع کر دیا۔ جلد ہی مجھے راستے کی درست سمت کا اندازہ ہوگیا۔ یہ وہی مقام تو جدھر پھوٹا خان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہم نے لالاں کی نشان دہی پر ٹیلوں کے اندر اپنا سفر شروع کیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر پھوٹا خان کی جیپ کو موجود ہونا چاہیے تھا' یہاں قد آدم خودرو اور خاردار جھاڑیوں کا سلسلہ بہت مختصر تھا...... اس کے بعد چھدری چھدری جھاڑیوں والا ویرانہ تھا اور وہیں پھوٹا خان کی جیپ کھڑی تھی لہٰذا منزل کے قریب پہنچنے کی دھن میں' میں بغیر رکے خاردار جھاڑیاں پھلانگتی ہوئی جب آخری سرے پر پہنچ کر یکدم جھاڑیوں سے نکلی تو سامنے نگاہ پڑتے ہی میرے قدم جیسے یک دم زمین میں گڑ سے گئے۔ سامنے مدھم روشنی میں مجھے پھوٹا خان کی جیپ تو کھڑی نظر آگئی تھی مگر میرے چونک کر رکنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ میں نے جیپ کے قریب کچھ لوگوں کو کھڑے دیکھا تھا۔ ان کا فاصلہ مجھ سے زیادہ نہ تھا۔ ان کی نظروں سے چھپنے کی غرض سے میں دوبارہ الٹے پاؤں جب واپس جھاڑیوں کی طرف پلٹی تو اچانک مجھے کسی کے زور سے ہنکارنے کی آواز سنائی دی۔

''خبردار...... رک جاؤ...... ورنہ......''

میں یہ آواز سن کر بری طرح دہل گئی' یہ مردود کوڑل کی آواز تھی۔ میرے تو فرشتے کوچ کر گئے مگر میں رکی نہیں اور دیوانہ وار عقب میں دوڑ لگادی۔ اس لمحے میرے عقب میں دو تین گولیاں چلنے کی آواز ابھری مگر میں رکی نہیں اور ہراساں ہرنی کے مانند دوڑتی چلی گئی۔ معاً مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی میرے تعاقب میں وحشیانہ انداز میں دوڑا چلا آرہا تھا۔ اپنے تعاقب کے احساس نے مجھے لرزا سا دیا۔ اور دیوانہ وار دوڑتے دوڑتے میری ٹانگیں بھی لرزنے لگیں۔ ٹھیک اسی وقت میرا پاؤں جھاڑیوں میں رپٹا اور میں ایک اضطراری سی کراہ آمیز چیخ مارتی ہوئی منہ کے بل خاردار جھاڑیوں میں جاگری۔ میرے چہرے پہ خراشیں ابھر آئیں۔ گھبراہٹ اور عالم سراسیمگی سے میرا خون رگوں میں جمنے لگا تھا اور شاید یہی سبب تھا کہ میں گرتے کے ساتھ ہی چند لمحے دم بخودسی بے حس و حرکت اپنی جگہ پڑی رہی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے مختل حواسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تو اچانک کسی نے عقب سے غراتے ہوئے مجھ پر چھلانگ لگادی اور میں ایک بار پھر خاردار .... جھاڑیوں میں گری اور گرتے ہی معاً مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر سوار میرا مدمقابل وجود نسوانی تھا۔ صنفِ نازک بذاتِ خود ایک کمزوری ہے' جس سے مجھے قدرے حوصلہ ہوا مگر مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہیں لگی یہ نسوانی وجود اس چنڈال لالاں کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا تھا۔ لالاں

جیسی مردمار ''صنفِ نازک'' کا خیال ذہن میں ابھرتے ہی میرے اندر ایک صرف ایک ثانیے کے لیے مغلوب ہونے کا متوحش سا خیال ابھرا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے میرے اندر کی ...... سرکش اور باغی کڑے حالات میں بھڑ جانے والی کونجاں انگڑائی لے کر یکدم بیدار ہوگئی چنانچہ میں نے گرتے ہی زخمی شیرنی کی طرح زمین پر لوٹ لگائی اور خود کو لالاں کی مضبوط گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میں اسے پہچان گئی تھی۔ وہ لالاں ہی تھی۔ میں فوراً اٹھ کر کھڑی ہوگئی تو وہ بھی زخمی ناگن کی طرح پھنکار سے مشابہ آواز نکال کر میرے سامنے کھڑی مجھے خوں خوار نگاہوں سے گھورنے لگی۔ تاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں اس کا چہرہ جوشِ غیظ سے سرخ نظر آرہا تھا تاہم مجھے وہ کچھ مضمحل اور زخمی بھی دکھائی دے رہی تھی۔

''کونجاں ......! تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ خاموشی سے میرے ساتھ چلو'' معاً وہ اپنی بپھری ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے دانت بھینچ کر بولی تو میرے دماغ میں بھی طیش آمیز جوش کا دھواں سا بھرنے لگا اور میں نے جواباً شعلہ فشاں لہجے میں اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لالاں! جس مقصد کے لیے تو اپنی جان کی پروا کیے بغیر...... تن من کی بازی لگائے ہوئے ہے' یوں سمجھ' اس سے کہیں زیادہ خود میری رگوں میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے لاوا بن کر مجھے شعلہ فشاں بنائے ہوئے ہے مگر تیرے مقابلے میں میرے دشمن زیادہ طاقت ور' سفاک اور دگنی تعداد میں ہیں اس لیے میں تجھے خبردار کرتی ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جا......'' میرے جواب نے لالاں کے خراش زدہ چہرے کی سرخی کو مزید گہرا کر دیا پھر وہ اگلے ہی لمحے میں دانت پیستی ہوئی جارحانہ انداز میں میری طرف یہ بڑبڑاتے ہوئے لپکی۔

''...... تو ایسے نہیں مانے گی کتیا!'' اس کے منہ سے گالی سن کر جیسے میرا جلتا ہوا دماغ بھک بھک کرنے لگا۔

''ذلیل ...... تو کتیا کی بچی! میں تیرا خون پی جاؤں گی'' شعلہ خوں لہجے میں اسے جواب دیتے ہوئے بیک وقت میں بھی اس کی طرف لپکی۔ پھر ہم دونوں زخمی شیرنی اور منتقم ناگن کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری گردن پر جمانے کی کوشش کی تو میں نے اپنی انگلیوں کے تیز نکیلے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچ ڈالا۔ اس کے حلق سے زخمی کراہ بلند ہوئی اس کے ساتھ ہی اس نے پستول نکال لیا اور غرا کر بولی۔

''کونجاں......! کاش ...... میں تجھے ہلاک کر سکتی ...... کاش......''

لالاں مجھ پر پستول تانے آتش خوں رنگ لہجے میں ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔

''میں واقعی تجھے ایک کمزور لڑکی سمجھی تھی۔ اچھا ہوا جو تو نے اپنے پر پرزوں سے مجھے آگاہ کر دیا۔ چل اب شرافت سے ورنہ میں تیری دونوں ٹانگوں پر گولیاں چلا کر تجھے معذور بنا دوں گی۔''

اس کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی کیونکہ میں نے اب اپنے تنے ہوئے اعصاب یک دم ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ میرے سپر ڈالنے پر اس کے خون آلود زخمی ہونٹوں پر زہرخندی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے پستول کے اشارے سے مجھے ایک طرف چلنے کو کہا۔ میں اس کا حکم ماننے پر مجبور تھی۔ چنانچہ خاموشی سے آگے بڑھی' وہ اپنے اور میرے درمیان ایک محتاط فاصلہ رکھ کر عقب میں چلنے لگی۔

لالاں مجھے پستول کے بل پر جیپ کے قریب لے آئی تو میں بری طرح چونکی۔ میں نے دیکھا' لالاں کا منگیتر مردود کوڑل' پھوٹا خان پر رائفل تانے کھڑا تھا اور اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک نو دس سالہ ڈرے سہمے بچے کو بھی گدی سے دبوچ رکھا تھا۔ بچے کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ معصوم بچہ پھوٹا خان کا بیٹا مراد علی تھا۔ پھوٹا خان کے چہرے پر قیامت کروٹ لے رہی تھی۔ میرے قریب پہنچنے پر کوڑل نے ایک خونخوار سی نظر میرے چہرے پر ڈالی اور پھر جب اس نے اپنی لالاں کے زخمی اور خون آلود چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں لمحہ بھر کو حیرت سے پھیل گئیں۔

''لالاں! یہ...... یہ تجھ کو کیا ہوا؟''

''یہ اس نے کیا ہے۔ بہوت خطرناک چھوکری ہے یہ ...... کوڑل' اس سے ہوشیار رہنا۔''

لالاں نے باچھوں سے خون تھوکتے ہوئے کوڑل سے کہا۔

اس کی بات سن کر کوڑل اپنی چندی چندی مگر سفاک آنکھوں سے میری طرف گھورنے لگا۔ پھر لالاں سے جوشِ غیظ سے بولا۔

''لالاں! تو ادھر آ' میں اس حرام زادی سے ابھی تیرا حساب بے باق کیے دیتا ہوں۔''

''نہیں کوڑل! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جتنی جلد ہو سکے' یہاں سے نکل چلو'' لالاں نے کہا۔

''کونجاں! ہمارے ہاتھ لگ چکی ہے' میرا خیال ہے' اب اس مردود پھوٹا خان کا ادھر ہی قصہ پاک کر دو کیونکہ اب ہماری مقدس مورتی (راکاس مورتی) کے راز سے واقف ہو چکا ہے'' لالاں کے لہجے میں یکایک سفاکی اتر آئی تھی جسے محسوس کر کے

خود میں بھی ایک لمحے کو دہل سی گئی تھی۔ بلکہ پھوٹا خان بھی لالاں کے خونی عزائم بھانپ کر ایک لمحے کو اپنا طیش بھلا کر پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

''ان دونوں کو گولیوں سے بھون دے کوڑل!'' اچانک میرے عقب سے لالاں کی سفاک گونج ابھری۔

پھوٹا خان لاکھ میرا دشمن سہی لیکن اس وقت اس کے معصوم بیٹے کو دیکھ کر میرا کلیجا پھٹنے لگا تھا۔ اس کی معصوم فریاد نے میرے اندر آگ سی بھڑکا دی...... پھر اس لمحے جیسے میرا رواں رواں بیدار ہو گیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے کچھ بجھائی نہیں دیتا تھا اور میں شینا باجی کی طرح بے خطر گویا آتشِ نمرود میں کود پڑتی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں لالاں کی آواز سے محسوس کیا تھا کہ وہ جوشِ غیظ میں میرے کافی قریب بلکہ بالکل ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی۔ پستول والا اس کا ہاتھ بھی ذرا نیچے جھک آیا تھا' اچانک میرے سنسناتے ہوئے وجود میں پارا سا دوڑ گیا۔ میں نے جھپٹ کر لالاں کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ لالاں ایک لمحے کو تو ہکا بکا سی کھڑی رہ گئی۔ ہوش اسے تب آیا جب میں اس کا چھینا ہوا پستول اس کی کنپٹی سے لگاتے ہوئے کوڑل سے بہ آواز بلند بولی۔

''کوڑل! خبردار...... اپنی رائفل پھینک دے ورنہ لالاں کا بھیجہ اڑا دوں گی۔''

میری غراہٹ سے مشابہ آواز نے ایک لمحے کو کوڑل کو ساکت سا کر دیا۔ تاہم اس کے مکروہ چہرے پر برافروختگی کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ پھوٹا خان کے زرد پڑتے چہرے پر جیسے زندگی کی رمق دوڑ گئی۔ ننھا مرادعلی اپنی معصوم پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب تکنے لگا۔

''رائفل مت پھینکنا کوڑل!'' اچانک لالاں کا جیسے سکتہ ٹوٹا اور اس نے خرخراتی آواز میں اپنے ساتھی کو متنبہ کیا ''زندہ تو ہمیں یہ بھی نہیں چھوڑیں گے کوڑل! رائفل پھینکنے کی بے وقوفی مت کرنا'' لالاں نے دوبارہ جی جان سے کوڑل کو تلقین کی۔

یہ بہت سنسنی خیز لمحات تھے۔ کوڑل نے میری دھمکی کو نظرانداز کر ڈالا اور بدستور وہ پھوٹا خان اور اس کے معصوم بچے پر اپنی رائفل تانے کھڑا رہا۔ ادھر جانے کیا سوچ کر کوڑل نے پھوٹا خان سے مخاطب ہو کر غراتے ہوئے کہا۔

''خبردار پھوٹا خان! اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت مت کرنا اور نہ ہی کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہونا۔ تم دونوں باپ بیٹے اب بھی میرے نشانے پر ہو۔''

اس عجیب صورتِ حال پر میں تلملا کر رہ گئی۔ اگرچہ میری بروقت اور فوری جارحانہ کارروائی سے دونوں باپ بیٹوں کے سروں پر ناچتی موت عارضی طور پر ٹل چکی تھی لیکن مکار لالاں نے عین میری جیتی ہوئی بازی کو مکمل فتح میں بدلنے سے روک [illegible] تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے مکار لالاں نے چلتر بازی سے [illegible] مخاطب کر کے کہا ''کونجاں! بے وقوفی مت کر۔ پھوٹا خان [illegible] بھی دشمن ہے۔ وہ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔''

''بکواس بند کر اپنی ...... کتیا!'' میں نے غرا کر [illegible] جھڑکا۔ ''تم ایک بے گناہ اور معصوم بچے کی جان لینا چاہ[illegible] یہ مجھے گوارا نہیں' اپنے ساتھی سے کہو کہ وہ رائفل پھینک د[illegible] میں تم دونوں کی بہتری ہے۔''

''ہماری بہترین کس میں ہے یہ ہم خوب جانت[illegible] کونجاں!'' لالاں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''اب اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم دونوں کو [illegible] سلامت یہاں سے نکل جانے دیا جائے ورنہ حالات جا[illegible] حد تک سنگین ہو جائیں گے اور پھر ہم میں سے کوئی بھی [illegible] نہیں بچے گا۔''

میں نے اس کی تجویز پر غور کیا۔ میرا پستول والا[illegible] ہنوز اس کی کنپٹی پر تھا دوسری طرف کوڑل نے اپنی رائفل [illegible] مہیب نال پھوٹا خان اور معصوم مرادعلی پر بدستور تانے رکھی [illegible]

''ٹھیک ہے پھر......'' چند ثانیے کی پُرسوچ مگر اعصا[illegible] شکن خاموشی کے بعد میں نے کہا ''تم پہلے اپنے ساتھی [illegible] کہ...... وہ...... دور چلا جائے۔ پھر میں تمہیں بھی زندہ سلا[illegible] یہاں سے رخصت کر دوں گی۔''

''ہرگز نہیں۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ یہاں سے جانے [illegible] جائے'' لالاں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مطالبہ کیا۔

''میرے پاس صرف ایک پستول ہے جبکہ تمہارے سا[illegible] کے پاس گولیوں سے بھری ہوئی رائفل ہے۔ وہ دور سے [illegible] آسانی ہمیں نشانہ بنا سکتا ہے۔ تمہیں پہلے ہماری بات مان[illegible] میں نے کہا۔ یہ بہت بھاری اور جاں گسل لمحات تھے کسی [illegible] فریق سے ذرا بھی چوک ہو جاتی تو گویا ایٹم بم پھٹ پڑتا[illegible] اپنی پیشانی عرق آلود سی محسوس ہونے لگی تھی۔

ان کڑے اور سنسنی خیز لمحات میں صرف میں اور لالاں [illegible] محوِ کلام تھے۔ کوڑل نے موجودہ حالات کی ساری ذمے[illegible] لالاں کی صوابدید پر چھوڑ رکھی تھی۔ وہ جو فیصلہ کرے۔

''کیا کہتی ہو پھر...... لالاں......!'' میں نے ان [illegible] لمحات کو جلد پاٹنے کی غرض سے لالاں کو مخاطب کر کے پوچھا [illegible] ایک ذرا چونک کر بولی۔

''ٹھیک ہے...... میں اور کوڑل یہاں سے الٹے [illegible] واپس لوٹیں گے۔''

''نہیں...... صرف...... کوڑل الٹے پیروں واپس پلٹے گا' تم ادھر ہی میرے نشانے پر موجود رہو گی۔'' میں نے کڑک کر کہا ''اب اس کا یہی حل باقی رہ جاتا ہے' میرا تم سے وعدہ ہے' پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد میں تمہیں بھی زندہ سلامت یہاں سے رخصت کر دوں گی۔''

میری بات سن کر لالاں چند ثانیے کچھ سوچتی رہی پھر ایک گہری ہنکاری بھر کر اس نے اپنے ساتھی کوڑل کی طرف دیکھا۔ درحقیقت موجودہ صورتِ حال کی خطرناکی پر یہ دونوں زیادہ پریشان نظر آ رہے تھے لہٰذا لالاں نے کوڑل کو یہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ کوڑل نے ایک لمحہ پھوٹا خان اور اس کے بیٹے مرادعلی کو...... سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورا پھر اس کے بعد وہ بدستور ان دونوں باپ بیٹیوں پر اپنی رائفل تانے ہوئے دھیرے دھیرے الٹے قدموں پیچھے کی طرف سرکنے لگا۔ میری تیز اور محتاط نگاہیں بیک وقت کوڑل اور لالاں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھوٹا خان کی حالت زیادہ پتلی ہو رہی تھی۔ کوڑل ان پر رائفل تانے کافی دور چلا گیا تھا اور پھر وہ جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔ میرا دل اس سمے انجانے اندیشوں سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کوڑل کے اوجھل ہوتے ہی میں نے پھوٹا خان کو جیپ میں سوار ہونے کا کہا۔ اس کی تشویش زدہ نظریں ہنوز سامنے تاریکی میں جمی ہوئی تھیں جہاں کوڑل غائب ہوا تھا۔

میری ہدایت پر پھوٹا خان نے اپنے بیٹے کو ڈرتے ڈرتے گود میں اٹھایا اور جیپ میں سوار کیا اور پھر جلدی سے خود بھی سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کیا۔ میرا خیال تھا کہ پھوٹا خان اپنی بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً آگے روانہ ہو جائے گا لیکن اس نے بہ آواز بلند مجھے بھی جیپ میں سوار ہونے کو کہا۔ میں نے پستول لالاں کی کنپٹی پر لگاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ جیپ تک چلنے کو کہا۔ وہ چند ثانیے جبڑے بھینچے' خاموش کھڑی رہی' اس کے بعد اس نے بھی جیپ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ میں اسے کوڑل کی گھات والے اندھے رخ پر اپنی ڈھال بنائے جیپ تک آئی اور پھر جیپ میں سوار ہو گئی...... میرے سوار ہوتے ہی پھوٹا خان نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ میں نے اس اثنا میں مرادعلی کے ہاتھوں کے جکڑ بند کھول دیے تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی طوفانی رفتار سے آگے دوڑنے لگی۔

میرے دل و دماغ کو اب پھوٹا خان کی طرف سے کھد بد لگ گئی تھی کیونکہ میں اس کے ساتھ تھی اور اس کی دغاباز فطرت سے بہ خوبی واقف تھی اس لیے میں نے ایک موقع پر اس سے کہا ''پھوٹا خان! تم مجھے ادھر ہی اتار دو۔''

میری بات پر پھوٹا خان سامنے نظریں مرکوز رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''کونجاں! خاموشی سے بیٹھی رہو۔ میں تمہیں اس اندھیرے ویرانے میں تنہا نہیں اتار سکتا۔''

اس کے جذبات سے عاری سرد لہجے پر جانے کیوں میرے پورے وجود میں متوحش سی لہر دوڑ گئی۔ تاہم میں نے کچھ نہ کہا' خود کو غیر یقینی حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

خاصی دیر بعد جیپ اندھیرے ویرانوں میں سفر کرتی ہوئی بالآخر پھوٹا خان کی اوطاق کے سامنے جا رکی۔ میرا دل اب انجانے خطرے سے دھک دھک کرنے لگا۔ اوطاق کے باہر پھوٹا خان کے چار پانچ مسلح آدمی موجود تھے۔ وہ سب بیک وقت ہماری طرف بڑھے۔ پھوٹا خان اپنے بیٹے سمیت نیچے اترا اور پھر مجھے بھی نیچے اترنے کو کہا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ جیپ سے اتر آئی۔

پھوٹا خان نے جیپ سے اترتے ہی مختصراً اپنے ساتھیوں کو حالات سے آگاہ کیا نیز انہیں یہ بھی بتایا کہ اس کا بیٹا مرادعلی میری وجہ سے لالاں اور کوڑل کے خونی چنگل سے نجات پا سکا ہے تو اس کے حواری عجیب گومگو سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

پھر ہم سب اوطاق کے اندر آ گئے۔ پھوٹا خان نے اپنے لختِ جگر کو خود سے لپٹا کر خوب چوما' اس کے بعد اس نے اپنے دو حواریوں کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''جاؤ' اسے پہلے گھر پہنچا دو' اس کی ماں بہت پریشان ہو گئی اور میری خیریت کی بھی اطلاع دے دینا۔ میں بھی ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

وہ دونوں حواری سعادت مندی سے سر ہلاتے ہوئے مرادعلی کو وہاں سے لے گئے۔ پھوٹا خان کا گھر اوطاق سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔

ان کے جانے کے بعد پھوٹا خان میرے چہرے کی طرف چند لمحے عجیب سی نظروں کے ساتھ تکنے لگا۔ خود میری اپنی متوحش سی نگاہیں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا کہ پھوٹا خان کے چہرے پر رقت آمیز آثار نمودار ہوئے اور پھر اگلے ہی لمحے جیسے میرے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ پھوٹا خان جو اپنے علاقے کا ایک بااثر زمیندار تھا اور جس کی خصلت میں کوٹ کوٹ کر بددیانتی اور دغابازی بھری ہوئی تھی' وہ اچانک آگے بڑھا اور اس نے یک دم جھک کر میرے پاؤں چھو لیے اور جذبات سے مرتعش لہجے میں بولا۔

''کونجاں! مم...... مجھے معاف کر دینا...... تم...... تم نے

میرے بچے کی زندگی بچا کر مجھے خرید لیا ہے۔ میں تو...... میں تو اتنا گر چکا ہوں کہ تجھ کو...... اپنی دھی بھی نہیں کہہ سکتا...... پر کونجاں! میں آج سے تیرا مرید بن گیا ہوں۔ تیرا غلام ہوں میں...... تو نے عورت ذات ہو کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کر کے ثابت کر ڈالا کہ عورت واقعی عظیم اور بڑے دل اور حوصلے کی مالک ہوتی ہے۔"

میں پھوٹا خان کی اس کایا کلپ پر چند لمحے کے لیے تو ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہاں موجود اس کے حواری حیرت بھری نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں نے آہستگی سے اپنا ایک ہاتھ پھوٹا خان کے کاندھے پر رکھ دیا اور دھیرے سے بولی۔

"پھوٹا خان! تم برے انسان نہیں ہو' مجھے خوشی ہے کہ میری ایک چھوٹی سی کوشش سے تمہارے اندر کا ایک اچھا انسان بیدار ہو گیا۔ مگر میں تمہیں صرف ایک صورت میں ہی معاف کر سکتی ہوں کہ اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اب اپنے اندر کے اس انسان کو کبھی مرنے نہیں دو گے" میری بات پر پھوٹا خان سیدھا کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا' اس کی آنکھیں نمناک سی تھیں۔ وہ چند ثانیے احسان مند نظروں سے میرے چہرے کی طرف تکتا رہا پھر اس کے بعد اس نے اپنے کاندھے سے اجرک اتار کر مجھے اوڑھا دی اور روایتی انداز میں اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھتے ہوئے جذبات سے مرتعش لہجے میں بولا "تجھے پہلے میری ایک درخواست ماننا ہو گی۔"

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا۔

"میرا صرف ایک ہی بیٹا ہے...... مراد علی' پتا نہیں تو مجھے اس قابل سمجھتی بھی ہے کہ نہیں...... مگر میری یہ دلی خواہش ہے' تجھے اپنی دھی بنا لوں...... اور...... اور تیرے سارے دکھ خود لے لوں۔"

اس کی بات پر بے اختیار میری آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کے بند ابل پڑے۔ میں خود دکھوں کی ماری تھی "ادی......" اور "دھی......" جیسے جذبات انگیز الفاظ مجھ پر ایکا ایکی عجیب سی رقت طاری کر دیتے تھے۔ مجھے روتا دیکھ کر پھوٹا خان نے بے اختیار "میڈھی دھی" کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور شفقت بھرے انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"بس میڈی دھی! اب اپنے یہ آنسو پونچھ لے۔ تو مجھے پہلے ہی بہت دکھی محسوس ہوتی ہے۔ تو وعدہ کر کہ مجھ سے کچھ نہیں چھپائے گی' میں تیری آنکھوں میں ایک تڑپ اور درد سا محسوس کر رہا ہوں۔ تو مجھے... لمبی اور کٹھن راہوں کی تنہا مسافر لگتی ہے۔

مجھ سے وعدہ کر دھیے! مجھے اپنے دکھوں کا حال سنائے گی' مجھے ایک باپ کی طرح ہی سمجھے گی؟"

پھوٹا خان کی اس انقلابی تبدیلی نے جیسے مجھے جذ... طور پر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے آنسو تھے کہ بہے چلے جا... تھے بلکہ اب تو میں سسکیاں بھی بھرنے لگی تھی۔ اس دوران... اس کی پُرشفقت آواز دوبارہ ابھری۔

"دھیے! تیرے آنسو بتا رہے ہیں کہ تو نے مجھے... والا...... مان دے دیا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے... میرے ساتھ...... تجھے میں اپنے گھر لے چلوں۔" یہ کہتے ہو... اس نے مجھے دھیرے سے الگ کیا تو میں نے اچانک قدر... پریشان کن لہجے میں آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"چاچا سائیں! میں اس وقت ایک بہت بڑی پریشانی... بے چینی کا شکار ہوں۔ تو اگر میری ایک مدد کر سکتا ہے تو......" ... نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ہاں...... ہاں دھیے! تو حکم کر...... جو راز ظاہر کرنا... ابھی کر دے۔ میں ہوں ناں' بول کیا پریشانی ہے تجھ... پھوٹا خان نے جوش سے کہا۔

"چاچا......! میری ایک بہنوں سے بھی بڑھ کر سہیلی... شینا...... وہ اس وقت شہر (لاڑکانہ) کے اسپتال میں زندگی... موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مجھے کسی طرح اس کے پاس... ہے۔ جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ بس چاچا' میں کسی طرح... اس کے پاس پہنچنا چاہتی ہوں۔"

"تو فکر مت کر دھیے!" پھوٹا خان میری آنکھوں... آنسو پونچھتے ہوئے شفیق لہجے میں بولا "میں ابھی اور اسی... خود تجھ کو شہر لے کر چلتا ہوں۔ پہلے تو کچھ کھا پی لے۔ پتا... نے کب سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے۔"

"نہیں چاچا! اپنی سہیلی کی خیریت معلوم کیے بغیر تو... ایک لقمہ بھی میرے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ بس تو مجھ... شہر لے چل۔ میرا دل بڑا بے چین سا ہو رہا ہے" حالات... پر آتے ہی شینا کی طرف سے میری تشویش ناک اور پریشان... بے چینی فزوں ہونے لگی تھی اور پھر شاید پھوٹا خان نے... پریشانی کی نزاکت کا احساس کر لیا مگر پھر چند ثانیے کچھ... کے بعد اسرار بھرے لہجے میں بولا "کونجاں دھیے! ٹھیک... میں خود اس وقت تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ پھر کیا تو مجھ کو... وقت دے سکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں' تیرے ساتھ شہر جا... پہلے میں ایک اور معاملہ طے کر لوں۔ تاکہ مجھے پیچھے... فکری رہے" اس کی بات سے پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ... گھر جا کر اپنی بیوی وغیرہ کو اپنے شہر جانے کی اطلاع دینے...

...ے مگر پھر جب اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ کہیں چلنے کو کہا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکی۔ پھر میرے استفسار پر وہ بولا "دھیے! تیرا میرے ساتھ چلنا ضروری ہے۔ پہلے میں تجھے اپنے گھر لے چلوں گا۔ پھر اس کے بعد ہم اس وقت بلخ شیر کے ہاں چلیں گے۔ چل آ...... میرے ساتھ میں تجھے راستے میں وہ بات بتاتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب کھڑے آدمیوں میں سے ایک کو مخاطب کر کے پوچھا۔

"زمان! جیپ میں تیل کتنا ہے؟"

"سائیں! جیپ میں تو تیل تھوڑا ہی ہو گا پر...... دو ڈبے ...التو موجود ہیں۔ میں ٹنکی فل کر دیتا ہوں۔"

"اور سنو...... میں ابھی شہر جاؤں گا...... پیچھے گھر کا خیال رکھنا اور ان دونوں سانپوں کے جوڑے (لالاں اور کوڑل) سے محتاط رہنا۔ اگر ادھر کا رخ کریں تو بے دریغ دونوں کا سر کچل دینا" پھوٹا خان نے انہیں ہدایت دی تو میں نے کچھ سوچ کر پھوٹا خان سے کہا۔

"چاچا سائیں! میرا خیال ہے' تم ادھر ہی رکو' میں خود شہر چلی جاتی ہوں۔"

میری بات پر پھوٹا خان ملائمت آمیزی سے بولا۔ "دھیے! میں بھلا تجھے اکیلا کیسے جانے دوں گا۔ تو فکر نہ کر۔ پہلے میں ان دونوں رذیلوں لالاں اور کوڑل سے غافل تھا۔ پھر اب مجھے یقین ہے' وہ ادھر کا رخ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ آ...... میرے ساتھ۔"

ہم دونوں اوطاق سے باہر آ گئے۔ ہمارے ساتھ دو مسلح آدمی بھی تھے۔ ذرا ہی فاصلے پر پھوٹا خان کا بڑا سا پختہ اینٹوں کا حویلی نما مکان تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک ادھیڑ عمر ملازم نے کھولا تو پھوٹا خان مجھے لیے اندر داخل ہو گیا۔ کشادہ صحن میں روشنی تھی۔ ہم اندر ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے۔ سامنے منقش پایوں والی ایک بڑی سی رلی بچھی چارپائی پر ایک فربہ اندام مگر خاصی قبول صورت گوری چٹی عورت ننھے مراد علی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا یہی عورت پھوٹا خان کی بیوی ہے اور شوہر کو دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر مجھے دیکھ کر وہ قدرے چونکی۔

"بشیراں! یہ کونجاں ہے...... میں اس کے ساتھ شہر جا رہا ہوں۔ ایک ضروری کام سے۔ پھر آ کر تفصیل بتاؤں گا۔" پھوٹا خان نے بہ عجلت اسے بتایا اور پھر چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

"بشیراں! ہمارے مراد علی کو بلخ شیر نے نہیں بلکہ کسی اور نے اغوا کیا تھا۔ مجھے ذرا غلط فہمی ہو گئی تھی۔ میں ابھی اس کے گھر جا کر اس سے معافی مانگتا ہوں۔ اور تو بھی اس کی طرف سے اپنا دل میلا نہ کرنا" میں نے دیکھا' شوہر کی بات پر یک دم اس کی بیوی بشیراں کا چہرہ کھل اٹھا اور بولی۔

"دیکھا' میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ میرا ادا...... ایسی گری ہوئی حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔ پر دیکھ...... اب تو بھی اس بے چارے کی زمینیں واپس کر دے۔ وہ بے چارہ بہن کی وجہ سے اب تک خاموش ہے۔ مگر میں جانتی ہوں' میرا ادا بلخ شیر کتنا جی دار شخص ہے۔"

"ھاؤ...... ھاؤ میں اس لیے تو اس کے پاس جا رہا ہوں۔ تو فکر نہ کر...... اور ہاں سن' ذرا محتاط رہنا۔ ابھی کچھ روز تک ...... مراد علی کو باہر مت نکلنے دینا۔ اچھا چلتا ہوں میں" پھوٹا خان نے جلدی سے کہا پھر مراد علی کا گال چوم کر مجھے لیے باہر آ گیا۔ اوطاق میں آ کر ہم جیپ میں سوار ہوئے۔ پھوٹا خان نے بغلی ہولسٹر لگایا اور اپنے ایک آدمی کو ساتھ لیا۔ وہ دونوں جیپ کی اگلی دونوں سیٹوں پر براجمان ہو گئے جبکہ میں عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔ پھر جیپ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھی۔ پھوٹا خان خود جیپ چلا رہا تھا۔ میں اس بات پر خوش تھی کہ میری ایک ذرا سی 'جرأت آمیز' نیکی سے نہ صرف پھوٹا خان راہِ راست پر آ چکا تھا بلکہ اب وہ اپنے سالے بلخ شیر سے بھی معافی تلافی کرنے پر تیار تھا اور اس کی زمینیں بھی واپس لوٹانا چاہتا تھا۔

جیپ تاریک اور ٹیڑھے میڑھے سے کچے راستے پر درمیانی رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ پھر ذرا دیر بعد جیپ بلخ شیر کے پختہ اینٹوں والے مکان کے سامنے رک گئی۔ پھوٹا خان اور میں نیچے اتر آئے۔ بلخ شیر کے مکان کے دروازے کی پیشانی پر بلب روشن تھا۔ باقی ہمارے چہار اطراف تاریک سناٹا طاری تھا۔ اس کا آدمی جیپ سے اتر کر چوکنا کھڑا تھا۔ پھوٹا خان مجھے لیے دروازے تک آیا اور اس کی کنڈی کھڑکا دی۔ دوسری بار دروازہ کھڑکانے پر اندر سے بھاری بھرکم آواز ابھری۔

"کون ہے؟" یہ بلخ شیر ہی کی آواز تھی۔ میں جانتی تھی' وہ مجھے دیکھ کر پہلے حیران اور پھر یک دم خوش ہو جائے گا۔ کیوں کہ آخر کو مجھے اس نے اپنی بہن بنا رکھا تھا۔

"در کھول بھا بلخ شیر! یہ میں ہوں...... تیرا بہنوئی...... پھوٹا خان!" جواباً پھوٹا خان نے بلند آواز میں کہا تو یک دم اندر سے پہلے کنڈی کھلنے کی آواز ابھری پھر اس کے ساتھ ہی دروازے کے دونوں پٹ بھی وا ہو گئے۔ سامنے بلخ شیر کھڑا تھا۔ اس کی حیرت بھری نظریں پہلے اپنے بہنوئی پھوٹا خان پر پڑیں پھر اس کے بعد اس نے میری طرف دیکھا تو یکدم جیسے اسے ایک اور

جھٹکا لگا۔

''ادی کونجاں! یہ تم ہو......مم...... مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ آؤ......آؤ' اندر آؤ۔''

بلخ شیر کے چہرے سے حیرت آمیز خوشی کے آثار پھوٹے پڑ رہے تھے۔ میں اور چھوٹا خان جب اندر داخل ہوئے تو بلخ شیر فخر آمیز خوشی سے اپنی بیوی کو آواز دیتے ہوئے بولا۔

''اڑی او...... بھاگ بھری' ادھر آ...... دیکھ تو سہی کون آیا ہے'' یہ کہہ کر وہ ہم دونوں کو اندر کمرے میں لے آیا۔ اندر کمرے میں اس کی بیوی بھاگ بھری جاگ رہی تھی۔ البتہ ایک چارپائی پر اس کے دونوں بچے...... محمد علی اور سوہڑیں محوِ خواب تھے۔ جبکہ ایک دوسری چارپائی پر ان کا سب سے چھوٹا ننھا منا بیٹا علی شیر سویا ہوا تھا۔ بھاگ بھری تو میری سہیلی بن چکی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی حیرت آمیز خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ پھر اس نے جلدی سے چادر درست کی اور پہلے چھوٹا خان کو ادب سے سلام کیا پھر آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''بھا بلخ شیر! میرے پاس وقت کم ہے۔ تجھ سے تھوڑی باتیں کرنی ہیں۔'' چھوٹا خان نے بہ عجلت بلخ شیر سے کہا' پھر اس کے گلے لگ کر بولا ''یار! کیا تو اتنا بڑا دل رکھتا ہے کہ...... اپنے بہنوئی کو معاف کر سکے۔''

اس کی بات سن کر بلخ شیر کا چہرہ یک لخت اپنائیت کے جوش سے تمتمایا پھر اس نے دوبارہ چھوٹا خان کو اپنے گلے سے لگاتے ہوئے مرتعش لہجے میں اس سے کہا۔

''اڑے بھا چھوٹا خان۔ یہ تو کیسی بات کرتا ہے۔ کیا تو نے یہاں آ کر اپنا دل بڑا نہیں کیا۔ بھلا میں پھر تنگ دل کیسے ہو سکتا ہوں یارا! پھر تو' تو میری لاڈلی ادی بشیراں کے سر کا سائیں ہے...... تیرے لیے تو میرے دل میں محبت کے ساتھ احترام بھی ہے۔ پر یار! سب سے پہلے مجھے یہ تو بتا میرے بھانجا...... مراد کا کیا بنا؟''

''بتاتا ہوں۔ وہ خیریت سے گھر آ گیا ہے اور یہ سب ...... دھی کونجاں کی وجہ سے ہوا ہے۔''

چھوٹا خان نے کہا اور پھر اس نے مختصراً دھیرے دھیرے اسے رات بیتے ہوئے سارے سنسنی خیز حالات سے آگاہ کر دیا۔

ادا بلخ شیر کو مجھے چھوٹا خان کے ساتھ دیکھ کر جو تھوڑی دیر پہلے حیرت ہوئی تھی' وہ اب ساری کتھا سننے کے بعد یکدم ایک دیدنی سی مسرت میں بدل گئی۔ پھر بلخ شیر نے بھی چھوٹا خان کو بتایا کہ اس نے بھی مجھے اپنی بہن بنایا ہوا ہے۔

''ھا...... ھاؤ...... بھا بلخ شیر! مجھے اس بات کا پہلے سے علم ہے'' چھوٹا خان دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا ''اچھا اب یہ بتا تو نے مجھے معاف کر دیا ہے۔''

''اڑے بابا! کیسی باتیں کرتا ہے تو بھا چھوٹا خان! تو چل کر یہاں آ گیا...... میرے لیے اس سے بڑی فخر اور خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ بس...... میں نے اپنی زمینیں بھی دے دیں۔''

بلخ شیر کی جوش آمیز خوشی دیدنی تھی۔ وہ دل کا اتنا کھرا تھا کہ اپنی وہ زمینیں بھی اپنے بہنوئی کو بخش دینے پر راضی ہو گیا مگر چھوٹا خان فوراً زور زور سے نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

''اڑے بابا! جب دل اپنے ہو گئے تو پھر ان زمینوں کی کیا حیثیت۔ بھلا اب میں اتنا بڑا بوجھ اپنے ضمیر پر برداشت کر سکتا ہوں...... کبھی نہیں۔''

''اڑی بھاگ بھری! تو کیا کھڑی ہمارا منہ تکے جا رہی ہے یہ خوشی کا موقع ہے جا' جا کر اپنے بھرا چھوٹا خان کے لیے سوجی کا حلوہ تیار کر۔''

بلخ شیر نے بھاگ بھری سے کہا۔ خوشی اور ایک عجب فخر آمیز جوش سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی مگر چھوٹا خان اسے منع کرتے ہوئے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اڑے یار! بلخ شیر! حلوے کی کنجوسی کیوں کرتا۔ ہماری صلح ہونے کی خوشی میں' باقاعدہ جشن منائیں گے کہ گوٹھ دیکھے گا۔ پر یار' سچ پوچھے تو ہمیں دھی کونجاں کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف میرا پٹ (بیٹا) مراد دشمنوں کے خونی چنگل سے بال بال بچا ہے بلکہ اس کی بہادری اور دلیری کے باعث آج ہم دونوں پھر ایک ہو گئے ہیں'' چھوٹا خان کی بات پر بلخ شیر صحیح معنوں میں تب میری طرف متوجہ ہوا تھا اور لمحہ بھر اپنی جگہ پر کھڑا میرے چہرے کی طرف نرم مشفق اور ممنون بھری نظروں سے تکتا رہا پھر میرے قریب آ کر اس نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے دونوں بازو پھیلا کر مجھے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جذبات سے لبریز لہجے میں کہا۔

''بھا چھوٹا خان! میرا رب سائیں جانتا ہے۔ کہ میں جتنی محبت اپنی لاڈلی بہن بشیراں سے کرتا ہوں اتنی ہی ادی کونجاں سے بھی کرنے لگا ہوں بلکہ بھا چھوٹا خان! اگر تو میری بات سن رہا ہے تو یقین کر' میں ادی کونجاں کو زیادہ محترم اور دل کی گہرائیوں سے اسے چاہنے لگا ہوں۔ اس کی وجہ ایک یہ ہے کہ میری بلکہ ہمارے خاندان کی محسن بھی ہے۔ دوسرا یہ بے چاری بہت دکھی بھی ہے۔ بھا چھوٹا خان' تو نے شاید اس کی دکھ بھری وہ داستان نہیں سنی جو اس نے ایک دن مجھے سنائی

اگر تو بھی سن لے تو تیرا دل بھی میری طرح اس کے غم میں چور چور ہو جائے۔''

میں نے محسوس کیا کہ ادا بلخ شیر کی آواز آخر میں بھرا سی گئی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب چھوٹا خان بھی ذرا میرے قریب آیا اور اپنا دایاں ہاتھ روایتی انداز میں میرے سر پر رکھتے ہوئے شفقانہ لہجے میں بولا۔

''ھاؤ بھا بلخ شیر! جب میں نے کونجاں کو اپنی روح کی گہرائیوں سے اپنی دھی (بیٹی) کہا تھا تو یقین جان...... اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر میرے دل میں ایک باپ کی سی تڑپ پیدا ہوئی تھی اور میں نے اس کی دکھ بھری داستان سنے بغیر ہی اس کے اندر چھپے ہوئے غم واندوہ کا مجھے بے اختیار احساس ہونے لگا تھا۔''

ان دونوں کے جذبات نے میری آنکھیں بھگو دیں۔

''اڑی دھیے! تو کیوں روتی ہے۔ اب تو تیرا ایک بھائی بھی ہے اور باپ بھی۔ اب تو اپنے سارے غم' دکھ' مصیبتیں اور پریشانیاں ہمیں دے دے اور بس۔'' چھوٹا خان جوشِ جذبات سے مجھے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''ہاں...... ہاں مم...... مگر میں ابھی شہر جانا چاہتی ہوں'' میں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا تو چھوٹا خان کو جیسے اچانک یاد آیا اور وہ قریب کھڑے بلخ شیر سے بولا۔

''ھاؤ یار! ایک بات سن' تمہیں تو پتا ہی ہوگا اس کی ایک سہیلی شینا...... اسے اس کمینے انسپکٹر یار وجلاد نے بری طرح زخمی کر ڈالا ہے۔ وہ شہر کے اسپتال میں داخل ہے اور میں دھی کونجاں کو لے کر ابھی شہر جا رہا ہوں۔ تو یار ذرا...... میرے گھر کا خیال رکھنا۔''

اس کی بات پر بلخ شیر ترت بولا ''بھا! تیرا ابھی یہاں رہنا مناسب رہے گا۔ ادی کونجاں کو میں خود شہر لے جاتا ہوں۔''

''نہیں...... بلخ شیر! یہ کام تو مجھے کرنے دے۔''

''...... تو ٹھیک ہے پھر...... میں بھی تیرے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں یار! تو ادھر رہے گا تو مجھے گھر کی طرف سے زیادہ فکر نہیں رہے گی۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔''

چھوٹا خان نے حتمی لہجے میں کہا اور پھر وہ بلخ شیر کو ہکا بکا چھوڑ کر مجھے اپنے ساتھ لیے باہر آ گیا۔ بلخ شیر ہمیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ پھر میں اور چھوٹا خان جیپ میں سوار ہوئے چھوٹا خان نے جیپ آگے بڑھا دی۔

جیپ اب تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

خاصی دیر بعد کچے اور ناہموار راستوں سے نجات ملی اور جیپ پختہ اور چوڑی شاہراہ پر آ کر اب طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی۔ اس کا رخ اب شہر کی جانب تھا۔ ہمارا سفر جاری تھا کہ اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے قدرے جھجکتے ہوئے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان چھوٹا خان سے کہا۔

''چاچا سائیں! وہ......ہم...... میرا مطلب ہے' ہمیں پہلے اس مقام کو دیکھ لینا چاہیے تھا جدھر...... چھوٹے سائیں......''

''ھاؤ......ھاؤ'' میری ادھوری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے چھوٹا خان نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سائیں! جیپ ذرا آہستہ کر لو اور...... جو سامنے موڑ آ رہا ہے اسے موڑنے کے بعد جیپ کنارے پر روک دینا۔ ہمیں دائیں طرف کے کچے میں اترنا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد جیپ رک گئی۔ نیچے اتر کر ہم نے گہری نظروں سے بہ غور چہار اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد قریب کا علاقہ کھنگال ڈالا مگر چھوٹے سائیں کہیں نظر نہیں آئے۔

''میرا خیال ہے ڈاکٹر خان محمد...... نے سڑک پر آ کر شہر جانے والی کسی گاڑی سے لفٹ مانگ لی ہوگی'' چھوٹا خان نے پرخیال لہجے میں کہا اور پھر اس کے بعد ہم مایوس ہو کر چھوٹے سائیں کی تلاش ترک کر کے دوبارہ جیپ میں آ بیٹھے۔

ہمارا شہر کی طرف ایک بار پھر سفر شروع ہو چکا تھا۔

اب ہماری جیپ شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ صبحِ کاذب کی وجہ سے لاڑکانہ کی سڑکیں ویران تھیں۔ بالآخر دس پندرہ منٹ کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد جیپ سول اسپتال کی عمارت کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ پھر جیپ کے رکتے ہی ہم سب جلدی سے نیچے اتر آئے۔ میں بے تابانہ اور متوحش انداز میں بے اختیار دوڑتی ہوئی شعبۂ حادثات کی عمارت کے اندر داخل ہوئی۔ اندر دل دھڑکا دینے والی ویرانی اور سوگوار سی خاموشی طاری تھی۔ دو تین سویپر فرش پر گیلا پوچا پھیر رہے تھے۔ میں دیوانوں کی طرح ایمرجنسی آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑی اور پاگلوں کی طرح اس کے دونوں پٹ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ مجھے اپنے عقب سے پوچا پھیرنے والے کسی سویپر کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ مجھے اس طرح دیوانہ وار آپریشن تھیٹر میں داخل ہونے سے روک رہا تھا شاید مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ آپریشن تھیٹر کے اندر داخل ہوتے ہی میں ٹھٹک کر رک گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے آپریشن ٹیبل کو تکنے لگی۔ اندر کوئی بھی موجود نہ تھا۔ میرے عقب میں چھوٹا خان بھی اندر آ گیا تھا۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ میں فوراً واپس پلٹی تو

ایک کالی کلوٹی سی بھنگن منہ بسورتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

''چلو...... چلو نکلو باہر' کیوں ہماری نوکری کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔''

''سنو' سنو...... یہاں ادھر اس کمرے میں ایک زخمی مریضہ کو لایا گیا تھا...... وہ...... وہ کہاں ہے؟'' میں نے پلٹ کر جیسے اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

''بی بی! تم کون سی مریضہ کی بات کر رہی ہو' یہاں تو گھنٹے گھنٹے بعد ادھ موئے مریضوں کو لایا جاتا ہے۔''

بھنگن نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور حلق میں رقت اتر آئی تھی۔ میں نے رندھے ہوئے لہجے میں اسے شینا کے اور یہاں اس کے داخلے کے بارے میں بتایا تو وہ جیسے چند ثانیے کچھ سوچ کر بولی۔

''اچھا...... وہ لڑکی...... ہائے' اس کی حالت تو بڑی نازک تھی...... چچ...... چچ...... بے چاری۔''

اس کے افسوس کرنے پر میں لرز گئی اور اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

''کک...... کیا ہوا...... اسے...... مم...... مجھے بتاؤ؟'' مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہو۔ میں اس وقت صدمے سے شاک کی ایک ایسی انتہائی کیفیت سے دوچار تھی۔

''بی بی! یہاں اس کا علاج ممکن نہ ہو سکا تھا...... وہ کوما میں چلی گئی تھی۔ اسے ہیلی کاپٹر کے ذریعے فوراً کراچی کے بڑے اسپتال لے جایا گیا ہے۔''

میں اس کی بات سن کر دھک سے رہ گئی۔ میرے اعصاب جواب دینے لگے۔ سانسیں رکنے لگیں اور مجھے پورا آپریشن تھیٹر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اگر مجھے پھوٹا خان یکدم تھام نہ لیتا تو یقیناً میں فرش پر غش کھا کر گر جاتی۔

''حوصلہ کر دھیے! حوصلہ کر...... اللہ سائیں پر بھروسا کر۔''

میری ڈوبتی ہوئی سماعتوں میں اترنے والے پھوٹا خان کے یہ آخری الفاظ تھے اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو...... پھوٹا خان میرے قریب ہی جھکا ہوا تھا۔ میں تڑپ کر شینا...... شینا پکارتی اٹھ بیٹھی۔ پھوٹا خان نے میرے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگا دیا۔ ہم ابھی تک ''شعبۂ حادثات'' میں ہی موجود تھے اور مجھے بے ہوش ہونے کی وجہ سے ایک بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر پھوٹا خان تشفی آمیز لہجے میں بولا۔

''دھیے! تو اتنی بہادر ہو کر یوں حوصلہ چھوڑ بیٹھے اس کی امید نہ تھی۔ دیکھ کونجاں! اللہ سائیں پر بھروسا کر وہ اچھا کرے گا۔''

''چاچا سائیں! میں کیسے حوصلہ کروں۔'' میں نے لہجے میں کہا۔ ''تم...... تم نہیں جانتے کہ شینا میرے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ...... وہ میری ماں سے بڑھ کر ...... وہ مم...... میرے لیے بہنوں سے بھی بڑھ کر ایک وہ...... وہ میری روح ہے۔ میرا حوصلہ...... میری ہمت کچھ ہے وہ۔ اگر...... اگر اسے کچھ ہو گیا تو...... تو شاید زندہ......''

''نہ...... نہ دھیے! نہ ایسی باتیں نہ کر۔ چل اٹھ اب چلنا ہے۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔'' پھوٹا خان نے محبت انداز میں میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''چاچا! تو...... تو واپس اپنے گھر لوٹ جا۔ مم...... اکیلی کراچی چلی جاؤں گی۔''

میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تو پھوٹا خان یکدم سے خائف سا نظر آنے لگا۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے دکھ آمیزی سے شکایتاً بولا ''دھیے! تو نے اپنے چاچا سائیں کا اتنا مان رکھا؟ تو کیا سمجھتی ہے کہ میں نے اگر تیرے سر پر ہاتھ رکھ کر تجھے ''دھی'' (بیٹی) کہا ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں اڑی چری! تو بھی تو اس دھرتی کی رہنے والی ہے' کیا تجھے نہیں پتا کہ اگر ہم ایک بار کسی عورت ذات کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ماں' بہن یا بیٹی بنالیں تو وہ ہمارے لیے سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ واہ...... کونجاں دھیے! تو نے چاچا سائیں کا دل دکھا دیا۔''

وہ اتنا کہہ کر سر جھکائے خاموش ہو گیا۔ اسے دکھ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی ''چاچا سائیں! مم...... مجھے معاف کر دینا۔ مم...... نے آپ کا دل دکھایا۔''

پھوٹا خان نے فوراً مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور میرے سر پر اپنا دست شفقت پھیرتے ہوئے بولا۔

''پاگل! میں تو ایسے تجھے جوش دلانے کے لیے مذاق کر رہا تھا۔ چل اٹھ اپنے آنسو پونچھ لے اور کچھ آگے کی سوچ۔''

پھوٹا خان اب میرے بیڈ کے پائنتی بیٹھا کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ خود میں بھی خاموشی سے آئندہ کے حالات کے بارے میں لائحہ عمل طے کر رہی تھی۔

اب میں سوچ رہی تھی کہ اگر چھوٹے سائیں کسی لفٹ وغیرہ لے کر یہاں پہنچ چکے تھے تو پھر اب کہاں ہوں گے

کنجھر ہاؤس اچانک میرے پرسوچ ذہن میں ابھرا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کراچی جانے سے پہلے کیا کنجھر ہاؤس جا کر چھوٹے سائیں سے ایک ملاقات کر لینی چاہیے۔ ہو سکتا ہے انہیں بھی شینا سے متعلق اسے کراچی کے بڑے اسپتال منتقل کرنے کی اطلاع ہو اور کوئی بعید نہیں کہ وہ بھی کراچی جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یہ سوچ کر میں نے گہری سوچ میں مستغرق پھوٹا خان کو اپنا مخاطب کر کے کہا ''چاچا سائیں' ہمیں سب سے پہلے فوراً چھوٹے سائیں سے مل لینا چاہیے' اس شہر میں ان کا کنجھر ہاؤس کی ایک بنگلا ہے۔''

میری بات پر پھوٹا خان نے خیالات سے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولے ''ٹھیک ہے...... اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو پھر اسی وقت چلتے ہیں۔''

''مجھے کنجھر ہاؤس تک کا راستہ معلوم تھا۔ اس لیے ذرا ہی دیر بعد ہماری جیپ کنجھر ہاؤس کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ ہم نیچے اتر آئے۔ گیٹ پر ایک بندوق بردار چوکیدار موجود تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ چھوٹے سائیں اندر موجود تھے۔ پھر وہ ہماری اطلاع دینے کے لیے اندر چلا گیا۔ پھوٹا خان اس سے مجھے کچھ زیادہ ہی مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی یہی وجہ تھی کہ اس نے نہ صرف چھوٹے سائیں کی تذلیل کی تھی بلکہ اسے زخمی بھی کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔ تاہم میں بار بار تسلی دے رہی تھی کہ وہ چھوٹے سائیں کی طرف سے بالکل بھی کسی ''بدمزگی'' کی توقع نہ رکھے کیونکہ میں یہ خوبی جانتی تھی کہ میرے ہوتے ہوئے وہ پھوٹا خان کی طرف سے اپنا سارا غصہ بھول جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار نمودار ہوا اور اس نے فوراً ہمیں اندر آنے کو کہا۔ وہ اب خاصا مرعوب سا نظر آ رہا تھا۔ زبان البتہ باہر موجود تھا۔ میں نے جیسے ہی اندر احاطے میں قدم رکھا تو ٹھٹھک کر رک گئی۔ سامنے مجھے چھوٹے سائیں نظر آئے ان کے ایک ہاتھ میں پٹی بندھی ہوئی تھی پھر معاً میری نگاہ ایک جانب کھڑی لینڈ کروزر پر پڑی جسے دیکھ کر میں پریشان سی ہو گئی کیونکہ یہ لینڈ کروزر سردار خمیسو خان کی تھی۔

''کک...... کونجاں! تت...... تم......؟'' چھوٹے سائیں نے بے قراری سے کہا اور پھر میرے ساتھ شرمسار سے کھڑے پھوٹا خان کو دیکھ کر ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہاں تین چار مسلح محافظ بھی کھڑے تھے۔

''تم...... تم نے...... یہاں آنے کی جرأت کیسے کی۔ میں...... میں تمہیں......'' مارے طیش کے چھوٹے سائیں کی آواز کانپنے لگی۔ ان کے بلند اور غصیلے لہجے پر لینڈ کروزر کے قریب کھڑے اجرک پوش مسلح محافظ بندوقیں سنبھالے فوراً اس کے قریب آ گئے۔

''چھوٹے سائیں! انہیں کچھ مت کہنا۔ یہ...... آ...... آپ سے معافی مانگنا چاہتے ہیں'' میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر چھوٹے سائیں سے کہا تو ان کا ابال کچھ سرد پڑا۔ پھر اس کے بعد میں نے گزرے ہوئے سنسنی خیز حالات کے بارے میں مختصراً انہیں آگاہ کیا تو پھوٹا خان نے نہایت احترام کے ساتھ چند قدم آگے بڑھ کر چھوٹے سائیں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ پر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ سے بہت نادم ہوں اور کونجاں دھی سے بھی۔ میں کونجاں دھی کو یہاں آپ کے پاس لے آیا ہوں۔ اب آپ میرے ساتھ جو سلوک کریں' میں حاضر ہوں۔''

اس کی بات سن کر چھوٹے سائیں کے چہرے پر غصے کی ذرا بھی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے چہرے پر فراخ دلانہ مسکراہٹ لیے پھوٹا خان کے قریب آئے' بے اختیار دوستانہ انداز میں اس سے مصافحہ اور بعد میں معانقہ کرنے کے بعد ہمیں اندر ایک بڑے آرام دہ کمرے میں لے آئے۔ میں نے دیکھا' وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً ایک ادھیڑ عمر ملازمہ کو ناشتے کا بندوبست کرنے کا کہا پھر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ سردار خمیسو خان یہاں موجود نہ تھا۔ ورنہ ماحول میں بدمزگی کا پیدا ہو جانا یقینی امر ہوتا۔ پھر میں نے پریشان کن بے قراری سے کہا۔

''چھوٹے سائیں! شینا کے بارے میں آپ کو پتا چل گیا ہوگا؟''

''ہاں کونجاں! میں نے یہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے اسپتال کا ہی رخ کیا تھا'' چھوٹے سائیں سوگوار سی متانت کے ساتھ بولے'' اور ہمارے سامنے کے صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر مزید بتانے لگے۔

''شینا کی حالت بدستور نازک ہے اور اسے فوراً ایدھی سینٹر والوں کے ایک ہیلی کاپٹر میں کراچی کے ایک بڑے اسپتال ریفر کر دیا گیا ہے۔ مجھے تمہاری طرف سے فکرمندی تھی۔ ورنہ میں بھی کراچی چلا گیا ہوتا۔''

''مجھ...... چھوٹے سائیں' ہم نے بھی اس وقت کراچی روانہ ہونے کا پروگرام بنایا ہے۔'' میں نے فوراً کہا اور پوچھا ''پتا نہیں شینا کے ساتھ کون گیا ہے؟''

''زیب النسا پلیجو نام کی ایک خاتون اس کے ساتھ ہیں اور اس نیک خاتون نے ہی آناً فاناً شینا کو کراچی منتقل کرنے کے انتظامات کیے تھے۔ یہ ساری معلومات میں نے ان کے دفتر فون کر کے حاصل کی تھیں۔''

میں خاموش غمگین انداز میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ درحقیقت میں اپنی آنکھوں سے بے اختیار امڈ پڑنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے شینا کی نازک حالت کا غم' ذہنی اور جسمانی طور پر نڈھال کیے ہوئے تھا۔ مجھے کسی طور بھی قرار نہیں مل رہا تھا۔ مجھے ہر لمحہ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی قیمتی چیز کھونے والی ہو۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اڑ کر کراچی موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا شینا کے پاس جا پہنچوں۔

''ڈاکٹر صاحب! آپ کا کب کراچی روانہ ہونے کا پروگرام ہے؟''

لمحہ بھر کی سوگوار خاموشی میں پھوٹا خان نے چھوٹے سائیں کو مخاطب کرکے پوچھا تو میں جلدی سے اپنے آنسو پونچھ کر چھوٹے سائیں کی طرف تکنے لگی۔ جواباً انہوں نے کہا۔

''میرا تو ابھی اسی وقت کراچی نکلنے کا ہورہا ہے ارادہ بلکہ میرا خیال ہے کہ ہمیں اسی وقت یہاں سے نکل لینا چاہیے مگر تم لوگوں نے کس طرح نکلنے کا پروگرام بنایا تھا؟''

''ارادہ تو ہمارا بھی ابھی نکلنے کا ہے' اپنی جیپ میں'' پھوٹا خان نے جواباً کہا۔ میں چھوٹے سائیں کا چہرہ تکنے لگی' وہ بولے ''میرا خیال ہے' ہمیں سکھر سے کوئی فلائٹ پکڑنا پڑے گی' میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پی آئی اے کے دفتر فون کرکے موہن جو دڑو ائرپورٹ سے معلوم کیا تھا۔ ہفتے میں دو دن کراچی کی فلائٹ ہوتی ہے۔ آج کا دن فلائٹ کا تو تھا مگر سیٹ کنفرم نہ ہوسکی۔ اب سکھر سے ہی بوئنگ طیارہ مل سکتا ہے مگر ایک منٹ...... میں نے نمبر ملایا تھا' انگیج جارہا تھا۔ ابھی پتا کرتا ہوں۔''

چھوٹے سائیں نے کچھ سوچ کر کہا پھر اس کے بعد انہوں نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور نمبر پنچ کیے اور رابطہ ملتے ہی بولے۔

''آج کراچی کے لیے کتنی فلائٹس ہیں...... جی...... اچھا ......اور پرائیویٹ ائرلائن کے فوکر میں ......اوہ' اس میں بھی سیٹ نہیں ہے۔ ویری سیڈ!'' میری نگاہیں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر مایوسی چھانے لگی تھی تاہم وہ ابھی تک گفتگو میں مصروف تھے۔ پھر میں نے دیکھا اچانک ان کے چہرے پر امید کی رمق نمودار ہوئی۔

''اچھا...... جیکب آباد سے آج کی فلائٹ مل جائے گی۔ ہاں' ہاں...... مجھے یاد تو آرہا ہے کہ پیر اور جمعرات کے روز فلائٹ جاتی ہیں مگر...... وہی سیٹ کا مسئلہ ہوگا' اچھا...... اچھا' ٹھیک' آپ مجھے جیکب آباد پی آئی اے آفس کا فون نمبر دے دیں۔ میں سیٹ کنفرم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تھینک یو''

اتنا کہہ کر چھوٹے سائیں نے گفتگو کا سلسلہ منقطع کرکے ایک نمبر پنچ کرنے لگے۔ میں اور پھوٹا خان خاموشی سے ان کا منہ تکے جارہے تھے۔

''ہیلو' پی آئی اے جیکب آباد؟'' رابطہ ہوتے ہی چھوٹے سائیں نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''جی مسٹر! کیا کراچی کے لیے آج کے دن کی فلائٹ میں تین سیٹیں مل جائیں گی؟ اچھا...... ایک سیٹ ہے' بس ٹھیک پھر وہ کنفرم کرلیں۔ ابھی فلائٹ کے نکلنے میں تین گھنٹے ہیں اوکے! میں ابھی دو گھنٹوں کے اندر اندر پہنچتا ہوں۔''

چھوٹے سائیں نے گفتگو مکمل کرنے کے بعد موبائل آف کیا اور اسے دوبارہ جیب میں ڈالتے ہوئے گومگو سے لہجے میں بولے ''جیکب آباد سے گیارہ بجے جانے والی فلائٹ میں صرف ایک سیٹ ہے۔''

''سائیں...... ڈاکٹر صاحب! ہم سے آپ کا جلد کراچی پہنچنا زیادہ بہتر ہوگا۔''

پھوٹا خان نے جلدی سے چھوٹے سائیں کی طرف دیکھ کر کہا اور میں نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے چھوٹے سائیں سے کہا۔

''چاچا پھوٹا خان ٹھیک کہہ رہے ہیں چھوٹے سائیں! آپ جہاز میں جائیں' ہم بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جائیں گے۔''

''مگر کونجاں! تم...... تمہارے دشمنوں کی بھی تو کمی نہیں۔ مجھے تمہاری فکر رہے گی'' بالآخر چھوٹے سائیں کی مجھ سے تشویش نوکِ زباں پر آہی گئی جسے سن کر میں پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''چھوٹے سائیں! آپ میری فکر نہ کریں۔ میرے چاروں طرف اگر دشمن بکھرے ہوئے ہیں تو آپ جیسے خیر خواہوں کی بھی کمی نہیں اور سب سے بڑا سہارا تو میرا سائیں ہے۔ ویسے چاچا پھوٹا خان میرے ساتھ ہوں گے۔ چھوٹے سائیں' آپ دیر نہ کریں۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کا فی الفور وہاں پہنچنا ضروری ہے۔''

میری بات پر چھوٹے سائیں نے بغور میرا چہرہ دیکھا اور خاموشی سے سرہلا دیا۔ اس اثنا میں ملازمہ نے ہمارے سامنے ناشتے کے برتن لگادیے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم نے تھوڑا بہت کھالیا۔ پھر اس کے بعد پھوٹا خان نے چھوٹے سائیں کو بتایا کہ ان کی کار ابھی تک دادو جانے والی شاہراہ کے کنارے ویرانے میں موجود ہے۔ جواباً چھوٹے سائیں نے بتایا کہ وہ اپنے آدمیوں کو کار واپس لانے کے لیے روانہ کرچکے تھے۔

قصہ کوتاہ' چھوٹے سائیں نے اس وقت اپنی لینڈ کروزر میں جیکب آباد نکلنے کا پروگرام بنایا اور وہاں بذریعہ فلائٹ کراچی پہنچنے کے لیے مختصراً تیاری کرنے لگے میں اور پھوٹا خان ان سے رخصت ہوئے۔ اس وقت صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ لاڑکانہ سے جیکب آباد کا راستہ بائی روڈ دو گھنٹے کا تھا۔ جبکہ جیکب آباد سے کراچی جانے والی فلائٹ کا وقت گیارہ بجے تھا۔

ہم نے جیپ ایک ماہر موٹر مکینک کو دکھائی جس نے اس کا موبل آئل بدلا اور ہلکی پھلکی ٹیوننگ کرکے اسے تیار کردیا۔ پھوٹا خان نے اسے اجرت خاص سے نوازا۔ اس کے بعد ہم براستہ دادو' سیہون شریف' کراچی کی طرف روانہ ہوگئے۔ کراچی پہنچنے کے لیے یہ راستہ دوسرے کراچی جانے والے راستے یعنی سکھر مورو سکرنڈ' نواب شاہ وغیرہ کے مقابلے میں مختصر' شارٹ کٹ تھا۔

اب ہم کراچی کی طرف محوِ سفر تھے۔ پھوٹا خان کے کہنے کے مطابق ہمیں کراچی پہنچنے میں نو یا دس گھنٹے لگ سکتے تھے۔ جس وقت ہم لاڑکانہ سے چلے تو اس وقت ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور ہمارا شام چھ سات بجے تک بہ قول پھوٹا خان کراچی پہنچنا متوقع تھا۔

میں اپنے خیالوں میں مستغرق تھی کہ معاً پھوٹا خان نے زمان کو مخاطب کرکے کہا۔

''زمان...... یار! اپنے گوٹھ کی طرف ذرا گاڑی موڑ لینا۔ میں چاہتا ہوں گھر پر اطلاع دیتا جاؤں اور بلخ شیر سے بھی مل کر اسے اپنے کراچی جانے کے ارادے سے مطلع کردوں۔ ''تمہارا کیا خیال ہے' دھی کونجاں؟''

پھوٹا خان نے اچانک ذرا گردن موڑ کر مجھ سے رائے طلب کی تو میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے مختصراً جواب دیا ''جیسے آپ کی مرضی چاچا!''

تھوڑی دیر بعد زمان نے پھوٹا خان کی ہدایت کے مطابق جیپ کو مطلوبہ کچے راستے پر اتار دیا۔

جیپ اب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ لگ بھگ نصف گھنٹے بعد جیپ جب پھوٹا خان کی اوطاق کے قریب سے گزرنے لگی تو پھوٹا خان نے اچانک زمان کو گاڑی روکنے کا کہا۔

میں نے اوطاق کے باہر رکھے موڑھوں پر کچھ لوگوں کو براجمان دیکھا۔ ان میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک گئی۔ دور سے اسے دیکھ کر میرے حلق تک میں کڑواہٹ سی گھل گئی۔ وہ گہرام تھا' سائیں ملغوزاد کا ناخلف بیٹا گہرام' جس نے اپنی سازش کے ذریعے نہ صرف اپنے ہی باپ سائیں ملغوزاد کو سرداری سے معزول کرکے گوٹھ بدر کردیا تھا بلکہ اس کی جگہ اب خود بستی کا سردار بن چکا تھا۔

پھوٹا خان کے چند آدمیوں نے بھی جیپ روکنے کا اشارہ کیا تھا۔ پھر ہم سب جیپ سے نیچے اتر گئے۔ میں نے جیپ سے اترتے ہوئے کن انکھیوں سے پھوٹا خان کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں مجھے حسبِ توقع الجھن اور تلخی کے آثار محسوس ہوئے تھے۔

ہمارے جیپ سے اترتے ہی وہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ گہرام کے دو مسلح ساتھی بھی اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ گہرام بڑی تیکھی نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے پھوٹا خان کے آدمیوں نے میرے متعلق ''حقیقت'' سے آگاہ کرڈالا ہو۔ بعد میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔

''پھوٹا خان! یہ میں کیا سن رہا ہوں' کیا تو نے اس چھوکری کے ساتھ یاری گانٹھ لی ہے؟''

اس مردود کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ پھوٹا خان ہتھے سے اکھڑ گیا اور ایک زناٹے دار تھپڑ گہرام کے چہرے پر جڑ دیا۔ پھوٹا خان کے بھاری بھرکم ہاتھ کے تھپڑ نے گہرام کو چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑانے پر مجبور کردیا۔

''اگر...... دوبارہ تو نے پھر کبھی اس قسم کے الفاظ منہ سے نکالے تو میں تیری گدی سے زبان کھینچ لوں گا۔''

پھوٹا خان نے انگارہ آنکھوں سے اس کے تپتے ہوئے چہرے کو گھورتے ہوئے قہربار لہجے میں غرا کر کہا تو گہرام اپنا گال سہلاتا ہوا جلتی آنکھوں سے پھوٹا خان کو گھورنے لگا۔ اس کے دونوں ساتھی مستعد ہوکر گویا گہرام کے اشارے کے منتظر تھے۔

پھوٹا خان کے موجود مسلح آدمی بھی یکدم چوکس ہوگئے تھے۔ صورتِ حال کی سنسنی خیزی سے لگتا تھا جیسے ابھی وہاں خوں ریز جنگ چھڑ جائے گی مگر مجھے یقین تھا کہ گہرام پھوٹا خان کے علاقے اور اس کی اوطاق میں کسی قسم کی جارحانہ ''بے وقوفی'' کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

''پھوٹا خان! تیری اس حرکت کو میں کیا سمجھوں؟ کیا تیری نیت بدل گئی ہے...... اور تو اکیلے ہی اس قیمتی مورتی (راکاس مورتی) کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے؟'' بدطینت گہرام نے سلگتی نظروں سے پھوٹا خان کو گھورتے ہوئے کینہ توز لہجے میں کہا۔

''گہرام! اپنی بکواس بند کر...... اور کان کھول کر میری بات سن لے'' دفعتاً پھوٹا خان نے گہرام کو شعلہ فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے کڑک دار لہجے میں کہا ''کونجاں! آج سے میری دھیوں جیسی ہے' سمجھا تو...... اگر تو مجھ سے دوستی چاہتا ہے تو

آج کے بعد سے تجھے راکاس مورتی والا سلسلہ فراموش کرنا ہوگا۔"

میں نے دیکھا پھوٹا خان کی بات پر گہرام کی درشت آنکھوں میں ایک لمحے کو بلا کی خطرناک جھپک سی ابھری تھی۔ پھر وہ استہزائیہ لہجے میں پھوٹا خان سے بولا۔

"ٹھیک ہے...... سمجھ گیا۔ تم دونوں نے اگر اندر ہی اندر سازباز کرلی ہے تو سو بسم اللہ...... رہی دوستی کی بات تو وہ تیرے تھپڑ نے ہی ختم کردی ہے۔ سونے کی چمک نے تیری آنکھوں کو اندھا کردیا ہے اور تو یقیناً آج سے مجھے اپنا دشمن ہی سمجھے گا کہ یہ تو یہی سہی۔" گہرام نے زہرآلود لہجے میں اپنی بات مکمل کی اور مجھ پر ایک آخری گھورتی ہوئی نظر ڈال کر اس نے اپنے ساتھ کھڑے دونوں ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں سے جھلکتی مکاری کو بھانپتے ہوئے میرا دل ایک لمحے کو زور سے دھڑکا تھا۔

"سائیں! حکم کرو' اس بدزبان کا ابھی حشر نشر کرکے رکھ دیتے ہیں۔" اچانک پھوٹا خان کے تینوں مسلح آدمیوں نے آگے بڑھتے ہوئے گہرام اور اس کے دونوں حواریوں کے سینوں پر اپنی بندوقوں کی نالیں لگاتے ہوئے پھوٹا خان سے کہا۔

"نہیں' اسے اپنا گل کھلانے دو' یہ بھول گیا ہے کہ آج یہ اپنے قبیلے کا سردار' میرے ہی "آشیرواد" سے بنا ہے۔ اب اسے اپنی "سرداری" سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ہٹ جاؤ اور اسے جانے دو۔"

پھوٹا خان نے مسکراتے ہوئے زہرخند لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہا اور پھر یہ تینوں گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو جارحانہ نظروں سے گھورتے ہوئے ایک طرف کو ہٹ گئے۔ راہ پاتے ہی وہ تینوں غصے سے دانت پیستے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہورہی تھی۔ مجھے گہرام کے تیور ٹھیک نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ پھوٹا خان کی نیت پر شک کررہا تھا۔ یہ حقیقت تو میں ہی جانتی تھی کہ اب پھوٹا خان کے اندر مثبت نوعیت کی انقلابی تبدیلی عود کر آئی تھی۔ اسے اب اس بیش قیمت راکاس مورتی سے ذرہ برابر بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ جب اس کا لختِ جگر مراد علی لالاں اور کوڈل کے خونی شکنجے میں تھا تو پھوٹا خان کو بہ خوبی اس حقیقت کا اندازہ ہوچلا تھا کہ اصل دولت "سونا چاندی" نہیں بلکہ "اولاد" ہوتی ہے۔

گہرام اپنے دل میں پھوٹا خان کے خلاف عناد اور بغض لیے وہاں سے رخصت ہوا تھا اور میں جانتی تھی کہ آنے والے حالات میں گہرام میرا ہی نہیں بلکہ پھوٹا خان کے لیے بھی بدترین اور کینہ پرور دشمن ثابت ہوگا۔

اگرچہ پھوٹا خان کے راہِ راست پر آتے ہی میں ... اسے گہرام کی اپنے شریف باپ سائیں ملغوزاد کے خلاف ... دستیوں کے بارے میں آگاہ کردیا تھا اور یہ کہ سائیں ... کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ سرداری کا اصل ... چاچا سائیں ملغوزاد ہی تھا اور یہ بات بھی پھوٹا خان پہلے ... جانتا تھا کہ سائیں ملغوزاد اس کے سالے بلخ شیر کا قریبی ... گہرا دوست بھی تھا۔ پھوٹا خان نے مجھ سے یہ بھی وعدہ کیا ... وہ اپنی اس غلطی کی تلافی بھی ایک روز ضرور کرکے رہے ... سائیں ملغوزاد کو اس کا حق ایک روز ضرور دلا کر رہے گا۔

بہرطور' اس قضیے کے بعد پھوٹا خان نے سب سے ... اپنے گھر اطلاع کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بچے ...... بلخ شیر کے ہاں تھے۔ ہم سیدھے بلخ شیر کے ... پہنچے اور اسے پیش آمدہ حالات اور اپنے آئندہ کراچی ... ہونے کے پروگرام سے بھی آگاہ کیا۔ بلخ شیر نے اگرچہ ... پھر پھوٹا خان کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے خود میرے ... کراچی جانے پر اصرار کیا مگر پھوٹا خان نہیں مانا' ہمیں کراچی ... پہنچنا تھا اس لیے ہم زیادہ دیر وہاں رکنے کے متحمل نہیں ہو ... تھے بہرطور پھوٹا خان کے آگے کسی کی بھی نہ چلی اور مجبوراً ... اس کی بیوی بھاگ بھری اور بہن بشیراں یعنی پھوٹا خان کی ... نے ہمیں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

یہاں ہمیں لگ بھگ ایک گھنٹا ہوگیا تھا یا شاید اس سے ... زیادہ۔ بہرطور میں پھوٹا خان اور زمان ایک بار پھر جیپ ... سوار ہوکر وہاں سے روانہ ہوگئے۔

پختہ سڑک ابھی دور تھی۔ وہاں سے پھوٹا خان کے گوٹھ ... کا کچا راستہ آمدورفت کی وجہ سے خاصا ہموار ہوچکا تھا ... جیپ کو نسبتاً کم ہچکولے لگ رہے تھے۔ میں شینا کی زندگی اور ... کی صحت یابی کی دعائیں کرنے لگی۔ اس سے مجھے شینا کے ... اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

جیپ بل کھاتے راستے پر سبک رفتاری سے رواں دواں ... تھی۔ راستے کے دائیں بائیں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ پختہ سڑک ... اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔

اچانک کسی سمت سے بندوق چلنے کی آواز ابھری ... دوسرے ہی لمحے جیپ کی ونڈ اسکرین ایک چھناکے ... چکنا چور ہوگئی۔ میں اور پھوٹا خان تو کارتوس کے دھماکے کی آواز ... پر یکدم نیچے جھک گئے تھے لیکن شاید اسٹیئرنگ پر موجود ... چارے زمان کو بچنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ ونڈ اسکرین ... ٹوٹتے ہی اس کے حلق سے بڑی کریہہ چیخ خارج ہوئی تھی۔ شاید سب سے پہلے نامعلوم حملہ آوروں نے اسے ہی گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ چنانچہ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھوں سے نکلتے ہی جیپ بری طرح لہرانے لگی۔ جب تک پھوٹا خان اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا' وہ جھاڑیوں میں ہچکولے کھاتی ہوئی اتر گئی شاید کسی درخت سے جا ٹکرائی۔ مجھے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ اور بے ساختہ میرے حلق سے اضطراری چیخ برآمد ہوگئی۔ میں چونکہ سیٹوں کے درمیان دبک گئی تھی' اس لیے مجھے کچھ خاص چوٹ نہ آئی البتہ پھوٹا خان کی میں نے درد بھری کراہ سنی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میری ٹھٹکی ہوئی متوحش سماعتوں سے پھوٹا خان کی جوش میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"گونجاں! تم اپنی جگہ سے ہلنا مت۔"

پھر میں نے ذرا سر ابھار کر دیکھا تو پھوٹا خان اپنا پستول ہاتھ میں پکڑے تیزی کے ساتھ باہر رینگ گیا اور نیچے اترتے ہی اس نے غالباً اندازے سے فائر کی سمت یکے بعد دیگرے تین چار گولیاں داغ دیں۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ دفعتاً جوابی فائرنگ کے نتیجے میں بھی بیک وقت تین چار کارتوسوں کے دھماکے ابھرے۔ میں دوبارہ سیٹوں کے درمیان دبک گئی۔ میرا دل کنپٹیوں پر دھڑ دھڑانے لگا۔ فائرنگ کے درمیانی وقفے میں ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے میں اپنی جگہ سے اٹھی اور جھکے جھکے انداز میں اگلی سیٹ پر آگئی۔ میں نے دیکھا' زمان کا چہرہ خون میں لت پت تھا۔ کارتوس کے بے رحم بارودی چھروں نے اس کا پورا چہرہ اڑا دیا تھا وہ بدہیت حد تک ناقابل شناخت ہوچکا تھا۔ زمان کا عبرتناک انجام دیکھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ تاہم میں نے آناً فاناً اس کی خونی قمیص کے نیچے کمر سے لپٹی گولیوں کی پٹی ہولسٹر سمیت کھینچ کر اتاری اور پھرتی کے ساتھ ہولسٹر سے پستول کھینچ کر اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اگلے ہی لمحے میں گولیوں کی پٹی کاندھے پر لٹکاتے جیپ سے نیچے اتر گئی۔ اب میں جھاڑیوں میں آن دبکی تھی۔ میری سانسیں تیزی کے ساتھ چل رہی تھیں۔ دفعتاً مجھے سامنے کی سمت سے پھر گولیاں چلنے کی سماعت شکن گرج سنائی دی۔ میں خود کو جھاڑیوں میں چھپائے کہنیوں اور سینے کے بل آگے بڑھنے لگی۔ میری متلاشی نگاہیں تیزی سے دائیں بائیں گردش کرتے ہوئے "دشمن منظر" دیکھنے کو بے تاب تھیں اور تب اچانک میری نگاہ کی پیاس بجھی' مجھے سامنے پاپلر کے ایک موٹے تنے والے درخت کے عقب میں دو ہیولے ابھرتے ہوئے نظر آگئے۔ انہوں نے بندوقیں تان رکھی تھیں اور وہ دونوں مجھ سے غافل اپنے بائیں جانب کسی کو تاڑتے ہوئے' دبے پاؤں جھکے

مقبول ترین مصنف محی الدین نواب جن کی کہانیاں آنکھوں سے نہیں دلوں سے پڑھی جاتی ہیں

8 بہترین کہانیوں کا مجموعہ

کچرا گھر

کمپیوٹرائزڈ کتابت
قیمت 100 روپے

خوبصورت گیٹ اپ
ڈاک خرچ 25 روپے

محی الدین نواب کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "ایمان کا سفر" بھی دستیاب ہے

کتاب کی قیمت' بمعہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
kitabiat1970@yahoo.com

جھکے آگے بڑھنے لگے۔ یہ مذکورہ سمت تھی جدھر پھوٹا خان نے پیش قدمی کی تھی۔ میں نے تاک کر پستول والا ہاتھ ذرا بلند کر کے ان دونوں دشمن حملہ آوردں میں ایک کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ میری پستول نے محدود گرج کے ساتھ شعلہ اگلا اور ایک دشمن کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ تیورا کر گرا جبکہ دوسرا ٹھٹکے ہوئے شکاری درندے کی طرح بدکا اور ایک درخت کی آڑ میں جادبکا۔ میں نے پہلا فائر کرتے ہی اسے بھی نشانے پر رکھتے ہوئے گولی چلادی مگر نشانہ خطا گیا۔ دوسرے دشمن نے درخت کی آڑ لیتے ہی اپنی بندوق سیدھی کر کے مجھ پر ایک کارتوس فائر کر ڈالا۔ میں فوراً جھاڑ دار زمین سے چپک گئی۔ میں سانس روکے چند ثانیے دم سادھے دبکی رہی پھر جنگلی بلی کی طرح میں نے ذرا سر ابھار کر سامنے دیکھا۔ دشمن درخت کی آڑ میں دبکا ہوا تھا۔ اس کا فاصلہ مجھ سے بہ مشکل تیس چالیس گام کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اپنی جگہ سینے کے بل لیٹے لیٹے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کا نشانہ لے کر دو فائر جھونک مارے۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی دل دوز تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے زمیں بوس ہوتا چلا گیا۔ میرا دل فتح مندی کے احساس سے دھڑکنے لگا۔ پھر اس لمحے مجھے اپنے دائیں جانب' جدھر پھوٹا خان غائب ہوا تھا' کچھ تیز تیز اور بلند آوازیں سنائی دیں۔ ایک دو بار گولی چلنے کی بھی آواز ابھری تھی۔ میں کسی انجانے اندیشے کے زیرِ اثر فوراً مذکورہ سمت کی طرف لپکی۔ میں جھاڑیوں میں محتاط روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ آوازیں اب قریب آنے لگی تھیں اور تب اچانک میں نے قد آدم جھاڑیوں کے چھدرے چھدرے روزنوں سے سامنے جھانکا تو میری روح فنا ہوگئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ مجھ سے چند ہی گز کے فاصلے پر پھوٹا خان کو دو افراد اس کے پشت کی سمت دونوں ہاتھ جکڑے کھڑے تھے اور مردود گہرام نے اپنی دونال بندوق اس کی گردن سے لگا رکھی تھی اور وہ بڑے درشت لہجے میں پھوٹا خان سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے پستول میں گولیاں بھریں اور آہستگی سے اسے کلپ کرنے کے بعد بہ غور سامنے نگاہیں جمادیں۔ میں نے دیکھا' پھوٹا خان کی پیشانی پر ہلکا سا زخم کا نشان ابھرا ہوا تھا۔

''اڑے! موریا خان! تم دونوں اس پر نظر رکھو۔ میں کونجاں کو جا کر تلاش کرتا ہوں۔''

معاً گہرام نے اپنے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا تو ان میں سے ایک نے قدرے متفکر لہجے میں گہرام سے کہا۔

''سائیں! احتیاط کرنا...... وہ بڑی خطرناک چھوکری ہے۔ اس نے ہمارے دو ساتھیوں کو بھی ہلاک کر ڈالا ہے۔ میرا خیال ہے' میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں'' اپنے ساتھی کی بات پر گہرام غصے سے بولا۔

''وہ مجھ سے زیادہ خطرناک نہیں ہوسکتی۔ تم ادھر ہی رکو اور اس غدار کو ہلنے نہ دینا'' یہ کہہ کر گہرام اپنی بندوق سنبھالے ایک طرف کو لپکا۔ ان کی گفتگو سے مجھے ایک بات کا تو اندازہ ہوا کہ ان کی اتنی ہی نفری تھی جتنی نظر آ رہی تھی۔ لہٰذا جیسے ہی گہرام ایک طرف کو لپکا' میں نے بھی فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور جنگلی بلی کی طرح گہرام کی طرف لپکی۔ وہ بندوق تانے خونخوار بھیڑیے کی طرح دبے پاؤں بڑھا چلا جا رہا تھا۔ میں پستول ہاتھ میں لیے اس کا اور اپنا درمیانی فاصلہ پاٹنے کی غرض سے راستہ کاٹتی ہوئی دبے پاؤں اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس کے بعد جب خاصے فاصلے پر وہ ایک جگہ رکا تو میں بھی اپنی جگہ دبک گئی۔ اس کے قدرے ٹھٹک کر رکنے کے انداز سے میں سمجھی شاید اسے اپنے تعاقب کا احساس ہو چکا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ رک گیا تھا مگر اب بھی اس کی پشت میری طرف ہی تھی۔ تب پھر میں نے ''ابھی نہیں تو کبھی نہیں'' کے مصداق پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں سے نکلی اور آگے بڑھ کر فوراً اپنے پستول کی نال اس کی گدی سے لگادی۔

''خبردار گہرام! اپنی جگہ سے ہلے بغیر بندوق پھینک دے ورنہ تیرا بھیجہ اُڑا دوں گی۔'' میں شیرنی کی طرح غرائی اور گہرام جیسے پتھر کا بت بن گیا۔

''میں آخری بار کہہ رہی ہوں' بندوق پھینک دے ورنہ......'' اس بار میں پستول کی نال اس کی گدی میں زور سے چبھو کر غرائی۔ گہرام نے جیسے میرے زخمی لہجے کی خونخواری بھانپتے ہوئے فوراً اپنی بندوق پھینک دی تب میں نے اسے عقب میں گھوم جانے کو کہا۔ اور اس کے عقب میں مڑتے ہی میں محتاط انداز میں اس سے چند فٹ دور کھڑی ہوگئی۔ پھر میں نے اسے غصیلی نگاہوں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھنے کو کہا۔ وہ چند ثانیے میری طرف شعلہ فشاں نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔ میں اس کے آگے بڑھتے ہی فوراً اس کے عقب میں بدستور اس پر اپنا پستول تانے چلنے لگی۔ بہت جلد ہم اس مقام تک پہنچ گئے' جدھر گہرام کے دو ساتھی پھوٹا خان کو بازوؤں سے جکڑے موجود تھے۔ بندوقیں ان کی پشت پر جھول رہی تھیں۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی اس کے دونوں ساتھیوں کی آنکھوں میں پہلے غیر یقینی کے سے تاثرات حیرت ابھری پھر فوراً اس کی جگہ خونخوار درشتی نے لے لی۔

''گہرام! اپنے ساتھیوں سے کہو کہ اپنی بندوقیں پھینک کر دونوں ہاتھ اٹھا کر ایک طرف کھڑے ہو جائیں۔'' میں نے بآواز بلند کڑک کر گہرام سے کہا تو اس نے بجائے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرنے کے قہر بار لہجے میں مجھ سے غرا کر کہا۔

''کونجاں! تو اپنی موت کو دعوت دے رہی ہے۔ پھوٹا خان ایک دغاباز شخص ہے۔ وہ تیرے ذریعے وہ قیمتی مورتی حاصل کرنے کے بعد تجھے بھی دھوکا دے سکتا ہے لیکن اگر تو میرے ساتھ نباہ کرلے تو......؟''

''اپنی بکواس بند کر رذیل انسان......'' میں اس کی بات کاٹ کر زور سے دہاڑی ''میں نے جو کہا ہے' وہ کر...... میری پاس وقت کم ہے'' میری غصیلی دہاڑ پر یکدم گہرام کے دونوں ساتھیوں نے اپنے کاندھوں سے بندوقیں اتار کر اپنے ہاتھوں میں پکڑلیں اور ان کا رخ میری طرف کر دیا۔ مگر میں بھی ایک کائیاں تھی۔ میں جانتی تھی وہ اس طرح خاموشی سے سپر ڈالنے والے نہیں تھے چنانچہ جیسے ہی ان دونوں نے مجھ پر بندوقیں تانیں' میں لپک کر گہرام کی پشت پر آ کر پستول اس کے سر سے لگا دیا اور غرا کر تہدیدی انداز میں اپنا حکم دُہرایا۔ میں نے دیکھا' پھوٹا خان کے چہرے پر تشویش آمیز پریشانی کے تاثرات تھے۔

''اڑے بابا! پھینک دو اپنی بندوقیں......'' بالآخر گہرام نے ہونٹ چبا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو حکم دیا۔ اس کے دونوں ساتھی چند ثانیے تو الجھن آمیز تذبذب میں مبتلا رہے مگر پھر اپنے سردار کا حکم پاتے ہی انہوں نے اپنی بندوقیں ایک طرف پھینک دیں۔ پھوٹا خان فوراً حرکت میں آیا اور اس نے زمین پر پڑی ہوئی دونوں بندوقوں پر قبضہ جمالیا اور یہی میں چاہتی بھی تھی۔

''بول کتے! اب تیرا کیا حشر کیا جائے؟'' پھوٹا خان نے ایک بندوق اپنے کاندھے پر اور دوسری اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے گہرام پر تان کر غصے سے بولا تو گہرام کے بدہیت باریک ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اسے گھور کر بولا۔

''پھوٹا خان! تو اب بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میرا ذرا بھی بال بیکا ہوا تو میری بستی کے سارے جنگجو لوگ مل کر تیری حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے'' میں اس کی بے خوفی پر ایک لمحے کو ششدر سی رہ گئی۔ مگر پھوٹا خان جیسے ہتھے سے اکھڑ گیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ چراغ پا ہو کر آگے بڑھا اور گہرام کو گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرادیا اور اس کے سینے پر بندوق کی نال لگا کر خونیں لہجے میں بولا۔

''تیری یہ خوش فہمی ابھی میں دور کیے دیتا ہوں حرام زادے!''

یہ کہہ کر پھوٹا خان نے بندوق کا گھوڑا چڑھایا اور لبلبی پر اپنی انگلی رکھ دی تو میں اسی وقت چلا کر اس سے بولی ''نہیں چاچا!

زندگی سنوارنے اور نکھارنے والی
کتابوں کے سلسلے کی ایک کڑی

مشہور ماہرینِ نفسیات کی آرا پر مشتمل کتاب

احساسِ کمتری

اسباب ← تدارک ← علاج

اس کتاب کا مطالعہ آپ کو بتائے گا کہ......

- احساس کمتری سے کس طرح نجات حاصل کی جاسکتی ہے؟
- کامیاب زندگی گزارنے کے اصول کیا ہیں؟
- کیا آپ واقعی احساس کمتری کے شکار ہیں یا صرف یہ آپ کا خیال ہے؟
- ہوسکتا ہے کہ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ہی آپ کا یہ احساس ختم ہو جائے؟

مشہور نفسیاتی ادیب اسلام حسین کے قلم سے

قیمت 30 روپے ۔ ڈاک خرچ 23 روپے

خط و کتابت کا پتہ
مکتبہ نفسیات
پوسٹ بکس 944 کراچی 74200

رابطے کے لیے:
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ
(حرا کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

نہیں' اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ مت خراب کر' اسے چھوڑ دے۔'' میرے منع کرنے پر پھوٹا خان کا طیش ذرا کم ہوا اور پھر وہ اپنے حلق سے غراہٹ آمیز آواز نکالتا ہوا ایک طرف کو ہٹ گیا۔ گہرام کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد پھوٹا خان نے گہرام کو دونوں ساتھیوں سمیت آگے بڑھنے کو کہا۔ اب میں اور پھوٹا خان ان تینوں پر اپنی گنیں تانے عقب میں چلنے لگے۔ ہم سب سے پہلے جیپ کے پاس پہنچے۔ پھوٹا خان نے اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود ہر بار سیلف لگانے پر اس کا انجن گھر گھرانے کے بعد خاموش ہو جاتا۔ ناچار پھوٹا خان اسٹیئرنگ وہیل پر جھنجلا کر مکا مارتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ مجھے اب کراچی جانے کا پروگرام موخر ہوتا محسوس ہوا۔ پھوٹا خان کو اپنے ساتھی زمان کی موت کا بڑا دکھ تھا مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے اس کے بدنصیب ساتھی کی موت کا بدلہ گہرام کے دو ساتھیوں کو ہلاک کر کے لے لیا تھا ورنہ تو پھوٹا خان نے گہرام سمیت ان تینوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔

بہر طور ہم دونوں گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنی گنوں کے نشانے پر دھکیلتے ہوئے بالآخر خاصی دیر بعد پھوٹا خان کی اوطاق پہنچے۔ وہاں حسبِ توقع اس کے ساتھی موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان کے بشروں پر حیرت آمیز پریشانی سی دوڑ گئی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے جیسے انہیں ساری صورتِ حال کا ادراک ہو گیا۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ فائرنگ کی آواز ان کے کانوں تک بھی پہنچی تھی اور وہ اب ہماری طرف نکلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے۔

پھوٹا خان نے تینوں کو اپنے مسلح ساتھیوں کے حوالے کیا پھر انہیں انتہائی افسوس ناک لہجے میں زمان کے قتل ہونے کی اطلاع دی اور ساتھ ہی انہیں جنگل سے جیپ اور زمان کی لاش اٹھوانے کے لیے روانہ کیا۔ مگر اس سے پہلے انہوں نے ان تینوں کی ایک مضبوط رسی سے مشکیں کس دی تھیں پھر پھوٹا خان نے اپنا ایک آدمی اسی وقت بلخ شیر کے ہاں اسے مطلع کرنے کے لیے روانہ کیا اور پھر ہم دونوں اندر آ کر تھکے تھکے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ باقی گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو اوطاق کے اندرونی کوٹھری میں قید کر دیا گیا تھا۔ پھوٹا خان نے شاید بلخ شیر کے آنے تک ان تینوں کے بارے میں فیصلہ موخر رکھا تھا۔ ہم نے پانی وغیرہ پیا اور پُرسوچ انداز میں خاموش ہو کر بلخ شیر کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

ذرا دیر بعد ہمیں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی پھر میں نے بلخ شیر کو بدحواسی کے سے انداز میں اندر داخل ہوتے دیکھا۔

''اڑے بھا پھوٹا خان! خیریت تو ہے...... یہ سب کیسے ہوا! بابا! کہاں ہیں وہ تینوں خنزیر۔ میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' وہ شیر کی طرح دہاڑتا ہوا ہمارے قریب آ کر بولا۔

پھوٹا خان نے ذرا دیر بعد اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ بلخ شیر موڑھے پر بیٹھا غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ پھر کوٹھری کے بند دروازے کو گھورتے ہوئے پھوٹا خان سے بولا۔

''بھا پھوٹا خان! اب ان تینوں کو بالکل مت چھوڑنا بلکہ ان تینوں کو تو میرے حوالے کر دے۔''

''نہیں بلخ شیر! اب ہمیں گرم دماغی کے بجائے ٹھنڈے دماغ سے سوچنا پڑے گا۔ کیونکہ اب یہ مردود گہرام عام آدمی نہیں رہا' اپنے قبیلے کا سردار ہے یہ......''

پھوٹا خان نے پہلی بار معاملہ فہمی سے بلخ شیر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا' اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ اس نے شاید صورتِ حال کی نزاکت کا اندازہ لگا لیا تھا مگر بلخ شیر کہاں نچلا بیٹھنے والا تھا۔ یک دم تپ کر بولا۔

''بھا پھوٹا خان! بھلے یہ ہوتا رہے اپنے قبیلے کا سردار۔ ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہم پر قاتلانہ حملہ کیا ہے' انہیں حساب دینا پڑے گا۔''

''اڑے بابا! اس لیے تو پہلے میں نے تجھ کو یہاں بلایا ہے؟'' پھوٹا خان نے اس کی طرف دیکھ کر کسی قدر پریشانی سے کہا۔

''پر یار بلخ شیر! ہمیں ٹھنڈے دماغ سے اس مسئلے کو حل کرنا ہوگا۔ میں اس رذیل گہرام کی زہریلی فطرت سے واقف ہوں۔ یہ سانپ کی طرح مٹی کھا کر زمین کھوکھلی کر ڈالتا ہے۔ اس کا کچھ اور ہی بندوبست کرنا پڑے گا'' اس کی پُرمغز گفتگو پر بلخ شیر بھی چند ثانیوں کے لیے پُرسوچ خاموشی میں ڈوب گیا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''بھا پھوٹا خان! آخر ان کی بستی کے چند معتبر لوگوں کی پنچائت تو ہو گی ناں...... ہم خود گہرام کو اس کے دونوں ساتھیوں سمیت ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔''

''ہاں یہی ایک طریقہ رہ جاتا ہے'' پھوٹا خان نے پُرخیال انداز میں اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

''بلکہ ایسا کرتے ہیں' میں اپنے چند آدمیوں کو پہلے ان کی بستی کی طرف روانہ کرتا ہوں...... اور بستی کے چند معتبر لوگوں کو یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں'' اس کی بات پر بلخ شیر نے بلا تامل اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

بالآخر یہ طے پایا گیا تو بلخ شیر نے آخر میں میری طرف

دیکھتے ہوئے پھوٹا خان سے پوچھا۔

''...... اور ...... تم لوگوں کا کراچی جانے کا پھر کیا ارادہ ہے؟'' اس کی بات پر میں نے جواباً پہلی بار شاملِ گفتگو ہوتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے' پہلے یہ قضیہ نمٹا لیتے ہیں یا پھر میں خود اکیلی کراچی روانہ ہو جاتی ہوں۔''

میری بات پر پھوٹا خان دھیرے سے اپنا دستِ شفقت میرے سر پر رکھتے ہوئے ملائمت سے بولا۔

''کونجاں دھیے! تمہارا بہرحال اکیلے کراچی جیسے اجنبی اور بھرے پرے شہر میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ زندگی اور موت اللہ سائیں کے اختیار میں ہے۔ ہمارے جلد پہنچنے نہ پہنچنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بس یہ گہرام والا معاملہ نمٹانے کے بعد ہم فوراً نکل پڑیں گے۔ میں ابھی اپنے آدمی بستی کی طرف روانہ کرتا ہوں۔''

اس کے سمجھانے پر میں خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد پھوٹا خان نے اپنے گوٹھ سے بھی چند مزید آدمی بلوا لیے۔ انہیں ہدایات دے کر گہرام کی بستی کی طرف روانہ کر دیا اور مجھے پھوٹا خان نے اپنے گھر بھیج دیا تاکہ میں کچھ دیر آرام کر لوں لیکن آرام اب میرے نصیب میں کہاں تھا؟ اس بدبخت گہرام والے معاملے نے میرا کراچی جانے کا پروگرام بدل ڈالا تھا اور میں تھی کہ جلد از جلد کراچی شینا کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین ہوئی جا رہی تھی۔ بلخ شیر کی بیوی بھاگ بھری کی طرح پھوٹا خان کی بیوی بشیراں بھی بڑی ملنسار اور ہمدرد خاتون ثابت ہوئی تھی بلکہ بشیراں تو اب مجھے اپنی ایک محسنہ کے روپ میں دیکھنے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میری بہادری کی وجہ سے اس کا اکلوتا بیٹا مراد علی لالاں اور کوڑل کے خونی پنجوں سے آزاد ہوا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ میری ہی وجہ سے اس کے شوہر پھوٹا خان اور بھائی بلخ شیر کے درمیان مفاہمت بھی ہو گئی تھی۔

بہرحال اب میں بے چینی سے اس وقت کی منتظر تھی کہ گہرام والا معاملہ بہ خیر و خوبی طے پا جائے تو میں اور پھوٹا خان ایک بار پھر کراچی کا قصد کریں۔ اس سلسلے میں پھوٹا خان نے اگرچہ مصالحانہ روش اپنائی تھی اور سب سے پہلے خیر سگالی کے طور پر اپنے آدمی گہرام کی بستی کی طرف روانہ کر چکا تھا مگر پھر بھی جانے کیوں اس گمبھیر معاملے کی طرف سے میرا دل انجانے شکوک و شبہات اور وسوسوں کا شکار تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ معاملہ اتنی جلدی اور آرام سے نمٹ جائے گا؟ بہرطور میرے پاس اب انتظار کی کٹھن گھڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس وقت دوپہر ہو چلی تھی۔ موسم کی رُت بدل چکی تھی۔ اپریل شروع ہو چکا تھا اور پسینہ بہاتی گرمیوں کی آمد آمد تھی۔

بشیراں نے دوپہر کا کھانا تیار کر لیا تھا اور اس کے منع کرنے کے باوجود میں نے بھی رسوئی میں اس کے ساتھ ہاتھ بٹایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھوٹا خان اور بلخ شیر بھی آ گئے اور ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا۔ اگرچہ مجھے ذرا بھی بھوک نہ تھی مگر کھانے سے قبل از وقت ہاتھ کھینچ لینا خلافِ تہذیب بھی تھا۔ کھانا کھانے کے بعد بہ قول پھوٹا خان کہ' اس کے آدمیوں کی گہرام کی بستی سے واپسی اگلے چند گھنٹوں میں متوقع تھی۔

ہم سب ایک نسبتاً بڑے اور آرام دہ کمرے میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور اس دوران میں بلخ شیر نے میرے ماضی سے متعلق وہ ساری دردانگیز اور عبرت اثر داستان دھیرے دھیرے پھوٹا خان کو سنا ڈالی جسے سن کر پھوٹا خان ایک لمحے کو تو انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔ چونکہ بلخ شیر کی طرح وہ خود بھی اخبار بینی کا شوق رکھتا تھا اور گاہے بہ گاہے وہ مقامی سندھی روزناموں میں میری اور صفت ابلیس وڈیرے عارب خان کی رساکشی سے متعلق خبریں اور ایڈیٹروں کے اداریے پڑھتا رہتا تھا۔ بالخصوص زیب النساء پلیجو کی میرے سلسلے میں دی گئی پریس کانفرنس کی مفصل کتھا بھی اس کی نظروں سے گزری تھی۔ پھوٹا خان نے میری بہادری' ہمت اور جرأت مندی کی دل سے تعریف کی تھی۔ پھوٹا خان اور بلخ شیر دونوں ہی مجھ سے ازحد متاثر نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں اور چہروں سے میرے لیے ہمدردی کے جذبات سے کہیں زیادہ ایک عجیب سی عقیدت فخر اور ستائش کے تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔ انہوں نے صحیح معنوں میں سندھ دھرتی کی ایک ایسی مظلوم بیٹی کے لقب سے بھی نواز دیا تھا جو اپنے اندر پیروں' مرشدوں جیسے خوائص رکھتی تھی۔ جس کے سامنے بڑے سے بڑے طوفان سرنگوں ہو جاتے تھے اور منہ زور آندھیاں میرے بلند حوصلوں کے بادبانوں سے ٹکرا کر ہوا کے نرم خو جھونکوں میں بدل جایا کرتی تھیں۔

پھوٹا خان نے تو بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے انہیں چوم لیا تھا پھر فرطِ جذبات سے مرتعش لہجے میں مجھ سے بولا۔

''دھیے! اگر تو ہمیں کسی قابل سمجھتی ہے کہ اپنی اس جنگ میں ہمیں بھی اپنے ساتھ شامل کر لے رب سائیں کی قسم! ہماری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا اور اگر تیری اس جنگ میں ہمیں موت بھی آ گئی تو یقین کر' وہ بڑی نصیبوں والی موت ہو گی۔''

''ہاں ادی کونجاں! بھا پھوٹا خان کی طرح میں بھی اپنے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اگر تو اپنے ادا بلخ شیر کو اس قابل سمجھتی ہے کہ وہ ایک غیرت مند بھائی کی طرح

تیری ڈھال بن جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری بخشش کا سامان پیدا ہوگیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک مظلوم بہن کی چادر کی حفاظت کرتے ہوئے اگر مجھے موت بھی آگئی تو وہ یقیناً شہادت سے بھی بڑھ کر میرے لیے درجہ رکھے گی۔" بلخ شیر نے بھی پھوٹا خان کی طرح میرے ساتھ شامل عقل ہونے کا دم بھرا تو بے اختیار میری آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے جو آج پہلی بار میری آنکھوں سے امڈ پڑے تھے۔ مجھے روتا دیکھ کر پھوٹا خان اور بلخ شیر یک دم اپنی جگہ سے اٹھے اور پھر میرے قریب آکر پہلے پھوٹا خان نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا اس کے بعد بلخ شیر نے بھی اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ ہمیں اب اپنے آدمیوں کا بے چینی سے انتظار تھا۔ لگ بھگ کوئی گھنٹے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز پر ٹا خان اور بلخ شیر چونک کر فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور باہر دروازے کی طرف لپکے۔ شاید ان کے آدمی گہرام کی بستی سے لوٹ آئے تھے۔

وہ دونوں واپس آئے تو خاصے فکرمند اور الجھے ہوئے نظر آرہے تھے بلکہ بلخ شیر کے چہرے پر تو جوش آمیز تمتماہٹ کے تاثرات بھی تھے "کیا ہوا؟ چاچا! تمہارے آدمی کیا پیغام لائے ہیں؟"

بالآخر ان کے خاموش بشروں کو تکتے ہوئے میں نے بے قرار ہوکر پھوٹا خان سے پوچھا۔

"ان لوگوں نے میرے آدمیوں کے ہاتھ بڑا سخت پیغام بھیجا ہے۔"

پھوٹا خان نے ایک گہری ہنکار خارج کرتے ہوئے کہا "انہوں نے کہا ہے کہ بلاتاخیر ہمارے سردار گہرام کو عزت و احترام کے ساتھ ان کی بستی میں لایا جائے اور ہم سے نہ صرف ہمارے سردار کو یرغمالی بنانے کی معافی مانگی جائے بلکہ ہمارے جن دو ساتھیوں کو ہلاک کیا گیا ہے ان کا خوں بہا بھی دیا جائے۔"

پھوٹا خان کی اس صراحت پر میں پریشان سی ہوگئی مگر دوسرے لمحے بلخ شیر پرجوش لہجے میں بڑبڑا کر بولا۔

"ان لوگوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے بھا پھوٹا خان! میں تو کہتا ہوں' گہرام کو ان لوگوں کے حوالے ہی نہ کیا جائے اور چونکہ گہرام نے پہلے تو ہم حملہ کرنے کا جرم کیا ہے' اب یہ لوگ اس جرم کا ہمیں "بھونگا" (قصاص) دیں گے بلکہ ہمارے ساتھی زمان کی موت کا بھی خوں بہا دینا پڑے گا۔ ان کی ڈھٹائی تو دیکھو' الٹا ہمارے گلے پڑ رہے ہیں۔ ان مردود جوگیوں کو تو ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم ان کا سردار زندہ سلامت ان کے حوالے کررہے ہیں۔"

"نہیں بلخ شیر! بلاوجہ اس طرح بات بگڑ جائے گ"

پھوٹا خان نے نفی میں سرہلاتے ہوئے الجھن آمیز لہجے میں "ایسا کرتے ہیں' گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا یہی حل ہے...... دیکھتے ہیں یہ جوگی کیا بگاڑ لیتے ہیں۔"

"یہ لوگ اپنی اوقات بھول رہے ہیں۔ جنگ تو جنگ" بلخ شیر نے بدستور طیش میں دانت پیس کر کہا۔

"تو ادھر ٹھہر' میں اس مردود گہرام کو دھکا دے کر آتا ہوں" پھوٹا خان نے کہا اور باہر نکل گیا۔

پھوٹا خان جا چکا تھا۔ بلخ شیر اپنی جگہ غصے سے تلملا رہا تھا۔ اپنے بہنوئی پھوٹا خان کے برعکس بلخ شیر ایک جی دار' نڈر آتش مزاج انسان تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ پھوٹا خان کوئی بزدل انسان تھا۔ بہادری اور سردھڑ کی بازی لگا دینا ان کے خمیر میں بھی شامل تھا مگر وہ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے معاملات کو حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تھکے تھکے سے انداز میں واپس لوٹ آیا بتایا کہ اس نے وہ بالآخر گہرام اور اس کے دونوں ساتھیوں کو آزاد کردیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے (پھوٹا خان) آدمیوں گہرام وغیرہ کو سندھو دریا (دریائے سندھ) کے پار تک چھوڑنے بھی گئے تھے۔

"یہ مردود گہرام! زخمی سانپ کی مثل یہاں سے گیا ہے' بستی پہنچتے ہی یہ کمینہ ضرور کوئی گل کھلائے گا۔"

پھوٹا خان نے پرتشویش لہجے میں جیسے خودکلامی کرتے ہوئے کہا تو بلخ شیر نے جوش سے کہا "دیکھ لیں گے پھوٹا خان! تو کیوں فکر کرتا ہے۔"

"اڑے یار' فکر کی بات تو نہیں ہے' میں کون سا ان جوگیوں سے ڈر رہا ہوں۔ مگر بلاوجہ میرا اور دھی کونجاں کا کراچی جانا مسئلہ ہوجائے گا۔"

"نہیں بھا! تو اس کی فکر نہ کر' میں پیچھے سنبھال لوں گا۔ تو نے اور ادی کونجاں نے اگر کراچی نکلنا ہے تو پہلے نکل جا۔" بلخ شیر نے فوراً کہا۔ مگر پھوٹا خان کا اس طرح کراچی جانے پر دل نہیں مان رہا تھا۔ خود میرا بھی یہی خیال تھا کہ ابھی ان حالات میں ہمارا سر دست گوٹھ سے نکلنا مناسب نہ ہوگا لہٰذا میں نے پھوٹا خان کی تائید کرتے ہوئے بلخ شیر سے کہا۔

"ادا بلخ شیر! چاچا سائیں ٹھیک کہہ رہے ہیں' پہلے یہ مردود گہرام والا معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے تو پھر کراچی جانے کچھ سوچیں گے۔"

میں نے دیکھا' میری بات پر پھوٹا خان نے مجھے

نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر دوسرے ہی لمحے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "دھیے! میں تیرے دل کی پریشانی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ جب تک تو خود کو شینا کے پاس نہیں پائے گی' تیرے دل کو قرار نہیں آئے گا۔"

میں نے اس کی بات پر صاف دل سے کہا "چاچا! شینا کی پریشانی اپنی جگہ لیکن یہ بھی تو سوچنے والی بات ہے کہ اگر ان حالات میں ہم کراچی نکل بھی گئے تو کیا ہمیں پیچھے کی فکر اور پریشانی نہ ہوگی لہٰذا اب بہتر یہی ہے کہ گھرام والا معاملہ نمٹ جائے تو بعد میں ہی کراچی جانے کا سوچتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر" میری بات پر پھوٹا خان نے کہا۔ "میں آج ہی اپنا ایک آدمی مخبر کی حیثیت سے جوگیوں کی بستی کی طرف روانہ کرتا ہوں۔ مجھے ان کے عزائم سے باخبر کرتا رہے گا۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ بستی کی جو پنچائت ہے وہ دراصل گھرام ہی کی ہم خیال اور شرپسند ہے ورنہ بستی کی اکثریت امن پسند ہے' وہ لڑائی یا مار کٹائی کی خوگر بہرحال نہیں ہے۔"

☆☆☆

یہ اس روز شام کا ذکر تھا۔ بلخ شیر اپنے گھر روانہ ہو چکا تھا۔ جبکہ پھوٹا خان موجودہ حالات سے باخبر رہنے کے لیے اپنی اوطاق کی طرف چل دیا تھا۔ اس وقت گھر پر میں بشیراں اور مراد علی تھے۔ گھرام والے معاملے کی پریشانی اگرچہ اپنی جگہ تھی مگر مجھے شینا کی طرف سے ایک پل بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے محبوب شوہر محمد پریل کا خیال بھی۔ بدقسمتی سے میں پے در پے اور یکے بعد دیگرے ایسے گوناگوں حالات سے دوچار رہی تھی کہ مجھے پھر دوبارہ پریل کو تلاش کرنے کا موقع نہ مل سکا البتہ دورانِ گفتگو ایک موقع پر ادا بلخ شیر نے مجھے یہ بتایا تھا کہ پریل کی تلاش جاری ہے۔ اس نے مائی مختاراں اور پریل کو ڈھونڈنے کے لیے اپنے دو آدمیوں کو بدستور لگا رکھا تھا۔ لیکن ابھی تک انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر بلخ شیر نے دبے دبے لفظوں میں مجھ سے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ مائی مختاراں' پریل کو لے کر کہیں دور نکل چکی ہے۔ اس اطلاع پر میں بری طرح اپنا دل مسوس کر رہ گئی تھی۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سردست میرے پاس صبر و دعا کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ سو وہ میں کر رہی تھی۔

میں اپنی بے چینی اور اداسی دور کرنے کے لیے پھوٹا خان کی بیوی بشیراں سے باتوں میں مصروف تھی۔ پھر اس کے بعد ہم ذرا آرام کرنے کی غرض سے اندر کمرے میں لیٹ گئے۔

جاگی تو شام ہو چکی تھی۔ بشیراں کے کہنے پر میں نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہن لیے۔ یہ کپڑے بشیراں کے ہی تھے اگرچہ مجھے ذرا کھلے تھے۔ مگر صاف اور اجلے تھے۔ اس اثنا میں بشیراں نے مجھے گڑ کی چائے پلائی۔ اس دوران میں پھوٹا خان اور بلخ شیر آپس میں باتیں کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ پھوٹا خان کچھ پریشان سا نظر آ رہا تھا جبکہ بلخ شیر خاصا غصے میں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں اندر کمرے میں جا بیٹھے۔ ان کے کمرے میں جاتے ہی میں بھی وہاں آ گئی اور پھوٹا خان کی ..... دیکھ کر پوچھا۔

"چاچا! خیر تو ہے' کیا ہوا؟" اس اثنا میں بشیراں بھی پریشان اور متفکر سی کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے برتن تھے۔ پھوٹا خان میری بات کا جواب دیے بغیر بلخ شیر سے مخاطب ہو کر بولا۔

"بلخ شیر! تو اب ایسا کر' دھی کونجاں اور میرے بچوں کو سب سے پہلے اپنے گھر لے جا۔ میں خود ہی ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھا! پر میں بھی ابھی جا کر اپنے آدمی تیار کرتا ہوں۔ آج ان لوگوں کو مزہ چکھا کر رہیں گے" بلخ شیر نے جواباً پُرجوش لہجے میں کہا تو میں مزید پریشان سی ہو گئی اور بالآخر متوحش لہجے میں دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو پھوٹا خان نے بتایا۔

"کونجاں دھیے! گھبرانے کی بات نہیں' وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میرے مخبر نے آ کر بتایا ہے کہ گھرام ہمارے گوٹھ پر شب خون مارنے کے لیے پر تول رہا ہے" اس کی بات پر میں بھی ..... فکرمند ہو گئی تھی۔ بعد میں پھوٹا خان نے مجھے یہ بھی بتایا کہ گھرام کی بستی سے کچھ لوگ اس کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کونجاں کو ہمارے حوالے کر دو یا پھر ایک بڑی جنگ کے لیے تیار رہو۔

اس بات نے مجھے مزید پریشانی میں مبتلا کر دیا اور ایک بار پھر میں اپنے سینے پر ایک بوجھ سا محسوس کرنے لگی' کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے اب یہاں بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو۔

مجھے تشویش میں مبتلا پا کر بلخ شیر جیسے میری پریشانی بھانپتے ہوئے تسلی دیتے ہوئے بولا "تو کیوں فکر کرتی ہے ادی کونجاں! ہم نے کوئی چوڑیاں تو نہیں پہن رکھی ہیں۔ تو دیکھنا' ہم ان لوگوں کو ایسا منہ توڑ جواب دیں گے کہ ساری عمر یاد رکھیں گے اور پھر کبھی ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ان میں ہمت نہ ہوگی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ادا! مگر...... اس ہولناک جنگ میں اس گوٹھ کے بے گناہ اور معصوم لوگوں کی جانوں کو بھی تو خطرہ ہوگا" میں نے کسی قدر تشویش آمیز لہجے میں کہا تو پھوٹا خان بولا۔

"تم اس کی فکر نہ کرو دھیے! میرے گوٹھ کے لوگ بہت جی دار اور نڈر ہیں۔ میری ایک آواز پر سب اکٹھے ہو جائیں گے لیکن میں نے پھر بھی انہیں محتاط رہنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ ہمارے آدمی سندھو دریا پر مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے ہیں۔ اول تو گھرام کے آدمی وہ دریا ہی پار کرنے کی جرأت نہیں کر پائیں گے۔ اگر ان کا کوئی بھولا بھٹکا آدمی دریا پار کر کے آ بھی گیا تو اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔"

پھوٹا خان کی بات پر میری پریشانی کم نہ ہوئی تھی۔

رات بھاری سل کی طرح دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ کمرے سے باہر ویران صحن میں چیختا ہوا سناٹا کوڑیالے سانپ کی طرح پھنکاریں مارتا محسوس ہو رہا تھا۔ صحن کی لائٹ گل تھی مگر باہر چاند کی روشنی چہار اطراف اتری ہوئی تھی۔

باہر دور کہیں آوارہ کتوں اور گیدڑوں کی السائی ہوئی چیخنے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

اگر یہ محض اطلاع ہوتی' گھرام کی بستی والے..... آج رات گوٹھ پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تو یقیناً اس میں اس بات کا امکان بھی غالب رہتا کہ ضروری نہیں کہ وہ لوگ آج کی رات ہی حملہ آور ہوں مگر یہ محض اطلاع ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک خفیہ اور مصدقہ خبر تھی جو پھوٹا خان کا ایک مخبر گھرام کی بستی سے اڑا لایا تھا۔ اور ان کے جارحانہ عزائم سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آج رات ہی گوٹھ پر ہلّہ بولنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

ہم تینوں خواتین سروں پر پیشانی تک دوپٹے کے طور پر چادریں لپیٹے دعا اور عبادت میں مشغول تھیں۔ اس دوران میں مجھے پیاس محسوس ہوئی پھر میں زیرلب دھیرے سے پانی پینے کا کہہ کر اٹھی اور باہر صحن میں آ گئی۔ ایک طرف گھڑونچی رکھی تھی جس پر دو بڑے بڑے تازہ پانی سے بھرے مٹکے رکھے تھے۔ میں نے گلاس سنبھالا اور سلور کی ڈوئی سے گھڑے میں سے پانی نکال کر گلاس میں بھرا اور ابھی میں نے چند گھونٹ ہی پیے تھے کہ اچانک دور کہیں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ میرا دل پہلے ہی "دھڑکا" ہوا تھا۔ پانی کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔ گولیوں کی بھیانک آواز شاید اندر کمرے میں موجود بشیراں اور بھاگ بھری نے بھی سن لی تھی۔ وہ دونوں ہی متوحش انداز میں باہر برآمدے میں آ کر مجھے مخاطب کر کے بولیں۔

"کونجاں! اندر آ جاؤ' لگتا ہے حملہ ہو گیا ہے" میں نے گلاس واپس رکھا اور ان کے قریب آ گئی۔ پھر ہم اندر کمرے میں آ گئے۔

"اللہ سائیں تو خیر کرنا۔ ہمارے سر کے سائیوں کی جانوں کی حفاظت کرنا" بھاگ بھری نے دعائیہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے زیرلب کہا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش کے آثار کھنڈ آئے تھے۔ ہم تینوں پھر دعاؤں میں مشغول ہو گئے مگر میری سماعتیں باہر کہیں دور ہونے والی فائرنگ پر لگی ہوئی تھیں۔ فائرنگ اب متواتر ہو رہی تھی' جس کے دھواں دھار آہنگ سے صاف عیاں ہو رہا تھا کہ اب باقاعدہ تبادلہ فائرنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ یعنی بالفاظِ دیگر جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بشیراں اور بھاگ بھری کے چہروں پر اب پریشانی کے ساتھ ہراس بھی پھیل چکا تھا۔ وہ اب زیادہ خضوع و خشوع کے ساتھ دعاؤں میں مصروف ہو گئیں۔ جبکہ میرے اندر دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ اچانک جانے کیا ہوا کہ میری چھٹی حس پھڑکی جس نے میرے اندر ایک عجیب سے "کھٹکے" کو بیدار کیا۔ بے شک اس وقت ہمارا واحد سہارا خدا سے خیر کی دعائیں مانگنا ہی تھا لیکن جانے کیا بات تھی کہ میرے دل کو پریشانی کے ساتھ ایک بے نام بے چینی نے آ لیا اور میں بشیراں اور بھاگ بھری کو دعاؤں میں مشغول چھوڑ کر کسی خیال کے تحت باہر نیم تاریک صحن میں آ گئی۔ صحن کی دیواریں دم بخود ہیولوں کی طرح ایستادہ تھیں۔ میں بیرونی دروازے کی طرف دبے پاؤں آئی اور پھر اس کی جھری سے آنکھ لگا دی۔ باہر مجھے بلخ شیر کے دو مسلح آدمی مستعدی سے کھڑے نظر آئے۔ میں چند ثانیے انہیں دیکھتی رہی پھر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی' اس سمے مجھے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے اور میں اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے صحن کے کونے میں رکھی گھڑونچی کی طرف بڑھی، پانی نکال کر میں نے چند گھونٹ ہی بھرے تھے کہ اچانک مجھے باہر عجیب سی کھڑپڑ کا احساس ہوا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور میں پانی کا گلاس رکھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی اور قریب پہنچ کر میں نے ایک بار پھر دروازے کی متوازی جھری سے اپنی آنکھ چپکا دی۔ باہر سناٹا اور ویرانی کا راج تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جو دو مسلح محافظ کھڑے تھے' وہ اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ میرے اندر انجانے اندیشناک وسوسوں کی یلغار ہونے لگی۔ میرے دل کے کسی عمیق گوشے میں ابھرنے والی بے نام "کھٹک" اب یکلخت کوڑیالے سانپ کی شکل اختیار کر گئی۔ تب مجھے ہلکی سی آہٹ کا احساس ہوا اور میں نے فوراً سیدھی ہو کر آواز کی سمت دیکھا تو بے اختیار میرے حلق سے خوف بھری چیخ خارج ہو گئی۔ میرے دائیں طرف کی دیوار پر جدھر گھڑونچی رکھی تھی وہاں ایک سایہ ابھرتا ہوا نظر آیا۔ دیوار کی منڈیر پر اس پُراسرار ہیولے کو دیکھ کر ایک لمحے کو خوف کی وجہ میری گھگی بندھ گئی اور میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گئی تھی۔ ہوش مجھے

تب آیا جب وہ پُراسرار ہیولا دیوار ٹاپ کر صحن میں کودا اور شکرے کی طرح میری طرف بڑھا۔ میرے حلق سے اس بار زوردار چیخ خارج ہوئی مگر اس وقت تک اس ہیولے نے آگے بڑھ کر میری گردن دبوچ لی تھی اور وہ مجھے اپنے ساتھ گھسیٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میری چیخوں کی آواز پر اندر کمرے میں موجود بشیراں اور بھاگ بھری بھی ہراساں انداز میں دوڑتی ہوئی باہر نکلیں تو ایک مشکوک شخص کو مجھے دبوچے ہوئے پا کر وہ بھی ہراساں انداز میں چیخنے لگیں۔ مگر اس حملہ آور نے ان کی پروا کیے بغیر مجھے بدستور ایک ہاتھ سے دبوچ کر دوسرے ہاتھ سے بہ سرعت دروازے کی....... کنڈی کھول دی۔ کنڈی کھلنے کی دیر تھی کہ اچانک پانچ مسلح حملہ آور دروازے کو دھکیل کر شیطانی بگولوں کی طرح اندر داخل ہوئے۔ بشیراں اور بھاگ بھری وحشیانہ چیخوں کے ساتھ واپس کمرے کی طرف دوڑیں تو ان میں سے دو حملہ آور انہیں جھپٹنے کو کمرے کی طرف دوڑے۔ میرے گرد جو حملہ آور کھڑے تھے ان میں ایک کو پہچان کر میں خوف سے زرد پڑ گئی۔ وہ مردود گہرام تھا جو میری طرف بڑی خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر وہ دونوں حملہ آور لرزتی کانپتی ہوئی بشیراں اور بھاگ بھری کو بھی اپنی بندوقوں کے نشانے پر باہر صحن میں لے آئے۔

''خبردار! اگر کسی نے بھی اب کوئی آواز نکالنے کی کوشش کی تو'' گہرام قہربار لہجے میں غرا کر بولا۔ ابھی ذرا دیر پہلے میرے اندر جو اندیشوں بھری بے نام کھٹک ابھری تھی' وہ اب ایک کریہہ حقیقت کی صورت میں میرے سامنے تھی۔ گہرام نے بڑی مکارانہ چال چلی تھی۔ اس نے چھوٹا خان اور بلخ شیر سمیت اس کے سارے آدمیوں کو یہاں سے دور لڑائی میں مصروف کر دیا تھا اور خود بڑی چالاکی سے اپنے چند حواریوں کے ساتھ ادھر نکل آیا تھا اور باہر متعین دونوں محافظوں پر قابو پالیا تھا۔

''ہم اس چھوکری کو اپنے ساتھ لے جارہے ہیں'' معاً گہرام نے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپتی ہوئی بشیراں اور بھاگ بھری سے کہا ''اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی تو تم دونوں گولیوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔''

گہرام نے اتنا کہہ کر اپنے دونوں حواریوں کو اشارہ کیا جنہوں نے بشیراں اور بھاگ بھری کو دبوچ رکھا تھا۔ اشارہ پاتے ہی وہ دونوں انہیں دھکیلتے ہوئے اندر کمرے میں لے گئے اور باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

میں مردود گہرام اور اس کے مسلح حواریوں کے عزائم جان چکی تھی۔ میں جس طرح اس ناگہانی افتاد کا شکار ہو چکی تھی' اس نے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو یکلخت مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور میں ابھی تک خوف اور سراسیمگی کا شکار تھی۔ اس کے بعد کی کارروائی کو بڑی منظم طریقے سے نمٹایا گیا اور مجھے دبوچ کر یہ لوگ بیرونی دروازے سے باہر تاریکی میں لے آئے پھر دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھانے کے بعد یہ لوگ اندھیرے میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

دور دریائے سندھ کی طرف دھواں دھار فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا اور میں بڑی بے بسی کے ساتھ یہ سوچ رہی تھی کہ چھوٹا خان اور بلخ شیر کے خواب و خیال میں بھی شاید یہ بات نہ ہوگی کہ دشمن نے کس مکاری کے ساتھ انہیں وہاں الجھا کر بلخ شیر کے گھر میں نقب لگائی تھی۔

وہ سب راستہ بدل کر تاریکی میں ڈھینگروں اور جھنگروں کی آڑ میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ مجھے گہرام نے بازو سے سختی سے دبوچ رکھا تھا۔ میری سانسیں بری طرح چڑھ اتر رہی تھیں اور دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں میں پر دھڑک رہا تھا۔ ان کا رخ یقیناً دریا کی سمت تھا جسے پار کرنے کے بعد یہ لوگ اپنی بستی کی حدود میں داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے قابو میں کیے اپنے علاقے کی طرف لے جارہے تھے۔ میرا دماغ اب تیزی کے ساتھ موجودہ خطرناک صورتِ حال سے مفر کی راہ تلاش کرنے میں منہمک تھا جو سرِدست مجھے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی نظر آرہا تھا۔ کیونکہ میں اس وقت پانچ چھ گیم گیم اور مسلح دشمنوں کے نرغے میں تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ ان رذیلوں نے بشیراں اور بھاگ بھری یا اندر کمرے میں سوتے ہوئے معصوم بچوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جلد ہی میرے کانوں میں دریا کے بہنے کا ہلکا سا شور سنائی دیا۔ ہم اب دریا کے ریتیلے کراڑے پر پہنچ چکے تھے۔ سامنے دریائے سندھ کا چوڑا پاٹ نظر آرہا تھا۔ اس کی جھلملاتی سطح مدھم چاندنی میں دمک رہی تھی۔ وہ اب دریا کے متوازی آگے بڑھنے لگے۔ پھر ایک پلیا نظر آئی' ہم اس پر سے گزرنے لگے۔ ایک لمحے کو میرے جی میں یہ جرأت انگیز خیال ابھرا کہ میں خود کو دریا میں گرادوں مگر پھر دریا کے چوڑے اور پُرہیبت پاٹ کو دیکھ کر مجھ میں ہمت نہ ہو سکی۔ ویسے بھی مجھے تیرنا کب آتا تھا۔ بہرطور اب ہم دوسری سمت کے کراڑے پر آگئے' سامنے تاریک اور گھنا جنگل تھا۔

ہم نشیب میں اترنے لگے اچانک میری متوحش نگاہوں نے سامنے درختوں کے قریب دو بیل گاڑیوں کو کھڑے پایا۔ پھر یہ لوگ تین افراد پر مشتمل دو ٹولیوں میں بٹ کر جلدی سے بیل گاڑیوں پر سوار ہوئے۔ گہرام اور اس کا ایک ساتھی مجھے دبوچے ہوئے بیل گاڑی میں سوار ہو گئے اور اس کے تیسرے ساتھی نے توانا بیلوں کی رسی تھام لی اور انہیں ہولے سے ٹشکارا۔ اب

دونوں بیل گاڑیاں آگے پیچھے تیزی کے ساتھ دوڑنے لگیں۔ ہماری بیل گاڑی آگے تھی۔ اب ہم جنگل کے ایک اور پُرہول بطن میں داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

تاریک جنگل کے پُرہول سناٹے میں سبک رفتار سے دوڑتی ہوئی بیل گاڑیوں کے چوبی پہیوں کی مدھم سی کھچا کھچ آواز بھی کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔

معاً تاریک فضا میں یکدم گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور ساتھ ہی ہمارے عقب میں آتی ہوئی بیل گاڑیوں پر سوار گہرام کے حواریوں کی جگر خراش چیخیں ابھریں میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ یکبارگی گہرام کے حلق سے سانپ کی سی ہلکی پھنکار سے مشابہ غراہٹ ابھری اور اس نے فوراً اپنے ساتھی کو بیل گاڑی روک دینے کا حکم دیا۔ وہ تینوں بری طرح ٹھٹک گئے تھے۔ گولیوں کی یکبارگی ابھرنے والی تڑتڑاہٹ کے بعد اب چہار سو سناٹا ہو گیا تھا۔ جو وحشت زدہ دلوں پر موت کی دستک دیتا محسوس ہو رہا تھا۔

''اترو' جلدی کرو'' معاً گہرام سانپ کی طرح پھنکارا۔ اس کے تینوں ساتھی بندوقیں ہاتھ میں لیے نیچے اتر آئے۔ اس ناگہاں بدلتی ہوئی صورتِ حال نے میرے اندر امید کی جوت سی جلادی تھی لیکن یہ گہرام اور اس کے دونوں حواریوں کے لیے کشاکش کا پیغام تھی۔ وہ تینوں مجھے دبوچے درختوں کی آڑ میں ہو گئے۔ وہ عقب میں دھندلے خاکے کی طرح نظر آتی بیل گاڑی کو پھٹی پھٹی اور وحشیانہ نظروں سے گھورنے لگے۔

گولیوں کی آواز سے بیلوں میں بے چینی سی پیدا ہونے لگی تھی اور عقب میں موجود بیل گاڑی جب دوڑتی ہوئی ہمارے قریب سے گزرنے لگی تو گہرام کے دونوں ساتھیوں نے یکدم آگے بڑھ کر بدک کر بھاگتے ہوئے دونوں بیلوں کا راستہ روک لیا اور پھر ایک نے فوراً آگے بڑھ کر ان کی رسی دبوچ لی۔ گہرام مجھے بازو سے پکڑے جب درخت کی آڑ سے نکل کر بیل گاڑی کے قریب آیا تو ہماری نظروں کے سامنے بیل گاڑی کے چوبی تختے پر گہرام کے تینوں ساتھیوں کی خون میں لت پت لاشیں پڑی تھیں۔

پھر اس لمحے جیسے گہرام کی چھٹی حس نے کسی خطرے کو محسوس کیا اور ہولے سے چلا کر اپنے دونوں ساتھیوں سے بولا۔

''یہاں سے پرے ہٹ جاؤ جلدی'' یہ کہہ کر مجھے بازو سے گھسیٹ کر دوبارہ درخت کی آڑ میں آگیا مگر اس کے دونوں ساتھیوں کو اپنی جگہ بدلنے میں ذرا دیر ہو چکی تھی کیونکہ اسی لمحے ایک بار پھر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور اس کے دونوں ساتھی تیورا کر گرے مگر اس کے ایک ساتھی میں شاید ابھی دم باقی تھا۔ اس نے گرتے ہی آواز کی سمت یکے بعد دیگرے دو کارتوس فائر کر دیے پھر ٹھیک اسی وقت مذکورہ ''اندھیری'' سمت سے دوبارہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور گہرام کے آخری ساتھی کا سر خون سے تربتر ہو گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ہی اگلے جہان کو سدھار چکا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو یوں آن کی آن میں جہنم واصل ہوتا دیکھ کر گہرام کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ اس نے اپنی دونال بندوق ایک ہاتھ میں پکڑ کر اندازے سے نامعلوم حملہ آوروں کی طرف دو فائر جھونک مارے۔ مگر پُراسرار حملہ آوروں کو گہرام کے مقابلے میں بڑی موثر گھات ملی ہوئی تھی اور گہرام اس وجہ سے مات کھا گیا تھا۔ ان پُراسرار حملہ آوروں کے بارے میں میرا اندازہ یہی تھا کہ یہ لوگ ہو نہ ہو چھوٹا خان یا بلخ شیر کے آدمی ہی ہو سکتے تھے۔ انہیں شاید عین وقت پر دشمنوں کی اس خفیہ کارروائی کا علم ہو گیا تھا۔ تاہم ساتھ ہی اب میرے دماغ میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک جھماکا ہوا۔ گہرام اب اکیلا رہ گیا تھا اور اس کی بندوق بھی سرِدست خالی تھی۔ اسے اب اپنی بندوق دوبارہ لوڈ کرنے میں ایک ''لمحاتی'' وقفہ درکار تھا لیکن میں اب اس لمحاتی وقفے سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی کیونکہ گہرام اس وقت شکست خوردہ تھا اور وہ کسی بھی وقت مجھے بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی گہرام نے اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی گولیوں کی پٹی سے کارتوس نکالنے کی کوشش کی' میں نے اس کی ایک ہاتھ کی گرفت سے آزادی ملتے ہی اسے زور کا دھکا دیا۔ اس کے لیے شاید میری یہ جارحانہ اور اچانک حرکت خلافِ توقع تھی یہی سبب تھا کہ وہ غیر متوقع دھکا کھا کر درخت کی آڑ سے نکل کر چند قدم تک لڑکھڑاتا چلا گیا مگر اس نے خود کو گرنے نہیں دیا تھا۔ مگر میں اس سے پہلے ہی جنگل کی طرف دوڑی۔ اچانک دوبارہ فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ نامعلوم حملہ آوروں نے شاید گہرام پر گولیاں برسائی تھیں۔ مگر میں اس کی پروا کیے بغیر اندھادھند تاریک جنگل میں دوڑی چلی جارہی تھی۔ میری سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ ایک دو جگہ پر میں جھاڑیوں سے الجھ کر گری بھی تھی اور میرے چہرے پر خاردار جھاڑیوں کی خراشیں بھی ابھری تھیں مگر چونکہ میری اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے میں ان خراشوں کی پروا کیے بغیر دوبارہ اٹھ کر دوڑنے لگی اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی میرے عقب میں دوڑا چلا آرہا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ شاید بدبخت گہرام میرا پیچھا کر رہا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے کسی نے عقب سے مجھ پر گولیاں برسائیں۔ یہ رائفل کی آواز تھی۔ جو پراسرار حملہ آوروں کے پاس تھی جبکہ

گہرام کے پاس بندوق تھی۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ کے ابھرتے ہی میری ٹانگیں لرز گئیں اور میں ایک بار پھر منہ کے بل پھر اندھی جھاڑیوں پر آن گری۔ اس بار میرے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ یہ چیخ میرا اضطراری عمل نہ تھا بلکہ گرتے ہوئے میرا سر سامنے درخت کے ایک موٹے تنے سے ٹکرایا تھا۔ مجھ پر عقب سے ہونے والی گولیوں کی بوچھار یقیناً مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے کی گئی تھی جس سے مجھے.....اس حقیقت کا ادراک ہوا تھا کہ گہرام اور اس کے ساتھیوں پر حملہ بولنے والے کم از کم میرے دوست نہیں تھے۔ تو پھر یہ کون لوگ تھے؟ میں نے متوحش ذہن کے ساتھ سوچا۔ تاہم میں نے اپنے سر کی چوٹ کو سہلاتے ہوئے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی تو اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی بے تحاشا دوڑتا ہوا میرے سر پر پہنچ چکا ہو اور پھر اگلے ہی لمحے جب میں اٹھ کر کھڑی ہوئی تو رائفل کی سرد نال میری گردن سے آن لگی۔ میں اپنی جگہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔

''خبردار کونجاں! اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت......ورنہ......''

ایک غراتی ہوئی نسوانی آواز میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں گونجی اور میں اس شناسا آواز کو پہچان کر دھک سے رہ گئی۔ یہ آواز لالاں کی تھی۔ وہی آفت کی پرکالہ لالاں۔ جو موت کا سایہ بنی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ تو مجھے اس کا شناسا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ کسی زخمی ناگن کی طرح پھنکاریں مارتی ہوئی ہانپ رہی تھی۔

اس نے انتہائی قہر آلود لہجے میں مجھے ایک طرف قدم بڑھانے کا حکم دیا۔ فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا۔ لالاں مجھے لیے اندھیرے میں آگے بڑھنے لگی۔ وہ بڑی محتاط اور جنگلی بلی کی طرح میرے عقب میں رائفل تانے چل رہی تھی۔ ادھر فائرنگ کا سلسلہ اچانک موقوف ہوگیا تھا۔ لالاں نے ایک مقام پر پہنچ کر اپنے حلق سے عجیب سی مگر مخصوص آواز نکالی دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی داہنی جانب سے ایک اور انسانی ہیولا ابھرتا ہوا نظر آیا۔ لالاں اسے دیکھ کر فتح سے چور لہجے میں بولی۔

''کوڑل! میں نے کونجاں کو پکڑ لیا ہے'' اس کی زبان سے کوڑل کا نام سن کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گئی۔ تو یہ ساری کارستانی اس سانپوں کے جوڑے لالاں اور کوڑل کی تھی' میں نے سوچا۔

''لالاں لگتا ہے' گہرام میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے''

اچانک جواباً کوڑل نے لالاں کو مخاطب کر کے پُرجوش لہجے میں کہا'' ایک بیل گاڑی موجود ہے' میرا خیال ہے' ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے' یہ سارا علاقہ اس مردود گہرام کا ہے۔ وہ اپنے آدمی لانے میں دیر نہیں کرے گا۔'' اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ کوڑل نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے پکڑا اور بڑی بے دردی سے کھینچتا ہوا آگے بڑھا۔ لالاں بڑی محتاط نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہوئی ساتھ ساتھ آرہی تھی۔ پھر سامنے ایک بیل گاڑی کھڑی نظر آئی۔ جس میں گہرام کے تینوں ساتھیوں کی خون میں لت پت لاشیں پڑی ہوئی تھیں جبکہ دوسری بیل گاڑی' جس میں گہرام اور میں سوار تھے' اس کے دونوں بیل شاید بدحواس ہوکر بھاگ چکے تھے۔ کوڑل نے جلدی جلدی تینوں لاشیں بیل گاڑی سے اتار کر نیچے پھینکیں پھر اس کی رسی سنبھال کر اس میں سوار ہوگیا جبکہ لالاں مجھے دبوچے بیل گاڑی میں سوار ہوگئی اور یہی نہیں' اس کمینی نے ایک رسی کی مدد سے میرے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے' کوڑل نے مخصوص آواز میں بیلوں کو ٹشکار کر اور انہیں واپسی کے کچے راستے پر دوڑانا شروع کردیا۔ دونوں بیل تندرست اور توانا تھے۔ کوڑل کا اشارہ پاتے ہی دوڑنے لگے۔ جلد ہی ہم سندھو دریا کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں آکر کوڑل کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے اچانک بیل گاڑی روک دی۔

''کوڑل! گاڑی کیوں روک دی؟'' لالاں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''لالاں! ہمیں دریا پار کر کے آگے نکلنا ہوگا'' کوڑل نے کچھ سوچنے کے سے انداز میں جواباً کہا۔

''اور یہ بیل گاڑی چھوڑ کر پیدل آگے بڑھنا ہوگا ورنہ گہرام اور اس کے ساتھی بیل گاڑی کے پہیوں کے نشانات کے ذریعے ہم تک پہنچ سکتے ہیں'' اس کی پُرمغز تاویل پر لالاں نے تفہیمی انداز میں اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد ہم تینوں بیل گاڑی سے نیچے اتر آئے پھر گہرام نے بیلوں کا رخ واپس جنگل کی طرف موڑ کر ایک بیل کی پشت کو زور سے نوچا اور انہیں آگے ٹشکار دیا۔ دونوں بیل ڈکراتے ہوئے اندھا دھند اندر جنگل کی طرف دوڑ گئے۔ ہم تینوں اب دریائے سندھ کے ریتیلے کراڑے پر دم بہ خود ہیولوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

یہاں مدھم مدھم اور نرم اور خنک چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ کوڑل نے دریا کی طرف قدم بڑھا دیے تو مجھے بھی عقب سے لالاں نے رائفل کا ٹہوکا مارا اور ناچار کوڑل کی تقلید میں، میں نے بھی قدم بڑھا دیے۔

تھوڑی دیر بعد ہم دریائے سندھ کے پُرہیبت چوڑے پاٹ پر بنی پلیا پر سے گزر رہے تھے۔ دریا پار کرنے کے بعد ہم اب تیز تیز قدموں سے اس کے متوازی ذرا نشیب میں بنی اونچی نیچی خاردار جھاڑیوں میں سے گزرنے لگے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے

تھے۔ ہمارے چہار سو پُرہیبت سناٹا طاری تھا۔ لالاں اور کوڑل خاصے سخت جان ثابت ہوئے تھے۔ وہ کافی دیر تک بغیر رکے چلتے رہے۔ اس دوران میں میرے قدم ذرا بھی سست پڑتے تو میرے عقب میں چلتی ہوئی لالاں میری پشت پر زور سے اپنی رائفل چبھو کر مجھے آگے کو دھکیلنے لگتی۔ میرے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ لالاں اور کوڑل کے نرغے میں آنے کا مطلب وہ پُرخطر مہم جو کندھ کوٹ اور کشمور کے صحرائی علاقوں تک محیط تھی۔ میں نے اب تک خاموش حکمتِ عملی اپنا رکھی یا پھر ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ کیونکہ میں بھلا ان سے کیا کہہ سکتی تھی؟ اور یہ بات خود یہ دونوں بھی بہ خوبی جانتے ہی ہوں گے' میرا ان کے ہاتھوں یرغمال بننے کا کیا مقصد ہوسکتا تھا؟ مگر میرے لیے اب یہ خیال ہی سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ کیا یہ دونوں بدبخت' اسی طرح پیدل ہی کندھ کوٹ تک کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟ بھلا یہ پُرمصائب' دشوار گزر منزلوں کی مسافت میں کس طرح طے کرسکتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ پریشان کن حیرانی بھی ہورہی تھی کہ کندھ کوٹ و کشمور تک کے دشوار گزار سفر کے راستوں کا بھلا کوڑل اور لالاں کو کیسے علم تھا؟ جبکہ ان دونوں کا تعلق تو اس دھرتی سے ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ دونوں و دیش دھرتی راجھستانی صحرائی علاقوں کے سانپ تھے لیکن شاید مقصد کے حصول کی لگن جب انسان کے دماغ میں سمانے لگتی ہے تو وہ انجان سے انجان منزلوں کا راستہ بھی کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ ضرور کوڑل اور لالاں نے بھی جب کندھ کوٹ اور کشمور کے علاقوں کے سفر کی ٹھانی ہوگی تو انہوں نے کسی طرح مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی ہوگی۔

بالآخر ایک موقع پر میں تھکن سے چور ہوکر گر سی گئی اور ہانپتے ہوئے بولی۔

''م......مجھ سے اب مزید نہیں چلا جارہا۔ میں تو تھوڑا سا سانس لینا چاہتی ہوں'' لالاں' کوڑل رک کر درشت نظروں سے مجھے گھورنے لگے۔

''کیا خیال ہے کوڑل! ذرا دیر بیٹھ کر تکان نہ اتار لی جائے'' اچانک لالاں نے کوڑل سے پوچھا۔

''نہیں لالاں! ابھی ہم اپنے دونوں بدترین دشمنوں کے علاقوں میں موجود ہیں۔ ہمیں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے یہاں سے بہت دور نکل جانا چاہیے۔ کیا تم بھی تھک گئی ہو؟'' کوڑل نے یہ کہتے ہوئے لالاں کے چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا تو لالاں بولی۔

''نہیں کوڑل! میں جب تک اس مقدس مورتی کو نہ پالوں' مجھے چین کہاں ملے گا لیکن یہ کم بخت کونجاں!'' وہ اتنا کہہ کے رکی تو کوڑل نے اپنے جبڑے بھینچ کر مجھے اپنے پاؤں کی ٹھوکر مارتے ہوئے تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔

''چل ڑی اٹھ چھوکری! بہت مکر کرلیا تو نے' ہم خوب جانتے ہیں تجھے۔ تو بڑی سخت چھوکری ہے۔''

''م......مگر تم مجھے کدھر لے جارہے ہو؟ اور میری تم لوگوں سے آخر کیا دشمنی ہے؟'' بالآخر میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھ ہی لیا تو کوڑل ابلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کاٹ دار لہجے میں بولا۔

''زیادہ سیانی بلی بننے کی کوشش مت کر......تو اچھی طرح جانتی ہے کہ ہم تجھے کدھر لے جارہے ہیں۔''

''تم لوگوں کو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ تم سمجھتے ہو میں اس مورتی کے مدفن سے واقف ہوں۔'' میں نے بالآخر ذرا ہمت اور جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا'' میری بات کا یقین کرو' میں......میں اس مورتی کے بارے میں بالکل بھی نہیں جانتی۔''

''زیادہ چالاکی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے چھوکری!'' اس بار لالاں نے غراتے ہوئے درشت لہجے میں مجھ سے کہا۔

''ہم یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب خالقو دھاڑیل کو اپنے غدار ساتھی جانو ماچھی کی بغاوت کے بعد اپنی موت سامنے نظر آنے لگی تھی تو اس نے تجھے مورتی کے مدفن تک پہنچنے کے ''اشارات'' سمجھا دیے تھے۔ بلکہ یہی نہیں' تجھے اس بڈھے ڈاکو نے چند ایسی نشانیاں بھی سمجھا دی تھیں جن سے اس مدفن تک پہنچنے میں مدد مل سکتی ہے'' میں ایک لمحے کے لیے لالاں کی بات سن کر ششدر سی رہ گئی۔

یہ کم بخت تو واقعی کسی منحوس سائے کی طرح میرے ساتھ ہی چپکی رہی تھی اور اسے ان خفیہ باتوں کا بھی علم تھا جو صرف میرے اور خالقو چاچا کے درمیان ہوئی تھیں۔ میں بہرحال اس کی توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہی تھی تاہم مجھے شبہ ضرور ہوا تھا کہ لالاں نے محض اپنے قیاسات کی بدولت اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ خالقو چاچا کو مجھ سے غیر معمولی شفقت' محبت اور قابلِ بھروسا ہونے کی وجہ سے اس نے مجھے راکاس مورتی کے مدفن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ پھر یہ بات صد فی صد درست بھی تھی' میں لالاں کی ذہانت پر ایک لمحے کو اش اش کر اٹھی' تاہم میں نے موقع محل اور حالات کے مطابق دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری بات اپنی جگہ درست سہی مگر یہ بھی تو سوچ کہ کہنے اور سننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس بات کو تو اب کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں خود اب تک مصیبتوں اور کڑے حالات کا اب تک شکار چلی آرہی ہوں۔ اس مورتی تک پہنچنے کی وہ

تمام نشانیاں اور اشارات میرے دل ودماغ سے اب تک محو ہوچکے ہیں اور ویسے بھی مجھے کبھی بھی اس مورتی سے ذرا بھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔"

"ہوں......" کوڑل نے میری تمام باتیں بہ غور سننے کے بعد معنی خیز ہمکاری بھری اور سنسناتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کو گھورتے ہوئے استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "کونجاں! تو اتنی بھولی نہیں جتنی نظر آتی ہے، تیرے دل و دماغ پر اس بڈھے ڈاکو کی ایک ایک بات نقش ہوچکی ہے جیسے پتھر پر لکیر......"

"چلو تمہاری بات میں اگر ذرا دیر کو مانے بھی لیتی ہوں تو ٹھیک ہے پھر......مورتی سے متعلق مجھے خالقو چاچا نے جو نشانیاں اور اشارے سمجھائے ہیں' وہ میں تم دونوں کو بھی بتائے دیتی ہوں۔ پھر مجھے اتنی دور خوار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم دونوں بہ آسانی اکیلے بھی اس مورتی کی مدفن تک پہنچ سکتے ہو" میں نے ایک بار پھر ان دونوں کو چکر دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو لالاں زہر خند مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولی۔

"تو کیا سمجھتی ہے ہم تیری باتوں میں آکر اور تجھے آزاد کرکے اپنی مہم پر روانہ ہوجائیں۔ تو ہم سے جھوٹ بھی بول سکتی ہو کیونکہ تو کبھی بھی یہ نہیں چاہے گی کہ وہ قیمتی اور مقدس مورتی ہمارے ہاتھ لگے' اس لیے کہ اس بڈھے ڈاکو نے اپنی زندگی میں ہی جو وصیت' صرف اور صرف تجھ سے کی ہے تو اسے ضرور پورا کرے گی' سمجھی تو...... چل اب اٹھ ہمارا وقت برباد نہ کر" مکار لالاں کی فطانت نے مجھے لاجواب کرکے رکھ دیا تھا' اس کی قیاسات لگانے کی قوت بڑی تیز اور بالکل درست سمت کام کرتی تھی۔ ناچار میں نے بندھے ہوئے ہاتھوں کے باوجود کھڑے ہونے کی کوشش کی تو لالاں نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کردیا اور آگے کی طرف دیکھا۔ ہم تینوں ایک بار پھر تاریکی میں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی چھدری جھاڑیوں کا سلسلہ اب موقوف ہوچکا تھا اور اب دور دور تک بنجر اور تاریک میدان کے سوا کچھ نہ تھا جبکہ لالاں اور کوڑل کی کوشش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد یہ میدان عبور کرلیں۔ میرا دماغ یہ سوچ سوچ کر دکھنے لگا تھا کہ یہ دونوں مردود کندھ کوٹ اور کشمور تک کا طویل اور دشوار گزار سفر آخر کب تک ایسے ہی پیدل طے کرتے رہیں گے؟ میرے ذہن میں یہ بھی خیال بجلی کی طرح کوندا ہمارا بلکہ میرا منزل سے سرِدست دور رہنا ہی بہتر تھا۔ کیونکہ اس طویل مسافت میں مجھے کسی وقت بھی ان کے چنگل سے نکل بھاگنے کا موقع مل سکتا تھا تاہم یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ میں کسی صورت بھی ان دونوں سانپوں کے جوڑے کو وہ مورتی حاصل نہیں کرنے دینا چاہتی تھی' بہ قول خالقو چاچا کے وہ مورتی ہمارے دیس' ہماری دھرتی کی امانت تھی' جو ایک بیش قیمت اور ثقافتی ورثہ کی حامل تھی۔ یوں تو میں نے پہلے ہی سے اپنے دل میں یہ عزمِ صمیم کررکھا تھا کہ اگر بدقسمتی سے ہم کندھ کوٹ اور کشمور کے علاقے میں پہنچ بھی جاتے تو تب بھی لالاں اور کوڑل کو اس مورتی کے مدفن کا سراغ نہیں دوں گی۔

میں اب تھکن کے مارے بے حال ہورہی تھی۔ پشت پر ہاتھ بندھے ہونے کی وجہ سے تھکن کا احساس سوا ہوتا محسوس ہورہا تھا۔ ہم مسلسل اور بغیر رکے آگے بڑھتے رہے۔ میں نے راستے میں چلتے چلتے لالاں سے یہ گزارش کی تھی کہ وہ کم ازکم میرے ہاتھ جکڑ بندوں سے آزاد کردے تاکہ مجھے چلنے میں بھی آسانی ہو۔ تھکن کا احساس بھی کم سے کم ہو۔

"کوڑل' کیا خیال ہے......اس کی یہ بات ہمیں مان لینی چاہیے۔ اس میں ہمارا بھی فائدہ ہے۔ اس طرح یہ چلنے کے دوران میں کوئی بہانہ بھی نہیں بنا سکتی" اس کی بات پر کوڑل نے دھیرے سے اپنا سر اثبات میں ہلایا تو لالاں نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب سے کھول دیے اور پھر سامنے کے رخ پر انہیں دوبارہ مضبوطی سے باندھ دیا۔ میرے لیے ان مردودوں کی اتنی "کرم نوازی" بھی سرِدست بہت تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ یہ دونوں اپنی پیٹ پوجا کے لیے کیا کرتے ہیں۔

پھر جلد ہی لالاں نے کوڑل سے کہا "کوڑل! کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہونا چاہیے۔"

"میرا خیال پانی کی پیاس تو ہم دریا سے بجھا سکتے ہیں اور کھانے کے لیے تو صبح سے پہلے بندوبست ہونا مشکل ہی نظر آرہا ہے" کوڑل نے جواب دیا۔

"چلو' پانی کی تو پیاس بجھا ہی لینی چاہیے پھر کھانے کے لیے بھی کچھ سوچ لیں گے۔"

لالاں نے کہا اور پھر ہم تینوں اٹھ کر دریا کے کنارے آگئے۔ سب سے پہلے لالاں اور کوڑل نے پانی پیا اس کے بعد لالاں نے میرے دونوں ہاتھ کھول دیے تو میں نے بھی خوب سیر ہوکر پانی پیا۔ سندھو دریا کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا تھا۔ پانی پی لینے کے بعد لالاں نے دوبارہ میرے ہاتھ مضبوطی سے باندھ دیے۔ ہم تینوں دریائے سندھ کے تاریک ریتیلے "کراڑے" پر موجود تھے۔ رات غالباً اپنے پچھلے پہر میں داخل ہوچکی تھی۔ آسمان شفاف اور روشن تھا۔ مدھم سی چاندنی نے چہار سو عجیب طرح کا طلسم بکھیرا ہوا تھا۔ کوڑل نے دریا کے اونچے ریتیلے کراڑے پر کھڑے ہوکر گردوپیش کا چند ثانیے گہرا جائزہ لینے کے بعد لالاں سے کہا۔

"لالاں! مجھے ذرا دور سامنے سبزیوں کے کھیت نظر آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں ذرا آگے بڑھنا چاہیے تاکہ سبزی کے کھیتوں سے کچھ کچی ترکاری ہی توڑ کر پیٹ کی پوجا کرسکیں۔"

اس کی تجویز پر لالاں نے اپنا سر اثبات میں ہلادیا۔ ہم اب کراڑے سے نشیب میں اترنے لگے۔

مجھے تو بھوک نہیں تھی بلکہ پانی بھی میں نے حلق اور ہونٹوں کی خشکی دور کرنے کی وجہ سے پیا تھا۔

پانی پینے کے بعد ہم دوبارہ اپنے پہلے والے مقام پر آگئے اور درختوں کے گھنے جھنڈ تلے تاریکی میں بیٹھ گئے۔

"لالاں! تو یہاں ذرا ہوشیار سے بیٹھ۔ میں ذرا کھیتوں سے کچھ ترکاری توڑ لاؤں" کوڑل نے کہا اور پھر ایک طرف اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ ایسے موقع پر میں بڑی حسرت سے سوچنے لگی کہ کاش...... میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے تو میں لالاں سے نمٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لیتی۔

ہمارے گردوپیش سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوڑل کو دور سبزی کے کھیتوں کی طرف گئے کافی دیر ہوچکی تھی اچانک ہمیں دور کہیں بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے دیکھا' لالاں بے چین اور متفکر سی نظر آنے لگی۔ میری طرح شاید اس نے بھی یہ اندازہ لگالیا تھا کہ کوڑل کا سبزی کے کھیتوں میں "پہرے دار" کتوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ پھر اچانک گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ لالاں کی پریشانی بھی سوا ہونے لگی "لگتا ہے' کوڑل کو کتوں نے گھیر لیا ہے" میں نے کسی خیال کے تحت مبہم لہجے میں لالاں سے کہا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہ تھی۔ پھر خاصی دیر بعد کوڑل ہانپتا ہوا آتا دکھائی دیا۔

لالاں یکدم چوکنا سی ہوگئی۔ پھر کوڑل کے قریب آنے پر لالاں نے قدرے متفکر لہجے میں اس سے پوچھا "کیا ہوا کوڑل! کیا کتے پیچھے لگ گئے تھے؟"

"ہاں' کم بخت جانے کدھر چھپے بیٹھے تھے' بڑی مشکلوں سے جان بچا کر آیا ہوں۔ کچھ لا بھی نہ سکا توڑ کر۔"

کوڑل نے تھکے تھکے سے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر وہیں نڈھال سا ہوکر گر گیا۔

"کسی کتے نے کاٹا تو نہیں تمہیں؟" لالاں نے متفکر ہوکر پوچھا۔

"نہیں' ایک تو میرے اوپر چڑھ آیا تھا' میں نے گولی چلائی تو اس کا کچومر بن گیا۔ باقی بھی بھاگ گئے۔ میں بھی بھاگ لیا" کوڑل نے جواباً بتایا تو لالاں بولی۔

"میرا خیال ہے' ہمیں پھر نکل لینا چاہیے۔ کہیں گوٹھ کے لوگ نہ جاگ پڑیں اور بھاگے بھاگے ادھر نہ آجائیں" کوڑل نے اس کی بات پر اثبات میں سر ہلادیا۔

"چل ری اٹھ۔ اب تو تیرے ہاتھ بھی آگے کو باندھ دیے ہیں' تیز تیز چل ذرا" لالاں نے کھڑے ہوتے ہوئے میری کمر پر اپنی رائفل کی نال چبھو کر درشت لہجے میں کہا۔ ناچار میں بہ مشکل اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہم تینوں ایک بار پھر خودرو جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے پُرے کچے اور تاریک راستے پر چلنے لگے۔

مذکورہ مقام سے کافی دور جانے کے بعد میں نے لالاں سے رفع حاجت کی درخواست کی۔ شکر تھا کہ انہوں نے میری یہ درخواست رد نہ کی۔

"تم بے شک یہاں میرے سر پر کھڑی رہو لیکن میرے ہاتھ ذرا دیر کو کھول دو۔"

لالاں شاید جلدی جلدی یہ سب نمٹانا چاہتی تھی اس لیے اس نے کسی بحث میں پڑے بغیر میرے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھول دیے۔ اور میرے سر پر رائفل کی نال تان کر چوکنا سی کھڑی ہوگئی۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے کن انکھیوں سے لالاں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی پھر جیسے ہی اس نے اپنی رائفل ایک طرف جھاڑیوں میں رکھ کر میرے دونوں ہاتھ رسی سے باندھنے لگی تو میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ پوری قوت سے ایک مکا اس کی ناک پر جڑ دیا۔ لالاں کے لیے میرا یہ حملہ قطعی غیر متوقع اور اچانک تھا' اس کے حلق سے ہلکی سی کراہ آمیز سی چیخ خارج ہوگئی اور اس کا دماغ جھنجھنا سا گیا اور پھر جب تک وہ سنبھلتی' میں نے ایک طرف تاریکی میں دوڑ لگادی۔

☆☆☆

گھٹا ٹوپ اندھیری قدِ آدم جھاڑیاں ایسے نازک وقت میں میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہورہی تھیں۔ میں بے تحاشا ان سے الجھتی ہوئی دوڑے چلی جارہی تھی۔ پھر دفعتاً مجھے عقب میں گولی چلنے کی گونج سنائی دی۔ مگر میں نہ رکی' البتہ اس لمحے مجھے ذرا دور سے آوارہ یا پہرے دار کھیتی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازوں نے مجھے مزید پریشان کردیا۔ لالاں اور کوڑل سے زیادہ مجھے کتوں کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ کیونکہ اگر کتوں کا یہ خونخوار اور بدمست غول میرے پیچھے پڑ جاتا تو مجھے ان سے اپنی جان چھڑانی مشکل ہوجاتی اور میرے لالاں اور کوڑل کے خونی ہاتھوں دھر لیا جانے کا بھی قوی خدشہ تھا۔ اچانک میرے ذہن

میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور میں نے ایک قریبی درخت کی طرف اپنا رخ موڑا اور پھر جنگلی بلی کی سی پھرتی کے ساتھ درختوں پر چڑھ گئی' وہ پاپلر کا بلند مگر خاصا جھنڈ دار اور گھنا درخت تھا۔ میں نے خود کو اس کی گھنی شاخوں میں چھپالیا اور دم سادھے دبک کر بیٹھ گئی۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اب قریب آتی جارہی تھیں۔ اچانک میں نے ایک طرف جھاڑیوں سے دو ہیولوں کو ابھرتے دیکھا۔ یہ دونوں لالاں اور کوڑل تھے جو شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں عین میرے نیچے کھڑے گردوپیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان دونوں رذیلوں کو اپنے قریب پاکر میں نے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ کہیں میری سانسوں کی بازگشت بھی انہیں نہ چونکادے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں انہیں میری اوپر درخت پر موجودگی کا نہ احساس ہوجائے۔ وہ دونوں چند ثانیے درخت کے عین نیچے کھڑے رہے پھر دونوں الگ سمتوں کی طرف بڑھ گئے۔ میں ابھی درخت سے نیچے نہیں اترنا چاہتی تھی بلکہ میرا ارادہ تو اب دن کی ہی روشنی میں ہی نیچے اترنے کا تھا۔ چنانچہ اب میں دم سادھے صبح کی منتظر تھی۔

چہار سو اسرار بھرے تاریک سناٹے مجھے غیر مرئی پراسرار نظروں سے گھورتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔ ماحول میں آسیب زدہ سا سکوت طاری تھا۔ کافی وقت گزرنے کے بعد خدا خدا کرکے چڑیوں کی چہچہاہٹ سی گونجنے لگی۔ میں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ جہاں اب ملگجا سا سپیدۂ سحر نمودار ہوچلا تھا۔ اور ہوتے ہوتے بالآخر صبح کاذب کے بعد دن کا اجیارا اندھیاروں کو نگلنے لگا۔ چڑیوں کے چہچہانے کی پرلحن آوازوں میں اب کوؤں کی کائیں کائیں کی کریہہ آوازیں مدغم ہونے لگی تھیں۔ اب دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا اور دور کہیں مشرق کی سمت گل گوں افق سے اٹدنے والی سورج کی سنہری کرنیں' جنگل جھاڑیوں اور درختوں کے چھدرے چھدرے روزنوں سے نمودار ہونے لگیں۔ میں ابھی کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ لالاں اور کوڑل اب شاید میری تلاش میں بھٹک کر کافی آگے نکل چکے تھے۔ دن کی روشنی کا بھی عجیب سحر ہوتا ہے۔ خود بہ خود دل نڈر سا ہونے لگتا ہے۔ ذرا دیر بعد سنہری دھوپ کی رو پہلی کرنیں جب کندنی ہونے لگیں تو میں نے نیچے اترنے کا ارادہ کیا اور اللہ کا نام لے کر زیر لب کلمہ پڑھا اور احتیاط کے ساتھ درخت سے نیچے اتر آئی۔ کئی گھنٹوں تک درخت پر سکڑے سمٹے بیٹھے رہنے کی وجہ سے میرا پورا وجود اکڑ سا گیا تھا۔ درخت سے اترنے کے بعد میں چند ثانیے گردوپیش کا بہ غور جائزہ لینے لگی اور پھر ایک محتاط اندازے کے تحت پھوٹا خان اور بلخ شیر کے گوٹھ کی سمت کا تعین کرکے قدم آگے بڑھادیے۔

☆☆☆

میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھی تھی کہ اچانک مجھے سامنے ذرا دور کچھ لوگوں کی جھلک دکھائی دی' میں ٹھٹک کر رک گئی اور فوراً ایک درخت کی آڑ میں ہوگئی اور بہ غور انہیں گھورنے لگی۔ وہ تعداد میں پانچ چھ کے قریب تھے اور مسلح بھی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک خدشہ ابھرا۔ ''کہیں یہ مردود گہرام کے آدمی تو نہیں' جو میری تلاش میں نکلے تھے۔'' یہ خیال آتے ہی میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور جرأت اور ہمت سے کام لیتے ہوئے میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ عقب کی جھاڑیوں کی طرف بڑھی اور بے تحاشا دوڑتی چلی گئی۔

میں اب درخت پر چڑھ کر چھپنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے میں نے یہی مناسب جانا تھا کہ یہاں سے پہلے خاصی دور نکل جاؤں' جب میں خاصی دور تک دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگی تو میں نے ایک جگہ رک کر ذرا دیر اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کیں اور پھر گاہے بہ گاہے عقب میں دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کے بعد میں نے دائیں جانب رخ کیا اور کھیتوں کی طرف نکل آئی۔ کھیتوں میں مجھے چند دیہاتی عورتیں اور لڑکیاں کام کرتی ہوئی نظر آئیں۔ انہوں نے ایک سرسری نظر مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگئیں۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ میں کسی دور پرے کے ایک مختصر سے کچے اور چھپر نما گھروں پر مشتمل گوٹھ کی طرف نکل آئی تھی۔ یوں تو اب میں دہرے خطرات سے دوچار تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ لالاں اور کوڑل بھی اس علاقے میں میری تلاش جاری رکھے ہوئے ہوں۔ دوسرے یہ کہ گہرام بھی اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ میری تلاش میں سرگرداں تھا مگر میں نے بھی دل میں مصمم ارادہ کررکھا تھا کہ میں کسی بھی جگہ ایک پل بھی رکے بغیر منزل کی طرف بڑھتی رہوں گی اور پھوٹا خان یا بلخ شیر کے گوٹھ پہنچ کر ہی دم لوں گی۔ ویسے پھوٹا خان کے گوٹھ کی بہ نسبت بلخ شیر کا گھر نسبتاً پہلے پڑتا تھا اس لیے میرا ارادہ سب سے پہلے بلخ شیر کے گھر پہنچنے ہی کا تھا کیونکہ مجھے سب سے پہلے اس مردود گہرام اور اس کے رذیل حواریوں نے وہیں سے اغوا کیا تھا۔

میں کھیتوں کے درمیان راستوں کی منڈیر پر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھی جارہی تھی۔ کھیتوں کے بائیں جانب گارے مٹی سے لپے ہوئے چھپر نما جھونپڑے سے گھروں کی

بے ترتیب قطاریں نظر آرہی تھیں۔ اچانک ایک پاٹ دار سی نسوانی آواز میری سماعتوں میں گونجی۔

''اڑی چھوکری...... ذرا ٹھہر تو'' میں نے ٹھٹک کر آواز کی سمت دیکھا۔ میرے بائیں جانب لوسن کے کھیت میں چند قدموں کے فاصلے پر ایک موٹی سی پکی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ اس کے قریب چارے کا کٹائی کیا ہوا ایک بڑا سا گٹھر پڑا ہوا تھا۔ ایک پانی سے بھرا مٹکا بھی تھا۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پاکر اس عورت نے مجھے اشارے سے اپنی طرف بلایا' کچھ سوچ کر میں اس کی طرف بڑھی اور بہ غور اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے ماسی؟''

''اڑی چھوکری! ذرا میری مدد تو کردے' یہ چارا میرے سر پر رکھوادے اور یہ پانی کا گھڑا تو اٹھالے' دو قدم پر میری جھونپڑی ہے' وہاں تک ذرا چھوڑ دے۔''

اس نے عجیب سے خرانٹ بھرے لہجے میں کہا مگر یہ لہجہ عام سے بڑے بوڑھوں والا تھا جو اپنے سے کم عمر لوگوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے اس لیے میں نے برا نہ منایا مگر مجھے ذرا تامل سا ہورہا تھا' میں نے ایک نظر اس کا جائزہ لیا۔

وہ سانولی رنگت مگر خاصی قبول صورت عورت تھی۔ عمر یہی کوئی پینتالیس چالیس کے لگ بھگ تھی۔

''اڑی سوچتی کیا ہے چھوکری! فکر نہ کر' میں تجھے مکھن اور جوار کی روٹی سے ناشتا بھی کرواؤں گی اور بکرے کے دودھ کی گرما گرم چائے بھی پلاؤں گی۔''

اس نے مجھے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر کراری آواز میں کہا تو اس کے دیہاتی لب و لہجے پر میں بے ساختہ مسکرا اٹھی اور پھر میں نے اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔ اس بے چاری کو ٹالنے کا میرا جی نہ چاہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر لوسن کے چارے کا بڑا سا گٹھر اٹھانے میں اس کی مدد کرتے ہوئے اس کے سر پر رکھا اور پھر پانی کا گھڑا اٹھاکر چل پڑی۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے حصے کا بوجھ اٹھائے آگے پیچھے چلنے لگے۔ میں اس کے عقب میں چلی جارہی تھی۔ پانی سے بھرا ہوا گھڑا خاصا بڑا اور بھاری بھی تھا۔ بہر طور میں اس کے عقب میں اپنے سر پر گھڑا اٹھائے خاموشی سے چلی جارہی تھی۔ جلد ہی مجھے اس خرانٹ عورت کی غلط بیانی پر غصہ آنے لگا۔ کیونکہ اس کے گھر کا فاصلہ خاصا طویل ہوتا جارہا تھا حالانکہ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ اس کی جھونپڑی زیادہ دور نہیں تھی۔ مگر یہاں تو یہ فاصلہ شیطان کی آنت کی طرح دراز ہوتا جارہا تھا۔ وہ خاصی توانا عورت تھی اور بڑا سا لوسن کے چارے کا گٹھر اٹھائے بڑے آرام سے چلی جارہی تھی۔ جبکہ اس کے عقب میں چلتے ہوئے میرا تھکن سے برا حال ہونے لگا تھا اور میرا سارا وجود سردیوں کے باوجود پسینے پسینے ہورہا تھا۔ تاہم مجھے اس بات پر حیرت بھی ہورہی تھی کہ اس خرانٹ عورت کی جھونپڑی گوٹھ کے گھروں سے الگ تھلگ مقام پر کیوں تھی؟ بہر طور اب تو یہ عورت کسی ویران جزیرے کی بلا کی طرح میرے گلے پڑ چکی تھی اس لیے اسے بھگتنا تو تھا ہی مجھے' خودرو جھاڑی دار میدان کے آخری سرے پر مجھے بھوسے اور گارے مٹی سے لپی ہوئی کچی دیواروں والی ایک جھونپڑی نظر آئی۔ دروازے پر بوسیدہ سارلی کا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ وہ بے دھڑک گٹھر اٹھائے اندر داخل ہوگئی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اس کے عقب میں اندر داخل ہوگئی۔ مختصر سے صحن کے ایک کونے میں وہ عورت لوسن کا گٹھر رکھ چکی تھی۔ پھر اس نے میرے سر سے گھڑا اتارنے میں مدد کی۔

میں پسینے پسینے ہوکر ہانپ رہی تھی۔ سامنے صرف ایک تنگ و تاریک سی کوٹھری نظر آرہی تھی۔ بوسیدہ صحن کے ایک کونے پر ایک بکری بندھی ہوئی تھی۔ اس کا ایک میمنہ بھی تھا۔ مجھے لگا یہ عورت بے چاری اکیلی رہتی تھی۔ اس کا دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔

''اچھا ماسی! میں اب چلتی ہوں'' ذرا سانس لینے کے بعد میں نے کہا تو وہ عورت بولی۔

''اڑی چھوکری' جلدی کس بات کی ہے؟ تو تھک گئی ہوگی۔ بیٹھ ذرا' میں تجھے جوار اور مکھن کی روٹی دیتی ہوں۔ پھر بکری کے دودھ کی چائے پی کر چلی جانا'' اس نے اپنے مخصوص پاٹ دار لہجے میں کہا پھر وسط میں بچھی ایک جھلنگا سی چارپائی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرا دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس عورت کی بات ماننے پر مجبور ہوگیا۔ وہ رسوئی میں چلی گئی۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں نے جست کے ایک ٹیڑھے میڑھے کٹورے میں گھڑے کے اندر ہاتھ ڈال کر گلاس بھرا اور پانی پی کر دوبارہ چارپائی پر آکر بیٹھ گئی۔ میری نگاہیں اب بار بار چھپر نما پھونس کے سائبان تلے اس تنگ و تاریک کوٹھری کی خالی چوکھٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی موجود تھا۔ اسی لمحے مجھے مختصر سی تاریک چوکھٹ سے دھوئیں کے مرغولے رقص کرتے دکھائی دیے اور اسی وقت اندر کوئی کھانسنے لگا۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ کوئی اندر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔

ایک مرد کی اندر موجودگی کا احساس ہوتے ہی میں بے چین سی ہوگئی۔ ٹھیک اسی وقت وہ عورت ہاتھ میں ایک بڑا سا چھابا اٹھائے رسوئی سے نمودار ہوئی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چائے کا میلا کچیلا پیالہ بھی تھا جس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اندر کوٹھری سے کھانسنے کی آواز اب نہیں آرہی تھی۔

اس عورت نے شاید میرے چہرے کی بے چینی تاڑ لی تھی

لہٰذا میرے آگے روٹی کا چھابا اور چائے کا پیالہ رکھتے ہوئے اپنے سانولے چہرے پر اسرار بھری سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولی۔

''کیا پریشانی ہوگئی؟''

''مم...... ماسی...... اندر کون ہے؟ کیا تیرا مرد ہے؟'' میں نے پوچھا تو اس کے سانولے اور بھرے پرے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر بھیدوں بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''ہاں...... ایسا ہی سمجھ لے......'' میں اس کے عجیب سے لہجے پر الجھن میں مبتلا ہوگئی ''چل مانی ٹکر تو کھا۔ میں آتی ہوں ابھی۔'' اس نے کہا اور پھر دوبارہ رسوئی میں چلی گئی اور وہاں سے روٹی کا ایک چھابڑا اٹھایا اور اندر کوٹھری میں چلی گئی۔

میں نے اپنے چھابے کی طرف دیکھا۔ جوار کی مکھن سے چپڑی گرما گرم روٹی سے بھاپ سی اٹھ رہی تھی۔ میں نے چارو ناچار دو تین لقمے حلق سے اتارے اور چائے کا پیالہ اٹھا کر جلدی جلدی چسکیاں لینے لگی۔ میری نگاہیں جانے کیوں اندر کوٹھری میں مرکوز کچھ دیکھنے کی ناکام کوشش کررہی تھیں۔ اتنے میں وہ عورت باہر نکلی اور وہیں کھڑے کھڑے مجھے مخاطب کرکے بولی ''ڑی چھوکری! میرا مرد باہر آرہا ہے' منہ ہاتھ دھوئے گا۔ ویسے تو وہ گریب اندھا ہے۔ پر تو اگر چاہے تو پردہ کرلے ذرا...... تیری مرضی......'' اس کی بات سن کر جانے کیوں میرے دل کے عمیق گوشے میں جھماکا ہوا۔ ''اس کا شوہر اندھا تھا'' میں نے الجھے ہوئے انداز میں سوچا اور پھر میرے جی میں جانے کیا سمائی کہ میں پردہ کیے بغیر یوں ہی کوٹھری کی چوکھٹ پر اپنی دم بہ خود نگاہیں مرکوز رکھیں۔ وہ عورت اندر جاچکی تھی۔ پھر وہ ایک نوجوان اور نابینا شخص کو سہارا دے کر باہر نکلی تو یک لخت جیسے میں سن ہوکر رہ گئی۔ اس نابینا نوجوان کو دیکھ کر میرے دل و دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میرے وجود کی جیسے ساری حسیات نگاہوں میں سمٹ آئیں اور گویا میں ایک مبہور سے منظر میں بت بنی کھوسی گئی۔ ایک لمحے کو تو میرا دل ہی دھڑکنا بھول گیا اور فرط جوش و جذبات تلے مجھ پر ہلکی سی کپکپی طاری ہوگئی۔ مجھے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں پر جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میری ستم رسیدہ تقدیر کیا اس طرح بھی مجھ پر کبھی مہربان ہوسکتی ہے اور...... اور کیا انہونی اس طرح بھی اچانک ظہور پذیر ہوسکتی ہے؟ کیا...... کیا مبہور اور ترسی ہوئی نگاہوں کی پیاس یوں بھی سیراب ہونے لگتی ہے۔

''ھے...... میرے مولا! میرے رب سائیں! یہ...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔''

میرے دل میں کراہ سی ابھری ''میرے مولا! مجھے ہمت دے...... مم...... مجھے ایسی طاقت دے کہ میں یہ منظر دیکھنے کی تاب رکھ سکوں۔ کہیں...... کہیں میرا دل اپنی گم گشتہ اور الوہی محبت کو اس طرح اچانک اور غیر یقینی حالات میں دیکھ کر خوشی سے پھٹ نہ جائے؟ بے اختیار میری آنکھوں میں کرب اور خوشی کے ملے جلے آنسو امڈ پڑے۔ میرے اندر جذبات انگیز ہلچل جاری تھی اور حواس بے قابو ہوئے جارہے تھے۔

وہ نابینا نوجوان' محمد پریل تھا۔ میرا پریل' میرا محبوب' میرے سر کا سائیں پریل وہ عورت جو بلاشبہ مائی مختاراں ہی تھی۔ میرے خار خار وجود کے اندر اٹھنے والے طوفانوں اور آندھیوں سے بے خبر وہ پریل کو سہارا دیتی ہوئی صحن کے ایک کونے میں لے گئی۔ جدھر پھونس کی ''آڑ'' سی بنی ہوئی تھی۔ اور وہیں منہ ہاتھ دھونے کا سامان موجود تھا۔ میرے جی میں تو آئی کہ میں یک دم اٹھوں اور لپک کر اپنی گم گشتہ محبت اپنے محبوب شوہر' محمد پریل سے جاکر لپٹ جاؤں مگر پھر فوراً ہی دماغ نے مجھے ایسی جذبات انگیز جلد بازی سے روکا تو میرے حواس معمول پر آنے لگے۔ میں نے سب سے پہلے جلدی جلدی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور دل میں اس بات کا شکر ادا کیا کہ کم بخت مائی مختاراں کو میری دیدنی حد تک غیر ہوتی حالت کا اندازہ ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کیوں کہ میں جانتی تھی کہ اگر اس گھاگ عورت کو ذرا سا بھی مجھ پر شک ہوجاتا کہ اس نے مجھے یہاں لاکر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے تو مجھے پھر ایک لمحہ بھی یہاں برداشت نہیں کرے گی۔ یوں تو مجھے اس عورت پر قابو پانا چنداں مشکل نہ تھا کیونکہ اس کی حقیقت کھلتے ہی میرے اندر اس کے لیے رقابت اور غیظ کا جولا وا ابل رہا تھا اس نے میرے وجود میں اس قدر قوت بھردی تھی کہ میں اس عورت کو پریل کو چھیننے کی ایسی سزا دیتی کہ ساری عمر پھر کسی پرائے مرد کو اپنی ملکیت بنانے کا خیال بھی دل میں نہ لاتی۔ لیکن میرے اندر اپنے اور پریل کے تعلق خاطر سے متعلق جو خدشات' میرے بے غیرت اور خود غرض بھائی سائیں داد نے بھردیے تھے' میں ابھی اس کی تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ کیا واقعی پریل نے مجھے طلاق دے دی تھی یا پھر یہ ساری سازش میرے بھائی سائیں داد کی تھی۔ اگرچہ مجھے اس بات کا پہلے ہی سے یقین تھا کہ حالات چاہے جیسے بھی ہوں' پریل کبھی بھی مجھے طلاق نہیں دے سکتا مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ میرے اور پریل کے بیچ بعض ایسے سرد و بے مہر حالات بھی پیدا ہوتے رہے تھے کہ ہماری ان مٹ محبت کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والے طویل فاصلے حائل ہوگئے تھے۔

میں جانتی تھی کہ مائی مختاراں اگرچہ میرے نام سے تو ضرور واقف تھی مگر اس نے میری صورت اب تک نہیں دیکھی تھی بلکہ

حقیقت یہ تھی کہ میرا سامنا بھی مائی مختاراں سے آج اچانک ہی ہوا تھا۔ البتہ بے چارہ پریل تو ویسے ہی مجھے دیکھنے سے قاصر تھا۔ لیکن اگر وہ میری آواز سن لیتا تو مجھے فوراً پہچان لینے میں دیر نہیں لگاتا۔

میں بہ ظاہر روٹی کھانے اور چائے پینے میں مگن تھی مگر میرے اندر زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی اور دل بے طرح انداز میں دھڑک رہا تھا۔ ایک پکڑ دھکڑ سی تھی جو میرے دماغ میں جاری تھی' میں اب اطمینان اور صبر و تحمل کے ساتھ ایک پرسوچ تانے بانے میں غرق سی تھی۔ تاہم یہ بات طے تھی کہ میں اب کسی بھی صورت پریل کو دوبارہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اسی دوران مائی مختاراں پریل کو سہارا دیتے ہوئے واپس اندر کوٹھری کی طرف لے جانے لگی' میری نگاہیں محمد پریل پر جمی ہوئی تھیں۔ اب میں ذرا گہری نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ بے چارہ پہلے سے زیادہ کمزور ہوچکا تھا۔ چہرے پر جیسے ازلی سوگواری سی ٹھنڈ کررہ گئی تھی۔ وہ خود سے بالکل بے گانہ نظر آرہا تھا تاہم اس کی صفائی ستھرائی میں یقیناً مائی مختاراں کا دخل تھا۔ اس نے اسے صاف ستھرا بنا رکھا تھا ورنہ پریل کے چہرے پر کھنڈی ہوئی مایوسی اور کرب ناک تاثرات سے تو یہی نظر آتا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ میں چائے وغیرہ سے فارغ ہوکر مائی مختاراں کو پٹانے کے بارے میں غور کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ کوٹھری سے باہر آکر رسوئی میں گئی اور چائے کا پیالہ ہاتھ میں لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا وہ غور سے میرے چہرے کو گھورے جارہی تھی۔ پھر وہ عجیب معنی خیز انداز میں مجھ سے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے بولی۔

''کیوں ڑی! کیسا لگا میرا مرد...... سوہنا ہے ناں؟'' اس کی بات پر میرے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی اور دل میں اس پر لعنت ملامت کرتے ہوئے بہ ظاہر میں بھی اسی بے تکلفی سے زبردستی مسکرا کر بولی۔

''ہاں...... ہے تو خوب صورت جوان...... پر ایک بات تو بتا کیا تو نے واقعی اس سے شادی کررکھی ہے؟''

یہ پوچھتے ہوئے میں نے بہ غور اس کے چہرے پر اپنی بھانپتی ہوئی نگاہیں مرکوز کردیں۔ میں نے دیکھا میرے استفسار پر ایک لمحے کو تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ مگر پھر وہ چائے کی چسکی لے کر بولی۔

''تجھ سے جھوٹ بولنے کو جی نہیں کرتا۔ مگر شاید تو اسے کچھ سمجھا سکے...... سن بتاتی ہوں۔''

اس نے یہ کہہ کر چائے کی ایک اور گرما گرم چسکی بھری اور میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔

''ابھی میں نے اس سے شادی نہیں کی۔ میں تو تیار ہوں پر یہ ابھی نہیں مانتا۔ کہتا ہے پہلے میں اپنی پہلی بیوی کو نجاں سے ایک آخری بار مل لوں...... پھر وہ مجھ سے شادی کرلے گا'' اس کی بات سن کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی اور میں بہ مشکل اپنے ابال پر قابو پاتے ہوئے چالاکی سے بولی۔

''تو کیا یہ شادی شدہ ہے...... پر اس کی بیوی نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟''

''وہ کم بخت اس سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ اسے اس بے چارے سے نفرت ہوگئی ہے'' مائی مختاراں نے منہ بسور کر کہا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا اور دکھ کی ایک کرب انگیز لہر میرے درماندہ وجود میں اندر تک سرایت کرگئی۔

''تو پھر...... یہ اسے طلاق کیوں نہیں دے دیتا؟'' میں نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں پوچھا تو وہ بولی۔

''یہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہے۔ پر اس بدبخت نے اس کی محبت کی قدر نہ کی۔ اب یہ کہتا ہے کہ میں کونجاں سے ایک بار مل کر اس سے پوچھ لوں کہ کیا اب بھی وہ اس سے طلاق لینا چاہتی ہے؟''

''تو...... تو پھر......؟'' میں نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بہ غور مجھے گھورتی

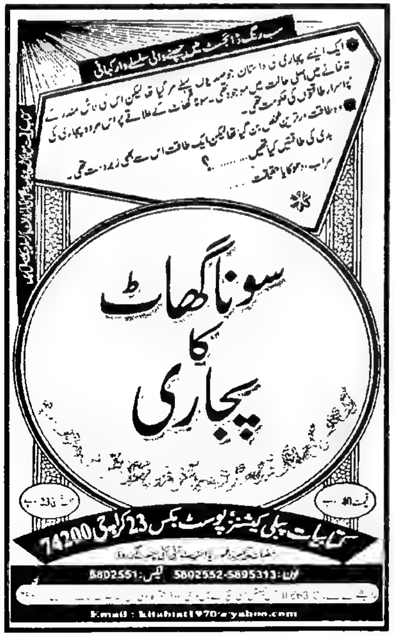

ہوئی پر تشکیک لہجے میں بولی۔

”کیوں ڑی! تجھے کیا ہے؟ تو‘ تو اسے پوچھ رہی ہے جیسے تو ہی کونجاں ہو‘ اس کی بیوی......؟“

اس کی بات پر میں دہل گئی مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں اپنا سر جھٹکتی ہوئی ہنسی میں اس کی بات اڑا کر دانستہ قدرے شرماتے ہوئے بولی۔

”تو کیسی بات کرتی ہے ماسی......! میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔“

میرے لجاتے اور شرمانے پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی ”تو پھر کیا...... میں نے تو اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر یہ اس سے ملے بغیر اسے طلاق دینے پر رضامند نہیں۔“ اس کی بات پر میرے سینے پر سے جیسے ایک بوجھ اتر گیا اور میں سوچنے لگی کہ سائیں داد نے واقعی مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ پریل نے مجھ سے مایوس ہو کر میری غیر موجودگی میں مجھے طلاق دے ڈالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ سائیں داد نے مجھے جو طلاق نامہ دکھایا تھا وہ جعلی اور جھوٹا تھا۔ تب میں نے کسی خیال کے تحت اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر کیا‘ اس نے اپنی بیوی کونجاں کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تو خود بھی تو اسے اس کی بیوی سے ملا سکتی تھی تاکہ کونجاں سے مل کر جلد از جلد اسے طلاق دے ڈالے تاکہ تیرا کام بھی بعد میں آسان ہو سکے؟“

میرے اس سوال پر مائی مختاراں نے عجیب سے گومگو لہجے میں جواباً کہا ”میں تو چاہتی ہوں...... پر اب پتا نہیں‘ یہ کیوں اپنی بیوی کا سامنا کرنے سے کترا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ اسے طلاق ہی نہیں دینا چاہتا“ میں نے اس کی بات سن کر اپنے دل میں نفرت اور رقابت کی آگ کو بہ مشکل دباتے ہوئے دل ہی دل میں مائی مختاراں پر ایک بار پھر لعنت بھیجی اور اپنے لہجے میں معصومانہ حیرت سموتے ہوئے پوچھا۔

”اگر یہ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا تو پھر تو کیوں اس کے پیچھے پڑی ہے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکی سی تندی آگئی جسے وہ گھاگ عورت بھانپ کر ایک بار پھر تیز سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے گھور کر بولی۔

”تجھے اس سے کیا چھوکری! ہو گئی ناں عاشق‘ میرے مرد پر۔ چل اٹھ بھاگ یہاں سے۔ چل......“ اس کے نفرت انگیز درشت لہجے پر جیسے میری رگوں میں خون کھولنے لگا مگر مائی مختاراں بھی ہتھے سے اکھڑ گئی تھی۔ چائے کا پیالہ نیچے رکھتے ہوئے اٹھی اور مجھے بازو سے پکڑ کر چارپائی سے کھڑا کر دیا۔ وہ مجھے گھسیٹ کر دروازے سے باہر نکالنے لگی تو جب تک میرے اندر کا خوابیدہ آتش فشاں پھٹنے کے قریب ہو گیا لہٰذا میں نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور پھر لاوا اگلتی نظروں سے اسے گھورتی ہوئی نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

”ذلیل...... کتیا......! تو نے آئینے میں خود کو دیکھا ہے‘ تو ’تو اس بے چارے لڑکے کی ماں کے برابر لگتی ہے‘“ میرے شعلہ فشاں لہجے اور زہریلے الفاظ پر مائی مختاراں ایک لمحے کو اپنی جگہ بت بنی رہ گئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے میرے چہرے کو تکنے لگی۔

”تت...... تو...... کون ہے......؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بوکھلا کر پوچھا۔

”میں...... اس کی بیوی کونجاں ہوں اور یہ میرا محبوب شوہر محمد پریل ہے“ میں نے فرط جذبات تلے زور سے چلا کر کہا تو مائی مختاراں کے سر پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ پھر اس لمحے میں نے دیکھا‘ اندر کوٹھری سے محمد پریل نمودار ہوا‘ اس کے دونوں ہاتھ ٹٹولنے کے انداز میں آگے کو اٹھے ہوئے تھے اور اس کے بے نور چہرے پر حیرت اور خوشی کے تاثرات طاری تھے۔ اس نے شاید میری آواز سن لی تھی۔

”کک...... کونجاں! میری کونجاں! یہ...... یہ تو ہے‘ کہاں ہے تو......؟“

اچانک پریل نے تنگ و تاریک کوٹھری کی چوکھٹ پار کرتے ہوئے بے پایاں خوشی سے لرزتی آواز میں کہا۔ اسی وقت اسے ٹھوکر لگی اور وہ زمین پر گر گیا۔ میرا دل اس کی بے بسی اور معذوری پر کٹ کر رہ گیا۔ میں بے اختیار ”پریل“ پکارتی ہوئی اسے سنبھالنے کو لپکی تو اچانک مائی مختاراں بپھری ہوئی ناگن کی طرح میرے سامنے آ گئی۔ میں اس کمینی اور فاحشہ عورت پر پہلے ہی سے ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ اسے اپنی راہ میں حائل دیکھ کر میری رگوں میں جنونانہ طاقت سی دوڑ گئی اور پھر میں نے اسے پوری قوت سے پرے دھکیلا۔ اسے اپنی راہ میں حائل دیکھ کر میری رگوں میں جنونانہ طاقت سی دوڑ گئی اور پھر میں نے اسے پوری قوت سے پرے دھکیلا۔ چیختی ہوئی چارپائی پر جا پڑی اور میں نے آگے بڑھ کر اپنے پریل کو تھام لیا۔ میرا لمس محسوس کرتے ہی جیسے وہ جی اٹھا اور وہ اس نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور یہی نہیں‘ وہ میرے نرم و نازک ہاتھ کو پکڑ کر وارفتانہ انداز میں چومنے لگا۔ اس کے وجود میں بلا کی جذبات انگیز لرزش تھی۔

”کک...... کونجاں! میری کونجاں! تت...... تت تو نے مجھے‘ مم...... معاف کر دیا۔ مم...... مجھے معاف کر دیا تو نے کونجاں!“

اس کی مرتعش آواز میں صدیوں کی پیاس شامل تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ادا کیے ہوئے ایک ایک لفظ میں شدید تڑپ تھی۔ میں نے بھی وفور جذبات سے اس کے دونوں ہاتھوں کو چومتے ہوئے لرزتی آواز میں شدت بے قراری سے کہا۔

”ہاں...... ہاں‘ میرے پریل! میرے محبوب...... میں نے تجھے معاف کر دیا۔ پر تو...... مجھ سے دور کیوں ہو گیا تھا رے۔“

میں نے جیسے روتے ہوئے شکوہ کیا۔ مگر ابھی پریل کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ پھر بے چینی سے بولا۔ ”تت...... تو...... اب مم...... مجھ سے طط...... طلاق تو نہیں مانگے گی ناں؟“

”نہیں‘ نہیں...... نہیں‘ میرے محبوب! میرے سر کے سائیں! نہیں“ میں جیسے جی جان سے چیخ اٹھی اور پھر پریل نے مجھے اپنے دونوں بازوؤں کے حلقے میں لے کر یوں بھینچ لیا کہ میں بھی اس سے لپٹ گئی۔ ہم دونوں باہم ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے تھے۔ پھر ہم دونوں ایک دوسرے کو پیاسی نظروں سے عالم محویت سے تکنے لگے۔ ہم دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گئے۔

ملن کی ساعتوں کے بعد پریل نے مرتعش لہجے میں کہا۔

”کونجاں! تو کہاں تھی .... کک ...... کک...... کیا مجھے بھول گئی تھی تو؟“

میں تڑپ کر بولی ”نہیں‘ نہیں...... میرے پریل! میرے سجن! میں بھلا تمہیں کیسے بھلا سکتی ہوں؟ یہ ساری تکرار‘ یہ یورش...... میری جستجو‘ سب تمہارے لیے ہی تو تھی۔“

پھر ہم دونوں گرد و پیش سے بے خبر نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کی پیاس بجھاتے رہے۔ ہماری بے ربط سانسوں میں مخفی شوریدہ سر جذبوں کی ہمک ہمارے دل کو اچھل پتھل کر رہی تھی۔ آن کی آن میں ہمارے خاموش چہروں نے صدیوں کے متلاطم خیز طوفانی اور گم شدہ فاصلوں کو سمیٹ کر یک جان دو قالب بنا کر رکھ دیا تھا۔

”کونجاں! تو نے...... تو نے تو میرے دل کا چراغ روشن کر دیا ہے۔ میری بے نور آنکھوں میں تیری صورت کے دیپ جل اٹھے ہیں۔ کونجاں! مجھے تو اب تیری صورت کے سوا کسی اور منظر کو دیکھنے کی حسرت بھی نہیں رہی“ پریل بولے جا رہا تھا اور میں عجیب سی سرشاری میں غرق تھی۔

بچھڑے ہوئے دو دلوں کی ادھوری کہانی کا تب تقدیر قرطاس دل پر مکمل کر رہا تھا۔ پھر جب ایک بہاؤ کی کیفیت قدرے کم ہوئی تو ہوش و خرد نے بند باندھے‘ عقل و شعور نے فوری فکر فردا سے نمٹنے کے لیے دل ناداں کو مائل بہ سوچ کیا تو جیسے مجھے کسی نے پریل سے پھول کی طرح بے دردی سے نوچا۔ یہ مردار مائی مختاراں تھی۔ جو جانے کس طرح اب تک صبر کیے بیٹھی تھی۔ اس بار اس نے مصمم ارادے کے ساتھ مجھ پر حملہ کیا تھا اور مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پریل سے دور کھینچ دیا تھا مگر میں نے بھی سنبھلتے ہی اپنے دائیں ہاتھ کا ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔

”مختاراں! یہ...... یہ تو کیا کر رہی ہے؟ یہ میری بیوی کونجاں ہے؟“ پریل نے پریشان ہو کر مختاراں کو اس کی چیرہ دستی سے روکا۔ مگر میں نے دیکھا‘ مختاراں کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ میری جوابی کارروائی نے اس کے شاید ہوش ٹھکانے لگا دیے تھے اور اس بار وہ پریل سے بھی درشت لہجے میں بولی۔

”کیوں ڑے! اب تو کیوں بدل گیا۔ تو‘ تو کہتا تھا کہ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا تو پھر اب کیوں نہیں دیتا اسے طلاق؟“

”بکواس بند کر!“ میں اس کی بات پر غصے سے پھٹ پڑی۔ ”تو کون ہوتی ہے‘ ہمارے بیچ بولنے والی...... اپنی اوقات دیکھی ہے تو نے؟“

”کک...... کونجاں! اسے کچھ مت کہہ۔ میں اسے سمجھاتا ہوں“ اچانک پریل نے مجھے روکا اور پھر مائی مختاراں سے مخاطب ہو کر بولا ”مختاراں! دیکھ‘ تو جھوٹ مت بول۔ میں نے کبھی تجھ سے کونجاں کو طلاق دینے کا نہیں کہا تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ کونجاں اب تک مجھ سے نفرت کرتی ہوگی اور...... اور میں اس

[illegible] آنا چاہتا تھا کہ کہیں یہ مجھ سے نفرت کی وجہ سے پھر نہ طلاق کا مطالبہ کر لے۔ کیونکہ میں نے اس کی ضد کے آگے مجبور ہو کر اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب یہ دیکھنے کے قابل ہوجائے گی تو تب یہ مجھ سے طلاق کا مطالبہ کرے گی تو ......تو......"

"بس پریل......بس! اب تو تجھے پتا چل گیا ناں کہ میرا دل تجھ سے صاف ہوگیا ہے۔ پھر یہ بات دوبارہ زبان پر مت لا۔ م...... مجھے تکلیف ہوتی ہے" میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں کونجاں' نہیں ......م...... مجھے تو تجھ سے ملنے سے زیادہ اس بات کی خوشی ہورہی ہے کہ تونے نہ صرف مجھے معاف کردیا ہے بلکہ میرے لیے اب بھی تیرے دل میں ویسی ہی محبت ہے جو شادی سے پہلے تھی۔"

میں بے اختیار آگے بڑھ کر پریل سے جالپٹی اور فرط جذبات سے اٹل لہجے میں بولی "ہاں' ہاں...... میرے پریل! میں نے سب کچھ بھلادیا ہے۔ اب تو بھی اس بات کو مت دہرا۔"

ادھر مختاراں کے سینے پر حسد کے سانپ لوٹ رہے تھے۔ وہ جلتی سلگتی نگاہوں سے پریل کو مخاطب کرکے نفرت بھرے لہجے میں بولی "پریل! لیکن تونے مجھ سے بھی وعدہ کیا تھا کہ...... تو......"

"تو غلط کہہ رہی ہے" پریل نے اس بار سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تجھ سے محض اتنا کہا تھا کہ اگر کونجاں چاہے گی تو...... تب......" پریل نے اچانک اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور پھر ذرا نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے دوبارہ بولا۔

"دیکھ مختاراں! میں تیری بھی عزت کرتا ہوں۔ تیرا یہ مجھ پر احسان ہے کہ تونے مجھ نابینا کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے سے بچاتے ہوئے اپنے پاس پناہ دی اور اس کی پاداش میں تو بھی دربدر کی ٹھوکریں کھانے لگی اور بستی سے تجھے باہر نکال دیا گیا۔"

"تو......تو...... پھر تو اس کا صلہ مجھے یہ دے رہا ہے پریل!" اچانک مختاراں نے اپنی کینچلی بدل کر مکارانہ انداز میں کہا۔ "حالانکہ تونے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا اب کیوں دھوکا دے رہا ہے مجھے۔"

"میں نے تجھ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا مختاراں! یہ جھوٹ مت بول" پریل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کیا تو اس بار میں نے مائی مختاراں کو مخاطب کرکے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"تونے اگر میرے شوہر پر احسان کیا ہے تو اس میں خود تیرا اپنا بھی مفاد شامل تھا۔ تو اس سے شادی کی آس لگائے بیٹھی اور...... اور تونے اس بے چارے کی مجبوری سے کھیلنے کی کوشش کی۔ تو یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ شادی شدہ ہے۔ تیرا احسان تو تب مانا جاتا جب تو اسے مجھ سے ملنے دیتی مگر جب یہ معلوم ہوا کہ میں اب اپنے شوہر پریل کو معاف کرچکی ہوں تو...... تونے سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ماسی حفیظاں کے ہاں سے اسے لے کر وہاں سے بھاگ گئی۔ کیا تو بھول گئی جب پنج شیر کے آدمی تجھے تلاش کرتے ہوئے تیری ماسی کے گھر آئے تھے' وہیں تجھے اس حقیقت کا علم ہوچکا تھا اور تو اسے لے کر خاموشی سے اس رات نکل بھاگی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تونے...... پریل کو یہ حقیقت بھی نہیں بتائی ہوگی جب پنج شیر کے آدمی تیرے پاس آئے تھے اور انہوں نے ہی یہ بات تجھے بتائی تھی کہ میں نے پریل کو معاف کردیا ہے۔"

میری تمام گفتگو سن کر پریل چونک کر مائی مختاراں سے بولا۔ "مختاراں! تونے واقعی مجھ سے اس رات جھوٹ بولا تھا کہ کونجاں مجھے اس لیے تلاش کرتی ہوئی وہاں تک آگئی تھی کہ وہ مجھ سے مل کر مجھ سے ایک بار پھر طلاق کا مطالبہ کرنا چاہتی۔"

یہ کہہ کر پریل نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔

"کونجاں! یہ حقیقت ہے کہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تو مجھے تلاش کرنے ماسی حفیظاں کے گھر تک آگئی ہے تو مختاراں نے مجھے یہ کہہ کر تجھ سے ملاقات کرنے سے روک دیا تھا کہ تو مجھ سے مل کر دوبارہ طلاق کا مطالبہ کرے گی ورنہ...... ورنہ کونجاں میں...... میں تجھ سے ضرور ملاقات کرتا۔"

"ہاں' ہاں میرے پریل! میں...... میں جانتی ہوں' میں سمجھتی تھی تیری مجبوری" میں نے تڑپ کر کہا۔ میں پھر مختاراں سے بولی "مختاراں! اب تو تجھے معلوم ہوگیا ناں کہ میرے اور پریل کے بیچ میاں بیوی سے بھی بڑھ کر رشتہ ہے اور وہ ہے عاشق اور محبوبہ کی "محبت" کا۔ یوں تو تجھے اپنے اس اخلاقی جرم کی سزا ملنی چاہیے مگر میں تجھے معاف کرتی ہوں" یہ کہہ کر میں نے پریل سے محبت پاش لہجے میں کہا "چل پریل! میرے ساتھ...... اب ہم کو دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتی۔"

"ہاں کونجاں! چلو...... میں بھی اب ایک پل تیرے بغیر نہیں رہ سکتا" پریل نے کہا اور ادھر مختاراں کا سانولا چہرہ دکھ اور رقابت کی آگ سے مزید سیاہ اور مکروہ پڑ گیا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ یکدم کوٹھری کی طرف بھاگی۔ میرا دل اس کی عجیب حرکت پر یکبارگی زور سے دھڑکا۔

اسی لمحے ایک دھمکی آمیز سرد آواز میری سماعت میں ابھرائی "ہینڈز اپ! اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بھون کر رکھ دوں گا۔"

میں نے بڑی شرافت سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ سمجھا' میں اس کے ڈراوے میں آگیا ہوں۔ برآمدے کی پیشانی پر ایک بلب روشن تھا تاہم میرے عقب میں ہونے کے باعث گن بردار میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا جس کا مطلب تھا وہ وجدان کی حیثیت سے فوری طور پر مجھے پہچان نہ پاتا اور ازاں بعد' میں اسے ایسی کوئی مہلت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

کے کے کی خطرناک نال میری پشت میں پیوست تھی۔ مجھے خاموشی سے ہینڈز اپ ہوتے دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی اور وہ میرے انتہائی قریب آگیا۔ میں نے ایک لمحے میں اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ وہ جامہ تلاشی کے بعد مجھ سے نمٹنا چاہتا تھا۔

"چپ چاپ کھڑے رہو۔ اپنی جگہ سے حرکت کی تو میں فائر کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا۔" وہ بڑے خطرناک انداز میں غرایا۔

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے وجود پر اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ دونوں ہاتھوں کی بہ یک وقت حرکات ظاہر کرتی تھیں' کلاشن اب اس کی گرفت میں نہیں رہی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا' گن اسٹریپ کے سہارے اس کے شانے پر جھول رہی ہوگی۔ میرے لیے یہ "اللہ دے اور بندہ لے" کے مصداق تھا۔

میرے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند تھے۔ عقب میں موجود اس شخص نے جیسے ہی میری پینٹ کی سائیڈ پاکٹس کو تھپتھپایا' میں نے بجلی کی سی سرعت سے بازو ڈاؤن کیے۔ اگلے ہی لمحے میرے ہاتھ اس کی کلائیوں پر گرفت حاصل کرچکے تھے۔

اس نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں اپنے ہاتھ پیچھے کھینچنا چاہے۔ میں نے اس کی ناف پر ایک ریئر کک مارتے ہوئے ہاتھ آزاد کردیے۔ وہ ہوا میں اچھلا اور پشت کے بل سنگی ستون سے جاٹکرایا۔ اس کے ساتھ جو پیش آیا وہ اس کے سان و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔

اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ کلاشن کوف اس کے کندھے سے پھسل کر دور جا گری۔ قبل اس کے کہ وہ گن تک رسائی حاصل کرتا' میں نے لپک کر کے اپنے قبضے میں کرلی۔

وہ اپنی پشت کو سہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوگیا اور متوحش نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے گھگیایا "وج ...... دان ...... تم......؟"

"لگتا ہے' تم لوگوں کے پرائی ویٹ باپ شعیب غوری نے تمہیں میرا حلیہ ازبر کروادیا ہے۔" میں نے کلاشن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا "اندر کتنے افراد موجود ہیں؟"

اس کے جواب دینے سے پہلے ہی اندر سے کسی نے پکار کر پوچھا "انیس! یہ چیخ کیسی تھی۔ تم خیریت سے تو ہو؟"

بات کے اختتام پر میں نے کسی کے قدموں کی آواز سنی۔ وہ آواز لحہ بہ لحہ جالی والے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا' انیس سے استفسار کرنے والا ہماری طرف آرہا تھا۔

میں نے انیس کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے نگاہی ہدایت دی کہ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا اندر سے برآمد ہونے والا ہمیں براہ راست دیکھ سکے۔ میں انیس کو ٹارگٹ بنا کر نووارد کو شکار کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

انیس کے لیے میرا نام ہی کافی تھا پھر وہ اس وقت ایک خطرناک گن کے رحم و کرم پر تھا "سی ایف کے" کے تمام اہلکاروں کو باور کرادیا گیا تھا' میں نہایت ہی سفاک اور بے رحم ہوں۔ شاید اسی لیے انیس نامی اس دراز قامت شخص نے بے چون و چرا میرے حکم کی تعمیل کردی۔

میں استفسار کرنے والے کے جلوے کا انتظار کرہی رہا تھا کہ بنگلے کے عقبی حصے میں فائرنگ کی آواز گونجی۔ صدا کی مخصوص بچ سے مجھے اندازہ ہوگیا' وہ فائرنگ کسی ماؤزر سے کی گئی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا' ادھر صدف سرگرم عمل ہوچکی تھی۔

فائرنگ کی آواز سن کر ہماری طرف آنے والے شخص نے ارادہ بدلا اور بنگلا کے عقبی حصے کی سمت بھاگ گیا۔ میں نے اطمینان کی سانس خارج کی اور انیس سے پوچھا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اندر کتنے افراد موجود ہیں؟"

وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں موت ناچتی نظر آئی۔ اسے یقین ہوگیا تھا میں اسے ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگادیا۔

ہمارے درمیان پانچ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ وہ کلاشنکوف چھیننے کے لیے مجھ پر لپکا۔ اس نے اچانک ہی جھپٹا مارا تھا۔

میں چاہتا تو ٹریگر دبا کر اس کے وجود کو چھلنی میں بدل دیتا لیکن خواہ مخواہ کا خون خرابا مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ انیس کی یہ حرکت جان لیوا تھی۔ اسے یقین تھا اگر وہ میرے ہاتھوں بچ بھی گیا تو شعیب اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اس تنظیم کا یہی چلن میں نے دیکھا تھا۔ وہ اپنے ناکام ساتھیوں کو پہلی فرصت میں موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ انیس نے اسی خوف کے باعث مجھ سے لڑتے ہوئے مرنے کو ترجیح دی تھی۔

انیس کے جھپٹتے ہی میں بیک فٹ پر اچھلا اور ایک فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔ اپنی دراز قامتی کے باعث وہ بہت جلد ہی میرے قریب پہنچ گیا تھا لہٰذا میرے پاؤں کی ایک بھرپور ٹھوکر اس کی ٹھوڑی پر لگی۔

وہ ''اوں'' کی آواز خارج کرتے ہوئے پیچھے کو الٹا۔ اس کے زمین بوس ہونے سے پہلے ہی میں نے ایک فرنٹ پش کک اس کے پیٹ میں ماری۔ وہ جالی دار دروازے سے جا ٹکرایا۔ شاید دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگائی گئی تھی۔ ٹکراؤ کے باعث وہ دروازہ ''دھڑ'' سے کھل گیا۔ انیس راہ داری میں پشت کے بل جا کر گرا۔

میں کلاشنکوف تانے بھرا مار کر اندر آ گیا۔ وہ راہ داری انسانی وجود سے عاری تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہاں کوئی آئے گا ہی نہیں۔ میں نے جھک کر چاروں خانے چت انیس کا سرسری جائزہ لیا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ اس کے سر کے نزدیک فرش پر خون دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا' انیس کی کھوپڑی کسی شدید ضرب کے باعث چٹخ گئی تھی۔ میں اس کے اوپر سے پھلانگتے ہوئے محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

اس راہ داری کے دونوں جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں ہر کمرے کے دروازے کو دھکیل کر چیک کرنے لگا۔ وہ سب اندر سے بند تھے یا پھر لاک تھے۔ راہ داری کے اختتام پر واقع ایک کمرے کے دروازے کو جب میں نے دھکا دیا تو وہ نہایت ہی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھل گیا۔ میں اس کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں مذکورہ چاپ کی سمت گن کو تانتے ہوئے نئی اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے ایک لمحے سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دوڑنے والے وہ دونوں افراد میری نگاہ میں آ گئے۔ ان میں سے ایک متناسب القد اور دبلا پتلا تھا جب کہ دوسرا سیاہ رو مائل بہ فربہی تھا۔ وہ بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں راہ داری میں داخل ہوئے تھے۔ پھر ان کی گھبراہٹ کا سبب بھی مجھے نظر آ گیا۔ ان کے عقب میں آٹھ فٹ کی دوری پر صدف موجود تھی! وہ انہیں جیسے کھدیڑتے ہوئے وہاں تک لائی تھی۔

میں نے ان بھگوڑوں کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا ''ہالٹ!''

وہ ٹھٹک کر رک گئے پھر جب سنبھل کر میری صورت دیکھی تو ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یک بہ یک انہوں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ وہاں صدف کمر پر ہاتھ ٹکائے ٹپیل کر کھڑی تھی۔ وہ متوحش نظروں سے باری باری مجھے دیکھنے لگے۔

صدف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''وجدان! میں نے جس حد تک بنگلے کو چھانا ہے ان دو کے سوا مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ تمہاری طرف کیا پوزیشن ہے؟''

''ایک بندہ ادھر راہ داری کے سرے پر بے ہوش پڑا ہے۔'' میں نے جالی دار دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ہمیں ان بند کمروں کی تلاشی لینا ہوگی۔ ساحل کو یہیں کہیں رکھا گیا ہوگا!''

صدف نے گھورتے ہوئے ان دو افراد کی طرف طنزیہ نظر سے دیکھا اور بولی ''ہم ایک ایک کو تاجھانکنے کی زحمت کیوں کریں۔ یہ قربانی کے دو بکرے کس مرض کی دوا ہیں؟''

''مجھے دو بکروں پر اعتراض ہے صدف!'' میں نے رو موٹے کی جانب تمسخرانہ انداز میں دیکھا ''یہ تو مجھے کسی بھینسے سے کم دکھائی نہیں دیتا۔''

صدف نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا ''ان کے ذرا انداز تو یہ بتاتا ہے' یہ دونوں سانڈ ہیں اور نہ ہی بکرے بلکہ انہیں بھیڑیں کہوں گی۔'' اس نے دبلے پتلے شخص کی طرف انگلی سے اشارہ کیا ''اس نے ماؤزر سے مجھ پر فائر کیا تھا۔ جمناسٹک کام آ گئی ورنہ میں تو گئی تھی جان سے اور یہ سانڈ!'' وہ سیاہ رو شخص کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے بولی ''میں نے اس کا پسٹل چھین کر ادھر عقبی لان میں پھینک دیا ہے۔ اس وقت یہ دونوں نہتا ہیں۔''

''ان کے تیسرے ساتھی انیس کی گن میرے قبضے میں ہے۔'' میں نے کلاشنکوف کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ''اب ان دونوں کے پاس ہمارے احکام کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

میری بات ادھر ختم ہوئی' ادھر صدف کی لات چل گئی۔ اس نے دبلے شخص کی پشت پر ایک بھرپور سائیڈ کک ماری۔ ٹھوکر کھانے والا اپنے ساتھی سے ٹکرایا اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے زمین بوس ہو گیا۔ میں اچھل کر ان کے قریب آ گیا۔ وہ ایک دوسرے کے اوپر لدے تھے۔

آئندہ ایک منٹ کے اندر میرے پاؤں کی طوفانی ٹھوکروں نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ موٹے کا نام اسلم معلوم ہوا جب کہ دبلا شخص موسیٰ تھا۔ ان کا تیسرا ساتھی انیس میرے ہاتھوں فرش نشینی کا مزہ چکھ رہا تھا۔ ایک طرح سے ہم نے بڑی آسانی سے اس بنگلے پر ''قابو'' پا لیا تھا۔

میں نے اسلم اور موسیٰ کی زبان کھلوانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا اگر میں انہیں جان سے بھی گزار دوں تو بھی وہ مجھے ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے۔ وہ سی ایف کے سے وفاداری نبھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

صدف بھی صورتِ حال کا اندازہ لگا چکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا ''وجدان! تم کسی طرح بند کمروں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں ان دونوں پر ''کام'' کرتی ہوں۔''

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں اسے موسیٰ اور اسلم کے پاس چھوڑ کر راہ داری میں گھوم گیا۔ یہ راہ داری کا آخری حصہ تھا۔ میں سب سے پہلے اس کمرے کی جانب بڑھا جس کا دروازہ کھولنے کے بعد مجھے اندر داخل ہونے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

مجھے حیرت کے ایک شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ مذکورہ دروازہ تقریباً بھڑا ہوا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا میں نے دروازے کو پورا کھول دیا تھا۔ دروازہ از خود بند نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اسے کسی شخص نے بند کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ شخص کمرے کے اندر موجود ہوگا۔ گویا ایک ان دیکھا انجانا دشمن بھی اس بنگلے میں وجود رکھتا تھا۔ یہ خاصی خطرناک صورتِ حال تھی!

میں نے پیچھے پلٹ کر صدف کو ایک نظر دیکھا۔ وہ مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر اپنے ''کام'' میں مصروف تھی۔ میں مطمئن ہو کر اس پُراسرار دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بند دروازوں کو بعد میں چیک کیا جا سکتا تھا۔

میں نے دروازے کے نیم واپٹ کے ساتھ لگ کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ کمرے کے اندر خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ایک فوری فیصلے پر پہنچنے کے بعد دروازے پر پاؤں کی ٹھوکر رسید کی اور کمرے کے اندر پہنچ گیا۔

وہ ایک بیڈ روم تھا۔ میں نے اس کی آرائش سے اندازہ لگایا' وہاں دو افراد کی شب بسری کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں چوکنا نظر سے کمرے کا جائزہ لے لیا۔ وہاں کسی متنفس کے آثار نظر نہ آئے۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی نتیجہ میری توقع کے بالعکس برآمد ہوا تھا۔ مجھے امید تھی وہاں کوئی دشمن ضرور چھپا ہوگا۔

لیکن نہیں...... میری توقع رائگاں نہیں گئی۔ میں الٹے قدموں کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ میری پشت پر ایک زوردار لات پڑی۔ میں منہ کے بل آگے کو گرا میرے سامنے ایک بیڈ بچھا تھا۔ میں سیدھا اس پر آ رہا۔ کلاشنکوف میرے نیچے دب کر رہ گئی۔

''تم اس وقت میرے نشانے پر ہو لہٰذا گن کو چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ!'' مجھے اپنے عقب میں ایک پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔

یہ وہی شخص تھا جس نے ایک لحہ پہلے مجھے دھکا دیا تھا۔ شاید وہ دروازے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا لیکن اب ''شاید اور اگر مگر'' کا کوئی سوال نہیں تھا اس لیے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

''گھوم جاؤ!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں گھوم گیا۔ اسی لمحے مجھے پتا چلا دھکا دینے کے ساتھ ہی اس شخص نے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔ وہ ایک صحت مند اور چاق و چوبند شخص تھا جو مجھے تیز نظر سے گھور رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں اعشاریہ تین دو کا ایک خوب صورت ریوالور چمک رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا وہ لیفٹ ہینڈیڈ تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''واہ بھئی وا'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے! یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے' تم کون ہو؟ لیکن میں نہیں پوچھوں گا۔ جانتے ہو کیوں؟'' اس نے ایک لحہ توقف کرنے کے بعد خود ہی بتا دیا ''اس لیے کہ میں جانتا ہوں تم وجدان ہو!''

''پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا' میں یہاں کس مقصد سے آیا ہوں!''

''بہت اچھی طرح معلوم ہے۔'' وہ گہری نظر سے میرا پا تا سر جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ وہ میری حرکات و سکنات کو جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھ پر نگاہ جماتے ہوئے بولا ''تم جس کی بو سونگھتے ہوئے ادھر آئے ہو' افسوس کہ اسے یہاں سے بھی ہٹا دیا گیا!''

میں تڑپ اٹھا ''کیا بک رہے ہو؟''

''میں تمہاری گرل فرینڈ ساحل کی بات کر رہا ہوں۔''

''ساحل کا نام احترام سے لو جنگلی کی اولاد!'' میری کن پٹیاں سلگنے لگیں۔

وہ پچکارنے والے انداز میں بولا ''زیادہ تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں ہے وجدان۔ گرل فرینڈ تو محض گرل فرینڈ ہوتی ہے۔ کبھی وہ تمہاری دوست تھی' پھر چوہدری نوازش کی بغل میں جا گھسی اور اب بگ باس شعیب......''

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ریوالور بردار نے بے ساختہ چونک کر پیچھے دیکھا۔ میرے لیے یہ مہلت ایک مکمل ٹرم سے کم نہ تھی۔ اس لعین کی غلیظ زبان میری ساحل کی شان میں اتنی گستاخیاں کر چکی تھی کہ میں اس لمحے کو گنوانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کسی شکاری باز کے مانند غوطہ لگایا اور سیدھا ریوالور بردار کے اوپر آ رہا۔ اس نے حتی الوسع سنبھلنے کی کوشش کی مگر میں نے حتی الامکان اس کی سعی ناکامیاب بنا دی۔ جست بھرتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس میں اس خبیث نے ریوالور پکڑ رکھا تھا۔

اس نے اپنی کلائی چھڑانے کے لیے زور مارا لیکن میں نے اپنی گرفت کو قائم رکھتے ہوئے اس کی ناک پر ٹکر جڑ دی۔ یہ ایک بڑی دھانسو قسم کی ٹکر تھی۔ اس کی نکسیر پھوٹ پڑی۔ وہ آزاد ہونے کے لیے اور زیادہ طاقت صرف کرنے لگا۔ یہ اس کی جھنجلاہٹ کا ثبوت بھی تھا۔ ناک پر پڑنے والی ٹکر نے اسے تیورا کر رکھ دیا تھا۔

میں نے اس کی کلائی اس لیے نہیں تھامی تھی کہ اس کے ایما پر چھوڑ دیتا۔ وہ تو کسی گنے کی طرح مشین میں آئی ہوئی تھی اور اپنی ہڈیوں کا کچومر بنوانے کے بعد ہی آزاد ہو سکتی تھی۔ مسلسل ناکامیابی کے بعد اس نے فائرنگ شروع کر دی۔

اس کا ہاتھ میری گرفت میں نہ ہوتا تو شاید وہ اس موقع پر مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں ہر فائر پر اس کی کلائی کو جھٹکا دیتا۔ جب چھے کی چھے گولیاں چل چکیں تو میں نے اس کی کلائی کا ''کڑاکا'' نکالنے کے بعد ہاتھ کو آزاد کر دیا۔ اس آزادی کے انعام کے طور پر میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک ہک پنچ بھی لگا دیا۔ وہ پیچھے کو الٹ کر دروازے سے جا ٹکرایا۔

اسی وقت صدف کی تیز چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! اندر کیا ہو رہا ہے۔ دروازہ کھولو یہ فائرنگ کیسی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو نا؟''

اس کے تشویش سے لبریز سوالات کو میں نے تحمل سے سنا اور بہ آوازِ بلند کہا ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ اندر امن و امان ہے تم اپنا کام جاری رکھو۔''

''دروازہ کھولو۔ میں ایک نظر تمہیں دیکھ کر مطمئن ہونا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے اطمینان کا بندوبست کرتا ہوں۔''

دروازہ کھولنے کے لیے اس شخص کو وہاں سے ہٹانا ضروری تھا' میں نے جس کی کلائی کا ستیاناس مار دیا تھا۔ وہ مضطرب و مجروح کلائی کو دائیں ہاتھ سے تھامے کراہ رہا تھا۔ میں نے اس کی تشریف پر ایک رف ٹھڈا رسید کیا اور مسخرانہ لہجے میں کہا ''کب تک یہیں لیٹے اپنی کلائی اور دستِ حال کا ماتم کرتے رہو گے؟''

وہ خون خوار نظر سے مجھے گھورتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''شاباش!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''میں تو سمجھا تھا' تمہیں اٹھانے کے لیے ''کے ایم سی'' والوں کو بلانا پڑے گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ''کے ایم سی اور ایف کے...... واہ! کیا کمبی نیشن ہے!''

صدف نے ایک مرتبہ مجھے پکارا ''وجدان! دروازہ کھولنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے؟''

''ایک کنگ سائز مردار خور دروازے کے سامنے گرا ہوا ہے۔'' میں نے اندر سے کہا۔

''یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ایک منٹ' میں خود ہی اسے ہٹانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے زمین بوس شخص کو ایک ٹھوکر ماری اور غصیلے لہجے میں کہا ''تم اٹھنے میں اتنی دیر کیوں لگا رہے ہو مردود؟''

اس کے ساتھ ہی میں نیچے جھک کر اسے وہاں سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا اور اسی لمحے اس شخص نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نامعقول نے اپنے سلامت ہاتھ سے میری پنڈلی کو تھاما اور بڑی تیزی سے اس کے گوشت میں دانت گاڑنے کی کوشش کی۔

کارڈرائے کی پینٹ پر اس کے دانت لگے تو مجھے تکلیف کا احساس ہوا۔ موٹے کپڑے کے سبب اس کے خطرناک دانت گوشت میں نہیں گڑ سکے تھے۔ میں نے دوسرے پاؤں سے اس کی کھوپڑی پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ یہ ایک

ٹی پر لیبر کک تھی۔

وہ پنڈلی کو کاٹنا بھول گیا۔ میری ٹھوکر کے نتیجے میں چشم زدن میں اس کا منہ کمرے کے پختہ فرش سے ٹکرایا۔ اس کی بلبلاہٹ میں بڑا درد پایا جاتا تھا۔ میں نے اس کے پیٹ میں ایک ٹھڈا مارا تو وہ تڑپ کر پیچھے الٹ گیا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ صدف لپک کر اندر آئی اور کمرے کے اندرونی منظر کو دیکھ کر سوالیہ نظروں سے مجھے تکنے لگی ''یہ کیا ہے وجدان؟''

''ایک بھوکا وحشی'' میں نے اپنی پنڈلی کو اس کے سامنے کر دیا ''اس نے مجھے یہاں کاٹنے کی کوشش کی تھی۔''

''تم اسی مردار خور کا ذکر کر رہے تھے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ''لیکن اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا' یہ زندوں پر بھی دانت آزماتا ہے۔ بہرحال اب تجربہ ہو گیا ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا ''باہر والوں کا کیا حال ہے؟''

''دونوں بڑے پکے ہیں۔'' وہ ذومعنی لہجے میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے انہوں نے ساحل کے بارے میں زبان نہیں کھولی!''

''ہاں' اس کا یہی مطلب ہے۔'' وہ سفاکی سے بولی۔ ''اس لیے میں نے ان کی خواہش کو مہمیز کر دیا ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے جملے میں خطرناکی پوشیدہ تھی۔

''تم غلط سمجھ رہے وجدان!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ''میں اس حد تک نہیں جا سکتی۔ بس وہ زبان کھولنے کے موڈ میں نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے سوچا اگر میرے سامنے کچھ بولنا نہیں چاہتے تو کسی دوسرے کے سامنے کیوں بولیں...... کم از کم آج کی رات تو انہیں امن و سکون سے گہری نیند سونا چاہیے۔ صبح کا اللہ مالک ہے!''

وہ ایک لمحے کو رکی پھر اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولی ''میں نے انہیں عارضی اور گہری نیند میں پہنچا دیا ہے۔ تم خواہ مخواہ فکر میں نہ پڑو۔''

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے کہا ''ممکن ہے وہ دونوں واقعی ساحل کے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوں لیکن یہ مردار خور بہت کچھ جانتا ہے۔'' میں نے زمین پر پڑے مضروب شخص کی طرف اشارہ کیا ''اس نے تھوڑی دیر پہلے انکشاف کیا ہے' ساحل کو اس بنگلے سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔''

''اور کہاں؟'' صدف نے متعجب نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''یہ بات بھی یہی شخص بتائے گا!''

پھر ہم دونوں اس کی طرف ''متوجہ'' ہو گئے۔ وہ زیادہ دیر تک ہماری ''توجہ'' کی تاب نہ لا سکا۔ اس کی ناک' ٹھوڑی اور ہونٹوں کا میں کباڑا کر چکا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اپنے سوالات کے جوابات حاصل کیے بغیر اس کی جان نہیں چھوڑوں گا تو اس نے زبان کھول دی۔ اس کا نام جنید تھا اور اس بنگلے کے کرتا دھرتا کا نائب بھی تھا۔ انیس اسلم اور موسیٰ اس کے اشاروں پر ناچتے تھے یعنی ان کا تعلق نچلے عملے سے تھا۔

''یہ تینوں تمہارے اشاروں پر ناچتے ہیں تو تم کس کی ڈگڈگی پر اچھل کود مچاتے ہو؟'' میں نے سفاکی سے کہا ''اپنے مداری کا نام نہیں بتاؤ گے؟''

''ہم سب شعیب غوری صاحب کے غلام ہیں۔''

''میں نے تمہارے آقائے اعلیٰ کا نام نہیں پوچھا۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا ''میں جانتا ہوں کہ یہ بنگلا ''ایسٹ'' کی حدود میں آتا ہے۔ یہاں کا قائم مقام سراج الدین ہے جو شعیب سے براہِ راست ہدایات لیتا ہے۔ میں تو اس بنگلے کے مکانی کا نام پوچھ رہا ہوں تم جس کی نائبی میں ہو؟''

''میرے باس کا نام شکیب عثمانی ہے۔''

''تمہارا باس اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ نو بجے رات اس لڑکی کے ساتھ ایسٹ کی طرف گیا ہے جسے تمہاری گرل فرینڈ ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ بے ساختہ میرا ہاتھ گھوم گیا تھا۔ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر چپکا۔ میں نے بڑے خوف ناک انداز میں کہا۔

''جنید! یہ آخری مرتبہ ہے۔ اب اگر تم نے ساحل کو گرل فرینڈ کا ٹائٹل دینا چاہا تو میں تمہاری زبان کو گدی سے جدا کر دوں گا۔''

وہ سہم کر بڑی سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں ساحل کے حوالے سے واقعی بہت جذباتی ہو رہا تھا۔ صدف بھی حیرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس وقت میرے ذہن میں بہ یک وقت کئی طوفان اٹھ رہے تھے۔ اگر مفہوم کے اعتبار سے غور کیا جائے تو جنید نے کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ گرل فرینڈ کے سیدھے معنی ہیں' دوست لڑکی!

مگر اس کے کہنے کا انداز سلگانے والا تھا' رگوں میں کانٹے بچھانے والا' روح کو سولی چڑھانے والا۔ ساری بات

انداز کی ہوتی ہے' الفاظ کے استعمال کی ہوتی ہے "یار" کے معنی ہیں دوست۔ اگر یہی لفظ کسی کی بیوی' بیٹی' بہن یا ماں سے منسوب کر کے ادا کیا جائے تو گالی بن جاتا ہے۔ ساحل کے لیے گرل فرینڈ کے الفاظ مجھے بہت چیپ محسوس ہوئے تھے۔

میں نے دو تین سانسیں کھینچ کر خود کو معتدل کیا پھر جنید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اچانک ساحل کو یہاں سے ایسٹ کیوں منتقل کیا گیا؟"

"یہ ہائی کمان کا فیصلہ تھا۔ میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"ہائی کمان......کیا مطلب؟"

"تم اس تنظیم میں رہ کر کچھ عرصہ کام کر چکے ہو۔" وہ اپنی تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے بولا "تمہیں معلوم ہے بگ باس جو احکام صادر کرتا ہے اس پر کسی سوال کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ ون مین شو سیٹ اپ ہے۔ اسی لیے کامیابی سے چل رہا ہے۔"

"کامیابی سے!" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا "جنید! تم نہیں جانتے تمہاری اس قاتل تنظیم "سی ایف کے" کے اندر کتنی اور کتنے ٹی این ٹی کی بارودی سرنگیں بچھائی جا چکی ہیں۔ جب دھماکوں کا آغاز ہوگا تو اس تنظیم کے پرخچے اڑ جائیں گے۔" شاید میں ایک مرتبہ پھر جذباتی ہونے لگا تھا۔ میں ایک لمحے کا توقف کر کے دوبارہ گویا ہوا۔ میری آواز میں مخصوص بھراہٹ تھی۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "ساؤتھ کو دوبار اجاڑا جا چکا ہے۔ اب ایسٹ کی باری ہے۔ اس کے بعد......"

صدف نے قطع کلامی کرتے ہوئے مجھ سے کہا "وجدان تم ساحل کے بارے میں کچھ پوچھ رہے تھے!"

میں سمجھ گیا' صدف مجھے سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ذہن کو جھٹکا اور یک سر سنبھل گیا۔ پھر میں جنید کی طرف متوجہ ہو گیا میں نے اس سے دریافت کیا۔

"میری ساتھی ساحل کو بڑی رازداری کے ساتھ اس بنگلے پر رکھا گیا تھا۔ پھر اچانک منتقلی کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟"

"اصل بات تو مجھے معلوم نہیں۔" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے آج صبح ہی سے حالات خاصے مخدوش چل رہے ہیں۔ ادھر ڈیفنس فیز ٹو کے ایک بنگلے پر بہت بڑا معرکہ ہوا ہے۔ پھر کھڈا مارکیٹ کے قریب بھی بڑی افراتفری کی خبریں ملی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی احتیاط کے پیش نظر تمہاری گر......میرا مطلب ہے تمہاری ساتھی کو یہاں سے ہٹا دیا گیا ہو!"

"سب سے زیادہ احتیاط پسند تو مجھے تم نظر آرہے ہو" میں نے تیکھی نظر سے اسے گھورا "سیدھی طرح یہ تسلیم نہیں کرتے کہ تمہارے ساؤتھ کا باجا بجا دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی تمہارے بگ باس کے نئے رشتے داروں نے آلۂ کار جے ڈی ملک کا بھٹا بٹھانے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی گئی۔ جب میں خم ٹھونک کر دعویٰ کر رہا ہوں کہ شہزاد غوری اور چوہدری نوازش کو میں نے نقصان پہنچایا ہے تو کیوں گھونگٹ میں رہ کر سرگوشیاں کر رہے ہو؟"

وہ نگاہ چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا "میری ساحل کے بارے... اور کیا جانتے ہو؟"

"کچھ نہیں تم یقین کرو۔ مجھے اس سے زیادہ... نہیں۔"

میں نے پوچھا "تمہارا باس شکیب واپس کب لو... گا؟"

"میں یہ بھی نہیں جانتا!" وہ بے بسی سے بولا۔

"پھر تم کیا جانتے ہو؟" میں چڑ گیا "دیکھو مجھے... مجبور نہ کرو۔"

وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر مضبوط لہجے... بتانے لگا "وجدان! مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا تمہاری ساتھی... یہاں سے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔ شکیب اور سراج الدین... کی کوئی بات ہوئی ہوگی۔ میں تو اس وقت چونکا جب... ایک بند پولیس موبائل اس بنگلے پر آئی اور شکیب ساحل کو... ساتھ اس موبائل میں بٹھا کر لے گیا۔"

"پولیس موبائل میں؟" میں نے بے یقینی سے اس... طرف دیکھا۔

وہ بولا "وہ بند موبائل اور اس میں موجود تینوں... والے نقلی تھے۔ ان میں دو تو کانسٹیبل تھے اور ایک سب... یہ ڈراما احتیاط کے پیش نظر رچایا گیا۔ اس طرح کسی دشمن... اس طرف نظر نہ جاتی!"

"یعنی میری نظر؟" میں نے دانت کچکچائے۔

وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کی دہشت... نہیں تھی۔

میں نے کہا "کیا شکیب نے روانہ ہوتے وقت تم... بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟"

اس نے نفی میں گردن ہلا دی "نہیں اس سلسلے میں... بات نہیں ہوئی۔"

”پھر تم کس بنا پر کہہ رہے ہو' وہ یہاں سے ایسٹ گئے ہیں؟“

”میں نے جن تین نقلی پولیس والوں کا ذکر کیا ہے' ان میں سے ایک کو میں جانتا ہوں۔“ جنید نے بتایا ”وہ سب انسپکٹر کی وردی والا۔ وہ شخص ایسٹ کے اسٹاف میں شامل ہے۔ اسی بنا پر میں کہہ رہا ہوں' ساحل کو اس بنگلے سے ایسٹ میں منتقل کیا گیا ہے۔“

”گویا' یہ تمہارا اندازہ ہے!“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

”مجھے تو پورا یقین ہے۔ تم جو دل چاہے' سمجھو۔“

جنید نامی اس بندے سے مزید کوئی مفید بات معلوم نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں صدف سے تبادلۂ خیال کیا پھر دوبارہ جنید کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”تم یہ مت سمجھنا' میں آنکھیں بند کرکے تمہاری بات کا اعتبار کرلوں گا۔ ساحل کی تلاش میں میں اس بنگلے کا ایک ایک کونا جھانکوں گا۔“ پھر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”اور اس سلسلے میں تم میری مدد کروگے۔“

جنید اس وقت ”نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن“ والی صورتِ حال سے گزر رہا تھا اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اصولی طور پر تو اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں سے بڑی بری طرح اس کے حلیے کا ستیاناس مارا تھا۔ وہ اس تکلیف کے اظہار کے طور پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے کراہنے بھی لگتا لیکن ظاہر ہے وہ اس وقت مجھ سے یہ فرمائش نہیں کرسکتا تھا کہ میں اسے کسی ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹی کروانے لے چلوں۔

ناچار اسے میرے احکام کی تعمیل کرنا پڑی۔ آئندہ دس منٹ کے اندر میں نے بنگلے کے ہر کمرے کو تسلی بخش انداز میں چیک کرلیا۔ وہ بنگلا ساحل کے وجود سے خالی تھا! مجھے یوں محسوس ہوا' سسٹم کا ہر پرزہ میری نقل کرنے اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ ساحل اگر میرے پاس نہیں ٹھہری تھی تو کہیں بھی نہیں ٹک رہی تھی!

جنید جب خالی کارتوس سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ رہا تو میں نے اسے بھی اس بنگلے کے ایک دور افتادہ کمرے میں اٹا غفیل کردیا۔ جو لوگ کسی کام نہ آسکیں' ان کا جاگنا کس کام کا!

اب اس منحوس بنگلے میں رکنا بے کار تھا۔ ہم جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچے تھے' وہ مقصد ہی فوت ہوگیا تھا۔ صدف نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”وجدان! تم نے بتایا تھا' ایسٹ بھی ہل پارک کے نزدیک ہی ہے۔ کیوں نہ اسے بھی دیکھ لیں!“

اس نے ”دیکھ لیں“ کے الفاظ اسی طرح ادا کیے تھے جیسے کسی تصویری نمائش کو دیکھنے کا ذکر کررہی ہو۔ میں جانتا تھا شعیب غوری کے ٹھکانوں میں ایسٹ کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ کسی مضبوط قلعے سے کم نہیں تھا۔ وہاں گھسنا اور وہ بھی سوچے سمجھے بغیر' موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ ان لمحات میں' میں جس ذہنی اذیت سے گزر رہا تھا اس کے زیرِ اثر میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے گریز نہ کرتا۔ ساحل کو یہاں سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اس وقت رات کے پونے گیارہ بجے تھے اور وہ نو بجے ایسٹ کی طرف روانہ ہوئی تھی۔

میں نے صدف کی بات کے جواب میں کہا ”تم نے شاید اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ یہ محض جنید کا اندازہ ہے' ساحل کو ایسٹ لے جایا گیا ہوگا تاہم......“

میں جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”میں جنید کے اندازے کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ساحل کے حصول کے لیے میں تاریک غاروں اور عمیق گپھاؤں میں بھی اتر سکتا ہوں۔“

وہ میرے چہرے کے تاثرات کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے بولی ”ہمیں پہلی فرصت میں اس بنگلے کو خیرباد کہہ دینا چاہیے۔ باقی باتیں گاڑی میں بیٹھ کر بھی ہوسکتی ہیں۔“

میں نے اس کے خیال کی تائید کی۔ واپسی کے لیے ہم نے آمد والا پے چیدہ طریقۂ کار نہیں اپنایا۔ اس کٹھنائی میں پڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم بڑے اعتماد کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوسکتے تھے۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اس بنگلے سے باہر آگئے۔

میری وہائٹ شیرڈ مانٹیسوری اسکول کے ڈرائیو وے پر تیار حالت میں کھڑی تھی۔ گیٹ کو ہم نے بھیڑ دیا تھا تاکہ بروقت واپسی کی راہ میں کسی تردد کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں اسکول کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا۔ صدف میرے ساتھ تھی۔ میں نے اسکول کو خیرباد کہنے سے پہلے بوڑھے چوکیدار کو ایک نظر دیکھنا ضروری سمجھا۔ وہ میرے ”دستِ کرم“ کا فیض یافتہ تھا۔ بعض اوقات اپنے مقصد کی خاطر دوسروں کو تھوڑی بہت تکلیف سے گزارنا پڑتا ہے۔

انسان بڑا خودغرض واقع ہوا ہے۔ یہ اپنی غرض کی وضاحت کے لیے مضبوط جواز بھی تراش لیتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں!

بوڑھا چوکیدار بڑی سکون کی نیند سو رہا تھا۔ میں نے ٹٹول کر اندازہ لگالیا کہ اسے کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی۔ میں نے شیرڈ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے اسکول کی عمارت سے باہر نکال لایا۔

اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔ ہل پارک والی سمت سے ایک پولیس موبائل گلی میں داخل ہوئی تھی اور ظاہر ہے اس کا رخ ہماری جانب تھا۔ صدف نے بھی اس موبائل کو دیکھ لیا۔ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

”کہیں یہ مصیبت وہی موبائل تو نہیں؟“

اس کا اشارہ ساحل کو لے جانے والی مبینہ موبائل کی طرف تھا۔

میں نے کہا ”کچھ بھی ہوسکتا ہے!“

میرا یہ مختصر سا جملہ پتا نہیں کیا معنی رکھتا تھا۔ مجھے خود پتا نہیں تھا' میں نے وہ جملہ کس تناظر میں بولا تھا۔ میں ہر شے کو فراموش کرکے شیرڈ کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ واپسی کا ہر دروازہ بند ہوچکا تھا۔

جب دونوں گاڑیوں کا کراس ہوا تو میں نے موبائل کی پسنجر سیٹ پر ایک گہرے سانولے اور موٹے تازے شخص کو بیٹھے دیکھا۔ وہ عمدہ قسم کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی پولیس والا تھا۔ خدا معلوم' اصلی یا نقلی!

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ جب موٹے کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ یک بہ یک چونک اٹھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات میں تشویش کے ساتھ ہی شناسائی کی جھلک بھی تھی جیسے وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا ہو۔ پولیس موبائل اور موٹے کے ردِعمل نے ایک لمحے میں میرے خیال کو شکیب عثمانی تک پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ کیا یہ وہی شخص تھا جو میری ساحل کو اپنے ساتھ ایسٹ لے گیا تھا؟

یہ نہایت ہی مہلک سوال تھا جس نے میرے چہرے کے تاثرات کو بگاڑ دیا۔ صدف میری کیفیت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ سو وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی جہاں کہ میں۔

اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”وجدان! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔ لگتا ہے' شکیب واپس آگیا۔“

”گویا تم مجھے پشت دکھا کر فرار ہونے کا مشورہ دے رہی ہو؟“ خود مجھے اپنی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ جلدی سے بولی ”یہ بات نہیں وجدان! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”سمجھنے اور سوچنے کا وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے۔“ میں نے سفاکی سے کہا اور شیرڈ کا بریک پیڈل دبا دیا۔ فضا ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ سے گونج اٹھی۔

اسی لمحے ہمارے عقب میں پولیس موبائل نے بھی بڑی سرعت سے بریک لگا دیے۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا موبائل کے ڈرائیور نے اس موٹے کے حکم پر گاڑی روکی ہوگی۔ پھر اس سے قبل کہ میں شیرڈ سے نکل کر شکیب عثمانی کی طرف بڑھتا' موبائل واپسی کے لیے مڑنے لگی۔

صدف نے میرے کان میں سرگوشی کی ”وہ ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔ تم گاڑی کو آگے بڑھا دو۔ پھر انہیں کسی مناسب جگہ پر گھیر لینا۔ وہ تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے۔“

صدف نے بروقت ایک قیمتی مشورہ دیا تھا۔ اس کی بات میری سمجھ میں آگئی۔ جائے وقوعہ سے کہیں دور جا کر انہیں گھیرنا زیادہ مناسب رہتا۔ پولیس موبائل نے گھوم کر ہماری جانب رخ کیا ہی تھا کہ میں نے شیرڈ کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

ہمارے درمیان بہ مشکل دو سو گز کا فاصلہ رہا ہوگا۔ اس گلی کا اختتام قریب آیا تو صدف نے کہا ”وجدان! گاڑی کو بائیں جانب موڑ لو۔ اس طرح ہم سیدھے شارع فیصل پر پہنچ جائیں گے' پھر تم میرے ساتھ گھر چلو۔ میں دیکھتی ہوں تمہارے دشمن کتنے پانی میں ہیں۔ میرے پاپا......“

”نہیں!“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطعی لہجے میں کہا اور گاڑی کو رائٹ ٹرن دے دیا ”تم کیا چاہتی ہو سنگین اور سفاک موت تمہارے گھر کا راستہ بھی دیکھ لے!“

وہ یک بہ یک خاموش ہوگئی۔ میرے تیور نے اس کے لبوں پر قفل ڈال دیا تھا۔ شیرڈ' ہل پارک کو بائیں بغل میں رکھتے ہوئے بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ میں مسلسل عقب نما آئینے میں جھانک رہا تھا پھر مجھے پولیس موبائل کی جھلک دکھائی دے گئی۔ ہمارا درمیانی فاصلہ اب تین سو گز کے قریب پہنچ چکا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے صدف سے کہا ”اگر ہم ہل پارک سے سیدھے شارع فیصل کو پکڑنے نکل کھڑے ہوتے تو فوراً دوسروں کی نظر میں آجاتے اور پھر شارع فیصل ایک معروف گہما گہمی والی سڑک ہے۔ پولیس موبائل کو... وہاں گھیرنے کی کوشش کرنا سنگین غلطی ہوتی جب کہ......“

میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر شیرڈ کی اسپیڈ بڑھائی اور کہا ”جب کہ اس طرف سوسائٹی کا رہائشی علاقہ ہے ہمیں اپنے

کام کے لیے کوئی موزوں مقام میسر آسکتا ہے۔“

اچانک مجھے محسوس ہوا‘ پولیس موبائل کی رفتار میں بھی اضافہ ہوگیا تھا...... وہ بہ تدریج ہمارے قریب آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا‘ شکیب عثمانی بڑی شدومد سے ہمارے تعاقب میں تھا۔ میں نے شیرڈ کی رفتار کم کی اور بڑی سرعت سے اسے بائیں موڑ لیا۔

یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا لہٰذا ڈرائیونگ میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہورہا تھا۔ ویسے ایک بات ماننا پڑے گی میری بہ نسبت اس علاقے کے بارے میں شکیب عثمانی کی جان کاری زیادہ ہوگی۔ وہ یہاں کا مقامی باشندہ تھا۔

تین چار چھوٹی بڑی گلیوں میں گھومنے کے بعد میں نے گاڑی کو بائیں سمت موڑ کر ایک قدرے کشادہ سڑک پر ڈال دیا۔ یہ سڑک اپنے اختتام پر شارع فیصل سے جاملتی۔ صدف نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

”تم تو اسی طرف جارہے ہو جدھر کے لیے انکار کرچکے ہو!“

”نہیں‘ ایسی کوئی بات نہیں۔“

”اس کا مطلب ہے‘ تمہارے ذہن میں راستہ بدلنے کا خیال ہے؟“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہوگئی۔

ایک فوری خیال کے تحت مجھے اپنے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ افراتفری کے عالم میں میرے دھیان میں نہیں رہا تھا‘ ہمارے راستے میں چند گز آگے تھانا پڑنے والا تھا۔ اب سوچنے اور ارادہ بدلنے کا وقت نہیں تھا کیوں کہ ہم مذکورہ تھانے کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔

میں نے نہایت اعتماد کے ساتھ اپنی شیرڈ کی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے کن انکھیوں سے بائیں سمت دیکھا۔ تھانے کی چوحدی کے ساتھ‘ سڑک کے کنارے ایک تیار موبائل کھڑی تھی۔ میں مذکورہ تھانے اور اس کے پہلو میں استادہ خوب صورت ہوٹل کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا چلا گیا۔

سٹی اسکول کے پاس سے میں نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی کو رائٹ ٹرن دیا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اس ڈھلوانی سڑک کا اختتام جھیل پارک پر ہوتا۔ جھیل پارک کے گردوپیش کا علاقہ قدرے سنسان اور تاریک تھا۔ نقلی پولیس موبائل میں سوار شکیب عثمانی سے یہاں دودو ہاتھ ہوسکتے تھے۔

میں انہی خیالوں سے الجھا ہوا تھا کہ فضا سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ پولیس کے مخصوص سائرن کی آواز تھی۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ شکیب عثمانی والی موبائل نے ابھی تک سائرن آن نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کوئی بڑی گڑبڑ ہوچکی تھی۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر میری نگاہ عقبی منظر دکھانے والے آئینے تک جاپہنچی۔ وہاں ابھرنے والا منظر بڑا ہی تشویش ناک اور فکر انگیز تھا۔

میں نے اپنے عقب میں ساڑھے تین سو گز کے فاصلے پر دو پولیس موبائلز کو دیکھا۔ ان دونوں کے درمیان بھی دو سو گز سے زیادہ فاصلہ رہا ہوگا۔ آگے والی موبائل تو وہی تھی جس میں شکیب سوار تھا۔ جب کہ اس کے تعاقب میں آنے والے موبائل کی پیشانی پر مخصوص لائٹ گھومتی نظر آرہی تھی۔ خوف ناک سائرن کی آواز بھی اسی موبائل سے خارج ہورہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا‘ تھانے کے سامنے کھڑی موبائل بھی ہمارے تعاقب میں لگ گئی تھی۔ وہ اپنے ”بھائی بندوں“ کی مدد اور ہماری سرکوبی کے لیے ہوا کے گھوڑے پر سوار آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

میں کھلم کھلا قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا تھا‘ میں نے شکیب عثمانی کو گھیرنے کا خیال دل سے نکال دیا اور شیرڈ کی رفتار کو ممکنہ حد تک بڑھا دیا۔ شکیب عثمانی اصلی پولیس والوں سے کیسے نمٹتا یہ دیکھنے کا موقع تھا اور نہ ہی وقت۔ میں نے جھیل پارک کے کنارے سے مڑنے کے بعد اپنی گاڑی کو علامہ اقبال روڈ پر ڈال دیا۔

”کیا فلیٹ پر جانے کا ارادہ ہے؟“ صدف نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

میں نے قطعیت سے کہا۔ ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!“ میں ان دنوں جس فلیٹ میں مقیم تھا‘ وہ یہاں سے چند گز کی دوری پر تھا۔

صدف نے کہا ”میں یہی سمجھی تھی۔“

”میں ایسی خطرناک حماقت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ میں نے اٹل انداز میں کہا ”ہمارے تعاقب میں ”ایک‘ ایک اور دو گیارہ مصیبتیں چلی آرہی ہیں۔ ان میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں طارق روڈ پر رہتا ہوں۔“

”یہ یک نہ شد‘ دو شد والی صورتِ حال ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں نے کہا“ تم اسے ختم شد ہی سمجھو۔“

میں نے لبرٹی چوک کے سگنل کو کراس کیا اور خالد بن ولید روڈ کی طرف بڑھ گیا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ سگنل کراس کرتے ہی‘ طارق روڈ والا سگنل کھل گیا۔ یعنی ہمارے پیچھے علامہ اقبال روڈ والا سگنل بند ہوگیا۔ یہ بڑا حسین اتفاق تھا۔ میرے جسم وجاں میں ایک اطمینان سا اترتا چلا گیا۔ لبرٹی والا سگنل متعاقبین کی راہ میں سنگین رکاوٹ ثابت ہونے والا تھا۔ اصولی طور پر وہ ہمارے تعاقب کے قابل نہیں رہے تھے۔

میں نے خالد بن ولید روڈ کو کراس کرنے کے بعد عقب نما آئینے میں جھانکا۔ ہمارے پیچھے کافی فاصلے تک علامہ اقبال روڈ خالی نظر آئی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ ہمارا تعاقب کرنے والے کسی ”معذوری“ کا شکار ہوگئے تھے۔

تھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے شیرڈ کو کشمیر روڈ پر ڈال دیا۔ میرا ارادہ تھا اس طرح میں سوسائٹی آفس سے گزر کر شارع قائدین کو جوائن کروں گا پھر شارع فیصل پر نکل جاؤں گا۔ آگے کی آگے جاکر سوچتے مگر مجھے فوری طور پر اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

اچانک ہمارے عقب میں سائرن بجاتی‘ لائٹ گھماتی پولیس موبائل نمودار ہوئی۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے دو ہی مطالب تھے۔ نمبر ایک شکیب عثمانی والی موبائل انہیں جل دے کر بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ نمبر دو نقلی اور اصلی پولیس موبائلز کے درمیان کوئی پُراسرار قسم کا فوری اور ہنگامی ”کمپرومائز“ ہوگیا تھا! صورت کوئی بھی رہی ہو۔ ہمارے لیے سنگینی بڑھ گئی تھی۔

اب شارع فیصل کا رخ کرنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لہٰذا میں نے اگلی چورنگی پر نصف دائرے میں گھومتے ہوئے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا۔ یہ علاقہ قدرے کم رونق والا تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک سے گزرنے کے بعد میں نے شیرڈ کی اسپیڈ بڑھا دی۔ ہمارے عقب میں پولیس کے مخصوص سائرن کی صدا تو ابھر رہی تھی تاہم اس موبائل کی صورت کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں پولیس والوں کو جزوی طور پر جُل دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

کاسموپولیٹن سوسائٹی کی طرف بڑھتے ہوئے ہمیں ایک حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک چورنگی پر سڑک کے وسط میں بڑا بے ہودہ قسم کا گڑھا تھا۔ میں تیز رفتاری کے چکر میں اس ظالم گڑھے کو بروقت نہ دیکھ سکا۔ اس قسم کے گڑھے میں ٹائر پڑ جانا کوئی خاص بات نہیں ہوتی تاہم ان نازک لمحات میں ہر عام بات خاص ہوتی جارہی تھی۔

شیرڈ کا ٹائر جیسے ہی گڑھے میں آیا ایک فلک شگاف دھماکا ہوا۔ یہ ٹائر برسٹ ہونے کی مخصوص آواز تھی۔ شیرڈ بری طرح ڈگمگائی۔ اس کے اسٹیئرنگ پر گرفت قائم رکھ کر سنبھالنا خاصا مشکل ثابت ہوا۔ میں نے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے کنارے گاڑی روک دی۔ وہ تو غنیمت تھا اس وقت سڑک پر ٹریفک کا ازدحام نہیں تھا ورنہ مزار قائد کی جانب سے آنے والا گاڑیوں کا ریلا ہمیں اپنے ساتھ ”بہا“ لے جاتا۔ شیرڈ ہمارے لیے بے کار ہوگئی۔

میں نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے اضطراری لہجے میں صدف سے کہا ”فوراً گاڑی سے باہر آجاؤ۔ یہاں ایک لمحے کو رکنا خطرناک ہوگا۔“

صدف نے پسنجرز سائیڈ کا دروازہ کھولا اور برق رفتاری سے باہر آگئی۔ پھر ہم نے ایک جانب نیم تاریکی میں دوڑ لگادی۔ وہ رہائشی علاقہ تھا اور سڑک کے کناروں پر درختوں کی بہتات تھی۔ اسٹریٹ لائٹس کی کمی نے نیم تاریکی کا ماحول تخلیق کردیا تھا۔ نرسریز سے اٹے ہوئے اس علاقے کو ہم دوڑ کر عبور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

اس منحوس سائرن نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ موبائل ہماری شیرڈ کے قریب رکی تو سائرن کی آواز میں بھی ٹھہراؤ آگیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ قاتل آواز ہمارے تعاقب میں لگ گئی۔ اس کا واضح مطلب تھا‘ پولیس موبائل ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ شاید پولیس والوں نے ہمیں نیم تاریکی میں بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”فاسٹ...... مور فاسٹ!“ میں نے صدف سے کہا اور بائیں جانب مڑ گیا۔

اس وقت ہم جگر مرادآبادی روڈ کو چھوڑ کر کاسموپولیٹن اور سہوانی سوسائٹی کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ اس غیر معروف سڑک پر اچھی خاصی تاریکی تھی جو ہمارے لیے ایک محفوظ آڑ کا کام کررہی تھی۔ ابھی تک پولیس موبائل مذکورہ سڑک پر نہیں مڑی تھی میں نے دانستہ سڑک عبور کرکے رائٹ ہینڈ لے لیا تاکہ فوری طور پر پولیس والوں کی نگاہوں میں نہ آسکیں۔

اس تاریک فٹ پاتھ پر دوڑتے ہوئے ہم نے ڈینٹنگ پینٹنگ کے گیراج کو پیچھے چھوڑا پھر ایک مزدور ہوٹل کے نزدیک سے گزرتے ہوئے ہاسا سنگھ پارک پہنچ گئے۔

”چھپنے کے لیے یہ پارک خاصا مناسب رہے گا۔“ میں نے صدف سے کہا۔

صدف نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔ ہاسا سنگھ

نامی اس پارک کا گیٹ گرومندر کی طرف تھا۔ باقاعدہ گیٹ سے داخل ہونے کا وہ موقع نہیں تھا پھر بھی یہ ضروری نہیں تھا' اس وقت گیٹ کھلا بھی ہو!

پارک کے گرداگرد آہنی ریلنگ نصب تھی جس کی اونچائی بہ مشکل چھ فٹ رہی ہوگی۔ تین فٹ بلند آہنی جنگلا اپنے نیچے بنی تین فٹ اونچی پختہ دیوار میں گڑا ہوا تھا۔ اس کل چھ فٹ کی بلندی کو پھلانگنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اسی لمحے پولیس موبائل اس تاریک سڑک پر نمودار ہوئی۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ ان لوگوں کی ہم پر نظر نہیں پڑی ہوگی۔ ہم نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور دوسرے ہی لمحے آواز پیدا کیے بغیر وہ آہنی جنگلا عبور کرکے ہاسانگھ پارک کے اندر پہنچ گئے۔

وہ پارک کا ایک کارنر تھا اور اس وقت مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ پارک کے دیگر حصوں میں بھی کسی قسم کی ہل چل نظر نہ آئی۔ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوا کہ پارک میں آمدوشد کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ یہ ہمارے لیے ایک خوش آیند بات تھی۔

میں نے اپنے قرب وجوار میں نگاہ دوڑائی تو ایک عمدہ قسم کی جائے پناہ دکھائی دے گئی۔ چندفٹ کے فاصلے پر بچوں کی تفریح اور کھیل کود کے لیے مختلف نوعیت کے جھولے موجود تھے۔ انہی میں ایک پائپ گیم بھی تھا۔ لگ بھگ دوفٹ قطر کا ایک پائپ ایل شیپ میں آہنی اینگل آئرن کے فریم میں جکڑا ہوا تھا۔ مذکورہ پائپ زمین سے کم وبیش تین فٹ کی بلندی پر نصب تھا۔ ایل شیپ پائپ کے ایک سرے پر تین چار اسٹیپ کا زینہ بنا ہوا تھا جہاں سے بچے اوپر چڑھ کر پائپ کے منہ تک پہنچتے۔ پائپ میں داخل ہوکر وہ اندر ہی اندر سفر کرتے ہوئے دوسرے سرے سے باہر آتے۔ کبھی اس سرے پر کوئی پھسل پٹی بھی نصب رہی ہوگی تاکہ بچے اس پر ''سلائیڈنگ'' کرسکیں مگر اب وہ سلائیڈنگ بورڈ مفقود تھا البتہ اسے سہارا دینے والا آہنی فریم اپنی جگہ پر استادہ تھا۔ پولیس والوں کی نگاہوں سے خود کو بچانے کے لیے اس پائپ سے زیادہ موزوں اور کوئی مقام نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور پھر صدف کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ آئندہ پندرہ سیکنڈ کے اندر ہم اس پائپ میں عارضی سکونت اختیار کرچکے تھے۔ پولیس کے مخصوص سائرن کی صدا ہماری سماعتوں سے ٹکرائی اور موبائل پارک کے پہلو سے گزرتے ہوئے گرومندر کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے ایک اطمینان بخش طویل سانس خارج کی۔ انہوں نے ہمیں ''نظرانداز'' کردیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس موبائل کے خبیث سائرن کی آواز معدوم ہوگئی۔

''لگتا ہے وہ چلے گئے!'' صدف نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے بھی سرگوشیانہ انداز میں کہا ''بہ ظاہر تو یہی نظر آرہا ہے۔''

''پھر ہم باہر نکلیں؟'' اس کے لہجے میں استفسار تھا۔

میں اس کی مشکل سمجھ رہا تھا تاہم احتیاط کے پیش نظر کہا ''ابھی نہیں' پانچ منٹ بعد۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

ہم اس آہنی پائپ میں بری طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ پائپ کا سلائیڈنگ والا حصہ ٹوٹ جانے کے سبب اس کی لمبائی اتنی نہیں بچی تھی کہ ہم ایک سیدھ میں لیٹ سکتے۔ اس وقت ہم ایک دوسرے سے جڑے لیٹے تھے۔ ہمارے بدن ایک دوسرے میں پیوست تھے اور سانسوں کی تپش ہمیں اپنے چہروں پر محسوس ہورہی تھی......ایک دوسرے کی سانسوں کی!

حالات کی ستم ظریفی نے خلافِ توقع ہمیں بے حد قریب کردیا تھا۔ اس پائپ میں ''ٹھنسنے'' کا عمل اس قدر پیچیدہ ہے کہ اس عمل سے گزرے بغیر اس کیفیت کو محسوس نہیں کیا جاسکتا۔ صدف اپنی پستہ قامتی کے باعث میرے وجود میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا میں نے کسی بڑے عمر کے بچے کو گود لے لیا ہو!

گود کے تصور سے میرا خیال آپوں آپ ماضی بعید میں بھٹکنے لگا۔ اپنی ماں کی آغوش کی نرمی اور گرمی یادداشت میں محفوظ تھی۔ میں چند لمحات کے لیے اپنی ماں کے منور چہرے کو تخیل کی آنکھ سے دیکھتا رہا پھر سوچ کا دھارا تھائی وانگ کی جانب مڑ گیا۔ اس جواں سال اور چینی کی مورت نے میری خاطر بڑی قربانیاں دی تھیں۔ ابتدائی دنوں میں' میں نے اس کی آغوش کا گداز بھی پرکھا تھا۔

تھائی وانگ بڑی عجیب وغریب عورت تھی۔ وہ سنگاپور میں ایک مساج پارلر چلاتی تھی اور خاصی ثروت والی تھی۔ ہماری ملاقات ایک اتفاق کے تحت ہوئی تھی۔ میں اپنے جنم مکانی دشمن دارا سے جان بچا کر چھپتا پھر رہا تھا کہ تھائی وانگ کی ہم راہی مجھے مل گئی۔ وہ مجھ سے عمر میں خاصی بڑی تھی۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ یہ عمر تو ناسمجھی اور نادانی کی عمر ہوتی ہے مگر تھائی وانگ کو ہر شے کی سمجھ تھی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا تو اس کی ایک حیرت انگیز عادت میرے علم میں آگئی۔

وہ خودسوزی کی عادی ایک اذیت پسند عورت تھی۔ اس

کے اس فعل کے پیچھے کیا نفسیاتی عوارض تھے' اس سے قطع نظر مجھے تھائی وانگ کی حالت پر بہت افسوس ہوتا۔ میں کم عمری میں بھی کڑیل جوان نظر آتا تھا۔ میری صحت اول دن سے قابلِ رشک رہی ہے۔ تھائی وانگ مجھ سے بری طرح پٹتی۔ میں اس کی فرمائش پر اس کی پشت کو چرمی ہنٹر سے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ وہ اس دوران میں مسلسل سسکی رہتی۔ یہ اس کا انجوائے کرنے کا ایک انداز تھا۔ ازاں بعد وہ اپنے گھائل بدن پر مجھی سے مرہم بھی لگواتی۔ گویا میں ہی اس کا قاتل اور میں ہی مسیحا تھا! میں ہی چیرہ دست اور میں ہی چارہ گر تھا!

بعد میں اس نے میری محبت میں اپنی اذیت ناک عادت سے چھٹکارا پالیا مگر میرے دشمنوں نے اسے زندگی سے چھٹکارا دلا دیا۔ وہ اپنا کاروبار' مال اور جائداد پہلے ہی میری دوستی کی پاداش میں تباہ کرچکی تھی۔ ایک جان بچی تھی سو وہ بھی نچھاور کردی!

جب میں اس کی مرہم کاری سے فارغ ہوتا تو وہ مجھے اپنی آغوش میں بھر کر بہت پیار کرتی۔ اس کے پیار میں بڑی حدت اور شدت ہوتی۔ میں ان گداز اور سرفراز لمحات کو زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔ میرے ذہن میں اس وقت کوئی گندی سوچ نہ ہوتی۔ شاید اسی لیے......ہاں اسی لیے تھائی وانگ کی آغوش کی نرماہٹ اور اس کی بانہوں کی گرماہٹ مجھے ممتا کی لذت سے آشنا کردیتی۔

''کس سوچ میں گم ہوگئے وجدان؟''

صدف کی استفساریہ سرگوشی نے مجھے چونکا دیا۔ میں واقعی تھائی وانگ کے تصور میں گم ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے جلدی سے کہا ''یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ہم کب تک اس چوہے دان میں پھنسے لیٹے رہیں گے!''

وہ کسمسائی اور بولی ''میرا خیال ہے ہمیں یہاں پناہ لیے دس منٹ سے زیادہ ہوگئے ہیں۔''

یقیناً اتنا وقت گزر گیا ہوگا۔ ماضی کا ایک دریچہ جھانکتے ہوئے وقت کی رفتار کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ میں نے پوری طرح پائپ میں حاضر ہوتے ہوئے کہا۔

''کافی دیر سے وہ منحوس سائرن بھی سنائی نہیں دیا۔ لگتا ہے وہ ہماری تلاش میں ناکامیاب ہوکر کسی اور طرف نکل گئے ہیں۔ ہم بلاخوف وخطر باہر نکل سکتے ہیں۔''

اس پائپ سے باہر نکلنا ایک کارے دارد تھا۔ انسان کے تعاقب میں اگر شکاری کتے لگے ہوں تو وہ پندرہ بیس فٹ چوڑی رکاوٹ کو بھی عبور کرجاتا ہے۔ جان بچاتے وقت اکثر ناممکن کام ممکن ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی اسی قسم کا سلسلہ ہوا تھا۔ اس وقت افراتفری میں کسی طرح گھس گھسا کر ہم پائپ کے اندر لیٹ تو گئے تھے مگر اب ہمارے بدن ایک دوسرے میں بڑے الجھن بھرے انداز میں پیوست تھے۔ ہم باری باری باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ ہمیں ایک ساتھ ''یک بدن' دوقالب'' کے روپ میں خارج ہونا تھا...... گرم جوش معانقے کے رنگ میں!

میں نے صدف کو ترکیب بتائی تو وہ تھوڑی متامل نظر آئی۔ میں نے کہا ''اور کوئی صورت نہیں ہے۔ ہم پائپ کو کاٹ کر باہر نکلنے کا انتظار نہیں کرسکتے!''

''ٹھہرو میں کوشش کرتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

پھر وہ اپنے بدن کو سمیٹتے ہوئے نیچے کی جانب کھسکنے لگی۔ شاید وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتی لیکن بر وقت مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے اپنے فعل کو ''شرارت'' فرض کیا ہے۔ جیسے الجبرا میں ''ایکس'' سے کام لیا جاتا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کیا حرکت تھی۔ کوئی شرارت تھی یا ایکس وائی زیڈ! وہ جو کچھ بھی تھا بے ساختہ اور بے اختیار تھا۔ میں اسے کوئی نام دینے سے قاصر ہوں شاید وہ اس سچویشن کا اثر تھا!

بہرحال جیسے ہی صدف نے پائپ کے سرے کی سمت سرکنے کی سعی کی میں غیر محسوس طریقے سے اس کی کوشش میں رکاوٹ بننے لگا۔ یہ باڈی کی جنبشوں کا ٹیکنیکل کمبی نیشن تھا۔ صدف کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ شکست خوردگی کے انداز میں بولی۔

''لگتا ہے اس پائپ کو ہمارے اوپر رکھ کر تیار کیا گیا ہے!''

''مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہورہا ہے۔'' میں نے کہا ''میں بھی اس انگریز کی طرح حیران ہورہا ہوں جو پہلی مرتبہ ایشیا کے دورے پر نکلا تھا!''

''کون سا انگریز؟'' صدف نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ''یہ تم کون سا قصہ لے بیٹھے وجدان؟''

میں نے شگفتہ سرگوشی کی ''تمہارا استفسار تیکنیکی اعتبار سے درست نہیں۔ میں یہ قصہ لے کر بیٹھا نہیں بلکہ لیٹا ہوا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے سنجیدگی سے اضافہ کیا ''اور وہ قصہ بھی سن لو۔ پتا نہیں زندگی پھر اتنی مہلت دے یا نہ دے!''

وہ مجھ میں پھنسے پھنسے سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ اس کے انداز میں بڑی محویت تھی جیسے ننھے بچے پورے انہماک

سے دادی اماں کی کہانی سننے بیٹھتے ہیں۔

میں نے اس کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جاتے ہوئے کہا ”کوئی انگریز ایشیا کے دورے پر نکلا۔ پتا نہیں پاکستان یا ہندوستان میں اسے دو حیرتوں سے سامنا ہوا۔ اس نے وہاں کی عورتوں کو ساڑی میں ملبوس دیکھا تو تعجب سے سوال کیا ”ان عورتوں نے یہ لباس کس طرح پہنا ہے؟ کسی ظریف نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ”مسٹر! یہ لباس تیار نہیں ہوتا جو کوئی عورت اسے پہن لے۔ پھر؟ انگریز نے پوچھا۔ بتانے والے نے بتایا‘ اس لباس کو عورت کے بدن پر رکھ کر ہی تیار کیا جاتا ہے لہٰذا پہننے اتارنے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ لائف ٹائم گارنٹی والا ڈریس ہے انگریز بھائی؟“

”بڑا دل چسپ واقعہ ہے۔“ صدف نے ترنگ سے بھرپور انداز میں کہا۔

میں نے کہا ”اسی انگریز بہادر کو ایک حلوائی کی دکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں گرما گرم جلیبیاں تیار رکھی تھیں۔ اس نے عجیب ساخت کی مٹھائی کو دیکھا چکھا اور حیرت سے بولا ”اس گنجلک نلکی میں شیرہ کس طرح بھرا گیا؟ کسی من چلے نے برسوں کی غلامی کا بدلہ لینے کے لیے انگریز کو بے وقوف بنانے کی خاطر بتایا‘ پہلے ایک خالص طریقے سے جلیبی تیار کی جاتی ہے۔ طریقہ اتنا مشکل ہے کہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا بس اتنا سمجھ لو کہ تیار جلیبی کے اندر انجیکشن کی مدد سے شیرہ داخل کیا جاتا ہے!“

”ہاؤ انٹریسٹنگ!“ وہ دھیمی آواز میں چہکی۔ اس کی چہکار میں بڑی زندگی تھی۔

میں نے کہا ”اس پائپ کا قصہ بھی کچھ ”ساڑی اور عورت“ جیسا ہی ہے۔“

وہ خاموش اور گہری نظر سے مجھے تکتی چلی گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا‘ صدف کی نظر میرے پار اتر جائے گی۔ اس کی نگاہ میں عقابی تیزی اور تندی تھی۔

باتیں بہت ہو چکی تھیں لہٰذا ہم ایک دوسرے میں پیوست اس پائپ سے باہر آ گئے۔ پارک کے اندر ہنوز خاموشی اور سکون تھا۔ چند لمحات کے بعد میں اس امن و امان کا راز بھی کھل گیا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا شاید پارک میں داخلے کا وقت ختم ہو گیا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس پارک کا گیٹ ابھی تک کھلا تھا......اور شاید ہمیشہ کھلا رہتا ہوگا۔ میں نے پارک میں موجود آٹھ دس بینچز پر مدہوش انسانوں کو سوتے ہوئے پایا۔ ایسا نظارہ میں ایک دو اور پارکس میں بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ سب کے سب نشے کے زیر اثر تھے۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس مفلوک الحال لوگ کس مپرسی کی حدوں میں داخل تباہ خیال انسان!

وہ چرس بھری سگریٹس پھونک کر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ انسان برداشت کی انتہا سے گزرنے کے بعد خود فراموشی کے بارے میں سوچتا ہے‘ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو جانا چاہتا ہے تاکہ وہ ’وہ‘ نہ رہے جو چھے سمت سے مسائل اور مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ وہ ’وہ‘ بن جائے جسے دنیا جہان کا کوئی غم نہیں۔

ایک انسان کو بچانا گویا پوری انسانیت کو بچانے کے مترادف ہے۔ ہم لاکھوں‘ کروڑوں اور اربوں جیتے جاگتے‘ چلتے پھرتے انسانوں کو اپنے درمیان مٹھی بھر کچلے اور بکھرے ہوئے یہ لوگ نظر کیوں نہیں آتے۔ ہم بہ حیثیت مجموعی اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں کہ ان گنتی کے افراد کا مداوا نہیں کرتے؟ کیا یہ انسانیت کی تذلیل نہیں!

میں ان سلگتے خیالات کو ذہن میں بسائے پارک سے باہر آ گیا۔ وہ گرومندر والی سائیڈ تھی۔ ہم نے خاموشی سے کلفٹن روڈ کراس کی اور کلفٹن روڈ مارکیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر سواری کا انتظار کرنے لگے۔

صدف نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ”ہماری ٹیرا کا کیا ہوگا؟“

”کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ میں نے پُر خیال انداز میں جواب دیا ”زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے جھنجھلائے اور سٹ پٹائے ہوئے پولیس والے اسے اٹھوا کر اپنے تھانے لے جائیں۔ منہاس باقر صاحب خود ان لوگوں سے نمٹ لیں گے۔ اب ہم تو اس طرف جانے سے رہے۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحات کے بعد میں نے پوچھا ”صدف تمہارا کیا ارادہ ہے۔ میں نے سوچا ہے پہلے تمہیں گھر پہنچاؤں پھر اپنے فلیٹ کی طرف نکل جاؤں؟“

”میں فی الحال تمہارے ساتھ جا رہی ہوں‘ تمہارے فلیٹ پر!“

میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی ”تم میرے لباس کا حشر دیکھ رہے ہو۔ کیا میں اس ڈریس اور حلیے میں مما پاپا کے سامنے جاؤں گی؟“ ایک لمحے کے وقفے سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”پھر میری گاڑی بھی تو تمہارے فلیٹ پر پارکنگ میں کھڑی ہے!“

اب میرے خاموش ہونے کی باری تھی۔ پچھلے ایک گھنٹے میں ہم دونوں جس مارا ماری دوڑ بھاگ اور افراتفری سے

گزرے تھے اس نے ہمارے اندر تھکن بھرنے کے ساتھ ہی ہمارے حلیوں کا بھی کباڑا کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس مختصر ”پائپ نشینی“ نے پوری کر دی تھی۔ صدف میرے فلیٹ پر پہنچ کر اپنی حالت درست کر سکتی تھی۔ وہاں مناسب میک اپ کے سامان کے علاوہ زرگل کے چند ملبوسات بھی دستیاب تھے۔ میں نے اس کے فیصلے پر صاد کر دیا۔

اسی لمحے ایک ییلو کیب مل گئی۔

☆☆☆

اس وقت رات کے بارہ پانچ کا عمل تھا!

تھکی ماندی رینگتی کھسکتی وہ ناگن صفت شب اپنا آدھا راستہ طے کرنے کے بعد نئے دن کا آغاز کر چکی تھی۔ انگریز نے بھی کیا دماغ پایا ہے۔ پوری کائنات کا دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور یہ نصف شب سے اپنی تاریخ بدلتے ہیں۔ ہم سال ہا سال سے ان کے غلام رہے ہیں لہٰذا ہمارے غلام ذہن ان کی اندھی تقلید پر آج بھی مجبور نظر آتے ہیں۔

جن قوموں کا اپنا کلچر‘ تہذیب‘ روایت اور اصول و ضوابط نہیں ہوتے انہیں زندگی بھر دوسروں ہی کا دستِ نگر رہنا پڑتا ہے!

صدف کو رخصت ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا اور اب میں بھی شاور لینے کے بعد فریش اپ ہو چکا تھا۔ میں ٹیلی فون سیٹ کے پاس آ بیٹھا اور پہلے منہاس باقر کے گھر کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ پتھر جگر اور آہنی اعصاب کا مالک شخص‘ غروب آفتاب سے چند لمحے پہلے پورے سات افراد کو سپردِ خاک کر چکا تھا۔ فرحت بیگم اور واجد تو اس کے فیملی ممبر تھے‘ اس کی بیوی اور بیٹا تھے مگر وہ اپنے دو گھریلو ملازمین اور تین سکیورٹی گارڈز کا بھی ان داتا تھا۔

وہ ان کے دکھ درد کا ساتھی اور کفیل تھا‘ گویا اس نے آج شام اپنی فیملی کے چھ افراد کو لحد میں اتارا تھا۔ سہیل کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ اس کی لاش کو آبائی گاؤں بھیجنے کا بندوبست کر دیا گیا۔

رابطہ ہونے پر میں نے منہاس سے ایسی بے مقصد باتیں کیں جن سے اس کا غم غلط ہو سکے۔ بعض اوقات بے مقصد اور فضول بات بھی بہت کاری اور بامقصد ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے‘ کسی شے کو کارخانۂ قدرت میں بے کار نہ سمجھو۔ ہاں فی الحال تمہیں اس بہ ظاہر بے کار نظر آنے والی چیز کی افادیت اور کام معلوم نہیں!

میں مختلف حیلوں بہانوں سے اس کی اشک شوئی نما دل جوئی میں لگا رہا۔ اچانک وہ موضوع بدل کر میری جانب رخ

ذاتی ہپناٹزم

مصنف: ڈاکٹر اے ایم ہچنس ایم ڈی

اپنے آپ کو ہپناٹائز کر کے اپنی کمزوریاں اور خرابیاں دور کریں

- ہپناٹیزم کی تاریخ
- ہپناٹک نیند پیدا کرنے کے طریقے
- ظہورات ہپناٹیزم
- مشورات
- ہپناٹیزم کی مختلف تھیوریاں
- ذاتی مشورات
- طبی علاج

قیمت:-/25 روپے | ڈاک خرچ:-/23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5895313-5802552 فیکس. 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

پھیر بیٹھا اور مجھ سے میری تازہ ترین سرگرمیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ پھر سفید شیرڈ کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار بھی کردیا۔

وہ سرسری انداز میں بولا "شیرڈ پر تم مٹی ڈالو۔ وہ تمہاری سلامتی کا پاسنگ بھی نہیں میں اسے پولیس کے قبضے سے اس طرح نکالوں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔"

ہمارے درمیان تھوڑی دیر مزید گفتگو ہوئی۔ میں نے اسے قدرے سنبھلا ہوا محسوس کیا تو اجازت چاہی "ٹھیک ہے منہاس صاحب! آپ آرام کریں' صبح بات ہوگی۔"

"تم اپنے محاذ پر ڈٹے رہنا!" اس نے گمبھیر آواز میں مجھے ہدایت دی۔

"اوکے منہاس صاحب!" میں نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کردیا۔

دوسرا فون میں نے منہاس کے زیرِ تعمیر بنگلے پر شہزاد کو کیا۔ شہزاد وہاں زرگل کے ساتھ فیصل کی نگرانی پر مامور تھا۔ فیصل کو میری نگرانی میں' تدفین سے تھوڑی دیر پہلے بھٹائی کالونی والے ٹھکانے سے مذکورہ بنگلے میں منتقل کیا گیا تھا۔

فون زرگل نے ریسیو کیا۔ میری آواز پہچانتے ہی بولی "تم کیسے ہو وجدان؟"

میں نے اپنے کیسے ہونے کا مختصر احوال بیان کیا تو وہ خاصی افسردہ ہوگئی۔ میں نے پوچھا "تمہیں تو وہاں کوئی پریشانی نہیں ہے نا؟"

"ہے ایک پریشانی۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر پوچھا "کیسی پریشانی زرگل؟"

"یہاں پر تم موجود نہیں ہو۔"

"تو؟" میں الجھ گیا "کیا شہزاد کے ساتھ تم ان ایزی فیل کرتی ہو؟"

"یہ بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولی "بس میں تمہارے ساتھ ایزی فیل کرتی ہوں۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا "زرگل! میں ایک وقت میں' ایک ہی جگہ پر موجود رہ سکتا ہوں۔ خدانخواستہ میں کوئی خدا تو نہیں!"

وہ موضوع سے کنی کاٹتے ہوئے بولی "پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو!"

میں نے اس کے دانستہ احتراز کو سمجھتے ہوئے ٹاپک بدل دیا اور پوچھا "شہزاد کہاں ہے؟"

"وہ چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے بنگلے کا ایک چکر لگانے گیا ہے۔" زرگل نے بتایا "وہ بڑا چوکنا اور محتاط آدمی ہے۔"

شہزاد کی اس صلاحیت کا انکشاف میرے لیے کوئی نئی اچنبھک بات نہیں تھی۔ میں نے زرگل سے استفسار کیا۔

"تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟"

"ابھی تو اس شہر کے نوّے فی صد لوگ جاگ رہے ہیں۔"

"مگر تم دوسرے شہر سے آئی ہو۔ لاہور میں لوگ جلدی سونے کے عادی ہیں!"

"میں اپنے حالات کی عادی ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں' جیسا دیس ویسا بھیس۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولی "انسان کو حالات اپنے ڈھنگ میں جینا سکھا دیتے ہیں۔" اس نے ذرا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگی "ویسے شہزاد واپس آکر اپنی ڈیوٹی سنبھال لے تو میں سونے کی کوشش کروں گی۔"

اس نے ڈیوٹی کا ذکر کیا تو میرا خیال فیصل کی طرف چلا گیا۔

"ہمارا مہمان پنچھی چوہدری زادہ کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خوش باش ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی "ہماری خاطر داری میں خاصا ریلیکس محسوس کررہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے شہزاد سے کافی باتیں بھی کی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' وہ ہوش و حواس میں آچکا ہے؟"

"ایسا ویسا!" وہ دبے جوش کا اظہار کرتے ہوئے بولی "مجھے تو لگتا ہے وہ پوری طرح فٹ ہے۔"

میں نے پوچھا "شہزاد سے اس کی کیا باتیں ہوئی ہیں؟"

"میں نے شہزاد سے پوچھا نہیں۔" وہ بولی پھر چونکے ہوئے انداز کے ساتھ کہنے لگی "شہزاد آگیا ہے لو تم اس سے بات کرلو۔"

اگلے ہی لمحے مجھے ائرپیس میں شہزاد کی مخصوص "ہیلو" سنائی دی۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا "محاذ کا کیا حال ہے۔ تم میدانِ جنگ کی سرحدوں کا جائزہ لے کر آگئے؟"

میں نے ذو معنی انداز میں بنگلے اور اس کے گرد و پیش کی خیریت دریافت کی تھی۔ وہ میرے استفسار کی گہرائی میں اترنے کے بعد بولا "تم پوری طرح مطمئن رہو۔ میری مرضی کے بغیر یہاں پر ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

"ویری گڈ" میں نے سراہنے والے انداز میں

کہا پھر پوچھا "فیصل سے تمہاری کیا بات ہوئی ہے۔ زرگل نے مجھے بتایا ہے' وہ خاصا اسمارٹ نظر آنے کی کوشش کررہا ہے!"

"تمہیں بالکل صحیح بتایا گیا ہے۔ وہ پوری طرح چاق و چوبند ہے۔" شہزاد نے تائیدی الفاظ میں جواب دیا "وہ مجھ سے دو دو ہاتھ کی بات کررہا تھا اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اور تمہیں بزدل ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ وہ مجھے طیش دلانے کی کوشش کررہا تھا۔ کہنے لگا یہ تم لوگوں کی کوئی مردانگی ہے جو مجھے آہنی زنجیروں میں جکڑ کر خوش ہورہے ہو۔ اگر طاقت اور تکنیک کا مقابلہ کرنا ہے تو مجھے آزاد کرکے دیکھو۔ چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا تو میرا نام بھی چوہدری فیصل نہیں۔"

"تو پھر تمہارا کیا ارادہ ہے۔" میں نے چھیڑنے والے انداز میں کہا "چھٹی' ساتویں اور آٹھویں کا دودھ تمہیں یاد ہے یا ڈائریکٹ میٹرک کا منصوبہ ہے؟"

وہ میرے لطیف مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "میں تو اس کی منصوبہ بندی کا خیال پالے بیٹھا ہوں۔" اس کے لہجے میں چٹانی کیفیت پائی جاتی تھی "وجدان! ایک مرتبہ تم فیصل کو میرے حوالے کردو۔ میں نے بڑے "ارمان" نکالنا ہیں۔ اس کی ہڈیوں کا چورا نہ کردیا تو......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے "یہ چورا کس بازار میں فروخت کرو گے؟"

"وجدان! تم تصور نہیں کرسکتے کہ میں فیصل کے لیے اپنے دل و دماغ میں......"

"مجھے ہر بات کا اندازہ ہے۔" میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی "تم فکر نہ کرو۔ میں تمہیں دل و دماغ کی آتش بجھانے کا موقع ضرور دوں گا۔ کل تم میری ریفری میں اپنی اپنی طاقت کو آزماؤ گے۔"

وہ جوشیلے لہجے میں بولا "تم نے دل خوش کردیا وجدان!"

"میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں' فیصل نے مارشل آرٹس کے میدان میں کیا چمن رکھا ہے!"

"میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا وجدان!"

"ان شاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔" وہ تیقن سے بولا۔

میں نے کہا "مجھے تم سے یہی امید ہے۔"

وہ یک لخت موضوع بدل کر مجھ سے میرے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے اسے پی ای سی ایچ سوسائٹی کے بنگلے میں پیش آنے والے واقعات کی آگاہی دی۔ اس نے پوری

ہر روحانیت پر ایک مستند کتاب

ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی

مصنف: ایس اے صدیقی

اپنا پیغام دوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے اور ان کے دل کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ

قیمت: -/40 روپے
ڈاک خرچ: -/23 روپے

کتاب کے چند عنوانات

ٹیلی پیتھی
شمع بینی کی مشق
تحت الشعور
اور اس کی مخفی قوت
جبلت کی کارفرمائیاں
ماہیت افکار
تبادلِ طرز تنفس
انتقال افکار
اور اس کی مشقیں
مضمرات انتقال افکار

مستقبل بینی
انسان
غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک
نفس امارہ
قوتوں کا سرچشمہ
مستقبل بینی
اصل حقیقت
بعض چشم دید واقعات
طاقت ور احساسات
مستقبل بینی سیکھیے
مستقبل بینی کے مضمرات
اچھے اور بُرے پہلو

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس۔ 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

توجہ سے میری بات سنی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ کہنے لگا۔

”وجدان! تمہارے لیے میرے پاس ایک گڈ نیوز ہے!“

”گڈ نیوز!“ میں نے اس کے الفاظ دہرائے ”یعنی خوش خبری۔“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”وجدان! میں نے یہ وقت اس بنگلے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں گزارا۔ میں ایک گھنٹے کے لیے فیصل کو زرگل کی سپردگی میں دے کر باہر گیا تھا اور میں نے اپنے ذرائع سے بہت کچھ معلوم کیا ہے۔ سنو گے تو دل خوش ہو جائے گا۔“

شہزاد نے اپنے جن ذرائع کا حوالہ دیا‘ میں ان سے بہ خوبی آشنا تھا۔ وہ ایک چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا۔ کرائم رپورٹر والی حیثیت نے اسے بڑا سورس والا بنا دیا تھا۔ وہ ایک فون گھما کر بہت سے ایسے مشکل کام بھی کر لیتا تھا جو بہ ظاہر ناممکنات میں شمار ہوتے تھے۔ کرائم رپورٹر کی نادیدہ اور طلسمی قوت کا مجھے پہلی مرتبہ ادراک ہوا۔ شہزاد کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا‘ بعض طاقتور کرائم رپورٹر کو تھانے والوں سے باقاعدہ بھتا بھی وصول کرتے ہیں۔ خبروں کی فراہمی تو بہت معمولی سی بات ہے۔ اگر تھانے والے یہ بھتا نہ دیں تو رپورٹر ان کی مخالفت میں الٹی سیدھی رپورٹ چھاپ کر ان کا بھٹا بٹھا دے۔

پولیس ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں عمومی طور پر یہی خیال پایا جاتا ہے کہ ان کی اکثریت مرتشی ہوتی ہے۔ اسی منظر کو ذہن میں لائیں جب ان لوگوں کو اپنی ساکھ بچانے کے لیے ایک راشی کا کردار نبھانا پڑتا ہوگا!

ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ گویا‘ کمزور ہمیشہ طاقتور کی خوراک رہا ہے۔ اب یہ طاقت والے کی مرضی اور موڈ پر منحصر ہے کہ وہ بے بس اور کمزور کو ذہنی طور پر نچوڑے یا جسمانی طور پر ہڑپ کر جائے۔ آخر الذکر کو بہ ہر صورت اس کا نوالہ بننا ہوتا ہے!

میں نے شہزاد کی جوش بھری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے پوچھا ”اس خوش خبری کا تعلق کس سے ہے؟“

وہ بولا ”جے ڈی ملک سے۔“

میں اچھل کر رہ گیا ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ میں نے جے ڈی ملک کا سراغ لگا لیا ہے۔“ وہ بڑے رسان سے بولا۔

میں شہزاد کے ذرائع معلومات سے واقف ہونے کے باوجود بھی پوچھے بنا نہ رہ سکا ”کیسے؟“

اس نے میرے ”کیسے؟“ کے جواب میں جو تفصیل بتائی اس کے مطابق جے ڈی ملک عارضی طور پر اپنے ٹھکانے سے ہجرت کر گیا تھا۔ اس وقت وہ اپنے دوست صفدر علی کے بنگلے میں مقیم تھا۔ صفدر علی نامی یہ شخص نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں رہتا تھا۔

نارتھ ناظم آباد کے ذکر پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ یہ علاقہ ڈسٹرکٹ سینٹرل میں واقع تھا۔ مذکورہ ضلع کراچی کا سب سے زیادہ اہم اور حساس ٹکڑا تھا..... جس طرح شعیب غوری نے اپنی تنظیم سی ایف کے (کرائم فری کراچی) کا ہر ضلع میں ایک ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ اس طرح سینٹرل میں بھی اس کا اڈا موجود تھا۔ مجھے اس طرف جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے چونکنے اور ٹھٹکنے کا سبب یہ تھا کہ کہیں جے ڈی ملک نے شعیب غوری کے ”سینٹرل“ میں پناہ تو نہیں لے رکھی!

یہ امکان قرین قیاس تھا کیوں کہ جب سے شعیب غوری اور چوہدری نواز ش میں دوستی ہوئی تھی‘ دونوں سرکٹ کے لوگ آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اس کی تازہ ترین مثال جے ڈی ملک اور نادر زمان کا گٹھ جوڑ تھا۔ نادر زمان تو پتا نہیں اب کہاں ہوگا...... اور ہوگا بھی یا نہیں! البتہ شہزاد کے انکشاف سے یہ ضرور سوچا جا سکتا تھا‘ صفدر علی نامی وہ شخص ”سینٹرل“ کا کرتا دھرتا بھی ہو سکتا تھا! یہ ایک نہایت ہی اہم اطلاع تھی میرے لیے۔

میں نے شہزاد سے کہا ”میں تمہاری فراہم کردہ معلومات کو شک کی نظر سے تو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بتاؤ جے ڈی ملک ڈیفنس سوسائٹی سے نارتھ کب گیا ہے؟“

”آج بعد از دوپہر“ اس نے جواب دیا ”اپنے بنگلے پر پیش آنے والے خونیں واقعے کو نمٹانے کے بعد وہ بنگلا لاک کر کے صفدر علی کے گھر چلا گیا تھا۔“

میں نے کہا ”اپنا بنگلا لاک کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے وہ آج کی تاریخ میں واپس نہیں آئے گا!“ میرا یہ اندازہ امکانات پر مبنی تھا۔

”میں نے اس سلسلے میں بھی سن گن لینے کی کوشش کی ہے۔“ شہزاد وضاحت کرتے ہوئے بولا ”وہ ایک دو دن وہاں رکے گا‘ جب تک ادھر کے حالات سازگار نہیں ہو جاتے۔“

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد شہزاد کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا تو وہ چونک اٹھا۔ حیرت بھرے لہجے میں بولا ”کمال ہے میں نے اس زاویے سے غور نہیں کیا تھا۔ عین ممکن ہے جے ڈی ملک نے شعیب غوری ہی کے کسی

ٹھکانے پر پناہ لی ہو!“

”تم نے اس زاویے پر اس لیے دماغ نہیں کھپایا کہ تمہاری سوچ کے کینوس پر ابھی تک سی ایف کے پوری طرح ابھری نہیں۔“ میں نے وضاحت کی ”اور نہ ہی چوہدری شعیب کے الحاق پر تم زیادہ توجہ دے رہے ہو۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ منہاس صاحب کے ساتھ پیش آنے والے خون چکاں واقعے نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو متاثر کیا ہو!“

وہ تائیدی انداز میں بولا ”تم بالکل درست سمت میں قیاس آرائی...... بلکہ حقائق نمائی کر رہے ہو۔ میں آج صبح سے بہت اپ سیٹ ہوں۔“

”ایسا ہونا بھی چاہیے۔ تمہارا یہ ردعمل عین فطری ہے۔“ میں نے ہمدردی سے بھرپور لہجے میں کہا ”انسان ایک حساس اور باشعور مخلوق ہے۔ اپنے پیاروں کو ملنے والی خوشی اور غم سے اسے متاثر ہونا چاہیے ورنہ اس میں اور پتھر میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔“

وہ سوالیہ انداز میں بولا ”وجدان! جب کوئی شخص قدم قدم پر ہمیں فائدہ پہنچاتا ہے تو ہم اسے خیر خواہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہمیں مسلسل نقصان پہنچانے پر کمر بستہ ہو جائے تو وہ ہمارے دشمنوں میں شمار ہونے لگتا ہے۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں کا حساب تو چکتا کرتے رہنا چاہیے نا؟“

میں بڑی حد تک اس کی بات سمجھ گیا تھا تاہم انجان بنتے ہوئے پوچھا ”میں سمجھا نہیں‘ تم کہنا کیا چاہتا ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں۔“ وہ وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا ”منہاس باقر صاحب میرے خیر خواہوں میں ٹاپ آف دی لسٹ کا اعزاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر ان گنت احسانات کر رکھے ہیں۔ میں ان سلوک لمحات کو شمار کرنے بیٹھوں تو زندگی بیت جائے لیکن گنتی ختم نہ ہو۔“ اس کی آواز میں بھراہٹ اتر آئی۔ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد بولا۔

”وجدان! کیا میں نے چوڑیاں پہن لی ہیں یا میں اتنا ہی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس عظیم محسن کو پہنچنے والے نقصان کا حساب نہ مانگ سکوں؟ کیا فرحت بیگم اور واجد کا خون مجھ سے کوئی تقاضا نہیں کرتا؟ میری یہ جان اور طاقت کس کام کی کہ میں ان سفاک قاتلوں کا ایک بال بھی بانکا نہ کر سکوں؟“

شہزاد اس وقت بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں اسے تسلی دی ”شہزاد! منہاس کے بنگلے پر خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں کو میں نے دردناک عذاب میں مبتلا کرنے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔“

وہ بے طرح پھٹ پڑا ”تم اتنے اطمینان سے اس لیے بات کر رہے ہو کہ تم نے ان چار کمانڈوز کو ہلاک کر کے اپنے جگر میں ٹھنڈک اتار لی ہے۔ مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔ میرے دل و دماغ میں جو الاؤ روشن ہے میں اسے کس کے خون کے چھینٹوں سے بجھاؤں۔ ہر شخص کا اپنا معاملہ ہوتا ہے۔ مجھے ایک بات بتاؤ وجدان!“

وہ بڑے ہیجان خیز انداز میں رکا پھر مجھ سے مستفسر ہوا ”ہم دونوں بھوکے ہوں۔ تم پیٹ بھر کر کھانا کھا لو اور میں سامنے بیٹھا للچائی ہوئی نظر سے تمہیں دیکھتا رہوں۔ کیا اس دیکھن دکھن میں میری بھوک مٹ سکتی ہے؟“

”ہرگز نہیں!“ میں نے قطعیت سے کہا۔

”تو پھر میرے سکون کا کوئی بندوبست کرو!“

”تم کیا چاہتے ہو۔“ میں نے کہا ”تمہارے ذہن میں کچھ تو ہوگا؟“

وہ بولا ”چار کمانڈوز کو تو تم نے جہنم کا ویزا دلا کر روانہ کر دیا مگر ان کا باوا آدم ابھی زندہ ہے۔ انہوں نے اسی شخص کے ایما پر منہاس صاحب کے بنگلے کو قبرستان میں تبدیل کیا تھا۔ میں جے ڈی ملک کے خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں۔“

”ڈن!“ میں نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

میرا یہ فیصلہ حالات کا تقاضا اور شہزاد کو لاحق انتقامی مرض کا علاج تھا۔ اگر اس موقع پر اسے اپنے اندر لگی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا راستہ نہ ملتا تو اس کا دماغ بھی الٹ سکتا تھا اور ویسے بھی جے ڈی ملک برے ترین سلوک کو مستحق تھا۔ اس کا زندہ رہنا بہت سے انسانوں کے لیے ایک مسلسل عذاب کے مترادف تھا۔

آئندہ دو منٹ میں ہمارے درمیان جے ڈی ملک کو چھاپنے کا منصوبہ زیر بحث رہا پھر ہم اس فیصلے پر پہنچے کہ کل ادھر کا رخ کیا جائے گا۔ شہزاد میری تائید اور تعاون پا کر قدرے مطمئن ہو گیا تو میں اسے نارمل کرنے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اسی دوران میں اس نے ایک عجیب سوال کیا۔ مجھ سے پوچھنے لگا۔

”یہ زرگل کیسی لڑکی ہے؟“

اس کے استفسار نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”تم کس حوالے سے پوچھ رہے ہو؟“

وہ گڑبڑا گیا ”بس ایسے ہی......“

ایک بات تو یہ طے تھی کہ زرگل اس وقت شہزاد کے قریب موجود نہیں ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ اس نے خاصے پُراسرار انداز میں سوال کیا تھا۔ لامحالہ مجھے کچھ شک سا ہوا۔ پھر اس کی گڑبڑاہٹ نے مزید مجھے متذبذب کر دیا۔

میں نے کریدنے والے انداز میں کہا ''بس ایسے ہی کا کیا مطلب ہوا شہزاد؟''

وہ اور بوکھلا گیا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا ''وہ پچھلے چند دنوں سے تمہارے ساتھ ہے نا...... تم نے اسے کیسا پایا ہے؟''

اس کی بوکھلاہٹ اور ہچکچاہٹ نے مجھے بتایا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ''یار! وہ جب سے میرے ساتھ ہے مجھے اس کے بارے میں سوچنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ کیسا پایا اور کیسا کھویا کے بارے میں کیا بتاؤں لیکن......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر اپنے شک کی تصدیق کی خاطر پوچھا ''تمہیں اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع آج ہی ملا ہے اور تم خاصا تیز بھاگنے لگے ہو، میرا خیال ہے صبح تک تم زرگل پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر لو گے۔''

''کیوں مذاق کر رہے ہو!'' وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کی کھسیاہٹ نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا۔ میں نے کہا ''میں مذاق نہیں کر رہا شہزاد! بالکل سنجیدہ ہوں۔ تم بھی اگر زرگل کے بارے میں سنجیدگی اختیار کر لو تو اس میں مضائقے والی کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔''

''تم اس کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟''

''نہ ہونے کے برابر'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''بس مجھے اتنا معلوم ہے اس کا چاچا حکمت یار کوئی بہت برا آدمی ہے جو اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس سے زیادہ اس کے بارے میں جاننے کا مجھے موقع نہیں ملا۔ تم کریدو گے تو ہو سکتا ہے وہ تمہیں اپنی اسٹوری سنا دے۔ باقی تمہارے اپنے گٹس پر منحصر ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم دونوں کے بیچ کوئی سنجیدہ......''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کا ذہن صاف کر دیا۔

''واقعی ایسی کوئی بات نہیں...... کم از کم میری طرف سے بالکل نہیں!''

''اور اس کی طرف سے؟''

''یہ تم معلوم کرنے کی کوشش کرو۔'' میں نے کہا ''ویسے پوٹھوہاری اور پشتون کی جوڑی خاصی دلچسپ رہے گی۔''

میرے لہجے میں قدرے شگفتگی پائی جاتی تھی۔ وہ الجھن زدہ لہجے میں پوچھ بیٹھا ''تمہیں تو میری اس کوشش پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا؟''

''ارے بھائی! میں اس کا کوئی والی وارث ہوں جو تم مجھ سے اجازت مانگ رہے ہو۔'' میں نے بے تکلفی سے کہا ''تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے براہ راست اسی سے کہو۔''

وہ جذبات میں آ کر انگریزی پر اتر آیا ''او کے! آئی ول ٹرائی۔''

''یو شڈ ہو ٹرائی۔'' میں نے کہا ''اینڈ ٹرائی اٹ اپ!''

اس کے ساتھ ہی ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔

میں ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد زرگل اور شہزاد کے بارے میں سوچنے لگا۔ شہزاد کے لیے یہ ایک مشکل ٹاسک تھا۔ زرگل آسانی سے اس کے قابو میں آنے والی نہیں تھی لیکن اس کھیل میں حتمی طور پر کوئی فتویٰ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ سنا اور دیکھا بھی ہے کہ اس راہ میں ہر شخص کا تجربہ نیا ہے۔ اگر شہزاد کی لگن سچی اور کوشش پکی ہوئی تو اس کی محنت رائیگاں نہیں جا سکتی تھی۔ حصول اور جستجو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم رشتے سے بندھے ہوئے ہیں۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ شہزاد کی جستجو زرگل کو اس کے قریب لے آتی۔ میں نے ان کے ملاپ کے لیے خلوصِ دل سے دعا کی اور کمرے میں حاضر ہو گیا۔

دیوارگیر کلاک ساڑھے بارہ بجا رہا تھا۔ طارق روڈ ایک شاپنگ ایریا ہے۔ عموماً دس سے گیارہ بجے تک دکانیں کھلی رہتی ہیں۔ اس کے بعد اچانک سناٹا چھا جاتا ہے۔ اکا دکا گاڑیوں کے گزرنے کی آواز کے سوا کوئی صدا نہیں ابھرتی۔ یہاں کی رات خاصی پُرسکون واقع ہوئی ہے۔ سونے سے پہلے میں نے ہلکی پھلکی ایکسرسائز کا ارادہ کیا اور بیڈ سے اتر کر فرش پر آ گیا۔

جس طرح زندہ رہنے کے لیے کھانا پینا ضروری ہے اسی طرح مستعد رہنے کے لیے بھرپور نیند بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آج کا پورا دن مار دھاڑ میں گزرا تھا۔ کل کا سامنا کرنے کے لیے میں ذہنی اور جسمانی طور پر چاق و چوبند ہو جانا چاہتا تھا لہٰذا ایک پُرسکون نیند ضروری تھی۔ اگر رات سونے سے پہلے کوئی اکا دکا جسمانی مشقیں کر لی جائیں تو تمام اعصاب اور پٹھے ریلیکس ہو جاتے ہیں جو گہری نیند کے لیے بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔

میرے نزدیک انسانی جسم میں تین حصے بہت اہمیت کے

حامل ہیں۔ سر، پیٹ اور پاؤں۔ سر میں چہرہ بھی شامل ہے۔ پیٹ میں معدے کو اولیت حاصل ہے اور پاؤں تو اول آخر پاؤں ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے اندر داخل ہونے والی صحت اور بیماری انہی تینوں حصوں کو اپنا راستہ بناتی ہے لہٰذا ان کی حفاظت' نگہداشت اور صفائی بہت ضروری ہے۔ اپنے ذہن میں ہمیشہ مثبت سوچ کو جگہ دینا چاہیے۔ ہر معاملے کو مثبت انداز میں دیکھنا' سننا اور بولنا چاہیے۔ معدے کی مضبوطی اور صفائی کے لیے سادہ اور بروقت غذا ضروری ہے۔ پاؤں کو حتی الوسع صاف رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے مگر سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم اپنے پاؤں کو بہت حقیر جانتے ہیں' ان پر کم سے کم توجہ دیتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں!

یاد رکھیں پاؤں غیر اہم نہیں ہیں۔ ہم اس کرۂ ارض پر انہی پاؤں کے طفیل جڑے ہوئے ہیں۔ پاؤں اس دنیا میں ہمارے رابطے کا ذریعہ ہیں۔ اگر ہمارے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لی جائے تو تصور کریں ہم اس کائنات میں کہاں کھڑے نظر آئیں گے؟

میں نے ہتھ یوگ کا ایک باب ذہن میں کھولا اور پاؤں کو آرام و سکون پہنچانے والی ایک ہلکی پھلکی مشق کرنے لگا۔ زمین پر پنجوں کے بل بیٹھنے کے بعد میں نے اپنے بدن کا سارا وزن ایک ایڑی پر منتقل کر دیا، دوسرا پاؤں بوجھ سے آزاد ہوا تو اس ٹانگ کو گھٹنے کے مقام سے تہ کر کے میں نے مذکورہ پاؤں کو دوسرے گھٹنے پر ٹکا لیا جو پہلے ہی ہوا میں معلق تھا۔ دونوں ہاتھوں کو میں نے کمر پر جمایا' ریڑھ کی ہڈی کو عمودی انداز میں تانتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانس لینے لگا۔ پندرہ سیکنڈ کے بعد میں نے آنکھیں کھول کر...... یہی عمل دوسرے پاؤں کے ساتھ دہرایا اور مشق ختم کر دی۔

یہ بظاہر ایک سیدھی سادی اور آسان سی مشق ہے لیکن اس میں ''اٹھنے'' والا مرحلہ مبتدیوں کے لیے قدرے دشوار ہے۔ ابتداء میں وہ دونوں ہتھیلیاں زمین پر ٹیک کر بھی یہ مشق کر سکتے ہیں۔ آہستہ آہستہ جب پریکٹس بڑھے اور توازن قائم ہونے لگے تو ہاتھوں کو کمر پر جمایا جا سکتا ہے۔

اس کم وقتی مشق کے بے پناہ فوائد ہیں۔ پاؤں کی ساری تھکن کو دور کرتی ہے۔ پنڈلیوں اور گھٹنوں کی اینٹھن کو ختم کر کے پٹھوں کو مضبوط بناتی ہے۔ کمر درد اور ضعیف عمری کے مختلف مسائل میں بھی مقوی و معاون ہے۔ ایک وقت میں تین سے پانچ چکر کافی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے پلو پوسچر (ہل آسن) لوٹس پوسچر (کنول آسن) اور بین پوسچر (مچھلی آسن) کا ایک ایک چکر مکمل کیا اور بستر پر آ گیا۔

یہ ہر انسان کی عادت ہوتی ہے کہ سونے سے قبل وہ اس روز کے اہم واقعات کو ذہن میں ضرور لاتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں وہ واقعات ازخود سوچ کے اندر سلسلہ وار چلے آتے ہیں۔ میں بھی اس ہنگامہ خیز دن کا ایک ایک لمحہ یاد کرنے لگا۔ یہ میری زندگی کا مصروف ترین دن تھا۔ آج میں نے بہت کچھ کھویا اور بہت کم پایا تھا۔

اس خیال نے مجھے قدرے افسردہ کر دیا کہ میری ساحل ہنوز مجھ سے دور تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا۔ میں اس کے جتنا نزدیک ہونے کی کوشش کرتا وہ مجھ سے اتنے ہی زیادہ فاصلے پر چلی جاتی اور دوری نزدیکی کے اس کھیل میں ساحل کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ بے چاری تو میرے دشمنوں کے رحم و کرم پر تھی۔ ان کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جیسے ڈوریاں ہلاتے تھے اسے ان کے اشاروں پر ناچنا پڑتا۔

میں اپنی زندگی میں ایسا مجبور اور بے بس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ چوہدری نوازش اور شعیب غوری نے میرے بڑے نازک پہلو پر ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ ساحل میرے لیے کسی دکھتی ہوئی رگ سے کم نہ تھی۔ اس کے لیے اپنے دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو دیکھ کر میں کبھی کبھی سوچتا' آخر یہ سب کیا ہے؟ میں اس قدر دیوانہ کیوں ہو گیا ہوں؟ کیا یہ میرا پاگل پن نہیں؟ ان تمام سوالوں اور ان جیسے سیکڑوں سوالوں کا صرف ایک ہی جواب آتا...... یہ کچھ بھی نہیں' صرف محبت ہے۔ وہ محبت جو مجھے ساحل سے ہو گئی ہے!

میری زندگی میں درجنوں لڑکیاں آئیں اور آ کر چلی گئیں۔ ہمارے درمیان دل لگی بھی ہوئی مگر ان میں سے کوئی تعلق دل کی لگی نہ بن سکا۔ میں نہیں جانتا تھا' بخدا نہیں جانتا تھا کہ یہ دل کی لگی کیا ہوتی ہے! مجھے اس جذبے کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ میں تو سمندر کے کنارے پر بیٹھا ہوا وہ شخص تھا جو آتی جاتی لہروں کو گنتا رہتا ہے، وہ کبھی یہ معلوم نہیں کر پاتا کہ اس سمندر کی گہرائی کتنی ہے۔ سوچ شاری کا مکمل نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا۔ سمندر کی گہرائی جاننے کے لیے اس کے اندر اترنا پڑتا ہے' خود کو اس کے اندر ڈبونا پڑتا ہے' پھر کہیں جا کر گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے!

میں ساحل کی تلاش میں محبت کے سمندر میں غرق ہوا جا رہا تھا۔ اب مجھے صحیح معنوں میں احساس ہو رہا تھا کہ ڈوبنے والے ساحل کی تمنا کیوں کرتے ہیں!

میں نے سونے سے پہلے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی اور اپنی جانِ تمنا ساحل کے تصور سے لپٹ کر نیند کی نرم آغوش میں دبک گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی چمکیلی اور سناٹے دار تھی!

میں ابتدائی مصروفیات سے فارغ ہو کر ناشتے کے لیے بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ طارق روڈ پر پائے جانے والے ریسٹورنٹس عموماً دیر سے کاروبارِ زندگی شروع کرتے تھے البتہ میری رہائش سے تھوڑے فاصلے پر ایک ایرانی ریسٹورنٹ ایسا بھی تھا جو علی الصباح مہمان نوازی شروع کر دیتا اور رات گئے تک وہاں آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مجھے کراچی کے جتنے بھی ایرانی ریسٹورنٹس میں کھانے پینے کا اتفاق ہوا میں نے تمام کی تمام ڈشز کو ذائقے میں ایک جیسا پایا۔ ان کی ریسیپیز میں بڑا توازن اور استحکام پایا جاتا ہے۔

میں آدھے گھنٹے بعد واپس فلیٹ پر آ گیا۔ میں راستے میں سے ایک نیوز پیپر بھی خرید لایا تھا۔ اخبار کے مطالعے کے بعد پتا چلا کہ آج روڈ پر اس قدر خاموشی اور ویرانی کیوں تھی۔ اس روز ٹرانسپورٹرز نے اسٹرائیک کا اعلان کر رکھا تھا۔ ان کا مطالبہ تھا ایندھن کی قیمتیں کم کی جائیں یا پھر انہیں کرائے میں اضافہ کی اجازت دی جائے۔

بہرحال میں اپنے مطلب کی خبروں کی تلاش میں ورق گردانی کرنے لگا۔ پی ای سی ایچ سوسائٹی والے واقعے کا کہیں ذکر نہ تھا تاہم جے ڈی ملک اور نادر زمان کے بنگلوں پر پیش آنے والے واقعات کی خبریں موجود تھیں۔ اسی طرح منہاس باقر کے بنگلے پر ٹوٹنے والی قیامت کا احوال بھی بڑی تفصیل سے شائع ہوا تھا۔ تبصرہ نگاروں نے مختلف انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا تاہم حکومت کے ذمّے دار ادارے اُن تین واقعات کو آپس میں نتھی کر کے گھسے پٹے انداز میں دہشت گردی کی وارداتیں قرار دے رہے تھے اور عوام کو یقین دلایا جا رہا تھا کہ نامعلوم دہشت گردوں کو ''معلوم'' کرنے کے فوراً بعد گرفتار کر کے کڑی سزا دی جائے گی۔

حقیقت کیا تھی! یہ صرف لوگ جانتے تھے جو ان واقعات کے ذمّے دار تھے یا پھر ان واقعات سے متاثر ہوئے تھے۔

میں نے اخبار کو ایک صوفے پر پھینک دیا۔

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے تیسری گھنٹی پر فون اٹینڈ کیا۔ میری ''ہیلو'' کے جواب میں شہزاد کی آواز مجھے سنائی دی۔

''ہیلو وجدان! گڈ مارننگ۔''

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر پوچھا ''خیریت تو ہے شہزاد! اتنی صبح کیسے فون کیا؟''

''شاید تمہیں معلوم نہ ہو، آج ٹرانسپورٹ کی ہڑتال ہے۔''

''مجھے معلوم ہو چکا، میں نے اخبار میں خبر پڑھ لی ہے۔'' میں نے کہا ''اور نیچے روڈ کا معائنہ بھی کر آیا ہوں۔ ایک دم سناٹا اور ویرانی ہے۔''

اس نے کہا ''تم نے گزشتہ رات شیرڈ کو تو خیرباد کہہ دیا تھا۔ تمہارے لیے سواری کا مسئلہ ہو جائے گا۔''

اس کی بات میں مجھے کچھ زیادہ اعتماد نظر نہ آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس موضوع کے عقب میں وہ کوئی اور بات کرنا چاہ رہا ہو۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔

''میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا یا کھڑا نہیں ہوگا۔ شاید تم نے خبر کو صحیح طور پر نہیں پڑھا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ گڑبڑا گیا۔

میں نے کہا ''یہ ٹرانسپورٹرز کی اسٹرائیک ہے۔ رکشا ٹیکسی اس سے مبرا ہیں اور تمہیں تو معلوم ہے میں عام طور پر پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر نہیں کرتا۔ اس صورت میں میرے لیے کیا پرابلم ہو سکتی ہے!''

''اوہ!'' وہ جلدی سے بولا ''میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔''

''وہ اس لیے کہ...... تمہارا دھیان کسی اور طرف لگا ہوا ہے!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''وہی مطلب!'' میں نے اپنے لہجے میں سنجیدگی برقرار رکھی۔

''پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو!'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا ''کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''کس سلسلے میں؟'' اس کے سوال میں الجھن تھی...... ایسا ہوتا ہے!

''خیر چھوڑو۔'' میں نے اس کی گلوخلاصی کرتے ہوئے کہا ''یہ بتاؤ زرگل کیسی ہے؟''

''خاصی ہارڈ ہے...... مم میرا مطلب ہے، وہ بڑی مشکل ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔ وہ مشکل اور ٹیڑھی تو ضرور ہے۔'' میں نے کہا ''بہرحال فرہاد اور مجنوں کی مثالیں تمہارے سامنے

ہیں۔ یہ کام اتنا آسان تو نہیں۔ پہاڑ کھود کر دودھ کی نہر نکالنا پڑتی ہے۔ تپتے صحراؤں میں آبلہ پا نغمۂ محبت گانا پڑتا ہے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بظاہر شہزاد سے مخاطب ہوں مگر درحقیقت میں وہ کلام خود سے کر رہا ہوں۔ شہزاد کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''میں خود مشکل پسند ہوں۔ محنت مشقت سے نہیں گھبراتا۔ ایک دن میں اس پتھر مورت کو موم کی گڑیا میں ضرور بدل دوں گا۔''

وہ جذبات میں خاصا کھل گیا تو میں نے کہا ''یہ ہوئی نا مردوں والی بات تمہارے عزم کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے تم واقعی اپنے مقصد کو پالو گے۔''

پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر بات ہونے لگی۔ میں نے اس سے فیصل کی تازہ ترین کیفیت دریافت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ مزید ایک رات کے آرام کے بعد پہلے سے کہیں زیادہ ہوشیار اور فٹ ہو گیا ہے۔ اور بار بار اسے مقابلے کے لیے اکسا رہا ہے۔ اس کے کندھے کا زخم بھی بہتر ہے وہ اسے خاطر ہی میں نہیں لا رہا۔ آخر میں شہزاد نے یاددہانی کے انداز میں استفسار کیا ''وجدان تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟''

''اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا ''آج تم اپنی زندگی کے دو اہم ترین معرکے سر کرو گے۔''

وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا ''دو معرکے!'' پھر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا ''ایک تو فیصل سے دو دو ہاتھ کرنا ہیں مگر دوسرا معرکہ کون سا ہے؟''

میں نے اس کے چٹکی لی ''لگتا ہے زرگل کے تصور نے تمہاری یادداشت کو گڑبڑا دیا ہے۔ میں جے ڈی ملک کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کا معاملہ بھی آج ہی نمٹ جائے تو اچھا ہے۔''

''اوہ!'' اس نے انتقام سے لبریز سانس خارج کی ''اس شیطان کی شہ رگ سے تو میں اتنا بلند فوارہ چھڑاؤں گا کہ دور دور تک فضا خون رنگ ہو جائے گی۔''

میں نے کام کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا ''شہزاد! تم نے جی ڈی ملک کے دوست کا نام صفدر علی ہی بتایا ہے نا جو نارتھ ناظم آباد میں رہتا ہے؟''

''میری معلومات تو یہی ہیں۔'' وہ سرسری انداز میں بولا ''جے ڈی ملک ایک دو روز تک اسی کے بنگلے پر رہے گا۔ یعنی روپوش رہے گا۔''

''روپوش کو رونما کرنا ضروری ہے۔'' میں نے خیال میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''دراصل میں صفدر علی اور یوسف ہمدانی میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔''

''یوسف ہمدانی؟'' وہ چونکا ''اوہ! تم اس رینج روور کے مالک کا ذکر تو نہیں کر رہے!''

''تم بالکل درست سمت میں سوچ رہے ہو۔'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا ''صفدر علی اور یوسف ہمدانی میں ''نارتھ ناظم آباد'' قدرِ مشترک ہے۔'' میں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر پُرسوچ انداز میں کہا ''اسی طرح جے ڈی ملک اور اس کے پشت پناہ دوستوں میں ''سی ایف کے'' قدرِ مشترک ہے۔ یعنی پہلے وہ نادر زمان کے پاس رکا اور اب صفدر علی کے بنگلے میں جا چھپا ہے۔ یہ دونوں افراد سی ایف کے کے نہایت ہی اہم مہرے ہیں اور......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ رینج روور والا وہ لم ڈھینگ ستاری ایف کے ہی کا ایک آلۂ کار ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کہیں صفدر علی اور یوسف ہمدانی میں بھی تو کوئی خاص تعلق نہیں پایا جاتا!''

''تم نے نہایت ہی اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔'' وہ فکر انگیز لہجے میں بولا ''میں اپنے طور پر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا ''اس کے ساتھ تم جے ڈی ملک کو اس کی پناہ گاہ سے باہر لانے کی بھی کوئی ترکیب سوچو۔ میں چاہتا ہوں صفدر علی کے بنگلے پر کوئی ہنگامہ آرائی نہ کی جائے۔ اگر ہم اسے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو زیادہ ''خوب صورت'' انداز میں کام کرنے کا مزہ آئے گا!'' بات کے اختتام پر میرا لہجہ خاصا سفاک ہو گیا تھا۔

شہزاد نے کہا ''میں دوپہر کے بعد تمہیں فون کروں گا۔ ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے۔ ساحل والا معاملہ تو بیچ میں لٹک کر رہ گیا ہے!''

میں نے اپنے جگر میں ایک ٹیس سی اٹھتی محسوس کی، کسی انجانے خیال کے زیرِ اثر میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ معاملہ اب لٹکا ہوا نہیں رہے گا۔ آج کی رات فیصلہ کن ثابت ہوگی!''

''اس کا مطلب ہے، تمہارے ذہن میں کوئی پروگرام ترتیب پا چکا ہے؟''

''بس ایسا ہی سمجھو۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''اگر ترتیب نہیں بھی پایا تو سورج غروب ہونے سے پہلے یہ کام ہو جائے گا۔ آنے والی رات شعیب غوری اور اس کی شیطانی

تنظیم کے لیے بہت بھاری ثابت ہونے والی ہے!"

شہزاد نے مضبوط لہجے میں کہا" انشاء اللہ اس وقت تک میں بھی فیصل ورجے ڈی ملک کو نمٹا چکا ہوں گا۔ ساحل والے مشن کے لیے ہم دونوں ایک ساتھ روانہ ہوں گے!"

"نہیں!" میرے اس ایک لفظی جملے میں بڑی قطعیت تھی۔

دوسری طرف یکسر خاموشی چھا گئی۔

چند لمحوں کے بعد میں نے اسی گمبھیر اور حتمی لہجے میں کہا "شہزاد! دوست احباب انسان کے دست و بازو ہوتے ہیں لیکن آج کی رات میں اپنے کسی بھی ہمدرد کو زحمت نہیں دوں گا۔ میں انہیں پہلے ہی بہت سے جھمیلوں میں جھونک چکا۔ ساحل کی تلاش اور حصول والا مرحلہ اب مجھے تن تنہا ہی طے کرنا ہے..... اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

جب کوئی انسان اٹل اور دوٹوک فیصلہ سنا دے تو پھر جرح و بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ شہزاد میری ثابت قدمی اور قوت ارادی سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا میں آگے اٹھنے والے قدم کو واپس نہیں ڈالتا لیکن ایک مخلص دوست ہونے کے ناتے وہ مجھے سمجھانے اور قائل کرنے کے فریضے کو نہ بھولا۔

لیکن اس نے کچھ کہنے کے لیے جیسے ہی زبان کھولنا چاہی' میں نے سختی سے منع کر دیا "نہیں شہزاد! میں نے جو کہہ دیا اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں۔ میں اپنوں کو پہلے ہی بہت دکھ پہنچا چکا ہوں۔ اب نہیں...... بالکل نہیں!"

"ٹھیک ہے بعد میں دیکھیں گے۔" وہ مبنی بر مصلحت لہجے میں بولا" آج کا سورج غروب ہونے میں ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ تمہارا مشن تو ویسے بھی رات ہی کو شروع ہو گا!"

مزید دو چار ضمنی باتوں کے بعد میں نے رابطہ ختم کر دیا۔

شہزاد سے ہونے والی گفتگو پر جب میں نے غور کیا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے اس کے ساتھ زیادتی کر دی ہو۔ وہ میرا بے لوث اور جان نثار دوست تھا۔ میری ہمدردی سے مجبور کر رہی تھی کہ کڑے وقت میں میرا ساتھ دے کندھے سے کندھا ملا کر دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دے اور میں نے بڑی درشتی سے اسے کارنر کر دیا تھا۔

مگر میں کیا کرتا! میں بھی تو اس معاملے میں مجبور تھا۔ میں اپنی دشمنی کی آگ میں کتنوں کو جھلساتا؟ دشمنوں کو تو ایک مشغلہ مل گیا تھا۔ وہ مجھے شکار کرنا چاہتے تھے اور جب میں نشانے پر نہیں آتا تھا تو وہ میرے کسی پیارے کو ٹارگٹ بنا لیتے تھے' اس گمان میں کہ شاید میں نے اس ٹارگٹ کے پیچھے پناہ لے رکھی ہو! وہ گمان سے یقین تک پہنچنے کے لیے بے دریغ ہلاکتیں کر رہے تھے۔ میرے اپنے' میرے ہمدرد' میرے پیارے ایک ایک کر کے ان کے ہاتھوں اپنی زندگیاں گنوا رہے تھے۔ یہ حالات میرے لیے سوہانِ روح تھے دل کا آزار تھے!

میں نے شہزاد سے جس رویے کا اظہار کیا' اس پر مجھے افسوس تو ہوا لیکن یہ سوچ کر میں نے خود کو تسلی دے لی کہ یہ افسوس اس زیاں کا پاسنگ بھی نہیں جو میری مستقل ہم راہی میں اس کے حصے آتا۔ پتا نہیں میری یہ سوچ کس حد تک درست تھی! بہرحال اس وقت میرے ذہن کی جو کیفیت تھی اس کے پیشِ نظر میں اس دائرے سے باہر سوچ نہیں پا رہا تھا۔

ابھی تک میں نے ساحل کو دست یاب کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار نہیں کیا تھا۔ میرا اشارہ "ایسٹ" کی جانب ہے۔ جنید کا دعویٰ تھا شکیب عثمانی ساحل کو اپنے ساتھ پولیس موبائل میں سراج الدین کے پاس ایسٹ لے گیا تھا۔ اگر میں جنید کی بات کا یقین بھی کر لیتا تو مجھے بہت سوچ سمجھ کر ایک پلان کے تحت اس جانب پیش قدمی کرنا چاہیے تھی اور اس کے لیے یقین دہانی ضروری تھی...... یعنی اس بات کا پتا چلانا ضروری تھا کہ ساحل واقعی ایسٹ میں موجود بھی ہے یا اسے وہاں سے کہیں اور پہنچا دیا گیا ہے۔

اب تک کچھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ رکھاں والی سے ساحل کو لاہور کے ایک مہنگے ترین اسپتال پہنچایا جانے والا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پتا چلا اسے منشا نامی ایک شخص کی کوٹھی پر پہنچا دیا گیا ہے۔ میں صدف کے ساتھ وہاں پہنچا تو معلوم ہوا تھوڑی دیر پہلے اسے چوہدری دلدار کی کوٹھی منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہم نے پوری تیاری کے ساتھ چوہدری دلدار کی کوٹھی پر ایک کامیاب آپریشن کیا جس کے نتیجے میں چوہدری نوازش کا بیٹا فیصل ہمارے ہتھے چڑھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مایوس کن اطلاع بھی ملی کہ ساحل کو لاہور سے کراچی بھیج دیا گیا ہے۔ اور یہاں کراچی میں...... بڑی خوش اسلوبی سے ساحل اور فیصل کا تبادلہ ہونے والا تھا کہ شعیب غوری نے چوہدری نوازش کو ورغلا کر عہد شکنی پر مجبور کر دیا۔ اس طرح ساحل ایک مرتبہ پھر میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ فیصل ابھی تک میری دست رس میں تھا لیکن میں نے اس کا اچار ڈالنا تھا کیا؟

تازہ ترین واقعہ گزشتہ رات پی سی ایچ ایس کے بنگلے والا تھا۔ ساحل میرے ہاتھ آتے آتے نکل گئی اور اب ایسٹ!

میری سوچ لمحے بھر کے لیے تھمی تھی اور میں نے اسی لمحے کے پتا نہیں' کس حصے میں فیصلہ کیا کہ میں پہلے ایسٹ میں ساحل کی موجودی کو کنفرم کروں گا اور پھر سر دھڑ کی بازی لگا کر اکیلا ہی اسے شعیب غوری کے پنجوں سے نکالنے وہاں جا پہنچوں گا۔

اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ منہاس باقر بہت بارسوخ اور طاقت ور شخص تھا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بھی اس کی اچھی یاد اللہ تھی۔ میں اس کی مدد اور تعاون سے ایسٹ پر چڑھائی کروا سکتا تھا اور وہ اس کام میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا اس سے پہلے منہاس کے تعاون سے ساؤتھ پر ایک کامیاب آپریشن کر کے وہاں کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی جس کے نتیجے میں کبیر شاہ جیسا جگادری بھی دم دبا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گیا...... مگر ایک ندامت آمیز خیال ایک خلش بردار احساس میری زبان کا قفل بن جاتا میری مدد اور تعاون کی پاداش میں اس کا آشیانہ اجڑ گیا۔ میں اسے اور کتنی آزمائشوں میں ڈالتا؟ البتہ میں اس کے ایک تعلق کو استعمال میں لا کر اپنے لیے بہت آسانیاں پیدا کر سکتا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے منہاس باقر کے نمبر ڈائل کیے۔ فون اسی نے ریسیو کیا۔ رسمی اور بوجھل علیک سلیک کے بعد اس نے میری آئندہ سرگرمیوں کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے جے ڈی ملک کے بارے میں شہزاد سے ہونے والی گفتگو سے اسے آگاہ کر دیا۔ وہ پوری بات سننے کے بعد گمبھیر آواز میں بولا۔

"قانون شکن اور سفاک قاتلوں کو عدالت سے قرار واقعی سزا دلوانا خاصا پیچیدہ عمل ہے اور خاص طور پر جب یہ لوگ شعیب غوری اور جے ڈی ملک جیسے طاقتور بھی ہوں تو ان کے خلاف ثبوت و شواہد جمع کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ عدالت تو ہر بات کا ثبوت مانگتی ہے لہٰذا ان لوگوں سے پرائیویٹ سیکٹر میں نمٹنا ہی بہتر ہے۔"

منہاس نے بڑے ڈھکے چھپے انداز میں ہمیں کسی بھی سنگین کارروائی کی اجازت دے دی تھی۔ میں نے کہا" آپ جیسا سوچ رہے ہیں ویسا ہی ہو گا۔"

"ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا!" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

"تمہاری ساحل والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟"

"جے ڈی ملک کے بعد ادھر کا رخ کروں گا۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔

"میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو بلاتکلف بتا دینا۔"

"میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے منہاس صاحب!" میں نے بڑے رسان سے کہا۔

"ہاں' ہاں بولو۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"وہ آپ کا جاننے والا میک اپ ماسٹر نسیم جوہر ہے نا!" میں نے کہا" جس نے مجھے سہیل کا روپ دیا تھا۔ مجھے اس شخص کی ضرورت ہے کم از کم دو گھنٹے کے لیے۔"

اس فن کار نے مجھے میک اپ کے بارے میں نہایت ہی اہم ٹپس دی تھیں۔ میں اس کے ساتھ دو تین گھنٹے کے ایک "سیشن" میں مزید کچھ سیکھنا چاہتا تھا۔

"خیریت تو ہے' تم نسیم سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟" منہاس نے پوچھا۔

میں نے اپنا مقصد بیان کیا اور کہا" اس کا بتایا ہوا ایک ایک نکتہ میرے ذہن میں نقش ہے میرا خیال ہے اگر وہ مجھے دو تین گھنٹے اور دے دے تو میں اس سلسلے میں ہر قسم کی محتاجی سے محفوظ ہو جاؤں گا۔"

منہاس نے کہا" شوبز سے متعلق لوگ رات دیر تک بلکہ صبح تلک جاگتے ہیں اسی لیے ان کی بیداری دن چڑھے اور بعض اوقات دوپہر کو ہوتی ہے۔ میں نسیم کو فون کر کے دیکھتا ہوں' وہ کس پوزیشن میں ہے۔"

میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا" آپ اس سے یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ میک اپ اور گیٹ اپ کا سامان وافر مقدار میں اپنے ساتھ رکھ لے۔ میں اس سامان کی قیمت ادا کر دوں گا۔"

"کیا کسی گروپ کا میک اپ کروانا ہے!" منہاس نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

میں نے وضاحت کی" ایکسٹرا سامان میں اپنے اسٹاک کے لیے منگوا رہا ہوں۔"

منہاس نے میرا کام کرنے کی ہامی بھری اور کہا" میں نسیم سے بات کرنے کے بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔"

ٹھیک دس منٹ بعد منہاس کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ نسیم جوہر ابھی سو کر اٹھا ہے" اس نے کہا ہے وجدان کو میرے اسٹوڈیو پر بھیج دیں۔ وہاں اسے سیکھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی رہے گی۔ وہاں ہر نوعیت کے سامان کی وافر مقدار بھی موجود ہے دراصل......" منہاس تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"نسیم کو تین بجے کسی نہایت ہی اہم اسائن منٹ پر جانا ہے۔ اسی سلسلے میں اسے اسٹوڈیو میں کچھ ضروری تیاری کرنا ہے۔ اگر وہ دو تین گھنٹے کے لیے تمہارے پاس آ گیا تو اس کا کام متاثر ہو گا۔ اسٹوڈیو میں رہتے ہوئے وہ تمہیں بھی ڈیل کر لے گا اور اپنا کام بھی جاری رکھے گا۔"

''ٹھیک ہے' آپ مجھے اس کا اسٹوڈیو ایڈریس بتا دیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ تم سے زیادہ دور نہیں۔'' منہاس نے کہا ''تم چاہو تو ٹہلتے ہوئے اس کے اسٹوڈیو تک جا سکتے ہو۔''

اس کے بعد منہاس نے مجھے نسیم جوہر کے اسٹوڈیو کا پتا اور فون نمبر نوٹ کروا دیا۔ مذکورہ اسٹوڈیو خالد بن ولید روڈ کے اس پار ایک چھوٹے سے خوبصورت بنگلے میں واقع تھا۔ برک ریڈ اور وہائٹ گرین کلر کا حامل وہ بنگلا آرٹ کا ایک عمدہ نمونہ نظر آتا تھا۔ نسیم جوہر کے اسٹوڈیو تک پہنچنے کے لیے ہاکی گراؤنڈ کے قریب سے گزرنا پڑتا۔ یہ پی ای سی ایچ سوسائٹی کا ایک صاف ستھرا اور عالی شان علاقہ تھا۔

میں نے منہاس باقر کا شکریہ ادا کیا تو وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا ''وجدان! میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا کہ تمہارا فون آ گیا۔ اب یہ بھی سن لو میں تمہیں کیوں فون کرنے والا تھا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا ''تم آج شام سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے میرے گھر آنا۔ تم سے ایک ضروری کام ہے۔'' اس کے انداز میں سنجیدگی تھی۔

میں چونک اٹھا ''کیسا کام منہاس صاحب؟''

''تم یہاں آؤ گے تو بتاؤں گا۔'' وہ مبہم لہجے میں بولا۔

میں اور زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا ''خیریت تو ہے نا؟''

''بالکل خیریت ہے۔'' وہ جلدی سے بولا ''دراصل میں تمہیں کچھ لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں بلکہ وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہاں آؤ گے تو بات ہو گی۔ تم کسی فکر میں نہ پڑنا۔ سب اپنے ہی لوگ ہیں۔ سہ پہر کے بعد کسی وقت بھی تھوڑی مہلت نکال کر ادھر کا ایک چکر لگا لو۔ سب لوگ بیٹھ کر چند باتیں کریں گے۔ وقت اچھا بہل جائے گا!''

منہاس کے آخری جملے کے بعد میں کوئی سوال نہ کر سکا۔ اس کے وقت کو بہلانے کے لیے میں دنیا کے کسی بھی کونے تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے متذکرہ بالا جملے میں چھپا ہوا درد واضح طور پر محسوس کیا۔ منہاس نے یاسیت کو کیموفلاج کرنے کی بھرپور سعی کی تھی تاہم میں اس کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں ایک ایسا مسیحا تھا جو اس کے درد اس کے مرض کو جانتا تھا لیکن اس کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے درد کی دوا نہیں تھی میرے پاس مستقل طور پر ساتھ چھوڑ جانے والوں کو کوئی واپس نہیں لا سکتا لہٰذا...... مجھے اس کے زخموں کو سہلانا تھا' ان پر تسلی و تشفی کا مرہم رکھنا تھا...... گویا اس کے وقت کو بہلانا تھا!

میں ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر کے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں بہ مشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ صدف آ دھمکی۔

وہ جینز اور ٹی شرٹ میں بڑی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ میں نے عموماً اسے مغربی لباس ہی میں دیکھا تھا۔ پتا نہیں یہ اس کی عادت تھی یا وہ میرے پاس آنے کے لیے خاص اہتمام کرتی تھی' ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوئی پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''صدف! تم لوکل ڈریس نہیں پہنتی ہو؟''

''بہت کم!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی ''کسی سماجی تقریب یا شادی بیاہ کے موقع پر پہن لیتی ہوں ورنہ عموماً میں پینٹ شرٹ کو پسند کرتی ہوں۔ اس لباس میں انسان بہت چست رہتا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا ''کیا تمہیں یہ لباس اچھا نہیں لگتا؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا ورنہ تم ہر لباس میں اچھی ہی لگتی ہو۔''

''اس تعریف کا شکریہ۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر پوچھا ''کیا تم نے ناشتا کر لیا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پوچھا ''آج کا کیا پروگرام ہے؟''

''ابھی کچھ سوچا نہیں۔'' میں نے دانستہ اسے اپنے پروگرام سے بے خبر رکھا۔

وہ بولی ''پھر تو ٹھیک ہے!''

''کیا ٹھیک ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے بتایا ''آج تم لنچ میرے ساتھ کرو گے...... یعنی ہمارے گھر پر!''

''اوہ!'' میں الجھ کر رہ گیا اور پوچھا ''کیوں کوئی خاص بات ہے؟''

''میرے مما پاپا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''لنچ تو ایک بہانہ ہے وہ کیا کہتے ہیں...... تقریب کچھ تو......''

میں نے اس کی بات کاٹی ''وہ کیا کہتے ہیں اور کیا نہیں کہتے' اس بات کو چھوڑو۔ تم بتاؤ تمہارے پاپا اور مما مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟''

جب کسی جوان لڑکی کے والدین کسی جوان لڑکے سے ملنے کے لیے اسے اپنے گھر کھانے پر بلائیں تو یہ ایک خطرناک اور معنی خیز صورتِ حالات کا آغاز ہوتا ہے۔ میں نے اکا

حوالے سے بدک کر صدف سے سوال کیا تھا۔
وہ جلدی سے بولی ''تم جو سمجھ رہے ہو' ایسی کوئی بات نہیں!''
اس کے انداز میں شرارت آمیز معنی خیزی پوشیدہ تھی۔ میں نے ایک طویل سانس کھینچتے ہوئے گہری نظر سے اسے دیکھا اور کہا ''پھر؟''
''پھر یہ کہ وہ تم سے صرف ایک ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ''تمہاری بہت تعریف ان تک پہنچی ہے جس کے نتیجے میں ان کے اندر تم سے ملنے کا اشتیاق جاگ اٹھا۔''
''مجھ میں ایسی تعریف والی کون سی بات ہے؟'' میرا لہجہ سرسری تھا۔
''یہ تو مجھے پتا نہیں' انہی کو جا کر بتانا!''
''تم نے ہی ان سے میرا تعارف کروایا ہوگا!''
''ہرگز نہیں!'' وہ دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے بولی ''تم لاہور میں میرے ڈی ایس پی ماموں سے مل چکے ہو۔ وہ تمہارے بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن یعنی میری مما کو بتایا وہاں سے یہ بات پاپا تک پہنچ گئی' ہاں......''
وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا متوقف ہوئی پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی ''ہاں مجھ سے صرف اتنا ہوا ہے کہ میں نے تمہاری صلاحیتوں کی تصدیق کی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔''
بات ختم کر کے وہ معصومیت سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی معصومیت میں مکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔
''گویا تم نے صرف بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کا کام کیا ہے؟''
''اب تم جو بھی مطلب اخذ کرتے پھرو۔'' وہ سادگی سے بولی۔
میں نے کہا ''صدف! آج یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کھانے کے پروگرام کو پھر کبھی پر ٹال دو۔''
''اس کا مطلب ہے' تمہارا آج کا دن پیک ہے؟''
''بالکل ایسا ہی سمجھو!''
''لیکن تھوڑی دیر پہلے تو تم نے کہا تھا' ابھی کچھ سوچا نہیں؟''
میں نے اسے چکر دینے کے لیے کہا ''جب تم نے مجھ سے میرے پروگرام کے بارے میں سوال کیا تھا تو اس وقت تک میں واقعی کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا بلکہ مسلسل سوچ رہا تھا۔''
''تو گویا تم نے مجھ سے گفتگو کے دوران میں سب کچھ سوچ لیا؟'' وہ شکایت بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔
یہ بات نہیں تھی کہ میں صدف سے غلط بیانی کر کے اسے اپنے پروگرام سے بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔ دراصل میں ایک گہری مصلحت کے تحت وہ اونچ نیچ کر رہا تھا۔ اگر اسے میرے آج کے ہنگامہ خیز پروگرام کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہ کسی سائے کے مانند میرے ساتھ لگ جاتی اور...... میں نہیں چاہتا تھا' وہ خواہ مخواہ کسی مصیبت کا شکار بنے۔ میں محض اس کی بہتری کی خاطر یہ چکر چلا رہا تھا۔
اس کے سوال کا جواب دینا ضروری تھا۔ لہٰذا میں نے گول مول انداز میں کہا ''میں نے ''سب کچھ'' کا دعویٰ کب کیا صدف! میں نے تو یہ کہا ہے میں مسلسل سوچ رہا تھا...... میں فی الحال اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فوری طور پر مجھے کیا کرنا ہے۔''
وہ الجھن بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''کیا کرنا ہے؟''
''مجھے ایک بیوٹیشن سے ملنے جانا ہے۔''
''بیوٹیشن کے پاس۔'' وہ چونکی ''کس سلسلے میں؟''
میں نے اسے بتایا کہ میں ایک ماہر میک اپ ... شعبے کے چند اسرار و رموز سیکھنے جا رہا ہوں تو وہ کھلکھلا کر بولی۔
''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہم گھر جائیں گے۔''
وہ اپنی ضد پر قائم تھی۔ میں نے کہا ''وہاں دو تین گھنٹے زیادہ لگ جائیں گے اس لیے لنچ کا پروگرام نہ ہی بنانا اچھا ہے۔ میں نے کہا نا' پھر کبھی چلوں گا تمہارے گھر۔''
''ٹھیک ہے' میں اپنے گھر فون کر کے انہیں آج کے لیے منع کر دیتی ہوں۔'' وہ مبنی بر مصلحت انداز اختیار کرتے ہوئے بولی ''یہ پروگرام بعد میں دیکھا جائے گا لیکن......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تیز نظر سے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی پھر لہجے میں بولی ''لیکن میں تمہارے ساتھ بیوٹیشن کے پاس ضرور جاؤں گی!''
میں اپنے خیال میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ بہ ظاہر میں نے گردن کو دو بار نفی میں جنبش دی اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس پستہ قامت قیامت کو تکنے لگا۔
آئندہ تیس سیکنڈ کے اندر اس نے اپنے گھر فون کر کے انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ صدف نے ریسیور رکھا تو میں

شہزاد کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔
گزشتہ گفتگو میں ہمارے درمیان یہی طے پایا تھا کہ وہ دوپہر کے بعد مجھے فون کرے گا لیکن موجودہ حالات میں' میں نہیں جانتا تھا' نسیم جوہر کے اسٹوڈیو پر کتنی دیر لگے گی لہٰذا شہزاد کو یہ بتانا ضروری تھا۔
ڈائلنگ کی تکمیل پر دوسری جانب گھنٹی بجی۔ دوسری گھنٹی پر زرگل نے فون ریسیو کیا۔ میں نے اس کی خیر خیریت دریافت کی تو وہ پوچھنے لگی ''وجدان! تم اس وقت کہاں ہو۔ ہماری طرف کب آؤ گے؟''
میں نے مبہم اور محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے جواب دیا ''اپنے فلیٹ پر ہوں اور آج دن میں کسی وقت ادھر کا چکر لگاؤں گا۔'' پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھ بیٹھتی میں نے استفسار کیا ''شہزاد کہاں ہے؟''
''وہ ابھی پانچ منٹ پہلے نکلا ہے۔'' زرگل نے بتایا ''ایک گھنٹے میں واپسی کا کہہ کر گیا ہے۔''
تو اس کا مطلب تھا وہ اپنے مشن پر روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تو نہیں تھی شہزاد نے زرگل کو اس سلسلے میں کچھ تفصیل بتائی ہوگا تاہم تصدیق کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔
''اس نے تمہیں کچھ بتایا' وہ کہاں جا رہا ہے؟''
''نہیں'' وہ قطعیت سے بولی۔
میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ''تم کسی قسم کی پریشانی تو محسوس نہیں کر رہی ہو؟''
پھر جلدی سے وضاحت بھی کر دی ''میرا مطلب ہے فیصل تمہارے لیے کوئی پرابلم تو پیدا نہیں کر رہا؟''
''ہرگز نہیں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی ''وہ پوری طرح میرے کنٹرول میں ہے۔''
''ویری گڈ!'' میں نے اس کی کارکردگی کو سراہا ''بس اب یہ ڈیوٹی ایک آدھ دن کی اور ہے۔ انشاء اللہ فیصل کے بارے میں بہت جلد فیصلہ کر لیا جائے گا۔''
زرگل میرے بارے میں کرید کرید کر پوچھنے لگی تو میں نے گفتگو کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا ''باقی باتیں ملاقات پر کریں گے۔ شہزاد واپس آئے تو تم اسے میرا ایک پیغام دے دینا۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔
''اس سے کہنا مجھے فلیٹ پر فون نہ کرے۔ میں خود ہی اس سے رابطہ کر لوں گا۔''
''ٹھیک ہے' میں تمہارا پیغام اس تک پہنچا دوں گی۔''
میں نے ''اللہ حافظ'' کہہ کر ریسیور کریڈل کر دیا۔
اس دوران میں صدف ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ ٹیلی فونک رابطہ ختم ہوا تو وہ معنی خیز لہجے میں بولی ''پٹھانی سے کیا راز و نیاز ہو رہے تھے؟''
وہ اپنی فطری جبلت سے مجبور تھی ورنہ میرے اور زرگل کے درمیان ہونے والی گفتگو کے لیے ''راز و نیاز'' جیسے الفاظ موزوں نہیں تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور قدرے خشک لہجے میں کہا۔
''صدف! جو کچھ بھی ہوا تمہارے سامنے ہی تو ہوا ہے کیا تم نے کان بند کر رکھے تھے؟''
وہ تیکھے لہجے میں بولی ''میرے کان بند تھے اور نہ ہی آنکھیں لیکن میں تمہارے خیالات تو نہیں پڑھ سکتی نا!''
میں نے کہا ''خیال خوانی یعنی ''تھاٹ ریڈنگ'' ایک باقاعدہ علم ہے اگر تمہیں میرے خیالات پڑھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو تم یہ علم سیکھ لو۔''
''تم ٹیلی پیتھی کا ذکر تو نہیں کر رہے؟''
''ہاں' ٹیلی پیتھی کا ہی آسان انگریزی ترجمہ ''تھاٹ ریڈنگ'' ہے۔ اردو میں ''خیال خوانی'' کہہ لو۔ ٹیلی وژن' ٹیلی فون اور ٹیلی اسکوپ کی طرح یہ بھی ایک سائنس ہے جس کے حصول کے لیے بڑی محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔''
''مارکیٹ میں اس علم پر جو کتابیں موجود ہیں ان کے مطالعے سے تو ٹیلی پیتھی نہیں سیکھی جا سکتی۔'' وہ حتمی لہجے میں بولی ''بات کو بہت الجھا کر تحریر کیا جاتا ہے۔''
''اس کا مطلب ہے' تم ٹرائی کر چکی ہو!''
''ہاں' ایک آدھ مہینا میں نے شمع بینی اور کرسٹل بینی کی تھی۔'' اس نے بتایا ''لیکن جب نتائج صفر سے آگے نہ بڑھے تو میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔''
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''دیکھو صدف! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کتابوں میں سب کچھ غلط لکھا ہوا ہے۔ یا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ کسی بھی علم کو سیکھنے کے لیے استاد کی راہ نمائی بہت ضروری ہوتی ہے۔ کتاب کی افادیت اپنی جگہ مگر استاد کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ورنہ اگر کتابیں پڑھ کر سب کچھ سیکھ لیا جاتا تو آج دنیا میں کوئی استاذ' کوئی تعلیمی ادارہ باقی نہ رہتا۔''
''تمہاری نظر میں اس علم کا کوئی استاد ہے؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔
میں نے صاف کلامی سے کام لیا ''اس سلسلے میں میری معلومات محدود ہیں۔ میں کسی ٹیلی پیتھی کے ماہر استاد کو نہیں

جانتا!''

وہ قدرے مایوسی سے بولی ''ٹیلی پیتھی تو خیالات پڑھنے کا علم ہے۔ کیا اس سے انسان کی نیت بھی پڑھی جا سکتی ہے؟''

''نیتوں کا احوال صرف اللہ کو معلوم ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ خاموش نظر سے مجھے ٹٹولنے لگی۔

میں نے پوچھا ''تم کس کی نیت پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہو؟''

''کک...... کسی کی نہیں......'' وہ گڑبڑا گئی۔

میں اس کی گڑبڑاہٹ کو بہت دور تک سمجھ رہا تھا۔ اس کی کیفیت کے پیش نظر میں نے کہا ''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے...... یعنی گڈ نیوز!''

''کیسی گڈ نیوز؟'' اس نے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''میرا وہ پوٹھوہاری شہزاد' تمہاری اس پٹھانی زرگل میں دلچسپی لے رہا ہے۔''

اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ جھلملانے لگے مگر اپنے تاثرات کی نفی کرتے ہوئے اس نے غیر متعلق انداز میں کہا ''وہ میری پٹھانی کب سے ہوگئی۔ تم خواہ مخواہ اسے میرے کھاتے میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

''چلو' میں نے اسے اپنے کھاتے میں رکھ لیا۔'' میں نے صدف کو چھیڑا ''بہرحال شہزاد بڑے بھرپور انداز میں زرگل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دیکھو یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے!''

اس نے کریدنے والے انداز میں پوچھا ''تمہیں شہزاد کی اس حرکت پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟''

''میں کون ہوتا ہوں اعتراض کرنے والا'' میں نے اس کے زاویے کو سمجھتے ہوئے کہا ''ویسے شہزاد نے مجھ سے 'این او سی' لے لیا ہے۔''

''اوہ!'' صدف نے ایک طویل اور گہری سانس کھینچی۔ اس 'اوہ' میں دنیا جہان کا سکون بھرا ہوا تھا۔ زرگل کے حوالے سے اس کا ذہن صاف ہوگیا تھا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی اور وہ یہ کہ ساحل کے معاملے میں صدف نے کبھی کسی قسم کا کوئی منفی یا اعتراضی رویہ ظاہر نہیں کیا تھا' البتہ وہ زرگل کو مجھ سے دور دیکھنے کی تمنائی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا یہ رویہ ایک خاص زاویے کا تھا۔ وہ ساحل کے علاوہ کسی لڑکی کو میرے قریب دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اس کی محبت کا یہ پہلو بڑا منفرد اور انوکھا تھا۔ میں نے اس پر جتنا غور کیا' الجھتا چلا گیا۔

صدف ان لڑکیوں میں سے تھی جنہیں سمجھنا آسان نہیں... ان پر غور و فکر سے سمجھ کی چولیں ہل کر رہ جاتی ہیں!

تھوڑی دیر بعد ہم صدف کی وہائٹ کی... اسٹوڈیو' کی طرف جا رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر... کا قبضہ تھا اور میں ایڈریس کے سلسلے میں اس کی راہ نمائی... تھا۔ میں نے اچانک اس سے پوچھا۔

''صدف! تمہارے بازو کا زخم اب کیسا ہے؟''

لاہور میں' چوہدری دلدار کی کوٹھی پر فیصل کو قابو... ہوئے صدف کا بایاں بازو کہنی کے قریب سے زخمی ہوگیا... لگ بھگ دو انچ کا کٹ آیا تھا' بعد ازاں میں نے اس کی... پٹی کر دی تھی۔ صدف خود بھی ایک ڈاکٹر تھی۔ میری میڈیکل... اسکل اس کے لیے حیرت کا باعث تھی۔

اس نے بتایا ''زخم ٹھیک ہے۔ تھوڑی اینٹھن اور درد... ہے۔ بہرحال یہ بازو استعمال کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا۔''

ہم مذکورہ اسٹوڈیو پہنچ گئے۔

نسیم جوہر ایک بیوٹیشن ہی نہیں بلکہ وہ ایک... ہیئر ڈریسر بھی تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے فوٹوگرافی... میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ جس طرح ایک ماہر پلاسٹک سرجن ایک اچھا آرٹسٹ بھی ہوتا ہے' اسی طرح نسیم جوہر بھی ایک... آرٹسٹ تھا۔ ایک انسان کے چہرے پر کام کرکے اسے دوسرے انسان کا حلیہ دینا آرٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ شاید... وجہ تھی کہ اس نے اپنے ''کارخانے'' کا نام اسٹوڈیو رکھ چھوڑا تھا۔

صدف نے مجھے بتایا کہ وہ نسیم جوہر کے نام اور شہرت سے واقف ہے تاہم ملاقات کا آج پہلی مرتبہ موقع مل رہا ہے۔ نسیم نے پُرتپاک استقبال کیا۔ اندر سے میں نے اس کا اسٹوڈیو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ وہاں کی آرائش و زیبائش... الاقوامی معیار کی تھی۔ ہماری مختصری تواضع کے بعد وہ مقصد کی بات پر آگیا۔

میں نے کہا ''ایک تو آپ مجھے تبدیل کریں یعنی میرے چہرے کو چینج دیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ مزید کار آمد ٹپس بھی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں اس سلسلے میں خود... ہو جاؤں۔''

وہ بات سننے کے دوران میں بہ غور میرے چہرے... جائزہ لے رہا تھا۔ میں خاموش ہوا تو اس نے کہا ''کیا آپ... مخصوص شخص کے حلیے میں آنا چاہتے ہو؟''

''نہیں'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا ''میں بس اتنا چاہتا ہوں' وجدان نظر نہ آؤں باقی سب کچھ آپ پر چھوڑتا ہوں۔''

''تمہارے فیس کٹس ماضی کے ایک سپر اسٹار سے بڑی حد تک ملتے ہیں۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا اور مسلسل میرے چہرے کو گھورتا رہا۔

میں نے پوچھا ''کہاں کے سپر اسٹار! ہالی ووڈ یا پھر لالی ووڈ؟''

''میں ہالی ووڈ کے مایہ ناز اداکار یل برائنر کی بات کر رہا ہوں!''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا ''میں نے یل برائنر کی دو تین فلمیں دیکھی ہیں لیکن ہم دونوں کی مشابہت میں بہت فرق ہے۔''

''میں مشابہت کی نہیں' فیس کٹس کی بات کر رہا ہوں!''

''ٹھیک ہے' آپ مجھے اس کے اریب قریب بنادیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''مگر میرے بال سلامت رہنا چاہئیں!''

وہ زیر لب مسکرایا اور بولا ''تم اس کی فکر نہ کرو۔''

ہالی ووڈ کا معروف اداکار یل برائنر ٹیلی سوالاس کی طرح ہر وقت اپنا سر منڈوا کر رکھتا تھا۔ بے بال سر ان کی مخصوص شناخت تھی۔ پتا نہیں محاورے کے مطابق وہ دونوں فارغ البال بھی تھے یا نہیں!

نسیم اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ مجھے مفید مشوروں سے بھی نوازنے لگا۔ جب اس نے میرا میک اپ ختم کیا تو میں اس دنیا کے لاتعداد اسرار و نکات سے آگاہ ہو چکا تھا۔ بس تھوڑی سی پریکٹس کی ضرورت تھی...... پریکٹس ہی کسی شے کو مکمل بناتی ہے!

نسیم نے کہا ''میں نے تمہارا جو میک اپ کیا ہے' اگر اس کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی گئی تو یہ چوبیس گھنٹوں تک بالکل ایسا ہی رہے گا۔ آج کل موسم میں زیادہ حدت نہیں اس لیے مذکورہ لمٹ میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔''

اس کے بعد نسیم نے مجھے مزید اہم رموز سے آشنا کیا جس میں مختلف قسم کے اسپرنگ پیڈز کی مدد سے چہرے کے خدوخال کو تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ کانٹیکٹ لینس کے ساتھ ساتھ گالوں اور نتھنوں کے پھیلاؤ اور سکڑاؤ کی تیکنیک بھی بتائی۔ نقلی مونچھوں اور داڑھی کا استعمال بھی سکھایا۔ الغرض اس نے منہاس باقر سے تعلق کا حق نبھا دیا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو مختلف قسم کے ضروری ساز و سامان کی ایک بڑی تعداد و مقدار بھی ہمارے ساتھ تھی۔

''اس سامان کے لیے میں کیا پیش کروں؟'' میں نے شائستگی سے اخلاقیات نبھانے کی کوشش کی۔

وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بولا ''کچھ بھی نہیں۔ منہاس صاحب نے مجھے اس سلسلے میں منع کر دیا ہے!''

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ جرح و بحث کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی لہٰذا ہم اس کے اسٹوڈیو سے نکل آئے۔ خالد بن ولید روڈ پر آنے کے بعد میں نے صدف سے کہا۔

''ہمیں واپس فلیٹ پر جانا ہے۔''

اس نے گاڑی کو علامہ اقبال روڈ پر ڈال دیا۔ چند منٹ بعد ہم طارق روڈ پر تھے' ہم فلیٹ کے اندر داخل ہوئے تو صدف نے کہا۔

''وجدان! تمہارا بدلا ہوا حلیہ بتا رہا ہے تم کسی نہایت ہی اہم مشن پر روانہ ہونے والے ہو تم مجھ سے چھپا کیوں رہے ہو؟''

میں نے الٹا اسی کو پکڑ لیا ''صدف! تم نے وعدہ کیا تھا' گزشتہ رات والے معرکے کے بعد تم اس آتشیں کھیل سے الگ ہو جاؤ گی اور پوری توجہ اپنی تعلیم پر دو گی۔ میں نے اسی وعدے کی بنیاد پر تمہیں کل رات اپنے ساتھ رکھا تھا اور اب تم......''

اس نے میری بات مکمل نہ ہونے دی اور بات کو سنبھالتے ہوئے بولی ''میں کب تم سے ضد کر رہی ہوں کہ آج کے مشن میں بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنا۔'' اس کے انداز میں بہت کچھ ڈھکا چھپا تھا ''میں تو صرف جاننا چاہتی ہوں آج تم کس قسم کی ہنگامی مصروفیات میں رہو گے؟''

اس نے بات ایسی کر دی کہ میں اسے جے ڈی ملک کے بارے میں بتانے پر مجبور ہوگیا۔ صدف ایک قابل اعتماد اور مخلص دوست تھی۔ ایسے جاں نثار ساتھیوں پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ میں تو محض اسے محفوظ رکھنے کے لیے احتراز برت رہا تھا کہ کہیں وہ بھی میرے ساتھ پرواز کے لیے پر نہ تولنے لگے۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا ''صدف! تم جان چکی ہو' منہاس صاحب کی فیملی پر جو قیامت برپا کی گئی اس کا ذمے دار چوہدری نوازش کا ایک مہرۂ خاص جے ڈی ملک ہے۔ میں نے اس کے آلۂ کار چار کمانڈوز کو جہنم واصل کر دیا ہے۔ شہزاد ان کمانڈوز کے 'ابا جان' یعنی جے ڈی ملک کو عبرت ناک انجام سے گزارنا چاہتا ہے۔ ہمیں پتا چلا

ہے ملک اپنے ایک دوست صفدر علی کے بنگلے پر چھپا بیٹھا ہے۔ میں جے ڈی ملک کو نارتھ ناظم آباد کے مذکورہ بنگلے سے نکال کر شہزاد کے حوالے کردوں گا۔ باقی وہ جانے اور اس کا کام!"

میری بات ختم ہوئی تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا "صدف! تم یہ مت سمجھو کہ میں تمہیں بالکل ہی نظر انداز کر رہا ہوں۔ آج ایک مشن میں تم میرا ساتھ دوگی۔"

اس کی آنکھیں چمک اٹھیں "کون سا مشن؟"

"لنچ مشن!"

"کیا تم میرے ساتھ کہیں لنچ پر جانا چاہتے ہو؟"

"کہیں کیا مطلب!" میں نے تیز لہجے میں کہا "آج کا لنچ تمہارے گھر پر ہوگا۔"

وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی "مگر...... میں تو انہیں منع کر چکی......"

"تو کیا منع کرنے کے بعد تمہارے گھر والے ہمیں کھانا نہیں دیں گے؟"

"ایسی بات نہیں۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "میرا مطلب ہے وہ اہتمام......"

"کسی اہتمام کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے قطعیت سے کہا "جو دال روٹی ملے گی وہ کھالیں گے۔ اصل مقصد تو تمہارے پاپا مما سے ملاقات کرنا ہے نا۔ دعوت اور اہتمام پھر کبھی سہی!"

وہ اس دوران میں یک ٹک میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جلدی سے بولی "لیکن اس وقت تو تم اپنے حلیے میں نہیں ہو۔ میرا مطلب ہے وجدان کے بجائے کچھ اور بن چکے ہو۔ میں وجدان کی حیثیت سے تمہارا تعارف کس طرح کراؤں گی۔ یہ تو ایک کھلا جھوٹ ہوگا۔ ماموں اورنگزیب نے جس وجدان کو دیکھا ہے پاپا اس سے مختلف وجدان کو دیکھیں گے تو گڑبڑ نہیں ہوجائے گی!"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا "اور نہ ہی تمہیں کھلا یا بند جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے۔ تم سیدھا سیدھا کہہ سکتی ہو اس وقت میں ہلکے میک اپ میں ہوں۔ اللہ اللہ خیر سلا!"

وہ مطمئن ہوگئی۔ میں نے میک اپ اور گیٹ اپ کے سامان کو فلیٹ میں لاک کیا اور صدف کی وہائٹ سٹی میں سوار ہوکر اس کے گھر واقع فیز دن' ڈیفنس سوسائٹی روانہ ہوگیا۔ صدف کی رہائش سی ایف کے کے سابق "ساؤتھ" کے نزدیک ہی تھی جہاں قریب ہی ایک سرسبز وشاداب پارک بھی موجود تھا۔ مذکورہ پارک کے ایک کونے میں جدید طرز تعمیر کی حامل ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی۔ صدف سے میری پہلی ملاقات اسی پارک میں ہوئی تھی۔

راستے میں' میں نے صدف سے پوچھا "جب میں تمہارے ڈی ایس پی ماموں اورنگزیب خان سے پہلی مرتبہ ملا تھا تو تم نے ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے میرا تعارف کروایا تھا۔ یاد ہے نا' جب ایک ریسٹورنٹ میں سکندر نامی غنڈے سے معرکہ ہوا تھا۔ وہ تمہاری کزن نادیہ کے ساتھ بدتمیزی کر رہا تھا!"

"اس منظر کا ایک ایک لمحہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولی "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ...... آیا تم نے اپنے والدین سے بھی اسی حوالے سے مجھے متعارف کروایا ہے؟"

"تمہارا ابتدائی تعارف پھل پھول اور پھیل کر اب کافی طویل وعریض ہوچکا ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "نادیہ کو تمہاری اصلیت معلوم تھی اور وہ ہمارے راز کی امین بھی ہے لیکن جب تم مجھے سمجھا بجھا کر لاہور میں چھوڑ کر کراچی آگئے تو تمہارے تعارف کو کھولنا ضروری ہوگیا۔ ماموں جانتے تھے تم فرید پاشا کی کوٹھی پر رکے ہوئے ہو اور میں تمہارے ساتھ کسی گاؤں کی سیر کو جارہی ہوں۔ ہم دونوں نے گاؤں کی سیر کا "لطف" جس طرح اٹھایا۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ازاں بعد فرید پاشا کی گلبرگ والی کوٹھی پر جو خون آشام واقعات پیش آئے وہ ماموں کے علم میں بھی آگئے۔ وہ پاشا انکل سے جاکر ملے تو مزید نئی کہانیاں ابھر کر سامنے آگئیں۔ ماموں نے گھر آکر اس سلسلے میں مجھ سے استفسار کیا تو میں نے تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر انہیں حقیقت سے آگاہ کردیا۔"

"کون سی حقیقت؟" اس کی بات ختم ہوئی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"تمہاری حقیقت اور کون سی!"

میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

"تمہیں اتنا زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت بھی نہیں کہ سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ۔"

میری سماعت سے صدف کی تسلی بردار آواز ٹکرائی "میں نے اپنے حوالے سے ایک لفظ بتا کر نہیں دیا۔"

"یہ تو اور بھی زیادہ خطرناک بات ہے۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "تمہارے پاپا کو تشویش ہوسکتی ہے کہ ان کی بیٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ کیوں گھومتی پھرتی ہے جو دردر کی خاک چھانتے ہوئے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہے!"

"میں نے تمہاری خوبیوں اور صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولی "لہٰذا پاپا کے دل میں تم سے ملنے کا اشتیاق جاگا۔ پھر انکل ذوالفقار زیدی سے بھی پاپا کی بات ہوئی تھی۔ تم سمجھ رہے ہو میں کون سے انکل کا ذکر کررہی ہوں۔"

میرا دھیان اس وقت کسی اور تانے بانے میں لگا ہوا تھا اس لیے بے توجہی سے کہہ دیا "پتا نہیں تم اپنے کون سے انکل کی بات کررہی ہو۔ ایک تو تم نے انکل بھی بہت سارے پال رکھے ہیں اور...... سب کے سب ہی تگڑے!"

وہ میری بات کا برا منائے بغیر بولی "میں ائرپورٹ منیجر ذوالفقار زیدی کا ذکر کررہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے نا' ڈارلنگ کے سلسلے میں انہوں نے ہماری بہت مدد کی تھی۔"

میں ڈارلنگ کے ذکر پر چونک اٹھا اور مجھے ائرپورٹ پر پیش آنے والا وہ عجیب وغریب واقعہ یاد آگیا۔ ڈارلنگ نامی اس پُراسرار سفید بلی نے لائیو اسٹاک کنٹینر میں پہنچتے ہی ایسا چکر چلایا تھا کہ وہاں موجود تمام جانوروں کی احتجاجی صدائیں ہر طرف گونجنے لگیں۔

ڈارلنگ کا تصور مجھے بہت دور تک لے گیا۔ اس بلی نے کسی محبوبہ کے مانند میرے ساتھ کئی شب وروز گزارے تھے اور بالآخر نقلی وجدان نے اسے ہلاک کردیا۔ اس کا دعویٰ تھا ڈارلنگ کے اندر کوئی بدروح چھپی ہوئی تھی جو مجھے شدید نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ ڈارلنگ کی ہلاکت جن حالات میں ہوئی اس وقت میں نقلی وجدان کی بات کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن اب جب کہ میں اس بہروپیے کی طرف سے خاصا بیزار بیٹھا تھا تو ایک خیال ذہن میں یہ بھی آرہا تھا کہ کہیں ڈارلنگ نقلی وجدان کی کسی غلط فہمی کا شکار تو نہیں ہوگئی تھی۔ بہرحال وہ جب تک میرے ساتھ رہی' اس ایک مخلص دوست' ایک وفادار محبوبہ کا کردار ادا کیا تھا' جب میں نقلی وجدان کی تھیوری کی روشنی میں ڈارلنگ کے اعمال وافعال کا جائزہ لیتا تو اس بلی کا کردار کسی گہری سازش سے کم دکھائی نہ دیتا۔ میرا ذہن ڈارلنگ کے حوالے سے ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔

"پاپا تم میں ایک خاص وجہ سے دلچسپی لے رہے ہیں۔" صدف کی آواز نے خیالات کا دھارا موڑ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی "تم مجھے جس طرح تعلیم کی طرف راغب اور مائل کررہے ہو اس بات نے انہیں بہت متاثر کیا ہے۔ وہ تمہارے احسان

ہر دلعزیز شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے

ایک سنسنی خیز سرگزشت

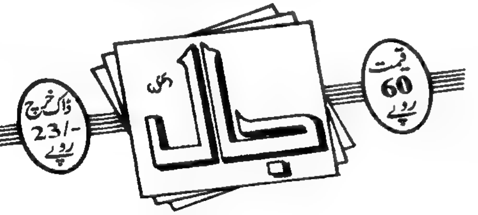

ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے

کتاب کی قیمت ۔ معہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551 Email: kitabiat1970@yahoo.com

مند ہیں کہ تم ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے کوشاں ہو۔“

”اس غائبانہ احسان مندی اور متاثری کے بارے میں، میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں!“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ جواب میں وہ کہنے لگی، بہت کچھ کہنے لگی اور کہتی چلی گئی!

☆☆☆

شہزاد ایک اچھوتا آئیڈیا لایا تھا۔

اس وقت سہ پہر کے تین بجے تھے اور میں تھوڑی دیر پہلے ہی اس زیرِ تعمیر بنگلے میں پہنچا تھا۔ صدف کے گھر پر لنچ بہ خیر و عافیت ہوگیا۔ ہلکی پھلکی گفتگو رہی صدف نے مجھے اپنی گھریلو ملازمہ اگنس سے بھی ملوایا۔ وہ سانولی سلونی باتونی لڑکی اپنے اندر ایک مخصوص قسم کی کشش رکھتی تھی۔ صدف کے پاپا خالص ایک کاروباری شخص مجھے یقین ہے اس ملاقات اور لنچ کے لیے صدف ہی نے زور مارا ہوگا۔ بہرحال صدف مجھے اپنی گاڑی میں اس ٹھکانے پر چھوڑ گئی تھی۔ فیصل والا معاملہ اس سے پوشیدہ نہیں تھا لہٰذا کسی قسم کی پردہ داری کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ میری ایک ایسی ساتھی تھی جس پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ میں نے بہ وقتِ رخصت اسے یہاں کا فون نمبر بھی دے دیا تھا۔

میں یک ٹک شہزاد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی میں بولا۔

”وجدان! جے ڈی ملک کو اس کی تازہ ترین پناہ گاہ سے نکالنا بہت آسان ہے۔ بس اس کے لیے مجھے تھوڑی سی نقالی کرنا ہوگی......اور میرا یقین ہے، میں بہ خوبی ایسا کرلوں گا۔“

اس وقت ہم ٹیلی فون والے کمرے میں تھے۔ بنگلے کے ایک دور افتادہ حصے میں زرگل بڑی ہوشیاری سے فیصل کی نگرانی کررہی تھی۔ میں نے شہزاد کی بات کے جواب میں کہا۔

”تم کس نقالی کی بات کررہے ہو؟“

”آواز کی نقالی۔“ اس نے بتایا ”فیصل کی آواز کی نقالی!“

”ذرا تفصیل بتاؤ۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ”میں نے بڑی گہرائی سے فیصل کو واچ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے میں پورے اعتماد کے ساتھ فیصل کے لب و لہجے میں بات کرسکتا ہوں۔ جے ڈی ملک کی پناہ گاہ کا فون نمبر میں نے حاصل کرلیا ہے۔ اگر میں فیصل بن کر اس سے رابطہ کروں اور اسے کسی مخصوص مقام پر پہنچنے کو کہوں تو وہ یقیناً میرے حکم کی تعمیل کرے گا۔ میں (فیصل) اس کے باپ چوہدری نوازش کا بیٹا ہوں گا۔ وہ کسی قسم کی چوں چراں نہیں کرسکتا۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”اس طے شدہ مقام سے ہم بہ آسانی جے ڈی ملک کو اغوا کر کے اپنی پسند کی جگہ پر پہنچا سکتے ہیں، تمہارا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟“

”آئیڈیا بُرا نہیں ہے۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا پھر پوچھا ”اغوا کے بعد تم جے ڈی ملک کو کہاں پہنچانا چاہتے ہو؟“

”سرجانی ٹاؤن والے ٹھکانے پر۔“ اس نے بتایا ”اس الگ تھلگ مقام پر اس سے نمٹنے میں بہت مزہ آئے گا۔ اس سلسلے میں تم تھوڑا ذہن دوڑاؤ۔“ وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا ”وجدان! تم بڑی سرعت سے بے داغ کہانیاں بُن لیتے ہو۔ فیصل کے لیے چند لائنوں کا ایک اسکرپٹ تیار کرو جو وہ فون پر جے ڈی ملک سے بولے گا۔ جملے تاثر انگیز اور عمل خیز ہونا چاہئیں۔“

”میں نے ذہن دوڑا دیا۔“ میں نے ایک دم چونکتے ہوئے کہا ”تمہارا آئیڈیا جتنا عمدہ ہے اس کے لیے اسکرپٹ بھی جان دار ہونا چاہئے، بالکل جینوئن۔ تمہیں کسی قسم کی اداکاری یا نقالی کی ضرورت نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور کہا ”جب اصلی فیصل ہمارے پاس موجود ہے تو پھر نقالی کا رسک کیوں لیں......اور سرجانی کی طرف جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس یہ ایک محفوظ ٹھکانا ہے۔ جب ہم فیصل کو یہاں کنٹرول کیے ہوئے ہیں تو ایک جے ڈی ملک بھی سہی۔ بندہ اور بندہ نواز کو ایک ہی چھت کے نیچے وقت گزارنا چاہئے۔ چوہدری نوازش اور اس کا سپوت چوہدری فیصل، جے ڈی ملک کے ان داتا اور آقا ہیں۔ آقا اور غلام کے تعلق کو جڑے رہنا چاہئے۔“

میں ایک لمحے کو خاموش ہوا، پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ”میں فیصل کے لیے ایک مؤثر اسکرپٹ تخلیق کرتا ہوں تاکہ ہمارا کام آسان ہوجائے۔“

”اگر ایسا ہوجائے تو مزہ آجائے گا۔“ وہ مسرور کن لہجے میں بولا ”انڈر دن روف کارروائی کا لطف دوبالا ہوجائے گا۔ فیصل سے ایک خون ریز مقابلہ اور جے ڈی ملک سے ایک......“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر معنی خیز نظر سے مجھے تکنے لگا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے شہزاد کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کردیا۔ یہ پلاننگ بڑے ہنگامی انداز میں میرے ذہن میں ترتیب پائی تھی۔ شہزاد کو فیصل کے پاس جا کر میری مرضی کے مطابق ایک ڈیل کرنا تھی۔ اس کام کے لیے اگر فیصل آمادہ

ہوجاتا تو فبہا۔ بصورتِ دیگر ہم کوئی اور راہ نکالتے۔ مجھے امید تھی، فیصل اپنی آزادی کی خاطر ہماری بات ماننے پر تیار ہوجاتا۔

زرگل کو واپس بلالیا گیا اور میں شہزاد کے ساتھ فیصل کے پاس پہنچ گیا۔ میں اس وقت میک اپ میں تھا اور شہزاد و زرگل اس راز سے واقف تھے۔ فیصل کے لیے میں ایک نیا چہرہ ایک اجنبی شخص تھا اور ویسے بھی مجھے خاموش رہنا تھا، فیصل سے معاملاتی گفتگو شہزاد ہی کو کرنا تھی۔

فیصل کو اس زیرِ تعمیر بنگلے کے انتہائی محفوظ گوشے میں رکھا گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے حرکات و سکنات کے قابل نہیں تھا۔ بہ قول شخصے ہم نے اسے نتھ ڈال کر رکھی تھی تاہم وہ اگر چیخ دہاڑ کر بھی کسی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی سعی کرتا تو اس کی یہ کوشش رائگاں ہی جاتی۔ پولیس کی کارروائی کے بعد وہ بنگلا ہمارے لیے اور بھی زیادہ موزوں اور محفوظ ہوگیا تھا۔ گویا ایک طرح سے اسے ”این او سی“ حاصل ہوگیا تھا۔ اب اس طرف کسی کا دھیان جانے کی امید نہیں تھی۔

ہم فیصل کے پاس پہنچے تو وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا۔ شہزاد تو اس کے لیے شناسا تھا لیکن میں نئی انٹری تھا۔ شہزاد نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے فیصل کو مخاطب کیا اور بولا۔

”لگتا ہے تمہاری قسمت خاصی یاور ہورہی ہے!“

”کوئی نئی چال چلنے آئے ہو؟“ وہ بہ دستور مجھے گھورتے ہوئے شہزاد سے بولا۔

شہزاد نے کہا ”میری نیت پر شک نہ کرو۔ میں تمہیں آزادی کی نوید سنانے آیا ہوں۔ تم آج کی تاریخ میں اس غم زدہ زندگی سے نجات حاصل کرسکتے ہو لیکن اگر تم میں تھوڑی سی بھی سمجھ بوجھ ہوئی تو!“

شہزاد نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو فیصل ایک لمحے کا تامل کیے بغیر بولا ”تم کس سمجھ بوجھ کی بات کررہے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک ابھر آئی تھی۔

آزادی کی خبر ہر انسان کو بے پناہ خوشی پہنچاتی ہے اور طاقت ور انسان اگر چند روز کے لیے بے بسی و بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوجائے تو آزادی اس کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ کی شکل و حیثیت اختیار کرجاتی ہے وہ اس آزادی کے حصول کی خاطر ہر بات ہر شرط، ہر مطالبہ ماننے پر تیار ہوجاتا ہے۔ فیصل کا ردِ عمل عین فطری اور حالات کے تقاضوں کے یکسر مطابق تھا۔

شہزاد نے میری ہدایات کے مطابق ”کھیل“ جاری

ایک مقبول ترین سلسلہ
شاطر
• شاطر کو مشہور انعام یافتہ مصنف شکیل احمد نے خاص انداز میں تحریر کیا ہے۔
• ایک ایسی دلچسپ ہنگامہ آرا اور سنسنی خیز داستان جس میں قدم قدم سسپنس اور سطر سطر قیامت آرائی ہے۔
قیمت فی حصہ 60 روپے
2 حصے مکمل
ڈاک خرچ 23 روپے
کتابی شکل میں شائع ہو گیا ہے
کتاب کی قیمت بذریعہ پیشگی ڈرافٹ، منی آرڈر یا کراسڈ چیک ارسال کریں
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23
کراچی 74200
5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com

رکھا اور گمبھیر لہجے میں بولا ”فیصل! یہ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں۔ خان بہادر!“ بات ختم کرتے ہی اس نے میری جانب اشارہ کردیا۔ فیصل نے بڑی گہری اور الجھی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

میں نے مسکراہٹ کے انداز میں ہونٹوں کو سکیڑا تاہم زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ شہزاد سلسلۂ کلام کو دراز کرتے ہوئے بولا۔

”اگر تم آج کی تاریخ میں آزادی چاہتے ہو تو ان کی ایک فرمائش پوری کردو۔ میں تمہیں بہ خوشی جانے کی اجازت دے دوں گا۔“

فیصل نے استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ”کس قسم کی فرمائش؟“

میرے بجائے شہزاد نے اسے بتایا ”خان بہادر کی ایک شخص سے بہت پرانی دشمنی ہے۔ مذکورہ شخص نے میرے اس دوست کو بے حساب نقصان پہنچایا ہے۔ اگر تم اس دشمن شخص کو میرے دوست کے حوالے کردو تو تمہاری جان چھوٹ سکتی ہے۔“

وہ ایک پتے کی بات کرتے ہوئے بولا ”دراصل میں تو وجدان کا قیدی ہوں۔ اگر تم مجھے کسی شرط کے بدلے آزاد کردو گے تو وجدان کو کیا جواب دو گے اور......“ وہ ایک لمحے کو رکا پھر متذبذب انداز میں بولا ”اور ابھی تک تو میں یہ بھی نہیں جانتا کہ تم مجھ سے کس شخص کا مطالبہ کررہے ہو؟“

”زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ شہزاد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”جب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ خان بہادر میرا دوست ہے تو اس کا مطلب یہی ہے یہ وجدان کا بھی دوست ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وجدان سے فون پر میری بات ہوئی ہے۔ میں اسی کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق تم سے سودے بازی کررہا ہوں۔“ وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا۔

شہزاد کو میں نے جتنا کچھ سمجھایا تھا‘ وہ اس سے بڑھ کر پرفارم کررہا تھا...... اور خوب پرفارم کررہا تھا۔ اس تیار ہنڈیا کو اس نے خوشبودار بگھار لگاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ وجدان نے اپنی ساتھی ساحل کا سراغ لگالیا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں وہ وجدان کی دست رس میں ہوگی۔ وجدان کے جان نثار دستے نے شعیب غوری کو شدید نقصان پہنچا کر ساحل کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا ہے اور اب تک وہ وجدان کے پاس پہنچ چکی ہوگی یا پہنچنے ہی والی ہوگی۔ خود سوچو اس کے بعد تم اور تمہاری حیثیت وجدان کی نظر میں دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔ وہ تم کو اچار مربہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ تم لوگوں سے اس کی جنگ ساحل کی خاطر تھی۔ جب وہ اس کے قبضے میں آگئی تو سب کچھ ختم ہوکر رہ جاتا ہے۔ وجدان خواہ مخواہ کی قتل و غارت گری کو پسند نہیں کرتا۔ اس لیے تمہارے ذریعے اپنے ایک دوست خان بہادر کا بھلا چاہتا ہے۔ اب یہ تمہاری سمجھ بوجھ پر منحصر ہے کہ تم کس طرح خان صاحب کے کام آتے ہو۔ میں تمہیں......“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ”تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میں کس شخص کو تمہارے اس دوست خان بہادر کے حوالے کروں اور کس طرح...... میں تو خود تمہارے رحم و کرم پر ہوں!“

”میں تمہیں یہی سب کچھ بتانے جارہا تھا لیکن تم ٹانگ چلانے سے باز نہیں آئے۔“ شہزاد نے اسے گھرکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”تم اس شخص سے فون پر رابطہ کروگے بلکہ ہم تمہارا رابطہ کرائیں گے۔ تم اسے ہمارے بتائے ہوئے ایک مخصوص مقام پر پہنچنے کا حکم دو گے۔ وہ تمہارا حکم سن کر دوڑا چلا آئے گا اور......“

”کون دوڑا چلا آئے گا؟“ وہ ایک مرتبہ پھر شہزاد کی بات پوری ہونے کا انتظار نہ کرسکا۔

شہزاد نے اسے بری طرح جھڑکا ”لگتا ہے تمہاری زبان میں بڑی خارش ہے۔ مجھے مجبور نہ کرو کہ میں اس گوشت کے لوتھڑے کو تمہاری گدی سے کھینچ باہر نکالوں!“

فیصل ناگواری سے باری باری ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔

شہزاد نے زہرخند لہجے میں انکشاف کیا ”تمہارے اس رشتے دار کا نام جے ڈی ملک ہے!“

”جے ڈی ملک!“ وہ اس طرح اچھلا جیسے بجلی کا ننگا تار چھولیا ہو۔

اسے پے در پے حیرت کے جھٹکے لگ رہے تھے۔ یہ خبر ہی کچھ کم غضب کی نہیں تھی کہ میں نے ساحل کو دستیاب کرلیا تھا۔ اس پر جے ڈی ملک کی حوالگی کا مطالبہ! فیصل کی حالت دیدنی تھی۔ ویسے ایک بات ہے جب شہزاد نے ساحل کے حصول کی بات کی تو میرے دل سے ”آمین!“ نکلا تھا۔ یہ ایک بے ساختہ جذبہ تھا۔

ہم فیصل سے اچھی خاصی غلط بیانی کررہے تھے اور یہ سب کچھ مصلحت اور حالات کا تقاضا تھا۔ ہمارے دشمن دودھ پیتے معصوم بچے نہیں تھے اور نہ ہی عبادت گزار نیک دل انسان۔ وہ جتنے سفاک اور بے رحم تھے‘ اس کے پیش نظر ان سلوک کے متقاضی تھے۔

فیصل کے اچھلنے پر شہزاد نے کہا ”ہاں میں اسی جے ڈی ملک کا ذکر کررہا تھا جو تم لوگوں کا کراچی نیٹ ورک چلا رہا ہے۔ تمہارے باپ نے میاں زاہد حسین کی جگہ اسے دے دی ہے لیکن یہ ملک سخت نالائق ثابت ہوا ہے۔ اس نے چند روز میں پے در پے اتنی غلطیاں کی ہیں کہ تمہارا باپ بھی اس سے خوش نہیں۔“

”لیکن وہ تو اباجی کا بہت خاص آدمی ہے۔“ فیصل تردد آمیز لہجے میں بولا ”اسے کسی دشمن کے حوالے کرنے کے لیے پہلے مجھے بڑے چوہدری صاحب سے بات کرنا ہوگی۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں اپنی آزادی بلکہ زندگی سے کوئی لگاؤ نہیں۔“ شہزاد نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا ”کان کھول کر سن لو‘ وجدان نے تمہیں مکمل طور پر میرے سپرد کردیا ہے۔ اس کی محبوبہ اسے مل گئی ہے۔ میں اب تمہارے ساتھ جو بھی سلوک کروں‘ وجدان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور میں تمہارے جسم و جان کو جس عذاب سے گزاروں گا‘ تم اس تکلیف اور اذیت کا تصور کرکے ہی بے ہوش ہوجاؤ گے۔ میں تمہاری روح فنا کرکے رکھ دوں گا۔“

فیصل خاصا متفکر نظر آنے لگا۔ اسے شش و پنج میں دیکھ کر شہزاد نے ایک اور ردا چڑھایا ”یہ تمہارے ہاتھ میں آیا ہوا آخری موقع ہے فیصل! تم نے اپنی آزادی کے لیے ہمارے سیکیورٹی گارڈ سہیل کو ایک کروڑ روپے کی پیش کش کی تھی اور یہ رقم تم اسے جے ڈی ملک ہی سے دلوانے والے تھے۔ اس ڈیل کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس پر بات کرنا فضول ہے۔ قسمت کی مہربانی نے تمہیں ایک اور نادر موقع دیا ہے۔ اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو اس غلطی پر پچھتانے کے لیے تم زندہ نہیں رہو گے‘ اینڈ اٹ از فل اینڈ فائنل!“

شہزاد کے لہجے میں پوشیدہ سنگینی نے فیصل کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ وہ مبہم سے لہجے میں بولا ”میں کس طرح جے ڈی ملک کو تمہارے حوالے کروں۔ میں تو خود قید و بند میں پڑا ہوں؟“

”تمہیں اس نیک کام کے لیے کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔“ شہزاد نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”ہماری ”مہمان نوازی“ میں شاید تمہاری یادداشت کو خاصا دھچکا لگا ہے۔ خاص طور پر شارٹ ٹرم میموری کو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تم صرف جے ڈی ملک کو فون پر ہمارے بتائے ہوئے مقام تک آنے کا حکم دو گے۔ ہم ملک کو مذکورہ مقام سے پک کرکے یہاں لے آئیں گے اور بس تمہاری چھٹی!“

وہ تعاون آمیز نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھنے لگا۔

شہزاد نے کہا ”میں تمہیں سوچ بچار کے لیے چار گھنٹے دیتا ہوں۔ اگر تم میری بات ماننے کے لیے تیار ہوگئے تو میں ٹھیک آٹھ بجے رات جے ڈی ملک سے تمہارا رابطہ کراؤں گا۔ اس سے اپنے حکم کی تعمیل کرانا تمہارا کام ہے۔ میں صرف تمہیں ٹپس دے سکتا ہوں۔ وہ اگر فوری طور پر اپنی پناہ گاہ سے روانہ ہوگیا تو تیس پینتیس منٹ میں ہمارے مطلوبہ مقام تک پہنچ جائے گا۔“ شہزاد میرے رٹائے ہوئے سبق کو دُہرا رہا تھا۔

فیصل نے اس کی بات کے اختتام پر کہا ”پناہ گاہ!“ اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت تھی۔

شہزاد نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ”جے ڈی ملک کی رہائش گاہ پر جو قیامت ٹوٹی ہے اس نے اسے سر پر ٹانگیں رکھ کر فرار ہونے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ اس وقت اپنے ایک دوست صفدر علی کے بنگلے پر نارتھ ناظم آباد میں چھپا ہوا ہے۔ میں اسی بنگلے کے فون نمبر پر اس سے تمہاری بات کراؤں گا۔ میں نے اس روپوش ملک کے لیے جبھی تو ”پناہ گاہ“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں!“

فیصل گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے انداز سے آمادگی جھلکتی تھی۔ وہ چوہدری زادہ تھا اور ان لوگوں کے نزدیک اپنے ملازموں یا آلۂ کاروں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی‘ چاہے ایسا شخص جے ڈی ملک ہی کیوں نہ ہو۔ فیصل کی سلامتی کی خاطر درجنوں جے ڈی ملکوں کو قربان کیا جاسکتا تھا۔

میں شہزاد کے ساتھ واپس ٹیلی فون والے کمرے میں آگیا۔ زرگل وہاں موجود تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی‘ فیصل کے ساتھ ہم نے کس قسم کے مذاکرات کیے ہیں اور اسے یہ سب کچھ جاننا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اس بنگلے پر آئندہ پانچ چھے گھنٹوں میں جو واقعات پیش آتے وہ خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیتی۔

میں نے فیصل کو سوچنے کے لیے اتنی زیادہ مہلت اس لیے بھی دے دی تھی کہ میں اندھیرا ہونے کا انتظار کررہا تھا۔ اندھیرا بے پناہ خوبیوں کا مالک ہے۔ یہ بہت سے عیوب کو اپنے سیاہ سینے میں چھپالیتا ہے۔ ہم اپنے انتقام کی خاطر جو کچھ کرنے جارہے تھے‘ وہ بہرحال ایک جرم ہی تھا۔ اندھیرے کی آڑ میں ایسے کام آسانی سے ہوجاتے ہیں۔ تاریکی جہاں گناہ کو جنم دیتی ہے‘ وہیں وہ اسے تحفظ بھی فراہم کرتی ہے۔

چاہے کچھ بھی ہے' تارکی وفا نبھانا جانتی ہے!

تھوڑی دیر بعد زگل فیصل کی نگرانی کے لیے وہاں سے اٹھ گئی۔ میں نے شہزاد سے کہا ''اب میں چلتا ہوں۔ شام سے پہلے آنے کی کوشش کروں گا اور اگر کچھ دیر بھی ہوگئی تو پھر بھی آٹھ بجے سے پہلے تو ضرور لوٹ آؤں گا۔''

میں اسے بتا چکا تھا کہ منہاس باقر نے مجھے اپنے بنگلے پر بلایا ہے۔ ہمارے درمیان ضروری نوعیت کے کچھ امور طے ہوئے پھر میں وہاں سے رخصت ہونے لگا تو شہزاد نے کہا۔

''وجدان! تم چاہو تو سوک لے جاؤ۔ مجھے تو کہیں آنا جانا نہیں۔''

لائٹ گرین کلر کی ہونڈا سوک پورچ میں کھڑی تھی تاہم میں نے اسے لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے تو چند قدم پیدل چلنے کے بعد کوئی ٹیکسی مل جاتی۔ لیکن اگر اس بنگلے پر کوئی ایمرجنسی پیش آجاتی تو وہ گاڑی بہت مفید ثابت ہوتی۔

''گاڑی کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

شہزاد نے اصرار نہیں کیا اور میں بنگلے سے نکل آیا۔

منہاس باقر کا وہ بنگلا اپنی تعمیر کے آخری مراحل میں تھا چوں کہ مکمل نہیں ہوا تھا اس لیے میں اسے بار بار زیر تعمیر ہی لکھ رہا ہوں حالاں کہ اس کی تکمیل میں بہت تھوڑا کام باقی تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ منہاس نے تعمیری عمل کو ایک عرصے سے کیوں روک رکھا تھا؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سے اس موضوع پر بات کرنے کی مجھے فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔

میں دو ڈھائی سو گز پیدل چلا تھا کہ ایک ٹیکسی مل گئی۔ منہاس باقر کا بنگلا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اس کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ نئے گارڈز میرے لیے اجنبی تھے پھر اس وقت میں بھی اپنے اصل حلیے میں نہیں تھا اس لیے جان پہچان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جب میں نے انہیں اپنا نام بتایا تو وہ اٹین شن ہوگئے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ایک اجڑے ہوئے گھر کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد منہاس باقر میرے پاس تھا۔ ہم نے بڑی گرم جوشی سے خاموشی اور جذباتی معانقہ کیا پھر وہ سنجیدگی سے بولا۔

''دوسرے کمرے میں آجاؤ۔ وہ سب لوگ ادھر بیٹھے ہیں۔''

میں نے رسمی علیک سلیک میں منہاس کو اپنے حلیے کے بارے میں پہلی فرصت میں بتادیا تھا مگر اس نے ابھی تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تھا کہ وہ مجھے کن لوگوں سے ملوانا چاہتا تھا۔ میں اس کی معیت میں ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔ پھر میں نے جیسے ہی اس کمرے میں قدم رکھا' میرا سر خود بخود ندامت سے جھک گیا۔

میری نظر نے وہاں فرید پاشا' قاضی سلطان اور شبانہ کے شوہر کو بیٹھے ہوئے دیکھا اسی لمحے فرید پاشا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ منہاس باقر سے پوچھ رہا تھا۔ ''یار منہاس! کیا واقعی یہ وجدان ہے؟''

اس وقت تک منہاس نے انہیں میرے تبدیل شدہ حلیے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ قاضی سلطان اور منہاس کا داماد بھی شک زدہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ منہاس نے مختصر الفاظ میں انہیں میرے بارے میں بتا کر مطمئن کردیا۔

قاضی سلطان اپنی جگہ سے اٹھا اور بانہیں وا کرتے ہوئے میری جانب بڑھا ''بڑا ترپایا ہے تم نے وجدان!'' اس کے انداز میں والہانہ پن تھا۔

میں بے اختیار اس کے سینے سے جالگا۔ وہ کافی دیر تک مجھے بھینچے خاموش کھڑا رہا۔

قاضی سلطان کے بعد فرید پاشا کی باری آئی۔ لاہور کی آب وہوا اور خالص خوراک کا دل دادہ وہ شخص بڑے محبت بھرے انداز میں مجھ سے بغل گیر ہوا اور کئی لمحات تک ہولے ہولے میری پشت کو تھپکتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے شبانہ کے شوہر سے معانقہ کیا۔

وہ سب لوگ منہاس باقر کا غم بانٹنے آئے تھے۔ منہاس نے مجھے ان کے بارے میں پیشگی کچھ نہیں بتایا تھا لہٰذا یہ ملاقات میرے لیے کسی سرپرائز سے کم نہ تھی۔ دوستوں پر احسان نہیں کیا جاتا لیکن قاضی سلطان اور فرید پاشا بار بار میرے تعاون اور کارناموں کو سراہ رہے تھے جس سے مجھے اور زیادہ شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز کو دو مرتبہ بازیاب کیا تھا۔ ایک دفعہ بنی سر میں جب ڈاکوؤں نے اسے بھاری تاوان کے لیے اغوا کیا تھا اور دوسری بار وہ ساحل کے ساتھ اغوا کی گئی تھی۔ ممتاز کو میری راہ نمائی میں عمرکوٹ سے برآمد کرلیا گیا مگر میری ساحل تا حال مجھ سے دور تھی۔ فرید پاشا کی جواں سال خوب رو بیوی نائلہ کو بھی میں نے ایک رات اغوا ہونے سے بچایا تھا۔ ان دونوں کا احسان مندی کا اظہار ایک طرف لیکن میں اس احساس سے بڑی خفت محسوس کررہا تھا کہ میرے سبب منہاس باقر اور فرید پاشا نے بے حد نقصان بھی اٹھایا تھا۔ البتہ شبانہ کا شوہر غیر جانب داری نبھاتے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔

وہ لوگ منہاس کے پاس تعزیت اور دل جوئی کے لیے آئے تھے۔ اس لیے ہلکے پھلکے انداز میں بات چیت کررہے تھے۔ ان لوگوں سے مل کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہورہا تھا۔ میں اپنے اس احساس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا...... اور اس میں منہاس باقر بھی شامل تھا۔ میں کچھ یوں محسوس کررہا تھا جیسے میں زندگی میں ان سے آخری بار مل رہا ہوں!

یہ بڑا خطرناک احساس تھا۔ اگر میری یہ فیلنگز مبنی برحقیقت تھیں تو اس کے دو مطالب نکلتے تھے یا تو وہ لوگ کسی بہت بڑے طوفان کی لپیٹ میں آنے والے تھے اور یا پھر میری زندگی قریب الختم تھی! میں نے ایک جھرجھری لی اور ان تمام ہولناک خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اسی لمحے قاضی سلطان نے کہا ''بھئی ایسے بالکل مزہ نہیں آرہا۔ میں جس وجدان سے بات کرنا چاہتا ہوں' وہ چہرہ کہیں نظر نہیں آرہا۔''

''یار! تم نے پردہ دار بی بیوں کی طرح کیوں میک اپ کا گھونگٹ نکال رکھا ہے۔'' پاشا نے کہا ''قاضی صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر ہم تمہاری یہ نئی صورت دیکھتے رہیں تو بات چیت میں خاک لطف آئے گا؟''

منہاس باقر نے میری حمایت میں کہا ''تم لوگ وجدان کو پریشان نہ کرو۔ اس نے اگر بھیس بدل رکھا ہے تو کسی خاص مقصد کے لیے یہ رنگ اپنایا ہوگا۔ بات چیت تو ایسے بھی ہوسکتی ہے۔''

''نہیں ہوسکتی ایسے بات چیت۔'' قاضی سلطان نے ضدیلے انداز میں کہا۔

فرید پاشا بولا ''اور تمہیں یل برائز بننے کا اتنا ہی شوق تھا تو ہمیں بھی ہوجاتے۔''

وہ باریک بیں شخص شوبز سے متعلق تھا اور میرے نئے حلیے کی باریکیاں اس سے چھپ نہیں سکی تھیں۔ وہ فوراً حقیقت تک پہنچ گیا تھا۔ قاضی اور پاشا کی باتوں سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی تھی اور...... پچھلے دنوں میں بھی مجھے کسی وقت کا سامنا نہیں پیش آیا کہ وہ لوگ منہاس باقر کا دل بہلانے کی کوشش میں چھیڑ چھاڑ سے کام لے رہے تھے۔ میں بھی تو وہاں منہاس کا وقت بہلانے ہی آیا تھا۔

میں نے باری باری موجود افراد کے چہروں کو دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے ہی لمحے میرے قدم واش روم کی جانب اٹھنے لگے۔

میں کمرے سے نکل کر واش روم میں داخل ہوا تو وہ احساس بھی میرے ساتھ ہی اندر پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے بڑی شدت سے محسوس ہوا' میں ان لوگوں ان چہروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑنے والا ہوں۔ یہ صورتیں میرے لیے عنقا ہونے والی ہیں!

باوجود کوشش کے بھی جب اس احساس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں جھنجلا کر میک اپ سے پیچھا چھڑانے لگا۔ وہ عارضی میک اپ جو دوبارہ' بارہ بھی کیا جاسکتا تھا...... اور اب میں اس کام کے لیے کسی کا محتاج بھی نہیں رہا تھا۔ اپنے خیر خواہوں کے لیے اس ادنیٰ سی شے کی قربانی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

میں اصلی وجدان کی حیثیت سے واش روم سے نکلا تو وہ لوگ ایک مرتبہ پھر اٹھ کر مجھ سے ملے تاہم اس بار انہوں نے صرف مصافحے پر اکتفا کیا۔ ان کے اس دوبارہ ملنے نے میرے احساس کو ایک دفعہ پھر چونکایا اور لامحالہ میرے ذہن میں ابھرا...... کیا میرا اختتام آن پہنچا یا پھر وہ چاروں سدا کے لیے مجھ سے جدا ہونے والے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ذہن کو جھٹکا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر ان سے بات کرنے لگا۔ منہاس باقر ''ابھی آیا'' کا کہہ کر وہاں سے جانے لگا تو قاضی سلطان بول اٹھا۔

''کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ ادھر بیٹھ جاؤ۔''

فرید پاشا نے کہا ''تم نے وجدان کو یہاں بلایا ہے اور خود کہیں اور چل دیے!''

منہاس باقر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''میں وجدان ہی کی خاطر جارہا ہوں...... اور اسی گھر کے اندر ہوں کہیں باہر تھوڑا جارہا ہوں۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''پتا نہیں' اس نے دوپہر کا کھانا بھی کھایا ہوگا یا نہیں!''

''میں پوری طرح کھا پی کر آیا ہوں منہاس صاحب۔'' میں نے جلدی سے کہا ''اس سلسلے میں کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ لنچ میں نے صدف کے گھر پر کیا ہے۔''

منہاس جاتے جاتے رک گیا اور خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ فرید پاشا نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا ''یہ صدف وہی لڑکی ہے نا جو لاہور میں تمہارے ساتھ گھوم رہی تھی؟''

''بالکل وہی ہے بھائی۔'' منہاس باقر نے گرہ لگائی ''اور پتا نہیں' وہ دنیا میں کہاں کہاں اس کے ساتھ گھومے

گی۔ بڑی ضدی لڑکی ہے۔"

منہاس باقر ایک سنجیدہ اور متین شخص تھا۔ اس کے مندرجہ بالا تبصرے سے لگتا تھا' پاشا اور قاضی اس کا غم غلط کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوگئے تھے۔ منہاس کے اس جملے میں اچھی خاصی شگفتگی پائی جاتی تھی جو کہ ایک مثبت علامت تھی۔ مخلص دوست اپنا فرض نبھانے کی حتی الامکان کوشش کررہے تھے۔

فرید پاشا نے گفتگو کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا" بھئی قاضی صاحب! میں نے تو اس لڑکی کا ذکر سنتے ہی پیش گوئی کردی تھی کہ یہ ایک مثلث فلم ہے...... ایک ہیرو دو ہیروئن والی بے انتہا جذباتی فلم۔ اگر وجدان صدف کے ساتھ بھی تھوڑے واقعات آگے بڑھائے تو میں زندہ کرداروں پر مبنی ایک جیتی جاگتی سپر ہٹ فلم بنانے کو تیار ہوں۔"

"جس طرح صدف اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اس سے تو یہی نظر آرہا ہے' ان دونوں کے باہمی واقعات تیزی سے آگے بڑھیں گے۔" منہاس باقر نے ایک اور پیش گوئی کردی۔ اگر میں خاموش بیٹھا رہتا تو یہ لوگ مجھ سے تفریح کا عمل جاری رکھتے۔ وہ میرے سچے خیر خواہ اور مخلص دوست تھے اور میں جانتا تھا' قاضی اور پاشا مجھے ٹارگٹ پر رکھ کر منہاس کو تفریح مہیا کرنے کی کوشش کررہے تھے جس کے خوش گوار تاثرات منہاس پر مرتب ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وہ رفتہ رفتہ رنج واندوہ کے بادلوں سے باہر آرہا تھا۔

فرید پاشا نے منہاس باقر کی بات پر ٹکڑا لگایا" تم ٹھیک کہہ رہے ہو منہاس! اب تو صدف کے گھر میں لنچ بھی ہونے لگے۔ میں اس لڑکی سے ملا ہوں۔ اپنی کزن کے ساتھ میری کوٹھی پر آئی تھی۔ بڑی آندھی طوفان قسم کی لڑکی ہے وہ۔ مارشل آرٹس کی چیمپئن اور میڈیکل کی طالبہ۔ میں تو سوچ رہا ہوں لاہور پہنچتے ہی اس فلم کی ابتدائی تیاریاں شروع کردوں.... بھئی وجدان کی فلم کے لیے تو اسپیشل یونٹ ترتیب دینا پڑے گا۔"

قاضی سلطان نے کہا" پاشا! یہ آپ نے خوب بات بتائی۔ وہ لڑکی ڈاکٹر بھی بن رہی ہے اور لڑائی بھڑائی کے فن کی بھی ماہر ہے۔ میرے دل میں اسے دیکھنے کا اشتیاق جاگ اٹھا ہے۔ یہ بڑا عجیب سا کمبی نیشن نہیں ہے سائیں!"

"ایسا ویسا عجیب قاضی صاحب!" منہاس باقر نے سنجیدگی سے کہا" لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور آپ نے اشتیاق جاگنے کا کیا ذکر کردیا جناب۔ وجدان ایک فون کرے گا تو وہ دوڑی چلی آئے گی۔ صدف سے ملاقات کروانا تو اس کے بائیں چٹکی کا کھیل ہے۔ وہ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتی۔"

"خدا خیر کرے وجدان کی۔" فرید پاشا نے شرارت آمیز انداز میں کہا" دو دو کا تجربہ بڑا خطرناک ہوتا ہے چاہے وہ بیویاں ہوں یا محبوبائیں! یہ تو کوئی ہم سے پوچھے!"

فرید پاشا نے دو شادیاں کررکھی تھیں۔ نائلہ اس کے ساتھ شہر میں رہتی تھی جب کہ شاہین نامی پہلی بیوی اس کے آبائی گاؤں سید پور میں سسرال میں رہتی تھی۔

اس سے پہلے کہ یہ موضوع کوئی سنگینی اختیار کرجاتا' میں نے قاضی سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" قاضی صاحب! اگر آپ صدف سے ملنا چاہتے ہیں تو میں کسی وقت اسے بلالوں گا۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا" اور سنائیں' نئی سرکا کیا حال ہے؟"

وہ مجھے اپنے علاقے اور حالات سے آگاہ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں فرید پاشا سے اس کے باپ کے انتقال کی تعزیت کررہا تھا۔ قاضی اور پاشا اکیلے ہی آئے تھے۔ شبانہ کا شوہر اس دوران میں تھوڑی دیر چپ بیٹھا رہا پھر اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ آخر میں' میں نے پاشا سے گلبرگ تھری اور فاضلیہ کالونی والی کوٹھیوں کے بارے میں دریافت کیا۔

وہ یک دم سنجیدہ ہوگیا اور گھمبیر لہجے میں بولا" یار وجدان! تم وہاں لاہور میں بڑا لمبا چوڑا پواڑا ڈال آئے تھے لیکن بہر حال میں نے سارے معاملات سیٹ کرلیے ہیں۔" ذرا دیر کو رک کر وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا" تعلقات کا زمانہ ہے یار! اگر میری جگہ کوئی ہماتڑ ہوتا تو لگ جاتا بے چارہ کسی تاریک کھڈے میں۔"

قاضی دوستی اور تعلق کے طفیل پنجابی کے اچھے الفاظ سے آشنا تھا۔ فرید پاشا نے پواڑا کا لفظ استعمال کیا تو وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے کے بعد پاشا سے بولا۔

"وجدان جہاں جاتا ہے' وہاں پواڑا ڈال کر آتا ہے۔ اندرون سندھ میں بھی اس نے کچھ کم افراتفری نہ مچائی تھی!"

پھر ہمارے درمیان گزرے ہوئے واقعات وحالات پر بات ہونے لگی۔ ممتاز کا دوبارہ کا اغوا لاہور میں پیش آنے والے خون ریز واقعات' پھر کراچی کی ہنگامہ خیز سرگرمیاں' یہود نواز تنظیم سی ایف کے شعیب غوری' چوہدری نواز اور نیٹ ورک الغرض میری زندگی کے تمام ہی اہم شعبے زیر بحث آئے۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی۔ قاضی و پاشا نے ایک مرتبہ بھی منہاس باقر پر ٹوٹنے والی قیامت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ یہ دوستی نبھانے کا ایک عمدہ نمونہ تھا!

ہماری گفتگو ابھی جاری ہی تھی کہ مغرب کی اذان ہونے لگی۔ اس وقت ساحل کا موضوع چل رہا تھا اور میں فی الحال اس ٹوپک سے بچنا چاہتا تھا لہٰذا وہاں سے رخصتی کے لیے اٹھنے لگا۔ مجھے ہر صورت آٹھ بجے سے پہلے شہزاد کے پاس پہنچنا تھا!

ملنے اور بچھڑنے کا عمل انسانی زندگی کا حصہ ہے۔ انسان مستقل طور پر کسی ایک حالت' ایک مقام پر نہیں رہ سکتا۔ فرید پاشا کو اسی رات واپس لاہور جانا تھا اور قاضی سلطان کو اگلے روز نئی سر روانہ ہونا تھا تاہم وہ دونوں باری باری مجھ سے بغل گیر ہوئے۔

فرید پاشا نے بڑے وثوق سے کہا" انشاء اللہ! ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔"

"انشاء اللہ!" میں نے مختصر گوئی پر اکتفا کیا۔

دل میں اچانک ایک بے نام سی بے چینی اور اضطراب بھر گیا۔ میں نے کہنے کو کہہ تو دیا تھا لیکن محسوسات چیخ چیخ کر شور مچارہے تھے...... یہ ہماری آخری ملاقات ہے! اس وقت میں نے کسی کو اپنے احساسات سے آگاہ کرنا ضروری نہ جانا اور دل گرفتہ خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوگیا۔ بے بسی اسی طرح مجبور کیا کرتی ہے!

وہ سب یہی سمجھے ہوں گے' یہ مل کر بچھڑنے کی ملولیت ہے۔ وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی تھے مگر ان کو کون بتاتا کہ یہ ابدی جدائی کی ملالیت ہے!

☆☆☆

کسی زمانے میں وہ برساتی نالا ہوا کرتا تھا۔ بعد میں شہر آباد ہوتے ہوتے پھیلتا چلا گیا۔ بستیاں اور علاقے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے تو اس نالے کے اندر سڑک بنا کر پی ای سی ایچ سوسائٹی اور ای مارکیٹ کو آپس میں ملا دیا گیا۔ مذکورہ برساتی نالا چینیسر ہالٹ کے نزدیک ریلوے لائن کے نیچے سے گزرتا تھا۔ اس نالے پر بنی ہوئی پلیا شاید انگریزوں کے زمانے سے تھی۔

ہم نے جے ڈی ملک کو شکار کرنے کے لیے اسی پلیا کا انتخاب کیا تھا۔ پلیا کے نزدیک دونوں جانب کم از کم پچاس گز تک تاریکی کا راج رہتا تھا۔ اکثر و بیشتر پولیس والے اس اندھیرے میں چھپ کر رکشا ٹیکسی والوں سے "ملاقات" کیا کرتے۔ وہ راستہ خاصا شارٹ کٹ تھا لیکن رکشا ٹیکسی والے رات گئے پولیس والوں کے خوف سے ادھر سے جانے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔

میری تازہ ترین معلومات کے مطابق پولیس رات ساڑھے دس کے بعد ہی اپنی کارکردگی کا آغاز کرتی تھی لہٰذا ہمیں ان کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ نہیں تھا۔ ہم ساڑھے آٹھ بجے تک اپنے مشن سے فارغ ہوجاتے۔

ہماری ہدایت کے مطابق فیصل نے جے ڈی ملک سے فون پر بات کرکے اسے صفدر علی کے بنگلے سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ فیصل ملک کے لیے ایک آقا کی حیثیت رکھتا تھا' اس کے حکم سے سرتابی کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جے ڈی ملک نے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اس پلیا کے نیچے سے گزرنا تھا۔ اسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ اکیلا آئے۔ اس نے گاڑی کا نمبر بتادیا تھا اور وعدہ کیا تھا وہ فیصل کی ہدایت کو یاد رکھے گا۔

پروگرام کے مطابق جے ڈی ملک کو یہی بتایا گیا تھا کہ فیصل ای مارکیٹ کے نزدیک ایک نان بائی کی دکان کے قریب کسی خفیہ گوشے میں چھپا کھڑا ہوگا اور جیسے ہی وہ جے ڈی ملک کی گاڑی کو دیکھے گا' سامنے آجائے گا۔ پھر جے ڈی ملک اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ہمارا شکار نیلے رنگ کی ٹویوٹا اسٹارلٹ میں آرہا تھا۔ ای مارکیٹ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ چینیسر ہالٹ والے ریلوے پھاٹک کی طرف سے تھا لیکن شہزاد کی تاکید کے مطابق فیصل نے پلیا کے نیچے سے گزر کر آنے کی شرط لگادی تھی۔ جے ڈی ملک کو پلیا کے نیچے سے گزر کر بائیں جانب مڑنا تھا۔ جہاں چند گز کے فاصلے پر مذکورہ نان بائی کی دکان تھی۔

اس مشن میں شہزاد نے اپنے ایک بااعتماد دوست کو بھی شامل کیا تھا لیکن پلیا والی کارروائی کی حد تک۔ محمود نامی وہ شخص ہرگز نہیں جانتا تھا کہ جے ڈی ملک کون ہے اور ہم اسے کہاں کس مقصد کے لیے لے جانا چاہتے ہیں۔ شہزاد نے اسے اتنا ہی بتایا تھا' ایک دشمن کو چھاپنا ہے جو ساڑھے آٹھ بجے رات نیلی اسٹارلٹ میں پلیا کے نیچے سے گزرے گا۔ شہزاد اور محمود دونوں مسلح تھے اور پولیس کی وردی میں بھی۔ یہ وردیاں شہزاد ہی نے مہیا کی تھیں۔ محمود اپنی موٹر سائیکل بھی لے آیا تھا۔

ہماری پلاننگ کے مطابق شہزاد اور محمود کو پولیس والوں کے بھیس میں پلیا کے نزدیک موجود رہنا تھا۔ جیسے ہی نیلی اسٹارلٹ پلیا میں داخل ہونے کے لیے ڈھلوان اترتی' محمود اسے رکنے کا اشارہ کرتا۔ لامحالہ جے ڈی ملک کو گاڑی روکنا پڑتی۔ پولیس والوں سے خواہ مخواہ پھڈا کوئی بھی مول نہیں لیتا۔ محمود' ملک کو گاڑی سے باہر نکلنے کو کہتا' بہانہ چیکنگ وغیرہ کا

ہوتا۔ ملک کے پاس انکار یا اعتراض کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ وہ اس لمحاتی چیکنگ کے لیے گاڑی سے نیچے اتر آتا۔ بس وہی لمحہ ہماری کارروائی کا ہوتا۔

شہزاد تھوڑے ہی فاصلے پر موٹر سائیکل کے قریب کھڑا ہوتا۔ میں اس ڈھلوان کے آغاز پر لائٹ گرین ہونڈا سوک میں ریڈ الرٹ بیٹھا ہوتا۔ شہزاد جیسے ہی جے ڈی ملک کو "گن پوائنٹ پر لاتا" میں سوک کو اس کے نزدیک لے آتا۔ اگلے ہی لمحے شہزاد جے ڈی ملک کو گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچا کر اپنے قابو میں کر چکا ہوتا۔

یہ ایک صاف ستھری اور بے داغ منصوبہ بندی تھی۔ مبینہ جائے وقوعہ اکثر ویران رہتی اس لیے ہمیں اپنی کارروائی میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔ اس مختصر سے ایکشن کے بعد ہم جے ڈی ملک کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے آتے اور محمود اپنی سوزوکی موٹر سائیکل پر کہیں بھی روانہ ہو جاتا۔ اور اب ہم اپنی اپنی پوزیشن پر بالکل تیار کھڑے تھے۔

میں نے گاڑی کو ایک ایسی جگہ روک رکھا تھا جہاں گاڑی کے اندر رہتے ہوئے میں عقب نما آئینے میں نیلی اسٹارلٹ کو اس سڑک پر مڑتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی "پولیس ناکے" پر بھی میری نگاہ تھی۔ میری گاڑی اس زاویے سے پارک تھی کہ میں پہلی نظر میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نظر نہ آتا۔ وہاں نیم تاریکی کا راج تھا۔

پھر وہ گاڑی میری نظر میں آ گئی۔ اس وقت آٹھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے گویا' جے ڈی ملک پانچ منٹ پہلے آ گیا تھا۔ نرسری کی جانب سے آنے والی سڑک پر سے جب نیلی اسٹارلٹ ہماری گلی میں مڑی تو میں تن کر بیٹھ گیا۔ میں نے پہلی نظر میں نمبر پلیٹ کو دیکھ کر گاڑی کا نمبر کنفرم کیا پھر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف میری نگاہ اٹھ گئی۔

میں نے جے ڈی ملک کو روبہ رو نہیں دیکھا تھا۔ تاہم فیصل کی زبانی اس کا جو حلیہ میری یادداشت میں نقش ہوا' ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص اس پر فٹ بیٹھتا تھا...... اور وہ گاڑی میں اکیلا ہی تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا' ملک نے فیصل کی ہدایت پر من و عن عمل کیا تھا۔

نیلی اسٹارلٹ میرے پاس سے گزر کر پلیا کی سمت بڑھ گئی تو میں نے نہایت ہی چابک دستی سے نستعلیق اور شائستہ مزاج ہونڈا سوک کا انجن بیدار کر دیا۔ وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے اور سیکنڈ کا دسواں حصہ بھی "کام' کام اور صرف کام" کا متقاضی تھا۔

میری آنکھوں نے دیکھا جے ڈی ملک نے "پولیس" کے اشارے پر بڑی شرافت سے گاڑی روک لی۔ میں بالکل تیار کھڑا تھا۔ جیسے ہی ملک' اسٹارلٹ سے باہر آیا میں نے گاڑی کو لمحاتی جنبشوں کے طفیل اس کے قریب پہنچانے کے لیے آگے بڑھا دیا۔

وہ میری اس حرکت پر چونکا لیکن میں اس سے پہلے ہی اسٹارلٹ کے اندر ہونے والی غیر متوقع "حرکت" پر چونک اٹھا تھا۔ اسٹارلٹ کی عقبی نشست پر میں نے ایک انسانی سر کی نموداری دیکھ لی تھی۔ میرے ذہن نے چشم زدن میں فیصلہ کیا اور میں نے گاڑی روکنے کے بجائے اسٹارلٹ کی پشت سے ٹکرا دی۔

یہ ایک اچانک ٹکر تھی جو میری گاڑی کی فرنٹ رائٹ سائیڈ نے ملک کی گاڑی کی بیک لیفٹ سائیڈ کو ماری تھی۔ اسٹارلٹ اسٹارٹ تھی۔ وہ میری گاڑی کا دھکا کھا کر نشیب میں چل نکلی اور اتفاق سے اس کا رخ آنے والے راستے کی جانب ہو گیا۔ اس دوران میں شہزاد جے ڈی ملک کو ٹارگٹ بنا چکا تھا۔

اسی لمحے اسٹارلٹ کے عقبی حصے میں سے ہم پر فائرنگ کی گئی لیکن ہم کلی طور پر محفوظ رہے۔ اسٹارلٹ بڑے بے ڈھنگے انداز میں قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رانگ سائیڈ سے پلیا میں داخل ہو رہی تھی اس لیے فائرنگ کرنے والے کا نشانہ چوک گیا۔ اس موقع پر چوکنا ہمارے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ شہزاد نے بڑی پھرتی کے ساتھ جے ڈی ملک کو سوک کی عقبی نشست پر پٹخا اور خود بھی گھس کر اندر بیٹھ گیا' اگلے ہی لمحے میں نے گاڑی کو پلیا کے اجوبڑ ڈال دیا۔ ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ خطرناک کلاشنکوف گرجی لیکن ہم یکسر فائرنگ کی رینج سے باہر تھے۔ محمود اپنی موٹر سائیکل پر ایک طرف کھسک گیا تھا۔

"اس خبیث نے مجھے ملک کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔" شہزاد نے زہر خند لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ جے ڈی ملک کے ساتھی کی طرف تھا جس نے دو مرتبہ فائرنگ کر کے ہمیں روکنے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے عقب نما آئینے میں بیک ویو کا جائزہ لیا۔ اسٹارلٹ پلیا کے عین نیچے پھنس کر رہ گئی تھی۔ سامنے کی طرف سے ایک مزدا ٹرک اس کی راہ روکے کھڑا تھا۔ کلاشن بردار شخص جب تک ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر سیدھے راستے پر ہمارے تعاقب میں لپکتا' ہم اس کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے۔ میں نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے سوک کو محمود آباد گیٹ کی جانب بڑھا دیا۔

اسی لمحے شہزاد نے جے ڈی ملک کو بڑی بے دردی سے بٹ کے اوپر سے اپنے پاؤں میں پہنچا دیا۔ پھر اسے گن کے نشانے پر رکھتے ہوئے غرایا "عہد شکن نامرادوں کو میں اپنے قدموں میں رکھتا ہوں۔" بات ختم ہی اس نے اپنا ایک پاؤں ملک کے سینے پر جما دیا۔

ملک کے لیے یہ ایک غیر متوقع اور ہول ناک صورتِ حال تھی۔ اس کی زبان سے ابھی تک میرا نام خارج نہیں ہوا تھا اس کا یہی مطلب تھا' وہ مجھے صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا۔ میں نے گاڑی کو کارپوریشن سے ٹرن کیا اور کالا پل کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لیا۔ یہاں اسپیڈ بڑھانے میں خاصی آسانی محسوس ہوئی۔

جے ڈی ملک شہزاد کے پاؤں تلے دبے دبے منمنایا "میں نے کون سی عہد شکنی کی ہے؟"

"فیصل نے تم سے کہا تھا' اکیلے آنا۔" شہزاد ترشی سے بولا "اور تم اپنے اس گن بردار چیلے کو بھی گاڑی میں چھپا لائے عہد شکنی اور کیا ہوتی ہے؟"

"فیصل کہاں ہے؟" ملک نے ترت پوچھا۔

"اگر یہ تمہارا آخری سوال ہے تو سن لو فیصل اس وقت جہاں بھی ہے تمہیں وہیں پہنچایا جا رہا ہے۔" شہزاد نے کہا اور میرا نام لیے بغیر بولا "یار! گاڑی کو پارسی گیٹ کے بعد بائیں جانب اندر لے لو۔ میں ڈیفنس فیز ون کے اندر ہی اندر رہتے ہوئے ڈیفنس آفیسرز کی طرف نکل جائیں گے۔ وہاں سے نیشنل ہائی وے پکڑ لینا۔ آگے کا راستہ تمہیں معلوم ہی ہے۔"

میں نے خاموشی سے شہزاد کی بات پر عمل کر ڈالا۔ جے ڈی ملک مجھے دیکھ نہیں پا رہا تھا اور شہزاد کی بھی یہی کوشش تھی' وہ گاڑی میں میری موجودی میں آگاہ نہ ہو پائے۔ مجبوری کی بات دوسری تھی۔

شہزاد کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ جے ڈی ملک نے پوچھا "اگر تم مجھے فیصل سے ملوانے جا رہے ہو تو یہ مجھ پر تمہارا احسانِ عظیم ہے۔ تم ایک مخلص دوست کا رول ادا کر رہے ہو لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی' تمہارا انداز دشمنوں جیسا کیوں ہے؟"

ایک بات ماننے والی تھی کہ اس کس مپرسی کی حالت میں بھی جے ڈی ملک نے اپنے حواس کو بے قابو نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ مضبوط اعصاب اور ٹھنڈے دماغ کا مالک تھا مگر اس وقت شہزاد کے تیور بہت خطرناک نظر آ رہے تھے۔

وہ دھمکی آمیز لہجے میں پھنکارا "تمہاری سمجھ میں اگر میری دوستی دشمنی نہیں بیٹھ رہی تو میں اس سمجھ کا آپریشن کر دوں گا۔ تمہیں اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر سنسناتے ہوئے انداز میں بولا "تم نے ثابت کر دیا ہے وہ تمہارا آخری سوال نہیں تھا لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ اگر اب تم نے اپنی منحوس زبان کھولی تو میں اپنی گن تمہارے سینے میں خالی کر دوں گا اور...... اس کا مطلب یہی ہے کہ گن خالی کر دوں گا جو پوری طرح بھری ہوئی ہے!"

گاڑی کے اندر کامل سناٹا چھا گیا۔ جے ڈی ملک جیسے گھاگ شخص نے صورتِ حالات کی سنگینی اور شہزاد کے الفاظ کی بے رحمی کو حقیقی معنوں کے ساتھ سمجھ لیا تھا۔

میں ڈیفنس آفیسرز' مسجد والے خوب صورت پارک اور صدف کی رہائش گاہ کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے نیشنل ہائی وے (مین کورنگی روڈ) پر آ گیا۔ یہاں سے دو راستوں کے ذریعے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ سکتے تھے۔ ایک تو نیشنل ہائی وے کراس کرنے کے بعد فیز ٹو کے اندر ہی اندر راستہ تھا اور دوسرا راستہ نیشنل ہائی وے پر سفر کرنے کا تھا۔ آگے جا کر ہم مین خیابان اتحاد پر مڑ جاتے جو چند منٹ میں ہمیں منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا۔

میں نے فیز ٹو کے قلب سے گزرنے والے راستے کا انتخاب کیا اور ہونڈا سوک کی رفتار میں بہ تدریج اضافہ کرتا چلا گیا۔ جے ڈی ملک ایک طرح سے اندھا ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے قطعاً یہ بات معلوم نہیں تھی کہ وہ اپنے ہی علاقے سے گزر کر لمحہ بہ لمحہ مقتل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

ٹھیک نو بجے ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

شہزاد نے گاڑی کے اندر ہی ایک میلا کپڑا جے ڈی ملک کی آنکھوں پر کس کر باندھ دیا تھا۔ یہ گاڑی صاف کرنے والا ایک بدبودار کپڑا تھا جو جے ڈی ملک کے لیے ہماری طرف سے ہونے والی خاطر تواضع کی پہلی ڈش تھی۔ بنگلے میں داخل ہونے کے بعد ملک کو آنکھیں بندھے بندھے ایک محفوظ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ اس بات سے یکسر بے خبر تھا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

شہزاد قید و بند کا معقول سامان وہاں پہنچا چکا تھا۔ آئندہ پندرہ منٹ میں شہزاد نے میری مدد سے جے ڈی ملک کو بڑے تسلی آمیز انداز میں "سیٹ" کر دیا۔ میں اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ زر گل نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔

اس کے انداز سے خاصی گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ ٹیلی فون والے کمرے میں آیا اور جلدی سے

پوچھا ”کیا بات ہے زرگل۔ تم اس قدر بوکھلائی ہوئی کیوں ہو؟“

”تمہاری آمد سے ایک منٹ پہلے صدف کا فون آیا تھا۔“ اس نے بتایا ”وہ فوری طور پر تم سے بات کرنا چاہتی ہے اس کے لہجے سے میں نے یہ محسوس کیا ہے، وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔“

زرگل کی بات نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا ”اس نے کچھ بتایا نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی ”بس اتنا کہا ہے وہ تھوڑی دیر بعد دوبارہ فون کرے گی۔ اس دوران میں وہ تمہیں فلیٹ اور منہاس صاحب کے بنگلے پر ٹریس کرنے کی کوشش کرے گی۔“

”اس کا مطلب ہے کوئی سیریس معاملہ ہے!“ میں یک دم متفکر ہوگیا۔

اس دوران میں شہزاد بھی ہمارے پاس آگیا۔ ہمارے لٹکے ہوئے چہروں نے اسے پریشان کردیا۔ الجھے ہوئے لہجے میں بولا ”تم دونوں کو کیا ہوا ہے؟“

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی اس کے سوال کا جواب دیتا، ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف صدف تھی۔

وہ ہیجانی لہجے میں بولی ”تم کہاں رہ گئے تھے وجدان؟“

”کیا ہوگیا صدف؟“ میں نے الٹا اسی سے سوال کرڈالا۔

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی ”میں نے ساحل کا سراغ لگالیا ہے۔ تم فوراً میرے پاس چلے آؤ۔“

صدف اتنی بڑی بات کہہ رہی تھی کہ میں اچھل پڑا ”تم نے اسے کہاں دیکھا ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”فون پر لمبی چوڑی بات نہیں ہوسکتی۔ میں ایک پبلک کال آفس سے بات کررہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں آرہا ہوں۔ تم مجھے بالکل درست لوکیشن بتاؤ؟“

”میں عوامی مرکز کے سامنے سڑک کی دوسری طرف اپنی گاڑی میں ہوں۔“ اس نے بتایا ”میں نے اپنی گاڑی سروس روڈ کے کنارے کھڑی کررکھی ہے۔ فون رکھنے کے بعد میں گاڑی میں جا بیٹھوں گی۔“

میں نے پوچھا ”تم لال قلعہ والی سائیڈ کی بات کررہی ہونا؟“

”بالکل صحیح۔“

”تم نے اس بات کا کسی اور سے ذکر تو نہیں کیا؟“

”قطعی نہیں۔“ وہ دوٹوک انداز میں بولی۔

”تم میرا انتظار کرو، میں آدھے گھنٹے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں نے ریسیور رکھا تو وہ دونوں استعجابیہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے انہیں مختصراً صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر شہزاد سے کہا۔

”مجھے فوری طور پر جانا ہوگا۔ تم دونوں ان دونوں پر گہری نظر رکھو گے۔ انشاء اللہ میں بہت جلد واپس لوٹ آؤں گا۔“

شہزاد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن میں نے اسے سختی سے منع کردیا اور کہا ”جب تک میں واپس آتا تم ان دونوں کی ڈرائنگ تیار کرلو۔ پھر ہم دونوں مل کر ان میں رنگ بھریں گے۔“

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

شہزاد اور زرگل کی خواہش تھی کہ میں گاڑی میں جاؤں لیکن میں نے ہونڈا اسوک کو زیرِ تعمیر بنگلے پر ہی چھوڑا اور ایک نئی نویلی ٹیکسی پکڑ کر صدف کی طرف روانہ ہوگیا۔ صدف نے اتنی بڑی خوش خبری سنائی تھی کہ میرا تن بدن ہوا میں اڑنے لگا تھا۔ میری ہدایت پر ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کو ہوائی گھوڑا بنادیا۔

تھوڑی دیر بعد میں صدف کی وہائٹ سنی میں بیٹھا اس سے استفسار کررہا تھا۔ اس وقت رات کے پونے دس بجے تھے۔ صدف نے مجھے جو تفصیل بتائی وہ ایک حیرت انگیز اتفاق ہی تھا۔ اس کے مطابق وہ اپنی ایک دوست سے مل کر واپس آرہی تھی کہ کارساز کے نزدیک اس نے ٹنٹڈ گلاسز والی ایک سیاہ گاڑی کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ روڈ کی دوسری جانب تھی۔ ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی کا گزرنا کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس سیاہ گاڑی کے پیچھے جانے والی پجارو نے صدف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرادی۔ اس نے مذکورہ پجارو میں شکیب عثمانی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا۔

”کیا تمہیں یقین ہے وہ شکیب عثمانی ہی تھا؟“ میری آواز خاصی تیز تھی۔

”ایک سو ایک فی صد یقین ہے۔ میں نے گزشتہ رات اسے نقلی پولیس موبائل میں بیٹھے دیکھا تھا۔“ صدف نے پورے وثوق سے کہا۔

”تم مجھے ساحل کے بارے میں بتانے والی تھیں؟“ مجھ سے صبر نہیں ہورہا تھا۔

وہ بولی ”میں سیاہ ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی کے اندر تو نہیں دیکھ سکی تھی تاہم میں نے پجارو کا تعاقب شروع کردیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے چلتے ہوئے محمد علی سوسائٹی میں داخل ہوگئیں۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی، وہ دونوں ایک ہی قافلے کا حصہ ہیں لیکن اندھے شیشوں والی گاڑی کو دیکھ کر میرے ذہن میں فوراً ساحل کا تصور ابھر آیا اور کوئی پُراسرار آواز میرے اندر کہنے لگی، اس گاڑی میں ساحل کو کہیں لے جایا جارہا ہے۔ میں نے بڑی محتاط روی سے دونوں گاڑیوں کا تعاقب جاری رکھا اور ان کی منزل دیکھ لی۔“

صدف دھماکا خیز انکشاف کررہی تھی۔ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہونے لگا جیسے ٹنٹڈ گلاسز والی سیاہ گاڑی میں میری ساحل کو کہیں شفٹ کیا گیا ہے۔ میں نے بڑے اضطرابی لہجے میں صدف سے دریافت کیا۔

”مجھے اس منزل کا راستہ دکھاؤ جہاں ساحل کو پہنچایا گیا ہے۔ تمہیں وہ جگہ یاد ہے نا؟“

”بہت اچھی طرح یاد ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”میں نے اس ایک منزلہ سفید بنگلے کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا ہے جہاں وہ دونوں گاڑیاں پہنچی تھیں۔ بنگلے کے مین گیٹ کے ساتھ نصب نیم پلیٹ پر میں نے ”ایس۔ غوری“ کے الفاظ بھی درج دیکھے ہیں۔“

”ایس غوری سے شعیب غوری بھی ہوسکتا ہے!“ میرے الفاظ میں بڑی تپش تھی۔

”میں بھی اسی حوالے سے ساحل کے بارے میں پُریقین ہوں۔“ صدف نے کہا۔

”مجھے فوراً اس سفید بنگلے پر پہنچادو۔“ میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

چند منٹ کے بعد ہم محمد علی سوسائٹی میں واقع اس بنگلے کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ گلی کے اختتام پر میں نے صدف کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے اشارے کی تعمیل کردی۔ میں نے کہا۔

”گاڑی کو اسی جگہ چھوڑ دو۔ ہم ابھی اور اسی وقت سفید بنگلے میں داخل ہورہے ہیں۔ کیا تم ذہنی طور پر تیار ہو؟“ اچانک ہی میں نے صدف کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

وہ بڑی دلیری سے بولی ”میں ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار ہوں۔“

ایک منٹ میں ہم نے لائحہ عمل تیار کیا۔ مجھے سامنے سے اور صدف کو عقبی سمت سے بنگلے میں داخل ہونا تھا۔ پھر جو بھی حالات پیش آتے، ان سے نمٹ لیا جاتا۔ ہم دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا اور اپنی اپنی راہ پر ہولیے۔

مجھے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے کوئی خاص کوشش نہیں کرنا پڑی۔ گیٹ پوری طرح بند تھا اور چوکیدار گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ میں نے نہایت ہی ہوشیاری سے دیوار پھاندی اور بنگلے کے اندر پہنچ گیا۔ سامنے ایک وسیع و عریض ڈرائیو وے نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے حصے میں ایک بڑا منقش چوبی دروازہ موجود تھا۔ جہاں سے عمارت کے اندرونی حصوں تک رسائی حاصل کی جاسکتی تھی۔ مذکورہ دروازہ بند تھا۔

میں نے اپنے گردوپیش پر ایک چوکنا نگاہ ڈالی اور مطمئن ہونے کے بعد دبے قدموں منقش دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی میں نے برآمدے کا نصف حصہ ہی عبور کیا تھا کہ میرے قدم یک بہ یک رک گئے۔ اس وقت عقب سے کسی نے للکارا۔

”خبردار! ایک قدم بھی اٹھایا تو جان سے جاؤ گے! اس وقت تم ایک خطرناک گن کے نشانے پر ہو۔ یہ جدید طرز کی ہلاکت خیز کے کے ہے۔“

میں ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے ”ہینڈز اپ“ ہوگیا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں چھوڑا تھا۔

میرے عقب میں موجود گن بردار ذرا قریب آگیا پھر اس نے مجھے رائفل کے نشانے پر رکھتے ہوئے جامہ تلاشی لی۔ اس کا انداز بڑا سرسری اور تھپتھپانے والا تھا۔ میں سمجھ گیا، اسے کسی مہلک ہتھیار کی تلاش تھی۔ میرے لباس میں ایسی کوئی شے موجود نہیں تھی چنانچہ اپنی تسلی کرنے کے بعد اس نے دوبارہ مجھے حکم دیا۔

”گھوم جاؤ!“

میں کسی مداری کا بچہ جمورا نہیں تھا جو اس کے ایسے بے ہودہ احکام کی تعمیل کرتا۔ میں تو وہاں ڈگڈگی بجانے آیا تھا جس کی مخصوص آواز پر ان سب کو ناچنا تھا۔

ہاتھ ہوا میں بلند رکھتے ہوئے میں چشم زدن میں گھوما لیکن اس سے پہلے میری دھیل کک چلی۔ فضا میں ”شائیں“ کی آواز پیدا ہوئی اور میرے پاؤں کی طوفانی ضرب نے گن بردار کی کنپٹی پر دستک دی۔ ٹانگ کے لپیٹے میں اس کے ہاتھ آگئے لہٰذا گن اس کی گرفت سے نکل کر برآمدے کے پختہ فرش پر گری۔ وہ ایک غیر متوقع آفت کی زد میں آگیا تھا۔

وھیل کک بڑی خطرناک اور سریع الاثر ٹھوکر ہے اور یہ کک استعمال کرتے ہوئے تھوڑا سا آگے کو جھکنا پڑتا ہے۔ اس سے حملہ آور کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اگر وھیل کک نشانے پر نہ بھی لگے تو اس کی باڈی مدِمقابل کے اٹیک سے محفوظ رہتی ہے۔

میری وھیل کک اپنے جائز مقام پر لگی تھی۔ مجھے دھمکی دینے والا سر کو تھام کر پیچھے الٹ گیا۔ گن اس کے قریب ہی گری تھی اور یہ بات وہ بھی جانتا تھا۔ اپنی تکلیف کی پروا کیے بغیر اس نے گن اٹھانے کے لیے زمین پر پڑے پڑے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ میں اس مرحلے پر چوکنے والا کہاں تھا۔

میں نے فضا میں ایک تیچی جمپ لگائی اور پریشر کک کے انداز میں اپنا پاؤں اس کے ہاتھ پر مارا۔ اس کے حلق سے بڑی دردناک چیخ برآمد ہوئی۔ اس کا ہاتھ گن اور میرے پاؤں کے بیچ آگیا تھا۔ وہ اپنے گھائل ہاتھ کو تھام کر زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میں نے جھک کر کلاشنکوف اٹھالی۔

اسی لمحے منقش چوبی دروازہ کھلا اور وہاں سے دو ہٹے کٹے افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ وہ اپنے ساتھی کی چیخ سن کر افراتفری میں اس کی خیریت معلوم کرنے آگئے تھے۔ میرے پاس تیار کلاشنکوف دیکھی تو ان کے چہرے دھواں ہوگئے پھر وہ ہڑبڑا کر الٹے قدموں اندر گھس گئے۔

میں نے اندرونی حصے میں قدم رکھنے سے پہلے برآمدے کے فرش پر موجود تکلیف میں مبتلا شخص کی مشکل آسان کی۔ یہ ڈاکٹروں کا آزمودہ کار نسخہ ہے۔ وہ کسی بھی مریض کو شدید تکلیف سے نجات دلانے کے لیے نیند کا انجکشن دیتے ہیں۔ میں نے بھی اس شخص کو گہری بے ہوشی میں پہنچا دیا۔ مقصد ایک ہی تھا۔ بس اپنے اپنے طریقۂ کار کی بات ہے!

مجھے مسلح دیکھ کر پلٹنے والے اب تک نہتے نہیں ہوں گے۔ انہوں نے یقیناً اندر پہنچتے ہی اپنے ہتھیار سنبھال لیے ہوں گے لہٰذا مجھے زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں اگلے قدم کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بنگلے کے اندرونی حصے میں چیخ کی آوازیں ابھریں۔ میں سمجھ گیا صدف نے کارروائی شروع کردی تھی وہ شیر کی بچی اسی طرح انٹری دیتی تھی۔

میں بنگلے کی سائیڈ لیتے ہوئے پہلو میں آگیا۔ اس طرف میں نے ایک روشن کھڑکی دیکھی تھی۔ سامنے کے بجائے اس جانب سے اندر داخل ہونا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے کھڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ بند تھی اور اس میں نصب شیشے اندر روشنی کا پتا دیتے تھے۔ میں نے سب سے اوپر والے شیشے پر رائفل کا دستہ مارا اور رینگ کر ایک طرف نکل گیا۔

چھناکے کی تیز آواز کے ساتھ شیشہ ٹوٹا اور اس کی کرچیاں دور تک پھیل گئیں۔ میں نے ایک لمحہ دیوار کے ساتھ کھڑے رہ کر انتظار کیا جب کھڑکی میں کوئی سرگرمی نظر نہ آئی تو میں سمجھ گیا' اس کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ شکر تھا ابھی تک بنگلے کے اندر کسی فائر کی آواز نہیں گونجی تھی۔

میں آگے بڑھا اور ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ہاتھ گزار کر کھڑکی کی سٹخنی گرادی۔ اگلے ہی لمحے میں کھڑکی کھول کر کمرے میں داخل ہوچکا تھا۔

وہ کمرا میری توقع کے مطابق خالی تھا اور اس کا دروازہ نیم وا تھا۔ اسی لمحے دروازے کے باہر مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں لپک کر نیم وا دروازے کے پیچھے پہنچ گیا۔ شاید کوئی شیشے کے ٹوٹنے کا سبب جاننے اس طرف آنکلا تھا۔ بڑی دیر کی تھی اس مہربان نے آتے آتے!

مگر میں کسی دیر کے موڈ میں نہیں تھا۔ جیسے ہی وہ شخص جھانکنے والے انداز میں کمرے کے اندر داخل ہوا، میں نے بڑی بے دردی سے کلاشنکوف کا بٹ اس کی کھوپڑی پر رسید کردیا۔ وہ ایک بے معنی سی آواز نکال کر منہ کے بل فرش پر گرا۔ اسی لمحے باہر سے کسی نے پکار کر پوچھا۔

''ادریس! کیا ہوا۔ یہ آواز کیسی تھی؟''

پتا نہیں ادریس کا ساتھی شیشے کے ٹوٹنے کی آواز کے بارے میں استفسار کررہا تھا یا اس کے منہ سے خارج ہونے والی بے معنی صدا کا پوچھ رہا تھا۔ ہر دوصورت میں ادریس نامی وہ شخص جواب دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اب یقینی تھا' ادریس کا ساتھی اس کی کیفیت معلوم کرنے ادھر کا رخ کرتا۔ میں کلاشن کو تان کر ریڈ الرٹ ہوگیا۔ ادریس کے خیر خواہ نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ ادریس ادھ کھلے دروازے میں سے صاف زمین بوس نظر آرہا تھا۔

اس سے پہلے کہ باہر موجود شخص خوف زدہ ہوکر بھاگ کھڑا ہوتا' میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اس کے سامنے آگیا۔ وہ انہی دو افراد میں سے ایک تھا جو تھوڑی دیر پہلے بڑے برآمدے والے دروازے میں نمودار ہوئے تھے۔ اس تنومند شخص کے ہاتھ میں مجھے ریوالور دکھائی دیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریوالور سیدھا کرنا چاہا لیکن میں نے اسے مہلت نہ دی۔

میں بڑی تیزی سے ہوا میں اچھلا اور ایک دھواں دھار گھٹنا اس کے سینے پر رسید کیا۔ دوسرا گھٹنا اس کے پیٹ کے زیریں حصے پر پڑا۔ ناف کے مقام پر بڑی شدید چوٹ آتی ہے اور تکلیف ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے۔ وہ کسی زخمی صحرائی اونٹ کے مانند بلبلایا۔

میں نے اسی پر بس نہ کیا اور اس کے چہرے کے مختلف حصوں کو نشانہ بناتے ہوئے متعدد خوفناک پنچ جڑ دیے۔ اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا۔ ان ناگفتہ بہ لمحات میں اسے ریوالور چلانے کا خیال کہاں سے آتا' اس کے لیے تو سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اور ''خاطر داری'' کی اور اسے فرش پر لمبا لٹا دیا۔ ریوالور کو اٹھا کر میں نے پتلون کی جیب میں رکھا اور ایک طویل راہ داری میں دوڑ گیا۔

اس راہ داری کا اختتام ایک کشادہ کمرے پر ہوا۔ وہاں میں نے صدف کو دو افراد کے ساتھ دھواں دھار انداز میں نبردآزما دیکھا۔ ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا اسے میری مدد کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں مطمئن ہوکر اس کا فائٹنگ اسٹائل دیکھنے لگا۔

یہ اطمینان بڑا عارضی ثابت ہوا اور میں منہ کے بل فرش پر آرہا۔ کسی نے بڑے خوفناک انداز میں مجھے عقب سے دھکا دیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا دبے قدموں میرے قریب پہنچا تھا اور میری غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے مجھے زمین بوس کردیا تھا۔

میں نے اٹھنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی لیکن اس دوران میں وہ گینڈا مجھے اپنے پسٹل کے نشانے پر رکھ چکا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں اسے پہچان لیا۔ وہ منقش دروازے سے پلٹنے والا دوسرا شخص تھا۔

میں نے کلاشنکوف سیدھی کرنا چاہی تو وہ غرایا ''تو...... گن کو پھینک دو۔ ورنہ بلا سوچے سمجھے کھوپڑی میں سوراخ کردوں گا۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کلاشن کوف کو دور پھینک دیا۔ گن صدف والے کمرے کے دروازہ کے پاس جا کر گری۔ اسی وقت پستول بردار شخص نے مجھے وارننگ دی۔

''کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ اپنے ہاتھ ہوا میں اٹھادو۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی ہدایت کو پورا کیا۔ ہم ایک دوسرے کے روبہ رو کھڑے تھے۔ ہمارے درمیان بہ مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میرا رخ صدف کی طرف تھا جب کہ پستول بردار شخص کی اس جانب پشت تھی۔ وہ بڑی چوکنا نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

اچانک صدف نے چیختے ہوئے اپنے مدِمقابل کو فرنٹ فلائنگ کک ماری۔ کلکس تو وہ پہلے بھی چلا ہی رہی تھی لیکن چیخی پہلی مرتبہ تھی میری چھٹی حس نے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں مجھے خبر دی کہ صدف نے مجھے پستول کے نشانے پر دیکھ لیا ہے اور مجھے چانس دینے کے لیے اس نے خواہ مخواہ حلق کا استعمال کیا ہے۔ مجھے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔

نتیجہ حسبِ توقع برآمد ہوا۔ اپنے عقب میں صدف کی تیز چیخ سن کر پستول بردار ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا۔ میرے لیے وہ لمحاتی وقفہ بہت کافی تھا۔ میں نے فرنٹ اسٹیپ کے ساتھ اس کے پیٹ میں تھرسٹ کک ماری۔ وہ پستول سمیت پیچھے کو لڑھکا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی تواضع شروع کردی۔

اب ہم دونوں بھی صدف والے کمرے ہی میں تھے۔ پستول اس شخص کے ہاتھ سے نکل کر دور پڑی کلاشنکوف کے

پاس جا گرا۔ صدف نے اپنے مدمقابلین کی ٹھکائی کے دوران میں مجھ سے کہا۔

''وجدان! میں نے اپنی سائیڈ صاف کردی ہے۔ بس یہی دو بچے ہیں تین کو میں نے ادھر لم لیٹ کردیا ہے۔ تمہاری طرف کیا صورتِ حال ہے؟''

میں نے اپنے مدمقابل کو تھرد مار کر زمین پر پٹخا اور کہا ''میری سائیڈ بھی صاف ہی سمجھو۔ جو کچھ بچا ہے تمہارے سامنے ہے۔''

''ان لوگوں کو جلد از جلد بے کار کرکے ہمیں بنگلے کی تلاشی لینا چاہئے۔'' صدف نے بلاکنگ کرتے ہوئے کہا ''ابھی تک جن کمروں سے گزری ہوں' وہاں ساحل مجھے دکھائی نہیں دی۔''

''وہ مجھے بھی کہیں نظر نہیں آئی۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اسی وقت صدف سے پٹنے والے ایک شخص نے موقع پاکر راہ داری میں دوڑ لگادی۔ یہ صدف کے حصے والی راہ داری تھی۔ وہ اس مفرور شخص کے پیچھے لپکی۔ بڑی سرعت سے بولی۔

''وجدان! تم انہیں سنبھالو۔ میں اس بھگوڑے کو مزہ چکھا کر آتی ہوں۔''

وہ دونوں میرے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ان کا پھلکا اڑا دیا۔ ایک بات کا مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان تین افراد کے سوا ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا اور کوئی شخص بنگلے میں باقی نہیں بچا تھا۔ گویا ساحل اور میرے درمیان حائل تمام رکاوٹیں اٹھ گئی تھیں!

اس خیال نے مجھے سرتاپا مسرور کردیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں کی نپی تلی خطرناک ضربات سے اپنے مقابل دونوں افراد کو زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اب وہ زمین سے اٹھ کر ہمارے کام میں مداخلت نہیں کریں گے تو میں ان پر لعنت بھیج کر اس سمت بڑھ گیا جدھر صدف گئی تھی۔

میں ایک دو راہ داریوں میں چکرایا اور پھر اسی کمرے میں آ گیا جہاں سے چلا تھا۔ وہ بنگلا عجیب و غریب طرزِ تعمیر کا حامل تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے احساس ہوا جیسے میں بھول بھلیوں میں آ نکلا ہوں۔ عام طور پر رہائش گاہیں اس انداز میں تعمیر نہیں کی جاتیں۔ اگر ساحل کو اس بنگلے میں رکھا گیا تھا تو اس کی اہمیت بھی تھی۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف وہی شخص باقی بچا تھا جس کے تعاقب میں صدف گئی تھی۔ مذکورہ شخص نہتا تھا۔ اگر وہ قابو آجاتا تو اس سے ساحل کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی تھیں۔ میں نے اپنے تئیں تمام ممکنہ کمروں میں جھانک لیا لیکن ساحل کا کوئی سراغ ہاتھ نہ آیا۔

میں اس وقت ایک مشین بنا ہوا تھا۔ ایک راہ داری سے گزرتے ہوئے مجھے صدف نظر آ گئی۔ اس نے مذکورہ شخص کو زمین پر گرار رکھا تھا اور اس کے سینے پر پاؤں رکھے کچھ پوچھنے کی کوشش کررہی تھی۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ زمین پر گرے ہوئے شخص کی حالت خاصی ابتر دکھائی دیتی تھی۔ صدف نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

''وجدان! کسی طرح اس کی زبان کھلواؤ ورنہ ہم ساحل تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

میں نے نیچے جھک کر اس شخص کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی آخری دموں پر تھا۔ میں نے مار پیٹ کے بجائے اسے ایسی جسمانی اذیت پہنچائی کہ تکلیف کی شدت سے اس کا بجھتا ہوا دماغ چند لحات کے لیے روشن ہوگیا۔ میں نے گنتی کے ان لحات کا بڑا بھرپور استعمال کیا اور اس سے اس بنگلے کے ایک کمرے کے بارے میں پوچھنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اہم کمرا جس میں میری ساحل کو قید کیا گیا تھا۔ میرا وجود اس وقت سنسنی کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

وہ شخص زندگی کی قید سے آزاد ہوا تو ہم دونوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہمارے قدم اس مخصوص دروازے کی طرف اٹھ گئے جسے کھولنے کا طریقۂ کار ہمیں معلوم ہوچکا تھا۔

وہ دروازہ اسی راہ داری میں واقع تھا جدھر میں نے پستول بردار کی گت بنائی تھی لیکن اس دروازے کی وضع قطع عام دروازوں جیسی نہیں تھی۔ وہ دیوار ہی کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ اس لیے ہمارا اس طرف پہلے دھیان نہیں گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ دروازہ کھولا اور ہم دونوں یکے بعد دیگرے اس کمرے میں داخل ہوگئے۔ اسی وقت ہمیں حیرت کے شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہمارے کمرے میں قدم رکھتے ہی دروازہ خودکار انداز میں کھٹاک سے بند ہوگیا تھا۔

ہم دونوں نے آنکھیں پھیلا کر اس کمرے کی حیرت آفرینی کو اپنی بصارت میں اتارا۔ وہ چکنے فرش والا ایک خالی کمرا تھا جس کی دیواروں اور چھت میں مختلف آئینے نصب تھے۔ اس کمرے کے در و دیوار میں ہم ہی ہم نظر آرہے تھے۔ ایسا ہی ایک سین میں نے بروس لی کی فلم ''انٹر دی ڈریگن'' میں دیکھا تھا۔ یہ آئینہ خانہ کمرا بھی اس کمرے جیسا ہی تھا۔ بروس لی کو شکار کرنے کے لیے فلم کے ولن نے وہ کمرا تیار کروایا تھا۔

اسی لمحے برق کی رفتار سے ایک سنسنی خیز خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ کیا ہمیں بھی شکار کرلیا گیا ہے؟

اس خیال کے ساتھ ہی میرے وجود میں کسیلا دھواں بھرنے لگا۔ کم و بیش یہی کیفیت صدف کی بھی تھی۔ ہم نے الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ بولتا' کمرے میں ایک مانوس آواز ابھری۔

میں نے اس ابلیس صفت شخص کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ سی ایف کے کا روحِ رواں شعیب غوری تھا۔ وہ اپنی منحوس زبان سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''ویلکم......اینڈ ویل ڈن مسٹر وجدان!''

میں نے چاروں جانب نگاہ گھما کر آواز کے ماخذ کو کھوجنا چاہا لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ اسی وقت شعیب غوری کی زہریلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''کوئی فائدہ نہیں وجدان! تم کچھ بھی تلاش نہیں کرسکو گے۔ میں تمہارے بہت قریب موجود ہوں اور تمہیں دیکھ سن رہا ہوں۔ تم اپنی تمام صلاحیتیں آزما ڈالو لیکن اس کمرے سے باہر نہیں نکل سکو گے۔ اگر یقین نہ آئے تو ٹرائی کرسکتے ہو۔''

''تم چاہتے کیا ہو؟'' میں نے درشتی سے کہا۔

''بہت ہی خوبصورت سوال کیا ہے تم نے!'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا'' پیارے! میں جو چاہتا ہوں وہ بھی بتادوں گا پہلے ضروری کام تو نمٹالوں۔''

''ضروری کام!'' میں نے بے ساختہ کہا اور صدف کی طرف دیکھا۔

''ویری گڈ!'' شعیب غوری نے سراہنے والے انداز میں کہا'' تم بڑی جلدی میری سوچ تک پہنچ گئے۔ میں نے جس ضروری کام کا ذکر کیا ہے' اس کا تمہاری ساتھی سے گہرا تعلق ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے بے ہودہ انداز میں قہقہہ لگایا۔

''یہ کیا بکواس ہے!'' میں چیخ اٹھا'' ساحل کہاں ہے؟''

''ساحل کو بھول جاؤ احمق۔ ڈوبنے والے ساحل کی تمنا ہی کرسکتے ہیں۔ ان کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی۔ میں تمہیں تمہاری اس پستہ قامت ساتھی کے ہمراہ شرمنا کی کے سمندر میں ڈبونا چاہتا ہوں۔''

اس کا اشارہ صدف کی طرف تھا۔ میں اس کے مقصد کی تہ تک نہ پہنچ سکا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا'' پتا نہیں' تم کیا واہی تباہی بک رہے ہو!''

''پتا چل جائے گا......ابھی سب کچھ سامنے آجائے گا!'' وہ سفاکی سے بولا'' میں بات ختم کرتے ہی اس بند حیرت انگیز کمرے میں ایک مخصوص قسم کی گیس چھوڑنے والا ہوں۔ وہ گیس تمہاری سانسوں کے ساتھ پھیپڑوں میں اترے گی۔ تم دونوں نیم غنودگی کے عالم میں پہنچ جاؤ گے' تمہارے جذبات میں طوفان اٹھیں گے منہ زور اور بے لگام طوفان۔ تمہارے ذہنوں سے ہر تعلق ہر رشتہ مٹ جائے گا۔ تم ایک دوسرے کو صرف ایک مرد اور عورت کی حیثیت سے دیکھو گے۔ تمہارے جذبات میں بلا کا ہیجان پیدا ہوچکا ہوگا۔ تم للچائی ہوئی بھوکی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھو گے پھر تمہارے جبلی تقاضے منہ پھاڑ کر چیخنے لگیں گے اور میں......'' اس نے ذرا توقف کیا پھر اسی شیطانی انداز میں بولا'' میں تم دونوں کی کارکردگی کی زندہ مووی تیار کروں گا۔ سانپ کو کیلنے کے بعد اس کا زہر نکالا جاتا ہے۔ میں بھی تمہیں اس مووی کے ذریعے بانجھ بنا کر رکھ دوں گا۔ وجدان! تمہاری ساری مردانگی اور پھرتی خاک میں مل جائے گی۔''

''بکواس بند کرو کتے!'' میں حلق کی پوری قوت سے دہاڑا۔

شعیب غوری کی آواز آنا بند ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کمرے کے اندر ایک عجیب سی بو کو محسوس کیا۔ صدف بھی وہ بو سونگھ چکی تھی۔ اس نے وحشت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔ میں نے پوری قوت سے ایک دیوار پر پنچ مارا۔ دیوار میں نصب آئینہ چٹخ گیا۔ اس کے ساتھ ہی آئینے میں ابھرنے والا میرا عکس بھی بگڑ گیا۔ میں نے پلٹ کر بڑی تشویش سے صدف کا جائزہ لیا۔ میں اس کے چہرے پر نظر نہ ٹکا سکا۔ میں نے نگاہ جھکالی۔

وہ مخصوص بُو لحہ بہ لحہ بڑھتی جارہی تھی!

زندگی سانس کی آمد و شد کا نام ہے!

ہم دونوں زندہ تھے اور سانس لے رہے تھے' زندہ رہنے کی خواہش ہمیں سانس لینے پر مجبور کر رہی تھی لیکن اس سانس کے ساتھ ہی ایک خطرناک گیس بھی ہمارے پھیپھڑوں میں اتر رہی تھی۔ شعیب غوری نے اگر اس مخصوص گیس کے شرم ناک اثرات کا ذکر نہ کیا ہوتا تو شاید میں اس قدر پریشان نہ ہوتا۔ ان نازک لمحات میں' میں انسانی نفسیات کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر رہ گیا تھا اور واقعتاً مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ ہیجان خیز گیس میرے جذبات کو بھڑکا رہی تھی' کچھ کر گزرنے پر اکسا رہی تھی۔ پھر اگلے ہی لمحے جذبات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی یہ شوریدہ سری میرے وجود کے اندر سوئے ہوئے جبلی تقاضوں کو بیدار کرنے لگی۔

میں نے گھبرا کر اپنے سر کو جھٹکا اور نگاہ اٹھا کر صدف کی طرف دیکھا۔

وہ بھی اس وقت بڑے آزمائشی مراحل سے گزر رہی تھی۔ ظاہر ہے' اس کی کیفیت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔ اس کے وجود میں بھی جذبات کا منہ زور طوفان اٹھ رہا ہوگا۔ جب ہم دونوں ایک ایسی فضا میں سانس لے رہے تھے تو پھر ہمارے احساسات کا دھارا دو رخ کیسے ہو سکتا تھا! ہم ایک ہی سمت میں بہہ رہے تھے۔ صدف نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے دونوں ہاتھ سر پر تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنے اندرون سے خاموش جنگ لڑ رہی تھی' اپنے خون میں پیدا ہونے والے اشتعال کو تھپک تھپک کر سلا رہی تھی۔

وہ مجھے بہت اچھی لگی اور اچانک میرے دل میں خواہش جاگی کہ آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں بھر لوں۔ وہ میرا اٹوٹ انگ نظر آ رہی تھی جس کے سنگ لگ کر میں اپنی تکمیل کر سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ کیسی جادوئی گیس تھی جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری خواہش کو مہمیز کر رہی تھی۔ پھر مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور میرے قدم خود بہ خود صدف کی جانب اٹھنے لگے۔

ہمارے درمیان بہ مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا جسے دو سیکنڈ میں پاٹا جا سکتا تھا لیکن ان ہیجانی لمحات میں مجھے وہ دو سیکنڈ دو صدیوں سے زیادہ طویل نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ بے بسی کے احساس نے مجھے ہوش سے بے گانہ کر دیا' اگلے ہی لمحے میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند' دونوں بازو وا کیے صدف پر جھپٹا۔

صدف نے آنکھیں کھولیں اور بڑی صفائی سے پہلو میں کھسک گئی۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا' وہ بند آنکھوں کے پیچھے سے بھی مجھ دیکھ رہی تھی۔ اس کا بروقت ردِعمل حیران کن تھا۔ میں اپنی ہی جھونک میں منہ کے بل چکنے فرش پر جا گرا۔ فری فال ٹیکنیک کے باعث میں کسی سنگین چوٹ سے محفوظ رہا۔ میری دونوں ہتھیلیوں نے چکنے فرش کو بوسے دیے اور میں رولنگ کرتے ہوئے ایک طرف نکل گیا' عقب میں مجھے صدف کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''دج...... دان...... خود کو سنبھالو......''

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر پلکیں جھپکاتے ہوئے صدف کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر اسٹانس بنائے کھڑی تھی تاہم اس کے اسٹانس میں مضبوطی اور پختگی نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنی سی کوشش کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

صدف کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان خمار آلود آنکھوں میں بڑی معنی خیز چمک دیکھ کر میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس شیطانی گیس نے صدف کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ شعیب غوری نے اپنے مذموم عزائم بڑی وضاحت سے بیان کیے تھے۔ صدف کی ذہنی کیفیت کو مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ ہم اس وقت ایک ایسی کشتی میں سوار تھے جس کے پیندے میں ایک خطرناک شگاف پیدا ہو گیا تھا۔ اگر ہمیں خود کو ذلت کے سمندر سے ڈوبنے سے بچانا تھا تو پھر اس فتنہ پرور گیس کے اثرات سے نکلنا تھا...... چاہے اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑتا!

پھر میرا دماغ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس گیس نے ہمارے اندر اتر کر جو ہیجان پیدا کیا تھا وہ جبلی تقاضوں کی تکمیل کا تقاضا کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک ہی خواہش مجسم ہو کر رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ ہر مصلحت اور احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر صدف کو حاصل کر لوں' آج اسے اس کا نہ رہنے دوں' اس کا سب کچھ میرا ہو جائے۔ اسی قسم کا شیطانی انتشار صدف کے ذہن میں بھی پیدا ہو رہا تھا۔ مرد کی بہ نسبت عورت زیادہ ظرف اور برداشت کی مالک ہوتی ہے۔ وہ اپنے منہ زور جذبات کو زیادہ بہتر انداز میں لگام ڈالنا جانتی ہے۔ صدف بھی خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں وہ گویا پل صراط سے گزر رہی تھی۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی آیا کہ اس ہیجانی انتشار سے بچنے کے لیے ہمیں کسی اور مصروفیت میں غرق ہو جانا چاہیے...... اور دو فائٹرز کے لیے دنیا کی بہترین تفریحی مصروفیت فائٹ ہی ہو سکتی ہے!

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنی جگہ سے پرواز کی

اور صدف کو ایک فلائنگ کک مارنے کی کوشش کی۔ کوشش اس لیے کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ میری کک میں وہ ایکوریسی نہیں تھی جو میرا خاصہ رہی ہے۔ یہ کسی نشے میں ڈوبے ہوئے شخص کا عدم دلچسپی سے معمور حملہ تھا۔

صدف بہ آسانی ایک جانب ہٹ کر میرے حملے سے محفوظ ہو گئی' اس کے ساتھ ہی وہ میرے ذہن تک بھی پہنچ گئی تھی کیونکہ راستے سے ہٹتے ہی اس نے ایک ریئر کک میری کمر پر جڑ دی۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی فرنٹ پش کک میرے پیٹ میں لگی۔ میں سمجھ گیا' وہ بھی اپنے خون میں پیدا ہونے والی گرمی کو کسی اور محاذ پر نکال رہی تھی۔

پھر ہمارے درمیان باقاعدہ فائٹ شروع ہو گئی۔ اپنے ذہنی فتور سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ راستہ ہی سب سے زیادہ موزوں تھا۔ ہم بے دریغ ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگے۔ تاہم صدف کی نسوانیت ایک لمحے کے لیے بھی میری یادداشت سے غائب نہ ہوئی۔ میں اس پر ایسا کوئی اٹیک نہیں کر رہا تھا جو شدید نقصان کا باعث بنتا۔ میں اسے کوئی مہلک چوٹ لگانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی جان و دل مجھ پر نچھاور کرنے والی وہ پاکٹ سائز حسینہ میرے لیے بہت اہم تھی۔

شعیب غوری کی شیطانی اور شرم ناک چال سے بچنے کے لیے ہم میں سے کم از کم کسی کا ہوش مند رہنا ضروری تھا۔ اگر ہم دونوں ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے تو پھر ہمیں حیوان بننے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوتی۔ ہم اس بند آئینہ خانے میں ایک ایسے گھناؤنے کھیل کے دو کردار بن کر رہ جاتے جس کے نتائج ہماری گردنوں کو زندگی بھر کے لیے جھکا کر رکھ دیتے۔

ہم دونوں ایک دوسرے پر بھرپور حملے کر رہے تھے۔ صدف کے ہاتھ پاؤں کسی مشین کے مانند کام کر رہے تھے مگر اس مشین کے موڈ کو شعیب کی سازشی چال نے ''سلو'' پر ایڈجسٹ کر دیا تھا۔ ہماری وہ فائٹ کسی فلم کا سلو موشن نظر آتی تھی۔ وہ خبیث ابنِ خبیث کسی دوسرے کمرے میں بیٹھا بہ غور ہمیں واچ کر رہا تھا۔ اب تک ہم نے اس کے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے ایک بھی لغزشی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ میں یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ شعیب کو ہمارے ایکٹ سے سخت مایوسی ہو رہی ہوگی۔

اگلے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا' میری ہمت جواب دے رہی ہے۔ میں نے اپنی جبلی خواہش کے آگے مار دھاڑ کا جو بند باندھ رکھا تھا' اس میں شگاف نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ شاید یہ اس سفلی گیس کے مسلسل اثرات کا نتیجہ تھا کہ میں اپنے اندرونی ہیجان کے آگے بے بس نظر آنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر میرے دل میں یہ خواہش پوری طرح بیدار ہو گئی کہ صدف کو بھنبھوڑ کر رکھ دوں۔ اس سے پہلے کہ یہ شیطانی خواہش مجھے کہیں کا نہ چھوڑتی' میں نے نرمی کا دامن چھوڑ دیا۔

شعیب غوری کے مطابق ہماری زندہ مووی تیار کی جا رہی تھی۔ اگر ہم اسی طرح ڈھیلی ڈھالی فائٹ جاری رکھتے تو کسی بھی مرحلے پر ہمارے قدم ڈگمگا سکتے تھے۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کیا بڑے جارحانہ انداز میں صدف پر حملے کرنے لگا۔ ندامت کے احساس سے اپنی روح کو گھائل کرنے سے کہیں زیادہ بہتر تھا ہم اپنے جسموں کو لہولہان کر لیتے۔ صدف کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں لہٰذا وہ بھی اس پٹنے اور پیٹنے کے عمل میں پوری شد و مد سے شامل ہو گئی۔ اگر عزت کو بچانا تھا تو ایک دوسرے کو زخمی کرنا لازمی تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم بری طرح ہانپنے لگے۔ ہمارے ہاتھوں اور چہروں کے مختلف حصوں پر خون بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو بے دریغ پیٹا تھا۔ بعض اوقات اپنے پیاروں کی بھلائی کے لیے ان پر ہاتھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ اس نامراد گیس نے ہمارے خون میں شامل ہو کر جو سرکشی پیدا کی تھی' اس کے جوش میں ہم نے اچھی خاصی معرکہ آرائی کر لی لیکن اب ہمارے بدن تھکن سے چور ہو گئے تھے' مزید مقابلے کی ہم میں ہمت باقی نہیں رہی تھی۔

اسی لمحے ایک تشویش ناک احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ صدف بھی پریشان نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ہمارے جسم تھک گئے تھے تاہم کمرے کی فضا میں موجود اس گیس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ان تکان زدہ لمحات میں وہ نشیلی گیس ہمیں زیادہ آسانی سے شکار کر سکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میرے ان خوف ناک خیالات کی تصدیق ہو گئی۔

صدف یک ٹک بڑی معنی خیز نظر سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کا نشہ اتر آیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں اس کے سامنے سے نہ ہٹا تو وہ بھوکی شیرنی کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑے گی۔ میں نے طرح دینے کے بارے میں سوچا لیکن میری یہ سوچ' سوچ ہی رہی...... عمل کی صورت اختیار نہ کر سکی کیوں کہ اس وقت جس عمل کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا وہ کسی بھی حفاظتی ردِعمل کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس منحوس گیس کے بداثرات نے ہمیں حیوانیت کے دائرے میں دھکیل دیا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر ان شرم ناک خیالات کو اپنے ذہن سے بھگانے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش بے سود رہی۔ اس وقت جبلی تقاضے حلق کے بل چنگھاڑ رہے تھے۔ بے بسی کے احساس کو فراموش کر کے میں صدف پر جھپٹ پڑا۔

وہ بڑی معنی خیز مدافعت پیش کرنے لگی۔ ہیجان انگیز گیس نے اس کے جذبات کو بھی برانگیختہ کر رکھا تھا۔ اس معنی خیز مدافعت میں بڑا جارحانہ پن تھا۔ لگتا تھا وہ مدافعت نہ ہو بلکہ ایک قسم کی ظالمانہ خودسپردگی ہو!

ہم حیرت آفرین کمرے کے چکنے فرش پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور دو وحشی جانوروں کی طرح جھنجھوڑ کر ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمارے ذہن سے شرافت اور انسانیت اٹھ گئی تھی جس کی جگہ وحشت اور درندگی نے لے لی تھی۔ اگر ہم اپنے حواس میں ہوتے تو اپنے اس ایکٹ پر شرم سے پانی پانی ہو جاتے۔ اس بیرن گیس نے ہمیں فلک سے توڑ کر قعرِ مذلت میں لا پٹخا تھا۔ فرزانگی اور دیوانگی کوسوں دور تھیں۔ اس وقت ہم اپنے جذبات کے غلام دو حیوان تھے جو ایک دوسرے کو نوچنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں ہمارے لباس تار تار ہو رہے تھے۔ اس وحشت میں بڑی بے گانگی اور خودغرضی پائی جاتی تھی۔

اچانک میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی قوت نے پیچھے کھینچ لیا ہو مجھے تباہی و بربادی سے بچالیا ہو۔ اس دماغی جھٹکے کے ساتھ ہی ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا بھی ہوا تھا۔ میرا اندرون منور ہو کر رہ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے صدف کو پیچھے دھکیلا اور آنکھیں بند کر لیں یہ سب کچھ جس بھی قوت کے زیرِ اثر ہوا تھا وہ بلاشبہ اس فتنہ انگیز گیس سے زیادہ فعال تھی جب ہی تو میں شرم ناکی کے گڑھے میں گرتے گرتے بچا تھا۔

جس طرح ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے بالکل اسی طرح بھٹکنے والے کو سنبھلنے کے لیے ایک اشارہ بہت ہوتا ہے۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر سنبھلنے کے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کمرے کے چکنے فرش پر پدم آسن جما کر بیٹھ گیا۔

صدف میرا دھکا کھا کر دور تک لڑھکتی چلی گئی تھی۔ وہ اس وقت مجھے ایک دیوار کے قریب نظر آ رہی تھی اور وہ حیرت بھری نظر سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ہم جس ندامت کے سمندر میں غرق ہونے جا رہے تھے اس کے پیشِ نظر میرے رویے نے صدف کو الجھا دیا تھا۔ ہم جس عمل سے گزرنے والے تھے اس میں ہم دونوں کی جبلی خواہشات شامل تھیں چاہے وہ کسی ظالم گیس کے طفیل ہی تھیں۔

میں نے صدف کو حیران و پریشان چھوڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے روشنی کا ایک اور جھماکا ہوا اور میری باطنی آنکھ آگ کے ایک گولے پر ٹک گئی۔ وہ گولا روشنی اور حرارت کا منبع سورج تھا گویا میں اندرونی آنکھ سے شمس بینی کر رہا تھا۔ پھر بند آنکھوں کے عقب میں ایک کھلا ہوا منظر طلوع ہونے لگا۔ تصور اور تخیل کندھے سے کندھا ملا کر بازی گری میں مصروف ہو گئے تھے۔

میں نے خود کو پہاڑ کی ایک چوٹی پر بیٹھے پایا۔ میری نگاہ کے سامنے ایک دوسرے پہاڑ کے اوپر وہ گولا موجود تھا جس پر میری نظر جمی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے احساس کی قوت سے اس منظر کو پہچان لیا۔ وہ شاؤلن ٹیمپل کا بیرونی علاقہ تھا۔ پھر مجھے یاد آنے لگا اپنی تربیت کے دوران میں میں اس پہاڑی پر بیٹھ کر شمس بینی کیا کرتا تھا۔ میرے دادا استاد ماسٹر ہینگ پائی "چی" کی بیداری کے لیے مجھے اسی پہاڑی پر لے آتے۔ مخصوص مشقوں کے اختتام پر وہ مجھے شمس بینی کا درس دیتے۔ ماسٹر کے مطابق ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھنا بہت مفید تھا۔ ارتکازِ توجہ کے لیے یہ ایک عمدہ مشق ہے۔

ان لمحات میں مجھے ارتکاز کی اشد ضرورت تھی۔ اگر میں اپنے دھیان کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ شر انگیز میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ میرا کچھ نہیں بگاڑنے کا مطلب تھا ہم دونوں کا ایک بال بھی بانکا نہیں کر سکتی تھی۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک بھی سنبھل جاتا تو شعیب غوری کی وہ مذموم سازش ناکام ہو جاتی اور...... میرا خیال ہے میں پوری طرح سنبھل چکا تھا!

میرے تصور کی نگاہ سورج پر جمی ہوئی تھی اور میں اپنے ذہن سے کچھ اس قسم کے خیالات کو گزار رہا تھا...... یہ سورج بہت مہربان اور دست گیر ہے۔ یہ میرا ہمدرد دوست ہے ایک مخلص دوست۔ یہ میری خیر خواہی کا خواہش مند ہے۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں۔ یہ وفا پیشہ میری سبک سری چاہتا ہے مجھے فخر سے سر اٹھا کر جیتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے اسی لیے یہ میرے تصور میں اجاگر ہوا ہے۔ سچے دوست مشکل وقت میں اسی طرح مدد کو آیا کرتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا میرے اندر پھیلی ہوئی اس ہیجانی کیفیت کی شدت میں کمی واقع ہونا شروع ہو گئی۔ صدف کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت سامنے نہیں آئی تھی اس کا بھی مطلب تھا وہ بھی اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو سرد کرنے کے لیے کسی برف زار میں اتر گئی تھی۔ ہو سکتا ہے میری طرح اسے بھی کچھ سوجھ گیا ہو! وہ بھی انتشار پر قابو پانے والی کسی مشق میں جت گئی ہو۔

میں نے واپس اپنا دھیان سورج کی طرف لگا دیا اور آٹو سجیشن (خود ترغیبی) کی مدد سے پیش آمدہ حالات سے نمٹنے لگا۔ رفتہ رفتہ میرے خون کا آتش فشاں ٹھنڈا ہونے لگا۔ جذبات کے بھڑکیلے پن میں کمی آئی تو اعصاب پُرسکون ہوتے چلے گئے حیوانی جوش و خروش ماند پڑنے لگا اور میں دھیرے دھیرے نارمل ہوتا چلا گیا۔ میں نے ان لمحات میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

آہستہ آہستہ اس کیفیت میں اضافہ ہونے لگا میں تن من سے شانت ہو گیا۔ میرا وجود زمین سے اٹھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ہوا میں پرواز کر رہا ہوں۔ میرے اردگرد بلند و بالا پہاڑ استادہ تھے۔ میں بادلوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میرا رخ سورج کی سمت تھا۔ وہ سورج جس کی مہربان کرنوں نے آگے بڑھ کر مجھے ذلت کے عمیق غار میں گرنے سے بچالیا تھا۔ میں اس دست گیر روشنی کی جانب بڑھتا گیا۔ یہ بڑھنا غیر ارادی اور بے اختیارانہ تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔ میرا تصور شاید اس روشنی کے تابع تھا جو اس کے ایما پر مجھے اس کی طرف اڑائے چلا جا رہا تھا۔ اس کی یہ پرواز بڑی کیف آور اور خودفراموشی کی حامل تھی۔

اچانک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ایک جھماکا ہوا اور میں اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ اب مجھے کچھ دکھائی یا سنائی نہیں دے رہا تھا۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی اور میں بھی اسی روشنی کا ایک حصہ تھا اسی آفتاب کا ایک ذرہ تھا۔

پتا نہیں سورج میرے وجود میں اتر آیا تھا یا میرا وجود ہی ٹوٹ کر اس میں بکھر گیا تھا!

☆☆☆

وہ ایک کنگ سائز عجیب و غریب پنجرہ تھا!

اس پنجرے کو دیکھ کر ہیبت سی محسوس ہوتی۔ اس کی شکل ایک عام دیسی پنجرے ایسی تھی تاہم سائز میں وہ ایک وسیع و عریض کمرے کو شرماتا تھا۔ اسے ایک گولائی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ کشادہ ہال کے ایک حصے میں اس آہنی پنجرے کو ایک کنکریٹیڈ چبوترے پر نصب کیا گیا تھا۔ مذکورہ چبوترے کی اونچائی تین فٹ رہی ہوگی۔ پنجرے کی تیلیاں اس چبوترے کے اندر گڑی تھیں۔ لفظ "تیلیاں" اس پنجرے کے شایانِ شان نہ تھا بلکہ تیلیوں کے نام پر دو انچ موٹی آہنی سلاخیں نظر آ رہی تھیں۔ اس پنجرے کا قطر لگ بھگ بیس فٹ تھا اور اونچائی کسی بھی طور پندرہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ تمام موٹی آہنی سلاخیں ایک خاص زاویے سے اوپر جا کر پندرہ فٹ کی بلندی پر آپس میں مل رہی تھیں۔ اس طرح ایک بڑا سا گنبد تشکیل پاتا تھا۔ ہر دو سلاخوں کے درمیان بہ مشکل پانچ انچ کا فاصلہ تھا گویا اس ہیبت ناک پنجرے میں مقید شخص سلاخوں کے بیچ سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتا تھا۔ پنجرے میں آمد و رفت کے لیے ایک دروازہ بھی تھا جو پانچ فٹ اونچا اور تین فٹ چوڑا تھا۔ وہ پنجرہ چوں کہ زمین سے تین فٹ کی بلندی پر تھا اس لیے اس کے اندر پہنچنے کے لیے تین اسٹیپ کی ایک آہنی سیڑھی بھی دروازے کے سامنے موجود تھی۔

مذکورہ حیرت انگیز پنجرہ جس ہال میں موجود تھا اس کے دوسرے حصے میں بھی ایک نیم بیضوی چبوترہ تھا جس پر تین کرسیاں پہلو بہ پہلو رکھی تھیں۔ وہ کرسیاں نہایت ہی قیمتی اور عالی شان تھیں لیکن ان کی شان بڑھانے کے لیے اس وقت کوئی بھی شخصیت وہاں براجمان نظر نہیں آتی تھی۔ وہ وسیع و عریض ہال کم و بیش پچیس ضرب پچاس فٹ پیمائش کا حامل تھا اور میں...... میں اس آہنی پنجرے کے عین وسط میں لکڑی کے ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔

میرے مجسم پر لباس کے نام پر صرف ایک شارٹ نیکر تھا جو کسی ریسلر کے جانگیا سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر آہنی جکڑ میں تھے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے یہاں پہنچایا گیا تھا۔ مجھے یہاں تک لانے والے مسلح افراد سنگین چہروں والے خاموش انسان تھے۔ ان کی آنکھوں سے وحشت اور سفاکی ٹپکتی تھی۔ میں نے ان کے بشروں کے تاثرات سے اندازہ لگالیا کہ اگر میں نے ایک ذرا سی زبان بھی کھولی تو وہ مجھے زندگی سے گزارنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے۔

میں نے نصف درجن مسلح افراد کے نرغے میں آنکھ کھولی تھی اور اپنے بدن پر اسی اکلوتے جانگیے کو پایا تھا۔ پتا نہیں میں کتنے گھنٹے ہوش و حواس سے بے گانہ رہا تھا۔ مجھے تو صرف اتنا یاد تھا کہ صدف سے کشتم کشتی اور چھینا جھپٹی کے دوران میں اچانک میرا ذہن روشنی میں نہا گیا تھا۔ میں شیطانی گیس کے زیرِ اثر ایک شرم ناک کھیل سے باز آ گیا تھا۔ اپنے ذہن کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے میں نے روشنی کے اس ماخذ سے آنکھیں چار کر لی تھیں۔ تخیل اور تصور کا یہ کھیل معلوم نہیں کہاں جا کر ختم ہوا تھا...... واقعی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا!

میں نے ہوش و حواس میں لوٹنے کے بعد خود کو آہنی گرفت میں پایا تھا۔ میرے اور میرے لباس کے ساتھ جو کچھ

بھی ہوا' وہ میری بے خبری میں ہوا تھا......اور اب یہ قائمی ہوش و حواس جو کچھ ہونے والا تھا اس کے بارے میں قبل از وقت کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ گن بردار افراد نے مجھے اس پنجرے میں پہنچانے کے بعد پنجرے کو مقفل کر دیا تھا' پھر وہ خاموشی کے ساتھ اس کشادہ ہال سے نکل گئے تھے۔ اس ہال میں آمد و شد کے لیے صرف دو دروازے تھے اور وہ دروازے نیم بیضوی چبوترے کے دونوں پہلوؤں میں واقع تھے۔

میرا ذہن اس وقت برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہلکی سی بھوک بھی محسوس ہوئی۔ میں نے دوپہر میں صدف کے گھر لنچ کیا تھا' اس کے بعد باقاعدہ کھانا کھانے کی نوبت نہ آئی۔ ہم دونوں رات دس بجے سفید رنگ کے اس یک منزلہ بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد کے حالات ایک فلم کے مانند میرے ذہن کے اسکرین سے گزر گئے پھر میرا تصور صدف پر اٹک ہوگیا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اس آئینہ خانے میں بند ہوئے تھے۔ وہاں ہم پر جو گزری وہ تو رہی ایک طرف' تشویش ناک بات یہ تھی کہ اب میں اکیلا تھا صدف کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی......اور اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا ہوگا!

میں صدف کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہال کے دو دروازوں میں سے ایک کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں مجھے خبیث الاخبث' شیطان ابنِ شیطان شعیب غوری نظر آیا۔ اس کے پیچھے دو مسلح گارڈز تھے۔ شعیب غوری نے ہمیشہ کی طرح بے داغ قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔

مجھ سے نگاہیں ملیں تو وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر خاموشی سے نیم بیضوی چبوترے کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں گارڈز اسے کمرے میں پہنچا کر واپس چلے گئے اور وہ دروازہ ایک مرتبہ پھر بند ہوگیا۔ شعیب کا تن تنہا اس وسیع و عریض ہال میں موجود رہنا اس کی بے پناہ قوتِ اعتمادی کو ظاہر کرتا تھا۔

شعیب چبوترے پر رکھی تین عالی شان کرسیوں میں سے درمیانی پر بیٹھ چکا تو بڑی دلچسپی سے مجھے تکنے لگا۔ اس نے ملٹی کوٹیڈ گلاسز والا نہایت ہی بیش قیمت چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس چشمے کے فریم کی مالیت کم از کم اتنی تھی کہ اس رقم سے ایک متوسط گھرانے کا دو ماہ کا راشن خریدا جاسکتا تھا۔

اس ہال میں روشنی کا مناسب انتظام تھا بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی چکا چوند تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں کوئی شوبز فنکشن ہونے والا ہو۔ شعیب کے دیکھنے کے جواب میں میں بھی اسے ناپسندیدہ نظر سے گھورنے لگا۔ اسی لمحے ہال میں شعیب کی بھاری بھرکم آواز گونجی۔

''غصہ تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں وجدان۔ خود کو کنٹرول میں رکھو!''

''صدف کہاں ہے؟'' میں نے جارحانہ انداز میں استفسار کیا۔

''میں نے کہا نا' جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرو۔'' وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ سنگین لہجے میں بولا ''تمہاری طرف سے معاملات خاصے گڑبڑ ہو چکے ہیں' ہماری جانب کا معاملہ بگاڑو گے تو تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

میں ہتھے سے اکھڑ گیا اور نہایت ہی سخت الفاظ میں کہا ''مجھے تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں ذلیل انسان۔ میں نے اپنی ساتھی کے بارے میں پوچھا ہے؟''

اس نے میرے گستاخانہ انداز کا......برا نہ منایا۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ سفاک شخص بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مسٹر وجدان! تمہارا ابھی کچھ ٹھیک نہیں۔ پہلے تم نے مجھ سے ساحل کے بارے میں استفسار کیا۔ اب صدف کو پوچھ رہے ہو؟''

''تم میرے سوال کا جواب دو۔ بڈھے طوطے کی طرح ''ٹیں ٹیں'' نہ کرو۔''

''بڑی گرمی ہے تمہارے دماغ میں۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا ''بدن کی گرمی تو خاصی حد تک نکل چکی۔ لگتا ہے تمہارے دماغ کے ساتھ بھی کوئی ہاتھ کرنا پڑے گا۔''

دماغ کی گرمی جیسے الفاظ اور بڑے چبھتے ہوئے انداز میں بدن کی گرمی کے ذکر نے مجھے چونکا دیا۔ وہ شیطان ایک مخصوص حوالے سے یہ تذکرہ چھیڑ رہا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں مجھے قلبی سکون حاصل تھا کہ صدف کے ساتھ اس بند آئینہ خانے میں' میں ایک شرم ناک کھیل کا کردار بننے سے بال بال بچ گیا تھا۔

میں نے شعیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے پروائی سے کہا ''پتا نہیں تم کیا بکواس کر رہے ہو!''

''ابھی پتا چل جائے گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میری بکواس کو حقیقت کا روپ دھارتے ہوئے تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ میں نے جس زندہ موویی کا ذکر کیا تھا' وہ تیار ہو چکی۔ تمہاری شرم ناک کارکردگی کی ایک ایک جنبش ریکارڈ پر آچکی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو میں وعدے کا کتنا پابند ہوں۔ ہم دونوں......''

''تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں چیخ اٹھا ''اس سلسلے میں تم مجھے بلیک میل نہیں کر سکتے۔ میں جانتا ہوں' میرا دامن داغ دار نہیں ہو سکا۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی اور صلاحیت کے بل بوتے پر خود کو آلودہ ہونے سے بچا لیا۔ تمہارے مذموم عزائم کی تکمیل نہیں ہو سکی میں تمہارے دباؤ میں نہیں ہوں۔''

اس نے ایک اونچا قہقہہ لگایا۔ اس کی آواز بڑے خوب صورت انداز میں چاروں جانب گونجنے لگی۔ اس ہال میں ساؤنڈ ایفیکٹس کا بھی معقول خیال رکھا گیا تھا۔ اپنی آواز کو ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے کے لیے چیخ کر بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عام بول چال کو ہر طرف سنا جاسکتا تھا۔

''وجدان! تمہارا تو وہ حال ہے کہ رسی جل گئی لیکن بل نہ گئے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ صورتِ حالات میں کس قدر سنگینی در آئی ہے۔ اس وقت تم کامل طور پر میرے رحم و کرم کے محتاج ہو۔ یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم پر میرا دباؤ نہیں۔ میرے عزائم مذموم تھے یا مسنون' اس بحث میں نہ پڑو۔ صرف یہ دیکھو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔''

''تم بکتے ہو......بکواس کرتے ہو......'' میں نفرت آمیز لہجے میں بولا ''مجھے اچھی طرح یاد ہے......''

''تمہیں کچھ بھی یاد نہیں۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں بولا ''تم اور تمہاری وہ پستہ قامت ساتھی اس مخصوص گیس کے زیرِ اثر تھے۔ تمہیں کچھ یاد نہیں تھا' کچھ دھیان نہیں تھا۔ تم لوگوں کا دھیان تو بس ایک ہی نقطے پر مرکوز تھا کہ اپنے جذبات کا غبار نکالنا ہے اپنے جبلی تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ تم تو اپنے گرد و پیش سے بے گانہ صرف اور صرف ایک ہی مہم پر کمربستہ تھے لیکن!'' اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑی اور کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں خاموش رہا تو اس نے بات مکمل کر دی ''لیکن کیمرے کی آنکھ بے گانہ اور بے خبر نہیں ہوتی۔ آج کل تو ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اور زوم لینس کا زمانہ ہے۔ حساس کیمرے سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے کہا تھا نا' سانپ کو کیلنے کے بعد اس کا زہر نکال دیا جاتا ہے۔ میں نہ صرف تمہیں کیل چکا بلکہ میں نے تمہارا سارا زہر بھی نکال دیا ہے۔ اب تمہاری حیثیت ایک حقیر کیچوے سے زیادہ نہیں۔ تمہارے اعمال کا جو ریکارڈ میں اپنے پاس محفوظ کر چکا ہوں' اس کے ذریعے میں تمہیں اپنے قدموں میں لوٹنے پر مجبور کر سکتا ہوں۔''

وہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا تھا۔ حقیقت کیا تھی یہ میرے اور صدف سے زیادہ اور کوئی نہیں جان سکتا تھا لیکن وہ جتنے اعتماد سے بول رہا تھا' اس کی بات کو نظر انداز کرنا حماقت ہوتی۔ وہ یہودیوں کا پٹھو اور ایک نہایت ہی طاقتور شخص تھا' سمجھدار اور منصوبہ ساز بھی تھا۔ وہ کوئی بھی سازشانہ چال چل کر سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کر سکتا تھا۔ اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ میں اپنے جوش کو قابو میں رکھوں اور ہوش کو کام میں لاتے ہوئے اس کے چنگل سے نکلنے کی کوشش کروں۔ ان فیصلہ کن خیالات نے مجھے شانت کر دیا۔

مجھے خاموش پا کر شعیب غوری نے دوستانہ انداز میں کہا ''اپنی شان دار کارکردگی کی رنگین وڈیو نہیں دیکھو گے؟''

میں نے دماغ کو ٹھنڈا اور جذبات کو معتدل رکھتے ہوئے کہا ''اب تم اتنا زیادہ اصرار کر رہے ہو تو دیکھ لیتا ہوں۔ تمہارے اشتیاق کو کچھ نہ کچھ خراجِ عقیدت پیش کرنا ہی پڑے گا نا!''

وہ میرے انداز پر چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ وہ شاید مجھ سے یہی توقع کر رہا تھا کہ میں چیخ چلا کر اسے برا بھلا کہوں گا۔ میں نے اس کی توقع کا جنازہ نکال دیا تو وہ معاندانہ نگاہ سے مجھے گھورتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور ہال کی ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔

مذکورہ دیوار کے ساتھ ایک ٹرالی پر بڑے اسکرین والا ٹی وی موجود تھا۔ یہ دیوار شعیب کے دائیں اور میرے بائیں ہاتھ پر تھی۔ وہ ٹی وی ٹرالی کے نزدیک پہنچا پھر اس کے دونوں ہاتھ وہاں رکھے ٹی وی اور وڈیو سے مصروف ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ اپنی کرسی پر موجود تھا۔ اس وقت شعیب کے ہاتھ میں مجھے ایک ریموٹ کنٹرول بھی نظر آیا۔

وہ چند لمحات تک ریموٹ کنٹرول کے ذریعے ریوائنڈ فارورڈ کھیلتا رہا پھر پلے کا بٹن دبانے کے بعد اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری تشویش بھری چوکنا نظر ٹی وی اسکرین پر جم گئی۔ اس کنگ سائز اسکرین پر کوئی بہت بڑا انکشاف ہونے جا رہا تھا۔ شعیب کا دعویٰ کسی خوف ناک طوفان سے کم نہیں تھا!

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹی وی اسکرین روشن ہوا اور وہاں اسی کمرے کا منظر اجاگر ہوا جہاں میں اور صدف شکار

کئے گئے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا' شعیب نے ریکارڈنگ کے حوالے سے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ ہمیں اس آئینہ خانے میں بے ہودہ شوٹ کیا گیا تھا۔ مذکورہ منظر اس موقع کا تھا جب شعیب کی آواز آنا بند ہوگئی تھی اور ہم نے اس خبیث گیس کے اثرات کو واضح طور پر محسوس کرلیا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس منظر میں کھوگیا۔

منظر میں تبدیلی واقع ہوئی اور کہانی آگے بڑھنے لگی۔ میں [illegible] ایک ایک سین کو دیکھتا چلا گیا۔ ہمارے ساتھ اس بند آئینہ خانے میں جو حالات و واقعات پیش آئے تھے ان کی مکمل عکس بندی کرلی گئی تھی۔ پھر جب کہانی ہماری چھینا جھپٹی پر پہنچی تو مجھے اپنے آپ سے شرم محسوس ہونے لگی۔ شعیب زیرِ لب طنزیہ انداز میں مسکرادیا۔ اس کی مسکراہٹ مجھے زہر لگی اور میں دوبارہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اب وہاں پر ایسا منظر پیش کیا جارہا تھا جس کو دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں اور صدف دو بھوکے حیوانوں کے مانند ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے' حصول کی اس جنگ میں ہم نے تمام تر اخلاقیات کو گہرے کنوئیں میں پھینک دیا تھا اور اپنے وحشیانہ جذبات کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے کے لباس کو نوچ رہے تھے۔ میں نے ندامت کے قوی احساس کے ساتھ نگاہ جھکالی۔ صدف کے بدن کے بیشتر حصے کھل گئے تھے۔ میں اس جان نثار لڑکی کو بے لباس ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا تھا!

اسی لمحے میری سماعت سے شعیب کی شیطانی آواز متصادم ہوئی۔ ''وجدان! میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔ تم تو بالکل بودے ثابت ہورہے ہو۔ چچ چچ چچ......''

میں نے کن انکھیوں سے ٹی وی کی طرف دیکھا۔ شعیب نے وڈیو کو اسٹل کردیا تھا اور وہ آخری شرم ناک منظر اسکرین پر مجسم ہوکر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے میں شعیب کی آنکھوں میں گھورنے لگا۔ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شعیب! میرے لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوچکی ہے' تم اس سے بھی زیادہ ذلیل اور کمینے ہو۔ میں تم سے ہر گھٹیا حرکت کی توقع رکھتا ہوں۔''

وہ ہونٹ بھینچ کر بڑی کینہ توز نظر سے مجھے دیکھنے لگا پھر بولا ''لگتا ہے' فلم بندی تمہیں پسند نہیں آئی۔ میں تو سوچ رہا تھا تم میری کارکردگی کو سراہو گے!''

''یہ شیطانی کارکردگی تمہاری ناکامیابی اور شکست کا بین ثبوت ہے۔''

''وہ کیسے بھئی؟'' اس نے چشمے کے عقب سے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''تم نے تھوڑی دیر پہلے جو دعویٰ کیا تھا' یہ فلم اس کی نفی کرتی ہے۔ تم اپنے مذموم عزائم کو پورا نہیں کرسکے۔ اس فلم سے تم مجھے اپنے دباؤ میں نہیں لے سکتے۔''

''کن خوش فہمیوں کی نگری میں گھوم رہے ہو احمق!'' وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں الجھ کر رہ گیا۔

''کیا تم نے پوری فلم دیکھ لی؟'' اس کا یہ خطرناک سوال طنز میں ڈوبا ہوا تھا۔

''ہاں......آں......'' میری الجھن میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔

شعیب نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر بڑی مکروہ ہنسی کھیل رہی تھی۔ اس کے اسٹائل نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ میری یادداشت کے مطابق وہ فلم ختم ہوچکی تھی۔ اس منظر کے بعد ہی میرے ذہن کو ایک طوفانی جھٹکا لگا تھا اور میں نے صدف کو دھکا دے کر بہت دور پھینک دیا تھا پھر میں نے ارتکازِ توجہ سے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن شعیب کا انداز کسی گہری سازش کی نوید دے رہا تھا' اس کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ فلم ابھی ختم نہیں ہوئی...... فلم کا جو حصہ دیکھنے سے رہ گیا وہ بہت ہی سنسنی خیز اور ذلت آمیز ہوگا۔

شعیب نے گہری سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''وجدان! اس وقت ہماری پوزیشن بالکل واضح ہوگئی ہے۔ میں زبردست اور تم زیردست ہو۔ تم کسی حقیر چوہے کے مانند میری گرفت میں آئے ہوئے ہو۔ میں چاہوں تو پلک جھپکتے میں تمہیں نیست و نابود کرسکتا ہوں اور تم۔'' وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تم تم ہزار کوشش کے باوجود بھی میرا بال بانکا نہیں کرسکتے اس لیے میں تم پر سب کچھ واضح کردینا چاہتا ہوں۔ جو فلم تم نے دیکھ لی' وہ اوریجنل ریکارڈنگ ہے۔ اس کے بعد تم جو کچھ دیکھنے جارہے ہو' وہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا کمال ہے۔ ذرا تم بھی تو دیکھو' سائنس نے کتنی ترقی کرلی ہے۔ میں نے تم دونوں کے چہروں کے کلوزاپ لے کر اسے ایک بلیو فلم کے ساتھ مکس کیا ہے۔ اس مکسنگ کا رزلٹ بہت عمدہ آیا ہے۔ تم دیکھو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور کیمرا ورک نے ہم آغوش ہوکر ایک ماسٹر پیس تخلیق کیا ہے۔ لو تم بھی دیدار کرو۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے اسٹل اسکرین کو دوبارہ

متحرک کردیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہاں جو مناظر ابھرنے لگے' میں انہیں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لہٰذا میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

''گھبرا گئے!'' شعیب غوری کی منحوس آواز میری سماعت پر نشتر چلا گئی ''ٹھیک ہے' میں ٹی وی آف کررہا ہوں۔ تم آنکھیں کھول دو۔ میں اندھوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا اور...... ابھی تو میں نے تم سے نہایت ہی اہم گفتگو کرنا ہے!''

میں نے دل میں شعیب پر لعن طعن کرتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ بے ساختہ میری زبان پر یہ سوال آگیا ''صدف کہاں ہے؟''

''اسی بنگلے میں ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''تم نے صدف کو تو یہ فلم نہیں دکھائی؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''اوہ!'' میں ایک اطمینان بھری سانس لے کر رہ گیا۔

شعیب نے کہا ''میرا شکار تم ہو۔ صدف تو تمہاری دم سے بندھ کر بونس کے طور پر مجھے ملی ہے۔ بہرحال وہ اس یادگار فلم میں تمہاری ہیروئن ہے۔ اگر تم ضد کرو گے تو اسے بھی یہ فلم دکھادوں گا۔'' اس کے اختتامی الفاظ سے بے پناہ مکاری ٹپکتی تھی۔

''ہرگز نہیں!'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''اٹس او کے!'' وہ ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا ''تم کبھی میرے دوست رہے ہو۔ میں اپنے ایک دیرینہ خیر خواہ کی اتنی سی فرمائش تو پوری کر ہی سکتا ہوں۔''

وہ لمحاتی خاموشی کے بعد مجھے بتانے لگا کہ اس شرم ناک فلم کی کل لمبائی پندرہ منٹ تھی۔ دس منٹ کی اوریجنل فلم اور آخری پانچ منٹ کی شیطانی مکسنگ۔ بات کے اختتام پر اس نے کہا۔

''وجدان! اس فلم کی حقیقت سے اگرچہ تم آگاہ ہو چکے ہو لیکن کوئی تمہاری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ میں نے بلیو فلم کے کرداروں کا انتخاب کرتے ہوئے تم دونوں کے جثوں اور قد کاٹھ کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ اس فلم کو دیکھنے والا ہر شخص بلاتردد اس کا یقین کرلے گا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانی ذہن اور یقین کو فریب دینا بہت آسان کردیا ہے۔''

اچانک میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا ''تم نے اتنی جلدی کمپیوٹر ٹیکنالوجی کا استعمال کرکے فلم مکسنگ کیسے کرلی۔ یہ کام تو اچھا خاصا وقت مانگتا ہے؟'' میں نے شعیب سے پوچھا۔

''تم بالکل درست کہتے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن کو جنبش دیتے ہوئے شیطانی مسکراہٹ بکھیرنے لگا ''ٹیکنیکل قسم کے کام واقعی ایک مخصوص وقت کے متقاضی ہوتے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''میں محسوس کررہا ہوں' تمہیں اندازہ نہیں کتنا وقت بیت چکا ہے ورنہ تم ''اتنی جلدی'' جیسے الفاظ استعمال نہ کرتے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں الجھ کر رہ گیا۔

''مطلب صرف اتنا ہے کہ تم جمعرات کو لگ بھگ رات دس بجے سفید بنگلے میں داخل ہوئے تھے اور سوا دس بجے تک تم میرے آدمیوں کے ساتھ مارا ماری کرتے رہے پھر آئینہ خانے میں پہنچ گئے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''تمہاری بات اور ردِعمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم ابھی تک جمعرات ہی کے تصور میں ہو جب کہ......''

''کیا جب کہ؟'' میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔

''سنو گے تو بتا سکوں گا نا۔'' وہ ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''جمعرات گزر گئی۔ آج جمعہ ہے اور اس وقت دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں نے جس واقعے کو فلم بند کیا ہے اس کو بیتے کم از کم بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ یہ تو اچھا خاصا وقت ہوتا ہے وجدان!''

''اوہ!'' میں ایک طویل بوجھل سانس خارج کرکے رہ گیا۔

ان ظالموں نے میری بے ہوشی کے دوران میں لباس کے ساتھ ساتھ رسٹ واچ بھی اتار لی تھی اس لیے مجھے وقت اور تاریخ و دن وغیرہ کا اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ اگر گھڑی میرے پاس ہوتی تو مجھے حالات کو سمجھنے میں اتنی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

میرا دل و دماغ شعیب غوری کے لیے نفرت آمیز غصے سے بھر گیا۔ میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''تم یہ سب کچھ کس لیے کررہے ہو؟''

''بہت دلچسپ سوال ہے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا ''میں تمہیں اس کا جواب ضرور دوں گا۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا اور گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے محسوس کیا' وہ اپنے ذہن میں خیالات کو ترتیب دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ تم نے مجھے کتنا نقصان پہنچایا اور جواباً میں نے تمہیں کس کس محاذ پر زک

پہنچائی۔ اس موضوع کو کھولنے کا کچھ فائدہ نہیں' سوائے اپنا خون جلانے اور دماغ تپانے کے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس وقت وہ بہت ہی سنجیدہ اور بردبار نظر آرہا تھا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

''اس گرما گرم جنگ میں' میں نے اپنے کئی اہم آدمیوں کو کھودیا۔ جہانگیر' فواد' کبیر شاہ' غلام جیلانی' نادر زمان وغیرہ تو بڑی بڑی مثالیں ہیں۔ اسی طرح تمہارے کئی ساتھی بھی اس دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے۔''

وہ بولتے بولتے ایک مرتبہ پھر رک گیا۔ اس کے بیان میں بڑی کھلی دروغ گوئی شامل تھی لیکن میں نے اسے روکنا یا ٹوکنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''وجدان! میں نے اب تک تمہارے خلاف جو کچھ کیا اور یہ جو کچھ کررہا ہوں' یہ سب اس لیے ہے کہ تم یہود دشمن ہو۔ تم یہودیوں سے نفرت کرتے ہو اور ہر لمحہ انہیں نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہو۔''

''تو یہی بات تمہاری زبان پر آہی گئی یہودیوں کے غلام!'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے کے تاثرات میں کوئی فرق نہ آیا' سادگی سے بولا ''تم میری تنظیم سی ایف کے کی جڑوں تک پہنچ چکے ہو' یہ بات مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں۔ تم ہمارے مقاصد کو بھانپ گئے ہو اور اس سیٹ اپ کو بہ خوبی سمجھنے لگے ہو لہٰذا کراچی میں تمہاری موجودگی کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔''

اس نے تھوڑا وقفہ دے کر ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ''یہاں سے دفع کرنے سے پہلے میں نے تمہارا ڈنک نکال لیا ہے۔ اب تم مجھے ڈسنے کا تصور بھی نہیں کرسکو گے۔ اگر کبھی تم نے میری جانب رخ کرنے کی کوشش کی' کراچی میں داخل ہونے کی نیت باندھی یا پھر پاکستان کی زمین پر قدم رکھنے کا خیال بھی تمہارے ذہن میں آیا تو سمجھ لینا، میں اس شیطانی فلم کی ایک ایک کاپی ہر وڈیو سینٹر پر پہنچادوں گا! اور تم یہ بات بڑی اچھی طرح جانتے ہو' یہاں کی عوام کس قدر ندیدہ ہے۔ ترسے اور تڑپے ہوئے لاکھوں فلم بین اور تماش بین اس نوعیت کی فلمز کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں۔ تم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے۔''

میں نے ترش لہجے میں کہا ''میں پاکستان میں پیدا ہوا' یہ میرا وطن ہے۔ تم مجھ سے اس ملک میں رہنے کا حق کس طرح چھین سکتے ہو۔ اس میں تمہارا کیا فائدہ ہے؟''

''میں نے کہا نا' اس وقت میں اپنے فائدے نقصان کی بات نہیں کررہا۔'' وہ سخت لہجے میں بولا ''میں یہ سب کچھ اپنے بڑوں کے حکم پر کررہا ہوں۔ تم نے سی ایف کے کو جو بھی نقصان پہنچایا ہے' وہ براہِ راست انہی کا نقصان ہے۔ تم نے ایک طرح سے خدا کو نقصان پہنچایا ہے۔ وہ تم سے سخت ناراض ہے۔''

''کیا بکتے ہو؟'' میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''میں زمینی خدا کی بات کررہا ہوں...... امریکا بہادر!''

''اوہ!'' میں نفرت آمیز نگاہ سے اسے گھور کر رہ گیا۔

وہ کہنے لگا ''اب تم یہودیوں سے دشمنی کا مزہ چکھ لوگے!''

''میں یہود کا دشمن ہوں اور نہ ہی ہنود کا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ''میں دراصل برائی کا دشمن ہوں۔ اس دشمنی میں کسی مذہب و ملت کی تخصیص نہیں۔ میں نے ہمیشہ اچھائی کا ساتھ دیا ہے اور برائی کی مذمت کی ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم یہودی ہو...... یا چوہدری نوازش یہودی ہے؟ میں تو تم دونوں کا دشمن اول ہوں کیوں کہ تم دونوں شیطان کے چیلے ہو' برائی کے علمبردار ہو۔ تم میری پوری ہسٹری سے واقف ہو۔ میری زندگی کا ایک ایک ورق پلٹ کر دیکھ لو۔ تمہیں ہر جگہ میرے الفاظ کی سچائی ملے گی۔ میں نے ہر قدم پر شیطانی ذہنیت کے حامل افراد کے دانت کھٹے کیے ہیں اور مظلوم و بے کس کی داد رسی کی ہے۔ میں تم دونوں ننگِ انسانیت کو چھوڑنے والا نہیں۔''

''اسی لیے تو میں نے تمہاری یہ وڈیو تیار کی ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''اب ہم دونوں تمہارے ہاتھوں محفوظ ہو چکے۔ تم پاکستان میں داخل ہو گے اور نہ ہی ہمیں کوئی نقصان پہنچاؤ گے۔ میرے بڑے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں' اس کی مجھے کوئی پروا نہیں۔'' وہ تھوڑی دیر رکنے کے بعد بولا ''اور یہ جو تم نے ہسٹری والی بات کی ہے نا' یہ تمام تفصیل میں نے اوپر پہنچادی ہے بلکہ وہ ریکارڈ جو تم نے سی ایف کے میں رہتے ہوئے مرتب کیا تھا۔ تمہیں وہ خون ریز واقعات تو یاد ہوں گے جب تم نے اپنے دوست اور میرے نمک خوار امتیاز کے ساتھ مل کر سی ایف کے کے پلیٹ فارم سے بڑے عظیم الشان کارنامے انجام دیے تھے؟''

شعیب غوری جن کارناموں کو عظیم الشان قرار دے رہا

تھا' وہ ایک ایک کر کے میرے ذہن سے گزرنے لگے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے سی الیف کے سے وابستگی کے دوران میں بعض اوقات قتل دغارت گری بھی کی تھی لیکن یہ سب کچھ انجانے میں ہوا تھا۔ میں سی الیف کے کو ایک اصلاحی اور انسانی بہبود کی تنظیم سمجھا تھا اور اپنی دانست میں' میں نے سچائی کا ساتھ دیتے ہوئے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور ظالم کا ہاتھ توڑا تھا۔ بہرحال اب نہ امتیاز باقی رہا تھا اور نہ ہی سی الیف کے سے میری وابستگی!

شعیب غوری پورا کھل گیا تھا۔ میں نے اور منہاس باقر نے اس کے بارے میں جو اندازے لگائے تھے وہ صدفی صد درست ثابت ہو رہے تھے۔ میں منہاس ہی کے ایما پر کسی یہود نواز سیٹ اپ کی تلاش میں نکلا تھا اور تان بالآخر سی الیف کے پر آن کر ٹوٹی تھی' یہ الگ بات ہے کہ میں پہلے سے اس تنظیم سے وابستہ تھا لیکن اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں تھا۔ شعیب غوری یہودی لابی کے اشاروں پر ناچتا تھا اور ان کی مقصد براری کے لیے کوشاں تھا۔ منہاس باقر نے یہودیوں کے اس چمچے اور اس کی شیطانی تنظیم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم کر رکھا تھا اور میں اس کے عزم کی تکمیل کے لیے کوشاں تھا۔ کوئی بھی محبِ وطن یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اغیار اس کی دھرتی کی جانب میلی نظر سے دیکھیں!

یہ تمام خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزر گئے اور میں سوچنے لگا کہ حالات نے اچانک کیسی واہیات صورت اختیار کر لی تھی۔ شعیب غوری نے سب سے زیادہ تشویش ناک انکشاف یہ کیا تھا کہ وہ اپنے یہودی آقاؤں کو میری ہسٹری سے آگاہ کر چکا تھا۔ میں یہودیوں کی ذہنیت' ان کی طاقت اور کام کرنے کے انداز کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ بال کی کھال اور کھال کے بال اتارنے کے ماہر تھے۔ وہ جب کسی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے تو پھر یہ دنیا اس معتوب کو بڑی تنگ نظر آنے لگتی' کوئی بھی محفوظ یا غیر محفوظ پناہ گاہ اس سے آنکھ نہ ملاتی اور وہ ایک نادیدہ شکاری کے آگے دوڑتے دوڑتے ہانپ جاتا۔ اس کے قدم ڈگمگاتے اور وہ منہ کے بل جا گرتا۔

کسی نے سچ کہا ہے' انسان محبت اور دوستی میں بہت مار کھاتا ہے۔ میں نے شعیب غوری سے دوستی کے نتیجے میں اسے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا تھا۔ وہ میرے حالاتِ زندگی سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ سنگاپور' تھائی لینڈ' نیپال' ہندوستان اور شاؤلن ٹیمپل کی بہت سی کہانیاں میں نے اسے سنا رکھی تھیں۔ یہ اس پر میرا اعتماد ہی تھا کہ میں نے اسے متروک کنوئیں میں سالہا سال سے دفن کروڑوں کی مالیت کے سونے کے راز سے آگاہ کر دیا۔ ازاں بعد اس سلسلے میں بھی اس نے مجھ سے دھوکا کیا اور میرے دشمن دیرینہ سے دوستی کر بیٹھا۔ بہرحال اب ان باتوں کو سوچنے یا ان پر کڑھنے کا وقت بیت گیا تھا۔ موجودہ صورتِ حال خاصی گمبھیر تھی۔

مجھے مسلسل خاموش اور اپنی جانب یک ٹک دیکھتے پا کر شعیب غوری نے کہا "وجدان! تم کس سوچ میں گم ہو؟ تمہیں امریکا بہادر کی دہشت ہی بہت ہے۔ لگتا ہے تمہاری سٹی گم ہو گئی ہے۔ تم اتنے چپ چپ تو کبھی نہیں رہا کرتے تھے!"

میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور جارحانہ انداز میں کہا "تمہارے اس امریکا بہادر کو میں اپنے جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں تم نے اسے زمینی خدا کہا ہے لیکن میری نگاہ میں وہ زمینی شیطان ہے۔ تم قبول چکے ہو میں نے تمہاری سی الیف کے کو جو بھی نقصان پہنچایا' وہ درحقیقت تمہارے بڑوں کا نقصان ہے۔ ایسا خدا کس کام کا جسے مجھ جیسا ایک معمولی انسان پے در پے نقصان پہنچانے میں کامیاب رہے؟" میں نے سانس لینے کی خاطر تھوڑا توقف کیا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "میرے نزدیک وہ ایک عظیم فتنہ ہے۔ ایسے فتنے اور زمینی خدائی کے جھوٹے دعوے دار ہر دور میں جنم لیتے رہے ہیں۔ جو چیز جنم لیتی ہے وہ فطری اصولوں کے تحت ایک دن فنا بھی ہو جاتی ہے...... تمہارا یہ بہ زعم خود زمینی خدا بھی بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔"

"تم تقریر بہت اچھی کر لیتے ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں سراہتے ہوئے بولا "بہرحال اب ان جوش بھری باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے' انہی سے جا کر کہنا جو تمہیں لینے آ رہے ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ تمہاری دونوں ساتھیوں کو بھی لے جائیں گے بلند و پست کا یہ کمبی نیشن تمہارے ہم رکاب رہے گا...... ایک پردے کے پیچھے' دوسری پردے پر۔"

شعیب کی بات ختم ہوئی تو میرے رگ و پے میں گہری تشویش دوڑ گئی۔ بلند و پست سے اس کی مراد ساحل اور صدف تھی۔ ساحل دراز قامت اور صدف پستہ قد تھی۔ شعیب کے آخری جملے میں بڑی سفاکی شامل تھی۔ اس کی بات کا یہی مطلب نکلتا تھا کہ ساحل کو مجھ سے ملنے نہیں دیا جائے گا' ورنہ وہ پردے کے پیچھے کا کنایہ استعمال نہ کرتا۔ ساحل سے دوری کے تصور نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ میرے انداز میں بے ساختہ پن تھا۔

"ساحل کہاں ہے؟"

"کسی سمندر کے کنارے استادہ ہوگا!" وہ بے پروائی سے بولا۔

"میں اپنی ساحل کی بات کر رہا ہوں؟" میں نے غراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

"وہ میرے پاس محفوظ ہے۔" شعیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا "ساحل اور صدف اسی بنگلے کے ایک آرام دہ حصے میں موجود ہیں۔"

میں نے پوچھا "چلو مان لیا' میں نے اور صدف نے مل کر تمہیں اور تمہاری تنظیم کو نقصان پہنچایا ہے' یا بقول تمہارے 'تمہارے آقاؤں کو نقصان پہنچایا ہے لیکن ساحل تو اس معاملے میں کسی بھی طور ملوث نہیں' پھر اسے کس بات کی سزا دی جا رہی ہے؟"

"تم سے کس نے کہہ دیا' میں ساحل کو سزا دے رہا ہوں۔" وہ عجیب سی نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "میں نے تو پھولوں کی طرح سجا کر اسے اپنے پاس سنبھال رکھا ہے۔ وہ میرے بڑوں کی امانت ہے۔ میں اسے ایک ذرا سی تکلیف پہنچانے کے بارے میں بھی نہیں سوچ سکتا۔" وہ ذرا متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ساحل کو تو کب کا یہاں سے روانہ کیا جا چکا ہوتا لیکن تم ہمارے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ تمہیں شکار کرنے کے لیے ساحل کا چارا استعمال کیا گیا۔ بہرحال اب یہ قصہ نمٹ چکا۔"

وہ خاموش ہوا تو میں الجھ کر رہ گیا۔ الجھن کا... سبب یہ تھا کہ ساحل کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی جا رہی تھی۔ وہ تو ایک غیر متعلق اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی کے جرم میں تکلیفیں اٹھا رہی ہے لیکن شعیب غوری نے غور و فکر کا ایک اور دروازہ کھول دیا تھا۔ جب اس دروازے میں ابھرنے والا منظر میری سمجھ میں نہ اتر سکا تو میں نے براہِ راست شعیب ہی سے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس کانٹے کو ذہن میں کھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

"تمہارے آقا میری ساتھی ساحل میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"وہ لوگ ساحل میں نہیں بلکہ دھنو میں دلچسپی لے رہے ہیں۔" وہ شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "میں تبتی نقوش والی اس حسینہ کی بات کر رہا ہوں جس کا تعلق کھٹمنڈو کے نزدیک واقع ایک بدھ عبادت گاہ سے ہے۔ تم نے اسے ساحل کا نام دے کر ایک آڑ میں چھپا لیا تھا لیکن دیکھ لو میرے بڑے کس قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے دھنو کو کھوج نکالا اور اسے پکڑنے کا فریضہ مجھے سونپ دیا۔ میں نے انہیں جب تمہارے بارے میں بتایا تو وہ ایک تیر دو شکار پر اصرار کرنے لگے۔"

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا تو میں اس نئے انکشاف پر ششدر رہ گیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "یہ وہ لمحات تھے جب تم میرے دوست ہوا کرتے تھے۔" ایک مکروہ قہقہہ لگانے کے بعد اس نے مزید کہا "میں جان گیا کہ تمہیں دوستی کے پلیٹ فارم پر بہ آسانی ذبح کیا جا سکتا ہے' سو میں تمہارے اور نزدیک ہو گیا۔ پھر تمہاری ساتھی کو اغوا کر لیا گیا چنانچہ مجھے بہ حالتِ مجبوری چوہدری نوازش سے دوستی گانٹھنا پڑی اور میں نے دس کروڑ کی رقم چوہدری کے حوالے کر کے دھنو یعنی تمہاری ساحل کو حاصل کر لیا۔" وہ ایک مرتبہ پھر بڑے زہریلے انداز میں مسکرایا اور بولا "یہ الگ بات ہے کہ وہ دس کروڑ روپے تمہارے ہی حصے کے تھے۔ اسے کہتے ہیں' جس کا جوتا اسی کے سر!"

میں اس کا تبصرہ سن کر سلگ اٹھا تاہم میں نے جوش میں آنے سے احتراز برتا۔ اس وقت اگر میں غصے کا مظاہرہ کرتا تو اصل بات بیچ میں لٹک کر رہ جاتی۔ ساحل سے متعلق یہودی لابی کی دلچسپی کے بارے میں جاننا نہایت ہی اہم اور ضروری تھا۔

میں نے متحمل لہجے میں شعیب سے سوال کیا "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تمہارے آقا ساحل کے حصول کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہیں؟"

"پوری بات تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا "جتنا جانتا ہوں وہ تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ آخر کو گزرے دنوں میں تم میرے دوست رہے ہو!" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد بولا۔

"میں نے اڑتی اڑتی سنی ہے' ساحل یعنی دھنو کے سینے میں کوئی راز دفن ہے۔ ایک بیش بہا خزانے کا راز۔ میرے بڑے اس خزانے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس خزانے کی اہمیت مادی بھی ہے اور روحانی بھی۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا' یہودی اور یہودیت کا ماضی اور حال بے حد پُراسرار ہے۔ ان کا ایک مخصوص طبقہ ماورائی اور روحانی علوم و فنون میں بڑی مہارت رکھتا ہے' اور یہ لوگ ہر قسم کی مسٹری کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دھنو بھی کسی ایسے ہی راز کی امین ہے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔"

شعیب کی وضاحت نے بجائے سلجھن کے الجھن پیدا کر دی۔ اس کی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ ساحل ایک بے ضرر اور سادہ سی لڑکی تھی۔ اس کے ناز و ادا میں معصومیت پائی جاتی تھی۔ اگر اس کے سینے میں کوئی راز پوشیدہ

ہوتا تو وہ مجھ سے اس کا ذکر ضرور کرتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ اپنے آپ سے دور ہوگئے تھے۔ ہمارے درمیان کوئی بات راز نہیں رہی تھی۔ سارے پردے اٹھ چکے تھے۔ ہم من وتو سے بہت آگے نکل آئے تھے۔

دوسری طرف میں شعیب غوری کی بات اور اس کے آقاؤں کے دعوے کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ وہ لوگ اگر ساحل کو کھوج رہے تھے بلکہ...... حاصل کرچکے تھے تو یہ ساری دوڑ دھوپ بے مقصد نہیں ہوسکتی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال ابھرا۔

کیا ساحل واقعی اتنی سادہ نہیں تھی جیسی دکھائی دیتی تھی؟ کیا میں اس کی گہرائی ناپنے میں ناکامیاب رہا تھا؟ کیا وہ معصومیت کا پیکر مجھ سے بھی بہت کچھ چھپائے بیٹھی تھی؟

ایک سوال نے اپنے پیچھے قطار لگادی اور ایک کے بعد ایک منفی اور سنسنی خیز سوال میرے ذہن میں ہتھوڑے برسانے لگا۔ میرا دماغ جھنجھنا اٹھا اور اگلے ہی لمحے میں نے سر جھٹک کر ان فضول استفسارات کو اپنی کھوپڑی سے نکال باہر کیا۔ میری ساحل ایسی نہیں ہوسکتی تھی۔

اسی لمحے شعیب غوری کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! صرف ایک چھپی ہوئی حقیقت نے تمہیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اگر سارا احوال سنو گے تو تمہارا دماغ پھٹ جائے گا۔ تمہاری وہ مضبوط اعصابی اور آہنی قوت ارادی کیا ہوئی؟ کیا میں کہوں...... ہوا ہوئی؟''

میں نے طیش میں آنے کے بجائے بڑی تحمل آمیز نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا ''تمہارے آقا ہمیں کہاں پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''بہت ہی اہم سوال کیا تم نے لیکن افسوس۔'' وہ خفیف سا ہوتے ہوئے بولا ''مائی اولڈ ڈیئر' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اپنے بڑوں سے سوال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور از خود انہوں نے اس سلسلے میں مجھے کچھ بتایا نہیں اس لیے...... سوری۔''

وہ ایسے انداز میں بات کررہا تھا جیسے اس سے زیادہ کوئی میرا خیرخواہ نہ ہو لیکن میں سمجھ رہا تھا' یہ اس کا طنزیہ' اذیت پہنچانے والا اور ناپسندیدگی کا انداز تھا۔ میں نے کرید جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اتنا تو تمہیں معلوم ہی ہوگا' وہ ہمیں کس ذریعے سے لے کر جائیں گے؟''

''ہاں معلوم ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا پھر الٹا مجھ سے مستفسر ہوا ''تمہیں یاد ہے' ابھی چند روز پہلے وہ لوگ ایک بندے کو پاکستان سے لے کر گئے ہیں۔ وہ ان لوگوں کے لیے ''موسٹ وانٹیڈ'' تھا۔ وہ امریکی سی آئی اے کا مجرم تھا۔ وہ لوگ کئی سال سے اس کی تلاش میں کروڑوں ڈالرز خرچ کرچکے تھے بالآخر وہ اسے یہاں سے پکڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسے گرفتاری کے مقام سے فی الفور حکومت وقت کے تعاون سے اسلام آباد پہنچایا گیا۔ میرے آقاؤں کا چارٹرڈ طیارہ اسے اسلام آباد سے سیدھا امریکا لے گیا تھا۔ تم نے اخبارات میں اس واقعے کی تفصیل پڑھی ہوگی؟''

''تمہارا اشارہ ایمل کاسی کی طرف تو نہیں؟'' اس وقت میرا پورا وجود سنسنی کی لپیٹ میں تھا ''پچھلے دنوں یہی اس نوعیت کا بڑا واقعہ پیش آیا ہے۔''

وہ گمبیر آواز میں بولا ''عقل مند کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ بس اتنا جان لو کہ ایک تیار چارٹرڈ طیارہ چند گھنٹوں بعد تم لوگوں کو یہاں سے لے جانے کا منتظر ہے۔ میرے آقا اس وقت بنگلے میں موجود ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس حال اور اس ہال میں تمہارا دیدار کریں گے۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے تھوڑی دیر پہلے چوہدری نوازش بھی اپنے گاؤں سے یہاں پہنچا ہے۔ اسے نہایت ہی ایمرجنسی میں کراچی آنا پڑا لیکن میں اسے اس ہال میں نہیں لے کر آؤں گا۔ تم نے اس کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کے نتیجے میں وہ تمہیں دیکھتے ہی شوٹ کردے گا اور میں تمہیں بتا چکا ہوں' تم اس وقت کتنی اہمیت اختیار کرچکے ہو!''

میں نے بے ساختہ پوچھا ''میں نے چوہدری کے ساتھ ایسا کیا کردیا؟''

وہ خاموشی سے مجھے تکنے لگا۔ انداز ایسا تھا یہ بھانپنے کی کوشش کررہا ہو کہ کیا میں واقعی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا یا بننے کی کوشش کررہا ہوں۔

''کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''یقین کرو' چوہدری کے ساتھ جو کچھ بھی نیا ہوا ہے' میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''میں تو کل رات دس بجے سے اب تک تمہارے بنگلے میں ہوں۔''

''ہوں!'' اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور بولا ''پھر وہ تمہارے ساتھیوں کا کارنامہ ہوگا!''

اس کی بات میرے پلے نہ پڑی تو میں نے اصرار

انداز میں دریافت کیا ''آخر ہوا کیا ہے؟''

''تم تھوڑی دیر کے مہمان ہو اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔'' وہ مدبرانہ لہجے میں بولا ''کل شام چوہدری نوازش کے ایک خاص بندے جے ڈی ملک کو اغوا کیا گیا تھا۔ چوہدری کا لختِ جگر پہلے ہی تمہاری قید میں تھا۔ آج علی الصباح وہ دونوں دریافت ہوگئے ہیں۔ ایک زندہ اور دوسرا مردہ!''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں چیخ سے مشابہ آواز میں چلایا۔

وہ ٹھہری ہوئی نگاہ مجھ پر گاڑتے ہوئے بولا ''حقیقت بیان کررہا ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا!'' میں اضطراری انداز میں بولا۔

وہ بولا ''حقائق ایسے ہی تلخ اور ناقابلِ یقین ہوتے ہیں۔''

''ذرا تفصیل بتاؤ۔'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

میرے اس مضطرب سوال کے جواب میں شعیب غوری نے بتایا کہ آج علی الصباح لگ بھگ پانچ بجے ''تین تلوار'' کے قدموں میں جے ڈی ملک کی لاش اور فیصل کا عبرت ناک وجود دریافت ہوا تھا۔ جے ڈی ملک کو بے پناہ اذیت سے گزارنے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا جب کہ فیصل زندہ تو تھا لیکن اس کو دیکھ کو بے ساختہ زبان سے ''استغفراللہ'' نکلتا تھا۔ اس کے دونوں کان' زبان' ناک کا گوشت والا حصہ کاٹ کر جسم سے الگ کردیا گیا تھا۔ ٹخنے کے عقب میں پائی جانے والی حساس رگیں بھی کاٹ دی گئی تھیں۔ اب وہ زندگی بھر اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی کہنیوں کے جوڑ پر بھی اچھی خاصی طبع آزمائی کی گئی تھی۔ بات کے اختتام پر شعیب نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔

''فیصل تمہاری تحویل میں تھا۔ جے ڈی ملک کا اس کے ساتھ پایا جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے بھی تم نے یا تمہارے ایما پر اغوا کیا گیا تھا۔ اس لیے ان دونوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے تم ہی ذمے دار ہوگے۔ میں نے صبح چھ بجے چوہدری کو اس سانحے کی اطلاع دی اور وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہے۔ اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟''

آخر میں شعیب نے بڑا معنی خیز سوال کیا تھا جس کا اسی ڈگری پر جواب دینا مجھ پر لازم تھا۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا تھا' جے ڈی ملک اور فیصل کا حشر خراب کرنے والا شہزاد کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں زرگل نے بھی اس کی کچھ مدد کی ہو۔ پہلے تو مجھے شہزاد کی اس جذباتی بے وقوفی پر غصہ آیا تھا لیکن میں اس وقت جس قسم کی صورت حالات سے گزر رہا تھا اس کے تقاضے کے مطابق شہزاد نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔

اس جاں نثار دوست کے لیے میرا دل مہر ووفا کے جذبات سے معمور ہوگیا۔ اس جی دار پوٹھوہاری نے دل بڑھانے اور لہو گرمانے والا کارنامہ انجام دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں شہزاد کی بہادری کو سلام کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں شعیب غوری سے کہا۔

''میں نہایت ہی مسرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ جے ڈی ملک اور فیصل کو میرے پینل پر نمونۂ عبرت بنایا گیا ہے اور......'' میں نے ذرا توقف کرکے اپنی بات کو مکمل کردیا۔

''اور...... تم' تمہارا وہ نیا نویلا دوست چوہدری نوازش اور تمہارے آقا سب کے سب میرے اسی یادگار سلوک کا مزہ چکھو گے۔ جلد یا بہ دیر میں تمہاری زندگیوں کو دردناک عذاب کے سپرد کرنے والا ہوں۔''

''بول لو' جتنی چاہو دل کی بھڑاس نکال لو کیوں کہ تم نہیں جانتے' اس پنجرے میں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ تمہیں ایک مخصوص قسم کے جانگیے میں بلاوجہ تو یہاں نہیں بٹھایا گیا! آخر کوئی تو مقصد ہوگا'' تمہارے دونوں ہاتھوں کو آہنی بندشوں میں جکڑنے کا!''

''کیا مقصد ہے تمہارا؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور میں اپنے برہنہ وجود کو دیکھنے لگا۔

''بس گھبرا گئے!'' شعیب غوری کی طنزیہ نظر مجھے اپنے پار ہوتی محسوس ہوئی۔

میں نے بوکھلا کر پوچھا ''مجھے اس جناتی پنجرے میں کیوں قید کیا گیا ہے؟''

''اس لیے کہ تم بھی کسی جن سے کم نہیں ہو۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ گیا پھر پنجرے کے نزدیک آکر بولا۔

''میرے آقا اپنے ساتھ دو نہایت ہی خطرناک فائٹرز بھی لائے ہیں۔ اس پنجرے کے اندر تم ان سے مقابلہ کروگے۔ یہ انتہائی خوفناک اور خون ریز مقابلہ ہوگا جس کا ایک ایک اسٹیپ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہوتا چلا جائے گا۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''خون ریزی اور ہلاکت خیزی میرے آقاؤں کو بہت پسند ہے۔ انہوں نے تو اپنے اسپورٹس میں بھی غیر انسانی عوامل کو شامل کرلیا ہے۔ اپنی تفریحِ طبع اور تسکینِ ذوق کی خاطر وہ کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔''

''تم اور تمہاری شیطانی تنظیم سی ایف کے اسی وحشیانہ

مزاج کا ٹریلر ہے۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحات تک بڑی معنی خیز نظر سے مجھے تکتا رہا پھر معتدل لہجے میں بولا ''بہرحال سابق دوستی کا خیال کرتے ہوئے ایک مشورہ میں تمہیں ضرور دوں گا۔ ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر مقابلہ کرنا۔ اس پنجرے کو میں نے ڈیتھ کیج کا نام دے رکھا ہے۔ آج تک کوئی زندہ یہاں سے باہر نہیں نکلا۔''

''ڈیتھ کیج!'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

اس نے کہا ''میں نے تمام ضروری باتیں تم سے کرلیں۔ اب دوسرے سیشن میں ملیں گے۔''

پھر وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے کچھ بھی نہ کہا۔ میری خفگی آمیز اور نفرت انگیز نگاہ شعیب غوری کی پشت پر جم کر رہ گئی۔ وہ میری نظر میں ایک ایسا بزدل حریف ثابت ہوا تھا جو عین میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر جارہا تھا...... اونہہ!

میں نے دانت کچکچائے اور آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

میری تمام تر توجہ اپنے ہاتھوں پر مرکوز تھی!

دونوں ہاتھوں کو پشت پر آہنی ہتھکڑی میں اس طرح فٹ کیا گیا تھا کہ میں انہیں حرکت دینے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں اپنی سی کوشش کے باوجود بھی اس آہنی بندش سے نجات حاصل نہیں کرسکتا تھا ورنہ ایک مرتبہ پہلے بھی اسی قسم کی صورتِ حال سے گزرا تھا اور میں نے جسم کی مخصوص جنبشوں کو کام میں لا کر ہتھکڑی کو غیر موثر بنادیا تھا۔ الٹی ہتھکڑی' سیدھی میں بدل گئی تھی۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں زمینی راستے سے پاکستان میں داخل ہورہا تھا اور تھر پار کر میں قدم رکھتے ہی ہمیں پے در پے مشکلات سے واسطہ پڑ گیا تھا۔

ہتھکڑی بڑی مختلف اور پیچیدہ قسم کی تھی۔ میں جمناسٹک کی ٹیکنیکس کے طفیل سے چھٹکارا نہیں پاسکتا تھا چنانچہ میں نے ''چی'' کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور آنکھیں بند کرکے اپنی توجہ بندھے ہوئے ہاتھوں پر مرکوز کردی۔ اس آہنی گرفت سے جلد از جلد آزادی حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ شعیب سے ہونے والی طویل گفتگو نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ بندھوائے چوبی اسٹول پر بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔ اب میرا مقابلہ کسی علاقائی بدمعاش سے نہیں تھا بلکہ شعیب کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس دنیا کا سب سے بڑا غنڈا میرے مدِمقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ شعیب جیسے ملک دشمن اور زمین فروش لوگوں کے لیے وہ ارضی خدا سے کم نہیں تھا لیکن میری نگاہ میں وہ ظلم و بربریت کی علامت تھا اور میں...... میں نے زندگی بھر ظالم کے خلاف' مظلوم کا ساتھ دیا تھا!

میں اس وقت تصور کی نظر سے ہتھکڑی کے لاک کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے چی کی پُراسرار اور خفیہ قوت کو اس لاک تک پہنچانا تھا۔ پنجرے کے لاک سے نمٹنے کا مرحلہ بعد میں آتا اور یہ ساری کارروائی شعیب کی واپسی سے پہلے کرنا تھی۔ اس نے دوسرے سیشن میں ملاقات کی نوید سنائی تھی اور وقت کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ پانچ منٹ بعد بھی واپس آسکتا تھا اور اس آمد میں پندرہ بیس منٹ بھی لگ سکتے تھے۔ آنے والے حالات کی سنگینی اور ہلاکت خیزی مجھے اس پنجرے سے جلد از جلد نکلنے پر مجبور کررہی تھی۔

میں نے ٹارگٹ کو ذہن میں بٹھانے کے بعد اپنے دھیان کو ناف کے مقام کی سمت منتقل کردیا۔ چی کی پوشیدہ قوت کا مسکن ناف کے عقب میں' ریڑھ کی ہڈی کے نزدیک تھا۔ میں اس قوت کو پہلے بھی کئی بار استعمال کرچکا تھا اس لیے مجھے اچھی خاصی پریکٹس ہوگئی تھی۔ جلد ہی مخفی توانائی کے اس ذخیرے سے میرا تصوراتی رابطہ ہوگیا۔ میں نے اس بیش بہا خزانے میں سے تھوڑی سی توانائی چرائی اور اسے اپنے خیال کی مٹھی میں بھر کر جسم کے اندر ہی اندر چلاتے ہوئے کندھوں تک لے آیا' پھر یہ پُراسرار نادیدہ قوت دونوں بازوؤں میں سفر کرتی ہوئی بڑی تیزی سے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ یہ سارا عمل تصور کے بل بوتے پر انجام پارہا تھا اور اس کی تکمیل میں سیکنڈ کے حصے استعمال ہورہے تھے۔ تصور کی کارفرمائی اتنی ہی زود اثر' تیز رفتار اور تیر بہ ہدف ہوتی ہے کیوں کہ تیسری آنکھ براہِ راست اس کی نگرانی کررہی ہوتی ہے۔ اس عمل کو سمجھنے کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہے!

ہتھکڑی کے سبب میری دونوں کلائیاں ایک دوسرے میں باہم پیوست تھیں لہٰذا بازوؤں سے گزر کر وہاں پہنچنے والی قوت کلائیوں کے جوڑوں پر یک جا ہوگئی۔ اس لمحے میں نے چی کا اسٹیرنگ ہتھکڑی کے لاک کی جانب گھمادیا۔

ایک ہلکی سی ''کھٹاک'' ابھری اور میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوگئے۔

میں نے خوشی خوشی اپنی دونوں کلائیوں کو سہلایا اور بے ساختہ میری نگاہ پنجرے کے فرش پر پڑی ہتھکڑی پر جا ٹکی۔ میں نے حقارت سے اس شکست خوردہ آہنی گرفت کو دیکھا اور ایک عزم کے ساتھ پنجرے کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں پنجرے کے لاک کو اپنے تصور کا ٹارگٹ بناتا' مجھے بری طرح چونک جانا پڑا۔ ہال کے دونوں

دروازے یک بہ یک کھل گئے تھے۔ اگر دروازے کھلے تھے تو اس کا یہی مطلب تھا' اب دوسرا سیشن شروع ہونے والا تھا...... خون ریز معرکے کا سیشن!

مجھے اس بات کا سخت افسوس ہوا کہ پنجرے کا لاک ٹوٹنے سے پہلے ہی دوسرا سیشن شروع ہوگیا تھا۔ اگر میں پنجرے سے باہر نکل چکا ہوتا تو صورتِ حالات بہت مختلف ہوتی۔ یہ بات نہیں کہ میں کسی خطرناک مقابلے سے گھبرا رہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ جب سے مجھے پتا چلا تھا' میں یہودیوں کے مدِمقابل آگیا ہوں' میرے سوچنے کے زاویے میں تھوڑی تبدیلی آگئی تھی۔ یہودیوں کی عیاری اور مکاری صدیوں سے مسلّم ہے۔ یہ مختلف قسم کے ناٹک کا اہتمام کرکے اپنے مریضوں بلکہ شکاروں کو الجھاتے ہیں' انہیں حالات کی سنگینی سے بے دھیان کردیتے ہیں اور اسی بے پروائی کی کیفیت میں وہ اپنے دشمن پر وار کردیتے ہیں...... مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ کوئی بھی سرگرمی دکھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ میں نے چوکنا نظر ہال کے دروازوں کی طرف مبذول کردی۔

ایک دروازے میں پہلے دو مسلح گارڈز نمودار ہوئے۔ یہ وہی دروازہ تھا جو شعیب غوری نے تھوڑی دیر پہلے اپنی آمد و شد کے لیے استعمال کیا تھا۔ دونوں گارڈ ہال کے اندر داخل ہونے کے بعد سیدھے ڈیتھ کیج کی جانب بڑھے اور کیج کے دروازے کے دائیں بائیں مجھ پر گنز تان کر کھڑے ہوگئے۔ یہ سمجھنے میں مجھے ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوئی کہ انہیں حفظِ ماتقدم کے طور پر بھیجا گیا تھا تاکہ میں کسی قسم کی مہم جوئی کا خیال دل میں نہ لاؤں۔ ایک بات سے مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ شعیب غوری اینڈ کمپنی کے دلوں پر میری بھرپور دہشت سوار تھی۔

پنجرے کے فرش پر ''چت'' پڑی ہتھکڑی مسلح گارڈز کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی انہوں نے بہ یک وقت چونکی ہوئی نظروں سے میرے آزاد ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر ان کے چہرے گہری تشویش میں ڈوب گئے۔ میں نے طنزیہ انداز میں زیرِ لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ممکن تھا وہ میری اس جسارت پر کوئی ایکشن لیتے کہ ہال میں دیگر افراد کی آمد شروع ہوگئی۔

شعیب غوری کسی سے باتیں کرتے ہوئے دوسرے دروازے سے ہال میں داخل ہوا۔ جلد ہی مجھے اس کے مخاطب کا چہرہ بھی نظر آگیا اور میں اس چہرے کو دیکھ کر واقعتاً چونک اٹھا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ ارب پتی بزنس مین یہودی النسل انگریز نیل آرمر تھا۔ ہالی ووڈ کے اداکار مائیکل ڈگلس سے مشابہ اس یہودی کو میں ہزاروں' لاکھوں چہروں میں بخوبی پہچان سکتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک کا مالک تھا اور ایک ڈائمنڈ ایکسپورٹ کمپنی کا روحِ رواں تھا' ''رکھاں والی'' کے متروک کنوئیں سے برآمد ہونے والا بیش قیمت سونا نیل آرمر کے قبضے میں چلا گیا تھا اور یہ سب کچھ شعیب غوری کے طفیل ہوا تھا۔ نیل آرمر کے عقب میں اس کی طرح دار سیکریٹری شیبا بھی نمودار ہوئی پھر وہ دونوں شعیب کی معیت میں چلتے ہوئے نیم بیضوی چبوترے پر رکھی تین عالی شان کرسیوں کی جانب بڑھ گئے۔

شیبا کو میں نے ایک مرتبہ پہلے کراچی ائرپورٹ کی عمارت سے نکلتے دیکھا تھا۔ وہ انتہائی پُرکشش اور گریس فل عورت تھی۔ یہودی عورتیں عام طور پر خوبصورت اور دل کش ہوتی ہیں۔ شیبا ایک ہزار یہودنوں کے مقابلۂ حسن میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی حقدار تھی۔

شعیب غوری ایک یہودی اور ایک یہودن کے درمیان براجمان ہوچکا تو پہلے والے دروازے سے دو اور افراد ہال میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں اپنی ڈھال چال اور اسٹائل سے فائٹرز نظر آتے تھے۔ شعیب غوری نے شاید انہی خطرناک فائٹرز کا ذکر کیا تھا۔ ایک فائٹر کے ہاتھ میں مجھے ایک کتے کی زنجیر نظر آئی۔ وہ گلی محلے والا ایک دیسی کتا تھا اور بڑی فرماں برداری سے اس شخص کے ساتھ چل رہا تھا۔ کتا بردار فائٹر اپنے حلیے اور خدوخال سے مغربی دکھائی دیتا تھا جب کہ دوسرے کے خال و خط اور پہناوے میں چینی رنگ غالب تھا۔

دونوں فائٹرز اسٹیج پر براجمان افراد کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے تو گارڈز نے شعیب غوری کا اشارہ پاکر ہال کے دروازوں کو بند کردیا اور ایک ایک دروازے پر پوزیشن سنبھال کر پہرا دینے والے انداز میں استادہ ہوگئے۔

میں ڈیتھ کیج کے اندر خاموش کھڑا ایک ایک چہرے کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ نیل آرمر خاصا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ شعیب نے اپنے امریکی آقاؤں کی آمد کا ذکر کیا تھا لیکن میں جانتا تھا' نیل آرمر انگریز بہادر کے ملک انگلینڈ سے تعلق رکھتا تھا البتہ وہ یہودی ضرور تھا۔ پہلے سیشن میں شعیب غوری نے مجھ سے جتنی بھی گفتگو کی اس میں سے بہت سی باتیں میرے ذہن کو الجھا رہی تھیں۔ سرِفہرست معاملہ امریکیوں کا مجھ میں اور ساحل میں دلچسپی لینے کا تھا اور دلچسپی بھی ایسی گہری کہ ہمیں لے جانے کے لیے ایک چارٹرڈ طیارہ بھی بھیج دیا گیا تھا اگر ایسی ہی بات تھی تو پھر اس کیج والی ڈرامے بازی کی کیا ضرورت تھی۔ وہ لوگ اپنے مشن کو چشم زدن میں تکمیل تک پہنچانے کے عادی ہوتے ہیں۔ میری گرفتاری کے بعد انہیں لمحہ بھر یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا' جیسا کہ ایمل کاسی کے سلسلے

میں واقعہ پیش آیا تھا۔ مجھے تو اس ڈرامے کے پیچھے کوئی اور ہی کہانی نظر آرہی تھی۔ یہ قصہ اگرچہ میری سمجھ میں فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا تاہم میں شعیب کی بات پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا۔ فی الحال میرے پاس ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اس کے کہے ہوئے کی صداقت کو پرکھ سکوں۔ یہ بھی ممکن تھا اس نے سراسر دروغ گوئی سے کام لیا ہو اور اصل معاملہ کچھ اور ہی ہو۔ آنے والا وقت اور پیش آمدہ حالات ہی حقیقت کے چہرے پر پڑے نقاب کو اٹھا سکتے تھے۔

شعیب غوری اپنی سیٹ سے اٹھا اور چبوترے سے نیچے اتر آیا پھر وہ پنجرے کے فرش پر پڑی ہتھکڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے امید تھی' تم کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرو گے۔ کیا تم نے پنجرے کے دروازے پر طبع آزمائی نہیں کی؟"

میں خاموشی سے اسے گھور کر رہ گیا۔

اس نے بالکل ویسٹرن اسٹائل میں کندھے اچکائے اور کہا "بہرحال! میں نہیں جانتا تم نے اس ہتھکڑی کو کیسے کھولا لیکن تمہاری اس کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔"

میں نے نیل آرمر کی جانب انگلی اٹھائی اور طنز بھرے لہجے میں استفسار کیا "کیا تم نے اپنے اسی یہودی آقا کا ذکر کیا تھا؟"

نیل آرمر اپنے کسی اور تعارف کے حوالے سے میری یادداشت کی چند لائنیں گھیرے بیٹھا تھا۔

"یہ تو میرا دوست ہے۔" شعیب نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "تم اسے میرے بڑوں کا نمائندہ سمجھ لو۔ اعلیٰ حکام تو دوسرے کمرے میں بیٹھے ہیں اور یہاں کی کارروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ اس ہال میں ہونے والی ایک ایک حرکت کو مانیٹر کیا جارہا ہے۔"

اس ہال میں کوئی اسٹل یا مووی کیمرا دکھائی نہیں دے رہا تھا' اس کا یہی مطلب تھا کہ ریکارڈنگ اور شوٹنگ نہایت ہی خفیہ طریقے سے کی جارہی تھی جیسا کہ آئینہ خانے میں کی گئی تھی۔ شعیب غوری نے اس بنگلے میں حیرت انگیز انتظامات کر رکھے تھے۔

شعیب غوری نے بنگلے کے کسی دوسرے کمرے میں امریکیوں کی موجودگی کا ذکر کر کے میرے تن بدن میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ اگر مجھے اس آہنی پنجرے سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا تو میں ان امریکیوں سے دو دو ہاتھ نمٹ لیتا۔ میری جانِ تمنا ساحل اور جاں نثار صدف بھی اسی بنگلے کے کسی گوشے میں مقید تھیں۔ ان تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں دوچار کیا' دو چار ہزار دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ قدیر نے حالات کی بساط پر بڑی چابک دستی سے مہرے بجا دیے تھے۔

شعیب غوری نے کتا بردار فائٹر کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ اس آوارہ کتے کی زنجیر تھامے دو قدم آگے بڑھ آیا۔ شعیب نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"وجدان! آج تمہارے مارشل آرٹس پر کڑی آزمائش ہے۔ یہ ڈیوڈ ہے۔" اس نے سگ بردار فائٹر کی جانب اشارہ کیا "اس کا تعلق امریکا سے ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے اس نے انٹراسٹیٹ چیمپئن شپ جیتی ہے۔ ڈیوڈ تمہاری ہڈیوں کا سرمہ بنائے گا۔"

میں نے ڈیوڈ نامی اس مارشل آرٹسٹ کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں سفاکی اور درندگی مجسم تھی۔ شعیب نے دوسرے فائٹر کو آگے بڑھایا اور ایک مرتبہ پھر مجھ سے مخاطب ہوگیا۔

"یہ چنگ یو ہے۔ چینی مارشل آرٹس کا ماہر۔ تم نے بھی شاؤلن ٹیمپل میں رہ کر بہت کچھ سیکھا ہے۔ چنگ یو اپنے ہاتھ پاؤں کی ضربوں سے تمہیں بتائے گا' کنگ فو کس طوفان کا نام ہے۔ آج تمہاری سٹی گم ہو کر رہ جائے گی۔"

چنگ یو گردن اکڑائے بڑے تکبر آمیز انداز میں کھڑا تھا۔ شعیب غوری کی باتوں میں واضح تضاد موجود تھا۔ ایک طرف وہ مجھے اپنے آقاؤں کے لیے نہایت ہی اہم گردان رہا تھا۔ اتنا اہم کہ وہ چوہدری نوازش کو اس ڈر سے میرے سامنے نہیں لا رہا تھا کہ کہیں وہ مجھے شوٹ نہ کر دے اور دوسری جانب وہ ان فائٹرز کے ہاتھوں میری ہڈی پسلی ایک کرنے کی واشگاف دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ میں نے شعیب کی الجھن زدہ اور منافقت آمیز باتوں کو ذہن سے جھٹکا اور حالات پر توجہ مرکوز کر دی۔ مجھے ہر صورت میں ایک ایسا چانس لینا تھا کہ بازی پلٹ سکوں۔ امریکیوں کے ہاتھوں بے بس ہونا مجھے گوارا نہ تھا' میں اس انڈرروف جنگ کا نقشہ بدلنے کے لیے ہر مشکل سے گزرنے کو کامل تیار تھا۔

مختصر سی تعارفی تقریر جھاڑنے کے بعد شعیب غوری نے ڈیوڈ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا یہی مطلب تھا' پہلے مجھے ڈیوڈ سے مقابلہ کرنا تھا۔ شعیب کا اشارہ پا کر دونوں مسلح گارڈز بھی آگے آگئے۔ ایک گارڈ پنجرے کا دروازہ کھولنے لگا جب کہ دوسرے نے بڑی مستعدی سے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تاکہ میں کسی بھی قسم کی مہم جوئی کا خیال دل میں نہ لاؤں۔

پنجرے کا دروازہ کھل گیا اور ڈیوڈ اس ادنیٰ نسل کتے کے ساتھ پنجرے کے اندر داخل ہوا۔ گارڈ نے ڈیوڈ کے داخلے کے ساتھ ہی دروازے کو دوبارہ مقفل کر دیا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ ایک کتے کا وہاں کیا کام۔ فوری طور پر ایک مضحکہ خیز خیال میرے ذہن میں ابھرا کہ شاید وہ کتا ریفری کے طور پر انٹروڈیوس کرایا گیا تھا۔ میں نے اس خیال کو مضحکہ خیز اس لیے کہا ہے کہ شعیب غوری کے مطابق وہاں ایک خون ریز مقابلہ ہونے جارہا تھا۔ جس میں فاؤل پلے اور فیئر پلے کی تمیز نہیں تھی۔ ایسے رف اینڈ ٹف مقابلوں میں ریفری کی بھی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہو جایا کرتی ہے۔ ریفری کے حوالے سے مارشل آرٹس کی ایک عظیم فلم "دی وے آف دی ڈریگن" میرے تصور میں پھر گئی۔ اس فلم کی آخری فائٹ کنگ فو کے بادشاہ بروس لی اور فلم کے ویلن چک نورس کے درمیان تھی۔ اس فائٹ میں ایک بلی نے ریفری کے فرائض انجام دیے تھے۔

میرا حریف پنجرے میں پہنچ چکا تو شعیب نے ایک گارڈ کو مخصوص اشارہ کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب کرتے ہوئے کہا "وجدان! مقابلے سے پہلے میں تمہیں ایک چھوٹا سا تماشا دکھانا چاہتا ہوں۔ اس منظر کو دیکھ کر یقیناً تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔"

اپنی بات ختم کر کے وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ گارڈ اس کی اشاراتی ہدایت لے کر ایک دیوار کی جانب بڑھ گیا تھا۔ میں گارڈ کو دیکھنے لگا۔ مذکورہ دیوار پر ایک بڑا سا پینل نصب تھا جس میں مختلف قسم کے بٹن اور ہینڈلز نظر آرہے تھے۔ گارڈ نے پینل کھولنے کے بعد ایک ہینڈل کو اوپر اٹھا دیا' گویا کسی شے کی سپلائی آن کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی پینل کے اندر ایک سرخ بلب روشن ہوگیا۔

سرخ بلب خطرے کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں ریڈ الرٹ ہوگیا۔ میں نہیں جانتا تھا' وہاں کیا پیش آنے والا تھا' بہرحال جو کچھ بھی رونما ہوا وہ روزمرہ سے کافی ہٹ کر ہوتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ڈیوڈ نے کتے کی زنجیر چھوڑ دی۔ کتا "چیاؤں چیاؤں" کی مخصوص آواز خارج کرتے ہوئے پنجرے کے اندر چکرانے لگا۔

پتا نہیں وہ جانور اب تک شرافت سے چپ کیوں سادھے بیٹھا تھا۔ ڈیوڈ ہانکا کرنے والے انداز میں کتے کے پیچھے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ سگ پرست قوم کا وہ فرزند اس وقت بڑا پُرجوش نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی سفاکی اور درندگی میں اچانک بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ میں دلچسپی سے وہ تماشا دیکھنے لگا۔

معاً ڈیوڈ نے اس کتے کو ایک ٹھوکر رسید کی۔ یہ فٹ بالر والی ایک خوفناک کک تھی۔ ڈیوڈ کا پاؤں کتے کے پیٹ پر پڑا اور وہ بے چارہ کسی فٹ بال کے مانند ہوا میں پرواز کر گیا۔ اس پرواز کے دوران میں اس کے ہاتھ پاؤں بڑی بے بسی سے متحرک تھے۔

پھر وہ تماشا رونما ہوا جس کے بارے میں شعیب نے رونگٹے کھڑے ہونے والی بات کی تھی۔ ہوا میں تیرتا ہوا وہ کتا پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ ایک دھماکے سے ٹکرایا۔ بے ساختہ کتے نے حفاظتِ خود اختیاری میں اپنے پنجوں سے آہنی پنجرے کی سلاخوں کو تھامنا چاہا۔ پھر وہ ان سلاخوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔

کتے کے وجود میں پیدا ہونے والے مخصوص ارتعاش نے سیکنڈ کے دس ویں حصے میں مجھے بتا دیا کہ آہنی پنجرے کی سلاخوں میں ایک طاقت ور کرنٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کے بعد دیوار میں نصب پینل کی حقیقت بھی کھل گئی۔ اس پنجرے کو بجلی کے نظام کے ساتھ بڑی مہارت سے منسلک کیا گیا تھا۔ پینل میں موجود ہینڈل کو ان کرتے ہی پنجرے میں مہلک کرنٹ رواں ہو جاتا تھا۔

چند لمحات تک کتے کا وجود تھرتھرایا پھر وہ ساکت ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کے مانند سلاخوں سے بچھڑا اور "دھپ" سے پنجرے کے فرش پر آن گرا۔ اس کے اندر زندگی کی کسی رمق کی موجودگی کے بارے میں سوچنا خود کو فریب دینے کے مترادف ہوتا۔

شعیب غوری نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "وجدان! اسے کہتے ہیں...... ڈیتھ کیج!"

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور پنجرے میں موجود ڈیوڈ پر نظر گاڑ دی۔ وہ پنجرے میں داخل ہوتے وقت جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ کتے کو اپنی بربریت کا نشانہ بنانے کے بعد اس نے ٹی شرٹ اتار دی اور وارم اپ ایکسرسائز کرنے لگا۔

میں بھی ہاتھ پاؤں کھولنے کے لیے جسم کو مخصوص جنبش دینے لگا۔ یہ مقابلہ مجھ پر مسلط کر دیا گیا تھا... تو میں خاموش کیسے بیٹھ سکتا تھا اور یہ مقابلہ کسی عام اکھاڑے میں نہیں بلکہ ڈیتھ کیج میں ہو رہا تھا۔ ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا' وہ پنجرہ اپنے پاس کس کی موت کا پیغام رکھتا ہے۔

ڈیوڈ کی صحت اور ہائٹ قابلِ رشک تھی۔ ہم دونوں میں انیس بیس کا فرق رہا ہوگا۔ شعیب نے اس کے تعارف میں بتایا تھا' وہ انٹراسٹیٹ چیمپئن شپ کا فاتح تھا اور یہ کوئی معمولی

بات نہ تھی۔ اس سے فائٹ کے دوران میں مجھے بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔

وارم اپ ہوتے وقت مجھے ہلکی سی بھوک کا احساس ہوا۔ صورتِ حالات کی مناسبت سے یہ ایک پلس پوائنٹ تھا۔ دشمنوں نے تو جسمانی طور پر کمزور کرنے کے لیے مجھے بھوکا رکھا تھا لیکن ان کی یہ چال اس وقت میرے لیے مفید ثابت ہو رہی تھی۔ میرا تجربہ یہ رہا ہے' بھرے ہوئے پیٹ کی بہ نسبت ہلکی بھوک کی کیفیت ہر نوعیت کی جسمانی کارکردگی میں اضافے کا باعث بن جاتی ہے!

ڈیوڈ مقابلے کے لیے تیار ہو چکا تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ میری نظر میں وہ اوچھی اور چھچھوری حرکت تھی۔ شاید اس طرح وہ مجھ پر اپنی دہشت بٹھانا چاہتا تھا۔ وہ پنجرے میں رکھے چوبی اسٹول کے پاس پہنچا۔ مذکورہ اسٹول کی اونچائی لگ بھگ دو فٹ تھی۔ وہ ذرا سا جھکا اور بریکنگ کے انداز میں اسٹول پر ایک ہاتھ جڑ دیا۔

ڈیوڈ کے ہاتھ کا وار اسٹول کے نشست والے تختے پر لگا اور چوبی اسٹول دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کی سنگینی اور حقارت پائی جاتی تھی۔

اسی لمحے شعیب کی طنز بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! تمہیں میرا مشورہ یاد ہے نا! ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر۔ ڈیوڈ بہت خطرناک فائٹر ہے اور ہاں...... پنجرے میں اس وقت مہلک کرنٹ بھی دوڑ رہا ہے۔''

ادھر شعیب کی بکواس ختم ہوئی' ادھر ڈیوڈ نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کا ' اٹیک بڑا جارحانہ تھا۔ اس نے چشم زدن میں رائٹ راؤنڈ ہاؤس چلائی تھی۔ میں بڑی سرعت سے بیک فٹ پر آیا اور ایک پہلو کو نکل گیا۔

اس مقابلے میں اٹیک اور بلاک سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ اپنے جسم کو پنجرے سے مس ہونے سے بچایا جائے۔ آگ' ہوا' پانی اور بجلی کی کسی سے دوستی نہیں ہوتی' نہ ہی انہیں کسی صلاحیت سے اپنا مطیع و فرماں بردار بنایا جا سکتا ہے۔ یہ اپنی فطرت کے عین مطابق موقع ملنے پر ضرور نقصان پہنچاتے ہیں۔

ڈیوڈ نے ایک کک پر اکتفا نہ کیا اور میرے سنبھلتے ہی اس نے اندر آ کر میرے چہرے پر ان سائیڈ پنچ مارا۔ میں نے نیک جرک کے طفیل اپنے چہرے کو بچایا اور اس کے آگے بڑھے ہوئے بازو کو گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ میں اس کی کلائی کو تھامنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی وقت اس نے میرے گھٹنے پر پاؤں کی ٹھوکر رسید کر دی۔

میں نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑی اور اس کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں مکا مارا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم پیچھے گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بھرپور سائیڈ کک اس کی پسلیوں کے سپرد کر دی۔

سائیڈ کک بڑی خطرناک ٹھوکر کا نام ہے اور اگر اس میں غصہ بھی شامل ہو تو یہ مدِمقابل کو قدموں سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ ڈیوڈ کے لیے میرے دل میں خیر اور بھلائی کے جذبات نہیں تھے' لہٰذا وہ سائیڈ کک کھانے کے بعد دور تک لڑھکتا چلا گیا پھر اسی غیر ارادی رولنگ کے دوران میں وہ اچانک اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

ڈیوڈ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ پنجرہ خاصا وسیع و عریض تھا۔ ورنہ اس وقت اس کا وجود کسی آہنی سلاخ کو سلامی پیش کر چکا ہوتا۔ اس ملن کے بعد جو کچھ ہوتا اس کے لیے کتے کی ایک مثال کافی تھی۔

ڈیوڈ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے تیور کی خطرناکی بڑھ چکی تھی۔ انٹر اسٹیٹ چیمپئن ...... تو مجھ سے ہاتھ کھانے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں میرے قریب پہنچا اور ایک ـــ محفوظ اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ مارشل آرٹس کے مقابلوں میں اگر آپ اپنے حریف کا اسٹانس توڑنے میں کامیابی حاصل کر لیں تو یہ نصف فتح کے برابر ہوتا تھا۔ آپ کو حریف پر نفسیاتی سبقت حاصل ہو جاتی ہے۔

ڈیوڈ' نئی' اسٹانس پر باکسنگ اسٹائل بنائے کھڑا تھا۔ میں نے چھیڑ چھاڑ کی غرض سے اس کے فرنٹ پنچ پر ایک جرک کک ماردی۔ اس نے پنچ کھول کر ہتھیلی سے میری کک بلاک کی اور بیک فرنٹ پر جاتے ہوئے ایک وھیل کک چلا دی۔

اس کی کک میرے کندھوں پر لگی اور میں ایک جھٹکے کے انداز میں لڑکھڑا کر دو قدم آگے چلا گیا۔ اسی وقت ڈیوڈ نے میرے جھکے ہوئے سر پر ایک کراس کک مارنا چاہی لیکن میں اس کی کمر کی حرکت سے اس کے عزائم کو بھانپ چکا تھا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے بیک فلیک لگائی اور اس کی کک کی رینج سے نکل گیا۔ وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے اپنے پنجوں پر اچھلنے لگا۔

میں نے فرنٹ اسپرنگ لگایا اور اس کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ مجھ پر تابڑتوڑ حملے کرنے لگا۔ اس نے پنچ کا ڈاج دیا' میں ایک قدم پیچھے گیا تو اس نے فرنٹ ہک کک میری ٹھوڑی پر مارنے کی کوشش کی۔ میں ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھا اور بیک سوئپ گھما دی۔

ڈیوڈ کی ایک ٹانگ ہوا میں اٹھی ہوئی تھی۔ بیک سوئپ نے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس سے ایک قدم کے فاصلے پر نیچی جمپنگ کرنے لگا۔ وہ شرمندہ سی صورت لے کر اٹھا اور جیسے ہی سیدھا ہوا' میں نے بلی کی آواز خارج کرتے ہوئے اس کی ناک پر پنچ مار دیا۔

ڈیوڈ کی ناک خون اگلنے لگی۔ اس دردناک چوٹ نے اسے وحشی بنا دیا۔ اس نے ناک سے نکلنے والے خون کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کیا پھر آلودہ ہاتھ کو منہ کے نزدیک لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہتھیلی کی پشت کو زبان سے چاٹنے لگا۔ میں اس کی مکروہ حرکت کو دیکھتے ہوئے مسلسل اپنے پنجوں پر اچھلتا رہا۔ میری یہ اچھلن ڈیوڈ کو غصہ دلانے کے لیے بڑی معاون ثابت ہو رہی تھی۔

وہ کسی بپھرے ہوئے سانڈ کے مانند آگے بڑھا۔ ایک نیچی جمپ لی اور فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔ میں نے سائیڈ اسٹیپ لے کر اس کی کک سے خود کو بچایا اور جیسے ہی اس کے قدموں نے زمین کو چھوا' میں نے رائٹ کریسنٹ مار دی۔

ڈیوڈ کا ہونٹ کٹ گیا۔ اس کی ناک میں پہلے ہی زخمی کر چکا تھا۔ اس نے خون آلود چہرے کے ساتھ کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور مجھ پر پل پڑا۔ وہ کوئی عام فائٹر نہیں تھا۔ اس کے حملوں میں بڑی طاقت تھی۔ ہمارے درمیان ہینڈ ٹیکنیکس کا مقابلہ ہونے لگا۔ اس کے وار کی میں روک پیش کرتا اور وہ فوراً میرے حملے کا توڑ پیش کر دیتا۔ حقیقی معنوں میں مجھے ڈیوڈ سے مقابلہ کرنے کا مزہ آ رہا تھا۔ کافی عرصے بعد کوئی ایسا فائٹر میرے مدِمقابل آیا تھا جس کے سامنے حاضر دماغی کی اشد ضرورت تھی۔ ہال کے اندر ایک پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا اور وہاں موجود ہر شخص بڑی دلچسپی سے یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔

کنگ فو کی ہینڈ ٹیکنیکس کے دوران میں ہمارے جسم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ اسی مرحلے پر ڈیوڈ کو میرے ایک بازو پر گرفت حاصل ہو گئی اور اس نے تھرو مار کر مجھے دور پھینک دیا۔ میں لڑھکتا ہوا آہنی سلاخوں کے پاس آیا اور تین انچ کے فاصلے پر میں نے اپنے جسم کو کنٹرول کر لیا۔

ڈیوڈ نے ایک ساتھ دو فلیک لگائیں۔ ڈبل بیک فلیک نے اسے میرے انتہائی نزدیک پہنچا دیا۔ وہ درحقیقت مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ سلاخوں کے نزدیک فائٹنگ میرے لیے سراسر نقصان دہ ثابت ہوتی لیکن میں نے ڈیوڈ کو خود پر وار کرنے کا موقع نہ دیا۔ حالات کی نزاکت اور سنگینی کو میں بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

ڈیوڈ جیسے ہی میرے پاس پہنچا' میں نے زمین پر ہی رہتے ہوئے ایک لمبی رولنگ کی اور پنجرے کے وسط میں پہنچ گیا۔ ڈیوڈ کسی شکاری کتے کی طرح لپک کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے بڑی تیز رفتاری سے یکے بعد دیگرے لیفٹ اور رائٹ راؤنڈ ہاؤس ککس چلائیں اور اگلے اسٹیپ پر میرے فیس کو نشانہ بناتے ہوئے ایک پنچ مار دیا۔

میں نے اس کے حملہ آور بازو کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ ازیں قبل میں نیک جرک سے اپنے چہرے کو بچا چکا تھا اس کی کلائی جیسے ہی میرے قابو میں آئی' میں نے ایک زوردار مروڑا دے کر گرفت کو آزاد کر دیا۔

وہ منہ کے بل پنجرے کے پختہ فرش سے ٹکرایا اور اس کے حلق سے ایک دردناک آواز خارج ہوئی۔ یہ اس مقابلے میں کسی پٹنے والے کی پہلی فریاد تھی۔ ڈیوڈ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے فوراً سے پیشتر اس کے منہ پر ایک زوردار فرنٹ ٹو سائیڈ کک جڑ دی۔

ڈیوڈ کا بدن چند انچ ہوا میں اچھلا اور وہ دھڑام سے پنجرے کے فرش پر چاروں خانے چت ہو گیا۔ میں ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے مخصوص انداز میں قدموں پر اچھلنے لگا۔

''فرنٹ ٹو سائیڈ کک'' دراصل ایک مخلوط کک ہے۔ فرنٹ اور سائیڈ کک کی خطرناکی کو یک جا کر کے ایک نہایت ہی سریع الاثر کک بنائی گئی ہے۔ اس کک کی سرعت اور زاویہ فوری طور پر مدمقابل کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے وہ مار کھا جاتا ہے۔

ڈیوڈ اس کک کی ہزیمت سے فیض یاب ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن اب اس کا انداز قدرے مختلف تھا۔ وہ غصے کو تھوک کر میری طرح نیچی جمپنگ کرنے لگا جلد ہی اس کی جمپنگ میں شدت پیدا ہونے لگی۔

☆☆☆

میں ڈیوڈ سے چند قدم کے فاصلے پر ٹائیگر اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس جمپنگ کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس پنجرے کی بلندی لگ بھگ پندرہ فٹ تھی اور یہ ہائٹ ڈیوڈ نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھی تھی ورنہ وہ کب کا اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔ وہ بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ اونچا نہیں اچھل رہا تھا۔

پھر اس کی جمپنگ میں سمر سالٹ بھی شامل ہو گئے۔ کبھی فرنٹ سمر سالٹ اور کبھی بیک سمر سالٹ اور کبھی ڈبل سمر سالٹ۔ وہ ایک ماہر جمناسٹ کی طرح ٹریمپولن کر رہا تھا' فرق صرف اتنا تھا کہ ٹریمپولن میں تنے ہوئے کسی کپڑے

یا نیٹ پر جمناسٹک کے کرتب دکھائے جاتے ہیں اور ڈیوڈ پنجرے کے پختہ فرش پر اپنے فن کا مظاہرہ کرر ہا تھا اسی لیے اس کے کمالات میں وہ حسن دیکھنے کو نہیں مل رہا تھا جو ٹرمپولن کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں بلغاریا کی گیلینا اور جرمنی کی ٹینا لڈوگ کا جواب نہیں!

چند لمحات کے بعد ڈیوڈ نے جمناسٹک کی کرتب بازی موقوف کردی اور اپنے قدموں پر ٹھہر کر ہانپنے لگا۔ اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اگر اس نے یہ مشقت مجھے متاثر کرنے کے لیے اٹھائی تھی تو میں واقعی اس کے فن سے متاثر ہوا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ خراجِ تحسین کے طور پر میں اس کی مدح سرائی شروع کر دیتا۔

ڈیوڈ جیسے ہی فرش پر ٹھہرا' میں نے ہوا میں پرواز کی اور ییل کرتے ہوئے اس کے سینے پر ایک فرنٹ فلائنگ ماری۔ وہ اس بری طرح ہانپا ہوا تھا کہ اپنا دفاع نہ کرسکا۔ بلاکنگ کے لیے اٹھنے والے ہاتھ ہوا میں معلق رہ گئے اور وہ میری زوردار کک کھا کر لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے گیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کی لڑکھڑاہٹ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ میرے پنچز اور ککس نے اس کے پورے وجود کی مالش کردی۔ اسی مارا ماری کے دوران میں وہ قدرے سنبھلا اور اس نے میرے دونوں ہاتھوں پر گرفت حاصل کرلی۔

ہم ایک دوسرے کے روبہ رو کھڑے تھے اور اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ ہمارے درمیان اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا پنجہ آزمائی کرنے والوں کے مابین ہوتا ہے۔ اچانک اس نے میرے ہاتھوں کو کلائیوں پر موڑنا شروع کردیا۔ میں نے بڑی سرعت سے بیک سمرسالٹ والے انداز میں اچھلتے ہوئے باڈی کو رول کیا' دوسرے ہی لمحے میرے دونوں پاؤں کی یک مشت خوف ناک جرک اس کے چہرے پر پڑی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلایا اور میرے ہاتھ آزاد کردیے۔

میں بیک سمرسالٹ کی تکمیل کے بعد اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ ڈیوڈ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میرے دونوں پاؤں کی یک لخت ٹھوکر نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس کی ناک اور ہونٹ کو میں پہلے ہی بری طرح زخمی کر چکا تھا۔

اس مرحلے پر میں اسے کوئی چانس دینے کو تیار نہیں تھا۔ میں جارحانہ انداز میں آگے بڑھا اور اسے اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ میں نے ڈبل راؤنڈ ہاؤس اور وھیل کک کا کمبی نیشن مکمل کیا تو وہ اپنا دفاع کرتے ہوئے آہنی سلاخوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر میں اسے ایک بھرپور سائیڈ کک لگا دیتا تو وہ کرنٹ زدہ سلاخوں سے جا ٹکراتا۔

اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی تھی یا پھر اس کی چھٹی حس نے اسے میرے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور رزاویہ بدلتے ہوئے ایک مرتبہ پھر جمناسٹک کے کمالات دکھانے لگا۔ میں نے گھوم کر اسے دیکھا تو وہ ٹمبلنگ کرتے ہوئے مجھ سے دور نکل رہا تھا۔ ٹمبلنگ جمناسٹک کا ایک خطرناک شعبہ ہے۔ اس میں ہاتھ اور سر کا استعمال کیے بغیر محض پاؤں کے پنجوں کے سہارے مسلسل ایک سیدھ میں سمرسالٹ لگانا ہوتے ہیں۔ یہ بہت ہی خوب صورت فارمیشن ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے' کوئی جمناسٹ ٹمبلنگ نہ کررہا ہو بلکہ انسانی بدن فٹ بال بنا کر ایک لائن میں ٹپنگ کرتا چلا جا رہا ہو۔

ڈیوڈ کے فن کا مظاہرہ تھما تو وہ اس اسٹول کے قریب پہنچ گیا جسے مقابلے کے آغاز میں اس نے دولخت کر دیا تھا۔ ڈیوڈ نے اسٹول کا ایک حصہ اٹھالیا اور بڑے خوفناک انداز میں میری جانب بڑھا۔ امریکی سپوت نے بالآخر اپنی نسلی روش کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی یہودی ہو اور مکاری و بے ایمانی اسے چھو کر نہ گزری ہو۔ اس قوم نے تو اپنے پیغمبر کو بھی بہت ستایا تھا' ہما شما کس کھاتے میں تھے! عیاری اور عہد شکنی ان کے خمیر میں رچی بسی تھی۔

اسٹول کا نصف حصہ کسی ہتھیار کے مانند ڈیوڈ کے ہاتھ میں سجا تھا اور وہ بڑے خونخوار انداز میں میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا اور اس کا یہ حشر میرے ہاتھ پاؤں کا کیا دھرا تھا۔ وہ میرے نزدیک آیا اور میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔

اس کے حملے میں ایکوریسی نہیں تھی' صرف جوش بھرا ہوا تھا۔ مسلسل پہنچنے والی چوٹوں نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ انٹر اسٹیٹ چیمپئن شپ کے ونر کو توقع نہیں تھی کہ میں اس کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوں گا۔

میں نے اس کے وار کو اپر بلاک سے روکا اور ساتھ ہی کاؤنٹر اٹیک کے طور پر اس کے پیٹ میں تھرسٹ کک جڑ دی۔ وہ توپ میں سے نکلنے والے گولے کے مانند ہوا میں نیچی پرواز کرتے ہوئے آہنی سلاخوں سے ٹکرایا لیکن اس موقع پر اس نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور سلاخوں کے قریب پہنچتے ہی اس نے ہاتھ میں تھامے ہوئے اسٹول کو ڈھال کے طور پر آگے کر دیا تھا۔ ٹکراؤ اسٹول اور سلاخوں کے درمیان ہوا۔ ڈیوڈ محفوظ رہا۔

خشک لکڑی ایک عمدہ قسم کا غیر موصل ہے۔ یہ اپنے اندر کسی بھی قسم کی برق رو کو گزرنے نہیں دیتی۔ چوبی اسٹول کا نصف حصہ ڈیوڈ کی زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔ میں نے دوسرے نصف حصے کو اٹھالیا اور غصیلے انداز میں ڈیوڈ کی طرف بڑھا۔

وہ پنجرے کے پختہ فرش پر پڑا حیران اور پریشان نظر سے کبھی مجھے اور کبھی کرنٹ زدہ آہنی سلاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اپنے زندہ بچ جانے کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اس کی حیرانی اور پریشانی کو توڑنے کے لیے اس کی تشریف پر بانتین چار ٹھنڈے برسائے۔ اس تحقیر آمیز سلوک کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور محتاط انداز میں مجھے گھورنے لگا۔

اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے جس انداز میں اس کی گت بنائی تھی وہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ لوگ ہمیں اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ ایک ادنیٰ غلام کی ایسی جسارت ڈیوڈ کی نظر میں ناقابلِ معافی تھی۔ لہٰذا وہ بری طرح پھنکار رہا تھا۔

وہ فرش سے اٹھتے ہوئے آہنی سلاخوں سے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک ہم پینترے بدلتے رہے پھر ہمارے درمیان باقاعدہ مارا ماری شروع ہوگئی۔ کراٹے میں اسٹک فائٹ کی جو اہمیت ہے' کنگ فو میں وہی مقام اسٹول فائٹ کو حاصل ہے۔ لیکن ہمارے درمیان ہونے والا وہ مقابلہ اسٹک فائٹ تھا اور نہ ہی اسٹول فائٹ ہم دونوں ادھورے اسٹول کو دھڑا دھڑ ایک دوسرے کے خلاف استعمال کررہے تھے۔

اسی ''استعمال'' کے دوران میں ڈیوڈ نے میرے بازو کو پکڑ لیا اور گھما کر مجھے دور پھینک دیا۔ میں اس ہتھکڑی کے نزدیک جا کر گرا جس نے تھوڑی دیر پہلے میری کلائیوں کو اپنی خطرناک گرفت میں جکڑ رکھا تھا۔ گرنے کے دوران میں چوبی اسٹول میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے ''ٹوٹی'' ہوئی ہتھکڑی کو اٹھالیا اور اچھل کر خود بھی اپنے قدموں پر استادہ ہو گیا۔

ڈیوڈ ایک مرتبہ پھر ادھورے اسٹول سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن وہ ہتھکڑی میرے ہاتھوں میں پہنچتے ہی نن چکو کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ میں نے اس کی ایک کڑی کو مضبوطی سے تھام لیا اور آزاد کڑی ہوا میں مختلف خوب صورت فارمیشن بنانے لگی۔ اس کی رفتار میں نن چکو جیسی تیزی تو نہیں تھی تاہم وہ میری بھرپور حفاظت کر رہی تھی...... اور اس کے ساتھ ہی ڈیوڈ کے جسم کے مختلف حصوں کو بھی یادگار بوسے دے رہی تھی۔

ہپناٹیزم

مصنف: ڈاکٹر جی ایم ناز

ہپناٹیزم کے موضوع پر اردو میں پہلی مستند کتاب

کتاب میں شامل چند عنوانات

- ہپناٹیزم ایک پوشیدہ قوت۔
- ہپناٹیزم کیا ہے؟
- ہپناٹیزم کی ابتدا۔
- ہپناٹیزم کے عملی اصول۔
- ہپناٹیزم اور جرائم۔
- ہپناٹیزم کا استعمال
- ازدواجی زندگی اور ہپناٹیزم
- بچوں پر ہپناٹیزم

قیمت:- /30 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

ڈیوڈ کی دہشت عروج کو پہنچ گئی۔ اس نے ادھورے اسٹول کو شدید غصے کے عالم میں مجھ پر پھینک مارا۔ میں نے ہتھکڑی کی مدد سے اپنی جانب آنے والے اسٹول کو لپیٹ کر ایک طرف اچھال دیا۔ یہ عمل اس سرعت سے ہوا تھا جیسے کوئی منجھا ہوا بیٹس مین باؤنسر کو ہک کر کے باؤنڈری لائن کے پار پھینک دیتا ہے۔

ڈیوڈ اس وقت بہت خون خوار ہو رہا تھا۔ پے در پے ناکامیابی اور پٹائی نے اسے بے قابو کر دیا اور وہ اندھے بیل کے مانند مجھ پر جھپٹ پڑا۔ وہ مارشل آرٹس کی کھلی توہین کر رہا تھا۔ ایک سچے مارشل آرٹسٹ کو یہ زیب تن نہیں دیتا کہ وہ اپنی ٹیکنیکس کو پسِ پشت ڈال کر عام دنگا فسادیوں کی طرح مدِمقابل سے دست و گریبان ہو جائے۔

ہم دونوں گتھم گتھا تھے اور فرش پر لوٹ رہے تھے۔ ہمارے جسم پسینے میں نہائے ہوئے تھے اور ایک اچھی خاصی فائٹ ریسلنگ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اسی چھینا جھپٹی کے دوران میں ایک مرحلے پر میری گردن ڈیوڈ کے ہاتھوں میں آ گئی۔ وہ میرا گلا دبانے کے لیے زور صرف کرنے لگا۔ میں نے سانس روک لی اور اسے خود کے اوپر سے اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے ہاتھوں کو استعمال کر کے گردن چھڑانے کے لیے بھی چارہ جوئی کر رہا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند چمکا اور میں نے اپنی حکمتِ عملی تبدیل کر دی۔ اب میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ میں نے سانس روک رکھی تھی لہٰذا ڈیوڈ مجھے کوئی سنگین نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس فوری خیال کے تحت میں غیر محسوس طور پر ڈیوڈ کو آہنی سلاخوں کے قریب لانے لگا...... اس طرح کہ کبھی وہ میرے سینے پر سوار ہوتا اور کبھی میرے نیچے دب کر رہ جاتا۔ میری گردن پر سے اس نے گرفت کو ایک لمحے کے لیے بھی ڈھیلا نہیں ہونے دیا تھا۔

اسی لوٹ پوٹ میں ہم خطرناک سلاخوں سے چار فٹ کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ اس وقت میں نیچے اور ڈیوڈ اوپر تھا۔ میرا گلا دبانے کی خواہش جنون کی شکل اختیار کر چکی تھی اور موت کا پیامبر وہ آہنی جنگلا ڈیوڈ کی پشت پر تھا۔

مجھے اسی نازک لمحے کا انتظار تھا۔ اس سنہری موقع کو حاصل کرنے لیے میں نے اپنی گردن دبوائی تھی۔ میں نے اچانک گردن چھڑانے کی کوشش ترک کر دی۔ اسی لمحے میں نے اپنے دونوں پاؤں کو سمیٹ کر ڈیوڈ کے پیٹ سے پیوست کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے ارادے کو بھانپ سکتا، میں نے جسم و جاں کی پوری قوت صرف کر کے ڈیوڈ کو اپنے اوپر سے اچھال دیا۔

اس ڈبل فٹ پش میں قیامت کا دھکا پوشیدہ تھا۔ میں نے اپنے تمام تر غیظ و غضب کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ حرکت کی تھی۔ ڈیوڈ کا وجود ہوا میں بلند ہوا اور سیدھا جا کر آہنی سلاخوں سے ٹکرایا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس حالت میں کرنٹ بردار آہنی سلاخوں نے کھلے بازوؤں سے اسے ویلکم کہا۔

میں ہینڈ پش کی مدد سے چشم زدن میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے میں نے شعیب غوری کو کرسی سے اٹھ کر بے ساختہ سوئچ پینل کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ یقینی طور پر پنجرے میں دوڑنے والے کرنٹ کو آف کرنے کے لیے حرکت میں آیا تھا تاکہ ڈیوڈ کو موت کے جبڑوں سے کھینچ لائے لیکن اسے دیر ہو گئی تھی...... بہت دیر ہو گئی تھی۔ بجلی، آگ، ہوا اور پانی کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ ان کے ہاتھوں واقع ہونے والی موت بڑی بھیانک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی ہوتی ہے!

شعیب غوری کے قدموں میں جیسے کسی نے آہنی زنجیر ڈال دی ہو۔ وہ ساکت کھڑا پھٹی ہوئی آنکھوں سے ڈیوڈ کو تکے جا رہا تھا جو یقینی طور پر اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے انجام کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے ساتھ بھی کم و بیش وہی سنگین حالات پیش آئے تھے جو تھوڑی دیر پہلے بے چارے کتے پر گزرے تھے۔ یہ بھی ایک حسین اتفاق ہی تھا کہ ڈیوڈ اس کتے سے صرف ایک فٹ کی دوری پر زمین بوس ہوا تھا۔ وہ کتے کی موت مارا گیا تھا۔ ایک بے زبان اور بے قصور جانور کو اذیت ناک موت سے دوچار کرنے والا جاندار نمونۂ عبرت بن کر رہ گیا تھا۔ شاید مکافاتِ عمل اسی کو کہا جاتا ہے!

ہال میں موجود تمام افراد کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے پنجرے کے دروازے کے پاس آیا اور نفرت آمیز نظر سے شعیب غوری کو گھورنے لگا۔ اس نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے مجھ پر ایک گہرا طنز کیا تھا۔ اب اس کے جواب کا وقت تھا۔ اینٹ کا جواب پتھر ہی سے دیا جانا چاہیے۔

میں نے بند مٹھی میں سے انگوٹھے کو الگ کیا، پھر اس انگوٹھے سے اپنے عقب میں بے جان پڑے ڈیوڈ کی طرف اشارہ کیا اور شعیب غوری سے مخاطب ہوتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''شعیب! اسے کہتے ہیں ڈیتھ کیچ!''

پھر میں چینی مارشل آرٹسٹ چنگ یو کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے انگلی سے اسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

''مسٹر چنگ یو!...... یو...... کم ان۔''

چنگ یو نے نیل آرمر کی طرف استفساریہ نظر سے دیکھا۔ نیل آرمر نے شعیب غوری کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔ شعیب غوری نے مسلح گارڈ کو حکم دیا کہ تھوڑی دیر کے لیے پنجرے میں دوڑنے والے کرنٹ کو روک دیا جائے۔

پھر اس نے چنگ یو کو آگے بڑھنے کا مخصوص اشارہ کیا۔ اب مجھے چنگ یو سے مقابلہ کرنا تھا۔ پنجرے والے کرنٹ کو روک کر چنگ یو اندر داخل کیا جانے والا تھا۔ اس وقت میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ چنگ یو کو زمین بوس کر کے مجھے کوئی میڈل یا ٹرافی نہیں جیتنا تھی۔ میں اگر اسے شکست فاش سے بھی ہمکنار کر دیتا تو رہتا اسی کرنٹ زدہ آہنی پنجرے میں ہی...... یعنی شعیب غوری کی قید میں...... اور اس قید کا مطلب تھا، یہودیوں کی قید میں!

سب سے اہم معاملہ میری آزادی کا تھا۔ اگر میں اپنے ہاتھ پاؤں کا ہو جاتا تو ایک ایک دشمن سے نمٹ سکتا تھا، چاہے وہ مشرقی ہو یا مغربی!

پلک جھپکتے میں میرے ذہن نے ایک لائحہ عمل طے کر لیا اور میں بڑے پُرسکون انداز میں اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب مجھے ایک ایسے عمل میں آنا تھا جس کے ردِعمل کے بارے میں قبل از وقت کوئی بھی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

گارڈ نے پینل کے اندر نصب ہینڈل کو گرا دیا، گویا آہنی پنجرے میں رواں دواں کرنٹ آف ہو گیا پھر چنگ یو دونوں گارڈ کی معیت میں پنجرے کے قریب آ گیا۔ اب طریقے کے مطابق ایک گارڈ نے دروازہ کھول کر چنگ یو کو پنجرے میں داخل کرنا تھا جب کہ دوسرا گارڈ تھوڑے فاصلے پر مجھے نشانہ بنائے کھڑا رہتا۔ میں پنجرے کا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس وقت میرا دل کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہایت ہی نازک اور اہمیت کا حامل تھا۔ گارڈز نے پنجرے کے لاک میں چابی گھمائی اور تھوڑی دیر بعد دروازہ کھول دیا۔ میں اپنی حالت سے یہ ظاہر کرنے لگا جیسے چنگ یو کا انتظار کر رہا ہوں لیکن میں اپنے ذہن میں کچھ اور ہی سوچے بیٹھا تھا۔

ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات
(باتصویر)
مصنف اسلام حسین
ٹیلی پیتھی کے موضوع پر جدید ترین اور مکمل کتاب
نئے طریقے، نئی مشقیں، سوال و جواب
کتاب کے چند عنوانات
ٹیلی پیتھی ایک علم، ایک سائنس
ٹیلی پیتھی کا ماضی اور حال
ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی مختلف مشقیں
ٹیلی پیتھی میں یوگا کا استعمال
غیر معمولی حس ادراک اور روحانی قوتیں
مستقبل کی پیش گوئی
قیمت:-/45 روپے
ڈاک خرچ:-/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

جیسے ہی چنگ یو نے پنجرے میں قدم رکھا' میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بڑی سرعت سے حرکت کی اور میری سائیڈ کک اس کے پیٹ میں لگی۔ چنگ یو کا ایک قدم پنجرے کے اندر اور دوسرا باہر تھا۔ وہ اس غیر متوقع حملے سے سنبھل نہ سکا اور اپنے عقب میں' زینے پر موجود گارڈ سے جاٹکرایا' پھر وہ دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے ہال کے پختہ فرش پر دور تک لڑھکتے چلے گئے میں نے کڑے وقت کے اس نازک لمحے کو کیش کر لیا تھا!

اسی لمحے دوسرے گارڈ کی گن نے ایک برسٹ مارا۔ اس نے پنجرے کے اندر میرے قدموں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن میں پنجرے میں موجود ہوتا تو اس کی فائرنگ کی زد میں آتا۔ سائیڈ کک کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے بے خطر فرنٹ رولنگ کی تھی۔ یہ رولنگ ایک طویل جست اور تھوڑے لڑھکنے پر مشتمل تھی۔ میں نے کسی گائیڈڈ میزائل کے مانند ہوا میں روٹیٹنگ فلائٹ کی اور زمین پر آتے ہی دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ہال' شیبا کی وحشت ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

میری اس برقی حرکت کا اختتام مسلح گارڈ کے قریب ہوا۔ وہ گارڈ اور چنگ یو ابھی سنبھل نہیں پائے تھے۔ اس وقت سب سے اہم شے گن تھی۔ میں نے جھپٹا مار کر گارڈ کے ہاتھ سے گن چھین لی اور رول کرتے ہوئے دور نکل گیا اور بڑی چابک دستی سے دوسرے گارڈ پر فائرنگ کی۔ وہ میری چلائی ہوئی گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے مہلک ہتھیار کا رخ نیم بیضوی چبوترے کی طرف پھیر دیا۔ وہاں کرسیوں پر مجھے نیل آرمر اور شیبا سکتے کی حالت میں بیٹھے نظر آئے۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر انہیں بھون ڈالا اور شعیب غوری کی خبر لی۔

شعیب غوری' نہتے گارڈ اور چنگ یو کی معیت میں رکوع کے بل دوڑتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے حالات کی سنگینی اور نزاکت کا بہ خوبی اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے ان کی پشت پر ایک طویل برسٹ مارا۔

شعیب غوری اور چنگ یو گولیوں کی آمد سے قبل ہی دروازہ پار کر چکے تھے۔ نہتا گارڈ البتہ لقمۂ اجل بن گیا۔ اس خوف ناک برسٹ نے گارڈ کا وجود چھید ڈالا تھا۔ اس کا جسم ہوا میں اچھلا پھر زمین بوس ہو کر تڑپنے لگا۔ وہ اب تب کا مہمان تھا۔

گن خالی ہو گئی تھی۔ میں نے دوسرے گارڈ کی گن کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس میں کافی سے زیادہ راؤنڈز باقی تھے۔ اس وقت ہال میں صرف میں ہی ایک زندہ بچا تھا۔ نیل آرمر' شیبا' ڈیوڈ اور دونوں گارڈز موت کے منہ میں لمبی تان کر سو رہے تھے جبکہ شعیب' چنگ یو کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ میں اس ہال سے نکلنے میں اپنی مرضی کا مالک تھا۔

اس ہال کو جلد از جلد چھوڑنا جتنا ضروری تھا' اس سے کہیں زیادہ اہم کام ایک اور بھی تھا۔ میں گن سونتے ہال کی اس دیوار کی طرف بڑھ گیا جہاں ایک ٹرالی پر بڑے اسکرین والا ٹی وی رکھا تھا۔ اس ٹی وی کے اسکرین پر شعیب نے مجھے ایک ناگفتہ بہ فلم دکھائی تھی۔ ٹرالی کے زیریں خانے میں وڈیو کیسٹ پلیئر بھی موجود تھا۔ وہ شرم ناک گردن جھکا دینے والی فلم ابھی تک اسی وڈیو کیسٹ پلیئر میں لگی ہوئی تھی۔

میں نے چشم زدن میں فائرنگ کر کے لنگ سائز ٹی وی کو کچرے کے ڈھیر میں بدل دیا۔ یہی حال میں نے وی سی پی کا بھی کیا۔ کیسٹ اس کے پیٹ میں موجود تھی۔ میں نے زچہ بچہ دونوں کے پرخچے اڑا دیے۔ مجھے بلیک میل کرنے کا سامان نیست و نابود ہو گیا۔ میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی اور کندھے پر گن کو ٹکا کر محتاط قدموں سے ہال کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اسی وقت ہال میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

وہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی تاریکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھا ہو کر رہ گیا ہوں۔ میں مہیب اندھیرے کے سمندر میں خود کو ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ شعیب غوری کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق وہ فرائی ڈے کی دوپہر تھی۔ اگر اس نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو لائٹ آف ہو جانے کے بعد بھی دن کا تھوڑا بہت اجالا ہال کے اندر ضرور آنا چاہیے تھا لیکن وہاں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کسی تاریک غار میں اتر گیا ہوں۔ وہ ہال مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ تھا۔ اگرچہ اس میں مناسب کولنگ ابھی باقی تھی تاہم ائرکنڈیشنر کے بند ہونے سے پیدا ہونے والا گھٹن کا مخصوص نفسیاتی احساس اجاگر ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں یہ خطرناک سوال ابھرا...... کہیں وہ ہال کسی تہ خانے میں تو واقع نہیں تھا؟

اس خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ اگر میں اس وقت واقعی کسی بیس منٹ میں تھا تو کولنگ کے اختتام پر وہاں میرے لیے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی تھی کہ دوپہر ہونے کے باوجود بھی اس ہال میں اس قدر تاریکی کیوں تھی۔

اس ہال کی گھٹن اور تاریکی اپنی جگہ رہی اس سے بھی کہیں یادہ خوف ناک بات یہ تھی کہ اس بنگلے میں شاطر یہودی وجود تھے جو مجھے اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے اور میری ہا بھی عورتیں ان وحشیوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ اگر اس ہال ی برقی رو کو ارادتاً منقطع یا آف کیا گیا تھا تو پھر اس بات کے کانات بھی روشن تھے کہ ہال کے دروازوں کو پہلی فرصت مقفل کر دیا جائے گا تاکہ میں اس اندھیرے کا فائدہ اٹھا ر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکوں۔

شعیب غوری کے یہودی آقا کسی قریبی کمرے میں، ہال ں ہونے والے ''شو'' کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ ہال کی ارروائی کو اس کمرے میں مانیٹر کیا جا رہا تھا۔ ان چٹی چمڑی الے فرعون صفت لوگوں نے ہال کے ایک ایک منظر کی زئیات کو ملاحظہ کیا ہوگا۔ میں نے وہاں جو تہلکہ ڈالا تھا وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا۔ شعیب کی زبان ان تک بری صلاحیتوں کا جو پروفائل پہنچا تھا' ہال والے واقعات کے بد اس کے مندرجات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہوگا...... یعنی ب میں ان کی انتہائی ضرورت بن گیا تھا...... مطلوب ل...... موسٹ وانٹیڈ!

یہودیوں کے نزدیک انسان صرف وہی ہیں۔ اس کرۂ رض پر جینے کا حق صرف انہی کا ہے۔ اگر اور کسی قوم کو زندہ ہنا ہے تو ان کا محکوم اور غلام بن کر زندہ رہنے کی اجازت ہے کسی بھی بہانے...... حالات پیدا کر کے یا نظریۂ ضرورت کے تحت وہ غیر یہودیوں کو اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرتے۔ بالکل ایسے جیسے آوارہ کتے بلیوں کو تلف کر دیا جائے لیکن اس کے بالعکس وہ اپنے کسی ایک یہودی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کروڑوں ڈالرز خرچ کرنے پر بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ قوم پرستی نہیں بلکہ شیطانیت ہے۔ امریکا بہادر کو زمینی خدا سمجھنے والوں کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ انسانی تاریخ میں تمام بڑے فتنے اسی رنگ ڈھنگ میں ظہور پذیر ہوئے ہیں لیکن افسوس...... صد افسوس! ہم تاریخی حقائق کو فراموش کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم......!

میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ وہ سوچ سے زیادہ عمل کا وقت تھا۔ جذباتی انداز میں غور و فکر اور فکری انداز میں جذبات کا اظہار پھر کسی موقع پر کیا جا سکتا تھا۔ یہ تمام خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں اس گارڈ کے مردہ جسم کی طرف بڑھ گیا جس نے پنجرے میں مجھ پر فائرنگ کی تھی۔ وہ قد کاٹھ میں مجھ سے ملتا جلتا تھا۔ اس وقت میرے جسم پر صرف ایک لنگوٹ نما جانگیا تھا۔ میں اندازے کی بنا پر جلد ہی اپنے مطلوبہ مردے تک پہنچ گیا۔

میں نے چند سیکنڈ میں اس کی پتلون اپنے بدن پر سجالی۔ شرٹ پہننا میں نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ جا بجا خون آلود ہو چکی تھی۔ اس ضروری کام سے نمٹنے کے بعد میں تاریکی کی ''آڑ'' لیتے ہوئے ہال کے ایک دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اب اس اندھے ہال میں رکنے کا کوئی جواز باقی نہ تھا۔

میں دروازے پر پہنچا اور اس سے پہلے کہ میں دروازے کے کھلا یا بند ہونے کا اندازہ لگاتا' باہر سے چند افراد کے باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں۔ میں نے ایک دیوار کے ساتھ لگ کر سانس روک لی۔ گن تیار حالت میں میرے ہاتھ میں تھی۔ اسے استعمال کرنے میں' میں کسی تردد یا سوچ بچار کے موڈ میں نہیں تھا۔

باہر سے ابھرنے والی آوازیں تھم گئیں۔ میں نہیں جانتا تھا' آنے والوں کے ذہنوں میں کیا تھا میں محض اندازے کی بنا پر چلتے ہوئے ایک دروازے تک پہنچا تھا اور مجھے اتفاق سے ایک ایسی آڑ میسر تھی کہ اگر وہ لوگ ہال میں داخل ہوتے تو ان کی اندھادھند فائرنگ بھی میرا ایک بال بانکا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ آڑ فائرنگ سے مطلق محفوظ تھی۔

دروازہ کھلا' نہ کوئی اندر داخل ہوا اور نہ ہی دروازے کو مقفل کرنے کی مخصوص آواز ابھری۔ میں آنے والوں کی پُر اسرار خاموشی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہال روشنی سے بھر گیا۔

میری چھٹی حس نے بروقت راہنمائی کی اور میں لمبی جست بھر کر نیم بیضوی چبوترے کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس چبوترے کے عقب میں دیوار کے ساتھ چھپنے کے لیے ایک مناسب جگہ موجود تھی۔ وہ نیم بیضوی چبوترہ زمین سے پانچ فٹ کی بلندی پر تھا۔ سامنے والے حصے میں نیم بیضوی انداز ہی کے زینے تھے تاہم عقب میں خلا ہونے کے باعث دو فٹ چوڑی' پانچ فٹ گہری اور طویل سی ایک خندق وجود میں آ گئی تھی جہاں میں گن تھامے دم سادھے بیٹھا تھا۔

میں جانتا تھا اس ہال کو شوٹ کرنے کے لیے نادیدہ کیمرے مختلف گوشوں میں خفیہ طریقے سے نصب کیے گئے تھے اور اس فلم بندی کو کسی دوسرے کمرے میں مانیٹر بھی کیا جا رہا تھا۔ ہال کے دوبارہ روشن ہو جانے کا واضح مطلب یہی تھا کہ اب وہاں کی ایک ایک شے کو کہیں اور دیکھا جا رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ لوگ وہاں کی صورتِ حالات کا جائزہ

لینے سے زیادہ مجھے تلاش کرنے میں دلچسپی لے رہے ہوں گے۔ میں نے وہاں جو افراتفری مچائی تھی وہ ان کے لیے ناقابلِ یقین ہی نہیں بلکہ ناقابلِ فراموش بھی تھی۔ ڈیوڈ نیل آرمر اور شیبا کی میری ہاتھوں موت انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دینے کے لیے کافی تھی۔ میں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس وقت کیمرے کی آنکھ سے محفوظ تھا۔ وہ لوگ وہاں میری موجودی کو نہیں پکڑ سکتے تھے۔

میں نے جس نیم بیضوی چبوترے کے عقب میں پناہ لے رکھی تھی، تھوڑی دیر پہلے وہ خاصا آباد تھا۔ اس پر موجود تین عالی شان کرسیوں پر شعیب غوری، نیل آرمر اور شیبا براجمان تھے۔ شعیب کو دم دبا کر بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا تھا لیکن نیل آرمر اور اس کی خوبرو سیکریٹری کو میں نے کرسیوں سے اٹھنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ اس وقت وہ عین میرے سر کے اوپر مردہ حالت میں اپنی کرسیوں میں پڑے تھے۔

میں دم سادھے اس خفیہ گوشے میں دبکا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کے باہر پھر زندگی کی مخصوص ہلچل سنائی دی۔ میں نے پہلے ہی وہاں کچھ افراد کی آوازیں سنی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس دروازے کو کھولا جانے لگا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، اندھیرا ہوتے ہی ہال کے دروازے آٹو میٹک نظام کے تحت بند ہوگئے تھے یا کسی شخص نے انہیں بند کر دیا تھا۔ ایک بات یہ بھی واضح ہوگئی کہ وہ لوگ کسی ٹی وی اسکرین پر مجھے ہال کے اندر تلاش کرنے میں ناکامیاب رہے تھے۔ کیمرے کی ناکامیابی کے بعد ان کے آلۂ کار بہ نفسِ نفیس میری خبر گیری کے لیے ہال میں داخل ہونے والے تھے۔

دروازہ کھل گیا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے دو گن بردار افراد دکھائی دیے۔ میں نے جس مقام پر پناہ لے رکھی تھی وہاں سے دروازہ واضح طور پر نظر آرہا تھا تاہم دروازے سے داخل یا خارج ہونے والے افراد مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں نے دیکھا، مذکورہ دو مسلح افراد سے دو قدم پیچھے چینی مارشل آرٹسٹ چنگ یو بھی ہال میں داخل ہوا تھا۔ چنگ یو نے تھوڑی دیر پہلے فرار ہو کر اپنی بزدلی کا ٹریلر دکھا دیا تھا۔ اس کی نظر میں وہ مصلحت کوشی رہی ہوگی لیکن اس کے طرزِ عمل نے مجھے خاصا مایوس کیا تھا۔

وہ تینوں ہال کے اندر داخل ہونے کے بعد چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ انہوں نے دروازے کو بند کرنے زحمت نہیں کی تھی۔ عین ممکن تھا، انہوں نے اپنے کسی ہنگامی فرار کے لیے وہ راستہ وا رکھا ہو!

میں چاہتا تو اپنی پناہ گاہ سے اچانک نمودار ہو کر ان سے بھڑ جاتا، پھر جو بھی نتیجہ سامنے آتا، اسے بھگت لیتا لیکن میں اس ہال کے اندر مزید کسی مارا ماری کے حق میں نہیں تھا۔ وہ وسیع و عریض ائیر کنڈیشنڈ ہال کسی کنگ سائز چوہے دان کی عمدہ مثال تھا۔ میں اب کسی رسک کے موڈ میں نہیں تھا۔

جب وہ لوگ ہال کے وسط میں پہنچ کر تین مختلف سمتوں میں پیش قدمی کرنے لگے تو میں ایک فوری فیصلے کے بعد اپنی جگہ سے متحرک ہوا اور گولی کی رفتار سے رکوع کے بل دوڑتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھا۔ اگر مزید کوئی دنگا فساد اور خون ریزی ناگزیر تھی تو وہ ہال کے باہر بھی عمل میں لائی جاسکتی تھی۔

انہوں نے جلد ہی میری حرکت کو نوٹس کرلیا اور بڑی سرعت سے میری جانب پلٹے مگر میں اس وقت تک دروازے میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے چشم زدن میں ڈائیو کیا اور کھلے ہوئے دروازے سے باہر پہنچ گیا۔ اپنے عقب میں مجھے اضطراری فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یقینی طور پر ان دو مسلح افراد نے پلٹتے ہی اپنی گنوں کو مجھ پر کھول دیا تھا...... اور کچھ بعید نہیں تھا کہ ہال کو مانیٹر کرنے والے کیمرے بھی میری موو کو بڑی وضاحت کے ساتھ شوٹ کرلیا ہو۔

اس لائف سیونگ ڈائیو کے نتیجے کے طور پر میں ایک راہ داری میں گرا اور فالنگ کے قاعدے کے مطابق دور تک رول کرتا چلا گیا۔ اسی لمحے مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ آواز کی سمت نے مجھے بتا دیا کہ میرا تعاقب کرنے والے ہال کی طرف سے آرہے تھے۔ وہ چنگ یو اور دو مسلح افراد کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتے تھے۔

میری اس رولنگ کا اختتام راہ داری کے جس حصے میں ہوا وہاں مجھے زینہ نظر آیا۔ میرے لحاتی اندازے کے مطابق وہ بیس سے پچیس اسٹیپ والا ایک پختہ زینہ تھا جس کے اختتام پر ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ مذکورہ ہال اس بنگلے کے بیس منٹ میں واقع تھا۔ میں اپنی گن سمیت اچھل کر زینے کی آڑ میں چلا گیا۔

اس راہ داری میں مناسب روشنی تھی مگر اطمینان بخش بات یہ تھی کہ اب میری حرکات و سکنات کو کسی ٹی وی اسکرین پر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے یہودیوں کے لیے میں ہال سے فرار ہوچکا تھا۔

میں نے زینے کی اوٹ میں خود کو چھپا کر عقل مندی کا ثبوت دیا تھا کیوں کہ ہال سے نکلنے کے بعد انہوں نے اسی زینے کو نشانہ بنا کر فائرنگ کی تھی۔ میں اس بے دریغ فائرنگ

سے محفوظ رہا۔ وہ راہ داری کوئی اتنی لمبی چوڑی نہیں تھی کہ مجھے ڈھونڈنے کے لیے انہیں کسی دقت کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں کسی بھی ہنگامی کارروائی کے لیے گن سنبھالنے تیار بیٹھا تھا۔

جب میں انہیں راہ داری میں کہیں نظر نہ آیا تو ایک گن بردار زینے کی جانب بڑھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے میری ہی طرف آ رہا تھا۔ اس راہ داری میں چھپنے کی جگہ صرف وہی تھی جہاں میں عارضی طور پر پناہ گزیں تھا۔ چنگ یو دوسرے گن بردار کے ساتھ زینہ طے کر کے اوپر جانے لگا کہ کہیں میں وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہو گیا ہوں۔

میں نے سانس روک کر گن کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ان نازک لمحات میں میرے اعصاب پر بے پناہ دباؤ تھا۔ موت اور زندگی کا یہ خوفناک کھیل طول پکڑتا جا رہا تھا۔ پھر جیسے ہی مجھے اس شخص کی ٹانگیں نظر آئیں میں نے بلاتردد اس کی ٹانگوں پر ایک برسٹ فائر کیا۔ مختصری راہ داری گن بردار کی ہولناک چیخوں سے گونج اٹھی۔ میں نے ٹانگوں سے گھسیٹ کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اب پہلی نظر میں وہ کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

اسی لمحے مجھے زینے کے اوپر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یقینی بات تھی چنگ یو دوسرے گن بردار کے ساتھ واپس لوٹ آیا تھا۔ میری گن خالی ہو چکی تھی میں نے بڑی سرعت سے مضروب شخص کی گن کو اپنے ہاتھوں میں سجا لیا۔

مجھے یہ جاننے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ میری فائرنگ نے اس شخص کی ٹانگوں کا کچومر نکال دیا تھا۔ وہ نچلے دھڑ سے خون میں لت پت بری طرح تڑپ رہا تھا۔ ہڈیوں کی ناکارگی کے ساتھ ہی گوشت دپوست میں بھی پگھلا ہوا سیسا اتر چکا تھا۔ طرفہ تماشا یہ تھا کہ اسے بلبلانے یا چیخنے چلانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ کو پھیلا کر اس کے منہ کا ڈھکن بنا دیا تھا۔ میری گرفت اتنی یقینی اور ظالم تھی کہ اس بے چارے کو سانس لینے میں بھی کافی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

چنگ یو مسلح شخص کے ہمراہ زینہ اتر کر مختصری راہ داری میں پہنچ گیا۔ وہ دونوں اس وقت مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے ان کے بارے میں حالات و واقعات کی روشنی میں ممکنہ اندازہ لگایا تھا۔ نیچے پہنچتے ہی انہوں نے اپنے ساتھی کو تلاش کیا ہوگا...... اور دکھائی نہ دینے پر انہیں میری ہی جانب آنا تھا۔ راہ داری میں چھپنے کے لیے اور کوئی گوشہ واقع نہ تھا۔

میں نے چشم زدن میں ایک ہنگامی فیصلہ کر لیا...... چنگ یو کو شدید زخمی کرنے کا فیصلہ!

میرے اس فیصلے کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں خدانخواستہ اس چینی مارشل آرٹسٹ سے مقابلے سے گھبرا رہا تھا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی تھا۔ اگر میں کنگ فو کے جوہر دکھانے میں مصروف ہو جاتا تو وقت ہاتھ سے نکلنے کا قوی امکان تھا۔ حالات کی نزاکت کے پیش نظر میرا وہ فیصلہ انتہائی معقول تھا۔ حالات کے تقاضوں کو نبھانے والے ہی آگے بڑھتے ہیں!

پھر وہ دونوں میری نگاہ میں آ گئے۔

مجھے ان کے جسموں کے زیریں حصے نظر آ رہے تھے۔ مخصوص پہناوے کے سبب چینی چنگ یو کو پہچاننے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہ ہوا۔ میں نے اس کے قدموں کو اپنے ذہن میں فوکس کیا اور گن کے ٹریگر پر میری انگلی دب گئی۔

خطرناک گن کے دہانے سے خارج ہونے والی گولیوں نے چنگ یو کے پاؤں اور پنڈلیوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں وہ کرب ناک انداز میں چیختے ہوئے ایک جانب لڑھک گیا۔ میں نے اپنی پناہ گاہ کو چھوڑتے ہوئے ایک لمبی لوٹ لگائی اور کئی فٹ دور مخالف سمت میں نکل گیا۔

میں نے یہ حرکت فطری ردعمل سے بچنے کے لیے کی تھی۔ میری فائرنگ کے جواب میں دوسرا گن بردار میری سمت فائرنگ کرتا اور میرے حساب کے عین مطابق ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں نے اپنی عارضی پناہ گاہ کو الوداع کہا' مجھے اپنے عقب میں زخمی آدمی کی بلند چیخیں سنائی دیں۔ یہ اس برسٹ کا خوفناک نتیجہ تھا جو دوسرے گن بردار نے مجھے ختم کرنے کے لیے فائر کیا تھا۔ ان شکست خوردہ لمحات میں یہ حقیقت اس کے ذہن سے نکل گئی تھی کہ مجھے مارنے کا مطلب تھا' اس نے اپنے پورے خاندان کو سپرد عذاب کیا۔ میں شعیب غوری کے آقاؤں کا مطلوب تھا۔ وہ میری جاں کا زیاں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ پتا نہیں انہوں نے مجھے کن کن کٹھنائیوں سے گزارنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

میں اس گن بردار کو مزید کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی فائرنگ سے اسی کا ساتھی جہنم واصل ہو چکا تھا۔ اس نے بے ساختہ میری طرف گن سیدھی کرنا چاہی مگر میں اس کی حرکت سے قبل ہی ایکشن لے چکا تھا۔ میں فرنٹ رول کرتے ہوئے اس کے انتہائی نزدیک پہنچا' پھر سر کو جھکاتے ہوئے پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ایک خوفناک ٹکر رسید کر دی۔

وہ بیک گیئر میں ڈگمگاتے ہوئے چنگ یو سے ٹکرایا جو

پہنچ گیا۔ درحقیقت مجھے یوں کہنا چاہئے میں دوسرے بنگلے سے پہلے بنگلے میں پہنچ گیا۔ سفید بنگلے کا عقبی لان والا حصہ کم و بیش ویسا ہی تھا جیسا میں دوسرے بنگلے میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

یہاں پر مجھے سناٹے اور ملگجے اجالے کی حکم رانی نظر آئی۔ آثار سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بنگلا بھی انسانی وجود سے خالی ہو لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک تشویش ناک سوال نے ڈنک مارا۔

کیا وہ سب لوگ یہاں اور وہاں سے کہیں اور جا چکے ہیں؟

''نہیں!'' میں قدرے بلند آواز میں بڑبڑایا۔

میری اس بڑبڑاہٹ میں بڑی شدت تھی۔ میں بے ساختہ اپنے دلی جذبات کو کھول بیٹھا تھا۔ شعیب غوری اور اس کے آقا گئے بھاڑ میں' میرا تصور تو اس احساس ہی سے لہولہان ہو رہا تھا کہ ساحل اور صدف کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ یہ کھو کر پانا اور اس طرح پانا کہ پانے سے چند لمحات پہلے کھو دینا بڑا روح فرسا ہوتا ہے۔ ابدی جدائی کا کبھی نہ کبھی صبر آ ہی جاتا ہے مگر ملنے بچھڑنے کا یہ کھیل تن من پر آبلے ڈال دیتا ہے' انسان کا احساس جھلس کر رہ جاتا ہے۔ ان بے وفا اور کج ادا لمحات میں میرے دل میں اس خواہش نے شدت سے انگڑائی لی کہ کاش! ملن اور جدائی کا یہ ناٹک ختم ہو جائے۔ میں اپنی ساحل سے اس طرح ملوں کہ بچھڑنے کا امکان باقی نہ رہے۔ اس لڑکی نے مجھ سے مجھے چھین لیا تھا!

ذہن میں بسے ان خیالات نے میرے پاؤں میں پہیے لگا دیے اور میں ایک دیوار سے پشت ٹکا کر کسی تربیت یافتہ کمانڈو کی طرح بنگلے کے اندرونی حصے کی سمت رینگ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے کو کھولا اور گن لہراتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ میری بینائی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخری لمحات میں' میں نے جو آخری منظر دیکھا وہ تیز روشنی کے ایک جھماکے کا منظر تھا۔ چشم زدن میں کوئی فلڈ لائٹ میری بینائی سے ہم آغوش ہوئی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے نور کی ایک چادر سی پھیلتی چلی گئی۔

ردِعمل کے طور پر بے اختیار میرے دونوں ہاتھ آنکھوں پر آئے۔ اس سے پہلے ہی گن چھوٹ کر نیچے گر گئی تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو دبائے تکلیف کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بند آنکھوں کے پیچھے بھی اسی تیز چندھیا دینے والی روشنی کا عکس تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سالم سورج میری آنکھوں میں گھس بیٹھا ہو!

پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن میں کوئی گولی اتر گئی ہو۔ وہ ایک بے آواز فائر تھا یا ہوسکتا ہے' بینائی کے ساتھ ہی میری سماعت بھی وداع ہو گئی ہو۔ فائر ہوا ہو مگر میں اس کی مہلک صدا سننے سے قاصر رہا ہوں۔

اگلے ہی لمحے میری کیفیات مین واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ میری سماعت اور بینائی اچانک لوٹ آئی۔ میں نے چند افراد کو بڑی افراتفری میں بڑبڑاتے اور اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ مجھے آناً فاناً میں مضبوط بندشوں میں جکڑنے میں مصروف ہو گئے۔

میری سماعت اور بینائی کے لوٹنے کا خاک فائدہ نہ ہوا کیونکہ اس واپسی کے ساتھ ہی قوتِ گویائی اور حرکت کی صلاحیت مفقود ہو گئی تھی۔ میں ایک مجسم عضوِ معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ میں گلا پھاڑ کر اس بہیمانہ کارروائی کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن بے سود۔ میں ہاتھ پاؤں کی جنبشوں سے ان شیطانوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلانا چاہتا تھا مگر بے فائدہ' میں کچھ بولنے' کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا...... اور یہ سب اسی بے آواز' ناہنجار' خانہ خراب گولی کا نتیجہ تھا جو میرے بدن میں اتر کر مجھے مفلوج بنا گئی تھی۔

میں بڑی بے بسی سے اپنے ساتھ ہونے والی کارروائی کو دیکھنے لگا!

☆☆☆

آنکھیں نعمت ہیں...... ایک بہت بڑی نعمت!

اس دنیا کی ساری خوب صورتی' رنگینی اور سنگینی ہم آنکھوں ہی کی مدد سے دیکھ پاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ یہ راز جانتے ہوں گے کہ ہماری یہ آنکھیں بہت ہی مجبور اور بے بس ہیں۔ کوئی بھی منظر دیکھنے یا دکھانے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہ کسی کیمرے کے لینس کی طرح ہیں۔ دنیا کا ہر کیمرا اور کیمرے کا ہر لینس اپنے کام کے لیے روشنی کا محتاج ہے۔ ہماری آنکھوں کو بھی جب تک روشنی میسر نہ ہو' یہ ہمیں کوئی بھی شے دکھا نہیں سکتیں۔ درحقیقت روشنی کی موجودی میں مختلف اشیا سے خارج ہونے والی مخصوص شعاعیں ہماری آنکھوں کے لینس پر ٹکراتی ہیں اور پردے پر اپنا عکس بناتی ہیں' یعنی اس شے کی شبیہ وجود میں آ جاتی ہے۔ ہمارا دماغ اس شبیہ کو نوٹس کر لیتا ہے اور ہمیں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم نے اپنی آنکھ سے اس شے کو دیکھا ہو۔ اگر واقعی یہ آنکھ کا کمال ہو تو پھر وہ شے ہمیں گھپ اندھیرے میں بھی دکھائی دینا چاہئے مگر ایسا نہیں ہوتا!

میری آنکھوں کے سامنے بھی اس وقت گہری تاریکی تھی اور اس تاریکی کا سبب بھی مجھے معلوم تھا۔ خدانخواستہ میں بینائی سے محروم نہیں ہوا تھا۔ میری بصارت اپنی جگہ قائم و دائم تھی مگر میری آنکھیں کسی دبیز سیاہ پٹی کی اوٹ میں بے بس ہو کر رہ گئی تھیں کیونکہ روشنی کی ایک موہوم سی کرن بھی ان تک پہنچنے میں ناکامیاب تھی۔ اس کس کر باندھی گئی سیاہ پٹی نے مجھ سے دیکھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو محسوس کرنا چاہا تھا تو سب سے پہلا احساس یہی ہوا تھا کہ میری آنکھوں پر کوئی مضبوط سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔ میں نے اپنی سننے اور بولنے کی صلاحیت کو آزمایا تو وہ مجھے صحیح سلامت محسوس ہوئیں۔ جب مجھے چند افراد مضبوط رسیوں میں جکڑ رہے تھے تو قوت گویائی اور قوت حرکت غائب ہو گئی تھیں۔ یہ اس پراسرار گولی کا کمال تھا جو میری داہنی ران میں گھس بیٹھی تھی۔ اس کرشمہ کار گولی کا اثر تھا کہ میں خود کو مفلوج محسوس کرنے لگا تھا۔ کیا میں اب بھی مفلوج ہی تھا؟

اس سوال نے میرے اندر تحریک پیدا کی کہ میں اپنے وجود کو ہلا جلا کر دیکھوں۔ میں نے پلکوں کو جھپکنا چاہا۔ پٹی کے باعث میری یہ کوشش بارآور نہ ہو سکی اور میں آنکھیں میچا کر رہ گیا تاہم یہ اندازہ ہو گیا کہ میں آنکھوں کو حرکت دے سکتا ہوں۔ یہی تجربہ میں نے ناک کے ساتھ کیا اور کامیاب رہا۔ اگلا نمبر گردن کا تھا اس کوشش میں بھی مجھے مایوسی نہ ہوئی۔ میری جدوجہد بازوؤں تک پہنچ گئی اور میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کسی آہنی کرسی کے ہتھوں پر' چرمی ڈوریوں کی مدد سے کس کر بندھے ہوئے پایا۔ لامحالہ میرا دھیان نچلے دھڑ کی جانب چلا گیا اور اسی وقت مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

میرے دھیان کی پرواز ناف پر جا کر رک گئی تھی جیسے اس کے پر پھڑپھڑانا بھول گئے ہوں۔ اس پرواز کے راستے میں کوئی نادیدہ رکاوٹ کھڑی کر دی گئی تھی۔ میں زیریں بدن کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ میرا نچلا دھڑ کسی خاص دوا' انجکشن یا پھر کسی بھی سائنسی طریقے سے مفلوج کر دیا گیا تھا۔ میں ہاتھوں کی بندشوں اور آہنی ہتھوں سے یہ تو سمجھ رہا تھا کہ اس وقت میں کسی کرسی پر بیٹھا ہوں لیکن بیٹھنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یہی کیفیت میری ٹانگوں اور پاؤں کی بھی تھی۔

اس واہیات نوعیت کی صورتِ حالات نے مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور میرا ذہن تیزی سے پیش آمدہ واقعات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی وقت ایک نامانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ بولنے والے نے انگلش زبان کا سہارا لیا تھا اور لب و لہجہ خالصتاً امریکی تھا۔ مذکورہ شخص نے مجھے میرے نام سے مخاطب کیا تھا۔

''وجدان! ایسی ویسی سوچوں سے اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔ ابھی تمہیں ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنا ہے۔''

میں نے چونک کر بولنے والے کی سمت دیکھا۔ اس دیکھنے کا واضح مطلب یہی ہے کہ میں نے اس سیاہ دبیز پٹی کے عقب سے آواز کی جانب توجہ مرکوز کر دی۔ باقاعدہ دیکھنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ شخص مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود تھا اور اس کے ایکسنٹ نے مجھے بتا دیا کہ اس وقت میں امریکیوں میں تھا' کم از کم ایک امریکی کے ساتھ!

میں نے بھی جواباً انگریزی ہی میں پوچھا ''تم کون ہو؟''

''تمہارے میزبان!'' مجھے بتایا گیا۔

''میں اس وقت کہاں ہوں؟''

''یو۔ ایس۔ اے میں۔''

''یو ایس اے میں!'' میں گڑبڑا کر رہ گیا ''امریکا میں کہاں...... کس علاقے میں' کس اسٹیٹ میں؟'' بے اختیار میری زبان سے متعدد سوالات پھسل گئے۔

ان سوالات کے اختتام پر اس شخص کی پُرمعنی اور طنز سے لبریز ہنسی میری سماعت تک پہنچی۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ اسی لمحے اس شخص نے میرے سوالات کے جواب میں کہا۔

''تم اس وقت پاکستان میں ہو۔''

''مگر تم نے تو بتایا ہے' میں امریکا......''

''ایک ہی بات ہے۔'' وہ میری بات کو قطع کرتے ہوئے بڑے مغرورانہ انداز میں ہنسا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا ''بکواس بند کرو۔ تم لوگوں کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوسکے گا۔ پاکستان ایک آزاد مملکت ہے اور ہمیشہ آزاد ہی رہے گا' اپنی ایک جداگانہ شناخت کے ساتھ۔ تم چاہے کتنی بھی کوشش کر لو' اس آزاد ریاست کو اپنی اسٹیٹس میں شامل نہیں کر سکتے۔ تمہارے منہ میں خاک!''

میں جب سے پاکستان میں تھا' اکثر سیاسی جگادریوں کو نجی محفلوں میں یہ پیش گوئی کرتے سنا تھا کہ عنقریب پاکستان' امریکا کی ریاستوں میں شامل ہو جائے گا۔ بعض' اندر کی خبر رکھنے والے ماہرین کا فتویٰ صرف کراچی تک محدود تھا۔ ان کے خیال میں امریکا بہادر پورے پاکستان میں نہیں بلکہ صرف کراچی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے کبھی سنجیدگی سے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا۔ بادی النظر میں مجھے یہ کسی سیاسی

پروپیگنڈا اسے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اکثر سیاستداں عوام کی سوچ کا رخ تبدیل کرنے کے لیے اس قسم کے ایشوز سامنے لاتے رہتے ہیں۔

یہ تمام خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزرے اور اگلے ہی لمحے اس ''نادیدہ'' امریکی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے لہجے میں بڑا ٹھہراؤ اور استحکام تھا۔

''جذباتی تقریر بہت اچھی کر لیتے ہو مگر ہمیں تمہاری اس صلاحیت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی امریکا کی کوئی نئی اسٹیٹ ہمارا موضوعِ گفتگو ہے۔''

ہمارے درمیان وہ تمام تر گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔

میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ''پھر مجھے یہاں کیوں پابند کیا گیا ہے۔ تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ میرے نچلے دھڑ کو تم لوگوں نے حرکت کے قابل کیوں نہیں چھوڑا؟''

''کیا سارے پاکستانی ایک سانس میں اتنے ہی سوال پوچھتے ہیں؟''

''تمہارا تجربہ کیا ہے؟'' میں نے ترکی بہ ترکی پوچھا۔

''میں نے اس قوم کو بہت ہی جذباتی اور پرجوش پایا ہے۔'' وہ زہریلے انداز میں گویا ہوا ''یہ جوش میں بہت جلد ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ انہیں شکار کرنا قدرے آسان ہے۔''

پتا نہیں' وہ اپنا تجربہ بیان کرنے میں کس قدر راست گوئی سے کام لے رہا تھا۔ اس وقت مجھے تو یوں محسوس ہوا وہ ساری باتیں مجھے سلگانے کے لیے کر رہا ہو۔ پاکستانیوں کی برائی کھول کر وہ نفسیاتی طور پر مجھے ٹارچر کرنا چاہتا ہو۔

میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا ''ہم ایک زندہ قوم ہیں۔ ہر زندہ قوم میں جوش اور جذبہ تو ضرور پایا جاتا ہے...... اور جہاں تک شکار کرنے کی بات ہے تو تم لوگوں کو اس محاذ پر بری طرح شکست ہوگی۔ ایسے خوش آئند خواب دیکھنا چھوڑ دو۔''

''ہم اپنی مرضی کے خواب دیکھنے پر قدرت رکھتے ہیں اور ان خوابوں کی تعبیریں پہلے سے رقم کر لیتے ہیں۔'' وہ رعونیت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی تعلی پر لعنت بھیجی اور اپنے مقصد کی طرف آ گیا ''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا مسٹر......؟''

میں نے ''مسٹر'' کے بعد دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے چال تھی۔ ایسے مواقع پر عموماً سامنے والا اپنا نام بتا دیا کرتا ہے لیکن وہ کائیاں امریکی میری چال میں نہ آیا اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا۔

''تم اس وقت ہماری گرفت میں اس لیے ہو کہ تم پر سنگین الزامات ہیں۔''

''مجھ پر سنگین الزامات؟'' میں ایک مرتبہ پھر بری طرح اچھل پڑا۔

''ہاں تم پر۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''اسی لیے ایک مخصوص انجیکشن کے ذریعے تمہارے نچلے دھڑ کو عارضی مدت کے لیے ناکارہ کیا گیا ہے تاکہ تم کسی قسم کی مہم جوئی کا خیال دل میں نہ لا سکو۔ اس سے پہلے تمہاری ران میں ایک مخصوص گولی اتار کر تمہیں وقتی طور پر مفلوج کیا گیا تھا۔ اس وقت تم صرف سوچنے' سننے اور بولنے کے قابل ہو۔ تم ہماری ضرورت اور مقاصد سے زیادہ کسی قسم کی ذاتی ایفی شینسی کے قابل نہیں ہو۔ اس قسم کے تمام شعبدے ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔''

میں الجھ کر رہ گیا۔ شعیب غوری کے مطابق اس کے یہودی آقاؤں کو ساحل یعنی دھنو کی تلاش تھی جو کسی بیش قیمت خزانے کے راز سے واقف تھی۔ مجھے تو صرف چارے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا تاکہ ساحل کو شکار کیا جا سکے۔ یا پھر میرا قصور یہ تھا کہ میں نے شعیب کی تنظیم سی ایف کے کو خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ شعیب غوری یہودیوں کا آلۂ کار تھا۔ سی ایف کے کو پہنچنے والا نقصان براہِ راست یہودیوں کا نقصان تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ تھی کہ میں سی ایف کے کے پردے میں یہودیوں کی خفیہ سرگرمیوں سے واقف ہو گیا تھا لیکن وہ امریکی جس انداز میں بات کر رہا تھا وہ خاصا سنگین اور تشویش ناک تھا۔

میں نے وضاحت طلب لہجے میں کہا ''تمہارے اس نمک خوار شعیب غوری نے تو مجھے بتایا تھا کہ تم لوگ ساحل کی تلاش میں ہو جو پہلے دھنو ہوا کرتی تھی۔ اب تم مجھ پر سنگین الزامات کا ذکر کر رہے ہو۔ یہ کیا بدمعاشی ہے؟''

''دھنو کا معاملہ الگ ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''اس پر کام امریکا پہنچنے کے بعد شروع کیا جائے گا۔ تم پر تین امریکی افراد کے قتل کا الزام ہے۔ ڈیوڈ' نیل آرمر اور اس کی خوبرو سیکریٹری شیبا۔ نیل آرمر اگرچہ برطانوی شہریت رکھتا ہے لیکن یہودی ہونے کے ناتے وہ ہمارے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جیسا کہ کوئی امریکی شہری! پھر وہ ہمارے سسٹم کا ایک اہم پرزہ بھی تھا۔''

میں اس کی مکاری پر دل ہی دل میں سلگ کر رہ گیا۔ میں نے کہا ''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے تین

یہودیوں کو صفحۂ ہستی سے رخصت کیا ہے' ان کا نام و نشان مٹا دیا ہے؟''

''ثبوت!'' وہ خوں خوار لہجے میں بولا ''میں نے تمہاری کارکردگی کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے اس ہال میں تیار ہونے والی فلم سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا۔ وہ خوں چکاں ریکارڈنگ اب ہمارے پاس محفوظ ہے۔'' اس کی بات وزن سے خالی نہیں تھی لیکن میں بھی ہار ماننے والا نہیں تھا۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہے' نیل آرمر اور شیبا میری فائرنگ سے ہلاک ہوئے لیکن ڈیوڈ کو تم کس طرح میرے کھاتے میں ڈال رہے ہو۔ وہ تو ایک خون ریز مقابلے میں مارا گیا ہے ''ڈیتھ میچ'' میں ہونے والے مقابلے تو زندگی اور موت کی بنیاد پر ہی منعقد کیے جاتے ہیں۔ ایسے کسی مقابلے کے فاتح کو قاتل اور مفتوح کو مقتول تو نہیں کہا جا سکتا۔ اس مقابلے کا نتیجہ اس کے بالعکس بھی سامنے آ سکتا تھا۔ کیا اس صورت میں تم ڈیوڈ کو میرا قاتل ماننے پر تیار ہو جاتے؟''

اس کی طرف خاموشی چھا گئی۔ میرے سوال میں ایک ہزار نیوٹن وزن تھا۔ وہ فوری طور پر لاجواب ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک ٹھوس حقیقت بیان کی تھی جسے جھٹلانا کسی بھی معقول آدمی کے بس میں نہیں تھا۔ تاہم مسلسل خاموش رہنا میرے اس ان دیکھے دشمن کی ناکامیابی ہوتی اس لیے بولنا اس پر لازم تھا۔ وہ بولا تو اس کے انداز میں مخصوص نسلی ڈھٹائی اور سفاکی شامل تھی۔

''وجدان! ڈیوڈ' نیل آرمر اور شیبا کے قتل کی تحقیق اور تفتیش تو امریکا پہنچ کر ہوگی۔ ہمارے بڑے تمہاری تقدیر کا فیصلہ کریں گے۔ فی الحال تو اس سے بھی اہم معاملہ درپیش ہے۔ اس مسئلے کو پاکستان میں رہتے ہی حل ہو جانا چاہیے ورنہ تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''اب کون سا نیا مسئلہ سامنے آ گیا ہے؟'' میں نے بیزاری سے استفسار کیا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''مسئلہ نیا نہیں' پرانا ہے یہ چند روز پہلے کا واقعہ ہے۔ تم نے ہماری ایک نہایت ہی اہم فائل چوری کی تھی۔ ہمیں اس فائل کی تلاش ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو۔ کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟'' میں بھڑک اٹھا۔

وہ بہ دستور سنجیدہ اور سفاک انداز میں بولا ''اس طرح غصہ دکھانے سے بات نہیں بنے گی۔ تم ہمیں بتاؤ گے کہ وہ فائل تم نے کہاں چھپائی ہے۔ فائل والا معاملہ ادھر ہی نمٹ جائے تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔''

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس فائل کا ذکر لے بیٹھا تھا۔ اس کی بہکی بہکی باتوں کے جواب میں' میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا ''تم نہایت ہی گھٹیا مذاق کر رہے ہو۔ میں ایسی کسی فائل کے وجود سے واقف نہیں ہوں۔''

''تم ثبوت جب اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو زبان سے کیے گئے انکار پر شرم سار ہو جاؤ گے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔ ''تم نے ہمارے جس خفیہ اڈے سے وہ فائل چرائی ہے وہاں پر نصف حساس کیمرے نے تمہاری اس چوری کو عکس بند کر لیا ہے جو ایک ٹھوس ثبوت کے طور پر ہمارے قبضے میں ہے۔ جھوٹ بول کر یا اس فائل کے بارے میں زبان نہ کھول کر تم اپنے لیے مصائب کو دعوت دے رہے ہو۔ ایسے مصائب جو اس سے پہلے تمہاری زندگی میں نہیں آئے۔''

اس کی باتیں سن کر مجھے غصہ آنے لگا۔ ایک تو یہی بات میری جھنجلاہٹ کا باعث تھی کہ وہ تو مجھے دیکھ رہا تھا اور میں اندھوں کی طرح اس کے سامنے بیٹھا' اس کی فضول ''ٹیں ٹیں'' سن رہا تھا۔ وہ بے دریغ جھوٹ بول رہا تھا۔ مذکورہ فائل یا متذکرہ کسی خفیہ اڈے سے میرا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ میں اس قدر بیزار بیٹھا تھا کہ اس امریکی کے چٹکی لینا ضروری ہو گیا۔

میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا ''تم لوگوں نے ویسے تو زمین سے آسمان تک ترقی کر لی ہے لیکن فائلوں کے اسی فرسودہ اور دقیانوسی سسٹم میں پھنسے ہوئے ہو۔ یہ کیا تم نے ''فائل فائل'' کی رٹ لگا رکھی ہے؟''

''فائل سے میری مراد کمپیکٹ ڈسک ہے...... یعنی سی ڈی!'' وہ رسانیت سے بولا ''اس سی ڈی میں تمہارے ملک سے متعلق نہایت ہی اہم معلومات ہیں۔ اگرچہ وہ معلومات ہماری مخصوص خفیہ زبان میں ہیں لیکن کوئی ایکسپرٹ اسے ڈی کوڈ کر سکتا ہے۔ تم نے یقیناً وہ سی ڈی کسی ماہر تک پہنچا دی ہوگی۔''

اب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کو میرے بارے میں کوئی بہت بڑی غلط فہمی ہو گئی تھی۔ لیکن کیا غلط فہمی ہوئی تھی' یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ لوگ بلاوجہ اپنا وقت ضائع نہیں کر رہے تھے۔ میں نے چڑ کر کہہ دیا ''اگر تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں تو تم میری تلاشی لے سکتے ہو۔''

''بڑی بچوں والی بات کی ہے تم نے۔'' وہ تحقیر آمیز انداز میں بولا ''تم جب سے ہمارے قبضے میں ہو' ہم مختلف طریقوں سے متعدد بار تمہاری تلاشی لے کر اپنی تسلی کر چکے ہیں۔ تمہاری کھال اور کھال کے ایک ایک بال کی اسکیننگ کی

جا چکی ہے۔ تمہارے وجود کے کسی حصے یا خفیہ گوشے میں وہ سی ڈی موجود نہیں۔ تمہارے چہرے کو بھی مختلف ٹیسٹ سے گزار کر دیکھ لیا۔ تم کسی قسم کے میک اپ میں بھی نہیں ہو۔ باقی فنگر پرنٹس بلڈ گروپ اور ڈی این اے اسپیمن کلیکشن کا کیا ذکر! وہ تو ہم پہلی فرصت میں کر گزرتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بولا "بہر حال ہماری مطلوبہ سی ڈی تمہارے پاس نہیں۔ تمہارے پاس نہیں تو اس کا مطلب یہی ہے' تم نے آگے کہیں پہنچا دی ہے۔ ہمیں بتاؤ' اس وقت وہ سی ڈی کہاں ہے؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ میں اس سی ڈی کے وجود سے آگاہ نہیں تھا مگر پوچھنے والے کی سنجیدگی اور الفاظ کی شدت بتاتی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی حقیقت پنہاں تھی' چاہے کسی بھی روپ میں ہو۔ میں نے اپنا ذہن صاف کرنے کے لیے پوچھ لیا۔

"تم جس اہم سی ڈی کا ذکر کر رہے ہو اس میں کون سا راز تھا؟"

"میں تمہیں اس کے بارے میں بتا چکا ہوں۔"

"تم نے ایک لنگڑی بات بتائی تھی۔ تم نے میرے وطن پاکستان سے متعلق اہم معلومات کا ذکر تو کیا تھا لیکن ان معلومات کی تفصیل یا نوعیت تمہاری زبان سے خارج نہیں ہوئی۔"

میرے سوال کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور سرد لہجے میں بولا "وجدان! ہمارا اپنا ایک طریقہ کار ہے۔ ہم اپنے شکار کو پھانسنے سے پہلے اس کے ساتھ تھوڑی اٹکھیلیاں کرتے ہیں۔ تھوڑی چھیڑ چھاڑ' تھوڑی دل داری۔ اس طرح ہمیں کسی کشٹ میں پڑے بغیر مقصد تک پہنچنے میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ فارمیلٹی پوری ہو چکی۔" وہ چند ثانیت کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

"میں نے تمہارے بہت سے فضول سوالات کے جواب دے دیے۔ اب سیدھی طرح بتا دو وہ سی ڈی تم نے کہاں چھپا رکھی ہے؟"

"میرا جواب اب بھی وہی ہے۔ میں ایسی کسی سی ڈی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر ٹھوس لہجے میں بولا "میں یہ چاہتا تھا کہ وہ سی ڈی خود برآمد کر کے اوپر تک پہنچاؤں۔ اس طرح میرے کریڈٹ پر ایک کارنامہ آ جاتا اور میری ترقی لازمی تھی لیکن تم میری ترقی نہیں ہونے دو گے۔ ٹھیک ہے!"... خفگی آمیز لہجے میں اتنا کہہ کر متوقف ہوا پھر حتمی انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"میں تمہاری چوری کے اس فلمی ثبوت کے ساتھ ہی تمہیں آگے بڑھا دیتا ہوں۔ شرافت کی زبان تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ آگے والے تم سے بہ خوبی نمٹ لیں گے۔ چند منٹ کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ میرے وجود کے بیدار حصے میں کھلبلی مچ گئی۔ دل اور دماغ اسی مذکورہ متحرک حصے میں واقع تھے۔ میرا دماغ نہایت ہی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ پیش آمدہ حالات و واقعات کا کھٹ کھٹ تجزیہ ہو رہا تھا۔ اس وقت میری تمام تر توجہ کا مرکز وہ خفیہ ریکارڈنگ تھی جو کسی خفیہ امریکی اڈے میں کی گئی تھی جس میں مجھے کوئی نہایت ہی اہم سی ڈی چوری کرتے ہوئے عکس بند کیا گیا تھا۔ امریکی اڈے سے اس شخص کی مراد کوئی دفتر وغیرہ ہی ہوگی۔ اس ریکارڈنگ کی موجودی ظاہر کرتی تھی' ایسا کوئی واقعہ پیش تو ضرور آیا ہوگا۔

اچانک میرے ذہن میں نقلی وجدان کا تصور جاگا اور میں اچھل پڑا۔ یہ اچھلنا جسم کے مخصوص حصوں کا محدود حد تک تھا۔ اس وقت میرے جسم کے بیدار حصوں میں ایک سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تک اس بہروپیے کی طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا تھا۔ شاید یہ حالات کے دباؤ کا اثر تھا کہ میں اس کے بارے میں نہ سوچ سکا۔ اس قسم کی حرکت بہ زعم خود میرے پرتو کے لیے چٹکی بجانے کے مترادف تھا۔ وہ پہلے بھی ایسے کئی شعبدے دکھا چکا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ آخری ملاقات میں وہ مجھ سے خاصا مایوس ہوا تھا۔ جب میں نے اس کی پیش کش کو سنجیدگی سے نہ لیا تو وہ خاصا دل شکستہ ہو گیا تھا۔ رخصت کے وقت وہ بڑا غصے میں بھی تھا۔ اگرچہ اس نے واضح طور پر مجھے سنگین نتائج سے متعلق کوئی دھمکی نہیں دی تھی تاہم اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ میں اس کے خلوص کو ٹھکرا کر بہت پچھتاؤں گا! یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم نادر زمان سے نمٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تو کیا اس سی ڈی کی چوری کا سہرا نقلی وجدان کے سر ہی بندھتا تھا؟ اس نے یہ حرکت مجھے پھنسانے کے لیے کی تھی؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس کی جانب سے دشمنی کا آغاز ہو گیا؟

یہ تینوں سوالات ایسے تھے کہ میں چکرا رہ گیا تھا۔ اسی لمحے ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں ابھرا اور وہ یہ کہ آج تک نقلی وجدان نے مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہمیشہ وہ میرے کام ہی آیا تھا۔ آخری ملاقاتوں میں وہ اس بات پر زور دیتا رہا تھا کہ میں جلد از جلد اسے اپنے قابو میں لے آؤں ورنہ بدی کی کوئی قوت اسے اپنا آلۂ کار بنا لے گی۔

وہ زیادہ عرصے تک یوں آزادانہ حالت میں اور غیر جانب دار نہیں رہ سکے گا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ واقعی وہ بدی کی کسی قوت کے قبضے میں چلا گیا ہو؟

یہ سوال بڑا تہلکہ خیز تھا اور اس سے زیادہ خوف ناک بھی۔ بدی کی کوئی قوت اگر نقلی وجدان کی صورت میں میرے سامنے آن کھڑی ہوتی تو میرے لیے ان گنت مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں آنے والے وقت کے تصور سے پریشان ہو گیا۔

"کیا بات ہے وجدان! تم چہرے سے کافی فکر مند دکھائی دینے لگے ہو۔" اسی امریکی لب و لہجے کی حامل آواز نے مجھ سے استفسار کیا "تھوڑی دیر پہلے تو تم..... اس قدر پریشان اور بوکھلائے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے؟"

اس شاطر نے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات سے میری کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"سی ڈی کی چوری والا واقعہ کس دن کا ہے؟"

وہ میری تشویش سے شاید یہی سمجھا ہو کہ میں اسے کوئی اہم بات بتانے جا رہا ہوں۔ اس نے میرے سوال کا مفصل جواب دیا اور میں ایک مرتبہ پھر چونک کر رہ گیا۔ یہ اس دن کے بعد آنے والی رات کا واقعہ تھا جب ہم نے ساؤتھ کے کرتا دھرتا نادر زمان کو ٹھکانے لگایا تھا اور اس مشن کے اختتام پر نقلی وجدان مجھ سے خفا ہو کر چلا گیا تھا۔ اس اعلان کے ساتھ کہ وہ اب کبھی میرے پاس نہیں آئے گا۔ میں اس وقت ساحل کے معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس کی خفگی پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔

یہ حالات و واقعات تو سیدھا سیدھا نقلی وجدان کی طرف ہی اشارہ کر رہے تھے لیکن ظاہر ہے' میں اس امریکی کے سامنے نقلی وجدان کا باب کھول کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک اور زاویے سے کھنگنے کی کوشش کی اور پوچھا۔

"تمہارے اس پٹھو شعیب غوری نے تو کسی خفیہ فائل یا سی ڈی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تم یہ نیا شوشہ کہاں سے اٹھا لائے ہو؟"

"غوری کو ہم نے اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا "وہ بے چارہ اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا جیسا کہ ہم تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے!" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہمارا مشن دھنو کو تلاش کرنا تھا اور اس سلسلے میں شعیب غوری ہماری بھرپور مدد کر رہا تھا۔ پھر دھنو کے حوالے سے تمہارا نام بیچ میں آ گیا۔ شعیب نے مختلف حوالوں سے تمہاری بہت تعریف کی۔" لفظ "تعریف" پر اس نے خاصا زور ڈالا تھا "تمہارا سابق ریکارڈ ہمارے پاس پہنچا تو ہم تمہاری ذات میں بھی دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئے۔ سنگاپور' تھائی لینڈ' نیپال' انڈیا' شمالی چین اور اب پاکستان میں تمہارے کارناموں کی کوئی حد ہے اور نہ ہی حساب۔ ہم ایسے ہر فن مولا اور جینئس افراد کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو ہماری بات ماننے سے انکار کرتا ہے' ہم اس کی کمزوریوں اور مجبوریوں کو ڈھونڈ کر اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر وہ شخص ہمارے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے جیسا کہ تم کرو گے!"

وہ معنی خیز انداز میں بات کو نامکمل چھوڑ کر متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "پھر سی ڈی کی چوری والا واقعہ پیش آ گیا۔" اس نے کلام کے تسلسل میں اچھی خاصی ایڈیٹنگ کر ڈالی تھی "تم نے ہماری ایک نہایت ہی اہم سی ڈی اڑا لی۔ ہم نے غوری کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور تمہیں اپنے دام میں لانے کے لیے سرگرم ہو گئے اور دیکھ لو' اس وقت تم ہمارے رحم و کرم پر ہو!"

میں نے دل ہی دل میں اسے بہت برا بھلا کہا' پھر زبان سے پوچھا "ایک لمحے کے لیے میں تمہیں سچا سمجھ لیتا ہوں۔ سی ڈی کی چوری والے واقعے کو حقیقت مان لیتا ہوں لیکن شعیب غوری کے بنگلے میں تم لوگوں نے جو رویہ اپنایا' وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ تم لوگ اتنے بے پروا کب سے ہو گئے؟"

"تم کس رویے کی بات کر رہے ہو؟" وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں مستفسر ہوا۔

میں نے اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "اس زمین دوز ہال میں جب میں نے پانسا پلٹ دیا تو تم لوگ دم دبا کر فرار کیوں ہو گئے تھے۔ میں کافی دیر تک من مانی کرتا رہا اور تمہارے نمک خواروں سے نمٹ کر جب میں بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچا تو کسی نے میری راہ نہ روکی اور میں بہ سہولت ایک بنگلے سے دوسرے بنگلے میں پہنچ گیا۔ وہ تو میرے ذہن میں اپنی ساتھی عورتوں کا سودا سمایا ہوا تھا اس لیے ان کی تلاش میں' میں دوسرے بنگلے میں داخل ہوا تھا ورنہ میرے فرار میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ موجود نہیں تھی۔ میں اگر چاہتا تو اس بنگلے کی عقبی دیوار پھاند کر وہاں سے رفو چکر ہو سکتا تھا۔"

میں سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اگر میں کسی نہایت ہی اہم سی ڈی کی چوری میں ملوث تھا

تو پھر ان لمحات میں آپ لوگوں نے میری طرف سے ایسی غفلت کیوں برتی؟"

"ہوں!" اس نے ایک طویل سانس کھینچی اور بولا۔ "پہلے تو تم اس غلط فہمی کو دور کرلو کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی تمہاری جانب سے غافل ہوئے ہوں۔ اگر تم اسے بنگلے سے باہر قدم ڈالتے تو تمہیں ہماری چوکسی کا اندازہ ہوجاتا۔ ان دونوں بنگلوں کی خفیہ نگرانی کے لیے ہمارے مستعد آدمی ہمہ تن الرٹ تھے۔ وہ تمہیں فوراً قابو کر لیتے۔"

وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا" اور جہاں تک تم نے ہمارے دم دبا کر بھاگنے کی بات کی ہے تو اس میں ذرا بھی حقیقت شامل نہیں۔ دراصل ان دونوں بنگلوں کو ہر حوالے سے آپس میں مربوط کیا گیا ہے۔ ہم تو شروع ہی سے سفید بنگلے میں موجود تھے اود ہیں ایک کمرے میں بیٹھے ہال میں پیش آنے والے واقعات کو ملاحظہ کررہے تھے۔ تم غوری کی باتوں سے الجھ گئے اور یہی سمجھ بیٹھے کہ ہم بھی تہ خانے والے بنگلے ہی میں کہیں کسی کمرے میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے اعتماد' پلاننگ اور کارکردگی کا نتیجہ ہی ہے کہ اس وقت تم پوری طرح ہمارے قبضے میں ہو!"

وہ اپنی بات مکمل کر چکا تو میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی وضاحت میں اچھا خاصا وزن تھا۔ میں نے دیگر امور پر لعنت بھیجتے ہوئے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

"ساحل اور صدف کہاں ہیں؟"

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیتے ہوئے بولا "صدف کو ہوش میں لانے کے بعد ہم نے اس کا طویل انٹرویو کیا تھا' پھر آئندہ چند گھنٹوں میں اس کے بیان کی تصدیق بھی کرلی۔ وہ ہمارے لیے ایک غیر متعلق لڑکی ہے 'البتہ تم سے انتہائی متعلق ہے!" اس کا انداز بڑا معنی خیز تھا" تمہارا اور صدف کا تعلق ہمارا مسئلہ نہیں۔ وہ اگر تمہاری ذات میں انٹرسٹیڈ ہے تو اب تمہاری یاد میں آنسو ہی بہا سکتی ہے۔ وہ کبھی تم تک نہیں پہنچ سکے گی۔ پہنچے گی تو وہ اس صورت نا، اگر اسے معلوم ہوگا کہ تم کہاں ہو۔ اس کی قسمت میں تمہیں یاد کرنا ہی رہ گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں اپنی جان نثار ساتھی کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر تڑپ اٹھا" تم لوگوں نے صدف کے ساتھ کیا کیا ہے؟"

"ابھی تک تو کچھ بھی نہیں کیا۔" وہ مکاری سے بولا۔ "لیکن اگر تم نے سی ڈی کے بارے میں زبان نہ کھولی تو اس لڑکی کے ساتھ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"صدف اس وقت کہاں ہے؟" اس کے عزائم سے مجھے کسی گہری سازش کی بو آرہی تھی۔

اس نے بتایا" ہم اسے غوری کے پاس چھوڑے جارہے ہیں۔ وہ یرغمال کے طور پر غوری کی تحویل میں رہے گی جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ ہمارے قبضے میں رہے گی۔ ہم جس وقت چاہیں گے' اس کا پتا صاف کردیں گے۔" وہ صدف کی زندگی کے خاتمے کی بات بڑی بے رحمی سے کررہا تھا" اگر تم ہمیں سی ڈی تک پہنچا دیتے ہو تو تمہاری ساتھی صدف کو چھوڑ دیا جائے گا۔ بہ صورتِ دیگر اس کے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کی سنگینی کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"یہ تو سراسر بزدلی ہے تم لوگوں کی۔" میں نے ایک چوٹ کی۔

"یہ ہمارے کام کا طریقہ کار ہے۔"

"یہ بہت ہی شرم ناک اور گھٹیا طریقہ کار ہے۔"

اس نے میری ترش کلامی کا برا نہ منایا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا" تم نے تین اہم یہودیوں کو قتل کیا ہے اس لیے فوری طور پر تمہارا امریکا پہنچایا جانا ضروری ہے۔ ہم چاہتے تو تمہارے ملک میں بھی تم پر مقدمے بازی کی جاسکتی تھی لیکن یہاں پر تمہارے "سلپ" ہونے کے امکانات موجود ہیں اسی لیے ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر جارہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر تمہیں قرار واقعی سزا دی جائے گی مگر۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا" لیکن اگر تم اپنی ضد سے باز نہ آئے تو پھر صدف پر جو بیتے گی اسے تم دیکھنے سے بھی محروم رہو گے۔ اگر کسی طرح اس کا قصہ تم تک پہنچ بھی گیا تو سن کر تم بہرے ہوجاؤ گے۔ سمجھ رہے ہونا' میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

اس کا انداز دھمکی سے لبریز تھا۔ میں جانتا تھا' وہ بہت طاقتور لوگ تھے۔ تقریباً دنیا کے ہر ملک میں انہیں آسانیاں میسر تھیں..... وہ اپنے الفاظ کو عملی جامہ پہنانے میں آزاد اور خود مختار تھے۔ صدف کے ان کی کسٹڈی میں ہونے نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ اگر وہ مجھ میں دلچسپی نہ لیتی تو آج اس حال کو نہ پہنچتی۔ اس کو پیش آنے والے ان غدار لمحات کا ذمے دار میں ہی تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے دل میں بہت ندامت محسوس ہوئی۔ کاش! مجھے اس منحوس سی ڈی کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا تو میں پہلی فرصت میں یہ معلومات اس شیطان امریکی کے سامنے کھول کر اپنی صدف کو ایک بہت بڑے عذاب سے بچالیتا!

میں ان لمحات میں خاصا جذباتی ہورہا تھا۔ حالانکہ یہ

بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر میں اپنے ہاتھ سے وہ سی ڈی ان لوگوں کے حوالے کردوں تو بھی وہ صدف کو چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ان کی کینہ پروری' سفاکی اور بربریت میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس وقت میں صدف کے لیے اپنے دل میں بہت درد محسوس کررہا تھا۔ شاید یہ اس محبت کا اثر تھا جو وہ مجھ سے کرتی تھی۔ میں صدف کے دلی جذبات کو سمجھتا تھا اور تہ دل سے ان کی قدر بھی کرتا تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز اور چونکا دینے والی لڑکی تھی۔ نقلی وجدان کی ایک ممکنہ کارستانی نے اسے ایک بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا تھا!

میں صدف اور نقلی وجدان کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس شخص کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی" تم کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔ کیا کوئی فیصلہ کرنے میں تمہیں کسی قسم کی دشواری پیش آرہی ہے؟"

"تم میری دشواری اور آسانی کے چکر میں نہ پڑو۔" میں نے درشتی سے کہا" ساحل کے بارے میں بتاؤ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"تم غالباً دھنو کا پوچھ رہے ہو!"

"غالباً نہیں یقیناً!" میں نے قطعیت سے کہا۔

وہ بتانے لگا" دھنو کا معاملہ تم سے الگ ہے۔ اس لیے اسے تم سے الگ ہی ایک محفوظ جگہ رکھا گیا ہے۔"

"یہ تم ایک نئی بات کررہے ہو!" میں نے بگڑ کر کہا۔

"تمہارے لیے نئی ہوگی ورنہ......" اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا' وہ میری مرضی کے مطابق کچھ اگل کر نہیں دے گا پھر بھی اپنے ذہن کی خلش دور کرنے کے لیے میں نے اس سے دو چار سوالات کر ہی ڈالے اگرچہ مجھے امید نہیں تھی کہ ان کے درست جواب مجھے ملیں گے۔ میں نے اسے اور اس کے بڑوں کو ناپنے کی خاطر پوچھا۔

"کیا تم لوگوں کا تعلق امریکی سی آئی اے سے ہے؟"

"نہیں۔" وہ بڑی شرافت سے انکار کر بیٹھا۔

میں نے پوچھا" پھر تم لوگ ایف بی آئی سے متعلق ہوگے؟"

"ہرگز نہیں۔" اب اس کے انکار میں زیادہ شدت شامل تھی۔

میں جانتا تھا سی آئی اے اور ایف بی آئی کا۔۔ دائرۂ کار کہاں سے کہاں تک تھا۔ میں نے وہ سوالات محض اسے مطمئن کرنے کے لیے کیے تھے تا کہ وہ میری کم علمی پر دل ہی دل میں خوش ہوجائے۔ اس کے مسلسل انکار سے میں چڑ گیا اور دریافت کیا۔

"پھر آخر تم لوگ ہو کون؟"

"ہم یہودی ہیں اور یہودیوں کی ایک اہم تنظیم کے ادنیٰ رکن ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا" باقی تفصیل تمہیں ہمارے بڑے بتائیں گے۔ اب ہمارے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔"

"ہم اس وقت کہاں پر ہیں؟" اس نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا" مسٹر وجدان! خلافِ معمول تم سے بہت باتیں ہوگئیں۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو ہمیں یہ اطمینان تھا کہ تم مکمل طور پر ہماری دسترس میں ہو' کسی قسم کی کوئی گڑبڑ پھیلانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یہ باتیں تمہیں بعد میں بھی بتا ہی دی جاتیں اس لیے وقت گزاری کے لیے میں نے انہیں موضوع بنالیا کیونکہ ہماری پرواز میں کچھ وقت باقی تھا۔" وہ اتنا کہہ کر متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"دوسری وجہ یہ تھی کہ میں چاہتا تھا' سی ڈی والا معاملہ یہیں نمٹ جاتا تو اچھا تھا۔ اس طرح میری ترقی کا امکان نکل آتا اور تمہاری ساتھی صدف کی جان چھوٹ جاتی لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم ہمارے ساتھ ساتھ اپنی ساتھی کے بھی دشمن ہو۔ اگر تمہیں صدف کے بارے میں ذرا سی بھی تشویش ہوتی' تمہارے دل میں اس کے لیے ہمدردی پائی جاتی تو تم فوراً وہ سی ڈی ہمارے حوالے کردیتے۔"

وہ اب جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لے رہا تھا لیکن افسوس کہ میں اس لعنتی کمپیکٹ ڈسک کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس کی وضاحت کو ملیا میٹ کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس وقت میں کہاں ہوں؟"

"یو۔ ایس ائربیس پر۔" اس نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

"اوہ!" میرے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز خارج ہوئی۔

اس نے اسی بے مہر انداز میں کہا" اگر تمہیں حالات کی سنگینی اور موقع کی نزاکت کا احساس ہوگیا ہو تو اب بھی اس خفیہ سی ڈی کے بارے میں بتادو۔ میں تمہیں آخری چانس دے رہا ہوں۔"

"میرے جواب میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا" کیونکہ میں واقعی کسی سی ڈی کے بارے

میں نہیں جانتا۔"

میرے حتمی انکار نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ اس کی سمت خاموشی چھا گئی۔ پھر چند لمحات کے بعد اس خاموشی کو اسی امریکی کی کھردری آواز نے توڑا۔ وہ سرد مہری سے بولا۔

"ٹھیک ہے!"

میں نہیں جانتا' یہ مختصر سا جملہ اس نے کس سے مخاطب ہو کر ادا کیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے عقب میں زندگی کے آثار محسوس ہوئے۔ کوئی پہلے سے وہاں موجود تھا یا اس شخص کا اشارہ پا کر وہاں پہنچا تھا' میں اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ آنکھوں پر بندھی دبیز سیاہ پٹی نے مجھے خاصا لاچار کر دیا تھا۔ وہاں ہونے والی سرگرمی نے مجھے جلد ہی بتا دیا کہ میرے آس پاس اس شخص کے علاوہ بھی چند افراد موجود تھے جس نے اب تک مجھ سے گفتگو کی تھی۔

میری چھٹی حس نے مجھے مطلع کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے' اس کا اندازہ لگانے کی مجھے مہلت نہ مل سکی کیونکہ اس وقت میں نے اپنے بازو میں کسی انجکشن کی سوئی پیوست ہوتے محسوس کی۔ میرے عقب میں موجود کسی شخص نے پہلو میں آ کر مجھے کوئی سریع الاثر انجکشن دے دیا تھا۔ ایک مخصوص چبھن کے ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے تاریکی کی جانب بڑھنے لگا۔

اس سے قبل کہ میں مکمل تاریکی میں گھر جاتا' میرے ذہن میں موجود کسی روشنی کی ننھی سے کرن نے کام کیا جس کے طفیل میری سماعت ایک مخصوص آواز سننے کے قابل ہوگئی۔ وہ کسی طیارے کے انجن کی آواز تھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میں اس وقت ایک طیارے میں موجود تھا جو پرواز کے لیے پر تول چکا تھا۔ ہم اب تب میں زمین چھوڑنے والے تھے۔

یہ میری زمین تھی' میرا وطن تھا۔ میں نے اس دھرتی پر جنم لیا تھا۔ اس پاک مٹی کا بہت قرض بہت احسان تھا مجھ پر اور آج مجھے اس مٹی سے دور کیا جا رہا تھا اور وہ بھی بہ جبر! اور یہ جبر پہلی مرتبہ نہیں کیا جا رہا تھا...... ماضی بعید میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ پیش آ چکا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسا میری سوچ کے پر نکل آئے ہوں۔ میرا تصور مجھے ماضی میں لے گیا جب میں ننھا منا ایک شیر خوار بچہ تھا۔ میرے والدین مجھے اور خود کو دشمنوں سے بچاتے پھر رہے تھے۔ بالآخر حالات کے جبر نے انہیں اپنی پیاری سرزمین چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا وہ اپنے دشمنوں سے چھپتے چھپاتے لاہور سے کراچی اور کراچی سے سنگاپور چلے گئے تھے اور آج مجھے زبردستی یہاں سے لے جایا جا رہا تھا۔ مجھے بھی بے کس اور بے بس بنا دیا گیا تھا۔ تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ اگرچہ دونوں واقعات کے مخالف کردار مختلف تھے' میرے دشمن الگ الگ تھے لیکن حالات کی ستم ظریفی ایک قدرِ مشترک کے مانند مجھ سے لپٹ کر رہ گئی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر پاکستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تھا مگر بہ اندازِ دگر!

یہ تمام احساسات سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تخلیق تھے۔ روشنی کی وہ ننھی سی کرن کسی راہنما لائٹ ہاؤس کی طرح مجھے ماضی کی جھلک دکھا گئی تھی۔ میں اس لمحاتی روشنی میں بہت دور سے ہو آیا تھا۔ پھر مجھے کچھ خبر نہ رہی۔ اس سریع الاثر انجکشن نے مجھے ہوش و حواس سے بےگانہ کر دیا۔ میں جیسے تاریکی کے کسی گہرے کنوئیں میں جا گرا تھا۔

☆☆☆

طیارہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز تھا!

مجھے ہوش میں آئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو کھلے آسمان کا منظر نگاہ سے ٹکرایا' پھر مخصوص جسمانی احساسات نے مجھے بتایا کہ میں کسی جہاز میں محوِ سفر ہوں...... ہوائی جہاز میں! میری گردن ایک جانب مڑی ہوئی تھی اور میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ میں نے خود کو ایک آرام دہ نشست پر نیم دراز پایا۔ پھر گزرا ہوا ایک ایک واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہونے لگا۔

مجھے شعیب غوری کا وہ بنگلا یاد آیا جس کے ایک زمین دوز ہال میں' میں نے ڈ-تھ کیج کے اندر ڈیوڈ نامی مارشل آرٹسٹ سے ایک خونی مقابلہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہال میں پیش آنے والے خون ریز واقعات اپنی جھلک دکھانے لگے۔ نیل آرمر اور اس کی دل کش سیکریٹری شیبا کی میرے ہاتھوں المناک موت۔ شعیب غوری کا بزدلانہ فرار۔ مسلح گارڈ کی زندگیوں کا خاتمہ اور چینی فائٹر چنگ یو کا عبرتناک انجام...... اور آخر میں میرا زیرِ دام آنا!

ان مکار یہودیوں نے اپنی ریسرچ کا استعمال کر کے مجھے بے بس بنا دیا تھا۔ پھر وہ منظر بھی ابھر آیا جب کسی یو۔ ایس ائربیس پر مجھ سے کڑی پوچھ تاچھ کی گئی تھی۔ اس وقت میری آنکھوں کو ایک دبیز سیاہ پٹی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اب اپنی آنکھوں کو میں نے کھلا ہوا پایا تو شدید حیرت ہوئی۔

اس حیرت نے مجھے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نیم دراز پڑا پڑا اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق میں امریکی سی آئی اے والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا اگرچہ مجھ سے گفتگو کرنے والے نے اس کا اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اگلا اندازہ میرا یہ تھا کہ مجھے ڈی سی (ڈسٹرکٹ آف کولمبیا) پہنچایا جائے گا۔ امریکا سے باہر لوگ اسے واشنگٹن ڈی سی کہتے ہیں جو یو۔ ایس۔ اے کا دارالحکومت بھی ہے لیکن مقامی لوگ صرف "ڈی سی" کہنا ہی کافی سمجھتے ہیں۔ مجھ پر سنگین الزامات عائد کیے گئے تھے ان کی تفتیش ڈی سی ہی میں ممکن تھی کیونکہ ایف بی آئی والوں کا ہیڈ کوارٹر وہیں پر تھا جہاں ڈی این اے ٹیسٹنگ لیبارٹری بھی موجود تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ہمیں پرواز کرتے ہوئے کتنا وقت گزر چکا تھا اور اس وقت طیارہ امریکا سے کتنی دور تھا۔ اچانک میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ امریکیوں یا یہودیوں کو ساحل میں بڑھتی ہوئی دلچسپی میرے لیے اچنبھک تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا' وہ کسی بیش بہا خزانے کے راز سے واقف ہوگی اور دوسری طرف یہودیوں کی سرگرمی کو بھی فضول چارہ جوئی کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔

ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے طیارے کے اندرونی ماحول کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسی وقت مجھے ایک اور حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ وہ طیارہ نہیں تھا جس میں ایک آہنی کرسی پر مجھے مفلوج کر کے سی ڈی کے بارے میں استفسار کیا گیا تھا۔ اس وقت میں ایک آرام دہ نشست پر موجود تھا۔ بے اختیار میں نے گردن گھما کر دائیں جانب دیکھا...... اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔

مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر' طیارے کے دوسری جانب والی کھڑکی کے ساتھ لگی نشست پر ساحل موجود تھی۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس منظر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا اور بے ساختہ میں اسے پکار بیٹھا۔ میری آواز میں ایک طوفانی بلاخیز شامل ہو گیا تھا۔

"ساحل......!"

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور بہ دستور خاموش نظر سے مجھے تکتی چلی گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں لمحے بھر کی دیر نہ لگی کہ اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ تھی۔ لگتا تھا ہمارے دشمنوں نے ساحل کو بھی عارضی طور پر مفلوج بنا دیا ہو۔ وہ کافی دنوں کے تڑپا دینے والے انتظار کے بعد مجھے دکھائی دی تھی۔ میں اس مکھڑے کو دیکھنے کو ترس گیا تھا۔ وہ نظر بھی آئی تو اس کس مپرسی میں کہ میری پکار پر لبیک بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ ان جذباتی لمحات میں مجھے خود پر اختیار نہ رہا اور بے ساختہ اٹھ کر ساحل کی طرف لپکا۔

لیکن یہ کیا؟ میں اپنی نشست پر ایک بے معنی سی حرکت کر کے رہ گیا۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی مرضی سے اس نشست کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں اس سلسلے میں کسی تعاون کو تیار نہیں تھے۔ میری جنبشی کوشش کے نتیجے میں دونوں ہاتھ پہلوؤں میں ساکت پڑے رہے اور پاؤں بھی اپنی جگہ بے حرکت موجود رہے۔ اس مرتبہ ان ظالموں نے مجھے ہاتھ پاؤں سے مفلوج کر کے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

میں نے دیوانگی کے عالم میں ایک اور کوشش کی لیکن نتیجہ پہلے سے مختلف برآمد نہ ہوا۔ میں دیکھ سکتا تھا' سن سکتا تھا اور بول سکتا تھا مگر اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ کیا بے بسی سی بےبسی تھی۔ میں رات دن ساحل کو دیکھنے کی تمنا کرتا رہا تھا۔ یہ تمنا پوری ہوئی بھی تو ادھوری۔ میں صرف اسے دور سے دیکھ سکتا تھا' اسے چھونے' پیار کرنے اور بانہوں میں بھرنے کی سکت مجھ سے چھین لی گئی تھی...... اور ساحل کو بھی ایسا بنا دیا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے میری جانب پیش قدمی کرنے کے قابل نہیں تھی۔ میں حالات کی بے رحمی اور واقعات کی ستم ظریفی پر کڑھ کر رہ گیا۔

ہاتھ پاؤں انسانی وجود کے نہایت ہی اہم اعضا ہیں جن کے بغیر حرکت بے معنی اور مضحکہ خیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جو کوشش کی تھی وہ بڑی مایوس کن ثابت ہوئی تھی اور میں تصور میں اپنا سر پیٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر حسرت بھری نظر سے ساحل کو دیکھا۔ وہ بہ دستور مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے تاثرات نظر نہ آئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ساحل کا سنگی مجسمہ اس نشست پر براجمان کر دیا گیا ہو تاکہ میری دل داری بہ الفاظ دیگر دل آزاری ہوتی رہے۔ شعیب کی زبانی میرے دشمنوں کو بہرحال یہ بات معلوم ہو چکی ہوگی کہ میں اپنے دل میں ساحل کے لیے کس قسم اور کتنی شدت کے جذبات رکھتا ہوں۔ میری یہ دکھتی ہوئی رگ ان ظالموں کے قابو میں آ گئی تھی۔ شعیب غوری اور چوہدری نوازش نے ساحل کو میری مجبوری بنا کر پچھلے کچھ عرصے سے میرا جینا عذاب کر رکھا تھا اور اب یہ نئے دشمن! یہ تو وہ لوگ تھے جن کے اختیار کی کوئی حد تھی اور نہ ہی طاقت کا کوئی حساب' میں بیٹھے بٹھائے ایک خوف ناک جن کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

میں نے ساحل پر سے اپنی توجہ ہٹائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ بند آنکھوں کے پیچھے روشن ہوگئی۔ اس کے چہرے کا ایک خط و خال ابھر کر سامنے آنے لگا۔ یہ وہ صورت تھی جو میری پیاسی' ترسی ہوئی آنکھوں کے لیے ٹھنڈے پانی کے چشمے

سے کم نہیں تھی لیکن ان عذاب لمحوں میں یہ صورت پتھر کی مورت بن کر رہ گئی تھی۔ ہم دونوں کی حالت زار ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ ہم حالات کے مارے ہوئے دڑبے کے پرندے بن کر رہ گئے تھے۔

مجھے اپنی بے بسی پر سخت غصہ آنے لگا۔ اگر میں یہودیوں کے ہتھے نہ چڑھا ہوتا تو ساحل کی رہائی اور واپسی کے لیے اپنی سی کوشش کرسکتا تھا لیکن اب تو میری حیثیت کسی عضوِ معطل جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا' کسی اور کی کیا خاک مدد کرتا۔

اسی لمحے نقلی وجدان میرے تصور میں در آیا۔ وہ بڑے طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ شاید یہ میرے تخیل کا کرشمہ ہو۔ میں اس وقت نقلی وجدان کی حرکت کی وجہ سے خاصا برہم۔ میری اسی لاشعوری اور شعوری ناراضی نے مجھے اس کا طنزیہ چہرہ دکھا دیا ہو۔ بہر حال اس کی سی ڈی کی چوری والی حرکت میری نظر میں ناقابلِ معافی تھی۔ میرے اندازے اور تجربے کے مطابق اگر واقعی ایسی کوئی اہم سی ڈی چوری ہوئی تھی تو پھر چور اس بہروپیے کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے تصور میں اسے بہت کھری کھری سنائیں اور کسی حد تک اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے میرے تصور سے رخصت ہوگیا۔ جیسے مجھے ٹھینگا دکھا کر جا رہا ہو!

اسی لمحے مجھے آنکھیں کھولنا پڑیں کیوں کہ میری سماعت سے وہی منحوس امریکی لب و لہجے والی آواز ٹکرائی تھی۔ اب وہ میری نظر کے سامنے کھڑا تھا۔ دراز قامت' مضبوط بدن کا مالک۔ اس کی آنکھیں نیلی اور ناک طوطے کی چونچ جیسی مخصوص انداز میں جھکی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے چند فٹ کی دوری پر کھڑا تھا اور میرے نام سے مجھے مخاطب کر رہا تھا۔

''مسٹر وجدان! اپنی حفاظتی بیلٹ باندھ لو۔ طیارے کی لینڈنگ میں بہت کم وقت باقی ہے۔''

میں اگرچہ اسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا لیکن آواز کے مخصوص انداز اور اتار چڑھاؤ سے میں نے اسے شناخت کرلیا۔ یو۔ ایس ائر بیس پر کسی طیارے کے اندر ہمارے درمیان طویل گفتگو ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت میں اس شخص کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور اب وہ بہ نفسِ نفیس میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے اس کی گہری نیلی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا۔ وہاں مجھے سرد مہری' سفاکی اور درندگی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ اس کے پتلے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ ایک بھرپور طنز تھا ہماری بے بسی اور لاچاری پر۔ میں نے نفرت سے اسے گھورا اور دھیان دوسری طرف کرلیا۔

وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا ''میں سمجھ رہا ہوں' تم مجھ سے کیوں ناراض ہو۔ دراصل میرے ذہن میں نہیں رہا تھا۔''

وہ بالکل میرے نزدیک آگیا اور میرے اوپر جھکتے ہوئے خاصی بلند سرگوشی کی ''میں بھول گیا تھا کہ تم سیفٹی بیلٹ باندھنے کے قابل نہیں ہو۔ یہ کام تو مجھے ہی کرنا ہوگا۔''

میں خاموشی سے اس کے ہاتھوں کی کارروائی دیکھتا رہا۔ مجھ سے فارغ ہونے کے بعد وہ ساحل والی نشست کی جانب بڑھ گیا اور اس کی سیفٹی بیلٹ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

وہ کسی طوطے کی نسل' کم بخت انسانی نفسیات کا ماہر بھی لگتا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ میرے اور ساحل کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ہم ایشیائی اور خاص طور پر انڈو پاک کے لوگ اپنی محبت کے معاملے میں کس قدر جذباتی اور حساس ہوتے ہیں۔ وہ میرے احساس کو گھائل کرنے اور جذبات کو مجروح کرنے کے لیے 'بیلٹ باندھنے کے دوران میں ایک طرح سے ساحل پر ڈھے سا گیا تھا۔ یہ اس کا ایک دانستہ فعل تھا۔

اس کی اس شیطانی حرکت سے میرا خون کھول کر رہ گیا لیکن میں اس کے خلاف کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہٰذا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مجھے وہ خون کے گھونٹ پینا پڑے۔ بعض اوقات انسان حد درجہ مجبور اور لاچار ہو جاتا ہے۔

وہ بدبخت اپنی کارروائی سے فارغ ہوا تو ایک مرتبہ پھر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں وہی سنگینی اور ہونٹوں پر وہی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے مخاطب کیا اور سرسراتے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''تم دونوں اس قابل تو نہیں ہو کہ کسی قسم کی مہم جوئی کا خیال دل میں لاسکو لیکن میں احتیاطاً پھر بھی تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اپنی جان کا دشمن بننے والی کوئی بھی حرکت نہ کرنا۔ نہ دیکھتے ہوئے بھی بہت سی آنکھیں تم دونوں کو دیکھ رہی ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا!''

میں نے زہر خند لہجے میں کہا ''میں صرف یہ سمجھ رہا ہوں کہ تمام تر ترقی کے باوجود بھی تم لوگوں میں اعتماد کا فقدان ہے۔ جب تمہیں یقین ہے کہ ہم اپنی مرضی سے حرکت نہیں کرسکتے تو پھر تمہاری یہ وارننگ کیا معنی رکھتی ہے؟''

اس نے برا سا منہ بنایا اور کندھے اچکاتے ہوئے

''اِٹس اوکے!''

''بس لاجواب ہوگئے؟'' میں نے ایک اور چوٹ کی۔

وہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے سرسری انداز ...بولا ''میں پائلٹ روم میں جا رہا ہوں۔ لینڈنگ کے بعد تم ...ں سے ملاقات ہوگی۔ ٹیک کیئر۔''

میرے محتاط اندازے کے مطابق اس طیارے کو ڈی سی ...کسی بھی ظاہرہ یا خفیہ ائرپورٹ پر اترنا چاہیے تھا لیکن میں ...جاتے جاتے اس دراز قامت یہودی کے چٹکی لینا ضروری ...تھا۔

''یہ تو بتاتے جاؤ۔'' میں نے کہا ''ہم کہاں لینڈنگ ...رنے والے ہیں؟''

''اینکوریج کے خوب صورت ائرپورٹ پر۔'' اس نے ...بتایا۔

''اینکوریج!'' میں بڑبڑایا ''یہ نام پہلے سننے میں نہیں ...آیا۔''

وہ فخریہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ...کوریج' الاسکا کا ایک حسین شہر ہے۔ دیکھو گے تو طبیعت خوش ...ہوجائے گی۔''

''الاسکا؟'' میں بساط بھر اچھل کر رہ گیا۔

''ہاں' ہم الاسکا کی زمین پر لینڈنگ کرنے جا رہے ہیں۔''

میں چکرا کر رہ گیا۔ اگر وہ بدمعاش کسی غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا تو پھر میرے تمام تر اندازے غلط ہوگئے تھے۔ الاسکا کے بارے میں تو میں خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ یو۔ ایس۔ اے کی اس ریاست کے حوالے سے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی اسٹیٹ تھی ...... اور اس رقبے کا بڑا حصہ برفانی تودوں اور برف کے پہاڑوں سے اٹا ہوا تھا۔ میں نے بے ساختہ آنکھیں بند کرلیں۔ اسی وقت میں نے اس شاطر یہودی کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔

میں نے الاسکا کا تصور کیا اور ایک وسیع و عریض برف زار تاحدِ نگاہ پھیلتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے میرا احساس کپکپا کر رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی اس برف زار کا حصہ بنتا جا رہا ہوں۔

پتا نہیں' اس موقع پر تقدیر ہم سے کون سا مذاق کرنے جا رہی تھی!

الف لیلہ ڈائجسٹ کے
دلچسپ ترین سلسلے، کتابی شکل میں

شیخ کرامت کی سرگزشت جو اس نے بسترِ مرگ پر بیان کی
ہمزاد (مکمل)
قیمت 60 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
- ایک پراسرار شخصیت کی کہانی جس کیلئے کوئی بھی کام ناممکن نہیں تھا
- اس شخصیت کا قصہ جس کے چہرے کی عمر 130 سال اور بقیہ جسم کی عمر 25 سال تھی۔
- ہمزاد مسخر کرنے کے طریقے۔

ہر دل عزیز شخصیت صبیحہ بانو کے قلم سے ایک سنسنی خیز سرگزشت
جال (مکمل)
قیمت 60 روپے
ڈاک خرچ 23 روپے
- ایک ایسے انسان کی کہانی جسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔
- جب اس نے آنکھ کھولی تو ایک ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔
- دنیا کی بڑی بڑی تنظیمیں اس کے تعاقب میں تھیں۔
- اس پر نہ کوئی گولی اثر کرتی تھی اور نہ ہی کوئی زہر۔

کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802551-5895313 فیکس: 5802551 — kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کے لئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

تقدیر کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ یہ اپنے انداز میں کھیلتی ہے اور مدِ مقابل کو چاروں خانے چت کر دیتی ہے۔ اس کی حکمتِ عملی کو سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں، شاید اسی لیے کہا جاتا ہے...... تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہے آدمی!

تاہم تقدیر ناانصاف نہیں۔ یہ باتدبیر لوگوں کو پسند کرتی ہے۔ جو لوگ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر نہیں بیٹھ جاتے' اپنے معاملات اور مسائل سے نمٹنے کے لیے کسی نہ کسی تدبیر میں لگے رہتے ہیں' یہ ان سے بہت خوش ہوتی ہے۔ ان کی محنت اور تگ و دو کو سراہتی ہے اور پچھاڑنے کے بعد انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازتی ہے۔ ان کی کوشش کا صلہ ضرور دیتی ہے۔ اسی حوالے سے یہ بھی کہا جاتا ہے...... تدبیر' تقدیر کو بدل دیتی ہے۔

سب سمجھ کا ہیر پھیر ہے۔ فطری اصول ہے' آپ محنت کریں تو اس کا ثمر آپ کو ضرور ملے گا مگر محنت کی تکمیل کے بعد کام کر چکنے پر۔ گویا تدبیر' تقدیر کو نہیں بدلتی بلکہ تقدیر' تدبیر کا بدلہ دیتی ہے! آپ کی محنت بار پاتی ہے' کوشش رنگ لاتی ہے اور آپ کامران ٹھہرتے ہیں۔

ہم دونوں اس وقت تقدیر کے رحم و کرم پر تھے۔ پتا نہیں، یہ ہمیں کون سا روپ دکھانے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔ ہمیں اس تقدیر کو بدلنا تھا کوئی ایسی سعی کرنا تھی کہ حالات مکمل طور پر ہمارے قابو میں آ جاتے۔ میرا ذہن تیزی سے کسی تدبیر کے بارے میں سوچنے لگا۔

یہ سچ ہے اور میرا ایمان بھی ہے کہ قدرت انسان کو اس کی بساط اور برداشت کے مطابق آزماتی ہے۔ کسی بھی شخص کو ایسے امتحان سے نہیں گزارا جاتا جس کے سلیبس سے وہ ناآشنا ہو' یہ الگ بات ہے، اس نے سلیبس پر توجہ دینے کی ضرورت نہ محسوس کی ہو۔ میں نے بڑی کٹھن اور عملی زندگی گزاری ہے۔ آنکھ کھولتے ہی زندگی کے ہنگاموں سے آشنا ہو گیا تھا اور حالات یہی بتاتے تھے، آنکھ بند ہونے تک مارا ماری کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ گویا میرا تو وہ معاملہ تھا...... مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔

میرا ذہن جدید ترین کمپیوٹر سے بھی زیادہ فعالیت دکھا رہا تھا لیکن ہاتھ پاؤں گویا برف کی سل بن چکے تھے۔ وہ میرے دماغ کے تابع نہیں رہے تھے۔ دماغی احکام کو ان تک پہنچانے والے مخصوص اعصاب کو کسی زود اثر اور حیرت انگیز دوا کے ذریعے مفلوج بنا دیا گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا' وہ مجھ سے روٹھ گئے ہوں۔ میں ہاتھ پاؤں کا نہیں رہا تھا۔ ہمارا جہاز ابھی الاسکا کے عظیم الشان برف زار میں نہیں اترا تھا لیکن اس سے پہلے ہی عیار یہودیوں نے ہمارے اجسام میں برف زار اتار دیا تھا۔

میں اپنی بے بسی پر جھنجلا کر رہ گیا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ انسان اپنی مرضی سے ہاتھ پاؤں کو حرکت بھی نہ دے سکے۔ اگر انسان ''کچھ'' ہوتا ہے تو ایسی صورتِ حال میں اسے اتنی ہی زیادہ بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ میں ایک عام اور سیدھا سادہ انسان نہیں تھا جو لگی بندھی زندگی کا عادی ہوتا ہے۔ اس کے شام و سحر اور دن رات کا معمول متعین ہوتا ہے، اس کی لائف میں کوئی اپ سیٹ نہیں ہوتا۔ وہ ایک مخصوص سیٹ اپ میں سانس لے رہا ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ زندگی کو نہیں گزار رہا ہوتا بلکہ زندگی اسے گزار رہی ہوتی ہے۔

جب کہ میں زندگی کو گزار رہا تھا۔ میرے صبح و شام کا کچھ ٹھیک نہیں تھا' میرے حالات میں ہر لمحے ایک نئی کروٹ انگڑائی لیتی تھی اور مجھے کسی نئی راہ پر دھکیل دیتی۔ قدم قدم پر ہنگامے طوفانی بگولوں کے مانند چکراتے نظر آتے۔ وہ مجھے اپنے حصار میں لینے کی کوشش کرتے لیکن میں ہر حصار کو توڑتا ہر بگولے کو چیرتا اور ہر طوفان کو روندتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے عملی اور ہنگامہ خیز زندگی میں اتنی راہیں، اتنی گزرگاہیں دیکھی تھیں کہ کوئی راستہ کوئی سمت میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں نے زندگی کا ہر مکروہ اور خوبصورت پہلو دیکھ لیا تھا لیکن......!

''لیکن'' پر آ کر میری سوچ کو ایک جھٹکا لگا اور بے بسی کے احساس نے ایک مرتبہ پھر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ میں زندگی میں اتنا مجبور آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بے ساختہ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ طوطے کی اولاد منحوس امریکی مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز تو میں نے بند آنکھوں کے پیچھے ہی سن لی تھی۔ بے اختیار میں نے دائیں جانب گردن موڑلی۔ میری نگاہ ساحل پر جا کر ٹک گئی۔ وہ یک ٹک مجھے ہی تکے جا رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر کوئی تاثر کوئی جذبہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے نہ دیکھ رہی ہو' میرے پار کہیں بہت دور خلا میں گھور رہی ہو۔

میرے دل سے ایک موہوم سی ٹیس اٹھی اور میرے تن بدن کو ایک اذیت میں مبتلا کر گئی۔ ساحل کو پانے کے لیے میں نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے' اپنے دشمنوں کی کتنی لاشیں گرائی تھیں میں نے۔ بدلے میں میرے پیاروں کا بھی ناقابلِ تلافی زیاں ہوا تھا۔ آگ اور خون کے کھیل کا یہی دستور ہے۔ یہ جہنم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دونوں جانب سے

[ایند]ھن کھاتا ہے۔ جیسے آگ سوکھی لکڑی کو چاٹ جاتی ہے [ایس]ے ہی یہ انسانی زندگیوں کو چاٹ جاتا ہے۔ ایک سنگین [ا]تفاق نے مجھے میری ساحل سے ملایا بھی تھا تو بڑے لاچار [حال]ات میں۔ بس ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے اور یہ دیکھنے [وا]لا معاملہ بھی شاید میری ہی حد تک تھا' ساحل کے بارے میں [می]ں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ چینی کی مورت' پتھر کی [م]ورت بن کر رہ گئی تھی۔

پیاسے کو اگر کسی کنوئیں کی منڈیر پر بٹھا دیا جائے اور [پھر] اس کے ہاتھ سے ڈول چھین لیا جائے تو اس کی بے بسی [او]ر کس مپرسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ [ا]یسا ہی معاملہ تھا۔ میں ساحل کے انتہائی قریب تھا مگر ایسی [قر]بت اور ہم نشینی کس کام کی کہ میں اسے چھو نہیں سکتا تھا' اپنے [جذب]ات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اور اسے عملاً بتا نہیں سکتا تھا کہ [می]ں نے اس کی جدائی میں، یہ دن و رات کس کرب میں [گز]ارے ہیں۔ میری آنکھوں میں کتنی تھکن، کتنی دکھن ہے۔ [می]رے ذہن میں کتنا اضطراب' کتنا عذاب ہے۔ میرے دل [می]ں کیا کیا ارمان ہیں' جذبات کے اظہار کے کیا کیا پلان [ت]ھا' کچھ نہیں' میں کچھ نہیں کر سکتا تھا...... کچھ بھی تو نہیں! میں [ن]ے اپنے دھیان کا رخ موڑا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ [جہا]ز اب نیچی پرواز کر رہا تھا' اتنی نیچی کہ نیچے کا منظر آنکھوں [میں] کھل گیا تھا۔ میں نے تاحدِ نگاہ ایک وسیع و عریض سفید چادر [پ]ھیلے ہوئے دیکھا۔ یہ سفید چادر درحقیقت وہ برف زار تھا [جس] کا تصور الاسکا کے تصور کے ساتھ نتھی تھا۔ میں ایک [جھر]جھری لے کر رہ گیا۔ یہ جھرجھری صرف میرے جسم کے [بیرونی] حصوں تک محدود تھی۔ ذہن میں ایک خوف ناک خیال [ابھ]ر ابھارا۔ کیا ہمیں اس برف زاد زمین پر پھینکا جا رہا تھا؟

[میں] نے امریکا کے بارے میں سنا ہی سنا تھا۔ آج پہلی [بار] اس بے بسی کی حالت میں اس کی کسی اسٹیٹ پر قدم [رکھن]ے جا رہا تھا۔ میں وہاں کے کسی مقام کے بارے میں کچھ [نہیں] جانتا تھا۔ جب دیکھا نہیں تھا تو میری معلومات تھیوری [کی ح]د تک تھیں۔ اب یہ تھیوری تجربے سے گزرنے والی تھی۔ [اس ب]ات کا تعین تو وقت ہی کر سکتا تھا کہ یہ تجربہ خوشگوار ہو گا یا [تلخ] ہلاکت!

ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ میں بتا چکا [ہوں می]ں پہلی بار امریکا میں داخل ہو رہا تھا۔ وہاں کی جگہیں [مقام]ات' عمارات اور سڑکیں میرے لیے نئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ [بعد میں] مجھے ان کے بارے میں سب کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔ [ل]ہٰذا اپنی معلومات کے مطابق میں اس داستانِ حیات میں ہر شے کا ذکر ایسے ہی کروں گا جیسی وہ ہے یا تھی۔ تاکہ یہ اظہار اندھا' گونگا اور بہرا محسوس نہ ہو۔ اپاہج بیان پڑھنے والے کی دلچسپی اور داستان کی خوبصورتی کھو دیتا ہے اور میں اپنی کہانی اور اپنے قارئین کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتا!

جہاز مزید نیچے آیا تو اینکوریج شہر کے آثار واضح ہونے لگے۔ امریکی اپنے ایکسنٹ کے اعتبار سے اسے ''اینکریج'' کہتے ہیں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کھڑکی سے باہر نگاہ جمائے تیزی سے ابھرتے ہوئے اینکریج کے خدوخال کو دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' کسی کشادہ سفید دستر خوان پر مختلف انواع و اقسام کی ڈشیں چن دی گئی ہوں۔ یہ چاروں طرف پھیلی ہوئی سفید برف تھی جس کے سینے پر اینکریج کا شہر نمودار ہو رہا تھا' عمارتیں' پل اور سڑکیں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ میں نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔

مجھے اس حال تک پہنچانے کا سہرا نعلی وجدان کے سر جاتا تھا۔ اب میں گہری سنجیدگی سے ''سی ڈی'' والے معاملے کو اسی کی ذات سے منسوب کر چکا تھا۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کرتا تو سی آئی اے والے اتنی شدومد سے میرے پیچھے نہ پڑتے۔ یہ بھی میرا اندازہ ہی تھا کہ مجھے امریکی سی آئی اے والے اپنے ساتھ لائے تھے ورنہ جس شخص سے اب تک میں گفتگو کرتا آیا تھا' اس نے سی آئی اے اور ایف بی آئی سے اپنی وابستگی سے انکار کیا تھا۔ اس کے انکار میں بھی اب خاصا وزن نظر آنے لگا تھا۔ اگر میں امریکی سی آئی اے کے ہتھے چڑھا ہوتا تو مجھے کہیں اور دھکیلنے کے بجائے سیدھا ڈی سی پہنچایا جاتا۔ ایک امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ یہودی لابی کا چلایا ہوا کوئی اور ہی چکر ہو اور واقعتاً ایف بی آئی یا سی آئی اے والے اس معاملے سے کوئی تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔

ہم اینکریج کی زمین پر اترنے والے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا صورتِ حالات مجھ پر واضح ہونے والی تھی۔ میری تشویش کا باعث نعلی وجدان کی ذات تھی۔ اس نے کوئی نہایت ہی اہم اور خفیہ سی ڈی چرا کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ اب وہ میرا کھلا دشمن ہے...... بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ وہ میرے کسی دشمن کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا ہے' ایک ایسا دشمن جو بدی کا علم بردار ہے اور نیکی کی راہ کھوٹی کرنے پر برسرِ پیکار ہے!

پھر مجھے وہ سہ پہر یاد آنے لگی جب میں منہاس باقر کے بنگلے پر قاضی سلطان' فرید پاشا اور منہاس باقر سے ملا تھا۔ یہ

سب میرے اپنے تھے۔ اتنے اپنے کہ میں انہیں خود سے زیادہ اپنا مخلص اور خیر خواہ سمجھتا تھا' جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ ان لمحات میں میرا دل بہت بوجھل اور ذہن بجھا ہوا تھا۔ میں ہمہ وقت یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ ان ایثار پیشہ اور یار باش لوگوں کو میں آخری بار دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں نے بہت سوچا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ میں ان سے بچھڑنے والا ہوں یا وہ لوگ مجھ سے اور اب...... میرے اس احساس کو حقیقت مل گئی تھی۔ میں ان سے بچھڑ گیا تھا۔ پتا نہیں وقتی طور پر یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

ایسا سوچتے ہوئے میرا دل خون ہونے لگا۔ ان بچھڑنے والوں میں ایک صدف بھی تو تھی۔ اس عجیب لڑکی نے میری خاطر جاں نثاری کی کون کون سی حد عبور نہیں کی تھی۔ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر میری جان بچائی تھی۔ صرف اس لیے کہ وہ مجھے چاہتی تھی۔ اس کی چاہت میں بڑی سچائی تھی' بڑی شدت تھی' بڑی حدت تھی مگر......

میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اس کے آگے میری مجبوری پر پھیلائے میری سوچ کا راستہ روکے کھڑی تھی۔ دیانت داری کی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میں نے اپنے دل میں بڑی ندامت محسوس کی۔ صدف کی محبت جس ردِعمل کی متقاضی تھی، وہ میں نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کی محبت کا استحقاق چھین کر گویا اس کا استحصال کیا تھا!

اسی لمحے میرے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ جہاز کے پہیوں نے غالباً رن وے کو چھولیا تھا۔ میں آنکھیں کھول کر اپنے ماحول میں حاضر ہوگیا۔

☆☆☆

وہ ایک بند اسٹیشن ویگن تھی جس کی کھڑکیوں پر ٹنٹڈ گلاسز کی حکم رانی تھی یعنی ہم ویگن کے باہر کے مناظر تو دیکھ سکتے تھے لیکن باہر والے ویگن کے اندر جھانکنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ یہ اندھے شیشے ان کی بصارت کے سامنے کسی سرخ سگنل کے مانند استادہ تھے۔ ہمیں جہاز سے نکال کر اس ویگن میں سوار کرایا گیا تھا پھر یہ ویگن ایک نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں ہوگئی تھی۔

ہم دونوں کو ویگن کی درمیانی نشست پر بٹھایا گیا تھا۔ عقبی نشست پر دو افراد موجود تھے۔ اسی طرح اگلے حصے میں بھی دو افراد نظر آرہے تھے۔ اسٹیشن ویگن چھے افراد کے ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی جن میں دو صید اور چار صیّاد تھے۔

ہماری حالت' اختیار اور مجبوری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو چھو سکتے تھے اور نہ ہی آگے بڑھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ سکتے تھے۔ زندہ رہنے کے لیے ایک مخصوص حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ویگن کی اندرونی فضا میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔ ویگن کا ائر کنڈیشنر بڑے مناسب انداز میں کام کر رہا تھا ورنہ باہر کے ماحول کو شدید سردی نے اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا تھا۔ رگوں میں خون منجمد کردینے والے ٹمپریچر کے سبب سڑکیں ویران اور عمارتیں سنسان نظر آرہی تھیں۔ مجھے جنوری کے مہینے میں' الاسکا کے اس شہر میں اترنے کا ''شرف'' حاصل ہوا تھا۔ جنوری کو وہاں کی سردی کی پیک تصور کیا جاتا ہے۔ الاسکا کے دور دراز شمالی علاقوں کا تو کیا ذکر یہاں اینکر یج میں ان دنوں درجۂ حرارت منفی چھے سے منفی تیرہ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا تھا' یعنی آٹھ سے اکیس ڈگری فارن ہائٹ۔ ویسے الاسکا کا ریکارڈ درجہ حرارت تیئیس جنوری انیس سو اکہتر عیسوی میں منفی باسٹھ ڈگری سینٹی گریڈ اور ستائیس جون انیس سو پندرہ عیسوی میں اڑتیس ڈگری سینٹی گریڈ نوٹ کیا گیا تھا۔

الاسکا نامی برف کا یہ دیو کسی زمانے میں روس کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ یہ خطہ روس کے لیے بے معنی اور فضول تھا یا یوں سمجھ لیں کہ ان ٹھنڈے خون والوں نے کبھی اپنے اس علاقے کو توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔ جب اپنے کسی شے پر سے توجہ ہٹالیں تو غیر تاکا جھانکی شروع کردیتے ہیں چنانچہ الاسکا پر بھی ایک ''غیر'' کی نگاہ پڑگئی۔ اس شخص نے اس برف زار میں جانے کیا خوبی دیکھی کہ اسے خریدنے پر تیار ہوگیا۔ ولیم ۔ ایچ ۔ سیوارڈ نامی وہ شخص بہت کائیاں اور موقع شناس تھا۔ اس نے اٹھارہ سو سڑسٹھ عیسوی میں روس والوں کو اپنے شیشے میں اتارا اور الاسکا کو صرف سات اعشاریہ دو ملین ڈالرز میں خرید لیا۔ روس والے خوش تھے کہ بیٹھے بٹھائے ایک برفانی طوفان سے جان چھوٹ گئی اور اچھی خاصی رقم بھی ہاتھ آگئی۔ ازاں بعد ان کی یہ خوشی اس وقت پچھتاوے میں بدل گئی جب اسی الاسکا کے برفانی پہاڑوں اور چٹانوں میں مختلف دھاتوں کا سراغ ملا۔ سب سے اہم اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس خطے میں سونے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے تھے۔ یہ دریافت اٹھارہ سو چھیانوے عیسوی میں ہوئی۔ سونے کے ذخائر پر مشتمل یہ علاقہ ''کلون ڈائیک ریجن'' کہلاتا ہے۔ الاسکا نامی اس وسیع و عریض برف خانے کو تین جنوری انیس سو انسٹھ عیسوی میں باقاعدہ امریکا کی ریاستوں میں شامل کیا گیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں اس کا نمبر انچاسواں ہے۔ امریکا کی پچاسویں ریاست ''ہوائی'' ہے جو اکیس

اگست انیس سو انسٹھ عیسوی ہی میں اس اتحاد میں شامل ہوئی۔ الاسکا کا دارالحکومت ''جون آ'' نامی شہر ہے۔ اس کے علاوہ زیادہ آباد شہروں میں اینکر یج' فیئر بینکس' سیوارڈ' ہومر اور ٹاکیٹنا ہیں۔ اینکر یج سب سے بڑا شہر ہے جس کی آبادی لگ بھگ تین لاکھ ہے۔ جو پورے الاسکا کی آبادی کا تقریباً نصف ہے۔ اینکر یج کا رقبہ ایک ہزار' چھے سو ستانوے مربع میل ہے جب کہ مکمل الاسکا چھے لاکھ' چھپن ہزار' چار سو چوبیس مربع میل پر مشتمل ہے جس میں گھنے جنگلات' ہموار اور پہاڑی زمین' برفانی تودے اور پانی کی سطح پر تیرتی میلوں لمبی چوڑی ----- برف ہی کی مضبوط چٹانیں سب شامل ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق امریکا کی اس ریاست میں بسنے والے پچھتر اعشاریہ پانچ فی صد سفید فام' چار اعشاریہ ایک فی صد سیاہ فام' پندرہ اعشاریہ چھے فی صد اسکیموز' تین اعشاریہ چھے فی صد ایشیائی اور ایک اعشاریہ دو فی صد دوسرے لوگ شامل ہیں۔

ہمیں اپنے ساتھ لے کر جانے والی وہ اسٹیشن ویگن تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ وہی امریکی یہودی براجمان تھا جو اب تک مجھ سے گفتگو کرتا آیا تھا۔ اس شخص کی شخصیت میں بڑی شدت اور سفاکی پائی جاتی تھی۔ ہمارے عقب والی نشست پر بیٹھے ہوئے دو افراد بھی بالکل خاموش تھے۔ وہ چاروں بظاہر ہماری جانب سے غافل نظر آرہے تھے لیکن میں جانتا تھا وہ ہم پر اس قدر متوجہ تھے کہ خود اپنے آپ سے غافل ہوچکے تھے اسی لیے ویگن کے اندر سناٹے کا راج تھا۔

ائرپورٹ سے نکلنے کے بعد ویگن جلد ہی اسپنارڈ روڈ پر آگئی پھر کچھ فاصلے طے کرلینے کے بعد وہ ''بیسٹ ویسٹرن ہیرٹ اِن'' کے پاس سے بائیں جانب مڑ گئی۔ چند چھوٹی اسٹریٹ میں گردش کرنے کے بعد ہم ایک عظیم الشان عمارت میں داخل ہوگئے۔

طویل اور کشادہ ڈرائیو وے پر کہیں بھی ویگن کو روکا نہیں گیا اور ہمارے سفر کا اختتام ایک بند دروازے پر ہوا۔ وہ کسی گیرج کا دروازہ معلوم ہوتا تھا۔ گاڑی کے اندر ہی سے کوئی میکانزم استعمال کیا گیا اور وہ شٹر نما دروازہ اوپر اٹھ گیا۔ قبل ازیں اس عمارت کے مین گیٹ کو بھی ایسے ہی کسی میکانزم سے کھولا گیا تھا۔ ویگن ایک کشادہ ہال میں داخل ہوئی تو ہمارے عقب میں وہ شٹر دوبارہ بند ہوگیا۔

میں اب تک خاموش بیٹھا تھا حالانکہ میری قوتِ گویائی سلامت تھی۔ میں نے جہاز کے اندر اس طوطے کی چونچ والے یہودی سے خاصی تلخ کلامی بھی کی تھی۔ میں اس موقع پر چپ نہ رہ سکا اور اسی شخص سے پوچھ بیٹھا۔ میں نے اظہار کے لیے انگریزی زبان کو وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا!

''کیا ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے؟''

اس دراز قامت چپٹی چڑی والے نے ٹھہری ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی تاہم زبان سے کچھ نہ بولا۔ اس کی نظر میں دنیا جہاں کی سرد مہری سمٹی ہوئی تھی۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا' اب مجھے کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

میں نے اس کے باوجود بھی اتمام حجت جاری رکھا ''کیا ویگن میں بیٹھتے ہی تم گونگے ہوگئے ہو؟'' میرا مخاطب وہی امریکی تھا ''ادھر جہاز میں تو تم نے ''ٹیں ٹیں'' لگا رکھی تھی!''

میرے لہجے سے ہویدا حقارت اور طنز کو وہ خاموشی سے پی گیا اور دروازہ کھول کر ویگن سے اتر گیا۔ باقی تین افراد بھی ویگن سے باہر چلے گئے۔ ایک ہم دونوں ہی ایسے محتاج تھے کہ اپنی مرضی سے جنبش نہیں کرسکتے تھے۔ ساحل کی حالت تو مجھ سے بھی زیادہ گئی گزری تھی۔ مجھے وہ بولنے کی قوت سے بھی محروم نظر آئی۔ پتا نہیں ان ظالموں نے اس کے ساتھ کون سا ہاتھ کیا تھا!

میں حتی الوسع کوشش کرکے اس ہال کا جائزہ لینے لگا جہاں وہ ویگن پہنچ کر رکی تھی۔ ویگن ہال کے وسط میں کھڑی تھی۔ وہ تینوں افراد اور ان کا ڈرائیور تھوڑی دیر تک مختلف کوششوں میں مصروف رہے پھر ویگن کے قریب دو کرسیاں پہنچادی گئیں۔ وہ وہیل چیئرز سے مشابہ کرسیاں تھیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب ہمیں ویگن سے باہر نکالا جانے والا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا اور یکے بعد دیگرے ان لوگوں نے سہارا دے کر ہمیں ویگن سے نکالا اور کرسیوں پر بٹھا دیا۔ طوطے کی چونچ جیسی ناک والا امریکی ڈرائیور کے ساتھ کسی اندرونی کمرے میں غائب ہوگیا جب کہ دوسرے دو افراد ہماری نگرانی کے لیے ہال میں موجود رہے۔ وہ بہ ظاہر غیر مسلح دکھائی دیتے تھے تاہم مجھے یقین تھا' انہوں نے اپنے لباس کے اندر خطرناک ہتھیار ضرور لگا رکھے ہوں گے۔ ویگن کا انجن بہ دستور اسٹارٹ تھا حالانکہ اس ہال میں خوشگوار حرارت موجود تھی۔ میں نے سن رکھا تھا' الاسکا جیسے برفیلے علاقوں میں اگر کھلی جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے رکنے کی ضرورت محسوس ہو تو گاڑی کے انجن کو سوئچ آف نہیں کیا جاتا ورنہ پھر گاڑی بھی اسی ٹھنڈک کا حصہ بن کر اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیتی۔ سوئچ آن کی ہر کوشش ناکامیاب ہوکر رہ جاتی

ہے۔

میرے ذہن نے کہا ان افراد سے تھوڑی تفریح لینا چاہئے۔ میں نے ان میں سے ایک کی آنکھوں میں جھانکا اور سوال کیا ”مسٹر! تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ کسی سنگی بت کے مانند مجھے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

میں نے ایک اور کوشش کی اور تیکھے لہجے میں کہا ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم لوگ مجھے اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو۔ احتیاط کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے پوری امریکی قوم کا اعتماد کہیں گم ہو گیا ہو!“

اس کی آنکھوں میں تحیر کی پرچھائیں لہرائی۔ پتا نہیں وہ میری جرأتِ گفتار کا اثر تھا یا میرے سوال نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے سوچا اس موقع پر بات کو آگے بڑھانا چاہئے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک واضح استفسار پڑھ لیا تھا۔

میں نے کہا ”اس جگہ پر اچھی خاصی حرارت موجود ہے اس کے باوجود بھی تم لوگوں نے ویگن کا انجن اسٹارٹ حالت میں چھوڑ دیا ہے۔ پتا نہیں، آپ لوگ مجھ سے اتنے خوف زدہ کیوں ہیں۔ کیا میں کوئی جن ہوں جو تم کو کھا جاؤں گا؟“

میں اسے اکسانے اور تاؤ دلانے کی کوششیں کر رہا تھا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

میں نے ایک اور وار کیا ”آپ لوگوں نے اپنی سائنسی ترقی کے طفیل ہمیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ ہم اپنی مرضی سے حرکت کر سکیں اس کے باوجود بھی تم لوگ ہماری طرف سے بہت محتاط ہو۔ کیا یہ تمہارے طاقتور اختیار کا شرمناک مظاہرہ نہیں؟“

وہ جی ہی جی میں بل کھا کر رہ گیا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ میں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے ایک اور وار کیا۔

”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے الاسکا کے موسم نے تم لوگوں کے جذبات کو بھی فریز کر کے رکھ دیا ہے جو میری تلخ باتیں بھی تمہارے خون میں ابال نہیں لا رہیں۔ تم دونوں جس بے غیرتی اور بے حسی کا مظاہرہ کر رہے ہو وہ یاد رکھنے کے قابل ہے!“

اس شخص کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں بڑی صاف انگلش میں اسے غصہ دلانے والی باتیں کر رہا تھا۔ ایک قیدی اور مجرم شخص جو کسی نقل و حرکت کے قابل بھی نہ ہو، کی زبان سے اس قسم کی زہریلی باتیں سن کر ان دونوں کے دماغوں کا جو حشر ہوا ہوگا اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا تاہم ان میں سے کسی نے کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ شاید انہیں اسی قسم کی ہدایات دی گئی تھیں۔

میں مزید تھوڑی دیر تک اسی نوعیت کی چھیڑ خانی میں مصروف رہا پھر مجھے یہ سلسلہ موقوف کرنا پڑا کیونکہ طوطا مار کا ناک والا یہودی واپس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک باکس نظر آیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کوئی فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ ازاں بعد میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

اس شخص نے وہ باکس کھولا اور ایک انجیکشن تیار کرنے لگا۔ میں سمجھ گیا وہ انجیکشن ہمارے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ پتا نہیں اب مزید وہ ہمارے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میرے بدن کے بیدار حصوں میں ایک گہری تشویش دوڑ گئی۔ شاید یہی حال ساحل کا بھی ہوا ہوگا۔

ڈسپوزیبل سرنج میں کوئی سیال بھرنے کے بعد وہ شخص ساحل والی وہیل چیئر کے نزدیک آ گیا۔ ساحل کسی پروگرامڈ روبوٹ کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوما میں چلی گئی ہو یا پھر شوکیس میں سجے کسی اسٹیچو کی بھرپور اداکاری کر رہی ہو۔

سرنج بردار سفاک شخص نے لباس کے اوپر ہی سے ساحل کے بازو میں وہ انجیکشن دے دیا۔ سوئی کی چبھن پر ساحل کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی سسکاری خارج ہوئی اور نہ ہی چہرے پر کوئی تاثر ابھرا۔

سرنج میں بھری ہوئی دوا ساحل کے جسم میں انجیکٹ ہو چکی تو اس شخص نے وہاں موجود دو افراد میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ مذکورہ شخص خاموشی سے آگے بڑھا اور ساحل والی وہیل چیئر کو دھکیل کر ایک طرف لے جانے لگا۔ میں خاموشی سے وہ تماشا دیکھنے پر مجبور تھا۔ میں نہیں جانتا تھا اگلے مرحلے پر ساحل کے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور یہ نہ جاننا ہی میری تشویش کا باعث تھا۔

میری نگاہ ساحل والی وہیل چیئر پر جمی ہوئی تھی۔ وہ شخص چیئر کو دھکیلتے ہوئے ایک دروازے کے قریب لے گیا پھر دروازہ کھول کر وہ ساحل سمیت کسی کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں اس کمرے کے اندرونی منظر کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ کوئی آپریشن تھیٹر بھی ہو سکتا تھا اور ڈیتھ چیمبر بھی!

اچانک میری سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے اپنی گردن میں کسی سوئی کو اترتے محسوس کیا تھا۔ وہ میرے جسم کا

بیدار حصہ تھا لہٰذا تکلیف کا احساس لازم تھا تاہم میں نے اپنے چہرے سے ایسا کوئی تاثر نہ دیا جس سے میری کمزوری یا کم ہمتی جھلکتی ہو۔ میں ان مکار یہودیوں کے سامنے سینہ تان کر رہنا چاہتا تھا۔

انجیکشن کی تکمیل کے بعد میری وہیل چیئر میں بھی حرکت پیدا ہوئی، دیکھتے ہی دیکھتے میں اس ہال کی ایک دیوار کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ہمارا یہ مختصر سا سفر ایک دروازے پر ختم ہوا۔ ایسے ہی ایک دروازے میں ساحل کو داخل کیا گیا تھا۔ تاہم یہ وہ دروازہ نہیں تھا۔ ہم دونوں کو دو مختلف سمتوں میں روانہ کیا گیا تھا۔

پتا نہیں اسے جدائی کہا جا سکتا ہے یا نہیں! جدائی کے لیے ملن کی شرط ہے، ملن کے بعد ہی جدائی کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاز کے اندر اور پھر ویگن میں ہم دونوں کا جو مضحکہ خیز اور عبرت انگیز ملن ہوا تھا اس کے بعد جدائی کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ میری وہیل چیئر ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں نے کمرے کے ماحول پر نظر ڈالی تو حیرت کا ایک شدید دھچکا لگا۔ وہ ایک کشادہ واش روم تھا۔ مجھے وہاں پہنچانے والا شخص واش روم کا دوسرا دروازہ کھول کر خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں واش روم میں تنہا رہ گیا۔

تنہائی بڑے انوکھے خیالات کو جنم دیتی ہے۔ میں نے سوچا کیا ساحل کو بھی کسی ایسے ہی واش روم میں پہنچایا گیا ہوگا؟ اگر اس سوال کا جواب ”ہاں“ میں تھا تو پھر ایک نیا سوال اٹھتا تھا...... ”کیوں؟“

واش روم پاکیزگی اور طہارت کے کام آتا ہے۔ نہا دھو کر ہم اپنے جسم کو صاف ستھرا کرتے ہیں۔ اس واش روم میں بھی صفائی ستھرائی کے سارے لوازمات موجود تھے بلکہ وہ حد سے زیادہ ماڈرن باتھ روم تھا۔ باتھ ٹب و شاورز کے علاوہ وہاں اسٹیم باتھ کا بھی مکمل بندوبست نظر آ رہا تھا۔ میں بہ غور وہاں کی ایک ایک شے کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔

واش روم کا وہ دروازہ کھلا، مجھے یہاں پہنچانے والا جہاں سے رخصت ہوا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ نظارہ سانس کی آمد و شد کو روکنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بدن کا سارا خون کن پٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا ہو۔ دو کڑکتی ہوئی بجلیاں کھلے ہوئے دروازے میں نمودار ہوئیں اور اگلے ہی لمحے دروازہ ایک مرتبہ پھر بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں بجلیاں بھی واش روم میں بند ہو گئیں۔ ان میں سے ایک توے سے زیادہ سیاہ اور دوسری چاندی سے زیادہ سفید تھی!

میں نے اپنے جسم کے مختلف حصوں میں پھریری سی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے بدن کے خوابیدہ حصے بیدار ہو رہے ہوں، ان میں ایک نئی زندگی دوڑنے لگی ہو۔ پتا نہیں یہ گردن پر لگنے والے اس انجیکشن کا اثر تھا یا ان کڑکتی بجلیوں کا کرنٹ! میں بڑی خوشگوار حیرت سے یک ٹک انہیں تکے جا رہا تھا۔ سیاہ و سفید ایک ہی صف میں آن کھڑے ہوئے تھے۔ کیا صف بندی تھی!

وہ دونوں کمر پر ہاتھ رکھے پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں اور کسی کمان کے مانند تن کر کھڑی تھیں۔ ان کی خوب صورتی اور حسن و جمال میں کوئی کلام نہیں تھا۔ بدن کی شادابی اور کشش بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ وہ اس وقت محض انڈر گارمنٹس میں تھیں، جیسے الاسکا میں نہ ہوں بلکہ یورپ کے کسی گرم ساحل پر سن باتھ کے ارادے سے نکلی ہوں!

اس وقت ان کے ارادے مجھے بڑے خطرناک نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے زیرِ لب مسکرا بھی رہی تھیں۔ ان کے زندہ و پائندہ لبوں پر سجی یہ معنی خیز مسکراہٹ مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ بلیک اینڈ وہائٹ کا ایک حسین اور سنگین سنگم تھیں۔

میں نے جلدی سے اپنی سوچ کو سنبھالا، حواس کو ان کے رعبِ حسن سے نکالا اور یکے بعد دیگرے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شستہ انگریزی میں سوال کیا۔

”تم دونوں کون ہو؟“

جواب دینے سے پہلے انہوں نے بڑی تیکھی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر کالی حسینہ نے ایک ادا...... سے اپنے کھلے گیسوؤں کو جوڑے کے انداز میں سمیٹتے ہوئے خالصتاً امریکی لب و لہجے میں کہا۔

”ہم تمہاری خادمائیں ہیں۔“

اس کے اس والہانہ جواب نے میرے بدن میں سنسناہٹ سی جگا دی۔ میں نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا ”یہ اگر مذاق ہے تو بس ہو چکا۔ مجھے تم لوگوں سے کسی قسم کی کوئی خدمت نہیں کرانا۔“

”یہ تو ہم جانتے ہیں، ہمیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا!“ سفید فام آفت بڑی سنجیدگی سے بولی اور میری جانب قدم بڑھا دیے۔

اماوس کی رات اٹھلاتے ہوئے باتھ ٹب کی طرف چلی گئی۔ گویا انہوں نے کسی کارروائی کا آغاز کردیا تھا۔ مکھن ملائی اور برف کی سنکائی سے پروان چڑھنے والی امریکی حسینہ میرے نزدیک آئی تو میں نے بڑے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''مجھے چھونے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھ سے دور رہو!''

''کیوں!'' وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولی ''تمہیں چھونے سے کرنٹ لگتا ہے کیا؟''

بے اختیار میرے ہونٹ مسکرا اٹھے۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔ سمندر' قطرے سے پوچھ رہا تھا' کہیں مجھے اپنے اندر غرقاب تو نہیں کردو گے؟ وہ کم بخت کسی تھرمل پاور اسٹیشن سے کم نہیں تھی اور بڑی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ میں اسے کرنٹ تو نہیں ماردوں گا!

میں نے اپنی سنجیدگی کو واپس لاتے ہوئے اس سے کہا ''مجھے تم دونوں کے ارادے ٹھیک نظر نہیں آرہے۔ سچ سچ بتاؤ میرے ساتھ کیا کرنے والی ہو؟''

''تمہیں بتایا ہے نا' ہم تمہاری خدمت کرنے آئے ہیں۔''

''کیسی خدمت؟'' میں اس کے تیور دیکھ کر بوکھلا گیا۔

''ہم تمہیں ایک شاندار اور یادگار باتھ دیں گے!'' وہ بڑے کھلے ڈلے انداز میں بولی۔

میری بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا کیونکہ اس نے میرے لباس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ میرے لیے یہ صورتِ حالات بڑی واہیات تھی۔ بے ساختہ میں نے مدافعت میں اس کے ہاتھ کو روکنا چاہا۔ اس ''چاہنے'' کا مطلب یہی تھا' میں نے اپنے ہاتھوں کو جنبش دینے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ وہ بے حس وحرکت ہی رہے۔ اس کے ساتھ ہی میرا وہ اندازہ بھی غلط ہوگیا کہ گردن پر لگنے والے انجیکشن کے اثر سے میرے جسم کے خوابیدہ حصے بیدار ہونے لگے تھے۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنے بدن میں جو تحریک محسوس کی تھی اس کا تعلق تصور اور تخیل سے تھا۔ درحقیقت میری سوچ میں ہل چل مچی تھی جس نے جذبات کو ایک نئی انگڑائی لینے پر مجبور کردیا تھا اور اس خوش گوار تغیر کا سبب وہی دو بجلیاں تھیں جن کے چیختے چلاتے بلیک اینڈ وہائٹ جلوے نے میرے احساس میں انتشار پیدا کردیا تھا۔ انہیں دیکھ کر یوں محسوس ہوا تھا' رات اور دن ایک ساتھ کسی وادی میں اتر آئے ہوں!

میں کسی قسم کی رکاوٹ یا مدافعت پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تاہم منہ میں زبان ضرور رکھتا تھا۔ میں نے وھیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے اس حسینہ سے استفسار کیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

میرے لباس کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔ منہ بگاڑ کر ٹیڑھے لہجے میں بولی ''کام بتادیا' یہی کافی ہے۔ نام پوچھ کر کیا کروگے؟''

''اتنی سنگ دل نہ بنو روزی!'' بلیک بیوٹی نے باتھ ٹب کے پاس کھڑے کھڑے اپنی ساتھی کو مخاطب کیا ''بے چارہ کتنی محبت سے پوچھ رہا ہے۔ نام بتادوگی تو تمہارا کیا چلا جائے گا؟''

میرے سامنے کھڑی گوری نے کہا ''تم نے مجھے مخاطب کرکے نام تو ظاہر کرہی دیا ہے۔ میرے بتانے نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے روزی!''

بات ختم کرتے ہی اس نے بے پروایانہ انداز میں کندھے اچکادیے۔

بلیک کوئین ٹب کے پاس سے ہٹ گئی اور ہماری جانب قدم بڑھاتے ہوئے اپنی ساتھی سے بولی ''تو گویا تم نے حساب برابر کردیا۔ ایک سینٹ اوپر نیچے نہیں ہونے دیتی ہو روٹی!''

ان کی باہمی نوک جھوک نے مجھے ان کے نام سے آشنا کردیا۔ سیاہ حسن کا نام روزی تھا۔ اگر وہ روزی تھی تو پھر اسے ''بلیک روز'' کہنا زیادہ مناسب تھا۔ سیاہ گلاب بھی اپنے اندر اسی قسم کا پُراسرار حسن رکھتا ہے۔ روزی کی ساتھی روٹی اپنے حسن کی چمک دمک کے باعث وہائٹ گولڈ کو شرماتی تھی۔ دونوں اپنے اپنے فیز میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔

پتا نہیں، یہ قدرت کا کیسا حسین مذاق تھا۔ میں اس وقت پردیس میں اپنے دشمنوں کے رحم وکرم پر تھا۔ ان نامساعد حالات میں اس نے میرے لیے بڑی سنگین روزی روٹی کا بندوبست کردیا تھا!

میری نگاہ نے ان دونوں کے بیچ سے راستہ نکالا اور جاکر باتھ ٹب پر ٹک گئی۔ ٹب کو تیار کردیا گیا تھا۔ اس میں ایک مناسب سطح تک پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی کی سطح پر بلبلے دار جھاگ کی حکم رانی تھی۔ گویا بلیک کوئین نے میرے باتھ کے لوازمات یک جا کردیے تھے۔ میری نگاہ اگلے ہی لمحے واپس لوٹ آئی۔

روزی (ROSY) نے سوالیہ نظر سے روٹی (ROTY) کو دیکھا اور بولی ''پروگرام شروع کریں؟''

''پہلے اسے ڈریس آؤٹ کرنا ہوگا۔'' روٹی نے میرے جسم کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔'' روزی بے پروائی سے بولی ''یہ کام ٹب کے اندر بھی ہوسکتا ہے۔''

پھر انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا اور بڑی مستعدی سے میری جانب ہاتھ بڑھائے۔ روٹی میرے عقب میں پہنچی اور میری بغلوں میں اپنے سڈول بازو ڈال دیے۔ روزی نے اپنی صندل بانہوں کو میری پنڈلیوں کے گرد حائل کرکے ٹانگوں کو مضبوط شکنجے میں جکڑ لیا۔ میرے پاؤں کے پنجے ایک گداز رکاوٹ کے سامنے سرنگوں ہوگئے۔ دوسری جانب روٹی نے میری پیشانی کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے دبا رکھا تھا۔ ان آفت زادیوں کی گرفت میں بڑی جان تھی' جکڑ میں بڑی شان تھی اور پکڑ میں بڑی آن تھی۔

انہوں نے آن واحد میں میرے جسم کو ایک جھٹکا دیا اور کرسی سے باہر نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے مجھے اٹھا کر اس کنگ سائز ٹب میں پھینک دیا۔ ان کے اس عمل میں بڑی مہارت اور تجربہ کاری تھی۔ وہ ماردھاڑ سے بھرپور شاہکار تھیں۔

وہ ٹب کسی ڈبل بیڈ کے سائز کا تھا جس میں بہ یک وقت تین چار افراد بہ آسانی باتھ لے سکتے تھے۔ مجھے باتھ ٹب میں پہنچانے کے بعد وہ دونوں بھی اندر اتر آئیں۔ ٹب میں بھرا ہوا پانی بڑے مناسب درجۂ حرارت کا تھا' جسم کو نکور دینے والا۔ اس پانی میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک راحت سی محسوس ہوئی' بدن کو ایک نئی زندگی ملنے لگی۔ پھر وہ دونوں خادمائیں میری خدمت گزاری میں جت گئیں۔

میں ایک ننھا بچہ بن کر رہ گیا تھا۔ میرے جسم کے وہ اعضا جو میرے تابع نہیں رہے تھے وہ ان جادوگرنیوں کے اشاروں پر ناچ رہے تھے۔ انہوں نے گداز اسفنج کی مدد سے خوب مل مل کر مجھے دھویا اور دھو دھو کر نہلایا۔ میں کسی فرماں بردار بچے کے مانند ان کے ہاتھوں کا کھلونا بنا رہا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ اس ہنگام سے نمٹ لیں۔

اس شان دار غسل نے مجھے ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ انہوں نے نہایت ہی خدمت گزار خادماؤں کی طرح مجھے ڈریس اپ کردیا۔ یہ وہ لباس نہیں تھا جو غسل سے پہلے میرے بدن کا پہناوا بنا ہوا تھا۔ روزی اور روٹی نے باہمی امداد سے مجھے دوبارہ کرسی پر بیٹھا دیا۔ میں ایک مرتبہ پھر وھیل چیئر کا مہمان بن گیا۔

انہوں نے مجھ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ شاید وہ اپنی کارکردگی کا تنقیدی جائزہ لے رہی تھیں۔ مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور ''بائے'' کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے واش روم سے نکل گئیں۔

اگلے پانچ منٹ میں میری وھیل چیئر کو دوبارہ اسی ہال میں پہنچا دیا گیا جہاں اسٹیشن ویگن آکر رکی تھی۔ ساحل اپنی وھیل چیئر پر پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کے جسم پر بھی وہ پہلے والا لباس نظر نہیں آرہا تھا۔ یقیناً اسے بھی ایک وارم باتھ سے گزارا گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ نکھری دکھائی دیتی تھی۔ اس کے نکھار میں ایسی کشش تھی کہ دل خواہ مخواہ اس کی طرف لپکتا تھا۔ اسے پکڑنے اور محسوس کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن......

لیکن کے بعد سوچ کے پَر پھڑ پھڑانے لگتے تھے' خیال کی پرواز تھم جاتی اور ایک اذیت ناک بے بسی جذبات کے غبار کو اپنے حصار میں لے لیتی۔ میری درجنوں ترسی ہوئی راتوں اور برسوں سلگتے ہوئے دنوں کے انتظار کے بعد وہ مجھے دیکھنے کو ملی تھی اور ایسے ملی تھی کہ بیان سے باہر! ہمارا یہ ملن' جدائی سے زیادہ تڑپانے والا تھا' بدن میں نشتر اتارنے والا' روح پر کوڑے برسانے والا!

اچانک ایک خیال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میں نے خطرناک انداز میں سوچا...... کیا ساحل کو بھی میرے ہی طریقے سے نہلایا گیا ہوگا؟ اس سوال کے عقب میں ایک اور سوال سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اگر مجھے دو حسیناؤں نے غسل کرایا تھا تو کیا ساحل کو دو مردوں نے باتھ کرایا تھا......؟ ایک سیاہ فام اور دوسرا اسفید فام؟ اور کیا وہ دونوں بھی روزی اور روٹی کی طرح مختصر جامے میں تھے؟ انہوں نے بھی اسی شدت سے ساحل کو اٹھا کر کسی ٹب میں پھینکا ہوگا!

میں ان ہولناک سوالات کے جواب ڈھونڈنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اس تصور نے کہ میری ساحل کو دشمن ہاتھوں نے چھوا ہوگا' مجھے بے حال کردیا۔ اس کے بعد پیش آنے والے حالات کے بارے میں' میں سوچنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ خون میری رگوں کے اندر اچھل کر رہ گیا۔

اسی لمحے وہ طوطے کی چونچ والا یہودی اس ہال میں نمودار ہوا۔ میں اس سے بہت سارے سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ڈھیروں کیا' مجھے ایک سوال کرنے کا موقع نہ دیا۔ وہ وہاں پہنچتے ہی اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنی گردن کے نزدیک کسی سوئی کی چبھن محسوس ہوئی۔ یقیناً مجھے کوئی انجیکشن دیا گیا تھا۔ غسل کے بعد میں خاصا ہلکا پھلکا ہوچکا تھا' اس انجیکشن کے بعد مجھے یوں لگا' میرا جسم روئی کا گالا بن گیا ہو۔ میں خود کو فضا میں اڑتا ہوا محسوس کرنے

لگا...... نشے میں چور کسی آوارہ بادل کی طرح!

ساحل کے بازو میں بھی ایک انجیکشن دیا گیا' پھر ہمیں دوبارہ اسی اسٹیشن ویگن میں سوار کرایا گیا۔ ایک مرتبہ پھر ہمارا سفر شروع ہوگیا تاہم اس بار ہمیں عقبی نشست تفویض کی گئی تھی۔ ہم دو سنگی مجسموں کے مانند چپ چاپ اور ساکت بیٹھے تھے۔ ہم دو ایسے پڑوسی تھے جو کسی شدید جھگڑے کے بعد اپنا جینا مرنا الگ کر چکے تھے!

میں نہیں جانتا تھا' ہمارا یہ ناتمام سفر کہاں جا کر تمام ہوگا! میں یہ جان بھی کیسے سکتا تھا۔ میں تو اس وقت خود اپنے آپ کو بھول رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں فضائے بسیط میں کہیں گم ہو رہا ہوں' ایک اتھاہ خلا میں تحلیل ہو رہا ہوں۔ میں قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا اور ذرہ ذرہ بکھر رہا تھا۔ شاید میں ہوش وخرد سے بہت دور بے خبری کی کسی وادی میں اتر رہا تھا۔

میری آنکھوں نے اس کیفیت میں جو آخری منظر دیکھا' وہ ویگن کے ڈیش بورڈ کا منظر تھا' جہاں اسپیڈو میٹر کے ساتھ ہی نارتھ کمپاس کا ڈائل بھی تھا۔ نارتھ کمپاس (قطب نما) کی سوئی بتا رہی تھی کہ ہم شمال کی جانب گامزن ہیں۔

الاسکا تو پہلے ہی کرۂ ارض کے انتہائی شمال میں واقع تھا۔ پتا نہیں یہ شاطر یہودی ہمارے لیے اپنے ذہن میں کیا سوچے بیٹھے تھے۔ کہیں یہ لوگ ہمیں نارتھ پول پر لے جا کر پھینکنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تھے!

☆☆☆

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک سنگلاخ کمرے میں پایا۔

میں حیرت اور دلچسپی سے اس کمرے کے در و دیوار کو دیکھنے لگا۔ در و دیوار کیا؟ وہاں تو چاروں طرف صرف دیواریں ہی نظر آ رہی تھیں' دروازے کا نام ونشان کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا البتہ ایک دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی ضرور موجود تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

تبھی مجھے احساس ہوا کہ میں کسی گدے پر ہوں۔ وہ ایک چھوٹا سا اسپرنگ والا میٹرس تھا جس کی لمبائی پانچ فٹ اور چوڑائی محض دو فٹ تھی۔ مذکورہ میٹرس اس مختصر سے کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بچھا ہوا تھا۔ اس سنگلاخ کمرے کا سائز آٹھ بائی آٹھ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا' کسی پہاڑی کو بڑی مہارت سے تراش کر وہ کمرا وجود میں لایا گیا تھا۔

میں میٹرس سے نیچے اُتر آیا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس پتھریلے کمرے کی چھت کا اندازہ ہوا۔ فرش اور چھت کے درمیان بھی آٹھ فٹ سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ وہ ایک نیچی چھت والا کمرا تھا۔ میں تھوڑا سا اچک کر اس کمرے کی چھت کو چھو سکتا تھا۔ اس کمرے کے ایک کونے میں مجھے ایک چھوٹی سی چوبی میز بھی نظر آئی۔ میز پر پانی سے بھری ہوئی ایک بوتل رکھی تھی۔ یقیناً یہ پانی میرے ہی لیے تھا کیوں کہ اس کمرے میں، میں ہی میں تھا' دوسرا کوئی نہیں تھا۔ لامحالہ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔

ہم دونوں کو ایک جیسے ''ٹریٹمنٹ'' سے گزارنے کے بعد ایک ساتھ اس اسٹیشن ویگن میں سوار کرایا گیا تھا۔ ویگن میں بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد میں انٹاغفیل ہوگیا تھا۔ میری آنکھ اس چھوٹے سے چٹانی کمرے میں کھلی تھی تو عین ممکن تھا ساحل کو بھی کسی ایسے ہی کمرے میں پہنچایا گیا ہو۔ بہرحال اسے مجھ سے الگ کر دیا گیا تھا۔

مجھے اپنی سوچ پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ الگ کر دینے والی بات تو میں ایسے سوچ رہا تھا جیسے اس سے پہلے وہ میرے ساتھ تھی' میرے ہاتھ تھی!

میں کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس آ گیا۔ وہ نہایت ہی مختصر اور عجیب وغریب کھڑکی تھی۔ اس کی کل پیمائش آٹھ بائی دس انچ ہوگی۔ دس انچ چوڑی اور آٹھ انچ اونچی۔ کھڑکی کے نچلے حصے میں' چوڑائی کے رخ اسٹیل کی ایک انچ موٹی سلاخ نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ تقسیم بھی سمجھ میں نہ آنے والی تھی۔ اس مضبوط سلاخ کی تنصیب نے کھڑکی کو ''ٹو ان ون'' بنا کر رکھ دیا تھا۔ نچلا پورشن دو بائی دس انچ کا تھا جب کہ اوپر والا چھ بائی دس انچ کا۔ یہ مخصوص قسم کی کھڑکی یقیناً کسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی بنائی گئی تھی۔

میں کھڑکی کے نزدیک کھڑا اس کی تعمیر کے مقاصد پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب دیوار میں مجھے ایک دراڑ سی نظر آئی۔ مذکورہ دراڑ دو دیواروں کے سنگم پر ایک کونے میں واقع تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس دراڑ کے اندر جھانکا۔ ایک فٹ کے اس خلا کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا واش روم نظر آیا۔

وہ دراڑ درحقیقت ایک فٹ چوڑا اور چار فٹ طویل ایک تنگ سا راستہ تھی جس میں پہلو کے بل کھسکتے ہوئے مذکورہ باتھ روم تک پہنچا جا سکتا تھا۔ میں کھڑکی والی دیوار سے پشت ٹکا کر دھیرے دھیرے کھسکتے اور سرکتے ہوئے باتھ روم کے اندر پہنچ گیا۔ وہ تین بائی تین فٹ کا ایک چوکور سا ڈربا تھا جس میں ایک کونے میں کموڈ نصب تھا۔ دوسری جانب دیوار کے ساتھ واش بیسن لگا ہوا تھا۔ واش بیسن کے دائیں ہاتھ دیوار پر ٹشو رول بھی نصب تھا۔ ایک کونے میں چھوٹی سی ویسٹ بن بھی

دکھائی دے رہی تھی حیرت انگیز طور پر اس باتھ روم میں مجھے کھڑکی یا دروازہ دکھائی نہ دیا۔ پتا نہیں وینٹی لیشن کا کیا بندوبست تھا۔ وہاں کسی قسم کی بدبو یا گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ صابن' تولیا یا آئینہ نام کی کوئی شے وہاں نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اس واش روم کو ''گزارہ چلاؤ'' کا نام دیا اور واپس دیوار کے ساتھ سرکتے ہوئے اس کوٹھری نما چٹانی کمرے میں آ گیا۔

کمرے میں کسی دروازے کی غیر موجودی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔ پتا نہیں اس کمرے میں آمد و شد کا کیا ذریعہ تھا۔ آخر انہوں نے مجھے بھی تو اس کمرے میں پہنچایا تھا!

ایسا سوچتے ہوئے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ میں بے انتہا تعجب سے اپنے ہاتھ پاؤں کو دیکھنے لگا۔ میرے مذکورہ اعضا میرے تابع تھے اور میری مرضی کے مطابق حرکت کر رہے تھے۔ خدا جانے بیدار ہونے کے بعد میرا اس طرف دھیان کیوں نہیں گیا تھا؟ اسٹیشن ویگن میں بیٹھنے تک تو یہ بے حس وحرکت تھے۔ شاید یہ اس انجیکشن کا اثر تھا جو وہاں سے لاتے وقت میری گردن کے نزدیک دیا گیا تھا یا پھر یہ بھی ممکن ہے میرے دشمنوں نے مجھے اپنے ہاتھ پاؤں کا کرنے کے لیے کوئی اور ترکیب آزمائی ہو!

دشمن کبھی آسانیاں اور سہولتیں فراہم نہیں کرتا۔ اگر ان یہودیوں نے میرے جسم کو حرکت کے قابل بنا دیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ کسی اور انداز میں مجھے پہلے سے بھی کہیں زیادہ پابند بنا چکے تھے۔ میں واپس میٹرس پر آ کر بیٹھ گیا اور اس محبس کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس کوٹھری کا واحد روزن وہ مختصر سی کھڑکی تھی جس میں اسٹیل کی مضبوط سلاخ نصب تھی۔ میں اس سلاخ کو جھنجوڑ کر اندازہ لگا چکا تھا' وہ دیوار میں بہت دور تک گھسی ہوئی تھی۔ اسے نکال کر باہر کرنا آسان کام نہیں تھا۔ بہ فرض محال' اگر میں ''جی'' کی قوت کو آزما کر کھڑکی کو سلاخ سے فارغ کر بھی دیتا تو بھی آٹھ بائی دس انچ کے خلا سے باہر نکلنا ناممکن تھا۔ گویا انہوں نے مجھے ''کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے!'' والی آزادی دی تھی!

میں میٹرس پر نیم دراز ہوگیا۔ اس گدے پر پھیل کر لیٹنا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ میری ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے فرش پر جاتیں۔ اگر پاؤں کو گدے پر رکھتا تو کندھے گردن سمیت اس سے جا لگتے۔ یہ بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال تھی۔ میں سٹ پٹا کر رہ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

ساحل کے حوالے سے ایک سوال ذہن میں جم کر بیٹھ گیا تھا۔ کراچی میں شعیب غوری اور پھر بعد میں طوطے کی چونچ جیسی ناک والے یہودی نے بھی اس بات پر زور دیا تھا کہ ساحل کسی بیش بہا خزانے کے راز سے واقف ہے جس کی روحانی اہمیت بھی ہے اور یہی بات مجھے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں ساحل کے بارے میں ایسا نہیں سوچتا تھا لیکن یہودی لابی کی سرگرمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں اس سلسلے میں جتنا سوچ رہا تھا' اتنا ہی الجھتا چلا رہا تھا۔ میری سوچ اس کوٹھری کی پتھریلی دیواروں اور چھت سے ٹکرا کر واپس آ جاتی اور مجھے ہر حال میں ساحل ایک سیدھی سادی اور معصوم لڑکی نظر آتی۔ وہ پگلی تو اپنے حسن وشباب کے خزانے کا پوری طرح ادراک نہیں رکھتی تھی کسی ارضی یا سماوی خزینے سے کیا واقف ہوتی!

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور سوچ کا پکھیرو الاسکا کی اس کوٹھری سے پرواز کر کے کھٹمنڈو کے مضافات میں پہنچ گیا۔ میری نگاہ اس کوٹھری کی چٹانی چھت پر ٹکی تھی لیکن تصور کی آنکھ سے میں پگوڈا نما بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کو دیکھ رہا تھا۔ تصور اور تخیل حیرت انگیز رفتار سے اڑان بھرتے ہیں اور پلک جھپکتے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتے ہیں۔

کھٹمنڈو کے اس مضافاتی پہاڑی علاقے میں ناگ پال کے خوں خوار آدمی میرے تعاقب میں تھے۔ میں زخموں سے چور سما کو سنبھالتے' اپنی جان بچاتے ہوئے اس عبادت گاہ کی طرف نکل آیا تھا۔ ساحل یعنی دھنو سے میری پہلی ملاقات اسی بدھ عبادت گاہ میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔ ساحل (دھنو) کا باپ تھوبجی بدھ بھکشو نہیں تھا تاہم اس عبادت گاہ کا انتظام و انصرام اسی کے ذمے تھا۔ تھوبچی پندرہ سال پہلے اپنی بیوی بھیر جانی کی عزت بچاتے ہوئے اس عبادت گاہ تک پہنچا تھا جو ہزاروں سال سے دریا کے کنارے ایک کوہ کے دامن میں موجود تھی۔ یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ میری داستان کے ابتدائی حصے میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

تھوبچی اور بھیر جانی نے نہ صرف ہمیں پناہ دی بلکہ میرے زخمی ساتھی سما کا حتیٰ المقدور علاج بھی کیا۔ تھوبچی مجھ پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کے مطابق میں پراسرار شکتیوں کا مالک ایک سچا انسان تھا۔ اسی اعتبار اور خیال کے نتیجے میں اس نے مجھے عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ ایک سربستہ راز سے بھی آگاہ کر دیا۔ میں اس کی معیت میں مختلف خفیہ اور پراسرار راستوں سے گزر کر عبادت گاہ کے تہ

خانے میں پہنچا تھا جہاں مہاتما بدھ کا دس فٹ بلند سونے کا مجسمہ استادہ تھا جس کا گھیر کسی بھی طور پر پانچ فٹ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ اس تہ خانے اور وہاں تک پہنچنے والے طویل غار میں بھی جابجا سونے کی ڈلیاں پڑی تھیں۔ اسی طرح دیواروں پر بھی سونے کی مخصوص آب و تاب دکھائی دیتی تھی۔ میں اس حیرت کدے میں ششدر کھڑا تھا۔ میں نے اتنا زیادہ سونا کسی ایک جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ تھوپچی نے اس موقع پر مجھے بتایا کہ اس راز سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں۔ ہر دور کا دلائی لاما اور اس کے قابلِ اعتماد چند افراد۔ اس عبادت گاہ کی حفاظت کرنے والے شخص کو بھی دلائی لاما کا معتمد تصور کیا جاتا ہے۔ میں نے تھوپچی سے پوچھا تھا' وہ مجھے کیوں اس راز سے آگاہ کررہا ہے؟ تو اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا تھا کہ میں بھی دلائی لاما کی نظر میں قابلِ اعتماد ہوں۔

کہیں یہ کم بخت یہودی اسی خزانے کی تلاش میں تو نہیں سرگرداں رہے تھے؟

یہ سوال اگرچہ بہت اہم تھا لیکن میں اس سے پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک بیش بہا خزانہ تھا۔ اگر دلائی لاما کی نگرانی میں تھا تو اس کی روحانی حیثیت اور اہمیت بھی مسلم تھی مگر ساحل (دھنو) کو اس راز کے ساتھ نتھی کرنا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اگر وہ لوگ اس خزانے کے وجود سے آگاہ تھے تو پھر یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ یہ راز صرف تھوپچی تک محدود تھا۔ اس نے اپنی بیوی یا بیٹی کو اس راز میں شریک نہیں کیا ہوگا...... اور تھوپچی اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ ناگ پال کے وحشی بھیڑیوں نے تھوپچی اور بھیر جانی کو بہیمانہ انداز میں قتل کردیا تھا۔

یہ بات صرف مجھ تک محدود تھی کہ مجھے دھنو کے ساتھ اس تہ خانے میں چھپنے کی ضرورت پیش آئی تھی اور میں نے یقین کرلیا تھا کہ وہ پہلی مرتبہ اس جادو نگری میں اتری تھی۔ بہرحال وہ سونے کے اس راز سے واقفیت حاصل کرچکی تھی۔ اگر اس بنیاد پر یہودی لابی دھنو کی تلاش میں تھی تو پھر انہیں اتنی ہی شدت سے میری بھی ضرورت ہونا چاہیے تھی۔ اگرچہ اس وقت ہم دونوں ان کے قبضے میں تھے تاہم وہ لوگ اول آخر ساحل کو مجھ سے الگ تصور کررہے تھے۔ اس کے معاملے کو مجھ سے جدا بیان کررہے تھے۔ پتا نہیں یہ کیسا گورکھ دھندا تھا! میرا ذہن سوچ سوچ کر مکڑی کے جالے کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اس تارِ عنکبوت میں پھنس کررہ جاتا' مجھے چونک جانا پڑا۔

باہر قدموں کی آواز ابھری تھی۔ یہ مخصوص چاپ اس کوٹھری کی اکلوتی کھڑکی کے راستے سے مجھ تک پہنچی تھی یقینا کوئی شخص اس طرف آرہا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں نہیں جانتا تھا' اس کھڑکی کے پار کوئی راہداری تھی یا کوئی ہال وغیرہ۔ ادھر سے مناسب روشنی کوٹھری کے اندر پہنچ رہی تھی تاہم اس روشنی کا ماخذ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اندر کا اجالا باہر کا رہینِ منت تھا۔ میں صبر و سکون کے ساتھ آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔

پھر کھڑکی میں مجھے اس کی صورت نظر آگئی۔ وہ رکا ایک لمحے کے لیے جھکا پھر سیدھا ہوگیا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اس نے کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس سے پہلے کہ میں میٹرلیس چھوڑتا' وہ ایک مرتبہ پھر جھک گیا۔

میں سبک قدموں سے کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ کھڑکی اس دیوار کے عین وسط میں نکالی گئی تھی۔ تین فٹ آٹھ انچ جگہ اوپر اور اتنی ہی جگہ نیچے تھی۔ میں کھڑکی کے نزدیک پہنچا تو جھکا ہوا شخص ایک بار پھر کھڑا ہو چکا تھا۔

وہ شکل و صورت سے کوئی امریکی ہی نظر آتا تھا۔ اس نے سکیورٹی گارڈ والی وردی پہن رکھی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے نظر آئی۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس شخص نے کھڑکی کے زیریں پورشن سے وہ ٹرے میری جانب دھکیل دی۔ مطلب یہی تھا میں اس ٹرے کو تھام لوں۔

اس دیوار کی چوڑائی لگ بھگ دو فٹ تھی تاہم اسٹیل کی مضبوط سلاخ دیوار کے اندرونی کنارے کے قریب نصب کی گئی تھی تاکہ دیوار کی چوڑائی کا فائدہ صید کو نہیں بلکہ صیاد کو پہنچے۔ ٹرے سلاخ کے نیچے سے میرے ہاتھوں میں پہنچ چکی تو وہ شخص ایک دفعہ پھر جھکا۔ میں خاموش کھڑا' ٹرے تھامے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری اور زبان خاموش تھی۔

دو تین مرتبہ جھکنے اور اٹھنے کے بعد اس نے اپنی کارروائی مکمل کرلی۔ اس اٹھک جھکک کے نتیجے میں کھانے پینے کی چند اشیا ٹرے میں منتقل ہوگئیں۔ وہ ان چیزوں کو ٹرے میں رکھ کر وہاں تک پہنچا تھا پھر ایک متاثر کرنے والے انداز میں کوٹھری میں مجھ تک پہنچا دیا تھا۔

میں نے ٹرے کو تھامے تھامے اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "میں اس وقت کہاں ہوں؟"

توقع کے مطابق مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا۔ اس سکیورٹی گارڈ نے بڑی سرد مہری سے مجھے گھورا اور اسی جانب

قدم بڑھا دیے جدھر سے وہ آتا تھا۔ میں ٹرے لے کر میٹرلیس پر آگیا اور کھانے پینے کے ان لوازمات کا جائزہ لینے لگا۔

ایک خوب صورت اور صاف ستھرے مگ میں خوش بو اڑاتی کافی تھی۔ ایک گوشت کی عجیب و غریب ڈش تھی۔ چند سلائس تھے۔ جام اور جیلی کے ساشے تھے اور دو ڈنر رول۔ یہ بڑا لاکمپینیشن تھا۔

کسی بھی شے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے میں نے اس تہ شدہ کاغذ کو اٹھالیا جو ڈنر رولز کے نیچے دبا ہوا تھا۔ سکیورٹی گارڈ نے مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں کیا تھا تو کیا ہوا! وہ لوگ شاید تحریری طور پر مجھ سے مخاطب ہورہے تھے۔ میں نے تہ شدہ کاغذ کو کھولا اور پڑھنے لگا۔

نہایت سلیس انگریزی میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا "مسٹر وجدان! یہ تمہارا ناشتا ہے۔ بے فکر ہوکر ہر شے کھا سکتے ہو۔ ہم نے کسی بھی آئیٹم میں کچھ نہیں ملایا۔ تمہاری زندگی ہمیں بہت عزیز ہے کیونکہ تم ہمارے لیے مستقبل قریب میں بہت مفید ثابت ہونے والے ہو۔ آدھے گھنٹے بعد برنارڈ لیو تم سے ملاقات کریں گے لہٰذا کھا پی کر اچھی طرح فریش ہوجاؤ۔ تمہارا ذہنی اور جسمانی طور پر چاق چوبند رہنا نہایت ضروری ہے۔"

اس مختصر سی تحریر نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ اس تحریر کا تخاطب' الفاظ اور انداز سے دوستی جھلکتی تھی۔ کراچی سے اینکریج تک ہمارے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ بدترین دشمنی کا غماز تھا البتہ اینکریج کی اس عالی شان عمارت میں ہمیں خصوصی "ٹریٹ" دیا گیا تھا۔ بہرحال یہ تحریر میری سمجھ سے باہر تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ یہودی کوئی نہایت ہی خطرناک چال کے موڈ میں تھے۔ ان کا یہ تازہ ترین رویہ خاصا الجھا ہوا تھا۔ پتا نہیں یہ برنارڈ لیو کون تھا اور مجھ سے کس سلسلے میں ملاقات کرنے والا تھا۔ اس تحریر میں برنارڈ لیو کو جس عزت و احترام سے بیان کیا گیا تھا' اس سے تو یہی لگتا تھا وہ ان کا کوئی نہایت اہم آدمی تھا۔ وہ کوئی ربی وغیرہ بھی ہوسکتا تھا!

میں نے واش روم کا معائنہ کرنے کے دوران میں بیسن پر کھڑے ہوکر چند چھپاکے اپنے چہرے پر مار لیے تھے اور ہاتھوں کو بھی اچھی طرح دھولیا تھا لہٰذا ناشتا شروع کرنے سے پہلے کسی تردد کی ضرورت نہیں تھی۔

اس وقت مجھے اچھی خاصی بھوک محسوس ہورہی تھی۔ ٹرے میں موجود سامانِ خورد و نوش اس بھوک کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا تاہم میں نے اس موقع پر بہت زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کیا۔ سالن کی ڈش کو تو میں نے بالکل ہاتھ نہیں لگایا۔ پتا نہیں وہ کون سے ایسے ویسے جانور کا گوشت تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا' یہودی جانور کا جھٹکا نہیں کرتے باقاعدہ ذبح کرکے کھاتے ہیں' پھر بھی حالات ایسے نہیں تھے کہ میں آنکھیں بند کرکے اس پرچے کی تحریر پر بھروسا کرلیتا اگرچہ راقم الحروف نے اس سلسلے میں مجھے بڑی تسلی تشفی دی تھی۔

میں نے جام' جیلی' سلائس اور کافی پر اکتفا کیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا' الاسکا میں بعض نہایت مثلاً معقول جانور بھی پائے جاتے تھے' موٹی کھال والی بڑے سائز کی بھیڑ' گائے بیل اور برفانی بکرا لیکن میں کسی قسم کے رسک کے موڈ میں نہیں تھا۔ کیا پتا' گھنے بالوں والا کوئی برفانی ریچھ میرے معدے میں اتار دیا جاتا!

میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ نیلی آنکھوں والا وہ سکیورٹی گارڈ کھڑکی کے سامنے نمودار ہوا۔ اس نے منہ سے ایک لفظ ادا کیے بغیر مجھے برتنوں کی واپسی کا اشارہ کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا وہاں نہایت ہی قیمتی ہوں جنہیں استعمال کرتے ہوئے بہت کچھ سوچنا سمجھنا پڑتا ہو۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا وہ شخص کسی مصلحت کے تحت میرے سامنے زبان نہ کھول رہا ہو' اسے اس سلسلے میں سخت ترین ہدایات دی گئی ہوں۔ یہ خیال قرین قیاس تھا کیونکہ مجھے مخاطب کرنے کے لیے بھی تقریر کے بجائے تحریر کا سہارا لیا گیا تھا۔

میں نے خالی اور بھرے ہوئے برتنوں سمیت وہ ٹرے اس شخص کو واپس کردی۔ یہ منتقلی اسی طریقے سے ہوئی تھی جیسے وہ ناشتا کوٹھری کے اندر پہنچایا گیا تھا۔ سکیورٹی گارڈ نے ٹرے میں موجود سامان کا بہ غور جائزہ لیا اور خاموشی سے رخصت ہوگیا۔ ٹرے کو گھورنے کا اس کا انداز ایسا ہی تھا' جیسے یہ معلوم کرنے کی کوشش کررہا ہو' میں نے کوئی برتن اپنے پاس تو نہیں رکھ لیا!

تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے باہر ایک مرتبہ پھر ہلچل کے آثار نمودار ہوئے۔ میں نے چند چلتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں اور پوری طرح کھڑکی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ یہ میں نے اندازہ لگایا ہے ورنہ وقت بتانے والا کوئی آلہ مجھے میسر نہیں تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا' اس وقت دن تھا یا رات! میرے خیال کے مطابق اب مجھے برنارڈ لیو کے پاس لے جایا جانے والا تھا۔

لیکن اگلے ہی لمحے میرے اس خیال کی تردید ہوگئی۔ وہ لوگ فی الحال مجھے اس کال کوٹھری سے نکالنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ برنارڈ لیو نامی وہ شخص بہ نفسِ نفیس کھڑکی کے باہر

پہنچنے والا تھا کیوں کہ ایک آرام دہ منقش کرسی کو وہاں رکھ دیا گیا تھا۔ مذکورہ کرسی دو افراد نے وہاں پہنچائی تھی اور وہ جس خاموشی سے آئے تھے اسی خاموشی کے ساتھ کرسی وہاں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ ان کے اجسام پر بھی سکیورٹی گارڈز والے یونیفارم تھے۔

امریکی خصوصاً یہودی وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ برنارڈلیو نے بھی مجھے زیادہ انتظار نہیں کرایا اور کرسی وہاں پہنچنے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ اس کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ میں کھڑکی کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

برنارڈلیو نے میری جانب دیکھتے ہوئے سر کو خفیف سی افہامی جنبش دی۔ شاید یہ اس کا ''ہیلو ہائے'' کا انداز تھا۔ میں گہری نظر سے اس کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی عمر اسی کے قریب ہوگی تاہم وہ خاصا صحت مند اور فٹ تھا۔ اس کی چوکسی کا مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا جب وہ تیز اور مستعد قدموں سے چلتے ہوئے اس کرسی تک پہنچا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ رہا ہوگا۔ سر کے بال اور بھویں تک سفید اور پیشانی بڑی حد تک صاف ہو چکی تھی۔ گویا وہاں ''ایم'' نمودار ہو چکا تھا۔ رنگت سرخ و سفید چہرہ بیضوی آنکھیں نیلی اور عصیلی۔ تھوڑی فربہ اور چوڑی جو اس کے دولت مند ہونے کی علامت تھی۔ پیشانی کی کشادگی اور آنکھوں کی گہرائی سے ذہانت مترشح تھی۔ اس نے رسمی علیک سلیک کو ضروری نہ سمجھا اور براہِ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''مسٹر وجدان! ہمارا مہمان بن کر تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟''

''نہایت ہی واہیات!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر شستہ انگریزی میں جواب دیا ''لگتا ہے تم لوگ ''مہمان'' کے مفہوم سے نا آشنا ہو۔ مہمان داری تو بہت دور کی بات ہے!''

وہ میری اس ترش کلامی کو بڑے تحمل سے پی گیا' ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''دراصل ہمارے نزدیک دوست اور دشمن کی مہمان نوازی کے آداب اور طریقہ جدا جدا ہے۔''

''مجھے تم لوگ اپنا دوست سمجھتے ہو۔ یا دشمن؟'' میں نے بدستور سخت لہجے میں استفسار کیا ''اگر تم کہو گے دوست...... تو مجھے یقین نہیں آئے گا۔ تم لوگوں نے ہمارے ساتھ بدترین دشمنوں ایسا سلوک کیا ہے۔''

وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا ''فی الحال تم دوست ہو اور نہ ہی دشمن۔ تمہارا آئندہ رویہ تمہاری حیثیت کا تعین کرے گا۔'' ایک لمحے کو متوقف ہونے کے بعد اس نے اضافہ کیا ''بہر حال اب تک تمہارے ساتھ جو بھی ناروا سلوک ہوا' وہ ہماری مجبوری تھی۔ تمہاری خطرناکی نے ہمیں بے حد محتاط بنا دیا تھا۔''

میں نے اس سے اپنی خطرناکی کی تفصیل نہیں مانگی اور براہِ راست مقصد کی بات کی طرف آ گیا۔ میں بھی ایک لمحہ ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔

''تم نے میرے آئندہ رویے اور حیثیت کے تعین کی کیا بات کی ہے؟''

''خاصے سمجھ دار ہو۔'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا ''میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم تمہیں دوست بنانے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔ اگر تم نے ہماری بات مان لی تو زندگی بھر عیش کرو گے۔''

میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا ''تم کون لوگ ہو؟''

''ہمارا تعلق یہودی لابی کے ایک اعلیٰ وارفع طبقے سے ہے۔''

''تم لوگوں نے امریکی سی آئی اے کے تعاون سے مجھے الاسکا پہنچایا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''یہ بھی تو عین ممکن ہے' میں اس وقت سی آئی اے والوں کے درمیان ہوں؟''

''میں تمہیں ایسا سوچنے سے روک تو نہیں سکتا البتہ یہ ضرور کہوں گا ہمارا تعلق سی آئی اے اور ایف بی آئی والوں سے ہرگز نہیں۔ ہم جس یہودی تنظیم سے وابستہ ہیں اس کا نام ''جے ڈی پی'' ہے۔ یہ راز ہمارے چند خاص خاص لوگوں تک محدود ہے۔ تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے قوی امید ہے ہم تمہیں اپنا دوست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے اور بہ فرض محال اگر ایسا نہیں بھی ہو سکا تو بھی تم ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے۔ تم نہیں جانتے اس وقت تم کہاں ہو اور آئندہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے!''

اس کے الفاظ میں چھپی ہوئی دھمکی کو میں نے بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کیا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

''مسٹر لیو! چلو میں تسلیم کر لیتا ہوں تم سی آئی اے یا ایف بی آئی والے نہیں لیکن تم نے جس طرح سی آئی اے والوں کے تعاون سے مجھے مجبور و بے کس بنا کر یہاں تک پہنچوایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' وہ لوگ تمہارے لیے کام کرنے کو ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تم لوگوں کا اچھا خاصا اثر ہے ان پر؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ [illegible]

لہجے میں بولا ''سی آئی اے ہو یا ایف بی آئی یا پھر پنٹاگون ہو' یہ ادارے ہمارے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ تمہیں ''جے ڈی پی'' کی طاقت کا شاید اندازہ نہیں!''

''جے ڈی پی کا لفظ یا الفاظ میرے لیے نئے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں یہودی لابی اس وقت بہت طاقت میں ہے۔ امریکا کا صدارتی نظام ان کی مرضی کے مطابق چلتا ہے۔ وہ جس کو چاہیں کرسیِ صدارت پر بٹھا دیں اور جسے چاہیں' عوام کی نگاہ میں ذلیل و رسوا کرا دیں۔''

وہ فخریہ انداز میں مسکرایا۔ اس کے کرخت چہرے پر مسکراہٹ نے عجیب سا تاثر ابھارا۔ رعونت بھرے لہجے میں بولا ''ہم کنگ میکر ہیں۔ صرف امریکا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہماری حکمرانی ہے۔ ہم لوگوں' قوموں اور ملکوں کی تقدیر لکھتے ہیں۔ تم ہماری دوستی پر ناز کرو گے۔''

میں نے اسے کھنے کی خاطر پوچھا ''مجھ پر سنگین الزامات عائد کر کے پاکستان سے یہاں لے آیا گیا ہے اور اب تم میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو۔ میں تو توقع کر رہا تھا' مجھے ڈی سی پہنچایا جائے گا' مجھ پر مقدمہ چلے گا اور سخت ترین سزا سے گزارا جائے گا جیسا کہ تم لوگ ایمل کاسی کے ساتھ کرنے والے ہو مگر تمہارا حالیہ رویہ دیکھ کر میں الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ یہ تم لوگوں کی کون سی پالیسی ہے؟''

''ایک تو تمہیں غیر متعلق لوگوں کو اپنے ساتھ نتھی کرنے کا بڑا شوق ہے۔'' اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا ''تم صرف اپنے بارے میں سوچو، ایمل کاسی اور دھنو تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔''

میں تڑپ کر رہ گیا۔ ایمل کاسی سے واقعی میرا کوئی تعلق واسطہ کبھی نہیں رہا تھا لیکن دھنو یعنی ساحل تو میرے لیے رگِ جاں کی حیثیت رکھتی تھی اور وہ منحوس برنارڈلیو اسے غیر متعلق کہہ رہا تھا۔ میرے چہرے پر ابھرنے والے ناگواری کے تاثرات کو اس نے فوراً نوٹ کر لیا۔

''ایک تو تم مشرقی لوگ خصوصاً پاکستانی بہت جوشیلے اور جذباتی ہوتے ہو۔ تم میں تحمل اور برداشت نام کی کوئی چیز نہیں۔ تمہارے احساسات کو ذرا سی ٹھیس لگے تو فوراً بھڑک اٹھتے ہو۔''

میں نے اس کے تبصرے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار اس طوطا مار کا ناک والے یہودی نے بھی کیا تھا۔ میں خاموشی سے برنارڈلیو کو گھورتا رہا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری تسلی کے لیے بتا دوں کہ ایمل کاسی امریکی سی آئی اے کا مجرم ہے۔ اس نے نہایت ہی اہم امریکی ایجنٹس کو قتل کیا تھا۔ سی آئی اے والوں نے اسے پکڑنے کے لیے وقت اور ڈالرز بے دریغ خرچ کیے ہیں۔ اب اس پر، امریکی قوانین کے مطابق باقاعدہ مقدمہ چلے گا اور اس کا جو بھی حشر ہوگا وہ دنیا دیکھے گی۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''شاید یہ بات تمہارے علم میں نہ ہو کہ ایمل کاسی ایک طویل عرصے تک سی آئی اے والوں کے لیے خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ پھر اچانک اس کے دماغ میں ایک پھوڑا اٹھا اور وہ سی آئی اے کا دشمن ہو گیا۔ اسی خواہ مخواہ کی دشمنی میں اس نے سی آئی اے کے ایجنٹس کو قتل کر دیا۔''

''واقعی مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ بولا ''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' غیر متعلق معاملات میں مت کودو۔''

مجھے اس کا انداز بہت برا لگا اور میں نے ناگواری سے کہہ دیا ''ایمل کاسی کا معاملہ تو ایک طرف رہنے دو لیکن ساحل میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اسے غیر متعلق نہیں کہہ سکتے؟''

وہ خاموش نظر سے چند لمحے مجھے گھورتا رہا پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا ''تم دونوں کی مکمل رپورٹ ہم تک پہنچ چکی ہے۔ میں جانتا ہوں' تمہارے درمیان کس قسم کا تعلق ہے لیکن تمہاری معلومات کے لیے بتا دوں کہ جب تک تم ہمارے دوست نہیں بن جاتے' ہم تم دونوں کو آپس میں ملنے نہیں دیں گے۔ دونوں معاملات کو الگ ڈیل کیا جائے گا۔ ہماری دوستی کا ہاتھ تھام لینے میں تم دونوں کا فائدہ ہے۔''

شعیب غوری اور ازاں بعد سی آئی اے کے ایجنٹ کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہودی لابی' ساحل میں کسی بیش بہا خزانے کی وجہ سے دلچسپی لے رہی ہے۔ اسی لابی کا ایک نمائندہ برنارڈلیو اس وقت مجھ سے مذاکرات کر رہا تھا۔ میں نے سوچا اس کو کریدنا چاہیے۔

''مسٹر لیو!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے مخاطب کیا ''مجھے پتا چلا ہے آپ لوگ کسی قیمتی خزانے کا راز جاننے کے لیے میری ساتھی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ یہ کیا چکر ہے؟''

وہ محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا ''دھنو ایک انمول خزانے کے راز سے واقف ہے۔ وہ خزانہ مادی اور روحانی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے ربی موشے ہائمن اس خزانے کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

موشے ہائمن...... یہ ایک نیا نام سامنے آیا تھا۔ لیو کے لب و لہجے میں شامل ادب و احترام یہ ظاہر کرتا تھا' مذکورہ ربی کوئی بہت ہی اونچی چیز تھا۔ میں نے کرید جاری رکھی اور سرسری انداز میں کہا۔

''ساحل یعنی دھنو تو ایک سیدھی سادی لڑکی ہے۔ تم کسی خزانے کے راز کو اس سے منسوب کر کے مجھے حیرت میں ڈال رہے ہو!''

وہ چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر استفسار کیا'' کیا تم اس خزانے کے بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتے؟''

میں نے بے پروائی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

وہ بے یقینی سے بولا'' دھنو تمہارے بہت قریب رہی ہے۔ میرا خیال ہے' اس نے اس بارے میں کبھی نہ کبھی تو ذکر کیا ہوگا!''

''اگر اس نے یہ بات مجھے بتائی ہوتی تو میں پہلی فرصت میں وہ خزانہ کھودنے نکل کھڑا ہوتا۔'' میں نے خالصتاً امریکی مزاج کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا'' تمہاری بات پر یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔ یہ دھنو بہت ہی گہری اور مضبوط لڑکی ہے۔ ابھی تک اس نے ہمیں بھی کچھ بتا کر نہیں دیا۔''

میں آہستہ آہستہ اسے اپنے ٹریپ میں لا رہا تھا۔ اچانک میں نے ایک باؤنسر مار دیا'' کہیں اس خزانے کا تعلق بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ سے تو نہیں؟''

برنارڈ لیو نیچی اور سیدھی بالز پر کافی رنز اسکور کر چکا تھا۔ میرے باؤنسر نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا'' ہاں وہ خفیہ خزانہ اسی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ ہے۔''

میں لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجا کر اس کی نیلی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

اگلے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا' تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ وہ نادانستگی میں مجھے اپنی سوچ کے بہت قریب لے آیا تھا تاہم وہ ایک یہودی تھا۔ اپنی فطری عیاری کو استعمال کرتے ہوئے اس نے تشویش ناک لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''کیا تم بھی اس راز سے آگاہی رکھتے ہو؟''

''بالکل نہیں'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''پھر تم نے بالکل درست حوالہ کیسے دیا؟'' اس پر ایک کرید سوار ہو گئی تھی۔

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا'' میں نے ایک اندازہ لگایا تھا جو اتفاق سے درست نکل آیا۔''

''درست اندازہ لگانا بھی ہر کسی کے بس کی بات نہیں!''

میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا'' دراصل ساحل (دھنو) سے میری پہلی ملاقات اسی عبادت گاہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ میرے ساتھ ہی رہی ہے اس لیے میں نے سوچا' اگر وہ کسی خزانے کے راز سے واقف ہے تو لامحالہ اس کا تعلق اسی بدھ عبادت گاہ سے ہوگا!''

''ہم تمہارے پیدا ہونے سے لے کر اب تک کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولا'' تم کھٹمنڈو کے مضافات میں واقع اس عبادت گاہ تک کیسے پہنچے اور اس کے بعد اب تک کیا کرتے رہے ہو اس کی ہمیں مکمل خبر ہو چکی ہے۔ تمہاری صلاحیتوں کو ناپنے اور بھانپنے کے بعد ہی ہم نے تمہارا انتخاب کیا ہے' ہم کسی پر کچا ہاتھ نہیں ڈالتے۔ تمہاری ہسٹری کا شاید ہی کوئی صفحہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہو!''

وہ میری ذات کو فوکس کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے چالاکی سے موضوع بدل دیا اور کہا'' تم لوگ تو بے پناہ طاقت کے مالک ہو' بے حساب اختیار رکھتے ہو۔ جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس عبادت گاہ کے تہ خانے کوئی خزانہ موجود ہے تو تم اسے کھود کر نکال لو۔ خواہ مخواہ ساحل کی محتاجی کی کیا ضرورت ہے؟''

''ایسا کرنا اگر ممکن ہوتا تو پھر کیا بات تھی۔'' وہ بے دلی سے بولا۔

''کیوں' ایسا کرنے میں کیا مشکل ہے؟''

''مشکل!'' اس نے خلا میں گھورا اور بولا'' ہم یہ کوشش کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمارے ربی موشے ہائمن کا کہنا ہے' اگر عبادت گاہ کے تہ خانے کو کھودا گیا تو کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا' سوائے ہلاکت اور بربادی کے۔ اس خزانے تک پہنچنے کا طریقہ کار صرف دھنو کو معلوم ہے اور...... ہم بہت جلد اسے تعاون کے لیے آمادہ کر لیں گے۔ وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ اسے ربی کی بات ماننا ہی ہوگی۔''

برنارڈ لیو کی بات سن کر میرے ذہن میں تھونچی کے الفاظ گونجنے لگے۔ ساحل کے باپ تھونچی نے مجھے بتایا تھا' جب بھی سونے کے اس بیش بہا ذخیرے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی تو عبادت گاہ میں خون کی ندیاں امڈ آئیں اور درجنوں سیکڑوں ہلاکتیں وجود میں آئیں۔ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا

وہ یہودی بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا اور...... یہ معلومات اس تک ان کے ربی نے پہنچائی تھیں۔ موشے ہائمن واقعی کوئی بہت پہنچی ہوئی شخصیت تھا۔

میں نے لیو سے پوچھا'' تمہارے ربی نے اس خزانے کی کوئی تفصیل تو بتائی ہوگی؟''

میں درحقیقت یہ جاننا چاہتا تھا' وہ لوگ صرف سونے کے ذخیرے تک محدود تھے یا کہانی اس سے بھی آگے کی تھی۔ یہودیوں کا ربی بے پناہ روحانی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔ اس کا درجہ روحانی اور مذہبی لیڈر' استاد اور اسکالر جیسا ہوتا ہے۔ اس کے لیے روحانی پیشوا کے الفاظ زیادہ مناسب ہیں۔ وہ مادی اور روحانی علوم کا ماہر ہوتا ہے۔ ظاہر اور باطن کے بہت سے معاملات پر اسے تصرف حاصل ہوتا ہے۔

لیو نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا'' ربی موشے ہائمن کا کہنا ہے کہ اس عبادت گاہ کے تہ خانے میں سونے کے ایک بڑے ذخیرے کے علاوہ پانچ نایاب اور انمول اسٹون بھی موجود ہیں۔ نایاب اور انمول ان معنوں میں کہ ان کے سائز' معیار اور تراش خراش کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ وہ دنیا میں تنہا و یکتا ہیں' کوئی ان جیسا دوسرا روئے زمین پر نہیں پایا جاتا۔ وہ پانچ بابرکت اسٹون روبی' ایمرالڈ' سیفائر' ٹوپاز اور ڈائمنڈ ہیں۔ یہ پانچوں اسٹون جہاں بھی ایک ساتھ موجود ہوں وہاں بے پناہ روحانی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے ربی اسی حوالے سے ان میں دلچسپی لے رہے ہیں۔''

میں صرف سونے کے ذخیرے کے بارے میں جانتا تھا۔ لیو نے اسٹونز کے حوالے سے جو انکشاف کیا تھا' اس نے وقتی طور پر میرے ہوش اڑا دیے تھے اور سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی سوال ابھرا تھا کہ کیا واقعی ساحل کسی نایاب خزانے تک پہنچنے کا راستہ جانتی ہے؟ میرا سابق تجربہ اور معلومات اس سوال کا جواب نفی میں دیتے تھے۔ بہرحال یہودیوں کے ربی کے دعوے کو آسانی سے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ سونے والے ذخیرے کا درست پتا دے رہا تھا تو اسٹونز والے معاملے کو یکسر رد کرنا بہت مشکل تھا۔ اس خطرناک سوال کا درست جواب ساحل ہی دے سکتی تھی اور ...... ساحل میری دسترس میں نہیں تھی!

میں نے برنارڈ لیو سے پوچھا'' تم مجھے اتنی اہم معلومات دے رہے ہو۔ کیا تمہیں ڈر نہیں کہ میں یہاں سے نکلنے کے بعد تم لوگوں کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہوں؟''

''مشکلات!'' اس نے نیم طنزیہ انداز میں کہا'' یہ سب تو اس وقت ممکن ہوگا جب تم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔'' وہ ایک لمحے کو خاموش رہنے کے بعد گمبھیر لہجے میں بولا'' وجدان! تم اس وقت '' جے ڈی پی'' کے ایک نہایت ہی خفیہ اڈے پر ہو۔ تمہارے یہاں سے باہر نکلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ تم ہمارے دوست بن جاؤ۔''

''میں اس وقت الاسکا کے کس حصے میں ہوں؟'' بے اختیار میں نے پوچھا۔

وہ بڑے اعتماد سے بولا'' یہ جے ڈی پی کا ایک ایسا پراسرار ٹھکانا ہے جس کے بارے میں الاسکا کے باسی کچھ نہیں جانتے۔ یوں سمجھ لو ہم سب کے درمیان بھی ہیں لیکن کوئی آنکھ ہمیں دیکھ نہیں سکتی۔ یہ ایک ان سین زون ہے...... نادیدہ اور ماورائی مقام!''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہیں تم مجھے مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے تو یہ لمبی لمبی نہیں چھوڑ رہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''نہیں!'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا'' ہمیں ایسی کسی کوشش کی ضرورت ہے اور نہ ہی تم ایسی باتوں سے متاثر ہونے والے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

آخری جملہ اس نے میری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے ادا کیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے پوچھ لیا'' تم نے میری بات کا جواب گول کر دیا ہے۔ ابھی تک یہ نہیں بتایا' تمہارا یہ خفیہ اڈا الاسکا کے کس علاقے میں واقع ہے؟''

''اس سوال کا جواب تمہیں اس وقت دیا جائے گا جب تم ہماری دوستی قبول کر لو گے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا'' بہرحال یہ بہت ہی پاکیزہ اور صاف ستھرا مقام ہے۔ باہر کے لوگوں کو یہاں لانے کی ضرورت پیش آ جائے تو پہلے انہیں نہلا دھلا کر اچھی طرح پاک صاف کر لیا جاتا ہے۔ تمہیں اینکریج میں ملنے والا وہ ریسیپشن تو یاد ہوگا؟''

اس نے لفظ'' ریسیپشن'' پر خاصا زور دیا تھا۔ میرے تصور میں وہ ہیجان خیز باتھ گھوم گیا جب روزی اور رونی نے مجھے ایک کنگ سائز باتھ ٹب میں مل مل کر دھویا تھا۔ اس یادگار باتھ کو میں بھلا کیسے سکتا تھا۔ حالانکہ اس وقت میں لگ بھگ آدھے بدن سے بیدار تھا لیکن پھر بھی مجھے نہلانے کے دوران میں روزی اور رونی نے اپنی گداز انگلیوں سے وہ اٹکھیلیاں کیں جنہوں نے مجھے سنسنا کر رکھ دیا تھا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ بنکاک میں گزرا تھا' جہاں مساج اینڈ باتھ پارلر کی کوئی کمی نہیں۔ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھائی وانگ بھی ایک مساج پارلر چلاتی تھی۔ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا' ایسے

سینٹرز پر کس طرح گاہک کی خدمت کی جاتی ہے' لیکن روزی اور روئی نے جس فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا وہ بے مثال اور ناقابلِ فراموش تھا۔

برنارڈلیو کی کھردری آواز نے مجھے تصور کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ وہ مزید بتا رہا تھا" حالانکہ تم اس وقت ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بند ہو لیکن تم نے یہاں کسی قسم کے گھٹن یا آلودگی محسوس نہیں کی ہوگی۔ اس پورے اڈے کو انتہائی فرحت بخش اور پاک صاف رکھا گیا ہے۔ اس وقت باہر درجہ حرارت منفی پندرہ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ بیرونی فضا میں تم چند منٹ سے زیادہ سلامت نہیں رہ سکتے' دیکھتے ہی دیکھتے برف کا حصہ بن جاؤ گے لیکن کوٹھری کے اندر تم بغیر کچھ اوڑھے یا اضافی گرم لباس پہنے بڑے آرام سے کھڑے ہو۔"

اس حوالے سے واقعی بڑا حیرت زدہ تھا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا" یہ سب کیسے ممکن ہوا؟"

اس نے بتایا" یہ ہمارے ربی موشے ہائمن کا کمال ہے۔"

ربی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے انداز میں ایک عجیب سا تفاخر آ جاتا تھا۔ میں فروعی باتوں کو پسِ پشت ڈال کر انتہائی مقصد کی طرف آ گیا۔ ان کے ربی کی شان میں سنائے جانے والے قصیدوں سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے برنارڈلیو سے سوال کیا۔

"دوست بنا کر تم لوگ مجھ سے کیا کام لوگے؟"

"دوست' دوست کے کام آتا ہے!" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا" ہم تمہارا ہر طرح سے خیال رکھیں گے' تم ہمارے کام آتے رہنا۔ تم جیسے لوگوں کی ہمیں تلاش رہتی ہے۔ تم اب تک چھوٹے موٹے دشمنوں سے نبرد آزما رہے ہو۔ ہمارے ساتھ مل کر تمہیں بڑے کام کرنے کا موقع ملے گا۔"

"تم نے ابھی تک کام کی نوعیت نہیں بتائی؟" میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

"تفصیلات تمہیں ربی موشے ہائمن بتائیں گے۔"

میں سمجھ گیا' وہ میری بات کا جواب نہیں دے گا۔ میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا" اور ان سنگین الزامات کا کیا ہوگا جو یہاں لانے سے پہلے مجھ پر عائد کیے گئے تھے۔ میں نے یہود نواز تنظیم سی ایف کے کو شدید نقصان پہنچایا ہے اور بہ قول تم لوگوں کے تین یہودیوں کا قاتل بھی ہوں حالانکہ تمہارا وہ مارشل آرٹس چیمپئن تو ایک خون ریز مقابلے میں مارا گیا تھا۔ ازیں علاوہ وہ "سی ڈی" والا معاملہ بھی ابھی بیچ میں ہی لٹکا ہوا ہے۔"

اس نے تحمل سے میری بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا" دوستی کی صورت میں تمہاری تمام خطائیں معاف کردی جائیں گی۔ ہم بڑے کشادہ دل اور وسیع ظرف کے مالک ہیں۔"

میں نے ان کی کشادہ دلی اور وسیع ظرفی پر بہ زبانِ خموشی لاحول بھیجی .... اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا" ویسے اس سی ڈی میں کون سا راز پوشیدہ تھا؟ طوطے کی چونچ والے اس سی آئی اے کے ایجنٹ نے مجھے بتایا تھا' سی ڈی میں میرے ملک پاکستان کے بارے میں کوئی اہم معلومات تھیں!"

"جانسن پلیدر نے تم سے غلط نہیں کہا تھا۔"

"کیا یہ اسی ایجنٹ کا نام ہے؟" میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"وہ جانسن نہیں بلکہ ڈاگ سن ہے اور اگر تم اس کے نام کے آخری حصے سے "آر" اڑا دو تو یہ زیادہ مناسب رہے گا۔ اردو اور انگریزی کا حسین ملاپ دیکھنے میں آئے گا......ڈاگ سن پلید!"

اس امریکی ایجنٹ کے لیے میرے دل و دماغ میں بے حد غصہ بھرا ہوا تھا۔ لیو کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تاہم اس کے مضبوط اعصاب نے اسے طیش میں آنے سے روکے رکھا۔ سی ڈی کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے اس نے بتایا۔

"سی آئی اے کا نیٹ ورک پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر امریکی بہ نفسِ نفیس خود جا جا کر دوسرے ملکوں میں کام کریں تو فوراً عوام و خواص کی نظروں میں آ جائیں گے لہٰذا انہیں وہاں کے مقامی بااثر اور معلومات یافتہ افراد سے کام لینا پڑتا ہے۔ اپنے کام کے بندے کو یہ لوگ کسی نہ کسی طرح چنگل میں پھنسا ہی لیتے ہیں پھر وہ ان کے آگے مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ہی ملک کے اندر اپنے ہم قوم افراد کے درمیان نہایت ہی خفیہ طور پر امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کے طور پر کام کرنے لگتا ہے۔ تاہم سی آئی اے والے اسے ایک لمحے کے لیے بھی آزاد نہیں چھوڑتے۔ اس کی نادیدہ نگرانی جاری رہتی ہے۔ اگر وہ انہیں دھوکا دینے کی کوشش کرے تو ایسی "ٹھوکر" لگائی جاتی ہے کہ آئندہ کے لیے "وہ راہِ راست" پر آ جاتا ہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"شعیب غوری اور ایمل کاسی کی مثالیں تمہارے سامنے

ہیں۔ تم پر جس سی ڈی کی چوری کا الزام ہے' اس میں ان تمام افراد کی مکمل فہرست تھی جو پاکستان کے مختلف علاقوں میں امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ معلومات کوڈ ورڈز میں ہیں لیکن کمپیوٹر کا کوئی ماہر انہیں بہ آسانی ڈی کوڈ کر سکتا ہے۔"

برنارڈلیو نہایت ہی خطرناک انکشاف کر رہا تھا۔ کاش' ایسی کوئی سی ڈی واقعتاً میرے ہاتھ لگ جاتی! میں ان ناسوروں کو نیست و نابود کر دیتا جو اغیار کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر میرے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ افسوس! وہ نہایت ہی اہم سی ڈی نعلی وجدان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں' وہ آفت زادہ اس سی ڈی کی معلومات کو کس کام میں لانے والا تھا!

میں نے برنارڈلیو سے پوچھا" ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے بتایا ہے' شعیب غوری کراچی میں سی آئی اے کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا لیکن میری معلومات کے مطابق وہ وہاں یہودی لابی کا آلۂ کار ہے۔ ان کے مقاصد کو پروان چڑھانے کے لیے اس نے نام نہاد اصلاحی تنظیم کرائم فری کراچی (سی ایف کے) کی آڑ لے رکھی ہے؟"

وہ زیرِلب معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا" ایک ہی بات ہے!"

میں نے پوچھا" میں نے تین یہودیوں کو قتل کیا ہے......تمہارے شمار کے مطابق......اور سی آئی اے والوں کی ایک خفیہ سی ڈی چرائی ہے۔ ان سنگین جرائم کی بنا پر مجھے ڈی سی پہنچایا جانا چاہیے تھا۔ سی آئی اے والوں نے مجھے اتنی آسانی سے چھوڑ کیسے دیا؟"

"یہ بھی ہمارے ربی کا کمال ہے!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا" ربی موشے ہائمن کے سامنے کوئی سوال نہیں اٹھا سکتا۔ انہوں نے تم دونوں کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ تمہیں ڈی سی کے بجائے اسرائیل پہنچایا جائے گا۔ پہلے ربی اپنا کام کریں گے' اس کے بعد اگر ضرورت محسوس ہوئی تو تمہیں واشنگٹن ڈی سی روانہ کر دیا جائے۔ ڈی سی والے تم لوگوں سے......"

میں اس کی بات سن کو چونک اٹھا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہا" پھر ہمیں اسرائیل کے بجائے الاسکا کے برف زار میں کیوں لا کر پھینک دیا گیا؟"

"میں یہی بتانے جا رہا تھا" وہ رسانیت سے بولا" لیکن تم نے میری بات کاٹ دی۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا" تمہیں اسرائیل کے بجائے الاسکا لانے

کا فیصلہ بھی ربی موشے ہائمن ہی کا ہے" جے ڈی پی" کا ہیڈکوارٹر تو اسرائیل ہی میں ہے تاہم ہیڈکوارٹر کے بعد یہ ٹھکانا سب سے زیادہ محفوظ سمجھا جاتا ہے جہاں پر تم اس وقت موجود ہو۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ اس ٹھکانے کے وجود سے کوئی واقف نہیں' سوائے انتہائی متعلقہ لوگوں کے۔"

اس نے سانس لینے کی خاطر تھوڑا توقف کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جب تم یو ایس ائربیس پر ایک طیارے کے اندر بیٹھے جانسن پلیدر کے سوالات کے جواب دے رہے تھے تو اسی وقت ہمارے ربی نے اسرائیل جانے کا پروگرام کینسل کر کے الاسکا کا فیصلہ سنا دیا تھا۔"

"آخر ایسا کیوں کیا گیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں تمہیں بتا چکا ہوں' ربی کے فیصلوں پر سوال نہیں کیا جاتا!" برنارڈلیو نے کہا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا" اگر مجھے تمہارے ربی سے ملنے کا موقع ملا تو میں یہ سوال ضرور اٹھاؤں گا۔"

برنارڈلیو نے غصیلی نظر سے مجھے گھورا۔ اس کی دانست میں' میں ان کے ربی کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔ انداز دھمکی دینے والا تھا۔

"اگر میری باتیں تمہاری سمجھ میں نہ اتر سکیں تو پھر ربی تمہیں "ٹریٹ" کریں گے۔ بہرحال ہم نے تم سے کام تو لینا ہے۔ ربی اپنا کوئی مشن ادھورا نہیں چھوڑتے۔"

میں نے اکڑے ہوئے لہجے میں کہا" اگر میں تم لوگوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دوں تو؟"

"میں نے کہا نا' پھر تمہیں ربی موشے ہائمن کے حوالے کیا جائے گا۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا" ربی سنگین ترین انکار کو بھی آسان ترین اقرار میں بدلنے کا ہنر جانتے ہیں۔"

میں نے جل کر کہا" تو پھر یہی بہتر ہے' تم پہلی فرصت میں مجھے اپنے ربی کے پاس لے چلو۔ میں تم لوگوں کی منافقانہ دوستی پر سوالاکھ لعنت بھیجتا ہوں۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں مٹھیوں کو بار بار بھینچ کھول رہا تھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ میرے طرزِ تکلم اور الفاظ کی آتش بازی نے اسے پاتا سر آگ کا گولا بنا دیا تا ہم چند لمحات کے بعد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ربی کی جانب سے فی الحال تمہیں کچھ نہ کہنے کے احکام ہیں لیکن فکر نہ کرو' تمہارے دماغ کی ساری گرمی کو کشید کر کے وہاں الاسکا کی ٹھنڈی ٹھار برف کو سجا دیا جائے گا۔ تم بہ خوشی ہمارے اشاروں پر ناچنے لگو گے۔''

میں خاموشی اور معاندانہ نظر سے یک ٹک اسے گھورتا چلا گیا۔ وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''تمہارے پاس صرف آج رات کی مہلت ہے۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے اچھی طرح سوچ کر فیصلہ کرلو — اگر صبح تمہارا فیصلہ ہماری دوستی کے حق میں ہوا تو بڑی اچھی بات ہے۔ بہ صورتِ دیگر تمہیں ربی کے سپرد کردیا جائے گا۔ دیٹس آل!''

بات ختم کر کے وہ مڑا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے میری نگاہ سے اوجھل ہوگیا۔

☆☆☆

برنارڈلیو کے ساتھ ہونے والی طویل گفتگو نے کوفت کے ساتھ ساتھ میری معلومات میں بھی بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ میں امریکی سی آئی اے اور صیہونی (یہودی) تنظیم ''جے ڈی پی'' کے درمیان تختۂ مشق بن کر رہ گیا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایک نیا اور ہنگامہ خیز موڑ تھا۔ پتا نہیں حالات کی کروٹ مجھے کہاں پہنچانے والی تھی!

بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے حوالے سے لیو نے حیرت انگیز انکشاف کیا تھا۔ میں صرف تہ خانے والے سونے کے ذخیرے سے واقف تھا۔ ربی موشے ہائمن کا دعویٰ تھا' اسی تہ خانے کے کسی حصے میں پانچ قیمتی پتھر ڈائمنڈ (ہیرا) ایمرالڈ (پنا) روبی (یاقوت) سیفائر (نیلم) اور ٹوپاز (پکھراج) بھی موجود تھے جو اپنی ساخت اور تراش خراش کی بنا پر انمول اور نایاب تھے اور...... ان روحانی نایاب پتھروں تک صرف اور صرف ساحل ہی پہنچا سکتی تھی لیکن مجھے ساحل کہیں سے بھی ایسی نہیں لگتی تھی!

برنارڈلیو نے رخصت ہوتے ہوئے مجھے ایک رات کی مہلت دی تھی تاکہ میں ان کی دوستی یا دشمنی کا انتخاب کرنے کے لیے اچھی طرح سوچ بچار کرلوں۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا' وہاں رات یا تو شروع ہو چکی تھی یا پھر شروع ہونے والی تھی۔ مجھے لیو سے یہ پوچھنے کا خیال نہیں رہا تھا کہ اس کوٹھری میں مجھے داخل کیسے کیا گیا تھا جب کہ اس کی دیواروں میں دروازہ نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ ننھی منی عجیب الشکل واحد کھڑکی سے انسانی داخلہ ممکن نہیں تھا۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھے ایک جگہ پر خاموش بٹھا کر وہ کوٹھری نما چھوٹا سا کمرا تعمیر کیا گیا تھا!

میرے بدن کے مفلوج حصے پورے طرح بیدار ہو چکے تھے۔ ہلکے پھلکے ناشتے نے جسم میں مزید چستی بھر دی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد مجھے جماہیاں آنے لگیں۔ یہ اس کافی کا اثر تھا جو ناشتے میں' میں نے پی تھی۔ چائے اور کافی مجھ پر الٹا اثر کرتی ہیں' نیند بھگانے کے بجائے یہ اسے دعوت دے کر بلاتی ہیں۔ میں جا کر میٹرس پر لیٹ گیا۔

کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے مجھے سوچ بچار کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا فیصلہ اٹل تھا اور وہ یہ کہ مجھے کسی بھی صورت یہودیوں کا آلۂ کار نہیں بننا تھا۔ نہ دوست کی شکل میں اور نہ ہی دشمن کے روپ میں لہٰذا زیادہ بہتر یہی تھا کہ میں اپنی نیند پوری کرلوں۔ پتا نہیں آئندہ کیسے حالات پیش آتے' گھنٹوں آنکھ لگانے کا موقع بھی ملتا یا نہیں!

اب میرا سابقہ چوہدری نوازش علی یا شعیب غوری جیسے دشمنوں سے نہیں تھا۔ یہودی اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھے۔ اس قوت سے نمٹنے کے لیے مجھے اپنی ذہنی' جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کو بہ یک وقت بروئے کار لانا تھا اور اس سلسلے میں ''چی'' کا شعبہ نہایت ہی اہم تھا۔

ایسا سوچتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نیند کی وادی میں اترنے سے قبل یوگا اور چی کی مخصوص مشقیں کرنا ضروری تھا۔ میں نے جسم کو آمادہ کرنے کے لیے ہتھ یوگ کے دو تین آسن لگائے مبینہ طور پر وہ رات کا وقت تھا تاہم کوٹھری کے اندر بڑی فرحت اور آسودگی محسوس ہوتی تھی۔ پتا نہیں یہ ائرکنڈیشننگ کا کیسا نظام تھا' میری تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

لوٹس پوسچر' کوبرا پوسچر اور پلو پوسچر کے بعد میں نے کینڈل پوسچر لگایا اور سانس کی مشق کے لیے آلتی پالتی مار کر پدم آسن میں بیٹھ گیا۔ میں لگ بھگ دس منٹ تک پرانا یام کے تحت اسٹروک بریتھنگ کرتا رہا۔ بریتھنگ کے اس مخصوص انداز میں ایک خاص طریقے سے انہیل اور ایگزہیل کیا جاتا ہے جو چی کو متحرک کردیتا ہے۔ جب چی پوری طرح بیدار ہوگئی تو میں نے تصور قائم کرلیا۔ اس وقت میری توجہ کا مرکز ساحل تھی۔

دراصل میں ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے ذکر سے میرے ذہن میں وہ واقعہ تازہ ہوگیا تھا جب ناگ پال کے بھیجے ہوئے تین افراد کی جیپ کو خوف ناک حادثہ پیش آگیا تھا۔ وہ لوگ میری اور زخمی سما کی تلاش میں اس عبادت گاہ کی طرف آئے تھے۔ تھونچی نے مجھے اور دھنو (ساحل) کو تہ خانے میں چھپا دیا تھا۔ وہ لوگ ہمیں نہ پا کر تھونچی اور بھیرجانی کو اپنے ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا کر

واپس چلے گئے تھے جب میں نے ساحل کے ماں باپ کی حالت دیکھی تو میرا خون کھول اٹھا اور میں نے آنکھیں بند کر کے ان تین افراد کا تصور کیا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا کہ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ لوگ میرے تصور میں آگئے تھے۔ میری سوچ کے عقاب نے انہیں جا لیا تھا۔ وہ تینوں ایک جیپ میں سوار بھاگ متی کی طرف جانے والی کا کانی ہائی وے پر تیز رفتاری سے اڑے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں اپنے تصور میں فوکس کرلیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے سامنے سے لکڑیوں سے لدا ہوا ایک ٹرک آتا دکھائی دیا تھا اور پھر...... وہ جیپ اس ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ وہ تینوں فنا کے گھاٹ اتر گئے تھے۔

میں نہیں جانتا یہ سب کیسے ہوا تھا۔ اس وقت میرا دل و دماغ ان بدمعاشوں کے لیے غم و غصے سے بھرا ہوا تھا۔ میں ان کی شدید ترین بربادی کا خواہاں تھا۔ انہوں نے تھونچی اور بھیرجانی کو وحشیانہ سلوک سے گزارا تھا۔ ہوسکتا ہے میری شدید خواہش نے ان تینوں کا بھٹا بٹھا دیا ہو! یہ بھی ممکن تھا ایسی کوئی بات نہ ہو۔ ان تینوں کی موت اسی حادثے میں واقع ہونا لکھی ہو اور میرے تصور نے مجھے ان کی بھیانک موت کا منظر دکھا دیا ہو!

ہونے کو کچھ بھی ہوسکتا تھا لیکن تھونچی کا خیال یہی تھا کہ میں نے اپنی کسی پراسرار شکتی کی مدد سے ان تینوں کو نیست و نابود کردیا۔ اور یہ کیا؟ ساحل کے سراپا پر توجہ مرکوز کیے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ میرے تصور کی گرفت میں آگئی۔ میرا تخیل اس کے سراپا سے روشن ہوگیا۔

وہ اس وقت میرے ہی جیسی ایک کوٹھری میں' کسی میٹرس پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پتا نہیں وہ سو رہی تھی یا ایسے ہی آنکھیں موند رکھی تھیں۔ وہ مجھے بہت اچھی، بہت پیاری لگی۔ جی چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھولوں۔ اٹھا کر بٹھاؤں بانہوں میں بھرلوں۔ بے ساختہ میرے لبوں نے اسے پکارا۔

''ساحل......!''

میری اس پکار کے ساتھ ہی تصور ٹوٹ گیا۔ وہ میرے تصور کی نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ میری بند آنکھوں کے سامنے تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

اس کوٹھری میں' میں اکیلا ہی تھا۔ ساحل کسی اور کوٹھری میں رہ گئی تھی۔ میں نے بے اختیار دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور ساحل کو اپنے تصور میں لانے کی کوشش کرنے لگا لیکن بار بار کوشش کے بعد بھی مجھے کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ وہ

میرے تصور میں ٹیون نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے اپنے پچیوٹری اور پینئل گلینڈز پر کئی مرتبہ توجہ مرکوز کی مگر کچھ حاصل نہ ہوسکا۔ میری باطنی آنکھ (پینئل گلینڈ) نے کام کرنے سے انکار کردیا۔ پچیوٹری گلینڈ بھی کوئی سگنل ریسیو کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے تھک ہار کر کوشش ترک کردی۔

آج میں ایک حیرت انگیز اور خوش گوار تجربے سے گزرا تھا۔ میں نے ارتکازِ توجہ سے اپنے ٹارگٹ تک رسائی حاصل کرلی تھی مگر پھر میری پکار کے سبب اس تصور میں رخنہ پڑ گیا جو کئی دفعہ کی کوشش کے بعد بھی دور نہ ہوسکا۔ اس وقت میں یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ ''چی'' کا کوئی کرشمہ تھا یا میری کوئی مخصوص باطنی قوت بیدار ہوگئی تھی۔ بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا اس کا تعلق تھرڈ آئی یعنی باطنی آنکھ (پینئل گلینڈ) ہی سے ہوسکتا تھا۔ چی کی قوت نے اسی راستے سے مجھے ساحل تک پہنچایا تھا۔ گویا طاقت (چی) اور وسیلے (تیسری آنکھ) کا ملاپ ہوگیا تھا۔

اس تجربے کے بعد مجھے افسوس ہونے لگا کہ اب تک میں نے ساحل کا سراغ لگانے کے لیے یہ عمل کیوں نہیں کیا تھا۔ میں کئی ماہ سے اس کی تلاش میں دردر کی خاک چھان رہا تھا۔ اگر میں پہلے ہی ساحل کا تصور کر کے اپنے گلینڈز کو زحمت دیتا تو اس کی لوکیشن وغیرہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ جانے اس سے پہلے ادھر میرا دھیان کیوں نہیں گیا تھا!

سچ کہتے ہیں قدرت کے کارخانے میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ اس سے پہلے یا بعد کی کوئی صورت نہیں۔ یہ صلاحیت بھی اس وقت مجھ پر کھلنا تھی جب میں اپنی زندگی کے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا تاہم ابھی میں اپنی اس صلاحیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر میں اس کی پریکٹس کرتا تو شاید اس میں مہارت حاصل ہوجاتی۔

ساحل خیر و عافیت سے تھی یہ جان کر میرے دل کو اطمینان ہوگیا۔ میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایات دیں اور نیند کی مہربان بانہوں میں سمٹتا چلا گیا۔ میں نے اپنے برین کلاک کو علی الصباح پر سیٹ کیا تھا۔

ہدایات کے سلسلے میں، میرے دماغ نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ میں نے جو وقت مقرر کیا اسی پر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ اسی ہدایات کا ایک حصہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر اس نیند کے دوران میں میرے آس پاس کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کی توقع ہو تو میری آنکھ وقت مقررہ سے پہلے ہی کھل جائے گی اور اس رات میری آنکھ اچانک کھل گئی تھی۔

میں ٹانگیں نیچے پھیلائے میٹریس پر خاموش لیٹا رہا۔ یہ

احساس تو ہوگیا تھا کہ ابھی میری بیداری کا وقت نہیں ہوا' اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوچکی ہے...... یا ہونے والی ہے۔ میں بڑی توجہ سے لیٹے لیٹے سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا پھر احتیاط سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوٹھری اور اس کے اندر کا مختصر سامان جوں کا توں تھا۔ عجیب الوجود کھڑکی سے مناسب روشنی کوٹھری کے اندر پہنچ رہی تھی۔ اس سماں سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ باہر دن ہوگا رات۔ میرے پاس گھڑی بھی موجود نہیں تھی کہ کوئی حساب کتاب کرلیتا البتہ مجھے بھروسا تھا کہ ابھی صبح ہونے میں بہت وقت باقی ہے۔ میری آنکھ خلافِ معمول وقت معینہ سے بہت پہلے کھل گئی تھی۔ میں میٹریس سے نیچے اتر آیا اور اسی وقت مجھے محسوس ہوا اس کوٹھری میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے لیکن کون؟

اس خیال پر میں نے بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے ایک لمحے میں کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ بے اختیار میرے پاؤں اس کوٹھری کے منی سائز واش روم کی جانب اٹھ گئے...... اور پھر واش روم کے اندر پہنچانے والی اس چار فٹ طویل دراڑ کے اس پار وہ مجھے نظر آگئی۔ میں نے پہلی ہی نگاہ میں اسے پہچان لیا۔

وہ روثی تھی!

روثی نے اس وقت قدرے معقول لباس زیب وجود بنا رکھا تھا۔ روثی کو وہاں دیکھ کر مجھے حد درجہ حیرت ہوئی۔ پتا نہیں وہ کب اور کیسے اس کوٹھری میں داخل ہوئی تھی۔ ایک ایسی کوٹھری میں جس میں آمدورفت کے لیے کوئی در کھلا یا بند نہیں چھوڑا گیا تھا۔ نامعلوم، یہ کیا طلسم تھا!

وہ میری جانب دیکھ کر دل آویز انداز میں مسکرائی پھر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے واش روم کے اندر آنے کو کہا۔ میں نے ایک لمحے کو غور کیا اور ایک فٹ چوڑی' چار فٹ لمبی دراڑ میں پہلو کے بل سرکنے لگا۔ روثی کا انداز دوستانہ تھا...... اور اگر وہ کسی خطرناک ارادے سے بھی وہاں پہنچی تھی تو میں اس سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ جب میں جزوی طور پر بے بس تھا تو اس نے میرا کیا بگاڑ لیا تھا؟ اور اگر کچھ بگاڑا بھی تھا تو وہ بگاڑ بڑا یادگار تھا! اس کی یاد میری یادداشت میں محفوظ تھی۔

میں واش روم کے اندر پہنچا تو روثی نے واش بیسن کا نل کھول دیا۔ واش روم میں پانی گرنے کی مخصوص آواز ابھرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔"

میں نے اس کی چمک دار آنکھوں میں جھانکا اور سرگوشی ہی کے انداز میں استفسار کیا" باتیں تو تم بعد میں کرنا' پہلے یہ بتاؤ کہ اندر کیسے آئی ہو...... کس دروازے سے؟"

"تمہارے سوال کا جواب میں واپسی پر دے دوں گی۔" وہ مخصوص امریکی لہجے میں بولی۔ ہمارے درمیان وہ گفتگو انگلش میں ہورہی تھی" تم مجھے اپنا دوست سمجھو۔" اس نے رسانیت سے کہا۔

میں نے کہا" اپنے دشمنوں کے اشاروں پر ناچنے والی کو میں کیوں کر دوست سمجھ لوں؟"

اس نے میرے سراپا پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور بڑے اعتماد سے بولی" میں جب تمہیں یہودیوں کی قید سے رہائی دلوادوں گی تو تمہیں میری بات...... میری دوستی پر یقین آجائے گا!"

"اگر تم دوست ہو تو پھر میرے دشمنوں کے اندر کیا کررہی ہو؟"

"میں ان کے اندر رہ کر انہیں کمزور کررہی ہوں۔"

"کیا تم یہودیوں کی ساتھی' ان کی آلۂ کار نہیں ہو؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

وہ نفی میں گردن کو جھٹکتے ہوئے بولی" ہرگز نہیں! میں ان کے درمیان رہتے ہوئے اپنے لوگوں کے لیے کام کرتی ہوں۔"

میں نے سوچا' ممکن ہے یہ یہودیوں کی کوئی نئی چال ہو۔ وہ اس روثی کو میرے پاس پہنچا کر مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتے ہوں' اسے میرا دوست ظاہر کرکے مجھے شکار کرنے کا ارادہ ہو۔ روثی کو وہ چارے کے طور پر آگے بڑھا سکتے تھے۔ میں نے روثی کو شک زدہ نظر سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اگر تم اپنے لوگوں کے لیے یہودیوں کے خلاف کچھ بھی کرتی پھر رہی ہو تو مجھے یہ سب کیوں بتارہی ہو۔ مجھ سے تمہارا کیا تعلق واسطہ؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی" تمہارا تعلق واسطہ ان لوگوں سے ہے میں جن کے لیے کام کرتی ہوں۔ ہماری ٹیم کے دو افراد اس وقت یہاں مصروفِ عمل ہیں۔ میں تمہیں اور مائیکل تمہاری ساتھی کو رہائی دلائے گا۔ بعد میں آپس میں مل جائیں گے۔ میرے بڑے تم دونوں کے دوست ہیں' لہٰذا اسی تعلق سے میں تمہیں اپنا دوست کہہ رہی ہوں۔"

"تمہارے بڑے کون ہیں؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"یہ تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔"

"وہ مجھ میں اور میری ساتھی ساحل میں کیوں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"دلچسپی کا سبب وہی ہے جو یہودیوں کے پیشِ نظر ہے۔" وہ بولی" فرق صرف مثبت اور منفی رویے کا ہے۔ یہودیوں کا ربی جس خفیہ خزانے پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے' میرے بڑے اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی" میں کہانا اس وقت تفصیل بتانا ممکن نہیں۔ میں بعد میں تمہارا ذہن صاف کردوں گی۔ مجھ پر اعتماد کرو۔"

اس کے انداز سے کہیں بھی دشمنی نہیں جھلکتی تھی' اگر وہ بالراست کوئی سے کام لے رہی تھی تو پھر میرے لیے بہت ثابت ہونے والی تھی روثی انسان کے لیے ہر دور میں ضروری اور اہم رہی ہے چاہے اس کی شکل مغربی ہو یا ...!

میں نے اسے کریدنے کی خاطر پوچھا" اس وقت میں کہاں ہوں؟"

"دینالی میں!" اس نے جواب دیا۔

"دینالی!" میں نے زیرِ لب دہرایا" کیا یہ اینکر یج ہی کا مقام ہے؟"

"نہیں۔ دینالی درحقیقت اینکر یج اور فیئر بینکس کے درمیان واقع ہے۔" اس نے جواب دیا" دینالی نیشنل پارک الاسکا کی بہت معروف تفریح گاہ ہے۔ یہاں پر جنگلی حیات کا بڑا ذخیرہ ہے۔"

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا" یہ کیسا نیشنل پارک ہے جس میں پتھر سے تراشی ہوئی کوٹھریاں ہیں۔ مجھے تو محسوس ہورہا ہے میں کسی پہاڑی کے اندر قید ہوکر رہ گیا ہوں۔ چاروں جانب سنگلاخ چٹانیں ہیں۔"

"تمہیں بالکل ٹھیک محسوس ہورہا ہے۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرائی" اس وقت ہم ماؤنٹ مکنلے کے اندر ہیں۔"

"ماؤنٹ مکنلے؟" میں اچھل پڑا۔

وہ بہ دستور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی" ماؤنٹ دینالی نیشنل پارک کے عین وسط میں استادہ ہے۔ یہ شمالی امریکا کی بلند ترین چوٹی ہے۔ اس کی بلندی بیس ہزار تین سو بیس فٹ ہے جو ہر وقت برف کی موٹی تہ سے ڈھکی رہتی ہے۔"

"اوہ۔" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا" تو اس کا مطلب ہے' میں واقعی اس وقت کسی دیو قامت پہاڑی کے اندر ہوں۔"

"یس' آئی مین اٹ" وہ ایک ادا سے بولی پھر وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی" اینکر یج سے دینالی آنے کے لیے روڈ اور ریل روڈ دونوں راستے موجود ہیں۔ اس سڑک کو" ہائی وے تھری" کہا جاتا ہے۔ جو اینکر یج سے فیئر بینکس تک جاتی ہے۔ ریل روڈ پر چلنے والی ٹرین کا روٹ بھی یہی ہے لیکن یہ لوگ ماؤنٹ مکنلے تک پہنچنے کے لیے دینالی نیشنل پارک کا مرکزی داخلی دروازہ استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ پارک کے آغاز پر ہی ہائی وے تھری کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا سفر تقریباً آدھا ہوجاتا ہے۔ اینکر یج سے نکل کر ہائی وے تھری پر ویلو' کیسویل' مونٹانا' سن شائن' ٹاکیٹنا' چیز اور کری کے مقامات پڑتے ہیں پھر دینالی کا کنارہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ ہائی وے تھری کو" کری" کے مقام پر چھوڑ کر بائیں جانب گھوم جاتے ہیں اور دشوار ترین راستہ طے کرکے ایک مخصوص جگہ پیٹرس ویل پہنچ جاتے ہیں۔ پیٹرس ویل میں یو۔ ایس آرمی کا ایک خفیہ اڈا بھی ہے۔ یہ لوگ اس اڈے میں غائب ہوجاتے ہیں۔ پھر نہایت ہی حفاظت سے تیار کردہ ایک زیرِ زمین راستہ اختیار کرکے یہ پارک میں داخل ہوجاتے ہیں' یعنی زیرِ زمین ہی رہتے ہوئے۔ یہ محفوظ اور کشادہ راستہ انہیں سیدھا ماؤنٹ مکنلے کے اس خفیہ ٹھکانے تک پہنچا دیتا ہے جہاں اس وقت ہم دونوں موجود ہیں۔ چند مخصوص لوگوں کو چھوڑ کر اس اڈے کے بارے میں کسی کو مطلق خبر نہیں۔ ربی موشے ہائمن اس کی ٹیم اور چند بڑے فوجی آفیسرز اس راز سے واقف ہیں۔ دینالی نیشنل پارک میں تفریح کی غرض سے آنے والوں اور ماؤنٹ مکنلے کی چوٹی سر کرنے والے ہر پھرے ہرگز یہ نہیں جانتے کہ اس دیو قامت پہاڑ کے اندر کتنا قیمتی راز زندہ ہے۔"

روثی کی باتیں سن کر میرے اندر تشویش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا" اس کا مطلب ہے چند بڑے فوجی آفیسر کو معلوم ہے' اس پہاڑی کے اندر کیا ہورہا ہے؟"

"نہیں!" وہ قطعیت سے بولی" وہ لوگ صرف اتنا جانتے ہیں اس پہاڑی کے اندر صیہونیت کی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا جارہا ہے۔ بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہیں اس کے آگے کھوج بھی نہیں ہے۔ یہودیوں کو صرف اپنے فائدے کی فکر ہوتی ہے۔ پیٹرس ویل کے مقام پر واقع یو۔ ایس آرمی کیمپ بھی ربی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ شاید

تمہیں معلوم نہیں ڈی سی میں واقع فوجی ہیڈ کوارٹر پنٹا گون بھی ربی کے اشارے کو ماننے کا پابند ہے۔"

"یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا "لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہا' تم یہودن ہونے کے باوجود بھی یہودیوں کے خلاف نفرت کا اظہار کیوں کر رہی ہو؟"

"تمہیں یہ بات کیسے پتا چلی کہ میں یہودی ہوں؟"

"میرا اندازہ ہے!" میں نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔

وہ جلدی سے بولی "تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں!"

"تمہارے سوال کا تفصیلی جواب میں بعد میں دوں گی۔"

وہ عجلت آمیز لہجے میں بولی "فی الحال اتنا جان لو کہ میرا باپ اینڈرسن ایک امریکی یہودی تھا جب کہ ماں کا تعلق اسپین سے تھا۔ میرا باپ اتنا برا آدمی تھا...... اس نے میری ماں ایک کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا کہ اس روئے زمین پر پائے جانے والے تمام یہودیوں سے مجھے شدید نفرت ہو گئی۔" اس کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا۔

"اس کے باوجود بھی تم یہودیوں کی ایک نہایت اہم تنظیم "جے ڈی پی" کے لیے کام کر رہی ہو؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "یہ میرا راز ہے" ہے۔ کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی۔ اتنا ذہن میں رکھ لو' میں یہودیوں کے درمیان رہ کر ان کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ یہ میرے بڑوں کی پالیسی ہے۔ میں ان کا حکم ماننے کی پابند ہوں۔"

"تم نے بتایا ہے' تمہارے بڑے ہم دونوں میں مثبت دلچسپی لے رہے ہیں۔" میں نے اپنی الجھن دور کرنے کی خاطر پوچھا "تم مجھے اور تمہارا ساتھی مائیکل میری ساتھی ساحل کو یہاں سے رہائی دلوا کر اپنے آدمیوں تک لے جاؤ گے۔ اس کے ساتھ ہی تم کہتی ہو' اس خفیہ اڈے تک آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہے جو پیٹرسن ویل والے فوجی کیمپ سے گزرتا ہے۔ اس صورت میں تم لوگوں کے لیے یہ کام اتنا ہی آسان ہوگا کہ یہودیوں کی ناک کے دو بال نوچ کر فرار ہو جاؤ...... اور یہودی بھی ربی موشے ہائمن جیسا روحانی اور مادی صلاحیتوں کا مالک؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "میں اور مائیکل تم دونوں کو اپنے دو دوسرے آدمیوں تک پہنچائیں گے۔ پہاڑی سے باہر لے جانا ان کا دردسر ہے۔ ظاہر ہے انہوں نے یہاں سے فرار کا کوئی کامل منصوبہ ضرور بنا رکھا ہوگا۔ ہم تم لوگوں کو ان کے حوالے کر کے اپنے معمول پر آ جائیں گے۔ مائیکل بھی میری طرح بظاہر جے ڈی پی کے لیے کام کرتا ہے لیکن اس کی وفاداریاں انہی لوگوں سے وابستہ ہیں جن کے لیے میں کام کر رہی ہوں۔"

"تم لوگ ہمیں کب۔۔۔ یہاں سے نکالنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" میں نے مطلب کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"کل اسی وقت" روٹی نے بتایا "یہ رات کا آخری پہر ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے بعد سورج طلوع ہو جائے گا۔ سورج طلوع ہونے سے میری مراد طلوع کا وقت ہے ورنہ اس کی صورت دیکھنا تو ہرگز نصیب نہ ہوگی۔ میرے خیال میں فرار کے لیے یہ وقت زیادہ مناسب رہے گا۔"

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "اگر تمہیں اور تمہارے بڑوں کو ہم سے اتنی ہی زیادہ ہمدردی ہے تو پھر وہاں اینکریج ہی میں ہمیں لے اڑتیں۔ اس چوہے دان میں پھنسوانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں اپنے بڑوں کا حکم مانتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی "ورنہ اینکریج میں تو یہ کام بہت ہی سہل ثابت ہوتا۔ میرا خیال ہے اس میں میرے بڑوں کی کوئی خاص مصلحت پوشیدہ ہے۔"

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا "کیسی مصلحت؟"

"وہ لوگ شاطر یہودیوں کے منہ پر بڑے زور کا طمانچہ مارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی "اگر تم دونوں اینکریج میں غائب ہو جاتے تو جانسن پلیدر اور دو چار دوسرے افراد کی نااہلی سمجھی جاتی لیکن اگر تم لوگ اس زیرِ زمین ... ٹھکانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو سمجھ لو یہودی اعتماد کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ یہ لوگ اپنے ربی کو خدا جتنا قدرت والا سمجھتے ہیں اور اس کی صلاحیتوں پر اندھا یقین رکھتے ہیں۔ لیو' ربی کا دستِ راست ہے۔ ان دو عظیم المرتبت شخصیات کے چنگل سے تمہارا نکل جانا کسی دھماکے سے کم نہیں ہوگا۔ اگرچہ اس واقعے کو عام نہیں ہونے دیا جائے گا کیونکہ یہ ایک نہایت ہی خفیہ مشن ہے مگر تمہارے فرار سے ربی اور برنارڈ لیو کی کمر ٹوٹ جائے گی...... اور شاید میرے بڑے یہی چاہتے بھی ہیں۔"

میں نے ایک اور اہم سوال کیا "اگر آپ لوگوں نے ہمیں یہودیوں کی قید سے نکالنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر کل کا انتظار کیوں یہ کام تو آج...... بلکہ ابھی فوری طور پر بھی ہو سکتا ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔" وہ تائیدی انداز میں بولی "اگر ہم ابھی یہ مشن شروع کر دیں تو تم دونوں کو کوٹھریوں سے نکال کر ایک مخصوص مقام تک پہنچا سکتے ہیں جہاں سے ہمارے دیگر دو ساتھی تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانے والے ہیں لیکن وہ پروگرام کے مطابق اس مقام پر کل پہنچیں گے لہٰذا یہ کام آج کر لینا نقصان کا باعث ہوگا۔ تم دونوں کے ساتھ ہی ہم بھی یہودی عتاب میں آ جائیں گے۔ میرے بڑوں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ منصوبہ تشکیل دیا ہے۔ تم ایک دن صبر کر لو تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا "برنارڈ لیو نے مجھے سوچنے کے لیے صرف اسی رات کی مہلت دی ہے۔ صبح اگر میرا فیصلہ ان کے حق میں نہ ہوا تو مجھے ربی موشے ہائمن کے حوالے کر دیا جائے گا۔ پتا نہیں اس کے بعد میرے ساتھ کیا حالات و واقعات پیش آئیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کل اس وقت تم میری کوٹھری میں آؤ تو میں تمہیں یہاں ملوں ہی نہیں!"

"تم مجھے ضرور یہاں ملو گے!" وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔

"یہ بات اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میرے بڑوں کا منصوبہ بے داغ ہے۔"

"تمہیں اپنے بڑوں پر اتنا ہی بھروسا ہے؟"

"تم ان سے ملو گے تو مجھ سے زیادہ بھروسا کرنے لگو گے!"

"دیکھوں گا!" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "میں تمہارے اور لیو کے درمیان ہونے والی گفتگو کی تفصیل سے تو واقف نہیں البتہ اتنا مجھے معلوم ہے کہ وہ لوگ تمہیں اپنا دوست بنانا چاہتے ہیں مگر تمہیں ان کے کسی جال میں نہیں پھنسنا۔ یہ لوگ بہت ہی عیار اور مکار ہیں۔ دوستی کا ہاتھ بڑھا کر شہ رگ کاٹ لیتے ہیں۔ اگر کل تمہارا جواب نفی میں ہوا تو واقعی تمہیں ربی موشے ہائمن کے سپرد کر دیا جائے گا...... اور میں اس وقت یہی بتانے آئی ہوں کہ ربی موشے ہائمن کی طرف سے بہت چوکنا رہنا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بات نہ کرنا۔ وہ ہپناٹزم کا ماہر ہے' فوراً تمہیں اپنے ٹرانس میں لے لے گا۔"

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔

روٹی نے بڑا ہی نازک انکشاف کیا تھا۔ ربی اگر واقعتاً ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی جیسی صلاحیتوں کا مالک تھا تو پھر ایک نہایت ہی خطرناک دشمن سے میرا پالا پڑنے والا تھا۔ مجھے اپنی "چی" اور یوگا کی قدرت پر اعتماد تھا۔ مارشل آرٹس کا شعبہ

کے عملی طریقے

✧ ہپناٹیزم کی ابتدائی تاریخ
✧ ہپناٹیزم کیا ہے؟
✧ ہپناٹیزم کے مزید طریقے
✧ ہپناٹیزم اور ذہنی گہرائیاں
✧ طبی استعمال
✧ اثر کی شدت
✧ جذباتی الجھنوں کا علاج
✧ روحانی قوتیں
✧ ہپناٹیزم کے ذریعے شخصی خامیاں دور

قیمت:- 50/ روپے
ڈاک خرچ:- 23/ روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

الگ تھا۔ پتا نہیں حالات و واقعات کی یہ نئی بساط میرے خلاف کون سی چال چلنے والی تھی؟

روثی تصدیقی لہجے میں کہہ رہی تھی ''ربی موشے ہائمن کو اگر یہودی قوم اپنا خدا سمجھتی ہے تو اس کی روحانی صلاحیتوں میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا لیکن میرے بڑے تم سے بہت پر امید ہیں!''

میں نے چونک کر روثی کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں مجسم سوال کو فوراً سمجھ گئی' وضاحت کرتے ہوئے بولی ''میرے بڑے تمہارے اور تمہاری صلاحیتوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ انہیں یہ بات معلوم ہے تم برنارڈ لیو کی پیشکش کر بری طرح ٹھکرا دو گے جس کے نتیجے میں کل تمہیں ربی کے حوالے کر دیا جائے گا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی ''اس کا یہی مطلب ہے تمہارے بڑے بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہیں۔''

''میں اسی لیے اپنے بڑوں کی بات تم تک پہنچانے آئی ہوں۔'' وہ رسانیت سے بولی ''ربی تمہیں پہلے محبت اور شفقت سے قائل کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب تم اس کی باتوں میں نہیں آؤ گے تو وہ ہپناٹزم کی صلاحیت کو آزمائے گا۔ اگر ایک مرتبہ تم اس کے ٹرانس میں آ گئے تو وہ تمہارا برین واش کر دے گا۔ وہ واقعی ایسا کر سکتا ہے...... اس لیے تمہیں ربی کے سامنے ہر لمحہ ہوشیار رہنا ہے۔ اس کی آنکھوں میں قطعاً نہیں دیکھنا اور اس کی گونج دار تاثر انگیز آواز پر بھی زیادہ توجہ نہیں دینا۔ ان یہودیوں نے تمہارے خلاف انتہائی خطرناک منصوبہ بنا رکھا ہے۔''

''مثلاً کیسا منصوبہ؟'' اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ میرے لہجے میں خاصی تشویش تھی۔

''تمہاری ساتھی کے ذہن سے تو صرف تہ خانے کے راز نکلوانا ہیں۔'' وہ ساحل کو تاسّف پر رکھتے ہوئے بولی۔ روثی کی معلومات قابلِ رشک تھیں ''لیکن تمہاری برین واشنگ کے بعد وہ تمہیں اور تمہاری سوچ کو نئے سرے سے تعمیر کریں گے۔ تمہاری بے پناہ صلاحیتوں سے وہ آگاہی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ تمہیں اپنے مقصد کے حصول کے لیے تیار کریں گے۔ تمہارے منہ میں ان کی زبان بولے گی اور تمہارا ذہن انہی کے مفاد میں سوچے گا یعنی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر تم ان کے ایک ناقابلِ تسخیر مہرے ہو گے!''

''یہ کبھی نہیں ہو سکتا!'' بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

روثی کی باتوں نے مجھے حد درجہ بے چین کر دیا تھا۔ یہ تو لگ بھگ وہی صورتِ حال تھی جو نعلی وجدان کے سلسلے میں ہو رہا تھا۔ ادھر وہ کسی بدی کی قوت کا آلۂ کار بن کر میرے لیے مشکلات کھڑی کر رہا تھا اور ادھر میں یہودیوں کے ہاتھ کا کھلونا بن کر ان کے منشا کے کھیل کھیلنے والا تھا۔ میں خواب و خیال میں بھی ایسا نہیں سوچ سکتا تھا۔

''ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔'' روثی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''اسی لیے میں نے اپنے بڑوں کا پیغام تم تک پہنچا دیا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا اور ربی موشے ہائمن سے سامنا کرتے وقت بے حد محتاط رہنا۔'' ایک لمحے کو توقف کرنے کے بعد اس نے کہا ''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔''

میں نے تہ دل سے کہا ''روثی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' پھر اضافہ کیا ''تم نے اپنا فرض تو پورا کر لیا لیکن میرا ایک قرض باقی ہے۔ وہ نہیں چکاؤ گی!''

''کیسا قرض؟'' اس نے آنکھیں پھیلا کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''تمہیں ''روثی'' کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے!''

''کیوں' اس میں عجیب والی کون سی بات ہے؟'' اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میری زبان میں روثی، بریڈ کو کہتے ہیں!''

''اوہ!'' وہ اچھلنے کے انداز میں ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

گویا' واش روم کی دیوار سے جا لگی۔ تین ضرب تین فٹ کے اس واش روم میں اچھلنے یا کودنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ روثی کے بدکنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اسے بریڈ سمجھ کر فوراً ہڑپ کر جاؤں گا۔

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی ''تمہاری زبان کون سی ہے؟''

میں نے کہا ''میری قومی زبان اردو ہے...... اور اس زبان کی روثی کو ہم بڑے مزے سے کھاتے ہیں۔ ویسے میں مینڈرن' تھائی' ہندی' انگریزی اور کسی حد تک جتی بھی جانتا ہوں۔''

''اٹس او کے!'' اس نے بڑی ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکا

اور وضاحت کرتے ہوئے بولی ''روثی میرا نک نیم ہے۔ میں بچپن میں گول مٹول ہوتی تھی اور میری ماں ایکی مجھے ''روثی'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ میں نہیں جانتی یہ اسپینش لفظ ہے یا کسی اور زبان کا!''

میں نے دل ہی دل میں کہا ''گول مٹول کی نسبت سے تو تمہارا نام روثی کے بجائے ڈبل روٹی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے روثی سے پوچھا ''ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے بتایا ''راکیل اینڈرسن''

میرے تصور میں راکیل ویلچ گھوم گئی۔ میں نے روثی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شریر لہجے میں کہا ''اسی لیے اہنکر تیج کے اس کنگ سائز واش روم میں تم ''ون ملین ایئر بی۔ سی'' بنی ہوئی تھیں...... اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ؟''

وہ خفیف سا مسکرا کر رہ گئی۔ میرے اشارے کو اس نے بڑی وضاحت سے سمجھ لیا تھا۔ ہالی ووڈ کی قیامت سراپا اداکارہ راکیل ویلچ نے ''ون ملین ایئر بی۔ سی'' میں بڑی ہوش ربا اداکاری کی تھی۔ پوری فلم میں وہ انڈر گارمنٹس کے بھی خلاصے کو بدن پر سجائے پورے اسکرین پر اپنی جوبن بھری جوانی کے جوہر دکھاتی نظر آتی تھی۔

روثی یعنی راکیل اینڈرسن نے ایک مرتبہ پھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ''تم ایک منٹ کے لیے کمرے میں چلے جاؤ۔''

''تم نے وعدہ کیا تھا' جاتے وقت مجھے بتاؤ گی' اس کوٹھری میں آمد و رفت کا کیا ذریعہ ہے۔'' میں نے یاددہانی کے طور پر کہا ''تمہاری باتوں سے لگتا ہے وہ خفیہ راستہ اس واش روم میں کہیں ہے؟'' بات ختم کرتے ہی میں اس مختصر سے واش روم کی دیواروں کو گھورنے لگا۔

''تمہارا یہ اندازہ بھی درست ہے۔'' وہ بڑی لگاوٹ سے بولی ''لیکن میں اپنے وعدہ کو ایک دن آگے بڑھاتی ہوں۔ تم ہمارے لیے بہت اہم ہو۔ اگر ابھی تم پر یہ راز کھل گیا تو تم اپنے طور پر کوئی قدم اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتے ہو جس میں کامیابی سے زیادہ نقصان کا اندیشہ ہے لہٰذا میں فی الحال ایسا کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ کل رات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا' ہم دونوں اس واش روم کے راستے کس طرح کوٹھری سے نکلتے ہیں!''

''اگر میں یہ وعدہ کروں کہ یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا تو؟''

''مجھے مجبور نہ کرو۔'' وہ بے چارگی سے بولی

میں خاموشی کے ساتھ ایک فٹ چوڑی اور چار فٹ لمبی دراز کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بڑی دل آواز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتی رہی حتیٰ کہ میں واپس کوٹھری میں نہیں آ گیا۔ میرے وہاں سے کھسکتے ہی اس نے واش بیسن کا نل بند کر دیا تھا۔

میں کوٹھری میں میٹرس کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ راکیل نے مجھ سے ایک منٹ کی مہلت مانگی تھی۔ میں پانچ منٹ کے بعد دوبارہ واش روم میں پہنچ گیا۔ راکیل وہاں موجود نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' ان سنگلاخ دیواروں میں کہیں جذب ہو گئی ہو۔ وہ جس پُراسرار انداز میں میری کوٹھری میں نمودار ہوئی تھی اسی جادوئی طریقے سے غائب ہو گئی۔ بادی النظر میں یہی لگتا تھا' حسن و جوانی کے خزانے سے مالا مال وہ یہودن طلسم پھونکنے کی ماہر تھی!

میں واپس آ کر میٹرس پر لیٹ گیا اور گہری گہری

ایک اچھوتی سرگزشت
چھلاوا
بیسویں صدی کی ایک نہایت پُراسرار خاتون
صبیحہ بانو کی آپ بیتی
* دولت مند' آزاد خیال، پروقار، خوبصورت اور خطرناک صبیحہ بانو، جنہیں لوگ جانتے ہیں مگر نہیں جانتے!
* جرائم پیشہ افراد انہیں ''چھلاوا'' کہتے ہیں!
* صبیحہ بانو کی زندگی عجیب عجیب اور خطرناک حالات سے گزرتی رہی ہے۔ انہوں نے جب اپنی زندگی کے کچھ حالات قلم بند کیے تو انہیں پڑھ کر ہزاروں لوگ ان سے ملنے اور انہیں جاننے کے متمنی ہو گئے۔ اسی لیے ان کی آپ بیتی کی اشاعت اردو زبان میں ایک ریکارڈ ہے۔
صفحات 1120 | قیمت 300 روپے | ڈاک خرچ 23 روپے
کتاب کی قیمت معہ ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ کریں
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
kitabiat1970@yahoo.com

سانسیں لینے لگا۔ روئی کی باتوں نے میرے دل و دماغ میں ہلچل مچادی تھی۔ صیہونی سازش کا ایک نیا رخ سامنے آرہا تھا۔ روئی کی باتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ وہ بہرحال میری دشمن نہیں تھی۔ وہ یہ کام کسی خاص گروہ کے ایما پر کررہی تھی جس کا مطلب تھا اس کے بڑے میرے دشمن نہیں تھے۔ بعد کے حالات تو وقت سے پہلے نہیں کھل سکتے تھے۔ ربی موشے ہائمن کی روحانی صلاحیتوں کے پیشِ نظر میں ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنے والا تھا۔ وہ ایک ایسا دشمن ثابت ہوتا۔ جس سے نبرد آزمائی میں مجھے دانتوں پسینا آجاتا۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ راکیل کے مطابق اس رات کے ڈھائی تین گھنٹے ابھی باقی تھے۔ میں یہ وقت جاگ کر خواہ مخواہ کے واہموں میں نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ دشمنوں کی نیندیں اڑانے کے لیے اپنی نیند پوری کرنا ازحد ضروری ہے۔

میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی اور چند لمحات کے بعد نیند کی گداز و مہربان گود میں سر رکھ دیا۔ وہ گود جس میں ماتا کی نرمی اور گرمی شامل تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں اس گود کا اسیر ہو کررہ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے ڈٹ کر ناشتا کیا۔ اس کا ایک سبب تو کڑاکے دار بھوک تھی، گزشتہ رات میں نے ناشتے کے نام پر فارملیٹی پوری کی تھی اور دوسری وجہ مینیو تھا۔ آج کافی 'سلائس کے علاوہ آملیٹ' پورج' مکھن پنیر اور کچھ پھل بھی ٹرے میں نظر آرہے تھے۔ اس صحت مند مینیو پر میں نے جی بھر کر ہاتھ صاف کیا۔ گزشتہ رات والا گوشت کا سالن اور ڈنر رولز غائب تھے۔ میں نے لگ بھگ پوری ٹرے کو صاف کردیا۔ اگر کچھ بچا تھا تو ایک آدھ سیب یا چند کیلے ہی بچے ہوں گے جو وافر تعداد میں مہیا کیے گئے تھے۔

سکیورٹی گارڈ ناشتے کے خالی برتن لے کر واپس چلا گیا تو برنارڈلیو آدھمکا۔ آج اس کے لیے کوئی عالی شان کرسی کی زحمت نہیں کی گئی تھی۔ اس نے بے داغ قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور خاصا جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری تھی۔

وہ اس کوٹھری کی واحد کھڑکی کے سامنے آیا اور کھردرے لہجے میں بولا ''گڈ مارننگ مسٹر جہان!''

اس کے سلام میں ایسی کرختگی تھی جیسے کسی کو فٹے منہ کہا جارہا ہو۔

میں نے جواباً گہری سنجیدگی سے کہا ''گڈ مارننگ!''

''کچھ سوچا تم نے؟'' برنارڈ نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں بے کار باتوں پر غور و فکر کر کے اپنا وقت برباد اور دماغ خراب نہیں کرتا۔'' میں نے رکھائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ متحمل لہجے میں بولا ''گویا ہماری دوستی کو ٹھکرا رہے ہو؟''

''میرا یہی مطلب ہے۔''

''اوہ!'' وہ عجیب سی گہری نظر سے مجھے تکتا چلا گیا۔

میں بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں، برنارڈلیو کو میری آنکھوں میں کیا نظر آرہا ہوگا! مجھے تو اس کی آنکھوں میں عیاری' سفاکی اور درندگی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے مجھے گھورنے کے بعد اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اِٹس اوکے۔ یو آر رائٹ لبرٹی!''

پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میں نے اپنے سر کو خاصا بھاری محسوس کیا۔ میں نے سوچا شاید یہ بھرپور ناشتے کی وجہ سے ہے پھر میں نے کافی کا بھرا ہوا مگ بھی معدے میں انڈیل لیا تھا جو میرے وجود میں چستی کے بجائے سستی بھرتی ہے لیکن...... یہ اس سے آگے کا معاملہ نظر آرہا تھا۔

کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے مجھے چکر آگیا۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ملی۔ میرے قدم بری طرح ڈگمگائے اور میں دھڑام سے کوٹھری کے سنگلاخ فرش پر آن گرا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف یہی خیال جاگزیں تھا...... اس ناشتے میں ضرور کوئی ایسی شے ملائی گئی ہے جو مجھے اپنے آپ سے بیگانہ کردے میں چشم زدن میں گہری غفلت میں چلا جاؤں۔

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات گیارہویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں جو جولائی 2006 میں شائع ہوگا

اسوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 11

فرش پر پڑے پڑے میں نے اپنی آنکھوں کو کھولنا چاہا لیکن پپوٹے کئی من وزنی محسوس ہوئے۔ انہوں نے میری کوشش کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنے بے سود ہوتے ہوئے وجود کو میٹرس کی جانب گھسیٹنے کی سعی کی مگر بے سود! میرا ذہن بڑی تیزی سے تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ ان لمحات میں بڑے ہی کمزور انداز میں' میں نے سوچا۔

برنارڈ لیوا بی کوشش میں ناکامیاب ہو کر مجھے ربی موشے ہائمن کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر میرا جواب سننے سے پہلے ہی مجھے اٹھا غفیل کرنے کا بندوبست کر دیا گیا تھا تا کہ انہیں بعد میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر عیار یہودیوں نے مجھ پر بڑا کاری داؤ مارا تھا۔

میں نے جی جان کی قوت کو مجتمع کر کے ایک مرتبہ پھر میٹرس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تگ و دو کی لیکن اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہ رہا۔ میرا ذہن اور حواس اپنے ماحول سے یکسر بےگانہ ہو گئے۔ میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک کشادہ ہال میں پایا۔ میں اس وقت ایک صوفے پر پڑا تھا۔ میں نے پوری طرح آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنے دماغ یا بدن میں کسی قسم کی نقاہت یا تکلیف محسوس نہ ہوئی۔ بالکل یوں لگا جیسے میں اسی صوفے پر بڑے آرام سے سو گیا تھا اور اب میری آنکھ کھلی ہے۔

میں تو ایک مختصر سی سنگلاخ کوٹھری میں تھا، پھر اس وسیع و عریض ہال میں کیسے پہنچ گیا؟ اس خیال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا، پھر میرے ذہن میں وہ واقعہ تازہ ہو گیا جب ناشتے کے بعد میں چکرا کر کوٹھری کے فرش پر گر گیا تھا تو..... تو اس کا مطلب ہے میری غفلت کے دوران میں مجھے کوٹھری سے یہاں پہنچایا گیا تھا؟

یہ خیال اور بھی زیادہ تشویش کا حامل تھا کیونکہ اس کا جواب یہی تھا کہ مجھے ربی موشے ہائمن نے سپرد کر دیا گیا ہے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور تنقیدی نظر سے اس ہال کا جائزہ لینے لگا۔

وہ وسیع و عریض کمرا کسی لائبریری کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کی پیمائش بیس بائی تیس فٹ رہی ہو گی۔ چاروں دیواروں کے ساتھ آدم قد چوبی الماریاں استادہ تھیں جو کتابوں سے بھری نظر آتی تھیں۔ ان الماریوں سے دو فٹ آگے صوفے رکھے تھے۔ میں بھی انہیں صوفوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔

بیس فٹ والی ایک دیوار میں آمد و رفت کا راستہ تھا۔ دروازہ میں نے اس لیے نہیں کہا کہ وہ صرف درہ سا بنا ہوا تھا۔ اس درے کی اونچائی سات فٹ اور چوڑائی چار فٹ تھی۔ کسی چوکھٹ یا پٹ کے بجائے وہاں جھالر کی شکل میں موتیوں والی لڑیاں لٹکی دکھائی دیتی تھیں ہال کی دیواریں اور فرش سنگلاخی میں اپنی مثال آپ تھا۔

دوسری بیس فٹ والی دیوار کے ساتھ' کتابوں والی الماریوں کے آگے ایک شاندار کرسی اور میز موجود تھی۔ یہ کسی اعلیٰ شخصیت کی نشست گاہ تھی۔ اس پہاڑی کے اندر یہودیوں کے لیے سب سے اہم معتبر اور قابلِ احترام شخصیت ربی موشے ہائمن ہی کی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا چند لمحات کے بعد ربی سے میرا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔ میں نے ایک طویل انگڑائی لی اور ذہن و جسم کو پوری طرح چاق و چوبند کر لیا۔ آنے والے لمحات میں کوئی بھی سنگین صورتِ حال پیش آ سکتی تھی۔ میں ایک عزم کے ساتھ صوفے سے نیچے اتر آیا اور گھوم پھر کر اس ہال کا معائنہ کرنے لگا۔

ہال میں میرے سوا کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔ میں آدم قد چوبی الماریوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ موٹی موٹی جدید اور قدیم کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں پر وہاں کتابیں موجود تھیں۔ سب سے زیادہ ذخیرہ عبرانی (ہیبرو) زبان کی کتابوں کا تھا۔ عبرانی' یہودیوں کی اصلی زبان ہے۔ ازیں علاوہ یونانی' مصری' سنسکرت' عربی' انگریزی اور فرانسیسی کی بھی بے شمار کتابیں تھیں۔ ظاہر ہے ان تمام کتابوں کا تعلق علم و ہنر سے تھا۔

میں الماریوں کے سرسری معائنے کے بعد اس عالی شان کرسی کی طرف بڑھ گیا جس کے سامنے اسی شان کی ایک میز بھی موجود تھی۔ میں میز کے قریب پہنچ کر رک گیا اور وہاں موجود ہر شے کا جائزہ لینے لگا اور اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔ مجھے اپنے کندھے پر ایک نرم سا دباؤ محسوس ہوا تھا۔ کوئی میرے عقب میں کھڑا تھا۔ یہ انسانی ہاتھ کا مخصوص دباؤ تھا۔

میں بے ساختہ گھوم گیا اور اسی وقت وہ مجھے نظر آ گیا۔

وہ یقینی طور پر ربی موشے ہائمن ہی ہو سکتا تھا۔ پتا نہیں، وہ کس وقت دبے قدموں خاموشی کے ساتھ میرے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا قد ساڑھے چھے فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ رنگت سرخ و سفید اور چہرہ جھریوں زدہ۔ اس کی عمر کسی بھی طور ایک سو بیس سے کم نہیں ہو سکتی تھی۔ جسم میں نحیفی و نزاری پائی جاتی تھی تاہم جھریوں کے باوجود بھی چہرے پر ایک خاص قسم کی تازگی پائی جاتی تھی۔ اس نے عام لباس کے اوپر ایک طویل جبہ پہن رکھا تھا۔ سر پر اونچی ٹوپی تھی اور وہ ہونٹوں پر مہربان مسکراہٹ سجائے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

ربی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور لپک

موجود تھی۔ میں نے یہ خاصیت اپنے استاد ماسٹر ہینگ بائی کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ ربی کے بارے میں مجھے پتا چل چکا تھا' وہ ہپناٹزم اور دیگر ماورائی علوم کا ماہر ہے لہٰذا میں بے حد محتاط تھا۔ اس کی پُرکشش آنکھیں اگرچہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں لیکن میں بھی کوئی عام انسان نہیں تھا۔ جو اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی زیر ہوجاتا۔ میں ربی سے آنکھیں ملا کر یک ٹک اسے گھور رہا تھا، اسی لمحے میری چھٹی حس نے مجھے ایک اچھوتی راہ دکھلائی۔

مکار یہودیوں کو کسی مکاری ہی سے اپنے دام میں لایا جاسکتا تھا۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ مجھے یوں ظاہر کرنا چاہئے جیسے میں ربی کی آنکھوں سے متاثر ہوگیا ہوں۔ مجھے عمل کر ہرگز اس کا مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔ اپنی صلاحیتوں کو مخفی رکھنا چاہئے تاکہ بہ وقتِ ضرورت انہیں استعمال کرکے ربی کو دھوکا دیا جاسکے۔ ربی کو اگر میں خوش گمانی میں مبتلا کردیتا تو یہ میری کامیابی ہوتی! جس طرح لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے...... بالکل ایسے ہی کسی سازش کو دھوکا دہی ہی سے ناکامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے ربی کے چہرے سے نگاہ ہٹا کر نظر جھکالی۔ وہ یہی سمجھا ہوگا' میں اس کی نگاہ کی تاب نہیں لاسکا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ وہی محبت بھرا مہربان ہاتھ ایک مرتبہ پھر میرے شانے پر آٹکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ربی لب کشا ہوا۔

''میرے بچے!'' اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی گونج اور شفقت پدری پائی جاتی تھی'' مجھے سخت افسوس ہے کہ یہاں پہنچنے تک تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔''

''تم یہ بات ایسے کہہ رہے ہو جیسے یہاں پہنچنے کے بعد مجھ سے نہایت ہی شاندار سلوک کیا جارہا ہے۔'' میں نے تلخی بھرے لہجے میں کہا تاہم نگاہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

ربی کی مخصوص نرم خوئگر گونج دار آواز میری سماعت تک پہنچی ''میرے بچے! مشکلات سے گزرنے کے بعد ہی انسان راحتیں پاتا ہے۔ بہرحال مجھے بے حد افسوس ہے کہ تمہیں ہماری طرف سے دکھ اٹھانے پڑے لیکن اس سلسلے کو ختم ہی سمجھو۔ اب تمہاری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ تم آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے نہایت ہی ضروری باتیں کرنے والا ہوں۔''

اپنی بات ختم کرکے وہ عالی شان کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ میں اسی صوفے پر آبیٹھا جہاں میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے ربی موشے ہائمن کی طرف دیکھا تو وہ اپنی کرسی پر براجمان ہوچکا تھا۔ وہ اس وقت گہری نظر سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی کے ساتھ ساتھ مقناطیسی کشش بھی پائی جاتی تھی۔ میں اپنی روحانی قوتوں کے بل بوتے پر ربی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی قدرت رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ چاہے جو بھی برآمد ہوتا مگر مجھے ایسا نہیں کرنا تھا۔ اس کو فریب دینے کے لیے انتہائی ...... ضروری تھا کہ میں خود کو اس سے متاثر ظاہر کروں۔ سو میں نے ایک بار پھر نظر جھکالی اور زانو پر رکھے اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگا۔ اسی لمحے ربی کی مخصوص آواز نے میری سماعت پر دستک دی۔

''وجدان' میرے بچے!'' اس کی گونجیلی آواز میں بے بھی پناہ تاثر پایا جاتا تھا'' دوسرے مسلمانوں کی طرح تم بھی یہودیوں کو اپنا دشمن سمجھتے ہو لیکن اس سوچ کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہودیوں نے بارہا مسلمانوں کی مدد کی۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لو تمہیں خود ہی اندازہ ہوجائے گا لیکن مسلمانوں کے اندر ایک انتہائی متشدد گروہ پایا جاتا ہے جو ہمیں اپنا ازلی دشمن سمجھتا ہے۔ یہ چند انتہا پسند لوگ باقی لاکھوں' کروڑوں مسلمانوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اس طرح مجموعی طور پر مسلمان ہم یہودیوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں جو کہ کوئی مثبت قدم نہیں۔ ایسا منفی رویہ اقوام کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتا ہے...... اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ تم خود دیکھ سکتے ہو۔ اس وقت تمہاری قوم کس انتشار کا شکار ہے۔ منفی اور مخالفانہ سوچ نے انہیں اندرونی طور پر شکست و ریخت میں مبتلا کررکھا ہے۔ وہ کہیں یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور کہیں ہندوؤں سے ان کی دشمنی ہے۔ کبھی عیسائیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور کبھی کسی اور قوم کو برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ انہیں اپنے سوا سب کافر نظر آتے ہیں۔ میرے بچے! یہ سوچ یہ رویہ منفی ہے۔ غیر صحت مند یعنی بیمار ہے۔ کیا یہ پنپنے کی نشانیاں ہیں؟''

میں سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ ربی کی باتوں کا یک سر مجھ پر اثر ہوا اور نہ ہی میں نے اس سے پوچھا کہ یہودی کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ محبت اور بھائی چارے کے نام پر کس طرح اقوام عالم کو اپنا غلام بنا رہے ہیں۔ خاموش رہ کر اس کی تقریر سننے میں ہی میری بھلائی تھی۔ میں اسے فریب مسلسل میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔ وہ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دوسری اقوام سے نفرت اور دشمنی تو رہی ایک طرف' مسلمان خود اپنے اندر بھی بے شمار فرقوں اور طبقوں میں بٹ

چکے ہیں۔ ہر طبقہ' ہر فرقہ دوسرے کو کافر قرار دیتا ہے اور واجب القتل سمجھتا ہے۔ اس اندرونی تفرقے نے کیسے کیسے عبقری کھا ڈالے۔ کیسے کیسے اعلیٰ دماغ نفرت کی اس آگ نے چاٹ لیے...... لیکن میں تمہیں برباد یا ضائع نہیں ہونے دوں گا!''

ربی کی گفتگو کا بیش تر حصہ منافقت اور منافرت آمیز ہی سہی لیکن ایک بات اس نے بڑی حقیقت افروز کی تھی۔ آج پوری دنیا کے مسلمان خصوصاً پاکستانی مسلمان ''مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔'' کی فلاسفی کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ہر فرقہ' ہر طبقہ خود کو صحیح اور دوسرے کو غلط سمجھتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف گن' لاٹھی اور خنجر بہ دست ہے۔ یہ واقعی افسوس ناک بلکہ شرم ناک صورتِ حال ہے جو کسی غیر مسلم کے سامنے سر جھکا دینے پر مجبور کردیتی ہے۔ میں چونکہ یہودیوں کے ربی کی عیاری اور چال بازی سے واقف تھا اس لیے خاموشی سے اس کا خطبہ سنتا رہا۔

''میرے بچے!'' وہ کہہ رہا تھا'' مسلمان قوم میں بڑے بڑے جینئس پیدا ہوئے ہیں لیکن بیشتر کے ٹیلنٹ کی کلی بن کھلے ہی مرجھا گئی۔ انہیں نفرت اور فرقہ واریت کی تپش نے جھلسا دیا۔ اس قوم کے بعض عاقبت نااندیش لوگوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری مگر میں تم پر ایک ذرا آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

اس نے دو مرتبہ اس حوالے سے خصوصاً میرا ذکر کیا تھا۔ ردِعمل کے طور پر میرا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا لازمی ہوگیا تھا۔ اس خیال سے کہ اسے مجھ پر کوئی شک نہ ہو' میں نے چونکے ہوئے انداز میں ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا پھر نگاہ جھکالی۔ میں اس پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اس سے آنکھ ملانا میرے بس کی بات نہیں۔

ربی موشے ہائمن نے اپنی مخصوص تاثر انگیز آواز میں خطاب جاری رکھا'' میرے بچے! تمہیں ایک نظر دیکھتے ہی مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا۔ تم نے آج تک فضول کاموں میں اپنی توانائی صرف کی ہے۔ میں تمہیں بتاؤں گا' عظیم کارنامے کس طرح سر انجام دیے جاتے ہیں۔ میرے سایے میں رہ کر تم زندگی کے انوکھے تجربے سے گزرو گے اسی لیے میں نے تمہیں امریکی سی آئی اے سے چھینا ہے۔''

اس نے لفظ ''چھینا'' پر کافی زور دیا تھا۔ میں نے بے ساختہ گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بولا'' یہ سی آئی اے والے بڑے ذہین اور چالاک بنتے ہیں لیکن یہ بے وقوف تمہاری حقیقت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتے۔ اب یہی دیکھ لو' وہ ''سی ڈی'' کی چوری کا الزام تم پر دھر رہے ہیں حالانکہ وہ سی ڈی تم نے نہیں چرائی جس کسی نے بھی چرائی ہے میں جانتا ہوں۔''

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ربی کوئی بہت بڑا انکشاف کرنے جارہا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ وہ نہایت ہی ٹھہرے ہوئے نرم و ملائم لہجے میں بولا۔

''میرے بچے تم اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو۔ میں جانتا ہوں تم چور نہیں ہوسکتے۔ وہ سب تمہارے پرتو کی شرارت ہے۔''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟''

میں واقعی حیرت زدہ تھا۔ ربی کی ماورائی قوتیں کھل رہی تھیں۔ یہ راز میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ میرے اچانک سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا۔ ''میرے بچے! میں عمر میں تم سے پانچ چھے گنا بڑا ہوں لیکن تمہارے لہجے میں وہ احترام نظر نہیں آتا جو ہونا چاہئے۔ تم مجھے جس انداز میں مخاطب کررہے ہو' وہ بدتمیزی کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنے لب و لہجے اور تیور کو درست کرو میرے بچے! یاد رکھو' بداخلاقی اور بدتہذیبی انسان کی صلاحیتوں کو اسی طرح تباہ و برباد کردیتی ہے جیسے لوہے کو زنگ اور لکڑی کو دیمک۔ آسمان بہت بلند' بہت بڑا اور بہت اعلیٰ ہے۔ اس کی جانب رخ پھیر کر تھوکنے والوں کا تھوک انہی کے چہروں پر گرتا ہے۔''

ربی ایک کھلی حقیقت بیان کررہا تھا۔ مجھے اس وقت بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ میں نے ندامت آمیز نظر سے اسے دیکھا اور ایک مرتبہ پھر گردن جھکالی۔ وہ چاہے یہودیوں کا مذہبی پیشوا تھا لیکن اخلاقیات کا ایک کائناتی اصول بیان کررہا تھا اس لیے اس کے کہے کو سننا اور اس پر عمل کرنا لازم تھا۔

''بہرحال میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ اس لیے تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔'' وہ رسانیت اور محبت کی آمیزش اپنے مخصوص لہجے میں بھرتے ہوئے بولا'' جب میں تمہاری پراسرار جسمانی اور ذہنی بلکہ روحانی صلاحیتوں سے آگاہ ہوگیا ہوں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا وہ پرتو کیا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ اس کی شرارتیں ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ سی ڈی کی چوری کے بعد بھی اس نے ایک تازہ ترین کارنامہ انجام دے ڈالا ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا البتہ اس دفعہ میرے لہجے میں احترام شامل تھا۔

''اس شریر نے تمہاری ساتھی صدف کو شعیب غوری کی

قید سے نکال لیا ہے۔'' ربی نے میری سماعت پر ایک خوفناک دھماکا کیا'' دلچسپ بات یہ ہے کہ صدف اسے اصلی وجدان ہی سمجھ رہی ہے اور...... اس میں اس بے چاری کا بھی کوئی قصور نہیں۔''

میں دیدے پھاڑے ربی موشے ہائمن کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی اسپر چوئیل اپروچ کا قائل ہو گیا۔ وہ بے پناہ روحانی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس وقت میں براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے اندر اترنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بے ساختہ میں نے نگاہ جھکالی۔

اسی لمحے ایک خطرناک سوال نے میرے ذہن میں جنم لیا۔ اگر ربی نے واقعی کسی روحانی صلاحیت سے وہ احوال معلوم کیا تھا تو پھر اس بات کے امکانات بھی روشن تھے کہ وہ روٹی والے منصوبے سے بھی واقف ہوگا بلکہ اسے تو یہ بھی جاننا چاہیے کہ روٹی اس کی نہیں بلکہ کسی مخالف گروہ کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس خیال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔

اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ میرا ذہن یہودیوں کی ازلی مکاری کی طرف جا رہا تھا اور ربی ایک طرح سے یہودیوں کا سردار تھا۔ اس کی مکاری اعلیٰ کوالٹی کی ہوتی۔ میں نے تنقیدی انداز میں سوچا ممکن ہے ربی مجھے متاثر کرنے کے لیے وہ باتیں کر رہا ہو۔ شعیب غوری یہودی لابی کا پلانٹیڈ تھی۔ صدف غوری کی قید سے نکل گئی ہو۔ وہاں کی ساری خبریں ربی تک پہنچ گئی ہوں اور اب یہ مجھ پر رعب جھاڑنے کے لیے یہ پراسرار انداز اختیار کر رہا ہو؟

ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن ربی کے ایک انکشاف پر میں واقعی حیرت زدہ تھا اور وہ یہ کہ نقلی وجدان کی کوڑی وہ خوب لایا تھا۔ سی ڈی کی چوری والے معاملے کی حقیقت صرف مجھ تک محدود تھی۔ اس سلسلے میں ربی نے واقعی مجھے حیران کر دیا تھا۔ میرا دھیان لامحالہ صدف کی طرف چلا گیا۔

ربی کے مطابق 'صدف نقلی وجدان کو اصلی سمجھ رہی تھی۔' پتا نہیں وہ بدمعاش اس کے ساتھ کیا کیا بدمعاشیاں کر رہا ہوگا! صدف مجھے بے پناہ چاہتی تھی۔ اپنے چاہنے والوں کو بیچ منجدھار نہیں چھوڑا جاتا۔ صدف میری ایک منتخب ساتھی تھی۔ اس نے میری جان بچانے کے لیے کئی بار اپنی جان کو داؤ پر لگایا تھا۔

''یہاں فون کی سہولت موجود ہے؟'' میں نے بے اختیار ربی سے استفسار کیا۔

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے نرمی سے بولا'' ہاں میرے بچے! یہاں سے پوری دنیا میں ڈائریکٹ کسی بھی جگہ فون کیا جا سکتا ہے۔'' پھر مجھ سے پوچھا'' تم کس الجھن میں گرفتار ہو؟''

''میں فوری طور پر صدف سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تم اپنے پرتو کی وجہ سے فکرمند ہو؟''

''بالکل یہی بات ہے۔''

''میں نے کہا نا' تم ہر فکر' ہر پریشانی کو ذہن سے جھٹک دو۔'' ربی مشفقانہ لہجے میں بولا'' سب ٹھیک ہو جائے گا میرے بچے! میں ہوں نا تمہاری پشت پر۔ تم دیکھ لینا' میں بہت جلد تمہاری ساتھی کو تمہارے پاس پہنچا دوں گا اور وہ تمہارا پرتو!'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر گمبھیر آواز میں بولا'' اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔ تم اپنے ذہن کو پراگندہ مت کرو۔''

ربی کی باتوں میں بڑی قوی تسلی تشفی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا اور فوراً گفتگو کو ساحل کی جانب موڑ دیا۔ میں نے ربی موشے ہائمن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ میرے انداز سے میں واضح شکوا تھا۔

''محترم ربی! میری ایک ساتھی ساحل بھی آپ کی قید میں ہے!''

''قید نہیں میرے بچے!'' وہ ایک مہربان مسکراہٹ کے ساتھ بولا'' وہ میری پناہ میں ہے۔''

میں نے کہا'' برنارڈ لیو نے ساحل کے حوالے سے مجھے جو تفصیلات بتائی ہیں وہ انتہائی حیرت انگیز اور چونکا دینے والی ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ ساحل کسی انمول خزانے کے راز سے آگاہ ہے اور وہاں تک رسائی کا ذریعہ بھی جانتی ہے؟''

''ہم بے مقصد باتوں میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کرتے!'' وہ پرمعنی انداز میں بولا۔

''لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ساحل اتنی گہری بھی ہو سکتی ہے؟''

''تم نے سنجیدگی سے کبھی اس کی گہرائی ناپنے کی کوشش ہی نہیں کی میرے بچے!'' وہ رسانیت سے بولا'' جو لوگ اوپر سے سیدھے سادے اور معصوم نظر آتے ہیں وہ اپنے اندر کئی سمندر چھپائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تم نے اپنی ساتھی ساحل کو ہمیشہ ایک عام سی لڑکی سمجھا ہے۔ بہرحال تمہیں بہت جلد یقین آ جائے گا کہ ساحل کوئی عام سی لڑکی نہیں ہے۔''

کیا میں اس وقت ساحل سے مل سکتا ہوں؟'' کافی دیر سے دل میں مچلنے والا سوال بالآخر میری زبان پر آ ہی گیا۔

ربی نے بڑی معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا اور گہری سنجیدگی

سے بولا'' میں تمہیں ساحل سے ضرور ملواؤں گا مگر فوری طور پر یہ ممکن نہیں...... بلکہ یوں سمجھو سردست یہ مناسب نہیں۔ تمہیں دو دن مزید انتظار کرنا ہوگا اس کی یاد میں تھوڑا اور تڑپنا ہوگا۔''

وہ خاموش ہو کر خلا میں گھورنے لگا۔ چند لمحات کے بعد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''وجدان! میرے بچے! کسی کی یاد میں تڑپنا اور اس طرح تڑپنا کہ تمہاری تڑپ کسی کو نظر نہ آئے' بہت مشکل کام ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تم یہ مشکل کام کرنے میں ناکام ہو رہے ہو حالانکہ میں جانتا ہوں تم اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل اور کٹھن کام کر سکتے ہو۔ تمہارے اندر بے پناہ حوصلہ اور قوت برداشت ہے مگر عشق کے میدان میں تم مار کھا رہے ہو!''

وہ خاموش ہوا تو میں نے اضطراری انداز میں پوچھا'' پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ ایک ٹک میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ مقناطیسی کشش تھی۔ اگلے ہی لمحے میں نے نگاہ جھکالی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اس سے آنکھ ملانے کی قدرت نہیں رکھتا تھا بلکہ میں یہ سب کچھ ایک خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ربی موشے ہائمن کی نگاہ سے بے حد تسخیری قوت پوشیدہ تھی مگر میں بھی کوئی عام آدمی نہیں تھا جو اس سے زیر ہو جاتا۔ میں نے زندگی میں بارہا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا اور کبھی اس سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس دنیا میں سب سے زیادہ تاثیر والی شے موت ہے جو بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ میں موت سے کبھی نہیں ڈرا تھا تو ربی کے سامنے کیا سرنگوں ہوتا۔ میرا متاثر ہونا ایک کھیل تھا جو میں یہودیوں کے سب سے بڑے ربی موشے ہائمن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ پتا نہیں اس اعصابی کھیل میں ہار کس کا مقدر بننے والی تھی اور جیت کس کا نصیب چمکانے والی تھی۔ میں اس بارے میں واقعی کچھ نہیں جانتا تھا۔

میری نظر جھکی تو ربی نے گونج دار آواز میں کہا'' میرے بچے! تم جتنی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کے مالک ہو' ابھی تک تم نے اس کا عشر عشیر بھی استعمال نہیں کیا بلکہ تمہاری کئی صلاحیتیں تو پڑے پڑے زنگ آلود ہو رہی ہیں اور بعض کو تم اپنی جذباتیت سے کند کر رہے ہو لیکن فکر نہ کرو' میں تمہارے ذہن کو پالش کر دوں گا' تمہاری صلاحیتوں کو صیقل کر کے تمہیں شخصیت کے اعتبار سے دیوہیکل بنا دوں گا۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا میرے بچے! اب سب کچھ میں کروں گا۔ تم بس خاموشی کے ساتھ میری ہدایات پر عمل کرتے جانا۔''

وہ آہستہ آہستہ مجھے اپنی راہ پر لا رہا تھا۔ میں بھی یہی ظاہر کرنے لگا کہ میں نے اس کے بچھائے ہوئے جال میں قدم ڈال دیا ہے۔ اسی پالیسی کو اختیار کر کے میں اسے کسی مرحلے پر چت کر سکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا۔ اس وقت میری اداکاری عروج پر تھی۔

''ٹھیک ہے محترم ربی! میں آپ کو فالو کرنے کی کوشش کروں گا۔''

اگر میری جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس کی چال ربی سے زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ تو اللہ کا شکر اور میرے استاد ماسٹر ہینگ پائی کا احسان تھا کہ میں ربی کے سامنے ثابت قدمی سے ڈٹا ہوا تھا'' چی'' کی پوشیدہ قوت اور یوگا ٹریننگ میرے لیے ایک مضبوط ڈھال ثابت ہو رہی تھی۔ میری اطاعت مندی پر ربی خوش ہو گیا۔

''شاباش میرے بچے! تم نے میرا دل بڑھا دیا ہے۔'' وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

میں کسی بچے ہی کی طرح مچل کر بولا'' دو دن بعد آپ مجھے ساحل سے ملوا دے گا نا؟''

''ضرور میرے بچے! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔''

میں نے پوچھا'' محترم ربی! آپ نے بتایا ہے ساحل آپ کی پناہ میں ہے۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق ہے؟''

''تم بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہے ہو۔'' وہ مربیانہ انداز میں بولا'' میرے بچے! ساحل کے سینے میں جتنا راز پوشیدہ ہے اس کے حصول کے لیے تو سارا عالم اس کا دشمن بن سکتا ہے لیکن فی الحال ایک خاص گروہ اس کے تعاقب میں ہے اسی لیے احتیاط کے پیش نظر اسرائیل کے بجائے اسے الاسکا لایا گیا ہے۔ بعد میں تم دونوں کو اسرائیل بھیج دیا جائے گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا'' لیو نے تمہیں اس بارے میں تو بتایا ہوگا؟''

''صرف اس حد تک کہ پہلے ہمیں اسرائیل پہنچایا جانے والا تھا پھر کسی مصلحت کی بنا پر الاسکا لایا گیا ہے۔'' میں نے بدستور نگاہ جھکائے ہوئے کہا'' اس نے کہا تھا اس سلسلے میں تفصیل سے آپ آگاہ کریں گے۔''

''اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔'' ربی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا'' تفصیلات کے سلسلے میں تم فی الحال اتنا جان لو کہ ایک گروہ تمہاری ساتھی کی تلاش میں ہے۔ دراصل وہ لوگ بدھ کے پیروکار ہیں اور اسرائیل میں بھی ان کے کچھ آدمی بھیس بدل کر کام کر رہے ہیں۔ مجھے ان کے منصوبے کی بھنک پڑ گئی۔

۔وہ ساحل کو اڑا لے جانا چاہتے ہیں اسی لیے میں نے سی آئی اے کو مجبور کیا اور چند دنوں کے لیے تمہیں الاسکا بلالیا۔ میں عموماً اسرائیل میں موجود رہتا ہوں۔ اگر کوئی خاص مشن درپیش ہوتو الاسکا کے اس خفیہ ٹھکانے پر آجاتا ہوں۔ مجھے امید ہے ہم بہت جلد اپنے ملک کو سازشی عناصر سے صاف کردیں گے۔"

ربی کے انکشاف نے مجھے راکیل عرف روثی کے بارے میں سوچنے پر مجبور کردیا۔ اس نے بتایا تھا اس کے بڑے تہ خانے کے راز کی حفاظت کررہے ہیں اور اسی سلسلے میں وہ مجھے اور ساحل کو یہودیوں کے چنگل سے نکال لے جانا چاہتے تھے۔اس سے تو یہی ثابت ہوتا تھا' راکیل بدھ مت کے ماننے والوں کے لیے کام کررہی تھی' گویا یہ یہودیت اور بدھ مت کے درمیان ایک خوف ناک جنگ تھی۔ بدھ کے پیروکار نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ قیمتی خزانے کی حفاظت کررہے تھے جب کہ یہودیوں کا ربی موشے ہائمن سونے کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ پانچ نایاب اور انمول بے مثال اسٹونز پر بھی ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور بتایا یہ جارہا تھا' ان قیمتی پتھروں کی ایک روحانی اور ماورائی حیثیت بھی تھی۔

یہودی ذہنیت کھل کر سامنے آگئی تھی۔ وہ روئے زمین پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اقوامِ عالم کو اپنا محتاج بلکہ غلام دیکھنا چاہتے تھے۔ ان پانچ پراسرار پتھروں کا حصول بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی تھا۔

میرا تجربہ اور مطالعہ بلکہ مشاہدہ تو یہ سبق دیتا تھا کہ قدرت نے اگر زیرِ زمین کچھ خزانوں کو پوشیدہ رکھ چھوڑا ہے تو اس میں اس کی کوئی گہری مصلحت کارفرما ہوتی ہے لہٰذا پوشیدہ راز کو پوشیدہ ہی رہنا چاہیے۔ آج تک جن خفیہ خزانوں کو بھی کھود کر نکالا گیا انہوں نے بڑی تباہی اور بربادی پھیلائی ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسانی جانوں کے زیاں کے ساتھ ساتھ اس کرۂ ارض نے بھی بہت مصیبت اٹھائی ہے۔ اس روشنی میں یہودی منفی اور بدھ کے پیروکار مثبت طرزِ عمل کے حامل نظر آتے تھے......اور میں نے ہمیشہ مثبت اور تعمیری لوگوں کا ساتھ دیا ہے۔ منفی اور تخریبی لوگ سدا میری ہٹ لسٹ پر رہے ہیں۔ لہٰذا یہودیوں سے میری دشمنی کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا میں بدھ مت کا دوست تھا......اس دوستی کی درخشندہ مثال تو ساحل تھی جو میری رگِ جاں کی حیثیت اختیار کرچکی تھی!

میں نے ربی موشے ہائمن سے استفسار کیا "محترم ربی! اسرائیل کے اندر تو آپ بہت طاقتور ہیں اور یہاں امریکا میں بھی آپ کے اشارے چلتے ہیں پھر بدھ مت کے ایک چھوٹے سے گروہ کے سامنے اتنے بے بس کیسے ہوگئے کہ آپ کو ہنگامی حالات میں اپنا منصوبہ تبدیل کرنا پڑا؟" اس نے بڑی ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھا' اس وقت میں اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ میں نے اس کے جواب دینے سے پہلے مزید کہا۔

"بدھ کے ماننے والے تو زیادہ تر تبت اور چین میں پائے جاتے ہیں یا پھر تھائی لینڈ وغیرہ میں ان کی بھاری تعداد ملتی ہے۔ ایسا ہی کیا ہے کہ انہوں نے اسرائیل اور امریکا میں آپ کو مجبور کردیا؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے مسکرایا اور گمبھیر آواز میں بولا "میرے بچے! ہم مجبور ہیں اور نہ ہی بے بس۔ اسے تم ہماری مصلحت اندیشی اور احتیاط پسندی سمجھ لو......اور یہ تمام تر احتیاط محض اس لیے برتی جارہی ہے کہ اس گروہ کی پشت پر ایک بہت بڑے شخص کا ہاتھ ہے ورنہ ان چوہے کی شکل والے گنجوں لنگوں سے کون ڈرتا ہے!" بات ختم کرتے کرتے ربی کے لہجے میں بے پناہ حقارت در آئی تھی اور یہ بڑی اہم بات تھی ورنہ وہ اب تک نرمی اور شائستگی کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

ربی موشے نے ان لڑکوں کے خلاف اپنی نفرت اور دشمنی کو ظاہر کرتے ہوئے ...... اپنی اصلیت کھول دی تھی۔ وہ اپنے خول سے باہر آیا تو پتا چلا اس کی شخصیت میں شامل محبت اور صلح جوئی کسی ڈرامے اور دکھاوے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے اس کے انکشاف کے حوالے سے سوال کیا۔

"محترم ربی! آپ کے خیال میں اس گروہ کی پشت پناہی کون کررہا ہے؟"

"دلائی لاما!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"کیا واقعی؟" میرے لہجے میں اصلی حیرت تھی۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی "ہاں واقعی میرے بچے! اور دلائی لاما کی روحانی صلاحیت کو بہرحال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔" پھر وہ رعونیت بھرے انداز میں بولا "لیکن میرے اس قلعے تک رسائی حاصل کرتے ہوئے دلائی لاما کی سوچ اور تصور کے پر جل جائیں گے۔ یہاں میری مرضی کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

اس کے بعد بھی ربی اپنی شان اور اختیارات کے ذیل

میں بہت کچھ کہتا رہا مگر میرا ذہن تھوپچی کی باتوں کو ٹریس کررہا تھا۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں تھوپچی نے مجھے بتایا تھا' تہ خانے والے خفیہ خزانے کی حفاظت باقاعدہ دلائی لاما کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ اسی لیے آج تک اس خزانے کو کوئی حاصل نہیں کرسکا۔ ہر دور کا دلائی لاما اور اس کے چند رفقا ہی اس راز سے واقف ہوتے ہیں۔ تھوپچی نے یہ بھی کہا تھا' دلائی لاما مجھ پر اپنا اعتماد ظاہر کرچکا ہے اس کا مطلب یہی تھا' تھوپچی نے کوئی غلط بیانی کی تھی اور نہ ہی ربی مجھ سے جھوٹ بول رہا تھا۔ منفی اور مثبت دو قوتوں میں ایک خوفناک ٹکراؤ ہونے والا تھا......اور میں اس جنگ کی بساط کا ایک ایسا مہرہ تھا جس کے لیے ہر دوسرا اپنے مدمقابل کو پیٹنے کی کوشش میں تھا' ربی حاصل کرچکا تھا اور لاما کے وفادار ہمیں اس پہاڑی سے نکالنے پر کمربستہ تھے۔ ابھی تک راکیل اور مائیکل کے نام سامنے آئے تھے۔ راکیل نے مجھے بتایا تھا ان کے دو ساتھی اور تھے جو ہمیں اپنے ساتھ ماؤنٹ مکنلے سے باہر لے جانے والے تھے۔ ماؤنٹ مکنلے سے نکلنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم دینالی نیشنل پارک سے بھی باہر نکل جاتے' اگر کوئی انڈر گراؤنڈ راستہ اختیار کیا جاتا تو ورنہ ہم پہاڑ سے نکل کر پارک میں آجاتے۔ اس کے بعد حالات ہمیں کہاں لے جاتے' اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

"تم کس سوچ میں غرق ہو میرے بچے!" میں خیالات کے تند و تیز دھارے میں کسی تنکے کے مانند بہہ رہا تھا کہ ربی موشے ہائمن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا اور میری جانب قدم بڑھا رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ وہ میرے صوفے کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"فضول کی سوچوں اور واہموں سے اپنے دماغ کو خراب نہ کرو میرے بچے۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ تمہیں نیند آرہی ہے۔ آرام سے سو جاؤ......اسی صوفے پر دراز ہوجاؤ......"

اس کی آواز میں ترغیب کا عنصر شامل ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا اب وہ مجھ پر کوئی جنتر منتر اور تنتر کرنے والا تھا۔ یہ بڑا ہی نازک اور اہم مرحلہ تھا۔ اگر میں بھرپور اداکاری کے مظاہرے میں کامیاب ہوجاتا تو ربی کے مذموم عزائم مجھ پر روزِ روشن کی طرح کھل سکتے تھے۔ مجھے اس سے تعاون کرنا تھا' یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں اس کے ٹرانس میں آگیا ہوں۔ وہ مجھے ہپناٹائز کرنے جا رہا تھا۔

میں کسی انتہائی فرماں بردار اور اطاعت گزار ملازم کے مانند ربی کے حکم پر صوفے پر دراز ہوگیا۔ وہ صوفہ بڑا دبیز اور آرام بخش تھا۔ میں نے آنکھیں کھلی رکھیں تاہم ان میں خمار کی سی مصنوعی کیفیت بھر لی۔ ربی میرے سرہانے آکر کھڑا ہوگیا۔ اس نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھنا شروع کردیا۔

چند سیکنڈ تک میں نے اس سے آنکھ ملائے رکھی پھر پلکیں جھپک کر یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اس دلکش دھن نے میرے اندر بے چینی بھردی ہو۔ اسی لمحے ربی کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

"میرے بچے! نیند نے تمہیں بے حال کررکھا ہے۔ تمہارے پپوٹے بھاری ہورہے ہیں۔ پلکیں من من کی ہورہی ہیں۔ آنکھیں کھلی رکھنا تمہارے اختیار میں نہیں رہا۔ تمہاری پلکیں نیند کے بوجھ سے دبی جارہی ہیں' یہ جھک رہی ہیں......تمہاری آنکھیں بند ہورہی ہیں۔"

ربی کی آواز میں بڑی زوردار ترغیب تھی۔ میری جگہ اگر کوئی اور شخص اس کے قابو میں آیا ہوتا تو ان سجیشنز کے نتیجے میں کب کا سوچکا ہوتا۔ یہ تو میرا ہی حوصلہ تھا کہ اب تک اس کے ٹرانس میں نہیں آیا تھا۔ "چی" کی قوت اور یوگا کی مشق نے مجھے ایک مضبوط ڈھال فراہم کررکھی تھی تاہم ربی کو کامل فریب دینے کے لیے اس کی سجیشنز کے اثرات کا اظہار ضروری تھا۔ میں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک دوبار پلکوں کو پھڑپھڑانے والے انداز میں حرکت دی اور آنکھیں بند کرلیں۔

بند آنکھوں کے پیچھے مجھے ربی کی گونج دار آواز سنائی دی "تمہاری آنکھیں بند ہوچکی ہیں۔ تم نیند کی وادیوں میں اتر رہے ہو لیکن تمہارے کان میری آواز سن رہے ہیں......صرف میری آواز! کائنات کی باقی آوازیں اور صدائیں تمہاری سماعت تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔ تم صرف میری آواز سن رہے ہو اور میری زبان سے ادا ہونے والا ایک ایک لفظ تمہاری یادداشت میں نقش ہورہا ہے۔ بیدار ہونے کے بعد حالتِ نیند میں ہونے والی کوئی بات تمہیں یاد نہیں رہے گی' سوائے میری ہدایات کے۔"

میں کسی عمدہ معمول کے مانند خاموش پڑا تھا۔ میں ربی پر یہی ظاہر کررہا تھا کہ اس کے مکمل ٹرانس میں ہوں۔ وہ اپنی ترغیبات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں تمہارا ربی مربی موشے ہائمن ہوں۔ تم میری ہدایت کو توجہ سے سن رہے ہو۔" مجھے اس کی آواز پُرتاثر لگی، یہی

تھی........"اس لیے بھی کہ کوئی اور آواز تمہاری سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی۔ تم اس وقت مکمل طور پر میرے قبضۂ قدرت میں ہو۔ تمہارے دماغ پر میری حکمرانی ہے۔ تمہارا دماغ کسی صاف شفاف سلیٹ کے مانند ہے۔ وہاں یادداشت کے نام پر ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ میں اب جو بھی بات تمہارے ذہن میں نقش کروں گا وہ تمہاری لانگ ٹرم میموری کا حصہ بن جائے گی۔ یہی تمہاری شخصیت تمہاری بنیاد ہوگی۔ بعد میں جب تمہاری ٹریننگ ہوگی تو تم از خود شارٹ ٹرم میموری بناتے چلے جاؤ گے۔ اب میں تمہارا ایک چھوٹا سا ٹیسٹ لوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ چند لحات کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر اپنی مخصوص تاثر انگیز اور گونج دار آواز میں سلسلۂ ترغیبات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے ایک آسان سا سوال پوچھتا ہوں۔ ذرا سوچ کر بتاؤ' تمہارا نام کیا ہے؟"

ربی نے ایک شاطرانہ چال چلی تھی۔ اس طرح وہ اپنی کارکردگی اور میری محکومی کو بھی چیک کرنا چاہتا تھا۔ ربی کے مطابق میرا دماغ اس وقت اس کے قبضے میں تھا......اور میں اسے اسی خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تاہم آنکھیں بند رکھتے ہوئے چہرے پر الجھن کے تاثرات پیدا کرلیے۔ میں ربی پر یہ ظاہر کررہا تھا' جیسے میں اپنا نام یاد کرنے کی کوشش کررہا ہوں لیکن مجھے اس کوشش میں ناکامیابی ہورہی ہو۔ ربی نے اپنی دانست میں میرا دماغ صاف کردیا تھا۔ پھر میں اپنا نام بتانے کی غلطی کیوں کرکرسکتا تھا!

"تم اپنے ذہن پر زور مت ڈالو میرے بچے!" ربی کی مشفق و مہربان آواز میری سماعت تک پہنچی۔ اس آواز میں کامیابی کا نشہ بھی شامل تھا" تمہارا ذہن کسی صاف سلیٹ کے مانند ہے اس وقت تمہاری یادداشت کے تمام خانے بالکل خالی ہیں۔ میں تمہاری یادداشت رقم کرتا ہوں۔ تمہارا نام راجر ہے...... بولو' تمہارا کیا نام ہے؟"

"راجر......" میرے ہونٹ تھرتھرائے۔

اس وقت میں چت آنکھیں بند کیے خاموش اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میری اداکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میں یہودیوں کے ایک جید عالم کے سامنے بڑی کامیابی سے اپنا خود منتخب کردہ رول ادا کررہا تھا......اور بڑی کام کی پرفارمنس دے رہا تھا۔

"میں تمہارا ربی مربی ہوں......موشے ہائمن!"

"آپ میرے ربی' میرے سب کچھ ہیں۔"

"آج کے بعد تم صرف میرا حکم مانو گے۔" ربی نے کہا۔

"آپ جیسا کہہ رہے ہیں' میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے نہایت ہی فرماں برداری سے کہا۔

وہ سجیشنز کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے بولا" آئندہ بھی تمہیں میں اسی طرح تنویمی عمل کے دوران میں خصوصی ہدایات دیا کروں گا جو تمہارے ذہن میں نقش ہوتی جائیں گی۔ تم اس عمل کا یا ان باتوں کا کسی سے بھی ذکر نہیں کرو گے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کمزور مگر قطعیت سے بھرپور لہجے میں کہا" میرے ربی! میں صرف اور صرف آپ سے متعلق رہوں گا اور ہر قسم کی ہدایت آپ ہی سے لوں گا۔"

"شاباش میرے بچے!" ربی کی آواز میں خوشی کا عنصر شامل ہوگیا۔

میں خاموش آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ ربی کے مذموم اور خطرناک ارادے اب کھل کر میرے سامنے آگئے تھے۔ وہ مکمل طور پر مجھے اپنا محکوم، اپنا آلۂ کار بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی جانب سے ایک طرح سے برین واشنگ کی ابتدا تھی۔ وہ میری شخصیت کو اپنے مقاصد کے مطابق تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ میری ضد سرکشی اور مستقل مزاجی نے اسے باور کرادیا تھا کہ دوستی کا ہاتھ بڑھا کر یا کسی عارضی "ٹریٹمنٹ" سے بات نہیں بنے گی۔ اگر مجھے اپنے اشاروں پر نچانا ہے تو پھر اسے کوئی دیرپا اور مضبوط بندوبست کرنا ہوگا۔ برین واشنگ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

راکیل عرف روئی کی باتیں حرف بہ حرف درست ثابت ہورہی تھیں۔ اس کے مطابق ربی ہپناٹزم اور دیگر پُراسرار علوم کا ماہر تھا۔ اگر میں اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ میری برین واشنگ کردے گا پھر وہ لوگ مجھے اپنے مقصد کا بنانے کے لیے واشنگٹن ڈی سی بھیج دیں گے جہاں تربیت کے نام پر میرے ساتھ پتا نہیں کیا کیا' کیا جائے گا۔ ربی نے بھی اسی قسم کے عزائم کا اظہار کیا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا بلکہ غیر محسوس طور پر اس وقت ہتھے سے اکھڑا ہوا تھا!

ربی موشے ہائمن مزید پانچ منٹ تک مجھے مختلف ترغیبات دیتا رہا۔ میں نے اس کی تکنیک سے اندازہ لگالیا کہ وہ کم از کم ایک بار اور مجھے تنویمی عمل سے گزارے گا۔ ترغیبات کے حساب سے اس کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس کی دانست میں اس نے "پروگرام" کا پہلا حصہ بڑی خوش اسلوبی

ے مکمل کرلیا تھا۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد وہ اختتامی غیبات کی طرف آگیا۔

"اب تم سو جاؤ گے۔ گہری نیند...... بہت ہی گہری ند...... تمہیں کچھ یاد نہیں رہے گا کہ تم پر کیا عمل کیا گیا۔ اقعات اور حالات کو تم بھول جاؤ گے تاہم تمہارا ذہن میری ایات کو یاد رکھے گا۔ بیدار ہونے کے بعد تم یہی سمجھو گے کہ شتے کے بعد تم گہری نیند سو گئے تھے' بے خبری کی نیند۔ تمہاری نکھ اسی کوٹھری میں کھلے گی جہاں تم نے ناشتا کیا تھا۔ تم کم از کم ار گھنٹے تک پُرسکون میٹھی اور گہری نیند ے...... نیند...... گہری نیند......اور گہری نیند!"

اس تکرار کے ساتھ ہی موشے ہائمن نے ترغیبات کا لسلہ موقوف کردیا۔ وہ میرے سرہانے ہی کھڑا رہا۔ یقینی طور وہ گہری نظر سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا گا۔ میں نے یہی ظاہر کیا جیسے بے خبری کی نیند سو رہا ہوں۔ ی کو ایک کامل دھوکا دینے کے اس آخری مرحلے پر میں کسی م کی کوتاہی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا!

ٹھیک پانچ منٹ بعد اس وسیع و عریض ہال کے سنگلاخ ں پر ربی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ وہ میری طرف سے لمئن ہونے کے بعد مجھ سے دور جارہا تھا۔ کہاں؟ میں اس کا ازہ نہیں لگا سکتا تھا کیونکہ میری آنکھیں بند تھیں اور میں پناٹائز" ہوچکا تھا!

تھوڑی دیر بعد اسی ہال میں متعدد قدموں کی آوازیں ریں۔ وہ کم از کم تین چار افراد تھے۔ میں سمجھ گیا وہ لوگ ے وہاں سے اٹھا کر واپس کوٹھری میں پہنچانے آئے ہیں میں نے خود کو ویسا ہی بنالیا جس کی وہ توقع کررہے تھے۔ مجھے ندھے پر لاد کر ہال سے نکال لیا گیا۔

جب مجھے اس مختصری کوٹھری سے لے جایا گیا تھا تو میں ل بے ہوشی کی حالت میں تھا میں نہیں جانتا تھا' کوٹھری سے نکلنے کے لیے کیا ٹیکنیک آزمائی گئی تھی تاہم اب میں محض ہوشی کا ناٹک کررہا تھا لہٰذا' کوٹھری [illegible] کے وقت یہ مجھے پر کھل جاتا۔ میں لحہ بہ لحہ ا[illegible] موقع کا انتظار کرنے ۔ ایک شخص نے مجھے کندھے پر ڈال رکھا تھا اور دو تین ساتھ ہارہے تھے۔

مختلف راہ داریوں سے گزرنے کے بعد وہ لوگ ایک رک گئے، یقیناً وہ کوٹھری کے قریب پہنچ گئے تھے۔ میرا ری دھڑ اٹھانے والے کی پشت پر لٹک رہا تھا اور ناف اس کندھے پر ٹکی تھی۔ میں اس سنہری موقع کو کھونے کا تصور بھی ا کرسکتا تھا۔

میں نے جسمانی طور پر خود کو یک سر بے سدھ ثابت کیا اور ایک آنکھ ذرا سی کھول کر ماحول کا جائزہ لیا۔ میں چونکہ سر کے بل الٹا لٹک رہا تھا اس لیے سب سے پہلے پختہ راہ داری کا فرش میری نظر میں آیا' پھر میری نگاہ ان افراد کے قدموں پر چلی گئی۔ میں اس سے زیادہ راہ داری کا جائزہ نہ لے سکا کیونکہ اسی وقت میری آنکھ نے ایک ایسا منظر دیکھا تھا کہ میری تمام تر توجہ اسی جانب مبذول ہوگئی۔

راہ داری نیم روشن تھی اور ہم جس دیوار کے نزدیک کھڑے تھے اس میں اچانک ایک شگاف سا نمودار ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے دو بڑے پتھر سلائیڈنگ ڈور کے مانند سائیڈ میں کھسک گئے ہوں۔ اس شگاف کی دوسری جانب مجھے وہی کوٹھری دکھائی دی جو پچھلے بارہ پندرہ گھنٹوں سے میری قیام گاہ رہی تھی۔ مجھے یہیں سے لے جایا گیا تھا۔

اس راز سے پردہ اٹھا تو میرے ذہن میں بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ کے تہ خانے کا منظر گھوم گیا۔ ساحل کے باپ تھونچی نے فاسنگ بدھا کے پاؤں کے نزدیک واقع پتھروں سے تھوڑی چھیڑ چھاڑ کی تھی اور اسی سلائیڈنگ انداز میں تہ خانے میں داخلے کا راستہ کھل گیا تھا۔ عین ممکن تھا' یہاں راہ داری کی اس دیوار میں بھی کوئی ویسا ہی میکانزم موجود ہو!

روئی کے مطابق وہ واش روم کے کسی خفیہ راستے سے اندر آئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا اس کوٹھری میں آمد و شد کے لیے ایک سے زیادہ راستے موجود تھے!

میں انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ مجھے کوٹھری کے اندر پہنچا دیا گیا۔ میں نے اپنی نیم وا آنکھوں کو بڑی صفائی سے بند کرلیا۔ میں چاہتا تو کن انکھیوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا لیکن اس مرحلے میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے بڑے تحمل اور محنت سے یہ کھیل بنایا تھا۔ ایک ذرا سے شوقِ دیدار میں' میں اس کھیل کو بگاڑنے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا!

انہوں نے مجھے میٹرس پر لٹادیا اور جس خاموشی سے وہاں پہنچے تھے' اسی خاموشی کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ اب مجھے کم از کم چار گھنٹے تک تنویمی نیند کا ناٹک کرنا تھا......ربی کو یقین دلانا تھا کہ اس کا "تجربہ" کامیاب رہا۔ اس کا یقین، میری کامیابی کی کنجی تھا!

☆☆☆

رات کا آخری پہر شروع ہوچکا تھا!

روئی حسبِ وعدہ کوٹھری میں پہنچ گئی۔ میں چونکہ آدھی رات کے بعد سے مسلسل جاگ رہا تھا اس لیے اس کی آمد مجھ سے چھپی نہ رہ سکی اور میں واش روم میں اس کے آثار محسوس

کرتے ہی اس جانب بڑھ گیا۔ میں چار فٹ طویل دراز کے آخری سرے پر پہنچا تو وہ آمد کے شگاف کو بند کر کے پلٹ چکی تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک اٹھی جیسے میں نے اس کی کوئی چوری پکڑلی۔ میں نے واش بیسن والا نل کھولنے کے بعد اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں اس کوٹھری میں آمدورفت کے ذرائع سے واقف ہو چکا ہوں۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے حیرت زدہ نظر سے مجھے دیکھا پھر بے ساختہ مسکرادی۔ اس کے دانت ہموار اور صاف شفاف تھے جن کے سبب اس کی مسکراہٹ میں آٹھ چاند لگ گئے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی' شاید اس لیے کہ وہ اس وقت انتہائی معقول لباس میں تھی۔ راکیل عرف روئی نے جینز پر فل سلیو گرم ہائی نیک پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں مخصوص قسم کے جوگرز ٹائپ جوتے تھے۔ اس نے اپنی زلفوں کو شانوں پر آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ لباس سے محروم حسن سوچ میں ہیجان تو پیدا کرتا ہے تاہم روح کی سرشاری اور ذہن کی تازگی کا سامان نہیں کرتا۔ ہر حسن کا اپنا ایک لبادہ ہوتا ہے اور یہ اسی میں اچھا لگتا ہے۔ حدود و قیود کی اس فلاسفی کو سمجھنے کے لیے احساس کی نزاکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

روئی نے میرا تنقیدی جائزہ لیا اور سوالیہ انداز میں بولی ''چلیں؟''

''بالکل چلیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور بولی ''اس وقت رات کے تین بجے ہیں۔ ہمیں ٹھیک ساڑھے تین بجے ایک مخصوص مقام پر پہنچنا ہے۔''

''آدھے گھنٹے کا مارجن ہے۔'' میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے وہ مخصوص مقام یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے؟'' میری آواز میں سرگوشی کی سی لہر تھی۔

وہ رکوع کے بل جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی ''فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ لگ بھگ پانچ سو میٹر ہوگا تاہم احتیاط کے پیش نظر کچھ زیادہ وقت رکھا گیا ہے۔ مائیکل ٹھیک سوا تین بجے اس مقام پر پہنچے گا۔''

مائیکل کے ذکر پر میرا دھیان ساحل کی طرح چلا گیا۔ روئی کے مطابق، مائیکل نے ساحل کو کوٹھری سے نکال کر کسی مقام پر پہنچانا تھا جہاں سے ان کے دیگر دو ساتھی ہمیں اپنے ساتھ اس پہاڑی خفیہ ٹھکانے سے کہیں دور اپنے لوگوں میں لے جاتے۔ اس کا مطلب یہی تھا' ساحل کو مجھ سے پہلے کوٹھری سے نکالا جانے والا تھا اور عین ممکن تھا' وہ اس وقت کوٹھری سے باہر نکل چکی ہو!

میں روئی سے کوئی سوال کیے بغیر اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔ وہ کموڈ کے نزدیک رکوع کے بل جھک کر عقبی دیوار کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے اس چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ برآمد ہو گیا۔ کموڈ کے پیچھے واقع دیوار میں لگ بھگ ایک فٹ کا شگاف پیدا ہو گیا۔ وہاں کی پتھریلی دیوار سلائیڈ کرتے ہوئے ایک جانب ہٹ گئی تھی۔

روئی سیدھی کھڑی ہو گئی اور آواز دبا کر بولی ''راستہ کھل گیا ہے۔ آجاؤ!''

میں نے اس کے بیان کردہ راستے میں جھانک کر دیکھا۔ مجھے اس کھوہ میں دور تک تاریکی ہی تاریکی نظر آئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''یہ راستہ تو بہت تنگ و تاریک ہے!''

''اس کی تنگی اور تاریکی ہی میں مزہ ہے۔ تم ڈرو نہیں۔''

''میں کوٹھری کی دیوار میں موجود ایسے ہی ایک چور راستے سے واقف ہوں۔'' میں نے کہا ''میرے خیال میں ادھر زیادہ آسانی رہے گی۔ وہ راستہ اس کی بہ نسبت خاصا کشادہ ہے۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''میں ہر راستے کے عواقب و جوانب سے آگاہ ہوں۔ کھلا ہوا راستہ آسان تو ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انتہائی غیر محفوظ بھی ہوتا ہے۔ اچانک کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بولی۔ ''میں اس معاملے میں تم سے زیادہ تجربہ کار ہوں' یہ تنگ راستہ ہماری کامیابی کی ضمانت ثابت ہوگا۔ تم مجھ پر میرے تجربے پر بھروسا رکھو۔''

وہ بڑے اعتماد سے سرگوشیانہ انداز میں بول رہی تھی۔ میں نے اپنی جانب بڑھے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ پہلے روئی اس تاریک کھوہ میں پہلو کے بل داخل ہوئی پھر مجھے بھی اندر کھینچ لیا۔ اس کے بعد اس نے مخصوص ٹیکنیک استعمال کر کے وہ شگاف بند کر دیا۔ ہم دونوں اس تنگ و تاریک کھوہ کے اندر بند ہو گئے۔

اس راستے کی چوڑائی ایک فٹ کے قریب تھی۔ لمبائی کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ روئی نے کہا ''ہمیں لگ بھگ پچیس فٹ تک اسی طرح کھسک کر آگے بڑھنا ہوگا' تم یہاں پر اپنے چار فٹ کے تجربے کو استعمال کر سکتے ہو!''

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ کوٹھری سے واش روم میں

آمدورفت کے راستے کا ذکر کر رہی تھی۔ وہ دراز ایک فٹ چوڑی اور چار فٹ طویل تھی۔ ایک دو بار کے تجربے کے بعد مجھے اس ''کھسکنے'' میں اچھی خاصی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ تنگ سا راستہ کافی کشادہ محسوس ہونے لگا تھا۔

ہمارے پہلو ایک دوسرے میں پیوست تھے اور ہم انچ انچ آگے سرک رہے تھے۔ وہاں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ہم اپنے ہاتھوں کو آگے پھیلا سکتے لہٰذا ہمارے بازو پہلوؤں میں لٹک رہے تھے۔ روئی مجھ سے آگے تھی اور اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو میرے بائیں ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ اس کا انداز کھینچنے والا تھا' جیسے وہ اپنی گائیڈ لنس کی روشنی میں مجھے آگے بڑھا رہی ہو۔ اس تنگ و تاریک کھوہ نما راستے میں کسی قسم کی گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ خاصیت یہاں کی تعمیر کا طرۂ امتیاز تھا۔

ہم دو فٹ آگے بڑھ آئے تو روئی نے کہا ''صبح تمہیں ربی کے پاس لے جایا گیا تھا۔ وہاں خیریت تو رہی نا؟'' اس کی معلومات اپ ڈیٹ تھیں۔

''تمہارا اندازہ درست نکلا۔'' میں نے اس کے ساتھ پیوست رہتے ہوئے جواب دیا ''وہ واقعی میری برین واشنگ کا ارادہ رکھتا ہے۔'' باتوں کے دوران میں ہمارا آگے کا سفر بھی جاری رہا۔

وہ بولی ''وہ میرا اندازہ نہیں تھا بلکہ میں اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ کیا اس نے تمہیں ہپناٹائز کیا تھا؟'' روئی کے اس سوال سے بڑی تشویش جھلکتی تھی۔

''وہ ایک سیشن مکمل کر چکا ہے' دوسرا باقی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

وہ رک کر پریشان نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں تاریکی کے باعث اس کی آنکھوں کو یا ان میں موج زن تاثرات کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس کی پریشانی کا اندازہ میں نے اس کے بدن کی اضطراری جنبشوں سے لگایا۔ اس اندازے کی توثیق روئی کی متلاطم سانس نے کر دی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور بے ترتیب سانس میرے چہرے پر ٹکور کر رہی تھی۔

میں نے اس کی ذہنی و دلی کیفیت کو بھانپ لیا۔ کسی کے احساس اور جذبات کو سمجھنے کے لیے آنکھوں کی ضرورت نہیں ہوتی' ورنہ بینائی سے محروم افراد انتہائی بے حس اور پتھر دل ہوتے! روئی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس کی تشفی کی خاطر میں نے کہہ دیا ''تمہیں فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ربی نے ہپناٹزم کے پہلے سیشن میں جتنی بک بک کی اس کا مجھ پر مطلق اثر نہیں ہوا اور دوسرے سیشن کی انشاء اللہ نوبت ہی نہیں آئے گی۔''

''تم یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان!'' وہ بے یقینی سے بولی۔ اس کی آواز میں بڑی معنی خیز سرسراہٹ تھی ''ربی کا کوئی عمل بے اثر کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں نے اسے پہلو سے ٹہوکا دیا اور کہا ''تم آگے بڑھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

وہ گریزی جنبش سے تھوڑا سا کھسکی اور بڑبڑانے والے انداز میں بولی ''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں وجدان!''

میں نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا ''دراصل بات یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے ربی کو کچھ زیادہ ہی بانس پر چڑھا رکھا ہے۔ ناقابلِ شکست اور قادرِ مطلق صرف خدا کی ذات ہے۔ باقی ہر سیر کے لیے خدا نے سوا سیر بنا رکھا ہے۔ ہر سیر کو اپنے سے کم وزن پر ظلم کرتے ہوئے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ طاقتور اور ظالم ہو سکتا ہے۔''

میری یہ معنی خیز باتیں روئی کی سمجھ میں نہ آئیں تو میں نے آسان الفاظ میں وضاحت کر دی اور آخر میں کہا۔

''پہلے سیشن میں ربی نے میری شخصیت تبدیل کرنے کا عمل کیا تھا۔'' وہ بڑی توجہ سے میری بات سننے لگی ''لیکن دیکھ لو' میں وہی وجدان ہوں جو کل اسی وقت تم سے ایک طویل ملاقات کر چکا ہے حالانکہ ربی اپنی دانست میں مجھے اپنا مطیع و فرماں بردار' راجر نامی ایک شخص بنا چکا ہے۔ اس راجر میں باقی فیڈنگ وہ بعد میں کرے گا۔''

وہ ایک مرتبہ پھر رک گئی۔ اس کے اس رکنے میں ہیجانی کیفیت پائی جاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے پر اس کی چڑھی ہوئی سانس کی تپش محسوس ہوئی۔ یقیناً وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنا چہرہ میری جانب پھیر لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے جذبات میں ڈوبی ہوئی روئی کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ میرے کان کو چھو رہے تھے۔

''وجدان! میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا ہے تم اس سے بھی آگے کی شے ہو۔''

اس کے لہجے میں موجود حیرت نے آواز میں ایک خاص قسم کا ارتعاش سا پیدا کر دیا تھا۔ میں نے اس کے پہلو سے چپکے چپکے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں آگے کی شے ہوں اور نہ ہی پیچھے کی۔ تم مجھے زمین پر ہی رہنے دو تو اچھا ہے۔''

''تم خود کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' اس کے لہجے کی بے یقینی برقرار رہی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا ”ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔“

”ربی جیسے ماہرِ عملیات کے اثر سے نکل آنا کوئی معمولی بات نہیں!“

”ربی ایک دھوکے باز ہے۔ کسی دھوکے باز کو‘ بے وقوف بن کر آسانی سے دھوکا دیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا ”بس اس کے لیے تھوڑی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم خواہ مخواہ بات کو طول دے رہی ہو!“

اس کی تسلی نہ ہوئی‘ مضطرب لہجے میں بولی ”تم نے جو کچھ کیا ہے وہ تھوڑی ذہانت کا کھیل نہیں وجدان۔ آئی سوئیر! تم مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔“

”خواہ مخواہ قسمیں کھا کر اپنا دین ایمان خراب نہ کرو۔“ میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا ”یہاں اتنی گنجائش کہاں ہے جو میں تمہیں کوئی چکر دوں گا۔“

”تم الفاظ بدل کر مجھے بہلا نہ سکو گے!“

”پھر تم کیسے بہلو گی؟“

”اپنے بارے میں سچ سچ بتا دو۔“

”میں نے ابھی تک تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا!“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا ”تم خواہ مخواہ کی جرح بحث میں پڑ کر وقت ضائع کر رہی ہو۔ ہمیں جلد از جلد اس مقام پر پہنچنا ہے‘ جہاں مائیکل ساحل کو پہنچانے والا ہے۔ اچھی بچی کی طرح آگے بڑھو۔ پتا نہیں یہ بے ہودہ راستہ اور کتنا باقی ہے!“

”ہم اس تنگ و تاریک راستے سرے پر کھڑے ہیں۔“ روٹی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ باتوں ہی باتوں میں پچیس فٹ کا فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولی ”اگر تم مجھے اپنی حقیقت نہیں بتاؤ گے تو میں تمہیں اس سنگلاخ دیوار کے اس پار نہیں پہنچاؤں گی...... اور تم جانتے ہو عقب میں واش روم والا راستہ بھی بند ہو چکا ہے۔ فیصلہ کر لو‘ تمہیں اپنی ساتھی ساحل تک پہنچنا ہے یا اسی کھوہ میں باقی زندگی گزارنا ہے؟“

”کیا باقی کی اس زندگی میں تم بھی میرے ساتھ ہو گی؟“ میں نے اسے چھیڑا۔

”ظاہر ہے میں کہاں جاؤں گی۔ ہم دونوں اسی کھوہ میں رہیں گے!“

”پھر تو میں تمہاری بات ماننے کو تیار ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا ”اس روٹی کے سہارے میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ نہ بابا! مجھے نکالو یہاں سے۔“

میں جانتا تھا‘ روٹی اپنی دھمکی پر کسی بھی طور پر عمل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا تو مشن تھا‘ ہمیں یہاں سے نکالنے کا۔ وہ اپنے بڑوں کے احکام کے خلاف کیوں کر جا سکتی تھی۔ وہ محض مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی تاکہ میں اپنا آپ اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ جواباً میں بھی اس سے بڑا ہی سنجیدہ مذاق کر رہا تھا۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والی صورتِ حال تھی۔

وہ مسرور لہجے میں بولی ”کیا واقعی مجھے اپنی اصلیت بتا دو گے؟“

”تم میری نیت پر شک نہ کرو۔“ میں نے کہا۔

”پھر بتاؤ جلدی سے۔“ وہ مچل گئی۔

میں نے بتایا ”میرا نام وجدان ہے۔ میں مارشل آرٹس کا ماہر ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی چمتکار جانتا ہوں۔ بس!“

”تم مجھے اپنی اس صلاحیت کے بارے میں بتاؤ جس کی مدد سے ربی موشے ہائمن کو دھوکا دیا ہے؟“ اس کی اضطراری آواز میں کرید کا عنصر نمایاں تھا۔

اس ”پٹ پٹ“ بولنے والی روٹی کی زبان بندی ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”میرا نام وجدان خواہ مخواہ ہی نہیں رکھا گیا۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔ میری زبان اردو تمہاری سمجھ میں تھوڑی آئے گی!“ اب میں مجبوراً واقعی اسے الو بنا رہا تھا۔

”تم بتاؤ...... سمجھ میں آئے یا نہ آئے!“ وہ بہت ہی پُرجوش ہو رہی تھی۔

میں نے کہا ”میرے نام میں ”ن“ ایک لاک کی حیثیت رکھتا ہے۔ باقی حروف کو ایک خاص ترتیب سے جوڑو تو جادو بنتا ہے۔ میں جادو جانتا ہوں...... آئی مین میجک!“

اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ ہیجان خیز لہجے میں بولی ”او! مائی گاڈ! تم میجک جانتے ہو...... یعنی میجیشن (جادوگر) ہو؟“

”ہاں میں جادوگر ہوں۔“ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”کوئی جادو دکھاؤ!“ وہ فرمائش کر بیٹھی۔

میں نے نہایت ہی آہستگی کے ساتھ اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا دیا۔ اس کی فرمائش پوری ہو گئی۔ میرے چلائے ہوئے جادو نے چند لمحات کے لیے اس کی قوتِ گویائی چھین لی۔ تنگ و تاریک کھوہ میں موت کا سناٹا پھیل گیا۔ اس سناٹے میں دو دل دھڑک رہے تھے۔

☆☆☆

ہم اس کھوہ سے باہر نکلے تو میری پشت پر ایک وزنی بیگ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ہم مسلسل نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ وہ پتھریلا راستہ ہموار تھا اور اس کی چوڑائی اگ بھگ بیس فٹ رہی ہو گی۔ راستہ رات کے آخری پہر بالکل خاموش اور

ویران تھا‘ کچھ سویا سویا سا!

میں نے روٹی سے پوچھا ”کیا اس راستے پر چلتے ہوئے زمین کے اندر اتر رہے ہیں؟“

”نہیں“ وہ محتاط قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے بولی ”ہم زمین پر اتر رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”ربی نے اپنا یہ خفیہ ٹھکانہ سطح زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کے اندر بنایا ہوا ہے۔ ہمیں اپنے مطلوبہ مقام تک پہنچنے کے لیے کم از کم آٹھ سو فٹ نیچے اترنا ہوگا۔ اس کے بعد ہماری منزل کا رخ بدل جائے گا۔“

میں نے اس کے ساتھ ساتھ ڈھلوانی راستے پر اترتے ہوئے کہا ”اس دیو قامت پہاڑ کے اندر اس قسم کا ٹھکانا بنانا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ارضی اور پہاڑی تغیر و تبدل اس کے اندر بہت ہی نقصان دہ تبدیلیاں بھی لا سکتے ہیں۔“

”تمہاری تشویش کسی حد تک درست ہے۔“ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی ”لیکن یہاں کی صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ ماؤنٹ مکنلے سال کے بارہ مہینے برف کی موٹی تہ میں ڈھکا رہتا ہے اس لیے اس کے اندر ارضی اور پہاڑی تغیر و تبدل کے امکانات بہت کم ہیں۔ کھلے آتش گرم پہاڑ اپنے اندر اس قسم کی تبدیلیوں کے زیادہ امکانات رکھتے ہیں اور پھر......“ وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے قدم بھی رک گئے۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مجھے وہیں خاموش کھڑے رہنے کا اشارہ کر کے نہایت ہی محتاط قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ چند فٹ کے فاصلے پر مجھے ایک موڑ نظر آ رہا تھا۔ موڑ کے اس طرف مناسب روشنی کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے اب تک جس دس فٹے راستے پر سفر کیا تھا‘ وہاں بھی ہلکی روشنی موجود تھی۔ ایک اندازے کے مطابق ہم دو سو میٹر فاصلہ طے کر چکے تھے۔

چند سیکنڈ بعد روٹی واپس آ گئی اور میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی ”آؤ آگے راستہ کلیئر ہے۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“

میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ موڑ کے بعد راستے کی چوڑائی بیس فٹ ہو گئی تھی۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتایا ”میں یہ کہہ رہی تھی کہ ربی اور اس کی ٹیم کو دنیا کے بہترین ماہرِ ارضیات میسر ہیں۔ اس ٹھکانے کی تعمیر کے لیے ماؤنٹ مکنلے کو بڑی ٹیکنیک سے کاٹا گیا ہے اور اس کے اندر آکسیجن و ہوا کا مناسب بلکہ بہترین بندوبست کیا گیا ہے۔ تمام خطرات ماہرین کی نظر میں بھی ہوں گے لہٰذا ان کا کوئی نہ کوئی سدباب بھی کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ربی اپنے حواریوں کے ساتھ اتنے اطمینان سے یہاں موجود نہ ہوتا۔“

روٹی، ایک معقول اور وزن سے بھرپور بات کر رہی تھی۔ میں نے اسے چھیڑا ”مجھے تو لگتا ہے ربی نے اس خفیہ ٹھکانے کی تعمیر کے سلسلے میں تم سے بھی خدمات لی ہوں گی!“

وہ رک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی ”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا ”تم بھی کسی ماہرِ ارضیات سے کم تو نہیں ہو!“

وہ شکایتی انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ”تمہیں باتیں بنانا خوب آتی ہیں!“

اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس کی تقلید میں قدم اٹھاتے ہوئے کہا ”ایک بات تو بتاؤ، روٹی؟“

”ہاں بولو۔“ وہ میری طرف بغیر بولی۔

میں نے پوچھا ”تمہارا نام مجھے الجھا رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں راکیل کہوں یا روٹی؟“

”اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ مت ڈالو۔“ وہ رک کر معنی خیز نظر سے مجھے دیکھنے لگی ”جب بھوک محسوس ہو تو روٹی کہہ لیا کرو۔ ورنہ راکیل بھی چلے گا!“

اس کھلی ڈلی امریکی حسینہ نے اپنے بے باک انداز سے مجھے پسینے میں نہلا دیا۔ میں اس کے جملے کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ یہ بات میں نے ہی اسے بتائی تھی کہ اردو میں روٹی‘ بریڈ کو کہتے ہیں اور ظاہر ہے‘ یہ بھوک مٹانے کے کام آتی ہے۔

وہ مجھے سوچوں کے ایک لامتناہی امتحان میں ڈال کر بے پروائی سے آگے بڑھ گئی۔ میں نے انسانی فطرت کے عین مطابق اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ انسان کو بھوک ہو یا نہ ہو‘ یہ ہر وقت روزی روٹی کی تلاش میں رہتا ہے! تاہم ان لمحات میں‘ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں راکیل اینڈرسن کو محض راکیل ہی کہوں گا۔

راکیل نے مجھے بتایا کہ اس موڑ تک پہنچتے ہوئے ہم نے دو سو میٹر کا فاصلہ طے کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو سو فٹ نیچے بھی اتر آئے تھے۔ اس بیس فٹ چوڑے راستے میں بہ نسبت زیادہ ڈھلان تھی۔ راکیل کے مطابق اب ہمیں اس راستے پر کم و بیش تین سو میٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا‘ اس کے ساتھ ہی مزید چھ سو فٹ نیچے بھی اترنا تھا اسی سبب ڈھلان کا زاویہ بڑھ گیا تھا۔

”جب ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچیں گے تو لگ بھگ

پانچ سو میٹر یعنی آدھا کلومیٹر فاصلہ طے کرنے کے ساتھ ساتھ سو فٹ بلندی سے نیچے اتر چکے ہوں گے۔'' راکیل نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''مگر تم نے تو کہا تھا' ربی کا یہ خفیہ ٹھکانا سطح زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

وہ بولی'' میں نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ ہم اپنے مطلوبہ مقام سے راستہ بدل دیں گے۔ وہ مقام سطح زمین سے دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور یہ راستہ جس پر اس وقت ہم سفر کر رہے ہیں' آگے جا کر تیس فٹ چوڑا ہو جائے گا۔ لگ بھگ ایک ہزار میٹر (ایک کلومیٹر) کے بعد یہ راستہ اس زمین دوز راستے سے جا ملے گا جو سیدھا پیٹرس ویل والے فوجی کیمپ تک پہنچاتا ہے لیکن مطلوبہ مقام پر پہنچ کر ہماری سمت بدل جائے گی۔ تم پہاڑی کے اندر ہی اندر کچھ فاصلہ طے کر کے دوسری جانب سے باہر نکلو گے۔''

''تم نے مجھے الجھا دیا ہے راکیل!'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا'' کبھی تمہاری باتوں سے لگتا ہے اس پہاڑ سے باہر نکلنے تک ہمارا ساتھ رہے گا اور کبھی یوں محسوس ہوتا ہے تم مجھے کسی مطلوبہ مقام پر پہنچا کر واپس چلی جاؤ گی؟''

''تمہارا دوسرا احساس درست ہے وجدان!'' وہ اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی'' ہمارا ساتھ مطلوبہ مقام تک ہی ہے۔ تمہیں وہاں پہنچا کر مجھے واپس آنا ہوگا۔ مائیکل بھی واپس آئے گا۔ ہم دونوں انہی لوگوں کے درمیان رہیں گے' بالکل پہلے کی طرح...... ان کے وفادار بن کر!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''مطلوبہ مقام پر ہمارے دو آدمی موجود ہوں گے۔ ان کے نام ریمنڈ اور نیلسن ہیں۔ تم دونوں ان کی راہنمائی میں پہاڑ سے باہر نکلو گے پھر وہ تمہیں ربی کی پہنچ سے بہت دور اپنے لوگوں میں پہنچا دیں گے۔'' بات ختم کرتے ہی وہ ایک مرتبہ پھر رسٹ واچ کو دیکھنے لگی۔

باتوں کے دوران میں ہم مسلسل سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے راکیل گھڑی میں وقت دیکھ لیتی تھی۔ میں وقت بتانے والے اس آلے سے محروم تھا مجھے نہیں معلوم تھا' اس وقت رات کا کیا بجا ہوگا۔ محتاط اندازے کے مطابق ہمیں کوٹھری سے نکلے ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آ رہا تھا۔ میں نے راکیل سے پوچھا۔

''تمہاری رسٹ واچ کیا وقت بتا رہی ہے؟''

''تین پچیس!'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ' اس کا مطلب ہے ابھی پانچ منٹ کا سفر باقی ہے!''

''میرا خیال ہے ایک منٹ بعد ہم اپنے مطلوبہ مقام پر ہوں گے۔'' راکیل نے انکشاف کیا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا'' اتنی جلدی؟''

راکیل نے میرے حیرت بھرے جملے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ثابت قدمی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے قدموں کے تعاقب میں قدم اٹھانے لگا۔

ذرا غور کیا تو یہ حقیقت میری سمجھ میں آ گئی۔ اس وقت ہم ڈھلوانی راستے پر سفر کر رہے تھے۔ ہم رکے نہیں تھے ہمارا سفر مسلسل جاری رہا تھا۔ بلندی سے اترتے وقت لامحالہ رفتار بڑھ جاتی ہے اور توانائی بھی کم خرچ ہوتی ہے جب کہ اس کے بالعکس چڑھائی چڑھتے وقت رفتار کم ہو جاتی ہے اور توانائی بھی زیادہ صرف کرنا پڑتی ہے۔ مجھے حالتِ بے ہوشی میں یہاں لایا گیا تھا۔ جو بھی قوت خرچ ہوئی ہوگی' وہ گاڑی کے انجن ہی کو پتا ہوگا۔

میں نے تاحدِ نگاہ دھڑکتے دل سے جائزہ لیا۔ راکیل کے مطابق ساحل کو سوا تین بجے مائیکل کے ساتھ اس مطلوبہ مقام پر پہنچنا تھا اور اب ساڑھے تین بجنے والے تھے۔ مجھے دور دور تک ساحل اور مائیکل کے آثار نظر نہ آئے تو میں نے راکیل سے پوچھا۔

''ساحل کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔ اسے تو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تم نے بتایا ہے ایک منٹ بعد ہم......؟''

''اب وہ ایک منٹ بھی گزر گیا۔'' راکیل نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا'' ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔''

میں نے بے قراری سے ہر سمت نگاہ دوڑائی اور میری نگاہ مایوس واپس لوٹ آئی۔ میں نے بے تاب لہجے میں راکیل سے استفسار کیا'' ساحل اور مائیکل کہاں ہیں؟''

''ابھی دکھاتی ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی اور پہاڑی دیوار کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

میں خاموشی سے اس کی کارروائی کو دیکھنے لگا۔

راکیل نے اس دیوار کے مختلف حصوں کو ٹھوک بجا کر دیکھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی خفیہ راستہ کھولنے کے لیے مخصوص ٹیکنیک کا استعمال کر رہی تھی۔ یقیناً اس دیوار کے عقب میں ہی وہ مطلوبہ مقام واقع تھا جہاں ساحل کو مائیکل نے اور مجھے راکیل نے پہنچانا تھا پھر ریمنڈ اور نیلسن ہمیں ساتھ لے کر آگے بڑھ جاتے۔ اس کا مطلب یہی تھا جب ہم دیوار کے پیچھے اس مقام پر پہنچیں گے تو بہ یک وقت ساحل'

مائیکل' ریمنڈ اور نیلسن سے ملاقات ہو جائے گی۔ اگر راکیل مجھے مطلوبہ مقام تک پہنچانے میں کامیاب رہی تھی تو مائیکل کی کامیابی بھی یقینی تھی۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد راکیل اپنے مقصد میں پوری اتری۔ اس دیوار کے دو بڑے پتھر سلائیڈنگ ڈور کے مانند دائیں بائیں سرک گئے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے چار بائی چار فٹ کا ایک شگاف کھل گیا۔ وفورِ مسرت سے میرا چہرہ کھل اٹھا۔

ہم دونوں نے اس شگاف کے اندر داخل ہونے سے پہلے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اسی وقت ہم چونک اٹھے۔ نشیب کی طرف ہمیں کسی ہیوی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ وہ گاڑی انجن کی مخصوص آواز کے ساتھ چڑھائی چڑھ رہی تھی اور یقینی طور پر اس کا رخ ہماری ہی سمت تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس لحہ بہ لحہ قریب پہنچ رہی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر ان لائٹس کے عقب میں وہ گاڑی ہمارے نزدیک پہنچ رہی تھی۔

ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور شگاف کے اندر کود گئے۔

اندر پہنچتے ہی راکیل نے دیوار پر مختلف مقامات سے ہلکی چھیڑ چھاڑ کی اور وہ دونوں پتھر سلائیڈ کرتے ہوئے اپنے اصل مقام پر آ گئے۔ شگاف بند ہو گیا۔ میں نے خود کو ایک طویل راہ داری میں پایا۔ وہ راہ داری لگ بھگ دس فٹ چوڑی تھی۔ تھوڑے فاصلے کے بعد آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

راکیل نے دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک لائٹ کو اس کے اسٹینڈ سے نکال لیا اور اس کی روشنی میں ہم آگے بڑھنے لگے۔ میں نے کہا'' راکیل! یہاں تو کوئی نظر نہیں آ رہا؟''

''مائیکل' ساحل کو لے کر یہاں پہنچا تو ہے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔

''پھر وہ دونوں کہاں ہیں؟'' میرے سوال میں احتجاج شامل تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا اور دھیمے لہجے میں مائیکل کو پکارا'' مائیکل......!''

اس کی دھیمی آواز راہ داری میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔ ہم مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ راکیل کی پکار کے جواب میں کوئی آواز نہ ابھری۔ وہ ایمر جنسی لائٹ کو تھامے اور آگے بڑھ گئی اور ایک مرتبہ پھر اس نے مائیکل کا نام لے کر اسے آواز دی۔

اس بار بھی مائیکل نے اس کی پکار کا جواب نہ دیا۔ مجھے جھنجلاہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے قدرے ترش لہجے میں اس سے پوچھا۔

''راکیل! کیا تمہیں یقین ہے' مائیکل اس غار میں پہنچ چکا ہے؟''

''میرے یقین کی نشانی یہ لائٹ ہے۔'' وہ ایمر جنسی لائٹ کو جھلاتے ہوئے بولی۔

''یہ لائٹ...... کیا مطلب؟'' میں الجھ کر رہ گیا۔

''ہمارے درمیان پہلے سے یہ طے تھا جب مائیکل یہاں پہنچ جائے گا تو وہ اس لائٹ کو آن کر کے دیوار پر ٹانگ دے گا۔'' راکیل وضاحت کرتے ہوئے بولی'' اس لائٹ کی موجودگی ظاہر کرتی ہے' وہ یہاں پہنچ چکا ہے۔'' وہ بات کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھ رہی تھی۔

''پہنچ چکا ہے تو پھر نظر کیوں نہیں آ رہا۔'' میں جھلاّ گیا'' کیا اس نے سلیمانی ٹوپی پہن لی ہے؟''

''یو مین...... سولومن کیپ؟'' وہ رکے بغیر استفساریہ انداز میں بولی۔

''یس' آئی مین اٹ!'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے راکیل کی چیخ سنائی دی۔ وہ ایک بے ساختہ چیخ تھی۔ میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کسی شے سے ٹھوکر کے باعث لڑکھڑا گئی تھی۔ وہ قدرے سنبھلی اور وحشت زدہ لہجے میں بولی۔

''وجدان! مائیکل...... مائیکل یہاں...... پڑا ہے......''

میں نے اس کے ہاتھ سے ایمر جنسی لائٹ لے لی اور جھک کر اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا جدھر راکیل نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں پتھریلے فرش پر ایک شخص بے ترتیب پڑا تھا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا' وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ گردن کی ہڈی توڑ کر اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

میں نے مائیکل پر سے روشنی ہٹائی اور راکیل کی طرف دیکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر سوال کیا'' مائیکل کو کس نے قتل کر دیا؟''

''مجھے کیا معلوم!'' اس کے لہجے سے وحشت برس رہی تھی۔

میں گہری تشویش میں ڈوب گیا۔ مائیکل کی موت اور ساحل کی غیر موجودگی کسی سنگین صورت حالات کا اعلان کر رہی تھی۔ راکیل کا دعویٰ تھا' وہ دونوں اس مقام پر پہنچے تھے۔ مائیکل کی لاش اس کے دعوے کو جزوی طور پر سچا ثابت کر رہی تھی۔ اس دعوے کی روشنی میں کہا جا سکتا تھا' ساحل بھی وہاں

ہنچی تھی۔ اگر وہ مائیکل کے ساتھ وہاں پہنچی تھی تو پھر نظر کیوں ہیں آرہی تھی؟

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ بولتا' اس خفیہ پناہ اہ کے باہر کسی ہیوی انجن والی گاڑی کے رکنے کی آواز بھری۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت متوحش نظروں سے ایک وسرے کو دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں کے ذہنوں میں ایک ں خطرناک سوال تھا۔

کیا ہمیں اس پناہ گاہ میں داخل ہوتے دیکھ لیا گیا ہے؟

پھر فوراً ہی اس خوفناک خیال کی تصدیق بھی ہوگئی۔ ہم نے اپنے عقب میں وہ خفیہ پتھر کا سلائیڈنگ ڈور کھلتے وئے سنا۔ بے اختیار ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ کھلے ہوئے در کے پار ایک ہیوی ٹرک کھڑا نظر آیا۔ اب اس بات میں کسی نک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ اس ٹرک کی ہیڈ ائٹس میں ہمیں اس پناہ گاہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا گیا ھا۔

یہ بہت ہی واہیات صورتِ حال تھی' منزل پر پہنچ کر منزل کا نشان کھو دینے والی بات تھی۔ میں نے سوالیہ نظر سے راکیل کو دیکھا اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''وجدان! بھاگو...... وہ آرہے ہیں۔''

میں نے اس کی وحشت بھری آواز پر مڑ کر اس کھلے ہوئے در کو دیکھا۔ وہاں سے تین چار باوردی افراد بڑے محتاط انداز میں اندر داخل ہو رہے تھے۔

یہ سوچنے کا نہیں بلکہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایمرجنسی لائٹ کو پتھریلی سنگلاخ دیوار پر دے مارا۔ اگلے ہی لمحے وہ پناہ گاہ تاریکی میں ڈوب گئی۔ پھر ہم دونوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھے بغیر اس طویل اندھے غار میں دوڑ لگا دی۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں تحکمانہ آواز سنائی دی ''خبردار! رک جاؤ۔ تم جو کوئی بھی ہو' سامنے آؤ۔ میں تین تک گنوں گا۔ اگر تم لوگوں نے میرا حکم نہ مانا تو بھون کر رکھ دوں گا۔''

دھمکی دینے والی آواز سے ثابت ہوتا تھا وہ لوگ ہمیں پہچان نہیں سکے۔ میں تو وہاں اجنبی تھا۔ راکیل کو بھی نہ پہچاننا ہمارے لیے مفید تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا' رک کر ذرا ان سے نمٹ لیا جائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری رفتاری میں کمی آنے لگی۔

راکیل نے بڑی شدت سے میرے بازو کو کھینچتے ہوئے کہا ''وجدان! ان شیطانوں کی دھمکی میں نہ آنا۔ یہ لوگ ہم پر گولی چلانے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ بھاگتے رہو!''

میں نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا ''تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ رہی ہو؟'' ''کیونکہ ہم اس وقت بارود کے خطرناک ذخیرے کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔''

میرے پورے بدن میں ایک سراسیمگی سی سرایت کرگئی۔ لرزیدہ آواز میں' میں نے راکیل سے پوچھا ''کیا تم کوئی سنگین مذاق کر رہی ہو؟''

''نہیں'' وہ مسلسل دوڑتے ہوئے قطعیت سے بولی ''یہ خفیہ پناہ گاہ درحقیقت یو۔ ایس آرمی کا ایمونیشن ڈپو ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہلاکت خیز مادے کے کسی ماؤنٹ مکنلے پر بیٹھا ہوں اور میرے دشمن ہاتھ میں دیا سلائی تھامے بڑے مکروہ انداز میں مجھے دیکھ رہے ہوں...... اور اب تب میں وہ بارود کا ڈھیر ایک دھماکے سے اڑ جانے والا ہو اور اس کے ساتھ ہی......

میں اس سے آگے اور کچھ نہ سوچ سکا۔ میری سوچ کو راکیل کی وحشت ناک چیخ نے بریک لگا دیے تھے۔ وہ کسی شے سے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ اس نے چونکہ... میرا ہاتھ بڑی مضبوطی سے تھام رکھا تھا اس لیے مجھے بھی شدید جھٹکا لگا اور میں منہ کے بل زمین کی طرف آرہا۔

میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے چہرے کو سنگی فرش سے ٹکرانے سے بچانے کے لیے دونوں ہاتھوں کو آگے پھیلا لیا اور اسی وقت میرے ہاتھ کسی انسانی جسم سے ٹکرائے۔ وہ انسانی جسم راکیل نہیں تھی بلکہ راکیل اسی جسم سے ٹھوکر کھا کر گری تھی اور مجھے بھی جزوی طور پر گرنے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ وہ انسانی جسم سنگلاخ زمین پر اوندھا پڑا تھا۔

میں نے بے اختیار اس کے چہرے کو ٹٹولنے کی کوشش کی اور جب میرے ہاتھ اس کے سر تک پہنچے تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ مجھے اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ میرے ہاتھ کسی حسینہ کی دراز ریشمی زلفوں کے گداز سے ہمکنار ہو کر پتھر کے ہوگئے تھے۔

میرے دل نے تڑپ کر کہا ''نہیں یہ میری ساحل نہیں ہوسکتی!''

اس سے پہلے کہ میں بے سدھ پڑی اس حسینہ پر مزید کوئی دستکاری کرتا' مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

میں موت وحیات کے بیچ سوالیہ کا نشان بن کر رہ گیا!

کتنی عجیب بات ہے! موت کا ایک دن' ایک وقت متعین ہے مگر زندگی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ یہ ہر لمحے اپنا راستہ' سمت اور منزل بدلتی رہتی ہے۔ اس پل پل کروٹ بدلتے سفر میں موت قدم قدم پر زندگی کو ڈراتی' دھمکاتی اور اپنی طرف بلاتی رہتی ہے۔ موت کی یہ کھلی غنڈا گردی تو زندگی کے ساتھ ایک سنگین زیادتی ہوئی نا! ایک حسین مذاق۔

یہی دست دراز موت اس وقت ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آرہی تھی۔ اسی پیچھا کرنے والی مہلک بد بخت کے ایک نمائندے نے ہمیں دھمکی دی تھی کہ اگر ہم تین گننے تک نہ رکے تو ہمیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ راکیل ہرگز رکنے کے حق میں نہیں تھی' اس کے پاس ایک مضبوط دلیل بھی تھی۔ اس نازک وقت میں ہم یو۔ ایس آرمی کے ایمونیشن ڈپو کے اندر تھے' ہمارے تعاقب میں آنے والے واقعی فائرنگ جیسی حماقت نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ ریشمی زلفوں والی میرے پاؤں کی زنجیر بن کر رہ گئی تھی۔ میں رکے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا تھا' چاہے عقب میں موت ہی کیوں نہ کھڑی ہو!

میں ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر بڑے ماہرانہ انداز میں اس اوندھی پڑی حسینہ کا ابتدائی جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے الٹ کر اسے سیدھا کر دیا' پھر میرے دونوں ہاتھ نسوانی خطوط کی تلاش میں اس کے جسم کے بالائی حصے پر سرسرانے لگے...... اور اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کے دو شدید جھٹکوں سے گزرنا پڑا۔

میرے دل نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ میری ساحل نہیں تھی...... وہ کوئی بھی نہیں تھی بلکہ وہ تھا' دبلا پتلا اور دراز زلفوں والا ایک مرد...... اور وہ ایک سو ایک فی صد زندگی سے روٹھ کر موت کی بانہوں میں پناہ گزیں ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے سینے میں' ایک خنجر کو دستے تک پیوست پایا۔ میں نے ایک اطمینان کی سانس لی اور اندازے کی بنیاد پر راکیل کی جانب بڑھ گیا۔

راکیل اٹھ کر سنبھل چکی تھی اور غار کے نسبتاً تاریک حصے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ میں نے اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے مڑ کر عقب میں دیکھا' تعاقب کرنے والے ہم سے چند فٹ کی دوری پر پہنچ چکے تھے۔ جس راستے سے پہلے ہم اور پھر متعاقبین اس غار میں اترے تھے' وہ اب کھلا نظر آرہا تھا لہٰذا اس دس فٹ چوڑے غار کے ابتدائی حصے میں نیم اجالا تھا۔ اسی ملگجی روشنی میں' میں نے پلک جھپکتے میں پیچھا کرنے والوں کا تنقیدی جائزہ لے لیا۔

وہ کل چار افراد تھے۔ ان میں سے ایک آگے اور تین پیچھے لپکے چلے آرہے تھے۔ ہمیں دھمکانے والا شاید وہی شخص تھا جو ان کا لیڈر بنا نظر آتا تھا۔ ان چاروں کے اجسام پر فوجی وردی تھی اور بلاشک وشبہ وہ مسلح تھے۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ یو۔ ایس آرمی سے متعلق تھے۔

میں نے راکیل کے ساتھ دوڑتے ہوئے کہا" تمہاری پیش گوئی درست ثابت ہو رہی ہے۔ انہوں نے ابھی تک ہمیں فائرنگ کا نشانہ نہیں بنایا!" میرا انداز سرگوشیانہ تھا۔

وہ بھی اسی دھیمی آواز میں بولی" وہ ایسی سنگین غلطی کبھی نہیں کریں گے۔"

"پھر کیوں نہ میں اپنے ہاتھ پاؤں کو تھوڑی زحمت دے لوں۔"

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ نیچی آواز میں پوچھا۔

میں نے دوڑنے میں کوئی رخنہ ڈالے بغیر گہری سنجیدگی سے کہا" مجھے یہ گوارا نہیں کہ کسی بھیڑ بکری کے مانند اپنے دشمنوں کے آگے بھاگتا پھروں۔ میں رک کر ان سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"تمہارا ارادہ بہت خطرناک ہے وجدان!" اس نے سرگوشی کی۔

"میں خطرات سے کھیلنے کا عادی ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے دعوے کے مطابق' وہ اپنی گنز کو استعمال کرنے کی حماقت نہیں کریں گے۔ میرے لیے اتنی ہی سکیورٹی کافی ہے۔ یہ تو صرف چار ہیں' چالیس بھی ہوں تو پروا نہیں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے راکیل کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور اسے اپنی سمت کھینچ لیا۔ وہ کسمساتے ہوئے بولی" یہ کیا کر رہے ہو؟"

اس کمزور سوال میں کوئی احتجاج' اعتراض یا احتراز نہیں تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو...... آج ہم کھانا کہاں کھائیں گے؟

میں نے بدستور دوڑتے ہوئے اسے اس راستے کے ایک کنارے سے لگا لیا پھر دیوار کے ساتھ پشت کے بل کھڑا کرتے ہوئے کہا" تم یہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہلو گی' ساکت وجامد اور خاموش کھڑی رہو گی۔ میں متعاقبین سے نمٹتا ہوں۔"

مسلسل دوڑنے سے اس کی سانس پھول چکی تھی۔ وہ بے ترتیب سانسوں کے درمیان بولی" یہ بہت ہی سفاک اور خطرناک لوگ ہیں۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے!"

"گڑبڑ تو آغاز ہو چکی ہے راکیل!" میں نے بپھرے

ہوئے لہجے میں کہا ''اور تم فکر نہ کرو۔ ایسے مواقع پر میں خود بھی بہت سفاک اور خطرناک بن جاتا ہوں۔''

وہ بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی پھر سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''وجدان! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

راکیل ایک عملی لڑکی تھی۔ وہ جس نوعیت کے مشن میں حصہ لے رہی تھی وہ نہایت ہی اہم اور کٹھن تھا۔ اس کے بڑوں نے کچھ سوچ کر ہی اسے منتخب کیا ہوگا۔ وہ بزدل اور ڈرپوک نہیں تھی۔ اس کا شمار چھوٹی موٹی لڑکیوں میں نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس وقت ہم جس قسم کی صورتِ حال سے گزر رہے تھے اس میں راکیل کا کنفیوز ہو جانا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ اپنا مشن ناکامیاب ہوتے دیکھ کر گہری تشویش میں مبتلا ہوگئی تھی۔ اسے اپنے بڑوں کو جواب دینا مشکل نظر آرہا تھا۔

میں نے زبردستی سے خود سے الگ کیا اور تشفی آمیز لہجے میں کہا ''تمہیں خوف زدہ ہونے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ خاموشی سے یہاں کھڑے ہو کر تماشا دیکھو...... دیکھو نہیں، بلکہ سماعت کرو۔ کیونکہ دیکھنے کے لیے روشنی درکار ہے وہ ہمیں میسر نہیں۔''

وہ پتا نہیں مجھ سے کیا کیا کہنے والی تھی۔ زبان سے پہلے اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور ایک مرتبہ پھر مجھے خود سے پیوست کرنے کی کوشش کر ڈالی' تاہم میں اس کی سعی کو ناکامیاب بناتے ہوئے تاریک غار میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ متعاقب موت ایسے چونچلوں کی کہاں اجازت دیتی ہے!

یہ میری ایک چال تھی جو میں نے بہت سوچ سمجھ کر چلی تھی۔ میں اور راکیل خاصی تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے متعاقبین سے اچھے خاصے فاصلے پر نکل آئے تھے مگر راکیل سے ہونے والی گفتگو کے طفیل وہ فاصلہ گھٹ کر بہت کم رہ گیا تھا۔ میں اس غار میں مسلسل دوڑ کر اپنے دشمنوں پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے ان کی دھمکی کا اثر نہیں لیا اور آگے ہی آگے بھاگتے چلے جارہے ہیں۔

میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بارود کے ایک عظیم ذخیرے کے بیچوں بیچ واقع وہ اندھا غار کتنا طویل ہوگا۔ داخلے کے وقت اس کی چوڑائی دس فٹ معلوم ہوئی تھی۔ میں بہ تدریج ڈھلوان میں جارہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ راکیل سے اتنے فاصلے پر آجاؤں کہ اپنے متعاقبین سے مڈبھیڑ کے دوران میں کسی بھی طور راکیل لپیٹ میں نہ آئے۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں ایک مرتبہ پھر دھمکی آمیز آواز سنائی دی ''یہ آخری وارننگ ہے۔ اگر تم دونوں کے قدم نہ رکے تو ہم بے دریغ فائرنگ شروع کردیں گے۔ یہ اندھا دھند تمہارا دائمی مسکن بن کر رہ جائے گا۔''

یہ آواز میرے عقب میں بیس فٹ کے فاصلے سے ابھری تھی اور اس میں ایک خاص قسم کا تحکم پایا جاتا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مسلسل تعاقب کرتے ہوئے وہ لوگ ایک مخصوص فاصلے سے زیادہ آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔ یہ محتاط روی اس اندھیرے کے باعث تھی جس نے غار کی آنکھیں چھین لی تھیں۔

میں یک لخت رک گیا۔ میرے تعاقب میں دوڑنے والے قدم بھی اٹھنا بند ہوگئے۔ اب وہ مجھ سے اتنی دوری پر تھے کہ ان کی ہانپتی کانپتی ہوئی سانسیں میری سماعت تک رسائی حاصل کررہی تھیں۔ میں دیوار کی پشت سے پشت لگا کر سانس روکے کھڑا تھا لہٰذا وہ مجھے کسی بھی انداز سے لوکیٹ نہیں کرسکتے تھے۔ یہ یوگا کا اعجاز تھا کہ میں کئی منٹ تک مسلسل سانس روک سکتا تھا۔ یوگا زندگی کو آسان اور خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ اعصابی قوت میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے قریب سے ایک تحکمانہ آواز ابھرتی سنائی دی۔ یہ وہی شخص تھا جو اس سے پہلے بھی بولتا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''وہ دونوں رک گئے ہیں۔ انہیں فوراً حراست میں لے لو۔''

''سر! اندھیرے میں وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔'' ایک محکوم آواز ابھری۔ لہجے میں بے بسی رچی بسی تھی ''انہیں کیسے پکڑا جائے؟''

''یو......'' مجاز افسر غرایا ''فریڈ! تم اتنے احمق کیوں ہو۔ اندھیرا ہے تو ٹارچ آن کرو۔ کیا تمہارے پاس ٹارچ نہیں ہے؟''

''سر رابرٹ! میرے پاس ٹارچ ہے۔'' یہ ایک تیسری آواز تھی۔

''ٹھیک ہے رابن۔'' رابرٹ نے فیصلہ کن انداز میں کہا ''تم اپنی ٹارچ جلاؤ اور انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ کم آن' ہری اپ میں نے بڑے غور سے انہیں دیکھا ہے۔ دونوں نہتے ہیں' آسانی سے ہمارے قابو میں آجائیں گے۔''

ان چاروں کے ''سرغنہ'' مسٹر رابرٹ کا مشاہدہ قابل داد تھا۔ اب کی باہمی گفتگو سے میں تین کے نام سے واقف ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ رابن اپنی ٹارچ کو روشن کرتا' میں دیوار کے ساتھ ساتھ پشت کو رگڑتے ہوئے بیک ٹو دی پویلین کھسکنا شروع کردیا۔

یہ میری ایک خطرناک حرکت تھی تاہم سانس روکے رکھنے کے سبب میں محفوظ رہا اور ان کی توجہ میں آئے بغیر میں ان سے پیچھے نکل آیا۔ جب رابن کی ٹارچ آن ہوئی تو میں ان سے دس فٹ پیچھے' غار کے آغاز کی جانب پہنچ چکا تھا۔

خیریت گزری کہ ان چاروں کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے سرکنے کا عمل جاری رکھا اور راکیل سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنے لگا تاہم میں اس وقت اس غار کی دوسری دیوار سے چپکا ہوا تھا' راکیل کی مخالف دیوار سے!

تھوڑی دیر تک ٹارچ کی مخصوص روشنی کا دائرہ غار سے اِدھر اُدھر اچھلتا رہا پھر ایک شخص نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں کہا' "لگتا ہے وہ دونوں کوئی خفیہ در کھول کر اندر گھس گئے ہیں۔ اگر یہاں ہوتے تو نظر میں ضرور آجاتے۔"

یہ اس چوتھے شخص کی آواز تھی جس کا نام ابھی تک میرے علم میں نہیں آسکا تھا۔ اس کا یہ تبصرہ خاصا خطرناک تھا لیکن رابرٹ نامی سینئر نے اسے ڈانٹ پلادی۔

"اسٹیورٹ! لگتا ہے تمہارے دماغ کا کوئی اسکریو ڈھیلا ہوگیا ہے۔ اگر وہ لوگ اندر کسی اسٹور میں داخل ہوئے ہوتے تو راستے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز ضرور آتی۔ ہم نے ان کے رکتے ہوئے قدموں کی آواز سنی پھر پن ڈراپ سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد ہم ہی باری باری بولے جارہے ہیں۔"

رابرٹ نے ایک تکنیکی نکتہ بیان کیا تھا۔ وہ خاصا معاملہ فہم اور دوراندیش لگتا تھا۔ میں اس تصور ہی سے تشویش میں مبتلا ہوگیا کہ ہمارے دونوں جانب' دیواروں کے عقب میں مختلف اسٹور وجود رکھتے تھے جن میں آنے جانے کے لیے مخصوص راستے کھولے اور بند کیے جاتے ہیں۔ راکیل مجھے بتا چکی تھی' غار نما وہ خفیہ اڈا یو۔ ایس آرمی کا ایمونیشن ڈپو تھا۔ رابرٹ کے اظہار سے راکیل کی بات تصدیق ہوتی تھی۔ اس بات کا یقین ہوجانے کے بعد کہ وہ لوگ ہرگز ہرگز فائرنگ نہیں کریں گے' میں نے عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس تاریک غار میں ان چاروں سے نمٹنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اگر ان میں سے کوئی واپس چلا جاتا یا غار کے اندر ہی سے باہر والوں کو یہاں کے حالات کی خبر دے دیتا تو ہم ایک ایسی مشکل سے دوچار ہوجاتے کہ لینے کے دینے پڑجاتے۔ یہ ویسی ہی صورتحال ہوجاتی کہ...... میں تو چھوڑتا ہوں مگر کمبل نہیں چھوڑتا!

یہاں سے کسی کو باہر جانا چاہیے تھا اور نہ ہی یہاں پیش آنے والے حالات کی کوئی اطلاع ربی موشے ہائمن تک پہنچنا چاہیے تھی! اس عزم کے ساتھ میں حرکت میں آنے ہی والا تھا کہ ٹارچ کی تھرکتی ہوئی لائٹ کا دائرہ میرے جسم کو گھیرے میں لینے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین آوازیں بہ یک وقت ابھریں۔ ان کے مشترکہ لہجے میں حد درجہ استعجاب پایا جاتا تھا۔

"ایک تو وہ رہا......!"

یہ جملہ مکمل ہونے تک میں وہاں نہ رہا جہاں مجھے ٹریس کیا گیا تھا۔ میں فضا میں اچھلا اور فرنٹ سمر سالٹ لگاتے ہوئے دوسری دیوار کی طرف چلا گیا۔ اس غار کی چھت میری کوٹھری کی بہ نسبت خاصی بلندی پر واقع تھی لہٰذا سمر سالٹ کی تکمیل میں مجھے کسی دیواری یا چھتی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ کام میں نے چشم زدن میں نمٹا دیا۔

میری توقع کے عین مطابق' ٹارچ کی روشنی کا ہالہ جمپ کر کے اس دیوار کی طرف چلا گیا' جدھر میں نے اڑان بھری تھی لیکن دشمنوں کی اس فطری حرکت کے لیے میں پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھا لہٰذا میں اس روشن دائرے میں داخل نہ ہوسکا۔

سمر سالٹ کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے ایک مخصوص زاویے سے' دوسری دیوار کی جانب بیک فلیک لگانا شروع کردیے' پھر ایک دیوار سے دوسری دیوار تک یہ سلسلہ تین مرتبہ دہرایا۔ وہ اس طرح کہ ہر دیوار کے ساتھ میرا آنا اور جانا لگ بھگ ساٹھ کا زاویہ بنا رہا تھا۔ ٹارچ کی روشنی مجھے ٹریس کرنے کے لیے اِدھر اُدھر مچلتی رہی اور میں اسے ایک کامیاب جل دے کر ٹارچ بردار کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔ اس اچھل کود میں بہ مشکل دس سے پندرہ سیکنڈ صرف ہوئے ہوں گے۔

ٹارچ بردار رابن مسلسل ناکامی سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ اس نے مجھے روشنی میں لانے کے لیے ٹارچ میری جانب سیدھی کرنا چاہی لیکن مجھے اس کی چاہت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے اس کے ٹارچ والے ہاتھ پر جھپٹا مارتے ہوئے' اس کے پیٹ میں ایک زوردار گھٹنا رسید کردیا۔

ٹارچ میری دسترس میں آگئی۔ اس کے ساتھ ہی رابن کے حلق سے ایک دردناک چیخ خارج ہوئی۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر باقی تین حریفوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ تینوں بڑے خون خوار انداز میں میری طرف لپکے چلے آرہے تھے۔

میں نے ٹارچ کو آف کردیا اور پہلو میں کھسک کر ایک محفوظ اسٹانس بنا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ تینوں یک بہ یک میری پہلے والی جگہ پر پہنچے' میں نے اندازے کی بنا پر اپنی باڈی کو لٹو بناتے ہوئے تین چار لگاتار فرنٹ وہیل ککس چلادیں۔ میرے بیش تر نشانے درست ثابت ہوئے اور وہ تاریک غار ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ٹارچ آن کی اور اس کی روشنی میں ان تینوں کی شکست و ریخت کا جائزہ لیا۔ ان کی حالت مجھے خاصی ابتر نظر آئی۔ اسٹیورٹ اور فریڈز مین بوس پڑے تھے اور ان کا کمان دار رابرٹ ان دونوں کے اوپر لدا ہوا تھا۔ میں نے روشنی کے دائرے کو سائیڈ میں حرکت دی تو رابن پیٹ پکڑ کر اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے ٹارچ آف کرکے اپنی پوزیشن کا زاویہ بدل دیا۔

وہ چاروں یو۔ ایس سولجر تھے لیکن مسلح ہونے کے باوجود بھی حالات کی ستم ظریفی نے انہیں خاک بلکہ...... سنگلاخ زمین چاٹنے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کی کسمپرسی پر میں اش اش کر اٹھا۔ وہ بزدل یا کمزور نہیں تھے ان کے پاس بے انداز طاقت اور بے حساب اختیار تھا لیکن اس ایمونیشن ڈپو نے انہیں بے بس اور لاچار بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھے گولیوں سے بھوننے اور میرے جسم کو چھلنی نمونہ بنانے پر قدرت رکھتے تھے مگر اپنی گنز کے بیرلز سے ایک گولی بھی فائر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے...... وہ سنگل شاٹ ایک ایسی دیاسلائی ثابت ہوتا کہ پھر......!

اس کے آگے سوچنے سے خیال بھک سے اڑنے لگتا تھا۔ اگرچہ ایمونیشن کے وہ خطرناک ذخائر اس تاریک راہ داری میں نظر کے سامنے نہیں رکھے تھے۔ پتھریلی دیواروں کے عقب میں ان خوف ناک اور ہلاکت خیز ہتھیاروں کا مسکن تھا مگر میرے دشمنوں کی محتاط روی اور احتیاط پسندی بتاتی تھی کہ وہ ذرہ برابر رسک لینے کو تیار نہیں۔

تاریکی میں وہ چاروں مجھے چھاپنے کے لیے پیش قدمی کرنے لگے۔ ان کے پاؤں کی آہٹوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یوشیپ میں میری سمت بڑھ رہے تھے' جیسے گھیرا ڈال کر مجھے پکڑنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ میں نے اپنی سماعت کو ان قدموں کی مخصوص چاپ پر مرکوز کردیا اور سانس روک کر' ان کے محدود فاصلے تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جیسے ہی وہ مجھ سے تین فٹ کی دوری پر آئے' میں نے ہوا میں پرواز کی اور ان کے اوپر سے گزر کر عقب میں پہنچ گیا۔

یہ ہائی جمپ کا ایک عمدہ مظاہرہ تھا مگر اس تاریک غار میں تالیاں پیٹ کر داد دینے والا کوئی نہیں تھا۔ فطری ردِعمل کے طور پر وہ چاروں بجلی کی سی سرعت سے پلٹے۔ اسی وقت میں نے ایک لمحے کے لیے ٹارچ آن کر کے آف کردی۔

میں درحقیقت ان کی تازہ ترین پوزیشنز کا اندازہ لگانا چاہتا تھا اور میرا مقصد ایک لمحے میں حاصل ہوگیا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں مجھے بلائنڈ فائٹ کے لیول سے بھی گزارا گیا تھا۔ میں نے اپنے استاد محترم ماسٹر ہینگ پائی کی منصفی میں' آنکھوں پر دبیز پٹی باندھ کر دو خطرناک فائٹرز سے خون ریز مقابلہ کیا تھا اور اس ٹیسٹ میں کامیاب رہا تھا۔

شاؤلن ٹیمپل کی وہ تربیت اس اندھے غار میں میرے کام آنے لگی۔ میں اپنے دشمنوں پر تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ اندازے کی ایک دو غلطیوں سے میرے ہاتھ پاؤں پتھریلی دیواروں سے بھی ٹکرائے تاہم مجموعی طور پر میں نے انہیں اچھا خاصا پیٹ ڈالا۔ ان کے لبوں سے بڑی کرب ناک آوازیں خارج ہوئی تھیں۔

اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے میں نے ایک مرتبہ پھر ٹارچ روشن کرلی اور اسی لمحے مجھ پر ایک خوف ناک انکشاف ہوا۔ ان تینوں کا لیڈر رابرٹ بڑی تیزی سے داخلی دروازے کی سمت دوڑ لگا رہا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ سے بھری بڑبڑاہٹ ہی نے مجھے بتایا تھا' وہ رابرٹ تھا۔ اسے دو تین مرتبہ سننے کے بعد میں نے لب و لہجے کو ذہن نشین کرلیا تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے روشن ٹارچ کا مخصوص دائرہ رابرٹ کی پشت پر مرکوز کیا اور اس کے پیچھے لپکا۔

رابرٹ کو کسی بھی صورت غار سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ اگر وہ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتا تو ہمارے لیے مشکلات کا ایک لامتناہی سلسلہ اٹھ کھڑا ہوتا۔ ہمارے درمیان جس جگہ پر وہ اندھا معرکہ ہو رہا تھا' وہ مقام داخلی دروازے سے لگ بھگ ایک سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ مذکورہ چاربائی چار فٹ کا وہ در کھلا ہوا تھا اور اس کھلے ہوئے شگاف میں سے باہر روڈ پر ایک چھوٹا فوجی ٹرک کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چاروں اسی ہیوی ڈیوٹی ٹرک میں سوار ہوکر وہاں پہنچے تھے۔

میں نے تھوڑا آگے جاکر رابرٹ کو چھاپ لیا۔ اسے بھی میری "آمد" کی خبر ہوگئی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹا اور اپنی گن کو لاٹھی کے انداز میں گھمادیا۔ اس نے میکانکی انداز میں میری کھوپڑی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنا ناریل چٹخوانے کے لیے اس کے قریب نہیں آیا تھا جو شرافت سے کھڑا رابرٹ کے حملے کو کامیاب ہونے دیتا!

اس کا ہاتھ گھومنے سے پہلے ہی میں نے بڑی سرعت سے ایک بیٹھک لگائی پھر اسی تیزی سے اٹھتے ہوئے رابرٹ

کی کمر پر ڈبل ہینڈ پش رسید کر دیا۔ وہ اپنی گن سمیت پوری طرح گھوم چکا تھا لہٰذا اس خطرناک ہینڈ پش نے اسے منہ کے بل نیم تاریک راہ داری میں گرنے پر مجبور کر دیا۔ راہ داری کا یہ حصہ داخلی دروازے سے پچاس میٹر کی دوری پر تھا اس لیے تھوڑی بہت روشنی وہاں پہنچ رہی تھی۔ یہ تھوڑی بہت روشنی میرے لیے بہت کافی تھی۔ میرا زبردست دھکا کھانے کے بعد گن اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی تھی۔

رابرٹ اٹھ کر کھڑا ہوا تو میں پہلے سے تیار تھا۔ وہ بڑے جارحانہ بلکہ بڑے عسکری انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے اپنے ہاتھ پاؤں کی کارکردگی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ وہ ایسے فراغت کے لمحات نہیں تھے کہ میں رابرٹ کو اپنے مارشل آرٹس کے چمتکار سے متاثر کرنے کی سعی کرتا۔ راکیل کی فکر بھی میرے ذہن کے ایک گوشے میں مقیم تھی۔ میں پچاس میٹر پیچھے اسے تین خطرناک یو۔ ایس سولجرز کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا تھا۔ اگرچہ وہ راکیل کی لوکیشن سے آگاہ نہیں تھے لیکن آگاہ ہو سکتے تھے!

میں نے ہاتھ پاؤں کی پے در پے ضربات سے رابرٹ کو زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور مزید تسلی کے لیے اپنا مخصوص داؤ استعمال کر کے اسے آئندہ دو تین گھنٹے کے لیے اس دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

میں ابھی اٹھ کر پوری طرح کھڑا بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے اپنے عقب میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں تیزی سے پلٹا اور اسی وقت راکیل پر میری نگاہ پڑ گئی۔

وہ بھاگتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی اور دیگر تینوں افراد اس کے تعاقب میں تھے۔ ان کے درمیان کم و بیش پندرہ فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ میں کسی طوفان کے مانند ڈٹ کر ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

راکیل میرے قریب پہنچ کر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکی بلکہ داخلی دروازے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع تھی لیکن سوچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ تینوں جہنمی بلاؤں کے مانند میرے سر پر آن پہنچے تھے۔ پہلے ان سے دو دو ہاتھ کرنا ضروری تھا' راکیل کو بعد میں بھی دیکھا جا سکتا تھا!

وہ تینوں جیسے ہی میری رینج میں آئے' میں نے انہیں ٹیڑھے ہاتھوں لیا۔ وہ مجھ سے اچھی خاصی درگت بنوا چکے تھے لہٰذا مجھے ان پر نفسیاتی برتری حاصل تھی۔ میں نے ایک کے وار کو روکا اور دوسرے کو راؤنڈ ہاؤس کک رسید کر دی۔ تیسرے نے میرے پیچھے آ کر مجھے کمر سے پکڑنا چاہا۔ میں نے جھکائی دے کر ایک خطرناک ریئر کک اس کی تھوڑی پر جڑ دی۔ وہ اپنے حلق سے ایک اذیت ناک آواز خارج کرتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔

مجھ سے مار کھانے والا راہ داری کے سنگلاخ فرش پر چت گرا تھا۔ میں نے ایک تیکھی جست لگائی اور دونوں پاؤں سے اس کے سینے پر آ رہا۔ یہ ایک جھٹکے دار ٹھوکر تھی۔ میرے نشانے پر آنے والے نے عجیب المعنی آواز نکالی اور ساکت ہو گیا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا' اس کا سکوت عارضی تھا یا دائمی!

میں اپنے پاؤں کے نیچے دبے شخص سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے چونک جانا پڑا۔ راہ داری کا معرکہ آرا حصہ اچانک بہت زیادہ روشن ہو گیا تھا۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ چار بائی چار فٹ والا شگاف پھیل کر دس بائی پندرہ فٹ میں بدل گیا تھا...... اور اس عظیم شگاف میں سے فوجی ٹرک غار کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ روشنی اسی ٹرک کی ہیڈ لائٹس سے خارج ہو رہی تھی۔

بے اختیار میری نگاہ ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب اٹھ گئی...... اور مذکورہ سیٹ پر راکیل کو مستعد دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں ابھی ان پے در پے حیرتوں سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ میری کمر پر ٹھوکر لگی ــــ میری لمحاتی غفلت نے باقی ماندہ دو بیدار دشمنوں میں سے کسی کو حملہ آور ہونے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

میں ٹھوکر کھا کر تھوڑا سا لڑکھڑایا پھر اسی لڑکھڑاہٹ کے دوران میں' میں نے ایک لیفٹ کریسنٹ کک چلا دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ حملہ آور بلبلا اٹھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار سائیڈ کک سے نوازا۔ وہ راہ داری کی پتھریلی دیوار سے جا ٹکرایا اور وہیں زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ شاید اس کے سر میں کوئی چوٹ آ گئی تھی۔ میں اس کے اٹھنے کا انتظار کیے بغیر آخری دشمن کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لاسٹ مین اٹیکنگ بہت بودا ثابت ہوا۔ اپنے تین ساتھیوں کے حشر نے اس کی ہمت کی کمر توڑ دی تھی۔ وہ بڑے ڈھیلے ڈھالے اور سہمے ہوئے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے لمحاتی کوشش سے اسے بھی لمبا لٹا دیا۔ جب انسان حوصلہ ہی ہار جائے تو پھر اسے شکست دینے میں ہل بیل نہیں لگتے!

میں اپنے دشمنوں سے فارغ ہو کر دوست کی طرف متوجہ ہو گیا۔ راکیل نے اب تک ایک ہمدرد اور مخلص دوست

کردار ادا کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل اس کی جانب سے بدگمان ہوا تھا جب میں نے اسے داخلی دروازے کی طرف بے دریغ بھاگتے دیکھا تھا۔ اس لمحے میرے ذہن میں خدشاتی خیال ابھرا تھا کہ کہیں وہ اپنی پوزیشن بچانے کے لیے وہاں سے فرار تو نہیں ہو رہی۔ راکیل نے ابھی نیا نیا' دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ اندھا اعتماد قائم ہونے میں تھوڑا وقت تو لگتا ہے نا!

راکیل اب ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود نہیں تھی۔ میں ٹرک کی سمت بڑھ گیا۔ اسی وقت وہ مجھے ٹرک کے عقب سے نکل کر اپنی جانب آتی دکھائی دی۔ ٹرک کے پیچھے وہ عظیم شگاف اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ راکیل نے داخلے کے اس ذریعے کو بند کر دیا تھا۔

مجھ سے نگاہ ملتے ہی وہ مسکرائی "وجدان! اب فکر والی کوئی بات نہیں۔ میں نے یہاں تک رسائی کا راستہ لاک کر دیا ہے۔"

"لاک؟" میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں لاک!" پھر وہ مجھے لاک اور بند کا فرق بتانے لگی "اس راستے کی اندرونی جانب ایسا نادیدہ میکانزم موجود ہے کہ جس کی مدد سے اس راستے کو لاک بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ راستہ باہر سے نہیں کھولا جا سکتا۔ ہم اندر' ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے محفوظ ہیں۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا "پہلے تم نے اس راستے کو لاک کیوں نہیں کیا تھا۔ خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع ہو گیا اور مارا ماری الگ ہوئی۔ ان چار فوجیوں اور ٹرک کی گمشدگی زیادہ عرصے تک راز نہیں رہے گی۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولی "ویسے تو تمہاری اور ساحل کی روپوشی بھی زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہے گی۔ تمہارے غیاب کا راز کھلتے ہی ربی کے آدمی تم دونوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ وہ شکاری کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتے پھریں گے مگر مجھے اطمینان ہے' وہ اس بارودی غار میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔"

"تمہاری وضاحت اپنی جگہ مگر یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔"

وہ میرے چہرے کو ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی "تمہارے سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ پہلے میں تمہیں یہاں پہنچا کر واپس جانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں مائیکل کی موت' بہت سے بند راز کھول دے گی۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں لہٰذا تم میری واپسی کے امکانات معدوم ہی سمجھو۔ میں تمہاری ہم راہی میں آگے ہی آگے بڑھوں گی۔"

میں ایک طویل اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ راکیل نے جس حقیقت کا اظہار کیا تھا وہ کوئی مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ واقعی اس کی واپسی میں خطرات کے سوا کچھ نہیں رکھا تھا۔

"تم تو سچے جادوگر ہو۔" راکیل نے حیرت بھری آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ زمین پوس چار یو۔ ایس سولجرز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی "تم نے جادو کی چھڑی گھما کر انہیں وہم و گمان سے بہت دور پہنچا دیا ہے۔"

میں نے اس کی نیلی اور گہری آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم بھی کچھ کم جادوگرنی نہیں ہو۔ ایک تنگ سے راستے کو ضرورت کے وقت الاسٹک کی طرح کھینچ کر پھیلا لیتی ہو۔ وہ راستہ جہاں سے اب کسی چیونٹی کے نکلنے کے امکانات بھی صفر کے برابر ہیں، تم اپنی مہارت کے بل بوتے پر وہاں سے ایک گراں ڈیل' بدمست ہاتھی کو گزار لائی ہو۔" میں نے فوجی ٹرک کی جانب انگلی اٹھائی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا "اس کے سونڈ نہیں تو کیا ہوا۔ یہ کسی عظیم الجثہ ہاتھی سے کم تو نہیں!"

"اوہ!" وہ شرارت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ سب تکنیک کا کمال ہے۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں' تم بڑی ماہر کاریگر ہو!" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

جواب میں وہ مجھے اس راستے کی تکنیکی خوبیاں بتانے لگی۔ راکیل کے مطابق، وہ راستہ تین مختلف سائز میں کھولا جا سکتا تھا۔ چار بائی چار فٹ' آٹھ بائی دس فٹ اور دس بائی پندرہ فٹ۔ ان تینوں سائز کو کھولنے کا حساب کتاب اور تکنیک جدا جدا تھی۔ میں راکیل کے ساتھ چار بائی چار فٹ کے درے سے گزرا تھا اور راکیل نے وہ فوجی ٹرک دس بائی پندرہ فٹ کے شگاف سے گزارا تھا۔ بہرحال اب وہ شگاف نابود ہو کر ایک سنگلاخ اور سرد موٹی دیوار کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

فوجی ٹرک کی ہیڈ لائٹس اس غار کو بہت دور تک روشن کر رہی تھیں۔ ہم زیادہ دیر تک ٹرک کا انجن اسٹارٹ حالت میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس انجن سے اچھا خاصا شور پیدا ہو رہا تھا۔ میں ان چار یو۔ ایس سولجرز پر لعنت بھیج کر مائیکل کی طرف بڑھ گیا۔

مائیکل کی موت کو کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ ...یں بڑی سرعت سے اس دراز زلف شخص کی جانب بڑھ گیا' ...ندھیرے میں راکیل جس سے ٹھوکر کھا کر گری تھی۔ راکیل بھی ...یرے پیچھے لپک آئی۔ پھر ریشمی زلفوں والے اس شخص کے ...دیک پہنچ کر وہ ٹھٹکی۔ اس کے لبوں سے تھرتھراتی ہوئی آواز ...ارج ہوئی۔

"وجدان...... یہ تو نیلسن ہے......"

میں چونک اٹھا۔ نیلسن ان دو افراد میں سے ایک تھا جو ...ے اور ساحل کو اپنے بڑوں تک پہنچانے والے تھے۔ نیلسن ...شبہ موت سے ہم کنار ہو چکا تھا۔ اس کے سینے میں ایک ...ناک خنجر دستے تک پیوست تھا۔ نیلسن کا ساتھی ریمنڈ کہیں ...ر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا "نیلسن اور مائیکل تو ...رگی سے روٹھ کر موت کو گلے لگا چکے ہیں۔ ریمنڈ کہیں دکھائی ...یں دے رہا۔ کہیں وہ بھی تو ختم نہیں کیا جا چکا؟"

"ڈرانے والی باتیں نہ کرو وجدان!" وہ میرے پہلو ...ے لگتے ہوئے بولی۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "میں ڈر اور خوف ...ے بہت آگے نکل آیا ہوں۔ ریمنڈ کے ساتھ ساتھ میری ...ی ساحل بھی غائب ہے۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ...ر ایک' ساحل اس مقام پر پہنچی ہی نہیں۔ نمبر دو! اگر وہ پہنچی ...تو پھر ریمنڈ اسے ساتھ لے گیا ہے کہاں......؟ یہ ہمیں ...لانا ہوگا اور......!"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے ..."اور...... کیا؟"

"اور...... دوسری صورت ایک سنسنی خیز تیسری صورت ...بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔" میں نے خیالات ...ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا "اگر واقعی ریمنڈ' ساحل کو اپنے ...ہ کہیں لے گیا ہے تو پھر مائیکل اور نیلسن کو اسی نے قتل کیا ...!"

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "یہ تم ...ا باتیں کر رہے ہو؟"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اس اندھے غار میں ابھی ...ہمیں ریمنڈ اور ساحل دکھائی نہیں دیے تمہارے دعوے ...طابق' مائیکل نے ساحل کو اور تم نے مجھے یہاں پہنچانا تھا۔ ...ا اور ریمنڈ ہمیں اپنے ساتھ کہیں لے جاتے۔ تمہارے ...ے کے مطابق مائیکل' ساحل کو یہاں پہنچانے میں ...ب رہا ہے' جیسا کہ تم مجھے یہاں پہنچا چکی ہو۔ مائیکل اور نیلسن کی لاشیں ہم دریافت کر چکے ہیں۔ تم اور میں زندہ حالت میں اس وقت گفتگو کر رہے ہیں۔ باقی بچتے ہیں ساحل اور ریمنڈ۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں ساحل اس تاریک غار میں دو شاطر افراد کے خون میں ہاتھ رنگنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پھر آ جا کر ریمنڈ ہی باقی بچتا ہے!"

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے استفسار کیا "تم ساحل کے بارے میں اتنے پُر وثوق کیوں ہو؟"

"اس لیے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ ریمنڈ اپنے ہی دو ساتھیوں کو قتل کیوں کرے گا؟"

"یہ تو تم سمجھ رہی ہو نا' وہ تمہارا ساتھی ہے!"

"کیا مطلب؟" وہ اچھل کر رہ گئی "تم کیا کہنا چاہتے ہو وجدان!"

میں نے کہا "ربی موشے ہائمن، اس کا دستِ راست برنارڈ لیو اور یہاں کا دیگر اسٹاف بھی تو تمہیں اور مائیکل کو اپنا ساتھی' اپنا وفادار سمجھتے ہیں مگر کیا یہ حقیقت ہے؟"

اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت نمودار ہوئی۔ حسین مکھڑے پر ہیجان کا ابھار بڑا عجیب تاثر پیدا کرتا ہے۔ تشویش ناک لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو' ریمنڈ ہمارے دشمنوں سے ملا ہوا ہے؟"

"یہ بعید القیاس تو نہیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "ریمنڈ کو دشمنوں سے ملنے کی کیا ضرورت ہے' یہ بھی عین ممکن ہے وہ دشمنوں ہی کا پلانٹڈ ہو...... جیسا کہ تم اور مائیکل اپنے دشمنوں کے اندر رہتے ہوئے کسی اور کے لیے کام کرتے ہو اسی طرح ریمنڈ تم لوگوں کے اندر رہتے ہوئے ربی وغیرہ کے لیے کام کر رہا ہو۔"

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی "اس کا مطلب ہے' ریمنڈ نے بلیک شیپ کا رول ادا کیا ہے!"

میں نے اسے یہ جتلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ اور مائیکل بھی کالی بھیڑوں (بلیک شیپ) ہی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ دراصل یہ سمجھ اور زاویے کا الٹ پھیر ہے۔ ایک ملک کا ہیرو' دشمن ملک کے لیے بدترین دہشت گرد کی حیثیت رکھتا ہے۔ راکیل اور مائیکل ربی کے خفیہ ٹھکانے پر رہتے ہوئے اپنے بڑوں سے وفاداریاں نبھا رہے تھے۔ اسی طرح عین ممکن تھا' ریمنڈ نے ان کے دھڑے کے اندر رہتے ہوئے ربی کے لیے کوئی کارروائی کی ہو۔ زاویہ بدل جانے

سے الفاظ اور افعال کے معنی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ زمین پر کھڑے ہو کر دیکھو تو چاند آسمان پر نظر آتا ہے اور اگر چاند پر جا کر نگاہ اوپر اٹھاؤ تو یہی زمین آسمان پر دکھائی دے گی!

میں نے رائیل کی تشویش کے جواب میں گول مول جملہ کہہ دیا ''تم بلیک شیپ کی بات کرتی ہو، وہ کم بخت ریمنڈ تو مجھے پورا کا پورا بلیک شیپ لگتا ہے۔''

''اسی لیے وہ بابا تمہاری بے بی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے!'' وہ بے ساختہ بولی۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ میری ساحل کا ذکر کر رہی تھی۔ میں یک دم سنجیدہ ہو گیا اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا ''رائیل! تم اس ٹرک کو ڈرائیو کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے لاؤ...... جہاں تک بھی ممکن ہو۔''

''تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ٹرک کی ہیڈ لائٹس میں دور تک، اس اندھے غار کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''ممکن ہے کچھ اور تیر تیں ہمارے انتظار میں بیٹھی ہوں۔''

رائیل نے بتایا ''یہ غار لگ بھگ ڈھائی سو میٹر طویل ہے یو۔ ایس سولجرز کو تم نے جس مقام پر گھیرنے کی کوشش کی تھی وہ داخلی دروازے سے ایک سو میٹر کی دوری پر ہے۔ اس سے آگے یہ دس فٹ کا راستہ پھیل کر پچاس فٹ پر محیط ہو جاتا ہے۔ اس طرح مزید ڈیڑھ سو میٹر طے کرنے کے بعد ہم اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں پہاڑی سے باہر نکلنے کا راستہ ہے۔ یہ کل ڈھائی سو میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہوئے ہم زمین کی سطح سے اور قریب ہو جائیں گے۔ جب ہم پہاڑی سے باہر نکلیں گے تو دینالی نیشنل پارک کی زمین سے محض سو فٹ کی بلندی پر ہوں گے جب کہ اس غار میں داخلے کے وقت یہ بلندی دو سو فٹ تھی مگر میں ایک بات واضح کر دوں کہ جہاں دس فٹ والا راستہ ختم ہوگا اس سے آگے ٹرک کو نہیں لے جایا جا سکتا۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ تم عجیب بات کر رہی ہو۔ ابھی تم ہی نے بتایا ہے آگے جا کر یہ راستہ پچاس فٹ کا ہو جائے گا پھر ٹرک کے مزید آگے بڑھنے میں قباحت ہے؟''

''میں نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا'' وہ رسانیت سے بولی ''سو میٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد راستہ واقعی پچاس فٹ چوڑا اور ڈیڑھ سو میٹر طویل ہو جائے گا مگر یہ سارا علاقہ انتہائی خطرناک زون ہے۔ یو ایس آرمی کا ایمونیشن ڈپو ادھر ہی واقع ہے...... یا پھر ان پتھریلی دیواروں کے عقب میں، وافر مقدار اور تعداد میں اسلحہ چھپا کر رکھا گیا ہے۔'' اس نے دو طرفہ سنگلاخ دیواروں کی جانب یکے بعد دیگرے اشارہ بھی کر دیا۔

اس کی بات بلکہ سنگین انکشاف سن کر میں گہری تشویش میں گھر گیا۔ رائیل بڑی گہری لڑکی تھی۔ اس کی معلومات خطرناک حد تک حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھیں۔ میں نے چند لمحات کے توقف کے بعد اس سے پوچھا۔

''کیا ریمنڈ اور نیلسن ہمیں اسی راستے سے باہر لے جانے والے تھے؟''

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ سادگی سے بولی۔

وہیں کھڑے کھڑے وقت برباد کرنا عقل مندی نہیں تھی۔ میں نے رائیل سے کہا ''چلو تم ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالو۔ میں تمہارے آگے آگے چلتا ہوں۔ اس دس فٹ کے راستے کو تو طے کر لو۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

رائیل کوئی سوال کیے بغیر ٹرک کی جانب بڑھ گئی۔ جب ٹرک حرکت میں آیا تو روشن راہ داری میں اس کے آگے چلنے لگا۔ میں جلد ہی اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ان چار یو۔ ایس سولجرز سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ راہ داری کے فرش پر مجھے رائیل کی ٹارچ پڑی ملی۔ فائٹنگ کے دوران میں نے وہ ٹارچ ایک جگہ ڈال دی تھی۔ پھر اس بیگ پر میری نگاہ گئی جو رائیل نے کوٹھری سے نکالتے وقت میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے دونوں چیزیں اٹھالیں۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔

راہ داری کے فرش پر دو گنز بھی پڑی نظر آ رہی تھیں۔ ہم جن حالات سے گزر رہے تھے ان میں کسی بھی وقت آتشیں اسلحے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر میں نے وہ دونوں گنز بھی اٹھالیں۔ میں سیدھا کھڑا ہوا ہی تھا کہ رائیل بھی ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن سے باہر آ گئی۔

''ان چیزوں کی قطعاً ضرورت نہیں۔'' وہ میرے ہاتھ میں موجود گنز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ''اس بیگ کے اندر ہماری ضرورت کا تمام سامان موجود ہے۔'' بات کرتے ہی اس نے سیاہ بھاری بھرکم بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

اب مجھے اس پُراسرار ہوئی بیگ کی اہمیت کا اندازہ معنوں میں ہوا تھا۔ رائیل گویا پوری تیاری کے ساتھ نکلی تھی میں نے اس کے حسب منشا گنز اور ٹارچ کو راہ داری کے فرش پر پھینک دیا۔

رائیل نے میرے ہاتھ سے بیگ لے لیا اور ایک جا

اشارہ کرتے ہوئے بولی ”آؤ چلیں۔“

”اس ٹرک کا انجن تو بند کردو۔“ میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”بے چارہ بیدار ہے' اسے بیدار ہی رہنے دو۔ زبردستی سلانے کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولی ”ہمارا کیا لے رہا ہے۔ اس کی روشنی میں ہم زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کرلیں گے۔ جب اس کی بیٹری ڈاؤن ہوگی تو خود ہی بند ہوجائے گا۔“

”مگر اس کا شور کسی کو بھی ادھر متوجہ کرسکتا ہے!“

”تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہوجاؤ۔“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی ”اس وقت ہم ماؤنٹ مکنلے کے جس حصے میں ہیں' وہاں سے کوئی آواز باہر نہیں جائے گی۔“

میں اس کی ارضیاتی معلومات کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تاہم آگے بڑھنے سے پہلے میں نے زمین سے ٹارچ اٹھالی۔ راکیل نے کوئی اعتراض نہ کیا اور خاموشی سے آگے بڑھنے لگی۔

میں نے کہا ”لاؤ یہ بیگ مجھے دے دو۔ کافی وزنی ہے۔ کہاں اٹھائے اٹھائے پھرو گی۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ مسلسل آگے بڑھتے ہوئے بولی ”یہ بیگ اس لیے وزنی ہے کہ اس میں' میں نے اچھا خاصا وزن بھر رکھا ہے۔ تم کافی دیر سے اسے اٹھائے ہوئے ہو۔ اب میری باری ہے۔“

امریکی معاشرے میں مرد اور عورت کو زندگی کے ہر شعبے میں برابری کا درجہ حاصل ہے۔ وہ دکھ اور سکھ بانٹ کر اٹھاتے ہیں۔ اس بات سے بحث نہیں کہ یہ برابری کس حد تک درست ہے تاہم بعض اوقات برابری کا یہ رویہ بڑا مضحکہ خیز ہوجاتا ہے۔ کسی ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھ جائیں تو مرد اور عورت اپنا اپنا بل خود ادا کرتے ہیں۔ سینما جانے کا اتفاق ہو تو دونوں کو اپنا ٹکٹ اپنی جیب سے لینا پڑتا ہے۔ اس معاشرے کے باسی کہتے ہیں...... آخر اس میں برائی کیا ہے؟ بظاہر کوئی برائی نظر نہیں آتی مگر صنفِ کرخت کا' صنفِ نازک کے ساتھ یہ سلوک خاصا غیر مہذب اور ناشائستہ سا لگتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ امریکی قوم کی اپنی کوئی تہذیب' اپنا کوئی تمدن نہیں اس لیے وہ ان نزاکتوں کا خیال نہ رکھتے ہوں۔ پوری امریکی قوم اس وقت ”ولیس گو اہیڈ“ اور ”آئی ڈونٹ کیئرز“ کے اصولوں پر بہ زعم خود کامیابی کی جانب رواں دواں ہے۔ ماضی اور اقدار کا پاس وہی اقوام کرتی ہیں جن کا اپنا کوئی ماضی...... اپنی کوئی قدریں ہوتی ہیں!

راکیل بھی اسی معاشرے کی پروردہ تھی لہٰذا میرے ہاتھ سے بیگ لے کر گویا وہ میرا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے ہولیا۔ جلد ہی ہم ہلاکت خیز آتشیں اسلحے کے ذخیرے کے درمیان سے گزرنے لگے۔ ٹرک کی ہیڈ لائٹس کافی حد تک اندر کے منظر کو واضح کررہی تھیں چنانچہ میں نے ٹارچ جلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

میں بتا نہیں سکتا' اس وقت ہمارے احساسات کیا تھے۔ ایک ذرا سی چنگاری بھی اس بارود کے عظیم ذخیرے کو نمونۂ جہنم بنا سکتی تھی۔ ہم بے حد محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے اس طویل ہال نما زون کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ یہ ڈیڑھ سو میٹر کا فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

راکیل نے اپنے کندھے سے بیگ اتارا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ”اب ہم چینج کریں گے۔“ پھر وہ بیگ کو کھول کر کچھ کھکھوڑنے لگی۔

میں نے پوچھا ”کیا چینج سے تمہاری مراد لباس تبدیل کرنے سے ہے؟“

”ہاں' کسی حد تک۔“ وہ بیگ میں سے مختلف گرم کپڑے نکالتے ہوئے بولی۔

”تمہارا...... کسی حد تک میری سمجھ میں نہیں آیا؟“

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ”ابھی تھوڑی دیر بعد ہم ماؤنٹ مکنلے سے باہر نکل جائیں گے۔ یہ اندر والی فرحت اور معتدل درجۂ حرارت باہر نہیں ملے گا۔ پہاڑی کے باہر اس وقت درجہ حرارت کم از کم منفی پندرہ ڈگری سنٹی گریڈ ہوگا۔ اب تم خود اندازہ لگالو' اگر ہم اس لباس میں باہر نکلے تو ہمارا کیا حشر ہوگا!“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”کسی حد تک لباس تبدیل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے اس لباس کے نیچے اور اوپر بھی چند مخصوص کپڑے پہنیں گے تاکہ موسم کی شدت بری طرح ہم پر اثر انداز نہ ہوسکے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے چند کپڑے میری جانب بڑھا دیے اور مختلف رنگ و نسل کے چند لبادے خود سمیٹ کر ایک طرف ہوگئی۔ میں الجھن زدہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

اس نے جلد ہی میری مشکل کو بھانپ لیا اور سوالیہ انداز میں بولی ”کوئی پرابلم ہے وجدان؟“

”ہاں۔“ میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا ”اوپر سے کپڑے پہننے والی بات تو ٹھیک ہے لیکن موجودہ لباس کے اندر کچھ پہننے کے لیے اس لباس کو اتارنا ہوگا۔“

”سو وہاٹ؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں متذبذب لہجے میں کہا ”کیا ہم اپنا لباس ایک دوسرے کے سامنے یہیں اتاریں گے؟“

”اس میں ہچکچاہٹ والی کون سی بات ہے؟“ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

راکیل جو کچھ بھی کہہ رہی تھی' اپنے تئیں بالکل درست کہہ رہی تھی۔ میرے سامنے لباس تبدیل کرنے میں اس کے لیے کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو مگر میں حد درجہ متامل تھا۔ اگرچہ لباس کی یہ تبدیلی انڈر گارمنٹس کی موجودی میں ہوتی تاہم پھر بھی میں اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ بس اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ راکیل جس بات کو بہت ایزی لے رہی تھی' وہ میرے لیے نہایت ہی کٹھن تھی۔

میں اسی شش و پنج میں کھڑا استملانہ نظر سے راکیل کو دیکھ رہا تھا کہ وہ شوخی سے بولی ”تم پتا نہیں کن سوچوں میں گم ہو۔ میں تو لباس تبدیل کرنے لگی ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے فل سلیو ہائی نیک اتارنا شروع کردیا۔ وہ میری طرف سے مکمل غفلت برتتے ہوئے اپنے کام میں جت گئی۔ ان لمحات میں' میری سمجھ میں یہی آیا کہ رخ پھیر کر میں بھی لباس تبدیل کرنا شروع کردوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنے لباس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میری مشکل آسان ہوگئی۔

فوجی ٹرک کی ہیڈ لائٹس اچانک بجھ گئی تھیں اور انجن کا شور بھی ناپید ہوگیا تھا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا' اس کی بیٹری بیٹھ گئی تھی یا پھر کوئی اور تکنیکی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال' جو کچھ بھی ہوا تھا' میرے حق میں بہتر ہی ہوا تھا!

پندرہ منٹ کے بعد ہم پوری طرح ڈریس اپ ہوچکے تھے۔ اب ہمارے اجسام پر اتنا لباس موجود تھا جو یہاں کے شدید موسم میں ہمیں ایک محفوظ ڈھال پیش کرتا۔ ہمارے پاؤں کے جوتے بھی بدل گئے تھے۔ سروں پر مخصوص قسم کی گرم ٹوپیاں سج گئی تھیں اور آنکھوں پر بھی خاص نوعیت کے چشمے نظر آرہے تھے۔ ہمارے ہاتھ بھی حرارت بخش دستانوں کی لپیٹ میں تھے۔ اپنی تیاری کے آخری مراحل ہم نے ٹارچ جلا کر طے کیے تھے۔ اب ہم اپنے حلیے اور وضع قطع سے دو مہم جو دکھائی دیتے تھے اور دیکھنے والا یہ اندازہ قائم نہیں کرسکتا تھا کہ ہم میں سے ایک مرد اور دوسری کوئی عورت ہے۔ راکیل نے اپنے بال سمیٹ کر گرم کوٹ کے اندر چھپا لیے تھے۔ ہم اس گیٹ اپ اور سیٹ اپ میں دوسروں کی نظروں میں آئے بغیر کسی محفوظ مقام پر پہنچ سکتے تھے۔

راکیل نے اس سیاہ بیگ کے اندر سے ایک زرد بیگ نکالا اور سامان کو تقسیم کرکے دونوں بیگز میں رکھنے لگی۔ وہ ضروریاتِ زندگی کا عام اور خاص سامان تھا۔ اس میں سب سے اہم دو چیزیں تھیں...... ڈالرز کے بنڈل اور پسٹل۔ ڈالرز کی شکل میں وہ ایک بھاری رقم تھی جو راکیل نے تقسیم کرکے دونوں بیگز میں ڈال دی۔ ایک خوب صورت اور خطرناک لیڈی پسٹل اس نے اپنی جیب میں ٹھونس لیا اور دوسرا میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے پسٹل ہاتھ میں لے کر اس کا کلپ چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ میں نے راکیل کو تین چار بھرے ہوئے فلپس بیگ میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بڑی خطرناک تیاری سے آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ اپنی مصروفیت سے فارغ ہوئی تو زرد بیگ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”وجدان! یہ تمہارا ہے۔ یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے ہم اپنا اپنا بوجھ خود اٹھائیں گے۔“

میں نے پوچھا ”میرے ساتھ آگے بڑھنے کا تمہارا یہ فیصلہ ہنگامی بنیادوں پر کیا گیا ہے' ورنہ تم تو مجھے یہاں پہنچا کر واپس جانے والی تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں' ہم کہاں جارہے ہیں؟“

”یہ پوچھنا تمہارا حق ہے۔“ وہ تفہیمی انداز میں بولی ”فی الحال تو ہمیں دینالی نیشنل پارک سے نکلنا ہے۔ آگے کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔“

میں نے کہا ”دینالی ایک نیشنل پارک ہے۔ لوگ یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے ہیں۔ مجھے امید ہے ہمیں کوئی لفٹ وغیرہ مل جائے گی۔“

”ایسی امید کو اپنے ذہن میں پھٹکنے بھی نہ دینا۔“ وہ تنبیہہ کرنے والے انداز میں بولی ”تمہیں اس وسیع و عریض پارک میں شاید ہی کوئی متنفس نظر آئے۔ سیر و تفریح کے شائق افراد صرف مئی سے اگست تک ادھر کا رخ کرتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ستمبر کے وسط تک۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد شدید...... موسم اس طرح منہ دینے کی اجازت نہیں دیتا اور...... آج کل جنوری چل رہا ہے...... سردی کی پیک۔ تم کسی قسم کی لفٹ یا امداد کے وہم و گمان میں نہ رہنا وجدان۔“

میں اس کی معلومات افزا باتیں سن کر سناٹے میں آگیا۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ”ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت میلوں پیدل چل کر اس پارک سے نکلنا ہوگا۔ اس موسم میں یہ پارک عموماً ویران اور سناٹے دار ہی رہتا ہے' البتہ نیشنل لیول کے موٹنیئرز اور گلیشیئر پائلٹس کو ادھر آنے کی اجازت

ہے اور یہ اجازت بھی اسٹیٹ گورنر ہی دیتا ہے۔ یہ تماشا کے
ں کی بات نہیں۔"

وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کی خاطر رکی پھر سلسلۂ
کلام کو جاری رکھتے ہوئے بتانے لگی "مئی سے اگست تک اس
رک میں اچھی خاصی رونق ہوتی ہے۔ پرائیویٹ گاڑیوں کو
ں پارک میں داخلے کی اجازت نہیں۔ پارک کے مین گیٹ
کے اندر ایک مخصوص مقام پر اپنی گاڑیوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔
ہاں سے پارک انتظامیہ نے اپنی شٹل بسیں چلا رکھی ہیں۔
پیلے رنگ کی یہ لمبی لمبی بسیں سیر و تفریح کی غرض سے پارک میں
نے والوں کو اپنے اندر سوار کر کے خوب گھماتی ہیں۔ یہ
سافروں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ جہاں چاہیں بس روک کر
ر جائیں۔ واپسی میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا۔ مذکورہ پیلی بسیں
یں آتے جاتے ہر وقت مل جاتی ہیں۔ ازیں علاوہ
'اینکر یج۔ فیئر بینکس ایکسپریس' نامی ایک ٹرین بھی دینالی
یشنل پارک کے ایک مخصوص حصے سے گزرتی ہے۔ یہ ٹرین
ینکریج سے فیئر بینکس تک جاتی ہے۔ اس کے مسافر ٹرین کے
ندر رہتے ہوئے دینالی پارک کے نظارے سے محظوظ ہوتے
یں۔"

"تمہاری فراہم کردہ معلومات نہایت ہی دلچسپ اور
رحت بخش ہیں لیکن افسوس کہ ہم جن حالات سے گزر رہے
یں ان میں دینالی پارک کے روح پرور نظاروں کو انجوائے
ہیں کر سکتے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم مجھے
بتاؤ ہم پہاڑی سے نکل کر کدھر کا رخ کریں گے۔ میرا
طلب ہے دینالی نیشنل پارک کو چھوڑنے کے بعد ہم کہاں پہنچ
ائیں گے؟"

"یہاں سے قریب ترین مقام اولڈ کریل ہے۔ ہم
ونٹ مکنلے سے باہر نکلنے کے بعد جنوب مشرق کی سمت سفر
کریں گے اور شام سے پہلے "اولڈ کریل" پہنچ جائیں
گے۔" راکیل نے بتایا۔

میں چونک اٹھا "شام سے پہلے کیا مطلب؟ ابھی تو صبح
ی نہیں ہوئی۔ کیا اولڈ کریل تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی لمبا
وڑا فاصلہ طے کرنا ہوگا؟"

"فاصلہ بہت زیادہ نہیں اور اسے کم بھی نہیں
کہا جا سکتا۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولی "اگر راستہ میدانی ہوتا
ور موسم بھی خوشگوار ہوتا تو یہ فاصلہ چار پانچ گھنٹے کی مار تھا لیکن میں
نے احتیاطاً موسم کی بے ہودگی کو دیکھتے ہوئے تمہیں زیادہ
قت بتایا ہے۔ ممکن ہے اس سے پہلے ہی ہم اولڈ کریل میں
وں۔"

"تم نے جنوری کی مناسبت سے دینالی پارک کے جو
حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے ہم دونوں
ہی اس پارک میں محو سفر نظر آئیں گے۔" میں نے ایک ممکنہ
خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کیا اس صورت میں ہم
دشمنوں کی توجہ کا مرکز نہیں بن جائیں گے؟"

"اس بات کے تھوڑے بہت امکانات تو ہیں۔" وہ
اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "اسی اندیشے کے
پیش نظر میں نے یہ حلیے بنائے ہیں۔ ہمیں دور سے دیکھنے والا
کوئی بھی شخص یہی سوچے گا ہم مہم جوئی کے شائق دو ایسے
افراد ہیں جنہیں زندگی سے زیادہ اپنے شوق سے پیار ہے۔
ایسے سر پھروں کی دنیا میں کوئی کمی نہیں وجدان!"

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اپنی بات پوری کرتے
ہوئے بولی "ہمیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑے گا
وجدان۔ راستے میں اگر کوئی افتاد آن پڑی تو آن دی اسپاٹ
اس سے بھی نمٹ ہی لیں گے۔"

میں شک زدہ نظر سے اسے گھورنے لگا۔ وہ بے چین
ہوگئی اور جلدی سے بولی۔

"تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

واضح رہے کہ اس منصوبہ بندانہ باہمی گفتگو کے دوران
میں ہم نے چشمے اتار رکھے تھے اور ایک دوسرے کی آنکھوں
میں دیکھتے ہوئے بات کر رہے تھے۔ میں نے بدستور راکیل
کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔

"تم جس ترتیب اور تفصیل کے ساتھ اپنے عزائم کا
اظہار فرما رہی ہو اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے پہلے ہی
میرے ساتھ جانے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ یہ تیاری
اور تام جھام تمہارے ارادے کی چغلی کھاتے ہیں۔ کیا میں غلط
کہہ رہا ہوں؟"

اس نے اقرار کیا اور نہ ہی انکار گہری سنجیدگی سے
بولی "وجدان! میری نیت پر شک نہ کرو۔ یہ سب کچھ ایک
سنگین اتفاق کے تحت ہو رہا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا
ہے تمہاری بہتری اور فائدے کے لیے کیا ہے۔ پلیز اس
سلسلے میں سوال کر کے میرے ذہن کو ڈسٹرب نہ کرو۔ میں
انتہائی سکون کے ساتھ بہت کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں ان لمحات میں کون سا ریاضی کا مسئلہ درپیش
ہے؟" میں نے قدرے تیز آواز میں پوچھا۔

وہ منت ریز لہجے میں بولی "میں نے کہا نا وجدان! مجھے
توجہ سے آگے کے بارے میں سوچنے دو۔ میں تمہیں صحیح
سلامت اپنے بڑوں کے سپرد کرنا چاہتی ہوں۔ ہم اس پارک

سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں' پھر میں کسی طرح اپنے سینئرز سے رابطہ کروں گی۔ وجدان! تم فکر نہ کرو' میں تمہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔"

"فکر کیسے نہ کروں راکیل!" بالآخر دل کی بات میری زبان پر آ ہی گئی۔ میں بڑی دیر سے ضبط کیے بیٹھا تھا "میں یہاں سے اکیلا روانہ ہو رہا ہوں۔ میری ساتھی ساحل کا کچھ پتا نہیں' وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔"

وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی "ساحل کا بھی سراغ مل جائے گا۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری ساتھی کو تم تک پہنچانے میں' میں تم سے بھرپور تعاون کروں گی۔ مجھے پوری امید ہے' میرے بڑے ساحل کی موجودہ پوزیشن سے ضرور آگاہ ہوں گے۔ مجھے ذرا ان تک رسائی حاصل کر لینے دو۔ پھر ریمنڈ اور ساحل کی مسٹری پر سے پردہ اٹھ جائے گا۔"

راکیل کا ایک ایک لفظ خلوص اور اپنائیت سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے دوستی سے لب ریز لہجے نے مجھے کوئی اور سوال نہ کرنے دیا اور میں خاموش نظر سے اسے تکنے لگا۔ یہ ایک طرح سے اس کا ساتھ دینے کے لیے میری رضامندی تھی۔

اس نے کہا "اولڈ کریل' مین روڈ یعنی ہائی وے تھری پر واقع ہے۔ اگر ہم اینکریج سے فیئر بینکس کی طرف جائیں تو یہ مقام کری کے بعد پڑتا ہے' کری' وہ جگہ ہے جہاں سے ربی موشے ہائمن کے بندے پیٹرس ویل جانے کے لیے مڑتے ہیں۔ اگر ہم صحیح سلامت اولڈ کریل پہنچ جاتے ہیں تو پھر سمجھو ایک طرح سے ہم آزاد ہوں گے۔ ہم ہائی وے پر سفر کریں یا ٹرین پکڑیں' ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہوگا۔"

راکیل بڑی عرق ریزی سے مجھے لائحہ عمل کی تفصیل بتا رہی تھی اور میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اپنی ساحل کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ساحل جس کے تصور میں' میں پُرشور سمندر کے طوفانی تھپیڑے کھا رہا تھا مگر ہزار کوشش کے باوجود بھی اس تک رسائی ممکن نہیں ہو رہی تھی۔

پتا نہیں میرے مقدر میں کوئی خرابی تھی یا قدرت کی طرف سے ایک سنگین آزمائش میں ڈال دیا گیا تھا۔ ساحل میرے اندر اس طور سمائی بیٹھی تھی کہ اس کی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کی نازک رگیں ٹوٹنے لگتی تھیں!

☆☆☆

جنوری کا مہینا الاسکا کے لیے بڑا قیامت خیز ثابت ہوتا ہے۔

عام سی بات ہے! جب ہم قیامت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے تصور میں ایک آگ سی جلنے لگتی ہے' ہمارا احساس تپش کی لپیٹ میں آ جاتا ہے اور تا حد نگاہ تباہی و بربادی کے مناظر ابھرنے لگتے ہیں مگر یہ جنوری کا قیامت خیز مہینا الاسکا کی ٹھنڈک میں اضافہ کرنے کے سوا کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیتا۔ یہاں کی زندگی ویران اور اجاڑ ہو کر رہ جاتی ہے۔ سورج دیکھنے کو آنکھیں ترس جاتی ہیں اور رات دن کا شمار گھڑیوں کا مرہونِ منت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہم محض گھڑی میں وقت دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس لمحے دن ہے یا رات' صبح ہے یا شام؟ کیسی محتاجی اور بے بسی کی زندگی ہے۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ دیگر ضروری اشیا کے ساتھ ہی یہ گھڑی بھی راکیل نے مجھے دی تھی۔ ہم خدا خدا کر کے دنیالی نیشنل پارک سے نکل آئے تھے۔ اس وقت ہم اولڈ کریل میں ہائی وے تھری کے کنارے کھڑے تھے۔ ماؤنٹ مکنلے سے اولڈ کریل تک جنوب مشرق میں ہم نے دنیالی نیشنل پارک کا جو حصہ پاٹا تھا اس کی کٹھنائیوں کی تفصیل میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کٹھنائی تو آخر کٹھنائی ہی ہوتی ہے۔ چھوٹی یا بڑی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تھا کہ کسی ناخوشگوار واقعے کے ظہور کے بغیر..... ہم بہ خیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے......یعنی میرے تئیں ایک نامعلوم منزل کے پہلے زینے پر!

ہم ہائی وے کے کنارے جس مقام پر کھڑے تھے وہاں قریب ہی ایک گیس اسٹیشن نظر آ رہا تھا۔ امریکا والے پیٹرول پمپ کو گیس اسٹیشن کہتے ہیں۔ بہرحال مذکورہ گیس اسٹیشن کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور بھی موجود تھا۔ راکیل میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"وجدان! تم دو منٹ یہاں رکو۔ میں ذرا اسٹور میں جا رہی ہوں۔"

"کیا کوئی کھانے پینے کا سامان خریدنے جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

ہمارے بیگز میں اشیائے خورد و نوش کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ سب سے زیادہ مقدار ڈرائی فروٹس کی تھی جو اس موسم میں زندگی کی حرارت قائم رکھنے کے لیے از حد ضروری تھے۔

راکیل نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں اسٹور میں سے اپنے بڑوں کو ایک فون کر کے موجودہ صورتِ حالات سے..... آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا اتنی اہم باتیں اسٹور کے فون پر کرنا ٹھیک ہے؟"

"اس برفیلے موسم میں یہ اسٹور ویران ہوگا۔" راکیل نے کہا "مجھے نہیں امید کہ ایک سیلز مین کے علاوہ بھی اندر کوئی

جود ہو۔ پھر میں نہایت ہی مختصر اور کام ہی کی بات کروں
ں۔ ان لوگوں سے جلد از جلد رابطہ کرنا بہت ضروری ہے۔"

میں نے ایک فوری اور اچھوتے خیال کے تحت
ہا "راکیل! پہلے میں ایک فون کر کے آتا ہوں۔ اس کے
ر تم جانا۔" اس وقت میرا ذہن نہایت ہی برق رفتاری سے
م کر رہا تھا۔

"تم کسے فون کرنا چاہتے ہو؟" وہ حیرت آمیز نظر سے
ے دیکھنے لگی۔

"ربی کو!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ربی موشے ہائمن؟" اس کی آنکھیں تعجب سے پھیل
ئیں۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی "یہ بہت ہی خطرناک ہوگا
ِدان! ابھی تو ہم کسی محفوظ پناہ گاہ تک بھی نہیں پہنچے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ میں ربی سے "ہیلو ہائے" کر کے
پس آ جاؤں گا۔" میرے ذہن میں ایک منفرد منصوبہ از خود
تیب پاتا چلا جا رہا تھا۔

"تم مذاق تو نہیں کر رہے؟" وہ بے حد الجھی ہوئی تھی۔

"میں اس وقت انتہائی سنجیدہ ہوں۔"

اس نے پوچھا "تمہارے پاس ربی کا فون نمبر ہے؟"

"اس کا نمبر تم مجھے دو گی۔" میں نے قطعیت سے
ہا "ربی میرے سامنے اقرار کر چکا ہے کہ اس کے خفیہ
کانے میں ٹیلی فون کا نظام موجود ہے جہاں سے دنیا کے کسی
ی ملک...... اور ملک کے کسی بھی علاقے سے فون کیا جا سکتا
ہے اور تم......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر تھوڑا توقف کیا پھر
ہا۔

"راکیل! تم ایک عرصے سے ربی کے سایے میں کام
ر رہی ہو۔ وہاں کے فون نمبرز تو تمہیں ازبر ہوں گے۔ کیا
ِ غلط کہہ رہا ہوں؟" بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی نیلی
نکھوں میں جھانکا۔

"تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے
ے بولی "مجھے وہاں کا فون نمبر یاد ہے لیکن یہ ضروری نہیں
ہ اس نمبر پر براہِ راست تمہاری ربی سے بات بھی
جائے۔"

"تم اس الجھن میں نہ پڑو کہ میں ربی کو کیسے آن لائن
رتا ہوں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "یہ میرا دردِ سر ہے۔ تم
ے وہاں کا نمبر بتاؤ؟"

"سکس' ایٹ' تھری۔ ٹو' تھری' فور' فائیو!" اس نے نمبر دہرایا پھر عجیب سے لہجے میں بولی "پتا نہیں تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو!"

میں نے مذکورہ فون نمبر کو اپنے ذہن میں نقش کیا۔ اس نمبر میں "چھ سو تراسی" تو دینالی ایکسچینج کا نمبر تھا یعنی وہاں کا ایریا کوڈ۔ باقی "دو ہزار تین سو پینتالیس" ربی کے ٹھکانے کا نمبر تھا۔ یہ بڑے کام کے فگرز میرے ہاتھ آ گئے تھے!

میں نے راکیل سے کہا "میں جو بھی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں' وہ ابھی تمہارے سامنے آ جائے گا۔ تم تو جانتی ہو' میں ایک جادوگر ہوں۔ پھر خواہ مخواہ کے اندیشوں میں کیوں گھرتی ہو؟"

"جادوگر!" اس کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار اور آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

میں اسے وہیں چھوڑ کر اسٹور کی جانب بڑھ گیا۔

راکیل کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس بھرے پرے چھوٹے سے اسٹور میں سیلز مین کے سوا مجھے کوئی اور بندہ بشر دکھائی نہ دیا۔ کوئی گاہک اور نہ ہی کوئی اسٹاف ممبر۔ اس اسٹور کا اکلوتا سیلز مین کسی تازہ ترین پورنوگرافک میگزین کے مطالعے بلکہ مشاہدے میں غرق تھا۔ میری آمد پر اس نے نگاہ اٹھا کر بڑے سرسری انداز میں مجھے دیکھا اور میرا مدعا جاننے کے بعد دوبارہ اس ہوش ربا میگزین کی رنگین و سنگین فضاؤں میں سانس لینے لگا۔ باہر کی بہ نسبت اسٹور کے اندر کا ماحول درجۂ حرارت کے اعتبار سے خاصا فرحت بخش تھا۔ میں پہلی فرصت میں اپنے کام سے لگ گیا۔

ڈائلنگ کی تکمیل کے بعد تیسری گھنٹی پر دوسری جانب فون اٹینڈ کر لیا گیا۔ ازپیں میں مجھے ایک سنجیدہ نسوانی آواز سنائی دی "ہیلو!"

"میں راجر بات کر رہا ہوں۔" میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کہنا شروع کیا "ربی سے میری بات کروا دو۔"

"ربی؟" اس عورت نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا "یہاں کوئی ربی نہیں ہوتا۔"

"میں ربی موشے ہائمن کی بات کر رہا ہوں۔"

"مسٹر راجر! یہ ایک اسنیکس بار ہے۔" اس نے کہا "سوری' رانگ نمبر۔"

اس بات کا مجھے پہلے سے خدشہ تھا کہ وہ فون نمبر ربی موشے ہائمن کے نام سے یا اس کی تنظیم کے نام سے نہیں ہوگا۔ سلسلہ جو بھی ہو لیکن کسی اسنیکس بار کی توقع ہرگز ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ میں نے قدرے برہمی سے کہا۔

"یہ اسفنکس بار ہے یا تم اسفنک جار مر ہو۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر فوری طور پر تم نے ربی موشے ہائمن سے میرا رابطہ نہ کرایا تو ربی اور اس کے مشن میں بہت بڑا رخنہ پڑ جائے گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

"مسٹر راجر! اگر تمہیں کسی ربی سے ملنا ہے تو سیدھے سائنا گاگ چلے جاؤ۔" اس نے پہلے والی سنجیدگی کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

سائنا گاگ (SYNAGOGUE) یہودیوں کی عبادت گاہ کو کہتے ہیں۔ اس مخصوص طرز کی عمارت میں ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی پینترے بازیاں ترتیب دی جاتی ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کی بعض مسجدوں میں بھی مذہب کے ساتھ ساتھ سیاست کا عمل دخل دیکھنے میں آتا ہے۔ کاش ہم آپس میں نفرتوں اور لسانی و فرقہ واریت سیاست کو فراموش کر کے ایک ہو جائیں۔ ایک ہو جائیں اور نیک ہو جائیں...... پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس دنیا کے آخری حکمراں ہم مسلمان ہی ہوں مگر اے کاش......!

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا' دوسری طرف پس منظر میں مجھے ایک بھاری بھر کم مردانہ آواز سنائی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس آواز کو میں نے پہلے بھی کہیں سنا ہے اور اس ساعت کو زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ وہ ممکنہ شناسا شخص ٹیلی فون والی سے پوچھ رہا تھا "سوزن! کس سے الجھ رہی ہو؟"

"کوئی مسٹر راجر ہے۔ میں کہہ چکی ہوں' رانگ نمبر لیکن وہ بہ ضد ہے کہ......"

"لاؤ' ریسیور مجھے دو۔" سوزن کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی اس شخص نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے ائرپیس میں مجھے اس کی مخصوص آواز سنائی دی۔

"ہیلو مسٹر راجر؟"

وہ پورے طمطراق سے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ربی موشے ہائمن کا دستِ راست برنارڈ لیو تھا۔ میں نے اپنی پالیسی کے مطابق کہا۔

"تم کون ہو؟ مجھے فوری طور پر ربی سے بات کرنا ہے۔ پلیز' دیر نہ کرو ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

نے برنارڈ کو پہچاننے سے انکار کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ ربی کا چلایا ہوا جادو ابھی تک پوری طرح مجھ پر اثر انداز ہے۔ دوسری جانب سناٹا چھا گیا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا' برنارڈ لیو بھی میری آواز کو پہچان گیا ہوگا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے گمبھیر آواز میں کہا "پلیز ہولڈ آن مسٹر......راجر!"

تیس سیکنڈ بعد ربی موشے ہائمن کی آواز میری ساعت سے ٹکرائی "میرے بچے! تم کہاں ہو؟" اس کی آواز میں تشویش سے زیادہ تجسس بھرا ہوا تھا۔

میں نے سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت کہا "میرے محتر ربی مربی! میں نہیں جانتا کہ اس وقت کہاں ہوں۔ بس احساس ہے آپ سے مجھے دور کر دیا گیا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو میرے بچے۔" وہ تسلی دیتے ہو بولا "میں تمہیں دوبارہ بہت جلد خود سے قریب کر لوں گا۔ مجھ بتاؤ تمہیں مجھ سے جدا کرنے والے کون لوگ ہیں؟"

"جناب! میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔" میں ربی کو فریب مسلسل میں مبتلا رکھتے ہوئے کہا "یا پھر یہ جا ہوں کہ میرا نام راجر ہے اور میں صرف آپ سے متعل ہوں۔"

"اوہ میرے بچے!"

ربی موشے ہائمن نے یہ مختصر سا جملہ ایسے جذباتی اند میں ادا کیا جیسے وہ میری جدائی میں اپنی آنکھوں کے سو خشک کر چکا ہو۔ اس کے اظہار میں ممتا کی جھلک تھی لیکن م چونکہ اس کی بدنیتی اور مکار ذہنیت سے پوری طرح آ ہو چکا تھا اس لیے اس کے جذباتی ڈائیلاگ کے پیچھے م دبے ہوئے جوش کو میں نے فوراً بھانپ لیا۔ وہ اس امر پر د مسرت سے نہال تھا کہ اس نے مجھ پر ہپناٹزم کا جو عمل کیا تھا صد فی صد کامیاب رہا تھا۔ یہ جی اور یوگا کی نوازش تھی کہ م مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کر کے ایک سپر سانک گیم کھیل ا تھا۔ ربی موشے ہائمن جیسے جید عالم کو چکر دینا کوئی آسا بات نہیں تھی۔

میں نے اپنی آواز میں اس گم شدہ بچے کی غمگینی ا یاسیت بھری جو بھرے پُرے میلے میں اپنی ماں کی انگلی چھو جانے سے بچھڑ جاتا ہے "میرے ربی! میں بہت پریشا ہوں۔ مجھے اپنے پاس بلالیں۔"

"میں ابھی بلاتا ہوں۔" وہ منافقت آمیز رقت کا م دکھاتے ہوئے بولا "جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا' تمہیں کیسے اور کن لوگوں نے مجھ سے جدا کیا ہے میں تمہیں ٹر نہیں کر سکوں گا۔ پریشانی سے نکلو اور ذرا غور کر کے بتاؤ' تمہارے ساتھ کیا واقعات پیش آئے ہیں؟"

میں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے بے سے کہا "میں ان لوگوں سے واقف نہیں ہوں۔ انہوں

مجھے بے ہوش کرنے کے بعد وہاں سے نکالا تھا۔"

"اس وقت تم کہاں سے فون کر رہے ہو؟"

"میں ان مقامات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے متاملانہ انداز میں کہا "میں ایک اسٹور سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ ادھر روڈ پر میں نے ہائی وے ٹو کا ایک بورڈ نصب دیکھا ہے اور اس کے نیچے بڑے جلی حروف میں "ویل کم ٹو فیئر بینکس" لکھا ہوا ہے۔" تھوڑا متوقف ہو کر میں نے اضافہ کرنا ضروری جانا "اس کے بعد "پانچ کے ایم" درج ہے۔"

جب چکر ہی دینا ٹھہرا تو پھر دروغ گوئی میں کوئی کمی کیوں چھوڑی جائے۔ میں نے یہ بات انکل بچو سے کہی تھی۔ جواب میں ربی کی تشویش بھری آواز میری سماعت تک پہنچی۔

"اوہ! میرے بچے! تم تو فیئر بینکس سے بہت آگے نکل گئے ہو۔ ہائی وے ٹو شرقی سمت سے فیئر بینکس کی طرف آتی ہے تم ہائی وے ٹو پر فیئر بینکس سے محض پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر کھڑے ہو اگر تم فیئر بینکس سے پیچھے ہوتے تو ہائی وے تھری پر کہیں کھڑے پائے جاتے۔ بہر حال" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر پچکارنے والے انداز میں بولا۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری موجودہ لوکیشن کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم اسی اسٹور میں انتظار کرو۔ میں اپنے چند بندوں کو تمہاری طرف بھیج رہا ہوں۔"

"بس' اب میری ساری پریشانیاں دور ہو گئیں۔" میں نے جی اٹھنے والے انداز میں کہا۔

وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا "چلو اچھا ہوا' تمہارا سراغ مل گیا۔ اب ساحل کا مسئلہ باقی ہے۔"

ساحل کے ذکر پر میرے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ربی کی بات سے واضح تھا' وہ ساحل تک رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا' ساحل اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ میں نے انجانے پن کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ساحل کون ہے میرے ربی؟"

یہ جملہ پورے تاثر کے ساتھ ادا کرنے کے لیے مجھے اپنے دلی جذبات کو اوکھلی میں ڈال کر موسلوں کے حوالے کرنا پڑا تھا۔ میرا سوال سن کر ربی گڑبڑا گیا۔ میں نے فوراً اندازہ لگایا' اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا' معاملے کو سنبھالتے ہوئے اپنی مخصوص گونج دار آواز میں بولا۔

"ساحل ایک لڑکی ہے۔ اسے بھی تمہارے ساتھ ہی یہاں سے اغوا کیا گیا ہے۔"

میں نے اس کے دکھتے ہوئے پہلو پر ایک خطرناک ضرب لگائی "محترم! کیا اس لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق ہے۔ اسے میرے ساتھ کیوں اغوا کیا گیا۔ میں تو کسی ساحل کو نہیں جانتا۔"

"تم واقعی اس لڑکی سے واقف نہیں ہو۔" وہ اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے لیپا پوتی کرتے ہوئے بولا "اور نہ ہی اس کا تم سے کوئی تعلق ہے۔ ابھی تم اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ جب میں تمہیں واپس بلالوں گا تو اس بارے میں ہم تفصیلی بات کریں گے۔ اوکے؟"

وہ اپنی لغزش پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے تشکر آمیز لہجے میں کہا "تھینک یو مائی ریسپکٹیڈ ربی!"

اس نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا "تمہیں اغوا کرنے والے اب کہاں ہیں۔ انہوں نے تمہیں آزاد کیوں چھوڑ رکھا ہے؟"

"میں کچھ نہیں جانتا میرے ربی!" میں نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا "جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو اس ہائی وے کے کنارے کھڑے پایا ہے اور پہلی ہی فرصت میں آپ کو فون کر رہا ہوں۔"

"بڑی عجیب سی صورت حال ہے۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا پھر تشویش ناک انداز میں پوچھا "تمہیں یہاں کا ٹیلیفون نمبر کس نے دیا؟"

میں نے حاضر دماغی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے کہا "آپ نے محترم ربی!"

"وج...... راجر! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

ربی کے لہجے میں موجود تعجب نے مجھے باور کرا دیا کہ وہ میری بات سن کر ایسے اچھلا ہوگا جیسے اس نے ہائی ٹینشن وائر کو ننگے ہاتھوں سے چھو لیا ہو۔ بوکھلاہٹ میں وہ مجھے "وجدان" کہہ کر پکارنے والا تھا لیکن "وج" کی ادائی کے بعد ہی سنبھل گیا۔

میں نے اس کی حالت اور کیفیت سے پوری طرح محظوظ ہوتے ہوئے گمبھیر مگر سعادت مندانہ لہجے میں کہا "میرے عظیم ربی مربی! جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے ذہن میں آپ کو بولتے ہوئے سنا۔ آپ اپنی مخصوص آواز میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں آپ کو فون کروں۔ میں آپ کی ہدایت سن کر الجھ گیا ہوں کیونکہ آپ کا ٹیلی فون نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔"

میں نے لمحاتی توقف کے بعد اداکاری...... صوتی

اری کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اسی ...... میرے محترم اسی لیے آپ نے اپنے رابطے کا فون نمبر یا۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے آپ میرے روبہ رو "

افسوس کہ اس وقت میں ربی موشے ہائمن سے بہت دور اس لیے اس کے چہرے پر بے یقینی کے ہیجان آمیز ات کو ابھرتے ہوئے دیکھنے سے محروم رہا۔ میں نے بات گے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"پھر میں فوراً اس اسٹور میں آیا اور اب آپ سے فون پر کر رہا ہوں۔ یہ...... یہ مجھے کیا...... ہو رہا ہے......" میں اچانک اپنی آواز اور الفاظ میں ہائی کو الٹی ڈارے کو شامل یا "یہ کون میرا گلا دبا...... " میرے حلق سے پھنسی پھنسی سی ز خارج ہوئی جو رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی "...... میرا...... گلا......!" پھر میں خاموش ہو گیا۔

میں نے دانستہ فون بند نہیں کیا تھا۔ دوسری طرف سے کی گھبراہٹ آواز ابھر رہی تھی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا...... اور پکار میں احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

"راجر! کیا تم میری آواز سن رہے ہو...... ؟ تم میری کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو راجر؟...... تم ٹھیک تو ہو ان؟ راجر...... وجدان...... تمہیں کیا ہو گیا ہے......؟"

میں نے دھیرے سے ریسیور کریڈل کر کے ٹیلی فونک لہ موقوف کر دیا۔

میں نے اگرچہ ربی سے کلام کرتے ہوئے اپنی آواز کو اد میعار کھا تھا پھر بھی ہمارے درمیان جس قسم کی گفتگو ہوئی اس سے سیلز مین کا چونک جانا لازمی تھا مگر وہ اللہ کا بندہ ہوس کا غلام اسی طرح نیوز میگزین پر سر جھکائے خاموش لاتعلق بیٹھا تھا۔ میں نے اسے اور اس کے شوق کو دل ہی میں "شاباشی" دی اور اسٹور سے باہر نکلنے کے لیے پلٹا تو ل پر نگاہ پڑ گئی۔ شاید وہ باہر کے شدید موسم سے اکتا کر ر آ گئی تھی۔ بہر حال اس کا یہ فیصلہ درست تھا۔

میری نظر سے اس کی نظر ملی تو وہ معنی خیز انداز میں رادی۔ اس کی آنکھوں میں جھلکنے والے رنگوں نے مجھے یا کہ سیلز مین نے نہ سہی لیکن راکیل نے بڑے کو خشوع وع سے میری باتیں سنی تھیں۔ جواباً میں بھی زیرِ لب رادیا۔

وہ فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دھیرے سے "تم صرف جادوگر ہی نہیں بلکہ بازی گر بھی ہو...... ایک ب ٹھاک چکر باز!"

میں نے اس کے اظہارِ خیال پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ وہ خاموشی سے فون کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ لگ بھگ مزید پانچ منٹ بعد ہم اپنی ضرورت پوری کر کے اس اسٹور سے باہر نکل رہے تھے۔

ربی اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو راکیل نے بھی سنی تھی۔ اسی طرح راکیل اور اس کے کسی سینئر کے مابین جو باتیں ہوئیں وہ میں نے سنی تھیں تاہم ہم دونوں یک طرفہ باتوں کے سامع تھے۔ یعنی میں نہیں جانتا تھا' راکیل کے سینئر نے اس سے کیا کہا اور راکیل کو معلوم نہیں تھا' دوسری طرف ربی مجھ سے کیا کہہ رہا تھا البتہ ہم نے اپنے طور پر کچھ اندازے قائم کر لیے تھے۔

میں نے آئندہ کا پروگرام جاننے کے لیے راکیل سے استفسار کیا "اب کیا کرنا ہے؟"

اس نے مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ اینکر تیج میں اس کی ایک سینئر سے بات ہو گئی ہے "اس کا نام وانگ شو ہے۔ وانگ شو نے کہا ہے کہ ہمیں فوری طور پر دینالی کے ایک ہوٹل "ہار پر لاج" پہنچنا ہے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ ہمارے لیے ایک گاڑی بھیج رہا ہے جو ہمیں بحفاظت دینالی کے مذکورہ ہوٹل پہنچا دے گی۔ اس ہوٹل کے ریسپشن پر لی یانگ نامی ایک لڑکی سے ہمیں ملنا ہوگا۔ باقی کا اسکیجوئل وہ لڑکی ہی ہمیں بتائے گی۔"

راکیل خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا "کیا تم نے اینکر تیج میں اپنے کسی بڑے سے بات کی ہے؟"

"بڑے کے اسسٹنٹ سے" اس نے بتایا "اینکر تیج میں ڈاکٹر مونگ ریوشے اس مشن کو کنٹرول کر رہا ہے۔ وانگ شو ڈاکٹر کا اسسٹنٹ ہے۔ اس نے بتایا ہے' فی الحال اینکر تیج میں ہمارا داخلہ بہت خطرناک ہوگا۔ یہودیوں کی جی ڈی پی نامی تنظیم پوری طرح سرگرم ہو چکی اور وہ بڑی شد و مد سے ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔"

"کیا وانگ شو نے ریمنڈ یا ساحل کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی "اس سے تمہارے سامنے ہی تو بات ہوئی ہے۔ ہوٹل پہنچ کر میں ڈاکٹر مونگ سے تفصیلی بات کروں گی۔ مجھے اپنی پوزیشن بھی کلیئر کرنا اور آئندہ کے لیے ہدایات بھی لینا ہیں۔ ربی اور اس کی تنظیم میں واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

حالات اس طور پیش آئے تھے کہ واقعی راکیل اب یہودیوں کی نظر میں معتوب ٹھہر چکی تھی۔ ہم اندھے غار میں

جن چار فوجیوں کو لساپلتا آئے تھے انہیں کبھی نہ کبھی بیدار بھی ہونا تھا' پھر ہمارا کارنامہ زیادہ دیر تک چھپا نہ رہتا۔ میں جانتا تھا' ربی موشے ہائمن بہت جلد اس حقیقت تک پہنچ جائے گا کہ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا بلکہ میں راکیل کے ساتھ اپنی مرضی سے فرار ہوں۔ راکیل کی حیثیت غدار کی اور میں مفرور تھا مگر میں نے وقتی طور پر ربی کو جس طرح الو بنایا تھا وہ خاصا محظوظ کن تھا۔

راکیل نے پتا نہیں میری سوچ پڑھ لی تھی' جلدی سے بولی" تم نے ربی موشے ہائمن کو بری طرح بے وقوف بنایا ہے۔"

میں نے کہا" جو لوگ حد سے زیادہ شاطر اور چال باز ہوتے ہیں انہیں چکر دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ بس اس سلسلے میں تھوڑی ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی" یہ تم ہائی وے ٹو پر کھڑے کیا کر رہے تھے؟"

" کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا" میں نے تو ایسے ہی ایک ہائی وے کا نام لے دیا تھا۔ جب ہائی وے تھری ہو سکتی ہے تو ہائی وے ٹو بھی کہیں نہ کہیں ہونا چاہیے البتہ" ویلکم ٹو فیئر بینکس" اور" فائیو کلومیٹر" کے سلسلے میں' میں نے سراسر تکا لگایا تھا۔"

" پتا نہیں' یہ تمہارا تکا کس قسم اور کس مزاج کا ہے!" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

" کیوں' کیا ہو گیا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ بولی" یہ اپنی سمت اور رخ کو ایک لمحے کے لیے نہیں بھولتا۔ سیدھا نشانے پر جا کر لگتا ہے۔" بات ختم کر کے وہ مجھے ٹٹولنے والی نظر سے تکنے لگی۔

" تم کہنا کیا چاہتی ہو!" میں الجھ گیا" کیا میں نے اس تکے کے پردے میں کوئی حقیقت کھول دی ہے؟ تمہارے انداز سے تو محسوس ہو رہا ہے' ویلکم ہائی وے اور فائیو کلومیٹر میں بڑا دم ہے!"

وہ گمبھیر لہجے میں بولی" کوئی ایسا ویسا دم!" پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے بتایا" ہائی وے تھری کی طرح الاسکا میں ہائی وے ٹو بھی موجود ہے اور واقعی یہ روڈ فیئر بینکس سے نکلتی ہے۔ ہائی وے ٹو جنوب مشرق میں ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد سیدھی کینیڈا کی سرحد سے جا ملتی ہے۔ راستے میں ڈیلٹا جنکشن پر اسی ہائی وے سے ہائی وے فور نکلتی ہے جو انتہائی جنوب میں' کانا کی طرف جاتی ہے۔ کینیڈا سے تھوڑا پہلے ہائی وے ٹو میں سے ٹوک کے مقام پر ہائی وے ون نکلتی ہے جو جنوب مغرب میں چلتے چلتے بالآخر گلکانا سے جا ملتی ہے۔ ہائی وے ون" ٹوک" اور" گلکانا" ملا کر وہی کام سرانجام دیتی ہے جو ہائی وے فور" ڈیلٹا جنکشن اور گلکانہ کو آپس میں ملانے پر انجام دیتی ہے اور سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر تھوڑا متوقف ہوئی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی" ہائی وے ٹو پر فیئر بینکس سے پانچ کلومیٹر پہلے واقعی" ویل کم فیئر بینکس" کا بورڈ نصب ہے۔"

" اوہ! میں نے اس کے انکشاف پر چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے چہرے کے تاثرات کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا" محض ایک اتفاق ہے۔"

" محض نہیں بلکہ...... خاصا جان دار اتفاق ہے۔" میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے موضوع کو ٹوئسٹ کرتے ہوئے کہا" کیا تم نے جیوگرافی اور جیالوجی میں کچھ کر رکھا ہے۔ لگتا ہے تم نے الاسکا کا چپا چپا دیکھ رکھا ہے؟"

" مجھ سے زیادہ تم نے!" وہ ذو معنی لہجے میں بولی اور دستور کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ میں بے یقینی پائی جاتی تھی" مجھے نہیں لگتا تم پہلی مرتبہ الاسکا آئے ہو!"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' وانگ شو کی بھیجی ہوئی گاڑی آ گئی۔ وہ تھرفٹی کار رینٹل کمپنی کی ایک چاق و چوبند گاڑی تھی جس کی سائیڈ میں تھرفٹی (THRIFTY) کمپنی کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا تھا۔ مذکورہ گاڑی لش پش تھی تاہم الاسکا کے موسم اور فضا میں موجود دھند و کہر نے اس کی چم چماہٹ ملگجا دیا تھا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بھاری تن و توش کا مالک شخص براجمان تھا۔

ڈرائیور نے گاڑی کے اندر ہی رہتے ہوئے راکیل کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ راکیل نے اثبات میں سر ہلایا اور سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے کہا" وجدان میں اسے جانتی ہوں یہ ہمارا ہی بندہ ہے لیکن بظاہر کار رینٹل کمپنی میں ملازم ہے اس کا نام گاچی ہے۔ چلو گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔"

میں نے راکیل کی تقلید کی اور اگلے ہی لمحے ہم دونوں گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچ چکے تھے۔ گاچی نے مطمئن انداز میں گاڑی آگے بڑھا دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ یہ ہوا سے باتیں کرنا دھیمی سرگوشیوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ غیر برفانی علاقوں کی نسبت سے یہ رفتار کچھ بھی نہیں تھی البتہ الاسکا میں خصوصاً جنوری میں اتنی رفتار کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔ ہمارا رخ" اولڈ کر

سے ''دینالی'' کی جانب تھا' گویا ہم انتہائی شمال کی سمت بڑھ رہے تھے۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد راکیل نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ میں نے بھی نشست کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ گاڑی کے اندر مخصوص حرارت کے سبب بڑا خوشگوار موسم تھا۔ پتا نہیں' اس وقت راکیل کے ذہن میں کیا چل رہا تھا' میں ربی اور ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔

ربی موشے ہائمن میرے بچھائے ہوئے ٹریپ میں الجھ کررہ گیا تھا۔ اس نے گفتگو کے آخری مرحلے میں، ہیجان خیز بوکھلاہٹ کے زیرِ اثر مجھے راجر کے بجائے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا' گویا احتیاط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ ربی کی اس مضطرب سوچ کا تصور کرکے مجھے بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ وہ یہودیوں کا ایک جید عالم تھا۔ ہر مذہب کے عالم واجب الاحترام ہوتے ہیں لیکن ربی موشے ہائمن کی اصلیت مجھ پر کھل چکی تھی۔ میں نے اپنی مضبوط قوتِ ارادی سے کام لے کر اس کی خطرناک سازش کو بے نقاب کردیا تھا اس لیے...... میرے دل میں اس کے لیے احترام کا جذبہ پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔

ربی کے مطابق ساحل بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور ابھی تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں مائیکل اور نیلسن کی لاشوں کو تاریک غار میں چھوڑ آیا تھا۔ ریمنڈ اور ساحل کی پُراسرار گمشدگی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ غار کے حالات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا' مائیکل اور نیلسن کو ریمنڈ ہی نے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کس مقصد کی خاطر؟

اس سوال کا سیدھا سیدھا جواب ذہن میں یہ آتا تھا...... ساحل کے حصول کی خاطر! مگر اس جواب کے بعد الجھنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلتا تھا۔ ریمنڈ نے اپنے دو ساتھیوں کو ہلاک کیوں کیا؟ وہ ساحل کو کیوں حاصل کرنا چاہتا تھا؟ میں ابھی تک ریمنڈ کو راکیل کے کیمپ کی کالی بھیڑ ہی سمجھ رہا تھا اور توقع یہی تھی وہ ساحل کو ربی موشے ہائمن کی خدمت میں پیش کرے گا لیکن ربی کی جھنجلاہٹ نے یہ راز کھول دیا تھا کہ ساحل اس کے پاس نہیں پہنچائی گئی تھی...... پھر ریمنڈ ساحل کو لے کر کہاں چلا گیا؟ ایک توجہ طلب سوال یہ بھی تھا کہ ریمنڈ اس اندھے ہاردی غار سے نکلا کیسے تھا؟

فی الحال میرا ذہن ایسے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ میری سوچ ایک مخصوص دائرے میں گردش کررہی تھی۔ وہ ان سوالات سے نمٹتے ہوئے لاجواب ہوجاتی اور ایک مرتبہ پھر زیرو پوائنٹ سے اپنا کام آغاز کردیتی۔ پتا نہیں یہ کیسا دائرہ تھا جس کے اندر میں مقید ہوکر رہ گیا تھا۔

مجھے صرف یہ نظر آرہا تھا' مذکورہ دائرہ ساحل کے گرد گھومتا تھا' گویا وہ ان لاجواب سوالات کے حلقے میں بند تھی۔ ایک نادیدہ حصار کے نرغے میں تھی۔ کاش...... وہ میری بانہوں کے حصار میں بند ہوجاتی!

☆☆☆

''ہارپرلاج'' ہوٹل کی عظیم الشان عمارت دینالی نیشنل پارک کے داخلی گیٹ کے نزدیک دریائے نینانا کے قریب واقع ہے۔ دریائے نینانا (NENANA RIVER) ہائی وے تھری کے متوازی بہتا ہے۔ ہوٹل کے زیادہ تر کمروں سے اس برفانی دریا کا دل کش نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں ہارلاج کا کمرا نمبر تین سو تین ملا تھا جہاں سے دریائے نینانا تا حدِ نگاہ دکھائی دیتا تھا۔

ہارپرلاج کے بارے میں مجھے پتا چلا کہ اس کا افتتاح ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے۔ اس ہوٹل میں عموماً صاحبِ حیثیت لوگ ہی ٹھہرتے تھے۔ یہ دینالی کا سب سے مہنگا ہوٹل تھا۔ ڈبل روم کا ایک دن کا کرایہ ایک سو بیس یو۔ ایس (امریکی ڈالرز) اور ڈی لکس سوئٹ کا ایک دن کا کرایہ دو سو بیس یو۔ ایس تھا۔ یہ ریش سیزن (مئی تا ستمبر) کے تھے البتہ آؤٹ سیزن میں بہ نسبت کم کرائے پر اور بہ آسانی بھی کمرا حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ہارپرلاج میں عمدہ ریسٹورنٹس' ریکریشن ہال' جمنازیم اور سوئمنگ پولز کی سہولت بھی موجود ہے۔ پارکنگ کا دہرا بندوبست ہے۔ گراؤنڈ فلور پر ہوٹل سے متعلق ہر خاص و عام اپنی گاڑی پارک کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وسیع پارکنگ ایریا ہوٹل کے بیس منٹ میں بھی موجود ہے جو صرف ''ممبرز'' کے لیے مخصوص ہے۔ اس ایریا میں ''شیئر دی پارٹنرز'' اور ''چینج دی پارٹنرز'' جیسے ڈرامے ہوتے ہیں۔ اس کھیل کو آن دی ریکارڈ ''شیئر دی میجک'' ایک ''ڈرائیو ان کی کلب'' کی حیثیت کا حامل ہے!

ریسپشن پر پی یانگ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پیشہ ورانہ دل کش مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا۔ راکیل نے وانگ شو کا حوالہ دیا تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ ہم کون ہیں اور کس مقصد سے وہاں پہنچے ہیں۔ اتفاق سے پی یانگ اس وقت ریسپشن پر اکیلی ہی تھی۔ اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ مسٹر ڈسلوا ہیں۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔ پھر وہ راکیل کی جانب تکنے لگی ''آپ گارشیا ہو۔ آپ دونوں

دوست ہیں اور اس قیامت خیز موسم میں آپ کے ذہن میں مہم جوئی کا سودا سمایا ہے۔ آپ ایک دن کے لیے اس ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ کل کسی وقت آپ کو چیک آؤٹ کرنا ہوگا۔''

اتنا کہہ کر وہ مڑی اور اپنے عقب میں دیوار پر نصب کی بورڈ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی پھر ایک کمرے کی چابی ریسپشن پر میرے جانب بڑھاتے ہوئے بولی ''آپ کو اس ہوٹل کا کمرا نمبر تین سو تین دیا جارہا ہے۔ یہ ریزرویشن آپ لوگوں نے فون پر کرائی ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہی ہوں!''

پی یانگ بڑی صاف انگریزی بول رہی تھی تاہم اس کا ایکسنٹ غیر امریکی تھا۔ راکیل نے قرب و جوار میں نگاہ دوڑائی اور مطمئن ہونے کے بعد سرگوشیانہ لہجے میں پوچھا۔

''مسٹر وانگ شو نے بتایا تھا کہ تم ہمیں آئندہ کے لائحۂ عمل کے بارے میں......''

وہ راکیل کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی ''مجھے سب یاد ہے۔ آؤٹ سیزن ہونے کے باعث میں ریسپشن پر اکیلی ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد میرا آف ہوجائے گا۔ پھر میں آپ لوگوں کے کمرے میں آکر تفصیلی بات کروں گی۔ ازاٹ اوکے!''

''اٹس اوکے۔'' میں نے کہا ''جب تک ہم فریش بھی ہوجائیں گے۔''

ہم اپنے سامان کے نام پر ایک ایک بیگ کے ساتھ ہوٹل کے روم نمبر تین سو تین میں پہنچ گئے۔ بدن تھکن سے چور تھا۔ ہم ایک طویل تھکا دینے والی مہم سے گزر کر یہاں تک پہنچے تھے اور حالات ہمیں آگے کہاں تک لے جانا چاہتے تھے' اس کے بارے میں' میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

روم نمبر تھری ناٹ تھری ایک ڈبل روم تھا اور ہماری ضرورت کے عین مطابق بھی۔ ایک بڑی سی سلائیڈنگ ونڈو دریائے نینانا کے رخ پر کھلتی تھی تاہم ان دنوں حد سے زیادہ گرے ہوئے درجۂ حرارت کے باعث دریا میں کوئی جولانی' روانی اور بہاؤ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کمرا مکمل طور پر ائرکنڈیشن تھا جہاں رہنے کے لیے کسی اضافی گرم کپڑے کی ضرورت نہیں تھی۔

میرے مشورے پر پہلے راکیل نے باتھ لیا پھر میری باری آئی۔ وہ واش روم میں سے جتنی نکھری نکھری برآمد ہوئی تھی اس سے لگتا تھا' یہ تھکن کش باتھ مجھے بھی روئی کے مانند ہلکا پھلکا کردے گا۔ میں شاور کے نیچے کھڑے ہوکر وانگ شو اور ڈاکٹر مونگ ریفو شے کے بارے میں سوچنے لگا۔

وانگ شو خاصا سمجھ دار تھا۔ اس نے میرے فرضی نام ڈسلوا سے یہاں بکنگ کرائی تھی۔ یہ نام مشرق اور مغرب میں یکساں چلتا ہے۔ راکیل کا گارشیا ہوجانا ایک عام سی بات تھی۔ سب سے اہم پوائنٹ یہ تھا کہ ڈاکٹر مونگ ریفو شے نے ہمارے بارے میں کیا سوچ رکھا تھا۔ اگرچہ ابھی تک میری اس ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی اور نہ ہی ملاقات تاہم اس کے نام کے حوالے سے میرے ذہن میں اس کی شخصیت کا جو تصور اور تاثر ابھر رہا تھا وہ بہت ہی تجربہ کار' بردبار اور ہمہ جہت شخص کا تھا۔ راکیل نے بتایا تھا' ڈاکٹر اینکریج میں رہتے ہوئے اس آپریشن کو کنٹرول کررہا تھا۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا وہ راکیل کے بڑوں کے لیے نہایت ہی اہم شخص تھا۔ ابھی تک یہ بھی واضح نہیں ہوسکا تھا' راکیل کے بڑے درحقیقت کون لوگ تھے؟ میرے اندازے کے مطابق ان کا تعلق بدھ بھکشوؤں ہی سے ہوسکتا تھا۔ کس سطح پر؟ اس کا علم آگے چل کر ہی ہوسکتا تھا!

الاسکا کے نہایت ہی واہیات موسم میں شاور کا پانی کسی غیر مترقبہ نعمت سے کم نہیں تھا۔ میں گرم شاور کے نیچے کھڑا ہوا تو پھر وہاں سے ہٹنا ہی بھول گیا۔ اس فرحت بخش غسل نے وقت گزرنے کا احساس مٹا دیا تھا حتیٰ کہ جب میں فارغ ہونے کے بعد باتھ روم سے باہر آیا تو پی یانگ راکیل سے ملاقات کرکے جاچکی تھی۔

''کیا تم واش روم میں سوگئے تھے؟'' راکیل نے پوچھا۔

میں نے کہا ''اگر سوگیا ہوتا تو پھر صبح سے پہلے باہر نہ آتا۔''

راکیل نے مجھے بتایا کہ پی یانگ سے اس کی بات ہوگئی ہے ''اس کے مطابق ہمیں کل لنچ کے بعد یہاں سے روانہ ہونا ہے الاسکا کی معروف ریل روڈ ''اینکریج۔ فیئر بینکس ایکسپریس'' میں ڈسلوا اور گارشیا کے نام سے ہماری ریزرویشن ہوچکی ہے۔ یہ ٹرین دینالی میں رکنے کے بعد آگے بڑھتی ہے۔''

''بس یا اور کچھ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''فی الحال بس!''

''اتنی سی بات کے لیے پی یانگ کو استعمال کیا گیا ہے۔'' میں نے بیزار کن انداز میں کہا ''یہ اطلاع تو وانگ شو بھی تمہیں فراہم کرسکتا تھا۔''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولی ''وہ لوگ بے حد احتیاط سے کام لے رہے ہیں وجدان......''

''وجدان نہیں ڈسلوا!'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

''اوہ سوری!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولی پھر

بتایا' بی بذگ کہہ رہی تھی' یہ ٹرین بہ سہولت ہمیں دینالی سے اینکریج پہنچادے گی پھر رات دس بجے ''ٹی ڈبلیو اے'' کا ایک طیارہ ہمیں لے کر اینکریج سے سیٹل روانہ ہو جائے گا۔ ٹرانس ورلڈ ائر لائنز کے پاس طیارے میں ڈاکٹر موگ ریفو شے بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔''

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر الجھن زدہ انداز میں دریافت کیا'' ہم سیٹل کیوں جائیں گے...... اور کیا یہ سیٹل بھی الاسکا ہی کا کوئی علاقہ ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولی'' سیٹل دراصل امریکن اسٹیٹ واشنگٹن کا کیپٹل ہے۔''

''یعنی کیپٹل کا بھی کیپٹل؟'' میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

وہ ایک لمحہ مجھے سوچتی ہوئی نظر سے دیکھتی رہی پھر بولی'' شاید تم واشنگٹن کے ذکر سے ڈی سی کی طرف چلے گئے ہو!''

''تو!'' میری الجھن ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی'' ڈی سی (ڈسٹرکٹ آف کولمبیا) کو امریکی ریاستوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ درحقیقت ورجینیا اور میری لینڈ نامی دو ریاستوں سے حاصل کیے گئے تھوڑے تھوڑے علاقے کے مجموعے کا نام ہے۔ امریکی صدر جارج واشنگٹن کا پایۂ تخت یہاں قائم کیا گیا تھا اور اب یو ایس اے کے لیے ڈی سی کی حیثیت ایک دارالحکومت ایسی ہے۔'' وہ چند لمحات کے متوقف ہوئی پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔

''سیٹل کے حوالے سے میں نے جس امریکی ریاست واشنگٹن کا ذکر کیا ہے' وہ ''یو ایس کینیڈا'' کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ ریاست یو ایس اے کے انتہائی شمال مغرب میں واقع ہے اور...... اس کی باؤنڈری مونٹانا' اوریگان' آئیڈاہو نامی ریاستوں سے ملتی ہے۔''

میں نے اس کی تفصیل سے مستفید ہوتے ہوئے سوال کیا'' ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارا وہ ڈاکٹر موگ ریفو شے ہمارے ساتھ سیٹل کیوں جا رہا ہے؟''

''ڈاکٹر موگ رات دس بجے اسی کمرے میں فون پر ہم سے بات کرے گا۔'' اس نے بتایا'' باقی کی تفصیل وہی بتائے گا۔ میں اتنا جانتی ہوں سیٹل' میں ہمارے بہت سے اہم آدمی موجود ہیں۔''

''ساحل کے بارے میں کوئی خیر خبر؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''پی یانگ کو ساحل والے معاملے سے دور رکھا گیا ہے۔'' راکیل نے بتایا'' اس سلسلے میں ڈاکٹر موگ سے پوچھیں گے۔''

میں نے ایک طویل انگڑائی لی پھر اس میں ایک جماہی کا اضافہ کرتے ہوئے کہا'' گارشیا! مجھے تو زبردست بھوک محسوس ہو رہی ہے...... اور نیند بھی آ رہی ہے۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔'' میری دیکھا دیکھی اس نے بھی منہ کھول کر ایک طویل جماہی لے ڈالی ''چلو ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں۔ کھانا کھا کر واپس آئیں گے تو دس بجنے ہی والے ہوں گے۔ پھر ڈاکٹر موگ سے بات کرنے کے بعد لمبی تان کر سو جائیں گے۔''

بات ختم کرتے ہی وہ خواب ناک نظر سے ڈبل بیڈ کو دیکھنے لگی۔ وہ کنگ سائز بیڈ اتنا لمبا چوڑا تھا کہ بہ یک وقت چار افراد بہ سہولت اس پر ایک گہری اور پُرسکون نیند لے سکتے تھے۔ آج کی رات مجھے راکیل کے ساتھ اس بیڈ پر سونا تھا۔ یہ تصور میرے لیے بڑا کنفیوژنگ تھا!

ہم تھری ناٹ تھری کو لاک کر کے زینے کی جانب بڑھ گئے۔ راکیل نے پوچھا'' اوپر جانا ہے یا نیچے؟''

''اوپر نیچے کیا مطلب؟'' میں نے متذبذب نظر سے اسے دیکھا'' ہمیں ڈائننگ ہال میں جانا ہے۔''

وہ بولی'' اس ہوٹل میں دو ڈائننگ ہالز ہیں۔ ایک گراؤنڈ فلور اور دوسرا اسکستھ فلور پر۔'' بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا'' ہم تیسرے فلور پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ نیچے ہی چلتے ہیں۔ میرا خیال ہے گراؤنڈ فلور زیادہ مناسب رہے گا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میرے ساتھ چل پڑی۔

ہارپر لاج میں ملنے والا کھانا بلاشبہ بہت لذیذ تھا۔ وہاں بوفے اور مینیو دونوں قسم کے ڈنرز کا بندوبست تھا۔ میں نے مینیو والے پورشن کو ترجیح دی اور چند منتخب چیزیں منگوالیں جو انتہائی ''محفوظ'' تھیں۔

کھانے کے دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ ایک شخص تھوڑے تھوڑے وقفے سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ہم سے چار میزیں چھوڑ کر ایک لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہال میں چونکہ برائے نام رش تھا اس لیے بھی میں نے اس کے تاڑنے کو نوٹ کر لیا۔ اس کا انداز خاصا مشکوک تھا۔ میں نے بھی نظر بچا

چپکے چپکے ا... دیکھنا شروع کر دیا۔

... عمر چالیس سے متجاوز تھی۔ نیلی آنکھیں' ہلکی سنہری مونچھیں' ر اس کے بال بھی گولڈن ہی تھے۔ اس نے بڑی بڑی قلمیں چھوڑ رکھی تھیں اور دائیں گال پر گہرے بھورے رنگ کا ایک مسا تھا جو مسور کے دانے کے برابر ہوگا۔ وہ ایک مضبوط کاٹھ کا مالک تھا تاہم اس کے ساتھ موجود لڑکی کی صحت کو دیکھ کر کہا جا سکتا تھا' وہ کافی دنوں کے فاقے سے یا پھر کسی پیچیدہ و پوشیدہ نسوانی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ پندرہ سے زیادہ کی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ شخص وقفے وقفے سے خاص طور پر ہمیں ہی دیکھ رہا ہے تو میں نے راکیل کی توجہ اس جانب مبذول کرائی' "پتا نہیں یہ شخص ہمیں کیوں واچ کر رہا ہے!" میں نے کہا۔

مذکورہ شخص راکیل کی عقبی سمت میں تھا۔ اس نے گردن موڑ کے پیچھے دیکھا پھر میری طرف منہ پھیرتے ہوئے بولی "اوہ! یہ تو ڈوگ گیٹنگ ہے!"

"کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟" میں نے کھانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتانے لگی "ایک میں کیا اسے تو سارا الاسکا جانتا ہے۔ ڈوگ گیٹنگ (DOUG GEETING) یہاں کا معروف ماؤنٹینئر اور گلیشئر پائلٹ ہے۔"

"مگر یہ کوہ پیما ہمیں کیوں تاک رہا ہے؟"

"دیکھنے دو، ہمارا کیا جاتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی "یہ تو ہمارے لیے آنر کی بات ہے کہ ایک نیشنل ہیرو بڑی دلچسپی سے ہمیں دیکھ رہا ہے ورنہ لوگ تو اس کے آٹوگراف کے لیے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وقت گزارنا تو اور بھی اعزاز کی بات ہے۔"

"کیا یہ نیشنل ہیرو اسی قسم کی لڑکیوں کو اعزاز بخشتا ہے؟" میں نے راکیل کے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چونکی "کیا مطلب۔ میں سمجھ نہیں سکی تم کہنا کیا چاہ رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا یہ ہیرو کوہ پیما جس لڑکی کے ساتھ ڈنر فرما رہا ہے وہ مجھے تو برسوں کی بیمار نظر آتی ہے یا پھر لگتا ہے اس نے کافی عرصہ صومالیہ کے قحط زدہ علاقے میں گزارا ہو۔ دیکھو اس کی آنکھیں اور گال کس طرح اندر کو دھنسے ہوئے ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "مجھے تو یہ خاصی نوعمر بھی لگتی ہے۔ میرے خیال میں پندرہ سال سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔"

"میں تمہارے اس خیال سے اتفاق نہیں کر سکتی۔" وہ پُر وثوق لہجے میں بولی "میرا اندازہ ہے' یہ لڑکی انیس سے کم نہیں ہوگی البتہ اس کی صحت واقعی قابل غور اور تشویش ناک ہے!"

"پتا نہیں' تم کس بنا پر اتنا بڑا اندازہ قائم کر رہی ہو!" میں نے سوچنے والے انداز میں کہا۔

وہ بولی "امریکا کی ہر اسٹیٹ میں بلوغت کی عمر الگ الگ ہے جو سولہ پلس سے انیس تک جاتی ہے۔ گرم اسٹیٹ میں جلدی اور سرد میں دیر سے بلوغت کا سرٹیفکیٹ جاری کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اس لڑکی کو انیس سے کم کا نہیں ہونا چاہیے۔ سن بلوغت کو پہنچے بغیر قانوناً ڈیٹنگ کی اجازت نہیں۔"

وہ پتا نہیں، مجھے کیا سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا' اس کوہ پیما کی تاکا جھانکی اس دوران میں مسلسل جاری رہی تھی۔ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں راکیل سے کہا۔

"بہرحال' تمہارا یہ ماؤنٹینئر ذوق کے معاملے میں بہت ہی بدذوق واقع ہوا ہے۔"

راکیل نے میری رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ہم ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد واپس تھری ناٹ تھری یعنی کمرا نمبر تین سو تین میں آگئے۔

ہم نے دروازہ بند کیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون سیٹ بیڈ کے کنارے کے ایک چھوٹی سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں راکیل کو اشارہ کیا' وہ میرے اشارے کی تائید میں ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت الاسکا کے وقت کے مطابق رات کے ٹھیک دس بج رہے تھے۔ قوی امکان اس بات کا تھا کہ وہ کال ڈاکٹر موگنگ کی ہوگی۔

میں نے اندازہ لگایا راکیل نے پہلے ہوٹل کی ٹیلی فون آپریٹر سے بات کی تھی اس کے بعد ہی آپریٹر نے کال تھرو کر دی۔ راکیل نے اشارے سے مجھے بتایا کہ دوسری جانب ڈاکٹر موگنگ ہے پھر وہ فون سیٹ کے مختلف بٹنز کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے لگی۔

اس فون سیٹ میں مائیک اور اسپیکر کی سہولت موجود تھی۔ راکیل نے اس سہولت سے فائدہ اٹھایا اور ہم تینوں صوتی اعتبار سے ایک دوسرے کے روبرو ہو گئے۔ راکیل نے ڈاکٹر موگنگ کو اس بارے میں بتا دیا تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد

ڈاکٹر موگنگ راکیل سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے محسوس کیا' وہ راکیل سے کوئی خاص یا اہم باتیں نہیں کر رہا تھا۔ اس گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ راکیل میرے ساتھ بذریعہ ریل روڈ اینکریج پہنچے گی۔ پھر وہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے کر اینکریج سے سیٹل کی جانب پرواز کر جائے گا۔ راکیل کی آئندہ سرگرمیوں اور مصروفیات کے بارے میں ادھر سیٹل ہی میں فیصلہ کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

راکیل کے بعد ڈاکٹر موگنگ ریفوشے براہ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ میں نے صرف اس کا نام سن کر اپنے دل میں اس کے لیے جو احترام محسوس کیا تھا وہ تاثر غلط نہیں تھا۔ وہ اپنی آواز اور بات چیت سے بھی بہت منجھا ہوا ایک تجربہ کار اور دور اندیش شخص لگتا تھا...... ایک سرد وگرم چشیدہ انسان!

رسمی "ہیلو ہائے" کے بعد میں فوراً اپنے مقصد کی طرف آگیا "ڈاکٹر موگنگ! یہ تو مجھے معلوم ہو چکا مجھے دینالی سے اینکریج اور اینکریج سے سیٹل پہنچایا جانے والا ہے لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ لوگ مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہیں؟ اور سب سے اہم پوائنٹ یہ کہ آخر آپ لوگ ہیں کون؟"

"فی الحال تم اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو اور یقین کر لو کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔" وہ ٹھہرے ہوئے تاثر انگیز لہجے میں بولا "تمہاری خیر خواہی اور تم پر مہربانی کا سبب یہ ہے کہ ہمارا دشمن...... بلکہ ہمارے دشمن مشترک ہیں۔ چالاک اور عیار یہودیوں کا ایک شاطر ٹولا جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کو تہ وبالا کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ لوگ ان پانچ نایاب پتھروں تک پہنچنے کا خواب دیکھ رہے ہیں جنہیں حاصل کرنے کے بعد وہ پوری دنیا پر حکمرانی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ربی موشے ہائمن ان پتھروں کی افادیت اور روحانی قدر قیمت سے پوری طرح آگاہ ہے اور......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اور ہم سب نے مل کر یہودیوں کی اس ناپاک سازش کو کامیاب نہیں ہونے دینا۔ زمین کا راز اسی کے سینے میں دفن رہنا چاہیے۔"

"کیا تمہارا تعلق بدھ مت سے ہے؟" میں نے احترام بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا "میں بھی تمہاری طرح شاؤلن ٹیمپل کا فارغ التحصیل ہوں لیکن یہ پچیس چھبیس سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو عملی زندگی گزار رہا ہوں۔"

اس کی بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے ہیجان خیز لہجے میں پوچھا "تمہیں یہ کس نے بتایا کہ میں نے شاؤلن ٹیمپل ایسی عظیم الشان تربیت گاہ سے ٹریننگ حاصل کی ہے؟"

"میرے بڑوں نے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا "میں اس کے علاوہ بھی تمہارے بارے میں بہت سی باتیں جانتا ہوں۔"

"کیا بڑوں سے تمہاری مراد...... اس دور کا دلائی لاما ہے؟" میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

"دلائی لاما کے بارے میں زبان کھولنے کی مجھے اجازت ہے اور نہ ہی میں اپنے انداز اس گفتار کی سکت رکھتا ہوں۔" ڈاکٹر موگنگ ریفوشے احترام سے بھرپور لہجے میں بولا "میرے بڑے ادھر سیٹل میں ہیں۔ میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا۔ باقی کی باتیں تمہیں میرے بڑے بتائیں گے۔"

"تو پھر تمہارے سیٹل والے بڑے' دلائی لاما سے رابطے میں ہوں گے!"

بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں دھنو (ساحل) کے باپ نے مجھے دلائی لاما کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ تھوچی نے یہاں تک کہا تھا کہ دلائی لاما نے مجھ پر اتنا اعتماد ظاہر کیا تھا...... اور اب یہ لوگ میرے تعاون سے ایک صیہونی سازش کو ناکام بنانا چاہتے تھے اور وہ سازش بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ سے متعلق تھی لہٰذا لامحالہ بار بار میرا دھیان دلائی لاما کی طرف چلا جاتا تھا۔

ڈاکٹر موگنگ ریفوشے نے ایک مرتبہ پھر معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا اور بولا "اس بارے میں' میں کچھ نہیں جانتا کہ میرے بڑوں کا کوئی تعلق دلائی لاما سے یا نہیں!"

میں نے اس سلسلے میں زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی اور موضوع بدلتے ہوئے کہا "ڈاکٹر موگنگ! کیا ٹیلی فون پر اتنی اہم گفتگو کرنا مناسب ہے؟"

"عام حالات میں تو قطعاً مناسب نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "لیکن میں نے اپنی حکمتِ عملی سے عام حالات کو اس وقت خاص بنایا ہوا ہے۔ پی یانگ کی طرح جولی بھی میری وفادار ہے لہٰذا فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے علاوہ کوئی بھی غیر متعلق شخص یہ گفتگو نہیں سن رہا۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "جولی سے میری مراد اس ہوٹل کی ٹیلی فون آپریٹر ہے۔"

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کہا۔ "ڈاکٹر موگنگ! اب تک آپ لوگوں کا جو رویہ سامنے آیا ہے وہ انتہائی دوستانہ اور مخلصانہ ہے۔" میں نے نظر اٹھا کر معنی خیز نگاہ

سے اپنے سامنے بیٹھی راکیل کو دیکھا اور کہا" لیکن کیا ضروری ہے کہ میں آپ لوگوں کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھوں؟ مجھے جو کچھ کرنا ہوگا میں اپنے طور پر کروں...... اور آپ لوگ اپنا کام کریں!"

راکیل نے خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اسے میری بات پسند نہیں آئی تھی۔ اسی لمحے ڈاکٹر مونگ کی مخصوص تاثر بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"مسٹر ڈسلوا! مجھے اوپر سے خصوصی ہدایت ہے کہ میں تمہارے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی نہ کروں۔" وہ احتیاط کے پیش نظر مجھے وجدان کے بجائے ڈسلوا کہہ کر ہی مخاطب کر رہا تھا" تم اپنی مرضی اور عمل کے لیے بالکل آزاد ہو لیکن یہ بات تمہیں بھی معلوم ہوگی کہ جب مقصد ایک ہو تو پھر مل جل کر کام کرنے سے جلدی کامیابی ہو جاتی ہے۔ اتفاق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے' بالفرض میں تن تنہا اس مشن کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا" ایسی صورت میں تم کیا کہو گے...... مجھے فوری طور پر کیا کرنا ہوگا؟ اس کے بعد تم کیا کرو گے؟" میں نے اسے ٹٹولنے کی غرض سے متعدد سوالات کر ڈالے۔

"ایسی صورت میں' میں تمہیں تمہاری مرضی پر آزاد چھوڑ دوں گا۔" وہ ترتیب وار میرے سوالات کے جواب دیتے ہوئے بولا" تم اس وقت جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو۔ کوئی تمہیں روکے ٹوکے گا اور نہ ہی کسی قسم کی نگرانی کی جائے گی...... اور جہاں میرے کچھ کرنے کا سوال ہے تو میں اپنے حصے کے کام کو پروگرام کے مطابق آگے بڑھا دوں گا۔ دھنو ریمنڈ کے ساتھ بہ حفاظت فیئر بینکس پہنچ چکی ہے۔ اسے فیئر بینکس سے ڈیلٹا ائر لائنز کے ذریعے کل شام میرے پاس اینکریج پہنچا دیا جائے گا۔ میں تمہارے ساتھ ساتھ اسے بھی سیئٹل لے جانے والا تھا لیکن اب......!"

اس کے انکشاف نے میرے اندر ایسا ہیجان جگا دیا تھا کہ میں اس کی بات مکمل ہونے کا بھی انتظار نہ کر سکا اور اضطراری لہجے میں کہا" تم میری ساحل کی بات کر رہے ہو نا؟"

"میں ہماری دھنو کی بات کر رہا ہوں۔ وہ تبتی لڑکی جو تھونچی اور بھیرجانی کی اکلوتی بیٹی ہے۔" ڈاکٹر مونگ نے گمبھیر لہجے میں کہا" یہ ایک اتفاق ہے کہ وہ تمہاری ساحل بھی ہے۔ بہر حال میں اسی لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں۔"

ڈاکٹر مونگ کی اس وضاحت نے میرے اندر حسد کا جذبہ ابھارا۔ مجھے یہ قطعاً اچھا نہیں لگا تھا کہ وہ میری ساحل کے لیے "ہماری دھنو" جیسے لفظ استعمال کرے۔ میں نے ترش آمیز لہجے میں کہا۔

"تم میری ساتھی کو میری مرضی کے بغیر کیسے کہیں لے جا سکتے ہو؟"

"اس لیے لے جا سکتا ہوں کہ وہ تمہاری ساتھی تو بہت بعد میں بنی ہے...... ہماری تو وہ شروع ہی سے ہے۔" اس کا انداز اچانک سسرالیوں ایسا ہو گیا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے پھڈے باز سسر سے مخاطب ہوں یا پھر کوئی فتنہ پرور سالا مجھے میری اوقات یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ والا معاملہ نہایت ہی اہم ہے۔ ہم دھنو کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں کر سکتے۔ ربی موشے ہائمن کسی بھی طرح اسے دوبارہ حاصل کر سکتا ہے اور اس کے اندر سے وہ راز باہر لا سکتا ہے جس کے حصول کے لیے وہ کافی عرصے سے بے چین ہے...... پانچ عجوبۂ روزگار اور عنقا پتھروں کا حصول...... ڈائمنڈ' ایمرالڈ' روبی' سیفائر' ٹوپاز۔"

یہ سن کر مجھے دلی اطمینان ہوا تھا کہ میری ساحل بہ خیر و عافیت تھی ورنہ ابھی تک تو اس کا کوئی سراغ ہی ہاتھ نہیں آ رہا تھا مگر ڈاکٹر مونگ ریفوشے جس طرح ساحل پر اپنا حق جتلا رہا تھا وہ دل جلانے والی باتیں تھیں۔ اس کے کلام کی قطعیت بتاتی تھی وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' وہ کر بھی گزرے گا۔ اس وقت ساحل ان لوگوں کے قبضے میں تھی۔ میری ذرا سی جذباتیت بنے بنائے کھیل کو بگاڑ سکتی تھی۔ ڈاکٹر واضح طور پر بتا چکا تھا کہ ڈیلٹا ائر لائنز کا طیارہ کل شام میں ساحل کو فیئر بینکس سے اینکریج پہنچانے والا تھا۔ ہم بھی ریل روڈ (ٹرین) کے ذریعے دینالی سے اینکریج پہنچائے جانے والے تھے پھر پروگرام کے مطابق' ڈاکٹر مونگ ہمیں اپنے ساتھ سیئٹل لے جانے والا تھا۔ ڈاکٹر مونگ سے "اتفاق" میں ایک فائدہ تو بہر حال تھا اور وہ یہ کہ کل شام اینکریج میں' میں ساحل کے ساتھ ہوتا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کے بارے میں ساحل سے ملنے کے بعد ہی سوچوں گا۔ فی الحال ڈاکٹر مونگ کے ساتھ دینے میں مجھے اپنا بھلا نظر آ رہا تھا۔ ایک حتمی فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے ڈاکٹر مونگ کو گھیرنے کی کوشش کی۔ میرا انداز ایسا تھا کہ وہ میرے ارادے تک نہ پہنچ سکے۔

"اگر میں آپ لوگوں سے مطالبہ کروں کہ ساحل کو

میرے حوالے کر دیں۔ ہم خود اپنے لیے لائحہ عمل بنائیں گے تو؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ ممکن نہیں......اور میں اس کی وضاحت کر چکا ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

''اگر ساحل خود میرے حق میں فیصلہ سنا دے تو؟''

''تو بھی سیٹل تک یہ ممکن نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''یہاں پہنچنے کے بعد تم بڑوں سے بات کر سکتے ہو۔ ممکن ہے وہ لوگ تمہاری تجویز کو مان لیں۔ دھنو سے تعلق کے سبب تم ہمارے لیے بڑے محترم ہو بہر حال میں اپنی ذمے داری پوری کر کے چھوڑوں گا۔ اگر تم ساتھ چلتے ہو تو اچھی بات ہے ورنہ دھنو کو تو میں ضرور سیٹل پہنچا دوں گا۔''

اس کے ارادے سے لگتا تھا' وہ اینکر یج میں بھی مجھے ساحل کے قریب نہیں ہونے دے گا۔ میں نے دل میں سوچا ایک مرتبہ میں اس کے نزدیک پہنچ جاؤں' پھر دیکھوں گا کہ کون مجھے ساحل سے ملنے سے روک سکتا ہے۔ مصلحت کا تقاضا اور حالات کی نزاکت یہی درس دیتی تھی کہ سر دست مجھے ڈاکٹر موِنگ اور اس کے بڑوں سے کوئی اختلاف نہیں کرنا چاہیے ''اتفاق میں برکت ہے'' ہی کو آزمانا چاہیے۔

میں نے اپنے لہجے میں اس داماد کی بے بسی شامل کی جو بچوں والی بیوی کی وجہ سے سسرال والوں کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے ''ڈاکٹر موِنگ! تمہارا ساتھ دینے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے۔ میں اپنی ساحل کو کھونے کا تصو[illegible]''

وہ دوستانہ لہجے میں بولا ''تم اس میں اپنی سبکی محسوس نہ کرو۔ عین ممکن ہے سیٹل میں بڑے تم دونوں کی مرضی کے مطابق کوئی سیٹ اپ بنا دیں۔ مجھے پتا چلا ہے تم دونوں کو نہایت ہی رازداری کے ساتھ سیٹل سے وینکوور اور وینکوور سے سیدھا تائے پی (تائیوان) روانہ کیا جائے گا۔ تائے پی سے تم لوگ نیپال پہنچو گے۔''

''تم تو بہت دور تک معلومات رکھتے ہو؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ بولا ''رکھنا پڑتی ہیں۔ وینکوور سے تم لوگ ملائشیا ائرلائنز میں بیٹھو گے اور تائے پی سے کیتھے پیسفک کا طیارہ تمہیں نیپال پہنچائے گا۔'' ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے خوشگوار لہجے میں اضافہ کیا ''یہ ساری باتیں ایک دوست سمجھ کر بتا رہا ہوں۔ مجھے یقین تھا...... کیونکہ بڑوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ تم اپنی جانب بڑھے ہوئے دوستی کے ہمارے ہاتھ کو بڑی مضبوطی سے تھام لو گے۔ تم ہماری دوستی پر ہمیشہ فخر کرو گے۔''

''بھئی ڈاکٹر موِنگ! یہ تمہارے بڑے تو بڑے پہنچے ہوئے لگ رہے ہیں۔ بڑی کمال کی پیش گوئیاں کرتے ہیں۔'' میں نے بھی دوستانہ رنگ میں کہا۔

''تم ان سے ملنے کے بعد اور زیادہ حیرت زدہ رہ جاؤ گے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''ضرور!'' اب میرے لہجے میں دوستی کا بھرپور تاثر ابھر آیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر موِنگ ریفوشے سے کہا ''یہ نہیں بتاؤ گے کہ ساحل اور ریمنڈ کس طرح فیئر بینکس تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں نے ادھر ماؤنٹ مکنلے کے تاریک غار میں تمہارے ہی دو بندوں کی لاشیں پڑی دیکھی تھیں۔ میں مائیکل اور نیلسن کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا ''اس واقعے کی خبر ہو گئی ہے۔ دراصل ساری گڑبڑ نیلسن کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ عین موقع پر اس کی اصلیت سامنے آ گئی۔ وہ بظاہر ہمارا وفادار تھا لیکن ہمارے اندر رہتے ہوئے وہ ربی موشے ہائمن کے لیے کام کر رہا تھا۔ خیر' یہ تو ہوتا ہے۔'' اس نے سرسری انداز میں کہا اور تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''مائیکل نے بہ حفاظت دھنو کو اس مقررہ مقام تک پہنچا دیا تھا جہاں تمہیں راکیل اینڈرسن پہنچانے والی تھی مگر تمہاری آمد سے قبل ہی نیلسن کھل کر سامنے آ گیا۔ اس نے مائیکل اور ریمنڈ کو ختم کرنے کی کوشش کی تاکہ ساحل کو وہ دوبارہ ربی کے پاس پہنچا سکے۔ مائیکل پر تو اس کا وار چل گیا تاہم ریمنڈ نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

وہ ایک لمحے کو رکا پھر اپنی بات کو اختتام دیتے ہوئے بولا۔

''نیلسن نے غداری کی......اور تم جانتے ہو غدار کی سزا موت کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی!''

''مجھے یہ سن کر واقعی حیرت ہو رہی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''میں تو یہ اندازہ لگائے بیٹھا تھا کہ ریمنڈ نے غداری کی ہو گی۔ وہ مائیکل اور نیلسن کو قتل کر کے ساحل کو لے اڑا......مگر یہاں تو بالکل مختلف حالات سامنے آ رہے ہیں۔''

ڈاکٹر موِنگ ریفوشے نے کہا ''ٹرین کی بکنگ کے بارے میں تمہیں بتایا جا چکا ہے۔ ریلوے اسٹیشن پر تمہیں ریسیو کر لیا جائے گا۔ تمہارے ٹکٹ نمبرز اور سیٹ نمبرز میرے پاس پہنچ چکے ہیں تاہم تمہیں ہوٹل چھوڑنے سے پہلے ایک کام کرنا ہوگا۔''

''کیسا کام؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''تم دونوں اپنے حلیوں اور ہیئر اسٹائلز میں تھوڑی بہت تبدیلی کر لینا۔ صبح پی یانگ ریڈی میڈ میک اپ کا سامان تمہارے کمرے میں پہنچا دے گی۔ راکیل اینڈرسن ایک بہت اچھی میک اپ آرٹسٹ بھی ہے۔''

میں نے ستائشی نظر سے راکیل کو دیکھا' اسی لمحے ڈاکٹر موِنگ کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''یہ سارا عمل احتیاط کے پیش نظر کیا جا رہا ہے۔ تم لوگوں کو دیکھنے میں بھی ڈسلوا اور گارشیا ہی نظر آنا چاہیے۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''اوکے گڈ نائٹ۔ کل ملاقات ہو گی۔''

میں نے بھی ''گڈ نائٹ'' کہا اور ریسیور کریڈل کر دیا۔

☆☆☆

دماغ کو مخصوص ہدایات دے کر سونے میں بڑا فائدہ ہے اور میں یہ کام کبھی نہیں بھولتا ہوں۔ اس رات بھی سونے سے قبل میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی تھی کہ صبح چھے بجے تک میں نہایت ہی پُرسکون' میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا لیکن اگر ہوٹل کے اس کمرے میں کوئی غیر معمولی' خلاف توقع واقعہ پیش آنے کے آثار پیدا ہوئے تو وقت مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ کھل جائے گی......اور حیرت انگیز طور پر میری آنکھ صبح چھے کے بجائے رات دو بجے کھل گئی تھی!

بیدار ہونے کے بعد میرے ذہن نے جو پہلا تاثر قبول کیا۔ وہ یہ تھا کہ کوئی اور وجود بھی مجھ سے جڑا ہوا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ لگی کہ وہ وجود راکیل کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

آنکھ کھلنا' کسی کو اپنے انتہائی قریب محسوس کرنا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھنا جیسے اعمال نے مجموعی طور پر بہ مشکل پانچ سیکنڈ لیے ہوں گے۔ میں نے راکیل کا سر اپنے پیٹ پر محسوس کیا تھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ جانے کے سبب اس کا سر میرے پیٹ پر سے لڑھک کر رانوں پر آ گیا اور...... اسی لمحے مجھے راکیل کی مجبوری کا احساس ہوا۔ ہمارا کمرا خاصا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

راکیل کی آنکھیں بند تھیں اور سانس کی آمد و رفت سے محسوس ہوتا تھا وہ اس وقت گہری نیند میں تھی۔ رات کو سوتے وقت ہم نے اس جہازی سائز بیڈ کے دو کنارے پکڑ لیے تھے۔ لیٹنے کے بعد ہمارے درمیان کم از کم چھے فٹ کا فاصلہ حائل رہا ہو گا۔ بیڈ پر ایک ڈبل کمبل بھی تھا جو میں نے راکیل کے حوالے کر دیا تھا۔ میں کچھ اوڑھے بغیر [illegible] نا چاہتا تھا کیونکہ کمرے میں خاصا خوشگوار درجۂ حرارت تھا۔ ائرکنڈیشنر آن تھا جو کمرے کے اندر الاسکا کی سردی کو پچھاڑنے میں خاطر خواہ کامیاب تھا لیکن......اب میں محسوس کر رہا تھا کہ کمرے کی وہ مخصوص خوشگوار حرارت غائب ہو چکی تھی۔ شاید ائرکنڈیشنر میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

میں نے بہ آہستگی راکیل کے سر کو اپنی رانوں پر سے اٹھایا اور بیڈ پر ڈال دیا۔ وہ تھوڑا سا کسمسائی پھر کروٹ بدل لی۔ ایک مرتبہ پھر ہمارے درمیان ایک معقول فاصلہ قائم ہو گیا۔ میں بیڈ سے نیچے اتر آیا اور دوسری طرف سے گھوم کر کمبل اٹھا لیا۔ موسم کی شدت سے بچانے کے لیے راکیل کو اوڑھانا ضروری تھا۔ اس کمبل کی ہیئت سے لگتا تھا' اس کی تیاری میں برفانی ریچھ کی اون استعمال کی گئی ہو گی۔ خود اسے نہ اوڑھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ برفانی ریچھ کی اون کے تصور نے جی متلا دیا تھا۔

اصلی انگریز یعنی برٹشر بڑے وضع دار اور روایت پسند ہوتے ہیں۔ مختلف اوقات اور مواقع کے لیے شراب کی طرح ان کے لباس بھی مخصوص ہوتے ہیں' دن میں کیا پہننا ہے' شام میں کیا اور رات میں کیا' یہ ان سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ سلیپنگ سوٹ' نائٹی' نائٹ گاؤن وغیرہ انہی کے چونچلے ہیں۔ بعض امریکی بھی ایسی روایات کا پاس کرتے ہیں لیکن امریکی بڑے لاابالی اور بے پروا واقع ہوئے ہیں۔ رات کو بستر میں جاتے وقت ان کی کوشش ہوتی ہے کہ لباس سے بے نیاز ہو جائیں یا پھر بدن پر کم سے کم لباس رکھیں۔ راکیل بھی اس وقت اسی طور کی تفسیر نظر آ رہی تھی۔ میں نے کمبل کو پھیلا کر اس پر ڈال دیا اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ائرکنڈیشنر کی جانب بڑھ گیا۔

مجھے الیکٹرک یا الیکٹرونک سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور نہ ہی اس شعبے میں کوئی قابل ذکر تجربہ ہے لہٰذا میں نے ائرکنڈیشنر کے کسی بٹن یا ناب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی اور صرف دیکھ کر ہی اس کا نقص پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا اس لیے مجبوراً مجھے روم سروس سے رابطہ کرنا پڑا۔ کمبل پر راکیل کا کامل قبضہ تھا اور کمرے کا درجہ حرارت صفر ڈگری سنٹی گریڈ کے آس پاس ہی کہیں ٹہل رہا تھا۔ اس ٹمپریچر پر نیند آنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

رابطہ ہونے پر میں نے اپنا مسئلہ بیان کیا ''روم نمبر تھری ناٹ تھری کا ائرکنڈیشنر کام نہیں کر رہا۔ پلیز اسے چیک

کر لیں۔"

"ٹھیک ہے' میں دکھواتی ہوں۔" متعلقہ شعبے سے مجھے جواب موصول ہوا۔

میں ریسیور رکھ کر بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا اور کسی ماہر مکینک کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد دروازے پر بڑی نستعلیق دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

میں کسی میل مکینک کی توقع کر رہا تھا لیکن اس وقت میری نگاہ کے سامنے ایک باوردی دل کش حسینہ کھڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہینڈی کٹ تھی جس میں یقیناً مختلف نوعیت کے بجلی کے اوزار ہوں گے۔

مجھ سے نگاہ ملتے ہی وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی "آپ کے ائرکنڈیشنر میں کوئی پرابلم ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے دخول کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ کمرے کے اندر پہنچی' ایک کھوجتی ہوئی نظر' سوتی ہوئی راکیل پر ڈالی اور بڑبڑانے والے انداز میں یہ جملہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے ائرکنڈیشنر کی جانب بڑھ گئی......"ائرکنڈیشنر تو واقعی کام نہیں کر رہا!"

میں اس حسین مکینک کے پیچھے ائرکنڈیشنر کے پاس پہنچ گیا۔ اس دوران میں وہ ائرکنڈیشنر پر تھوڑی طبع آزمائی کر چکی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ایک ناب کو گھمایا اور بڑے فخریہ لہجے میں بولی۔

"لو یہ آن ہو گیا!"

واقعی اب ائرکنڈیشنر کام کرنے لگا تھا۔ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا "لگتا ہے تمہاری انگلیوں میں کوئی جادو ہے۔ تم نے تو چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کر دیا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "ویسے اسے کیا ہو گیا تھا؟"

وہ اپنی ٹول کٹ کو اٹھانے کے بعد بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہ میں بڑا پُراسرار اور معنی خیز سوال تھا۔ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ الٹا مجھے ہی استفساریہ نظر سے گھور رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا' اس نے کہا۔

"ویری سمپل...... اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔"

"کیا مطلب۔" میں چونک اٹھا "اگر کچھ نہیں ہوا تھا تو پھر بند کیسے ہو گیا؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا "یہ کس وقت بند ہوا تھا؟"

"میں صحیح وقت تو نہیں بتا سکتا۔ رات ہم سوئے تھے تو یہ آن ہی تھا۔" میں نے کہا "ابھی تھوڑی دیر پہلے میری آنکھ کھلی تو یہ بند پڑا تھا۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔ بیٹھے بٹھائے اس میں کون سی خرابی پیدا ہو گئی تھی؟"

وہ چند لمحے سنجیدہ اور ٹٹولنے والے انداز میں مجھے تکتی رہی۔ اس کی نگاہ میں بے یقینی کا تاثر پایا جاتا تھا۔ جیسے اسے میرے بتائے کا اعتبار نہ ہو۔ میں اس کے اس رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بڑی سادگی سے بولی "اس میں آن آف کی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کا ائرکنڈیشنر آف تھا' میں نے صرف اسے آن کیا ہے...... اور دیکھ لو یہ آن ہو گیا ہے۔ سمپل از دیٹ!"

لیڈی مکینک کے جانے کے بعد میں گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ ائرکنڈیشنر کو کس نے آف کیا تھا۔ اس کمرے میں صرف میں اور راکیل ہی تھے۔ میں اپنے بارے میں تو دعوے سے کہہ سکتا تھا' ائرکنڈیشنر میں نے آف نہیں کیا تھا...... اور اگر راکیل نے آف کیا تھا تو پھر یہ سوال اٹھتا تھا...... کیوں؟

اب کمرے کا درجۂ حرارت بڑی حد تک معتدل ہو چکا تھا۔ میں ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف ٹہلتے ہوئے راکیل اور ائرکنڈیشنر کے بارے میں سوچنے لگا۔ ائرکنڈیشنر بڑی سبک خرامی سے چل رہا تھا اور راکیل بڑی بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ اس حالت میں وہ بڑی معصوم دکھائی دیتی تھی...... کیا وہ واقعی ایسی ہی معصوم اور بے خبر تھی۔

اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ ائرکنڈیشنر راکیل نے آف کیا تھا۔ اس کی خطرناک شرارت کی تہ میں پہنچ جانے کے بعد مجھے یقین ہو چلا کہ وہ اس وقت سو نہیں رہی تھی بلکہ سونے کی بھرپور اداکاری کر رہی تھی۔

میں اس کے پاس رک کر چند لمحے اسے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر ایک ٹیسٹ کے طور پر میں نے نہایت ہی دھیمی آواز میں اسے پکارا "راکیل...... کارشیا......"

یہ عمل میں نے دو تین مرتبہ دہرایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی' گویا اپنی اداکاری سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ گہری نیند میں ہے۔ میں نے اس کا "یقین" کر لیا۔ اس یقین کرنے میں میرا کیا جاتا تھا۔ پردہ داری اور پردہ دری میں فرق تو قائم رہنا چاہیے نا!

میں خاموشی سے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس ٹیبل کے ایک کونے میں ایک خوبصورت مستطیل کلاک رکھا تھا۔ مذکورہ کلاک کے دو خانے تھے یا حصے تھے۔ اوپر والا حصہ گول تھا اور اس حصے کے اندر ایک نہایت ہی [illegible] گھڑی نصب تھی جب کہ نیچے والا خانہ مستطیل تھا اور اس

خانے میں ایک مخصوص میگنیٹک فیلڈ قائم کیا گیا تھا جس کے اندر تین میٹلک رنگز تین مختلف ایکسیز (AXIS) میں مسلسل گھوم رہی تھیں۔ کہنے کو یہ ایک ڈیکوریشن پیس تھا لیکن ایکس ایکسیز' وائی ایکسیز' زیڈ ایکسیز میں لگاتار گھومتی ہوئی وہ رنگز بڑا مبہوتی تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ دیکھنے والی آنکھ اس منظر پر جم کر رہ جاتی تھی۔ یہ فریم آف ریفرنس کی بڑی عمدہ جادوگری تھی۔

میں چند لمحات تک اس کلاک کی چنکاری دیکھتا رہا پھر کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے دبیز پردہ ہٹایا تو سامنے سلائیڈنگ ونڈو موجود تھی۔ اس کھڑکی کے اس پار دریائے نینانا سویا ہوا تھا۔ منفی پندرہ ڈگری سنٹی گریڈ کے آس پاس درجہ حرارت ہو تو کسی دریا کا بہنا سمجھ میں نہیں آتا لہٰذا ''نینانا'' کا ''سویا ہونا'' ہی مناسب الفاظ ہیں۔ برف کی موٹی تہ کے نیچے اگر پانی کی کوئی لکیر رینگ رہی ہو تو یہ بات دوسری ہے۔ میں نے گرین لینڈ اور انٹارکٹیکا میں بنائی جانے والی دستاویزی فلموں میں ایسے مناظر دیکھے تھے جب پینگوئن اور برفانی ریچھ شکار کی تلاش میں برف کی دبیز تہ کو توڑ کر نیچے اتر جاتے ہیں۔ رزق کا حصول بڑا ہی نازک مسئلہ ہے اور ناممکن کو ممکن بنا کر رکھ دیتا ہے۔

میں کچھ دیر بعد اس سلائیڈنگ ونڈو سے ہٹا تو ذہن میں ایک چھوٹی سی کھڑکی کھل چکی تھی۔ یہ کھڑکی مجھے ساحل تک پہنچا سکتی تھی۔ مجھے حیرت اور افسوس ہوا کہ ابھی تک اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا تھا۔ ربی موشے ہائمن کی قید میں' میں نے بڑے خشوع وخضوع سے ساحل کا تصور کیا تھا اور میرے خیال کی قوت نے چند سیکنڈ کے لیے مجھے ساحل تک پہنچا دیا تھا۔ یہ درحقیقت پینئل گلینڈ (PINEAL GLAND) کی کارفرمائی تھی جو انسانی کھوپڑی کے سامنے والے حصے میں پیشانی کے بالکل عقب میں واقع ہوتا ہے۔ بعض ماہر روحیات اسے تیسری آنکھ یا باطنی آنکھ بھی کہتے ہیں۔ اگر یہ گلینڈ انسان کی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے تو پھر اس کی آنکھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں رہتا۔ یہ آپ کے خیالات آپ کی سوچ اور آپ کی خواہش کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے۔ بس پینئل گلینڈ کو بیدار کرنے کے بعد کام میں لانے کی بات ہے جس کے لیے ارتکازِ توجہ پر مبنی کڑی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میں ایک طویل عرصے سے یوگا اور جی کی ایڈوانس مشقیں کر رہا تھا۔ پتا نہیں کس وقت میرا پینئل گلینڈ متحرک ہو گیا تھا۔ اس کا پہلا تجربہ تو مجھے اسی سنگلاخ کوٹھری میں ہوا تھا...... اور اس نے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ میرا یہ تجربہ ابھی کچا تھا کیونکہ تصور ٹوٹتے ہی میں نے ساحل تک رسائی حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کی تھی اور مجھے ناکامی ہوئی تھی۔

کسی کام کو بار بار کرنے سے اس میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ اگر میں پینئل گلینڈ کی کارکردگی کو بار بار آزماتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس کے استعمال پر قدرت حاصل کر لیتا۔ یہ بیدار تو ہو چکا تھا۔ اب مسلسل پریکٹس کی ضرورت تھی اور...... اس سلسلے میں یوگا و جی کی ایڈوانس مشقیں بہت مفید اور مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔

اس وقت میرے دل میں شدید خواہش مچلی کہ ابھی ساحل کا تصور قائم کروں اور دیکھوں کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ ڈاکٹر موتنگ ریفوشے مجھے بتا چکا تھا کہ ساحل فیئر بینکس میں تھی اور بالکل خیروعافیت سے تھی لیکن میں اپنے سینے میں ساحل کے لیے جو جذبات رکھتا تھا وہ سالا ڈاکٹر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں نے مصنوعی نیند کی اداکاری میں مصروف راکیل اینڈرسن عرف روٹی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ عشق کے خم دار مسائل سے دوچار انسان روزی کا رہتا ہے اور نہ ہی روٹی کا...... اور روٹی بھی ایسی کہ جو اپنے ریپر میں رہنا پسند نہ کرتی ہو!

بہرحال' برفانی ریچھ کی گرم مزاج اون سے تیار شدہ موٹے کمبل نے اس مختصر اللباس حسینہ کو ایک ریپر میں محفوظ کر دیا تھا۔ یہ تو وہی بتا سکتی تھی کہ اب اسے مزید کسی حرارت کی ضرورت تھی یا نہیں؟

میں کمرے کے کونے میں لوٹس پوسچر بنا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر موتنگ کے مطابق ساحل اس وقت فیئر بینکس میں تھی جو دینالی کے عین شمال میں واقع ہے اور میرا رخ اس وقت شمال ہی کی طرف تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چند گہری ہموار سانسیں لینے کے بعد اپنے تصور کو ساحل پر مرکوز کر دیا۔

میرے ذہن کے اسکرین پر اس وقت ساحل کا سراپا روشن تھا۔ اس کا ایک ایک نقش میرے دل پر نقش تھا' میری روح میں پیوست تھا۔ میں اس صورت کو کس صورت بھلا سکتا تھا! اس وقت میری تمام تر توجہ اپنی باطنی آنکھ یعنی پینئل گلینڈ پر مرتکز تھی۔ چند لمحات کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ساحل کا سراپا بگڑ رہا ہو۔ میں قدرے پریشان ہو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میری پریشانی دور ہو گئی۔

درحقیقت میرے تصور میں ساحل کا سراپا بگڑا نہیں تھا بلکہ سنور گیا تھا۔ یہ سب کچھ پانی کی سطح پر بننے والے عکس کے مانند ہوا تھا۔ اگر پانی میں ارتعاش پیدا ہو جائے تو سطح پر

ابھرنے والا عکس بھی لہرانے اور ڈگمگانے لگتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی ٹھہر جاتا ہے۔ ساحل کا سراپا بھی میرے تصور میں لمحاتی طور پر زیروزبر ہوا پھر ٹھہر گیا...... اور یہ ٹھہرنا ایک لمحے سے زیادہ کا نہیں تھا کیونکہ ٹھہراؤ کے فوراً بعد ہی اس تصوراتی منظر میں تحریک پیدا ہو گئی تھی...... میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا تھا۔

وہ کسی آرام دہ نشست کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔ اس کا ماحول بڑا پُرسکون اور روشن سا تھا۔ میں اس ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ یہ جائزہ تصور کی نگاہ کا کمال تھا۔ وہ تصور جس کی پرواز نے مجھے ساحل تک پہنچنے کا راستہ دکھایا تھا۔ میں اسی تصور کی چھنگلی تھامے ساحل کے اردگرد دیکھنے لگا اور اسی وقت مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

ساحل کے آس پاس موجود خواتین وحضرات بھی اسی کی طرح اپنی آرام دہ نشستوں پر بیٹھے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ لگی کہ وہ کسی ہوائی جہاز کا اندرونی ماحول تھا...... تو کیا ساحل اس وقت کسی طیارے میں سفر کر رہی تھی؟

یہ سوال اتنا سنسنی خیز اور تہلکہ انگیز تھا کہ اس نے میرے شعور کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ مجھے یہ بھی خیال نہ رہا کہ میں اس وقت گہرے مراقبے کی کیفیت میں ہوں۔ ساحل کا کسی ہوائی جہاز میں سفر کرنا اتنا بڑا انکشاف تھا کہ میں اپنی حرکات وسکنات پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے بےساختہ آنکھیں کھول لیں۔

آنکھ کھلتے ہی میں ہاربر لاج کے کمرا نمبر تھری ناٹ تھری میں حاضر ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا' میرا پورا وجود پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کیفیت پر غوروفکر کرنے کے بجائے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ساحل کو کھوجنے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا' اب اس کوشش کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے تھک ہار کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے اندر یہ جو نئی صلاحیت اجاگر ہوئی تھی اس میں ابھی کوئی کمی یا کمزوری موجود تھی یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے اس صلاحیت سے بھرپور استفادہ کرنا نہ آتا ہو...... میں اس کے استعمال کا مناسب طریقۂ کار نہ جانتا ہوں۔ بہرحال یہ ایک نئی بات تھی اور کسی بھی نئی چیز کو سمجھنے اور اسے استعمال کرنے کے لیے تھوڑا وقت درکار ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے کسی ماہر روحیت سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔

ساحل کے حالیہ تصور نے میرے اندرون کو بری طرح بےچین کر دیا تھا۔ وہ اگر کسی ہوائی جہاز پر سوار تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا تھا' وہ کہاں جا رہی تھی یا کہاں سے آ رہی تھی؟

ڈاکٹر موتنگ ریفوشے کے مطابق' وہ اس وقت فیئر بینکس میں تھی اور کل شام کو اسے اینکریج پہنچنا تھا۔ ڈاکٹر موتنگ یہ بھی بتا چکا تھا' وہ ڈیلٹا ائر لائنز کے طیارے سے سفر کرے گی لیکن کل شام میں تو ابھی پندرہ سولہ گھنٹے باقی تھے جب کہ فیئر بینکس سے اینکریج آنے کے لیے کسی بھی طور ڈھائی تین گھنٹے سے زیادہ وقت درکار نہیں تھا۔

ساحل والے معاملے نے نہ صرف یہ کہ مجھے ذہنی طور پر بری طرح الجھا دیا بلکہ میں گہری تشویش میں بھی مبتلا ہو گیا۔ اگر ساحل رات کے اس آخری پہر فیئر بینکس سے اینکریج جا رہی تھی تو پھر ڈاکٹر موتنگ نے مجھ سے جھوٹ بولا؟ اور اگر موتنگ نے دروغ گوئی سے کام نہیں لیا اور واقعی ساحل کل شام ہی کو اینکریج پہنچنے والی تھی تو پھر اس وقت وہ کسی طیارے میں سوار ہو کر کہاں جا رہی تھی؟ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میرے تصور نے مجھے دھوکا دیا ہو۔

میری ذہنی الجھن کو صرف ایک ہی شخص دور کر سکتا تھا اور وہ شخص تھا' ڈاکٹر موتنگ ریفوشے! یہ بھی ہو سکتا تھا' پروگرام میں کچھ تبدیلی ہو گئی ہو اور ساحل کو واقعی اسی وقت اینکریج پہنچایا جا رہا ہو۔ میں ڈاکٹر موتنگ کو فون کر کے اس بارے میں معلوم کر سکتا تھا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی پلٹا' راکیل سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بےساختہ میرے لبوں سے نکلا ''تم کب اٹھی ہو؟''

وہ بڑی معنی خیز نظر سے سرتاپا میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی ''تھوڑی دیر پہلے واش روم جانے کے لیے اٹھی تھی۔ تمہیں اس کونے میں خاموش بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ شاید تم کوئی عبادت وغیرہ کر رہے تھے۔ میں نے سن رکھا ہے' مسلمان نمازیں بہت زیادہ پڑھتے ہیں اور اکثر رات گئے عبادت بھی کرتے ہیں!''

وہ لباس کے خلاصے میں ملبوس میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے دھڑلے سے بات کر رہی تھی۔ اس بےخوف حسینہ کا حوصلہ قابلِ دید اور قابلِ داد تھا۔ اگر میں اس کے حسن اور بہادری کی تعریف کرنے بیٹھ گیا تو اپنے مقصد سے دور ہو جاؤں گا۔ میرے پاس ان گنت سوال تھے جو اس موقع پر راکیل سے پوچھے جا سکتے تھے۔ سب سے اہم اور نازک سوال تو یہی تھا کہ اس نے ائرکنڈیشنر کو کیوں بند کیا تھا' اس حرکت سے اس کا مطلب کیا تھا لیکن میرا ذہن اس وقت ساحل والے معاملے میں الجھا ہوا تھا اس لیے میں راکیل کو چھیڑ کر کوئی نیا محاذ نہیں کھولنا چاہتا تھا لہٰذا اس کے جواب میں

نہایت ہی سادگی سے کہا۔
''تم نے مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ سن اور دیکھ رکھا ہے اسے فی الحال اپنے ذہن سے نکال دو۔ تمہاری آسانی کے لیے اتنا بتا دیتا ہوں کہ میں ادھر کونے میں بیٹھا کوئی عبادت نہیں بلکہ یوگا کی ایک مشق کر رہا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''رات ابھی باقی ہے۔ خاموشی سے بستر پر جا کر سو جاؤ۔ اگر تم اس حالت میں زیادہ دیر تک کمبل سے دور رہیں تو تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے وجود پر چسپاں لباس کے ٹریلر کی جانب اشارہ کیا۔
اس نے عجیب سی نظر سے ائر کنڈیشنر کو دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی ''کیا تمہیں ٹھنڈ نہیں لگتی؟''
''میرے سینے میں جو آتش فشاں دہک رہا ہے اس کی تپش ہر ٹھنڈ کا احساس مٹا دیتی ہے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''تم اس سلسلے میں فکرمند نہ ہو۔''
''بعض اوقات تم بڑی مشکل باتیں کرنے لگتے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''
''جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کے لیے ذہن کو تھکانا نہیں چاہیے۔''
''کیا مطلب؟'' وہ سوالیہ انداز میں مجھے گھورنے لگی۔
میں نے کہا ''مطلب بہت واضح ہے۔ ایسی باتوں پر سوچنے سے ذہن الجھتا ہے اور الجھے ہوئے ذہن سے نیند کوسوں دور بھاگتی ہے جب کہ تمہیں اس وقت برفانی ریچھ کی اون سے تیار کردہ کمبل میں دبک کر سونا ہے۔''
وہ ایک آنکھ دبا کر بولی ''اور تمہیں تو کمبل میں نہیں دبکنا نا؟''
''مجھے کمبل سے بہت ڈر لگتا ہے!'' میں نے یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔
''کمبل سے ڈر...... وہ کیوں؟''
''کیا تم نے کمبل اور انسان کی کہانی نہیں سن رکھی؟''
''نہیں تو۔ سناؤ' کیا کہانی ہے؟'' وہ اچانک مچل گئی۔
میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے وہ کہانی سنا دی جس میں ایک انسان شدید سردی سے بچاؤ کی خاطر ایک سیاہ ریچھ کو کمبل سمجھ کر اوڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر نتیجے کے طور پر نوبت یہاں پہنچ جاتی ہے کہ وہ تو کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہے لیکن کمبل اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا!
کہانی سن کر راکیل کی ہنسی نکل گئی' بڑے کھلے ڈلے انداز میں بولی ''میں نہیں جانتی کہانی والے سیاہ ریچھ کا تعلق دنیا کے کس خطے سے تھا' البتہ الاسکا کا برفانی سفید ریچھ ذرا مختلف مزاج کا واقع ہوا ہے۔ اگر کوئی اسے اوڑھنے کی کوشش کرے تو یہ بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتا ہے اور تھوڑی دیر بعد خود ہی الگ ہو جاتا ہے۔ بغیر کسی شکوہ شکایت کے!'' اس کے ایک ایک لفظ سے معنی آفرینی ٹپکتی تھی۔
''ہاں' اس کا ایک ثبوت تو میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ لگتا ہے تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو!''
''کون سا ثبوت؟'' وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔
میں نے کہا ''رات تم اس کمبل کو اچھی طرح اوڑھ کر سوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ خود ہی تم سے الگ ہو گیا' بغیر کسی شکوہ شکایت کے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''
وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی ''میں سفید ریچھ کی بات کر رہی تھی!''
''بھئی یہ کمبل بھی تو اسی ریچھ کی اون سے بنا ہے نا!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''سفید برفانی ریچھ کے اچھے خاصے خصائل اس میں بھی آ گئے ہوں گے؟''
''کیا یہ کوئی سنجیدہ مذاق ہے؟''
''نہیں تمہاری بیان کی ہوئی ایک حقیقت ہے۔''
وہ سٹ پٹائے ہوئے تیوروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ یہ لاجوابی کے اثرات تھے!
میں نے کہا ''تمہاری نیند پوری نہیں ہوئی۔ چہرے پر خاصی کشیدگی پائی جاتی ہے۔ اسے کشادگی میں بدلنے کے لیے تمہیں بھرپور نیند کی ضرورت ہے۔ میرا مشورہ ہے تم کمبل اوڑھ کر...... میرا مطلب ہے اس شریف النفس برفانی سفید ریچھ کو اوڑھ کر اطمینان سے سو جاؤ۔'' بات کے اختتام پر میں نے بیڈ پر پڑے مذکورہ کمبل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔
راکیل نے پوچھا ''کیا تمہارا سونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟''
''مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔'' میں نے کہا ''اس کے بعد ہی سوؤں گا۔''
''فون...... اس وقت!'' اس نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''پونے تین بج رہے ہیں۔ اتنی رات گئے تم کس سے بات کرو گے؟''
میں اس وقت ہر صورت میں ڈاکٹر مونگ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا اور راکیل کے علم میں لائے بغیر ڈاکٹر کو فون کرنا ممکن نہیں تھا لہٰذا میں نے اس سے چھپانا مناسب نہ سمجھا اور کہا۔
''میں ڈاکٹر سونگ کو فون کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ہونقانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس نظر میں حیرت کے ساتھ ساتھ بے یقینی بھی شامل تھی ”وجدان! تم اس وقت ڈاکٹر مونگ کو جگاؤ گے۔ کیا کوئی بہت ہی ایمرجینسی میٹر ہے؟“

”ہاں‘ اسے ایمرجینسی ہی سمجھو۔“ میں نے گول مول جواب دیا۔

”کچھ مجھے بھی بتاؤ“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

مجھے یقین ہوگیا‘ وہ آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔ اسے بستر تک پہنچانے کے لیے خود بھی وہاں جانا ضروری تھا ورنہ وہ رات کا باقی حصہ یونہی کھڑے کھڑے سوال و جواب میں گزار دیتی۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

”ڈاکٹر مونگ سے جو بھی بات ہوگی‘ تمہارے سامنے ہی ہوگی لہٰذا اچھے بچوں کی طرح کمبل میں پہنچ جاؤ۔ میں ڈاکٹر مونگ کا نمبر ملوا رہا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی میں بیڈ کے اس کنارے کی جانب بڑھ گیا جدھر چھوٹی سی سائیڈ ٹیبل پر ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ جب تک میں آپریٹر سے ڈاکٹر مونگ کو ملوانے کے لیے کہتا‘ راکیل بیڈ کے دوسرے کنارے پر سوار ہو کر کمبل اوڑھ چکی تھی۔

مجھے امید تھی‘ آپریٹر رات کے آخری پہر ڈاکٹر مونگ کو ڈسٹرب کرنے پر چیں بہ جبیں ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ٹیلی فون پر آپریٹر کی جبیں تو دکھائی نہیں دے رہی تھی تاہم الفاظ اور آواز میں بھی کہیں مجھے چیں یا چوں محسوس نہ ہوئی۔ ڈاکٹر مونگ‘ آپریٹر کے لیے ایک باس کی طرح تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا‘ ڈاکٹر مونگ نے ہمارے سلسلے میں جولی نامی اس ٹیلی فون آپریٹر کو خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں۔ کوئی سوال کیے بغیر آپریٹر نے فوراً ڈاکٹر کو ملوادیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ائرپیس میں مجھے ڈاکٹر ریفوشے کی ”ہیلو“ سنائی دی۔ اس کی آواز سے لگتا تھا وہ گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔

”ہیلو ڈاکٹر!“ میں نے کہا ”میں ڈسلوا بول رہا ہوں۔ پہچانا مجھے؟“

”پہچان گیا“ اس کی گمبھیر آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”خیریت تو ہے۔ اس وقت فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟“

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا ”ڈاکٹر! تم نے بتایا تھا‘ میری ساتھی اس وقت فیئر بینکس میں ہے۔ کیا وہ واقعی فیئر بینکس میں ہے؟“

”ہاں ہاں‘ مگر کیا تم نے یہی سوال کرنے کے لیے مجھے اس وقت فون کیا ہے؟“ ڈاکٹر مونگ کی آواز سے الجھن جھلکتی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کا جواب دیے بغیر سوال داغ دیا ”اور اس پروگرام میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی کہ میری ساتھی کل شام میں تمہارے پاس پہنچے گی؟“

”فی الحال تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔“ ڈاکٹر مونگ نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”لیکن تمہاری آواز اور انداز سے لگتا ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے یا پھر ہونے والی ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے پوچھا ”مسٹر ڈسلوا! آخر بات کیا ہے؟ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“

میں نے کہا ”میرے خیال میں میری ساتھی اس وقت کسی ہوائی جہاز میں سفر کر رہی ہے!“

”کیا...... یہ کیا کہہ رہے ہو ڈسلوا؟“ ڈاکٹر مونگ کے لہجے کی بوکھلاہٹ مخفی نہ رہ سکی۔

”میری ساتھی کسی طیارے پر سوار ہے!“ میں نے زور دے کر اپنے الفاظ دہرائے۔

دوسری طرف چند لمحات کے لیے خاموشی چھا گئی پھر ڈاکٹر مونگ کی گمبھیر آواز ابھری ”تم کس بنا پر اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہو؟“

”فی الحال میں اس بنا کی وضاحت نہیں کر سکتا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ”تم فیئر بینکس کو فوراً چیک کرو۔“

”تم اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو تو چیک کرنا ہی پڑے گا ڈسلوا!“ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا ”تم فون رکھ دو میں تھوڑی دیر بعد تم سے رابطہ کرتا ہوں۔“

میں نے ریسیور رکھا تو راکیل پیچھے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی۔ وہ اس ٹیلی فونک گفتگو کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے متعدد سوالات کر ڈالے لیکن میں نے اس کے کسی بھی اہم یا غیر اہم سوال کا جواب نہیں دیا اور بڑے حتمی لہجے میں کہا۔

”ڈاکٹر کا فون آنے کے بعد اس معاملے پر بات کریں گے!“

وہ کچھ نہیں بولی اور خاموشی کے ساتھ بیڈ سے اتر کر واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ راکیل کی اس ادا پر مجھے قدرے تعجب بھی ہوا لیکن اس وقت میرا ذہن ساحل کی گتھی سے نبرد آزما تھا لہٰذا میں نے راکیل کی اس حرکت کا نوٹس نہیں لیا۔

ڈاکٹر مونگ نے تھوڑی دیر بعد فون کرنے کو کہا لیکن جب دس منٹ سے زیادہ ہو گئے تو میری فکر میں اضافہ ہو گیا۔

اس فکر میں ایک حیرت اس وقت شامل ہو گئی جب راکیل واش روم سے برآمد ہوئی۔ پوری طرح ڈریس اپ ہو چکی تھی۔ یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ اسی وقت کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتی ہو!

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور اس سے پہلے کہ اس غیر متوقع تیاری کے بارے میں اس سے کوئی سوال کرتا‘ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے فوراً فون اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر مونگ ریفوشے تھا۔ اس نے بڑے تشویش ناک انداز میں کہا۔

”فیئر بینکس میں واقعی کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”کیسی گڑبڑ...... اس کا بھی کچھ پتا چلا؟“

”کسی سے رابطہ ہوتا تو پتا چلتا!“ ڈاکٹر کی تھکی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”فیئر بینکس میں میرے جن لوگوں کے پاس دھنو کو رکھا گیا تھا وہ سب خاموش ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ وہ زندہ ہوں اور فون اٹینڈ نہ کریں۔ لگتا ہے انہیں خاموش کرا دیا گیا ہے...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“

”اس سے یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ یہ ساری مارا ماری ساحل کے حصول کے لیے کی گئی ہے۔ جواب کسی طیارے میں سفر کر رہی ہے۔“

”تم دوپہر کی ٹرین پر لعنت بھیجو اور صبح میرے پاس چلے آؤ۔“ وہ اضطراری لہجے میں بولا ”میں اسی ڈرائیور کو رینٹل کار کے ساتھ تمہارے ہوٹل بھیج دوں گا جس نے تم دونوں کو اولڈ کریل سے دینالی پہنچایا تھا۔ وہی سوتا گاچی!“

”میں اینکریج آنے کے بجائے سیدھا فیئر بینکس کیوں نہ چلا جاؤں!“ میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔

”فیئر بینکس کی طرف رخ کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔“ وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ”ورنہ میں اسی وقت تمہارے پاس آ جاتا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ فیئر بینکس روانہ ہو جاتے۔“

”فی الحال ناممکن کیوں ہے؟“ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

”رات شدید برف باری ہوئی ہے اور سڑک والا راستہ ناقابلِ استعمال ہو کر رہ گیا ہے۔“ ڈاکٹر مونگ نے اطلاع فراہم کرنے والے انداز میں کہا ”میں یہ ساری معلومات حاصل کر چکا ہوں۔ دینالی سے فیئر بینکس تک ہائی وے تھری ویسے بھی برفانی موسم میں خاصی خطرناک ہو جاتی ہے۔“

”کیا کسی خطرنا کی کی خاطر ہم کمروں میں بند بیٹھے رہ جائیں گے؟“ میرے لہجے میں خود بہ خود کڑواہٹ گھل گئی ”تمہارا تو کچھ پتا نہیں لیکن میں اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکتا۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”تم اس وقت بہت جذباتی ہو رہے ہو۔ دھنو جتنی تمہارے لیے اہم ہے اس سے کہیں زیادہ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ میں ایک اور سبب بھی فیئر بینکس کا رخ کرنے سے منع کر رہا ہوں۔ اب ادھر جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ تھوڑی وضاحت کرو؟“

وہ بولا ”اگرچہ تم نے اپنے ذرائع سے پردہ نہیں اٹھایا تاہم میں پھر بھی تمہاری بات کی روشنی میں کہوں گا کہ دھنو کے حصول کے لیے فیئر بینکس کی طرف جانا بے سود ہے۔ تمہارے دعوے کے مطابق تو وہ اس وقت کسی ہوائی جہاز میں سفر کر رہی ہے!“

میں ایک بوجھل اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ ریفوشے خاصی معقولیت کی بات کر رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا تو پتا چلا‘ میں واقعی اس وقت جذباتی ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”ڈاکٹر مونگ! ٹھیک ہے میں کل صبح تمہاری طرف سے بھیجی گئی گاڑی کا انتظار کروں گا۔“

”ویٹس گڈ!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں ریسیور رکھ کر راکیل کی جانب مڑا۔ اس وقت وہ جوتے پہن رہی تھی۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ سے باہر تھی۔ رات کے سوا تین بجے وہ پتا نہیں کہاں جانے کی ٹھانے بیٹھی تھی۔ مجھ سے نظر ملی تو میں نے پوچھ لیا۔

”راکیل! کہاں جانے کی تیاری ہے؟“

اس نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی اور بولی ”نہیں جاؤں؟“

”یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں!“

”اچھا ٹھیک ہے تم کہتے ہو تو نہیں جاتی ہوں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے شوز اتارنا شروع کر دیے۔

میں ہکا بکا اس امریکی حسینہ کو تکنے لگا۔ اس نے میرے ایک بھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔ اپنی ہی طرف سے بولتی جا رہی ہو۔ اس کی خودکار حرکات و سکنات تو کوئی دیسی عامل کامل دیکھ لیتا تو یہ فتویٰ صادر کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا کہ اس خوبصورت لڑکی پر کوئی جن آ گیا ہے! اس فتوے کے ساتھ ہی وہ یہ پیش کش بھی کر دیتا کہ وہ اس خطرناک جن کو بھگانے کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کو تیار ہے!

راکیل نے صرف شوز اتارنے پر اکتفا نہیں کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پہلے والی حالت میں آ گئی پھر اس نے کنگ سائز بیڈ پر سوار ہو کر سفید برفانی ریچھ کو اوڑھ لیا۔

میں نے کہا ”اب چپ چاپ اس کمبل میں دبکی رہنا۔ مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔“

”پھر ایک ضروری فون؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

”میں نے کہا...... چپ چاپ......“ میں نے تنبیہی انداز میں اسے دیکھا۔

وہ خاموش ہو گئی۔ ان لمحات میں وہ بڑی فرمانبرداری کا ثبوت دے رہی تھی۔ میں نے ہوٹل کی آپریٹر کا کال کیا اور پوچھا۔

”جولی! کیا مجھے اوورسیز نمبر مل سکتا ہے؟“

”آف کورس...... آپ نمبر بتائیں۔“

آپریٹر کے لہجے میں ایک مخصوص احترام شامل تھا اور یہ سب ڈاکٹر مونگ کی مہربانی سے تھا۔ ویسے بھی یورپ اور امریکا کے مہنگے ہوٹلز کا اسٹاف بہت تعلیم یافتہ اور مہذب ہوتا ہے۔ میں نے جولی کو صدف کا نمبر نوٹ کروایا۔

صدف کی طرف سے میرا دل بہت بے چین تھا۔ جب سے ربی موشے ہائمن نے مجھے بتایا تھا کہ آج کل نقلی وجدان صدف کے ساتھ ہے اور وہ اسے اصلی وجدان سمجھ رہی ہے، میں پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔ پتا نہیں وہ فتنہ پرور کیا کیا گل افشانیاں کر رہا ہوگا۔ پہلے وہ میرا مددگار بنا ہوا تھا لیکن اب بدک گیا تھا اور اگر وہ کسی بدی کی قوت کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو پھر صدف کو اس سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اگرچہ ربی موشے ہائمن نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد صدف کو میرے پاس پہنچا دے گا اور اس کے ساتھ ہی وہ نقلی وجدان کا بھی کوئی بندوبست کر دے گا لیکن میں اپنے طور پر بھی صدف کو اس خطرے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

آپریٹر نے لائن تھرو کی تو ائیر پیس میں مجھے اگنس کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا ”صدف کو بلاؤ۔ میں وجدان بات کر رہا ہوں۔“

”اچھا جی! ابھی بلاتی ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی اور مجھے ہولڈ پر ڈال دیا۔

اگنس صدف کی گھریلو ملازمہ تھی۔ میں اس سے ایک مرتبہ مل چکا تھا۔ سانولی سلونی اس کرسچن لڑکی کے خطوط میں بے پناہ کشش تھی۔ اس کے باتونی پن نے اس صلاحیت کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس سے خواہ مخواہ بات کرنے کو جی مچلتا تھا۔

صدف لائن پر آئی اور الجھن زدہ لہجے میں بولی ”ہیلو وجدان! تم نے تو کہا تھا آج فون نہیں کرو گے۔ خیریت تو ہے۔“

اس کی بات سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ وہ یقیناً نقلی وجدان کا حوالہ دے رہی تھی۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا ”صدف خیریت نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ میں اس وقت کوئی لمبی چوڑی گفتگو نہیں کر سکتا کیونکہ یہ ایک لانگ ڈسٹینس اوورسیز کال ہے۔ سننے اور یاد رکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ تم نقلی وجدان کے فریب میں آ گئی ہو۔ اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ میں اس وقت تم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر اپنے دشمنوں سے نمٹ رہا ہوں۔“

اس کے لہجے میں ہیجان اتر آیا ”وجدان!“ وہ لرزیدہ آواز میں بولی ”کیا تم کوئی مذاق کر رہے ہو؟“

”مذاق نہیں بلکہ میں ایک حقیقت تم پر کھول رہا ہوں۔ نقلی وجدان کے چکر میں نہ آنا۔ وہ اب ہمارا کھلا دشمن ہے۔ میں اس کی چال کو سمجھ رہا ہوں۔ وہ تمہارے ذریعے مجھے کمزور بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“ میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر کہا ”وہ بہروپیا نقلی وجدان اس وقت بدی کی قوتوں کے چنگل میں ہے۔ تم نے اس کی فتنہ انگیزیاں تو دیکھی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر تمہیں وارن کرتا ہوں کہ اس بدمعاش کے کسی چھل فریب میں نہ آنا۔“

”لیکن میں کیسے یقین کر لوں کہ تم اصلی وجدان ہو؟“ وہ متذبذب لہجے میں بولی۔

اس کے سوال سے میرے دل پر ایک گھونسا لگا۔ وہ جس قسم کی صورت حالات سے دوچار تھی اس میں یہ سوال کرنا اس کا حق بنتا تھا۔ وہ اصلی اور نقلی کے چکر میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

”میں تمہیں یقین دلانے کے لیے فی الحال اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہیں یہاں کا فون نمبر دے دوں تم رنگ بیک کر کے میری بات کی تصدیق کر سکتی ہو۔“ میں نے مزید کہا ”مجھے اور ساحل کو بڑی مجبوری کی حالت میں پاکستان سے بہت دور سات سمندر پار پہنچا دیا گیا ہے۔“

”تم اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟“ صدف نے پوچھا۔

”الاسکا سے۔“ میں نے کہا۔

”او مائی گاڈ!“ وہ استعجابیہ لہجے میں بے اختیار بولی ”اس برف خانے میں تو اس وقت ہر طرف برف

برف بنتی نظر آ رہی ہوگی۔ انسان سانس لے تو اس کی سانس بھی جم جائے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو صدف۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''لیکن میں اس وقت ایک لگژری ہوٹل کے حرارت بخش کمرے میں ہوں جہاں رات کا آخری پہر گزر رہا ہے۔ میرے کمرے کا وال کلاک ساڑھے تین کا وقت بتا رہا ہے۔''

''یہاں شام کے ساڑھے چھ بج رہے ہیں۔'' صدف نے کہا۔

پاکستان اور الاسکا کے معیاری وقت میں پندرہ گھنٹے کا تفاوت ہے۔ پاکستان کا وقت الاسکا کے وقت سے پندرہ گھنٹے آگے ہے۔ میں نے صدف سے کہا ''کیسا عجیب جغرافیائی حساب کتاب ہے کہ جو دن یہاں ابھی شروع ہی نہیں ہوا 'وہاں پاکستان میں اسی دن کی شام ہو چکی ہے۔ بہرحال تم میرا نمبر نوٹ کرو'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے ہار پر لاج ہوٹل کا نمبر دہرا دیا ''ڈبل زیرو اور کنٹری کوڈ کے مسائل سے نمٹنے کے بعد تم اس نمبر پر مجھ سے رابطہ بلکہ میری بات کی تصدیق کر سکتی ہو...... نائن زیرو سیون۔ سکس ایٹ تھری۔ ڈبل ٹو' ایٹ ٹو۔'' اس میں نائن زیرو سیون الاسکا کا اور سکس ایٹ تھری دینالی کا مخصوص کوڈ تھا۔

پھر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اس نمبر پر میں پانچ چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔ اس نقلی وجدان سے دور رہنے کی کوشش کرو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔ وش یو گڈ لک۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ راکیل اس دوران میں یک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں فارغ ہوا تو وہ بول اٹھی ''یہ کیا نیا چکر ہے...... نقلی وجدان اور اصلی وجدان کا؟''

''یہ چکر نیا نہیں بلکہ خاصا پرانا ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا ''میرے ساتھ رہو گی تو آہستہ آہستہ سمجھ میں آ جائے گا۔''

ٹھیک پانچ منٹ بعد صدف کی کال آ گئی۔ مجھ سے بات ہوئی تو اس نے ہیجانی لہجے میں کہا ''وجدان! تم بہت گریٹ ہو۔ بروقت مجھے ایک بڑے خطرے سے آگاہ کر دیا۔ یقین جانو' میں اس بہروپیے ہی کو اصلی وجدان سمجھ رہی تھی۔''

''تمہاری باتوں سے لگتا ہے تمہیں میری بات کی سچائی کا یقین آ گیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے' تم نے بالکل درست وقت پر مجھے خبردار کر دیا۔'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی ''پتا نہیں وہ منحوس مجھے کیا کیا چکر دیتا۔ اب میں اس کی طرف سے بہت محتاط رہوں گی اور بڑی حکمت عملی سے آہستہ آہستہ اس سے پیچھا چھڑا لوں گی۔''

''اس سے بہ آسانی پیچھا چھڑانے کا ایک گر بھی ہے۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں بتاؤ' میں تمہاری بات پر عمل کروں گی۔''

میں نے بتایا ''تمہارے ایم بی بی ایس کے فائنل امتحانات ہونے والے ہیں۔ نقلی وجدان سے کہو' وہ تمہیں پیپر آؤٹ کر کے دے دے۔ تم اس سے یہ بات فرمائش کے انداز میں کہنا اور زور دینا کہ وہ اپنے تعلقات کو استعمال کر کے تمہارا یہ چھوٹا سا کام کر دے۔ دیکھ لینا وہ چند گھنٹوں کے اندر تمہارا یہ کام کر کے دکھلائے گا۔ اس بہروپیے کے اس عمل سے تم پر واضح ہو جائے گا کہ وہ میں نہیں ہوں کیونکہ میں نے ہمیشہ تمہیں محنت' سخت محنت کی تلقین کی ہے۔ میں پرچہ جات کو آؤٹ کرنے والی حماقت کبھی نہیں کر سکتا!'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اور جیسے ہی وہ شیطان پرچہ جات تمہارے حوالے کرے تم بڑے کھلے الفاظ میں اس سے کہہ سکتی ہو کہ وہ تمہارا وجدان نہیں...... بلکہ وجدان کی کھال میں چھپا ہوا وہ بہروپیا ہے جسے چند روز پہلے وجدان نے بری طرح جھڑک کر بھگا دیا تھا۔ اپنی اصلیت کا انکشاف ہوتے ہی وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے گا۔ یہ بالکل ایسا ہوگا جیسے لاحول پڑھنے سے شیطان نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔''

''یہ ہوئی نا بات...... ایک تیر سے دو شکار کرنے والی۔'' صدف نے خوش ہو کر کہا پھر قدرے گمبھیر لہجے میں بولی ''وجدان! اپنا راز کھل جانے کے بعد وہ کہیں کوئی انتقامی کارروائی تو نہیں کرے گا؟''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''بظاہر تو اس کا امکان نظر نہیں آتا اور بالفرض' اگر وہ کوئی پر پرزے نکالنے کی کوشش بھی کرتا ہے تو کیا تم اس سے ڈرتی ہو؟''

''میری ڈرتی ہے جوتی۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

میں نے کہا ''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم آنکھیں اور دماغ کھلا رکھ کر حالات کے سامنے ڈٹی رہو۔ مجھے امید ہے' وہ اپنا بھانڈا پھوٹ جانے کے بعد خود ہی تم سے کنی کاٹنے لگے گا۔ ویسے اسے کیلنے کے لیے یہودیوں کا ایک جید ربی بھی ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مجھے امید ہے' بہت جلد اس نقلی وجدان سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔''

''تم امریکا پہنچ کر یہ کس قسم کی مصروفیات میں پڑ گئے ہو؟'' وہ الجھ کر بولی۔

''فرصت میں تفصیل سے بتاؤں گا۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے' ابھی فرصت نہیں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی ''کیا اس ہوٹل میں تم اکیلے ہی ٹھہرے ہوئے ہو؟''

''نہیں میرے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ اس ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔''

''میں پورے ہوٹل کی نہیں صرف تمہارے کمرے کی بات کر رہی ہوں!'' وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا'' ہار پر لاج کے کمرا نمبر تھری ناٹ تھری میں اس وقت میرے ساتھ ایک امریکی حسینہ راکیل بھی موجود ہے اور...... وہ گہری نیند میں ہے۔'' میں نے دانستہ تھوڑا سا جھوٹ بولا۔ یہ مصلحت اندیشی کا تقاضا بھی تھا'' راکیل کا شمار دشمنوں میں نہیں ہوتا۔ بس یا اور کچھ؟''

اس نے چونک کر پوچھا ''ساحل کیسی ہے؟''

یہ ایک فطری سوال تھا جو اس نے خاصی دیر کے بعد کیا تھا۔ میں اور صدف نے مل کر خاصے دنوں تک ساحل کی تلاش میں سر کھپایا تھا۔ میں نے کہا ''وہ خیریت سے ہے۔''

''کیا تمہاری اس سے ملاقات ہوئی؟''

''ہونے والی ہے...... تم دعا کرنا!'' میں نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

''ان شاء اللہ ضرور!'' وہ تہہ دل سے بولی پھر کہا ''وجدان ہم اپنے درمیان کوئی کوڈ ورڈز مقرر کر لیتے ہیں تاکہ نقلی وجدان سے دھوکے کا اندیشہ نہ رہے!''

''اچھا آئیڈیا ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر کچھ سوچتے ہوئے اضافہ کیا ''صدف! ہمارا جب بھی سامنا ہوگا تم کہنا...... ہاسا نگھ پارک۔ اس کے جواب میں' میں کہوں گا...... پائپ میں پناہ! کہو یہ کوڈ ورڈز ٹھیک ہیں یا......؟''

یا کے بعد میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا' وہ جلدی سے بولی ''ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ اس کوڈ ورڈز میں بڑا رومانس ہے۔''

صدف کی آواز میں موجود ایک خاص قسم کی جوشیلی ترنگ کو میں نے فوراً محسوس کر لیا۔ ہاسا نگھ پارک اور پائپ میں پناہ کے ذکر پر اس کے ذہن میں وہ واقعہ تازہ ہو گیا جب ہم دونوں اپنے دشمن کے آدمیوں سے چھپتے چھپاتے مذکورہ پارک میں داخل ہوئے تھے اور ایک ادھورے سلائیڈنگ پائپ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہم نے ایک دوسرے کی قربت میں وہ چند لمحات بڑے رومان پرور انداز میں گزارے تھے۔

دو چار رسمی باتوں کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔ میں نے ریسیور کریڈل کیا تو راکیل سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میرے صدف کے درمیان زیادہ تر بات چیت اردو میں ہوئی تھی لیکن نقلی وجدان اور اصلی وجدان کا کیڑا راکیل کے ذہن میں کلبلا رہا تھا اس لیے اس نے بہت سی باتوں کا مفہوم کنسیو کر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھ بیٹھتی' میں نے انکوائری والے انداز میں کہا۔

''تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟''

''یہ صدف کون ہے...... تم نے پاکستان میں کسی کو فون کیا ہے نا؟''

''ہاں' صدف پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں رہتی ہے۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ''اور یہ میری کزن ہے۔''

راکیل نے پوچھا ''کیا تمہارے علاوہ کوئی اور وجدان بھی ہے جو تمہاری اس کزن کو پریشان کر رہا ہے؟''

''تم ان چکروں میں نہ پڑو آرام سے سو جاؤ۔'' میں نے قدرے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی۔ تم ہی کسی طرح سلا دو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''بڑے جادوگر بنتے ہو نا!''

''ٹھیک ہے' میں تمہیں سلاتا ہوں۔'' میں نے بھی اسی سنجیدگی سے کہا ''لیکن ایک شرط ہے!''

''کیسی شرط؟'' اس کی خمار آلود نیلی آنکھوں میں ایک چمک سی ابھر آئی۔

میں چند لمحے خاموشی سے ان گہری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ راکیل کی اس بات میں ذرہ برابر حقیقت نہیں تھی کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے اڈتے ہوئے بادل واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ وہ محض مجھے تنگ کرنے کے لیے اس قسم کی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے کہا ''شرط صرف اتنی سی ہے کہ سونے کے بعد تم ائر کنڈیشنر کو آف نہیں کرو گی!''

''ائر کنڈیشنر کو آف!'' اس نے شرارت سے مجھے دیکھا ''کیا مط......؟''

''جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کی گویائی کو لاک کر دیا۔ شاید وہ یہ پوچھنا چاہتی تھی' کیا مطلب ہے تمہارا؟ لیکن مطلب' مط سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ اس کا مطلب پورا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

(ر)ات دیر سے سوئے تھے اس لیے دوسری صبح دیر سے آنکھ (کھل)ی۔

(می)ں نے بیدار ہونے کے بعد ایک طویل سکون بخش انگڑا(ئی) لی اور گردن موڑ کر راکیل کی جانب دیکھا۔ وہ آسودگی بھری (نی)ند سو رہی تھی۔ میں نے اسے سوتا چھوڑا اور واش روم میں گ(ھس) گیا۔

(نا)شتے سے پہلے پی یانگ ہمارے کمرے میں چلی آئی۔ اس (دو)ران میں راکیل بھی فریش ہو چکی تھی۔ وہ بڑی نکھری نکھر(ی) نظر آرہی تھی۔ پی یانگ نے ایک ہوٹی بکس ٹائپ شے (را)کیل کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس میں میک اپ کی مکمل رینج موجود ہے جو تم دونوں کی ض(ر)وریات کے لیے کافی ہوگی۔ ناشتے کے بعد تم واقعتا ڈسلو (و)ر گارشیا بن جانا۔"

(می)ں نے پی یانگ سے کہا "تمہیں ہمارے پروگرام کی تبد(یلی) کے بارے میں تو معلوم ہو گیا ہوگا؟"

"ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا "ڈاکٹر مونگ سے تھوڑ(ی) دیر پہلے میری بات ہوئی ہے۔ تم دونوں کو لے جانے والی (گا)ڑی جیسے ہی یہاں پہنچتی ہے، میں تمہیں بتا دوں گی۔"

(را)کیل نے کہا "ناشتا ہم اپنے کمرے ہی میں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے، میں روم سروس سے کہہ دیتی ہوں۔" اس نے (پ)ھر پوچھا "آرڈر کے بارے میں کچھ بتا دو؟"

(را)کیل کھٹا کھٹ اسے ناشتے کا آرڈر لکھوانے لگی۔ میرے (حس)اب سے وہ کم از کم چار افراد کا ناشتا تھا۔ میں نے راکیل (کو ٹ)وکنا مناسب نہ سمجھا۔ جب پی یانگ ہمارے کمرے سے (رخ)صت ہو گئی تو میں نے کہا۔

"کیا تم نے کسی اور کو بھی ناشتے پر مدعو کر لیا ہے؟"

"کیوں، کیا ہو گیا!" وہ چہک کر بولی۔ اس کے چہکنے میں (ای)ک خاص قسم کی اتھلاہٹ تھی۔

میں نے کہا "ہم صرف دو افراد ہیں اور تم نے ہماری ضرور(ت) سے دگنا ناشتا منگوالیا ہے!"

اس کی چہکار میں قدرے اضافہ ہو گیا۔ بڑے ولولہ انگیز اندا(ز) میں بولی "وجدان! سچی بات یہ ہے کہ مجھے شدید قسم کی بھوک (ل)گ رہی ہے۔ معدے میں کچھ اس طرح کی لہریں پیدا ہو ر(ہی) ہیں جیسے پچھلے دو تین دن سے میں نے کچھ کھایا نہ ہو!"

"حیرت کی بات ہے۔" میں نے کہا "حالانکہ رات تم نے (اچ)ھا خاصا ڈٹ کر ڈنر کیا تھا!"

"شاید میں نے تمہیں اپنی اس عادت کے بارے میں نہیں بتایا کہ عام لوگوں کی بہ نسبت مجھے زیادہ بھوک لگتی ہے۔" وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"شاید نہیں بلکہ یقیناً تم نے مجھے اپنی اس عادت کے بارے میں پہلے نہیں بتایا تھا۔" میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "میں تو تمہاری اس عادت کا سن کر گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔"

میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ گھمانا بند کر دیا اور پوچھا "تمہیں کیا تشویش ہو رہی ہے؟"

"بھئی! میں نے اپنی پوری زندگی میں کہیں دیکھا اور سنا نہیں کہ کسی روٹی کو بھی شدید قسم کی بھوک لگتی ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اچانک اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ بڑے فراخ دلانہ انداز میں قہقہے لگانے لگی پھر رک کر گہری سنجیدگی سے بولی "وجدان! میں بڑی عجیب و غریب روٹی ہوں۔ بھوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتی لہٰذا۔" وہ ایک لمحے کو رکی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی "لہٰذا ناشتے کے آرڈر میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ میں تمہیں ساری پلیٹیں صاف کر کے دکھاؤں گی۔"

"دیکھوں گا!" اس کے دعوے کے جواب میں، میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

تھرفٹی کار رینٹل کا ڈرائیور موٹا گاچی ٹھیک گیارہ بجے ہمیں لینے آ گیا۔ لگتا تھا اس نے کار رینٹل کمپنی میں نوکری محض دنیا دکھاوے کے لیے کر رکھی ہے۔ ورنہ درحقیقت وہ ڈاکٹر مونگ کے لیے کسی چراغی جن ایسی حیثیت رکھتا ہے جو اس کے احکام کی تعمیل کے لیے اِدھر اُدھر ناچتا پھرتا ہے۔

ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے تو ہائی وے تھری پر آتے ہی اندازہ ہو گیا کہ رات اچھی خاصی برف باری ہوئی تھی چنانچہ جس رفتار سے گاچی نے ہمیں اولڈ کریل سے دینالی پہنچایا تھا، اسے برقرار رکھنا ممکنات میں سے نہیں تھا۔ گاڑی کا انجن طاقتور تھا تاہم گاچی بیس سے زیادہ رفتار بڑھانے کا رسک نہیں لے رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم شام سے تھوڑی دیر پہلے اینکریج پہنچ گئے۔ کری اور چیز کے بعد راستہ قدرے آسان ہو گیا تھا اس لیے بھی ڈرائیونگ کی مشکلات میں کمی آ گئی اور گاچی نے چیز سے اینکریج کے درمیانی ٹکڑے میں رفتار کو بیس سے تیس تک پہنچا دیا تھا۔

ڈاکٹر مونگ ریفو شے کی رہائش گاہ ائرپورٹ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اینکریج، الاسکا کا سب سے زیادہ آباد شہر ہے پھر بھی خاصا سویا سویا محسوس ہوتا ہے۔ اس میں دنیا کے دوسرے

شہروں والی مخصوص گہما گہمی اور شور شرابا کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ایک ہزار چھے سو ستانوے مربع میل پر پھیلے ہوئے اس شہر کی کل آبادی لگ بھگ ڈھائی لاکھ ہے۔ کراچی اور لاہور کے بعض بڑے محلوں میں اتنی آبادی ہوتی ہے پھر تناسب بھی تو دیکھیں' ڈیڑھ ہزار مربع میل سے بھی زیادہ رقبہ اور اس قدر کم آبادی! اس نسبت تناسب کے علاوہ موسم کی شدت نے بھی لوگوں کو گھروں کے اندر بند کر رکھا تھا۔

ڈاکٹر مونگ نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا اور فوراً مجھے اپنی رہائش گاہ کے ایک مخصوص کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر مونگ بڑی تاثر انگیز شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے سامنے سے اپنا آدھا سر منڈا رکھا تھا۔ پچھلے نصف حصے پر بال موجود تھے اور بڑی شان سے موجود تھے۔ بالوں کی طوالت کے پیش نظر ڈاکٹر مونگ نے عورتوں کی طرح باقاعدہ انہیں ایک چوٹی کی شکل دے رکھی تھی۔ لباس کے نام پر اس نے تنگ پائچوں والا پاجامہ پہن رکھا تھا جس کے اوپر کرتہ نما کوئی شے تھی۔ اس کرتے کی آستینیں حد سے زیادہ کشادہ تھیں۔ اس کھلے ڈلے کرتے کے نیچے ڈاکٹر مونگ نے اور کیا کچھ پہن رکھا تھا' میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بہرحال اس کا لبادہ جس بھی تراش خراش اور ڈیزائن کا ہو' وہ ایک عمدہ اور قیمتی کپڑے سے تیار کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مونگ کے چہرے پر ایک مستقل سنجیدگی پائی جاتی تھی جس میں خفیف مسکراہٹ کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ وہ بولتا تھا تو لگتا تھا جیسے تاثر کا کوئی دریا بہہ رہا ہو۔ بے ساختہ اس کے لیے دل میں ادب و احترام کے جذبات ابھرنے لگتے تھے۔ میں نے اس کے بارے میں جو تصور قائم کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ اس کی شخصیت میں تسخیر کی خاصیت موجود تھی۔

ہم اس وقت جس کمرے میں بیٹھے تھے وہ نہایت ہی مختصر تھا یعنی اتنا مختصر کہ اس میں ایک چھوٹی سی میز کے گرد صرف دو کرسیاں ہی رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر میں اور دوسری پر ڈاکٹر مونگ براجمان تھا۔ میز پر دو ننھی منی پیالیوں کے ساتھ ایک کیتلی رکھی تھی۔ مذکورہ کیتلی میں خوش بودار قہوہ بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اس بے حد لذیذ قہوے سے میری ابتدائی تواضع کر رہا تھا۔ راکیل کو وہاں پہنچتے ہی مجھ سے الگ کر دیا گیا تھا۔

ساحل کے حوالے سے اس وقت میرے دل میں ایک طوفان سا مچل رہا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ ڈاکٹر مونگ ملاقات پر سب سے پہلے اسی کا ذکر کرے گا لیکن وہ شاؤلن ٹیمپل اور وہاں کی تربیت کا موضوع لے بیٹھا۔ ڈاکٹر مونگ نے پچیس چھبیس سال پہلے اس عظیم تربیت گاہ میں ٹریننگ حاصل کی تھی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اب عملی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اپنے بعض ایسے اساتذہ کے نام بھی لیے جن سے مجھے بھی کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اگرچہ بیتے دنوں کو یاد کرنا ایک دلچسپ مصروفیت ہے لیکن اس وقت مجھے یہ تذکرہ کھل رہا تھا' چنانچہ میں نے کہہ ہی دیا۔

''ڈاکٹر مونگ! شاؤلن ٹیمپل پر ہم بعد میں بھی باتیں کر سکتے ہیں۔ تم مجھے ساحل کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ اس کا کچھ سراغ ملا یا نہیں؟''

وہ اپنے ہونٹوں پر بڑی سنجیدہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا'' وجدان! میں کافی دیر سے تمہاری بے چینی کو محسوس کر رہا ہوں۔ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے اور تمہاری کیفیت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم دھنو کے لیے خاصے سنجیدہ ہو!''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کوئی دوسرا ہی موضوع نکال لیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' ڈاکٹر مونگ! تم جتنا محسوس کر رہے ہو' میں اس سے بھی کہیں زیادہ سنجیدہ ہوں لیکن تم سے میری ایک درخواست ہے۔''

وہ اسی مسکراہٹ بھری سنجیدگی کے ساتھ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا'' تم کیا درخواست کرنے والے ہو؟''

میں نے کہا'' تم اس تبتی لڑکی کے لیے دھنو کے بجائے ساحل کا لفظ استعمال کرو تو مجھے خوشی ہوگی...... کم از کم میرے سامنے یا مجھ سے گفتگو کرتے وقت تم اسے ساحل کے نام ہی سے پکارا کرو۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ بڑی فراخ دلی سے بولا'' تمہیں دوست بنایا ہے تو تمہارے جذبات کا احترام بھی ضروری ہے۔ میں تمہاری یہ فرمائش ضرور پوری کروں گا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا شانہ تھپتھپایا اور کہا'' اور کچھ؟''

میں نے کہا'' اب ساحل کے بارے میں تازہ ترین حالات سے بھی مجھے آگاہ کر دو۔''

وہ چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد گمبھیر آواز میں بولا۔ ''وجدان! تمہارا خیال بالکل درست تھا کہ وہ اس وقت کسی طیارے میں سفر کر رہی تھی اور حالات و واقعات سے ثابت ہو رہا ہے' اسے ربی ہی کے آدمیوں نے فیئر بینکس سے اغوا کیا ہے اس طرح اغوا کیا ہے کہ وہاں میرے ٹھکانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی ہے۔ خیر ربی کو یہ قرض سود در سود واپس کرنا ہوگا۔''

وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے کہا'' یہ تو تمام وہی باتیں ہیں جن کی میں بھی توقع کر رہا ہوں۔ کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم نے ساحل کے کسی طیارے میں سفر کرنے کی تصدیق کیسے کی؟''

''میں نے ہنگامی حالات میں اپنے بڑوں سے رابطہ کیا تھا۔'' ڈاکٹر مونگ نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا'' سیٹل میں موجود میرے سینئرز نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ فیئر بینکس سے اغوا کرنے کے بعد تمہاری ساتھی کو کسی طیارے میں سوار کرایا گیا ہے۔''

''پھر تو تمہیں یہ بھی بتایا جا چکا ہوگا کہ وہ طیارہ ساحل کو کہاں پہنچانے والا ہے؟''

''نہیں' اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا گیا۔''

''اور تم نے پوچھا بھی نہیں؟''

''میں اپنے بڑوں سے سوالات کی جرأت نہیں رکھتا۔'' وہ ٹھوس اور سنجیدہ لہجے میں بولا'' میں نے انہیں تمہارے خیال سے آگاہ کیا تو انہوں نے کہا' ہم وجدان کے خیال کو ضرور چیک کریں گے۔ اس کے خیال اور اندازے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ تمہارا یعنی وجدان کا خیال ٹھیک ہے۔'' وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سیٹل والے بڑوں نے مجھے یقین دلایا کہ ساحل بالکل خیریت سے ہے اور یہ کہ وہ بہت جلد اسے ربی موشے ہائمن کے قبضے سے نکال لیں گے۔''

میں ٹٹولتی ہوئی نظر سے ڈاکٹر مونگ ریفوشے کو دیکھنے لگا۔ اس کی باتوں میں بہت گہرائی اور گیرائی پائی جاتی تھی۔ اس کی باتوں پر یقین کرنے کو دل چاہتا تھا۔ مجھے خاموش اور سوچتا ہوا پا کر اس نے کہا۔

''مجھ سے تو سب کچھ پوچھ لیا۔ میرے ایک سوال کا جواب بھی دے دو!''

''کون سا سوال؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بولا'' تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا' ساحل کس طیارے میں سفر کر رہی ہے؟''

وہ دوستی نبھانے یا مجھے خوش کرنے کے لیے اب دھنو کے بجائے ساحل کا لفظ استعمال کر رہا تھا۔ میں نے کہا'' تمہارے سوال کا سن کر میرے ذہن میں ایک فوری جواب آیا ہے جو تمہاری طرف سے ہر سوال کا دروازہ بند کر دے گا لیکن میں تمہیں وہ جواب نہیں دوں گا بلکہ سیدھا اور معقول جواب دوں گا۔''

وہ گہری دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا'' معقول اور سیدھا جواب تم بعد میں دینا' پہلے بتاؤ وہ کون سا جواب ہے جو میرے سوالات کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ کھڑی کر دے گا؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' تمہارے اس سوال کے جواب میں' میں تمہاری طرح یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ساحل کے کسی ہوائی جہاز میں سفر کرنے کے بارے میں مجھے میرے بڑوں نے بتایا تھا اور یہ کہ میں اپنے بڑوں سے کراس توئسچن کی جرات نہیں رکھتا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

''تم ذہین ہی نہیں بلکہ خاصے عیار بھی ہو۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے بھی اسی انداز میں کہا'' ڈاکٹر مونگ! میں گزشتہ دو دن اور دو رات سے ایک یہودن کے ساتھ ہوں۔ تھوڑا بہت اثر تو ہوگا نا۔ ممکن ہے اس رفاقت نے میرے اندر بھی کچھ عیاری بھر دی ہو!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''راکیل بڑی زبردست لڑکی ہے۔''

اس کے اس مختصر سے تبصرے سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ راکیل کے بارے میں وہ اپنا تجربہ بیان کر رہا تھا یا مشاہدہ۔ بہرحال میں نے اس کے سوال کا معقول جواب دیتے ہوئے بتایا کہ مجھے ساحل کے بارے میں کیسے پتا چلا تھا۔

وہ بڑے انہماک سے میری بات سنتا رہا پھر اٹھ کھڑا ہوگیا۔ اس کی تقلید میں' میں بھی کھڑا ہوگیا۔ اس نے بڑے والہانہ انداز میں مجھ سے ایک پُرجوش مصافحہ کیا پھر دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

ایک اچھوتی سرگزشت
چھلاوا
بیسویں صدی کی ایک نہایت پُراسرار خاتون
صبیحہ بانو کی آپ بیتی
صفحات 1120 — قیمت 300 روپے — ڈاک خرچ 29 روپے
کتابیات پبلی کیشنز

"مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ اس کائنات کی سب
چیزیں سب کے لیے نہیں ہوتیں۔ بعض معاملات کے لیے
بعض لوگ مخصوص ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی چی کی صلاحیت کو
اس حد تک بڑھانے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن مجھے اس میں
کامیابی نہیں ہوئی حالانکہ میں نے مارشل آرٹس کے دیگر
شعبوں میں جو کچھ حاصل کیا ہے اسے سنو گے تو حیرت زدہ رہ
جاؤ گے!"

میں نے کہا "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر مونگ! میں
نے تمہیں دوست جان کر اپنا یہ راز بتا دیا ہے۔ اسے خود تک ہی
محدود رکھنا۔ ویسے ابھی میری اس صلاحیت میں کچا پن ہے۔"

"کچا پن بھی آ جائے گا۔ مشق جاری رکھو۔" وہ دوستانہ
انداز میں بولا "جس حد تک ممکن ہو سکا میں بھی تمہاری مدد
کروں گا اور جہاں تک راز کو راز رکھنے کا تعلق ہے تو تم اس
سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ۔ میرا سینہ بہت وسیع اور گہرا ہے۔"

ڈاکٹر مونگ ریفوشے کے ایک ایک لفظ سے ہمدردی
خلوص اور سچائی ٹپکتی تھی۔ اس کی باتوں پر یقین اور اس کی
ذات پر اعتماد کرنے کو جی چاہتا تھا اور اب تو ہمارے درمیان
دوستی کا رشتہ استوار ہو چکا تھا جو منہ بولے رشتوں میں دنیا کا
سب سے مضبوط رشتہ سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک باہمی دلچسپی کے امور پر
بات چیت ہوتی رہی۔ مجھے ڈاکٹر کی ایک حیرت انگیز صلاحیت
کا پتا چلا کہ وہ فلائٹ فائٹنگ کا بھی ماہر تھا۔ یہ خاصیت بہت کم
افراد میں پائی جاتی ہے۔ ہوا میں پرواز کرتے ہوئے لڑائی
کرنا آسان کھیل نہیں۔ میں نے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا۔ یہ
سوال کافی دیر سے میری سوچ میں گردش کر رہا تھا۔

"تم نے کس شے میں ڈاکٹریٹ کر رکھا ہے؟"

"چینی طب میں!" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
جواب دیا۔

یہ ایک اور حیرت انگیز صلاحیت تھی۔ چینی طب کے
بارے میں میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ویسے بھی ہمارے
نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ علم حاصل کرو چاہیے اس حصول کے
لیے چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ اس سے یہ تو مسلم
ہو جاتا ہے کہ چین علم و ہنر کا گہوارہ ہے۔ میں چینی طب کے
بعض معجزاتی واقعات سے بھی آگاہ تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم روانگی کی
تیاری کرنے لگے۔ ڈاکٹر مونگ نے اس موقع پر ایک عجیب
حرکت کی۔ اس نے اپنی چوٹی کو گردن پر سے کاٹ ڈالا۔ ان
ڈیڑھ سات انچ لمبے بالوں میں سے آگے اس نے سر کے اگلے
حصے پر گرا لیے یعنی منڈا ہوا حصہ بالوں سے ڈھک گیا۔ کچھ
بال سائیڈز پر اور باقی پیچھے ڈال دیے۔ صرف اس چھوٹی سی
حرکت سے اس کے حلیے میں نمایاں تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔

میں نے جب حیرت سے اسے دیکھا تو وہ وضاحت
کرتے ہوئے بولا "جس طرح تمہارے مذہب میں مخصوص
حالات میں جان بچانے کے لیے بعض اوقات حرام شے بھی
حلال ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح کسی نہایت ہی خاص الخاص
موقع پر ہم بھی چوٹی کٹوا دیتے ہیں۔ اس عمل سے تم اس مشن کی
اہمیت کا اندازہ لگا لو۔"

میں خاموشی سے اس کی مفکرانہ باتیں سنتا رہا۔ میرے
اور راکیل کے حلیوں میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ جب
ساری تیاری ہو چکی تو ہم ائرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے۔

ائرپورٹ ڈاکٹر مونگ ریفوشے کی رہائش گاہ سے قریب
ہی تھا۔ ہم ٹھیک نو بجے گھر سے نکلے۔ فلائٹ دس بجے کی تھی۔
ہمارا یہ سفر رینٹل کار میں شروع ہوا جو تھرنٹی نامی کمپنی نے اپنے
ایک ڈرائیور گاچی کے حوالے کر رکھی تھی۔ وہ بے چارے یہ
نہیں جانتے تھے وہ موٹا گاچی کس قسم کی سرگرمیوں میں
مصروف ہے۔

گھر سے ائرپورٹ اور پھر ائرپورٹ پر کوئی قابلِ ذکر
واقعہ پیش نہ آیا۔ ہم بہ خیر و عافیت جہاز میں سوار ہو گئے۔
مقررہ وقت پر جہاز نے ٹیک آف کیا تو میں نے اطمینان کی
سانس لی۔ پھر میں نے نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں
بند کر لیں۔

پرواز متوازن ہو کر اپنی منزل کی جانب رواں دواں
ہو گئی۔ ڈاکٹر مونگ اور راکیل بھی میرے ساتھ محوِ پرواز تھے۔
ہم سب کی منزل ریاست واشنگٹن کا شہر سیٹل تھا جہاں ڈاکٹر
مونگ کے بڑے موجود تھے۔ مجھے ننانوے فیصد امید یہی تھی
کہ ان لوگوں کا بالواسطہ یا بلاواسطہ دلائی لاما سے ضرور تعلق
ہو گا۔ بہرحال، جو کچھ بھی تھا، چند گھنٹوں بعد سامنے آنے والا
تھا۔

میں نے تمام اِدھر اُدھر کے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور
ساحل کا تصور قائم کرنے لگا۔ یہ اچھا موقع تھا۔ اگر میں اپنے
ارتکازی عمل سے اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب
ہو جاتا تو مجھے ساحل کی تازہ ترین پوزیشن کا علم ہو سکتا تھا۔

میری ایک دو منٹ کی کوشش رنگ لے آئی۔ میں ساحل
کے تصور کو چھونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا سراپا میری تیسری
آنکھ کے سامنے روشن ہو گیا۔ پٹیل گلینڈ بڑی فرماں برداری
سے کام کر رہا تھا۔

میں نے دیکھا...... اور بڑی توجہ سے دیکھا کہ ساحل

ایک جہاز سے باہر آرہی تھی۔ وہ کسی ہوائی جہاز کے جسم کو خیرباد کہنے کے بعد ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہورہی تھی۔ میں نے اضطراری انداز میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی تاکہ مجھے یہ معلوم ہوسکے کہ وہ کس ائرپورٹ پر اتر رہی ہے۔ یہ بہت اہم تھا...... میں ساحل کی منزل کا سراغ پانے والا تھا لیکن......

اس لیکن کے بعد ایک افراتفری تھی اور اس افراتفری نے میرے انہماک، میرے ارتکاز کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ ہم جس جہاز میں سوار تھے وہاں مسافروں کے لیے کوئی خاص اعلان ہورہا تھا۔ میں راکیل کی کہنی کی اس نسوانی ضرب سے منتشر ہوا تھا جو اس نے میری توجہ مبذول کرانے کے لیے میری پسلیوں پر رسید کی تھی۔ وہ جہاز میں ہونے والی اناؤنس منٹ سے مجھے باخبر کرنا چاہتی تھی۔ میری آنکھیں بند دیکھ کر شاید اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں سو چکا ہوں۔

راکیل کی اس حرکت پر مجھے غصہ تو بہت آیا کہ میں اپنی ساحل کا سراغ کھو بیٹھا تھا مگر وہ غصہ دکھانے کا موقع نہیں تھا۔ اس حرکت میں راکیل کی کوئی دانستہ کوتاہی شامل نہیں تھی۔ جہاز میں واقعی ایک سنسنی خیز اعلان کیا جارہا تھا۔ میں پوری توجہ سے اس آواز کو سننے لگا۔

وہ اس لڑکی کی آواز نہیں تھی جواب تک میں نے دو تین مرتبہ سنی تھی بلکہ میرا تو یہ خیال تھا کہ وہ جہاز کے عملے میں سے کسی کی بھی آواز نہیں تھی۔ الفاظ اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے لگتا تھا، وہ کوئی غیر متعلق شخص ہے جو جہاز کے مسافروں کو کوئی سنگین وارننگ دے رہا ہے۔ وہ شخص کہہ رہا تھا۔

''کتنی عجیب بات ہے، بلکہ اتفاق ہے کہ ٹی ڈبلیو اے (ٹرانس ورلڈ ائرلائنز) کا یہ طیارہ آپ لوگوں کے دم قدم سے آباد ہے۔ اسی ائرلائنز کا ایک بوئنگ جیٹ لائنر سیون فور سیون پچھلے سال آپ ہی جیسے لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ نیویارک سے پیرس جانے والے تھے۔ ''میں ٹی ڈبلیو اے'' کی فلائٹ نمبر آٹھ سو کی بات کررہا ہوں۔ آپ میں سے بہت سارے لوگ اس فلائٹ کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے۔''

اتنا کہہ کر وہ رکا۔ میری چھٹی حس پکار اٹھی، کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ میں ابھی اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اعلان کرنے والا دوبارہ مسافروں سے مخاطب ہوا۔

''بہرحال، آپ لوگوں میں سے جو اس فلائٹ کے بارے میں نہیں جانتے میں ان کی معلومات کے لیے بتادیتا ہوں کہ ''ٹی ڈبلیو اے'' کی فلائٹ نمبر آٹھ سو، سترہ جولائی کو، رات آٹھ بج کر انیس منٹ پر نیویارک کے جے ایف کینیڈی ائرپورٹ سے اڑا۔ اسے سیدھا پیرس جانا تھا۔ اس بوئنگ سیون فور سیون میں کل دو سو تیس افراد سوار تھے جن میں دو سو بارہ مسافر اور اٹھارہ جہاز کے عملے کے لوگ تھے۔ مذکورہ بوئنگ رات آٹھ بج کر اڑتالیس منٹ پر یعنی ٹیک آف کے ٹھیک انتیس منٹ بعد ریڈار سے غائب ہوگیا۔ ائرپورٹ کے عملے میں کھلبلی مچ گئی۔ ریڈار اسکرین سے کسی جہاز کا غائب ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں۔''

بولنے والا تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا۔ میں نے جہاز کے مسافروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ بیش تر افراد کے چہرے خوف و ہراس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ جس جہاز کے بارے میں بتایا جارہا تھا اس کے ساتھ خیریت نہیں گزری تھی۔

مخصوص آواز دوبارہ نشر ہونے لگی ''میں جس جہاز کا ذکر کررہا ہوں، وہ تھوڑی دیر بعد، لانگ آئی لینڈ سے تھوڑے فاصلے پر فضا میں پھٹ گیا تھا۔ اس حادثے کے وقت وہ جہاز تیرہ ہزار سات سو فٹ کی بلندی پر، ائرپورٹ سے پچاس میل مشرق کی سمت تھا۔ بہرحال اس حادثے میں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکا تھا۔ جہاز کا ملبا اور دو سو تیس افراد کی لاشیں اٹلانٹک اوشین کی تہ میں چلی گئیں۔''

عورتوں نے باقاعدہ چیخنا چلانا شروع کردیا، ان میں سے بعض اعلان کرنے والے کو بے نقط بھی سنا رہی تھیں۔ مردوں میں بھی بے پناہ اشتعال پایا جاتا تھا۔ اس غم و غصے کے ساتھ ہی سارے مسافر خوف و ہراس میں بھی مبتلا تھے۔

''چیخنے چلانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اعلان کرنے والے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''اگرچہ اس وقت یہ جہاز بھی کم و بیش اتنی ہی بلندی پر ہے ہم اس وقت گلف آف الاسکا پر سے گزر رہے ہیں لیکن میں تم لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اس جہاز کو کوئی حادثہ پیش نہیں آئے گا۔ بشرطیکہ آپ تمام مسافروں کو ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا اعلان کیا جائے گا۔''

میں نے گردن گھما کر ڈاکٹر موننگ ریفوشے کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے پتھر کا بت بنے بیٹھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے اس اعلان کا ایک لفظ نہ سنا ہو۔

لیکن یہ کیسے ہوسکتا تھا...... ایسا ہونا ناممکن تھا!

زندگی بڑی پیاری شے ہے اس لیے سب کو پیاری ہے۔ یہ صرف ایک بار ملتی ہے اور انسان اس ایک بار کی ں میں ہزار بار جینا چاہتا ہے' اس پیاری شے کو پیار کرتا ہے' اسے گلے سے لگا کر رکھنا چاہتا ہے۔ گلے کے ہار کرا چانک کانٹے اگ آئیں تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ اسی طرح زندگی کسی بڑے خطرے سے دوچار ہوجائے تو انسان کررہ جاتا ہے' خوف و ہراس اسے اپنے حلقے میں جکڑ لیتا

طیارے کی اندرونی فضا میں اس وقت ایک کھلبلی مچی تی۔ تمام مسافر خصوصاً لیڈیز کی حالت دیدنی تھی۔ اس خیز اعلان نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ اعلان نے والے نے وعدہ کیا تھا کہ اگر مسافروں نے ان لوگوں عاون کیا تو انہیں اور اس طیارے کو کوئی نقصان نہیں پہنچے ن اس وعدے پر کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ گزشتہ فضائی حادثے کی نذر ہونے والے جس طیارے کا حوالہ یا تھا' وہ مسافروں کے ذہنوں میں سراسیمگی پھیلانے کے انی تھا...... اور ہم تینوں بھی ٹی ڈبلیو اے کے اسی بوئنگ فورسیون کے مسافروں میں شامل تھے!

اس مبہم اور سنسنی پھیلانے والے اعلان کو پہلے راکیل نا تھا۔ میں اس وقت اپنے تصور کے ساتھ ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ساحل کسی ہوائی جہاز سے اتر رہی تھی راکیل کی مداخلت نے مجھے جاننے نہ دیا کہ ساحل کس کس شہر کے کس ائرپورٹ پر پہنچی تھی۔ راکیل نے اپنی کی ضرب' میری پسلیوں پر لگا کر میرے تصور کا شیرازہ دیا تھا۔ بہرحال اس کا یہ عمل عین فطری تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر موننگ ریفوشے کی جانب ۔ اس کی آنکھیں ہنوز بند تھیں اور وہ بڑے صبر و سکون یٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی یہ لاتعلقی بے خبری مجھے عجیب سی لگی۔ طیارے کو فضا میں پرواز کیے آدھا گھنٹا گزر رہا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا' کوئی شخص اتنی قلیل میں گہری نیند میں اتر جائے...... اور شخص بھی ڈاکٹر ریفوشے جیسا محتاط اور دور بین!

میں ڈاکٹر موننگ کے اس رویے کو کسی خانے میں فٹ نے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ راکیل نے مجھے بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

''میرا خیال ہے' یہ جہاز اغوا کرلیا گیا ہے۔'' اس کی بڑبڑاہٹ سے مشابہ تھی۔

''تمہارا خیال خاصا تقویت بخش ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں ان لمحات میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے؟''

''میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' میں نے اسی انداز میں کہا۔ ''طیارے کے تباہ ہوجانے سے اس کا اغوا ہوجانا خاصا اطمینان بخش ہوگا۔ کیا تم نے ٹی ڈبلیو اے کی فلائٹ نمبر آٹھ سو کا احوال نہیں سنا؟''

''وہ حادثہ میرے ذہن میں نقش ہے۔'' وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''اس فلائٹ سے میری ایک دوست بھی نیویارک سے پیرس جارہی تھی۔ او مائی گاڈ!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

''لانگ آئی لینڈ کے باسیوں نے فضا میں ایک خوف ناک دھماکے کی آواز سنی تھی اور پھر ان کی نگاہوں میں آگ کا ایک عظیم الشان گولا گھوم گیا تھا۔ بعد کی تحقیق نے اس فضائی حادثے کو دہشت گردی کی ایک واردات قرار دیا تھا۔''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' اللہ کا شکر ادا کرو' یہ طیارہ تباہ و برباد ہونے نہیں جارہا' صرف اغوا ہوا ہے۔''

ہمارے درمیان وہ گفتگو سرگوشیانہ انداز میں ہورہی تھی۔ ویسے اگر ہم بہ آوازِ بلند بھی بات کرتے تو کوئی ہماری جانب دھیان دینے والا نہیں تھا۔ اس خوف ناک اعلان نے مسافروں کے ذہنوں کو تلپٹ کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ سب اپنے بارے میں اپنے تحفظ کے لیے سوچ اور بول رہے تھے...... اور بہت بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے۔ طیارے کے ماحول میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔

راکیل کی جھنجلائی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''تم اپنے اعصاب کو کیا کھلاتے پلاتے ہو۔ اس سنگین صورتِ حال میں بھی تمہیں خود پر بڑا کنٹرول حاصل ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور ڈاکٹر موننگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''اسے کیا ہوا ہے؟'' میرے استفسار میں ڈاکٹر کے لیے ایک احترام شامل تھا۔

اس سے پہلے کہ راکیل کچھ بولتی' جہاز کے اندر ایک مرتبہ پھر وہی مخصوص آواز سنائی دینے لگی جس نے مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ سنسنی خیز اعلان کیا تھا۔ اب وہ کہہ رہا تھا۔

''ٹی ڈبلیو اے کی فلائٹ نمبر آٹھ سو کا حوالہ اس لیے دینا پڑا کہ اتفاق سے یہ بھی اسی ائرلائنز کا بوئنگ سیون فور سیون ہے۔ عام مسافروں کو چاہیے کہ وہ ہم سے تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے امن و امان سے اپنی سیٹوں پر بیٹھے

رہیں۔ آپ لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی نہیں۔ ہم نے یہ زحمت صرف ایک خاص مسافر اور اس کے دو ساتھیوں کی خاطر اٹھائی ہے۔''

اسپیکر سے ابھرنے والی اس آواز میں تھوڑا توقف ہوا۔ تین خاص آدمیوں کے ذکر پر میرا چونکنا لازمی تھا۔ ہم بھی تین تھے اور ہمارے دشمن پورے الاسکا میں ہمیں کھوجتے پھر رہے تھے۔ تین خاص افراد کے انکشاف کے بعد راکیل فوراً مجھ پر تقریباً جھک سی گئی۔ اسی وقت اعلان کرنے والے کی آواز دوبارہ ابھرنے لگی۔

''آپ لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جن تین خاص افراد کا ذکر کیا ہے' وہ اس وقت ہمارے قابو میں ہیں اور اس جہاز کے عملے پر بھی ہمیں مکمل اختیار حاصل ہے۔ اب یہ جہاز ہماری مرضی کے مطابق پرواز کرے اور جہاں ہم چاہیں گے' لینڈ کرے گا۔ آپ لوگ اطمینان سے سفر کریں۔ آپ کی زندگیوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ اپنی منزل پر پہنچ کر ہم آپ لوگوں کو آزاد کردیں گے...... اور اپنے شکار کو ساتھ لے جائیں گے۔''

میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ اعلان کرنے والے کے الفاظ سے ظاہر ہوتا تھا' ہم تینوں ان کے نشانے پر نہیں تھے۔ راکیل بھی خاصی مطمئن دکھائی دینے لگی لیکن ڈاکٹر موننگ کی ''کیفیت'' میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں اسے جتانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسپیکر میں ایک مرتبہ پھر جان آگئی۔

''اگرچہ مجھے امید ہے' آپ لوگ کسی قسم کی بدامنی پھیلانے کی کوشش نہیں کروگے لیکن انسان بڑی عجیب و غریب چیز ہے اور ہر شخص کی کیمسٹری دوسرے سے مختلف ہے۔ عین ممکن ہے آپ لوگوں میں سے کسی کے ذہن میں مہم جوئی کا خیال پیدا ہو جائے اور کوئی الٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے اس لیے ہم تم لوگوں پر دو نگران مقرر کر رہے ہیں...... مسلح نگران! مجھے یقین ہے آپ لوگ اپنی سلامتی کی خاطر ان مسلح نگرانوں کو اسلحہ استعمال کرنے کا موقع نہیں دو گے۔ وش یو گڈ لک!''

اسپیکر خاموش ہوا تو میں نے یہاں سے وہاں تک سپرد عذاب مسافروں کا جائزہ لیا۔ ان کی سراسیمگی میں قدرے کمی آگئی تھی۔ موت کا خطرہ ٹل جانے سے بڑی راحت کا احساس ہوتا ہے۔ اکثر مسافر خاموش ہوگئے تھے تاہم بیشتر کے چہروں پر بے یقینی بھی تھی۔ انسان منزل سے بے منزل ہو جائے تو ایک نامعلوم اضطراب ذہن و دل کو اپنے جالے میں جکڑ لیتا ہے۔ ہم سب اپنی منزل کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ اس وقت ہم اغوا کنندگان کے رحم و کرم پر تھے...... اور ان کے وعدے پر بھروسا کرنا ہماری مجبوری!

ایک مرتبہ پھر راکیل نے میری پسلیوں پر طبع آزمائی اور مجھے چونک کر اس کی طرف دیکھنا پڑا۔ ہم تینوں مڈل میں بیٹھے تھے۔ میں راکیل اور ڈاکٹر موننگ کے درمیان والی سیٹ پر براجمان تھا۔ راکیل میری دائیں جانب اور ڈاکٹر موننگ بائیں طرف والی سیٹوں پر تھے۔ میں نے راکیل کی سمت توجہ کی تو وہ نظر سے دائیں طرف اشارہ کرنے لگی۔

میں نے اس کے اشارے کا تعاقب کیا اور میری نگاہ ونڈو سائیڈ والی ایک سیٹ پر جم کر رہ گئی۔ مذکورہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر کو میں نے ایک غیر معمولی حرکت کرتے دیکھا۔ اس نے اپنے گھٹنوں پر ایک سیاہ بریف کیس کھول رکھا تھا اور ایک معنی خیز کام میں مصروف تھا۔ میری نظر اس کے کام پر اٹک گئی۔ اس کے ہاتھ نپی تلی جنبشوں میں مصروف تھے۔

اس شخص نے بریف کیس کے اندر موجود ایک بلسٹر پیک تھیلی کو کھولنا شروع کیا۔ اس تھیلی کے اندر سے ایک چھوٹا پیکٹ برآمد ہوا۔ میں نے بہ غور دیکھا وہ پیکٹ ایکسرے شیٹ سے مشابہ کسی میٹریل سے تیار کیا گیا تھا۔ اس شخص نے بڑے انہماک سے اس پیکٹ کو کھول ڈالا پھر اس کے اندر سے جو شے نمودار ہوئی' اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

وہ ایک خوف ناک جدید طرز کا پسٹل تھا۔ مذکورہ شخص بڑے اطمینان سے پسٹل کے ساتھ ایک سائلنسر منسلک کرنے لگا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگی کہ اس شخص نے چیکنگ کے نظام کو دھوکا دینے کے لیے وہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ شاطر شخص اس سیاہ بریف کیس کو بہ آسانی ویپن اینڈ میٹل ڈیٹیکٹنگ آلات سے گزار لایا تھا۔ ایکسرے شیٹ یا اس سے ملتے جلتے کسی میٹریل سے تیار کردہ وہ پیکٹ اپنے اندر موجود پسٹل کو حساس مشین کی ''نظر'' سے بچا کر طیارے تک پہنچانے میں بڑا معاون اور مددگار ثابت ہوا تھا۔

میرے ذہن میں کسی فوری ایکشن کا خیال ابھرا۔ وہ شخص مجھ سے اتنے فاصلے پر تھا کہ میں ایک جست بھر کر اسے جھما ڈال سکتا تھا مگر اس سے قبل کہ میں اپنی جگہ سے حرکت کرتا ایک تیز نسوانی چیخ طیارے کی اندرونی فضا میں گونجی۔

میں نے بے ساختہ طیارے کے اگلے حصے کی جانب دوڑائی۔ وہ نسوانی چیخ اسی سمت سے ابھری تھی۔ دوسرے لمحے ایک گن بردار میری نظر میں آگیا۔ اس گن پر بھی سائلنسر لگا ہوا تھا۔ مذکورہ گن کی جھلک ہی نے اس عورت کو دعوت دی تھی۔ اس دوران میں میرے پہلو والا مسلح شخص

اٹھ کر گزرگاہ میں کھڑا ہو چکا تھا۔ میں سمجھ گیا یہ دونوں گن بردار اغوا کنندگان کے ساتھی ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے اعلان کرنے والے نے انہی دو نگرانوں کا ذکر کیا تھا۔ اس جہاز کو بڑے طریقے سلیقے سے اغوا کیا گیا تھا۔ جلد ہی ان دونوں نگرانوں نے بڑی مہارت سے مسافروں کو اپنے کور میں لے لیا۔

گن کو دیکھ کر جس عورت کی چیخ نکل گئی تھی، وہ تو سہم کر دبک گئی تھی تاہم اس کے ساتھی کو جلال آ گیا۔ وہ میکانکی انداز میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور گن بردار کو الٹی سیدھی سنانے لگا۔ اس کے انداز میں اچھا خاصا اشتعال پایا جاتا تھا۔

''تم لوگ بہت بے حس اور سفاک ہو۔''

''کیپ سائلنٹ!'' گن بردار غرایا۔

مخاطب کا جوش وخروش بڑھ گیا ''تم لوگوں نے یہ جہاز اغوا کر لیا۔ اتنا کافی نہیں کیا؟ ہم سب مکمل طور پر تمہارے رحم و کرم پر ہیں۔ اب اسلحے کی نمائش کر کے عورتوں اور بچوں کو کیوں ڈراتے ہو؟''

گن بردار اس شخص کے قریب ہی تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا پھر اس کا گن والا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اگلے ہی لمحے بولنے والا اپنی پیشانی تھام کر رہ گیا۔ گن کا فولادی دستہ اس کے ماتھے پر لگا تھا۔ یہ ایک جچی تلی ضرب تھی جو بجلی کی سی سرعت سے لگائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی گن بردار کی غراہٹ بھری آواز ابھری۔

''یہ فرسٹ وارننگ ہے۔ آئندہ تقریر کرنے کی کوشش کی تو گن سے بے آواز گولی نکلے گی جو تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے آواز کر دے گی!''

گن بردار کی دھمکی میں بڑی قطعیت تھی۔ چیخنے والی عورت نے اپنے ساتھی کو بڑی مضبوطی سے تھام لیا جیسے خدشہ ہو، وہ دوبارہ اٹھ کر گن بردار سے الجھ جائے گا۔ اپنی پیشانی پر گن کا دستہ کھانے والا شخص چپ سادھ کر بیٹھ گیا اور وہاں سے رسنے والے خون کو صاف کرنے لگا۔

اسی وقت ہمارے عقب سے ایک آواز ابھری۔ کوئی بڑی برہمی سے اغوا کنندگان سے مخاطب تھا ''تم لوگوں کا جھوٹ تو پہلے قدم پر ہی کھل گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کہا تھا' جہاز کے مسافروں سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ تم اپنے مطلوبہ افراد کو قابو کر چکے ہو پھر یہ کیسی درندگی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ تمہارا وہ وعدہ کیا ہوا کہ ہماری سلامتی محفوظ رہے گی؟''

میں نے گردن گھما کر اس جیالے کا دیدار کرنا ضروری سمجھا اور پھر اس بولنے والے شخص کو دیکھتے ہی میں ٹھٹک اٹھا۔ وہ الاسکا کا نیشنل ہیرو ڈوگ کیننگ تھا۔ وہی مونٹینز اور گلیشئر پائلٹ جسے میں نے ہار پر لاج کے ڈائننگ ہال میں ایک مریل سی لڑکی کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھا تھا۔ اب وہ قحط زدہ لڑکی اس کے ہمراہ نہیں تھی۔

میں ڈوگ کیننگ کو جہاز کے اندر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پتا نہیں وہ اب تک میری نظر سے کیسے بچا ہوا تھا۔ میری حیرت کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ طیارے میں سفر کر رہا تھا بلکہ میں اس کی طرف سے ایک بے نام سی تشویش میں مبتلا تھا۔ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں وہ بڑے مشکوک انداز میں مجھے اور راکیل کو تاڑ تا رہا تھا چنانچہ اس طیارے میں ڈوگ کیننگ کی موجودگی لامحالہ مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ مجھے اس بات کا اطمینان تو تھا' اس وقت ہم تبدیل شدہ حلیوں میں تھے لہٰذا وہ ہمیں پہچان نہیں سکتا تھا۔ ہار پر لاج میں وہ ہمیں اصلی صورت شکل میں دیکھ چکا تھا۔

ڈوگ کیننگ کے نزدیک ہی وہ گن بردار کھڑا تھا جسے میں نے سیاہ بریف کیس میں سے گن برآمد کرتے دیکھا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی یقیناً اسی طریقے پر عمل کر کے ہتھیار کو جہاز کے اندر پہنچایا ہوگا۔ ان کا طریقۂ کار بڑا یونیک تھا!

گن بردار شخص نے ڈوگ کیننگ کے سینے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا ''میں مانتا ہوں تم الاسکا کے نیشنل ہیرو ہو لیکن اس وقت تم الاسکا میں ہو اور نہ ہی یہاں جہاز کے اندر کوئی مونٹین اور گلیشئر ہے لہٰذا ہیرو شپ کی کوئی گنجائش نہیں۔ چپ چاپ اپنی سیٹ پر بیٹھے رہو ورنہ......؟''

''ورنہ'' کے بعد گن بردار نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا تھا اور اس ادھورے جملے میں ایک سنگین دھمکی پوشیدہ تھی۔ الفاظ کی قطعیت بتاتی تھی' دھمکی دینے والا کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ شاید انہیں اس سلسلے میں خصوصی ہدایات دی گئی تھیں۔

میری تقلید میں راکیل بھی نیشنل ہیرو کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا ''ہیرو واقعی ہیرو ہوتا ہے!''

''اور زیرو واقعی زیرو ہوتا ہے۔'' یہ ڈاکٹر مونگ کی آواز تھی۔

میں نے جلدی سے پلٹ کر اپنے بائیں پہلو میں دیکھا۔ ڈاکٹر مونگ ''بیدار'' ہو چکا تھا اور خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ہیرو بننا اتنا مشکل نہیں جتنا ہیرو شپ کو برقرار رکھنا۔ حالات و واقعات دشمنی پر اتر آئیں تو ہیرو کو زیرو بننے میں ایک لمحہ نہیں لگتا۔'' تھوڑے توقف کے بعد اس نے اضافہ

کیا ''گن بردار کچھ غلط نہیں کہہ رہا۔ واقعی یہاں جہاز میں کوئی پہاڑ نظر آ رہا ہے اور نہ ہی کوئی برفانی تودہ دکھائی دیتا ہے!''

ڈاکٹر مونگ کے جملے کی معنی آفرینی پر میں غور کر ہی رہا تھا کہ اسپیکر آن ہو گیا۔ اعلان کرنے والا نیشنل ہیرو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ڈوگ کیننگ! ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ آپ لوگوں کی سلامتی کو اس بات سے مشروط کیا گیا تھا کہ آپ کسی قسم کی بدامنی پھیلانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ اگر آپ لوگ اپنے جذبات کو قابو میں رکھو گے تو تم لوگوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی جائے گی۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ سب کو یاد دلاتا ہوں کہ مسلح نگرانوں سے الجھنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ لوگ شرافت کا ثبوت دیں گے تو محفوظ رہیں گے۔''

بولنے والے کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا وہ کسی بھی وسیلے سے ہمیں دیکھ رہا تھا اور جہاز کی اندرونی صورت حال اس کے علم میں تھی۔ وہ خاموش ہوا تو ڈوگ کیننگ نے کہا۔

''اپنے دعوے کے مطابق تم لوگ مطلوبہ افراد کو اپنے قابو میں کر چکے ہو لیکن ہم نے جہاز کے اندر کسی قسم کی سرگرمی نوٹ نہیں کی۔ یہ خفیہ آپریشن کب کیا گیا؟''

طیارے کے اندر اس وقت پن ڈراپ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ڈوگ کیننگ گویا تمام مسافروں کا ترجمان بن گیا تھا۔ سب نہایت انہماک سے اسے بولتے ہوئے سن رہے تھے۔

اسپیکر کے توسط سے ہم کلام شخص نے کہا ''جب تم نے اسے خفیہ آپریشن کا نام دے ہی دیا ہے تو یہ بھی ذہن میں رکھو کہ خفیہ کام علی الاعلان نہیں کیے جاتے۔ ہم نے بھی نہایت چابکدستی سے اپنے مطلوبہ افراد کو اپنی دسترس میں کیا ہے۔ جہاز میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی کلاس میں تو پہنچے لیکن انہیں سیٹوں پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا' ہم نے بڑی صفائی سے انہیں بیچ ہی میں اچک لیا۔''

''اگر ایک منٹ کے لیے تمہاری بات کا یقین کر لیا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے' اس وقت وہ تینوں افراد کہاں ہیں؟'' ڈوگ کیننگ واقعی بڑی جرأت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

اسے جواب دیا گیا...... گویا طیارے کے مسافروں کو بتایا گیا ''اس وقت ہمارے تینوں مطلوبہ افراد جہاں بھی ہیں وہ ہماری گرفت میں ہیں۔ پائلٹ ہمارے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور ہے کیونکہ سیکڑوں افراد کی سلامتی کا سوال ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کو پائلٹ ہمارا اپنا آدمی ہے۔ اس لیے بھی ہمیں کافی آسانیاں حاصل ہو گئیں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''یہ تفصیل بتانے کا ایک خاص مقصد ہے کہ آپ لوگوں کے ذہن صاف ہو جائیں تاکہ چند گھنٹوں کے اس سفر میں آپ ہمارے لیے مشکلات کھڑی کرنے کے بارے میں نہ سوچیں۔ ایک بات کا یقین کر لیں کہ یہ جہاز اپنے تمام تر عملے کے ساتھ اس وقت مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہے لہٰذا کسی بھی قسم کی مہم جوئی آپ لوگوں کو کسی بھی بھیانک انجام سے دوچار کر سکتی ہے۔''

ڈوگ کیننگ سوال کرنے سے باز نہ آیا۔ اس نے پوچھا ''اس جہاز کے اغوا اور ان تین افراد کو یرغمالی بنانے سے آپ لوگ اپنا کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

یہ ایک نہایت ہی حساس اور اہم سوال تھا۔ مجھے امید تھی ڈوگ کو ڈانٹ پھٹکار کر چپ کرا دیا جائے گا۔ میں پوری توجہ سے اسپیکر سے ابھرنے والے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ میری توقع کے برعکس ڈوگ کو بتایا گیا۔

''ہمارا ایک بہت ہی خاص الخاص آدمی نیویارک کی جیل میں بند ہے۔ ہمیں اس کی رہائی چاہیے...... نہایت ہی محفوظ اور یقینی رہائی!'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''جب ہمارا آدمی صحیح سلامت ہماری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جائے گا تو ہم ان تین یرغمالیوں کو آزاد کر دیں گے۔''

''اور جہاز کے باقی مسافر؟'' ڈوگ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''میں نے بتایا نا' آپ لوگوں سے ہماری کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی دوستی۔'' اس شخص نے دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''آپ لوگوں کی حیثیت اس وقت گھن کی سی ہے جو گیہوں کے ساتھ ساتھ ہے۔ ہم اپنی منزل پر پہنچ کر ذمے دار افراد سے بات کریں گے۔ اگر ہمارا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو ہم اپنے مطلوبہ افراد کو جہاز سے اتار کر اس جہاز کو پرواز کی اجازت دے دیں گے۔ اس جہاز میں اتنا ایندھن موجود ہے کہ تم لوگ اس مقام سے بہ آسانی اپنی منزل یعنی سیٹل تک جا سکو گے۔''

اس شخص کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں کی منزل زیادہ دور نہیں تھی اور ہم چند گھنٹوں میں کہیں لینڈ کرنے والے تھے۔ اعلان کرنے والے شخص نے ابتدا میں بتایا تھا' ہم ''گلف آف الاسکا'' کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ اس فلائٹ کی سمت شمال سے جنوب کی جانب تھی...... اور اس جنوبی سمت میں سیکڑوں میلوں تک پیسفک اوشین (بحرالکاہل) پھیلا ہوا تھا۔ اس بحرِ بے کراں

میں خال خال چھوٹے بڑے جزیرے واقع تھے۔ پتا نہیں اغوا کنندگان نے اپنی منزل کے طور پر کس جزیرے کو چن رکھا تھا!

الاسکا کا ہیرو اپنے سوالات کے خاطر خواہ جواب پا کر کچھ زیادہ ہی ہمت پکڑ بیٹھا۔ اس نے اسپیکر سے بولنے والے سے پوچھا ''ان تین افراد کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے جنہیں تم نے اس وقت یرغمال بنا رکھا ہے؟''

''تمہیں جاننے کا مرض ہے تو سنو۔'' جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا گیا ''وہ تینوں افراد یہ ہیں...... بروس لولز' فران بوٹیل اور ٹونی ووڈلر!''

''اوہ!'' ڈوگ کینگ نے ایک تشویش بھری سانس خارج کی ''یہ تو یہاں کی ہائی اتھارٹیز ہیں۔ خاص طور پر بروس لولز تو الاسکا کے لیے بہت اہم ہے۔''

''بے شک ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''لیکن میں نے اپنے جس آدمی کا ذکر کیا ہے' وہ ہمارے لیے ان سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہم جیف ہولڈنگ کی رہائی کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارا ٹارگٹ بروس لولز ہے۔ اس کے دو ساتھی تو بونس میں ہیں۔''

جیف ہولڈنگ یقیناً اس شخص کا نام تھا جو نیویارک کی جیل میں بند تھا۔ یہ کوئی لیڈر یا سرغنہ ٹائپ شخصیت معلوم ہوتا تھا۔ ڈوگ کینگ نے بڑے محتاط الفاظ میں سوال کیا۔

''اگر اعلیٰ احکام تمہارے ساتھی جیف ہولڈنگ کی رہائی پر تیار نہ ہوئے تو؟''

''تو ہم بھی اپنی مرضی کے لیے آزاد ہوں گے۔'' بڑی سفاکی سے کہا گیا۔

''یہ تو سراسر زیادتی ہوگی؟'' ڈوگ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''یہ سوچنا اعلیٰ حکام کا کام ہے۔''

''تم وعدہ کر چکے ہو کہ طیارے کے مسافروں سے تمہاری کوئی دشمنی نہیں اور......''

''اور اب تمہاری کسی بکواس کی گنجائش نہیں!'' ان الفاظ کے ساتھ ہی اسپیکر خاموش ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں مسلح افراد نے بڑی کام کی پوزیشنز سنبھال لیں۔ وہ ایک دم ہائی الرٹ ہو گئے تھے جیسے فوری طور پر کسی بدامنی کا اندیشہ ہو مگر ایسا کچھ نہیں ہوا حتیٰ کہ ڈوگ کینگ بھی بڑے مایوسانہ انداز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس گفتگو کے بعد صورت حالات سب پر واضح ہو چکی تھی۔ کوئی مسافر بھی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس لیے طیارے کی اندرونی فضا پر ایک سکوت نما بوجھل پن طاری ہو گیا۔

اغوا کنندگان کے عزائم کھل کر سامنے آئے تو تشویش ہوئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا' کسی نامعلوم منزل پ ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اغوا کنندگان کے اعلان کرنے نمائندے کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا' اگر ان کا مطالبہ تو وہ ان ہائی اتھارٹیز کے ساتھ ساتھ جہاز کے مسافر بدترین سلوک سے گزاریں گے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہو یونہی بے بسی کی حالت میں شکار کر لیے جائیں!

اس خیال نے میرے تن بدن میں ایک دوڑائی۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کرنا چاہیے...... کچھ بھی! کوئی ایسا داؤ' کوئی ایسا پان چاہیے کہ بازی الٹ کر رہ جائے۔ زیر' زبر اور زبر' زیر جائے۔ میرے ذہن میں یہ ترنگ اٹھی تو میں نے مشور والے انداز میں ڈاکٹر موننگ سے کہا۔ میں نے اپنی آ الامکان دھیما رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''کیا ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے؟''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور سرگوشیا میں بولا ''تم کچھ کرنا چاہتے ہو؟''

''ہم جہاز کے عام مسافر نہیں ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''جو حالات سے سمجھوتا کر کے خاموشی کر لیں۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا ہے...... بلکہ ایک ش سی محسوس ہو رہی ہے۔'' میں اس وقت قدرے جھنجلایا

''کبھی میں بھی تمہاری طرح بہت جوشیلا ہوا کر وہ بہ دستور نیچی اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ''خیر کچھ ہیں!''

ڈاکٹر موننگ ریفوشے نے آخری جملہ اس انداز کیا تھا کہ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے پر مجبور ہو گ لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔

''کارشا آج تک کسی ہوائی جہاز کے کاک نہیں گئی۔ مجھے بھی کسی فلائنگ کلب میں ٹریننگ حاصل کا اتفاق نہیں ہوا۔ کیا تم جہاز اڑانا جانتے ہو؟''

ڈاکٹر موننگ کے سوال نے مجھے گڑبڑا دیا۔ میں میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''نن...... نہیں!''

''ا......'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو مسافروں کی جانب منہ کر کے بہ آوازِ بلند پوچھنے لگا' ''خواتین و حضرات میں سے کسی کو جہاز اڑانا آتا ہے؟''

مسافروں کے بولنے سے پہلے ہی گن بردار لہجے میں کہا ''او مسٹر! امن سے بیٹھو۔ ورنہ بھیجا اڑا کر ر گا۔''

ڈاکٹر مونگ کسی فرماں بردار بچے کے مانند خاموشی سے بیٹھ گیا۔

دیگر مسافر ڈاکٹر مونگ کو ناپسندیدہ نظروں سے تکنے لگے۔ گویا ان کی دانست میں ڈاکٹر نے ایک ایسی جرأت کی تھی جو ان سب کی زندگیوں کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ اس سے مسافروں کا مجموعی رویہ واضح ہوگیا۔ ان بے چاروں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ کر مصالحتی خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اغوا کنندگان سے الجھنے کو تیار نہیں تھا...... بہ شمول ڈوگ کیننگ!

میں نے ڈاکٹر مونگ کی جانب جھکتے ہوئے بڑے احترام بھرے انداز میں سرگوشی کی ''یہ کیا حرکت تھی؟''

وہ میری جانب دیکھے بغیر بولا ''مسٹر ڈسلوا! یہ طیارہ اس وقت ہزاروں فٹ کی بلندی پر نارتھ پیسفک اوشین کے اوپر پرواز کررہا ہے' اس طیارے کا کو پائلٹ اغوا کنندگان کا آدمی ہے۔ پائلٹ ان کے اشاروں پر حرکت کرنے پر مجبور ہے۔ ہم میں سے کوئی جہاز اڑانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ تو کیا......؟'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور بہ دستور میری طرف دیکھے بنا بولا۔

''ایسی صورت میں کسی قسم کی مہم جوئی مناسب ہوگی؟ بحرالکاہل بہت ہی ظالم سمندر ہے ڈسلوا۔ اگر ہماری کسی سرگرمی کے نتیجے میں جہاز کو کوئی خطرناک صورتِ حال پیش آگئی تو دنیا کی کوئی لیبارٹری یہ نہیں بتا سکے گی کہ کون سی شارک کے پیٹ میں کون سا مسافر ابدی نیند سو رہا ہے لہٰذا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

''صبر کرو...... اور انتظار کرو۔ ذرا اس جہاز کو کسی زمین پر قدم رکھنے دو پھر دیکھتے ہیں کیا ہوسکتا ہے۔ ہم کیا کرسکتے ہیں!''

میں نے ایک طویل سانس لی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ ڈاکٹر مونگ کا کہنا بالکل درست تھا۔ کسی بھی مؤثر کارروائی کے لیے ہمیں جہاز کی لینڈنگ کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

رات کے آخری پہر ٹی ڈبلیو اے کے بوئنگ سیون فور سیون نے کسی بحرالکاہلی جزیرے کی سرزمین کو چھولیا۔ تھوڑی دیر پہلے اس بات پر ہمارا یعنی مسافروں کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ ہم نے امن و امان کی صورتِ حال میں کوئی رخنہ نہیں ڈالا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں سیفٹی بیلٹس باندھنے کی ہدایت بھی کی گئی تھی۔ سیفٹی بیلٹس باندھنے کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ ہم لینڈ کرنے والے تھے۔ اس اعلان نے مسافروں میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑا دی تھی تاہم اس خوشی میں بھی ایک خاص نوعیت کی تشویش شامل تھی۔ بے منزل ہونے کی تشویش آئندہ پیش آنے والے غیر یقینی حالات کا اندیشہ!

مجھے کئی مرتبہ بائی ائر سفر کرنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن لینڈنگ مجھے بڑی عجیب محسوس ہوئی۔ بے ترتیب اور غیر معمولی جھٹکوں سے اندازہ ہوا کہ ہمارا جہاز کسی باقاعدہ رن وے پر نہیں دوڑ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ کسی ائرپورٹ کا رن وے نہ ہو بلکہ لینڈنگ کے لیے کوئی ہنگامی ٹریک تیار کر لیا گیا ہو۔ یہ صورتِ حال خاصی مخدوش اور فکر انگیز تھی۔ معلوم نہیں ہمیں کس گمنام اور ویران جزیرے پر اتارا جارہا تھا۔

جہاز رکا تو سب کی جان میں جان آئی۔ جیسے تیسے جہاز ایک محفوظ لینڈنگ میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس بحفاظت لینڈنگ میں پائلٹ کی حاضر دماغی اور مہارت بھی شامل تھی جب کہ وہ گزشتہ چند گھنٹوں سے گن پوائنٹ پر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا...... اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی! جہاز کے رکتے ہی نگران افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ جہاز کے مسافروں کو کنٹرول کرنے کے لیے یہ تعداد بڑھ کر تین ہوگئی تیسرے نگران کے ہاتھوں میں ایک آٹومیٹک گن نظر آرہی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر مونگ ریفوشے کو دیکھا۔ اسی وقت وہ مخصوص اسپیکر جاگ اٹھا۔ ہم سب مسافروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جارہا تھا۔

''اس جزیرے کی صبح میں ابھی تھوڑی دیر باقی ہے۔ طیارہ چونکہ بہ خیر و عافیت لینڈ کرچکا ہے اس لیے کسی غم و فکر کی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ بڑے سکون سے ایک مختصری نیند لے سکتے ہیں۔ اس دوران میں ہم متعلقہ اعلیٰ حکام سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

وہ منحوس شخص جہاز کے ڈرے سہمے مسافروں کو یوں سونے کا مشورہ دے رہا تھا جیسے وہ اس وقت اپنے بیڈروم میں ہوں اور نیند نے ان کا برا حال کر رکھا ہو۔ شاید اس کا پہلا اعلان پورا نہیں ہوا تھا کہ وہ دوبارہ بولنے لگا۔

''ہمیں امید ہے' مذکورہ متعلقہ حکام عقل مندی سے کام لیں گے اور ہمارے مطالبے کو بلاچون و چرا مان جائیں گے۔ آپ لوگ بھی دعا کریں کہ وہ آپ کے اور ہمارے حق میں فیصلہ کریں تاکہ سورج طلوع ہوتے ہی یہ طیارہ آپ سب کو لے کر سیٹل (SEATTLE) کی جانب پرواز کر جائے۔

تھوڑی تاخیر ہی سے سہی مگر آپ لوگ اپنی منزل پر تو پہنچ جائیں۔'' وہ ذرا دیر کو خاموش ہوا پھر بولا۔

''اب اعلیٰ حکام سے مذاکرات کے بعد آپ لوگوں سے بات ہوگی۔ آپ لوگ اپنی نیند پوری کریں۔ گڈ نائٹ!''

جہاز کے مسافروں میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت ہر شخص یقیناً یہی سوچ رہا ہوگا کہ اگر اعلیٰ حکام نے ہائی جیکرز کا مطالبہ نہ مانا تو اس کا کیا انجام ہوگا! ان غیر یقینی حالات میں نیند کسے آسکتی تھی تاہم اس بات سے قدرے اطمینان حاصل ہوا تھا کہ طیارہ کسی جزیرے کی زمین پر کھڑا تھا۔

مسلح نگرانوں میں جس تیسرے شخص کا اضافہ ہوا وہ خاصا تیز و طرار اور ان دونوں میں سینئر نظر آتا تھا۔ اس نے باری باری دونوں کے پاس جا کر کچھ کانا پھوسی کی پھر اس گزرگاہ کی جانب سے ایک محفوظ پوزیشن سنبھال کر کھڑا ہوگیا جو مسافروں والے حصے کو اس گول سیڑھی تک لے جاتی تھی جہاں سے پائلٹ روم تک پہنچا جاسکتا تھا۔ وہاں سے گزرے بغیر کاک پٹ تک رسائی حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔

نووارد نگران کی ہدایت پا کر پسٹل والا مسلح شخص ایک دم مستعد ہوگیا پھر اس کی مستعدی کا رخ ڈاکٹر مونگ ریفوشے کی جانب مڑ گیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے سیاہ بریف کیس میں سے وہ خطرناک پسٹل برآمد کرتے دیکھا تھا۔ سیٹوں کے درمیان گزرگاہوں میں' نگرانی کے دوران میں اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کرلی تھی۔ جب میں نے پسٹل بردار کو ڈاکٹر مونگ کی طرف بڑھتے دیکھا تو میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس شخص کے تیور خاصے جارحانہ اور سفاک دکھائی دے رہے تھے۔ میری چھٹی حس نے مجھے مطلع کیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگیا۔ پستول بردار ڈاکٹر مونگ سے تین فٹ کے فاصلے پر آکر رک گیا پھر پسٹل سے ڈاکٹر مونگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مسٹر! یو...... گیٹ اپ۔''

ڈاکٹر مونگ نے خاموش نظر سے باری باری مجھے اور رائیل کو دیکھا اور بڑے رسان سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے ڈاکٹر کی اس خاموش نظر میں ایک خاص قسم کا پیغام واضح طور پر پڑھ لیا۔ ڈاکٹر مونگ نے تاثراتی زبان میں مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس موقع پر کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ کروں۔ ڈاکٹر مونگ نے کھڑے ہو کر پستول بردار کی جانب سوالیہ نظر سے دیکھا۔

اس شخص نے ڈاکٹر مونگ کو سیٹ سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور بے رحمی سے بولا ''تمہیں جہاز اڑانے کا بہت شوق ہے نا۔ چلو میرے ساتھ ہم تمہارا جہاز اڑاتے ہیں!''

ڈاکٹر مونگ نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کیا اور اپنی سیٹ سے نکل کر گزرگاہ میں پہنچ گیا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ مجھے شدید قسم کا احتجاج بلکہ ردِعمل ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ اگر میں حرکت میں آجاتا تو اس پستول بردار کی مجال نہیں تھی' وہ ڈاکٹر مونگ کو یوں حکم دیتا مگر ڈاکٹر مونگ کی نگاہ میں موجود وہ خاص تاکید میرے پیشِ نظر رہی اور میں برداشت کی آخری ڈگری پر ثابت قدمی سے جما رہا۔ ڈاکٹر مونگ نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر ہماری سمت نہیں دیکھا۔

پستول بردار' ڈاکٹر مونگ کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے کاک پٹ تک پہنچانے والی گول سیڑھی کی طرف لے جانے لگا تو میرے سینے سے ایک گہری اور اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ ڈاکٹر مونگ کوئی عام مسافر نہیں تھا۔ وہ ایک مرتبہ پائلٹ روم میں پہنچ جاتا تو پھر بازی پلٹنا چنداں مشکل نہ رہتا۔

ڈاکٹر مونگ نظر سے اوجھل ہوا ہی تھا کہ رائیل نے فکر مندی سے پوچھا ''وہ ڈاکٹر مونگ کو کہاں لے گیا ہے؟''

''اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''وج...... ڈسلوا! میں بہت پریشان ہوں۔'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی ''تم تھوڑی دیر کے لیے اس گھماؤ پھراؤ سے باز آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے میں باز آگیا۔'' میں نے اپنے لہجے میں سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا ''میں ایک اندازہ لگا سکتا ہوں۔'' وہ پوری طرح میری جانب متوجہ ہوگئی۔

دراصل اس وقت میرا ذہن کسی اور ہی محاذ پر نبرد آزما تھا۔ رائیل کو محض ٹالنے کے لیے میں وہ چھیڑ چھاڑ کررہا تھا۔ اس تسلسل میں' میں نے کہہ دیا ''میرا خیال ہے' وہاں کاک پٹ میں کوئی کرکٹ میچ ہونے والا ہے۔ اغوا کنندگان نے جہاز کے عملے کو تو پہلے ہی قابو کررکھا ہے۔ ممکن ہے کسی ایک آدھ کھلاڑی کی کمی واقع ہوگئی ہو اس لیے ہنگامی حالات نے انہیں ڈاکٹر مونگ کو بلانے پر مجبور کردیا۔ اب الاسکا کی ہائی اتھارٹیز کو تو وہ کھیلنے کی زحمت نہیں دے سکتے نا!''

''تم نے کہا' میں باز آگیا لیکن تم خاک باز نہیں آئے!'' اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

اسی وقت وہ پستول بردار مجھے نظر آگیا جو ڈاکٹر مونگ کو اپنے ساتھ کاک پٹ کی جانب لے گیا تھا۔ وہ اکیلا تھا اس کا مطلب یہی تھا وہ ڈاکٹر مونگ کو کاک پٹ میں چھوڑ آیا تھا۔

"لو دیکھو وہ آ رہا ہے۔" میں نے رائیکل کے بائیں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ سے دباتے ہوئے کہا "اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو تم خود اس سے پوچھ لو۔"

وہ سرزنش آمیز نظر سے مجھے گھور کر رہ گئی۔ میں نے ...ل بردار پر نگاہ جمادی۔

وہ بڑے چاق و چوبند انداز میں ہمارے پاس سے گزر عقب میں چلا گیا۔ میرے ذہن نے اعلان کر دیا کہ وہ ...ڈاگ گینگ کی طرف جا رہا تھا۔ بے اختیار میں نے پلٹ کر ...کھا تو ذہن کی فراہم کردہ اطلاع بالکل درست نکلی۔ وہ ...ڈاگ گینگ کے پاس کھڑا اس سے کہہ رہا تھا۔

"الاسکا کے نیشنل ہیرو! آپ بھی آ جاؤ۔ ہم نے آپ ...کے لیے بھی تھوڑی بہت شوٹنگ نکالی ہے۔ ادھر آپ کا انتظار ...رہا ہے۔"

ڈوگ نے برہمی سے کہا "میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں ...ؤں گا۔ جو کہنا ہے یہاں سب کے سامنے کہو۔"

پستول بردار کو توقع نہیں تھی، ڈوگ اڑی پر اتر آئے گا۔ ...خاصے جارحانہ انداز میں بولا "ہم تم سے کچھ خاص باتیں ...رنا چاہتے ہیں، جو سب کے سامنے نہیں ہو سکتیں!"

"اور میں تمہارے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گا!" ...وگ حتمی لہجے میں بولا۔

"تم الاسکا کے نیشنل ہیرو ہو۔ یہاں عام مسافروں کے ...رمیان بیٹھے اچھے نہیں لگتے۔" پستول بردار نے طنزیہ لہجے ...ں کہا "یہ تمہاری کلاس نہیں۔ تمہیں تو ہائی اتھارٹیز کے ساتھ ہونا ...ا ہیے۔"

جہاز کے مسافروں میں سے صرف دو افراد نے جرأتِ ...گفتار کی تھی یعنی ڈاکٹر موتنگ اور ڈوگ گینگ۔ اغوا کنندگان کو ...ڑی شدت سے اس بات کا احساس ہوگا کہ یہی دو افراد ان ...کے لیے کوئی بڑی مشکل کھڑی کر سکتے ہیں لہٰذا انہیں بڑی ...صفائی سے وہ کارنر کرنے کے موڈ میں تھے۔ ڈاکٹر موتنگ کو ...ہاں سے لے جایا جا چکا تھا، اب ڈوگ کی باری تھی۔

ڈوگ کسی بھی طور پستول بردار کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھا۔ اسے اپنے ساتھی سے الجھتے دیکھ کر دوسرا گن بردار بھی اس کی مدد کو آ گیا۔ میں بے ساختہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ میرے لیے ایک غیر محسوس اشارہ تھا کہ اب مجھے حرکت میں آ جانا چاہیے کیونکہ کاک پٹ کی جانب سے ایک دھماکے کی آواز ابھری تھی۔

تمام مسافروں کی نگاہیں غیر ارادی طور پر چکر دار سیڑھی کی سمت اٹھ گئیں۔ وہ آواز اس نوعیت کی تھی جیسے ایک شخص نے کسی دوسرے شخص کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا ہو۔ میرے دل نے پکار کر کہا...... ڈاکٹر موتنگ از ان ایکشن!

میں تقریباً اچھل کر اپنی سیٹ سے باہر نکلا اور تیزی سے ڈوگ گینگ کی جانب بڑھ گیا۔ جب ڈاکٹر موتنگ نے ادھر کا محاذ سنبھال لیا تھا تو میں ادھر کیوں کر خاموش بیٹھ سکتا تھا! میں جیسے ہی ان دونوں مسلح افراد کے قریب پہنچا، جہاز کے اندر فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ آواز کی سمت تلاش کرنے میں مجھے بہ مشکل سیکنڈ کا دسواں حصہ لگا ہوگا۔ وہ فائرنگ یقینی طور پر بالائی حصے کے اندر ہوئی تھی۔

اس فائرنگ نے دونوں مسلح نگرانوں کو بوکھلا دیا اور وہ ڈوگ گینگ کو فراموش کر کے بڑی سرعت سے پیچھے پلٹے۔ ان کے عقب میں، میں موجود تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مجھے وہاں پا کر چونکے اور میں نے اسی لمحے کے دوران میں ان کی آؤ بھگت شروع کر دی۔ وہ دو مختلف راہداریوں میں تھے۔

اس گزرگاہ میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ کوئی باقاعدہ فائٹ کی جاتی اور نہ ہی اس کا موقع تھا۔ میں نے قریبی گن بردار کے ہاتھ پر ایک فرنٹ جرک کک رسید کی اور جھکائی دینے والے انداز میں نیچے بیٹھ گیا کیونکہ اسی لمحے دوسرے مسلح نگران نے ردِعمل کے طور پر اپنی گن کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔

گن چلی اور گولی کی مخصوص "ٹھک" نے جہاز کے مسافروں کو چیخنے پر مجبور کر دیا۔ میرا بروقت بیٹھ جانا کام آ گیا ورنہ وہ بے آواز گولی میرے بھیجے کے پار ہو جاتی۔ میں نے جس مسلح نگران کے ہاتھ پر کک ماری تھی وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں پیچھے کو الٹا تھا اور گن اس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی توجہ فائر کرنے والے شخص کی جانب مبذول کر دی کیونکہ وہ دوبارہ مجھے نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ میری مخالف سمت والی گزرگاہ میں تھا۔

اس کا گن والا ہاتھ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے اپنی جگہ سے ڈائیو کیا اور سیٹوں کی مڈل رو کے اوپر سے گزرتے ہوئے دوسری گزرگاہ میں پہنچ گیا۔ اس نے بوکھلا کر اپنے ہاتھ کا زاویہ تبدیل کیا۔ مگر میں اسے کسی فائر کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اس کے گن والے ہاتھ پر ایک جھپٹا مارا اور اس کے ساتھ ہی ٹریگر پر اس کی انگلی دب گئی۔ گن سے ایک اور بے آواز گولی برآمد ہوئی اور ایک مرتبہ پھر جہاز مسافر کی تیز چیخوں سے گونج اٹھا مگر خیریت گزری کہ سابق فائر کی طرح اس گولی نے بھی کسی مسافر کو کوئی جانی نقصان نہ پہنچایا۔ پہلی

گولی ونڈ و گلاس میں لگی تھی جب کہ دوسری گولی نے جہاز کی چھت کا مزاج پوچھ لیا تھا۔

وہ مسلح نگران میری گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ اس کے اسی ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو ایک تیکنیکی مروڑا دیا اور یک جھٹکے سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔

ہڈی ٹوٹنے کی مخصوص آواز ابھری اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر جہاز کے فرش پر جا گری۔ اس کے بعد معتوب شخص کے حلق سے بڑی دردناک آواز خارج ہوئی۔ میں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر گھٹنے کی ایک خوفناک ٹھوکر رسید کی اور وہ بری طرح بلبلاتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ میں نے فوراً اس کی گن فرش سے اٹھا کر اپنے قبضے میں کر لی۔

اس بدلتی ہوئی صورتِ حالات نے مسافروں میں حوصلہ پیدا کر دیا اور پانچ چھے افراد اپنی سیٹوں سے نکل کر اس معتوب شخص پر ٹوٹ پڑے جو فرش پر پڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔ میرے گھٹنے کی ٹھوکر نے اس کی ناک اور ہونٹوں کا کباڑا کر دیا تھا۔ مسافروں نے جس انداز میں اسے دبوچا تھا اس نے مجھے اس شخص کی جانب سے بے فکر کر دیا۔ میں تیزی سے دوسرے نگران کی طرف پلٹا جو میری کک کھا کر چند لمحے پہلے غیر مسلح ہوا تھا۔

میں نے ڈوگ گینگ کو مذکورہ شخص سے دو دو ہاتھ کرتے دیکھا۔ ڈوگ ایک تندرست و توانا کوہ پیا تھا اور اس وقت اغوا کنندگان کی جانب سے اس کا دل و دماغ غم و غصے سے بھی بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے شکار کر بری طرح رگیدتے ہوئے ہاتھ پاؤں سے اس کی خاطر خواہ تواضع بھی کر رہا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے نکل کر ادھر ادھر ہو جانے والی گن کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو اسی لمحے اپنے عقب میں مجھے راکیل کی آواز سنائی دی۔

”یہ میرے پاس ہے ڈسلوا!“ اس نے گن کو لہراتے ہوئے کہا۔

میں نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اور اس کے ہاتھ میں گن موجود پا کر مجھے اطمینان ہو گیا۔ اس مارا ماری کے دوران میں راکیل بھی کسی وقت اپنی سیٹ سے اٹھ کر سرگرم ہو گئی تھی۔ میں نے بڑے ہنگامی انداز میں اس سے کہا۔

”تم ادھر کے معاملات پر نظر رکھو میں ادھر اوپر کاک پٹ کی طرف جا رہا ہوں۔ پتا نہیں ہمارے ساتھی کے ساتھ کیا گزر رہی ہے؟“

بات ختم کرتے ہی میں نے کاک پٹ تک جانے والی گول سیڑھی کی جانب دیکھا۔ میری بے قرار نگاہ کو نگرانوں کے تیسرے ساتھی کی تلاش تھی۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا حالانکہ اسے اپنے دو ”مصیبت زدگان“ ساتھیوں کی مدد کے لیے فوراً لپکنا چاہیے تھا۔ اس کے غیاب کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ آٹو میٹک گن بردار اپنے بالائی ساتھیوں کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں ہونے والی فائرنگ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ہوگا۔ اس نے مسافروں والے حصے کی جانب آنے کے بجائے ادھر جانا ضروری سمجھا ہوگا۔

راکیل مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے کچھ بولنے کو موقع نہ دیا اور کہا ”تم گن تھامے پوری طرح مستعد رہو۔ مجھے امید تو نہیں کہ مشتعل مسافران دو افراد میں اتنی بھی سکت باقی رہنے دیں کہ وہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اڑا سکیں لیکن پھر بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر کہہ رہا ہوں اگر ان میں سے کوئی اسمارٹ بننے کی کوشش کرے تو بے دریغ اس کے سینے میں شگاف ڈال دینا!“

راکیل نے اثبات میں گردن ہلائی اور میں اپنی منزل کی سمت لپک گیا۔

گول سیڑھی پر قدم رکھنے سے پہلے میں نے عقب میں نگاہ دوڑا کر مسافروں والے حصے کا جائزہ لیا اور وہاں کی صورتِ حالات کو ”تسلی بخش“ پایا۔ مسافروں نے امداد باہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دونوں نگرانوں کی ایسی کم تیسی کر دی تھی۔ میں مطمئن انداز میں پلٹ گیا...... اور اسی وقت مجھے ایک زوردار دھکا لگا۔

سیڑھی والے حصے میں سے انسانوں کا ایک ریلا بہہ نکلا۔ وہ کل بارہ یا کم و بیش اتنے ہی افراد تھے۔ ان کے لباس دیکھ کر مجھے ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ جہاز کے عملے سے متعلق تھے۔ مجھے انہی لوگوں کا دھکا لگا تھا اور میں ان میں خلط ملط ہو کر رہ گیا تھا۔ میں جہاز کی ایک ”دیوار“ سے لگا اس ”انقلاب“ کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ بالائی حصے کی جانب سے حرکت کرنے ڈاکٹر مونگ ریفوشے کی آواز ابھری۔

”بے فکر ہو کر جاؤ۔ وہاں کے حالات کو کنٹرول کر لیا گیا ہے۔“ وہ بھگدڑ کے انداز میں کاک پٹ سے نکلنے والے عملے کے افراد سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز میں بڑا اعتماد اور تسلی پائی جاتی تھی ”وہاں کے مسافروں کو تم لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ انہیں اٹینڈ کرو۔ ہری اپ!“

ڈاکٹر مونگ کے اسٹائل نے مجھے بتا دیا کہ وہ پائلٹ روم کے حالات پر قابو پا چکا تھا ورنہ وہ یوں کسی کمانڈر کے مانند

احکام صادر نہ کر رہا ہوتا۔ جب میں نے اس جانب فائرنگ کی آواز سنی تو میں ایک لمحے کے لیے ڈاکٹر کی طرف سے متفکر ہو گیا تھا پھر دوسرے لمحے میں مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور میں دونوں گن بردار نگرانوں سے نبرد آزما ہو گیا۔

جہاز کا عملہ مسافروں والے حصے میں پہنچ کر ادھر ادھر پھیل گیا تو میں بڑی سرعت سے اوپر پہنچ گیا۔ پھر وہاں کے نقشے نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ڈاکٹر مونگ مجھ سے نگاہ ملتے ہی بڑی سنجیدگی سے مسکرایا اور بولا۔

”ڈسلوا!! یہاں کے حالات تو تمہارے سامنے ہیں۔ ادھر کیا پوزیشن ہے؟“

میں نے مسافروں کی ہائی کلاس اور کاک پٹ میں ادھر ادھر نظر گھماتے ہوئے جواب دیا ”ادھر سب خیریت ہے۔ دو مسلح نگرانوں پر قابو پا لیا گیا ہے، تیسرا ادھر ہی آیا تھا مگر یہاں کا تو نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ یہ جہاز تو اب شاید پرواز کے قابل نہیں رہا!“ میں نے چھت تک نصب مختلف قسم کے ڈائلز کے حشر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں اچھی خاصی فائرنگ ہوئی تھی۔

”یہاں ہونے والی فائرنگ نے ان آلات کو وغیرہ کو نقصان پہنچایا ہے۔“ اس نے بتایا ”اگر میں فائرنگ کرنے والے کا زاویہ نہ بگاڑتا تو تینوں مغوی زندہ نہ بچتے۔“

میں نے چونک کر ڈاکٹر مونگ کو دیکھا اور پُرتجسس لہجے میں استفسار کیا ”الاسکا کی ہائی اتھارٹیز کہیں نظر نہیں آرہیں اور وہ اغوا کنندگان......؟“

میرا سوالیہ جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور بولا ”بدھا کا شکر ہے، وہ تینوں زندہ اور محفوظ ہیں اور...... اغوا کنندگان کو میں نے دائمی نیند سلا دیا ہے۔ یہاں ہونے والے معرکے کی تفصیل میں تمہیں بعد میں سناؤں گا۔ بس سمجھ لو، سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ لارڈ بدھا کا بڑا احسان ہے۔“

ڈاکٹر مونگ کے مطابق اسے صرف تین ہائی جیکرز سے نمٹنا پڑا تھا۔ ایک ان کا سرغنہ جو بار بار اعلان کرتا رہا تھا۔ دوسرا شخص کو پائلٹ تھا اور تیسرا وہ گن بردار تھا جو وہاں ہونے والی فائرنگ سے متاثر ہو کر اندر گھس آیا تھا۔ یہ تینوں افراد مردہ حالت میں اس خلا میں ٹھونس دیے گئے تھے جو دونوں پائلٹس کی سیٹوں کے سامنے، پاؤں رکھنے والی جگہ پر واقع ہوتا ہے۔ یہ کارنامہ ڈاکٹر مونگ کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے بار بار کے سوالیہ انداز میں دیکھنے کے نتیجے میں ڈاکٹر مونگ نے جہاز کے پائلٹ سمیت مسٹر بروس نولز اور اس کے دو ساتھیوں فران بوٹیل و ٹونی وولمر کو اس حصے سے ”برآمد“ کر لیا جہاں ائر ہوسٹس مسافروں کی خاطر تواضع کے لوازمات جمع رکھتی ہیں۔ مسافروں کی ہائی کلاس میں اتفاق سے الاسکا کی صرف یہی تین اتھارٹیز سفر کر رہی تھیں اس لیے ڈاکٹر مونگ کو زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی ورنہ جانی نقصان کا اندیشہ بہرحال تھا! اب چونکہ جہاز کے کسی حصے میں کوئی ”خطرہ“ موجود نہیں تھا اس لیے وہ اہم افراد سامنے آگئے جن کی خاطر اس بوئنگ کو ہائی جیک کیا گیا تھا۔

جہاز کا عملہ معاملات سنبھال چکا تو مسافروں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ یہ جان کر سب میں زندگی دوڑ گئی تھی کہ وہ ہائی جیکرز کے چنگل سے نکل آئے ہیں۔ دو ہائی جیکرز کو حراست میں لے کر ان پر کڑی نگرانی مقرر کر دی گئی۔ یہ وہی دو افراد تھے جو مسافروں کو کنٹرول کرنے کا فرض ادا کر رہے تھے۔ میری بروقت مداخلت نے انہیں کہیں کا نہیں رہنے دیا تھا۔

مسٹر بروس نولز اور اس کے دونوں ساتھی بری طرح سہمے ہوئے تھے اور بار بار ڈاکٹر مونگ کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ وہ ڈاکٹر مونگ کو یوآن ماؤ کے نام سے پکار رہے تھے کیونکہ ہماری طرح وہ بھی تبدیل شدہ نام سے سفر کر رہا تھا۔ ہم تینوں کے حلئے بھی تبدیل تھے۔

جب حالات قابو میں آگئے تو جہاز کے پائلٹ گلفورڈ نے سب سے پہلے کاک پٹ میں نصف خلائی آلات اور مختلف ڈائلز کا تکنیکی جائزہ لیا۔ اس جائزے کے بعد اس نے اعلان کیا کہ وہ جہاز فوری طور پر پرواز کے قابل نہیں رہا تھا۔

مسٹر بروس نولز اور پائلٹ گلفورڈ کی باہمی کوشش سے ہینکر یج اور سیٹل کے متعلقہ حکام کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا گیا۔ یہ بھی معلوم کر لیا گیا کہ ہائی جیکرز نے وہ طیارہ زونارا آئی لینڈ کے ایک زیرِ تکمیل ائر پورٹ پر اتارا تھا۔ زونارا آئی لینڈ میں صرف ایک باقاعدہ ائر پورٹ تھا جہاں ریگولر فلائٹس کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ یہ دوسرا ائر پورٹ جو ابھی تکمیل کے آخری مراحل میں تھا، ابھی فلائٹس کے لیے کھولا نہیں گیا تھا۔ اس کے رن وے کو بھی ابھی فائنل ٹچ نہیں دیا گیا تھا اس لیے میں نے لینڈنگ کی ناہمواری فوراً محسوس کر لی تھی۔

متعلقہ حکام نے فوری طور پر جہاز خالی کرنے کے احکام صادر کر دیے۔ اس سلسلے میں زونارا آئی لینڈ کے ریگولر ائر

پورٹ سے رابطہ کر کے ماہرین کی ایک ٹیم کو وہاں سے طلب کر لیا گیا جو مسافروں کو بہ حفاظت یہاں سے وہاں لے جاتے۔ جب تک ان کا کوئی مناسب بندوبست ہوتا، انہیں کسی پُرسکون جگہ پر ٹھہرانا ضروری تھا۔ ان ماہرین کی ٹیم میں وہ انجینئرز بھی شامل تھے جو جہاز کا باقاعدہ "چیک اپ" بھی کرتے کہ اس کا، زیر تکمیل ائر پورٹ پر یونہی کھڑا رہنا کہیں خطرناک تو نہیں!

ٹی ڈبلیو اے کا وہ بوئنگ سیون فور سیون جس ائر پورٹ پر اتارا گیا اس کا نام "کاشی ہارا" تھا جبکہ ریگولر ائر پورٹ "بورونارا" کہلاتا تھا۔ آئندہ ایک گھنٹے میں ہمیں کاشی ہارا سے بورونارا پہنچا دیا گیا۔ لگ بھگ دو سو مسافروں کو فوری طور پر کسی ایک ہوٹل میں ٹھہرانا تو ممکن نہیں تھا اس لیے ائر پورٹ کی گاڑیوں نے مسافروں کو مختلف ہوٹلوں تک پہنچا دیا۔ مجھے، راکیل اور ڈاکٹر مونگ ریفو شے کو ان تین افراد کے ساتھ "ہوٹل ائر پورٹ" میں ٹھہرایا گیا جن کی خاطر وہ طیارہ اغوا کیا گیا تھا۔ مذکورہ ہوٹل ائر پورٹ سے واکنگ ڈسٹینس پر تھا۔ ہمیں اپنے قریب رکھنا مسٹر برومس نولز کی خواہش تھی کیونکہ اس پورے آپریشن کا کریڈٹ ہمارے کھاتے میں آ رہا تھا...... اور یہ خاصا فکر انگیز نکتہ تھا۔

یہ ٹھیک ہے، میری اور ڈاکٹر مونگ کی کارروائی سے ہائی جیکرز پر قابو پا لیا گیا تھا۔ زندہ ہاتھ آنے والے دونوں ہائی جیکرز کو فوراً ائر پورٹ پولیس کے حوالے کر دیا گیا تھا لیکن ہمیں ہیرو بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا، وہ حالات کا تقاضا تھا۔ اب اس کامیاب آپریشن کے بعد جو حالات سامنے آئے تھے، وہ اس بات کے متقاضی تھے کہ جلد از جلد الاسکا کی ہائی اتھارٹیز سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے ورنہ وہ ہماری جگہ جگہ نمائش کرتے پھریں گے۔ ہمیں اعلیٰ حکام کے علاوہ پریس اور مختلف ٹی وی چینلز کے عملے کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔ مختلف اخبارات کے نمائندے انٹرویوز کے لیے ہماری جان کھائیں گے اور ہم یہ سارے بکھیڑے افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا مشن بہت اہم تھا۔ اگر ہم ان چونچلوں میں گھر جاتے تو ہماری راہ کھوٹی ہونے کا اندیشہ تھا...... اور اس کے ساتھ ہی یہ خدشہ بھی موجود تھا کہ کہیں ہماری اصلیت کسی پر ظاہر نہ ہو جائے! امریکی پریس اور پولیس بہت طاقت ور اور بے انداز ذرائع کی مالک ہے لہٰذا کسی قسم کا رسک لینا عقل مندی کے منافی تھا۔ اگر برومس نولز ہمیں اپنے ساتھ گانٹھے رکھتا تو قدم قدم پر پولیس اور پریس سے سامنا ہونا لازمی بات تھی...... اور "ہمیں" بڑی سرگرمی سے تلاش بھی کیا جا رہا تھا!

میں نے ہوٹل کی جانب جاتے ہوئے تہیہ کر لیا کہ مسٹر برومس نولز کا دم چھلا بننے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں پہلی فرصت میں کوشش کر کے الاسکا کی اس ہائی اتھارٹی سے جان چھڑانا ہوگی۔ کس طرح؟ اس کے بارے میں ڈاکٹر مونگ سے مشورہ کر کے ہی کوئی لائحہ عمل بنایا جا سکتا تھا۔

زونارا آئی لینڈ پر انتہائی مختصر قیام کے دوران میں مجھے اس جزیرے کے بارے میں جو چیدہ چیدہ معلومات حاصل ہوئیں ان کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں، میں بورونارا ائر پورٹ سے معلوماتی باتصویر کتابچہ اٹھا لایا تھا اور ہوٹل ائر پورٹ کے استقبالیہ سے بھی کافی مواد حاصل ہو گیا تھا۔

پہلی مرتبہ ایک ڈچ سیاح نے سولہ سو تیس عیسوی میں اس جزیرے پر قدم رکھا پھر اٹھارہ سو پینتالیس عیسوی میں مختلف جگہوں پر جب خانہ جنگیوں کا سلسلہ موقوف ہوا تو زونارا آئی لینڈ پر باقاعدہ حکومت قائم ہوگئی اور کنگ ژولا اول برسراقتدار آیا۔ اٹھارہ سو نوے عیسوی میں کنگ ژولا دوئم نے تخت سنبھالا۔ انیس سو تیس عیسوی میں کنگ ژولا سوئم بادشاہ بنا اور انیس سو چھتر عیسوی میں کنگ ژولا چہارم نے حکومت کی باگ ڈور تھام لی۔ اس وقت اسی بادشاہ کی بادشاہت تھی۔ کنگ ژولا چہارم کا نام توہارا ژولا تھا۔ توہارا ژولا انیس سو اٹھائیس عیسوی میں پیدا ہوا تھا۔ اب وہ خاصا معمر ہو چکا تھا۔

زونارا آئی لینڈ نارتھ پیسفک اوشین میں پینتالیس ڈگری نارتھ اور ایک سو پچپن ڈگری ویسٹ میں واقع ہے۔ یہ اتنا چھوٹا سا جزیرہ ہے کہ عام طور پر نقشہ جات میں اس کی نشاندہی مشکل سے ملتی ہے۔ زونارا آئی لینڈ میں بادشاہت قائم ہے۔ اس کی کل آبادی لگ بھگ پندرہ ہزار ہے اور رقبہ صرف ایک سو تیس مربع میل۔ اس کا کیپیٹل بورونارا ہے، دوسرا بڑا "شہر" کاشی ہارا ہے جہاں نیا ائر پورٹ زیر تعمیر ہے۔ مقامی زبان زونارین اور انگلش برابر کی اہمیت کی حامل ہیں اور انہیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آبادی میں اکثریت پولی نیشیائی اور یورپی افراد کی ہے۔ یہاں کی کرنسی ڈرم کہلاتی ہے۔ تین ڈرم ایک امریکی ڈالر کے برابر ہوتے ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں کیلا، بانس، کوکونٹ اور ونیلا وغیرہ شامل ہیں۔ معیشت کا دارومدار ماہی گیری اور سیاحوں کی آمد و رفت پر ہے۔ یہاں کے باسیوں میں ہر دوسرے آدمی کے پاس ایک ریڈیو موجود ہے اور ہر بیس افراد میں ایک کو ٹیلی فون کی سہولت میسر ہے۔ پڑھے لکھے افراد کا تناسب اکانوے فیصد ہے۔

ویسے تو اریب قریب میں زونارا آئی لینڈ کا کوئی پڑوسی دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر دور دراز نگاہ دوڑائی جائے تو جنوب مشرق میں ''مڈوے آئی لینڈ'' اور انتہائی جنوب میں مشہور ''جزیرہ ہوائی'' نظر آجاتا ہے۔ یہی اس کے دو ممکنہ ہمسائے ہیں۔

ہم ہوٹل ائرپورٹ میں پہنچ کر تھوڑے ریلیکس ہوئے ہی تھے کہ مسٹر بروس نولز ہمارے کمرے میں آگیا۔ الاسکا کی اس ہائی اتھارٹی کو ہم روک نہیں سکتے تھے لہٰذا اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔

اب وہ خاصا ہشاش بشاش دکھائی دیتا تھا۔ جہاز کے اندر جس سراسیمگی نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ اب وہ دور دور نظر نہیں آرہی تھی۔ جہاز کے زمین سے لگنے اور متعلقہ حکام سے رابطہ ہوجانے کے بعد اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی اور اس وقت وہ پوری شان و شوکت کے ساتھ واقعی الاسکا کی ہائی اتھارٹی لگ رہا تھا۔

''مسٹر یو آن ماؤ!'' اس نے ڈاکٹر مونگ ریفوشے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''آپ لوگوں نے آج جو کارنامہ انجام دیا ہے، وہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔''

اس گفتگو سے پہلے ہمارا مختصر تعارف کرادیا گیا تھا۔ میں ڈسلوا اور راکیل' گارشیا سیٹل سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر مونگ نے احتیاط کے تقاضے نبھاتے ہوئے ہمارے ضروری کاغذات بھی اسی مناسبت سے تیار کروا لیے تھے۔ ہم دونوں دوست تھے اور مسٹر یو آن ماؤ سے ملنے اینکریج آئے تھے اور اب وہ ہمارے ساتھ سیٹل جارہا تھا۔

یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ ڈاکٹر مونگ' اینکریج میں یو آن ماؤ کے نام سے رہائش پذیر تھا اور وہاں ایک مارشل آرٹس سینٹر چلاتا تھا۔ اس کے اصل نام اور کام سے قابل اعتماد اور قریبی لوگ ہی واقف تھے۔ ہم تینوں اس وقت تبدیل شدہ حلیوں میں تھے۔ میرا اور راکیل کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن ڈاکٹر مونگ کی طرف سے مجھے ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ اس نے تو اپنی چوٹی تک کاٹ ڈالی تھی' حلیے میں ردوبدل الگ تھا۔ بروس نولز اس کی طرف سے کسی بھی وقت کھٹک سکتا تھا۔

''ہم نے جو کچھ بھی کیا' وہ انسانیت کے ناتے ہمارا فرض بنتا تھا۔'' ڈاکٹر مونگ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اس افسوس ناک واقعے کو ہم نے جس طرح نپٹایا ہے' اس سے آپ کو مارشل آرٹس کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہوگا۔''

''بالکل...... بالکل......'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''یہ تمام ترفنون واقعی بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔''

''مجھے امید ہے' آپ اینکریج میں میرے سینٹر کی سرپرستی کریں گے۔'' ڈاکٹر مونگ نے کہا۔

''بے شک!'' بروس نولز نے بڑے قطعی اور تعاون آمیز لہجے میں کہا ''میں تمہارے نام اور مارشل آرٹس سینٹر سے تو واقف ہوں لیکن روبرو آج پہلی مرتبہ ملاقات ہورہی ہے۔ تم فکر نہ کرو' مجھ سے جو بھی ہوسکا' میں تمہارے سینٹر کی ترقی کے لیے ضرور کروں گا۔''

''تھینک یو سوچ!'' ڈاکٹر مونگ نے تشکرانہ انداز میں گردن کو جھکاتے ہوئے کہا۔

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ یہ جان کر قدرے تسلی ہوئی کہ بروس نولز ڈاکٹر مونگ کو چہرے سے نہیں پہچانتا تھا۔ تاہم ایک کانٹا سا بدستور میری سوچ میں چبھ رہا کہ جب بروس نولز اینکریج میں ڈاکٹر مونگ کو سینٹر چلاتے دیکھے گا تو اس کے تاثرات کیا ہوں گے۔ وہاں ڈاکٹر مونگ اپنے اصلی حلیے بشمول چوٹی کے رہ رہا تھا۔ یہ ایک ایسا گمبھیر مسئلہ تھا کہ اس پر ڈاکٹر مونگ سے بات کیے بنا میری تشفی نہیں ہوسکتی تھی۔

بروس نولز نے بڑے سرسری انداز میں کہا ''میں دراصل اس وقت آپ لوگوں کو ایک اہم اطلاع دینے آیا تھا۔ میں نے اعلیٰ حکام اور متعلقہ تمام افراد سے بڑی تفصیلی بات چیت کرلی ہے۔ ہماری یہاں سے روانگی کل دن میں گیارہ بجے ممکن ہوسکے گی۔ بورونارا ائرپورٹ سے کل گیارہ بجے ایک فلائٹ ہونولولو (جزیرہ ہوائی) جانے والی تھی۔ اس فلائٹ کو ہنگامی بنیادوں پر کینسل کر کے ہمارے لیے مختص کردیا گیا ہے۔ ہم کل گیارہ بجے مذکورہ فلائٹ سے سیٹل روانہ ہوسکیں گے۔ آپ لوگ اطمینان سے لمبی تان کر سو جاؤ۔ صبح آرام سے اٹھو' پھر ملاقات ہوگی۔''

میں نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں کہا ''مسٹر بروس نولز! جس فلائٹ کا آپ نے تذکرہ کیا ہے' اس کے ریگولر مسافروں کا کیا ہوگا۔ وہ تو اس سیٹ اپ سے سخت برہم ہوں گے!''

''ان کے لیے متبادل بندوبست کردیا گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

وہ یہ بات ایسے کہہ رہا تھا جیسے کسی مرکزی سڑک کی تعمیر ہورہی ہو اور اس سڑک سے ریگولر گزرنے والوں کے لیے ''متبادل راستہ'' کا بورڈ نصب کردیا جائے۔ میں نے پوچھا ''کس قسم کا متبادل بندوبست کیا گیا ہے؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''اسی ائرپورٹ سے دوپہر دو بجے ایک فلائٹ فجی جانے والی ہے۔ اس فلائٹ میں اچھی خاصی گنجائش تھی۔ ہوائی جانے والی فلائٹ کے مسافروں کو فجی (FIJI) جانے والی فلائٹ میں بٹھایا جائے گا۔ مذکورہ فلائٹ ہونولولو میں بریک جرنی کرے گی پھر اپنی منزل فجی کی طرف روانہ ہوجائے گی۔ ہونولولو (جزیرہ ہوائی) کے مسافر راستے میں اتر جائیں گے۔ بس اتنی سی بات ہے!''

''یہ جو بس اتنی سی بات ہے...... یہ خاصی بڑی بات ہے مسٹر بروس نولز۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''ائر ٹریفک کے اسکیجوئل میں ایسی تبدیلیاں کرانا کوئی...... معمولی کام نہیں۔''

''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''لیکن جب ہمارے اعلیٰ حکام اوپر سے ڈوریاں ہلاتے ہیں تو ہر ناممکن کام ممکن ہوجاتا ہے۔''

اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا تفاخر سا ابھر آیا۔ یہ مخصوص احساس امریکا بہادر اور پوری یہودی قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں نے بروس نولز کے دعوے کے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور محض گردن کو اثباتی جنبش دے کر رہ گیا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ہمیں ''گڈ نائٹ'' کہہ کر کمرے سے رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر مونگ سے کہا ''میرے خیال میں اچھی خاصی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ بروس نولز آج پہلی مرتبہ یو آن ماؤ سے بالمشافہ ملا ہے۔ تمہارا یہ بدلا ہوا حلیہ اس کے ذہن میں نقش ہو کر رہ جائے گا۔ اغوا کنندگان سے نمٹنے والا واقعہ اتنا بڑا اور اہم ہے کہ اینکریج میں یہ شخص تم سے ضرور ملے گا۔ وہ الاسکا کی ہائی اتھارٹی ہے۔ تمہارے لیے بڑی مشکل ہوجائے گی ڈاکٹر مونگ۔ تم اس تبدیل شدہ حلیے کے ساتھ تو اپنا مارشل آرٹس سینٹر نہیں چلا سکتے۔''

''میرے حلیے اور چوٹی کے مسائل تو اس وقت درپیش ہوں گے جب میں اینکریج پہنچوں گا۔'' ڈاکٹر مونگ نے پُرسوچ انداز میں کہا ''فی الحال تو میں فوری طور پر اس شخص سے جان چھڑانے کے بارے میں ذہن دوڑا رہا ہوں۔ اگر یہ ہمارے ساتھ چپکا رہا تو سمجھ لو سیٹل پہنچ کر ہمارا جلوس نکل جائے گا۔ ہم پریس اور پولیس کے جھمیلوں میں ایسے پھنسیں گے کہ ہمارا راز' راز نہیں رہ سکے گا...... اور یہ بہت برا ہوگا۔''

تشویش ناک انداز میں بات ختم کر کے ڈاکٹر مونگ خاموش ہوا تو میں نے کہا ''میں بھی اس جزیرے ''زونارا'' پر اترنے سے لے کر اب تک اسی نکتے پر غور کررہا ہوں۔ اگر ہم نے خود کو ان ہائی اتھارٹیز سے الگ نہ کیا تو ہمارا مشن تو کھوٹا ہوگا ہی' اس کے ساتھ ہی یہ راز بھی فاش ہوجائے گا کہ راکیل اور وجدان' یو آن ماؤ کی پناہ میں ہیں پھر یہودی لابی یہ جاننے میں قطعی دیر نہیں لگائے گی کہ یو آن ماؤ کا تعلق بدھ ازم سے ہے اور پھر وہ لوگ کڑی سے کڑی ملاتے جائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

ڈاکٹر مونگ نے خلا میں گھورتے ہوئے بڑے پُرمعنی انداز میں گردن ہلائی۔

راکیل کافی دیر سے خاموش بیٹھی ہمارے مابین ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ راکیل' ڈاکٹر مونگ کے سامنے بڑی باادب' باملاحظہ' ہوشیار رہتی تھی۔ اس معاملے پر اس نے لب کشائی کی اور مشورہ دینے والے انداز میں بولی۔

''میرا خیال ہے' ہمیں اس ہوٹل سے غائب ہوجانا چاہیے۔''

میں نے اور ڈاکٹر مونگ نے چونک کر اسے دیکھا۔

ڈاکٹر نے صرف ایک لفظ میں استفسار کیا ''کہاں؟''

''کہیں بھی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولی۔

میں نے کہا ''اس وقت ہم ایک جزیرے پر ہیں یعنی ہمارے چاروں جانب تاحد نگاہ پانی ہی پانی ہے۔ اگر ہم اس ہوٹل سے سب کی نظریں بچا کر نکل جاتے ہیں تو اول آخر زونارا آئی لینڈ پر ہی رہیں گے۔'' ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ''کیا تمہارا مستقل طور پر' اسی جزیرے پر رہنے کا ارادہ ہے؟''

وہ بوکھلا گئی پھر ذرا تامل کرتے ہوئے بولی ''میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اس وقت تک اس جزیرے میں کہیں روپوش ہوجاتے ہیں جب تک گیارہ بجے والی فلائٹ بورونارا ائرپورٹ سے ٹیک آف نہیں کرجاتی۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اپنی تجویز کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''زیادہ سے زیادہ احتیاط برتتے ہوئے ہم یہ کرسکتے ہیں کہ فجی کی طرف جانے والی فلائٹ کے اڑنے کا انتظار کرلیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے بروس نولز کی جانب سے کوئی ''خطرہ'' نہیں ہوگا۔ آئندہ کے بارے میں بعد میں سوچا جاسکتا ہے۔ اس جزیرے سے نکلنے کے لیے ہم یہ بہانہ کرسکتے ہیں کہ ہم سیر و تفریح کے لیے ذرا ہوٹل سے نکل گئے تھے' پھر کسی ایسی مصیبت میں پھنس گئے کہ بروقت ہوٹل یا ائرپورٹ نہیں پہنچ سکے لہٰذا ہمیں آئندہ کسی ممکنہ فلائٹ سے سفر کی اجازت دی جائے۔ ہم ایک پائیدار لائحہ عمل تیار کرنے کے بعد یہاں سے

روانہ ہونے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ کسی کو بھی ہمارے کچھ پر شک نہیں ہو گا۔ ہمارے پاس ایسے تمام ثبوت موجود ہیں جو ظاہر کرتے ہیں' ہم ٹی ڈبلیو اے کے اس طیارے کے مسافر ہیں جو اسنکر تج سے سینٹل جا رہا تھا...... اور اب وہ طیارہ کاشی ہارا کے زیر تکمیل ائر پورٹ پر کھڑا ہے۔"

بات ختم کر کے راکیل نے داد طلب نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ اس کے شیطانی دماغ میں واقعی ایک وزنی منصوبہ آیا تھا لیکن میں نے ایک خاص پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک تمہاری تجویز بہت عمدہ اور پیش آنے والے حالات کے عین مطابق ہے مگر میرے خیال میں بروس نولز آسانی سے ہماری جان نہیں چھوڑے گا۔ ہماری حیثیت اس آپریشن کے سرجنوں جیسی ہے۔ وہ ہمیں ہر ممکن طریقے سے تلاش کروانے کی کوشش کرے گا اور اگر اسے اس کوشش میں ناکامی ہوئی تو پھر وہ کچھ ایسا بندوبست ضرور کر جائے گا کہ ہم جیسے ہی یہ جزیرہ چھوڑنے کے لیے ائر پورٹ پہنچیں' ہمیں بڑے تپاک سے "خوش آمدید" کہا جائے۔ سمجھ رہی ہو نا' میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور الجھن بھرے انداز میں بولی' "پھر کیا کریں؟"

"فی الحال کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ڈاکٹر موتگ نے بڑے ٹھہرے ہوئے اور فیصلہ کن لہجے میں کہا "صبح دیکھیں گے' کیا کیا جا سکتا ہے۔ تم دونوں آرام سے سو جاؤ۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کا سونے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

"اور تم؟" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ سرسری انداز میں بولا "مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔ اس کمرے میں بند بیٹھنے سے بہتر ہے' میں ایک چکر نیچے کا لگا آؤں۔ میں کمرے کی چابی اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں تا کہ جب واپس آؤں تو تمہاری نیند میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔" وہ دروازے کے قریب جا کر رکا اور تاکیدی انداز میں بولا۔

اس رات کا جو تھوڑا بہت وقت باقی بچا ہے' اسے باتوں میں نہ گزار دینا۔ اچھے انسانوں کی طرح سکون سے سو جاؤ۔ کل کا سورج پتا نہیں' ہمارے لیے کون سے ہنگامے لے کر آنے والا ہے!"

بات ختم کرتے ہی اس نے دروازہ کھولا اور ایک لفظ مزید بولے بغیر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہماری نگاہیں بند دروازے سے ٹکرا کر واپس آ گئیں' پھر ایک دوسرے سے چار ہو گئیں۔

راکیل نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے پو
"ڈاکٹر موتگ کہاں گیا ہو گا؟"

"اگر میں تمہارے سوال کا سیدھا سیدھا جواب دوں' تو تم کہو گی' میں تمہیں ادھر ادھر گھما رہا ہوں۔" میں نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا "بہر حال' وہ تمہارے سامنے گیا اور تم نے دیکھا ہے' وہ کچھ بھی بتا کر نہیں گیا۔"

"میں تمہارا اندازہ جاننا چاہتی تھی؟" وہ قدرے کھسیا ہو گئی۔

"فی الحال میں اندازہ کاری کے موڈ میں نہیں۔" م نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "مجھے شدید نیند آ رہ ہے...... پھر ڈاکٹر نے بھی ہدایت کی ہے' ہمیں اچھے انسانو کی طرح چپ چاپ سو جانا چاہیے۔" بات ختم کرتے ہی م نے ایک اور جماہی لے ڈالی' "ڈاکٹر کو فالو کرنا مفید ہوتا ہے۔"

راکیل باتوں کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ میں جا تھا' اگر میں نے اس کی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کی تو پھر تھو ہی دیر بعد زونارا کا سورج ہماری آنکھوں کے سامنے طلو ہو گا۔ میں ڈاکٹر موتگ کی اس بات سے صد فیصد متفق تھا کہ نہیں' آنے والا دن ہمارے لیے کون سے ہنگامے لانے وا تھا۔

میں نے ایک اور طویل جماہی لی اور ڈاکٹر موتگ ہدایت کے مطابق لمبی تان کر سو گیا۔ اس لمبی تان کی بھی ایک حد تھی۔ سونے سے پہلے میں نے اپنے دماغ کو دو گھنٹے بع ہشاش بشاش بیداری کا حکم دے دیا تھا۔ ذیلی ہدایات ا کے علاوہ تھیں۔

☆☆☆

ٹھیک سات بجے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے گھڑ میں وقت دیکھا تو پتا چلا' میری نیند کے دوران میں کوئی غ معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا ورنہ مقررہ دو گھنٹے سے پہلے میں بیدار ہو جاتا۔

میں نے راکیل پر نظر ڈالی تو وہ مجھے بے خبر سوتی ہو ملی۔ میں نے اس کے قریب جا کر ماہرانہ جائزہ لیا۔ وہ ا وقت گہری نیند میں تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ اس کمر میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ دو گھنٹے گزر جا کے باوجود بھی ڈاکٹر موتگ ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ اگ خیال ذہن میں یہ آیا کہ ممکن ہے' وہ واش روم میں ہو۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور واش روم میں ڈاکٹر موتگ چیک کرنے کی کوشش کی۔ واش روم مجھے خالی ملا۔ اس کا اگ

ہی مطلب تھا' اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی ...... اس مطلب نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

میں ڈاکٹر مونگ کے خیال کو ذہن میں بٹھا کر واش روم میں گھس گیا اور پندرہ منٹ بعد فریش اپ ہو کر باہر نکل آیا۔ اب میرے ذہن میں ساحل کا خیال رچ بس چکا تھا۔ راکیل ہنوز گہری نیند میں تھی۔ میں نے سوچا' کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کروں۔ ممکن ہے' میرا تصور اس کے محل وقوع تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے۔ اگر ایک مرتبہ مجھے اس کی درست لوکیشن کا اندازہ ہو جاتا تو میں اڑ کر اس تک پہنچ جاتا۔

میں نے سوئی ہوئی راکیل پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ایک آرم چیئر پر نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے مذکورہ کرسی کو شمال رخ کر لیا تھا۔ شمال سے جنوب کی سمت بہنے والی مقناطیسی لہریں اس قسم کی ارتکازی مشقوں اور مراقبہ جات کے لیے بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔

میں نے آنکھیں بند کر کے چار پانچ گہری سانسیں لیں۔ سانس لینے کا یہ مخصوص انداز یوگا کی لغت میں پرانایام (PRANAYAM) کہلاتا ہے۔ اس عمل کی تکمیل کے بعد میں نے ساحل کے سراپا کا تصور کیا۔ اس کے خال و خط کو اپنے تخیل میں ابھارنے کی کوشش کی۔ اس وقت میری پوری توجہ صرف اور صرف ایک نقطے پر مرکوز تھی اور وہ نقطہ تھا...... ساحل! میرے تصور کی بے قرار موجیں' میرے تخیل کی بے چین لہریں اس ساحل کی آغوش میں سر رکھنا چاہتی تھیں' اس مہربان سایے میں پناہ کی متلاشی تھیں۔

ٹی ڈبلیو اے کی پرواز ہموار ہوتے ہی میں نے ساحل کو کھوجنے کی کوشش کی تھی اور وہ مجھے کسی ائرپورٹ کی ...رت میں نظر آ گئی تھی لیکن کس ائرپورٹ پر؟ یہ جاننے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ میں نے اس کھوج کے بارے میں ڈاکٹر مونگ یا راکیل کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے اینکر تج... بڑے دوستانہ ...از میں مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں جی کی ...ماحیت کو بار بار آزماتا رہوں۔ میری باطنی آنکھ (THIRD EYE) کھل چکی ہے۔ پنیل گلینڈ نے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر میں مشق کو جاری رکھوں گا تو کچا پن' پکے پن میں بدل جائے گا۔ مجھے پنیل گلینڈ کے استعمال میں مہارت حاصل ہو جائے گی...... اور ڈاکٹر مونگ نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

مجھے ساحل کا تصور کیے بمشکل ایک منٹ گزرا ہو گا کہ اس پری وش کا سراپا میرے تصور کی نگاہ میں روشن ہو گیا۔ میں نے بڑی وضاحت سے اسے دیکھا۔ وہ ایک آرام دہ کاؤچ پر دراز تھی' ایک دم چت...... اور اس وقت اس کی آنکھیں ...تھیں۔ دونوں بازو پہلوؤں میں دراز تھے۔ وہ کچھ ... پوزیشن میں لیٹی تھی جیسے اس درازی میں اس کی مرضی شامل ہو بلکہ کسی کی بھی ہدایت پر اسے یوں لیٹنا پڑا ہو۔ وہ جس کاؤ... چت پڑی تھی ایسے کاؤچز یا تو اسپتال میں ہوتے ہیں یا ماہرین نفسیات کے کلینک میں۔

کیا ساحل بیمار ہے؟ میرے ذہن نے ایک لمحے لیے سوچا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ میں ساحل کے تصور ... رہتے ہوئے اس کمرے کا جائزہ لینے لگا جہاں ایک کاؤچ پر وہ موجود تھی اور دوسرے ہی لمحے مجھے انداز... کہ ساحل کسی اسپتال میں تھی اور نہ ہی کسی نفسیاتی کلینک... بلکہ وہ ایک بیڈ روم میں تھی!

کسی بیڈ روم میں ایک معالجاتی چرمی کاؤچ کے بار... میں' میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کمرے میں مجھے کسی اور شخ... موجودگی کا احساس ہوا۔ کوئی بآہستگی دروازہ کھول کر کم... میں داخل ہوا تھا۔ میرے تصور کی نگاہ کسی حساس کیمر... طرح ریڈ الرٹ ہو گئی' پھر دوسرے ہی لمحے نو وارد میری... میں آ گیا۔ میرے تصور نے اسے فوکس کر لیا تھا اور... فوکسنگ کے بعد مجھے ایک شدید ترین جھٹکا لگا...... وہ شخص... موشے ہائمن تھا۔

میں اس دراز قامت اور طویل العمر ربی کو ایک نظر... پہچان گیا اور اس پہچان نے میرے تصور کی نگاہ میں جلو... بھر دی۔ میری ساحل ایک مرتبہ پھر اس عیار ربی کے چنگل... جا پھنسی تھی۔ وہ بڑے جچے تلے قدموں سے اس کی ... بڑھ رہا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ساحل کو کسی خاص... سے گزارنے والا ہو...... یا عمل سے گزار چکا ہو اور... کارکردگی چیک کرنے آیا ہو۔ ساحل کا کسی چرمی کاؤچ پر... حس و حرکت پڑے ہونا مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہا... اس مرتبہ میں نے کوئی جذباتی غلطی نہیں کی اور اپنی تمام تر... ربی کی سرگرمی پر مرکوز کر دی۔ اس مستقل مزاجی اور ثا... قدمی نے میرے تصور میں کوئی رخنہ نہیں آنے دیا۔

ربی موشے ہائمن ساحل والے کاؤچ کے نزدیک... کر رک گیا۔ چند لمحے وہ بڑے انہماک سے اس کے چہر... دیکھتا رہا پھر مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا۔ اس کے عمل... مجھے بتا دیا' وہ اپنی کوئی کارگزاری چیک کرنے آیا تھا۔ سا... کی حالت اور پوزیشن چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ ا... تنویمی عمل سے گزارا گیا تھا۔ وہ ہپناٹک نیند میں تھی۔

میں اس بیڈ روم کو دیکھ کر قطعاً یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کمرا کس عمارت میں اور وہ عمارت کس شہر' کس ملک میں واقع ہے۔ اگر میرے تصور کی نگاہ کو اس بیڈ روم سے باہر نکلنے کا موقع مل جاتا تو میری مراد برآ سکتی تھی۔ میں نے ربی موشے ہائمن کو اپنا ٹارگٹ بنا لیا۔ اگر وہ بیڈ روم سے نکلتا تو میں ساحل کے ...یس اور ٹریک کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

ایک منٹ کے تنقیدی جائزے کے بعد ربی مڑا اور ...ک قدموں سے دروازے کی سمت بڑھا۔ میرے تصور کی آنکھ گویا اس کی پشت پر چپک کر رہ گئی۔ وہ بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر رکا' مڑ کر ساحل پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور جیسے ہی اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا' سب کچھ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔

راکیل کی تیز آواز نے میرا تصور پاش پاش کر دیا۔ میرے وجود کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ آواز دینے کے ساتھ ہی کندھے سے پکڑ کر مجھے جھنجوڑ بھی رہی تھی۔ اس کے یہ الفاظ میری سماعت تک پہنچے......

''وجدان! کیا تم بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ کھڑکی سے باہر دیکھو اس جزیرے کی صبح کتنی سہانی ہے۔''

''جہنم میں گیا یہ جزیرہ اور اس کی صبح......!'' میں خاصی دبی آواز میں چلایا۔

راکیل کھڑکی سے ہٹ گئی اور میرے سامنے آ کر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی' ''تمہیں کیا ہوا ہے وجدان! کس قدر برہم کیوں ہو رہے ہو؟''

''کیا تم چند منٹ صبر کر لیتیں تو کوئی قیامت آ جاتی؟'' میں نے بدستور خفگی آمیز انداز میں کہا' ''کیا اس جزیرے کی صبح کہیں بھاگی جا رہی تھی؟''

راکیل کی بے جا داخلت نے میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ میری برہمی اور ناراضی اپنی جگہ درست تھی لیکن جب میں نے حقیقت پسندی سے سوچا تو وہ مجھے بے قصور نظر آئی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ میں اس وقت کتنے اہم کام میں مصروف تھا۔ وہ یہی سمجھی ہو گی' میں آنکھیں بند کیے آرام چیئر پر ریلیکس بیٹھا ہوں۔ راکیل کی ایسی ہی ایک فطری حرکت نے طیارے کے اندر بھی میرے تصور کا خانہ خراب کر دیا تھا۔

وہ بڑی گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی' ''تمہاری حالت ٹھیک نظر نہیں آ رہی وجدان! کیا پرابلم ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' میں اس وقت تک خود پر قابو پا چکا تھا' نارمل انداز میں کہا' ''دراصل' میں یہ دیکھنا چاہتا تھا' تم مجھے غصے میں دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کرتی ہو۔''

''پھر دیکھ لیا؟'' وہ بے یقینی سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا' ''تم بڑی برداشت والی لڑکی ہو۔''

اس کی نگاہ میں میری وضاحت کے لیے بے اعتباری موجود رہی' شاکی لہجے میں بولی' ''میں سمجھ رہی ہوں' تم مجھے بہلانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اگر تم خود ہی نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔''

وہ وقتی پسپائی کا مظاہرہ کر کے بڑی عقلمندی کا ثبوت دے رہی تھی۔ میں نے موضوع کا زاویہ بدلتے ہوئے کہا ''کیا ڈاکٹر مونگ ابھی تک واپس نہیں آیا؟''

اس سے پہلے کہ راکیل میرے سوال کے جواب میں کچھ کہتی' کمرے کا دروازہ کھلا اور متذکرہ بالا شخص اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر میں نے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا۔

''تم تو ذرا سی چہل قدمی کرنے گئے تھے۔ پورے تین گھنٹے بعد لوٹے ہو۔ خیریت تو تھی؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے دیوار کلاک کی جانب اشارہ کیا۔ کلاک کی سوئیاں آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ ڈاکٹر مونگ ایک کرسی سنبھالنے کے بعد بولا۔

''فکرمندی والی کوئی بات نہیں۔ میری چہل قدمی تھوڑی دراز ہو گئی تو میں نے سوچا' کچھ اپنا بندوبست بھی کر ہی لیا جائے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''راکیل کی تجویز مجھے بھلی لگی ہے۔ ہمیں پہلی فرصت

سسپنس ڈائجسٹ کا دلچسپ ترین سلسلہ
جسے قارئین آج تک نہیں بھولے

طالوت

③ حصوں میں (مکمل)

قیمت فی حصہ 60 روپے۔ ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے
تینوں حصے ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ 25 روپے

74200

میں اس ''قافلے'' سے الگ ہوجانا چاہیے اور میں نے اپنی روپوشی کا بڑا معقول انتظام کرلیا ہے۔ تم دونوں چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔''

میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا ''کچھ معلوم تو ہو' تم کیسا انتظام کرکے آئے ہو؟''

''یہاں سے نکلنے کے بعد میں تمہیں تفصیل بتادوں گا۔'' وہ رسانیت سے بولا ''ابھی تک ہوٹل میں زیادہ چہل پہل نہیں ہوئی۔ یہ ہمارے ''فرار'' کے لیے اچھا موقع ہے۔ ہم کسی کی نگاہ میں آئے بغیر رفو چکر ہوسکتے ہیں۔ ٹھیک نو بجے ہمیں ہانگ چو کی لانچ میں پہنچنا ہے۔''

''ہانگ چو!'' میں نے حیرت بھری نظر سے ڈاکٹر مونگ کو دیکھا۔

وہ بولا ''کہا ہے نا' یہاں سے نکلو' پھر تفصیل بتاتا ہوں۔ دس منٹ کے اندر ایک ایک کرکے ہمیں ہوٹل چھوڑنا ہوگا تاکہ کسی کو ہمارے ''فرار'' کا فوری طور پر احساس نہ ہو۔ میں پہلے جارہا ہوں۔ ہوٹل سے باہر دائیں جانب سو گز کے فاصلے پر ایک نیوز اسٹینڈ ہے۔ تم بھی یکے بعد دیگرے وہاں پہنچو اور...... ہوٹل چھوڑنے سے قبل ذرا اپنے حلیوں کی ٹچنگ ضرور کرلینا۔''

ڈاکٹر مونگ اس وقت راکیل کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اور اس کا حلیہ قدرے ''منتشر'' ہو رہا تھا۔ میں نے فریش اپ ہوتے وقت اپنی کٹنی نیوٹی کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ نسیم جوہر نے کراچی میں مجھے میک اپ کے جو اسرار و رموز سکھائے اور بتائے تھے' وہ قدم قدم پر کام آرہے تھے۔ نسیم جوہر واقعی بڑے جواہر کا مالک تھا۔

ڈاکٹر مونگ بات ختم کرکے کمرے سے نکل گیا۔ اس دوران میں راکیل واش روم میں گھس چکی تھی۔ دینالی کے ہار پر لاج ہوٹل میں ٹیلی فونک گفتگو میں' ڈاکٹر مونگ نے راکیل کی پروفیشنل مہارت کے بارے میں مجھے تفصیلاً آگاہ کیا تھا۔ ٹھیک دس منٹ بعد ہم دونوں مذکورہ نیوز اسٹینڈ پر ڈاکٹر مونگ کے پاس پہنچ گئے۔

ڈاکٹر مونگ نے ایک ٹیکسی روکی اور ہم اس کے اندر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر مونگ پسنجرز سیٹ پر تھا جبکہ راکیل میرے ساتھ ٹیکسی کی عقبی نشست پر براجمان تھی۔ اس مختصر سے سفر کے دوران میں' ٹیکسی میں کامل خاموشی چھائی رہی۔ ڈاکٹر مونگ نے کچھ کہا اور نہ ہی ہم میں سے کسی نے ایک لفظ بول کر دیا۔ میرے ذہن میں ڈاکٹر مونگ کے منصوبے کے حوالے سے اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ پتا نہیں' اس خدا کے بندے نے کس قسم کا پلان بنایا تھا؟ اور یہ ہانگ چو کون تھا! کی لانچ میں وہ ہمیں سوار کرانا چاہتا تھا!

پندرہ منٹ بعد ہمارا یہ سفر ایک چھوٹے سے ریسٹور کے سامنے جاکر ختم ہوا۔ ڈاکٹر مونگ نے ٹیکسی والے کو کیا اور ہمیں اپنے ساتھ ریسٹورنٹ کے اندر آنے کو کہا۔ چون و چرا اس کی تقلید میں آگے بڑھ گئے۔

ریسٹورنٹ میں زیادہ رش نہیں تھا بلکہ رش بالکل تھا۔ ہمارے علاوہ صرف دو میزیں آباد تھیں اور وہ بھی خا فاصلے پر۔ ڈاکٹر مونگ نے ویٹر کی آمد پر مختصر سے ناشت آرڈر دیا پھر ہماری جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ اس وقت ہم دو سے بیک وقت مخاطب تھا۔

''انسان کی زبان کی اس دنیا میں بڑی اہمیت ہے۔ ہم زبان آپ کو جہاں بھی مل جائے' آپ اس کے لیے دل اور معمولات میں گنجائش نکال ہی لیتے ہیں۔ میں مینڈ زبان بڑے طریقے سلیقے سے بولتا اور سمجھتا ہوں۔ ہانگ ایک چینی ہے۔ اس کا تعلق چین کے علاقے شنگھائی سے۔ میں نے مختصر سے وقفے میں ہانگ چو سے اچھی خاصی راہ بنالی ہے۔ مجھے مینڈرن بولتے دیکھ کر وہ خوشی سے پھول جزیرہ زونارا میں اِکا دُکا چینی بھی آباد ہیں۔ ہانگ چو بنیا طور پر ایک ماہی گیر ہے۔ آج نو بجے اس کی لانچ سمندر روانہ ہوگی' پھر شام سے کچھ پہلے ہی وہ واپس لوٹے گا۔ آج کا دن اس کے ساتھ لانچ پر گزاریں گے۔'' وہ ایک کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہو بولا۔

''اس دوران میں دونوں پروازیں اپنی منزل جانب روانہ ہوجائیں گی۔ رات کو واپس آکر سوچیں آیندہ کیا کرنا ہے۔ بردس نولز اور دیگر اہم افراد سے چھڑانے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ملے گا۔ تم میں نے اپنے ہتھکنڈوں سے ہانگ چو کو گہرا دوست ہے۔''

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور متفکر لہجے میں ''ساڑھے آٹھ تو بج رہے ہیں اور تم نے بتایا ہے' ٹھیک نو ہمیں ہانگ چو کی لانچ پر سوار ہونا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو گا ابھی تو ہم نے ناشتا شروع کیا ہے؟''

''سب ہوجائے گا۔'' وہ بڑے مطمئن انداز میں ''اس ریسٹورنٹ سے صرف تین منٹ میں پیدل چلتے ہم ہانگ چو کی لانچ تک پہنچ جائیں گے۔ وہ جگہ یہاں دور نہیں۔''

"آئیڈیا عمدہ ہے۔" میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

راکیل نے فخریہ نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولی۔ اس کی نگاہ کا فخر بجا تھا۔ بلاشبہ یہ اسی کی سجھائی ہوئی راہ تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے کھانے پینے کی اشیا پر تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کہا" تم لوگ جلدی سے فارغ ہو جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

راکیل سب سے پہلے فارغ ہوئی اور میز چھوڑ کر واش بیسن کی جانب بڑھ گئی۔ ڈاکٹر مونگ تیزی سے میری جانب مڑا اور سرگوشیانہ انداز میں بولا" ڈسلوا......! میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی سوال نہ کرنا کہ وقت بہت قلیل ہے۔ میں گارشیا کو اس گفتگو میں شامل نہیں کرنا چاہتا۔"

اس کا رازدارانہ اور پُراسرار انداز دیکھ کر میں چونک اٹھا پھر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ راکیل ایک طرح سے اس کی ماتحت تھی۔ اگر وہ اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا وہ بات ٹاپ سیکرٹ ہوگی۔

ڈاکٹر مونگ نے نپے تلے الفاظ میں بتایا" میں نے ہانگ چو کو شیشے میں اتارنے کے علاوہ بھی ایک اہم کام کیا ہے۔ سیشل میں اپنے بڑوں سے رابطہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے انہیں تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ طیارے کا اغوا ان کے علم میں آچکا ہے۔ وہ لوگ بھی اس بات کے حق میں نہیں ہیں کہ گورنمنٹ سے متعلق افراد ہمارے ساتھ نتھی ہو کر سیشل پہنچیں۔ بروس نولز وغیرہ سے سیشل میں جان چھڑانا ممکن نہیں ہوگا لہٰذا ہمیں پہلی فرصت میں الاسکا کی ہائی اتھارٹیز سے الگ ہو جانا چاہیے اور اس کے لیے مجھے ایک منصوبہ بھی دے دیا گیا ہے۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا تو میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کے بڑوں کے کسی منصوبے کا سن کر میں الجھ گیا تھا۔ وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میرے بڑوں کا حکم ہے کہ ہم اس قافلے سے سلپ ہو جائیں اور حالات و واقعات میں سے ایک مناسب موقع نکال کر جاپان پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"جاپان!" میں تقریباً اچھل کر رہ گیا۔ تاہم آواز پر کنٹرول رکھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا" اس وقت ہم ایک سو پچپن ڈگری ویسٹ یعنی طول البلد پر ہیں۔ ایک سو اسی ڈگری پر انٹرنیشنل ڈیٹ لائن واقع ہے۔ اگر ہم مذکورہ لائن کو قبول کر لیں تو جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو تک پہنچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق انٹرنیشنل ڈیٹ لائن زونارا آئی لینڈ اور ٹوکیو کے وسط میں واقع ہے۔ میں نے ہانگ چو کو ایسا سیٹ کر دیا ہے کہ وہ ہمارے ٹوکیو تک جانے کا کوئی بھی معقول یا نامعقول یعنی قانونی یا غیر قانونی بندوبست کر دے گا پھر ٹوکیو سے تائے پی اور تائے پی سے نیپال تک پہنچنا ہمارے لیے چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ مجھے سیشل کی طرف جانے سے منع کر دیا گیا ہے اور ٹوکیو میں ایک ایسے بندے سے ملنے کو کہا گیا ہے جو ہمارے لیے آگے کے سفر کے انتظامات کرے گا۔"

ڈاکٹر مونگ کی باتیں انکشاف انگیز تھیں۔ ہمارے پروگرام میں یہ اچانک تبدیلی خاصی سنسنی خیز اور مہماتی تھی لیکن میرا ذہن اس وقت ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ابھی تک ڈاکٹر مونگ کو صبح والے تجربے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ شاید ڈاکٹر مونگ نے میری سوچ پڑھ لی۔ بڑے ڈرامائی انداز میں بولا۔

"دمن...... ساحل کے حوالے سے تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔"

"کیا؟" میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر مونگ میرے سوال کا جواب دیتا' راکیل واپس آتی ہوئی دکھائی دی۔ ڈاکٹر مونگ مخصوص انداز میں کھنکارتے ہوئے سیدھا ہو گیا۔ ہماری بات ادھوری رہ گئی۔

ادھورا علم ہو یا کوئی بیان' بڑا تہلکہ ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر مونگ نے میرے نازک پہلو کو چھو کر میرے اندر کھلبلی مچا دی تھی۔ پتا نہیں' وہ ساحل کے حوالے سے مجھے کون سی خوش خبری سنانے والا تھا۔ وہ واضح طور پر بتا چکا تھا کہ اس موضوع کو راکیل کے سامنے ڈسکس نہیں کرے گا لہٰذا مجھے اس وقت کا انتظار کرنا تھا جب تنہائی میں اس سے بات کرنے کا موقع ملے۔ انتظار کے یہ لمحات میرے لیے قیامت خیز اور وحشت انگیز تھے۔

ناشتا ختم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے بل ادا کیا اور ہم ریسٹورنٹ سے نکل آئے پھر واقعی ٹھیک نو بجے ہم ہانگ چو کی لانچ پر سوار ہو رہے تھے۔

ہانگ چو کی لانچ بڑی شان دار اور جدید سہولیات سے آراستہ تھی۔ ریڈیو اور اسپیڈومیٹر کے علاوہ اس میں فضائی دباؤ' درست سمت مع درجہ جات اور آبی تغیر و تبدل کے بارے میں بتانے کے لیے حساس آلات نصب تھے۔ ہانگ چو اس

لانچ کو چونکہ فشنگ (ماہی گیری) کے لیے استعمال کر رہا تھا اس لیے اس کے اندر کولڈ اسٹوریج بھی موجود تھا جہاں پکڑی جانے والی مچھلیوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ ہانگ چو کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہوگی۔ اس کی وضع قطع اور حلیہ عام چینیوں جیسا تھا۔ سر پر اس نے مخصوص چینی ٹوپی لگا رکھی تھی۔

ہانگ چو کے علاوہ اس لانچ میں دو اور افراد بھی موجود تھے۔ پندرہ سالہ ینگ لی اور پینتیس سالہ چی فان۔ یہ دونوں فشنگ وغیرہ میں ہانگ چو کی مدد کرتے تھے۔ ینگ لی اور چی فان کی حیثیت ہانگ چو کے ملازمین کی سی تھی۔ اس لانچ میں دیگر ضروریات کے ساتھ ساتھ آٹھ دس افراد کے کھانے پینے کا بھی بندوبست تھا۔ ہانگ چو نے اپنے ملازمین سے ہمارا تعارف مہمانوں کے طور پر کرایا تھا جنہیں وہ سیر و تفریح کی غرض سے کھلے سمندر میں لے آیا تھا۔ ہانگ چو کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ ڈاکٹر مونگ کی متاثر کن شخصیت نے یہاں بھی بہت کام دکھایا تھا۔

ہم کھلے سمندر میں ایک مخصوص رفتار سے آگے بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر بعد زونارا آئی لینڈ کے آثار معدوم ہو گئے۔ اب ہمارے چاروں طرف تا حدِ نگاہ پانی ہی پانی تھا۔ ہانگ چو کے مطابق ابھی ہم سمندر کے اس حصے میں نہیں پہنچے تھے جو مچھلی پکڑنے کے لیے موزوں ترین تھا۔

اچانک راکیل کو انجن روم اور لانچ کے مختلف حصے دیکھنے کا شوق اٹھا۔ ہانگ چو اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ ذرا سی تنہائی میسر آتے ہی میں نے ڈاکٹر مونگ سے استفسار کیا۔

"تم مجھے ساحل کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور گہری سنجیدگی سے بولا "مجھے اپنے بڑوں سے پتا چلا ہے کہ تمہاری ساتھی ساحل کو مین ہیٹن (نیویارک) پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اس وقت سخت پہرے اور حفاظت میں ہے۔ بہرحال......!" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا" میرے بڑے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لارڈ بدھا ہمیں جلد کامیابی دے گا۔"

میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا" میری ساتھی ادھر مین ہیٹن میں ہے اور تم مجھے اپنے ساتھ جاپان لے جانا چاہتے ہو۔ یہ کیسی منطق ہے ڈاکٹر مونگ۔ میری زندگی کی یہ جنگ تو ساحل کے حصول کے لیے ہے اور تم مجھے محاذ سے کھدیڑ کر بیرک میں دھکیلنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے اور تمہارے بڑوں کے منصوبے کو سمجھ نہیں پایا ہوں؟"

اس نے بڑی تسلی سے میری بات سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا" میں تمہیں تمہارے مقصد سے نہیں ہٹا رہا بلکہ ایک چھوٹے سے بڑے محاذ پر پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جاپان ہماری منزل نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا' ہم ٹوکیو سے تائے پی اور تائے پی سے نیپال پہنچیں گے جہاں بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں یہودیوں سے ہمارا اصل معرکہ ہوگا۔"

"اور ساحل؟" میں نے الجھن بھری نظر سے اسے دیکھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا" ساحل کو بہت جلد یہودیوں کے چنگل سے نکال لیا جائے گا۔ تم بے فکر رہو' وہ سیشل میں محفوظ رہے گی۔"

ڈاکٹر مونگ کی وضاحت سن کر میں تلملا اٹھا۔ وہ واضح طور پر مجھے ساحل سے الگ کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔ اس کا انداز بہت مبہم اور قابلِ غور تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک سازشی سالا نظر آیا۔ میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اسے اپنے صبح والے تجربے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں بڑی اچھی طرح یہ جان چکا تھا کہ میری ساحل اس وقت ربی موشے ہائمن کے قبضے میں تھی۔ اب ڈاکٹر مونگ نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ نیویارک کے علاقے مین ہیٹن میں تھی۔ اگر میں کسی طرح نیویارک پہنچ جاتا تو پھر ساحل تک رسائی حاصل کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہ رہتا۔ میں نے اپنے تازہ ترین خیالات کو ڈاکٹر مونگ پر ظاہر نہیں کیا اور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تم جتنی شد و مد سے مجھے نیپال لے کر جانا چاہتے ہو اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ربی موشے ہائمن نے ساحل کے اندر سے وہ راز نکال لیا ہے جو خفیہ تہ خانے تک پہنچا سکتا ہے...... اور اب ربی کے اشارے پر طاقت ور یہودیوں کی ایک منظم ٹیم کسی بھی وقت بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ پر دھاوا بولنے والی ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ تمہیں اپنے ساتھ نیپال لے جانا میرا نہیں' بلکہ میرے بڑوں کا فیصلہ ہے۔" وہ بڑے رسان سے بولا" اور جہاں تک ساحل کے اندر سے کوئی راز اگلوانے کی بات ہے' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ربی اپنی کوشش میں کامیاب ہو یا نہ ہو' بہرحال وہ لوگ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کو ٹارگٹ تو بنا چکے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اس پر چڑھائی کر سکتے ہیں۔ میرے بڑوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلہ کیا ہے۔"

گفتگو کے دوران میں وہ بندہ بار بار اپنے بڑوں کو لے آتا تھا اور اس آڑ میں اسے فرار کا موقع مل جاتا تھا۔ اس کے بڑوں کے ذکر سے مجھے چڑ سی ہونے لگی تھی۔ ساری دنیا کے بکھیڑے رہیں ایک طرف' مجھے سب سے پہلے اپنی ساحل سے مطلب تھا۔ سچی اور ایمان داری کی بات یہ ہے کہ میں ڈاکٹر مونگ اور اس کے بڑوں کا ساتھ دینے کے لیے محض اس لیے تیار ہو گیا تھا کہ ساحل ان کے قبضے میں تھی۔ ان لوگوں کے ایک آدمی نے ساحل کو ماؤنٹ مکنلے سے نکال کر بحفاظت فیئر بینکس پہنچا دیا تھا لیکن جب سے دوبارہ ربی کے آدمیوں نے اسے اڑا لیا تھا' میں ایک عجیب سے مخمصے میں تھا۔ ڈاکٹر مونگ کا ساتھ دینے کے سوا مجھے کوئی چارہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اب صورت حال خاصی بدل گئی تھی۔ میں ساحل کا سراغ پانے میں کامیاب ہو گیا تھا لہٰذا میری ہر مجبوری اور بے بسی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا ''کیا تمہارے بڑوں نے یہ معلوم کر لیا کہ ساحل مین ہیٹن میں کس شخص کے قبضے میں ہے؟''

''نہیں' یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔'' اس نے جواب دیا ''مگر بہت جلد میرے بڑے اس کا کھوج لگا لیں گے۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا' وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کرید جاری رکھی ''ڈاکٹر مونگ! اگر تم برا نہ مانو تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں' تمہارے بڑوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میری ساحل کو ریاست الاسکا کے شہر فیئر بینکس سے اغوا کر کے نیویارک کے پوش علاقے مین ہیٹن میں پہنچا دیا گیا ہے؟'' میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اور وہ لوگ یہ جاننے میں ابھی تک ناکام کیوں ہیں کہ ساحل کی درست لوکیشن کیا ہے اور وہ کس دشمن کے قبضے میں ہے؟''

میں نے نہایت ہی چبھتے ہوئے اور اہم سوالات کیے تھے۔ وہ چند لمحے گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تمہارے اندر تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور جب تک کسی معاملے میں تمہاری تسلی نہیں ہو جاتی' تمہاری روح کو سکون نہیں ملتا۔''

''لیکن راکیل کا تو میرے بارے میں یہ خیال ہے کہ میں بہت بے پروا ہوں!''

''راکیل کو فی الحال اس اہم گفتگو سے دور ہی رکھو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اپنے سر کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور پوچھا ''کیا متجسس مزاج کا حامل ہونا کوئی بری بات ہے؟''

میں اس دوران میں مسلسل ڈاکٹر مونگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ جب سے مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے' میں اس کی اور اس کے بڑوں کی طرف سے بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ یہ حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت تھی۔

وہ بولا ''اس عادت کو برا تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے سبب معاملات میں بگاڑ اور حالات میں خرابی و الجھن پیدا ہو سکتی۔ جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔''

''اس وقت ایسا کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''میں محسوس کر رہا ہوں' تمہیں میرے کہے کا اعتبار نہیں!''

''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں!'' میں نے تردید کرتے ہوئے کہا۔

''بہرحال!'' وہ بحث سے پہلو تہی کرتے ہوئے بولا ''کسی چیز کا جاننا یا نہ جاننا صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے۔ ہر انسان کی اپنی ایک شکتی ہے اور کوئی شکتی' کوئی قوت اور کوئی صلاحیت بھی مکمل نہیں ہوتی۔ ہر جگہ حدود اور قیود کا نظام لاگو ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میرے بڑوں نے جہاں تک معلوم کیا اور جو فی الحال معلوم نہیں کر سکے اس کے درمیان ایک بفرزون ہے...... اور یہ ضروری نہیں' وہ کبھی بھی اس کے آگے معلوم نہیں کر سکیں گے۔ کوشش جاری ہے' رکاوٹ ہٹا دی جائے گی۔ اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو کوشش کا دوسرا' تیسرا زاویہ آزمایا جائے گا۔ پراسرار علوم میں ان داؤ پیچ اور اونچ نیچ کا سامنا لازمی ہے۔ میٹا فزکس کا شعبہ بڑا عجیب و غریب ہے!''

''میٹا فزکس!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں' میٹا فزکس!'' وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''جس عمل کو سادہ الفاظ میں دھیان گیان کہا جاتا ہے' سائنسی تحقیق اسے میڈیٹیشن اور میٹا فزکس کے خانے میں فٹ کرتی ہے۔''

اس کے بعد ڈاکٹر مونگ نے مجھے میٹا فزکس (مابعد الطبیعیات) پر ایک مختصر سا لیکچر دے ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میری ''چی'' کی صلاحیت کی مثال بھی دی جو رفتہ رفتہ اپنے سامنے حائل حدود اور رکاوٹوں کو توڑتے ہوئے اپنا دائرۂ کار وسیع کرتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی باتیں پُرمعنی اور مبنی بر

تھیں لیکن میں یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا کہ وہ محض میری توجہ ہٹانے کے لیے ایسی عالمانہ موشگافیاں کر رہا تھا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی آیا کہ اس کے بڑے ساحل کا سراغ پا چکے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ میں ان کے مشن کو چھوڑ چھاڑ کر ساحل کے پیچھے دوڑ پڑوں۔ اسی لیے ربی والی حقیقت کو مجھ سے مخفی رکھا جا رہا تھا۔

وہ لوگ جو کچھ مجھ سے چھپا رہے تھے' میں اس تک رسائی حاصل کر چکا تھا لہٰذا ان کے لیے ''استعمال'' ہونے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا۔ میرے لیے دنیا بھر کے خزانے' ساحل کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے' چنانچہ میں نے ڈاکٹر مونگ سے دوٹوک انداز میں کہہ دیا۔

''دیکھو ڈاکٹر! تم نے مجھ سے دوستی کی ہے اور میں ایک دوست ہونے کے ناتے تم سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں کون کون سے انمول خزانے پوشیدہ ہیں' مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں سیدھا یہاں سے نیویارک جانا چاہتا ہوں۔''

''میرے بڑوں کا خیال ہے' بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ پر ہونے والی یہودیوں کی یلغار کو صرف اور صرف تم ہی روک سکتے ہو!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''اسی لیے ہم نے اپنے مشن میں تمہیں ہر قدم پر ساتھ رکھا ہے۔ تم گزشتہ چند روز کے واقعات پر نگاہ ڈالو۔''

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا ''اگر ہم چاہتے تو ربی موشے ہائمن کی' ماؤنٹ مکنلے والی پناہ گاہ سے صرف ساحل کو نکال لاتے اور یہ ہمارے لیے قدرے آسان ہوتا۔ اس کے بعد بھی ہم نے تمہیں پوری اہمیت دی ہے جس کے نتیجے میں تم میرے ساتھ اب نیپال جانے والے ہو۔''

''میں نیپال نہیں' نیویارک جانے والا ہوں!'' میرے لہجے میں قطعیت تھی۔

وہ جلدی سے بولا ''بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ سے متعلق مشن میں تمہاری جو اہمیت ہے' وہ میں تم پر واضح کر چکا ہوں اور......''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں مستفسر ہوا ''ڈاکٹر مونگ! تم بدھا کے پیروکار ہو نا؟''

اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''ہاں۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم مجھے لارڈ بدھا سے بھی اونچی چیز سمجھتے ہو؟''

''قطعی نہیں!'' وہ اضطراری انداز میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

''پھر تم حوصلہ رکھو اور ہر فکر اندیشے کو ذہن سے جھٹک دو۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''ساحل کے باپ تھونچی نے مجھے بتایا تھا کہ جب بھی اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کی گئی' انسانی خون کی ندیاں سی بہہ نکلیں۔ اس خزانے کے طلبگار کتے بلی کی موت مارے گئے۔ آج تک کوئی شخص اس خزانے تک رسائی حاصل نہیں کر سکا کیونکہ ہر دور کا دلائی لاما اس بیش قیمت خزانے کا نگران ہوتا ہے۔ میرے خیال میں' دلائی لاما اور لارڈ بدھا ان معاملات کو بخوبی سنبھال لیں گے۔ میری شمولیت یا غیر حاضری سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''لارڈ بدھا اور محترم دلائی لاما تم جیسے ہرفن مولا لوگوں ہی سے کام لیتے ہیں......اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو!''

میں نے اٹل لہجے میں کہا ''ڈاکٹر مونگ! میں صرف ایک ہی صورت میں تم لوگوں کا ساتھ دے سکتا ہوں کہ بدھ نیل کنڈ والے مشن میں ساحل بھی میرے ساتھ ہو!'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''تمہارے بڑوں کی اپروچ کے سامنے تو ایک بفرزون آن کھڑا ہوا ہے۔ اب میں ہی نیویارک پہنچ کر کوئی کوشش کرتا ہوں۔''

میں جانتا تھا' میرے یہ سخت الفاظ ڈاکٹر مونگ کو بہت چبھے ہوں گے۔ ان لمحات میں' میں خاصا تلخ ہو گیا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے کسی قسم کی ناگواری ظاہر نہ ہونے دی۔ چند لمحات تک بڑی کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے' ہم زونارا پہنچ کر اس موضوع پر بات کریں گے۔''

میں نے اس موقع پر اسے اس کا وعدہ یاد دلانا ضروری سمجھا اور کہا ''ڈاکٹر مونگ! تم نے مجھے بتایا تھا' تمہارے بڑوں نے تمہیں تاکید کر رکھی ہے' مجھ پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے۔ میں جب اور جہاں جانا چاہوں' میرے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا جائے۔''

''مجھے یہ وعدہ یاد ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''میں تمہیں اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا

ہوں۔ مجھے ہر صورت میں نیویارک پہنچنا ہے۔ تم اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''میں نے کہا نا' واپس زونارا پہنچنے کے بعد اس معاملے پر بات کریں گے۔''

میں نے کرید اور استفسار کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ ڈاکٹر مونگ ریفوشے زونارا پہنچنے کے بعد یقیناً اپنے بڑوں سے رابطہ کر کے نئی ہدایات لینا چاہتا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم سب نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ ہانگ چو اپنے مددگاروں کے تعاون سے ماہی گیری میں مصروف رہا۔ یہ کام دو مرحلوں میں کیا گیا۔ پہلا مرحلہ لنچ سے پہلے کا تھا اور دوسرا لنچ کے بعد کا۔ ہانگ چو نے ہمیں بتایا کہ کھانے کے بعد وہ صرف ایک گھنٹے تک فشنگ کریں گے پھر واپسی کی راہ لی جائے گی تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے زونارا آئی لینڈ پہنچ جائیں۔

دوسرا مرحلہ آغاز ہوئے ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک سنسنی خیز واقعہ پیش آ گیا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ ہمیں اپنے عقب میں' زونارا آئی لینڈ کی جانب ایک لانچ کے آثار نظر آئے۔ وہ لانچ بڑی تیز رفتاری سے ہماری سمت چلی آ رہی تھی۔ اس کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا تھا' وہ زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں ہمارے سر پر ہوگی۔

ہانگ چو بڑا تجربہ کار ماہی گیر تھا۔ اس کی پوری زندگی اسی سمندر میں ماہی گیری کرتے گزری تھی۔ اس لانچ کے تیور دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے تشویش ناک لہجے میں ڈاکٹر مونگ سے کہا۔

''مجھے کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' ڈاکٹر مونگ کے بجائے میں نے پوچھا۔

وہ بدستور اس لانچ پر نگاہ جما کر بولا ''فی الحال میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بات طے ہے' وہ لوگ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں۔''

اب ہم تینوں بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ ان کا آگے بڑھنے کا انداز تو یہی بتا رہا تھا' وہ دوست ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دشمن تھے تو کس کے؟ ہانگ چو کے یا ہمارے!

یہ بڑے فکر انگیز سوالات تھے۔ اس دوران میں ہانگ چو نے ادھر ادھر گھوم پھر کر ایک ریوالور برآمد کر لیا اور بڑی عجلت میں بولا ''میں اپنی حفاظت کے خیال سے اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے' ہمیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' اس نے بڑے ماہرانہ انداز میں ریوالور کو جیب میں ٹھونسا اور ہماری جانب دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولا۔

''تم تینوں تھوڑی دیر کے لیے خود کو روپوش کر لو۔ اگر خیریت گزری تو میں تمہیں باہر نکال لوں گا۔''

پھر ہمارا جواب سنے بغیر اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور لانچ کے ایک ڈھکے ہوئے حصے کی جانب بڑھ گیا۔ اگر ہم اس حصے میں پناہ لے لیتے تو دوسری لانچ والے ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔

ہمیں محفوظ کرنے کے بعد ہانگ چو نے ناصحانہ انداز میں کہا ''جب تک میں آواز دے کر نہ بلاؤں' تم لوگ یہاں سے باہر نہیں آؤ گے۔ میں جا کر دیکھتا ہوں' وہ کون لوگ ہیں اور کیا ارادے باندھ کر ادھر آئے ہیں!''

ہم نے اثباتی جنبشوں سے اسے یقین دلایا کہ اس کی ہدایت پر سختی سے عمل کریں گے۔ ہانگ چو نے اس موقع پر ڈاکٹر مونگ کو مخاطب کرتے ہوئے مینڈرن میں کلام کیا تھا۔ میں مینڈرن زبان سے بہ خوبی واقف تھا۔ میں نے سنگاپور میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا جہاں کا ہر دوسرا باشندہ مینڈرن بولتا ہے۔

اب وہ لانچ ہماری لانچ کے انتہائی قریب پہنچ گئی تھی۔ اس قربت کا اندازہ ہمیں اس کے انجن کے شور اور سمندری موجوں کے تموج سے ہوا۔ وہ یقینی طور پر ہماری لانچ سے کافی بڑی تھی۔ ہمارے ماحول میں اس قدر شور موجود تھا کہ اگر ہم بہ آوازِ بلند بھی گفتگو کرتے تو ہماری آوازیں اس خفیہ پناہ سے باہر نہیں سنی جا سکتی تھیں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا ''مونگ ریفوشے! اگر وہ لوگ دشمن ہیں تو پھر ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ ہانگ چو کی بھرپور مدد کریں۔ اس بوڑھے چینی نے میزبانی کا حق ادا کر کے ہمارے دل جیت لیے ہیں۔''

''صورتِ حال واضح ہو جانے دو۔'' ڈاکٹر مونگ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا ''اگر وہ لوگ واقعی دشمنی کرنے آئے ہیں تو انہیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ہم ہانگ چو کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس شریف انسان نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔''

ڈاکٹر مونگ کے لہجے سے چٹانی عزم جھلکتا تھا۔ اسی دوران میں مذکورہ لانچ ہماری لانچ کے قریب آ کر ٹھہر گئی تھی۔ ان کے ٹھہراؤ سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ وہ لوگ ہم ہی سے دوستی یا دشمنی نبھانے آئے تھے۔ ہانگ چو اور دوسری لانچ والوں کے درمیان کیا مذاکرات ہو رہے تھے' اس کی ہمیں خبر نہیں تھی۔

ہم نے باہر کی صورتِ حال جاننے کے لیے اپنی سماعتوں کو شور سے نبرد آزما کر دیا۔

دو منٹ بعد ہمیں چونک جانا پڑا۔ ہم نے واضح طور پر محسوس کیا' چند افراد ہماری لانچ پر کود رہے تھے۔ اگر اپنی توجہ کسی خاص نقطے پر مرکوز کر دی جائے تو انسان کے حواسِ خمسہ میں حیرت انگیز توانائی بھر جاتی ہے۔ ان سنسنی خیز لمحات میں ہم قوتِ شامہ کو آزما رہے تھے لہٰذا انتہائی شور کے باوجود بھی ہم نے اپنی لانچ پر کودنے والوں کی آواز سماعت کر لی تھی...... اور یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ پتا نہیں' انہیں کس شے کی تلاش تھی؟

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا' ہانگ چو اور اس کے ساتھیوں پر بڑا کڑا وقت آن پڑا ہے۔ ڈاکٹر مونگ نے بھی محسوس کر لیا کہ ہانگ چو وغیرہ سے سخت استفسار کیا جا رہا ہے۔ اگلے ہی لمحے ایک دردناک چیخ ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے ہم تک پہنچی۔ میں نے اس آواز کو آنِ واحد میں شناخت کر لیا۔ وہ میرے میزبان' قدرداں اور مہربان ہانگ چو کی اذیت میں ڈوبی ہوئی فریاد تھی۔ یقینی طور پر اسے زدوکوب کیا جا رہا تھا۔

میری نگاہ میں وہ منظر گھوم گیا جب کچھ عرصہ پہلے میں ساحل (دھنو) کے ساتھ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے میں روپوش تھا اور میری تلاش میں سرگرداں' ناگ پال کے پالتو غنڈوں نے بھیرجانی اور تھونچی کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا تھا۔ ساحل کے والدین نے میرے دشمنوں کا جبر سہا لیکن میرے خلاف زبان کھول کر نہیں دی۔ میرے دل سے ایک صدا اٹھی یا پتا نہیں' یہ میری چھٹی حس کی پکار تھی! مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس لانچ پر میرے خون کے پیاسوں نے دھاوا بولا ہو' اور مجھے پانے کے لیے وہ ہانگ چو کو دردناک عذاب سے گزارنا چاہتے ہوں۔

''یہ نہیں ہو سکتا......!'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر ایک جھٹکے سے اس پناہ گاہ کو خیرباد کہہ دیا۔

جلد ہی میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ہانگ چو اور اس کے دونوں ساتھی' دوسری لانچ والوں کے نرغے میں زیادتی برداشت کر رہے تھے۔

وہ کل تین افراد تھے اور تینوں ہی مسلح۔ ان کے ہاتھوں میں مجھے آٹومیٹک گنز دکھائی دیں۔ میری اچانک آمد نے حملہ آوروں کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بڑی سرعت سے پلٹے لمحے بھر کو ان کی نگاہوں میں شناسائی کی چمک ابھری اور انہوں نے اپنی گنز کو میری جانب سیدھا کیا لیکن میں انہیں کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے جمپ کی اور لانچ سے چھ فٹ ہوا میں بلند ہو گیا۔ اسی لمحے ان کی گنز کے دہانے کھل گئے۔ انہوں نے بے دریغ مجھے فائرنگ میں بھوننے کی کوشش کی تھی لیکن میں اپنی جگہ پر کھڑا رہتا تو ان کی گولیوں کا نشانہ بنتا۔

وار خالی جاتے دیکھ کر انہوں نے گنز کے بیرلز ہوا میں اٹھا دیے مگر میں نے انہیں دوسری مرتبہ ٹریگرز دبانے کی مہلت نہ دی۔ میں ہوا میں اپنی باڈی کو رول کرتے ہوئے ان کے اوپر آن گرا تھا۔ میرا گرنا ایسا ہی تھا جیسے وہ جنگی جہاز میں سے گرائے گئے کسی مہلک بم کی زد میں آ گئے ہوں۔

وہ تینوں اپنی گنز سمیت ایک دوسرے سے الجھ کر زمین بوس ہو گئے۔ یعنی لانچ کے فرش سے جا لگے پھر میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ فرش نشین ہوتے ہوئے ایک حملہ آور کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور جا گری تھی۔ اسے نہتا ہوتے دیکھا تو ہانگ چو' ینگ لی' چی فان نے اپنی ہزیمت کا بدلہ سود در سود چکانا شروع کر دیا۔ وہ تینوں بھوکے چیتوں کے مانند اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔

دوسرے دونوں گن بردار اٹھ کر کھڑے ہوئے تو میں نے ہوا میں اچھل کر ایک ڈبل سائیڈ فلائنگ کک جڑ دی۔ میرے دونوں پاؤں نے فرداً فرداً ان کے چہروں کا مزاج پوچھا۔ وہ سائیڈز میں الٹ گئے۔ ہانگ چو کی لانچ میں اتنی گنجائش تھی کہ وہاں کسی رنگ فائٹ کا اہتمام ہو سکے۔ میرے لیے اتنی جگہ بہت کافی تھی۔ میں بڑی خوش دلی سے اپنے ''کام'' میں مصروف ہو گیا۔

میرے ذہن میں وہ لمحہ نقش ہو کر رہ گیا تھا جب مجھ پر نظر پڑتے ہی حملہ آوروں کی نگاہوں میں شناسائی چمکی تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور میری ہی تلاش میں اس لانچ تک پہنچے ہیں۔ ان کا انداز کھلے دشمنوں ایسا تھا۔ میں اس وقت ڈسلوا کے بھیس میں تھا۔ گویا' وہ دھیدان کے نہیں بلکہ ڈسلوا کے دشمن تھے۔ اس جزیرے میں دھیدان یا ڈسلوا کی کسی سے دوستی یا دشمنی نہیں تھی۔ ان تین حملہ آوروں کی تازہ ترین دشمنی صرف ایک ہی جانب اشارہ کرتی تھی کہ ہو نہ ہو' ان کا تعلق ہائی جیکرز سے ہو سکتا تھا۔ ہمارے طیارے کو اغوا کرنے والے اگر زونارا آئی لینڈ پر اترے تھے تو یہ بات یقینی تھی' یہاں ان کے ساتھی' ان کے حمایتی ضرور موجود ہوں گے۔ ہم نے اغوا کنندگان کا منصوبہ سپردِ خاک کر دیا تھا۔ ان کے حمایتیوں کی برہمی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے کہ حملہ آور ہائی جیکرز

کے ساتھی تھے۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے ہوں گے۔ ایسے ہنگامی حالات میں' میری کھوپڑی میں نصب ذہن نامی یہ مشین کسی حساس کمپیوٹر سے بھی زیادہ فعال ہو جاتی تھی اور ہاتھ پاؤں ایک نادیدہ جلال کے اشاروں پر حرکت کرنے لگتے تھے۔

میری ڈبل سائیڈ فلائنگ کھانے والے اٹھنے کے بعد اٹھے۔ اس دوران میں' میں اچک کر ایک کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا' میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک سلانٹ کک ماری۔ وہ ایک اسٹیپ پیچھے سرکا۔ میں نے ہوا میں اچھل کر اس کے سینے پر ایک فرنٹ پش کک رسید کی۔ میرا ٹارگٹ اس کا مقام قلب تھا۔

اس کے حلق سے ''اوں'' سے مشابہ ایک بے معنی آواز خارج ہوئی اور وہ گن سمیت پیچھے الٹ گیا۔ اس کے دوبارہ اٹھنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

اس دوران میں' میں دوسرے حملہ آور کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ جب تک وہ سنبھل کر اپنی گن کو سیدھا کرتا' میں اس کے ساتھی کو نمٹا چکا تھا۔ پتا نہیں' اس کے ذہن میں کیا آئی کہ وہ فائرنگ کرنے کے بجائے اپنی گن کو لاٹھی کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے میری جانب دوڑا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی بات آئی کہ اس کی آٹو میٹک گن میں راؤنڈز باقی نہیں بچے تھے۔ وہ اپنا ''اکاؤنٹ'' صاف کر چکا تھا۔

اس کا انداز ''اللہ دے اور بندہ لے'' والا تھا۔ میں کشاں کشاں آگے بڑھا اور اسی لمحے مجھے حملہ آور کے عقب میں ڈاکٹر مونگ ریغوشے کی جھلک دکھائی دی۔ وہ ایک چوبی ستون سے ٹیک لگائے بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر رائیکل بھی یہ تماشا ملاحظہ کر رہی تھی۔

گن بردار نے مجھے غافل سمجھ کر اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور کلہاڑی کے وار کی طرح اپنی گن میری کھوپڑی پر برسانا چاہی۔ میں نے ڈاکٹر مونگ کا جائزہ لیتے ہوئے حملہ آور کی حرکات و سکنات کو اپنے دفاع میں ملحوظ رکھا تھا لہٰذا اسے اپنی خوش فہمی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

اس نے جیسے ہی میرے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کی' میں نے بڑی سرعت سے فرنٹ فٹ پر حرکت کی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دونوں ہاتھوں کو سر سے بلند کرتے ہوئے ''سیزرز ہینڈ ڈیفنس'' کی ٹیکنیک کو آزمایا۔

میرے بازوؤں کے کراس نے حملہ آور کے گن بدست ہاتھ کی کلائی پر ایک دھواں دھار ''بوسہ'' دیا۔ گن میرے سر سے ایک' ڈیڑھ فٹ پیچھے ہوا میں معلق ہو گئی۔ اس روک کے ساتھ ہی میں نے برق رفتاری سے اپنے کراس بازوؤں میں اس کی کلائی کو جکڑ لیا۔ وہ ابھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے' میں نے اپنی گرفت میں آئی ہوئی اس کی کلائی کو مروڑا دے کر ایک خوفناک جھٹکا دیا۔

ہڈی ٹوٹنے کی مخصوص آواز پیدا ہوئی اور وہ شخص اپنے حلق سے فلک شگاف چیخیں خارج کرنے لگا۔ میں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے اس کے پیٹ میں ایک نیچی سائیڈ کک رسید کر دی۔

وہ توپ میں سے نکلے ہوئے کسی خوفناک گولے کے مانند ہوا میں بلند ہوا اور نیچی پرواز کرتے ہوئے ڈاکٹر مونگ کے قدموں میں جا گرا۔

اسی لمحے فضا فائرنگ کی تیز تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔

میں یہی سمجھا اس حملہ آور کو ''ہوش'' آ گیا ہے جو مجھ سے دل پر ''چوٹ'' کھا کر گن سمیت پیچھے الٹ گیا تھا۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا اور مذکورہ شخص کو بے حس و حرکت پایا۔

اسی وقت میں نے اپنے اوپر سے کسی دیو قامت پرندے کو پرواز کرتے محسوس کیا۔ بے اختیار میری نگاہ اوپر کو اٹھ گئی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ کوئی پرندہ نہیں بلکہ ڈاکٹر مونگ ریغوشے تھا جو ہماری لانچ سے فلائی کر کے حملہ آوروں والی لانچ کی طرف جا رہا تھا۔ گویا اس نے اپنے خاص الخاص فن کا مظاہرہ کیا تھا۔

پلک جھپکتے میں' ڈاکٹر مونگ کی اڑان کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ دشمن لانچ میں مجھے ایک گن بردار کی جھلک دکھائی دی۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ یقیناً اسی شخص نے کی تھی اور ڈاکٹر مونگ نے اس کی ''مزاج پرسی'' کے لیے ادھر کا رخ کیا تھا۔

آن واحد میں ڈاکٹر مونگ نے دشمن لانچ پر ''لینڈنگ'' کی پھر اس گن بردار کو دوسرا برسٹ مارنے کا موقع نہ دیا۔ میں ڈاکٹر مونگ کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اپنی لانچ میں حاضر ہو گیا اور اسی وقت رائیکل کی ایک تیز چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے تیزی سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ حواس باختہ سی ہینڈز اپ کھڑی تھی۔ اس حواس باختگی کا سبب وہ شخص تھا جسے میں نے کک مار کر ڈاکٹر مونگ کے قدموں میں

پہنچایا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں مجھے آٹو میٹک گن نظر آئی۔ اس نے مذکورہ گن رائیکل پر تان رکھی تھی۔ یہ خاصی تشویش ناک صورت حال تھی۔

اس شخص نے چند لمحے پہلے اپنی گن کو لاٹھی کے سے انداز میں میری کھوپڑی پر آزمانے کی کوشش کی تھی اور میں نے اس کی دائیں کلائی کا جلوس نکال دیا تھا۔ ہڈی ٹوٹتے ہی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور وہ فضا میں پرواز کرتے ہوئے ادھر جا پہنچا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں جو گن نظر آ رہی تھی وہ یقیناً اس حملہ آور کی تھی جو ہانگ چو وغیرہ کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے جس لمحے ڈاکٹر مونگ کی پرواز ملاحظہ کی، اس معتوب شخص نے مذکورہ گن کو قابو میں لا کر رائیکل کو نشانے پر رکھ لیا۔

گن بردار کی پشت میری جانب تھی اور وہ مجھ سے محض بارہ فٹ کی دوری پر تھا۔ مجھ سے توڑ پھوڑ کرانے والا اس کا ہاتھ کسی ترکی کے مانند کلائی پر لٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت تکلیف کی جس شدت سے گزر رہا تھا وہ میں جانتا تھا یا پھر وہ۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس حالت میں وہ فائرنگ کر کے رائیکل کو کوئی نقصان پہنچا سکے گا۔ اگر اس کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ زندگی کے معاملات میں لمحاتی تاخیر موت کی پیامبر ثابت ہوتی ہے!

میں نے چشم زدن میں حساب جوڑا اور للکارنے والے انداز میں گن بردار سے مخاطب ہوا ''تم اس وقت میرے نشانے پر ہو۔ گن پھینک دو ورنہ چھلنی کر دوں گا۔''

اس نے گن تو نہیں پھینکی البتہ بڑی سرعت اور بے یقینی سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میرے لیے یہ لمحاتی مہلت کافی تھی۔ اس کا دھیان جیسے ہی رائیکل پر سے ہٹا، میں نے لانگ ڈائیو لگاتے ہوئے تیزی سے فرنٹ رول کیا۔ یہ ایک میکانکی عمل تھا۔

ردِعمل کے طور پر گن بردار پوری طرح میری جانب مڑا اور گن مجھ پر سیدھی کرنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ سے کسی وزنی آٹو میٹک گن کو کنٹرول کرنا آسان نہیں ہوتا اور وہ شخص بری طرح معتوب بھی تھا۔ جیسے ہی اس کا گن بدست لرزتا ہوا ہاتھ میری طرف اٹھا' اس وقت تک میں رولنگ مکمل کر کے اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔

میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا پھر ایک قدم اندر آتے ہوئے اس کے گن والے ہاتھ کو لیفٹ آؤٹ بلاک کیا۔ گن کے ساتھ ہی اس کے وجود کو بھی ایک جھٹکا لگا۔ اسی لمحے میں نے اس کے پیٹ میں ایک زوردار گھٹنا مارا۔

وہ ذبح ہوتے ہوئے کسی جانور کی طرح ڈکرایا اور لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی سمت گیا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے سینے میں سائیڈ کک رسید کر دی۔

وہ ریورس کک میں اچھلا اور پشت کے بل [illegible] ستون سے جا ٹکرایا جہاں تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر مونگ [illegible] کھڑا بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل کر رائیکل کے نزدیک جا گری۔

میں نے آگے بڑھ کر گن کو اٹھا لیا اور اس کے ''اکاؤنٹ'' کو چیک کیا۔ دوسری گن کی طرح وہ بھی اپنے بیلنس سے محروم ہو چکی تھی۔ میرے سینے سے ایک اطمینان بخش گہری سانس خارج ہوئی اور میں نے گن کو رائیکل کی جانب بڑھا دیا۔ رائیکل نے فوراً گن تھام لی۔

اسی لمحے مجھے اپنے پہلو میں حرکت محسوس ہوئی۔ میں برق رفتاری سے پلٹا اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ہاتھ بھی گھما دیا۔ میرا ہاتھ اس شخص کے تھوبڑے پر پڑا جو چند لمحے پہلے چوبی ستون سے ٹکرا کر زمین بوس ہوا تھا۔ مجھے اس کی ہمت کی داد دینا پڑی کہ مجھ سے بری طرح پٹنے کے بعد بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی حالت پر رحم بھی آیا کہ وہ بری طرح لہولہان ہو رہا تھا۔ چوبی ستون سے ٹکراؤ نے اس کے چہرے کے مختلف حصوں کو کھول دیا تھا اور وہاں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس کی صورت خاصی خوفناک ہو رہی تھی۔

وہ حملہ کرنے سے باز نہ آیا تو مجھے بھی جواباً ہاتھ پاؤں کو زحمت دینا پڑی۔ اب اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے اور وہ بازو پھیلا کر مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے کوشاں نظر آیا۔ میں نے ٹائیگر اسٹانس بنایا اور دعوت دینے والے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

میرے اس دیکھنے نے اس کے رستے ہوئے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا۔ وہ آپے سے باہر نکل آیا اور کسی برہم درندے کے مانند چنگھاڑے ہوئے مجھ پر جھپٹا۔ میں نے پہلو میں سرکتے ہوئے بڑی صفائی سے وہیل کک چلا دی۔ اس کے منہ سے ایک دردناک آواز خارج ہوئی۔

میرے پاؤں کی ایڑی اس کی ٹھوڑی پر لگی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کے دہانے سے خون ابلنے لگا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اس کی زبان دانتوں تلے دب کر بری طرح کچلی گئی تھی۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے اپنے ہونٹ صاف کیے اور ایک رتبہ پھر مجھے دبوچنے کے لیے آگے بڑھا۔

میں نے اس کے ساتھ اٹکھیلیاں شروع کر دیں۔ اس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر میں نے ایک نیچی راؤنڈ

ہاس چلائی۔ وہ تھوڑا ڈگمگایا پھر غراتے ہوئے میری ب مڑا۔ میں جھکائی دے کر دوسری سمت نکل گیا۔ وہ میری ب پلٹا تو میں نے ہوا میں بلند ہوتے ہوئے اس کے منہ پر یڈ فلائنگ کک جڑ دی۔ وہ لڑکھڑایا۔ میں نے زمین پر تے ہی اس کے سولر پر پنچ مار دیا۔

وہ دوفٹ اچھلا اور پشت کے بل اپنے اس ساتھی پر گرا جو میری فرنٹ پش کک سینے پر کھا کر انٹا غفیل ہو گیا تھا۔ ہتے ہیں صحبت میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ مجھ سے پٹنے والا اپنے تھی کی صحبت میں پہنچتے ہی بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا جائزہ لیا۔ میں اس کے اندر رگی کو تلاش کرنے میں ناکامیاب رہا۔ اس کے نیچے دبے ئے شخص کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی انسان کے سینے میں یافرام سے تھوڑا اوپر سولر ایک ایسا مقام پر جس پر ٹھوکر لگتے ہی سب سے پہلے دل "بے وفائی" کرتا ہے۔ ان دونوں نے ہ سے ایک ہی مقام پر چوٹیں کھائی تھیں...... لہٰذا وہ حالت نزرک میں بے سدھ پڑے تھے زندگی سے دور...... بہت ر! میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلائی اور ہانگ چو یرہ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لوگ اپنے شکار کو بری طرح مارکوٹ کر رسی میں جکڑ چکے تھے۔ لانچ کے حالات قابو میں آگئے تو مجھے ڈاکٹر مونگ یفو شے کی فکر ہوئی۔ اسی لمحے راکیل میرے قریب آگئی۔

اس نے میرے بازو سے لگتے ہوئے کہا "ادھر تو سب ٹھیک ہو گیا۔ پتا نہیں ادھر ڈاکٹر مونگ کا کیا حال ہے۔ وہاں تو مجھے خاموشی نظر آرہی ہے۔"

راکیل کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی حملہ آوروں والی لانچ کی طرف کامل سناٹے کا راج تھا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر میں بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ڈاکٹر مونگ شدید فائرنگ کے جواب میں اس لانچ سے اس لانچ تک پہنچا تھا۔ میں نے اس لانچ میں فائرنگ کرنے والے کی جھلک دیکھی تھی لیکن اب وہاں کوئی صورت دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں دوسری لانچ کی طرف جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہانگ چو میرے پاس آگیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں وہ آٹومیٹک گن اٹھا رکھی تھی جو میری فرنٹ پش کک کھا کر ناللہ ہونے والے حملہ آور کے ہاتھ سے گری تھی۔ اس گن میں چند راؤنڈ ابھی باقی تھے۔

اس نے گمبھیر انداز میں کہا "ہمیں دوسری لانچ پر جا کر وہاں کی صورتِ حال کے بارے میں جاننا چاہیے۔ تمہارا ساتھی کافی دیر سے خاموش ہے۔"

وہ مجھ سے مینڈرن میں بات کر رہا تھا۔ پیش آنے والے واقعے نے اسے ہراساں یا پریشان نہیں کیا تھا۔ وہ خاصے مضبوط اعصاب کا مالک اور "مہمان نواز" چینی تھا۔ اس کے جذبے اور جرأت نے مجھے خاصا متاثر کیا۔ میں نے دشمن لانچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی لانچ کو ذرا اس کے قریب کر دو۔ مجھے اپنے ساتھی کی طرح اڑنا نہیں آتا۔ میں ادھر جا کر دیکھتا ہوں کیا حالات ہیں!"

اس معرکے کے دوران میں دونوں لانچوں میں اچھی خاصی دوری پیدا ہو گئی تھی حالانکہ جب تین مسلح حملہ آور ہماری لانچ پر کودے تھے تو یہ فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا۔ ہانگ چو انجن روم کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم میرے دونوں ملازمین کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ میں لانچ کو ادھر کرتا ہوں۔"

ہانگ چو کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ مجھے ڈاکٹر مونگ کی جھلک نظر آئی۔ وہ اس لانچ سے اس لانچ کی طرف پرواز کرتے ہوئے آرہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس کی "فلائٹ" نے "لینڈنگ" کر لی۔ میں نے اس کی زبانی سنا تھا کہ اسے فلائٹ فائٹنگ میں مہارت حاصل تھی۔ اس کی ارضی یا فضائی فائٹنگ دیکھنے کا تو ابھی مجھے موقع نہیں ملا تھا مگر اس کی فلائٹ کو میں نے ملاحظہ کر لیا تھا۔

اس نے لانچ میں پہنچتے ہی وہاں کے حالات کا ایک نظر میں جائزہ لے لیا پھر مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "دونوں طرف امن و امان قائم ہو گیا ہے۔"

اس کا تبصرہ ہماری تسلی کے لیے کافی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا "یہاں کے حالات کا تو تم نے جائزہ لے لیا۔ ادھر کی سناؤ؟"

"اس لانچ پر صرف دو افراد تھے۔" ڈاکٹر مونگ نے بتایا "ایک وہ جس کی فائرنگ نے مجھے ادھر جانے پر مجبور کر دیا اور دوسرا اس لانچ کا کیپٹن۔ بہرحال!" وہ ایک لمحے کو رکا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا "اب وہ دونوں مردہ حالت میں وہاں پڑے ہیں۔"

"تمہیں اتنی دیر کیوں لگ گئی؟" میری پوری طرح تشفی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میں ان سے ایک کا انٹرویو لینے کے لیے تھوڑی دیر وہاں رک گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا کہ وہ لوگ ہماری تلاش

میں ہی ادھر آئے تھے۔ ان کا تعلق زونارا آئی لینڈ کے ایک ایسے گروہ سے ہے جو ہائی جیکرز کا حمایتی ہے۔ ہم نے چونکہ ہائی جیکرز کا منصوبہ ناکام بنادیا ہے اس لیے وہ ہمیں ناپنے کی فکر میں تھے۔ ہائی جیکرز کے اس حمایتی میزبان گروہ نے اپنے ذرائع استعمال کرکے ہمارے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کرلیں اور ہماری خفیہ نگرانی کرنے لگے۔ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا‘ تم بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہو!‘‘

بات ختم کرتے ہی اس نے مخصوص انداز میں کندھے اچکادیے۔ میں نے اپنے حصے میں آئے ہوئے مخالفین سے نمٹتے ہوئے ان کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا تھا‘ ڈاکٹر مونگ نے گویا اس کی تصدیق کردی۔ میں نے کہا ’’اس خفیہ نگرانی کا آغاز ہوٹل ائر پورٹ سے ہوا ہوگا۔ جب تم علی الصباح ہوٹل سے نکل کر ہانگ چو سے ملنے آئے تو تمہارا تعاقب کیا گیا‘ پھر ہم تینوں اس طرف آئے تو یقیناً تعاقب کے سلسلے میں کوئی تعطل نہیں آیا ہوگا۔ جب ہم ہانگ چو کی لانچ میں بیٹھ کر کھلے سمندر میں پہنچ گئے تو ہائی جیکرز کا حمایتی گروہ ہمیں چھاپنے آن پہنچا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔‘‘

یہ گفتگو ہم چاروں یعنی ہانگ چو اور ہم تینوں کے درمیان ہو رہی تھی۔ ہانگ چو نے اپنے دونوں ملازمین کو زیرِ حراست حملہ آوروں کے ساتھی کی نگرانی پر مامور کردیا تھا۔ وہ ہم سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ہماری آواز ان کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ ویسے ہم احتیاطاً خاصے دھیمے انداز میں بات کررہے تھے۔ ملازم آخر ملازم ہی ہوتا ہے اسے ملازمت تک ہی محدود رہنا چاہیے!

اس صورتِ حال نے ہانگ چو کو قدرے تشویش میں مبتلا کردیا۔ وہ ہمیں وقتی پناہ دے کر بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا تاہم اس نے ہم سے کوئی شکوہ شکایت کرنے کے بجائے ڈاکٹر مونگ سے استفسار کیا۔

’’تم نے جس بندے سے پوچھ گچھ کی ہے کیا اس نے اپنے گروہ کے بارے میں کچھ بتایا ہے؟‘‘

’’وہ شنی مونگا کا نام لے رہا تھا!‘‘ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ہانگ چو گہری تشویش میں گھر گیا اور زیرِ لب بڑبڑایا ’’شنی مانگا!‘‘

’’کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟‘‘ میں نے جلدی سے پوچھا۔

اس کے چہرے کے تیزی سے بدلتے ہوئے تاثرات نے مجھے ایک گمبھیرتا میں ڈال دیا۔ وہ میرے سوال کے جواب میں بولا ’’شنی مانگا‘ کنگ تو ہارا ڈولا چہارم کا بھتیجا ہے!‘‘

’’اوہ!‘‘ میں ایک پُرتفکر سانس خارج کرکے رہ گیا ’’کمان کا ایک بندہ ہائی جیکرز کی پشت پناہی کررہا ہے۔ کیا شاہی خاندان بھی اس سازش میں ملوث ہے؟‘‘

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ’’نہیں ایسی بات نہیں۔‘‘ پھر ہانگ چو نے ہمیں تفصیلاً بتایا۔

’’دراصل شنی مونگا کنگ کے مخالف گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ایک طرح سے فتنہ پرور ٹولا ہے جس کا سرغنہ کنگ کا بھتیجا شنی مونگا ہے۔ کنگ ڈولا اولادِ نرینہ سے محروم ہے۔ اس کی صرف ایک بیٹی ہے۔ رسنا نامی یہ لڑکی کنگ کی توجہ کا مرکز ہے۔ وہ رسنا کو زونارا آئی لینڈ کی ملکہ بنانا چاہتا ہے اور اس کی شادی اپنے ایک معتمد خاص سے کرنے کا خواہش مند ہے۔ یہ بات شنی مونگا کو قطعاً پسند نہیں۔ شنی رسنا سے شادی کرکے زونارا آئی لینڈ کا تخت سنبھالنے کا خواب دیکھ رہا تھا لیکن کنگ ڈولا اس سازشی شخص سے شدید نفرت کرتا ہے۔ وہ شنی کے مذموم عزائم سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ بہرحال شنی مونگا اسی قسم کی شیطانی سرگرمیوں میں معروف ہے۔‘‘ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر خوف زدہ لہجے میں بولا ’’یہ جو کچھ بھی ہوا ہے‘ اچھا نہیں ہوا۔ شاید میں شنی کی دشمنی کا مقابلہ نہ کرسکوں۔‘‘ اس کی فکرمندی بجا تھی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا ’’اس طرف سے بے فکر ہوجاؤ ہانگ چو۔ کیا تم نے ہم تینوں کو اپنی لانچ میں بٹھایا ہی نہیں تھا۔‘‘

’’یہ کیسے ممکن ہے!‘‘ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا ’’وقت پیچھے کو نہیں بہتا۔ شنی مونگا اور اس کے آدمی یہ بات جانتے ہیں کہ تم تینوں میری لانچ میں سوار ہوکر کھلے سمندر میں آئے ہو۔ اس حقیقت کو کیسے بدلا جاسکتا ہے؟‘‘

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ’’انسان اگر اپنی عقل کو مناسب انداز میں استعمال کرے تو وقت بھی الٹا بہہ سکتا ہے اور حقیقت کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔‘‘ میں ذرا دیر کو خاموش ہوا۔

ہانگ چو کے علاوہ ڈاکٹر مونگ اور راکیل بھی پورے انہماک سے مجھے سن رہے تھے۔ میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ’’دوسری لانچ میں ہم تک پہنچنے والے شنی کے آدمیوں میں سے چار ازلی ابدی خاموش ہوچکے ہیں۔ وہ کسی کو اس واقعے اور ہمارے بارے میں کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے اور...... جو شخص رسی کی جکڑ بندیوں میں قید ہے

کوئی نہ کوئی مناسب سا بندوبست کرلیں گے۔ تمہارے ملازم یہ نہیں جانتے کہ شنی مونگا کے آدمیوں نے ہم پر حملہ کیا تھا۔ اگر تم انہیں کسی طرح ’’سمجھا بجھا‘‘ سکو تو پھر تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔‘‘

ڈاکٹر مونگ نے میری پلاننگ میں حصہ لیتے ہوئے کہا ’’حملہ آوروں کے زندہ بچ جانے والے بندے کو ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس لانچ میں پڑی ہوئی دیگر دو افراد کی لاشوں کو اس لانچ میں پہنچا دیتا ہوں۔ دو لاشیں وہاں پہلے ہی پڑی ہیں۔ تم اس لانچ کو ایک لمبا بیضوی چکر دے کر دوسرے رخ پر لے جاؤ اور اس زاویے سے جزیرے میں داخل ہونا جیسے تم اس طرف گئے ہی نہیں تھے۔ جب دشمنوں کی لانچ میں چار ساتھیوں کی لاشیں ملیں گی اور ان کا پانچواں ساتھی غائب ملے گا تو شنی مونگا یہ سوچنے پر مجبور ہوجائے گا کہ وہ پانچواں آدمی اپنے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر کہیں روپوش ہوگیا ہو۔ شنی مونگا اس شخص کو تلاش کرتا پھرے گا اور ہماری طرف سے اس کی توجہ ہٹ جائے گی۔‘‘

ہانگ چو نے دو تین مرتبہ نفی میں گردن ہلائی پھر پریشان انداز میں بولا ’’توجہ کیسے ہٹ جائے گی۔ لانچ والوں کے ساتھی وہاں جزیرے میں ان کا انتظار کررہے ہوں گے۔ وہ تو واپس نہیں پہنچیں گے لیکن جب ہماری لانچ جزیرے پر جاکر لگے گی تو شنی مونگا کے آدمی ہمیں گھیر لیں گے...... اور تم تینوں میری لانچ میں موجود ہوگے۔ بتاؤ میں ان لوگوں سے کیسے جان چھڑاؤں گا؟‘‘

ڈاکٹر مونگ نے میری جانب دیکھتے ہوئے بڑی سادگی سے کہا ’’تم عقل کے استعمال کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟‘‘

اس دوران میں راکیل خاموشی سے باری باری ہمارے چہرے دیکھ رہی تھی۔ وہ مینڈرن زبان سے واقف نہیں تھی اور ہم تینوں مردوں کے درمیان وہ تمام تر گفتگو مذکورہ زبان میں ہو رہی تھی۔

میں نے ہانگ چو کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ’’تم نے جس انداز میں ہماری میزبانی کا حق ادا کیا ہے‘ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی جان کو داؤ پر لگا کر بھی تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔‘‘ میں ایک لمحے کو رکا تو وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا ’’ہمیں تھوڑی سی تنہائی اور سادہ صاف پانی کی ضرورت ہوگی۔ کیا تم یہ دونوں چیزیں ہمیں مہیا کرسکتے ہو؟‘‘

’’ہاں ہاں مہیا کرسکتا ہوں۔‘‘ وہ استعجابیہ انداز میں بولا ’’لیکن میں سمجھا نہیں آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟‘‘

میں نے بہ دستور رازدارانہ انداز میں کہا ’’میں میک اپ کرنے کا ماہر ہوں۔ اگر ہمیں تھوڑی سی مہلت اور تنہائی میسر آجائے تو میں اپنے سمیت ان دونوں کے حلیوں کو بھی اس طرح بدل کر رکھ دوں گا کہ کسی کا باپ بھی نہیں پہچان سکے گا‘ وہی تین افراد جو زونارا آئی لینڈ کے کسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور آج صبح نو بجے تمہاری لانچ میں سوار ہوئے ہیں۔‘‘

’’وہ تو ٹھیک ہے۔‘‘ وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ’’لیکن اگر تم تینوں پر انہیں شک ہوگیا اور انہوں نے تم لوگوں کا میک اپ اتار کر دیکھا تو پھر کیا ہوگا؟‘‘

’’کچھ بھی نہیں ہوگا۔‘‘ میں بے پروائی سے بولا ’’میں ایسا میک اپ کروں گا کہ جب تک میری مرضی شامل نہیں ہوگی‘ کوئی مائی کا لال اسے اتار نہیں سکے گا۔‘‘ پھر میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا ’’ہانگ چو! بے فکر ہوجاؤ۔ تم ان مہمانوں کو زندگی بھر فراموش نہیں کرسکو گے۔‘‘

وہ چند لمحے بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے میری فرمائش پوری کردی اور ہمیں ایک محفوظ پناہ گاہ میں ہمارے سامان سمیت چھوڑ کر اپنے ملازمین کو ’’سمجھانے‘‘ چلا گیا۔

تنہائی میسر ہوتے ہی ڈاکٹر مونگ نے مجھ سے سوال کیا ’’تم کیا کرنا چاہتے ہو؟‘‘

’’ہم اپنے اصلی حلیوں میں آرہے ہیں۔‘‘ میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

’’کیا؟‘‘ اس کے سوال میں گہری تشویش تھی۔

میں نے کہا ’’شنی مونگا اور اس کے ساتھیوں کی نظر میں ہم ان کے پکے دشمن ہیں اس لیے پہلی فرصت میں ہمیں ان بدلے ہوئے حلیوں سے نجات حاصل کرنا ہے تاکہ زونارا آئی لینڈ پر کوئی ہمیں ان افراد کی حیثیت سے شناخت نہ کرسکے جنہوں نے نہ صرف اپنی جان کی بازی لگا کر ایک جہاز کو ہائی جیکرز کے قبضے سے نکالا ہے بلکہ ان ہائی جیکرز کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا بھی بڑا معقول بندوبست کیا ہے۔‘‘ میں ایک لمحے کو خاموش ہوا۔ پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’اس طرح ہم نہ صرف شنی مونگا سے محفوظ ہوجائیں گے بلکہ الاسکا کی ہائی اتھارٹیز بھی اگر ہمارا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی تو انہیں کامل ناکامی... کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ کہو کیسا

آئیڈیا ہے؟"

راکیل نے کہا" اور بے چارہ ہانگ چو یہی سمجھتا رہے گا کہ ہم لوگ کسی حیرت انگیز میک اپ میں ہیں...... ایسا میک اپ جو ہمارے اشاروں کا غلام ہے!"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!" میں نے سادگی سے کہا۔

ڈاکٹر موننگ گہری سنجیدگی سے بولا" تمہارے آئیڈیا میں چند پیچیدگیاں تو ہیں مگر فی الحال ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں لہٰذا اس آئیڈیا پر عمل کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد ہم تینوں گہری سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

ہم اپنی اصلی شکل صورت میں آئے ہی تھے کہ ہانگ چو ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات ابھر آئے۔ ہم نے اینکریج سے روانہ ہوتے وقت اپنے حلیوں میں چونکہ ہلکی پھلکی تبدیلیاں کی تھیں اس لیے اس مائنر میک اپ سے چھٹکارا پانے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔

میں ہانگ چو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا" میرے فن کی تعریف نہیں کرو گے؟"

"لاجواب...... بے مثال......!" وہ جذباتی انداز میں بولا" آپ لوگوں کی تبدیلی کو دیکھ کر میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے اپنے ملازمین کو آپ کے بارے میں جو کہانی سنائی ہے وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔"

ڈاکٹر موننگ نے اس سے پوچھا" تم نے انہیں ایسی کیا کہانی سنا دی ہے؟"

"میں نے انہیں بتایا ہے کہ تم ایک وچ ڈاکٹر ہو۔ ووڈو (جادو) جانتے ہو۔" وہ ڈاکٹر موننگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا" تم نے اپنے دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے اپنے کسی عمل کے ذریعے خود کو اور دونوں ساتھیوں کو تبدیل کر لیا ہے۔ وہ تم لوگوں کے بارے میں زبان کھولتے ہوئے سو بار سوچیں۔ اگر تمہیں ان کی کوئی بات ناگوار لگ گئی تو ان کا خرابا شروع ہو جائے گا۔" ہانگ چو ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر اپنا بیان آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ دونوں تم لوگوں کی طرف سے بہت خوف زدہ ہیں اور بار بار یہی کہہ رہے ہیں کہ وہ میری ہدایت پر عمل کریں گے۔ وہ میری مرضی کے بغیر کسی سے اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہیں گے۔"

... نے کہا" ان کا خوف زدہ ہو جانا عین فطری بات ہے۔ وہ تھوڑی دیر پہلے تمہیں ہوا میں اڑتا دیکھ... اور...... اب جادو کے زور پر حلیوں کی تبدیلی!" میں... ڈاکٹر موننگ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے ... رنگ میں کہا" وچ ڈاکٹر اور طب ڈاکٹر بھی اچھا... ہے۔"

ڈاکٹر موننگ نے چینی طب میں ڈاکٹریٹ کر ر... آخری جملہ میں نے اسی تناظر میں کہا تھا۔ ڈاکٹر موننگ ... سا مسکرایا اور ہانگ چو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"آؤ ہم سب باہر چلتے ہیں۔ میں بھی ان دونوں ... چھوٹا سا لیکچر دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ کسی مرحلے پر تمہار... کوئی خطرہ پیدا نہ کر سکیں۔"

ہانگ چو نے اثبات میں گردن ہلائی اور پھر... ہانگ چو کے ملازمین کے پاس پہنچ گئے انہوں نے ... بدلے ہوئے چہروں میں دیکھا تو ان کی ... سیمگی ابھر... گئی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے باری باری ہمیں دیکھنے ... اس موقع پر ڈاکٹر موننگ نے ایک اور چمتکار دکھایا۔

وہ نپے تلے قدموں سے دو حملہ آوروں کی لاشو... پاس پہنچا۔ انہیں سیدھا کیا اور دو فٹ کے فاصلے پر لٹا... لاشوں کے سروں کا رخ دشمن لانچ کی جانب تھا اور مخالف سمت میں۔ پاؤں کے بعد لانچ میں آٹھ فٹ ... خالی تھی۔ ڈاکٹر موننگ اسی جانب لانچ کے کنارے پر ... رک گیا۔ ہم سب سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے تا... فان اور ینگ لی کی نگاہوں میں سوالات کے علاوہ ... خوف و ہراس بھی موجزن تھا۔

ڈاکٹر موننگ نے سنجیدگی سے ہمیں دیکھا پھر اس ... لاشوں کی طرف متوازن دوڑ لگا دی۔ وہ دونوں لاشوں ... درمیان پہنچا' ایک جھٹکے سے جھکا، اس کے دونوں ہاتھ ... دونوں کے گریبانوں تک پہنچے اور دوسرے ہی لمحے وہ ... لاشوں کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے ان کی لانچ کی سمت ... کر چکا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی چیل ز... پڑے ہوئے گوشت کے پارچے کو اپنے پنجوں میں دبو... فضا میں پرواز کر جاتی ہے۔

میں اور راکیل بہ شمول ہانگ چو حیرت زدہ تھے ج... ینگ لی اور چی فان کے چہرے تاریک ہو گئے تھے ... تاریکی میں سخت خوف پایا جاتا تھا۔ انہیں ہانگ چو کی ... ہوئی کہانی پر کامل یقین آ گیا تھا۔ کوئی زبردست جادو... ایسے ایسے کمالات دکھا سکتا ہے!

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر موننگ ہوا میں اڑتے ہوئے وا...

...پر آ گیا۔ پھر اس نے ایک گن رکھ کر باقی دونوں آٹو... بھی دوسری لانچ پر پھینک دیں۔ ہم جو ڈراما کھیلنے ... تھے اس میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یہ بہت ... تھا۔ حملہ آوروں کا صرف ایک ساتھی اپنی گن سمیت ... غائب ہونا چاہیے تھا تاکہ شنی مونگا ہماری توقع کے ... بق سوچنے پر مجبور ہو سکے! اپنی لانچ پر واپسی سے پہلے ... ہم نے دشمن لانچ کا انجن بھی خاموش کر دیا تھا۔

...اکٹر موننگ ریفوشے اب ہانگ چو اور اس کے دونوں ... سے مخاطب تھا" میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں اسے غور ... اور اپنے دماغوں میں نقش کر لو۔"

...نگ چو ہماری پلاننگ سے واقف تھا لیکن ملازمین کے ... ل ڈالنے کی خاطر وہ بھی گہری سنجیدگی سے ڈاکٹر موننگ ... رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا" سمندر کے اس حصے میں کسی قسم کا ... اقعہ پیش نہیں آیا۔ تم لوگ اس لانچ اور اس پر سوار لوگوں ... رے میں کچھ نہیں جانتے۔" ڈاکٹر نے مذکورہ لانچ کی ... انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا" بلکہ ہماری لانچ ... کے اس حصے میں آج آئی ہی نہیں۔ تم لوگوں نے ... ے حصے میں فشنگ کی ہے۔"

وہ سانس لینے کی خاطر ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری ... ہوئے بولا" تم دونوں ہمارے بارے میں صرف اتنا ... ہو کہ ہانگ چو نے ہمیں اس لانچ پر آج کا دن ... نے کا موقع دیا ہے۔" پھر وہ ہانگ چو کی جانب روئے ... موڑتے ہوئے بولا" اور تم بھی ہم سے واقفیت نہیں ... ۔ میں نے آج صبح تم سے کہا کہ میں اپنے دو ساتھیوں ... ہمراہ سمندر کی سیر کرنا چاہتا ہوں اور فشنگ دیکھنا چاہتا ... ۔ تم نے ایک معقول معاوضہ لے کر ہمیں لانچ پر سوار ... لیا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہم کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں ... میں کہاں جانا ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی ... پورا دن کھلے سمندر میں فشنگ کرنے کے بعد تم ہمیں ... سے پر اتار دو گے۔ تم سے جو بھی پوچھ گچھ کی جائے تم اسی ... مطابق جواب دو گے۔"

تھوڑا توقف کر کے ڈاکٹر موننگ نے ان کے چہروں پر ... ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا پھر گمبھیر اور دھمکی دار لہجے میں بولا۔ ... تم لوگ من و عن میری ہدایت پر عمل کرو گے تو زندہ بھی رہو ... اور فائدے میں بھی۔ بہ صورتِ دیگر......!"

ڈاکٹر موننگ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر بڑے معنی خیز مگر ... خطرناک انداز میں باری باری ان تینوں کو دیکھا۔ اس کا دیکھنا ... بہ خیز ثابت ہوا۔ ینگ لی اور چی فان تیزی سے آگے بڑھے اور ڈاکٹر موننگ کے قدموں میں گر گئے۔ پھر وہ اپنی جان کی امان کے لیے گڑگڑا کر اس سے التجائیں کرنے لگے۔

ہانگ چو اس ڈرامے سے واقف تھا لیکن اپنے ملازمین کی تسلی کے لیے وہ بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ ہماری پلاننگ نے اسے شنی مونگا کے خطرے سے محفوظ کر دیا تھا۔ اگر وہ ہماری بتائی ہوئی کہانی کے مطابق مو دکرتا تو ہمارے حوالے سے اس پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی تھی۔ اس نے تشکرانہ نظر سے باری باری ہم تینوں کو دیکھا پھر اس کی نگاہ ڈاکٹر موننگ پر آ کر ٹک گئی۔

ڈاکٹر موننگ نے ینگ لی اور چی فان کو اٹھ کر کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ انہوں نے فوراً سے پیشتر اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ ڈاکٹر موننگ نے کہا" اب تم دونوں اس لانچ سے افراتفری کے آثار کو مٹاؤ گے۔ ہر شے کو اس کی اپنی جگہ پر پہنچا دو اور لانچ کے جن حصوں پر خون کے دھبے آ گئے ہیں انہیں بھی اچھی طرح دھو کر صاف کر دو۔ کہیں سے بھی یہ دکھائی نہیں دینا چاہیے کہ یہاں کوئی معرکہ ہوا ہے۔"

وہ دونوں بڑی تیزی سے اپنے سر کو اثباتی جنبشیں دینے لگے پھر چی فان نے رسی میں جکڑے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈرتے ڈرتے پوچھا" اس کا کیا کرنا ہے؟"

"فی الحال اسے کولڈ اسٹوریج میں پکڑی ہوئی مچھلیوں کے پاس پہنچا دو۔" ڈاکٹر موننگ نے حتمی لہجے میں کہا" اس کے خوف کا درجۂ حرارت کافی "اوپر چڑھا" ہوا ہے۔ تھوڑی دیر ٹھنڈک میں رہے گا تو بہت سکون محسوس کرے گا۔ ساحل تک پہنچنے سے پہلے میں اس کے بارے میں فیصلہ کر لوں گا۔"

دونوں ملازمین اپنے کام میں جُت گئے۔

ہانگ چو کو لے کر ہم ایک طرف آ گئے۔ پھر میں نے اس کے ہاتھ پر ایک معقول رقم رکھتے ہوئے کہا" اب تو تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہے نا؟"

"بالکل نہیں" وہ پُراعتماد لہجے میں بولا" آپ لوگوں نے ایسا کچھ کر دیا ہے کہ میں شنی مونگا اور اس کے کسی بھی آدمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا ہوں لیکن......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور ہاتھ والی رقم کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا" یہ میں نہیں لوں گا...... ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک نہیں۔ میں اپنے مہمانوں سے......"

"یہ رقم اپنی جیب میں رکھ لو مسٹر ہانگ چو!" ڈاکٹر موننگ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا" جزیرے پر جا کر تمہارے

ساتھ کسی بھی قسم کے حالات پیش آ سکتے ہیں۔ اگر یہ رقم تمہارے پاس ہوگی تو تم قسم کھا کر اور یہ رقم دکھا کر خود کو سچا ثابت کر سکتے ہو اور یہ قسم جھوٹی بھی نہیں ہوگی۔ اس میں کوئی شک اور غلط بیانی نہیں کہ یہ رقم ہم نے ہی تمہیں دی ہے۔ یہ رقم تمہاری حفاظت کرے گی۔"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ رقم کو جیب میں رکھتے ہوئے اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "آپ لوگوں نے میری حفاظت اور نجات کا بندوبست تو کر دیا لیکن اپنے بارے میں بھی کچھ سوچا ہے۔ اگر جزیرے پر پہنچ کر شنی مونگا کے آدمیوں سے سامنا ہو گیا تو کیا کرو گے؟"

"جب کی جب دیکھیں گے۔" ڈاکٹر مونگ بے پروائی سے بولا "ابھی زونارا آئی لینڈ پر پہنچنے میں کافی وقت باقی ہے۔ ویسے آنے والی رات میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ یہ رات تو بہر حال ہمیں جزیرے پر ہی گزارنا ہوگی! ہم کل صبح ہی یہاں سے نکل سکیں گے۔"

"میں تم لوگوں کی ہر قسم کی مدد کے لیے تیار ہوں۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا "ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم لوگوں نے خود کو جہاز کے مسافروں سے الگ کیوں کر لیا۔ تم تو اس واقعے کے ہیروز ہو مگر تمہارا انداز اور تیور خاصے الجھے ہوئے ہیں؟"

اس کا الجھنا عین فطری تھا۔ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا "جزیرے پر پہنچ کر ذرا سکون کا سانس لیں تو پھر ہم تمہیں اپنے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے۔ بے فکر رہو کہ ہم جرائم پیشہ یا غلط قسم کے لوگ نہیں ہیں۔"

"تم نہ بتاؤ پھر بھی یہ حقیقت چھپی ہوئی نہیں۔" وہ مرعوب لہجے میں بولا "اگر تم لوگ غلط ہوتے تو اس جہاز کو ہائی جیکرز کے چنگل سے نہ نکالتے اور تین اہم افراد کو رہائی نہ دلاتے۔ تمہارا موجودہ طرزِ عمل کسی مجبوری یا مصلحت کے تحت ہے!"

"تم نے ہمارے حالات کا بالکل درست تجزیہ کیا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہم اس وقت واقعی حالات کے ہاتھوں مجبور ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں اس مصلحت کی وضاحت ہم ضرور کریں گے مگر جزیرے پر پہنچ کر۔"

وہ مطمئن انداز میں سر ہلانے لگا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "اگر حالات بالکل نارمل رہتے ہیں تو تم تینوں جزیرے پر پہنچ کر خاموشی کے ساتھ لانچ سے اتر جانا اور پوسٹ آفس کے قریب رک کر میرا انتظار کرنا۔ میں لانچ کے معاملات سے نمٹ کر سیدھا تمہاری طرف آ جاؤں گا۔ پوسٹ آفس پندرہ بیس کے قدمی فاصلے پر ہے۔ اس جزیرے پر صرف ایک ہی پو آفس ہے جو صبح سے رات گئے تک کھلا رہتا ہے۔ کسی پوچھو گے تو تمہیں بتا دے گا۔" وہ ایک لمحے کو متوقف اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اگر حالات گڑبڑ ہو جاتے ہیں تو......!"

میں نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی اور کہا "تو ہر گڑبڑ سے نمٹ کر ہم بالآخر پوسٹ آفس ہی پہنچیں گے ہم سے ملنے ادھر ہی آ جانا۔ ہم تمہارا کریں گے۔"

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا' خاموشی سے اثبات میں گرد کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو سے کہا "اب تم جلدی لانچ کا انتظام سنبھال لو تمہیں ایک لمبا چکر کاٹ کر دوسر زاویے سے جزیرے تک پہنچنا ہے۔"

وہ گردن کو ایک بڑے زاویے کا خم دے کر انجن روم طرف بڑھ گیا۔

تنہائی میسر آتے ہی راکیل نے الجھن بھرے لہجے کہا "سب معاملات تو طے ہو گئے لیکن ابھی تک اس شخص بارے میں کوئی فیصلہ سامنے نہیں آیا جو ادھر مچھلیوں کے سا وقت گزار رہا ہے۔ کیا اسے اپنے ساتھ جزیرے پر لے کر مناسب ہوگا؟"

راکیل کی بات مکمل ہوئی تو اس کے ساتھ ہی میں نے سوالیہ نظر سے ڈاکٹر مونگ کو دیکھا۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا "اس بدبخت کو جزیرے پر کون لے کر جا رہا ہے؟"

"تو؟" راکیل پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا "ہانگ چو لانچ کو دوسرے رخ پر لے جائے گا پھر اس شخص کو اس کی گن سمیت سپردِ آب کر دیا جائے گا۔" ایک لمحے کے وقفے سے وہ اضا کرتے ہوئے بولا۔ "جب انسان کا اس سمندر کی مچھلیوں حق ہے تو جواب میں وہ بھی کچھ استحقاق رکھتی ہیں!" بڑے معنی خیز انداز میں بات ختم کرتے ہوئے اس نے ایک کہاوت کو دہرایا۔

اس کہاوت کا مفہوم کم و بیش یہ بنتا تھا...... خس کم جہاں پاک!

میں نے بدھ مت کے افراد کو عموماً رقیق القلب اور امن پسند پایا تھا۔ بعض کٹر بدھ بھکشو تو ایک چیونٹی کو مارنا بھی گوارا ہیں کہ عظیم بدھا کی یہی تعلیمات ہیں۔ بہر حال: صورتِ حال عام بدھ کے پیروکاروں میں دکھائی نہیں دیتی

مجھے اس مذہب کے ماننے والوں کے قریب رہنے کا بہت موقع ملا ہے اور میں نے دوسرے مذاہب کی طرف ان لوگوں میں بھی مختلف درجے دیکھے ہیں۔ بدھا کی تعلیمات پر پوری طرح عمل پیرا بدھ بھکشو' بدھا کی تعلیمات سے انتہائی دور زندگی گزارنے والے لوگ اور ایک بڑا طبقہ ان افراد کا جو بہ وقتِ ضرورت بدھا اور بدھ عبادت گاہ کا رخ کرتے ہیں اور وقتِ یا ضرورت نکل جانے کے بعد پھر اپنی مصروفیات میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بہرحال جس طرح اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں، بالکل اسی طرح ہر مذہب کے پیروکاروں میں بھی ہر قسم کے افراد مل جائیں گے کیوں کہ..... کوئی بھی مذہب ہو یا ملت' فرقہ ہو یا قوم' وہ اسی دنیا میں موجود ہوتا ہے لہٰذا اس میں اچھے برے افراد بھی شامل ہوتے ہیں!

میں چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مونگ کو دیکھتا رہا پھر پُر معنی لہجے میں کہا" تمہاری مارشل آرٹس ٹیکنیکس کی طرح بعض اوقات سوچ بھی لیتھل (مہلک) ہو جاتی ہے!"

مارشل آرٹس میں ایسے داؤ پیچ کو لیتھل ٹیکنیکس کہا جاتا ہے جن کا استعمال مدِمقابل کو پلک جھپکتے میں موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ انسانی جسم پر سامنے اور عقبی حصے میں ایسے نازک اور حساس مقامات پائے جاتے ہیں جن پر لگنے والی ضرب جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ مارشل آرٹس کی زبان میں یہ مقامات پریشر پوائنٹس کہلاتے ہیں۔ پریشر پوائنٹس کی تعداد سات ہے۔ چار سامنے اور تین عقب میں۔ کبھی ان پوائنٹس کی وضاحت بھی کروں گا۔

ڈاکٹر مونگ نے میرے سوال کے جواب میں کہا" دشمن صرف دشمن ہوتا ہے۔ اسے دشمنی کرنے کے لیے بھی کوئی موقع نہیں دینا چاہیے ورنہ اپنی زندگی خطرات میں گھر جاتی ہے۔"

اس کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ محبت اور جنگ کے اپنے اصول ہیں جن کی پاس داری بہرحال لازمی ہوتی ہے۔ میں کسی انکار یا تکرار کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا خاموشی اختیار کر لی۔

☆☆☆

پوسٹ آفس خاصے بارونق علاقے میں تھا۔ ہم ٹھیک چھے بجے وہاں پہنچ گئے۔ ہانگ چو نے غلط نہیں کہا تھا۔ ساحل سے پوسٹ آفس تک بہ مشکل پندرہ فٹ کا پیدل کا راستہ تھا۔ زونارا آئی لینڈ تھا ہی کتنا بڑا جو کہیں آنے میں دیر لگتی!

خدا کا شکر تھا' لانچ سے اترتے وقت کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہ آیا ورنہ نوے فی صد اس بات کا امکان تھا کہ جزیرے پر قدم رکھتے ہی شی مونگا کے گروہ سے ٹکراؤ ہو جاتا۔ ہم نے ساڑھے چھے بجے تک ادھر اُدھر ٹہل کر ہانگ چو کا انتظار کیا پھر ایک متوسط ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ وہاں سے پوسٹ آفس کا مین گیٹ بڑی وضاحت سے دکھائی دیتا تھا۔ اس وقت تک اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا اور فضا میں اچھی خاصی خنکی رچ بس گئی تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے ویٹریس کو تین کافی کا آرڈر دے دیا۔ راکیل نے تشویش بھرے لہجے میں کہا" مجھے تو لگتا ہے ہانگ چو اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ بے چارہ ہماری وجہ سے ایک مصیبت کو گلے لگا بیٹھا ہے۔ اس کا انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تمہاری سوچ سے مایوسی جھلکتی ہے۔" ڈاکٹر مونگ نے تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔ میں محسوس کر رہا ہوں موجودہ حالات نے تمہارے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ سیٹل پہنچ کر تمہیں چند روز مکمل آرام کرنا چاہیے۔"

وہ ڈاکٹر مونگ ریفو شے سے نظر چرا کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں کھسیاہٹ تھی۔

میں نے کہا" ہمیں ہانگ چو کی طرف سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں وفاداری اور جی داری کے آثار دیکھے ہیں۔ ممکن ہے وہ کسی اہم مسئلے میں الجھ گیا ہو اس لیے آنے میں دیر ہو گئی!"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" ڈاکٹر مونگ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا" امکانات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے!... ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا" اگر ہانگ چو واقعی کسی مسئلے سے دوچار ہو گیا ہے تو پھر وہ مسئلہ یقینی طور پر شی مونگا سے متعلق ہی ہو سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ سوچنے والے انداز میں خاموش ہو گیا۔ ویٹرس نے آرڈر سرو کر دیا تھا۔ ہم کافی کی چسکیاں لینے لگے۔ اس دوران میں ہم گاہے بہ گاہے نگاہ اٹھا کر پوسٹ آفس کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر مونگ نے کہا۔

"ہم آٹھ بجے تک ہانگ چو کا انتظار کریں گے۔ اگر وہ یہاں نہیں پہنچا تو پھر اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ہم نہ تو ساری رات اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہ سکتے ہیں اور نہ پوسٹ آفس کے سامنے ٹہل لگانا مناسب ہوگا۔ یہ تو اچھا ہوا ہم اس وقت اپنے اصلی حلیوں میں ہیں ورنہ شی مونگا اور [illegible] لوگوں کا دھڑکا لگا تھا۔"

ہم نے اچھا خاصا وقت ریسٹورنٹ میں بتایا اور تقریباً

ساڑھے سات بجے اٹھ گئے۔ باقی کا طے شدہ وقت ہم نے پوسٹ آفس کے سامنے مٹر گشت کرتے ہوئے گزارا۔ پھر ٹھیک آٹھ بجے جب ہم ہانگ چو کی طرف سے ناامید ہو چکے تھے کہ اس کی صورت نظر آ گئی۔

ہم تینوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور نتیجے میں اس کی جانب بڑھ گئے۔ چند سیکنڈ کے بعد ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔ ہانگ چو نے پہلے تو اس تاخیر کے لیے ہم سے معذرت کی پھر تاخیر کا سبب بیان کرتے ہوئے بولا۔

''میں دراصل پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد آپ لوگوں کی طرف آنا چاہتا تھا تاکہ آگے کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ میں نے نہ صرف آپ کے رات گزارنے کا محفوظ بندوبست کرلیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کرآیا ہوں کہ اغوا شدہ طیارے کے تمام مسافر زونارا آئی لینڈ سے رخصت ہو گئے ہیں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا الاسکا کی وہ ہائی اتھارٹیز بھی، جن کی خاطر اس طیارے کو ہائی جیک کیا گیا تھا؟''

ہم لانچ پر ہانگ چو کی ٹی ڈبلیو اے کے بوئنگ سیون فور سیون اور بروس نولز وغیرہ کے بارے میں مختصراً بتا چکے تھے۔ اس نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔

''ہاں، وہ تینوں افراد بھی روانہ ہو چکے ہیں۔ آپ تینوں یہاں رہ گئے ہیں۔''

میں ایک طویل اطمینان بھری سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو سے سوال کیا ''تم نے ہماری رہائش کا کیا بندوبست کیا ہے؟''

''یہاں قریب ہی ساحل کے ساتھ ساتھ مختلف ہٹس بنے ہوئے ہیں جو پکنک کے شوقین افراد کے کام آتے ہیں یا پھر وہ سیاح یہاں قیام کرتے ہیں جو زونارا آئی لینڈ پر رات گزارنے کے ارادے سے آتے ہیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!''

ہانگ چو نے اپنی آنکھوں اور ہاتھوں کو ایک ساتھ بڑے معنی خیز انداز میں حرکت دی۔ ہم چونکہ اس کی بات کا مطلب بڑی وضاحت سے سمجھ گئے تھے اس لیے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اس جزیرے کی رات، خصوصاً ساحل پر گزاری جانے والی رات کا اپنا ایک لطف ہے۔ اس فضا میں بڑا رومان اور چاشنی ہے۔ اس کیفیت کو بیان نہیں بلکہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سیزن میں یہاں جگہ ملنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے مگر آج کل آؤٹ سیزن ہے اس لیے اکثر ہٹس خالی پڑے ہوئے ہیں۔''

وہ سانس لینے کو رکا پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا

''میرا دوست چیانگ یہاں ایک ہٹ کا چوکیدار ہے۔ میں نے اس سے بات کرلی ہے۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے۔ اس کے ہاتھ پر تھوڑی رقم رکھ دو گے تو وہ خوش ہو جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر وہاں رات گزار سکتے ہیں۔ چیانگ کے لیے یہ اضافی آمدنی ہوگی جو سراسر اس کی جیب میں جائے گی۔ وہ جی جان سے آپ لوگوں کی خدمت بھی کرے گا اور حفاظت بھی!''

اس بات چیت کے دوران ہم ہانگ چو کے ساتھ ایک طرف چل بھی رہے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا ''شی مونگا یا اس کے گروہ سے سامنا تو نہیں ہوا؟''

اس نے نفی میں گردن ہلادی۔ پھر قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی ہم سے بیس فٹ آگے جا کر رکی۔ ہانگ چو نے ٹیکسی ڈرائیور سے مقامی زبان ''زونارین'' میں کچھ مکالمات کی۔ اگلے ہی لمحے ہم ٹیکسی کے اندر تھے۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہانگ چو نے ایک اوسط درجے کے ریسٹورنٹ کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ ہم نے مذکورہ ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا۔ اس دوران میں ہانگ چو نے ہمیں بتایا کہ وہ جس ہٹ میں ہمیں لے جا رہا تھا، ریسٹورنٹ وہاں سے محض پانچ منٹ میں پہنچا جا سکتا تھا۔ احتیاط کے پیشِ نظر اس نے منزل سے پہلے ہی ٹیکسی چھوڑ دی تھی۔ اس کی یہ محتاط روی مجھے پسند آئی۔

ٹھیک نو بجے رات ہم مذکورہ ہٹ میں تھے۔ وہ ایک چھوٹا سا ہٹ تھا جو عام سائز کے دو بیڈ رومز پر مشتمل تھا۔ کمروں کے آگے مختصر سا برآمدہ اور پھر پچیس بائی دس فٹ کا احاطہ۔ ہٹ کا دوسرا رخ سمندر کی جانب تھا۔ ہٹ سے سمندر کی طرف جانے کے لیے لگ بھگ بیس اسٹیپس کی ایک پختہ سیڑھی اترنا پڑتی تھی۔ بہرحال سمندر کا پانی اس سیڑھی سے پچاس فٹ کی دوری پر تھا۔

چیانگ تیس سال کا ایک صحت مند، چاق و چوبند اور پستہ قامت شخص تھا۔ اس نے بڑے پُرجوش انداز میں ہمارا استقبال کیا اور جب ہانگ چو کے ایما پر میں نے دس امریکی ڈالر اس کی ہتھیلی پر رکھے تو اس جوش و خروش میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اسے بیٹھے بٹھائے دس ڈالر یعنی تین سو ڈرم کی آمدنی ہوگئی تھی اور یہ آمدنی خالصتاً اس کی جیب میں جانے والی تھی۔ چیانگ نے ہمیں بتایا کہ جنوری کا مہینہ عموماً یونہی مکھیاں مارتے گزر جاتا تھا، بس کبھی کبھار ہمارے جیسے مہربان ادھر کا رخ کر لیتے تھے۔

ہانگ چو کو واپس جانے کی جلدی تھی اور وہ ہمارے ساتھ کچھ ضروری باتیں بھی کرنا چاہتا تھا۔ راکیل، چیانگ کے ساتھ سمندر کا جائزہ لینے کے لیے گئی تھی تو ہم دونوں ہانگ چو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسے زیادہ فکر ہماری روانگی کی تھی اور یہی سوال اس نے سب سے پہلے کیا۔

''آپ لوگوں کا اس جزیرے پر زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں بولا ''اگر شی مونگا کو آپ کے میک اپ زدہ چہروں پر ذرا بھی شک ہوگیا تو آپ کے ساتھ میرے لیے بھی بڑی مشکل ہو جائے گی۔ وہ بے چارہ یہی سمجھ رہا تھا، ہم تینوں میک اپ میں ہیں جبکہ ہم اپنے اصلی حلیوں میں تھے۔ وہ ایک لمحے کو رکا پھر پوچھا ''آپ کب تک یہاں سے روانہ ہو جائیں گے؟''

میں نے اس کی پوزیشن کو سمجھتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا ''تم فکر نہ کرو ہانگ چو! ہم کل کسی وقت اس جزیرے کو چھوڑ دیں گے۔''

یہ بات میں نے روا روی میں کہہ دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، ڈاکٹر مونگ نے اس سلسلے میں کیا سوچ رکھا تھا تاہم وہ اس موقع پر خاموش رہا۔

ہانگ چو نے سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا پھر بولا ''ویسے آپ لوگوں کے لیے میدان صاف ہے۔ طیارے کے عام اور خاص تمام مسافر یہاں سے رخصت ہو چکے ہیں۔ آپ کل کی فلائٹ سے بہ سہولت اپنی منزل کی طرف سفر کر سکتے ہیں لیکن...... ظاہر ہے، اس کے لیے آپ لوگوں کو یہ میک اپ اتارنا ہوگا اور......''

اس نے ادھورا جملہ چھوڑا پھر بڑے رازدارانہ انداز میں بولا ''اگر آپ لوگ انہی تبدیل شدہ حلیوں میں سفر کا ارادہ رکھتے ہیں تو بھی میں آپ کے لیے ایک راہ نکال سکتا ہوں۔''

میں نے اور ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا پھر پوری طرح متوجہ ہو گئے۔ وہ ہماری نگاہوں سے جھلکتے استفسار کو سمجھ گیا اور وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''کل دوپہر کے بعد، دو بجے نارویجین کروز لائن کا ایک شپ (بحری جہاز) زونارا آئی لینڈ سے لاس اینجلس روانہ ہونے والا ہے۔ ''ایس ایس۔ ناروے'' نامی یہ دیوہیکل بحری جہاز دنیا کا سب سے بڑا مسافر بردار جہاز سمجھا جاتا ہے۔ میں کوشش کر کے ایس۔ ایس۔ ناروے میں آپ لوگوں کو فٹ کروا سکتا ہوں۔ اس سے اتنا تو ہوگا کہ تم یو ایس اے میں داخل ہو جاؤ گے۔ سیئٹل (واشنگٹن) نہ سہی، لاس اینجلس (کیلیفورنیا) ہی سہی۔ میرا خیال ہے، آپ لوگوں کے لیے آگے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔''

ہانگ چو خاموش ہو کر سوالیہ نظر سے ہمیں تکنے لگا۔ وہ ایک اچھا آئیڈیا پیش کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہماری نگاہوں میں اس وقت ایک ہی مفہوم بسا ہوا تھا اور وہ یہ کہ...... ناروجین کروز لائن کے بحری جہاز میں ہم اپنی اصلی شکل و صورت سے سفر کر سکتے تھے۔ میں نے ہانگ چو سے پوچھا۔

''کل دوپہر دو بجے زونارا آئی لینڈ سے روانہ ہونے والا ''ایس ایس۔ ناروے'' ہمیں کب لاس اینجلس پہنچائے گا؟''

''کم و بیش ایک ہفتہ تو لگے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سرِدست نفی میں گردن ہلادی ''پھر تو بے کار ہے۔''

''بحری جہاز کی رفتار بہت زیادہ نہیں ہوتی۔'' ہانگ چو بتانے لگا ''ایس ایس ناروے نے آسٹریلیا سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ پھر مارشل آئی لینڈ، مڈوے آئی لینڈ، ہوائین آئی لینڈز سے ہوتے ہوئے وہ زونارا آئی لینڈ پہنچا ہے۔ اب یہاں سے سیدھا لاس اینجلس جائے گا۔ لانگ روٹ کے بحری جہازوں کو مہینوں سمندری سفر میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔''

''سمندر اور سمندری ذرائع آمدورفت کے بارے میں تمہاری معلومات قابلِ رشک ہیں مسٹر ہانگ چو؟'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''یہ میرا پروفیشن ہے۔ میرا پورا دن سمندر میں گزرتا ہے۔ اس قسم کی معلومات تو رکھنا پڑتی ہیں نا!''

''ٹھیک ہے ہانگ چو!'' ڈاکٹر مونگ نے کہا ''ہم آج رات میں سوچ بچار کر کے کسی فیصلے پر پہنچ جائیں گے، صبح تمہیں بتا دیں گے کہ ہم بائی سی سفر کا ارادہ رکھتے ہیں یا بائی ائر!'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے اضافہ کیا۔

''ویسے تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ کل ہم اگر بائی ائر جانا چاہیں تو کس فلائٹ سے سفر ممکن ہے اور کتنے بجے؟''

ہانگ چو نے جواب دیا ''کل صبح مقامی ائر لائنز کی ایک ائر بس ''اے تھری تھرٹی'' یہاں سے ٹھیک آٹھ بجے پرواز کرے گی۔ اس فلائٹ کی منزل سیئٹل ہے۔''

میں نے بہت سارے شکریے کے ساتھ ہانگ چو کو

رخصت کر دیا۔ جاتے ہوئے میں نے اسے یہ بات سمجھا دی تھی کہ ہم مذکورہ ائربس سے سفر کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے لہٰذا وہ ہمیں علی الصبح ''تنگ'' کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم اپنی روانگی کے بارے میں اسے بعد میں خود بتادیں گے۔ میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ وہ خالی ہاتھ رخصت نہ ہو۔ اس کے ''نہ نہ'' کرنے کے باوجود بھی میں نے اسے دو سو ڈالرز بردستی تھما دیے۔ اس نے جس طرح ہم سے تعاون کیا اور جس طرح ہمارے کام آرہا تھا، یہ رقم اس کا معاوضہ نہیں تھی۔ یہ تو ایک تحفہ تھا جو ہم نے اپنے اجنبی مخلص اور دوست پیشہ میزبان کو پیش کیا تھا۔ اس رقم کو وہ مقامی کرنسی میں بدلتا تو یہ چھ سو ڈرم ہو جاتے۔

ہانگ چو کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا ''تم کافی دیر سے گہری سوچ میں ہو۔ کیا بچار ہو رہی ہے؟''

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا، اپنے مخصوص لہجے میں بولا ''میں اس وقت صرف تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو دوست؟''

''ہانگ چو سے ہونے والی تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم کل صبح آٹھ بجے بوردنارا ائرپورٹ سے روانہ ہونے والی ائربس میں سفر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بحری جہاز پر سوار ہونے سے پہلے بھی تم انکاری ہو۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، تم زونارا آئی لینڈ پر چند روزہ قیام کے بارے میں سوچ رہے ہو۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر مونگ؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

وہ بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا ''میں نے جو محسوس کیا وہی کہہ رہا ہوں۔''

''تم جانتے ہو ڈاکٹر مونگ، میں پہلی فرصت میں نیویارک پہنچنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''ایس ایس ناروے'' نامی وہ کروز لائن ایک ہفتے تک مجھے سمندر کے بیچ سوالیہ نشان کے مانند لٹکائے رکھے گا۔ میں ایسے کسی بھی سست رفتار ذریعہ سفر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

وہ قدرے شاکی لہجے میں بولا ''اور سیٹل جانے والی ائربس میں کیا خرابی ہے؟''

''وہ......وہ......'' میں گڑبڑا گیا ''وہ تو میں نے ایسے ہی ہانگ چو کو ٹالنے کے لیے کہہ دیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، تم سیٹل جانے سے سراسر انکاری نہیں ہو!'' وہ میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولا ''اگر میں ادھر کا رخ کرنا چاہوں تو تم میرا ساتھ دو گے؟''

میں نے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔''

''ہوں!'' وہ ایک پُرمعنی ہنکاری بھر کر رہ گیا۔

میں نے اس کا دھیان بٹانے کی خاطر گفتگو کا زاویہ بدل دیا ''ڈاکٹر مونگ نے ہانگ چو کی لانچ پر مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جزیرے پر پہنچتے ہی تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو گے۔ میں اگر نیویارک جانا چاہتا ہوں تو تم مجھے روکنے کی کوشش نہیں کرو گے؟''

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''تم میری طرف سے آزاد ہو۔ نیویارک جاؤ یا میکسیکو، میں تمہاری راہ میں رکاوٹ کھڑی نہیں کروں گا......اور یہ تو تمہیں بھی اندازہ ہے کہ تم اکیلے اس جزیرے سے کہیں نہیں جا سکتے۔ تمہیں بہرحال، میری مدد کی ضرورت ہے۔''

میں نے اس کے چہرے پر نظر گاڑتے ہوئے کہا ''یہ ''مدد'' میں نے تم سے مانگی تھی مگر اس سلسلے میں بھی تم نے یہی کہا تھا، زونارا آئی لینڈ پہنچنے کے بعد ہم اس موضوع پر بات کریں گے؟'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے یاددہانی کے انداز میں کہا۔

''اور......اس وقت ہم زونارا آئی لینڈ پر ہی ہیں!''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''مجھے اپنی کہی ہوئی ایک ایک بات یاد ہے۔ ہم اس جزیرے سے نکل جائیں، پھر مجھ سے جو بن پڑا، میں تمہارے نیویارک جانے کے سلسلے میں ضرور کروں گا۔''

میں ڈاکٹر مونگ ریفو شے کے ارادوں کو بڑی اچھی طرح بھانپ چکا تھا۔ وہ پہلی اور آخری کوشش کر کے مجھے ''اپنے بڑوں'' کے پاس سیٹل پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے ہانگ چو کی لانچ پر جاپان جانے والی جو بات کی تھی، میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے بڑوں کا حکم تھا یا خود ڈاکٹر مونگ کی اپنی تجویز!

ڈاکٹر کی بات کو نظرانداز کرنا مشکل تھا۔ میں نے جب سنجیدگی سے موجودہ حالات کا تجزیہ کیا تو مجھے بھی یہی بات موزوں اور درست لگی کہ پہلے کسی بھی صورت مجھے اسٹیٹس میں داخل ہو جانا چاہیے۔ ڈاکٹر مونگ کے مطابق (ڈسلوا) اور راکیل (گارشیا) دونوں دوست تھے اور واشنگٹن کے علاوہ سیٹل سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے تمام ضروری کاغذات اکی

مناسبت سے تیار کروائے گئے تھے۔ یو ایس اے میں داخل ہونے کے بعد ہم صرف اپنی ''آئی ڈی'' پر ایک اسٹیٹ سے دوسرے اسٹیٹ تک بہ سہولت سفر کر سکتے تھے۔ اسٹیٹس میں ''آئی ڈی'' ایک شناخت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ آپ کا کسی بھی قسم کا شناختی کارڈ، آپ کا ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ۔ آپ کی ''آئی ڈی'' اسٹیٹس قوانین کی نظر میں آپ کو قابلِ بھروسا بنا دیتی ہے۔ گویا ''آئی ڈی'' آپ کے ''اوکے'' ہونے کا ثبوت ہے!

پتا نہیں، کیا بات تھی کہ میں ڈاکٹر موتگ سے جتنا کٹنے کی کوشش کر رہا تھا، حالات اتنا ہی زیادہ مجھے اس سے نتھی کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس سے کٹنے یا دور ہونے کا سبب ہرگز یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ اس نے مجھے کوئی نقصان پہنچایا تھا یا میرے اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات رکھتا تھا۔ قطعاً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس سے اور اس کے بڑوں سے بدکنے کی وجہ نفسیاتی تھی۔ وہ لوگ پہلے کھلم کھلا اور اب درپردہ میری ساحل پر اپنا حق جتا رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں، ان کا رویہ مجھے کھلتا تھا۔ میں خود کو بلاشرکت غیرے ساحل کا حق دار سمجھتا تھا۔ اس ''حق'' میں مجھے کسی کی رتی بھر شراکت قبول نہیں تھی۔ میں اپنی اس ذہنی اور دلی کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ احساس کی زبان سے سمجھنے اور محسوس کرنے والا معاملہ ہے۔ پتا نہیں، یہ میری دیوانگی تھی یا پاگل پن! یہ جو کچھ بھی تھا، مجھے بہت عزیز تھا۔

ڈاکٹر موتگ کافی دیر سے سوالیہ انداز میں مجھے تک رہا تھا۔ میں نے ایک سوال پر مبنی جواب اس کی جانب اچھال دیا۔ ''دوست! اگر برا نہ مناؤ تو میں یہ کہے بنا نہیں رہوں گا کہ تم میری مدد کرنے کا وعدہ اس شرط کے ساتھ کر رہے ہو کہ پہلے میں تمہارے ساتھ سیئٹل جاؤں!''

''یہ میری شرط نہیں بلکہ حالات کا تقاضا ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں نے صرف اتنا کہا ''ہاں، حالات سے تو یہی نظر آ رہا ہے، مجھے تمہارے ساتھ سیئٹل جانا ہوگا۔''

''تمہارے اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔'' وہ فاتحانہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولا ''اگر لارڈ بدھا کی مرضی ہوئی تو ہم صبح آٹھ بجے والی ائربس سے سیئٹل کے لیے پرواز کر جائیں گے...... کیسے؟'' وہ اتنا کہہ کر رکا پھر ڈرامائی انداز میں بولا۔

''یہ سارے بکھیڑے تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اس سلسلے میں دماغ کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے نیند پوری کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے اس سے یہ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا کہ یہ سب کیسے ٹھیک ہو جائے گا۔ یقیناً اس کے ذہن میں کوئی ٹھوس منصوبہ ہوگا ورنہ وہ اتنے وثوق سے یہ بات نہ کرتا۔ میں نے اس کے پچھلے پروگرام پر بھی ایک لفظ نہ کہا کہ وہ جاپان جانے کا ارادہ کیا ہوا...؟ اس کے پاس ایک ریڈی میڈ وضاحت موجود تھی۔ وہ اپنے بڑوں کی آڑ میں صاف بچ نکلتا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تاکیدی لہجے میں بولا۔

''میں دوسرے کمرے میں سونے جا رہا ہوں۔ راکیل سے کہا ''وہ بھی سکون سے سو جائے۔ صبح ہمیں بہت جلدی اٹھنا ہوگا۔''

''راکیل کو تم اپنے کمرے میں سلا لو تو اچھا ہے۔ وہ باتوں میں لگ گئی تو آنکھوں میں رات کٹ جائے گی۔'' میں نے کہا ''تم سے وہ ڈری سہمی رہتی ہے۔ تم قریب موجود ہو گے تو خاموشی سے دبک کر سو جائے گی۔''

''اوکے۔'' وہ ہٹ کی سیڑھیوں والے حصے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا ''وہ آ رہی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔'' بات ختم کرتے ہی وہ اس جانب بڑھ گیا۔

میں نے برسبیلِ تذکرہ ڈاکٹر موتگ سے پوچھ لیا ''دوست! ایک بات تو بتاؤ، تم نے میرے کس رویے سے یہ اندازہ لگایا کہ میں زونارا آئی لینڈ پر چند روزہ قیام کا ارادہ رکھتا ہوں؟''

''اوہ! تمہارا ذہن ابھی تک اسی میں اٹکا ہوا ہے۔'' وہ سرسری انداز میں بولا پھر یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا ''میں نے سوچا، شاید تمہارے دل میں رسنا کے لیے کوئی ہمدردی جاگ گئی ہو۔ شی مونگا، کنگ تو ہارا ڑولا کے تاج و تخت کے ساتھ ہی اس کی بیٹی رسنا پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ تم نے ہمیشہ باطل کے خلاف حق کا ساتھ دیا ہے۔ یہاں بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال ہے!''

ڈاکٹر موتگ نے اگر یہ کوئی مذاق کیا تھا تو میں نے سنجیدہ مذاق پہلے کبھی دیکھا یا سنا نہیں تھا۔ اس کے چہرے سے جھلکتی سنجیدگی کے پیشِ نظر میں نے کہا۔

''ڈاکٹر موتگ! حق و باطل کی جنگ میری زندگی کا مقصد ہے لیکن اس جزیرے کے اندرونی معاملات میں الجھ کر میں اپنی راہ کھوٹی نہیں کرنا چاہتا۔ میرے لیے جو وسیع و عریض بساط مین ہیٹن میں بچھائی جا رہی ہے، جزیرے کے حالات اس کا پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ میں کسی بڑی بازی کے لیے چنا جا چکا ہوں۔''

وہ معنی خیز انداز میں خفیف سا مسکرایا اور کمرے سے نکل گیا۔

میں سونے سے پہلے کی ضروریات سے نمٹا اور بستر پر آ گیا۔ اس وقت میری رسٹ واچ رات دس بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ یہ زونارا آئی لینڈ کا مقامی وقت تھا۔ ہوٹل ائرپورٹ نکلتے وقت ہم نے اپنی گھڑیوں کو مقامی وقت کے مطابق سیٹ کر لیا تھا۔

میں بستر پر دراز ہوا تو آپوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں نے آج صبح اسے کسی بیڈ روم میں، عالمِ نیند میں تصور کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر موتگ کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اسے مین ہیٹن (نیویارک) پہنچا دیا گیا تھا۔ ایک بات میرے ذہن کو برابر الجھا رہی تھی۔ فیئر بینکس سے اگر ساحل کو ڈائریکٹ مین ہیٹن لایا جاتا تو زیادہ سے زیادہ دس گھنٹے صرف ہوتے جبکہ یہاں وقت کی ایک بہت بڑی خلیج دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دینالی کے ہار پر لاج میں صبح تین بجے ہی ساحل کو کسی طیارے میں سوار دیکھا تھا پھر تقریباً انیس گھنٹے بعد جبکہ میں ٹی ڈبلیو اے کے طیارے میں ڈاکٹر موتگ اور راکیل کے درمیان بیٹھا تھا تو نگاہِ تصور نے مجھے ساحل کو کسی طیارے سے نکل کر ایک ائرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوتے دکھایا تھا اور اس کے بعد، کم و بیش نو گھنٹے بعد یعنی آج صبح وہ مجھے کسی بیڈ روم میں دکھائی دی۔ یہ اعداد و شمار اور وقت کا حساب تو یہی ظاہر کرتا تھا کہ اسے براہِ راست الاسکا سے نیویارک نہیں لایا گیا تھا۔ بہرحال، یہ بات خاصی تشویش ناک تھی کہ وہ دوبارہ ربی موشے ہائمن کے چنگل میں جا پھنسی تھی۔

میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ مجھے اسی وقت ساحل تک تصوراتی رسائی حاصل کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کس حال میں ہے۔ کیا پتا، اس کوشش کے نتیجے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ اس وقت مین ہیٹن میں کہاں موجود ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہٹ کا چوکیدار باہر برآمدے میں موجود تھا۔ میں نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ بھی میرے والے کمرے میں بستر لگا لے لیکن اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا۔ وہ برآمدے ہی میں ٹھیک ہے۔ اگر ہماری حفاظت کے سلسلے میں اس سے کوئی کوتاہی ہو گئی تو وہ ہانگ چو کو کیا جواب دے گا۔ چیانگ نہایت ہی فرض شناس چوکیدار تھا۔ راکیل اور ڈاکٹر موتگ دوسرے کمرے میں تھے۔

میں نے چند لمحات تک کمرے میں موجود ہر شے کا تنقیدی جائزہ لیا پھر ایک کرسی پر نیم دراز ہو کر ساحل تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت میری تمام تر توجہ کا مرکز باطنی آنکھ یعنی پنیل (PINEAL) گلینڈ تھا۔ انسان کی پیشانی کے عین وسط میں، دماغ کے سامنے والے حصے پر موجود یہ گلینڈ بڑے کام کی چیز ہے۔ میں ''چی'' کی ایڈوانس مشقوں کے ذریعے پنیل گلینڈ کو بیدار کر چکا تھا۔ اب اس نے میرا کہنا ''ماننا'' شروع کر دیا تھا۔ میں اس ''تھرڈ آئی'' کے تجربات سے گزر رہا تھا۔

لیکن پتا نہیں، کیا بات تھی، اس وقت تصور قائم کرنے میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہو پا رہی تھی۔ پنیل گلینڈ مجھ سے تعاون پر آمادہ نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت کے ساتھ ہی انتہائی کوفت بھی محسوس ہوئی پھر جلد ہی پنیل گلینڈ کے عدم تعاون کا سبب بھی میری سمجھ میں آ گیا۔

میں اس وقت بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور اعصاب بھی ایک دم کشیدہ تھے۔ میں نے ایک پُرسکون نیند لینے کا فیصلہ کیا اور کرسی کو چھوڑ کر بستر پر آ گیا پھر میں نے اپنے دماغ کو صبح تین بجے تک نہایت ہی میٹھی اور گہری نیند کی ہدایت دی اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اگر میں پانچ گھنٹے کی بھرپور نیند لے لیتا تو میرے اعصاب چاق و چوبند ہو جاتے۔

سوچتے ہی سوچتے نیند کی گداز بانہوں نے مجھے اپنی مہربان گرفت میں لے لیا۔

☆☆☆

ٹھیک تین بجے میری آنکھ کھل گئی۔ نیند پوری ہونے کی وجہ سے بدن ہلکا پھلکا اور اعصاب مستعد ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے دماغ کو بیدار اور ہشاش بشاش پایا۔ پانچ منٹ کے اندر میں اپنی مشق بلکہ عمل کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

میں نے ایک آرام دہ پوزیشن میں بیٹھ کر ساحل کا تصور کیا اور اس مرتبہ پنیل گلینڈ نے کسی چراغی جن کے مانند میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں پنیل گلینڈ کی تیز رفتاری پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ادھر میں نے ساحل کے خال و خط کو اپنے ذہن میں ابھارا، ادھر میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے اپنے تصور کی نگاہ کو بند کرنا پڑا۔

ساحل کسی واش روم میں شاور لے رہی تھی۔

تصور کی نگاہ بند ہوئی تو ظاہرہ آنکھیں کھل گئیں۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس سانس میں کامیابی کا مخصوص نشہ اور ترنگ شامل تھی۔ میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ وہ تین دس کا وقت بتا رہی تھی۔ یہ زونارا آئی لینڈ کا

مقامی وقت تھا۔ ٹائم زون کے حساب سے اس وقت نیویارک میں صبح کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا، جب میں نے صبح ہوٹل ائرپورٹ میں ساحل تک تصوراتی رسائی حاصل کی تھی تو نیویارک میں لگ بھگ دوپہر کا وقت تھا۔ دن میں ساحل کا کسی کاؤچ پر گہری نیند میں ہونا بڑی تشویش کی بات تھی تاہم یہ تشویش حالیہ تجربے کے بعد جاتی رہی تھی کہ ساحل اس وقت پورے ہوش وحواس سے غسل میں مصروف تھی۔

میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ اگر ساحل اس وقت واش روم میں تھی تو اس کا یہی مطلب تھا، بیڈروم میں کوئی اور بھی موجود ہوگا۔ وہ ساحل کا کوئی اٹینڈنٹ بھی ہوسکتا تھا اور ربی موشے ہائمن بھی۔ میرے دل میں خواہش جاگی کہ میں کیوں نہ ربی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ یہ ایک مثبت اور ولولہ انگیز خیال تھا لہٰذا میں نے ایک عزم کے ساتھ دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

ربی موشے ہائمن کا سراپا میرے ذہن میں نقش ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے اس کی صورت کے خدوخال کو فوکس کیا اور تصور کی نگاہ سے اس تک پہنچنے کی سعی کی مگر مجھے اپنے مقصد میں واضح ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میں ایک پریشان کن تجربے سے گزرا تھا۔

میرے تصور کی پرواز کے سامنے اچانک ایک سنگلاخ سی دیوار آن کھڑی ہوئی تھی۔ تصور کا پرندہ اس دیوار سے ٹکرا کر زمین بوس ہوگیا۔ یہ نتیجہ میرے لیے خاصا حیران کن اور فکر انگیز تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میرا پیلیگینڈ پوری طرح کام کررہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ تعاون پر آمادہ نہ ہو۔ بس اس کی راہ میں اچانک ایک رکاوٹ سی آجاتی تھی۔

متعدد بار کوشش کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میری ناکامیابی کا سبب ربی موشے ہائمن تھا۔ اس نے اپنی کسی عمل یا علم کے زور پر، خود تک تصوراتی رسائی کی راہ میں کوئی نادیدہ رکاوٹ کھڑی کررکھی تھی۔ اس انکشاف کے بعد میں گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔

اب میری سمجھ میں آرہا تھا، ڈاکٹر مونگ کے "بڑوں" کے راستے میں کوئی بغزدون کیوں حائل ہوگیا تھا۔ انہوں نے بھی میری طرح ربی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اس نادیدہ پُراسرار دیوار نے انہیں بے بس کردیا ہوگا۔

ڈاکٹر مونگ نے زاویہ اور رخ بدل کر کوشش کرنی کی بات کی تھی۔ اس بات کی اہمیت اب مجھ پر واضح ہورہی تھی۔

میں بھی ایک دوسرے زاویے سے اپنے تصور کی نگاہ کو ربی کی پشت سے چپکا کر بیڈروم کے دروازے تک لے گیا تھا پھر راکیل کی پکار نے سب کچھ درہم برہم کردیا تھا۔ اگر ربی ایک مرتبہ پھر میری تصوراتی نگاہ کے فریم میں آجاتا تو میں کسی انوکھے اور کامیاب تجربے سے گزرسکتا تھا۔ اس خوشگوار احساس نے مجھے مسرور کردیا۔

میں ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ آنکھیں بند کرنے ہی والا تھا کہ کمرے میں کسی کی موجودگی کو محسوس کرکے چونک اٹھا۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

وہ راکیل تھی اور خاصی پریشان دکھائی دیتی تھی۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا "کیا بات ہے راکیل۔ تم اس وقت میرے کمرے میں کیوں آئی ہو؟"

وہ میرے قریب ہی بستر پر بیٹھتے ہوئے بولی "وجدان! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے!"

نیند سے بیدار ہونے کے بعد میں نے بستر پر ہی ایک آرام دہ پوزیشن میں نشست جمالی تھی۔ راکیل کے ڈر کا سبب میری سمجھ سے باہر تھا۔ الجھن زدہ لہجے میں، میں نے اس سے پوچھا "تم کس شے سے خوف زدہ ہو۔ ڈاکٹر مونگ جیسے زیرک شخص کی موجودگی میں ڈر کا کیا سوال؟"

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی "ڈاکٹر کمرے میں موجود نہیں وجدان!"

"وہ کہاں چلا گیا؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی "تھوڑی دیر پہلے اچانک میری آنکھ کھلی تو وہ مجھے کمرے میں نظر نہیں آیا۔ چند لمحے میں بستر پر خاموش پڑی رہی پھر اچانک ہی مجھے ایک انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا...... اور میں تمہارے پاس چلی آئی ہوں۔ تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور پوچھا "کیا تم نے ڈاکٹر مونگ کے بارے میں چیانگ سے دریافت کیا ہے؟"

"نہیں، میں سیدھی ادھر ہی آئی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی۔

میں نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا "ٹھہرو، میں چیانگ سے پوچھتا ہوں۔"

راکیل بھی میرے ساتھ ہی برآمدے میں آگئی۔

چیانگ اپنے بستر پر نیم دراز تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور ڈاکٹر مونگ کے سلسلے میں استفسار کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک گھنٹا پہلے ڈاکٹر مونگ ہٹ سے نکلا تھا۔ چیانگ نے جب اس کی واپسی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر میں واپس آجائے گا۔ اس کے ساتھیوں کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔

میں راکیل کے ساتھ واپس کمرے میں آگیا۔ ڈاکٹر مونگ کے یوں اٹھ کر خاموشی سے کہیں چلے جانے کی تشویش مجھے بھی تھی لیکن میں نے اپنی تشویش راکیل پر ظاہر نہیں ہونے دی اور کہا "تم یہاں آرام سے میرے بستر پر سوجاؤ۔ ڈاکٹر مونگ آئے گا تو دیکھا جائے گا۔"

بات ختم کرتے ہی میں کرسی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ بستر پر دراز ہوتے ہوئے بولی "کیا تمہارا سونے کا ارادہ نہیں؟"

"میں تھوڑی دیر بعد سوؤں گا۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا "کم ازکم ڈاکٹر مونگ کی واپسی تک تو مجھے جاگنا ہی ہوگا۔"

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور چند لمحے اس انتظار میں خاموش رہا کہ اگر راکیل کو میرے کام میں کوئی مداخلت کرنا ہے تو وہ سامنے آجائے۔ میری توقع غلط ثابت نہیں ہوئی اور چند سیکنڈ کے بعد ہی اس نے مجھے مخاطب کرلیا "وجدان! میں تمہارے ساتھ جاگ کر ڈاکٹر مونگ کا انتظار کروں گی۔"

میں نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ راکیل مجھے بے حد حسین دکھائی دی۔ اس کے حسن میں خوف زدگی کی کیفیت نے کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے، زوتارا آئی لینڈ کی رات اس کا سبب ہو! ہانگ چو نے بتایا تھا، اس جزیرے کی الی رات میں بہت چاشنی اور سرور ہوتا ہے۔ ہانگ چو نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ اس رات کا طلسم میری نگاہ کے سامنے تھا۔ راکیل مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق محسوس ہورہی تھی۔ اس کے سراپا میں ایک جادوئی کشش سی بھر گئی تھی۔

میں نے اپنے وجود میں ایک انتشار سا پھیلتا محسوس کیا تو راکیل کے سراپا سے نظر ہٹالی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اگر تمہیں سونا نہیں تو پھر کام کی باتیں کرتے ہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں خفیف سا مسکراتے ہوئے بولی "کام کی باتیں اتنی دور بیٹھ کر کروگے؟"

"تم نے بتایا تھا راکیل!" میں نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا "پچھلے سال ٹی ڈبلیو اے کے کریش ہونے والے طیارے میں تمہاری کوئی دوست بھی سفر کررہی تھی جو نیویارک سے پیرس جانے والی تھی۔ اس حادثے نے تمہاری دوست کو پیرس پہنچایا اور نہ ہی نیویارک میں رہنے دیا۔"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، میں اس سے کہنا کیا چاہ رہا ہوں۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا "تمہیں تو نیویارک جانے کا کئی بار موقع ملا ہوگا؟"

میری ساحل مبینہ طور پر اس وقت نیویارک میں تھی۔ اس اسٹیٹ کے بارے میں جاننے اور معلومات حاصل کرنے کی مجھے کرید لگی ہوئی تھی۔ اگر باتیں ہی کرنا تھیں تو پھر کیوں نہ مفید باتیں ہی کی جاتیں!

"میں نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ نیویارک میں گزارا ہے۔" اس نے بتایا "میں نے اپنی جس دوست کا ذکر کیا تھا، وہ چیلسی میں رہتی تھی۔ جینیفر بہت اچھی لڑکی تھی۔ میں اکثر اس کے پاس جاتی رہتی تھی۔"

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "کیا یہ چیلسی، مین ہیٹن کے آس پاس ہی کہیں واقع ہے؟"

"آس پاس کیا، چیلسی تو مین ہیٹن کے اندر ہی ہے۔" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

کتاب کے چند عنوانات

ٹیلی پیتھی
شمع بینی کی مشق
تحت الشعور
اور آپ کی مخفی قوت
جبلت کی کارفرمائیاں
ماہیت افکار
تبادلِ طرزِ تنفس
انتقالِ افکار
اور آپ کی مشقیں
مضرات انتقالِ افکار

مستقبل بینی
انسان
غیرمعمولی صلاحیتوں کا مالک
نفس امارہ
قوتوں کا سرچشمہ
مستقبل بینی
اصل حقیقت
بند چشم دیدواقعات
طاقت ور احساسات
مستقبل بینی کیسے؟
مستقبل بینی کے مضرات
اچھے اور بُرے پہلو

’’مین ہیٹن کے بارے میں تم اور کیا جانتی ہو؟‘‘ میری دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔

وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے جوش بھرے انداز میں بولی۔ ’’مین ہیٹن تو نیویارک کا دل ہے۔ اس جزیرے نے نیویارک کے باقی چار حصوں کو پوری طرح اپنی ہی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔ مین ہیٹن آئی لینڈ دراصل بروکلین، کوئینز، برونکس اور اسٹیٹن آئی لینڈ کی گود میں واقع ہے۔‘‘ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر خاموش ہوئی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

’’مین ہیٹن آئی لینڈ تیرہ میل طویل اور دو میل چوڑا ایک خوب صورت اور مرکزِ نگاہ جزیرہ ہے جسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن، مڈ ٹاؤن مین ہیٹن اور اپر ٹاؤن مین ہیٹن۔ چیلسی کا علاقہ مڈ ٹاؤن مین ہیٹن میں پایا جاتا ہے۔ معروف و مشہور ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ بھی مڈ ٹاؤن میں واقع ہے۔ بس یا...... کچھ اور؟‘‘

مین ہیٹن کے بارے میں یہ مفید معلومات آگے چل کر میرے کام آسکتی تھیں۔ زیریں، وسطی اور بالائی مین ہیٹن کی تفصیل اس وقت تک میرے لیے غیر اہم تھی جب تک میں ساحل کی بالکل درست لوکیشن سے واقف نہ ہو جاتا۔

میں نے تشکرانہ نظر سے راکیل کی طرف دیکھا اور کہا ’’بس۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔‘‘

’’تمہاری باتوں سے تو محسوس ہوتا ہے، تم مستقبل قریب میں نیویارک جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟‘‘ وہ بڑی کھوجتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے سرسری انداز میں کہا ’’ابھی تو میں نے ایسا کچھ نہیں سوچا۔ بہرحال، کوئی چاند پر جانے کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس کے بارے میں معلومات رکھنے میں کیا حرج ہے؟‘‘

’’کوئی حرج نہیں!‘‘ اس نے مخصوص امریکی انداز میں کندھے اچکا دیے۔

میں نے کہا ’’میں دس پندرہ منٹ کے لیے تم سے اجازت چاہتا ہوں۔‘‘

’’کیا تم بھی ڈاکٹر مونگ کی طرح کہیں جانا چاہتے ہو؟‘‘ وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

’’نہیں، میں ادھر کمرے میں موجود رہوں گا۔‘‘ میں نے وضاحت کر [illegible] نے کہا ’’تم خاموش رہنا اور میرے کسی کام میں مد [illegible] ت نہ کرنا۔ او کے!‘‘

وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کا جواب سننے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا اور کرسی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرنے کا اس وقت صرف ایک ہی مقصد تھا...... ساحل تک رسائی!

میں نے پینل گلینڈ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور سوچ میں ساحل کے سراپا کو ابھارنے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ میری سوچ کے پرندے نے ساحل کو چھو لیا تھا۔ وہ اس وقت ناشتے کی میز پر بیٹھی تھی اور کھانے میں مصروف تھی۔ اس کے جسم پر ایک اجلا لباس ’’نظر‘‘ آ رہا تھا جس میں وہ نکھری نکھری محسوس ہوئی۔ میں نے اس کے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو سب کچھ بدلا ہوا ملا۔ یہ وہ بیڈ روم نہیں تھا جہاں میں نے اسے ایک آرام دہ کاؤچ پر حالتِ نیند میں دیکھا تھا۔ یہ حصہ کسی ڈائننگ سے مشابہ تھا۔ میں بڑی دلچسپی سے ساحل کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ میں ساحل کی قیام گاہ کا بیرونی منظر دیکھوں تاکہ اس کی وقوع پذیری کا اندازہ ہو سکے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی سوچ میں دھیرے سے ساحل کو پکارا۔

اس پکار کا اس پر کوئی ردِعمل نہ ہوا۔ جیسے میری آواز اس تک پہنچی ہی نہ ہو۔ وہ بدستور ناشتا کرنے میں مصروف رہی۔ اس بات سے مجھے دلی اطمینان ہوا کہ میرے پکارنے سے تصوراتی سلسلہ موقوف نہیں ہوا تھا ورنہ ماؤنٹ مکنلے کے اندر جب میں نے سنگلاخ کوٹھری میں رہتے ہوئے ساحل سے پہلا تخیلاتی رابطہ کیا تھا تو اسے آواز دیتے ہی [illegible] پاش پاش ہو گیا تھا۔

میں نئے جوش اور ولولے کے ساتھ ساحل پر نگاہِ تصور جمائے بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ناشتا مکمل کر لیا۔ اگلے ہی لمحے اس کے قریب مجھے ایک لڑکی نظر آئی۔ میں نے تنقیدی انداز میں مذکورہ لڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ اگرچہ مغربی پہناوے میں تھی تاہم اس کے نقش و نگار ایشیائی تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ہو نہ ہو، اس لڑکی کا تعلق انڈیا یا پاکستان سے ہے۔ اس کی عمر پچیس تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کے انداز سے بڑی کاملیت جھلکتی تھی۔ میں بڑے خشوع و خضوع سے اس کی حرکات و سکنات کو جانچنے لگا۔

اس نے ساحل کے سامنے سے ناشتے کے برتن سمیٹے اور اس سے چند باتیں بھی کیں۔ میں نے دونوں کے ہونٹوں کی جنبشوں کو بڑی وضاحت سے ’’دیکھا‘‘ لیکن کسی قسم کی کوئی آواز مجھ تک نہ پہنچی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا کہ جب ساحل [illegible] پلیٹ میں چمچہ چلا رہی تھی تو اس ٹکراؤ سے ایک مخصوص قسم [illegible]

[illegible] بھی پیدا ہو رہی ہوگی۔ وہ مخصوص آواز بھی مجھ تک نہیں [illegible] پائی تھی۔ میں اس وقت اپنے وجود کی جس صلاحیت سے [illegible] فادہ کر رہا تھا یقیناً اسی میں کوئی کمی، کوئی کجی اور کوئی ناپختگی [illegible] میرا ویڈیو سسٹم تو فعال تھا لیکن آڈیو والے سیکشن میں [illegible] دنی تھی، وہ ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔

کسی بھی متحرک اور جان دار منظر سے لطف اندوز ہونے [illegible] لیے آڈیو اور وڈیو، دونوں کی کارکردگی کا تسلی بخش ہونا [illegible]ی ہے۔ ایک طرح سے میں اس وقت ادھورا تھا لہٰذا میری [illegible]حیت کی رسائی بھی ادھوری تھی۔ میں ساحل اور اس کے [illegible] دو نواح کو تو تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا مگر وہاں کے صوتی [illegible]ت مجھ تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ یہ خوشبو سے خالی کسی گل کو [illegible]نے کے مترادف تھا!

وہ ایشیائی لڑکی برتن سمیٹ کر وہاں سے جانے لگی تو میں [illegible]ل کو وقتی طور پر چھوڑ کر اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ ساحل [illegible] وقت ربی موشے ہائمن کی قید میں تھی۔ اس کے قید سے آزادانہ حرکت کرنے کے امکانات صفر کے برابر تھے لیکن [illegible] اٹینڈ کرنے والی یہ لڑکی کسی بھی وقت اس رہائش گاہ سے جا سکتی تھی۔ میں نے اس سے ایک مضبوط امید باندھ لی [illegible]س کا سایہ بن کر تصور میں اس کے ساتھ ساتھ موو کرنے [illegible] اسے چھوڑنے کا مطلب تھا، منزل کا نشان کھو دینا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد میری امید بر آئی۔ مختلف [illegible] اریوں سے گزرنے کے بعد وہ لڑکی ایک کثیر المنزلہ [illegible]ت سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ اس نے سڑک پر رک کر [illegible]ں بائیں دیکھا۔ یہ کیسے ممکن تھا، میں ’’دیکھنے‘‘ سے باز [illegible]۔ میں نے بڑی شاطر نظر سے سڑک کی دونوں جانب کا [illegible] لیا۔ یہاں سے وہاں تک مجھے فلک بوس عمارتوں کا ایک [illegible] نظر آیا۔ میں کسی عمارت پر آویزاں بورڈ کو ڈھونڈنے [illegible] ڈھونڈ کر پڑھنے کے لیے تصور کی نگاہ کو زحمت دے ہی رہا [illegible] میرا ٹارگٹ حرکت میں آ گیا۔ اس لڑکی نے میکانکی [illegible]ں فٹ پاتھ پر ایک طرف پیدل چلنا شروع کر دیا تھا۔ [illegible] کوشش کو ترک کر کے ٹارگٹ کے تعاقب [illegible] لگ گیا۔

کم و بیش پچاس فٹ پیدل چلنے کے بعد وہ فٹ پاتھ پر [illegible]ک کے کنارے رک گئی۔ اس نے ایک دیو ہیکل مجسمے [illegible]ک لگائی اور انتظار کی سی کیفیت میں کھڑی ہو گئی۔ فٹ [illegible] کے بیچ استادہ وہ مجسمہ مجھے عجیب سا لگا۔ میں اندرونی [illegible] کے باعث اس مجسمے کا تفصیلی تصوراتی جائزہ لینے پر مجبور [illegible] وہ کانسی سے تیار کیا گیا کسی طاقت ور سانڈ کا مجسمہ تھا۔ بنانے والے نے اس پر بڑی محنت کی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ سچ مچ کا کوئی برہم سانڈ ہو۔ دہانہ کھلا ہوا، نتھنے پھولے ہوئے اور اسٹانس ایک دم ٹکر مارنے والا، خوفناک نکیلے سینگ اوپر کو اٹھے ہوئے!

اس غضب ناک سانڈ کا معائنہ کرتے ہوئے میں چند لمحات کے لیے اپنے ٹارگٹ سے غافل ہو گیا تھا۔ جو دوبارہ پلٹ کر اس کی طرف نگاہ ڈالی تو وہ غائب تھی۔ اسی وقت تھوڑے فاصلے پر مجھے ایک کار جاتی ہوئی دکھائی دی۔ کار کا انداز اور رفتار بتاتے تھے کہ اس مقام پر رکنے کے بعد وہ آگے بڑھی ہے۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اندازہ لگا لیا کہ میرا ٹارگٹ، وہ لڑکی اس کار میں بیٹھ کر کہیں گئی تھی۔

میں دور جاتی ہوئی کار کو اپنے تصور کے فریم میں لانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میرا تصور کرچی کرچی ہو گیا۔ اسی لمحے راکیل کی دہشت زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

’’وجدان! تمہیں کیا ہو رہا ہے...... آنکھیں کھولو...... تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔‘‘ وہ پکارنے کے ساتھ ہی بازو سے پکڑ کر مجھے جھنجوڑ بھی رہی تھی۔

میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔ میں ہنوز کرسی پر نیم دراز تھا اور راکیل بڑی تشویش ناک حالت میں مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو میرے اتنے نزدیک کر رکھا تھا کہ میں نے اس کی چڑھی ہوئی سانسوں کی ریشمی تپش کو اپنے گالوں اور ہونٹوں کا مساج کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس کا زرخیز سینہ کسی دھونکنی کا عمل دہرا رہا تھا۔

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، راکیل کی یہ حالت میرے چہرے کے تیزی سے بدلتے...... بلکہ بگڑتے ہوئے تاثرات

کے سبب ہوئی تھی۔ اپنے ٹارگٹ کو غائب پا کر میں بڑی ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوگیا تھا اور راکیل نے میرے چہرے کی حالت کو نوٹس کرلیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ ان لمحات میں بستر پر نہیں بلکہ میرے آس پاس ہی موجود تھی، جبھی میرے چہرے کا تغیر و تبدل اس کی نظر میں آ گیا ورنہ وہ بستر تو میری پشت پر تھا۔

یہ اندازے اور خیالات سیکنڈ کے دس ویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے، اگلے ہی لمحے میں راکیل کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ ٹکائے ایک طرح سے مجھ پر سوار تھی۔ میری آنکھوں میں بڑی تشویش ناک انداز میں جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''تمہیں کیا ہوگیا تھا وجدان۔ تمہارے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے، تم سخت تکلیف میں ہو۔ کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا ''کیا مین ہیٹن کی کسی فٹ پاتھ پر کسی سانڈ کا مجسمہ نصب ہے...... بہت ہی شاندار کانسی کا مجسمہ؟''

وہ میرے اس غیر متعلق سوال پر تعجب بھری نظر سے مجھے تکنے لگی پھر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی ''یقیناً تم نے کوئی الٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہے۔ آج پتا نہیں، مین ہیٹن کیوں تمہارے ذہن پر سوار ہے!''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''تم میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں مین ہیٹن کے بارے میں اپنی معلومات پر بڑا فخر ہے نا......!''

وہ چند لمحے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر چونک اٹھی۔ یہ چونکنا اس کے کسی فوری خیال کا نتیجہ تھا۔ اضطراری انداز میں اس نے کہا۔

''ہاں، ایسا ایک مجسمہ وال اسٹریٹ کی فٹ پاتھ پر نصب تو ہے مگر...... تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ''وال اسٹریٹ مین ہیٹن میں کس طرف واقع ہے؟''

''وال اسٹریٹ، فنانشل ڈسٹرکٹ میں ہے۔ یہ ڈاؤن ٹاؤن میں مین ہیٹن میں آتا ہے۔ تم نے سانڈ کے جس مجسمے کے بارے میں پوچھا ہے وہ ''دی بروزنگ بل آف وال اسٹریٹ'' کہلاتا ہے۔ اسے مستحکم امریکی معیشت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر سوال کرنے سے باز نہ آئی۔

''وجدان! یہ اچانک تمہیں بروزنگ بل کا خیال کیسے آ گیا؟''

اس سے پہلے کہ میں اسے ٹالنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرتا، ہٹ کے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھریں۔ میری رگ رگ سے گہری تشویش دوڑ گئی۔ راکیل نے بھی دہشت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ ہٹ کے باہر کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔

پھر وہ گڑبڑ ہٹ کے احاطے کے اندر داخل ہوگئی۔ میں نے چیانگ کو کسی شخص سے تکرار کرتے ہوئے سنا۔ وہ دونوں مقامی زبان میں بہ آواز بلند بول رہے تھے۔ ان کے الفاظ کا اتار چڑھاؤ بتاتا تھا، وہ لوگ اندر کمروں تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چیانگ ان کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کا رول ادا کر رہا ہے۔

میں کرسی سے نکل کر کسی عملی اقدام کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کے باہر کوئی گن گرجی۔ ایک خطرناک برسٹ کی آواز، خاموش فضا کو تار تار کرگئی۔ فائرنگ کی مخصوص تڑتڑاہٹ میں ایک انسانی چیخ بھی بلند ہوئی۔

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا، وہ دردناک چیخ چیانگ کی تھی یا اس کے کسی مخالف کی۔ اس چیخ کے ساتھ میری کرسی سے اٹھنے کی کوشش بھی ناکام ...... ہوگئی کیونکہ اگلے لمحے راکیل بڑے بے اختیار انداز میں، میری آغوش میں آ گری تھی۔

راکیل کا پورا بدن کسی دہشت زدہ ہرنی کے مانند کپکپا رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ اگلے پل کمرے کے باہر، برآمدے میں ایک خوفناک دھماکا ہوا۔

اس دھماکے کی آواز ایسی زناٹے دار تھی کہ مجھے سماعت رخصت ہوتی محسوس ہوئی۔ میں نے بڑی سرعت سے راکیل کو خود سے الگ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے بدن کو میرے وجود میں پیوست کرلیا جیسے خدشہ ہو کہ اگر وہ مجھ سے جدا ہوئی تو اس کے سینے سے سانس جدا ہو جائے گی۔ ان لمحات میں، میں اس کے لیے آکسیجن کا سلنڈر بن گیا تھا۔

میں اسے اپنی آغوش میں بھر کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور دو گن بردار بھرا مار کر اندر آئے پھر ان کی گنز ہماری سمت اٹھ گئیں!

ان کے ہاتھوں میں کھلونا گنز نہیں تھیں جو محض دھمکانے کے لیے انہوں نے ہم پر تان لی ہوں۔ وہ اصلاً نسلاً ہلاکت خیز ہتھیار تھے تاہم گن بردار افراد نے ٹریگرز پر جمی اپنی انگلیوں کو زحمت دینے میں تھوڑا تکلف برتا ہم پر نگاہ پڑتے ہی لمحے بھر کو ٹھٹکے پھر ایک نے خون خوار نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا ''تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟''

''کیا دو سے کام نہیں چلے گا؟'' میں نے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔

اس دوران میں میرا ذہن دشمنوں کو ناپنے تولنے میں تیزی سے مصروف تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بے دریغ فائرنگ نہ کرکے انہوں نے یہ تو ثابت کر دیا تھا کہ وہ ضروری پوچھ تاچھ سے پہلے ہمیں ٹھکانے لگانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ یہ ایک خوش آیند اور عمل پر اکسانے والی بات تھی۔

''بکواس بند کرو۔'' دوسرا گن بردار چیخا ''تم سے جو پوچھا جا رہا ہے صرف اس کا جواب دو۔''

وہ لوگ انگریزی میں بات کر رہے تھے تاہم ان کے لب و لہجے سے گنوار پن جھلکتا تھا۔ میں انہیں باتوں میں الجھا کر ایکشن کا موقع نکالنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں کھلے ہوئے دروازے کے اندر کھڑے تھے جب کہ میں راکیل کو اٹھائے کرسی کے نزدیک موجود تھا۔ ہمارے درمیان وہ بیڈ حائل تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں نے لگ بھگ پانچ گھنٹے نیند لی تھی۔

میں نے چہرے سے کوئی گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دی۔ اگر انہوں نے ڈائیلاگ کا دروازہ کھول ہی دیا تھا تو اس سے فائدہ اٹھانا لازم ہوگیا تھا۔ میں نے بہ آہستگی راکیل کو کرسی کے اندر ڈالا اور کھڑے ہوتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا۔

''یقیناً تم لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا کوئی ساتھی نہیں۔ ہم صرف دو ہی ہیں۔''

ان میں سے ایک اپنی گن کو بڑے خطرناک انداز میں لہراتے ہوئے بولا ''تم ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ ہم بالکل صحیح جگہ پر آئے ہیں۔ حلیے بدل کر اگر ہماری آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہو تو تم سنگین غلطی کر رہے ہو۔ اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں شرافت سے بتا دو، ورنہ تم دونوں کو چھلنی کرنے کے بعد ہم تمہارے ساتھی کی تلاش میں نکلیں گے۔ میں تین تک گنوں گا۔ اگر تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو سمجھ لو ہماری گنز کے دہانے کھل جائیں گے۔''

ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ شنی مونگا سے تعلق رکھتے تھے۔ حلیے بدلنے کا حوالہ انہیں سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ اتنی شد و مد اور وحشیانہ انداز میں شنی مونگا ہی ہمیں تلاش کروا سکتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا ان میں کوئی شنی مونگا بھی ہے یا یہ لوگ اس کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں!

میں نے ایک رسک لیتے ہوئے گہری چال چلی اور ان میں سے ایک گن بردار کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم میں سے شنی مونگا کون ہے؟''

یہ ایک انتہائی خطرناک سوال تھا۔ انہوں نے بڑی معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''تمہیں شنی مونگا سے کیا کام ہے؟''

''اس کا مطلب ہے تم میں سے کوئی شنی مونگا نہیں۔'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''تم محض اس کے پالتو کتے ہو۔ مجھے شنی مونگا سے جو کام ہے وہ تمہیں نہیں بتایا جا سکتا!''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گرا دیے۔ گنز کے نشانے پر آتے وقت تو میرے دونوں ہاتھ راکیل کے ساتھ مصروف تھے لیکن اسے کرسی پر ڈالنے کے بعد میں نے گن بردار افراد کی تسلی کے لیے خود کو رضاکارانہ طور پر ''ہینڈز اپ'' کرلیا تھا۔

میری زبان سے اپنے لیے ذلت آمیز کلمات سن کر ایک گن بردار تلملا اٹھا اور اس نے ہاتھوں میں دبی ہوئی گن کو اس انداز میں حرکت دی جیسے ایک برسٹ مار کر میری دھجیاں بکھیرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن دوسرے گن بردار نے اسے اس کوشش سے پہلے ہی روک دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے اکھڑ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''تمہیں شنی مونگا سے جو کام ہے، ہمیں بتا دو۔ تمہارا پیغام شنی مونگا تک پہنچا دیا جائے گا لیکن...... تمہاری موت کے بعد!'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''ہینڈز اپ!''

اس گفتگو کے دوران میں میرا ذہن میدانِ جنگ کا نقشہ تیار کر چکا تھا۔ میں نے اس کے حکم پر ایک مرتبہ پھر اپنے ہاتھ ''اپ'' کر دیے اور متاسفانہ انداز میں کہا۔

''میں دراصل شنی مونگا کو اپنے تیسرے ساتھی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔''

''آ گئے نا پٹری پر؟'' اس گن بردار نے زہرخند لہجے میں کہا جو چند لمحے پہلے مجھے شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دوسرا اضطراری انداز میں پوچھ بیٹھا ''تمہارا تیسرا ساتھی کہاں ہے......؟''

میں نے بڑی سرعت سے ان کے عقب میں دیکھا اور اس کے ساتھ ہی کہا ''وہ رہا...... تمہارے پیچھے ......''

انہوں نے بے ساختہ میری نگاہ کے تعاقب میں پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت کافی تھی۔

میں نے اپنی جگہ سے کسی چیتے کے مانند ایک زقند بھری اور بیڈ کو عبور کر کے گن بردار افراد کے قدموں میں پہنچ گیا۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں پیش آیا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے والوں کو اگلے ہی لمحے اپنے بے وقوف بن جانے کا احساس ہو گیا۔ وہ بڑے جارحانہ انداز میں اپنی گنز سمیت پلٹے اور مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی...... میں اب وہاں نہیں رہا تھا جدھر ان کی گنز اٹھی تھیں۔

میں ان کے قریب پہنچ کر کبھی مٹی کے مادھو کی طرح کونا پکڑ کر خاموش نہیں بیٹھ گیا تھا۔ بے وقوف بننے کے بعد وہ جس نوعیت کا ردِعمل ظاہر کر سکتے تھے اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا۔ وہ پلٹ کر مجھے گولیوں سے بھوننے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتے...... اور انہوں نے ایسی ہی کوشش کی تھی۔

میں نے ان کی کوشش ناکام ـــ بنادی۔ میں چھلانگ لگانے کے بعد جیسے ہی ان کے نزدیک فرش پر پہنچا' میں نے اپنے کندھے فرش پر ٹکا کر ایک جھٹکے سے دونوں ٹانگوں کو ہوا میں بلند کر دیا۔ پھر میں نے کمر کی ٹوئسٹ کے سہارے اپنی ٹانگوں کو کسی سیلنگ فین کے بلیڈز کے مانند تیزی سے گھما دیا۔ نتیجہ میرے حسبِ منشا برآمد ہوا۔

ان دونوں کی میری سمت اٹھی ہوئی گنز پر میرے پاؤں کی شدید ٹھوکریں پڑیں۔ فائرنگ کے زاویے پلک جھپکتے میں تبدیل ہو گئے۔ وہ جو ایک سو اسی ڈگری پر برسٹ مار کر میرے وجود کو ادھیڑ ڈالنا چاہتے تھے' ہٹ کر دیواروں اور چھت پر گولیاں برسا کر رہ گئے۔

اس ناکامی ـــ نے انہیں میری لوکیشن سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہوں نے بڑے بپھرے ہوئے تیوروں کے ساتھ میری طرف رخ کیا لیکن میں اب انہیں گنز کے استعمال کا کوئی موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے بجلی کی سی تیزی سے ایک ہینڈ پش اپ لگایا اور کسی اسپرنگ کے مانند اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میں ان دونوں کے درمیان تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی گنز کو مجھ پر آزماتے' میں نے بڑی تیزی سے ایک کے پیٹ میں فرنٹ پش کک ماری' پھر ایک قدم پیچھے آتے ہوئے دوسرے کے تھوبڑے پر ڈمیل کک جڑ دی۔ میں نے یہ دونوں ککس میکانگی انداز میں چلائی تھیں لہٰذا وہ ان ٹھوکروں کی زد میں آ گئے۔ وہ شاید مجھ سے ایسی تیزی اور طراری کی توقع نہیں رکھتے تھے!

پیٹ میں فرنٹ کک کا نذرانہ وصول کرنے والا بیک گیئر میں پیچھے کو گیا اور بے طرح اس کرسی سے جا ٹکرایا، میں نے راکیل کو بٹھایا تھا۔ کرسی اس شخص کے دھکے سے گئی اور وہ راکیل کے ساتھ غلط ملط ہو کر رہ گیا۔ اس ٹکر نتیجے میں راکیل کے حلق سے ایک وحشت ناک چیخ ہوئی۔ وہ کرسی میں سے نکل کر کافی دور جا گری تھی۔

میں نے تشویش بھری نظر سے راکیل کو دیکھا اور مجھے قدرے اطمینان ہو گیا کہ مجھ سے تواضع کروانے ہو گیا تھا۔ کرسی کی سمت جاتے ہوئے گن اس کے ہا نکل کر کہیں اِدھر اُدھر ہو گئی تھی۔ میں اپنے مدِمقابل کی متوجہ ہو گیا۔

مجھ سے تھوبڑا سنکوانے والا بڑا برہم تھا۔ اس تین جھٹکے دے کر خود کو سنبھالا اور گن سیدھی کر بڑے جارحانہ انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔ یہ حملہ فائر مشتمل تھا۔ میں نے ٹریگر دبنے سے پیش تر ہائی جمپ اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے عقب میں پہنچ گیا۔

وہ جھنجلا کر پیچھے مڑا اور میں نے اس کی جھنجلاہ تیکھے لگا دیے۔ میری ایک برق رفتار ہاف کک اس کی لگی۔ ہاف کک میں فل کک سے دوگنا طاقت ہوتی اس کے ہاتھ سے اس طرح فضا میں اچھلی جیسے کسی کے ہاتھ سے وقت نکل جاتا ہے!

اس کے دونوں ہاتھ دہائی دینے والے انداز ہوئے۔ میں نے اسی لمحے بیٹھتے ہوئے ایک بیک سوئپ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ منہ کے بل نیچے آ رہا۔ وہ زمین پر پہنچا' میں نے اس کی پشت پر ایک جھٹکے جرک کک رسید کر دی۔

وہ اپنی تشریف پر تصدیقی مہر ثبت کروانے حرکت میں آیا اور ''حرکت میں برکت'' کے اصول کرتے ہوئے بیڈ کے وزنی پائے سے جا ٹکرایا۔ تما تک اس کی جو درگت بنائی تھی یہ اس میں ایک شاند اضافہ'' تھا۔

اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ برآمد ہو دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام کر فرش پر لوٹ پوٹ لگا۔ میں نے اسی لوٹ پوٹ حالت میں اسے ایک کک ماری اور دور لڑھکا دیا۔ وہ بے ترتیب رول ہوئے اپنے ساتھی کے قریب پہنچ گیا۔

اسی لمحے مجھے راکیل کے ہاتھ میں گن دکھائی دی تسلی بخش سانس میرے سینے سے خارج ہوئی۔ اس سے پٹنے والے مسلح شخص کے ہاتھ سے نکلنے والی گن

کرلیا تھا اور اپنے قریب پڑے ہوئے نہتے شخص کو نشانے پر رکھے کھڑی تھی ۔ اس موقع پر راکیل نے خاصی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر زمین پر پڑے ہوئے شخص کو کالر سے پکڑ کر سیدھا کیا۔ میں اس سے چند سوالات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس موقع پر اس نے بڑی عجیب حرکت کی۔ اس نے بڑی سرعت سے اپنی گردن کو جھٹکا دیا اور کسی وحشی درندے کے مانند جبڑے کھول کر میری کلائی میں دانت پیوست کرنے کی کوشش کی ''کوشش'' کا لفظ اس لیے کہ میں نے اسے اس نسوانی حرکت میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

میں نے اس کے کالر کو چھوڑتے ہوئے ایک گھٹنا اس کے آگے بڑھے ہوئے تھوبڑے پر رسید کیا۔ نرم ہڈی کے مجروح ہونے کی دھیمی سی مخصوص آواز پیدا ہوئی اور وہ شخص ذبح ہوتے ہوئے بیل کے مانند ڈکرانے لگا۔ وہ قربانی کا بیل نہیں تھا لہٰذا صبر و برداشت اسے چھو کر نہیں گزرا تھا۔

میں نے ایک گھٹنے پر بس نہیں کی۔ چار پانچ نیچی ککس لگاتار اس کے منہ' سینے اور پیٹ پر رسید کر دیں۔ ان ٹھوکروں میں ایک جنون بھرا ہوا تھا۔ مضروب شخص چاروں خانے چت ہو کر ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔

میں نے راکیل سے مخاطب ہوتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا ''یہ بد بخت تمہاری صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ تم ہی اس کی خاطر مدارات کرو۔'' اس شخص نے خالص زنانہ انداز میں میری کلائی کو چبانا چاہا تھا۔

میرا اشارہ پا کر راکیل بھوکی شیرنی کے مانند آگے بڑھی اور گن کو کسی لٹھ کے بہ طور استعمال کرتے ہوئے زمین بوس شخص کی ہڈیوں کی مزاج پرسی کرنے لگی۔ یہ منظر بڑا دلچسپ اور تفریحی تھا۔ پٹنے والا شخص بری طرح بلبلا رہا تھا اور راکیل کسی سوامن کی پھرتیلی دھوبن کے انداز میں اس کے کپڑوں کو جسم سمیت کوٹ کوٹ کر اجلا کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ میں اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد دوسرے شخص کی جانب بڑھ گیا۔

اس کا چہرہ بڑا بھیانک منظر پیش کر رہا تھا' چہرے کے ایک ایک حصے سے دہشت برستی تھی۔ بیڈ کے وزنی پائے سے ہونے والے ٹکراؤ نے اس کے منہ ناک سے خون چھڑا دیا تھا۔ اس کا خون آلود دہانہ چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ زبان کے کٹاؤ کے علاوہ اس کے چند دانت بھی اپنے مسکن کو چھوڑ چکے تھے۔ ایک ہی نظر میں' میں نے اس کا تنقیدی جائزہ لے لیا۔ وہ اب کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں رہا تھا۔ یہی بہت تھا کہ وہ زندہ تھا...... اور اپنے کیے پر بجز شرمندہ تھا!

اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے راکیل کی جانب دیکھا۔ اس نے مار مار کر اپنے شکار کا بھرتا بنا دیا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہاتھ روک لو گارشیا! یہ کہیں جان ہی سے نہ گزر جائے۔''

''ڈسلوا یہ لوگ ہماری جان لینے آئے تھے۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی ''ذرا ان کو تو پتا چلے جان کیسے نکلتی ہے!''

حملہ آوروں کا خیال تھا' ہم نے میک اپ کے ذریعے اپنے حلیے تبدیل کر رکھے ہیں ورنہ ایک سو ایک فی صد ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے اغوا کنندگان کے پکے پکائے حلوے میں مٹھی بھر مرچ ڈال دی تھی۔ وہ جب ہمیں شنی مونگا اور اغوا کنندگان کا دشمن سمجھ ہی رہے تھے تو پھر احتیاط کا تقاضا تھا' ہم ایک دوسرے کو انہی ناموں سے پکاریں جو نئی ڈیل اے کے مسافروں کی حیثیت سے ہمارے تھے۔ یعنی ڈسلوا' گارشیا اور یو آن ماؤ!

ویسے میں نے جب راکیل کو گارشیا کے نام سے پکارا تھا تو اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا بھی آیا تھا۔ اس آئیڈیا کے مندرجات واضح نہیں تھے تاہم ذہن کو سوچنے کے لیے ایک روزن مل گیا تھا اور...... اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

میں نے راکیل سے کہا ''یہ بھلے ہماری جان کے دشمن سہی مگر ہم ان کے غلیظ خون سے اپنے ہاتھ آلودہ نہیں کریں گے۔ ان کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے' کیونکہ ان کی جانیں ہمارے کام آنے والی ہیں۔''

راکیل نے میرے اس معنی خیز پیرائے کے جواب میں کوئی سوال نہیں کیا۔

میں نے مزید کہا ''ویسے مجھے امید تو نہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی گڑبڑ کی کوشش کرے تاہم تم انہیں گن پوائنٹ پر رکھنا۔ اگر کوئی ہیرو بننے کے موڈ میں دکھائی دے تو ہاتھ پاؤں چھلنی کر کے رکھ دینا۔ میں ذرا باہر کی صورتِ حال کا جائزہ لے آتا ہوں۔''

راکیل نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور گن سونت کر کھڑی ہو گئی۔

میں تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ جس دوران میں' میں کمرے کے اندر ان دو گن بردار افراد سے نبرد آزما رہا' باہر مکمل سناٹا طاری رہا تھا اور یہ خاصی تشویشناک بات تھی۔ گمبھیر صورتِ حال بہت سے معنی خیز اشارے کر رہی تھی۔ چیانگ کی مسلسل خاموشی' زناٹے دار دھماکا' فائرنگ کی مخصوص تڑتڑاہٹ' انسانی چیخ...... وغیرہ وغیرہ! میرا ذہن شدید الجھن کا شکار تھا۔

بیڈ روم کے باہر کسی گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی میں نے چیانگ اور حملہ آوروں میں تکرار کی آواز سنی تھی۔ اس کے بعد ہی کوئی گن گرجی تھی۔ اس کی گرج میں انسانی چیخ بلند ہوئی اور پھر سماعت شکن دھماکا!

میں انہیں تشویش ناک خیالات کو ذہن میں بٹھائے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گیا اور پھر وہاں کے منظر نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ چیانگ کا جسم مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ برآمدے کے آخری سرے پر ایک شخص کی لاش نظر آ رہی تھی۔ وہ شخص مقامی تھا اور یقینی طور پر حملہ آوروں کا ساتھی!

مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ حملہ آوروں کا تیسرا ساتھی چیانگ کی فائرنگ سے ہلاک ہوا تھا اور...... چیانگ کے وجود کے دھجیاں بکھیرنے والا ان دو افراد میں سے کوئی ایک تھا جو کسمپرسی کی حالت میں اندر بیڈ روم میں راکیل کا ٹارگٹ بنے ہوئے تھے۔

چیانگ کے حسرت ناک انجام نے مجھے ملول کر دیا۔ اس نے ہماری حفاظت میں اپنی جان دے دی تھی۔ میرے ذہن میں یک بہ یک وہ سماعت شکن دھماکا گونج اٹھا' چیانگ کو کسی دستی بم سے اڑایا گیا تھا۔ اس غیر تیکنیکی حرکت سے حملہ آوروں کی نفسیات کھلتی تھی۔ وہ بہت ہی اجڈ اور وحشی مزاج کے حامل تھے۔ خدا کا شکر تھا ان کی دہشت ہم تک پہنچنے سے پہلے سوالات کی سرائے میں لحاتی قیام کر بیٹھی تھی ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا!

میری زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ میرے اور موت کے درمیان فاصلے مٹ گئے لیکن وہی بات ہے' جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟ بہرحال چیانگ کی المناک موت کا مجھے دلی رنج ہوا اور میں بوجھل قدموں کے ساتھ واپس کمرے میں آ گیا۔ تقدیر کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اس ایثار پیشہ محافظ کی موت اسی طرح لکھی تھی!

آئندہ پندرہ منٹ کے اندر میں نے ہٹ میں سے تھوڑی کوشش کے بعد ایک مضبوط رسی تلاش کی پھر راکیل کی مدد سے مغلوب افراد کو میں نے واش روم میں پہنچا دیا۔ انہیں اوپر تلے ترتیب دینے کے بعد میں نے نائیلون کی رسی کی مدد سے کس کر باندھ دیا۔ میں نے بندشیں لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ان کی آزادی حاصل کرنے کی کوئی کوشش بار آور نہ ہو سکے۔ اگر وہ میری لگائی ہوئی گرہوں کو کھولنے کے لیے جسمانی طاقت صرف کرتے تو وہ گرہیں اور مضبوط ہو جاتیں۔

واش روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگانے کے بعد میں نے راکیل سے کہا ''تم اپنا بیگ کھول لو اور میک اپ والا باکس نکال کر شروع ہو جاؤ۔''

ہم نے میک اپ کا ضروری سامان راکیل کے بیگ میں رکھا تھا۔ ایک خوبصورت اور فیشن ایبل عورت ہونے کے ناتے اس کے پاس وہ سامان دیکھ کر کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا تھا۔ ہم نے ایسی منتخب کاسمیٹکس کا ذخیرہ کیا تھا جو ہماری ضرورت کے عین مطابق ہو۔ میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اچھوتے آئیڈیا کے پیشِ نظر راکیل کو وہ ہدایت دی تھی۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک واضح نقشہ ترتیب پا چکا تھا۔

راکیل نے الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی ''میں سمجھ نہیں سکی۔ کیا شروع ہو جاؤں؟''

''جتنی جلدی ممکن ہو سکے تمہیں گارشیا بننا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اور مجھے ڈسلوا۔ ہم دونوں دوست ہیں جن کا تعلق واشنگٹن کے علاقے سیٹل سے ہے۔''

''اوہ!'' اس نے ایک طویل سانس خارج کی پھر پوچھا ''اور ڈاکٹر مونگ......؟''

میں نے جواب دیا ''جب تک ڈاکٹر مونگ ریفو شے واپس آتا، ہم اپنے مبینہ حلیوں میں آ چکے ہوں گے۔ پھر اسے بھی یو آن ماؤ بننا پڑے گا۔''

''میں محسوس کر رہی ہو' تم کوئی سنسنی خیز پلاننگ کر چکے ہو!'' وہ بیگ کھول کر بیوٹی باکس باہر نکالتے ہوئے بولی۔

''تم بالکل ٹھیک محسوس کر رہی ہو۔'' میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

ہم اس وقت اسی کمرے میں تھے جہاں تھوڑی دیر پہلے معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ زیرِ حراست دونوں دشمنوں کو میں نے دوسرے کمرے کے واش روم میں قید کیا تھا۔ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ان دونوں کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

دورانِ میک اپ ـــ راکیل نے کہا ''وجدان! یہ کیسی عجیب بات ہے جب ہم اپنے اصلی حلیے میں تھے تو حملہ آوروں نے ہمیں میک اپ میں سمجھا اور جب ہم نے اپنا میک اپ اتارا تھا تو بانگ چوا اپنی دانست میں' ہمیں میک اپ میں دیکھ

کر حیران رہ گیا تھا!''

''ہم جس راہ کے مسافر ہیں اس میں گام بہ گام ایسی عجیب وغریب صورتِ حالات سے سامنا ہوتا رہتا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا ''حالات وواقعات کا زاویہ بدل جائے تو تجزیے کے نتائج میں بھی ایک واضح تبدیلی آجاتی ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''زمین پر کھڑے ہوکر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائیں تو چاند ہمیں اوپر دکھائی دیتا ہے جب کہ چاند کی سطح پر کھڑے ہوکر اگر زمین کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ بھی آسمان پر ٹھہری نظر آتی ہے۔ زاویۂ نظارہ (پوائنٹ آف ویو) کی تبدیلی سے مشاہدے کے نتائج خود بہ خود بدل جاتے ہیں۔''

وہ اپنے میک اپ کو فائنل ٹچ دیتے ہوئے بولی ''پتا نہیں ان منحوسوں نے ہمارا سراغ کیسے لگالیا جب کہ ہماری صورت شکل میں نمایاں ''تبدیلی'' موجود تھی!''

''یہ لوگ ہمارے حلیوں کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں نہیں پہنچے ہوں گے۔'' میں نے بھی میک اپ کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا ''اگر ایسی بات ہوتی تو یہ لوگ رات کے ابتدائی حصے میں ہی ہمیں چھاپنے کی کوشش کرتے' ہمیں اتنی مہلت ہرگز نہ دیتے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تاہم میرا اندازہ ہے ایک دوردراز اور غیر آباد ہٹ کو آباد ہوتے دیکھ کر یہ ہماری طرف متوجہ ہوئے ہوں گے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا ہوگا کہ تین غیر مقامی افراد رات کو یہاں آئے ہیں تو انہیں اس ''قیام'' سے تشویش ہوئی ہوگی۔ ازاں بعد چیانگ کی مزاحمت نے ان کے شک کو یقین میں بدل دیا ہوگا۔ جن تین افراد کی انہیں تلاش ہے' وہ ہم ہی ہیں۔ بہرحال فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

وہ بیزاری سے بولی ''ان شیطانوں پر لعنت بھیجو۔'' پھر اس کی آواز بھرا گئی ''مجھے چیانگ کی موت کا سخت افسوس ہے۔''

میں نے راکیل کو چیانگ کی ''کیفیت'' سے آگاہ کردیا تھا تاہم اس نے چیانگ کی لاش کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چیانگ کی موت کا مجھے بھی بہت افسوس تھا لہٰذا کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے میں خاموش ہی رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد راکیل نے کہا ''یہاں اچھی خاصی فائرنگ ہوئی ہے اور ایک بم بھی بلاسٹ ہوا ہے لیکن ابھی تک کوئی شخص اس طرف متوجہ نہیں ہوا!''

''مجھے بھی اس پر حیرت ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہوسکتا ہے یہاں اریب قریب میں ہمارے سوا اور کوئی موجود ہی نہ ہو۔''

''قانون کے محافظوں کو تو اس واقعے کا نوٹس لینا چاہیے تھا!''

میں نے کہا ''پندرہ ہزار نفوس کی کل آبادی میں قانون کے محافظ بھی گنتی ہی کے ہوں گے اور رات کے آخری پہر ممکن ہے وہ لوگ گہری نیند میں ہوں۔ اس جزیرے زونارا آئی لینڈ کا رقبہ ایک سو تیس مربع میل ہے لہٰذا آبادی خاصی چھدری ہوگی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اس ہٹ سے میلوں کے فاصلے تک کوئی قانون کا رکھوالا یا چوکی موجود ہی نہ ہو!''

''شاید ایسی ہی بات ہے۔'' وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے مجھ سے پوچھا ''وجدان! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی گہری نیلی آنکھوں میں جھانکا پھر سنجیدہ لہجے میں کہا ''ہم دونوں ڈی ڈبلیو اے کے مسافروں' گارشیا اور ڈسلوا کا روپ دھار چکے ہیں۔ ڈاکٹر مونگ بھی واپسی پر یوآن ماؤ کا حلیہ اختیار کرے گا۔ ہم تینوں گزشتہ صبح چہل قدمی کے ارادے سے ہوٹل ائرپورٹ سے نکلتے ہیں۔ پانچ منٹ بعد نیوز اسٹینڈ کے قریب ہمیں چند اجنبی افراد گھیر لیتے ہیں پھر گن پوائنٹ پر ہمیں مجبور کرکے وہ اس ہٹ میں لے آتے ہیں اور ہمیں ایک کمرے میں قید کردیا جاتا ہے۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا۔ راکیل بڑی دلچسپی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہم ان افراد کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن وہ اپنے رویے اور سلوک سے ہمارے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ ہم انہیں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہمیں آزاد نہ کیا تو ہماری فلائٹ نکل جائے گی لیکن جواب میں وہ ہمیں شنی مونگا نامی کسی شخص کا حوالہ دے کر دھمکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے آنے کے بعد ہی ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا۔ ہم اس دوران میں اپنے اندازے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ شنی مونگا ان کی سرغنہ کا نام ہے اور وہ لوگ ہائی جیکرز کے حمایتی ہیں۔ ہماری جہاز والی کارروائی انہیں پسند نہیں آئی لہٰذا وہ ہمیں کسی سخت ترین سزا سے گزارنا چاہتے ہیں مگر انہیں شنی مونگا کی آمد کا انتظار ہے۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تک ہم تینوں ان لوگوں کے رحم وکرم پر تھے۔ اس دوران میں ہمیں نہیں معلوم زونارا آئی لینڈ پر کیا حالات پیش آچکے ہیں۔ ہماری فلائٹ اس جزیرے سے

روانہ ہو چکی ہے یا نہیں ہم نہیں جانتے۔ اس سے آگے کہانی میں ایک ٹرننگ پوائنٹ آتا ہے۔"

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں نے ذرا توقف کیا اور سوالیہ نظر سے راکیل کو دیکھا۔ جب وہ خاموش رہی تو میں نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"رات کے آخری پہر ان لوگوں کی تم پر یعنی گارشیا پر نیت خراب ہو جاتی ہے۔ وہ تمہیں ایک کمرے سے نکال کر دوسرے کمرے میں لے جانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے ڈسلوا اور یو آن ماؤ کو گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے لیکن ان لمحات میں عورت کی ہوس نے انہیں پہلے جتنا چاق و چوبند نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ ہمیں اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہم فوراً ایکشن میں آجاتے ہیں اور پھر بازی پلٹ جاتی ہے۔ اس معرکے میں ان کے دو آدمی انہی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ باقی دو کو ہم بے دست و پا کر کے باتھ روم کی فرش نشینی پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چیانگ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا لہٰذا اسے ان کا ساتھی ظاہر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم نے ان لوگوں پر کیوں کر غلبہ پایا، ہم سے یہ سوال پوچھنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ زونارا آئی لینڈ والوں کو اب تک اچھی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم نے ہائی جیکرز پر کس طرح قابو پایا تھا۔ کسی کو ہمارے تازہ ترین "کارنامے" پر حیرت نہیں ہو گی اور جہاں تک ان دو خبیثوں کا تعلق ہے تو ان کی کون سنے گا۔ شنی مونگا' کنگ تو ہارا ژولا کا بھتیجا سہی لیکن اس کا شمار کنگ کے دشمن افراد میں ہوتا ہے۔ جب یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ شنی مونگا ہوائی جیکرز کا پشت پناہ ہے تو کنگ اس باغی بھتیجے کا جلوس نکال دے گا۔ ممکن ہے، کنگ کو آج تک ایسا جاندار کوئی موقع نہ ملا ہو۔ یہ موقع اسے ہم فراہم کریں گے۔ اس کے بعد ہمیں یہاں سے جانے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ کنگ کے خصوصی حکم سے ہمیں ہماری ہی خواہش پر مقامی ائرلائنز کی ائربس "اے۔ تھری تھرٹی" سے ٹھیک آٹھ بجے صبح سیٹل جانے کی اجازت مل جائے گی۔ بردس تولر وغیرہ کل دن میں گیارہ بجے یہاں سے روانہ ہو گئے تھے لہٰذا اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ سمپل از دیٹ!"

"دس سمپل از ویری ونڈرفل!" وہ جوش بھرے لہجے میں بولی "وجدان! تم تو اچھے خاصے فکشن رائٹر ہو۔ کبھی اس شعبے میں ٹرائی کی؟"

میں نے مذاق کے رنگ میں کہہ دیا "اگر امریکا کا کوئی پبلشر موقع دے تو میں کوشش کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔ میں نے سن رکھا ہے' یہاں اس کام کا بہت زیادہ معاوضہ ملتا ہے۔"

"تم نے کچھ غلط نہیں سنا۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "فکشن رائٹر کو بھی اس کی کلاس کے مطابق ہی معاوضہ ملتا ہے۔ اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اس کام سے ٹھیک ٹھاک گزارہ کر لیتے ہیں البتہ بعض ہاٹ کیک بیسٹ سیلرز ایسے فکشن رائٹرز بھی ہیں جن کا ایک ناول ان کی زندگی بھر کی روزی روٹی کا بندوبست کر دیتا ہے۔"

مجھے مذاق سوجھا' میں نے برجستہ پوچھا "راکیل! تم کس فکشن رائٹر کے معاوضے کا نصف بہتر ہو؟"

اس نے روزی روٹی کے لیے "بریڈ اینڈ بزنس" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں اس کے نک نیم "روٹی" کے حوالے سے اس سے خاصی اٹھکیلیاں کر چکا تھا لہٰذا اس نے میرے مذاق کو بڑے بھرپور انداز میں انجوائے کیا۔ اس کا انجوائمنٹ میرے سوال کا تسلی بخش جواب تھا۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "ہمیں جلد از جلد اس ہٹ سے نکل کر کنگ کے کسی آدمی سے رابطہ کرنا چاہیے۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے قدرے اضطراری لہجے میں کہا "نہیں' یہ اللہ کا بندہ ڈاکٹر مونگ کہاں رہ گیا!"

ڈاکٹر مونگ کے سلسلے میں راکیل کو بھی تشویش تھی۔ چیانگ کے مطابق' ڈاکٹر لگ بھگ دو بجے رات ہٹ سے گیا تھا اور اس نے چیانگ کو تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہا تھا۔ اب سوا چار بج رہے تھے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر مونگ کی "تھوڑی دیر" کتنی طویل و عریض تھی!

راکیل نے ایک اہم سوال اٹھایا "اگر ہم علی الصباح یہاں سے نکل جاتے ہیں تو ہانگ چو ہمارے بارے میں کیا سوچے گا۔ آخر کو وہ ہمارا میزبان ہے......اور اس نے ہم سے ہر ممکن تعاون کیا ہے؟"

"ہانگ چو کو جب ہمارے بارے میں سوچنے کا خیال آئے گا ہم زونارا آئی لینڈ کی زمین کو چھوڑ چکے ہوں گے۔" میں نے راکیل کے غیاب میں ہانگ چو سے ہونے والی بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا "ہم اسے صاف منع کر چکے ہیں۔ ہم ائربس سے سفر کا ارادہ نہیں رکھتے لہٰذا وہ ہمیں صبح صبح ملاقات کرنے نہ آئے۔ میرے خیال میں وہ دس بجے سے پہلے ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔" تھوڑا توقف کرنے کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "اس کے بعد ہانگ چو ہمارے بارے میں جو بھی سوچے اس کا حق ہے۔ ہم کسی وضاحت کے لیے واپس تو نہیں آسکتے!"

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر رہ گئی پھر اس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی رونما ہوئی جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آگئی ہو۔ اگلے ہی لمحے اس نے سوال داغ دیا۔

"وجدان! وہاں کرسی پر بیٹھے بیٹھے تمہاری حالت کیوں بگڑ گئی تھی؟"

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا اس کا اشارہ میری کون سی حالت کی طرف تھا۔ ہوٹل ائرپورٹ کی طرح یہاں بھی میں نے اسے خوبصورتی سے ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

"راکیل! جب کوئی شخص میری بات نہیں مانتا یا مجھ سے وعدہ خلافی کرتا ہے تو مجھے بہت دکھ پہنچتا ہے۔ بس پھر میری ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے!"

اس نے متعجب نظر سے مجھے دیکھا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی "وہاں آرام کرسی پر بیٹھے بٹھائے کس نے تم سے وعدہ خلافی یا کس نے تمہاری کون سی بات نہیں مانی۔ اس وقت ہم دونوں کے سوا کمرے میں کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ کس نے تمہیں دکھ پہنچایا؟"

"تم نے راکیل!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بھونچکا سی رہ گئی "میں نے......!"

"ہاں تم نے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کی تھی۔"

"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے "پتا لگاتے" ہوئے کہا "راکیل! میں نے کرسی کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے تم سے کہا تھا' تم میرے بستر پر آرام سے سو جاؤ۔ پھر میں نے تم سے چند منٹ کی رخصت مانگ کر آنکھیں بند کر لی تھیں' اس ہدایت کے ساتھ کہ تم خاموش رہو گی اور میرے کام میں مداخلت نہیں کرو گی لیکن......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر شاکی نظر سے اسے دیکھا اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جب تم نے بازو سے جھنجوڑ کر اور زبان سے پکار کر مجھے جگایا تو میں نے اپنی کھلی آنکھوں کے سامنے تمہیں پایا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے تم نے نہ صرف وعدہ خلافی کی بلکہ میری بات بھی نہیں مانی۔ تم خاموش رہیں اور نہ ہی میرے کام میں مداخلت سے باز آئیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس سوال کے جواب میں مجھے ایک خوشگوار دھکا لگا۔ راکیل ایک دم مجھ پر ڈھے سی گئی تھی۔ بڑی شوخی سے بولی "تم بڑے بدمعاش ہو وجدان!"

ایک آزاد خیال امریکی حسینہ کے بے لاگ لبوں سے اپنے لیے بدمعاش کا لفظ سن کر مجھے عجیب سے لگا۔ راکیل نے اس تبصرے پر بس نہیں کیا بلکہ مجھ پر گرتے ہی بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میں اس وقت بیڈ کے کنارے پر تھا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ہم دونوں گتھم گتھا زمین پر پڑے نظر آتے۔ میں نے اپنا توازن بگڑتے دیکھا تو بے ساختہ میرے ہونٹوں سے نکلا "اررر......رے! یہ کیا کر رہی ہو راکیل! تم گر جاؤ گی۔"

"مجھے پورا یقین ہے تم مجھے گرنے نہیں دو گے۔" وہ میرے ساتھ خلط ملط ہوتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی "اس وقت تم کرسی پر بیٹھے ہو......اور نہ ہی گن پوائنٹ پر ہو تم نے تو مجھے اس وقت بھی بخوبی سنبھال لیا تھا!"

میں نے اس کے یقین کو ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ اس کا یقین ٹوٹ جاتا تو وہ بکھر کر رہ جاتی۔ میں نے اسے تھام لیا۔ اس دوران میں ہم اپنا توازن کھو بیٹھے تھے۔ کششِ ثقل نے اپنا کام دکھایا اور راکیل مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے اس طرح فرش تک پہنچی کہ مجھے لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ گندم سے بھری سوندھی خوشبو والی کسی بوری کے مانند مجھ پر لد گئی۔

وقت کے پکھیرو نے گویا اپنے پنکھ سمیٹ لیے۔ اس کی پرواز تھم گئی۔ ان لمحات میں زمین اپنے محور پر انگشت بہ دنداں تھی لہٰذا کششِ ثقل کا کوئی قانون ہم پر لاگو نہیں تھا۔ ہم دو اجسام... فضائے بسیط میں معلق ہو کر رہ گئے۔ اس کائنات میں ہم نیوٹن کے اخذ کردہ قانونِ تجاذب کی تعمیل کرنے لگے۔ راکیل کی خودسپردگی' میری وارفتگی کا سبب بن گئی۔ میں اپنے محور پر ڈگمگا کر رہ گیا۔

بعض متقاضی حالات میں مجبورِ محض بن کر انسان کو اپنے مقام سے گرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ فوم کے دبیز اور آرام دہ بستر کو چھوڑ کر زمین پر سونا بھلا لگتا ہے!

☆☆☆

زونارین ائرلائنز کی ائربس "اے۔ تھری تھرٹی" نے ٹھیک آٹھ بجے صبح بورونارا ائرپورٹ سے ٹیک آف کیا۔ ہم تینوں ڈسلوا' گارشیا اور یو آن ماؤ کی حیثیت سے اس جہاز کے مسافروں میں شامل تھے۔ اس طیارے کی طرح ہماری منزل بھی واشنگٹن اسٹیٹ کا خوب صورت شہر سیٹل تھی۔

ڈاکٹر مونگ ریفو شے ساڑھے چار بجے واپس آیا تھا۔ ہٹ کے "حالات" نے تھوڑی دیر کے لیے اسے متذبذب

کردیا تھا لیکن جب میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا تو وہ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے مطمئن ہوگیا۔ اگر قدرت نے ہمیں اس جزیرے سے نکلنے کا ایک منطقی موقع فراہم کردیا تھا تو ہمیں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا...... اور ہم نے ایسا کیا بھی تھا جبھی تو اس وقت زونارا آئی لینڈ کو خیر باد کہہ کر سیٹل کی جانب محوِ پرواز تھے۔

ڈاکٹر کی، ہٹ میں آمد کے بعد ہم نے ایک میل دور واقع پولیس چوکی سے رابطہ کر کے کنگ کو حالات حاضرہ سے آگاہ کرنے پر زور دیا سارے دروازے خود بہ خود کھلتے چلے گئے۔ ٹی ڈبلیو۔ اے کے بوئنگ سیون فور سیون کو پیش آنے والا واقعہ جزیرے میں ''برننگ ٹاپک'' بنا ہوا تھا اور ہم اس کامیاب آپریشن میں ہیروز کی حیثیت رکھتے تھے لہٰذا ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہماری خاطر کنگ کو اپنی نیند خراب کرنا پڑی اور وہ پوری مستعدی کے ساتھ احکام صادر کرنے لگا۔

اسی وقت مجھے یہ بات بھی پتا چلی کہ زونارا آئی لینڈ میں امریکا نواز بادشاہت قائم تھی۔ کنگ تو ہارا اڑولا نہ صرف امریکا کا حمایتی تھا بلکہ وہ اس کے مفادات کا بھی خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ ہمارا تعلق چونکہ امریکا سے تھا اور ٹی ڈبلیو اے کا طیارہ بھی امریکا (اینکریج) سے اڑ کر امریکا (سیٹل) ہی جارہا تھا اس لیے بھی کنگ کی کارکردگی میں گویا پہیے سے لگ گئے تھے۔ پھر وہ شنی مونگا کے حوالے سے ہمارا مشکور بھی تھا لہٰذا صرف تین گھنٹے کی ہنگامی کارروائی کے بعد ہم بورونارا ائرپورٹ کی عمارت میں تھے۔ کنگ توہارا اڑولا بہ نفسِ نفیس ہمیں سی آف کرنے ائرپورٹ تک آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی۔

پرواز متوازن ہوئی تو میں نے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا۔ ''تم اچانک اٹھ کر ہٹ سے کہاں چلے گئے تھے؟''

''بس ذرا ایک ٹہل لگانے نکل گیا تھا۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے کہا ''تمہاری یہ ''ذرا ایک ٹہل'' لگ بھگ ڈھائی گھنٹے پر مشتمل تھی!''

میرے لہجے میں ایک استفسار چھپا ہوا تھا۔ اس نے کوئی منطقی جواب دینے کے بجائے سرسری انداز میں کہا ''تمہیں میری ضرورت تو محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔ تم نے سارا معاملہ بڑی مہارت سے نمٹا دیا۔'' وہ ذرا متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''مجھے یقین تھا تم نمٹ لوگے!''

میں اس کے آخری جملے پر چونک اٹھا۔ اس جملے کا واضح مطلب یہی تھا' وہ ہٹ پر پیش آنے والے واقعے سے قبل از وقت آگاہ تھا ورنہ وہ اپنے یقین کا اظہار نہ کرتا۔ ڈاکٹر کا گریز دیکھتے ہوئے میں سمجھ گیا کہ اس ذیل میں پوچھے گئے میرے کسی سوال کا وہ سیدھا جواب نہیں دے گا لہٰذا میں نے کرید اور ٹٹول کا خیال دل سے نکال دیا اور موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا ان ڈھائی گھنٹوں کے دوران میں تم نے اپنے بڑوں سے سیٹل میں رابطہ کرنے کی کوشش کی؟''

اس نے مجھ پر ایک گہری نگاہ ڈالی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''ہاں مجھے ایک گیس اسٹیشن سے سیٹل فون کرنے کا موقع ملا تھا۔ تمہارے سیٹل جانے پر سانگ فو مطمئن ہیں۔''

اس نے ایک اور چونکا دینے والی بات کی تھی۔ ائربس سے سیٹل جانے کا پروگرام میں نے اس کی غیر موجودگی میں طے کیا تھا پھر وہ کسی سانگ فو سے میرے سیٹل جانے کو کیسے ڈسکس کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر مونگ کی شخصیت اور ''حرکات'' بے حد پُراسرار تھیں۔ میں نے بھی تہیہ کرلیا کہ اس کی حیرت سے بھرپور باتوں پر اچنبھک ہوں گا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی استفسار کروں گا۔ سانگ فو ایک نیا نام سامنے آیا تھا اور ڈاکٹر نے جس ادب واحترام سے اس کا ذکر کیا تھا اس سے محسوس ہوا کہ سانگ فو اس کا کوئی بڑا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا ''یہ سانگ فو صاحب کون ہیں؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے چند لمحات تک بڑی بھرپور نظر سے مجھے دیکھا اور بتایا ''سانگ فو سیٹل میں ہمارے سب کچھ ہیں' سب بڑوں سے بڑے ہم انہی کے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں۔''

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ نے کہا ''میں جانتا ہوں' کچھ عرصہ پہلے جب تم کھٹمنڈو نیپال کے مضافات میں' بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ میں پناہ گزیں تھے تو دلائی لاما نے تم پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں اور اب سانگ فو بھی تمہیں ایک خاص اہمیت دے رہے ہیں۔ میں تمہارے مرتبے اور اہلیت سے واقف ہوں وجدان اس لیے......''

ہمارے درمیان وہ گفتگو سرگوشیانہ انداز میں ہورہی تھی۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموشی اختیار کی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''اس لیے...... کیا؟''

''اس لیے اگر تمہیں کبھی یہ محسوس ہو کہ میں تم سے چھپانے کی کوشش کررہا ہوں یا یہ کہ میں تمہیں اپنی سوچ کے منصوبے سے آگاہ نہیں کررہا تو اپنے دل میں میرے لیے کوئی ایسا ویسا خیال نہ لانا۔ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتا بلکہ اس میں سانگ فو کی رضا شامل ہوتی ہے۔''

''میں تمہاری مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا ''تھینک یو!''

میں نے اچانک موضوع بدل دیا اور حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا ''ڈاکٹر مونگ! تم اپنی نیند کیسے پوری کرتے ہو۔ میں نے کبھی تمہیں ٹک کر سوتے ہوئے نہیں دیکھا؟''

''میں گزشتہ دس سال سے جھپکی نیند پر گزارہ کررہا ہوں۔''

میں ''جھپکی نیند'' کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا، بعض ہنگامی حالات میں، میں خود بھی اس ٹیکنیک سے استفادہ کرچکا تھا لیکن دس سال ایسے طویل عرصے کا سن کر مجھے واقعی بڑی حیرت ہوئی۔ یہ ناممکن... حد تک حیران کن تھا۔

''دس سال!'' میں نے متعجب لہجے میں دہرایا۔

''ہاں، دس سال۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''جب بھی نیند مجھے بے بس کرنے لگتی ہے، میں آنکھیں بند کر کے ایک جھپکی لگا لیتا ہوں جو دس منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک کی ہوسکتی ہے۔ اس مختصر مگر مخصوص دماغی ہدایات کے زیرِ اثر گہری اور پُرسکون نیند کے بعد میں آئندہ آٹھ چھ گھنٹے کے لیے ہشاش بشاش اور چاق و چوبند ہوجاتا ہوں۔''

میں نے اسے توصیفی نظر سے دیکھا اور کہا ''میں بھی اس عادت کو اپنانے کی کوشش کروں گا۔'' پھر اپنی معلومات کے لیے پوچھ لیا ''کیا مسلسل ایک طویل عرصے تک ایسا کرنے سے انسان کی مجموعی صحت پر کسی قسم کے برے اثرات تو مرتب نہیں ہوتے؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''تم مجھے دیکھ لو۔ گزرے ہوئے دس سال نے میری ذہنی، جسمانی اور روحانی صحت کا کیا بگاڑ لیا ہے۔ البتہ......'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ابتدا میں اس نیند کی پریکٹس سے انسان الجھتا ضرور ہے لیکن رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔ نہایت ہی سنجیدگی سے اگر کوئی بھی کام کیا جائے تو کامیابی ضرور قدم چومتی ہے۔ بس اس کے لیے ثابت قدمی اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے جو تم میں بڑی وافر مقدار میں موجود ہیں۔''

''بس ذرا فرصت مل جائے، پھر میں بھی جھپکی نیند کی پریکٹس میں لگ جاتا ہوں۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا ''میں جس نوعیت کی زندگی گزار رہا ہوں اس میں یہ ایک ہتھیار سے کم نہیں۔''

وہ بولا ''فرصت ملتی نہیں، حاصل کرنا پڑتی ہے۔ موقع ہر بار ہاتھ نہیں آتا، نکالنا پڑتا ہے...... جیسے میں نکال لیتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اپنی نشست پر تھوڑا ایزی ہوا پھر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں سمجھ گیا، وہ جھپکی نیند میں چلا گیا تھا۔ میں راکیل کی طرف متوجہ ہوگیا۔

جہاز نے مقررہ وقت پر، سیٹل ائرپورٹ کے رن وے کو چھولیا۔ اس وقت میری رسٹ واچ ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ زونارا آئی لینڈ اور سیٹل کے مقامی وقت میں لگ بھگ ڈھائی گھنٹے کا تفاوت ہے۔ گویا اس وقت سیٹل کی گھڑیاں سہ پہر تین بجے کا وقت بتارہی تھیں۔ مختلف ملکوں کے مابین وقت کا فرق بھی بعض اوقات حیران کن نتائج سامنے لاتا ہے۔ ہم نے ٹھیک ساڑھے چار گھنٹے ائربس میں گزارے تھے مگر انٹرنیشنل ٹائم زون پر یہ ساڑھے چار گھنٹے ہمارے لیے سات گھنٹوں میں بدل گئے تھے۔ شام وسحر کی گردش کے مطابق، ہم آٹھ بجے صبح طیارے میں زونارا آئی لینڈ سے اڑے اور تین بجے سہ پہر سیٹل کی فضا میں سانس لے رہے تھے۔ جو لوگ ملکوں ملکوں سفر کرتے رہتے ہیں، وہ بارہا اس حیرت آفریں تجربے سے گزرے ہوں گے۔

ائرپورٹ سے ہم نے ایک شاندار ٹیکسی لی اور لگ بھگ چار بجے ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے اس میں وہ وقت بھی شامل ہے جو لینڈنگ کے بعد ائرپورٹ سے نکلنے میں صرف ہوا۔ امریکا کی گنجان آباد اسٹیٹس کی بہ نسبت واشنگٹن خاصا کھلا کھلا اور کشادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ تجزیہ مختلف اسٹیٹس میں گھومنے کے بعد کا ہے۔ سیٹل میں ہماری منزل پائینر اسکوائر تھی۔

پائینر اسکوائر بڑی خوب صورت جگہ ہے جو دو ایونیوز اور دو اسٹریٹس کے باہمی ملاپ کے نتیجے میں وجود پاتا ہے۔ فرسٹ ایونیو اور سیکنڈ ایونیو، چیری اسٹریٹ اور جیمس اسٹریٹ کو کراس کرتے ہوئے متوازی سفر کرتی ہیں۔ ان چاروں سڑکوں کے ایک دوسرے کے اوپر سے گزرنے سے، مربع صورت پائینر اسکوائر بن جاتا ہے۔ امریکا اور دیگر مغربی ممالک میں اسٹریٹ کا مطلب اچھی خاصی سڑک ہے، نہ کہ ہماری طرح کوئی چھوٹی سی گلی!

ڈاکٹر مونگ ریفوشے کی ہدایت پر ڈرائیور نے ٹیکسی ایک بڑی سی فلا ...ں شاپ کے سامنے روک دی۔ انواع و

قسام کے رنگ برنگے پھولوں سے بھی اس بڑی سی دکان کے پہلو میں واقع زینے کے ذریعے ہم عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔

اس عمارت کا زیریں حصہ سانگ فو اور اس کے آدمیوں کے استعمال میں تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے مجھے بتایا کہ سانگ فو کے علاوہ وہاں سات اور افراد بھی موجود تھے۔ چار مرد اور تین عورتیں۔ چیری اسٹریٹ پر واقع فلورل شاپ اور اس کے برابر میں موجود ریسٹورنٹ سانگ فو کی ملکیت تھی۔ عقبی حصہ رہائش کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں یہاں ایک بڑی سی وائن شاپ ہوا کرتی تھی سانگ فو نے کئی سال پہلے عمارت کا زیریں حصہ خرید لیا اور اپنے خاص بندوں کے ساتھ یہاں کاروبار شروع کر دیا۔ یہی سات افراد مذکورہ ریسٹورنٹ اور فلورل شاپ (پھولوں کی دکان) کا نظام سنبھالتے تھے۔

سانگ فو بظاہر، چیری اسٹریٹ کا ایک سیدھا سادہ کاروباری آدمی تھا لیکن دنیا داری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ''ازم'' کے لیے بھرپور کام کر رہا تھا۔ اس کے عقیدت مندوں میں جب ڈاکٹر مونگ ریفو شے جیسے عبقری موجود تھے تو پھر اس کی اپنی مخفی و ظاہرہ صلاحیتوں کا کیا ٹھکانا ہو سکتا تھا۔

رات آٹھ بجے مجھے سانگ فو سے ملنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر مونگ مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں فرشی نشست کا اہتمام تھا۔ امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں ایسی نشست گاہ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر مونگ مجھے وہاں پہنچا کر واپس چلا گیا تو میں بغور اس چھوٹے سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

کمرے کے اندر داخلے کے دو دروازے تھے جو مقابل دیواروں میں نظر آ رہے تھے۔ فرشی نشست کے علاوہ اس کمرے میں کوئی قابلِ ذکر شے مجھے دکھائی نہ دی۔ کمرے کے فرش پر پیلے رنگ کا سنتھیٹک کارپٹ بچھا تھا۔ ایک کونے میں تین ضرب تین فٹ کا ایک چھوٹا سا سرخ کارپٹ بھی موجود تھا۔ قالین کا یہ سرخ ٹکڑا پیلے کارپٹ کے اوپر بچھایا گیا تھا۔ میں اس کمرے کی سادگی اور سونے پن پر غور کر ہی رہا تھا کہ ایک دروازہ آہستگی سے کھل گیا۔

یہ وہ دروازہ نہیں تھا جو ڈاکٹر مونگ نے آمد ورفت کے لیے استعمال کیا تھا بلکہ یہ اس کے مقابل والا دروازہ تھا اور اس دروازے سے جو شخصیت اندر داخل ہوئی اس پر نگاہ پڑتے ہی میں احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سانگ فو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

سانگ فو نے خالص آسمانی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ میں نے اپنے استاد محترم ماسٹر ہینگ پائی کو کئی بار اس قسم کے لباس میں دیکھا تھا۔ سانگ فو نے بڑی مہربان مسکراہٹ کے ساتھ مجھے ایک مخصوص انداز میں سلام کیا۔ میں نے اس کے ''سلام'' کا جواب دیا تو اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

میں ابھی کھڑا ہی تھا کہ سانگ فو قالین کے سرخ ٹکڑے پر جا بیٹھا۔ میں بھی چند فٹ کے فاصلے پر اس کے قریب پیلے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ سانگ فو کی عمر ستر کے نزدیک نظر آتی تھی۔ اس کے سر پر آدھی انچ کے برابر بال تھے جو پوری طرح چاندی میں بدل چکے تھے۔ ہلکی مونچھیں بھی سفیدی دکھلاتی تھیں۔ آنکھوں پر بڑا سوبر چشمہ تھا۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ وہ چشمہ نظر کا تھا یا پھر محض حفظانِ چشم کی کوئی کوشش!

سانگ فو کی شخصیت انتہائی متاثر کن تھی اور صورت میں کسی حد تک کارل مارکس کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ہمارے درمیان بڑی اہم گفتگو ہوئی۔ سانگ فو کو مینڈرین، تمی، ہندی اور انگلش زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ تاہم ہمارے درمیان اس وقت اول آخر انگلش میں بات ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر تک ہمارے بیچ بدھ نیل کنٹھ کی عبادت گاہ، ربی موشے ہائمن، صیہونی سازش اور پوری دنیا کو اپنا غلام بنانے کی یہودی کوشش جیسے موضوعات زیر بحث رہے پھر زاویۂ گفتگو ساحل کی جانب مڑ گیا۔ میں نے احترام بھرے لہجے میں کہا۔

''محترم سانگ فو! ڈاکٹر مونگ کی زبانی مجھے پتا چلا تھا، آپ نے ساحل کا سراغ لگا لیا ہے۔ وہ نیویارک کے سب سے پوش علاقے مین ہٹن میں ہے لیکن مین ہٹن میں کہاں، یہ پتا نہیں چل سکا؟''

وہ خفیف سا مسکرایا اور استفساریہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''تم نے تو اس سے آگے بھی کچھ معلوم کرنے کی کوشش کی ہو گی!''

سانگ فو کا انداز بتاتا تھا، وہ میری کوشش اور جزوی کامیابی سے آگاہ ہے۔ میں نے اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں اتنا معلوم کر چکا ہوں کہ ساحل کو ڈاؤن ٹاؤن مین ہٹن کے فنانشل ڈسٹرکٹ میں واقع، وال اسٹریٹ کی کسی عمارت میں رکھا گیا ہے مگر یہ پتا نہیں چل سکا کہ کون سی عمارت میں، کس جگہ!''

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے وال اسٹریٹ کی فٹ پاتھ پر نصب ''برونز بل'' اور ساحل کی نگران عورت کے بارے میں بتایا۔ وہ اس دوران میں بڑے معنی خیز انداز میں مجھے یک ٹک دیکھتا رہا۔ آخر میں، میں نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اگر ربی موشے ہائمن میری گرفت میں آجاتا تو میں بہ آسانی ساحل تک پہنچ سکتا تھا۔ لگتا ہے، اس نے کسی مخصوص عمل کے ذریعے خود پر کوئی ایسا خول چڑھا رکھا ہے کہ میرے تصور کی پرواز اس تک رسائی حاصل نہیں کر پاتی۔ وہ براہ راست میری رینج میں نہیں آتا۔''

''ربی موشے ہائمن پُراسرار علوم کا ماہر ایک کائیاں شخص ہے۔'' سانگ فو نے گمبھیر آواز میں کہا ''میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بھی یہی شخص بنا ہوا ہے۔ بہر حال، ربی سے تو ہم بعد میں نمٹ لیں گے، پہلی ضرورت ساحل تک پہنچنا ہے۔ نہ صرف اس تک رسائی حاصل کرنا ہے بلکہ اسے ربی کے چنگل سے صحیح سلامت باہر بھی لانا ہے۔ وہ اگرچہ اپنے مقصد میں جزوی طور پر کامیاب ہو چکا ہے لیکن ہم اس لڑکی کو بے یار و مددگار تو نہیں چھوڑ سکتے!''

میں نے چونک کر سانگ فو کو دیکھا۔ لڑکی سے اس کی مراد ساحل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ ربی کے، اپنا مقصد حاصل کرنے کا ایک ہی مطلب تھا، وہ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے تک پہنچنے کا راز جان چکا تھا اور...... یہ راز یقیناً اس نے ساحل کے خوابیدہ، ہپناٹائزڈ ذہن سے نکالا ہوگا۔

میں نے اپنی بے چینی سانگ فو پر ظاہر کی تو وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا ''آپ کو یہ اطلاع کیسے ملی؟ کیا آپ نے ربی تک رسائی حاصل کر لی ہے یا......؟''

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر بے تابی سے اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ اس نے بتایا ''تمہاری طرح میں بھی ابھی تک ربی کو اپنے ''دائرے'' میں نہیں لا سکا۔ وہ ایک طلسم کدے میں بند ہے۔ دوسری طرف ساحل زیادہ تر نیند میں رہتی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے تھوڑی دیر پہلے جو کچھ کہا ہے، اس کا ایک سبب ہے اور سبب یہ ہے کہ ادھر کھٹمنڈو کے پہاڑی مضافات میں واقع بدھ عبادت گاہ کے آس پاس بڑی پُراسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ چند امریکیوں کا ادھر متوجہ ہونا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرف سے مجھے جس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے، ربی نے تنویمی عمل کے ذریعے ساحل کے ذہن میں پوشیدہ راز کو اپنے لیے راز نہیں رہنے دیا۔ وہ جان چکا ہے، عبادت گاہ کے خفیہ تہ خانے میں پہنچنے کا طریقۂ کار کیا ہے اور...... اس تہ خانے کے اندر کتنا بڑا خزانہ موجود ہے یہ بات تم بھی جانتے ہو، میں بھی جانتا ہوں اور ربی موشے ہائمن بھی۔ میرا خیال ہے، آنے والے ایک دو روز میں وہ لوگ ادھر کوئی کارروائی کریں گے!''

''یہ تو بڑی تشویش ناک صورتِ حال ہے!'' میں نے کہا۔

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''ہاں، صورتِ حالات تو واقعی تشویش ناک ہے لیکن میں نے ڈاکٹر مونگ کو معاملات سنبھالنے کے لیے ادھر روانہ کر دیا ہے۔ لارڈ بدھا سب ٹھیک کر دیں گے۔''

ڈاکٹر مونگ کی روانگی پر میں ایک مرتبہ پھر چونکا اور پوچھے بنا نہیں رہ سکا ''ڈاکٹر مونگ تھوڑی دیر پہلے تک تو یہیں تھے سو وہ کب یہاں سے گیا؟''

''تمہیں اس کمرے میں پہنچانے کے بعد وہ سیدھا سیٹل ایئر پورٹ کی طرف چلا گیا ہے۔'' سانگ فو نے بڑی رسانیت سے بتایا ''تم لوگوں کے یہاں پہنچتے ہی میں نے ڈاکٹر سے میٹنگ کر کے پروگرام طے کر لیا تھا۔ ٹھیک نو بجے اس کی فلائٹ ہے۔ وہ ملائیشیا ایئر لائنز کے طیارے بوئنگ سیون سیون سیون سے سیدھا کوالالمپور پہنچے گا پھر وہاں سے کوئی اور فلائٹ پکڑ کر نیپال کی طرف چلا جائے گا۔ ''بوئنگ ٹرپل سیون'' بڑا ریکارڈ میکنگ طیارہ ہے۔ پچھلے سال دو اپریل کو اس جہاز نے صرف بیالیس گھنٹے میں پوری دنیا کے اوپر پرواز کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس نے اپنے سفر کا آغاز سیٹل سے کیا اور اٹلانٹک اوشین کے اوپر سے گزر کر کوالالمپور پہنچ گیا پھر کوالالمپور سے اڑا اور پیسفک اوشین کے اوپر سے اڑتے ہوئے واپس سیٹل پہنچ گیا۔ بہر حال......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑا متوقف ہوا پھر موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔

''ڈاکٹر مونگ سے آج صبح، بلکہ رات کے آخری پہر میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہی میں نے ملائیشیا ایئر لائنز میں اس کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔ مجھے امید ہے، وہ وہاں کے حالات کو کنٹرول کر لے گا۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے شاکی نظر سے مجھے دیکھا جیسے بہ زبانِ خموشی کہہ رہا ہو، اگر میں اس محاذ کی کمان سنبھالتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ میں نے اس کے احساسات کے پیشِ نظر قدرے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔

''میرے محترم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقع پر پورا نہیں اتر سکا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ پُرمعنی انداز میں خفیف سا مسکرایا ''ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔'' پھر گویا میرے آر پار دیکھتے ہوئے بولا ''میں تمہیں بدھ نیل کنڈ والے مشن سے ہرگز ہرگز الگ نہیں دیکھ رہا ہوں۔''

سانگ فو کے آخری جملے میں کئی اسرار پوشیدہ تھے۔ میں اس کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''وجدان! تمہارا آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟''

میرا خیال تھا، سانگ فو (ڈاکٹر مونگ کا بڑا) میرے کھٹمنڈو جانے پر زور دے گا کیونکہ اب تک کے ڈاکٹر مونگ کے رویے سے میں نے یہی اخذ کیا تھا۔ وہ مجھے ہر صورت میں سیٹل لانے کے لیے اس طور مصر تھا کہ میں کوئی اور اندازہ لگا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس حوالے سے اس نے دلائی لاما اور لارڈ بدھا کا ذکر بھی کیا تھا لیکن سانگ فو کا سوال، صورتِ حال میں تبدیلی کا مظہر تھا۔

میں نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا ''میں ساحل کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، کسی بپھرے ہوئے سمندر کو ساحل ہی کی تلاش ہوتی ہے!'' وہ گمبھیر لہجے میں اتنا بول کر خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا ''ڈاکٹر مونگ نے مجھے ایک روز پہلے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ کھٹمنڈو والے مشن کے لیے میرا انتخاب کیا جا چکا ہے اور میں یہ امید بھی کر رہا تھا کہ سیٹل پہنچنے کے بعد اسی حوالے سے مجھ پر زور دیا جائے گا لیکن......'' میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر تھوڑا متوقف ہوا پھر کہا۔

''لیکن آپ کا رویہ میرے لیے خلافِ توقع ہے۔'' میں اپنے ذہن کی الجھن کو بیان کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

سانگ فو نے مدبرانہ انداز میں کہا ''اگر انسان کی ہر توقع پوری ہونے لگے تو وہ انسان نہیں رہتا۔ انسان ایک اعتدال، ایک توازن کا نام ہے۔ اس کی ایک مخصوص رینج ہے۔ اسے اس رینج ہی میں رہنا پڑتا ہے۔ نہ ایک ڈگری نیچے اور نہ ہی ایک ڈگری اوپر۔ نارمل تو نارمل ہے۔ ''بیلو دی نارمل'' اور ''ابوو دی نارمل'' ہر شے ایب نارمل کہلاتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا!''

وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوا پھر سرسری لہجے میں بولا۔ ''جہاں تک بدھ نیل کنڈ والے مشن میں تمہاری شمولیت کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر مونگ نے تم سے غلط نہیں کہا تھا۔ حقیقت یہی ہے کہ تم پوری طرح اس مشن میں ہمارے ساتھ ہو۔''

سانگ فو کی مبہم بیانی نے مجھے ذہنی طور پر الجھا دیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''محترم، آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں بیٹھ سکی!''

''بیٹھ جائے گی۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا ''میں نے کہا ہے نا، ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ نہ ایک پل ادھر، نہ ایک پل ادھر۔ تم بھی انتظار کرو۔''

جب مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ میرے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دے گا تو میں نے خاموش رہنا ہی مناسب جانا۔ چند لمحات تک ہمارے درمیان سکوت کی چادر تنی رہی پھر اس چادر کو سانگ فو ہی نے چاک کیا۔ اس نے گہری سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا اور کہا۔

''وجدان! سیٹل سے نیویارک کے لیے دو اوپن ٹکٹ خرید لیے گئے ہیں۔ آج رات ساڑھے بارہ بجے یونائیٹڈ ایئر لائنز کی ایک فلائٹ سیٹل سے نیویارک جا رہی ہے۔ اگر تم کہو تو ٹکٹ کنفرم کروا دوں؟''

''دو ٹکٹ؟'' میں نے متذبذب انداز میں کہا ''ڈاکٹر مونگ تو کوالالمپور روانہ ہو گیا۔ میرے ساتھ دوسرا کون نیویارک جائے گا؟''

''راکیل!'' سانگ فو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا ''راکیل کو میں ایک خاص وجہ سے تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ایک تو وہ نیویارک کے چپے چپے سے واقف ہے، دوسرے ساحل تمہاری اور ہماری مشترکہ ضرورت ہے اس لیے بھی اس کے حصول کے لیے کوئی ایک فرد تو ہماری طرف سے بھی ہونا چاہیے۔'' وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر مجھ سے مستفسر ہوا ''اگر تمہیں راکیل کو ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض ہے تو پھر دوسری بات ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تم دونوں میں اچھی خاصی

انڈر اسٹینڈنگ بھی پیدا ہو چکی ہے!''

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور جواب دیا ''ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں!''

سانگ فو نے مجھے اسی کمرے میں بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور خود اٹھ کر باہر چلا گیا۔ میں سمجھ گیا، وہ ٹکٹ کنفرم کرانے کے سلسلے میں کسی کو ہدایت دینے گیا تھا۔

پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا اور بتایا ''اگر لارڈ بدھا کی مرضی ہوئی تو تم دونوں آج ہی رات سینٹل کی فضا سے نکل جاؤ گے۔ میں نے اس سلسلے میں گھوڑا دوڑا دیا ہے۔''

میں نے پوچھا ''ڈاکٹر مونگ کھٹمنڈو کی طرف گیا ہے۔ پتا نہیں اسے وہاں کتنے دن لگ جائیں اس دوران میں اینکریج والے مارشل آرٹس سینٹر کا کیا ہوگا۔ ہم کسی طرح بروس ٹولز کی نظر بچا کر زونارا آئی لینڈ سے سینٹل تو آ گئے ہیں لیکن بروس ٹولز اور الاسکا کا دیگر ہائی اتھارٹیز وہاں اینکریج میں ڈاکٹر مونگ سے ضرور رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح معاملہ گڑبڑ نہیں ہو جائے گا؟''

''تمہارے ذہن میں ایک اچھا سوال آیا ہے۔'' سانگ فو نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''لیکن میں اس پہلو کو بھولا نہیں ہوں۔ اینکریج والے سینٹر اور ڈاکٹر مونگ کی وہاں حاضری کا مکمل بندوبست کر دیا گیا ہے۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا لیکن یہ نہیں پوچھا کہ اس نے کس قسم کا بندوبست کیا تھا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے خود ہی بتایا۔

''ڈاکٹر مونگ نے اپنے حلیے میں جو تھوڑی بہت تبدیلی کی تھی' اس شکل و صورت کا ایک شخص میرے اسٹاف میں شامل ہے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی وہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ میں تمہیں مذکورہ شخص سے ملواؤں گا۔ تم اسے دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے۔ ایک آدھ دن میں وہ سینٹل سے اینکریج روانہ ہو جائے گا پھر الاسکا کی ہائی اتھارٹیز کو وہ سنبھال لے گا۔ تمام حالات اس کے علم میں ہیں۔''

سانگ فو کی وضاحت پوری طرح مجھے ہضم نہیں ہوئی۔ میں نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا ''اور ڈاکٹر مونگ کے اسٹوڈنٹس کا کیا ہوگا وہ تو اسے کسی اور ہی صورت سے پہچانتے ہیں؟''

''تم ایک بہت بڑے مشن پر جا رہے ہو لہٰذا ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اپنے ذہن کو مت الجھاؤ۔'' سانگ فو نے بڑی نرمی سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی' ''جو شخص ڈاکٹر مونگ بن کر اینکریج جائے گا وہ مختلف قسم کے میک اپ کا ماہر ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تمہارے اور راکیل کے چہروں پر بھی کام کرے گا تو تمہیں اس کی مہارت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ تمہیں آسان اور فوری ماسک میک اپ کے سلسلے میں ضروری ٹپس بھی دے گا جو تمہارے بہت کام آئیں گے۔ ویسے راکیل بھی اس فن میں کسی سے کم نہیں!'' وہ چند لمحات کے لیے ٹھہرا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''یو آن ماؤ بھی تمہارے ذہن میں الجھن پیدا کر رہا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ تم اس سلسلے میں کوئی سوال کرو' میں خود ہی تمہیں بتا دیتا ہوں۔ مونگ کے اسٹوڈنٹس اسے صرف ڈاکٹر کہہ کر پکارتے ہے یا پھر ماسٹر کہتے ہیں اور ان اسٹوڈنٹس میں بھی اکثریت ہمارے اپنے بندوں کی ہے۔ غیروں میں سے کوئی نہیں جانتا' وہ مونگ ریفوشے ہے یا یو آن ماؤ اس لیے تمام معاملات کو سیٹ کر لیا جائے گا۔ تمہیں اس سلسلے میں ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔''

میں ڈاکٹر مونگ اس کے مارشل آرٹس سینٹر اور الاسکا کی ہائی اتھارٹیز کے خیالات سے یکسر باز آ گیا اور ساری توجہ خود پر مرکوز کرتے ہوئے سانگ فو سے استفسار کیا۔

''کیا میں ڈسلوا کی حیثیت ہی سے نیویارک جا رہا ہوں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ''تمہیں ڈسلوا اور راکیل کو گارشیا بناتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ تمہیں میک اپ وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ محنت نہ کرنا پڑے تم دونوں اصلی ڈسلوا اور گارشیا سے بہت حد تک مشابہت رکھتے ہو خصوصاً چہروں کی ساخت کے حوالے سے۔''

''اوہ!'' میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی ''تو اس کا مطلب ہے اصلی ڈسلوا اور گارشیا بھی وجود رکھتے ہیں؟''

''یہ دونوں ہمارے ہی آدمی ہیں۔'' سانگ فو نے بتایا ''تم دونوں کو جو کاغذات وغیرہ فراہم کیے گئے ہیں' وہ بالکل اصلی ہیں۔ تمہارے پاس ان دونوں کی جینوئن آئی ڈی ہے لہٰذا کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ جب تک تم متحرک رہو گے' اصلی ڈسلوا اور گارشیا میری ہدایت کے مطابق منظر عام پر نہیں آئیں گے۔ ان کی آئی ڈی پر تم دونوں پورے امریکا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دندناتے پھرو۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ کسی بڑی قانون شکنی کا ارتکاب نہ کرنا اور...... مجبوری میں ایسا ہو جائے تو پھر پولیس کے ہتھے نہ چڑھنا ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔'' وہ تھوڑا متوقف

ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بہ فرضِ محال‘ اگر تم قانون کی مضبوط گرفت میں آجاتے ہو تو پھر وہ تمہارے اندر سے وجدان کو باہر نکال لیں گے۔ اس کے بعد تمہیں اپنی سمجھ بوجھ سے معاملات کو [illegible] ہوگا۔ یہ انڈو پاک کی پولیس نہیں جو تمہاری جیب نرم اور اپنی مٹھی گرم کر کے تمہیں چھوڑ دے گی۔ خاص طور پر ”این وائے پی ڈی“ کو ہر قسم کی جدید سہولت مہیا ہے۔ وہ لوگ اگر کسی پر مضبوط ہاتھ ڈال دیں تو پھر چند لمحوں میں اس کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ تم دونوں این وائے پی ڈی (نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) کے قلب (مین ہیٹن) میں اترنے جا رہے ہو۔ اس ”دل“ میں امن و امان سے بسے رہنا کیونکہ وہیں پر تمہارا ایک طاقتور دشمن ربی موشے ہائمن بھی ڈیرا ڈالے بیٹھا ہے جس کے قبضے میں تمہاری روح ہے۔ تمہیں اپنی روح کو اس شیطان کے چنگل سے نکالنا ہے اور ذہن میں رکھنا ہے کہ ربی موشے ہائمن ”این وائے پی ڈی“ سے کہیں زیادہ اختیارات کا مالک ہے۔ اس کے ایک اشارے پر امریکی صدر بھی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا ”تمہاری ہسٹری سے میں جس حد تک واقف ہوں اس کے مطابق‘ ربی موشے ہائمن جیسا طاقتور شخص آج تک تمہارے مقابل نہیں آیا۔ اب پتا چلے گا تمہاری صلاحیتوں کا۔ ایک ایک قدم پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہے۔“

سانگ فو نے اپنی بات مکمل کی تو میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ واقعی اس مرتبہ میرا مقابلہ ایک بہت ہی باکمال اور بااختیار شخص سے تھا۔ میں نے ماؤنٹ مکنلے والے ربی کے ٹھکانے سے فرار ہو کر اسے جو چرکا لگایا تھا۔ وہ اب تک خون کی اس لکیر کو چاٹ رہا ہوگا۔ زخمی مدِمقابل اور زیادہ خطرناک ہو جاتا خصوصاً اس صورت میں کہ وہ زخم آپ نے اسے دیا ہو۔

میں نے اس زخم کے علاوہ اسے ایک دھوکا بھی دیا تھا جب اولڈ کریل (الاسکا) کے ایک گیس اسٹیشن (پیٹرول پمپ) سے راجر کی حیثیت سے میں نے اسے فون کیا تھا۔ فون پر ہونے والی وہ گفتگو اس کا سکون برباد کرنے کے لیے کافی تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا‘ ربی اب تک میرے فریب میں مبتلا تھا یا میری چال کی اس کی سمجھ میں اتر گئی تھی۔ ویسے ربی کی علمیت اور عملیت کے پیشِ نظر امکان اسی بات کا تھا کہ وہ میری چال سے واقف ہو گیا تھا ورنہ وہ ماؤنٹ مکنلے والا انتہائی محفوظ ٹھکانا چھوڑ کر مین ہیٹن کا رخ نہ کرتا!

سانگ فو نے میری صلاحیتوں کا حوالہ دیا تو میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا پھر اسی خیال کے تحت میں نے اس سے کہا ”آپ اگر اجازت دیں تو لمحے بھر میں ساحل کی خیریت معلوم کر کے آتا ہوں۔“

”وہ خیریت سے ہے اور اس وقت اس پر گہری نیند کا تسلط ہے۔“ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ”میں نے چند لمحے پہلے ادھر جھانکا تھا۔“

میں چونک اٹھا ”آپ کا مطلب ہے مجھ سے گفتگو کرنے کے دوران میں؟“

اس نے میری حیرت کا نوٹس نہیں لیا اور بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولا ”تم بھی تراٹی کرلو۔“

میں نے آنکھیں بند کیں۔ اپنے تصور کو ساحل کے سراپا پر مرتکز کیا۔ میرے پن یل گلینڈ نے کام دکھایا اور میں اسی بیڈروم میں پہنچ گیا جہاں میں نے ساحل کو بے سدھ پڑے دیکھا تھا۔ سانگ فو کا کہنا بالکل درست تھا۔ ساحل گہری نیند میں تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور سانگ فو کے سامنے حاضر ہو گیا۔

اس کے لبوں پر شبنمی تبسم ابھرا پھر اس نے میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ اس کا انداز کسی استاد کا سا تھا۔ ماسٹر ہینگ پائی اسی انداز میں مجھے لیکچر دیا کرتا تھا۔ میرے ذہن میں شاؤلن ٹیمپل کی وہ پہاڑی آن کھڑی ہوئی جس کے دامن میں ماسٹر ہینگ پائی مجھے ”چی“ کی خصوصی ٹریننگ دیا کرتا تھا۔ آج ڈاکٹر موشنگ کا بڑا ”سانگ فو“ بھی اسی انہماک سے مجھے کچھ بتانے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”وجدان! میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اسی لیے میں نے تمہیں سیٹل بلایا ہے۔ اگرچہ وقت ساتھ بہت مختصر ہے لیکن میں اپنی بات پوری کرلوں گا۔ یہ بات تم سے روبہ رو بیٹھ کر ہی ہو سکتی تھی۔“

اس کے لہجے کی گمبھیرتا اور سنجیدگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا راز مجھ تک منتقل کرنے والا ہے۔ اس کی کیفیت نے مجھے بتایا کہ وہ قدرے ملول بھی تھا۔ میں نے کہا۔

”محترم! اگرچہ ہم آج تھوڑی دیر کے لیے ملے ہیں لیکن اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ میں ساحل کو حاصل کرنے کے بعد سیدھا آپ کے پاس سیٹل ہی آؤں گا۔“

وہ دور خلا میں گھورتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم دوبارہ ملیں گے مگر دوسرے جنم میں۔ اس جنم میں یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔“

”دوسرا جنم!“ میں نے متعجب نظر سے اسے دیکھا ”محترم سانگ فو! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”میں نے وہی کہا ہے جو تم نے سنا ہے!“ وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

میں بدھ ازم کے بارے میں وسیع معلومات رکھتا تھا۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ بدھ مت کے ماننے والے آخرت پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہندومت کی طرح وہ دوسرے‘ تیسرے...... جنم پر یقین رکھتے ہیں۔ بدھ ازم کے مطابق‘ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کرتا ہے ان اعمال کی بنا پر اسے دوسرا جنم ملتا ہے۔ ایک نیک اور صالح انسان کو دوسرے جنم میں اعلیٰ و ارفع خصال کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور برے اعمال کا حامل شخص‘ سزا کے طور پر بڑی عبرتناک صورت میں دوسرا جنم لیتا ہے۔ بہرحال اس عقیدے سے قطع نظر سانگ فو نے اس وقت جو بات کی تھی اس نے میرے اندر کھلبلی سی مچا دی اور میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”محترم آپ کس کے دوسرے جنم کی بات کر رہے ہیں۔ اپنے یا......“

”میں اپنے دوسرے جنم کا ذکر کر رہا ہوں۔“ وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا ”تمہاری تو ابھی اٹھتی جوانی ہے جب کہ میں زندگی کا سفر پورا کر چکا ہوں۔ پتا نہیں کب یہ چراغ بجھ جائے۔“

وہ انتہائی سنجیدگی سے مستقبل کا احوال بیان کر رہا تھا۔ میں نے دل جوئی کے انداز میں کہا ”آپ کو کچھ نہیں ہوگا میرے محترم۔ ہم عنقریب سیٹل میں دوبارہ ملاقات کریں گے۔“

”میں کب کہہ رہا ہوں‘ مجھے کچھ ہو جائے گا۔“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ”بس میں تو ایک لباس سے نکل کر دوسرے لباس میں چلا جاؤں گا۔ ہم واقعی دوبارہ ملیں گے لیکن سیٹل میں نہیں بلکہ تبت میں۔“

”تبت میں؟“ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

”ہاں۔“ اس نے زیرِلب مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا ”ہماری دوسری ملاقات تبت میں ہوگی۔ میں تمہیں چار سال کے ایک خوبصورت بچے کے اندر ملوں گا۔ اس بچے کا نام بھی سانگ فو ہوگا۔ مجھے پورا یقین ہے تم مجھے دیکھتے ہی پہچان لوگے۔“

ایک مسلمان ہونے کے ناتے سانگ فو کا فلسفہ اور بیان میرے لیے فضولیات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہمارا عقیدہ اور مذہبی تعلیمات اس سے مختلف ہیں۔ بہرحال میں نے سانگ فو سے کسی قسم کی جرح بحث مناسب نہ سمجھی اور خاموش بیٹھا رہا۔

چند لمحے کے سکوت کے بعد اس نے کہا ”مجھے یقین ہے تم سے زیادہ سنجیدگی اور شدومد سے ساحل کو اور کوئی تلاش نہیں کرسکتا۔ ساحل کا حصول اگرچہ آسان نہیں لیکن تمہارے عزم اور مستقل مزاجی سے کچھ بعید بھی نہیں۔“ وہ ذرا دیر کو خاموش ہوا پھر گفتگو کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”جب تم ساحل کو حاصل کرلو تو اس کی قدر کرنا۔ اس نے تمہاری خاطر بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ میں ساحل کا ایک بزرگ ہونے کے ناتے اسے تمہاری سپردگی میں دیتا ہوں۔“

وہ ایک مرتبہ پھر بڑے معنی خیز انداز میں چپ ہو گیا۔ اس کی یہ خاموشی اسرار و رموز کا مرقع تھی۔ مجھے ان لمحات میں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سسر بسترِ مرگ پر اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہو اور اپنی دانست میں ایک لائق اور قابلِ بھروسا نوجوان کے ہاتھ میں اپنی لختِ جگر کا ہاتھ تھما کر بیٹی کا مستقبل محفوظ کرنے کی سعی کر رہا ہو...... لیکن یہ سپردگی‘ یہ حوالگی اور یہ عطا کتنی مضحکہ خیز اور عجیب و غریب تھی۔ سانگ فو ایک ایسی شے مجھے دے رہا تھا جو اس کے پاس تھی ہی نہیں ”یہ گیو اینڈ ٹیک“ کی ایک ناقابلِ یقین مثال تھی۔ بہرحال اس میں میرے لیے اطمینان کا پہلو موجود تھا۔ ساحل کے کرتا دھرتا مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو رہے تھے۔ سانگ فو کی عطا کے جواب میں‘ میں نے صرف اتنا کہا۔

”محترم! میں اس مہربانی کے لیے زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔“

اس نے دیوار گیر کلاک پر ایک نظر ڈالی اور بولا ”وقت بہت کم ہے۔ اس اہم بات چیت کے علاوہ بھی بہت سارے کام باقی ہیں لہٰذا میں پہلے تمہاری ذات کو نمٹا دوں۔“

پتا نہیں وہ میرے بارے میں مزید کیا کہنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کچھ بولنے کے بجائے سننے پر ہی اکتفا کیا۔

اس نے کہا ”وجدان! میری بات کو ذرا دھیان سے سننا اور اس گفتگو کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”ماسٹر ہینگ پائی کی نگرانی میں تم نے ”چی“ کی بیداری کا آغاز کیا تھا۔ تمہاری تھرڈ آئی (پن یل گلینڈ) خاطر خواہ متحرک ہو چکا ہے لیکن ابھی اسے مزید مستعد اور کارآمد بنایا جا سکتا ہے۔ جب بھی اور جتنی بھی فرصت ملے تم اس غدود کو مرکزِ تصور بنا کر مشق

کرتے رہو۔ یہ تمہاری منزل نہیں تمہیں اور آگے جانا ہے۔"

وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "انسانی جسم میں موجود یہ غدود (گلینڈز) بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ پن یل گلینڈ (PINEAL GLAND) کی مدد سے آپ اپنی سوچ اور خواہش کو تصور کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ گویا آپ کی باطنی آنکھ ہے۔ اگرچہ یہ پوری طرح کھل جائے تو پھر کوئی پردہ پردہ نہیں رہتا۔ یہ غدود دماغ کے سامنے والے حصے پر واقع ہے۔ دونوں آنکھوں کے بیچ...... پیشانی کے عین وسط میں۔"

اس نے ایک انگلی سے اپنی پیشانی کو چھوا۔ یہ وہ مقام تھا جس کے پیچھے پن یل گلینڈ موجود ہوتا ہے۔ ہندو عورتیں اور پنڈت عین اسی مقام پر سرخ بندیا لگاتے ہیں۔ انسانی آنکھ کو نظر آنے والے رنگوں میں سرخ رنگ کی طول موج (WAVELENGHT) سب سے زیادہ ہوتی ہے ماتھے پر چمکنے والی سرخ بندیا غور وفکر کرنے والوں کے لیے کئی در کھولتی ہے۔

"باطنی آنکھ کی طرح ایک باطنی کان بھی ہوتا ہے۔" سانگ فو کہہ رہا تھا "میں انسانی دماغ کے عقبی حصے میں موجود پچیوٹری گلینڈ (PITUITARY GLAND) کی بات کر رہا ہوں یہ غدود انسان کے لیے باطنی کان کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ کنٹرول میں آجائے تو آپ تصور کی نگاہ سے دیکھے گئے منظر کا ساؤنڈ سسٹم آن کر سکتے ہیں۔ وہاں پیدا ہونے والی ہر آواز کو سن سکتے ہیں اور اپنی آواز کو وہاں پہنچا بھی سکتے ہیں۔ اگر پچیوٹری اور پن یل دونوں گلینڈز آپ کے فرماں بردار بن جائیں اور یہ دونوں آپس میں بھی اچھی انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرلیں تو ان کی کارکردگی سے وقوع پانے والی صلاحیت ٹیلی پیتھی کہلاتی ہے مگر...... یہ تمہارا شعبہ نہیں۔"

"پھر آپ مجھے اس بارے میں اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہے ہیں؟" میرے لبوں سے بے ساختہ یہ سوال پھسل گیا۔

وہ مدبرانہ انداز میں بولا "اس لیے اگر کبھی تمہیں کہیں سے پچیوٹری گلینڈ کی اہمیت کے بارے میں پتا چلے تو تم اس کی مشقیں کرنے نہ بیٹھ جاؤ۔ ایسی کوئی بھی کوشش وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ ماسٹر ہینگ پائی نے تمہاری ناپ تول کے بعد ہی "چی" کے میدان میں ڈالا تھا۔ ہر انسان کی کیمسٹری دوسرے سے مختلف ہے اور ہر صلاحیت ہر انسان کے لیے نہیں ہوتی۔ تم "چی" اور پن یل گلینڈ تک محدود رہو تو تمہارے لیے یہی بہتر ہے کیونکہ تمہیں "دنیاداری" کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ عظیم پہاڑوں کی گپھائیں اور تنگ وتاریک غار تمہارا مسکن نہیں ہیں۔ تم کوئی راہب، کوئی بھکشو، کوئی تارک الدنیا قسم کے شخص نہیں۔ ٹھیٹ روحیت کے معاملات تمہارے لیے نہیں ہیں۔ تمہیں انسانوں کے بیچ، انسانوں کی طرح رہنا ہے اور انسانوں کی مدد کرنا ہے۔ مظلوم کے تحفظ کے لیے ظالم کا ہاتھ توڑنا ہے۔ تم معرکۂ حق وباطل کے لیے مخصوص ہو۔ اس جنگ میں مارشل آرٹس، یوگا اور چی تمہارے ہتھیار ہیں۔ انتہائی ضرورت کے تحت تم تھرڈ آئی کا استعمال بھی کر سکتے ہو۔" ایک لمحے کو متوقف رہنے کے بعد مجھے مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا "وجدان! میں نے تمہاری حدود وقیود کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا ہے۔ یہ میرا فرض تھا جو میں نے پورا کردیا۔ اب تم اپنا فرض پورا کرو گے اور کبھی بھولے سے بھی ان حدود وقیود کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کرو گے۔"

"محترم! میں نے آپ کی ہدایت کو اپنے ذہن میں نقش کرلیا ہے۔" میں نے تعظیم سے بھرپور لہجے میں کہا "میں اپنا فرض پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"اسی میں تمہاری بھلائی اور بہتری پوشیدہ ہے۔" وہ گمبھیر آواز میں بولا "حدود توڑ کر تم سراسر خسارے میں رہو گے۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو تم خود کو آزمائش میں ڈال سکتے ہو!"

"میں ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔" میں نے فرماں برداری سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہ کر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا پھر دوبارہ گویا ہوا "اب کچھ تذکرہ تمہارے اس ہم شکل کا ہوجائے جس نے ادھر پاکستان میں خاصی گڑبڑ مچا رکھی تھی......"

"آپ اس بہروپیے، کم بخت نقلی وجدان کی بات کر رہے ہیں؟" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ میرا یہ سوال بے ساختہ اور اندرونی اضطراب کا مظہر تھا۔

اس نے سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا "ہاں، میں اسی فتنہ پرور کا ذکر کر رہا ہوں۔"

سانگ فو نے "گڑبڑ مچا رکھی تھی۔" ایسے الفاظ استعمال کیے تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ ان الفاظ سے یہی مفہوم برآمد ہوتا تھا کہ اب نقلی وجدان پاکستان میں موجود نہیں تھا۔ میں نے اس سلسلے میں سانگ فو سے استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، وہ اس وقت کہاں ہوگا کیونکہ ہزار کوشش کے بعد بھی میں اس تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا ہوں۔ البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں، اسے پاکستان سے نکال لیا گیا ہے۔"

میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا "اسے پاکستان سے کس نے نکالا ہے؟"

"ربی موشے ہائمن نے۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

"کیا؟" میں سناٹے میں آگیا۔

سانگ فو نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ماؤنٹ مکنلے میں، مجھے اپنے ٹرانس میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے ربی نے اپنے عزائم کا اظہار تو کیا تھا۔ اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد وہ میرے پرتو...نقلی وجدان کو اپنے قابو میں کرلے گا لیکن مجھے امید نہیں تھی، اسے اتنی آسانی سے کامیابی حاصل ہوجائے گی۔ میں سانگ فو کی اطلاع کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ میرے الفاظ سے جھنجلاہٹ جھلکتی تھی۔

"میرے محترم! یہ تو بہت برا ہوا!!"

"اس دنیا میں یا تو اچھا ہوتا ہے اور یا پھر برا ہوتا ہے...... بلکہ زیادہ تر برا ہی ہوتا ہے۔" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا "اس میں بے چاری دنیا کا کوئی قصور نہیں کیونکہ اس دنیا میں اکثر لوگ برے ہوتے ہیں۔"

سانگ فو ایک تلخ حقیقت بیان کر رہا تھا لہٰذا اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے متذبذب انداز میں کہا "نقلی وجدان اگر ربی کے ہاتھ کا کھلونا بن گیا تو بڑی افراتفری پھیلے گی۔ میں ربی موشے ہائمن کی ذہنیت اور عزائم کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ وہ سب سے پہلے اسے میرے خلاف استعمال کرے گا۔"

"کیا تم نقلی وجدان سے ڈرتے ہو؟" سانگ فو نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے دانت کچکچائے "نقلی وجدان...... مائی فٹ!"

"میں تم سے یہی سننا چاہتا تھا" وہ مشفقانہ انداز میں میرے عزائم کو سراہتے ہوئے بولا "ربی موشے ہائمن بلاشبہ ایک عامل کامل اور عالم فاضل شخص ہے۔ وہ تمہارے پرتو سے کوئی حیرت انگیز کام ہی لے گا...... لینے دو۔" وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا "ربی تو تم پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔ تم قابو میں نہیں آئے تو نقلی وجدان ہی سہی۔"

سانگ فو نے آخری الفاظ اس انداز میں ادا کیے تھے جیسے کہہ رہا ہو...... تو نہ سہی، تیری تصویر ہی سہی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ہماری وہ طویل مگر نہایت ہی اہمیت کی حامل ملاقات اختتام پذیر ہوگئی۔ اس ملاقات نے میری عملی زندگی کے خطوط متعین کردیے تھے۔

سانگ فو اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے اس کی تقلید کی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے نرم لہجے میں بولا "آؤ میں تمہیں دوسرے اہم لوگوں سے ملواتا ہوں۔"

میں گردن جھکا کر اس کے پیچھے ہولیا۔

☆☆☆

یونائیٹڈ ائرلائنز کے طیارے نے ٹھیک ساڑھے نو بجے "لاگارڈیا" ائرپورٹ کے رن وے کو چھولیا۔ سیٹل اور نیویارک کے درمیان لگ بھگ چھ گھنٹے کی فلائٹ ہے جب کہ مقامی وقت کا تفاوت تین گھنٹے ہے۔ لاگارڈیا ائرپورٹ آؤٹ بورڈ "کوئینز" میں واقع ہے۔ ڈومیسٹک فلائٹس کا زیادہ لوڈ اسی ائرپورٹ پر ہے جب کہ جے ایف کینیڈی انٹرنیشنل ائرپورٹ زیادہ تر بین الاقوامی پروازوں کی وجہ سے مصروف رہتا ہے تاہم بعض نیشنل فلائٹس بھی اس ائرپورٹ سے ڈیل ہوتی ہے۔

ائرپورٹ سے باہر آکر ہم نے ایک چمچماتی میڈیلین کیب لے لی۔ اپنے وطن کی طرح نیویارک میں ٹیکسی ڈرائیور کو اپنی منزل تک لے جانے کے لیے اس کی خوشامد درآمد نہیں کرنا پڑتی۔ رکوع کے بل جھک کر اس سے یہ نہیں پوچھنا پڑتا کہ بھائی فلاں جگہ جاؤ گے؟...... اور نہ ہی وہ رعونت بھرے انداز میں کہتا ہے، نہیں میں تو کہیں اور جا رہا ہوں۔ اگر ٹیکسی خالی ہے تو اس کا مطلب ہے، اسے جانا ہے...... اور جہاں آپ چاہتے ہیں، وہیں جانا ہے۔ آپ ٹیکسی کا دروازہ کھولیں اور بے دھڑک اندر بیٹھ جائیں۔ کرایے کے لین دین پر بھی کوئی جھگڑا ٹنٹا نہیں۔ مختلف جمع تفریق کے حساب کتاب سے گزرنے کے بعد اوسطاً تین ڈالر فی میل کرایہ پڑتا ہے۔ ہر میل کا پہلا چوتھائی فاصلہ ڈیڑھ ڈالر میں، باقی ہر چوتھائی میل پچاس سینٹ میں۔ اگر اپنی مرضی سے، کچھ وقت کے لیے کہیں ٹیکسی رکوانا چاہیں تو پچیس سینٹ فی منٹ الگ چارج ہوگا۔ انگلینڈ کی بہ نسبت امریکا میں ٹیکسی خاصی سستی پڑتی ہے۔

ہم یلو میڈیلین کیب کی عقبی نشست پر بیٹھ چکے تو مراکیل نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا "مین ہیٹن ڈاؤن ٹاؤن...... بیتھم اسکوائر!"

سیاہ فام ٹیکسی ڈرائیور نے استفسار کیا "بیتھم اسکوائر...... چائنا ٹاؤن؟"

''یس، چائنا ٹاؤن۔''

''آسٹوریا سے نکالوں؟''

''نکالو مگر مین ہیٹن میں داخل نہیں ہونا۔'' راکیل نے کہا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے گردن گھما کر عقب میں دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا ''آپ لوگ مین ہیٹن نہیں جا رہے؟''

''جا رہے ہیں لیکن ہمیں چائنا ٹاؤن پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں۔'' راکیل نے بے پروائی سے کہا ''اس لیے مین ہیٹن میں آپ ٹاؤن سے گھسنے کی ضرورت نہیں۔ تم سیدھا سیدھا ''ٹوسیونٹی ایٹ'' پکڑو اور نیویارک سٹی کے درمیان سے گزر کر مین ہیٹن برج پر پہنچو اور برج کراس کرکے چائنا ٹاؤن میں داخل ہو جاؤ۔''

''اس طرح کرایہ اور فاصلہ ڈیڑھ گنا ہو جائے گا!'' ٹیکسی ڈرائیور نے سیاہ چہرے پر موجود سفید آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''جانتی ہوں۔'' وہ مخصوص امریکی انداز میں بولی۔

سیاہ فام ٹیکسی ڈرائیور نے کندھے اچکائے اور سیدھا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے ہمارے اور ڈرائیور کے درمیان پارٹیشن گلاس حائل ہو گیا۔ ڈرائیور نے ڈیش بورڈ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرکے ہمیں پرائی ویسی فراہم کر دی تھی۔ اب ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو ڈرائیور کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہمیں کوئی بے وقوف یا فضول خرچ جوڑا سمجھا تھا جو خواہ مخواہ پچاس فی صد زیادہ کرایہ دینے پر تلا بیٹھا ہو!

یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ ہماری باتیں ڈرائیور تک نہیں پہنچیں گی' میں نے راکیل سے پوچھا ''تمہارا یہ فیصلہ ڈرائیور کی سمجھ میں نہیں آیا۔''

''نہ آئے'' اس نے کندھے جھٹکے اور بولی ''دراصل میں اپ ٹاؤن سے مین ہیٹن میں داخل نہیں ہونا چاہتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول اپ ٹاؤن مین ہیٹن میں اسٹریٹ ون ٹوسکسٹی ون سے ون تھرٹی فائیو تک ''ہارلم'' کا علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ متعصب کالوں کا علاقہ ہے۔ رات تو رات دن میں بھی سوچ سمجھ کر ادھر کا رخ کرنا چاہیے اور ٹیکسی کے ذریعے تو بالکل نہیں جانا چاہیے۔ میں بعد میں ''ہارلم ٹریجڈی'' کے بارے میں تفصیلاً بتاؤں گی۔ دوسری وجہ ''ٹریفک جیم'' ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکی پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اگر ہم آسٹوریا سے مین ہیٹن کی طرف جائیں تو ہمیں ''ٹرائی بورد برج'' سے گزر کر اپ ٹاؤن ناتھ' اسٹریٹ ون ٹوئنٹی فائیو ایسٹ پر آنا ہو گا۔ پھر تھرڈ ایونیو پکڑنا ہو گی۔ اس ایونیو پر سفر کرتے ہوئے ہمیں آدھے اپ ٹاؤن اور پورے مڈ ٹاؤن سے گزرنا ہو گا۔ پھر اسٹریٹ فورٹین ایسٹ سے ہم ڈاؤن ٹاؤن میں داخل ہو جائیں گے اور کوپر اسکوائر سے ''باوری'' اسٹریٹ پکڑ کر سیدھے کیتھم اسکوائر (چائنا ٹاؤن) پہنچ جائیں گے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مین ہیٹن کی ایک سے لے کر بارہ ایونیوز تک بے حد مصروف ہیں اور ٹریفک جوں کے مانند رینگتا ہے' خاص طور پر مڈ ٹاؤن مین ہیٹن میں کسی بھی ایونیو پر ڈرائیونگ کے لیے نہایت ہی مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب کہ......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر تھوڑی دیر کو متوقف ہوئی پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''جب کہ نیویارک سٹی کے اندر سے گزرنے والی ''ٹوسیونٹی ایٹ'' ایک ایکسپریس ہائی وے ہے جو ''بروکلین۔ کوئینز ایکسپریس ہائی وے'' کہلاتی ہے۔ اس پر ڈرائیونگ ظاہر ہے' زیادہ اعصاب شکن اور تکلیف دہ نہیں۔ ہم مین ہیٹن برج پر اس ہائی وے کو چھوڑ دیں گے اور پل عبور کرکے چائنا ٹاؤن میں داخل ہو جائیں گے۔''

میں بڑی توجہ سے راکیل کی فراہم کردہ معلومات کو ذہن نشین کرتا رہا۔ اس نے مجھے آسٹوریا کے بارے میں بھی مختصراً بتایا۔ آسٹوریا میں غالب آبادی یونانی افراد کی ہے۔ کسی زمانے میں جب ابھی ہالی ووڈ فلم انڈسٹری قائم نہیں ہوئی تھی تو آسٹوریا ہی میں فلم اسٹوڈیوز ہوا کرتے تھے ''آسٹوریا اسٹوڈیوز'' اپنے وقت کا بڑا مشہور اسٹوڈیو رہا ہے۔ روڈولف ویلنٹینو اور گلوریا سوانسن نے اپنے فلمی کیئریر کا آغاز آسٹوریا ہی سے کیا تھا۔

میں نے راکیل سے پوچھا ''ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''کم از کم چالیس منٹ۔'' اس نے جواب دیا ''اس وقت میں دس منٹ تک کا اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔''

''او کے! پھر میں تھوڑی سی نیند لے لیتا ہوں۔'' میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ''جب ہم چائنا ٹاؤن میں داخل ہوں تو مجھے جگا دینا۔''

میں دراصل اس دوران میں اپنی تھرڈ آئی سے ساحل کو جھانکنا چاہتا تھا۔ راکیل میری اس تاکا جھانکی کی حقیقت سے بڑی حد تک آگاہ ہو چکی تھی' معنی خیز لہجے میں بولی ''کیا تم واقعی نیند لینے جا رہے ہو؟''

''کیا تمہیں کوئی شک ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''نہیں' نہیں۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بڑی چالاکی سے بولی' پھر بات بدل کر کہنے لگی ''کیا عظیم الشان مین ہیٹن برج سے گزرتے ہوئے تم ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ نہیں کرو گے۔ ایسٹ ریور کو اس پل کی مدد سے عبور کرنا بڑا ہیجان خیز ہوتا ہے۔''

''او کے!'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا ''جب ہم ایکسپریس ہائی وے کو چھوڑ کر برج میں داخل ہونے لگیں تو تم مجھے بیدار کر دینا۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ راکیل نے اس موقع پر بڑی عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور میرے ''کام'' میں کسی قسم کی مداخلت کی کوشش نہیں کی۔ میں راکیل کی بات سے ایک سو ایک فی صد متفق ہوں کہ مین ہیٹن برج اور بروکلین برج سے ڈاؤن ٹاؤن کا نظارہ واقعی قابلِ دید اور ناقابلِ فراموش ہے۔ یہ دونوں برج ایسٹ ریور پر واقع ہیں جو بروکلین کو ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن سے ملاتے ہیں۔ بعد میں کئی مرتبہ مجھے اس حسین نظارے کا تجربہ ہوا۔

آنکھیں بند کرتے ہی میں اپنے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔ گزشتہ روز سانگ فو سے میری بڑی اہم اور تفصیلی میٹنگ ہوئی تھی جس کے نتیجے میں' میں راکیل کے ساتھ اس وقت نیویارک میں موجود تھا۔ ساحل کی تلاش کے سلسلے میں' راکیل سانگ فو کی نمائندگی کر رہی تھی۔ راکیل ساحل اور میرے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی حتیٰ کہ بڑی حد تک اسے میری ''چی'' اور ''تیسری آنکھ'' والی صلاحیت کی بھی خبر ہو گئی تھی۔ میرا مشن اس کے ذہن میں روزِ روشن کی طرح واضح تھا۔ وہ اب تک ایک قابلِ اعتماد دوست کا کردار ادا کرتی آئی تھی لہٰذا اس پر بھروسا کرنے میں کسی قسم کی کوئی قباحت نہیں تھی۔

سیئٹل میں سانگ فو نے مجھے اپنے اس بندے سے بھی ملوا دیا تھا جو ہر قسم کے میک اپ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ خاص طور پر ماسک میک اپ میں اسے بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اس نے مجھے نہایت ہی مفید ٹپس بھی دیں۔ اس کا نام چاؤ یان تھا۔ سانگ فو کے مطابق ایک آدھ دن میں ہی یوآن ماؤ (ڈاکٹر موہنگ) کی حیثیت سے وہ اینکریج (الاسکا) روانہ ہونے والا تھا۔

سانگ فو کی بزرگانہ ہدایت کے مطابق مجھے اور راکیل کو چائنا ٹاؤن (مین ہیٹن) میں پہنچنا تھا۔ اس نے ہمیں ''ونگ ہنگ'' نامی ایک شخص کا ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا' وہ ہمارے نیویارک پہنچنے سے پہلے ونگ ہنگ کو فون بھی کر دے گا۔ ونگ ہنگ کو ہمارے مشن سے آگاہ نہیں کیا جاتا تاہم سانگ فو کے مطابق ونگ ہنگ مین ہیٹن میں ہم سے ہر قسم کا تعاون کرنے کا پابند ہوتا۔ وہ سانگ فو کا گہرا عقیدت مند تھا اور بدھ مت سے تعلق رکھتا تھا۔ چائنا ٹاؤن میں اس کی فوٹوگرافی کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔ میں اور راکیل' گارشیا اور ڈسلوا کی حیثیت سے جا کر اس سے ملتے۔ ہم ایک طرح سے اس کے مہمان تھے جو سیئٹل سے آئے تھے...... اور اس وقت ہم سیدھے کیتھم اسکوائر (چائنا ٹاؤن) ونگ ہنگ کے پاس ہی جا رہے تھے۔

میں گہری سنجیدگی سے ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرے لیے سب سے بڑا اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ سانگ فو نے بڑی شرافت سے ساحل کو مجھے سونپ دیا تھا اور اس کی دل گرفتہ باتوں سے یہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا...... وہ چند گھڑیوں' چند دن یا چند ہفتوں کا مہمان تھا! سانگ فو کو سب اپنا بڑا مانتے تھے جب اس نے ساحل کو میرے حوالے کر دیا تھا تو دوسرے کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اب یہ مجھ پر منحصر تھا کہ میں کتنی جلدی ساحل تک پہنچ جاتا ہوں!

آخری مرتبہ میں نے جب ساحل کی طرف جھانکا تھا تو وہ حالتِ نیند میں تھی۔ اس وقت میں سانگ فو کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھا۔ میں نے ساحل کو اسی بیڈ روم میں پایا تھا جہاں وہ ربی موشے ہائمن کی قید میں تھی۔ اس کے بعد میں نے ساحل کی خبر نہیں لی تھی۔

میں نے اپنے تصور میں ساحل کے خال و خط کو ابھارا اور اگلے ہی لمحے میری باطنی آنکھ نے مجھے اس کے ماحول میں پہنچا دیا۔ میں نے اسے ایک بیڈ پر چت لیٹے ہوئے پایا۔ وہ یقینی طور پر اس وقت جاگ رہی تھی لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ بیڈ روم نہیں تھا جہاں میں نے اسے ایک چرمی کاؤچ پر حالتِ نیند میں دیکھا تھا۔ اس بیڈ روم کا ماحول اس بیڈ روم سے قطعی مختلف تھا۔ ممکن ہے یہ اسی بلڈنگ کا کوئی دوسرا بیڈ روم ہو یا یہ بھی ہو سکتا تھا' ساحل اس وقت کسی دوسری جگہ پر ہو!

آخر الذکر خیال نے اندرونی طور پر مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور بے ساختہ میرے دل سے یہ صدا بلند ہوئی۔ نہیں، اب ساحل کو کسی نئی جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ میں اس کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنا ساحل ضرور حاصل کرکے رہوں گا۔ ربی کو میرے سامنے گھٹنے ٹیکنا ہی ہوں گے!

اس عزم نے میرے اندر ایک نئی توانائی بھر دی اور میں

نے اپنی تمام تر توجہ ساحل پر مرکوز کردی۔ وہ اس وقت جاگ رہی تھی' مکمل ہوش وحواس میں تھی۔ میں نے وقفے وقفے سے اس کی پلکوں کو جھپکتے ہوئے محسوس کیا۔ میں جانتا تھا اور سانگ فو نے اس جاننے کی تصدیق بھی کی تھی کہ میری آواز کہیں اور' اور کہیں اور کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی۔ مجھے صرف تصور کے وڈیو سیکشن سے کام لینا ہوگا' آڈیو سیکشن میری رسائی میں نہیں آسکتا لیکن ساحل کو ایک بیڈ پر دراز دیکھ کر میرا دل مچل گیا۔ میں نے بے اختیار ہوکر بہ زبان خاموشی اسے پکارا۔ اس عمل کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ میری پکار اس تک نہ پہنچ سکی۔ وہاں کی بھی کوئی آواز میری ظاہرہ یا باطنی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرپارہی تھی۔ جھنجلا کر میں نے کوشش ترک کردی اور بیڈروم کے ماحول کی جزئیات کو اپنے ذہن میں نقش کرنے لگا۔

اس بیڈروم میں ساحل بالکل اکیلی تھی۔ میں نے کمرے کے سائز' وہاں موجود تمام اشیاء دروازے کے رنگ اور ڈیزائن' پردوں کے رنگ' کپڑے اور تراش خراش کے علاوہ فرش پر بچھے ہوئے دبیز قالین کو بھی ذہن نشین کرلیا۔ اسی طرح الیکٹرک لائٹس کی تفصیل بھی میری نظر سے پوشیدہ نہیں رہی تھیں۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں انتظار کرنے لگا کہ کوئی اس کمرے میں داخل ہو' تاکہ میں اس کا "ماحول" پکڑ کر بیڈروم سے باہر "نکل" سکوں۔ ساحل کے از خود بیڈروم سے باہر قدم رکھنے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ وہ عورت مجھے نظر آجائے گی جس کا پیچھا پکڑ کر میں وال اسٹریٹ تک چلا آیا تھا۔ میری لمحاتی تصوراتی غفلت سے وہ ایشیائی عورت میری دسترس میں نہیں رہی تھی۔

دس منٹ کے مسلسل انتظار کے بعد بھی جب میری امید پوری ہونے کے آثار واضح نہ ہوئے تو ایک بے نام سی اکتاہٹ نے میرے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسی اکتاہٹ میں ایک چونکا دینے والا خیال میری سوچ میں نمودار ہوا۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں تصور کی نگاہ سے اس ایشیائی عورت کے ماحول میں اترنے کی کوشش کروں؟

یہ ایک اچھوتا خیال تھا۔ مذکورہ عورت کے خدوخال میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ میں نے اس کی بادامی آنکھوں' چوڑی پیشانی' بیضوی چہرے' گلابی ہونٹوں اور ستواں ناک کا تصور کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اسے کسی آفس میں پایا۔ وہ ایک کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی بڑی توجہ سے کسی کام میں مصروف تھی۔ میں نے مانیٹر کے اسکرین "پر نگاہ" ڈالی۔ وہاں نظر آنے والی تحریر سے مجھے اندازہ ہوا' وہ اسٹاک ایکسچینج سے متعلق کوئی فائل کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب تھا' وہ اس وقت اپنے دفتری کام میں مصروف تھی۔ میں پانچ چھے منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ وہ اپنی سیٹ چھوڑے اور مجھے بھی اس کے ساتھ موو کرنے کا موقع ملے لیکن میرا انتظار رنگ نہ لاسکا۔ اس کے انہماک کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا' ابھی گھنٹوں اس کے اٹھنے کا کوئی امکان نہیں۔

نیویارک کے وقت کے مطابق اس لمحے ساڑھے دس بجے تھے۔ میں نے زونارا آئی لینڈ کے ہٹ سے جب ساحل کو ناشتا کرتے ہوئے دیکھا تھا تو اس وقت نیویارک میں لگ بھگ نو بجے تھے۔ کم وبیش نو پچیس پر وہ ایشیائی عورت مختلف راہ داریوں سے گزرنے کے بعد وال اسٹریٹ پر نکل آئی تھی اور جب میں نے اسے "کھویا" تو صبح کے ساڑھے نو بجے تھے۔ اس حساب کتاب کو اگر ذہن میں مناسب جگہ دی جائے تو پھر یہ نتیجہ سامنے آتا تھا کہ وہ ایشیائی خوبصورت عورت' ساحل کو ناشتا کروانے کے بعد کسی دفتر میں آکر بیٹھتی تھی اور اسٹاک ایکسچینج سے متعلق کوئی ضروری کام کرتی تھی مگر کس آفس میں اور کہاں؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کا فی الحال میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا!

جب مزید پانچ منٹ تک بھی مذکورہ عورت کے' اپنی سیٹ سے اٹھنے کا کوئی امکان نظر نہ آیا تو میں اس کے آفس کے ماحول کو ذہن میں بسا کر وہاں سے چلا آیا۔

میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے تازہ ترین صورت حالات پر غور کرنے لگا۔ آنکھیں کھولنے کا مطلب تھا' راکیل کی بولتی کا ڈھکن اٹھا دینا اور فی الحال اس موڈ میں نہیں تھا۔ اسی سوچ بچار میں میرے ذہن میں خیال آیا کہ ایک مرتبہ پھر ربی کو ٹرائی کروں۔

میں نے ربی موشے ہائمن کے نقش ونگار اور تاثر انگیز شخصیت کو اپنے تصور میں تازہ کیا اور اس کے ماحول میں اترنے کے لیے اپنی تھرڈ آئی کو زحمت دی لیکن تاریکی کی ایک موٹی دیوار نے میری تصوراتی بصارت کا راستہ بلاک کردیا۔ میں ربی کے ماحول تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ دو تین مرتبہ کی سعی کے بعد جھنجلا کر میں نے یہ کوشش ترک کردی۔ ربی نے خود تک پہنچنے والے ہر راستے کو اپنے کسی پُراسرار علم یا عمل سے بند کررکھا تھا۔ اس ناکام ... کوشش سے ایک نہایت ہی اہم نکتہ میرے ہاتھ آگیا۔ میں بڑی سنجیدگی سے اس نکتے پر غور کرنے لگا۔

میں براہِ راست ربی کو نشانہ بنا کر اس کے ماحول میں

نہیں جھانک سکوں گا۔ ہاں البتہ وہ جس ماحول میں موجود ہو وہاں کے کسی اور کردار کے ذریعے میں اس ماحول تک رسائی حاصل کرسکتا ہوں جیسا کہ ساحل والے معاملے میں ہوا تھا۔ جب وہ چرمی کاؤچ پر دراز تھی تو میں ربی کا تعاقب کرتے ہوئے بیڈروم کے دروازے تک چلا گیا تھا۔ اب مجھے کسی بھی طرح اس ماحول تک رسائی حاصل کرنا تھی جہاں ربی موشے ہائمن موجود ہو۔ اس طرح میں ربی کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا اور یہ جاننا نہایت ہی دشوار کام تھا کہ ربی کس وقت' کس ماحول میں کن لوگوں کے ساتھ موجود ہوگا اور آیا ان لوگوں میں سے میں کسی کا صورت آشنا بھی ہوں گا یا نہیں! یہ موقع سوائے اتفاق کے میرے ہاتھ نہیں آسکتا تھا۔

یہ سچ ہے جاننا بہت بڑا عذاب ہے اور قبل از وقت کی جان کاری ایک عظیم عذاب! جو انسان جتنا زیادہ باخبر ہوتا ہے وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اتنی ہی زیادہ اذیت سے گزرتا ہے۔ صلاحیت چاہے جسمانی ہو یا ذہنی یا پھر روحانی ہو' اپنے استعمال کے جواب میں وہ ہم سے بھی "تقاضا" کرتی ہے۔ وہ ایک مخصوص "خراج" حاصل کیے بغیر جان نہیں چھوڑتی۔

اس سسٹم میں جس کا ہم حصہ ہیں' ادائی کے بغیر کچھ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ادائی البتہ پری پیڈ بھی ہوسکتی ہے اور پوسٹ پیڈ بھی۔ بالکل کریڈٹ اور ڈیبٹ کارڈ کی طرح۔ یہ سسٹم "اس ہاتھ لو' اس ہاتھ دو۔" کے تحت دو اور دو چار کی طرح کام کرتا ہے۔ جو لوگ واقعی باصلاحیت ہیں اور سسٹم کے "طریقۂ واردات" کو جانتے ہیں وہ شب وروز اس تجربے سے گزرتے رہتے ہیں۔ غور وفکر کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جب سے میں نے تیسری آنکھ کا استعمال شروع کیا تھا' مذکورہ تجربے سے گزر رہا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر کے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور اپنے تصور کے گھوڑے کو تھرڈ آئی کے چابک سے ساحل کی جانب دوڑایا۔ وہ اسی بیڈ پر موجود تھی لیکن اب اس کی آنکھیں بند تھیں اور سینے کا زیرو بم بتاتا تھا' وہ حالتِ نیند میں داخل ہوچکی تھی۔ یہ سونے کا وقت تو نہیں تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا اسے زیادہ تر بے ہوش یا نیند کی حالت میں رکھنے کے لیے کوئی مخصوص دوا دی جارہی تھی۔ یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا' ربی نے تنویمی عمل کے ذریعے اس کی نیند کو اپنی مرضی کے مطابق سیٹ کردیا ہو!

میں نے آنکھیں کھول دیں اور ٹیکسی میں حاضر ہوگیا۔

اسی وقت راکیل پر میری نگاہ پڑی۔ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملی تو اس نے استفسار کیا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں تمہیں جگانے ہی والی ہوں؟"

"بس اندازے ہی سے میں نے آنکھیں کھول دیں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری نیند پوری ہوگئی!" وہ شرارت بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی۔

میں نے سرزنش آمیز نظر سے اسے دیکھا لیکن خاموش رہا۔

وہ خاموش نہ رہ سکی اور پوچھ بیٹھی "کوئی کامیابی ہوئی؟"

میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا اور ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

میرے انکار کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں دانستہ اس سے کچھ چھپا رہا ہوں۔ وہ میری صلاحیتوں اور سرگرمیوں سے آگاہ ہوچکی تھی۔ میں اس وقت تک خود بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا' راکیل کو کیا بتاتا۔ تھوڑی دیر بعد میڈیلین کیب نے ایکسپریس ہائی وے کو چھوڑ دیا اور ایک نیم بیضوی دائرے میں سفر کرتے ہوئے سیدھی فلیٹ بش ایونیو میں داخل ہوگئی۔ فلیٹ بش ایونیو مین ہیٹن برج کے اوپر سے گزر کر سیدھی چائنا ٹاؤن میں داخل ہوجاتی ہے۔ برج کے اختتام پر یہ ایونیو' کینال اسٹریٹ اور کریسٹک اسٹریٹ میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

وہ جنوری کا آخری ہفتہ تھا اور درجۂ حرارت صفر کے آس پاس چل رہا تھا۔ فضا میں اچھی خاصی دھند بھی موجود تھی۔ نیویارک کو امریکا کی سردترین ریاستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ انتہائی شمال میں کینیڈا سے جڑی بیٹھی ہے۔ موسم سرما میں یہاں کا درجۂ حرارت بعض اوقات منفی دس درجہ سنٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔ دھندلی فضا کے سبب مین ہیٹن ڈاؤن ٹاؤن بھی دھندلا دھندلا نظر آرہا تھا۔ اس نظارے میں ایک عجیب سے سحر کا تاثر تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مین ہیٹن برج پر سے گزر کر ہم خوابوں کے کسی جزیرے میں داخل ہورہے ہیں۔

نیویارک' خصوصاً مین ہیٹن خوابوں کا ایک جزیرہ ہی ہے۔ موسیقار اور شاعر لوگ بھی بڑے کمال کے ہوتے ہیں۔ معاشرے کی بڑی گہری عکاسی کرتے ہیں۔ جس طرح ہر تصویر کے دو رخ ہوتے ہیں' اچھا اور برا۔ ڈراک اینڈ لائٹ۔ بالکل اسی طرح نیویارک کے بھی دو رخ ہیں۔ انتہائی خوبصورت اور دل کش نیویارک......اور گندا غلیظ نیویارک!

کسی زمانے میں جیز (JAZZ) موسیقاروں نے نیویارک کی چکاچوند اور دل کشی کے پیشِ نظر اسے بگ ایپل (BIG APPLE) کا خطاب دیا تھا۔ بعد میں اس خطے کے تاریک پہلو دکھانے کے لیے "ہوبوز گروپ" نے اس ریاست کو بگ

بن (BIG ONION) قرار دیا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ
یارک کی بعض گلیوں میں موجود کچرے کے متعفن انباروں
کے قریب سے گزریں تو آنکھوں میں ویسے ہی پانی اتر آتا ہے
جیسے پیاز کو کاٹتے وقت! مرحوم اشفاق احمد نے اس جزیرے کے
ایک پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔

راکیل نے مجھے بتایا کہ ہر سال لگ بھگ پینتیس ملین
افراد نیویارک یاترا کو آتے ہیں۔ ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز و
محور خوابوں کا جزیرہ ''مین ہیٹن'' ہی ہوتا ہے۔ مین ہیٹن کو
بڑے طریقے سلیقے سے آباد کیا گیا ہے۔ جنوب اور شمال کے
درمیان بہنے والی تمام سڑکیں ایونیوز ہیں جب کہ جزیرے
کے مشرق کو مغرب سے ملانے والی چھوٹی سڑکیں اسٹریٹس
کہلاتی ہیں۔ مین ہیٹن میں ففتھ ایونیو کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ
جزیرے کے قلب سے گزر کر اسے مشرقی اور مغربی میں تقسیم
کر دیتی ہے۔ ہر ایسٹ اسٹریٹ جب ففتھ ایونیو کو کراس کرتی
ہے تو وہ ویسٹ اسٹریٹ میں بدل جاتی ہے مگر اس کا نمبر تبدیل
نہیں ہوتا۔ مین ہیٹن میں شرقاً غرباً ایک سو اکانوے اسٹریٹس
ہیں۔ ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن ایک سے تیرہ اسٹریٹس تک
ہے۔ اسٹریٹ چودہ سے انسٹھ تک مڈ ٹاؤن مین ہیٹن ہے اور
اسٹریٹ ساٹھ سے ایک سو اکانوے تک اپ ٹاؤن مین ہیٹن
کہلاتا ہے۔ متعصب اور نسل پرست کالوں کا خطرناک
علاقہ ''ہارلم'' اپ ٹاؤن میں ہی واقع ہے۔

ہم بذریعہ ییلو میڈ یلین، مین ہیٹن برج کو عبور کر کے
چائنا ٹاؤن میں داخل ہو گئے۔ ییلو میڈ یلین کیب کو نیویارک
کی لائسنس یافتہ ٹیکسی ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور اس کا
اترانا لائسنس یافتہ پونی (PONY) سے کہیں زیادہ ہے۔
پونی ایک مخصوص شناخت ہے جو لائسنس یافتہ ''پرانچپولس
آف نیویارک'' کی پہچان ہے۔

کیب نے کینال اسٹریٹ پر تھوڑا فاصلہ طے کیا اور
بائیں جانب باوری اسٹریٹ پر مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم کیتھم
اسکوائر میں تھے۔ ڈرائیور نے گلاس پارٹیشن کو ہٹایا اور ہم سے
استفسار کیا۔

''کیتھم اسکوائر میں کہاں روکوں؟''

اس دوران میں راکیل مسلسل باہر دیکھ رہی تھی۔ اس نے
ایک سمت ڈرائیور کی توجہ مبذول کرائی اور فیصلہ کن لہجے میں
کہا ''اس بینک کے سامنے روک دو۔''

ٹیکسی مذکورہ بینک سے تھوڑے فاصلے پر سڑک کے
کنارے رک گئی۔ کرایہ صرف اکتیس ڈالر بنا تھا۔ راکیل نے
ڈرائیور کو پینتیس ڈالر ادا کیے اور ''کیپ دی چینج'' کہتے ہوئے
ٹیکسی سے اتر گئی۔ اگر ہم دوسرے راستے سے مین ہیٹن میں
داخل ہوتے تو کم و بیش بیس ڈالر کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ راکیل نے
چار ڈالر ڈرائیور کو ٹپ کی مد میں دے دیے تھے۔ بعد میں مجھے
معلوم ہوا، قانوناً کسی ٹیکسی والے کو پندرہ فی صد سے زیادہ ٹپ
نہیں دی جا سکتی۔ اکتیس پر چار کا تناسب تقریباً اتنا ہی بنتا تھا۔

امریکا میں کرنسی نوٹ کا استعمال بہت کم اور نچلی سطح پر
ہوتا ہے۔ بیس ڈالر سے نیچے نیچے۔ اس سے اوپر عموماً کیش
ڈیلنگ نہیں ہوتی بلکہ ادائی خالصتاً کریڈٹ کارڈز کے ذریعے
کی جاتی ہے۔ کیش کے معاملات صرف بینک تک محدود ہیں۔
اوپن مارکیٹ، ہوٹلوں، دکانوں وغیرہ میں کیش قبول نہیں
کیا جاتا۔ امریکی کرنسی ایک، دو، پانچ، دس، بیس، پچاس اور
سو ڈالر کے نوٹوں پر مشتمل ہے پانچ سو، ایک ہزار، پانچ ہزار، دس
ہزار اور سو ہزار کے نوٹ عام نہیں ہیں۔ یہ تمام بڑے نوٹ
فیڈرل ریزرو سسٹم اور ٹریژری ڈیپارٹمنٹ کی ڈیلنگ کے لیے
ہیں۔ سب سے زیادہ اہمیت بیس ڈالر کے نوٹ کو حاصل ہے
آج کل امریکا میں جو حالات ہیں ان کے پیشِ نظر اس سال
کے وسط تک فیڈرل ریزرو بینک پانچ سو ڈالر کا نوٹ عام
کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ امریکی عوام کی طرف سے حکومتی
سطح پر کی جانے والی اس ''حرکت'' پر شدید احتجاج کی توقع
ہے۔ سننے میں یہ بھی آ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں بینک
دولت پاکستان بھی بیس، پانچ ہزار اور دس ہزار کے کرنسی نوٹ
کے اجرا کی تیاریوں میں ہے۔ امید نہیں کہ پاکستانی عوام اس
کا کوئی سنجیدہ نوٹس لے...... کیونکہ یہ ایک بے بس عوام
ہے، امریکی عوام کی طرح طاقتور اور حقوق یافتہ نہیں...... اور یہ
بہت ہی افسوس ناک بات ہے!

ٹیکسی چھوڑنے کے ٹھیک ایک منٹ بعد ہم ''ونگ ہنگ
فوٹو آرٹ'' میں داخل ہو رہے تھے۔ ونگ ہنگ کا یہ شان دار
فوٹو اسٹوڈیو کیتھم اسکوائر میں ''مین ہیٹن سیونگ بینک'' کے
نزدیک ہی واقع ہے۔ بینک کی عمارت کسی چائنیز ٹیمپل سے
مشابہ ہے۔ قریب ہی تھوڑے فاصلے پر عظیم چینی فلسفی کے نام
پر تعمیر کی جانے والی عمارت ''کنفیوشس پلازا'' ایستادہ ہے۔

ونگ ہنگ نے ہمارا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ چالیس
سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ میانہ قد اور جسم مائل بہ فربہی۔
آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ سانگ فو نے اسے ہماری آمد کی اطلاع
دے دی تھی اور اس کے رویے سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ
ہمارے لیے سراپا تعاون ہے۔ ہمارے درمیان رسمی گفتگو
ہو چکی تو اس نے پوچھ ہی لیا۔

''فوری طور پر میں آپ لوگوں کے لیے کیا کروں؟''

ونگ ہنگ انگلش کے علاوہ مینڈرن بھی روانی سے بولتا تھا تاہم اس وقت ہمارے درمیان ..بات چیت انگریزی ہی میں ہو رہی تھی۔ سانگ فو نے ہمارا تعارف اپنے خاص آدمیوں کی حیثیت سے کرایا تھا اس لیے بھی ونگ ہنگ بچھا جا رہا تھا۔ اسے ہمارے مشن کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ہم چند دن مین ہیٹن میں گزار کر واپس چلے جائیں گے اور اس دوران میں اسے ہماری ضروریات کا خیال رکھنا ہوگا۔ میری طرح راکیل بھی اس سے پہلی مرتبہ مل رہی تھی۔ البتہ سانگ فو نے اسے ہمارے ماسک میک اپ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ہماری شخصیت کی تبدیلی نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس وقت ہم کسی خاص ٹاسک پر تھے۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''مسٹر ہنگ! اگر آپ چائنا ٹاؤن کے کسی متوسط ہوٹل میں ہمارے لیے قیام کا بندوبست کردو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔ فی الحال ہماری ضرورت یہی ہے۔ باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔''

وہ مسکرایا اور بولا'' چائنا ٹاؤن میں ہوٹلز برائے نام ہی ہیں اور یہاں کا ماحول بھی آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ غیر چینی افراد کے لیے بڑے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''اگر تم لوگ محسوس نہ کرو تو میرا فلیٹ حاضر ہے۔ وہ فلیٹ کی طرز پر بنا ہوا ایک خالص گھر ہے جہاں میں اکیلا رہتا ہوں یا میرا گھریلو ملازم ہوتا ہے۔ میں آپ لوگوں کو ایک کمرا دے سکتا ہوں۔''

یہ اچھا آئیڈیا تھا۔ کسی ہوٹل کی بہ نسبت ایک مقامی شخص کا گھر ہمارے لیے زیادہ موزوں اور محفوظ تھا۔ میں نے اس کے مشورے سے فوراً اتفاق کرلیا اور پوچھا''مسٹر ہنگ! تمہارا وہ فلیٹ یہاں سے کتنا دور ہے؟''

''کچھ بھی دور نہیں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور بتانے لگا'' یہ اسٹوڈیو کیتھم اسکوائر میں ہے اور فلیٹ ادھر موٹ اسٹریٹ پر بدھ عبادت گاہ کے نزدیک۔ میں ابھی جا کر تمہیں دکھا دیتا ہوں۔''

آئندہ دس منٹ میں میرے اور راکیل کے درمیان طے ہوگیا کہ ہم ونگ ہنگ کے فلیٹ پر ہی قیام کریں گے۔ میں نے واضح الفاظ میں اس سے کہا۔

''مسٹر ہنگ! ہم عموماً رات گزارنے ہی تمہارے فلیٹ پر آئیں گے۔ دن کا سارا وقت ہم باہر ہی گزاریں گے۔''

''ٹھیک ہے' میں فلیٹ کی ایک چابی تمہیں دے دیتا ہوں۔'' اس نے اپنی میز کی دراز کھولتے ہوئے کہا'' ویسے تو میرا ملازم گھر ہی میں رہتا ہے۔ بہرحال احتیاطاً چابی رکھ لو اور میرے ساتھ چل کر فلیٹ بھی دیکھ لو۔''

''ہمیں ایک گاڑی بھی چاہیے۔ کیا رینٹل کار کمپنی......''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا'' میرے پاس دو گاڑیاں ہیں۔ ایک تم استعمال میں لے آؤ۔ میں شیوی تمہیں دے سکتا ہوں۔ ماڈل چند سال پرانا ہے لیکن نئی گاڑیوں سے زیادہ کارکردگی کی حامل ہے۔''

''او کے' ڈن!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا'' ہمیں تمہاری شیوی (شیورلٹ) قبول ہے۔''

اس کے بعد ونگ ہنگ ہمیں اپنے ساتھ گھر دکھانے لے گیا۔ اس کے فلیٹ کا راستہ بہت ہی آسان تھا۔ ہم کیتھم اسکوائر سے واپس باوری اسٹریٹ پر آئے اور کینال اسٹریٹ سے پہلے ہی بائیں جانب بیارڈ اسٹریٹ پر مڑ گئے۔ بیارڈ اسٹریٹ آگے جا کر موٹ اسٹریٹ سے جا ملی۔ ہم نے دائیں جانب ٹرن لیا اور سیدھے بدھ عبادت گاہ کے سامنے پہنچ گئے۔ پھر ہمیں ہنگ کے گھر تک پہنچنے کے لیے بہ مشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔

☆☆☆

دوپہر کا وقت تھا۔ فضا میں' رگوں میں خون منجمد کردینے والی ٹھنڈک رچی بسی تھی۔ صبح سے اب تک سورج نے ایک مرتبہ بھی نیویارک کے باسیوں کو آنکھ دکھانا گوارا نہیں کیا تھا' پورے مکھڑے کی جلوہ نمائی تو بہت دور کی بات تھی۔ تاہم اس شدید موسم کے باوجود بھی نیویارک میں کاروبارِ زندگی اپنے معمول پر تھا۔

میں اس وقت راکیل کے ساتھ فورٹی فائیو ڈویژن اسٹریٹ پر ''کینٹن'' میں بیٹھا تھا۔ کینٹن (CANTON) اپنی سی فوڈ ڈشز کے حوالے سے بہت معروف ہے جو مین ہیٹن برج کے نزدیک ہی' چائنا ٹاؤن میں واقع ہے۔ ناشتا ہم نے طیارے ہی میں کرلیا تھا۔ مجھے کوئی خاص بھوک نہیں تھی لیکن بھوک کے معاملے میں راکیل بڑی بے صبری اور کچی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے پیٹ پوجا کیے بغیر آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ میں پہلی فرصت میں وال اسٹریٹ پہنچنا چاہتا تھا مگر راکیل کی کمزوری کا خیال کرتے ہوئے اس ریسٹورنٹ میں چلا آیا تھا۔

کھانے کے بعد ہم نے کریڈٹ کارڈ سے ادائی کی اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ گارشیا اور ڈسلوا کا تعلق میکسیکو سے تھا۔ وہ امریکن نیشنل تھے اور اسی حیثیت سے ''ان دونوں'' کے پاس مختلف کریڈٹ کارڈز بھی تھے...... یعنی ہمارے پاس ڈائنرز کلب' ویزا اور ماسٹر کارڈز تھے۔ کریڈٹ کارڈز کے باوا آدم' ''ماسٹر کارڈ'' کو امریکا والے ''ایکسیس'' کا نام دیتے ہیں۔ ماسٹر کارڈ یعنی ایکسیس (ACCESS) کو سب سے زیادہ خوش دلی سے قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈائنرز کلب (DINERS CLUB) کو بھی ''عزت'' کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ونگ ہنگ نے اپنی گاڑی کے بارے میں بالکل درست کہا تھا۔ شیوی کے انجن میں بے پناہ طاقت تھی اور رفتار میں اضافے کے ساتھ ہی وہ گویا سڑک پر بچھتی چلی جاتی تھی۔ پورے امریکا میں ٹریفک لیفٹ ہینڈ ڈرائیو کے اصول پر رواں دواں ہے اور سگنلائزیشن ایسے مربوط انداز میں کی گئی ہے کہ آنے جانے والوں اور دائیں بائیں مڑنے والوں کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بس ٹریفک قوانین سے آپ کو واقف ہونا ضروری ہے۔

ہم نے ریسٹورنٹ سے نکل کر ڈویژن اسٹریٹ پکڑی اور کیتھم اسکوائر پہنچ گئے۔ ظاہر ہے' گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس وقت راکیل ہی براجمان تھی۔ میں تو ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن کو سمجھنے اور ذہن نشین کرنے میں مصروف تھا۔ کیتھم اسکوائر سے راکیل نے شیوی کو پارک رو پر ڈال دیا۔ کچھ دیر بعد ہم سٹی ہال کے قریب سے گزر رہے تھے۔ بروکلین برج بھی مین ہیٹن آنے والوں کو سٹی ہال (سوک سینٹر) ہی پہنچاتا ہے۔ سٹی ہال اور کرمنل کورٹ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ''ہماری'' شیوی بڑی آن بان کے ساتھ ''براڈوے'' میں داخل ہوگئی۔ ہم نے تھوڑی دیر بعد براڈوے کو خیرباد کہا اور وال اسٹریٹ پر مڑ گئے۔

اس وقت میرے دل کی دھڑکن میں قدرے اضافہ ہوگیا تھا۔ یہ وہی اسٹریٹ تھی جہاں کہیں فٹ پاتھ ''برونز بل'' اِستادہ تھا۔ اس کے آس پاس ہی کہیں وہ عمارت موجود تھی جہاں میری ساحل کو رکھا گیا تھا۔ میں اضطراری انداز میں وال اسٹریٹ کو اور اس کی عمارتوں کو دیکھنے لگا۔

وال اسٹریٹ پر کھڑی بلڈنگز' مین ہیٹن... اسکریپرز کے مقابلے میں کم بلند ہیں تاہم انہیں فلک بوس کہا جا سکتا ہے۔ ڈبل لین ٹریفک جاری وساری تھا۔ وال اسٹریٹ کے عین وسط میں ایک کشادہ فٹ پاتھ موجود تھی۔ فٹ پاتھ کے ٹائلز کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ میں نے ''برونز بل آف وال اسٹریٹ'' کو جس فٹ پاتھ پر اِستادہ دیکھا تھا' اس کے ٹائلز بھی ایسے ہی تھے۔ میرے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

میں نے ہیجان خیز انداز میں راکیل سے کہا'' گاڑی کی رفتار کم کردو۔''

''کیوں کچھ نظر آ گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نظر نہیں آیا...... مگر آنے ہی والا ہے۔'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا'' تم یہ وسطی فٹ پاتھ دیکھ رہی ہونا' کانسی کا وہ سانڈ اسی راستے پر کھڑا تھا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی'' جانتی ہوں۔ ہم برونز بل کے نزدیک پہنچنے ہی والے ہیں۔ وہ سامنے دیکھو۔''

میں نے راکیل کے اشارے کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو مجھے وہ برونز بل نظر آ گیا۔ میں نے جلدی سے کہا'' راکیل! تم وہاں پہنچ کر گاڑی روک دینا۔ میں اس سانڈ اور اس کے گردونواح کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

مجھے امید تھی' اگر میں نے اس سانڈ کے گردونواح پر نگاہ دوڑائی تو وہ بلڈنگ میری نظر میں آ جائے گی جہاں سے میں نے اس خوبصورت ایشیائی عورت کو برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ مذکورہ بلڈنگ کسی ہیولے کے مانند میری یادداشت میں لہرا رہی تھی۔

راکیل نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا'' میں برونز بل سے تھوڑا آگے جا کر شیوی کو روک لوں گی۔ تم گاڑی سے اتر کر برونز بل کی طرف آ جانا۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے پاس آ جاؤں گی۔ اس طرح ہماری سرگرمی کسی کی نظر میں نہیں آئے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا'' اگرچہ اس وقت ہم بدلے ہوئے حلیوں میں ہیں لیکن احتیاط برتنا بری بات نہیں۔''

ہم بپھرے ہوئے سانڈ کے مجسمے سے آگے گزر گئے تو راکیل نے سڑک کے کنارے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ میں نے پسنجرز سائیڈ کا دروازہ کھولا اور پیدل چلتے ہوئے مذکورہ فٹ پاتھ پر آ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد میں سانڈ کے مجسمے کے قریب پہنچ گیا۔ ازیں قبل میں نے اسے اپنی تیسری آنکھ کی مدد سے دیکھا تھا۔ اس نظارے اور اس نظارے میں رتی بھر فرق نہیں تھا۔ بلکہ تصور والا منظر زیادہ واضح تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ باطنی آنکھ ظاہرہ دو آنکھوں سے زیادہ صاف دکھاتی ہے۔

میں برونز بل کے نزدیک یوں کھڑا ہوگیا جیسے مجھے کسی کا انتظار ہو۔ وہ ایشیائی عورت بھی کچھ اسی انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس دوران میں' میں اردگرد کی عمارتوں کو بھی بہ غور دیکھ رہا تھا وہاں قدیم اور جدید دونوں طرح کی عمارتیں اِستادہ تھیں

گاڑی کے اندر بیٹھنے کے بعد میں نے راکیل سے کہا ''میں چند منٹ کے لیے غروب ہورہا ہوں۔تم خاموش رہنا۔اٹ از ویری امپارٹنٹ۔''

''اوہ!'' وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی ''یہاں غروب ہوکر کہاں طلوع ہونے کا ارادہ ہے؟''

''ساحل کی اٹینڈنٹ کے آفس میں'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

مذکورہ عورت کے نقش و نگار میری یادداشت میں محفوظ تھے۔میں نے اپنی تیسری آنکھ کے سامنے اس کا سراپا روشن کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے دفتر میں تھا۔ میں نے اسے کلوزنگ کی پوزیشن میں دیکھا۔میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کمپیوٹر آف کیا پھر تمام اسیسریز کو کور سے ڈھانپ دیا۔صبح کی طرح اس وقت بھی وہ اس آفس میں اکیلی ہی تھی۔اس کا آفس ایک چھوٹے سے چیمبر پر مشتمل تھا۔

دفتری اشیا کو سمیٹنے کے بعد اس نے اپنے لباس کا جائزہ لیا پھر پرس سے بے بی مرر نکال کر فیس ٹچنگ کرنے لگی۔میک اپ کے نام پر اس نے صرف لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔میرے خیال میں یہ بھی ایک تکلف ہی تھا ورنہ اسے کسی لپ اسٹک کی ضرورت نہیں تھی۔گوری چٹی رنگت پر زندگی سے معمور اور رعنائی سے بھرپور گلابی ہونٹ کسی کاسمیٹک زیور کے محتاج نہیں تھے۔

بناؤ سنگار عورت کا بنیادی حق ہے۔اس کو ''ضرورت'' کے خانے میں بند نہیں کیا جاسکتا۔دنیا کی حسین ترین عورت کو بھی بننے سنورنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا کسی میک اپ کی محتاج عورت کو!

وہ اپنے اس ازلی ابدی حق کو استعمال کرکے فارغ ہوئی تو اس کی حرکات و سکنات نے مجھے بتادیا کہ وہ اپنے دفتر سے نکلنے والی تھی۔دفتر سے نکلنے کے دو ہی مطالب تھے۔یا تو وہ ساحل کو اٹینڈ کرنے جارہی تھی یا پھر اس عمارت سے باہر آنے والی تھی۔میں نے اپنے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس کی پھر میں نے تیسری آنکھ کو پورے انہماک سے اس پر مرکوز کردیا۔

اس نے پرس اٹھایا اور اپنے آفس سے نکل آئی۔میں کسی ماہر جاسوس کی طرح اس کے تعاقب میں لگ گیا مگر اس وقت جیمس بانڈ ڈبل او سیون مجھے دیکھ لیتا اور اس کی سمجھ میں آجاتا کہ میں کیا کررہا ہوں تو وہ میری کارکردگی پر اش اش کر اٹھتا! میں اس کی دھرتی پر اس کا باپ بننے کی کوشش کررہا تھا۔وہ ہانپتا کانپتا سیدھا اپنے مصنف این فلیمنگ کے پاس پہنچتا اور اس سے میرے لیے کوئی قلم لکھوانے کی درخواست کرتا۔

میرا ٹارگٹ مختلف راہ داریوں سے گھوم پھر کر جب عمارت کے زیریں حصے میں پہنچا تو میں نے سانس روک لی۔کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ایشیائی عورت اس عمارت سے باہر قدم رکھنے والی تھی۔پھر جیسے ہی وہ عمارت کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھی' میں نے آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھولتے ہی میں نے بے ساختہ ا... کا دروازہ کھولا اور شیوی سے باہر آگیا۔اپنے عقب میں' میں نے راکیل کو کہتے ہوئے سنا ''یہ بیٹھے بٹھائے اٹھ کر کہاں چل دیے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور پیلے پتھروں والی بیس منزلہ عمارت کے مین گیٹ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تیزی سے ادھر بڑھنے لگا۔اگر میری نظر ایک لمحے کو بھی چوک جاتی تو میں ایک بار پھر اس عورت کو کھودیتا۔حالات و واقعات یہی بتاتے تھے' وہ اس عمارت سے باہر آنے والی ہے۔

لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔میں مذکورہ عمارت کے سامنے فٹ پاتھ پر موجود رہا۔اس دوران میں راکیل نے بھی مجھے جوائن کرلیا تھا۔یہ اس مضطرب انتظار میں دس منٹ گزر گئے تو مجھے سخت مایوسی ہوئی۔راکیل کے استفسار پر میں نے اسے صورتِ حالات سے آگاہ کیا تو اس نے کہا۔

''کیا ضروری ہے کہ وہ اسی عمارت سے باہر آنے والی ہو!''

''میرا تصور مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔'' میں نے مستحکم انداز میں کہا۔

راکیل ایک لمحے تک گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر گمبھیر آواز سے بولی ''وجدان! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اس عمارت کو نیچے سے اوپر تک وزٹ کیا ہے۔ہم اگرچہ ایک ایک کمرے میں نہیں جھانک سکے لیکن تم نے مختلف فلورز کی لابیز اور کوری ڈورز کو تو توجہ سے دیکھا ہے۔کیا اس ایشین عورت کے ماحول میں بھی یہی سب کچھ موجود تھا؟''

راکیل نے بڑا ہی کانٹے کا سوال کیا تھا۔میں جوش جذبات میں اس طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔اب جو غور کیا اور ذہن کے یادداشتی خانے کو کھنگالا تو مجھے اس اور اس ماحول میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی۔میں نے اس عورت کو ابھی ا... تصور کی نگاہ سے جن راستوں سے گزرتے دیکھا تھا وہ ... بلڈنگ سے میچ نہیں کرتے تھے جس کے سامنے اس وقت ہم

...ے تھے۔اس کا واضح مطلب یہی تھا' وہ عورت اس ...ں میں تھی اور نہ ہی یہاں سے نکلی تھی۔

میں نے چونک کر راکیل کی طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا ...اسٹریٹ کی کسی اور بلڈنگ میں بھی اسٹاک ایکسچینج سے ...ق کام ہوتا ہے؟''

''تم یہ سوال کیوں کررہے ہو؟''

''میں نے اس عورت کو کمپیوٹر پر اسٹاک ایکسچینج سے متعلق ...فائل کھولے دیکھا تھا۔'' میں نے بتایا۔

...راکیل نے بتایا ''وال اسٹریٹ کی اکثر عمارتوں میں اسی ...ت کے دھندے ہوتے ہیں مگر اس کام کا مرکز ''نیویارک ...ل ایکس چینج'' ہے۔''

''یہ یہاں سے کتنا دور ہے؟'' میں نے جلدی سے سوال ...

''وال اسٹریٹ ہے ہی کتنی طویل کہ کچھ دور ہو۔'' وہ ...ے اچکاتے ہوئے بولی ''جب ہم براڈوے کو چھوڑ کر ...اسٹریٹ میں داخل ہوئے تھے تو دائیں جانب جو دوسری ...ب واقع ہے وہ براڈ اسٹریٹ کہلاتی ہے۔براڈ اسٹریٹ ...وال اسٹریٹ سے بننے والے کونے پر جو بلڈنگ کھڑی ...وہی نیویارک اسٹاک ایکس چینج ہے۔ایڈریس کے ...ب سے یہ ٹوئنٹی براڈ اسٹریٹ کہلائے گی۔کیا تم اس طرف ...نے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔

وہ بولی ''ادھر دیکھو' وہ سامنے ہی تو ہے نیویارک اسٹاک ...ج'' اس نے ایک جانب اشارہ بھی کردیا ''چلو پیدل ہی ...یں۔''

''پیدل نہیں'' میں نے گاڑی کی طرف قدم بڑھاتے ...ے قطعی لہجے میں کہا ''اس عورت کو کسی بھی عمارت سے نکلے ...ے کم از کم دس منٹ ہوگئے ہیں۔اس وقت وہ اپنی گاڑی ...کی روڈ پر ہوگی یا پھر کسی اور عمارت میں۔ہم شیوی میں ...ر اس کا تعاقب کریں گے۔''

...اس گفتگو کے دوران ہی میں ہم شیوی کے قریب آگئے۔ ...ل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد مجھ سے ...ا ''کس طرف چلوں؟''

...اس کے سوال کرنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں نے ...سا کا تعین کرلیا ہو۔میں نے کہا ''فی الحال کسی سمت بھی چل ...یں اس عورت کی درست لوکیشن معلوم کرکے تمہیں بتاتا ...''

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کرلیں۔راکیل کی بڑبڑاہٹ سے مشابہ آواز مجھ تک پہنچی ''میں براڈوے ہی کی طرف نکلتی ہوں۔''

میں اس کے بیان پر توجہ نہیں دی اور رخشِ تصور کو خوب رو ایشیائی عورت کے تعاقب میں دوڑا دیا۔اگلے ہی لمحے میری باطنی آنکھ نے مجھے اس کے ماحول میں پہنچا دیا۔وہ ایک شاندار گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھی۔اس کا یہی مطلب تھا' وہ ابھی تک اپنی منزل تک نہیں پہنچی تھی۔میں نے چند لمحات تک اس کے ماحول کو سمجھا پھر آنکھیں بند رکھتے ہوئے راکیل سے کہا۔

''وہ اس وقت سرخ کیڈلک میں موجود ہے۔''

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔مجھے خدشہ تھا' کہیں بولنے سے میرا تصور کرچی کرچی نہ ہوجائے۔میں نے ڈرتے ڈرتے راکیل سے بات کی تھی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا اور سرخ کیڈلک کے اندر اس حسین عورت کے ساتھ موجود رہا۔میرے لیے یہ تجربہ نہایت ہی خوش آئند تھا۔گویا میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے کسی بھی مقام کی منظر کشی اور وہاں پیش آنے والے واقعات پر رواں تبصرہ کرسکتا تھا۔میں نے اپنے تن بدن میں مسرت سے بھرپور ایک لہر سی دوڑتی محسوس کی۔اسی لمحے راکیل کی ہیجان آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وجدان! یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو' وہ اس وقت کہاں سے گزر رہی ہے تاکہ میں اس کے قریب پہنچ سکوں۔ابھی تو تاحدِ نگاہ کوئی سرخ کیڈی (کیڈلک) دکھائی نہیں دے رہی۔''

میں پوری طرح اس عورت کی گاڑی میں جم کر ''بیٹھ'' گیا۔کیڈی کے اندر رہتے ہوئے میں نے ونڈ اسکرین کے پار نگاہ دوڑائی اور ایک عمارت کو دیکھ کر چونک گیا۔وال اسٹریٹ کی طرف آتے ہوئے ہم اس عمارت کے قریب سے گزرے تھے لیکن اس وقت مجھے مذکورہ عمارت کا دوسرا رخ نظر آرہا تھا۔

''راکیل!'' میں نے بہ دستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے راکیل کو مخاطب کیا اور بتایا ''سرخ کیڈی اس وقت سٹی ہال کے پاس ہے مگر یہ وہ رخ نہیں جدھر سے ہم آئے تھے۔''

''اوہ!'' راکیل نے ایک طویل سانس خارج کی اور شیوی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے بولی ''اس کا مطلب ہے وہ ابھی براڈوے پر ہی ہے...... مگر ہم سے آگے۔''

میں نے اپنا کام جاری رکھا اور تھوڑی دیر بعد راکیل کو بتایا ''اس کے دائیں ہاتھ مین ہیٹن پلازا ہے اور...... اور اب

پھر میری نگاہ پیلے پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت پر ٹک گئی۔ میری یادداشت نے گواہی دی کہ ساحل کی اٹینڈنٹ وہ ایشیائی عورت اسی عمارت سے نکلی تھی۔ مذکورہ عمارت کے زیریں حصے میں بلند و بالا محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ بالائی حصہ ویسا ہی تھا جیسے دوسری عمارتوں کا ہوتا ہے۔ میری نگاہ نے شمار کیا تو مجھے اندازہ ہوا' وہ پیلی عمارت تین منزلہ تھی۔ اس اندازے میں ایک آدھ منزل کی کمی بیشی ممکن تھی۔ میں نے مذکورہ عمارت کے مین گیٹ پر نظر جمادی۔

اس عمارت میں مسلسل لوگوں کی آمد و شد جاری تھی جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہاں مختلف قسم کے دفاتر ہوں گے۔ ویسے تو پورا فنانشل ڈسٹرکٹ ہی دفاتر کا مجموعہ ہے لیکن وال اسٹریٹ خاص طور پر اس نوعیت کے لیے مشہور ہے۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر میں الجھ گیا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا کہ ساحل کی دیکھ بھال کرنے والی عورت اسی عمارت سے نکلی تھی۔ اگر یہ عمارت خالصتاً کاروباری مقاصد کی حامل تھی تو پھر وہ بیڈروم کیا حیثیت رکھتا تھا جہاں میں نے ساحل کو ربی موشے ہائمن کی قید میں دیکھا تھا؟

میں انہی خیالات کی جمع تفریق میں غرق تھا کہ راکیل میرے قریب آگئی۔ پھر سرسری انداز میں بولی "کیا تم اپنی مطلوبہ عمارت کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئے؟"

جواب میں' میں نے پیلے پتھروں سے تعمیر شدہ عمارت کی جانب اشارہ کردیا۔

راکیل نے متذبذب انداز میں میری طرف دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی "یہ کیسے ہوسکتا ہے وجدان!" اس کا انداز سرگوشیانہ تھا "اس عمارت میں کسی کی رہائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں جانتی ہوں' یہاں شیئرز کا کاروبار ہوتا ہے۔ تم شناخت میں کہیں غلطی تو نہیں کر رہے؟"

راکیل نے شیئرز کا حوالہ دیا تو میرے ذہن میں اسٹاک ایکسچینج کی وہ فائل گھوم گئی جو میں نے ایشیائی عورت کے سامنے رکھے کمپیوٹر کے مانیٹر پر دیکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا' وہ عورت اسی عمارت کے کسی کمرے میں چھپی بیٹھی تھی۔ ایک مرتبہ میں اس تک پہنچ جاتا تو پھر ساحل کا سراغ لگانا مشکل نہ رہتا۔

راکیل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا "میں ہرگز کوئی غلطی نہیں کر رہا۔ ساحل کو اسی عمارت کی کسی بیڈروم میں رکھا گیا ہے۔"

"بیڈروم!" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا' تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

میں نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا "کیا ہم اس عمارت کے اندر جاسکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے اور کہا "ابھی وزیٹرز آورز ختم نہیں ہوئے۔ ہم اس بلڈنگ کی سیر کرسکتے ہیں۔"

پھر آئندہ پانچ منٹ میں ہم دونوں اس عمارت کے اندر تھے۔ میں نے پورے ایک گھنٹے تک نیچے سے اوپر اس عمارت کو جھانک ڈالا اور عمارت کے کسی بھی حصے میں ایسے آثار نظر میں نہ آسکے کہ وہاں کوئی بیڈروم بھی ہوگا...... اور ایسا ڈائننگ بھی ہوگا جہاں میں نے ساحل کو ناشتا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اول آخر وہ پوری عمارت کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہورہی تھی۔ اس میں نیچے سے اوپر تک مختلف کمپنیوں کے دفاتر کھلے ہوئے تھے۔ اس صورتِ حالات نے مجھے چکرا کر رکھ دیا اور میرا ذہن لامحالہ ربی موشے ہائمن کی کسی عیاری کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس عمارت کے ایک ایک کمرے کے اندر جھانکنا ممکن نہیں تھا لہٰذا مایوس ہوکر ہم عمارت سے باہر نکل آئے۔ میں ایک مرتبہ پھر بروزنبل کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور تازہ ترین حالات کا جائزہ لینے لگا۔ اگر ساحل کو اسی عمارت میں رکھا گیا تھا تو پھر یہ راز ربی موشے ہائمن اور اس کے چند قابلِ اعتماد افراد تک ہی محدود ہوگا...... اور اس رہائشی حصے کو بھی نہایت خفیہ رکھا گیا ہوگا۔ یہاں کام کرنے والے ہزاروں افراد کو ساحل کی اقامت گاہ کی بھنک بھی نہیں ہوگی۔ وہ نائن ٹو فائیو کے چکر میں روزانہ یہاں آتے جاتے ہوں گے۔

اسی سوچ بچار کے دوران میں ایک مرتبہ پھر اس دل کش ایشیائی عورت کا چہرہ میرے خیال میں روشن ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور میں نے بے اختیار راکیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "چلو!"

"کہاں؟" وہ میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے متذبذب لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "شیوی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ضروری کام کے بارے میں استفسار نہیں کیا اور میرے ساتھ چلتی رہی۔ ہم نے "بروزنبل آف وال اسٹریٹ" کو عقب میں چھوڑا اور ٹائلز والے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اپنی گاڑی کے پاس پہنچ گئے۔

مجھے اسی سمت میں فیڈرل آفس بلڈنگ اور کسٹمز کورٹ دکھائی دے رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اس نے براڈوے کو بڑی مستقل مزاجی سے پکڑ رکھا ہے۔" راکیل نے کہا "وجدان! تم تو آنکھیں بند رکھتے ہوئے بھی بہت کچھ دیکھ رہے ہو لیکن میں کھلی آنکھوں سے ابھی تک سرخ کیڈی کو نہیں دیکھ سکی ہوں۔"

میں نے راکیل کو کوئی جواب دینے کے بجائے اپنا مشاہدہ جاری رکھا "اب ہماری یعنی اس عورت کی بائیں جانب مجھے فرینکلن پلازا نظر آ رہا ہے۔ وہ اس پلازا کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہی ہے۔"

"کیا تم کیڈی کا نمبر معلوم کر سکتے ہو؟"

"اس کے لیے مجھے کیڈی سے باہر نکلنا ہوگا۔" میں نے کہا "گاڑی کی نمبر پلیٹ کو سامنے سے یا پیچھے سے جھانکنا ہوگا اور...... فی الحال میں کیڈی سے باہر آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"اوہ۔" راکیل ایک بوجھل سانس لے کر رہ گئی۔

میں نے کیڈی کے بدلتے ہوئے تیور دیکھے تو جلدی سے کہا "راکیل! وہ دائیں جانب مڑنے والی ہے اور...... اور اس نے گاڑی کو موڑ لیا......"

راکیل نے کہا "فرینکلن پلازا کے بعد براڈوے کینال اسٹریٹ کو کراس کرتی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ کینال اسٹریٹ میں داخل ہوئی ہے۔"

"کیا یہ وہی کینال اسٹریٹ ہے جو مین ہیٹن برج سے جا ملے گی؟"

"بالکل وہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ چائنا ٹاؤن کی طرف جا رہی ہے۔"

"آثار تو یہی دکھائی دیتے ہیں۔"

"تم رفتار کو اور بڑھاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "ہم اس وقت فرینکلن پلازا کے نزدیک ہی ہیں۔ تم فکر نہ کرو وہ بچ کر نہیں جائے گی۔"

میں آنکھیں بند رکھتے ہوئے اس ایشیائی عورت سے چپکا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے شیوی کو دائیں جانب مڑتے محسوس کیا۔ اس کا یہی مطلب تھا' راکیل نے گاڑی کو کینال اسٹریٹ پر ڈال دیا تھا۔ وہ چائنا ٹاؤن سے گزرتے ہوئے بڑی تیزی سے مین ہیٹن برج کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس دوران میں اس نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اپنے موبائل فون پر کوئی کال بھی ریسیو کی۔ افسوس کہ میں اس کی آواز نہیں سن سکتا تھا ورنہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے کس سے بات کی تھی۔ موبائل پر بات ختم ہوئی تو اس نے موبائل پسنجرز سیٹ پر رکھ دیا۔ اسی لمحے راکیل کی تیز آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"وجدان! کیڈی کے پیچھے ہی جانا ہے یا ... چیز کروں؟"

"بیوی!" میں اچھل پڑا۔

راکیل نے بیوی نہیں' بیوی کہا تھا۔ بیوی بروزن ...

اس کے الفاظ پر میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول ...

اس وقت ہماری گاڑی ایک سگنل پر کھڑی تھی۔ میں نے ... کر راکیل کی طرف دیکھا اور پوچھا "تم کس بیوی کی ... کر رہی ہو؟"

اس نے بائیں سمت ہٹتے ہوئے ٹریفک کی طرف ... کیا اور بولی "ابھی ابھی میں نے اپنے سامنے سے ایک ... میں برنارڈ لیو کو گزرتے دیکھا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میرے لیے یہ بہت بڑا ... تھا "برنارڈ لیو اور یہاں...... تمہیں کوئی مغالطہ تو نہیں ہوا ..."

"لیو اور ربی کے سلسلے میں مجھے کوئی مغالطہ کیسے ... ہے۔" وہ اسٹیئرنگ پر مخروطی انگلیوں سے دستک دیتے ... بولی "میں نے اپنے طویل عرصہ ماؤنٹ مکنلے میں ان ... کے ساتھ گزارا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت باوری ... کینال اسٹریٹ کو کراس کر رہی ہے۔ میں اسی اسٹریٹ ... نیوی بلیو بیوی (بی ایم ڈبلیو) کی عقبی نشست پر برنارڈ ... براجمان دیکھا ہے۔ وہ گاڑی باوری کی طرف جا ... جلدی فیصلہ کرو۔ سگنل کھلنے ہی والا ہے۔"

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے ... سنا دیا "تم نیوی بلیو بی ایم ڈبلیو کا تعاقب کرو۔ میں کیڈی ... کی خبر گیری کر کے آتا ہوں۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ سگنل کھل گیا۔ ... خوب صورت ایشیائی عورت کا تصور کیا اور ایک مرتبہ ... سرخ کیڈی میں پہنچ گیا۔ وہ مین ہیٹن برج کو پیچھے ... کینال اسٹریٹ پر آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ... اسکوائر پر پہنچ کر اس نے کیڈی کو ایسٹ براڈوے ... اور سیوارڈ پارک کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک ... اپارٹمنٹس بلڈنگ میں داخل ہو گئی۔ میں نے یہ جاننے ... کوتاہی نہیں برتی کہ وہ عورت سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس ... تھی۔ میں اس کی پشت سے چپکا رہا اور اپارٹمنٹ نمبر ... تک پہنچ گیا پھر میں اس کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ کے ... ہو گیا۔

تھرٹی فور ایک شاندار لگژری اپارٹمنٹ تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ عورت اس اپارٹمنٹ میں بالکل اکیلی تھی۔ اس نے اپنی اقامت گاہ کے جن جن حصوں میں گردش کی وہ تمام گوشے اور کونے کھدرے میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیے۔ پھر جب اس نے واش روم کا رخ کیا تو میں اس کے ماحول کو "بائے بائے" کہتے ہوئے شیوی میں حاضر ہو گیا۔ اس وقت ہماری گاڑی باوری اسٹریٹ پر سفر جاری رکھتے ہوئے "باوری" میں داخل ہو چکی تھی۔

مجھے آنکھیں کھولتے دیکھا تو راکیل نے اپنے سامنے ساٹھ گز دور اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ نیوی بلیو گاڑی دیکھ رہے ہونا' اس میں ہے لیو۔"

"میں نے تصدیق کی خاطر آنکھیں بند کیں اور لیو کے سراپا کو ذہن میں لاتے ہوئے اسے اپنے ذہن میں اجاگر کرنے کی کوشش کی اور میری یہ کوشش صد فی صد کامیاب ٹھہری۔ اگلے ہی لمحے میں بی ایم ڈبلیو کے اندر تھا۔ برنارڈ لیو گہری سنجیدگی کے ساتھ بیوی کی عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باوردی شوفر کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ لیو جہاں بھی جا رہا تھا' بڑے تزک و احتشام کے ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔

راکیل نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے پوچھا "تسلی ہو گئی؟"

"ہاں۔" میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

اس نے استفسار کیا "کیڈی والی کا کیا بنا؟"

"وہ سیوارڈ اپارک اپارٹمنٹس میں پہنچی ہے اور اس وقت گرم شاور لے رہی ہے۔"

"اوہ! تو تم اس کے واش روم میں بھی گھس گئے؟" وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

"میں صرف واش روم کے دروازے تک اس کے ساتھ رہا پھر لوٹ آیا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "وہ اپارٹمنٹ نمبر تھرٹی فور میں رہتی ہے۔"

"وجدان! میں سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس کے بارے میں جتنا جانتی ہوں اس کے مطابق وہاں نیویارک کے متمول لوگ رہتے ہیں۔ کسی ایرے غیرے کو ادھر گھسنے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

اس نے آنکھیں پھیلائیں "میں سمجھی نہیں!"

میں نے کہا "جب اس حسینہ کا پتا ٹھکانا معلوم ہو گیا ہے تو مجھے وہاں گھسنا بھی ہوگا۔ کیا میں یہ ہمت کر سکتا ہوں۔ تم مجھے بھی کوئی ایرا غیرا تو نہیں سمجھ رہی ہو؟"

وہ میرے لطیف مذاق کی تہ میں پہنچ گئی اور جلدی سے بولی "تمہیں کہیں بھی گھسنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی سے اجازت لینے کی۔ تم تو تھوڑی دیر پہلے بلا اجازت' غیر محسوس طریقے سے اس کے اپارٹمنٹ کو کھنگال آئے ہو۔" وہ ایک لمحے کو رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی "میری مراد وہاں رہائش اختیار کرنے سے تھی۔"

میں نے برجستہ کہا "کون کافر یہاں رکنے آیا ہے!"

لٹل اٹلی اور باوری کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم ایسٹ ولیج میں داخل ہو گئے۔ بیوی اس دوران میں ہم سے آگے لگ بھگ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ہی رہی۔ ہم دونوں تبدیل شدہ حلیوں میں تھے لہٰذا فکر اور پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی۔ برنارڈ لیو بھولے سے بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ جو دو افراد ان کے لیے "موسٹ وانٹیڈ" کی حیثیت رکھتے ہیں' وہ چند گز کے فاصلے پر اس وقت اس کے تعاقب میں آ رہے ہیں۔

میں اس ایشیائی عورت کا کھوج لگا چکا تھا لہٰذا کسی بھی وقت اسے چھاپا جا سکتا تھا۔ اب لیو کی منزل اور نیویارک میں آمد کا مقصد جاننا تھا۔ وہ خواہ مخواہ ہی ماؤنٹ مکنلے کو چھوڑ کر مین ہیٹن تو نہیں آیا ہوگا اور جب کہ...... اس کا گرو ربی موشے ہائمن بھی یہیں موجود تھا۔ میں ربی کی کسی گہری سازش کے بارے میں سوچتے ہوئے ہائی الرٹ ہو گیا۔ عین ممکن تھا' لیو ربی ہی کے پاس جا رہا ہو!

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں راکیل سے کہا "نیوی بلیو بی ایم ڈبلیو کو نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔ میں محسوس کر رہا ہوں' ہم ربی کے قریب پہنچنے والے ہیں۔"

"اگر ایسا ہو گیا تو یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہوگی۔" وہ پرعزم لہجے میں بولی "ویسے میرے خیال میں اوجھل اور ظاہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ہو نا!"

اس نے بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھا اور دوبارہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بولی "میں نے سرخ کیڈی اور اس میں موجود ایشیائی عورت کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا اور تم یہاں میرے پہلو میں رہتے ہوئے اس کے واش روم تک ہو آئے ہو! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

بات ختم کرتے کرتے اس کا انداز بہت شوخ اور چھیڑ

چھاڑ والا ہو گیا تھا میں نے کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور ونڈ اسکرین کے پار نیوی بلیو بیوی کو دیکھتا رہا۔

شیوی ایسٹ ولیج سے گزری اور باوری اسٹریٹ پر رہتے ہوئے ایسٹ فورٹین اسٹریٹ میں داخل ہو گئی۔ پھر یونین اسکوائر سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ چودھویں اسٹریٹ میں آنے کا مطلب تھا' ہم ڈاؤن ٹاؤن سے مڈ ٹاؤن مین ہیٹن میں داخل ہو گئے تھے۔ اسٹریٹ چودہ سے انسٹھ تک مڈ ٹاؤن کا علاقہ تھا۔ مین ہیٹن کا سب سے زیادہ چکا چوند علاقہ!

اس دوران میں میرے اور راکیل کے بیچ موجودہ حالات پر انتہائی سنجیدہ گفتگو بھی جاری تھی۔ ہم برنارڈ لیو کی گاڑی کا تعاقب کرتے ہوئے ایسٹ فورٹین اسٹریٹ کو چھوڑ کر ففتھ ایونیو میں داخل ہو گئے۔ اب ہم مین ہیٹن کے قلب سے گزر رہے تھے۔

کچھ دیر تک جنوب سے شمال کی جانب ہمارا یہ سفر جاری رہا۔ ہم نے تئیس ویں اسٹریٹ پر براڈوے کو کراس کیا پھر میڈیسن اسکوائر پارک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے چونتیس ویں اسٹریٹ کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ان دونوں سڑکوں کے ملاپ سے جو کارنر بنتا ہے وہیں پر مشہور و معروف ''ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ'' ایستادہ ہے۔

کسی زمانے میں اسی جگہ ''والڈورف آسٹوریا ہوٹل'' ہوا کرتا تھا۔ پھر اکتوبر انیس سو انتیس عیسوی میں اس ہوٹل کو ختم کر دیا گیا اور دو سال سے بھی کم مدت میں اسی مقام پر ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کھڑی کر دی گئی۔ اس زمانے میں اس بلڈنگ کی تعمیر پر ڈھائی کروڑ ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ ایک سو دو منزلہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے اوپر دو سو تین فٹ اونچائی دی انٹینا نصب ہے۔

ہم اس عظیم الشان بلڈنگ کے قریب سے گزرے پھر نیویارک پبلک لائبریری' راک فیلر سینٹر' سینٹ پیٹرک کیتھیڈرل اور جی۔ ایم کارپوریشن سے گزرتے ہوئے سینٹرل پارک پہنچ گئے۔ سینٹرل پارک کے آغاز سے اپ ٹاؤن مین ہیٹن شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پارک اسٹریٹ ساٹھ سے لے کر اسٹریٹ ایک سو دس تک جنوباً شمالاً پھیلا ہوا ہے۔

اس تعاقب سے اب مجھے کوفت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں برنارڈ لیو کہاں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے بیزاری سے یہی سوال جب راکیل کے سامنے رکھا تو وہ پُراسرار لہجے میں بولی۔

''وجدان! میرا خیال ہے' بیوی کی منزل آ گئی۔ دیکھو اس کی رفتار بہ تدریج کم ہو رہی ہے۔''

اس وقت ہم اسٹریٹ اکسٹھ سے باسٹھ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میں نے غور کیا تو راکیل کے اندازے کو بالکل درست پایا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے برنارڈ لیو والی گاڑی اسٹریٹ باسٹھ کے کارنر پر رک گئی۔ اسی وقت راکیل نے سنسنی خیز سرگوشی کی۔

''اوہ! یہ تو سائنا گاگ ہے۔''

راکیل کا اشارہ اس عمارت کی جانب تھا جس کے سامنے نیوی بلیو بی ایم ڈبلیو ٹھہری تھی۔ راکیل کا انکشاف رگوں میں پارا دوڑانے والا تھا۔ برنارڈ لیو کسی سائنا گاگ (اہلِ یہود کی عبادت گاہ) پہنچا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا' وہ کسی ربی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ موشے ہائمن کے مین ہیٹن میں ہوتے ہوئے وہ بھلا کسی اور ربی سے کیوں ملتا! میرے رگ و پے میں بجلیاں سی دوڑ گئیں۔

اس دوران میں راکیل نے بہت عقل مندی کا مظاہرہ کیا اور شیوی کو اسٹریٹ باسٹھ میں موڑنے کے بعد فوراً روکا نہیں بلکہ دو بلاک آگے جا کر میڈیسن ایونیو کے نزدیک سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔ سائنا گاگ تک جانے کے لیے ہمیں اسٹریٹ باسٹھ کو عبور کرنا پڑتا جو اب دو بلاک پیچھے ہمارے عقب میں تھا۔

راکیل نے گمبھیر لہجے میں کہا' ''ہم دونوں کا سائنا گاگ کے اندر داخل ہونا تو فی الحال ممکن نہیں اور وہ بھی کسی پلاننگ کے بغیر۔ تم ہی ذرا اندر جھانک کر حالات کا جائزہ لو۔ پھر سوچتے ہیں' کیا کیا جا سکتا ہے!''

راکیل کو ابھی تک یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ربی کے سلسلے میں میری یہ صلاحیت فی الحال کسی کام کی نہیں۔ میں نے ماؤنٹ مکلنے میں ربی کے تنویمی عمل کے جواب میں اسے جس طرح بیوقوف بنایا تھا اس بارے میں راکیل کو سب معلوم تھا۔ میں نے ربی والا نکتہ اس پر واضح کیا اور کہا۔

''ٹھہرو میں برنارڈ لیو کو چیک کرتا ہوں۔''

اس بار میں نے ایک نیا تجربہ کیا۔ آنکھیں بند کیے بغیر میں نے تیسری آنکھ کو زحمت دینا چاہی لیکن مجھے اس میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ تین چار مرتبہ کی ناکامیاب کوشش کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ظاہرہ آنکھوں کو بند کیے بغیر باطنی آنکھ سے کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس نتیجے کے بعد میں ایک اور تجربے کا خواہاں تھا جو سرِ دست ممکن نہیں تھا۔ میں گپ اندھیرے میں بیٹھ کر جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا ہو' آنکھیں کھلی رکھ کر تھرڈ آئی کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ فی الحال ایسی گہری تاریکی مجھے میسر نہیں تھی لہٰذا میں نے

آنکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کے توسط سے برنارڈلیو کے ماحول میں جھانکنے لگا...... اور اسی لمحے میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔

برنارڈلیو اپنے گرو ربی موشے ہائمن کے ساتھ ایک کمرے میں موجود تھا۔ وہ دونوں ایک چرمی کاؤچ کے پاس گمبھیر صورتیں بنائے کھڑے تھے۔ چرمی کاؤچ پر کوئی چت پڑا تھا۔ اس کا گردن سے نیچے کا بدن ایک سفید شیٹ سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چت لیٹے ہوئے انسان کے چہرے کی جانب نگاہ گھمائی تو مجھے حیرت کا ایک اور زبردست جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسا میرے خون میں انڈیل دیا ہو!

میں ان لمحات میں واثق توقع کر رہا تھا کہ میری تصوراتی نگاہ ساحل کے چہرے کو بوسہ دے گی لیکن میری نظر اپنے ہی چہرے سے ٹکرا کر رستہ بھول بیٹھی تھی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور بے اختیار بڑبڑایا۔

''وجدان ...... اور یہاں! ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیا ہوا وجدان؟'' راکیل نے فکرمندی سے میری جانب دیکھا ''تم کس وجدان کا ذکر کر رہے ہو!''

''نقلی وجدان ــــ میرا ڈپلیکیٹ ......'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

وہ بڑی حیرت سے آنکھیں کھول کر مجھے تکنے لگی۔

ہار پر لاج ہوٹل میں' میں نے جب صدف کو فون کیا تھا تو راکیل بھی اس وقت پر بستر پر میرے ساتھ موجود تھی۔ اس روز تک نقلی وجدان کراچی ہی میں تھا۔ یہ چار پانچ دن پہلے کی بات تھی۔ اس شیطان کی مین ہیٹن میں موجودی ظاہر کرتی تھی' پچھلے چار روز ہی میں اسے پاکستان سے امریکا پہنچایا گیا تھا۔ ربی موشے ہائمن بہت بااثر شخصیت تھا۔ وہائٹ ہاؤس کے علاوہ امریکی سی آئی اے اور ایف بی آئی والے بھی اس کے اشاروں کو پہلی اہمیت دیتے تھے۔ مجھے اور ساحل کو سی آئی اے کے ایجنٹ جانسن پلیڈر نے ایک چارٹرڈ طیارے میں کراچی سے اینکریج پہنچایا تھا۔ ایسے کام ان لوگوں کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل بن کر رہ گئے ہیں۔ اس وقت دنیا کا ہر باشعور شخص یہ ادراک رکھتا ہے کہ یہودی قوم کس قدر طاقت ور ہو چکی ہے اور امریکا بہادر کو فرنٹ پر رکھ کر وہ اقوام عالم کو اپنا غلام بنانے کی سعی میں مصروف ہیں۔ کوئی شوقین اور صاحب حیثیت شخص لاکھوں روپیا خرچ کر کے امریکا کی سیر کو جانا چاہے تو ویزا آفس والے سوالات کر کے اس کے دماغ کی چولیں ہلا دیتے ہیں۔ ایک انتہائی پیچیدہ اور لایعنی ویزا فارم کو بھرنے کے بعد جب خواہش مند امیدوار اپنے توہین آمیز سلوک والے انٹرویو میں فیل ہو کر ویزا آفس سے باہر آتا ہے تو اس کی حالت افسوس ناک ہوتی ہے۔ امریکا جانے کا خیال تو اس کے دل سے نکلا ہو یا نہ نکلا ہو' البتہ اور بہت سی مفید چیزیں اس کے دماغ سے خارج ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ اس ہتک آمیز تجربے سے گزرے ہیں' وہ میرے جذبات کو محسوس کر سکتے ہیں اور اس بات میں مضمر نکتے کو سمجھ سکتے ہیں!

یہ رویہ صرف عام اور امریکا کے لیے غیر مفید لوگوں کے ساتھ ہے۔ البتہ مختلف اقوام اور ممالک کے وہ افراد جو زندگی کے کسی بھی شعبے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے امریکا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اس کی مزید اور لامتناہی ترقی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں' ان ہنرمند اور عبقری افراد کے لیے امریکا کی ساری سرحدیں کھلی ہوئی ہیں اور ہر سرحد' دخول کے ہر راستے پر ''ویل کم'' کا بورڈ آویزاں ہے...... آؤ اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو امریکی عوام' یہودی نسل کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کر دو۔ تمہیں کیا چاہیے؟ پیسا نا! وہ ہم منہ مانگا دیں گے۔ پتا نہیں' کیسے کیسے دماغ انہی یہودی پالیسیوں کا ایندھن بن گئے۔ صیہونی سازش کو سمجھنا آسان نہیں۔ آج امریکا ترقی اور بلندی کے جس مقام پر فائز نظر آتا ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس میں یہودی قوم کا کوئی کمال ہے تو وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے۔ یہ تو ان ہنرمندوں کی محنت کا ثمر ہے جو دنیا کے مختلف خطوں سے اپنی زمین کو چھوڑ کر امریکا میں آباد ہیں اور اس کی مزید ترقی کے لیے کوشاں!

مجھے فون پر صدف سے بات کرتے دیکھ کر راکیل تشویش میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس وقت اس نے پوچھا بھی تھا کہ میری کزن (میں نے راکیل سے صدف کا تعارف کزن کی حیثیت سے کرایا تھا) کے ساتھ کیا مسئلہ ہے لیکن کوئی واضح جواب دینے کے بجائے میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ جب میں راکیل سے اتنا زیادہ بے تکلف نہیں ہوا تھا اور نہ ہی وہ میرے معاملات میں پوری طرح شامل ہوئی تھی مگر اب صورت حال مختلف تھی۔

میں نے راکیل کو نہایت ہی مختصر الفاظ میں نقلی وجدان کے بارے میں بتایا اور آنکھیں بند کر کے پتا نہیں' سائنا گاگ کے کس حصے میں پہنچ گیا۔ بہرحال میں بالکل درست مقام پر پہنچا تھا۔ برنارڈلیو اور ربی موشے ہائمن اب بھی نقلی وجدان کے پاس کھڑے تھے۔ وہ آپس میں کچھ باتیں بھی کر رہے تھے لیکن ظاہر ہے ان کی آوازیں مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھیں' حتی

کہ وہ بدمعاش نقلی وجدان بھی ان سے متاثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور یوں لگتا تھا' وہ گہری نیند میں ہو...... ہپناٹک نیند۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نقلی وجدان کو ربی نے مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہو گیا تھا تو یہ ربی کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ نقلی وجدان ہما شما کے ٹرانس میں آنے والی چیز نہیں تھا۔ میں اسے ایک عرصے تک بھگت چکا تھا اور اس وقت میری تشویش کا سبب یہ تھا کہ پتا نہیں اور کتنے عرصے تک اور کس کس انداز میں اسے بھگتنا ہو گا۔ اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ ربی اس فتنہ پرور کو اپنے حق میں اور میرے خلاف استعمال کرنے والا تھا۔ محترم سانگ فو نے بھی کچھ اسی قسم کی پیش گوئی کی تھی۔ نقلی وجدان ایک منفی قوت کی شکل میں میرے مقابل آنے والا تھا جس کی لگام شاطر الشاطرین ربی موشے ہائمن کے ہاتھ میں ہوتی اور یہ ایک لمحہ فکریہ تھا!

میں نے سائنا گاگ کے اس حصے میں رہتے ہوئے اپنے طور پر یہ اندازہ قائم کیا کہ ربی' لیو کو نقلی وجدان کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں' میں دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ مجھے گونگوں میں رہنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد ربی لیو کو اپنے ساتھ لے کر ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میں خوش ہو گیا کہ وہ دونوں یونہی کمرا در کمرا ہوتے ہوئے شاید ساحل کے پاس پہنچ جائیں یا یہ بھی ہو سکتا تھا' وہ سائنا گاگ ہی سے باہر نکل آئیں۔ کسی سائنا گاگ میں ایک بیڈروم کا تصور خاصا مضحکہ خیز نظر آتا ہے لیکن جب کسی شیئر مارکیٹ میں ایسا بیڈروم وجود رکھتا تھا تو پھر ممکن اور ناممکن کی کیا اہمیت تھی!

دوسرے کمرے میں آنے کے بعد ربی نے برنارڈ کو بھی ایک چرمی کاؤچ پر لٹا دیا۔ وہ لیو پر کوئی خاص عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایک گرو گھنٹال اپنے چیلے چانٹے کو کسی کوئی دنیا سبق تعلیم کرنے جا رہا تھا۔ میں سانس روک کر ربی کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

ربی کا ''تماشا'' شروع ہوئے بہ مشکل دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اچانک لائٹ چلی گئی ہو۔ میں تاریکی کے اتھاہ سمندر میں معلق ہو گیا۔ اس ویرانی اور بے سروسامانی سے گھبرا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میں شیوی کے اندر راکیل کے پہلو میں بیٹھا تھا اور سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ راکیل نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا ہوا' تم خاصے نروس دکھائی دے رہے ہو؟''

''ابھی آ کر بتاتا ہوں۔''

میں نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کے توسط سے برنارڈلیو تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن متعدد بار کی سعی کے بعد بھی جب میری تیسری آنکھ کے سامنے ایک دبیز سیاہ چادر تنی رہی تو جھنجلا کر میں نے کوشش ترک کر دی۔ ربی اپنے عمل کے دوران میں برنارڈلیو کو کسی ایسے فیز میں لے گیا تھا جہاں تک تیسری آنکھ کے ذریعے دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ پتا نہیں یہودیوں کا وہ ربی مربی کیسے کیسے سحر پھونکنا جانتا تھا۔

مجھ پر جھنجلاہٹ تو سوار ہو ہی چکی تھی۔ اس کوفت زدگی میں' میں نے براہِ راست ربی کو ٹریس کرنا چاہا لیکن نتیجہ سابق تجربے کی صورت میں برآمد ہوا۔ سٹ پٹا کر میں نے شیطان کے فرسٹ کزن نقلی وجدان کا رخ کیا اور اس مرتبہ بھی مجھے ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میری تیسری آنکھ اس سائنا گاگ کے کسی بھی گوشے تک رسائی کے قابل نہیں رہی تھی۔ آنکھ پہلی دوسری ہو یا تیسری' اسے دیکھنے کے لیے واسطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہرہ آنکھیں بصارت کے لیے روشنی کو واسطہ بناتی ہیں جب کہ باطنی آنکھ بصیرت کے لیے کسی میڈیم کی متلاشی ہوتی ہے۔ میرے میڈیم کو ربی موشے ہائمن نے اپنے کسی تیر بہ ہدف عمل کی مدد سے کیموفلاج کر دیا تھا۔ بے بسی کے احساس کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔

میرے چہرے کے تاثرات کوئی راکیل سے چھپے ہوئے نہیں تھے۔ وہ فکرمندی سے بولی ''وجدان! تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو۔ سائنا گاگ کے اندر کیا صورت حال ہے؟''

میں نے اسے اندر کی صورتِ حال اور اپنی معذوری سے آگاہ کر دیا۔

اس کی فکرمندی میں اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہم اس وقت ''گولڈن یونی کارن'' میں بیٹھے بونے ڈنر کا مزہ اڑا رہے تھے۔ ہمارے حالات ایسے نہیں تھے کہ بے فکری سے مزے اڑاتے پھرتے تاہم پیٹ پوجا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں اور اپنے حالات سے نبرد آزمائی کے لیے زندہ تو رہنا پڑتا ہے نا!

ربی موشے ہائمن نے برنارڈلیو کو اپنے کسی طلسمی عمل سے گزار کر میرے لیے بے کار کر دیا تھا۔ نقلی وجدان پہلے ہی میری دسترس سے کوسوں دور تھا اور ربی...... اس تک بھی میں ابھی براہِ راست رسائی حاصل نہیں کر سکا تھا چنانچہ ایسٹ ہاسٹھ

اسٹریٹ والے سائنا گاگ میں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ وہاں کی حساس اور انتہائی فعال سکیورٹی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اندھے بیل کی طرح اندر گھسنا سراسر حماقت ہوتی۔ یہ خواہ مخواہ خود کسی مصیبت میں ڈالنے کے مترادف ہوتا۔

ویسے بھی ربی یا اس کا چیلا لیو میری فوری ضرورت نہیں تھے۔ مجھے اپنے ساحل کی تلاش تھی اور اس تک مجھے وہ ایشیائی عورت ہی پہنچا سکتی تھی جسے میں سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس میں چھوڑ آیا تھا۔ راکیل سے باہمی مشورے کے بعد ہی میں نے واپسی کا قصد کیا اور اس وقت ہم ''گولڈن یونی کارن'' میں موجود تھے۔

گولڈن یونی کارن ''لذتِ کام و دہن'' کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہاں عمدہ قسم کا بوفے ڈنر صرف پچیس ڈالر فی کس میں کیا جا سکتا تھا اور یہاں بیٹھنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یہ طعام گاہ 'سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس' سے بہت قریب تھی۔ گولڈن یونی کان اٹھارہ ایسٹ براڈ رکیتھرین اسٹریٹ پر واقع تھا۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اپارٹمنٹ نمبر تھرٹی فور میں ''جھانکا'' تھا۔ وہ عورت سو رہی تھی۔ یہ سونے کا وقت نہیں تھا۔ ابھی تو رات کا آغاز ہوا تھا۔ مجھے اس ایشیائی خوبصورت عورت کی اس حرکت پر سخت حیرت ہوئی اور میں نے راکیل سے تذکرہ کیا تو وہ بولی۔

''ہو سکتا ہے' بے چاری کی کوئی لیٹ نائٹ ڈیٹ ہو!''

میں نے چونک کر راکیل کو دیکھا اور ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ''دن بھر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے بیٹھے تھک بھی تو جاتی ہوگی۔ اگر واقعی اس کی کوئی لیٹ نائٹ ڈیٹ ہے تو پھر آرام کرنا اس کا حق بنتا ہے۔''

راکیل نے کہا ''اور یہ ڈیٹ اوور نائٹ کی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ کل چھٹی کا دن ہے۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں راکیل کی طرف دیکھا۔

پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر بات ہونے لگی۔ بوفے ڈنر میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک معقول رقم میں آپ انواع واقسام کے کھانے ٹیسٹ کر سکتے ہیں اور اچھا خاصا وقت بھی گزارنے کو مل جاتا ہے ''ٹیسٹ کرنے'' کے الفاظ میں نے اس لیے استعمال کیے ہیں کہ کسی ایک ڈش کو پیٹ بھر کر کھا لینا بوفے کی توہین ہے۔

میں وقفے وقفے سے تھرٹی فور میں بھی جھانک رہا تھا اور راکیل سے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ عورت سو کر اٹھے گی تو اپارٹمنٹ سے باہر ضرور نکلے گی اور میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں اسے چھاپنے کی کوشش کروں گا پھر اس سے ساحل کا پتا اگلوانا میرے لیے چنداں مشکل نہ ہوتا۔ میں تو دو گھنٹے پہلے ہی اسے گھیرنے کے موڈ میں تھا لیکن برنارڈ لیو کی اچانک انٹری نے ہمارا رخ پھیر دیا تھا۔

دس بجے رات میری امید بر آئی وہ عورت بیدار ہوئی۔ دس پندرہ منٹ اس نے فریش اپ ہونے میں لگائے پھر میری توقع کے عین مطابق وہ تیار ہو کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی۔ اپارٹمنٹس بلڈنگ سے وہ اپنی سرخ کیڈلک ہی میں برآمد ہوئی تھی۔ اس دوران میں ہم دونوں بھی گولڈن یونی کارن سے اٹھ کر اپنی شیوی میں بیٹھ چکے تھے۔

سرخ کیڈی جب ایسٹ براڈوے پر آئی تو ہم نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ اب چونکہ وہ ہماری نظروں کے سامنے تھی اس لیے میں باطنی آنکھ کا شٹر گرا کر راکیل کے پہلو میں حاضر ہو گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بہ دستور راکیل کا قبضہ تھا۔

ویسے پچھلے چند گھنٹوں میں ہم نے مین ہیٹن کی اسٹریٹس اور ایونیوز کی جو خاک چھانی تھی اس کے نتیجے میں مجھے اتنا تجربہ ہو گیا تھا کہ اکیلے ڈرائیونگ کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ مین ہیٹن بہت ہی طریقے سلیقے سے آباد کیا گیا ہے۔ ناجائز تجاوزات کا وہاں کوئی تصور نہیں۔

کیڈی اسٹراس اسکوائر سے کینال اسٹریٹ پر آئی تو ہم چالیس پچاس گز کے فاصلے پر اس کے تعاقب میں تھے۔ راکیل نے کہا ''کہیں یہ واپس اپنے دفتر تو نہیں جا رہی؟''

''کیوں' اس وقت دفتر جا کر کرے گی کیا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا ''کیا وہاں کچھ بھول آئی ہے؟''

سرخ کیڈی کینال اسٹریٹ کو چھوڑ کر جب باورڈ اسٹریٹ میں داخل ہوئی اور اس کا رخ شمال کی سمت ہو گیا تو راکیل نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا ''یہ دفتر نہیں بلکہ کہیں اور ہی جا رہی ہے۔ ممکن ہے سائنا گاگ میں ربی موشے ہائمن کے پاس جا رہی ہو!''

راکیل کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ یہ عین ممکن تھا کہ ایسٹ ہاسٹھ اسٹریٹ پر واقع یہود عبادت میں ربی سے ملنے جا رہی ہو۔ یہ راستہ تو اسی سمت اشارہ کرتا تھا۔ ہم خود بھی برنارڈ لیو کی بیوی کا تعاقب کرتے ہوئے اسی راستے سے سائنا گاگ پہنچے تھے۔ اگر وہ ایشیائی عورت واقعی ربی کے پاس جا رہی تھی تو اس کا یہی مطلب تھا' وہاں سائنا گاگ میں کوئی نہایت ہی خطرناک پلاننگ ہو رہی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ بہ دستور آنکھیں بند کیے اسی بیڈ روم میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا' وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔ مجھے اس کی کیفیت پر شدید حیرت ہوئی۔ آج صبح لگ بھگ ساڑھے دس بجے میں نے اسے اسی بیڈ روم میں محوِ خواب دیکھا تھا۔ تو کیا وہ پچھلے بارہ گھنٹے سے اسی حالت میں تھی؟

اس ہولناک سوال نے مجھے لرزا کر رکھ دیا پھر میں نے یہ سوچتے ہوئے خود کو تسلی دی کہ ممکن ہے اس دوران میں وہ چند گھنٹوں کے لیے جاگتی بھی رہی ہو۔ بہر حال ایسا تھا بھی تو اس کی کنڈیشن اور سچویشن میرے لیے انتہائی تشویش ناک تھی۔ میں آنکھیں کھول کر گاڑی میں حاضر ہو گیا۔

راکیل کو میں نے ساحل کے بارے میں مختصراً بتایا تو اس نے کہا ''جس دوران میں تم ساحل کے پاس تھے' سرخ کیڈی والی نے موبائل فون پر کسی سے بات کی ہے۔''

میں اس وقت کیڈی پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ راکیل کی بات ختم ہوئی تو میں نے دیکھا' اس ایشیائی عورت نے ایک مرتبہ پھر موبائل اپنے کان سے لگا لیا تھا۔ میں جان نہیں سکتا تھا' وہ موبائل پر کس سے کیا بات کر رہی تھی اور یہ نہ جاننا مجھے ایک عجیب سے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا۔

وہ لٹل اٹلی اور باوری کے اندر سے گزری پھر باوری اسٹریٹ پر ہی رہتے ہوئے اس نے ایسٹ ولیج عبور کیا اور یونین اسکوائر سے وہ ایسٹ فورٹین اسٹریٹ پر مڑ گئی تو میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔ اب اگر وہ آگے جا کر ففتھ ایونیو پکڑ لیتی تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ وہ سائنا گاگ ہی جا رہی تھی مگر اس نے میری توقع کے بالعکس عمل کیا۔

سرخ کیڈی ففتھ ایونیو کراس کر کے اسٹریٹ فورٹین پر آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔ مجبوراً ہمیں بھی تعاقب میں اس کے پیچھے ہی آنا پڑا۔ ایسٹ فورٹین اسٹریٹ' ففتھ ایونیو کے بعد ویسٹ فورٹین اسٹریٹ میں بدل گئی تھی۔ کیڈی نے ففتھ کے بعد سکستھ' سیونتھ' ایتھ اور نائنتھ ایونیو بھی کراس کیا اور چار سو بیس ویسٹ فورٹین اسٹریٹ پر جا کر رک گئی۔ ہم نے اسی اسٹریٹ پر تھوڑا آگے جا کر ٹینتھ ایونیو کے آغاز پر اپنی گاڑی سڑک کے کنارے لگا دی۔ وہ ایشیائی عورت اپنی گاڑی سے نکلی اور ایک عمارت میں داخل ہو گئی۔

''یہ یہاں کس سے ملنے آئی ہے؟'' میں نے راکیل کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی ''یہ پوچھو' وہ یہاں کیا کرنے آئی ہے؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا۔

''وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگی ''کیا تم واقعی کچھ نہیں جانتے؟''

''کیا نہیں جانتے مطلب؟'' راکیل کے انداز نے مجھے مزید الجھا دیا۔

''میں کلٹ کلب (CLIT CLUB) کی بات کر رہی ہوں۔'' راکیل کی نگاہ میں بے یقینی موجود رہی ''وہ عورت کلٹ کلب میں داخل ہوئی ہے۔''

''تو؟'' میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔

اس نے افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکی اور ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم کلٹ کلب کی حقیقت سے بے خبر ہو۔''

''کیا یہ کوئی گوگو کلب ٹائپ کا کوئی کلب ہے؟''

''گوگو!'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی ''کلٹ کلب' گوگو سے کہیں آگے کی چیز ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں؟'' راکیل کا ڈھکا چھپا انداز میرے لیے الجھن کا باعث تھا۔

اس کو وضاحت کرنا پڑی۔ بیک ویو مرر میں وہ سرخ کیڈی کا جائزہ لینے کے بعد بولی ''کلٹ کلب ایک لزبین کلب ہے...... مکس نیشنز لزبین کلب!''

''اوہ!'' میں انگشت بہ دنداں رہ گیا۔

مکس نیشنز لزبین کلب...... یعنی مختلف الاقوام اختلاطِ ہم صنفاں کی مظاہرہ گاہ! میں نے اپنے کانوں کی لوؤں کو تپتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے لزبین عورتوں اور ان کے کرتوتوں کے بارے میں صرف سن ہی سن رکھا تھا اور یہ سنا ہوا بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ آج ایک لزبین کلب (LESBIAN CLUB) کو باہر سے دیکھنے کا اتفاق ہو رہا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے راکیل سے استفسار کیا ''مجھے تو اس عمارت پر کسی کلب وغیرہ کا کوئی سائن نظر نہیں آیا۔ تم نے کس بنا پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ عورت لزبین کلب میں گئی ہے؟''

''ایسے کلبز کے کھلم کھلا نیون سائن آویزاں نہیں کیے جاتے۔'' راکیل نے بتایا ''بلکہ جس عمارت میں کوئی لزبین یا گائے کلب موجود ہو وہاں صنف کی مناسبت سے ایک مخصوص نشان بنا دیا جاتا ہے۔ تم اسے خفیہ پبلسٹی سمجھ لو۔ ضرورت مند

کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ میں اس مخصوص نشان کو دیکھ کر ہی یہ بات کہہ رہی ہوں۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"فورٹین ویسٹ اسٹریٹ کے اس کلٹ کلب کے بارے میں' میں نے کسی میگزین میں ایک فیچر پڑھا تھا۔ یہ کلب کچھ عرصہ پہلے ہی قائم ہوا ہے۔ اس کی روح رواں اور آرگنائزرز دو عورتیں ہیں جن کے نام جوسلین ٹیلر اور جولی ٹولنٹینو ہیں۔ اس فیچر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس کلب میں "ایڈز فری سیف سیکس" پر معلوماتی لیکچرز بھی دیے جاتے ہیں اور پورن ویڈیوز بھی دکھائی جاتی ہیں۔ جوسلین ٹیلر اور جولی ٹولنٹینو مستقبل قریب میں نہ صرف امریکا بلکہ دنیا کے تمام بڑے اور ماڈرن شہروں میں "کلٹ کلبز" کی چین چلانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔"

"تمہاری معلومات حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی ہیں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "کوئی بھی معلومات نہ تو خطرناک ہوتی ہے اور نہ ہی محفوظ۔ اس کا استعمال اس کی نوعیت کا تعین کرتا ہے۔ میں ہر قسم کے میگزین کا مطالعہ کرتی ہوں۔ خود کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنا پڑتا ہے۔"

راکیل بالکل درست کہہ رہی تھی۔ مجھے اس کی بات سے سو فی صد اتفاق تھا۔ اس کے ذریعے جو معلومات مجھ تک پہنچی تھی اگر میں اس کا منفی استعمال نہ کرتا تو وہ کسی بھی پہلو سے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتی تھیں لیکن میرے ذہن میں پیدا ہونے والا سوال ہنوز تشنہ تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر راکیل سے اس عورت کی یہاں آمد کے بارے میں پوچھا تو شوخی سے بولی۔

"تم خود ہی ذرا ادھر جھانک کر دیکھ لو۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے اسے گھورا

اس نے کہا "پریشانی کی کوئی بات نہیں وجدان۔ ابھی تو وہ آئی ہے۔ اس نے آتے ہی اپنے فن کا مظاہرہ تو شروع نہیں کردیا ہوگا۔ تم ایک نظر ادھر ڈال کر واپس آجاؤ۔ اس کا ماحول تمہیں سمجھا دے گا وہ اس وقت کہاں ہے!"

راکیل کی تجویز معقول تھی۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ مذکورہ خوبرو ایشیائی عورت کا تصور کیا اور پلک جھپکتے میں اس کے ماحول میں اتر ہو گیا۔ وہ اس وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھی تھی جہاں کوئی نیوڈ فلم دکھائی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ چند اور عورتیں بھی تھیں جن میں سے دو حسین و جمیل "امریکنیں" اپنے فن کے جوہر دکھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں' راکیل نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا "کیا ہوا؟"

"تم بالکل درست کہہ رہی تھیں۔" میں نے اس کے دعوے کی تصدیق کردی۔

راکیل نے مجھے بتایا کہ ایسے کلبز عام نظر سے اوجھل رکھے جاتے ہیں۔ کلب میں داخل ہوں تو فرنٹ پر ایک باررُوم دکھائی ...... دیتا ہے۔ بادی النظر میں وہ کوئی شراب خانہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک میز پر مختلف کارڈز رکھے ہوتے ہیں۔ آپ اپنی ضرورت اور خواہش کے مطابق اس کارڈ کے اندر اندراج کر دیں۔ باقی معاملات بار والے خود ہی دیکھ لیتے ہیں' یہاں "آپ" سے میری مراد لزبئنز ہے۔"

وہ ذرا دیر کو رکی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولی "بظاہر ایک بار نظر آنے والے کمرے کے عقب میں ایک پوشیدہ کمرا بھی موجود ہوتا ہے جہاں لزبئن عورتیں اپنے فن اور تکنیک کا مظاہرہ کرتی ہیں۔"

"بھاڑ میں جائیں یہ عورتیں اور ان کے فنی مظاہرے!" میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا "میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں' وہ ایشیائی عورت کلٹ کلب سے کب باہر نکلے گی؟"

"اپنے پروگرام کے بارے میں تو ٹھیک طور پر وہی بتا سکتی ہے۔" راکیل نے میری بیزاری اور جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے' چھیڑنے والے انداز میں کہا "اگر تم کہو تو اس سے پوچھ کر آجاتی ہوں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔" میں بڑبڑایا۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

میں امریکا کی اس ترقی اور آزادی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ واقعہ تو کچھ عرصہ پہلے کا ہے جب ڈھکے چھپے انداز میں کئی' نیویارک میں کئی لزبئن اور گے کلبز کھلے ہوئے تھے۔ آج کل تو وہاں ہم جنس افراد کی شادی کو قانونی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اگر آپ مرد ہیں تو اپنی پسند کے مرد سے شادی کر سکتے اور عورت ہیں تو اپنی پسند کی عورت سے شادی کر سکتی ہیں۔ امریکی "ماہرین" اسے "ایڈز" سے بچاؤ کا راستہ بھی بتاتے ہیں لیکن اس غیر فطری اختلاط کے نتیجے میں آگے جا کر جو نا قابل علاج اور مہلک بیماریاں سامنے آئیں گی' ان "ماہرین" کے باپ بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ خطرناک اور موذی امراض کے سامنے "ایڈز" تو بے چارہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کا بچہ نظر آئے گی۔ امریکا کی تعریفوں کے پل باندھنے والے دیسی افراد کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ

اگر ہر قسم کی بے راہ روی کو آزادی کا نام دے دیا جائے اور اس آزادی کو ترقی کا زینہ سمجھ لیا جائے تو پھر یہ ترقی بڑی ہی گھٹیا ترقی ہوگی۔ فطرت سے متصادم ہونے والا کبھی پنپ نہیں سکتا۔ جلد یا بہ دیر' اسے تباہ ہونا ہوتا ہے۔ خدا نے عورت کے لیے مرد اور مرد کے لیے عورت کو پیدا کیا ہے۔ اس فطری اصول سے انکار درحقیقت خدا کا انکار ہے' اس کے آفاقی قانون کا پامال ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے!

سرخ کیڈی والی ایشیائی عورت رات ایک بجے کے بعد مکس نیشنز کلٹ کلب سے برآمد ہوئی۔ یہ وقت ہم نے کس کوفت میں اور کہاں کہاں گھوم پھر کر گزارا اس کی تفصیل میں جانے کا کوئی فائدہ نہیں' بہرحال اس دوران میں ہمارے درمیان ایک لائحہ عمل ترتیب پا چکا تھا...... اس عورت کو ٹریپ کرنے کا منصوبہ!

آئیڈیا میرا تھا اور راکیل کی تائید مجھے حاصل تھی۔ میرے اندازے کے مطابق' اس عورت کا تعلق برصغیر پاک و ہند سے تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا' وہ انڈین ہے۔ میں ایک گیم کھیلنا چاہتا تھا۔ منصوبے کے مطابق میں اسٹریٹ کراس کر کے نائنتھ ایونیو کے کونے پر سڑک کے کنارے کھڑا ہو جاتا۔ راکیل ٹینتھ ایونیو پر اپنی گاڑی میں موجود رہتی۔ اس عورت کو واپسی کی راہ اختیار کرنے کے لیے ہماری شیوی کے پاس سے گزر کر اسٹریٹ کی دوسری سمت آنا پڑتا۔ جب وہ نائنتھ ایونیو پر پہنچتی تو میں ہاتھ کے مخصوص اشارے سے اس سے لفٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ مجھے لفٹ دینے پر تیار ہو جاتی تو فبہا ورنہ اس کے آگے نکل جانے کی صورت میں ہم شیوی میں اس کا تعاقب کرتے اور کوئی ''موزوں'' سی جگہ دیکھ کر اسے گھیر لیتے۔ اس ''کام'' کے لیے ایسٹ ولیج کا علاقہ زیادہ مناسب ثابت ہوا۔

اور اگر خوش قسمتی سے وہ مجھے لفٹ دینے پر تیار ہو جاتی تو میں انڈین کے طور پر اپنا تعارف کراتا اور کس طرح اسے اپنے شیشے میں اتارتا' اس بارے میں' میں نے فی الحال کچھ نہیں سوچا تھا۔ مجھے امید تھی میں اس سے نمٹ لوں گا۔ میں نے ایک طویل عرصہ انڈیا میں گزارا تھا۔ وہاں کے رہن سہن اور علاقوں سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اسے ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ اس دوران میں راکیل ایک مخصوص فاصلہ رکھتے ہوئے شیوی میں پیچھے آتی۔

کلب کی عمارت سے نکل کر جب وہ اپنی کیڈی کی طرف بڑھی تو اس کی چال نے مجھے بتا دیا کہ وہ اچھی خاصی پیے ہوئے تھی۔ اس کیفیت میں اس فن کا نتیجہ بھی شامل تھا جس کا مظاہرہ کرنے وہ یہاں اپنی رہائش سے اتنی دور آئی تھی۔ اس کے قدموں میں شامل ہلکی ڈگمگاہٹ میرا کام آسان کرنے کے لیے مفید ثابت ہوتی۔ میں اس کو نظر انداز کر کے تیز قدموں سے اس مقام کی طرف بڑھ گیا جہاں مجھے گھات لگا کر کھڑا ہونا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ سرخ کیڈی میں مجھے اپنے جانب آتے دکھائی دی۔ میں نے بائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے انگوٹھے کی ڈاؤن ورڈ حرکت سے، اس سے لفٹ مانگی۔ میں نے ففٹی ففٹی کے چانس پر وہ اسٹیپ لیا تھا لیکن اس نے مجھے مایوس نہ کیا۔ میرے پچاس فی صد اندازے کو سینٹ پرسینٹ میں بدلتے ہوئے اس نے کیڈی میرے نزدیک روک دی۔ میرا کام شروع ہو گیا۔

میں نے رکوع کے بل جھکتے ہوئے پسنجرز سائیڈ والے شیشے سے اندر دیکھا۔ اس دوران میں وہ شیشہ گرا چکی تھی۔ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بوجھل آواز میں بولی ''کہاں جاؤ گے؟''

''کسی بھی سستے ہوٹل تک پہنچا دو۔ میں بہت پریشان ہوں۔'' میں نے یہ جملہ ہندی میں ادا کیا تھا اور یہ میری ایک چال تھی۔

اس نے چونک کر سرتاپا میرا تنقیدی جائزہ لیا اور ہونٹ سکوڑتے ہوئے ہندی ہی میں بولی ''انڈیا سے آئے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میرا تیر گویا نشانے پر جا بیٹھا تھا!

اس نے پسنجرز سائیڈ کا دروازہ کھول دیا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولی ''گیٹ ان!''

میں نے ''ان'' ہونے میں ایک لمحہ تاخیر نہ کی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کیڈی آگے بڑھا دی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا ''ڈی سوزا۔''

''اپنی شکل اور حلیے سے انڈین نظر نہیں آتے ہو۔'' وہ اب باقاعدہ ہندی میں بات کرنے لگی تھی ''لیکن تمہاری زبان سے بھاشا سن کر یقین کرنا پڑ رہا ہے۔ کوئی غیر ہندوستانی اتنی صاف بھاشا (ہندی) نہیں بول سکتا۔''

میں نے بھرپور اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ''دراصل میں اینگلو انڈین ہوں۔ میرا باپ ہندوستانی اور ماں انگریز تھی۔ میں ہندی اور انگلش ایک جیسی روانی سے بول اور سمجھ سکتا ہوں۔''

''انڈیا میں تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟'' وہ میری ذات

یں دلچسپی لینے لگی تھی۔

میں نے بتایا ''پنک سٹی۔''

''اوہ......'' اس نے حیرت سے بھرپور مخمور میں کہا'' جے پور''

میں نے نشانہ تاک کر تیر چھوڑا ''تم بھی تو بڑی صاف ندی بول رہی ہو۔ کیا تمہارا تعلق بھی بھارت سے ہے؟''

''میرا نہیں بلکہ میرے ماتا پتا انڈین تھے۔ وہ برسوں پہلے امریکا آ گئے تھے۔'' اس نے خمار آلود انداز میں ایا ''میں امریکا بورن ہوں۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے سے لے کر اب تک امریکا ہی کی فضا میں سانس لے رہی ہوں۔ تم مجھے سینٹ پرسینٹ امریکن کہہ سکتے ہو۔ یہاں پر نسل خاندان ر خون کوئی نہیں دیکھتا۔ ذات برادری کی کوئی اہمیت نہیں۔ ں اگر آپ امریکی ہیں تو سب سے برتر ہیں۔'' بات ختم رتے کرتے اس کے انداز میں ایک تفاخر شامل ہو گیا۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اس وقت پوری رح اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس کی اس کیفیت میں سب ے بڑا ہاتھ مے نوشی اور خود فراموشی کا تھا۔ وہ کلٹ کلب میں ے یہ دونوں ''سوغاتیں'' اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ سچی ت تو یہ ہے کہ اس وقت اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے مجھے راہیت کا احساس ہو رہا تھا لیکن وہاں موجود رہنا میری وری تھی۔ میرے شکار نے دانے پر منہ مارنے کے لیے ل میں قدم رکھ دیا تھا۔ اب مجھے نہایت ہی صفائی سے جال سمیٹتے ہوئے اسے اپنے قابو میں کرنا تھا۔ اپنا مقصد حاصل رنے کے لیے بعض اوقات ناخوشگوار صورتِ حال سے گزرنا تا ہے۔ میں بہ جبر اسے برداشت کرتا رہا اور پوچھا۔

''تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟''

''روئے'' وہ مخصوص امریکی لہجے میں بولی ''بینا روئے!''

دراصل اس نے بتایا تھا کہ اس کا نام ''بینا رائے'' ہے۔

میں نے اپنی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا ''تمہاری زی اور پہناوے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم خاصی مال دار ۔ تمہارا ذریعۂ آمدنی کیا ہے؟''

وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی ''پرائیوٹ ں!''

پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی اور سوال کرتا' وہ مجھ سے فسار کر بیٹھی ''تم کسی سستے ہوٹل میں کیوں جانا چاہتے ... اور تمہارے ساتھ کیا پریشانی ہے۔ تم آدھی رات کے وہاں کھڑے کیا کر رہے تھے؟''

بینا رائے کے یہ تمام سوال میری کہانی کے انٹرو کی بنا پر

خوف!

ایک ایسا مسئلہ جس سے ہر شخص دوچار ہے

خوف سے آدمی پریشان ہوتا ہے۔
خوف سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔
خوف سے زندگی ناکام ہو جاتی ہے۔
خوف سے ازدواجی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔
خوف سے آدمی خودکشی کر لیتا ہے۔
خوف دیمک کی طرح زندگی کو چاٹتا رہتا ہے۔
شرم بھی خوف ہی کا ایک پہلو ہے اور اتنا ہی خطرناک۔

اردو کے جانے پہچانے منفرد نفسیاتی ادیب

خوف و شرم

اور اس کا سدباب

کا مطالعہ کیجیے

اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کر کے کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزاریے

قیمت: 50 روپے
ڈاک خرچ: 23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون۔ 5802551-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کے لیے: 63-C-2 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

تھے۔ وہ نشے میں ضرور تھی تاہم میں نے محسوس کیا' وہ اپنی ذات کو میرے سوالات سے بچانے کے لیے پوری طرح حساس تھی۔ بس اس نے اپنی زبان سے جو بتا دیا' بتا دیا۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''میری پریشانی کی کہانی بہت طویل ہے۔ سنو گی تو تم بھی خواہ مخواہ پریشان ہو جاؤ گی اس لیے رہنے ہی دو۔'' میں نے بڑے دل شکستہ انداز میں توقف کیا پھر اپنے لہجے میں مسکینیت بھرتے ہوئے اضافہ کیا' ''بس یوں سمجھ لو میرے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہے۔ میرا پاسپورٹ دیگر ضروری کاغذات بنی سامان میرے پاس نہیں رہا۔ بس جیب میں سوڈیڑھ سو ڈالر بچے ہیں۔ اگر کسی سستے ہوٹل میں رات گزارنے کا موقع مل جائے تو......''

''مین ہیٹن میں اتنی رات گئے تمہیں کسی بجٹ ہوٹل (سستے ہوٹل) میں کوئی جگہ نہیں ملے گی اور پھر تم غیر امریکی بھی ہو اور تمہارے پاس کوئی دستاویز یا ''آئی ڈی'' بھی نہیں۔'' وہ ہمدردانہ لہجے میں میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی' ''تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' میں نے اپنے لہجے میں اس شخص کی بے بسی شامل کر لی جس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔

''تم کیا کرو گے' میں ہی کچھ کرتی ہوں۔'' وہ ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی' ''ایسا کرو فی الحال تم میرے ساتھ چلو۔ یہ رات میرے اپارٹمنٹ پر گزار لو۔ صبح کی صبح دیکھیں گے۔''

اس کی پیشکش نے میرا کام آسان ترین کر دیا۔ اگر وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے جاتی تو پھر میں اسے زیر کر کے ساحل کے بارے میں سب کچھ اگلوا سکتا تھا۔ اسے زیر کرنا کون سا مشکل تھا۔ وہ اپنے اعمال کے ہاتھوں اس وقت خود ہی زیر و زبر ہو رہی تھی۔ البتہ اس صورت میں راکیل ضرور پریشان ہو جاتی۔ مجھے امید تھی' وقتی پریشانی کے بعد وہ سمجھ جاتی کہ میں کس سچویشن میں ہوں لہٰذا وہ سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس کے قریب ہی موجود رہتی۔

''کس سوچ میں گم ہو؟'' بینا رائے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آں' ہاں۔'' میں نے چونکنے کی اداکاری کی' ''کک ......کچھ نہیں۔''

''کیا میری پیش کش پسند نہیں آئی؟''

''ایسی بات نہیں۔'' میں متذبذب انداز میں بولا۔

''پھر؟''

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا' ''وہ دراصل میں اس وقت تمہیں کوئی تکلیف......''

''بس بس رہنے دو یہ تکلفات۔'' وہ بے تکلفی سے بولی' ''یہ سب کچھ انڈیا ہی میں اچھا لگتا ہے۔ میں نے تمہاری باتوں سے اندازہ لگا لیا ہے کہ تم ایک بھلے آدمی ہو۔ مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے استفسار کیا' ''تم میری ذات سے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس کر رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

باقی کا راستہ ہلکی پھلکی گفتگو میں کٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے خمار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں' میں نے اپنی کامل اداکاری کے جوہر دکھائے اور کسی ''اپ سیٹ'' کے بغیر ہم ٹھیک دو بجے رات سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس میں پہنچ گئے۔

بینا رائے لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے اپارٹمنٹ کے اندر پہنچی تھی۔ میں نے سوچا تھا گھر کے اندر محفوظ ہو جانے کے بعد میں اس سے دو دو ہاتھ کروں گا۔ اس وقت وہ پوری طرح ٹن تھی لہٰذا اس کی زبان سے اپنا مقصد اگلوانے میں مجھے کوئی دقت پیش آتی اور نہ ہی کوئی خاص محنت کرنا پڑتی لیکن اس نے اندر داخل ہوتے ہی میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

ہم جیسے ہی اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے سے اندر آئے بینا نے ٹٹول کر دروازہ بند کر دیا پھر بہکے بہکے ہاتھوں سے اپنے پرس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ میں یہی سمجھا وہ کوئی الگ چابی ڈھونڈ رہی ہے جس سے بیرونی دروازے کو ڈبل لاک کیا جا سکے مگر جب اس کا متلاشی ہاتھ پرس سے برآمد ہوا تو میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

اس کے ہاتھ میں مجھے ایک چمکتا ہوا خطرناک لیڈی پسٹل نظر آیا۔ اس نے مجھے ٹارگٹ پر رکھتے ہوئے غراہٹ آمیز لہجے میں کہا' ''کون ہو تم؟''

میں بینا رائے سے صرف چند قدم کی دوری پر تھا اور اس کے تیور بتاتے تھے' اگر میں نے اس کے سوال کا جواب دینے میں لمحے بھر کی تاخیر بھی کی تو وہ میرے سینے میں جان لیوا چھید ڈال دے گی۔ ان لمحات میں وہ مجھے نارمل سے کہیں زیادہ باہوش و حواس دکھائی دی۔ گویا' مدہوشی کا وہ ناٹک مجھے ٹریپ کرنے کے لیے تھا۔ میں اسے مدہوش سمجھ بیٹھا تھا' جب کہ وہ میرے ہوش اڑانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ......

لو' آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا!

کھیل بگڑ گیا تھا۔ بگڑے ہوئے کھیل کو بنانا آسان نہیں ہوتا، خاص طور پر جب اس کامیاب بگاڑ کے پیچھے کسی خوب صورت عورت کا ہاتھ ہو۔ حالات کو اپنے حق میں پھیرنے کے لیے پھر ''میم'' سے کام لینا پڑتا ہے۔ منافقت، مکاری اور کمین کاری!

بینا رائے مجھے بدستور نشانے پر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ پھر غرائی ''میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہو تم؟''

میں نے کچھ دیر پہلے شروع ہونے والی اداکاری میں کوئی تعطل نہ آنے دیا اور حیرت بھرے لہجے میں کہا ''میں تمہیں بتا چکا ہوں، میرا نام ڈی سوزا ہے اور میں پنک سٹی......''

''بکواس نہیں، میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی خوں خوار لہجے میں بولی پھر ٹانگوں میں تھوڑا پھیلاؤ پیدا کرتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ کو بھی پسٹل تک پہنچادیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے سفاکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

اس موقع پر حاضر دماغی اور اداکاری ہی سے کام لیا جاسکتا تھا تاکہ ''حرکت'' کے لیے کوئی راہ نکل سکے۔ ہمارے درمیان صرف چار قدم کا فاصلہ تھا۔ میں کوئی بھی انتہائی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں تھا۔ بس، پسٹل والی کو یہ احساس دلانا تھا کہ میں اس قسم کی ''حرکت'' کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میرے ساتھ ایک یقینی دھوکا ہوا تھا...... اور اس کے مابعد اثرات کو کسی دھوکے ہی سے کاٹا جاسکتا تھا۔

میں نے اچانک اپنے چہرے پر برہمی کے آثار پیدا کیے اور کہا ''اگر تم مجھے لوٹنے کا ارادہ ہی رکھتی تھیں تو وہیں کلب کے سامنے پسٹل دکھا کر میری جیب خالی کروالیتیں۔ اتنا لمبا ڈراما رچانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر میرے پاس ہے ہی کیا۔'' میں نے بے بسی سے کندھے جھٹکے اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو پہلے ہی سب کچھ گنوائے بیٹھا ہوں۔ یہ عزت اور سو، ڈیڑھ سو ڈالر بچے ہیں۔ کیا تم ان پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتی ہو؟''

اس نے بڑی زہریلی نظر سے مجھے دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی ''میں نے کہا نا، میں تمہاری حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔ شرافت سے بتادو، تم کون ہو اور کس مقصد سے میرے تعاقب میں لگے ہوئے ہو۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو وہ خود تم سے پوچھ لیں گے جو تھوڑی دیر بعد یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

پرس میں سے پسٹل نکالنے کے بعد ہندی کو یکسر بھول کر وہ امریکی انگریزی پر اتر آئی تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پسٹل کو غیر محسوس حرکت دی اور بولی ''کم آن!''

میں اس کے انکشاف سے چونک اٹھا تھا تاہم میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے اندرونی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس نے اپنے تعاقب اور کسی کے یہاں پہنچنے کا ذکر کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا ہمارا ''راز'' بڑی حد تک اس پر کھل گیا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ میں نے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''پتا نہیں، تم کس قسم کی عجیب و غریب باتیں کررہی ہو۔ میں بھلا تمہارا تعاقب کیوں کروں گا اور...... یہاں کون آنے والا ہے؟''

''اداکاری اچھی کرلیتے ہو۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تم شیور لسٹ میں جس لڑکی کے ساتھ میرا تعاقب کررہے ہو، وہ اب تک میرے آدمیوں کے قابو میں آچکی ہوگی...... ور وہی لوگ تم سے ملنے یہاں آرہے ہیں۔''

راکیل اور شیوی کے بارے میں بینا رائے کا انکشاف سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں سناٹے میں آگیا۔ مجھے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو نہ رہا اور اضطراری لہجے میں میرے منہ سے نکلا ''یہ...... نہیں ہوسکتا......''

یہ میرا ایک فطری ردِعمل تھا۔ اس دوران میں بینا رائے مسلسل میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بڑے نکیلے الفاظ میں بولی۔

''یہ ہوچکا ہے احمق! تم نادانی میں ایک عفریت کے جبڑے میں قدم رکھ بیٹھے ہو...... اور میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔'' اس نے حقارت بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی اور کہنے لگی۔ ''تمہیں اداکاری کی اے بی سی بھی نہیں آتی!''

''مجھے اداکاری کی اے بی سی نہیں آتی لیکن تمہیں ایکس وائی زیڈ سکھا سکتا ہوں۔ کیا تم جانتی ہو، اے سے پہلے اور زیڈ کے بعد کیا آتا ہے؟'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میرے انداز نے اسے اور ہوشیار کردیا ''یعنی وہ ''ڈیڑھ ہوشیار'' ہوگئی۔ بڑی فراخ دلی سے پوچھ بیٹھی ''وھاٹ ڈو یو مین؟''

ڈیڑھ ہوشیار ہمیشہ مار کھاتا ہے اور بڑی بری مار کھاتا ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترکی بہ ترکی کہا ''آئی مین، یو آر ویری مین...... اشٹنگی!''

''وھاٹ نان سینس؟'' وہ غضب ناک لہجے میں بولی۔

اس سے پہلے کہ بینا رائے کی آنکھوں سے چھوٹنے والی

چنگاریاں مجھ تک رسائی حاصل کرتیں، میں حرکت میں آگیا اور اس وقت یہ حرکت بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی۔

میں نے ٹٹولنے والے انداز میں اپنے ہاتھوں سے پینٹ کی جیبوں کو تھپتھپایا اور چہرے پر اضطراری کیفیت طاری کرلی پھر بڑبڑانے والے انداز میں کہا ''پتا نہیں، کہاں چلی گئی......؟''

''اے، ہینڈز اپ!'' وہ خطرناک انداز میں پسٹل کو لہراتے ہوئے بولی۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، تمہاری مرضی۔ میں تو اپنی جیبوں میں وہ چابی تلاش کررہا تھا جس سے تمہارا سبق شروع ہوتا۔ میں تمہیں اے سے پہلے اور زیڈ کے بعد......''

''شٹ یور ماؤتھ۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چلائی ''ٹرن اراؤنڈ!''

میں نے اس کی ''ٹرن اراؤنڈ'' والی ہدایت پر بعینہٖ عمل کیا۔ میں بڑے شریفانہ انداز میں، ہاتھوں کو سر سے بلند رکھے ہوئے گھوم گیا لیکن اس گھماؤ کی تکمیل سے قبل ہی میری رائٹ وہیل کک اپنا کام دکھا چکی تھی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر بائیں دیوار سے جاٹکرایا۔

غنیمت تھا، ٹریگر پر بینا کی انگلی نہیں دبی ورنہ فائر کی آواز لوگوں کو اس اپارٹمنٹ کی طرف متوجہ کردیتی۔ میری وہیل کک نے پسٹل چھڑانے کے ساتھ ساتھ اس کے پسٹل بردار ہاتھ کا مزاج بھی پوچھ لیا تھا۔ وہ معتوب ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے پستول کی سمت لپکی مگر اب میں اسے کسی کارکردگی کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے ایک طویل جست بھری اور بینا رائے کو عقب سے دبوچ لیا پھر ہم ایک دوسرے سے گتھم گتھا فرش پر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ وہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا جاتا۔ اگر آس پڑوس میں سے کسی کی توجہ ہماری جانب مبذول ہوجاتی تو میرے لیے بے انتہا مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ بینا رائے کے خوف ناک انکشاف نے پہلے ہی میرے دماغ میں ہلچل مچا رکھی تھی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا، آنِ واحد میں کرگزرنا تھا۔

میں نے بینا کے نسوانی خطوط کا لحاظ اور اس کی خوب صورتی کا خیال رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلکا رکھا اور آئندہ ایک منٹ کے اندر میں نے اسے مکمل طور پر اپنے قابو میں کرلیا۔ جب وہ بے بسی کی تصویر میں ڈھل گئی تو میں نے ایک بیڈ شیٹ سے لمبی پٹی پھاڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں کو پشت پر جکڑ دیا اور اپنی بانہوں میں اٹھا کر بیڈ روم میں لا پٹخا۔ وہ بیڈ کے اوپر کسی گٹھری کے مانند اچھل کر رہ گئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''ساحل اس وقت کہاں ہے؟''

''سا...... حل......'' اس کی آنکھوں میں سراسیمگی تیر گئی پھر وہ جلدی سے بولی ''مم...... میں کسی ساحل کو نہیں جانتی۔''

''تم جانتی ہو...... اور بڑی اچھی طرح جانتی ہو۔'' میں نے اسی کے پسٹل کو اس کی پیشانی پر ٹکاتے ہوئے کہا ''تم میری ساحل کی اٹینڈنٹ بنی ہوئی تھیں لیکن اب ساحل کو وال اسٹریٹ والے ٹھکانے سے ہٹادیا گیا ہے۔ وہ کسی دوسرے بیڈ روم اور نئے ماحول میں ہے...... اور اس بیڈ روم، اس ماحول تک تم مجھے پہنچاؤ گی۔''

بینا رائے کو بیڈ روم تک پہنچانے کے بعد میں اس کا پسٹل اٹھالایا تھا اور اس وقت وہ اپنی ہی گن کے نشانے پر تھی۔ ''میری ساحل'' کے الفاظ نے اس کی دہشت بھری آنکھوں میں اچھا خاصا پھیلاؤ پیدا کردیا تھا۔

''کک...... کیا تم...... وجدان ہو......؟'' وہ سراسیمہ لہجے میں متفسر ہوئی۔

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا ''میں کون ہوں، تم اس چکر میں نہ پڑو۔ وجدان کا نام زبان پر لاکر تم نے ثابت کردیا ہے، تم ربی موشے ہائمن کے لیے کام کرتی ہو۔ اب شرافت سے ساحل کا ٹھکانا بھی بتادو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تمہارے وہ لگتے لگاتے جنہوں نے میری ساتھی کو قابو کیا ہے اور تمہارے بقول، وہ یہاں پہنچنے ہی والے ہیں، میں ان سے ملاقات کا ہرگز ہرگز ارادہ نہیں رکھتا لہٰذا میں جو پوچھ رہا ہوں، بتادو...... اگر تمہیں اپنی زندگی پیاری ہے تو ورنہ......''

میں نے پسٹل کی نال کو اس کی پیشانی میں چبھوتے ہوئے دانستہ خطرناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو اس کی آنکھوں میں موجود دہشت دوچند ہوگئی۔ وہ لکنت زدہ انداز میں بولی۔

''مم...... میں نہیں جانتی، وہ لڑکی اس وقت کہاں ہوگی۔''

''اس کا مطلب ہے، تم زندہ نہیں رہنا چاہتی ہو؟''

''میری بات کا یقین کرو......''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے درشت لہجے میں کہا ''ساحل کا پتا بتاتی ہو یا میں تمہارا قصہ تمام کروں؟''

''تم میری بات کا یقین کرو۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

''آج علی الصباح اس لڑکی کو وال اسٹریٹ والے ٹھکانے سے کہیں اور منتقل کر دیا گیا ہے۔''

''اتنا تو میں بھی جانتا ہوں۔'' میں غرایا ''تم مجھے بتاؤ، ساحل کو کس جگہ پہنچایا گیا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ آئی سویئر!'' وہ بے بسی سے بولی ''اس لڑکی کو ربی کے حکم پر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہے۔ وہی اس کے بارے میں جانتے ہیں۔''

بینا رائے کی حالت بتاتی تھی، وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی ہے تاہم تصدیق کی خاطر میں نے ایک چال چلی اور سفاکی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، جب تم ساحل کے بارے میں کچھ جانتی نہیں ہو تو پھر تمہیں زندہ رہنے کا بھی کوئی حق نہیں۔ تمہارے ساتھی جب یہاں پہنچیں گے تو انہیں تمہاری لاش ملے گی۔''

وہ گڑگڑانے لگی ''فار گاڈ سیک......''

اس کا جملہ ابھی نامکمل ہی تھا کہ موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ بینا کا موبائل تھا جو اس کے پرس میں رکھا تھا۔ میں پسٹل کے ساتھ اس کے پرس کو بھی بیڈ روم میں اٹھا لایا تھا۔ بینا بات ادھوری چھوڑ کر اپنے پرس کی طرف دیکھنے لگی۔

''تمہارے ساتھیوں کی کال ہوگی۔ ٹھہرو، میں سنتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پرس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی ''موبائل مجھے دو، میں اٹینڈ کروں گی۔''

''تمہارا کھیل ختم ہو چکا بینا۔'' میں نے پرس میں سے موبائل فون باہر نکالتے ہوئے کہا ''یہاں سے میرا کھیل شروع ہوتا ہے۔ تم چپ چاپ خاموشی سے دیکھتی رہو۔''

اس دوران میں موبائل فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بج چکی تھی۔ میں نے ''یس'' کا بٹن دبانے کے بعد موبائل کان سے لگا لیا۔ میں نے ''ہیلو'' کہنے کے بجائے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

''ہیلو رائے!'' دوسری طرف سے ٹھہرے ہوئے انداز میں بینا کو مخاطب کیا گیا ''ہم نے اس کی ساتھی پر قابو پالیا ہے۔ اس وقت وہ ہمارے قبضے میں ہے۔ لعل اٹلی کے اختتام پر ہم اس نے اس کی شیورلٹ کو گھیر لیا تھا پھر اسے اپنی گاڑی میں منتقل کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس کی گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ تم نے بھی اپنے شکار پر قابو پالیا ہوگا؟''

آخری جملہ بولنے والے نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تھا لیکن میں چپ سادھے رہا۔ میری اس خاموشی نے دوسری طرف سے بولنے والے کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ الجھن بھرے لہجے میں بولا۔

''رائے! تم خاموش کیوں ہو۔ ہیلو رائے!'' اس کی آواز میں ہیجان بھرنے لگا۔ ''تم ٹھیک تو ہو۔ کیا موبائل اس وقت تمہارے ہی ہاتھ میں ہے؟ جواب دو رائے؟ ہمارے آدمی اسٹراس اسکوائر سے ایسٹ براڈوے میں داخل ہو رہے ہیں۔ ٹھیک دس منٹ بعد وہ تمہارے اپارٹمنٹ پر ہوں گے انی پرابلم؟''

اگرچہ میں اس وقت بڑی پرابلم میں تھا لیکن پوچھنے والے نے رائے کی پرابلم کے بارے میں استفسار کیا تھا لہٰذا میں نے ''نو'' کا بٹن دبا کر کال منقطع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موبائل کو آف کرنے کے بعد جمپر کی جیب میں ٹھونس لیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے بینا رائے کو الوداع نظروں سے دیکھا تو وہ پوچھ بیٹھی۔

''کس کا فون تھا؟''

''تمہارے رشتے دار کا۔''

''تم نے مجھ سے بات کیوں نہیں کرائی؟'' وہ برہمی سے بولی۔

''بات کر کے کیا کرتیں، وہ دس منٹ میں یہاں پہنچنے والے ہیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا ''تم ان کے گلے مل کر رونا اور رو رو کر انہیں اپنا احوال سنانا۔'' پھر میں نے اس کی بندشوں کا جائزہ لیا اور انہیں اطمینان بخش پایا۔ تم نے اس کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہونے سے قبل نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''دیکھو رائے! میں نہیں جانتا تم نے مجھے اپنا نام صحیح بتایا ہے یا غلط، البتہ تم ''رائے'' تو ضرور ہو۔ موبائل فون پر تمہیں رائے کہہ کر ہی مخاطب کیا گیا تھا۔''

''میں بینا رائے ہی ہوں۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''او کے بینا!'' میں نے اس کی وحشت بھری آنکھوں میں جھانکا ''ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن اس وقت ایک لمحے کی فرصت نہیں۔'' پھر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں کی بندشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''تم جیسی خوب صورت عورت کے ساتھ یہ سلوک کرنے کا مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور ہوں......اور مجھے مجبور کرنے والی بھی تم ہی ہو۔ گڈ نائٹ۔''

''تت......تم میرا پسٹل اور موبائل تو دے جاؤ۔'' وہ ملتجیانہ انداز میں بولی۔

میں نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا، جواب دینا تو دور کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے میں بیٹا رائے کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ بیٹا رائے تھی یا نا بیٹا دھوئے، مجھے اس کے رونے دھونے سے کوئی سروکار نہیں تھا!

☆☆☆

میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا ان میں دس منٹ دس گھنٹوں سے زیادہ اہم اور طویل ہوتے ہیں۔ میں نے بیٹا کے اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد، سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس کو چھوڑنے میں بہ مشکل تین منٹ لگائے ہوں گے، یعنی راکیل کو قابو کرنے کے دعوے دار افراد کے، سیوارڈ پارک اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں قدم رکھنے سے پانچ منٹ پہلے۔ اس وقت مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں اطمینان سے بیٹھ کر میں راکیل کے ماحول میں جھانک سکتا۔

میں سیوارڈ پارک میں داخل ہوگیا۔ ولیم۔ ایچ سیوارڈ پارک ایک کونے میں بنا ہوا ہے اور اسٹراس اسکوائر سے جڑا ہوا۔ موبائل فون پر بات کرنے والے نے اپنے اسٹراس اسکوائر پر ہونے کی اطلاع دی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا، اب تک وہ لوگ یہاں سے گزر کر ایسٹ براڈوے پر آگے بڑھ گئے ہوں گے...... اور اب تب میں وہ بیٹا رائے کے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے والے ہوں گے۔ ان کی بعد میں بھی خبر گیری کی جاسکتی تھی۔ میں راکیل کی جانب متوجہ ہوگیا۔

پارک میں اس وقت نیم تاریکی اور سناٹا تھا۔ اِکّا دُکّا گارڈن لائٹ روشن تھیں۔ یہ ماحول میرے لیے بہت سازگار تھا۔ اگرچہ موسم اپنی شدت دکھا رہا تھا اور اسی شدت کے سبب پارک میں ویرانی تھی لیکن میرا ذہن موسم کی شدت اور حالات کی حدت کو خاطر میں لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ایک خالی بینچ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کے توسط سے راکیل کے ماحول میں پہنچ گیا اور وہاں پہنچتے ہی میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔

میں نے بند آنکھوں کے پیچھے راکیل کا تصور کیا تھا، گارشیا کا نہیں...... اور میرے تصور نے مجھے راکیل اینڈرسن ہی کے ماحول میں پہنچایا تھا۔ اس کے چہرے پر موجود گارشیا کا میک اپ اتارا جاچکا تھا۔ وہ اس وقت چار افراد کے نرغے میں تھی جو اس سے مختلف قسم کے سوالات کررہے تھے۔ راکیل ان کے استفسار کے جواب بھی دے رہی تھی لیکن ظاہر ہے، وہاں کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچ پارہی تھی۔ اس لیے میں وہاں ہونے والی گفتگو سے ناواقف تھا۔ راکیل کے ماحول سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت ایک کمرے میں موجود تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا، موبائل پر بات کرنے والے کے دوسرے ساتھی راکیل کو اپنے ساتھ کہیں اور لے گئے تھے۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات یہ تھی کہ راکیل کا راز، راز نہیں رہا تھا...... گویا میرا راز بھی کھلنے والا تھا۔

یہ بڑی واہیات صورتِ حال تھی۔ میں نے جھنجلا کر آنکھیں کھول دیں۔ پھر مجھے ساحل کا خیال آیا اور ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کرکے میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ بدستور اسی بیڈروم میں تھی جہاں میں نے آخری مرتبہ اسے دیکھا تھا اور وہ گہری نیند میں لگتی تھی۔ رات کے آخری پہر اسے نیند ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ میں چند لمحے اس کے ماحول میں رہا اور پھر مطمئن ہوکر پارک میں حاضر ہوگیا۔

دوبارہ راکیل کی طرف تصوراتی چھلانگ لگانے سے قبل میں نے بیٹا رائے کو جھانکنا چاہا اور اس کے خال و خط پر توجہ مرکوز کرکے میں تیسری آنکھ کے طفیل اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں پہنچ گیا۔ میں نے اسے دو افراد کے ساتھ اسی بیڈروم میں پایا جہاں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ تاہم اب اس کے ہاتھ پاؤں کی بندشیں کھول دی گئی تھیں اور وہ خاصا ریلیکس محسوس کررہی تھی۔ اس کے پاس جو دو افراد موجود تھے، وہ اپنی صورتوں ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے لیکن چونکہ وہ بیٹا کے ساتھی تھے اس لیے اس کے ساتھ کوئی بدمعاشی نہیں کررہے تھے۔ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس وقت میں ہی ان کی باتوں کا مرکز و محور ہوں گا۔ میں ان پر لعنت بھیج کر وہاں سے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ چونک اٹھا۔

جیسے چور، چوری سے باز آئے مگر ہیرا پھیری سے نہیں، بالکل اسی طرح وہ بدمعاش بھی شرافت کے مظاہرے کے بعد کمینے پن پر اتر آئے۔ ان میں سے ایک نے اپنی جیب سے سائلنسر لگا پسٹل برآمد کیا اور پلک جھپکتے میں، دو گولیاں بیٹا کے سینے میں اتار دیں۔ کوئی فائر کی آواز پیدا ہوئی اور نہ ہی بیٹا رائے کی چیخ خارج ہوئی۔ وہ سینے میں دو شگاف ڈلوا کر کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہوگئی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں، میں نے حیرت اور استعجاب کی ملی جلی کیفیت واضح طور پر محسوس کی۔ شاید اسے اپنے بھیانک انجام کا یقینا نہیں آیا تھا...... وہ بھی اپنوں کے ہاتھوں!

ایسا ہوتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ نقصان اسی شخص کے ہاتھوں اٹھاتا ہے جو اس سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ قربت دراصل اعتماد پیدا کرتی ہے۔ دوسروں پر بھروسا ہونے لگتا ہے، پھر انسان آنکھیں بند کرکے ان پر اعتبار

کرنے لگتا ہے۔ انہیں اپنا سمجھنے لگتا ہے...... خود سے بھی زیادہ اہم! اور یہیں سے دھوکے اور دغا کا دروازہ کھلتا ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنی زندگی کو عزیز رکھتا ہے اور وہ بھی ایک دن اسے دغا دے جاتی ہے۔ آج تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ دوسروں پر بھروسا کرنا چاہیے یا نہیں مگر یہ طے ہے کہ آنکھیں کھول کر اعتماد کرنا چاہیے...... اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے!

میں دوبارہ راکیل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اکیلی تھی اور ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کو کرسی کے ہتھوں پر بڑی مضبوطی سے باندھ دیا گیا تھا اور پاؤں بھی کرسی کی ٹانگوں سے جکڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند اور سر کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا ہوا تھا۔ وہ اگر اس وقت سو نہیں رہی تھی تو پھر حالاتِ حاضرہ پر غور کررہی ہوگی۔ اس صورتِ حال میں سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں، وہ چاروں افراد کہاں غائب ہوگئے تھے جنہیں میں نے تھوڑی دیر پہلے راکیل سے استفسارات کرتے دیکھا تھا!

میں بڑی تشویش سے، راکیل کو پیش آنے والے حالات پر غور کرنے لگا تاہم تصوراتی طور پر میں اس کے ماحول ہی میں رہا۔ موبائل فون پر بیٹا رائے سے بات کرنے والے نے بتایا تھا کہ انہوں نے راکیل کو لٹل اٹلی کے اختتام پر گھیرا تھا۔ بیٹا رائے کی سرخ کیڈی میں بیٹھنے کے بعد میں راکیل پر مسلسل نظر نہیں رکھ سکا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو بیٹا کو مجھ پر شک ہوجاتا اور اس سلسلے میں، میں کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ اس سفر کے اختتام پر جب بیٹا نے اپنا رنگ دکھایا تو میری خوش فہمی خاک میں مل کر رہ گئی۔

کیڈی کے اندر بیٹا سے محتاط گفتگو کے دوران میں، میں گاہے بہ گاہے راکیل کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ فورٹین اسٹریٹ پر تو برابر وہ ہمارے تعاقب میں رہی تھی پھر یونین اسکوائر کراس کرنے کے بعد وہ باوری اسٹریٹ پر بھی مڑی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں، بیٹا کو گھیرنے کے لیے جو ہلکا سا خاکہ بنایا تھا، اس کے مطابق "ایسٹ ولیج" موزوں جگہ تھی۔ باوری اسٹریٹ اس کے اندر سے گزرتی تھی لیکن اس دوران میں بیٹا مجھے اپنے ساتھ جانے کی دعوت دے چکی تھی لہٰذا میں راکیل کی طرف سے خاصا بے پروا ہوگیا تھا۔ مجھے امید تھی، وہ کیڈی کا تعاقب کرتے ہوئے سیدھی سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس تک پہنچ جائے گی۔

میں کیڈی کے اندر بیٹا رائے کے ساتھ ایسا مصروفِ گفتگو ہوا کہ مجھے پتا ہی نہ چل سکا، ہم ایسٹ ولیج سے کب "باوری" میں داخل ہوئے اور باوری کو چھوڑ کر کب "لٹل اٹلی" سے گزرے جہاں میں یہ نہ جان سکا کہ ہمارے دشمنوں نے کس وقت لٹل اٹلی کے اختتام پر راکیل کو گھیر لیا تھا اور شیوی کو وہیں چھوڑ کر راکیل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے؟

شیوی والا معاملہ مجھے الگ پریشان کررہا تھا۔ وہ ونگ ہنگ کی گاڑی تھی۔ اگر میرے دشمن اس کی پڑتال میں لگ جاتے تو ہمارے محسن بے چارے ونگ ہنگ کے لیے مشکل کھڑی ہوجاتی۔ مجھے صبح ہونے سے پہلے ونگ ہنگ اور شیوی کا کوئی مناسب بندوبست بھی کرنا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا، وہ لوگ گاڑی کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے، لٹل اٹلی ہی میں چھوڑ گئے تھے۔

میں نے راکیل والے کمرے میں دو افراد کو داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو ریڈ الرٹ ہوگیا۔ یہ انہی چار میں سے دو تھے جنہیں میں پہلے راکیل کے قریب دیکھ چکا تھا۔ راکیل کے چہرے پر سے گارشیا کا میک اپ اتر چکا تھا اور اب وہ اس کے فنگر پرنٹس لے رہے تھے۔ راکیل والا معاملہ میری توقع سے زیادہ گمبھیر ہوتا جارہا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہ رہی کہ راکیل ربی موشے ہائمن کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ فنگر پرنٹس اسے مکمل طور پر راکیل ثابت کردیتے جس کے بعد ربی کو یقین ہوجاتا کہ راکیل کے ساتھ ڈسلوا کے بھیس میں وجدان چھپا ہوا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی، راکیل میرے حوالے سے زبان کھولے گی لیکن اگر اس کی زبان کھلوانے کے لیے تشدد کا راستہ اختیار کیا جاتا تو میں نتائج کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ربی کے نزدیک راکیل کی حیثیت ایک باغی کی سی تھی۔ بغاوت اور غداری کی سزا ہمیشہ بدترین ہی رہی ہے۔

امریکا میں انیس سو اکسٹھ عیسوی اور اس کے بعد پیدا ہونے والے تمام افراد کا فنگر پرنٹس ریکارڈ محفوظ ہے۔ جیسے ہی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے، سب سے پہلے اس کے فنگر پرنٹس لیے جاتے ہیں۔ راکیل بہرحال انیس سو اکسٹھ سے بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ریکارڈ تک رسائی حاصل کرنا ربی کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ اور دیگر سرکاری ادارے اس کے اشارۂ ابرو پر حرکت میں آجاتے۔ راکیل اس وقت بڑی مصیبت میں گھر گئی تھی اور یہ مصیبت اس نے مجھے ربی کے چنگل سے نکالنے کے لیے مول لی تھی۔ اس سے پہلے کہ راکیل کو کسی ناروا سلوک سے گزارا جاتا، مجھے اڑ کر اس کے پاس پہنچنا تھا...... مگر کیسے اور کہاں؟

یہ سوالات مجھے ایک بند گلی میں لا کھڑا کرتے۔ راکیل

چند روز سے میرے ساتھ تھی لیکن یوں محسوس ہوتا تھا، وہ صدیوں سے یونہی میرے قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہو۔ اس نے انتہائی بُرے وقت، میں میری مدد کی تھی، اب مجھ پر لازم تھا، میں بھی اسے ان کڑے حالات سے باہر نکال لاؤں۔ میں اس پر نگاہِ تصور مرکوز رکھتے ہوئے بڑی تیزی سے سوچنے لگا۔

راکیل کے پاس اس وقت جو دو افراد موجود تھے، ان میں سے ایک نے اس کے فنگر پرنٹس حاصل کیے اور دوسرے نے اس کے بازو میں ایک انجکشن دے دیا۔ اگلے ہی لمحے راکیل کا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ یقینی طور پر اسے بے ہوشی کا انجکشن دیا گیا تھا۔ ویسے راکیل کو کرسی کے ساتھ اتنی مضبوطی سے جکڑا گیا تھا کہ اس کی طرف سے کسی مہم جوئی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی تاہم اسے دیے جانے والے انجکشن سے ظاہر ہوتا تھا، وہ لوگ راکیل کے معاملے میں بے حد محتاط ہیں۔

میں بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا کہ وہ لوگ کمرے سے باہر جائیں...... اور اگر اس رہائش گاہ سے بھی باہر نکل پڑیں تو سبحان اللہ! اس صورت میں، میں ان کی لوکیشن سے آگاہ ہو جاتا۔ میری خواہش کا سوا ستیاناس مارتے ہوئے وہ راکیل والے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہاں دیگر دو افراد بھی موجود تھے۔ پھر وہ چاروں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ وہاں سے باہر نکلنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو میں جھنجلا کر پارک میں حاضر ہو گیا۔

اس وقت رات کے (صبح کے) تین بجے تھے اور درجۂ حرارت صفر یا صفر سے نیچے رہا ہوگا۔ میں خود کو بڑی برداشت والا سمجھتا ہوں اور اس وقت میں مناسب گرم لباس میں بھی تھا لیکن بقول کسے، قلفی سی جم کر رہ گئی تھی۔ رات کا باقی حصہ اس پارک میں بیٹھ کر نہیں گزارا جا سکتا تھا لہٰذا میں نے بینچ چھوڑ دی اور پارک سے باہر نکل آیا۔ اس مقصد کے لیے میں نے پارک کا دوسرا رخ استعمال کیا۔ اب میں ایسٹ براڈوے کے بجائے ایلیکس اسٹریٹ پر تھا۔

میں جیسے ہی سیوارڈ پارک سے باہر آیا، میرے ذہن میں کوئی جگنو سا چمکا۔ اس لحاتی روشنی میں مجھے راکیل تک رسائی کا راستہ نظر آ گیا۔ بینا رائے کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے والے یقیناً اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچیں گے۔ اگر میں ان کا تعاقب کرتا تو راکیل تک پہنچ سکتا تھا۔ ان دونوں کے حلیے میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ میں ان سفاک اور بدمعاش صورتوں کو کیوں کر بُھلا سکتا تھا۔

جلد ہی مجھے ایک میڈ یلین کیب مل گئی۔ اگلے ہی لمحے میں ٹیکسی کی پینجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس تیزی کا ایک سبب اس ٹیکسی کا ڈرائیور بھی تھا۔ وہ صورت شکل میں ہنا بنایا پاکستانی تھا۔ اس نے ٹیکسی کو آگے بڑھانے سے پہلے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ مطلب یہی تھا، مجھے کہاں جانا ہے؟

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہہ دیا "لٹل اٹلی چلو۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیکسی ایلیکس اسٹریٹ پر شمال کی سمت دوڑنے لگی۔ میں نے اپنے اندرونی تجسس کے باعث ڈرائیور سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

اس نے منہ اور لہجہ بگاڑے بغیر جواب دیا "وسیم۔"

"اوہ، تم مسلم ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسلم پاکستانی۔" اس کے جواب نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

میں اس وقت ڈسلوا کے بہروپ میں تھا اور امریکن نیشنل ہونے کی وجہ سے خالص امریکی لب و لہجے میں اس سے بات کر رہا تھا۔ وسیم سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس وقت اس کی یلو کیب میں اس کا ایک ہم مذہب پاکستانی بھائی بیٹھا ہوا ہے۔

میں نے گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے دانستہ اردو میں اس سے پوچھ لیا "اگر تم پاکستانی ہو تو پھر تمہیں اردو بھی آتی ہوگی؟"

ایلیکس اسٹریٹ پر ٹیکسی تھوڑا سا لہرائی۔ یہ اس ذہنی جھٹکے کا نتیجہ تھا جو مجھے اردو بولتے سن کر وسیم کو پہنچا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا، رات کے آخری پہر سڑک سنسان تھی ورنہ ایکسیڈنٹ بھی ہو سکتا تھا۔ ٹیکسی لہراتے ہوئے اپنی لین سے دوسری لین میں جا گھسی تھی۔

وسیم کی حیرت بھری لرزیدہ آواز میری سماعت تک پہنچی۔ "کیا آپ کو بھی اردو آتی ہے!"

یہ جملہ وسیم نے اردو میں ادا کیا تھا اور اس کا لہجہ چغلی کھاتا تھا کہ اس کا تعلق پنجاب سے ہے۔ میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا "آتی جاتی رہتی ہے۔"

"آپ پاکستانی تو نظر نہیں آتے!" میرے منہ سے اپنی قومی زبان سن کر اس کے انداز میں ایک خاص احترام رچ بس گیا تھا۔

میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے دیکھنے کے بجائے تم اپنی نظر اور توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھو۔ اردو ایک اہم زبان ہے جسے کوئی غیر پاکستانی بھی

استعمال کرسکتا ہے۔ بہر حال، میرا تعلق بھی پاکستان ہی سے ہے۔"

وسیم نے لیکسس اسٹریٹ چھوڑی اور کیب کو ہیسٹر اسٹریٹ پر ڈال دیا پھر مسرت بھرے لہجے میں بولا "ایک پاکستانی سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہورہی ہے لیکن آپ کی صورت مجھے ذہنی طور پر الجھا رہی ہے۔ بہر حال، السلام علیکم۔"

میں نے بھرپور انداز میں وسیم کے سلام کا جواب دیا اور کہا "صورت پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے، یہ اکثر دھوکا دے جاتی ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے بتادوں کہ میں بھی تمہاری طرح ایک مسلمان پاکستانی ہوں۔" میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب تم تھوڑی دیر تک مجھے مخاطب نہ کرنا۔ میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں...... اور ہاں...... ذرا احتیاط سے ڈرائیونگ کرو۔ میں کسی معمولی حادثے کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا۔"

وسیم نے بڑی فرمانبرداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ یلو کیب ہیسٹر اسٹریٹ پر آگے بڑھتی چلی گئی۔ وسیم سے بعد میں بھی گفت وشنید ہوسکتی تھی۔ پہلے میں ان کی خبر لینا چاہتا تھا جو ممکنہ طور پر مجھے راکیل تک پہنچانے کا سبب بن سکتے تھے۔

میں نے ان بدمعاشوں میں سے ایک کے خدوخال کو اپنے تصور میں ابھارا اور دوسرے ہی لمحے ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک گاڑی میں پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے یعنی ایک نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسرا پسنجر سیٹ پر موجود تھا۔ میں ان کے ماحول میں رہتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کون سے علاقے سے گزر رہے ہیں!

بینا رائے کو انہوں نے جس سلوک سے گزارا تھا، اس سے ان کی وحشت اور بربریت کا پتا چلتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، اپارٹمنٹ نمبر تھری فور میں بینا رائے اور ان میں کیا مکالمات ہوئے تھے لیکن میں محسوس کررہا تھا، بینا کو میرے فرار کی سزا دی گئی تھی۔ وہ راکیل کے بعد مجھے بھی اپنے قابو میں دیکھنا چاہتے تھے اور بینا اس سلسلے میں ناکام ہوگئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا، بینا اب ان کے لیے کسی کام کی نہ رہی ہو اور انہوں نے اوپری احکام پر اس کا پتا صاف کردیا ہو۔ بہر حال، سرِدست وثوق سے کوئی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔

میری جستجو رنگ لائی اور میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ لوگ اس وقت باوری کے اندر سے گزر رہے تھے۔ گاڑی باوری اسٹریٹ پر رہتے ہوئے شمال کی سمت بڑھ رہی تھی۔ میں اس اسٹریٹ سے گزر چکا تھا لہٰذا راستہ پہچاننے میں مجھے زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ ان لوگوں کا شمال کی طرف سفر کرنا مجھے یہ سوچنے پر مجبور کررہا تھا کہ کہیں وہ باسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ میں ربی موشے ہائمن کے پاس تو نہیں جارہے؟ اس تناظر میں ذہن اس نتیجے پر پہنچتا تھا، راکیل کو بھی وہیں کہیں پہنچایا گیا تھا۔ میں آنکھیں کھول کر ٹیکسی میں حاضر ہوگیا۔

وسیم میری جانب متوجہ ہوا تو اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی میں نے پوچھا "لٹل اٹلی پہنچنے کے لیے اور کتنی دیر لگے گی؟"

اس نے بتایا "ہم اس وقت ہیسٹر اسٹریٹ پر ہیں، یہ آگے چل کر آرچڈ، ایلن اور کرسٹی اسٹریٹ کراس کرے گی پھر ہم باوری اسٹریٹ پہنچ جائیں گے۔ لٹل اٹلی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ویسے آپ کو لٹل اٹلی میں کہاں جانا ہے؟"

"جب ہم لٹل اٹلی کے قریب پہنچیں گے تو بتادوں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "تم ٹیکسی کی رفتار کو ممکنہ حد تک بڑھادو۔ میں کچھ اور سوچنا چاہتا ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اس گاڑی کے ماحول میں پہنچ گیا جو ہمارے آگے شمال کی سمت بڑھ رہی تھی۔ وہ لوگ باوری کے آخری کنارے پر تھے۔ اگر وہ باوری اسٹریٹ پر ہی رہتے تو ایسٹ ویلج میں داخل ہوجاتے لیکن ہوسٹن اسٹریٹ سے انہوں نے گاڑی ایک جانب موڑلی یعنی وہ ایسٹ ہوسٹن اسٹریٹ پر آگئے۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ اسٹریٹ آگے کہاں جائے گی مگر یہ واضح ہوگیا کہ وہ ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ پر سائنا گاگ میں نہیں جارہے تھے اور یہ ایک نئی بات تھی۔ میں ان کے ساتھ چپکا رہا اور وہ مغرب کی سمت بڑھتے رہے۔ تھوڑا آگے جاکر براڈوے کو عبور کرنے کے بعد وہ دائیں طرف مرسر اسٹریٹ میں مڑ گئے۔ مرسر اسٹریٹ کی بائیں جانب مجھے رہائشی علاقہ نظر آیا۔ میں نے بڑی محنت سے اس علاقے کے بارے میں معلوم کرلیا۔ وہ "واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز" تھے۔ ان لوگوں کی گاڑی واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز کے احاطے میں داخل ہوئی تو میں ہائی الرٹ ہوگیا پھر آئندہ چند منٹ میں، میں ان کا سایہ بن کر ہاؤس نمبر انیس میں داخل ہوگیا جب وہ دونوں اپنے ان چار ساتھیوں کے پاس پہنچے جو راکیل کے اردگرد موجود تھے تو میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ میں راکیل کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

اسی وقت وسیم نے مجھے مخاطب کیا "سر! ہم لٹل اٹلی میں داخل ہورہے ہیں۔ آگے کے بارے میں کچھ بتائیں۔"

ہمارے درمیان اب باقاعدہ اردو میں بات چیت ہورہی تھی اور اس سے مجھے ایک خاص قسم کی خوشی بھی مل رہی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا اور وسیم سے کہا "تم باوری اسٹریٹ پر سفر جاری رکھو لیکن رفتار قدرے کم کرلو۔"

وہ ایک لفظ ادا کیے بغیر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ میں مسلسل ٹیکسی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دراصل مجھے شیوی کی تلاش تھی۔ بینا رائے سے موبائل فون پر بات کرنے والے نے بتایا تھا کہ انہوں نے راکیل کو لٹل اٹلی کے اختتام پر گھیرا تھا۔ اس وقت وہ لوگ شمال سے جنوب کی سمت سفر کررہے تھے۔ جب کہ ہم جنوب سے شمال کے رخ بڑھ رہے تھے اس لیے ہماری شیوی کو لٹل اٹلی کے آغاز پر کہیں سڑک کے کنارے کھڑا ہونا چاہیے تھا اور پھر وہ مجھے نظر آگئی۔

میں نے وسیم سے ٹیکسی روکنے کو کہا اور ٹیکسی رکنے پر میں باہر نکل کر شیوی کی طرف بڑھ گیا۔ یہ غنیمت تھا کہ ہم اپنا سامان ونگ ہنگ کے فلیٹ پر رکھ آئے تھے۔ صرف ڈرائیونگ لائسنس اور چند دیگر ضروری کاغذات ہمارے ساتھ تھے۔ شیوی کے مختصر معائنے سے میں نے اندازہ لگالیا کہ وہ لوگ راکیل کے ساتھ ہی وہ کاغذات بھی لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے کریڈٹ کارڈز بھی میں نے راکیل کو تھمادیے تھے۔ میں اپنی جیب میں سو، ڈیڑھ سو ڈالر رکھ کر بینا رائے کو چھاپنے نکلا تھا اور خود ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

میں واپس آکر ٹیکسی میں بیٹھا اور وسیم سے کہا "باوری اسٹریٹ پر آگے بڑھو اور ہوسٹن اسٹریٹ پر پہنچنے کے بعد لیفٹ کو مڑ جانا۔ ہمیں "واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز" تک جانا ہے۔"

"یہ ہاؤسز واشنگٹن اسکوائر کے نزدیک ہی ہیں۔" وسیم نے بتایا "یہ گرین وچ ویلج کا علاقہ ہے۔ نیویارک یونیورسٹی بھی ادھر ہی ہے لیکن سر!" وہ الجھن زدہ انداز میں لمحے بھر کو خاموش ہوا پھر پوچھنے لگا "آپ کو تو لٹل اٹلی تک جانا تھا، گرین وچ ویلج کا پروگرام کیسے بن گیا؟"

"لٹل اٹلی میں کام ختم ہوگیا۔ باقی کام ادھر واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز میں ہوگا۔" میں نے قدرے رکھائی سے کہا "کیا تمہیں گرین وچ ویلج کی طرف جانے پر کوئی اعتراض ہے؟"

"نو سر!" وہ جلدی سے بولا اور توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کردی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بینا رائے کا موبائل برآمد کیا۔ اس کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہوتے وقت میں موبائل فون اور لیڈی پسٹل اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ سلم ماڈل خطرناک پسٹل میری دوسری جیب میں تھا۔ میں نے موبائل سیٹ آن کیا۔ فون کی بیٹری تسلی بخش سگنلز ظاہر کررہی تھی دیگر سگنلز بھی ٹھیک تھے۔ میں نہیں جانتا تھا، بینا کے موبائل میں کریڈٹ کی کیا صورت ہے۔ میں اس وقت چائنا ٹاؤن میں مسٹر ونگ ہنگ سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے شیوی کے سلسلے میں ضروری ہدایات دینا چاہتا تھا ورنہ وہ بے چارہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے کسی بڑی مصیبت سے دوچار ہوجاتا۔ راکیل کو لے جانے والے اہم کاغذات بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

میں نے اسٹیٹ کوڈ ٹو ون ٹو پنچ کرنے کے بعد ونگ ہنگ کا نمبر ملایا اور اوکے کرنے کے بعد موبائل کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رات کے آخری پہر پہلی یا دوسری گھنٹی پر فون اٹینڈ کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی لہٰذا میں انتظار کرنے لگا۔ آخر چھٹی گھنٹی پر ریسیور اٹھالیا گیا اور ونگ ہنگ کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو۔ کون؟" میں نے اس کی آواز میں شامل جھلاہٹ کو واضح طور پر محسوس کیا۔

یہ تو ثابت ہوگیا کہ موبائل میں کریڈٹ موجود تھا۔ کتنا؟ اس بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس موبائل سیٹ کے بارے میں میری معلومات محدود تھیں۔

ونگ ہنگ کے استفسار کے جواب میں، میں نے کہا "ونگ ہنگ! میں ڈسلوا بات کررہا ہوں۔ اس وقت تکلیف دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں لیکن سمجھ لو ایمرجنسی ہے۔"

وہ میرا نام سنتے ہی ہشاش بشاش ہوگیا اور خوشدلانہ لہجے میں بولا "ہاں ڈسلوا! بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے کہا "مسئلے کی تفصیل تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم میرے چند سوالات کے جواب دو...... اور جیسا میں کہو، تم ویسا ہی کرنا۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

اس کی فرماں برداری سانگ فو کی ہدایات کا نتیجہ تھی۔

میں نے پوچھا "مسٹر ہنگ! تم نے جو شیورلٹ ہمیں دے رکھی ہے، اس کے بارے میں اور کس کو پتا ہے؟"

"صرف میرے ملازم کو۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے۔"

"جب وہ ہمارے پاس نہیں تھی تو رات کو تم اسے کہاں پارک کرتے تھے؟"

"اپنے اسٹوڈیو کے سامنے ہی۔" اس نے بتایا "لیکن مسئلہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "مسئلہ خاصا گمبھیر ہے۔ ہمارے ساتھ گڑبڑ ہوگئی ہے جس کے نتیجے میں تمہاری شیوی لٹل اٹلی میں ایک سڑک کے کنارے کھڑی ہے۔" پھر میں نے اسے شیوی کی درست لوکیشن بتائی اور کہا "تم صبح جب اپنے اسٹوڈیو جاؤ گے تو شیوی کو غائب پاؤ گے حالانکہ رات تم نے اسے وہیں پارک کیا تھا۔ تم فوراً اپنی گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کراؤ گے۔ تم ہمیں بالکل نہیں جانتے اور نہ ہی تم نے ہمیں گاڑی دی تھی۔ اپنے ملازم کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دینا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

میں سوالیہ انداز میں متوقف ہوا تو اس نے پُرسوچ لہجے میں کہا "تم فکر نہ کرو ڈسلوا! میں تمہاری بات کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔ تم جو کہہ رہے ہو، میں وہی کروں گا۔"

میں نے تنبیہی انداز میں کہا "کسی بھی حوالے سے تمہارا ہم سے کوئی تعلق یا واسطہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمہارے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"اوکے، میں حالات کی نزاکت کا خیال رکھوں گا۔" اس نے یقینی لہجے میں کہا۔

"میں بعد میں تم سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔" یہ کہہ کر میں نے موبائل پر رابطہ موقوف کر دیا۔

اس مرتبہ میں نے موبائل کو آف نہیں کیا اور اسی حالت میں جیب میں رکھ لیا۔ وسیم نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور کہا "کیا آپ کا نام ڈسلوا ہے؟"

پوچھنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو، مجھے تو یقین نہیں آیا۔ وسیم مجھے بھلا آدمی معلوم ہوا تھا۔ پتا نہیں، کیوں میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس سے جھوٹ نہ بولوں۔ شاید یہ ہمارے ہم مذہب اور ہم وطن ہونے کا اثر تھا۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غیر مذہب اور غیر وطن افراد سے غلط بیانی کرنی چاہیے۔ میں اپنے احساسات کو بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وسیم پر اعتبار کرنے اور اسے اپنے قریب لانے کے لیے میں غیر ارادی طور پر سوچ رہا تھا۔ دیارِ غیر میں کوئی اپنا مل جائے تو شاید سب کو اسی قسم کے احساسات کا سامنا ہوتا ہے!

میں نے وسیم کے سوال کا جواب دیا "یہ میرا فرضی نام ہے۔ میں تمہیں اپنے بارے میں بعد میں تفصیلاً بتاؤں گا۔"

"مجھے تو نام کی طرح آپ کا چہرہ بھی فرضی یعنی نقلی لگ رہا ہے؟" وہ شک زدہ لہجے میں بولا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔ میں اس وقت میک اپ میں ہوں۔"

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا "ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے فون پر کسی مسٹر ہنگ سے جو گفتگو کی ہے اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے، آپ نہایت ہی خطرناک حالات سے گزر رہے ہیں...... اور آپ اکیلے نہیں ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

وسیم کے لہجے میں حد درجہ ہمدردی اور خلوص بھرا ہوا تھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔ میری ایک ساتھی دشمن کے قبضے میں ہے۔ انہوں نے اسے ادھر واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز میں رکھا ہوا ہے۔ میں اپنی ساتھی کو چھڑانے کے لیے ہی ادھر جا رہا ہوں۔ وہ لوگ اس وقت ہاؤس نمبر انیس میں ہیں۔"

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں بھائی؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"وسیم نے "بھائی" کا لفظ اتنے خلوص اور اپنائیت سے ادا کیا تھا کہ میں روح تک متاثر ہو گیا۔ وہ دل کی گہرائی سے میری مدد کرنے کا خواہاں تھا۔ ایسے سچے جذبات والے پُرخلوص لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی ہاتھ آ جائے تو اس کے احساسات کی قدر کرنی چاہیے۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالی تو یوں لگا، وہ وسیم نہ ہو بلکہ امتیاز ہو...... شہزاد ہو......!

امتیاز، شہزاد اور وسیم تو محض پہچان ہیں۔ ایسے لوگوں کے اندر ایک جیسا جوہر ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اخلاص اور وفا کا علم بردار، دوست کی خاطر گردن تک کٹوانے کے لیے تیار! میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یقین کر لیا کہ قدرت نے وسیم کی شکل میں مجھے ایک وفا پیشہ شخص سے ملوا دیا تھا۔

میں نے بڑی توجہ سے وسیم کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا "وسیم! تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟"

"میں نے آپ کو بھائی کہا ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

میں نے کہا "مجھے بھائی بھی کہتے ہو اور میرے ہی سامنے جان دینے کی بات بھی کرتے ہو۔ تمہیں ذرا سی بھی حیا ہے؟"

اس نے اپنی آنکھوں کے نم ہوتے گوشوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور اپنی آواز کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بولا "مجھے ٹیکسی چلانا آتی ہے یا پھر لڑائی بھڑائی جانتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو تم بولو، میں کرنے کو تیار ہوں۔"

"بس اتنا ہی بہت ہے۔" وہ "آپ" سے "تم" پر آیا تو مجھے اچھا لگا "فی الحال، مجھے تمہاری انہی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

وہ خوش ہو گیا اور اسی خوشی میں اس نے ٹیکسی کی رفتار کو بھی بڑھا دیا۔ جلد ہی ہم باوری اور لٹل اٹلی کو پیچھے چھوڑ کر ہوسٹن اسٹریٹ میں داخل ہو گئے "منزل" پر پہنچنے سے پہلے وسیم نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا اس کے مطابق، وہ گزشتہ دو سال سے نیویارک میں ٹیکسی چلا رہا ہے۔ ان دو سالوں سے پہلے کا عرصہ بے کاری میں گزرا تھا۔ اس کی رہائش مین ہیٹن اپ ٹاؤن میں تھی۔ "شوگر ہل" کا علاقہ اگرچہ ہارلم میں واقع تھا تاہم یہ بہ نسبت محفوظ حصہ تھا۔ شوگر ہل میں مڈل کلاس لوگ رہتے تھے۔ میں نے وسیم سے جب متعصب سیاہ فام کا ذکر کیا تو اس نے بڑی عجیب بات کی۔ کہنے لگا "یہ کالے صرف چٹی چمڑی والوں کے دشمن ہیں اور ان کا سارا تعصب انہی لوگوں سے ہے۔ ہم چاہے کتنے بھی گورے کیوں نہ ہوں، یہ لوگ ہمیں ہلکی ہی سمجھتے ہیں اس لیے ہم پر ہاتھ نہیں ڈالتے۔ اِکا دُکا واقعات کی بات الگ ہے۔"

وسیم نوشہرہ روڈ گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا اور قسمت بنانے نیویارک آیا تھا۔ قسمت بنی یا نہیں بنی، البتہ وہ نیویارک کا ہو کر رہ گیا۔

اچانک موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے موبائل کو جیب سے نکالا اور کال اٹینڈ کی۔ دوسری جانب وہی شخص تھا جس کی آواز میں نے بینا رائے کے فلیٹ پر سنی تھی۔ میری "ہیلو" کے جواب میں اس نے کہا۔

"وجدان! تمہارا بھید کھل چکا ہے اپنی ساتھی کی واپسی کس حالت میں چاہیے؟"

اس نے مجھے براہ راست وجدان کے نام سے پکارا تو ایک لمحے کو میں ٹھٹکا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں سنبھل گیا اور کہا "میری دو ساتھی تم لوگوں کے قبضے میں ہیں۔ تم کس کی واپسی کی بات کر رہے ہو۔ ساحل یا راگیل؟"

جب ہمارا راز، راز نہیں رہا تھا تو میں نے بھی دو ٹوک انداز اختیار کر لیا۔ بات کرنے والے کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا، وہ ان سب میں سینئر ہے اور با اختیار بھی۔ اس کی بھاری آواز ایک مرتبہ پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔

"راگیل کو بھول جاؤ۔ اس نے ہم سے غداری کی ہے۔ ایک غدار اور باغی کی جو سزا ہونا چاہیے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ بدترین سزا سے گزرے گی۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے تمہاری ساتھی ساحل کا ذکر کیا ہے۔"

"مجھے اپنی دونوں ساتھی زندہ سلامت چاہئیں۔"

"تم سے بحث کرنا فضول ہے۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولا "بہرحال میں نے تم سے رابطہ اس لیے کیا ہے کہ اس موبائل کو آف نہ کرنا۔ محترم ربی کسی بھی وقت تم سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہی ہوا، تم رائے کے اپارٹمنٹ سے موبائل اٹھا لائے ورنہ تم سے رابطہ کیسے ہوتا۔"

وہ مجھے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا، وہ مجھے ٹریس کرنے کے لیے موبائل فون کو آن رکھنے کی بات کر رہا تھا۔ ممکن ہے، ان لوگوں کے پاس ایسی کوئی الیکٹرانک سہولت موجود ہو جس کی مدد سے وہ موبائل کی درست لوکیشن معلوم کر سکتے ہوں۔ اس شخص نے ربی کا حوالہ دیا تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ ربی کا کوئی خاص آدمی ہے۔ میں نے اس کی مکاری کو سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم رابطہ نہیں بھی کرتے تو میں تمہارے ربی سے بات کرنے ہی والا تھا۔"

"کک...... کیسے؟" اس کے استفسار میں حیرت تھی۔

میں نے بتایا "ایسے کہ میں اس وقت ربی موشے ہائمن کے قریب پہنچنے والا ہوں۔ میری ایک بات ذہن نشین کر لو اور اپنے ربی کو بھی سمجھا دو۔ میری ساتھیوں کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہونا چاہیے ورنہ تمہارا یہ گریٹ نیویارک اور اس کی فلک بوس عمارتیں ملبے کے ڈھیر میں بدل جائیں گی۔"

"تم بہت اونچے بول، بول رہے ہو جب کہ ربی اب بھی اپنے دل میں تمہارے لیے بہت گنجائش رکھتے ہیں۔"

اس شخص نے مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم بینا رائے کا پسٹل اور موبائل فون اٹھا لائے۔ اگر ہم چاہتے تو فوراً اس کی لائن بند کروا دیتے۔ موبائل تمہارے لیے بے کار ہو کر رہ جاتا مگر ہم نے......"

"ٹیں ٹیں بند کرو منحوس!" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے بہت سن لی تمہاری بک بک۔ میں تو صرف اس کا پسٹل اور موبائل اٹھا لایا ہوں، تم لوگوں نے تو اس کا جنازہ اٹھا دیا!" لمحے بھر کو میں نے توقف کیا۔ اس توقف میں دوسری طرف بولنے والے کو ایک جھٹکے کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ میں نے انکشاف ہی ایسا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے یہ کہتے ہی موبائل آف کر دیا۔

"میں ربی سے رابطہ کرنے یا اس تک پہنچنے کے لیے کسی موبائل فون کا محتاج نہیں ہوں اس لیے...... وش یو بیڈ لک آف آل آف۔"

دوسری جانب وہ سٹپٹا کر رہ گیا ہوگا۔ میں موبائل کو آن رکھ کر اپنے لیے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں اس وقت بولنے والے کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ باقی باتیں ''روبرو'' بھی ہوسکتی تھیں۔ ویسے ان لمحات میں ربی موشے ہائمن کی بے چینی نے مجھے مسرور کر دیا تھا۔ وہ میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا لیکن مجھے زیرِ دام لانے کے لیے وہ اب بھی محبت اور شفقت بھری مکاری سے کام لے رہا تھا۔ اگر وہ مجھ سے بات کرنا بھی چاہتا تو میں اسے بعد میں بھی یہ موقع فراہم کر سکتا تھا۔ فی الحال، راکیل کا معاملہ ''نمٹانا'' زیادہ ضروری تھا۔

واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز کے قریب پہنچ کر وسیم نے مجھ سے پوچھا ''کیا ٹیکسی کو احاطے کے اندر لے جانا ہے یا باہر ہی کہیں روک دوں؟''

''اندر لے جانا ٹھیک نہیں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''مگر زیادہ بہتر یہ ہے کہ روکنے سے پہلے اس رہائشی علاقے کا ایک چکر لگاؤ۔''

وسیم نے کیب کو مرسر اسٹریٹ پر ڈال دیا اور بولا ''یار وجدان!'' میں نے اسے اپنا نام بتا دیا تھا اور اس دوران میں ہمارے بیچ خاصی بے تکلفی بھی پیدا ہو چکی تھی ''تم نے موبائل فون پر جس سے بھی بات کی ہے اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے، تم کسی بہت ہی اونچے گیم میں ہو۔ خاص طور پر کسی ربی سے ٹکراؤ کا مطلب تو یہی ہے، پوری یہودی قوم کو اپنا دشمن بنالینا!''

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا ''گیم تو واقعی بہت خطرناک ہے۔ میں اس وقت یہودیوں کے نشانے پر ہوں۔ مجھے کمزور بنانے کے لیے انہوں نے میری ایک عزیز از جان ہستی کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔''

''راکیل یا ساحل؟'' وسیم کا استفسار عزیز از جان ہستی سے متعلق تھا۔

میں نے کہا ''میں ساحل کی بات کر رہا ہوں۔'' پھر اضافہ کیا ''راکیل بھی میری ایک جاں نثار دوست ہے۔''

''بڑی ہمت ہے تمہاری!'' وہ توصیفی انداز میں بولا ''یہودیوں کے اندر رہ کر ان سے اتنی زبردست ٹکر لی ہوئی ہے۔''

میں نے... پُرمعنی انداز میں کہا ''اب تمہاری ہمت دیکھنا ہے!''

''تم مجھے خود سے ایک قدم آگے ہی پاؤ گے۔'' وہ جی داری سے بولا۔

میں وسیم کی مدد اور تعاون کا محتاج نہیں تھا تاہم اس نے جتنے خلوص اور عزم سے میرا ساتھ دینے کی بات کی تھی، اس سے میرا سیروں خون بڑھ گیا۔ یہ دنیا سچے دوستوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے۔ دیارِ غیر میں وسیم جیسے کسی ولولہ انگیز شخص کا مل جانا کسی نعمت سے کم نہیں! اس معاملے میں، واقعی میں بڑا خوش قسمت ثابت ہوا تھا۔

ہم نے مرسر اسٹریٹ، ویسٹ تھرڈ اسٹریٹ، ویسٹ براڈوے اور ویسٹ ہوسٹن اسٹریٹ پر سفر کرتے ہوئے واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز کا ایک چکر لگایا پھر ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے وسیم سے ٹیکسی روکنے کو کہا۔ وہ مقام احاطے کی انٹرنس کے نزدیک ہی تھا اور نیم تاریکی میں واقع تھا۔ یہاں احاطے سے مراد کوئی باقاعدہ چار دیواری نہیں بلکہ ایک خاص حد ہے۔ مذکورہ ہاؤسز سڑک سے تھوڑا ہٹ کر بنے ہوئے تھے۔ ان کے اور سڑک کے درمیان واقع جگہ ہی ان کا احاطہ تھا۔ اس حصے میں خوب صورت گھاس اگائی گئی تھی۔

میں اکیلا ہی ہاؤس نمبر انیس میں جانا چاہتا تھا لیکن وسیم بھی مچل گیا اور میں اس کے جوش کو دیکھتے ہوئے ساتھ لے جانے پر مجبور ہوگیا۔ بیٹا رائے والا چھوٹا پسٹل میں نے وسیم کے حوالے کر دیا۔ اس نے میرا ساتھ دے کر خود کو ایک بہادر اور نڈر شخص ثابت کر دیا تھا ورنہ اس حیثیت کے لوگ امریکیوں اور خصوصاً امریکی طاقت و ریہودیوں کے خلاف قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے!

ٹھیک ساڑھے تین بجے ہم ہاؤس نمبر انیس کے سامنے کھڑے تھے۔ واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز میں اس وقت سناٹے کا راج تھا۔ نیو یارک کے یخ بستہ موسم نے ہر شے کو خاموشی کی دبیز چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے وسیم سے کہا ''وہ لوگ مجھے پہچانتے ہیں اور میک اَپ کا راز بھی ان پر کھل چکا ہے لہٰذا تم فرنٹ پر رہو۔ جو بھی دروازہ کھولے یا کھولے بغیر استفسار کرے، تم کوئی بھی فرضی نام بتا کر راستہ صاف کرنے کی کوشش کرنا، باقی میں سنبھالوں گا۔ ہمیں ہر صورت میں اندر داخل ہونا ہے۔ میں ایک سائیڈ میں کھڑا ہوں۔ تم گھنٹی کا بٹن دباؤ۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بٹن پر انگلی رکھ دی۔ میں ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ یہ احتیاط اس لیے بھی ضروری تھی کہ اگر یہاں کے منظر کو اندر کہیں دیکھا جا رہا ہو تو میں ان لوگوں کی نظر میں نہ آؤں۔

دوسری گھنٹی پر دروازہ نیم وا ہوا، پھر اس سے پہلے کہ اندر سے کوئی استفساری آواز ابھرتی، وسیم نے بڑی پھرتی دکھائی اور دروازے کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے چشم زدن میں

ے اندر پہنچ گیا۔ میں اس موقع پر بھلا کہاں چوکنے والا میں نے ایک طویل قلانچ بھری اور دوسرے ہی لمحے وسیم ''تعاقب'' میں، میں بھی روم نمبر انیس میں داخل ہو چکا اندر پہنچتے ہی میں نے دروازے کو لاک کر دیا پھر وسیم کی متوجہ ہوا۔

وہ ایک شخص سے گتھم گتھا اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا غالباً یہ وہی بدنصیب تھا جو دروازہ کھولنے کے لیے آیا اس کی صورت پر میری نگاہ گئی تو اسے پہچاننے میں مجھے دشواری محسوس نہ ہوئی۔ اسی شخص نے راکیل کے فنگر حاصل کیے تھے۔ وہ ایک گراں ڈیل شخص تھا۔

اسی لمحے گھر کے اندرونی حصے سے ایک تحکمانہ آواز ''الفریڈ! تم کس سے الجھ رہے ہو۔ یہ اٹھا پٹخ کی یں کیسی آ رہی ہیں؟''

استفسار کرنے والے کی آواز نے پلک جھپکنے میں مجھے یہ وہی شخص تھا، موبائل فون پر میں نے دو مرتبہ جس کی سنی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا ''تم اس سانڈ سے نمٹو۔ دھر جا رہا ہوں۔''

میرے اندازے کے مطابق، راکیل کے علاوہ اس گھر تھے افراد کو ہونا چاہیے تھا۔ ابھی تک ہماری صرف ایک ملاقات'' ہوئی تھی یا پھر دوسرے کی آواز سنائی دی تھی۔ سے پہلے کہ میں اس آواز کے حامل شخص تک رسائی کرتا، اچانک سامنے سے ایک گن بردار نمودار ہوا۔ مجھ پڑتے ہی وہ ٹھٹکا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کے ت ابھرے، اگلے ہی لمحے اس نے گن سیدھی کرنا چاہی اس سے پہلے ہی حرکت میں آ گیا۔

میں نے ایک لمبی جست بھری اور فرش پر رول کرتے ایک صوفے کے عقب میں پہنچ گیا۔ فائر کی آواز گونجی صوفے کے ''گداز'' میں کہیں دھنس کر رہ گئی۔ اس کی میں نے بھی ایک ہی نظر میں اسے شناخت کر لیا تھا۔ اسی امت شخص نے راکیل کو انجیکشن دیا تھا۔

صوفے کے پیچھے پہنچتے ہی میں نے میکانکی انداز میں قدام کا فیصلہ کیا اور اس سے پہلے گن بردار دوسرا فائر میں نے صوفے کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے اس کی اچھال دیا۔ اس وقت مجھ پر ایک عجیب سی وحشت سوار بن خاصا جنونی ہو رہا تھا۔

صوفہ کسی بھاری بھرکم گولے کے مانند گن بردار سے ہوا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور وہ کو اپنے اوپر لیتے ہوئے عقب میں زمیں بوس ہوگیا۔

گن اس کے ہاتھ سے نکل کر میرے قریب آ گری۔ میں نے گن پر قبضہ کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کی اور بڑی سرعت سے زمیں بوس شخص کی جانب بڑھا۔

اسی لمحے تحکمانہ آواز ایک مرتبہ پھر ابھری ''یہ کیا ہو رہا ہے گراہم۔ تم نے کس پر گولی چلائی ہے؟'' اب اس آواز میں جھنجلاہٹ کے ساتھ... فکر بھی شامل ہوگیا تھا۔

میں نے دراز قامت شخص کو جواب دینے کی مہلت فراہم نہ کی اور دوسرا صوفہ اٹھا کر اس کے اوپر پھینک دیا۔ پہلے صوفے نے تو اسے ایک زوردار دھکا ہی مارا تھا، اس صوفے نے اس کا کچومر نکال دیا۔ اس کے حلق سے ''اوں'' سے مشابہ ایک آواز خارج ہوئی اور وہ وزنی صوفے کے نیچے بے حس و حرکت ہوگیا۔ میں گن سونتے اس آواز کی سمت بڑھ گیا جو اپنے ساتھیوں گراہم اور الفریڈ سے ہمارے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔

آواز کی سمت کو ذہن میں ٹیون کر کے میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچا پھر تیسرے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر قدم رکھنے ہی والا تھا کہ کسی نے عقب سے مجھے دھکا دیا۔ میں چونکہ خاصی اسپیڈ میں تھا اس لیے کمر پر پش لے کر میں لڑکھڑایا اور منہ کے بل قالین پوش فرش پر آ رہا تاہم گن پر میری گرفت برقرار رہی۔

میں نے ردِعمل ظاہر کرنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور بجلی کی سی تیزی سے پلٹ کر اپنے عقب میں فائر کر دیا۔ ادھر گولی چلی، ادھر اس شخص کی چیخ بلند ہوئی جو میری فائرنگ کی زد میں آیا تھا۔ وہ ایک صحت مند اور توانا شخص تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میری گن سے چلنے والی گولی نے اس کے بازو کو چھید ڈالا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اپنے گھائل بازو کو تھامتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا ''وجدان! گن پھینک دو۔ تم چوہے دان میں قدم رکھ چکے ہو، خواہ مخواہ کی ایفی شینسی دکھا کر تم اپنی مشکلات میں اضافہ ہی کرو گے۔''

میں اس وقت ڈسلوا کے روپ میں تھا مگر اس شخص نے مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس سے پہلے موبائل پر بات کرنے والے نے بھی مجھے وجدان ہی کہا تھا۔ زخمی شخص مجھے کسی ''شرارت'' کے موڈ میں نظر آیا لہٰذا میں نے پہلی فرصت میں اس کی ہدایت پر عمل کیا اور گن کو اس کے منہ پر دے مارا۔ گن پھینکنا اور کیا ہوتا ہے!

اس نے گردن کی حرکت سے جھکائی دی، گن اس کے اوپر سے اڑتی ہوئی سامنے والی دیوار پر جا لگی۔ پھر اس سے

قبل کہ اس کا جھکا ہوا سر دوبارہ اٹھتا، میں نے ایک دھواں دھار فرنٹ کک اس کے چہرے پر رسید کردی۔ وہ پیچھے کو الٹنے کے لیے پر تولنے لگا تو میں نے ہوا میں اچھلتے ہوئے ایک زبردست فرنٹ فلائنگ کک جڑ دی۔ وہ عقب میں لڑھکتے ہوئے دور جا گرا اور گرنے سے پہلے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔

یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں فائٹ کو طول دیتا۔ مجھے جلد از جلد راکیل تک پہنچنا تھا لہٰذا میں نے مدِمقابل کو نظر انداز کیا اور گھر کے دوسرے حصے کی جانب بڑھ گیا۔ گراہم اور الفریڈ سے استفسار کرنے والے کی آواز آنا اچانک بند ہوگئی تھی۔ ابھی ابھی میں نے جس شخص کی درگت بنائی تھی اس کے نام سے میں واقف نہیں تھا۔ بہرحال، ابھی دو افراد باقی تھے جن کی صورت دکھائی دی تھی اور نہ ہی آواز سنائی دی تھی...... اور میرے خیال میں یہ وہی افراد تھے جو میری تلاش میں بینا رائے کے اپارٹمنٹ پر پہنچے تھے۔ مجھے نہ پاکر انہوں نے میرے غیاب کا ذمے دار بینا رائے کو سمجھتے ہوئے بڑی بے دردی سے اُسے ٹھکانے لگادیا تھا۔

میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکراتا رہا لیکن راکیل کہیں دکھائی نہ دی۔ میرا تصور مجھے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے آخری مرتبہ راکیل کو یہیں ایک کرسی پر بندھے ہوئے دیکھا تھا لیکن اب وہ کرسی کہیں نظر آرہی تھی اور نہ ہی راکیل۔ اور تو اور، منحوس تحکمانہ آواز کا حامل وہ شخص بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس صورتِ حال میں میرا گڑبڑا جانا لازمی تھا۔

میں زیادہ دیر تک یہاں رکنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس گھر میں فائرنگ ہوچکی تھی۔ رات کا آخری پہر سہی لیکن آس پڑوس سے اگر کوئی پولیس کو فون کردیتا تو ہمارے لیے بڑی مشکل ہوجاتی۔ میں خود کو پیش آمدہ حالات کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وسیم کی صورت دکھائی دی۔

''تمہاری ساتھی مل گئی وجدان؟'' مجھ سے نگاہ ملتے ہی اس نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہوگیا اور الجھ کر بولا ''ہم ٹھیک جگہ پر تو آئے ہیں نا؟''

''جگہ تو ٹھیک ہی ہے مگر لگتا ہے، حالات کچھ گڑبڑ ہوگئے ہیں۔'' میں نے کہا ''راکیل کے علاوہ دو اور افراد بھی غائب ہیں اور...... وہ شیطان بھی پتا نہیں، کہاں چلا گیا۔ میں نے موبائل فون پر جس سے بات کی تھی۔ یہاں بھی اس کی جھنجلائی ہوئی آواز میں نے دو مرتبہ سنی ہے۔''

''آؤ، دیکھتے ہیں۔'' وسیم نے پُراعتماد لہجے میں... ایک جانب بڑھ گیا۔

آئندہ دو تین منٹ میں ہم نے ہاؤس نمبر انیس کا... جھانک مارا لیکن ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی... نے اپنے شکار الفریڈ کو اتنا غفیل کردیا تھا۔ اس کا... حرکت جسم بیرونی دروازے کے قریب ہی پڑا تھا۔... گینڈا نما الفریڈ کو گھسیٹ کر اس کے دراز قامت ساتھی... کے پاس پہنچادیا۔ گراہم ہنوز وزنی صوفے کے نیچے... تھا۔ میں نے رکوع کے بل جھک کر اس کا جائزہ لیا۔... گہری بے ہوشی میں تھا یا پھر وہاں پہنچ چکا تھا جہاں کی خبر نہیں ہوسکتی تھی۔ بادی النظر میں مجھے اس میں زندگی کے... دکھائی نہ دیے۔

اس شخص نے راکیل کو کوئی زود اثر انجکشن دے... مافیہا سے بے خبر کردیا تھا۔ گراہم کے لیے میرے دل... غصے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں دانت پیستے ہوئے... کھڑا ہوا اور اس کے نحوست مآب تھوبڑے پر ایک... رسید کردی۔

اسی وقت گھر سے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہو... مخصوص آواز ابھری۔ رات کے آخری پہر ہر طرف... بسیرا تھا۔ اس لیے وہ آواز بڑی واضح سنائی دی۔ میں... وسیم نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے کہا۔

''وہ شیطان کی اولاد یہاں سے فرار ہورہا ہے... اپ۔''

یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں وہی شخص موجود... سے موبائل فون پر میری بات ہوئی تھی۔ گراہم اور... ہماری نظروں کے سامنے موجود تھے اور وہ شخص جس... میں، میں نے گولی اتاری تھی، وہ بھی دیوار کے سا... سدھ پڑا تھا۔ شاید اس کا سر دیوار کے ساتھ خطرناک... میں ٹکرا گیا تھا۔ جس کے سبب اسے دوبارہ اٹھنے کی تو... ہوئی۔ ننانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ فرار ہو... شخص وہی تھا جو اب تک تحکمانہ انداز میں بولتا آیا تھا۔

ہم نے گنز کو اپنی اپنی جیب میں رکھا اور اپارٹمنٹ... باہر نکل آئے۔ مذکورہ شخص کا فرار اس بات پر دلالت... کہ راکیل اس گھر میں موجود نہیں تھی ورنہ وہ یوں... بھاگنے کی کوشش نہ کرتا۔ راکیل اگر وہاں نہیں تھی تو... تھی؟ تھوڑی دیر پہلے میں نے اسے اسی گھر میں... تھا۔ دس پندرہ منٹ کے اندر وہ کہاں غائب ہوگئی... ...ب کردیا گیا؟ جو کچھ بھی ہوا تھا، انہی دس پندرہ منٹ کے... ہوا تھا۔

میں انہی الجھن زدہ خیالات کو ذہن میں بسائے وسیم ساتھ گھر سے باہر نکلا تو ایک سیاہ گاڑی کو مرسر اسٹریٹ پر ...تے دیکھا۔ یہ ہماری مطلوبہ گاڑی کے سوا اور کوئی نہیں ...تھی۔ ڈرائیونگ کا انداز بتاتا تھا، وہ شخص شدید افراتفری ...کے عالم میں وہاں سے جارہا تھا۔ یقیناً ہاؤس نمبر انیس میں ...ورفت کا کوئی اور دروازہ بھی موجود تھا جہاں سے وہ فرار ...تھا۔ ہمارے، یلو کیب میں بیٹھنے تک وہ اپنی گاڑی کو مرسر ...یٹ سے دائیں جانب ویسٹ تھرڈ اسٹریٹ پر موڑ چکا...

میں نے ہیجانی انداز میں وسیم سے کہا ''اس کا پیچھا کرو۔ ...نے نہ پائے۔''

اس نے کوئی جواب دیے بغیر ایک جھٹکے سے یلو کیب ...ے بڑھادی پھر دیکھتے ہی دیکھتے یلو میڈیلین ہوا سے باتیں ...نے لگی۔ رات کے اس پہر مین ہیٹن کی سڑکیں ویران ...لہٰذا ہم جلد ہی سیاہ گاڑی کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ ...ٹ تھرڈ اسٹریٹ کو چھوڑ کر براڈوے پر مڑا پھر اپنی گاڑی کو ...کی سمت بھگاتا چلا گیا۔ ایسٹ ایٹتھ اسٹریٹ تک ہم آگے ...رہے پھر جب وہ مذکورہ بالا اسٹریٹ پر مڑا تو ہمارے ...ان فاصلہ بڑھ چکا تھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''وسیم! وہ نکلا جارہا ہے۔ تم کیا کررہے ہو؟''

وسیم نے پُراعتماد انداز میں کہا ''یار! وہ کہیں نہیں جائے ...م دیکھو، میں اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وسیم نے یلو کیب کی رفتار میں بے پناہ ...نہ کردیا۔ اسٹریٹ خالی ہونے کے باعث لین کا کوئی ...باقی نہیں رہا تھا۔ اسی اسٹریٹ پر رہتے ہوئے ہم نے ...ے پیچھے تھرڈ ایونیو کو کراس کیا اور جب ہم سیکنڈ ایونیو کے ...ب پہنچے تو وسیم نے رانگ سائیڈ سے کیب سیاہ گاڑی کے ...نے کردی۔ مجبوراً اسے بریک لگانا پڑے۔ وہ ہمارے پیچھے ...ٹ کے فاصلے پر رکا تھا۔

اسی لمحے اس شخص کے چہرے پر میری نگاہ گئی اور میں ...اسے پہچان لیا۔ وہ انہی چاروں میں سے ایک تھا جنہیں ...نے تصور کی نظر سے راکیل کے آس پاس دیکھا تھا اور جن ...سے تین اس وقت ہاؤس نمبر انیس میں دنیا و مافیہا سے ...بر پڑے تھے۔

سیاہ گاڑی جیسے ہی رکی، میں اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول ...باہر نکل آیا۔ گن میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا امکان صفر کے برابر تھا کہ وہ مسلح ہوگا۔ اگر اس کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو وہ ہمیں اپنے تعاقب میں آنے سے روکنے کی کوشش ضرور کرتا۔ وہ جس افراتفری کے عالم میں نمبر انیس سے نکلا تھا، اس میں اپنی جان کو ساتھ رکھنا ہی غنیمت تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ کہیں وہ مجھے اپنی جانب گن بہ دست بڑھتا دیکھ کر گاڑی کو بیک گیئر میں نہ ڈال دے۔ میں نے اس کی سٹی گم کرنے کے لیے پسنجر سیٹ کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔

گاڑی کی ونڈ اسکرین ایک مخصوص آواز کے ساتھ ''داغ دار'' ہوگئی تاہم گولی چلنے کی آواز نے رات کے سناٹے کو مجروح کردیا۔ میں نے اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک اور فائر کردیا۔ میں نے یہ گولی بھی بے نشانہ چلائی تھی۔ نتیجہ میری توقع کے عین مطابق برآمد ہوا اور اس شخص نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر ایک جانب دوڑ لگادی۔

میں گن لہراتا ہوا اس کے تعاقب میں لپکا۔ میں ہرگز اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میں تو اسے زیرِ دام لاکر اس کے اندر سے بہت کچھ برآمد کرنا چاہتا تھا۔ ذرا پتا تو چلتا، رعب دار آواز میں احکام صادر کرنے والا وہ شخص کتنے پانی میں ہے...... اور اگر پانی میں نہیں ہے تو اسے کتنے پانی میں پھینکنا چاہیے!

وہ میرے آگے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ میری فائرنگ نے اسے اچھا خاصا دہشت زدہ کردیا تھا۔ وہ چاہے کتنا بھی تیز دوڑتا، مجھ سے زیادہ تیزی نہیں دکھا سکتا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں سیکنڈ ایونیو پر دائیں جانب مڑا اور آگے جاکر ''ٹمل کالجیٹ چرچ'' کے سامنے اسے چھاپ لیا۔

جب وہ ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' والی صورتِ حال سے دوچار ہوا تو بھاگنے کا خیال ذہن سے نکال کر ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق مجھ پر حملہ آور ہوگیا۔ میں چرچ کے سامنے کوئی میلہ نہیں لگانا چاہتا تھا لہٰذا دو چار جان دار تکنیکی ہاتھ مار کر اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔

اسی اثنا میں وسیم کیب کو ہمارے قریب لے آیا۔ ہم دونوں نے ڈنڈا ڈولی کرکے اس شخص کو ٹیکسی کی عقبی نشست پر پہنچایا۔ میں خود بھی وہیں گھس بیٹھا۔ وسیم نے لپک کر اسٹیئرنگ سنبھالا اور کیب کو آگے بڑھادیا۔

میں نے عقبی سیٹ کا منظر دکھانے (ڈرائیور کو) والے آئینے میں وسیم کو دیکھا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا اور آنکھوں کے اشارے سے پوچھا ''کہاں...... کس طرف چلوں؟''

میں نے اشاراتی زبان میں جواب دیا ''جہاں......

جدھر جی چاہے، چلو۔''

پھر اپنے شکار کو سنانے کے لیے کھردرے لہجے میں کہا ''میں پارٹیشن گلاس کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ذرا ''جان'' سے دو چار ضروری باتیں کرنا ہیں۔ تم بھی اپنا کام جاری رکھو۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے زیرِ دام آئے شخص کو زبردستی دھکیل کر اپنے پاؤں میں پہنچادیا۔ اس خلا میں سکونت اختیار کرنے کے بعد وہ آس پاس سے گزرنے والوں کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ ہمارے اور وسیم کے درمیان شیشے کی دیوار حائل ہوگئی تو میں نے دھیمی لائٹ میں اپنے شکار کا جائزہ لیا۔

اس کی عمر لگ بھگ چالیس رہی ہوگی۔ وہ ایک صحت مند اور مضبوط شخص تھا لیکن میں نے مارشل آرٹس کے خطرناک ہاتھ دکھا کر اسے بے بس کردیا تھا۔ گن بدستور میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''سائمن!'' اس نے بتایا۔

''راکیل کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا ہے؟''

''پپ...... پتا نہیں۔'' وہ لرزاں آواز میں بولا ''وہ ہمارے پاس نہیں تھی۔''

میں نے اس کی ناک پر گن کا دستہ مارا۔ تکلیف کی شدت سے وہ بلبلا اٹھا۔ کیب کے شیشے پوری طرح چڑھے ہوئے تھے اس لیے اس کی بلبلاہٹ گاڑی سے باہر نہ جاسکی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خونخوار لہجے میں کہا۔

''تین اور ساڑھے تین بجے کے درمیان راکیل ہاؤس نمبر انیس میں موجود تھی۔ تم لوگ لٹل اٹلی میں اسے گھیرنے کے بعد اپنے ساتھ واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز کی طرف لے آئے تھے۔ کیا میرا تعارف کرواتے وقت تمہارے ربی نے یہ نہیں بتایا کہ میں جھوٹ کو برداشت نہیں کرتا؟''

وہ اپنی ناک سے پھوٹنے والے خون کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولنے لگا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ واقعی مجھے راکیل کے ٹھکانے کا علم نہیں۔ تم کس بنا پر دعویٰ کررہے ہو کہ وہ ہمارے پاس تھی؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ہمارے ساتھی اسے کہیں اور لے گئے......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ایک دردناک ٹھڈا مارا اور حقارت آمیز لہجے میں کہا ''جھوٹ پر جھوٹ ناقابلِ معافی جرم ہے۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ ربی نے تمہیں صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ میں وجدان ہوں، اور کی ڈسلوا کے میک اپ میں، نیویارک میں داخل ہوا ہوں۔ تم جلد از جلد مجھ پر قابو پاکر اس کے پاس پہنچادو جیسا کہ تم نے راکیل کو قابو کرلیا ہے مگر افسوس......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''افسوس کہ تم لوگوں کو میری خطرناکی سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ میں تمہیں جس اذیت ناک تجربے سے گزارنے والا ہوں، تم اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔''

''میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور گن کے دستے کو ایک مرتبہ پھر زحمت دی۔ وہ ذبح ہوئے کسی جانور کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے اس کی تکلیف کی پروا کیے بغیر ایک اور ضرب لگائی۔ ان لوگوں کو میرے ہاتھ سے جو تکلیف پہنچ رہی تھی، وہ اس تکلیف کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھی جس سے میں اس وقت گزر رہا تھا۔ اس کی چیخیں تھمیں تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں نے ہی موبائل پر تمہاری وہ کال اٹینڈ کی تھی جس میں تم نے بینا رائے کو راکیل کے بارے میں بتایا تھا اور میرے سلسلے میں بھی ضروری ہدایات کی تھیں۔ اس وقت تک میں بینا رائے کو اپنے قابو میں کرچکا تھا۔'' میں نے اس کا بھرم کھولتے ہوئے کہا ''سیوارڈ پارک اپارٹمنٹس میں پہنچنے والے تمہارے دو ساتھیوں نے رائے کے ساتھ کیا کیا، وہ تمہیں پتا ہے کیونکہ وہ یہ کارنامہ انجام دینے کے بعد سیدھے تمہارے پاس واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز پہنچے تھے!''

اس کی آنکھوں میں خوف زدگی کے آثار پیدا ہوئے جن میں استعجاب کا عنصر غالب تھا۔ میرے انکشاف نے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے مزید کہا۔

''تم لوگ جب راکیل کو لے کر اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو اسے ایک کرسی پر جکڑ دیا گیا۔ پھر الفریڈ نے اس کے پرنٹس لیے اور گراہم نے اس کو ایک انجکشن لگایا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ حیرت کی شدت سے پھٹ پڑا ''تم نے یہ سب کیسے دیکھا؟''

''جیسے اس وقت میں موت کو تمہارے آس پاس منڈلاتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے بے رحمی سے کہا ''اگر تم نے میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات نہ دیے تو پھر یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہوگی!''

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا ”کیا تم کوئی جادو جانتے ہو؟“

”میں کیا کیا جانتا ہوں، یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا ”اور اب میں تمہاری زبان سے کوئی سوال نہ سنوں۔ میں تمہیں صرف ایک منٹ کی مہلت دے رہا ہوں۔ ان ساٹھ سیکنڈ میں اچھی طرح غور وفکر کرلو، تمہیں مرنا ہے یا راکیل کے بارے میں درست معلومات فراہم کرکے زندگی کو انجوائے کرنا ہے...... اور تمہارا وقت شروع ہوگیا!“

سائمن کو میرے سلوک اور انکشاف نے پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ اس پر میں نے ایک منٹ کی مہلت دے کر گویا اس کی زندگی کے ساتھ کاؤنٹ ڈاؤن ٹائم بم منسلک کردیا۔ اسے مزید دہشت زدہ کرنے کے لیے میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ٹکادی جس پر گزرنے والا ہر سیکنڈ، موت کو اس کی زندگی کے قریب لانے کا اعلان کررہا تھا۔ ان لمحات میں سائمن کی حالت دیدنی تھی۔ پیشانی کے ایک ہی مقام پر پڑنے والی دو چوٹوں نے ایک ”آلو“ کو جنم دے دیا تھا۔ اس کے ماتھے کا گومڑ کسی بے ڈھنگے آلو ہی سے مشابہ تھا۔ ناک سے نکلنے والے خون نے اس کے چہرے کو مزید بھیانک بنا رکھا تھا۔ اگر سائمن دہشت اور خوف کی انتہا کو پہنچا ہوا تھا تو میری وحشت اور جنون کی ڈگری بھی معمولی نہیں تھی۔

اس دوران میں وسیم نے نہایت ہی چابک دستی سے کیب کو ایسٹ ففتھ اسٹریٹ میں موڑ کر سیکنڈ ایونیو کو خیرباد کہہ دیا پھر کوپر اسکوائر سے تھرڈ ایونیو میں داخل ہوگیا۔ اب وہ تھرڈ ایونیو پر شمال کی سمت میڈیلین کو بھگائے چلا جارہا تھا۔ اس کا موڈ اور تیور یہی ظاہر کررہے تھے کہ وہ اپ ٹاؤن مین ہیٹن میں ہارلم کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وسیم کی رہائش ہارلم کے قدرے محفوظ علاقے ”شوگر ہل“ میں تھی۔

”ایک منٹ پورا ہوگیا سائمن!“ میں نے گن اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سفاکی سے کہا ”تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”مجھے مار کر تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا!“ وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔

”اسی لیے تو تم سے راکیل کا پتا ٹھکانا پوچھ رہا ہوں۔ میں تمہیں زندہ رکھ کر راکیل کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے اپنی سفاکی میں کوئی کمی لائے بغیر کہا۔

سائمن کی آنکھوں میں متضاد کیفیت کے رنگ ایک ساتھ لہرائے اور وہ مجھے تذبذب کی انتہا پر کھڑا دکھائی دیا۔ میں نے گن کی نال کو اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والے ابھار کے اوپر ٹکادیا اور اس کی آنکھوں میں گھورنے لگا۔

سائمن کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی اور وہ مردہ سی آواز میں بولا ”وجدان! تم مجھے مار ہی دو تو اچھا ہے کیونکہ...... کچھ نہیں ہوسکتا۔ تم راکیل کو کبھی حاصل نہیں کر......“

”کیوں؟“ میری غراہٹ نے سائمن کو دہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے پیٹ کے نازک حصے پر کاری ٹھوکر لگائی اور کہا ”قسطوں میں بات نہ کرو۔ جلدی بتاؤ، راکیل کے ساتھ تم لوگوں نے کیا کیا ہے اور وہ اس وقت کہاں ہے؟“

”دریائے ہڈسن کی تہ میں۔“ سائمن نے نحیف آواز میں بتایا۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ میں سمجھا، شاید مجھے مغالطہ ہوا ہے۔ سائمن نے کچھ اور کہا اور میں نے کچھ اور سنا۔ تھوڑی دیر پہلے تک راکیل ہاؤس نمبر انیس میں موجود تھی تو ہڈسن ریور کی تہ میں کیسے پہنچ گئی۔

میں نے چیخ کر پوچھا ”کیا بک رہے ہو؟“

اس نے میرے اس چیختے ہوئے سوال کے جواب میں جو کچھ بتایا وہ بہت ہی اندوہناک اور دل خراش تھا۔ اس کے مطابق، گراہم نے راکیل کے بازو میں جو انجیکشن لگایا تھا وہ درحقیقت ایک خطرناک پائزن تھا۔ جس نے چند سیکنڈ میں راکیل کی زندگی کا چراغ گل کردیا۔ پھر ان کے دو ساتھی لاش سمیت راکیل کو ہاؤس نمبر...... انیس سے دریائے ہڈسن کی طرف لے گئے تھے۔ یہ وہی دو افراد تھے جنہوں نے چارلس کے اپارٹمنٹ میں پہنچ کر اسے ٹھکانے لگایا تھا۔ سائمن نے مجھے بتایا کہ راکیل کو اسی آہنی کرسی پر بندھا رہنے دیا تاکہ کافی دنوں تک راکیل کا کوئی سراغ نہ ملے بلکہ ان لوگوں نے جو بندوبست کیا تھا اس کے پیشِ نظر تو یہ سراغ کبھی نہ ملتا۔ آہنی کرسی دریائے ہڈسن کی تہ میں پڑی رہتی اور راکیل کی ڈیڈ باڈی......!

میں اس سے آگے کچھ سوچ سکا اور نہ ہی سن سکا۔ میں نے سائمن سے مزید کوئی سوال بھی نہ کیا۔ میرے سارے سوال بے جواب ہوکر رہ گئے تھے جب راکیل ہی اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی تو پھر میں بے سود سوالات میں وقت برباد کرتا۔ اب پتا چلا کہ ہاؤس نمبر انیس میں راکیل دکھائی کیوں نہیں دی تھی!

اس وقت میرا دماغ کسی تنور کے مانند دہک رہا تھا اور سینے میں چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ راکیل چند روز کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی۔ سائمن کو ...جن حالات سے گزار رہا تھا ان میں وہ دروغ گوئی جیسی ...نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے مجھے جو بتایا، ویسا ہوا ہوگا...... ...سب کچھ ربی موشے ہائمن کی منظوری بلکہ حکم پر ہوا تھا۔ ...کے لیے میرے دل میں نفرت کا ایک پہاڑ کھڑا ہوگیا۔ ...کی الم ناک موت نے میرے دماغ کو پہلے ہی منتشر کر ...تھا۔ میرا جنون انتہا کو پہنچ گیا۔ میں نے گن کی نال کو ...کی پیشانی میں گڑایا اور خون خوار لہجے میں کہا۔

”اگر راکیل ہڈسن ریور کی تہ میں پہنچ گئی ہے تو تم آؤٹ ...واٹر کیا کررہے ہو؟“

اس نے آنکھیں بند کرلیں گویا اسے یقین ہوگیا ”اب ...دو پل کے لیے زندہ ہے۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے ...نے شکست خوردہ لہجے میں کہا ”میں مرنے کے لیے تیار ...ہوں۔“

”تم اب بھی زندہ رہ سکتے ہو۔“ میں نے ایک چال ...

اس نے ہڑبڑانے والے انداز میں آنکھیں کھول دیں ...بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے منمنایا ”کیسے؟“

میں نے اپنی چال کو آگے بڑھایا ”اگر تم مجھے ساحل کے ...بارے میں بالکل ٹھیک بتادو تو میں تمہیں اسی وقت گاڑی سے نیچے اتار دوں گا۔ مجھے وہ ایڈریس چاہیے جہاں پر ساحل ...رکھا گیا ہے۔“

”وجدان! میری موت تمہارے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔“ ...سائمن نے بے بسی کی آخری حد کو چھوتے ہوئے کہا ”اگرچہ ...تمہارے وعدے کا اعتبار نہیں لیکن میں زندگی بچانے کے ...ضرور رسک لیتا مگر افسوس کہ مجھے ساحل کے ٹھکانے کا علم ...نہیں ہے۔“

”تمہیں علم نہیں تو پھر اس کے ٹھکانے کے بارے میں ...کون جانتا ہے؟“ میں نے درشتی سے کہا ”پہلے تو بینا رائے کو ...اسٹریٹ والے ٹھکانے پر ساحل کی دیکھ بھال کے لیے ...رکھا گیا تھا بعد میں ربی کے حکم پر اسے کسی دوسری جگہ منتقل کردیا ...اب تو بینا رائے بھی باقی نہیں رہی!“

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”میرے خیال میں محترم ربی ...کے سوا اس ٹھکانے سے کوئی اور واقف نہیں، رائے کی ...ربی پر ہمیں شک ہوگیا تھا اس لیے اسے ختم کردیا گیا۔“

...موت کو چند سانس کے فاصلے پر کھڑا دیکھ کر وہ سچ بولنے ...پر مجبور ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کی سنگینی کو برقرار رکھتے ...ہوئے سائمن سے پوچھا ”چلو، اپنے ربی کے ٹھکانے کے بارے میں ہی بتادو۔ میں ساحل کا پتا براہِ راست اسی سے معلوم کرلوں گا۔“

”میں محترم ربی کے ٹھکانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”کوئی رابطہ نمبر؟“

”نہیں۔“

”اس کے احکام کس وسیلے سے تم تک پہنچتے ہیں؟“

”محترم ربی کے دستِ راست برنارڈ لیو ہم سے رابطہ کرتے ہیں۔“ سائمن نے جواب دیا ”اس کام کے لیے وہ اپنا موبائل فون استعمال کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا، لیو کا قیام کہاں ہے؟“

سائمن نے میرے آئندہ متوقع سوال کا جواب خود ہی دے دیا تو میں نے پوچھا ”تمہیں برنارڈ لیو کا سیل نمبر تو یاد ہوگا؟“

تھوڑے تامل کے بعد اس نے مذکورہ نمبر بتادیا۔ میں نے وہ نمبر اپنے ذہن میں بٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے رحمی سے کہا ”سائمن! تمہارے لیے کوئی چانس نہیں بچا۔ جب تم میرے کسی کام نہیں آسکتے تو ربی کے لیے بھی کیوں مفید رہو۔ گڈ بائے!“

اس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کرلیں، اس یقین کے ساتھ کہ میں کسی بھی صورت اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے ذہن کی گہرائیوں سے موت کو قبول کرلیا تھا۔

میں نے اس کے یقین کا پاس کیا اور گن کے کلپ میں موجود باقی ماندہ گولیوں کو سائمن کی پیشانی پر نمودار ہونے والے آلو میں اتاردیا۔ خس کم، جہاں پاک!

☆☆☆

صبح کے ساڑھے چار کا وقت تھا۔ اس وقت سارا نیویارک سو رہا تھا، سوائے میرے جیسے شب بیدار اور خانماں خراب افراد کے۔ میرے ساتھ وسیم بھی جاگ رہا تھا۔ سائمن کے بے جان وجود کو ہارلم ریور میں پھینکنے کے بعد ہم وسیم کی رہائش گاہ پر آگئے تھے۔ وسیم اپنے ایک دوست کے ساتھ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اس کا دوست نوید ایک ہوٹل کے کچن میں کام کرتا تھا لیکن ان دنوں وہ چھٹی پر تھا اور عید منانے پاکستان گیا ہوا تھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ نہایت ہی چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل تھا۔ شوگر ہل میں زیادہ تر مڈل کلاس سیاہ فام رہتے ہیں۔ ڈچ اسٹائل میں بنی ہوئی پانچ منزلہ عمارتوں میں زیادہ تر بھورے پتھر اور سرخ اینٹوں کا استعمال کیا گیا ہے۔

راکیل کی موت نے میرے دل کو بوجھل اور ذہن کو تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے دکھ کو شیئر کرنے کے لیے سیٹل میں محترم سانگ فو کو فون کیا۔ وسیم کے اپارٹمنٹ میں فون کی سہولت موجود نہیں تھی لہٰذا مجھے مجبوراً پیٹا رائے والا موبائل فون استعمال کرنا پڑا۔ واشنگٹن اسٹیٹ کا کوڈ ٹو زیرو سکس ڈائل کرنے کے بعد میں نے سانگ فو کے نمبرز پنچ کیے۔ اگلے ہی لمحے میرا اس سے رابطہ ہوگیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر اور مؤثر الفاظ میں سانگ فو کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میری بات ختم ہوئی تو اس نے ایک گمبھیر سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''اس جنم میں راکیل کی سانسیں پوری ہوگئی تھیں۔''

''میرے لیے کیا ہدایت ہے؟'' میں نے پوچھا ''گارشیا اور ڈسلوا کا بھید کھل گیا ہے۔ کیا میں اسی میک اپ میں رہوں یا مجھے اپنی آئی ڈی تبدیل کرنا ہوگی؟''

''گارشیا اور ڈسلوا کا راز ربی اور اس کے قابلِ اعتماد لوگوں پر افشا ہوا ہے لہٰذا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ڈسلوا کی آئی ڈی کو استعمال میں رکھ سکتے ہو۔ عام لوگوں کو ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں کہ تم وجدان ہو، ڈسلوا ہو یا کوئی اور ہو! بہرحال، ربی اور اس کے بندوں سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔''

میں نے استفسار کیا ''اور اصلی گارشیا ڈسلوا کا کیا ہوگا۔ ہم ان کے نام سے جاری شدہ کریڈٹ کارڈز وغیرہ استعمال کررہے تھے۔ کیا ربی کے آدمی کھوج لگاتے ہوئے آپ تک نہیں پہنچ جائیں گے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ قطعیت سے بولا ''تم نے بتایا ہے کہ ضروری کاغذات اور سامان وغیرہ تم لوگ وِنگ ہنگ کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ صرف تمہارے کریڈٹ کارڈز ربی کے آدمیوں کے ہتھے چڑھے ہیں اور وہ بھی تمام نہیں، صرف دو!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''اصلی ڈسلوا اور گارشیا نے اپنی ضروری اشیا کی، چوری کی رپورٹ درج کروادی تھی۔ اس لیے ان پر کوئی وبال نہیں آسکتا۔ میں نے مصلحتاً انہیں سیٹل تک پابند کررکھا تھا۔ اب بھی وہ میرے حکم کے مطابق اسی اسٹیٹ میں رہیں گے۔ ایک دو روز میں انہیں نئے کاغذات مل جائیں گے۔ میں نے رپورٹ والی بات دانستہ تم سے چھپائی تھی۔ بہرحال، یہ احتیاط کام آگئی۔ تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ربی یا ربی کے آدمی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس پولیس والوں سے براہِ راست کوئی فکر نہ لینا ورنہ بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ میں نے وِنگ ہنگ کو تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دے رکھی ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو، تم بلاتکلف اس سے کہہ سکتے ہو۔''

سیل کی بیٹری شاید ڈاؤن ہورہی تھی۔ ایک دو مزید باتوں کے بعد میں نے رابطہ ختم کردیا۔ پھر موبائل سیٹ وسیم کو دکھاتے ہوئے کہا ''یار! اس کے چارجر کا کوئی بندوبست کرو۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''ذرا اس کا بیلنس بھی چیک کرو۔''

وسیم نے موبائل اپنے ہاتھ میں لیا۔ پھر اسے گھما پھرا کر دیکھنے کے بعد بولا ''یہ ایک ہائی فائی سیل ہے اور اس کا پوسٹ پیڈ ہے۔ بیٹری واقعی خاصی لو ہورہی ہے۔ بہرحال، میں اس کی چارجنگ کا انتظام کرتا ہوں۔ میرا مشورہ ہے اس کا فون انڈیکس دیکھ ڈالو، ممکن ہے اس لسٹ میں تمہارے کام کا کوئی نمبر موجود ہو!''

وسیم کا مشورہ مفید تھا لہٰذا میں نے موبائل فون کی فون بک کو کھنگالنا شروع کردیا۔ وہاں پر بے شمار فون نمبرز فیڈ تھے لیکن کسی بھی نمبر کے ساتھ مجھے ربی کا نام یا حوالہ نظر نہ آیا۔ سائمن نے اپنی موت سے قبل مجھے برنارڈ لیو کا جو حوالہ دیا تھا وہ پیٹا رائے کی فون بک میں موجود تھا۔ اگر موبائل کی بیٹری ڈاؤن نہ ہورہی ہوتی تو میں اسی وقت اس سے رابطہ کرتا۔ بہرحال، تھوڑی چھیڑ چھاڑ کے بعد میں نے وہ سیل وسیم کے حوالے کردیا۔

میں اس وقت شدید تھکن اور نیند محسوس کررہا تھا۔ گزشتہ انیس بیس گھنٹے مسلسل بھاگ دوڑ میں گزرے تھے۔ راکیل کی جدائی نے بھی میرے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ چند روزہ ساتھ میں راکیل نے مجھے اپنا عادی بنالیا تھا۔ میں اس کی فرقت کو بڑی شدت سے محسوس کررہا تھا۔ بکری کا بچہ چند دن تک آپ کے ساتھ رہے تو آپ کو اس سے بھی گہری انسیت پیدا ہوجاتی ہے، راکیل تو ایک جیتی جاگتی انسان تھی۔

میں نے جب وسیم کو بتایا کہ میں سونا چاہتا ہوں تو اس نے گھر کے فریج میں سے میرے لیے کھانے پینے کا بندوبست کردیا۔ میں نے رات راکیل کے ساتھ کارن میں پونے ڈنر کیا تھا۔ سرد موسم میں انسان کو زیادہ بھوک لگتی ہے اور میں مسلسل دوڑ دھوپ میں بھی تھا تاہم مجھے اس وقت کھانے کی کوئی خاص طلب محسوس نہیں ہورہی تھی۔ اس میں زیادہ ہاتھ راکیل کو پیش آنے والے واقعے کا بھی تھا۔ سائمن کے مطابق، گراہم نے اسے

میں زہریلا انجیکشن دے کر اسے موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہ سب کچھ ربی کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ میں نے دراز قامت گراہم کی وہ درگت بنائی تھی کہ اس کا کچومر نکل کر رہ گیا تھا۔ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا، راکیل کی موت کا ذمے دار وہی شخص ہے ورنہ پتا نہیں میں اس کا کیا حشر کرتا۔ ویسے میں نے اسے جس سلوک سے گزارا تھا اس کے پیشِ نظر گراہم کی زندگی کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔

وسیم کے اصرار پر میں نے تھوڑا زہر مار کرلیا تو اس نے کہا ''پانچ بجنے والے ہیں۔ تم پانچ چھ گھنٹے تک اطمینان سے نیند لے لو۔ میں گیارہ بجے سے پہلے گھر سے نہیں نکلتا۔''

میں نے دل کا بوجھ اور ذہن کا انتشار کم کرنے کے لیے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے میں گہری نیند میں پہنچ گیا۔ اس سرعت میں میری تھکاوٹ کا بھی غالب ہاتھ تھا۔

دس بجے کے قریب وسیم نے مجھے جگادیا۔ موبائل فون پر کسی کی کال آرہی تھی۔ میری نیند کے دوران میں وسیم کہیں سے ڈھونڈ کر اس موبائل کا چارجر لے آیا تھا اور موبائل کو آن رکھتے ہوئے چارجنگ پر لگادیا تھا۔

''میں نے سوچا، کوئی ضروری کال نہ ہو اس لیے تمہیں اٹھادیا۔'' وسیم نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

میں نے کوئی تبصرہ کیے بغیر سیل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسکرین پر ''آر ایل'' لکھا ہوا آرہا تھا۔ میں نے فون بک میں بہت سے نمبروں کے ساتھ اس قسم کے مختلف کوڈ لکھے دیکھے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ ''آر ایل'' کس شخص کا کوڈ تھا۔ بہرحال، میں نے کال ریسیو کرلی۔

میرے ''ہیلو'' کے جواب میں دوسری طرف جو آواز ابھری اس نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ وہ ربی موشے ہائمن کی مخصوص تاثر انگیز آواز تھی۔

''گڈ مارننگ میرے بچے!'' اس نے بڑی شفقت سے کہا۔

''تو یہ ''آر ایل'' تمہارا کوڈ ہے؟'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

وہ نرمی سے بولا ''آر ایل کا مطلب ہے، ریسپیکٹڈ لارڈ۔ رائے مجھے اسی انداز میں مخاطب کرتی تھی۔ بہرحال، تم سناؤ مائی سن۔ اتنے غصے میں کیوں ہو؟''

میں نے اس کے استفسار پر لعنت بھیجی اور طنزیہ لہجے میں کہا ''وہ تمہارا اتنا احترام کرتی تھی اور تم نے اس کا بڑا بھیانک انجام کیا۔ اس بے چاری کو تم نے یہ اچھا صلہ دیا ہے؟''

''وہ غیروں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئی تھی۔'' ربی کی منافقت سے لبریز آواز میری سماعت تک پہنچی ''اس کی وجہ سے مجھے ساحل کا ٹھکانا بدلنا پڑا۔''

میں نے پیٹا رائے کے جرم کی تفصیل نہیں پوچھی اور تیکھے انداز میں کہا ''شاید تم نے راکیل کو بھی اسی لیے عبرت ناک انجام سے دوچار کردیا ہے کہ وہ میرے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی تھی۔''

''تم سمجھ دار اور معاملہ فہم ہو میرے بچے!'' اس نے محبت بھرے انداز میں کہا۔ ربی پُراسرار صلاحیتوں کا مالک تو تھا ہی، اس کے ساتھ ہی بلا کا اداکار بھی تھا۔ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے نرم لہجے میں بولا ''وجدان! تم جانتے ہو، غداری اور بغاوت کی سزا بڑی کڑی ہوتی ہے۔ رائے نے ہم سے غداری کی اور روئی نے بغاوت۔ وہ دونوں اپنے حقیقی انجام کو پہنچ گئیں۔ تم سے میری کوئی دشمنی نہیں اس لیے اب تک میرے کسی آدمی نے آنکھ اٹھا کر بھی تمہاری طرف نہیں دیکھا۔''

وہ چند لمحات کے لیے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''حالانکہ تم نے قدم قدم پر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مجھ سے غلط بیانی بھی کی ہے۔ میں نے تمہاری بات کا یقین کیا اور یہی سمجھتا رہا کہ کسی نے تمہیں اغوا کرلیا ہے۔ تم نے راجر بن کر مجھ سے طویل بات کی اور میں نے تمہاری دروغ گوئی پر شک کرنے کے بجائے تمہاری ساتھی ساحل کو تلاش کروایا اور بالآخر اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا۔''

''اور پھر ہپناٹائز کرکے اس کے اندر سے ان نایاب پتھروں کا راز اگلوالیا جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں ہیں۔'' میں نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میں کہا ''اور آج کل ادھر کھٹمنڈو کے مضافات میں کچھ پُراسرار سرگرمیاں دیکھنے میں آرہی ہیں۔ غالباً تمہارے آدمیوں نے عبادت گاہ کو نشانہ بنانے کے لیے پیش قدمی شروع کردی ہے!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا میرے بچے!'' ربی کی منافقت پورے عروج پر تھی ''لیکن تمہارے لہجے سے میں محسوس کررہا ہوں، کسی نے میرے خلاف تمہیں زبردست ورغلا دیا ہے۔ تم کو میں نے بڑا فرماں بردار پایا تھا!''

ربی کی مکاری بڑی کلاس کی تھی۔ وہ مجھے اخلاق اور نرمی کی مار مارنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے بدستور اکھڑ لہجے

میں کہا ”مجھے کسی نے نہیں ورغلایا۔ میرا یہ ردِّعمل، تمہارے عمل کا نتیجہ ہے۔ میں اب بھی وہی پہلے والا وجدان ہوں۔“

”جیتے رہو میرے بچے!“ اس نے بڑے خلوص سے مجھے دعا دی اور بڑی شفقت سے دریافت کیا ”میرے کس عمل نے تمہیں ٹھیس پہنچائی ہے۔ اپنے دل کا غبار نکال دو وجدان! تمہارے ذہن میں جو لاوا پک رہا ہے، اسے بہہ جانے دو۔ مجھے بتاؤ، تمہیں مجھ سے کیا شکایت ہے؟“

ربی موشے ہائمن میرا ہر قصور، ہر غلطی معاف کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ یہ اس کی ایک گہری چال تھی۔ مجھے ماننا پڑا، وہ عمر کے اس حصے میں بھی بے پناہ اعصابی قوت کا مالک تھا۔ اگر میں اس کی حقیقت سے واقف نہ ہوتا اور اس کے عزائم تک مجھے رسائی حاصل نہ ہو چکی ہوتی تو میں آنکھیں بند کر کے اس پر ایمان لے آتا۔ میں چونکہ اس کی اصلیت کو جانتا تھا اس لیے منافقت کے جال کو منافقت ہی کے بلیڈ سے کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ میری تھرڈ آئی والی صلاحیت سے آگاہ نہیں تھا۔ میں نے اس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ میری ”پہنچ“ کو کسی پشت پناہ کی ”مدد“ سے تعبیر کر رہا تھا۔ جب سانگ فو، ربی اور اس کی صلاحیتوں سے باخبر تھا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ بدھ ازم اور یہودیت کی اس ارضی چپقلش میں ربی، سانگ فو کے بارے میں نہ جانتا ہو!

ربی موشے ہائمن چونکہ کارڈز چھپا کر کھیل رہا تھا لہٰذا میں نے بھی اسے اپنی اپروچ کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور نہ ہی اسے یہ احساس ہونے دیا کہ میں اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر گزشتہ رات ایسٹ ہاسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ میں جا گھسا تھا۔ اس کے محبت بھرے استفسار کے جواب میں میں نے جو بھی کہا۔ لوہا، لوہے کو اسی طرح کاٹتا ہے!

”مجھے تم سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ ایک طرف تم مجھے بہت ہی عزیز سمجھتے ہو اور دوسری جانب تم نے میری ساتھی کو مجھ سے چھپا کر رکھا ہوا ہے؟“

”اوہ!“ اس نے ایک گہری اور گمبھیر سانس خارج کی ”پتا نہیں، آج کل تم کن لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے لگے ہو۔“ اس کا اشارہ واضح طور پر سانگ فو کی سمت تھا ”تمہارا لہجہ خاصا خراب ہو گیا ہے، اس میں سے احترام اور تقدس جاتا رہا ہے۔ پہلے تو تم اس تو تڑاق سے بات نہیں کرتے تھے۔ بہرحال۔“

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں نے ساحل کو تم سے نہیں بلکہ اس کے دشمنوں سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ میں تو اس کا ہاتھ، تمہارے ہاتھ میں دینے کو تیار ہوں۔“

”پھر دیر کس بات کی ہے؟“ میں نے ترش لہجے میں کہا۔

وہ نرمی سے بولا ”دیر تو تمہاری طرف سے ہو رہی تھی میرے بچے! میں اس دوران میں مسلسل تمہاری تلاش میں رہا ہوں۔ اب جا کر تم ملے ہو۔ میں آج ہی ساحل کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

ربی کی اس مہربانی سے کسی گہری سازش کی بو آ رہی تھی۔ میں نے ہر بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اپنے اسٹائل میں نرمی پیدا کی اور پوچھا۔

”آپ کب اور کہاں ساحل کو مجھ سے ملوا رہے ہیں؟“

”شاباش میرے بچے! تمہارا نستعلیق انداز واپس لوٹ آیا ہے جس کی مجھے بے حد خوشی ہے۔“ وہ مجھے خوش فہمی کے بانس پر چڑھاتے ہوئے بولا ”میں نے آج رات ایک شاندار ڈنر پر تم دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دیا ہے۔“

”محترم ربی! آپ یہ بھی بتا دیں، یہ ڈنر کہاں ہوگا؟“ میں نے احترام بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا ”میں نے تمہارے اور ساحل کے لیے نیویارک کے ایک مہنگے ترین ریسٹورنٹ ”ونڈوز آف دی ورلڈ“ میں ٹیبل ریزرو کروا دی ہے۔ کیا تمہیں اس شاندار ریسٹورنٹ کے بارے میں معلومات ہیں؟“

میں ”ونڈوز آف دی ورلڈ“ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا نفی میں جواب دیا تو اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ریسٹورنٹ ٹوئن ٹاورز کے ایک سو سات ویں فلور پر بنا ہوا ہے۔“

”ٹوئن ٹاورز!“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ”یعنی ورلڈ ٹریڈ سینٹر؟“

”اس وقت تک نائن الیون والا واقعہ پیش نہیں آیا تھا اور ٹوئن ٹاورز ”آہ! ورلڈ ٹریڈ سینٹر“ میں نہیں بدلا تھا۔

”میرا مطلب وہی ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔“ موشے ہائمن نے جواب دیا ”تم دونوں ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے سے بچھڑے ہوئے ہو۔ حالات جو بھی رہے ہوں بہرحال مجھے تمہارے جذبات کے پامال ہونے کا افسوس ہے۔ نوٹ کر لو، تم دونوں کے لیے جو ٹیبل ریزرو کرائی گئی ہے اس کا نمبر ”ون او فائیو“ ہے وقت پر پہنچ جانا۔ کہیں وہ بے چاری تمہارا انتظار نہ کرتی رہ جائے۔ ساحل ٹھیک نو بجے رات ٹیبل نمبر ایک سو پانچ پر موجود ہوگی۔“

”اور آپ!“ میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا ”میرے محترم! کیا آپ ہمارا ساتھ نہیں دیں گے؟“

”جوانوں کی بھیڑ میں اس بڈھے کا کیا کام!“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں نے اداکاری کی ضرورت کو مسلم جانا اور کہا ”مجھے آپ کی کمی شدت سے محسوس ہوگی میرے محترم!“

”مجبوری ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”ایک تو میں ریسٹورنٹ وغیرہ میں جاتا نہیں ہوں۔ دوسرے، میں اس وقت امریکا میں نہیں ہوں۔“

وہ صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے لگ بھگ دس گھنٹے پہلے ربی موشے ہائمن کو ایسٹ ہاسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ میں دیکھا تھا۔ پھر میں نے سوچا، ممکن ہے کہ وہ واقعی امریکا سے باہر چلا گیا ہو! اپنی معلومات اور اس کے بیان کی تصدیق کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

”میرے محترم! آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”اسرائیل میں!“ اس نے بتایا۔

ربی کے جواب نے اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا لیکن میں نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا اور کہا ”ٹھیک ہے محترم! آپ کا سیل نمبر اس موبائل سیٹ کی فون بک میں موجود ہے۔ مجھے جب ضرورت ہوگی، میں آپ سے رابطہ کر لوں گا۔“

”بڑی خوشی سے میرے بچے۔“ وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا ”اچھا ہوا، یہ موبائل سیٹ تمہارے پاس پہنچ گیا۔ یہ ایک پوسٹ پیڈ کنکشن ہے۔ جتنا جی چاہے، استعمال کرو۔ بل کی فکر نہ کرنا۔ وہ میرے اکاؤنٹ سے ادا ہوتا رہے گا۔“

میں نے اس عنایتِ خسروانہ پر اس کا بھرپور شکریہ ادا کیا۔ اس نے مجھے اور ساحل کو ڈھیروں دعائیں دیں اور رابطہ منقطع کر دیا۔

بظاہر سیدھی اور کھری نظر آنے والی ربی کی اس ٹیڑھی چال پر میں گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے میری سوچ کو ایک سوالیہ نشان پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

اگر کسی چیز کے آسانی سے حاصل ہونے کے آثار پیدا ہو جائیں تو انسان کو یقین نہیں آتا۔ یہ ایک انہونی سی لگتی ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ربی اتنی شرافت سے ساحل کو میرے حوالے کر دے گا۔ اس کے پیچھے اس کی یقیناً کوئی چالاکی چھپی ہوئی تھی۔ اس کی عیاری اور مکاری کو مجھ سے زیادہ بھلا اور کون جان سکتا تھا!

اس کے باوجود بھی میں نے رسک لیتے ہوئے ریسٹورنٹ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ساحل کا معاملہ ہی ایسا تھا کہ میں کسی رسک کو خاطر میں نہیں لا سکتا تھا۔ اس بات کے قوی امکانات تھے کہ یہ ”دعوت“ ربی نے مجھے گھیرنے کے لیے دی تھی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا کہ اس اہتمام کے ساتھ مجھے ساحل سے ملوا دیتا۔ بہرحال، ایک چال باز کو کسی چال بازی ہی سے شکست دی جا سکتی تھی۔ مجھے ہر صورت ریسٹورنٹ پہنچنا تھا اور مضبوط پلاننگ کے ساتھ پہنچنا تھا۔

ناشتے کے بعد وسیم نے دھندے پر نکلنے سے انکار کر دیا ”آج کا دن تمہارے نام ہے وجدان!“ اس نے خلوصِ دل سے کہا۔

میں نیویارک میں ٹیکسی چلانے والوں کے مسائل سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ ایک دن اگر ان کا پہیا رک جاتا تو اچھا بھلا نقصان ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کے ایثار سے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے جذبات کو محسوس کر رہا ہوں وسیم! تم خواہ مخواہ اپنا نقصان کیوں کرتے ہو۔ تم حسبِ معمول اپنے کام پر نکلو۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ قطعیت سے بولا ”ایک دن میڈیلین کھڑی رہے گی تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ آج تو ویسے بھی چھٹی کا دن ہے، تو ایسے بھی سہی۔“

جب وہ اپنے ارادے سے باز نہ آیا تو میں اسے اپنے ساتھ لے کر ڈونگ ہنگ کے پاس پہنچ گیا۔ وسیم کی کیب کو ہم نے احتیاطاً شوگر ہل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس ٹیکسی کے راز سے صرف سائمن ہی آگاہ تھا اور وہ دریائے ہارلم میں ابدی ”سکونت“ اختیار کر چکا تھا بہرحال، کم از کم ایک دن کی احتیاط تو ضروری تھی۔ وسیم نے اس دن ٹیکسی نہ نکالنے کا فیصلہ کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ ہم ایک ٹیکسی پکڑ کر ڈونگ ہنگ کے گھر پہنچ گئے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد ہنگ مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا۔ اس کا انداز کسی بڑی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں سمجھا شاید شیوی والے معاملے میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ تنہائی میسر آتے ہی میں نے سوال داغ دیا۔

”مسٹر ہنگ! تم نے شیوی کی چوری سے متعلق رپورٹ درج کروا دی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بولا ”سب نمٹ گیا۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”پھر کیا مسئلہ ہے۔ تم اس قدر پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟“

اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور تامل کرتے ہوئے بولا ”تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔“

میں سمجھا' شاید وہ راکیل کے بارے میں کوئی انکشاف کرنے والا ہے۔ ویسے میں نے ابھی تک اسے راکیل کی موت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

''کیسی بری خبر؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

وہ بوجھل آواز میں بولا'' سانگ فو گزر گئے!''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا اور میں نے تیز آواز میں دریافت کیا'' کب؟ آج صبح ہی تو میری ان سے بات ہوئی ہے......لگ بھگ پانچ بجے!''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے سیئل سے چاؤلیان کا فون آیا تھا۔'' مسٹر ہنگ نے بتایا'' سانگ فو کی موت آج صبح چھے بجے واقع ہوئی ہے۔''

''اوہ!'' میں ایک تھکی ہوئی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

چاؤلیان وہی میک اپ ایکسپرٹ تھا جس نے مجھے کئی مفید ٹپس دی تھیں۔ ہنگ نے کہا'' میں سیئل جانے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن چاؤلیان نے واضح الفاظ میں مجھے منع کر دیا۔ اس نے بتایا ہے کہ محترم سانگ فو نے آخری لمحات میں ہدایت کی تھی کہ سیئل میں بھیڑ لگانے کی ضرورت نہیں۔ سب کام اپنی اپنی جگہ پر جاری رہیں گے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر مونگ کو بھی واپس آنے سے روک دیا گیا ہے۔''

میں نے چونک کر دیکھ ہنگ کو دیکھا'' تم ڈاکٹر مونگ ریفوشے اور اس کے مشن سے واقف ہو؟''

اس نے بڑے رسان سے اثبات میں سر ہلایا اور کہا'' میں تو تمہارے بارے میں بھی اب جاننے لگا ہوں۔ گزشتہ رات محترم سانگ فو نے مجھ سے رابطہ کر کے تم دونوں کے لیے خصوصی ہدایات جاری کی تھیں اور یہ تک بتا دیا تھا کہ ڈسلوا اور گارشیا کے بھیس میں تم لوگ وجدان اور راکیل ہو۔ مجھے ہر ممکن اور ہر صورت تمہاری مدد کرنا ہے۔ تم سانگ فو کے کسی نہایت اہم مشن پر ہو!'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کرتے ہوئے بتایا'' محترم سانگ فو تم دونوں کے لیے یہاں آسانیاں چاہتے تھے۔ میں نے اپنے طور پر سوچا ہے 'تمہارے تمام کریڈٹ کارڈز بھی'' اسمارٹ کارڈ'' میں تبدیل کروا دوں۔ اسمارٹ کارڈ کو تم ایک بٹوا سمجھ لو۔ اس ایک کارڈ کے ذریعے تم اپنے تمام پن کوڈز کو استعمال کر سکو گے!''

میں نے سر دست اسے کریڈٹ کارڈز کے بارے میں کچھ نہ بتایا اور خاموش رہ کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ہنگ کی بات سے اندازہ ہوا' سانگ فو کو اپنی رخصتی کا یقین ہو گیا تھا اسی لیے اس نے ہنگ کو ہماری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ ویسے تو وہ مجھ سے بھی بڑے واشگاف الفاظ میں کہہ چکا تھا کہ وہ زندگی کا سفر پورا کر چکا ہے۔ پتا نہیں' کب یہ چراغ بجھ جائے۔ اس نے اپنے دوسرے جنم میں مجھ سے تبت میں ملنے کی پیش گوئی بھی کی تھی کہ وہ مجھے سانگ فو نامی' چار سال کے ایک خوبصورت بچے کے روپ میں ملے گا اور یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ میں اسے دیکھتے ہی پہچان لوں گا۔ اس وقت میں نے سانگ فو کی بات پر زیادہ توجہ اس لیے بھی نہیں دی تھی کہ میں آواگون جیسے نظریے پر یقین نہیں رکھتا ہوں بہر حال' اگر واقعی میں تبت جاتا اور سانگ فو کی پیش گوئی صد فی صد درست ثابت ہوتی تو میں بدھ مت اور ہندو مت کے اس نظریے پر سنجیدگی سے غور کرتا کہ فنا اور بقا' تخلیق اور تردید کا یہ کون سا شعبہ ہے؟ کیا یہ انسانی لاشعور کی منتقلی کا کوئی آفاقی کھیل ہے؟ جیسے ایک موبائل فون کی بیٹری اگر اسی کمپنی کے کسی دوسرے موبائل سیٹ میں لگا دی جائے تو اس کے اندر جان آ جاتی ہے۔ آج کل تو مائیکرو چپ اور'' جی ایس ایم'' کا دور ہے۔ بیٹری والی مثال کو زیادہ تفصیل سے سمجھنے کے لیے ہم '' سم'' کی کارکردگی پر غور کر سکتے ہیں۔ اس ننھے سے کارڈ کے سلسلے میں تو ایک ہی کمپنی کو موبائل سیٹ ہونا بھی ضروری نہیں۔ آپ کا سارا ڈیٹا ایک ننھی منی سم میں محفوظ ہے۔ آپ اسے ایک موبائل سیٹ سے نکال کر دوسرے میں ڈالیں' وہ پہلے موبائل کا دوسرا جنم لے لے گا۔ کمپنی چاہے کوئی بھی ہو' ماڈل چاہے کوئی بھی ہو اور موبائل سیٹ کی شکل و صورت چاہے کتنی بھی مختلف کیوں نہ ہو' سم کی منتقلی کے بعد وہ بھی'' لاشعوری'' طور پر پہلے جیسا ہی ہو جائے گا۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ کیا عجب کہ وہ کسی گزرے ہوئے انسان کے لاشعور کو ایک سم کے مانند آنے والے کسی انسان کے اندر منتقل کر دیتا ہو! قدرت کے کھیل کو سمجھنا آسان کام نہیں اسی لیے انسان اپنی عقل فہم کے مطابق اس کے کھیل کو کوئی بھی نام دے دیتا ہے۔ آواگون یا آواگمن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بے شک' قدرت کے راز صرف غور و فکر کرنے والوں پر کھلتے ہیں!

چند لمحات تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے ہنگ کو راکیل کے بارے میں بتایا تو متاسفانہ انداز میں اس نے بھی وہی تبصرہ کیا جو اس سے پہلے سانگ فو کر چکا تھا'' اس جنم میں راکیل کی سانسیں پوری ہو چکی تھیں۔''

میں اپنے طور پر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ریسٹورنٹ میں ضرور جاؤں گا اور اس طرح جاؤں گا کہ ربی یا اس کے آدمیوں کی نظر میں نہ آؤں۔ میں وسیم کو فرنٹ پر رکھنا چاہتا تھا۔ میں وسیم کو

وجدان کی حیثیت سے ٹیبل نمبر ون او فائیو کی جانب بڑھا تا اور خود کسی دوسری میز پر موجود رہتا۔ وسیم سے الگ رہتے ہوئے بھی میں اس کے ماحول کا حصہ بن کر میز نمبر ایک سو پانچ پر پہنچ جاتا۔ ویسے ساحل کی تصدیق کے لیے میں براہِ راست بھی اس میز تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ مجھے ساحل تک کیسے پیش قدمی کرنا ہے اس کا فیصلہ ریسٹورنٹ میں پہنچنے کے بعد ہی کیا جا سکتا تھا۔ فوری طور پر تو مجھے اس ہوٹل میں پہنچنے کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے ہنگ سے اس سلسلے میں بات کی تو اس نے بتایا۔

''ونڈوز آف دی ورلڈ میں عام لوگ صرف ڈنر ہی کر سکتے ہیں اور اس کے لیے بھی پہلے سے میز بک کروانا ہوتی ہے۔ بریک فاسٹ اور لنچ کی اجازت صرف مہمانوں کو اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کلب کے ممبران کو حاصل ہے۔ بہر حال!'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں ابھی فون کر دیتا ہوں۔ تمہارے لیے میز بک ہو جائے گی۔ ویسے اس ریسٹورنٹ کے کچن میں میرا ایک دوست مائیکل لومانا کو بھی کام کرتا ہے۔ وہ اس ریسٹورنٹ کا ایک نہایت ہی اہم شیف ہے۔''

بات ختم کرتے ہی ہنگ میری فرمائش پر ونڈوز آف دی ورلڈ کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ میں فون ڈائل پر حرکت کرتی ہوئی اس کی انگلی کو توجہ سے دیکھتا رہا اور ریسٹورنٹ کا فون نمبر ''فائیو ٹو فور سیون ٹرپل زیرو'' اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ دوسری جانب بات کرنے کے بعد اس نے مجھے خبر دی کہ میرے لیے نارتھ ویو کی ٹیبل نمبر ایک سو نو بک ہو گئی تھی۔ ہما نے یہ میز وسیم کے نام سے بک کروائی تھی۔ وسیم کو میں وجدان (ڈسلوا) کی حیثیت سے ساحل والی میز کی طرف بھیجنا چاہتا تھا۔ اس'' تبدیلی'' کے لیے ہم دونوں کو اپنے چہروں پر تھوڑا کام کرنا تھا اور یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں تھی۔ میک اپ کا یہ کام اب میرے لیے بائیں ہاتھ کے کھیل جیسی حیثیت رکھتا تھا۔

ربی موشے ہائمن کے مطابق' ساحل ٹھیک نو بجے رات میز نمبر ایک سو پانچ پر میری منتظر ہوتی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ مجھے (وسیم) کو میز نمبر ایک سو نو مل گئی تھی جو یقیناً ساحل والی میز سے زیادہ فاصلے پر نہ ہوتی۔ میں نے اس سلسلے میں مسٹر ہنگ سے استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

''ون او فائیو اور ون او نائن دونوں نارتھ ویو ٹیبل ہیں اور ایک رو کے فاصلے پر واقع ہیں۔''

ہما نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔ میری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے مسٹر ہنگ مجھے ونڈوز آف دی ورلڈ کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگے۔ اس کے مطابق مذکورہ عظیم الشان ریسٹورنٹ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ایک سو سات ویں فلور پر واقع تھا۔ انیس سو ترانوے میں ایک بم دھماکے کے باعث سینٹر کے بیس منٹ کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ ریسٹورنٹ کا کچن اسی حصے میں واقع تھا چنانچہ کچھ عرصے کے لیے ریسٹورنٹ کو بند کر دیا تھا۔ انیس سو ستانوے میں یہ ریسٹورنٹ دوبارہ کھول دیا گیا اور اب یہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی سروس فراہم کرنے لگا۔ ایک ٹاور کی چھت پر آبزرویشن ڈیک بھی بنا ہوا ہے۔ اس مشاہدے گاہ سے مخصوص دوربین کی مدد سے میلوں (لگ بھگ اسی کلومیٹر) دور تک کا حسین نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اگر آپ کو نارتھ ویو ٹیبل مل گئی تو اس ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن کے روشن' چمکتے دمکتے اسکائی اسکریپرز' سینٹرل پارک' ہڈسن ریور اور جارج واشنگٹن برج کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ ایسٹ ویو ٹیبل سے کم و بیش نصف کلومیٹر نیچے ایسٹ ریور' مین ہیٹن برج' بروکلین برج اور ولیمز برگ کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے مگر یہ تمام تر'' سکتا ہے'' آج کل'' سکتا تھا'' میں بدل چکا ہے۔

جب بانس ہی ناپید ہو جائیں تو پھر بانسری کیوں کر بجے گی!

یہ ریسٹورنٹ انیس سو ستانوے میں جب دوبارہ کھلا تو لوگ اسے ونڈوز آن دی ورلڈ کے نام سے یاد کرنے لگے مگر بعض اب بھی اسے ونڈوز آف دی ورلڈ ہی کہتے تھے۔ پھر نائن الیون کے بعد یہ'' آن۔ آف'' کا ٹنٹا بھی نکل گیا۔ خدا سے ڈرنا چاہیے اور ہر وقت ذہن میں یہ رکھنا چاہیے کہ......مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے!

مسٹر ہنگ میرا راز دار بن گیا تھا لہٰذا میں نے اسے اپنے مشن اور تازہ ترین حالات کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ وہ سانگ فو کا قابلِ اعتماد بندہ تھا لہٰذا اس پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ موبائل فون کو صرف ربی یا اس کے آدمیوں سے رابطے کے لیے استعمال کروں ورنہ پوسٹ پیڈ لائن کا جب بل جاری ہوگا تو ربی کو پتا چل جائے گا 'نیویارک میں' میں کس کس شخص سے رابطے میں ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اس سیل پر اس سے اور سانگ فو سے بات کر چکا ہوں' اس نے کہا۔

''جو وقت گزر گیا اسے واپس نہیں لایا جا سکتا۔ آئندہ کے لیے محتاط رہنا۔''

اس کا مشورہ انتہائی معقول تھا لہٰذا میں نے اسے ذہن

نشین کر لیا پھر کہا" مجھے کچھ رقم کی بھی ضرورت ہو گی۔"

"آج چھٹی کا دن ہے اس لیے تمام بینک بند ہیں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا" بہر حال میں ڈیبٹ کارڈ (اے ٹی ایم) استعمال کر کے دس ہزار ڈالرز تک کا بندوبست کر سکتا ہوں۔"

میں نے مطمئن لہجے میں کہا" بس اتنی ہی رقم کافی ہے۔ کام چل جائے گا۔"

"تمہاری پوری کہانی کے پیشِ نظر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم اب ڈسلوا کے بھیس میں رہو یا وجدان کی حیثیت سے گھومو پھرو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے جن دشمنوں کی خاطر اپنا حلیہ تبدیل کیا تھا' وہ تمہاری شخصیت سے پوری طرح واقف ہیں۔ تم کہو تو میں تمہارے لیے نئے کریڈٹ کارڈز بھی بنوا دیتا ہوں۔"

"کارڈز کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا" پہلے ذرا میں آج کے مشن سے نمٹ آؤں۔"

مسٹر ہنگ نے مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی۔ میں نے اسے اپنے اور وسیم کے حلیوں میں تبدیلی سے متعلق آگاہ کیا۔ اس نے کہا" یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میں وسیم کو لگ بھگ ڈسلوا اور تمہیں جو کہو گے بنا دوں گا۔" میں نے اسے اپنی میک اپ میں مہارت کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو گیا" وجدان! سانگ تو جیسے شخص نے اگر تمہاری تعریف کی ہے تو یہ کوئی عام بات نہیں ہو سکتی۔ تمہیں میک اپ کے سلسلے میں جو بھی سامان درکار ہو' میں مہیا کر دوں گا اور...... رقم کا بندوبست کرنے میں ابھی جا رہا ہوں۔"

اس کے بعد وہ مجھے اور وسیم کو اپنے گھر میں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ میں نے دراصل وہ رقم وسیم کے لیے منگوائی تھی۔ میں مذکورہ دس ہزار ڈالرز کو وسیم کے اکاؤنٹ میں ڈلوانا چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا' آئندہ چند روز میں وسیم کے ساتھ ہی رہوں گا۔ ڈنگ ہنگ سے بار بار ملنا اس کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ وسیم میرا ہم وطن اور جی دار بندہ تھا میں نے انیس واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز میں اس کی "کارکردگی" کو اطمینان بخش پایا تھا۔ ازیں علاوہ اس کے فلیٹ میں فی الحال میرے لیے اچھی خاصی گنجائش بھی تھی۔ نوید کے لوٹنے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔

ویسے بھی ہارلم کا علاقہ میرے لیے زیادہ "محفوظ" تھا۔ ربی یا اس کے گماشتوں کا بھول کر بھی اس طرف دھیان نہیں جا سکتا تھا۔ وہ لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں شوگر ہل (ہارلم) میں کہیں چھپا بیٹھا ہوں۔

ہنگ کے جانے کے بعد میں وسیم سے باتیں کرنے لگا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو خود سے متعارف کرایا۔ وسیم ایک باہمت دلیر لڑکا تھا۔ میں نے بعض نہایت ہی حساس پہلوؤں کو چھوڑ کر اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ میری مبینہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"یار وجدان! مجھے بھی اس جنگی فن کا بہت شوق تھا مگر...... یہ شوق ابتدائی مرحلے ہی میں دم توڑ گیا!" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا' وہ خاصا افسردہ ہو گیا تھا۔

میں نے کہا" انسان کا شوق کبھی دم نہیں توڑتا۔ یہ آخری سانس تک جاری رہتا ہے اور انسان کے ساتھ ہی قبر میں اترتا ہے۔ تمہاری اداسی کو دیکھ کر لگتا ہے' تمہارے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوئی ہے؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو یار!" وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے سنجیدگی سے پوچھا" کوئی لڑکی وغیرہ کا چکر تھا؟"

اس نے متاملانہ انداز میں مجھے دیکھا اور بولا" ہاں وہ بھی تھا......"

"وہ بھی تھا......" میں نے اسی کے ادا کردہ الفاظ کو دہرایا اور بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا" اس کا مطلب ہے تم نے ایک سے زیادہ چکر چلا رکھے ہیں؟"

"نہیں یار اب تو سب چکر ختم ہو گئے۔" وہ جلدی سے بولا" ہاں تو میں تمہیں اپنے شوق کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس شوق کے دم توڑنے میں کسی لڑکی کا ہاتھ نہیں بلکہ سب سے بڑی وجہ میرے انسٹرکٹر تھے۔" میں نے واضح طور پر محسوس کیا وہ لڑکی والے موضوع سے کنی کاٹ رہا تھا۔ میں نے سوچا' میں کسی وقت اس سلسلے میں اسے گھیروں گا میں اس کی جانب متوجہ رہا۔

"انسٹرکٹر!" میں نے حیرت سے اسے دیکھا" انہوں نے تمہیں سکھانے سے انکار کر دیا تھا؟"

"انکار تو نہیں کیا مگر سکھایا بھی نہیں۔"

"تم ایک الجھی ہوئی بات کر رہے ہو وسیم۔" میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور بتانے لگا" ہمارے والے باغ میں ایک بہت معیاری مارشل آرٹس سینٹر تھا

اپنے علاقے کا ذکر کر رہا تھا' میں انسٹرکٹر مقصود مغل سے یہ فن سیکھ رہا تھا۔ مقصود صاحب ہر فن مولا تھے۔ ہمارے درمیان استاد شاگرد کے علاوہ دوستی کا رشتہ بھی تھا۔ سینٹر سے باہر بھی ہم اکثر ساتھ ہی نظر آتے۔ رات کو دو دو' تین تین بجے تک کنگ فو کی ڈاکومینٹری بھی دیکھتے۔ بروس لی کے ایک ایک اسٹیپ کی ہم پریکٹس کرتے۔ پھر مقصود صاحب اچانک سینٹر چھوڑ کر سعودیہ چلے گئے۔ سینٹر تو ان کے جانے کے بعد بھی چلتا رہا مگر میں پھر ایک دن بھی وہاں نہ گیا۔ بس دل بجھ سا گیا تھا۔"

وہ ذرا دیر کے لیے متوقف ہوا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا "ابو کی نوشہرہ روڈ پر ہی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ کام میں لگانا چاہتے تھے لیکن میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ میں نے آوارہ گردی شروع کر دی اور دنگے فساد کو اپنا شیوہ بنالیا۔ میں شرطیں لگا کر اسٹریٹ فائٹ کرنے لگا۔ اس طرح اچھی خاصی آمدنی بھی ہو جاتی۔ میں اگر دوسروں کو چوٹیں پہنچاتا تو مجھے بھی یہ "تحفے" ضرور ملتے۔ ابو کو میری سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے امی کے پاس بٹھا کر مجھ سے فائنل بات کر لی۔ انہوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ اس قسم کے بیٹے کو وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ گھر میں رہنا ہے تو بندے کا پتر بن کر رہوں ورنہ چلتا پھرتا نظر آؤں۔ پتا نہیں' میرے دماغ میں کیا آئی کہ میں نے کہہ دیا' آپ مجھے ملک سے باہر بھجوا دیں۔ ابو مجھ سے اور میری حرکتوں سے تنگ تو تھے ہی' غصے میں پوچھنے لگے' باہر کس ملک میں جاؤ گے؟ میں نے سعودیہ کا نام لیا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ بولے اب سعودیہ میں کچھ نہیں رکھا۔ زندگی بنانا ہے تو امریکا جاؤ۔ میری زبان سے نکل گیا' ٹھیک ہے' آپ مجھے امریکا ہی بھجوا دیں...... اور انہوں نے کسی طرح کوشش کر کے مجھے امریکا بھجوا دیا۔" وہ لمحے بھر کو رکا پھر گہری سنجیدگی سے بولا "میں نے سعودیہ جانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ مقصود صاحب کا ساتھ حاصل ہو جائے گا لیکن قسمت کے کھیل بڑے نرالے ہیں۔ میں امریکا آ گیا' مجھے کیا معلوم تھا' مقصود مغل کے بجائے اب میری ملاقات کسی وجدان سے ہونے والی ہے!"

میں نے کہا "اسٹریٹ فائٹر ہونا ایک بہت بڑی کوالٹی ہے۔ عملی زندگی میں اسی فن کی ضرورت پیش آتی ہے۔ میرے ساتھ رہو گے تو قدم قدم پر اس کے مظاہرے دیکھنے کو ملیں گے۔ میں نہیں جانتا' میں تمہیں کیا سکھا پاؤں گا لیکن یہ ضرور ہے اگر تم چاہو تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہو!"

"تم نے بہت گہری بات کر دی ہے!"

"اچھا' کیا واقعی؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں' میں نے وسیم کو رات والے مشن سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی۔ اس دوران میں اس کے چہرے کے تاثرات میں سنسنی سی دوڑتی رہی۔ جو شخص لڑائی بھڑائی کا ماہر ہو' اس قسم کے اسائنمنٹ اس کے اندر ایک کرنٹ سا دوڑا دیتے ہیں۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے کہا۔

"ہمارا یہ میزبان کچھ رقم لے کر واپس آنے والا ہے۔ میری خواہش ہے' وہ رقم تم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروالو۔ تمہارے ڈیبٹ اور کریڈٹ کارڈز سے میں بھی استفادہ کرتا رہوں گا۔"

وسیم ویزا' ایم ایکس (امریکن ایکسپریس) اور ایکسیس (ماسٹر) کارڈز استعمال کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے پاس ڈیبٹ کارڈ (اے ٹی ایم) بھی تھا۔ میں نے اپنے استفادہ کرنے والی بات دانستہ کہی تھی تا کہ اس کے پاس انکار یا ہچکچاہٹ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ میرا یہ حربہ کامیاب رہا اور بلا چون و چرا اس نے میری بات مان لی۔

لنچ ہم نے ونگ ہنگ کے ساتھ کیا اور ہلکی پھلکی شاپنگ کے لیے میں وسیم کے ساتھ باہر نکل گیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا تاہم اِکا دُکا مول (مال) اور ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھلے تھے۔ تین بجے ہم واپس ونگ ہنگ کی رہائش گاہ' واقع موٹ اسٹریٹ پہنچ گئے۔

چائنا ٹاؤن میں موٹ اسٹریٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک تو بدھ عبادت گاہ اسی اسٹریٹ پر واقع ہے۔ دوسرے چائنیز ہیپی نیو ایئر کے موقع پر یہاں سب سے زیادہ رونق دیکھنے کو ملتی ہے۔ موٹ' بیارڈ اور پیل اسٹریٹس کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ آگ کی شعبدہ گری اور ڈریگن ڈانس اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ موٹ اسٹریٹ کے ہنگامے بہت ہی ولولہ انگیز اور محظوظ کن ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق چائنا ٹاؤن میں لگ بھگ تین لاکھ چینی آباد ہیں۔ اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے' چین میں قدم رکھ دیا ہو!

چینی کیلنڈر کے مطابق نیا سال انیس جنوری کے بعد پڑنے والے پہلے مکمل چاند سے شروع ہوتا ہے۔ چینی کیلنڈر شمسی اور قمری گردشوں کے نچوڑ سے تیار کیا گیا ہے۔ اس حساب سے ان لوگوں کا نیا سال عموماً جنوری یا فروری ہی کی

کسی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ ان دنوں بھی ہیپی نیو ایئر کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ اس سال یہ تہوار فروری میں منایا جانے والا تھا۔

"ونڈوز آف دی ورلڈ" کی طرف روانگی میں ابھی دیر تھی۔ میں نے تھوڑے آرام کو ترجیح دی۔ اگر چھ بجے تک ایک مختصر مگر گہری نیند لے لی جاتی تو زیادہ مستعدی کے ساتھ میں اپنے مشن کو سر کر سکتا تھا۔ ہماری تیاری کے لیے ایک گھنٹا کافی تھا۔ ہم ہنگ کی رہائش گاہ پر ہی دو الگ کمروں میں گھس گئے۔

میں نے خود کو نیند کی بانہوں میں دینے سے قبل تھوڑی سی تصوراتی آوارہ گردی کو ضروری سمجھا اور آنکھیں بند کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ ادھر ظاہرہ آنکھیں بند ہوئیں ادھر باطنی آنکھ کا شٹر کھل گیا۔ میں تھرڈ آئی کے طفیل ساحل کے پاس پہنچ گیا۔ ساحل کے ماحول میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے لگ بھگ بارہ گھنٹے پہلے اسے جس بیڈ روم میں دیکھا تھا وہ اس وقت بھی وہیں موجود تھی' فرق صرف اتنا تھا کہ صبح کے تین بجے وہ گہری نیند میں مجھے نظر آئی تھی اور اب سہ پہر تین بجے وہ پوری طرح بیدار تھی۔ میں بڑے انہماک سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بستر پر چت لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔

اس بیڈ روم کی ایک ایک شے کو میں نے ذہن میں کندہ کر رکھا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ وہ کمرا کس عمارت میں واقع ہے تو میں کسی گائیڈڈ میزائل کے مانند اپنا راستہ بناتے ہوئے ساحل تک پہنچ جاتا لیکن افسوس کہ فی الحال مجھے یہ معلومات حاصل نہیں تھیں۔

تقدیر اور تدبیر کی جنگ انسان کو بڑا رلاتی ہے۔ باتدبیر لوگوں کے ساتھ تقدیر سب سے زیادہ اٹکھیلیاں کرتی ہے اور انہیں قدم قدم پر بے بسی کے احساس سے دو چار کر کے یہ باور کراتی ہے کہ تمہاری تدبیر کو پلک جھپکتے میں ملیا میٹ کیا جا سکتا ہے لیکن تدبیر کرنے والے حوصلہ نہیں ہارتے۔ وہ اپنی تگ و دو کو جاری رکھتے ہیں اور بالآخر ایک روز اپنی کسی تدبیر سے مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں!

اس وقت ساحل مجھے بہت پیاری لگی۔ اسے پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد اسے ابھی تک کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا تھا کہ وہ مجھے پیاری نہ لگی ہو لیکن وہ میری دسترس میں تھی' اب پہنچ سے دور ہوئی تھی۔ جس شے کا حصول مشکل ہو جائے وہ زیادہ پرکشش ہو جاتی ہے۔ حالات کی ستم ظریفی نے ایک طویل عرصے سے ساحل کو مجھ سے جدا کر رکھا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جدا کرنے والے ہاتھ بدلتے رہے لیکن میری تکلیف میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ دردِ جدائی اور کربِ فراق بڑھتا گیا۔

چوہدری نوازش علی دو ٹکے کا غنڈا تھا۔ ساحل جب تک اس کی تحویل میں رہی وہ میری نظر سے اوجھل بھی رہی۔ پھر شعیب غوری ولین بن کر سامنے آیا۔ میں یہ تو جان گیا تھا' غوری یہودی لابی کا آلۂ کار ہے اور ان کے مفاد کے لیے پاکستان' خصوصاً کراچی میں کام کر رہا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا وہ ساحل کو پکڑ کر یہودیوں ...... اپنے خود منتخب کردہ باپوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اور اب یہ براہ راست یہودی لابی سے میری ٹھن گئی تھی۔ ربی موشے ہائمن کسی معمولی شخص کا نام نہیں تھا۔ میں اس غیر معمولی شخص کے حصار کو توڑ کر اس پر ثابت کر چکا تھا کہ وہ بھی مجھے کوئی چلتا پھرتا نوجوان نہ سمجھے میں اس کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوں گا۔

موشے ہائمن نہایت ہی محتاط اور زیرک شخص تھا۔ وہ مجھے کیلنے کے لیے دوستی اور محبت کا منتر پڑھ رہا تھا۔ وہ بڑی شفقت اور بزرگی سے مجھے اپنے ہاتھ کے نیچے لانے کی تگ و دو میں تھا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا' میں اس کے سایے میں آتا ہوں یا پھر سایے بان ہی کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہوں۔

مجھے ربی کے وعدے کا رتّی بھر اعتبار نہیں تھا لیکن میں پھر بھی اس کی دعوت پر ریسٹورنٹ جانے والا تھا۔ اگر یہ دھوکا ہی تھا تو پھر مجھے ربی کی طرف سے یہ آخری دھوکا بھی کھانا ہی تھا تا کہ زندگی میں جب کبھی ہمارا سامنا ہو تو میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھور سکوں اور نگاہوں کی زبان میں اس سے کہہ سکوں ...... میرا نام وجدان ہے۔ میں جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا کر آتا ہوں اور اس طرح پہنچا کر آتا ہوں کہ وہ خود اپنی نظر میں گر جاتا ہے!

میں نے محسوس کیا' میں ربی کے بارے میں سوچتے ہوئے خاصا تلخ ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکا اور اپنی ساحل کو دیکھنے لگا۔ میں کافی دیر تک اس انتظار میں رہا کہ وہ بستر سے اٹھے' اٹھ کر چلے اور چل کر کمرے سے باہر نکلے ...... یا پھر اس کو دیکھنے کے لیے کوئی کمرے کے اندر داخل ہو تا کہ میری "سرگرمی" کی راہ کھلے لیکن میری خواہش پوری نہ ہوئی۔

میں اس سوچ کے ساتھ ساحل کے ماحول سے نکل آیا کہ رات نو بجے ونڈوز آف دی ورلڈ میں اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ ویسے ایک بات کا مجھے اطمینان تھا اور وہ یہ کہ ساحل کی صحت اور طبیعت مجھے پہلے سے کافی بہتر محسوس ہو رہی تھی

''گویا ربی اس کا خاصا ''خیال'' رکھ رہا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک چپ چاپ لیٹا رہا پھر ربی کے چٹکی لینے کے لیے تیسری آنکھ کو زحمت دی۔ گزشتہ سے پیوستہ اس بار بھی مجھے ناکامیابی کا سامنا ہوا۔ دوسری کوشش کے طور پر میں نے برنارڈ لیو کی جانب چھلانگ لگائی۔ اس مرتبہ بھی میں اپنا ہدف حاصل نہ کرسکا۔ تیسری ٹرائی میں نے اس آفت زادے پر ماری جو ربی کے کسی ''چمتکار'' کے طفیل کراچی سے نیویارک پہنچا تھا اور میں نے برنارڈ لیو کے توسط سے اسے ایسٹ ہاسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ میں دیکھا تھا۔ وہ براہِ راست میری رسائی میں نہیں تھا۔ ازاں بعد ربی نے لیو کو بھی کسی ایسے عمل سے گزارا کہ وہ بھی میری پہنچ میں نہ رہا۔ اس دفعہ بھی میں نقلی وجدان کا سراغ نہ پاسکا۔ برنارڈ لیو اور نقلی وجدان ربی کے زیرِ اثر تھا۔ پتا نہیں وہ انہیں کس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا! میں ''سہ کھی'' میں ناکامیاب ہوکر واپس لوٹ آیا۔

میں نے گزشتہ روز رات آٹھ بجے سائنا گاگ میں لیو کے توسط سے ربی کو دیکھا تھا۔ پھر چودہ گھنٹے بعد آج صبح دو بجے سیل پر میری اس سے بات ہوئی اور اس نے بتایا کہ وہ اسرائیل میں ہے۔ میں نہیں جانتا تھا' امریکا سے چودہ گھنٹے میں اسرائیل پہنچا جاسکتا تھا یا نہیں۔ ربی کی مکاری مجھ پر کھل چکی تھی اور وہ میری نگاہ میں ایک ناقابلِ اعتبار شخص ٹھہر چکا تھا لٰہذا میں اس کے اسرائیل میں ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور اب ...... ان تینوں کو دیکھے کم و بیش انیس گھنٹے بیت گئے تھے۔

مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے سیل سے لیو کو کال کی۔ لیو کا سیل نمبر میرے موبائل میں موجود تھا۔ وہ میرے تصور میں نہیں آرہا تھا لیکن اس واسطے سے میں اس سے بات تو کرسکتا تھا۔ میری یہ کوشش بھی ناکام رہی...... برنارڈ لیو کا سیل آف تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ مذکورہ سیل اب اس کے استعمال میں تھا بھی یا نہیں! ربی کی پُراسرار سرگرمیوں سے تو یہی جواب سامنے آتا تھا...... نہیں!

میں نے اپنے دماغ کو ہدایت دی کہ میں شام چھے بجے تک نہایت ہی پُرسکون' میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا لیکن اس دوران میں اگر اس اقامت گاہ پر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کے آثار ابھرے تو وقت مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ کھل جائے گی۔

اس ہدایت کی تکمیل کے چند سیکنڈ بعد میں نیند کی گداز بانہوں کے ریشمی شکنجے میں گرفتار ہوچکا تھا۔ اس شکنجے سے اسیری اور رہائی کا امتزاج جھلکتا تھا۔

☆☆☆

ٹھیک آٹھ بجے ہم چائنا ٹاؤن سے نکل آئے۔

میں وسیم کے ساتھ ییلو میڈیلین کی عقبی نشست پر براجمان تھا۔ میرے اور وسیم کے قد کاٹھ میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ وسیم کے چہرے پر ہلکا پھلکا میک اپ کرکے اسے ڈسلوا کے بھیس میں یا پھر کسی اور ہی رنگ میں' اور یہ آزادی میرے حق میں جاتی تھی میں نے وسیم کو ڈسلوا سے قریب تر کرنے کی کوشش کی تھی ...... ربی نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی کہ مجھے وجدان کے روپ میں وہاں پہنچنا ہے یا ڈسلوا کے طور ٹیبل نمبر ون او فائیو پر پہنچنا چاہتا تھا اور خود ٹیبل نمبر ون او نائن پر رہ کر ادھر کا جائزہ لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اپنے حلیے میں کچھ اس نوعیت کی تبدیلی کی تھی کہ میں وجدان رہا تھا اور نہ ہی ڈسلوا! بہرحال میرا نام ''وسیم'' تھا۔ ربی اگر مجھے چھاپنا چاہتا تو اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ ٹیبل نمبر ون او فائیو والے بندے پر ہاتھ ڈال دیتا۔ پروگرام کے مطابق وجدان کو نہیں مجھے اس میز تک پہنچنا تھا۔

سفر کے دوران میں ہمارے درمیان بات چیت جاری رہی۔ ڈرائیور ہماری گفتگو کا ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا کیونکہ دونوں ''پارٹیوں'' کے بیچ شیشے کی دیوار حائل تھی۔ ٹیکسی ڈیپارٹمنٹ کا یہ انتظام قابلِ تعریف تھا۔

ہم بیٹھم اسکوائر پر پہنچے پھر پارک رو پر سفر کرتے ہوئے پیس یونیورسٹی کے قریب سے گزرے اور سینٹ پال چیپل سے ییلو کیب فلٹن اسٹریٹ میں داخل ہوگئی۔ مذکورہ اسٹریٹ آگے جاکر چرچ اسٹریٹ سے مل گئی۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر درحقیقت چار اسٹریٹس کے اندر ''بند'' تھا۔ ٹوئن ٹاورز نے اچھی خاصی جگہ گھیر رکھی تھی۔ لوکیشن کے اعتبار سے نارتھ ٹاور بلڈنگ اور ساؤتھ ٹاور بلڈنگ چرچ اسٹریٹ پر' لبرٹی اسٹریٹ اور ویزے اسٹریٹ کے درمیان استادہ تھے۔ ویسٹ اسٹریٹ عقب میں تھی۔ شیشے اور فولاد سے بنے اس' ایک سو دس منزلہ سینٹر میں پچاس ہزار سے زیادہ افراد کام کرتے تھے۔

چرچ اسٹریٹ کے آغاز پر ہم نے ییلو کیب کو چھوڑ دیا اور ایک شاندار کافی ہاؤس میں آبیٹھے۔ اس وقت رات کے آٹھ بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے۔ میں چند منٹ یہاں رک کر آئندہ کے لیے لائحۂ عمل ترتیب دینا چاہتا تھا۔

کافی ہاؤس کے اندر سکون ہی سکون تھا۔ سوچ بچار کے لیے یہ خاصا سازگار ماحول تھا۔ ہم نے کافی کا آرڈر دیا اور وسیم کو چند لمحات تک خاموش رہنے کا اشارہ کرکے میں نے

آنکھیں بند کرلیں۔ نو بجنے میں صرف پینتیس منٹ باقی تھے۔ میں کوئی قدم اٹھانے سے قبل ساحل کی تازہ ترین پوزیشن کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ میں آج ونڈوز آف دی ورلڈ میں جس ہستی کے ساتھ ڈنر کرنے والا تھا' اس کی خبر گیری بہت ضروری تھی۔

میں نے اسی ہستی کے ان مٹ خال و خط کو تیسری آنکھ کے سامنے ابھارا' دوسرے ہی لمحے میں اپنے ساحل سے جالگا اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ساحل ہنوز اسی بیڈروم میں بستر پر خاموش لیٹی تھی۔ بیڈروم میں اس کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا اور ساحل اس وقت جاگ رہی تھی!

ربی کی مشفقانہ دعوت کا راز فاش ہوگیا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ ساحل کا چارا لگا کر مجھے شکار کرنا چاہتا تھا۔ اگر ساحل کو میرے ساتھ ڈنر کرنا تھا تو اس وقت وہ بیڈروم میں لیٹی کیا کررہی تھی۔ اسے تو ریسٹورنٹ میں ہونا چاہیے تھا یا پھر راستے میں!

اس رخ پر سوچتے ہوئے ایک فوری خیال میرے ذہن سے گزرا۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا' ساحل والا وہ بیڈروم ونڈوز آف دی ورلڈ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہو۔ میں نے ساحل کو بیڈروم میں چھوڑا اور کافی ہاؤس میں حاضر ہوگیا۔ اس ''واپسی'' کا سبب سیل کی مخصوص ٹون تھی۔ موبائل پر کسی کی کال آرہی تھی۔

اس دوران میں کافی سرو کردی گئی تھی۔ میں نے سیل کو جیب سے نکالا تو اسکرین پر ''آرایل'' کے الفاظ دکھائی دیے۔ وہ ربی کی کال تھی جو اپنے عقیدت مندوں کے لیے ریسپکٹیڈ لارڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے احترام بھرے لہجے میں کہا۔ احترام کا اظہار بھی ضروری تھا۔

''ہیلو!''

''گڈ ایوننگ میرے بچے!'' اس نے منافقانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''تم اس وقت کہاں ہو۔ اب تو ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں؟''

میں نے اس کی مکاری کو فوراً گرفت میں لے لیا' محترم ربی! آپ تو اس وقت اسرائیل میں ہیں۔ کیا وہاں بھی ساڑھے آٹھ ہی بجنے والے ہیں؟'

وہ گڑبڑا گیا۔ میں نے اس کے لہجے میں واضح طور پر لرزش محسوس کی جو اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے' سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''وجدان! میں نیویارک کے وقت کی بات کررہا ہوں۔ ٹھیک نو بجے تمہیں ریسٹورنٹ میں پہنچنا ہے نا!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر صفائی پیش کرتے ہوئے بولا ''میں تو اس وقت اسرائیل ہی میں ہوں لیکن مجھے وہاں کی پل پل کی خبر رہتی ہے۔ تم سمجھ رہے ہونا' میں نیویارک کا ذکر کررہا ہوں۔''

وہ اپنے جھوٹ کو نبھانے کے لیے یہ ساری لیپا پوتی کررہا تھا۔ میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا' وہ اس وقت امریکا ہی میں تھا اور عین ممکن تھا' ہمارے بہت قریب بھی ہو۔ میں نے جھوٹے کو اس کے گھر کی راہ دکھاتے ہوئے منافقت آمیز لہجے میں کہا۔

''محترم ربی! میں آپ کے اختیارات کو مانتا ہوں۔ آپ دنیا کے کسی بھی کونے میں بیٹھ کر زمانے بھر کا احوال جان سکتے ہیں۔ وہ تو ویسے ہی میں نے ایک بات کہہ دی تھی۔ آپ نے بتایا ہے کہ آپ اسرائیل میں ہیں تو پھر یہی بات درست ہے۔''

وہ میٹھے لہجے میں بولا ''کوئی بات نہیں۔ انسان کا ذہن خیالات کی فیکٹری ہے۔ اس میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں سوچنے والے کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ صرف بولتے وقت محتاط رہنا چاہیے۔ بہرحال۔''

وہ لمحے بھر کو رکا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

''تم اس وقت کہاں ہو۔ مجھے اپنی درست لوکیشن سے آگاہ کرو؟''

میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہوئے کہا ''میں اپنے ٹھکانے سے نکل چکا ہوں اور اس وقت ایک ٹیکسی میں ہوں۔'' پھر میں نے اسے چکر دینے کے لیے کہہ دیا ''ہماری کیب اس وقت سینٹرل پارک کے نزدیک سے گزر رہی ہے۔''

''اوہ!'' اس کی تاسف بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''تم تو ابھی کافی دور ہو۔''

''میں ٹھیک نو بجے ونڈوز آف دی ورلڈ میں ٹیبل نمبر ون او فائیو پر موجود ہوں گا۔'' میں نے اپنے لہجے کو حتی المقدور یقینی بناتے ہوئے کہا ''آپ اس سلسلے میں زیادہ فکرمند نہ ہوں۔ میں ساحل کو ایک لمحے بھی انتظار کی کوفت سے نہیں گزرنے دوں گا۔''

''وہ تو گزر رہی ہے!'' ربی نے شاطرانہ انداز میں کہا۔

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ''کیا ساحل ریسٹورنٹ میں پہنچ چکی ہے؟''

''وہ پچھلے دس منٹ سے میز پر موجود ہے۔''

میں اس جھوٹوں کے سردار کے بیان پر دل ہی دل میں

مسکرا کر رہ گیا۔ میں اپنی مسکراہٹ کو ربی تک نہیں پہنچانا چاہتا تھا لہٰذا لہجے میں کسی شوخی کو جگہ نہ دی اور یہ پوچھے بغیر کہ وہ قبل از وقت ریسٹورنٹ کیوں پہنچ گئی' میں نے کسی انتہائی فرمانبردار بچے کے مانند جلدی سے کہا۔

''مجھے سخت افسوس ہے۔'' میری آواز سے ندامت جھلکتی تھی' ''میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔ اوکے گڈ بائے......''

میں کال کو قطع کرنے ہی والا تھا کہ ربی کی اضطراری آواز ابھری ''یہ تو بتادو' تم کس حلیے میں ریسٹورنٹ آرہے ہو؟''

''ڈسلوا کے روپ میں۔'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ربی نے رابطہ ختم کردیا۔

میں موبائل فون کو میز پر رکھ کر وسیم کو دیکھنے لگا۔ اس نے یہ تمام تر گفتگو سنی تھی' فکر مند لہجے میں بولا ''وجدان تمہیں گھیرنے کے لیے زبردست جال پھیلایا جارہا ہے۔ وہ تمہاری لوکیشن اور حلیے سے تمہیں ٹریس اینڈ ٹریپ کرنا چاہتا ہے۔ تم نے سینٹرل پارک کا حوالہ دے کر اسے اچھا خاصا گمراہ کردیا ہے۔''

میں وسیم کو یہ بتا چکا تھا کہ وہ کال یہودیوں کے ربی محترم موشے ہائمن کی تھی۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا ''میں نے ربی کو اتنا گمراہ نہیں کیا' جتنے لمبے چوڑے چکروں میں وہ مجھے ڈال رہا ہے۔''

پھر وسیم کے استفسار پر میں نے اسے تازہ ترین صورتِ حالات سے آگاہ کیا۔ اس دوران میں ہم کافی کو ختم کرنے کی کوشش میں بھی مصروف رہے۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری بات پر شک نہیں کررہا ہوں لیکن یہ جاننا چاہتا ہوں' تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ تمہاری ساتھی ساحل ریسٹورنٹ میں موجود نہیں اور ربی اس سلسلے میں سراسر غلط بیانی سے کام لے رہا ہے؟'' وسیم کی الجھن بجا اور برمحل تھی۔

''میں اپنے سورس کے بارے میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے مصلحت بھرے انداز میں کہا۔ وسیم نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور اس سلسلے میں مجھے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

اس نے کہا ''چلو کوئی بات نہیں۔'' پھر موبائل فون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ''اس کو فوراً آف کردو۔ ربی تمہاری لوکیشن جاننے کے لیے سخت مضطرب ہے۔ امریکا میں موبائل فون ایمز سسٹم کے تحت کام کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری اس سے خاصی طویل بات ہوئی ہے۔ اس کے ذرائع کا تم ذکر کرچکے ہو۔ وہ نیٹ ورک کو حکم دے کر کم ازکم اتنا تو معلوم کرسکتا ہے کہ تم اس وقت کون سا انٹینا استعمال کررہے تھے۔ تمہارے موبائل کے سگنلز انہیں بتادیں گے کہ تم اس وقت نیویارک کے کون سے علاقے میں موجود ہو۔''

میں نے جلدی سے سیل کو آف کردیا اور کہا ''ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب میں اپنے سیل کو استعمال کررہا ہوں۔ کال کے دوران میں یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ موبائل کا حامل اس وقت نیٹ ورک کا کون سا انٹینا استعمال کررہا ہے۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''کیا سیل مصروف نہ ہونے کی صورت میں بھی مجھے ٹریس کیا جاسکتا ہے؟''

''نہیں!'' اس نے قطعیت سے کہا ''یہ ممکن نہیں لیکن سیل کو آف رکھنا عقل مندی ہوگی۔ تم کسی کو فون کرو یا نہ کرو' کوئی تو تم سے رابطہ کرسکتا ہے۔ ربی جیسے وسیع ذرائع کے مالک شخص نے نیٹ ورک والوں کا ناک میں دم کر رکھا ہوگا۔ وہ اس وقت ہائی الرٹ ہوں گے۔ ادھر تمہارا موبائل نیٹ ورک سے جڑا' ادھر وہ یہ جاننے میں کامیاب ہوگئے کہ سیل تک کس علاقے کے انٹینا سے سگنلز پہنچ رہے ہیں۔'' وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر واقعی تمہارا دشمن ربی اس وقت نیٹ ورک کو اپنے اشاروں پر نچا رہا ہے تو تمہارا یہ جھوٹ بھی اس پر کھل چکا ہوگا کہ تم سینٹرل پارک کے اردگرد ہو۔ سینٹرل پارک اور چرچ اسٹریٹ کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ ہے اور اس اچھے خاصے فاصلے میں کئی انٹینا نصب ہیں۔''

وسیم کی تشویش بجا تھی۔ میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے' ربی یہ جان چکا ہے' اس وقت ہم کس علاقے میں ہیں اس لیے...... ہمیں فوراً یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔ وہ اپنے گھیرے کو تنگ کرتے ہوئے اس کافی ہاؤس تک رسائی حاصل کرسکتا ہے!''

''ہاں' ایسا ہوسکتا ہے مگر اس میں ان لوگوں کو تھوڑا وقت لگے گا۔'' وسیم نے کہا ''بہرحال' ہمیں ڈینجر زون سے فوراً باہر نکل جانا چاہیے۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور کہا ''ڈینجر زون سے باہر نکلنے کا مطلب ہے' مشن سے دستبردار ہوجانا...... اور یہ مجھے گوارا نہ ہوگا وسیم!''

''تم کس مشن کی بات کررہے ہو؟'' اس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا ''تم نے تو بتایا ہے ساحل کو ریسٹورنٹ میں نہیں پہنچایا گیا۔ تمہارا مشن تو ساحل کے حصول سے مشروط

ہے نا!''

''ہاں تم ٹھیک کہتے ہو!'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''یہاں سے نکلو' پھر بات کرتے ہیں۔''

ہم نے بل ادا کیا اور کافی ہاؤس سے باہر نکل آئے۔ اس وقت میری رسٹ واچ رات آٹھ بج کر پچاس منٹ کا وقت بتارہی تھی۔ میرے پاس صرف دس منٹ تھے فیصلہ کرنے کے لیے۔ یہ فیصلہ کہ مجھے ''وِنڈوز آف دی ورلڈ'' میں قدم رکھنا ہے یا نہیں؟

میں ٹوئن ٹاورز کی جانب بڑھتے ہوئے سوچنے لگا۔ وسیم نے انٹینا' سگنلز اور نیٹ ورک کے حوالے سے جو بات کی تھی وہ خاصی قابلِ غور اور فکر انگیز تھی۔ موبائل فون کا استعمال کسی بھی لمحے میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ میرے مدمقابل کوئی ہما شما دشمن نہیں تھا۔ موشے ہائمن وہ شخص تھا جس کے احکام کو وہائٹ ہاؤس بھی اولین اہمیت دیتا تھا' ٹیلی کمیونیکیشن والے تو کیا بیچتے تھے......! اور اگر یہ ٹریسنگ اسی لمحے سے جاری تھی جب سے یہ سیل میرے ہاتھ لگا تھا تو یہ اور بھی تشویش ناک بات تھی۔ میں نے شوگرل میں رہتے ہوئے اس سیل پر ربی' سانگ فو وغیرہ سے بات کی تھی۔ پھر لٹل اٹلی کے علاقے سے مسٹر ہنگ کو بھی ایک کال کی تھی لیکن میرے خیال میں اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ اول لمحے سے مجھے ٹریس کیا جارہا ہو۔ اگر ایسی بات ہوتی تو کم ازکم ونگ ہنگ ضرور کسی وبال میں گھر جاتا۔ ہم نے اس کی گاڑی کو استعمال کیا تھا۔ شیوی (شیورلٹ) اور راکیل ربی کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور ہنگ نے اپنی گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کروائی تھی۔ اگر وہ لوگ ونگ ہنگ کو ٹچ کرتے تو ہماری چائنا ٹاؤن میں موجودگی کا راز کھل سکتا تھا۔ میں نے ابھی سہ پہر میں اسی سیل سے برنارڈ لیو کو بھی کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں مسٹر ہنگ کے گھر پر تھا اور مزید پانچ گھنٹے بھی وہیں موجود رہا تھا جو ٹریسنگ کی نفی کرتا تھا۔ بہرحال جو بیت گیا' سو بیت گیا۔ آئندہ کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک ایک قدم پھونک کر اٹھانا۔

وہ تو ایمز کا زمانہ تھا۔ آج کل جی ایس ایم رائج ہے۔ اس جدید ترین سسٹم' پر نیٹ ورک والے کوشش کرکے' نیٹ ورک کو استعمال کرنے والے' موبائل کے حامل شخص کی بالکل درست لوکیشن بھی معلوم کرسکتے ہیں۔ یہ ٹریس کیا جاسکتا ہے' موبائل استعمال کرنے والا شخص کس مقام پر موجود ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ شخص استعمال کے فوراً بعد اپنی پوزیشن بدل دے!

''جی ایس ایم'' ایک حیرت انگیز ٹیکنالوجی ہے مگر صاحب! امریکی قوم اس سے کہیں زیادہ پیچ دار اور قدم قدم پر حیرت زدہ کردینے والی ''مخلوق'' ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے امریکی ماہرین اور نافذین بالکل مختلف دماغ سے سوچتے ہوں۔ آج جب پوری دنیا میں جدید ترین ٹیکنالوجی ''جی ایس ایم'' کا فراوانی سے استعمال ہورہا ہے لیکن امریکا میں اب بھی ''ایمز'' سے کام چلایا جارہا ہے...... اور بڑے دھڑلے سے چلایا جارہا ہے (جی ایس ایم کا استعمال نہایت ہی محدود پیمانے پر ہے) اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکا نیٹ ورکنگ کی دنیا میں ترقی کا خواہاں نہیں! آئی ٹی کے میدان میں سب سے زیادہ ترقی اسی نے کی ہے۔ اس پر بھی اگر وہاں ایمز استعمال ہورہا ہے تو اسے فرسودگی نہ سمجھا جائے۔ یہ ''یہودگی'' ہے...... ایک مخصوص شاطرانہ ذہنیت! ایمز کی افادیت کو وہ دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اس شعبے کے ماہرین پتا نہیں' میری بات کو تسلیم کریں گے یا نہیں! یہودی کوئی بھی کام خواہ مخواہ اور بغیر کسی مفاد کے تو نہیں کرسکتے!

نو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ میں نے وسیم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا ''تم یہیں رک کر میرا انتظار کرو گے۔ میں ریسٹورنٹ کے اندر جاؤں گا۔''

اس وقت ہم ہوٹل وزٹا انٹرنیشنل کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ نیویارک میں بہت کم ایسے ہوٹل ہیں جن میں سوئمنگ پول بھی موجود ہیں۔ وزٹا انٹرنیشنل فنانشل ڈسٹرکٹ کا ایک عالی شان ہوٹل ہے جس میں پچاس فٹ لمبا سوئمنگ پول موجود ہے۔ وزٹا ایک ہائی فائی ہوٹل ہے۔ سنگل روم دو سو سے ڈھائی سو ڈالر تک ہے' ڈبل روم کا کرایہ ڈھائی سے تین سو ڈالر کے درمیان ہے اور سوئٹ ساڑھے پانچ سو ڈالر سے لے کر ایک ہزار دو سو پچاس ڈالر تک مل جاتا ہے۔ یہ تمام کرایہ جات ایک رات گزارنے کے لیے ہیں۔ اس اماؤنٹ سے ہوٹل کی اونچی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وزٹا انٹرنیشنل ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی ساؤتھ ٹاور بلڈنگ کے سامنے ویسٹ اور لبرٹی اسٹریٹ کے سنگم پر واقع ہے۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔'' وسیم کے قدم رک گئے ''وجدان! میں تمہیں تنہا تو نہیں جانے دوں گا جب کہ ادھر ریسٹورنٹ کے اندر تمہارے لیے ایک خطرناک پھندا ابھی لگایا جاچکا ہے۔''

''اس میں خطرناکی والی کوئی بات نہیں یار۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے اس کے سچے جذبے سے متاثر ہوتے ہوئے کہا ''اس وقت میں وجدان ہوں اور نہ ہی ڈسلوا۔ میں

بالکل ایک تیسرے اجنبی شخص کے حلیے میں ہوں جس کا نام وسیم ہے جب کہ اصل خطرہ تمہارے لیے ہے۔ تم کسی بھی وقت ڈسکوا کے طور پر دشمن کی نگاہ میں آسکتے ہو۔"

وہ تامل کرتے ہوئے بولا" کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو لیکن تمہارا اکیلے جانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا!"

"اس وقت اچھا یا برا لگنے کے چکر میں نہ پڑو۔" میں نے موبائل فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا" یہ اپنے پاس رکھ لو۔ اگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پیش آگئی تو میں ریسٹورنٹ کے اندر سے تمہیں مس کال کروں گا۔ تم اس "اشارے" پر فوراً میری طرف آجانا۔ اس کے علاوہ تم اور کوئی کال اٹینڈ نہ کرنا۔ کچھ دیر کے لیے ہمیں سیل کو آن رکھنا ہوگا۔ یہ وقت کی مجبوری ہے۔" ربی نے مجھے اس موبائل کی لائن کا نمبر بتا دیا تھا۔ وہ نمبر میرے ذہن میں محفوظ بھی تھا۔

میری بات وسیم کی سمجھ میں بیٹھ گئی۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا" ہاں یہ پلاننگ تسلی بخش ہے۔ میں کسی بھی کال کو اٹینڈ نہیں کروں گا۔ تمہاری مس کال کو میں فوراً شناخت کرلوں گا کیونکہ اس کا تعلق اسی ایکسچینج سے ہوگا۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں وزٹا کے قریب ہی موجود ہوں۔ جاؤ اللہ تمہاری حفاظت کرے۔"

وسیم کے یہ دعائیہ کلمات جذبات کی سچائیوں سے معمور تھے۔ میں نے اس پر ایک فخریہ نگاہ ڈالی اور ٹوئن ٹاورز کی جانب قدم اٹھا دیے۔ میرے قدموں میں بلا کا اعتماد بھرا ہوا تھا۔

ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی عمارت پُرشکوہ ہونے کے ساتھ ہی ایک خاص قسم کی ہیبت بھی رکھتی تھی۔ دونوں ٹاورز کے درمیان ایک مناسب فاصلہ موجود ہے (تھا) کسی زمانے میں ایک سر پھرے فلپ پیٹٹ نامی شخص نے 'دونوں ٹاورز کے درمیان تنی ہوئی ایک مضبوط رسی پر ایک ٹاور سے دوسرے ٹاور تک چل کر دکھایا تھا۔ اپنی جان جوکھم میں ڈالنے والے ایسے جاں بازوں کی دنیا میں کمی نہیں!

ربی موشے ہائمن کی سازش کو میں نے بڑی صفائی سے بے نقاب کر ڈالا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا' میں اس کی چال سے آگاہی حاصل کر چکا ہوں اور اس کی یہ بے خبری میرے حق میں سودمند تھی۔ میں وسیم کی حیثیت سے ٹیبل نمبر ایک سو نو پر جا بیٹھتا اور خاموشی سے ٹیبل نمبر دن او فائیو کا "نظارہ" کرتا رہتا۔ وسیم کے طور پر میرے لیے وہاں کسی خطرے کا امکان نظر تو نہیں آتا تھا۔ ویسے مسٹر ہنگ نے اپنے دوست مائیکل لوما کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ مجھ سے بھرپور تعاون کیا جائے!

ربی کی نیت کھل جانے کے بعد اصولی طور پر مجھے اس ریسٹورنٹ میں نہیں جانا چاہیے تھا مگر مجھے بھی ایک ضد سی ہو چلی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اس چال باز نے مجھے شکار کرنے کے لیے کون سا چارا لگایا ہے۔ یہ بات طے تھی کہ ٹیبل نمبر ایک سو پانچ بہرحال خالی نہیں ہوگی۔

انہی خیالات کے تانے بانے سے گزرتے ہوئے میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ایک سو ساتویں فلور پر واقع "ونڈوز آف دی ورلڈ" میں داخل ہوگیا۔ اسی لمحے میری رسٹ واچ رات کے نو دس کا وقت بتا رہی تھی۔

☆☆☆

میں یک ٹک اس عورت کو دیکھ رہا تھا!

میرے دیکھنے میں حیرت اور بے یقینی شامل تھی۔ دونوں میزوں میں اگرچہ ایک رو کا فاصلہ تھا تاہم اس فاصلے کے باوجود بھی میں اسے بہ آسانی دیکھ رہا تھا۔ وہ میز نمبر ایک سو پانچ پر موجود تھی اور اس کا رخ میری ہی جانب تھا اس لیے میرے نظارے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں تھی۔ وہ ہو بہو ساحل تھی۔ میری حیرت اور بے یقینی کا سبب یہ تھا کہ وہ ساحل کیوں کر ہو سکتی تھی؟ میرے حساب سے ساحل تو اس وقت ایک بیڈروم میں موجود تھی۔ زیادہ دیر اس بے یقینی کی کیفیت میں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا لہٰذا میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

ظاہرہ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے تمام تر توجہ تیسری آنکھ پر مرکوز کر دی۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف اور صرف ساحل ہی کا تصور تھا' اس کا سراپا میری سوچ کی رگ رگ میں منعکس ہو رہا تھا۔ تھرڈ آئی نے آن واحد میں مجھے ساحل تک پہنچا دیا۔

میری ساحل بیڈ سے نیچے اتر رہی تھی۔ میں پورے استعجاب سے اسے تکنے لگا۔ وہ بیڈ چھوڑ کر سبک خرامی سے چلتے ہوئے ملحقہ واش روم کی جانب بڑھ گئی پھر اگلے ہی لمحے اس نے واش روم کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ میں آنکھیں کھول کو ونڈوز آف دی ورلڈ میں حاضر ہوگیا۔

ساحل کی ڈپلیکیٹ ٹیبل نمبر ون او فائیو پر موجود تھی۔ ربی نے میرے لیے ایسا بھرپور چارا لگایا تھا کہ میں ریسٹورنٹ میں قدم رکھتے ہی کشاں کشاں اس چارے پر منہ ماروں۔ میری حکمت عملی اس موقع پر بہت کام آئی اور میں ربی کے فریب سے بال بال بچ گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھی' ساحل کے کامیاب میک اپ میں تھی۔ زیادہ امکان ماسکنگ کا تھا!

میں ڈپلیکیٹ پر نگاہ رکھتے ہوئے مینیو کا جائزہ لینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ایک مناسب سے ڈنر کا آرڈر دے دیا۔ اس دوران میں' میں ڈائننگ ہال میں بھی نہایت ہی محتاط انداز میں نگاہ دوڑاتا رہا اور میری اس احتیاط پسندی نے یہ جانچ لیا کہ وہاں ڈپلیکیٹ کی نگرانی بھی ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ ربی کے مامور کردہ لوگ ہوں گے۔ وہ اس انتظار میں وہاں موجود تھے کہ جیسے ہی کوئی ڈسلوا میز نمبر ایک سو پانچ پر آ کر بیٹھے وہ اسے چھاپ لیں۔ اچھا ہی ہوا' میں اکیلا ریسٹورنٹ میں آیا تھا ورنہ وسیم کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔

میں اس موقع کی تاک میں تھا کہ کوئی اس ڈپلیکیٹ سے بات کرے' اس کے قریب آ کر کوئی اشارہ وغیرہ دے تا کہ میں اس خاص شخص کے حلیے کو اپنی یادداشت میں رقم کر سکوں۔ ڈپلیکیٹ سے تصوراتی رابطہ کرنے کی کوشش مجھے اصلی ساحل تک پہنچا دیتی۔ میں نے یہاں جن نگاہوں کو ڈپلیکیٹ کا نگران محسوس کیا تھا' ان کے حلیوں کو بھی یاد کر لیا تھا تاہم میرے خیال میں ان کی افادیت کے سلسلے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ونڈوز آف دی ورلڈ جیسے مہنگے ریسٹورنٹ میں آرڈر پلیسنگ اور سرونگ میں تھوڑا وقت لگتا ہے لہٰذا نظری آوارہ گردی کے لیے میرے پاس کافی فرصت تھی۔ میں بہ ظاہر مینیو کارڈ کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے ''آوارہ گردی'' وغیرہ کا یہ شوق پورا کرنے لگا۔

''ایکسکیوزمی سر!''

ایک شائستہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس وقت میں مینیو کارڈ کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کارڈ پر سے نگاہ اٹھائی تو نظر کے سامنے ایک وردی پوش ویٹر کو پایا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک کارڈلیس تھام رکھا تھا۔ میں نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ کارڈلیس کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا ''سر! آپ کے لیے کال ہے۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈلیس لے لیا۔ مجھے اس کال پر حیرت تو بہت ہوئی تھی لیکن چہرے کے تاثرات سے میں نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ ویٹر خاموشی سے ایک جانب بڑھ گیا تو میں نے کارڈلیس کو کان سے لگا لیا۔ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا ''ہیلو!''

دوسری طرف وسیم تھا۔ اس کی تشویش بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! اس وقت ڈبلیو ٹی سی (ورلڈ ٹریڈ سینٹر) کے احاطے میں پُراسرار سرگرمیاں جاری ہیں۔ تمہیں گھیرنے کے لیے بڑا منظم بندوبست کیا گیا ہے۔ مجھے شک ہے' تمہارے دشمنوں کو وہاں تمہاری موجودگی کا پتا چل گیا ہے۔''

''یہ ممکن نہیں!'' میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میرا مشورہ ہے' فوراً وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ نیچے تمہارے لیے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے پولیس کی ایک بھاری نفری کو بھی متحرک دیکھا ہے۔''

وسیم' ڈسلوا کے میک اپ میں تھا چنانچہ خطرات کی تمام تر رشتے داری اس وقت اسی کے ساتھ تھی۔ میں نے پوچھا ''تم کہاں ہو؟''

''میں نیچے کے حالات دیکھتے ہی وزٹا انٹرنیشنل سے دور ہٹ گیا ہوں۔'' وسیم نے بتایا ''میں اس وقت سب وے انٹرنس گلوب کے نزدیک ہوں اور ایک پبلک بوتھ سے تمہیں کال کر رہا ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''سب وے گلوب کے پاس ہی رہو۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم ہر حال میں وہیں پر میرا انتظار کرنا۔ او کے۔''

رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں نے کارڈلیس کو میز پر رکھ دیا۔ اب یہاں مزید رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وسیم نے نیچے کی جو صورتِ حال بتائی تھی' وہ غیر معمولی اور تشویشناک تھی۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ خود وزٹا سے ہٹ کر سب وے گلوب کے پاس پہنچ گیا تھا ''سب وے'' نیویارک کی انڈر گراؤنڈ ٹرین کو کہا جاتا ہے۔ لندن میں ریلوے کا یہی نظام ''ٹیوب سسٹم'' یا محض ''انڈر گراؤنڈ'' کہلاتا ہے۔ سب وے انٹرنس کی نشاندہی محض "S" والے گلوب سے کی جاتی ہے۔

ویٹر کارڈلیس لینے کے لیے میری میز پر پہنچا تو میں نے اس سے واش روم کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''ڈائننگ ہال سے باہر دائیں جانب۔''

میں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور میز چھوڑ کر اس طرف بڑھ گیا جدھر ویٹر نے راہ نمائی کی تھی۔ واش روم میں جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے تو ڈائننگ سے نکلنے کے لیے ایک ایسا فوری بہانہ چاہیے تھا کہ کچھ دیر تک میری غیر حاضری کو محسوس نہ کیا جائے۔ ویٹر نے میرے اٹھتے ہی ٹیبل پر ایک مخصوص ٹیگ رکھ دیا تھا جو میری عارضی غیر حاضری کی ''وضاحت'' تھا۔

میں پُراعتماد انداز میں چلتے ہوئے ڈائننگ سے باہر آیا اور واش رومز کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس سمت بڑھ گیا جو راستہ لفٹ کی طرف جاتا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد میں ونڈوز آف دی ورلڈ ہی سے نہیں بلکہ ٹوئن ٹاورز کے احاطے سے بھی باہر تھا۔ وسیم نے جس "سرگرمی" کا ذکر کیا تھا وہ میری نگاہ سے بھی گزری اور میں نے اپنے دشمنوں کی نظر بچا کر سب وے انٹرنس کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا' وسیم کا مشورہ مان کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی!

ربی نے مجھے شکار کرنے کے لیے بڑا مضبوط جال بچھایا تھا اور میں اس جال کے پاتال سے ہو آیا تھا۔ موشے ہائمن جیسا شاطر شخص میری اس چالاکی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ربی نے ایک "سیانا کوا" بن کر چال چلی تھی۔ اب یہ مجھ پر فرض تھا کہ میں سیانے کوئے کی سیان پتی کا جنازہ نکال دوں۔ اس وقت ربی کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت کا ایک طوفان بلاخیز اٹھ رہا تھا۔ میں انہی انتقامی سلگتے ہوئے خیالات کے ساتھ سب وے گلوب تک پہنچ گیا۔

وسیم کی مجھ پر نظر پڑی تو لپک کر میرے قریب آ گیا "ربی مسلسل کال کر رہا ہے لیکن میں نے ایک مرتبہ بھی اٹینڈ کرنے کی کوشش نہیں کی۔" اس نے سیل میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں اس کی تکلیف کو سمجھ رہا ہوں۔" میں نے زہرخند انداز میں کہتے ہوئے سیل اس کے ہاتھ سے لے لیا "اس کی تکلیف کو دور کرنا مجھ پر فرض ہو گیا ہے وسیم!"

وسیم سمجھ گیا' میں انتہائی خطرناک موڈ میں ہوں۔ میرے لہجے کی تپش نے اسے میرے عزائم سے آگاہ کر دیا تھا۔ گمبھیر آواز میں پوچھنے لگا "بتاؤ کیا کرنا ہے باس؟"

"ہم ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ جا رہے ہیں!" میری آواز سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں "ابھی اور اسی وقت۔ ربی کی سرکوبی ضروری ہو گئی ہے۔"

"ٹیکسی پکڑوں؟" اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے گلوب کی طرف اشارہ کیا "یہ کیسی رہے گی!"

"سب وے نیویارک میں سفر کا تیز ترین ذریعہ ہے۔" وسیم نے بتایا "اس اسٹیشن سے سب وے کی تین لائنز (ٹرینیں) اپ ٹاؤن کی سمت جاتی ہیں مگر ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ تک براہِ راست کوئی نہیں جائے گی۔ ہمیں ویسٹ بیالیس اسٹریٹ کے اسٹیشن پر اترنا ہو گا۔ پھر ٹیکسی پکڑ کر آگے جانا ہو گا۔"

"او کے ڈن!" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "مین ہیٹن کے سینے پر بہت سفر کر لیا۔ اب ذرا اس کے پیٹ میں جھانک کر دیکھتے ہیں' وہاں کون کون سی الا بلا بھری ہوئی ہے۔"

ہم نیچے اترنے ہی والے تھے کہ ربی کی کال آ گئی۔ میں نے سوچا' پہلے اسے ایک تعارفی ڈوز پلا دوں' پھر آگے بڑھتا ہوں۔ ربی میری آنکھ کا خار بن گیا تھا۔

"ہیلو!" میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بے چین آواز میری سماعت تک پہنچی "وجدان...... میرے بچے! تم کہاں رہ گئے۔ اب تو پونے دس بج رہے ہیں۔ تم خیریت سے تو ہو۔ میں اتنی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں تم فون اٹینڈ کیوں نہیں کر رہے تھے؟"

اس کے متعدد سوالات کے جواب میں' میں نے صرف اتنا کہا "میں اس وقت ایک ہوائی جہاز میں ہوں۔ یہ غور و فکر کرنا آپ کا کام ہے کہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر کوئی موبائل سیٹ کار آمد رہ سکتا ہے یا نہیں؟" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا "آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے اور وہ یہ کہ میں نے ساحل کا خیال اپنے دل سے نکال دیا ہے اور اب براہِ راست میں آپ کے پاس اسرائیل آ رہا ہوں!"

بات مکمل کرتے ہی میں نے رابطہ منقطع کر دیا پھر اگلے ہی لمحے میں نے سیل کو آف کر دیا۔

پلیٹ فارم کی سمت بڑھتے ہوئے وسیم نے کہا "ہمیں یہاں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ہر دس منٹ بعد ایک ٹرین موجود ہوتی ہے۔"

وسیم نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ ٹھیک دس بجے رات ہم دونوں سب وے کی ٹرین "ای لائن" پر سوار ہو رہے تھے "ای لائن ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے اسٹیشن سے چل کر چیمبرز اسٹریٹ' اسپرنگ اسٹریٹ' گرین وچ ولیج اور پنسلوانیا اسٹیشن سے گزرتے ہوئے ویسٹ بیالیس اسٹریٹ کے اسٹیشن پر پہنچی تو ہم نے "E لائن" سب وے کو چھوڑ دیا۔

ہم زیرِ زمین پلیٹ فارم سے باہر نکلے اور بس ٹرمنل کے قریب سے ایک ٹیکسی پکڑ لی۔ وسیم نے کہا "اس سے تو اچھا تھا میں اپنی کیب ہی لے آتا۔ کم از کم آمد و رفت کا مسئلہ تو حل ہو جاتا۔"

"پہلے سے اگر انسان کو آنے والے حالات کا علم ہو جائے تو مسائل حل ہونے کے بجائے بڑھ جاتے ہیں۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا "آگہی کے عذاب سے وہی لوگ آشنا ہیں جو روز و شب اس تجربے سے گزرتے رہتے ہیں۔"

وسیم خاموش رہا۔ میری پُراسرار سنجیدگی اور گمبھیرتا نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ ہم دونوں کے بیچ ایک ایسی خاموشی حائل ہو گئی جو کسی چیختے دہاڑتے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہونے والی تھی۔ ہماری کیب اسٹریٹ بیالیس پر رجے ہوئے ٹائمز اسکوائر سے گزری پھر برینٹ پارک اور نیویارک پبلک لائبریری کو پیچھے

چھوڑتے ہوئے ففتھ ایونیو پر مڑ گئی۔ ففتھ ایونیو پر سفر کرتے ہوئے ہمیں سیدھا ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ پہنچنا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا' ان لحات میں وسیم کے دماغ میں کیا چل رہا تھا لیکن میں پوری یک سوئی سے ربی موشے ہائمن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس شاطر کی گردن تک میرے ہاتھ پہنچ جاتے تو میں ساحل کو حاصل کر سکتا تھا۔ مجھے قوی امید تھی وہ اس وقت اگر سائنا گاگ میں نہ بھی مل سکا تو وہاں سے اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ ضرور دکھائی دے جائے گا۔ سائنا گاگ میں داخل ہونے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ میں بڑی تیزی سے اس "داخلے" کے سلسلے میں غور و فکر کرنے لگا۔

ییلو کیب کو ہم نے تھوڑا آگے آ کر ایسٹ پینسٹھ اسٹریٹ پر ٹیمپل ایمنول کے سامنے چھوڑ دیا اور پیدل ہی پیچھے کو چل پڑے۔

وسیم نے پوچھا "وجدان! سائنا گاگ کے بارے میں سوچا ہے؟"

"اس وقت تو میں تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا "ربی اور اس کے آدمیوں کو جس وجدان کی تلاش ہے، وہ ڈسلوا کے میک اپ میں ہے لہٰذا تم ان کے لیے کسی شکار کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔ تمہارا میک اپ فوری طور پر اترنا بہت ضروری ہے۔"

وہ اپنے چہرے کو چھوتے ہوئے بولا "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو!"

نیویارک خصوصاً مین ہیٹن میں پبلک ٹوائلٹس کا بڑا کال ہے۔ دن بھر گردش میں رہنے والے افراد اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ریسٹورنٹس اور ریسٹ رومز کے واش رومز کو استعمال کرتے ہیں۔ ایسٹ تریسٹھ اسٹریٹ پر ایک ریسٹ روم موجود تھا۔ ہم نے ادھر کا رخ کیا اور پندرہ منٹ بعد جب ہم وہاں سے نکلے تو وسیم اپنی اصلی شکل و صورت میں آ چکا تھا البتہ میرے چہرے پر ایک "اجنبی" شخص کا ہلکا پھلکا میک اپ موجود تھا۔

کسی بھی مذہب کے ماننے والوں کی عبادت گاہ کا تقدس بہت اہم ہوتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں کوشش کروں گا' سائنا گاگ کے اندر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی کی نوبت نہ آئے۔ ربی کو بڑے طریقے سلیقے سے وہاں سے نکالنا تھا' پھر جیسے بھی ممکن ہوتا' اس کی "خبر گیری" کر لی جاتی!

ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ پر پہنچ کر میں نے وسیم سے کہا "تم ادھر ہی رکو میں سن گن لے کر آتا ہوں۔ اگر سائنا گاگ کے اندر گھسنا پڑا تو میں تمہیں اشارہ کر دوں گا۔" اس وقت ہم ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ اور ففتھ ایونیو کے کارنر پر کھڑے تھے۔

وسیم نے اثبات میں سر ہلایا تو میں سائنا گاگ کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے وسیم کو جہاں روکا تھا' وہاں سے گاگ کا دروازہ بڑے واضح طور پر نظر آتا تھا۔

میرے ذہن نے ایک سیدھا سادہ منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ اگر سب کچھ نارمل رہتا تو میں اس منصوبے پر عمل کر کے بہ آسانی گاگ کے اندر رسائی حاصل کر سکتا تھا۔

میں سیدھا گاگ کے نگران کے پاس پہنچا۔ سر کی مخصوص جنبش سے اسے "ہیلو" کہا پھر بتایا "میرا نام جیری ہے۔" میں "لا" سے آیا ہوں۔"

"جیری!" اس نے سرتاپا تنقیدی نظر سے میرا جائزہ لیا اور بولا "لا (لاس اینجلس) سے آئے ہو۔ بولو کیا کام ہے؟"

"مجھے ربی سے ملنا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی پھر بھویں اچکا کر بولا "اس وقت ربی سے کیا کام پڑ گیا؟"

اس وقت رات کے سوا گیارہ بج رہے تھے۔

میں نے کہا "ربی تو اتنی ہمدرد اور عظیم شخصیت ہے کہ ان سے کسی کو کسی بھی وقت کام پڑ سکتا ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اضافہ کیا "لا (ایل اے) کے ایک ربی سیموئل نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اس کا ایک ضروری پیغام مجھے یہاں کے ربی تک پہنچانا ہے۔ پلیز مجھے جلدی سے ربی تک پہنچا دو۔"

"ربی تو گاگ میں موجود نہیں ہے۔" اس نے ایک مرتبہ پھر بڑی بھرپور نظر سے مجھے دیکھا "وہ لگ بھگ دس بجے یہاں سے چلے گئے تھے۔"

"کہاں چلے گئے؟" میں نے قدرے الجھن کی اداکاری کی۔

"ظاہر ہے' اپنی رہائش پر گئے ہیں۔" اس نے کندھے اچکائے "جہاں وہ روز جاتے ہیں۔" پھر رک کر اس نے استفسار کیا "تم ربی فرینکلن سے ملنے آئے ہو نا؟"

"اوہ نو!" میں نے مخصوص امریکی لہجے میں کہا "میں ربی موشے ہائمن کی بات کر رہا ہوں جو الاسکا سے آئے ہوئے ہیں۔ ربی سیموئل کا پیغام مجھے موشے ہائمن تک پہنچانا ہے...... یا پھر ان کا رائٹ ہینڈ برنارڈ لیوِل جائے!"

آخری جملہ میں نے خاص چال کے طور پر ادا کیا تھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا "سوری! میں سمجھا تم اس گاگ کے ربی فرینکلن کے پاس آئے ہو۔" پھر تھوڑے توقف کے بعد

اس نے اضافہ کیا ''اگین سوری' ربی موشے ہائمن سے تمہاری ملاقات نہیں ہوسکتی البتہ برنارڈ لیو' فرینکلن کے ساتھ ہی ان کے گھر گئے ہیں۔''

یہ بھی ایک ''خوشخبری'' ہی تھی مگر میں نے چہرے کے تاثرات سے اپنی اندرونی خوشی ظاہر نہ ہونے دی اور قدرے مایوس لہجے میں استفسار کیا ''ربی موشے ہائمن سے ملاقات کیوں نہیں ہوسکتی؟''

''وہ کل رات مین ہیٹن سے چلے گئے تھے۔'' اس نے بتایا۔

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے کل رات آٹھ بجے اسی سائنا گاگ میں تصور کی نگاہ سے ربی موشے ہائمن' برنارڈ لیو اور نعلی وجدان کو دیکھا تھا۔ اگر اس شخص کی اطلاع درست تھی تو اس کا مطلب تھا ربی نیویارک بلکہ امریکا سے باہر جاچکا تھا۔ تو کیا وہ واقعی اس وقت اسرائیل میں تھا؟ اگر وہ اسرائیل میں تھا تو پھر میری ساحل کہاں تھی؟

یہ تمام تر سوالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن میں گزرے اور میں نے گاگ کے نگران سے پوچھا ''ربی موشے ہائمن کل رات کب اور کہاں گئے ہیں؟''

''کہاں گئے ہیں' اس بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا ''البتہ میرا اندازہ ہے وہ اس وقت نیویارک میں نہیں ہیں۔ اس گاگ سے وہ کل رات کم و بیش اسی وقت نکلے تھے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

''اوہ!'' میں نے اپنے چہرے پر موجود مایوسی کے تاثرات میں اضافہ کیا اور کہا ''ٹھیک ہے ربی چلے گئے تو ان کے دستِ راست مسٹر لیو کے بارے ہی میں بتاؤ۔ میں انہی سے مل لیتا ہوں۔ ربی فرینکلن کی رہائش کس طرف ہے؟ لا ''LA'' سے بار بار تو نہیں آیا جاسکتا۔ ممکن ہے لیو کو معلوم ہو' موشے ہائمن اس وقت کہاں ہوں گے!''

اس بندے نے اپنے سر کو کچھ اس طور اثباتی جنبش دی جیسے کہہ رہا ہو...... ہاں یہ بات لیو ہی کو معلوم ہوسکتی ہے۔ پھر اس نے بڑی شرافت سے مجھے ربی فرینکلن کے گھر کا پتا بتا دیا۔ مذکورہ ربی ایسٹ انسٹھ اسٹریٹ پر واقع سن شائن اپارٹمنٹس میں رہتا تھا۔ اس کے اپارٹمنٹ کا نمبر سی۔ سکسٹی ٹو تھا۔ گویا یہ علاقہ سائنا گاگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سن شائن اپارٹمنٹس ایسٹ انسٹھ اسٹریٹ پر پارک ایونیو اور لیکزنگٹن ایونیو کے درمیان واقع تھے۔

میں نے گاگ کے نگران کا بے حد شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس گفتگو کے دوران میں' میں نے اس شخص کے خال و خط کو اپنے ذہن میں نقش کرلیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا نام مورگن بتایا تھا مجھے نہیں لگتا تھا اس نے مجھ سے کوئی غلط بیانی کی ہو۔ میں اپنے طور پر کسی بھی وقت اسے چیک کرسکتا تھا۔ وہ جب بھی گاگ کے اندر جاتا' میں اس کے حلیے کی انگلی پکڑ کر اس کے بیان کی تصدیق کرسکتا تھا۔ ویسے برنارڈ لیو کا سراغ مل جانا بھی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں وسیم کے ساتھ پیدل مارچ کرتے ہوئے ایسٹ انسٹھ اسٹریٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

وسیم نے گہری سنجیدگی سے پوچھا ''ادھر کیا رہا؟''

''ربی تو نیویارک میں موجود نہیں۔'' میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا ''البتہ اس کے ایک خاص آدمی برنارڈ لیو کا پتا چل گیا ہے۔ وہ سن شائن اپارٹمنٹس میں ربی فرینکلن کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔'' پھر اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا' ربی فرینکلن کون ہے؟ میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''فرینکلن ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ کا ربی ہے۔'' پھر میں وسیم کو برنارڈ لیو کے بارے میں مختصراً بتانے لگا۔

ہم نے ایسٹ انسٹھ اسٹریٹ کے آغاز پر ففتھ ایونیو کو چھوڑ دیا اور اپنی مطلوبہ اسٹریٹ میں داخل ہو کر مشرق کی سمت بڑھنے لگے۔ میرے جی میں آئی کہ میں موشے ہائمن کو کال کرکے خوب کھری کھری سناؤں لیکن پھر نیٹ ورک ٹریسنگ کے خیال نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ ٹریسنگ اینڈ ٹریکنگ ڈیوائس کا استعمال کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ کسی مخصوص موبائل کے سگنلز کے ذریعے اس کی لوکیشن معلوم کرنا اور یہ جاننا کہ وہ ان لمحات میں کون سا انٹینا استعمال کررہا ہے' خاصا مشکل کام ہے...... اور یہ مشکل کام ربی موشے ہائمن جیسے بااثر شخص کے اشارے پر ہی ممکن تھا ورنہ نیٹ ورک والے اس نوعیت کی دردسری کے چکر میں نہیں پڑتے۔ قصہ مختصر مجھے اگر موبائل فون استعمال کرنا تھا تو پھر جلدی جلدی اینٹینا تبدیل کرنے کی ضرورت تھی یعنی ایک کال اس علاقے سے کی اور فوراً کسی دوسرے علاقے میں پہنچ گئے تاکہ دوسری کال کسی دوسرے اینٹینا کے توسط سے ہو...... اور فی الحال یہ ممکن نہیں تھا لہٰذا اسیل کو آف رکھنے ہی میں عافیت تھی!

ہم نے ایسٹ انسٹھ پر رہتے ہوئے پارک ایونیو کو کراس کیا اور سن شائن اپارٹمنٹس کے قریب پہنچ گئے۔ مذکورہ اپارٹمنٹس طرزِ تعمیر کا عمدہ نمونہ پیش کررہے تھے۔ میں نے وسیم کو اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ پروگرام کے مطابق وسیم کو اپارٹمنٹ کے باہر رہنا تھا اور مجھے اندر داخل ہونا تھا۔ ہماری معلومات کے مطابق اس وقت سی۔ سکسٹی ٹو میں ربی فرینکلن اور برنارڈ لیو کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور ان دو افراد سے نمٹنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ اگر میں اندر داخل ہونے کے بعد پندرہ منٹ تک وسیم سے رابطہ نہ کرتا تو

پھر وہ بھی اپارٹمنٹ کے اندر پہنچ جاتا' ورنہ وہ بیرونی حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا۔

میں نے موبائل فون اور رائے سے چھینا ہوا ہتھیار وسیم کے پاس چھوڑ دیا اور ایک خطرناک خنجر کو اپنے پاس رکھ کر سی۔ سکسٹی ٹو کے داخلی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ مذکورہ خنجر ایک بڑے چاقو سے مشابہ تھا۔ میں نے وسیم کے ساتھ آج چائنا ٹاؤن میں جو شاپنگ کی تھی' یہ خنجر اسی کا نتیجہ تھا۔ ایک دکان کے شوکیس میں رکھا ہوا یہ ننھا سا خنجر یا بڑا سا چاقو مجھے بے حد پسند آیا تھا اور اسے خریدنے میں' میں نے ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی تھی۔

میں نے سی۔ سکسٹی ٹو اپارٹمنٹ کی ڈور بیل کا بٹن دبایا اور ایک طرف کھڑا ہو کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اس وقت تبدیل شدہ حلیے میں تھا' کس کے حلیے میں تھا؟ اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ سائنا گاگ کے نگران کو میں نے اپنا نام جیری بتایا تھا۔ یہاں بھی میں وہی کارڈ کھیلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ عین ممکن تھا' نگران مورگن نے فون پر فرینکلن کو بتا دیا ہو۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک حسینہ کی صورت میری نگاہ سے متصادم ہوئی۔

میں نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا اور اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''میرا نام جیری ہے۔ میں لاس اینجلس سے آیا ہوں۔ میں ربی سیموئیل کا ایک خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے برنارڈ لیو سے ملنا ہے۔ میں سائنا گاگ گیا تھا۔ مورگن سے پتا چلا کہ لیو' فرینکلن کے ساتھ اس اپارٹمنٹ میں موجود ہیں!''

میں نے ایک ہی سانس میں اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔ وہ کھڑی آنکھیں پٹ پٹاتی رہی۔ میں نے اضافہ کرتے ہوئے الٹا اس سے سوال کیا ''کیا مورگن نے یہاں فون کرکے میری آمد کے بارے میں آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتایا؟''

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''میں فرینکلن کو بھیجتی ہوں!''

اتنا کہہ کر وہ ''یہ جا اور وہ جا'' ہوگئی۔ اس کی صورت غائب ہونے سے قبل دروازہ بند ہوچکا تھا۔ میں خاموشی سے اندر کے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ دروازہ کھولنے والی حسینہ کی موجودگی غیر متوقع تھی۔ پتا نہیں اور کون کون اس فلیٹ میں اپنا وجود رکھتا تھا!

میں اگر چاہتا تو دروازہ کھلتے ہی بھرا مار کر اندر داخل ہوجاتا مگر یہاں میں قدرے مختلف حکمتِ عملی کو اپنانا چاہتا تھا۔ میں نے جیری بن کر جس کھیل کا آغاز کیا تھا' اس میں مجھے اچھا خاصا مزہ آرہا تھا۔ گاگ میں' میں ہی فرنٹ پر رہا تھا لہٰذا اب بھی میں نے وسیم کو پیچھے ہی رکھا تھا۔ اس بات کے امکانات بڑے قوی تھے کہ مورگن نے فون کرکے ربی فرینکلن کو کسی جیری کی آمد کی اطلاع دے دی ہوگی۔

اسی حسینہ کا چہرہ دوبارہ مجھے دکھائی دیا اور اس نے مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ میں نے مسکرا کر سر کو اثباتی جنبش دی اور اس کے اشارے پر اپارٹمنٹ کے اندر قدم رکھ دیا' پھر اگلے ہی لمحے میری کنپٹی پر کسی بے رحم گن کی سرد نال آکر ٹک گئی۔

حسینہ نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں غراتی ہوئی ایک آواز سنائی دی ''انجلی! اس کی تلاشی لو۔ یہ اینجلس سے آیا ہے۔ ہوسکتا ہے تمہارا کوئی رشتے دار ہو!''

بولنے والا وہی تھا جس کی گن کی آہنی نال میری کنپٹی کا مزاج پوچھ رہی تھی اور اس کی مخاطب وہ حسینہ تھی جس نے بڑی فراخ دلی سے مجھے ویلکم کرنے کے بعد کھٹاک سے دروازہ بند کیا تھا۔

انجلی نامی وہ عورت میکانکی انداز میں میری سمت بڑھی' پھر میرے بالائی لباس کو تھپتھپا کر اس میں کسی ہتھیار کی موجودگی کا سراغ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایک بات تو فوراً ہی میری سمجھ میں آگئی کہ ان لوگوں نے میری ربی سیموئیل والی کہانی پر اعتبار نہیں کیا تھا اور اس گن بردار کا انداز بتاتا تھا' اسے خود پر اور اپنی صلاحیت پر بڑا ابھروسا ہے۔ میں ہینڈز اپ کھڑا کسی عملی لمحے کو گرفت میں لینے کے بارے میں سوچ رہا اور..... انجلی نے فوراً ہی مجھے ایسا موقع فراہم کردیا۔

اس کے ''تھپ تھپ'' کرتے ہاتھ بالائی جسم کا معائنہ کرنے کے بعد جب میری رانوں تک پہنچے تو میرے رگ وپے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ سنسنی جذباتی اور محسوساتی دونوں نوعیت کی تھی۔ اگر وہ میری دائیں پنڈلی تک رسائی حاصل کرلیتی تو پھر کیس کے اندر چھپا ہوا خنجر اس کی دسترس سے دور نہ رہتا اور...... میں یوں بے دست و پا ہونے کے موڈ میں قطعاً نہیں تھا۔

گھٹنوں تک پہنچنے کے لیے انجلی کو رکوع کے بل جھکنا پڑا۔ اس سے اچھا عمل کا لمحہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے اس کی عبادت کے طریقۂ کار کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے رکوع سے سجدے میں پہنچا دیا۔

میں نے بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے کرتے اچانک ہی ایک پھرتیلی حرکت کر ڈالی۔ میرا گھٹنا انجلی کی پیشانی پر پڑا۔ یہ ٹھوکر اتنی شدید اور ترچھے زاویے کی تھی کہ وہ عقب میں الٹنے کے بجائے میرے قدموں میں منہ کے بل آرہی لیکن میں نے اسے قدم بوسی کا موقع نہ دیا۔ اگر میں انجلی کو ایسا موقع دے دیتا تو کنپٹی پر ٹکی گن میری کھوپڑی میں ضرور ایک ہوادان بنا دیتی۔

میری کمر اور گھٹنے نے ایک ساتھ حرکت کی۔ گھٹنا انجلی کی پیشانی پر پڑا' اس کے ساتھ ہی میں نے کمر کی ٹوائسٹ سے خود کو ہوا میں روٹیٹ کیا۔ میرا پورا جسم کسی اسپنڈل کے مانند گھوما اور میں توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند پیچھے کو آیا۔ میری اس غیر متوقع اور فوری حرکت نے گن بردار کو بوکھلا دیا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں ایک دھکے سے اس کے اوپر آیا۔ اسے فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ عین ممکن ہے' اسے ایسی کوئی ہدایت ہی نہ ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو لیتے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔

گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ انجلی کی دردناک چیخ نے اپارٹمنٹ میں ہلچل مچا دی۔ میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میں بری طرح گھیر لیا جاتا۔ قدموں کی آوازیں بتدریج ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔

میں نے گن بردار کو ڈھال بنانے کے لیے تھوڑی "محنت" کی۔ وہ میرے نیچے دبا ہوا تھا۔ میں نے اس کے گن والے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لیا اور سیلف ڈیفنس کی ایک مخصوص ٹیکنیک سے اس کی کلائی کی ہڈی کا کڑاکا نکال دیا۔

اس کے حلق سے بڑی وحشت ناک بلبلاہٹ خارج ہوئی۔ میں نے اس کی کلائی کو آزاد کیا اور ایک ہینڈ اسپرنگ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے زمین بوس دراز قامت شخص کو کھینچ تان کر اپنے سامنے کھڑا کیا اور اس کی گن کو اسی کی گردن میں دھنسا دیا۔ اس دوران میں انجلی اٹھنے کی کوشش میں نظر آئی تو میں نے اس کے کولھے پر دھواں دھار ٹھوکر رسید کی۔ وہ لوٹ پوٹ ہوتی ہوئی مجھ سے دس فٹ دور چلی گئی۔ اس لڑھکنے کا اختتام ایک دیوار سے ٹکراؤ کی صورت میں سامنے آیا۔ انجلی کا سر اتنی شدت کے ساتھ اس دیوار سے متصادم ہوا کہ وہ پھر اٹھ نہ سکی' بے حس و حرکت ہو گئی۔ ان لمحات میں مجھ پر ایک عجیب سا جنون سوار ہو گیا تھا۔

اسی لمحے دوڑتے ہوئے قدموں والوں کی صورتیں میری نگاہ میں آ گئیں۔ ایک صورت کو میں نے فوراً پہچان لیا۔ وہ برنارڈ لیو تھا۔ اس کے ساتھ جو دوسرا شخص تھا' وہ ربی فرینکلن ہو سکتا تھا۔ ان کے چہروں کے تاثرات بتاتے تھے وہ مجھے ڈسلوایا وجدان کی حیثیت سے پہچان نہیں پائے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی دہشت ٹھہر کر رہ گئی تھی۔

متوقع ربی فرینکلن نے درشت لہجے میں مجھ سے دریافت کیا "کون ہو تم؟"

"میں تمہارا باپ ہوں...... جیری!" میں نے سلگتے ہوئے انداز میں کہا "اور تمہارے دادا سیموئیل نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔"

"تمہارا اسٹائل مجرموں والا ہے اور تم......"

فرینکلن کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے اپنی گرفت میں آئے ہوئے دراز قامت شخص کی گردن کو مخصوص جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے بازو پر جھول گیا۔ میں نے اسے ایک طرف دھکیل کر پھینک دیا اور فرینکلن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"تم نے ابھی میرا ایک ہی اسٹائل دیکھا ہے۔ لو اب دوسرا ملاحظہ کرو۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے اسے گن کے نشانے پر رکھ لیا اور ہاتھ کو اس انداز میں حرکت دی جیسے میں اسے شوٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ربی کی آنکھوں میں موت کا سایہ سا لہرا کر رہ گیا

"یہ...... یہ کیا کر...... رہے ہو......؟" وہ ہکلایا۔

"میں تو مسٹر برنارڈ لیو سے بات کرنے آیا تھا۔" میں نے اسے گھورا "تم بیچ میں کیوں آ گئے بڈھے طوطے۔ بتاؤ! مسٹر لیو کہاں ہیں؟"

میں یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے برنارڈ لیو کی شکل سے مجھے واقفیت نہ ہو۔ میرے استفسار پر فرینکلن نے بے ساختہ لیو کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"بس' بس میں سمجھ گیا یہ مسٹر برنارڈ لیو ہیں۔" میں نے بڑی اداکاری سے لیو کی جانب گن سے اشارہ کیا پھر دوبارہ فرینکلن کی سمت متوجہ ہو گیا "او گنجو بنگے! تم مجھے مسٹر لیو سے بات کرنے دو گے یا میں تمہیں بھی......!" میں نے جملہ ادھورا چھوڑا اور فرش نشیں بے حس و حرکت دراز قامت کو دیکھا۔

فرینکلن میری بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا' اضطراری لہجے میں بولا۔

"نن...... نہیں تم لیو سے جو بات کرنا چاہتے ہو کرو۔ میں تم دونوں کے بیچ نہیں آؤں گا...... بلکہ میں تو دوسرے کمرے میں جا رہا......"

"تم کہیں نہیں جاؤ گے۔" میں گن لہراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا "تم دوسرے کمرے میں پہنچ کر میری موت کا سامان بھی کر سکتے ہو۔ میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا بڈھے طوطے!"

ربی فرینکلن سر سے گنجا تھا' اس کی ناک کسی طوطے کی ناک سے مشابہ تھی اور زیادہ عمر کے باعث وہ کوئی بڈھا طوطا اور گنجو بنگا ہی دکھائی دیتا تھا۔

"اچھا' میں ادھر ہی بیٹھ جاتا ہوں۔" میرے تیور دیکھ کر خاصا فرماں بردار ہو گیا تھا "آپ لوگ میٹنگ کرو۔ میں کوئی

مداخلت نہیں کروں گا۔“

برنارڈ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا”جیری! تم میرے لیے ربی سیموئیل کا کیا پیغام لے کر آئے ہو؟“

موجودہ سچویشن نے برنارڈ لیو کو مصلحت کوشی پر مجبور کر دیا تھا لیکن میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا اس کی مصلحت کوشی منافقت سے لبریز تھی۔ آخر کو وہ ربی موشے ہائمن کا دستِ راست تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے وہ ایک سو ایک فیصد مجھے شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس کا یہ شک بجا بھی تھا۔

میں ربی فرینکلن کے انتہائی قریب آ گیا اور گن کے زور پر بے بس کر کے اس کی گردن کو اپنے بازو کی لپیٹ میں لے لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”سوری ربی! میں تمہاری کسی بات پر بھروسا نہیں کر سکتا لہٰذا تمہیں کسی مداخلت کے قابل نہیں رہنا چاہیے۔ افسوس کہ تم..... خوامخواہ ہمارے بیچ آ گئے!“

”یہ..... یہ کیا کر رہے ہو؟“ میرے الفاظ کی سنگینی اور سفاکی نے لیو کو چیخنے پر مجبور کر دیا”ربی فرینکلن کو چھوڑ دو..... اس کا دم گھٹ جائے گا۔“

”دیکھ لو کیا کر رہا ہوں۔ تم سے کچھ چھپا کر تھوڑی کر رہا ہوں۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا اور بات کے اختتام پر ربی فرینکلن کی گردن کو ایک مخصوص جھٹکے سے نوازا۔

برنارڈ لیو نے اپنے میزبان کا حشر نشر دیکھا تو سراسیمہ لہجے میں بولا”تت..... تم جیری نہیں‘ ہیرا پھیری ہو۔ بب..... بتاؤ .....کون ہو تم؟“

میں نے فرینکلن کے غیر متوازن بدن کو دراز قامت شخص کے پاس فرش پر پھینک دیا اور لیو کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا”تم نے بالکل صحیح کہا لیو! میں واقعی ایک بہت بڑی ہیرا پھیری ہوں۔ تمہاری محبت مجھے اپنا نام بتانے پر مجبور کر رہی ہے۔ میں تمہاری موت وجدان ہوں!“

اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ میں نے ان حیرت بھری آنکھوں میں بے پناہ وحشت اور دہشت کو موجزن پایا۔ اس کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے صرف اتنا خارج ہوا۔

”وجدان..... تم یہاں.....؟“

”کیوں‘ میں یہاں نہیں آ سکتا کیا؟“ میں نے غصیلی نظر سے گھور کر اسے دیکھا اور گن بہ دست آگے بڑھتے ہوئے کہا”اگر تم میرے کام کے ثابت نہ ہوئے تو میں اگلی چھلانگ میں ربی موشے ہائمن کے پاس ہوں گا۔“

”تت..... تم بہت غلط کر رہے ہو!“ اس کے الفاظ چغلی کھاتے تھے کہ وہ میری وجدان والی حیثیت پر ایمان لا چکا ہے۔ ورنہ یوں اس کے چہرے پر ہوائیاں نہ اڑتیں۔

میں دہاڑا”میں غلط کر رہا ہوں اور تم لوگوں نے میرے ساتھ بہت صحیح کیا ہے؟“

اس نے ایک نظر زمین پر پڑے ہوئے انجلی‘ فرینکلن اور دراز قامت شخص کو دیکھا پھر مجھ سے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی اور وہ جانب تھی دروازے والی۔

میں اس اٹھا پٹخ میں دوسرے رخ پر آ گیا تھا۔ ہمارے درمیان بہ مشکل دس فٹ کا فاصلہ حائل رہا ہوگا۔ لیو کتنا بھی تیز بھاگتا لیکن میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک طویل جست بھری اور دروازے سے محض ایک فٹ پہلے اسے چھاپ لیا۔ میں اتنے اہم آدمی کو یوں آسانی سے فرار ہوتے ہوئے بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ میری گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح مچلنے لگا۔

میں نے جیسے ہی برنارڈ لیو کو پکڑ کر اپنی سمت کھینچا‘ اپارٹمنٹ کا بیرونی دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے سے وسیم اندر آ گیا۔ ہمارا طے شدہ وقت پورا ہو گیا تھا!

میں نے دراز قامت شخص سے چھینی ہوئی گن وسیم کی طرف بڑھا دی اور کہا”تم ان تینوں کا”خیال“ رکھو۔“ میرا اشارہ فرش نشینوں کی جانب تھا”مجھے امید تو نہیں کہ ان میں سے کوئی تمہیں پریشان کرے گا۔ بہر حال اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو اس سائلنسر لگی گن کو بے دریغ استعمال کرنا۔ او کے۔“

وسیم نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا”تم بے فکر ہو کر اس کا”انٹرویو“ کرو۔ میں ادھر کے حالات کو سنبھال لوں گا۔“

میں برنارڈ لیو کو کسی ذبح شدہ جانور کے مانند گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ ایک لونگ روم تھا۔ ابھی تک اس اپارٹمنٹ میں جو بھی کارروائی ہوئی تھی اس کی خبر اڑ کر باہر نہیں جا سکی تھی اور یہ ہمارے حق میں بہت ہی اچھا تھا۔ ویسے تو اگر کوئی گولی وغیرہ بھی چل جاتی تو پھر بھی کسی کے اس جانب متوجہ ہونے کے امکان نہیں تھا‘ اس گن پر سائلنسر فٹ تھا۔

میں نے لیو کو ایک صوفے پر پھینکا اور پھنکار سے مشابہ آواز میں پوچھا”شرافت کے ساتھ انٹرویو دو گے یا پھر تمہاری بدمعاشی کو روکنے کا میں کوئی اور بندوبست کروں؟“

میرے اب تک کے سلوک نے اسے بری طرح دہشت میں مبتلا کر دیا تھا‘ لکنت زدہ لہجے میں بولا”وجدان! ہم تو تمہارے دوست ہیں۔ تم خوامخواہ.....“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے الٹے ہاتھ کا ایک زناٹے دار طمانچہ اس کے ہونٹوں پر رسید کیا‘ اگلے ہی لمحے اس کے

منہ سے خون جاری ہوگیا۔ میرے تھپڑ نے اس کے ہونٹوں کو زخمی کر دیا تھا۔ اس کی دہشت میں ہزار گنا اضافہ ہوگیا۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی لہٰذا......" میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑا اور اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کیس سے باہر کھینچ لیا "میرے پاس وقت بہت کم ہے لیو! اگر جینے کی تمنا رکھتے ہو تو میرے ہر سوال کا سیدھا جواب دینا ورنہ آج تمہارا ربی تمہیں میرے عتاب سے بچا نہیں سکے گا۔ کبھی تم نے مجھے ایک کال کوٹھری میں بند کر کے میرا انٹرویو کیا تھا' آج یہی کڑا وقت تم پر آن پڑا ہے۔ ماؤنٹ مکنلے اور سن شائن اپارٹمنٹس میں جتنا فرق ہے میں اس خنجر کی ایک جنبش سے اس تفاوت کو مٹا دوں گا اور......" میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم عیار یہودی کسی غیر یہودی کے دوست ہو ہی نہیں سکتے لہٰذا اس ذیل میں اپنی ناپاک زبان سے ایک لفظ نہ نکالنا ورنہ میں انٹرویو لیے بغیر ہی تمہیں "پاس" کر دوں گا۔"

وہ بے حد سراسیمہ نظر سے خنجر کی چمکتی ہوئی دھار کو تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں موت کے سائے رقصاں تھے۔ ماؤنٹ مکنلے (الاسکا) والی خفیہ پناہ گاہ میں' میں نے برنارڈ لیو کے اندر جو تنتنا اور کروفر دیکھا تھا' وہ اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے اس کے سامنے وجدان نہیں بلکہ ملک الموت موجود ہو!

میں نے اس کی ڈری سہمی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سوال کیا "میری ساحل کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"م......میں نہیں جانتا۔" وہ دہشت زدہ انداز میں ہکلایا۔

میں نے بجلی کی سی سرعت سے اپنے ہاتھ کو حرکت دی' اگلے ہی لمحے برنارڈ کے بائیں گال پر ایک سرخ لکیر سی نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس لکیر سے خون ابلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لیو کے حلق سے ایک دبی دبی چیخ بھی برآمد ہوئی۔ میں نے غرا کر کہا "تم نہیں جانتے یا تمہیں بتانے سے روکا گیا ہے؟"

"ت......تم میری بات کا یقین کرو وجدان۔" وہ سراسیمہ انداز میں بولا "مجھے ساحل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں......"

بات ختم کرتے ہی اس کے منہ سے ایک چیخ خارج ہوئی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک کاری جرکا لگا دیا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے گمبھیر لہجے میں دریافت کیا۔

"ساحل کو پہلے وال اسٹریٹ والے ٹھکانے پر رکھا گیا تھا۔ پھر اس کا ٹھکانا بدل دیا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں تم لوگوں کی سرگرمیوں سے بالکل ہی بے خبر ہوں۔ نیویارک آنے کے بعد تم نیوی بلیو کلر بی ایم ڈبلیو میں ایسٹ باسٹھ اسٹریٹ والے سائنا گاگ پہنچے تھے۔ اس گاڑی کا نمبر "ایٹ فائیو۔ بی۔ سیون فور ڈبل زیرو" ہے۔ اس سائنا گاگ میں ربی نے تم پر اور میری ڈپلیکیٹ پر کوئی عمل بھی کیا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ مجھے کسی اور ہی سیارے کی مخلوق سمجھ رہا ہو۔ میرے انکشافات اسے ورطۂ حیرت میں سرتاپا غرق کرنے کے لیے بہت کافی تھے۔ میں نے اس کی تشویش آمیز حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں نے مجھے گھیرنے کے لیے ونڈوز آف دی ورلڈ والا چکر چلایا۔ وہاں ٹیبل نمبر ون او فائیو پر ساحل کی ڈپلیکیٹ کو پہنچا کر مجھے شکار کرنا چاہا۔ تمہارا ربی مجھ سے دوستی کا دم بھرتا ہے اور تم بھی اسی کا راگ الاپتے ہو۔ کیا میں اتنا ہی احمق ہوں کہ آنکھیں بند کر کے تم لوگوں کا فریب کھا لوں گا؟" میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے دیکھا اور مزید کہا۔

"لیو! میں تمہیں زندہ رہنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔ سیدھی طرح بتا دو میری ساحل کہاں ہے ورنہ تم لیو نہیں رہو گے' میں تمہیں "کالی کالی بکری" بنا کر بے دریغ ذبح کر ڈالوں گا۔ پھر تمہاری "میں میں" سدا کے لیے بند ہو جائے گی!"

میرے الفاظ کی سنگینی نے اسے ایک صحت مند جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا پھر اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی بے بسی جھلکنے لگی' بڑے مسکین سے لہجے میں گویا ہوا "وجدان تم یقین کرو' میں تمہاری ساتھی کے ٹھکانے سے واقف نہیں ہوں۔"

میں نے اس کے سامنے بیٹھے بیٹھے ایک جھٹکے سے لات چلائی۔ میری فرنٹ جرک کک نے اس کی گھائل ٹھوڑی کا مزاج پوچھا۔ وہ بری طرح بلبلاتے ہوئے صوفے کی پشت سے جا ٹکرایا۔ میں نے خنجر کی نوک سے اس کے ماتھے پر دو تین خونیں لکیریں چکائیں اور غراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

"مگر میں تمہارے ٹھکانے سے ضرور واقف ہوں۔ تم آئندہ چند لمحوں میں جہنم واصل کیے جانے والے ہو۔"

اس کی بے بسی میں کئی گنا اضافہ ہوگیا' تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا "وجدان! میں تمہیں یقین نہیں دلا سکتا۔ میں بہت مجبور ہوں۔"

"میں تم سے بھی زیادہ مجبور ہوں لیو۔" میں نے خنجر کی دھار کو اس کی گردن پر ٹکاتے ہوئے کہا "جب تم مجھے ساحل کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے تو پھر تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔"

اس نے بے بسی کی انتہا کو پہنچ کر آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ایک نئی چال آزمائی "چلو مرنے سے پہلے اپنے

گرد گھنسال کے بارے ہی میں بتادو۔ روبی موشے ہائمن اس وقت کہاں ملے گا؟'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''میں ربی ہی سے ساحل کے بارے میں پوچھوں گا۔ وہ گرگِ باراں دیدہ تو ضرور میری ساتھی کے ٹھکانے سے واقف ہوگا؟''

''ربی اس وقت اسرائیل میں ہیں۔'' لیو نے نحیف سی آواز میں بتایا۔

''تم ربی کے پکے چیلے ہو لیو۔'' میں نے پھنکار کر کہا ''اس کی طرح بڑا پکا جھوٹ بول رہے ہو۔''

وہ منمنایا ''میں تم سے غلط نہیں کہہ رہا۔ ربی واقعی امریکا میں نہیں ہیں۔''

''کل رات آٹھ بجے تو وہ سائنا گاگ میں موجود تھا؟''

''ہاں' وہ نو بجے کے قریب نیو یارک سے اسرائیل روانہ ہوگئے تھے۔''

''تمہیں کیسے معلوم......؟'' میں نے خنجر پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا ''تم تو اس وقت ربی کے کسی پراسرار عمل کے زیر اثر گہری نیند میں تھے؟''

''وہ......وہ......'' وہ ہڑبڑا کر رہ گیا پھر جھوٹ کا سہارا لے کر اپنی بات کو سنبھالتے ہوئے بولا ''میرا مطلب ہے' ربی نے مجھے اپنے پروگرام سے پہلے ہی آگاہ کردیا تھا۔''

مجھے یقین ہوگیا' وہ دروغ گوئی کرکے مجھے چکر دینا چاہتا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ربی امریکا میں تھا یا اسرائیل میں' میں نے دو ٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''تم ربی کے پروگرام سے تو آگاہ ہوگئے تھے لیکن تمہیں نہیں معلوم' میں نے تمہارے بارے میں کیا پروگرام بنا رکھا ہے۔ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہیں یک مشت ختم کردوں گا۔ میں تمہیں قسط وار ماروں گا۔''

میں نے تھوڑا توقف کیا پھر خنجر کو اس کے گلے سے ہٹاتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا ''اس ڈیل کی پہلی قسط پکڑو۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے برنارڈ لیو کی ناک پر خنجر کی دھار کو آزمایا۔ میرے ہاتھ نے زناٹے سے ایک حرکت کی۔ خنجر کی نیچے سے اوپر موومنٹ نے لیو کے چہرے کو ناک کے بوجھ سے آزاد کردیا۔ مقام ناک پر ایک بھیانک خلا نمودار ہوگیا۔

درد کی شدت نے لیو کو ذبح ہوتے ہوئے بکرے کے مانند ڈکرانے پر مجبور کردیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی اور اس کے ایک کان کو بھی اڑا کر رکھ دیا۔

''لو یہ دوسری قسط بھی وصول کرو۔'' میں نے تمام تر سفاکی سے کہا۔

لیو کی تکلیف کا بالکل صحیح اندازہ تو وہی لگا سکتا ہے جو کبھی اس اذیت ناک تجربے سے گزرا ہو۔ اس کی حالت بڑی مخدوش تھی۔ شاید اس لیے بھی میں ایسا محسوس کررہا تھا کہ ان لمحات میں میں ایک جنونی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اسی کیفیت میں' میں نے اسے دوسرے کان سے بھی فارغ کردیا۔ وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کے مانند تڑپنے لگا۔

میں نے موت سے بھی زیادہ سفاک لہجے میں کہا ''تمہارا ایک ایک عضو اسی طرح میرے خنجر کی پیاس بجھاتا رہے گا۔ جب تک تم زبان نہیں کھولو گے' میں ہاتھ نہیں روکوں گا۔ سب سے آخر میں تمہاری زبان کی باری آئے گی۔ اگر باقی اعضا محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو بتادو' ربی کہاں ہے؟''

''میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں' ربی اس وقت تل ابیب میں ہیں۔'' بات کرتے ہوئے اس کے آنسو بھی نکل آئے۔ ''تم انہیں فون کرکے میری بات کی تصدیق کرسکتے ہو۔ تمہارے پاس ان کا موبائل نمبر موجود ہے۔''

لیو جن لمحات سے گزر رہا تھا ان میں کسی سے جھوٹ کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔ میں نے ربی کے اسرائیل میں ہونے کا یقین کرلیا اور لیو کو مزید گھسیٹتے ہوئے کہا۔

''میں مان لیتا ہوں' ربی کل رات یہاں سے چلا گیا تو میں ضرورت محسوس کروں گا تو اس کو کال بھی کرلوں گا۔ تم اچھے بچوں کی طرح اب یہ بھی بتادو کہ ساحل کو کہاں رکھا گیا ہے؟''

''مم......میں ساحل کے ٹھکانے سے آگاہ نہیں ہوں۔'' بڑی بے چارگی سے بولا ''البتہ مجھے اتنا پتا ہے' تمہارا وہ ہم شکل اس بارے میں ضرور جانتا ہوگا۔''

اس کا اشارہ نقلی وجدان کی طرف تھا۔ میں چونک اٹھا ''ہم شکل ہوگا کا کیا مطلب؟''

''ربی اس شخص اور تمہاری ساتھی کے بارے میں کوئی منصوبہ بنا رہے تھے۔'' لیو نے میرے دیے ہوئے زخموں کی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے کہا ''آئندہ ان دونوں کو ایک ساتھ مل کر موو کرنا تھا۔''

لیو کا انکشاف نہایت ہی اہم تھا۔ اگر وہ غلط بیانی نہیں کر رہا تھا تو ساحل اس وقت نقلی وجدان کے پاس ہوسکتی تھی۔ ربی بڑا ہی کائیاں اور مکار شخص تھا۔ وہ ساحل کو نقلی وجدان کے ساتھ کرکے مجھے کمزور بنانا چاہتا تھا۔ اس خیال نے مجھے ہولا کر رکھ دیا کہ ساحل تو اسے اصلی وجدان ہی سمجھتی ہوگی جیسے چند روز پہلے تک صدف سمجھ رہی تھی۔ ربی میری کمزوریاں بخوبی جان گیا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔

میں نے لیو سے استفسار کیا ''اس وقت وہ شیطان کہاں ہوگا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ بولا ''ہاں' یہ جانتا ہوں' وہ نیو یارک ہی میں ہے۔''

''وہ ساحل کے ساتھ کس ڈائریکشن میں موو کرنے والا ہے؟''

''ربی کے منصوبے کے مطابق ان دونوں کو گھمنڈ و جانا تھا۔'' اس نے بتایا۔

میں ربی کی شاطر چال پر دنگ رہ گیا۔ اس نے ساحل کو نقلی خوشی بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ تک پہنچانے کا اچھا طریقہ وضع کیا تھا۔ ساحل بے چاری یہی سمجھتی کہ وہ اپنے وجدان کے ساتھ اپنی دھرتی پر واپس جارہی ہے۔ اس چال سے یہ بھی ثابت ہوا' نیپال میں ابھی ربی کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی ورنہ ساحل کو اس طرف روانہ کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ ویسے ایک بات ہے' ربی کو اس سلسلے میں بہروپیے پر اچھی خاصی محنت کرنا پڑی ہوگی۔

میں نے لیو سے پوچھا ''اگر وہ آفت زادہ ابھی تک نیو یارک میں ہے تو اس کا مطلب ہے' ساحل بھی یہیں کہیں موجود ہے۔ کیا میرا ہم شکل تمہارے رابطے میں ہے؟''

برنارڈ لیو نے اس بہروپیے کو میرا ہم شکل کہا تھا لہٰذا میں نے بھی یہی الفاظ استعمال کیے۔ اس نے جواب دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو مجھے شک ہوا' وہ کچھ چھپانے کے موڈ میں ہے۔ میں نے فوراً خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

''کوئی چکر نہیں لیو!'' میں نے سنگین لہجے میں کہا ''ورنہ ابھی چیر کر رکھ دوں گا۔''

وہ ان لمحات میں پوری طرح میری دہشت کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ جھوٹ بول کر وہ اپنی زندگی سے جاتا' انتہائی بے چارگی کے عالم میں اس نے بتایا۔

''ہم دونوں یک طرفہ رابطے میں ہیں۔ یعنی وہ چاہے تو مجھ سے رابطہ کرسکتا ہے لیکن مجھے اس کی اجازت نہیں۔ ربی نے سختی سے ہدایت کر رکھی ہے' میں تمہارے ہم شکل کی ہر ممکن مدد کروں لیکن از خود اس کی جانب بڑھنے کی کوشش نہ کروں۔''

بات پوری کرنے کے بعد لیو نے وال کلاک کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھی اس نے ایسی ہی حرکت کی تھی لیکن میں نے اس وقت دھیان نہیں دیا تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کسی خاص مقصد سے ٹائم دیکھ رہا ہو' اس کی نگاہ میں انتظار کی سی کیفیت تھی۔ میرے لیے اتنا ہی اشارہ کافی تھا۔ میں نے خنجر کی نوک کو گوشت کے ذائقے سے آشنا کرتے ہوئے کہا۔

''کیا وہ آفت زادہ یہاں بھی آتا رہتا ہے؟''

اس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا ''ٹھیک ہے' سمجھ گیا میں۔ وہ تمہاری رہائش گاہ سے واقف ہے۔'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا پھر پوچھا۔

''کیا اس وقت بھی تم اس کی آمد کی امید کررہے ہو؟''

برنارڈ لیو نے جواب دینے کے لیے اپنے زخمی لب وا کیے ہی تھے کہ ڈور بیل نے اپنی مخصوص آواز سے کسی کی آمد کا اعلان کردیا۔ میں نے لیو کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے سوالیہ انداز میں بھویں اچکائیں۔ وہ فوراً سے پیشتر سمجھ گیا' میں اس سے کیا پوچھ رہا ہوں۔ جواب میں اثبات کے طور پر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجانے والا میرا پرتو نقلی وجدان ہی تھا۔ میرے اعصاب کلف زدہ ہوگئے۔

میرے پاس سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ میں نے نئے نویلے خنجر کو برنارڈ لیو کی شہ رگ پر چلا دیا۔ ادھر دھار نے کام دکھایا' ادھر گندے خون کا ایک فوارہ سا چھوٹ گیا۔ میں اچک کر ایک جانب ہٹ گیا۔ اگر میں یہ قدم اٹھانے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کردیتا تو میرا لباس آلودہ ہوجاتا۔

میں لیو کو تڑپتا' پھڑکتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وسیم میری ہی طرف آرہا تھا۔ یقیناً وہ مجھ سے پوچھے بغیر دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پھر اطلاعی گھنٹی اپنا فرض پورا کرچکی تھی۔ بیرونی دروازے کے قریب ہی فرش پر' اپارٹمنٹ کے اندر تین افراد دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ جن میں سے انجلی کی زندگی کا امکان باقی تھا۔ ربی فرینکلن اور دراز قامت شخص کا تو میں نے منکا توڑ دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی ٹوٹی ہوئی گردنوں سمیت اب کسی اور ہی دنیا کے باسی تھے۔

جب تک تیسری بار گھنٹی بجتی' ہم دونوں نگاہوں ہی نگاہوں میں لائحہ عمل ترتیب دے چکے تھے۔ میں دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہوگیا اور وسیم سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ وسیم نے دروازے کی سمت ہاتھ بڑھانے سے قبل گن کو جیب میں رکھ لیا تھا۔

آنے والا جو کوئی بھی ہوتا' بہر حال وہ ہمارا دوست نہیں ہوسکتا تھا۔ ویسے زیادہ امکان نقلی وجدان کا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس سے یوں ون ٹو ون میرا سامنا ہوگا۔ میں نے اسے لفٹ نہ کرا کر برہم کردیا تھا اور ربی نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے میرے مقابل لا کھڑا کیا تھا۔ ویسے میں نقلی وجدان کی ایک بات کو مان گیا تھا' اس نے کہا تھا اگر میں نے اس پر تصرف حاصل نہ کیا تو وہ بدی کی کسی قوت کے ہاتھ کا کھلونا بن جائے گا۔ ربی کا اب تک جتنا کردار مجھ پر کھلا تھا' وہ اس تعریف پر پورا اترتا تھا۔

وسیم نے میرے اشارے پر جیسے ہی دروازہ کھولا' ایک قد آور شخص اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ وسیم کی صورت کا رنگ بدل

گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے استعجاب کا پہلو نظر آیا۔ وسیم اس کے لیے ایک اجنبی چہرہ تھا لہٰذا وہ بھی تھوڑا سا چونکا مگر اس سے پہلے کہ وہ تین فرش نشینوں کو دیکھ کر مزید چونکتا' میں نے اسے ایک لات کی سلامی پیش کرنا ضروری جانا۔

اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ایک فرنٹ پریشر کک اس کی تشریف پر رسید کی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے تھوڑا آگے گیا پھر پلٹ کر عقب میں دیکھا...... اور میری توقع کی تصدیق ہو گئی۔

اس وقت میں اپنے ہی سامنے کھڑا تھا یعنی نقلی وجدان میرے روبرو تھا۔ وہ جب تک صرف میرا پرتو تھا تو اور بات تھی۔ اب تو وہ ایک سو ایک فیصد نقلی وجدان تھا' رٹی نے اپنی پراسرار صلاحیتوں کے طفیل اس میں بہت کچھ بھرنے کی کوشش کی تھی۔

نقلی وجدان نے چونکہ میری لات کھائی تھی لہٰذا اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ میں کسی اور کے میک اپ میں تھا چنانچہ وہ فوری طور پر میری اصلیت سے واقف نہ ہو سکا' البتہ فرش پر دراز تین بے حس و حرکت افراد کو دیکھ کر اس نے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں امید کر رہا تھا' وہ پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوگا۔ میں اس کے لیے پوری طرح ذہنی طور پر تیار کھڑا تھا مگر اس موقع پر اس نے بڑی عجیب حرکت کی۔ اس حرکت میں بلا کا اعتماد پایا جاتا تھا۔

وہ ہم دونوں کو یکسر نظر انداز کر کے اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ برنارڈ لیو کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں ذرہ برابر اہمیت نہیں دی تھی۔ ہم دونوں نے معنی خیز اور تعجب انگیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

"وسیم! یہ شخص یہاں سے نکل کر نہیں جانا چاہیے۔ برنارڈ لیو سے میں معلوم کر چکا ہوں' میری ساتھی ساحل اس کے قبضے میں ہے۔"

"کیا یہ تمہارے میک اپ میں ہے؟" وسیم نے میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

میں نے کہا "اس کے بارے میں' میں تمہیں بعد میں تفصیلاً بتاؤں گا۔ فی الحال اتنا جان لو یہ کسی میک اپ وغیرہ میں نہیں' اپنی اصل شکل و صورت میں ہے۔"

وسیم حیران و پریشان میرے ساتھ دوڑتے ہوئے اس کمرے میں پہنچا جہاں میں نے بڑی بے دردی سے برنارڈ لیو کو ذبح کیا تھا۔ نقلی وجدان اس وقت متاسفانہ انداز میں لیو کی اجڑی پچھڑی لاش کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ ہماری موجودگی کو محسوس کر کے وہ ایک جھٹکے سے پلٹا۔ ہم دونوں سے سامنا ہوا تو میں نے اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹتی دیکھیں اور نہ ہی کسی قسم کی برہمی کے آثار مجھے نظر آئے۔ یہ عجیب و غریب صورت حال تھ[ی] نہیں' رٹی نے اسے ہپناٹائز کر کے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ [یہ] نہیں ہوا کرتا تھا۔

وہ ہم پر ایک اچٹتی ہی نگاہ ڈال کر واپس جانے لگا اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا "وجدان! [تم] ایسے تو نہیں جانے دوں گا۔"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی اصلی آواز [اور] لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ اس کا چونک جانا عین فطر[ی] تھی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اس کے چہرے پر تمسخرانہ سلوٹیں دکھائی دیں۔ وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔

"تو تم نے بھی بھیس بدلنا شروع کر دیا۔ مجھے نقلی کہ[نے] خود کسی کی نقل بنے گھوم رہے ہو۔ واہ بھئی واہ۔ تمہارا بھی [جواب] نہیں۔"

"زیادہ ڈائیلاگ مارنے کی ضرورت نہیں۔" م[یں نے] بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "بتاؤ' تم نے میری ساحل کو کہا[ں] رکھا ہے؟"

وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا "نیویارک [بہت بڑا شہر] ہے اور اسے کئی ساحل لگتے ہیں۔ ذرا اس کا طواف کر[و] ادھر ادھر نگاہ دوڑاؤ۔ ہو سکتا ہے گوہرِ مقصود ہاتھ آ جائے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اس پر حملہ کر د[یا۔ میں] نے تین زبردست کِکس کے کمبی نیشن سے اسے پیچھے [دھکیلتے] ہوئے دیوار کے قریب' وسیم کے پہلو میں پہنچا دیا۔ اچا[نک وہ] اس پر پل پڑا۔ اس کے انداز میں بڑا جارحانہ پن تھا۔

میرے نیگیٹو (نقلی وجدان) نے وسیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔ [چند] لمحاتی کوشش سے وسیم کی گردن اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ [اس نے] وسیم کی گردن دبوچ کر اس کو اوپر اٹھا لیا۔ وسیم ہوا میں [معلق] پاؤں جھٹکنے لگا۔ یہ بڑی واہیات صورت حال تھی۔

میں وسیم کی مدد کو لپکا اور ایک لمبے اسٹیپ والی سا[ئیڈ کک] نیگیٹو کی پشت پر رسید کر دی۔ وہ تھوڑا سا ڈگمگایا اور وسیم کو [اپنے ہاتھوں] سے تھامے تھامے دور اچھال دیا۔ وسیم ایک دیوار سے ٹکرا[تا ہوا فرش] پر آ رہا۔ میں نے نیگیٹو پر تابڑتوڑ حملے شروع کر دیے۔

اس نے میرے ہر اٹیک کو مناسب طریقے [سے بلاک] کرنے کے بعد کاؤنٹر اٹیک کیا پھر ہم دونوں میں [گھمسان کی جنگ چھڑ] گئی۔ کبھی وہ مجھ پر حاوی آنے لگتا اور کبھی میں اس [پر حاوی] آ جاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں اپنے آپ سے لڑ [رہا ہوں۔] میں اس پر جو بھی حملہ کرتا' اس کے پاس اس کا توڑ موجود [ہوتا۔] وہ میرے ہی دماغ سے سوچ رہا تھا۔

پانچ منٹ کی فائٹا فائٹی میں ہم نے ایک دوسرے [کو]

خاصی ضربات پہنچائیں۔ بلاکنگ کرتے ہوئے میری دونوں کہنیاں جیسے سن سی ہوگئیں۔ میں نے ایک بھرپور کریسنٹ کک سے اس کے بالائی ہونٹ کو زخمی کردیا۔ اس دوران میں وسیم ایک طرف ساکت کھڑا ہمیں یک ٹک دیکھتا رہا۔ اس نے اس نوعیت کی فائٹ زندگی میں پہلی مرتبہ ملاحظہ کی ہوگی۔

ہمارا مقابلہ جاری ہی تھا کہ نیکیٹو نے ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے ایک ہائی جمپ لگائی اور میرے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے کافی فاصلے پر چلا گیا۔ اب وہ میرے اور داخلی دروازے کے درمیان تین انشا عقیل افراد کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے ایک غصہ دلانے والی معنی خیز نگاہ مجھ پر ڈالی اور دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

میں نے اسے پکڑنے کے لیے دوڑ لگادی۔ وسیم نے بھی میری تقلید کی اور جب تک ہم اس تک پہنچتے' وہ دروازہ کھول کر اپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا تھا۔

''وسیم' کسی قیمت پر اسے نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دینا۔ بڑی مشکل سے مجھے ساحل تک پہنچنے کا ایک راستہ ملا ہے۔ اگر یہ ہاتھ سے نکل گیا تو غضب ہوجائے گا۔''

ہم اندھا دھند دوڑتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر آئے۔ نیکیٹو مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس کی تلاش میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی۔ وسیم نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔

''وجدان! ادھر دیکھو وہ کتنے اطمینان سے ٹہلتے ہوئے جارہا ہے۔''

میں نے وسیم کے اشارے کا تعاقب کیا تو وہ بدمعاش مجھے نظر آگیا۔ نقلی وجدان ایسٹ انسٹھ اسٹریٹ پر چلتے ہوئے الیگزنڈر ایونیو کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بلا کا سکون بھرا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بانکا چھبیلا نیویارکر آدمی رات کو مٹرگشت کرنے نکلا ہو۔ ہم نے اپنے پاؤں میں بگولے باندھے اور آندھی طوفان کی رفتار سے بھاگتے ہوئے اس کا تعاقب کرنے لگے۔

اس کے اطمینان اور ہمارے اضطراب نے درمیانی فاصلہ بتدریج کم کردیا۔ ہم جب اس سے محض پچاس گز کی دوری پر تھے تو وہ ایک سب وے گلوب کے پاس رک گیا۔ اس نے ایک نظر گلوب کو دیکھا پھر مخصوص انٹرنس میں داخل ہوگیا۔

''وہ سب وے سے فرار ہورہا ہے۔'' وسیم نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کرتے ہوئے پرعزم لہجے میں کہا ''میں اسے کسی قیمت پر فرار نہیں ہونے دوں گا۔ ہمیں جلدی سے پلیٹ فارم پر پہنچنا ہوگا۔''

ہم انٹرنس گلوب کے سامنے پہنچے تو وسیم ٹھٹک کر رک گیا۔

''کیا ہوا۔ تم رکے کیوں ہو؟''

''گلوب کا رنگ دیکھ رہے ہو!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ مجھے نیویارک کے سب وے کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ میں نے کہا ''گلوب کا رنگ سرخ ہے' پھر؟''

''سرخ گلوب کا مطلب ہے' یہ انٹرنس عارضی طور پر بند ہے۔'' وسیم نے وضاحت کی ''ایسے پلیٹ فارم پر بے گھر افراد' جرائم پیشہ اسٹریٹ بوائز اور منشیات کے عادی لوگوں کا قبضہ ہوتا ہے۔ تم اسے چھوٹی موٹی کرائم مارکیٹ بھی کہہ سکتے ہو۔ صرف وہ پلیٹ فارم بارونق اور استعمال میں ہوتے ہیں جن کا انٹرنس گلوب سبز رنگ ظاہر کرتا ہو۔''

''جو بھی ہو' ہمیں اندر اترنا ہے کیونکہ ہمارا شکار اسی طرف گیا ہے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''اس کو پکڑنے کے لیے میں پاتال میں بھی غوطہ لگا سکتا ہوں۔''

وسیم نے کوئی جرح نہیں کی اور ہم سب وے انٹرنس میں داخل ہوگئے۔

پلیٹ فارم تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ سب وے کا وہ اسٹیشن پوری طرح آباد تھا۔ وسیم نے بکھری ہوئی آواز میں کہا ''یہ...... یہ کیسے...... ہوسکتا ہے؟''

میں نیکیٹو کے چمتکار پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا لہٰذا ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''آج سب کچھ ہوسکتا ہے۔ تم آؤ میرے ساتھ!''

اس آفتی نے یقیناً انٹرنس والے گلوب کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تھی۔ اس گڑبڑ پر غور و فکر کا وقت نہیں تھا۔ ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچے۔ پلیٹ فارم پر سب وے سکس لائن کھڑی تھی۔ اس کا رخ جنوب سے شمال کی سمت تھا۔ اسٹریٹ نفٹی نائن مڈ ٹاؤن مین ہٹن کی آخری اسٹریٹ تھی۔ کہا ''6-LINE'' اپ ٹاؤن جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میری متلاشی نظر پلیٹ فارم پر موجود ایک ایک چہرے کا جائزہ لے رہی تھی...... پھر میں نے اپنی مراد پالی!

میں نے نقلی وجدان کو سب وے کے دروازے کی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ کوئی عورت اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ مذکورہ عورت کا چہرہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے دل نے تڑپ کر گواہی دی...... وہ میری ساحل ہے!

پھر ہم دونوں نے سکس لائن کی جانب دوڑ لگادی۔

وقت کو تھام کر رکھنا آسان نہیں۔ یہ بڑا کج ادا ہے' پلٹ کر دیکھتا ہے اور نہ ہی پوچھتا۔ اپنی مخصوص رفتار سے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ انسان اس کے تعاقب میں دوڑنے پر مجبور ہے ورنہ یہ ریت کی طرح پھسل کر مٹھی سے نکل جاتا ہے!

اس وقت میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور میں اندھا دھند سکس لائن کی جانب دوڑ رہا تھا۔ وسیم بھی میری تقلید میں تھا۔ مجھے ہر صورت وقت کو اپنی گرفت میں لینا تھا۔ اگر وہ آفت زادہ نقلی وجدان میرے ہتھے چڑھ جاتا تو میں چٹکی بجاتے میں وقت کو پچھاڑ سکتا تھا۔ نقلی وجدان کے قابو آنے کا مطلب تھا' میں نے ساحل کو حاصل کرلیا۔

ہم نے ٹرین کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ آٹو میٹک سسٹم کے تحت اس کا دروازہ بند ہوگیا۔ ہمیں اگر لمحہ بھر... کی تاخیر بھی ہوجاتی تو ٹرین چھوٹنے کا قوی امکان تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب وے سکس لائن حرکت میں آگئی۔ ہم اسی بوگی میں سوار ہوئے تھے جس کے اندر میں نے اس بدمعاش کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔ سب وے لائنز (ٹرینوں) کی پیشانی پر اور ہر بوگی کے دروازے پر اس کا مخصوص نمبر درج ہوتا تھا تاکہ مسافروں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

میں اس وقت سخت پریشان تھا کیونکہ میں کوئی عام مسافر نہیں تھا اور نہ ہی کسی معمول کے کام سے سفر کررہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی مشن تھا اور میری پریشانی کا سبب وہ نیکیٹو تھا جو مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے مضطرب قدم اور متلاشی نگاہ بوگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اسے ڈھونڈ رہی تھی...... پھر وہ مجھے نظر آگیا۔ وہ ایک سیٹ پر اکیلا بیٹھا تھا۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ اس کمینے نے اپنے چہرے کے سامنے کوئی میگزین کھول رکھا تھا جس کے سبب اس کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی تاہم میں نے شکل دیکھے بغیر بھی اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہ کی۔ میری دیکھا دیکھی وسیم کی نگاہ بھی اس تک رسائی حاصل کرچکی تھی۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی سرگوشی میں گہری تشویش تھی۔

''وجدان! اس کے ساتھ ایک عورت بھی ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ وہ کہیں نظر نہیں آرہی!''

میں نے بھی سرگوشیانہ انداز ہی میں جواب دیا ''لگتا ہے اس بدمعاش نے اسے کہیں اِدھر اُدھر کردیا ہے۔ اس سے کوئی بھی حیرت انگیز بات بعید نہیں۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''مجھے شک ہے اس کی ساتھی عورت ساحل کے سوا اور کوئی نہیں......''

''اس شک کی تصدیق کرلیتے ہیں۔'' وسیم نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا تاہم لہجے کو دھیما ہی رکھا ''یہ چلتی ہوئی ٹرین سے بھاگ کر کہاں جائے گا۔ آؤ اس کا مزاج پوچھتے ہیں۔''

''ٹھہرو!'' میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا ''تم اس آفتی پر نظر رکھو۔ میں چند سیکنڈ میں آتا ہوں۔''

''تم کہاں جارہے ہو؟'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کرلیں۔ دو آنکھیں بند ہوتے ہی تیسری آنکھ بیدار ہوگئی۔ میں نے ساحل کے خال و خط کو تھرڈ آئی کے سامنے اجاگر کیا۔ اس کام میں اب مجھے خاصی مہارت حاصل ہوگئی تھی' پلک جھپکے بغیر میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا اور یہ جان کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ وہ اس وقت ٹرین میں نہیں تھی۔

میری ساحل کی سکس لائن میں غیر موجودگی اتنی زیادہ تشویش ناک نہیں تھی۔ نیکیٹو کے پہلو میں چلتی ہوئی عورت کی شکل میں نے نہیں دیکھی تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا کہ وہ ساحل ہوگی۔ بعض اوقات قوی اندازے بھی غلط ثابت ہوجاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا وہ کوئی غیر متعلق عورت ہو۔ نیکیٹو کے نزدیک اسے دیکھ کر میرا دھیان آپوں آپ ساحل کی طرف چلا گیا ہو۔ ہاتھ تھام لینا مغرب خصوصاً امریکا میں ایک عام سی بات ہے۔ وہ میری نظر کا دھوکا بھی ہوسکتا تھا۔ نقلی وجدان ایسے فریب دینے کا ماہر تھا۔ سب وے انٹرنس گلوب کے ساتھ بھی اس نے کچھ اسی قسم کا ہاتھ دکھایا تھا۔ میں جس قسم کی صورتِ حالات سے گزر رہا تھا اس میں اس ڈگر پر سوچنا عین فطری بات تھی۔ اب میرے اضطراب...... بلکہ عذاب کا سبب یہ تھا کہ اس وقت ساحل ایک بند ویگن میں سفر کررہی تھی۔ میں نے آخری مرتبہ اسے اسی بیڈروم میں دیکھا تھا جہاں وہ پچھلے دو دن سے موجود تھی۔ کسی ویگن میں اس کا محوِ سفر ہونا حالات میں بہت بڑی تبدیلی کی جانب ایک واضح اشارہ تھا۔ میں اس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے میں اس ماحول کا حصہ بن گیا۔

وہ ایک ڈبل کیبن والی ویگن تھی۔ ساحل کو عقبی کیبن میں رکھا گیا تھا اور وہ وہاں اکیلی تھی۔ فرنٹ کیبن میں ڈرائیور کے علاوہ اور کون کون موجود تھا' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ساحل کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ایک آرام دہ سیٹ پر دراز تھی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس وقت سو رہی تھی

نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی میری جانب سیدھا ہوا' میں نے مختصر سے اسٹیپ کے ساتھ اس کے سینے پر ایک پش کک رسید کردی۔

اس کک میں ایک زوردار دھکا پوشیدہ تھا۔ وہ دو قدم پیچھے گیا پھر اپنے عقب میں ٹرین کی ''دیوار'' سے جاٹکرایا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ بیک پش کی مدد سے وہ تقریباً ہوا میں تیرتے ہوئے میری سمت آیا۔ اس کا انداز فلائنگ کک مارنے والا تھا۔

میں نے سائیڈ بلاک کیا۔ ٹرین میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ ہم آزادانہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوسکتے۔ میرا پرتو جذبات میں آکر کچھ زیادہ ہی اچھل کود مچا رہا تھا' شاید اسی لیے اسے بار بار ناکامی... کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا جبکہ اس کے برعکس میں اسٹریٹ فائٹ کے اصولوں پر کاربند تھا۔ موقع کی نزاکت انہی اصولوں کی متقاضی تھی۔

میری بلاکنگ کے نتیجے میں وہ ایک مسافر کے اوپر جاگرا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں مضروب مسافر کی گالیاں بلند ہوئیں۔ میرے مدمقابل نے اس مسافر کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا اور اٹھ کر میری جانب بڑھا۔ اسی لمحے میں نے اس کی ناک پر ایک زوردار مکا جڑ دیا۔

وہ اپنی ناک تھام کر پیچھے کو گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ایک پریشر کک ٹکا دی۔ وہ ٹرین کے فرش پر پھسلا اور اسی مسافر کے قدموں میں جاگرا جس کے منہ پر اس نے لحہ بھر پہلے طمانچہ مارا تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا اور خاصا سنگین اتفاق تھا۔ میرے دشمن کی ہزیمت قابلِ دید تھی!

وہ مسافر بہت برہم تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' اپنے بوٹ کو نقلی وجدان کے سینے اور پیٹ پر برسانا شروع کردیا۔ یہ اس کے غصے اور کمزوری کا اظہار تھا اور عین فطری ردِعمل تھا۔ وہ بے چارہ یہ نہیں جانتا تھا' غلطی سے کس مصیبت کے منہ میں ہاتھ دے بیٹھا ہے۔ جلد ہی اسے اس غلطی کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔

فرش پر پڑے ہوئے آفت زادے نے مسافر کی ٹانگوں میں ہاتھ دے کر اسے اوپر اٹھالیا پھر اسے اپنے پاؤں پر رکھے ہوئے پوری قوت سے دور اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بڑی سرعت سے ہینڈ اسپرنگ لگا کر ایک جھٹکے سے اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

مسافر نے فضا میں لمحاتی پرواز کی اور ٹرین کی ونڈو سائیڈ سے جاٹکرایا پھر ایک جھٹکے سے فرش پر آرہا۔ چند مسافر ہمدردی سے مضروب مسافر کی جانب بڑھے اور اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ نقلی وجدان نے اپنے طرزِ عمل سے مسافروں کے دلوں کو مکدر کر کے رکھ دیا تھا۔ سب نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے' تاہم اس کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے کسی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموش تماشائی بنے رہنے میں اپنی عافیت محسوس کر رہے تھے۔ پرائی آگ میں کون کودتا ہے!

یہ صورتِ حالات میرے حق میں سازگار تھی۔ میں چشم زدن میں وہاں موجود افراد کی ہمدردیاں سمیٹ چکا تھا۔ ہمارے مابین ہونے والی مکالمے بازی نے انہیں یہ بھی باور کرایا تھا کہ وہ ظالم اور میں مظلوم ہوں میری کسی ساتھی عورت پر اس نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتیں ہر حال میں عمل کر رہتی ہیں' چاہے وہ کسی بھی شکل میں برسرِ پیکار کیوں نہ ہوں!

اچانک مجھے پلٹ جانا پڑا۔ میں نے اپنے پہلو میں ایک غیر معمولی حرکت محسوس کی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے غافل پاکر وہ کمینہ میرے قریب آگیا تھا اور عقب سے مجھے اٹھانے کے لیے اپنے دونوں بازو میری... کمر کے گرد حمائل کرنے ہی والا تھا کہ میں بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور میری دائیں کہنی اس کی کنپٹی پر پڑی۔ چوٹ اگرچہ شدید تھی مگر وہ بڑے تحمل سے پی گیا۔ اس کے منہ سے ایک ہلکی سی سسکاری برآمد ہوئی تاہم اس دوران میں اس نے میری کمر پر گرفت قائم کرلی۔ اسی حالت میں اس نے مجھے اٹھانے کی کوشش کی تو میں نے بائیں کہنی کو پہلے والے انداز میں آزمایا۔ نتیجہ قدرے مختلف برآمد ہوا۔

اس مرتبہ کنپٹی کے بجائے میری کہنی نے اس کی گردن کا مزاج پوچھا۔ پھر میں نے ان حملہ آور ''حرکتوں'' کو پے در پے آزمانا شروع کردیا۔ وہ چٹا رہا مگر اس نے اپنی گرفت ڈھیلی نہ کی اور ٹھہرے ہوئے انداز سے مضبوط قدموں کے ساتھ ٹرین کے دروازے کی جانب بڑھتا رہا۔ اس کے تیور سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ یونہی اٹھائے اٹھائے مجھے ٹرین سے باہر پھینکنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

ٹرین کے دروازے آٹومیٹک سسٹم کے تحت لاک تھے۔ انہیں اپنی مرضی سے نہیں کھولا جاسکتا تھا۔ ٹرین سے متعلق ذمے دار شخص ہی اپنی یا پھر کسی مسافر کی درخواست پر وہ دروازہ کھول سکتا تھا اور وہ بھی ٹرین رکنے کے بعد۔ چلتی ہوئی ٹرین میں تو یہ ممکن نہیں تھا البتہ یہ ہوسکتا تھا کہ وہ شیطان زادہ دور ہی سے مجھے دروازے پر دے مارتا...... اور اتفاق سے اس ٹکراؤ کے نتیجے میں دروازہ کھل جاتا۔

میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ اتفاق سے بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر وہ واقعی مجھے ٹرین سے باہر پھینک دیتا تو میری سلامتی کے امکانات معدوم ہوجاتے۔ انڈر گراؤنڈ پتھریلی محدود سرنگ میں دوڑنے والی وہ ٹرین میری آخری سواری ثابت ہوتی اور اس سے باہر پہنچتے ہی میرا جو حشر ہوتا وہ سننے اور دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی ہوتا۔

میں نے لحہ بھر میں ایک فیصلہ کیا اور جب ہم دروازے سے تین فٹ کی دوری پر تھے تو میں نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد بھی کر ڈالا۔ اس کام کے لیے مجھے بھرپور مکاری دکھانا پڑی۔ میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں اس کی گرفت سے نکل کر نیچے بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ میرے چکر میں آگیا۔ میں نے پھر اس دھوکا دہی کے دوران ہی میں اچانک اپنے بدن کو جھٹکا دیا۔ میرا جسم کسی گٹھری کے مانند ہوا میں بلند ہوا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نقلی وجدان کی گرفت میں رہتے ہوئے دونوں ٹانگیں سامنے کی سمت کھول دیں۔ یہ ایک بے ساختہ اور بھرپور ایکشن تھا۔

میرے پاؤں دروازے کے ہینڈل سے ٹکرائے اور میں نے چشم زدن میں ہینڈل پر پاؤں کے دباؤ سے زبردست پش حاصل کیا اور اپنے پرتو کو ایک جھٹکے سے پیچھے دھکیل دیا۔

وہ شاید میری اس اچانک کارروائی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں میں لغزش نمودار ہوئی۔ میرے لیے یہ لمحاتی مہلت کسی سنہری موقع سے کم نہیں تھی۔ میں نے کسی نتیجے کی پروا کیے بغیر' اپنے بالائی بدن کو آگے کی جانب جھلایا اور دونوں ٹانگیں فولڈ کر کے پاؤں کی ایڑیاں اس شیطان زادے کے پیٹ کے زیریں حصے پر رسید کردیں۔

ایڑی اور کہنی کی ضرب اپنے اندر دردناک عذاب کا خزانہ سمیٹے ہوتی ہے۔ اس تکلیف کی شدت کو وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو کبھی بدقسمتی سے اس تجربے سے گزرا ہو۔ یہ زبانی کلامی سمجھ میں آنے والی بات نہیں...... اور میں نے ایڑیوں کی یہ ضرب نقلی وجدان کے جسم کے جس حصے پر پہنچائی تھی وہاں اس کی شدت میں ہزار گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔

میری میکانکی حرکت نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ اس بہروپے کے حلق سے ایک تکلیف دہ آواز خارج ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے خود کو ٹرین کے فرش کی جانب منہ کے بل گرتے ہوئے پایا۔ میری ضرب نے نقلی وجدان کی گرفت چھڑا دی تھی۔ وہ اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا۔ وہاں ہاتھوں کی گرفت قائم رکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کے مضروب متاثرہ حصے کو دبائے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

اس سے پیشتر کہ میرا چہرہ ٹرین کے فرش سے ٹکراتا' میں نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں فرش پر ٹکائیں اور ہینڈ پش کے ذریعے اپنی باڈی کو ہوا میں اچھالا۔ یہ اچھال نیچے درجے کی تھی۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوچکا تھا۔

اسی وقت میں نے نقلی وجدان کو سنبھل کر اپنی سمت بڑھتے ہوئے پایا۔ ہم دونوں بہ مشکل ایک دوسرے سے چھے فٹ کی دوری پر راہ گزر میں کھڑے تھے۔ ہمارے درمیان فرش سے چھت تک وہ فولادی ڈنڈا استادہ تھا جو کھڑے مسافروں کے لیے سہارے کا باعث ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے سہارے کے لیے ٹرین کی چھت سے آہنی زنجیر والے ہک بھی لٹک رہے تھے۔ نقلی وجدان کا چہرہ غضب ناک ہورہا تھا۔ وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا جیسے میں اس کے ہاتھ لگا تو وہ مجھے چٹکیوں میں مسل ڈالے گا۔ یہ اس انویسٹمنٹ کا کمال تھا جو میں نے اس پر کی تھی۔

میں اس پر نگاہ رکھتے ہوئے فولادی ڈنڈے کے قریب آیا پھر اسے مضبوطی کے ساتھ تھام کر ہوا میں گھوم گیا۔ یہ میری ایک اچانک اور خطرناک حرکت تھی۔ مدِمقابل بوکھلا کر رہ گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ کے دوران میں میری ٹانگیں اپنا کام دکھا چکی تھیں۔

میں نے فولادی ڈنڈے پر گرفت قائم رکھتے ہوئے اس کے چہرے کو نشانہ بنایا' پھر تابڑ توڑ کراس ککس کی برسات کردی۔ ردِعمل کے طور پر مدافعتی انداز میں اس کے ہاتھ چہرے کی جانب اٹھ گئے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ایک ڈبل پش کک اس کے سینے پر رسید کر کے دور دھکیل دیا۔ وہ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پندرہ فٹ تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے فولادی ڈنڈے کو چھوڑا اور جم کر قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سکس لائن کی رفتار کم ہورہی ہو۔ یہ بات نقلی وجدان نے بھی نوٹ کرلی تھی۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور اٹھتے ہی ایک طرف دوڑ لگادی۔

یہ بڑی واہیات صورتِ حال تھی۔ اگر وہ ہاتھ سے نکل جاتا تو بڑی مشکل ہوجاتی۔ ٹرین کی بتدریج کم ہوتی رفتار اس بات کا اعلان تھا کہ ہنٹر کالج کا اسٹیشن آگیا ہے۔ اگرچہ نقلی وجدان نے تھوڑی دیر پہلے یہی بتایا تھا کہ وہ ساحل کے ساتھ

ایسٹ ہارلم کی طرف جا رہا ہے لیکن اس کی بات پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کم بخت جھوٹوں کا سردار تو اس بات کا دعوے دار بھی تھا کہ ساحل اس وقت ٹرین میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی جب کہ میں اپنی ساحل کو ایک بند وین میں محوِ سفر دیکھ چکا تھا۔

ایسٹ ہارلم کا اسٹیشن ایسٹ ایک سو دس ویں اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ہنٹر کالج ایسٹ اڑسٹھ پر تھا۔ اس اسٹیشن کے بعد بس ایسٹ ستتر، ایسٹ چھیاسی، ایسٹ چھیانوے، ایسٹ ایک سو تین اسٹریٹ سے گزرنے کے بعد ایسٹ ہارلم کے اسٹیشن پر پہنچتی۔ سب وے کے اس ٹریک پر تین ٹرینیں (فور لائن، فائیو لائن اور سکس لائن) مین ہٹن کے شرقی حصے میں ڈاؤن ٹاؤن اور اپ ٹاؤن کے درمیان شمالاً جنوباً دوڑتی رہتی تھیں۔ میرا عقل و وجدان کے اس بیان پر یقین کرنے کو قطعاً تیار نہیں تھا کہ وہ ساحل کے ساتھ ایسٹ ہارلم کی طرف جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا وہ ہنٹر کالج کے اسٹیشن پر ٹرین سے اتر کر فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھ سے چند منٹ میں جیسی درگت بنوا چکا تھا اس کے پیشِ نظر فرار ہی میں اس کی عافیت تھی۔

اگلے ہی لمحے میں اس کے پیچھے لپک گیا۔ اس کام میں وسیم خاموش نہ رہا اور بڑی سرعت سے میرے ساتھ ہولیا۔ ہم دوڑتے قدموں سے اس جانب بڑھے جدھر اس کمینے نے دوڑ لگائی تھی۔ یہ بوگی کا وہ حصہ تھا جہاں واش روم بنا ہوا تھا۔ ٹرین کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی۔

جب ہم مذکورہ مقام پر پہنچے تو وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا "وہ واش روم میں چھپا ہے۔" وسیم نے تھراتی آواز میں کہا "کہیں اور نہیں جا سکتا۔"

میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کیونکہ وہاں چھپنے کے لیے واش روم سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی نہیں تھی۔ ہم واش روم کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ بند تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔ میں نے اضطراری انداز میں دروازے کے ہینڈل کو جھنجوڑ ڈالا۔

وسیم نے کہا "اگر وہ اندر ہے تو اسے باہر لانا ہوگا۔۔۔۔ فوراً ورنہ ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ٹرین رکنے والی ہے۔ اس بوگی کے مسافروں میں سے جو کوئی بھی اترے گا وہ یہاں پیش آنے والے حالات کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ پھر متعلقہ پولیس والے سکس لائن کو ہنٹر کالج سے آگے نہیں بڑھنے دیں گے۔ تمہارے ہم شکل کے ساتھ پتا نہیں وہ کیا سلوک کریں گے لیکن ہم ضرور اس جھمیلے میں الجھ کر رہ جائیں گے پھر سن شائن اپارٹمنٹ میں پیش آنے والے واقعات ہمارے گلے کا پھندا بن جائیں گے!"

"پھر؟" میں نے سوالیہ نظروں سے وسیم کو دیکھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں پہلی فرصت میں ٹرین کو چھوڑ دینا چاہیے۔" وسیم نے سنجیدہ لہجے میں کہا "دیکھو ٹرین رکنے ہی والی ہے۔ ہم سب سے پہلے نیچے اتر کر پلیٹ فارم کی بھیڑ میں گم ہو جاتے ہیں۔"

میں نے گمبھیر آواز میں کہا "یہ کم بخت بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے۔ کیا اسے یونہی چھوڑ دوں؟"

"مجبوری ہے، واش روم کا دروازہ اس نے اندر سے بند کر رکھا ہے۔" وسیم فکر مند لہجے میں بولا "اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔۔۔۔۔ بلکہ بالکل نہیں ہے۔"

"ہم ٹرین سے ضرور اتریں گے اور اس شیطان کو اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

"مگر کیسے؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا "اس نے دروازے کو اندر سے۔۔۔۔۔"

"دروازہ اندر سے بند ہے یا باہر سے' تم اس چکر میں نہ پڑو۔" میں نے قطع کلامی کی اور سنسناتی ہوئی آواز میں کہا "اور تمہارے "کیسے" کا جواب یہ ہے۔۔۔۔۔ دیکھتے جاؤ۔"

میرے لیے ایک ایک لمحہ بہت قیمتی تھا اور میں نے حتمی طور پر سوچ لیا تھا' آج یہ آفت زادہ میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جائے گا۔ کوئی بند دروازہ کھولنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میں واش روم کے دروازے کے سامنے ہارس اسٹانس بنا کر کھڑا ہو گیا۔ یہ بریکنگ پوزیشن تھی۔ میں نے چی کی قوت کو آزمانے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ ایک بروقت فیصلہ تھا۔

میں نے دروازے کے ہینڈل کے اوپر نگاہ جمائی' ایک طویل سانس کھینچ کر پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرا' پھر ہیل کرتے ہوئے پھیپھڑوں کی ہوا کو ایک دھکے سے منہ کے راستے خارج کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری دائیں ہتھیلی نے میکانکی انداز میں حرکت کی اور ہاتھ کا ایک قیامت خیز پش ہینڈل پر منتقل ہوا۔ یہ تینوں اسٹیپ بہ مشکل ایک سیکنڈ میں مکمل ہوئے تھے۔

واش روم کا دروازہ اس انداز میں کھلا جیسے کسی چنگھاڑتے ہاتھی نے اسے اپنی بدمستی کا نشانہ بنایا ہو۔ دروازہ کھلنے کی مہیب آواز میں لاک ٹوٹنے کی صدا کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید نقار خانے میں طوطی کی آواز والا محاورہ ایسے مواقع ہی کے لیے ہے۔

ہم دونوں ہکا بکا واش روم کے اندر دیکھ رہے تھے۔ ہماری حد درجہ حیرت کا باعث یہ تھا کہ واش روم کا سونا پن ہمارا منہ چڑھا رہا تھا۔ یہ ہمارے لیے ناقابلِ یقین صورت حال

تھی۔ پتا نہیں وہ خبیث ہمیں جُل دے کر کدھر نکل گیا تھا۔ بوگی میں تو وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

داش ردم کے سامنے کھڑے ہو کر وقت برباد کرنا سراسر حماقت ہوتی۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بات کی اور تیزی سے دروازے کی جانب پلٹے۔ اس دوران میں سکس لائن ہنٹر کالج کے اسٹیشن پر رک گئی تھی۔ اگلے ہی لمحے آٹومیٹک سسٹم کے پابند دروازے کھل گئے۔

میں اپنے ہیگلبو کو اس ٹرین کے اندر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن اسے ٹریس کرنے کا وقت نہیں تھا۔ وسیم کے مشورے میں اچھا خاصا وزن تھا۔ ہماری بوگی میں ہونے والی کارروائی ایم ٹی اے (میٹرو پولیٹن ٹرانسپورٹیشن اتھارٹی) پولیس سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ امریکا کی پولیس چاہے کسی ڈپارٹمنٹ ہی کی کیوں نہ ہو، بال کی کھال اور کھال کے بال اکھاڑنے کی ماہر ہے......اور مجھے کسی بھی صورت براہِ راست پولیس سے نہیں الجھنا تھا۔ چاہے وہ ''ایم ٹی اے'' والے ہوں یا ''این وائے پی ڈی'' والے! یہ محترم سانگ فو کا مشورہ تھا۔ اس مخلص کا مشورہ میرے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔

میں نے ٹرین چھوڑنے سے قبل ایک مرتبہ پھر نقلی وجدان کی تلاش میں اپنی نگاہ کو اس بوگی کے طول و عرض میں دوڑایا لیکن بوگی کو اس کے وجود سے خالی پایا' پھر ہم باہر نکل آئے۔

ہم نے ہنٹر کالج اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا کہ وہ کمینہ مجھے نظر آگیا۔ وہ پلیٹ فارم کے آخری سرے پر کسی عورت کا ہاتھ تھامے تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اس وقت سکس لائن کی آخری بوگی کے پاس سے گزر رہے تھے۔ میں نے وسیم کی اس جانب توجہ دلائی اور اندھا دھند ان کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔

اس وقت میرے ذہن میں ان گنت طوفان مچل رہے تھے۔ میرا ہیگلبو پتا نہیں کن اٹکھیلیوں کے موڈ میں تھا۔ سکس لائن پر سوار ہوتے وقت بھی ایک عورت کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا اور اس وقت بھی ایسی ہی صورتِ حال تھی۔ میں تھرڈ آئی کے طفیل یہ معلوم کر چکا تھا وہ عورت میری ساحل نہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا تھا وہ کون ہے جو ٹرین میں داخل ہوتے ہی غائب ہو گئی اور اب دوبارہ نگاہ میں آگئی؟ پھر یہ بھی توجہ طلب بات تھی کہ نقلی وجدان کہاں گم ہو گیا تھا اور وہ کب اور کیسے ٹرین سے اترا؟

ان تمام تر سوالات کے جواب صرف وہی دونوں بھگوڑے دے سکتے تھے۔ ان لمحات میں میرے جی میں یہ بھی آئی کہ میں ایک نظر ساحل کو جھانک کر اس کی تازہ ترین پوزیشن کے بارے میں معلوم کروں مگر یہ سردست ممکن نہیں تھا۔ تیسری آنکھ سے استفادہ کرنے کے لیے کہیں رکنا اور رک کر آنکھیں بند کرنا ضروری تھا اور ایسا کرنے کی صورت میں' میں اس بھگوڑے کو کھو بیٹھتا۔ فی الحال میں یہ نقصان اٹھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

جب تک ہم دوڑتے ہوئے سکس لائن کی دم تک پہنچے وہ دوبارہ حرکت میں آچکی تھی۔ اس دوران میں نقلی وجدان اور اس کی ساتھی عورت پلیٹ فارم سے اتر کر ریلوے ٹریک والے حصے میں داخل ہو گئے تھے۔ پتا نہیں ان کی منزل کہاں تھی اور انہوں نے اپنے ذہن میں کیا سوچ رکھا تھا۔ ان کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم اس بات کی دلیل تھے کہ وہ اپنے تعاقب سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کی پشت ہماری جانب تھی، لہٰذا ابھی تک میں اپنے ہیگلبو کی ساتھی کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

ہم آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ایسٹ اڑسٹھ کے اسٹیشن (ہنٹر کالج) سے بہت پیچھے نکل آئے۔ سرنگ کے اس حصے میں بہت کم روشنی تھی۔ انڈر گراؤنڈ ٹرین کی آمدورفت کے لیے ایک خصوصی قسم کی سرنگ تیار کر کے زیرِ زمین ریلوے ٹریک بچھایا جاتا ہے۔ یہ سرنگ نما طویل راستہ سگنل پولز کی روشنی کا مرہونِ منت ہوتا ہے جب وے اسٹیشن اور پلیٹ فارم کی چکاچوند اس تعریف سے باہر ہے۔ ہم اسی ملگجی روشنی میں ان کا تعاقب کر رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

میرے ہیگلبو کا ہاتھ تھام کر بھاگنے والی عورت کے پاؤں کو ٹھوکر لگی اور وہ کراہتے ہوئے منہ کے بل نیچے گرنے لگی۔ اگر اس کا ہاتھ نقلی وجدان کی گرفت میں نہ ہوتا تو اسے گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بہرحال اس صورتِ حال نے اسے قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی ساتھی کو سنبھالنے کے لیے رکا اور اس کے ساتھ ہی اس نے پلٹ کر ہم پر فائر کر دیا۔ یہ اس کی ایک غیر متوقع حرکت تھی۔ پتا نہیں اس نے کب ایک خطرناک گن اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ فائرنگ کے زاویے نے پلک جھپکتے میں بتا دیا وہ ہمیں اپنی جانب بڑھنے سے روکنا چاہتا تھا۔ اس نے براہِ راست ہمیں شوٹ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میرے رکتے ہوئے قدموں نے صورتِ حال کو بھانپ لیا اور میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کی جانب دوڑ لگا دی۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ اگر وہ چاہتا تو بہ آسانی ہمیں نشانہ بنا سکتا تھا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ محض ہمیں خوف زدہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کا یہ ارادہ میرے لیے مفید تھا۔

نقلی وجدان نے اپنی ساتھی کو بانہوں میں سنبھال لیا۔ اس طرح کہ اب اس کا گن بردار ہاتھ استعمال کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسی کشمکش میں' میں نے اس عورت کے چہرے کی ایک جھلک بھی دیکھ لی......اور وہاں مجھے ساحل کی صورت نظر آئی۔ میں اب کوئی دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی' ساحل کے بھرپور میک اپ میں تھی۔ عین ممکن تھا یہ وہی عورت ہو جسے آج رات کے ابتدائی حصے میں' میں نے ونڈوز آف دی ورلڈ میں دیکھا تھا!

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ میری دیکھا دیکھی میرے کپی نے اپنی ساتھی کو بغل میں دبایا اور مڑ کر اسی سمت دوڑ لگا دی جدھر وہ پہلے جا رہا تھا۔

اسی لمحے سرنگ کی اندرونی فضا میں ایک مرتبہ پھر فائر کی آواز گونجی۔ اس گونج کے نتیجے میں ایک سریلی نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وسیم نے بھگوڑوں کو روکنے کے لیے بینارائے والی گن کا استعمال کیا تھا۔ میں نے مذکورہ گن اور موبائل فون وسیم کو دے رکھا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ وسیم کی گن سے نکلنے والی گولی نے نقلی وجدان کی ساتھی نقلی ساحل کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ وہ کسی مردہ چھپکلی کے مانند اس کے ہاتھوں سے نکل کر سنگلاخ زمین پر جا گری۔

نقلی وجدان نے گن والا ہاتھ بلند کیا اور میرے قدموں میں فائر کر دیا۔ ہمارے درمیان اس وقت بہ مشکل بیس فٹ کا فاصلہ رہا ہو گا۔ میں نے اپنی سمت آنے والی گولی کی پروا نہیں کی اور دوڑتے ہوئے قدموں کے ایک اسٹیپ کو گراؤنڈ پش بنا کر فضا میں فرنٹ سمر سالٹ لگا دیا۔ یہ ایک ہلکی قلابازی تھی کیونکہ سرنگ کی چھت کھل کھیلنے کے لیے سازگار نہیں تھی۔

میرے جسم نے ہوا میں نیچی گردش کی اور نقلی وجدان سے دو قدم کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر چونکا اور اس سے پیشتر کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتا میں جلدی سے فرنٹ فٹ پر آیا اور کھینچ کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کی کوشش کی۔

میری یہ کوشش جزوی طور پر کامیاب رہی' یعنی جزوی طور پر ناکامیاب ہو گئی۔ جب تک میرا ہاتھ اس کے چہرے تک رسائی حاصل کرتا وہ گردن کو ایک جھٹکے سے گھما چکا تھا۔ ایک زناٹے دار طمانچہ اس کی گردن پر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی میری کمر پر اس کے پاؤں کی ایڑی لگی۔ اس نے گھومنے کے ساتھ ہی ایک ریئر کک چلا دی تھی۔ یہ اس کا فطری ردِ عمل تھا۔

اس کی کک نے مجھے کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچایا' میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کی تشریف پر ایک زوردار پریشر کک جڑ دی۔ وہ گرنے کی پوزیشن میں چند قدم جھک کر آگے بڑھتا چلا گیا مگر گرا نہیں' زمین بوس ہونے سے پہلے ہی سنبھل گیا۔

میں اسے سنبھلنے کا موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور اس کے پہلو میں سائیڈ کک ماری۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پسپا ہوا اور بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس نے اندر آتے ہوئے ایک نیچی راؤنڈ ہاؤس چلائی پھر اچھل کر مجھے فرنٹ ہک کک مارنے کی کوشش کی۔

یہ کک اگر میری ٹھوڑی پر لگ جاتی تو جبڑے کا سوا ستیاناس ہو سکتا تھا۔ میں اس کے اچھلتے ہی بیک فٹ پر رول کر گیا تھا۔ رولنگ کے اختتام پر میں نے ہینڈ پش لیا اور لگاتار تین بیک فلیک لگائیں۔ بچاؤ کی اس کوشش میں' میں اپنے دشمن سے دس فٹ دور چلا گیا اور اس دوری سے اس شیطان نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور اپنی سمت میں دوڑ لگا دی۔ وہ کوئی کمزور اور بزدل مدِمقابل نہیں تھا۔ اس لیے اس کا بار بار پسپا ہونا مجھے کھٹک رہا تھا اور اس مرتبہ تو وہ اپنی ساتھی کو بھی ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ کر فرار ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ان ناگہانی لمحات میں اس کے ذہن میں کون سا منصوبہ پنپ رہا تھا!

مجھ پر بھی ایک ضد سی سوار ہو گئی۔ میں لمبی قلانچیں بھرتے ہوئے زیرِ زمین سرنگ میں اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ یہ تعاقب ایک منٹ سے زیادہ جاری نہ رہ سکا اور میں نے ہانپتے کانپتے اس کو جا لیا۔ اس کا سینہ بھی دھونکنی کا عمل پیش کر رہا تھا۔ وہ رکا اور اس بار جم کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا۔ اس مرتبہ اس کے تیور خاصے خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔

وسیم اور ساحل کی ڈپلیکیٹ ہم سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وسیم کا میرے پیچھے نہ آنا ظاہر کرتا تھا' اس نے ہیگلبو کی ساتھی کو ''سنبھال'' لیا تھا۔ یہ اس کا ایک عقل مندانہ فیصلہ تھا۔ اس عورت کو آزاد چھوڑ دینا بے وقوفی ہوتی، جب کہ وہ زخمی بھی تھی۔

ہم چند لمحات تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے۔ پھر ہمارے درمیان ایک خون ریز معرکہ شروع ہو گیا۔ جب سے وہ مجھ سے ناامید بلکہ برگشتہ ہوا تھا' میں یہ تو سوچ رہا تھا پتا نہیں زندگی کے کس موڑ پر کس انداز

میں اس سے سامنا ہو! اس قسم کے ٹکراؤ میں بہرحال میں نے توقع نہیں کی تھی اور اس میں آدھے سے زیادہ ہاتھ ربی موشے ہائمن کا تھا۔

اس کی ایک لوئر راؤنڈ ہاؤس کک کو بلاک کرتے ہوئے مجھ سے غلطی ہوگئی اور اس کا پاؤں میری بغل میں لگا۔ یہ ایک بھرپور چوٹ تھی۔ میں ڈگمگایا اور دو قدم پیچھے چلا گیا۔ اس نے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک وھیل فلائنگ چلا دی۔ اس بار بھی میں جزوی طور پر خود کو بچا پایا۔ اس ادھوری کامیابی نے اسے فتح کے نشے میں مبتلا کر دیا۔ وہ یہی سمجھا کہ میں اس سے زیر ہونے والا ہوں چنانچہ وہ بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے انتہائی قریب آ گیا۔ اس نے ایک باکسر کا سا اسٹانس بنا رکھا تھا اور ہولے ہولے قدموں پر اچھل رہا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر ایک فرنٹ جرک کک ماری۔ اس کا اسٹانس ٹوٹ گیا اور وہ کسی زخمی بھیڑیے کے مانند غرا کر مجھ پر پل پڑا۔ وہ دھواں دھار مکوں سے میرے چہرے کو بگاڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے بڑی ثابت قدمی سے اس کے تین تیز رفتار پنچ بلاک کیے تو وہ جھنجلا گیا اور پنچنگ چھوڑ کر اس نے مجھے جپھا ڈال دیا۔

اس کی گرفت میں کسی جنگلی ریچھ کی سی سختی اور مضبوطی تھی۔ وہ مجھے اٹھا کر پتھریلی زمین پر پٹخنے کی کوشش میں تھا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اس کے بازوؤں میں بجلیاں سی بھری ہوئی تھیں۔ میں اس کے شکنجے میں کسی گنے کے مانند کس کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش ترک کر دی۔ نتیجے میں وہ اپنی ہی جھونک میں لڑکھڑا گیا کیونکہ وہ برابر مجھے پٹخنے کے لیے زور مار رہا تھا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس وقت ہم سگنل پول کے انتہائی نزدیک تھے۔ میں نے ڈبل کک کے انداز میں دونوں پاؤں پول پر مارے۔ کھینچا تانی میں وہ میرے عقب میں ہو گیا تھا۔ اس زبردست پش نے اس کے پاؤں اکھاڑ دیے۔ ہم ایک دوسرے کو لپٹے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔

وہ پشت کے بل میرے نیچے پڑا تھا۔ میں نے زمین پر آتے ہی اپنی دونوں کہنیاں اس کے پیٹ میں رسید کر دیں۔ وہ تکلیف کی شدت سے کراہ اٹھا۔ فرار کی کوشش میں یقیناً گن اس کے ہاتھ سے نکل کر ادھر ادھر ہو گئی تھی ورنہ ہزیمت کے ایسے موقع پر زبردست مسلح شخص اپنے ہتھیار سے یاری ضروری نبھاتا ہے۔ ایسا دوست کس کام کا جو بہ وقتِ ضرورت ساتھ نہ دے۔ ہتھیار تو ہاتھ کا یار ہوتا ہے!

میں ہاتھ آئے ہوئے اپنے نیگلیو کو بری طرح رگیدنے لگا۔ فرصت اور ''آسانی'' کے لمحات میں میں اس کے چہرے سینے اور پیٹ میں سنگین نوعیت کی ضربیں بھی لگا رہا تھا۔ جواب میں مجھے بھی اس کی جانب سے شدید چوٹیں مل رہی تھیں۔ اسی لوٹ پوٹ میں ایک موقع پر وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا۔ سواری حاصل ہوتے ہی اس نے میری گردن دبانا شروع کر دی۔

میں اس کے ہاتھوں میں پھنسی ہوئی گردن چھڑانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اچانک سرنگ کی روشنی میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مخصوص آواز بھی میری سماعت تک پہنچنے لگی۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک خیال نے جنم لیا اور اس کے ساتھ ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہم اس وقت ریلوے ٹریک سے محض ایک ڈیڑھ فٹ کی دوری پر ''نبرد آزما'' تھے۔ وہ مخصوص روشنی اور آواز لائن (ٹرین) کی آمد کا اعلان تھا۔ زمین کی لرزش بھی اس بات کی تصدیق کر رہی تھی کہ کوئی لائن عنقریب ہمارے نزدیک سے گزرنے والی ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ ڈاؤن ٹاؤن سے اپ ٹاؤن آنے والی کوئی لائن تھی۔ فور لائن یا فائیو لائن یا پھر سکس لائن۔ نیویارک کے سب وے میں ہر دس منٹ بعد ایک ٹرین چھوٹتی ہے اور ہماری والی سکس لائن کو ہنٹر کالج' ایسٹ اڑسٹھ اسٹریٹ کے اسٹیشن سے روانہ ہوئے کم و بیش اتنا وقت ہو گیا تھا۔

وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ ٹرین کی آواز اور روشنی لمحہ بہ لمحہ ہمارے قریب پہنچ رہی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ میرے مدمقابل نے وہ آواز نہ سنی ہو۔ میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ وہ مجھ پر سوار تھا اس لیے طاقت اور کامیابی کے نشے میں چور تھا۔ میں نے اس کی ''غفلت'' سے فائدہ اٹھایا اور گردن چھڑانے کی کوشش کے دوران ہی میں نے ایک جھٹکے سے ٹانگیں فولڈ کر کے اپنے دونوں پاؤں اس کے پیٹ سے لگا دیے۔

وہ چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر ابھرا جیسے میرا ارادہ بھانپ گیا ہو مگر میں نے اسے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی۔ میرے پاس مہلت تھی ہی کہاں جو میں اسے سرِعام بانٹتا پھرتا! اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا سراسر حماقت ہوتی اور اس وقت کسی حماقت کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ایک سنہری موقع تھا۔

اس سے پہلے کہ میرا مدِمقابل کوئی مدافعتی حرکت کرتا' میں نے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں اپنے ارادے پر عمل کر ڈالا۔ چونک جانے کے باعث میری گردن پر اس کے ہاتھوں کی گرفت قدرے ڈھیلی ہو گئی تھی۔ میں نے نتائج کی پروا کیے بغیر نقلی وجدان کو دونوں پاؤں کے پش سے ریلوے ٹریک کی جانب اچھال دیا اور خود بیک رول کرتے ہوئے ٹریک سے چند فٹ دور نکل گیا۔ اسی لمحے میں نے اپنے نزدیک سے تیز رفتار لائن کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اس وقت میری آنکھیں بند تھیں اور تصور کی نگاہ اس آفت زادے کے حشر کو شمار کرنے میں مصروف تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اب اس کی باقیات کو تلاش کرنا بھی مشکل ہوگا۔

میں بہ یک وقت متضاد احساسات میں گھر گیا، دکھ اور سکھ کے احساسات۔ مجھے اس بات سے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ ایک بڑے فتنے کو میں نے نیست و نابود کر دیا اور ساتھ ہی اس احساس نے دل کو بوجھل کر دیا کہ وہ جیسا بھی تھا...... میں تھا!

میں آخر الذکر احساس کو کوئی نام دینے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ زیرِ زمین سرنگ کی محدود فضا ایک مخصوص نقرئی قہقہے سے گونج اٹھی۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے برسرِپیکار تھا اسے موت نگل چکی تھی۔

سرنگ میں موجود ملگجی روشنی جو منظر واضح کر رہی تھی اس میں مجھے نقلی وجدان اور نقرئی قہقہے کی حامل ہستی کہیں دکھائی نہیں دی۔ اپنے نیگلیو کے بارے میں تو میں سوچ سکتا تھا کہ تیز رفتار ٹرین نے اس کا قیمہ بنا دیا ہوگا۔ اس کے جسم کی باقیات سرنگ کی دیواروں اور ریلوے ٹریک پر کہیں تلاش کی جا سکتی تھیں لیکن وہ مخصوص قہقہہ جس ہستی کی طرف اشارہ کر رہا تھا اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا اور یہ بات بھی نہیں تھی کہ میری سماعت نے اس کی آواز پہچاننے میں کوئی کوتاہی کی ہو۔

ایک لمحے کے لیے اس ویران زیرِ زمین سرنگ میں گونجنے والے نقرئی قہقہے کے رس' سرور اور کھنک کو میں نے پلک جھپکنے میں شناخت کر لیا تھا۔ وہ ملکۂ کود سار ییلگری کی جانی پہچانی اور مانی ہوئی آواز تھی!

☆☆☆

صبح کے تین بجنے والے تھے۔ ہم اس وقت شوگر ہل کے علاقے میں سیم کے اپارٹمنٹ میں تھے۔ ہم تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں پہنچے تھے۔ ہارلم اس وقت گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ نقلی وجدان کا کانٹا نکل گیا تھا لیکن اس کی چبھن باقی تھی اور یہ چبھن سیکڑوں اندیشوں کو جنم دے رہی تھی' خاص طور پر ییلگری کے مخصوص قہقہے نے مجھے غور و فکر کے اتھاہ سمندر میں لا پھینکا تھا۔ زمین دوز ریلوے ٹریک پر اس کی غیر مرئی موجودگی عقل میں سمانے والی بات نہیں تھی۔

ییلگری سے ہونے والی آخری ملاقات میرے ذہن میں نقش تھی۔ بوقتِ رخصت وہ از حد ملول اور دل گرفتہ تھی۔ وہ مجھ سے شاکی تھی کہ میں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس نے تن من دھن مجھ پر نچھاور کر دیا لیکن میں اس کا نہ ہو سکا۔ میں پتا نہیں اپنا بھی تھا یا نہیں۔ اس کا کیسے ہو جاتا۔ یہی شکوہ نقلی وجدان کو بھی تھا۔ وہ میرے تصرف میں آنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے درخورِ اعتنا نہ جانا۔ ردِعمل کے طور پر وہ مجھ سے بھڑک کر منفی قوت کے ہاتھ کا میل بن گیا اور اب ربی کو اس سے ہاتھ دھونا پڑ گئے تھے۔ میں نے شاطر ربی کے ہاتھوں کا میل نکال کر زمین دوز ریلوے سرنگ کی دیواروں پر پوت دیا تھا اونہہ' خس کم جہاں پاک!

ییلگری مثبت طرزِ فکر کی حامل تھی۔ وہ تو میری کج ادائی سے شاکی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا بنا کر رکھنا چاہتی تھی لیکن میں ایسی پابندی کا قائل نہیں تھا۔ میری زندگی کا طور ایسا تھا کہ میں اپنے پاؤں میں زنجیر نہیں ڈال سکتا تھا چاہے وہ زنجیر......!

ایسا سوچتے ہوئے اچانک میری سوچ کو ایک جھٹکا لگا اور آپ ہی آپ میرا دھیان ساحل کی طرف مڑ گیا۔ وہ ایک ایسی زنجیر تھی کہ جس کی تمنا نے مجھے تڑپا کر رکھا ہوا تھا۔ اس کے حصول کے لیے میں دربدر کی خاک چھان رہا تھا۔ وہ کبھی بھی مجھ سے دور نہیں رہی مگر نزدیکی کے باوجود بھی اس کے حصول میں ان گنت دیواریں اٹھتی چلی گئی تھیں...... اور اب تک اٹھ رہی تھیں۔ ان میں سے بعض دیواریں تو آسمان تک بلند تھیں۔ ان کے قد کاٹھ ناپتے ناپتے میری گردن تھکنے لگتی' آنکھوں میں مرچیں سی بھر جاتیں اور میں سٹ پٹا کر رہ جاتا۔

پتا نہیں' میں نے اس کا نام ساحل کیوں رکھ دیا تھا۔ ڈوبنے والے ساحل کی خواہش میں ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ وہ انہیں چند ہاتھ کی دوری پر دکھائی دیتا ہے لیکن یہ چند ہاتھ کبھی ختم نہیں ہوتے، حتیٰ کہ ان کے ہاتھ پاؤں بے دم ہو جاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا' میری سوچ میں مایوسی در آئی تھی۔ یہ صحت مند نشانی نہیں تھی مگر ہر انسان اپنی نفسیات سے مجبور ہوتا ہے اور حالات کے پیشِ نظر اسے غمی اور خوشی کے دورے پڑتے رہتے ہیں اور میں بھی ایک انسان ہی تھا۔ میں نے

مایوسی کی فضا کو زیادہ دیر تک خود پر طاری نہیں رہنے دیا اور ذہن جھٹک کر اپنی توجہ بیلگری کی جانب مبذول کردی۔

اس حسن کی دیوی نے کراچی میں آخری ملاقات کے دوران میں یہ دعویٰ کیا تھا' اب وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے گی' بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کردے گی۔ اس کا یہ دعویٰ اگر چہ عجیب و غریب تھا تاہم ابھی تک جزوی طور پر سچا ثابت ہوا تھا، یعنی اس ملاقات کے بعد سے اس نے مجھے اپنی جھلک نہیں دکھائی تھی۔ یہ الگ بات کہ وہ مجھے بھی اپنے پاس بلوانے کے لیے مجبور نہیں کرسکی تھی۔

اس روشنی میں سرنگ کے اندر ابھرنے والا بیلگری کا نقرئی قہقہہ مجھے ذہنی طور پر الجھا رہا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر اس قصے کو دماغ سے جھٹک دیا کہ ہوسکتا ہے' وہ میری سماعت کا دھوکا ہو! یہ بڑا موثر ٹوٹکا ہے۔ انسان کسی بھی شے کو دھوکا قرار دے کر خود کو بڑی خوب صورتی سے دھوکا دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے!

وسیم مجھ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر نقلی وجدان اور میری باطنی صلاحیتیں اس کے ذہن میں اودھم مچا رہی تھیں۔ اس وقت اس کی جو ذہنی حالت تھی وہ پوری طرح اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ وہ بے حد الجھا ہوا تھا۔

وسیم ایک قابلِ اعتماد شخص تھا، لہٰذا میں نے نہایت ہی جامع مگر مختصر اور موثر الفاظ میں اس کی تشفی کردی۔ اپنی باطنی صلاحیت کو میں نے ایک حد تک ہی اس پر واضح کیا تھا۔ وہ نقلی وجدان کا قصہ سن کر بہت محظوظ ہوا پھر یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''وجدان! میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا ہے۔''

''ہاں بولو۔ کیا آئیڈیا ہے؟''

وہ بولا'' ربی کا آلۂ کار نقلی وجدان اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا۔ اگر تم اپنا میک اپ صاف کر کے اس کی جگہ لے لو تو ربی کو بڑی آسانی سے الو بنایا جاسکتا ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہے گا' تم اس کے معمول اس کے آلۂ کار ہو۔ تم اس کی لاعلمی میں چونا کاری کرتے رہنا۔''

''یہ آئیڈیا تمہارے ذہن میں اس لیے آیا ہے کہ تم ربی موشے ہائمن کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا'' وہ ایک طرف روحانی علوم کا ماہر ہے اور دوسری جانب اس کے اندر عیاری اور مکاری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ تو میرا ہی حوصلہ ہے جو اب تک اس کے ہتھے نہیں چڑھا ہوں۔ میں ایک مرتبہ اس کے گھیرے سے نکل آیا ہوں' یہی کافی ہے۔''

''تم اپنے حالات کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہو۔'' وہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے بولا'' میرے ذہن میں ایک بات آئی' وہ میں نے کہہ دی۔''

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا'' یہ تھکے ہوئے ذہن میں آنے والی بات تھی۔ زیادہ مناسب یہی ہوگا' ہم تھوڑی نیند لے لیں۔ باتیں کل بھی ہوسکتی ہیں۔''

اس نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور مجھے سونے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ اپارٹمنٹ پر پہنچتے ہی ہم نے تسلی بخش پیٹ پوجا کرلی تھی۔ شکم میں خوراک پہنچے اور ذہن و جسم بھی تھکن سے چور ہوچکے ہوں تو بڑی غضب کی نیند آتی ہے۔ میری آنکھیں بھی بوجھل اور دماغ بھاری ہورہا تھا مگر نیند کی مہربان آغوش میں سر رکھنے سے پہلے مجھے انتہائی اہم کام کرنا تھا...... اور وہ کام تھا اپنی ساحل کی خبر گیری!

نقلی وجدان کی ساتھی عورت اور ساحل کی ڈپلیکیٹ کے نزاعی بیان نے میری سوچ کو تلپٹ کر رکھا تھا۔ وسیم کی چلائی ہوئی گولی نے اس عورت کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا اور ہم اسے زمین دوز ریلوے لائن ہی میں چھوڑ آئے تھے۔ ریٹا نامی اس عورت سے میں نے چند باتیں کی تھیں اور وہ نہایت ہی اہم مختصر گفتگو تھی۔

ریٹا کے مطابق' ربی نے اسے اور نقلی وجدان کو مجھے گھیرنے کے لیے مین ہیٹن میں چھوڑ دیا تھا۔ اصلی ساحل کو وال اسٹریٹ سے ہٹانے کے بعد نیویارک سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ اس وقت میری ساحل کہاں تھی' وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس کا مطلب تھا' برنارڈ لیو نے نقلی وجدان اور اصلی ساحل کے حوالے سے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ ساحل کی نیویارک میں موجودگی اور ان دونوں کا ایک ساتھ گمشدہ جانے کا پروگرام ایک فرضی کہانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ریٹا اور لیو نے یہ متضاد بیانات اپنی زندگی کے بڑے نازک لمحات میں دیے تھے اور ان لمحات میں عموماً سچ بولنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب یا تو ان میں سے ایک سچا اور ایک جھوٹا تھا یا پھر وہ دونوں ہی حالات کی اصل حقیقت سے لاعلم تھے۔ انہیں ربی کی طرف سے جو معلومات فراہم کی گئیں وہ اسی پر یقین کیے بیٹھے تھے!

ریٹا نے اس بات کا اقرار بھی کیا کہ آج رات '' ٹاپ آف دی ورلڈ'' میں وہی ساحل کے بہروپ میں مجھے ملی گئی تھی۔ اگر میں یعنی وجدان نیبل نمبر ون او فائیو پر پہنچ جاتا پھر نقلی وجدان مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں ایک

خبر نہ کرتا۔ وہ اسی ریسٹورنٹ میں گھات لگائے میری آمد کا منتظر تھا۔ ڈبلیو ٹی سی کے احاطے میں پولیس کے انتظامات کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ مجھے گرفت میں لینے کے لیے میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تھا۔ ریٹا سے بات کرتے ہوئے میں نے وجدان کی حیثیت سے اپنا تعارف کرادیا تھا۔ جاں کنی کی حالت میں مجھ سے مل کر اسے خوشی ہوئی تھی یا افسوس' میں اس بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر تھا۔

اب میرا انیگٹو زندہ رہا تھا اور نہ ہی ساحل کی ڈپلیکیٹ...... حتیٰ کہ کچھ عرصے بعد تو ڈبلیو ٹی سی ہی اپنے قدموں پر قائم نہ رہا جس کے ایک سو سات ویں فلور پر وہ عالی شان ریسٹورنٹ تھا جہاں مجھے شکار کرنے کے لیے ربی موشے ہائمن نے ریٹا کو چارے کے طور پر آگے بڑھایا تھا۔

ویزے اسٹریٹ' ویسٹ اسٹریٹ' لبرٹی اسٹریٹ اور چرچ اسٹریٹ کے باہمی میل تال سے وجود پانے والا نیم مذکور قطعہ ارض ٹوئن ٹاورز کے جاہ و حشمت سے خالی ہوگیا لیکن سدا کے لیے خالی نہیں رہ سکتا۔ آج کل ڈاؤن ٹاؤن مین ہیٹن کے اس حصے میں ''فریڈم ٹاور'' کی تعمیرات کا کام شروع ہوچکا ہے۔

امریکا کو ''فریڈم ٹاور'' اور ''اسٹیچو آف لبرٹی'' جیسی تعمیرات کا بہت شوق ہے۔ پتا نہیں وہ اس سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ دنیا میں آزادی صرف اسی کا حق ہے۔ دیگر اقوامِ عالم محض اس کی غلام ہیں!

میں نے آنکھیں بند کیں اور ساحل تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں مجھے جلد ہی کامیابی حاصل ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے میں اس کے ماحول میں تھا۔

وہ ایک ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ اس تصوراتی انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ اس سے پہلے جب میں نے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ کسی ڈبل کیبن بدرین میں محوِ سفر تھی۔ کسی طیارے میں اس کی موجودگی تو یہی ظاہر کرتی تھی' اسے امریکا سے باہر لے جایا جا رہا ہے یا پھر نیویارک سے کسی دوسری اسٹیٹ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے مجھے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا۔

سب وے سکس لائن میں رہتے ہوئے جب میں نے ساحل کو جھانکا تھا تو اس وقت رات کے سوا بارہ بجے تھے' گویا اس واقعے کو لگ بھگ تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا' اسے ہوائی جہاز میں سوار ہوئے کتنا وقت گزر رہا تھا اور یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی آئندہ منزل کہاں ہوگی؟ یہ بات بھی ابھی تک واضح نہیں ہوسکی تھی کہ گزشتہ ڈیڑھ دو دن سے وہ کہاں تھی؟ میں نے اسے ایک مخصوص بیڈروم میں دیکھا تھا۔ پتا نہیں وہ بیڈروم امریکا میں تھا یا نہیں۔ وال اسٹریٹ والے ٹھکانے پر میں نے آخری مرتبہ ساحل کو' سیشل میں رہتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس وقت نیویارک میں رات کے کم و بیش بارہ بجے تھے۔ اگلے روز میں نیویارک میں تھا اور لگ بھگ ساڑھے دس بجے صبح جب میں نے ساحل کے ماحول میں دوبارہ جھانکا تو اس کا بیڈروم تبدیل ہوچکا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ مین ہیٹن کے اندر رہتے ہوئے اس کا ٹھکانا بدل دیا گیا ہے مگر اب میرا ذہن کسی اور زاویے پر سوچ رہا تھا۔ ریٹا کی بات زیادہ درست نظر آرہی تھی۔ وال اسٹریٹ سے ہٹانے کے بعد ساحل کو نیویارک ہی سے باہر نکال دیا گیا تھا۔ کہاں؟ امریکا ہی میں یا پھر کسی دوسرے ملک میں؟ یہ ایسے سوالات تھے جن کے تسلی بخش جوابات صرف اور صرف ربی موشے ہائمن ہی دے سکتا تھا!

ساحل اس وقت سو رہی تھی۔ جہاز کے دیگر مسافر بھی کم و بیش اسی حالت میں تھے۔ جب تک وہ طیارہ فضا میں تھا' میں اس کی منزل کا تعین نہیں کرسکتا تھا۔ فلائٹ کی ہمواری اور مسافروں کا سکون یہی ظاہر کرتا تھا' وہ اس وقت ہزاروں فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز ہیں۔ میں آنکھیں کھول کو بیڈروم میں حاضر ہوگیا۔

جب میں بستر پر لیٹا تھا تو مجھے شدید نیند آرہی تھی مگر تازہ ترین صورتِ حالات نے میری نیند اچاٹ کردی۔ میرے دل میں فی الفور ربی سے رابطہ کرنے کی خواہش جاگی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے آخری بار رات دس بجے ربی سے سیلولر رابطہ کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ میں اس کے پاس' اسرائیل پہنچ رہا ہوں۔ یہ ایک طرح سے میرے شدید غصے کا اظہار تھا۔ پتا نہیں میری اس مختصر اور مبہم گفتگو سے موشے ہائمن نے کیا تاثر لیا ہوگا۔ میں نے اپنی بات کہنے کے بعد موبائل کو آف کر کے سیلولر رابطہ منقطع کردیا تھا۔ ہم اس وقت ڈبلیو ٹی سی (ورلڈ ٹریڈ سینٹر) کی سب وے انٹرنس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ میں نے اس موقع پر ربی کو جو ڈوز پلایا، وہ اس پر تلملا کر رہ گیا ہوگا لیکن افسوس کہ میں اس کی تلملاہٹ سے محظوظ نہیں ہوسکا تھا!

وسیم کے اس مختصر سے اپارٹمنٹ میں فون کی سہولت میسر نہیں تھی البتہ' بینا رائے والا موبائل فون وسیم کے پاس موجود تھا۔ اس موبائل کا استعمال انتہائی خطرناک تھا تاہم میرے

ذہن میں اس وقت جو طوفان مچل رہا تھا، اس نے مجھے تھوڑا سا غیر محتاط بنا دیا۔ میں بیڈ سے نیچے اترا اور وسیم والے بیڈ روم کی جانب بڑھ گیا۔
وہ جاگ رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا ''نیند نہیں آرہی کیا؟''
''تم نے میری نیند اڑادی ہے وجدان!'' اس نے ہیجان خیز لہجے میں کہا اور ایک طویل جماہی لی ''یہ کمبخت آبھی رہی ہے اور نہیں بھی آرہی۔''
میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور حیرت بھرے لہجے میں پوچھا ''میں نے کس طرح تمہاری نیند میں ہوائی جہاز کا انجن فٹ کر دیا؟''
''تمہارے حالات کسی فلائنگ ساسر (اڑن طشتری) سے کم نہیں ہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ہم شکل نقلی وجدان اور اس کے بھیانک انجام نے میری آنکھوں میں حیرتوں کے سمندر انڈیل دیے ہیں۔ ان واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے نیند کیوں کر آئے گی!''
''تو ایسا سوچنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔
''سوچنا میرے بس میں تو نہیں وجدان!''
''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''انسان جس قسم کی سچویشن سے گزر رہا ہوتا ہے، اس بارے میں غیر ارادی طور پر بھی سوچتا چلا جاتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔''
''تم کیوں نہیں سوئے؟'' اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔
میں نے کہا ''میں ایک ضروری فون کرنے کے بعد سوؤں گا۔''
''ضروری فون!'' اس نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا پھر قدرے فکرمندی سے بولا ''اس کے لیے تو ہمیں کسی پبلک فون بوتھ تک جانا ہوگا۔ تم جانتے ہو اس اپارٹمنٹ میں فون کی سہولت موجود نہیں اور موبائل فون تو......!''
''ہم موبائل فون کو ہی استعمال کریں گے لیکن باہر جاکر۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''اور یہ اس موبائل کا میرے ہاتھوں آخری استعمال ہوگا!''
میرے لہجے کی حتمیت نے وسیم کو باور کرا دیا کہ میں کوئی فیصلہ کرنے کے بعد ہی اس کے پاس آیا ہوں۔ وہ بستر چھوڑتے ہوئے بولا ''ٹھیک ہے ہم اسی وقت باہر جا رہے ہیں لیکن اتنا تو بتا دو' یہ ایمرجنسی کال تم کسے کرنا چاہتے ہو؟''

''وہ شخص جو اس موبائل کا بل بھرنے کا ٹھیکے دار بنا ہوا ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ''میں اس سیل سے چھٹکارا پانے کے بارے میں فیصلہ کر چکا ہوں پھر کیوں نہ اس کے ٹھیکے دار سے دو باتیں کر لی جائیں!''
''اوہ تم ربی موشے ہائمن کو رِنگ کرنا چاہتے ہو!'' وسیم نے تاسف آمیز انداز میں کہا۔
ٹھیک دس منٹ بعد ہم یلو میڈیلین میں بیٹھ کر شوگر ہل سے نکل رہے تھے۔ وسیم نے اپنی ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ میں اس کے برابر میں پسنجر سیٹ پر موجود تھا۔ میں نے موبائل کو آن کرتے ہوئے کہا ''کیا مین ہٹن میں کوئی سگنل فری ایونیو بھی ہے؟''
''رات کے آخری پہر میں تم تمام ایونیوز کو سگنل فری ہی سمجھو۔'' اس نے جواب دیا ''سخت ترین سرد موسم میں کسی کو سڑکوں پر رش لگانے کی مصیبت نہیں پڑی۔ ہم جس بھی ایونیو یا اسٹریٹ میں داخل ہوں گے' وہ تاحد نگاہ ہمیں خالی ہی نظر آئے گی۔'' ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا ''ویسے تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''
میں نے گہری نظر سے دیکھا اور کہا ''کیا تم کوئی گھبراہٹ محسوس کر رہے ہو؟''
''نہیں تو۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا ''گھبراہٹ کیسی!''
میں نے کہا ''خیر چھوڑو...... ہاں سنو۔'' میں چند لمحات کے لیے متوقف ہوا پھر ٹھہری ہوئی آواز میں اضافہ کیا ''تم بس ٹیکسی کو دوڑاتے جاؤ۔ مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ تم کہاں کہاں سے گزرو گے اور کیسے گزرو گے۔ جس ٹیکسی کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا' موبائل پر گفتگو کے دوران میں نیٹ ورک کا کوئی اینٹینا (ٹاور) ہماری لوکیشن کو جانچنے میں کامیاب ہو۔ ٹریسنگ اور ٹریکنگ کے امکانات کو ایک لمحے کے لیے بھی ذہن سے خارج نہ کرنا!''
''او کے باس!'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا ''تمہیں مجھ سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوگی۔ تم نہایت اطمینان سے ربی موشے ہائمن کے نمبرز پنچ کر سکتے ہو۔''
میں مطمئن ہو کر موبائل کے کی پیڈ سے ''کھیلنے'' لگا۔ اگلے ہی لمحے ربی سے رابطہ ہو گیا۔ میں نے اس کے ''ہیلو'' کے جواب میں چھوٹتے ہی کہا ''ریسپیکٹیڈ لارڈ! کیسے ہو؟''
میرے لب و لہجے سے ربی کے لیے منافقانہ احترام بھی رخصت ہو گیا۔ حالات جس نہج پر پہنچ گئے تھے وہاں کسی مصلحت یا منافقت کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کے کھلے دشمن تھے اور اس حقیقت کو کسی ملمع کاری سے گزارنے

کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

''میرے بچے وجدا......''

''چاپلوسی اور منافقانہ شفقت کا وقت گزر چکا موشے ہائمن!'' میں نے نہایت ہی سخت الفاظ میں کہا تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا'' بتاؤ...... کب کہاں اور کن شرائط پر ساحل کو میرے حوالے کرو گے؟''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولا'' تو میری ساری محنت ضائع ہو گئی!''

''عنقریب تم بھی ضائع ہونے والے ہو۔'' میں نے تُرش لہجے میں کہا'' جس طرح رات کے درمیانی حصے میں تمہارا دستِ راست برنارڈلیو' آلۂ کار نقلی وجدان اس کی ساتھی ڈپلیکیٹ آف ساحل ریٹا' ایسٹ ہاسٹھ اسٹریٹ والے سائناگاگ کا ربی فرینکلن اور اس کا دراز قامت ساتھی میرے ہاتھوں ضائع ہو چکے ہیں۔'' میں سانس لینے کو رُکا پھر کہا'' تم تو بڑے بااختیار اور باخبر ربی ہو۔ دنیا میں کہیں بھی موجود ہو' تازہ ترین اطلاعات تمہاری دسترس میں رہتی ہیں۔ یہ نیوز تو تمہاری اپنی ہیں' یقیناً تم تک پہنچ چکی ہوں گی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس کی پُھنکار سے مشابہ مگر ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی'' وجدان! سن شائن اپارٹمنٹ اور زمین دوز ریلوے ٹریک پر جو افسوس ناک واقعات پیش آئے' اس سلسلے میں میں تمہاری ہر غلطی کو معاف کرنے......''

''تم کون ہوتے ہو معاف کرنے والے؟'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی درشت لہجے میں کہا۔

وہ سنگین نرمی سے بولا'' وجدان! میں تمہیں دوست بنانا چاہتا......''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹ دی'' ہم کبھی دوست تھے اور نہ آئندہ کبھی بن سکتے ہیں۔ میرے کیا' تم یہودی کسی بھی غیر یہودی کے دوست نہیں ہو سکتے۔ آج تک تم لوگوں نے جس سے بھی دوستی کی وہ گیا کام سے۔ تم لوگ جس ملک میں دوست بن کر قدم رکھ دو وہاں قحط سالی اور فاقہ کشی کی نوبت آ جاتی ہے۔ اس دنیا کے کتنے ہی ممالک کو تم لوگوں نے دوستی کی آڑ میں دشمنوں سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ یہودی صرف یہودی کا دوست ہے اور ذاتی مفاد کی خاطر وہ کسی بھی مصلحت کی بنا کر' راستے کا خار جان کر اپنے دوست کا پتا بھی صاف کر سکتا ہے...... اور تمہیں یہ دوستی کا ناٹک رچاتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آ رہی؟ تم نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے ریٹا کو ساحل کے بہروپ میں وِنڈوز آف دی ورلڈ میں بھیج دیا اور کہتے ہو تم مجھ پر بہت شفیق اور مہربان ہو۔ وہ تو میری حکمتِ عملی کام آ گئی ورنہ میں تمہاری جھوٹی دوستی کی نذر ہو چکا ہوتا۔ یہی ہے تمہاری محبت اور دوستی؟''

مصلحت اور منافقت کے درمیان حائل تمام پردے اٹھ گئے تو وہ بھی بدلے ہوئے انداز کے ساتھ بولا'' تم کبھی بھی میری دسترس سے باہر نہیں رہے۔ میں جب چاہوں' تمہیں اچک لوں۔ میں نے ابھی تک ایسا نہیں کیا مگر اب کرنا ہوگا۔ میری ڈھیل کا تم نے غلط مطلب لیا۔ تمہیں میرے اختیارات کا اندازہ نہیں۔''

''یہ ڈائیلاگ کسی مرعوب اور معتوب شخص کے سامنے مارنا۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا'' میں مانتا ہوں تم بہت اونچی اپروچ والے ہو لیکن یہ بات بکواس ہے کہ میں تمہاری دسترس میں رہا ہوں۔ اگر تمہیں میرے بارے میں ذرا سا بھی سراغ مل جاتا تو تمہارے ہرکارے لمحے بھر میں مجھ تک پہنچ جاتے پھر میری شہ رگ اور تمہارے ہاتھ ہوتے!''

وہ پتھریلے لہجے میں بولا'' فکر نہ کرو اب ایسا ہی ہوگا۔ تم مجھ سے مرعوب نہ سہی لیکن معتوب ضرور ہو۔ تم پر چار امریکی شہریوں برنارڈلیو' ربی فرینکلن' ریٹا اور ایڈمنڈ کے قتل کا الزام ہے (ایڈمنڈ وہ دراز قامت شخص تھا جو فرینکلن کے پہلو میں مردہ پڑا تھا) دنیا کا کوئی ممالک تمہیں پناہ دینے کی غلطی نہیں کرے گا...... بھاگو...... میں دیکھتا ہوں تم کتنا تیز بھاگ سکتے ہو!''

وہ شاطر بڑی صفائی سے نقلی وجدان کا تذکرہ گول کر گیا تھا۔ اس کے عزائم کی خطرناکی سے متاثر ہوئے بغیر میں نے کہا۔

''ربی! اس نوعیت کا ایک الزام پہلے بھی مجھ پر عائد کیا گیا تھا جب کراچی میں' میں نے یہودی النسل ارب پتی مسز نیل آرمز' اس کی خوب رو سیکریٹری شیبا اور امریکی فائٹر ڈیوڈ کو کتے کی موت مارا تھا۔'' ایک لمحے کو متوقف ہو کر میں نے کہا'' ماؤنٹ مکنلے کی بارودی گزرگاہ سے فرار ہوتے وقت بھی میں نے یو۔ ایس آرمی کے چند افراد کو نقصان پہنچایا تھا اور یہاں مین ہیٹن میں الفریڈ' گراہم اور سائمن کو میں نے جس عذاب سے گزارا ہے وہ بھی تم سے مخفی نہیں اور آئندہ بھی جو فتنہ پرور یہودی میرے ہاتھوں......''

''سب...... سب۔'' جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ربی کی اضطراری آواز میرے سماعت سے ٹکرائی'' ان سب اموات کو تمہارے کھاتے میں درج کیا جائے گا۔ مجموعی طور پر تم ایک درجن امریکی یہودیوں کو قتل کر چکے ہو۔ تم مرد معتوب ہی نہیں بلکہ'' مطلوب'' کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔ موسٹ وانٹیڈ پرسن فاری اینڈ اسٹیٹس۔''

میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا'' ربی! تم تو مجھے ایمل کاسی کا بھی گرد ثابت کرنے پر تلے بیٹھے ہو!''

''ایمل نے چند اہم افراد کو قتل کیا تھا۔ تم اس سے کہیں بڑے مجرم ہو۔''

''سی آئی اے کے ایجنٹ کہتے ہوئے تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے جو'' اہم افراد'' جیسے الفاظ استعمال کر رہے ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ میرے طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی کہتا چلا گیا'' ایمل کا جرم اسے پوری دنیا میں دوڑاتا پھرا اور بالآخر ہم نے اسے گرفتار کر ہی لیا اور وہ بھی تمہارے ہی ملک سے۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کے لہجے میں حقارت در آئی'' اب وہ ہماری گرفت میں ہے۔ اس پر امریکا میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے اور عنقریب اسے بدترین سزا سے بھی گزارا جائے گا۔''

اس وقت تک ایمل کاسی کا انجام نہیں ہوا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' موشے ہائمن! میں ایمل نہیں ہوں جو سی آئی اے کے ایجنٹوں کے ڈر سے' ایک ملک سے دوسرے ملک بھاگتا پھروں گا۔ میں اس وقت تم لوگوں کے اندر گھسا بیٹھا ہوں...... اور اندر رہ کر ہی تمہارا کباڑا کرتا رہوں گا۔ نچ می اف یو کین!''

میری زبان سے ادا ہونے والا آخری جملہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ ایسا چیلنج آج تک کسی شخص نے امریکا بہادر کو نہیں دیا ہوگا۔ دوسری جانب ایک لمحے کے لیے موت کا سا سناٹا پھیل گیا پھر ربی کی گمبھیر آواز سنائی۔

''کیا تم اس ہٹ دھرمی اور یہود دشمنی میں اپنی ساتھی کو بھی فراموش کر دو گے۔ اگر تم اسٹیٹس ہی میں بیٹھے رہے تو اس کا کیا ہوگا؟''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی خوف ناک کیکڑے نے میرے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ میں تصور کی نگاہ سے اسے ایک ہوائی جہاز میں محوِ پرواز دیکھ چکا تھا' اس کا غالب مطلب یہی تھا' وہ امریکا سے باہر کہیں جا رہی تھی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ یہ کیسے ممکن تھا میں اپنے وجود کے سب سے اہم عضو کو فراموش کر بیٹھوں!

''کس سوچ میں گم ہو؟'' میری لمحاتی خاموشی کے پیشِ نظر ربی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ایک تجویز دی'' تمام تر دشمنی کے باوجود بھی میں تمہارے لیے ایک دروازہ کھلا چھوڑ رہا ہوں وجدان۔ تم اس دروازے سے گزر کر اپنی ساحل تک پہنچ سکتے ہو!''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا'' تم کس دروازے کا ذکر کر رہے ہو؟''

وہ بولا'' تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے سوال کیا تھا...... میں کب کہاں اور کن شرائط پر ساحل کو تمہارے حوالے کروں گا...... تو نوٹ کر لو۔''

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا'' یہ شرائط نامہ صرف ایک ننھی سی فرمائش پر مشتمل ہے۔ اگر ساحل کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلی فرصت میں میرے پاس اسرائیل چلے آؤ۔''

وہ بہت ہی گہری چال چل رہا تھا۔ اس پیش کش کے زور پر وہ مجھے پناہ گاہ سے نکال کر منظر پر لانا چاہتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی ناکامی کا اعتراف بھی تھا۔ اس کا یہ دعویٰ ریت کی دیوار کی سی حیثیت کا حامل تھا کہ وہ جب اور جہاں چاہے' مجھے اپنی گرفت میں لے سکتا ہے!

میں نے کسی بحث میں پڑنے کے بجائے اس سے کہا'' اسرائیل آنے کی دعوت تو تم مجھے اس طرح دے رہے ہو جیسے ساحل بھی وہاں موجود ہو!''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ رعب دار آواز میں بولا'' صرف اتنا بتا دو' کب اور کس فلائٹ سے اسرائیل پہنچ رہے ہو۔ ائرپورٹ پر میرے خاص آدمی تمہارے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ وہ تمہیں سیدھا میرے ٹھکانے پر پہنچا دیں گے۔''

''ربی! میں تمہارے ظرف اور مہمان نوازی کو سیلوٹ کرتا ہوں۔'' میرے الفاظ میں طنز کے نشتر چھپے تھے'' درجن بھر افراد کے قاتل کو تم کتنی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہے ہو!''

''یہ بھی دشمنی کا ایک انداز ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا'' تمہاری مجرمانہ حیثیت اپنی جگہ' لیکن اگر تم امریکا سے اسرائیل آ جاتے ہو تو میں اپنا وعدہ ضرور پورا کر دوں گا۔ تم ساحل کو یہاں پاؤ گے۔''

''میری اس سے بات کراؤ۔'' میں نے اچانک ایک باؤنسر مارا۔

وہ مکاری سے بولا'' وہ اس وقت باتھ لے رہی ہے۔ ابھی ابھی سو کر اٹھی ہے۔ سوری میں تمہاری فرمائش پوری نہیں کر سکتا۔''

مجھے اس کی عیاری پر غصہ آ گیا ہے۔ بے ساختہ میرے

منہ سے نکلا ”کاش! لاکھوں کروڑوں یہودیوں کو یہ پتا چل جائے کہ ان کا ربی مربی کتنے فراٹے سے جھوٹ بولتا ہے۔“

ٹیڑھی صورت والے کسی شخص کو آئینہ دکھا دیا جائے تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ ربی کی سیرت میں ٹیڑھ اور نیت میں پھیر تھا‘ میرے الفاظ کی تلخی نے اسے آتشِ زیرپا کی کیفیت میں پہنچا دیا‘ برہمی سے بولا۔

”کیا بک رہے ہو؟“

”میں یہ فرما رہا ہوں کہ ساحل اس وقت ایک ہوائی جہاز میں سفر کر رہی ہے۔“

دوسری جانب متاسفانہ خاموشی چھا گئی پھر ربی کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری ”اس کا مطلب ہے تمہارے بارے میں میرا اندازہ درست ہے!“

میں نے اس سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ میرے بارے میں کس قسم کی اندازے بازی کرتا رہتا ہے۔ ربی کا واضح اشارہ میری اس مخفی صلاحیت کی جانب تھا جس کے طفیل میں ساحل کی وقوع پذیری سے آگاہ ہو گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے ربی کی ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

”ٹھیک ہے وجدان! میں تمہیں اپ گریڈ کر رہا ہوں۔“

”اوور گریڈ اور ڈی گریڈ نہ کرنا۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا ”باقی سب گریڈ چلیں گے!“

وہ میرے طنز اور تمسخر کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ”اگر تمہاری ساتھی اس وقت طیارے میں ہے تو میرے ہی حکم پر ہے۔ اس وقت یہاں اسرائیل میں دن کے بارہ بجنے والے ہیں۔ جب نیویارک کی گھڑیاں اس وقت کو چھوئیں گی تو ساحل میرے پاس پہنچ چکی ہوگی...... اور اب اس کی حیثیت مہمان کی نہیں بلکہ قیدی ایسی ہوگی۔ تم اپنی کسی بھی ذہنی اور روحانی صلاحیت کے بل بوتے پر اس تک کسی بھی قسم کی رسائی حاصل نہیں کر سکو گے۔ تم جانتے ہو میں عملیات کے شعبے میں کیا کیا کر سکتا ہوں۔ نیویارک میں تو بارہ بجیں گے ہی‘ میں نے تمہارے بھی بارہ نہیں بجا دیے تو میرا نام بھی ربی موشے ہائمن نہیں! میں دیکھتا ہوں تم کب تک اور کس بل میں چھپ کر بیٹھے رہتے ہو۔ میں تمہارے لیے ایسا شیرہ لگاؤں گا کہ کسی دیوانی مکھی کے مانند تم سر دھنتے ہوئے میری جانب لپکو گے ...... اسرائیل‘ میرے قدموں میں پہنچو گے!“

”میں تمہارے لیے عزرائیل بن کر اسرائیل پہنچوں گا۔“ میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا ”وش یو بیڈ لک کبی لوشے ڈیمن!“

بات ختم کرتے ہی میں نے سیل کو آف کر دیا‘ پھر بڑے اطمینان سے اپنی سائیڈ کا شیشہ گرایا اور اس دستی موبائل فون کو کھڑکی سے باہر‘ مین ہیٹن کی ٹھٹھرتی ہوئی فضا میں دور اچھال دیا۔ یلو کیب اتنی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی کہ اس ایونیو نے میرے دیے ہوئے ”تحفے“ کا کس طور استقبال کیا‘ یہ معلوم نہ ہو سکا۔

میں شیشہ چڑھا کر سیدھا ہوا ہی تھا کہ وسیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”اگر اب تک تم ٹریس آؤٹ نہیں ہوئے یا ٹریس آؤٹ نہیں کیا گیا تو آئندہ اس خوش فہمی میں نہ رہنا۔ ربی سے ہونے والی تمہاری طویل گفتگو بڑی خطرناک اور ہلچل مچانے والی ہے۔ تم اس وقت ہائی رسک پر ہو۔“

”تم نہیں...... ہم کا لفظ استعمال کرو۔“ میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا ”تم نے ٹریسنگ اور رسک کے حوالے سے واحد کا صیغہ اپنایا ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس وقت میں ایک اجنبی ٹیکسی والے کے ساتھ بیٹھا ہوں جو مجھے میری منزل پر پہنچانے کے بعد کرایہ وصول کرے گا اور آگے بڑھ جائے گا۔“

ربی سے ہونے والی بات چیت کو یک طرفہ طور پر وسیم نے بھی سنا تھا اور نفسِ گفتگو کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کی تشویش بجا تھی مگر میں اس وقت بہت مختلف موڈ میں تھا۔ یہ اسے آزمانے کا موقع بھی تھا لہٰذا میں دوٹوک رہا۔

”آئی ایم ویری سوری یار۔“ وہ ندامت آمیز لہجے میں جلدی سے بولا ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ہم دونوں اب ایک ساتھ ہیں۔ ہمارا دکھ سکھ‘ نفع نقصان مشترک ہے۔ پتا نہیں بے دھیانی میں میرے منہ سے کیا نکل گیا۔ اگین ’آئی ایم سوری۔“

”وسیم!“ میں نے بدستور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا ”میری تو ساری زندگی ریڈ الرٹ اور ہائی رسک پر گزری ہے لہٰذا ربی سے پڑنے والا دنگل میرے لیے معمول کی بات ہے۔ البتہ تم اگر یہ محسوس کر رہے ہو کہ......“

”سوری بول دیا نا یار۔“ وہ خفگی آمیز انداز میں بولا ”کہو تو اسٹیئرنگ چھوڑ کر تمہارے پاؤں پڑ جاتا ہوں۔ اس طرح اور کچھ ہو نہ ہو‘ ربی کا کام ضرور آسان ہو جائے گا۔ ہائی اسپیڈ پر دوڑتی ہوئی کسی گاڑی کا اسٹیئرنگ چھوڑنے کا مطلب جانتے ہو نا؟“

”کافی کا موڈ ہو رہا ہے!“ میں نے سادگی سے کہا۔ وسیم کی دوستی اور اخلاص کو کسی آزمائش کی ضرورت نہیں

تھی۔ وہ سوال میں نے اپنے حالات کے دباؤ کے تحت اس سے کیا تھا۔ اس نے گزشتہ رات میرے ساتھ جس سفر کا آغاز کیا تھا‘ آگے چل کر وہ پتا نہیں‘ اسے کیا کیا رنگ دکھلاتا اس لیے ابتدائی مرحلے پر ہی اس کی ڈرائی کلیننگ مناسب تھی۔

کافی کے ذکر پر اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور کافی دیر تک خاموش نظر سے دیکھتا چلا گیا۔ میری سنجیدگی میں جب کوئی فرق نہ آیا تو اس نے سرسری انداز میں کہا۔

”اس وقت کون سا کافی ہاؤس کھلا ہوگا!“

میرے دل و دماغ میں نفرت کا ایک الاؤ روشن تھا۔ مخصوص منافقانہ اور دغاباز یہودی ذہنیت سے نفرت کسی بھی قوم کے سارے افراد ایک جیسے نہیں ہوتے مگر یہودی دنیا کی وہ واحد قوم ہیں جن کے عمومی مزاج میں قدرِ مشترک پائی جاتی ہے۔ میں اس وقت ایک خاص کیفیت میں تھا‘ اس لیے وسیم کی بات کے جواب میں کہا۔

”یار! یہ مین ہیٹن ہے یا امریکیوں کا لنڈا بازار۔ اس کا نام تو نٹے منہ ہونا چاہیے۔“ میں ایک ترنگ میں بولتا چلا گیا ”اپنا پیارا وطن سب سے اچھا ہے۔ پاکستان کے دل لاہور اور دماغ کراچی میں یہ ”بے رونقی“ تو دیکھنے میں نہیں آتی!“

”مین ہیٹن کے بعض کیسینو تو ساری رات کھلے رہتے ہیں۔“ وسیم نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا ”مگر کسی کافی ہاؤس کا آن سروس ملنا محال ہے۔“

میں نے مذاق کے رنگ میں جلدی سے کہا ”کیسینو اور پب میں جانے کا مجھے شوق نہیں۔ اگر کافی نہیں مل سکتی تو واپس اپارٹمنٹ چلو۔“

”میں تھیٹر ڈسٹرکٹ کو ٹرائی کرتا ہوں۔“ وسیم نے کہا ”شاید ٹائمز اسکوائر میں بات بن جائے۔ وہاں کی رونق آسانی سے ختم نہیں ہوتی۔“

تیرہ میل طویل اور دو میل عریض مین ہیٹن کے علاقے کو مختلف اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے اور وہاں کی خصوصیت کے پیشِ نظر اضلاع کے نام رکھے گئے ہیں۔ بینکنگ‘ اسٹاک‘ ٹریڈ اینڈ فنانس کے لیے فنانشل ڈسٹرکٹ۔ ملبوسات‘ شوز‘ بیوٹی سیلون اینڈ پارلرز‘ لنگریز اور ہر قسم کے پہناوے کا مرکز گارمنٹ ڈسٹرکٹ۔ شوبز اور پکچر ہاؤسز کی منڈی تھیٹر ڈسٹرکٹ وغیرہ وغیرہ۔

ہر بستی کا اپنا ایک چلن ہوتا ہے۔ خوش یا بد‘ اس سے بحث نہیں!

سکستھ ایونیو‘ ایتھ ایونیو‘ ویسٹ فورٹی اسٹریٹ اور ویسٹ ترپن اسٹریٹ کے درمیان واقع مستطیل قطعہ مین ہیٹن ”تھیٹر ڈسٹرکٹ“ کہلاتا ہے اور ٹائمز اسکوائر اس ڈسٹرکٹ کا دل ہے۔ ٹائمز اسکوائر درحقیقت براڈوے‘ سیونتھ ایونیو اور ویسٹ چوالیس اسٹریٹ کے انٹرسیکشن سے وجود پاتا ہے۔ اس کا نک نیم ”دی کراس روڈز آف دی ورلڈ“ ہے۔ یہاں ہر وقت رنگ و نور کا ایک سیلاب سا آیا رہتا ہے۔ آپ یہاں کی عمارتوں کو نیون سائنز کی مارکیٹ سمجھ لیں۔

وسیم نے بلوڈ بلین ”ایم۔ ٹی وی“ براڈ کاسٹنگ بلڈنگ کے نزدیک سے گزاری اور دوسری جانب میکڈونلڈ کو پہلو میں چھوڑتے ہوئے ”ڈزنی اسٹور“ پہنچ گیا۔ ڈزنی اسٹور کے اندر متعدد ریسٹورنٹس‘ کافی ہاؤسز‘ ہوٹلز‘ پبز اور دفاتر واقع ہیں۔ اتفاق سے ہمیں اپنے مطلب کا ایک کافی ہاؤس کھلا مل گیا۔

اپنی طلب پوری کرنے کے بعد جب ہم واپس شوگر ہل پہنچے تو صبح کے چھ بج رہے تھے۔ وسیم حد سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ اس سنجیدگی میں ایک خاص قسم کی الجھن پائی جاتی تھی۔ میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے ربی کا ذکر چھیڑ دیا۔

”پتا نہیں‘ اس بندے کے ذرائع اطلاعات کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سن شائن اپارٹمنٹ اور سب وے ٹریک والے واقعات کو چند گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ برننگ اسٹوریز اس تک پہنچ گئیں۔ میری تو سمجھ کام نہیں کر رہی!“

وسیم میری چال میں آ گیا‘ سنجیدگی کو توڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا ”وجدان! ربی تو جو ہے‘ سو ہے مگر تم بھی بہت اونچی چیز ہو۔ تمہارا نیوز نیٹ ورک میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

”نیوز نیٹ ورک؟“ میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔

”اور نہیں تو کیا۔“ وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا ”ہم نقلی وجدان اور اصلی ساحل کے پیچھے لپک کر سکس لائن پر سوار ہوئے لیکن جب ٹرین کے اندر ساحل نظر نہیں آئی تو تم نے فتویٰ صادر کر دیا‘ وہ ٹرین پر سوار ہی نہیں ہوئی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں‘ تمہیں ساحل کے بارے میں یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنے جملے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اور تھوڑی دیر پہلے تم نے ربی کے منہ پر الفاظ کا طمانچہ رسید کرنے کے لیے انکشاف کیا کہ ساحل اسرائیل میں نہیں بلکہ کسی ہوائی جہاز میں محوِ پرواز ہے۔ یہ اچنبھک خبر تم تک کیسے

پہنچی؟ ربی نے تمہارے انکشاف کی تردید نہیں کی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"تم غلط کہہ رہے ہو اور نہ ہی تمہارے سوال کرنے پر کوئی پابندی عائد ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور اٹھ کر اسے گلے سے لگالیا پھر اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بڑے رسان سے کہا۔

"میں نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کے بارے میں بعض باتیں تمہیں نہیں بتائی تھیں۔ چھپانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا! بلکہ میں اس گفتگو کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھا......اور میرا خیال ہے اب وہ مناسب موقع آگیا ہے۔"

وسیم نے مجھے سختی سے بھینچ لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے وجود الگ ہوئے تو دونوں کی آنکھوں میں نمی اتری ہوئی تھی۔ یہ غم کی نہیں' خوشی کی نمی تھی۔ اعتبار اور اعتماد کی دلیل تھی جو ہم ایک دوسرے پر کرنے لگے تھے۔ اس ایثار اور قربانی کا ثبوت تھی جس کے جذبات ایک دوسرے کے لیے ہم اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔

آئندہ ایک گھنٹے میں' میں نے وسیم کو اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

دنیا میں جتنے بھی منہ بولے رشتے پائے جاتے ہیں ان میں سب سے پائیدار اور کھرا رشتہ دوستی کا ہے۔ ہمارے درمیان یہ رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ اگر خالص رشتے کی عمارت کھڑی کرنا ہو تو بنیاد سچ پر رکھنا چاہیے!

☆☆☆

دماغ کو مخصوص ہدایات دے کر سونے کا فائدہ یہ ہے کہ نیند کے دوران میں یہ کسی ہوشیار چوکیدار کی طرح نہ صرف بیدار رہتا ہے بلکہ آپ کے احکام کی تعمیل بھی کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

میں سات بجے صبح سونے کے لیے لیٹا اور اپنے دماغ کو دوپہر گیارہ بجے تک پُرسکون اور محفوظ نیند کی ہدایت کی مگر نو بجے ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' میرے ماحول میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی ورنہ یوں مقررہ وقت سے پہلے میری آنکھ نہ کھلتی۔

میں نے بستر پر لیٹے لیٹے پہلے اس کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں سب ٹھیک تھا۔ میں نے بستر چھوڑ دیا اور وسیم والے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کے دیگر حصوں میں بھی امن و امان قائم تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا' جو بھی غیر معمولی بات ہوئی تھی اس کے اثرات ابھی تک اپارٹمنٹ کے اندر نہیں پہنچے تھے مگر......کسی بھی وقت پہنچ سکتے تھے۔

میرے کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی سمت کھلتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں واپس آیا اور مذکورہ کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ وہ اپارٹمنٹ اس بلڈنگ کے سیکنڈ فلور پر واقع تھا۔ میں نے پردہ ہٹائے بغیر ہاتھ ڈال کر ایک مخصوص ٹیکنیک سے کھڑکی کھول لی اور ایک سائیڈ سے محتاط انداز میں پردہ سرکا کر باہر سڑک کا جائزہ لینے لگا۔ اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ میرے دماغ نے بروقت مجھے ایک بڑے خطرے سے آگاہ کردیا تھا۔

نیچے سڑک پر پولیس کی تین گاڑیاں آگے پیچھے آکر رکیں اور درجن بھر پولیس والے باہر نکل کر اس عمارت کے داخلی دروازے کی سمت بڑھے جس میں وسیم والا اپارٹمنٹ واقع تھا۔ میرے اعصاب تن گئے اور میکانکی انداز میں نے وسیم والے بیڈروم کی جانب قدم بڑھا دیے۔

پولیس والے اپنی مخصوص نیلی یونیفارم میں تھے۔ انہی کے بیچ میں نے ایک دو سوٹڈ بوٹڈ افراد کو بھی مستعدی سے آگے بڑھتے دیکھا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا' یہ پولیس سے کچھ اوپر کا معاملہ تھا۔ یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا' وہ کس مقصد سے عمارت میں داخل ہوئے ہیں مگر پیش آمدہ حالات کی بنا پر میرے ذہن نے یہی فیصلہ دیا کہ وہ میری تلاش میں وہاں آئے ہیں......اور یہ تلاش ہائی لیول پر کی جارہی ہے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ ہمارے دروازے پر تیز دستک سنائی دیتی!

میں محض پانچ سیکنڈ میں وسیم تک پہنچا اور آئندہ بیس سیکنڈ کے اندر میں اسے جھنجوڑ کر بیدار کر چکا تھا۔ اس کے اعصاب مضبوط تھے کہ آنکھ کھولنے کے بعد اس نے کسی ہڑبڑاہٹ اور افراتفری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تفصیل بیان کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے صورتِ حال کی سنگینی سے آگاہ کیا اور کہا۔

"ہمیں ابھی اور اسی وقت اپارٹمنٹ سے باہر نکلنا ہے ورنہ یہ فلیٹ ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہوگا!"

اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا۔ میرے چہرے پر پھیلے ہوئے پُرتشویش تاثرات نے اسے حالات کی نزاکت سے روشناس کردیا تھا۔ ٹھیک ایک منٹ بعد ہم اپارٹمنٹ کو لاک کرکے اوپر جانے والے زینے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سیکنڈ اور تھرڈ فلور کو ملانے والے زینے کی ٹرننگ پر کونے میں ایک کنگ سائز گملا رکھا تھا جس میں انڈور پلانٹس کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ مذکورہ گملا تین ہائی تین فٹ کا تھا۔ اس کی اونچائی بھی کم و بیش اتنی ہی تھی۔ قبل اس کے کہ پولیس والے

سیکنڈ فلور تک رسائی حاصل کرتے' ہم لپک کر اس گملے کے عقب میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔ میں وہاں رک کر یہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ واقعی میرے طلب گار ہیں!

وسیم نے سرگوشی کی "وجدان! کیا افتاد آن پڑی ہے؟"

"میں نے این وائے پی ڈی کی بھاری نفری کو اس عمارت میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔" میں نے بھی سرگوشیانہ انداز ہی میں جواب دیا "اگر وہ ربی کے حکم پر میری تلاش میں ادھر آئے ہیں تو سمجھو بہت بڑی افتاد نے تمہارے اپارٹمنٹ کا راستہ دیکھ لیا ہے۔"

"اوہ!" اس نے متاسفانہ انداز میں سانس خارج کی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں گملے کی اوٹ سے راہ داری کے دوسرے سرے کو تکنے لگا۔ اس راہ داری کے دونوں سروں پر زینے بنے ہوئے تھے۔ میری نگاہ جس زینے پر جمی تھی وہ فرسٹ فلور کو سیکنڈ فلور سے ملاتا تھا اور جس زینے کے کونے میں' گملے کے پیچھے ہم نے پناہ لے رکھی تھی' وہ سیکنڈ کو تھرڈ فلور سے ملاتا تھا۔ پولیس والے سیکنڈ فلور پر قدم رکھتے تو فوراً ہی میری نظر میں آجاتے۔

اگلے ہی لمحے وہ میری نظر میں آگئے۔ وہ صرف چار افراد تھے جب کہ نیچے میں نے درجن بھر کو دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کی حکمتِ عملی سے تو یہی لگا کہ باقی نیچے رک گئے ہیں تاکہ میرے فرار کی ہر کوشش کو ناکام بنایا جاسکے۔ یہ بڑی سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔

دو سیکنڈ بعد اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ لوگ میرے فراق ہی میں وہاں پہنچے تھے۔ ان چاروں کے قدم وسیم والے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کے سامنے رک گئے۔ وہ چاروں نہایت ہی مستعد اور مسلح تھے۔ وسیم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا تھا کہ پولیس کو اتنی شدومد سے اس کی تلاش ہوتی۔ وہ مجھے ہی سونگھتے ہوئے وہاں نازل ہوئے تھے۔ پتا نہیں' ربی نے انہیں میرا کون سا استعمال شدہ کپڑا سنگھا دیا تھا کہ وہ بالکل درست مقام تک چلے آئے تھے۔ وسیم اگرچہ جرم میں ملوث نہیں تھا تاہم مجھ سے دوستی اس کی جان کا وبال بننے والی تھی۔

ایک پولیس والے نے اپارٹمنٹ کی ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔ ان کے تیور بتاتے تھے' اگر چند لمحات میں دروازہ نہیں کھلا تو وہ اسے توڑ کر اندر گھس جائیں گے۔

"انہیں یہاں کے بارے میں کس نے بتایا؟" وسیم کی متفکر سرگوشی ابھری۔

"یہ ساری باتیں بعد میں بھی سوچی جاسکتی ہیں۔" میں نے ٹھہری ہوئی سرگوشی کی "یہ بتاؤ اس عمارت میں آمد و رفت کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

وسیم کا اپارٹمنٹ اس گملے سے پچاس گز کی دوری پر تھا۔ ہماری سرگوشیاں پولیس والوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں' پھر بھی ہم بہت زیادہ احتیاط کر رہے تھے۔ وسیم نے تجویز دی۔

"انہیں اپنی تسلی کر کے جانے دیں۔ اس وقت ہم یہیں چھپے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ اتنی آسانی سے نہیں ٹلیں گے بلکہ دروازہ توڑ کر تمہارے اپارٹمنٹ میں ڈیرا ڈال کر بیٹھ جائیں گے۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر پولیس والوں نے دروازہ توڑنے کی کارروائی کا آغاز کردیا۔ وسیم نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

اس کے چہرے پر طاری تشویش میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ اس دوران میں پولیس والے اپنی توڑ پھوڑ کی کارروائی میں کامیاب ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھرا مار کر اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہوگئے۔

میں نے وسیم کے کندھے کو تھپکا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا "چلو!"

اس نے نہیں پوچھا' کہاں چلو! میں جیسے ہی کنگ سائز گملے کی آڑ سے نکل کر اوپر جانے والے زینے کی سمت بڑھا' وسیم نے بھی میرے تعاقب میں قدم اٹھا دیے۔ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ ہم عمارت کی چھت کا رخ کرتے۔ ممکن ہے وہاں سے فرار کی کوئی راہ دکھائی دے جاتی۔ نیچے کی جانب حرکت کرنا تو ایسا ہی ہوتا جیسے خود کو موت کے منہ میں دھکیل دینا۔ کسی غلطی میں کی جانے والی ہماری یہ حرکت بڑی بے برکت ثابت ہوتی!

ہم تھرڈ فلور پر چند لمحوں میں پہنچے' پولیس والوں کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ دونوں فلور کے درمیان زینے کے چودہ پندرہ اسٹیپ تھے۔ ہم نے وہ اسٹیپس تقریباً دوڑتے ہوئے طے کیے لیکن تھرڈ فلور پر پہنچتے ہی ہم نے اپنی رفتار نارمل کرلی۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ راستے میں وسیم کا کوئی شناسا نہیں ملا اور ہم بہ خیر و خوبی عمارت کی چھت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ شوگر ہل کی وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ دیگر کئی رہائشی عمارتوں سے جڑی ہوئی تھی۔ ان میں سے اکثر پانچ منزلہ تھیں۔ ان عمارتوں کی تعمیرات کی ایک اور قدرِ مشترک سرخ اینٹیں' بھورے پتھر اور ڈچ اسٹائل تھا۔

ہم ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری چھت کے

اوپر سے گزرتے ہوئے کافی دور نکل آئے۔ ہم اس وقت اس رہائشی علاقے کی آخری چھت پر کھڑے تھے۔ اگر مذکورہ عمارت کے زینے اتر کر ہم باہر نکل جاتے تو این وائے پی ڈی (نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) والوں کا باپ بھی ہمارے پاؤں کی گرد کو نہیں چھو سکتا تھا!

میں چھت اور زینے کے بیچ حائل دروازے کی جانب بڑھا تو معلوم ہوا اسے دوسری طرف سے لاک کیا گیا ہے۔ یہاں مجھے جی کی قوت کو آزمانا پڑا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد ہم اس عمارت کا زینہ اتر کر باہر سڑک پر قدم رکھ چکے تھے۔

نو سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا تاہم سورج کا کہیں نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گہری دھند نے پورے نیویارک کو اپنی لپیٹ میں سمیٹ رکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا اگر مزید تھوڑی دیر تک یونہی کھلی فضا میں رہا تو کانپنے لگوں گا۔ درجہ حرارت اگر صفر سے نیچے نہیں تو آس پاس ضرور تھا۔ اس وقت ہمارے جسم پر مناسب گرم لباس بھی نہیں تھا۔ جس ڈریس میں سوئے تھے اسی میں اٹھ کر بھاگنا پڑ گیا تھا۔ میرا سامان تو ونگ ہنگ کے گھر رکھا تھا۔ ویم بھی جس افراتفری میں بھاگا تھا اس میں کوئی سامان سمیٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ غنیمت تھی کہ والٹ اس کی جیب میں موجود تھا ورنہ رقم کے سلسلے میں بڑی مشکل ہو جاتی۔

دو اسٹریٹ تک ''چہل قدمی'' کرنے کے بعد ہم نے ایک ییلو کیب پکڑ لی۔ ویم نے ڈرائیور کو 'لی ناکس' ایونیو چلنے کو کہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا 'لی ناکس (LENOX) ایونیو کہاں ہے اور ویم وہاں کیوں جانا چاہتا ہے۔ سرِدست سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہم جائے وقوعہ سے دور جا رہے تھے۔ بیٹا رائے والی گن اپارٹمنٹ پر ہی رہ گئی تھی جب کہ خطرناک خنجر اپنے کیس کے اندر میری پنڈلی پر موجود تھا۔ میں نے اس ہتھیار کو اپنے جسم کا حصہ بنا لیا تھا۔

ٹیکسی میں سفر کے دوران میں ہمارے درمیان گفتگو نہیں ہوئی۔ ہم دونوں اپنی اپنی سطح پر گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔ ویسٹ ون ٹوئنٹی سکس اسٹریٹ پر ویم نے ٹیکسی رکوائی اور کرایہ ادا کرنے کے بعد ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ہم اسٹریٹ کے کنارے پیدل ہی چلنے لگے تو میں نے ویم سے استفسار کیا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''سلویا!'' اس نے ایک لفظ پر مبنی جواب دیا۔

''سلویا!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ''کیا یہ کوئی تمہاری گرل فرینڈ ہے؟''

وہ زیرِلب سنجیدگی سے مسکرایا اور بتانے لگا ''سلویا ایک کوالٹی فوڈ ریسٹورنٹ ہے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں بیٹھنا ہی ہے تو کیوں نہ لگے ہاتھ ناشتا بھی کر لیں۔''

''اچھا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس نے بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کیا ''دیکھے بغیر ہی فیصلہ سنا دیا۔''

میں سمجھ گیا' ویم کا اشارہ سلویا ریسٹورنٹ کی جانب تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میں ریسٹورنٹ کی نہیں تمہارے آئیڈیا کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ۔'' اس نے ذومعنی انداز میں مجھے دیکھا اور بولا ''ویسے ریسٹورنٹ بھی برا نہیں اور...... اس کی مالکن سلویا اپنی عمر سے بیس سال کم لگتی ہے۔''

اب کے میں نے ایک طویل ''اوہ!'' خارج کی اور پوچھا ''ویسے اس کی اصل عمر کتنی ہے جو وہ بیس سال کم کی دکھائی دیتی ہے؟''

''وہ پچاس کے پیٹے میں ہے۔'' ویم نے بتایا۔

''کیا تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

''اکثر نہیں کبھی کبھار۔'' اس نے بتایا۔

''تمہاری سلویا سے دعا سلام تو نہیں؟''

''ارے نہیں یار!'' وہ جلدی سے بولا ''سلویا کے بارے میں یہ معلومات تو ہارلم کے ہر دوسرے بندے کے علم میں ہیں۔ میرا اس سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں۔''

میں نے اطمینان بھری سانس چھوڑی۔ دراصل میں نے یہ تمام تر سوالات ویم سے اس لیے کیے تھے کہ کہیں سلویا کے ذہن میں یہ نہ رہ جائے کہ آج ویم کے ساتھ میں نے اس کے ریسٹورنٹ میں ناشتا کیا تھا۔ میں جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا اس کے پیشِ نظر یہ احتیاط ضروری تھی۔

تین سو انتیس لی ناکس ایونیو اور ویسٹ ایک سو چھبیس اسٹریٹ کے سنگم پر واقع ''سلویا'' نامی وہ ریسٹورنٹ واقعی ایک عمدہ مرکزِ طعام تھا۔ اس کا اندرون جنگل گرین اور لیمن ییلو وال پیپرز سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر بڑی بڑی عالی شان پلاسٹک کی موم بتیاں اور فریم شدہ تصاویر آویزاں تھیں۔ یہ سب مشہور شخصیات کی تصاویر تھیں جن میں جیسی جیکسن' مسز میبز ڈنکنز' ڈینی منڈیلا اور خود سلویا کی فریم شدہ تصویر سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ ''سلویا'' کی خصوصی ڈشز میں کارن بریڈ' فرینڈ چکن' سیاہ آنکھوں والے مٹر اور میٹھے آلو شامل ہیں۔

ہم نے ایک ہلکا پھلکا آرڈر دیا اور دھیمے لہجے میں باتیں

کرنے لگے۔ میرے حالات میں پہلے ہی ایمرجنسی نافذ تھی' تازہ ترین صورتِ حال نے مزید سنسنی دوڑا دی۔ میں تو دربدر تھا ہی' میرے ساتھ اب ویم کی بھی شامت آ گئی تھی۔ پولیس یقیناً میری تلاش میں راہ سونگھتے ہوئے اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچی تھی۔ وہ بیچارہ اب گھر جانے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہا تھا اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا!

میں نے گمبھیر لہجے میں اس سے پوچھا ''تم گزشتہ دو سال سے نیویارک میں ٹیکسی چلا رہے ہو۔ کیا تم نے ایسا بھی کوئی دوست بنایا ہے جس کے پاس ایک آدھ دن قیام کیا جا سکے۔ فی الحال تمہارے اپارٹمنٹ کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے بتایا ''فوبی کیٹ نامی ایک لڑکی سے میری اچھی دوستی ہے۔ میں اسے فون کر کے معلوم کرتا ہوں۔''

''فوبی کیٹ!'' میں نے زیرِلب دہرایا ''یہ کون ہے اور کیا کرتی ہے؟''

وہ بولا ''فوبی کیٹ ایک کلب ڈانسر ہے۔ ایل باریو (EL BARRIO) میں رہتی ہے۔ ایل باریو ہسپانوی کمیونٹی کا علاقہ ہے فوبی بھی ہسپانوی ہے۔ ایل باریو والے انگلش مکس ہسپانوی بولتے ہیں جس کا نام انہوں نے سپینگلش یعنی (SPANGLISH) رکھا ہوا ہے۔ اس علاقے کے تمام نیون سائنز ''اسپینگلش'' ہی میں دکھائی دیتے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیا ایل باریو یہاں سے قریب ہی ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا ''فوبی کیٹ ''ڈانس ٹیریا'' نامی کلب میں جاب کرتی ہے۔ ڈانس ٹیریا (DANCE TERIA) میڈیسن ایونیو اور پارک ایونیو کے درمیان ایسٹ انتیس اسٹریٹ پر واقع ہے۔ کہا جاتا ہے' عالمی شہرت کی حامل گلوکارہ اور رقاصہ میڈونا نے اپنے کیریئر کا آغاز ڈانس ٹیریا ہی سے کیا تھا۔ اس کلب میں ''راک اینڈ رول لنگری کانٹیسٹ'' بھی ہوتا ہے۔ اس کانٹیسٹ میں سب سے زیادہ جنسی کشش رکھنے والے بدن کے حامل کو مبلغ تین سو ڈالر کا انعام بھی دیا جاتا ہے۔''

میں نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور اس دوران میں ناشتے میں بھی مصروف رہا۔ میرے لیے ٹھکانے کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اصولی طور پر مجھے سیدھا ونگ ہنگ کی طرف رخ کرنا چاہیے تھا لیکن پولیس کا تیزی سے حرکت میں آنا مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اسی وقت این وائے پی ڈی کی دو تین گاڑیوں میں پولیس والوں نے ونگ ہنگ کے ٹھکانے پر بھی چڑھائی کر ڈالی ہو۔ میں جب تک وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ نہ ہو جاتا، ٹاؤن کی طرف نہیں جا سکتا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے ویم سے کہا ''تم ناشتا جاری رکھو۔ میں پانچ منٹ میں ایک ضروری فون کر کے آتا ہوں۔''

''فون کہاں سے کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے بتایا ''پبلک بوتھ زیادہ مناسب رہے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''تمہاری جیب میں پیسے ہیں؟''

''ہاں' سو ڈیڑھ سو ڈالر رکھے ہیں۔''

''پبلک بوتھ استعمال کرنے کے لیے ریزگاری چاہیے ہو گی۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ''فون مشین میں ایک کوارٹر (پچیس سینٹ) کا سکہ ڈالو گے تو کام چلے گا۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے بٹوے میں سے ایک ڈالر کا نوٹ نکال کر میری جانب بڑھا دیا اور بولا ''نیوز پیپر بھی پکڑ لو۔ اس طرح کھلا بھی ہو جائے گا۔''

ویم کی تجویز انتہائی معقول تھی۔ میں ایک ڈالر کا نوٹ جیب میں رکھ کر سلویا سے باہر نکل آیا۔ نیوز اسٹینڈ کے لیے مجھے زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ میں نے ''دی نیویارک ٹائمز'' چالیس سینٹ میں خریدا۔ اس طرح ایک ڈالر میں سے ساٹھ سینٹ مجھے واپس مل گئے۔ پچیس سینٹ والے دو سکے اور ایک دس سینٹ والا۔ امریکی ڈالر کی ریزگاری پانچ' دس' پچیس اور پچاس سینٹ کے سکوں پر مشتمل ہے۔ پانچ سینٹ کا سکہ نکل' دس سینٹ کا سکہ ڈائم' پچیس سینٹ کا سکہ کوارٹر اور پچاس سینٹ کا سکہ ہاف ڈالر کہلاتا ہے۔ ہاف ڈالر کے سکے پر سوسن بی انتھونی کی شبیہ موجود ہے۔ پچیس سینٹ کا سکہ سب سے زیادہ مستعمل ہے۔ ٹیلیفون بوتھ' سگریٹ وغیرہ اور دیگر مشینوں میں استعمال کے لیے اسی کی زیادہ مانگ ہے۔

تہ شدہ اخبار کو میں نے بغل میں دبایا اور نارمل انداز میں چلتے ہوئے ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ میں گھس گیا۔ اگلے ہی لمحے میں چائنا ٹاؤن میں ونگ ہنگ کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ میں نے پہلے گھر کو ٹرائی کیا تھا۔ میری یہ ٹرائی کامیاب رہی۔ تیسری گھنٹی پر مسٹر ہنگ نے فون ریسیو کر لیا۔

میری آواز پہچانتے ہی وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا ''تم کہاں ہو وجدان! میں پوری رات تمہارے انتظار میں جاگتا رہا ہوں۔ تم خود آئے اور نہ ہی کوئی فون کیا۔''

''بس حالات اتنی تیزی سے پیش آئے کہ میں تم سے رابطہ نہیں کرسکا۔'' میں نے محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہا ''تم سناؤ۔ وہاں چائنا ٹاؤن میں تو سب خیریت ہے نا۔ پولیس نے میرے حوالے سے تمہیں تنگ کرنے کی کوشش تو نہیں کی؟''

ونگ ہنگ نے بتایا ''ابھی تک تو خیریت ہی ہے لیکن تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم کسی لمبے پھڈے میں پھنس گئے ہو!''

''ہاں' ایسی ہی صورتِ حال ہے۔''

''میرے پاس چلے آؤ۔''

''آنکھیں بند کرکے' منہ اٹھائے نہیں آسکتا۔'' میں نے کہا ''این وائے پی ڈی والوں نے وسیم کے اپارٹمنٹ پر ریڈ کیا ہے۔ ہم بڑی مشکل سے فلیٹ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ میں خواہ مخواہ تمہیں کسی بڑی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا لیکن تم سے ملنا بھی ضروری ہے۔ بہت سی اہم باتیں ڈسکس کرنا ہیں۔''

''تم اس وقت کہاں پر ہو۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا ''اپنی درست لوکیشن بتاؤ۔''

''میں وسیم کے ساتھ سلوا ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوں۔''

''تم لی ناکس ایونیو والے سلوا کی بات کررہے ہو؟''

''بالکل وہی۔'' میں نے کہا اور اپنی میز کی لوکیشن بھی اسے بتادی۔

''وہیں بیٹھو۔ میں دس منٹ میں تمہیں کال کرتا ہوں۔'' اس نے گمبھیر آواز میں کہا ''میں جوزف کے نام پر تمہیں فون کروں گا۔''

''کیا یہاں کا فون نمبر ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں ہے۔'' اس کے اعتماد سے ظاہر ہوتا ہے' وہ سلویا میں آتا رہتا تھا۔ مذکورہ ریسٹورنٹ کا نمبر دہراتے ہوئے اس نے کہا ''ڈبل نائن سکس' زیرو ڈبل سکس زیرو۔''

میں نے ریسیور کو کریڈل کیا اور بوتھ سے نکل آیا۔

جب میں سلویا کے اندر پہنچا تو وسیم ناشتے سے فارغ ہوچکا تھا۔ اس نے مجھ سے فون کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور اخبار کھول کر پڑھنے لگا۔ ایک منٹ بعد ہی اس نے چونکے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''اب سمجھا' پولیس میرے اپارٹمنٹ تک کیسے پہنچی ہے!''

اس کی آواز دھیمی مگر لہجہ سنسنی خیز تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''کیا ہمارے بارے میں کوئی خبر شائع ہوئی ہے؟''

''لو' تم خود ہی پڑھ لو۔'' اس نے متعلقہ صفحے پر کھلا ہوا نیو یارک ٹائمز میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے وہ خبر پڑھی اور سناٹے میں رہ گیا۔ واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز کے ہاؤس نمبر ون نائن کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا گیا تھا...... ایک روز پہلے مذکورہ اپارٹمنٹ میں قتل اور اغوا کی جو واردات ہوئی تھی اس سلسلے میں مزید باتیں سامنے آئی ہیں۔ اس واردات میں ملوث شخص ایک امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد ہے۔ اس نے ہاؤس نمبر انیس میں گراہم اور نارمن نامی دو افراد کو قتل کیا' ان کے ایک ساتھی الفریڈ کو مار پیٹ کر بے ہوش کیا اور چوتھے شخص سائمن کو اغوا کرکے اپنے ساتھ لے گیا۔ ابھی تک سائمن کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔ پولیس کو اس یلو کیب کی تلاش ہے جس میں وہ دہشت گرد واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز تک پہنچا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے' ٹیکسی ڈرائیور بھی اس دہشت گرد کا کوئی ساتھی ہے۔ الفریڈ کو اتفاق سے جلد ہی ہوش آگیا اور اس نے یلو کیب کا نمبر نوٹ کرلیا۔ یہ نمبر کچھ یوں ہے ''فور نائن۔ ای۔ ون نائن تھری نائن۔'' شہر یوں سے پُر زور اپیل ہے' جیسے ہی کسی کو یہ کیب نظر آئے وہ فوراً پولیس کو اطلاع دے۔ سائمن کی پُراسرار گمشدگی کا مطلب تھا' ہارلم...یورے ابھی تک اس کی لاش دستیاب نہیں ہوئی تھی' میں نے اخبار کے دیگر صفحات بھی دیکھ ڈالے مگر ہن شائن اپارٹمنٹ اور زمین دوز ریلوے ٹریک پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا یا تو دانستہ کسی مصلحت کی بنا پر وہ خبر روک دی گئی تھی اور یا پھر یہ تفصیل ابھی اخبارات تک پہنچی نہیں تھی۔

''میری کیب کا نمبر اخبارات کی زینت بن گیا۔ کسی نے ہمیں سڑکیں ناپتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔'' وسیم گہری تشویش سے بولا ''اسی لیے پولیس کی بھاری جمعیت نے میرے اپارٹمنٹ تک رسائی حاصل کرلی۔ اب میں اپنے اپارٹمنٹ جاسکتا ہوں' نہ ٹیکسی استعمال کرسکتا ہوں اور نہ ہی فوبی کیٹ مجھے پناہ دینے کو تیار ہوگی۔ اس معاملے میں پولیس براہ راست ملوث ہوگئی ہے۔ ایک امریکن سٹیزن ہونے کے ناتے فوبی کسی قسم کا رسک نہیں لے گی۔ وہ میری کیب کے نمبر سے آگاہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے' ہم اس کے پاس جائیں تو وہ مجھے پہچاننے ہی سے انکار کردے!''

''اور یہ بھی ہوسکتا ہے وہ تمہارے ساتھ مجھے بھی پہچان لے!'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تاہم انداز میں گمبھیر...رچی بسی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وسیم نے متذبذب نظر سے

مجھے دیکھا۔

میں نے اپنا مطلب واضح کرتے ہوئے کہا ''امریکی عوام ایک لحاظ سے قابلِ ستائش ہے کہ یہ قانون کی مدد کرنے کے لیے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال دیتے ہیں۔ پولیس کی فعالیت میں ان کے تعاون کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔'' ایک لمحے کو متوقف ہونے کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ عین ممکن ہے' تمہاری وہ ہسپانوی فوبی کیٹ ہمیں دیکھتے ہی خوشی سے پھول جائے۔ وہ تمہارے ساتھ مجھے دیکھ کر فوراً سمجھ جائے کہ میں ہی وہ پاکستانی دہشت گرد ہوں جس نے واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز والی واردات کی ہے۔ نیو یارک ٹائمز میں شائع ہونے والی خبر سے واضح ہے کہ اسی تناظر میں کل کے اخبارات میں بھی اس واقعے کی خبریں شائع ہوچکی ہیں۔ امریکی عوام بہت باخبر اور باشعور ہیں۔ فوبی نے کل کے اخبارات ضرور دیکھے ہوں گے۔ وہ ہمیں بڑے چاؤ سے اپنے گھر کے اندر بٹھائے گی پھر پولیس کو فون کرکے ہمیں گرفتار کروادے گی۔''

''ہاں' ایسا ہوسکتا ہے۔'' وہ فکرمند لہجے میں بولا ''کاش ہم نے کل کے اخبارات دیکھے ہوتے!''

''سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے کہا ''فوبی کیٹ کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں میں کچھ اور بندوبست کررہا ہوں۔''

''کیسا بندوبست؟''

''دیکھتے جاؤ۔'' میں نے مبہم لہجے میں کہا ''ویسے اس خبر سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تم اس پاکستانی دہشت گرد یعنی میرے ساتھی ہو۔ تم کہہ سکتے ہو' میں نے گن پوائنٹ پر تمہیں اپنا ساتھ دینے پر مجبور کیا تھا۔'' یہ بات میں نے محض اس کی تسلی کے لیے کہی تھی ورنہ صورتِ حال ایسی سیدھی سادی نہیں تھی۔

وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکنے لگا ''نہیں وہدان! شاید تم نے خبر کو غور سے نہیں پڑھا۔ پولیس کو میری ٹیکسی کا نمبر بتانے والا الفریڈ ہے۔ یہ وہی شخص ہے جسے میں نے ہی مار مار کر انٹا غفیل کیا تھا۔ ہم دونوں نمبر انیس میں جس طور داخل ہوئے تھے اس انداز سے یہی ظاہر ہوتا ہے' ہم دونوں ساتھی ہیں۔ میرے لیے واپسی کا ہر دروازہ بند ہوچکا تھا۔''

''میں تمہیں واپس نہیں دھکیل رہا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا ''اب ہم ہر قدم ایک ساتھ اٹھائیں گے۔ تم اپنے اپارٹمنٹ اور کیب کو

ہپناٹیزم کے عملی طریقے

کتاب میں شامل چند عنوانات

- ہپناٹیزم کی ابتدائی تاریخ
- ہپناٹیزم کیا ہے؟
- ہپناٹیزم کے مزید طریقے
- ہپناٹیزم اور ذہنی گہرائیاں
- طبی استعمال
- اثر کی شدت
- جذباتی الجھنوں کا علاج
- روحانی قوتیں
- ہپناٹیزم کے ذریعے شخصی خامیاں دور

قیمت:-/50 روپے

ڈاک خرچ:-/23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کیلئے: C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

ذہن سے جھٹک دو۔"

"جھٹک دیا۔" اس نے باقاعدہ گردن کو جھٹکا اور بولا "ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی" یہ پاکستانی دہشت گرد اور امریکا دشمن والا آئیڈیا پریس والوں کو کہاں سے مل گیا!"

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "اس کے پیچھے مجھے ربی کا مکار ذہن کام کرتا نظر آرہا ہے۔ وہ ایک طرف مجھ سے دوستی کی کوشش میں تھا اور دوسری جانب پولیس کے توسط سے اس نے اپنا کام جاری رکھا تھا۔ اس کی منافقت آمیز دوستی، دشمنی آمیز مصلحت پر مبنی تھی۔"

"وہ ابھی تک اگر ڈھکے چھپے انداز میں پولیس کو ایک امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد یعنی تمہارے پیچھے دوڑا چکا ہے تو آئندہ وہ کھل کر وار کرے گا۔" وسیم نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "تم نے اس سے جو طویل تلخ گفتگو کی ہے اس کے ردِعمل کے طور پر اس کے اشارے پر تمہارا نام بھی منظر عام پر آسکتا ہے۔ سن شائن اپارٹمنٹ اور سب وے ٹریک والے واقعے کو وہ آسانی سے فراموش نہیں کرسکتا۔"

"ہاں، اب سب کچھ ممکن ہے۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا "ہمیں ہر نوعیت کی سنگین صورتِ حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اس نے پوچھا "وجدان! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ فوری طور پر پناہ کے لیے تم کیا بندوبست کررہے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا، ایک ویٹر کارڈلیس تھامے، جوزف کی تلاش میں ہماری میز کے قریب آگیا۔ میں سمجھ گیا، وہ ونگ ہنگ کا فون تھا۔ ویٹر کارڈلیس مجھے تھما کر چلا گیا تو میں نے ریسیور کو کان سے لگا کر ماؤتھ پیس میں دھیرے سے "ہیلو" کہا۔

جواب میں ونگ ہنگ کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اس وقت تم کس حلیے میں ہو؟" وہ میرا نام لیے بغیر مخاطب ہوا تھا۔ اس کی احتیاط کو دیکھتے ہوئے میں سمجھ گیا، کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے بھی محتاط انداز میں جواب دیا "ایک اجنبی کے حلیے میں اس حلیے کو تم پہچان سکتے ہو۔"

میں نے ونگ ہنگ کے سامنے ہی میک اپ کیا تھا۔

"اور تمہارا ساتھی؟" اس نے وسیم کا نام لینا ضروری نہ سمجھا۔

میں نے جواب دیا "اپنے اصلی رنگ روپ میں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

میں نے پوچھا "کوئی گڑبڑ ہے؟"

"بہت زبردست۔" اس کی سنگین آواز میری سماعت تک پہنچی "فون پر تفصیلی بات کرنا مناسب نہیں۔ تم دونوں فوراً سلویا سے نکلو۔ ایک اسٹریٹ کا فاصلہ پیدل طے کرو۔ پھر ویسٹ ایک سو پچیس اسٹریٹ پر تمہیں سب وے کا انٹرنس گلوب نظر آئے گا۔ تم وہاں سے "ایکسپریس تھری لائن" پکڑو اور سیدھے وال اسٹریٹ پہنچ جاؤ۔ جب تم وال اسٹریٹ والے اسٹیشن سے باہر نکلو تو بائیں جانب روڈ پر تمہیں سلیٹی رنگ کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئے گی۔ تم دونوں خاموشی کے ساتھ مذکورہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ جانا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں تمہیں بیٹھا ہوا ملوں گا۔ گاڑی کا نمبر "سی۔ ٹرپل فور زیرو ایٹ ہے۔"

"اس قدر رازداری سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ......"

"پلیز، وقت بہت کم ہے۔" اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنی کہی اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں حیران پریشان نگاہ سے کارڈلیس کو دیکھنے لگا۔

وسیم نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا "کس کا فون تھا؟"

"ونگ ہنگ کا۔" میں نے بتایا "ہمیں فوراً وال اسٹریٹ پہنچنا ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"وہیں جاکر پتا چلے گا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس کے بعد ہم نے سلویا میں ناشتے کا بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ سلویا ویسٹ ایک سو پچیس اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ویسٹ ایک سو پچیس والے انٹرنس گلوب تک پہنچنے میں ہمیں بہ مشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ ٹھیک دس بجے ہم ایکسپریس ٹرین "تھری لائن" پر سوار ہو چکے تھے۔ تقدیر کی بازی گری بڑی عجیب ہے۔ اب سے ٹھیک بارہ گھنٹے پہلے یعنی گزشتہ رات دس بجے ہم دونوں پردیسی ڈبلیو سی والے اسٹیشن سے "ای لائن" پر سوار ہوئے تھے اور...... نہ جانے کہاں کہاں سے کس کس "لائن" پر سوار ہونا نصیب میں لکھا تھا!

ویسٹ ون ٹوینٹی فائیو والے سب وے اسٹیشن سے صرف دو ٹرینیں (ٹو اینڈ تھری لائنز) چلتی تھیں۔ یہ دونوں ٹرینیں لی ناکس ٹرمینل اور برونکس کی طرف سے آتی تھیں۔ اسٹریٹ ایک سو سولہ اور اسٹریٹ ایک سو دس کے اسٹیشنوں سے گزرنے کے بعد یہ سینٹرل پارک کے نیچے سے دوڑتے ہوئے اسٹریٹ ایک سو تین سے ایک نئے ٹریک میں داخل ہوجاتیں۔ اسی ٹریک پر واشنگٹن ہائٹس اور کنگز برج کی جانب سے آنے والی دو ٹرینیں (ون اینڈ نائن لائنز) بھی آجاتیں۔ اس کے بعد یہ ٹریک ون، ٹو، تھری اور نائن لائن کی گزرگاہ بن جاتا۔

ہم تھری لائن میں بیٹھے تھے۔ مذکورہ اسٹیشنوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ اسٹریٹ چھیانوے، اسٹریٹ بہتر، اسٹریٹ چھیاسٹھ لنکن سینٹر، اسٹریٹ انسٹھ کولمبیا سرکل، اسٹریٹ پچاس، ٹائمز اسکوائر، اسٹریٹ چونتیس پنسلوانیا اسٹیشن، اسٹریٹ چودہ، ہوسٹن اسٹریٹ، کینال اسٹریٹ، چیمبرز اسٹریٹ، پارک پلیس، فلٹن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے وال اسٹریٹ کے اسٹیشن پر جارکی۔

ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو بائیں جانب، اسٹریٹ پر سلیٹی رنگ کی وہ گاڑی موجود تھی، جس کا نمبر مسٹر ہنگ نے مجھے بتایا تھا۔ مذکورہ گاڑی میں ٹنٹڈ گلاس نصب تھے۔ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی کے اندر جا بیٹھے۔

"ویل کم اینڈ گڈ مارننگ!" ونگ ہنگ نے گردن گھما کر مسکراتے ہوئے چہرے سے ہمیں دیکھا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا "مسٹر ہنگ! یہ سب کیا ہے؟"

"کل ایک ایوننگر میں تمہارے بارے میں خبر چھپی تھی۔" وہ بلاتمہید بتانے لگا "تمہارے جانے کے بعد وہ اخبار میری نظر سے گزرا۔ خبر میں واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز والا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ میں ایک معتبر ایوننگر (شام کا اخبار) کی بات کررہا ہوں۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر مزید بتاتے ہوئے بولا۔

"آج صبح کے تمام اخبار میں اس واقعے سے متعلق مزید خبریں چھپی ہیں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں تمہیں پاکستانی دہشت گرد اور امریکا دشمن قرار دیا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ سب کچھ ربی موشے ہائمن کے اشارے پر کیا گیا ہے۔"

ونگ ہنگ میرے پیش آمدہ تازہ ترین حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا، آج کل یہودی لابی سے میری بری طرح ٹھنی ہوئی ہے۔

میں نے کہا "میں نے دی نیویارک ٹائمز میں ایسی ایک خبر پڑھی ہے۔"

"اس خبر کے بعد بھی بہت سی سنسنی خیز خبریں چل گئی ہیں وجدان!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو مسٹر ہنگ؟"

ہنگ نے گاڑی وال اسٹریٹ سے نکال کر براڈ وے پر لے لی اور کہا "جب تمہارا فون آیا اس وقت میں ناشتے سے

ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات
(باتصویر)
ٹیلی پیتھی کے موضوع پر جدید ترین اور کامل کتاب
نئے طریقے، نئی مشقیں، سوال و جواب
کتاب کے چند عنوانات
ٹیلی پیتھی ایک علم، ایک سائنس
ٹیلی پیتھی کا ماضی اور حال
ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی مختلف مشقیں
ٹیلی پیتھی میں یوگا کا استعمال
غیر معمولی حس ادراک اور روحانی قوتیں
مستقبل کی پیش گوئی
قیمت:-/45 روپے
ڈاک خرچ:-/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

ذہن سے جھٹک دو۔"

"جھٹک دیا۔" اس نے باقاعدہ گردن کو جھٹکا اور بولا "ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی" یہ پاکستانی دہشت گرد اور امریکا دشمن والا آئیڈیا پریس والوں کو کہاں سے مل گیا!"

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا "اس کے پیچھے مجھے ربی کا مکار ذہن کام کرتا نظر آرہا ہے۔ وہ ایک طرف مجھ سے دوستی کی کوشش میں تھا اور دوسری جانب پولیس کے توسط سے اس نے اپنا کام جاری رکھا تھا۔ اس کی منافقت آمیز دوستی' دشمنی آمیز مصلحت پر مبنی تھی۔"

"وہ ابھی تک اگر ڈھکے چھپے انداز میں پولیس کو ایک امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد یعنی تمہارے پیچھے دوڑا چکا ہے تو آئندہ وہ کھل کر وار کرے گا۔" وسیم نے ایک اہم نکتہ اٹھایا "تم نے اس سے جو طویل تلخ گفتگو کی ہے اس کے ردِعمل کے طور پر اس کے اشارے پر تمہارا نام بھی منظرِ عام پر آسکتا ہے۔ سن شائن اپارٹمنٹ اور سب وے ٹریک والے واقعے کو وہ آسانی سے فراموش نہیں کرسکتا۔"

"ہاں' اب سب کچھ ممکن ہے۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا "ہمیں ہر نوعیت کی سنگین صورتِ حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اس نے پوچھا "وجدان! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ فوری طور پر پناہ کے لیے تم کیا بندوبست کررہے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں اس کے سوال کا جواب دیتا' ایک ویٹر کارڈلیس تھامے' جوزف کی تلاش میں ہماری میز کے قریب آگیا۔ میں سمجھ گیا' وہ ونگ ہنگ کا فون تھا۔ ویٹر کارڈلیس مجھے تھما کر چلا گیا تو میں نے ریسیور کو کان سے لگا کر ماؤتھ پیس میں دھیرے سے "ہیلو" کہا۔

جواب میں ونگ ہنگ کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی "اس وقت تم کس حلیے میں ہو؟" وہ میرا نام لیے بغیر مخاطب ہوا تھا۔ اس کی احتیاط کو دیکھتے ہوئے میں سمجھ گیا' کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے بھی محتاط انداز میں جواب دیا "ایک اجنبی کے حلیے میں اس حلیے کو تم پہچان سکتے ہو۔"

میں نے ونگ ہنگ کے سامنے ہی میک اپ کیا تھا۔

"اور تمہارا ساتھی؟" اس نے وسیم کا نام لینا ضروری نہ سمجھا۔

میں نے جواب دیا "اپنے اصلی رنگ روپ میں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔

میں نے پوچھا "کوئی گڑبڑ ہے؟"

"بہت زبردست۔" اس کی سنگین آواز میری سماعت تک پہنچی "فون پر تفصیلی بات کرنا مناسب نہیں۔ تم دونوں فوراً سلویا سے نکلو۔ ایک اسٹریٹ کا فاصلہ پیدل طے کرو۔ پھر ویسٹ ایک سو پچیس اسٹریٹ پر تمہیں سب وے کا انٹرنس گلوب نظر آئے گا۔ تم وہاں سے "ایکسپریس تھری لائن" پکڑو اور سیدھے وال اسٹریٹ پہنچ جاؤ۔ جب تم وال اسٹریٹ والے اسٹیشن سے باہر نکلو تو بائیں جانب روڈ پر تمہیں سلیٹی رنگ کی ایک گاڑی کھڑی نظر آئے گی۔ تم دونوں خاموشی کے ساتھ مذکورہ گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اندر بیٹھ جانا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں تمہیں بیٹھا ہوا ملوں گا۔ گاڑی کا نمبر "سی۔ ٹرپل فور زیرو ایٹ ہے۔"

"اس قدر رازداری سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ......"

"پلیز' وقت بہت کم ہے۔" اس نے میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی اپنی کہی اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں حیران پریشان نگاہ سے کارڈلیس کو دیکھنے لگا۔

وسیم نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا "کس کا فون تھا؟"

"ونگ ہنگ کا۔" میں نے بتایا "ہمیں فوراً وال اسٹریٹ پہنچنا ہے۔"

"کیا کوئی خاص بات ہے؟"

"وہیں جاکر پتا چلے گا۔" میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

اس کے بعد ہم نے سلویا میں ناشتے کا بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ سلویا ویسٹ ایک سو چھبیس اسٹریٹ پر واقع تھا۔ ویسٹ ایک سو پچیس والے انٹرنس گلوب تک پہنچنے میں ہمیں بہ مشکل پانچ منٹ لگے ہوں گے۔ ٹھیک دس بجے ہم ایکسپریس ٹرین "تھری لائن" پر سوار ہوئے تھے۔ تقدیر کی بازی گری بڑی عجیب ہے۔ اب سے ٹھیک بارہ گھنٹے پہلے یعنی گزشتہ رات دس بجے ہم دونوں پردیسی ڈبلیوسی والے اسٹیشن سے "ای لائن" پر سوار ہوئے تھے اور...... جانے کہاں کہاں سے کس کس "لائن" پر سوار ہونا نصیب میں لکھا تھا!

ویسٹ ون ٹوینٹی فائیو والے سب وے اسٹیشن سے صرف دو ٹرینیں (ٹو اینڈ تھری لائنز) چلتی تھیں۔ یہ دونوں ٹرینیں لی ناکس ٹرمینل اور برونکس کی طرف سے آتی تھیں۔ اسٹریٹ ایک سو سولہ اور اسٹریٹ ایک سو دس کے اسٹیشنوں سے گزرنے کے بعد یہ سینٹرل پارک کے نیچے سے دوڑتے ہوئے اسٹریٹ ایک سو تین سے ایک نئے ٹریک میں داخل ہوجاتیں۔ اسی ٹریک پر واشنگٹن ہائٹس اور کنگز برج کی جانب سے آنے والی دو ٹرینیں (ون اینڈ نائن لائنز) بھی آملتیں۔ اس کے بعد یہ ٹریک ون' ٹو' تھری اور نائن لائن کی گزرگاہ بن جاتا۔

ہم تھری لائن میں بیٹھے تھے۔ مذکورہ اسٹیشنوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ اسٹریٹ چھیانوے' اسٹریٹ بہتر' اسٹریٹ چھیاسٹھ لنکن سینٹر' اسٹریٹ انسٹھ کولمبیا سرکل' اسٹریٹ بیالیس ٹائمز اسکوائر' اسٹریٹ چونتیس پنسلوانیا اسٹیشن' اسٹریٹ چودہ' ہوسٹن اسٹریٹ' کینال اسٹریٹ' چیمبرز اسٹریٹ' پارک پلیس' فلٹن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے وال اسٹریٹ کے اسٹیشن پر جارکی۔

ہم اسٹیشن سے باہر نکلے تو بائیں جانب' اسٹریٹ پر سلیٹی رنگ کی وہ گاڑی موجود تھی جس کا نمبر مسٹر ہنگ نے مجھے بتایا تھا۔ مذکورہ گاڑی میں ٹنٹڈ گلاس نصب تھے۔ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر گاڑی کے اندر جا بیٹھے۔

"ویل کم اینڈ گڈ مارننگ!" ونگ ہنگ نے گردن گھما کر مسکراتے ہوئے چہرے سے ہمیں دیکھا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا "مسٹر ہنگ! یہ سب کیا ہے؟"

"کل ایک ایوننگر میں تمہارے بارے میں خبر چھپی تھی۔" وہ بلاتمہید بتانے لگا "تمہارے جانے کے بعد وہ اخبار میری نظر سے گزرا۔ خبر میں واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز والا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ میں ایک معتبر ایوننگر (شام کا اخبار) کی بات کررہا ہوں۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر مزید بتاتے ہوئے بولا۔

"آج صبح کے تمام اخبار میں اس واقعے سے متعلق مزید خبریں چھپی ہیں۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں تمہیں پاکستانی دہشت گرد اور امریکا دشمن قرار دیا گیا ہے اور میرے خیال میں یہ سب کچھ ربی موشے ہائمن کے اشارے پر کیا گیا ہے۔"

ونگ ہنگ میرے پیش آمدہ تازہ ترین حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ وہ جانتا تھا' آج کل یہودی لابی سے میری بری طرح ٹھنی ہوئی ہے۔

میں نے کہا "میں نے دی نیویارک ٹائمز میں ایسی ایک خبر پڑھی ہے۔"

"اس خبر کے بعد بھی بہت سی سنسنی خیز خبریں چل گئی ہیں وجدان!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو مسٹر ہنگ؟"

ہنگ نے گاڑی وال اسٹریٹ سے نکال کر براڈ وے پر ڈال لی اور کہا "جب تمہارا فون آیا اس وقت میں ناشتے سے

ٹیلی پیتھی کی جدید تحقیقات

(باتصویر)

مصنف: اسلام حسین

ٹیلی پیتھی کے موضوع پر جدید ترین اور مکمل کتاب

نئے طریقے، نئی مشقیں، سوال و جواب

کتاب کے چند عنوانات

- ٹیلی پیتھی ایک علم، ایک سائنس
- ٹیلی پیتھی کا ماضی اور حال
- ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی مختلف مشقیں
- ٹیلی پیتھی میں یوگا کا استعمال
- غیر معمولی حس ادراک اور روحانی قوتیں
- مستقبل کی پیش گوئی

قیمت:- 45/- روپے

ڈاک خرچ:- 23/- روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

فارغ ہو کر اخبار دیکھ رہا تھا۔ کمرے میں ٹی وی بھی کھلا ہوا تھا۔ اخبار میں چھپنے والی تمہاری خبر میں نے پڑھی تو تم مجھے بہت یاد آئے۔ میں کل رات ہی سے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا.....''

''میں نے موبائل آف کر رکھا تھا...... مجبوری تھی!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ''میں نے گزشتہ رات بڑے عذاب میں گزاری ہے۔ بہر حال صبح تمہارا فون آیا تو میں نے فی الفور تمہیں وال اسٹریٹ پہنچنے کو کہا۔ میں چاہتا تو تمہیں اپنے گھر پر بھی بلا سکتا تھا لیکن حالات اس بری طرح بگڑ چکے ہیں کہ یہ احتیاط برتنا پڑی۔''

''حالات کبھی سدھرے ہوئے کہاں تھے جو اب بگڑ گئے ہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

ہنگ نے براڈوے کو چھوڑا اور گاڑی کورٹ لینڈ اسٹریٹ پر ڈال دی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''اب میں تمہیں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں، اسے سن کر تم سمجھ جاؤ گے کہ حالات کی خرابی کس سنگینی نوعیت کی ہے۔ تمہاری باتوں سے میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ تم تازہ ترین خبروں سے واقف نہیں ہو۔ شاید اس دوران میں تمہیں ٹی وی دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو مسٹر ہنگ؟'' اس کا پُراسرار انداز دیکھتے ہوئے میں الجھ کر رہ گیا۔

وہ بولا ''جیسے ہی میں نے تمہارا فون سننے کے بعد ریسیور رکھا، ٹی وی پر بریکنگ نیوز آنے لگی اور وہ نیوز تمہارے ہی بارے میں تھی۔ ''فاکس نیوز'' والے بڑے سنسنی خیز انداز میں پوری دنیا کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ واشنگٹن اسکوائر ہاؤسز میں جس پاکستانی امریکا دشمن دہشت گرد نے قتل اور اغوا کی واردات کی ہے اس کا نام وجدان ہے اور وہ کسی ڈسلوا کے حلیے اور آئی ڈی پر اسٹیٹس میں دندناتا پھر رہا ہے۔ اغوا شدہ سائمن کی لاش ہارلم ریور سے برآمد کر لی گئی ہے۔ اس کے علاوہ سن شائن اپارٹمنٹ میں تمہارے کارنامے کو بھی ہائی لائٹ کیا گیا ہے اور سب وے کے ٹریک پر ملنے والی ریٹا نامی ایک عورت کی لاش کو بھی تمہارے ہی کھاتے میں ڈال دیا گیا ہے۔ میں تمہیں......''

ہنگ اتنی بڑی اور ادھوری خبر سنا رہا تھا کہ میں اس کی بات کاٹنے پر مجبور ہو گیا ''زمین دوز ریلوے ٹریک پر سے کسی مرد کی لاش کے پارچے نہیں ملے؟''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''ایسا کچھ سننے میں نہیں آیا۔ بہر حال میں تمہیں بتا رہا تھا۔''

وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا تو میں ربی کی یہودیت آمیز مکاری پر دل ہی دل میں اسے صلواتیں سنانے سے باز نہ رہ سکا۔ اس نے نقلی وجدان کے انجام کو اتنی صفائی کے ساتھ منظر سے ہٹایا یعنی ہٹوایا تھا کہ بس! امریکا بڑا جمہوری ملک ہے اور وہاں کے پریس کی آزادی سے پوری دنیا واقف ہے لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے اور یہ چھپی ہوئی حقیقت ہے کہ وہاں کا پریس صرف غیر امریکی خصوصاً کی حد تک ہی آزاد ہے ورنہ جہاں ''یہودی کاز'' کا معاملہ آن پڑتا ہے تو گھر کی بیٹی کا قصہ سمجھ کر ناک کٹنے سے بچانے کے لیے ہر عیب فعل پر دبیز چادر ڈال دی جاتی ہے جیسا کہ نقلی وجدان کے سلسلے میں ہوا تھا۔ ربی نے اس کی ہولناک موت کو سرے ہی سے غائب کروا کر اس کی لاش (چھوٹے بڑے چند پارچہ جات کے بکھراؤ) کو بھی کیش کر لیا تھا۔ مجھے وجدان ڈکلیئر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میرے نیکلو کو منظر سے ہٹا لیا جاتا اور ربی نے کچھ اسی قسم کا چکر چلایا تھا۔

ہنگ نے مزید بتایا ''بریکنگ نیوز کے اختتام پر نیوز کاسٹر نے کہا ہے کہ اس بلو کیب والے کا نام ٹھکانا معلوم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جلد ہی وجدان کو اس کے ٹھکانے سے گرفتار کر لیا جائے گا۔ سن شائن اپارٹمنٹ والے معرکے میں بھی وہ بندہ وجدان کے ساتھ تھا لہٰذا پولیس کو یقین ہے کہ وجدان نے اسی کے ٹھکانے پر پناہ لے رکھی ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری دو تصاویر کے فریم بھی ٹی وی اسکرین پر دکھائے گئے ہیں۔ ایک اصلی تصویر وجدان کی صورت میں اور دوسری ڈسلوا کے میک اپ میں۔ اس کے ساتھ ہی ٹی وی نے نیویارک کے باسیوں سے درخواست کی ہے کہ وہ ان حلیوں کے حامل افراد کو ڈھونڈنے کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور جیسے ہی وجدان یا ڈسلوا کہیں دکھائی دے، وہ پولیس کو اطلاع دیں۔ تمہارے معاملے کو نیشنل سیکیورٹی کا بتایا جا رہا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے اضطراری انداز میں اپنے چہرے پر انگلیاں سرسراتے ہوئے کہا ''شکر ہے میں اس وقت نہ وجدان ہوں اور نہ ہی ڈسلوا کے روپ میں۔ تم واقعی ٹھیک کہتے ہو مسٹر ہنگ! اب جس پیمانے پر مجھے تلاش کیا جا رہا ہے وہ واقعی خطرناک صورتِ حال ہے۔'' پھر میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے شوگر ہل والے وسیم کے اپارٹمنٹ پر پولیس کی ریڈ اور اپنے فرار کے بارے میں بتایا تو وہ بولا

''اب تم دونوں این وائے پی ڈی کو مطلوب ہو......اور ہوسکتا ہے' آگے چل کر ایف بی آئی بھی اس کیس میں کود پڑے۔ امریکا کی پولیس اور فیڈرل ایجنسی جس معاملے میں دلچسپی لینے لگے اس کے اونٹ کو کسی نہ کسی کروٹ بٹھا کر ہی دم لیتے ہیں۔''

''ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔

وہ بڑے سکون سے بولا'' میں کچھ کرنے ہی تو نکلا ہوں۔ بس دیکھتے جاؤ۔''

بات کے اختتام پر مسٹر ہنگ نے ٹنٹڈ گلاسز والی لگژری سیلٹی گاڑی ایک تین منزلہ شاندار عمارت کے سامنے روک دی۔ مذکورہ بلڈنگ پر'' سینچری۔ ٹوئنٹی ون۔'' کا بڑا سا بورڈ آویزاں تھا۔ یہ عمارت بائیس کورٹ لینڈ اسٹریٹ پر براڈوے اور چرچ اسٹریٹ کے درمیان واقع تھی۔

مسٹر ہنگ نے گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا اور بولا'' میں تھوڑی دیر کے لیے اس عمارت میں جارہا ہوں۔'' اس نے سینچری ٹوئنٹی ون کی جانب اشارہ کیا'' تم دونوں گاڑی کے اندر ہی بیٹھو۔'' پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

ٹنٹڈ گلاسز کی بدولت باہر سے گزرنے والے لوگ گاڑی کے اندر ہمیں دیکھ نہیں سکتے تھے جب کہ ہم بہ آسانی باہر کی ہر چیز کا مشاہدہ اور نظارہ کرسکتے تھے۔ ہنگ نے ٹنٹڈ گلاسز والی گاڑی' بہت سوچ سمجھ کر منتخب کی تھی۔ وہ جس عمارت میں گیا تھا وہ دیکھنے میں ایک چھوٹا ڈیپارٹمنٹل اسٹور نظر آتا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا' وہ وہاں کچھ خریداری کرنے گیا تھا۔

میرا یہ اندازہ درست نکلا کیونکہ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں تین چار شاپنگ بیگز موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''وجدان! تم پسنجرز سیٹ پر آجاؤ۔ فی الحال تمہارے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔''

میں نے خاموشی سے دروازہ کھولا اور گاڑی کی عقبی نشست سے پسنجرز سیٹ پر پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے ہنگ نے گاڑی آگے بڑھادی۔

''میں تم لوگوں کے لیے کپڑے' جوتے اور میک اپ کا سامان خریدنے گیا تھا۔'' ہنگ نے بتایا'' تمہیں فوری طور پر ایک نئے روپ میں آنا ہوگا۔ عارضی یا مستقل' اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں تمہیں نیویارک سے نکال دوں گا۔ یہاں تمہارے لیے خطرات بہت بڑھ گئے ہیں۔ تم اپنی ساتھی والے معاملے کو بعد میں دیکھ لینا'' آخری جملہ اس نے میری جانب دیکھتے ہو... ادا کیا تھا۔ میری ساتھی سے اس کی مراد ساحل کے سوا اور ک... نہیں تھی۔

میں نے کہا'' مسٹر ہنگ! میری ساتھی کو مجھ سے پہلے... یہاں سے رخصت کیا جاچکا ہے۔ آج لگ بھگ دوپہر ... بجے وہ ربی موشے ہائمن کے پاس اسرائیل پہنچ جائے گی۔''

''ربی کب یہاں سے نکلا؟'' بے ساختہ اس کی زبا... سے خارج ہوا۔

میں نے اسے ربی اور ساحل کے حوالے سے تفصیل... سے پوری طرح آگاہ کیا اور کہا'' تمہارا آئیڈیا مجھے پسند... مسٹر ہنگ! میں پہلی فرصت میں اسرائیل جانا چاہوں گا... ویسے تم نے ہمیں کدھر بھیجنے کے بارے میں سوچا ہے؟''

''فی الحال میں تمہیں نیویارک اسٹیٹ سے نیوجر... اسٹیٹ میں شفٹ کررہا ہوں۔ یہ دونوں اسٹیٹ ایک... دوسرے کے پڑوسی ہیں۔'' ہنگ نے گہری سنجیدگی ... کہا'' نیوجرسی میں میرے فوٹو اسٹوڈیو کی ایک برانچ ہے... دونوں تین چار دن تک وہاں قیام کروگے۔ اس قیام کا... بندوبست کرچکا ہوں۔ اس دوران میں' میں تمہارے پا... پورٹ اور دیگر اہم کاغذات کی تیاری کا کام مکمل کرلوں گا... میں ایک ایسے ایجنٹ کو جانتا ہوں' جو بھاری معاوضہ لے... اس قسم کے کام کرتا ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی'' تو یہا... امریکا میں بھی ایسی'' وارداتیں'' کھلے عام ہوتی ہیں۔''

''کھلے عام نہیں' بڑے طریقے سلیقے سے چھپ... کر ایسے کام کیے جاتے ہیں۔'' ہنگ نے بتایا۔

''امریکا میں بھی آخر انسان ہی بستے ہیں۔ جو کام پو... دنیا کے انسان کرتے ہیں وہ یہاں بھی ہوتا ہے۔ بس ذ... مشکل سے ہوتا ہے اسی لیے معاوضہ زیادہ لیا جاتا ہے۔... نے مذکورہ ایجنٹ کو چالیس ہزار میں راضی کیا ہے۔''

''چالیس ہزار امریکی ڈالر؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ظاہر ہے' امریکا میں امریکی ڈالر ہی چلتے ہیں۔''

''کیا یہ دو افراد کی'' فیس'' ہے؟'' میں نے لفظ فیس... اچھا خاصا دباؤ ڈالا تھا۔

اس نے اثبات میں سرہلایا اور بولا'' اس رقم کے عوض... تم دونوں کی فوٹو آئی ڈی' ڈرائیونگ لائسنس' ایف بی (... پرنٹس) اور پاس پورٹ...... امریکن پاسپورٹ تیار کر... دے گا۔ تم دونوں ایسے غیر امریکی ہوگے جو طویل عرصے... یہاں رہ رہے ہو اور مختلف مراحل سے گزر کر پہلے تمہارا ... کارڈ بنا اور پھر تم گرین کارڈ ہولڈر بن گئے۔''

میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور پوچھا'' کیا یہ تمام دستاویزات اصلی ہوں گی؟''

''ایک دم اصلی......ریکارڈ کے ساتھ۔'' وہ تیقن سے بولا'' اسی بات کے تو وہ ایجنٹ چالیس ہزار ڈالر وصول کرے گا۔ بڑی مشکل سے راضی کیا ہے۔ وہ تو پچاس ہزار سے ایک ڈالر نیچے نہیں آرہا تھا۔ بہر حال ایک آپشن میں نے رکھ چھوڑا ہے۔''

''کیسا آپشن؟'' میں نے سوال کیا۔

''ٹھہرو' بتاتا ہوں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ کو قابو میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اپنا موبائل نکال لیا پھر کی پیڈ پر ٹو ون ٹو۔ تھری ڈبل فائیو' سیون ٹرپل فائیو کے نمبر پنچ کرنے کے بعد موبائل کو کان سے لگاتے ہوئے بولا'' پہلے لنچ کے لیے ٹیبل بک کروالوں' پھر بات کرتے ہیں۔'' اگلے ہی لمحے وہ کسی ریسٹورنٹ کے ریسپشن سے مخاطب تھا۔

''ہیلو دعوت! مدھر جعفری سے بات کروادیں۔''

شاید دوسری طرف سے کہا گیا کہ مدھر جعفری موجود نہیں ہے۔ ہنگ نے برا سا منہ بنایا اور بولا'' ٹھیک ہے' جعفری سے بعد میں بات ہوجائے گی۔ فی الحال آپ تین افراد کے لنچ کے لیے کوئی مناسب لوکیشن کی ٹیبل روک لیں۔ میرا نام ونگ ہنگ ہے۔ جعفری مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ وہ میرے پاس چائنا ٹاؤن آتی رہتی ہیں۔''

دوسری جانب سے ریزرویشن کی یقین دہانی کرائی گئی ہوگی چنانچہ ہنگ نے سلسلہ منقطع کردیا۔ دعوت اور جعفری کے الفاظ نے مجھے اور وسیم کو بے طرح چونکنے پر مجبور کردیا تھا اور ہمارا یہ چونکنا ہنگ سے چھپا نہیں رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی سوال کرتا' اس نے خود ہی وضاحت کردی۔

''دعوت نامی ریسٹورنٹ مین ہیٹن کا نمبر ون انڈین ریسٹورنٹ ہے۔ میں نے سوچا کیوں نہ آج آپ لوگوں کی دیسی کھانوں سے تواضع کی جائے'' دعوت'' میں داخل ہوکر آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے انڈو پاک کے کسی اعلیٰ کوالٹی شاندار ریسٹورنٹ میں قدم رکھ دیا ہو۔''

''اور یہ مدھر جعفری صاحبہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھ لیا۔

ہنگ نے بتایا'' مدھر جعفری اس ریسٹورنٹ کی روح رواں ہے اور میری شناسا بھی ہے۔ مدھر ایک اعلیٰ پائے کی کوکری رائٹر ہے۔ کوکری رائٹر (کھانا پکانے سے متعلق لکھنے والا) ہونا حیرت کی بات نہیں کیونکہ وہ ایک کامیاب ریسٹورنٹ چلارہی ہے۔ کمال تو اس خاتون کا یہ ہے کہ وہ ایک بہترین ایکٹریس بھی ہے!''

تھوڑی دیر تک ہنگ ہمیں'' دعوت'' میں پیش کیے جانے والے کھانے اور ان کی خصوصیات سے آگاہ کرتا رہا پھر اصل موضوع کی طرف آگیا۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''وجدان! میں آپشن کی بات کررہا تھا۔ دراصل' سانگ فو کی ہدایت کے مطابق مجھے تمہارا ہر طرح کا خیال رکھنا ہے۔ میں نہیں جانتا' تمہارا یہ ٹیکسی ڈرائیور دوست کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بھی مذکورہ دستاویزات چاہئیں یا نہیں۔ مستقبل میں یہ تمہارا ساتھ دے گا یا نہیں! تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔ میں درحقیقت تمہارے پروگرام سے آگاہ نہیں ہوں اس لیے میں نے بھی ایجنٹ سے بات فائنل نہیں کی۔ اگر وسیم تمہارے ساتھ نہیں تو پھر صرف تمہارے کاغذات ہی تیار کروانا ہوں گے!''

''میں تمہاری بات کو بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں مسٹر ہنگ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے مگر خوش گوار لہجے میں کہا'' جس طرح تم سانگ فو کی ہدایت کے مطابق میرا خیال رکھنے کے پابند ہو' بالکل اسی طرح میری ہدایت پر وسیم کا خیال رکھنے کی پابندی بھی قبول کرلو۔ کیا تمہیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض ہے؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔

میں وسیم کی جانب مڑ گیا اور پوچھا'' تمہیں میرے ساتھ جانے میں کوئی حرج محسوس ہورہا ہو تو بتادو؟''

''کیسی باتیں کرتے ہو وجدان!' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا'' میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر تمہارے ساتھ چلا ہوں۔ اب موت ہی ہمیں جدا کرسکتی ہے۔''

''ویل سیڈ۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور دوبارہ مسٹر ہنگ سے مخاطب ہوا'' دونوں کے کاغذات تیار ہوں گے لیکن اس سلسلے میں میری کچھ ترجیحات ہوں گی۔''

یہ بات میں نے دور بینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہی تھی۔ ہنگ نے پوچھا'' کیسی ترجیحات؟''

میں نے اپنے منصوبے بلکہ دور اندیشی کے پیش نظر کہا'' وسیم کے کاغذات تو ویسے ہی بنیں گے جیسا تم نے کہا ہے یعنی ایک ایسا پاکستانی جو طویل عرصے سے امریکا میں مقیم ہے اور مختلف مراحل سے گزر کر پہلے اسے وہائٹ کارڈ ایشو ہوتا ہے اور ازاں بعد گرین کارڈ۔ اس کے نام اور حلیے کا مسئلہ بعد میں حل کرلیں گے مگر۔'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''مگر میرے تمام ڈاکومنٹس ایک امریکن یہودی کی

حیثیت سے تیار رہنا چاہئیں اور نام ہو گا راجر!''

یہ نام ربی موشے ہائمن نے تنویمی عمل کے دوران میرے لیے ''تجویز'' کیا تھا۔ افسوس کے اس کی تجویز شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکے گا کہ میں راجر کا نام اختیار کر کے اس کی گردن تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ میں اس نام سے بڑے فائدے اٹھا سکتا تھا۔

مسٹر ہنگ نے کہا ''تمہارے فیس کٹس ہالی ووڈ کے ایک سابق اسٹار سے بہت کلوز ہیں۔ تمہیں حلیے میں بہت زیادہ تبدیلی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں تم سے......''

یہی بات کراچی میں میک اپ آرٹسٹ نسیم جوہر نے بھی کہی تھی۔ میں نے بے ساختہ ہنگ کی بات کاٹی اور کہا ''تم یل برائز کی بات کر رہے ہو جو سر منڈا کر فلموں میں کام کرتا تھا؟''

''ایگزیکٹلی!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم ایک امریکی یہودی کی آئی ڈی کیوں چاہتے ہو؟''

''کیا اس میں کوئی پرابلم ہے؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''کوئی پرابلم نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا ''ایجنٹ کو دس ہزار زیادہ دینا ہوں گے۔ جو کام چالیس میں ہو رہا تھا' اب پچاس ہزار ڈالر میں ہو جائے گا۔ میں صرف اپنی تسلی اور معلومات کے لیے پوچھ رہا ہوں!''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ''ربی موشے ہائمن نے مجھے جس دہکتی ہوئی آگ میں اتارا ہے وہ اب آسانی سے سرد نہیں ہو گی۔ یہ گرم جنگ ہمارے درمیان پتا نہیں کتنا عرصہ چلے۔ مجھے فوری طور پر اسرائیل روانہ ہونا ہے۔ ایک امریکی یہودی کو بہ آسانی اسرائیل کا ویزا مل جاتا ہے۔ اپنی مطلوبہ آئی ڈی کے طفیل میں بڑی سہولت سے یہودیوں کے اندر گھس سکوں گا۔ کیا تم جانتے ہو' میں یہ سارا کشٹ کس کی خاطر اٹھا رہا ہوں؟''

میرا آخری جملہ ایک ایسا پل شارٹ تھا جسے فیلڈ کرنا ہنگ کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔

''تم اپنی ساتھی ساحل کو ربی کے چنگل سے آزاد کرانا چاہتے ہو اور...... یہ لڑکی بھی دھنو تھی۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے بھکشو تھونچی کی بیٹی...... دھنو اس عبادت گاہ کے تہ خانے میں دفن ایک سربستہ راز کی امین بھی ہے۔ ربی نے اسی لیے دھنو کی شہ رگ پر اپنے ناپاک پنجے گاڑ رکھے ہیں کہ وہ بدھ عبادت گاہ کے خزانے پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ دھنو تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ ہمارے لیے بھی بہت اہم ہے۔''

میں نے دوٹوک انداز میں کہا ''دھنو کی اہمیت تم لوگوں کے نزدیک بدھ ازم اور عبادت گاہ میں پوشیدہ بیش بہا خزانے کے طفیل ہو گی لیکن مجھے ان تمام مسائل سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ماضی والی تمہاری دھنو اب حال میں میری ساحل ہے' وہ میرا سب کچھ ہے اور ہمیشہ سب کچھ رہے گی۔ وہ میری محبوبہ ہے۔ محترم سانگ فو مجھے اس کا مختار بنا گئے ہیں۔''

میں خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ مگر اس جذباتیت میں کوئی ابال نہیں' ایک ٹھہراؤ تھا' چٹان کی سی ہمت اور پہاڑ کا سا عزم تھا۔ اس کے بعد ہنگ نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ ڈرائیونگ اس دوران میں مسلسل جاری تھی۔ چنانچہ ہمیں کسی نہ کسی منزل تک تو پہنچنا ہی تھا۔

''ویڈال ساسون'' کے سامنے ہنگ نے گاڑی روک دی۔ یہ ایک ہیئر کٹ اور بیوٹی سیلون جیسی جگہ تھی مگر نہایت ہی پُرسکون اور فرحت بخش۔ ویڈال ساسون ففتھ ایونیو کی ایک قابلِ ذکر جگہ تھی جو اٹھادن اور انسٹھ اسٹریٹ کے درمیان واقع تھا۔ ہنگ کی ہدایت پر ہم گاڑی سے نکلے اور ویڈال ساسون کی سمت بڑھ گئے۔

ہنگ کا آئیڈیا تھا' وہ مجھے یل برائز کے قریب تر بنا رکھے گا۔ بس فرق اتنا ہو گا کہ میں سر کے بال نہیں منڈواؤں گا بلکہ بالوں کی مانگ ختم کر کے ان میں گھونگر ڈلوا لوں گا۔ اس بیوٹی سیلون میں ہم بالوں کی سیٹنگ کے لیے آئے تھے۔ ولیم کے بال ترشوا کر اس کا ہیئر اسٹائل تبدیل کروانا تھا۔ یہیں پر ہم نے لباس بھی تبدیل کیا۔ مذکورہ ہیئر کٹ اینڈ سیلون مسٹر ہنگ کے ایک جاننے والے کی مینجمنٹ میں چل رہا تھا۔

ہر قسم کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران ڈائجسٹ
0301-7253296

داستان دلچسپ ترین [illegible] کے بقیہ واقعات بارھویں اور تیرھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

جو جنوری 2007ء میں شائع ہو رہے ہیں

تش فشاں
حصہ
12

جب میں بالوں میں کرل ڈلوانے کے لیے مخصوص گداز سیٹ پر بیٹھا تو دن کے پونے بارہ کا وقت تھا۔ یہ نیویارک کا وقت تھا۔ ربی نے دھمکی دینے والے انداز میں مجھے کہا تھا کہ جب نیویارک کی گھڑیاں بارہ بجائیں گی تو میرے بھی بارہ بج جائیں گے کیونکہ اس وقت تک ساحل اس کے پاس پہنچ چکی ہوگی۔

بارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے لہٰذا میں نے سوچا کہ جب تک ہیئر ماسٹر اپنا کام کرتا، میں ذرا ساحل کی خیر خبر لے آؤں۔ میں نے آنکھیں بند کیں، بند آنکھوں کے پیچھے تیسری آنکھ کو زحمت دی ساحل کے نقوش میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ ادھر میں نے اس کا تصور کیا ادھر میرے تصور نے اڑان بھری اور ساحل کے ماحول میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ کام میں کوئی زندگی میں پہلی مرتبہ نہیں کر رہا تھا کہ مجھے کوشش کرنا پڑتی۔ میں نے اپنے تصور کے کوشش کرنے کی جو بات کی ہے تو اس کا مطلب بھی ہے میری وہ کوشش بار آور نہیں ہو سکی تھی۔ میرے تصور کی نگاہ ساحل کے سراپا کو چھونے میں ناکام ہو گئی۔

اس ناکامی نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اسی لمحے ربی کے کہے ہوئے سنگین الفاظ میرے دماغ میں چیخنے لگے۔ جب میں نے اسے آئینہ دکھانے کے لیے یہ انکشاف کیا تھا کہ ساحل اس وقت اس کے پاس نہیں بلکہ کسی ہوائی جہاز میں سفر کر رہی ہے تو اس نے میری اس صلاحیت کے پیش نظر بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا ...... میں تمہیں اپ گریڈ کر رہا ہوں وہدان۔ تمہارے بارے میں قائم کردہ میرا اندازہ درست ہے! تم جانتے ہو میں عملیات کی دنیا میں کس درجے پر ہوں۔

تو کیا ربی نے میری ساحل کو کسی عمل سے گزار کر میری تصوراتی نگاہ کی دسترس سے دور کر دیا تھا؟ یہ سوال بڑا ہیبت ناک اور لرزا دینے والا تھا۔ میرے پاس ساحل کی خیر و عافیت جاننے کا صرف ایک ہی وسیلہ تھا۔ اگر ربی نے اس وسیلے پر بھی اپنے کسی عمل کا قفل ڈال دیا تھا تو یہ بڑے گھاٹے والی بات تھی۔ ربی ایسا کرنے کی صلاحیت تو رکھتا تھا۔ ساحل اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی ایک بے بس ہرنی تھی ...... لیکن نہیں!

اچانک میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا ساحل تو ہوائی جہاز میں سفر کر رہی تھی اور ربی اس کا ہم راہی نہیں تھا۔ ساحل کا طیارہ بارہ بجے (نیویارک ٹائم کے مطابق) اسرائیل پہنچنا تھا اور اس میں ابھی کم از کم دس منٹ باقی تھے پھر ربی کیونکر ساحل کو کسی عمل سے گزار سکتا تھا۔

ہاں یہ البتہ ہو سکتا تھا کہ جہاز کی لینڈنگ کے سلسلے میں ربی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو۔ ساحل بارہ سے بہت پہلے اسرائیل کی زمین پر قدم رکھ چکی ہو اور اب تک واقعی ربی نے اس پر کوئی رکاوٹی عمل کر ڈالا ہو۔ یہ خیال قرین قیاس تھا کیونکہ یہودیوں کا وہ ربی مربی مجھ سے پہلے بھی متعدد غلط بیانیاں کر چکا تھا۔ اس کی بات کا اعتبار کرنا حماقت کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں نے آنکھیں بند رکھتے ہوئے ساحل کے ماحول میں پہنچنے کی تین چار مرتبہ کوشش کی۔ جب ہر بار ایک ہی جیسا نتیجہ برآمد ہوا تو جھنجلا کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

اسی لمحے ایک سریلا قہقہہ میری سماعت میں رس گھول گیا۔ اس نسوانی شہد یلی آواز نے مجھے چونک کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ میری اس اضطراری حرکت کو ہیئر آرٹسٹ نے خاص طور پر نوٹ کیا۔ وہ ہاتھ روک کر مجھ سے پوچھنے لگا۔

”اینی پرابلم سر؟“

”نو پرابلم۔“ میں نے برجستہ یہ کہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

بند آنکھوں کے پیچھے ایک حسین چہرہ روشن ہو گیا۔ پتا نہیں یہ میرے تخیل کی کارفرمائی تھی یا پھر وہ واقعی اپنی کسی شکتی کے طفیل میرے تصور میں مجسم ہو گئی تھی۔ میں اس من موہنی صورت کو لاکھوں کروڑوں چہروں کے بیچ ایک نگاہ میں شناخت کر سکتا تھا۔ وہ نیل گری کی نیلگری تھی!

میں نے بے آہستگی آنکھیں کھول دیں۔ اس کا تصور ہوا ہو گیا۔ میں نے آزمانے کے لیے دوبارہ آنکھیں بند کیں لیکن وہ پھر نظر نہ آئی۔ پتا نہیں وہ میرے تصور کا دھوکا تھا یا سماعت کا فتور! گزشتہ رات بھی میں نے زمین دوز سب وے ٹریک پر اس کا نقرئی قہقہہ سماعت کیا تھا۔ میں اس مخصوص رسیلی کھنک اور سریلی چہک والی آواز کو شناخت کرنے میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ پتا نہیں وہ اسراروں کی شہزادی کوہساروں کی ملکہ میری زندگی میں کون سا نیا گل کھلانے کا ارادہ رکھتی تھی!

نیلگری نے کراچی میں مجھ سے مایوس ہونے کے بعد وعدہ کیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے سر کے بل چل کر اس کے پاس پربتوں کے تاج تک پہنچنا ہوگا۔ اگر گزشتہ چوبیس گھنٹے کے اندر مجھے اس کی آواز کا دو دفعہ تجربہ ہوا تھا تو پھر میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ نیلگری نے اپنا وعدہ توڑ دیا تھا اور یہ بہت ہی عجیب بات تھی!

اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں تھرڈ آئی کے توسط سے اپنے ہر شناسا کے ماحول میں پہنچ جاتا تھا...... تو کیوں نہ میں نیلگری کو بھی ٹرائی کرتا۔ اگر میں تصور کی

نگاہ کے سامنے اس کے خال و خط اس کا سراپا فوکس کرتا تو اس کے ماحول میں پہنچ سکتا تھا۔ پھر وہ مجھ سے چھپی نہ رہتی۔ میں جان جاتا کہ وہ کہاں ہے...... اور کیا کر رہی ہے!

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور پری وش ڈیلگری کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ متعدد بار کی کوشش کے بعد بھی جب میں اس کا اور اس کے ماحول کا سراغ پانے میں ناکام رہا تو مایوس ہو کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

مجھ پر عجیب سی بیزاری اور اکتاہٹ سوار ہو گئی تھی۔ ہیئر آرٹسٹ کا کام ختم ہو گیا تو ہم "ویڈل ساسون" سے باہر نکل آئے۔

ہماری اگلی منزل انڈین ریسٹورنٹ "دعوت" تھا جہاں ہم تینوں نے ایک شاندار دیسی لنچ تناول کرنا تھا۔ میں اور وسیم تو پاکستانی تھے۔ عرصے سے خالص دیسی کھانے کو ترسے ہوئے لیکن ونگ ہنگ کسی شامل باجے کی طرح ہمارے ساتھ تھا' بلکہ وہ ہمارا میزبان تھا۔

بعض اوقات مہمان اور میزبان کا ایسا کمبی نیشن بھی دیکھنے کو ملتا ہے!

☆☆☆

ایک نئے ہیئر کٹ اور منفرد اسٹائل نے ہمارے چہروں کو بڑی حد تک تبدیل کر دیا تھا۔ میک اپ والا معاملہ بعد کا تھا۔ وہ مرحلہ ہم نے ہنگ کے گھر جا کر طے کرنا تھا۔ ونگ ہنگ ایک پروفیشنل فوٹو گرافر ہونے کے ساتھ ہی اعلیٰ پائے کا میک اپ آرٹسٹ بھی تھا۔ ہمارے حلیے کا انتخاب اور ڈاکومینٹس کے لیے تصاویر وغیرہ اسی کو بنانا تھیں' "دعوت" میں دعوت اڑانے کے بعد' پروگرام کے مطابق ہمیں سیدھا ہنگ کے گھر جانا تھا۔

اب تک کے حالات بتاتے تھے کہ ہنگ میرے حوالے سے پولیس یا ربی کے ہرکاروں کی نگاہ میں نہیں آیا تھا لہٰذا اس کی اقامت گاہ ہمارے لیے ایک محفوظ ٹھکانا تھی۔ ویسے بھی صرف آج ہی کے دن کی تو بات تھی۔ ہنگ بڑے دعوے سے کہہ چکا تھا' آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے وہ ہمیں نیویارک سے نکال کر نیو جرسی پہنچا دے گا۔ بالوں کو ایک نئی لک دینے کے بعد وسیم بالکل بدلا بدلا دکھائی دینے لگا تھا۔ انسان کے حلیے میں دو چیزوں کی بہت زیادہ اہمیت ہیں۔ ہیئر اسٹائل اور آنکھیں۔ ان میں معمولی سی تبدیلی بھی انسان کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ آنکھیں بدلنے والا محاورہ ایسے ہی نہیں بن گیا۔

ففتھ ایونیو' مین ہیٹن کی سب سے مہنگی اور معروف شاہراہ ہے۔ مصروفیت کے باعث یہاں پارکنگ کا بھی اکثر مسئلہ رہتا ہے لیکن یہ مسئلہ ویسا گمبھیر نہیں جیسا لاہور اور کراچی میں نظر آتا ہے۔

ہم ففتھ ایونیو پر واقع ویڈال ساسون سے نکلے تو ہنگ نے کہا" گاڑی کو یہیں پارک رہنے دیتے ہیں۔ تھوڑی چہل قدمی بھی کرنا چاہیے۔ ویسے اب تم دونوں لباس اور ہیئر اسٹائل کی تبدیلی کے بعد اتنے بدل گئے ہو کہ مین ہیٹن کی سڑکوں پر بے خوف و خطر گھوم پھر سکتے ہو۔"

"مسٹر ہنگ! تم تو یہ بات اس طرح کہہ رہے ہو جیسے دعوت نامی وہ ریسٹورنٹ یہاں قریب ہی ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا" بہت زیادہ قریب ہے اور نہ ہی دور۔ ہم اس وقت ففتھ ایونیو پر اسٹریٹ اتحادن اور السٹو کے درمیان کھڑے ہیں" دعوت" بھی ایسٹ اتحادن اسٹریٹ پر ہی ہے مگر سیکنڈ اور تھرڈ ایونیو کے درمیان۔ ہمیں اسٹریٹ اتحادن پر رہتے ہوئے مشرق کی سمت حرکت کرنا ہوگی۔"

"تو بسم اللہ کریں۔" میں نے وسیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا" سنا ہے حرکت میں بڑی برکت ہوتی ہے!"

یہ جملہ میں نے اُردو میں ادا کیا تھا۔ مسٹر ہنگ چونک کر میری طرف جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اپنے جملے کا مطلب جب اس پر واضح کیا تو وہ جلدی سے اثبات میں گردن جھٹکنے لگا' پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ویل سیڈ مسٹر وجدان! حرکت زندگی اور سکون موت کا نام ہے۔ زندہ انسان کو کبھی سکون میسر نہیں آ سکتا۔ پتا نہیں' پھر بھی وہ سکون کی تلاش اور حصول کی خاطر کیا کیا کرتا پھرتا ہے!"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا" ہنگ! اس میں انسان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ اپنی فطرت سے مجبور ہے۔ تلاش اور خواہش صرف اسی شے کی جاتی ہے جو میسا نہ ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں اگر پوری دنیا میں امن و آشتی کا بول بالا ہو جائے' یہ خطہ کائنات یوٹوپیا کا منظر پیش کرنے لگے تو پھر انسان تھوڑے ہی عرصے میں اس ماحول سے اکتا جائے گا۔ اسے بوریت اور جھنجلاہٹ محسوس ہونے لگے گی۔ وہ کچھ تبدیلی کا خواہاں ہوگا۔ امن و سکون کے ماحول میں تبدیلی کا مطلب ہے بدامنی اور بے سکونی۔ وہ فضا اور ماحول میں تبدیلی لانے کے لیے عجیب عجیب فتنے جگانے میں مصروف ہو جائے گا۔ جن لوگوں کی زندگی میں کوئی مسئلہ نہیں ہوتا' وہ

فتنہ جگانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔"

"ویل سیڈ۔" مسٹر ہنگ نے ستائشی نظر سے مجھے دیکھا" آئی ایگری ودیو۔"

ہم اسی قسم کی ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے "دعوت" کے اندر پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ کا اندرونی ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہنگ نے سرسری طور پر بیان کیا تھا۔ اور تو اور انڈو پاک کے ریسٹورنٹس کی طرح ڈائننگ ہال میں ایک ٹی وی بھی موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ اس وقت وہ آن بھی تھا۔ ہم اپنے لیے مخصوص میز پر پہنچے اور تھوڑی دیر بعد ہم مینیو میں سے انتخاب کر رہے تھے۔

سبزی کی دو مختلف ڈشز منگوائی گئیں۔ ایک چکن کی کوئی مخصوص ڈش تھی۔ اس ریسٹورنٹ کے سموسے اور سوپ اپنی مثال آپ تھے۔ پیشکش کا انداز اگرچہ روایتی مشرقی نہیں تھا لیکن کھانے کی لذت اور ذائقہ ناقابلِ فراموش تھا۔ میں نے اور وسیم نے سلو بار ریسٹورنٹ میں بس گزارہ ناشتا کیا تھا' لہٰذا لنچ خوب ڈٹ کر کیا گیا۔ سرد موسم میں ویسے بھی بھوک زیادہ لگتی ہے۔ وہ جنوری کا اختتام تھا۔ دوپہر کا وقت تھا مگر مین ہیٹن میں ابھی تک سورج کی شکل دکھائی نہیں دی تھی حالانکہ یہاں کے اسکائی اسکریپرز (فلک بوس عمارتیں) تو سورج کو چھونے کی دعوے دار نظر آتی ہیں۔ بس وہی بات کہ جو جتنا زیادہ با اختیار نظر آتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ مجبور اور بے بس بھی ہوتا ہے!

لنچ اپنے عروج پر تھا کہ ٹی وی پر بریکنگ نیوز چلنے لگی۔ ہم تینوں بہ یک وقت چونک کر ٹی وی کی جانب دیکھنے لگے کیونکہ وہ نیوز ہمارے ہی متعلق تھی۔ نیویارک کی عوام کو پولیس کے نئے کارنامے سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔ نیوز کاسٹر بڑے جوش و خروش سے بتا رہی تھی کہ نیویارک پولیس کو پچھلے دو دن سے جس پاکستانی دہشت گرد کی تلاش تھی، اس کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا گیا ہے مگر امریکا دشمن وجدان نامی وہ دہشت گرد پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو گیا۔ وجدان کے ٹیکسی ڈرائیور ساتھی کا نام وسیم معلوم ہوا ہے۔ وجدان کی طرح وہ بھی پاکستانی ہے۔ وجدان' وسیم کے اپارٹمنٹ میں چھپا ہوا تھا۔ شوگر ہل ہارلم میں واقع مذکورہ اپارٹمنٹ پر پولیس کی بھاری جمعیت نے چھاپا مارا لیکن مطلوبہ وسیم اور وجدان اپارٹمنٹ پر نہیں ملے۔ پولیس کا خیال ہے کہ وہ انہیں دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے لہٰذا پولیس کی آنکھ بچا کر اِدھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ بہرحال پولیس نے اپارٹمنٹ پر کڑی نگرانی مقرر کر دی ہے۔ پولیس پورے نیویارک میں بڑی سرگرمی سے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ نیویارک' خصوصاً مین ہیٹن کے تمام ہوٹلز' ریسٹورنٹس' گیسٹ ہاؤسز' بارز' شاپنگ مالز اور

ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کے مالکان سے خصوصی درخواست کی گئی کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں اور مجرموں کی گرفتاری کے سلسلے میں پولیس سے بھرپور تعاون کا مظاہرہ کریں۔

آخر میں میرے اور وسیم کے فوٹو گراف کے فریم بھی دکھائے گئے۔ وسیم کی تصویر پتا نہیں کیسے پولیس والوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر کل تین فریم دکھائے جا رہے تھے۔ ایک فریم میں وسیم کی تصویر تھی' دوسرے میں وجدان کی یعنی میری اصلی صورت اور تیسرے میں ڈسلوا کی تصویر تھی۔ این وائے پی ڈی کی کارکردگی واقعی قابلِ داد تھی۔ اس بریکنگ نیوز کی ہیڈ لائن بڑی سنسنی خیز تھی جس میں بتایا گیا کہ ڈسلوا کی آئی ڈی کا استعمال کرنے والا یہ پاکستانی دہشت گرد وجدان نہایت ہی خطرناک انٹرنیشنل کرمنل ہے امریکا

میں قدم رکھنے سے پہلے یہ دنیا کے بہت سے ممالک میں بڑی افراتفری پھیلا چکا ہے لہٰذا اس شخص کی گرفتاری کے لیے عوام پوری طرح پولیس سے تعاون کرے۔

وہ تو شکر تھا' ہم تبدیل شدہ حلیوں میں تھے ورنہ کوئی بھی من چلا نمودار کر ہم پر ہاتھ ڈال دیتا۔ وسیم نے سرگوشیانہ انداز میں کہا ''صورتِ حال بڑی خوفناک ہوتی جا رہی ہے۔''

''کیا تم کسی قسم کا ڈر محسوس کر رہے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''بات ڈر اور خوف کی نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟'' میں الجھ کر رہ گیا۔

مسٹر ہنگ بھی پوری طرح ہماری جانب متوجہ تھا۔ ہمارے درمیان وہ گفتگو انگلش میں ہو رہی تھی۔ وسیم میرے استفسار کے جواب میں تامل کرتے ہوئے بولا۔

''یار! میں اپنے گھر والوں کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

''کیوں' انہیں وہاں بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا؟''

''وہ جانتے ہیں میں شوگر لل میں رہتا ہوں اور یہاں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا ''اگر یہ خبریں ان تک پہنچ گئیں تو وہ کیا سوچیں گے۔ میں تو پوری دنیا میں ایک خطرناک مجرم کے بطور مشہور ہو گیا ہوں۔''

اس کی تشویش بجا اور فکر برحق تھی۔ میں جس راہ کا مسافر تھا' یہ کام فیملی والوں کے بس کا نہیں۔ وسیم نے میرے ساتھ چلنے کا عزم کر کے جس آتش کدے میں چھلانگ لگائی تھی' وہ اسے اور اس کی فیملی کو جلا کر بھسم کر دیتا۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا کہ اسے پاکستان ہی میں کہیں سیٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تفصیلات کے بارے میں بعد میں سوچا جا سکتا تھا۔ فی الحال اسے ایک بھرپور تسلی کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے یہ کام ضرور کیا۔

''دیکھو وسیم! میں نے آواز نیچی رکھتے ہوئے کہا ''اول تو یہ خبر ایک لوکل چینل سے نشر کی گئی ہے اس لیے فی الفور اس کا پاکستان پہنچنا سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ پاکستان پہنچنے کے بعد بھی یہ خبر تمہاری فیملی تک رسائی حاصل کر سکے۔ تم ایک کام کرو!''

''کیا کام؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے پوچھا ''گھر والوں سے تمہارا رابطہ کس طرح قائم ہے؟''

''ٹیلی فون...... دونوں ذرائع سے۔''

اس نے جواب دیا ''ادھر سے خط آتا ہے میں ادھر سے فون کرتا ہوں۔''

''آخری رابطہ ہوئے کتنا عرصہ گزرا ہے؟''

''لگ بھگ ایک ماہ!'' اس نے جواب دیا۔

''ویری گڈ۔'' میں نے ایک بے آواز چٹکی بجائی ''تم آج ہی اپنے گھر فون کرو اور انہیں بتاؤ کہ چند روز پہلے تم اپنی رہائش اور روزگار تبدیل کر لیا ہے۔ اب تم نیوجرسی میں کسی فوٹو گرافر کی دکان پر کام کرتے ہو۔ ایڈریس وغیرہ انہیں بعد میں بھی بھیجا جا سکتا ہے۔''

''اور وہ جو عید منانے پاکستان گیا ہوا ہے۔'' وسیم کا اشارہ اپنے اپارٹمنٹ ساتھی نوید کی طرف تھا ''وہ میرے گھر بھی جائے گا۔ اس طرح میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔''

میں سر پکڑ کر رہ گیا۔ مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تو میں نے وسیم سے کہا ''بہت دور کی سوچنے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ اپنے تازہ ترین اور ایمرجنسی حالات پر توجہ مرکوز کر دو۔ میں تم سے جو کہہ رہا ہوں' بس اتنا ہی کرو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں تمہارے مسئلے کو پوری طرح حل کرنے کی کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے یہ مسئلہ ضرور حل ہو گا۔''

وسیم خاموش ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ وسیم کو پاکستان میں سیٹ کرنے کا میرا فیصلہ انتہائی مناسب تھا۔ اگر پاکستان میں اس کے روزگار کا کوئی مناسب سیٹ اپ بن جاتا تو وہ اپنی فیملی کے قریب ہو سکتا تھا اور اس کے لیے بھی بہتر تھا۔ فوری طور پر میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا۔ یہ بات اسے آرام ہی سے سمجھائی جا سکتی تھی۔

اس دوران میں مسٹر ہنگ خاموش بیٹھا ہماری سنتا رہا۔ جب ہم خاموش ہوئے تو وہ بول اٹھا ''ایک بات ضرور کہوں گا۔ چاہے آپ لوگوں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔''

ہم دونوں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''آپ دونوں دو مختلف راہوں کے مسافر ہو!''

وہ صد فی صد درست کہہ رہا تھا۔ وسیم کی تازہ ترین کیفیت کو دیکھتے ہوئے میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ظاہر ہے جس کی فیملی ہو گی وہ ان لوگوں کے لیے پریشان بھی ہو گا۔ اگر نہیں ہو گا تو پھر وہ انسان نہیں ہو گا۔ انسان اور پریشان لازم و ملزوم ہیں!

''مسٹر ہنگ! اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے نہایت ہی گمبھیر آواز میں کہا اور ساتھ ہی وِنگ

ہنگ کو آنکھ کا مخصوص اشارہ بھی کر دیا۔

وسیم اس وقت ٹیبل پر رکھے اپنے ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔

''اٹس او کے!'' ہنگ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے جلدی سے بولا۔

ہم ''دعوت'' سے اٹھنے ہی والے تھے کہ ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ ویسے تو میں جس قسم کے واہیات حالات سے گزر رہا تھا، اس میں خوشگواریت کو زیادہ عمل دخل نہیں رہا تھا۔ پھر بھی دعوت میں جو حالات سامنے آئے وہ سنگینی میں بھی مختلف نوعیت کے تھے۔

اچانک دو باوردی پولیس والے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے اور ریسپشن پر کھڑے ہو کر بڑی چوکنا نظروں سے ڈائننگ ہال کا جائزہ لینے لگے۔ ہم میں سے ہر ایک نے پیش آمدہ حالات کی روشنی میں یہی سمجھا کہ وہ وجدان اور وسیم کی تلاش میں وہاں جھانکنے آئے ہیں۔

چور کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تنکا اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ کسی کے توجہ دلائے بغیر ہی محسوس ہونے لگتا ہے اور تنکے کا حامل چیخ چیخ کر پوری دنیا کو بتا رہا ہوتا ہے۔ میں چور ہوں...... میں ہوں چور!

پولیس والوں پر نگاہ پڑتے ہی وسیم نروس ہو گیا۔ اس کا ذہن پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ اسی پریشانی میں اس سے ایک اضطراری حرکت سرزد ہو گئی۔ اس کا ہاتھ سالن والی ایک ڈش (ڈونگے) سے ٹکرا گیا اور ڈونگا میز کو چھوتے ہوئے فرش پر جا گرا۔

ریسٹورنٹ کا چکنا فرش پھول دار عمدہ پالشڈ ٹائلوں سے سجا تھا۔ ڈونگے اور فرش کے باہمی ٹکراؤ سے ایک مخصوص چھناکے ...... دار آواز پیدا ہوئی۔ چینی کا بنا ہوا ڈونگا ٹکڑوں میں تقسیم ہوا اور سارا سالن فرش پر بکھر گیا۔

اس وقت ریسٹورنٹ کا ڈائننگ ہال تقریباً بھرا ہوا تھا مگر اس چھناکے کی آواز نے پولیس والوں کو ہماری جانب متوجہ کر دیا۔ یہ ان کی ایک عین فطری پیش قدمی تھی۔ وہ اگر اس ریسٹورنٹ میں کسی کی تلاش میں آئے تھے تو انہیں ادھر ہی کا رخ کرنا چاہیے تھا۔

ویٹر صورتِ حال سے آگاہ ہوا تو ایک وائپر سنبھالے فی الفور ہماری میز کی جانب بڑھا لیکن اس سے پہلے پولیس والے ہمارے قریب پہنچ گئے۔ میں نے کسی کی طرف دیکھے اور کسی کو مخاطب کیے بغیر گمبھیر آواز میں سرگوشی کی ''کانفیڈنس!''

میرا یہ یک لفظی مشورہ مسٹر ہنگ اور وسیم تک پہنچا یا نہیں بہرحال' میں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔ اگر اس موقع پر ہم بھرپور اعتماد کا مظاہرہ کرتے تو صورتِ حالات کو اپنے ہاتھ میں لیا جا سکتا تھا اور میں نے اس مظاہرے میں پہل کی۔

وائپر بردار وردی پوش ویٹر پولیس والوں کی وجہ سے ٹھٹک کر رک گیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے برہمی سے کہا ''کھڑے کھڑے ہمارا منہ کیا دیکھ رہے ہو کیا یہ سارا کچرا یونہی پھیلا رہے گا؟''

امریکا میں ''کسٹمر'' کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور اس کی خوشنودی کا ہر صورت خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک کامیاب کاروبار کا یہی اصول اور معقول کاروباری کی یہی نشانی ہے!

ویٹر ''سوری سر...... سوری سر۔'' کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

پولیس والوں نے اس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ ان کی توجہ کا مرکز میں اور وسیم تھے۔ ہنگ شکل و صورت میں ہم سے الگ تھلگ تھا لہٰذا پولیس والوں کا صرف ہمیں مرکزِ نگاہ بنانا یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ ہماری ہی کھوج میں ہیں۔

''یس آفیسر!'' میں نے ایک پولیس والے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ میرے چہرے کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا ''شو یور آئی ڈی!''

''آئی ڈی؟'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا ''کیا میں اپنی فائلیں اور ڈاکومینٹس ساتھ ساتھ لیے گھومتا ہوں۔ میرا نام سلطان ہے اور یہ میرا دوست سلمان ہے۔'' میں نے وسیم کی جانب اشارہ کیا پھر ہنگ کی ذات کو پردے کی اوٹ میں چھپاتے ہوئے کہا ''انہوں نے اپنا نام ریمنڈ شو بتایا ہے۔ ابھی ابھی اسی ریسٹورنٹ کے باہر ہماری ملاقات ...... بلکہ دوستی ہوئی ہے۔''

''یہ امریکا ہے' یہاں کی پولیس سے جھوٹ بولنا ہو تو ٹھیک ٹھاک تیاری تو کر لینا چاہیے۔'' مجھ سے مخاطب آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا ''ریسپشن سے ہمیں پتا چل چکا ہے یہ میز دو گھنٹے پہلے کسی مسٹر ہنگ نے تین افراد کے لنچ کے لیے ریزرو کرائی تھی۔'' وہ ایک لمحے کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''اپنی آئی ڈی شو کرانے کے لیے فائلوں کے پلندے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنا کوئی بھی لیگل پیپر دکھا سکتے ہو۔ آفس کارڈ' سروس کارڈ' ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ وغیرہ۔''

میں نے کہا ''سوری آفیسر! اس وقت میرے پاس ایسی کوئی آئی ڈی موجود نہیں۔'' میرا لہجہ اگرچہ معذرت خواہانہ تھا

تاہم اس میں اعتماد کی کوئی کمی نہیں تھی' اور تم جو ریزرویشن کی بات کررہے ہو وہ غلط نہیں البتہ ریسٹورنٹ والوں نے شاید نام سننے میں غلطی کی ہے۔ ریمنڈ کو انہوں نے ہنک سمجھ لیا۔"

وہ ریزرویشن کے قصے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے تمہارے پاس اتفاق سے اس وقت کوئی آئی ڈی نہیں مگر ان دو کے پاس تو ہوگی؟"

"اتفاق سے نہیں ہے۔" ہنک نے نرمی سے کہا۔

"یہ بڑا خطرناک اتفاق ہے۔" پولیس آفیسر زہریلے انداز میں مسکرایا "آپ لوگوں کو ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔"

میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا "کہیں آپ لوگ ہمیں وہ خطرناک مجرم تو نہیں سمجھ رہے جنہوں نے پولیس والوں کی نیندیں حرام کررکھی ہیں۔ ہم نے اسی ریسٹورنٹ کے ٹی وی پر ان کے بارے میں ابھی بریکنگ نیوز سنی ہے۔"

"تمہارے تمام سوالات کے جواب ہیڈ کوارٹر چل کر مل جائیں گے۔" وہ رکھائی سے بولا اور گن نکال لی۔

صورتِ حال کی سنگینی مسلم تھی۔ ربی نے ہماری سرکوبی کے لیے پولیس کو ہائی لیول پر متحرک کردیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو نگاہوں ہی نگاہوں میں "عمل کا پیغام" دیا اور اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"او کے آفیسر! ہم تمہارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنے کو تیار ہیں۔"

میری دیکھا دیکھی وہ دونوں بھی اٹھ کر کھڑے ہوگئے تاہم انہوں نے میری پلاننگ کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ ایسا سوال حماقت کے زمرے میں آتا۔ میرے ذہن میں اس وقت کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا۔ بہرحال یہ طے تھا کہ ہمیں ان کے ساتھ نہیں جانا۔ اگر ایک مرتبہ ان کی کسٹڈی میں چلے جاتے تو پھر یہ راز کھلنے میں ذرا دیر نہ لگتی کہ سلطان اور سلمان نام بتانے والے درحقیقت وہی مفرور خطرناک مجرم ہیں پولیس کو جن کی تلاش تھی۔ مسٹر ہنک بے چارہ ہماری وجہ سے مصیبت میں پھنس جاتا۔

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ میں ان لمحات میں ایک لیڈر کا رول کررہا تھا۔ مجھے جو بھی عملی قدم اٹھانا تھا' اسی ریسٹورنٹ کے ڈائننگ ہال میں اٹھانا تھا لوگوں کی موجودگی میں پولیس والے ہم پر بے دریغ فائرنگ نہیں کرسکتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہمیں یہاں سے رفو چکر ہونا تھا۔ ویسے ایک بات کا میں نے بہ خوبی اندازہ لگا لیا تھا اور وہ یہ کہ انہیں ہم پر مضبوط شک نہیں تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ہمیں گرفتار پہلے کرتے اور بات بعد میں۔ وہ معمول کی کارروائی کے تحت چیکنگ پر تھے اور وسیم کی اضطراری حرکت نے انہیں ہماری جانب متوجہ کردیا تھا پھر ہم نے آئی ڈی پیش نہ کرکے ان کے شک کو مہمیز کردیا۔

انہوں نے ہمیں اپنے درمیان رکھ لیا۔ ایک گن بردار پولیس والا سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے وسیم اور ہنک پھر میں تھا۔ دوسرا پولیس والا میرے عقب میں گن سونتے چل رہا تھا۔ جب ہم ڈائننگ ہال کے عین وسط میں پہنچے تو میں نے کارروائی کا آغاز کردیا۔

میں بجلی کی سی تیزی سے گھوما اور پولیس والے کی گن پر ہال کک ماردی۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل کر فضا میں اچھلی۔ وہ مجھ سے ایسے کسی ردِعمل کی توقع نہیں کررہا تھا۔ میں نے اس کے پُرحیرت تھوبڑے پر ایک دھواں دھار پنچ رسید کردیا۔ وہ پیچھے کی جانب لڑکھڑایا تو میں نے اچھل کر اس کے سینے پر ایک فرنٹ پش کک جڑ دی۔ وہ میزوں اور کرسیوں کو الٹتے ہوئے دس فٹ دور چلا گیا۔

اس دوران میں وسیم بھی حرکت میں آچکا تھا۔ اسے تو میری جانب سے محض اشارے کی ضرورت تھی۔ میں نے دیکھا وہ پولیس والے کی گردن میں لاک لگائے کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر پولیس والے کے پیٹ میں ایک طوفانی گھٹنا رسید کیا تو وہ بلبلا اٹھا۔ اسی لمحے وسیم نے اس کی گردن پر سے گرفت ختم کردی۔ پولیس والا دھڑام سے پختہ فرش پر جا رہا۔

یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ وہاں جم کر کوئی باقاعدہ مقابلہ کیا جاتا۔ پولیس والوں پر جارحانہ ہاتھ ڈال کر ہم ایک سنگین جرم کے مرتکب ہوچکے تھے۔ ہمیں پہلی فرصت میں وہاں سے غائب ہونا تھا۔ اگر ہم بدقسمتی سے ان کے قابو میں آجاتے تو بڑی مصیبت آجاتی۔ میری تقلید میں وسیم اور ہنک نے ریسٹورنٹ کے دروازے کی جانب دوڑ لگادی۔

ریسٹورنٹ میں موجود کسی شخص نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ہم دروازے کے قریب پہنچے تو دونوں پولیس والے اٹھ کر ہمارے تعاقب میں چلے آرہے تھے۔ ہم دروازے سے نکلنے لگے تو انہوں نے ہم پر فائر کردیا تاہم ہم محفوظ رہے اور باہر ایسٹ اٹھادن اسٹریٹ پر نکل آئے۔

"دعوت" ریسٹورنٹ دوسو دس ایسٹ اٹھادن اسٹریٹ پر سیکنڈ اور تھرڈ ایونیوز کے درمیان واقع تھا۔ اس ٹکڑے میں ایڈریس کے ایک سو پینسٹھ سے دوسو پچاس تک نمبر چلتے تھے۔ ہنک کی سلیٹی گاڑی ففتھ ایونیو پر پارک تھی۔ اگر ہم وہاں تک دوڑتے ہوئے جاتے تو پولیس والوں سے بچ نہیں سکتے تھے۔

وہ راستے میں کہیں بھی ہمیں شکار کرلیتے۔ انہیں ڈاج دینا ضروری تھا۔

ہمارے پاس اگر کوئی گن ہوتی تو ہوائی فائر کرکے عارضی طور پر ان کا راستہ روکا جاسکتا تھا۔ ایسی کوئی سہولت ہمیں "میسر" نہیں تھی۔ ہم آگے پیچھے بھاگتے ہوئے ایک سو ستر ایسٹ تک چلے آئے چند گز آگے تھرڈ ایونیو شروع ہوجاتا۔ ہماری بہ نسبت پولیس والوں نے کم تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں باہمی فاصلہ بہ تدریج بڑھتا چلا گیا۔

اچانک میں نے اپنی رفتار میں کمی کی اور دائیں ہاتھ پر واقع ایک عمارت میں داخل ہوگیا۔ میری دیکھا دیکھی ہنک اور وسیم بھی اسی بلڈنگ میں گھس گئے۔ ہم لفٹ کو نظر انداز کرکے بلاتکلف سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے۔ ہمارے انداز میں ایک خاص قسم کی جلد بازی پائی جاتی تھی!

فرسٹ فلور تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے ہی میں نے دائیں بائیں چلتے ہوئے وسیم اور ہنک سے کہا "میری بات توجہ سے سنو اگر پولیس والوں سے چھٹکارا پانا ہے تو تمہیں میری ہدایت پر عمل کرنا ہوگا۔"

"ہاں بولو تم کیا کہتے ہو؟" ہنک نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔ گویا وہ مجھے باس تسلیم کرچکا تھا۔

میں نے کہا "ہمیں پہلی فرصت میں بکھر جانا چاہیے۔ اگر ایک ساتھ رہے تو فوراً پولیس والوں کی نظر میں آجائیں گے۔ ہمیں انفرادی طور پر گاڑی تک پہنچنا ہے۔ بتاؤ تمہاری سلیٹی گاڑی کی درست لوکیشن کیا ہے؟"

ہنک نے میرے سامنے ففتھ ایونیو پر گاڑی کھڑی کی تھی لیکن میں ایڈریس کے حوالے سے وہ سوال پوچھ رہا تھا تاکہ کیب پکڑ کر وہاں پہنچ سکو۔ وسیم اور ہنک کے لیے وہ ایونیوز اور اسٹریٹس کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ من ہیٹن کی ایک ایک گلی سے آگاہی رکھتے تھے۔

اس دوران میں ہمارے قدم مسلسل اوپر کو اٹھ رہے تھے۔ سیڑھیوں والا راستہ لفٹ کی بہ نسبت زیادہ محفوظ تھا اسی لیے میں نے یہ راہ اختیار کی تھی۔ جب ہم نے فرسٹ سے سیکنڈ فلور کی سمت بڑھنا شروع کیا تو وسیم نے کہا۔

"کیوں نہ ہم "ڈیڈال سباسون" کے سامنے ملیں۔ وہاں سے گاڑی زیادہ دور نہیں۔"

مسٹر ہنک نے اس کی تجویز کی تردید کی اور کہا "زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم "دی پام کورٹ" میں ملیں "دی پام کورٹ" ہوٹل پلازا کی لابی میں واقع ہے۔ ہم کیب یا بس وغیرہ میں بیٹھ کر وہاں پہنچ سکتے ہیں لیکن پہلے ان پولیس والوں سے جان

علم ہپناٹزم پر ایک نئی کتاب

جسے ایک ماہرِ ہپناٹزم نے تحریر کیا ہے

باتصویر

ہپناٹزم کی جدید تحقیقات

قیمت 60 روپے ● ڈاک خرچ 23 روپے

اردو زبان کی پہلی کتاب جس میں اس عمل کی حقیقی تصاویر بھی دی گئی ہیں

- ہپناٹزم کے بارے میں آج تک کی تمام تحقیقات کا نچوڑ
- جدید طریقے اور مشقیں
- ہپناٹزم کی مشقوں کیلئے مکمل لائحہ عمل اور پورا پروگرام
- بے شمار سوالات کے جواب
- ہپناٹزم کے موضوع پر ایک مکمل اور مستند کتاب جس میں مصنف کے ذاتی تجربے بھی شامل ہیں

ارتکاز توجہ کیلئے سیاہ دائرہ اور مشقوں کو سمجھنے کیلئے

حقیقی تصاویر

چھڑانا ہوگی۔"

"سمجھ لو اِن سے تو جان چھوٹ گئی۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "دی پام کورٹ والا آئیڈیا ڈن ہے۔ اب میری بات غور سے سنو۔" میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اپنے فوری منصوبے سے انہیں آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم سیکنڈ فلور پر پہنچنے والے ہیں۔ مسٹر ہنگ ! تم یہاں ہم سے بچھڑ جاؤ گے۔ ہم دونوں انہی سیڑھیوں سے تھرڈ فلور کی سمت بڑھیں گے۔ مسٹر ہنگ ! تم سیکنڈ فلور پر جتنا چاہو وقت گزار لو۔ اس کے بعد ہاتھ پاؤں بچا کر عمارت سے نکلنا اور سیدھے پلازا ہوٹل کی لابی میں پہنچ جانا۔ او کے؟"

"ہیسولیوٹلی او کے۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میں لوگوں کے ہجوم میں شامل ہو کر لفٹ کے راستے نکل جاؤں گا۔ یہ ترکیب زیادہ موثر رہے گی۔"

"تم بالکل درست اور محفوظ خطوط پر سوچ رہے ہو۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "پولیس والوں کو تین بھگوڑوں کی تلاش ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ہم یوں بکھر کر لوگوں کے ہجوم میں انہیں جل دے جائیں گے۔ میں اور وسیم بھی یہی طریقہ آزمائیں گے لیکن علیحدہ علیحدہ۔ اس مقصد کے لیے وسیم تھرڈ فلور کو اور میں فورتھ فلور کو استعمال کروں گا۔ ہماری کارروائی میں پانچ پانچ منٹ کا وقفہ ہوگا تاکہ کہیں پھر کسی ایک لفٹ میں ہم تینوں یک جا نہ جائیں۔ پانچ منٹ میں یہ ایکسپریس لفٹس اوپر سے نیچے عمارت کے کئی چکر لگا لیتی ہیں۔ ٹھیک ہے مسٹر ہنگ ! سیکنڈ فلور آگیا۔ اب تم ہم سے جدا ہو رہے ہو۔ ہم نہیں جانتے تم کون ہو۔ بائے۔"

اپنی بات ختم کرتے ہی میں وسیم کے ساتھ تھرڈ فلور کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کی حیرت بھری سرگوشی میری سماعت تک پہنچی۔

"وجدان! تم انسان ہو یا مشین! سنگین ترین صورتِ حالات میں تمہارا دماغ زیادہ تیزی سے کام کرنے لگتا ہے۔ تم مجھے اس وقت ایک ایسا کمانڈر نظر آ رہے ہو جو سیکڑوں سپاہیوں کے دستے کو عین مقامِ جنگ پر کاری ہدایات دے رہا ہو!"

"اور تم......" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا "ہنگامی حالات میں سالن سے بھرے ڈونگے گراتے رہتے ہو۔ انسان کو اتنا بھی کمزور اعصاب نہیں ہونا چاہیے۔"

"آئی ایم سوری وجدان!" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا "وہ میری ایک غیر ارادی حرکت تھی۔ پتا نہیں کیسے اس ڈونگے سے میرا ہاتھ لگ گیا۔ میں ذہنی طور پر بری طرح الجھا ہوا تھا۔"

"ندامت اور معذرت کا موقع محل تو دیکھ لیا کرو یار۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تھرڈ فلور آگیا ہے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اعصاب کو قابو میں رکھو۔ اگر اب کوئی غیر ارادی اضطراری غلطی سرزد ہوگئی تو تمہیں چھڑانے کے لیے مجھے پولیس ہیڈکوارٹر پر دھاوا بولنا پڑے گا۔"

اس نے تشکرانہ جذبات سے بھی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بولا "تم ایک عظیم انسان ہو۔"

"میری تعریفوں میں وقت ضائع کر کے تم پھر وہی غلطی کرنے جا رہے ہو جو پولیس کے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچا دے گی۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا "گو آن"

"پھر میں پیچھے پلٹے بغیر فورتھ فلور کی جانب جانے والے زینے طے کرنے لگا۔

☆☆☆

ہوٹل پلازا کی شاندار عمارت ففتھ ایونیو اور ویسٹ ففٹی نائنتھ اسٹریٹ کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کے نزدیک ہی گرینڈ آرمی پلازہ ایستادہ ہے۔ ٹھیک تین بجے میں ہوٹل پلازا کی لابی میں واقع دی پام کورٹ میں موجود تھا۔ ہوٹل پلازا ایک مہنگا ہوٹل ہے لہٰذا دی پام کورٹ بھی ہما شما کے لیے نہیں بنایا گیا۔ اس ریسٹورنٹ میں اگر آپ سہ پہر کی چائے پی کر اچھا وقت گزارنا چاہتے ہیں تو جیب میں کم از کم ساٹھ ستر ڈالر ضرور ہونا چاہئیں کیونکہ ایک پیالی چائے پچاس ڈالر تک میں پڑتی ہے۔

ہم تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہاں پہنچے تھے اور یہ پہنچ بہ خیر و عافیت تھی۔ پولیس والے پتا نہیں اس وقت ہمیں کہاں کہاں تلاش کر رہے ہوں گے۔ میری حکمتِ عملی انتہائی کامیاب رہی تھی۔ بہر حال اس سے حالات کی سنگینی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہماری تلاش میں شدت ہی آنا تھی۔

"دی پام کورٹ" میں چائے کے بہانے دو تین گھنٹے آرام سے گزارے جا سکتے تھے۔ وہاں کا ماحول بہت ہی پُرسکون اور حسین تھا۔ لگتا تھا جیسے مین ہیٹن کی ساری خوب صورتی وہیں سمٹ گئی ہو۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ وہاں موجود تھی۔

چائے سرو کر دی گئی تو میں نے ونگ ہنگ سے کہا "مسٹر ہنگ! میں اور وسیم تو بدلے ہوئے حلیوں میں ہیں مگر آپ کے ساتھ ٹھیک نہیں ہوا۔ خاص طور پر یہ بات پولیس کے ریکارڈ پر آ گئی ہے کہ تین افراد کے لیے آپ نے میز بک کرائی تھی۔"

"اس میں خرابی والی کون سی بات ہے؟" ہنگ نے

مضبوط لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا "اگر اس ریسٹورنٹ کی مالک مدھر جعفری کے سامنے تمہارا نام آیا اور میز بک کرنے والے نے مدھر کو یہ بھی بتایا کہ تم نے بکنگ سے پہلے اپنا نام اور چائنا ٹاؤن کا حوالہ بھی دیا تھا تو جعفری فوراً پہچان جائے گی کہ تم کون سے ہنگ ہو۔ پھر پولیس والے پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"تمہارا یہ خیال کس بنیاد پر ہے؟"

"دیکھو وجدان!" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "اول تو یہ کہ دعوت کا اسٹاف مجھے پہچانتا نہیں۔ میں یہاں بہت کم آیا ہوں۔ ریزرویشن کے وقت میں نے فون پر اپنا نام بتانے کے بعد کہا تھا کہ مدھر جعفری میرے پاس چائنا ٹاؤن آتی رہتی ہے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ مدھر سے ملاقات نہیں ہو سکی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے تحمل سے اس کی بات سنی اور کہا "یہ تو "اول" ہوا۔ "دوم" کیا ہے؟"

"دوم اول سے زیادہ سادہ اور پُرکار ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں اور وسیم منتظر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ مسٹر ہنگ ٹھہری ہوئی طبیعت اور مضبوط اعصاب کا مالک تھا "دعوت" میں ہمیں جو صورتِ حال پیش آئی اس میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی گھبرایا نہیں تھا۔

چند لمحات کی پُراسرار خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا "دراصل اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ واقعی میں نے فون کر کے تین افراد کے لنچ کے لیے میز بک کرائی تھی۔ میرا نام استعمال کر کے کوئی اور شخص بھی تو یہ حرکت کر سکتا ہے!"

"تمہاری بات میں وزن ہے لیکن اس آئیڈیے میں ایک بہت بڑی خامی بھی ہے۔" میں نے کہا۔

"کیسی خامی؟" وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "تم نے ریزرویشن والی کال اپنے موبائل فون سے کی ہے۔ ہوٹل والے فون سیٹ پر تمہارا نمبر آیا ہوگا۔ اس طرح یہ ٹریس کیا جا سکتا ہے کہ اس نمبر والی سیلولر لائن کس شخص کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ اس راہ کو پکڑ کر پولیس بہ آسانی تم تک رسائی حاصل کر لے گی۔"

"دور کی کوڑی لائے ہو۔" وہ ستائشی انداز میں بولا۔ "لیکن یہاں میں شیوی والا آئیڈیا استعمال کر سکتا ہوں۔"

میں نے چونک کر ہنگ کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا "یعنی گمشدگی والا آئیڈیا؟"

"ایگزیکٹلی۔" وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔

مسٹر ونگ ہنگ کی دی ہوئی گاڑی شیورلٹ عرف شیوی ایک موقع پر ربی کے آدمیوں کے ہاتھ چڑھ گئی تھی۔ اس گاڑی میں راکیل بھی موجود تھی۔ وہ گاڑی کو وہیں چھوڑ کر راکیل کو اپنے ساتھ لے گئے تھے پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ گئی۔ اس موقع پر میری ہدایت کے مطابق ونگ ہنگ نے گاڑی کی چوری کی رپورٹ درج کروا دی تھی۔

راکیل کی یاد نے میرے دل کو افسردہ کر دیا۔ وہ عجیب و غریب لڑکی الاسکا سے نیو یارک تک میرے ساتھ آئی تھی۔ اس دوران میں ہمیں نارتھ پیسفک اوشین کے ایک مختصر سے جزیرے "زونارا آئی لینڈ" پر بھی کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ ہمارا طیارہ اغوا ہونے کے بعد مذکورہ جزیرے پر پہنچا دیا گیا تھا۔ میں نے راکیل کے ساتھ بہت ہی یادگار اور ناقابلِ فراموش لمحات گزارے تھے۔ اس کے کئی ایک احسانات میرے اوپر تھے۔ ربی موشے ہائمن کے ماؤنٹ مکنلے والے خفیہ ٹھکانے سے مجھے رہائی دلانے کا سہرا بھی راکیل ہی کے سر تھا۔ وہ ربی کے سیٹ اَپ کے اندر رہتے ہوئے بدھ ازم کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس بغاوت اور غداری (یہودی کی نظر میں) کی سزا کے طور پر ربی کے حکم پر اسے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دراصل اس نے اپنے کاز کے لیے جان دی تھی۔

یہ تو محبت اور جنگ کا اصول ہے۔ ایک ملک کا ہیرو دوسرے ملک کے لیے دہشت گرد کی حیثیت رکھتا ہے! سچی سے سچی محبت کرنے والے بھی معاشرے کی نظر میں ایک سنگین جرم کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔ یہ عمومی رویے کی بات ہے۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے مزید کہا "میں موبائل کمپنی والوں سے رابطہ کر کے اپنی لائن بند کروا دوں گا۔ میں کہہ سکتا ہوں میرا سیل کہیں کھو گیا ہے یہ عام سی بات ہے کوئی اس پر زیادہ دھیان نہیں دے گا۔ میں یہاں کا ایک معتبر شہری ہوں۔ میری بات پر یقین کیا جائے گا۔"

"تم جس بات کو معمولی کہہ رہے ہو، وہ میری نظر میں بہت اہم ہے۔" میں نے پُرتشویش لہجے میں کہا "ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں ان میں معمولی بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شیوی اور سیل کی چوری یا گمشدگی میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی "پارٹی" کے ہاتھوں استعمال ہوئے...... یعنی امریکا دشمن پاکستانی دہشت گرد

وجدان!'' میں ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''دعوت میں تو تم بہ نفسِ نفیس موجود تھے اور دو ایسے افراد کے ساتھ تھے جو پولیس کی نظر میں انتہائی مشکوک ٹھہر چکے ہیں۔ مسٹر ہنگ تمہاری جان آسانی سے چھوٹنے والی نہیں۔''

وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولا ''اگر کوئی میرا سیل استعمال کر سکتا ہے تو وہ میرے میک اَپ میں ''دعوت'' میں بھی جا سکتا ہے۔ یہ ناممکن تو نہیں؟''

اس کی بات خاصی وزن والی تھی۔

میں نے تائید کرتے ہوئے کہا ''ہاں یہ ناممکن تو نہیں مگر اس صورت میں تمہارا ایک دشمن جنم لیتا ہے جو تمہاری صورت بنا کر ''دعوت'' پہنچتا ہے اور ''مجرموں'' کے لیے وہ تمہارے ہی موبائل فون سے میز ریزرو کراتا ہے۔''

''میرا کوئی دشمن جنم لیتا ہے یا مرجاتا ہے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے وجدان!'' وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ''جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یہ شخص ایک ''اجنبی مجرم'' ہوگا۔''

''بہرحال۔'' میں نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا ''تمہیں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے لپیٹے میں آکر کہیں تم بھی رگڑے نہ جانا۔''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا ''مجھے اس کھیل کے انجام کی پروا نہیں۔ ویسے میں نے احتیاط کے سلسلے میں انتظام کر دیا ہے۔ آج کا دن تو میں مین ہیٹن بلکہ نیویارک ہی میں نہیں ہوں۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

وہ بتانے لگا ''کل اور آج کے اخبارات کی خبریں پڑھ کر اور صبح تمہارا فون سننے کے بعد میں نے تمہارے بارے میں ایک اہم فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے کاغذات وغیرہ کے بارے میں' میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ میں نے گھر سے روانہ ہوتے وقت اپنے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ آج کا دن میں چائنا ٹاؤن سے باہر بہت مصروف گزاروں گا اور عین ممکن ہے' میں نیوجرسی کا بھی پھیرا لگا لوں۔ امکانی بات میں نے دانستہ کہی تھی تاکہ حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے اس میں ضروری تبدیلی کی جا سکے۔ ویسے میں نے سوچا تھا' آج تمہیں نیوجرسی پہنچا ہی دوں گا۔ اس سلسلے میں' میں نے وہاں تم لوگوں کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔''

''مسٹر ہنگ!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''تمہاری گفتگو میں ''تھا' تھا'' کی تکرار سے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہو؟''

''ترک تو نہیں کیا لیکن موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ اس سلسلے میں پہلے تمہاری رائے جان لوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''تمہاری طرف آتے ہوئے میں نے ایجنٹ سے سرسری سی بات کی تھی۔ فائنل میں کل کروں گا۔ اب تم مجھے بتا دو' ایک آدمی کا کام کرنا ہے یا دونوں کا؟''

میں ہنگ کے تذبذب کو سمجھ گیا۔ وسیم نے جس قسم کے رویے کا مظاہرہ کیا تھا اور اس کی فیملی کے حوالے سے جو باتیں سامنے آئی تھیں' ان کے پیشِ نظر وہ ہچکچاہٹ میں پڑ گیا تھا لیکن میرا ذہن وسیم کے معاملے کو بہت دور تک دیکھ چکا تھا۔ میں نے یقینی لہجے میں کہا۔

''مسٹر ہنگ! کام تو دونوں ہی کا ہوگا۔ میں اپنا نام راجر منتخب کر چکا ہوں۔ کاغذات کے مطابق میں امریکی یہودی ہوں گا جب کہ وسیم کی ڈاکومینٹیشن ''سلمان'' کے نام سے ہوگی۔ ایک ایسا پاکستانی جو طویل عرصہ امریکا میں رہنے کے بعد مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر امریکی شہریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ہمارا ایڈریس اور کام کی نوعیت تم اپنی مرضی سے رکھ سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے' یہی فائنل طے ہو گیا۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا ''میں کل ایجنٹ سے مل کر کام کے ڈن ہونے کا بتا دیتا ہوں۔ وہ بہت چلتا پرزہ قسم کا بندہ ہے۔ مجھے امید ہے' دو دن میں تم لوگوں کے تمام ضروری کاغذات تیار ہو کر مجھ تک پہنچ جائیں گے۔''

''ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''میرے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ ہم امریکا کے اندر اور امریکا سے باہر بہ آسانی موو کر سکیں گے۔ میں تو پہلی فرصت میں اسرائیل جانا چاہوں گا۔''

''تمہارے ارادے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم اکیلے ہی اسرائیل جانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟'' ہنگ نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

میں نے کن انکھیوں سے وسیم کو دیکھا اور سرسری انداز میں کہا ''یہ کوئی حتمی بات نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کی ہے۔ اصل فیصلہ تو کاغذات بن جانے کے بعد ہوگا۔'' پھر میں نے اس سے پوچھ لیا ''تمہیں ان کاغذات کی تیاری کے سلسلے میں کیا کیا چاہیے ہوگا؟''

''تم لوگوں کے فوٹوگرافس' فنگر پرنٹس اور مخصوص

مقامات پر تمہارے دستخط۔'' اس نے جواب دیا ''نیوجرسی روانہ ہونے سے پہلے یہ کام نمٹانا ہوگا۔ میں فوٹوگرافی کا تمام ضروری سامان ساتھ لے آیا ہوں' میک اپ کے لوازمات ''سینچری ٹوئنٹی ون'' سے خرید لیے ہیں۔ بس اب ایک محفوظ ٹھکانے پر بیٹھ کر تمہارا وہ میک اپ کرنا ہوگا جس شناخت کے مطابق تمہارے کاغذات تیار کروائے جائیں گے۔ ہیئر اسٹائل کا مرحلہ طے ہو چکا۔ میک اپ کرتے ہوئے میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھوں گا کہ تمہارے چہروں کی معمولی ٹچنگ سے کام چلایا جائے تاکہ دس پندرہ منٹ میں تم خود بھی بہ وقتِ ضرورت یہ کام کر سکو۔ میک اَپ کے بعد میں تمہارے فوٹوگرافس بناؤں گا اور وہیں پر مذکورہ ایجنٹ کو بھی بلواؤں گا۔ وہ اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد چلا جائے گا۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''مسٹر ہنگ! میں محسوس کر رہا ہوں' نیوجرسی روانہ ہونے سے پہلے تم ہمیں جس محفوظ ٹھکانے پر لے جانے والے ہو' وہ چائنا ٹاؤن میں تو نہیں!''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ہم یہاں سے اٹھنے کے بعد سیدھے ''ٹرائی بیکا'' جائیں گے۔ ٹرائی بیکا (TRI BECA) چائنا ٹاؤن سے زیادہ دور نہیں۔ بس مشرق اور مغرب کی سمت کا فرق ہے۔ مین ہیٹن کے دونوں علاقوں کو کینال اسٹریٹ آپس میں ملاتی ہے۔ ٹرائی بیکا میں میرا ایک محفوظ ٹھکانا ہے جہاں رازداری کے ساتھ ہم اپنا کام نمٹا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہم ''ہالینڈ ٹنل'' کے ذریعے دریائے ہڈسن کو کراس کریں گے اور یو۔ ایس انٹر اسٹیٹ سیونٹی ایٹ پکڑ کر سیدھے نیوجرسی کے علاقے ''جرسی سٹی'' پہنچ جائیں گے۔ میں نے اپنے جس فوٹو اسٹوڈیو کا ذکر کیا ہے' وہ جرسی سٹی ہی میں واقع ہے۔ ہالینڈ ٹنل کے ذریعے سفر تمہارے لیے عجیب تجربہ ہوگا۔''

اس کے بعد ونگ ہنگ ہمیں مین ہیٹن برج اور ٹنل کے بارے میں بتانے لگا جو مین ہیٹن کو گرد و نواح کے علاقوں سے ملاتے تھے۔ وسیم اس ساری گفتگو کے دوران میں خاموش بیٹھا ہمیں سن رہا تھا۔ ہم خاموش ہوئے تو وہ تشویش بھرے انداز میں بولا۔

''میں اپنے اپارٹمنٹ سے نکلتے وقت صرف بٹوا ہی لا سکا ہوں۔ میرا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات ادھر ہی رہ گئے ہیں۔ اس سے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو جائے گی؟''

''اول تو کسی گڑبڑ کے امکانات نہیں ہیں۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا ''تم ایک دو دن میں وسیم سے سلمان بننے والے ہو۔ وسیم والا پاسپورٹ اور دیگر کاغذات تمہارے لیے بیکار ہیں۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ پولیس تمہاری تلاش میں امریکا سے پاکستان تک کا سفر کرے اور خواہ مخواہ تمہاری فیملی کو پریشان کرتی پھرے۔ ویسے انہیں صرف وجدان کی تلاش ہے۔ تم مجھے پناہ دینے کے گناہ گار ہو۔ وہ تمہاری خاطر اتنا کشٹ نہیں اٹھائیں گے۔ اس قسم کے منصوبے جاتی پروگرام وہ ایمل کاسی جیسے اہم افراد کے لیے چلاتے ہیں۔''

میری اس تسلی سے وہ قدرے مطمئن دکھائی دینے لگا۔

ونگ ہنگ نے اس سے پوچھا ''کیب تمہاری اپنی تھی یا کرائے کی؟''

''اپنی کہاں بھئی۔'' وسیم نے سرسری انداز میں کہا ''کرائے کی تھی۔ میرے دوست نوید نے اپنی گارنٹی پر مجھے دلائی تھی۔ اب وہ واپس آئے گا تو اس بیچارے کے لیے بھی اچھے خاصے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''کچھ نہیں ہوگا۔ تم اندیشۂ دور دراز سے اپنے ذہن کو مت پریشان کرو۔''

ایسی بات نہیں کہ وسیم کوئی بزدل شخص تھا۔ میں اس کی بہادری اور جرأت کا مظاہرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ بس موجودہ صورتِ حال نے اسے ذہنی طور پر الجھا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کچھ دن بعد وہ اس کیفیت سے نکل آئے گا۔

ہم لگ بھگ چار بجے ''دم پام کورٹ'' سے نکل آئے۔ باہر ہمارے لیے خطرہ اگرچہ کم ہو گیا تھا مگر بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ اصل مرحلہ ہوٹل سے گاڑی تک پہنچنے کا تھا۔ ایک مرتبہ ہم ٹنٹڈ گلاسز والی سلیٹی گاڑی کے اندر پہنچ جاتے تو پھر فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ ٹنٹڈ گلاسز کی بدولت باہر والے ہمیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے جب کہ یہ سہولت ہمیں میسر رہتی۔

ہنگ کی مذکورہ گاڑی ویڈال ساسون کے نزدیک کھڑی تھی جو ہوٹل پلازا سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے تھوڑا فاصلہ رکھ کر اسٹریٹ السٹھ پر چلتے ہوئے ففتھ ایونیو کی طرف چلے آئے پھر ویڈال ساسون کی جانب بڑھ گیا۔ ٹھیک دس منٹ بعد سلیٹی گاڑی ففتھ ایونیو پر شمال سے جنوب کی سمت دوڑ رہی تھی۔

واشنگٹن اسکوائر پہنچنے کے بعد ہم نے سکسٹھ ایونیو پکڑ لی۔

یہ ایونیو "ایونیو آف امریکا" کہلاتی ہے اور کینال اسٹریٹ کو کراس کرنے کے بعد چرچ اسٹریٹ میں داخل ہو جاتی ہے۔
ہم نے کینال اسٹریٹ پر پہنچ کر AVENUE OF AMERICAS کو چھوڑ دیا اور ٹرائی بیکا میں داخل ہو گئے۔

ٹرائی بیکا کو عموماً (TRI BECA) لکھا جاتا ہے۔ یعنی "ٹرائی اینگل بیلو کینال۔" یہ مین ہیٹن کا صاف شفاف اور خاصا مہنگا حصہ ہے۔ ونگ کا ٹھکانا واشنگٹن مارکیٹ پارک کے نزدیک تھا۔

ہم اپارٹمنٹ کے اندر پہنچے اور ونگ ہنگ نے ہمارے چہروں پر کام شروع کر دیا۔ اس سے پہلے وہ اس ایجنٹ کو فون کر چکا تھا جو ہماری معاوضے پر ہمارے کاغذات تیار کروانے والا تھا۔ اس "مفید" شخص کا نام جونی تھا۔ جونی نے چھ بجے ہمارے پاس پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔

ونگ ہنگ نے میک اپ کا کام ختم کرنے کے بعد ہمارا ایک مختصر سا فوٹو سیشن بھی کر ڈالا۔ کسی بھی اچھے فوٹو گرافر کے لیے آرٹسٹ مائنڈ ہونا بہت ضروری ہے۔ ہنگ ایک مکمل آرٹسٹ تھا۔ اس نے ہمارے حلیوں کی تبدیلی کے لیے میک اپ کی جو ٹیکنیک اپنائی وہ نہایت ہی آسان اور فوری تھی۔ ہم دس پندرہ منٹ صرف کر کے بہ آسانی اس مرحلے سے گزر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ہنگ نے ہمیں کچھ سودمند ٹپس بھی دیں۔

پانچ بجے تک ہم ضروری کاموں سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب صرف جونی کا انتظار تھا۔ وہ اپنا کام نمٹا کر چلا جاتا تو ہم باہر نکلتے۔ اس کے بعد ہمیں ہنگ کے ساتھ نیو جرسی کی طرف جانا تھا۔

لگ بھگ ساڑھے پانچ بجے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ہنگ کے اس اپارٹمنٹ میں ٹیلیفون موجود تھا اور یہیں سے ہنگ نے جونی کو فون کیا تھا۔

ہنگ نے دوسری گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا۔ میں نہیں جانتا، دوسری طرف کون تھا تاہم ہنگ کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ کوئی گڑبڑ ہے "ٹھیک ہے......اور ہوں ہاں۔" کرنے کے بعد ہنگ نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

میں نے فوراً پوچھ لیا "ہنگ! کس کا فون تھا؟"

"مسٹر جونی کی کال تھی۔"

"سب خیریت تو ہے نا؟" میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں، خیریت ہی ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "ہنگ! تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے!"

"کچھ خاص نہیں۔" اس نے کندھے اچکائے "جونی کو ایک ایمرجنسی پیش آ گئی ہے۔ وہ اب کل صبح ہی آئے گا۔"

"کیا امریکا کے "ایجنٹ" بھی اس قسم کی وعدہ خلافیاں کرتے ہیں؟"

"جونی کا پرابلم جینوئن ہے۔" ہنگ نے سنجیدہ لہجے میں کہا "اب تم لوگ کل ہی نیو جرسی روانہ ہو سکو گے۔"

میں نے کسی فوری خیال کے تحت استفسار کیا "یہ مسٹر جونی بھروسے کا بندہ تو ہے نا؟"

"سو فی صد بھروسے کا ہے۔" وہ قطعی لہجے میں بولا "میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ کام لے چکا ہوں۔ یہ اپنے کام کا ماہر ہے۔ اس نے آج تک مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔"

میں مطمئن ہو گیا "تب تو ٹھیک ہے!"

وسیم نے کہا "ایک اچھی بات یہ ہے کہ ہماری صورت وشن تبدیل ہو چکی ہے۔ اب ہم آزادی اور بے فکری سے باہر گھوم پھر سکتے ہیں۔"

"ضرور......ضرور۔" ہنگ نے اثبات میں گردن ہلائی "ہم تھوڑی دیر بعد اپارٹمنٹ سے نکلتے ہیں۔ کچھ کھائیں پئیں گے۔ پھر میں تم لوگوں سے رخصت ہو کر چائنا ٹاؤن کی طرف نکل جاؤں گا۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس لی "اس کا مطلب ہے ہم آج کی رات اس اپارٹمنٹ پر تمہارے بغیر گزاریں گے۔"

"ہاں۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا "تم کوئی پرابلم محسوس کر رہے ہو؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔"

ہنگ نے کہا "میں یہ گاڑی تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔ ٹرائی بیکا سے چائنا ٹاؤن زیادہ دور نہیں۔ میں ٹیکسی پکڑ کر چلا جاؤں گا اور صبح مسٹر جونی کی آمد سے قبل تمہارے پاس ہوں گا۔ اس اپارٹمنٹ میں تم لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"اوہ شیور۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔

وہ بولا "جونی صبح نو بجے یہاں پہنچے گا۔ میں ساڑھے آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔"

میں نے پوچھا "جونی کو اچانک کیا ایمرجنسی پیش آ گئی؟"

"دو روز بعد اس کی بیوی کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔" ہنگ نے بتایا "اس کے کیس میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ ابھی سات بجے ہنگامی بنیاد پر اس کا آپریشن کیا جا رہا ہے۔ زچہ اور بچہ کی سلامتی کے لیے ڈاکٹروں کے پینل نے فوری آپریشن کا فیصلہ دیا ہے اور جونی اس فیصلے کو ماننے پر مجبور ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں اپنی بیوی کے پاس ہے۔"

"پھر تو مجبوری ہے۔" میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

ہنگ بولا "ایک رات تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں نے تمہارے حلیوں کو اس صفائی سے بدلا ہے کہ مین ہیٹن میں اب تمہارے لیے خطرے والی کوئی بات نہیں رہی۔ تم دونوں ریلیکس انداز میں وقت گزار سکتے ہو۔"

وسیم نے کہا "ویسے ایک بات ہے......"

"کون سی بات؟" ہم نے بیک وقت پوچھا۔

ہم نے وسیم کی بات نہیں کاٹی تھی۔ دراصل اس نے ایک مختصر سا جملہ بولنے کے بعد خود ہی وقفہ دے دیا تھا۔ ہم یک زبان بڑی سرعت سے مستفسر ہوئے تو وہ قدرے خجل ہو گیا پھر تامل کرتے ہوئے بولا۔

"مسٹر جونی کا بچہ بہت لکی ہے۔"

"کیا تم اتنی دیر سے اس لیے خاموش بیٹھے تھے کہ جونی کے آنے والے بچے کے زائچے پر غور و فکر کر رہے تھے؟" میں نے وسیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔

"میں نے اس کا زائچہ تو نہیں بنایا مگر یہ کام میں کر سکتا ہوں۔"

"رئیلی!" ہنگ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "کیا تمہیں ہاروسکوپ (زائچہ) بنانا آتا ہے؟"

وسیم نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں یہی سمجھا کہ وہ کوئی سنجیدہ مذاق کرنے کے موڈ میں ہے "اگر تم نے آنے والے بچے کے ستاروں پر کمند نہیں ڈالی تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہت لکی ہے؟" میں نے بے یقینی کے سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"بھئی سیدھی سی بات ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولا "تھوڑی دیر بعد وہ بچہ اس دنیا میں آنکھ کھولنے والا ہے اور مسٹر جونی نے مسٹر ہنگ سے پچاس ہزار ڈالر کی ایک ڈیل کی ہے۔ یہ اس بچے کا نصیب ہی ہوا نا!"

"ویل سیڈ......ویل سیڈ۔" ہنگ نے بڑی شدت سے اثبات میں گردن ہلائی "مسٹر وسیم! تم نے بڑی گہری بات کی ہے۔" پھر پوچھا "کیا تم واقعی ہاروسکوپ کا علم جانتے ہو؟"

"ہاں میں نے اپنے ایک دوست سے یہ علم سیکھا ہے۔" وسیم نے سنجیدگی سے بتایا۔

"ٹھیک ہے میں کل تمہیں اپنے کوائف نوٹ کروا دوں گا۔" ہنگ نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا "تم وہاں نیو جرسی میں بیٹھ کر میرے ہاروسکوپ پر کام کرنا۔"

"مبارک ہو...... مستقبل کے آسٹرولوجسٹ صاحب۔" میں نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "کل سے تم پروفیسر سلمان ہوئے۔"

"شاید تم آسٹرولوجی والی میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو!"

"نہیں یار تم نے کہا اور میں نے یقین کر لیا۔" میں نے کہا "ذرا مسٹر ہنگ کے زائچے سے فارغ ہو جاؤ تو میرے....

ستاروں کی چال بھی دیکھ لینا۔ مجھے بتاؤ ساحل کب ملے گی؟''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔ اس جملے سے اس ڈوبنے والے شخص کا کرب جھلکتا تھا جو بیچ سمندر میں ناکام ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے یہ سوچ رہا ہو کہ اس کا ساحل اسے کب ملے گا!

میں اپنی ساحل کے حصول کے لیے دن رات ہاتھ پاؤں کو مصروف رکھے ہوئے تھا مگر میری ہر کوشش آخری مرحلے میں ناکام ہو جاتی تھی۔ میں ساحل کو حاصل کرتے کرتے کھو بیٹھتا تھا۔ تقدیر کی یہ آنکھ مچولی کافی عرصے سے جاری تھی اور میں نہیں جانتا تھا' کب تک جاری رہے گی!

جس طرح ڈوبتا ہوا شخص تنکے کو بھی سہارا سمجھ لیتا ہے بالکل اسی طرح پے در پے ناکامیابی کی وجہ سے وہ جملہ میرے منہ سے نکل گیا تھا کہ ستاروں کی چال کے مطابق میں کب ساحل کو حاصل کر سکوں گا۔

مایوسی ایک بہت بڑا گناہ ہے کیونکہ یہ منفی سوچ کو جنم دیتی ہے۔ میں زندگی میں کبھی مایوس نہیں ہوا مگر ساحل کی جدائی بھی کبھی مجھے اس کیفیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ درحقیقت یہ مایوسی نہیں بلکہ ایک افسردگی تھی...... افسردگی بھی تھی تو کیوں تھی؟

میں نے جھنجلا کر ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو جھٹک دیا تاہم وہ دونوں میری تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے دیگر موضوعات میں الجھا کر میرا دل بہلانے کی کوشش شروع کر دی۔ نادان یہ نہیں جانتے تھے' یہ الوکھا لاڈلا آسانی سے ماننے والا نہیں۔ اسے بھلا کون بہلا پایا ہے!

ٹھیک نو بجے ہم ہنگ کی گاڑی میں باہر نکل آئے۔ کھانے کا موڈ ہو رہا تھا۔ مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے ہنگ گاڑی کو گرین وچ اسٹریٹ اور فرینکلن اسٹریٹ کے سنگم پر لے آیا' پھر اس نے ''ٹرائی بیکا گرل'' کے سامنے گاڑی روک دی۔ اس ریسٹورنٹ میں ڈنر ہنگ کا مشورہ تھا۔ ٹرائی بیکا گرل (TRI BECA GRILL) کی تعریف و توصیف بیان کرتے ہوئے اس نے یہ بھی بتایا کہ مذکورہ ریسٹورنٹ ہالی ووڈ کے سپر اسٹار اور فلم میکر رابرٹ ڈی نیرو کی ملکیت ہے۔

دس بجے ہم ٹرائی بیکا گرل سے باہر نکل آئے۔ پروگرام کے مطابق گاڑی ہمارے پاس رہتی اور ہنگ ییلو میڈ یلین پکڑ کر چائنا ٹاؤن کی طرف نکل جاتا۔ بہ وقتِ رخصت میں نے یاد دہانی کے طور پر اس سے کہا۔

''مسٹر ہنگ! تمہارا موبائل گم ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کی کارروائی کو بھولنا نہیں۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا' 'اسی لیے میں نے سیل کو مسلسل آف رکھا ہوا ہے۔''

ہنگ ییلو کیب میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا تو ہم سلیٹی گاڑی میں واپس اپارٹمنٹ آ گئے۔ میں اس وقت اچھی خاصی نیند محسوس کر رہا تھا۔ گزشتہ رات کے آخری پہر' بلکہ آج صبح سونے کا بہت کم وقت ملا تھا اور ہنگامی حالات میں ہمیں شوگر ہل والے اپارٹمنٹ سے نکلنا پڑا تھا۔ وسیم کا حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ آج کا پورا دن بھاگ دوڑ میں گزرا تھا۔ بدن تھکن سے چور ہو رہا تھا لہٰذا ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے نیند پوری کرنا چاہیے۔ مسائل پر سوچنے اور انہیں حل کرنے کے لیے ساری عمر پڑی تھی!

خود کو نیند کی آغوش میں ڈالنے سے پہلے اپنوں کی خیریت معلوم کرنا ضروری تھا اور اپنوں میں سب سے زیادہ اپنا ساحل تھی۔ میں نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور تصور کی نگاہ کو ساحل کی جانب جھانکنے کی زحمت دی مگر اگلے ہی لمحے تصور کا پرندہ پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔ میں اپنی ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔

میں نے ہمت نہ ہاری اور کوشش پر کوشش کرتا چلا گیا لیکن پندرہ منٹ کی ناکامی کے بعد میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور دل ہی دل میں ربی موشے ہائمن کی مکاری کو کھری کھری سنانے لگا۔ اس عیار نے گویا مجھے باندھ کر ڈال دیا تھا۔

ربی کے دعوے کے مطابق' ساحل کو آج دوپہر (نیویارک کے وقت کے مطابق) اسرائیل پہنچنا تھا۔ اگر اس نے اسرائیل کے حوالے سے دروغ گوئی بھی کی تھی تو پھر بھی اب تک ساحل کسی منزل پر پہنچ چکی ہوگی۔ کہاں؟ اس بارے میں' میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں نیلگری کا خیال آ گیا۔ ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد پچھلے چوبیس گھنٹے میں' میں نے دو بار اسے محسوس کیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ میرے تصور کا دھوکا ہو۔ اگر یہ دھوکا بھی تھا تو بڑا ہی خوب صورت دھوکا تھا۔ میں نے اس کے نقرئی قہقہے اور کھنکتی ہوئی ہنسی کو بڑی وضاحت کے ساتھ سماعت کیا تھا۔

نیلگری کا خیال آتے ہی میں نے بیڈروم میں اس کی مخصوص خوشبو کو پایا۔ بے اختیار میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرا نیلگری کے وجود سے خالی تھا تاہم اس کی موجودگی کا

احساس' اس کے بدن کی منفرد مہک بیڈروم کے ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا' نیلگری ذرّوں میں تقسیم ہو کر کمرے کی فضا میں نفوذ کر چکی ہو۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی' ذرّے میں بھی آفتاب کو شرمانے کا فن جانتی تھی۔

میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز سوال نے سر اٹھایا۔ کیا نیلگری میرے آس پاس کہیں موجود ہے؟ یہ بڑا خطرناک سوال تھا کیونکہ اگر وہ کہیں موجود تھی تو دکھائی کیوں نہیں دے رہی تھی۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں نے جب بھی اس کے وجود کی مخصوص خوشبو محسوس کی' اگلے ہی لمحے وہ میرے سامنے حاضر ہوتی۔ یہ عجیب ڈھب کی اٹکھیلیاں میری سمجھ سے باہر تھیں۔

میں نے نیلگری کو ٹریس کرنے کے بارے میں سوچا۔ حالانکہ پہلے میری ایسی ہی ایک کوشش سراسر فیل ہو چکی تھی جب میں ہیئر آرٹسٹ کے سامنے ویڈال ساسون میں بیٹھا اپنے بالوں کو کرلی کروا رہا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں بند کیں اور تصور کی انگلی پکڑ کر نیلگری کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجہ حسبِ سابق برآمد ہوا۔ میری تھرڈ آئی نے نیلگری کا منظر اجاگر کرنے سے انکار کر دیا۔

ایسا ہوتا ہے۔ بااختیار شخص بھی بعض معمولی نوعیت کے معاملے میں بے اختیار ہو جاتا ہے۔ انسان کے ساتھ ایسا اتفاق ہو سکتا ہے کہ اس کی جیب نوٹوں سے بھری ہو اور وہ اس قسم کی واہیات مصروفیات میں پھنس جائے کہ اسے دن بھر کھانا کھانے کی فرصت نصیب نہ ہو۔ وہ بھری ہوئی جیب اور خالی پیٹ کے ساتھ پورا دن گزار دے۔

دو مسلسل ناکامیوں کے بعد مجھ پر کوفت سوار ہونے لگی۔ اسی کوفت نے نقلی دھدان کی موت کا منظر میری نگاہ میں روشن کر دیا۔ وہ بڑی عبرتناک اور بھیانک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کا یہ حشر میری ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ اگر وہ فتنہ پرور شیطان زادہ زندہ رہتا تو پتا نہیں کون کون سی آفت ڈھاتا' کیسی کیسی قیامت برپا کرتا اور کن کن فتنوں کو جنم دیتا۔ وہ پہلے ہی زبردست تھا۔ ربی کا ہاتھ لگنے سے میتل ہو گیا تھا۔ وہ کراچی میں میری ایک ساتھی صدف کو دھوکا دینے کی پوری کوشش کر چکا تھا۔ وہ تو میں نے صدف کو بروقت خبردار کر دیا ورنہ وہ تو اسے بالکل اصلی دھدان ہی سمجھ رہی تھی۔

صدف کا خیال آیا تو دل بے اختیار اسے دیکھنے کو مچلا۔ صدف کے ساتھ میں نے پاکستان میں بہت اچھا وقت...... گزارا تھا۔ وہ مجھ سے ہزاروں میل دور، ساڑھے دس گھنٹے کے وقتی تفاوت پر بیٹھی تھی۔ اس وقت نیویارک میں رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے جبکہ پاکستان میں آئندہ روز صبح کے دس بج رہے ہوں گے۔ میں فوری طور پر بہ نفسِ نفیس اس کے پاس پہنچ سکتا تھا لہٰذا تیسری آنکھ کا وسیلہ استعمال کیا اور صدف کے ماحول میں قدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ وہائٹ سی میں...... ایک روڈ سے گزر رہی تھی اور بہ خیر و عافیت تھی۔ میں نے کراچی میں قیام کے دوران میں تقریباً ساری بڑی چھوٹی سڑکیں دیکھ لی تھیں۔ دس منٹ تک صدف کو واچ کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میڈیکل کالج کی جانب جا رہی تھی پھر جب وہ اپنے کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی تو میں نے تصوراتی تعاقب کو توڑ کر واپسی کی راہ اختیار کی۔

صدف زندہ سلامت اور خیریت سے تھی لہٰذا میرے دل کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ میں نے سوچا' کل کسی وقت اسے فون کر کے دو باتیں کروں گا۔ افسوس بھی ہوا کہ ابھی تک مجھے اس کا خیال کیوں نہیں آیا تھا!

انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ اس کے پاس جو کچھ موجود ہوتا ہے، وہ اس سے بڑھ کر خواہش رکھتا ہے اور خواہشات کا یہ لامتناہی سلسلہ کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ تھرڈ آئی سے استفادہ کرتے ہوئے، میرے دل میں بھی یہ خواہش مچلتی تھی کہ کاش! میں جس ماحول کا حصہ بن جاتا ہوں وہاں موجود افراد کی آوازیں بھی سن سکوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے پنیل گلینڈ اور چی کے باہمی روابط سے باطنی آنکھ کی روشنی حاصل کی تھی اور اس روشنی میں، میں صرف دیکھ سکتا تھا۔ اگر میں پیچوٹری گلینڈ کو بھی چی کے تال میل سے متحرک کرنے کی کوشش میں لگ جاتا تو ساؤنڈ والا سیکشن بھی اوپن ہو سکتا تھا مگر محترم سانگ فو نے مجھے ایسی کسی کوشش کے لیے سختی سے منع کر دیا تھا...... اور میرے نزدیک مستند تھا، سانگ فو کا فرمایا ہوا!

سانگ فو کی یاد آئی تو ڈاکٹر مونگ ریفوشے کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ ہماری آخری ملاقات واشنگٹن اسٹیٹ کے شہر سیئٹل میں ہوئی تھی اور اب اس بات کو بھی چار دن گزر گئے تھے۔ ڈاکٹر مونگ، سانگ فو کی ہدایت پر چار روز پہلے کھٹمنڈو روانہ ہوا تھا۔ اسے بدھ نیل کنٹھ والی عبادت گاہ میں ربی کی سرگرمیوں کو روکنا تھا، اس نایاب اور بے بہا خزانے کی حفاظت کرنا تھی جو عبادت گاہ کے تہ خانے میں کئی برسوں سے سو رہا تھا۔ اس راز سے چند افراد ہی آگاہ تھے جن میں ساحل

اور میں شامل تھا۔ ربی ہاتھ دھو کر اور پنجے جھاڑ کر اس انمول خزانے کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ ساحل اور میرا اغوا اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ میں تو اس کی قید سے آزاد ہو گیا تھا تاہم ساحل ہنوز اس کے پنجۂ ستم کی اسیر تھی۔

میں نے ڈاکٹر مونگ کے خدوخال کو تیسری آنکھ کے سامنے ابھارا اور پلک جھپکتے میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ ہانپ رہا تھا اور مسلسل دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس منظر میں وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کا ہاتھ تھامے کوئی عورت بھی اپنی بساط کے مطابق دوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دور دور تک پہاڑی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اس سلسلۂ کوہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ کھٹمنڈو کے مضافات میں پھیلے ہوئے بلند و بالا پہاڑ تھے۔ انہی پہاڑوں میں سے ایک کے دامن میں بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ اپنا وجود رکھتی تھی۔ میں سانس روک کر اس منظر میں جذب ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

ڈاکٹر مونگ کی ساتھی عورت اس زاویے سے بھاگ رہی تھی کہ میں ابھی تک اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ پھر مجھے یہ موقع حاصل ہو گیا۔

اس عورت کا پاؤں الٹا اور وہ منہ کے بل پہاڑی زمین کی جانب آ رہی۔ ڈاکٹر مونگ نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا لہٰذا وہ گرنے سے محفوظ رہی۔

اسی لمحے ڈاکٹر مونگ نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا اور ایک جھٹکے سے اس عورت کو اپنی گود میں اٹھا لیا، اگلے ہی لمحے وہ اسے کسی ماں کی سی مہارت کے ساتھ پہلو سے چمٹائے دوبارہ دوڑنے لگا۔

اس عورت نے ڈاکٹر کے پہلو میں پہنچتے ہی اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔ میری تصوراتی نگاہ اس عورت کے چہرے پر گئی تو میں سناٹے میں آ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں، میری ساحل تھی!

میں نے بے اختیار ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساحل اور کھٹمنڈو کے مضافات میں! یہ کیسے ممکن ہے۔ اسے تو اس وقت اسرائیل میں ہونا چاہیے تھا یا پھر وہ جہاں بھی ہوتی، ربی کی کڑی نگرانی میں ہوتی۔

بعض اوقات آنکھوں دیکھی حقیقت پر بھی یقین نہیں آتا۔ میں بھی اس وقت کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ان متذبذب لمحات میں، میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا تھا۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور ڈاکٹر مونگ کے تصور کے پیچھے لپک گیا۔

منظر میں تھوڑی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ ساحل کا سر ہنوز ڈاکٹر کے کندھے پر ٹکا تھا اور ڈاکٹر آندھی طوفان کی رفتار سے بھاگ رہا تھا مگر اب ان کے تعاقب میں نصف درجن افراد بھی دوڑ رہے تھے۔ وہ سب کے سب خطرناک ہتھیاروں سے مسلح تھے اور آنِ واحد میں ڈاکٹر مونگ تک رسائی حاصل کرنے کے متمنی نظر آتے تھے۔

میں نے پہلے جب ڈاکٹر مونگ کو جھانکا تو وہ منظر ایسے تعاقبین کے شر سے پاک تھا۔ پتا نہیں، وہ بدبخت کہاں سے نمودار ہو کر ان کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ڈاکٹر انہی لوگوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے بھاگ رہا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ سب کے سب ڈاکٹر مونگ کے دشمن تھے۔ ساحل اس وقت ڈاکٹر کی تحویل میں تھی لہٰذا وہ یقینی طور پر اس کے بھی کھلے دشمن تھے۔

میں بے بسی اور بے چارگی کی انتہا پر کھڑا اپنا دماغ کھولا رہا تھا۔ نیویارک سے ہزاروں میل دور کھٹمنڈو کے مضافات میں، میں ان کی کیا مدد کر سکتا تھا! میری ساحل سفاک قاتلوں کے رحم و کرم پر تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ کیسی ستم ظریفی، کیسا غضب تھا؟

اسی لمحے اس سے بھی بڑا غضب ہو گیا۔

ڈاکٹر مونگ ساحل کو "سنبھالے" ایک پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ تعاقبین چالیس پچاس قدموں کی دوری پر اس کے پیچھے تھے۔ ڈاکٹر جہاں کھڑا تھا، وہ پہاڑی کا آخری کنارہ تھا۔ آگے بڑھنے کا مطلب یہ تھا، پہاڑ سے نیچے اترنا، پھر اس سے پیش تر کہ ڈاکٹر کسی فیصلے پر پہنچ کر کوئی عملی قدم اٹھاتا، تعاقبین نے اپنی گنوں کے دہانے کھول دیے۔

میں فائرنگ کی آواز سننے سے قاصر تھا۔ گنوں کی مخصوص حرکت نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ میرے ساتھیوں کو گولیوں سے بھوننے کی کوشش کر رہے ہیں...... یا پھر ڈاکٹر مونگ کے ردِعمل نے اس امر کی تصدیق کی کہ ان پر شدید قسم کی فائرنگ کی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر مونگ ساحل سمیت ہوا میں اچھلا اور پہاڑی کے نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ وہ فلائٹ فائٹ کا ماہر تھا مگر فلائنگ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ پہاڑی ہزاروں فٹ اونچی تھی لہٰذا وہ کسی طاقت ور پرندے کے مانند پرواز کرتے ہوئے زمین تک نہیں جا سکتا تھا۔ اسے لڑھکنا ہی تھا اور وہ ساحل کو ساتھ لیے بے دریغ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے پہاڑی سے نیچے آ رہا تھا اور...... وہ نصف درجن خون آشام بھیڑیے اپنی گنوں کو ان دونوں کے رخ پر رکھ کر مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔

اچانک لڑھکتے ہوئے دو پیوستہ بدن ایک جھٹکے سے رک گئے۔ یہ رکنا بڑا میکانکی تھا۔ ان کے بے حس و حرکت جسم دیکھ کر، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ خوں چکاں منظر میری تصوراتی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ بند آنکھوں کے پیچھے ایک تاریک چادر دور تک پھیلتی چلی گئی۔

میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔

اس وقت میرا دماغ کسی تنور کے مانند دہک رہا تھا۔ میں نے بستر چھوڑا اور ایک جھٹکے سے فون کی جانب لپک گیا۔ وہ سب حرکات میں سوچ سمجھ کر نہیں بلکہ ایک اضطرار میں بے اختیار کر رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، میں کیا کرنے والا ہوں۔ میرے دماغ کا کوئی حصہ ان ہنگامی حالات میں آٹو پر ٹیون ہو گیا تھا۔ اتنی رفتار سے سوچنا میرے بس میں نہیں تھا جتنی تیزی سے میں عمل کر رہا تھا۔

میں نے ریسیور اٹھا کر چائنا ٹاؤن میں ونگ ہنگ کے گھر کا نمبر ملایا۔ تیسری گھنٹی پر دوسری جانب کال ریسیو کر لی گئی۔ مجھے ائرپیس میں مسٹر ہنگ کی "ہیلو" سنائی دی۔

"ہاں ہنگ! تمہارے پاس ڈاکٹر مونگ کا کوئی رابطہ نمبر ہے؟" میں نے چھوٹتے ہی کہا۔

"اس کا سیل نمبر ہے میرے پاس۔" وہ فکرمندی سے بولا "کیوں، کیا ہو گیا؟"

"تم فوری طور پر اس کا سیل نمبر دہراؤ۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی وجدان؟"

"میں نے کہا نا، مونگ کا سیل نمبر دہراؤ۔" میرے لہجے میں سنگینی اتر آئی تھی "فضول باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔"

وہ بحث میں پڑے بغیر مصلحت آمیز لہجے میں بولا "ٹھہرو، میں فون انڈیکس میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔"

ایک منٹ کے لیے ہمارے درمیان خاموشی کی دبیز تہ ابھر آئی۔ یہ ایک منٹ میری زندگی کا طویل ترین منٹ تھا۔ لمحات نے اس ایک منٹ میں ایک ہزار صدیاں گزاریں اور ان صدیوں کا بیتنے والا ایک ایک لمحہ میرے دل پر ایک تیر برسا گیا۔ میرے روح کو اتنے ہی نشتروں نے گھائل کیا۔ میں اس وقت اپنی زندگی کے سب سے عذاب ناک لمحات سے دوچار تھا۔

ہنگ کی مخصوص آواز ائرپیس میں ابھری تو میں ریڈ الرٹ ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر مونگ کا سیل نمبر دہرایا۔ میں نے پلک جھپکتے میں وہ نمبر اپنی یادداشت میں نقش کیا اور پوچھا۔

"کیا اس اپارٹمنٹ کے فون سے میں یہ سیل نمبر ڈائل کر سکتا ہوں؟"

"بالکل کر سکتے ہو۔" ہنگ کی الجھنوں کے بوجھ تلے دبی آواز ابھری "وجدان! پلیز کچھ تو بتاؤ، آخر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔"

"قیامتِ کبریٰ سمجھ لو۔" میں نے یہ کہتے ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

میں مانتا ہوں، ہنگ کے ساتھ مجھے اس رویے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں بھی کیا کرتا، حالات کا دھارا میرے ساتھ کون سا رویہ اپنائے ہوئے تھا۔ میری روح گولیوں کی بوچھاڑ میں میری منتظر تھی اور میں...... میں......!

میں نے ذہن میں نقش ڈاکٹر مونگ کے سیل نمبر کو اس فون سے ملایا۔ اگلے ہی لمحے اس کے سیل پر گھنٹی جانے لگی۔ میں دھڑکن روک کر فون اٹینڈ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن اس طرف گھنٹی تو مسلسل جا رہی تھی مگر سیل کو کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

"کیا ڈاکٹر مونگ اب اس قابل نہیں رہا کہ موبائل کا ایک ننھا سا بٹن بھی دبا سکے؟"

اس روح کش سوال نے میری جان نکال دی کیونکہ اس سوال کے ساتھ ہی ایک اور روح فرسا سوال بھی نتھی تھا...... اگر ڈاکٹر مونگ...... تو کیا ساحل بھی......؟

اسی لمحے بیڈروم میں گہری تاریکی چھا گئی۔ نیویارک میں لائٹ جانے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہاں صارفین اپنے ہاتھ ہی سے سوئچ آف کر کے لائٹ بجھاتے ہیں۔ ہمارے اپارٹمنٹ کی لائٹ چلی گئی تھی تو اس کا یہی مطلب تھا، دانستہ اس سپلائی کو کاٹا گیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ دشمن لائٹ کاٹنے کے بعد دبے پاؤں میرا گلا کاٹنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہو۔

میں نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی تاریکی میں بیڈروم کے دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ برابر والے بیڈروم میں سے ایک دردناک انسانی چیخ بلند ہوئی۔ اس بیڈروم میں وسیم سو رہا تھا، یہ چیخ اسی کی ہو سکتی تھی۔

وہ چیخ اتنی بھیانک اور الم ناک تھی جیسے کسی جانور کو کند چھری سے بے دریغ ذبح کر دیا گیا ہو۔

میں اپنے من من وزنی پاؤں پر ساکت کھڑا رہ گیا!

تاریکی اور سکوت' موت کی علامات ہیں!

نادیدہ موت اس اپارٹمنٹ میں قدم رکھ چکی تھی۔ اگر میں گھپ اندھیرے میں ساکت کھڑا رہ جاتا تو مجھ تک رسائی حاصل کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہ آتی مگر میں اتنی آسانی سے اس کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ یہ تو راضی خوشی خود کو موت کے حوالے کرنے والی بات ہوتی۔

ایسے نازک حالات میں عموماً انسان اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے لیکن اس ناگہانی صورتِ حال نے میرے دماغ کو حد سے زیادہ مستعد کر دیا۔ دروازے کے ہینڈل پر جما ہوا میرا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور میں ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اگلے ہی لمحے اس کے عقب میں پناہ گزیں ہو گیا۔

اب اس بیڈروم میں داخل ہونے والے مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تاریکی آنکھ کی راہ میں سب سے بڑی مزاحمت تھی پھر دروازے کی اوٹ نے مجھے دُہرا محفوظ کر دیا تھا۔ اس آڑ میں پہنچتے ہی میں نے آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کے توسط سے وسیم کے ماحول میں قدم رکھ دیا۔

وہ بیڈروم بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں کی موہوم حرکات وسکنات نے مجھے باور کرایا کہ وسیم تین چار افراد کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ اندھیرے کے باعث وہ لوگ مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہ میرا تصوراتی قیاس تھا کہ وسیم ان سے بری طرح پٹ رہا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ وسیم تو انہیں دیکھ نہیں پا رہا تھا مگر حملہ آور اسے اس اندھیرے میں بھی بہ خوبی دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے اپنی آنکھوں پر اینٹی ڈارک لینس یا پھر اینٹی ڈارک گاگلز لگائے ہوئے تھے!

یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ میں دروازے کی اوٹ میں کسی خاموش تماشائی کی طرح کھڑا وسیم کو پٹتے ہوئے نہیں ''دیکھ'' سکتا تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک کسی حملہ آور نے میرے بیڈروم کا رخ کیوں نہیں کیا تھا؟

میں نے وسیم کی مدد کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میری یہ حیرت دور ہو گئی۔ میں جیسے ہی دروازے کی آڑ سے نکل کر بیڈروم سے باہر آیا' دو افراد سے خوف ناک تصادم ہو گیا۔ وہ دوڑتے ہوئے اس بیڈروم کی طرف آئے تھے لہٰذا اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہم تینوں بیڈروم کے اندر آ گرے۔

یہ میرا اندازہ تھا کہ مجھ سے ٹکرانے والے افراد کی تعداد دو تھی ورنہ میں گہری تاریکی میں انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔ فرش پر گرنے کے بعد' اٹھنے میں' میں نے ایک لمحے کی تاخیر نہ کی۔ لمحے کا دسواں حصہ بھی ہاتھ سے نکل جاتا تو شدید نقصان کا اندیشہ تھا۔ میں نے بیک پش کی مدد سے ایک فعال ہینڈ اسپرنگ لگایا اور اچھل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

میں نہیں جانتا تھا' مجھ سے ٹکرانے والے کس پوزیشن میں تھے۔ میں نے کھڑے ہوتے ہی حفظِ ماتقدم کے طور پر لیفٹ رائٹ دو کریسنٹ ککس چلا دیں۔ میری دونوں ککس خالی گئیں۔ اس سے ثابت ہوا حملہ آور ابھی سنبھلنے نہیں پائے تھے۔ عین ممکن تھا وہ ابھی تک بیڈروم کے فرش پر ہی پڑے ہوں۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کی حرکات وسکنات کو محسوس کرنے لگا۔

اگلے ہی لمحے میرا اندازہ غلط ثابت ہو گیا۔ ایک طاقت ور بازو عقب سے ''نمودار'' ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے میری گردن کو گرفت میں لے لیا۔ اس کی یہ حرکت اتنی بروقت اور نپی تلی تھی جیسے وہ دیکھ بھال کر میری جانب بڑھا ہو۔ اس کا یہی مطلب تھا' حملہ آور اس اندھیرے میں بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اینٹی ڈارک میکینکس والا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔

میں اپنی گردن کو چھڑانے کی تگ ودو میں مصروف تھا کہ دوسرے حملہ آور نے مجھے ٹانگوں سے دبوچ لیا پھر وہ مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے بیڈروم سے باہر لانے لگے۔ ان دونوں کے ایکشن میں اتنا ربط ضبط تھا جیسے وہ بخوبی ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔ ان کی گرفت میں بڑی مضبوطی تھی۔ اگر میں خود کو ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا تو پتا نہیں' وہ میرا کیا حشر کرتے!

میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے لہٰذا میں نے سر دست انہیں استعمال کیا۔ جس شخص نے میری گردن دبوچ رکھی تھی' میں نے اس کے پہلو میں ہاتھ ڈال دیے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دونوں ٹانگوں کو ایک جھٹکے سے سمیٹ لیا۔ اس جھٹکے نے اس شخص کو آگے جھکنے پر مجبور کر دیا جس نے میری ٹانگیں تھام رکھی تھیں۔ اسی لمحے میں نے پوری قوت سے کک مارنے والے انداز میں دونوں ٹانگوں کو کھول دیا۔ میری یہ حرکت ایک طوفانی ڈبل پش کک جیسی تھی۔

میرے پاؤں نے آگے پیچھے بجلی کی سی سرعت سے حرکت کی تو ٹانگیں اس شخص کی گرفت سے آزاد ہو گئیں۔ میں نے اسی لمحے' دوسرے شخص کے پہلو میں ہاتھوں کو مضبوطی سے استعمال کرتے ہوئے ایک جرک سے خود کو اوپر اٹھا لیا۔ میں اس کے سر پر پہنچا تو میں نے اس کے پہلو کو آزاد کرتے ہوئے ایک بیک سمر سالٹ لگایا اور اس کے عقب میں پہنچتے ہی ایک بیک کک جڑ دی۔

یہ بڑی زوردار کک تھی۔ وہ ایک اندازے کے مطابق رکوع کے بل جھکتے ہوئے آگے بڑھا ہو گا۔ پھر مجھے اس کے ٹکراؤ کی آواز سنائی دی تو یہ اندازہ درست نکلا۔ وہ اپنے ہی ساتھی سے متصادم ہو گیا تھا۔ یہ تصادم خاصا خطرناک ثابت ہوا کیونکہ اگلے ہی لمحے ان کی کراہیں میری سماعت تک پہنچیں۔ آواز اگرچہ بھنچی ہوئی تھی تاہم تکلیف ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

میں نے ان دونوں پر لعنت بھیجی اور لاؤنج کی جانب رینگ گیا۔ اصولی طور پر مجھے وسیم والے بیڈروم کی طرف جانا چاہیے تھا لیکن ان نازک لمحات میں میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال چمکا تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا لاؤنج داخلی دروازے کے قریب تھا اور لاؤنج کی ایک سلائیڈنگ ونڈو باہر کو کھلتی تھی۔ اگر میں مذکورہ کھڑکی کو سلائیڈ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اپارٹمنٹ کی اتھاہ تاریکی میں اجالے کی نقب لگائی جا سکتی تھی۔ اس طرح ہمیں بھی وہی آسانی میسر ہو جاتی جو اس وقت حملہ آوروں کو حاصل تھی۔ مجھے پورا یقین تھا' صرف ہمارے اپارٹمنٹ کی الیکٹرک سپلائی منقطع کی گئی تھی۔ ہمارے سوا وہ اپارٹمنٹس بلڈنگ اور پورا ٹرائی بیکا روشنی سے مستفید ہو رہا ہو گا۔

نہی خیالات کے ساتھ میں سلائیڈنگ ونڈو تک پہنچا اور پھر اگلے ہی لمحے میرے ہاتھوں کی حرکات نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی۔ کھڑکی کھلتے ہی لاؤنج میں ملگجا اجالا پھیل گیا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی محسوس ہوئی اور میں ایک جھٹکے سے پلٹ گیا۔

مجھ سے پٹنے والے وہ دونوں افراد میرے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ اب میں انہیں بہت واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ان کی آنکھوں پر مجھے سیاہ شیشوں والے گاگلز دکھائی دیے۔ یقینی طور پر یہ اینٹی ڈارک گاگلز تھے۔ ان گاگلز میں کمانی کے بجائے اسٹریپس لگے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ہاتھوں' زیر وزبر ہونے کے باوجود بھی مذکورہ گاگلز ان کے چہروں پر موجود تھے۔ اسٹریپس نے انہیں بڑی حفاظت سے سنبھال رکھا تھا۔

وہ دونوں بڑے خطرناک تیور سے میری جانب بڑھے۔ ایک کے ہاتھ میں مجھے سائیلنسر لگی گن صاف نظر آ رہی تھی۔ وسیم والے بیڈروم میں اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا حالات پیش آئے تھے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا تھا' یہی دونوں حملہ آور پہلے وسیم سے نبرد آزما تھے۔ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد میرے بیڈروم کی طرف آئے تھے۔ وسیم کی جانب چھائی خاموشی سے ظاہر ہوتا تھا' اسے زیر کرنے کے بعد ہی وہ میری سمت بڑھے تھے۔

''ہینڈز اپ!'' گن بردار نے کرخت لہجے میں کہا۔

اس کا ساتھی بڑی سرعت سے آگے بڑھا۔ میں نے گن بردار کی ''آنکھوں'' میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''کون ہو تم لوگ؟''

''ایف بی آئی!'' اس نے چمک کر کہا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔

وہ اپنی آنکھوں پر سے گاگلز ہٹاتے ہوئے بولا ''اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے؟''

اس کے لہجے سے حد درجہ حیرت جھلکتی تھی۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''ایف بی آئی والے یوں چوروں کی طرح کارروائی نہیں کرتے۔ یہ ملک کی ایک نہایت ہی طاقت ور ایجنسی ہے۔ اس سے متعلق افراد بڑے شان دار طریقے سے موقع پر پہنچتے ہیں اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی آئی ڈی شو کرتے ہیں۔ تم نے اپنی شناخت نہیں کرائی'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے زہریلے انداز میں کہا ''کیا ایف بی آئی نے تمہیں آئی ڈی کارڈز جاری نہیں کیے؟''

اس دوران میں گن بردار کا ساتھی میرے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کا انداز بتاتا تھا وہ میری جامہ تلاشی کا ارادہ رکھتا تھا۔ گن بردار سے میری مکالمت نے اسے لمحاتی مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوالیہ نظر سے گن بردار کو تکنے لگا۔ گن بردار کی دیکھا دیکھی اس نے بھی سیاہ گاگلز کو آنکھوں پر سے ہٹا دیا تھا۔

گن بردار مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''ہم اپنی آئی ڈی بعد میں شو کریں گے' پہلے ذرا آپ دونوں کا حدود اربعہ معلوم کر لیں۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے ساتھی کو تحکمانہ اشارہ کیا۔

اس اشارے کا واضح مطلب یہی تھا' وہ میری تلاشی کا کام شروع کر دے۔

میں نے اس موقع پر بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ میں نے بڑی شرافت سے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ وہ یہی سمجھے میں ان کی ایف بی آئی والی دھونس میں آ گیا ہوں۔ ویسے میں ان لمحات میں یہ حتمی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ وہ اصلی ایف بی آئی والے ہیں یا اس آڑ میں کسی خفیہ مشن پر ہیں۔ گن بردار اس دوران میں وقفے وقفے سے اپنی رسٹ واچ پر بھی نگاہ ڈال رہا تھا۔ اس کا انداز بتاتا تھا' انہیں واپسی

کی جلدی ہے۔

میری تلاشی کی غرض سے آگے بڑھنے والا شخص جب مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر پہنچا تو میں شرافت اور مرعوبیت کے لبادے کو ایک طرف پھینک کر حرکت میں آ گیا۔ میرا یہ فوری اور غیر متوقع ردِعمل ان کے لیے بوکھلاہٹ کا باعث بن گیا۔

اس شخص نے تحکمانہ انداز میں صرف ایک مختصر سا جملہ ادا کیا ''اباؤٹ ٹرن!''

میں بجلی کی سی سرعت سے ایک ایڑی پر گھوما اور اسی اثنا میں دوسری ٹانگ چلا دی۔ میری برق رفتار بیک پش کک اس شخص کے سینے پر پڑی۔ میں اپنی ہی جھونک میں تھوڑا آگے آیا اور سامنے والی دیوار سے ہینڈ پش لے کر ترچھی ڈبل بیک فلیک لگا دی۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی حرکات کا زاویہ ایسا رکھا تھا کہ ان دونوں کے پہلو میں نکل جاؤں تاکہ گن بردار اگر فائر کرے تو میں کسی نقصان سے محفوظ رہوں۔

مجھے اپنے مقصد میں کامیابی تو حاصل ہوئی لیکن اسی دوران میں فائر کی مخصوص ''ٹھک'' بھی سنائی دی۔ مجھ سے کک کھانے والا بیک گیئر میں سفر کرتے ہوئے اپنے گن بردار ساتھی سے جا ٹکرایا تھا اور شاید اسی ٹکراؤ کے نتیجے میں گولی چل گئی تھی تاہم میں اپنی حکمتِ عملی کے باعث کسی قسم کے نقصان سے محفوظ رہا۔ گن کی نال پر سائیلنسر لگا ہوا تھا لہٰذا وہ مخصوص ''ٹھک'' اس اپارٹمنٹ سے باہر نہ جا سکی۔

قدموں پر کھڑے ہوتے ہی میں نے پُراسرار دشمنوں کا جائزہ لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے لاؤنج کے فرش پر پڑے تھے۔ میں تیزی سے ان کی جانب بڑھا اور اسی لمحے میری نگاہ گن بردار کے ہاتھ پر گئی۔ وہ گن سیدھی کرتے ہوئے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا۔

میں چیتے کے مانند اس کی طرف لپکا اور اس کے گن والے ہاتھ پر اپنے بوٹ کی کاری ضرب لگائی۔ ادھر اس کے ہاتھ سے گن نکلی' ادھر اس کے حلق سے کرب ناک سسکاری برآمد ہوئی۔ میں اس گن پر قبضہ کرنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ مضروب کے ساتھی نے یہ کارنامہ انجام دے ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک لمبی رولنگ کرتے ہوئے مجھ سے پانچ قدم کی دوری پر چلا گیا۔

میں نے پلک جھپکتے میں اس کے خطرناک ارادے کو بھانپ لیا۔ وہ دور جا کر مجھے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ میں نے مضروب شخص کے چہرے پر ایک فٹ بال کک رسید کی اور دو بیک فلیک لگاتے ہوئے گن بردار کے قریب پہنچ گیا۔ میری یہ حرکت اس کے لیے خلافِ توقع تھی۔ مجھے نزدیک آنے کے بجائے اس سے دور بھاگنا چاہیے تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے بوکھلا گیا۔ یہ لمحہ میرے لیے ایک صدی کے برابر تھا۔ میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑی تیزی سے ایک کریسنٹ کک چلا دی۔ کک اس کے گن بردار ہاتھ پر لگی۔ گن نے مخصوص ٹھک کے ساتھ ایک گولی اگلی۔

میں اب بھی بالکل محفوظ رہا۔ اس نے میری کھوپڑی میں ہوادان بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن بھلا ہو کریسنٹ کک کا۔ اس کک کے دوران میں جسم کا بالائی حصہ پینتالیس درجے کے زاویے پر پیچھے کو جھک جاتا ہے۔ گولی میرے سر کے ایک فٹ اوپر سے گزر گئی۔

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور کریسنٹ کی تکمیل پر جیسے ہی میرا پاؤں زمین پر آیا' میں نے فرنٹ فٹ پر حرکت کی اور اندر آتے ہوئے گن پر جھپٹا مارا۔ ردِعمل کے طور پر اس نے اپنے گن بردار ہاتھ کو پیچھے کھینچا۔ میں نے لپک کر اس کی گردن پر ہاتھ ڈالے اور گھٹنوں کی پے در پے ٹھوکریں اس کے پیٹ کی زیریں حصے پر برسانا شروع کر دیں۔

وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ اس افتاد کے دوران میں اسے گن استعمال کرنے کا ہوش نہ رہا۔ میں نے اس کی تکلیف کی پروا کیے بغیر اپنی کارروائی جاری رکھی اور بالآخر تھرو مار کر اسے اپنے اوپر سے پیچھے اچھال دیا۔

اس نے ہاتھ پاؤں جھٹکتے ہوئے فضا میں بے ڈھنگی پرواز کی اور لینڈنگ کے لیے اپنے زمین بوس ساتھی کا انتخاب کیا۔ اس ''لینڈنگ'' نے ان دونوں پر جو قیامت ڈھائی' وہ بیان سے باہر ہے۔ پرواز کے دوران میں گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اِدھر اُدھر ہو گئی تھی۔ میں اچھل کر ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔

وہ فرش پر سے اٹھنے کی کوشش میں تھے۔ میں نے یکے بعد دیگرے ان کے تھوبڑوں پر ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ مضروب چہروں کو تھام کر پیچھے کو الٹ گئے۔ میں آگے بڑھا اور ہاتھ پاؤں کی ضربات سے انہیں روئی کے مانند دھنک کر رکھ دیا۔ دو منٹ کے بعد وہ میرے قدموں میں پڑے ہانپ رہے تھے۔

میں نے سرسری انداز میں ان کی تلاشی لی۔ ایک کی گن نے اپنا کردار ادا کر دیا تھا۔ دوسرے کی گن کو میں نے اس کے لباس میں سے برآمد کر لیا۔ اس تلاشی میں ان کے سروس کارڈز بھی میرے ہتھے لگ گئے جن پر نگاہ پڑتے ہی میں جان

گیا‘ ان کا تعلق ایف بی آئی سے تھا۔

یہ ایک سنسنی خیز انکشاف تھا۔ اصلی اور نقلی کے چکر میں پڑے بغیر اگر وہ واقعی ایف بی آئی والے تھے تو پھر حالات کی سنگینی ہزار گنا بڑھ جاتی تھی۔ میں ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے اس بیڈروم میں لے آیا جہاں وسیم کو ہونا چاہیے تھا۔

میرے استفسار پر زیرِدام آئے ہوئے ایف بی آئی کے دونوں ایجنٹوں کو بتانا پڑا کہ انہوں نے ہمارے اپارٹمنٹ کی لائٹ کے ساتھ کیا کیا تھا۔ ان کی نشان دہی پر میں نے مین سوئچ آن کیا تو اپارٹمنٹ میں بجلی کی فراہمی بحال ہوگئی۔ ہمیں شکار کرنے کے لیے انہوں نے مین سوئچ کو آف کر دیا تھا۔

وسیم نیم بے ہوش تھا تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ اس کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد میں ایف بی آئی والوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس دوران میں‘ میں ان کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور کہا۔

”اس بات کا فیصلہ تو میں بعد میں کروں گا کہ تم ایف بی آئی والے ہو بھی یا نہیں، تمہارے سروس کارڈز اور گنز میرے قبضے میں ہیں جو تمہاری شناخت کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔“ اپارٹمنٹ کی بجلی بحال ہوتے ہی میں نے ”کھوئی ہوئی“ گن بھی ڈھونڈ لی تھی“ فی الحال اتنا بتاؤ کہ اس اپارٹمنٹ میں تم کیسے اور کس مقصد سے داخل ہوئے تھے۔ ہم سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟“

ایک نے نفرت انگیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے جواب دیا ”دوستی اور دشمنی کا ہمیں پتا نہیں۔ ہم صرف احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔“

”کس کے احکام کی؟“

”اپنے سینئرز کے احکام کی۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے تم شرافت سے زبان نہیں کھولو گے۔“ میں نے زہر خند انداز میں کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنے مخاطب کے قدموں میں ایک فائر کر دیا۔

اس گن پر بھی سائیلنسر موجود تھا۔ مخصوص ٹھک اس کی تیز چیخ میں فنا ہو کر رہ گئی۔ خاموش گولی نے اس کے پاؤں کا خانہ خراب کر دیا تھا۔ میں نے وحشت ناک لہجے میں کہا۔

”اگر تم لوگوں نے میرے سوالات کے درست جواب فراہم نہ کیے تو اگلی گولی تم میں سے ایک کے سینے میں اترے گی۔ اس کے بعد دوسرے کی باری آئے گی!“

میرے لہجے کی سنگینی نے انہیں باور کرا دیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنے میں بھی کسی تاخیر سے کام نہیں لوں گا۔ میں نے جس کے پاؤں کا کباڑا کیا تھا وہ معاندانہ نظر سے مجھے تکتا رہا۔ دوسرے نے کہا۔

”ہمیں حکم دیا گیا تھا‘ ہم تم دونوں کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کریں اور اگر تمہاری ذات مشکوک ٹھہرے تو تمہیں فوراً گرفتار کر لیا جائے۔“

میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور کہا ”اصلیت جاننے کا یہ کون سا طریقہ ہے کہ تم نے اپارٹمنٹ کا مین سوئچ آف کر دیا اور ہمیں قابو کرنے کے لیے اپنی آنکھوں پر اینٹی ڈارک گاگلز چڑھا لیے؟“

میرے انکشاف نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں جس سے مخاطب تھا‘ اس نے روکھے لہجے میں کہا ”ہمارا کام کرنے کا اپنا ایک طریقہ ہے۔“

”اور میرا بھی اپنا ایک منفرد طریقہ ہے۔“ میں نے سفاکی سے کہا اور اس کے پاؤں کو نشانہ بنا کر ایک گولی داغ دی۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ میں نے کہا ”کہو میرا طریقۂ کار پسند آیا؟“

وہ مجھے بے نقط سنانے لگا۔ مغلظات کی اس برآمدگی پر میں نے ایک مرتبہ پھر ان کی ٹھکائی شروع کر دی۔ وہ تکلیف کے باعث کراہ رہے تھے‘ بلبلا رہے تھے مگر ان کے کس بل تھے کہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا دونوں گنز پر سائیلنسر فٹ تھے۔ میں نے باری باری ان کا بھرپور استعمال کیا اور ان کے کلپس کو ایف بی آئی کے ایجنٹوں کے ہاتھ پاؤں پر خالی کر دیا۔ مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ میں امریکا کی زمین پر اس کی ایک طاقتور ایجنسی کے دو ایجنٹوں کا کیا حشر کر رہا ہوں۔ ربی موشے ہائمن کے اشارۂ ابرو پر وہاں کی پولیس مجھے ”امریکا دشمن“ کا ٹائٹل دے چکی تھی۔ این وائے پی ڈی والے بڑی سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہے تھے اور بریکنگ نیوز کے ذریعے بار بار نیویارک کے عوام سے اپیل کی جا رہی تھی کہ میری گرفتاری یا مخبری کے سلسلے میں وہ پولیس سے بھرپور تعاون کریں۔ مجھ پر درجن بھر یہودیوں کے بہیمانہ قتل کا الزام عائد کیا جا رہا تھا۔ میں صحتِ الزام سے تو انکاری نہیں تھا مگر لفظ ”بہیمانہ“ پر مجھے سخت اعتراض تھا۔ یہ بہیمانہ نہیں بلکہ میرا امن پسندانہ اقدام تھا۔

ایف بی آئی کے دونوں ایجنٹ تکلیف کی شدت کے باعث دُہرے تہرے ہوئے جا رہے تھے۔ لاؤنج سے بیڈروم کی طرف آتے ہوئے میں نے سلائیڈنگ ونڈو کو بند کر دیا تھا چنانچہ ان دونوں مصیبت زدگان کی آہ و بکا اپارٹمنٹ سے باہر رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ بجلی کی فراہمی بحال ہو جانے کے بعد کھڑکی کا کھلا رہنا ضروری نہیں تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر ان دونوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میرے ایک ایک لفظ سے سنگینی اور سفاکی ٹپک رہی تھی۔

”تم نے دیکھ لیا‘ میں کس انداز میں کام کرنے کا عادی ہوں۔ میں تم دونوں کو ایک آخری موقع دے رہا ہوں۔ سچ سچ بتا دو‘ تم کیا سوچ کر اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے اور...... اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپارٹمنٹ کے اندر کیسے پہنچے۔ داخلی دروازہ تو میں نے لاک کر دیا تھا اور وہ ابھی تک لاک ہے؟“

لاؤنج میں ان پر سبقت حاصل کرنے کے بعد میں نے آنِ واحد میں تین کام کیے تھے۔ میں نے سائیلنسر لگی گن تلاش کی‘ سلائیڈنگ ونڈو کو بند کیا اور اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کو چیک کیا تھا مجھے جتنی شدومد سے تلاش کیا جا رہا تھا اس کے پیشِ نظر ذرا سی کوتاہی یا بے احتیاطی بھی کسی بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھی جب کہ وہ دونوں ایف بی آئی کے ایجنٹ ہونے کے بھی دعوے دار تھے۔ اس دوران میں وسیم کو ہوش آنے لگا اور یہ ایک صحت مند علامت تھی۔

میں اور وسیم تبدیل شدہ حلیوں میں تھے حتیٰ کہ ہم جو صورتیں لے کر اس اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے، وہ بھی اب کامیاب میک اپ کے پیچھے پناہ لے چکی تھیں۔ یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ ایف بی آئی کے وہ ایجنٹ وجدان کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے یا یہ کوئی دوسرا ہی معاملہ تھا!

ہاتھ پاؤں سے بے کار ہونے کے بعد انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اب بھی انہوں نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو میں انہیں ختم کرنے میں کسی حیل و حجت سے کام نہیں لوں گا چنانچہ ایک نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

”تم تینوں جب رات نو بجے اپارٹمنٹ سے نکلے تو ہم نے ”ٹرائی بیکا گرل“ تک تمہارا تعاقب کیا تھا۔ تم ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو ہم واپس آ کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ ہم اندر کیسے پہنچے! اس نوعیت کے کام ہمیں بہ خوبی آتے ہیں۔“

”اوہ!“ میں نے چونک کر اسے دیکھا ”تم نو سے ساڑھے گیارہ بجے تک اس اپارٹمنٹ میں چھپے بیٹھے رہے اور ہمیں خبر بھی نہ ہوسکی۔ خیر تم بتاؤ کارروائی کے لیے تم لوگوں نے اتنا انتظار کیوں کیا۔ تم ہمارے پاس آتے ہی سرگرمی دکھا سکتے تھے؟“

”اس کا حکم نہیں تھا۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا ”ہمیں خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی‘ ساڑھے گیارہ کے بعد ہم میدان میں اتریں۔“ بات ختم کرتے ہی اس نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

اس کے انداز میں چھپی بے چینی نے مجھے چونکا دیا۔ بے اختیار میری نظر دیوار گیر کلاک کی جانب اٹھ گئی۔ کلاک رات گیارہ پچاس کا وقت بتا رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں تاریکی چھانے سے لے کر اب تک صرف دس بارہ منٹ گزرے تھے۔ میں نے خود سے مخاطب شخص سے پوچھا۔

”اب یہ بھی بتا دو تم دونوں کو کس مقصد سے ہمارے پیچھے لگایا گیا تھا؟“

اس کے چہرے پر متامّلانہ تاثرات نمودار ہوئے تو میں نے اسے ایک ہیوی ڈوز دینا ضروری جانا۔ اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

”سچ بول کر تم اپنے لیے رعایت حاصل کر سکتے ہو اور یہ آخری موقع ہے۔ اس کے بعد میں تم دونوں کے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہوں وہ تمہارے تصور میں نہیں آ سکتا۔“

اس کی آنکھوں میں مجھے موت کے سائے لہراتے دکھائی دیے۔ اس دوران میں وسیم پوری طرح ہوش و حواس میں آچکا تھا اور اس نے محاذ کا دوسرا سرا تسلی بخش انداز میں سنبھال لیا تھا۔ ان دونوں بدبختوں نے اندھیرے کی آڑ میں اس کے ساتھ بڑا ظالم سلوک کیا تھا۔ وہ اس وقت بڑے خطرناک موڈ میں نظر آ رہا تھا۔ میں نے جس انداز میں صورتِ حال کو اپنے حق میں پھیرا‘ اس نے وسیم کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

میں نے جس سے سوال کیا تھا‘ وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم چاہے میری بات کا یقین کرو یا نہ کرو لیکن میں صرف اتنا کہوں گا ہمیں تم لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ہم محض یہ جانتے ہیں تم دونوں اپنی آئی ڈی تبدیل کرنے والے ہو۔ کوئی ایجنٹ آج کل تم سے رابطہ کرنے والا ہے۔ اس اپارٹمنٹ میں تمہارا قیام عارضی ہے۔ کاغذات بنتے ہی تم دونوں امریکا سے نکل جاؤ گے۔“

اس کے انکشافات بڑے سنسنی خیز تھے۔ ہماری آئی ڈی کی تبدیلی والی بات صرف چار افراد کو معلوم تھی۔ یعنی میں‘ وسیم‘ ونگ ہنگ اور مسٹر جونی جو ہمارے کاغذات تیار کرنے والا تھا۔ یہ راز اگر ایف بی آئی والوں تک پہنچا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا‘ انہی چار افراد میں سے کسی نے غداری کی تھی۔ مسٹر ہنگ میرے لیے بھروسے کا آدمی تھا۔ میں اور وسیم اپنے پاؤں پر اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ آجا کر مسٹر جونی ہی بچتا تھا۔ کیا اس نے ایف بی آئی

والوں کو ہمارے منصوبے کے بارے میں بتادیا تھا؟ جونی' مسٹر ہنگ کی نگاہ میں قابل اعتماد تھا لیکن میں جس قسم کے حالات سے دوچار تھا' ان میں کسی امریکی پر تو قطعاً اعتبار نہیں کرسکتا تھا۔ میرے حوالے سے مین ہیٹن میں جس قسم کی ایمرجنسی نافذ تھی اس میں کسی بھی اپ سیٹ کی توقع کی جاسکتی تھی۔

یہ تمام پُرتشویش خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے نہایت ہی چبھتے ہوئے لہجے میں ایف بی آئی ایجنٹ سے استفسار کیا" تم لوگوں کو یہ کیسے پتا چلا کہ ہم دونوں آئی ڈی تبدیل کرنے کے بعد امریکا سے نکلنے والے ہیں؟"

"ہمارے اپنے سورسز ہوتے ہیں۔" وہ نحیف سی آواز میں بولا اور ایک مرتبہ پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ اس نظر میں گہری تشویش پائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے تاثرات کا خصوصی نوٹس لیا۔ اس کے انداز سے اضطراب چھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی خاص لمحے کا انتظار ہو۔ میں نے وقت کے ایک ایک پل کا درست استعمال کرتے ہوئے کہا۔

"تم ظاہر نہ کرو مگر میں تمھیں بتاتا ہوں' تم لوگوں کی معلومات کا ذریعہ مسٹر جونی ہے وہ ایجنٹ جس کے توسط سے ہماری نئی آئی ڈی بننے والی ہے۔"

"تو گویا تم نے اپنی اصلیت ظاہر کرہی دی!" اس کی آواز میں کمزور سا تمسخر تھا۔

میں نے قطعی لہجے میں کہا" میں نے اپنی نہیں' مسٹر جونی کی اصلیت کھولی ہے۔ ویسے آپ لوگوں نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔"

اس نے حیرت بھری سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا مگر خاموش رہا۔

میں نے کہا" میں نے ایف بی آئی نامی اس ایجنسی کی بہت تعریف سنی تھی۔ ایک عالم اس سے خوف زدہ ہے مگر تمھاری کارکردگی کو دیکھ کر مجھے افسوس ہورہا ہے۔ کیا تم لوگ ایسی ہی سست رفتاری سے کام کرتے ہو؟"

اس نے جواب دینے سے قبل ایک مرتبہ پھر دستی گھڑی پر نظر ڈالی اور بولا" بہت جلد تمھیں ہماری کارکردگی اور رفتار کا اندازہ ہوجائے گا۔ ہم دو افراد کو زیر کرکے تم پتا نہیں کیا سمجھنے لگے ہو!"

"میں خود کو وہی سمجھ رہا ہوں جو ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا" تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ جان سکوں' ایف بی آئی والوں کو کس کی تلاش ہے۔ کیا وہ اس سرگرمی کے ذریعے وجدان یعنی مجھ تک پہنچنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ویسے مجھے اس کی امید نہیں تھی کیونکہ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ اتنی سست روی کا مظاہرہ نہ کرتے۔ میں تو اس وقت کا برننگ ٹاپک تھا۔ مجھے چھاپنے کے لیے محض دو ایجنٹ ناکافی تھے۔ اگر انھیں یہ شک تھا کہ آئی ڈی کی تبدیلی کے بعد امریکا سے نکلنے والے وسیم اور وجدان ہیں تو پھر وہ بھاری جمعیت کے ساتھ اس اپارٹمنٹ پر دھاوا بولتے۔ اس سلسلے میں وہ ایک لمحے ضائع کرنا بھی افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔

وہ تھوڑے تامل کے بعد بولا" میں نہیں جانتا تم کون ہو مگر اتنا مجھے معلوم ہے کہ تم ایک خطرناک دشمن ہو۔ تمھارے حالیہ عمل نے بھی یہ ثابت کردیا ہے کہ تم نہایت ہی سفاک ہو۔"

"میں ایف بی آئی اور سی آئی اے والوں سے زیادہ سفاک اور ظالم نہیں ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک مرتبہ پھر رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔

میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا" تمھیں کس کا انتظار ہے؟"

"ٹھیک پانچ منٹ بعد تمھیں تمھارے سوال کا جواب مل جائے گا۔"

اس وقت رات کے گیارہ پچپن ہوئے تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد کا مطلب تھا' عین رات کے بارہ بجے۔ اس کا انداز بتاتا تھا' بارہ بجے کوئی وہاں پہنچنے والا ہے اور...... یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ میرے پاس صرف پانچ منٹ تھے۔ اس قلیل وقفے میں مجھے اپنے بچاؤ کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا تھا۔

وہ دونوں ایجنٹ میرے لیے بیکار تھے۔ ویسے وہ فی الحال خود اپنے لیے بھی بیکار ہوچکے تھے۔ میں نے انھی کی گنوں کو استعمال کرکے ان کے ہاتھ پاؤں سے ایسی "مہندی" لگادی تھی کہ وہ کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے میں نے ان سے ونگ ہنگ کے بارے میں پوچھنا ضروری سمجھا۔

"ہم اپنے جس ساتھی کے ہمراہ ٹرائی بیکا گرل نامی ریسٹورنٹ میں گئے تھے' اس پر تم نے کوئی کام نہیں کیا؟"

وہ پلک جھپکتے میں میرے سوال کی غرض و غایت تک پہنچ گیا' ٹھوس لہجے میں بولا'' ہماری معلومات کے مطابق جونی اسی شخص کے ایما پر تمہاری نئی آئی ڈی تیار کرنے والا تھا۔ اوپر والے تمہارے ساتھی کے ساتھ کیا سلوک کریں گے ہم نہیں جانتے۔ ہمارے بڑوں نے اس کے بارے میں بھی کچھ سوچ ہی رکھا ہوگا۔ ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور غیر ضروری سوال نہیں کرتے۔ ہمارے لیے صرف یہی احکام تھے کہ تم دونوں کو قابو کریں اور بارہ بجے......''

اس نے اس انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ اس کے آخری الفاظ ''بارہ بجے'' نے مجھے بتا دیا تھا کہ چار پانچ منٹ بعد کچھ ہونے والا ہے۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ اسی اپارٹمنٹ میں ہونے والا ہے۔ میرے ہاتھ میں صرف چار منٹ کا وقت باقی تھا۔

اس شخص نے جونی اور آئی ڈی کی تبدیلی کا پُر وثوق ذکر کر کے اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ ہمارے سلسلے میں جونی ہی نے غداری کی تھی۔ اس حساب سے ونگ ہنگ کی ذات بھی خطرات میں گھری ہوئی تھی۔ اگر ایف بی آئی' آئی ڈی تبدیل کر کے امریکا سے نکلنے والوں میں دلچسپی لے رہی تھی تو پھر ان کے لیے ونگ ہنگ کی شخصیت بھی خالی از دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے میں نے مسٹر ہنگ سے آخری گفتگو کی تھی اور اس وقت تک وہ بخیر و عافیت تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ فوری طور پر مجھے مسٹر ہنگ سے رابطہ کرنا چاہیے۔ اسے یہاں پیش آنے والے حالات اور تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ کہیں وہ بے خبری ہی میں نہ مارا جاتا۔

میں نے نگاہ ہی نگاہ میں وسیم کو اشارہ کیا اور آئندہ دو منٹ کے اندر ہم نے ان دونوں ایف بی آئی ایجنٹ کو گھسیٹ کر ایک واش روم میں پہنچا دیا۔ وہ ہاتھ پاؤں سے بری طرح زخمی تھے۔ اپنے قدموں پر چل کر وہ اپارٹمنٹ سے باہر نہیں جا سکتے تھے تاہم احتیاط کے پیشِ نظر انہیں واش روم میں پہنچانے کے بعد میں نے دروازے کو لاک کر دیا۔ ان کے سروس آئی ڈی کارڈ اور گنز بھی میں نے واش روم کے فرش پر پھینک دیں۔ یہ سب میرے لیے بیکار تھا۔ ان سے متعلق اشیا انہیں کے پاس رہتیں تو زیادہ اچھا تھا۔ یہ وسیم والے بیڈ روم کا واش روم تھا۔ جب تک باہر سے اس واش روم کا دروازہ کھولا جاتا وہ وہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ٹیلی فون سیٹ کی جانب لپک گیا۔ میرے اور ایف بی آئی ایجنٹ کے درمیان ہونے والی تمام تر گفتگو وسیم نے بھی سنی تھی' تشویش بھرے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔

''وجدان! ہمیں فوری طور پر اس اپارٹمنٹ سے نکل جانا چاہیے۔ این وائے پی ڈی کے بعد اب ایف بی آئی بھی ہمارے پیچھے پڑ گئی ہے۔''

میں نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا'' مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے لیکن اپارٹمنٹ چھوڑنے سے پہلے میں ایک ضروری کال کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس کو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے ڈائلنگ مکمل کرنے کے بعد کہا'' مسٹر ہنگ کو۔''

وہ تفکر آمیز خاموش نظر سے مجھے تکنے لگا۔

ڈائلنگ کی تکمیل کے ساتھ ہی دوسری جانب گھنٹی بجنے لگی۔ یہ ونگ ہنگ کے گھر کا نمبر تھا۔ لگ بھگ آدھا گھنٹا پہلے اسی نمبر پر میری اس سے بات ہوئی تھی۔ میں نے ہنگ سے ڈاکٹر مونگ ریفو شے کا سیل نمبر لیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اور ساحل کو میں انتہائی غیر یقینی سچویشن میں چھوڑ کر آیا تھا۔ پتا نہیں وہ اب کس حال میں ہوں گے۔ ایف بی آئی والوں کی ''شیطانی'' نے مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں دی تھی کہ میں کھٹمنڈو کے مضافات میں ایک ''نگاہ'' ڈال سکتا اور...... ابھی تک حالات کی یہ ستم ظریفی جاری تھی۔ میرا ذہن اس وقت متعدد محاذوں پر نبرد آزما تھا۔

پانچویں گھنٹی پر دوسری جانب سے ریسیور اٹھا لیا گیا تھا پھر ائرپیس میں مجھے مسٹر ہنگ کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی'' ہیلو وجدان! کیا یہ تم ہو؟''

کالر آئی ڈی سے اس نے سمجھ لیا تھا' ٹرائی بیکا کے اپارٹمنٹ سے فون کیا جا رہا ہے۔ میں نے جواب میں کہا'' ہاں میں وجدان بات کر رہا ہوں۔ یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فون پر تفصیلی بات نہیں ہو سکتی۔ تم خیریت سے تو ہو؟''

''ابھی تک خیریت سے ہوں لیکن آئندہ کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''وہاں تمہاری طرف گڑبڑ ہو چکی ہے اور یہاں میری جانب ہونے والی ہے۔ تم فوری طور پر اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ دو۔ میں گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آ گیا۔ میں ریسیور رکھنے کے بعد عارضی طور پر اس رہائش گاہ کو چھوڑ رہا ہوں۔ تم ایک سیل نمبر نوٹ کر لو۔''

''ہاں بولو۔'' میں نے وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے کہا'' بارہ بجنے میں صرف ایک منٹ باقی تھا۔

اس نے مذکورہ نمبر دُہرایا۔ میں نے سرِ دست اس نمبر کو اپنے ذہن کے یادداشتی خانے میں فیڈ کر لیا۔ وہ بولا'' یہ میرے ایک پرائیوٹ سیل کا نمبر ہے۔ تم اس نمبر پر بعد میں مجھ سے رابطہ کرنا۔ اوکے بائے...... گڈ نائٹ!''

میں نے بھی جواب میں اسے گڈ نائٹ کہا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ میرا یہ رات کا سلام اس تک پہنچا ہوگا کیونکہ اسی لمحے ہنگ نے ریسیور کریڈل کر دیا تھا۔

مسٹر ہنگ سے ہونے والی اس مختصر گفتگو سے پتا چلا کہ اس کی طرف بھی ایف آئی والوں نے کوئی کارروائی ڈال دی تھی یا پھر ڈالنے والے تھے۔ ہنگ نے مختلف مراحل میں ہماری بھرپور مدد کی تھی اور جونی والا معاملہ تو بالکل تازہ تھا۔ ہمارے ڈاکومینٹس والی ڈیل ہنگ ہی کے توسط سے مسٹر جونی سے ہوئی تھی۔ اگر ایف بی آئی والے ''وجدان'' کی تلاش میں نہیں بھی تھے تو بھی یہ صورتِ حالات ہم سب کے لیے انتہائی خطرناک تھی۔ آنے والے لمحات سنگین سے سنگین تر ثابت ہو سکتے تھے۔

ہم نے اپنے ضروری سامان کو ایک بیگ میں بھرا اور بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میں گاڑی اور اپارٹمنٹ کی چابیاں اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ میں اپارٹمنٹ کو لاک کر کے جانا چاہتا تھا اور فرار کے لیے ہمیں ایک گاڑی کی ضرورت بھی تھی۔

ہم بیرونی دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ آدھی رات کو ہم سے ملنے وہاں کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ آنے والے یقیناً انہی کے ساتھی تھے جنہیں میں نے واش روم میں بند کر دیا تھا۔

میں دروازہ کھول کر ایف بی آئی والوں کو ''ویلکم'' نہیں کر سکتا تھا۔ یہ...... آبیل مجھے مار والی بات ہوتی۔ میں نے وسیم کو اشارہ کیا اور اپنے بیڈ روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔ اس دوران میں ایک مرتبہ پھر گھنٹی بج اٹھی۔ باہر جو کوئی بھی تھا' ایک خاص انداز میں بٹن دبا رہا تھا جیسے اندر موجود افراد کو کوئی اشارہ دے رہا ہو۔ ایسی اشارے بازی کرنے والا ہمارا ملاقاتی نہیں ہو سکتا تھا!

وہ اپارٹمنٹ' بلڈنگ کے فرسٹ فلور پر واقع تھا۔ میں نے بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی دروازے کو اندر سے لاک کر دیا۔ وسیم نے پوچھا۔

''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ہم اس بلڈنگ سے فرار ہو رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور سلائیڈنگ ونڈو کی سمت بڑھ گیا۔

میرے بیڈ روم کی ایک کھڑکی عمارت کی عقبی جانب کھلتی تھی۔ میں آمد و شد کا روایتی راستہ اختیار کر کے خود کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔ ان نازک لمحات میں ہمیں وہ راہ اپنانا تھی جو غیر روایتی ہو۔ وہ چاہے کتنی بھی پُرخطر کیوں نہ ہو لیکن اس راہ پر چلتے ہوئے ایف بی آئی والوں سے ٹکراؤ کا اندیشہ نہ ہو!

میں نے پردہ ہٹا کر ونڈو کو سلائیڈ کیا اور جھک کر باہر جھانکنے لگا۔ عمارت کی عقبی جانب مجھے سکون کے آثار دکھائی دیے۔ ہر طرف امن اور خاموشی تھی۔ اگر ہم فرسٹ فلور کے اس اپارٹمنٹ سے کسی طرح زمین پر پہنچ جاتے تو ایف بی آئی والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔

میں جیسے ہی سیدھا ہوا' وسیم نے متذبذب لہجے میں کہا'' کیا تم اس کھڑکی کے راستے نیچے پہنچنا چاہتے ہو؟''

''اور کوئی ذریعہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا'' اور نہ ہی کوئی نیا ذریعہ تلاش کرنے کا وقت ہے۔ اگر ہم چند منٹ مزید یہاں رک گئے تو بے موت مارے جائیں گے۔ گھنٹی بجانے والے ہماری جانب سے کوئی ردِعمل نہ پا کر شرافت سے واپس نہیں چلے جائیں گے۔ وہ اپارٹمنٹ کا دروازہ توڑ کر بھی اندر داخل ہو سکتے ہیں!''

ادھر میری بات ختم ہوئی' ادھر اپارٹمنٹ کے باہر فائر کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی دھاڑ سے دروازہ کھلنے کی صدا ابھری۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں اندازہ لگا لیا' پہلے فائر کر کے دروازے کا لاک توڑا گیا تھا' ازاں بعد دروازہ کھول کر وہ اندر گھسے ہوں گے۔ عین ممکن تھا وہ یہی عمل اس بیڈ روم کے دروازے کے ساتھ بھی دُہرائیں۔ ایف بی آئی والوں کے پاس گولیوں کی کمی تھی اور نہ ہی اختیارات کی!

وسیم نے بیگ کے اسٹریپ کو گردن کے اوپر سے گھما کر کندھے پر لٹکا لیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا'' چلو وجدان! میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

ہم یکے بعد دیگرے سلائیڈنگ ونڈو سے باہر نکلے۔ وہ ونڈو زمین سے کم و بیش پندرہ فٹ کی بلندی پر واقع تھی۔ یہاں سے ایک مخصوص ٹیکنیک کے ذریعے ہم بہ آسانی عمارت کے عقب میں پہنچ سکتے تھے۔ شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کی تربیت کے دوران میں مجھے اس ٹیکنیک کی پریکٹس بھی کرائی گئی تھی۔ یہ ایک طرح کی سلائیڈنگ تھی جو ہاتھوں پر دستانے ہونے کی صورت میں زیادہ سہل اور محفوظ سمجھی جاتی تھی۔ بہرحال' ایمرجنسی میں ہمیں دستانوں کے بغیر ہی کام

چلانا تھا۔

میں نے ونڈو کے نچلے حصے پر دونوں ہاتھ جمائے اور باڈی کو نیچے لٹکا دیا۔ میرا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ گویا پندرہ فٹ کی بلندی میں لگ بھگ سات فٹ کی کمی واقع ہوگئی ایک فٹ کی کسر بازوؤں نے پوری کر دی تھی۔

میں نے دیوار کے ساتھ دونوں ہتھیلیوں کو جماتے ہوئے جسم کو آزاد چھوڑ دیا۔ اس دوران میں میری تمام تر توجہ اس پش پر تھی جو میں ہتھیلیوں کے ذریعے دیوار پر منتقل کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں زمین پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے ایک خوف ناک فائر کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں نے بے ساختہ گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وسیم بھی میرے انداز میں کھڑکی سے نیچے لٹک رہا تھا لیکن ابھی اس نے سلائیڈنگ شروع نہیں کی تھی۔ فائر کی آواز نے اسے گڑبڑا دیا اور وہ پھسلنے کے بجائے کودنے والے انداز میں نیچے کو آیا۔

اس دوران میں، میں اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ وسیم جس بے ڈھب انداز میں نیچے آیا تھا اس میں اسے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگ گئے اور اسی مہلت میں، میں نے کھلی ہوئی کھڑکی میں ایک شخص کا چہرہ نمودار ہوتے دیکھا۔

اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ چند لمحے پہلے میں نے فائر کی جو آواز سنی تھی اس گولی کے ذریعے بیڈروم کے دروازے کا لاک توڑا گیا تھا۔

میں نے کھڑکی میں نمودار ہونے والے چہرے میں حرکت محسوس کی اور دوسرے ہی لمحے ایک گن بردار ہاتھ بھی میری نگاہ میں آ گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ہمیں نشانۂ اجل بنانے والا تھا۔

میں نے چیخ کر وسیم کو پکارا ''بھاگو!''

اس سے پہلے کہ وسیم اٹھ کر میرا ساتھ دیتا، کھڑکی میں نمودار ہونے والے شخص نے گولی داغ دی۔ میں اس دوران میں ایک سمت دوڑ لگا چکا تھا۔ فائر کی مخصوص آواز سنتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔

وسیم ایک بازو کو تھامے ہوئے میری سمت آ رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ گولی اس کے بازو میں لگی تھی۔ اس موقع پر وسیم نے حواس باختہ ہونے کے بجائے بڑی بہادری اور ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ اور ترچھا دوڑتے ہوئے میرے قریب پہنچ گیا۔ پھر ہم نے ایک سمت میں بھاگنا شروع کر دیا۔

اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں متعدد گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یقینی طور پر یہ آوازیں وسیم نے بھی سنی تھیں۔ ہماری رفتار میں کئی گناہ اضافہ ہوگیا۔ جب موت تعاقب میں ہو تو زندگی کو بچانے کی کوشش انتہا سے گزر جاتی ہے۔ ہم بھی ایک نامعلوم رفتار سے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ جلد ہی ہم فائرنگ رینج سے باہر نکل آئے۔

ہمارے سامنے کوئی متعین منزل نہیں تھی۔ بلڈنگ کی پارکنگ کی طرف جا کر گاڑی نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایف بی آئی والے خونخوار بھیڑیوں کے مانند ہمیں سونگھ رہے ہوں گے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ان کی چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے ورنہ انہوں نے اپارٹمنٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی سے فائرنگ کر کے ہمیں بھوننے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ واشنگٹن مارکیٹ پارک کے نزدیک تھی۔ ہم بے دریغ بھاگتے ہوئے ہیریسن اسٹریٹ پر نکل آئے تھے۔ یہاں ایک بڑے اسٹور کے عقب میں چلڈرن پلے گراؤنڈ واقع تھا۔ ہم سانس ہموار کرنے کے لیے گراؤنڈ کے گیٹ کے نزدیک رک گئے۔

وہ یخ بستہ موسم سرما کی آدھی رات کا عمل تھا۔ پارک میں ہو کا عالم تھا البتہ گارڈن لائٹس روشن تھیں۔ میں ایک ایسے حصے کی جانب رینگ گیا جدھر اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ وسیم کے بازو نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے تاریکی کی پناہ میں آتے ہی وسیم سے پوچھا ''تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟''

''گولی لگی ہے۔ حال کا اندازہ تم خود ہی لگالو۔'' وہ جیداری سے بولا۔

میں نے اس کے زخمی بازو کو ٹٹولتے ہوئے کہا ''اندر گھس بیٹھی ہے یا صرف چھو کر گزری ہے؟''

''میرا خیال ہے محض چھو کر گزری ہے۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا ''میں اپنے بازو میں بڑی تکلیف دہ جلن سی محسوس کر رہا ہوں۔''

اس دوران میں میری ٹٹول نتیجہ خیز ثابت ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی کاریگری سے یہ جان لیا تھا کہ گولی اس کے بازو کے گوشت کو چھیلتے ہوئے گزری تھی۔ یہ زیادہ تشویش ناک بات نہیں تھی۔ بازو میں سے رسنے والے خون نے آستین کو بھگو دیا تھا تاہم اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ اگر بازو پر کوئی کپڑا کس کر باندھ دیا جاتا تو خون کے رساؤ کو روکا جا سکتا تھا۔

ہم نے اس وقت چلڈرن پلے گراؤنڈ کے نزدیک جس

مقام پر پناہ لے رکھی تھی وہاں زیادہ دیر تک قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ہیریسن اسٹریٹ' واشنگٹن مارکیٹ پارک سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ہم ایف بی آئی والوں کو وقتی طور پر غچا دے آئے تھے لیکن ان کی طرف سے بے فکری کسی ناقابل تلافی نقصان کا پیغام ثابت ہوسکتی تھی۔

میں نے وسیم کے کندھے سے بیگ اتار لیا اور اسے کھول کر کسی ایسے کپڑے کی تلاش میں مصروف ہوگیا جو پٹی کی صورت اس کے زخمی بازو پر باندھا جاسکے۔

جب مجھے مطلوبہ کپڑا نہ مل سکا تو میں نے بیگ میں رکھی ہوئی اپنی ایک شرٹ کی آستین کو پھاڑ کر ایک لمبی پٹی حاصل کرلی پھر جتنی جلدی ممکن ہوسکا میں نے وسیم کے گھائل بازو کو بینڈیج کا لبادہ پہنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس عارضی پناہ گاہ سے باہر نکل آئے۔

ہیریسن اسٹریٹ پر نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے ہم گرین وچ اسٹریٹ پر نکل آئے۔ اس وقت ہمیں بڑی شدت سے کسی یلو کیب کی تلاش تھی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ گرین وچ اسٹریٹ پر بائیں جانب مڑنے کے بعد ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ٹرائی بیکا گرل ریسٹورنٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔ مذکورہ ریسٹورنٹ تین سو پچھتر گرین وچ اسٹریٹ پر واقع ہے۔ آج ہم تینوں نے اسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے سامنے سے فرینکلن اسٹریٹ نکلتی ہے۔ وسیم نے کہا۔

''جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے' فرینکلن اسٹریٹ پر سب وے انٹرنس موجود ہے۔ ہمیں فوری طور پر خود کو انڈر گراؤنڈ کرلینا چاہیے۔''

''تو گویا تم این وائے پی ڈی کے الزام کی تائید کررہے ہو!'' میں نے اسے چھیڑا۔

وہ میری بات کو سمجھ نہیں سکا' بولا ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا ''این وائے پی ڈی (نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) والے مجھے ''امریکا دشمن'' کا ٹائٹل دے چکے ہیں' یعنی میں انڈر گراؤنڈ مافیا کی ٹکر کا مجرم ہوں۔ تم میرے ساتھ انڈر گراؤنڈ ہوکر ان کے خیال کی تصدیق کرنا چاہتے ہو!''

''اوہ!'' اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی ''ان سنگین لمحات میں بھی تمہیں تفریح کی سوجھ رہی ہے۔'' وہ میری بات کی تہ تک پہنچ گیا۔

میں نے کہا ''حالات سنگین ہوں یا رنگین' غمگین ہونے سے انہیں بدلا نہیں جاسکتا' پھر کیوں خواہ مخواہ ذہن کو پریشان کیا جائے۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ میرے ساتھ فرینکلن اسٹریٹ پر قدم بڑھاتے ہوئے بولا ''میں تمہارے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھ رہا ہوں۔''

اس وقت فرینکلن اسٹریٹ کا کاروبارِ زندگی اختتام پذیر تھا۔ ہم اسٹریٹ سے تھوڑا ہٹ کر شاپس اور مالز کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ اس طرح ہمیں بعض جگہ مکمل اور بعض جگہ نیم تاریکی کی آڑ بھی مل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا' چلتے ہوئے وسیم تھوڑا لنگڑا رہا تھا۔ شاید اس کے پاؤں میں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔ اپارٹمنٹ کی کھڑکی میں سے اس نے جس انداز میں چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا!

''کیا تم اپنے پاؤں میں تکلیف محسوس کررہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' سیدھے پاؤں کی ایڑی میں بہت درد ہو رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''مگر اپارٹمنٹ کے پچھواڑے سے تو تم نے دوڑ میں میرا ساتھ دیا تھا۔'' میں نے الجھن زدہ انداز میں سوال کیا ''کیا اس وقت تمہیں یہ تکلیف محسوس نہیں ہورہی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''شاید اس وقت چوٹ گرم تھی اس لیے درد محسوس نہیں ہوا۔ اب ہماری رفتار کم ہونے اور سرد موسم کے باعث یہ تکلیف اپنا رنگ دکھا رہی ہے۔''

میں نے محسوس کیا' وہ اچھی خاصی مشکل میں مبتلا تھا۔ ایک تو پہلے ہی اس کا بازو زخمی تھا اور اب یہ پاؤں والا معاملہ سامنے آگیا تھا۔ میں نے نیم تاریکی میں اس کے بائیں بازو کا معائنہ کرکے پٹی تو باندھ دی تھی لیکن صحیح صورتِ حال جاننے کے لیے روشنی میں تفصیلی چیک اپ کی ضرورت تھی۔

چاروں جانب چوکنا نظر سے دیکھتے اور محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے میں نے وسیم سے پوچھا ''سب وے انٹرنس یہاں سے کتنی دور ہے۔ میں کہیں آرام سے بیٹھ کر تمہارے پاؤں کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''سمجھ لو' ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔'' وہ تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔

وسیم کی موجودہ حالت سے مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایف بی آئی کے خطرناک ایجنٹ ہمیں ٹرائی بیکا کی سڑکوں پر ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ ابھی تک وہ ہم تک رسائی حاصل نہیں کرسکے تھے۔ اگر اچانک ان

لوگوں سے مڈھ بھیڑ ہوجاتی تو میرے لیے بڑی مشکل ہوجاتی۔ وسیم اب اس مستعدی کے قابل نہیں رہا تھا جس کا تھوڑی دیر پہلے اس نے مظاہرہ کیا تھا۔ انہی پُر اندیشہ خیالات کے ساتھ خدا خدا کرکے ہم سب وے والے انٹرنس میں داخل ہوگئے۔

وسیم نے کہا ''اس سب وے ٹریک پر چار ٹرینیں چلتی ہیں۔ ون لائن اور نائن لائن تو فرینکلن اسٹریٹ کے اسٹیشن پر رکیں گی مگر ٹو لائن اور تھری لائن بغیر رکے آگے بڑھ جائیں گی۔ ہمارے پاس ون اور نائن میں سے انتخاب کا اختیار ہے اور اس سے پہلے یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ ہمیں اپ ٹاؤن جانا ہے یا ڈاؤن ٹاؤن۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''ٹرین میں سوار ہونے سے زیادہ ضروری ایک اور کام بھی ہے۔'' میں نے ایک الگ تھلگ بینچ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ''پہلے میں تمہارے پاؤں کا معائنہ کروں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اگر میں غلطی نہیں کررہا تو صبح بھی اسی ٹریک پر ہم نے اپ سے ڈاؤن ٹاؤن سفر کیا تھا۔''

وہ تائیدی انداز میں بولا ''بالکل درست۔ ہم تھری لائن میں سلویا سے وال اسٹریٹ تک پہنچے تھے۔ تھری لائن ایک ایکسپریس ٹرین ہے' فرینکلن اسٹریٹ پر وہ نہیں رکتی۔''

میں نے جس بینچ کا انتخاب کیا ادھر خاصی خاموشی اور سکون تھا۔ ویسے بھی آدھی رات کے بعد سب وے اسٹیشن پر وہ ریل پیل اور رونق نظر نہیں آتی جو صبح شام اور دن میں دکھائی دیتی ہے۔ میں نے وسیم کے متاثرہ پاؤں والا جوتا اتروایا اور جیسے ہی اس کا پاؤں موزے سے باہر آیا' میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔

مذکورہ پاؤں ٹخنے کے مقام سے اچھا خاصا سوجا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں یہی محسوس ہوا کہ اس کے ٹخنے میں شدید نوعیت کی موچ آچکی ہے اور یقیناً یہ موچ کھڑکی سے کودنے کے نتیجے میں آئی تھی۔ میں نے گھما پھرا کر اچھی طرح اس کے پاؤں کا جائزہ لے لیا۔ گوشت کہیں سے نہیں پھٹا تھا تاہم ٹخنے پر نمودار ہونے والا ورم تشویش ناک تھا۔ اس کا بایاں بازو اور دایاں پاؤں ایک طرح سے بے کار ہوکر رہ گئے تھے۔ بازو والا زخم تو گرم جیکٹ کے اندر چھپا ہوا تھا اور دیکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کرتا تھا مگر پاؤں کی موچ موزے اور جوتے کے اندر پوشیدہ ہونے کے باوجود بھی چال کی لنگڑاہٹ سے ہر خاص و عام کو دعوتِ نظارہ دیتی تھی۔

''تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''اس وقت کسی اسپتال کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔''

''ہاں ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔'' میں نے اس کی تائید کی۔

وہ دائیں ہاتھ سے دائیں پنڈلی کو دباتے ہوئے بولا ''پھر کیا کریں۔ پاؤں کی تکلیف تو رفتہ رفتہ بڑھتی جارہی ہے اور خاص طور پر یہاں بیٹھنے کے بعد میں محسوس کررہا ہوں کہ شاید اب اس پاؤں پر کھڑا ابھی نہیں ہوسکوں گا۔''

میں اس کی تکلیف کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ہڈی پر لگنے والی چوٹ بڑی سنگین ہوتی ہے۔ اگر گرم چوٹ کے ساتھ متاثرہ حصے کو بہت زیادہ حرکت دے دی جائے تو ازاں بعد بہت بھیانک نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔ وسیم کے ساتھ بھی ایسا ہی المیہ پیش آیا تھا۔ ایف بی آئی والوں کی بے دریغ فائرنگ سے بچنے کے لیے ہم نے اندھا دھند دوڑ لگائی تھی۔ اس وقت تک وسیم ٹخنے کی اس چوٹ سے بے خبر تھا۔ اب خبر ہوئی تو پلوں کے اوپر سے بھی پانی بہہ چکا تھا۔ اس کا معاملہ بہت ٹیڑھا ہوگیا تھا۔

میں نے پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک جائزہ نگاہ ڈالی اور وہاں کی صورتِ حالات کو اپنے لیے نقصان دہ نہ پاکر اطمینان کی سانس لی پھر وسیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم بیگ کے ساتھ اسی بینچ پر بیٹھے رہو۔ میں دو منٹ میں آتا ہوں۔''

''تم کہاں جارہے ہو؟'' اس نے متذبذب انداز میں استفسار کیا۔

میں نے کہا ''میں تمہارے پاؤں کا بندوبست کرنے جارہا ہوں۔''

پتا نہیں میرے اس معنی خیز جملے سے اس نے کیا مطلب اخذ کیا' میں اسے بینچ پر بیٹھا چھوڑ کر ایک فون بوتھ کی جانب بڑھ گیا۔

میں وسیم کو اس حالت میں اپنے ساتھ ساتھ بھگائے نہیں پھر سکتا تھا۔ ٹیلی فون کے مخصوص سوراخ میں سکہ ڈالنے کے بعد میں نے ونگ ہنگ کے سیل کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ نمبر تھوڑی دیر پہلے میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کیا تھا۔ مسٹر ہنگ نے نمبر دیتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ یہ اس کا ایک خفیہ موبائل ہے۔

دوسری گھنٹی پر مسٹر ہنگ نے کال ریسیو کرلی۔ میری

آواز پہچانتے ہی اس نے کہا ”وہاں وجدان! تم لوگ خیریت سے تو ہو؟“

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی ”خیریت“ سے آگاہ تو وہ فکر مند لہجے میں بولا ”تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟“

”فرینکلن اسٹریٹ کے سب وے پلیٹ فارم پر۔“

”اوہ“ اس نے ایک گہری سانس لی ”اس حالت میں وسیم کو لوگوں کے ہجوم سے دور رہنا چاہیے۔ تمہیں اندازہ نہیں تم دونوں کے لیے حالات کتنے سنگین ہو چکے ہیں۔“

میں نے کہا ”مجھے بخوبی اندازہ ہے مسٹر ہنگ۔“ پھر اضافہ کیا ”ہم اس وقت پلیٹ فارم کی ایک الگ تھلگ بینچ پر لوگوں سے دور بیٹھے ہیں۔ تم فوراً پہنچنے کی کوشش کرو۔ ہم زیادہ دیر تک یہاں رک نہیں سکتے اور...... میں وسیم کو اس حالت میں اکیلا سنبھال نہیں پاؤں گا۔ سمجھ لو وہ اپنے قدموں سے چلنے کے قابل نہیں۔“

”میں اس وقت گاڑی میں ہوں۔ اور تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا ”تم ہوشیار ہو کر وہیں بیٹھے رہو۔ میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

میں ریسیور کو ہک کر کے واپس وسیم کے پاس آ گیا۔

وہ بینچ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے گردن کو پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر رکھی تھیں حالانکہ میں نے جاتے وقت اسے تاکید کی تھی کہ وہ گردونواح پر گہری نظر رکھے۔ ہم جن حالات سے گزر رہے تھے، ان میں ایک ایک قدم پھونک کر اٹھانے کی ضرورت تھی۔

میں وسیم کے قریب آیا تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس نے درد کی شدت سے مجبور ہو کر آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار موجود تھے۔ میں نے بینچ پر اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وسیم! ہنگ دس منٹ تک یہاں پہنچ جائے گا ہمیں کسی سب وے میں سوار نہیں ہونا بلکہ اس کے ساتھ جانا ہے۔“

اس نے آنکھیں کھول دیں اور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا تاہم اس موقع پر اس نے کوئی سوال کرنے کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔ میں جانتا تھا کہ یہ ترجیح اس اکتاہٹ، بیزاری اور تکلیف کا نتیجہ تھی جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا۔ میں نے اس کے پاؤں اور بازو کی حالت دیکھی تھی اور مجھے اندازہ تھا، وہ بڑی تکلیف میں تھا۔

میں نے سادہ سے لہجے میں کہا ”اب آنکھیں بند کرنے کی میری باری ہے۔ جب تک مسٹر ہنگ یہاں نہیں پہنچ جاتا، تمہیں چوکنا رہ کر پہرا دینا ہوگا۔“

پھر اس سے قبل کہ وہ مجھ سے کسی سلسلے میں کوئی استفسار کرتا میں نے بینچ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت آنکھیں بند کرنے کا میرا صرف ایک ہی مقصد تھا...... ڈاکٹر مونگ سے تصوراتی رابطہ، ساحل تک تخیلاتی رسائی!

میں نے پینئل (PINEAL) گلینڈ یعنی اپنی تھرڈ آئی کو زحمت دی۔ تیسری آنکھ کے سامنے ساحل کے خال و خط کو ابھارا اور اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کوشش میں واضح ناکامی ہوئی۔ یہ مسلسل تیسری ناکامی تھی۔ اس سے پہلے، ویڈال سائسون میں بالوں کی سیٹنگ کرانے کے دوران میں بھی میں اس کے ماحول کو چھو نہیں پایا تھا اور آدھا پونا گھنٹا قبل جب میں واشنگٹن پارک والے اپارٹمنٹ میں ایسی ہی ایک کوشش کر رہا تھا تو مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ پتا نہیں ربی موشے ہائمن نے اس پر کیسی بندش لگا دی تھی۔ میری باطنی آنکھ اس بندشی دیوار کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتی تھی البتہ اس مرتبہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ ڈاکٹر مونگ ریفوشے کے توسط سے وہ مجھے نظر آ گئی تھی۔

میں نے ساحل والے محاذ پر کوشش ترک کی اور تھرڈ آئی کا انٹینا ڈاکٹر مونگ کی جانب پھیر دیا۔ اس مرتبہ مجھے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی۔ ڈاکٹر مونگ کو میں نے ایک بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے ماحول نے مجھے بتایا، وہ کسی بند ٹرک کے عقبی حصے میں تھا اور وہ ٹرک پہاڑی راستے پر طوفانی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ ڈاکٹر مونگ کے ماحول میں مجھے ساحل کہیں دکھائی نہ دی تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ لگ بھگ پونا گھنٹا پہلے میں نے ان دونوں کو ایک ساتھ کھٹمنڈو کی پہاڑیوں میں دوڑتے اور پھر گولیوں کی بوچھار میں گر کر بے حس و حرکت ہوتے دیکھا تھا۔

اب ڈاکٹر مونگ اکیلا نظر آ رہا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ ساحل کو اس کے ساتھ ہونا چاہیے تھا اور وہ نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کہاں تھی؟

ڈاکٹر مونگ تک رسائی حاصل کر کے مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ میں نے آخری منظر میں انہیں نصف درجن مسلح افراد کے نشانے پر دیکھا تھا۔ وہ سفاک لوگ انہیں روکنے کے لیے اپنی گنوں کے دہانے کھول چکے تھے۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر مونگ کا بچ جانا ایک معجزہ ہی تھا۔ پتا نہیں یہ معجزہ ساحل کے ساتھ بھی ہوا تھا یا نہیں!

اچانک میرے ذہن میں ایک خوفناک سوال ابھرا۔ کہیں ڈاکٹر مونگ بھی میری طرح دھوکا تو نہیں کھا گیا۔ عین ممکن تھا، ربی نے ساحل کی ایک ڈپلی کیٹ کھٹمنڈو کے مضافات میں بھی پہنچا دی ہو۔ اس مکار شخص سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ ہمارا واسطہ ریٹا نامی جس ڈپلی کیٹ سے پڑا تھا، وسیم کی چلائی ہوئی گولی نے زمین دوز ریلوے ٹریک پر اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ ریٹا سے ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم اسے سب وے ٹریک پر ہی چھوڑ آئے تھے۔

سوچ کو ایک نیا زاویہ ملا تو میں ایک خاص انداز میں غور کرنے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور نتیجہ پہلے سے مختلف برآمد نہ ہوا۔ میں اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر مونگ اگرچہ بے ہوشی کی حالت میں تھا، میں پھر بھی اس کے ماحول میں داخل ہو گیا تھا ...... پھر ساحل کے سلسلے میں معذوری کیوں تھی؟

ان حالات میں صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی اور وہ یہ کہ ڈاکٹر مونگ کے ساتھ میں نے جس عورت کو دیکھا، وہ ساحل نہیں تھی۔ میری ساحل اس وقت ربی کے دعوے کے مطابق اسرائیل میں تھی۔ اس عیار نے ساحل پر کوئی ایسی طلسماتی گرہ لگائی تھی کہ وہ میری دسترس سے دور ہو گئی تھی۔

ذہن بہت زیادہ الجھنے لگا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

☆☆☆

مسٹر ہنگ ایک پرانی سی سیاہ فورڈ میں ہم تک پہنچا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر باہمی سہارے سے وسیم کو گاڑی کی عقبی نشست پر پہنچا دیا۔ میں ہنگ کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ فورڈ فرینکلن اسٹریٹ سے نکل کر ہڈسن اسٹریٹ میں داخل ہوگئی۔ اس دوران میں ہمارے درمیان خاموشی حائل رہی۔ وسیم عقبی نشست پر پہنچتے ہی لمبا لیٹ گیا تھا۔ اس کی حالت خاصی تشویش ناک ہو رہی تھی۔ شاید وہ تکلیف کو برداشت نہیں کر پا رہا تھا!

مسٹر ہنگ نے نہایت ہی محتاط ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایرکسن پلازا کے قریب سے گاڑی کو موڑ لیا اور ہڈسن اسٹریٹ کو چھوڑ کر مین ٹرائی بیکا میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب سیاہ فورڈ سرنگ نما ایک راستے میں داخل ہونے لگی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”مسٹر ہنگ! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”نیو جرسی!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”اوہ!“ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔

اس نے کہا ”ہم ہالینڈ ٹنل کے ذریعے دریائے ہڈسن کو عبور کر رہے ہیں۔ یہ ٹنل ہمیں نیویارک سے نیو جرسی پہنچا دے گی پھر ہم یو۔ ایس انٹرا سٹیٹ سیونٹی ایٹ پکڑ کر سیدھے جرسی سٹی پہنچ جائیں گے جہاں میرا فوٹو اسٹوڈیو ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا ”شاید تمہارا ٹرائی بیکا میں رات گزارنا بدھا کو منظور نہیں اسی لیے یہ افراتفری مچی ہے۔“

ابھی تک ہمارے درمیان موجودہ ہنگامی صورتِ حال پر بات نہیں ہوئی تھی۔ میری طرح شاید وہ بھی کسی مقام پر پہنچ کر اطمینان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور کی بازی گری سے ”لطف اندوز“ ہونے لگا۔

میں نے پہلی چھلانگ ساحل کی طرف لگائی اور منہ کے بل گرا۔ میں اٹھا، سنبھلا اور ڈاکٹر مونگ کی جانب جست بھری۔ اس مرتبہ میں گرنے کے بجائے اپنے قدموں پر آیا اور ڈاکٹر کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

وہ ابھی تک اسی بند ٹرک کے اندر محوِ سفر تھا اور اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔ وہ غالباً گہری بے ہوشی میں تھا۔ بند ٹرک کے عقبی حصے میں کسی بستر پر پایا جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے دوستوں میں تھا جو اس کی مشکل کشائی کے لیے یقیناً کسی اسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔ اگر وہ دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوتا تو وہ آرام دہ بستر کا تکلف ہرگز نہ کرتے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ٹرک کے ننگے فرش پر ڈال دیتے۔

میں ڈاکٹر مونگ کے ماحول سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک بجلی سی چمک اٹھی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہنگ سے استفسار کیا۔

”تم ذرا اپنا موبائل مجھے دو۔“

اس نے سوچتی ہوئی ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور کوٹ کی اندرونی جیب میں سے سیل نکال کر میری سمت بڑھاتے ہوئے کہا ”کس کو فون کرو گے؟“

”ڈاکٹر مونگ کو۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

وہ شکایتی لہجے میں بولا ''اور یہ نہیں بتاؤ گے' کیوں؟''
اس کی شکایت بروقت اور بجا تھی۔ میں نے اس سے ڈاکٹر موسنگ کا سیل نمبر لیتے وقت خاصی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن میں ان لمحات میں جس سچویشن سے گزر رہا تھا' مجبوری اس کا تقاضا تھی۔ میں نے ڈاکٹر موسنگ کا سیل نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

''بتا دوں گا' کہیں آرام سے بیٹھنے کا موقع تو ملے۔''

''میں نے تمہیں ڈاکٹر کا نمبر دینے کے بعد اسے فون کیا تھا۔'' وہ ہالینڈ ٹنل کے اندر محتاط ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا ''لیکن اس سے رابطہ نہیں ہو سکا۔''

میں نے کہا ''میری بھی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی۔''

ڈائلنگ کی تکمیل کے بعد خاموشی کے چند لمحات گزرے پھر ریکارڈنگ سنائی دینے لگی جس کے مطابق وہ فون فی الحال کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ میں نے یہ سوچ کر ڈاکٹر کو کال کی تھی کہ اگر سیل اس کے قریب ہی کہیں موجود ہوا تو اس کی گھنٹی بج اٹھے گی اور عین ممکن ہے' ڈاکٹر گھنٹی کی آواز سن کر بیدار ہو جائے مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مایوس ہو کر میں نے سیل ہنگ کی جانب بڑھا دیا اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر کا سیل یا تو آف ہے یا پھر اپنی طبعی عمر پوری کر چکا۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا' محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا ''یہ ٹنل کب ختم ہو گی؟''

''بس ہم اس سے برآمد ہونے ہی والے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''ہم نیویارک اسٹیٹ سے نکل کر نیو جرسی اسٹیٹ میں تو داخل ہو چکے ہیں۔''

کافی دیر سے عقبی نشست کی جانب سے وسیم کی کوئی آہ کراہ سنائی نہیں دی تھی۔ میں عقبی سیٹ کا منظر دکھانے والے آئینے میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سو چکا تھا یا پھر نیم بے ہوش تھا۔

میں نے ہنگ سے پوچھا ''کیا تمہارے پاس دو موبائل کنکشن ہیں؟''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔'' اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

میں نے پھر اسے اس سلسلے میں کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ دانستہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو! بلکہ میں اس وقت اسے خاصا الجھا ہوا محسوس کر رہا تھا اور خود میری حالت بھی کچھ اسی قسم کی تھی چنانچہ خاموش رہا۔

ایک' سوا ایک بجے رات ہم جرسی سٹی میں تھے۔ ہنگ کا فوٹو اسٹوڈیو واشنگٹن ایونیو پر واقع تھا۔ اس نے اسٹیشن کے سامنے سے گاڑی گزاری پھر انٹر اسٹیٹ کو چھوڑ کر ایونیو پر آ گیا اور تھوڑا آگے جا کر کینیڈی بلیوارڈ پر مڑا اور ... کی سمت گاڑی بڑھا دی۔

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ''اسٹوڈیو اس وقت بند ہے اس لیے ہم شون کے گھر جا رہے ہیں۔ ... کی رہائش ادھر لنکن پارک کے نزدیک ہے۔''

''شون؟'' میں زیر لب بڑبڑایا۔

میری بڑبڑاہٹ کے جواب میں اس نے بتایا ''... شخص کا نام شان ہے لیکن امریکی لب و لہجے کی مہربانی سے شان سے شون ہو گیا ہے۔ جیسے مال سے مول اور کال سے کول......'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''شون کا تعلق انڈیا سے ہے۔ یہاں کا فوٹو اسٹوڈیو ... کی نگرانی میں چلتا ہے۔ لنکن پارک والے اپارٹمنٹ میں اپنی فلپائنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ شون لگ بھگ دس سال سے میرے ساتھ ہے۔ دونوں میاں بیوی بہت محنتی اور فرض شناس ہیں۔ اسٹوڈیو کا نظام انہوں نے مل کر سنبھال رکھا ہے۔ انہوں نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ان سے مل کر تمہیں بڑی خوشی ہو گی۔ بظاہر ان کی حیثیت میرے ملازمین کی سی ہے لیکن درحقیقت وہ میرے سیٹ اپ کے لوگ ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟'' آخری جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا۔

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

پھر وہ مجھے شون (شان) اور اس کی فلپینو بیوی لی یا کے بارے میں خاص خاص باتیں بتانے لگا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔

''کیا یہ شان مسلم ہے؟''

اس نے کندھے اچکائے اور بے پروائی سے بولا ''میں نے کبھی اس سلسلے میں ریسرچ نہیں کی کیونکہ یہ اس کا نازک پہلو ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کا باپ مسلم تھا۔ اس نے ایک ہندو عورت کو مسلمان کر کے اس سے شادی کی تھی اس کے بعد شون کے والدین انڈیا میں مختلف جگہوں پر چھپتے پھرے کیونکہ اس کی ماں کا گھرانہ ان کا دشمن ہو گیا تھا۔ ...

دوران میں شون پیدا ہوگیا۔ بہرحال پتا نہیں پھر کیا کیا ہوتا رہا۔" وہ بات کو مختصر کرتے ہوئے بولا۔

"اب یہ امریکا میں ہے۔ اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور اس نے ایک فلپینو لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ میں پچھلے دس سال سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ یہ ہندو ہے یا مسلم اس سے غرض نہیں اور شاید خود شون کو بھی اس بات کی پروا نہیں۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ بندہ کام کا ہے۔"

شان کا باپ مسلمان تھا اور ماں نے بھی اسلام قبول کرنے کے بعد اس شخص سے شادی کی تھی تو یقیناً شان اصلاً نسلاً مسلمان تھا۔ بہرحال میں اس سلسلے میں ہنگ سے کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا خاموش رہا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ دانستہ اس موضوع سے پہلو تہی برت رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا' کوئی شخص دس سال سے ہنگ کے تجربے میں ہو اور اس کے سیٹ اپ کا حصہ بن چکا ہو لیکن ہنگ نے ابھی تک اس پر ریسرچ نہ کی ہو!

باقی کا سفر خاموشی میں کٹا اور تھوڑی دیر بعد سیاہ فورڈ لنکن پارک کی اس اپارٹمنٹس بلڈنگ کے قریب پہنچ گئی جہاں شان اپنی فلپائنی بیوی لی یان کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔

وہ تین بیڈروم والا ایک کشادہ اپارٹمنٹ تھا جو بلڈنگ کے تھرڈ فلور پر واقع تھا۔ ہم نے بدقتِ تمام وسیم کو سہارا دے کر اپارٹمنٹ کے اندر پہنچا دیا۔ لی یان اور شون اتنی رات گئے اس زحمت پر چنداں پریشان نہیں ہوئے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہنگ کے لیے ان دونوں کی نگاہوں اور رویوں میں' میں نے ایک خاص قسم کا احترام پایا۔

اپارٹمنٹ کے اندر پہنچتے ہی سب سے پہلے وسیم کا تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ اس معائنے میں شون اور لی یان بھی ہمارے ساتھ تھے بلکہ لی یان کچھ زیادہ ہی پیش پیش تھی۔ ہنگ نے مجھے بتایا کہ لی یان نے نرسنگ کورس بھی کر رکھا تھا۔

لی یان متناسب القد اور بھرپور بدن کی مالک تھی۔ حلیہ اور خال و خط خوبصورت فلپائنی لڑکیوں جیسے اور ہاتھ پاؤں نہایت ہی مستعد۔ شون خوبرو' دراز قامت اور مضبوط البدن تھا۔ ان دونوں کو ہماری آمد کے بارے میں ہنگ نے آگاہ ہی دے رکھی تھی۔ ہماری حیثیت وہاں ہنگ کے مہمانوں کی سی تھی۔

وسیم کا بایاں بازو کہنی سے تھوڑا اوپر بری طرح زخمی تھا۔ چلڈرن پلے گراؤنڈ کے نزدیک نیم تاریکی میں' میں باریک بینی سے اس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اب روشنی میں دیکھا تو پتا چلا' گولی نے اسے اچھا خاصا زخم دیا تھا۔ لی یان نے متاثرہ حصے کو صاف کر کے بڑی مہارت سے بینڈ یج کردی۔ مذکورہ زخم ہفتے بھر سے پہلے بھرنے والا نہیں تھا۔

پاؤں کی حالت بازو سے زیادہ ابتر تھی۔ دایاں پاؤں سوج کر کپا بن چکا تھا۔ امکان یہی تھا' ٹخنے کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ ورم کی زیادتی تشویش کا باعث تھی۔ نیم گرم پانی میں کوئی آئنٹمنٹ ڈال کر پہلے اس کے پاؤں کو دھویا گیا پھر ایک زود اثر درد کش کریم کی مالش کرنے کے بعد اس کے پاؤں پر پٹی باندھ دی گئی۔ لی یان نے بتایا کہ اگر فریکچر وغیرہ نہ ہوا تو کل تک ورم جاتا رہے گا۔ بصورتِ دیگر اس کے پاؤں پر پلاسٹر چڑھانا ہوگا۔ اس نے تسلی آمیز انداز میں یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں وسیم کو کسی اسپتال وغیرہ میں دکھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ایکسرے سے لے کر پلاسٹر تک تمام مراحل کو وہ اپارٹمنٹ کے اندر ہی ڈیل کرلے گی۔

وسیم کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد میں مسٹر ہنگ کے ساتھ ایک کمرے میں بند ہوگیا۔ ابھی تک ہمارے درمیان موجودہ حالات کی سنگینی پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ تنہائی میسر آتے ہی ہنگ نے کہا۔

"وجدان! تمہارا یہ دوست تو فی الحال کسی کام کا نہیں رہا۔ تم جس قسم کی زندگی گزار رہے ہو، اس میں یہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ ہفتہ دس دن تک اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اس صورتِ حال میں تمہیں اس کے بغیر ہی آگے بڑھنا ہوگا...... یا پھر چند روز کے لیے تمہیں اپنے مشن سے ہاتھ کھینچنا ہوگا!"

آخری جملہ اس نے سوالیہ انداز میں ادا کیا تو میں تڑپ اٹھا "مشن میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہوسکتی۔"

پھر میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اسے ڈاکٹر مونگ اور ساحل کے بارے میں بتا دیا۔ ہنگ اس دوران میں مجھ سے خاصا کلوز ہو چکا تھا اور میری پتا نہیں کون کون سی صلاحیت کے بارے میں سانگ فو اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

وہ گمبھیر لہجے میں بولا "مگر تم نے پہلے تو یہ بتایا تھا کہ دھنو (ساحل) کو ربی نے اپنے پاس اسرائیل پہنچا دیا ہے؟"

"وہ ربی کا بیان تھا جو میں نے تم تک پہنچایا۔" میں نے کہا "اب میں تمہیں جو کچھ بتا رہا ہوں' وہ میرے تصور کا مشاہدہ ہے۔"

اس کے بعد میں نے ہنگ کو ڈاکٹر مونگ کی تازہ ترین پوزیشن سے بھی آگاہ کردیا۔ ساحل کی ڈپلی کیٹ ریٹا کے

انجام کے بارے میں' میں اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد وہ سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔

"ربی نے تمہیں دھوکا دینے کے لیے جس طرح مین ہیٹن میں ریٹا کا استعمال کیا' عین ممکن ہے' ڈاکٹر مونگ کو راہ سے بھٹکانے کے لیے اس نے ادھر کھٹمنڈو میں بھی ایسی ہی کسی بہروپیا لڑکی کو پہنچا دیا ہو۔ اس کے اختیارات اور صلاحیتوں کے سامنے یہ تو بہت معمولی نوعیت کا کام ہے۔"

وہ میرے ذہن میں پہلے سے موجود خدشے کی تائید کر رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اس بات کے روشن امکانات ہیں۔ اس کی تصدیق یا تردید کے لیے ڈاکٹر مونگ سے رابطہ ہونا ضروری ہے۔ سیل شاید اس کے پاس نہیں رہا اور میں اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر اس سے گفتگو نہیں کرسکتا۔ وہ کسی ٹھکانے پر پہنچ جائے تو کچھ سوچا جاسکتا ہے۔"

"اور اگر یہ پتا چل جاتا ہے کہ دھنو (ساحل) کھٹمنڈو کے مضافات میں پہنچا دی گئی ہے تو پھر تمہارا کیا پروگرام ہوگا؟"

میں اس کے اشارے کو فوراً سے پیشتر سمجھ گیا اور جلدی سے بولا "اس صورت میں' میں پہلی فرصت میں کھٹمنڈو جانا چاہوں گا۔"

"پہلی فرصت میں تو تمہیں اکیلے ہی جانا ہوگا۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا "وسیم تو کم از کم ایک ہفتے کے لیے کسی سفر کے قابل نہیں رہا۔ پھر تمہارے لیے جس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہو چکے ہیں' ان کے پیشِ نظر وسیم کو آرام سے گھر کے اندر چھپ کر وقت گزارنا چاہیے۔"

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی "تم ٹھیک کہتے ہو ہنگ! میں پہلے یہ کنفرم کرلوں کہ آیا میں نے ڈاکٹر مونگ کے ساتھ کھٹمنڈو کے مضافات میں جس لڑکی کو دیکھا ہے، وہ میری ساحل ہی ہے۔ اس تصدیق کے بعد میں سیدھا کھٹمنڈو جانا چاہوں گا لیکن......"

میں نے رک کر ایک گہری سانس لی اور بات پوری کرتے ہوئے کہا "امریکا سے نیپال تک کے سفر کے لیے بھی ضروری کاغذات تو چاہیے ہی ہوں گے نا!"

وہ ٹھوس لہجے میں بولا "تم اپنی صلاحیت کو آزما کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ڈاکٹر مونگ کی طرف کیا پوزیشن ہے۔ میں خود بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر مونگ کھٹمنڈو میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جہاں ٹھہرا ہوا ہے' وہاں کا نمبر بھی ہے میرے پاس۔ پہلے میں وہاں ٹرائی کرتا ہوں۔ سیل سے تو کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا۔"

بات ختم کرتے ہی وہ ٹیلی فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ہم جس کمرے میں میٹنگ کر رہے تھے وہاں فون کی سہولت موجود تھی۔ ہنگ نے ڈائلنگ کے بعد خاموش نظر سے مجھے دیکھا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ میں پوری توجہ سے اس کی جانب دیکھنے لگا کہ پتا نہیں وہاں سے کیا خبر ملتی ہے۔

ہنگ تین منٹ تک ٹرائی کرتا رہا۔ پھر مایوسی سے ریسیور کریڈل کردیا اور بولا "ادھر گھنٹی تو بج رہی ہے مگر کوئی فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ لگتا ہے انہوں نے وہ ٹھکانا چھوڑ دیا ہے۔"

"تم نے نمبر تو ٹھیک ملایا ہے نا؟" میں نے ایک خدشاتی سوال کیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "لو تم بھی ٹرائی کر کے دیکھ لو۔ میں تو دو تین مرتبہ ری ڈائل بھی کر چکا ہوں۔"

میں نے ہنگ سے فون نمبر دریافت کیا اور فون سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے ہنگ کی زبان پر اعتبار تھا۔ پتا نہیں پھر بھی کیوں میں ایک مرتبہ اپنے ہاتھوں سے ڈائل کرنا چاہتا تھا۔ میری اس کوشش کا وہی نتیجہ برآمد ہوا جس کے بارے میں ہنگ مجھے بتا چکا تھا تاہم اس طرح ڈاکٹر مونگ کے کھٹمنڈو والے ٹھکانے کا نمبر میرے ذہن میں محفوظ ہوگیا۔

میں واپس ہنگ کے سامنے آکر بیٹھا تو اس نے کہا "اب تم اپنی صلاحیت کو آزماؤ۔ شاید ان کا کوئی سراغ مل جائے!"

"اوکے!" میں نے یہ کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

"ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ ذرا دھنو (ساحل) کو بھی جھانک لینا۔" ہنگ کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

ونگ ہنگ میری تھرڈ آئی والی اس صلاحیت پر اچنبھک نہیں ہوا تھا۔ وہ سانگ فو کو اپنا بڑا مانتا تھا جو ایسی پتا نہیں' کتنی صلاحیتوں کا مالک رہا تھا اور اب اس کے ساتھ ہی یہ صلاحیتیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ سانگ فو کی ڈیتھ کے بعد ان لوگوں کا بڑا ڈاکٹر مونگ تھا۔ سانگ فو کی پیروی کرنے والوں میں ڈاکٹر مونگ ریفو شے سب سے زیادہ سینئر اور باصلاحیت تھا۔

میں نے پہلے ساحل کی خیر خبر ضروری سمجھی اور اس کے نقش کو تیسری آنکھ کے سامنے ابھارتے ہوئے تصور کے گھوڑے کو دوڑایا۔ رخشِ تصور اگلے ہی لمحے زمین بوس ہوگیا۔ میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ دو تین بار کی ناکامی کے بعد میں باطنی آنکھ کے طفیل ڈاکٹر

موگنگ کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت کسی اسپتال کے صاف شفاف بستر پر موجود تھا۔

اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک کی موجودگی ظاہر کرتی تھی' اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے بے ہوش پڑا تھا۔ اس کے بدن سے مختلف مانیٹرنگ مشینیں منسلک تھیں۔ ایک ڈاکٹر بڑی توجہ سے اس کا معائنہ کررہا تھا۔ ڈاکٹر کے عقب میں کھڑی خوبصورت نیپالی نرس نوٹس لے رہی تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس ماحول میں موجود رہا۔

معائنے کے بعد ڈاکٹر نے امید افزا انداز میں گردن ہلائی اور کمرے سے نکل گیا۔

میں نے ڈاکٹر کا پیچھا پکڑا اور اس کے تعاقب میں لگ گیا۔ وہ مختلف راہ داریوں میں گھومنے کے بعد ایک کمرے میں پہنچا۔ ایک کرسی پر بیٹھ کر اس نے کلپ بورڈ پر لگے کاغذ پر کچھ تحریر کیا اور گھڑی پر نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسپتال سے رخصت ہوگیا۔

میں اس کے ساتھ چپک کر اسپتال سے باہر نکلا تھا لہٰذا یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا کہ ڈاکٹر موگنگ اس وقت کھٹمنڈو کے سٹی اسپتال میں تھا۔ لگ بھگ دو گھنٹے پہلے میں نے اسے ایک بند ٹرک کے عقبی حصے میں پہاڑی راستے پر سفر کرتے دیکھا تھا۔ اسپتال میں زیرِ علاج اسے دیکھ کر ثابت ہوگیا کہ ٹرک میں اسپتال تک پہنچانے والے اس کے خیر خواہ تھے۔

اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں جو خوفناک سوال ابھرا اس نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر موگنگ کو اگر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا تو پھر میری ساحل کہاں تھی؟

میں نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ونگ ہنگ سے کہا ''ڈاکٹر موگنگ کو تشویش ناک حالت میں سٹی اسپتال کھٹمنڈو پہنچا دیا گیا ہے لیکن ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کامیابی نہیں ہوسکی۔''

''اس کو بھی ڈھونڈ لیتے ہیں۔'' وہ تیزی سے فون سیٹ کی جانب لپکا۔

میں اس کو دیکھتے ہوئے موجودہ صورتِ حال پر غور کرنے لگا۔

ہنگ نے ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد مختصر بات کی اور فون سیٹ کے قریب رکھی نوٹ بک پر ایک نمبر لکھ لیا۔ پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے مذکورہ اسپتال کا نمبر لے لیا ہے۔ اب میں کھٹمنڈو کے اس اسپتال سے رابطہ کررہا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔

اگلے ہی لمحے وہ سٹی اسپتال کھٹمنڈو سے جڑ چکا تھا۔ اس نے تین منٹ تک متعلقہ افراد سے بات کی۔ میں یک طرفہ گفتگو سنتا رہا۔ ریسیور کریڈل کرنے کے بعد اس نے مجھے بتایا۔

''وجدان! آج لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے دوپہر دو زخمی اور بے ہوش افراد کو اس اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ ان میں ایک مرد اور دوسری عورت ہے تاہم ان کے نام ڈاکٹر موگنگ اور دھنو یا ساحل نہیں ہیں۔ تم تصدیق کررہے ہو کہ اس اسپتال میں ڈاکٹر موگنگ موجود ہے تو پھر سوچا جاسکتا ہے' انہوں نے وہاں اپنے اصل نام ظاہر نہ کیے ہوں۔ بہر حال!''

وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''زخمی مرد اور عورت کو الگ الگ کمروں میں رکھا گیا ہے اور بڑی توجہ سے ان کا علاج جاری ہے۔ ڈاکٹر موگنگ کے ساتھ تم نے جس عورت کو دیکھا تھا، وہ بھی اسپتال پہنچادی گئی ہے۔ وہ دھنو یا ساحل ہے یا نہیں' اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

نیوجرسی اور کھٹمنڈو کے مقامی وقت میں کم و بیش سوا گیارہ گھنٹے کا فرق ہے۔ اگر کھٹمنڈو کے وقت کے مطابق انہیں ساڑھے بارہ بجے دوپہر اسپتال پہنچایا گیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا اس وقت یہاں رات کا سوا ایک بجا تھا...... اور یہ وہی لمحات تھے جب ہم وسیم کے معائنے میں مصروف تھے۔ اس کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال میں ہمیں خاصا وقت لگ گیا تھا۔

میں نے ہنگ سے کہا ''اس وقت تک ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں جب تک ڈاکٹر موگنگ کو ہوش نہیں آجاتا۔ ایک مرتبہ کسی طرح براہِ راست اس سے ہماری بات ہوجائے تو صورتِ حال کی صحیح شکل سامنے آسکتی ہے۔''

''لارڈ بدھا سے مجھے امید ہے' سورج طلوع ہونے سے پہلے ڈاکٹر موگنگ کو ہوش آجائے گا۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا ''نیوجرسی کا سورج یا کھٹمنڈو کا؟''

''میں یہاں کی بات کررہا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولا ''وہاں کھٹمنڈو میں تو اس وقت رات کا آغاز ہوچکا ہوگا۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔'' میں اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔

وہ بولا ''اس دوران میں تم تھوڑے وقفے سے اگر چاہو تو ادھر جھانک بھی سکتے ہو مگر میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔''

''پھر تم مجھے کون سا مشورہ دینے والے ہو؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''آرام سے سو جاؤ اور اپنی نیند پوری کرو۔ بدھا نے چاہا تو صبح تک سب ٹھیک ہوجائے گا۔ جن خیر خواہوں نے ڈاکٹر کو اسپتال تک پہنچایا ہے' وہ اور وہاں کے ڈاکٹر سب مل کے اس کا بہت خیال رکھ رہے ہوں گے۔ میں محسوس کررہا ہوں' تمہیں بھی ایک بھرپور نیند کی ضرورت ہے۔''

''اور تمہیں تو بالکل نہیں ہے نا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ بولا ''میں جانے کی تیاری کروں گا۔''

''اس وقت کہاں جاؤ گے؟''

''کہیں بھی۔'' وہ پُراسرار انداز میں بولا ''وسیم تو فی الحال کہیں آنے جانے کے قابل نہیں رہا لیکن تمہارے ڈاکومینٹس کی تیاری بہت ضروری ہے۔ اگر یہ کنفرم ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر کے ساتھ دھنو بھی اس اسپتال میں پہنچائی گئی ہے تو پھر میرا خیال ہے تم اسرائیل کے بجائے نیپال جانے کو ترجیح دو گے!''

''تمہارا خیال بالکل درست ہے۔'' میں نے جلدی سے کہا ''اسی لیے میں سونے کے بجائے ڈاکٹر سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ کھٹمنڈو کے اس اسپتال کا نمبر میری یادداشت میں محفوظ ہوچکا ہے۔''

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ''اگر اس دوران میں ڈاکٹر کو ہوش آ بھی جاتا ہے تو بھی اسپتال والے براہِ راست اس سے تمہاری بات نہیں ہونے دیں گے۔''

''میں ان لوگوں میں سے کسی کو فون تک لانے کی کوشش کروں گا جنہوں نے ڈاکٹر کو اسپتال پہنچایا ہے۔'' میں نے کہا ''ان میں سے کوئی نہ کوئی اسپتال میں ضرور موجود ہوگا۔ وہ ڈاکٹر اور ساحل کے بارے میں مجھے بتا سکتے ہیں۔''

''مجھے اس کی امید نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''تم ان لوگوں سے اور وہ تم سے واقف نہیں ہوں گے۔ ایک اجنبی کو وہ کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔''

میں نے کہا ''میں محسوس کررہا ہوں تم ان سے جانکاری نہ ل سکتے ہو!''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تو ٹھیک ہے تم ہی ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔''

میں نے کہنے کو یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن میرے ذہن میں کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ میں رات کے باقی حصے میں سونے کے بجائے ڈاکٹر موگنگ کی خیریت اور ساحل کی ''حقیقت'' جاننا چاہتا تھا۔ یہ معلوم کرنا بہت ضروری تھا کہ میں نے کھٹمنڈو کے مضافات میں پھیلے ہوئے بلند و بالا پہاڑوں میں جس عورت کو ڈاکٹر موگنگ کے ساتھ گولیوں کی برسات میں نہاتے ہوئے دیکھا تھا' وہ میری ساحل ہی تھی یا پھر کوئی اور دھوکا عورت!

''ٹھیک ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔''

ہنگ نے ایک مرتبہ پھر جانے کی بات کی تو میں نے کہا ''تم واپس چائنا ٹاؤن تو نہیں جاسکتے۔ وہاں کے حالات بھی خاصے گڑبڑ ہیں۔ کیا کسی نئے ٹھکانے کی طرف رخ کرنے کا ارادہ ہے؟''

وہ بولا ''میں نے جانے کی بات اس لیے کی تھی کہ تم آرام سے سو جاؤ' ورنہ میں صبح ہی یہاں سے روانہ ہوں گا۔ میں دوسرے کمرے میں رات کا باقی حصہ گزاروں گا اور جہاں تک چائنا ٹاؤن کا تعلق ہے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے واپس چائنا ٹاؤن ہی جانا ہے۔''

اس کے لہجے کی قطعیت نے مجھے چونکا دیا۔ ہمارے درمیان' ایف بی آئی والوں کی سرگرمیوں کے بارے میں تفصیلی بات ہوچکی تھی اس کے باوجود بھی وہ چائنا ٹاؤن جانا چاہتا تھا تو میں اس کے فیصلے پر حیران تھا۔ میں نے کہا۔

''یہ خود کو پریشانیوں میں پھینکنے والی بات نہیں ہوگی؟''

''ہوگی!'' اس نے کندھے اچکائے ''لیکن فرار کا راستہ اختیار کرنا مجھے گوارا نہیں۔ تمہارے منظر سے ہٹ جانے کی بات دوسری ہے لیکن میں چائنا ٹاؤن کا ایک معزز اور دیرینہ رہائشی ہوں۔ ابھی تک میں تمہارے سلسلے میں ملوث ثابت نہیں ہوا۔ میں چائنا ٹاؤن میں رہ کر حالات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کروں گا...... اور مجھے یقین ہے میں ایسا کرلوں گا۔''

وہ سانس لینے کو رکا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''مجھے جیسے ہی حالات کی سنگینی کا پتا چلا' میں اپنے ٹھکانے سے ہٹ گیا۔ میں دراصل تم لوگوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانا چاہتا تھا۔ اب مجھے تمہاری طرف سے بے فکری ہوگئی ہے۔ تم یہاں آرام اور اطمینان سے وقت گزار سکتے ہو۔ لی یان اور شون تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے۔ میں نیویارک کے

معاملات کو سنبھال لوں گا۔ ویسے بھی آج کا دن میں مین ہیٹن میں نہیں ہوں اس لیے وہاں ہونے والی کسی بھی قانونی یا غیر قانونی سرگرمی میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ اپنے مین ہیٹن سے باہر ہونے کی بات میں تمہیں دوپہر میں بتا چکا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا ''مگر مجھے تمہاری جان آسانی سے چھوٹتی ہوئی نظر نہیں آ رہی۔ ٹرائی بیکا والے اپارٹمنٹ میں جو کچھ پیش آیا اور ایف بی والوں نے جس انداز میں تمہارا ذکر کیا تھا اس کے پیش نظر تمہارے لیے بھی حالات اتنے ہی سنگین ہیں جتنے ہمارے لیے۔ بہر حال!''

''تم سب مجھ پر چھوڑ دو نا!'' وہ دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے چھوڑ دیا۔'' میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا ''میں کسی وقت بھی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ تم آرام سے اپنی نیند پوری کرو۔ بدھا نے چاہا تو کل دن میں کسی وقت ملاقات ہوگی۔ میں لی یان اور شون کو تمہارے متعلق خصوصی ہدایات دے جاؤں گا۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''تھینک یو۔'' میں نے تشکرانہ لہجے میں کہا ''میرے ڈاکومینٹس کے سلسلے میں دیکھ بھال کر کسی سے بات کرنا۔ تمہارا قابلِ اعتماد بندہ مسٹر جونی تو بہت ہی بودا ثابت ہوا ہے۔''

ہم جونی کی ''کارکردگی'' پر تفصیلی بات کر چکے تھے۔ ہنگ نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میں ابھی تک کنفرم نہیں ہوں کہ جونی نے بدعہدی کا ارتکاب کیا ہوگا!''

''تم بھی کمال کی بات کرتے ہو!'' میں نے الجھن بھری نظر سے اسے دیکھا ''ایف بی آئی والوں نے خود اس کے ''کارنامے'' کا ذکر کیا تھا؟''

''جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں' ایف بی آئی والوں نے تمہیں بلف کیا ہے۔'' وہ بڑی رسانیت سے بولا ''تم نے مجھے جو واقعات بتائے ہیں ان سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہارے منہ سے جونی کا نام سن کر انہوں نے اس کردار کو کہانی میں انٹر کر دیا ہے ورنہ وہ اپنی معلومات کے بل بوتے پر وہاں پہنچے تھے۔ تم ایف بی آئی اور دیگر خفیہ ایجنسیوں کے ایجنٹوں کو نہیں جانتے۔ یہ بلا کے دروغ گو اور موقع پرست ہوتے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

''اگر مسٹر جونی کی مخبری پر وہ شام ہی سے ہمیں واچ کر رہے تھے تو پھر انہیں ہم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے آدھی رات تک انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہارا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ وہ ایک لمحے کی تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اوپر والے ان کی ایسی کم تیسی کر دیں گے۔''

وہ بیک وقت دو متضاد باتیں کر رہا تھا۔ ٹرائی بیکا والے اپارٹمنٹ کو چھوڑنے سے پیشتر جب میں نے اسے اپنے حالات بتانے کے لیے فون کیا تھا تو اس نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ وہاں چائنا ٹاؤن میں بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں اس لیے وہ اپنا ٹھکانا چھوڑ رہا ہے اور اب وہ اتنے اطمینان سے باتیں کر رہا تھا جیسے اس کے لیے کہیں کوئی خطرہ نہ ہو۔ اس کے متضاد رویّے نے مجھے الجھا دیا تاہم میں نے اس سے کوئی جرح نہ کی اور معتدل لہجے میں کہا۔

''بہر حال مسٹر ہنگ! تم زیادہ بہتر جانتے ہو۔''

''ریلیکس مائی فرینڈ۔'' اس نے میرا شانہ تھپتھپایا ''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اتنا کمزور نہیں ہوں۔''

میں زیر لب مسکرا دیا۔ وہ مجھ سے شیک ہینڈ کرنے کے بعد دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ خود بہ خود سب ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ سب ٹھیک کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔

ہم نے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر یہ گفتگو کی تھی۔ ہنگ کے جانے کے بعد میں اس کمرے میں آ گیا جہاں وسیم موجود تھا۔ وہ اس وقت گہری نیند میں تھا۔ مرہم پٹی کے بعد لی یان نے اسے دردکش اور مسکن انجکشن بھی دے دیا تھا۔ ہنگ میرے لیے الگ بیڈ روم میں سونے کا بندوبست کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے وسیم کے ساتھ ہی رہنے کو ترجیح دی۔ ویسے بھی اس اپارٹمنٹ میں تین بیڈ روم تھے۔ دو ہم گھیر کر بیٹھ جاتے تو میزبان بے چارے کہاں جاتے جب کہ ہنگ بھی اس رات وہیں رک رہا تھا۔

ہنگ کا رویّہ مسلسل مجھے الجھن میں ڈال رہا تھا۔ پہلے اس نے کہا' وہ واپس جا رہا ہے پھر بتایا وہ رات یہیں گزارے گا۔ مجھ کو شب بخیر کہنے سے پہلے اس نے یہ بھی سنا دیا کہ اب کل دن میں کسی وقت ملاقات ہوگی۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے' ان کے پیش نظر اسے جتنا پُرتشویش ہونا چاہیے تھا وہ اتنا نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے ٹھہراؤ اور اطمینان کو دیکھتے ہوئے میں کہہ سکتا تھا' اس نے اپنے ذہن میں کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے اور اس ''کچھ اور'' سے فی الحال مجھے آگاہ نہیں کرنا چاہتا۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ رات...... یعنی صبح کے

تین بج رہے تھے۔ اس وقت کھٹمنڈو میں اگلے روز دو یا دو سوا دو بج رہے ہوں گے۔ میں شدید نیند محسوس کر رہا تھا لیکن خود کو نیند کی آغوش کے سپرد کرنے سے پہلے میں نے اسپتال کھٹمنڈو میں جھانکنا ضروری سمجھا۔

میں نے بیڈ پر دراز ہونے کے بعد اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ڈاکٹر مونگ کے خدوخال کو اپنے تصور میں ابھار کر تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ ہنوز سو رہا تھا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ اس وقت بے ہوش تھا یا نارمل نیند کے زیرِ اثر تھا۔ اس کمرے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے ماحول کا حصہ بنا رہا پھر وہاں سے واپس آگیا۔

میرا ذہن تیزی سے ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ براہِ راست کوشش پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی بارآور نہ ہوسکی۔ اسی لمحے یکایک میرے تصور میں اس نرس کا چہرہ گھوم گیا جسے میں نے ایک ڈاکٹر کے ساتھ ڈاکٹر مونگ والے کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے ساحل تک پہنچانے کا وسیلہ بن سکتی تھی۔

میں نے مذکورہ نرس کے سراپا اور صورت کو تیسری آنکھ کے سامنے روشن کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا مگر...... اس سے اگلے لمحے مجھے واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ وہ اس وقت کسی مرد کے ساتھ تھی اور وہ دونوں ایسی حالت میں تھے کہ اخلاقیات انہیں دیکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ پتا نہیں وہ مرد اس کا شوہر تھا یا پھر بوائے فرینڈ! وہ جو کوئی بھی تھا اس کے بہت قریب تھا۔ وہ من و تو کی دنیا سے بہت دور نکل گئے تھے۔

میں آنکھیں کھول کر بیڈ روم میں حاضر ہوگیا۔ کمرے کی لائٹ کو میں نے جلتا چھوڑ دیا تھا۔ وسیم کی جانب نظر گئی تو میں نے اسے بے سدھ سوتے ہوئے پایا۔ لامحالہ میرا ذہن دوبارہ اس نرس کی طرف چلا گیا لیکن اس مرتبہ میں نے تصور کی نگاہ کو زحمت نہیں دی بلکہ اسے محض سوچ کی حد تک محدود رکھا۔

ایک بات یقینی تھی کہ وہ اس وقت اپنی ڈیوٹی پر نہیں ہوسکتی تھی۔ عام طور پر اسپتالوں میں ایک یا دو بجے کے قریب ڈیوٹی تبدیل ہوجاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو تصور کی نگاہ سے اس اسپتال سے رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ عین ممکن تھا اس نرس کی ڈیوٹی بھی آف ہوگئی ہو۔ جب تک وہ دوبارہ اسپتال میں ان نہ ہوتے میں ان کے توسط سے ساحل تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

ابھی تک اس بات کی تصدیق نہیں ہوسکی تھی کہ ڈاکٹر سانگ کے ساتھ زخمی حالت میں اسپتال پہنچائی جانے والی عورت ساحل ہی تھی یا کوئی اور۔ یہ تصدیق صرف دو افراد ہی کرسکتے تھے۔ نمبر ایک ڈاکٹر مونگ ریفوشے! اور وہ فی الحال میرے رابطے میں نہیں تھا۔ نمبر دو، ربی موشے ہائمن!

ربی کا خیال آتے ہی اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس عیار شخص نے مجھے نچا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کے سامنے میری روحانی صلاحیتیں بے اثر ہوکر رہ جاتی تھیں۔ جب سے اسے میری تیسری آنکھ والی صلاحیت کے بارے میں مبہم پتا چلا تھا اس نے ساحل کے حوالے سے میرے تصور کے سامنے ایک ایسی دیوار کھینچ دی تھی کہ میں براہِ راست ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہا تھا، حالانکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔

ساحل ربی کے لیے بہت قیمتی تھی۔ وہ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ ''راز'' تک رسائی کی ٹیکنیک سے آگاہ تھی۔ ایک موقع پر ربی نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اقرار کیا تھا کہ کھٹمنڈو والے محاذ پر اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ ساحل کو کھٹمنڈو کے مضافاتی پہاڑوں تک پہنچانے میں دریغ نہیں کرے گا۔ عین ممکن تھا، اسرائیل کے حوالے سے اس نے مجھ سے غلط بیانی کی ہو۔ ساحل کو اس نے اپنے شاطر بندوں کی نگرانی میں کھٹمنڈو پہنچا دیا ہو! وہ مجھے اسرائیل کا راگ محض اس لیے سنا رہا ہو کہ اس راگ پر مست ہوکر میں دوڑا چلا آؤں گا!

یہ ایک خاصا قوی امکان تھا۔ بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں انمول خزائن دفن تھے۔ ربی کا خصوصی ٹارگٹ وہ پانچ قیمتی پتھر تھے جو پوری دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ربی کا عقیدہ تھا کہ اگر وہ ان پتھروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ دنیا کا طاقتور ترین شخص بن جائے گا۔ ڈائمنڈ (ہیرا) ایمرالڈ (پنا) روبی (یاقوت) سیفائر (نیلم) اور ٹوپاز (پکھراج) کا وہ کمبی نیشن طاقت اور سربلندی کی علامت تھا۔ قدیم عبرانی کتابوں میں اس کی روحانی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ ربی موشے ہائمن ہیبرو (عبرانی) کا ماہر تھا اور اس نے اپنی روحانی صلاحیت کو استعمال کرکے یہ جان لیا تھا کہ یہ پانچ لاثانی پتھر کہاں پوشیدہ ہیں۔ ان کے حصول کے لیے وہ زمین آسمان ایک کرنے کو تیار تھا۔

انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے۔ یہ کبھی ایک مقام پر قناعت نہیں کرتا۔ اس کا شمار نہیں کرتا کہ اسے کیا کیا حاصل

ہے بلکہ یہ دیکھتا ہے، اسے کیا حاصل نہیں۔ اس کے حصول کے لیے وہ سر پٹختا رہتا ہے۔ ربی موشے ہائمن کی طاقت و اختیار میں کوئی کلام نہیں تھا۔ دنیا کے سب سے بڑے بااختیار ملک کا صدر دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ وہائٹ ہاؤس میں اس کی چلتی تھی۔ اس کے اشارۂ ابرو پر امریکی صدور کی تقرری اور تنزلی عمل میں آتی تھی لیکن یہی بااثر شخص اپنے اثر میں اضافے کی خاطر پانچ بے مثال پتھروں کے حصول کا خواہاں تھا اور اس خواہش کے لیے وہ خون کی ندیاں بہانے کو بھی تیار تھا!

دوسری جانب اس زیرِ زمین دفینے کی بھی ایک خونریز تاریخ موجود تھی۔ آج تک جس کسی نے بھی اس تک پہنچنے کی کوشش کی وہ بے موت مارا گیا۔ ہر دور کا دلائی لاما اس خزانے پر خصوصی نظر رکھتا تھا اور اپنے چنیدہ بندوں کے توسط سے وہ اس کی حفاظت کا بندوبست بھی کرتا تھا۔ پتا نہیں اس مرتبہ ''یہ حصول اور بچاؤ'' کی کشمکش کون سا خون رنگ نقشہ تیار کر رہی تھی!

ڈاکٹر مونگ کی کوشش اور محترم سانگ فو کی یہ خواہش تھی کہ کھٹمنڈو والے مشن میں، میں ان کے ساتھ رہوں لیکن میرا دھیان کہیں اور ہی لگا ہوا تھا۔ ایک موقع پر میں نے سانگ فو سے ندامت آمیز انداز میں کہہ بھی دیا تھا، میرے محترم! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی توقع پر پورا نہیں اتر سکا۔

اس نے مسکرا کر کہا تھا، کوئی بات نہیں۔ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ میں تمہیں بدھ نیل کنڈ والے مشن سے ہرگز ہرگز الگ نہیں دیکھ رہا ہوں!

اس کے پُراسرار اور معنی خیز جملے نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ہماری آخری اور پہلی ملاقات تھی۔ سانگ فو بہت ہی گہرا شخص تھا۔ وہ اگر مجھے بدھ نیل والے مشن میں اپنے ساتھ دیکھ رہا تھا تو پھر میں بھی......!

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک تیز جھماکا سا ہوا اور سوچ خود بخود اسی پٹری پر دوڑنے لگی کہ حالات مجھے باندھ کر کھٹمنڈو کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اگر سانگ فو کے مبہم الفاظ کسی پیش گوئی کا حصہ تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، میری ساحل کو ربی نے کھٹمنڈو پہنچا دیا تھا اور مجھے خزانے کی حفاظت اور ساحل کے حصول کے لیے ادھر ہی کا رخ کرنا تھا۔

اس سوچ نے مجھے بے چین کردیا اور میں بستر سے اُتر کر کمرے کے فرش پر ٹہلنے لگا۔ حالات و واقعات کھٹمنڈو کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میری ساحل کھٹمنڈو کے سٹی اسپتال میں زخمی پڑی تھی اور میں اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر تڑپ رہا تھا۔

میری زندگی میں بہت کم ایسے مواقع آئے ہیں جب جذبات نے مجھ پر غلبہ حاصل کرلیا ہو۔ میں عقلی دلائل کو بہت اہمیت دیتا ہوں اور عقل کا تقاضا یہ تھا کہ جب تک ساحل کے حوالے سے تصدیق نہ ہوجائے، مجھے کھٹمنڈو کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ تصدیق کرنے والوں میں سے ایک بے ہوش تھا یعنی ڈاکٹر مونگ اور دوسرا یعنی موشے ہائمن اسرائیل میں بیٹھا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ربّی کے چٹکی لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کا سیل نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں اسے فون کرکے الٹی سیدھی سنا سکتا تھا۔ ممکن تھا اس کے نتیجے میں اس کی زبان سے کوئی اہم بات خارج ہوجاتی۔ موشے ہائمن اس وقت میرا دشمنِ اول تھا اور اس کے ایما پر مجھے ایک خطرناک پاکستانی دہشت گرد قرار دیا جاچکا تھا۔ ایسے ''خیر خواہوں'' کی گاہے بگاہے خبر لیتے رہنا چاہیے!

لیکن مصیبت یہ تھی کہ اسے فون کرنے کے لیے بے حد احتیاط کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے سورس سے کال کرنے والے کی پوزیشن معلوم کرواسکتا تھا چنانچہ اپارٹمنٹ والا فون استعمال کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر مجھے مسٹر ہنگ کے موبائل فون کا خیال آگیا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر ہنگ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت شون اور لی یان کے ساتھ کسی سنجیدہ گفتگو میں مصروف تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی حیرت بھرے لہجے میں اس نے کہا۔

''تم سوئے نہیں؟''

''میں کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کافی!'' ہنگ نے حیرت سے دہرایا ''کافی پی کر تو تمہاری رہی سہی نیند بھی اڑ جائے گی۔''

میں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا ''میرے ساتھ الٹا معاملہ ہے چائے کافی اور دیگر برین اسٹیمولینٹ میرے اعصاب کا مساج کرکے مجھے نیند کی گود میں لے جاتے ہیں۔ اگر اس وقت مجھے ایک مگ کافی مل جائے تو میں پُرسکون نیند سو سکوں گا۔''

''یہ تو عجیب و غریب رسپونڈ ہے۔'' شون نے آنکھیں پھیلائیں ''میں نے پہلے تو کسی شخص کو ایسی عادت میں گرفتار نہیں دیکھا!''

ہنگ نے کہا ''مسٹر وجدان کے ساتھ بہت کچھ عجیب و غریب ہے۔ بہرحال۔'' پھر وہ لی یان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا ''وجدان کے لیے ایک مگ کافی چاہیے۔''

''شیور!'' وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئی ''میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔''

لی یان کمرے سے نکل گئی تو ہنگ نے مجھ سے استفسار کیا ''تمہارے ساتھی کا کیا حال ہے؟''

اس کا اشارہ وسیم کی جانب تھا' میں نے کہا ''مزے سے سو رہا ہے!''

''تمہیں اسرائیل جانا ہے یا کھٹمنڈو اس کا فیصلہ تو کل ہوجائے گا لیکن ایک بات طے ہے' وسیم آٹھ دس دن کے لیے یہیں آرام کرے گا۔ جب تک یہ ٹھیک ہوجاتا' میں بہ آسانی تمہاری ہدایت کے مطابق اس کے ڈاکومینٹس تیار کروالوں گا۔''

''وسیم کے ڈاکومینٹس تو بعد میں تیار ہوتے رہیں گے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''لیکن میں اپنی روانگی کا فیصلہ سورج طلوع ہونے سے پہلے کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' ہنگ نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

شون بھی الجھی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

ہنگ جس طرح شون کے سامنے مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کررہا تھا اور میرے کیس کو جتنی آزادی سے ڈسکس کررہا تھا اس سے یہی ثابت ہوا کہ شون اور لی یان اس کے با اعتماد اور قابلِ بھروسا ساتھی تھے۔ میں نے ہنگ کے سوال کے جواب میں کہا۔

''وہ ایسے کہ مجھے اسی وقت ربی کو ایک کال کرنا ہوگی اور اس کے لیے مجھے ایک ایسے فون کی ضرورت ہوگی جس کی ٹریسنگ کا خدشہ موجود نہ ہو!''

ہنگ نے گمبھیر لہجے میں کہا ''اس اپارٹمنٹ والے فون کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔''

''میں بھی اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔

ہنگ نے پوچھا ''تمہارے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہے؟''

''میں تمہارے سیل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔''

''اوہ!'' اس کے لبوں سے تاسف بھری سانس خارج ہوئی۔

''کیوں' کوئی پرابلم ہے؟''

''نن..... نہیں۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا ''لیکن اس کال کے بعد مجھے سیل کو آف رکھنا ہوگا ورنہ......''

''میں اس سیل کی بات کررہا ہوں جو آل ریڈی آف

چل رہا ہے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''وہ سیل جس کی چوری کی تم رپورٹ درج کروانے والے ہو جیسے گمشدہ شیورلٹ کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ اگر تمہارے ''گمشدہ'' سیل کو استعمال کرکے میں ربی کو ایک کال کرلوں گا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ متاثر ہوتے ہوئے بولا ''تمہارے ذہن میں غضب کا خیال آیا ہے وجدان! میں تو اس سیل کو فراموش کیے بیٹھا تھا۔ واقعی اس سلسلے میں اس سیل کا استعمال انتہائی محفوظ ثابت ہوگا!''

''گم ہوجانے والی اشیا کو یوں فراموش نہیں کردینا چاہیے مسٹر ہنگ!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا ''کیا وہ موبائل اس وقت تمہارے پاس ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا ''اس کی بیٹری قریب الختم تھی جب میں نے اسے آف کیا تھا۔ دیکھتا ہوں' اب کیا پوزیشن ہے۔''

''اگر چارجر تمہارے پاس ہو تو سیل کو چارجنگ پر لگادو۔'' جب تک ہم...... بلکہ میں کافی پی کر فارغ ہوتا' اس میں اتنی چارجنگ ہوچکی ہوگی کہ میں ربی سے ایک دو باتیں کرسکوں۔''

ہنگ نے مذکورہ سیل کو چارجنگ پر لگادیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''میرا مشورہ ہے کہ تم اپارٹمنٹ سے باہر جاکر سیل کو استعمال کرنا۔ ابھی ایک آدھ روز تمہیں یہاں قیام کرنا ہے۔''

''میں تمہارے مشورے کی حقیقت کو سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے مدبرانہ انداز میں کہا ''یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے تم فکر نہ کرو' میں اس اپارٹمنٹ سے کچھ فاصلے پر جاکر ربی سے رابطہ کروں گا۔''

اسی وقت لی یان میرے لیے کافی بنا لائی۔ میں نے مشرقی روایات کا خیال کرتے ہوئے انہیں ''صلح'' ماری لیکن انہوں نے رات کے آخری پہر ایک سپ تک لینے سے انکار کردیا چنانچہ آئندہ دس منٹ میں' میں نے کافی کا مگ خالی کردیا۔

اس دوران میں سیل کی بیٹری میں اتنی ''جان'' آگئی تھی کہ میں بہ آسانی پانچ منٹ تک ربی سے بات کرسکتا تھا۔ میرے باہر جانے کا مرحلہ آیا تو ہنگ نے لی یان کو اشارہ کیا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''تم لی یان کے ساتھ ان کی گاڑی میں جاؤ۔ لی یان

یہاں کے چپے چپے سے آگاہی رکھتی ہے۔ اپنا کام کرنے کے بعد تم واپس آجانا۔ کسی عورت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے تم زیادہ محفوظ رہو گے۔''

میں نے ہنگ کے مشورے کو راست جانا اور لی یان کے ساتھ اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ نیویارک اور نیوجرسی کے موسم میں زیادہ فرق نہیں۔ رات کا آخری حصہ یخ بستگی کا عظیم الشان نمونہ پیش کررہا تھا تاہم لی یان کی گاڑی ائرکنڈیشنڈ تھی لہٰذا ہم دونوں موسم کی غضب ناکی سے محفوظ تھے۔ میں اس کے برابر میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب گاڑی لنکن پارک سے نکل کر کینیڈی بلیوارڈ پر آئی تو لی یان نے مجھ سے پوچھا۔

''کس طرف چلنا ہے؟''

''میں تو پہلی مرتبہ نیوجرسی آیا ہوں۔ یہاں کے راستوں سے واقف نہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی ''میرا مطلب یہ تھا کتنی دور جانا ہے؟''

''بہت دور۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''بہت دور کہاں؟'' وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

لی یان فلپائنی تھی لیکن امریکا میں طویل قیام کے طفیل وہ فراٹے سے امریکی لب و لہجے میں بولنے کی ماہر ہوگئی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں ایک ایسی بات کہہ دی تھی جس پر اس کا چونک جانا لازمی تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیا یہاں قریب ہی کوئی ایسا مقام موجود ہے جہاں سے ہم نیویارک اسٹیٹ میں داخل ہوسکیں؟'' میں نے بات کے اختتام پر اس کی جانب دیکھا۔

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولی ''ایک تو وہی ہالینڈ ٹنل والا راستہ ہے۔''

''وہ نہیں۔'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔

''ایک آگے بھی ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''ادھر سے ہم اسٹیٹن آئی لینڈ میں داخل ہوسکتے ہیں جو نیویارک کا ایک مشہور جزیرہ ہے۔''

''اوکے ہم تھوڑی دیر کے لیے اسٹیٹن آئی لینڈ جارہے ہیں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

درحقیقت اس پیش بندی سے میں ربی موشے ہائمن کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں ابھی تک نیویارک ہی میں ہوں۔ مین ہیٹن میں نہ سہی' اسٹیٹن آئی لینڈ ہی میں سہی! اس بات کے روشن امکانات تھے کہ وہ میری لوکیشن کو معلوم کروالے گا۔ اس کے لیے یہ ایک خوبصورت دھوکا ہوتا۔

لی یان نے پھر کوئی سوال نہ کیا اور محتاط انداز میں گاڑی دوڑاتی چلی گئی۔ کینیڈی بلیوارڈ کو چھوڑ کر ہم ''ون سکسٹی نائن نیوجرسی ہائے وے'' پر آئے۔ یہ ہائی وے آگے جاکر نیوجرسی کی حدود ہی میں ''فورفورٹی نیویارک ہائی وے'' میں بدل گئی اور اسی پر سفر کرتے ہوئے ہم نیویارک کے ایک جزیرے ''اسٹیٹن آئی لینڈ'' میں داخل ہوگئے۔

فاریسٹ ایونیو کو عبور کرکے ہم ویلو بروک پارک کی جانب بڑھنے لگے تو میں نے سیل آن کرکے ربی کا نمبر ملایا۔ اس وقت نیویارک وغیرہ میں صبح کے چار بجے تھے۔ اسرائیل میں آئندہ روز دوپہر کے ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا۔

جیسے ہی دوسری جانب کال ریسیونگ کے بعد مجھے ربی کی ''ہیلو'' سنائی دی' میں نے چہکنے والے انداز میں کہا ''چوری کے موبائل سے بات کررہا ہوں اس لیے لمبی چوڑی تمہید میں نہ پڑ جانا۔ میں جو پوچھوں اس کا ٹھیک ٹھاک جواب دینا۔''

''وجدان! تم اس وقت کہاں ہو؟'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولا۔

میں نے اس کے ساتھ ہتک آمیز انداز اپنایا تھا لیکن اس کے استفسار میں کسی قسم کی برہمی موجود نہیں تھی' بجائے اس کے گہری تشویش پائی جاتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا' میری آواز سن کر اس نے کسی گمشدہ خزانے کا سراغ پالیا ہو۔ میں اس موقع پر لمبی چوڑی گفتگو کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ میری یہ کال ٹیپ اور ٹریس کرنے کے سلسلے میں ٹیلی کمیونی کیشن کے کئی حساس آلات اس وقت مصروفِ عمل ہوں گے۔

''میں اسرائیل میں کھڑا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''اور ایک مرتبہ پھر تمہارے جھوٹ کی داد دینے کو جی مچل رہا ہے۔''

''کیسا جھوٹ؟''

''تم نے بتایا تھا' ساحل تمہارے پاس اسرائیل پہنچنے والی ہے لیکن تم نے اسے کہیں اور ہی پہنچا دیا!'' میں نے زہریلے انداز میں کہا۔

وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولا ''میں نے اسے کہاں پہنچادیا ہے؟''

''کھٹمنڈو۔''

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔''

''یہ خرابی تمہارے ہی کرتوتوں کے طفیل پیدا ہوئی ہے۔'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھ بیٹھا ''تمہارے پاس

یہ ثبوت ہے کہ میں نے ساحل کو اسرائیل کے بجائے کھٹمنڈو پہنچا دیا ہے؟"

"سب سے بڑا ثبوت تو تم ہی ہو!"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ کہہ رہا ہوں' کھٹمنڈو والی بات تم ہی نے مجھے بتائی ہے!"

"کومت!" وہ پھنکارا "اتنا بڑا راز میں تمہیں کیونکر......!"

میں نے لائن کاٹ دی اور اگلے ہی لمحے موبائل فون کا سوئچ آف کر دیا۔ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا میں نے ربی کو تاؤ دلا کر اس کے منہ سے وہ حقیقت اگلوائی تھی جس کی تصدیق نہیں ہو پا رہی تھی۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کا امکان باقی نہیں تھا کہ میری ساحل اسرائیل میں نہیں بلکہ کھٹمنڈو میں تھی۔

میں نے سیل کو جیب میں رکھنے کے بعد لی یان سے کہا "واپس چلو کام ہو گیا۔"

وہ نیویارک ہائی وے فورفورٹی پر تھوڑا آگے آئی پھر ویلو بروک پارک کے نزدیک سے اس نے گاڑی کو یو۔ ایس انٹراسٹیٹ ٹو سیونٹی ایٹ پر موڑ لیا۔ ہم نے اسی روڈ پر سفر جاری رکھتے ہوئے اسٹیٹ حدود کو عبور کیا اور نیویارک سے نیوجرسی میں داخل ہونے کے بعد یو۔ ایس انٹراسٹیٹ نائن فائیو پکڑ لی۔

لی یان نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "وجدان! میں تمہارے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ ہمارے حلقے میں پچھلے چند دنوں سے تمہارا ذکر ہونے لگا ہے۔ ابھی زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے تمہارے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ہے۔ تم زبردست ایڈونچر میں ہو!"

لی یان کے لہجے سے مسرت آمیز حیرت جھلکتی تھی۔ میں نے اس کے توصیفی کلمات کے جواب میں کہا "ٹھیک کہتی ہو۔ ہم دونوں کے طرز زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ تم سارا دن فوٹو اسٹوڈیو میں دکان داری کرتی ہو اور میری زندگی مسلسل حرکت میں ہے۔ یہ تفاوت بھی بہت اہم ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں' تم اپنی زندگی سے کچھ بور ہو۔"

"ایسی بات نہیں وجدان!" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "ہمیں متحرک زندگی گزارنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ کبھی ایک ساتھ مل کر اور کبھی علیحدہ علیحدہ مگر جو تھرل تمہاری زندگی کا خاصہ ہے اس کا تجربہ ابھی تک نہیں ہوا۔"

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا "دل چھوٹا نہ کرو لی یان! قدرت تمہیں بھی ایسا موقع ضرور دے گی۔ ویسے ایک بات بتا دوں اس تھرل میں ہر لمحہ زندگی داؤ پر لگی رہتی ہے۔"

"اسی میں تو مزہ ہے۔" وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔

پھر ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو ہونے لگی۔ لی یان نے مجھے بتایا کہ وہ اور شون' مسٹر ہنگ کے احکام کی تعمیل کرنے کے پابند ہیں۔ بظاہر وہ لوگ دوستوں کی طرح رہتے ہیں مگر ہنگ کی حیثیت ایک باس کی سی ہے۔ وہ انہیں مختلف مقاصد کے لیے کام میں لاتا رہتا ہے۔ فوٹو اسٹوڈیو تو ایک آڑ ہے اور کاروبار کا کاروبار بھی ہے۔ اس اسٹوڈیو پر دو ملازم بھی انہوں نے رکھے ہوئے تھے۔ لی یان اور شون نگرانی اور منیجمنٹ وغیرہ کا کام کرتے تھے۔

تھوڑی بے تکلفی ہوئی تو لی یان نے مجھے نجی زندگی کے بارے میں بھی بتایا۔ ان کی شادی کو چار سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک وہ بے اولاد تھے۔ ان کی محرومی کا سن کر مجھے افسوس ہوا۔ میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اولاد بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے بغیر شادی شدہ جوڑے کی زندگی مکمل نہیں ہوتی۔"

وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی اور خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے' میری بات اسے پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے کوئی اعتراض تو نہیں کیا تاہم اس کا ردعمل بہت کچھ ظاہر کر رہا تھا جب وہ مزید پانچ منٹ بھی خاموش رہی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"تم اچانک اتنی سنجیدہ کیوں ہو گئی ہو؟"

"کوئی بات نہیں۔" وہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"بات تو ہے۔" میں نے کہا "اگر بتانا نہیں چاہتی ہو تو یہ الگ مسئلہ ہے۔"

اس نے کہا "میں زندگی کے لیے اولاد کو ضروری نہیں سمجھتی۔"

اس کے خیالات نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا "کیا تمہارا شوہر شون بھی انہی نظریات کا حامل ہے؟"

جواب دینے کے بجائے وہ زیریں ہونٹ پر ظلم کرنے لگی۔

میں سمجھ گیا' وہ کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھی۔ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا لی یان؟"

"شون کو بچے کی بہت خواہش ہے۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی "میں ہی اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"اوہ!" اب مجھے شون کی بے چارگی پر افسوس ہونے لگا۔

لی یان نے قدرے تلخ لہجے میں کہا "کیا ضروری ہے اپنا ہی بچہ پیدا کیا جائے!"

میں نے استعجابیہ نظر سے اسے دیکھا اور پوچھا "تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ انسان اپنا ہی بچہ پیدا کرتا ہے' دوسروں کا تو نہیں۔ تمہاری بات نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے!"

"میں اڈاپشن کی بات کررہی ہوں۔" وہ میری جانب دیکھے بغیر بولی۔

"کیا تم کوئی بچہ اڈاپٹ کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہو؟"

"ہاں مگر شون کو یہ آئیڈیا پسند نہیں۔" اس نے برا سا منہ بنایا "وہ اپنا بچہ چاہتا ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کا مطالبہ' بلکہ خواہش جائز ہے۔"

"تم مرد ہونا...... اسی کا ساتھ دو گے!"

"یہ بات نہیں لی یان!" میں نے اس عجیب و غریب لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں نے ایک جائز اور اصولی بات کی ہے۔ اس میں مرد کی طرف داری کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولی "تم شاید امریکا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ یہاں ان وانٹیڈ بے بیز (بن چاہے بچے) کا ریشو بہت زیادہ ہے۔ لاتعداد بچے لاوارثوں کی طرح مختلف فلاحی مراکز میں پلتے ہیں۔ اگر ہم وہاں سے کوئی بچہ اڈاپٹ کرلیں تو ایک انسان کو بہتر زندگی فراہم کرسکتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے نیکی کا کام بھی ہوگا۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے مجھ سے سوال کیا "کیا شون کی طرح تم بھی اڈاپشن کو برا سمجھتے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی "میں اڈاپشن کو ہرگز برا نہیں سمجھتا مگر یہ کام اگر نظریۂ ضرورت کے تحت کیا جائے تو واقعی اس سے بڑی اور کوئی نیکی نہیں۔"

"نظریۂ ضرورت سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے پوچھا۔

"اگر کوئی شادی شدہ جوڑا بچہ پیدا کرنے کی قدرتی صلاحیت سے محروم ہو تو اس صورت میں اڈاپشن نظریۂ ضرورت کے تحت ہوگی۔" میں نے وضاحتی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "کیا تم لوگوں کے ساتھ اس قسم کی کوئی پرابلم ہے؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔" وہ قطعی انداز میں بولی۔

"پھر میں یہی کہوں گا تم غلطی پر ہو!"

"میں کیا کروں۔" وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی "بس میں بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتی۔ میں تین بار اابارشن کروا چکی ہوں۔"

"تم فطرت سے کھلی جنگ کررہی ہو۔" میں نے کہا "اور اس جنگ میں آج تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی!"

لی یان کے خیالات کے بارے میں جان کر مجھے اس کی حالت پر افسوس اور بے چارے شون پر ترس آنے لگا۔ یقینی طور پر وہ کسی نفسیاتی پیچیدگی کا شکار تھی۔ بعض اہل اور بعض نااہل والدین اولاد کی خواہش کی خاطر علاج معالجے پر لاکھوں' کروڑوں لٹا دیتے ہیں اور ایک لی یان تھی جو قدرت کے ساتھ جنگ پر کمربستہ تھی۔ میں نے آخر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"تم فطرت کے ساتھ کیوں لڑ رہی ہو؟"

"بس...... مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔" وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی "میں زچگی کے مراحل سے گزرنا نہیں چاہتی۔ میں ڈرتی ہوں۔"

میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ میں کوئی سوشل لیکچرر نہیں تھا کہ اسے سمجھانے کے لیے کوئی لمبی چوڑی دھواں دھار تقریر جھاڑ دیتا۔ لی یان کی اپنی زندگی تھی۔ اس کی مرضی وہ اسے جیسے بھی گزارتی۔ اللہ نے وسیع و عریض دنیا پیدا کی ہے اور اس دنیا کے اندر ہر نوعیت کا کردار بستا ہے۔ اس کی قدرت سے نبرد آزما کردار بھی نظر آئیں گے اور فطرت کی پیروی کرنے والے کردار بھی دکھائی دیں گے۔ لی یان بھی اسی جیتی جاگتی دنیا کا ایک کردار تھی!

ہم یو۔ایس انٹر اسٹیٹ نائن فائیو پر سفر جاری رکھتے ہوئے نیوآرک ائرپورٹ کے پہلو سے گزرے اور "نیوآرک" کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ جرسی سٹی کی طرح نیوآرک بھی نیوجرسی کا ایک اہم حصہ ہے۔ انٹرنیشنل ائرپورٹ کی وجہ سے اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

نیوآرک کے اندر سے گزرتے ہوئے ہم نے نائن فائیو انٹر اسٹیٹ کو چھوڑ کر پولاسکی اسکائی وے پکڑی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر لنکن پارک پہنچ گئے۔

ہم اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہوئے تو ہنگ نے چھوٹتے ہی پوچھا "تم لوگ دور نکل گئے تھے کیا۔ بہت دیر لگا دی۔"

"بس ہوا خوری کا موڈ ہو رہا تھا۔" میں نے لی یان کو معنی خیز نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا "ہم ذرا اسٹیٹن آئی لینڈ کی سیر کو نکل گئے تھے۔"

"اسٹیٹن آئی لینڈ!" ہنگ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "تم جس قسم کی صورتِ حالات سے گزر رہے ہو' اس میں نیویارک کے کسی بھی حصے میں قدم رکھنا تمہارے لیے انتہائی خطرناک ہے۔"

"دیکھو' میں صحیح سلامت واپس آگیا ہوں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"بہرحال!" وہ جلدی سے بولا "تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے وجدان!"

میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوگیا "کیسی خوشخبری؟"

"میں نے کھٹمنڈو میں انسپکٹر شیوا سے بات کی ہے۔" وہ جوش بھرے لہجے میں بولا "اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ڈاکٹر مونگ کے ساتھ دھنو (ساحل) کو بھی سٹی اسپتال میں پہنچایا گیا ہے۔ وہ دونوں شدید زخمی ہیں اور انتہائی نگہداشت کے شعبے میں انہیں رکھا گیا ہے۔ سٹی اسپتال پولیس کی کڑی نگرانی میں ہے۔ انسپکٹر شیوا اس مشن کا نگرانِ اعلیٰ ہے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر مونگ یا دھنو سے فی الحال براہِ راست بات نہیں ہوسکتی۔ ہمیں ان کے قدرے بہتر ہوجانے کا انتظار کرنا ہوگا!"

"اس بات کی تصدیق کیسے ہوئی کہ ڈاکٹر مونگ کے ساتھ ساحل ہی کو اسپتال پہنچایا گیا ہے؟" میں نے ایک ضروری سوال کیا حالانکہ میں اس سلسلے میں پہلے ہی کنفرم ہوچکا تھا۔ رتی سے ہونے والی وہ اہم گفتگو میرے اطمینان کے لیے کافی تھی "وہ لوگ تو اسپتال میں اپنے اصلی ناموں سے داخل نہیں ہیں!"

ونگ ہنگ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "انسپکٹر شیوا کے علاوہ مجھے جالوس سے بات کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔ جالوس کی حیثیت کھٹمنڈو میں ڈاکٹر مونگ کے میزبان کی سی ہے۔ جالوس اس وقت اسپتال ہی میں تھا جب انسپکٹر شیوا سے میرا رابطہ ہوا۔ جالوس نے تصدیق کی ہے کہ ڈاکٹر مونگ کے ساتھ جس لڑکی کو اسپتال پہنچایا گیا ہے' ماضی میں اس کا تعلق بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ سے رہا ہے۔ وہ وہاں کے ایک بھکشو کی بیٹی ہے۔"

"اوہ!" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی "یہ تصدیق بڑی مستند ہے۔"

پھر میں نے ہنگ کو رتی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور کہا "میں پہلی فرصت میں کھٹمنڈو جانا چاہتا ہوں۔ تم اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہو مسٹر ہنگ؟"

ہنگ نے شون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم کل شام میں یعنی آنے والی شام کو یہاں سے روانہ ہونے والے ہو۔ ہم نے اس سلسلے میں ابتدائی پروگرام مرتب کرلیا ہے۔ باقی باتیں ابھی طے کرلیتے ہیں......"

"میرے ڈاکومینٹس کا کیا ہوگا؟" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔

وہ بولا "ڈاکومینٹس کا مسئلہ بھی حل کرلیا گیا ہے۔ تم شون کی آئی ڈی پر نیوجرسی سے کھٹمنڈو تک سفر کرو گے۔"

"شون کی آئی ڈی؟" میں نے چونک کر باری باری ہنگ اور شون کو دیکھا۔

ان کے درمیان پہلے سے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوچکی تھی' ان کے چہروں کا اطمینان اور ٹھہراؤ یہی بتاتا تھا۔

ہنگ نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑے رسان سے بولا۔

"شون اور تمہارے قد کاٹھ اور صحت میں انیس بیس کا فرق ہے۔ تمہیں شون بنانے کے لیے مجھے تمہارے چہرے پر بہت کم کام کرنا پڑے گا۔ میک اپ کی دنیا میں دو نہایت ہی اہم ٹیکنیکس استعمال ہوتی ہیں۔ تھیم اور کلر اسکن!"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تھیم والی ٹیکنیک میں پورے چہرے کو بدل کر رکھ دیا جاتا ہے جبکہ کلر اسکرین ایک مائنر قسم کا میک اپ ہے۔ اس میں صرف چہرے کی اسکننگ کی جاتی ہے اور اسے مطلوبہ چہرے کے قریب ترین بنا لیا جاتا ہے۔"

وہ ایک مرتبہ پھر تھوڑی دیر کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم دونوں ایشیائی ہو۔ انڈو پاک سے تمہارا تعلق ہے۔ تم لوگوں کے رہن سہن اور بول چال میں بھی زیادہ فرق نہیں۔ تمہیں شون کی کاپی کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اگر تم کہیں اٹک گئے تو لی یان تمہاری مدد کے لیے موجود ہوگی!"

ہنگ کے آخری جملے نے ایک مرتبہ پھر مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ لی یان کا حوالہ اس نے ایسے دیا تھا جیسے وہ میرے ساتھ کھٹمنڈو جارہی ہو۔ میں نے تعجب خیز لہجے میں استفسار کیا۔

"لی یان کی موجودگی سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

جواب دینے سے پہلے ہنگ نے ایک مرتبہ پھر شون کی جانب دیکھا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولا "میں نے سردست جو پروگرام ترتیب دیا ہے، اس کے مطابق تم شون کی حیثیت سے اپنی "بیوی" لی یان کے ہمراہ نیوجرسی سے

کھٹمنڈو جا رہے ہو اور اس سفر کا مقصد سیاحت کے علاوہ قدرتی فوٹوگرافی بھی ہے۔"

میں نے شون کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہنگ نے کہا" کتنی دلچسپ اور عجیب بات ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک کے باشندوں کو امریکا کا ویزا حاصل کرنے کے لیے جتنی دشواریاں اٹھانا پڑتی ہیں' اسی کام کے لیے امریکی شہریوں کو اتنی ہی آسانیاں حاصل ہیں' صبح شون لی یان کے ساتھ نیپال کے ویزا کے لیے کوشش کرے گا اور معمولی سی کاغذی کارروائی کے بعد انہیں ویزا جاری کر دیا جائے گا۔ ٹکٹ کا بندوبست بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ بدھا کی مرضی ہوئی تو شام سے پہلے پہلے تمام تیاریاں مکمل ہو جائیں گی۔"

ہنگ اور شون نے ہماری غیر موجودگی میں بڑا جاندار منصوبہ بنایا تھا۔ میری طرح لی یان کے لیے بھی یہ ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے میں نے اس سے دریافت کیا۔

"تم اس سلسلے میں کیا کہتی ہو لی یان؟"

"میں بہت سنسنی محسوس کر رہی ہوں۔" وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی۔

ہنگ نے کہا" یہ بھی کافی دنوں سے اسٹوڈیو میں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی تھی۔ اسی بہانے اسے بھی ہاتھ پاؤں کھولنے کا موقع مل جائے گا۔"

ہنگ نے ہاتھ پاؤں کھولنے کے الفاظ اس انداز میں ادا کیے تھے کہ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا" کیا لی یان یہاں ہاتھ پاؤں بند کیے بیٹھی تھی؟"

"تمہاری طرح یہ بھی مارشل آرٹس جانتی ہے!" ہنگ نے ایک اور انکشاف کیا۔

میں تعریفی نظر سے لی یان کو دیکھنے لگا۔

وہ بولی" وجدان! کسی مشن میں تمہارا ساتھ دے کر مجھے بڑی خوشی ہوگی اور یہ میرے لیے ایک نیا تجربہ بھی ہوگا!"

"اور شون کا کیا ہوگا؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میرے اس سوال کا اثر سب نے بہت مختلف لیا۔ تھوڑی دیر پہلے نیویارک سے نیوجرسی کی طرف آتے ہوئے میرے اور لی یان کے درمیان جس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی، اس کے پیش نظر شون بے چارہ بہت مظلوم نظر آتا تھا۔ لی یان نے غیر فطری رویے بلکہ ضد نے شون کو ایک عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ہر شوہر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ باپ بنے۔ ہر بیوی بھی یہی چاہتی ہے کہ وہ ماں بنے لیکن ان دونوں میاں بیوی کے درمیان عجیب سی کشمکش جاری تھی۔ لی یان کسی بے آسرا' بے سہارا بچے کی اڈاپشن کے لیے تو تیار تھی مگر اپنی کوکھ کو ہری بھری کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب نفسیاتی خوف میں مبتلا تھی۔ اس موضوع پر ہمارے درمیان بڑی مختصر اور ادھوری بات ہوئی تھی۔ اب ہمیں ایک ساتھ چند دن گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ میں نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اس کی برین واشنگ ضرور کروں گا۔ اس نے اپنے ذہن میں جو خواہ مخواہ کے اندیشے پال رکھے ہیں' انہیں دور کر کے لی یان کو شون کی طرف راغب کرنے کی کوشش کروں گا۔

سب نے چونک کر میرے سوال کو جدا جدا تناظر میں محسوس کیا تھا اس لیے ان کا جواب بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لی یان نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"شون مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ یہ بے تابی سے میری واپسی کا انتظار کرے گا۔"

ہنگ بولا" میں نے فوٹو اسٹوڈیو سے اسے چند روز کے لیے چھٹی دے دی ہے۔ یہ پوری توجہ سے وسیم کی تیمارداری کرے گا۔ اسٹوڈیو کے معاملات کو ملازمین سنبھال لیں گے۔ وہ برسوں کے آزمائے ہوئے تجربہ کار ملازم ہیں۔ جب تم مشن سے کامیاب لوٹو گے تو وسیم تمہیں صحت مند اور چاق و چوبند ملے گا۔"

شون نے کہا" وجدان! لی یان کا بہت خیال رکھنا۔ یہ ایک امانت کے طور پر تمہارے ساتھ جا رہی ہے۔"

"ڈونٹ وری!" میں نے اس کا شانہ تھپتھپایا" واپسی پر یہ تمہیں پہلے سے زیادہ سدھری ہوئی ملے گی۔ میں اس کے دماغ کی ٹیڑھ نکالنے کی بھی کوشش کروں گا۔ یہ تمہاری امانت اور میری رہبر ہے۔"

ہنگ نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا" باتیں بہت ہو چکیں۔ اب نیند پوری کرنا چاہیے۔ سب لوگ اچھے بچوں کی طرح اپنے بستر پر پہنچ جائیں۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور اس بیڈ روم میں آ گیا جہاں وسیم موجود تھا۔ یہ رات مجھے اسی بیڈ روم میں گزارنا تھی۔ آئندہ رات ہوائی جہاز میں گزرنے والی تھی۔ ان لمحات میں شاید قدرت مجھ پر مہربان ہو گئی تھی۔ کوئی ایسا شخص جو این وائے پی ڈی اور ایف بی آئی کو مطلوب ہو وہ اتنی آسانی سے امریکا چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا جیسا بندوبست میرا ہو گیا تھا۔

ہنگ کی ذہانت اور تجربہ کاری کی داد دینا پڑی۔ اس نے لی یان کو میرے ساتھ کر کے مشن کو ہر قسم کے خطرے سے پاک کر دیا تھا۔ شون اور لی یان امریکن نیشنل تھے اور کئی مرتبہ

امریکا سے باہر دیگر ممالک کا سفر کر چکے تھے۔ امریکن نیشنل ہونے کا مطلب ہے' حکومت اور قانون کی نظر میں معتبر ہونا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شون کے بھیس میں وجدان امریکا کو ٹھینگا دکھا کر" بائے بائے" کرنے والا تھا۔ وہ وجدان جسے" امریکا دشمن" قرار دیا جا چکا تھا۔

میں نے بستر پر لیٹنے سے پہلے وسیم کا جائزہ لیا اور اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا' وسیم کو جب میرے پروگرام کا علم ہوگا تو وہ کیا ردِعمل ظاہر کرے گا لیکن یہ بات طے تھی کہ میرے پروگرام میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا' نیوجرسی سے روانہ ہوتے وقت میں وسیم کے بارے میں ونگ ہنگ کو خصوصی ہدایات دے دوں گا۔

میں اس وقت نیند کے شدید غلبے میں تھا۔ جی چاہ رہا تھا' آنکھیں بند کروں تو برسوں بعد ہی بیدار ہوں۔ میں نے خود کو نیند کے حوالے کرنے سے پہلے ساحل کو اپنے تصور میں چمکایا اور تھرڈ آئی کے توسط سے اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

میری یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ وہ ربی کے قبضے میں تو نہیں رہی تھی تاہم اس کی ڈالی ہوئی گرہ باقی تھی۔ ربی نے میرے تصور کی راہ میں ساحل کے آگے ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی تھی کہ میرے تخیل کا پرندہ اس دیوار سے سر ٹکرا کر رہ جاتا۔ تھوڑی سی تصوراتی دوڑ دھوپ کے بعد میں واپس آ گیا۔

اس کے بعد میں نے تیسری آنکھ کے سامنے ڈاکٹر مونگ کے خدوخال کو اجاگر کیا اور اگلے ہی لمحے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے ایک لمحے کی دیر ہوگئی۔ ماحول میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کے کمرے سے کسی کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ میں نے یونیفارم سے پہچانا' وہ کوئی نرس تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے اس کا سراپا میری یادداشت میں محفوظ نہ ہو سکا ورنہ میں اس کے ساتھ چپک کر کمرے سے باہر نکل جاتا۔ ممکن ہے وہ ڈاکٹر کو اٹینڈ کرنے کے بعد ساحل کی طرف جاتی۔ اس طرح میں ساحل کا دیدار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ میں ڈاکٹر والے کمرے ہی میں رہا اور اس کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا اور کھلی ہوئی آنکھوں سے کمرے کی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے اطمینان اور …ان نظر آیا جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ فکر والی کوئی بات نہیں۔ جب میں اس کے پاس پہنچوں گا تو وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو کر مجھ سے معانقہ کرے گا۔

مزید پانچ منٹ تک سٹی اسپتال کھٹمنڈو کے کمرے میں رہنے کے بعد میں واپس لنکن پارک' نیوجرسی کے اپارٹمنٹ میں حاضر ہو گیا۔

ساحل تک پہنچنے کا تصور بڑا سنسنی خیز تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ پہلی مرتبہ مجھے کھٹمنڈو کے مضافات میں ملی تھی اور دوسری بار بھی کھٹمنڈو ہی میں ملنے والی تھی۔ میں نے کھٹمنڈو (نیپال) میں اچھا خاصا وقت گزارا تھا اور وہاں نہایت ہی سنگین اور پُراسرار واقعات سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ اس وقت نیپال کے بارے میں سوچتے ہوئے کئی چہرے تصور کی نگاہ کے سامنے ڈوبنے ابھرنے لگے۔

ان میں دوستوں اور دشمنوں کے چہرے شامل تھے۔ انسپکٹر اعظم خان' انسپکٹر ریندرا نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ شوبھا' بملا' مایامتی اور نیلگری کی یادیں بھی میرے ذہن میں تازہ تھیں۔ میں گوتم بھوش' چانگ لی اور ناگ پال کی دشمنی کو بھی نہیں بھولا تھا۔ ان میں سے کئی افراد اب زندہ نہیں تھے......اور جو زندہ تھے وہ بھی پتا نہیں کہاں کہاں بکھر چکے ہوں گے!

نیپال اور وہاں کے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک میں نے محسوس کیا جیسے اس کمرے میں میرے اور وسیم کے علاوہ بھی کوئی موجود ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں لیکن اپنے اور وسیم کے سوا کسی کو نہ پایا' میرے محسوسات نے مجھے دھوکا دیا تھا؟

نہیں' یہ دھوکا نہیں تھا! وہ بھی وہاں موجود تھی۔ میں نے کمرے میں اس کے بدن کی مخصوص مسحور کُن خوشبو کو محسوس کیا۔ میں اس خوشبو کو ہزاروں خوشبوؤں میں الگ پہچان سکتا تھا۔ یہ خوشبو کبھی میرے جسم کا حصہ بھی رہی تھی۔ وہ پربتوں کی ملکہ نیلگری کی مخصوص خوشبو تھی۔

میں نے کمرے میں چاروں جانب نظر دوڑائی اور دھیرے سے اسے پکارا" نیلگری!"

میری اس پکار کا کوئی جواب موصول نہ ہوا مگر وہ بھینی بھینی مہک بہ دستور محسوس ہوتی رہی جو نیلگری کی وہاں موجودگی کا بین ثبوت تھی۔ میں نے دو تین بار اور اسے آواز دی لیکن جواب میں اس کی جانب خاموشی طاری رہی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت میری سماعت میں اس کی ریشمی آواز رس

گھولنے لگی۔ اس نے کھنکتا ہوا ایک سبک خرام قہقہہ لگایا تھا۔ میں اس نقرئی قہقہے کے طلسم میں کھو کر رہ گیا۔ اس کھنک کی شیرینی میرے اعصاب کو شانتی میں بھگونے لگی۔ میں اسی مدھوشالا میں زیروزبر ہورہا تھا کہ کمرا اس کے وجود سے خالی ہو گیا تاہم اس کے انگ انگ سے پھوٹنے والی مدھر اور کیف آور خوشبو اس کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک کمرے کی فضا اور در و دیوار میں قیام پذیر رہی۔

نیلگری نے نیا پینترا بدل کر مجھ سے نئے انداز کی اٹھکیلیاں شروع کر دی تھیں۔ پتا نہیں وہ ایسا کیوں کر رہی تھی۔ میں یہ نہیں جان سکتا تھا کہ میرا تصور اور حواس مجھے فریب دے رہے ہیں۔ اس کی آمد تو ہو رہی تھی مگر بہ اندازِ دگر!

کراچی میں ہونے والی آخری ملاقات میں اس نے دعویٰ کیا تھا' اب وہ میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی لیکن نغلی وجدان کے بھیانک انجام کے بعد اس نے دوبارہ انٹری مارنا شروع کر دی تھی۔ حیرت اور الجھن اس بات کی تھی کہ وہ اب مجھ پر ظاہر کیوں نہیں ہو رہی تھی۔ پردہ نشینوں کے مانند میرے ماحول میں وارد ہو کر کیا ثابت کرنا چاہتی تھی!

اچانک ایک خیال نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ میں امریکا سے نیپال جانے والا تھا اور نیپال سے نیلگری کا استھان زیادہ دور نہیں تھا۔ کیا میں غیر محسوس انداز میں ملکہ کوہسار کے نزدیک جا رہا تھا؟

☆☆☆

آئندہ روز دس بجے کے قریب میری آنکھ کھل گئی۔ وسیم مجھ سے پہلے بیدار ہو چکا تھا اور ایک تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ خفیف انداز میں مسکرایا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور بستر چھوڑ دیا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' میں نے قریب آ کر اس کے زخموں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

اس کا بایاں بازو اور دایاں پاؤں پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولا ''پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ بہت معمولی درد محسوس ہو رہا ہے۔ یہ میری مرہم پٹی کس نے کی ہے؟''

رات جب لی یان ایک نرس کا رول ادا کر رہی تھی تو وسیم نیم بے ہوش تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا' اسے کس قسم کا میڈیکل ٹریٹمنٹ دیا گیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے سوال کیا۔

''تم کب سو کر اٹھے ہو؟''

''کوئی دس منٹ پہلے۔'' اس نے جواب دیا ''بیٹھنے کو جی چاہ رہا تھا' اس لیے تکیے سے ٹیک لگا لی!''

''اس کا مطلب ہے تم ابھی تک بیڈ سے نیچے اترے ہو اور نہ ہی تم کمرے سے باہر گئے ہو؟''

''فی الحال یہ میرے بس میں نہیں۔'' اس نے اپنے پاؤں کی معذوری کی جانب اشارہ کیا۔

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

پھر میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے ان حالات کے بارے میں بتایا جو اس کی بے خبری کے دوران میں واقع ہوئے تھے۔ وہ تو سب وے سے نکلنے کے بعد ہنگ کی گاڑی میں بیٹھتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے نیویارک سے نیوجرسی پہنچنے اس کی میڈیکل ٹریٹمنٹ اور شون و لی یان کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑی توجہ اور حیرت سے میری بات سنتا رہا اور میرے خاموش ہوتے ہی اس نے سوال کر دیا۔

''کیا اس اپارٹمنٹ میں ہمارے علاوہ بھی کچھ لوگ موجود ہیں؟''

''میں جب رات کو سونے کے لیے اس کمرے میں داخل ہوا تھا تو ہنگ کے علاوہ شون اور لی یان بھی یہاں موجود تھے۔'' میں نے کہا ''موجودہ صورتِ حال کے بارے میں دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔''

''خاموشی اور سناٹے سے تو یہ محسوس ہوتا ہے' ہمارے سوا کوئی ذی روح اس اپارٹمنٹ میں موجود نہیں۔'' وہ زخمی پاؤں والی ٹانگ کو دراز کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''ممکن ہے وہ لوگ ابھی تک سو رہے ہوں۔ صبح پانچ بجے تک تو ہم جاگ رہے تھے۔''

ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس سے پوچھا ''تمہیں واش روم جانا ہو تو میں سہارا دے دوں؟''

''میں تھوڑی دیر بعد واش روم جاؤں گا۔'' اس نے کہا ''اور میرا خیال ہے میں کسی سہارے کے بغیر تھوڑا لنگڑا کر چل ہی لوں گا۔''

میں نے کہا ''تمہارے پاؤں کی حالت ٹھیک نہیں۔ فی الحال تمہیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ میرا سہارا نہیں لینا چاہتے تو دیوار کو پکڑ کر واش روم تک چلے جانا۔''

اس نے ممنونیت بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں نے ایک انگڑائی لی اور فریش اپ ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔

ساڑھے دس بجے تک ہم دونوں ناشتے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ میں وسیم کو بیڈ روم میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ اپارٹمنٹ کے باقی دونوں بیڈ رومز اور سٹنگ روم مجھے خالی ملا۔ اس بات پر مجھے حیرت بھی ہوئی۔ پتا نہیں وہ لوگ ہمیں یہاں چھوڑ کر جہاں چلے گئے تھے!

کچن کی جانب سے کھٹ پٹ کی آواز پر میں چونکا اور بے ساختہ میرے قدم اس طرف اٹھ گئے۔ لی یان کچن میں موجود تھی اور اس کی کارروائی سے اندازہ ہوا' وہ ہمارے لیے ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ چہک اٹھی ''گڈ مارننگ!''

''مارننگ!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پوچھا ''وہ دونوں کہاں چلے گئے؟''

وہ میرا اشارہ سمجھ گئی' بولی ''مسٹر ہنگ تو اسی وقت چلے گئے تھے' شون ایک گھنٹا پہلے تیار ہو کر اسٹوڈیو کی طرف گیا ہے۔''

''ہنگ نے کچھ بتایا کہ وہ کہاں گیا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں سمجھ گیا' وہ اس سلسلے میں ڈسکس نہیں کرے گی۔ میں نے کہا ''اپارٹمنٹ میں پھیلی ہوئی خاموشی سے تو میں یہی سمجھا تھا' آپ لوگ ہمیں چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہو!''

''شون کا اسٹوڈیو جانا ضروری تھا۔'' اس نے ہاتھ روکے بغیر کہا ''ملازموں کو مختلف ہدایات دینا ہے تاکہ دو تین روز تک وہ کام کو اچھے طریقے سے سنبھال سکیں۔ انہیں یہی بتایا جائے گا کہ ہم دونوں کیلی فورنیا تک جا رہے ہیں اور دو تین دن میں واپس آجائیں گے۔'' وہ تھوڑی دیر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''ویسے مجھے معلوم ہو گیا تھا' تم دونوں بیدار ہو چکے ہو اسی لیے میں تم لوگوں کے لیے ناشتا بنانے میں لگ گئی۔ تم اپنے دوست کو سہارا دے کر ادھر ہی لے آؤ۔ ناشتے کے بعد میں اس کی چوٹوں کا معائنہ بھی کر دوں گی۔''

اپارٹمنٹ کا کچن خاصا کشادہ تھا اور ڈائننگ ٹیبل بھی اس کے اندر ہی لگی ہوئی تھی۔ میں نے لی یان کی بات کے اختتام پر کہا۔

''یہ دو تین دن کے لیے کیلی فورنیا والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر ہمیں واپسی میں ہفتہ دس دن لگ گئے تو اس اسٹیٹمنٹ کا کیا ہوگا؟''

''یہ ایک ڈمی اسٹیٹمنٹ ہے۔'' وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ''اور اسے مسٹر ہنگ کے حکم پر تیار کیا گیا ہے۔ تین دن بعد شون اسٹوڈیو جانے لگے گا اور یہی ظاہر کرے گا' مجھے کیلی فورنیا میں ابھی چند روز مزید قیام کرنا ہے' اس طرح یہ معاملہ نبھ جائے گا۔''

میں نے پُر معنی انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں ہنگ کی پلاننگ کی تہ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ میری (شون کی) اور لی یان کی بیرونی ملک روانگی کو عام لوگوں سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ مجھے پکڑنے اور امریکا سے نہ نکلنے دینے کے سلسلے میں اعلیٰ سطح پر جو بھی چارہ جوئی کی جا رہی تھی' وہ ہنگ کی پلاننگ کے سامنے ناکارہ ہو جاتی۔ شون (میں) اور اس کی بیوی لی یان انتہائی قانونی انداز میں نیو جرسی سے کھٹمنڈو جانے والے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا کہ وہ حساس ترین امریکی قوانین اور این وائے پی ڈی و ایف بی آئی والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والے تھے!

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو گیارہ بجنے والے تھے۔ وسیم نے اس انداز میں مجھے دیکھا جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو۔

''کیا ہوا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''یار وجدان! آج تو اٹھائیس جنوری ہے!'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔

''اٹھائیس جنوری ہے تو؟'' میں نے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''اس وقت پاکستان میں رات کے ساڑھے نو بجے ہوں گے' یعنی وہاں سورج غروب ہوئے کافی وقت گزر چکا ہے۔ مجھے امید ہے' عید کا چاند نظر آگیا ہوگا!''

اس کا آخری جملہ سن کر میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ عیدین وغیرہ ہمارے بڑے تہوار ہیں اور ان کی خوشی بھی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ آپ پاکستان میں ہوں یا پاکستان سے باہر خوشی کے ان جذبات کو محسوس کیے بنا رہ ہی نہیں سکتے لیکن جو مزہ اپنوں کے ساتھ عید منانے کا ہے وہ دیارِ غیر میں کہاں۔ بدلیس میں تو روزہ نماز کا وہ اہتمام نہیں ہو پاتا جو اپنے وطن کی روایت ہے!

اگر پاکستان میں اس روز چاند ہو گیا تھا تو اگلے روز' یعنی انتیس جنوری کو وہاں عید الفطر منائی جانے والی تھی۔ میں نے وسیم کے جوش و جذبے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں فوراً اپنے گھر فون کرنا چاہیے۔ وہاں جا نہیں سکتے تو کم از کم انہیں عید مبارک ہی کہہ دو۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ''اور ہاں اپنی خیر خیریت کی خبر دینے

کے بعد انہیں یہ بھی بتا دینا کہ تم نے مین ہیٹن اور ٹیکسی ڈرائیوری کو ترک کر دیا ہے۔ اپنی نئی جاب اور پتے ٹھکانے کے بارے میں تم انہیں بعد میں بتاؤ گے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی تو میں نے لی یان سے فون کے بارے میں معلومات کی۔ اس نے بتایا کہ اس اپارٹمنٹ کے فون سے اوورسیز ڈائلنگ ہو سکتی تھی چنانچہ وسیم نے پورے دس منٹ تک اپنے گھر والوں سے بات کی۔ وہاں چاند نظر آگیا تھا اور اگلی صبح وہاں عید منائی جانے والی تھی۔

اس کی دیکھا دیکھی مجھے بھی طراری آگئی۔ عید خوشی کا ایک بہت بڑا موقع ہے اور اپنوں سے دور بسنے والوں کو اس کی اہمیت کا کچھ زیادہ ہی احساس اور قدر ہوتی ہے۔ پاکستان میں میرے بھی بہت سے خیر خواہ موجود تھے مگر میں اپنے حالات کے پیشِ نظر فرداً فرداً سب سے بات نہیں کر سکتا تھا چنانچہ میں نے صرف ایک نام کو سرکل کیا اور اس کے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میری مطلوبہ آواز ''ہیلو'' کی صورت میں سماعت تک پہنچی تو میں نے بے اختیار کہا ''صدف! چاند رات مبارک ہو......اور عید کی بھی پیشگی مبارک باد قبول کر دا!''

''اوہ وجدان!'' اس کی ہیجان بھری آواز مجھے سنائی دی ''تم کہاں غائب ہو؟''

میں نے کہا ''تمہارے کان میں بول رہا ہوں۔ کیا مجھے وش نہیں کرو گی؟''

''تمہیں بھی بہت بہت عید مبارک ہو!'' وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولی ''میرے فون کا کالر آئی ڈی ڈائل یو ایس اے کا کوئی نمبر شو کر رہا ہے۔ میں نہیں جان سکتی تم کس اسٹیٹ میں ہو۔ البتہ ایریا کوڈ سیون تھری ٹو لکھا ہوا آ رہا ہے۔''

''سیون تھری ٹو...... نیو جرسی اسٹیٹ کا ایریا کوڈ ہے اور میں جرسی سٹی سے بات کر رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''نیو جرسی کا دوسرا ایریا کوڈ سکس زیرو نائن ہے۔''

''تم سے بات کرنا کتنا اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ مسرت بھرے لہجے میں بولی ''کب تک امریکا میں رکنے کا ارادہ ہے؟ پاکستان کب آ رہے ہو؟''

وہ ایک ہی سانس میں دو سوال پوچھ گئی۔ میں اس کی بے تابی اور اپنے حالات کی نزاکت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا ''کہیں آنا جانا کب میرے اختیار میں تھا۔ میں یہاں کے وقت کے مطابق آج رات کسی وقت امریکا سے پرواز کر جاؤں گا۔ میری اگلی منزل نیپال کا شہر کھٹمنڈو ہوگی۔ بہر حال۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''انشاء اللہ بہت جلد ہماری ملاقات ہوگی۔''

''ساحل کا کیا حال ہے؟'' اس نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا ''تم اسے پانے میں کامیاب ہو گئے ہو؟''

ہماری جب بھی بات ہوتی' وہ ساحل کی خیریت ضرور معلوم کرتی تھی۔ وہ ساحل کے لیے بڑی فکرمند رہتی تھی اور یہ فکرمندی مصنوعی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی تھی۔ میں صدف کے جذبات اور احساسات کو پوری تفصیل سے جانتا تھا۔ میرے اور ساحل کے درمیان جس نوعیت کی دوری حائل ہو گئی تھی، اس کی روداد سنانے کا وقت نہیں تھا چنانچہ میں نے نہایت ہی مختصر سا جواب دیا۔

''میں ساحل کے سلسلے ہی میں کھٹمنڈو جا رہا ہوں۔''

''کھٹمنڈو میں تمہارا قیام کس جگہ ہوگا؟''

''فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

وہ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے بولی ''ٹھیک ہے وعدہ کرو تم کھٹمنڈو پہنچ کر مجھ سے رابطہ کرو گے اور مجھے اپنے پتے ٹھکانے سے بھی آگاہ کرو گے!''

میں نے یہ وعدہ کرتے ہوئے الوداعی کلمات کا استعمال کیا اور خدا حافظ کہہ کر ٹیلی فونک رابطہ موقوف کر دیا۔

صدف میری زندگی کے ایک بڑے حصے پر قابض تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔ صدف بہت ہی کھلے دل اور کشادہ ذہن کی مالک تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں آنے والی لڑکیوں سے اسے بہت مختلف پایا تھا۔ میرے تجربے کے مطابق صدف ایک ایسی لڑکی تھی جو میرے مسئلے کو جانتی تھی......اور یہ بہت بڑی بات تھی۔ بعض انسان ساری زندگی ایک ساتھ گزار دیتے ہیں مگر ایک دوسرے کے مسئلے کو سمجھ نہیں پاتے اس کے حل کرنے کی بات تو کہیں آگے کی ہے!

ہم فون سے فارغ ہوئے تو لی یان وسیم کی چوٹوں کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔ بازو والے زخم پر اس نے نئی بینڈیج کی اور کہا ''خون کا رساؤ رک گیا ہے۔ میں نے جو نئی پٹی باندھی ہے اسے دو دن تک کھولنے کی ضرورت نہیں۔ آج کل موسم خاصا ٹھنڈا ہے لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''ٹخنے کی چوٹ کے بارے میں کیا کہتی ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ بولی ''میں محسوس کر رہی ہوں' ایکسرے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ورم میں خاصی کمی واقع ہوئی ہے۔ اگر فریکچر وغیرہ کا مسئلہ ہوتا تو اب تک سوجن اور بھی بڑھ چکی ہوتی۔ بہرحال ہفتہ بھر تو اسے آرام کرنا ہی ہوگا۔ ہمارے جانے کے بعد شون بہ آسانی اس کی دیکھ بھال کرلے گا۔''

لی یان کے آخری جملے پر وسیم نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ابھی تک میں نے اسے اپنی کھٹمنڈو روانگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''وجدان! آپ لوگ کہیں جارہے ہو؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کہاں؟'' اس کے لہجے کی حیرت دوچند ہوگئی۔

میں نے کہا ''ابھی بتاتا ہوں۔''

لی یان یہ سمجھی کہ شاید میں اس کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ فرسٹ ایڈ باکس کو سمیٹتے ہوئے بولی ''تم لوگ گپ لگاؤ میں دیگر کام دیکھ لوں۔ جانے سے پہلے ایک مناسب سی تیاری بھی کرنا ہے۔''

لی یان نے دوسری مرتبہ جانے کا ذکر کیا تو وسیم بے حد الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا اور جب لی یان کمرے سے رخصت ہوگئی تو وہ پھٹ پڑا۔

''یہ جانے کا کیا چکر ہے وجدان؟''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی ہنگامی پروگرام سے آگاہ کیا۔ اس نے نہ صرف پوری توجہ سے میری بات سنی بلکہ وہ معاملے کی نزاکت کو بھی بخوبی سمجھ گیا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''وجدان! اگر تمہیں ساحل کا کوئی سراغ مل گیا ہے تو پہلی فرصت میں تمہیں اس کی جانب روانہ ہوجانا چاہیے۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''اس مجبوری نے مجھے بے بس کردیا ہے۔''

اس نے پٹی بندھے پاؤں کی جانب اشارہ کیا ''افسوس کہ میں اس مشن میں تمہارا ساتھ دینے کے قابل نہیں ہوں۔ وش یو گڈ لک!''

میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگالیا اور اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تم فکر نہ کرو یار! انشاء اللہ ہم بہت جلد دوبارہ ملیں گے۔ اگر میں تمہارے پاس نہ آسکا تو تمہیں اپنے پاس بلوالوں گا۔ تم ٹھیک کراور پوری توجہ سے اپنا علاج کراؤ۔''

وسیم کو دوا کھلانے کے بعد اس کمرے سے اٹھ آیا۔ وہ مجھ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں چاہتا تھا وہ تھوڑا آرام کرلے۔ دوا میں ایک گولی بھی تھی جو اعصاب کو سکون پہنچا کر نیند طاری کرتی تھی۔ اگر وہ گھنٹا' دو گھنٹا اور سو لیتا تو یہ اس کے حق میں بہتر تھا۔

لی یان اپنے بیڈروم میں کپڑوں والی الماری کو الٹ پلٹ کررہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ روک لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سٹنگ روم میں بیٹھے آئندہ کے پروگرام پر گفتگو کررہے تھے۔ لی یان ایک پرعزم لڑکی تھی۔ وہ زندگی میں تھرل کی خواہاں تھی۔ ایڈونچر کا اسے موقع تو ملتا رہتا تھا مگر وہ اس سے بڑھ کر چاہتی تھی۔ عجیب لڑکی تھی جس محاذ پر سرگرمی دکھانے کی ضرورت تھی وہاں وہ بے رغبتی اور اکتاہٹ کا شکار تھی۔ جب سے مجھے اس کی نفسیات کی ٹیڑھ کا علم ہوا تھا' میں اس کے علاج کے لیے سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

انسان کی فطرت ثانیہ اس کے ماحول سے بھی بہت اثر قبول کرتی ہے۔ جو لڑکیاں اور عورتیں دن بھر مردوں کے درمیان رہ کر امور زندگی سرانجام دیتی رہتی ہیں' ان کی سوچ میں ایک مخصوص قسم کی سختی آجاتی ہے۔ ایسے ہی مردانہ شوق اپنانے والی عورتیں بھی خاصی جنگجو یانہ خیالات کی مالک ہوجاتی ہیں۔ مثلاً مارشل آرٹس اور ریسلنگ وغیرہ سیکھنے والی خواتین کے مزاج میں ایک خاص قسم کا جارحانہ پن آجاتا ہے۔ لی یان نے بھی فنون حرب وضرب کی تربیت حاصل کر رکھی تھی۔ اس کے مسئلے کی تہ میں اترنے کے لیے اس کی ہسٹری لینا ضروری تھا۔ میں ازخود اس کے مسئلے کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہاں البتہ اگر وہ اس موضوع کو دوبارہ زندہ کرتی تو میں اس کی طبیعت صاف کردیتا۔

اس نے پوچھا ''وجدان! کیا تمہیں کبھی کسی ایک جگہ ٹھہر کر زندگی گزارنے کا موقع بھی ملا ہے؟''

''ابھی تک تو ایسا موقع نہیں ملا۔'' میں نے جواب دیا۔

''تمہاری خواہش تو ہوگی؟''

''ہر انسان اپنی زندگی میں آرام وسکون کا خواہاں ہوتا ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن میں ایسے آرام وسکون کا قائل نہیں جس سے زندگی ٹھہری ٹھہری سی لگنے لگی۔ بہرحال مجھے بھی کہیں ٹکنے کا موقع نہیں مل سکا۔''

''میں نے سنا ہے تم جس لڑکی کے پیچھے کھٹمنڈو جارہے ہو اس کا تعلق بدھ مت سے ہے؟''

''تم نے بالکل درست سنا ہے۔'' میں نے تائید کی۔

''اس کا نام دھنو تھا' تم نے بدل کر ساحل کردیا؟''

''ہاں' یہ ہی حقیقت ہے۔''

''کیا نام کے ساتھ تم نے اس کا مذہب بھی تبدیل کردیا

''میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر تم یہ بات کیوں پوچھ رہی ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولی ''میرا اندازہ تھا' تم نے ایسا کیا ہوگا!''

''تمہارا یہ اندازہ کس بنا پر تھا؟''

''میں نے سنا ہے' مسلمان عموماً یہی کرتے ہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ''اور تم بھی ایک مسلمان ہی ہو۔''

''الحمد للہ! میں مسلمان ہوں۔'' میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''لیکن تمہاری سنی سنائی کو فارمولا نہیں بنایا جاسکتا۔ میں نے کبھی اس حوالے سے ساحل پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔''

''اصل میں میرے سامنے ایک مثال موجود ہے میں اس لیے کہہ رہی تھی۔'' وہ شون کے والدین کی شادی کا حوالہ دیتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا ''کیا کبھی شون نے بھی تم پر زور دیا کہ تم اس کا مذہب اختیار کرلو؟''

''نہیں تو!'' اس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''اس مثال کو بھی اپنی یادداشت میں محفوظ کرلو۔'' میں نے فضا میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تم باتوں میں چت کردیتے ہو!'' وہ بے ساختہ بولی۔

میں نے اس کے بے ساختہ اظہار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گفتگو کے موضوع کو مارشل آرٹس کی جانب موڑ دیا۔ ہمارے درمیان گھنٹا بھر اس ٹاپک پر ڈسکس ہوتا رہا۔

لنچ ہم تینوں نے ایک ساتھ کیا۔ اس وقت تک شون اور ہنگ کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ لنچ کے بعد لی یان نے کہا کہ وہ تھوڑا آرام کرے گی۔ رات اس کی نیند پوری نہیں ہوسکی تھی اور وہ خود کو خاصا مضمحل محسوس کررہی تھی۔ میں اسے چھوڑ کر وسیم والے کمرے میں آگیا۔

اب اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ ہاتھ پاؤں کی چوٹوں کو تو اپنے وقت پر ہی ٹھیک ہونا تھا تاہم وہ تکلیف دہ کیفیت سے نکل آیا تھا۔ تنہائی میسر آتے ہی اس نے پوچھ لیا۔

''ہمارے ڈاکومینٹس کا مسئلہ تو اٹک گیا تھا۔ پھر تم کس طرح نیو جرسی سے کھٹمنڈو تک سفر کروگے؟''

اس کے سوال کے جواب میں' میں نے اسے تفصیل بتادی۔

وہ بولا ''یار وجدان! یہ مسٹر ہنگ تو تمہارے ساتھ بہت کچھ کررہا ہے۔''

''کیا کررہا ہے بھئی؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ گڑبڑا گیا' بولا ''میرا مطلب ہے تمہارا بہت خیال رکھ رہا ہے۔''

''خیال کیسے نہیں رکھے گا۔ ایک طرح سے میں ان لوگوں کا داماد ہوں!''

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس لی اور میری بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ پوچھنے لگا ''کیا تمام بدھ مت اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں؟''

میں نے گمبھیر انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''انسان کے اچھا یا برا ہونے کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اچھے برے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ کسی بھی مذہب کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ دنیا کے تمام مذاہب بنیادی طور پر اچھائی ہی کا درس دیتے ہیں اور برائی کی مذمت کرتے ہیں۔''

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے تکنے لگا۔

''کیا ہوگیا بھئی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا ''وجدان! تم آخر چیز کیا ہو؟''

''میں چیز ہوں اور نہ ہی مارجرین۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا ''مجھے تم ناچیز ہی سمجھو۔''

میں دانستہ وسیم سے مذاق کے رنگ میں بات کررہا تھا کہ اس کا دل بہلتا رہے۔ وہ ایک قابل بھروسا اور سچا انسان تھا۔ ہمیں ایک ساتھ بہت کم وقت گزارنے کا موقع ملا تھا اور آئندہ میرے حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا' اس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا!

''تم کبھی انتہائی دنیادار نظر آنے لگتے ہو اور کبھی دین دار بن جاتے ہو۔'' وہ مجھے ٹٹولتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ''پتا نہیں تم نے کیا پڑھ اور سیکھ رکھا ہے!''

''میں نے زندگی کا سبق پڑھ رکھا ہے اور انسانوں کی نفسیات سیکھنے اور جاننے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''میں جو کچھ بھی کہتا ہوں' وہ میرا تجربہ ہے۔''

''تم بڑے تجربہ کار ہو وجدان!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں اسے مزید تجربے کی باتیں بتانے لگا۔

پانچ بجے کے قریب مسٹر ہنگ شون کے ساتھ واپس

آ گیا۔ وہ دونوں الگ الگ اس اپارٹمنٹ سے نکلے تھے مگر یوں محسوس ہوتا تھا وہ پورا دن ایک ساتھ ہی رہے ہوں۔ ہنگ نے مجھے یہ خوشخبری سنائی کہ کام ہوگیا تھا۔ ہمیں رات نو بجے کی فلائٹ سے نیو جرسی کو خیر باد کہنا تھا۔ وہ میرے اور لی یان کے لیے ضروری شاپنگ بھی کرلایا تھا۔ وہ خاصا تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اسے تمام امور سے نمٹنے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑی ہوگی!

''اب میں تمہارے چہرے پر کام کروں گا۔'' ہنگ نے کہا ''کلر اسکننگ زیادہ لمبا چوڑا کام نہیں مجھے اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔''

میں نے پوچھا ''کھٹمنڈو میں مزید کوئی رابطہ ہوا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

''چائنا ٹاؤن کا کیا حال ہے؟''

''میں ادھر نہیں جاسکا۔'' اس نے بتایا ''ایک پبلک بوتھ سے میں نے اپنے ملازم سے بات کی تھی۔ اس نے بتایا ہے وہاں سب ٹھیک ہے۔''

''حیرت ہے۔'' مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا ''کیا ایف بی آئی والے اتنے ہی سست اور کام چور ہیں؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ''مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا ہوا ہے۔ بہر حال حقیقت جلد ہی سامنے آجائے گی کہ ٹرائی بیکا والے اپارٹمنٹ پر چڑھائی کرنے والوں کا تعلق ایف بی آئی سے تھا یا پھر وہ کوئی دوسرا ہی معاملہ ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ''تم اس سلسلے میں اپنے ذہن کو کیوں تھکاتے ہو۔ میں ہوں نا! چائنا ٹاؤن ٹرائی بیکا حتیٰ کہ نیو جرسی میں بھی جو حالات پیش آئیں گے میں ان سے نمٹ لوں گا۔''

پھر میں نے اس سلسلے میں ہنگ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے محسوس کرلیا' وہ کسی مصلحت کی بنا پر مجھ سے کچھ چھپا رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کوئی ایسی گڑ بڑ واقع ہوچکی ہو جس کا ذکر کرکے وہ مجھے پریشان نہ کرنا چاہتا ہو۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کرلی۔

ایک گھنٹے بعد ہنگ نے اپنا کام مکمل کرلیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''میں نے انیس بیس کے فرق سے تمہیں شون بنادیا ہے۔ اب تم لی یان کے ساتھ اس کے شوہر کی حیثیت سے بہ آسانی سفر کرسکتے ہو۔ چھوٹی موٹی مشکلات کو لی یان خود ٹیکل کرلے گی۔ تم خود بھی میک اپ میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہو۔ اگر ضرورت پڑی تو اپنے چہرے کی ٹچنگ کرسکتے ہو۔ تمہاری ضرورت اور حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے تھیم تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

اس کے بعد مجھے شون کے دستخط کرنے کی پریکٹس کرائی گئی۔ اس کے نام سے جاری تمام کریڈٹ کارڈز اب میرے استعمال میں آنے والے تھے۔ میں نے تھوڑی کوشش کرکے ان کے پن کوڈز کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔ اس کے علاوہ ان پاس ورڈز کو ایک ڈائری میں بھی نوٹ کرلیا۔ لی یان کے پاس بھی اس کے ذاتی کارڈز موجود تھے۔ کریڈٹ کارڈز نے زندگی کو خاصا آسان بنادیا ہے بشرطیکہ آپ ان کو افورڈ کرسکتے ہوں۔ جو بینک آپ کو یہ سہولت دیتا ہے وہ اپنے فائدے کو پہلے دیکھتا ہے۔ امریکا میں اور اب تو تقریباً پوری دنیا میں کریڈٹ کارڈز بڑی فراوانی سے استعمال کیے جارہے ہیں۔ پچھلے ایک دو سال سے پاکستان میں بھی ان کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے۔

لی یان نے اس دوران میں پیکنگ کرلی تھی۔ مجھے کسی قسم کے سامان کی ضرورت نہیں تھی لیکن ہم دونوں سیاحت کے لیے نیپال جارہے تھے لہٰذا بعض تقاضے نبھانا ضروری تھے۔ ہم دونوں نے ایک ایک سفری بیگ اور فوٹو گرافی کے ضروری آلات رکھ لیے تھے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں ذرا جلدی گھر سے نکلنا تھا۔ نیو آرک ائرپورٹ کے نزدیک ہم کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے، پھر میں اور لی یان ائرپورٹ کی جانب روانہ ہوجاتے۔ شون کو وسیم کے پاس گھر ہی میں رہنا تھا۔ ہنگ ریسٹورنٹ تک ہمارا ساتھ دیتا اور وہیں سے ہمیں رخصت کردیتا۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ہنگ نے مجھ سے کہا ''میں ذرا کھٹمنڈو میں جالوس سے رابطہ کرکے اسے تمہاری آمد کے بارے میں کنفرم کردوں تاکہ وہ لوگ تمہیں ائرپورٹ سے سیدھا شی اسپتال لے جائیں جہاں پر ڈاکٹر مونگ اور ساحل موجود ہیں۔''

''یہ کچھ عجیب سا نہیں ہوجائے گا مسٹر ہنگ!'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا ''ہم سیاحت کی غرض سے نیپال جارہے ہیں۔ اصولی طور پر ہمیں ائرپورٹ سے نکل کر کسی ہوٹل کا رخ کرنا چاہیے۔''

وہ جوشیلے انداز میں بولا ''میں نے اس کا بھی بندوبست کررکھا ہے۔ کھٹمنڈو کے انا پورنا ہوٹل میں تم دونوں کے نام سے ایک کمرا بک کروادیا ہے۔ انا پورنا خوبصورت لوکیشن کا ہوٹل ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور توصیفی نظر سے ہنگ کو دیکھا۔

انا پورنا ہوٹل میرا دیکھا ہوا تھا۔ انا پورنا کے معنی بلندی کے ہیں۔ مذکورہ ہوٹل بھی خاصی بلندی پر واقع تھا۔ ویسے انا پورنا کے نام سے وہاں ایک پہاڑ بھی موجود ہے۔

ہم اپارٹمنٹ سے رخصت ہونے لگے تو شون نے سرگوشیانہ انداز میں مجھ سے کہا ''لی یان خاصی کھسکی ہوئی عورت ہے' اس کی کسی ایسی حرکت کا برا نہ منانا۔''

''ڈونٹ وری اینڈ ٹیک ہارٹ'' میں نے اس کے شانے کو تھپتھپایا ''میں اسے ہینڈل کرلوں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا ''اور کوشش کروں گا' جب یہ تمہارے پاس آئے تو کھسکی ہوئی نہیں بلکہ سدھری ہوئی ہو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

ہم اپارٹمنٹ سے روانہ ہوئے اور ایک ریسٹورنٹ میں جابیٹھے۔ بہ وقتِ رخصت وسیم بڑے جذباتی انداز میں مجھ سے بغلگیر ہوا تھا۔ میں زبان سے کچھ بولنے کے بجائے تسلی آمیز انداز میں اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ ہم بڑے جذباتی انداز میں جدا ہوئے تھے۔

مسٹر ہنگ بہت چپ چپ اور سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بولا ''شاید بدھا کی مرضی نہیں کہ ہم ایک ساتھ کسی خوشی کو انجوائے کرسکیں، خیر۔'' وہ ذرا دیر کو متوقف ہوا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم ایک اہم مشن پر جارہے ہو۔ بدھا تمہیں کامیابی دے۔ خوشیوں کے اور مواقع بھی آتے رہیں گے۔''

میں نے اپنے اندازے کے پیشِ نظر اس سے سوال کیا ''کیا تم نے کوئی خاص پروگرام بنا رکھا تھا؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''چند روز بعد نیا سال شروع ہونے والا ہے۔ چائنا ٹاؤن میں بڑے جوش و خروش سے ''ہیپی نیو ائیر'' کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ ایک جشن کا سا سماں دیکھنے کو ملتا ہے۔''

''تم چینی نئے سال کی آمد کی بات کررہے ہونا!''

''بالکل! میں نے اس مرتبہ یہ تہوار تمہارے ساتھ منانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔''

میں نے پوچھا ''ویسے چینی سال کب سے شروع ہورہا ہے؟''

''اس سال...... بارہ فروری سے چینی نئے سال کا آغاز ہورہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

ہنگ ہی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ چینی نئے سال کے آغاز کے لیے ایک خاص فارمولا موجود ہے۔ ہر عیسوی کیلنڈر میں انیس جنوری کے بعد جو بھی پورا چاند آتا ہے۔ وہاں سے چینی کیلنڈر کی ابتدا ہوجاتی ہے۔ اس سال عید الفطر یعنی یکم شوال انتیس جنوری کو پڑ رہا تھا۔ امریکا میں اس وقت اٹھائیس جنوری کی رات ہوتی۔ اس حساب سے پورا چاند یعنی چودہ شوال' بارہ فروری کو پڑتا۔

میں نے مسٹر ہنگ کی اداسی دور کرنے کی خاطر کہا ''زندگی رہی تو انشاء اللہ کبھی خوشی کا یہ موقع میں تمہارے ساتھ ضرور انجوائے کروں گا۔'' تھوڑا رک کر میں نے اضافہ کیا ''اور تم یہ کیوں سمجھتے ہو' اس سال ہم ہیپی نیو ائیر ایک ساتھ نہیں منا سکیں گے! اس ایونٹ میں ابھی پورے پندرہ دن باقی ہیں۔''

وہ خاموش رہا تاہم اس خاموشی میں بھی اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ سجی رہی۔ میں نہیں جانتا' وہ اس وقت اپنے ذہن میں کیا سوچ رہا تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ وہ مجھ سے بچھڑ کر بے حد ملول تھا۔

ائرپورٹ پہنچنے کا وقت ہوا تو ہنگ نے ہمیں نیک خواہشات کے ساتھ رخصت کردیا۔

ہم ایک کیب میں بیٹھ کر ائرپورٹ پہنچے اور مختلف ''ائرپورٹی'' مراحل سے گزرنے کے بعد بالآخر طیارے میں جابیٹھے۔ مذکورہ مراحل میں کہیں بھی کوئی اڑچن پیدا نہ ہوئی گویا مجھے اصلی شون ''تسلیم'' کرلیا گیا تھا۔ اس ''تسلیم و رضا'' میں مجھے لی یان کا ایڈوانٹیج حاصل تھا۔

طیارے میں سوار ہونے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک بے چین رہا اور کسی بھی ناخوش گوار واقعے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار رکھا۔ ایک مرتبہ کھٹمنڈو ائرپورٹ پر میں ایک ناخوشگوار واقعے سے گزر چکا تھا۔ میں شوبھا اور دھنو (ساحل) کے ساتھ کھٹمنڈو سے دہلی جانے کے لیے ایک طیارے پر سوار ہوا تھا اور پرواز سے پہلے ہی ہمیں نیچے اتار لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم تینوں کو جس سلوک سے گزارا گیا وہ آج تک میری یادداشت میں محفوظ تھا۔

میں اس وقت بھی کھٹمنڈو جارہا تھا۔ شاید کھٹمنڈو کے حوالے سے وہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہوگیا تھا تاہم خیریت گزری اور اپنے مقررہ وقت پر طیارے نے زمین چھوڑ دی۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

کھٹمنڈو اور ہانگ کانگ کے ائرپورٹ کو لینڈنگ کے

حوالے سے دنیا کے مشکل ترین ائرپورٹ میں شمار کیا جاتا ہے کھٹمنڈو خطرناک پہاڑیوں کی وجہ سے اور ہانگ کانگ سمندر کے باعث... طیارہ پائلٹ کے لیے ایک کڑا امتحان ثابت ہوتے ہیں۔ بہرحال ہمارے طیارے نے بخیر و عافیت اپنی منزل کو چھولیا۔ نیوجرسی سے کھٹمنڈو تک پہنچنے کے لیے ہمیں دو طیاروں میں سفر کرنا پڑا تھا۔ راستے میں ایک گھنٹے کا بریک جرنی تھا۔ کیونکہ ہمیں ڈائریکٹ فلائٹ نہیں مل سکی تھی۔ میں نہیں جانتا، یہ وقت کی مجبوری تھی یا پھر نیوجرسی سے کھٹمنڈو تک کوئی ڈائریکٹ فلائٹ آتی ہی نہیں تھی۔

ائرپورٹ پر جانوس بہ نفسِ نفیس ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ پلے کارڈز کا سہارا لے کر وہ ہم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ میں شون اور لی یان کے ناموں والے پلے کارڈز دیکھ کر خود ہی ان کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ مسٹر ہنگ نے جانوس کو ہمارے بارے میں بڑی وضاحت سے بتا رکھا تھا۔ کوڈ ورڈز کے تبادلے کے بعد ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرنے کو تیار ہوگئے۔ جانوس کے ساتھ ایک باوردی شوفر بھی موجود تھا۔

جانوس لگ بھگ پچاس سال کا ایک سانولا سا شخص تھا۔ دراز قامت اور مضبوط بدن اس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے اور چندیا بڑی وضاحت سے چمکتی نظر آرہی تھی۔ جانوس کے مزاج میں ایک اکھڑ پن جھلکتا تھا۔ اس نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے مصافحہ کیا اور ہم اس کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ اگلے ہی لمحے گاڑی پارکنگ سے نکل کر کھٹمنڈو کی ایک کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

میں نے نیپال اور خصوصاً کھٹمنڈو میں خاصا وقت گزارا تھا اور یہاں کی راہ و رسم سے بخوبی آگاہ تھا۔ انسپکٹر برہندرا، انسپکٹر اعظم خان، مایا متی، شوبھا اور دھنو (ساحل) کے ساتھ میں یہاں کی سڑکوں پر بہت گھوما تھا۔ کھٹمنڈو ہی میں نیلگری سے میرا پہلا تعارف بھی ہوا تھا۔

نیلگری کا خیال آتے ہی میں اس کے تصور میں کھو گیا۔ اس پُراسرار ہستی نے میری زندگی میں بڑا طلسمی کردار ادا کیا تھا...... اور ابھی تک کر رہی تھی۔ اس نے کراچی میں، کے ڈی اے اسکیم کے ایک بنگلے میں اپنے نادیدہ طلسمی چکر کے ذریعے مجھے زندگی کے جس تجربے سے گزارا تھا، میں اسے ساری عمر فراموش نہیں کرسکتا تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ہم کسی اور سمت جارہے ہیں۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جو سٹی اسپتال تک جاتا تھا۔ میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے اپنے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''مسٹر جانوس! کیا ہم سٹی اسپتال نہیں جارہے؟''

''نہیں مسٹر شون!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''پھر کہاں جارہے ہیں؟''

''فریک اسٹریٹ۔'' اس نے بتایا ''آپ دونوں کی رہائش کا بندوبست وہیں کیا گیا ہے۔''

میں نے قدرے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا ''ہماری رہائش کوئی مسئلہ نہیں۔ اناپورنا ہوٹل میں ہمارے لیے کمرا بک ہے۔ تم ہمیں جلد از جلد ڈاکٹر مونگ تک پہنچا دو۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''میں آپ لوگوں کو ڈاکٹر مونگ کے حکم پر ہی فریک اسٹریٹ لے جارہا ہوں۔ وہاں میرا ایک شاندار بنگلا موجود ہے۔ ڈاکٹر مونگ نے کہا ہے جب آپ بنگلے پر پہنچیں گے تو وہ آپ سے بات کریں گے۔''

''بات کریں گے!'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''اب خاصے بہتر ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کیا ڈاکٹر مونگ سٹی اسپتال میں ہی ہیں؟''

مجھے اثبات میں جواب ملا۔

''اور ساحل...... میرا مطلب ہے دھنو؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

اس نے جواب دینے میں تھوڑا تامل کیا پھر بولا ''وہ بھی ڈاکٹر مونگ کے ساتھ سٹی اسپتال ہی میں ہے۔''

یہ سوچ کر کہ میں اپنی ساحل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں، میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا ابھی اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاؤں مگر جانوس مجھے فریک اسٹریٹ کے کسی بنگلے میں پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھ سے صبر نہ ہوسکا اور میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

''مسٹر جانوس! میں ابھی اور اسی وقت سٹی اسپتال جانا چاہتا ہوں۔''

''تم سمجھنے کی کوشش کرو شون۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''ڈاکٹر مونگ نے کسی مصلحت کی بنا پر ہی تمہیں میرے بنگلے پر ٹھہرانے کا حکم دیا ہے۔ وہ بہت زیادہ احتیاط سے کام لے رہے ہیں۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں یہاں ہم کتنے سنگین حالات سے گزر رہے ہیں۔''

''میں یہاں کے حالات کی سنگینی کو سب سے زیادہ جانتا ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ خاصا تلخ ہوگیا ''تم گاڑی کو سٹی اسپتال کی جانب مڑواتے ہو یا پھر کوئی ٹیکسی

پکڑلوں؟''

''تم بہت جذباتی ہو رہے ہو مسٹر شون!''

''ہاں ایسی ہی بات ہے۔''

لی یان میری بیوی کی حیثیت سے کھٹمنڈو پہنچی تھی لہٰذا بیویوں والا کردار ادا کرنے سے غافل نہیں تھی۔ وہ بار بار میرے بازو کو کھینچ کر اس تلخ کلامی سے منع کر رہی تھی۔

جانوس نے کہا ''جذباتی ہونے سے معاملہ بگڑ جائے گا۔ ڈاکٹر مونگ بڑی خوبصورتی سے حالات کو نیکل کر رہے ہیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم فریک اسٹریٹ والے بنگلے پر پہنچ جائیں گے۔ پھر میں ڈاکٹر مونگ سے تمہاری بات کروا دوں گا۔ تم ان سے تصدیق کر لینا کہ میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہہ رہا ہوں، صرف ان کے احکام کی تعمیل کر رہا ہوں۔''

جانوس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ اس کے شوفر نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''سر ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ میں ایک سرخ جیپ کو اپنے پیچھے دیکھ رہا ہوں۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر ائرپورٹ سے ہمارے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔''

جانوس کے ساتھ ہی میں نے بھی پلٹ کر سرخ جیپ کی طرف دیکھا اور شوفر کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ جانوس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ڈائریکٹ فریک اسٹریٹ کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔ مختلف سڑکوں پر اس جیپ کو اپنے پیچھے دوڑاؤ۔ ذرا پتا تو چلے ان کا مقصد کیا ہے!''

''او کے سر!'' شوفر نے نہایت ہی فرمانبرداری سے کہا۔

جانوس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے گن برآمد کی۔ بڑی مہارت کے ساتھ اس کا کلپ چیک کیا اور مطمئن ہونے کے بعد گن کو بیرونی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے یقین تھا اس کا شوفر بھی غیر مسلح نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس کسی قسم کا کوئی آتشیں ہتھیار موجود نہیں تھا۔

''تم دیکھ رہے ہو مسٹر شون!'' جانوس نے گاڑی کا عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا ''ہمارے دشمن یہ بات جانتے ہیں کہ ڈاکٹر مونگ کا مجھ سے گہرا تعلق ہے۔ یہ سرخ جیپ بھی کسی دشمنی کا ہی سلسلہ ہے۔ اسے ڈاج دے کر بنگلے تک پہنچنا ہوگا ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔''

وہ مجھے اس طرح سمجھا رہا تھا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ جانوس سے ہمارا تعارف ڈاکٹر مونگ کے دوستوں کی حیثیت سے کرایا گیا تھا۔ ہماری اصلیت صرف اور صرف ڈاکٹر مونگ کو معلوم تھی۔ نیوجرسی سے رخصت ہوتے وقت مسٹر ہنگ نے سٹی اسپتال میں جو فون کیا تھا اس میں ڈاکٹر سے اس کی ... سی بات بھی ہوئی تھی۔

میں نے کہا ''مسٹر جانوس! اس سرخ فیتے کو دم باندھ کر گلی گلی گھومنا بڑا مضحکہ خیز ہے۔''

وہ میری بات میں پوشیدہ اشارہ سمجھ گیا بولا ''پھر ... جائے؟''

''دو دو ہاتھ!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''تمہارا مطلب ہے ہم گاڑی روک کر ان سے ... جائیں؟''

''گاڑی روکنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی ان ... بھڑنے کی!''

''پھر دو دو ہاتھ کیسے ہوں گے؟''

''وہ اگر چاہیں گے تو انشاء اللہ ضرور ہوں گے۔''

''پتا نہیں تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' وہ اکتاہٹ آ... انداز میں بولا۔

میں نے کہا ''سیدھی سی بات ہے اگر ہماری گاڑی ... اسپیڈ کم ہو جائے تو انہیں ہمارے قریب آنے کا موقع ... جائے گا۔ اس طرح ان کی نیت کھل کر سامنے آ جا... گی۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات کو آ... بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ لوگ صرف یہ جاننے کے لیے ہمارا تعاق... کر رہے ہیں کہ ہماری منزل کا پتا لگا سکیں تو اسپیڈ کم ہوتے ... وہ ہمیں یا تو اوورٹیک کر کے آگے نکل جائیں گے یا پھر وہ ... اپنی جیپ کی رفتار کم کر کے عقب میں کچھ فاصلے پر آ... بڑھتے رہیں گے۔''

میں نے ایک بار پھر توقف کیا اور اضافہ کرتے ہو... کہا ''ان کیس اگر وہ خطرناک ارادوں سے ہمارے پیچھے چلے آ رہے ہیں تو پھر ہماری رفتار کم ہوتے ہی وہ ہمیں گھیر... کی کوشش کریں گے۔''

''آئیڈیا تو اچھا ہے۔'' جانوس نے گمبھیر لہجے ... کہا ''مگر خطرناک بھی ہے۔''

''پھر تم انہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر بنگلے پر لے چلو'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میرا یہ طنز جانوس کو بہت برا لگا تاہم اس نے اپنی خفگی ... اظہار نہیں کیا۔ اپنے اندرونی احساسات کو چھپاتے ہو... اس نے معتدل لہجے میں کہا ''سنگھا! سرخ جیپ کو ڈاج د... کر ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔'' اس کا مخاط... باوردی ڈرائیور تھا۔

''سر! پیچھا چھڑانا اب اتنا آسان نہیں رہا۔'' سنگھا نے جلدی سے کہا اور گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔

دراصل جب میرے اور جانوس کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی تو سنگھا نے غیر ارادی طور پر گاڑی کی رفتار کم ... کی تھی اور اس دوران میں تعاقب میں آنے والوں کو موقع مل گیا تھا۔ ان کی راہ اس حوالے سے بھی ہموار تھی کہ اس وقت ہم ایک غیر مصروف سڑک پر سے گزر رہے تھے لہٰذا متعاقبین کو اور زیادہ آسانی فراہم ہو گئی تھی۔

کہا جاتا ہے انسان کا پہلا تاثر ہی اس کا آخری تاثر ہوتا ہے! اس تجربے کے تحت میں نے اور جانوس نے ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا تھا۔ ہماری سوچ اور اپروچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ڈاکٹر مونگ کا میزبان تھا اور میں ڈاکٹر کا مہمان لہٰذا ہم ایک دوسرے کو برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ سرخ جیپ والے ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔ وہ اب تب میں ہمیں گھیرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس جیپ میں غالباً چار افراد سوار تھے۔ میں نے جانوس کے چٹکی لی اور سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں نہ رک کر ان سے بات کر لی جائے۔ پتا نہیں وہ کس ضرورت سے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں!''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے سنگھا سے کہا ''ڈرائیور اسپیڈ کو تھوڑا اور بڑھاؤ پھر اچانک بریک لگا دو!''

سنگھا نے سوالیہ نظر سے اپنے باس کو دیکھا۔

اس سے پہلے کہ جانوس اسے کسی قسم کی ہدایت دیتا فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ سرخ جیپ میں سے ہماری گاڑی کے عقبی پہیوں پر برسٹ مارا گیا تھا۔

میں نے میکانکی انداز میں لی یان کو اپنے بازو کی لپیٹ میں لیا اور کھینچ کر نیچے جھکا لیا۔ متعاقبین دوسرا برسٹ ہماری زندگیوں کے چراغوں کو گل کرنے کے لیے بھی فائر کر سکتے تھے۔

فائرنگ سے ہماری گاڑی کے ٹائر تو محفوظ رہے تاہم ڈرائیور کی بوکھلاہٹ نے اسے لہرا کر سڑک سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ظاہر ہے گاڑی کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ اسی اثنا میں سرخ جیپ ہماری گاڑی کے متوازی آ گئی۔

وہ بہت ہی نازک اور مہلک لمحات تھے۔ موت کے ہرکارے سرخ جیپ میں سوار ہو کر ہمارے سر پر آن پہنچے تھے۔ جانوس نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا ''سنگھا! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ۔''

میں نے سیٹ پر جھکے جھکے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور جانوس کے کوٹ کی جیب کے اندر پہنچا دیا۔ اگلے ہی لمحے میرے اس ہاتھ میں جانوس کی گن آ چکی تھی۔ جانوس میری اس حرکت کو محسوس نہ کر سکا۔ وہ اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ اسے ڈرائیور پر چیخنے کے سوا کسی اور بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔

اس دوران میں سنگھا نے گاڑی واپس سڑک پر پہنچا کر اس کی رفتار بڑھا دی۔ سرخ جیپ والوں نے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں ہماری گاڑی کی باڈی میں سوراخ بنا رہی تھیں۔ ایک جانب کے ٹائر براہِ راست فائرنگ کی زد میں تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ متعاقبین کی فائرنگ نے گاڑی کے ایک سائیڈ کے ٹائروں کو بے کار کر دیا۔ گاڑی ایک مرتبہ پھر بڑے خوفناک انداز میں لہرائی۔ میں نے دیکھا جانوس اس وقت بہت غصے میں تھا کیونکہ وہ اپنی گن سے دشمن جیپ پر فائرنگ کرنا چاہتا تھا اور گن تھی کہ وہ اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔

ڈرائیور کے لیے گاڑی کو آگے بڑھانا ممکن نہ رہا تو وہ اسے روکنے پر مجبور ہو گیا۔ ہماری گاڑی سڑک کے کنارے رکی ہی تھی کہ سرخ جیپ بھی ہماری گاڑی کے سامنے آ گئی۔ پھر اس کے دروازے دھڑا دھڑ کھلنے لگے۔ میں نے دو گن بردار افراد کو جیپ میں سے نکل کر اپنی جانب بڑھتے دیکھا۔ وہ آٹومیٹک گنوں کو بڑے خوفناک انداز میں تھامے ہوئے تھے۔

کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ ہمیں گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ اگر جانوس نے بروقت میرا مشورہ مان لیا ہوتا تو ہم ایسی صورتِ حال سے دوچار نہ ہوتے۔ بہرحال اب تو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا تھا۔

ایک گن بردار نے سنگھا اور جانوس کو نشانے پر رکھ لیا دوسرے نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''تم دونوں باہر آ جاؤ۔''

ایک بات تو یہ سمجھ میں آئی کہ وہ ہم دونوں کے گاہک تھے اور دوسری بات یہ کہ وہ ہمیں جان سے نہیں مارنا چاہتے تھے ورنہ وہ اب تک اپنی گنز کو اشارہ کر کے ہمیں موت کی نیند سلا چکے ہوتے۔ ان لمحات میں ہم پوری طرح ان کے رحم و کرم پر تھے۔

میں نے گن کو سائیڈ پاکٹ میں ڈالنا چاہا تو اس نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا ''اے! پہلے اسے باہر پھینکو۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے آگے بڑھ کر خوفناک گن کی نال میرے سینے کی جانب اٹھادی۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور جانوس والی گن گاڑی سے باہر پھینک دی۔ تھوڑی دیر پہلے جانوس اسی گن کو اپنی جیب میں تلاش کررہا تھا۔ اپنی گن میرے پاس سے برآمد ہوتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی تاہم ان لمحات میں اس کی حیرت کو نوٹس کرنے کا وقت نہیں تھا۔

گن بردار نے ایک مرتبہ پھر ہمیں حکم دیا ''اب تم دونوں باہر آجاؤ۔ جلدی!''

میں نے سرگوشیانہ انداز میں لی یان سے کہا ''میں دروازہ کھول کر جیسے ہی باہر نکلوں' تم دونوں سیٹوں کے درمیان واقع خلا میں خود کو گرا لینا۔''

پھر میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور ایک جھٹکے سے اسے کھول کر باہر آگیا۔ باہر نکلتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ''ہینڈز اپ'' ہونے والے انداز میں اوپر اٹھادیا۔ دراصل یہ ایک جھانسا تھا۔ وہ شخص میرے جھانسے میں آگیا۔

گن بردار یہی سمجھا کہ میں شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''ہینڈز اپ'' ہورہا ہوں مگر یہ سمجھنا اس کی زندگی کی سب سے خطرناک بھول تھی۔ میں نے ہوا میں ہاتھ اٹھانے کے ساتھ ہی بجلی کی سی سرعت سے اپنی لات کو بھی حرکت دی۔

اگلے ہی لمحے میری رائٹ فرنٹ پش کک گن بردار کے پیٹ میں لگی۔ وہ میری طرف سے ایسے کسی جارحانہ عمل کی توقع نہیں کررہا تھا۔ میری ''شرافت'' کے مظاہرے کو دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہوگیا تھا اور یہ لمحاتی اطمینان اسے بہت مہنگا پڑا۔

وہ پیٹ میں میری لات کھا کر پیچھے کو گیا اور اپنے دوسرے گن بردار ساتھی سے جاٹکرایا۔ بوکھلاہٹ میں اس کی گن گرج اٹھی۔ میں نے لی یان کو جو ہدایت کی تھی وہ کام آگئی۔ جانوس بھی جان بچانے کے لیے ڈیش بورڈ کے نیچے تقریباً گھس گیا تھا۔ بے چارہ سنگھا فائرنگ کی رینج میں آگیا۔ اس کا وجود چھلنی ہوکر رہ گیا۔

گن بوکھلاہٹ میں چلی تھی لہٰذا گن بردار کو سنبھل کر دوبارہ فائرنگ کرنے کے لیے لمحاتی مہلت درکار تھی مگر میں نے اسے مہلت نہ دی۔ میری لیفٹ راؤنڈ ہاؤس کک ایک جھٹکے سے چلی اور اس کے گن بردار ہاتھ پر پڑی۔ وہ ابھی پوری طرح سنبھل نہیں پایا تھا کہ میں نے ایک لمبی سائیڈ کک مار کر اسے دور پھینک دیا۔

اس دوران میں پہلا گن بردار اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ گن کو میری جانب سیدھی کرچکا تھا۔ میں فضا میں اچھلا اور ڈبل فلائنگ اس کے چہرے پر جڑ دی۔ وہ پیچھے کو الٹ گیا۔

پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور ہاتھ پاؤں کی پے درپے ٹھوکروں سے اسے دھو کر رکھ دیا۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگری۔ میں نے آگے بڑھ کر گن اٹھالی اور بڑے خطرناک انداز میں سرخ جیپ کی طرف بڑھا۔

اس دوران میں جیپ کی طرف سے کوئی نیا ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا اور اس بات پر مجھے حیرت بھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق جیپ میں کم از کم دو افراد موجود تھے مگر جب جیپ کے قریب پہنچا تو اسے خالی پایا۔ پتا نہیں وہ لوگ کس وقت وہاں سے نکل کر اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔

میں نے پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف دیکھا اور لی یان کو سرگرم پایا۔ وہ میرے چھوڑے ہوئے شکاروں پر ''ہاتھ صاف'' کررہی تھی۔ جانوس ابھی تک گاڑی کے اندر ہی دبکا ہوا تھا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں دوبارہ جیپ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اسی لمحے مجھے کمر پر کسی گن کی آہنی نال کا ٹہوکا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی تحکمانہ انداز میں کہا گیا ''چلو' جیپ کے اندر بیٹھو......اور اس سے پہلے گن کو پھینک دو۔''

میں حکم دینے والے کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ غالباً وہ جیپ سواروں ہی کا ساتھی تھا جو نظر بچا کر یا ہوشیاری دکھا کر میدانِ کارزار گرم ہوتے ہی جیپ سے نکل کر اس کے پیچھے کہیں چھپ گیا تھا اور اب موقع پاتے ہی اپنی ''پناہ گاہ'' سے نکل آیا تھا۔

میں نے ''مخفی گن بردار'' کے حکم پر گن پھینکنے کے بعد دونوں ہاتھ اوپر اٹھادیے اور بڑی شرافت کے ساتھ جیپ کی سمت قدم اٹھانے لگا۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ حائل تھا اور وہ اس زاویے سے کھڑی تھیں کہ میرے ساتھ ہونے والی کارروائی کو لی یان دیکھ نہیں سکتی تھی۔

میں گن بردار کے آگے چلتے ہوئے جیپ کے دروازے کے پاس پہنچا۔ مذکورہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ غالباً وہ شخص اسی دروازے سے نکل کر جیپ کی آڑ میں چھپ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

''چلو اندر!'' مجھے اپنے عقب میں اس کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے جھک کر جیپ کے اندر ایک قدم رکھا اور اس طرح ہڑبڑا کر پیچھے پلٹا جیسے اندر کوئی خوف ناک شے موجود ہو۔ میری یہ ہڑبڑاہٹ ایک سوچی سمجھی فوری اسکیم کے تحت تھی۔ میں نے اسی ہڑبڑاہٹ کے دوران میں بڑی صفائی سے ایک ریئر کک چلادی۔

میرا پاؤں اس کی گن پر لگا اور وہ گن سمیت پیچھے کو الٹ گیا۔ ریئر کک مارتے ہی میں فضا میں اچھلا اور بیک سمر سالٹ لگاتے ہوئے اس کے اوپر سے گزر گیا۔

میری یہ حکمتِ عملی مفید ثابت ہوئی کیونکہ گن بردار نے زمین پر گرتے ہی میری سمت فائرنگ کی تھی۔ اگر میں جیپ کے دروازے کے پاس موجود رہتا تو یقیناً فائرنگ کی زد میں آجاتا۔ مجھے وہاں نہ پاکر وہ حیران ہوا اور زمین پر پڑے پڑے اس نے گردن گھما کر میری سمت دیکھا۔

اسی وقت میں نے اس کے چہرے پر ایک فٹ بال کک ماری۔ میرا دھواں دھار ٹھڈا کھا کر وہ بلبلا اٹھا۔ میں نے ہوا میں جمپ لگائی اور دونوں پاؤں سے اس کے سینے پر آرہا۔ یہ ایک طرح سے ڈبل پش کک تھی۔ اس کے وجود نے ایک جھٹکا کھایا اور پھر ساکت ہوگیا۔

میرے پاس یہ معلوم کرنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہوا تھا یا پھر یہ دنیا اور مافیہا ہمیشہ کے لیے اس سے روٹھ گئے تھے......!

اس ''کام'' سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جیپ کا جائزہ لیا اور اسے انسانی وجود سے خالی پایا۔ اس کا مطلب یہی تھا' وہ صرف تین افراد تھے۔ میں اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

وہاں لی یان نے میدان مار لیا تھا۔ جانوس بھی گاڑی سے باہر نکل آیا تھا لیکن وہ دو حملہ آور مجھے کہیں دکھائی نہ دیے جنہیں میں لی یان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جیپ کی طرف بڑھا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے لی یان کو دیکھا تو اس نے میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''بھاگ گئے دونوں۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کرکے رہ گیا۔

جانوس نے کہا ''وہ کہیں بھی بھاگ جائیں میں انہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ ہم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ میرے ڈرائیور کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میں اس معاملے کی چھان بین کراؤں گا۔''

وہ اس معاملے کی چھان بین کراتا یا پھر اس واقعے پر بیٹھا بین بجاتا رہتا' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے دوٹوک انداز میں اس سے کہا۔

''مسٹر جانوس! تم اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کارروائی کرو۔ ہم تو جارہے ہیں۔''

''تم لوگ کہاں جارہے ہو؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کہیں بھی چلے جائیں گے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا اور لی یان کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ جانوس کی طرف متوجہ ہوگیا ''یہاں کے حالات کو میں نے کنٹرول کرلیا ہے۔ جیپ کے اس طرف ایک حملہ آور بے ہوش پڑا ہے۔ دو حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ ان لوگوں کی جیپ اور چھوڑی ہوئی آٹو میٹک گنیں بھی یہاں موجود ہیں۔ تم ان لوگوں کے خلاف جو بھی کارروائی کرنا چاہتے ہو' اس کے لیے آزاد ہو۔ ہم جارہے ہیں اگر اللہ نے چاہا تو دوبارہ بھی ملاقات ہوسکتی ہے!''

میں نے ذرا توقف کیا۔ جانوس غصے اور شرمندگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ یک ٹک مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا ''بس ایک بات ذہن میں رکھنا کہ آج ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے۔ تم اس معاملے کو ہمارا ذکر کیے بغیر ہینڈل کرنے کی کوشش کرنا اور......اگر بہت دل چاہے تو ڈاکٹر موگن سے میری شکایت بھی کردینا۔''

اس دوران میں لی یان میری خاموش ہدایت پر گاڑی کے اندر سے بیگ اٹھالائی تھی۔ میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے ایک جانب قدم بڑھادیے۔ جانوس نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ اس سلسلے میں وہ کیا کوشش کرے۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل اناپورنا کی طرف جارہے تھے۔

اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد لی یان نے کہا ''وجدان! یہاں تو پہلا قدم ہی الٹا پڑ گیا۔''

''لیکن ہم نے کوئی نقصان اٹھائے بغیر الٹے قدم کو سیدھا کرلیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''اور میں وجدان نہیں' شون ہوں!''

''اوہ! آئی ایم ویری سوری۔'' وہ معذرت آمیز لہجے میں بولی ''مگر تنہائی میں تو میں تمہیں وجدان کہہ کر پکار سکتی ہوں نا۔ یہاں ہوٹل کے کمرے میں ہمیں کون دیکھ سن رہا ہے!''

''ہر کمرے کی دیواریں بھی ہوتی ہیں۔'' میں نے لہجے کی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا ''اور تم نے یہ تو سن ہی رکھا ہوگا..... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے میں آیندہ احتیاط برتوں گی۔'' وہ مصلحت آمیز انداز میں بولی پھر پوچھا ''اب کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا ''پہلے فریش اپ ہو جائیں۔ پروگرام بعد میں بھی بنایا جا سکتا ہے۔''

پھر ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ پہلے لی یان باتھ لے گی' اس کے بعد میں۔ وہ اس پروگرام کے مطابق واش روم میں داخل ہوئی تو میں اس واقعے پر غور کرنے لگا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کھٹمنڈو کی ایک سڑک پر پیش آیا تھا۔ پتا نہیں وہ سرخ جیپ والے کون تھے اور کس مقصد سے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ ان کے رویے سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ ہماری طلب میں تھے۔ وہ ہمیں گاڑی سے اتار کر اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتے تھے' کہاں؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا فی الحال کوئی جواب میرے ذہن میں موجود نہیں تھا' بالکل اس سوال کی طرح کہ وہ لوگ کون تھے؟ ڈاکٹر مونگ ہی اس الجھن کو سلجھن میں بدل سکتا تھا۔

میرے چہرے پر ہنگ نے ہلکا پھلکا ''کام'' کر رکھا تھا لہٰذا باتھ لیتے وقت مجھے بہت محتاط رہنا پڑا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم تیار ہو کر ہوٹل سے نکل آئے۔ میں نے ایک ٹیکسی والے سے سٹی اسپتال چلنے کی بات کی اور ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ ٹیکسی نے چند سڑکوں کی سیر کرانے کے بعد ہمیں مذکورہ اسپتال پہنچا دیا۔

میرے ذہن میں ساحل کے حوالے سے بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ایک طویل انتظار کے بعد اس سے ملنے کی سبیل بنی تھی۔ میں پنکھ لگا کر اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اگر صبح ائر پورٹ پر جانوس ہمیں لینے نہ آ جاتا اور وہ فرینک اسٹریٹ جانے کے لیے ڈاکٹر مونگ کی ہدایت کا ذکر نہ کرتا تو میں ائر پورٹ سے سیدھا اسپتال ہی پہنچتا۔ بہرحال' دیر آید درست آید کے مصداق میں نے دل کو تسلی دے لی۔

اسی شہر کے ایک اسپتال میں مایا متی نرس ہوا کرتی تھی۔ مایا متی بدھ کی پیروکار تھی۔ میں نے کھٹمنڈو میں مایا کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا تھا اور مجھے اس کے اسپتال میں ''داخل'' ہونے کا بھی موقع ملا تھا۔ مایا بہت اچھی لڑکی تھی لیکن افسوس کہ اب وہ اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ میرے ماضی کے دشمنوں نے اسے بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ مایا متی جس اسپتال میں نرس تھی اس کا نام ''ٹیکو'' تھا۔

اسپتال کے ریسپشن پر پہنچ کر میں نے ڈاکٹر مونگ کے بارے میں استفسار کیا تو ریسپشنسٹ سے بحث مناسب نہ سمجھی اور اسپتال کے سکیورٹی انچارج کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

ہنگ نے مجھے بتایا تھا' ڈاکٹر مونگ اور ساحل کی حفاظت کی خاطر وہاں سادہ لباس میں پولیس اہلکاروں کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی جن کی کمان انسپکٹر شیوا کے ہاتھ میں تھی۔ یہ خفیہ نگرانی اسپتال کی سکیورٹی سے خفیہ نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اسی مقصد کی خاطر سکیورٹی انچارج سے ملنا چاہتا تھا۔ اگر انسپکٹر شیوا سے میری ملاقات ہو جاتی تو ڈاکٹر مونگ اور ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہ ہوتی۔

اسپتال کا سکیورٹی انچارج اپنے کمرے میں موجود تھا اور اس کے ساتھ ایک اور باوردی شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ وردی ظاہر کرتی تھی' اس کا تعلق نیپال پولیس سے ہے۔ اس کے شولڈر بیجز اسے پولیس انسپکٹر ظاہر کر رہے تھے۔ اس شخص کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا' وہ یہ تھا کہ ہو نہ ہو یہ انسپکٹر شیوا ہے!

سکیورٹی انچارج وزن اور جثے کے اعتبار سے مسٹر یونیورس نظر آتا تھا۔ اس نے اپنی متورم آنکھیں ہم پر مرکوز کیں اور سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا۔ میں نے کہا ''انچارج! میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر تنہائی میں!''

بات ختم کرتے ہی میں نے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ وہ گہری اور سنجیدہ نظر سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

سکیورٹی انچارج نے مجھ سے پوچھا ''تمہاری ضروری باتوں کی نوعیت کیا ہے مسٹر.....؟''

''شون!'' اس کے ادھورے جملے کے جواب میں' میں نے فوراً کہا پھر اپنی ساتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس کا نام لی یان ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں اور.....'' میں نے سانس لینے کا توقف کیا پھر انچارج کے سوال کا جواب دے دیا ''باتوں کی نوعیت بہت خاص ہے اور تعلق اسی اسپتال سے ہے۔''

سکیورٹی انچارج سے بات کرتے ہوئے میں پولیس انسپکٹر کے چہرے کے تاثرات کا بھی بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ میرے اور لی یان کے تعارف پر وہ ایک خاص انداز میں چونکا تھا۔ ایک مرتبہ پھر میرے ذہن نے اشارہ دیا' وہ انسپکٹر شیوا

ہو سکتا ہے۔

سکیورٹی انچارج نے کہا ''آپ ہر قسم کی ضروری باتیں اس شخص کی موجودگی میں کر سکتے ہیں۔''

میں متذبذب نظر سے کبھی انسپکٹر اور کبھی انچارج کو تکنے لگا۔

انچارج نے کہا ''تم سمجھ لو میں اس وقت تنہا ہی ہوں۔''

میں نے پولیس انسپکٹر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اگر یہ انسپکٹر شیوا ہے تو مجھے اس کی موجودگی میں بات کرنے میں کوئی باک نہیں۔''

''رائٹ یو آر!'' انچارج کے بجائے انسپکٹر نے تیز آواز میں کہا ''میں انسپکٹر شیوا ہی ہوں اور..... اگر میں کوئی غلطی نہیں کر رہا تو تم دونوں نیوجرسی' امریکا سے آئے ہو لیکن.....''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''تم کوئی غلطی نہیں کر رہے انسپکٹر شیوا!'' پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن کے بعد تم رک کیوں گئے۔''

''پہلے مل تو لو پھر بتاتا ہوں۔'' اس نے بڑی گرمجوشی سے باری باری ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔ ہم سے ملنے پر خوشی کا اظہار کیا پھر بولا'' میرا خیال ہے تم دونوں کو اس وقت فرینک اسٹریٹ والے بنگلے پر ہونا چاہیے تھا۔ مسٹر جانوس کے پاس!''

''تمہارا خیال درست ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''لیکن ائر پورٹ سے فرینک اسٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے ایک اپ سیٹ ہو گیا اور ہم یہاں پہنچ گئے۔''

''کیسا اپ سیٹ؟'' وہ ایک دم چوکنا ہو گیا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اسپتال کے سکیورٹی انچارج کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں پوشیدہ مقصد تک پہنچ گیا اور اپنی سیٹ سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''شیوا! میں ذرا ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔ کافی دیر سے کرسی میں ٹھنسا بیٹھا ہوں۔ ڈاکٹر نے کھانے پینے میں احتیاط کے ساتھ چلنے پھرنے کی ہدایت بھی کی تھی۔ یہ مٹاپا تو لگتا ہے میری جان ہی لے لے گا۔''

پھر وہ انسپکٹر کا جواب سنے بغیر کمرے سے نکل گیا۔

سکیورٹی انچارج ایک نہایت ہی موٹا تازہ شخص تھا۔

ٹیلی پیتھی اور مستقبل بینی
اپنا پیغام دوسروں کے ذہنوں تک پہنچانے
اور ان کے دل کا حال جاننے کا سائنسی طریقہ
قیمت: -/40 روپے
ڈاک خرچ: -/23 روپے
کتاب کے چند عنوانات
ٹیلی پیتھی
شمع بینی کی مشق
تحت الشعور
اور اس کی مخفی قوت
جبلت کی کارفرمائیاں
ماہیت افکار
متبادل طرز تنفس
اشتمال افکار
اور اس کی مشقیں
مضرات انتقال افکار
مستقبل بینی
انسان
غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک
نفس امارہ
قوتوں کا سرچشمہ
مستقبل بینی
اصل حقیقت
بعض چشم دید واقعات
طاقت ور احساسات
مستقبل بینی سیکھیے
مستقبل بینی کے مضرات
اچھے اور برے پہلو
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

اس پر نگاہ پڑتے ہی ذہن میں ہاتھی' گینڈے اور دریائی گھوڑے کا تصور ابھرتا تھا۔ سکیورٹی ایک انتہائی حساس اور نازک شعبہ ہے اور اس شعبے سے متعلق لوگوں کو اسمارٹ اور چاق چوبند ہونا چاہیے...... اور عموماً ایسا ہوتا بھی ہے لیکن پھر بھی کہیں کہیں اس انچارج جیسے ست الوجود دکھائی دے جاتے ہیں۔

تسلیم کہ اسے ڈاکٹر نے مٹاپا دور کرنے کے لیے چہل قدمی کا مشورہ دے رکھا ہوگا لیکن میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس وقت وہ ہمیں تنہائی میں بات چیت کا موقع فراہم کرنے کے لیے کمرے سے نکلا تھا۔ اس کے جانے کے بعد انسپکٹر میری جانب متوجہ ہوگیا اور تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''مسٹر شون! تم کسی اپ سیٹ کے بارے میں بتا رہے تھے؟''

مجھے اندازہ ہوا' ڈاکٹر مونگ نے اسے ہمارے بارے میں کافی کچھ بتا رکھا تھا تاہم وہ یہ نہیں جانتا تھا' شون کے بھیس میں وجدان یعنی میں چھپا ہوا ہوں اور یہ میرے حق میں اچھا ہی تھا۔ نیوجرسی سے رخصت ہوتے وقت ہنگ نے کھٹمنڈو میں جو ٹیلی فونک رابطہ کیا تھا اس میں میری کسی سے بات نہیں ہوئی تھی۔ ہنگ ہی نے مجھے بتایا تھا' اس کی ڈاکٹر مونگ سے مختصر بات ہوئی تھی۔ ہنگ نے ڈاکٹر کو ہمارے بارے میں بتا دیا تھا اور ڈاکٹر مونگ نے اپنے طور پر انسپکٹر شیوا کو کے بریفنگ دی ہوگی۔

میں نے نہایت ہی جامع الفاظ میں شیوا کو اس واقعے کے بارے میں بتایا جو ائرپورٹ سے فریک اسٹریٹ کی طرف جاتے ہوئے پیش آیا تھا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے اضطراری انداز میں کہا۔

''اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔ کیا ڈاکٹر مونگ کو اس کی اطلاع ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کندھے اچکائے ''میں تو ہوٹل سے سیدھا یہاں پہنچا ہوں۔ تم ڈاکٹر کو میری آمد کی اطلاع دو۔ میں خود اسے بتا دوں گا۔''

وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔ میں حیرت زدہ اور الجھن سے اس کی کارروائی دیکھنے لگا۔ اس نے ایک نمبر ڈائل کیا پھر ریسیور کان سے لگا کر الرٹ ہوگیا۔ فوری طور پر میں یہی اندازہ قائم کرسکا کہ وہ ڈاکٹر مونگ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی یہ کوشش میری سوچ کو اندیشوں کے سپرد کر رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق' ڈاکٹر مونگ اور ساحل کو اس وقت سٹی اسپتال میں ہونا چاہیے تھا جہاں ہم موجود تھے۔ ڈاکٹر تک کسی اطلاع کو پہنچانے کے لیے فون کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شیوا نے جتنی لمبی چوڑی ڈائلنگ کی تھی اس نے انٹرکام کے امکان کو رد کر دیا۔ وہ یقینی طور پر کھٹمنڈو یا نیپال کے کسی دوسرے شہر میں رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال ابھرا۔

کیا ڈاکٹر مونگ اس وقت اسپتال میں موجود نہیں؟

اس سوال نے مجھے انسپکٹر سے استفسار کرنے پر مجبور کر دیا ''شیوا! تم کسے فون کر رہے ہو؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے استفسار کا جواب دیتا' دوسری طرف فون اٹینڈ کر لیا گیا۔ شیوا باادب' بالملاحظہ ہو کر بات کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے سنے ہوئے واقعے کی رپورٹ پیش کی پھر ہمارے اسپتال پہنچنے کا ذکر کیا اور دس بیس مرتبہ ''لیس سر' نو سر'' کہنے کے بعد ریسیور کریڈل کر دیا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ اس وقت ڈاکٹر مونگ سے بات کر رہا تھا۔

''شون! ڈاکٹر مونگ کو اس افسوس ناک واقعے کی خبر جانوس کے ذریعے مل چکی ہے۔'' شیوا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

میرا ذہن مزید الجھ گیا۔ جانوس نے مجھے بتایا تھا' جب وہ ہمیں فریک اسٹریٹ والے بنگلے پر پہنچا دے گا تو ڈاکٹر مونگ ہم سے بات کرے گا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر مونگ اور ساحل اسپتال میں ہیں تاہم یہ معلومات فراہم کرتے ہوئے اس کا انداز متاملانہ تھا۔ اس وقت بھی میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور اب تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ڈاکٹر مونگ اور ساحل اس اسپتال میں موجود نہیں ہیں۔

میں تیسری آنکھ کے ذریعے ڈاکٹر کے ماحول میں داخل ہو کر یہ معلوم کرسکتا تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اگر وہ اسپتال کے کمرے میں ہوتا تو مجھے پتا چل جاتا۔ میں دو تین مرتبہ اس کمرے میں اسے دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت میں دھیان گیان کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے براہِ راست شیوا ہی سے پوچھ لیا۔

''انسپکٹر! میں محسوس کر رہا ہوں' ڈاکٹر مونگ اسپتال میں موجود نہیں؟''

''تم بالکل ٹھیک محسوس کر رہے ہو۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا ''ہم اس وقت ڈاکٹر مونگ کے پاس چل رہے ہیں۔ اس نے آپ دونوں کو فوراً بلایا ہے۔ میں آپ کو اپنی سرکاری جیپ میں ڈاکٹر تک پہنچاؤں گا۔''

اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''ڈاکٹر اس وقت کہاں ہے؟''

''رتنا پارک کے نزدیک وہ ایک بنگلے میں ٹھہرا ہوا ہے!'' اس نے سپاٹ آواز میں بتایا۔

''رتنا پارک!'' بے ساختہ میری زبان سے ادا ہوا۔ میری آواز اتنی اونچی تھی کہ انسپکٹر چونک کر مجھے دیکھنے لگا ''کیوں کیا ہوا؟''

میں نے فوراً خود پر کنٹرول کر لیا اور کہا ''کچھ نہیں'' پھر میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا ''چلو ہم ڈاکٹر مونگ کے پاس جا رہے ہیں!''

لی یان بھی میری تقلید میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ شیوا کے ساتھ ساتھ وہ بھی میری بلند آواز سن کر چونکی تھی اس نے شیوا کے برعکس سوال نہیں کیا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے اسپتال سے باہر آئے اور پھر انسپکٹر شیوا کی جیپ میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔

اگر ڈاکٹر مونگ اسپتال میں نہیں تھا تو اس کا یہی مطلب تھا' ساحل بھی وہاں نہیں ہوگی۔ ساحل کی اہمیت میرے اور ڈاکٹر سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے تصدیق کی خاطر انسپکٹر سے پوچھ لیا۔

''ڈاکٹر مونگ کب یہاں سے گیا ہے؟''

''گزشتہ رات!'' اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت جیپ میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے سوال کیا ''کیا ساحل بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہے؟''

''ساحل!'' وہ تھوڑی دیر کے لیے متذبذب نظر آیا پھر پوچھنے لگا ''کہیں تم اس تبتی لڑکی کا ذکر تو نہیں کر رہے جو ڈاکٹر کے ساتھ اسپتال پہنچی تھی؟''

''بالکل! میں اسی کی بابت پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا ''اس کا پیدائشی نام دھنو ہے۔ میرے لیے وہ ساحل ہے جس کی تلاش میں' میں دردر کی خاک چھان رہا ہوں۔''

میرے انداز نے شیوا کو بتا دیا کہ میں اپنے دل میں ساحل کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں وہ لڑکی بھی ڈاکٹر مونگ کے ساتھ ہی رتنا پارک والے بنگلے پر پہنچی ہے۔''

''پھر اسپتال میں خفیہ نگرانی اور حفاظت کا سلسلہ کیوں جاری ہے؟''

''دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے۔'' وہ قطعیت سے بولا ''ڈاکٹر مونگ کے دشمن ابھی تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر اور اس تبتی لڑکی کو نہایت ہی پُراسرار انداز میں اسپتال سے رتنا پارک والے بنگلے میں منتقل کیا گیا ہے۔''

پھر وہ مجھے اس منتقلی کی تفصیل بتانے لگا۔ اس کے مطابق' ڈاکٹر مونگ اور ساحل (تبتی لڑکی) کو مردوں کے بھیس میں اسپتال کی ایمبولینس میں وہاں سے نکالا گیا تھا اور مختلف سڑکوں پر ایمبولینس دوڑانے اور اس بات کا اطمینان ہو جانے کے بعد کہ ان کا تعاقب نہیں کیا گیا' انہیں رتنا پارک والے بنگلے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ یہ تفصیل سننے کے بعد مجھے اطمینان بھی ہوا کیونکہ کیسے بھی سہی بہرحال میری ساحل ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئی تھی۔

میں نے ٹرائی بیکا والے اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے تصور کی نگاہ سے ڈاکٹر مونگ کی ''بھاگ دوڑ'' کا جو خونچکاں منظر دیکھا تھا' اس نے میری روح تک کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ پھر اسپتال میں بھی میں نے ڈاکٹر کو تشویش ناک حالت میں دیکھا اور اب اس کی بحفاظت منتقلی میرے ذہن کو ایک حوالے سے الجھا رہی تھی۔ میں نے شیوا سے پوچھا۔

''انسپکٹر! ڈاکٹر اور ساحل کی طبیعت کیسی ہے۔ انہیں شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا تھا؟''

اس نے تھوڑا تامل کیا پھر بولا ''اب وہ دونوں ٹھیک ہیں۔''

اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتانے پر مجبور نہیں کیا کیونکہ تھوڑی دیر بعد میں ڈاکٹر مونگ اور ساحل کے قریب پہنچنے ہی والا تھا۔ یہ تفصیل میں ڈاکٹر ہی سے پوچھ لیتا۔ کھٹمنڈو کے مضافات میں پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہسار میں' میں نے تصور کی نظر سے جو خونیں منظر دیکھا تھا اس کے حوالے سے میرے ذہن میں سیکڑوں سوالات سر اٹھائے کھڑے تھے۔

میں نے انسپکٹر سے پوچھا ''اس وقت تم سرکاری گاڑی میں ہمیں ڈاکٹر مونگ کے ٹھکانے پر پہنچانے جا رہے ہو۔ اگر دشمنوں نے تعاقب کر کے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی یا ہماری دم سے بندھ کر وہ غیر محسوس انداز میں رتنا پارک کے اس بنگلے تک پہنچ گئے تو کیا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' وہ تیقن سے بولا ''وہ لوگ ہمارا تعاقب کر کے کبھی بھی ڈاکٹر مونگ والے ٹھکانے تک رسائی

حاصل نہیں کر سکتے۔ ہم براہِ راست رتنا پارک نہیں جائیں گے۔ پہلے ہم کماری چوک کے ایک بنگلے پر پہنچیں گے پھر اس بنگلے کے اندر سے ہم نہایت ہی خفیہ انداز میں آگے بڑھیں گے جس کی تفصیل تمہیں کماری چوک کے مذکورہ بنگلے کے اندر پہنچنے کے بعد پتا چل جائے گی۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگر بالفرض ہمارا تعاقب کیا بھی گیا تو متعاقبین زیادہ سے زیادہ کماری چوک والے بنگلے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے اور اس کامیابی کے نتیجے میں انہیں کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ کسی بھی صورت یہ جان نہیں پائیں گے کہ ہم وہاں سے رتنا پارک کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔''

انسپکٹر شیوا بڑی الجھی ہوئی باتیں کر رہا تھا لیکن میں نے اس سے سوال و جواب میں وقت ضائع نہیں کیا اور نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

رتنا پارک کے ذکر نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی۔ میں اس پارک اور اس سے وابستہ یادوں کو بھلا کیسے بھلا سکتا تھا۔ رتنا پارک میں نیلگری سے میرا پہلا تعارف ہوا تھا۔ اس وقت وہ کرسٹل کے ایک مجسمے کی صورت میں تھی جس کے دو حصے ہو چکے تھے۔ میں نے اس ٹوٹے ہوئے مجسمے کو بڑی حفاظت اور محبت سے سمیٹا تھا اور اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ رات میری زندگی کی بڑی عجیب و غریب رات تھی۔

میں نیلگری کے کرسٹلی مجسمے کو گھر تو لے آیا تھا لیکن اس کے حسن نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے کوشش کر کے مجسمے کے دونوں حصوں کو ٹیپ کی مدد سے جوڑا تو وہ ''زندہ'' ہو گئی پھر اس نے ایک نادیدہ اور سمجھ میں نہ آنے والی زبان میں مجھ سے باتیں کی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ میری زندگی میں داخل ہوتی گئی اور اب تک داخل تھی...... بس یہ کہ اس کے ''دخل'' کا انداز بدل گیا تھا!

میں نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے بہت دور نکل گیا' پھر مجھے یاد آیا کہ ایک نظر ڈاکٹر مونگ پر بھی ڈالنا چاہیے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حال میں ہے۔ اس کے ماحول میں میری ساحل بھی موجود تھی۔ ڈاکٹر کی خیریت سے مجھے ساحل کی خیریت مل سکتی تھی۔ میں براہِ راست ساحل سے تصوراتی رابطہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے بالواسطہ اس تک پہنچنے کے لیے مجبور تھا!

میں نے ڈاکٹر مونگ کے خدوخال کو اپنے تصور میں تیسری آنکھ کے سامنے اجاگر کیا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اس کا ماحول حد درجہ متحرک تھا۔ وہ اس وقت بیک وقت چار افراد سے نمٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چاروں کوئی للو پنجو قسم کے فائٹر نہیں تھے۔ ڈاکٹر مونگ کو ان کا مقابلہ کرنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی تھی۔ یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

میں نے ڈاکٹر کو میدان جنگ میں چھوڑا اور ساحل کا تصور قائم کر کے اس کے ماحول میں کودنے کی کوشش کی۔ میں ایک مرتبہ پھر چاروں خانے چت ہو گیا۔ ساحل کا ماحول میری رسائی میں نہ آ سکا۔ پتا نہیں ربی موشے ہائمن نے کیسی بندش ڈال دی تھی۔

میں واپس پلٹا اور ڈاکٹر مونگ ریفوشے کے ماحول میں چھلانگ لگا دی۔

اسی لمحے مجھے آنکھیں کھولنا پڑیں۔ ہماری گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ میں نے بے اختیار جیپ سے باہر دیکھا اور میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک ہولناک منظر میرا منتظر تھا!

جیپ رکنے کا سبب وہ ٹرک تھا جو ہمارے آگے کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں میری سمجھ میں یہی آیا کہ ٹرک نے اچانک بریک لگائے ہوں گے جس کی وجہ سے انسپکٹر شیوا کو بھی مجبوراً بریک پیڈل دبانا پڑے۔ اگر ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو جیپ ٹرک کے اندر گھس چکی ہوتی۔

اس سے پہلے کہ صورتِ حال میری سمجھ میں آتی' جیپ کے عقب میں ایک تیز رفتار گاڑی نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ گاڑی ہماری قریب پہنچ گئی۔ شیوا جیپ کو ٹرن کرنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ ٹرک کے باعث سیدھا آگے نکلنا ممکن نہیں تھا۔

جب تک ہماری جیپ سڑک پر راہ حاصل کر پاتی' عقب میں آنے والی گاڑی ہمارے پہلو میں پہنچ کر رک چکی تھی۔ رکی ہوئی گاڑی میں سے کوئی باہر نہیں نکلا تاہم ہماری جانب کھلنے والے اس کے شیشوں میں سے دو آٹو میٹک رائفلوں کے بیرل برآمد ہوئے۔ اگلے ہی لمحے وہ بیرل ہماری طرف موت اچھالنے لگے۔

ہم اس وقت گولیوں کی بوچھار میں تھے!

موت کا ایک دن معین ہے مگر اس دن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ انسان زندگی کی آخری سانس تک اس کا مقابلہ کرتا ہے...... اور ہم بھی کر رہے تھے۔ یہ سفاک حقیقت تمام تر سنگینی کے ساتھ ہمارے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' وہ

ہمیں نیست و نابود کر کے ہی دم لیں گے۔

ہم بڑی واہیات صورتِ حالات سے دوچار تھے۔ یہ ''آگے کنواں' پیچھے کھائی'' والی سچویشن تھی۔ سائیڈ اسٹریٹ سے برآمد ہونے والے ٹرک نے مین روڈ پر آ کر آگے بڑھنے کا راستہ مسدود کر دیا تھا اور عقب میں وہ گاڑی تھی جو کم و بیش ہمارے پہلو میں آ کر رکی تھی۔ اس گاڑی میں موجود افراد ہمیں بھون کر رکھنے کے لیے اپنی گنوں سے مسلسل گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ اندھی بے زبان گولیاں ہماری جیپ کی باڈی کو چھلنی میں بدل رہی تھیں' شیشوں کو چکنا چور کر رہی تھیں اور ہمیں مجبور کر رہی تھیں کہ جان بچانے کے لیے ہم جو بھی کر سکتے ہوں' کر گزریں۔ اگر نہیں کریں گے تو پھر یہ جان لیوا گولیاں ہمیں زندگی سے گزار دیں گی!

میں نے خطرناک رائفلوں کو اپنی جانب اٹھتے دیکھ کر میکانکی انداز میں لی یان کو دھکا دے کر سیٹ پر گرا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں خود بھی اس کے اوپر لیٹ گیا تھا۔ فوری طور پر خود کو محفوظ کرنے کا اس سے زیادہ موزوں اور کوئی اقدام نہیں ہو سکتا تھا۔ ہماری دیکھا دیکھی یا اپنی مرضی سے' بہرحال انسپکٹر شیوا نے بھی پسنجر سیٹ کی جانب لپک کر خود کو برستی گولیوں کی زد سے بچا لیا۔

ایک لمحے کے لیے فائرنگ میں وقفہ ہوا تو مجھے سوچنے کا موقع ملا۔ سوچ کا عمل تو مسلسل جاری رہتا ہے' یوں سمجھیں اس لمحے میں مجھے عمل کرنے کا موقع ملا۔ اس فیصلے پر عمل کرنے کا موقع جو حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر ہنگامی انداز میں میرے ذہن نے کیا تھا۔ میں نے جیپ سے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس فیصلے کے ساتھ ہی میں نے لی یان کے کان میں سرگوشی کی ''میں جیپ کا دروازہ کھول رہا ہوں۔ ہمیں رولنگ کرتے ہوئے ٹرک کی طرف جانا ہے اور اس کے نیچے پناہ گزیں ہونا ہے۔ کیا میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟''

ہماری جیپ قاتل بردار گاڑی اور ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے درمیان کھڑی تھی۔ جیپ اور ٹرک کے درمیان بہ مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا تھا اور یہ فاصلہ اس وقت پیدا ہوا تھا جب شیوا نے آگے راستہ نہ پا کر جیپ کو موڑنے کی کوشش کی تھی۔ اگر ایک مرتبہ ہم ٹرک کے نیچے پہنچ جاتے تو براہِ راست گولیوں کی زد سے محفوظ ہو سکتے تھے۔

لی یان جزوی طور پر میرے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے بدن کی اثباتی جنبش سے میرے سوال کا جواب دیا اور سرگوشیانہ انداز ہی میں بولی ''اوکے' آئی ایم ریڈی۔ تم دروازہ کھولو۔''

میری مستفسر سرگوشی شیوا کی سماعت تک بھی رسائی حاصل کر چکی تھی۔ وہ گمبھیر آواز میں بولا ''شون! میں بھی تیار ہوں۔ اگر ہم چند لمحے مزید جیپ میں ٹھہرے رہے تو یہ جیپ ہمارا مدفن بن جائے گی لیکن ٹرک کے نیچے پناہ لینا ٹھیک نہیں۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین ہے' یہ ٹرک بھی ہمارے دشمنوں ہی کا ہے جو میری راہ کھوٹی کرنے کے لیے سڑک کو روک کر کھڑا ہو گیا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو شیوا...! ہمارے ٹرک کے نیچے پہنچتے ہی وہ ہمیں روندنے کے لیے ٹرک کو آگے بھی بڑھا سکتے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' ہم ٹرک کے نیچے سے گزر کر دوسری طرف نکلنے کی کوشش کریں گے۔ تمہارے پاس گن وغیرہ تو ہو گی؟''

''ہاں' گن میری جیب میں ہے۔ میں اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں ''

شیوا کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت فضا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی مخصوص تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ حملہ آوروں کو ہماری خاموشی پسند نہیں آئی تھی۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ آیا ہم نے دانستہ چپ سادھ رکھی ہے یا پھر ہماری یہ خاموشی ازلی ابدی ہے!

میں نے کہا ''میں تین تک گنتی گنوں گا اور تین کے بعد جیپ کا دروازہ کھول کر باہر لڑھک جاؤں گا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ جیپ کے اندر دبک کر بیٹھے رہنا خود کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے۔''

ادھر میری بات پوری ہوئی' ادھر قاتل بردار گاڑی کے دروازے کھلنے کی مخصوص آواز ابھری۔ وہ لوگ ہماری جانب مکمل خاموشی پا کر ادھر کی صورتِ حال جاننے کے لیے اپنی گاڑی سے باہر آ رہے تھے۔ یہ بہت ہی نازک اور سنسنی خیز لمحات تھے۔ اگر وہ ہتھیار بدست ہمارے سروں پر پہنچ جاتے تو زندگی کو موت سے معانقہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

میں نے ایک طویل سانس کھینچی اور ''ایک دو تین'' کہتے ہوئے ٹرک والی سائیڈ کا دروازہ کھول دیا پھر لی یان کے اوپر سے ایک طویل فرنٹ رول کرتے ہوئے ہیوی ڈیوٹی ٹرک کے نیچے پہنچ گیا۔ میں ٹرک کے نیچے رکا نہیں بلکہ رولنگ کو آگے بڑھاتے ہوئے دوسری سمت نکل گیا۔

میں جیسے ہی رکا اور رک کر اپنے عقب میں نگاہ ڈالی تو لی یان کو تین قدم کے فاصلے پر پایا۔ اسی لمحے لی یان نے غیر متوقع طور پر ایک لمبی جست بھری اور مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے ٹرک کی فرنٹ سائیڈ کی سمت لڑھک گئی۔

اسی اضطراری رولنگ کے دوران میں میری نگاہ نے وہ منظر دیکھ لیا جو لی یان کی غیر متوقع جست کا سبب بنا تھا۔ ٹرک کا اس طرف والا دروازہ کھلا ہوا تھا جس میں ایک گن بردار موجود تھا۔ یقینی بات تھی' مذکورہ گن بردار نے مجھے نشانہ بنانا چاہا ہوگا اور لی یان نے بروقت مجھے لڑھکا کر فائرنگ ٹارگٹ سے باہر نکال دیا تھا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ رولنگ کے اختتام پر میں ایک لمحے کے لیے بھی زمین پر نہیں رکا۔ بیک رول کرتے ہوئے اپنے قدموں پر آیا اور ہائی جمپ کے ایکشن میں اچھل کر ایک بیک سمر سالٹ لگا دیا۔ گن بردار میری اڑان کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ میرے لیے اس کی یہ معمولی سی غفلت کسی سنہری موقع سے کم نہیں تھی۔

سمر سالٹ کے وسط میں' میں اس سے چند انچ کی دوری پر تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے اس کے گن والے ہاتھ پر ایک طوفانی جھپٹا مارا اور ہتھیار کو اپنے قابو میں کرتے ہوئے دوسری سمت نکل گیا۔

اسی لمحے ٹرک کی دوسری جانب فائرنگ سنائی دی۔ اس فائرنگ نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شیوا ابھی تک ہماری طرف نہیں پہنچا تھا۔ یقیناً حملہ آوروں سے اس کی مٹھ بھیڑ ہوگئی تھی۔ میں نے پلٹ کر لی یان کی طرف دیکھا۔

وہ اس ''گن بردار'' سے نبرد آزما تھی جو اب نہتا ہو چکا تھا۔ اس کی گن پر میرا کامل قبضہ تھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں موجود شخص کو لی یان نے گھسیٹ کر نیچے کھینچ لیا تھا اور چار ہاتھ پاؤں سے اس کی درگت بنانے کا فریضہ ادا کر رہی تھی۔ میں اس کی طرف سے مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔

ٹرک کی دوسری سمت ایک مرتبہ پھر سناٹا چھا گیا۔ ادھر کے حالات جاننا از حد ضروری تھا کیونکہ شیوا ابھی تک ہماری طرف دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں دبے قدموں سرکتے ہوئے ٹرک کی عقبی جانب بڑھ گیا پھر جیسے ہی میں ٹرک کے پیچھے پہنچا' ایک اجنبی چہرے سے سامنا ہوگیا۔

وہ یقیناً حملہ آوروں ہی کا کوئی ساتھی تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں موجود تھی لیکن میں نے اسے گن استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ جیسے ہی اس نے مجھے نشانہ بنانے کے لیے گن سیدھی کرنا چاہی' میں حرکت میں آگیا۔ مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ لہٰذا اس کے عمل میں وہ ایکوریسی مفقود تھی جس کی اس موقع پر ضرورت تھی۔

جیسے ہی فائرنگ کے لیے اس نے گن کو میری جانب سیدھا کیا' میں نے اپنی گن کو لاٹھی کے سے انداز میں گھما کر اس کی گن پر مارا۔ نتیجے میں اس کی گن چلی ضرور تاہم، میں اس کی فائرنگ سے سراسر محفوظ رہا۔ خطرناک برسٹ اس سڑک کے ایک حصے کو دور تک ادھیڑتا چلا گیا پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی میں نے اس کی خاطر تواضع شروع کر دی۔

میری ایک زبردست پریشر کک اس کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم پیچھے گیا۔ خطرناک گن بدستور اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ اسی لڑکھڑاہٹ کے دوران میں ایک مرتبہ پھر اس نے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تو میں نے چیتے کے مانند ایک طویل جست بھری اور اس کے سولر پر ایک خوفناک سائیڈ کک جڑ دی۔ سولر پر لگنے والی معمولی سی ٹھوکر' ننھا سا پش بھی جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے اور...... سائیڈ اسٹیپ کک کی خطرناکی کو صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے کبھی یہ مہلک کک کھائی ہو یا مذکورہ کک لگانا جانتا ہو۔

میں یہ کک مارنا بہ خوبی جانتا تھا اور میرے مدمقابل نے میری کک کھائی تھی لہٰذا نتیجہ اتنا ہی مہلک برآمد ہوا جتنا بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ ''اوں'' کی آواز خارج کرتے ہوئے بیک گیئر میں اچھلا اور بیک فٹ پر سفر کرتے ہوئے' سڑک کے عین وسط میں چاروں شانے چت ہوگیا۔ اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اسی اثنا میں ایک دوسرا حملہ آور ٹرک کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بے دریغ اس کے پاؤں میں فائرنگ کر دی۔ جس عمارت کی بنیاد ہلا دی جائے وہ اپنی قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ میں نے گن بردار حملہ آور کے قدموں کو چھلنی بنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ وہ کسی ایسی فلک بوس عمارت کے مانند زمین بوس ہوگیا جس کے نیچے سے اچانک زمین کھینچ لی گئی ہو!

میں اس کا جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی اور وہ بڑی کسمپرسی کے عالم میں سنگلاخ سڑک پر زخمی ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر بڑے سفاک انداز میں اس کے چہرے پر وزنی بوٹ کی تین چار اذیت بھری ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میں اس کا مزید حشر خراب کرنا چاہتا تھا کہ لی یان کی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا اور منظر کی سنگینی

نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لی یان کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر ایک گن کی خوفناک نال ٹکی ہوئی تھی اور یہ وہ شخص نہیں تھا' تھوڑی دیر پہلے وہ جس کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ مذکورہ شخص پانچ فٹ کی دوری پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔ لی یان نے اسے بڑے آرام سے لگا دیا تھا۔ اب وہ خود دشمن کے نشانے پر تھی۔

میں نے لی یان کو مصیبت میں دیکھا تو بے ساختہ میری گن اس سمت اٹھ گئی۔ اسی لمحے لی یان کو نشانے پر رکھنے والا گن بردار غرایا۔

''کوئی حرکت نہیں' گن کو دور پھینک دو!''

میں تذبذب کے عالم میں ایک لمحہ یونہی گن تھامے کھڑا رہا۔

''کیا تم چاہتے ہو' میں اس عورت کا بھیجا ہوا میں اڑا دوں؟'' اس نے بڑے سنگین انداز میں گن کی نال سے لی یان کی کھوپڑی پر ٹھوکا دیا۔

ظاہر ہے' میں ویسا نہیں چاہتا تھا جیسا اس شخص نے بیان کیا تھا لہٰذا میں نے لی یان کی سلامتی کے لیے گن کو دور ٹرک کے نیچے پھینک دیا۔

''دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو!'' وہ ایک مرتبہ پھر تحکمانہ انداز میں غرایا۔

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

ہمارے درمیان دس فٹ سے زیادہ فاصلہ حائل تھا۔ میری کوئی بھی مدافعتی چال لی یان کی زندگی کو انتہائی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ میں کوئی ایسا رسک لینے کو تیار نہیں تھا جس کے نتیجے میں میری ساتھی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جاتا۔

اس شخص نے اپنے حکم کو آگے بڑھایا ''گھوم جاؤ۔''

میں کسی مداری کے بچہ جمہورا کی طرح گھوم گیا۔

اسی لمحے گولی چلنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔

میں نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ گن کے زور پر مجھے دھمکانے والا کٹے ہوئے کسی شہتیر کے مانند زمین کی جانب جھک رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ گن اس کے ہاتھوں سے نکل کر اس سے پہلے زمین بوس ہو چکی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی دھپ سے سڑک پر جا گرا۔

لی یان نے ایک وحشت بھری نظر اس پر ڈالی پھر اس کی نگاہ ٹرک کے اوپری حصے کی سمت اٹھ گئی۔ میں نے غیر ارادی طور پر لی یان کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر مجھے انسپکٹر شیوا کی صورت نظر آئی۔

مجھ سے نظر ملی تو اس نے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے ایک ہاتھ کو اوپر اٹھا دیا پھر خود بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک جدید ریوالور موجود تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ شیوا نے ڈرائیونگ کیبن کی چھت پر لیٹے لیٹے اس گن بردار حملہ آور کو مار گرایا تھا' جو لی یان کو نشانے پر رکھ کر مجھے اپنے احکام کی تعمیل پر مجبور کر رہا تھا۔ میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔

اسی لمحے شیوا کسی ماہر کوہ پیما کی طرح ٹرک سے نیچے اتر آیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''مسٹر شون! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات اپنے کنٹرول میں ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور لی یان کی طرف بڑھ گیا۔

لی یان کو ایڈونچر بہت پسند تھا۔ وہ اپنی زندگی میں سنسنی خیزی کی خواہاں تھی۔ میرے ساتھ رہتے ہوئے اس کا یہ شوق تو پورا ہو رہا تھا لیکن تھوڑی دیر پہلے اس نے موت کو اتنے قریب دیکھ لیا کہ وہ اس وقت کسی ہرنی کے مانند سہمی ہوئی تھی۔ میرے قریب آتے ہی وہ مجھ سے چپک گئی۔ اس کا خوف دور کرنے کے لیے میں نے اس کو خود سے دور کرنا مناسب نہ سمجھا!

آئندہ دو منٹ کے اندر ہم نے حملہ آوروں کا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ کل چار افراد تھے۔ ایک ہیوی ڈیوٹی ٹرک میں سے برآمد ہوا تھا اور لی یان سے درگت بنوانے کے بعد وہ ''بے فکری'' سے لمبا لیٹ گیا تھا۔ تاہم اس میں زندگی کے آثار باقی تھے۔

دیگر تین میں سے ایک انسپکٹر شیوا کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ لی یان کا بھیجا ہوا میں اڑانے کی دھمکی دے رہا تھا اور اب اس کا اپنا بھیجا خاک میں مل رہا تھا۔ شیوا کے سچے نشانے نے اس کی کھوپڑی میں خاصا کشادہ ہوادان بنا دیا تھا۔

انسان بڑا بڑبولا ہے۔ طاقت کے نشے میں پتا نہیں' کہاں کہاں کی بولتا چلا جاتا ہے مگر جیسے ہی یہ نشہ ٹوٹتا ہے' وہ فلک سے زمین پر آ گرتا ہے۔ آسمان پر رہ کر خود کو آفتاب و مہتاب سمجھنے والا کتے بلیوں کے پاؤں کی دھول بن کر رہ جاتا ہے۔ نشہ کسی بھی شے کا ہو' برا ہے کیونکہ اس میں انسان اپنی اوقات میں نہیں رہتا۔

میں نے دو حملہ آوروں کی مزاج پرسی کی تھی جن میں سے ایک اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے اپنے سینے پر میری سائیڈ سولر کک کا تمغا سجایا تھا۔ دوسرا شدید زخمی اور بے ہوش تھا۔ اس کے گھائل پاؤں خون میں زبتر تھے۔

ہماری جیپ کی ایک سائیڈ گولیوں سے چھلنی ہو گئی تھی۔ ٹائر بھی ناکارہ ہو چکے تھے۔ فی الحال وہ کسی قسم کے سفر کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس سائیڈ کے دروازے ابھی تک کھلے ہوئے تھے جہاں سے ہم نے راہِ فرار اختیار کی تھی۔

شیوا نے کھلے ہوئے دروازے میں سے ڈیش بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''میں موبائل فون پر ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کر کے مزید کمک منگواتا ہوں۔ حالات اگرچہ قابو میں ہیں مگر اس سچویشن کو ہینڈل کرنے کے لیے مزید نفری کی ضرورت ہو گی۔''

وہ موبائل نکال کر سیدھا ہوا تو میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''اگر ہم موقع کی کارروائی میں الجھ گئے تو اچھا خاصا وقت برباد ہو جائے گا جب کہ مجھے فوری طور پر ڈاکٹر مونگ کے پاس پہنچنا چاہیے۔ وہ اس وقت بڑی مشکل میں ہے۔''

''مشکل میں؟'' اس نے کی پیڈ پر حرکت کرتی انگلی کو روک کر حیرت سے مجھے دیکھا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا ''اگر ڈاکٹر مونگ رتنا پارک کے کسی بنگلے میں قیام پذیر ہے تو سمجھو' وہاں بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔''

انسپکٹر شیوا کی حیرت دوچند ہو گئی ''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں بیٹھ سکی مسٹر شون! پتا نہیں' تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ رتنا پارک والے بنگلے میں کس قسم کی گڑبڑ ہو گئی ہے؟ اور...... اور تمہیں یہ خبر کیسے ہو گئی۔ تم تو اسپتال سے میرے ساتھ یہاں آئے ہو؟''

انسپکٹر شیوا کے چہرے پر شکوک و شبہات کی ایک دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ میں اس کے سوالات کے جواب میں اپنی تھرڈ آئی والی صلاحیت کو ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ باطنی آنکھ والے معاملے کو ہر کسی پر ظاہر ہونا بھی نہیں چاہیے تھا لہٰذا مصلحت کی راہ اختیار کرتے ہوئے میں نے اس سے کہا۔

''دیکھو شیوا! فضول کے بحث مباحثے میں سوائے وقت ضائع کرنے کے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تم میری بات کی تصدیق کے لیے رتنا پارک والے بنگلے پر فون کر کے ڈاکٹر مونگ کی خیریت معلوم کر سکتے ہو۔''

اس کی تسلی تو نہیں ہوئی۔ تاہم میں نے ایک معقول بات کی تھی اس لیے وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ڈاکٹر مونگ کے نمبرز پنچ کرتے ہوئے وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کا انداز گھورنے والا تھا۔ نگاہ میں کسی عقاب ایسی تیزی تھی جیسے وہ میری سوچ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس دوران میں' میں بھی اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا جن میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گمبھیرتا بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے شکست خوردہ اور تشویش ناک انداز میں کہا ''ڈاکٹر فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ادھر حالات سازگار نہیں رہے۔''

''اس کے سیل پر ٹرائی کرو۔''

''کر چکا ہوں۔ وہ بھی بند مل رہا ہے۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے ڈاکٹر مونگ کے سیل کا نمبر دہرایا اور پوچھا ''کیا تم نے اسی نمبر کو ٹرائی کیا ہے؟''

''نہیں۔ ڈاکٹر کے پاس دوسرا سیل ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

پھر میری فرمائش پر شیوا نے مجھے مذکورہ سیل نمبر بتا دیا جو میں نے اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔ اگر اس وقت اس نمبر پر رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا تو بعد میں ایسی کوشش کی جا سکتی تھی۔

شیوا گہرے تذبذب میں مبتلا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے ٹٹولنے کی سعی کی ''مسٹر شون! تم نے بتایا نہیں' تمہیں رتنا پارک والے بنگلے میں ہونے والی گڑبڑ کا کیسے علم ہوا؟''

''میرا خیال ہے' اب ہم واقعی وقت ضائع کر رہے ہیں۔'' میں نے شیوا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''تم پولیس انسپکٹر ہو۔ یہاں جو کچھ پیش آ چکا ہے اس کو تمہی نے ڈیل کرنا ہے۔ تم مجھے رتنا پارک والے بنگلے کا نمبر اور لوکیشن بتا دو۔ کھٹمنڈو میرا دیکھا بھالا ہے۔ میں بہ آسانی ڈاکٹر مونگ تک پہنچ جاؤں گا۔ تمہارا یہاں رکنا اور ضروری کارروائی نمٹانا ضروری ہے۔''

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے میری مطلوبہ معلومات فراہم کیں پھر ایک طویل اور بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں ڈاکٹر مونگ کا وفادار ہوں لیکن قانون سے وفا شناسی بھی ضروری ہے۔ میں یہاں سے فارغ ہوتے ہی تم سے رابطہ کر دوں گا۔ تم فوراً رتنا پارک کی طرف روانہ ہو جاؤ۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کا سیل نمبر لینے کے بعد کہا ''وہاں پہنچتے ہی میں تمہیں صورتِ حالات سے آگاہ کروں گا۔ تم یہاں کے معاملات کو نمٹانے کی کوشش کرو اور......'' میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر اس واقعے میں ہمارا کہیں ذکر نہ آئے تو اچھا ہے!''

''ٹھیک ہے' میں تمہاری خواہش کا خیال رکھوں گا۔''

ہم اس وقت ایک غیر مصروف سڑک پر کھڑے تھے۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد شیوا نے دانستہ یہ لمبا اور کم مصروف روٹ لیا تھا۔ وہ کماری چوک تک نسبتاً آسان راستے سے کم وقت میں بھی پہنچ سکتا تھا' بہر حال ہر شخص کے کام کرنے کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے۔ حملہ آوروں پر قابو پانے کے بعد شیوا نے ہیوی ڈیوٹی ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس کا رخ پھیر دیا تھا تاکہ اس کی وجہ سے ٹریفک میں تعطل واقع نہ ہو مگر ابھی تک ادھر سے کوئی گاڑی نہیں گزری تھی۔

میرے ذہن میں مسلسل یہ سوال کلبلا رہا تھا کہ یہ حملہ آور کون تھے اور ان کے مقاصد کیا تھے۔ آج صبح اسی طرح کا ایک اور حملہ بھی ہم پر ہو چکا تھا۔ جب ہم جانوس کے ساتھ اس کی رہائش گاہ فریک اسٹریٹ کی طرف جا رہے تھے۔ اس معرکے میں جانوس کا باوردی شوفر سنگھا مارا گیا تھا۔ ہمیں کھٹمنڈو میں قدم رکھے ابھی آدھا دن بھی نہیں گزرا تھا اور دو بار ہم پر قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ ان سنگین واقعات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے انسپکٹر شیوا سے کہا ''حملہ آوروں میں سے دو زندہ سلامت ہاتھ لگے ہیں۔ ان کی گاڑی اور ٹرک بھی تمہارے قبضے میں ہے۔ مجھے امید ہے' تمہاری تفتیش کے نتیجے میں ان بدمعاشوں کا کچا چٹھا کھل جائے گا۔''

''لارڈ بدھا سب ٹھیک کر دے گا۔'' وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا ''میں بہت جلد اس سلسلے میں تمہیں کوئی بہت بڑی خبر سناؤں گا۔''

اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ایک ٹیکسی اس طرف آتی دکھائی دی۔ شیوا نے ٹیکسی کو روک لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے نیپالی میں کوئی بات کی اور ہمیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے شیوا سے مصافحہ کیا اور لی یان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر رتنا پارک کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس وقت ہم خالی ہاتھ تھے۔ اپنے سفری بیگ ہم نے انا پورنا ہوٹل میں چھوڑ دیئے تھے۔ ٹیکسی نے مختلف سڑکوں پر گھومنے کے بعد دریائے وشنومتی کو عبور کیا اور ٹیکو کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں دریائے وشنومتی اور دریائے بھاگ متی آپس میں ملتے ہیں۔ کالرا اسپتال' ہوٹل دیلی ویو اور سینٹرل ٹیلی گراف آفس کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جب ٹیکسی کانتی پاتھ میں داخل ہوئی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ کانتی پاتھ پر سفر کرتے ہوئے ہم سیدھے رتنا پارک پہنچ جاتے۔

ڈاکٹر موتگ کی طرف جھانکے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پیش آمدہ ہنگامی حالات نے مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں دی تھی۔ اگرچہ اس وقت ہم ڈاکٹر موتگ ہی کی طرف جا رہے تھے لیکن ڈاکٹر کے حوالے سے میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ میں اسے انتہائی غیر یقینی حالات میں چھوڑ کر اپنی جگہ یعنی شیوا کی سرکاری جیپ میں حاضر ہوا تھا۔ میری رگِ جان ساحل حاصل شدہ معلومات کے مطابق ڈاکٹر کے ساتھ تھی۔ اگر ڈاکٹر غیر یقینی حالات میں تھا تو ساحل کے لیے بھی خطرات ہو سکتے تھے۔

میں نے لی یان سے کہا ''میں تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کر کے خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ تم مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ جب ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں تو تم مجھے ڈسٹرب کر سکتی ہو۔''

انسپکٹر شیوا نے ٹیکسی ڈرائیو کو رتنا پارک والے بنگلے کا ایڈریس اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ میری بات کے جواب میں لی یان نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا اور اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ تاہم اس کے چہرے اور آنکھوں میں پھیلے ہوئے ان گنت سوالات کو میں نے محسوس کر لیا۔ وہ سوالات کے جوابات کا وقت نہیں تھا لہٰذا میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

دو بند آنکھوں کے پیچھے میں نے تیسری آنکھ کا شٹر اٹھایا اور ڈاکٹر موتگ کے خدوخال کی انگلی پکڑ کر تصور کی نگاہ سے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ اس وقت پولیس والوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ تین پولیس والے اس سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں چونکہ ان کی آواز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا لہٰذا یہ نہیں جان سکا' ان کے درمیان کس موضوع پر بات چیت ہو رہی تھی۔ اندازہ یہی تھا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے تصور کی کرشمہ کاری کے طفیل ڈاکٹر موتگ کو جن حالات سے نبرد آزما دیکھا تھا' پولیس والے اسی سلسلے میں اس سے پوچھ تاچھ کر رہے ہوں گے۔ میں نے آخری مرتبہ جب ڈاکٹر موتگ کے ماحول سے تصوراتی رابطہ کیا تو وہ چار انتہائی مشاق فائٹرز کے مدِمقابل ثابت قدمی سے جما ہوا تھا۔

میرے تصور کی بے چین نگاہ جس صورت کو دیکھنے کی متمنی تھی۔ وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب تک حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق' گزشتہ رات ساحل کو ڈاکٹر موتگ

کے ساتھ سٹی اسپتال سے رتنا پارک والے بنگلے پر منتقل کیا گیا تھا۔ انہیں دو مردوں کے بھیس میں ایک ایمبولینس میں ڈال کر یہاں تک لایا گیا تھا۔ اس وقت میں ڈاکٹر موتگ کے چہرے پر جو اطمینان دیکھ رہا تھا اس سے اندازہ ہوا' ساحل بہ خیرو عافیت ہوگی۔ افسوس کہ میں براہ راست ساحل کے ماحول میں داخل ہونے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ربی موشے ہائمن کے کسی شاطرانہ عمل نے میرے تصور کے پرندے کے پر کاٹ ڈالے تھے۔ بار بار کے ناکام تجربات کے بعد بھی میں نے کوشش جاری رکھی اور ایک مرتبہ پھر ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے لیے تیسری آنکھ کو زحمت دی لیکن نتیجہ وہی' ڈھاک کے تین پات!

میں آنکھیں کھول کر ٹیکسی میں حاضر ہو گیا۔

لی یان نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولی ''شون! میں نے تو تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا نا؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا ''تم تو بہت اچھی بچی ہو!''

''بچی!'' اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔

''مم...... میرا مطلب ہے' تم گڈ گرل ہو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

وہ مطمئن ہوتے ہوئے بولی ''ہاں' اب ٹھیک ہے۔''

ہمارے درمیان امریکی انگلش میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہم امریکا سے آئے تھے تو ہمیں اسی انداز میں بات چیت کرنا چاہیے تھی۔ نیپال کی قومی زبان ''نیپالی'' ہے۔ تاہم تمام سرکاری دفاتر' ہوٹلوں اور ایسے مقامات جہاں سیاحوں سے واسطہ رہتا ہے' انگلش فراٹے سے بولی جاتی ہے' اس حوالے سے ٹیکسی ڈرائیور بھی عام طور پر انگلش سے واقف ہوتے ہیں کیونکہ ہر سیاح کو اس مخلوق سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ مجھے یقین تھا' یہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہماری گفتگو کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوگا۔ تاہم اس میں فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہم بہت ہی محتاط انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ دو ایسے سیاحوں کی طرح جو نیپال کی خوب صورتی سے انجوائے کرنے آئے ہوں۔ سیاحت' نیپال کے لیے آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔

تھوڑی دیر بعد' ہماری ٹیکسی کانتی پاتھ کو چھوڑ کر رتنا پارک کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ رتنا پارک کھٹمنڈو کی ایک معروف تفریح گاہ ہے جس کے آس پاس متمول لوگ عالیشان بنگلوں میں رہائش پذیر ہیں۔ یہ پارک شاہ نیپال کی ملکہ عالیہ ''ملکہ رتنا'' کے نام سے موسوم ہے۔

ہم مطلوبہ گلی میں داخل ہوئے تو سامنے سے ایک پولیس جیپ آتی دکھائی دی۔ میرے ذہن نے بتا دیا کہ یہ وہی پولیس والے ہیں جو تھوڑی دیر پہلے ڈاکٹر موتگ سے ''میٹنگ'' کر رہے تھے۔ پولیس جیپ ہمارے قریب سے گزر گئی۔ آئندہ چند سیکنڈ میں ہم اس بنگلے کی گھنٹی بجا رہے تھے جہاں ڈاکٹر موتگ کو ہونا چاہیے تھا۔

دوسری گھنٹی پر ایک ملازم صورت نیپالی نے گیٹ کھول دیا۔ وہ پوری طرح مسلح تھا لیکن اس کے بدن پر سیکیورٹی گارڈ والی مخصوص یونیفارم موجود نہیں تھی۔ اس نے سوالیہ نظر سے ہمیں دیکھا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم ڈاکٹر موتگ کے مہمان ہیں' امریکا سے آئے ہیں۔ تم ڈاکٹر کو جا کر ہمارے بارے میں بتاؤ۔''

امریکا کے ذکر پر وہ اس طرح چونکا جیسے اسے ہماری آمد کی خبر ہو۔ اس نے پوچھا ''آپ لوگوں کو تو انسپکٹر شیوا کے ساتھ آنا تھا؟''

''شیوا ایک قانونی معاملے میں الجھ گیا ہے۔'' میں نے کہا ''اس لیے مجبوراً ہمیں اکیلے ہی آنا پڑا۔''

نیپالی ملازم ہمیں انتظار کی زحمت دیتے ہوئے بنگلے کے اندر غائب ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں بنگلے کے اندر' ایک کمرے میں ڈاکٹر موتگ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر موتگ نے جس گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا' اس بیان کو الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن نہیں۔ رسمی علیک سلیک کے مراحل طے ہو گئے تو میں نے لی یان سے کہا۔

''تم نے اچھی خاصی محنت کی ہے۔ فریش اپ ہو جاؤ۔ باقی باتیں بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔'' میں دراصل لی یان کی غیر موجودگی میں موتگ سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر ڈاکٹر موتگ کی راہ نمائی پا کر لی یان ایک واش روم میں گھس گئی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی اور وہ یہ کہ ڈاکٹر موتگ بڑی دکھی نظر سے بار بار لی یان کو دیکھ رہا تھا جیسے اسے کسی قسم کا افسوس یا ملال ہو۔ تنہائی پاتے ہی میں نے سب سے پہلے ساحل کے بارے میں پوچھ لیا۔

''ڈاکٹر! ساحل کہاں ہے؟ وہ مجھے نظر کیوں نہیں آ رہی؟'' میرے استفسار میں بے تابی تھی۔

''بالکل محفوظ ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

اس کے انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ ذہن کی سوچ میری زبان تک آ گئی ''کیا وہ اس بنگلے میں موجود نہیں؟''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا ''میں نے احتیاط کے پیشِ نظر اسے ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے۔''

''مگر اسپتال سے تو تم دونوں ایک ساتھ یہاں پہنچے تھے؟'' میں نے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں کہا ''اور انسپکٹر شیوا نے بھی مجھے یہی بتایا تھا' تبتی نقوش والی لڑکی تمہارے ساتھ اس بنگلے پر ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی ''شیوا سمیت میرے سیٹ اپ کے بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ساحل اس بنگلے میں موجود ہے۔ یہ بات میرے علاوہ اب صرف تم جانتے ہو کہ ساحل یہاں نہیں ہے۔''

''پھر وہ کہاں ہے؟'' میرے استفسار میں احتجاج کی آمیزش تھی۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور میرے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے بولا ''میں تمہاری ذہنی کیفیت اور جذبات کو بہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے' تھوڑا اور کرلو۔ آج رات میں ساحل سے تمہاری ملاقات کرادوں گا۔ میں نے اسے بستی میں روپوش کردیا ہے۔ وہ بہت ہی محفوظ اور مضبوط ہاتھوں میں ہے۔''

''تم کس بستی کا ذکر کررہے ہو؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہی بستی جو ہائی وے کے نزدیک ہے۔'' اس نے بتایا ''وہ تمہارا دیکھا بھالا علاقہ ہے۔''

ڈاکٹر مونگ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے اس بستی میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ سے کشتی کے ذریعے اس بستی تک پہنچا تھا۔ مذکورہ بستی ہائی وے پر واقع تھی اور کھٹمنڈو شہر سے لگ بھگ ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھی۔

''ساحل کو اس بستی میں رکھنے کا کوئی خاص مقصد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مقصد صرف حفاظت ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تمہیں اندازہ نہیں ربی کے خوں خوار بھیڑیے کس شدومد سے اس کی تلاش میں ہیں۔ اگر وہ یہاں ہوتی تو تھوڑی دیر پہلے شاید کوئی بہت بڑا اپ سیٹ ہوجاتا۔ میں ابھی ابھی ایک خون ریز معرکے سے نمٹا ہوں۔''

''ہاں' میں نے تمہیں چار تربیت یافتہ فائٹرز سے لڑتے دیکھا تھا۔'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

ڈاکٹر مونگ میری تھرڈ آئی والی صلاحیت سے واقف تھا۔ میرے بے اختیار جملے پر وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ سر کی اس جنبش میں بڑی گیرائی اور گہرائی تھی۔ اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نے ربی کے آدمیوں سے ساحل کو چھین کر انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ کھٹمنڈو کے چپے چپے پر اس کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ ساحل کے بغیر ان کا مشن نامکمل ہے۔ وہ ایک مرتبہ ٹرائی کرچکے ہیں لیکن عبادت گاہ کے تہ خانے تک رسائی حاصل کرنے میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری ٹرائی وہ ساحل کے ساتھ کرنے والے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر ربی نے ساحل کو یہاں پہنچایا تھا۔ وہ بدھا تہ خانے میں پوشیدہ قیمتی پتھروں کے لیے پاگل ہوا جارہا ہے۔ دو دن پہلے تک میں عبادت گاہ ہی میں تھا لیکن اپنے مخصوص ذرائع سے جب مجھے پتا چلا کہ تمہاری ساتھی کو یہاں پہنچایا جارہا ہے تو میں اپنا مورچا چھوڑ کر سرگرم ہوگیا۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر ربی کے بندے ساحل کی راہنمائی میں تہ خانے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے تو وہ کامیاب ہوسکتے ہیں۔ ساحل تہ خانے کا راز جانتی ہے اور وہ اس وقت مکمل طور پر ربی کے ٹرانس میں ہے۔''

وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے کہا ''ہاں' یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے۔ میں جب بھی اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں' مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں' ربی نے میرے راستے میں کون سی رکاوٹ کھڑی کردی ہے!''

''میں تمہاری ساتھی کا علاج بھی کررہا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''تم جانتے ہو' میں نے چینی طب میں ڈاکٹریٹ کررکھا ہے۔ لارڈ بدھا نے چاہا تو وہ بہت جلد صحت یاب ہوجائے گی۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

پھر ڈاکٹر مونگ مجھے اس خون ریز معرکے کی تفصیل بتانے لگا جب اس نے ساحل کو ربی کے آدمیوں سے چھینا تھا۔ اس معرکے کا ایک خونیں منظر میں نے بھی ٹرائی بیکا کے اپارٹمنٹ میں رہتے ہوئے تصور کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ مونگ نے مجھے بتایا کہ اس کے اپنے آدمی بروقت پہنچ گئے تھے جنہوں نے دشمنوں کے دانت کھٹے کرکے ان دونوں کو کھٹمنڈو کے سٹی اسپتال تک پہنچادیا تھا۔ میرے لیے ایک خوشی کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر مونگ ساحل کو ساحل کہہ کر ہی اس کا ذکر کررہا تھا ورنہ اس سے پہلے وہ ''دھنو'' پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے دل سے مجھے اپنا ''بہنوئی'' تسلیم کرلیا تھا۔ جب اس کا بڑا سانگ نو مجھے اپنا ''داماد'' سمجھتے ہوئے ساحل کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے چکا تھا تو پھر ڈاکٹر

مونگ اعتراض کرنے والا کون ہوتا تھا!

محترم سانگ نو اب آنجہانی ہوچکا تھا۔ ہمارے درمیان سانگ نو کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ سانگ نو کا انتقال ڈاکٹر مونگ کی غیر موجودی میں' سیٹل میں ہوا تھا۔ مونگ کے لیے سانگ نو کی خصوصی ہدایت تھی کہ وہ مشن کو چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا اور اس نے اپنے بڑے کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے محاذ پر ڈٹا ہوا تھا بلکہ ساحل کو ربی کے آدمیوں سے چھین کر اس نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ ربی ساحل کے بغیر اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا اس حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے تھا کہ ربی کے آدمی ساحل کی تلاش میں کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ جنونی یہودیوں کا وہ شیطانی ٹولا آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ میں نے اس حقیقت کا ذکر ڈاکٹر سے کیا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مدبرانہ انداز میں بولا۔

''جانتا ہوں۔ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے ساحل کو ایک ایسے مقام پر چھپا دیا ہے جس طرف بھولے سے بھی کسی کا دھیان نہیں جاسکتا۔ وہ لوگ یہی توقع کررہے ہوں گے کہ ساحل کو عبادت گاہ سے دور رکھنے کی کوشش کی جائے گی جب کہ میں نے اسے عبادت گاہ سے قریبی بستی میں پہنچادیا ہے۔ اگر لارڈ بدھا کی مرضی شامل حال رہی تو آج رات ساحل سے تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔ تم نے اس کے انتظار میں بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔''

اس کی بات نے میرے تن بدن میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ ساحل سے ملنے کا تصور بڑا ہوش ربا اور نشاط انگیز تھا۔ ڈاکٹر نے بالکل ٹھیک کہا کہ میں نے اس کے حصول کی خاطر بہت ہی دکھ اٹھائے تھے۔ میں اس وقت بڑے جذباتی انداز میں ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس دوران میں ڈاکٹر مونگ مسلسل میرے چہرے پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا۔ اپنے دل کا راز افشا ہوتے دیکھا تو میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ کوئی بھی شخص اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا اس کے دلی معاملات تک پہنچ جائے۔

''ڈاکٹر! تم جس حالت میں اسپتال پہنچائے گئے اس کے پیش نظر تو تمہیں ہفتہ دس دن تک وہیں رہنا چاہیے تھا مگر تم جتنے ہشاش بشاش نظر آرہے ہو اس سے تو یہی لگتا ہے' تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔''

''ہوا تو بہت کچھ تھا لیکن میں اس بات کا قائل ہوں کہ انسان کے دکھ اور سکھ کا تعلق اس کے محسوس کرنے سے ہے۔ اگر کوئی شدت سے یہ محسوس کرے کہ اسے کچھ بھی نہیں ہوا تو بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ایک تو یہ سوچ' دوسرے میں نے ڈاکٹری علاج کے ساتھ ساتھ چینی طب کو بھی آزمایا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز طریقۂ علاج ہے۔ میں اس وقت بالکل ٹھیک تو نہیں ہوں۔ تاہم کافی بہتر محسوس کررہا ہوں۔''

میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''ڈاکٹر! تم تو مارشل آرٹس کے ماہر اور مضبوط اعصاب کے مالک ہو لیکن ساحل اس مہارت اور مضبوطی میں تمہارا عشر عشیر بھی نہیں۔ وہ بھی زخمی حالت میں اسپتال پہنچائی گئی تھی۔ کیا اس وقت وہاں بستی میں وہ بھی تمہاری طرح ہنس مسکرا رہی ہوگی؟''

''اگر وہ مسکرا نہیں بھی رہی تو بھی تکلیف میں نہیں ہوگی۔'' وہ پورے تیقن سے بولا ''ایک تو اسے پہنچنے والی چوٹیں شدید نوعیت کی نہیں ہیں' دوسرے میں نے اس کا مناسب علاج بھی کیا ہے۔ مجھے امید ہے' آج رات جب تم اس سے ملاقات کروگے تو اسے نارمل پاؤگے۔''

ڈاکٹر مونگ نے ساحل کے سلسلے میں دو تین مرتبہ رات میں ملاقات کا ذکر کیا تو میں سوال کیے بنا نہ رہ سکا۔ اس سوال میں ہزاروں سال سے پیاسے کی بے تابی اور تھکن شامل تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''رات ہی کو کیوں ڈاکٹر۔ میں ابھی اور اسی وقت ساحل سے ملنے کیوں نہیں جاسکتا؟''

''جا تو سکتے ہو لیکن میرے بغیر وہاں تمہیں کوئی لفٹ نہیں کرائے گا۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ''بلکہ تم اگر ایک ایک شخص سے بھی ساحل کے بارے میں پوچھتے پھروگے تو بھی کوئی اس کی وہاں موجودگی کا اقرار نہیں کرے گا۔ تمہاری ساتھی کو نہایت ہی خفیہ انداز میں ایک گھر میں ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ اس وقت بدلے ہوئے گیٹ اپ میں ہے اور اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے وہاں موجود ہے۔ اس گھر کے تمام افراد میرے وفادار ہیں۔ تم مصلحت اور احتیاط پسندی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جانوس نے بھی مجھے بتایا ہے' تم خاصے جذباتی ہورہے ہو۔''

ڈاکٹر مونگ نے جانوس کا حوالہ دیا تو مجھے یاد آگیا' میں نے اس شخص کے ساتھ خاصا تلخ رویہ اختیار کیا تھا۔ میں نے پوچھا ''کیا جانوس نے میری کوئی شکایت کردی؟''

''ہاں۔'' مونگ نے اثبات میں گردن ہلائی ''مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری ایک اپنی اہمیت ہے۔ جانوس کی شکایت کو میں نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا ہے۔''

میں نے کہا ”ڈاکٹر! سچی بات تو یہ ہے‘ تمہارا یہ آدمی جانوس میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”میں نے کہا نا‘ تمہاری اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔“ وہ تاکیدی لہجے میں بولا ”بہر حال‘ اتنا بتادوں کہ جانوس کھٹمنڈو کی ایک با اثر شخصیت ہے۔“

میں نے جانوس کے موضوع کو پس پشت ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مونگ سے پوچھا ”تم کہہ رہے ہو‘ تمہارے بغیر میرا بستی میں جانا بیکار ہے۔ میں کسی بھی صورت اپنی ساحل تک رسائی حاصل نہیں کرسکوں گا پھر تم ابھی میرے ساتھ ادھر کیوں نہیں جاتے۔ کیا ایسا کرنے میں کوئی قباحت ہے؟“

”قباحت تو کوئی نہیں مگر میں شام سے پہلے شہر کو نہیں چھوڑ سکتا۔“ وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”یہاں مجھے نہایت ہی اہم امور نمٹانے ہیں۔ ربی کے وفادار بڑی سرگرمی سے ساحل کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تم لوگوں پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ بھی ہوا ہے۔ وہ لوگ میرے ہر تعلق والے کو ”ٹٹول“ رہے ہیں۔ جہاں بھی میرے کسی جاننے والے کے ساتھ کوئی کپل دکھائی دیتا ہے‘ وہ یہی سمجھتے ہیں یہ کپل میرے اور ساحل کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ ربی کے حکم پر‘ ساحل کو حاصل کرنے کے لیے کھٹمنڈو کو تہ و بالا کرنے کو تیار ہیں۔ میرے بنگلے پر جو مار دھاڑ کی کارروائی ہوئی وہ بھی اسی تلاش کے سلسلے کی کڑی ہے۔ انہیں یہاں ساحل تو نہیں ملی البتہ میں نے انہیں ڈرائی کلین کرکے ”رخصت“ کیا ہے۔ اب وہ کبھی اس طرف منہ دینے کی ہمت نہیں کریں گے۔ میں نے اس واقعے کو پولیس تک پہنچا دیا ہے۔ تمہاری آمد سے تھوڑی دیر پہلے ہی چند پولیس والے یہاں کی رپورٹ تیار کرکے لے گئے ہیں۔“

ڈاکٹر مونگ جن پولیس والوں کا ذکر کررہا تھا‘ میں نے ٹیکسی میں رہتے ہوئے‘ اپنی باطنی آنکھ سے انہیں ڈاکٹر کے بنگلے میں بیٹھے دیکھا تھا لیکن ڈاکٹر نے ابھی مجھے جو معلومات فراہم کیں ان میں مجھے چونکا دینے والی دو باتیں تھیں۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر ان دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھی۔

یہ بات تو میرے علم میں آچکی تھی کہ جانوس نے ڈاکٹر کو صبح والے واقعے کی رپورٹ پیش کردی تھی لیکن ڈاکٹر مونگ نے اپنے بیان میں دو قاتلانہ حملوں کا ذکر کیا تھا۔ میں نے پوچھا ”ڈاکٹر مونگ! کیا ہماری یہاں آمد سے قبل انسپکٹر شیوا سے تمہاری بات ہوگئی تھی؟“

اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ میرے سوال کے مقصد تک پہنچ گیا تھا۔ دھیمے لہجے میں اس نے جواب دیا ”ہاں! تمہاری آمد سے کوئی آدھا گھنٹا پہلے میری شیوا سے طویل بات ہوئی ہے۔ میں نے ہی اس سے رابطہ کیا تھا۔ جب تم لوگوں کے آنے کا متوقع وقت گزر گیا تو مجھے تشویش ہوئی اور میں نے شیوا کو فون کھڑکا دیا۔ اس نے مجھے دوسرے قاتلانہ حملے کے بارے میں بتایا ہے۔ دو لاشوں اور دو زخمیوں کو پولیس تحویل میں اسپتال پہنچایا جاچکا ہے۔ جلد ہی کوئی بڑا انکشاف ہونے والا ہے۔ مجھے امید ہے‘ ان لوگوں کا تعلق ربی کی بھیجی ہوئی ٹیم ہی سے ثابت ہوگا۔“

میں نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا ”ڈاکٹر! اس خون ریز واقعے کے بعد انسپکٹر شیوا نے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر رابطے میں اسے ناکامی ہوئی۔ ایسا کیوں کر ہوا؟“

”میرا موبائل آف تھا۔“ وہ بڑی رسان سے بولا ”اور گھریلو فون کو میں نے دانستہ اٹینڈ نہیں کیا یا یوں سمجھ لو‘ مجھے فون کا ریسیور اٹھانے کی مہلت نہیں مل سکی۔ گھنٹی تھوڑی دیر تک بجتی رہی‘ پھر خاموشی چھا گئی۔ دراصل اس وقت میں حملہ آوروں سے نمٹنے میں بے حد مصروف تھا۔“

اس کا جواز معقول تھا لیکن میں ایک اور زاویے سے بھی اپنے ذہن کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا ”ڈاکٹر مونگ! تم نے بتایا ہے‘ اس بنگلے پر ہلّا بولنے والے چار خطرناک فائٹرز کا تعلق ربی کے گروپ سے ہے اور وہ تمہاری اور ساحل کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔ ٹھیک ہے‘ ساحل تو یہاں تھی ہی نہیں‘ انہیں کیا ملتی مگر وہ یہ جاننے میں تو کامیاب ہوگئے کہ تم اس بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہو۔ یہ بھی کچھ کم تشویش ناک بات نہیں ہے!“

”اپنے ذہن کو مت الجھاؤ وجدان!“ وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا ”یہ تو پولیس والوں سے میٹنگ کرنے اور تمہارے استقبال کے لیے میں نے اپنے چہرے کو صاف کیا ہے ورنہ ان چار حملہ آوروں کی تو میں نے کسی اور ہی روپ میں ”خدمت“ کی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ڈاکٹر مونگ سے پنجہ لڑا کر گئے ہیں۔“

”اوہ!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

شیوا کی جیپ میں سے جب میں نے مونگ سے تصوراتی رابطہ کیا تو وہ چار ماہر مارشل آرٹسٹ سے نبرد آزما تھا۔ اس لمحاتی جھانک میں‘ میں اس کے چہرے کے بارے میں غور نہیں کرسکا تھا۔ اس لیے میں یہ نہ جان سکا کہ وہ اپنے اصلی حلیے میں تھا یا میک اپ میں۔ بہر حال‘ میرا تصور مجھے کسی

غلط جگہ پر نہیں پہنچا سکتا تھا۔ سٹی اسپتال میں‘ میں نے جب بھی ڈاکٹر کے ماحول میں جھانکا‘ وہ مجھے اپنی ہی صورت میں نظر آیا۔ اس حوالے سے میں نے اس سے استفسار کیا تو اس نے بتایا۔

”ہاں‘ اسپتال میں بعض مجبوریوں کے باعث میں تمام وقت میک اپ میں نہیں رہ سکا‘ البتہ جب ہمیں مُردوں کے بھیس میں اسپتال سے نکالا گیا تو اس سلسلے میں سب سے بڑا سہارا میک اپ ہی کا استعمال کیا گیا۔“

میرے ذہن میں ساحل کے حوالے سے ایک کانٹا سا چبھا ہوا تھا۔ دراصل‘ اصلی اور نقلی کا چکر اتنی بار چلا کہ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ حالانکہ کھٹمنڈو میں پائی جانے والی ساحل کے حوالے سے اب تک جو بھی شہادتیں حاصل ہوئیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا‘ یہ میری ہی ساحل ہے‘ کوئی ڈمی نہیں تاہم میں نے ڈاکٹر مونگ سے استفسار ضروری سمجھا۔

”ڈاکٹر! کیا تمہیں یقین ہے‘ جس لڑکی کو تم نے بستی میں پہنچایا ہے‘ وہ میری ساحل ہی ہے؟“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

ہماری آخری ملاقات چند روز قبل سیٹل میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں زونارا آئی لینڈ سے سیٹل پہنچے تھے۔ سانگ فو نے ہنگامی فیصلہ کرکے ڈاکٹر مونگ کو نیپال اور مجھے میری خواہش کے مطابق نیویارک روانہ کردیا تھا۔ نیویارک خصوصاً مین ہیٹن میں‘ میں جن سنسنی خیز حالات سے گزرا ان کا خلاصہ میں نے ڈاکٹر مونگ کے گوش گزار کیا اور ڈمی ساحل کا قصہ بیان کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں‘ کہیں اس شاطر ربی نے ہمیں یعنی تمہیں دھوکا دینے کے لیے یہاں بھی کوئی ساحل کی ڈپلی کیٹ تو نہیں بھیج دی۔ تم نے تسلی کرلی نا‘ یہ ہماری ساحل ہی ہے؟“

وہ پُر اعتماد انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”میں نے تو تسلی کرلی۔ اب تم رات میں اس سے ملاقات کرکے اپنا اطمینان کرلینا۔“

میں نے ایک اہم سوال کیا ”ہم کب تک یہاں سے روانہ ہوں گے؟“

”رات نو بجے۔“ اس نے جواب دیا ”اور اگر لارڈ بدھا کی مرضی شامل حال رہی تو ٹھیک دس بجے ہم ہائی وے والی اس بستی میں ہوں گے۔“

جس طرح ہم مسلمان اپنے روزمرہ کے کاموں میں خدا کی مرضی اور مصلحت کو بہت اہمیت دیتے ہیں‘ بالکل اسی طرح بدھ کے پیروکار لارڈ بدھا کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ بس اپنے اپنے عقیدے اور اعتقاد کی بات ہے۔ انسان کو جس سہارے‘ جس وسیلے سے فائدہ پہنچنے لگتا ہے وہ اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ مذہب کی روح کو سمجھ کر اختیار کرنے والوں کی تعداد ہمیشہ نسبتاً کم رہی ہے‘ چاہے وہ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو۔ دیکھا دیکھی‘ کسی تہذیبی و تمدنی مجبوری اور نظریۂ ضرورت کے تحت خود کو بڑا مذہبی ظاہر کرنے والوں کا تناسب ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے‘ تسلیم کریں یا نہ کریں!

میں نے لگے ہاتھوں ڈاکٹر مونگ سے یہ بھی پوچھ لیا ”دن کا باقی حصہ کھٹمنڈو میں گزار کر تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی اپنی مصروفیت کے بارے میں بتادو۔ ہوسکتا ہے‘ میں تمہارے کسی کام آجاؤں!“

”وجدان! تم ہر حوالے اور زاویے سے میرے لیے مفید ہو اور اپنے کسی منصوبے کے بارے میں‘ تمہیں بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں۔“ وہ دوستانہ لہجے میں بولا ”لیکن میں یہ چاہوں گا کہ تم رات تک مجھ سے الگ رہو۔ زیادہ مناسب یہی ہے‘ اسی بنگلے میں اپنی ساتھی کے ہمراہ آرام کرو۔ تمہارا کام رات کے بعد شروع ہوگا۔“

”میں سمجھ نہیں سکا ڈاکٹر!“ میں نے متذبذب انداز میں ڈاکٹر مونگ کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”مجھے باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ آج آدھی رات کے بعد ربی کی ٹیم ایک اور کوشش کرے گی۔ وہ لوگ بدھ عبادت گاہ کے خفیہ تہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے شب خون ماریں گے۔ آج کی رات بہت اہم ہے۔ عبادت گاہ میں خون کی ندیاں بھی بہہ سکتی ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس عبادت گاہ کی تاریخ سے تم بھی بہ خوبی آگاہ ہو۔ آج تک جس کسی نے بھی بیش بہا خزانے تک پہنچنے کی کوشش کی وہ بے موت مارا گیا۔ ربی پہلی کوشش میں بہت سا جانی اور مالی نقصان اٹھا چکا ہے۔ دوسری کوشش وہ ساحل کی راہنمائی میں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن یہ قیمتی مُہرہ ان کے ہاتھ سے پھسل کر میرے قبضے میں آچکا ہے لہٰذا آنے والی رات وہ ساحل کے بغیر ہی.... دوسری کوشش کریں گے۔ ساحل کی تلاش بھی بڑی شد و مد سے جاری ہے۔“

ڈاکٹر مونگ نے ساحل کو قیمتی مُہرے سے تعبیر کیا تو مجھے بہت دکھ ہوا لیکن میں اپنی تکلیف کا اظہار کیے بغیر پوری طرح

اس کی جانب متوجہ رہا۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''میں اپنے دشمنوں کے حتمی پروگرام کے بارے میں جاننے کی کوشش کررہا ہوں۔ ربی کے چند آدمی بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے آس پاس موجود ہیں۔ ربی کا ایک نائب جمی فونڈا اس مشن کی کمان سنبھالے ہوئے ہے۔ امریکا بہادر کا پوری دنیا میں جو اثر و رسوخ ہے اس سے تم بہ خوبی واقف ہو۔ ان لوگوں کو ہر جگہ آسانیاں میسر آجاتی ہیں۔ کھٹمنڈو کی ایک طاقت ور سیاسی شخصیت جمی فونڈا کا ساتھ دے رہی ہے.... جوگندر پال نامی یہ سیاسی شخصیت ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے یہاں بہت مشہور ہے۔ اس سے تم حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتا' تم میرے ساتھ باہر نکلو اور کسی نئی مصیبت میں الجھ کر واپس نہ آسکو۔ ہمیں ٹھیک نو بجے رات یہاں سے بستی کی طرف روانہ ہونا ہے۔ کچھ دیر وہاں ٹھہرنا ہے اور پھر آگے روانہ ہوجانا ہے' تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟''

بات کے اختتام پر ڈاکٹر مونگ نے گہری سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ آگے بڑھنے کا مطلب تھا' بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کی حفاظت کرنا۔ مجھے یہ بھی بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ بستی میں میری خاطر ہی تھوڑی دیر رکنا چاہتا تھا۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔

''ٹھیک ہے' میں تمہارے ساتھ باہر نہیں نکلوں گا۔ لی یان کے ہمراہ جانے کی اجازت تو ہے نا؟''

''تم لوگوں پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہوچکا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''جتنی بھی احتیاط کرو' اچھا ہے۔ ویسے جو تمہاری مرضی۔''

اس نے فیصلے کی گیند میری کورٹ میں پھینک دی تو میں نے کہا ''ہمارا سامان وغیرہ اناپورنا ہوٹل میں رکھا ہے۔ ہم شام سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے نکلیں گے۔ اپنا سامان لے آئیں گے اور کچھ سیر وغیرہ بھی ہوجائے گی۔ ویسے......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک نظر ڈاکٹر مونگ کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا ''ویسے بھی ابھی تک یہی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ قاتلانہ حملہ ہم پر نہیں بلکہ تم سے متعلق لوگوں پر ہوا ہے اور تم نے اس بات کا اقرار بھی کیا ہے۔ ہم تو امریکا سے' سیاحت کی غرض سے نیپال آنے والے دو میاں بیوی ہیں۔ ہمارا کسی جھگڑے پھڈے سے کیا واسطہ؟''

''میں تمہاری دلیل کو رد نہیں کروں گا۔'' وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولا ''لیکن ان دونوں قاتلانہ حملوں میں تم میرے ساتھیوں کی گاڑیوں میں پائے گئے ہو۔ نہ صرف پائے گئے ہو بلکہ حقیقی معنوں میں تم ہی نے حملہ آوروں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا ہے۔ اس کا مطلب ہے' اب تم دونوں پر بھی میرے ساتھیوں کا لیبل چسپاں ہوچکا ہے۔''

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''میں یہ فیصلہ تم پر چھوڑ چکا ہوں۔ اگر تم نہیں رکنے والے تو ایک چھوٹا موٹا چکر لگا لینا باہر کا... مگر احتیاط کے ساتھ...!''

ڈاکٹر مونگ کے آخری جملے میں ایک تنبیہ پوشیدہ تھی۔ میں نے کہا ''اب ہاتھ پاؤں باندھ کر پورا دن گھر کے اندر بھی تو نہیں گزارا جاسکتا!''

جواب میں ڈاکٹر مونگ نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کا بندوبست ڈاکٹر مونگ کے مسلح ملازم چندر نے کیا تھا تاہم اس دوران میں پولیس کے دو سادہ لباس جوان بنگلے کی حفاظت کے لیے وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں نہایت ہی مستعد اور عقابی نگاہ رکھنے والے پولیس اہلکار تھے۔ یہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے پر چار افراد نے دھاوا بولا تھا۔ پولیس کا فرض بنتا تھا' وہ اس بنگلے میں بسنے والوں کی حفاظت کا انتظام کرے اور اس نے یہ انتظام کردیا تھا۔

کھانے کے دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر مونگ بڑی اداس نظر سے' تھوڑی تھوڑی دیر بعد لی یان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے پریشان کردیا۔ کھانے کے اختتام پر جب لی یان ہاتھ دھونے کے لیے اٹھی تو میں نے ڈاکٹر مونگ سے پوچھ لیا۔

''ڈاکٹر! لی یان کے حوالے سے تم کیا سوچ رہے ہو؟''

''آں!'' وہ چونکا ''کچھ نہیں۔'' اس نے بات گھمادی۔

میں نے کہا ''بتانا نہیں چاہتے تو دوسری بات ہے لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ تم جب بھی لی یان کی طرف دیکھتے ہو تو تمہاری آنکھوں میں ایک عجیب سی اداسی بھر جاتی ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

اس نے ایک گہری سانس چھوڑی اور گمبھیر آواز میں بولا ''وجدان! میں اپنے احساسات کی وضاحت نہیں کرسکتا لیکن اتنا جان لو کہ مجھے اس لڑکی کی طرف سے گہری تشویش ہے!''

''وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''تمہاری تشویش مجھے بھی پریشانی میں مبتلا کررہی ہے۔''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اس کی پُراسرار خاموشی سے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میں نے پوچھا ''کیا لی یان کسی بھی حوالے سے میرے لیے مضر ثابت ہوسکتی ہے؟''

''یہ بات نہیں وجدان۔'' وہ جلدی سے بولا ''لی یان بہت اچھی اور متعاون لڑکی ہے۔ میری تشویش اور فکرمندی کا سبب یہ ہے کہ میں محسوس کررہا ہوں' عنقریب لی یان کو کوئی بہت بڑا صدمہ پہنچنے والا ہے۔''

میں نے چونکتے ہوئے انداز میں سوال کیا ''کس نوعیت کا صدمہ؟''

''میں فی الحال اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔'' ڈاکٹر مونگ نے متذبذب انداز میں کہا۔

اسی وقت لی یان واپس آگئی اور ہم اس موضوع پر مزید گفتگو نہ کرسکے۔

ڈاکٹر مونگ نے باآوازِ بلند کہا ''کھانے سے تو فارغ ہوگئے۔ میرا مشورہ ہے' تم دونوں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرلو۔ تم لوگوں نے صبح سے بڑی ''مشقت'' اٹھائی ہے۔ شام میں فریش اپ ہوکر سیر سپاٹے کو نکل جانا۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا ''آؤ' میں تم لوگوں کو کمرا دکھادوں۔''

اسی وقت ڈاکٹر کا نیپالی ملازم چندر وہاں پہنچا اور اطلاع دی کہ جانوس ملنے کے لیے آیا ہے۔ ڈاکٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چندر کو کوئی اشارہ کیا تو وہ الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ ڈاکٹر ہمیں کمرا دکھانے کے لیے ہمارے ساتھ ہولیا۔

چند سیکنڈ بعد ہم ایک شاندار بیڈ روم میں تھے۔ ڈاکٹر ہمیں بیڈ روم میں چھوڑ کر چلا گیا تو لی یان کی صورت پر نگاہ پڑتے ہی ڈاکٹر کی نامعلوم تشویش میرے ذہن میں چکرانے لگی۔ ڈاکٹر مونگ ایسا شخص نہیں تھا کہ اس کی کسی بھی بات کو آسانی سے نظر انداز کیا جاسکتا۔ وہ سانگ فو جیسی عظیم المرتبت شخصیت کا خلیفہ (نائب) تھا۔ میں سانگ فو کی روحانی صلاحیتوں کا معترف تھا' ڈاکٹر مونگ ریفوشے کے کئی کمال بھی میرے تجربے میں آچکے تھے۔ لی یان کے حوالے سے اس نے اپنے جن مبہم احساسات کا اظہار کیا تھا' اس سے میں بھی اچھا خاصا فکرمند ہوگیا۔

یہ فکرمندی چہرے سے چھلکی تو لی یان پوچھے بنا نہ رہ سکی ''کیا ہوا وجدان...... میرا مطلب ہے شون!'' وہ گڑبڑا گئی پھر سنبھل کر بولی ''تم خاصے الجھے ہوئے دکھائی دے رہے ہو؟''

میں اپنی پریشانی کے بارے میں اسے کیا بتاتا' اس کا دھیان بٹانے کے لیے کہہ دیا ''جب تم مسلسل غلطی پر غلطی کیے جاؤ گی تو میں الجھوں گا نہیں تو پھر کیا کروں گا؟''

''میں نے کیا کیا ہے!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

''میں وجدان نہیں' شون ہوں... تمہارا شوہر شون!'' میں نے اس کی غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے بات نبھادی ''اور یہ نکتہ تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا؟''

بے ساختہ اس کی ہنسی نکل گئی پھر وہ ہنستی چلی گئی۔

اس کی اس حرکت نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اس پر ٹھٹھا مار کر ہنسا جاتا۔ میں یک دم سنجیدہ ہوگیا اور قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''لی یان! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ بے طرح ہنسے چلی جارہی ہو۔ کیا میں نے تمہیں کوئی لطیفہ سنادیا ہے؟''

''یہ لطیفہ نہیں تو اور کیا ہے؟'' وہ ہنسی کو روکتے ہوئے بولی۔

میں مزید الجھ گیا ''کیا مطلب؟''

''تم نے کہا... تم میرے شوہر شون ہو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی ''ٹھیک ہے' ہم میاں بیوی کا رول کررہے ہیں۔ تم میرے شوہر ہو اور نہ ہی میں تمہاری بیوی۔ میرا خیال ہے' کم از کم تنہائی میں تو اس ڈھونگ کی ضرورت نہیں۔ اگر ہم اتنا ڈوب کر میاں بیوی کا رول کرنے لگے تو تنہائی کے لمحات میں کوئی سنجیدہ مسئلہ بھی کھڑا ہوسکتا ہے۔''

وہ ایک فطری بات کررہی تھی۔ اس قسم کا کوئی مسئلہ کھڑا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ بہرحال' میں نے اس موضوع کو بحث نہیں بننے دیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''بس اتنی سی بات پر تم قہقہے لگارہی تھیں؟''

جواب میں وہ ایک مرتبہ پھر ہنس دی ''دراصل بات یہ ہے کہ شون ایک بورنگ انسان ہے۔ مجھے اس بات پر ہنسی آگئی تھی کہ تم شون کیسے ہوسکتے ہو۔ تمہاری زندگی تو ایڈونچر اور سنسنی خیزی سے بھری پڑی ہے۔ ایک دو نظارے تو دیکھ چکی ہوں۔ آیندہ یہ آنکھیں پتا نہیں' کیا کیا دکھائیں گی!''

بات ختم کرتے ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکرادی۔

میں بے حد محتاط نظر سے اس فلپائنی حسینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ اس وقت مجھے خطرے کی ایک گھنٹی دکھائی دے رہی تھی۔ جب کوئی عورت' کسی مرد کے سامنے اپنے شوہر کے عیب گنواتے ہوئے اس کی تعریف کرے تو ''اس'' کو الرٹ ہوجانا چاہیے۔ لی یان مجھے ایڈونچرس اور شون کو بورنگ کہہ رہی تھی۔ اگرچہ یہ حقیقت بھی ہوتی تو بھی اسے اس اظہار میں احتیاط

کرنا چاہیے تھی لیکن امریکی کلچر کے پروردہ مرد و زن بڑے بے دھڑک اور من موجی ہوتے ہیں اور اکثر معاملات میں عورتیں، مردوں کی نسبت زیادہ بولڈنیس کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ لی یان اگرچہ فلپائنی تھی تاہم ایک طویل عرصے سے وہ امریکا بہادر کی فضاؤں میں سانس لے رہی تھی۔ اس کا بہادر بن جانا منطقی بات تھی۔

میں نے موقع کی مناسبت سے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا ''شون تمہاری نظر میں بورنگ ہوگا مگر میرا خیال تم سے بہت مختلف ہے۔''

''اس سلسلے میں تمہیں مجھ سے کیا اختلاف ہے؟'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا ''میری نظر میں شون کے لیے ''بے چارہ'' کا ٹائٹل زیادہ موزوں رہے گا!''

''وہ کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''تم اپنے طرز عمل کو دیانت داری سے ناپو تو تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل جائے گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ''کیا تم مسلسل چار سال سے اس کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی چلی آ رہی ہو؟''

''تم مردانہ بلاک بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

''میں زمینی حقیقت اور فطری اصول بیان کر رہا ہوں۔''

''میں نے بھی تمہیں اپنی مجبوری بتادی تھی۔''

''ٹھیک ہے، اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔'' میں نے کہا۔

لی یان میرے حساب سے کسی نفسیاتی عارضے میں مبتلا تھی۔ شون سے اس کی شادی کو چار سال ہوگئے تھے مگر ابھی تک وہ دو سے تین نہیں ہوئے تھے۔ لی یان بچہ پیدا کرنے سے گریزاں تھی اور اس دوران میں اس کے تین ابارشن ہو چکے تھے۔ وہ اڈاپشن کے حق میں تھی لیکن ڈلیوری کے مراحل سے گزرتے ہوئے اس کی جان جاتی تھی۔ خیر ڈلیوری بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ آج کل آپریشن کا زمانہ ہے۔ لی یان کی پریشانی کئی ماہ پر مشتمل وہ عرصہ تھا جس کے بعد ڈلیوری کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس عرصے کے نشیب و فراز تو بہرحال اسی کو جھیلنا تھے اور وہ اسی سے خوف زدہ تھی۔ میں اس کے مسئلے کو بڑی حد تک سمجھ گیا تھا اور اس کے ''سائیکو انالسس'' کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ اس کے بالعکس شون کو اپنے بچے کی شدید خواہش تھی!

''بعد میں بھی یہی بات ہوگی وجدان...... شون!'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ''تم آرام کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

''کہاں جارہے ہو؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ذرا دیکھوں، جانوس کیا خبر لایا ہے!'' میں نے کہا ''جلدی واپس آجاؤں گا۔''

پھر اس کا جواب سنے بغیر میں وہاں سے چلا آیا۔ جانوس اور ڈاکٹر مونگ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے لی یان کے حوالے سے میرا ذہن متضاد خیالات میں گھرا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے لی یان کے مترنم اور زندگی سے معمور قہقہے سنے تھے اور ڈاکٹر مونگ کا احساس بتاتا تھا، اسے کوئی بہت بڑا صدمہ ملنے والا ہے۔ میں اپنے مشاہدے اور ڈاکٹر مونگ کے تجربے کو جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا شاید اسی لیے میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ پتا نہیں، وہ کون سے دکھ سے ہمکنار ہونے والی تھی؟

میں ڈاکٹر مونگ اور جانوس کے ساتھ جا بیٹھا۔ انہوں نے میری آمد کو ''محسوس'' نہیں کیا اور اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ جانوس اس وقت مونگ کو صبح والے واقعے کی تفصیلی رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ اس کے مطابق، سرخ جیپ جس میں تین مسلح افراد نے آج صبح ہمارا تعاقب کیا، وہ چوری کی ثابت ہوئی تھی۔ ہم نے مسلح حملہ آوروں کی وہ درگت بنائی تھی کہ ان میں سے دو موقع پاتے ہی وہاں سے فرار ہوگئے۔ تیسرا تو اضع کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا تھا۔ اس بے ہوش شخص کو جانوس نے پولیس کے حوالے کرکے تحقیق کرائی تو کوئی اہم بات معلوم نہ ہوسکی۔ وہ ایک تھرڈ ریٹ غنڈا تھا جو معاوضہ لے کر قتل و غارت گری جیسے کام بشوق کرتا تھا۔ کسی نامعلوم شخص نے بھاری معاوضے کے عوض اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس شخص نے سارا الزام ان دو بھگوڑوں پر ڈال دیا جو موقع سے راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ بہرحال، وہ شخص ابھی پولیس کی تحویل میں تھا اور اس پر مزید تفتیش جاری تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے پوری بات سننے کے بعد گمبھیر لہجے میں کہا ''مجھے تو ان دونوں واقعات میں ایک خاص ربط نظر آ رہا ہے کہ حملہ آوروں کا تعلق بلاواسطہ یا بالواسطہ ہمارے دشمنوں سے ہے۔''

مونگ کا یہ جملہ احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ میں سمجھ گیا، اس کا اشارہ موشے ہائمن اینڈ کمپنی کی جانب تھا۔ نہ جانے، جانوس نے اس سے کیا مطلب اخذ کیا تھا۔ میں یہ

نہیں جانتا تھا' ڈاکٹر نے اس معاملے میں جانوس کو کس حد تک انوالو کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر کو میں نے بڑے واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اس کا میزبان مجھے ایک ذرا پسند نہیں آیا۔ اسی لیے وہ گفتگو کے دوران میں کوئی ایسی بات نہیں کر رہا تھا۔ جس پر ہم دونوں کا بیک وقت اظہارِ رائے ضروری سمجھا جاتا۔ ڈاکٹر مونگ مجھے جانوس کے بااثر ہونے کے بارے میں تو بتا ہی چکا تھا۔ اس موقع پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ جانوس نے کھٹمنڈو میں خفیہ پراپرٹی بھی بنا رکھی ہے۔ بہت سے کاروبار جن کا مالک لوگ کسی اور شخص کو سمجھتے ہیں وہ درحقیقت جانوس کی ملکیت تھے۔ ان میں ایک مثال ''ہوٹل ییلو پیگوڈا'' کی تھی۔ کانتی پاتھ پر واقع شان دار ہوٹل ''ییلو پیگوڈا'' کا اصل مالک جانوس ہی تھا۔

یہ سنجیدہ گفتگو جاری ہی تھی کہ انسپکٹر شیوا کا فون آ گیا۔ فون ڈاکٹر مونگ ریفوشے نے ریسیور کیا۔ شیوا پولیس ہیڈ کوارٹرز سے بات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر بڑی توجہ سے اس کی رپورٹ سننے لگا۔ اس دوران میں اس کے چہرے پر ملی جلی کیفیت نمودار ہوتی رہی۔ کبھی وہ انتہائی سنجیدہ ہو جاتا اور کبھی اس کے تاثرات سے تفکر جھلکنے لگتا۔ ریسیور رکھنے کے بعد اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور ٹھوس لہجے میں بولا۔

''دو مردہ افراد کی شناخت نہیں ہو سکی۔ شدید زخمی اور بے ہوش افراد نے ابھی تک زبان نہیں کھولی۔ ان پر ہونے والے تشدد سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہیں اور تھانا جیل وغیرہ ان کے لیے نئی بات نہیں۔ سرخ جیپ کی طرح وہ گاڑی اور ہیوی ڈیوٹی ٹرک بھی چوری شدہ ثابت ہوئے ہیں۔'' وہ چند لمحات کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''دونوں قاتلانہ وارداتوں میں بہت سے اشارے مشترک ملتے ہیں۔ میں تو اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ واقعات ایک ہی پیڑ کی دو شاخیں ہیں' بہرحال شیوا کی اسکیم مجھے پسند آئی ہے۔''

وہ ایک لمحے کے لیے دوبارہ متوقف ہوا پھر بتانے لگا ''شیوا آج کی رات ان دونوں افراد پر مختلف انداز میں ''دباؤ'' ڈال کر ان کی زبان کھلوانے کی کوشش کرے گا۔ اگر صبح تک اسے کامیابی نہ ہوئی تو پھر انہیں رہا کر دیا جائے گا۔''

''انہیں رہا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا ڈاکٹر مونگ!'' جانوس نے معترض لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر بولا ''یہ رہائی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوگی۔ تھانے سے انہیں رخصت کرنے سے پہلے ہی ان کی نگرانی کا مکمل بندوبست کر لیا جائے گا۔ یہ دو ہوشیار قسم کے سادہ لباس پولیس والے سائے کے مانند ان کے وجود کا حصہ بن جائیں گے۔ وہ ٹریسر اور ٹریکر کا کام کریں گے۔ اس طرح پولیس ہیڈ کوارٹرز کو ان دو افراد سے متعلق لمحہ بہ لمحہ رپورٹ ملتی رہے گی اور یہ پتا چل جائے گا کہ ان لوگوں کا ٹھکانا کہاں ہے۔ وہ کس کے لیے کام کرتے ہیں اور اس سے رابطے کے لیے کیا ذریعہ اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح فساد کی جڑ تک رسائی حاصل ہو جائے گی۔''

''ایکسیلنٹ!'' ڈاکٹر مونگ خاموش ہوا تو میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''شیوا ایک ذہین پولیس انسپکٹر ہے۔''

جانوس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''اس نوعیت کا کوئی حربہ اس شخص کے ساتھ آزمانے کی ضرورت نہیں جسے میں نے پولیس کے حوالے کیا ہے۔ اس پر تو سیدھا سیدھا قتل کا مقدمہ چلے گا۔ اس واردات میں میرا ایک قیمتی آدمی جان ہار گیا ہے۔ میں اپنے شوفر سنگھا کی موت کو آسانی سے فراموش نہیں کر سکتا۔''

ہمارے درمیان مزید تھوڑی دیر تک اسی نوعیت کی گفتگو جاری رہی' پھر جانوس ڈاکٹر مونگ سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

''وجدان! میں اب باہر نکلنے کی تیاری کروں گا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام میک اپ اور گیٹ اپ ہے۔ اس وقت دوپہر کے دو بجے ہیں۔ تم دونوں تو پانچ کے بعد ہی نکلو گے۔ میرا مشورہ ہے' تم بھی لی یان کی طرح تھوڑا آرام کر لو۔'' وہ ایک لمحے کے وقفے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا ''تم لوگوں کو گاڑی کی ضرورت ہے یا ٹیکسی میں سفر کرنا پسند کرو گے؟''

''میرا خیال ہے' ٹیکسی زیادہ مناسب رہے گی۔'' میں نے جواب میں کہا ''ہم دونوں ٹورسٹ ہیں۔ کسی بھی اجنبی اور غیر ملک میں ٹورسٹ' ٹیکسی اور ہوٹل میں ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ ہوٹل کو ہم چھوڑ رہے ہیں' کم از کم ٹیکسی سے تو ہمارا تعلق بحال رہنا چاہیے نا۔ آخر کو ہم ٹورسٹ ہیں!''

آخری جملہ میں نے معنی خیز انداز میں ادا کیا تو ڈاکٹر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ابھی ہوٹل اناپورنا سے چیک آؤٹ نہیں کرو۔ وہاں جاؤ ضرور اور انتہائی ضروری سامان بھی اٹھا لاؤ۔ ویسے بھی اس ہوٹل میں

تمہاری تین دن کی بکنگ ہے۔ تم وہاں قیام کرو یا نہ کرو مگر بکنگ کو چلنے دو۔ اس طرح ٹورسٹ' ہوٹل اور ٹیکسی کا مثلث قائم و دائم رہے گا...... اور یہ فائدہ بھی ہر وقت تمہارے ہاتھ میں رہے گا کہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں' ان تین دنوں کے دوران میں تم وہاں خاموشی سے ''پناہ'' حاصل کر سکتے ہو۔''

''آئیڈیا عمدہ ہے ڈاکٹر۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''سمجھو' میں نے تمہارا مشورہ مان لیا۔''

''سیر و تفریح کے لیے تمہیں رقم کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔'' ڈاکٹر مونگ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

میں نے کہا ''ویسے تو ہم دونوں کے پاس اپنے اپنے کریڈٹ کارڈز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ڈالرز کی صورت میں کرنسی نوٹ بھی ہیں۔''

''کھٹمنڈو میں صرف ایم۔ ایکس (امریکن ایکسپریس) اور ویزا کارڈ قبول کیے جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر مونگ نے بتایا ''ڈالر کے مقابلے میں یہاں کا کرنسی ایکسچینج' اٹھاون روپے فی امریکی ڈالر ہے۔ اس حساب کتاب کو بھی ذہن میں رکھنا۔''

''میں کوئی پہلی مرتبہ نیپال نہیں آیا ہوں مونگ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''یہاں کے رسم و رواج اور ادب آداب سے مجھے گہری واقفیت حاصل ہے۔ تم فکر نہ کرو' میں کسی بھی محاذ پر مار نہیں کھاؤں گا۔''

''ویٹس گڈ۔'' اس نے ایک مختصر سا جملہ ادا کرنے پر اکتفا کیا۔

نیپال میں انڈیا اور پاکستان کی طرح روپیا چلتا ہے۔ تاہم ویلیو وغیرہ میں فرق ہے۔ امریکی ڈالر اور نیپالی روپے کا حساب تو ڈاکٹر مونگ نے بتا دیا۔ انڈین روپے کے مقابلے میں نیپالی روپے کی قدر و قیمت فکس ہے۔ ایک سو انڈین روپے' ایک سو ساٹھ نیپالی روپے کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ نیپال کے کرنسی نوٹ ایک ہزار' پانچ سو' ایک سو' پچاس' دس' پانچ' دو اور ایک روپے کی صورت میں ہیں جبکہ دو' پانچ' دس' پچیس اور پچاس پیسے کے سکے رائج ہیں۔

میں نے ڈاکٹر کی اس گفتگو میں ایک خاص بات نوٹ کی تھی۔ اسی حوالے سے میں نے پوچھ لیا ''ڈاکٹر! میں محسوس کر رہا ہوں' جب ہم شام میں یہاں سے نکلیں گے تو اس وقت تک تمہاری واپسی نہیں ہوگی۔ تم سے ملاقات کیے بغیر ہی ہمیں جانا ہوگا۔''

''ہاں' ایسا ہو سکتا ہے!'' اس نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔

میں نے اس سلسلے میں زیادہ کرید نہیں کی اور اپنے مطلب کی بات پوچھ لی۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک کانٹا سا پیوست تھا اور جانوس کی موجودگی میں ہونے والی بات چیت کے بعد تو یہ کانٹا کچھ زیادہ ہی چبھنے لگا تھا۔ میں اس چبھن کو پہلی فرصت میں دور کرنا چاہتا تھا۔

''مونگ! ساحل کی روپوشی کا راز تمہارے علاوہ اور کس کو معلوم ہے؟''

وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اٹل لہجے میں بولا ''مجھے' اس شخص کو جس کے گھر میں ساحل کو چھپایا گیا ہے اور تمہیں۔ اس کے سوا کسی شخص کو بھنک بھی نہیں ہے۔''

میں نے ایک گہری اور اطمینان بھری سانس خارج کی۔

ساحل کے حوالے سے ہمارے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی لی یان کو خبر نہیں تھی۔ اس وقت وہ باتھ لے رہی تھی...... اور موجودہ بات چیت بھی اس کی غیر موجودگی ہی میں ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر مونگ نے ایک مرتبہ پھر رخصت طلب نظر سے مجھے دیکھا تو میں اٹھ کر لی یان کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

لگ بھگ پانچ بجے شام ہم تیار ہو کر بنگلے سے نکل آئے۔ چندر نے بڑے احترام سے ہمیں رخصت کیا۔ دیگر سادہ لباس پولیس گارڈز بھی مستعدی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔ میری توقع کے عین مطابق' ڈاکٹر مونگ ابھی تک اپنے مشن سے واپس نہیں لوٹا تھا۔

رتنا پارک' کانتی پاتھ اور دربار پاتھ کے وسط میں واقع ہے۔ ہم اپنی اسٹریٹ سے نکلے اور پارک کی چوحدی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دربار پاتھ کی طرف آ گئے۔ موسم خوشگوار ہو رہا تھا اس خوشگواریت میں اچھی خاصی ٹھنڈک رچی بسی تھی۔ وہ جنوری کی آخری تاریخیں تھیں۔ نومبر سے فروری کے دوران میں نیپال شدید سردی کی لپیٹ میں رہتا ہے' خصوصاً دسمبر اور جنوری یہاں موسم سرما کی پیک تصور کی جاتی ہے۔ ان دنوں درجہ حرارت منفی چھ سے منفی پندرہ ڈگری سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹھنڈی ٹھار ہوائیں بھی قلفی جمانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ہم نے مناسب گرم لباس پہن رکھا تھا۔

دربار پاتھ پر واقع بس اسٹاپ سے ہمیں ٹیکسی مل گئی۔ دن کے اوقات میں کھٹمنڈو کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے کے ٹیکسی والے چالیس سے ساٹھ روپے وصول کر لیتے ہیں جبکہ شام اور رات میں یہی رقم بہتر سے سو روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے ٹیکسی والے کو کلاک ٹاور چلنے کو کہا اور اندر بیٹھ گئے۔

کلاک ٹاور کے نزدیک ہی دربار مارگ پر ہوٹل اناپورنا واقع تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا' ایک بیگ میں تمام انتہائی

ضروری اشیاء بھر کر لے آؤں گا' دوسرے بیگ کو عام اور غیر ضروری چیزوں کے ساتھ ہوٹل ہی میں چھوڑ دوں گا تا کہ اگر واپس کبھی اس ہوٹل میں آنے کے امکانات پیدا نہ ہوسکیں تو کسی شے کے زیاں کا احساس نہ ہو۔

ٹیکسی میں سفر کے دوران میں لی یان نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور تازہ ترین حالات پر کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بالعکس نیپال کے موسم اور وہاں موجود قدرتی حسن پر ہم گفتگو کرتے رہے۔ ہماری گفتگو سے پہلا اور آخری تاثر یہی ابھرتا تھا کہ ہم ٹورسٹ ہیں۔ ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان کا تقاضا بھی یہی تھا۔

ہوٹل والی ''کارروائی'' مکمل کرنے کے بعد ہم انا پورنا ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ لی یان کافی کی طلب محسوس کر رہی تھی۔ موسم کی شدت سے نمٹنے کے لیے اس کی طلب برمحل تھی۔ ویٹر مینیو چھوڑ کر چلا گیا تو لی یان نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کیا لوگے شون؟''

''تم کافی لے رہی ہو تو میں بھی یہی لے لوں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

وہ جھٹ سے بولی ''مگر تمہیں تو چائے کافی کے استعمال سے نیند آنے لگتی ہے؟''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا ''لیکن موسم کی ٹھنڈک کو شکست دینے کے لیے ایک کپ کافی پینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔''

''یہ کچھ ایب نارمل سا نہیں ہے شون؟'' وہ احتیاطاً وجدان کے بجائے مجھے شون کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

میں نے چونک کر پوچھا ''کیا ایب نارمل ہے' سردی کو بھگانے کے لیے کافی پینا؟''

وہ گڑبڑا گئی ''مم...... میرا مطلب ہے' عام طور پر تو یہی سننے میں آیا ہے کہ چائے کافی کے استعمال سے نیند اڑ جاتی ہے لیکن تمہارے ساتھ معاملہ بالکل الٹ ہے۔''

''معاملہ ہم دونوں کے ساتھ ہی الٹا ہے!'' میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میرے ساتھ کیوں...... اور کیسے؟'' وہ متذبذب لہجے میں بولی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''میرا مطلب ہے' عام طور پر تو یہی سننے میں آیا ہے کہ شادی کے بعد عورت ماں بننے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن تمہارے ساتھ معاملہ......''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی قطع کلامی کرتے ہوئے بولی ''ہم دونوں ہی سیدھے ہیں۔ مطلب یہ کہ...... ہمارے ساتھ کچھ بھی الٹا نہیں...... او کے!''

میں لی یان کی اس فرار نما وضاحت پر زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ میری معنی خیز مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

''یہاں سے اٹھنے کے بعد میں شون کو فون کروں گی۔ اس نے رخصت کے وقت مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ کھٹمنڈو پہنچتے ہی میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کروں لیکن یہاں قدم رکھتے ہی جس نوعیت کے واقعات سے واسطہ پڑا اس میں یہ بات میرے دھیان میں نہیں رہی۔''

میں نے اس کی خواہش پر صاد کرتے ہوئے کہا ''تم ٹھیک کہتی ہو' میں بھی وسیم کی خیر خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ تم شون سے بات کر چکو تو ریسیور مجھے دے دینا۔''

وہ عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو...... بات کر چکوں' کیا مطلب! میں اس وقت شون ہی سے تو بات کر رہی ہوں؟

انسان اس کائنات کا سب سے حیرت انگیز عجوبہ ہے۔ یہ موقع محل کی مناسبت سے اس طور رنگ بدلتا ہے کہ گرگٹ کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ انسان نظریہ ضرورت کا استعمال کرکے اپنی غلط بات کو تسلیم کروانے کے لیے دوسرے کی ناجائز بات کو بڑی ڈھٹائی سے قبول کرلیتا ہے۔ لی یان...... ذاتی بچے کے حوالے سے' سوچ میں واقع اپنی ایب نارملیٹی کو درست ثابت کرنے کے لیے میرے ذہن کے ایک مختلف ردعمل کو صحیح ماننے کے لیے فوراً تیار ہوگئی تھی۔

کافی پینے کے بعد نیو جرسی فون کرنے کی کوشش کی گئی۔ کوشش ان معنوں میں کہ ٹیلی فون تک رابطہ ہو نہیں سکا۔ دو تین مرتبہ کی ٹرائی کے بعد یہ پتا چلا کہ دوسری جانب کوئی فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ بہر حال' ہم انا پورنا ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ ہم صبح بھی انا پورنا (ANNAPURNA) سے نکل کر سٹی اسپتال کی طرف گئے تھے لیکن اس وقت سب نارمل تھا جبکہ اب کی بار میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اب اس ہوٹل کی طرف میرا آنا نہیں ہوگا۔ کم از کم ان تین دنوں میں تو نہیں جب تک کی بکنگ تھی۔ میں اپنے اس احساس کی کوئی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر تھا۔

ٹیکسی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے لی یان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''وجدان! شون نے فون کیوں نہیں اٹینڈ کیا؟''

وہ پریشانی میں مجھے وجدان کہنے پر مجبور ہوگئی تھی۔ وہ شون کہہ کر' مجھ سے شون کا ذکر نہیں کرسکتی تھی۔ جب سے ہم ایک ساتھ تھے' میں نے بعض مراحل میں اسے خاصی الجھن اور تذبذب میں پایا۔ میں اس کا شوہر نہیں تھا مگر اس کے شوہر کے روپ میں تھا۔ شون کے میک اپ میں' میں ہو بہو شون ہی نظر آتا تھا۔ میں لی یان کی متاملانہ بےبسی کو سمجھ رہا تھا۔ بعض نازک جذباتی موڑ پر وہ چکرا کر رہ جاتی تھی۔ اس کی تشویش دور کرنے کے لیے میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے' شون اس وقت گھر میں موجود نہ ہو!''

''گھر میں موجود نہ ہو۔ کیا مطلب؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی ''ہم یہاں جس تاریخ کی شام کو گزار رہے ہیں وہاں نیو جرسی میں ابھی اس تاریخ کا سورج طلوع نہیں ہوا۔''

نیو جرسی اور کھٹمنڈو کے مقامی وقت میں گیارہ گھنٹے سے زیادہ کا تفاوت ہے۔ میں نے لی یان سے کہا ''پھر تو تم نے بہت بڑی غلطی کی۔ شون وہاں نیو جرسی میں اس وقت گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہوگا۔ تمہیں موقع محل اور وقت دیکھ کر اسے فون کرنا چاہیے تھا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو وجدان!'' غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ معتدل ہوگئی۔

میں نے کہا ''ہم ڈاکٹر مونگ کے بنگلے پر پہنچ کر نیو جرسی فون کریں گے۔ تم فکر نہ کرو' یہاں سے رخصت ہونے سے قبل شون' وسیم اور مسٹر ونگ ہنگ کی خیریت معلوم ہوجائے گی۔''

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر چونک کر بولی ''کیا ہم یہاں سے کہیں اور جارہے ہیں؟''

ہائی وے والی بستی کی جانب جانے کا پروگرام لی یان کی غیر موجودگی میں ترتیب پایا تھا چنانچہ وہ میرے اور ڈاکٹر مونگ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ نہیں تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں' آج رات نو بجے ہم ڈاکٹر مونگ کے ساتھ اس شہر سے نکل جائیں گے۔''

''اوہ!'' وہ جوشیلے انداز میں بولی ''اس کا مطلب ہے' تمہاری ساتھی کا سراغ مل گیا۔''

''ہاں' ایک سرا ہاتھ تو آیا ہے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔

لی یان نیو جرسی سے میری بیوی بن کر یہاں کھٹمنڈو تک پہنچی تھی۔ وہ ونگ ہنگ کے لیے کئی کارنامے انجام دے چکی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا' وہ قابل بھروسا ہے۔ ونگ ہنگ نے اسے یہاں کے مشن کے بارے میں تفصیلاً بتایا تھا۔ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ اور ساحل والا معاملہ اس سے پوشیدہ نہیں رکھا گیا تھا لہٰذا میرا احتیاط اور مبہم انداز دیکھتے ہوئے وہ شاکی لہجے میں بولی۔

''وجدان! میں محسوس کر رہی ہوں' تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ خاص طور پر اپنی ساتھی کے حوالے سے؟''

''ایسی بات نہیں لی یان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''فی الحال ڈاکٹر مونگ نے مجھے بھی زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ بس اتنا پتا چلا ہے کہ میری ساتھی ساحل کو کھٹمنڈو سے ایک گھنٹے کی مسافت پر' ہائی وے پر واقع ایک بستی میں رکھا گیا ہے۔ ہم یہاں سے اس بستی تک جائیں گے پھر کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد آگے بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کی طرف بڑھ جائیں گے۔ آج آدھی رات کے بعد عبادت گاہ میں ایک خون ریز معرکہ ہونے والا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق' ربی موشے ہائمن کی ٹیم عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ بیش بہا خزانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور ہمیں......'' میں نے تھوڑا توقف کر کے سانس ہموار کی پھر بات پوری کرتے ہوئے لی یان کو بتایا۔

''ہمیں...... اپنے دشمنوں کی اس کوشش کو ناکام بنانا ہوگا۔ ڈاکٹر مونگ' ربی کے محکوموں کے عزائم جاننے ہی گیا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ لوگ کس انداز میں کارروائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

میری وضاحت نے لی یان کو قدرے مطمئن کر دیا مگر میرے اندر ایک نامعلوم سی بےچینی نے گھر کرلیا۔ یہ بےچینی لی یان سے متعلق تھی۔ میں نہیں جانتا' کیا ہونے والا تھا لیکن ڈاکٹر مونگ نے' لی یان کو کوئی بڑا صدمہ ملنے والی جو بات کی تھی اس نے میرے ذہن کو الجھا کر رکھ دیا تھا اور ان لمحات میں یہ الجھن کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

ہم ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ ٹیکسی نے ہمیں دربار اسکوائر میں گھمایا پھر سنگھا دربار سیکریٹریل بلڈنگ کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ رام شاہ پاتھ پر آ گئی۔ کچھ دیر بعد ہم دربار پاتھ پر آ گئے اور پھر رتنا پارک پہنچ گئے۔ ٹیکسی پارک کے پہلو سے گزرنے لگی تو میں نے ایک فوری خیال کے تحت ڈرائیور سے ٹیکسی روکنے کو کہا ''ایک منٹ بھائی۔ پارک کے مین گیٹ پر اتار دو۔''

لی یان نے مجھ سے پوچھا ''کیا سیدھا بنگلے کی طرف جانے کا ارادہ نہیں۔''

میں نے کرایہ دے کر ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور پارک کے گیٹ کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے لی یان سے کہا ''میں

تھوڑی دیر اس پارک میں گزارنا چاہتا ہوں' پھر یہاں سے ٹہلتے ہوئے گھر کی طرف نکل جائیں گے۔ اس پارک سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔"

وہ مزید کوئی سوال کیے بغیر میرے ساتھ قدم اٹھانے لگی۔

رتنا پارک بہت ہی فرحت بخش جگہ ہے۔ کھٹمنڈو میں قیام کے دوران میں' میں روزانہ صبح یہاں آیا کرتا تھا۔ ہلکی پھلکی ایکسر سائز بھی ہو جاتی اور کچھ جوگنگ بھی۔ میں شب و روز جس قسم کے ہنگامی حالات سے نبرد آزما رہتا تھا ان کے لیے جسمانی طور پر چاق و چوبند اور فٹ رہنا ضروری تھا۔

اس پارک میں عموماً رات دس بجے تک خوب رونق رہتی تھی لیکن موسم کی شدت کے باعث آج کل لوگ جلدی وہاں سے رخصت ہو جاتے۔ پورے پارک میں' مناسب فاصلے سے کھمبوں پر گارڈن لائٹس روشن تھیں جو پارک کی خوب صورتی میں اضافے کا باعث تھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں نیلگری کا خیال رچا بسا تھا۔ اس پُراسرار ہستی سے میری پہلی ملاقات اسی پارک میں ہوئی تھی۔ لی یان خاموشی سے میرے ساتھ آگے بڑھتی چلی آئی۔ میں بے اختیار پارک کے اس حصے کی جانب جا رہا تھا جہاں مجھے نیلگری کا ٹوٹا ہوا مجسمہ پڑا ملا تھا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گئے۔ اس طرف درختوں کی بہتات تھی اور یہ جگہ عام پختہ روشوں سے ذرا ہٹ کر تھی۔ اس سے تھوڑا آگے پارک کا حفاظتی جنگلا تھا۔ میں کچھ دیر تک بے سبب یونہی ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ اسی جگہ کرسٹل کے ٹوٹے ہوئے مجسمے سے مجھے ٹھوکر لگی تھی اور میں اس حسین ترین مجسمے کو اپنی گاڑی میں رکھ کر گھر لے آیا تھا...... پھر وہ زندہ ہو گئی تھی۔

اس وقت پارک کے ماحول میں.... نیلگری کے وجود کی مخصوص مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی درخت کی آڑ میں چھپی کھڑی ہو اور مجھے حیرت زدہ کرنے کے لیے اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آجائے گی۔ نیلگری نے میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے غائب رہنے کے بعد وہ دوبارہ مجھے اپنے وجود کا احساس دلانے لگی تھی مگر قدرے مختلف انداز میں اور اس کا یہ نیا انداز میرے لیے تشویش کا باعث تھا۔ پتا نہیں' اب وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی۔

نیلگری تو کسی درخت کی اوٹ سے برآمد نہیں ہوئی۔ تاہم لی یان [illegible] بے معنی حرکات سے بور ہوتے ہوئے کہا "وجدان! تم مجھے پارک کے اس نیم تاریک حصے میں کیوں لے آئے ہو؟ میں محسوس کر رہی ہوں جیسے تمہیں کسی خاص شے کی تلاش ہو۔"

"ہاں' وہ بہت ہی خاص تھی۔" میں نے بے خیالی میں کہہ دیا۔

"وہ کون؟" لی یان کی چونکی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں سنبھل گیا اور بات بناتے ہوئے کہا" میں اپنی ایک دوست کے ساتھ یہاں ایکسر سائز کرنے آیا کرتا تھا۔ بس اس کی یاد آگئی۔"

"اوہ!" لی یان نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور بولی" چلو کوئی بات نہیں۔ تمہاری دوست کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہم بھی تھوڑی ایکسر سائز کر لیتے ہیں۔ موسم کا تقاضا بھی نبھ جائے گا اور کچھ ہاتھ پاؤں بھی کھل جائیں گے مگر پارک کے کسی روشن حصے کی طرف چلو۔"

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے بے ساختہ کہہ دیا" کیا یہاں نیم تاریکی میں تمہیں مجھ سے ڈر لگ رہا ہے؟"

"اگر میں تم سے ڈر رہی ہوتی تو نیو جرسی سے کھٹمنڈو تک نہ آتی۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی" تم تو مجھے کہیں سے بھی خطرناک نہیں لگے۔" پھر وہ بڑے دلآویز انداز میں ہنس دی۔

اس نے آخری جملہ بہت معنی خیز انداز میں ادا کیا تو مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس دوران میں وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ میں اس کے انداز کی سنگینی کو بھانپ گیا اور سنبھلتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے' ہم جوگنگ ٹریک کی طرف چلتے ہیں۔ ادھر میں نے گھاس کے ایک قطعے پر چند افراد کو ورزش کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

اس نے کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی کسی قسم کی بحث چھیڑی۔ ہم نیم تاریک حصے سے نکل کر مذکورہ مقام کی طرف چل پڑے۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد لی یان نے کہا" وجدان تنہائی میں' میں تمہیں وجدان کہوں تو تم اعتراض تو نہیں کرو گے؟"

"اس وقت تم کیا کر رہی ہو' مجھے وجدان کہہ کر ہی تو پکار رہی ہو۔" میں نے معتدل لہجے میں کہا" میں نے کون سا اعتراض کیا ہے۔ وہ تو میں نے احتیاط کے پیش نظر کہہ دیا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ بہر حال' بعض جگہوں پر بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

میں پارک کے نیم تاریک گوشے سے نکل کر قدرے روشن حصے میں پہنچا تو محسوس ہوا جیسے نیلگری کی وہ مخصوص خوشبو بھی میرا تعاقب کرتے ہوئے ادھر آ گئی ہو۔ دراصل پارک میں داخل ہونے کے بعد سے میں مسلسل نیلگری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پتا نہیں اب یہ میری سوچ کا نتیجہ تھا یا واقعی وہ ہستی میرے ساتھ تھی۔ اگرچہ مجھے امید تو نہیں تھی کہ وہ میری پکار پر لبیک کہے گی۔ تاہم پھر بھی میں نے اپنی تسلی کی خاطر اسے زیرِلب پکارا ''نیلگری......!''

جواب میں خاموشی رہی۔ اس نے میری پکار پر لبیک نہیں کہا تاہم اس کے حیرت انگیز وجود کی سحر کار خوشبو مسلسل میری سانسوں میں بسیرا کیے رہی۔ میں اس خوشبو کو کئی مرتبہ سانس کے راستے اپنے خون میں جذب کر چکا تھا اور کے ڈی اے اسکیم ون کے ایک بنگلے میں تو میں نے نیلگری کے سحر انگیز وجود کی کرشمہ کاری بھی دیکھ لی تھی۔ وہ رات میری زندگی کی ایک تاریخ ساز اور ان مٹ رات تھی۔ اس ناقابلِ فراموش رات میں پربتوں کی ملکہ نے مجھے لذتِ حیات سے روشناس کرایا تھا۔

ہم نے لگ بھگ آدھا گھنٹا ایکسر سائز کی پھر ایک سنگی بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے لی یان سے کہا ''میں آنکھیں بند کر کے تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''مجھے کیوں اعتراض ہوگا......!'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی ''تمہاری آنکھیں ہیں' آرام کرنے کے لیے انہیں بند کر دیا کھلا رہنے دو' تمہاری مرضی ہے۔''

لی یان اس وقت ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ میں نے بھی جواباً شوخی سے پوچھ لیا ''اچھا' اگر میں آرام کرنے کے لیے تمہاری آنکھیں استعمال کروں گا تو تمہیں تب اعتراض ہوگا؟''

''تب بھی نہیں ہوگا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

میں نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور سنگی بینچ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں (اپنی) بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی انسان اپنے اندر بند ہو جاتا ہے۔ میں بھی خود میں بند ہو کر خود کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ میرے وجود کا اٹوٹ انگ مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ میں نے تھرڈ آئی کے سامنے ساحل کے سراپا کو اجاگر کیا اور رخشِ تصور کو اس کی جانب دوڑا دیا۔

نتیجہ حسبِ سابق برآمد ہوا۔ میں اپنے وجود کے ''اٹوٹ انگ'' تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک نامعلوم' ایک بے نام سی سفاک دیوار ہمارے بیچ حائل رہی۔ ڈاکٹر موگ کو صد فیصد یقین تھا کہ اس نے جس لڑکی کو ہائی وے والی بستی میں پہنچایا ہے' وہ میری ساحل ہی ہے۔ مجھے ڈاکٹر موگ کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا لیکن دل کی اپنی مچلن تھی' یہ سینے کے پنجرے کو توڑ کر کھلی فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتا تھا اور ایک لمبی اڑان بھر کر اپنی منزل...... میری ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا مگر پتا نہیں' کس سبب یہ ''پرندہ'' پر پھڑ پھڑا کر رہ جاتا' منزل کا سراغ پانے سے پہلے ہی یہ بے دم سا ہو کر زمین سے آ لگتا۔ ربی موشے ہائمن کی شاطرانہ چال نے میری زندگی کی بساط کو تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ ساحل کو مجھ سے دور کرنے میں اسی کا ہاتھ تھا۔

ربی کے تصور نے میری سوچ کو زہریلا کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ کوشش میں ناکامی اور موشے ہائمن کے بارے میں سوچنے کی تلخی میرے چہرے سے ہویدا تھی۔ یہ تاثرات لی یان نے نوٹ کر لیے' گہری تشویش سے بولی۔

''کیا بات ہے وجدان! تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟''

''میں ٹھیک ہوں' تم فکر نہ کرو۔''

''چلو' گھر چلتے ہیں۔'' وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولی۔

''چلتے ہیں' ایک منٹ......'' میں نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

اس بار میں نے تیسری آنکھ کے توسط سے نیلگری کو ٹریس آؤٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوشش میں بھی مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جھنجلا کر میں آنکھیں کھولنے ہی والا تھا کہ ایک مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''تم یہاں بیٹھے تصور کی کرتب بازیاں دکھاتے رہو اور وہاں......!''

جملہ ادھورا چھوڑ کر آواز معدوم ہو گئی۔ اس بات میں ایک فیصد بھی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ آواز نیلگری کی تھی۔ وہ یہیں کہیں میرے آس پاس موجود تھی مگر مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی مخصوص آواز سنتے ہی میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں تو لی یان بھی بوکھلا گئی۔

''کیا ہوا وجدان؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے نیلگری کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''کچھ تو ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ''میں محسوس کر رہی ہوں' تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش ہے' کس کی......؟ یہ تم ہی بتا سکتے ہو۔''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے سرسری انداز میں کہا ''گھر چلتے ہیں'' پھر میں بینچ پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''وجدان! تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔'' لی یان نے ناراضی لہجے میں کہا ''اگر دانستہ یا کسی مصلحت کی بنا پر نہیں بتانا چاہتے تو دوسری بات ہے۔''

میں نے اس کی تشفی کی خاطر کہہ دیا ''بعد میں بتا دوں گا۔ اس وقت میرا ذہن بہت الجھا ہوا ہے۔''

''میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟''

''فی الحال میرے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

پھر لی یان نے مجھ سے کسی قسم کا کوئی سوال نہیں کیا اور ہم رنا پارک سے باہر نکل آئے۔

اس وقت میرے دماغ میں صرف ایک ہی جملہ...... ادھورا جملہ گردش کر رہا تھا ''تم یہاں بیٹھے تصور کی کرتب بازیاں دکھاتے رہو اور وہاں......''

یہ آواز ایک سو ایک فیصد نیلگری کی تھی۔ اس نے مجھے کوئی نہایت ہی اہم اشارہ دیا تھا۔ وہ مجھے کسی بات سے باخبر کرنا چاہتی تھی' مجھے کچھ بتانا چاہتی تھی' میری کسی کوتاہی' کسی غفلت کی نشان دہی کرنا چاہتی تھی۔ میں جیسے جیسے سوچ رہا تھا' میرا ذہن الجھتا جا رہا تھا۔

پھر میرا دھیان آپوں آپ ساحل کی طرف چلا گیا۔ میری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اسی ہستی کو حاصل تھی۔ شاید نیلگری مجھے ساحل کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھی۔ ایک وہی تھی جو مجھ سے دور تھی اور اس پر کسی بھی وقت، کوئی بھی مصیبت نازل ہو سکتی تھی۔

میں انہی تشویش ناک اور سنگین خیالات سے لڑتے ہوئے ڈاکٹر موگ والے بنگلے پر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر موگ بنگلے پر موجود تھا۔ ہماری طرف دیکھتے ہوئے اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''تم لوگ خیریت سے آ گئے۔ کوئی اپ سیٹ تو نہیں ہوا؟''

''سب ٹھیک ہے ڈاکٹر۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

لی یان سامان والے بیگ کے ساتھ دوسرے کمرے میں گئی تو موگ نے گمبھیر لہجے میں استفسار کیا ''وجدان! اگر کوئی اپ سیٹ نہیں تو پھر تم کیوں اپ سیٹ نظر آ رہے ہو؟''

میں نے ایک لمحے کے تامل کے بعد اسے اپنی کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر موگ دوستی کے بعد میرے بہت قریب ہو گیا تھا۔ الاسکا میں' اس کے مارشل آرٹس سینٹر میں ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر بڑی بے تکلف گفتگو ہوئی تھی۔ وہ میری ''چی'' اور تھرڈ آئی والی صلاحیت سے بھی آگاہ تھا بلکہ تھرڈ آئی کے سلسلے میں تو وہ مجھ پر رشک کر رہا تھا۔ اس نے بھی اس شعبے میں کافی محنت کی تھی لیکن میری طرح اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی' البتہ وہ ''چی'' کی قوت سے دیگر بہت سے کام لیتا رہتا تھا۔ فلائنگ فائٹ بھی ''چی'' ہی کے طفیل تھی۔ وہ بھی میری طرح شاؤلن ٹیمپل ہی سے تربیت یافتہ تھا مگر یہ بہت عرصہ پہلے کی بات تھی۔

میری بات اور نیلگری کے حوالے سے تشویش کو اس نے پوری توجہ سے سنا اور کہنے لگا ''تم اس سلسلے میں پریشان نہ ہو۔ ہمارے پروگرام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ہم ہلکا سا کھانا کھائیں گے اور پھر ہائی وے والی بستی کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔ وہاں جا کر ہی پتا چلے گا' کیا صورتِ حال ہے۔''

ڈاکٹر کی تسلی سے میری تشویش میں قدرے کمی تو ہوئی لیکن دل کی بے کلی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر موگ سے پوچھا ''کیا یہاں سے کسی طرح اس بستی میں رابطہ نہیں کیا جا سکتا؟''

''اس گھر میں فون کی سہولت موجود نہیں جہاں ساحل کو رکھا گیا ہے۔'' ڈاکٹر نے پُرخیال انداز میں جواب دیا ''وہ بہت چھوٹی سی بستی ہے جس کے اکثر گھر ضروریاتِ زندگی سے عاری ہیں۔ اگر وہاں کوئی گڑبڑ ہوتی تو شاکا ضرور مجھے اس کی اطلاع دیتا۔''

''کون شاکا؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

اس نے بتایا ''شاکا اس قابلِ اعتماد شخص کا نام ہے جس کے گھر میں' میں نے تمہاری ساتھی ساحل کو چھپا رکھا ہے۔ ساحل وہاں شاکا کی بیٹی بندیا کے بھیس میں رہ رہی ہے۔ بندیا اور ساحل کے قد کاٹھ میں نمایاں فرق نہیں اس لیے مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ شاکا اپنی بیوی بھان متی اور بیٹی بندیا کے ساتھ اس بستی میں رہتا ہے...... اور وہ اتنا عام سا آدمی ہے کہ بھولے سے بھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں جا سکتا۔''

''اور اصل بندیا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''وہ بھی اسی گھر میں ہے۔'' ڈاکٹر موگ نے جواب دیا

''مگر وہ بالکل روپوش ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی ''بندیا'' منظرِ عام پر رہ سکتی ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''جیسا کہ ایک وقت میں ایک شون منظرِ عام پر ہے!''

شون کے ذکر پر میں چونک اٹھا ''اس طرف کی کوئی خیر خبر ہے ڈاکٹر مونگ؟'' میں نے اس سے استفسار کیا اور یہ بھی بتادیا کہ ہم نے دربار مارگ سے نیوجرسی فون کرنے کی کوشش کی تھی۔

اس کی گمبھیرتا میں اضافہ ہوگیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''وہاں کے معاملات خاصے گڑبڑ ہیں۔ ہنگامی حالات میں شون کو تمہارے زخمی ساتھی کے ہمراہ کسی دوسری جگہ شفٹ ہونا پڑا ہے۔ اسی لیے وہاں کسی نے تمہارا فون اٹینڈ نہیں کیا۔ میری ہنگ سے بات ہوچکی ہے۔ اس نے بتایا ہے' ایف بی آئی والے بڑی سرگرمی سے تمہیں اور تمہارے زخمی ساتھی کو تلاش کررہے ہیں۔ ان کی توجہ کا مرکز اس وقت امریکا کی دو ریاستیں بنی ہوئی ہیں' یعنی نیویارک اور نیوجرسی۔ دونوں ریاستوں کے تمام ائرپورٹس پر تمہارے حوالے سے ایمرجنسی نافذ ہے۔ ہنگ نے کسی نہ کسی طور خود کو بچا رکھا ہے لیکن مجھے لگتا ہے' تمہارے ساتھی کی تلاش میں بے چارہ شون رگڑا جائے گا۔ اسے کسی بھی صورت ایف بی آئی والوں کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے' بہرحال ہنگ اس کو بچانے کی پوری کوشش میں ہے۔''

میں نے کہا ''اصلی شون کو روپوش ہی رہنا چاہیے کیونکہ وہ دونوں ''میاں بیوی'' تو اس وقت نیوجرسی سے ہزاروں میل دور کھٹمنڈو کی سیاحت پر نکلے ہوئے ہیں۔''

''ہوں!'' ڈاکٹر مونگ نے گمبھیر انداز میں مجھے دیکھا اور خاموش ہوگیا۔

میں نے پوچھا ''کیا نیوجرسی والی تازہ ترین صورتِ حال سے لی یان کو آگاہ کردینا چاہیے؟''

''تمہاری مرضی ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا ''میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔''

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ڈاکٹر مونگ نے کہا ''ہم ٹھیک آٹھ بجے کھانے کی میز پر ہوں گے۔ اس وقت ساڑھے سات بجنے والے ہیں۔ ہمیں خلافِ معمول کافی جلدی ہلکا پھلکا ڈنر کرنا ہوگا۔ ٹھیک نو بجے ہماری روانگی ہے۔ تمہارے پاس آدھا گھنٹا ہے۔ نہا دھو کر فریش ہوجاؤ تو اچھا ہے۔ پتا نہیں' آگے کون سے حالات ہمارا انتظار کررہے ہیں۔ کہیں منہ دھونے کی فرصت بھی ملے گی یا نہیں۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا ''ڈاکٹر مونگ میں اپنے اصلی روپ میں آنا چاہتا ہوں۔''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر پوچھا ''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں' بہت ہی خاص الخاص وجہ ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''امریکا کے تازہ ترین حالات بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہے ہیں۔ ایف بی آئی والے شیطان سے کم نہیں ہیں۔ اگر وہ ہاتھ دھو کر اور پاؤں لتھڑ... میرے زخمی ساتھی وسیم کے پیچھے پڑ گئے ہیں تو وہ بہت جلد... جاننے میں کامیاب ہوجائیں گے کہ شون نے اسے پناہ د... رکھی ہے۔ جب شون ان کی گرفت میں آئے گا تو میرے فر... کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اگر شون ان کے ہتھے نہیں بھ... چڑھتا تو بھی وہ شون اور لی یان کے بارے میں معلومات ضرور حاصل کریں گے اور جب انہیں پتا چلے گا' وہ دونوں میاں بیوی نیپال گئے ہوئے ہیں تو وہ لامحالہ شکی انداز میں سوچنے لگیں گے۔''

میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا' پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''ایف بی آئی' سی آئی اے' این وائے پی ڈی...... حتیٰ کہ امریکی صدر تک اس وقت ربی موٹے ہاتھ... سے جڑے ہوئے ہیں' پل پل کی خبریں ربی تک پہنچائی جارہی ہیں اور وہ بھی انہیں نت نئے احکام صادر کررہا ہے۔ ربی کے لیے بدھ نیل کنٹھ والا مشن بہت اہم ہے۔ جب ربی کو یہ پتا چلے گا کہ شون اپنی بیوی کے ساتھ کھٹمنڈو گیا ہے تو وہ کھٹک جائے گا۔ اور کچھ ہو یا نہ ہو' کھٹمنڈو میں شون اور لی یان کی نگرانی شروع ہوجائے گی۔ پہلے تو دو مرتبہ ہم پر قاتلانہ حملہ اس لیے ہوا کہ ہم تمہارے لوگوں کے ساتھ تھے۔ اب وہ لوگ ربی کے حکم پر ہمیں براہِ راست بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ... کچھ نہیں تو وہ ہمیں قابو کرکے ہماری زبان کھلوانے کی کوشش ضرور کریں گے کہ ہمیں یوں اچانک بیٹھے بٹھائے کھٹمنڈو دیکھنے کا شوق کیوں چرایا اس لیے اب ہمیں شون اور لی یان نظر ... آنا چاہیے۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس میک اپ وغیرہ سے تنگ آگیا ہوں۔ ... وجدان کی اصلی صورت کے ساتھ ہی آگے بڑھوں گا چا... میرے سامنے کتنے ہی خطرات کیوں نہ منہ کھولے کھڑے ہوں' البتہ لی یان کے چہرے پر تھوڑی پفنگ کرنا ہوگی تھوڑا ہیئر اسٹائل میں تبدیلی بھی ضروری ہے تاکہ پہلی

میں وہ لی یان دکھائی نہ دے' اس پر دوسری نظر پڑنے سے پہلے کوئی بندوبست کرلیا جائے گا۔''

''او کے!'' ڈاکٹر مونگ نے مدبرانہ انداز میں کہا ''تمہاری تجویز معقول ہے۔ اس پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں' تمہارے ''فرار'' کا راز اب زیادہ دیر تک راز نہیں رہے گا۔ ایف بی آئی والوں نے اگر نیوجرسی میں' اوشین ایونیو اور لنکن پارک کا رخ کرلیا ہے تو شون کے لیے واقعی بہت بڑی مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔ یہ لوگ بال کی کھال اور کھال کے بال نکالنا جانتے ہیں۔''

نیوجرسی کے علاقے ''جرسی سٹی'' میں اوشین ایونیو پر شون کا فوٹو اسٹوڈیو واقع تھا جبکہ وہ لی یان کے ساتھ لنکن پارک کی ایک اپارٹمنٹس بلڈنگ میں رہتا تھا۔ میں نے ڈاکٹر مونگ کی توجہ ایک اور نہایت ہی اہم نکتے کی طرف مبذول کرائی۔

''فوٹو اسٹوڈیو پر کام کرنے والے ملازمین کو یہ بتایا گیا ہے کہ شون اور لی یان دو تین دن کے لیے کیلیفورنیا جارہے ہیں۔ اس مدت میں سے لگ بھگ دو دن تو نکل گئے۔ اگر مزید ایک دن تک شون روپوش رہتا ہے تو چل جائے گا البتہ اگر ایف بی آئی والوں نے ملازمین سے پوچھ گچھ کی تو معاملہ وقت سے پہلے ہی بگڑ جائے گا اور...... وہ لوگ چھوڑیں گے نہیں۔ مجھے اور وسیم کو پانے کے لیے وہ ہنگ اور اس سے وابستہ ہر شخص کو ''چیک'' کریں گے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ ہنگ ابھی تک کیسے بچا ہوا ہے۔''

''لگتا ہے' لارڈ بدھا اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے!'' ڈاکٹر مونگ نے سرسراتے ہوئے لہجے میں ایک جملہ بول کر بات ہی ختم کردی۔

ڈاکٹر نے مجھے صرف آدھے گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ میں اس سے رخصت لے کر لی یان والے کمرے میں آگیا۔ نہایت ہی مختصر الفاظ میں' میں نے اسے نیوجرسی کے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا پھر فریش اپ ہونے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔

ایک بات نے مجھے چونکا دیا۔ شون کو پیش آمدہ حالات کے بارے میں جان کر لی یان کو جس قدر فکرمند ہونا چاہیے تھا' وہ مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ پتا نہیں' وہ اندر سے بھی اتنی پُرسکون تھی کہ نہیں' جتنی باہر سے دکھائی دیتی تھی!

☆☆☆

لنچ کی طرح ڈنر پر بھی ہم تینوں ایک ساتھ تھے۔ کھانے پینے کی بہت سی اشیا ڈاکٹر مونگ واپسی میں ساتھ لیتا آیا تھا' چند ایک چیزیں چندر سے منگوالی گئیں۔ وہ اپنا اور دونوں سادہ لباس پولیس والوں کا کھانا لینے گیا تھا۔ پولیس کے وہ جوان اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ ہم چونکہ اپنی مجبوری کے باعث قبل از وقت کھانا کھا رہے تھے لہٰذا چندر اور دیگر پولیس والوں کو ہمارے وہاں سے رخصت ہونے کے بعد کھانا کھانا تھا۔

کھانے کے دوران میں ہمارے درمیان رات والے مشن پر ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ انہی باتوں میں ڈاکٹر مونگ نے یہ انکشاف کیا ''وجدان! تمہاری طرح میں بھی اپنے اصلی رنگ و روپ میں بستی کی طرف روانہ ہورہا ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''انتہائی مجبوری کی بات دوسری ہے ورنہ ہمیں میک اپ کے بغیر ہی رہنا چاہیے۔ جب ہم میک اپ کے ذریعے حلیے تبدیل کرکے سوسائٹی میں موو کرتے ہیں تو کیا ہم پر دشمنوں کی طرف سے آفات نازل نہیں ہوتیں!'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''جب ہر صورت میں دشمنوں سے نبرد آزمائی ہی ٹھہری تو ہم کیوں خود سے بیگانہ ہوکر زندگی گزاریں۔ مجھے جب سے میک اپ کے تجربات ہورہے ہیں' میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں جیسے میرے اندر کوئی اور وجدان ہو اور باہر کوئی اور۔ میں بیک وقت دو شخصیات کے ساتھ روز و شب بتا رہا ہوں۔''

ڈاکٹر مونگ نے کہا ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن بعض حساس معاملات میں حلیے کی تبدیلی ضروری ہوجاتی ہے' جیسے امریکا سے نکلنے کے لیے تمہارا شون بننا وقت کا تقاضا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔''

لی یان کو میں اس کے حلیے کی تبدیلی کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس نے ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ''کیا اس مشن میں' میں بھی اپنی اصلی صورت کے ساتھ حصہ لوں گی؟''

''تمہارے لیے فی الحال تھوڑی احتیاط ضروری ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ویسے بھی تمہیں اپنے چہرے پر کوئی باقاعدہ میک اپ تو کرنا نہیں۔ ہیئر اسٹائل کی تبدیلی اور ہلکی پفنگ سے کام چل جائے گا۔ یہ احتیاط تم سے زیادہ شون کے کام آئے گی۔''

وہ خاموش ہوکر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا لیکن میں اس دور میں شامل نہیں تھا۔ میں آئندہ چند گھنٹوں تک بیدار مغز اور ہشاش بشاش رہنا چاہتا تھا۔ لگ بھگ دو گھنٹے بعد میری ایک ایسی ہستی

سے ملاقات ہونے والی تھی جس کی تلاش میں' میں نے پاکستان سے لے کر یہاں تک دردر کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ ہزاروں لاکھوں عذاب لمحے میری زندگی میں سے گزرے تھے' کروڑوں مرتبہ میں نے اپنی جانِ تمنا کی آرزو کی تھی۔ ساحل مجھ سے اس طور بچھڑی تھی کہ میرے اندر کا موسم مجھ سے روٹھ گیا تھا۔ میں نے جدائی کے اس تمام تر عرصے کو جس طرح برداشت کیا' اس کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے' جس نے فرقت اور ہجر کی رت میں سانسیں لی ہوں۔

پونے نو بجے ڈاکٹر مونگ نے بتایا ''ہم ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔''

''ہم بستی تک کس ذریعے سے جائیں گے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے اس سفر کے لیے ایک ہیوی انجن والی جیپ کا بندوبست کر رکھا ہے جو پہاڑی راستوں کے لیے نہایت ہی موزوں ہے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا ''آرمی گرین کلر کی یہ جیپ رات کی تاریکی میں اور بھی زیادہ محفوظ ہے۔ اس جیپ میں مناسب اسلحے کے علاوہ پیٹرول کی وافر مقدار بھی موجود ہے۔ جیپ کا ٹینک تو فل ہے ہی' ازیں علاوہ اس کے پچھلے حصے میں پانچ گیلن والے دو کین بھی بھرے رکھے ہیں۔ مذکورہ جیپ ساتھ والے بنگلے کے پورچ میں کھڑی ہے۔ میں نے اپنا ضروری سامان جیپ کے اندر پہنچا دیا ہے۔ تم لوگ جو کچھ لے جانا چاہو' اپنے بیگ میں بھر لینا۔''

میں نے ڈاکٹر کی بات پوری توجہ سے سنی اور ایک انکشاف پر الجھن زدہ انداز میں دریافت کیا ''ڈاکٹر! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ جیپ ساتھ والے بنگلے میں کیوں کھڑی ہے؟''

''محض احتیاط اور حفاظت کی خاطر۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''ساتھ والے بنگلے میں کوئی بھی رہائش پذیر نہیں۔ وہ میرے ہی تصرف میں ہے۔ یہ بات جانوس کے علاوہ چندر کو بھی معلوم ہے۔ یہ دونوں بنگلے مجھے جانوس نے فراہم کر رکھے ہیں جو اس کی خفیہ پراپرٹی میں شمار ہوتے ہیں۔''

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ جیپ والا آئیڈیا مجھے پسند آیا تھا۔

ڈاکٹر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''دوسرے اس ''خاموش'' بنگلے کا بندوبست میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اس وقت ہم جن دشمنوں سے ٹکر بازی کر رہے ہیں وہ بہت ہی با اثر ہیں۔ یوں سمجھو کہ ہم بالواسطہ امریکا سے لڑ رہے ہیں اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔''

''تم بالواسطہ کی بات کر رہے ہو ڈاکٹر۔ میں تو بلاواسطہ بھی پچھلے دنوں امریکا سے نمٹ رہا تھا۔ نیویارک کے دل مین ہیٹن میں جو واقعات پیش آئے' میں تمہیں ان کی تفصیل بتا چکا ہوں۔ میرے انہی ''کارناموں'' کے طفیل تو مجھے ''امریکا دشمن'' کا ٹائٹل ملا ہے۔''

''ہوں!'' ڈاکٹر مونگ نے ایک گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''امریکا سے کہیں زیادہ سنگین واقعات یہاں نیپال میں بھی پیش آ سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایک ایک قدم پھونک کر......''

ڈاکٹر کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی لمحے ہمیں چھت پر کسی کے کودنے کی آواز سنائی دی۔ ہم تینوں نے بیک وقت چونک کر کمرے کی چھت کی طرف دیکھا۔ وہ آواز اگرچہ بہت مدھم تھی لیکن ہم نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا' کوئی نہایت ہی محتاط قدموں سے چھت کے اوپر چل رہا تھا' جلد ہی محتاط قدموں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

ہم نے ایک دوسرے کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا اور یک لخت اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میرے اعصاب اچانک تن گئے تھے۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ کم از کم نصف درجن افراد' اس یخ بستہ موسم میں بنگلے کی چھت پر موجود تھے اور ظاہر ہے' وہ کسی اچھی نیت سے وہاں نہیں پہنچے تھے۔

''آپ دونوں اسی کمرے میں رہو۔ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر مونگ نے اضطراری لہجے میں کہا اور دروازے کی سمت قدم بڑھا دیئے۔

اسی لمحے بنگلے کے بیرونی حصے میں بحث وتکرار کی آوازیں ابھریں۔ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی چندر یا سادہ لباس پولیس والوں سے الجھ رہا ہو' وہ زبردستی بنگلے کے اندر گھسنا چاہتا ہو اور بنگلے کے محافظ اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہے ہوں۔

یہ بحث ومباحثہ لمحاتی ثابت ہوا اور اگلے ہی لمحے فائرنگ کی تیز تڑ تڑاہٹ نے ٹھنڈے ٹھار ماحول کی خاموشی اور سناٹے کو پاش پاش کر دیا۔ ڈاکٹر مونگ نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اسی لمحے جوابی فائرنگ ہونے لگی۔ اگر پہلی فائرنگ حملہ آوروں کی طرف سے تھی تو پھر جوابی فائرنگ چندر وغیرہ کا کارنامہ ہی ہو سکتا تھا اور صورتِ حالات اس کے برعکس بھی متوقع تھی۔ آخر الذکر فائرنگ کے ساتھ ہی فضا میں انسانی چیخوں کی بھیانک آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ یہ ان بدقسمت

افراد کی چیخیں تھیں جو براہِ راست گولیوں کی زد میں آ گئے تھے۔ لگتا تھا' ہم میدانِ جنگ میں کھڑے ہوں!

میں نے تشویش بھری نظر سے لی یان کو دیکھا' وہ مضبوط لہجے میں بولی ''ہمیں ڈاکٹر مونگ کی مدد کرنا چاہیے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے' درجن بھر کالی بلاؤں نے اس بنگلے پر شب خون مارا ہو۔''

لی یان کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ ہمارے کمرے کے باہر کوریڈور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ کوئی اس طرف آ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کمرے سے نکلتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ یقینی بات تھی' باہر جو کوئی بھی تھا یا تھے وہ سیدھے اندر ہی آتے۔ دوڑتے ہوئے قدموں سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا' وہ ایک دو ہیں یا اس سے زیادہ!

وہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ اگر ہم یونہی کھڑے رہ جاتے تو موت بڑی بے رحمی سے ہمیں اپنی آغوش میں سمیٹ لیتی۔ اس طرف چڑھائی کرنے والے ہمارے دوست تو ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ دوست یوں گولیوں کی برسات کے ساتھ ملنے کے لیے نہیں آتے۔

میں نے پلک جھپکتے میں ایک فوری فیصلہ کیا اور لی یان کو بازو سے تھام لیا پھر میں اسے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے کھلے دروازے کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ دروازے کے پٹ نے ہمیں پوری طرح اپنے پیچھے چھپا لیا۔ باہر سے اندر داخل ہونے والوں کو ہم پہلی نظر میں دکھائی نہیں دے سکتے تھے۔

ہم نے دروازے کے عقب میں پناہ لی ہی تھی کہ فضا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی بھیانک آواز سے گونج اٹھی۔ یہ دو طرفہ فائرنگ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں محدود پیمانے پر انسانی چیخیں بھی بلند ہوئیں جس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ حملہ آوروں کی مزاحمت بھرپور انداز میں نہیں کی جا رہی۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خوفناک خیال چمکا کہ چندر اور دونوں پولیس والے مسلح افراد اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں یہ سوچا اور میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ اسی اثنا میں ایک مرتبہ پھر بنگلے کے مختلف حصوں میں برسٹ فائرنگ کی بھیانک صدائیں بلند ہونے لگیں۔ لی یان مجھ سے لگی کھڑی تھی' بے اختیار وہ مجھ سے پیوست ہو گئی۔ میں نے اس کے نازک بدن کی مخصوص دھیمی تھرتھراہٹ کو اپنے وجود پر محسوس کیا۔ وہ کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن وہاں خوفناک گنیں اس طور گرج رہی تھیں کہ دلوں پر ایک عجیب سی ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق حملہ آور ایل ایم جی اور ایس ایم جی کا استعمال کر رہے تھے۔

لی یان بری طرح مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ میں نے تحفظ کا بھرپور احساس دلانے کے لیے اسے ایک بازو کے حلقے میں سمیٹا اور اپنی تمام تر سماعت کو کوریڈور کی سمت مبذول کر دیا۔

تین سیکنڈ کے بعد' وہ دوڑتے ہوئے قدم ہمارے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ اگلے مرحلے میں وہ لوگ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو جاتے۔ میں نے لی یان کے کان کے نزدیک اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی۔

''تم یہیں کھڑی رہنا۔ میں آنے والوں سے نمٹتا ہوں۔''

سرگوشی کے دوران میں میرے ہونٹ اس کے کان سے مس ہو گئے تھے۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ تاہم اس نے مجھے اپنی اضطراری گرفت سے آزاد کر دیا۔

باہر رکنے والوں نے ایک لمحہ کمرے کے اندر جھانکا۔ کمرے کی لائٹ آن تھی اور باہر کھڑے ہو کر اندر کسی انسان کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اصولی طور پر انہیں کمرا خالی دیکھ کر آگے بڑھ جانا چاہیے تھا لیکن ڈاکوؤں کے مانند بنگلے پر چڑھائی کر کے انہوں نے کون سے اصولوں کی پاسداری کی تھی جو اب ان سے ایسی کوئی توقع رکھی جاتی۔

وہ اندر داخل ہوئے تو مجھے ان کی تعداد کا علم ہوا۔ وہ تین افراد تھے اور تینوں ہی مسلح۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے ان کی جھلک دیکھی۔ اس وقت ان کی پشت میری طرف تھی اور ان کے سروں کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے اپنے چہروں پر لمبے نقاب چڑھا رکھے ہیں۔ اس قسم کے نقاب سر سے لے کر گردن تک کے حصے کو اچھی طرح ڈھانپ لیتے ہیں۔ صرف دیکھنے کے لیے آنکھوں کے سامنے دو چھوٹے چھوٹے سوراخ چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ یہ سارا بندوبست شناخت کو چھپانے کے لیے کیا جاتا ہے۔

مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کون تھے' ان کا شجرہ نسب کیا تھا۔ اس وقت وہ صرف دشمن تھے اور دشمنوں کو ہتھیار استعمال کرنے سے پہلے بے دست وپا کر دینا چاہیے۔

کمرے کو خالی پا کر وہ پیچھے کو مڑے اور یہ مڑنا ان پر غضب ڈھا گیا۔ اسی لمحے میں دروازے کی اوٹ سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے اپنے مقابل دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بوکھلا گئے۔ اس بوکھلاہٹ سے فائدہ نہ اٹھانا زندگی کی سنگین ترین غلطی ہوتی۔

میں توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند ان

سے ''بھڑ'' گیا۔ میرا خوفناک ترچھا دھکا ایک گن بردار کے پہلو میں لگا۔ وہ اپنے برابر کھڑے ساتھی سے ٹکرایا پھر یہ ٹکراؤ تیسرے مسلح شخص تک منتقل ہوگیا۔ وہ تینوں ایک دوسرے سے الجھ کر زمیں بوس ہوگئے۔ میں نے ان کے اوپر سے جمپ کی اور کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

زمین پر گرتے ہی ان میں سے ایک نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش میں بے دریغ مجھ پر فائرنگ کردی لیکن میں اس کے نشانے کو چھوڑ چکا تھا لہٰذا گن کے خوفناک بیرل سے خارج ہونے والی مہلک گولیاں چھت اور دیواروں کی خیریت دریافت کرنے لگیں پھر میں نے اسے گن استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔

میں نے اپنے قریب گرے ہوئے گن بردار کی کلائی کو بوٹ تلے روند ڈالا اور نیچے جھک کر اس کی گن پر قبضہ کرلیا۔ بوٹ والی کارروائی کے نتیجے میں گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ گن ہاتھ میں آتے ہی میں نے دیگر دو افراد کی ٹانگوں پر فائرنگ کردی۔ ان کی بھیانک چیخوں سے کمرا گونج اٹھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ان کی گنوں والے ہاتھوں پر دھواں دھار ٹھڈے برسائے تو ان کی گنیں ہاتھوں سے نکل کر دوسری دیوار کے قریب پہنچ گئیں۔ اب وہ فائرنگ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ گنیں ان سے ناقابلِ عبور فاصلے پر چلی گئی تھیں کیونکہ وہ اپنے قدموں پر چل کر وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے تھے۔

اس دوران میں اس شخص نے کارکردگی دکھانے کی کوشش کی جس کی گن میرے ہاتھوں میں تھی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے وزنی بوٹ کی ضرب سے ناکارہ ہوکر رہ گیا تھا۔ اس نے سلامت ہاتھ سے میری ٹانگ کھینچنا چاہی۔ وہ مجھے زمین پر گرانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میں نے اس کے ارادے کو ملیامیٹ کردیا۔

وہ ایک ہاتھ کے بل بوتے پر کسی مینڈک کی طرح پھدک کر میری ٹانگ کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ میرا پاؤں چل گیا۔ میں نے ایک فٹ بال کک اس کے تھوبڑے پر جڑ دی۔ وہ جنگلی بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر بھی ایک برسٹ مارا اور انصاف کا تقاضا نبھاتے ہوئے اسے اس کے دیگر دو ساتھیوں کی صف میں ''کھڑا'' کردیا۔

اسی وقت باہر کوریڈور میں دو مزید نقاب پوش نمودار ہوئے۔ میں نے پلک جھپکتے میں فائرنگ کرکے انہیں زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ میں نے انہیں گھائل کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ زندگی کی بازی کھیلتے رہیں گے اپاہجوں کے مانند۔ میں نے انہیں بھی ان کے دیگر ساتھیوں کی طرح ہاتھ پاؤں سے ازلی ابدی معذور کردیا تھا۔ میری فائرنگ نے ان کے دست و بازو کی ہڈیوں کا کچومر نکال دیا۔

گن کا میگزین خالی ہوگیا تھا۔ میں نے اسے پھینک کر دوسری گن اٹھالی۔ اسی لمحے لی یان بھی دروازے کی اوٹ سے نکل آئی۔ ایک گن میں نے اسے بھی تھمادی۔ وہ گن کو سنبھالتے ہوئے سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''وجدان! لگتا ہے اس بنگلے میں اچھی خاصی خون ریزی ہوگئی۔ پتا نہیں باہر کا کیا حال ہوگا۔ ڈاکٹر مونگ بھی واپس پلٹ کر نہیں آیا۔''

''آؤ باہر جاکر صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہیں۔'' میں نے کمرے کے اندر اور باہر کوریڈور میں پڑے ہوئے شدید زخمی افراد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

ان پانچ افراد میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں رہا تھا کہ ہمارے تعاقب میں لپکتا۔ ان کے وجود میں پائی جانے والی تمام تر توانائیاں اس وقت زندگی کے پیچھے لپک رہی تھیں۔ ان کے مرنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا لیکن وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ اب ہیں...... اب نہیں ہیں! موت کے خوف اور حالات کی دہشت نے ان کے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

کوریڈور میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے محتاط نظر سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں لی یان کو اشارہ کیا۔ وہ میرے اشارے کو پلک جھپکتے میں سمجھ گئی۔ اگلے ہی لمحے ہم کوریڈور میں محتاط قدموں سے مخالف سمتوں میں بڑھ گئے۔

مجھے ڈاکٹر کی طرف سے گہری تشویش تھی۔ گیٹ پر موجود تین محافظوں کی زندگی کے امکانات معدوم تھے۔ جتنی بے دردی سے وہاں فائرنگ کی گئی تھی اس کے پیشِ نظر دونوں پارٹیوں نے شدید نقصان اٹھایا ہوگا۔ اگر ان میں کوئی زندہ بچ گیا تھا تو وہ شدید زخمی ضرور ہوگا۔

کوریڈور کے اختتام پر میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ لی یان مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ بنگلے کے عقبی حصے کی جانب نکل گئی تھی۔ وہ طویل کوریڈور بنگلے کے سامنے والے حصے کو عقبی حصے سے ملاتا تھا اور اس کے دونوں طرف کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں اس وقت جہاں کھڑا تھا وہاں سے سامنے والا لان نظر آرہا تھا۔ اگر میں تھوڑا آگے نکل آتا تو گیٹ کا منظر دیکھ سکتا تھا اور وہ منظر کسی بھی طور دیکھنے کے قابل نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے گن کو سونتے سونتے محتاط نظر سے ادھر ادھر دیکھا

اور آہستگی سے آگے کو سرک آیا۔ اس حصے میں کوئی بندہ بشر مجھے دکھائی نہ دیا۔ سامنے والے لان سے گیٹ تک میں نے ایک نگاہ دوڑائی اور کھلے ہوئے گیٹ کے نزدیک تین چار انسان پڑے ہوئے نظر آئے۔ میں نے نیپالی ملازم چندر اور دونوں سادہ لباس محافظوں کو پلک جھپکتے میں پہچان لیا' باقی ایک شخص دشمن کی طرف سے تھا۔ میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے مزید چند قدم آگے بڑھ آیا۔ ان سب کی حالت بتاتی تھی' انہوں نے اپنا جیون پورا کرلیا۔ اب انہیں زندہ انسانوں میں شمار کرنا ایک حماقت ہی ہوتی!

فائرنگ گویا تھم گئی تھی۔ پچھلے چند منٹ سے ایک بھی گولی چلنے کی صدا نہیں ابھری تھی۔ میں نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ بیرونی گیٹ بند کیا اور بنگلے کے پہلو میں رہتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اسی وقت میں نے برآمدے میں ایک ہیولا سا لہراتے دیکھا۔ کوئی شخص دوڑتے ہوئے برآمدے سے نکل کر کوریڈور کی سمت بڑھا تھا۔ اس کے انداز میں فرار کی جھلک تھی اور یہ بھی یقینی بات تھی' وہ جو کوئی بھی تھا' اس وقت نہتا تھا ورنہ وہ مجھ پر فائرنگ ضرور کرتا۔ اس کی نسبت میں زیادہ روشن حصے میں تھا۔ اگر میں نے اسے دیکھ لیا تھا تو یہ ممکن نہیں تھا' اس نے مجھے نہ دیکھا ہو!

میں نپے تلے قدموں سے واپس کوریڈور کی طرف بڑھنے لگا۔

اسی لمحے بنگلے کے عقبی حصے میں فائرنگ ہونے لگی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ کیونکہ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی ایک وحشت ناک نسوانی چیخ بھی بلند ہوئی تھی۔ میری ساتھی لی یان بنگلے کے اس حصے میں موجود تھی۔ میرے دل سے دعا نکلی' اے اللہ! لی یان کو کچھ نہ ہو۔

میں اس وقت برآمدے میں قدم رکھ چکا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر دیوار پر موجود لائٹ کے سوئچ کو آف کردیا۔ اگلے ہی لمحے برآمدہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ تاہم یہ تاریکی لمحے بھر کی تھی۔ لان والی لائٹ نے دو سیکنڈ بعد اس تاریکی کو ملگجے اجالے میں بدل دیا۔ رہی سہی کسر کوریڈور کی جانب سے آنے والی روشنی نے پوری کردی۔

اسی اثنا میں کوریڈور میں اٹھا پٹخ کی آوازیں پیدا ہونے لگیں۔ میں سمجھ گیا' برآمدے سے نکل کر کوریڈور کی جانب لپکنے والا بھگوڑا کسی سے ٹکرا گیا ہے اور قوی امکان اس بات کا تھا' یہ ٹکراؤ ڈاکٹر مونگ ریفو شے سے ہوا ہوگا۔ اب وہ بھگوڑا اپنے ہی کسی بھائی بند سے تو دھینگا مشتی کرنے سے رہا! میں فارغ تھا' لی یان عقبی حصے کی طرف گئی تھی۔ آ جا کر ایک ڈاکٹر مونگ ہی بچتا تھا۔ میں اس دشمن کو ڈاکٹر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بنگلے کے پہلو میں رہتے ہوئے عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

بنگلے کے پیچھے پائیں باغ تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے چند سیکنڈ لگے ہوں گے اور اس دوران میں' میں نے مزید دو افراد کی لاشیں دیکھ لیں۔ وہ ہمارے دشمن حملہ آوروں کی لاشیں تھیں۔ انہوں نے بھی اپنے چہروں کو مخصوص نقابوں کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ وہ دونوں یقیناً ڈاکٹر مونگ کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے تھے۔

پائیں باغ میں لی یان مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس کی طرف سے میں پہلے ہی تشویش میں مبتلا تھا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ میرے دماغ میں چکرا رہی تھی۔ پائیں باغ کو روشن کرنے والی لائٹس چکنا چور ہوگئی تھیں۔ میں اندازے کی بنیاد پر آگے بڑھنے لگا۔ جب میں عقبی برآمدے کے قریب پہنچا تو وہاں برآمدے کی سیڑھیوں میں مجھے ایک شخص پڑا ہوا ملا۔ وہ بھی دشمنوں کا ساتھی تھا اور اپنی زندگی کی بازی ہار بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے نقاب زدہ تھوبڑے پر ایک غصیلا ٹھڈا رسید کیا اور آگے قدم بڑھا دیئے۔ مجھے اس وقت بڑی شدت سے لی یان کی تلاش تھی جو کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

برآمد کے اختتام پر مجھے اپنے قدم روکنا پڑے۔ مجھے ایک نقاب پوش کی آدھی پشت دکھائی دی۔ بنگلے کے پہلو میں نصب کسی بلب کی تھوڑی سی روشنی وہاں پہنچ رہی تھی اور اسی روشنی میں' میں نے اس شخص کے سر پر نقاب چڑھا دیکھ لیا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے خبر تھا۔

میں نے اس کی بے خبری کا فائدہ اٹھایا اور دبے قدموں اس کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ وہ چپ چاپ وہاں کیوں کھڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے میری حیرت دور ہوگئی۔ نزدیک پہنچتے ہی میں نے اس کی سرگوشی سماعت کرلی۔ وہ دھیمے لہجے میں کسی سے بات کررہا تھا۔ اس کا مخاطب مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر جب میں نے ایک نسوانی سسکی کی آواز سنی تو سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔

وہ شخص یقیناً لی یان سے ''سرگوشیاں'' کررہا تھا۔ نسوانی سسکی میں شامل بے بسی سے مجھے اندازہ ہوگیا' گن اب لی یان کے ہاتھ میں نہیں رہی تھی ورنہ وہ اس شخص کے سامنے یوں مجبور نہ ہوتی۔

میں نے فوری ایکشن کا فیصلہ کیا اور اس شخص کے اتنا قریب آگیا کہ بہ آسانی اسے چھو سکوں پھر میں نے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر اس کے شانے پر دستک دی۔

وہ اس طرح اچھل کر پلٹا جیسے کسی بھیانک خواب سے چونک کر جاگ گیا ہو۔ میں نے آندھی طوفان کی رفتار سے اسے واپس بھیانک خواب میں دھکیل دیا۔ اس کا نقاب پوش چہرہ جیسے ہی میری جانب پھرا' میں نے اس کی ناک پر ایک اسٹریٹ پنچ جڑ دیا۔

اسٹریٹ پنچ کسی وزنی ہتھوڑے کے مانند کام کرتا ہے۔ یہ ہیمر پنچ بھی کہلاتا ہے۔ اگر یہی پنچ سر پر برسایا جائے تو ہیمر ہیڈ پنچ کہلاتا ہے۔ اپنی پوشیدہ ناک کو وہ میرے ظاہرہ کے سے سنکوانے کے بعد ذبح ہوتے ہوئے کسی جانور کی طرح بلبلایا اور لڑکھڑاتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گیا، گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ قدموں کی یہ لڑکھڑاہٹ اس کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی کیونکہ اسی لمحے لی یان کسی شیرنی کے مانند اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو کر ان کا تماشا دیکھنے لگا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، اس نقاب پوش نے گن کے زور پر لی یان کو وقتی طور پر بے بس کر رکھا تھا ورنہ وہ اس کے لیے سوا سیر سے کم نہیں تھی۔ لی یان نے دل کھول کر اپنی ہزیمت کا بدلہ چکایا اور ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں سے صرف تین منٹ کے اندر اس نقاب پوش دشمن حملہ آور کو لمبا لٹا دیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس زمین بوس شخص کا جائزہ لیا۔ وہ زندہ تھا مگر آنے والے دو تین گھنٹے تک وہ اٹھ کر اپنے قدموں پر چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر موجود ایک مخصوص نس کو بڑی تکنیک سے مسل کر اس کی انٹا غفیلی کو یقینی بنا دیا پھر کھڑے ہوتے ہوئے لی یان کو دیکھا۔

اس کا سینہ کسی لوہار کی دھونکنی کے مانند چل رہا تھا، سانس کی آمد و شد بتاتی تھی، اس وقت لی یان کے سینے میں کس قیامت کا زیر و بم پیدا ہو رہا تھا۔ اس طوفان کو محسوس کرنے کے لیے کسی خاص روشنی کی ضرورت نہیں تھی، اس قسم کے معاملات میں آنکھ روشنی کی محتاج نہیں رہتی!

میں نے ذہن کو جھٹکا اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''تم اس جنگلی کے ہتھے کس طرح چڑھ گئیں؟''

''بس اچانک ہی اس نے عقب میں پہنچ کر مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا'' وہ اپنے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی ''میں نے فائرنگ کر کے سامنے سے آنے والے بندے کو بے کار کر دیا تھا۔ اسی لمحے میں اس کی گرفت میں آ گئی۔ پتا نہیں، یہ مردود کہاں گھات لگائے کھڑا تھا۔'' اس نے نفرت انگیز نظر سے زمین پر پڑے مذکورہ شخص کی طرف دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اس کے حکم پر، میں گن پھینکنے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن اس خبیث نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ میرے بالوں کو بھی اپنی مٹھی میں جکڑ لیا پھر گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے وہ مجھے اس طرف لے گیا۔''

''وہ سرگوشیوں میں تمہیں کیا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا؟''

''وہی جو کوئی ندیدہ مرد، کسی عورت کو اپنے سامنے بے بس دیکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولی پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگی ''اندر کیا پوزیشن ہے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے زمین پر پڑے انٹا غفیل ندیدے مرد پر تبصرہ کرنا ضروری سمجھا ''یہ تو احمقوں کا سردار نکلا۔ اس بنگلے میں ہر سو موت کی سیل لگی ہوئی تھی اور یہ بے وقوف تمہارے حسن کی سوغات کے چکر میں تھا'' پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''بہرحال، اندر سب امن و امان ہے، آؤ میرے ساتھ۔''

وہ میرے قدم سے قدم ملاتے ہوئے بولی ''یہ تم نے میری تعریف کی ہے یا اس بدمعاش کی برائی کی؟''

میں لی یان کا اشارہ واضح طور پر سمجھ گیا۔ میں نے اس کے حسن اور ندیدے مرد کی حماقت کا ذکر کیا تھا۔ میں نے ذو معنی انداز میں کہا ''اگر اس مردود کی برائی کرتے ہوئے تمہاری تعریف کا کوئی پہلو نکلتا ہے تو اس میں کون سی غلط بات ہے؟''

''میں غلط اور صحیح کی بات نہیں کر رہی'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی، پھر پوچھنے لگی ''کیا میں واقعی حسین ہوں؟''

''اس میں کیا شک ہے؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

عموماً لڑکی چاہے واجبی سی شکل و صورت کی مالک کیوں نہ ہو لیکن وہ خود کو ملکہ حسن سمجھتی ہے اور ایک لی یان تھی، مستند حسین ہونے کے باوجود بھی اسے اپنی خوبصورتی کا یقین نہیں تھا اور یہی بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی، پھر اس نے میری الجھن کو دور کر دیا۔

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی ''شک تو کوئی نہیں مگر شون نے آج تک تمہاری طرح کھل کر میرے حسن کی تعریف نہیں کی!''

''وہ تمہارا شوہر ہے نا...... اس لئے......'' میں نے کہا۔

وہ چلتے چلتے رک گئی ''شوہر ہے تو؟''

''شوہر عام طور پر اپنی بیویوں کی تعریف نہیں کرتے۔''

''اوہ!'' وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔

میں نے کہا'' بہت کم شوہر ایسے ہوتے ہیں جو پیٹھ پیچھے اور سامنے بھی اپنی بیویوں کے گن گاتے نظر آتے ہیں...... جیسے بہت کم بیویاں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے شوہروں کے لیے اولاد پیدا کرنے سے خائف ہوتی ہیں!''

وہ میٹھی نظر سے مجھے گھور کر رہ گئی۔

اسی لمحے سامنے سے ڈاکٹر موگنگ آتا دکھائی دیا۔ اس کی صورت پر گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر ہم بھی انتہائی سنجیدہ ہوگئے۔ اس بنگلے میں پچھلے دس پندرہ منٹ میں جو کچھ ہو چکا تھا، اس میں ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا تھا۔ میں تو لی یان کی کوفت کو دور کرنے کے لئے وہ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ ورنہ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کا موقع نہیں تھا۔

''ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنا ہوگا'' ڈاکٹر موگنگ نے ہمیں صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کی سانس لی'' آؤ میرے ساتھ''

ہم نے خاموشی سے ڈاکٹر کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

وہ ہمیں لیتے ہوئے بنگلے کے ایک دور افتادہ کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ اس نے کوئی نمبر ڈائل کیا پھر رابطہ ہونے پر اس نے مختصر الفاظ میں یہاں کی صورتِ حال سے کسی کو آگاہ کیا اور آخر میں کہا'' میں یہاں سے نکل رہا ہوں۔ تم یہاں کے معاملات کو اپنے طور پر ہینڈل کرنے کی کوشش کرنا۔ کیا تم کر لوگے؟''

پھر وہ پوری توجہ سے دوسری طرف بولنے والے کی بات سنتا رہا اور بولا'' ٹھیک ہے، تم جو چاہے کہانی گھڑ لو، بس ایک بات کا خیال رکھنا، یہاں جو کچھ ہوا ہے، میری غیر موجودگی میں ہوا ہے۔ تم دو پارٹیوں کا آپس میں ٹکراؤ بھی بیان کر سکتے ہو، ویسے پولیس والے تمہاری بھی مانتے ہیں اور یہاں تو ان کے اپنے دو آدمی بھی مارے گئے ہیں ......اور سب سے بڑی بات یہ کہ آج دن میں بھی مجھ پر ایک ایسا ہی قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے، میرا خیال ہے، تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی'' اس نے ایک مرتبہ پھر دوسری طرف کی بات سنی اور حتمی لہجے میں بولا'' میں تم سے بعد میں رابطہ کروں گا'' اتنا کہتے ہی ڈاکٹر موگنگ نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ بولا'' میں نے جانوس کو فون کیا ہے۔ وہ یہاں کے حالات کو کنٹرول کر لے گا۔ ہمیں فوری طور پر بستی کی طرف روانہ ہو جانا چاہئے۔ اگر مزید کچھ دیر یہاں رک گئے تو خواہ مخواہ کی پولیس کارروائی میں وقت برباد ہوگا اور اس بات کا بھی امکان ہے...... ہم پر کوئی تیسرا قاتلانہ حملہ بھی ہو جائے، دو مرتبہ کی ناکامی کے بعد ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمیں منظر سے ہٹ جانا ہوگا''

وہ میری ساحل کی طرف روانہ ہونے کی بات کر رہا تھا، میں بھلا کیسے انکار کر دیتا۔ آئندہ پانچ منٹ میں ہم نے اپنا بیگ تیار کر لیا پھر ڈاکٹر موگنگ کی ہدایت پر ایک کمرے میں پہنچ گئے

ڈاکٹر نے کہا'' ہم یہاں سے دوسرے بنگلے میں داخل ہوں گے پھر جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو جائیں گے۔ ہم روانگی کے وقت سے پندرہ بیس منٹ لیٹ ہو چکے ہیں''

میں ڈاکٹر کی بات سن کر چونک اٹھا اور پوچھا'' اس کمرے سے دوسرے بنگلے میں کیسے داخل ہوں گے؟''

''ایسے'' وہ کمرے کے ایک کونے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا'' دیکھتے جاؤ''

میں دیکھتا گیا بلکہ میرے ساتھ ساتھ لی یان بھی دیکھتی چلی گئی۔

ڈاکٹر نے کمرے کے مذکورہ کونے سے قالین کو اٹھایا تو نیچے پختہ فرش کے بجائے لکڑی کا تختہ نظر آیا۔ یہ تختہ تین بائی تین فٹ کے سائز کا تھا۔ کمرے کے فرش میں یہ ایک خاص قسم کی تبدیلی تھی جس طرف کسی کا دھیان نہیں جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے مخصوص تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے مذکورہ چوبی تختے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا۔ یہ ایسا ہی عمل تھا جیسے کسی گٹر کا ڈھکنا اٹھایا جاتا ہے۔

وہ ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں بولا'' میں اس کے اندر اتر رہا ہوں۔ تم بھی باری باری میرے پیچھے آ جاؤ''

پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس خلا میں غائب ہو گیا جو تختہ اٹھ جانے سے پیدا ہوا تھا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھا اور کہا'' پہلے تم اس گڑھے میں اترو۔ تمہارے بعد میں اتروں گا ''

لی یان کو یہ ہدایت دینے سے پہلے میں اس خلا میں اچھی طرح جھانک کر اپنا اطمینان کر چکا تھا۔ ویسے مستند تھا ڈاکٹر موگنگ کا فرمایا ہوا۔ وہ ایک قابلِ اعتماد اور تجربہ کار شخص تھا۔ میں اس کی بات پر یقین کر سکتا تھا۔ وہ تہ دل سے ہماری مدد کر رہا تھا اور وہ بھی ایک ذمے دار بزرگ کے مانند۔

لی یان نے کسی فرمانبردار بچے کی طرح میرے حکم کی تعمیل کی اور گڑھے کی جانب بڑھ گئی۔ میں دیکھ چکا تھا، اس خلا کے اندر اترنے کے لیے باقاعدہ زینہ بنا ہوا تھا، لی یان کے بعد میں نے بیگ سنبھالا اور خلا میں قدم ڈال دیا۔ وہ لگ بھگ

دس اسٹیپ کا زینہ تھا۔ میں بآہستگی ایک ایک اسٹیپ طے کر کے نیچے پہنچ گیا جہاں لی یان اور ڈاکٹر موگنگ موجود تھے۔ وہ ایک تنگ سی راہداری تھی۔

یہاں پر ایک بلب روشن تھا۔ ڈاکٹر نے کہا'' تم ایک منٹ کے لیے رکو میں اس راستے کے داخلی حصے کو صحیح کر کے آتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اس زینے کی جانب بڑھ گیا جس کے ذریعے ہم اس راہداری میں پہنچے تھے۔ میں سمجھ گیا، داخلی حصے کو صحیح کرنے سے اس کی مراد یہی تھی کہ وہ اس راستے کو بالکل ویسا ہی کر دے گا جیسا وہ پہلے تھا تاکہ اوپر کمرے میں آنے والے کسی شخص کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ وہاں کوئی چور راستہ بھی موجود ہے۔ یہ دونوں بنگلے جانوس کی خفیہ جائداد میں شمار ہوتے تھے۔ وہ یقیناً اس پُر اسرار راستے کے راز سے واقف ہوگا۔

تین منٹ بعد ڈاکٹر موگنگ ایک مرتبہ پھر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم اس کی معیت میں اس تنگ سی راہداری میں آگے بڑھنے لگے۔ میں نے گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ڈاکٹر جس بنگلے کو ہم خیرباد کہہ آئے ہیں اس میں چودہ پندرہ افراد خاک وخون میں نہائے پڑے ہیں جن میں ہمارے تین افراد کی لاشیں بھی شامل ہیں، جانوس کو یہ گمبھیر صورتِ حالات سنبھالنے میں دشواری تو پیش نہیں آئے گی؟''

میں نے جن چودہ پندرہ افراد کا ذکر کیا ان میں چھ شدید زخمی اور نو کے قریب لاشوں میں بدل چکے تھے، چندر اور دونوں سادہ لباس پولیس والے بھی لاشوں کی قطار میں تھے۔ دس پندرہ منٹ کے اندر اس بنگلے میں اچھی خاصی خونریزی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے میرے سوال کے جواب میں بتایا'' جانوس ایسی سچویشن سے نمٹنے کا ماہر ہے۔ میرا خیال ہے، وہ بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو نمٹا لے گا، لارڈ بدھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم تینوں بالکل محفوظ ہیں۔''

وہ ایک کھلی حقیقت بیان کر رہا تھا۔ واقعی' یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس مختصر سے معرکے میں ہمیں کسی قسم کا جانی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ میں نے ڈاکٹر موگنگ سے دریافت کیا۔

''فائرنگ کی آواز سننے کے بعد تم کمرے سے نکلے تو ایسے غائب ہوئے کہ پھر پلٹ کر نظر نہیں آئے۔ میں نے تمہیں اس معرکے کے اختتام پر دوبارہ کوریڈور میں دیکھا جب تم ہمیں تلاش کرتے ہوئے ادھر آ نکلے تھے۔ اس تمام عرصے میں تم کیا کرتے پھرے؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا'' ہم دونوں ایک ہی نوعیت کے کام میں مصروف تھے' بس فرق صرف اتنا ہے کہ میں نے یہ کام نہایت ہی خاموشی سے انجام دیا اور تم نے کافی ''ہلا گلا'' مچایا ہے۔ میں نے اس کمرے میں اور اس کے سامنے والی راہداری میں تمہارے کارنامے کے نتائج ملاحظہ کیے ہیں' تمہیں بھی میری خاموش کارکردگی دکھائی دی ہوگی۔''

''بالکل دکھائی دی ہے۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا پھر ڈاکٹر موگنگ کو لی یان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتانے لگا۔

پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا'' لی یان کے لیے یہ ایک بڑا محاذ ہے۔ اس سے پہلے یہ چھوٹے موٹے مشن میں کام کر چکی ہے۔ مجھے امید ہے' اس مشن میں اسے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا' اس کا تجربہ بلوغت کے زینے پر قدم رکھ دے گا۔''

اس دوران میں لی یان بالکل خاموش ہمارے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ لی یان ڈاکٹر کا بے حد احترام کرتی تھی اور اس کی موجودگی میں وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھی اور اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی۔

لی یان اور اس کا شوہر نامدار شون، مسٹر ونگ ہنگ کے لیے کام کرتے تھے اور ڈاکٹر موگنگ' ونگ ہنگ کا بڑا تھا۔ وہ دونوں ہنگ کے ساتھ تو بے تکلف دوستوں کی طرح رہتے تھے مگر موگنگ کے ساتھ ایسا رویہ نہیں اختیار کر سکتے تھے۔ وہ ایک طرح سے ان کے باس کا بھی باس تھا' لی یان کو پہلی مرتبہ ڈاکٹر موگنگ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے بھی وہ کچھ زیادہ ہی محتاط اور سنجیدہ نظر آتی تھی۔

ہم اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے ایک زینہ طے کر کے دوسرے بنگلے کے کسی کمرے میں نمودار ہو جاتے۔ جو عمل اس بنگلے کے کمرے سے تہ خانے میں اترنے کے لیے کیا گیا تھا وہی عمل ایک مرتبہ پھر واپسی کے رخ پر اختیار کیا گیا اور ہم زیرِ زمین خفیہ راستہ استعمال کر کے بہ آسانی دوسرے بنگلے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس بنگلے کے ایک کمرے میں نمودار ہونے کے بعد ڈاکٹر موگنگ نے اس خفیہ راستے کے آثار کو قالین کے نیچے چھپا دیا اور ہم جیپ میں آ بیٹھے۔

جیپ بنگلے سے باہر نکلی تو ہم نے اس کے گیٹ کو ویسے ہی لاک کر دیا جیسے وہ پہلے تھا پھر ہم وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اس وقت میری گھڑی رات کے نو بجکر پچیس کا اعلان کر رہی تھی۔ یہ

.... اعلان ان کانٹوں کی زبانی تھا جو گھڑی کے ڈائل پر اپنی مخصوص حرکات سے وقت بتانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس حساب سے ہم پورے پچیس منٹ لیٹ تھے۔

ڈاکٹر مونگ نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ میں لی یان کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہماری سیٹ کے پیچھے بھی ایک تنگ سا خلا موجود تھا جس میں پیٹرول کے دو بڑے کین رکھے تھے جو اپنے اسٹینڈ میں فکس تھے۔ خلا کے دوسرے کونے میں ہمارا بیگ پڑا تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے اپنے ضروری سامان اور جس اسلحے کا ذکر کیا تھا' وہ جیپ میں مجھے دکھائی نہیں دیا۔ یقیناً یہ چیزیں اس نے جیپ کے کسی خفیہ گوشے میں محفوظ کر رکھی ہوں گی۔

ہماری جیپ گلی سے نکلی اور رتنا پارک کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس وقت تک جانوس یا کوئی اور اس ہنگامہ پرور بنگلے تک نہیں پہنچا تھا اور یہ ہمارے لیے ایک اطمینان بخش بات تھی۔ کسی کو ہماری روانگی کی خبر نہیں ہوسکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہماری جیپ رنگ روڈ پر نکل آئی۔ رنگ روڈ (RING ROAD) کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سڑک نے پورے کھٹمنڈو کو اپنی آغوش میں سمیٹ رکھا ہے۔ کھٹمنڈو میں کہیں سے بھی داخل ہوں یا اس شہر سے خارج ہوں' کہیں نہ کہیں رنگ روڈ سے ضرور واسطہ پڑ جاتا ہے۔ یہ پورے شہر کے لیے ایک بائی پاس کا کام کرتی ہے۔

ہم نے رنگ روڈ کو چھوڑا اور ہائی وے پر نکل آئے پھر ہم کھٹمنڈو شہر کے آثار کو اپنے پیچھے چھوڑتے چلے گئے۔ ہائی وے ایک طرح سے ویران ہی پڑی تھی۔ یخ بستہ موسم نے اس کی خاموشی اور سناٹے میں اضافہ کر رکھا تھا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے ہمیں رفتار بڑھانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی مگر دس پندرہ منٹ بعد احتیاطاً ہمیں رفتار کم کرنا پڑی۔

ڈاکٹر مونگ نے بتایا ''کھٹمنڈو کی حدود میں ہائی وے بڑی ہموار اور کشادہ ہے مگر اب وہ پہلے سی بات نہیں رہی لہٰذا ہمیں محتاط رہ کر آگے بڑھنا ہوگا۔''

میں اس ہائی وے پر سفر کر چکا تھا اور اس راستے کے نشیب و فراز سے بخوبی آگاہ تھا اس لیے ڈاکٹر مونگ کے اظہار پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گفتگو کو ساحل کی طرف موڑ دیا۔ میں نے ڈاکٹر سے استفسار کیا۔

''ڈاکٹر! آخری مرتبہ تمہیں کب اطلاع ملی کہ وہاں بستی میں سب ٹھیک ہے؟''

اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا

''لگ بھگ شام چھ بجے۔''

''کاش کوئی ایسا ذریعہ بھی ہوتا کہ ہم اپنی مرضی سے وہاں رابطہ کر سکتے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا ''تاکہ وہاں کی پل پل کی خبر ہمیں ملتی رہتی۔''

ڈاکٹر بڑی اچھی طرح سمجھ رہا تھا' میرے استفسار میں اتنی بے تابی کیوں ہے۔ اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''میں تمہیں بتا چکا ہوں اور تم خود بھی اس بستی کو دیکھ چکے ہو کہ وہاں کی کیا صورتِ حال ہے۔ بمشکل پچاس گھروں پر مشتمل اس بستی میں تمام ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہیں' ٹیلی فون کی سہولت ایک دو جگہ پر ہے۔ اسی لیے میں ازخود شاکا سے رابطہ نہیں کر پاتا۔ وہ خود ہی کسی کال آفس سے مجھے فون کرتا ہے۔ تمہاری ساتھی کو اس بستی میں منتقل کیے زیادہ وقت نہیں ہوا۔ اس دوران میں شاکا مجھے اس کی خیریت سے تین مرتبہ آگاہ کر چکا ہے اور میں وہاں کے حالات سے مطمئن ہوں۔''

وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''آج شام چھ بجے جب شاکا سے میری بات ہوئی تو میں نے اسے بتا دیا تھا' رات دس بجے تک ہم اس کے پاس پہنچ جائیں گے۔ ویسے تم خود بھی تو وہاں کی خبر لے سکتے ہو۔''

ڈاکٹر مونگ نے آخری جملہ بڑے ڈھکے چھپے انداز میں ادا کیا تھا اور یہ اس نے اچھا ہی کیا۔ لی یان میری جی اور تھرڈ آئی والی صلاحیت سے واقف نہیں تھی۔ ڈاکٹر اگر کھل کر بات کرتا تو پھر جلد یا بدیر مجھے لی یان کے ڈھیروں سوالات کے جوابات دینا پڑتے۔ ہوسکتا ہے' ڈاکٹر مونگ کی معیت میں وہ خاموشی اختیار کیے رہتی لیکن جیسے ہی اسے تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کا موقع ملتا' وہ میرا دماغ چاٹنے کی ضرور کوشش کرتی۔

مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ حساس اور متجسس ہوتی ہیں اسی لیے ان کی جذباتیت کا گراف بھی قدرے اونچا ہوتا ہے اور اگر معاملہ کسی مرد کا ہو تو ان کا تجسس آسمان کو چھونے لگتا ہے۔ اگر لی یان کو میری خفیہ صلاحیتوں کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ تفصیل جانے بغیر پُرسکون نہیں ہوسکتی تھی۔ میں فی الحال اسے جی اور تھرڈ آئی کے معاملات سے بے خبر ہی رکھنا چاہتا تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔ انسان کا اختیار صرف تدبیر تک محدود ہے' تقدیر کا مالک کوئی اور ہی ہے اور وہ تقدیر رقم کرنے کے سلسلے میں کسی سے مشورہ یا رائے لینے کا پابند ہے؟ اور نہ ہی محتاج!

میں نے بھی مبہم انداز میں ڈاکٹر مونگ سے کہا ''کاش!

میں وہاں کی خبر لے سکتا۔ اس شاطر ربی نے میرے راستے میں اپنے کسی عمل کی دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔ میں اس دیوار سے سر ٹکرا کر رہ جاتا ہوں۔ پتا نہیں' یہ مجبوری کب تک میری کوشش کی راہ میں حائل رہے گی!''

میری سوچ میں ایک نامعلوم سی مایوسی در آئی۔ ڈاکٹر نے میری کیفیت کو سمجھتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

''دل چھوٹا نہ کرو۔ میں نے تمہاری ساتھی کا علاج شروع کر دیا ہے۔ اگر لارڈ بدھا نے مہربانی کی تو وہ بہت جلد صحت یاب ہوجائے گی۔ اسے بنیادی طور پر کوئی بیماری نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ربی موشے ہائمن نے ہپناٹزم کے مختلف سیشن میں اس کے دماغ کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے' وہ اپنے ذہن میں ربی کے لیے بہت احترام اور اطاعت مندی کی گنجائش رکھتی ہے اور جہاں تک تمہاری ناکامی کا تعلق ہے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھتا ہوں' ربی نے اپنے کسی عمل سے تمہاری ساتھی کے گرد ایک طلسمی حصار سا قائم کر دیا ہے جو تمہارے راستے کی رکاوٹ بن کر سامنے آ رہا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' میں اس حصار کی کاٹ میں لگا ہوا ہوں۔ لارڈ بدھا مجھے جلد ہی کامیابی دے گا!''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے!'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا پھر میں نے کسیلے لہجے میں کہا ''اس مکار ربی نے اپنے گرد بھی ایسا ہی حصار کھینچ رکھا ہے جیسا تم بتا رہے ہو۔ ان دونوں محاذوں پر میں مسلسل ناکامی کا منہ دیکھ رہا ہوں۔''

''فکر نہ کرو' آدھے پونے گھنٹے بعد تم اپنی ساحل کا منہ دیکھنے والے ہو۔'' ڈاکٹر مونگ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا ''پھر تمہاری ساری تھکن' مایوسی اور کلفت دور ہوجائے گی۔''

میں نے ڈاکٹر مونگ کی اس خوش خبری کے جواب میں کچھ نہ کہا اور آنکھیں بند کر کے ساحل کے تصور میں کھو گیا۔ اس کا تصور بڑا سہانا' بڑا مستانہ تھا۔ یہ مستانہ تصور مجھے دیوانہ بنا دیتا تھا۔ انسان کو جس شے کی شدت سے طلب ہو' اس کے حصول کے آثار پیدا ہوجائیں تو اس کی حالت دیدنی ہوتی ہے۔ اسے یقین نہیں آتا کہ وہ اپنے کسی دیرینہ مقصد کو پانے والا ہے۔ میں بھی اسی بے یقینی کا شکار تھا اور اس میں میرا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ میں ایسا سوچنے اور محسوس کرنے کے لیے لاشعوری طور پر مجبور تھا۔

ساحل کو مجھ سے بچھڑے اب اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا۔ اس دوران میں بارہا ایسے مواقع بھی آئے کہ مجھے یوں محسوس ہوا' ساحل مجھ سے ایک ہاتھ کی دوری پر ہے۔ میں ہاتھ بڑھاؤں گا اور وہ میری دسترس میں ہوگی لیکن میرا یہ احساس سراب ثابت ہوا۔ شاید اس لیے بھی میں بے یقینی کا شکار تھا۔

میں نے اس کی تلاش میں کیا کیا نہیں کیا تھا۔ خود تو جو صدمات اٹھائے تھے وہ اپنی جگہ مسلم تھے لیکن اس کے جواب میں' میں نے دشمنوں کے دانت بھی کھٹے کیے تھے' یہ الگ بات کہ اس راہ میں میرے دشمن بدلتے رہے' شیطان مختلف روپ دھار کر میرے مقابل ڈٹا رہا۔ وہ چوہدری نوازش علی ہو' شعیب غوری ہو یا پھر ربی موشے ہائمن...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ان سب کرداروں کا ایک ہی مقصد تھا' ساحل کو مجھ سے جدا کرنا۔ چاہے وہ کسی بھی سبب میری رگ جاں کو مجھ سے الگ کر رہے ہوں...... اور ان میں ربی موشے ہائمن میرا سب سے زیادہ خطرناک اور طاقت ور دشمن تھا اور حقیقی معنوں میں' میں نے سب سے زیادہ نقصان بھی اسی شخص کو پہنچایا تھا۔ امریکا میں تو مجھے ''پاکستانی دہشت گرد'' اور ''امریکا دشمن'' جیسے ٹائٹل سے نوازا جا چکا تھا۔ میں نے ربی کے درجنوں آدمیوں کی لاشیں گرائی تھیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری و ساری تھا۔ میں امریکا میں ہوں یا نیپال میں' اس وقت میری موشے ہائمن ہی سے ٹھنی ہوئی تھی...... میں نہیں جانتا تھا' ہمارے درمیان یہ جنگ کب تک جاری رہے گی۔ میں ساحل کے حصول کی خاطر اس سے ٹکرا رہا تھا اور اب میری ساحل اس کے قبضے سے نکل کر میرے ایک انتہائی ہمدرد کی پناہ میں آ چکی تھی۔ میں ڈاکٹر مونگ کے اس عظیم احسان کو زندگی بھر بھول نہیں سکتا تھا۔

ساحل کا تصور میرے رگ و پے میں ایک گدگدی سی مچا دیتا۔ دل میں ایک ترنگ' ایک امنگ سی کروٹ لینے لگتی۔ میرے احساسات اس کی خوشبو سے جگمگانے لگتے اور میں اپنے تن بدن میں ایک کیف سا دوڑتا ہوا محسوس کرتا۔ ساحل کا خیال میری روح کی سرشاری کا باعث تھا۔ درجنوں بار کی ناکامی کے بعد بھی اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کو جی مچل جاتا۔ کیا پتا' اس مرتبہ کامیابی قدم چوم لے...... کیا پتا!

میں نے تیسری آنکھ کے سامنے ساحل کے نقوش کو ابھارا اور اپنی تمام تر باطنی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی' پھر میری یہ کوشش ایک بار تک محدود نہ رہی' میں نے متعدد مرتبہ ساحل

کے ماحول کو چھونا چاہا مگر ہر دفعہ میرے تصور کے پر جل کر رہ گئے۔ میں اپنی جانِ تمنا کے ماحول میں داخل نہ ہوسکا۔ مایوس ہوکر میں نے یہ کوشش ترک کردی اور آنکھیں کھول کر جیپ میں حاضر ہوگیا۔

ڈاکٹر مونگ میری اس ''کارروائی'' کو عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ میری ناکامی اس سے چھپی نہ رہی۔ میرے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے اسے بہت کچھ بتادیا تھا۔ تاہم وہ خاموش رہا۔ میں اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی لی یان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

لی یان کافی دیر سے خاموش تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو اسے غنودگی کی حالت میں پایا۔ وہ ایک طرح سے مجھ پر لدی ہوئی تھی۔ اس کے بدن کے بوجھ ہی نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ سونے کا وقت نہیں تھا حالانکہ اس نے اور ڈاکٹر مونگ نے کافی بھی پی تھی۔ میں لی یان کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہی سمجھا کہ آج صبح سے رات تک ہونے والی معرکہ آرائی نے اسے بری طرح تھکادیا ہے' شاید اسی سبب وہ نیند کی آغوش میں سر ڈالنے کو مچل رہی ہے۔

میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا تاکہ وہ سیدھی ہوکر آرام سے لیٹ جائے مگر اس نے تھپتھپاہٹ کے جواب میں آنکھیں نہیں کھولیں اور مزید میرے اوپر گرتی چلی گئی۔ اسے گرنے سے بچانے کے لیے مجبوراً مجھے گھٹنے کا سہارا لینا پڑا۔ میں نے ایک ٹانگ کو ذرا سا اوپر اٹھایا اور گھٹنے پر اس کا سر ٹکا دیا۔ اسی لمحے اس کی گردن ڈھلک گئی اور وہ منہ کے بل میری ران پر آرہی۔ اب ٹانگ کو واپس اس کی جگہ پہنچانے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا۔ میں اس عمل سے گزرا تو وہ میری ران کو تکیہ بنائے بڑے مزے سے سو رہی تھی۔ اس کی تراشیدہ نرم و ملائم زلفوں نے میری ران پر پوری طرح قبضہ جمالیا۔

''پتا نہیں' اسے کیا ہوگیا ہے؟'' میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

ڈاکٹر مونگ کی آواز ابھری ''بے چاری تھک گئی ہے۔ آج اس نے حد سے زیادہ مشقت کی ہے۔''

''تھک گئی ہے تو آرام سے سو جائے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''بے چاری سو تو رہی ہے' اور کیسے سوئے گی؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''میں چاہتا ہوں' یہ پوری سیٹ پر آرام سے ٹانگیں پسار کر سو جائے۔ میں تمہارے برابر میں اگلی سیٹ پر آجاتا ہوں لیکن لگتا ہے' یہ میری سننے کی پوزیشن میں نہیں رہی۔''

''ہاں لگ تو مجھے بھی یہی رہا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا پھر اچانک پوچھا ''کیا تمہیں اس کے سر کا بوجھ ناگوار محسوس ہو رہا ہے؟''

''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''پھر خوامخواہ اس کی نیند کیوں خراب کرتے ہو۔ ایسے ہی لیٹے رہنے دو۔''

میں نے ڈاکٹر مونگ سے کوئی بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور کھسک کر سیٹ کے آخری کنارے پر پہنچ گیا۔ اس طرح اس سیٹ پر لی یان کے لیے زیادہ گنجائش نکل آئی۔ میں نے اس کے آرام کی خاطر آگے جھک کر اس کی ٹانگوں کو سمیٹا اور اٹھا کر سیٹ پر پھیلادیں۔ وہ تھوڑا سا کسمسائی اور کروٹ بدل کر اپنے منہ کو میرے پیٹ سے لگادیا۔ اس کی گرم سانس میرے پیٹ کے زیریں حصے کو ٹکورنے لگی۔ کروٹ بدلنے کے دوران میں اس نے اپنی ٹانگیں بھی فولڈ کرلی تھیں۔ اب وہ گھٹنے اپنے پیٹ میں دبائے اور منہ میرے پیٹ سے لگائے بڑے مزے سے سو رہی تھی۔

میں چند لمحات تک خوابیدہ حسن کو دیکھتا رہا۔ چست جینز نے اس کے جسمانی خطوط کو خاصا نمایاں کردیا تھا۔ وہ نیپال کی ایک سرد ترین رات تھی اور جیپ کے اندر بھی خوشگوار خنکی موجود تھی' اس کے باوجود بھی مجھے اپنے بدن پر پسینہ سا رینگتا محسوس ہوا۔ وہ بڑے آزمائشی لمحات تھے۔ میری دسترس میں مجسم خوابیدہ فلپائنی حسن پناہ گزیں تھا۔ پناہ دینے والا کبھی امانت میں خیانت نہیں کرتا۔ لی یان میرے پاس شون کی امانت تھی۔ میں نے نیوجرسی سے روانہ ہوتے وقت شون سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس کی بیوی کا خیال رکھوں گا...... اور میں نے اس کا خیال رکھا ہوا تھا۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں تو میں نے ڈاکٹر مونگ کو مخاطب کرلیا ''تھکن اپنی جگہ لیکن لی یان کی یہ اچانک نیند میری سمجھ سے باہر ہے حالانکہ آپ دونوں نے تو کافی بھی پی تھی۔ آپ لوگوں کو مجھ سے زیادہ ہشاش بشاش ہونا چاہیے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ''رات کے کھانے سے پہلے تک تو لی یان بہت ایکٹیو تھی۔ ہم نے رتنا پارک میں اچھی خاصی ایکسر سائز بھی کی تھی۔ پتا نہیں اب اسے کیا ہوگیا ہے!''

''تم اس وقت جھنجلائے ہوئے ہو اس لیے لی یان کی

نیند کو ایشو بنا رہے ہو۔'' ڈاکٹر مونگ نے آئینے میں مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں اس کا اشارہ بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ ساحل کے ماحول تک رسائی میں ناکامی پر میری جھنجلاہٹ کا ذکر کر رہا تھا ''میں سمجھتا ہوں' تھکن نے اسے بے حال کردیا ہے۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں برداشت کی قوت کم ہوتی ہے۔ اسی لیے انہیں صنفِ نازک کہا جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''ڈاکٹر مونگ! تم چاہے کچھ بھی ہو' میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا مگر میں محسوس کر رہا ہوں' ہم نے جو ڈنر کیا ہے اس میں کوئی گڑبڑ تھی!''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے کہا ''تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو' میں کس طرف اشارہ کر رہا ہوں۔''

وہ ٹٹولنے والے انداز میں مستفسر ہوا ''کیا تم بھی اپنے اندر کوئی گڑبڑ محسوس کر رہے ہو؟''

اس کا استفسار یہ ظاہر کرتا تھا' وہ میرے اشارے کی تہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے جواب میں بتایا ''ہاں' میں بھی اپنے اعصاب اور عضلات میں کافی اضمحلال محسوس کر رہا ہوں۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھر رہی ہے کہ لمبی تان کر سو جاؤں۔''

''تم عجیب بات کر رہے ہو وجدان!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''ہم تینوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا ہے۔ اگر اس کھانے میں کوئی ایسی ویسی شے ملی ہوتی تو تمہاری طرح میں بھی......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اسی وقت اس نے ایک طویل جماہی لی تھی۔ میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''ڈاکٹر! تمہیں ماننا پڑے گا' ہم تینوں کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوچکی ہے ورنہ رات کے پہلے ہی پہر تمہاری یہ طویل جماہی کیا معنی رکھتی ہے؟''

''میں اب اپنی آنکھوں میں جلن سی بھی محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ بوجھل آواز میں بولا۔

میں نے کہا ''مجھے بھی نیند آرہی ہے۔''

''میں تمہارے خدشے پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں وجدان۔'' ڈاکٹر نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین ہو چلا ہے' رات کے کھانے میں کوئی بھی نشہ آور اور اعصاب کو مضمحل کرنے والی شے ضرور ملی ہوئی تھی۔'' میں نے پُر وثوق انداز میں کہا۔

ڈاکٹر کے لہجے سے گہری پریشانی جھلکنے لگی۔ متذبذب انداز میں بولا ''مگر یہ کیونکر ہوسکتا ہے!''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔

وہ بولا ''رات کا کھانا میں خود باہر سے لے کر آیا تھا۔ فاسٹ فوڈ میں خاص طور پر ہمارے لیے کوئی ملاوٹ کیوں کرے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔''

''تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ پولیس والوں کے لیے چندر بھی کھانا لے کر آیا تھا۔'' میں نے اس کی توجہ چندر کی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا ''اسی کھانے کا کچھ حصہ ہماری ٹیبل پر بھی پہنچا تھا اور......'' میں سوچنے والے انداز میں ذرا دیر کو رکا پھر بھاری آواز میں بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اور...... اگر ان دونوں کھانوں میں پہلے سے کچھ نہ بھی ملا ہوا ہو تو سرد کرتے وقت تو ملایا جا سکتا ہے نا؟''

''تم بہت خطرناک باتیں کر رہے ہو وجدان!'' وہ گمبھیر آواز میں بولا ''کھانا میرے بااعتماد ملازم چندر نے سرد کیا تھا۔ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو، چندر نے کھانے میں کسی اعصاب کشیدہ شے کی ملاوٹ کردی ہوگی؟''

''ایسا ہونا ناممکن تو نہیں ڈاکٹر مونگ!''

''لیکن چندر بھروسے کا آدمی ہے!''

''کس کے بھروسے کا؟'' میں نے چبھتے ہوئے کہا ''تمہیں کھٹمنڈو میں ڈیرا ڈالے ابھی چند روز ہوئے ہیں۔ کیا تم چندر کو بھی سینٹل سے اپنے ساتھ لے کر آئے تھے؟''

''چندر، جانوس کا برسوں کا آزمایا ہوا ہے۔''

''جانوس...... اونہہ!'' لامحالہ میرے لہجے میں ترشی در آئی۔

میرے انداز نے ڈاکٹر مونگ کو گہری تشویش میں مبتلا کردیا، الجھن زدہ لہجے میں بولا ''جانوس کی نیت پر شک کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور...... جانوس کے لیے چندر ایک قابلِ بھروسا جاں نثار ہے۔''

میں نے قدرے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ''ڈاکٹر! تم مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہو۔ جرائم کی دنیا میں وفاداریاں بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ عین ممکن ہے، چندر ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں بک گیا ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں نے کہا ''تم رتنا پارک والے جس بنگلے پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں تم پر دو مرتبہ قاتلانہ حملہ ہوا۔ پہلی بار تم نے چار انتہائی خطرناک فائٹرز کو دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کردیا۔ دوسری دفعہ درجن بھر مسلح افراد نے شب خون مارا۔ ہماری خوش قسمتی کہ ہم زندہ ہیں اور وہ حملہ آور عبرت ناک انجام سے دوچار

ہو چکے ہیں۔''

میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے مزید کہا ''اگر میری تھیوری کے مطابق سوچا جائے تو چندر ہمارے دشمنوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا تھا۔ تمہیں نہایت ہی رازداری کے ساتھ سٹی اسپتال سے رتنا پارک کے اس بنگلے پر منتقل کیا گیا۔ یہ راز جانوس، انسپکٹر شیوا اور چندر کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں تھا۔ ذرا سوچو، چار مشاق فائٹرز کیونکر تمہارا سراغ لگانے میں کامیاب ہوئے، یقیناً چندر نے اپنے نئے آقاؤں کو اس بارے میں بتایا ہوگا۔ انہوں نے تم سے نمٹنے کے لیے مارشل آرٹس کے بہترین ماہرین کو بھیجا۔ ان کی بدقسمتی کہ وہ منہ کی کھا کر یہاں سے بھاگنے پر مجبور ہوگئے۔ اس کے بعد مسلح افراد کی ایک بھاری جمعیت کو روانہ کیا گیا جو بے دریغ فائرنگ کرتے ہوئے اس بنگلے کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتے تھے'' میں نے ذرا دیر کو رک کر سانس درست کی پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس مرتبہ انہوں نے پولیس والوں سمیت چندر کو بھی گولیوں سے بھون ڈالا تاکہ ثبوت کے طور پر نہ رہے بانس اور بعد میں نہ بجے بانسری۔ حملہ آوروں کو یقین تھا کہ کھانے میں ملی ہوئی نشہ آور دوائی کے باعث ہم خاصے کمزور ہو چکے ہوں گے لہٰذا انہیں مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ بڑی آسانی سے ہمیں خاک وخون میں نہلا کر چلتے بنیں گے لیکن ہماری مضبوط اعصابی ان کے لیے غلط فہمی بن گئی۔ ہم نے پوری طرح ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور اپنے بجائے انہیں خاک وخون کا تحفہ دیا مگر...... یہ مضبوط اعصابی کب تک چلے گی۔ لی یان تقریباً بے ہوش پڑی ہے اور ہم دونوں بھی غنودگی کی طرف جا رہے ہیں۔ میرا مشورہ ہے ڈاکٹر، جیپ کی رفتار قدرے کم کردو۔ اس اونچے نیچے پہاڑی راستے پر سفر کرتے ہوئے اگر اسٹیئرنگ پر تمہارے ہاتھ بہک گئے تو ہم بیٹھے بٹھائے موت کی آغوش میں پہنچ جائیں گے۔ موت کو تھپک تھپک کر سلانا خوب آتا ہے!''

''میں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی رفتار کافی کم کردی ہے'' ڈاکٹر نے انکشاف کیا۔

میرے لیے یہ اس صورت انکشاف تھا کہ رفتار کی کمی کو میں محسوس نہیں کرسکا تھا۔ اس کا مطلب تھا، مجھ پر ''ڈرگ'' نے اچھا خاصا اثر کیا تھا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آرہا کہ ہم کسی گہری سازش کا شکار ہوگئے ہیں؟''

''یقین آگیا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ جیپ بری طرح لہرائی۔ میں نے سیدھا ہوتے ہوئے تیز لہجے میں کہا ''سنبھل کر ڈاکٹر! اس وقت تین زندگیاں تمہارے رحم وکرم پر ہیں۔''

میرے اچانک اچھل کر سیدھا ہونے کے باعث لی یان کا سر میری ران سے ہٹ کر سیٹ پر چلا گیا۔ وہ ذرا کسمسائی پھر ساکت ہوگئی۔ یہ ایک جھٹکا اس کی نیند توڑنے میں ناکام رہا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ سب سے زیادہ وہی متاثر ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور جیپ کو سڑک سے اتار کر ایک سائیڈ میں کھڑا کردیا۔ سڑک کی باقاعدہ سیاہ پٹی کے ساتھ ساتھ دونوں جانب آٹھ آٹھ فٹ تک زمین کو ہموار کرکے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ کسی ہنگامی صورت حال میں گاڑی کو کنارے لگایا جاسکے۔ اس طرح دونوں طرف سے رواں دواں ٹریفک میں کوئی تعطل واقع نہ ہوتا۔ ویسے ٹھنڈی ٹھار رات میں وہ سڑک کسی سنسان قبرستان کا منظر پیش کررہی تھی۔ جب سے ہم ہاکی دے میں داخل ہوئے تھے، ہم نے بمشکل تین گاڑیوں کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا تھا۔

''اب کیا ارادہ ہے ڈاکٹر؟'' میں نے پُرتشویش انداز میں استفسار کیا۔

وہ بولا ''لی یان مزے سے سوتی رہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ہم دونوں جس حالت میں ہیں، اس میں ڈرائیونگ کو جاری نہیں رکھا جاسکتا۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں، اب کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے کہا ''آگے بڑھنا بھی ضروری ہے۔ آج آدھی رات کے بعد بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں قیامت آنے والی ہے اور اس قیامت کا مقابلہ ہمیں ہی کرنا ہے...... اور اس سے پہلے مجھے ہاکی دے والی بستی میں ساحل سے بھی ملاقات کرنا ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے'' ڈاکٹر نے اسٹیئرنگ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ''رفتار کی کمی کے باعث ہم کافی وقت ضائع کرچکے ہیں۔ کچھ وقت وہاں بنگلے میں ہونے والی مارا ماری میں نکل گیا۔ ہمیں جلد از جلد بستی تک پہنچنا ہوگا۔''

''آئیڈیا کیا ہے، تمہارے ذہن میں؟''

وہ بولا ''جیپ سے باہر اچھا خاصا ٹھنڈا موسم ہے۔ اگر ہم اس موسم میں نکل کر اپنے ہاتھ پاؤں کو کچھ زحمت دیں تو اعصاب اور دماغ پر چھائی ہوئی یہ کسل مندی چھٹ سکتی ہے؟''

''نیک خیال ہے'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''مجھے

تمہارا آئیڈیا پسند آیا۔“

پھر ہم دونوں جیپ سے باہر نکل آئے۔ پہلے دس منٹ تک ہم وارم اپ ایکسر سائز کرتے رہے۔ اس شدید موسم میں وارم اپ ہونا اتنا آسان نہیں تھا اور ہم درحقیقت وارم اپ ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ دراصل ہاتھ پاؤں کی حرکات تو اس لیے تھیں کہ ہمارے ذہنوں پر چھائی ہوئی دھند ڈھل جائے تاکہ نشہ آور خوراک کے اثرات زائل ہو سکیں۔

انسان کے اعضا اور اعصاب میں ایک گہرا ربط پایا جاتا ہے اور یہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر آپ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر آرام سے لیٹ جائیں تو اعصاب میں بھی نرمی اور لچک پیدا ہو جاتی ہے پھر خواہ مخواہ ہی نیند آنے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر اعصاب کسی شے کے زیر اثر ہوں تو ہاتھ پاؤں خود بخود ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ آخر الذکر صورتِ حال تھی۔

دس منٹ کی اس مشقت میں ہم نے آپس میں تین منٹ کی ایک محفوظ فائٹ بھی کی جس کے نتیجے میں ہمارے دماغ ہشاش بشاش اور چاق و چوبند ہو گئے۔ گویا ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ واپس جیپ میں بیٹھنے سے قبل ہم نے یوگا کی مشقیں بھی کیں تاکہ تازہ آکسیجن سے پھیپھڑوں اور ذہن کو تازگی ملے۔

ہم پوری طرح فٹ ہو کر جیپ کی جانب بڑھے ہی تھے کہ ہمیں چونک جانا پڑا۔

دور نشیب میں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اچھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ وہ وہی سمت تھی جدھر سے ہم آرہے تھے۔ اس کا مطلب تھا' ہماری طرح کوئی اور بھی کھٹمنڈو کی طرف سے ہائی وے پر چلا آرہا تھا۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ڈاکٹر موتنگ کو اشارہ کیا اور ہم اپنی جیپ میں آبیٹھے۔

لی یان ابھی تک اسی طرح عقبی نشست پر آڑی ترچھی بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب کھلنے والا کھڑکی کا شیشہ وا کر دیا تاکہ کھڑکی کے راستے اندر پہنچنے والی ٹھنڈک اس کے حواس کا مساج کر سکے اس طرح وہ خود بخود گہری غفلتانہ نیند سے بیدار ہو جاتی۔ اگر وہ نارمل روزمرہ کی نیند سو رہی ہوتی تو تشویش والی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ ہمیں کھانے میں کوئی ایسی ویسی چیز کھلا دی گئی ہے لی یان کا جلد از جلد ہوش میں آجانا بہت ضروری تھا!

کھڑکی اور شیشے والی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد میں پسنجر سیٹ پر آبیٹھا اور ڈاکٹر موتنگ نے جیپ کو کچے میں سے نکال کر باقاعدہ سڑک پر پہنچا دیا۔ ایک مرتبہ پھر کھٹمنڈو سے ہائی وے والی بستی کی جانب ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ اب ہم دونوں پوری طرح ہوش و حواس میں تھے۔

ڈاکٹر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ”شاکا ہماری طرف سے پریشان ہو رہا ہوگا۔ میں نے اسے دس بجے تک بستی میں پہنچنے کے بارے میں بتایا تھا اور اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی ہم کھٹمنڈو اور بستی کے وسط میں موجود ہیں۔ بستی تک پہنچتے پہنچتے گیارہ تو بج ہی جائیں گے۔“

میں نے کہا ”اگر شاکا ہماری وجہ سے پریشان ہوگا تو اسے چاہیے فون کر کے تم سے اس تاخیر کا سبب معلوم کرے۔ کیا اس کے پاس تمہارا موبائل نمبر بھی ہے؟“

”میں نے اسے اپنے تمام نمبرز لکھوا رکھے ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے' شاکا بڑے مزے سے وہاں بستی میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”اگر اسے تمہاری جانب سے کوئی پریشانی لاحق ہوتی یا پھر وہاں بستی میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ کا امکان ہوتا تو وہ اب تک تم سے ٹیلی فونک رابطہ کر چکا ہوتا۔“

وہ گمبھیر لہجے میں بولا ”لارڈ بدھا خیر کرے۔“ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

”ویسے اس وقت تک بستی والی دکانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ اگر شاکا کو ٹیلی فون کی ضرورت محسوس ہوئی بھی تو وہ فون نہیں کر سکے گا۔“

”ڈاکٹر موتنگ! ساحل والا معاملہ بہت ہی اہم ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ”تمہیں چاہیے تھا' ایک آدھ موبائل فون شاکا کو بھی دلوا دیتے تاکہ وقت بے وقت وہ تمہاری رسائی میں رہتا۔“

وہ بولا ”موبائل فون والا آئیڈیا پہلے میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن پھر میں نے کچھ سوچ کر اسے رد کر دیا۔“

”کیا سوچ کر تم نے اس معقول اور مفید آئیڈیا کو رد کر دیا؟“ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا ”شاکا اس بستی کا ایک عام اور بے ضرر انسان ہے' اپنے کام سے کام رکھنے والا۔ وہ موبائل جیسی سہولت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے شاکا کی ذات پر کوئی شک کی نظر ڈالے۔“

میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سے بحث کرنا ضروری نہ سمجھا حالانکہ مجھے اس کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا۔ میرے حساب سے شاکا کے پاس موبائل فون بہت ضروری تھا۔ وہ

اسے چھپا کر رکھتا اور بوقت ضرورت اس کا استعمال کرتا۔ خواہ مخواہ موبائل فون کی نمائش کی کوئی تُک نہیں بنتی تھی۔ جب تک دوسروں کی نظر اس موبائل پر نہ جاتی' کوئی اسے شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ڈاکٹر نے عقب نما آئینے میں جھانکتے ہوئے کہا ”لگتا ہے ان لوگوں کو کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔ وہ بہت غیر محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہے ہیں۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی حرکات سے اندازہ ہوتا ہے وہ جیسے اچھلتے کودتے آگے بڑھ رہے ہیں' ان کی رفتار خاصی خطرناک ہے۔“

ڈاکٹر موتنگ اس گاڑی کا ذکر کر رہا تھا جس کی ہیڈ لائٹس میں نے بھی دور نشیب میں چمکتی ہوئی دیکھی تھیں۔ میں نے سرسری انداز میں کہا ”جلدی تو ہمیں بھی ہے ڈاکٹر! ہم اپنے پروگرام سے ایک گھنٹا لیٹ ہو چکے ہیں لیکن میں تمہیں رف ڈرائیونگ کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ہم تاریک رات میں اس وقت ایک خطرناک پہاڑی راستے پر سفر کر رہے ہیں۔ جلدی میں ہونے والی کوئی بھی غلطی ہمیں منزل کے بجائے کہیں اور بھی پہنچا سکتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ”تم فکر نہ کرو' میں بہت احتیاط سے اور دیکھ بھال کر جیپ کو آگے بڑھا رہا ہوں۔“

میں نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں لی یان کا جائزہ لیا۔ وہ ہنوز غفلت کی نیند کے ”مزے“ لوٹ رہی تھی۔ میں اس کی طرف سے خاصا متفکر تھا۔ مجھے فکر مند ہونا بھی چاہیے تھا۔ میں نے شون سے اس کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا تھا۔

پہاڑی راستے کے سبب پہنچنے والے جھٹکوں اور ہچکولوں نے عقبی نشست پر لی یان کی پوزیشن بدل دی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا' کھڑکی کے راستے اندر پہنچنے والی ٹھنڈک نے اسے کروٹ بدلنے پر مجبور کر دیا ہو۔ عقب نما آئینے میں اس کا چہرہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ وہ بے خبر تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ ویسے جیپ روکنے کے بعد میں نے اور ڈاکٹر موتنگ نے بڑی توجہ سے اسے چیک کیا تھا۔ اس کے وائٹل سائنز تسلی بخش تھے۔ بس وہ غفلت کی نیند میں تھی۔ اس کی زندگی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

لی یان کی معصوم صورت کو دیکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ ہم نے اس کے چہرے کی کٹنگ اور ہیئر اسٹائل کی تبدیلی کا پروگرام بنایا تھا لیکن رتنا پارک والے بنگلے میں وہ خونریز واقعات اتنی تیزی سے رونما ہوئے کہ ہمیں خود پر توجہ دینے کا ہوش نہیں رہا تھا، لی یان کے میک اپ کے بارے میں کب سوچتے۔ ان حالات میں' پہلی فرصت میں اس بنگلے کو خیر باد کہنا ضروری تھا......اور یہ ضروری کام ہم نے پہلے کیا تھا۔ لی یان کے چہرے کی کٹنگ اور ہیئر اسٹائل کے بارے میں بستی میں پہنچنے کے بعد بھی سوچا جا سکتا تھا۔ ہم جو بیگ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے' اس میں میک اپ کے حوالے سے مکمل رینج موجود تھی۔

”وجدان! یہ لوگ تو سر پر چڑھے آرہے ہیں۔“ ڈاکٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے بھی تھوڑا سا جھک کر عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں جھانکا تو تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی واقعی بڑے خطرناک انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی رفتار اور راستے کی صورت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا تھا' اس گاڑی میں موجود افراد کو اپنی زندگی سے ذرا سا بھی پیار نہیں۔ میں نے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر ڈاکٹر کو مشورہ دیا۔

”ڈاکٹر موتنگ! جیپ کو ایک طرف ہٹا کر اس گاڑی کو اوورٹیک کا موقع دو' ورنہ مجھے تو یوں لگ رہا ہے یہ لوگ ہمیں روندتے ہوئے آگے بڑھ جائیں گے۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر اس گاڑی نے اوورٹیک کے لیے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' انہوں نے ہماری گفتگو سن لی ہو۔ اگرچہ ماحول میں ہر سو تاریکی رچی بسی تھی تاہم ہیڈ لائٹس کی روشنی نے ہمیں بتا دیا کہ وہ کوئی ہیوی گاڑی تھی۔ میرا اندازہ اسٹیشن ویگن کا تھا۔

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس گاڑی کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتا' تاریک یخ بستہ فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

ہم دونوں نے تشویش بھری نظروں سے بے ساختہ ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے جیپ کی اسپیڈ میں اضافہ کر دیا۔ میں نے کہا ”کیا کر رہے ہو ڈاکٹر؟“

”کیا کر رہا ہوں!“ اس کی جھلائی ہوئی آواز ابھری۔

میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا ”یہ بہت خطرناک ہے۔ تاریکی اور راستہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم کوئی بہت بڑا نقصان اٹھا لیں گے۔“

”ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔“ وہ جیپ کی رفتار کو بتدریج بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نے وحشت زدہ نظر سے عقب میں دیکھا۔ ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی نے ہارن بجانا بند کر دیا تھا تاہم اس کی

رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے بڑے لرزہ خیز انداز میں تاریک سڑک پر دوڑنے لگیں۔ میں نے واضح طور پر دیکھ لیا۔ وہ ایک اسٹیشن ویگن تھی۔ اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ لوگ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچے تھے اور تھوڑی دیر پہلے چلنے والی گولی نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ہمارے دشمن تھے۔ وہ فائر یقیناً ہماری جیپ پر کیا گیا تھا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جیپ اس گولی سے محفوظ رہی۔

ڈاکٹر نے ڈرائیونگ پر کنٹرول برقرار رکھتے ہوئے اپنے ایک پاؤں کو کک کے سے انداز میں جیپ کے ڈیش بورڈ کے نیچے واقع خلا میں چلایا۔ کھٹک کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ وہی خلا تھا جہاں میں نے پاؤں رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''میں نے ایک خفیہ خانہ کھول دیا ہے۔ وہاں دو آٹو میٹک رائفلیں رکھی ہیں۔ وہ نکال لو۔ ان لوگوں کو تعاقب سے روکنا ہوگا۔''

میں نے پلک جھپکتے میں تھوڑا جھک کر دونوں مذکورہ رائفلیں اس خفیہ خانے سے برآمد کر لیں۔ وہ پوری طرح لوڈ تھیں۔ ایک گن کو میں نے ڈاکٹر کی سیٹ کے ساتھ کھڑا کر دیا دوسری کو اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ وہ دونوں سیون ایم ایم گنیں تھیں۔

فائر کے بعد متعاقب گاڑی کی طرف سے مزید کوئی گولی نہ چلی' انہوں نے ہارن کی ضرورت بھی محسوس نہ کی البتہ انہوں نے ہمیں روکنے اور دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ اپنایا۔ میں جیسے ہی گن تھام کر سیدھا ہوا' ہماری جیپ کو ایک خوفناک دھکا لگا۔

تعاقب میں آنے والی اسٹیشن ویگن نے ہماری جیپ کو ایک ہنگامہ خیز بوسہ دیا تھا۔ اس ٹکر کے نتیجے میں جیپ کے اندر ایک نسوانی مدھم چیخ ابھری۔ میں نے بے ساختہ پلٹ کر جیپ کی عقبی نشست کو دیکھا' لی یان مجھے وہاں دکھائی نہیں دی۔ جیپ کی پشت پر لگنے والے خطرناک دھکے نے لی یان کو سیٹ ''چھوڑنے'' پر مجبور کر دیا تھا اور یقینی بات تھی' وہ اس وقت دونوں سیٹوں کے درمیان واقع خلا میں فٹ میٹ پر پڑی ہوگی۔ میں نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر لی یان کو دیکھنا چاہا تو ڈاکٹر موِنگ نے ٹھوس لہجے میں کہا ''وہ جہاں پڑی ہے پڑے رہنے دو۔ اس کے لیے سب سے زیادہ محفوظ جگہ وہی ہے۔ تم تعاقب میں آنے والوں کی راہ کھوٹی کرنے کی کوشش کرو۔''

بات ختم کرتے ہی ڈاکٹر موِنگ نے جیپ کی اندرونی لائٹ کو آف کر دیا۔ جیپ کا اندرونی ماحول اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اب باہر اور آس پاس سے جیپ کے اندر جھانکا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ایک طرف کے محاذ کو پوری ذہنی بیداری کے ساتھ سنبھال لیا۔

میں نے پسنجرز سیٹ والی کھڑکی کا شیشہ گرایا اور اپنے بالائی نصف دھڑ کو ٹھنڈی ٹھار فضا کے سپرد کر دیا۔ جسم کے اسی حصے میں میرے دونوں ہاتھ بھی پیوست تھے اور ان ہاتھوں میں ایک خطرناک سیون ایم ایم دبی ہوئی تھی۔

میں نے جیپ سے باہر نکلے ہوئے اپنے جسم کو ایک خاص زاویے سے موڑا اور سیون ایم ایم سے اسٹیشن ویگن کی ہیڈ لائٹس کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ممکن ہے وہ گاڑی کے پہیوں پر فائرنگ کرتا مگر میں نے ایک خاص وجہ سے ہیڈ لائٹس کو چنا تھا۔ میرے سامنے اس وقت متعاقب اسٹیشن ویگن کے ''جسم'' کے تین حصے کھلے ہوئے تھے۔ پاؤں' پیٹ اور آنکھیں۔ میں اپنی جیپ میں رہتے ہوئے باسانی اسٹیشن ویگن کے ٹائروں' ونڈ اسکرین اور ہیڈ لائٹس کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں نے اس بدبخت کو مجروح یا معذور کرنے کے بجائے اندھا کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے ہی لمحے سیون ایم ایم گرج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی اسٹیشن ویگن کی لائٹس چکنا چور ہو گئیں۔ میں نے نشانہ باندھ کر جو برسٹ مارا تھا اس نے متعاقب گاڑی کو دونوں آنکھوں سے اندھا کر دیا۔ اب وہ اسٹیشن ویگن تاریک رات میں ہماری جیپ کو ''دیکھنے'' کے قابل نہیں رہی تھی۔

میں واپس پسنجرز سیٹ پر پہنچا اور ڈاکٹر موِنگ سے کہا ''جیپ کی رفتار کو بڑھا دو۔''

وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں تیز رفتاری کے حق میں نہیں تھا اور اب خود ہی ڈاکٹر کو اسپیڈ بڑھانے کا مشورہ دے رہا تھا۔ یہ سب نظریہ ضرورت کا کھیل ہے۔ ڈاکٹر فلائنگ فائٹ کا ماہر ضرور تھا لیکن وہ جیپ کو اڑا کر نہیں لے جا سکتا تھا۔ اسے جیپ کو اسی سڑک پر دوڑانا تھا۔ اسٹیئرنگ پر قابو رکھتے ہوئے اس نے جیپ کی رفتار میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

''میں تو انہیں پیچھے چھوڑنے کی کوشش کر ہی رہا ہوں۔ تم بھی انہیں روکنے کی چارہ جوئی کرو۔''

میں نے اگلے ہی لمحے اپنے جسم کے نصف بالائی حصے کو جیپ کی کھڑکی سے باہر پہنچا دیا۔ گن بدستور میرے ہاتھ میں تھی۔ اسٹیشن ویگن کے تعاقب سے مکمل نجات کے لیے اس کے پاؤں کو گھائل کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا۔ یہ بھی نظریہ ضرورت کا ایک رخ تھا۔

میں نے جیسے ہی سیون ایم ایم کو سیدھا کر کے ٹریگر دبانا چاہا' ہماری جیپ کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ اسی لمحے اسٹیشن ویگن نے عقب سے جیپ کو ٹکر ماری تھی۔ وہ اسٹیشن ویگن کم بخت ہماری جیپ کی دم سے گویا بندھی چلی آ رہی تھی۔ میں دھکا کھانے کے سبب اپنے ٹارگٹ پر فائر نہ کر سکا۔ دوبارہ سنبھل کر جب میں نے یہ کوشش کرنا چاہی تو میدانِ جنگ کے نقشے میں تھوڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ اسٹیشن ویگن میری فائرنگ رینج میں نہیں رہی تھی۔

دوسری مرتبہ وہ ڈرائیونگ سائیڈ میں نمودار ہوئی۔ اب اس کا انداز اوورٹیک کرنے والا تھا۔ میں سمجھ گیا وہ لوگ ہم سے آگے نکل کر ہماری راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہونے کا عزم رکھتے ہیں۔ اگر اسٹیشن ویگن ہماری جیپ کے سامنے پہنچ کر ایسی کوئی کوشش کرتی تو لامحالہ ہم جیپ روکنے پر مجبور ہو جاتے' بصورتِ دیگر ہمیں اسٹیشن ویگن سے ٹکرانا ہوتا۔

میں نے یہ صورتِ حال دیکھی تو اپنی نشست کے اوپر سے ہوتے ہوئے عقبی نشست پر پہنچ گیا۔ میں نے سرسری انداز میں لی یان کا جائزہ لیا۔ وہ فٹ میٹ پر بے سدھ پڑی تھی۔ میں پوری توجہ سے محاذ پر ڈٹ گیا۔

میں نے بڑی احتیاط سے کھڑکی کا شیشہ اتنا سا کھول لیا جہاں سے میں گن کے بیرل کو باہر نکال سکوں۔ اسٹیشن ویگن اب تقریباً جیپ کے متوازی چل رہی تھی۔ ویگن کی کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ اس لیے میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا' اس کے اندر کتنے دشمن موجود ہیں۔

میں نے جیسے ہی اسٹیشن ویگن پر سیون ایم ایم کو استعمال کرنا چاہا' وہ گولی کی رفتار سے آگے بڑھ گئی۔ میں پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ میری نگاہ نے ایک ناقابلِ یقین نظارہ دیکھا تھا۔ میں نے سیکڑوں' ہزاروں اور لاکھوں گاڑیوں کو اوورٹیک کرتے دیکھا تھا مگر ایسی سرعت کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں یہ حیرت انگیز منظر دیکھا اور اگلے ہی لمحے میری حیرت کی وضاحت ہو گئی۔

رات کی تاریکی اور سناٹے میں ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ ابھری اور میں اپنی جگہ پر توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اگلے ہی لمحے صورتِ حال میری سمجھ میں آ گئی۔ ڈاکٹر نے اچانک جیپ کے بریک لگا دیے تھے جس کے سبب اسٹیشن ویگن جیپ کے پہلو سے گولی کی طرح آگے نکل گئی تھی۔

تھوڑے فاصلے پر آگے جا کر وہ ویگن بھی رک گئی۔ اس دوران میں ڈاکٹر موِنگ بھی آٹو میٹک سیون ایم ایم سنبھال چکا تھا۔ میں نے اپنی گن پر کنٹرول حاصل کیا اور سفاک لہجے میں ڈاکٹر سے کہا۔

''ان خبیثوں سے یہیں نمٹ لیا جائے تو اچھا ہے ورنہ یہ ہمارے ساتھ ہی بستی تک پہنچیں گے۔''

''میں نے ان سے نمٹنے کے لیے ہی جیپ روکی ہے۔'' ڈاکٹر نے چٹانی لہجے میں کہا ''انہیں اپنے ساتھ بستی تک لے کر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں پوچھا ''کیا ہم ان کے استقبال کے لیے جیپ سے باہر نکل جائیں؟''

ڈاکٹر نے اپنے سامنے سڑک پر کھڑی اسٹیشن ویگن کو گہری نظر سے دیکھا اور بولا ''میرا خیال ہے' ہمیں ان کے برآمد ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ ہم سے ''ملاقات'' کی خواہش وہ لوگ اپنے دلوں میں بسا کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے اسٹیشن ویگن اور جیپ کے مابین فاصلے کو نگاہ میں تولتے ہوئے کہا ''وہاں کھڑے کھڑے تو وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکتے۔ انہیں ویگن سے نکل کر ہماری طرف آنا ہوگا۔ ہم جیپ کے اندر رہتے ہوئے انہیں آسانی سے شکار کر سکتے ہیں۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی' ادھر وہ اسٹیشن ویگن دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ یہ حرکت اس نے ریورس گیئر میں کی تھی۔ ڈاکٹر نے گن کو پسنجرز سیٹ پر رکھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں ایک چال چل رہا ہوں۔ تم پوری طرح ہوشیار رہنا۔ جیسے ہی اسٹیشن ویگن فائرنگ رینج میں آئے' تم سیون ایم ایم کا دہانہ کھول دینا۔''

''اوکے...... آئی ایم ریڈی!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نہیں جانتا تھا' ڈاکٹر نے کون سی چال چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ بہرحال' میں ریڈ الرٹ ہو کر آنے والے سنگین لمحات کا انتظار کرنے لگا۔

اسٹیشن ویگن بیک گیئر میں چلتے ہوئے تیزی سے پیچھے آ رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ فائرنگ رینج میں آتی' ڈاکٹر نے ایک جھٹکے سے جیپ کو آگے بڑھا دیا۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آنے لگیں۔ وہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا اور اس ''ہونے'' کا نتیجہ دونوں پارٹیوں کے لیے مختلف اثرات کا حامل ہوتا۔ میں اپنی گن سے گولیاں برسانے کا ارادہ کر ہی رہا

تھا کہ اسٹیشن ویگن کی طرف سے فائرنگ کا آغاز ہوگیا۔

ڈاکٹر جیسے اس ماحول سے بیگانہ ہوگیا تھا۔ وہ نتائج کی پروا کیے بغیر جیپ کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ اسٹیشن ویگن والوں کی کوشش تھی کہ وہ اپنی گاڑی کو جیپ سے ٹکرا دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ جیپ کی جانب گولیاں بھی اچھال رہے تھے تاکہ ہمیں کسی جوابی کارروائی کا موقع نہ مل سکے لیکن میں تو دشمنوں کے حرکت میں آنے سے پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔

جب دونوں گاڑیوں کے بیچ اتنا فاصلہ رہ گیا کہ کسی بھی لمحے وہ ایک عظیم الشان تصادم کو جنم دے سکتی تھیں تو ڈاکٹر نے بڑی صفائی سے اسٹیرنگ کو ایک جرک دی اور جیپ کو ایک مخصوص زاویے سے آگے بڑھاتا چلا گیا۔

اس لمحاتی جرک نے جیپ کو لرزا کر رکھ دیا۔ تاہم اس دوران میں مجھے بھرپور فائرنگ کا موقع مل گیا۔ جیسے ہی اسٹیشن ویگن ہماری جیپ کے قریب پہنچی' میں نے اس کے عقبی ٹائروں پر ایک طویل برسٹ مارا۔ بیک گیئر میں گاڑی کو کنٹرول میں رکھنا نسبتاً مشکل ہوتا ہے' پھر ہماری جیپ بھی لہراتی ہوتی آگے بڑھی تھی لہٰذا میری فائرنگ سے اسٹیشن ویگن کے ٹائر محفوظ رہے۔ البتہ وہ جیپ کی سائیڈ لگنے سے تھوڑا ڈگمگا چکی تھی چنانچہ میری گن سے نکلنے والی گولیوں نے اسٹیشن ویگن کی باڈی کا مزاج پوچھ لیا پھر ہمارے درمیان دوطرفہ فائرنگ ہونے لگی۔

میں نے ڈاکٹر مونگ سے کہا ''ہمیں جیپ سے باہر نکل کر ان پر فائرنگ کرنا چاہیے تاکہ ان کی فائرنگ کا زاویہ تبدیل ہوسکے۔ ابھی تک تو ہماری جیپ محفوظ اور سفر کرنے کے قابل ہے۔ اگر کوئی اندھی گولی اس کے فیول ٹینک میں گھس گئی تو ہم خود کو نارِ جہنم کے حصار میں پائیں گے۔ جیپ کے عقبی حصے میں خطرناک ایندھن سے بھرے ہوئے دو کین بھی رکھے ہیں...... اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری ایک ساتھی اس جیپ کے فٹ میٹ پر بے ہوش پڑی ہے۔''

میری تجویز ڈاکٹر کی سمجھ میں آ گئی۔ ہم اپنی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر جیپ سے باہر کود گئے۔ ڈاکٹر جیپ کے اگنیشن میں سے چابی نکالنا نہیں بھولا تھا۔ ہم دونوں سیون ایم ایم سے لیس مختلف سمتوں میں تاریکی کا سہارا لیتے ہوئے تیزی سے دوڑتے چلے گئے۔ اس دوڑ کے دوران میں ہم فائرنگ کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

نتیجہ ہماری توقع کے عین مطابق برآمد ہوا۔ اب اسٹیشن ویگن والے دشمنوں کی فائرنگ کا رخ بدل گیا تھا۔ وہ اس وقت دورخی فائرنگ کررہے تھے کیونکہ میں اور ڈاکٹر دو مختلف سمتوں میں نکلے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر مونگ کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ تھم گیا۔ میں نے بھی اپنی گن کو ''زحمت'' سے بچالیا البتہ' اسٹیشن ویگن والے وقفے وقفے سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہماری خاموشی سے یہ تاثر لے سکتے تھے کہ ہم وہاں سے فرار کی کوشش میں ہیں۔ اگر وہ واقعی ایسا سوچ رہے تھے تو زندگی کی ایک بہت بڑی حماقت کررہے تھے۔

جیپ سے نکلتے وقت ہمارے درمیان آیندہ کا لائحہ عمل طے نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ ہمیں اپنی گاڑی سے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے۔ جیپ کے اندر لی یان بے سدھ پڑی تھی۔ اگر ہمارے دشمن جیپ کے اندر جھانکنے کے لیے اس طرف نکل آتے تو ایک نئی مصیبت کھڑی ہوسکتی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا' ڈاکٹر نے اس سچویشن سے نمٹنے کے لیے اپنے ذہن میں کیا سوچ رکھا ہے' میں نے البتہ ایک منی شیڈول بنالیا۔ یہ ایک فوری فیصلہ تھا۔ مجھے جیپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں جانا تھا اور دشمنوں تک رسائی بھی حاصل کرنا تھی۔

میں نے جیپ کو فائرنگ رینج میں رکھ لیا تاکہ اگر کوئی دشمن اس طرف جانے کی کوشش کرے تو میں اسے گولیوں سے بھون سکوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نیم دائرے میں اسٹیشن ویگن کی سمت قدم اٹھانا شروع کردیے۔

دونوں گاڑیاں ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں اور وہ ایسے بے ہودہ انداز میں کھڑی تھیں کہ نہ آتی ہوئی نظر آتی تھیں اور نہ ہی جاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھار تاریکی میں ان کے ہیولے بڑا ہیبت ناک منظر پیش کررہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دو بھوت آمنے سامنے کھڑے ہوں۔ اسٹیشن ویگن کی ہیڈ لائٹس پر فائرنگ کرکے میں نے اس کی آنکھیں چھین لی تھیں اور ڈاکٹر نے جیپ کے اگنیشن سے چابی نکالتے وقت انجن کو بند کردیا تھا۔

میں محتاط قدموں سے اسٹیشن ویگن کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ مخالف سمت میں مجھے شدید فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی سمت تھی جدھر ڈاکٹر مونگ گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے محاذ کو نظر انداز کرکے اپنے محاذ پر توجہ مرکوز کردی۔ ڈاکٹر اپنے ''معاملات'' سے نمٹنا جانتا تھا۔

اچانک میرے نزدیک ہی ایک گولی چلی اور مجھے اپنے بازو میں چنگاریاں سی بھرتی محسوس ہوئیں۔ کوئی مجھ پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا اور اس نے میری زندگی کا چراغ گل کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو میری خوش قسمتی کہ پھونکوں سے اس چراغ

کو بجھایا نہیں جاسکتا تھا جب تک کہ ہوا کا فانوس میری حفاظت کررہا تھا۔ یہ وہی بات تھی' جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اس سمت اندھیرے میں فائرنگ کی جدھر سے آنے والی گولی نے میرے کندھے میں جیسے آگ سی لگادی تھی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں ایک طویل' اذیت ناک انسانی چیخ بلند ہوئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا' یا تو شدید زخمی ہوگیا تھا یا پھر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

میں نے ایک لمبی رولنگ کی اور اپنی جگہ سے خاصے فاصلے پر چلا گیا۔

کھلی جگہ پر گن فائٹ کے دوران میں اپنی پوزیشن کو بدلتے رہنا چاہیے ورنہ شدید نقصان پہنچ جاتا ہے میں جیسے ہی رولنگ مکمل کرکے اپنے قدموں پر آیا، ایک اور دشمن سے سامنا ہوگیا۔ وہ اپنی گن کو میری سمت سیدھا کر ہی رہا تھا کہ میں نے اچھل کر ڈبل فرنٹ فلائنگ کک اس کے سینے پر ماری۔

وہ عقبی سمت میں اچھلا اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں گم ہوگئی۔

گم اس لیے کہ وہاں اچھی خاصی تاریکی تھی۔ میں یہ جاننے سے قاصر تھا کہ وہ گن کہاں گری ہوگی۔ مجھ سے کک کھانے والا بہت پھرتیلا ثابت ہوا۔ وہ زمین پر پشت لگاتے ہی کسی اسپرنگ کے مانند اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ مارشل آرٹس سے واقف تھا۔ میں اس اندھیرے میں فائٹ کو طول دے کر اپنا اور اس کا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ساحل کے پاس پہنچنے کی جلدی تھی اور اس بد بخت کو موت آوازیں دے رہی تھی۔ موت کی آواز پر لبیک کہنا اس پر لازم تھا۔ مجھ پر جو کچھ لازم تھا میں نے صرف اس پر دھیان دیا۔

وہ جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا، میں نے اس کے سینے پر فائرنگ کردی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ دباتے ہوئے کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمین بوس ہوگیا۔

اسی لمحے میں نے تھوڑے فاصلے پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی، اندھیرے کے باعث میں اتنی دور تک دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تاہم مجھے اندازہ ہوگیا، کوئی وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھا۔ میں نے جن دو افراد کو ابھی ابھی جہنم واصل کیا تھا، وہ بھی یقیناً انہی کا کوئی ساتھی ہوگا۔

میں نے اندازے سے اس سمت فائرنگ کردی جدھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری تھی

جواب میں کوئی انسانی چیخ فضا میں بلند نہ ہوئی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا۔ یا تو وہ فائرنگ رینج سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا یا پھر وہ میرے نشانے پر نہیں آیا تھا۔

میں محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا، رات کی تاریکی کے باعث وہ اسٹیشن ویگن کسی ہیولے کے مانند نظر آرہی تھی۔ میں اس وقت ویگن کی عقبی سمت میں تھا۔ ویگن مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی تاہم اس کا انجن اسٹارٹ تھا جس کی مخصوص ''گھوں گھوں'' ایک تواتر کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔

میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسٹیشن ویگن میں بھر کر کتنے دشمن ہمارے تعاقب میں لپکے تھے۔ دو کو میں نے مار گرایا تھا، تیسرا ممکنہ طور پر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ چوتھے کی کرب ناک چیخ میں نے اس سمت سے ابھرتی سنی تھی جدھر ڈاکٹر مونگ نے مورچا سنبھال رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اگر ان کا کوئی اور ساتھی بھی تھا تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

جاننے کے لئے اسٹیشن ویگن کے نزدیک جانا ضروری تھا اور میرے محتاط قدم اسی سمت اٹھ رہے تھے۔

موسم کی شدت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اور اس سخت ترین موسم کی ٹھنڈک نے جلد ہی میرے بازو کے زخم کو بھی جما کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر پہلے میں جو اس میں شرارے سے بھرے محسوس کررہا تھا، اب اس جلن اور تکلیف میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ میں زخمی بازو کی پروا کیے بغیر اسٹیشن ویگن کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

میں نے اپنی سانس روک لی اور بے آواز قدموں سے آگے بڑھنے لگا مگر ویگن کے اندر اور آس پاس مجھے سناٹے کا راج دکھائی دیا۔ وہاں کسی بھی تنفس کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ویگن کی کھڑکیوں پر چونکہ پردے گرے ہوئے تھے اس لئے میں اس کے اندر دیکھنے سے قاصر تھا۔ اگر میں ویگن کے سامنے والے حصے کی طرف نکل جاتا تو ممکن تھا، ونڈ اسکرین کے پار، ویگن کے اندر کچھ دکھائی دے جاتا۔ میں اس وقت عقبی سمت میں تھا۔

میں نے اسٹیشن ونگ کے یخ بستہ پہلو کو چھو کر دیکھا اور اس پر دستک دیتے ہوئے آگے نکل آیا۔ اگر وہاں آس پاس یا ویگن کے اندر کوئی موجود ہوتا تو وہ میری اس دستک پر چونک جاتا اور چونکنے کے بعد کوئی نہ کوئی ردِعمل بھی ضرور پیش کرتا!

مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ویگن کے گرد و نواح کو کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں اس وقت ویگن کے ڈرائیونگ سائیڈ والے پہلو میں تھا۔ دو سیکنڈ بعد میں ڈرائیونگ کیبن کے قریب پہنچ گیا۔ تھوڑا سا جھک کر میں نے

ویگن کے اندر جھانکا۔ ڈرائیور والی کھڑکی پر چونکہ پردہ موجود نہیں تھا اس لیے مجھے اندر کا ماحول نظر آ گیا۔ ویگن کے اندر ریڈنگ لائٹ آن تھی مگر کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس ویگن میں ہمارا تعاقب کرنے والے تمام افراد کہیں اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے عقب میں موجود ہو۔ یہ بڑا سنسنی خیز احساس تھا۔ میں دیکھ چکا تھا، تھوڑی دیر پہلے وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن میں اپنے احساس کو جھٹلا نہیں سکتا تھا، چنانچہ فوری ایکشن کا فیصلہ کرتے ہی میں عمل کے میدان میں اتر آیا۔

اس وقت میں رکوع کے بل جھک کر ویگن کے اندر جھانک رہا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ گاڑی کی باڈی پر ٹکے تھے جن میں سیون ایم ایم بھی موجود تھی۔ جیسے ہی مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، میں نے سیکنڈ کا ہزاروں حصہ ضائع کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، وہیں جھکے جھکے میں نے گاڑی کی باڈی سے ہینڈ پش لیا اور عقب میں فلائی کرتے ہوئے ایک تیز رفتار ریئر کک چلا دی۔

اس کک کے جواب میں ایک انسانی چیخ بلند ہوئی اور کوئی وزنی شے ''دھپ'' سے زمین پر گری۔ زمین پر قدم پڑتے ہی میں نے بیک سمر سالٹ لگایا اور متاثرہ قطعہ زمین سے کافی فاصلے پر پہنچ گیا۔

اسی وقت میری نگاہ ایک شخص پر پڑی۔ وہ زمین سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی ایک وزنی پتھر بھی نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے ''دھپ'' کی جو آواز سنی وہ یقیناً اسی پتھر کے زمین پر گرنے سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ وہ شخص عقب سے پتھر پھینک کر میرا کام تمام کرنا چاہتا تھا۔

مذکورہ شخص اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کا ایک ہاتھ ہونٹوں کی مزاج پرسی میں مصروف تھا، میری ریئر فلائنگ کک نے اس کی ناک اور ہونٹوں کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔

ریئر کک (بیک کک) بہت ہی خطرناک تصور کی جاتی ہے اور گراؤنڈ ریئر کک کی نسبت فلائنگ ریئر کک ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ شخص نہتا، حاصل شدہ تمام تر نقصان کے ساتھ میرے سامنے کھڑا تھا، اندھیرے کے باعث ہم ایک دوسرے کے خدوخال کی تفصیل تو نہیں جان سکتے تھے تاہم ایک دوسرے کو دیکھ ضرور سکتے تھے۔

مجھے امید تھی، وہ سنبھلتے ہی مجھ پر حملہ آور ہوگا لیکن پتا نہیں، اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے ایک جانب دوڑ لگا دی، شاید اس کی غالب وجہ یہ تھی کہ وہ نہتا تھا اور میرے ہاتھ میں اس نے ایک خطرناک گن نے جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ ممکنہ موت سے بچنے کے لیے زندگی کی طرف لپکا تھا۔ زندگی ...... جو ایک بے وفا شے کا نام ہے!

اس کی بھگوڑوں والی حرکت پر میں ایک لمحے کے لیے حیران ہوا پھر اس کے تعاقب میں لپک گیا۔

اتفاق سے وہ اس طرف جا رہا تھا جدھر ہماری جیپ کھڑی تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا۔ اس طرح میں اس کا پیچھا کرتے ہوئے جیپ کے قریب پہنچ جاتا، جیپ کے اندر لیان بے ہوش پڑی تھی۔ پتا نہیں، اب وہ کس حال میں تھی۔

میں پوری تیز رفتاری سے بھاگا اور جیپ سے محض پانچ فٹ کی دوری پر اسے جا لیا۔ جب کوئی راہ فرار نہ رہی تو اس نے موت کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور میرے مقابل جم کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے خطرناک سیون ایم ایم کو جیپ کے قریب زمین پر ڈالا اور اس شخص کی جانب بڑھا۔ اس نے نروس انداز میں مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے حملے میں دیسی پن تھا یعنی وہ لڑائی بھڑائی کا شائق تو نظر آتا تھا مگر مارشل آرٹس کی ٹیکنیکس سے نابلد تھا۔

اس نے دونوں بازو وا کر کے مجھے اپنی گرفت میں دبوچنے کی کوشش کی۔ اس کا انداز جن جپھا ڈالنے والا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کی دبوچ میں آ جاتا۔ میں اپنے قدموں کی حرکات سے تھوڑا پیچھے ہٹا اور ایک اسٹیپ لے کر اس کے، آگے بڑھتے ہوئے ہاتھوں پر فرنٹ کک مار دی۔

میرے فٹ ورک نے مجھے محفوظ رکھا لیکن وہ کک کھانے کے بعد دوبارہ اندر کو آیا۔ میں اس کے انداز سے سمجھ گیا، وہ جوڈو اور اکاڈو وغیرہ کی ٹیکنیکس سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے میری ٹانگ پر ٹانگ مارنا چاہی۔

میں نے بیک فٹ پر جاتے ہوئے اپنی ٹانگ کو بچایا اور وہیں بیٹھ کر فرنٹ سویپ چلا دی، میری پنڈلی کے سامنے والی ہڈی اس کی پنڈلی کے گوشت پر لگی۔ وہ قدموں سے اکھڑا اور پشت کے بل زمین پر جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے تکلیف دہ ''اوں'' خارج ہوئی۔

وہاں کی زمین پتھریلی تھی جس نے اس کی تشریف کا ولولہ انگیز خیر مقدم کیا۔ میں ایک اسٹیپ لے کر اس کے نزدیک پہنچ گیا اور اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ زمین پر گرے ہوئے مدِ مقابل پر حملہ کرنا سچے مارشل آرٹسٹ کی توہین

ہے۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا اور اس ٹانگ کو بری طرح جھٹکنے لگا جس کی پنڈلی پر میں نے خطرناک فرنٹ سوئپ ماری تھی، شن (پنڈلی کی ہڈی) کی ضرب بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ یہ کسی تیز دھار تلوار کے مانند کام کرتی ہے اور اس کے برابر نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ اس طرح شن (SHIN) پر لگنے والی چوٹ بھی دن میں تارے دکھا دیتی ہے۔ معتروب کافی دلوں تک لنگڑا کر چلنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی لیے مارشل آرٹس کی فائٹ کے دوران میں دونوں فائٹرز شن گارڈز کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔

میرا مدِمقابل جیسے ہی اٹھ کر کھڑا ہوا، میں نے اچھل کر فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔ وہ خود کو بچانے کے لیے تیزی سے پیچھے کو گیا۔ وہ میری کک سے تو محفوظ رہا تاہم اندھا دھند پیچھے ہٹنے کے باعث اس کا پاؤں ایک آڑے ٹیڑھے پتھر پر پڑ گیا۔

وہ بری طرح لڑکھڑایا اور ایک مرتبہ پھر پیٹھ کے بل زمین پر جا گرا۔

اس مرتبہ پہلے کی نسبت اسے زیادہ چوٹ لگی تاہم وہ پہلے کی نسبت جلدی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں، میں اس کے سر پر پہنچ گیا تھا پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

میں نے ہاتھ پاؤں کی مسلسل ٹھوکروں سے اسے دھو کر رکھ دیا۔ وہ مجھ سے بری طرح پٹ رہا تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ایک دو مرتبہ اس نے وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش بھی کی لیکن میں نے اس کے فرار کی ہر راہ مسدود کر دی۔ اس کی موت میرے ہاتھوں لکھی تھی لہٰذا وہ کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میں دل سے اس بات کا خواہاں نہیں تھا کہ اس کی جان لوں مگر تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔

میں تو محض اسے ناکارہ بنا کر چھوڑنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وہ ایک مرتبہ میری ڈھال پر ایسا آیا کہ اس کی زندگی کی کہانی کو ''دی اینڈ'' کا ٹائٹل مل گیا۔

وہ مجھے اٹھا کر پھینکنے کی کوشش میں جوڈو کی ایک مقبول عام ٹیکنیک ''تھرو'' کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کا داؤ اسی پر لوٹا دیا اور ''ریورس تھرو'' مار کر اسے دور پھینک دیا۔

ان سنگین لمحات میں اجل اس کے آس پاس ہی گھوم رہی تھی۔ وہ جس جگہ جا کر گرا وہاں چھوٹے بڑے کئی پتھر موجود تھے۔ اس بدبخت کا سر ایک بڑے پتھر سے جا ٹکرایا۔ کھوپڑی اور پتھر کے تصادم سے ایک مخصوص آواز پیدا ہوئی۔ میں نے پلک جھپکتے میں جان لیا' اس کا ناریل بری طرح چٹخ گیا تھا۔

میں لپک کر اس کے نزدیک پہنچا تو مجھے اس کا وجود خطرناک انداز میں جھٹکے لیتا ہوا نظر آیا۔ وہ اس وقت جان کنی کے عالم میں تھا۔ اندھیرے کے باعث میں اس کی کھوپڑی پر ٹوٹنے والی قیامت اور اس کے نتیجے میں پہنچنے والے نقصان کا اندازہ تو نہیں لگا سکتا تھا تاہم اس کی حالت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پل دو پل کا مہمان تھا۔ وہ آخری مرتبہ اس دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ دنیا کے آخری نظارے کی صورت میں تاریکی کے سوا کچھ بھی اس کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ انسان کسی طاقت ور جن کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر نصیب سے نہیں لڑ سکتا کیونکہ یہ براہِ راست نصیب بنانے والے سے لڑائی ہو گی۔ نصیب بنانے والا سب سے زیادہ قدرت والا ہے۔ آج تک کوئی اس سے جیت سکا ہے اور نہ ہی کبھی جیت سکے گا!

میں واپس جیپ کی طرف پلٹا تو سامنے سے ڈاکٹر مونگ آتا نظر آیا۔ میں نے اس کے گیٹ اپ کی وجہ سے اسے پہچان لیا تھا ورنہ تاریکی میں اس کا سراپا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اب تک جو مار اماری کی تھی' وہ درحقیقت دو ہیولوں کا تصادم ہی تھا جن میں ہر دفعہ ایک ہیولا میں رہا تھا۔ ہم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کارکردگی کے بارے میں بتایا جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ ہمارے تعاقب میں یہاں پہنچنے والے دشمنوں کا صفایا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے فکر میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب ہمیں فوراً یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

''شیور!'' میں نے حتمی لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے۔

ہم دونوں چند سیکنڈ کے وقفے سے جیپ کے اندر آ بیٹھے۔ ڈاکٹر مونگ نے حسب سابق ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ میں پسنجر سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا کیا حال ہے؟''

اس کا اشارہ لی یان کی طرف تھا۔ میں نے مڑ کر جیپ کے عقبی حصے میں نگاہ دوڑائی۔ لی یان بدستور فٹ میٹ پر پڑی تھی تاہم اس کے وجود میں مجھے حرکت نظر آئی۔ وہ بے ہوشی کے عالم سے واپس آ رہی تھی۔

''یہ ہوش میں آ رہی ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم عقبی نشست پر چلے جاؤ اور اس کی مدد کرو۔'' ڈاکٹر نے بڑی رسان سے کہا۔

میں ڈاکٹر کی ہدایت پر جیپ کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

ڈاکٹر نے مجھے لی یان کی مدد کرنے کو کہا تھا۔ میں اس کے اشارے کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا' میں جلد از جلد لی یان کو ہوش میں لے آؤں۔ وہ سنگین کیفیت سے نکل آئی تھی۔ میری مذکورہ کوشش آسانی سے بار آور ہو سکتی تھی۔

اس دوران میں ڈاکٹر مونگ نے چار پانچ بار کی کوشش کے بعد بالآخر کسی نہ کسی طرح جیپ کو اسٹارٹ کر ہی لیا۔ سخت ترین سرد موسم کے باعث جیپ کے ہیوی انجن کو ''ٹھنڈ'' لگ گئی تھی۔ اس لیے وہ تعاون کرنے سے گریزاں تھا اور اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر نے جاتے وقت اس کا انجن سوئچ آف کر دیا تھا۔ اگر اس جیپ کے بجائے کوئی چھوٹی موٹی گاڑی ہوتی تو اس کنڈیشن میں اس کے اسٹارٹ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو میں لی یان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

میں نے بڑی احتیاط سے اس کے گٹھڑی وجود کو اپنی بانہوں میں سمیٹا اور اٹھا کر سیٹ پر رکھ دیا۔ اس کے جسم میں بے ربط جنبش پیدا ہوئی اور اس نے کوشش کر کے اپنی ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ اس کوشش میں' میں نے اس کا بھرپور' ہاتھ بٹایا۔''

میں نے اس کے وائٹل سائنز کو ایک مرتبہ پھر چیک کیا۔ تسلی ہو جانے کے بعد میں نے اسے بیدار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جیپ کے ٹھنڈے ٹھار فٹ میٹ پر کھلے پڑے رہنے سے اس کے وجود میں اچھی خاصی ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ اور یہ اس کے لیے مفید بھی ثابت ہوا تھا۔ اسی ٹھنڈک کے باعث وہ ہوش میں آنے کے قابل ہوئی تھی۔

میں نے اس کی پھیلی ہوئی جینز ملبوس ٹانگوں پر ایک گرم کپڑا ڈال دیا اور اس کے بالوں میں اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ہلکا ہلکا سا مساج کرنے لگا۔ پہلے اس نے اپنی بے خبری میں میری ران کو تکیہ بنایا تھا' اب میں نے دانستہ اسے یہ موقع فراہم کیا۔ میں انگلیوں کے مساج کے ساتھ ساتھ گھٹنے کے متوازن جھٹکے سے اسے جھولا بھی جھلا رہا تھا۔ یہ ایک طرح کی لوری تھی۔

لوری عموماً جاگتے ہوئے انسان کو نیند کی وادی میں پہنچا دیتا ہے۔ سر کا مساج بھی خاصا نیند آور ہوتا ہے لیکن اگر یہی دونوں عمل کسی سوتے ہوئے یا بے ہوش انسان پر آزمائے جائیں تو نتائج اس کے بالعکس برآمد ہوتے ہیں۔ سوتا ہوا آدمی بیدار ہو جاتا ہے۔

لی یان پر بھی میری یہ کوشش خاصے حوصلہ افزا اثرات مرتب کر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ جیپ کے ماحول میں واپس آ رہی تھی۔ میں نے اس سے آگے بڑھ کر ایک اور ٹیکنیک بھی آزمائی۔ میں نے وقفے وقفے سے اس کی ناک کو دو انگلیوں کی چٹکی میں پکڑ کر دبانا شروع کر دیا۔ اس طرح اس کی سانس کا سلسلہ لمحاتی طور پر رکا تو اسے اپنے وجود میں ایک بے چینی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔

بالآخر اس بے چینی اور سانس کے تعطل نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔

لی یان نے آنکھیں کھول کر حیرت سے اپنے ماحول کو جانچنے کی کوشش کی۔ شناسا چہروں پر نظر گئی تو اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ اپنوں میں ہے۔ آئندہ پانچ منٹ بعد وہ سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ اسے یہ جاننے کی بڑی تشویش تھی کہ پچھلے بیس پچیس منٹ میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ بیس پچیس منٹ نہیں بلکہ وہ اس سے دگنے وقت تک اپنے آپ سے بیگانہ رہی ہے پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا گیا۔

''کھانا تو ہم تینوں نے ایک ساتھ کھایا تھا۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی ''پھر آپ دونوں پر کوئی اثر کیوں نہیں ہوا؟''

''ہوا تھا۔'' میں نے کہا ''لیکن ہم نے کوشش کر کے اس اثر کو زائل کر دیا مگر تم اس نشہ آور کھانے کی وجہ سے گہری بے ہوشی میں چلی گئیں۔ بہرحال' اب سب کچھ ٹھیک ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

پھر ہمارے درمیان راستے میں پیش آنے والے واقعے پر بات ہونے لگی۔ ڈاکٹر مونگ نے کہا ''اب تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ رات کے کھانے میں کسی سازش کے تحت کچھ ملایا گیا تھا اور یہ حرکت چندر کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔''

''جس کسی کی بھی حرکت تھی اب اس کا ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے کہا ''سازشی اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گیا۔''

ڈاکٹر نے کہا ''ہمیں شکار کرنے کا منصوبہ خاصے وسیع پیمانے بنایا گیا ہے۔ پہلے چار فائٹرز کو بھیجا گیا۔ ناکامی کے بعد گن بردار اس بنگلے پر چڑھ دوڑے اور اب یہ بیچ راہ میں ایک اور حملہ آور ٹیم نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی تھی۔''

''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے حملوں کو ختم نہیں سمجھنا چاہیے۔'' میں نے کہا ''آگے چل کر بھی ایسا ہی کوئی

ناخوشگوار واقعہ اور بھی پیش آ سکتا ہے۔"

"وجدان! تم خواہ مخواہ ڈرانے والی باتیں کررہے ہو!" لی یان نے کہا۔ اب وہ اپنے حواس میں مکمل طور پر آ چکی تھی۔

میں نے کہا "میں نے ایک حقیقت اور متوقع حالات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیا تمہیں اس سے ڈر لگ رہا ہے؟"

"میرے دل میں کوئی اندیشہ ہے اور نہ ہی ذہن میں کوئی خوف۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی "میں تو صرف یہ کہنا چاہتی ہوں، جو بیت گیا' سو بیت گیا' ہمیں اچھی اور خوش آیند باتیں کرکے باقی کا راستہ کاٹنا چاہیے۔"

مجھے شرارت سوجھی اور میں نے تیکھے لہجے میں کہا "تم کیوں اتنی فکرمند ہوتی ہو۔ اگر آگے چل کر پھر کسی دشمن نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی تو تم بے ہوش ہو جانا۔ اللہ اللہ خیر سلا!"

وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔

ڈاکٹر مونگ نے میری شرارت میں دم باندھتے ہوئے کہا "اس میں تم دونوں کا بھلا بھی ہے۔"

"کیا مطلب' کن دونوں کا؟" یہ سوال میں نے ڈاکٹر مونگ سے کیا تھا۔

"میں تم دونوں "میاں بیوی" کا ذکر کررہا ہوں۔"

اس نے لفظ میاں بیوی پر اچھا خاصا زور دیا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا "اس میں ہم دونوں کا کیسے بھلا ہے؟"

اس نے کہا "بھئی سیدھی سی بات ہے' بیوی بے ہوش ہو کر خون ریز واقعات دیکھنے سے محفوظ ہو جائے گی اور شوہر کو اسے ہوش میں لانے کا نادر موقع ہاتھ آ جائے گا۔"

ڈاکٹر کی اس لطیف چھیڑ چھاڑ پر ہم دونوں ہنس پڑے۔

باقی کا سفر بھی بخوشی اور خیر و عافیت سے گزر گیا اور ہم لگ بھگ رات ساڑھے گیارہ بجے ہائی دے والی بستی میں پہنچ گئے۔

پچاس گھروں پر مشتمل وہ چھوٹی سی بستی اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں سوئی سوئی نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر جیپ کو بستی کے اندر سے گزار کر سیدھا شاکا کے گھر کی طرف لے گیا۔

شاکا کا گھر بستی کے آخری کنارے پر واقع تھا۔ جیپ کو شاکا کے دروازے کے سامنے کھڑا کرکے ڈاکٹر نے مخصوص انداز میں تین مرتبہ ہارن بجایا اور بتایا۔

"ہمارے درمیان یہ پہلے سے طے ہے۔ ہارن کی آواز سن کر شاکا گھر کا دروازہ کھول دے گا۔"

میں متجسس نگاہ سے اس دروازے کو دیکھنے لگا جس کے عقب سے شاکا نمودار ہونے والا تھا۔ جب پانچ منٹ اس انتظار میں گزر گئے تو مجھے گہری تشویش ہوئی۔

میں نے کہا "ہمیں نیچے اتر کر خود دیکھنا چاہیے۔"

ڈاکٹر بولا "شاکا کو اب تک دروازہ کھول دینا چاہیے تھا لیکن......"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر گمبھیرتا کو پھیلتے ہوئے واضح طور پر محسوس کیا۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ڈاکٹر! گھر کے اندر چھائی ہوئی خاموشی مجھے گہری تشویش میں مبتلا کررہی ہیں۔ چلو جیپ سے نیچے اترو۔ دیکھتے ہیں، وہاں کیا صورتِ حال ہے!"

ہم تینوں یکے بعد دیگرے جیپ سے باہر آئے۔ پھر شاکا کے گھر کے دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ایک ایک لمحہ میرے لیے ایک ایک صدی کے برابر تھا۔

جب تین دستک پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دروازے کے پٹ پر دباؤ ڈال کر دیکھا۔ اس دباؤ کے نتیجے میں دروازہ خود بہ خود کھلتا چلا گیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔

میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور لپک کر گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

میری پہلی نگاہ نے گھر کے اندر جو منظر دیکھا وہ رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھا۔ میرے پیچھے ڈاکٹر مونگ اور لی یان بھی گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس خونچکاں منظر کو دیکھ رہے تھے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان لمحات میں وقت تھم گیا ہو!

وقت تھکتا نہیں، رکتا نہیں۔ یہ ایک مخصوص رفتار سے اپنا سفر جاری رکھتا ہے لیکن بعض اوقات حالات اتنے غیر یقینی انداز میں پیش آتے ہیں کہ انسان کی سوچ گویا تھم سی جاتی ہے۔ یہی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے وقت کے پاؤں پکڑ لیے ہوں، وہ ایک جگہ ٹھہر گیا ہو!

ہم بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار تھے۔

وہ چھوٹے چھوٹے دو کمروں پر مشتمل ایک مختصر سا کوارٹر تھا جس کے صحن میں اس وقت ہم کھڑے تھے۔ ہم سب کی نظریں ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ نقطہ اتنا جسیم تھا کہ آدھی رات کو بھی ہم اسے بہ آسانی دیکھ اور پہچان سکتے تھے۔ ہم شاکا کے گھر میں ایسے کسی منظر کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے ہمارے دماغ، ہماری سوچ ایک لمحے کے لیے جیسے رک گئی تھی۔ ہم تینوں متوحش نگاہوں سے اس خونیں منظر کو ملاحظہ کر رہے تھے۔ اس لمحے میں، ہمارے لیے ایک طرح وقت واقعی تھم سا گیا تھا۔

اس مہیب اور موت ایسے سناٹے کو ڈاکٹر مونگ کی سرسراتی ہوئی آواز نے مجروح کر دیا۔ وہ اضطراری انداز میں گویا خود کلامی کرتے ہوئے بولا ''یہ...... یہ تو شاکا معلوم ہوتا ہے!''

یہ جملہ ادا کرتے ہی وہ میکانکی انداز میں آگے بڑھا۔ ہم دونوں نے اس کی تقلید کی۔ وہ جسیم نقطہ کسی انسان کی لاش تھی۔ مونگ کی اضطراری آواز نے تصدیق کر دی کہ وہ شاکا کی لاش تھی۔ میرے دل و دماغ میں ایک طوفان سا اٹھا اور میں نے بے اختیار ان کمروں کی جانب قدم اٹھائے جو صحن کے اختتام پر پہلو بہ پہلو تعمیر کیے گئے تھے۔ اس وقت میرا ذہن تیز آندھیوں کی زد میں تھا۔

شاکا وہ شخص تھا جس کی پناہ میں میری ساحل کو رکھا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر مونگ کا منصوبہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک معقول اور بے داغ منصوبہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی میرا دل اس طرف سے مطمئن نہیں تھا اور...... میری یہ قلبی بے اطمینانی کوئی رنگ لے آئی تھی۔ شاکا کی لاش کسی بہت بڑے بھونچال کی آمد کی خبر دیتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، ڈاکٹر مونگ کا منصوبہ داغ دار ہو گیا ہو!

میں دھڑکتے دل اور دوڑتے ہوئے قدموں سے ایک کمرے میں پہنچا۔ مذکورہ کمرا کسی انسانی وجود سے خالی تھا۔ نیچی چھت والے اس کمرے کی ایک پتھریلی دیوار میں طاق کے اندر ایک دیا روشن تھا۔ فضا میں رچی بسی مخصوص بو نے مجھے بتا دیا، وہ دیا یاک کی چربی سے روشن کیا گیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس چھوٹے سے گھر میں چار افراد کو موجود ہونا چاہیے تھا۔ شاکا، اس کی بیوی بھان متی، ان کی بیٹی بندیا اور میری رگِ جاں ساحل!

شاکا کی عبرت اثر لاش باہر صحن میں پڑی تھی۔ باقی تین افراد کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں لپک کر دوسرے کمرے میں پہنچا اور اس کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے پاؤں من من کے ہو گئے۔ میری بصارت کو ایک خونچکاں منظر نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ کمرے کے فرش پر دو عورتوں کی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں ایک نوجوان لڑکی اور دوسری ادھیڑ عمر عورت تھی۔ ان دونوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وہ کٹی ہوئی گردنوں کے ساتھ کمرے کے فرش پر ایک دوسرے سے الجھی پڑی تھیں۔ اس کمرے میں بھی یاک کی چربی سے جلنے والا ایک دیا روشن تھا۔ تبت اور نیپال کے دور دراز علاقوں میں یاک کا گوشت کھانے میں اور چربی جلانے میں استعمال کی جاتی ہے۔

ملگجی روشنی میں دو انسانوں کی موت کے منظر نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ وہ آپس میں گتھم گتھا پڑی تھیں اور ان کی نصف کٹی ہوئی گردنوں سے بہنے والے خون نے کمرے کے فرش کو دور تک سرخ کر رکھا تھا۔ موسم کی ٹھنڈک نے اس خون کو جما دیا تھا۔ وہ اس طور ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا، ایک نے دوسری کو بچانے کی کوشش کی ہو مگر سفاک درندوں نے وہ کمزور کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ زندگی دونوں سے روٹھ گئی۔ گھر کے صحن میں شاکا کو بھی اسی انداز میں گردن کاٹ کر موت سے ہمکنار کیا گیا تھا۔ قاتلوں نے فائرنگ سے اجتناب برتا تھا۔

یہ اندازہ لگانے میں مجھے ذرا دیر نہ لگی کہ کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی ان دو لاشوں میں سے کسی کا تعلق میری ساحل سے نہیں تھا۔ ساحل کو اس ''مردہ خانے'' میں نہ پا کر مجھے اطمینان سا محسوس ہوا۔ تاہم اس مختصر سے خاندان کے عبرت ناک انجام نے مجھے ان لمحات میں دل گرفتہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا کہ اگر ساحل وہاں موجود نہیں تو پھر کہاں ہے؟

اس سوال کا فوری اور منطقی جواب یہی تھا کہ جن سفاک وحشیوں نے شاکا اور اس کی فیملی کو حسرت بھری موت دی وہ ساحل کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے۔ بلکہ زیادہ درست یہ تھا کہ ساحل کو حاصل کرنے کے لیے ہی اس ہنستے بستے گھرانے کا چراغ گل کر دیا گیا تھا۔ شاکا، بھان متی اور بندیا نہایت ہی خفیہ انداز میں ساحل کی حفاظت پر مامور تھے۔

انہیں اس فرض کی ادائیگی پر کڑی سزا دی گئی تھی' ایک بے درد سزائے موت!

اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ شاکا کے گھر پر میرے ہی دشمنوں نے شب خون مارا تھا اور اس وقت میرا سب سے بڑا دشمن تھا...... ربی موشے ہائمن!

موشے ہائمن ان پانچ نایاب پتھروں کے حصول کی خاطر دیوانہ ہو رہا تھا جو بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں موجود تھے۔ مذکورہ خفیہ تہ خانے تک صرف اور صرف ساحل ہی اسے پہنچا سکتی تھی۔ ساحل پچھلے کچھ عرصے سے اسی شیطان کی تحویل میں تھی۔ ساحل کو ربی کے قبضۂ قدرت سے نکالنے کے لیے میں نے اسے ناقابلِ فراموش نقصان پہنچایا تھا۔ جس کے بدلے میں وہ میری جان کا دشمن ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر موتگ نے پچھلے دنوں ساحل کو ربی کے بندوں سے چھین کر جو کارنامہ انجام دیا تھا یہ اسی کا ردِعمل تھا۔ جواب آں غزل میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے!

نیپال خصوصاً کھٹمنڈو میں جمی فونڈا ربی کے عزائم کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل تھا۔ اسے یہاں کی ایک طاقت ور سیاسی شخصیت کی آشیر باد حاصل تھی۔ جوگندر پال نامی وہ سیاسی شخص کھلم کھلا اور در پردہ دونوں طریقوں سے جمی فونڈا کی مدد کر رہا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا' اس بستی میں جمی فونڈا کے بندوں ہی نے کارروائی کی ہوگی۔ ربی نے بدھ نیل کنڈ والا مشن جمی فونڈا کو سونپ رکھا تھا۔

میں گہرے رنج و دکھ سے ان دو لاشوں کو تکے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر موتگ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا ''وجدان! سب کچھ ختم ہوگیا۔ یہاں اب ہمارے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ دونوں میری بے خبری میں لاشوں والے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔

''سب کچھ ختم نہیں ہوا ڈاکٹر!'' میں نے گمبھیر مگر بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''ان تینوں کو دردناک موت کے منہ میں دھکیلنے والے میری ساحل کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ہمیں فوراً ان تک پہنچنا ہوگا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''اس سے پہلے کہ سب کچھ ختم ہو جائے!''

ڈاکٹر تشویش بھرے لہجے میں بولا ''یہ جمی فونڈا کے آدمیوں کی وحشیانہ کارروائی ہوسکتی ہے۔ ساحل کو اس کے قبضے سے نکال کر میں نے اسے جو چوٹ دی تھی یہ اسی کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر افسردہ نظر سے فرش پر پڑی بھان متی اور بندیا کی لاشوں کو دیکھنے لگا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن...... جمی فونڈا اور اس کے آدمی یہاں تک پہنچنے میں کیسے کامیاب ہوگئے۔ یہ ٹھکانا تو اتنا محفوظ اور خفیہ تھا کہ......''

''یہ بعد میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''فی الحال ہمیں فوری طور پر ساحل کا تعاقب کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں وہ لوگ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کی طرف گئے ہوں گے۔ تم نے بتایا تھا' آج آدھی رات کے بعد وہ عبادت گاہ پر ہلا بولیں گے اور اب آدھی رات بھی ہوگئی۔''

ڈاکٹر نے میرے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا ''میں تمہارے خیال اور تجویز کی تائید کرتا ہوں۔ وہ یقیناً ساحل کو اپنے ساتھ عبادت گاہ ہی لے کر جائیں گے کیونکہ اس کے تعاون کے بغیر وہ لوگ عبادت گاہ کے تہ خانے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ تم فکر نہ کرو' ہم سیدھے ادھر ہی جائیں گے۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ایک بات کا مجھے پورا یقین ہے وجدان! وہ لوگ ساحل کو کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں بھول کر بھی نہیں سوچ سکتے۔ ساحل اس خزانے کی کنجی ہے جس کے حصول کے لیے ربی موشے ہائمن پاگل ہوا جا رہا ہے اور ساحل ان لوگوں کے پاس ایک طرح سے ربی کی امانت کی حیثیت رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر کی بات وزن سے خالی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک اندیشے نے سر ابھارا ''موتگ!'' میں نے تشویش ناک لہجے میں ڈاکٹر کو مخاطب کیا ''کیا اس بات کا امکان ہے کہ وہ لوگ ساحل کے توسط سے تہ خانے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں؟''

ڈاکٹر موتگ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ یاک کی چربی سے روشن چراغ کی مدھم روشنی میں ڈاکٹر کا چہرہ تشویش اور فکر کا مرقع نظر آتا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں' اس بات کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''دیکھو وجدان! اگر ساحل نارمل ہوتی تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا تھا' وہ اپنی جان دے دیتی مگر کسی دیوانے کو اس گراں قدر خزانے تک پہنچانے کا وسیلہ نہ بنتی لیکن تم جانتے ہو' اس کی ذہنی اور روحانی صحت تسلی بخش نہیں۔ ربی نے اسے ہپناٹزم کے مختلف سیشنز سے

گزار کر تقریباً خود سے بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ ربی کی تحیشنز کے زیرِ اثر ہے۔ مجھے اس کے علاج کا خاطر خواہ موقع نہیں مل سکا۔''

وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ''اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ لوگ عبادت گاہ کے تہ خانے میں داخل ہو جائیں۔ شاید اسی لیے محترم سانگ نو کی خواہش تھی کہ ہم دونوں مل کر اس خزانے کی حفاظت کریں۔''

سانگ نو' ڈاکٹر موتگ کا بڑا تھا۔ سانگ نو کا ذکر کر کے وہ افسردہ ہوگیا کیونکہ محترم سانگ نو اب آں جہانی ہو چکا تھا۔ اس نے پہلی اور آخری واحد ملاقات میں مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس کی نصیحتیں میرے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس کی باتوں سے میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا' بدھ نیل کنڈ والے مشن میں ڈاکٹر موتگ کے ساتھ مجھے بھی دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لیے سانگ نو نے مجھ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالا تھا لیکن حالات خود بخود مجھے یو ایس اے سے گھسیٹ کر یہاں کھٹمنڈو میں لے آئے تھے۔ ''ہم دونوں'' سے ڈاکٹر موتگ کی مراد بھی وہ اور میں ہی تھی۔

میں نے پوچھا ''ڈاکٹر نوتگ! ان دنوں جو بدھ بھکشو اپنی فیملی کے ساتھ عبادت گاہ کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے ہے' اس کا کیا ہوا۔ میری معلومات کے مطابق وہ شخص بھی خفیہ تہ خانے اور وہاں موجود بیش بہا خزانے کے راز سے واقف ہے۔ ربی کے بھیجے ہوئے وحشی درندے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش بھی تو کر سکتے ہیں؟''

ڈاکٹر موتگ نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور یک ٹک بھان متی' بندیا کی لاشوں کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گمبھیرتا ظاہر کرتی تھی' وہ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے کہیں اور بھی پہنچا ہوا تھا۔

اس کی خاموشی کے دوران میں لی یان کو بولنے کا موقع مل گیا۔ پہلی مرتبہ' ہمارے درمیان جاری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا ''میرا خیال ہے' آگے بڑھنے سے پہلے ہمیں شاکا کی لاش کو بھی صحن سے اٹھا کر اندر کمرے میں ڈال دینا چاہیے۔'' پھر وہ افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولی ''اوہ...... بے چارے......!''

ڈاکٹر موتگ جیسے کسی موقع کی تلاش ہی میں تھا' جلدی سے بولا ''ہاں وجدان! آؤ' شاکا کی لاش کو اٹھا کر اندر لاتے ہیں۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا' وہ میرے سوال کا جواب دینے سے کترایا تھا۔ بہرحال' وہ کرید کا وقت اور موقع نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھ ہی صحن کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ آیندہ پانچ منٹ کے اندر ہماری باہمی کوشش سے شاکا اپنی ''فیملی'' کا قرب حاصل کر چکا تھا۔

تین لاشوں پر مشتمل اس ''فیملی'' پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے بے ساختہ میرے ہونٹوں سے پھسل گیا ''ان بدبختوں نے بھی کیا حسرت ناک موت پائی ہے۔ کاش ہم سرِشام ہی یہاں پہنچ گئے ہوتے!''

''سرِشام؟'' ڈاکٹر موتگ نے چونک کر وضاحت طلب نظر سے میری جانب دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''میرے اندازے کے مطابق آج شام کو اس گھر پر یہ قیامت ٹوٹی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو وجدان؟'' ڈاکٹر موتگ کا چہرہ تفکر کی لکیروں کے جال میں قید ہوگیا ''آج شام چھ بجے تو شاکا نے مجھے ''سب ٹھیک ہے'' کی اطلاع دی تھی۔ میں یہ بات تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم کس بنا پر سرِشام اس خوں چکاں واقعے کی وقوع پذیری کی بات کر رہے ہو؟''

میں نے اس کے سوالات کے جواب دینے کے بجائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میرے اندازے کے مطابق' یہ واقعہ آج شام لگ بھگ سات بجے پیش آیا ہے!''

یہ اندازہ قائم کرتے ہوئے میرے ذہن میں تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ میں خود کو رتنا پارک میں بیٹھا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ لی یان بھی میرے ساتھ ہی پارک کی ایک سنگی بینچ پر بیٹھی تھی۔ میں آنکھیں بند کیے تیسری آنکھ کے استعمال میں مصروف تھا۔ اسی مصروفیت کے دوران میں اچانک ایک مانوس کھنکتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ تم یہاں بیٹھے تصور کی کرتب بازیاں دکھاتے رہو اور وہاں......!

جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ آواز معدوم ہوگئی تھی۔ میں جل ترنگ بجاتی اس سحر آفریں آواز کو لاکھوں کروڑوں آوازوں میں بالکل الگ شناخت کر سکتا تھا۔ وہ ملکہ کوہسار نیلگری کی جادو اثر اور کیف آور آواز تھی۔ اس دھمکی بردار آواز نے مجھے یک لخت آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس وقت شام کے سات بجے تھے۔ نیلگری کی آواز اور الفاظ نے مجھے کسی خطرے کی آگاہی دینا چاہی تھی۔ وہ بعض اوقات ایسی ہی اشاروں کنایوں والی ہو جاتی تھی۔ اس وقت میں جن حالات میں گھرا ہوا تھا اس

میں سب سے زیادہ اہمیت ساحل کی تھی۔ نیلگری کی وارننگ نے میرا دھیان ساحل کی جانب پھیر دیا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا' موجودہ حالات میں' میں ساحل کے بارے میں سوچوں اور میرے چہرے سے پریشانی ظاہر نہ ہو!

اسی پریشانی کو سب سے پہلے لی یان نے نوٹ کیا کیونکہ وہی ہستی اس وقت میرے سب سے زیادہ قریب بیٹھی تھی۔ اس نے اس بارے میں مجھ سے استفسار بھی کیا تھا لیکن میں نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔ اس سے میری اندرونی بے چینی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ میں راستے بھر ساحل کے بارے میں سوچتا اور فکرمند ہوتا رہا۔

گھر پہنچے تو ڈاکٹر مونگ سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے میری پریشانی کو چہرے سے بھانپ لیا۔ علیحدگی میسر آتے ہی اس نے پوچھ لیا۔ میں نے نیلگری کے حوالے سے ساری بات بتادی تو اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا' فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم پروگرام کے مطابق بستی کی طرف جائیں گے اور...... یہ کہ شام چھ بجے شاکا نے اسے ''سب ٹھیک'' ہے کی اطلاع دی تھی۔

ڈاکٹر مونگ کی تسلی تشفی سے میرے دل کی بے کلی رفع نہ ہوسکی۔ اس کے بعد حالات میں ایسی ہنگامہ خیزی نے جگہ بنائی کہ سنجیدگی اور آرام سے اس بارے میں سوچنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور اب میں محسوس کررہا تھا' اس وقت فکرمند ہونے کی ضرورت تھی۔ نیلگری کی کوئی صدا' کوئی ادا خالی از معنی نہیں ہوسکتی۔ اس نے یقیناً مجھے اسی واقعے کے بارے میں اشارہ دیا تھا لیکن اب تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس خون ریز واقعے کو بیتے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزر گئے تھے۔ اگر جی فونڈا کے آدمی ساحل کو اپنے ساتھ لے کر بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کی طرف گئے تھے تو وہ کب کے وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔ اس ہائی وے والی بستی سے عبادت گاہ تک پہنچنے کے لیے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ درکار تھا۔

ڈاکٹر مونگ کافی دیر سے خاموش کھڑا مجھے تکے جارہا تھا۔ میں امید کررہا تھا' وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا لیکن سوال کرنے کے بجائے وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے' اب ہمیں بدھ نیل کنڈ کی جانب روانہ ہوجانا چاہیے!''

میں نے اور لی یان نے خاموشی سے اس کی تقلید کی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تاہم بدنصیب شاکا کے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے گھوم پھر کر اچھی طرح دونوں کمروں کا جائزہ لیا تاکہ حملہ آور قاتلوں کے بارے میں کوئی سراغ مل سکے لیکن اس سلسلے میں ہمارے ہاتھ کسی کامیابی تک رسائی حاصل نہ کرسکے۔

میرے مشورے پر اس ''مردہ خانے'' کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تاکہ اگلی صبح بستی والے بہ آسانی ان تک رسائی حاصل کرسکیں۔ اس طرح وقت پر ان کے عقیدے کے مطابق آخری رسومات کی ادائیگی ممکن ہوجاتی۔ میں گھر کا داخلی دروازہ بھی کھلا چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔ وہ گھر اب ہر قسم کے خطرے سے آزاد ہوگیا تھا۔

کوئی بھی مکان' مکینوں سے ہوتا ہے۔ جس مکان میں مکین موجود ہوں وہ گھر ہوجاتا ہے۔ وہ گھر اب خالی مکان میں بدل گیا تھا۔ اس مکان میں بسنے والے اب اس دنیا کے باسی نہیں رہے تھے لہٰذا وہاں موجود کسی بھی شے کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ انسان کی زندگی کی بس اتنی سی حقیقت ہے!

جس گھر کے ایک' دو یا اس سے زیادہ افراد کسی دشمنانہ کارروائی کی بھینٹ چڑھ جائیں' انہیں کوئی دوبارہ زندہ تو نہیں کرسکتا لیکن دستورِ زمانہ ہے کہ باقی زندہ بچ رہنے والے افراد کی اشک شوئی کے لیے ان کی بھرپور مالی مدد کردی جاتی ہے۔ افسوس! ہم شاکا کی فیملی کے ساتھ دستورِ زمانہ بھی نہیں نبھاسکتے تھے۔ ہم لاکھوں' کروڑوں بھی اس مکان کے در و دیوار پر نچھاور کردیتے' وہاں کی جگر پاش ویرانی اور ہولناک سناٹے میں بہار کا ایک جھونکا بھی نہیں لاسکتے تھے۔

بعض حالات میں انسان کتنا مجبور ہوجاتا ہے۔ ایسی مجبوری میں یہی محسوس ہوتا ہے' انسان ازل سے مجبور ہے اور ابد تک مجبور ہی رہے گا۔

ہم بوجھل ذہنوں' پژمردہ دلوں اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ بیرونی دروازے کے قریب پہنچے تو دروازے کی پشت پر نگاہ پڑتے ہی میں چونک اٹھا۔ دروازے کی اندرونی کنڈی کے ساتھ ایک کاغذ لٹکا ہوا دکھائی دیا۔

جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تھے تو کسی کو دروازے کی طرف دھیان دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کنڈی میں سے وہ کاغذ نکال لیا۔ وہ ایک رول کیا ہوا فل اسکیپ کاغذ تھا جو کنڈی کے ہک میں بڑی مہارت سے پھنسایا گیا تھا۔

میں نے رول کیے ہوئے کاغذ کو ایک خاص انداز میں کھول لیا اور اس پر موجود تحریر پر نگاہ دوڑانے لگا۔ اس مقصد کے لیے مجھے ماچس جلانا پڑی جو میں اندر ایک کمرے کے طاق سے اٹھا لایا تھا۔ یہ میری ایک اضطراری حرکت تھی۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔ چلو اچھا ہوا' یہ ماچس اب کام آرہا

تھی۔ وہاں شفاف اور شستہ انگلش میں ایک مختصر سا پیغام درج تھا۔ ڈاکٹر مونگ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا گیا تھا:

نکلوں کے سردار! تمہارا بچا بچایا سر مونڈنا کیسا رہا؟ اگر میری راہ میں دوبارہ آنے کی کوشش کی تو یہ استرا تمہاری شہ رگ پر بھی چل سکتا ہے۔ اپنے تین وفاداروں کا حشر دیکھ کر یقیناً تمہیں عبرت ہوگئی ہوگی!

اس مختصر دھمکی آمیز پیغام کے اختتام پر ''جے۔ ایف'' درج تھا۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا' جے۔ ایف کا مطلب سیدھا سیدھا ''جمی فونڈا'' تھا۔ اب جے۔ ایف کینیڈی تو ہونے سے رہا!

بدھ کے پیروکار عموماً اپنے سر کو منڈوا کر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مونگ کو اسی مناسبت سے نکلوں کا سردار کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ کا اپنا آدھا سر آگے سے منڈا ہوا تھا۔ تاہم چوٹی کاٹنے کے بعد اس نے پچھلے بالوں کو آگے گرا کر ایک مخصوص اسٹائل بنالیا تھا۔ جب ہم الاسکا سے واشنگٹن آرہے تھے تو ڈاکٹر مونگ ریفوشے نے اپنی چوٹی کاٹ ڈالی تھی اور حلیے میں بھی مناسب تبدیلی کرلی تھی۔ جمی فونڈا کی اس دل جلانے والی تحریر سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ ڈاکٹر مونگ کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ ربی نے اس سلسلے میں اسے ہر قسم کی معلومات فراہم کی تھیں۔

''کیا لکھا ہے' اس کاغذ پر؟'' ڈاکٹر کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

اسی وقت ماچس کی تیلی اپنے جلاؤ کے اختتام تک جا پہنچی۔ میں نے نئی تیلی جلانے کے بجائے دروازے سے باہر قدم نکالتے ہوئے کہا۔

''جیپ میں بیٹھ کر آرام سے پڑھ لینا ڈاکٹر!''

اس نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ میرے پیچھے پیچھے وہ دونوں بھی شاکا کے گھر سے نکل آئے۔ گھر کے بیرونی دروازے کو پروگرام کے مطابق کھلا چھوڑ دیا گیا۔ ہم پہلے والی پوزیشن میں جیپ کے اندر آکر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر نے ریڈنگ لائٹ جلائی اور گردن موڑ کر ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا جبکہ میں لی یان کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر کے دراز ہاتھ کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے جمی فونڈا کا سندیسہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ رول کیا ہوا کاغذ میرے ہاتھ سے لے کر پڑھنے لگا۔

اسی لمحے میرے پہلو میں کہنی کا ہلکا سا ٹہوکا لگا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھا۔ وہ الجھی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے بھویں اچکائیں تو وہ منہ سے کچھ نہ بولی تاہم میں نے اس کی آنکھوں میں مجسم سوال کو بہ آسانی پڑھ لیا۔ وہ بھی مجھ سے اس دھمکی آمیز رقعے کے بارے میں بہ زبانِ خاموشی پوچھ رہی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے صبر کی تلقین کی اور ڈاکٹر مونگ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس دوران میں وہ اس کاغذ کی تحریر پڑھ چکا تھا' گمبھیر آواز میں بولا۔

''اس رقعے نے ثابت کردیا کہ یہاں ہونے والی بہیمانہ کارروائی جمی فونڈا کی کارستانی ہے!''

''میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''لو یہ کاغذ لی یان کو بھی پڑھاؤ۔'' وہ مذکورہ کاغذ میری سمت بڑھاتے ہوئے بولا ''یہ اس مشن میں ہمارے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ اس کی معلومات بھی اپ ٹو ڈیٹ رہنا چاہئیں۔''

لی یان' جمی فونڈا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں جمی فونڈا کا پس منظر اس کے گوش گزار کیا پھر وہ رقعہ اسے تھمادیا۔ وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''اوہ......!''

لی یان کی یہ ''اوہ'' ڈاکٹر مونگ تک رسائی حاصل نہ کرسکی کیونکہ اسی لمحے اس نے جیپ کے بیدار انجن کو احکام کی تعمیل پر مجبور کردیا تھا۔ جیپ حرکت میں آئی تو ہمارے پہلو ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے۔ ہم نے لگ بھگ آدھا گھنٹا کھلے میں گزارا تھا۔ وہ کھٹمنڈو کے سرد ترین موسم کی ایک ٹھنڈی ٹھار رات تھی۔ ایسے ظالم موسم میں لگ کر بیٹھنا بھلا محسوس ہوتا ہے۔ میں نے لی یان سے دور ہٹنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس نے ضرورت سمجھی۔ جیپ کے اندر خاموشی کا راج تھا اور یہ جیپ ماحول کے سناٹے کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ بستی سوئی سوئی سی لگ رہی تھی۔ اس بستی کے گھر میں آج قیامت برپا ہوگئی تھی مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی شخص کو کانوں کان اس سانحے کی خبر نہ ہو۔

جلد ہی ہم ایک نیم بیضوی چکر کاٹنے کے بعد اس راستے پر نکل آئے جو ہمیں اس بستی سے بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کی طرف لے جاتا۔ ہماری اگلی منزل وہ عبادت گاہ ہوتی جہاں آج رات' ربی کی بھیجی ہوئی ٹیم کوئی ''عظیم کارنامہ'' انجام دینے والی تھی۔

ہم اپنے راستے پر کوئی پانچ سو میٹر آگے نکل آئے تو مونگ ریفوشے نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''وجدان! تمہارے بازو کا کیا حال ہے؟''

یہ ایک غیر متوقع سوال تھا۔ میں امید کر رہا تھا' وہ جمی فونڈا یا نیل کنڈ کے بارے میں بات کرے گا۔ میں اسٹیشن ویگن والے دشمنوں سے نمٹنے کے بعد جب جیپ میں آ کر بیٹھا تھا تو ڈاکٹر کو اپنے زخمی بازو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس کے بعد جب لی یان پوری طرح ہوش وحواس میں آ گئی تو وہ بھی میرے گھائل بازو کی ہسٹری اور مسٹری سے آگاہ ہو گئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی اپنے بازو سے غافل ہو گیا تھا۔ شاید یہ شاکا کے گھر میں پیش آنے والے اس افسوس ناک خونچکاں واقعے کا اثر تھا۔ اب ڈاکٹر مونگ نے یاد دلایا تو مجھے بازو میں تکلیف کا احساس ہوا۔

''ہلکا ہلکا درد محسوس کر رہا ہوں۔'' میں نے اپنے مضروب بازو کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔

وہ معنی خیز انداز میں بولا ''وجدان! جس طرح قطرہ قطرہ مل کر دریا بن جاتا ہے' بالکل اسی طرح ہلکا ہلکا مل کر بھاری ہو جاتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں لینے کے دینے پڑ جائیں اس لیے......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا دیر کو خاموش ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے جیپ کی رفتار انتہائی کم کر دی تھی۔ اپنے ادھورے بیان کو مکمل کرنے کے لیے اس نے اضافہ کیا۔

''کیوں نہ پہلے تمہارے زخم کا معائنہ کر لیا جائے۔ ہمارے پاس فرسٹ ایڈ کا تمام سامان موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک خوب صورت فلپائنی نرس کا ساتھ بھی ہمیں میسر ہے۔'' اس نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں لی یان کو دیکھا اور استفساریہ انداز میں بولا ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''نو سر۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ مؤدب انداز میں بولی۔

ڈاکٹر مونگ ریفو شے کی شخصیت لی یان کے لیے ہر لحاظ سے واجب الاحترام تھی۔ سانگ فو کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مونگ' وِنگ ہنگ کا بڑا تھا اور لی یان وشون' مسٹر ہنگ کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ لی یان کے لیے مونگ بگ باس کی حیثیت رکھتا تھا۔

ڈاکٹر مونگ نے نگاہ کا زاویہ تبدیل کیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''تم کیا کہتے ہو وجدان؟''

ہم نے تھوڑی دیر پہلے جو خوں ریز مظاہر دیکھے تھے وہ سنجیدگی' افسردگی اور گمبھیرتا کا تقاضا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مونگ کے انداز سے میں نے محسوس کیا کہ وہ ماحول میں طاری سنگینی اور دل گرفتگی کو کم کرنے کا خواہاں تھا جبھی اس نے چھیڑ چھاڑ والا اسٹائل اپنایا تھا۔ یہ ایک طرح سے ٹھیک بھی تھا۔ ہم جتنے بڑے معرکے پر جا رہے تھے اس کے لیے اعصاب کو پُرسکون اور ہاتھ پاؤں کو نہایت ہی مستعد ہونا چاہیے تھا۔ اگر اعصاب ہمارے قابو میں رہتے تو ہم پوری ذہنی یک سوئی کے ساتھ وہ میدان مار سکتے تھے۔ میں نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں کہہ دیا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اس وقت ایک تجربہ کار ڈاکٹر اور ایک خوب صورت نرس کے درمیان آ پھنسا ہوں۔ تم جو چاہو' میرے ساتھ سلوک کرو۔ میں اف تک نہیں کروں گا۔''

''لارڈ بدھا نے چاہا تو ہم تمہارے ساتھ اچھا سلوک ہی کریں گے۔'' ڈاکٹر مونگ نے پُراعتماد لہجے میں کہا اور جیپ روک دی۔ میں سمجھ گیا' وہ میرے بازو کی ''تیمارداری'' کے بغیر آگے نہیں بڑھے گا۔

لی یان نے نرسنگ کورس کر رکھا تھا۔ نیوجرسی میں میرے دوست وسیم کو وہی اٹینڈ کرتی رہی تھی۔ ہم اس وقت جس جیپ میں سفر کر رہے تھے' اس میں عقبی نشست کے پیچھے ایک خلا سا بنا ہوا تھا جہاں ایک طرف پانچ پانچ گیلن پیٹرول والے دو کین اپنے اسٹینڈز میں فکس تھے' دوسرے کونے میں ہمارا بیگ رکھا تھا۔ ہمارے بیگ کے ساتھ ہی فرسٹ ایڈ باکس بھی موجود تھا۔

آئندہ دس پندرہ منٹ میں ڈاکٹر اور نرس نے مل کر میرے بازو کا ماہرانہ معائنہ فرمایا اور یہ رپورٹ دی کہ زخم خطرناک نہیں۔ گولی میرے بائیں بازو کے ٹرائی سیپ مسل کو چھیلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ لی یان نے میرے ٹرائی سپس (TRI CEPS) کو اچھی طرح ایک اینٹی سیپٹک لوشن میں روئی بھگو کر صاف کیا پھر زخم پر ایک ہیلنگ آئنٹمنٹ پھیلا کر ڈریسنگ کر دی۔

''کسی پین کلر کی ضرورت تو محسوس نہیں کر رہے ہو؟'' ڈاکٹر مونگ نے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

ڈاکٹر نے ایک مرتبہ پھر جیپ آگے بڑھا دی۔

ہائی وے والی بستی سے بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ تک کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا لیکن طے شدہ پروگرام کے تحت ہمیں یہ فاصلہ پاٹنے میں ڈھائی سے تین گھنٹے لگ سکتے تھے اور کچھ بعید نہیں کہ تین گھنٹے سے بھی زیادہ!

دراصل مزید چند کلومیٹر آگے جانے کے بعد ہمیں اپنا

رخ تبدیل کرنا تھا۔ ہم اس راستے سے عبادت گاہ تک نہیں پہنچنا چاہتے تھے جو عام گزرگاہ تھی۔ ہمارے دشمن اس وقت بھاری تعداد میں وہاں موجود تھے اور عام گزرگاہ خصوصاً عبادت گاہ کے نزدیک ہمارے لیے کئی گھاتوں کا بندوبست ہو گا۔ ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ عبادت گاہ سے چند کلومیٹر پہلے ہم اپنا راستہ تبدیل کر دیں گے اور ایک لمبا چکر کاٹ کر عبادت گاہ کی دوسری سمت پہاڑی سلسلے کے بیچ نمودار ہوں گے۔ یہ وہی رخ ہوتا جدھر سے میں پہلی مرتبہ اس عبادت گاہ تک پہنچا تھا۔ وہ سمت ہمارے مشن کے لیے زیادہ سودمند تھی۔

اس خیال نے میرے تصور میں ماضی کی وہ رات پھرا دی جب میں زخمی سمبا کے ہمراہ ایک لینڈ کروزر میں سوار اپنے دشمنوں سے بھاگتا پھرتا اس عبادت گاہ کی طرف اتفاقاً نکل آیا تھا۔ تب جانگ لی کے غنڈوں نے ہمیں ایک حویلی میں قید کر کے بری طرح پیٹا تھا۔ گویا انہوں نے میرا جوڑ جوڑ کھول کر رکھ دیا تھا۔ سمبا کی حالت قابل رحم تھی۔ حویلی سے فرار کے لیے ہمیں ایک لینڈ کروزر جیپ حاصل ہو گئی اور ہم چٹانی راستوں کی دشواریوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس عبادت گاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے جس کے تہ خانے میں ایک انمول خزانہ موجود تھا مگر اس وقت یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔

بہرحال' اب اگر ہم عبادت گاہ کی اس سمت رسائی حاصل کر لیتے تو دشمن کی نظر سے محفوظ رہ سکتے تھے اور اس سمت تک پہنچنے کے لیے ہمیں ایک لمبا' دشوار گزار چکر کاٹنا تھا جس کے سبب وقت دگنا لگتا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق' اگر راستے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آتا تو ہم ساڑھے تین بجے تک اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتے۔

ہماری جیپ اونچے نیچے پہاڑی راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک تو وہ مشکل ترین راستہ' اوپر سے رات کا وقت۔ ڈاکٹر مونگ بڑی مضبوطی سے احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھا۔ ایک ذرا سی غلطی ہم تینوں کو موت کے منہ میں پھینک سکتی تھی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا' پھر بھی ہم شدید زخمی ضرور ہو جاتے۔ جیپ کو جو نقصان پہنچتا' وہ ہماری راہ کھوٹی کرنے کا وسیلہ بن جاتا۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک خاموشی رہی پھر ڈاکٹر مونگ نے قدرے شکایتی انداز میں کہا ''وجدان! وہاں شاکا کے گھر میں تم نے ایک بات بڑے وثوق سے کہی تھی لیکن یہ نہیں بتایا' تمہارے وثوق کی بنیاد کیا تھی؟''

''تم کس بات کا ذکر کر رہے ہو ڈاکٹر؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اس واقعے کے پیش آنے کا وقت تم نے بڑے اعتماد سے بتایا تھا!''

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر کہا ''ڈاکٹر! میں تمہیں اس بارے میں بتا چکا ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا' آج شام جب میں باہر سے آیا تھا تو تم نے مجھے الجھا ہوا پا کر کئی سوالات کر ڈالے تھے اور میں نے تمہیں اپنی ذہنی کیفیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ ہمارے درمیان نیلگری بھی ڈسکس ہوئی تھی۔ میں نے نیلگری کے ایک جملے کی بنا پر وہ بات کی تھی۔ جب نیلگری نے مجھے کسی ان جانے خطرے سے آگاہ کیا اس وقت شام کے سات بج رہے تھے۔''

اس مرتبہ ڈاکٹر مونگ نے طویل سانس خارج کی ''اوہ......!''

نیلگری کے ذکر پر لی یان کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ سات بجے شام میرے ساتھ تھی اور ہم دونوں اس وقت رتنا پارک کی بینچ پر بیٹھے تھے جب کا یہ ذکر ہے۔ نیلگری کی ''اطلاع'' کے بعد میرے چہرے پر جو تاثرات نمودار ہوئے اور میں نے فوری طور پر جس اضطراری رویے کا مظاہرہ کیا وہ لی یان سے چھپا نہیں رہا تھا۔ اس نے اس وقت مجھ سے استفسار بھی کیا تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ ڈھیروں سوالات کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے ڈاکٹر مونگ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے لی یان کو یہ موقع فراہم نہیں ہونے دیا۔

''ڈاکٹر! میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا ''تم نے بھی میرے ایک اہم سوال کا ابھی تک جواب نہیں دیا حالانکہ وہ سوال خاصا وضاحت طلب تھا؟''

وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ''تم سوال دہراؤ۔ میں وضاحت کر دیتا ہوں۔''

''میں نے تم سے عبادت گاہ میں موجود بدھ بھکشو اور اس کی فیملی کے بارے میں استفسار کیا تھا؟''

''اوہ وہ لوگ!'' ڈاکٹر مونگ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''کیا ہوا ان لوگوں کو؟''

''جیسا کہ تم جانتے ہو' وہ بھکشو تہ خانے والے راز سے واقف تھا......'' ڈاکٹر مونگ نے اتنا کہہ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میرا دماغ سنسنا اٹھا۔ رگ و پے میں ہل چل سی مچ گئی اور دل کی دھڑکن یک دم بڑھ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا' ڈاکٹر ماضی کے کسی قصے کو حال کے کرداروں کی مناسبت سے بیان

کرنے جا رہا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے اسی عبادت گاہ میں خون رنگ تماشا ہوا تھا۔ جانگ لی اور ناگ پال کے غنڈوں نے وہاں انسانی خون کی ہولی کھیلی تھی۔ تھونچی اور بھیرجانی کی تشدد شدہ لاشیں میرے تصور میں گھوم گئیں۔

تھونچی ایک طویل عرصے سے اس عبادت گاہ میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ وہ بھی تہ خانے والے راز سے آگاہ تھا۔ اس کی بیوی بھیرجانی اور دھنو (ساحل) اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں۔ تھونچی نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے وہ راز میری آنکھوں کے راستے میرے سینے میں منتقل کیا تھا پھر میرے توسط سے دھنو بھی تہ خانے والے خزانے اور وہاں تک رسائی کے طریقۂ کار سے آگاہ ہوگئی تھی۔ یہ سوچ کر میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی کہ کہیں اس عبادت گاہ کی تاریخ کو دہرایا تو نہیں جا چکا!

یہ تمام تر خیالات سیکنڈ کے دس ویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے اور میں دوبارہ ڈاکٹر مونگ کی طرف متوجہ ہوگیا ''ہاں' میں اچھی طرح جانتا ہوں' وہ بدھ بھکشو تہ خانے والے راز سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ کافی عرصہ پہلے وقفے وقفے سے اس عبادت گاہ کے پھیرے بھی لگاتا رہا تھا۔ اس وقت تھونچی زندہ تھا۔ دونوں بھکشو عبادت گاہ کے اندر جا کر گھنٹوں غائب رہتے تھے۔ وہ تہ خانے میں اتر کر راز و نیاز کرتے رہتے۔ اس بدھ بھکشو کا تعلق دلائی لاما کے دیش دھرم شالا سے تھا۔ وہ اپنی ادھیڑ عمر بیوی اور دو نوعمر بچوں کے ساتھ' تھونچی کے انتقال کے بعد اس عبادت گاہ میں ''تعیناتی'' ہوا تھا۔ تھونچی کی موت کے بعد دلائی لاما نے اسے عبادت گاہ کے انتظام اور اس کے تہ خانے میں موجود خزانے کی حفاظت کے لیے یہاں بھیجا تھا مگر......''

میں جملہ ادھورا چھوڑ کر متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''مگر یہ تو بتاؤ' اس بھکشو اور اس کی فیملی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ تمہاری پُراسرار خاموشی مجھے تشویش میں مبتلا کر رہی ہے!''

ڈاکٹر نے فوراً میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے گہری سوچ میں ڈوبے پایا تو انتظار کرنے لگا۔ اس انتظار کے ساتھ ہی میرا ذہن ماضی میں بھی جھانک رہا تھا۔ دلائی لاما کے بارے میں بہت سی معلومات مجھے ساحل کے باپ تھونچی سے حاصل ہوئی تھیں۔ تبت سے جلاوطنی کے بعد دلائی لاما نے انڈیا کی شمالی ریاست ہماچل پردیش میں سکونت اختیار کی۔ ہماچل پردیش کے صدر مقام دھرم شالا میں دلائی لاما کو وہ تمام مراعات حاصل تھیں جو کسی بھی جلاوطن ہیڈ آف اسٹیٹ کو حاصل ہوسکتی تھیں۔ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے میں جو خزانہ پوشیدہ تھا وہ ہر دور کے دلائی لاما کی نظر میں رہتا تھا اور تھونچی کے مطابق' دلائی لاما نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات تھی۔

نئے بدھ بھکشو کو میری موجودگی میں ہی اس عبادت گاہ کا چارج دیا گیا تھا۔ ان دنوں میں' کھٹمنڈو میں مایامتی کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ مایامتی ٹیکوناکی ایک اسپتال میں نرس تھی۔ تھی یوں کہ ازاں بعد ناگ پال کے غنڈوں نے اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ نیا بدھ بھکشو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ دھرم شالا سے سیدھا مایامتی کے گھر پر پہنچا تھا۔ اس وقت دھنو بھی میرے ساتھ تھی۔ وہ اس بھکشو کو دیکھتے ہی پہچان گئی تھی۔ وہ عبادت گاہ میں اپنے باپ کے پاس اسے آتے جاتے دیکھ چکی تھی۔ بہرحال' میں نے اس بھکشو سے تفصیلی ملاقات کی اور اگلے روز انسپکٹر بریندرا کے ساتھ اس بھکشو فیملی کو عبادت گاہ میں چھوڑ آیا تھا۔ اسی بھکشو کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ دلائی لاما کو تھونچی کی موت کی خبر مل گئی تھی اور اس نے اسے تھونچی کی جگہ عبادت گاہ میں قیام کرنے کو بھیجا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی تھی کہ وہ لوگ پہلے میرے پاس آئیں پھر عبادت گاہ کا رخ کریں۔ یہ دلائی لاما کا بے پناہ اعتماد تھا جو اس نے مجھ پر کیا تھا۔

ڈاکٹر کی سرسراتی ہوئی آواز نے میرا انتظار ختم کردیا۔ وہ گمبھیر انداز میں مجھے بتا رہا تھا ''ربی کی بھیجی ہوئی ٹیم نے جب پہلی مرتبہ عبادت گاہ کے تہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ بدھ بھکشو اور اس کے بیوی بچے بھی ان کے تشدد کا نشانہ بنے پھر ان ظالموں نے اس مختصر سے خاندان کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ماضی میں ناگ پال کے غنڈوں نے تھونچی اور بھیرجانی کے ساتھ کیا تھا۔''

گویا میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ڈاکٹر مونگ نے نہایت ہی مناسب الفاظ میں بھکشو اور اس کی فیملی کی موت کا اعلان کردیا تو میں ایک افسوس بھری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ ڈاکٹر مونگ کی آواز دوبارہ ابھری۔

''ربی کی ٹیم نے پہلی پیش قدمی اس وقت کی جب ساحل ابھی یہاں نہیں پہنچی تھی۔ اس معرکے میں دونوں طرف شدید نقصان ہوا۔ دوسری کوشش وہ ساحل کی معیت میں کرنا چاہتے تھے لیکن میں نے جمی فونڈا کے چنگل سے ساحل کو نکال لیا پھر مجھے پتا چلا کہ آج آدھی رات کے بعد وہ دوبارہ' ساحل کے بغیر ہی تہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں گے پھر......''

''اور اب تو ساحل بھی انہیں حاصل ہوگئی ہے!'' میں نے ڈاکٹر کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

اس کی خاموشی مجھے کھلنے لگی تو میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا ''ڈاکٹر! بدھ نیل کنڈ کی وہ عبادت گاہ کھٹمنڈو کے ایک تھانے کی حدود میں آتی ہے۔ چار افراد کی ہلاکت کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ تمہیں عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے پولیس سے مدد لینا چاہیے تھی۔ اس سلسلے میں انسپکٹر شیوا بہت اہم کردار ادا کر سکتا تھا؟''

مجھے اچھی طرح یاد تھا' جن دنوں میں کھٹمنڈو میں سرگرم عمل تھا' انسپکٹر بریندرا میرے بہت قریب آ گیا تھا۔ میں نے بھی نیپالی پولیس کی مختلف مراحل پر بھرپور مدد کی تھی پھر جب تھوپچی اور بھیر جانی کو بڑے بہیمانہ انداز میں قتل کر دیا تو بریندرا نے پولیس کی ایک تفتیشی ٹیم ترتیب دے کر باقاعدہ کارروائی کرائی تھی۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ دھنو (ساحل) اب میرے ساتھ رہے گی۔

''تم کیا سمجھتے ہو' میں اس دوران میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا ہوں!'' ڈاکٹر مونگ نے میرے سوال کے جواب میں کہا ''وہاں عبادت گاہ کے اندر جو لوگ اس وقت دیکھ بھال کے فرائض انجام دے رہے ہیں' ان کا تعلق پولیس سے ہے۔ وہ سادہ لباس میں وہاں کی کڑی نگرانی کر رہے ہیں۔''

''اور وہاں آس پاس جمی فونڈا کے آدمی بھی موجود ہیں؟'' میں نے کہا۔

''ہاں' وہ بھی ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا ''شدید ترین نقصان اٹھانے کے بعد بھی انہوں نے مورچا نہیں چھوڑا...... اور اب تک تو ان کے پاس نئی کمک بھی پہنچ گئی ہوگی جس میں سب سے خطرناک ہتھیار تمہاری ساتھی ساحل ہے۔''

ڈاکٹر مونگ نے رتنا پارک والے بنگلے پر گفتگو کے دوران میں ساحل کو قیمتی مہرے سے تعبیر کیا تھا اور اب وہ اس کے لیے خطرناک ہتھیار جیسے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ میرے اور ساحل کے درمیان جس نوعیت کا حساس تعلق تھا' وہ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت بھی مجھے بہت دکھ ہوا تھا اور اب بھی میں ایک تکلیف سے گزر رہا تھا لیکن میں جانتا تھا' ڈاکٹر مونگ نے میری دل آزاری کے لیے وہ سب نہیں کہا تھا لہٰذا میں الفاظ کے وقتی تاثر کو فراموش کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ہمارے پاس اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''وہی دو آٹومیٹک رائفلیں ہیں جن کا تم دیدار کر چکے ہو۔'' اس نے جواب دیا ''ان کے کم و بیش ایک ہزار راؤنڈز بھی موجود ہیں۔ گولیوں والی پیٹی کو میں نے ایک دوسرے خفیہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔''

ڈاکٹر کا اشارہ ان دو سیون ایم ایم گنز کی جانب تھا جو ہم ہائی وے والے معرکے میں استعمال کر چکے تھے۔ مذکورہ گنز ڈاکٹر نے ڈیش بورڈ کے نیچے واقع ایک خفیہ خانے سے برآمد کی تھیں۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''عبادت گاہ کے اندر ہمارے کل چھ افراد موجود ہیں۔ ان میں چار سادہ لباس پولیس والے اور دو میرے اپنے آدمی ہیں۔ یہ چھ کے چھ پوری طرح مسلح ہیں اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے ماہر ہیں۔ مجھے گنز وغیرہ کے استعمال سے دلچسپی نہیں۔ یہ دو گنز میں نے تم دونوں کے لیے رکھ لی تھیں۔''

میں نے کہا ''میں بھی آتشیں اسلحے کے استعمال سے ممکنہ حد تک پرہیز ہی کرتا ہوں لیکن بعض حالات میں یہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جیسے اسٹیشن ویگن والے دشمنوں کے خلاف اگر ہم ہتھیار نہ اٹھاتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا ''ڈاکٹر! جیپ میں فیول کی کیا خبریں ہیں؟''

''دس گیلن پیٹرول تو دو کین میں فاضل رکھا ہے۔'' اس نے بتایا ''اور جیپ کے ٹینک میں فیول کی پوزیشن بتانے والی سوئی اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ ہم اسی ایندھن سے واپس کھٹمنڈو بھی جا سکتے ہیں۔''

''ویِس گڈ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اسی وقت مجھے لی یان پر جھک جانا پڑا۔ ڈاکٹر نے جیپ کو مرکزی راستے سے ہٹا کر ایک تنگ اور مزید دشوار گزار راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ اگر ہم مین راستے پر سفر جاری رکھتے تو لگ بھگ پونے دو بجے ہم عبادت گاہ تک پہنچ جاتے۔ اب راستہ بدل گیا تھا۔ ہمیں ایک طویل چکر کاٹ کر عبادت گاہ تک پہنچنا تھا جس میں زیادہ وقت صرف ہونا یقینی بات تھی۔

میں جیپ کے ٹرن کی وجہ سے لی یان پر جھکا تو وہ مزید آگے جھکتی چلی گئی۔ ہم دونوں کا جھکاؤ ایک ہی سمت میں تھا۔ ہم عقبی نشست پر گویا ایک دوسرے پر گر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

''ذرا سنبھل کر بھئی۔ آگے تو اور بھی خطرناک ٹرننگ آئے گی۔''

ہم دونوں سنبھل گئے۔ مرہم پٹی سے پہلے لی یان میرے بائیں پہلو میں بیٹھی تھی۔ ڈریسنگ کے بعد وہ میرے دائیں طرف آ گئی تھی تاکہ زخمی بازو زیادہ سے زیادہ محفوظ رہے۔ گھائل بازو تو رہا ایک طرف' لی یان کی پوزیشن بدل جانے سے میں بازوئے دیگر میں بھی اچھی خاصی ''تکلیف'' محسوس کرنے لگا تھا!

موسمِ سرما میں انسانی جسم کو زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا معدہ نسبتاً تیز کام کرتا ہے۔ ہم نے رتنا پارک والے بنگلے پر رات آٹھ بجے ڈنر کیا تھا۔ کچھ کھائے پیے ہمیں لگ بھگ پانچ گھنٹے ہو گئے تھے۔ ان دونوں کا تو پتا نہیں مگر میں ہلکی بھوک محسوس کر رہا تھا۔ ہائی وے پر اسٹیشن ویگن والے دشمنوں سے جو مارا ماری ہوئی اس نے اچھی خاصی توانائی کھا لی تھی۔

''ڈاکٹر مونگ! کیا تم کچھ کھانا پسند کرو گے؟'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''نہیں۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا ''البتہ اگر تم لوگ کچھ بھوک محسوس کر رہے ہو تو شغل کر سکتے ہو۔ تمہارے بیگ کے اندر میں نے ایک منی باکس رکھا ہوا ہے جس میں پیٹ پوجا کا مناسب بندوبست موجود ہے۔''

ڈاکٹر جس منی باکس کا ذکر کر رہا تھا' میں اس سے واقف تھا۔ ڈاکٹر نے پیکنگ کے وقت مذکورہ باکس ہمارے بیگ میں رکھوا دیا تھا۔ باکس میں باقاعدہ کھانا تو نہیں تھا البتہ ایک خاص قسم کی مٹھائی موجود تھی جو سوجی اور مختلف قسم کے ڈرائی فروٹس کی آمیزش سے تیار کی گئی تھی۔

بدھا کے پیروکاروں (کٹڑ) کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ دوپہر ڈھلنے کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔ پینے والی اشیا میں بھی پانی' جوس اور سافٹ مشروب پر گزارہ کرتے ہیں لیکن یہ ان لوگوں کا اصول تھا جو دنیا تیاگ کر ایک طرح کا جوگ لے لیتے ہیں۔ باقی بدھ مت بھی ویسی ہی زندگی گزارتے ہیں جیسی دوسرے عام لوگ۔ ڈاکٹر مونگ کے حوالے سے میں نے ایک خاص بات نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ رات کے کھانے کے بعد سے دوسری صبح تک کچھ نہیں کھاتا تھا۔

میں نے لی یان کی طرف صلح مارنے والی نظر سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے تائید دکھائی دی۔ میں نے مخصوص مٹھائی والا وہ باکس کھولا اور ڈاکٹر مونگ کے مطابق' ہم اس ڈرائی فروٹس والی مٹھائی سے شغل کرنے لگے۔

اس دوران میں ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہوتی رہی۔ زیادہ تر بدھ عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ خزانے اور جمی فونڈا کے بارے میں باتیں ہوئیں پھر ہماری گفتگو کا زاویہ شون کی جانب مڑ گیا۔

رتنا پارک والے بنگلے میں آج شام ڈاکٹر مونگ نے مجھے نیوجرسی کے حوالے سے جو تازہ ترین اطلاعات فراہم کی تھیں' وہ میں نے ڈاکٹر کی اجازت پا کر لی یان کے گوش گزار کر دی تھیں۔ وہ شون کے لیے پریشان ضرور تھی تاہم اس پریشانی کو اس نے خود پر طاری نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی برداشت والی عجیب و غریب لڑکی تھی۔

وہ اپنے نظریات کے حوالے سے عجیب اور ان کے ثمرات کے باعث واقعی غریب تھی!

ڈاکٹر مونگ ہماری بات چیت میں شریک ضرور تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا' اس کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں کھٹمنڈو کے مضافات میں میلوں تک پھیلے ہوئے اس سلسلۂ کوہ کو پہلے بھی بھگت چکا تھا۔ یہ خطرناک اور دشوار گزار ٹیڑھے میڑھے راستے قدم قدم پر موت کے مانند منہ کھولے بیٹھے تھے۔ ایک ذرا سی غفلت یا کوتاہی کی سزا زندگی بھر کا پچھتاوا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں اس لیے بھی فضا میں کچھ زیادہ ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی سیاہ رو کے چہرے پر کالک مل دی گئی ہو۔ ہماری جیپ اونچے نیچے چٹانی راستے پر آگے بڑھتے ہوئے اچھل کود مچاتی تو اس کی باڈی جنبشوں کی مناسبت سے ہیڈ لائٹس کی روشنیاں بھی تھرکنے لگتیں۔ ہیڈ لائٹس کے اونچے نیچے حرکت کرتے ہوئے وہ ملگجے ہیولے تاریک رات کے سینے پر بڑا سحر انگیز رقص کر رہے تھے۔ فضا میں ٹھنڈک اور تاریکی ایک خاص تناسب سے نفوذ کیے بیٹھی تھیں۔

ڈاکٹر مونگ نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس ہیوی انجن والی آرمی گرین جیپ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ پتھریلے اور ریتیلے دونوں قسم کے راستوں پر بھاگنے کے لیے یکساں موزوں تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور گاڑی ہوتی تو کبھی کا جواب دے چکی ہوتی۔ وہ بظاہر دکھنے میں ایک پرانی سی میلی جیپ نظر آتی تھی مگر اس کا انجن کسی دیو کی طاقت اور ٹائر کسی جن ایسی گرفت کے حامل تھے۔ میں جب زخمی سمبا کے ساتھ ناگ پال کے حویلی نما بندی خانے سے فرار ہوا تھا تو ایک لینڈ

.....کروز میرے ہتھے چڑھ گئی تھی۔ تمام تر راستے میں اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جما بیٹھا رہا تھا لہٰذا میں ان ڈھلوانی چٹانی راستوں کی ہلاکت خیزی سے بخوبی آگاہ تھا۔

ہمارا سفر ایک مخصوص رفتار سے جاری رہا۔ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا تو محسوس کیا جاسکتا تھا کہ ہم ایک دائرے میں سفر کر رہے تھے اور یہ ایک حقیقت بھی تھی۔ ہم نے جس مقام سے راستہ بدلا تھا اگر وہاں سے ناک کی سیدھ میں چلتے چلے جاتے تو نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں پہنچ جاتے۔ اب ہمیں نصف دائرے میں ایک لمبا قوسی سفر طے کرتے ہوئے عبادت گاہ کی دوسری سمت تھوڑا فاصلے سے باہر نکلنا تھا۔

اس وقت ہم جس راستے سے گزر رہے تھے وہ ایک طرح سے متروک راہ گزر تھی۔ اس لیے بھی وہاں صفائی ستھرائی نظر نہیں آتی تھی۔ جن راستوں سے باقاعدہ سواریاں گزرتی رہیں وہ چھوٹی موٹی رکاوٹوں اور دیگر آلائشوں سے پاک ہوجاتے ہیں مگر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ راستہ صدیوں پہلے آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا رہا تھا اور ایک زمانے سے اس طرف کسی گاڑی وغیرہ کا گزر نہیں ہوا تھا۔

اس قوسی سفر کا ابھی نصف راستہ ہی طے ہوا تھا کہ ہماری جیپ دوطرفہ چٹانوں میں داخل ہوگئی۔ درحقیقت وہ راستہ آگے جا کر نسبتاً تنگ ہوگیا تھا اور ہمیں یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہم دوطرفہ چٹانوں میں داخل ہوگئے ہوں حالانکہ وہ چٹانیں پہلے بھی کچھ فاصلے پر موجود تھیں۔ اگرچہ اوپر آسمان نظر آرہا تھا لیکن تنگ و تاریک راستے کے سبب یہی لگتا تھا جیسے ہم کسی اندھے غار میں محوِ سفر ہوں۔ اس تصور کے ساتھ ہی گھٹن بھی محسوس ہونے لگی۔

یہ سب تو چل ہی رہا تھا' اس پر مستزاد چڑھائی شروع ہوگئی۔ جیپ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی' چڑھائی کا زاویہ بھی بتدریج بڑھتا چلا جارہا تھا پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہماری جیپ سطحِ زمین سے ساٹھ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے آگے یعنی اوپر کو بڑھنے لگی۔ یہ انتہائی خطرناک صورتِ حال تھی۔ اس موقع پر جیپ کے ہیوی ڈیوٹی انجن نے کسی وفادار ساتھی کا کردار نبھایا۔ اگر خدانخواستہ جیپ کا انجن ہم سے خفا ہو کر چپ سادھ لیتا تو ہمارے لیے ایک بڑی مصیبت کھڑی ہوسکتی تھی۔ خدا کا شکر کہ ہم بخیرو عافیت اس ڈھلوانی راستے کے عروج پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد چند گز تک ایک مسطح میدان سا تھا۔ کچھ آگے جا کر وہ پتھریلا راستہ پھر کمرائے امتحان کی صورت اختیار کر گیا۔ اب ہم ایک خطرناک ڈھلوان پر سفر کر رہے تھے۔

چڑھائی کی بہ نسبت اترائی کا سفر زیادہ مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ چڑھائی میں صرف گاڑی کے انجن کا امتحان ہوتا ہے' ڈرائیور کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جبکہ اترائی میں گاڑی کا انجن بہت ریلیکس ہوتا ہے اور ڈرائیور کو اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھنے کے لیے بہت پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ ہر لمحے موت کے منہ میں جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

ڈھلوان پر آتے ہی راستے کا زاویہ بڑی تیزی سے نشیب کی سمت بڑھنے لگا۔ اس راہ پر جابجا چھوٹے بڑے پتھر بھی موجود تھے۔ ہماری جیپ کے طاقت ور ٹائر ان پتھروں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے گویا اپنے ''پاؤں'' تلے روندتے چلے جارہے تھے۔ چڑھائی کی بہ نسبت اترائی کی یہ راہ اس لیے بھی زیادہ خطرناک تھی کہ اب اس کے دائیں بائیں چٹانوں کا وہ سلسلہ بھی نظر نہیں آرہا تھا جو ایک طرح سے حفاظتی بند کا کام کر رہا تھا۔ اب اگر کسی بیری پتھر کے سبب ہماری جیپ اچھل کر بے قابو ہوجاتی تو اسے سنبھالنا مشکل ہوتا...... اور اس بات کے قوی امکانات موجود تھے کہ ہم جیپ سمیت ہزاروں فٹ کے تاریک نشیب میں کہیں گم ہو کر رہ جاتے۔

ہم بہ خیرو عافیت ڈھلوانی سفر طے کر کے عروج پر تو پہنچ گئے تھے مگر واپسی میں ہم نے ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ ایک مصیبت منہ کھول کر ہمارے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

وہ مصیبت ایک بڑا سا بڑا سا پتھر تھا جو کسی چٹان کے مانند ہمارے راستے میں استادہ تھا۔ اس پتھر نے کچھ اس طور آگے بڑھنے کی راہ مسدود کر رکھی تھی کہ اس کے دائیں بائیں بمشکل تین تین فٹ کا راستہ بچا تھا۔ ہم اس پتھر سے کنی کاٹتے ہوئے جیپ کو دائیں یا بائیں سے آگے نہیں بڑھا سکتے تھے لہٰذا بریک لگانا لازم ٹھہرا۔ اس کے علاوہ ہر چارہ' موت کا ہرکارہ تھا!

ڈاکٹر موتگ نے بہ آہستگی بریک لگائے اور جیپ کو اس ظلمی پتھر کے ساتھ لگا کر کھڑا کر دیا پھر گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا ''ہمیں باہر نکل کر اس بدمعاش پتھر کو اپنی راہ سے ہٹانا ہوگا ورنہ یہیں کھڑے ہم اور ہماری جیپ سردی میں ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔''

''آجاؤ۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا ''اس پتھر سے بھی مل لیتے ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ پُرعزم انداز میں ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھول کر جیپ سے نیچے کود گیا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں باہر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم آرام سے اندر بیٹھ کر تماشا دیکھو۔''

''یہ بات تو تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے واقعی کوئی جادو تماشا دکھانے والے ہو۔'' وہ چمک کر بولی۔

لی یان کافی دیر سے خاموش بیٹھی تھی اور اس کی یہ خاموشی بگ باس ڈاکٹر موتگ کے احترام میں تھی۔ وہ اس کی موجودگی میں بہت محتاط اور باادب باملاحظہ رہتی تھی۔ اب وہ جو اچانک بولی تو مجھے اس کی آواز کچھ زیادہ ہی چہکی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں معنی خیز انداز میں دیکھا اور کہا ''کسی جادو کے مظاہرے کے بغیر تو وہ جناتی پتھر اپنی جگہ سے ہٹے گا نہیں۔ توجہ سے دیکھتی رہو' باہر کیا کیا کھیل تماشا ہوتا ہے۔''

وہ خالص امریکی لہجے میں بولی ''او گاڈ! اتنے سنسنی خیز اور مہم جو منظر کو میں کیا جیپ کے اندر بیٹھ کر دیکھوں گی۔ نہیں......'' اس نے ہیجانی انداز میں گردن کو منفی جنبش دی اور ولولہ انگیز لہجے میں بولی ''میں بھی باہر آرہی ہوں۔''

''اگر قلفی جمانے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے تو چلی آؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ کندھے جھٹکتے ہوئے بولی ''اگر قلفی جم گئی تو اسے ڈرائی فروٹ کی حرارت سے دوبارہ پگھلالیں گے۔ ہمارے بیگ میں رکھا ہوا وہ لنچ باکس آخر کس مرض کی دوا ہے!''

میں لی یان کو اس کے حال پر چھوڑ کر جیپ سے باہر نکل آیا۔ وہ جیپ کے اندر رہنے یا باہر آنے کے لیے اپنی مرضی کی مالک تھی۔ ویسے ڈاکٹر کے جیپ چھوڑتے ہی اس کی جون بدل گئی تھی۔ اس کے شوخ مکالمات سے ظاہر ہوا کہ وہ اندر سے اتنی افسردہ اور غمزدہ نہیں تھی جتنی اوپر سے دکھائی دیتی تھی۔ اس کی خاموشی' سنجیدگی اور ٹھہراؤ محض ڈاکٹر موتگ کی موجودگی کی وجہ سے تھا۔

میں نے جیپ سے باہر آ کر اس پتھر کی جانب ایک قدم ہی بڑھایا تھا کہ اپنے عقب میں ''دھپ'' کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ لی یان نے میرے نقشِ قدم پر پاؤں ڈال دیا تھا۔ میں خاموشی سے ڈاکٹر موتگ کی طرف بڑھ گیا جو اس چٹان نما پتھر کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ پتھر اپنی ذات میں کسی چٹان سے کم نہیں تھا۔ پتا نہیں وہ کس طرح بیچ راہ پہنچ گیا تھا۔ اسے اٹھا کر وہاں رکھنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ منوں وزنی وہ دیو قامت پتھر بالکل گول تو نہیں تھا تاہم اس کا قطر کسی بھی طور پانچ فٹ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ اونچائی بھی کم و بیش اتنی ہی تھی۔ ایک بات طے تھی کہ اسے راہ سے ہٹائے بغیر آگے بڑھنا ممکنات میں سے نہیں تھا' یعنی جیپ سمیت!

ڈاکٹر ٹھونک بجا کر اس پتھر کا معائنہ کر چکا تو سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ''ڈاکٹر! کیا خیال ہے' اس پتھر کو راستے سے ہٹانے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا ''یہ اصلاً نسلاً ایک وزنی چٹانی پتھر ہے۔ اگر یہ فلموں کی شوٹنگ میں استعمال ہونے والا ہوا بھرا کوئی ربر کا گولا ہوتا تو ہم ایک زوردار فٹ بال کک سے اسے دور گہرائی میں اچھال دیتے۔ میرا خیال ہے' یہ تمہارا کیس ہے۔''

''میرا کیس؟'' میں نے متعجب نظر سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا ''یہ تو مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے کہ یہ فلمی شوٹنگز میں استعمال ہونے والا کوئی مصنوعی پتھر نہیں مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میرا کیس کیسے ہوگیا؟''

''تم نے شاؤلن ٹیمپل میں اچھا خاصا وقت گزارا ہے!''

میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا' اس کا اشارہ میری پوشیدہ قوت چی کی جانب تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''تم بھی تو اسی تربیت گاہ کے فارغ التحصیل ہو؟''

''بھئی! میں تو اب بوڑھا ہوگیا ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں سمجھ گیا' وہ اس پتھر کے سلسلے میں میری چی کی قوت کو آزمانا چاہتا تھا ورنہ نہ وہ بوڑھا ہوا تھا اور نہ ہی اس میں پُراسرار قوتوں اور اعلیٰ صلاحیتوں کی کمی تھی۔ اسے بھی چی پر عبور حاصل تھا۔ فلائنگ فائٹ وہ چی کے بل بوتے پر کرتا تھا۔

میں نے اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کہا ''ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔''

وہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی یہ مسکراہٹ لی یان تک نہیں پہنچی کیونکہ وہ ہمارے عقب میں چند فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ تاریکی اس کی نگاہ کا خار ثابت ہورہی تھی۔ ہماری جیپ اسی پتھر کے سہارے کھڑی تھی۔ اگر پتھر کو ہٹا دیا جاتا تو اس خطرناک ڈھلوان پر جیپ دوڑ لگانے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتی اور ہم اپنے مشن کے اس مرحلے میں جیپ سے ہاتھ دھونا.... افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے کہا" ڈاکٹر! پتھر کو ہٹانے سے پہلے ہمیں جیپ کو اس کے قدموں پر رو کے رکھنے کا کوئی بندوبست کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی "میں یہ بندوبست ابھی کر دیتا ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ کسی شے کی تلاش میں تھوڑا نشیب میں اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ مناسب سائز کے چار چھوٹے پتھر وہاں جمع کر چکا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے وہ پتھر جیپ کے چاروں پہیوں کے آگے لگا کر روک پیدا کر دی اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"میں نے اس جیپ کو باندھ کر قدموں پر کھڑا کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے' یہ اب کہیں نہیں جائے گی۔ تم اپنا کام شروع کر دو۔"

بات ختم کرتے ہی وہ جیپ کی طرف مڑا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ مجھے امید تھی اس نے بریک پیڈل کو بھی دبا رکھا ہوگا اور ہینڈ بریک کے استعمال سے بھی غافل نہیں ہوگا۔ جیپ کو روکے رکھنے کے لیے تین مختلف محاذوں سے کوشش کی جا رہی تھی حالانکہ اس مقصد کے لیے ایک کوشش بھی کافی ہوتی مگر ہم جن سنگین ترین حالات سے گزر رہے تھے ان میں حتی الامکان احتیاط کی ضرورت تھی۔

میں اس جسیم چٹانی پتھر سے لگ بھگ ایک فٹ کے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا چہرہ ہزاروں فٹ گہرے نشیب کی طرف تھا جو مجھ سے محض آٹھ فٹ کی دوری پر واقع تھا۔ پانچ فٹ قطر کا وہ پتھر اور آگے مزید تین فٹ خالی جگہ۔

چی کا استعمال کرتے ہوئے اس پتھر کو کھسکانا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا لیکن اسے کھسکانے سے ہمارا مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا۔ میں اگر اسے سرکا کر کنارے تک پہنچا دیتا یا کنارے سے تھوڑا آگے بھی جھکا دیتا تو بھی ہماری جیپ کو آگے بڑھنے کے لیے جتنی گنجائش کی ضرورت تھی وہ پیدا نہ ہو پاتی۔ اس مسئلے کا واحد... حل یہی تھا کہ میں اپنی مخفی قوت کو بروئے کار لا کر اس پتھر کو گہرے نشیب میں لڑھکا دیتا۔

میں نے خود کو تیار کرنے کے لیے ایک منٹ تک پرانا یام (PRANAYAM) کی مشق کی۔ خوب ڈوب کر ہموار .... گہری گہری سانس لیں۔ اس مخصوص انداز کی بریدنگ (BREATHING) سے دماغ اور روح کو تازگی ملی تو میں پوری طرح اس پتھر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

سب سے پہلے میں ہارس پوزیشن میں آیا۔ مارشل آرٹس میں اس پوزیشن کو بنیادی اسٹانس کی حیثیت حاصل ہے۔ گھٹنے ایک خاص زاویے پر جھک جانے کے باعث میں پتھر کے قد کا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کو آگے پھیلا کر دیکھا۔ میرے اور پتھر کے درمیان محض ایک فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ میرے ہاتھوں کی ہتھیلیوں نے اس چٹانی پتھر کو بڑے بھرپور بوسے دیے۔ دونوں ہاتھ پوری طرح پھیلانے کے لیے مجھے کم از کم دو فٹ جگہ درکار تھی جو یہاں میسر نہیں تھی اور یہی اس ٹیکنیک کی کامیابی کی ضرورت تھی۔ اس پتھر پر ایک بھرپور پش اسی پوزیشن میں کھڑے ہو کر لگایا جا سکتا تھا۔

ہاتھوں کی حرکات اور پتھر کی وقوع پذیری کو ذہن میں نقش کرنے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے میں تصور کی نگاہ سے.... اس پتھر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک متوازن سانس کھینچ کر اپنے پھیپھڑوں کو بھرا' پھر اس سانس کو ایک مخصوص اسٹروک سے نیچے کی جانب مقام چی کی طرف منتقل کر دیا۔ چی کی مخصوص جگہ ناف کے پیچھے' ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کے قریب واقع ہے۔ اس عمل کو تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ "چی" کے طریقہ کار کو اچھی طرح سمجھ جائیں!

طاقتور سانس نے پلک جھپکتے میں چی کو متحرک کر دیا۔ مجھے اپنے اندر توانائی کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ایک پھونک مار کر پہاڑ کو بھی ہوا میں اڑا سکتا ہوں۔ یہ طاقت اور تصرف کا ایک علامتی احساس تھا۔ سادہ الفاظ میں' اس وقت میں اپنے وجود میں بے پناہ قوت اور توانائی کو موجزن محسوس کر رہا تھا۔ پیٹ کے زیریں حصے میں طاقت کا طوفان مچل رہا تھا۔

چی کے متحرک ہوتے ہی میں نے اپنی سانس کو واپس پھیپھڑوں کی طرف بلایا اور اسٹروک بریدنگ (STROKE BREATHING) کی تیکنیک کا استعمال کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے پتھر کی جانب بڑھایا۔ میری کھلی ہتھیلیوں کے قیامت خیز پش نے پتھر کے "قدم" اکھاڑ دیے۔ سانس خارج کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں کو جو بھی حرکت دی جائے اس میں بے حد حساب توانائی موجود ہوتی ہے۔ میرے پش میں ہزاروں نیوٹن قوت بھری ہوئی تھی۔

پتھر کے اپنی جگہ سے ہٹتے ہی مخصوص آواز پیدا ہوئی۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ ثبوت ملتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ رکاوٹی پتھر تیزی سے لڑھکتے ہوئے نشیب کی طرف جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی جہازی سائز دہانہ رکھنے والی توپ میں بھر کر داغا گیا ہو..... یا پھر اس کا یہ لڑھکاؤ

کسی طاقت ور منجنیق کا کارنامہ ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتھر پل بھر میں تاریک گہرائی میں اتر گیا۔ نشیب کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں سے اس کے ٹکراؤ کی مخصوص ہیبت ناک آواز کچھ دیر تک ابھرتی رہی پھر ماحول کا سناٹا واپس لوٹ آیا۔

میں واپسی کے لیے پلٹا تو اپنے عقب میں لی یان کو کھڑے پایا۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی ترچھے زاویے سے اس کے چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ششدر کھڑے پایا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں اور وہ یک ٹک اندھیرے میں اس سمت دیکھ رہی تھی جدھر تاریک نشیب واقع تھا۔

پتھر لڑھکنے کے منظر نے اسے ساکت و مبہوت کر دیا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے پکارا ''لی یان......!'' وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

میں نے قدرے بلند آواز میں اس کا نام دہرایا ''لی یان!''

اس کے باوجود بھی لی یان کے وجود میں جنبش پیدا نہ ہوئی تو میں نے آگے بڑھ کر اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا ''لی یان! ہوش میں آؤ۔''

اس نے گردن کو حرکت دے کر اپنے سکتے میں نہ ہونے کا یقین دلایا اور متوحش نظر سے میرے چہرے کو تکنے لگی۔ میں جانتا تھا' اس کی حیرت اور تعجب کا سبب میں اور وہ پتھر تھا۔ پتھر کو وہ اندھے نشیب میں غائب ہوتے دیکھ چکی تھی اور میں اس کی نگاہ کے سامنے موجود تھا۔ یہ نظارہ اس کی زندگی کے ناقابلِ فراموش مشاہدے میں ایک گراں قدر اضافہ تھا۔

اس کی تمام تر سوالیہ نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے اس کا شانہ تھپکا اور پچکارنے والے لہجے میں کہا ''یہاں کچھ دیر اور کھڑی رہو گی تو سردی سے جم کر برف بن جاؤ گی۔ گاڑی کے اندر جا کر بیٹھو۔ چلو' شاباش۔''

اس نے کوئی سوال نہ کیا اور بہ دستور متوحش نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے جیپ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ڈاکٹر مونگ چی اور اس کے کرشمات سے بہ خوبی آگاہی رکھتا تھا۔ میرا اس بھاری پتھر کو اندھیرے میں دھکیلنا اس کے لیے ایک شعبدہ تھا لیکن اس حیرت ناک منظر نے لی یان کی سٹی گم کر دی تھی۔

میں نے بہ آواز بلند ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر مونگ! تم جیپ کے بریکس کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔ میں اس کے ''پاؤں'' کی ''بندشیں'' کھول رہا ہوں۔''

پھر میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ جیپ کے چاروں پہیوں کے آگے رکھے ہوئے رکاوٹی پتھروں کو ہٹا دیا اور جیپ کے اندر آ کر لی یان کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے جیپ کا انجن اس دوران میں بیدار رکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

چند لمحات تک جیپ کے اندر موت جیسا سناٹا طاری رہا پھر لی یان کی سرسراتی آواز نے اس خاموشی میں نقب لگائی۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ سراسیمہ لہجے میں بولی۔

''وجدان! میں نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔'' میں قطعیت سے بولا ''تمہاری آنکھوں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ ایک کھلی حقیقت ہے اور یہ حقیقت اب پیچھے رہ گئی ہے۔ تم اس منظر کے ٹرانس سے نکلنے کی کوشش کرو۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' وہ ہیجان خیز لہجے میں بولی۔

''بعض چیزیں ناقابلِ یقین ہوتی ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''خاص طور پر وہ جن سے زندگی میں پہلی مرتبہ واسطہ پڑتا ہے۔ ایسا واسطہ انسان کے ذہن کو الجھا کر رکھ دیتا ہے۔ تم بھی اسی لیے الجھن محسوس کر رہی ہو لیکن فکر نہ کرو۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں نظر آنے والی وحشت اور سراسیمگی اب کافی حد تک زائل ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ پُرتجسس اور حیرانی نے قبضہ جما لیا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا۔

''رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا لی یان! اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔ پلیز ری لیکس!''

وہ اپنے ہاتھوں کے مخصوص نسوانی گداز کو' گھٹنوں پر رکھے میرے ہاتھوں میں اتارنے لگی۔ اس کی مخروطی انگلیوں کی اضطراری جنبشوں میں خاموش تجسس پنہاں تھا۔ وہ انگلیاں میرے ہاتھوں پر سرسراتے ہوئے اس راز سے آگاہی کی خواہاں تھیں جس کا مظاہرہ میں نے تھوڑی دیر پہلے اس ٹھنڈی ٹھار راہ گزر پر کیا تھا۔ میں نے لی یان کی متلاشی انگلیوں کی جستجو کے راستے میں دیوار بننے کی کوشش نہیں کی اور اس مرمریں لمس سے آشنائی لیتا رہا۔ وہ بڑبڑانے والے انداز میں ایک ہی جملے کی تکرار کرتی جا رہی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ! آئی ڈونٹ بیلیو......''

ڈاکٹر نے کھنکار کر لی یان کو مخاطب کیا تو اس نے اپنے ہاتھ بڑی سرعت سے سمیٹ کر گود میں رکھ لیے اور پوری

طرح اپنے بگ باس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

ڈاکٹر مونگ نے نہایت ہی مختصر اور آسان انداز میں اسے پُراسرار قوت ''چی'' کے بارے میں بتایا پھر وہ اسے اس قوت سے نے لیے جانے والے مختلف کاموں کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں وہ کہہ رہا تھا۔

''وجدان نے ایک طویل عرصہ شاؤلن ٹیمپل ایسی عظیم المرتبت مارشل آرٹس کی تربیت گاہ میں ٹریننگ حاصل کی ہے۔ شاؤلن ٹیمپل میں زیرِ تربیت افراد میں سے چنیدہ کو ''چی'' کی مشقیں کرائی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے وجدان بہت خوش قسمت ثابت ہوا ہے کہ شاؤلن ٹیمپل میں اسے جید اساتذہ کی توجہ اور قرب حاصل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنی چی کی قوت کو بیدار کر لیا ہے۔ اس قوت کی مدد سے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں۔ ''چی'' دراصل چینی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں پُراسرار مخفی قوت۔ اس قوت کا پورا نام چی گونگ (QI GONG) ہے۔''

''کیا میں بھی اپنے وجود میں چی کی قوت کو بیدار کر سکتی ہوں؟'' وہ ایک ایسے معصوم بچے کے مانند مچل کر بولی جو دفورِ مسرت سے کہہ رہا ہو......''میں بھی ٹافی کھاؤں گا!''

دراصل چی کا موضوع ہی بہت پُرکشش اور دلچسپ تھا۔ جو بھی اس کا ذکر سنتا' اس کے حصول کے لیے بے چین ہو جاتا۔ اس میں بے چاری لی یان کا کوئی قصور نہیں تھا۔

''کیوں نہیں!'' ڈاکٹر مونگ نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا ''جس انسان کے اندر سچی لگن ہو وہ محنت سے نہیں گھبراتا اور تم نے یہ تو سن رکھا ہو گا' محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔''

اس کے بعد بھی ڈاکٹر کچھ دیر تک لی یان کو چی اور اس کی بیداری کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتا رہا۔ ان کی گفتگو میں ذرا سا وقفہ آیا تو میں نے ڈاکٹر کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔

''ڈاکٹر مونگ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ بھاری پتھر کس نے اور کس مقصد سے بیچ راہ میں ڈال دیا تھا؟''

''میں نے بھی اس بارے میں بڑا غور کیا ہے۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولا ''اور ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی ہے اور وہ یہ کہ...... یہ بندروں کی کارستانی ہے۔''

''بندروں کی کارستانی؟'' میں نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

وہ ہونٹ سکیڑ کر بولا ''اس میں اتنا حیران ہونے کا کیا سبب ہے؟''

''تم بھی کمال کرتے ہو ڈاکٹر!'' میں نے بے یقینی سے کہا ''اس پتھر کو راستے میں کھڑا کرنے میں بھلا بندروں کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''

لی یان نے کہا ''کیا بندروں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ منوں وزنی پتھر سے اٹکھیلیاں کر سکیں؟'' اس کے سوال سے الجھن عیاں تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں باری باری ہماری طرف دیکھا اور بولا ''بندروں کا بڑا فائدہ ہے وجدان۔ اس پہاڑی سلسلے کی اکثر چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اس موسم میں بندروں کے لیے سب سے اہم ترین مسئلہ خوراک کا ہوتا ہے۔ وہ راہ میں ایسی رکاوٹیں کھڑی کر کے آنے جانے والوں کا راستہ مسدود کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ انہیں خوف زدہ کرنے کے لیے ان پر باجماعت حملہ آور ہوتے ہیں۔ یہ حملہ سراسر مصنوعی ہوتا ہے لیکن کوئی مسافر بندروں کے ذہن کو نہیں پڑھ سکتا۔ اس سلسلے میں تجربہ ہی کام آتا ہے اور مصیبت یہ ہے کہ اکثر مسافروں کے پاس نہ ایسا تجربہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ بندروں کی مخصوص نفسیات سے واقف ہوتے ہیں اس لیے مار کھا جاتے ہیں۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر معلومات کے دریا کو مزید بہاتے ہوئے بولا ''بے چارے مسافر اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد پر خوف زدہ ہو کر اپنی سواری اور سواری میں موجود سامان کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح بندروں کو سامانِ خور و نوش پر ہاتھ صاف کرنے کا بھرپور موقع مل جاتا ہے۔ بعد میں جب دور کھڑے مسافر ان کی چالاکی اور بدمعاشی کو سمجھ کر غصے کا اظہار کرتے ہیں تو یہ شکم سیر بندر ''کھی کھی'' ہنستے ہوئے اچھلتے کودتے' قلانچیں بھرتے پہاڑوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ایسی کارروائیاں بندر عموماً دن کی روشنی میں کرتے ہیں۔ رات کو وہ بڑے آرام کی نیند سوتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' بندروں نے اپنے شکار کو پھانسنے کے لیے پتھر کا وہ ''پھندا'' دن میں کسی وقت لگایا تھا۔'' میں نے ڈاکٹر کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہا ''اور ظاہر ہے یہ ''پھندا'' ہمارے لیے نہیں تھا۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تمہاری بات ٹھیک ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے' یہ رکاوٹ انہوں نے آج نہ کھڑی کی ہو بلکہ اس پتھر کو راہ میں حائل ہوئے کئی روز یا کئی

ماہ گزر گئے ہوں!''

میں نے اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے کہا ''ہاں بھئی کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ ٹھہرے بندر۔ ان سے کیا بعید ہے!''

ڈاکٹر مونگ نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم نے تھوڑی دیر پہلے بندروں کی طاقت کے حوالے سے ایک سوال کیا تھا تو سن لو اس ذہین جانور میں وجدان کی طرح ''چی'' کی قوت تو موجود نہیں ہوتی البتہ یہ ''چو'' سے مالا مال ہوتے ہیں۔ میں خاص طور پر پہاڑی بندروں کی بات کر رہا ہوں۔''

''چو؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

وہ وضاحت میں ہم دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا ''چو...... دراصل پہاڑوں سے نکلنے والا ایک مخصوص سیال ہے جو سیاہی مائل بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ جب یہ سیال پہاڑوں کے اندر سے خارج ہوتا ہے تو اس کی شکل مائع جیسی ہوتی ہے بعد میں یہ سوکھ کر سخت ہو جاتا ہے۔ پہاڑوں میں آباد بندر چو نامی اس سخت شے کو گاہے بہ گاہے چاٹتے رہتے ہیں جس کے سبب چو کی طاقت ان کے معدوں میں پہنچ کر جزو بدن بنتی رہتی ہے۔ اسی لیے جنگلی بندر کی بہ نسبت پہاڑی بندر زیادہ جفاکش اور طاقتور ہوتا ہے۔ چو کی قوت اسے بہادر بنا دیتی ہے۔''

ڈاکٹر مونگ پتا نہیں کس ''چو'' کی کہانی سنا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا چو کی کوئی ارضی حقیقت بھی تھی یا ڈاکٹر وقت گزاری کے لیے ایک دلچسپ قصہ لے بیٹھا تھا لیکن اس وقت میرا دماغ کھٹمنڈو سے ہزاروں میل دور پاکستان کے پہاڑی قبائلی علاقوں میں گھوم رہا تھا۔ وہاں گلگت چیلاس اور چترال وغیرہ کے پہاڑوں سے بھی ایسی ہی ایک طاقتور شے برآمد ہوتی تھی جسے عرف عام میں ''سلاجیت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بندروں والی کہانی سلاجیت سے بھی منسوب ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ سلاجیت بڑھاپے کے بہتر امراض کا علاج ہے!

لی یان بار بار عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ چی کے مظاہرے کے بعد سے میرے لیے اس کا رویہ کچھ زیادہ ہی متاثر کن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ کی موجودگی کا لحاظ تھا ورنہ وہ فرطِ جذبات میں جانے کیا کر بیٹھتی۔ بہر حال وہ پھر بھی یہ کہے بنا نہ رہ سکی۔

''وجدان! تم گریٹ ہو۔ میں تمہارے یہ ہاتھ چومنا چاہتی ہوں جن سے تم نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ تم بہت مختلف اور عام انسانوں سے برتر ہو!''

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اپنا خلیفہ اور تمام کائناتی مخلوقات کا سردار قرار دیا ہے لیکن پتا نہیں انسان انسان کو انسان کیوں نہیں رہنے دیتا۔ کبھی یہ اسے اس کے مقام سے گرا کر جانوروں سے بھی بدتر درجے پر لے جاتا ہے اور کبھی ایسا بانس پر چڑھا تا ہے کہ اللہ معاف کرے......!

لی یان کی فرمائش کو ڈاکٹر مونگ کی تائید نما سفارش حاصل ہوگئی تو مجھے ان دونوں کے سامنے سپر ڈالنا پڑی۔ لی یان اپنی خواہش پوری کر چکی تو میں نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے اور کہا۔

''تم دونوں باتیں کرو۔ میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ آرام کرنے کے لیے آنکھیں بند کرنا لازمی نہیں تھا۔ یہ احتیاط میں نے اسے لیے برتی تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھے مخاطب نہ کرے۔ اگلے ہی لمحے میں' میں اپنے تازہ ترین حالات پر غور کرنے لگا۔ وہ حالات جن کی سنگینی پل پل بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

یہ سچ ہے کہ اس وقت ہم ایک اہم مشن پر جا رہے تھے۔ ربی کی بھیجی ہوئی ٹیم بدھ نیل کنڈ کی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ خزانے پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جان کی بازی لگائے ہوئے تھی۔ اقتدار اور اختیار کی اندھی ہوس نے ربی کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ ہر صورت ان پانچ نایاب پتھروں تک پہنچنا چاہتا تھا جن کی ایک روحانی حیثیت مسلم تھی۔

غیر معمولی ساخت اور سائز کے حامل وہ پانچ حاکم پتھر ڈائمنڈ (ہیرا) ایمرالڈ (زمرد) روبی (یاقوت) سیفائر (نیلم) اور ٹوپاز (پکھراج) جس کسی کے بھی ہتھے چڑھ جاتے' اسے ایک خاص قسم کی روحانی قوت اور تصرف حاصل ہو جاتا...... اور ہمیں ان قیمتی پتھروں کو چوری ہونے سے بچانا تھا۔

اگر معاملہ صرف ان پتھروں کی حفاظت تک محدود ہوتا تو میں کبھی بھی اس عبادت گاہ یا کھٹمنڈو کا رخ نہ کرتا۔ مجھے ایسے خزانوں سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر میں لالچی فطرت کا مالک ہوتا تو اس دور کا دلائی لاما بھی مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار نہ کرتا۔ جس بدھ بھکشو کو میں انسپکٹر بریندرا کے توسط سے کچھ عرصہ پہلے اس عبادت گاہ میں چھوڑ گیا تھا' اس نے ایک آزمائش کی خاطر مجھے بڑی پُرکشش پیش کش کی تھی۔ جب میں اس سے رخصت ہو رہا تھا تو اس نے کہا تھا۔ اس وقت ہم عبادت گاہ کے خفیہ تہ خانے میں تھے۔

''دلائی لاما نے اجازت دی ہے کہ تم یہاں سے جتنا سونا چاہو' اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔''

اور میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تھا ''اگر مجھے سونا لے جانا ہوتا تو مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سب کچھ میرے اختیار میں تھا۔''

میں تو اپنی جانِ تمنا کی تلاش میں دردر کی خاک چھانتے ہوئے یہاں تک چلا آیا تھا۔ اگر ساحل اس دیس میں نہ پہنچائی گئی ہوتی تو میں بھول کر بھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔

ساحل کی یاد نے میرے سینے کے جلتے ہوئے زخموں کو ہوا دی۔ میں جسم و جاں سے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ ربی موشے ہائمن نے ساحل کو ہپناٹزم اور جانے کون کون سے ازم سے گزار کر میری رسائی سے بہت دور کردیا تھا۔ میں باطنی آنکھ رکھتے ہوئے بھی اسے اپنی دسترس میں نہیں لا پا رہا تھا۔ تھرڈ آئی کی راہ میں ایسی نادیدہ رکاوٹ کھڑی ہوگئی تھی کہ اس طرف پرواز کا سوچتے ہی میرے تصور کا پکھیرو چاروں خانے چت ہوجاتا۔ تیسری آنکھ پھڑ پھڑا کر بند ہوجاتی اور میں ناکامی ...کی ایک اور ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا!

مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں ہمت ہار بیٹھتا اور کوشش ترک کردیتا۔ یہ تو اس حقیقت کی نفی ہوتی کہ ہمتِ مرداں' مددِ خدا! میں ہاتھ پاؤں چھوڑ کر اس ذات باری کی رحمت' مدد اور عنایت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔

میں نے ساحل کا تصور کیا اور تیسری آنکھ کے توسط سے اس کے ماحول میں رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ساحل کے خال وخط کو یاد کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کا سراپا میری سوچ میں کندہ ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ لہو بن کر میری نس نس میں دوڑ رہی تھی اور مجھے اپنے پیچھے دوڑا رہی تھی......جسمانی اور خیالی' دونوں طور پر!

اس کوشش میں تین بار ناکامی کے بعد میں نے ربتوں کی ملکہ نیلگری کا رخ کیا کہ شاید ساحل کے سلسلے میں کوئی اور اشارہ مل جائے لیکن وہ بھی میرے قابو میں نہ آسکی۔

اگلی ٹرائی میں نے اپنے دشمنِ خاص ربی موشے ہائمن پر ماری۔ یہ سارا کھٹ راگ اسی شاطر کا پھیلایا ہوا تھا۔ میں اس کو اور اس کے ماحول کو اپنے دام میں نہ لاسکا۔ میں نے تصور میں ربی پر دانت کچکچائے اور آنکھیں کھول دیں۔

جیپ کی رفتار بہت دھیمی ہوچکی تھی۔ میں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں' ڈاکٹر مونگ نے جیپ کو ایک سائیڈ میں روک دیا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو جیپ کو روکنے کا سبب سامنے آگیا۔ اس دوران میں وہ موبائل فون کو جیب سے نکال کر کان سے پیوست کرچکا تھا۔

ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے فون اٹینڈ کیا جاسکتا تھا لیکن اس خطرناک پہاڑی راستے پر ڈاکٹر نے ایسا کوئی رسک لینا مناسب نہ سمجھا جس کے نتائج کو ہم اس وقت افورڈ نہیں کرسکتے تھے۔ فون پر بات کرتے ہوئے اس کی آواز گمبھیرتا میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ بھاری گونج دار آواز میں محض ''ہوں' ہاں ٹھیک ہے' او کے' رائٹ۔'' وغیرہ پر اکتفا کرتا رہا۔

ڈاکٹر کے پُراسرار انداز نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ میرے اندر سے کسی نے چیخ کر کہا' کوئی بڑی گڑبڑ واقع ہوچکی ہے۔ کیا؟ اس کے بارے میں تو ڈاکٹر مونگ ہی بتا سکتا تھا۔ میں اس کے فارغ ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

اس نے سیلولر گفتگو ختم کرتے ہوئے موبائل کو جیب میں رکھا اور دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر مارتے ہوئے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

''کیا ہوا ڈاکٹر!'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''وہ کس کا فون تھا؟''

''ڈنگ ہنگ!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

اس مختصر گوئی نے میری تشویش میں اضافہ کردیا۔ میں نے پوچھا ''وہاں امریکا میں خیریت تو ہے نا؟''

ڈہنگ ہنگ کے ذکر پر لی یان بھی پوری طرح ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ اس نے استفسار کیا ''محترم! آپ کی خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پتا دے رہی ہے!''

''ہاں' ایسی ہی بات ہے۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔

ڈاکٹر کا مبہم انداز مجھے بری طرح الجھا رہا تھا۔ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا ''ڈاکٹر پلیز! صاف صاف بتاؤ' وہاں کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''اوکے!'' اس نے ایک طویل سانس خارج کی اور ہمیں ڈنگ ہنگ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کردیا۔

ڈاکٹر کے مطابق' ڈہنگ ہنگ نے انتہائی ایمرجنسی میں وہ کال کی تھی۔ ادھر نیویارک اور نیوجرسی میں بازی پلٹ گئی تھی۔ ایف بی آئی اور این وائے پی ڈی والے شون کا سراغ لگانے اور اسے حراست میں لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وسیم بھی ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر شون اور وسیم کو کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل ہونا پڑا تھا مگر امریکی خفیہ اور ظاہرہ ایجنسیز نے سرگرمی دکھا کر انہیں ڈھونڈ نکالا تھا۔

انٹیروگیشن سیل میں جب ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو وہ

آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ ربی موشے ہائمن امریکا کے حساس ترین اداروں کی مدد سے مجھے اور وسیم کو تلاش کروا رہا تھا اور ان کی تلاش کا محور امریکا کی دوریاستیں نیویارک اور نیوجرسی بنی ہوئی تھیں۔ زخمی وسیم ان کے ہتھے چڑھا تو وہ اس سے میرے بارے میں پوچھنے لگے۔ اس نے جب میری خاطر زبان نہ کھولی تو ان ظالموں نے تشدد کی انتہا کرکے اسے زندگی کے ہر دکھ سے آزاد کردیا۔ وسیم کو میری دوستی کی سزا دی گئی تھی ..... میرا دل بھر آیا۔

شون پر بھی کڑی تفتیش کی گئی۔ یہ ثابت ہوگیا تھا کہ میں نے اور وسیم نے شون کے اپارٹمنٹ پر وقت گزارا تھا۔ شون اور اس کی بیوی لی یان نے ہمیں پناہ دی تھی۔ شون حتی الامکان ان کے سوالات کے سامنے ڈٹا رہا لیکن جب اس کی بیوی کے غیاب کے بارے میں استفسار کیا گیا تو کھیل بگڑ گیا۔ اس نے ایف بی آئی والوں کو بتایا کہ لی یان چند روز کے لیے کیلیفورنیا گئی ہے۔ اس کے بیان پر پلک جھپکتے میں متعلقہ فلائٹ کی ایگزٹ کنٹرول لسٹ چیک کی گئی تو وہ جھوٹا ثابت ہوا۔ اس پر سختی روا رکھتے ہوئے ان ایک دو دنوں میں نیوجرسی اسٹیٹ کے ''نیو آرک'' انٹرنیشنل ائرپورٹ سے روانہ ہونے والی تمام فلائٹس کی ای سی ایل (ایگزٹ کنٹرول لسٹ) چیک کی گئیں تو شون کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ ایف بی آئی والے یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ نیو یارک ائرپورٹ سے شون اور اس کی بیوی لی یان نے کھٹمنڈو کے لیے پرواز کی تھی۔

جب کسی معاملے کا ایک سرا ایف بی آئی والوں کے ہاتھ لگ جائے تو وہ اس کے آخری سرے تک پہنچنے میں تاخیر سے کام نہیں لیتے۔ نیو آرک ائرپورٹ سے اپنی بیوی کے ساتھ کھٹمنڈو روانہ ہونے والا شون بہ نفسِ نفیس ان کے سامنے موجود تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' شون کی آئی ڈی پر لی یان کے ساتھ کوئی اور امریکا سے باہر نکل گیا تھا۔ وسیم کا شون کے ساتھ پایا جانا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ لی یان کے ساتھ میں امریکا سے ''فرار'' ہوا تھا۔ ایک میں ہی منظر پر نظر نہیں آرہا تھا۔

ایف بی آئی والوں کے اس وثوق کو اس وقت تقویت مل گئی جب انہیں شون کے لنکن پارک والے اپارٹمنٹ سے میرے فرار کی مصدقہ اطلاع موصول ہوئی۔ ایف بی آئی کے دو ایجنٹ اس اپارٹمنٹ میں دھرنا دیے بیٹھے تھے کہ پاکستان سے صدف کا فون آگیا۔ وہ مجھ سے کسی ضروری مسئلے پر بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسی اپارٹمنٹ کے فون سے صدف کو عید مبارک دی تھی۔ ایف بی آئی کے ایجنٹس نے بڑے فریب سے خود کو میرے ساتھی ظاہر کرتے ہوئے صدف سے یہ اگلوالیا کہ میں نے اس سے کہا تھا' میں نیوجرسی سے کھٹمنڈو پہنچنے والا ہوں۔ ازاں بعد ادشین ایونیو والے اسٹوڈیو سے شون کے دونوں ملازمین کو بھی شاملِ تفتیش کرلیا گیا۔ ان کے مطابق' شون اور لی یان دو تین دن کے لیے کیلیفورنیا گئے ہوئے تھے۔ شون کا جھوٹ پر جھوٹ کھلتا چلا گیا۔ کڑی سے کڑی مل کر میرے فرار کی زنجیر مکمل ہوگئی۔ ربی موشے ہائمن اور ایف بی آئی والے اتنے بدھو نہیں تھے کہ صورتِ حالات کو سمجھنے کے لیے انہیں پاپڑ بیلنا پڑتے۔

مسٹر ہنگ نے مختصر الفاظ میں ڈاکٹر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا اور جواب میں ڈاکٹر گمبھیر انداز میں ''ہوں ہاں'' کرتا رہا تھا۔ ونگ ہنگ کی فراہم کردہ تشویش ناک اطلاعات کو ڈاکٹر مونگ نے پھیلا کر ہمارے سامنے پیش کیا تو حالات کی سنگینی ہم پر واضح ہوگئی۔

وسیم کی پُرتشدد موت کا مجھے گہرا صدمہ پہنچا۔ اسے پیش آنے والے حالات نے مجھے سناٹے میں پہنچا دیا تھا۔ اسی سناٹے میں لی یان کی لرزتی ہوئی تشویش بھری آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ڈاکٹر مونگ سے پوچھ رہی تھی۔

''محترم! ایف بی آئی والوں نے شون کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

ڈاکٹر نے ایک افسردہ سانس چھوڑی اور افسوس ناک لہجے میں بولا ''شون کو جب انٹیروگیشن سیل سے لاک اپ کی طرف لے جایا جارہا تھا تو اسے مہم جوئی کی سوجھی۔ ہتھ کڑی کے باوجود بھی اس نے ایک گارڈ کے ہولسٹر سے اس کا سروس ریوالور اچک لیا اور خود کو فرار کے قابل بنانے کے لیے اس نے بے دریغ فائرنگ شروع کردی۔ گارڈز کو جوابی فائرنگ پر مجبور ہونا پڑا۔ وہ اسے زخمی کرکے فرار سے روکنا چاہتے تھے لیکن بھاگم دوڑ میں وہ زخمی کرنے والی حد تک محدود نہ رہ سکے۔ دو گارڈز شون کی فائرنگ سے موقع پر ہی ہلاک ہوگئے اور جواب میں شون......؟''

ڈاکٹر نے جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموشی اختیار کرلی۔ اس کی خاموشی میں ماتمی رنگ غالب تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ شون ہمیں چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں دور چلا گیا تھا۔ میرا دل وسیم کی موت کا سن کر پہلے ہی بہت بوجھل تھا۔ شون کی ''رخصتی'' نے اس بوجھ میں بے پناہ اضافہ کردیا۔ میں نے افسوس ناک انداز میں سر جھٹکتے ہوئے گردن جھکالی۔ میرے اور موشے ہائمن کے درمیان دشمنی اور انتقام کی جو

آگ روشن تھی اس نے وسیم اور شون کو بھی نگل لیا تھا۔ میرا دل و دماغ ربی کی طرف سے شدید نفرت سے لبریز ہوگیا۔ میں اس کے ''احسانات'' کے بوجھ تلے پوری طرح دب کر رہ گیا۔ یہ اس کا مجھ پر قرض تھا جسے چکانا اور سود در سود چکانا میرا فرض تھا!

شون کی موت کی خبر نے لی یان کو بے حد افسردہ اور ملول کردیا۔ بس، اس کے آنسو ہی نہیں نکلے ورنہ وہ اس شدید غم کی لپیٹ میں دکھائی دیتی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کس طرح لی یان سے تعزیت کروں۔ شون نے لی یان کو اپنی امانت کہہ کر میری حفاظت میں دیا تھا۔ میں نے اس امانت کو ممکنہ تحفظ دیا تھا۔ میں لی یان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا تھا کہ آیندہ بھی اس کا خیال رکھوں۔ شون کو واپس لانا میرے بس میں نہیں تھا!

لی یان کی خاموشی کو توڑنے کے لیے ڈاکٹر مونگ اس سے تسلی تشفی کی باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں بھی اس مرہم کاری میں شامل ہوگیا۔ پندرہ بیس منٹ تک ہم دونوں مل کر لی یان کے دکھ کو بانٹنے کی کوشش کرتے رہے اور ہمیں اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ لی یان نے حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے بڑی حد تک خود کو سنبھال لیا۔

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا ''ونگ ہنگ کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟''

''وہ روپوش ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا ''وہاں مین ہیٹن کے چائنا ٹاؤن میں مسٹر ہنگ کا فوٹو اسٹوڈیو اور رہائش گاہ واقع ہے این وائے پی ڈی (نیویارک پولیس ڈیپارٹمنٹ) اور ایف بی آئی والے اس کی جان نہیں چھوڑیں گے وہ کب تک روپوش رہے گا؟''

''جب تک لارڈ بدھا کو منظور ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں سمجھ گیا وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ہم کب تک یہاں کھڑے رہیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''صرف پانچ منٹ اور۔''

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ رات یعنی صبح کے تین بج کر بتیس منٹ ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے محض پانچ منٹ کی مہلت مانگی تھی۔ اس کا مطلب تھا' وہ تین بج کر سینتیس منٹ تک وہاں رکنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں اس ٹھہراؤ میں کیا حکمت پوشیدہ تھی! میں سرِدست ڈاکٹر سے کوئی سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کیونکہ اس نے میرے آخری سوال کا جواب دینے کے بعد آنکھیں بند کرلی تھیں' یوں محسوس ہورہا تھا' وہ دھیان گیان میں مصروف ہوگیا ہو! اس کی یہ ادا اسرار و رموز سے لبریز تھی۔ خدا جانے' وہ کہاں مصروف ہوگیا تھا!

میرے پاس سوائے صبر اور انتظار کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

جب ڈاکٹر مونگ نے ہیوی ڈیوٹی جیپ آگے بڑھائی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''ڈاکٹر! تم نے کس مقصد کی خاطر وہ پانچ منٹ لیے تھے۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو میرے تجسس کی تسکین کے لیے بتادو۔''

''کوئی حرج نہیں ہے۔'' وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا ''کائنات کے گوشے گوشے میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم جس دنیا کے باسی ہیں وہاں کے چپے چپے پر تین بج کر سینتیس منٹ اور سینتیس سیکنڈ والے وقت کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ اس لمحے کا سمک ریز (کائناتی شعاعیں) براہ راست اس دنیا کے ہر خطے پر مرتکز ہوتی ہیں۔ کاسمک ریز کی موجودگی میں اگر کوئی روحانی مشق یا دھیان گیان کیا جائے تو اس کے نتائج زیادہ نمایاں اور فوائد بے حد و حساب حاصل ہوتے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''بس' میں بھی اسی ''نادر و نایاب'' لمحے کو حاصل کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔''

ڈاکٹر مونگ اپنی تھیوری کے مطابق ایک خاص وقت کی افادیت کو اجاگر کرکے خاموش ہوگیا تو میرا دھیان ایک اور ہی نقطے پر جم گیا۔ میں مذہب اسلام کی حقانیت اور ہمہ گیری پر غور کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک لمحے کی اہمیت بیان کی تھی اور میں اس پورے فیز کو ہی بہت اہم اور سود مند سمجھ رہا تھا صبح کاذب کے پاس کا وقت ہر لحاظ سے مفید ہے۔ تہجد گزار افراد میری بات کو زیادہ وضاحت سے سمجھ رہے ہوں گے!

چار بجے صبح ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ گئے۔

ڈاکٹر نے جیپ کو راستے کے کنارے پر روک دیا اور اس کا انجن بند کرنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''وہ سامنے بڑی سی چٹان دکھائی دے رہی ہے؟''

رات کی تاریکی میں مذکورہ چٹان کسی ہیبت ناک دیو کے مانند لگ بھگ دو سو گز کے فاصلے پر استادہ تھی اور ایک ہیولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اس چٹان کی بلندی اچھی

خاصی تھی۔ اترائی کے اختتام پر ہماری جیپ نے کچھ فاصلہ ایک مسطح میدان میں طے کیا تھا۔

''ہاں' نظر تو آرہی ہے۔'' میں نے ڈاکٹر کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''اس چٹان کے عقب میں بدھ نیل کنڈ والی وہ عبادت گاہ ہے جو ہماری منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔''

''اوہ!'' ہم نے ایک طویل اطمینان بھری سانس خارج کی۔

ڈاکٹر نے کہا ''ہم اپنی جیپ کو اس چٹان کی اوٹ میں کھڑا کرکے عبادت گاہ کا رخ کریں گے۔ اس جگہ پر موجود رہتے ہوئے ہماری جیپ کسی کی نگاہ میں نہیں آئے گی' ماسوائے ان کے جو ہماری راہ پر چل کر ادھر آئیں......اور اس بات کے امکانات فی الحال نہ ہونے کے برابر ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''مگر تم نے اس چٹان تک پہنچنے سے پہلے ہی جیپ کیوں روک دی ہے۔ نہ صرف جیپ روکی ہے بلکہ اس کا انجن بھی بند کردیا ہے؟''

وہ متحمل انداز میں بولا ''وہ محض اس لیے کہ انجن کی آواز سے کوئی ہماری جانب متوجہ نہ ہونے پائے۔ اس کو ایک احتیاطی تدبیر سمجھ لو۔''

لی یان نے پوچھا ''پھر ہماری جیپ اس چٹان تک کیسے پہنچے گی؟''

''پش سے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا ''ہم جیپ کو دھکیلتے ہوئے اس محفوظ مقام تک لے جائیں گے۔''

جہاں ہماری جیپ کھڑی تھی وہاں سے وہ چٹان کم و بیش دو سو گز کے فاصلے پر واقع تھی اور یہ اچھا خاصا فاصلہ تھا مگر لی یان نے اس حوالے سے کوئی سوال نہیں اٹھایا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے میرے پش کا چمتکار... دیکھ چکی تھی۔ وہ میری جانب ایسی نظر سے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو...... جیپ کو پش میں دوں گا نا!

ڈاکٹر نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تمہاری ذہنی کیفیت کیسی ہے۔ کیا تم خود کو ایک آسان سی ڈرائیونگ کے قابل سمجھ رہی ہو۔ ایسی ڈرائیونگ جس میں اسٹیئرنگ پر کنٹرول رکھتے ہوئے محض بریکس کا استعمال کرنا ہوگا؟''

اس نے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

اس کے بعد ڈاکٹر کی پلاننگ کے تحت لی یان ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھی۔ میں اور مونگ ریفوشے دھیرے دھیرے جیپ کو دھکیلنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم جیپ سمیت مطلوبہ محفوظ مقام تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

آیندہ دس منٹ میں ہم پوری تیاری کے ساتھ جیپ کو چٹان کی آڑ میں چھوڑ کر عبادت گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سیون ایم ایم گنز کو لوڈ کرکے ہم اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ ان میں سے ایک گن میرے پاس اور دوسری لی یان کے پاس تھی۔ فاضل راؤنڈز کی اچھی خاصی تعداد ہم نے اپنے گرم لباس میں چھپا رکھی تھی۔ ڈاکٹر مونگ خالی ہاتھ تھا۔

میں کچھ عرصہ پہلے جب دن کی روشنی میں یہاں آیا تھا تو مجھے بہت عجیب سا محسوس ہوا تھا تاہم کچھ دن وہاں گزارنے کے بعد میں وہاں کے ماحول اور اونچے نیچے راستوں سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ بدھ نیل کنڈ کی وہ عبادت گاہ ایک پیگوڈا کی شکل میں بلند ٹیلے پر دریا کے کنارے واقع تھی۔ یہ مقام بھاگ متی کی طرف جانے والی سڑک سے لگ بھگ پانچ میل ہٹ کر تھا۔

نشیب میں بہنے والے دریائے بھاگ متی کی دوسری جانب دور تک سرسبز و شاداب وادی پھیلی ہوئی تھی لیکن وادی کی ساری سرسبزی اور شادابی کو اس وقت رات کی مہیب تاریکی نے نگل رکھا تھا۔ یہ قدیم بدھ عبادت گاہ سیکڑوں سال پرانی تھی۔ دور سے عبادت گاہ کی پیگوڈا نما عمارت چھوٹی نظر آتی تھی لیکن قریب پہنچ کر یہ اچھی خاصی بڑی دکھائی دینے لگتی۔

ہم نہایت ہی احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے عبادت گاہ کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس دوران میں ہم نے عبادت گاہ کی طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز ابھرتے نہیں سنی تھی۔ ہم ایک محفوظ مقام پر رک کر لائحۂ عمل ترتیب دینے لگے۔ ہماری آواز سرگوشیوں سے مشابہ تھی۔

ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا ''عبادت گاہ کے اندر اور قرب و جوار میں پھیلا ہوا سناٹا اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یا تو سب خیریت ہے اور یا پھر کچھ بھی خیریت نہیں۔''

لی یان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا ''جیپ سے لے کر یہاں تک پہنچنے میں جمی نونڈا کے کسی آدمی سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ لوگ یا تو ادھر آئے ہی نہیں یا پھر اپنا کام کرکے یہاں سے رخصت ہوچکے ہیں۔''

لی یان نے ڈاکٹر مونگ کے تجزیے ہی کو الفاظ بدل کر دہرادیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اسے شوہر کی موت کی خبر سنائی گئی

تھی لہٰذا اس کا ذہنی طور پر اپ سیٹ ہونا ایک فطری بات تھی۔

میں لی یان کو نظر انداز کرتے ہوئے ڈاکٹر مونگ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"تم نے بتایا تھا' عبادت گاہ کے اندر تمہارے چھ افراد موجود ہیں' چار سادہ لباس پولیس والے اور دو تمہارے خاص آدمی۔ وہ عبادت گاہ کی نگرانی اور حفاظت کے لیے یہاں چھوڑے گئے ہیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ سب کے سب ایک ساتھ سو گئے ہوں۔ ان میں سے کم از کم دو تین افراد کو تو جاگ کر پہرا دینا چاہیے تھا لیکن اس طرف چھائی خاموشی مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کہیں......"

میں نے تشویش ناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ڈاکٹر نے سرسراتی ہوئی سرگوشی کی' "مجھے یقین ہے' وہ پوری طرح مستعد ہوں گے۔" پھر فیصلہ سناتے ہوئے اس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور کہا۔

"میں عبادت گاہ کے سامنے والے حصے سے پیش قدمی کرتا ہوں۔ تم دونوں عقبی حصے کو آزماؤ۔ ہمیں بکھر کر اپنے ٹارگٹ پر پہنچنا ہے اور سمٹ کر اپنے مقصد کو سمیٹ لینا ہے۔"

ڈاکٹر نے بڑے خوب صورت الفاظ میں کارروائی کا نقشہ کھینچ ڈالا تھا۔ میں نے اپنی گن اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم رکھ لو۔ میں اگر ضرورت محسوس کروں گا تو لی یان سے گن لے لوں گا۔"

"میں نے تمہیں بتایا ہے نا' گن کا استعمال مجھے پسند نہیں ہے۔"

"میرے ساتھ بھی یہی صورت حال ہے ڈاکٹر!"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا' "ڈاکٹر! ہم یہاں سے دو ٹولیوں میں بٹ کر اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ تمہاری ٹولی صرف ایک فرد یعنی تم پر مشتمل ہے۔ ایسی صورت میں' اصولی طور پر تو تمہارے پاس زیادہ اسلحہ ہونا چاہیے۔ چلو زیادہ نہ سہی' کم از کم اس ہلاکت خیز خود کار طاقت میں دونوں جانب توازن تو ہونا چاہیے نا!"

میں نے گن بردار ہاتھ کو بہ دستور آگے بڑھا رکھا تھا۔ ڈاکٹر کی ہچکچاہٹ طول پکڑنے لگی تو میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"رکھ لو ڈاکٹر! اگر تمہیں گن چلانا پسند نہیں تو اپنے کسی بندے کو دے دینا۔ اس خطرناک گن کی انہیں بہت ضرورت ہو گی۔"

ڈاکٹر نے میرے ہاتھ سے وہ ہلاکت خیز سیون ایم ایم آٹومیٹک رائفل لے لی۔ ہمارے درمیان خاموش نظروں کا تبادلہ ہوا پھر وہ اس راستے پر ہو لیا جو ذرا گھوم کر عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں نمودار ہوتا۔

بدھ نیل کنڈ کی اس عبادت گاہ کا سامنے والا بیرونی حصہ ایک وسیع و عریض ہال نما قطعے پر مشتمل تھا جس کے عین وسط میں ایک چبوترے پر مہاتما بدھ کا مجسمہ استادہ تھا۔ فاسٹنگ بدھا (فاقہ زدہ بدھا) کا یہ مجسمہ کم و بیش تین فٹ بلند تھا جو سرخ پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ فاسٹنگ بدھا کا وہ مجسمہ کسی سنگ تراش کی فنکارانہ مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اندر کو دھنسے ہوئے پیٹ کے دائیں بائیں بدھا کی پسلیاں بہ آسانی گنی جا سکتی تھیں۔

عبادت گاہ کا عقبی حصہ ایک عظیم چٹان سے جڑا ہوا تھا۔ مجھے اور لی یان کو اسی سمت سے عبادت گاہ کی طرف بڑھنا تھا۔

میں لی یان کے ساتھ احتیاط سے قدم اٹھانے لگا۔ چاروں جانب ایک پُراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس ہولناک سناٹے میں ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔

ایک جگہ لی یان اچانک رک گئی اور گن کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی' "وجدان! یہ تم لے لو۔ میری حفاظت کے لیے تم موجود ہو تو پھر مجھے کیا پروا ہے۔ ویسے بھی آتشیں اسلحے کا زیور مردوں ہی کو جچتا ہے۔"

اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میں نے اس کے چہرے پر تھکن اور اضمحلال کو نوٹ کر لیا۔ وہ تازہ تازہ بیوہ ہوئی تھی۔ اس صدمے کے اثرات اس کی آواز سے ہویدا تھے۔ اس نے عام بیویوں کی طرح رونا پیٹنا تو نہیں مچایا تھا' نہ ہی اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی ٹپکا مگر وہ بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی تھی اور یہ سنجیدگی اس سنجیدگی سے قطعی مختلف تھی جو ڈاکٹر مونگ کی موجودگی کے باعث احترام اوڑھ کر اس پر غالب آ جاتی تھی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے گن لے لی اور ہم خاموشی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں رک جانا پڑا۔ ایک سایہ سا میری نگاہ کے سامنے لہرایا تھا۔ مجھے یوں لگا' کوئی انسانی ہیولا کسی چھلاوے کے مانند ادھر سے ادھر گیا ہو۔

میں گن سونتے محتاط نظر سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن وہاں مجھے کوئی دکھائی نہ دیا۔ ایک لمحے کو میں نے یہی سوچا' شاید وہ میرے تصور کی کرشمہ کاری تھی۔ ہم جس قسم کے

حالات سے گزر رہے تھے۔ ان میں واہمے تخلیق ہونا کوئی خاص بات نہیں تھی مگر وہ میرا واہمہ یا نظر کا دھوکا نہیں تھا۔

اگلے ہی لمحے میری سماعت سے ایک غراتی ہوئی آواز ٹکرائی "گن پھینک کر شرافت سے سیدھے کھڑے ہو جاؤ!"

یہ تحکمانہ آواز ہمارے عقب سے ابھری تھی۔ لب و لہجہ خالص امریکی تھا۔ تاہم اس نے غراہٹ بھری آواز کو زیادہ بلند نہیں ہونے دیا تھا۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جس کا سایہ سا میں نے تاریکی میں لہراتے دیکھا تھا۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ میں اس وقت تمہارے بہت قریب ہوں۔ تم دونوں میرے نشانے پر ہو۔ اگر تم نے تین گننے تک گن نہیں پھینکی تو پھر تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

"تم کون ہو؟" میں نے اسے باتوں میں لگاتے ہوئے پوچھا۔

میں اس کی آواز سے باہمی فاصلے کا اندازہ لگا چکا تھا۔ کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے میں اس کی پوزیشن کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر غرایا۔

"سوالات نہیں کرو۔ ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

"گولی چلانے والے مکالمت کے چکر میں نہیں پڑتے۔" میں نے کہا' "بہرحال' تمہارے نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری بک بک سے ظاہر ہو گیا کہ تم امریکی ہو۔" پھر میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا "تم امریکا سے ہزاروں میل دور یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"میں تمہیں جہنم واصل کرنے کے لیے یہاں تعینات کیا گیا ہوں۔" وہ سنگین لہجے میں بولا "تین گننے کی مہلت تم نے کھو دی۔ اب جلدی سے گن پھینک کر سیدھے ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں بھی وہیں پہنچا دوں گا جہاں اس وقت تمہارے ساتھی پہنچے ہوئے ہیں۔"

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا "ہمارے ساتھی" سے اس کی مراد یقیناً وہ افراد تھے جو عبادت گاہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ اب اس طرف خاموشی اور سناٹے کا سبب سمجھ میں آ رہا تھا۔ ہمارے بندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو بھائی' میں گن پھینک رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہمیں مرنے کا کوئی شوق نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی میں ذرا سا آگے کو جھک گیا۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں گن کو بصد احترام پتھریلی زمین پر رکھنے جا رہا ہوں مگر میرے ذہن میں اس وقت کوئی اور پروگرام ہی چل رہا تھا لیکن مجھے اپنے پروگرام میں ہنگامی طور پر تھوڑی تبدیلی کرنا پڑی۔

میں جیسے ہی آگے کو جھکا' عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی جانب سے فائرنگ کی آواز آنے لگی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہمیں نشانے پر رکھنے والا فائرنگ کی اس آواز سے چونکا نہ ہو' خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو تلف کرنے کا بھی دعوے دار تھا۔

میں نے اس کے لمحاتی چونکنے سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور چشم زدن میں ایک جھٹکے سے گھوم کر اپنے عقب میں فائرنگ کر دی۔

یہ ایک رسکی اسٹیپ تھا لیکن میں چونکہ اس کی پوزیشن کو ذہن میں نقش کر چکا تھا اس لیے میرے اندازے نے کام دکھایا اور فائرنگ کی تیز تڑتڑاہٹ میں انسانی چیخوں کی آواز غلط ملط ہو کر رہ گئی۔

میں نے تیزی سے پلٹ کر اس جانب گن سیدھی کر لی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی گن سمیت الٹا پڑا تھا۔ میری گن سے نکلنے والی گولیوں نے اس کے وجود کو چھلنی میں بدل دیا تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر اس کی موت کی تصدیق کی اور گن اٹھا کر لی یان کی طرف بڑھا دی۔

وہ چھوٹے سائز کی ایک خود کار گن تھی اور پوری طرح لوڈ بھی تھی۔ لی یان کو اس کے استعمال میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ میں سیدھا ہوا ہی تھا کہ اسی لمحے ایک مرتبہ پھر فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی پھر اس کے جواب میں فائرنگ ہونے لگی۔

میں نے لی یان کے ساتھ ایک جانب دوڑ لگا دی۔ تاہم اس دوڑ میں ہم نے احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی جانب سے ابھری تھیں اس کا یہی مطلب تھا' ڈاکٹر مونگ بھی اس طرف "مصروفِ عمل" ہو گیا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے لی یان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے استفسار کیا۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میں نے کہا "اگر ہم کھٹمنڈو میں ہوتے اور شون کے بارے میں کوئی ایسی ویسی اطلاع ملتی تو میں تمہیں ہرگز ہرگز اپنے ساتھ نہ آنے دیتا۔ یہ ایسا وقت نہیں کہ تم مار امار کی کارروائی میں ہمارا ساتھ دیتی۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"زندگی اور موت کا کھیل بڑا بھیانک ہے وجدان!"

وہ ٹھوس لہجے میں بولی "اس میں انسان کو ایک لمحے کے آرام کی مہلت میسر نہیں آتی۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہم جس مشن میں ہیں، اس میں موت ہماری زندگی سے نہیں کھیلے گی؟"

"ہاں اس بات کی گارنٹی تو واقعی کوئی نہیں دے سکتا۔"

"تو پھر ہمیں موت اور زندگی کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "یہ دونوں آس پاس محوِ سفر ہیں اور ہر لمحے ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش میں رہتی ہیں۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"شون کی موت کا مجھے دکھ ضرور ہے لیکن میں اس سچائی کو تسلیم کرتی ہوں کہ اس کی زندگی پوری ہوگئی تھی اس لیے وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ ایک روز ہماری زندگی کو بھی موت ہڑپ کر جائے گی اور...... ہم بھی بہت لوگوں کو دکھ میں مبتلا کر جائیں گے۔"

لی یان کی مبنی بر حقیقت باتوں نے مجھے متاثر کیا۔ وہ اس وقت پہلے والی لی یان نظر نہیں آرہی تھی۔ پتا نہیں، یہ اس کا اصل روپ تھا یا حالات کی سنگینی نے اس کے دماغ کو ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ حالات و واقعات انسانی سوچ پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس کے بعد کوئی ہماری راہ میں نہ آیا اور ہم پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے اس چٹان کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ لی یان نے اس عبادت گاہ میں پہلی مرتبہ قدم رکھا تھا مگر میں پہلے بھی یہاں چند روز گزار کر گیا تھا اور عبادت گاہ کے ایک ایک راز سے بخوبی آگاہ تھا۔

باہر سے سنگلاخ اور ٹھوس نظر آنے والی وہ عظیم الجثہ چٹان اندرونی جانب سے خاصی کھلی تھی اور اس کے کھلاؤ نے ایک غار سا بنا دیا تھا۔ اس غار میں داخل ہونے کا راستہ دوسری سمت آخری کنارے پر تھا۔ ہم ایک تنگ سی راہداری کو عبور کرتے ہوئے اس راستے تک پہنچ گئے۔ اسی لمحے غار کے اندر فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔

ہم دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ لی یان کی آنکھوں میں مجھے استفسار نظر آیا۔ تاریکی کے باوجود بھی میں نے سمجھ لیا کہ وہ اشاروں کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہی تھی...... یہاں کھڑے ہو کر کچھ دیر انتظار کریں یا اندر داخل ہو جائیں!

میں نے وہیں رک کر اندر کی سن گن لینے کی کوشش کی اور غار کے اندر مجھے اٹھا پٹخ کی مخصوص آواز صاف سنائی دے گئی۔ میں سمجھ گیا، اس طرف ڈاکٹر مونگ دشمنوں سے نمٹ رہا تھا۔ میں نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے بڑے اعتماد کے ساتھ آگے قدم بڑھا دیئے۔

ہم دونوں غار کے اندر داخل ہو گئے۔ وہ غار ایک ہال نما تھا اور تقریباً مربع شکل کا تھا۔ اس کی دیواروں کی لمبائی ساٹھ فٹ کے قریب تھی اور "چھت" بھی کم و بیش اتنی ہی بلندی پر واقع تھی۔ غار کے وسط میں مہاتما بدھ کا ایک عظیم الجسامت مجسمہ کھڑا تھا۔ اس مجسمے کی اونچائی لگ بھگ تیس فٹ تھی اور اسے ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا جس کا گھیر کم و بیش پندرہ فٹ تھا۔ اتنے بڑے مجسمے کو تراش کر باہر سے اندر لانا تو ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا، غار کے اندر پہلے سے کوئی بڑی چٹان موجود ہو جسے تراش کر مجسمے کی شکل دے دی گئی تھی۔ غار کی دیواروں پر بھی جا بجا پتھر تراش کر بدھ کی شبیہ ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسی ہی ایک سنگلاخ دیوار میں نصب مخصوص اسٹینڈ میں ایک مشعل روشن تھی۔ مشعل کی محدود روشنی اگرچہ غار کو پوری طرح اجاگر کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ تاہم ہم اسی کے طفیل غار کے اندرونی مناظر کو دیکھ پا رہے تھے۔ وہ ماحول سمجھنے میں مجھے اس لیے بھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ سب کچھ میرا دیکھا بھالا ہوا تھا!

ہم اس مجسمے کے عقب سے گھوم کر پہلو میں پہنچے تو وہاں غار کے فرش پر مجھے دو انسان پڑے ہوئے نظر آئے۔ ان کی حالت سے لگتا تھا وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ میں نے قریب پہنچنے کے بعد ٹھڈے مار کر ان کو سیدھا کیا پھر نشانے پر رکھتے ہوئے ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ ان دونوں کی صورت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مقامی تھے۔ یہ بات میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ جمی فونڈا کے آدمی تھے یا ان چھ افراد میں سے دو جو اس عبادت گاہ کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی بھی صورت ممکن ہو سکتی تھی۔ جمی فونڈا کو ایک مقامی طاقت ور شخصیت جوگندر پال کا تعاون حاصل تھا۔ جوگندر پال اسے مقامی جاں نثار بھی مہیا کر سکتا تھا۔

اغلب امکان اس بات کا تھا کہ وہ دشمنوں کے آدمی ہوں گے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے غار کے اندر اٹھا پٹخ کی آواز سی تھی۔ یہ دو لاشیں اسی کا نتیجہ تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کارروائی ڈاکٹر مونگ نے کی تھی لیکن وہ خود غار میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دونوں لاشوں کے قریب

فرش پر ان کی گنیں بھی پڑی تھیں جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا، انہوں نے ہی ڈاکٹر پر فائرنگ کی ہوگی۔

ہم تھوڑا آگے بڑھے تو ایک اور آدمی اوندھا پڑا ہوا ملا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو وہ صورت شکل سے امریکی نظر آیا۔ اس کی گن بھی ہاتھوں میں دبی وہیں اسی کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ میں نے وسیع وعریض ہال نما غار میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی، ہال میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔ میں پلٹا اور مجسمے کے ہاتھ پاؤں کی طرف آ گیا۔

یہ مجسمہ اپنے اندر ایک خطرناک راز چھپائے ہوئے تھا۔ اس کو دیکھ کر، چھو کر اور جانچ کر کوئی ناواقف یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے اندر بھی داخل ہوا جا سکتا ہے۔ وہ بظاہر ایک ٹھوس ترشی ہوئی چٹان تھی جس کی سنگلاخی کو ماہر ہاتھوں نے بدھا کے مجسمے میں ڈھال دیا تھا لیکن میں جانتا تھا، اس مجسمے کے اندر داخل ہوا جا سکتا ہے۔ میں داخلے کے مخصوص طریقۂ کار سے بھی واقف تھا۔

میں نے جھک کر مجسمے کے دونوں پاؤں کا جائزہ لیا۔ دونوں سنگی پاؤں کے درمیان تقریباً چار فٹ کا فاصلہ تھا اور یہ فاصلہ ٹھوس چٹانی پتھر پر مشتمل تھا۔ دونوں پاؤں کی ایڑیوں کو جب مخصوص انداز میں دبایا جاتا تو چار فٹ کا یہ چٹانی پتھر اپنی جگہ سے سرک جاتا تھا اور وہاں ایک کھڑکی نما خلا پیدا ہو جاتا تھا۔ اس خلا میں سے گزر کر مجسمے کے اندر پہنچا جا سکتا تھا۔ میں اس تجربے سے گزر چکا تھا۔

وہ ٹھوس پتھر اپنی جگہ پر ثابت قدم کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، ہمارے دشمنوں میں سے کوئی اندر داخل ہونے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک اطمینان بخش صورتِ حال تھی لیکن میرا اندرون بے اطمینانی اور اضطراب کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میرا دل جس صورت کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے دیوار میں نصب مشعل کو اس کے اسٹینڈ میں سے نکال لیا۔ سیون ایم ایم کو اسٹریپ کی مدد سے کندھے پر لٹکایا اور مشعل کو ہاتھ میں تھام کر آگے بڑھنے لگا۔ اس غار نما ہال میں ڈاکٹر کو غیر موجود پا کر میں یہی سمجھا کہ وہ عبادت گاہ کے کسی دوسرے حصے کی طرف بڑھ گیا ہے۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے اس جانب بڑھنے لگے جو راستہ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی طرف جاتا تھا۔ اسی لمحے غار کے آخری سرے پر فائرنگ کی آواز ابھری۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے۔ فائرنگ کے ساتھ ہی انسانی چیخیں بھی بلند ہوئیں۔ میں نے مشعل کو ہاتھ پھیلا کر اپنے وجود سے کافی دور کر دیا تاکہ روشنی دیکھ کر اگر کوئی ہماری سمت فائرنگ کھول دے تو ہم ہلاکت خیز گولیوں سے محفوظ رہیں مگر ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ چند لمحے کے انتظار کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔

اس غار کے اندر بدھا کے مجسمے کو ٹھیک حالت میں دیکھ کر اگرچہ مجھے اطمینان سا ہو گیا تھا لیکن موجودہ فائرنگ بتاتی تھی کہ وہاں سب ٹھیک نہیں بلکہ کوئی بڑی گڑبڑ موجود ہے۔ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر کے میں اس سمت بڑھنے لگا جدھر سے ایک لمحے پہلے فائرنگ اور انسانی چیخوں کی آواز ابھری تھی۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے اچھی طرح اس ہال نما غار کا جائزہ لیا تھا اور وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی بھی موجود نہیں تھا پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اچانک کس نے کس پر فائرنگ کی تھی۔ انسانی چیخوں نے کسی کی ہلاکت کی خبر بھی دی تھی۔

ہم نہایت ہی محتاط قدموں سے اپنے ٹارگٹ کی جانب بڑھتے رہے اور غار کے اس حصے میں جا پہنچے جہاں ایک تنگ سی راہداری موجود تھی جس میں بمشکل دو افراد پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے۔ اس راہداری کے اندر، خاصے فاصلے پر مجھے ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ تاہم اس روشنی کا ماخذ کہیں دکھائی نہ دیا۔ راہداری کی تنگی کو دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ دھنو (ساحل) کے باپ نے مجھے اس راہداری کے بارے میں بتایا تھا۔

لی یان نے کہا ”وجدان! ہمیں اس طرف جا کر صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ ڈاکٹر مونگ کسی خطرے سے بھی دوچار ہو سکتا ہے!“

اس کے لہجے میں ڈاکٹر مونگ کے لیے احترام بھری تشویش موجود تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، اس طرف راہداریوں کا کیسا الجھا ہوا جال پھیلا ہے۔ وہ ان بھول بھلیوں کی سنگینی اور سحر آفرینی سے آگاہ نہیں تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ تھونچی نے بھی ان راہداریوں کے بارے میں کھل کر کوئی بات نہیں کی تھی۔ مبہم انداز میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ ادھر بڑے اہم اور پُراسرار راز پوشیدہ ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بدھا کے عظیم الجثہ مجسمے کے اندر لے گیا تھا جہاں میں نے سونے کا ایک بے بہا ذخیرہ دیکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے پوری دنیا سے تمام تر سونا اکٹھا کر کے وہاں ڈھیر لگا دیا گیا ہو جس میں بدھا کے طلائی مجسمے کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

اس سنسنی خیز تجرباتی نظارے کا تصور کرتے ہوئے مجھے اپنے وجود میں ہیجان سا پھیلتا محسوس ہوا۔ کوئی عام آدمی

سونے کے اتنے بڑے ذخیرے کو دیکھ لیتا تو حیرت سے اس کا دماغ الٹ جاتا۔ ربی موشے ہائمن ایسے ہی تو اس تہ خانے کا دیوانہ نہیں بنا بیٹھا تھا!

ربی کے خیال نے میرا دھیان اس کی خواہش کی طرف پھیر دیا۔ ربی تہ خانے میں پوشیدہ ان پانچ متبرک پتھروں کو حاصل کرنا چاہتا تھا جن کی یکجائی ایک بہت بڑی روحانی قوت کا وسیلہ تھی۔ اس قوت کا حامل شخص پوری دنیا کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

تھونچی نے بڑی وضاحت کے ساتھ مجھے سونے کے اس ذخیرے سے آگاہی دی تھی۔ میں نے کہیں دیکھا اور نہ ہی تھونچی نے ان پانچ عظیم المرتبت پتھروں کا ذکر کیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ربی کی جستجو کا تعلق انہی بھول بھلیوں سے تھا جن کی سمت جانے والے راستے پر ہم اس وقت کھڑے تھے۔ وہ نادر و نایاب پتھر اسی طرف کہیں محفوظ کیے گئے تھے۔

لی یان کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا ”وجدان! ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

سونے کے ذخیرے اور پانچ روحانی پتھروں کے بارے میں میرے ذہن نے محض پانچ سیکنڈ سوچا ہوگا اور اسی مختصر سی محویت نے لی یان کو، مجھے دوبارہ مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اوکے...... کم آن......!“

میرے منہ سے یہ الفاظ خارج ہوئے ہی تھے کہ غار کے عقبی حصے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ یہ وہی سمت تھی جدھر سے ہم اس ہال نما غار میں داخل ہوئے تھے۔ گویا کوئی اور بھی ادھر رہا تھا۔ قدموں کی چاپ بتاتی تھی، وہ کم از کم دو افراد ہوں گے اور یہ بات بھی یقینی تھی کہ وہ ہمارے دشمن ہی ہوں گے!

میں نے لی یان کا بازو تھاما اور اچک کر تنگ سی راہداری میں داخل ہو گیا۔ اسی لمحے وہ غار گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ ہمیں اس راہداری میں پناہ لینے میں اگر لمحے بھر کی تاخیر ہو جاتی تو ہمارے وجود اندھی گولیوں کی راہ میں حائل ہو کر اپنے اندر کئی سوراخ بنوا لیتے۔ وہ فائرنگ براہِ راست ہماری سمت کی گئی تھی۔

جلد ہی اس کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ میرے ہاتھ میں موجود مشعل، فائرنگ کے لیے مشعلِ راہ بن گئی تھی۔ میں نے فوری طور پر اس مشعل کو غار میں ایک جانب اچھال دیا۔ اگر وہ میرے پاس رہتی تو دشمنوں کے لیے سدِ راہ ثابت ہو سکتے تھے۔ میں اس مشعل کو اپنے دشمنوں کے اسلحہ بردار ”سفینوں“ کی راہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس کا کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

وہ مشعل میرے ہاتھ سے جدا ہونے کے بعد لگ بھگ دس فٹ کے فاصلے پر ہمارے اور بدھا کے مجسمے کے وسط میں گری تھی اور بدستور روشن تھی اور اس نے اپنی روشنی سے اردگرد کے ماحول کو بھی کافی حد تک روشن کر رکھا تھا۔

میں نے لی یان کا ہاتھ تھاما اور اس کے کان کے قریب اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی ”ہم غار کے نسبتاً تاریک حصے کی طرف جا رہے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

اس نے میری معیت میں قدم اٹھانا شروع کر دیئے۔

جلد ہی ہم بھول بھلیوں کی سمت جانے والی تنگ سی راہداری سے باہر نکل آئے۔ فائرنگ کرنے والے ابھی ہماری نظر میں نہیں آئے تھے۔ ہم پتھریلی دیوار کے ساتھ چپک کر سرکتے ہوئے غار کے ایک کونے میں پہنچ گئے۔ اب ہمارے اور مشعل کے درمیان بدھا کا دیو قامت سنگی مجسمہ حائل تھا۔ اس وجہ سے بھی اس کونے میں مناسب تاریکی موجود تھی۔ اگر بہت گھور گھور کر اس کونے کا جائزہ نہ لیا جاتا تو ہمارے لیے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

اس غار میں داخل ہونے والے تازہ ترین دشمن مجھے نظر تو نہیں آ رہے تھے۔ تاہم محتاط انداز میں اس تاریک راہ داری کی جانب بڑھتے ہوئے ان کے قدموں کی دھیمی چاپ کو میں بڑی وضاحت سے محسوس کر رہا تھا۔ پوزیشن کے لحاظ سے وہ روشن مشعل تنگ راہداری اور دشمنوں کے قدموں کے درمیان آ گئی تھی۔

لی یان مجھ سے چپک کر کھڑی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی ”تم پوزیشن سنبھالے یہیں الرٹ کھڑی رہو۔ میں دوسری سمت سے انہیں گھیرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے اپنی آواز کو اس حد تک مدھم رکھا تھا کہ لی یان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے محض میرے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔ ان لمحات میں ایک ذرا سی آواز دشمنوں کو ہماری جانب متوجہ کر سکتی تھی۔ اس سرگوشی کے دوران میں میرے لب لی یان کے کان کی لو سے مس ہوئے تو مجھے اپنے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ دل گویا کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

میں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور لی یان کا ہاتھ تسلی دینے والے انداز میں دبانے کے بعد سنگی مجسمے کی طرف بڑھ

گیا۔ میرے دشمن اس مجسمے کی دوسری جانب پیش قدمی کررہے تھے۔ میں مجسمے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک انسانی وجود سے ٹکرا گیا۔

کوئی پہلے سے اس تاریکی میں موجود تھا۔ یہ یقیناً نووارد دشمنوں کا کوئی ساتھی تھا۔ ورنہ ہم ان کی آمد سے قبل اس ہال نما غار کو اچھی طرح دیکھ چکے تھے۔ وہاں ہمارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

ٹکر کے نتیجے میں وہ شخص بڑی سرعت کے ساتھ متحرک ہوگیا۔

اسی لمحے غار کے دوسرے حصے میں فائرنگ کی مخصوص تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی مردانہ چیخوں سے وہ غار بھر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ ہوئی کہ وہ مردانہ چیخیں لی یان کی فائرنگ کا نتیجہ تھیں۔ میں پوری تن دہی سے اپنے محاذ پر ڈٹ گیا۔ لی یان نے بڑی مہارت سے محاذ کا دوسرا سرا سنبھال لیا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا' مجھے زیر کرنے کے لیے بے انتہا قوت صرف کررہا تھا۔ میں اندھیرے کے باعث اس کے جپھے میں آ گیا تھا۔ متحرک ہوتے ہی اس نے مجھے گرفت میں لیتے ہوئے نیچے گرانے کی کوشش شروع کردی' اس کی اس کوشش میں بلا کی پھرتی اور طاقت بھری ہوئی تھی۔

اس نے مجھے اٹھا کر پتھریلے فرش پر پٹخنے کے لیے جیسے ہی ہوا میں بلند کیا' میرا داؤ چل گیا۔ میں نے بائیں پاؤں کی ایڑی کو ایک جرک کے ساتھ اس کے پیٹ کے زیریں حصے پر رسید کردیا۔

پیٹ کا زیریں حصہ انسانی بدن کا بہت نازک مقام ہوتا ہے اور اس پر لگنے والی معمولی سی چوٹ بھی دن میں تارے دکھلا دیتی ہے۔ مجھے گرفت میں لینے والا دشمن رات کی تاریکی میں دہکتا ہوا گولا دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کے حلق سے ایسی وحشت ناک چیخ خارج ہوئی جیسے اچانک سورج اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔

میں نے اس کی غفلت سے فائدہ اٹھایا اور کھڑے ہاتھ کی ایک بھرپور ضرب اس کی گردن پر جمادی۔ وہ پہلے ہی اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس ضرب نے اسے تیورا کر رکھ دیا۔ نتیجے کے طور پر میرے وجود پر سے اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے ایک خاص زاویے سے باڈی کو ٹوئسٹ کیا اور اس کے بازوؤں کے حلقے سے باہر نکل آیا۔

وہ پیٹ کو دبائے کھڑا تھا۔ میں نے گھوم کر ایک ریئر کک اس کے چہرے پر جڑ دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے کو گیا اور بدھا کے سنگی مجسمے سے ٹکرا کر زمین بوس ہوگیا۔ اس ہال نما غار کی زمین قالین پوش نہیں تھی کہ خیریت گزرتی' پتھریلی زمین نے اس کے وجود کے مختلف حصوں پر بے دریغ بڑے سنگین بوسے دے ڈالے' گویا زمیں بوس ہونے کا حق ادا کردیا۔

اسی لمحے مجھے اپنے ماحول میں تاریکی چھٹنے کا احساس ہوا۔ مشعل غار کے دوسرے حصے میں گری تھی اور میں نے ابھی اس شخص سے ملگجے اجالے میں دو دو ہاتھ کیے تھے۔ وہاں نہ تو مکمل تاریکی تھی اور نہ ہی مناسب اجالا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اپنے ماحول میں روشنی بڑھنے کا سبب معلوم ہوگیا۔

لی یان مشعل تھامے میری جانب آ رہی تھی۔ میں نے ایک پرسکون سانس لی اور اپنے مدمقابل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی گن تھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔ وہ جیسے ہی سیدھا ہوا' میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ کک چلادی۔

اس نے اچانک بڑی پھرتی سے گن کی جانب ڈائیو کیا اور رول کرتے ہوئے میرے ٹارگٹ سے دور چلا گیا۔ میرا پاؤں جا کر سیدھا بدھا کے مجسمے پر لگا مگر اس سے پہلے میں صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا۔ میں نے دیکھ لیا کہ مدمقابل اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا لہٰذا میرے ذہن نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک اہم فیصلہ کیا۔ میرے پاؤں نے جیسے ہی سنگی مجسمے کو چھوا' ذہن کی ہدایت کے مطابق میں نے اس پاؤں کا پش لیا اور بیک ڈائیو کرتے ہوئے مخالف سمت میں نکل گیا۔

میں نے وہاں رکنا انتہائی غیر مناسب سمجھا اور بڑی سرعت سے تین بیک فلیک لگاتے ہوئے اپنے دشمن کے پاس پہنچ گیا۔ اس دوران میں وہ اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک خطرناک گن نظر آئی مگر میں نے اسے گن کے استعمال کا موقع نہ دیا۔

اس نے جیسے ہی میری طرف گن سیدھی کرنا چاہی' میں نے اس کے گن بردار ہاتھوں پر ایک فٹ بال کک جڑ دی۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ اس کک کا بھرپور استعمال کیا جاسکتا تھا۔ یہ کک کسی فٹ بال کو ایک ڈی سے دوسری ڈی تک پہنچانے کے لیے مناسب توانائی سے لیس تھی۔ میرے مدمقابل کی گن اس طرح ہوا میں اچھلی جیسے کسی پُرغرور ظالم شخص کی پگڑی اچھلتی ہے۔ وہ ہکا بکا میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی حیرت میں چار چاند لگانا شروع کردیے۔

صرف تین منٹ کی ٹھوکا پیٹی کے بعد وہ غار کے پتھریلے

[فر]ش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں کے [علاوہ] غار کے سنگلاخ ماحول نے بھی اسے شدید چوٹیں پہنچائی [تھ]یں۔ لی یان مشعل لے کر میرے پاس آ گئی۔ میں روشنی [میں] فرش نشین دشمن کا جائزہ لینے لگا۔

وہ مقامی نہیں تھا' صورت سے امریکی یا یورپی دکھائی [دے ر]ہا تھا۔ میں نے اس کی گردن پر اپنا بھاری بوٹ جمایا اور غرا [ک]ر پوچھا ''جمی فونڈا کہاں ہے؟''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا مگر اس نے [ز]بان نہیں کھولی۔ میں سمجھا' وہ جواب دینے میں تردد سے کام لے رہا ہے۔ میں نے بے رحمی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا [او]ر سفاک لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ ہیں۔ اگر تم نے یہ [م]ہلت پوری ہونے سے پہلے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو [تم]ہاری زندگی کو فل اسٹاپ لگ جائے گا۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے سیون ایم ایم کی خطرناک [گن] اس کی جانب اٹھادی۔ وہ اشاروں میں مجھے اپنی گردن [کی] طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی اس حرکت [س]ے میں فوراً سمجھ گیا کہ وہ بولنے میں دقت محسوس کررہا تھا۔ [اس] کے جواب نہ دینے کا سبب سامنے آ گیا۔ میرے پاؤں [کے] داب نے اس کی گردن کو مفلوج کرکے رکھ دیا تھا' گویا وہ [عار]ضی طور پر قوتِ گویائی سے محروم ہوگیا تھا۔

میں نے اس کی گردن پر سے پاؤں کا دباؤ ذرا ہلکا کیا تو [وہ] کھانسنے لگا۔ یہ اس کا ایک فطری ردِعمل تھا مگر میں نے خون [خو]ار لہجے میں کہا۔

''اگر تمہیں کھانسنے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں تمہیں کسی [سی]نی ٹوریم میں داخل کروادوں گا۔ تم ٹی بی وارڈ کے کسی بیڈ پر [اپن]ے اپنا یہ شوق پورا کرتے رہنا۔'' میں نے گن کی نال کو اس [کی آنکھوں] کے انتہائی قریب کردیا۔

میرے الفاظ میں ایسی سنگینی بھری ہوئی تھی کہ اس کی [کھانسی] کو بریک لگ گئے۔

''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' [میں] نے اسی سفاک لہجے میں دریافت کیا ''وہ تمہارا باپ جمی [فونڈا] کہاں ہے؟''

''میں جمی فونڈا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ [بولا] ''وہ لوگ ادھر اندر تھے' ہم باہر دوسری طرف پہرا دے [رہے] تھے۔''

''تم لوگوں نے ہائی دے والی بستی کے ایک گھر میں [وحش]ت بپا کرکے وہاں سے ایک لڑکی کو اغوا کیا تھا۔'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا ''وہ لڑکی کہاں ہے؟''

وہ منت ریز لہجے میں بولا ''میں ہائی دے والی کسی بستی اور لڑکی کے اغوا سے بھی واقف نہیں ہوں۔ ہم تو کئی دنوں سے یہاں موجود ہیں۔ جمی فونڈا کے ساتھ جو لوگ آج رات یہاں پہنچے ہیں' ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''تمہارے اور کتنے ساتھی باہر پہرا دے رہے ہیں؟''

''میں آخری بچا ہوں۔'' وہ امید بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں پہرا دینے والے ہمارے تمام ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاچکا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''تھوڑی دیر پہلے یہاں اچانک ہی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ ہم نے بڑی کامیابی سے یہاں کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا کہ سب کچھ الٹ کر رہ گیا۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''ادھر عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں ہمارے ساتھی مارے گئے تو ہم تینوں ایک سائیڈ میں چٹان کے پیچھے چھپ گئے تھے پھر چٹان کے قریب فائرنگ کی آواز گونجی تو ہم جائزہ لینے کے لیے اس طرف چلے گئے۔ وہاں ہمیں اپنے ایک ساتھی کی لاش مل گئی۔ ہم چٹان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس ہال تک آ پہنچے ہیں لیکن......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لی یان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں موت کے خوف اور زندگی کی وحشت سے پھٹی جارہی تھیں۔ ابھی اس نے اپنے جس ساتھی کی لاش کا ذکر کیا تھا وہ وہی دشمن گن بردار تھا جو میرے ہاتھوں جہنم رسید ہوا تھا اور اس جہنمی کی خطرناک گن اب لی یان کے ہاتھوں میں تھی جس کے ہلاکت خیز برسٹ سے لی یان نے اسی ہال نما غار میں دشمنوں کی تعداد میں دو کی کمی پیدا کردی تھی۔ یہ دشمن کا جوتا اسی کے سر پر توڑنے والی بات تھی!

عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں دشمنوں کی جتنی لاشیں گری تھیں، اس میں یقیناً ڈاکٹر مونگ کا ہاتھ تھا۔ میں دوبارہ زیرِدام آئے ہوئے اس شخص کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''تم نے بتایا ہے کہ تم لوگوں نے بڑی کامیابی سے یہاں کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''یہاں پر جو لوگ عبادت گاہ کی حفاظت اور دیکھ بھال کا فرض انجام دے رہے تھے' وہ

کہاں گئے؟ تم لوگوں نے انہیں کس سلوک سے گزارا؟''
میری معلومات کے مطابق' بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے اندر اور باہر چھ افراد نگرانی اور حفاظت وغیرہ کا کام سنبھالے ہوئے تھے جن میں دو ڈاکٹر موتگ کے اپنے آدمی تھے اور چار سادہ لباس افراد کا تعلق نیپال پولیس سے تھا۔ اس شخص کے جواب نے میرا خون کھولا کر رکھ دیا۔
''وہ چھ کے چھ بے بسی کی موت مارے گئے!''
تعداد کا ذکر کر کے اس نے اس بات کی بھی تصدیق کر دی کہ اب ہم تینوں یعنی ڈاکٹر موتگ' لی یان اور میرے سوا اس عبادت گاہ میں ہمارا اور کوئی ساتھی زندہ موجود نہیں تھا۔
میں نے گن کی نال کو نیچے پڑے ہوئے اس امریکی شخص کی پیشانی سے ٹکا دیا اور موت سے بھی زیادہ سرد لہجے میں کہا ''وہ چھ کے چھ مارے گئے تو تم کیوں زندہ ہو؟''۔
''پلیز' مجھے نہ مارو......'' وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔
''کیوں نہ ماروں؟'' میں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اپنی آواز خود بھی اجنبی سی لگی۔
''م...... میں...... تمہاری منت کرتا ہوں کہ......''
''ان چھ افراد نے بھی تم لوگوں کی بہت منت کی ہوگی۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''کیا تم میں سے کسی کو ان پر ترس آیا تھا؟''
پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنی منحوس زبان سے مزید کوئی التجا کرتا' وہ ہال نما غار فائرنگ کی تیز آواز سے گونج اٹھا۔ سیون ایم ایم کے ایک مختصر سے برسٹ نے اس کی کھوپڑی کو نابود کر دیا۔ اگلے ہی لمحے غار میں ایک مرتبہ پھر موت کا سا سناٹا پھیل گیا۔
میں نے گن کو سیدھا کیا اور مڑ کر لی یان کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پائی جاتی تھی۔ ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلۂ خیال کیا پھر اس جانب بڑھ گئے جدھر لی یان کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے گرے تھے۔ لی یان نے گن کا بروقت استعمال کر کے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا۔
جلد ہی ہم مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔ میں نے مشعل کی روشنی میں دیکھا' وہ دونوں خون میں نہائے ہوئے تھے۔ لی یان نے ایک خطرناک برسٹ مار کر ان کے جسموں کے چیتھڑے اڑا دیئے تھے۔ ان میں سے ایک مقامی اور دوسرا سفید فام تھا۔ وہ دونوں ہمارے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے اور اس بات کی تصدیق اس شخص نے کی تھی جو چند لمحے پہلے میرے ہاتھوں زندگی کے بعد کے کڑے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں نے سیون ایم ایم کو ری لوڈ کیا۔ لی یان والی گن بھی خالی ہو گئی تھی۔ مذکورہ گن میں استعمال ہونے والی گولیاں ہمارے پاس نہیں تھیں۔ ہمارے فاضل ایمونیشن میں موجود گولیوں کا کیلی بر مختلف تھا۔ لی یان والی گن راؤنڈز کے بغیر ایک آہنی لاٹھی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی لہٰذا اسے ہم نے وہیں پھینک دیا۔ اب ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا تھا کہ کس طرف کا رخ کیا جائے!
اس وقت میرے ذہن میں بڑی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ جمی فونڈا عبادت گاہ کے اندر کہیں موجود تھا' کہاں؟ یہ ہمیں معلوم کرنا تھا۔ میرے ہاتھوں موت سے ہم کنار ہونے والے شخص نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ جمی فونڈا وہاں آیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق' آج شام سات بجے جمی فونڈا نے ہائی دے والی بستی کے ایک گھر میں خون کی ہولی کھیل کر میری ساحل کو وہاں سے اغوا کر لیا تھا۔ شاکا کے گھر کے داخلی دروازے کی اندرونی کنڈی میں لٹکا جمی فونڈا کا ''پیغام'' ہم نے پڑھ لیا تھا۔ اس نے اس خونیں واردات کا تحریری اقبال کیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ ساحل کو اپنے ساتھ اس عبادت گاہ میں لایا ہوگا مگر یہاں جمی فونڈا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی ساحل کا کوئی سراغ دکھائی دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر موتگ ریفوشے بھی پُراسرار طور پر کہیں غائب ہو گیا تھا۔ پتا نہیں' یہ سب لوگ کہاں چلے گئے تھے!
لی یان نے اس تنگ سی راہداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو آگے جا کر راہداریوں کی بھول بھلیوں کو جنم دیتی تھی ''میرا خیال ہے' ہمیں ادھر جانا چاہیے۔''
اس کا خیال معقول اور حالات کے تقاضے کے عین مطابق تھا لیکن میں نے اس کے خیال کی تردید کر دی ''پہلے ہم عبادت گاہ کا بیرونی اور رہائشی حصہ دیکھ لیں پھر ادھر جائیں گے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔
اس نے میری تجویز پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ شاید اس لیے کہ اس تجویز میں ایک قسم کا تحکم پایا جاتا تھا۔ بھول بھلیوں والے' اس تہ خانے کے حصے کے بارے میں تونچی نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ خاصا اطمینان بخش تھا۔ کوئی انجان شخص اگر بھول بھلیوں کی اس نگری میں قدم رکھ دیتا تو واپسی اسے نصیب نہ ہوتی اور...... کسی ''واقف'' شخص کا اس طرف جانا تشویش ناک نہیں تھا۔ بہرحال اس جانب ہونے والی فائرنگ ضرور تشویش کا باعث تھی!
ہم ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس ہال نما غار کے داخلی

راستے تک پہنچ گئے۔ عبادت گاہ کے رہائشی حصے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہمیں تھوڑا گھوم کر ادھر جانا تھا۔ لی یان نے بڑی مضبوطی سے مشعل تھام رکھی تھی۔ وہ خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ پہلے وہ ڈاکٹر موتگ کو نہ پاکر فوراً مجھ سے بے تکلف ہو جاتی تھی۔ ہمارے درمیان زندگی کے ہر موضوع پر بات ہوتی۔ میں اسے چھیڑنے اور اس کا نفسیاتی علاج کرنے کے لیے گفتگو کو اس کی ذہنی ٹیڑھ کی طرف موڑ دیتا اور وہ واقعی چھڑ جاتی۔ یہ موضوع اس کی زندگی کا بڑا نازک پہلو تھا اور شون کی موت کے ساتھ ہی اس موضوع کی بساط بھی لپٹ گئی تھی۔ اس کی خاموشی اور گہری سنجیدگی بھی بیوگی کے سبب ہی تھی! مجھے نہیں امید تھی کہ وہ دوبارہ شادی کے بارے میں سوچے گی بھی۔

ویسے مستقبل کے بارے میں محض اندازے ہی قائم کیے جاسکتے ہیں' کوئی حتمی بات کہنا سراسر حماقت کے زمرے میں شمار ہوگا کیونکہ مستقبل کا حال کوئی اور ہی جانتا ہے اور وہ ذات پاک بہت ہی قدرت والی ہے۔ انسان اگر پوری طرح ماضی کے حال تک ہی رسائی حاصل کر لے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔ اس کا تصرف تو حال تک محدود ہے اور اسے اپنے حال کا خیال رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر کسی کا حال ٹھیک نہ ہو تو ماضی اور مستقبل دونوں کی صورت بگڑ کر رہ جاتی ہے!

ہم عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں آ گئے۔ وہاں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ مشعل کی روشنی کے طفیل ہم ایک دوسرے کمرے میں چکراتے پھرے۔ اس چلت پھرت کے دوران میں کئی ہولناک مناظر نے ہماری آنکھوں میں جگہ پائی۔ کم و بیش آٹھ انسانی لاشوں نے ہمارا ''استقبال'' کیا۔ ان میں اپنوں اور بیگانوں کی لاشیں شامل تھیں۔ بیرونی حصے کا مکمل معائنہ کرتے ہوئے بھی پہاڑی ڈھلوان پر تین چار افراد مردہ حالت میں پائے گئے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم کسی بدھ پیگوڈا نما عبادت گاہ میں نہ ہوں بلکہ انسان کے بے گور و کفن شہرِ خاموشاں میں چہل قدمی کر رہے ہوں۔

اس تلاش میں مجھے صرف تین افراد کو دیکھنے کی خواہش تھی اور وہ تین افراد تھے میری ساحل' ڈاکٹر موتگ ریفوشے اور شیطان اعظم ربی موشے ہائمن کا چیلا جی فونڈا...... مگر یہ تینوں صورتیں ہنوز آنکھوں سے اوجھل تھیں۔

میں لی یان کے ساتھ واپس عبادت گاہ کی عقبی سمت نکل آیا۔ اس طرف چٹان کے ساتھ چلتے ہوئے ہمیں ہال نما غار تک پہنچنا تھا۔ اب بھول بھلیوں کی طرف جانے والی راہداری میں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس طرح لی یان کی تشویش بھی دور ہو جاتی کیونکہ اس طرف ہم نے فائرنگ اور انسانی چیخوں کی آواز بہرحال سنی تھی۔

غار کے اندر داخل ہوتے وقت میں ٹھٹک کر رک گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غار کے اندرونی حصے میں کوئی مشعل جل رہی ہو۔ میں نے وہاں واضح طور پر روشنی کے آثار دیکھے تھے۔ تنگ راہداری کے دور افتادہ کسی حصے سے روشنی سفر کر کے اس غار تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ جب ہم مشعل لے کر غار سے باہر نکلے تھے تو وہاں گھپ اندھیرے نے خیمہ ڈال دیا تھا۔

اب اگر وہاں کسی قسم کی روشنی دکھائی دے رہی تھی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہاں کوئی ہے!

''کوئی ہے'' کے الفاظ تن بدن میں تشویش دوڑانے کا باعث تھے۔ وہ کوئی بھی ہوسکتا تھا۔ جی فونڈا یا ڈاکٹر موتگ یا پھر میری جانِ تمنا ساحل!

میرے دل نے ان لمحات میں بڑی شدت سے پکارا...... کاش' وہ میری ساحل ہو!

لی یان کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی ''رک کیوں گئے وجدان؟''

وہ میرے پیچھے تھوڑے فاصلے پر تھی اس لیے غار کے اندر نظر آنے والی روشنی کا اسے احساس نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی پکار بلکہ استفسار نے ساحل کے تصور کو ذہن سے مٹا دیا اور میں پوری طرح اپنے ماحول میں حاضر ہوگیا۔ دراصل' بات یہ تھی کہ ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے میں بعض اوقات اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتا تھا' وہ ماحول کیا بیچتا تھا ساحل کی یاد کے سامنے!

''آں...... آگے کچھ گڑبڑ ہے لی یان!'' میں نے جلدی سے بات بنائی۔

''آگے؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی ''لیکن مجھے تو کوئی گڑبڑ دکھائی نہیں دے رہی!''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میرا مطلب ہے...... اس غار کے اندر!''

''غار کے اندر کسی گڑبڑ کو تم نے باہر رہتے ہوئے کیسے دیکھ لیا؟''

جواب میں' میں نے اسے اندر نظر آنے والی روشنی کے بارے میں بتا دیا۔ میری بات سننے کے بعد وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوگئی ''ہاں' یہ تو واقعی بڑی فکر والی بات ہے۔''

میں نے کہا ''لی یان! یہ گن تم اپنے ہاتھوں میں تھام لو۔ مشعل مجھے دے دو۔''

''اور تم؟'' اس نے سوالیہ انداز میں کہا ''تم اس مشعل کے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟''

''میں اس مشعل کو غار کے اندر پھینکوں گا جیسا کہ پہلے پھینکا تھا۔'' میں نے فوری طور پر ذہن میں آنے والے آئیڈیا کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لی کو بتایا ''اندر جو کوئی بھی ہے وہ فطری انداز میں ردعمل کے طور پر مشعل کی سمت بے دریغ فائرنگ کرے گا۔ اس سے ہمیں دو فائدے حاصل ہوں گے۔''

''مثلاً...... کون کون سے دو فائدے؟'' وہ پوری توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔

''نمبر ایک'' میں نے سرگوشیانہ انداز میں کہا ''اس فائرنگ میں اس شخص کا اچھا خاصا ایمونیشن کام آ جائے گا۔ اگر وہ ہمارا دشمن ہے تو یہ ہماری ایک اہم کامیابی ہوگی اور دوسرے۔'' میں نے سانس لینے کے لیے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

''نمبر دو' ہمیں اس کی درست لوکیشن معلوم ہو جائے گی۔''

''آئیڈیا عمدہ ہے۔'' وہ ستائشی انداز میں بولی۔

میں نے مزید کہا ''اس کے بعد میں چپکے سے غار کے اندر داخل ہو جاؤں گا۔ اگر وہاں میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی سچویشن پیدا ہوگئی تو تم سنبھال لینا۔ تم اس خطرناک سیون ایم ایم کے ساتھ غار کے اندر موجود دشمن پر ہلا بول سکتی ہو!''

وہ میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں بولی ''ڈن!''

ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ بجایا اور اس کے بعد ہاتھوں میں پکڑی ہوئی گن اور مشعل کا تبادلہ کر لیا۔ اگلے ہی لمحے میں اس ہال نما غار کے داخلی راستے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چند قدم آگے آ کر میں نے غار کے اندر موجود روشنی کا تنقیدی جائزہ لیا اور پھر اپنے منصوبے کے پہلے مرحلے پر عمل کر ڈالا۔ مشعل کو اندر پھینکنے کے بعد میں لپک کر ایک طرف ہو گیا۔ اس طرح مجھے ایک سنگی آڑ میسر آ گئی۔ یہ احتیاط اس لیے بھی تھی کہ اگر غار کے اندر چھپا ہوا کوئی دشمن مشعل کے زاویے کو پکڑ کر میری جانب فائرنگ کرتا تو بھی میں گولیوں کی زد میں نہ آتا۔

مشعل ''شوں'' کر کے غار کے اندر پہنچی' پھر اس کے سنگی فرش پر ٹکرانے کی مخصوص آواز ابھری اور اس کے ساتھ ہی وہ کسی آتش بازی کے انجام کی طرح ٹھنڈی ہوگئی۔ یقیناً وہ کسی ایسے زاویے سے جا کر فرش پر گری تھی کہ اس کا مزید روشن رہنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ بے چاری بھی کب تک اس پھینکا تانی کی تاب لاتی مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ غار کے اندر کسی بھی نوعیت کی فائرنگ سنائی نہیں دی۔

اندر موجود شخص کی اس بے اعتنائی نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اب اندر داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔ غار کے اندر وہ مدھم روشنی اب بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر دبے قدموں غار کے اندر پاؤں ڈال دیئے اور ایک دیوار کے ساتھ پیوست ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ یہ رسک لیے بغیر اندر کی صورتِ حال سے آگاہی ممکن نہیں تھی۔

سب سے پہلے بدھا کا عظیم الجثہ مجسمہ میری نگاہ میں آیا اور میں جان سکا کہ مذکورہ روشنی اس مجسمے کی دوسری جانب سے پھوٹ رہی تھی۔ میں روشنی کے مخرج کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اندازہ یہی تھا کہ وہ کوئی مشعل ہی ہوگی۔ مجسمے کے ادھر ماحول روشن ہونے کے سبب اُدھر کا ماحول خاصا تاریک ہو گیا تھا۔ میں نے اس تاریکی کا فائدہ اٹھایا اور اچک کر مجسمے کے عین پیچھے پہنچ گیا۔ یہ ایک بہترین آڑ تھی جہاں میں ہر قسم کی فائرنگ سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

میں نے اس آڑ کو ڈھال ہی کی طرح استعمال کرتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں گردن اور آنکھوں کو مختلف زاویوں میں گھمانے کے بعد یہ معلوم کر لیا کہ وہ ہال نما غار کسی زندہ انسان کے وجود سے خالی تھا' سوائے میرے۔ یہ ایک الجھن زدہ اور سمجھ میں نہ آنے والی صورتِ حال تھی۔

میں مجسمے کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور اس سمت بڑھنے لگا جدھر وہ مشعل رکھی تھی۔ وہ مشعل اس رخ والی سنگی دیوار میں اٹکی ہوئی تھی جہاں سے بھول بھلیوں کی طرف تنگ سی راہداری جاتی تھی۔ میں مشعل سے ابھی چند قدم کی دوری پر ہی تھا کہ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا پہنچا۔

ہم اس مقام پر دو افراد کی لاشوں کو چھوڑ کر گئے تھے لیکن اب لاشوں کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک فوری گنتی کے مطابق وہاں چھ افراد کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے دو تو وہی تھے جنہیں لی یان نے شکار کیا تھا۔ باقی چار کہاں سے آئے تھے' یہ سوچتے ہوئے دماغ گھوم رہا تھا۔ ان لمحات میں لامحالہ میرے ذہن میں یہ خیال آیا...... کہیں میرے ساتھ پھر کوئی طلسماتی چکر تو نہیں شروع ہونے والا؟

میں نے آواز دے کر لی یان کو غار کے اندر بلا لیا۔ وہ میرے پاس پہنچی تو لاشوں کی تعداد میں گراں قدر اضافے

نے اسے ششدر کر کے رکھ دیا۔ استعجاب میں ڈوبی ہوئی آواز میں وہ بولی۔

''یہ لاشیں...... کس نے یہاں ڈالی ہیں؟''

''کم از کم میں نے تو نہیں ڈالیں۔'' بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

وہ میرے بازو سے لگتے ہوئے بولی ''مذاق نہیں کرو وجدان!''

اس کی آواز خاصی سہمی ہوئی تھی۔ وہ کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی کہ لاشوں کو دو سے چھ میں بدلتے دیکھ کر وہ بھی یہی سمجھی تھی کہ وہاں کوئی پراسرار کھیل شروع ہوگیا ہے۔ اس عبادت گاہ اور اس کے تہ خانے سے متعلق بہت سی تحیر آمیز کہانیاں اس نے بھی سن رکھی تھیں...... اور مزید بہت سے کھیل تماشے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں لی یان! ان لاشوں کے یہاں پہنچنے کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔''

''اوہ!'' وہ خوف زدہ نگاہ سے کبھی مجھے اور کبھی ان لاشوں کو تکنے لگی۔

اسی وقت ہمیں ہمارے تمام تر سوالات کے جوابات مل گئے۔ تنگ راہ داری میں مجھے ڈاکٹر مونگ کی صورت دکھائی دی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ دو بے سدھ افراد کو ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے راہ داری سے باہر لا رہا تھا۔ اس کا انداز بڑا نپا تلا تھا۔

مجھ سے نظر ملی تو وہ معنی خیز انداز میں دھیرے سے مسکرایا لیکن اس نے اپنے ''کام'' سے غفلت نہیں برتی اور ان دو یقینی لاشوں کو لا کر پہلے سے موجود چھ افراد کی لاشوں کے اوپر ڈھیر کر دیا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے ڈاکٹر؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس نے کندھے اچکائے ''لاشیں ہیں!''

''وہ تو مجھے بھی نظر آ رہی ہیں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا ''لیکن یہ ماجرا کیا ہے؟''

وہ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھنے کے بعد گویا ہوا ''ماجرا کچھ نہیں ہے۔ یہ گندے لوگ اپنے ناپاک مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ادھر متبرک راہ داریوں کی طرف چلے گئے تھے پھر بھول بھلیوں میں کھو کر خود کو بھی بھول بیٹھے۔ اگر ان کی لاشیں ادھر راہ داریوں کے اندر پڑی رہتیں تو خواہ مخواہ تعفن پھیلتا۔ میں نے غلیظ لوگوں کے مردہ جسموں کو وہاں سے اٹھا کر راہ داریوں کے تقدس کی حفاظت کی ہے۔ اب اس طرف سب ٹھیک ہے۔ کسی فکر پریشانی کی ضرورت نہیں۔'' بات ختم کر کے وہ تنگ سی راہ داری کی طرف دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر نے معنی خیز انداز میں ڈھیروں انکشافات کر ڈالے تو مجھے اپنے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں سب کچھ کہہ ڈالا تھا۔ اس کے مطابق یہ لوگ اپنے مقصد کو حاصل کرنے ان بھول بھلیوں کی طرف گئے تھے۔ اس وقت ہمارے دشمنوں کا سب سے بڑا مقصد ان پانچ نایاب پتھروں کا حصول تھا جن کے لیے ربی موشے ہائمن بے دریغ انسانی خون بہانے پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔

میں نے ٹھہری ہوئی نظر سے ڈاکٹر مونگ کی طرف دیکھا اور اپنے خیال کی تصدیق کی خاطر پوچھ لیا ''تمہارا مطلب ہے وہ پانچ متبرک پتھر ان بھول بھلیوں میں کہیں موجود ہیں؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ان بھول بھلیوں سے بھی آگے ایک جہان حیرت اپنا وجود رکھتا ہے۔ وہ پتھر اسی جہان کے ایک نادیدہ محفوظ گوشے میں موجود ہیں۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''بہر حال۔'' وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''میں نے کہا نا' فکر اور تردد کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ پتھر صحیح سلامت اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ کوئی ناواقف شخص اگر کسی طرح اس تنگ سی راہ داری تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو بھی وہ بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اسے واپسی کا راستہ نہیں ملتا' وہ اس سے آگے اور کہاں جائے گا۔'' پھر اس نے زمین پر پڑی لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

''اگر یہ لوگ آپس میں نہ لڑ مرتے تو بھول بھلیوں میں چکراتے رہ جاتے۔ بہر حال......!''

اس نے کندھے اچکا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے پوچھا ''یہ آپس میں کیوں لڑ مرے ہیں؟''

''ان کے دماغ خراب ہو گئے تھے۔'' وہ تحقیر آمیز انداز میں بولا ''بھول بھلیوں کے سحر انگیز ماحول نے ان کے ذہن الٹ دیے۔ یہ خود پر قابو نہ رکھ سکے اور......'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سفاک لہجے میں بولا ''اس طرح کے مہم جو اکثر و بیشتر خطرات سے دوچار ہوتے رہتے

ہیں۔ یہ جان لیوا نتائج مہم جوئی کا لازمی حصہ ہیں۔''

میں نے محسوس کیا' وہ بھول بھلیوں تک رسائی حاصل کرنے والے دشمنوں کی اموات کے بارے میں کھل کر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے اس رویے سے ظاہر ہوتا تھا' شاید اسی نے ان لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اسے زیادہ نہیں کریدا اور ایک اہم سوال کیا۔

''ڈاکٹر! تم نے بتایا ہے' وہ قیمتی پُراسرار پتھر صحیح سلامت اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ تمہارے پُر وثوق الفاظ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم خود اپنی آنکھوں سے ان پتھروں کو محفوظ مقام پر رکھا دیکھ کر آ رہے ہو؟''

اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا ''ہاں' ایسی ہی بات ہے!''

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ڈاکٹر مونگ میرے اندازے سے بڑھ کر پُراسرار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ محترم سانگ فو کا نائب تھا۔ سانگ فو جیسے عظیم شخص کی نائبی ایسے ہی حاصل نہیں ہو جاتی۔ بہر حال' یہ بھی ایک خوشگوار امر تھا کہ میں پچھلے کچھ عرصے سے ڈاکٹر مونگ جیسے نابغۂ روزگار کے ساتھ مل کر مصروفِ عمل تھا۔

میرے ذہن میں ایک فوری خیال پیدا ہوا اور میں نے لاشوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مونگ سے استفسار کیا ''ان بدبختوں میں جمی فونڈا کی لاش بھی موجود ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی ''مجھے اسی کی تلاش ہے۔''

''کیا تم اس کے صورت آشنا ہو؟''

اس نے زبان ہلانے کے بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے کہا ''ساحل بھی کہیں نظر نہیں آ رہی۔ ہم نے اسے عبادت گاہ کے بیرونی اور رہائشی حصے میں بھی جھانک لیا ہے۔ ادھر کوئی زندہ انسان موجود نہیں۔ اپنے اور بیگانے لاشوں کی صورت بکھرے ہوئے ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا' ان میں کون اپنا ہے اور کون بیگانہ!''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''ہمارے جو چھ افراد یہاں موجود تھے' ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ دشمنوں کے بھی کئی افراد مارے گئے ہیں۔ بہر حال دوطرفہ لڑائی میں یہ سب کچھ تو ہوتا ہی ہے۔''

میں نے پوچھا ''کیا دشمن کی صورت میں صرف جمی فونڈا بچا ہے؟''

پھر میں نے اسے ان افراد کے بارے میں بھی بتا دیا جنہیں میں نے اور لی یان نے شکار کیا تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

''اس بارے میں' میں فی الحال وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے دشمنوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا ''اب ہمیں سب سے پہلے ساحل اور جمی فونڈا کو تلاش کرنا ہے۔''

میں نے کہا ''اس عبادت گاہ کے اندر' باہر اور تہ خانے میں پھیلے ہوئے موت نما سناٹے سے تو یہی لگتا ہے' اب کوئی بھی بندہ بشر زندہ حالت میں باقی نہیں بچا۔ ساحل اور جمی فونڈا منظر سے غائب ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ انہیں کہاں تلاش کیا جائے!''

''حالانکہ سب سے پہلے یہ تمہاری ہی سمجھ میں آنا چاہیے تھا!''

ڈاکٹر مونگ کے معنی خیز جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا ''پتا نہیں' تم کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا پہلے میری سمجھ میں کیوں آنا چاہیے تھا؟''

''اس لیے کہ تم سونے والے عظیم الشان ذخیرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''نہ صرف دیکھ چکے ہو بلکہ اس طرف رسائی حاصل کرنے کے طریقۂ کار سے بھی واقف ہو۔''

''تت...... تمہارا مطلب ہے......؟'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر بدھا کے عظیم الجثہ مجسمے کی طرف حیرت بھری نظر سے دیکھا۔

''ہاں...... میرا یہی مطلب ہے!''

''اوہ!'' بے ساختہ میری زبان سے ادا ہوا۔

ڈاکٹر مونگ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''کچھ لوگوں کا ان بھول بھلیوں والی راہ داریوں تک رسائی حاصل کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ جمی فونڈا کی ٹیم کو عبادت گاہ کے تہ خانے سے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ ان کی معلومات کا وسیلہ کچھ بھی رہا ہو' ہمیں اس سے غرض نہیں۔''

''ان کو حاصل ہونے والی معلومات کا ذریعہ صرف اور صرف ربی ہی ہو سکتا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''چاہے ربی نے یہ معلومات اپنے تئیں فراہم کی ہوں...... یا پھر ساحل کے دماغ سے نکالی ہوں!''

''ساحل کے دماغ سے نکالنے والی بات سمجھ میں نہیں

آرہی۔'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا ''اگر ربی اس مقصد میں کامیاب ہوگیا تو پھر ساحل کو اسرائیل سے کھٹمنڈو بھیجنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے دماغ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ربی کے آدمی یہاں عبادت گاہ میں کارروائی کرسکتے تھے۔''

''تم بھی غلط نہیں کہہ رہے ہو ڈاکٹر۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''ربی کے آدمی بھی عبادت گاہ پر ایک چڑھائی کرچکے ہیں جس میں وہ بری طرح ناکام رہے مگر آج والی کارروائی بہت منفرد حیثیت کی حامل ہے۔ اس تہ خانے اور بھول بھلیوں تک رسائی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آج شام ہی ساحل بھی ان کے ہتھے چڑھی ہے۔''

ڈاکٹر مونگ نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ میں بڑی کھوج تھی۔ مشعل کی ناکافی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات بڑے مختلف رنگ میں اجاگر ہورہے تھے۔ چند لمحے یک ٹک مجھے دیکھنے کے بعد وہ گمبھیر آواز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''کیا تم ایسا سوچ رہے ہو کہ آج شام کے بعد ہی ساحل کے دماغ سے اس تہ خانے سے متعلق معلومات حاصل کی گئی ہیں؟''

''میں کیا سوچوں گا' حالات خود ہی اس طرف اشارہ کررہے ہیں۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا ''دشمنوں کی پہلی اور دوسری یلغار میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہی فرق نتائج کی صورت میں بھی سامنے آرہا ہے۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا اور لاشوں کے انبار کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس تہ خانے تک رسائی حاصل کرنے کے بعد جمی فونڈا کے آدمی پُراسرار بھول بھلیوں میں بھی جا گھسے تھے۔ یہ کوئی معمولی اور نظر انداز کردینے والی حقیقت نہیں۔ جو لوگ اس تہ خانے کے رازوں کے امین ہیں ان میں سے صرف ایک اس وقت ہمارے دشمنوں کے قبضے میں ہے اور وہ ہے' میری ساتھی ساحل!''

میرے دوٹوک انداز نے ڈاکٹر مونگ کو گہری سوچ میں مبتلا کردیا۔ میں نے جو کچھ بھی کہا تھا' وہ سیدھا سیدھا پیش آمدہ حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ تھا اور ایسی تجزیہ نگاری کے لیے کسی خاص صلاحیت یا قوت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

''اگر تمہاری بات کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساحل کے دماغ سے مذکورہ معلومات کس نے نکالی ہوں گی۔'' ڈاکٹر مونگ نے ایک خاص زاویے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''ہپناٹزم اور دیگر روحانی علوم کا ماہر ہمارا دشمن تو ادھر اسرائیل میں بیٹھا ہوا ہے جب کہ ساحل پچھلے چند روز سے یہاں نیپال میں ہے۔'' تھوڑا توقف کرکے اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو' ربی وہاں اسرائیل میں بیٹھ کر یہاں نیپال میں ساحل کے دماغ کو کنٹرول کررہا ہے؟''

''میں فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے کہا ''میں نے موجودہ حالات میں جو دیکھا اور محسوس کیا' وہی بیان کررہا ہوں۔''

ڈاکٹر مونگ نے کہا ''ساحل کے دماغ سے تہ خانے کے بارے میں معلومات نکالنا اگر ربی کے اختیار میں ہوتا تو وہ وہاں اسرائیل ہی میں یہ کام سرانجام دے چکا ہوتا۔ ساحل اس کے لیے اتنا قیمتی اور اہم مہرہ تھا کہ وہ اسے اپنے قبضے میں رکھ کر تمہیں اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرسکتا تھا۔ وہ ساحل کو اسرائیل سے نیپال روانہ نہ کرتا۔''

وہ ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''ربی نہایت ہی منتقم المزاج شخص ہے۔ تم نے اس کے چنگل سے نکل کر اسے گہری چوٹ دی ہے اور اس کے بعد بھی اس ''گہری چوٹ'' پر پے در پے چوٹیں لگائے جارہے ہو۔ تم نے انہیں دیگر نقصانات کے ساتھ ساتھ درجنوں لاشوں کے تحائف بھی پیش کیے ہیں جس کے نتیجے میں این وائے پی ڈی اور ایف بی آئی والے وہاں امریکا میں تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تمہیں ''امریکا دشمن'' کا ٹائٹل دیا جاچکا ہے۔ تم ان کی نظر میں وہ پاکستانی دہشت گرد ہو جسے وہ ہر قیمت پر تلاش کرکے عبرت ناک سزا دینا چاہتے ہیں اور اب......''

اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر تھوڑا وقفہ کیا پھر بولا ''اب تو یہ راز بھی فاش ہوچکا ہے کہ تم شون کی آئی ڈی پر اس کی بیوی لی یان کے ساتھ نیوآرک (نیوجرسی) سے پرواز کرکے تری بھون (کھٹمنڈو) پہنچے ہو (نیوآرک اور تری بھون علی الترتیب نیوجرسی اور کھٹمنڈو کے ائرپورٹس ہیں) تمہاری تلاش اور سرکوبی کے لیے اب تو سی آئی اے والے بھی سرگرم ہوچکے ہوں گے اور ربی جانتا ہے کہ تمہیں شکار کرنے کے لیے ساحل سے زیادہ پُرکشش چارا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا اس لیے مائی ڈیئر!''

اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اگر ربی نے ساحل کے دماغ سے کسی بھی طرح اس تہ خانے کے بارے میں معلومات حاصل کرلی ہوتیں تو وہ تمہیں پکڑنے کے لیے ساحل کو اپنے قبضے میں رکھتا۔ یوں اسرائیل سے نیپال نہیں بھیج دیتا!''

ہمارے درمیان جو گفتگو چھڑ گئی تھی اس کا اختتام بہت دور نظر آتا تھا مگر وہ موقع اس بحث کے لیے مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے بات چیت کا رخ بدل دیا اور کہا۔

''یہ باتیں تو ہم بعد میں بھی کرسکتے ہیں ڈاکٹر۔ فی الحال ہمیں ساحل اور جمی فونڈا کو تلاش کرنا چاہیے۔''

''یس...... دیٹ از۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''آؤ انہیں وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔''

میں نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے لارڈ بدھا کے کنگ سائز مجسمے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ڈاکٹر کی ایک بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔ سی آئی اے والے اگر میری تلاش میں لگ گئے تھے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اب مجھے ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا تھا اور پھر اچھی طرح دیکھ بھال کر اسے زمین پر سے اٹھانا تھا۔

ہم مجسمے کے سامنے پہنچے تو ڈاکٹر مونگ نے پُرمعنی انداز میں میری جانب دیکھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں مشعل اٹھا رکھی تھی۔ مشعل اس زاویے پر تھی کہ اس سے پھوٹنے والی روشنی پوری طرح ڈاکٹر کے چہرے پر نہیں پڑرہی تھی جس کے باعث اس کے چہرے پر بڑے عجیب وغریب تاثرات دکھائی دیتے تھے تاہم میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا' وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتا تھا۔

میں نے سیون ایم ایم لی یان کی طرف بڑھا دی اور خود مجسمے کی جانب بڑھ گیا۔ ڈاکٹر مونگ نے اپنی گن کے ساتھ جانے کیا کیا تھا۔ جب وہ ہم سے رخصت ہوا تھا تو میں نے دوسری سیون ایم ایم آٹومیٹک رائفل اسے تھمادی تھی اور جب وہ دوبارہ نظر آیا تو اس کے ہاتھ میں کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔

میں نے مجسمے کا بہ غور جائزہ لیا اور پھر اس کے پاؤں کی طرف آگیا۔ میں نے پہلے بائیں پاؤں کی ایڑی کی جگہ پتھر کو دبایا اور پھر یہی عمل دوسرے پاؤں کی ایڑی کے ساتھ بھی دہرایا۔ اس کے بعد میں ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

اگلے ہی لمحے مجسمے کے زیریں حصے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے دونوں پاؤں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ یہاں کا ٹھوس پتھر اپنی جگہ سے سلائیڈنگ کے سے انداز میں ہٹنے لگا۔ یہ سلائیڈنگ دوطرفہ تھی یعنی پتھر کا ایک حصہ دائیں جانب اور دوسرا بائیں طرف مجسمے کے وجود کے اندر غائب ہورہا تھا۔ میرے اور ڈاکٹر مونگ کے لیے یہ کوئی حیرت انگیز نظارہ نہیں تھا لیکن لی یان مبہوت کھڑی اس پتھر کی سلائیڈنگ کو دیکھتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس پتھر کی جگہ ایک کھڑکی نما خلا نمودار ہوگیا۔ اس خلا کا منہ بس اتنا سا تھا کہ وہاں سے ایک وقت میں صرف ایک آدمی ہی اندر داخل ہوسکتا تھا۔

مشعل بردار ڈاکٹر مونگ آگے بڑھا اور اس کھڑکی نما خلا میں داخل ہوگیا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھا اور کہا ''اب تمہاری باری ہے۔''

اس نے کوئی سوال کیے بغیر میری بات کی تقلید کی اور گن مجھے تھما کر ڈاکٹر کے پیچھے اس خلا میں اتر گئی۔ اس کے بعد میں بھی اندر پہنچ گیا۔ وہ مجسمہ اندر سے بھی کھوکھلا تھا۔ بڑی محنت اور جاں فشانی سے تراش کر اسے اندر سے کھوکھلا کیا گیا تھا۔ اس حصے میں چار پانچ افراد بہ آسانی چل پھر سکتے تھے۔ یہاں سے مزید نیچے جانے کے لیے دائیں جانب تنگ سی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''وجدان! اس راستے کو بند کردو جدھر سے گزر کر ہم یہاں پہنچے ہیں۔''

میں آگے بڑھا اور اس خلا کی ایک سنگی دیوار پر لگا ہوا آہنی ہک کھینچ کر وہ خلا بند کردیا۔ دونوں پتھر بہ آہستگی سلائیڈ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر آگئے۔ باہر سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہ تصور نہیں کرسکتا تھا کہ اس عظیم الجثہ مجسمے کے پیٹ کے اندر اس وقت تین جیتے جاگتے انسان موجود ہوں گے۔

میں اپنا کام ختم کرکے مڑا ہی تھا کہ فائرنگ کی صدا سنائی دی۔ وہ فائرنگ کسی اندرونی دورافتادہ حصے میں ہوئی تھی۔ ہم تینوں نے بہ یک وقت چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ یقیناً اس حصے میں ہمارے علاوہ بھی کوئی موجود تھا...... یا تھے...... اور یہ خاصی تشویش ناک بات تھی۔

ڈاکٹر نے دھیمی آواز میں کہا ''تو میرا شک نما اندازہ درست نکلا۔ ہم سے پہلے بھی کوئی یہاں موجود ہے۔ فائرنگ کی آواز سے ظاہر ہوتا ہے وہ ہم سے خاصے فاصلے پر ہیں۔ مجھے یقین ہے' انہوں نے ہماری آمد کو محسوس نہیں کیا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے' جمی فونڈا اور اس کے دیگر ساتھی یہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''اور اغلب امکان یہی ہے' ساحل اس وقت جمی فونڈا کے قبضے میں ہوگی۔ ہمیں بہت احتیاط برتنا ہوگی!''

''اگر یہ بات ہے تو پھر جمی فونڈا ساحل ہی کے توسط

سے اس تہ خانے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔" ڈاکٹر مونگ نے پُرسوچ انداز میں کہا" ٹھیک ہے آؤ اس سے بھی "ملاقات" کر لیتے ہیں۔"

ہم دائیں جانب بنی ہوئی تنگ سی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔ بارہ اسٹیپ کا وہ زینہ اتر کر ہم نیچے پہنچے تو خود کو ایک تہ خانے میں پایا۔ گویا اب ہم تہ در تہ خانے میں کھڑے تھے۔ وہ تہ خانہ بھی ایک وسیع و عریض غار پر مشتمل تھا۔ میں تو یہاں پہلے بھی آ چکا تھا لیکن ڈاکٹر مونگ کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ بھی اس عظیم الشان خزانے سے ناواقف نہیں البتہ لی یان دیدے پھاڑ پھاڑ کر ایک جانب دیکھ رہی تھی۔

اس وقت لی یان کی تمام تر توجہ بدھا کے اس مجسمے پر مرکوز تھی جو ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر استادہ تھا۔ مشعل کی روشنی میں اس مجسمے سے منعکس ہونے والی طلائی چمک نے لی یان کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ دس فٹ قامت کا مالک مجسمہ ٹھوس سونے کا بنا ہوا تھا۔

لی یان کی محویت کو فائرنگ کی آواز نے توڑ دیا۔ اس غار میں ایک مرتبہ پھر گولیاں چلی تھیں تاہم اس بار فائرنگ کی آواز کے ساتھ انسانی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ غار کے کسی دور افتادہ حصے میں زبردست قسم کی خون ریزی جاری تھی۔

میں ساحل کی طرف سے بے انتہا متفکر تھا۔ اگر اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جاتا تو مجھے یونہی محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے جگر میں زہر میں بجھا ہوا خنجر اتار دیا ہو' کجا یہ کہ یہاں خطرناک فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں نے بڑے حتمی لہجے میں ڈاکٹر مونگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر! میری ساحل کو کچھ نہیں ہونا چاہیے!"

"لارڈ بدھا نے چاہا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔" وہ تیقن سے بولا۔

میں نے محسوس کیا' ان لمحات میں' میں انتہائی جذباتی اور ڈاکٹر مونگ انتہائی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اپنے اپنے درجۂ وابستگی کی بات ہوتی ہے۔ اس عبادت گاہ اور اس کے تہ خانے میں پوشیدہ ان مول خزانے کے سلسلے میں ہم دونوں کی ڈگری آف اٹیچ منٹ میں نمایاں فرق تھا۔ میری جذباتیت ساحل کے حوالے سے تھی اور اس کی سنجیدگی کا تعلق اس بیش بہا خزانے کی حفاظت اور عبادت گاہ کے تقدس سے تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھے ہوئے تھے۔

اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ اس تہ خانے میں ہمارے دشمن ہی گھسے بیٹھے تھے۔ میں نے اس کشادہ صحن نما غار کے آخری سرے تک نگاہ دوڑائی اور ڈاکٹر مونگ سے کہا۔

"تم لوگ یہاں رک کر میرا انتظار کرو۔ میں ادھر کی خیر خبر لے کر آتا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ جلدی سے بولا" اندر ہم تینوں آئے ہیں' آگے بھی ہم ایک ساتھ ہی بڑھیں گے۔"

وہ وقت بحث و مباحثے کے لیے ٹھیک نہیں تھا لہٰذا میں نے آگے قدم بڑھا دیے۔ ڈاکٹر نے چند قدم آگے آنے کے بعد کہا" میں تم دنوں سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر سائیڈ پر چلتا ہوں۔ ہمیں ایک ٹولی بنا کر پیش قدمی نہیں کرنا چاہیے۔"

بات ختم کرتے ہی وہ ایک طرف کھسک گیا۔ مشعل اس کے ہاتھ میں تھی لہٰذا ہمارے ماحول میں روشنی نسبتاً کم ہو گئی۔ میں لی یان کو آڑ میں رکھتے ہوئے' گن تھامے آگے بڑھنے لگا۔ وہ غار اپنے اختتام پر ایک سرنگ جیسے راستے میں بدل جاتی تھی جو آگے جا کر مزید تنگ ہو جاتی اور اس کے ساتھ ہی اتنی نیچی بھی کہ تھوڑا جھک کر چلنا پڑتا تھا۔

ہم اس وقت جس غار میں سے گزر رہے تھے اس کی سنگلاخ دیواروں پر بھی طلائی چمک موجود تھی۔ اگر نظر ٹھہرا کر اس چمک کا نظارہ کیا جاتا تو آنکھیں چکاچوند ہو جاتی تھیں حتیٰ کہ غار کی زمین میں بھی سونے کی آمیزش موجود تھی۔ لاتعداد چھوٹے بڑے سونے کے ٹکڑے بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی سونے کا پہاڑ ہو جس کے اندر سونے ہی کا بدھا کا مجسمہ استادہ کر دیا گیا ہو اور شاید یہی حقیقت بھی تھی۔

اس کشادہ غار کے دائیں بائیں تین چار تنگ اور نیچی چھتوں والی سرنگیں بھی نکلتی تھیں جن کی ٹھوس اور ناہموار دیواریں بھی خالص سونے کی تھیں مگر ہم اس وقت جس سرنگ کی طرف بڑھ رہے تھے وہ قدرے کشادہ تھی۔ فائرنگ اور پھر انسانی چیخوں کی آواز اسی سمت سے ابھری تھی۔

پھر ایک قہقہہ سنائی دیا۔ وہ ایک مردانہ قہقہہ تھا جس میں بلا کی رعونت اور دیوانگی پائی جاتی تھی۔ یہ آواز بھی اسی سرنگ کی طرف سے آئی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہاں کسی مشعل کی روشنی بھی تھرکتی ہوئی دکھائی دی۔ کوئی مشعل بردار اُدھر سے اِدھر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیوانگی بھرا قہقہہ دوبارہ بلند ہوا۔ اب الفاظ واضح طور پر سمجھ میں آ رہے تھے۔ وہ بڑے سرور میں بولا تھا۔

"آہا...... ہاہا...... ہاہاہا......" اس کی آواز میں کسی کم ظرف فاتح کا سا نشہ جھلکتا تھا۔" میں نے سب کو ختم کر دیا۔ اب کوئی مجھ سے حصہ نہیں مانگے گا۔ کوئی بٹوارے کا مطالبہ نہیں کرے گا کیونکہ میرے سوا کوئی زندہ ہی نہیں بچا۔"

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر ایک اور قہقہہ بلند کرتے ہوئے اسی بدمستی میں بولتا چلا گیا" اس سونے کے ذخیرے کا میں اکیلا مالک ہوں۔ کوئی مجھ سے سوال نہیں کر سکتا۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا...... ربی کو بھی ہوا نہیں لگنے دوں گا۔ اب دنیا کو پتا چلے گا' جمی کس طاقت کا نام ہے۔ میں یہ سارا سونا خفیہ طریقے سے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دوں گا۔ میں...... جمی فونڈا...... دنیا کا امیر ترین شخص بن جائے گا۔ آہا...... ہاہا...... ہاہاہا...... ہا...... آ کی دوڈ لی دی کنگ آف دی ورلڈ!"

صورتِ حال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی۔ جمی فونڈا اپنے ساتھیوں کو اس سرنگ میں فنا کے گھاٹ اتار کر واپس آ رہا تھا۔ اس کے الفاظ کی لڑکھڑاہٹ اور آواز کے زیر و بم سے محسوس ہوتا تھا' وہ اس وقت گہرے نشے میں ہے۔ پتا نہیں' یہ کیسا نشہ تھا۔ وہ شراب میں ڈوب کر تو اس اہم مشن پر نہیں نکل سکتا تھا۔ یقیناً یہ اس سونے کے ذخیرے کا طلسم تھا۔

اس دوران میں ڈاکٹر مونگ بھی ہمارے قریب آ گیا۔ دیوانے کی یہ تمام تر بڑ اس نے بھی سنی تھی۔ صاف ظاہر تھا' ہمارے مقابل اس وقت جمی اکیلا تھا اور اس کی آواز کی...... لڑکھڑاہٹ اطلاع فراہم کر رہی تھی کہ اس سے نمٹنے کے لیے کسی ہل بیل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

ہم ایک پتھریلی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ غار کی یہ دیوار' سرنگ میں سے باہر آنے والے کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ ڈاکٹر مونگ ہماری طرف آتے ہوئے مشعل کو دوسری دیوار ہی میں اٹکا آیا تھا۔ ادھر روشنی کم ہونے کے باعث ہم کچھ زیادہ ہی محفوظ ہو گئے تھے۔

ڈاکٹر مونگ نے دھیرے سے سرگوشی کی" سونے کی چمک نے اس گدھے کا دماغ الٹ دیا ہے۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ لالچی اور ہوس پرست انسان جب کسی ایک جگہ پر اتنی بیش بہا دولت کو دیکھ لیتا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ ادھر بھول بھلیوں والی راہداریوں میں بھی کچھ اسی قسم کی صورتِ حال پیش آ گئی تھی۔ وہ سب آپس میں لڑ کر ختم ہو گئے۔ مجھے ان کی لاشیں ڈھونے کا کام کرنا پڑا۔"

جب ڈاکٹر نے مجھے بھول بھلیوں والی کہانی سنائی تھی تو ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا تھا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے' خود ڈاکٹر ہی نے ان دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیا ہو لیکن جمی فونڈا کا "اقبالِ جرم" ڈاکٹر کے بیان کی تصدیق کے لیے کافی تھا۔ یہاں کی سچویشن کے مطابق' جمی کا حالتِ دیوانگی میں کہا ہوا ایک بھی لفظ سند کا درجہ رکھتا تھا کیونکہ تمام تر بین ثبوت بھی یہاں موجود تھے۔

میں نے ڈاکٹر کی سرگوشی کی روشنی میں کہا" اگر سونے کے اس ذخیرے کو دیکھ کر کسی لالچی انسان کی ایسے ہی مت ماری جاتی ہے تو پھر ربی موشے ہائمن کو یہاں لا کر چھوڑنا چاہیے۔ وہ بھی اختیار اور اقتدار کی بھوک میں مرا جا رہا ہے۔ پوری دنیا پر حکمرانی کا خواب اسے ایسی خطرناک مہم جوئی پر اکساتا رہتا ہے۔"

"موشے ہائمن بڑا سیانا ہے۔" ڈاکٹر مونگ نے زہریلے لہجے میں کہا" وہ ایسے کسی بھی چرے ہوئے پھٹے میں براہ راست اپنی ٹانگ نہیں پھنساتا۔ اس کے پاس ایسے مشنز کے لیے قربانی کے جانوروں کی کمی نہیں۔ وہ اس آگ میں ہمیشہ اپنے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کو جھونکتا ہی آیا ہے۔ ویسے بھی ایسے جاں نثاروں اور عقیدت مندوں کا کیا فائدہ جو وقت پر "کام" نہ آ سکیں! جمی فونڈا' برنارڈ لیو اور فرینکلن ایسے ہی جاں نثاروں میں شمار ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے لفظ "کام" پر خاص زور دیا تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھ لیا" تمہاری گن کہاں ہے ڈاکٹر مونگ؟"

"ایک محفوظ مقام پر پڑی ہے۔" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

اس کا یہ جواب اتنا معنی خیز تھا کہ میں کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اگر میں اس سے مبینہ محفوظ مقام کے بارے میں استفسار کرتا تو ممکن تھا' وہ کہتا کہ وہ محفوظ مقام ایک انتہائی قابلِ بھروسا دنیا میں واقع ہے۔ میں چونکہ اس کے اسٹائل سے واقف تھا اس لیے مزید کرید نہیں کی۔ اگر اسے کوئی بات نہیں بتانا ہوتی تھی تو وہ ایسی ہی ٹال مٹول سے کام لیتا تھا۔ میں نے سرنگ والے کھلے سرے پر نگاہ ٹکا دی اور جمی فونڈا کے بارے میں سوچنے لگا۔

اس نے خمار کی حالت میں اپنی زبان سے جو الفاظ ادا کیے تھے' ان میں میری ساحل کا کہیں ذکر نہیں تھا اور میرے لیے یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ جمی فونڈا نے قہقہہ لگاتے ہوئے بڑے فخر سے کہا تھا...... "میں نے سب کو ختم کر دیا۔" میری ساحل "سب" میں نہیں آتی تھی۔ اس کی ایک جداگانہ حیثیت تھی۔ میرے دل کو یہ تقویت حاصل تھی کہ ساحل کو انشاء اللہ کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس تقویت میں ڈاکٹر مونگ کا بھی حصہ شامل تھا۔ اس نے بڑے یقین سے کہا تھا' لارڈ بدھا نے چاہا تو ساحل کو کچھ بھی نہیں ہوگا! ڈاکٹر مونگ اگر پورے اعتماد سے کوئی بات کہتا تھا تو وہ خالی خولی تسلی نہیں ہوتی تھی۔

ہماری گہری توجہ کے دوران میں تنگ سرنگ کے اندر مشعل کی روشنی تھرکتے ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ اس کا یہی مطلب تھا' جمی فونڈا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ سرنگ بیس پچیس فٹ سے زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس کے آگے وہ اتنی تنگ ہوجاتی تھی کہ سیدھے کھڑے ہوکر چلنا ممکن نہیں تھا۔ جمی فونڈا یقیناً سرنگ کے سامنے والے حصے ہی میں تھا۔

ڈاکٹر مونگ نے ایک حیرت انگیز انکشاف کرتے ہوئے بتایا ''اس غار سے نکلنے والی یہ واحد سرنگ ہے جو آگے...... بہت آگے جاکر انہی بھول بھلیوں سے جاملتی ہے جہاں سے میں نے دشمنوں کی لاشیں ڈھوئی ہیں۔ بدھ عبادت گاہ والے اس عظیم المرتبت پہاڑ میں راہداریوں اور بھول بھلیوں کا ایک ایسا جال پھیلا ہوا ہے جسے سمجھنا کسی لالچی اور منفی ذہن رکھنے والے انسان کے بس کا روگ نہیں۔''

''پھر تو اس خزانے کی حفاظت کی ضرورت......''

میرا وہ سرگوشیانہ جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ اسی لمحے جمی فونڈا سرنگ سے باہر نکل آیا تھا۔ میں اپنی بات نامکمل چھوڑ کر اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میں اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے قہقہوں کے دورانیے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ جمی فونڈا ہے۔

میں نے ڈاکٹر کی طرف استفساریہ نگاہ سے دیکھا تو اس نے گردن کی خفیف سی جنبش سے میرے استفسار کا جواب دے دیا۔ گویا اس نے اس شخص کے جمی فونڈا ہونے کی تصدیق کردی تھی۔

جمی فونڈا ایک قد آور اور مضبوط البدن شخص تھا۔ سر کے بال بڑھے ہوئے اور بے ترتیب۔ زیر ناک بھاری مونچھیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں پسٹل تھام رکھا تھا۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ اور آنکھوں میں ایک عجیب سی مستی نظر آتی تھی۔ وہ یک ٹک بدھا کے طلائی ٹھوس مجسمے کی طرف دیکھتا رہا پھر چونک کر بڑبڑایا۔

''یہاں یہ لائٹ کیسی نظر آرہی ہے......!''

اس کی بڑبڑاہٹ مشعل کی روشنی کے بارے میں تھی۔

میں نے اپنی گن ڈاکٹر مونگ کو تھمائی اور اچھل کر اس کے سامنے جاکھڑا ہوا۔

یہ میرا ایک اضطراری عمل تھا۔ جمی فونڈا کو دیکھ کر مجھے خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو میری ساحل کے بارے میں جانتا تھا۔ اگر جانتا تھا تو مجھے بھی بتا سکتا تھا۔ میں اس کی زبان کھلوا کر ساحل کا پتا نشان پاسکتا تھا۔ ڈاکٹر مونگ نے سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی اور لی یان کے ساتھ اپنی جگہ پر خاموش کھڑا رہا۔

اچانک ایک انسان کو اپنے سامنے پاکر جمی فونڈا چکرا کر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں مچمچائیں اور بگڑے ہوئے لہجے میں' میری طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''تم کون ہو؟''

انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی بادشاہ سلامت کسی حقیر شخص سے بات کررہا ہو۔ وہ تھوڑی دیر پہلے مستی میں' خود کو مستقبل کا جہانگیر تو ڈکلیئر کرہی چکا تھا۔ جو شخص خود کو کنگ آف دی ورلڈ کہنے لگے اس سے کسی بھی رویے کی توقع کی جاسکتی ہے۔

میں نے اس کے پسٹل والے ہاتھ پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا ''میں ڈریم بریکر ہوں۔ احمقانہ خوابوں کو چکنا چور کردیتا ہوں۔ جو لوگ پوری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھتے ہیں' میں ان کی ایسی کم تیسی کردیتا ہوں' چاہے وہ موٹے ہاتھی ہو یا اس کا شیر خوار جمی فونڈا!!''

میرے منہ سے اپنا نام سن کر وہ چونکا اور اس کے ساتھ ہی اس کا پسٹل والا ہاتھ بڑی سرعت سے حرکت میں آیا۔ میں اگر پہلے سے پسٹل کو نگاہ میں نہ رکھے ہوتا تو یقیناً اس موقع پر مارکھا جاتا۔ جمی فونڈا نے مجھے شوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

کوشش ان معنوں میں کہ اسے اس عمل میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ میں گولی چلنے سے پہلے ہی اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ کے زاویے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک ہائی جمپ لگائی اور پلک جھپکتے میں' میں اس کے کندھوں پر سوار تھا۔

میں نے وہاں صرف ایک لمحہ قیام کیا اور اس کے پستول والے ہاتھ پر ایک زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے پیچھے کو چلا گیا۔ میرے پاؤں کی خطرناک ٹھوکر نے اس کے ہاتھ سے پستول تو نہ چھڑایا تاہم اس دوران میں وہ ٹریگر پر انگلی دبا چکا تھا۔ غار کے مہیب سناٹے میں گولی چلنے کی مخصوص آواز ابھری لیکن میں محفوظ رہا۔

پہلی ناکامیابی کے بعد وہ خوں خوار انداز میں میری جانب پلٹا لیکن اس کا پسٹل والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں نے لات چلادی۔ زوردار راؤنڈ ہاؤس کک اس کی کلائی پر لگی۔ اس مرتبہ وہ گن پر گرفت قائم نہ رکھ سکا۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا۔

اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے ہوش وحواس میں آنے کی

کوشش کی اور مشعل سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں اسے کوئی موقع دینے کو تیار نہیں تھا۔ جمی فونڈا کی مناسب سی خاطر تواضع بہت ضروری تھی۔ مجھ سے جسم کے مختلف حصوں کی ''مالش'' کروانے کے بعد ہی وہ سونے کے طلسم سے باہر آسکتا تھا۔ جب تک اس کی ذہنی کیفیت نارمل نہ ہوجاتی' اس کی زبان سے کام کی کوئی بات نہیں اگلوائی جاسکتی تھی...... اور مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا!

اس کے مشعل بردار ہاتھ کے حملے کو میں نے اندر آتے ہوئے مڈل آؤٹر بلاک کیا پھر اس کے سینے پر اپنی کھلی ہتھیلی کا ایک اسٹریٹ پش دے دیا۔

اس پش میں بے پناہ قوت چھپی ہوئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ چار فٹ پیچھے چلا گیا۔ میں نے اسی وقت ایک لمبا اسٹیپ لے کر سائیڈ کک ماردی۔ میرے پاؤں کی دھواں دھار ٹھوکر اس کی پسلیوں میں لگی اور وہ مشعل سمیت پیچھے کو الٹ گیا۔

میں اطمینان سے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گیا اور اسے ایک انہونی میں گرفتار پایا۔ اگر پیچھے کو الٹتے ہوئے اس کے ہاتھ سے مشعل نکل جاتی تو یہ اس کے حق میں بہتر ہوتا۔ ایسا نہیں ہوا تھا چنانچہ مشعل کے شعلوں نے لباس سے بغل گیر ہوکر جمی فونڈا کو ایک مصیبت میں ڈال دیا۔ اس کا لباس آگ پکڑ چکا تھا۔ وہ مشعل کو ایک جانب پھینکتے ہوئے خود کو تھپڑا رہا تھا۔ یہ اضطراری کوشش دراصل آگ بجھانے کے لیے تھی۔ وہ مجھے بھول کر خود کو بچانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔ اچانک کوئی افتاد ٹوٹ پڑے تو انسان اپنے بارے میں پہلے سوچتا ہے!

مگر میں اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ تاہم میرے دل و دماغ کے غصے نے اسے جھلسنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح کم از کم وہ مکمل ہوش وحواس میں تو آجاتا۔ آدھے منٹ کی ''تگ ودو'' کے بعد وہ اپنے لباس میں لگی آگ بجھانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کوشش کے دوران میں اس کے سر کے بال بھی اچھے خاصے جھلس کر رہ گئے تھے۔ بے ترتیب بڑھی ہوئی کوئی جھاڑی ہو یا سر کے بال ہوں' کوئی بھی بن بلائی مصیبت لاسکتے ہیں۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھا پھر اگلے ہی لمحے کھڑے ہوتے ہوئے میری جانب دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اب اس کی حالت کافی حد تک ''سنبھل'' چکی تھی۔ وہ نشے اور مستی والی کیفیت سے نکل آیا تھا۔ وہ آنکھیں کھول میچ کر تھوڑی دیر تک مجھے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''وجدان...... تم...... اور یہاں......؟''

وہ ہماری پہلی ''ملاقات'' تھی۔ زندگی میں' میں نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا' اس نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ مجھ سے شناسی نکل آنے کا سبب یہی ہوسکتا تھا کہ اسے میری تصویر دکھائی گئی ہوگی۔ میں اس وقت اپنی اصلی شکل و صورت میں تھا۔

میں نے اس کی حیرت میں گرہ لگاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا ''اچھا ہوا تم نے مجھے پہچان لیا ورنہ پتا نہیں' اپنی شناخت کرانے کے لیے مجھے تمہیں کون سے جہنم میں پھینکنا پڑتا۔ یہ تھوڑا سا جلنا کام دکھا گیا۔ اب شرافت سے یہ بھی بتادو' میری ساحل کہاں ہے؟''

''ساحل...... کون ساحل؟'' وہ مجھ پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''اگر تم مجھے دیکھ کر پہچان گئے ہو تو یقیناً میری اور ساحل والی کہانی سے بھی واقف ہوگے لہٰذا ان جانے پن کی اداکاری کام نہیں آئے گی۔ میں اس لڑکی کی بات کررہا ہوں جسے تم نے آج شام ہائی وے والی بستی سے اغوا کیا تھا...... اور وہاں کے ایک گھر میں آباد تین معصوم افراد کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی میں اٹکا ہوا تمہارا پیغام نما اقرار جرم پڑھ لیا ہے۔ نہ صرف پڑھ لیا ہے بلکہ اسے متعلقہ شخص یعنی ڈاکٹر مونگ ریفوشے کو بھی پڑھوا دیا ہے۔ اب تو تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا' میں کس ساحل کی بات کررہا ہوں؟''

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے مستفسر ہوا ''مگر تم تو امریکا میں تھے؟''

''ہاں' کبھی میں امریکا میں تھا۔ اب یہاں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔'' میں نے سفاکی سے کہا ''اور پندرہ سیکنڈ کے اندر اگر تم نے مجھے ساحل کے بارے میں نہ بتایا تو ہوسکتا ہے' میں تمہاری قبر پر یہ کتبہ نصب کرتا ہوا پایا جاؤں...... یہ ایک خارش زدہ کتے کی قبر ہے۔ یہاں آنے والوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے کچھ فاصلہ برقرار رکھیں ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

ادھر میں نے اپنی بات پوری کی' ادھر اس نے مجھ پر حملہ کردیا۔ اس کے وار سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی مارشل آرٹس سے واقفیت رکھتا تھا۔ پہلے وہ کسی طلسمی کیفیت کے تحت ہاتھ پاؤں چلاتا آیا تھا' اب باقاعدہ ہوش وحواس میں وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تھا۔

اس نے ہوا میں اڑتے ہوئے مجھے فرنٹ فلائنگ کک ماری۔ میں دو قدم پیچھے کو ہٹا اور اس کی کک کو بلاک کرتے ہوئے ایک سائیڈ میں نکل گیا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور مجھے فرنٹ جرک کک مارنے کی کوشش کی۔

میں نے ایک دم نیچے بیٹھتے ہوئے بیک سوئپ چلادی۔ میری پنڈلی کی جھٹکے دار ضرب نے اس کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ پشت کے بل غار کے پتھریلے فرش پر جاگرا۔ پشت کے بل گرنے سے سب سے زیادہ نقصان تشریف کو پہنچتا ہے۔ وہ بھی جسم کے مذکورہ حصے کو سہلاتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

میں نے اسی وقت تین کک کا کمبی نیشن بنایا۔ میری لیفٹ راؤنڈ ہاؤس تیزی سے چلی۔ وہ تھوڑا پیچھے ہٹا تو میں نے رائٹ راؤنڈ ہاؤس گھمادی اور اس کی تکمیل کے ساتھ ہی بڑی سرعت سے وہیل کک ماری۔

میری دونوں راؤنڈ ہاؤس ککس سے تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچا مگر وہیل کک نے اس کے دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ میرے پاؤں کی ایڑی نے اس کی کھوپڑی بجا کر رکھ دی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کو گیا تو میں نے فائنل ٹچ لگاتے ہوئے اپنے قدموں پر اچھل کر ایک بھرپور سائیڈ فلائنگ کک بھی لگا ڈالی۔

جمی فونڈا ڈگمگایا اور پھر لڑھکتے ہوئے دور تک چلا گیا۔ اس کے لڑھکاؤ کا اختتام اس طرف ہوا جدھر دیوار میں ہمارے والی مشعل ٹنگی تھی۔ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ چاروں خانے چت پڑا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے غرا کر کہا۔

''میں ساحل کے بارے میں تم سے آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم یہ سنہری موقع گنوا کر موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟''

ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے سوال کا جواب دینے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن یہ اس کی طرف سے ایک تاثری دھوکا تھا اگلے ہی لمحے اس نے جو حرکت کی وہ کسی بھی مارشل آرٹسٹ کو زیب نہیں دیتی۔

جمی فونڈا نے دونوں ہاتھوں سے میرے بوٹ پوش پاؤں کو تھاما اور گردن اٹھا کر میری پنڈلی پر کاٹنے کی کوشش کی۔ یہ بہت ہی گھٹیا اور نیچ عمل تھا۔ وہ ایک ٹچا آرٹسٹ ثابت ہو رہا تھا لہٰذا میں نے اسے اس حرکت کی فوری سزا دی۔

میرا آزاد پاؤں بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کی ایک ظالم ٹھوکر جمی فونڈا کی ٹھوڑی پر پڑی۔ اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ میرے پابند پاؤں کو آزاد کرنے پر مجبور ہوگیا۔ میں نے اسی کے سینے پر سے پاؤں کا پش لیا اور بیک سمرسالٹ لگاتے ہوئے چار فٹ دور چلا گیا۔

جمی فونڈا اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کے دونوں ہاتھوں نے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا' وہ دوبارہ زیادہ خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوگا لیکن کم ظرف اور ٹچا انسان ہمیشہ کمینی حرکت ہی کرتا ہے۔ اس نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے اور غار کے اس حصے کی جانب دوڑ لگا دی جدھر' وہاں سے باہر نکلنے کا راستہ واقع تھا۔

اس نے واضح طور پر فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں اس کی کوشش کو کامیاب ہونے دیتا تو میرا نام وجدان نہیں تھا۔ میں نے لپک کر اس کے تعاقب میں دوڑ لگا دی اور دس فٹ آگے جا کر اسے پالیا۔ وہ اس وقت غار سے باہر پہنچانے والے تنگ سے زینے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے اس کی پشت پر ایک فرنٹ فلائنگ پش کک جڑ دی۔

وہ اس جھٹکے سے سنبھل نہ پایا اور منہ کے بل پتھریلے فرش پر جاگرا۔

میں اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔ تاہم اس مرتبہ میں نے اتنا فاصلہ برقرار رکھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی اوچھی حرکت نہ کر سکے۔ چند لمحات کے بعد وہ گھٹنوں کے بل اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میری نگاہ اس کے چہرے پر گئی اور میں چونک اٹھا۔

جمی فونڈا کا چہرہ لہولہان ہو رہا تھا۔ پتا نہیں' یہ سنگی فرش سے منہ کے بل ٹکرانے کا نتیجہ تھا یا میرے پاؤں کی غصیلی ٹھوکر نے اس کے چہرے اور منہ سے لہو چھڑا دیا تھا۔ میں نے اپنے وزنی بوٹ سے اس کی ٹھوڑی پر جو ٹھوکر برسائی تھی وہ دانتوں اور زبان کو شدید نقصان پہنچانے کے بعد ناک منہ سے خون جاری کرنے کے لیے بہت مفید تھی۔

وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر کھڑا ہوا اور خوں خوار نظر میں مجھے تولنے لگا۔ غار کے اس حصے میں روشنی ناکافی مقدار میں پہنچ رہی تھی۔ لہٰذا خون آلود گھائل چہرہ بڑا بھیانک منظر پیش کرنے لگا۔ کوئی راہ فرار نہ پا کر اس کی آنکھوں میں وحشت سی بھر گئی۔ خون بھرے چہرے نے اس وحشت میں آٹھ چاند لگا دیے مگر جمی فونڈا کے حالات میں کوئی روشنی پیدا نہ ہو سکی۔

میں اس وقت جمی اور زینے کے درمیان کھڑا تھا۔ زینے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے راستے سے ہٹانا ضروری

تھا۔

ڈاکٹر مونگ اور لی یان' نے ایک مکمل چپ سادھ لی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سانس بھی نہ لے رہے ہوں۔ جمی ابھی تک ان کی غار میں موجودگی سے آگاہ نہیں ہوا تھا۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا اس وقت ہم دونوں ہی وہاں موجود ہیں۔ جب سے اس کا مجھ سے سامنا ہوا تھا' میں نے اسے سر کھجانے کی فرصت نہیں دی تھی' وہ کسی اور طرف دھیان بھی کیسے دیتا پھر لی یان اور ڈاکٹر مونگ ایسے زاویے پر کھڑے تھے کہ ان کی طرف نظر بمشکل جاتی۔

جمی فونڈا چند لمحات تک غصے' حیرت اور نفرت کے ملے جلے تاثرات سے میری جانب دیکھتا رہا پھر نہ جائے ماندن' نہ پائے رفتن...... کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوگیا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے مجھے دبوچنے کے لیے فری لانس آگے بڑھا۔ میں نے ردعمل کے طور پر اسے جھکائی دی اور ایک سائیڈ میں نکلتے ہوئے اپنا دایاں گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ یہ ایک ترچھی اور بھرپور ضرب تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر دہرا ہوگیا۔

میں فائٹنگ اسٹیپ مکمل کرنے کے بعد اس کے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل ڈھائی فٹ کا فاصلہ حائل تھا۔ میں نے اپنے قدموں پر کھڑے کھڑے اسے ایک بھرپور ریئر (بیک) کک ٹکا دی۔

وہ پیٹ کو تھامے مجھ سے ملنے والے صدمے کو ''انجوائے'' کرنے میں غرق تھا۔ ریئر کک کے جھٹکے نے اس کا توازن بگاڑ دیا۔ وہ رکوع کے بل جھکے جھکے کئی قدم آگے نکل گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور لانگ اسٹیپ والی ایک دھواں دھار سائیڈ کک اس کی تشریف پر جڑ دی۔

اس کی رفتار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا اور وہ توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند سامنے والی پتھریلی دیوار کی سمت ''پرواز'' کر گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ مذکورہ دیوار سے ٹکرایا اور ''دھپ'' کی آواز پیدا کرتے ہوئے سنگی فرش پر اوندھا ہوگیا۔

دیوار سے ہونے والا ٹکراؤ بہت شدید تھا۔ اس تصادم کے نتیجے میں اس کے چہرے اور سر کو زیادہ نقصان پہنچا۔ وہ فرش پر گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ اس کا جسم ہولے ہولے تھرک رہا تھا۔ وہ زندہ تھا مگر اپنی مدد آپ کے تحت اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زمین پر بے بس پڑے دیکھ کر میں اس کی ''مدد'' کو لپکا۔ آخر کو...... یہ تو میرا فرض تھا!

اسی وقت ڈاکٹر مونگ مشعل کو لے کر ہمارے قریب پہنچ گیا۔ گن کو اس نے لی یان کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے مشعل کی روشنی میں جمی کو سیدھا کیا۔ وہ بڑے تسلی بخش انداز میں زندہ تھا اور اس پر ہرگز شرمندہ نہیں تھا' بس فی الوقت اٹھنے بیٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ لی یان اور ڈاکٹر مونگ کو اپنے قریب کھڑے دیکھ کر وہ اور بھی گھبرا گیا۔ ابھی تک وہ یہی سمجھ رہا تھا' اسے صرف مجھ ہی سے نمٹنا ہوگا۔ ویسے ایک بات ہے' لی یان اور مونگ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا' وہ انہیں پہچانتا نہیں تھا۔ لی یان اس کے لیے اجنبی تھی اور ڈاکٹر مونگ میک اپ کے بغیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا!

میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور اس کے زخمی چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا ''کچھ یاد آیا یا تمہاری یادداشت کو مزید دھونا پڑے گا۔ میں نے تم سے ساحل کے بارے میں پوچھا تھا؟''

ڈاکٹر مونگ کے اشارے پر لی یان نے سیون ایم ایم کا رخ جمی فونڈا کی جانب پھیرتے ہوئے اس کی خطرناک نال کو اس کی کھوپڑی سے لگا دیا۔ جمی کی آنکھوں میں موت کے سائے لہرانے لگے۔ وہ متوحش نظر سے باری باری ہم تینوں کو تکنے لگا۔ اس نے لی یان اور ڈاکٹر مونگ کو میرا... ساتھی سمجھا تھا۔

میں نے سفاکی سے کہا ''جمی فونڈا' تمہارا کھیل بگڑ چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ تمہاری قسمت بگڑ جائے' مجھے ساحل کے بارے میں بتا دو۔ سچ بول کر تم اپنے لیے کچھ آسانیاں حاصل کر سکتے ہو!''

اسے اپنی موت کا یقین ہوگیا تو زبان کھولنا اس کی مجبوری بن گئی۔ مفاد پرست لوگوں کے لیے سب سے اہم ان کی اپنی زندگی ہوتی ہے۔ وہ زندہ رہنے کے لیے ہر قسم کی سودے بازی پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس کے گھائل لب تھرتھرائے۔

''وہ لڑکی یہاں نہیں ہے......''

''پھر کہاں ہے؟'' میں غرایا ''تم ہائی وے والی بستی سے اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ ادھر ہی لائے تھے۔ جھوٹ بولو گے تو تمہاری سانسیں گھٹ کر صفر کے برابر ہو جائیں گی۔ لگتا ہے' تمہیں زندگی کی ضرورت نہیں رہی؟''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔'' وہ گھگیایا ''میری بات کا یقین کرو۔ میں تمہاری ساتھی کو یہاں لے کر نہیں آیا۔''

"یہاں نہیں لے کر آئے تو پھر اسے تم نے کہاں پہنچایا ہے؟"

"میں نے اسے جوگندر پال کے ایک خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا تھا۔"

"جوگندر پال!" میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا "میری معلومات کے مطابق' جوگندر پال یہاں کھٹمنڈو میں تمہیں ہر قسم کا کور دے رہا ہے۔ ساحل کا تعلق سراسر تم لوگوں کے مشن سے ہے پھر تم نے اسے جوگندر پال کے کسی خفیہ ٹھکانے پر کیوں پہنچا دیا۔ جوگندر کو ساحل سے کیا دلچسپی پیدا ہوگئی؟"

"میں تو حکم کا غلام ہوں۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا "مجھے جو حکم ملا' میں نے اس کی تعمیل کردی۔ مجھے ساحل کو اس عبادت گاہ کی طرف لے جانے کے بجائے جوگندر کے ٹھکانے پر پہنچانے کی ہدایت دی گئی تھی۔"

"اچھا! تو یہاں تم سے اوپر بھی کوئی ہدایت دینے والا بیٹھا ہوا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے تامل جھلکتا نظر آیا' اس کے ساتھ ہی چہرے پر ایسے تاثرات بھی نمودار ہوئے جیسے اسے اس راز افشائی کی غلطی کا سنگین احساس ہوگیا ہو۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے کوئی چکر دے کر بچ نکلو گے۔ ربی کی نظر میں سرخرو ہونے کے لیے تمہارے پاس کوئی موقع باقی نہیں بچا۔ تم اتنا آگے نکل آئے ہو کہ واپسی کی راہ نگاہ سے اوجھل ہوگئی ہے۔ تم میرے ساتھ تعاون کر کے ہی اپنے لیے کچھ آسانی حاصل کر سکتے ہو۔" میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

"بتاؤ' تم نے کس شخص کی ہدایت پر ساحل کو جوگندر پال کے ٹھکانے پر پہنچایا ہے۔ یہ تو مجھے اندازہ ہوگیا' ایسا حکم دینے والا جوگندر پال نہیں ہوسکتا!"

"اس شخص کا نام ڈین ہاروے ہے۔" وہ کمزور سی آواز میں انکشاف کرتے ہوئے بولا "وہ آج صبح ہی اسرائیل سے یہاں پہنچا ہے۔ ڈین ہاروے جوگندر پال کے اس ٹھکانے پر ٹھہرا ہوا ہے۔"

"ڈین ہاروے اگر اسرائیل سے آیا ہے تو یقیناً اسے موشے ہائمن نے بھیجا ہوگا!" میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا "اس نے میری ساحل کو اپنے پاس بلانے کا حکم کیوں دیا تھا؟"

"میں نہیں جانتا۔" وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے سنگین لہجے میں کہا "تم نے ساحل کو جوگندر پال کے جس ٹھکانے پر پہنچایا ہے' اس کا ایڈریس بتاؤ؟"

اس نے مجھے ایک عالیشان بنگلے کا ایڈریس اور لوکیشن بتانے کے بعد کہا "یہ پوش رہائشی علاقہ اسرائیل ایمبیسی کے پچھواڑے واقع ہے۔"

یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ تاہم وہاں کے کسی بنگلے میں جانے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کھٹمنڈو کے اس حصے میں زیادہ تر ملکوں کے سفارت خانے موجود ہیں۔ اسرائیل ایمبیسی دراصل بیلجیئم قونصلیٹ' اٹالین ایمبیسی اور فرنچ ایمبیسی کے درمیان واقع ہے۔

میں نے جمی فونڈا کو زندگی کے دکھوں سے نجات دلانے سے پہلے ایک اہم سوال کیا "تم لوگ عبادت گاہ کے تہ خانے میں کیسے داخل ہوئے ہو۔ یہاں تک تو تمہیں صرف اور صرف ساحل ہی لا سکتی تھی اور تم اسے ڈین ہاروے کے پاس چھوڑ آئے ہو؟"

"میں نے تمہاری ساتھی کو لگ بھگ نو بجے رات جوگندر پال کے بنگلے پر پہنچایا تھا۔ مجھے ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ طلب کرلیا گیا۔ دس بجے مجھے نئی ہدایات کے ساتھ عبادت گاہ پر چڑھائی کے لیے روانہ کردیا گیا۔ اس تہ خانے میں داخلے کا طریقۂ کار بھی مجھے ڈین ہاروے ہی نے بتایا تھا۔"

اس کی بات سن کر میں اچھل پڑا۔ ڈین ہاروے کوئی بہت ہی پہنچی ہوئی شے ثابت ہو رہا تھا۔ یقیناً تہ خانے میں داخلے کا راز اس نے ساحل ہی کے ذہن سے نکالا تھا۔ یہ سوچنا تو سراسر حماقت ہوتی کہ ڈین ہاروے ربی سے بھی اوپر کا کوئی آدمی ہوگا۔ بہر حال' یہ بات طے تھی کہ ربی ہی نے اسے اسرائیل سے یہاں بھیجا تھا۔ اس معاملے کی انکوائری تو ڈین ہاروے سے "ملاقات" کے بعد ہی ہوسکتی تھی!

میں نے ڈاکٹر مونگ کا ایک مخصوص اشارہ پا کر جمی فونڈا سے آخری سوال کیا "تمہیں یہ کیسے پتا چلا کہ ساحل کو ہائی وے والی بستی میں شاکا کے گھر کے اندر رکھا گیا تھا؟"

"یہ اطلاعات بھی جوگندر پال کے اسی خفیہ بنگلے سے ملی تھیں۔"

"یعنی ڈین ہاروے سے؟"

اس کی آنکھوں میں اثباتی تاثر ابھرا۔

میں نے سوالیہ نظر سے ڈاکٹر مونگ کو دیکھا۔ اس نے تائیدی انداز میں گردن کو مخصوص جنبش دی۔ میں جمی فونڈا کی

طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے' یہاں تک پہنچنے والے تمہارے تمام ساتھی ختم ہو چکے ہیں؟"

اس نے متوحش نظر سے مجھے دیکھا اور سراسیمہ آواز میں بولا "میں صرف ان تین کی موت سے آگاہ ہوں جو ادھر تنگ سی سرنگ میں پڑے ہیں۔"

"اور تم مستی کی کیفیت میں ان کے قتل کا اقرار کر چکے ہو۔" میں نے سنگین لہجے میں کہا "اور اسی مستی میں تم دنیا کے امیر ترین شخص بننے کا خواب بھی دیکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس وقت تو تم اپنے ربی مربی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔"

اس کی آنکھوں میں موجود وحشت کئی گنا بڑھ گئی۔ میں نے کہا "بہر حال' اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہارے تمام ساتھی لقمۂ اجل بن گئے' تمہیں بھی جہنم کا ایندھن بننا ہے۔ یہی اس عبادت گاہ کا دستور ہے اور یہی اس تہ خانے کی تاریخ ہے۔ کوئی بھی غیر متعلق شخص یہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور جو بدقسمتی سے ان خزانوں کو دیکھنے کا گناہگار ہو جاتا ہے' بڑی سنگین موت مرتا ہے۔"

"مم...... مگر......" وہ ہکلایا "تم نے مجھے...... آسانیاں فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا......؟"

"میں عہد شکن نہیں ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا اور دونوں ہاتھ اس کی گردن کی جانب بڑھا دیے۔

"یہ...... یہ کیا کر رہے ہو......؟" وہ تڑپ اٹھا۔

"جمی! میں اپنا وعدہ پورا کر رہا ہوں۔" میں نے پکارنے والے انداز میں کہا "میں اپنے ان ہاتھوں سے تمہیں دائمی آسانیاں فراہم کر رہا ہوں۔ اب تمہاری زندگی میں کوئی دکھ باقی نہیں رہے گا۔ بس ایک ہلکا سا جھٹکا۔" میں نے اس کی گردن کو اپنے ہاتھوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیا اور کہا "اس جھٹکے کے بعد تمہیں زندگی کی تمام تر مشکلات سے نجات مل جائے گی۔ یہ لو......"

اس کے ساتھ ہی میرے ہاتھوں نے مخصوص انداز میں میکانکی حرکت کی اور اس پُرہیبت غار میں' جمی کی گردن کا منکا ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوئی۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر ہم تینوں تنگ سی سرنگ کی جانب بڑھ گئے۔

وہ تین لاشیں دریافت کرنے میں ہمیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ ان کے قریب ہی تین گنز بھی پڑی ہوئی مل گئیں۔ ہم نے ان کو گھسیٹ کر سرنگ سے باہر نکالا تو ایک حیرت انگیز

خواتین کے بے حد اصرار پر
آپ کی پسندیدہ مصنفات کے
خوبصورت ناول
کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی — خلش — صفحات 450 سے زائد، قیمت 350 روپے
رخ چوہدری — سیپ صدف اور ساحل — صفحات 850 سے زائد، قیمت 450 روپے
دکھ کا دریا سکھ کا ساگر — صفحات 850 سے زائد، قیمت 450 روپے
آسیہ مرزا — ہری ہے شاخِ تمنا ابھی — صفحات 300 سے زائد، قیمت 250 روپے
ناہید سلطانہ اختر — بہتے پانی پہ مکاں — صفحات 300 سے زائد، قیمت 250 روپے
ماہ مبین ایم اے — منزل کہاں ہے — صفحات 400 سے زائد، قیمت 350 روپے
ماہ مبین ایم اے — مہمان — صفحات 400 سے زائد، قیمت 350 روپے
نگہت سیما — دھوپ بارش اور سائے — صفحات 1000 سے زائد، قیمت 800 روپے
یہ کیسا جیون — صفحات 176 سے زائد، قیمت 125 روپے
صفحات 224 سے زائد، قیمت 130 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب =/50 روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
5804300-5895313
kitabiat1970@yahoo.com

انکشاف یہ بھی ہوا کہ ان لوگوں کی جیبیں سونے کی ڈلیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سونے کے عظیم الشان ذخیرے کو دیکھ کر واقعی ان کے دماغ الٹ گئے تھے اور انہیں موت کے منہ میں دھکیلنے والا جمی فونڈا بھی دنیا کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھتے دیکھتے اب کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ لالچ اور ہوس نے ان تمام لوگوں کی زندگیوں کے چراغ گل کر دیے تھے۔

میں نے کچھ عرصہ پہلے ماضی کی ایک یادگار فلم میکناز گولڈ دیکھی تھی جس میں چند افراد سونے کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور بالآخر وہ سونے کے ذخائر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن نتیجہ وہی سامنے آتا ہے جو اس عبادت گاہ کے تہ خانے میں ظاہر ہوا تھا۔ یہاں بھی آج رات میکناز گولڈ جیسی کہانی ہی دہرائی گئی تھی۔

ڈاکٹر مونگ کے نزدیک عبادت گاہ کا تقدس بہت اہم تھا' لہٰذا ہم سب نے کوشش کر کے اس عبادت گاہ کے اندر' باہر اور تہ خانے میں موجود تمام لاشوں کو عبادت گاہ سے باہر ایک چٹان کے نزدیک ڈھیر کر دیا۔ البتہ اس بات کا خیال رکھا گیا کہ اپنے چھ بندوں کی لاشوں کو ان سے الگ کر دیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا' ڈاکٹر مونگ نے اپنے ذہن میں کیا منصوبہ پال رکھا ہے۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ دشمنوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے اور اپنوں کی لاشوں کو سنبھالنے کے بارے میں اس نے یقیناً کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ ان چھ افراد میں چار پولیس والوں کی لاشیں بھی شامل تھیں۔ کسی نہ کسی قسم کی کارروائی تو بہت ضروری تھی۔

ہم تہ خانے کے تمام تر راستوں کو بند کر کے عبادت گاہ کے بالائی حصے میں آ گئے۔ اس وقت تک سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اجالے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کے انداز میں ایک خاص قسم کا اضطرار محسوس کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔

ہمارے درمیان اس خونچکاں واقعے پر مختصر بات ہوئی پھر میں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا ''ڈاکٹر! اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں ساحل کی طرف جانا چاہیے۔''

''صرف دس منٹ اور رک جاؤ پھر چلتے ہیں۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے پوچھا ''تمہیں کسی کا انتظار ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی ''میں نے مارا ماری کے دوران میں موقع ملتے ہی شیوا کو فون کیا تھا۔ اس وقت تک مجھے اپنے آدمیوں کی ہلاکت کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے وہاں سے مزید کمک منگوائی ہے۔ مجھے انہی لوگوں کے پہنچنے کا انتظار ہے۔ اس عبادت گاہ کو یونہی بے آسرا و بے سہارا تو نہیں چھوڑا جا سکتا نا۔''

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی لیکن میں نے اس کے اظہار پر حتی الامکان قابو رکھتے ہوئے کہا ''میرا یہ خیال ہے.... اور یہ خیال تجربے کی کسوٹی سے گزرنے کے بعد یقین میں بدل چکا ہے کہ اس عبادت گاہ کو درحقیقت کسی محافظ کی ضرورت نہیں۔ اس کے تہ خانے کا طلسم یا اس دور کا دلائی لاما یا تمہارا لارڈ بدھا یا میرا خدا...... تم کچھ بھی کہہ لو مگر اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ یہاں کی حفاظت کسی خودکار نظام کے تحت ہو رہی ہے۔ ماضی میں بھی ایسے کئی واقعات ملیں گے جب کچھ لوگوں نے اس خزانے تک پہنچنے کی کوشش کی اور کتے بلیوں کی طرح مارے گئے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعات تو میرے خیال کا بین ثبوت ہیں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''چاہے جیسے بھی معلوم کیا ہو لیکن ہمارے دشمنوں کو عبادت گاہ کے تہ خانے تک رسائی کا طریقہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے وہ عظیم الشان خزانے تک پہنچ بھی گئے لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ وہ سب کے سب عبرت ناک موت سے دوچار ہو گئے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ خزائن منفی ذہنیت رکھنے والوں کے لیے ہیں ہی نہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں تمہیں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ خزانہ اپنی حفاظت خود کر سکتا ہے' تم کیا کہتے ہو؟''

میں نے اپنی بات کو ایک گمبھیر سوال پر اختتام دیا تو ڈاکٹر مونگ زیرِ لب مسکرایا اور نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن فرائض کی ادائیگی بھی بہت ضروری ہے۔''

اس نے آخری جملہ بڑے معنی خیز اور الجھے ہوئے انداز میں ادا کیا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''تم کس فرض کی بات کر رہے ہو؟''

''فرض کرو' ایک مریض کسی ایسے مرض کے فائنل اسٹیج میں ہے جس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں حتی کہ اس کی موت اور اس کی زندگی کے درمیانی فاصلے کو بھی ناپا جا چکا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ چند دنوں یا چند ہفتوں کا مہمان ہے۔ تو کیا ایسی صورت میں ہم اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیں گے؟''

''قطعی نہیں' ہمارا یہ رویہ سراسر غیر انسانی ہوگا۔'' میں نے کہا۔

وہ اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا ''فرض کرو' کوئی اسٹوڈنٹ بہت ہی ذہین اور قابل ہے۔ اس کے اساتذہ کو معلوم ہے کہ اگر اسے مشکل سے مشکل تر امتحان میں بھی بٹھا دیا جائے تو وہ پہلی پوزیشن حاصل کر لے گا لیکن کیا ایسا ممکن ہے کہ امتحان لیے بغیر ہی اسے ڈگری دے دی جائے' صرف یہ سوچ کر کہ یہ تو اس کا حق بنتا ہے؟''

''ڈگری تو اسے اس وقت ملے گی جب وہ امتحان میں بیٹھ کر اپنی لیاقت کو ثابت کر دے گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''بس تو ثابت یہ ہوا کہ ہر کام کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''یقینی موت کے قریب کھڑے مریض کا علاج کرانا' قابل ترین اسٹوڈنٹ کا بھی امتحان لے کر اسے سرٹیفکیٹ جاری کرنا اور کسی تہ خانے میں پوشیدہ راز کی حفاظت کرنا اپنی اپنی نوعیت کے ایسے تقاضے ہیں جو فرائض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ جس پر جو فرض عائد ہوتا ہو اسے اس فرض کو ضرور ادا کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ عبادت گاہ کے باہر ہیوی انجن والی گاڑیوں کا مخصوص شور سنائی دینے لگا۔ ڈاکٹر مونگ نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا ''ڈاکٹر! لگتا ہے' تمہاری طلب کی ہوئی کمک آ گئی ہے۔''

وہ اٹھا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس کھڑکی کے پاس چلا گیا جہاں سے دور تک وہ سیدھا راستہ دکھائی دیتا تھا جو بستی سے اس عبادت گاہ تک آتا تھا۔ ایک لمحے بعد ہی وہ کھڑکی کے پاس سے واپس لوٹ آیا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش پائی جاتی تھی۔

میں نے سوال کیا ''کیا ہوا ڈاکٹر!''

''اس طرف تو کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی۔'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں بھی الجھ کر رہ گیا ''گاڑیوں کی آواز تو ہم نے سنی ہے اور اب بھی سن رہے......''

میں نے اچانک جملہ ادھورا چھوڑ کر' گاڑیوں کے بیدار انجنوں کی آواز پر توجہ مرکوز کر دی اور اسی لمحے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ آواز عبادت گاہ کے عقب سے آ رہی تھی۔ پلک جھپکتے میں ڈاکٹر بھی اس حقیقت تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے وجدان۔ اس طرف تو ہماری جیپ بھی کھڑی ہے!''

اس کے آخری جملے نے مجھے بتا دیا کہ وہ بھی انجنوں کی آواز کی درست سمت کو بھانپ چکا تھا۔

میں نے پوچھا ''کیا کمک کو اس طرف سے آنا تھا؟''

''نہیں' میں نے یہاں کی صورتِ حال کو ''تسلی بخش'' پا کر شیوا کو ہدایت کی تھی کہ وہ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے سے آئے لیکن یہ تو مجھے کوئی دوسرا ہی معاملہ نظر آ رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

''چلو' اس معاملے کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے باہر کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے عبادت گاہ کے عقب میں ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس دھماکے نے عبادت گاہ کے در و دیوار کو بھی گویا ہلا کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قریب ہی کوئی طاقت ور بم پھٹا ہو۔ ہم اپنے قدموں پر کھڑے نہ رہ سکے۔

ڈاکٹر نے ایک جانب جست لگائی۔ میں دوسری طرف گرا۔ لی یان میرے پہلو میں زمین پر پڑی تھی۔ عبادت گاہ کی دیواروں اور چھت میں سے چھوٹے چھوٹے پتھر ٹوٹ کر ہمارے اوپر گر رہے تھے۔ ہم ابھی یہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہے تھے' کیا کیا جائے کہ اسی لمحے ایک اور خوفناک دھماکے کی آواز نے فضا میں تہلکہ ڈال دیا۔

یہ دھماکا پہلے سے بھی زیادہ شدید اور ہلاکت خیز تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قیامت کا دن طلوع ہو چکا ہو۔ اس دھماکے نے لی یان کو بری طرح بوکھلا دیا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی گرفت سے لگتا تھا' وہ جیسے صدیوں سے یہیں پیوست ہو۔

پتا نہیں' کون سی قیامت برپا ہونے جا رہی تھی!

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں
بزرگانِ دین کے ایمان افروز واقعات
روشنی کے مینار
قیمت -/225 روپے
ڈاک خرچ -/25 روپے
مصنفہ: ضیاء تسنیم بلگرامی
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر1

یہ قیامت سے پہلے والی قیامت تھی!

یکے بعد دیگرے ہونے والے اُن دو دھماکوں نے گویا عبادت گاہ کے در و دیوار کو ہلا کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا' بیٹھے بٹھائے کوئی بڑا زلزلہ آ گیا ہو۔ حشر انگیز دھمک نے ہماری سماعت کو لمحاتی طور پر مجروح کر دیا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا' یہ سلسلہ دو دھماکوں تک ہی محدود رہے گا' اس کے بعد بھی دھماکے ہو سکتے تھے اور قبل از وقت ان کی شدت اور ہلاکت خیزی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہمیں فوری طور پر کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

زلزلے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ کسی عمارت کے اندر ہیں تو پہلی فرصت میں اس عمارت کو چھوڑ کر کسی کھلی جگہ پر نکل آئیں۔ اگر عملاً ایسا کرنا ممکن دکھائی نہ دے رہا ہو تو حفظِ ماتقدم کے طور پر کسی مضبوط میز کے نیچے پناہ لے لیں تاکہ اس زلزلے کے نتیجے میں چھت اور دیواروں سے گرنے والا ملبا آپ کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو۔ ہم جس نوعیت کی صورتِ حال سے دوچار تھے اس میں ایسی کوئی محفوظ آڑ میسر ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ اگر عبادت گاہ کی چھت اور پتھریلی دیواریں منہدم ہونے کا فیصلہ کر لیتیں تو ہم ایک سنگلاخ مدفن میں ''امر'' ہو کر رہ جاتے۔ دھماکوں کی شدت بتاتی تھی ایسا ہو بھی سکتا ہے!

میرے ذہن نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں عبادت گاہ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے دس فٹ دور پڑے ڈاکٹر مونگ کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اس کی تائید پاتے ہی میں ایکشن میں آ گیا۔ ڈاکٹر مونگ نے بھی میرے ساتھ ہی بڑی سرعت سے حرکت کی۔

میں نے لی یان کو اپنے بدن میں پیوست رکھتے ہوئے ایک لمبی رولنگ کی۔ میں نے اس دوران میں رخ کا خاص طور پر خیال رکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم اس سنگی کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ سنگلاخ فرش پر رول کرتے ہوئے ہمارے اجسام کو چھوٹی موٹی چوٹوں سے بھی واسطہ پڑا مگر ان لمحات میں ایسی چوٹوں کو محسوس کرنے کا وقت نہیں تھا۔

ہم مذکورہ کمرے سے باہر نکلے اور اٹھ کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔ اسی لمحے تیسرے خوف ناک دھماکے کی لرزہ خیز آواز نے ہماری سماعت تک رسائی حاصل کی مگر خیریت گزری کی کہ اس وقت تک ہم چھت کے نیچے سے نکل کر کھلے آسمان تلے آ گئے تھے۔ یہ عبادت گاہ کا سامنے والا بیرونی حصہ تھا۔ وسیع و عریض ہال اور اس کے وسط میں ایک چبوترے پر استادہ فاسٹنگ بدھا کا مجسمہ ہم سے بہت پیچھے رہ گیا۔ ہم واقعتاً عبادت گاہ کی عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔

اجالا پھیلنے لگا تھا تاہم کھنڈو کے یخ بستہ ماحول نے اس صبح کو ٹھٹھرا رکھا تھا۔ اس ٹھنڈی ٹھار فضا میں ہم خود کو کسی فریزر میں کھڑے محسوس کر رہے تھے۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ لی یان میرے ہاتھ میں ہاتھ دیے بھاگ رہی تھی، میرے رکنے نے اسے بھی روک دیا۔ میں نے پلٹ کر عبادت گاہ کی طرف دیکھا۔ عبادت گاہ کی عمارت اپنی جگہ پر صحیح و سالم کھڑی تھی لیکن ڈاکٹر مونگ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ پتا نہیں وہ کہاں رہ گیا تھا!

یہ ایک تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا' ڈاکٹر نے بھی ہمارے ساتھ ہی کمرے کے پتھریلے فرش پر رول کیا تھا پھر دروازے سے نکلنے کے بعد ہمیں مڑ کر پیچھے دیکھنے کا ہوش نہیں رہا تھا اور اب دیکھا تو وہ غائب تھا۔

لی یان نے میرے چہرے پر پھیلی ہوئی تشویش کو بھانپ لیا' اضطراری لہجے میں وہ بولی ''ڈاکٹر مونگ دکھائی نہیں دے رہا۔ لگتا ہے وہ کسی اور طرف نکل گیا ہے!''

''ہاں' مجھے بھی یہی لگتا ہے۔'' میں نے متفکر انداز میں کہا۔

''اسے ڈھونڈتے ہیں۔'' لی یان کے لہجے میں ڈاکٹر مونگ کے لیے اچھی خاصی تشویش موجود تھی۔

میں نے کہا ''اس کی ضرورت نہیں لی یان! تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے' ڈاکٹر بڑے پراسرار انداز میں موو کرتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہوگا' خیریت ہی سے ہوگا۔ ہم سب کو... بہرحال اپنی جیپ تک پہنچنا ہے لہٰذا اسی سمت بڑھنا چاہیے۔''

''مجھے ڈاکٹر مونگ کے ساتھ کسی مشن میں حصہ لینے کا پہلی مرتبہ موقع مل رہا ہے۔'' لی یان عبادت گاہ کی جانب متلاشی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی ''واقعی' اس کا انداز بہت ہی پراسرار ہے۔''

''میں نے ہمیشہ اسے ''ادھر ڈوبے' ادھر ابھرے۔'' والے انداز میں متحرک پایا ہے۔'' میں نے کہا ''وہ جب بھی ابھرا خیریت ہی سے ابھرا۔ میرا اندازہ ہے وہ عبادت گاہ کے عقبی حصے کی طرف نکل گیا ہوگا۔ اگر اس طرف آیا ہوتا تو ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی' ادھر عبادت گاہ کے عقبی حصے میں فائرنگ ہونے لگی۔ وہ فائرنگ بڑی شدید اور یک طرفہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' کسی تن تنہا شخص پر نصف درجن گنز کے دہانے کھول دیے گئے ہیں۔ ہم بے ساختہ نیچے بیٹھ گئے۔ اس طرح ہم ایک چھوٹی چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے۔

فائرنگ کی آواز نے لمحے بھر کو فضا میں ''چیخم دھاڑ'' مچائی پھر خاموشی چھا گئی۔

لی یان متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مجسم سوال کو پلک جھپکتے میں پڑھ لیا۔ اس کی تمام تر تشویش ڈاکٹر مونگ کے حوالے سے تھی۔ اس نے بھی میری طرح یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ فائرنگ ڈاکٹر مونگ کو شکار کرنے کے لیے کی گئی ہوگی۔

میں نے سیون ایم ایم کو اپنی گرفت میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا شانہ تھپتھپایا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تم پریشان نہ ہو لی یان! ڈاکٹر مونگ ان کے لیے آسان شکار ثابت نہیں ہوگا۔ وہ انہیں تگنی کا ناچ نچا کر رکھ دے گا۔''

اس کے چہرے پر لمحاتی سکون ابھرا۔ میں اچھی طرح محسوس کر رہا تھا' وہ اندر سے مطمئن نہیں تھا اور یہ اس کا ایک فطری ردِعمل تھا۔ وہ بار بار میری گن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہ میں ستائش کی جھلک تھی۔ اس مشن کے ابتدائی حصے میں لی یان نے گن میرے پاس رکھنے پر اصرار کرتے ہوئے کہا تھا' آتشیں ہتھیار' مرد کا زیور ہوتے ہیں۔ اسلحے کا زیور مردوں کو ہی سجتا ہے' میری حفاظت کے لیے تم موجود ہو تو مجھے کیا پروا ہے!

اس کی ستائش بھری نگاہ سے ظاہر ہوتا تھا' میرے ہاتھ میں مردانہ زیور کی سجاوٹ سے اسے بڑی تقویت مل رہی تھی۔ عبادت گاہ کو ہنگامی حالت میں خیرباد کہتے ہوئے میں نے لی یان کے ساتھ سیون ایم ایم کو بھی بڑی مہارت سے سنبھال رکھا تھا۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے ورنہ ہم تینوں باہم پیوست جس طرح رول کرتے ہوئے کمرے سے نکلے تھے اس حالت میں پورے وثوق سے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا' کس نے کس کو سنبھال رکھا تھا۔

اس چٹان کی آڑ میں بیٹھے بیٹھے میں توقع کر رہا تھا کہ دوبارہ بھی فائرنگ ہوگی لیکن جب چند لمحے فضا میں پراسرار سکوت طاری رہا تو میں نے صورتِ حال کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ میں نے لی یان کو وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور ایک جانب جھک کر اس چٹان کے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی۔ فائرنگ کی آواز اسی سمت سے سنائی دی تھی۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا' فائرنگ عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں ہوئی تھی یا پھر اس کے پچھواڑے عظیم الشان بڑی چٹان کی طرف کیونکہ لوکیشن کے اعتبار سے مذکورہ دونوں مقامات اس وقت ہمارے عقب میں واقع تھے۔ ہم عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں خاصا آگے نشیب میں اتر آئے تھے۔

بدھ نیل کنڈ والی وہ عبادت گاہ ایک پیگوڈا کی صورت بلند ٹیلے پر بنائی گئی تھی۔ نیچے نشیب میں بھاگ متی نامی ایک دریا بہتا تھا۔ ایک طرح سے عبادت گاہ دریائے بھاگ متی کے کنارے واقع تھی۔

میں نے بلندی کی جانب دور تک نگاہ دوڑائی۔ میری وہ متلاشی نگاہ جہاں تک منظر کو گرفتار کر سکی وہاں تک امن و امان ہی نظر آیا۔ عبادت گاہ کی چھت والی' آگے کو بڑھی ہوئی پتھریلی منڈیر کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا اور وہاں سے یہاں تک چٹانی سلسلہ تھا جہاں کسی قسم کی گڑبڑ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ فائرنگ عبادت گاہ کے عقبی حصے میں ہوئی تھی اب اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ڈاکٹر مونگ ادھر عظیم الشان چٹان کی طرف نکل گیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا' ہمارے دشمن آپس میں ایک دوسرے کو ہی نشانہ بنانے میں لگ جائیں!

میں مطمئن ہو کر لی یان کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ اس بار برسٹ فائر نہیں کیے گئے بلکہ تین چار سنگل شاٹس سنائی دیے۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں انسانی چیخوں کی مخصوص آواز بھی ابھری۔ لگتا تھا' بڑے تاک تاک کر نشانے لگائے گئے تھے۔ میرے دل نے کہا' ادھر ڈاکٹر مونگ نے مورچا سنبھال لیا تھا۔

وہ جب ہم سے رخصت ہوا تو خالی ہاتھ تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' یا تو اس نے کسی دشمن کی گن پر قبضہ جما لیا تھا یا پھر وہ سیون ایم ایم برآمد کر لی تھی جو اس کے بقول اس نے ایک محفوظ مقام پر رکھ چھوڑی تھی۔

''ہمیں فوراً ڈاکٹر مونگ کی مدد کے لیے اس طرف جانا چاہیے۔'' لی یان نے گمبھیر آواز میں کہا۔

وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس فائرنگ اور ڈاکٹر مونگ میں گہرا تعلق ہے۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے یا کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اپنی تمام تر سماعت کو ماحول پر مرکوز کر دیا۔

فائرنگ اور انسانی چیخوں کے بعد ایک مرتبہ پھر مہیب خاموشی چھا گئی تھی۔ میری توجہ کا مرکز عبادت گاہ کا عقبی حصہ تھا جدھر وہ عظیم الشان چٹان واقع تھی جس کے عقب میں ہماری جیپ کھڑی تھی۔ مجھے اس طرف کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دی' حتیٰ کہ عبادت گاہ کے اندر ہم نے جن گاڑیوں کے بیدار انجنوں کی مخصوص آواز سنی تھی وہ بھی اب خاموش ہو چکے تھے۔

میں نے فیصلہ کن انداز میں لی یان کی طرف دیکھا اور

اس کا ہاتھ تھام کر چٹان کی اوٹ سے نکل آیا ”ہم ایک نیم بیضوی چکر کاٹ کر عبادت گاہ کے عقب میں پہنچیں گے۔“ میں نے کہا ”ساری گڑبڑ ادھر ہی معلوم ہوتی ہے۔“

لی یان کو پہاڑی راستوں پر سفر کرنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا اس لیے آگے بڑھنے میں اچھی خاصی مشکل پیش آرہی تھی۔ ہم ڈھلوانی فاصلہ طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ پہاڑی علاقے میں چڑھائی کی بہ نسبت اترائی میں توازن قائم رکھنے میں زیادہ دقّت محسوس ہوتی ہے۔ ویسے میں لی یان کی ہمت اور حوصلے کو مان گیا تھا۔ وہ جس نوعیت کے حالات سے گزر رہی تھی' ان میں اعصاب پر اتنی کامیابی کے ساتھ قابو رکھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی پیش قدمی کو دیکھتے ہوئے لگتا ہی نہیں تھا کہ اسے بیوہ ہوئے ایک دن بھی نہیں گزرا!

ہمیں ایک جگہ پر رک جانا پڑا۔ میں نے قریب ہی کہیں کسی کے قدموں کی مخصوص آواز سنی تھی۔ وہ آواز اتنی دھیمی تھی کہ لی یان کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر پائی تھی۔ کوئی بڑے محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ادھر سے گزر رہا تھا۔

لی یان میرے اچانک رک جانے پر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے اس کے قدموں کی جانب جھک گیا۔ وہ میری اس حرکت سے جانے کیا سمجھی کہ بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اس کے بدکنے نے میرے منصوبے کو وقت سے پہلے تکمیل تک پہنچا دیا۔ پیچھے ہٹتے ہوئے اس کے پاؤں سے ایک پتھر کو ٹھوکر لگی۔ ٹھوکر کھا کر مذکورہ پتھر نشیب میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فضا فائرنگ کی صدا سے گونج اٹھی۔ اس لڑھکتے ہوئے پتھر کو نشانے پر رکھتے ہوئے کسی شخص نے فائرنگ کی تھی اور میں نے پلک جھپکتے میں جان لیا کہ وہ شخص میرے بائیں پہلو میں پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر موجود تھا اور...... مسلح بھی تھا۔

میں دراصل لی یان کے قدموں میں پڑے ہوئے اسی پتھر کو اٹھا کر دور پھینکنے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ آس پاس موجود شخص کی لوکیشن کا اندازہ ہو سکے۔ اس بات کے روشن امکانات تھے کہ اگر وہاں موجود شخص مسلح ہے تو وہ پتھر لڑھکنے کی آواز سن کر اس پر فائرنگ ضرور کرے گا...... اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ میرے منصوبے کو لی یان کی ایک اضطراری حرکت نے پایہ تکمیل کو پہنچا دیا۔

اب صورتِ حال لی یان پر واضح ہو چکی تھی۔ وہ ایک بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اسی پتھر کی اوٹ میں خاموش بیٹھی رہے۔ میں اس مسلح شخص کی خبر لے کر آتا ہوں۔ اس نے بہادری اور سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اگلے ہی لمحے میں دبے قدموں ایک سمت بڑھ گیا۔

میں نے دشمن کی لوکیشن کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا اور اسے بڑے طریقے سلیقے سے گھیرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے مجھے تھوڑا گھوم کر اس کی سمت بڑھنا پڑا تاکہ اسے میری پیش قدمی کا احساس نہ ہو اور وہ مقام بھی میری نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائے جہاں میں لی یان کو چھوڑ آیا تھا۔ اس کی حفاظت میرے فرائض میں شامل تھی۔

میں گن تھامے محتاط قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا اور دو منٹ کی کوشش کے بعد اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق' دشمن کو تین چار فٹ آگے میرے نشانے پر ہونا چاہیے تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

میں متلاشی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ لی یان کی چیخ نے مجھے اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ میری نگاہ میں وہ بڑا سا پتھر آ گیا جس کے عقب میں' میں نے لی یان کو چھوڑا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ مسلح شخص اس طرف لی یان کے پاس جا پہنچا تھا اور اس نے لی یان کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔

میرے لیے وہ بڑے نازک لمحات تھے۔ مجھے فوری طور پر وہاں پہنچنا تھا۔ ویسے ایک بات کی مجھے تسلی تھی کہ وہ بدبخت لی یان کو شوٹ نہیں کرے گا۔ اگر اس نے ایسا کرنا ہوتا تو لی یان کے چیخنے سے پہلے ہی فائر کھول دیتا۔ لی یان کی زندگی کو سر دست کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں اوندھے منہ پتھریلی زمین پر لیٹ گیا اور کرالنگ کرتے ہوئے اس پتھر کی سمت بڑھنے لگا جس کے پیچھے وہ دونوں موجود تھے۔ جلد ہی میں اس پتھر کے اوپر پہنچ گیا اور پھر لی یان میری نگاہ میں آ گئی۔

وہ زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ گن بردار محض تین فٹ کے فاصلے پر اس پر گن تانے کھڑا تھا۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک ترچھے زاویے سے اس کی پشت میری سمت تھی۔ میں نے اوندھے لیٹے لیٹے گن بردار کی کھوپڑی کو سیون ایم ایم کے ٹارگٹ پر رکھ لیا پھر تحکمانہ لہجے میں غرا کر کہا۔

”گن پھینک دو مسٹر!“

میری آواز پر وہ میکانکی انداز میں اچھلا اور تیزی سے گھوم کر مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی صورت دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا۔ اس کا تعلق امریکا سے تھا۔

اس کی کوشش کو لی یان نے پلک جھپکتے میں خاک چٹا دی۔ وہ شخص جیسے ہی میری جانب مڑا لی یان نے پتھریلی زمین پر ہینڈ پش لیا اور اچھل کر دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ میں رسید کر دیں۔ یہ ایک زبردست ڈبل کک تھی۔

گن بردار نے میری طرف گھومتے وقت دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے تھے لہٰذا لی یان کا نشانہ بڑا کاری ثابت ہوا۔ گن بردار توازن قائم نہ رکھ سکا اور پیچھے کو لڑھک گیا۔ اس دوران میں ٹریگر پر اس کی انگلی دب گئی۔ ٹریگر پر انگلی دبنے کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے...... فائرنگ!

پیچھے کو الٹتے ہوئے اس کی گن نے بھی متعدد گولیاں اگلیں لیکن ٹارگٹ بگڑ جانے کے باعث ہم دونوں گولیوں کا نشانہ بننے سے محفوظ رہے۔ لی یان نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ اچھل کر گن بردار کے تعاقب میں لپک گئی۔ میں پتھر سے کود کر نیچے آیا اور ان کا تماشا دیکھنے لگا۔

پیچھے کو لڑھکتے ہوئے گن اس شخص کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ دس فٹ نشیب میں جانے کے بعد سنبھلا اور گن کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگا۔ مذکورہ گن اس کی دائیں جانب چار فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔ اس نے گن کی طرف جست بھری۔

اسی وقت میں حرکت میں آ گیا۔ گن بردار سے پہلے میں گن کو دیکھ چکا تھا اور گن بردار کا ارادہ بھی میں نے بھانپ لیا تھا میں نے سیون ایم ایم کو سیدھا کیا اور گن کی سمت بڑھنے والے اس کے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے لی یان پر سوا سیر ہونے کا موقع دیتا!

اس نے ایک چیخ ماری اور اپنی مادری زبان میں گالیاں بکتے ہوئے زخمی ہاتھ کو تیزی سے جھٹکنے لگا۔ اس دوران میں لی یان اس کے سر پر پہنچ گئی۔ جھنجلاہٹ میں وہ زخمی ہاتھ ہی سے لی یان پر حملہ آور ہوا۔

اس کا انداز تھپڑ مارنے والا تھا۔ لی یان نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور اس کی پسلیوں میں پاؤں کی ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کو گیا پھر سنبھل کر خونخوار انداز میں لی یان کی طرف بڑھا۔ اس کی پیش قدمی میں بڑی جارحیت پائی جاتی تھی۔

لی یان ایک محفوظ اسٹانس بنائے تیار کھڑی تھی۔ اس شخص نے غصیلے انداز میں ایک فٹ بال کک چلائی۔ لی یان نے بیک فٹ پر جاتے ہوئے اس کی کک کو بلاک کیا اور اسی لمحے گھوم کر ایک خطرناک وہیل کک ماری۔

لی یان کی ایڑی اس شخص کی کنپٹی پر پڑی اور وہ سر کو تھام کر ایک طرف جا گرا۔ لی یان تیزی سے اس کی طرف لپکی اور سنبھلنے سے پہلے ہی اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ اس شخص کا اسٹائل یہ ظاہر کرتا تھا اس نے باقاعدہ مارشل آرٹس کی تربیت حاصل نہیں کی تاہم لڑائی بھڑائی کا اسے وسیع تجربہ تھا۔ لی یان کی جگہ کوئی اور اس کے مدِمقابل ہوتا تو وہ اسے چٹکیوں میں مسل کر رکھ دیتا۔ لی یان بڑی تندہی سے اس کے سامنے ڈٹی ہوئی تھی۔

لی یان کو اس مشن میں پہلی مرتبہ ہاتھ پاؤں کھولنے کا موقع مل رہا تھا۔ اب تک ساری ”کسرت“ میں نے اور ڈاکٹر مونگ نے ہی کی تھی۔ لی یان بڑے بھرپور اور تسلی بخش انداز میں اس شخص سے نمٹ رہی تھی۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ لی یان کا مدمقابل طاقتور اور مضبوطی میں اس پر سبقت رکھتا تھا۔ اس میں کسی گینڈے جیسی قوت بھری ہوئی تھی۔ لی یان کی پھرتی اور مہارت نے اسے ابھی تک اس شخص کے قابو میں آنے سے بچا رکھا تھا۔

وہ بری طرح پٹ رہا تھا اور جھنجلا کر بار بار لی یان پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ میں بڑی توجہ سے وہ فری اسٹائل فائٹ دیکھتا رہا۔ لی یان نے مدمقابل کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بار بار اپنے چہرے کو صاف کرتا جا رہا تھا۔ لی یان کے انداز میں غضب کا غیظ وغصہ بھرا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' وہ شون کی موت کا ذمے دار اس شخص کو سمجھ رہی ہو...... اور اس ”کوتاہی“ کے لیے وہ اس سے سود در سود وصول کرنے کا ارادہ رکھتی ہو!

پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک کک چلاتے ہوئے لی یان توازن قائم نہ رکھ سکی۔ پتھریلی ڈھلوان زمین پر اس کا پاؤں رپٹ گیا اور اس شخص کو موقع مل گیا۔ کسی قسم کا جارحانہ حملہ کرنے کے بجائے اس نے لی یان کو اپنے کلاوے میں لے کر دبانا شروع کر دیا۔ لی یان بوکھلا کر رہ گئی۔

اس شخص کی گرفت میں کسی سانڈ کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ لی یان کو اوپر اٹھایا اور پٹخنے کی کوشش کی لیکن لی یان نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ وہ جب بھی اسے پھینکنے لگتا' لی یان اپنا بازو یا ٹانگ اس کے جسم کے کسی حصے سے الجھا دیتی۔ لی یان اس کے لیے ایک ایسی شے ثابت ہو رہی تھی جسے وہ اگل سکتا تھا اور نہ ہی نگلنے کی ہمت ہو رہی تھی۔

اس شخص کی جھنجلاہٹ حد درجہ بڑھ گئی اور اس نے خود کو منہ کے بل زمین پر گرانے کے لیے اپنے وجود کو ایک جھٹکا دیا۔ لی یان ہنوز اس کی گرفت میں تھی۔ اگر وہ اوندھا زمین پر گرتا تو اس سے پہلے لی یان کا جسم زمین سے ٹکراتا۔ یہ بڑی واہیات صورتِ حال تھی لیکن زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی لی یان نے بازی پلٹ دی۔ یہ اس کا ایک فوری اور بروقت فیصلہ تھا۔

اس سے قبل کہ وہ دونوں اوپر تلے زمین سے آکر ٹکراتے' لی یان کا داؤ چل گیا۔ اس نے زمین کی طرف آتے ہوئے مدِمقابل کے جسم کے ایک نازک حصے پر پاؤں کی خطرناک ٹھوکر رسید کی۔ وہ بلبلا اٹھا اور اسی بلبلاہٹ میں لی یان کے جسم پر سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ختم ہوگئی۔ لی یان نے خود کو آزاد محسوس کرتے ہی ہوا میں رول کیا اور چند فٹ دور جا گری۔

وہ شخص توازن کھو بیٹھا تھا لہٰذا سنبھلنے کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں تھے۔ وہ آناً فاناً منہ کے بل پتھریلی زمین سے ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ برآمد ہوئی۔ یقیناً اس کے چہرے کا سوا ستیاناس ہوگیا تھا۔

جتنی دیر میں وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہوتا' لی یان دو قدم کے فاصلے پر اس کے استقبال کے لیے ایک خطرناک اسٹانس کے ساتھ موجود تھی۔ پھر ان کے درمیان ایک مرتبہ پھر معرکہ آرائی شروع ہوگئی جس میں لی یان کا پلہ بھاری تھا۔

اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں لی یان کو دل کے ارمان نکالنے کا پورا موقع فراہم کرتا لیکن ہم جن سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان میں اس فائٹ کو طول دینا مناسب نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کا معاملہ ''نمٹانے'' کا ارادہ کیا ہی تھا کہ مجھے ایک دوسرے محاذ کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

دو گن بردار اچانک ہی میری نگاہ میں آگئے۔ وہ نشیب سے ہماری سمت بڑھ رہے تھے۔ میں ایک ایسے زاویے سے کھڑا تھا کہ وہ نشیب میں ہونے کے باعث مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے' ہمارے دشمن ہی ہو سکتے تھے کیونکہ انسپکٹر شیوا کی طرف سے آنے والی کمک ابھی تک یہاں نہیں پہنچ پائی تھی۔ میرے' لی یان اور ڈاکٹر مونگ کے سوا یہاں پایا جانے والا ہر شخص فی الحال ہمارا دشمن ہی تھا۔ وہ دونوں گن بردار یقیناً فائرنگ کی آواز سن کر ہماری طرف متوجہ ہوئے تھے یا پھر لی یان سے پٹنے والے کی چیخیں بھی ان کی توجہ اس جانب مبذول کرنے کا باعث ہو سکتی تھیں' میں نے سیون ایم ایم پر گرفت مضبوط کی اور ان کے استقبال کے لیے تیار ہوگیا۔

جب وہ لی یان اور اس کے مدِمقابل کے قریب پہنچے تو صورت حال ان کے لیے بڑی سازگار ہوچکی تھی۔ لی یان کی ایک کریسنٹ کک نے مدمقابل کو تین فٹ دور اچھال دیا۔ اگر وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہوتے تو آنے والے گن بردار افراد کو کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑتا۔ لی یان پر کی جانے والی فائرنگ ان کے ساتھی کو بھی چھلنی میں بدل سکتی تھی!

موجودہ صورت حال میں ان دونوں نے بڑی سرعت سے اپنی گنز کو لی یان کی طرف سیدھا کیا پھر اس سے پہلے کہ ٹریگر پر ان کی انگلیاں حرکت کرتیں' میں نے ان کے اجسام کے زیریں حصوں کو نشانہ بناتے ہوئے ایک خطرناک برسٹ مارا۔ اگر مجھے ایک لمحے کی بھی دیر ہوجاتی تو ان کا داؤ چل چکا ہوتا۔ وہ لی یان کو بھوننے کا کامل فیصلہ کر چکے تھے۔

فائرنگ کی مخصوص تڑتڑاہٹ نے فضا میں خوف ناک ارتعاش پیدا کیا اور اس کے ساتھ ہی متاثرہ افراد کی اذیت ناک چیخیں گونج اٹھیں' میں نے انہیں بڑی کس مپرسی میں لڑکھڑاتے' ڈگمگاتے اور پھر زمین بوس ہوتے دیکھا۔ گنز ان کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا گری تھیں۔ سیون ایم ایم کے ایک ہی برسٹ نے ان کی رانوں اور گھٹنوں کا کباڑا کردیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اب کبھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں گے۔

اس منظر نے لی یان اور اس کے مدِمقابل کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا اور چونک اٹھا۔ لی یان کی کریسنٹ کک کھا کر وہ شخص جہاں گرا تھا وہیں مجھے اس کی گن بھی پڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ شخص بھی گن کی وہاں موجودی سے آگاہ ہوچکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں تیزی سے بدلتے ہوئے تاثرات کو پلک جھپکنے میں نوٹ کرلیا۔ میرے طرف سے ہونے والی فائرنگ نے شاید اسے بوکھلا دیا تھا ورنہ وہ کب کا گن کا جانب ہاتھ بڑھا چکا ہوتا...... اور اب میں اسے کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کا ارادہ بھانپ لینے کے بعد تاخیر کس بات کی!

میں نے ایک جھٹکے سے سیون ایم ایم کے خطرناک بیرل کا زاویہ تبدیل کیا اور ٹریگر پر انگلی دبا دی۔ فضا میں آٹومیٹک سیون ایم ایم کا ایک موت بردار قہقہہ گونجا اور اگلے ہی لمحے وہ شخص اپنے ہی خون میں لت پت تڑپتا ہوا نظر آیا۔ اس کے وجود نے چند نزعی جھٹکے لیے پھر وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی حسرت ناک انداز میں آگے کو بڑھا ہوا تھا جہاں تھوڑی...... محض ایک فٹ کی دوری پر اس کی وہ گن پڑی تھی جسے اٹھانے کے لیے اس نے ہاتھ پھیلایا تھا۔ وہ کسی گن کی ضرورت سے بہت دور جا چکا تھا۔

انسان اس دنیا میں خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ ہی لوٹ جاتا ہے۔ سمیٹنے اور لپیٹنے کے چکر میں زندگی بھر اس کے دونوں ہاتھ مختلف زاویوں میں پھیلتے اور سکڑتے رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات یہی ہاتھ بھیک کے لیے بھی دراز ہوجاتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ سب کو بھیک بھی مل ہی جائے۔ کچھ بدنصیب ایسے بھی ہوتے ہیں' حالات کی ستم ظریفی جنہیں موقع کی بھیک دینے سے انکار کردیتی ہے۔ اس بدبخت کا گن کی سمت پھیلا ہوا ہاتھ بھی کوئی ایسی ہی کہانی سنا رہا تھا!

میں نے اس پر ایک افسوس ناک نظر ڈالی اور اس کے ساتھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دونوں پتھریلی زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ میری گن سے خارج ہونے والی گولیوں نے ان کی رانوں اور گھٹنوں میں کئی ہوادان بنا دیے تھے۔ پنڈلیاں بھی اس سلوک سے محروم نہیں رہی تھیں۔ بادی النظر میں ان کے ٹخنوں' پنڈلیوں' گھٹنوں اور کولہوں کی ہڈیوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ وہ کرب ناک انداز میں کراہتے اور سسکتے ہوئے مجھے مغلظات میں تول رہے تھے۔

میں نے رکوع کے بل جھک کر ان کی حالت کو اندازے کی نگاہ میں تول لیا۔ وہ فوری طور پر کسی قابل نہیں رہے تھے۔ اگر وہ ہزار کوشش کر کے دیکھ لیتے تو بھی ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ان کی جان لینے کا مجھے کوئی شوق نہیں تھا' لہٰذا میں گن سونتے سیدھا کھڑا ہوگیا۔

اسی لمحے لی یان کی ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! ان مردودوں پر لعنت بھیجو۔ ہمیں فوراً ڈاکٹر مونگ کی طرف جانا چاہیے۔''

وہ میرے عقب میں موجود تھی۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا' اس کے ہاتھ میں مجھے وہی گن نظر آئی جس کے حصول کے لیے اس کا مدِمقابل جان ہار بیٹھا تھا۔ وہ ایک خطرناک شاٹ گن تھی۔

لی یان کی تجویز میں معقولیت تھی۔ میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اس کے ایما پر ان دونوں ''معذور افراد'' پر لعنت بھیج کر ہم آگے بڑھ گئے۔

میں نے ایک جگہ رک کر بڑی سرعت سے سیون ایم ایم کوری لوڈ کیا اور اسٹریپ کی مدد سے اسے گردن اور بازو کے اوپر سے گزار کر پہلو میں لٹکا لیا۔ یہ میرا بایاں پہلو تھا۔ اسی بازو کے ٹرائی سپس (TRICEPS) پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کندھے کا زخم اگرچہ تشویش ناک نہیں تھا لیکن پچھلے دو گھنٹے سے عبادت گاہ کے اندر اور باہر جو مارا ماری ہوتی رہی تھی' اس کے طفیل اس معمولی زخم کی تکلیف میں غیر معمولی اضافہ ہوا تھا' خصوصاً خوف ناک دھماکوں کے بعد جب میں نے لی یان اور سیون ایم ایم کے ساتھ باہم پیوست رول کرتے ہوئے عبادت گاہ سے باہر نکلنے کی تگ و دو کی تو کندھے کی چوٹ کے ساتھ اچھی خاصی زیادتی ہوگئی تھی۔

دھماکوں کے خیال کے ساتھ ہی یاد آیا کہ تیسرے دھماکے کے بعد یہ ہلاکت خیز سلسلہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ عبادت گاہ کے عقبی حصے کی طرف کافی دیر سے فائرنگ کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ میں نے لی یان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ستائشی لہجے میں کہا۔

''تم نے تو کمال کردیا لی یان! میں نہیں جانتا تھا کہ تم اتنی اچھی فائٹر ہو۔''

اس نے رک کر بے یقینی سے میری آنکھوں میں دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولی ''تم میرا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ رہے ہو؟''

''دل رکھنے اور رکھوانے کا معاملہ تو رہا ایک طرف۔'' میں نے قدرے شگفتہ لہجے میں کہا ''میں نے اس وقت تمہاری تعریف میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا۔''

''اوہ......'' وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''اس تعریف کا شکریہ۔ اگر تم مجھے ایک اچھی فائٹر کہہ رہے ہو تو میرے لیے یہ بات کسی سند کا درجہ رکھتی ہے۔ تم کوئی عام انسان نہیں ہو۔''

لی یان ہمارے ساتھ سنگین حالات سے تو گزر رہی تھی' اس کے ساتھ ہی ونگ ہنگ کے فون نے اس کے لیے ان حالات کو غمگین بھی بنا دیا تھا۔ شون اس کا شوہر تھا اور شوہر کی موت کسی بھی بیوی کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہوا کرتی ہے۔ میں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ڈاکٹر مونگ لی یان کو اس صدمے سے باہر لانے کے لیے ہلکی پھلکی گفتگو سے کام لے رہا تھا۔ میں نے بھی ڈاکٹر کی روش ہی کو اپنانا مناسب سمجھا اور قدرے بے تکلف انداز میں کہا۔

''لی یان! یہ خاص و عام کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ تم کس بنا پر مجھے عام انسانوں کی فہرست سے خارج کر رہی ہو؟''

وہ گڑبڑا گئی۔ رکے بغیر جلدی سے بولی ''مم...... میرا مطلب ہے تم ایک خاص' ایک منفرد شخص ہو!''

''یہ بات تو میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' یہ سوال کرتے ہوئے وہ رک گئی۔

''مطلب یہ کہ تم بھی اپنی ذات میں بہت منفرد ہو۔'' میں نے کہا جیسی انفرادیت میں نے آج تک کسی اور انسان میں نہیں دیکھی لہٰذا...... تم بھی کوئی عام نہیں بلکہ ایک خاص انسان ہو۔''

وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگی پھر الجھن زدہ انداز میں بولی ''تم میری کس انفرادیت کی بات کر رہے ہو؟''

اگر حالات نارمل ہوتے تو شاید وہ فوراً میری بات کی تہ میں پہنچ جاتی لیکن موجودہ سچویشن نے اس کے ذہن کو تلپٹ کر رکھا تھا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جسے بچے کی خواہش تو ہو لیکن وہ تعمیر اور تخلیق کے عمل کو پسند نہ کرتی ہو بلکہ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اڈاپشن کو زیادہ مناسب سمجھتی ہو!''

موجودہ حالات میں مجھے لی یان سے اس نوعیت کی گفتگو کرنا تو نہیں چاہیے تھی مگر علاج کچھ اسی قسم کا تقاضا کر رہا تھا۔ وہ جس انداز کی نفسیاتی پیچیدگی میں گھری ہوئی تھی' اس سے نکالنے کے لیے ایسا ہی کوئی موقع موثر ثابت ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر بعض اوقات مریض کی جان بچانے کے لیے اسے خطرناک آپریشن سے بھی گزارتا ہے یعنی اپنے ہاتھوں سے اس کے جسم کے کسی خاص حصے پر تیز دھار نشتر کو آزمانے میں کسی تردد اور ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ کوئی بڑا مقصد حاصل کرنے کے لیے دل کو سخت اور انداز کو سفاک بنانا پڑتا ہے۔ میں بھی لی یان کو ایک نفسیاتی عارضے سے نجات دلانا چاہتا تھا اس لیے بھی نہ چاہتے ہوئے میں نے اس خطرناک موضوع کو کھول دیا تھا۔

میری وضاحت سن کر اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑی کامیابی سے خود کو سنبھال لیا' جلدی سے بولی۔

''تم کہیں کی ہوا' اٹھا کر دہیں لے جاتے ہو!''

میں بڑی اچھی طرح سمجھ گیا تھا' وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی مگر اس کے ادا کردہ الفاظ کسی اور کے لیے قابل فہم نہیں تھے۔ بڑبڑاہٹ میں وہ ایک الجھا ہوا جملہ بول گئی تھی۔ میں نے دانستہ انجان بنتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں' تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو کچھ بھی اٹھا کر کہیں بھی نہیں رکھا!''

وہ زچ ہوتے ہوئے بولی ''میں دراصل تمہاری صلاحیتوں کی بنا پر انفرادیت کی بات کر رہی تھی۔ راستے میں آتے ہوئے تم نے جو ''چی'' کا مظاہرہ کیا ہے وہ کسی عام انسان کے بس کا روگ نہیں۔

پتا نہیں تم میں اور کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں!''

''میں محسوس کر رہا ہوں' تم بڑی خوب صورتی سے مجھے موضوع سے ہٹا رہی ہو۔'' میں نے اس کی اداس آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے کہا'' حالانکہ تم نے اٹھانے اور لے جانے والی بات کسی اور پس منظر میں کہی تھی!''

''کس پس منظر میں؟'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

یہ وہ سادگی تھی جس پر.... ہائے کر کے کوئی بھی مر سکتا تھا۔ میں نے شاکی لہجے میں کہا'' اگر تمہیں پسند نہیں تو میں آج کے بعد اس موضوع پر بات نہیں کروں گا۔''

''ایسی بات نہیں دجدان!'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی!

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس کی جان خود بہ خود چھٹ گئی۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے سے بچ گئی کیونکہ اسی وقت عبادت گاہ کے عقبی حصے میں ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی آواز گونج اٹھی تھی۔ وہ اضطراری انداز میں آگے بڑھ گئی۔

''میں نے کہا'' رک جاؤ لی یان!''

وہ رکی اور پلٹ کر حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا وجدان؟''

''تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا ہے، پتا نہیں میرے اندر کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا'' ایک گن تو یہ بھی ہے کہ میں بعض اوقات آگے بڑھنے کے موقع پر ٹھہر جایا کرتا ہوں۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا'' میں نے کہا رک جاؤ اور تم رک گئیں۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو میں کیا کہنے اور کرنے جا رہا ہوں۔''

میں نے بات کو مبہم انداز میں ختم کیا اور ایک چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ لی یان چار قدم دور کھڑی الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے مزید ایک لفظ ادا کیے بغیر

آنکھیں بند کر لیں۔

دراصل اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا تھا۔ میں کسی محفوظ اور پر سکون جگہ پر بیٹھ کر تصور کی نگاہ سے ڈاکٹر مونگ کے ماحول میں جھانکنا چاہتا تھا اور یہ جگہ اس کام کے لیے نہایت ہی موزوں تھی۔ یہاں پر ایک آدم قد چٹان کی آڑ میسر تھی۔ مجھے یقین تھا میرے تصوراتی تماشے کے دوران میں لی یان گن سونتے ریڈ الرٹ کھڑی رہتی۔

پہلے دو جگر پاش دھماکوں کے بعد جب ہم نے عبادت گاہ کو چھوڑا تھا، اس کے بعد سے مجھے ڈاکٹر مونگ کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اس وقت عبادت گاہ کے عقبی حصے میں موجود تھا۔ ہمیں ہر صورت اسی کی سمت بڑھنا تھا کیونکہ ادھر ہی کچھ فاصلے پر ہماری جیپ بھی کھڑی تھی۔ ہم نے عبادت گاہ کے اندر، ہیوی انجن والی جن گاڑیوں کی آواز سنی تھی، وہ کافی دیر سے چپ سادھے بیٹھی تھیں۔ ادھر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد ہی ان کی درست لوکیشن کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کرنے کے بعد ڈاکٹر مونگ کے خال وخط کو اپنی تیسری آنکھ کے سامنے اجاگر کیا۔ اس کا سراپا میرے تصور میں چمکا اور اگلے ہی لمحے میں اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا پینیل گلینڈ PINEAL GLAND کام کرنے لگا۔

وہ اس وقت ایک جیپ کے اندر تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں سمجھ لیا' وہ وہی جیپ تھی جس میں سفر کر کے ہم کھنڈو شہر سے یہاں پہنچے تھے۔ ہیوی انجن والی آرمی گرین کلر جیپ کو پہچاننے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ باطنی آنکھ جب کوئی منظر دکھاتی ہے تو دیکھنے والا اس منظر کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔ بھلا ہو، ماسٹر ہینگ پائی کا جس نے شاؤلن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں مجھے ''چی'' کی بیداری کے لیے خصوصی مشقیں کرائی تھیں اور وہ بھی اپنی نگرانی میں۔ ماسٹر ہینگ پائی ایک طرف سے میرا دادا استاد بھی تھا۔ میرا استاد مہاراج وانگ ونگ پائے، شاؤلن ٹیمپل میں ہینگ پائی کا شاگرد رہ چکا تھا۔ اب یہ دونوں عظیم ہستیاں آنجہانی ہو چکی تھیں۔

ماسٹر ہینگ پائی نے میرے اندر ''چی'' کے حوالے سے جو شمع روشن کی تھی، میں نے پھر اسے کبھی بجھنے نہیں دیا بلکہ ماسٹر کی بتائی ہوئی یوگا کی ایڈوانس مشقیں خود کر کے اس قوت کو پوری طرح بیدار کر لیا تھا۔ اس کے بعد اسٹروک بریدنگ کی مدد سے میں نے متحرک کر لی تھی۔ انسانی دماغ کے سامنے والے حصے میں واقع یہ گلینڈ بہت کام کی چیز ہے جسے باطنی آنکھ یا تھرڈ آئی بھی کہا جاتا ہے۔ متحرک کرنے کے بعد اس سے کام لینا آتا ہو تو انسان کو بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ پچھلی قسطوں میں گاہے بہ گاہے چی اور پینیل گلینڈ کی بیداری کے سلسلے میں، میں یوگا کی مخصوص مشقوں کے بارے میں تفصیلاً بیان کر چکا ہوں۔ یہ دونوں جوہر ہر انسان کے اندر موجود ہیں۔ اگر سچی لگن سے محنت کی جائے تو منزل ضرور حاصل ہو جاتی ہے!

یہ تمام تر خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزر گئے اور میں جیپ کے اندر حاضر ہو گیا۔ ڈاکٹر مونگ اس وقت جیپ میں اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی کیفیت کسی یرغمالی جیسی تھی۔ وہ دونوں جیپ کی عقبی نشست پر تھے۔ ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے، وہ مذکورہ شخص سے نہایت ہی اہم سوال و جواب میں مصروف تھا۔ دام میں آیا ہوا شخص مقامی نہیں بلکہ ایک سفید فام تھا اور یقیناً اس کا تعلق ہمارے دشمنوں ہی سے تھا۔

افسوس کہ میں ان دونوں کے درمیان ہونے والی مکالمت کو سن نہیں سکتا تھا۔ پینل گلینڈ کے متحرک ہونے سے میرے دماغ کا صرف ویڈیو سسٹم کام کرنے لگا تھا یعنی دماغ کے اس حصے کا ویڈیو سسٹم جو تیسری آنکھ کے معاملات کو کنٹرول کرتا تھا۔ آڈیو سسٹم کو کارآمد بنانے کے لیے پچیوٹری گلینڈ (PITUITARY GLAND) پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ اگر پچیوٹری گلینڈ بھی متحرک ہو جاتا اور ''پینل پچیوٹری لنک'' بھی قائم ہو جاتا تو میں اس ماحول میں پیدا ہونے والی تمام آوازیں بھی سن سکتا تھا جو تھرڈ آئی کے توسط سے مجھے نظر آ رہا ہو مگر محترم سانگ نو نے مجھے ایسی کسی بھی کوشش سے صاف منع کر دیا تھا اور میں...... واقعی باز آ بھی گیا تھا۔

میں تھوڑی دیر تک اس جیپ کے ماحول میں موجود رہا پھر نگاہ دوڑا کر ارد گرد کا جائزہ لیا اور......... جہاں تک میری نظر نے کام کیا، مجھے ہیوی یا لائٹ انجن والی کوئی گاڑی کھڑی دکھائی نہ دی۔ ڈاکٹر مونگ کے تیور بتاتے تھے، حالات پر اسے مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ میں مطمئن ہونے کے بعد اپنی جگہ پر حاضر ہو گیا۔

میں آنکھیں کھولی ہی تھیں کہ لی یان کے چہرے پر نگاہ گئی۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھ لیا۔ ''وجدان! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں...... میں تو یہیں تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

وہ کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''تمہارا جسم تو یہاں موجود تھا لیکن مجھے یقین ہے، ذہنی طور پر تم کہیں اور پہنچے ہوئے تھے۔''

''اچھا! میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔۔۔''تم ایسا سمجھ رہی ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا۔''

''جی'' والا معاملہ کھل جانے کے بعد وہ مجھ میں گہری دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس کا انداز کھوجنے والا ہوتا۔ تھوڑی دیر پہلے تو وہ اس شک بلکہ یقین کا اظہار بھی کر چکی تھی کہ میرے اندر بہت سے گن چھپے ہوئے ہیں۔ میرے جواب نے اس کی تشفی نہ کی اور وہ ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے مجھے تکتے ہوئے بولی۔

''تم جتنی سادگی سے جواب دے کر مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو، اتنے سیدھے اور سادے تم ہو نہیں!''

''سادہ نہیں تو پھر پیچیدہ ہوں گا!'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے بہلا رہے ہو۔'' اس کے لہجے اور نگاہ کا شک دور ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''میں کوئی تمہارا مقروض نہیں ہوں جو ٹالنے کی کوشش کروں گا اور نہ تم ننھی بچی ہو جو میں تمہیں بہلانے کے چکر میں لگ جاؤں۔ بہر حال جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی۔ یقین کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے قدم بڑھا دیے۔ وہ میری تقلید کرتے ہوئے بولی ''ہم کس طرف جا رہے ہیں؟''

''جدھر پہلے جا رہے تھے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یعنی ڈاکٹر مونگ کی طرف مگر اب لمبا چکر کاٹنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ہم براہِ راست ادھر کا رخ کر سکتے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے بولی ''یہ بات تم اتنے وثوق سے کہہ رہے ہو جیسے تم جان چکے ہو، ادھر ڈاکٹر مونگ نے صورتِ حال کو اپنے ہاتھ میں کر لیا ہے؟''

اس کی باتوں میں شک اور استفسار کی آمیزش شامل رہی۔ وہ میری اور میرے معاملات کی طرف سے مطمئن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے گول مول جواب دے کر گزارہ چلانے کی کوشش کی ہے۔

''ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے کہا ''ڈاکٹر مونگ اس وقت اپنی جیپ میں موجود ہے اور لگتا ہے اس نے ادھر بدامنی پر مکمل قابو پا لیا ہے۔''

''ایسا کیوں کر لگتا ہے؟'' اس نے گہری سنجیدگی سے کرید جاری رکھی۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہہ دیا ''میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''ریئلی؟'' وہ ایک مرتبہ پھر رک کر متجسس نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے بات بناتے ہوئے کہا ''بھئی! جب تمہیں مجھ میں چھپے ہوئے گن نظر آ ہی گئے ہیں تو یہ فرض کر لینے میں کیا حرج ہے کہ میں یہاں بیٹھے بیٹھے...... ڈاکٹر مونگ کی خبر لے آیا ہوں!''

''تم جان چھڑانے کے لیے بات کو گھما رہے ہو!''

میں نے جلدی سے کہا ''لی یان! تم ایسی تو نہیں ہو کہ تم سے جان چھڑانے کے بارے میں سوچا جائے!'' یہ بات میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہی تھی۔ ''اچھا ہوا، تم نے بات کو گھمانے کا ذکر کیا۔ اگر تم یہ کہتیں کہ میں تمہیں گھما رہا ہوں تو میں تمہارا کیا بگاڑ لیتا؟''

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی ''وجدان! تم بہت خطرناک ہو!''

''خطرناک شے سے انسان کو ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا میری معیت میں تم بھی ایسا ہی محسوس کر رہی ہو؟''

''تمہاری صحبت میں مجھے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔''

''گویا میں تمہارے لیے خطرناک نہیں ہوں۔''

''بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا، تم اپنے پہلے بیان کی نفی کر رہی ہو۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے خیال میں، میں خطرناک نہیں ہوں؟''

''پتا نہیں!'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔

''اٹس او کے۔'' میں نے اس بحث کو طول دینے سے اجتناب برتا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان بہت کم بات ہوئی زیادہ تر ہم خاموش ہی رہے۔ محتاط انداز میں چلتے ہوئے ہم عبادت گاہ کے پہلو سے گزرے اور پھر عقبی چٹان تک جا پہنچے۔ راستے میں ہمیں کسی دشمن کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، ڈاکٹر مونگ نے میدان صاف کر دیا تھا۔ زاویہ بدلنے سے چونکہ ہمارا راستہ بھی خاصی حد تک تبدیل ہو گیا تھا لہٰذا اس طرف آتے ہوئے دشمنوں کی کوئی لاش ہماری نگاہ سے نہیں گزری۔

پندرہ منٹ کی پہاڑی مسافت کے بعد ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے لیکن جیپ ہمیں خالی ملی۔ میں تصور کی نگاہ سے تھوڑی دیر پہلے اس جیپ کی عقبی نشست پر ڈاکٹر مونگ کو ایک دشمن کا خاص الخاص ''انٹرویو'' کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ میں ڈاکٹر مونگ کی جیپ میں موجودگی کے بارے میں لی یان کو بتا چکا تھا لہٰذا اس کے غیاب پر وہ بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

یہ تو ممکن نہیں تھا کہ تیسری آنکھ نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ اس آنکھ کا تعلق بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مونگ اگر جیپ میں نہیں تو اسے یہیں کہیں آس پاس موجود ہونا چاہیے تھا۔

میں نے متلاشی انداز میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو میری یہ کوشش کامیاب ہو گئی۔ وہ مجھے ایک بڑی سی چٹان کے عقب سے نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ یہ وہی محافظ چٹان تھی جس کی آڑ میں ہماری جیپ نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس چٹان کے عقب میں کچھ فاصلے پر بدھ نیل کنڈ کی وہ عبادت گاہ ایک ٹیلے پر تھی جہاں آدھی رات کے بعد اسے اب تک ہنگامہ آرائی کا سلسلہ جاری تھا۔ پتا نہیں اس سلسلے میں مزید کہاں تک دراز ہونا تھا۔ اس عبادت گاہ کے نیچے، اوپر، اندر اور باہر درجنوں افراد لقمۂ اجل بن چکے تھے اور حتمی طور پر یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ یہاں موت کی آگ کا جو الاؤ روشن ہوا تھا وہ مزید کتنے انسانوں کی زندگیوں کو چاٹ کر سرد ہوگا۔ وہ ایک انتہائی غیر یقینی صورتِ حال تھی۔

میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ اگر قدرت نے کچھ خزانوں کو زیرِ زمین پوشیدہ کر رکھا ہے تو ان کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر ہے، اس پوشیدگی میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ جب بھی ایسے مخفی خزائن کو کھوجنے اور نکالنے کی کوشش کی گئی تو ایک بڑی تباہی، ایک عظیم الشان خون ریزی سامنے آئی۔ اس تلاش و جستجو میں سب سے زیادہ نقصان انسانوں ہی نے اٹھایا اور وہ بھی ہلاکتوں کی صورت میں!

ہوس اور لالچ (کم یا زیادہ) ہر انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اسے کنٹرول میں رکھنا بڑے کمال کی بات ہے۔ جب یہ دونوں حد سے بڑھ جائیں تو پھر انسان کو سوچ منفی رخ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ زیرِ زمین پوشیدہ خزانوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے، قناعت سے زیادہ لوٹ کھسوٹ پر توجہ دیتا ہے اور کسی ایسی طاقت کے حصول میں سرگرداں نظر آتا ہے جس کے بل بوتے پر وہ پوری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے پر قادر ہو جائے۔ اس خواہش کے لیے خاص و عام یا ادنیٰ و اعلیٰ کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایسا شخص کوئی ایرا غیرا۔ نتھو خیرا بھی ہو سکتا ہے اور ربی موشے ہائمن بھی!

مجھ پر نگاہ پڑی تو ڈاکٹر مونگ چونکا نہیں بلکہ نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے وہ ہمارے قریب پہنچا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''دشمن کا ایک مفید بندہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر ادھر آ رہا ہوں۔ تم دونوں تو خیریت سے ہونا؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور کہا ''محسوس کر رہا ہوں، تم اس مفید بندے سے فارغ ہو کر نہیں بلکہ اسے فارغ کر کے آ رہے ہو تھوڑی دیر پہلے تم جس کا انٹرویو، جیپ کی عقبی نشست پر لے رہے تھے!''

''ہاں! ایسی ہی بات ہے۔'' وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''اس دشمن کا نام کلارک تھا۔ میں نے اس انٹرویو میں کلارک سے بہت اہم باتیں اگلوائی ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آؤ جیپ کے اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ہم بھی اس طرف دو دشمنوں کو زندگی مگر بے چارگی کے عالم میں چھوڑ آئے ہیں۔ ایک اپنی حرکتوں کی وجہ سے فنا کے گھاٹ اتر گیا۔''

''میں نے اس طرف آٹھ دس افراد کو موت کا مزہ چکھایا ہے۔'' ڈاکٹر مونگ نے جیپ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا ''لگتا ہے، یہاں پر موجود سب دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ کلارک بھی مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے جا ملا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں توقف کیا تو میں اس کے استفسار پر اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ وہ اضافہ کرتے ہوئے بولا ''تم جن دو افراد کو لولا لنگڑا بنا کر وہاں چھوڑ آئے ہو، میں انہیں بھی دیکھ لوں گا تم فکر نہ کرو، یہاں کے حالات لارڈ بدھا کے منشا سے قابو میں ہیں۔''

''اگر تمہاری طرف آنے کی جلدی نہ ہوتی تو میں بھی ان دو ''معذوروں'' سے ضرور پوچھ تاچھ کرتا۔'' میں نے کہا ''ویسے وہ ایسی کسمپرسی میں وہاں پڑے ہیں کہ ان کی طرف سے کسی نوعیت کی مزاحمت کے امکانات صفر کے برابر ہیں۔ تم کافی دیر سے غائب تھے اس لیے بھی ہم اس طرف آ گئے۔ لی یان تمہارے لیے بہت پریشان ہو رہی تھی!''

وہ لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا ''وجدان! مجھے امید ہے، تم نے اسے زیادہ پریشان نہیں ہونے دیا ہوگا؟''

اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو، میں نے اسے زیادہ پریشان نہیں کیا ہوگا؟

میں نے ایک نظر لی یان پر ڈالی اور جلدی سے کہا ''بالکل نہیں ڈاکٹر!''

''ہوں!'' وہ معنی خیز انداز میں ہنکاری بھر کر رہ گیا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا ''وہ گاڑیاں کہیں نظر نہیں آرہیں جن کے طاقتور انجنوں کی مخصوص غراہٹ ہم نے عبادت گاہ کے اندر سنی تھی۔ ان گاڑیوں کو یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا!''

''ہاں، وہ دونوں جیپیں اس چٹان کی دوسری طرف کھڑی ہیں، اپنے خوابیدہ انجنوں سمیت۔'' ڈاکٹر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آؤ، تمہیں بھی دکھادوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گیا۔ میں اور لی یان بھی اس کی تقلید میں قدم اٹھانے لگے۔ ہم چٹان کی دوسری جانب پہنچے تو دو لینڈ کروزر جیپ وہاں نظر آگئیں۔ دونوں کے اندر نصب ہیوی انجن اس وقت خاموش تھے۔ ان جیپوں سے چند فٹ آگے گہرا نشیب تھا جس کی گہرائی ہزاروں نہیں تو سیکڑوں فٹ ضرور تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر مونگ نے کلارک کو اسی عمیق گڑھے کے سپرد کیا ہوگا۔ ہم نے اپنی جیپ کو اس چٹان کی اوٹ میں ایسے کھڑا کیا تھا کہ وہ عبادت گاہ کی سمت سے دکھائی نہ دے جب کہ وہ دونوں جیپیں عبادت گاہ کے رخ پر اس چٹان کی دوسری طرف ٹھہرائی گئی تھیں اسی لیے جب میں نے ڈاکٹر کے ماحول میں جھانکا تو مذکورہ جیپیں مجھے نظر نہیں آئی تھیں اور ہم چونکہ ذرا گھوم کر اس طرف آئے تھے اس لیے بھی وہ جیپیں ہماری نگاہ میں نہ آسکیں۔ اس امر میں کسی شک وشبہے کی گنجائش ڈھونڈنا ممکن نہیں تھا کہ وہ دونوں جیپیں ہمارے والے راستے پر سفر کرتے ہوئے اس چھوٹے سے مسطح میدان تک پہنچی تھیں...... چنانچہ ہماری جیپ ان لوگوں سے چھپی نہیں رہی ہوگی۔

ہم ایک مرتبہ پھر چلتے ہوئے اپنی جیپ کے قریب پہنچے۔ ڈاکٹر مونگ نے ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھولا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ جیپ میں سوار ہونے جارہا ہے لیکن اگلے ہی لمحے میرا اندازہ غلط ثابت ہوگیا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وجدان! تم ڈرائیونگ سیٹ پر آجاؤ۔''

میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔

ڈاکٹر مونگ کا اشارہ پا کر لی یان پسنجرز سیٹ پر آبیٹھی تو ڈاکٹر عقبی نشست والا دروازہ کھول کر جیپ کے اندر آگیا۔ میں نے اپنے وجود پر لٹکی ہوئی سیون ایم ایم کو اتار کر ڈیش بورڈ کے نیچے واقع خفیہ خانے کی طرف بڑھایا تو چونک اٹھا۔ دوسری سیون ایم ایم وہاں پہلے سے موجود تھی۔ یقیناً ڈاکٹر ہی نے وہ گن وہاں رکھی تھی۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ڈاکٹر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ''تو گویا تم نے اس گن کو اس ''محفوظ مقام'' سے نکال ہی لیا۔ یقیناً اسی گن کے بل بوتے پر تم نے درجن بھر دشمنوں کو ٹھکانے لگایا ہے؟''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے کہا ''ڈاکٹر! تم ہمیں کلارک کے بارے میں کچھ بتانے جارہے تھے؟''

وہ چند لمحے گمبھیر انداز میں خاموش بیٹھا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہمیں کلارک سے حاصل ہونے والی معلومات سے آگاہ کرنے لگا۔ کلارک ان تمام افراد میں سب سے سینئر تھا جو ان دو ہیوی لینڈ کروزر جیپوں میں وہاں پہنچے تھے۔ وہ لگ بھگ ایک درجن افراد تھے اور اپنے ساتھیوں کی مدد کو آئے تھے جو نصف شب سے قبل عبادت گاہ کے تہ خانے میں ایک خاص مشن، جمی فونڈا کی سرکردگی میں انجام دے رہے تھے۔ جس طرح جمی فونڈا اپنے درجن بھر ساتھیوں کے ہمراہ اس وقت سفرِ آخرت پر روانہ ہوچکا تھا بالکل اسی طرح کلارک کے ساتھ بھی واقعات پیش آئے تھے۔ کلارک اور جمی فونڈا ایک سی حیثیت کے مالک تھے اور ڈین ہاردے ان کا باس تھا۔

ڈین ہاردے کی طرف سے اسے خصوصی ہدایت تھی کہ وہ لوگ عام گزرگاہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے راستے سے اپنے ٹارگٹ تک پہنچیں۔ کلارک نے اپنے باس کے حکم کی تعمیل کی اور جب وہ لوگ یہاں پہنچنے کے بعد اپنی جیپوں سے باہر نکلے تو انہیں ایک دہشت ناک اور غیر متوقع صورتِ حال سے واسطہ پڑا۔ وہ جیسے ہی عبادت گاہ کی طرف بڑھے، ایک سماعت شکن دھماکے نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ وہ بوکھلا کر رہ گئے۔ اسی اثنا میں دوسرا دھماکا بھی ہوگیا۔ کلارک نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو احکام صادر کیے کہ وہ لوگ پھیل کر عبادت گاہ کی جانب بڑھیں اور دشمنوں کو کچل کر رکھ دیں۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر؟'' میں قطع کلامی پر مجبور

ہوگیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''کیوں، کیا ہوگیا؟''

ڈاکٹر کے انکشاف نے میرے ذہن میں ہلچل مچادی تھی۔ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا، وہ تینوں دھماکے ہمارے نو وارد دشمنوں کا کارنامہ ہیں لیکن ڈاکٹر تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ تین خوفناک دھماکے ہم تینوں میں سے کسی نے نہیں کیے تھے۔ کلارک بھی اگر ان دھماکوں کی ذمّے داری قبول نہیں کررہا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا، وہ دھماکے آخر کس نے کیے؟''

میرے سوچنے کے دوران میں ڈاکٹر کھب جانے والی نگاہ سے یک ٹک مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے الجھن بھرے لہجے میں استفسار کیا ''میں تو یہی سمجھ رہا تھا، وہ دھماکے آنے والے دشمنوں نے کیے ہیں۔ اگر انہوں نے نہیں کیے تو پھر اس کا ذمّے دار کون ہے؟''

''تمہاری طرح میرا بھی یہی خیال تھا'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''لیکن کلارک کے بیان نے ہمارے اس خیال کی تردید کردی ہے۔''

میں نے اپنے سوال کو دہرایا ''پھر ان دھماکوں کی ذمّے داری کس کے کھاتے میں جائے گی؟''

''لارڈ بدھا ہی بہتر جانتا ہے'' وہ پُرسوچ انداز میں گویا ہوا۔

ڈاکٹر مونگ جب گفتگو کے دوران میں لارڈ بدھا کو لے کر آتا تھا تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا تھا، اب وہ کسی سوال کا واضح جواب نہیں دے گا۔ میں ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ چند لمحات کے گمبھیر توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا...... کلارک کے احکام کی تعمیل میں وہ درجن بھر افراد دو تین سمت سے عبادت گاہ کی طرف بڑھے تاکہ اپنے ساتھیوں کی خیر گیری کرسکیں۔ دھماکوں نے انہیں گہری تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ عبادت گاہ کی جانب چند قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ تیسرا دھماکا ہوگیا۔ اس دوران میں ہم عبادت گاہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ وہ لوگ ہمارے حصے میں آکر موت سے ہمکنار ہوتے چلے گئے۔ بس اتنی ہی بات ہے!''

ڈاکٹر تو ''بس اتنی سی بات'' کہہ کر خاموش ہوگیا لیکن میرا ذہن پہلے سے بھی زیادہ الجھ گیا۔ اب یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ دھماکے اپنی مرضی سے خود بہ خود ہی ہوگئے ہوں۔ ان کا کوئی محرک، کوئی مقصد تو ضرور تھا اور مجھے یقین تھا، اس محرک اور مقصد سے ڈاکٹر مونگ بہ خوبی آگاہ تھا مگر اس وقت ڈاکٹر کی زبان سے کچھ اگلوانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ بس اطمینان بخش بات یہی تھی کہ ان تینوں دھماکوں میں ہم تینوں کو کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچا تھا اور مجھے یقین تھا، عبادت گاہ بھی اندر اور باہر سے محفوظ رہی تھی۔ ہمارے نو وارد دشمن سراسر گھاٹے میں رہے تھے۔ ڈاکٹر مونگ کے مطابق، ان دھماکوں کے بارے میں اگر لارڈ بدھا ہی بہتر جانتا تھا تو اس میں مجھے کوئی اعتراض کیوں ہوتا؟

میں نے کہا ''کلارک نے اور کیا کیا بتایا ہے؟''

''اس نے زیادہ تر وہی باتیں بتائی ہیں جو ہم جمی فونڈا سے معلوم کرچکے ہیں'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''کلارک نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ڈین ہاردے ایک دل کش یہودن کے ہمراہ کل صبح ہی اسرائیل سے یہاں پہنچا ہے۔ وہ دونوں جوگندر پال کے اسی ٹھکانے پر قیام پذیر ہیں جو اسرائیل ایمبیسی کے عقب میں، شہر کے پوش علاقے میں واقع ہے۔''

میں نے پُرخیال انداز میں کہا ''تو گویا کلارک نے جمی فونڈا سے بڑھ کر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس خبیث جمی فونڈا نے تو دل کش یہودن کا ذکر گول ہی کردیا تھا!''

میرے اس اظہار پر ڈاکٹر فونگ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''ڈین ہاردے کے ساتھ یہاں پہنچنے والی یہودن کا کیا نام ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''کلاڈیا!'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''کیا کلارک نے میری ساحل کے بارے میں بھی کچھ بتایا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''پھر بھی...... کوئی عام بات ہی سہی......؟'' میں گویا مچل کر رہ گیا۔

ڈاکٹر اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا ''کلارک اور جمی فونڈا، ڈین ہاردے سے احکام لینے کے پابند تھے۔ انہیں گاہے بہ گاہے جوگندر پال والے اس بنگلے پر طلب کرلیا جاتا، جہاں ڈین ہاردے ٹھہرا ہوا ہے۔ گزشتہ رات نو بجے جمی فونڈا نے ساحل کو ہائی وے والی بستی سے ڈین ہاردے کے پاس پہنچایا تو کلارک بھی وہاں موجود تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد جب ڈین ہاردے نے جمی فونڈا کو عبادت گاہ کی طرف روانہ کیا تو کلارک اس وقت بھی اسی بنگلے میں تھا لیکن یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ ڈین ہاردے عبادت گاہ کے تہ خانے تک رسائی کا راز جان گیا ہے اور وہ یہ بات بھی نہیں جانتا تھا

کہ جمی فونڈا کو کس نوعیت کی چڑھائی کے لیے عبادت گاہ کی طرف بھیجا جا رہا ہے'' ڈاکٹر لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے بولا۔

''جب کلارک انتہائی ایمرجنسی میں خصوصی ہدایات کے ساتھ عبادت گاہ کی طرف روانہ ہو گیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ لوگ جمی فونڈا وغیرہ کی مدد کے لیے جا رہے ہیں۔''

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا ''کسی شخص کو مشکل یا مصیبت میں دیکھ کر اس کی مدد کی جاتی ہے۔ اگر کلارک کو کسی ایمرجنسی میں ادھر بھیجا گیا تھا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، ڈین ہاروے یہاں کی صورت حالات سے کافی حد تک آگاہ ہے۔ اگر آگاہ نہیں بھی ہے تو کم از کم اسے یہاں ہونے والی کسی گڑبڑ کا احساس ضرور ہے۔ میں تصور میں اس شخص کو گہری تشویش میں دیکھ رہا ہوں۔''

''میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے، عبادت گاہ پر ایک اور چڑھائی بھی ہو سکتی ہے۔ کلارک اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ بھی ہم نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ ڈین ہاروے بڑا باخبر اور اونچی شے ثابت ہو رہا ہے۔ وہ یہاں کے تازہ ترین حالات سے بھی آگاہی حاصل کر سکتا ہے جس سے اس کی تشویش میں کئی ہزار گنا اضافہ متوقع ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں، یہاں خون ریزی کا ایک نیا باب کھلنے والا ہے!''

''تم بے فکر رہو۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا'' ڈاکٹر موننگ نے پورے تیقن سے کہا۔

میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہاں کے حالات کے بارے میں اگر اتنا ہی مطمئن اور پر یقین تھا تو یہ کچھ بے سبب نہیں تھا۔ یقیناً اس کے ذہن میں میدان کا کوئی خاص نقشہ پوری جزئیات کے ساتھ کھلا ہوا تھا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔

''ڈاکٹر! تمہارے اطمینان کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا ہے جیسے تمہیں کوئی بھرپور مدد حاصل ہو گئی ہو؟''

''میں لارڈ بدھا کی مدد پر یقین رکھتا ہوں'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

ڈاکٹر موننگ ایک راسخ العقیدہ شخص تھا۔ انسان کا تعلق چاہے کسی بھی مذہب و ملت سے ہو، اپنے مذہب کے بیان کردہ اوصاف میں ڈھلنے اور اس کے ثمرات سے خاطر خواہ استفادہ کرنے کے لیے راسخ العقیدہ ہونا بہت ضروری ہے۔

لارڈ بدھا، ڈاکٹر موننگ کی کس طرح مدد کرتا تھا، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تاہم یہ میرے دیکھنے میں ضرور آیا تھا کہ بدھا کے معاملے میں وہ شخص عین الیقین تک پہنچا ہوا تھا۔

میں نے گفتگو کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے ڈاکٹر سے پوچھا ''تم نے عبادت گاہ کے اندر کہا تھا، صرف دس منٹ اور رک جاؤ۔ اس کے بعد ہم ساحل کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ تمہیں شیوا کی بھیجی ہوئی کمک کا انتظار تھا لیکن اب تو اس بات کو کئی ''دس منٹ'' گزر گئے ہیں۔ ہم کب تک اس کمک کے انتظار میں بیٹھے رہیں گے میں فوری طور پر ساحل کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''اور تمہیں اب ایسا ہی کرنا ہوگا۔''

ڈاکٹر کے انداز نے مجھے ٹھٹکا دیا ''اب ایسا ہی کرنا ہوگا کیا مطلب؟'' میں نے قدرے احتجاجی لہجے میں کہا ''کیا اس سے پہلے میں کچھ اور کر رہا تھا؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''میں یہ کہنا چاہ رہا تھا، تم پہلی فرصت میں کھٹمنڈو کی طرف روانہ ہو جاؤ۔'' پھر اس نے جیپ کی چابیاں اپنی جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔

میں نے سوالیہ نظر سے پہلے چابیوں کے گچھے کو اور پھر ڈاکٹر موننگ کو دیکھا۔ اس کے جملے سے واضح تھا کہ وہ میرے ساتھ آگے بڑھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر موننگ کا یہ فیصلہ میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ میں نے چابیوں والے گچھے کو چھوئے بغیر اس سے پوچھا۔

''اور تم......؟''

میرے اس دو لفظی جملے میں ستر صفحات کے برابر استفسار موجود تھا۔ وہ ایک لمحے تک میری آنکھوں میں دیکھنے کے بعد بولا۔ اس کی آواز میں قطعیت شامل تھی۔

''مجھے کم از کم ایک ہفتے تک یہاں رکنا ہوگا!''

نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ قدرے طنزیہ ہو گیا۔ ''کیا شیوا کی طرف سے آنے والی کمک ایک ہفتے کے بعد یہاں پہنچ پائے گی؟''

''ایسی بات نہیں'' اس کی سنجیدگی اور لہجے کے اٹل پن میں شمہ برابر کمی واقع نہ ہوئی ''شیوا والی کمک تو کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔ میرا ایک ہفتے تک یہاں رکنا اس لیے ضروری ہے کہ میں اس عبادت گاہ کو یونہی بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ میں یہاں کے انتظامات کو اچھی شکل دینے کے

بعد ہی یہاں سے رخصت ہوں گا۔ زندگی رہی اور لارڈ بدھا کی مرضی ہوئی تو ہم کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں دوبارہ ملیں گے۔''

میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''تو تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ آج ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، چاہے عارضی طور پر ہی سہی!''

''یہی حقیقت ہے'' وہ بہ دستور گمبھیر آواز میں بولا ''تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے وہاں کھٹمنڈو میں تمہاری مدد اور تعاون کا بھرپور بندوبست کر دیا ہے۔ تمہیں اپنے مشن میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ انسپکٹر شیوا اور جانوس تمہاری خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے خاص طور پر جانوس کو تمہارے بارے میں بریفنگ دے دی ہے۔ تم اس کی طرف سے اپنا دل صاف رکھو۔ وہ برا آدمی نہیں ہے۔ میں نے اسے خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ اب تمہیں کسی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

میں گہری نظر سے ڈاکٹر موننگ کے چہرے پر موجود تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اس وقت حد سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر موننگ کا محتاج تھا۔ میں اس کے ساتھ مل کر اس لیے آگے بڑھ رہا تھا کہ ہمارے مقاصد نے قدم سے قدم ملا رکھا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا، اب ہمارے مقاصد کے بیچ اچھا خاصا فاصلہ حائل ہو چکا تھا۔ اس حقیقت کا ادراک ہونے کے باوجود بھی میں ڈاکٹر موننگ سے شکوہ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ڈاکٹر!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تم نے تھوڑی دیر پہلے کہا ہے، کھٹمنڈو میں مجھے اپنے مشن میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا'' ''اپنے مشن'' کے الفاظ تم نے ایسے استعمال کیے ہیں جیسے یہ صرف میرے اکیلے کا مشن تھا، تم خواہ مخواہ میرے ساتھ اپنا وقت برباد کرتے پھر رہے تھے!''

لی یان اس گفتگو کے دوران میں ہکا بکا کبھی ڈاکٹر موننگ کی صورت دیکھ رہی تھی۔ گاڑی کی چابیوں والا گچھا ہنوز ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے ابھی تک اس کی جانب اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔ میں پہلے ڈاکٹر کی سننا چاہتا تھا۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو پہلی مرتبہ میرے سامنے آ رہا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے وجدان!'' وہ میری شکایت کے جواب میں بڑی رسان سے بولا ''اب تک یہ ہم دونوں کا مشترکہ مشن تھا اسی لیے محترم سانگ فو کی خواہش تھی کہ ہم شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھیں مگر یہاں پہنچ کر ہمارے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ سانگ فو کی خواہش کی تکمیل ہو گئی۔ یہ میرے لیے بڑی خوشی، اعزاز اور فخر کی بات ہے۔''

میں دل میں کچھ نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ''کیا ہمارے راستے اس لیے جدا ہو گئے کہ اس تجربے سے تمہیں اور تمہارے بڑوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کسی بھی ذریعے سے عبادت گاہ کے تہ خانے میں اترنے کا طریقہ معلوم کر لے پھر بھی وہ اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تہ خانے میں پوشیدہ گراں قدر خزانہ ہر حال میں محفوظ رہے گا؟''

وہ خفیف سا مسکرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لارڈ بدھا کی قسم! مجھے اور میرے بڑوں کو اس بات کا یقین تو پہلے ہی سے تھا۔''

''پھر اس جوائنٹ وینچر کی کیا ضرورت تھی؟'' میری آواز قدرے بلند ہو گئی۔

''یہ دلائی لاما کی خواہش تھی۔''

''دلائی لاما!'' میں اچھل پڑا ''پہلے تم اسے سانگ فو کی خواہش کہہ رہے تھے۔ اب اسے دلائی لاما سے منسوب کر رہے ہو؟''

''محترم سانگ فو کی خواہش دلائی لاما کی مرضی کے سبب ہی تھی'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ڈاکٹر موننگ بہ وقت رخصت انکشاف پر انکشاف کیے جا رہا تھا۔ میرے لیے وہ تمام تر باتیں انتہائی اہم اور دلچسپ تھیں۔ اپنی معلومات کو دور تک پہنچانے کی خاطر میں نے پوچھ لیا۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر! میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں کہ دلائی لاما کی خواہش پر ہی سانگ فو نے عمل کرتے ہوئے ہمیں اس مشن کے لیے چن لیا تھا لیکن حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے میں یہ اندازہ قائم کر رہا ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی پیش آیا، اس کے بارے میں تمہیں پہلے سے خبر تھی؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''میری معلومات کے مطابق، تم ہر قسم کی ہدایات اور احکام سانگ فو سے لیا کرتے تھے۔ محترم سانگ فو کی موت کے بعد اپنے حلقے میں تم سب سے بڑے ہو۔ لی یان، دنگ ہنگ اور دیگر لوگ تمہیں اپنا بڑا مانتے ہیں لیکن میں

محسوس کر رہا ہوں کہ تم بھی کسی اور بڑے کے زیر سایہ چل رہے ہو" میں ایک لمحے کو رکا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"کیا تم دلائی لاما سے براہِ راست رابطے میں ہو؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" وہ بات کو گھماتے ہوئے بولا۔

میں نے اصراری انداز میں کہا "مجھے فرق پڑتا ہے، تم میری تسلی کی خاطر ہی بتا دو؟"

"پلیز وجدان!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا "بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

ان لمحات میں ڈاکٹر مونگ مجھے بہت ہی مجبور اور بے بس نظر آیا۔ میں نے اس کا خیال کرتے ہوئے اپنی ضد کے ہتھیار پھینک دیے اور معتدل لہجے میں کہا۔

"چلو اتنا ہی بتا دو، دلائی لاما مجھے اس مشن میں کیوں رکھنا چاہتا تھا۔ میرا اشارہ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے والے معاملات کی طرف ہے؟"

"وہ تمہیں ایک آزمائش سے گزارنا چاہتا تھا۔" وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "مبارک ہو کہ تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے ہو۔"

"آزمائش...... امتحان......!" میں بے ساختہ بولتا چلا گیا "پتا نہیں، تم کیا کہہ رہے ہو؟"

اس نے کہا "متحرم دلائی لاما یہ ثابت کرنا چاہتا تھا، تم ایک سچے اور کھرے انسان ہو۔ تمہارا مقصد نیک اور جستجو راسخ ہے۔ تم جس راہ پر چل رہے ہو، اس مسافرت کی اہلیت رکھتے ہو۔"

میں نے قطعی لہجے میں کہا "ڈاکٹر! تم بات کو الجھا کر پیش کر رہے ہو۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ دلائی لاما مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کر چکا ہے پھر اس کھٹ راگ کی کیا ضرورت تھی؟"

"ضرورت تھی جبھی تو یہ کھٹ راگ پھیلایا گیا ہے" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں؟" میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔

وہ چند لمحات تک گہری نظر سے مجھے تکتا رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "وجدان! تم ایک بدھ مت لڑکی کے عشق میں گرفتار ہو، دھنو سے محبت کے دعوے دار ہو" وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں بولتے ہوئے ساحل سے دھنو پر آ گیا تھا "متحرم دلائی لاما کے چند قریبی افراد کو تمہاری اس جسارت پر سخت اعتراض ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عبادت گاہ کے تہ خانے کے حوالے سے دلائی لاما نے تم پر بھرپور اعتماد ظاہر کیا ہے۔ ایک غیر بدھ مت پر دلائی لاما کی ایسی نوازش انہیں پسند نہیں آئی۔ کسی میں اتنی ہمت تو نہیں ہے کہ وہ اپنے اعتراضات اور ناپسندیدگی کو براہ راست دلائی لاما کے سامنے پیش کرے مگر دلائی لاما اس قسم کی غلط فہمیوں کو پالنے کا قائل نہیں۔ اس نے اپنے قریبی معترض افراد پر تمہاری اہلیت ثابت کرنے کے لیے تمہیں اس آزمائشی مشن میں ڈالا تھا اور تم اس کڑے امتحان میں سرخرو ہو گئے تمہاری کامیابی نے بدخواہوں کے منہ بند کر دیے۔ ایک طرح سے اب تمہیں ایک سند سی مل گئی ہے۔ اعتراض کرنے والوں پر واضح ہو گیا کہ دلائی لاما نے تم پر اعتماد کر کے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔"

وہ ذرا دیر کو متوقف ہوا پھر قدرے تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "وجدان! یہاں بیٹھ کر وقت برباد نہ کرو۔ تمہیں فوراً ساحل کی طرف روانہ ہو جانا چاہیے۔" بات ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر چابیوں والا گچھا میری جانب بڑھا دیا۔

اس بار میں نے اس کے ہاتھ سے مذکورہ گچھا تھام لیا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "وجدان! تمہارے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ محترم دلائی لاما نے نہ صرف یہ کہ تم پر اعتماد کیا بلکہ اس اعتماد کو تجربے کے عمل سے گزار کر تمہیں اہل اور سچا ثابت بھی کر دکھایا ہے۔ تم نے عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ خزانے کی حفاظت کے لیے جس طرح سرگرمی دکھائی وہ بہت اہمیت کی حامل ہے۔ میں ساحل کے حصول کے لیے مزید تمہارا ساتھ دیتا لیکن میرے فرائض کچھ اور تقاضا کر رہے ہیں۔ تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا، متحرم سانگ نو کے بعد میری ذمے داریوں میں کس قدر اضافہ ہو گیا ہے......"

"اس سلسلے میں تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ڈاکٹر!" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "ہر شخص کو اپنی ذمے داریوں کی طرف دیکھنا چاہیے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ ہم آج سے اپنی اپنی راہ کے ہو گئے اور اپنی راہ پر چل کر ہم اپنے فرائض کو زیادہ احسن طریقے سے پورا کر سکیں گے۔ تم نے اس سلسلے میں اب تک میری بہت مدد کی ہے میں اس کے لیے تمہارا شکر گزار ہوں۔"

بات کے اختتام پر میری آواز بھرا گئی۔ ڈاکٹر مونگ ریفوشے کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کا بہت اچھا وقت گزارا تھا اور اس دوران میں مجھے بہت کچھ سمجھنے اور سیکھنے کا

موقع بھی ملا تھا۔ میری آواز کی بھراہٹ اسی تعلق کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر سے جدائی کا مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ وہ میرے لیے ایک دوست استاد کی حیثیت رکھتا تھا۔

"وجدان!" وہ بڑی محبت سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ میرا فرض تھا اور اوپر سے مجھے اس کی خصوصی ہدایت کی گئی تھی میں نے تمہارے ساتھ جو وقت گزارا ہے، اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تم ایک عظیم اور مخلص دوست ہو، میں لارڈ بدھا سے التجا کروں گا کہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیابی ملے!"

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، میرے "مقصد" سے اس کی کیا مراد ہے۔ وہ یقیناً ساحل کے حصول کا ذکر کر رہا تھا۔ اس کے خلوص، محبت اور ہم دردی کو دیکھتے ہوئے بے اختیار میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔

"ڈاکٹر مونگ! تمہارے خیال میں، میں کب تک اپنے مقصد کو پا لوں گا؟"

اس نے ایک گہری سانس کھینچی اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں منتظر استفساریہ نظر سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ پتا نہیں، وہ میرے اضطراری سوال کے جواب میں کیا کہنے والا تھا۔ جس شے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ ہو اس سے متعلق خواہ مخواہ تجسس ابھرتا ہے۔ میں ساحل کی تلاش میں در در کی خاک چھان چکا تھا اور پتا نہیں، اور کتنے نگر دگلی کوچے مجھے جھانکنا تھے۔ وہ ہستی میرے قریب آ کر اچانک دور ہو جاتی تھی۔ ایک لمحے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اگلے لمحے میں اسے پا لوں گا لیکن وہ اگلا لمحہ آنے میں کئی گھنٹے، دن، ہفتے اور مہینے گزر جاتے۔ ان لمحات کے چکر میں، مجھے لمحے بھر کا سکون میسر نہیں تھا۔ وہ ہر وقت میری نگاہ میں پھرتی رہتی، اس کا سراپا میری سوچ کا پیز لفظ بن گیا تھا۔ میں اس کے بغیر کچھ بھی نہیں سوچ سکتا تھا...... کچھ بھی تو نہیں! اس کے تصور سے خالی ایک لائن سوچنا سوہان روح تھا۔ میں ایک ایک سانس اس کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ وہ میری زندگی کا ماحصل بن گئی تھی اس لیے...... ڈاکٹر نے مجھے ایک بہت بڑی دعا دی تو بے ساختہ میری زبان سے یہ سوال پھسل گیا۔

ڈاکٹر نے آنکھیں کھولیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "دیکھو وجدان! میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تم کب ساحل کو حاصل کرو گے مگر اس بات کا مجھے پکا یقین ہے کہ ساحل...... وہ لڑکی جس کا نام کبھی دھنو ہوا کرتا تھا، وہ اب صرف اور صرف تمہاری ہے۔ اسے تمہارے نام لکھ دیا گیا ہے۔ تم ایک نہ ایک دن اس کو ضرور پا لو گے" اتنا کہہ کر اس نے ذرا دیر کو خاموشی اختیار کی پھر پُرخیال انداز میں بولا۔

"متحرم دلائی لاما کسی عام آدم کو آزمائش سے نہیں گزار سکتا۔ وہ دنیا میں بسنے والے تمام بدھ...... افراد کے لیے مذہبی اور روحانی پیش وا کی حیثیت رکھتا ہے۔ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد بھی متحرم کی علمیت اور مقام و مرتبے کو تسلیم کرتے ہیں۔ تمہارے ساتھ متحرم کا رویہ اور سلوک خاص الخاص ہے۔ جب اس نے اپنے قریبی اہم افراد پر تمہاری اہلیت ثابت کی ہے تو اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ وہ تمہارے معاملات کو بہ راہ رست دیکھ رہا ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا کہ لارڈ بدھا م تم پر مہربان ہو، تم اپنی منزل کو پا لو!"

ڈاکٹر مونگ نے بڑے نپے تلے اور محتاط الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میرے معاملے کو دلائی لاما کی تائید حاصل ہے۔ یہ ایک حوصلہ افزا بات تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ایک نہ ایک دن ہجر و فراق کے یہ شب و روز کٹ جائیں گے میرے اور ساحل کے بیچ حائل فاصلے مٹ جائیں گے اور ہمارے وصال کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی!

ان لمحات میں، متحرم سانگ نو سے ہونے والی پہلی اور آخری ملاقات میری نگاہ میں گھوم گئی۔ اس ملاقات میں، میں نے اپنی زندگی کی نہایت ہی اہم گفت گو کی تھی۔ دیگر امور کے علاوہ ساحل کا معاملہ بھی زیر بحث آیا تھا۔ متحرم سانگ نو نے بھی مجھے ساحل کا سچا طلب گار تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا...... ساحل کا حصول اگر چہ آسان نہیں لیکن تمہارے عزم اور مستقل مزاجی سے کچھ بعید بھی نہیں پھر اس نے مجھے ایک بزرگانہ مشورہ دیا تھا...... جب تم ساحل کو حاصل کر لو تو اس کی قدر کرنا، اس نے تمہاری خاطر بہت صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ میں ساحل کا ایک بزرگ ہونے کے ناتے اسے تمہارے سپردگی میں دیتا ہوں۔ ساحل کے کرتا دھرتا محترم سانگ نو اور محترم دلائی لاما مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے اس کا حق دار تسلیم کر چکے تھے۔ یہ اس بات کی نادیدہ سند تھی کہ ایک روز اپنی ساحل کو ضرور پا لوں گی۔

ان مسرت انگیز خوش آئند خیالات نے میرا انگ انگ مہکا دیا۔ میں ساحل کی خوش بو کو اپنے وجود میں چکراتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے میں اس کے ماحول میں سانس لے رہا ہوں۔ واقعی، میرا ماحول اس لڑکی سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتا تھا!

ڈاکٹر مونگ کی سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی آواز نے مجھے ان نشاط انگیز خیالات سے چونکا دیا، وہ کہہ رہا تھا "وجدان!

عبادت گاہ کے تہ خانے میں شیوا سے بات کرنے کے بعد میں نے جانوس سے بھی رابطہ کیا تھا۔ میں نے اسے تمہارے حوالے سے خصوصی ہدایات دی ہیں۔ وہ تمہارے حکم پر کھٹمنڈو میں ہر قسم کا بندوبست کردے گا۔ تمہیں جس شے کی ضرورت ہوگی، فوراً مہیا کردے گا تم وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اسی سے ملنا، پھر سوچ سمجھ کر مضبوط پلاننگ کے ساتھ ساحل کی طرف قدم بڑھانا۔ تم جانوس کے فون نمبرز وغیرہ نوٹ کرلو۔"

اس کے بعد ڈاکٹر نے مجھے جانوس کا سیل نمبر اور دوسرے فون نمبرز نوٹ کروادیے اور بولا۔ "کھٹمنڈو تمہارا دیکھا بھالا شہر ہے۔ مجھے امید ہے، تمہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

میں نے اس بار جانوس کے حوالے سے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا اور ڈاکٹر کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کرنے کے بعد گفت گو کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے ڈاکٹر! موشے ہائمن ان پے درپے .... ناکامیابیوں کے بعد ٹھنڈا ہوکر بیٹھ جائے گا؟"

وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا "پوری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے اور اس میں بسنے والے انسانوں کو اپنے حکم کا غلام بنانے کا خیال آسانی سے اس کے ذہن سے محو نہیں ہوسکتا۔ ان پانچ نادر الوجود لاثانی پتھروں کا حصول اسے کروٹ کروٹ بے قرار رکھے گا۔"

"اس کا مطلب ہے، وہ پھر عبادت گاہ پر کسی نئے انداز میں چڑھائی کرے گا؟" میں نے ایک خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اس بات کے روشن امکانات ہیں" ڈاکٹر نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "لیکن مجھے یقین ہے، ہر مرتبہ اسے منہ کی کھانا پڑے گی، اگر اس کے دل سے ان پتھروں کے حصول کی خواہش رخصت نہ ہوئی تو پے در پے ناکامیابیوں کے بعد ایک دن وہ خود اس دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔"

"ہوں!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا "میرا خیال ہے، موشے ہائمن کے لیے ساحل کی اب کوئی خاص اہمیت نہیں رہی۔ تہ خانے میں داخلے کا طریقۂ کار معلوم ہوجانے کے بعد اسے قید میں ڈالے رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا!"

"یہ تمہارا خیال ہے" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "لیکن میں ذرا مختلف انداز میں سوچتا ہوں۔ یہودیوں کی ایک خاص ذہنیت ہے۔ یہ قوم آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وصول کرنا جانتی ہے۔ اپنے ملک میں ناکام اور مضر ثابت ہونے والی اشیا کو یہ پُرکشش پبلسٹی کے ذریعے کئی گنا دام پر پوری دنیا میں فروخت کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی بے کار اور فضول چیز کو بھی کیش کرنا جانتے ہیں ...... اور ساحل تو ایک جیتی جاگتی اہم شخصیت ہے۔"

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "وجدان! یہ مت بھولو کہ امریکا والے تمہیں "امریکا دشمن" کا ٹائٹل دے چکے ہیں۔ تم ربی موشے ہائمن کے لیے معتوب اور انتہائی مطلوب ہو۔ تم اب تک اسے جو گراں قدر نقصان پہنچا چکے ہو وہ اسے تم سے سود در سود وصول کرے گا۔ ربی اچھی طرح یہ بات جان گیا ہے کہ ساحل کے اندر تمہاری جان اٹکی ہوئی .... وہ تمہیں شکار کرنے کے لیے ساحل کو چارے کے طور پر استعمال کرے گا اور اس دوران میں وہ بھی بعض صبر آزما لمحات سے گزرے گی۔ ربی کو کبھی انڈر اسٹیمیٹ نہیں کرنا وجدان۔ یہ تمہارا نہایت ہی بارسوخ اور طاقت ور دشمن ثابت ہوگا۔ اس سے نمٹتے ہوئے تمہیں دانتوں پسینہ آجائے گا۔"

ڈاکٹر اپنی بات مکمل کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں میدانِ جنگ کے نقشے پر غور کرنے لگا ڈاکٹر نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے وہ مبنی بر حقیقت تھے۔ اب میرے اور موشے ہائمن کے درمیان ایک سنگین ٹکراؤ ہونے والا تھا۔ موشے ہائمن مجھ سے ہزاروں میل دور اس وقت اسرائیل میں بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے بھیجے ہوئے دو انتہائی خطرناک افراد ڈین ہاردے اور کلاڈیا یہاں کھٹمنڈو میں سرگرم عمل تھے۔ جمی نوڈا نے ہائی وے والی بستی سے ساحل کو اغوا کرنے کے بعد ڈین ہاردے کے پاس پہنچایا تھا ...... لہٰذا ڈین ہاردے کی گردن ناپنے کے لیے مجھے فوری طور پر کھٹمنڈو پہنچنا تھا ...... اور اپنی جانِ تمنا کو اس کے چنگل سے چھڑانا تھا!

"میں روانہ ہو رہا ہوں ڈاکٹر!" میں نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا۔

"ویری نائس" وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس کے بعد ڈاکٹر نے مجھے اس جیپ اور جانوس کے حوالے سے چند اہم باتیں بتائیں۔ میں نے ذہن نشین کرنے والے انداز میں بڑے غور سے اس کی ہدایات سنیں اور آخر میں ایک ضروری سوال کیا۔

"لی یان کے بارے میں کیا کہتے ہو ڈاکٹر؟"

"میرا خیال ہے۔ وہ پسنجر زسیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے!"

"یہ تو مجھے بھی دکھائی دے رہا ہے" میں نے کہا۔

اس نے پوچھا "پھر کیسی اُلجھن ہے؟"

"میرا مطلب ہے، اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے تم نے" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اب یہ جوائنٹ وینچر نہیں رہا۔ مجھے آگے بڑھنے کے لیے سولو فلائٹ کرنا ہوگا اس صورت میں لی یان کو بھی تمہارے پاس ہی رکنا ہوگا نا؟"

اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر بولا "میرا خیال ہے، لی یان کا معاملہ اسی پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اپنے بارے میں زیادہ بہتر طور پر فیصلہ کرسکے گی۔" پھر وہ لی یان سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"کیوں لی یان! تم مجھے بتاؤ، یہاں میرے پاس رکو گی یا وجدان کے ساتھ جانے کا ارادہ ہے؟"

میرا خیال تھا، اس مرحلے پر لی یان کو فیصلہ کرتے ہوئے سو بار سوچنا پڑے گا لیکن اس نے میری توقع کے برخلاف ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کوئی تردد کیا اور نہ ہی تامل ایک لمحے میں فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے میں بلا کا اعتماد شامل تھا۔

"میں وجدان کے ساتھ کھٹمنڈو جاؤں گی!"

یہ اتنا واضح فیصلہ تھا جیسا "ہیڈ یا ٹیل؟" کی صورت میں کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ یعنی ادھر یا ادھر! لی یان نے ادھر کو فراموش کرکے یکسر ادھر جانے کا فیصلے سنا دیا تھا۔ ماضی میں اسی نوعیت کا ایک فیصلہ ساحل (دھنو) نے بھی سنایا تھا۔ اس کے والدین کی المناک موت کے بعد جب نئے بدھ بھکشو نے اسے اپنے ساتھ عبادت گاہ میں رکھنے کی پیش کش کی تھی تو ساحل نے وہاں رکنے کے بجائے میرے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

ڈاکٹر مونگ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے لی یان کے اس فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔ اس طرح کم از کم ایک فرد ہماری طرف سے بھی، ساحل کی تلاش اور حصول کے سلسلے میں تمہارے ساتھ ہوگا۔"

ڈاکٹر مونگ نے کم و بیش محترم سانگ جیسے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جب میں سیٹل سے نیویارک آرہا تھا تو سانگ خو نے راکیل کو میرے ہم راہ کرتے ہوئے کہا تھا، ساحل تمہاری اور ہماری مشترکہ ضرورت ہے اس لیے بھی اس کے حصول کے لیے کوئی ایک فرد تو ہماری طرف سے بھی ہونا چاہیے۔

راکیل کے تصور نے مجھے دل گرفتہ کردیا۔ اس نے میری دوستی کے جرم میں اذیت ناک موت پائی تھی تاہم میں نے بھی، اسے موت سے ہمکنار کرنے والوں کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ الفریڈ، گراہم اور سائمن اس کی موت میں حصے دار تھے میں نے ان تین افراد کو جس بےبسی کی موت مارا، مین ہیٹن کی فضا اس کی گواہ تھی ...... اور دریائے ہارلم بھی اس "شہادت" میں پیش پیش تھا جس کی گواہی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا! ان واقعات کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے حلق میں دھواں سا بھرنے لگا۔

"وجدان!" ڈاکٹر مونگ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "لی یان کا بہت خیال رکھنا۔ تم جانتے ہو، شون کی موت کے بعد یہ بالکل تنہا ہوگئی ہے۔"

شون کا ذکر سن کر لی یان اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔ اسے بیوہ ہوئے چند گھنٹے گزرے تھے۔ اگرچہ شون اور لی یان کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق تھا تاہم، وہ اس کا شوہر تھا۔ لی یان کا دکھی اور ملول ہوجانا ایک فطری امر تھا۔ بہرحال، وہ ایک بہادر عورت تھی۔ مجھے امید تھی، وہ بہت جلد اس صدمے سے سنبھل جائے گی۔ حقیقت پسند ہونا جذباتی معاملات میں مفید ثابت ہوتا ہے!

ڈاکٹر مونگ کی بات کے جواب میں، میں نے کہا "تم فکر نہ کرو ڈاکٹر۔ میں نے نیو جرسی سے روانہ ہوتے وقت شون سے جو وعدہ کیا تھا اسے نبھانے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔ افسوس کہ میں شون کی امانت اسے واپس نہیں لوٹا سکتا البتہ اس کی حفاظت اب میری ذمّے داری کا حصہ ہے۔"

"یہ تمہارے ساتھ ہی سب سے زیادہ محفوظ رہ سکتی ہے۔" ڈاکٹر نے کہا "وہاں نیو جرسی میں این وائے پی ڈی اور ایف بی آئی والے یہ جان چکے ہیں کہ تم شون کی آئی ڈی پر لی یان کے ساتھ کھٹمنڈو آئے ہو چنانچہ لی یان کا نیو جرسی میں قدم رکھنا موت کے دہانے میں قدم رکھنے کے مترادف ہوگا تمہارے دشمنوں نے اس بات کا بھی یقیناً پتا لگا لیا ہوگا کہ تم دونوں نے کھٹمنڈو نے انا پورنا ہوٹل میں قیام کیا تھا لہٰذا اب بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کرنا تم لوگوں کے استقبال کے لیے نیپالی پولیس کے بھیس میں کوئی امریکی ایجنٹ اس ہوٹل میں موجود ہوگا۔ اس کے علاوہ کھٹمنڈو میں موو کرتے ہوئے بھی تمہیں احتیاط کے دامن کو مضبوطی سے تھام کر رکھنا ہوگا۔ وہاں ہر طرف تمہاری تلاش کا کام جاری ہو چکا ہوگا۔" وہ ذرا دیر کو ٹھہرا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے تم دونوں کے سلسلے میں جانوس کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ تم جب وہاں پہنچوں گے تو تمام تر انتظامات مکمل ہوں گے۔ فی الحال تمہیں حلیوں میں عارضی

تبدیلی کے ساتھ آگے بڑھنا ہوگا۔ جانوس تمہارے لیے رقم کا بندوبست بھی کردے گا۔ شون اور لی یان کے کریڈٹ کارڈز کو استعمال کرنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا!“

ہم دونوں نے ڈاکٹر مونگ کی بات پر صاد کیا۔

ٹھیک سات بجے ہم ڈاکٹر سے رخصت ہو کر واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

لی یان چپ چپ اور اداس تھی۔ میں اس کی اداسی کا سبب جانتا تھا۔ میں شون کو تو واپس نہیں لا سکتا تھا البتہ اسے پُرسکون اور نارمل کرنے کے لیے حیلہ وسیلہ کرنا میرے اختیار میں تھا۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد میں نے جیپ کو سڑک کے کنارے روک دیا۔

”کیا ہوا؟“ لی یان نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی تو بہت کچھ ہو جائے گا!“

اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی ”تم یہاں ویرانے میں جیپ روک کر مجھ سے کون سی بات منوانا چاہتے ہو؟“

”بتاتا ہوں۔“ میں نے پُراسرار انداز میں کہا ”پہلے تم پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹ جاؤ۔“

اس کی الجھن میں حیرت بھی شامل ہو گئی ”پھر؟“

”پھر...... بعد میں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا ”پہلے وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔ چلو، شاباش۔“

میں نے اسے کسی ننھی بچی کے مانند پچکارا تو وہ تھوڑے تامل کے بعد اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر جیپ سے باہر نکلی اور خاموشی کے ساتھ عقبی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔

میں نے ایک جھٹکے سے جیپ کو آگے بڑھا دیا اور کہا ”میں نے بیٹھنے کی نہیں بلکہ لیٹنے کی بات کی ہے۔“

”تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ گڑبڑا گئی۔

”اپنی شکل دیکھی ہے تم نے!“ میں نے کہا۔

”کیوں، کیا ہوا ہے میری شکل کو؟“ اس نے حیرت بھرے انداز میں دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھو کر دیکھا۔

میرے غیر متوقع اور بے محل سوال نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا ”پانچ گھنٹے ...۔ پہلے ہی دہاں پورے بارہ بج رہے ہیں۔ تھکن اور نیند نے تمہیں نڈھال اور بے حال کر رکھا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے آرام سے اس سیٹ پر سو جاؤ گی تو فریش ہو جاؤ گی۔“

صورت حال واضح ہوئی تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ”تمہارا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں ہے وجدان! میری بہ نسبت تم نے کہیں زیادہ محنت و مشقت کی ہے۔“

”فکر نہ کرو، اپنی باری پر میں بھی آرام کروں گا۔“ میں نے کہا ”ہائی دے والی بستی تک میں ڈرائیونگ اور تم آرام کرو گی۔ بستی سے کھٹمنڈو شہر تک ہم اپنی ڈیوٹی بدل لیں گے۔ کہو، کیسا آئیڈیا ہے؟“

”فنٹاسٹک!“ وہ اداسی اور سنجیدگی کو قدرے کم کرتے ہوئے بولی۔

”پھر اس فنٹاسٹک آئیڈیا پر عمل درآمد گی میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔“ میں نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں تکتے ہوئے کہا ”تم ابھی تک بیٹھی ہوئی نظر آ رہی ہو؟“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر لی یان بہ آہستگی نشست پر دراز ہو گئی۔ پھر ایک خاص انداز میں بولی۔ ”ہاؤ کیئرنگ یو آر!“

میں لی یان کی افسردگی کم کرنے کے لیے دانستہ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہا تھا...... اس کے آخری جملے سے ظاہر ہوا کہ مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔ کسی کا دکھ بانٹنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ لی یان سے بات کرتے ہوئے میرے لہجے میں محبت اور شفقت شامل ہو گئی تھی۔ محبت بڑا طاقتور جذبہ ہے۔ یہ خوشیوں کو ضرب اور غموں کو تقسیم کرتا ہے۔ میں لی یان سے لگاوٹ بھرے انداز میں گفتگو کر کے دراصل اس کے غم کو زائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کیئرنگ اور ڈیئرنگ کا فیصلہ کھٹمنڈو شہر میں پہنچ کر کریں گے۔“ میں نے کہا ”فی الحال تم اچھے بچوں کی طرح فوراً آنکھیں بند کر کے نیند کی بانہوں میں سمٹ جاؤ کیونکہ تمہارے آرام کا وقت شروع ہو چکا ہے۔“

اس نے کسی فرماں بردار بچے کے مانند آنکھیں بند کر لیں۔

میں نہیں جانتا تھا، وہ سونے کی کوشش کرے گی یا یونہی آنکھیں بند کیے پڑی رہے گی مگر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے مثبت اثرات نے مجھے مطمئن کر دیا۔ میں اسے دکھ نگری سے کھینچ کر باہر لانے میں خاصی حد تک کامیاب رہا تھا۔

دن کی روشنی کے باعث واپسی کا سفر بہ نسبت آسانی سے طے ہوا اور کسی بدمزگی کے بغیر ہم بہ خیر و عافیت ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کھٹمنڈو شہر کی حدود میں داخل ہو گئے۔

ہائی دے والی بستی سے پروگرام کے مطابق لی یان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی اور میں جھپکی نیند کے لیے پچھلی

سیٹ پر چلا گیا تھا۔ بستی سے کھٹمنڈو شہر کا فاصلہ لگ بھگ ایک گھنٹے کا تھا، جھپکی نیند میں نے اس لیے کہا کہ پہاڑی راستے پر سفر کرتے ہوئے پُرسکون اور گہری نیند سونا ناممکنات میں سے تھا۔ لی یان کے مطابق، وہ اچھی طرح سوئی تھی اور اس ”اچھی طرح“ کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا!

اب میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اور لی یان پسنجرز سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے جیپ کو کورنگ روڈ پر چڑھایا تو لی یان نے کہا۔

”وجدان! کہیں رک کر پہلے جانوس کو فون کر لو تاکہ ہمیں معلوم تو ہو، جانا کہاں ہے!“

میں نے ناگواری سے کہا ”یہ شخص مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اگر ڈاکٹر مونگ کی اصرار نما خواہش کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کی صورت دیکھنا پسند نہ کرتا۔“

”اب تو مجبوری ہے۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی ”ویسے ڈاکٹر مونگ نے یقین تو دلایا ہے کہ جانوس کو تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ مجھے امید ہے، اب وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جس سے تمہیں کسی قسم کی کوفت کا سامنا کرنا پڑے۔“

”تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں!“ میں نے جیپ کے باہر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا ”فون بوتھ نظر آ جائے، پھر میں جیپ روکتا ہوں۔“

وہ قدرے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ”کیا تمہیں ڈاکٹر کی کہی ہوئی بات کا یقین نہیں ہے؟“

میں فوراً سمجھ گیا، اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر پر تو مجھے پورا ابھروسا ہے۔ اس نے جو کچھ کہا ہے، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں لیکن ......“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تمہاری بات ماننا بھی تو ضروری ہے!“

وہ اداسی کی کیفیت سے بڑی حد تک باہر نکل آئی تھی، میری بات سن کر وہ خاصی متعجب ہوئی۔ ایک طرح سے میں اسے ڈاکٹر مونگ پر فوقیت دے رہا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اس کے لیے ”بڑے“ کا درجہ رکھتا تھا اس لیے اس کا الجھنا عین فطری بات تھی۔ اسی الجھن میں اس نے مجھ سے پوچھ لیا۔

”وجدان! میری بات ماننا تمہارے لیے کیوں ضروری ہے؟“

”اس لیے کہ اس وقت تم میری ساتھی ہو!“

”اوہ!“ وہ گہری سانس لے کر بولی ”وجدان! تم معمولی سی بات کے لیے بے پناہ سسپنس پیدا کر دیتے ہو۔“

میں نے قدرے شوخی سے کہا ”میری ساتھی ہونا تمہارے نزدیک گویا معمولی سی بات ہے؟“

”اوہ...... نو......!“ وہ سٹپٹا گئی ”تم غلط سمجھ رہے ہو وجدان تمہاری ساتھی ہونا تو میرے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ وہ...... وہ میں نے تو سسپنس کے حوالے سے اس بات کو معمولی کہا تھا۔ میرا مطلب ہرگز تمہاری ساتھی ہونے سے نہیں تھا۔ آئی ایم سوری!“

”سوری کی ضرورت نہیں۔“ میں نے معتدل لہجے میں کہا ”اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور ”ساتھ“ میں سب چلتا ہے۔ سوری، تھینک یو اور پلیز، ایکسکیوزی کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دو۔“

”او کے!“ اس کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم ابھر آیا۔ اس کے لبوں کے نظارے نے مجھے حقیقی خوشی دی۔ وہ خفیف سا تبسم میری بہت بڑی کامیابی تھی۔ مجھے امید تھی، میں لی یان کی افسردگی اور اداسی کو بہت جلد بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور سوال کرتی، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”لی یان! ونگ ہنگ کی حیثیت تمہارے لیے ایک باس کی سی تھی۔ مسٹر ہنگ، ڈاکٹر مونگ ریفو شے کو اپنا بڑا سمجھتا ہے، اس حوالے سے ڈاکٹر مونگ تمہارا بگ باس ہوا۔ عبادت گاہ سے رخصت ہونے سے پہلے ڈاکٹر نے تمہاری موجودگی میں مجھ سے بڑی اہم باتیں کی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے، ڈاکٹر مونگ تم پر بڑا ابھروسا کرتا ہے۔“

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ میں نے بہ دستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا ”مسٹر ہنگ اور ڈاکٹر کا تعلق بدھ مت سے ہے۔ کیا تم بھی بدھسٹ ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”مذہب کے لحاظ سے کرسچن ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے!“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی ”میں کوئی کٹر مذہبی نہیں ہوں۔ انسان کو اپنے کاز پر نظر رکھنا چاہیے۔ اگر سوچ مثبت، مقصد نیک اور عمل تعمیری ہو تو کسی کے ساتھ بھی مل کر کام کیا جا سکتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ پچھلے دو روز سے میں تمہارے ساتھ ایک مشن میں شامل ہوں اور آئندہ پتا نہیں، کب تک ہم قدم سے قدم ملا کر چلتے رہیں گے!“

میں نے مذہب کی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو لی

یان!''

لی یان کا تعلق فلپائن سے تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے امریکا میں رہ رہی تھی اس لیے اس کے لب و لہجے اور انداز و اطوار پر خالص امریکی رنگ چڑھا ہوا تھا تاہم وہ اپنے خال و خط اور نین نقش میں پوری فلپائنی تھی۔۔ فلپائن میں عیسائی (کرسچن) بھاری تناسب سے موجود ہیں۔ ملک کی بڑی آبادی رومن کیتھولک پر مشتمل ہے یعنی تراسی فی صد۔ اس کے بعد پروٹسٹنٹ کا نمبر آتا ہے، یعنی نو فی صد۔ فلپائن میں لگ بھگ پانچ فی صد مسلمان بھی بستے ہیں۔ لی یان فلپائن کے دارلحکومت ''منیلا'' کی رہنے والی تھی۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسا کہ ہمارا تعاقب کیا جارہا ہے۔ ایک سفید گاڑی بڑی مستقل مزاجی سے ہمارے پیچھے آرہی تھی۔

میں نے ذرا غور کیا تو معلوم ہوا، وہ ٹنٹیڈ گلاسز والی ایک لگژری کار تھی۔ وہ ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر ہماری راہ ناپ رہی تھی میں نے لی یان سے اس متعاقب گاڑی کا ذکر کیا تو وہ بولی۔

''ہاں، میں نے بھی یہ بات نوٹ کر لی ہے۔''

''پھر کیا ارادہ ہے۔'' میں نے بیک ویومرر میں اس گاڑی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ''یہیں گھیر لیں یا اسے اٹکھیلیاں کرنے دیں؟''

''میرا خیال ہے، جب تک وہ لوگ کوئی مداخلت نہ کریں، ہمیں اپنی طرف سے پیش قدمی نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہمیں پہلی فرصت میں کسی طرح جانوس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

ادھر لی یان کی بات ختم ہوئی، ادھر متعاقب گاڑی کی رفتار میں اچانک اضافہ ہوگیا۔ ہم اس وقت رنگ روڈ سے گزر رہے تھے اور اتفاق سے زیادہ رش بھی نہیں تھا۔ میں نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری فرمائش پر کوئی پیش قدمی نہیں کروں گا لیکن اگر دوسری طرف سے کوئی ''شرارت'' کی گئی تو پھر ان سے نمٹنا لازم ٹھہرے گا لہٰذا تم شاٹ گن کو تیار حالت میں بڑی مستعدی سے تھام لو!''

یہ وہی گن تھی جو عبادت گاہ کے سامنے والے حصے میں ایک دشمن کے ہاتھ سے گری تھی۔ اب اس شاٹ گن پر ہمارا قبضہ تھا۔ واپسی پر ہم نے اسے بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ دو خطرناک سیون ایم ایم گنز بھی ڈیش بورڈ کے نیچے ایک خفیہ خانے میں موجود تھیں۔

لی یان نے مضبوط لہجے میں کہا ''تم فکر نہ کرو۔ میں تیار ہوں۔''

متعاقب سفید گاڑی بڑی شرافت سے ہماری جیپ کے پیچھے پہنچی پھر اسی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ہمیں اوورٹیک کرنے لگی۔ پتا نہیں، ان لوگوں نے کیا سوچ رکھا تھا۔ اگر وہ ہمارے دشمن تھے تو اب تک انہیں ہلکی یا بھاری فائرنگ کا مظاہرہ کر دینا چاہیے تھا۔ میں نے دانستہ اپنی جیپ کی رفتار کم کر دی۔ اس سے اتنا ہوا کہ سفید گاڑی نے نسبتاً جلدی ہمیں اوورٹیک کر لیا۔

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔ وہ بولی ''کوئی من چلا معلوم ہوتا ہے!''

ٹنٹیڈ گلاسز کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ اس گاڑی میں کتنے افراد سوار ہیں لہٰذا وہ من چلا کے بجائے من چلے اور دل جلے بھی ہو سکتے تھے۔ ہمیں اوورٹیک کرنے کے بعد وہ گاڑی بالکل ہمارے سامنے آگئی اور ایک مخصوص انداز میں اس کے انڈی کیٹرز جلنے بجھنے لگے تاہم خیریت گزری کہ ابھی تک اس طرف سے ایک گولی نہیں چلی تھی۔ یہ ایک مثبت صورتِ حال تھی۔

میں نے لی یان سے کہا ''یہ کیا اٹکھیلیاں کر رہے ہیں بھئی!''

''میرا خیال ہے، یہ ہمیں رکنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''یہ تو رکنے کے بعد ہی معلوم ہوگا!''

''کیا میں جیپ کو روک دوں؟''

''ہاں، روک دو۔'' اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

میں نے جیپ کو سڑک کے کنارے روک دیا۔

سفید گاڑی ہم سے پندرہ بیس فٹ آگے رک گئی۔

لی یان نے کہا ''نیچے اتر کر دیکھنا چاہیے۔ انہیں کیا تکلیف ہے!''

''جنہیں تکلیف ہے، نیچے بھی وہی اتریں گے۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا ''وہ اپنی گاڑی سے باہر نکلیں تو میں ان کی تکلیف دور کر دوں گا!''

اسی وقت سفید گاڑی کے انڈی کیٹرز ''خاموش'' ہوگئے۔ پھر اس کا عقبی نشست والا دروازہ کھلا۔ ہم دونوں سانس روک کر آنے والے لمحات کا انتظار کرنے لگے۔ لی یان نے شاٹ گن کا بالکل تیار حالت میں تھام لیا۔ یہ تو ثابت ہوگیا کہ انہوں نے ہمیں روکنے کے لیے ہی انڈی کیٹرز والا

کھیل کھیلا تھا۔ وہ ہمیں روکنا چاہتے تھے تو کیوں؟ یہ ایک گمبھیر سوال تھا جس کا جواب بھی انہیں لوگوں میں سے کسی کو دینا تھا جو ہمیں روکنے کے خواہش مند تھے!

گاڑی کا دروازہ کھلنے کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ عقبی نشست سے کوئی اٹھ کر باہر آنے والا تھا، پھر وہ باہر آگیا۔ وہ ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص تھا۔ باہر نکلنے کے بعد جب اس نے ہماری جانب چہرہ موڑا تو میں اچھل کر رہ گیا۔ وہ صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔

''جانوس ......!'' بے ساختہ میرے لبوں سے خارج ہوا۔

لی یان بھی اسے پہچان گئی، حیرت بھرے لہجے میں بولی ''یہ یہاں کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''اسی سے پوچھنا!'' میں نے قدرے تلخی سے کہا ''وہ ہماری ہی طرف آرہا ہے۔''

پتا نہیں کیوں، میں جانوس کو دیکھتے ہی بدمزہ ہوگیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ زندگی میں دوبارہ کبھی اس شخص سے ملاقات ہوگی۔ کم از کم خود تو کبھی اس سے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔ اگر ڈاکٹر مونگ کی خواہش نہ ہوتی تو میں اس سے دور ہی رہتا۔ بہرحال، ڈاکٹر کا دعویٰ تھا کہ اس نے جانوس کو میرے سلسلے میں ہدایات دے دی ہیں۔ وہ مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں دے گا۔ میں نے دل میں کہا، ٹھیک ہے۔ دیکھتا ہوں اس میں کیا تبدیلی آئی ہے!

جانوس تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہماری جیپ کے قریب آگیا۔ اس کے چہرے پر خیر مقدمانہ مسکراہٹ سجی تھی۔ میں نے بھی جواباً مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔ وہ میرے پاس آکر محتاط لہجے میں بولا۔

''آپ لوگوں سے مل کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔''

کل صبح آٹھ بجے بھی اسی جانوس نے تری بھون انٹرنیشنل ائرپورٹ پر ہمارا استقبال کیا تھا لیکن یہ جانوس گزشتہ روز والے جانوس سے قطعی مختلف نظر آرہا تھا۔ اس کے چہرے کی سختی اور لہجے میں کا اکھڑ پن کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ممکن ہے، اس گرم مزاج شخص کو چھوڑ کر سمر ویکیشنز منانے ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف نکل گئے ہوں! ان کے لیے قریب ترین ''تفریح گاہ'' ماؤنٹ ایورسٹ ہی تھی۔

وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، ڈاکٹر مونگ کی ہدایت سے مجبور ہو کر کر رہا تھا۔ یہ اس کا اپنا مزاج نہیں تھا۔ وہ ایک ہدایت کار کے اشارے پر اداکاری کر رہا تھا لہٰذا میں بھی اپنے موڈ مزاج کے خلاف عمل پر مجبور تھا۔ ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہوگئی تو وہ اردگرد دیکھتے ہوئے دوبارہ چوکنا لہجے میں بولا۔

''آپ دونوں اپنا بیگ لے کر میرے گاڑی میں آجائیں۔''

''کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے اس کے شائستہ رویے کے جواب میں شائستگی ہی برتی۔

وہ گمبھیر انداز میں بولا ''شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

''کس کے لیے؟'' لی یان نے استفسار کیا۔

وہ بولا ''خصوصاً تم دونوں کے لیے۔ اسی لیے میں ٹنٹیڈ گلاسز والی گاڑی لے کر آیا ہوں۔''

''تم کب سے ہمارے تعاقب میں لگے ہوئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''پلیز! پہلے آپ لوگ میرے گاڑی میں جاکر بیٹھیں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا ''باقی باتیں ہم وہیں کریں گے۔ اس جیپ کو فوری طور پر چھوڑ دیں ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔''

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس کھینچی پھر لی یان کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے تائیدی تاثرات نظر آئے۔

اگلے ایک منٹ کے اندر ہم اپنے بیگ کے ساتھ جیپ سے نکل کر ٹنٹیڈ گلاسز والی سفید گاڑی کی عقبی نشست پر منتقل ہو چکے تھے۔ جانوس نے نیپالی میں ڈرائیور کو کچھ ہدایات دیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر ہماری جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ میں نہیں جانتا، اس نے کیا کہا تھا اپنے ڈرائیور سے تاہم قرائن بتاتے تھے، ڈرائیور اب ہماری جیپ کو کہیں پہنچائے گا۔ کہاں؟ جہاں کے لیے جانوس نے اسے ہدایت کی تھی۔

جانوس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ایک جھٹکے سے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

''میں سب سے پہلے تم سے معذرت چاہوں گا وجدان!'' گاڑی کے اندر پہلی آواز جانوس کی ابھری۔

''کس بات کی معذرت؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ نرمی سے بولا ''ڈاکٹر مونگ نے مجھے بتایا، مختصر سی ملاقات میں تمہیں مجھ سے ڈھیر ساری شکایات پیدا ہوگئی ہیں۔ میں کوشش کروں گا۔ آئندہ ایسا کوئی موقع نہ آئے۔''

''کوئی بات نہیں مسٹر جانوس!'' میں نے قدرے....

بے تکلفی سے کہا ”میں گزری ہوئی باتوں کو بھول گیا۔ تم بھی بھول جاؤ۔“

”گویا، تمہیں اب مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے؟“

”اٹس او کے مسٹر جانوس! ڈونٹ ڈسٹرب یور سیلف۔“

”اوہ تھینکس!“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

ایک بے نام سے تجسس نے میرے دماغ کو کسی آکٹو پس کے مانند جکڑ رکھا تھا۔ میں فوراً کام کی بات کی طرف آ گیا۔ ”مسٹر جانوس! اب تو..... ہم تمہاری ٹنیڈ گلاسز والی گاڑی کے اندر محفوظ بیٹھے ہیں۔ بتاؤ، شہر میں ہمارے لیے کس قسم کے خطرات پیدا ہو چکے ہیں؟ اور یہ بھی جاننا چاہوں گا، تم کب سے اور کہاں سے ہمارے تعاقب میں لگے ہوئے تھے؟“

اس نے ایک تشویش بھری طویل سانس خارج کی اور میرے سوالات کے جواب میں بتایا ”ڈاکٹر مونگ نے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، تم لوگوں کو گیارہ اور بارے بجے کے درمیان کھٹمنڈو شہر کی حدود میں داخل ہونا تھا لہٰذا میں ساڑھے دس بجے سے ہی اس گاڑی میں شہر کے داخلی راستے پر موجود تھا۔ یہ وجہ میں تمہیں وہاں روک نہیں پایا۔ تم کسی چھلاوے کے مانند آگے بڑھ گئے۔ مجبوراً تمہارا تعاقب کرتے ہوئے مجھے یہاں تک آنا پڑا۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”اس جیپ کو فوری طور پر چھوڑنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ہمارے دشمن اس کا میک اور نمبر جان چکے ہیں۔ مذکورہ جیپ کو اور تم دونوں کو بڑی سرگرمی سے پورے کھٹمنڈو میں تلاش کیا جا رہا ہے......“

وہ آگے بھی کچھ بولنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ ”ہماری جیپ کے بارے میں دشمنوں کو کیسے خبر ہو گئی اور یہ بات انہیں کس نے بتائی کہ میں اور لی یان اس جیپ میں سوار عبادت گاہ کی طرف سے کھٹمنڈو آ رہے ہیں؟“

”شاید میں تمہیں ٹھیک طرح سے اپنی بات سمجھا نہیں سکا!“ وہ گاڑی کو رنگ روڈ پر جنوب کی سمت بڑھاتے ہوئے خجالت آمیز لہجے میں بولا ”جیپ میں تم لوگوں کے سوار ہونے کی بات میں نے اپنے تجزیے کی بنیاد پر کی ہے۔ ہمارے دشمنوں تک صرف یہ بات پہنچی ہے کہ مذکورہ جیپ عبادت گاہ کے عقبی حصے میں ایک چٹان کے پیچھے کھڑی دیکھی گئی ہے۔“

”اوہ۔“ میں گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ”دشمنوں تک یہ خبر کیسے پہنچی؟“ میں پُرخیال انداز میں بڑبڑایا۔

میری بڑبڑاہٹ کے جواب میں جانوس نے بتایا ”ڈاکٹر مونگ کا خیال ہے، آج علی الصباح دشمنوں کی جو دو لینڈ کروزر وہاں پہنچی ہیں، ان میں سوار افراد میں سے کسی نے یہاں اپنے بڑوں کو اس جیپ کے بارے میں اطلاع دی ہے۔ وہ دونوں جیپیں ہماری جیپ کے قریب ہی چٹان کی دوسری طرف کھڑی کی گئی تھیں۔“

جانوس کے انکشاف سے ظاہر ہوا کہ ڈاکٹر مونگ نے اسے ہمارے موجودہ حالات کے بارے میں کچھ بہت بتا رکھا تھا۔ جانوس کے بیان سے پتا چلتا تھا۔ ہمارے عبادت گاہ سے رخصت ہونے کے بعد ڈاکٹر مونگ نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ ہم وہاں سے سات بجے صبح روانہ ہوئے تھے اور وہ دونوں لینڈ کروزر جیپیں لگ بھگ چھ بجے صبح عبادت گاہ کے پچھواڑے پہنچی تھیں۔

”ڈاکٹر مونگ سے تمہاری آخری بات کب ہوئی تھی؟“ میں نے اپنے اندازے کے تصدیق کے لیے پوچھ لیا۔

اس نے بتایا ”نو بجے صبح۔ ڈاکٹر ہی کی ہدایت پر میں تم لوگوں کو ’ریسیو‘ کرنے ادھر آ گیا تھا۔“

”ہوں!“ میں نے ایک ہنکارا بھرا ”اس کا مطلب ہے۔ ڈاکٹر نے قابو میں آنے والے دشمن کے آدمی کلارک ہی سے یہ بات اگلوائی ہوگی کہ ہماری جیپ کی وہاں موجودگی کے بارے میں..... یہاں کھٹمنڈو میں اطلاع دے دی گئی ہے!“

”یہ اطلاع اسی شیطان کلارک نے اپنے بڑوں کو دی تھی۔“ جانوس نے بتایا ”ڈاکٹر مونگ نے مجھے تمہارے حوالے سے عبادت گاہ میں پیش آنے والی بہت سے واقعات سے آگاہ کر دیا ہے۔“

میں الجھن کا شکار ہو گیا۔ ”لیکن ڈاکٹر نے مجھ سے ذکر کیوں نہیں کیا؟“

”حفظِ ماتقدم کے طور پر۔“ وہ عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیز لہجے میں پوچھا۔ ”کیسا حفظِ ماتقدم؟“

”اگر ڈاکٹر تم لوگوں کو یہ بات بتا دیتا کہ جس گاڑی میں تم لوگ کھٹمنڈو جا رہے ہو، دشمن اسے ’ہاتھوں ہاتھ‘ لیں گے تو تمہارے اعصاب ایک عجیب سے تناؤ کا شکار رہتے۔ ڈاکٹر چاہتا تھا، تم دونوں بالکل ری لیکس انداز میں کھٹمنڈو پہنچو۔“ جانوس نے مجھے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ”تم لوگوں

کی حفاظت اور خبر داری کے لیے ڈاکٹر نے مجھے یہاں کھٹمنڈو میں متحرک کر دیا اور دیکھ لو...... میں تمہیں نہ صرف بہ حفاظت اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں بلکہ اس ”مشکوک“ جیپ کی روپوشی کا بھی مناسب بندوبست کر دیا ہے!“

جانوس پہلی مرتبہ مجھے ایک معقول آدمی لگا۔ ڈاکٹر مونگ کی ہدایت نے واقعی اس پر اثر کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر مونگ کے لیے میرا دل محبت کے جذبات سے بھر گیا۔ اس نے ہمیں کسی ذہنی کوفت اور اعصابی دباؤ سے بچانے کے لیے بڑا خوب صورت انتظام کیا تھا لیکن اس حوالے سے میرے دل میں ایک معمولی سا کھٹکا ہو رہا تھا۔ میں نے اس پھانس کو نکالنا ضروری سمجھا اور جانوس سے پوچھا۔

”ٹھیک ہے، ڈاکٹر نے ہمیں قبل از وقت اس جیپ کے ”معاملے“ سے آگاہ نہ کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، وہ اس جیپ کے بجائے ہمیں دشمنوں کی ایک لینڈ کروزر میں واپس بھیج دیتا!“

وہ بڑی رسان سے بولا ”ہاں، ایسا ہو سکتا تھا۔“ پھر اس نے تھوڑا توقف کیا اور کھٹمنڈو کے انتہائی جنوب میں پہنچنے کے بعد رنگ روڈ کو خیر باد کہہ کر گاڑی کو بانیسور روڈ پر ڈال دیا او بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”ڈاکٹر نے ایسا اس لیے نہیں کیا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، یہ جیپ بدھ نیل کنڈ کی عبات گاہ کی طرف کبھی گئی ہی نہیں۔ وہ کل شام سے وہاں موجود ہیں اور شر پسند عناصر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ ایک رات میں دو مرتبہ عبادت گاہ پر چڑھائی کی گئی اور دونوں مرتبہ ڈاکٹر مونگ نے حملہ آوروں کے دانت کھٹے کیے۔ عبادت گاہ کے اگلے حصے میں :: ہ گاڑیاں موجود ہیں جن میں جمی فونڈا اور ان کے ساتھ وہاں پہنچے تھے اسی لیے عبادت گاہ کے عقبی حصے میں بھی ان گاڑیوں کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آنا چاہیے جن میں کلارک اپنے حواریوں کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر نے تمہیں ان لینڈ کروزر میں سے کوئی جیپ نہیں لانے دی۔ عبادت گاہ کے اندر اور باہر چاروں طرف ایسی واقعاتی شہادتیں موجود ہیں جن کی بنیاد پر مضبوط سے مضبوط تر کیس بنانے میں پولیس بنانے میں پولیس کو بھرپور مدد ملے گی۔ پہلے رتنا پارک والے بنگلے پر دو سادہ لباس پولیس والے مارے گئے۔ پھر وہاں عبادت گاہ میں، چار سادہ لباس اہلکاروں کے ساتھ ہی ہمارے دو افراد کی اموات بھی واقع ہوئی ہیں۔ یہ تمام لوگ حملہ آور شیطانوں کی یورش کو ختم کرنے کے لیے کٹ مرے۔ ہمارے دشمنوں کی دو درجن لاشیں بھی گواہی دیں گی۔ ڈاکٹر مونگ

ریفوشے کے دو آدمیوں اور چار سادہ لباس پولیس والوں نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر عبادت گاہ کی حفاظت کی ہے۔“ وہ سانس لینے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر بانیسور (BANESWAR) روڈ پر گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”یہاں نیپال میں مذہب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ نیپال میں لگ بھگ پانچ فی صد بدھسٹ آباد ہیں۔ ان کی اکثریت عبادت گاہوں (بدھ اسٹو پاز) میں باقاعدگی سے جاتی ہے۔ یہ لوگ عبادت گاہ کے تقدس اور حفاظت کو ہر شے پر مقدم سمجھتے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا کا ایک بڑا اسٹو پا (بدھ عبادت گاہ) بھی یہاں کھٹمنڈو میں ہی واقع ہے جو ’اسٹو پا آف بودھ ناتھ‘ کہلاتا ہے!“

نیپال میں غالب آبادی ہندوؤں کی ہے یعنی نوے فی صد!

”میں یہ بات جانتا ہوں۔“ میں نے اس کے گویائی وقفے میں کہا۔

”ویری گڈ!“ وہ سراہنے والے انداز میں بولا پھر بتانے لگا ”جب ڈاکٹر مونگ سے میری آخری بات ہوئی تو اس نے بتایا تھا، انسپکٹر پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ خود بھی وہاں پہنچ چکا ہے۔ عبادت گاہ کے اندر اور باہر پولیس کی تفتیشی کارروائی جاری ہے لہٰذا تمہیں اس طرف کی فکر کرنا چاہیے۔ وہاں ڈاکٹر مونگ اور انسپکٹر شیوا معاملات کو اچھی طرح سنبھال لیں گے۔ ہمیں یہاں کھٹمنڈو میں ان لوگوں سے نمٹنا ہے جنہیں وجدان اور لی یان کی تلاش ہے...... اور مجھے پورا یقین ہے، ہم بڑے ٹھیک ٹھاک انداز میں ان سے نمٹ لیں گے۔“

جانوس پُراعتماد انداز میں اپنی بات مکمل کی تو میں نے کہا ”تمہارا اشارہ جوگندر پال اور اسرائیل سے آنے والی ڈین ہاروے کی طرف ہے نا؟“

ہاں!“ جانوس نے بڑے معنی خیز انداز میں اپنے موٹے سر کو اثباتی جنبش دی اور بڑی ترنگ میں بولا ”جوگندر پال اور ڈین ہاروے کے علاوہ ہاروے کی یہودن ساتھی کی طرف بھی!“

وہ اب خاصا بے تکلف ہو کر بات کر رہا تھا، لگتا تھا کلاڈیا کو دیکھ کر اس کی رال بے قابو ہو گئی ہے۔ اس کی شخصیت کا ایک نیا پہلو سامنے آ رہا تھا لیکن میں نے یہ بات بھی خاص طور پر محسوس کی کہ لی یان کے لیے اس کی آنکھ اور انداز و اطوار میں ایک احترام موجود تھا۔ گویا وہ وضع داری اور کردار کے لحاظ

سے ایک قابلِ بھروسا انسان تھا۔

جانوس کی بات سے ظاہر ہوا کہ وہ تازہ ترین حالات سے بڑی گہری واقفیت رکھتا تھا۔ یہ اس کی اپنی محنت تھی یا اس سلسلے میں ڈاکٹر موونگ نے اس کے اندر کچھ انڈیلا تھا' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کا باخبر اور آگاہ ہونا میرے لیے ہر حوالے سے مفید تھا۔ جانوس نے ہاردے کی یہودن ساتھی کا جس انداز میں ذکر کیا تھا، اس نے مجھے اس کے چٹکی لینے پر مجبور کردیا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''مسٹر جانوس! ڈاکٹر نے تمہاری تعریف کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا تم دل کے بہت اچھے ہو۔ میں محسوس کررہا ہوں ''اچھا دل'' اس دشمن یہودن کی طرف جھک رہا ہے۔ کہیں تم میری لیے کوئی نئی پرابلم تو نہیں کھڑی کردو گے؟''

''نہیں یار!'' وہ بے تکلفی سے بولا ''دشمن تو ہر حال میں دشمن ہی ہوتا ہے اور اس کا ہر ساتھی بھی دشمنوں ہی میں شمار ہوتا ہے۔ ویسے کلاڈیا بڑی زبردست شے ہے۔ تم دیکھو گے تو میری بات کا یقین آجائے گا'' وہ کلاڈیا کے حوالے سے خاصا کھل کر بول رہا تھا جس سے پتا چلا کہ وہ زندہ دل بھی ہے۔

''ٹھیک ہے، دیکھ لوں گا کلاڈیا کو بھی اور اس کے ساتھی فراڈیا (ڈین ہاردے) کو بھی'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''یہ دونوں دشمن مجھ سے بچ نہیں سکیں گے'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کیا تم نے اسرائیل سے آنے والے کلاڈیا اور فراڈیا پر نظر رکھی ہوئی ہے؟''

اس نے بڑے فخر سے بتایا ''آج صبح چھ بجے سے لے کر اب تک وہ بنگلا پوری طرح نگاہ میں ہے جہاں جوگندر پال نے ان دو اسرائیلیوں کو ٹھہرایا ہوا ہے۔ میرے دو نہایت ہی مستعد سادہ لباس آدمی اس بنگلے کی نگرانی پر مامور ہیں اور مجھے تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہاں کے حالات کی خبر بھی دے رہے ہیں۔ ڈین ہاردے اور کلاڈیا میں سے کوئی بھی اس بنگلے سے باہر نہیں نکلا۔ جوگندر پال صبح سے دو چکر وہاں کے لگا چکا ہے۔ مجھے امید ہے، ہم مذکورہ بنگلے پر چڑھائی کرکے بہ آسانی تمہاری ساتھی کو ان کے چنگل سے چھڑا لیں گے''۔

اسی وقت جانوس کے موبائل فون کا بزر بج اٹھا۔ اس نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے اپنی جیب سے سیل نکال کر اس کے ڈسپلے پر ایک نگاہ ڈالی پھر سیل کو فوراً کان سے لگالیا اور تحکمانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنے کسی ملازم سے بات کررہا تھا۔

''ہاں بولو، کیا رپورٹ ہے؟''

پھر وہ ''ہوں، ہاں، او کے'' جیسے الفاظ بولتے ہوئے دوسری طرف کی بات سنتا رہا اور آدھے منٹ کی اس گفتگو کے بعد اس نے موبائل فون جیب میں رکھ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''ایوری تھنگ از اوکے مسٹر وجدان!''

''میرا خیال ہے، یہ ان دونوں میں سے کسی نگران کا فون تھا جنہیں تم نے اسرائیل ایمبیسی کے پچھواڑے جوگندر پال کے بنگلے کی نگرانی پر مامور کررکھا ہے؟'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔

وہ تصدیقی انداز میں بولا ''تمہارا خیال سینٹ پرسینٹ درست ہے''

میں نے ایک اطمینان بخش طویل سانس خارج کی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹنیڈ گلاسز کا یہی سب سے بڑا کمال ہے۔ باہر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا کہ گاڑی کے اندر کیا ہورہا ہے جب کہ اندر موجود افراد بڑی آسانی سے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ اس وقت ہم بانیسور روڈ پر ''ایورسٹ شیرٹن انٹرنیشنل ہوٹل'' کے قریب سے گزر رہے تھے۔ روڈ کے دونوں طرف استادہ عمارتیں دھلی دھلائی دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم نے دائیں جانب ایورسٹ شیرٹن ہوٹل اور بابر محل کو، اور بائیں سمت رائل ڈرگ ریسرچ سینٹر، انکم ٹیکس آفس وغیرہ کو پیچھے چھوڑا اور اگلے چوراہے سے سیدھے ہاتھ کو مڑ گئے۔ اب ہماری گاڑی رام شاہ پاتھ پر دوڑ رہی تھی۔ میں نے جانوس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ہم کس طرف جارہے ہیں مسٹر جانوس؟''

رام شاہ پاتھ جنوب سے شمال کی طرف جاتا ہے یا یوں سمجھ لیں شمال سے جنوب کی سمت آتا ہے۔ ہم اس وقت کھٹمنڈو کے جنوب سے شمال کی جانب جارہے تھے۔ دربار پاتھ اور کانتی پاتھ بھی رام شاہ پاتھ کے متوازی چلتے ہیں۔

جانوس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا ''میں تم لوگوں کو ایک محفوظ پناہ گاہ کی طرف لے کر جارہا ہوں۔ ٹیکسل NAXAL میں میرا ایک ذاتی فلیٹ ہے۔ ہم ادھر ہی جارہے ہیں۔ وہ فلیٹ تم دونوں کے لیے بہت موزوں رہے گا۔ ویسے میں نے تم دونوں کے لیے ایک متبادل رہائش کا بھی بندوبست کررکھا ہے۔ لارڈ بدھا نے چاہا تو تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''تمہاری رہائش گاہ تو ادھر فریک اسٹریٹ پر ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں ہے...... لیکن ادھر جانا ان حالات میں بہت خطرناک ہوگا۔''

''اور متبادل رہائش کا کہاں بندوبست کیا گیا ہے؟''

''میں نے کسی ایمرجنسی کی صورت میں، تم دونوں کے لیے ایک ہوٹل میں بھی کمرا بک کرادیا ہے۔''

''اور یہ کمرا یقیناً تمہارے ہوٹل ''ییلو پیگوڈا'' میں ہوگا؟''

ڈاکٹر موونگ نے مجھے بتایا تھا، کانتی پاتھ پر واقع سی۔ کلاس ہوٹل ''ییلو پیگوڈا'' کا اصل مالک جانوس ہی تھا۔ اسی طرح خفیہ طریقے سے اس بندے نے کھٹمنڈو میں اپنی بہت سی پراپرٹی بنا رکھی تھی۔ جانوس نے نفی میں سر ہلایا اور میرے اندازے کی ایسی تیسی کرتے ہوئے بولا۔

''کانتی پاتھ والا ییلو پیگوڈا تمہارے شایانِ شان نہیں۔ تم اے کلاس ہوٹل اناپورنا میں کچھ وقت گزار چکے ہو۔ اب کم از کم بی۔ کلاس ہوٹل تو ہو'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے ابھی جس ہوٹل میں تم دونوں کے ایمرجنسی قیام کا بندوبست کیا ہے اس کا نام ''ہوٹل شنگریلا'' ہے۔ یہ ہوٹل لازم پت کے علاقے میں واقع ہے۔''

''لازم پت'' کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ اسرائیل ایمبیسی بھی اسی علاقے میں واقع تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا، ہوٹل شنگریلا، جوگندر پال کے اس بنگلے سے زیادہ دور نہیں ہوگا جس میں ڈین ہاردے اور کلاڈیا ٹھہرے ہوئے تھے اور...... میری ساحل ان دو خبیثوں کے قبضے میں تھی۔

میں نے اضطراری لہجے میں کہا ''بہتر یہ ہوگا، ہمیں سیدھا ہوٹل شنگریلا ہی لے چلو۔''

''میں تمہاری بے قراری کو سمجھ رہا ہوں وجدان!'' وہ نہایت ہی دوستانہ لہجے میں بولا ''تم لازم پت کا نام سن کر مچل گئے ہو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، تم اس علاقے سے بہ خوبی واقف ہو!''

میں نے کہا ''جس اسرائیل ایمبیسی کے عقب میں میری ساحل کو جوگندر پال کے بنگلے میں رکھا گیا ہے وہ بھی لازم پت ہی میں واقع ہے حتیٰ کہ بیلجیم قونصلیٹ، فرنچ ایمبیسی ہوٹل شنگریلا ہوٹل ایمبیسیڈر اور ہوٹل شنکر وغیرہ سب لازم پت ہی میں آتے ہیں اس لیے میرا مچل جانا لازمی بات ہے۔ میں ہوٹل شنگریلا کو چھوڑ کر ٹیکسل کے کسی فلیٹ میں کیوں ٹھہروں گا؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''جانتا ہوں، سب جانتا ہوں۔ جن ہوٹلوں کے تم نے نام گنوائے ہیں ان میں سب سے موزوں ہوٹل شنگریلا ہی ہے۔ یہ ہمارے ٹارگٹ سے قریب ترین ہے اسی لیے میں نے اس ہوٹل میں تمہارے ٹھکانے کا بندوبست کیا ہے'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ کس نے کہہ دیا کہ تم ٹیکسل والے ٹھکانے پر ہی ٹھہرو گے۔ ہم فی الحال وہاں جارہے ہیں۔ مشن پر آگے بڑھنے کے لیے کچھ ضروری تیاری بھی کرنا ہے۔ تم کچھ دیر تک وہاں قیام اور آرام کرو گے پھر ہم سیدھے ہوٹل شنگریلا پہنچ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا، ہمارے منصوبے میں کوئی کمی یا کمزوری باقی رہے اور ہم عین وقت پر ناکام ہوجائیں۔ ہمیں ہر حال میں تمہاری ساتھی ساحل کو جوگندر پال والے بنگلے سے نکالنا ہے۔ از اٹ کلیئر؟''

اس نے جو کچھ کہا وہ بہت واضح تھا اس لیے میں اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''یس!'' جانوس کے عزائم اور ولولے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ پہلے والا جانوس نظر نہیں آتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ ساحل کو ڈین ہاردے کے چنگل سے نکالنے کے سلسلے میں مجھ سے بھی زیادہ بے تاب ہو۔ ڈاکٹر موونگ کی ہدایات حد سے زیادہ کام دکھا رہی تھیں۔

اس کے جذبے سے متاثر ہوتے ہوئے میں نے قدر کی نگاہ سے اسے دیکھا اور پوچھ لیا ''مسٹر جانوس! ویسے تمہارا کیا پروگرام ہے۔ میرا مطلب ہے، جوگندر پال کے بنگلے پر چڑھائی کرنے کے سلسلے میں تم نے کچھ تو سوچ رکھا ہوگا؟''

''کافی کچھ سوچ رکھا ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا ''باقی تمہارے مشورے سے طے کرلیا جائے گا۔ پہلے ہم فلیٹ پر پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کریں گے۔''

میں نے محسوس کیا۔ وہ دانستہ ابھی اس ٹاپک کو زیادہ کھولنا نہیں چاہتا تھا لہٰذا میں بھی کرید سے باز آگیا اور ایک مرتبہ پھر ٹنیڈ گلاس سے گاڑی کے باہر دیکھنے لگا۔ اس دوران میں لی یان گم صم خاموش بیٹھی تھی۔ جانوس سے تمام تر گفتگو میں نے ہی کی تھی۔

ہماری گاڑی ہائی کورٹ۔ بھدرا کالی مندر، سٹی ہال، سینٹرل امیگریشن آفس سے گزرتے ہوئے باغ بازار پہنچی یہاں گاڑی روک کر جانوس نے کچھ شاپنگ کی۔ اس دوران میں ہم ٹنیڈ گلاسز والی گاڑی میں اندر ہی بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا اور ایک مرتبہ پھر گاڑی رام شاہ پاتھ پر آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی ہم کمل پوکھاری کے علاقے میں پہنچ گئے۔ کمل پوکھاری سے گزرنے کے بعد جانوس نے گاڑی کو

دائیں جانب نیکسل روڈ پر موڑلیا۔

کل صبح جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اس کی حفاظت کے لیے ایک باڈی گارڈ نما ڈرائیور بھی اس کے ساتھ تھا لیکن آج اس نے اپنے ساتھ آنے والے ڈرائیور کو جیپ کے ساتھ کہیں اور روانہ کردیا تھا۔ سنگھا نامی اس باڈی گارڈ نے کل صبح ہماری آنکھوں کے سامنے موت کو گلے لگا کر اپنی ڈیوٹی کا حق نبھا دیا تھا۔

باڈی گارڈ کو باڈی کی حفاظت کے لیے رکھا جاتا ہے اور اکثر وہ کسی دوسری باڈی کو تحفظ فراہم کرتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کردیتا ہے اور یہی اس پیشے کا تقاضا بھی ہے ورنہ ایسے باڈی گارڈز کی مثالیں بھی موجود ہیں جو مخالف پارٹی سے لمبی چوڑی رقم کما کر اپنی ہی گن سے اس شخص کے جسم کو چھلنی کردیتے ہیں جس کی حفاظت پر انہیں مامور کیا گیا ہوتا ہے! بہرحال، اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں!

میں نے جانوس کے سامنے سنگھا کا ذکر کیا تو وہ افسردہ ہوگیا۔ یہ ایک مالک کا اپنے وفادار ملازم کے لیے اظہارِ ہمدردی اور اظہارِ افسوس تھا۔ گاڑی میں تھوڑی دیر کے لیے سوگوار خاموشی طاری ہوگئی۔ اس وحشت ناک سناٹے میں صرف تین دل دھڑک رہے تھے یا پھر ہم تینوں کے سانس لینے کی مخصوص دھیمی صدائیں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت ہم تینوں اپنی اپنی کیفیت کے مطابق تین مختلف محاذوں پر سوچ بچار کی جنگ میں مصروف تھے۔

میرا دھیان ساحل میں لگا ہوا تھا، جانوس اپنے جاں نثار گارڈ سنگھا کے بارے میں سوچ رہا تھا اور لی یان کے بارے میں یہی کہا جاسکتا تھا، وہ شون کی یاد میں کھوگئی ہوگی!

نیکسل روڈ پر چلتے ہوئے ہماری گاڑی ایکسپریس ہاؤس کے قریب سے گزری پھر بنگلہ دیش کی ایمبیسی سے تھوڑا پہلے ایک ذیلی سڑک پر مڑنے کے بعد ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کے اندر داخل ہوگئی۔ ''پیتو راما اپارٹمنٹس'' نامی یہ بلڈنگ دراصل بنگلہ دیش ایمبیسی اور ایکسپریس ہاؤس کے درمیان واقع تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپارٹمنٹ نمبر دو سو ایک کے اندر موجود تھے۔

پیتو راما اپارٹمنٹس میں جانوس کے ایک آدمی کاشانوک ہر فن مولا شخص ہے۔ یہ ہماری ہر قسم کی مدد کے لیے فلیٹ میں موجود رہے گا۔ کاشانوک کا تعلق بدھ مت سے تھا اور وہ شکل ہی سے بھردسے کا آدمی لگتا تھا۔ وہ فلیٹ تین آرام دہ بیڈ روم پر مشتمل تھا۔

اس کے بعد ہم جانوس کے ساتھ ایک بیڈ روم میں آگئے۔ جانوس نے بیڈ روم کا دروازہ بند کردیا اور دوستانہ لہجے میں بولا۔

''میں جانتا ہوں، تم لوگوں نے آج ناشتا نہیں کیا۔ کل رات رتنا پارک والے بنگلے پر جو کچھ کھایا تھا اسی کے سہارے چل رہے ہو اور اس دوران میں تم دونوں نے اچھی خاصی مارا ماری بھی کی ہے لہٰذا اس وقت تم دونوں شدید بھوک محسوس کررہے ہوگے'' وہ سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں چاہتا ہوں، تم لوگوں کی بھوک میں اور شدت پیدا ہوجائے اس لیے تم دونوں پہلے اچھی طرح نہا دھولو، فریش ہوکر جب تم واش روم سے باہر آؤ گے تو اس وقت تک میں تم لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرچکا ہوں گا۔ باقی باتیں کھانے کے بعد ہوں گی۔ او کے!''

جانوس کی تجویز نہایت ہی معقول اور وقت کے تقاضے کے عین مطابق تھی۔ کل رات سے اب تک میں اور لی یان جن حالات سے گزرے تھے' ان کی تکلیف کو دور کرنے کے لیے ایک طویل اور گرم شاور بہت ضروری تھا۔ جانوس ہمیں بیڈ روم میں چھوڑ کر باہر نکلا تو ہم نے اپنا بیگ کھول لیا پھر صاف لباس نکال کر ہم دو مختلف واش روم میں گھس گئے۔

ٹھیک ایک بجے دوپہر ہم تینوں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے لذیز ترین کھانے سے انصاف کررہے تھے۔ یہ کھانا جانوس نے کاشانوک سے منگوایا تھا۔ نیپال میں سب سے زیادہ جو کھانا کھایا جاتا ہے' وہ ہے سادہ چاول اور کری جو کہ بڑی چٹ پٹی اور مسالے دار ہوتی ہے یہ کری عموماً پہاڑی بکرے کے گوشت سے تیار کی جاتی ہے ہمارے کھانے میں یہ خصوصی ڈش بھی شامل تھی۔ علاوہ ازیں، کباب اور انڈین و چینی ڈشز بھی موجود تھیں۔

ہم نے خوب سیر ہوکر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد موسم کی مناسبت سے کافی کا دور چلا۔ حسبِ معمول میں نے اس دور میں حصہ نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا، جانوس نے آیندہ کے لیے کیا لائحۂ عمل تیار کررکھا ہے۔ ہوسکتا تھا، ہمیں فوراً اپنے مشن پر روانہ ہونا ہو۔ میں کافی پی کر خواہ مخواہ خود کو سست نہیں کرنا چاہتا۔ چائے کافی وغیرہ مجھے پر الٹا اثر کرتی تھیں!

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہم ایک بیڈ روم میں بند ہوکر بیٹھ گئے۔ کاشانوک کامن روم میں پہرے دار کی حیثیت سے موجود رہا۔ جانوس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''اگر آپ لوگوں کو برا محسوس نہ ہو تو میں ایک سگریٹ

پینا چاہوں گا۔''

میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''کوئی بات نہیں مسٹر جانوس! تم اپنا شوق پورا کرسکتے ہو۔''

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں کھانے کے بعد جب تک ایک آدھ سگریٹ نہ لے لوں، میرا دماغ صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔ اگر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض ہو تو میں باہر جاکر اپنی طلب پوری کرلیتا ہوں۔''

میں نے اس کی تسلی کی خاطر ایک مرتبہ پھر کہا ''ہمیں کوئی اعتراض نہیں مسٹر جانوس! تم سگریٹ سلگالو۔ تمہاری اسموکنگ کے دوران ہی ہم اہم امور پر گفتگو بھی کریں گے۔''

اس نے سگریٹ سلگانے سے پہلے ممنونیت بھری نظر سے ہمیں دیکھا پھر لگاتار دو کش لگانے کے بعد ہماری جانب متوجہ ہوگیا۔ میں اور لی یان ہمہ تن گوش ہوگئے۔

''جوگندر پال نے آج رات اسرائیل سے آنے والے ڈین ہاروے اور کلاڈیا کے اعزاز میں ایک ڈانس پارٹی رکھی ہے جس میں کھانے پینے اور پینے پلانے کا بھی بھرپور بندوبست ہوگا اور یہ خاص پارٹی اسی بنگلے پر دی جارہی ہے جہاں تمہاری ساتھی کو رکھا گیا ہے'' جانوس اپنی معلومات کا دریا بہاتے ہوئے بولا ''اس ڈانس پارٹی میں صرف چند منتخب افراد ہی حصہ لیں گے۔ اسرائیلی مہمانوں کے علاوہ جوگندر پال اور دو چار اس کے قریبی ساتھی وہاں پہنچیں گے۔ البتہ، شہر کے ایک بدنام زمانہ نائٹ کلب سے دو کانٹے کی ڈانسرز کو بھی بلایا گیا ہے جو ہر قسم کے ڈانس کی ماہر ہیں۔ یہ ڈانسرز جوگندر پال کی کوشش سے آنے پر راضی ہوئی ہیں ورنہ وہ اپنے کلب کے سوا کہیں اور فنی مظاہرے کے لیے جاتی نہیں ہیں۔ اس بنگلے میں ایک بہت بڑا ہال بھی موجود ہیں۔ یہ ڈانس پارٹی اسی ہال میں ترتیب دی جارہی ہے۔''

وہ ایک لمحے کو رکا تو میں نے پوچھ لیا ''مسٹر جانوس! یہ اہم معلومات تم تک کیسے پہنچیں؟''

''ٹھیک ہے، مانا کہ جوگندر پال اس شہر کی ایک طاقت ور سیاسی شخصیت ہے لیکن تمہارا یہ دوست!'' اس نے اپنا سینہ ٹھونکا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''کسی سے کم نہیں۔ میں نے اپنے خفیہ ذرائع سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ جوگندر کے سیٹ اپ میں میرے بھی ایک دو بندے موجود ہیں جو مجھے ادھر کے حالات سے گاہے بہ گاہے آگاہ کرتے رہتے ہیں لیکن افسوس کہ اس بنگلے کے اندر میرے کسی آدمی کو رسائی حاصل نہیں ...... خیر!''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں متوقف ہوا پھر پُرعزم لہجے میں بولا ''اس بنگلے کے اندر آج رات ہم رسائی حاصل کریں گے!''

جانوس کے آخری جملے سے ظاہر ہوگیا، وہ رات میں اس بنگلے پر چڑھائی کا ارادہ رکھتا ہے۔ میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں چاہتا تھا، وہ اپنی بات پوری کرلے، اس کے بعد میں کچھ کہوں گا۔ اس کا پُراسرار انداز سننے پر مجبور کررہا تھا۔

جانوس نے ایک مرتبہ پھر پے در پے چار کش لگائے اور ایک چوتھائی بچ رہنے والی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلنے کے بعد دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے سگریٹ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے اندازہ ہوا، اس کی طلب پوری ہوگئی تھی!

''میں نے اس بنگلے میں گھسنے کے لیے بڑا محفوظ طریقہ سوچا ہے'' وہ اپنے منصوبے کی تفصیل بتاتے ہوئے بولا ''اس شہر میں موہن نامی ایک شخص کیٹرنگ کا کام کرتا ہے۔ لارڈ بدھا نے اس کے کام کو بڑی وسعت دی ہے۔ ''وی آئی پی'' کیٹرنگ سروس کھٹمنڈو میں ایک نام اور مقام رکھتی ہے جوگندر نے اس ڈانس پارٹی کے لیے ''وی آئی پی'' والوں سے رجوع کیا ہے۔ وی آئی پی والے نہ صرف وہاں کھانے پینے کا اہتمام کریں گے بلکہ اس کمپنی کے دو افراد مستقل وہاں موجود بھی رہیں گے تاکہ ''پارٹی'' کی ہر ضرورت کو ہمہ وقت پورا کرسکیں۔ میں نے معلوم کرلیا ہے۔ وہ دو افراد وکرم اور ونود ہوں گے۔ ونود قد کاٹھ اور نقش نگار میں تمہارے زیادہ قریب ہے لہٰذا مناسب سے میک اپ کے بعد تم اس کی جگہ لے لوگے۔ اس طرح تمہیں اس بنگلے کے اندر اچھا خاصا وقت گزارنے کا موقع مل جائے گا۔ اندر رہتے ہوئے تم ہمارے لیے راہ ہموار کرسکتے ہو۔''

میں نے پوچھا ''کیا ضروری ہے کہ وی آئی پی والے ونود ہی کو وکرم کے ساتھ اس بنگلے میں بھیجیں؟''

''میں نے اس سلسلے میں یقینی معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی یہ منصوبہ بنایا ہے۔''

لی یان نے کہا ''ٹھیک ہے، تھوڑی دیر کے لیے ہم فرض کرلیتے ہیں، تمہاری معلومات صد فی صد درست ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، وجدان اس بندے یعنی ونود کی جگہ کب اور کیسے لے گا۔ کیا تم ونود کے اغوا کے بارے میں سوچ رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں'' اس نے گردن کو نفی میں جھٹکا ''اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ ونود خود چل کر ہمارے پاس آئے گا۔ ہم

اسے اپنے پاس رکھ کر وجدان کو اس کے میک اپ میں آگے بڑھا دیں گے۔"

میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "مسٹر جانوس! تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے، دی آئی پی کیٹرنگ کمپنی کا ملازم ونود نامی یہ شخص دراصل تمہارا بندہ ہے جو تمہارے احکام کی تعمیل کرے گا؟"

"ونود جو کچھ بھی کرے گا، اپنے باس کے حکم پر کرے گا" وہ فخریہ لہجے میں بولا "دراصل میں نے دی آئی پی کیٹرنگ سروس کے مالک مسٹر موہن کو اپنی مٹھی میں دبا رکھا ہے۔ کسی زمانے میں، میں نے اس پر ایک احسان کیا تھا۔ مجھ سے لیے ہوئے قرض کی مدد سے اس نے محدود پیمانے پر کیٹرنگ کا کام شروع کیا تھا۔ ازاں بعد اس نے میرا قرض تو چکا دیا لیکن جب بھی ملاقات ہوتی ہے، وہ بڑے ارمان سے کہتا ہے...... مسٹر جانوس! کبھی مجھے بھی خدمت کا موقع دیں کوئی کام ہو تو بتائیں۔ میں آپ کے احسان کو زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، آپ ہی کی وجہ سے ہوں۔

"مسٹر موہن بہت ہی احسان شناس اور مخلص شخص ہے۔ میں اس سے احسان کا بدلہ تو نہیں چاہتا تھا لیکن یہ اتفاق ہے کہ اس دوران میں مجھے کبھی اس سے کام ہی نہیں پڑا اور اب......

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر باری باری ہم دونوں کو انکشاف انگیز انداز میں دیکھنے لگا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "اب سوچا، موجودہ حالات میں اس سے یہ چھوٹا سا کام لے ہی لیا جائے۔ اس طرح کم از کم اس کی یہ خلش تو نکل ہی جائے گی کہ وہ کبھی میرے کام نہیں آیا! میں نے موہن سے تفصیلی بات کر کے اسے تعاون کے لیے آمادہ کرلیا ہے۔ ہم ٹھیک سات بجے اس فلیٹ سے ہوٹل شنگریلا منتقل ہو جائیں گے۔ "ہم" سے میری مراد تم دونوں ہو" اس نے انگلی اٹھا کر باری باری ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا "اس منتقلی سے پہلے تم دونوں کے چہروں پر ضروری میک اپ کر دیا جائے گا۔ وجدان، ونود کے حلیے میں اور لی یان ایک اجنبی لڑکی کے روپ میں آکر محفوظ ہو جائے گی۔ ٹھیک نو بجے رات موہن فون کر کے ونود کو جوگندر پال کے بنگلے سے تھوڑی دیر کے لیے بلائے گا۔ ونود، وکرم کو جلدی واپس آنے کا بتا کر وہاں سے چلا آئے گا۔ موہن ونود کو لے کر میرے پاس آجائے گا۔ مجھے ان دونوں سے خصوصی "میٹنگ" کرنا ہے۔ ونود جیسے ہی بنگلے کو چھوڑے گا میں تمہیں فون پر اطلاع دے دوں گا اور تم ہوٹل سے نکل کر بنگلے کی جانب بڑھو گے۔ او کے؟"

"اور لی یان؟" بے ساختہ میرے ہونٹوں سے پھسل گیا۔

"میں لی یان کے ساتھ بنگلے کے باہر موجود رہوں گا۔" جانوس نے حتمی لہجے میں کہا "ہم تینوں کے پاس موبائل فون ہوں گے جس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔ میں موہن وغیرہ والی "میٹنگ" سے فارغ ہو کر سیدھا لی یان کے پاس پہنچوں گا۔ بنگلے کے اندر ہمارے داخلے کا بندوبست تم کرو گے اور میرا خیال ہے۔ یہ تمہارے لیے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا؟"

"میں یہ کرلوں گا" میں نے تیقن سے کہا "مگر اصلی ونود کا کیا ہوگا؟"

وہ مسٹر موہن کے ساتھ کہیں بھی چلا جائے گا مگر جوگندر پال والے بنگلے کی طرف نہیں آئے گا" اسی وقت جانوس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی!

وہ ہماری طرف سے توجہ ہٹا کر موبائل کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ چند سیکنڈ کی معنی خیز "ہوں ہاں" کے بعد اس نے رابطہ ختم کر کے موبائل کو سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولا۔

"ادھر سب خیریت ہے۔ ڈین ہاروے اور اس کی یہودن ساتھی کلاڈیا بنگلے کے اندر ہی ہیں۔ اس کا مطلب ہے' ساحل بھی بنگلے ہی میں ہے۔ میرے آدمی نے مجھے بتایا ہے' پانچ منٹ پہلے جوگندر پال وہاں پہنچا ہے۔"

میں نے کہا "جانوس! تمہارے مطابق' اس بنگلے میں جوگندر کا یہ تیسرا چکر ہے۔ پتا نہیں' وہ کس چکر میں ہے" جوگندر کا رویہ مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

"اس کے چکر کا بھی پتا چلا لیں گے" وہ پُرسوچ انداز میں بولا "پہلے میں ذرا گوتم کی خبر لے لوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹیلی فون اسٹینڈ کی جانب بڑھ گیا جو بیڈروم کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ گوتم...... ایک نیا نام سامنے آیا تھا لہٰذا میں خاموشی اور توجہ سے جانوس کی حرکات وسکنات کو نوٹ کرنے لگا۔

وہ ٹیلی فون سیٹ کو اٹھا کر میرے قریب ہی آ بیٹھا پھر اس نے ریسیور اٹھا کر فون کے ڈائل پر فور ون ڈبل زیرو فائیو ون کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف رابطہ ہونے پر اس نے کمرا نمبر ون او سکس مانگ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی گوتم سے بات کر رہا تھا۔

ان کے درمیان بہ مشکل پندرہ سیکنڈ بات ہوئی ہوگی۔

ریسیور کریڈل کرنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور بتایا "ہوٹل شنگریلا میں بھی ہر قسم کی خیریت ہے؟"

"تم نے ہوٹل کے کمرا نمبر ایک سو چھ میں بات کی ہے" میں نے کہا "کیا گوتم اس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہے...... اور یہ گوتم ہے کون؟"

"گوتم میرے بھروسے کا آدمی ہے" جانوس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا "کمرا نمبر ون او سکس میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ آج ہی بنارس سے کھٹمنڈو پہنچا ہے' تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟" وہ معنی خیز انداز میں ذرا متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے بولا "تم دونوں اس کے ملاقاتیوں کی حیثیت سے ہوٹل میں پہنچو گے لہٰذا کسی کو تم پر کوئی شک نہیں ہوگا۔ کمرا نمبر ون او سکس میں گوتم ایک وفادار ملازم کی طرح تم دونوں سے پیش آئے گا!"

"اچھا' تو تم نے ایسی منصوبہ بندی کر رکھی ہے!" میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

وہ بولا "میں نے تو اپنی پلاننگ کے بارے میں تمہیں تفصیلاً بتا دیا۔ اب تم کہو' کیا کرنا ہے؟"

"تمہارا منصوبہ اچھا ہے مگر کسی کھٹ راگ کے مانند شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"پھر؟" وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "پھر...... یہ کہ میں اسے تھوڑا ایڈٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں' بتاؤ۔ تم کیا چاہتے ہو؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے' موہن سے تفصیلی بات کر کے اسے تم نے تعاون کے لیے آمادہ کیا ہے" میں نے گمبھیر انداز میں کہا "میں پہلے یہ جاننا چاہوں گا' موہن نامی یہ شخص ہمارے معاملات سے کس حد تک واقف ہے؟"

جانوس نے جواب دیا "ہمارے منصوبے کی اسے مطلق خبر نہیں۔ اسے اصل حالات سے آگاہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے تو موہن سے صرف اتنا کہا ہے کہ وہ ونود کو لے کر میرے پاس آجائے۔ مجھے ان دونوں سے ایک ضروری کام ہے۔ اس پر موہن نے کہا کہ ونود میرے مطلوبہ وقت پر وہاں جوگندر پال کے بنگلے میں مصروف ہوگا تو میں نے کہا' وہ تھوڑی دیر کے لیے اسے بلا لے۔ اس پر وہ راضی ہوگیا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا "میں صرف اتنا چاہتا ہوں' ونود رات نو بجے کچھ دیر کے لیے اس بنگلے سے ہٹ جائے تاکہ تمہیں وہاں داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ تم رات نو بجے سے پہلے ہی ونود کا روپ دھار چکے ہوگے۔ اس سلسلے میں تمام انتظامات مکمل ہیں۔"

پھر وہ مجھے ان انتظامات کی تفصیل بتانے لگا۔ باغ بازار سے جانوس نے جو شاپنگ کی تھی' اس میں دیگر ضروری اشیا کے علاوہ میک اپ کے جملہ لوازمات بھی شامل تھے۔ میری فرمائش پر اس نے ایک دکان سے میرے لیے ایک خوب صورت خنجر بھی خرید لیا تھا جس کے ساتھ ایک دیدہ زیب چمڑے کا کیس بھی موجود تھا۔ ونود اور وکرم کی' پوسٹ کارڈ سائز تصاویر بھی حاصل کرلی گئی تھیں تاکہ میرے میک اپ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے اور وکرم کے خال وخط کو بھی میں اپنے ذہن میں نقش کرلوں۔ مجھے رات نو بجے کے بعد جوگندر پال کے بنگلے میں ونود کی حیثیت سے وکرم کی معیت میں وقت گزارنا تھا۔ جانوس نے مجھے وکرم اور ونود کے باہمی تعلقات کی نوعیت کے بارے میں بھی بتا دیا تاکہ اسے ہینڈل کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

اس سیٹ اپ کو دیکھتے ہوئے میں مطمئن ہوگیا اور جانوس سے کہا "تم نے بڑا بھرپور بندوبست کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے' اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ہم اسے انتہائی مختصر کرسکتے ہیں!"

"ہاں بولو' میں سن رہا ہوں؟" وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "تم ونود اور موہن کے ساتھ کیا کرتے ہو' یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ میں صرف اتنا چاہوں گا کہ ونود ٹھیک نو بجے رات' وکرم سے تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر نکلے اور پھر دس بجے سے پہلے ادھر کا رخ نہ کرے بلکہ ممکن ہو تو وہ آج رات ادھر آئے ہی نہیں۔ موہن اسے کسی بھی کام میں الجھا دے۔ تم ان دونوں سے جو بھی میٹنگ کرو گے' وہ اس فلیٹ پر نہیں ہوگی تو ونود کے' جوگندر پال کے بنگلے سے غیاب کی وجہ سے ان دونوں پر کوئی مصیبت بھی نہیں آئے گی۔ اس قسم کی محفوظ پلاننگ کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

"یہ ہو جائے گا۔ آگے بولو؟" جانوس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "میں ونود کے اور لی یان کسی اجنبی لڑکی کے روپ میں ساڑھے آٹھ بجے اس فلیٹ سے نکلیں گے۔ میرے جسم پر دی آئی پی کیٹرنگ کمپنی کی مخصوص یونی فارم ہوگی جو تم مجھے مہیا کرو گے۔ ہم دونوں کے پاس تمہارے دیے ہوئے موبائل فون ہوں گے۔ ہم لازم پت کے علاقے

میں بڑی شرافت کے ساتھ سڑکیں ناپتے رہیں گے۔ جب تم فون کر کے مجھے بتاؤ گے کہ ونود اس بنگلے سے نکل آیا ہے تو دس پندرہ منٹ کے بعد میں ونود کی حیثیت سے وکرم کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ پھر لی یان کو بنگلے کے اندر کس طرح بلانا ہے' یہ میں سوچ لوں گا'' میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا'' فی الحال ہوٹل شنگریلا کا چکر رہنے دو۔ اس پناہ گاہ کو بعد میں کسی فوری ضرورت کے تحت استعمال کرلیں گے۔''

''اور میں......'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا'' میں اس مشن میں کہیں نظر نہیں آرہا؟''

''تم بھرپور تعاون کی صورت میں قدم قدم پر ہمارے ساتھ ہو'' میں نے کہا'' تم اس فلیٹ پر ہماری واپسی کا انتظار کرنا۔ ہم اپنے مشن میں کامیابی کے بعد سیدھا یہیں آئیں گے۔''

''یہ نہیں ہوسکتا وجدان!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''میں تم دونوں کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔''

''پھر تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کسی بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا'' میں موہن اور ونود سے فارغ ہوکر تمہاری طرف آجاؤں گا اور ایک اسٹیشن ویگن پر جوگندر پال کے بنگلے کے قریب ہی کسی محفوظ آڑ میں موجود رہوں گا۔ تم جب بنگلے سے نکلنے لگو تو مجھے موبائل پر رنگ دے دینا' میں اسٹیشن ویگن کے ساتھ بنگلے کے گیٹ پر پہنچ جاؤں گا۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا پھر بڑے عجیب سے لہجے میں بولا'' کم از کم اتنا ہاتھ تو مجھے بھی بٹانے دو وجدان!''

''ٹھیک ہے' یہی طے ہوگیا'' میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

اس کے بعد آدھے گھنٹے تک ہمارے درمیان دیگر اہم امور پر بات چیت ہوتی رہی۔ جانوس نے دو موبائل فون ہمارے حوالے کیے اور اپنا رابطہ نمبر بھی ہمیں بتادیا۔ یہ نمبر ڈاکٹر مونگ کے توسط سے پہلے ہی مجھ تک پہنچ چکا تھا۔ جانوس نے تین پوسٹ کارڈ تصاویر بھی مجھے دکھائیں۔ ان میں دو تو ونود اور وکرم کی تصویریں تھیں اور تیسری کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ جوگندر پال کی تصویر ہے۔

''جوگندر کے ساتھ جو دو تین افراد آج رات اس بنگلے پر پہنچیں گے' وہ مقامی ہیں'' جانوس نے بتایا۔ ''لہٰذا ڈین ہاردے اور کلاڈیا کو پہچاننے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ وہ دونوں رنگ و نسل کے اعتبار سے ان سب سے خاصے مختلف ہوں گے۔ میں ان یہودیوں کی تصاویر حاصل نہیں کرسکا۔''

میں نے کہا'' جانوس! گاڑی میں جب ہمارے درمیان ڈین ہاردے اور اس کے ساتھی کلاڈیا کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی تو تم نے ایک خاص انداز میں کلاڈیا کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا' وہ بڑی زبردست شے ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے' تم اسے دیکھ چکے ہو؟''

''میں نے اپنی ان آنکھوں سے تو نہیں دیکھا'' وہ بڑی حسرت سے دونوں آنکھوں کو چھوتے ہوئے بولا'' بس سنا ہی سنا ہے۔ جن لوگوں نے اس سراپا قیامت کو دیکھا ہے' ان کی رائے کو رد نہیں کیا جاسکتا۔''

''ٹھیک ہے' اگر یہ بات ہے تو ہم بھی دیکھیں گے'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے پوچھا'' تم لازم پت کی طرف جاتے ہوئے کس قسم کی گاڑی استعمال کرنا چاہو گے؟''

''کسی بھی قسم کی نہیں'' میں نے قطعیت سے کہا'' ہم یہاں سے ٹیکسی پکڑیں گے اور لازم پت کے اندر سے گزرتے ہوئے پانی پوکھاری کی طرف نکل جائیں گے۔ رائل گیسٹ ہاؤس سے تھوڑا آگے جاکر ہم ٹیکسی والے کو فارغ کردیں گے اور چند قدم واپس چلنے کے بعد ''بالووتر'' روڈ سے دوسری ٹیکسی لے لیں گے اور اٹالین ایمبیسی کے قریب پہنچ کر اس ٹیکسی کو بھی چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد ہم اپنے ٹارگٹ کے نزدیک رہتے ہوئے تمہارے فون کا انتظار کریں گے'' میں نے سانس لینے کے لیے توقف کیا پھر کہا'' جب تم اسٹیشن ویگن کے ساتھ اس بنگلے کے نزدیک ہی موجود ہوگے تو پھر ہمیں کسی گاڑی کا اچار ڈالنا ہے کیا؟''

جانوس نے تسلی بخش انداز میں گردن ہلائی اور بولا ''ٹھیک ہے'' پھر پوچھا'' تم لوگوں کو کوئی خاص ہتھیار چاہیے ہو تو بتادو؟''

میں نے کہا'' میرے لیے تو یہ خنجر ہی کافی ہے۔''

جانوس نے باغ بازار سے جو خریداری کی تھی وہ تمام چیزیں اس وقت میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ جانوس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے مذکورہ خنجر کو اٹھالیا تھا۔ آٹھ انچ پھل والے اس خنجر کے ایک طرف تیز دھار تھی جبکہ دوسری جانب خطرناک دندانے بنے ہوئے تھے۔ اس خنجر کا دستہ لگ بھگ چار انچ لمبا تھا۔

جانوس نے ایک ننھا منا پسٹل لی یان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا'' یہ تمہارے لباس میں بڑی آسانی سے چھپ جائے گا اور بہ وقت ضرورت انتہائی مفید ثابت ہوگا۔''

لی یان نے کسی تردد کے بغیر وہ لیڈی پسٹل رکھ لیا۔

جانوس اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا'' اب میں چلوں گا۔ مجھے کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔ میں لگ بھگ چھ بجے واپس آجاؤں گا اور رات کے کھانے کے لیے بھی کچھ لیتا آؤں گا۔ پھر جب تک تم دونوں یہاں سے روانہ نہیں ہوجاتے' میں اسی فلیٹ میں موجود رہوں گا۔ تمہارے میک اپ کے مراحل میری نگاہ کے سامنے طے ہوں گے۔'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا'' کاشانوک اس دوران میں مسلسل یہاں کامن روم میں موجود رہے گا۔ یہ ہر فن مولا قسم کا آدمی ہے۔ تم لوگ اس سے کوئی بھی کام لے سکتے ہو۔ ویسے میرا ایک مشورہ ہے'' اس نے باری باری سوالیہ نظر سے ہم دونوں کو دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولا'' تم لوگوں کو جتنا وقت مل رہا ہے' اچھی طرح آرام کرلو اور ہوسکے تو ایک پُرسکون نیند بھی لے لو۔ آئندہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''

''ٹھیک ہے'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' ہم تمہارے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔''

پھر وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر فلیٹ سے رخصت ہوگیا۔

میں نے لی یان کے ساتھ گھوم پھر کر اس فلیٹ کا جائزہ لیا۔ راہ نمائی اور معلومات کی فراہمی کے لیے کاشانوک ہمارے ہم راہ رہا۔ وہ فلیٹ بنیادی طور پر تین بیڈ رومز اور ایک کامن پر مشتمل تھا اور خاصی محفوظ بلڈنگ میں واقع تھا۔ پیوراما اپارٹمنٹس کا شمار کھٹمنڈو کی پوش رہائشی عمارتوں میں ہوتا ہے۔

ہم واپس اپنے بیڈ روم کی طرف آنے لگے تو کاشانوک نے احترام بھرے لہجے میں کہا'' اگر آپ لوگوں کو کسی شے کی ضرورت ہو تو میں کامن میں موجود ہوں۔''

کاشانوک کا تعلق بدھ مت سے تھا اور وہ بڑی روانی سے انگلش بولتا تھا۔ وہ مضبوط بدن کا مالک ایک چاق و چوبند شخص تھا۔ آنکھوں کی چمک بتاتی تھی' وہ ذہین اور بیدار مغز بھی ہے۔ کاشانوک نے پورا سر منڈوا رکھا تھا۔ اس سے اس کی شخصیت کچھ اور نمایاں ہوگئی تھی۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا'' ٹھیک ہے' بتادیں گے۔''

پھر ہم دونوں بیڈ روم کے اندر بند ہوگئے۔ لی یان نے کہا'' وجدان! مجھے تو بالکل نیند نہیں آرہی۔ کیا تم سونے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت سہ پہر کے تین بجنے والے تھے۔ میں نے لی یان سے کہا'' کوئی خاص نیند تو مجھے بھی نہیں آرہی لیکن جانوس کے مشورے پر عمل کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' تم سونے کی کوشش کرنا چاہتے ہو!''

''ہاں' ایسی ہی بات ہے'' میں نے کہا'' تمہیں اگر نیند نہیں آرہی تو ٹی وی دیکھ لو۔''

''ٹی وی کی آواز تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گی؟''

میں نے بے ساختہ کہہ دیا'' ڈسٹرب تو وہ ہوتا ہے جو پُرسکون ہو۔''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی'' ٹی وی کو بند ہی رہنے دو۔ میں کوئی میگزین دیکھ لیتی ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ گلاس ٹاپ کارنر ٹیبل کی طرف بڑھ گئی جہاں مختلف قسم کے میگزینز رکھے تھے۔ اس نے فیشن اور فوٹوگرافی سے متعلق دو میگزینز اٹھائے اور واپس صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بیڈ روم میں ڈبل بیڈ کے علاوہ ایک مکمل صوفہ سیٹ بھی موجود تھا اسی طرح وہ بیڈ کم سٹنگ روم بن گیا تھا۔

میں نے جوتے اتارے اور بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کہا ''لی یان! تم ٹی وی کی آواز دھیمی رکھ کر اسے آن کرلو۔ میں بالکل ڈسٹرب نہیں ہوں گا۔''

''اوکے'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی'' دیکھتی ہوں' اگر میگزینز میں دل نہ لگا تو ٹی وی آن کرلوں گی۔''

میں نے آنکھیں بند کرلیں اور لی یان پر یہی ظاہر کرنے لگا جیسے میں سونے کی کوشش کررہا ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے بھی نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔ اس وقت میرا ذہن مسلسل ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کا سراپا روشن ہوگیا۔ ساحل تو میرے لیے جاگتی آنکھوں کا خواب بن گئی تھی' بند آنکھوں کے پیچھے روشن کیسے نہ ہوتی!

میں نے اس کے خدوخال پر توجہ مرکوز کی اور تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا......اور اس مرتبہ مجھے مکمل ناکامی نہیں ہوئی۔

میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ میری جانِ تمنا اس وقت ایک آرام دہ بستر پر چت لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا' وہ فطری نیند کا مزہ لوٹ رہی ہے یا اس پر مصنوعی نیند طاری ہے۔ وہ ان دلوں ربی اور اس کے چیلوں کے جن تجربات کا نشانہ بنی ہوئی

تھی' ان کے پیش نظر مصنوعی نیند کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ جمی نے عبادت گاہ کے تہ خانے میں' اپنی زندگی کی سانسیں پوری کرنے سے پہلے مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں' ان کے مطابق' موشے ہائمن کے بھیجے ہوئے ڈین ہاردے نے کسی طرح ساحل کے اندر سے' تہ خانے کے خفیہ راستے کا راز اگلوالیا تھا۔ جمی فونڈا کے انکشاف نے مجھے یہ سوچنے پہ مجبور کردیا تھا کہ موشے ہائمن کی طرح ڈین ہاردے بھی پُراسرار صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔ آخری خبروں تک ساحل' ڈین ہاردے کے قبضے میں تھی لہٰذا یہی کہا جاسکتا تھا' وہ اس وقت ڈین ہاردے ہی کے کسی ساحری عمل کے زیرِ اثر تھی۔

اس کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔ میں نے تصور کی نگاہ دوڑا کر اس بیڈ روم کا جائزہ لے لیا۔ وہ ایک عام سا بیڈ روم تھا۔ میں ساحل کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ کافی دنوں کے بعد میرے تصور کی گرفت میں آئی تھی۔ میں خاصی دیر تک یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ ان لمحات میں یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وقت ایک مقام پر رک گیا ہو اور وہ مقام صرف اور صرف ساحل تک محدود ہو۔ وہ بے حس حرکت خاموش لیٹی تھی۔ اس کے چہرے سے نگاہ ہٹی تو تھوڑا نیچے آگئی۔ میں بڑی تشویش سے اس میں زندگی تلاش کرنے لگا۔ اس کے سینے کا زیر و بم ظاہر کرتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور گہری بے ہوشی میں ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مسلسل ناکام ہورہا تھا۔ پتا نہیں' موشے ہائمن نے میری تیسری آنکھ کی راہ میں کون سی طلسماتی رکاوٹ کھڑی کردی تھی کہ تصور کا پرندہ اس رکاوٹ کو عبور کرنے سے پہلے ہی پھڑ پھڑا کر زمین بوس ہوجاتا۔ اب میں اس کے ماحول میں پہنچا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' ڈین ہاردے نے ساحل کی یادداشت میں سے نیل کنڈ والی بدھ عبادت گاہ کے تہ خانے کا راز اگلوانے کے لیے جو بھی روحانی عمل کیا تھا' اس نے موشے ہائمن کے لگائے ہوئے لاک کو کھول دیا تھا۔

میرے ذہن میں شدت سے اس خیال نے سر ابھارا ......اس سے پہلے کہ ساحل کو کسی ایسے ویسے عمل سے گزار کر پھر مجھ سے' میری باطنی آنکھ کی رسائی سے دور کردیا جائے' مجھے فوراً اس تک پہنچ جانا چاہیے۔

یہ خیال اتنا طاقت ور تھا کہ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ بیڈ پر میرے پہلو میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ لی یان کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''کیا ہوا وجدان! لگتا ہے' تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے۔''

میں ساحل کے تصور میں کھو کر اپنے گردونواح سے یکسر بے گانہ ہوگیا تھا۔ پتا نہیں' لی یان کس وقت بستر پر آ کر دراز ہوگئی تھی۔ مجھے ہڑبڑا کر اٹھتے دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور متوحش نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے سرسری انداز میں کہا'' کچھ نہیں لی یان!''

''بہت کچھ ہے'' وہ مجھے بازو سے پکڑ کر تقریباً جھنجوڑتے ہوئے بولی ''تم نہ بتاؤ مگر تمہارا چہرہ چغلی کھا رہا ہے۔ تم نے یا تو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے یا پھر اچانک ہی کوئی خطرناک بات تمہارے ذہن میں آئی ہے؟''

''تمہارا دوسرا اندازہ درست ہے'' میں نے اس زود فہم لڑکی کے سامنے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔

وہ تشویش بھرے لہجے میں مستفسر ہوئی ''وجدان! کیا مسئلہ ہے؟''

''ہم اسی وقت جوگندر پال کے بنگلے کی طرف جارہے ہیں'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی ''کیا تم' پروگرام میں اس اچانک تبدیلی کے بارے میں جانوس کو بتاؤ گے؟''

''نہیں!'' میں نے قطعیت سے کہا۔

میرے دوٹوک لہجے نے لی یان کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ میرے اسٹائل کو بہ خوبی سمجھنے لگی تھی' ایک بھی سوال کیے بغیر اس نے حتمی لہجے میں کہا ''اوکے' وی آر لیونگ۔''

میں نے اس خوبصورت خطرناک خنجر کو لیدر کیس سمیت اپنی پنڈلی پر باندھ لیا۔ لی یان نے بھی لیڈی پسٹل کو اپنے لباس میں رکھا اور پُراعتماد لہجے میں بولی ''آئی ایم ریڈی!''

ٹھیک دس منٹ کے بعد ہم پوری طرح تیار ہوکر بیڈ روم سے نکل آئے۔ یہ تیاری اگرچہ ہنگامی بنیادوں پر تھی لیکن ضرورت کے عین مطابق تھی۔ ہم کامن روم میں پہنچے تو کاشانوک ہمیں دیکھ کر چونک اٹھا۔

''آپ لوگ کہیں جارہے ہیں؟'' وہ حیرت زدہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے جواب دیا ''ہم باہر جارہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔''

''میں بھی ساتھ چلوں'' وہ ٹھٹکے ہوئے انداز میں پوچھ بیٹھا۔

''نہیں' اس کی ضرورت نہیں'' میں نے کہا ''کھٹمنڈو میرا دیکھا بھالا شہر ہے۔''

اس نے پوچھا ''کیا آپ نے مسٹر جانوس کو اس بارے میں بتادیا ہے؟''

''ہاں' جانوس سے میری بات ہوگئی ہے'' میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ مطمئن تو نہیں ہوا لیکن بہرحال' اس نے مزید کوئی سوال بھی نہیں کیا اور ہمیں جانے کی ''اجازت'' دے دی۔ ہم پیوراما اپارٹمنٹس سے نکل کر نیکسل روڈ پر آگئے اور ایکسپریس ہاؤس کی طرف پیدل ہی چلنے لگے۔

لی یان نے کہا ''تمہارا کیا خیال ہے وجدان! کاشانوک' جانوس کو ہمارے بارے میں نہیں بتائے گا؟''

''میرا خیال ہے' یہ پہلی فرصت میں جانوس سے رابطہ کرے گا'' میں نے جواب دیا۔

''پھر تم نے اس سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے؟''

میں نے لی یان کے سوال کا جواب دینے کے بجائے جیب سے سیل نکالا اور کی پیڈ پر جانوس کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری طرف رابطہ ہونے کے بعد' رسمی علیک سلیک کے چکر میں پڑے بغیر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''جانوس! کیا تم مجھے جوگندر پال کے بنگلے کا فون نمبر بتا سکتے ہو؟''

''شیور'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا ''ایک منٹ!''

میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے لی یان مسلسل سوالیہ نظر سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔ ایک منٹ سے پہلے ہی جانوس کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''نمبر نوٹ کرلو......فور ڈبل ون تھری ڈبل ون۔''

یہ اتنا آسان نمبر تھا کہ فوراً ذہن نشین ہوگیا۔ میں نے کہا ''نوٹ کرلیا۔ تمہارا شکریہ۔''

''کیا تم اس بنگلے پر فون کرنا چاہتے ہو؟''

''اگر موڈ بن گیا تو کرلوں گا۔''

''ایک بات کا خیال رکھنا'' اس نے تاکیدی لہجے میں کہا ''اس مقصد کے لیے وہ فلیٹ والا فون استعمال نہ کرنا۔ کالر آئی ڈی گڑبڑ کردے گی۔ وہ فلیٹ ہمارے لیے فی الحال ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔''

میں نے کہا ''تم فکر نہ کرو۔ میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں کسی پبلک کال آفس کو ٹرائی کروں گا۔ اس وقت ہم ویسے بھی سیر سپاٹے کے لیے باہر نکلے ہوئے ہیں۔''

''سیر سپاٹے کے لیے!'' اس کے لہجے میں حد درجہ حیرت بھر گئی ''تم تو فلیٹ کے اندر آرام سے سونا چاہتے تھے؟''

میں نے سرسری انداز میں کہا ''بس' نیند نہیں آرہی تھی اس لیے تھوڑی چہل قدمی کے لیے نیچے اتر آئے ہیں۔''

''زیادہ دور تک چہل قدمی کے لیے نہ نکل جانا'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولا ''اور اپنے گردونواح پر کڑی نظر رکھنا۔ کھٹمنڈو کی فضا تم دونوں کے لیے یوں آزاد گھومنے کے لیے سازگار نہیں ہے۔''

''میں تمہاری نصیحت کو یاد رکھوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

لی یان نے اضطراری انداز میں کہا ''جانوس کو تو تم نے اِدھر اُدھر کی پھینک کر مطمئن کردیا لیکن میں محسوس کررہی ہوں' تم ایک خطرناک منصوبہ لے کر فلیٹ سے نکلے ہو۔ کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گے' تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میں نے سیل کو جیب میں رکھا اور چوراہے پر سے دائیں جانب مڑتے ہوئے لی یان کو بتایا ''واقعی' میں کسی کال آفس سے جوگندر پال کے بنگلے پر فون کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم بہ نفسِ نفیس اس بنگلے پر چڑھائی کریں گے'' ایک لمحے کو رک کر میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں ساحل کے سلسلے میں' رات ڈھلنے کا انتظار نہیں کرسکتا لی یان!''

وہ تھوڑی دیر تک مجھے حیرت بھری متذبذب نظر سے دیکھتی رہی پھر سپاٹ آواز میں بولی ''اس بنگلے پر چڑھائی کے لیے تم نے کیا منصوبہ بنایا ہے؟''

''منصوبہ فون کرنے کے بعد بناؤں گا'' میں نے گول مول انداز میں کہا۔

اس کے بعد لی یان نے مزید کوئی سوال نہیں کیا اور خاموشی سے میرے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ ہم پولیس ہیڈ کوارٹر کے پاس سے گزرے تو تھوڑا آگے جاکر بالوتر روڈ پر ہی ہمیں ایک پبلک کال آفس نظر آگیا۔ اگلے ہی لمحے میں کال آفس میں داخل ہونے کے بعد جوگندر پال کے بنگلے کا نمبر ملا رہا تھا۔

ڈائلنگ کی تکمیل کے بعد دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ تیسری گھنٹی پر کسی نے ادھر سے ریسیور اٹھالیا اور بھاری لہجے میں استفسار کیا ''ہیلو' کون؟''

میں نے فرضی تعارف کا سہارا لیتے ہوئے کہا ''میں وشوا ناتھ بول رہا ہوں۔ جوگندر پال سے بات کروادیں'' میں نے کوشش کی کہ میری اصل آواز کھل نہ سکے۔

دوسری طرف بولنے والے کا لب و لہجہ خالصتاً مغربی

تھا۔ وہ جوگندر پال یا کوئی اور مقامی تو ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ میری درخواست کے جواب میں اس نے کہا۔

''جوگندر پال اس وقت یہاں موجود نہیں ہے۔ اس سے بات کرنا ہے تو رات آٹھ بجے کے بعد فون کریں۔''

''آپ کون بول رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

میرا مقصد پورا ہوگیا۔ جوگندر پال وہاں سے جا چکا تھا اور رات آٹھ بجے سے پہلے اس کے ادھر آنے کا امکان نہیں تھا۔ جوگندر کے وہاں نہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ اس بنگلے پر زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوگی۔ ڈین ہاروے' کلاڈیا کے علاوہ سیکیورٹی گارڈز کے نام پر دو تین افراد کی موجودگی متوقع تھی۔ کسی قسم کی ہنگامی کارروائی کے لیے یہ انتہائی مناسب موقع تھا۔ اگر میں کسی طرح اسرائیل ایمبیسی کے پچھواڑے واقع ---- بنگلا نمبر ''جے۔ ٹو ہنڈریڈ'' میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کوئی نہیں روک سکتا تھا......اور یہ کام مجھے ہر صورت میں کرنا تھا۔

ہم کال آفس سے باہر نکلے تو لی یان نے استفسار کیا ''منصوبہ پک گیا؟''

اس کے سوال میں اتنی سادگی تھی کہ میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بھوکا بچہ بڑی معصومیت سے' اپنی ماں سے پوچھ رہا ہو......مما! کھانا پک گیا؟

''ہاں پک گیا'' میں نے گمبھیر انداز میں جواب دیا ''بس' دم پر لگا ہوا ہے!''

وہ قدرے جھنجلا گئی ''کیا بنگلے کے اندر داخل ہونے کے بعد بتاؤ گے؟''

''نہیں' ٹیکسی سے نکلنے کے بعد!''

''ٹیکسی!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی ''کون سی ٹیکسی؟ وجدان! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' اس کے استفسار میں تشویش در آئی ''اس وقت ہم پیدل چل رہے ہیں۔ تم کون سی ٹیکسی میں سے نکلنے کی بات کر رہے ہو؟''

میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا ''جس ٹیکسی میں ہم بیٹھنے جا رہے ہیں؟''

پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی اور سوال کرتی' میں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ اگلے ہی لمحے ہم مذکورہ ٹیکسی کی عقبی نشست پر براجمان ہو چکے تھے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے چائنیز ایمبیسی چلنے کو کہا۔

ٹیکسی بالووتر (Baluwatar) روڈ پر شمال کی سمت بڑھنے لگی۔ میں نے نشست کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

جالوس نے فلیٹ پر مجھے .... جو تین پوسٹ کارڈ تصاویر دکھائی تھیں' ان میں ایک تصویر جوگندر پال کی بھی تھی۔ میں نے دلوذ کرم اور جوگندر کے خد و خال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے جوگندر پال کے نقش و نگار کو ذہن میں ابھارا اور تیسری آنکھ کے طفیل اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت ایک لگژری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کے ماحول میں رہا پھر ٹیکسی میں حاضر ہوگیا۔ اس طرح اس شخص کی بات کی تصدیق ہوگئی جس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے وشوا ناتھ کی حیثیت سے بات کی تھی۔ اب رات آٹھ بجے سے پہلے جوگندر پال ادھر کا رخ کرنے والا نہیں تھا۔

ٹیکسی چائنیز ایمبیسی کے قریب پہنچی تو میں نے ڈرائیور سے کہا ''سیدھا چلتے ہوئے تھوڑا آگے جاؤ اور نیپال راسترا بینک کے پاس روک دینا۔''

ٹیکسی ڈرائیور نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ہمیں مطلوبہ مقام پر ڈراپ کر دیا۔ اس وقت ہم بالووتر روڈ پر چائنیز اور رشین ایمبیسیز کے تقریباً وسط میں کھڑے تھے۔ ٹیکسی وہاں سے رخصت ہوگئی تو لی یان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے' اب تو تمہارا منصوبہ دم سے اتر آیا ہوگا؟''

''بالکل اتر آیا ہے'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

وہ ہمہ تن گوش ہوگئی' انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو ......بتاؤ!

میں نے بتایا ''ہم اندرونی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے تھوڑا واپس آئیں گے تو اس پوش رہائشی علاقے میں پہنچ جائیں گے جہاں جوگندر پال کا بنگلا نمبر ''جے۔ دو سو'' واقع ہے۔ ہم مذکورہ بنگلے کے گرد و نواح کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اندر داخل ہو جائیں گے۔ بس اتنا سا منصوبہ ہے'' میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم بنگلے کی عقبی جانب سے اندر پہنچو گی اور میں سامنے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔ ہمارا ٹارگٹ ساحل

ہے جو اس بنگلے کے کسی بیڈ روم میں' اس وقت گہری نیند میں ہے۔ ہمیں اس تک پہنچنا ہوگا۔ مخصوص تبتی نقوش کے سبب تم اسے بہ آسانی شناخت کر لو گی۔ دن دہاڑے ساحل کے علاوہ اس بنگلے میں موجود تمام افراد جاگ رہے ہوں گے۔ میرا خیال ہے' ہمیں زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

لی یان نے دو چار اہم سوال کیے ''تمہارے اندازے کے مطابق' اس بنگلے پر اس وقت کتنے افراد موجود ہوں گے؟''

''میرا خیال ہے' ڈین ہاروے اور کلاڈیا کے علاوہ دو تین سیکیورٹی گارڈز وغیرہ ہو سکتے ہیں۔'' میں نے اپنے اندازے کا اظہار کر دیا۔

وہ پُراعتماد انداز میں بولی ''پھر تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ان لوگوں سے نمٹنا ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں ہوگا۔''

''تو پھر چلیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے پوچھنے لگی ''واپسی میں سواری کے لیے تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟ وہاں بنگلے میں کوئی بھی سنگین صورتِ حال پیش آ سکتی ہے اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ ہمیں ہنگامی حالت میں وہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''ٹھیک کہتی ہو'' میں نے کہا ''مجھے امید ہے' بنگلا نمبر ''جے۔ دو سو'' میں کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور موجود ہوگی جو ہمیں وہاں سے فرار میں مدد دے سکتی ہے اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو......'' میری آواز بھرا گئی ''تو...... میں ساحل کو پانے کے بعد تو ہوا میں اڑ کر بھی یہاں سے جا سکتا ہوں۔''

میرا---آخری جملہ جذبات کی مغلوبیت کا غماز تھا۔ میں بھلا کیوں کر اڑ سکتا تھا لیکن ان لمحات میں لی یان نے ذرا سا بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ میری حیرت انگیز صلاحیتوں کے اتنے مناظر دیکھ چکی تھی کہ شاید میری اس اڑنے والی بات کو بھی سچ سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے کوئی وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔

جلد ہی ہم بنگلہ نمبر ''جے۔ دو سو'' تک پہنچ گئے۔ ہم نے آئندہ دس منٹ میں اچھی طرح گھوم پھر کر بنگلے کا جائزہ لے لیا۔ وہ ایک عالی شان سنگل اسٹوری بنگلا تھا۔ عقبی دیوار کی اونچائی آٹھ فٹ رہی ہوگی۔ اس دیوار کے اوپر کسی قسم کی حفاظتی خاردار باڑ نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی کسی طرح کے کانچ کے ٹکڑے نصب تھے۔ گویا اس بات کا امکان پیدا ہوگیا کہ اندر کی جانب کوئی مسلح گارڈ ہو سکتا تھا۔

میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''اس دیوار کو پھلانگ کر اندر چلی جاؤ گی یا میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کروں؟''

''میں یہ کام کر لوں گی'' وہ پُرعزم لہجے میں بولی ''تم بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچو۔ اندر پہنچ کر ہمیں ایک ساتھ ریڈ کرنا چاہیے۔ بنگلا سنگل اسٹوری ہے اس لیے میرا خیال ہے' ہم جلد ہی ایک دوسرے سے آ ملیں گے۔''

''اوکے!'' میں نے الوداعی نظر سے لی یان کو دیکھا ''وش یو گڈ لک!''

''سیم ٹو یو'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے سامنے والے حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ پہلے پھیرے میں' میں نے بنگلے کے گیٹ پر ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ...کو مستعد کھڑے دیکھا تھا۔ اب اس سے نمٹاؤ کا وقت آ گیا تھا۔ میں نے اپنے ٹرائی بینڈ جی ایس ایم سیل کو سائلنٹ الرٹ پر رکھ کر جینز میں ٹھونس لیا۔

میں بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچنے کے بعد گیٹ کی طرف بڑھا تو گارڈ حد سے زیادہ الرٹ ہوگیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر سر کی خفیف سی جنبش سے اسے ''ہیلو'' کیا پھر پوچھا۔

''کیا مسٹر جوگندر پال یہیں رہتا ہے؟''

''تم کون ہو......اور جوگندر پال کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟'' وہ اکھڑ لہجے میں بولا۔

''میں اس سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے چوکنا نظر سے گارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

وہ میرے انداز کو دیکھتے ہوئے اور محتاط ہوگیا ''جوگندر پال اس وقت بنگلے میں نہیں ہے اور......تم اپنی شناخت کرائے بغیر اندر نہیں جا سکتے۔''

''شناخت!'' میں نے برہمی سے اسے دیکھا ''میں جوگندر کا باپ ہوں۔ کیا تم مجھ سے شناخت مانگو گے؟'' بات کے اختتام تک میرا انداز ہتک آمیز ہوگیا۔

میں دانستہ اس قسم کی جارحانہ گفتگو کر کے اس کو فرائض سے ''غافل'' کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ گارڈ میرے سوال کا جواب دیتا' اندر سے کسی نے پوچھا ''کس سے الجھ رہے ہو وجے!''

''کوئی شخص خود کو جوگندر صاحب کا باپ بتا رہا ہے'' وجے نامی اس گارڈ نے متاملانہ انداز میں کہا ''راجیش! تم آ کر دیکھو' یہ کیا چکر ہے؟''

''میں آ رہا ہوں۔'' اندر سے راجیش نے کہا۔

وہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ ایک گارڈ کو میں باتوں میں الجھا چکا تھا' دوسرا ابھی سامنے آنے والا تھا۔ اگر میں بہ یک وقت ان دونوں کو شکار کر لیتا تو مزاحمت دم توڑنے پر مجبور ہو جاتی۔ پھر کلاڈیا اور فراڈیا (ڈین ہاردے) سے نمٹنا ہمارے لیے مشکل نہ رہتا!

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوسرا' راجیش نامی گارڈ گیٹ پر نمودار ہوا۔ اس نے باہر آ کر ایک تنقیدی نظر مجھ پر ڈالی پھر قبل اس کے کہ وہ مجھ سے کچھ پوچھتا' بنگلے کے عقبی حصے میں گولی چلنے کی مخصوص آواز اُبھری۔ اس آواز نے گویا مجھے گرین سگنل دکھا دیا۔

میں چشم زدن میں سمجھ گیا' اس طرف لی یان نے محاذ سنبھال لیا تھا۔ میں بھلا کیوں کر اس سے پیچھے رہ سکتا تھا۔ گولی کی آواز پر دونوں گارڈز نے الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا' لمحے بھر کے لیے ان کی نگاہیں مجھ سے ہٹ گئیں۔ میرے لیے وہ لمحہ صدیوں کی مہلت کا حامل تھا۔

میں نے بڑی سرعت سے حرکت میں آتے ہوئے وجے کو ایک زوردار فرنٹ کک ماری۔ راجیش کی جانب متوجہ ہونے کی وجہ سے اس کی پشت میری سمت ہو گئی تھی۔ میری کک بڑے بھرپور انداز... میں اس کے کندھوں کے عین وسط میں لگی اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے راجیش کی طرف گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر الجھے اور کھلے ہوئے گیٹ سے اندر جا پہنچے۔

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایک لمبی جست بھری اور ان کے سر پر پہنچ گیا۔ اب ہم تینوں بنگلے کے اندر تھے۔ میں نے گیٹ کو بند کر کے اندر سے کنڈی لگا دی اور ان گارڈز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

وہ اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد پر بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھل کر مجھے اپنی گن کا نشانہ بنانے کی کوشش کرتے' میں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔

وجے اٹھ کر جیسے ہی میری سمت پلٹا' میں نے اس کے گن بردار ہاتھوں پر ایک تیز رفتار کریسنٹ کک ماری۔ گن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور لان پر جا گری۔ میں نے فرنٹ فٹ پر آتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک دھانسو قسم کا پنچ رسید کر دیا۔ وہ بلبلاتے ہوئے پیچھے کو گیا۔ میں پلٹ کر راجیش کی جانب متوجہ ہو گیا۔

راجیش اس دوران میں سنبھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے جیسے ہی گن میری جانب سیدھی کی' میں نے ایک خطرناک راؤنڈ ہاؤس کک چلا دی۔ میری کوشش تھی کہ اس بنگلے میں فائرنگ کی نوبت نہ آئے۔ میں خواہ مخواہ آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میری زوردار راؤنڈ ہاؤس راجیش کی بغل میں لگی تو ردِعمل کے طور پر اس کے دونوں ہاتھ فضا میں اٹھ گئے۔ میں نے تیزی سے نیچے بیٹھتے ہوئے بیک سوئپ چلا دی۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل ڈرائیو دے کے پختہ فرش پر آ رہا۔

گن ہنوز اس کے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر اس پر ایک بھرپور حملہ کر دیا۔ میرے پاؤں کی دھواں دھار ٹھوکر اس کی کلائی پر لگی تو اس کے ہاتھ گن کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ میں نے ایک غصیلا ٹھڈا مار کر راجیش کی گن کو بھی وجے کی گن کے پاس سرسبز لان پر پہنچا دیا۔

راجیش تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے مرہم کاری میں لگ جاتا۔ میں نے نیچے جھک کر اس کی چربیلی گردن کو اپنے دائیں بازو کی گرفت میں لیا اور ایک مخصوص جھٹکا دے کر اسے دو گھنٹوں کے لیے انٹاغفیل کر دیا۔ اب اس کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا اندیشہ باقی نہیں رہا تھا۔

کھڑے ہونے سے پہلے مجھے ایک اور ہنگامی قدم اٹھانا پڑا۔ چہرے پر میرے پنچ کا تمغا سجا کر منہ موڑنے والا وجے واپس لوٹ آیا تھا اور عقب سے مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اس کی نیت کو بھانپتے ہوئے اپنے بدن کو ایک خاص زاویے سے ٹوئسٹ کیا اور ہاف وہیل کک چلا دی۔ فل وہیل کک کی بہ نسبت اس میں دگنی قوت پوشیدہ تھی۔

میرے پاؤں کی ایڑی نے اس کی ٹھوڑی پر بوسہ دیا۔ وہ کراہتے ہوئے پیچھے کو گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ملوں پر رکھ لیا۔ میرے خوں خوار پنچز نے اس کی ناک منہ سے خون چھڑا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ کیوں کر میرے تابڑ توڑ حملے کا جواب دے۔ وہ بڑی مشکل میں تھا۔

اسی ناسمجھی کے دوران میں' میں نے اس کی گردن پر واقع ایک مخصوص نس کو دبا کر اسے بھی اس کے ساتھی کے پاس پہنچا دیا۔ اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ اب وہ بھی راجیش سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ میں نے ان دونوں پر اطمینان بھری نظر ڈالی اور لان کی سمت بڑھ گیا۔

میں نے لان کی گھاس پر سے دونوں گنز کو اٹھا لیا اور محتاط انداز سے بنگلے کی اندرونی جانب قدم اٹھانے لگا۔ بنگلے کے عقبی حصے میں ایک فائر کے بعد کسی قسم کی کوئی آواز نہیں ابھری تھی اور اندرونی جانب بھی سناٹے کا راج تھا۔ اس صورتِ حال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی ابھرا کہ کہیں وہ بنگلا خالی تو نہیں۔ لی یان کو اندر داخل ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ابھی تک وہاں اٹھا پٹخ شروع ہو جانا چاہیے تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ لی یان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو!

نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا......! میرے ذہن نے فوراً تردید کر دی۔ پتا نہیں' میرے اندر کی وہ کون سی قوت تھی جو لی یان کی سلامتی کے لیے پُریقین تھی۔ شاید میں اسے کوئی گزند پہنچتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے گیٹ پر وجے اور راجیش سے جو مارا ماری کی تھی' اس کی خبر گیری کے لیے بنگلے کے اندرونی حصے سے نکل کر کسی کو گیٹ کی طرف ضرور آنا چاہیے تھا۔ یہ پُراسرار خاموشی مجھے ان گنت واہموں میں ڈال رہی تھی۔ میں نے پبلک کال آفس سے تھوڑی دیر پہلے اس بنگلے میں فون پر ایک شخص سے بات کی تھی...... پھر اس سناٹے اور خاموشی کا کیا مطلب تھا؟

بنگلے کے اندرونی حصے میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے لی یان کی خبر لینے کے بارے میں سوچا اور عقبی جانب بڑھ گیا۔ موجودہ صورتِ حال نے مجھے اس کی طرف سے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ گنز کو میں نے ایک محفوظ آڑ میں چھپا دیا اور بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔

وہاں میں نے ایک باوردی مسلح گارڈ کو اوندھے منہ زمین پر پڑے دیکھا تو فوراً سمجھ گیا' اسے لی یان نے شکار کیا تھا۔ میں نے جھک کر اس گارڈ کا جائزہ لیا۔ اس کی وردی میں' عین دل کے مقام پر نمودار ہونے والے سوراخ نے مجھے بتا دیا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بہت دور جا چکا تھا۔ سیدھا ہونے کے بعد میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی مگر لی یان مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہو چکی ہے۔

میں نے ایک دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں عمارت کے اندر تھا...... اور اسی وقت مجھ پر منکشف ہوا کہ اس طرف اتنی خاموشی اور سناٹا کیوں تھا؟ میں نے خود کو ایک ساؤنڈ پروف زون میں پایا۔

ساؤنڈ پروف فضا کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ اندر قدم رکھتے ہی وہ خاموشی اور سناٹا یکسر جاتا رہا۔ کسی قریبی حصے سے ابھرنے والی اٹھا پٹخ کی مخصوص آوازیں میری سماعت تک پہنچیں تو مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعی کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا کہ لی یان اس طرف نبرد آزما تھی۔ وہ ییل (Yell) کرتے ہوئے کسی پر حملہ آور ہو رہی تھی۔

میں نے اسی سمت دوڑ لگا دی۔

ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے میری متلاشی نگاہ اس بیڈ روم کو کھوج رہی تھی جہاں میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے ساحل کو بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا لیکن ایسا بیڈ روم مجھے کہیں دکھائی نہ دیا البتہ اس تلاش میں' میں ایک ایسے کمرے میں پہنچ گیا جہاں لی یان بڑے طمطراق سے موجود تھی۔ وہ دو افراد سے بہ یک وقت نمٹنے میں مصروف نظر آئی۔

ان میں سے ایک عورت اور دوسرا مرد تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ ڈین ہاروے اور کلاڈیا کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اس عورت کی میری جانب پشت تھی' لہٰذا میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ مرد کی صورت بڑی حد تک امریکی صدر کلنٹن سے ملتی جلتی تھی اور درحقیقت وہی لی یان کے مقابل ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا سے مارشل آرٹس کی جھلک نظر آتی تھی۔

اسی کمرے میں میرے دخول نے سب کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ لی یان کے چہرے پر اطمینان ابھر آیا لیکن بل کلنٹن کی مشابہت رکھنے والا مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ایسے اچھلا جیسے موت اچانک آن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی ضرورت نہیں تھی کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

مارا ماری میں پیدا ہونے والے اس لمحاتی تعطل سے عورت نے فائدہ اٹھایا اور اس کمرے سے نکل کر کوریڈور میں لپک گئی۔ میں نے بڑے تسلی بخش انداز میں لی یان کو اس شخص سے مقابلہ کرتے دیکھا تھا لہٰذا اس کی طرف سے بے پروا ہو کر میں نے عورت کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔

میں ابھی تک اس کی صورت نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ کلاڈیا ہو گی۔ مجھے اپنے عقب میں لی یان کی تشویش سے بھری آواز سنائی دی۔

''وجدان! اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھنا' یہ عورت کوئی جادوگرنی ہے۔''

لی یان کی اس ہدایت نے مجھے بری طرح چونکا دیا تاہم میں نے اس جادوگرنی کے تعاقب میں کوئی کوتاہی نہ برتی اور

کوریڈور کے آخری سرے پر اسے جالیا۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہونے ہی والی تھی کہ میں نے عقب سے اسے ایک زوردار دھکا دیا۔

وہ لڑکھڑاتے ہوئے منہ کے بل کمرے کے قالین پوش فرش پر گری۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی کمرے میں داخل ہوگیا۔ لی یان نے بڑی شدت سے مجھے تاکید کی تھی کہ میں اس عورت کی آنکھوں میں نہ دیکھوں اور اس تاکید نے میرے اندر ایک ضد کو ابھار دیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا' اس عورت کی آنکھوں میں ایسا کیا ہے جو لی یان نے اسے جادوگرنی سے تعبیر کیا تھا؟

وہ فرش پر پڑی دھیرے دھیرے کراہ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اٹھ کر بیٹھنے یا کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بادی النظر میں یہی لگتا تھا کہ اسے کوئی ایسی شدید چوٹ پہنچی ہے کہ وہ فرش سے اٹھنے کے قابل نہیں رہی۔

میں محتاط قدموں سے اس کی پائنتی سے سر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی طرف سے کسی حملے کی امید نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے اپنے اندازے کی بنا پر اسے پکارا۔

''کلاڈیا! اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ۔ تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔''

اس نے میری پکار کے جواب میں کچھ کہا اور نہ ہی فرش سے اٹھنے کی کوشش کی البتہ' اس کے حلق سے میٹھی میٹھی کراہیں خارج ہوتی رہیں۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ شاید اس کے جسم کے کسی نازک اور حساس حصے پر کوئی خطرناک چوٹ آگئی ہے جو وہ اٹھ کر بیٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

میں اس کے قریب ہوگیا اور اسی وقت کمرے کے فرش پر پڑی ہوئی عورت نے میرے اندازوں کی ایسی تیسی کردی۔

اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنی باڈی کو ایک خاص انداز سے رول کیا اور میرے پاؤں کو اپنی ٹانگوں کی قینچی میں جکڑ کر فرش پر گھوم گئی۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت کے نتیجے میں' میں زمین پر آرہا۔ وہ کسی بندریا کے مانند اچھلی اور میرے سینے پر سوار ہوگئی۔

میں اس کی اس جسارت پر ابھی پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کہ وہ مجھ پر جھکی اور اپنے ہاتھوں سے میری گردن کو دبوچ کر براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔

میں ہکا بکا اس دل کش عورت کو دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اتنی حسین عورت اپنی زندگی میں پہلے کبھی اور کہیں نہیں دیکھی تھی۔ وہ بنی بنائی یونانی دیوی تھی۔ آنکھیں گہری نیلی اور جاذب' خال و خط پُرکشش اور رنگت سرخی مائل سفید۔ اس کے شہد ملے بال بڑے دل ربا انداز میں ترشے ہوئے تھے۔ وہ حسن کا خزانہ میرے اوپر کسی زبر کی طرح سجا ہوا تھا۔

یہ منظر سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں آنکھوں کے راستے میرے حافظے تک منتقل ہوا پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے جان نکلی جارہی ہو۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر میرے اندر اترنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اگرچہ دونوں ہاتھوں سے میری گردن کو گرفت میں لے رکھا تھا لیکن اسے دبانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی تمام تر توجہ میری آنکھوں پر مرکوز تھی۔ اسی لمحے اس کی پُرتاثر آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وجدان!...... تم خود کو بھول رہے ہو...... سب کچھ بھول رہے ہو...... صرف میری آنکھیں تمہیں یاد رہیں گی۔ تم صرف میری آواز سن رہے ہو...... باقی تمام آوازیں تمہاری سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتیں۔ تم میری آنکھوں کے اسیر ہو...... یہ آنکھیں تمہارے دماغ میں پیوست رہیں گی اور تمہیں جب بھی' جو بھی حکم دیں گی' تم فوراً بلا سوچے سمجھے اس کی تعمیل کرو گے......''

میں یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا' یوں محسوس ہوتا تھا' وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیے گئے ہوں۔ وہ گویا دو طاقت ور مقناطیس تھے جو بڑی شدت سے مجھے اپنی جانب کھینچ رہے تھے...... خدا کی پناہ! ایسی غضب ناک آنکھیں میرے نظارے میں پہلی مرتبہ آئی تھیں۔

بلاشبہ وہ عورت کوئی بہت بڑی ساحرہ تھی۔ وہ مجھے مسمرائز کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ میری جگہ اگر کوئی اور شخص اس کے مدمقابل ہوتا تو اب تک ہتھیار پھینک کر اس کے قدموں میں جبیں رکھ چکا ہوتا۔ یونانی حسن کا شاہکار وہ عورت ایسی ماہ جبیں و دل نشیں تھی کہ ہزاروں مرد اس کی پابوسی کے لیے قطار بنا کر اپنی باری کا انتظار کرسکتے تھے۔

''آج کے بعد تم صرف مجھے یاد رکھو گے'' وہ اپنی مخروطی انگلی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''تم میرے غلام ہو...... میرے اشاروں پر ناچو گے......''

اس کی آواز اور الفاظ میں بلا کا اعتماد تھا۔ اسے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ مجھے اپنے ٹرانس میں لاچکی ہے لیکن یہ اس کی بھول تھی' ایک بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملتے ہی میں پورے حواسوں سے ریڈ الرٹ ہوگیا تھا۔ لی یان کے الفاظ مسلسل میرے دماغ میں گونج رہے تھے...... وجدان! اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھنا' یہ عورت کوئی جادوگرنی ہے!

وہ واقعی جادوگرنی تھی۔ اپنے جادو کے زور پر مجھے غلام بنا کر رکھنے کی خواہش مند تھی مگر میں بھی نادان نہیں تھا' وجدان تھا۔ اپنے شعبے کا سلطان تھا اور اللہ میرا نگہبان تھا۔ اگر میں اس جادوگرنی کے ٹرانس میں آجاتا تو یہ میری نہیں' میری صلاحیتوں کی شکست ہوتی۔ اس نازک مرحلے پر میں ہار کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میں تو ماؤنٹ مکنلے میں اس کے گرد گھنٹال ربی موشے ہائمن کو چونا لگا آیا تھا' یہ چیلی چانٹی کلاڈیا لاڈیا میرے سامنے کیا بیچتی تھی!

کہتے ہیں' منہ دیکھ کر تھپڑ مارنا چاہیے۔ سامنے والے کی چال کے عین مطابق اپنے مہرے کو آگے بڑھانا چاہیے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں دو تر غیبی ڈائیلاگ مار کر یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ اس نے وجدان ایسے پہاڑ کو چت کرلیا۔ میں نے اسے اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا۔ وہ اپنی بھول میں ایک قدم اور آگے بڑھ آئی۔

''وجدان! اب تم آنکھیں بند کرلو گے۔ میں تین تک گنوں گی تو تمہاری آنکھیں بند ہوچکی ہوں گی...... ایک......''

اس نے پہلے بھی مجھے وجدان کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا مطلب تھا' ڈین ہاروے کی طرح وہ بھی مجھے پہچان چکی تھی ویسے یہ لی یان کی پکار کا نتیجہ بھی ہوسکتا تھا۔ اس نے مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے اس جادوگرنی سے خبردار کیا تھا۔

''دو......'' وہ چند سیکنڈ کے وقفے سے بولی ''...... تین!''

میں نے کسی فرماں بردار بچے کے مانند پلکیں جھپکائیں اور نہایت ہی شرافت کے ساتھ آنکھیں بند کرلیں۔ یہ عمل کلاڈیا کو خوش فہمی میں مبتلا کرنے کا سرٹیفکیٹ تھا۔

اب وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اس کے شاداب بدن کو اپنے سینے پر سوار محسوس کررہا تھا۔ کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں کوئی بہت بڑا ذخیرہ اندوز ہوں جس نے حسن و جوانی کے ایک عظیم الشان ذخیرے کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔

کلاڈیا کا سراپا میری یادداشت میں اس طور چھپ گیا تھا کہ تصور کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے مجھے اس کے خدوخال کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ظاہرہ آنکھیں بند رکھتے ہوئے باطنی آنکھ کا سوئچ آن کیا تو اس کا ملکوتی حسن میری نگاہ میں پھیل گیا۔

اسی وقت وہ تھوڑا سا کسمسائی اور میرے سینے سے نیچے اتر گئی' پھر مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر کھڑی ہوکر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اطمینان اور کامیابی کے آثار نظر آئے۔ اپنی دانست میں وہ مجھے محکوم بنا چکی تھی۔ اس نے مجھ پر ایک تحقیر آمیز نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

وہ بڑے مطمئن انداز میں چلتے ہوئے کمرے کے دروازے تک پہنچی تو میں نے زمین پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند رکھتے ہوئے' نہایت ہی پُرسکون لہجے میں اسے پکارا۔

''کلاڈیا! تم تو ریلیکس ہوکر جارہی ہو۔ مجھے کون اطمینان دلائے گا؟''

وہ اس طرح اچھل کر مڑی جیسے اچانک اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔ وہ بڑی تیزی سے میرے قریب پہنچی اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اسی وقت میں نے آنکھیں کھول دیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت میرے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ سجی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے اس نے قیامت سے پہلے قیامت دیکھ لی ہو۔

''وج...... دان...... تم......'' وہ حیرت کی شدت سے ہکلا اٹھی۔

میں نے کہا ''یقین نہیں آرہا نا؟''

''مگر تم تو...... تم تو......'' وہ اپنی بات مکمل نہ کرسکی۔

''شاید تمہارے ربی نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وجدان کس طوفان کا نام ہے'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''میں نے کہا نا' تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔ اب میں کھلاڑی اور تم تماشائی ہو۔ بتاؤ' تم لوگوں نے میری ساحل کو اس بنگلے کے کس کمرے میں بند کر رکھا ہے؟''

کلاڈیا کی مسمریزائی صلاحیتوں کو دیکھ کر میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ ساحل آج کل اسی ساحرہ کے طلسم میں گرفتار تھی اور اس کے ذہن سے' بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے والا راز بھی اسی ساحرہ نے نکالا ہوگا!

کلاڈیا نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مجھ پر حملہ کردیا۔ اسی وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مارشل آرٹس سے بھی گہری واقفیت رکھتی تھی۔ اسے ذہنی اور جسمانی دونوں طرح کی صلاحیتوں پر عبور حاصل تھا۔

کوئی اور فارغ موقع ہوتا تو میں فائٹ کو طول دے کر بھرپور انجوائے کرتا۔ اس وقت مجھے بڑی شدت سے ساحل کی تلاش تھی۔ میں نے اب تک جتنے کمروں میں جھانکا تھا' وہاں وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ کلاڈیا کی زبان کھلوانے کے لیے اسے بے بس کرنا بہت ضروری تھا...... اور اسے بے بس کرکے اپنے بس میں لاتے ہوئے مجھے پھونک

پھونک کر ہاتھ پاؤں کو استعمال کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ عمل چوبی ہتھوڑے کی مدد سے کانچ کی دیوار میں آہنی میخ ٹھونکنے کے مترادف تھا!

اس کا انگ انگ دستِ قدرت کی صناعی کا منہ بولتا شاہکار تھا۔ لگتا تھا' خالق نے اسے بنانے کے بعد وہ سانچہ ہی توڑ ڈالا تھا۔ اس کے پُرغرور جسمانی خطوط کو ہاتھ پاؤں کی بے رحم ٹھوکروں سے بگاڑنا ایک گناہ عظیم تھا۔ یہ کچھ میں ہی جانتا تھا' دس منٹ کی کڑی آزمائش کے بعد میں نے کلاڈیا کو کس طرح زیر کیا!

جب وہ پوری طرح میرے قابو میں آ گئی تو میں نے بیڈ شیٹ میں سے دو لمبی لمبی پٹیاں پھاڑ لیں۔ ایک پٹی سے میں نے اس کی آنکھوں کو ڈھانپ کر اچھی طرح کس کر باندھ دیا۔ دوسری پٹی کی مدد سے میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر باہم پیوست کر کے بڑی مضبوطی سے جکڑ دیے۔ اب وہ ان ہاتھوں کی مدد سے آنکھوں والی پٹی نہیں کھول سکتی تھی۔ اس کے بعد میں کلاڈیا کو کسی اسیر کے مانند دھکیلتے ہوئے اس کمرے میں لے آیا جہاں لی یان کو ڈین ہاروے کے ساتھ نبرد آزما چھوڑ گیا تھا۔

اس کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک زوردار دھکے کا سامنا کرنا پڑا۔ لی یان' توپ میں سے نکلے کسی گولے کے مانند آ کر مجھ سے ٹکرائی تھی اور اسے اس طرف پھینکنے والا ڈین ہاروے تھا۔ میں نے لی یان کو سنبھالا اور تیز لہجے میں کہا۔

''تم کلاڈیا کو دیکھو' میں اس سورما سے نمٹتا ہوں۔''

ڈین ہاروے' کلاڈیا کی حالت زار دیکھ کر بری طرح چونکا اور اگلے ہی لمحے اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے مجھے فلائنگ کک مارنا چاہی۔ میں یک دم نیچے بیٹھ گیا۔ وہ میرے اوپر سے قلابازی کرتے ہوئے کھلے ہوئے دروازے سے باہر کوریڈور میں پہنچ گیا۔

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کلاڈیا کی طرح فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنے قدموں پر آتے ہی واپس مڑا۔ اس دوران میں' میں بھی کوریڈور میں نکل آیا تھا۔ پھر ہمارے درمیان باقاعدہ مارشل آرٹس کی ٹیکنیکس کا تبادلہ ہونے لگا۔

لی یان نے اس کی اچھی خاصی درگت بنا دی تھی تاہم وہ اس پر پوری طرح قابو پانے میں کامیاب نہیں رہی تھی۔ لی یان کو ایک نظر دیکھتے ہی میں نے بھانپ لیا تھا' ڈین ہاروے نے بھی اسے ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچایا تھا۔ دونوں طرف ٹوٹ پھوٹ کا تناسب برابر ہی رہا تھا۔

ڈین ہاروے مارشل آرٹس سے بہ خوبی آگاہ تھا لیکن میں نے اس مرحلے میں چند آزمودہ کار شارٹ کٹس استعمال کر کے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ لی یان نے اسے اچھا خاصا تھکا دیا تھا لہٰذا وہ میرے دھواں دھار حملوں کے سامنے زیادہ دیر مزاحمت نہ کر سکا۔ میں نے اسے پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑاتے ہوئے کلاڈیا کے پاس پہنچا دیا۔

لی یان نے لیڈی پسٹل لباس میں سے نکال کر کلاڈیا کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ کلاڈیا اور ڈین ہاروے پر قابو پا کر ہم نے گویا اس بنگلے پر تسلط جما لیا تھا۔ اس بنگلے میں اگر ان کا کوئی اور حمایتی موجود ہوتا تو اب تک ضرور سامنے آ جاتا۔ حالات پوری طرح کنٹرول میں آ گئے تو میں ایک کرسی کھینچ کر ڈین ہاروے کے قریب بیٹھ گیا۔

لی یان سمجھ گئی کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ریڈ الرٹ ہو گئی۔ اس نے خطرناک ننھے پسٹل کو اس انداز میں تھام رکھا تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی ایفی شینسی دکھانے کی کوشش کرتا تو وہ بے دریغ اس کی کوشش کو ناکامی کا منہ دکھا دیتی۔

میں نے اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے پیارے خنجر کو اس کے کیس میں سے نکالا اور بڑے خطرناک انداز میں ڈین ہاروے کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

''ساحل کہاں ہے؟''

میرے لہجے میں اس درجے کی سفاکی موجود تھی کہ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس کے لب تھرتھرا کر رہ گئے۔ وہ متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کی وحشت میں اضافہ کرنے کے لیے خنجر کی نوک کو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے بیچ رکھا اور کہا ''ڈین ہاروے! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے اس بنگلے کا ایک ایک کونا کھدرا جھانکنے کی زحمت نہ دو۔ اس کے بدلے میں تمہیں زندہ رہنے کا موقع فراہم کر سکتا ہوں۔ بتاؤ' میری ساتھی کو تم نے کس کمرے میں بند کر رکھا ہے؟''

''وہ......وہ یہاں نہیں ہے'' وہ خوف زدہ انداز میں ہکلایا۔

میں نے خنجر کی نوک کو ایک حد تک اس کی پیشانی میں گڑایا اور پھنکار سے مشابہ انداز میں کہا ''اس کا مطلب ہے تم زبان بند رکھ کر موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر چکے ہو؟''

تکلیف کی شدت نے اس کے چہرے کے نقوش کو بری طرح بگاڑ دیا۔ وہ کراہتے ہوئے بولا ''تم میری بات کا یقین

کرو' ساحل یہاں نہیں......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کرب ناک آواز خارج ہوئی۔ میں نے میکانکی انداز میں اس کی پیشانی پر ایک چرکا لگا دیا تھا۔ اس کی حالت دیدنی ہو گئی۔

''میں تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتا ڈین ہاروے!'' میں نے دوبارہ خنجر کو اس کے چہرے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا ''ساحل اسی بنگلے کے کسی بیڈ روم میں بند ہے' ایسا بیڈ روم جس میں زیرو پاور کا بلب جل رہا ہے۔ تم لوگوں نے کسی عمل کے ذریعے اسے بے خبری کے عالم میں پہنچا رکھا ہے۔''

''میں یہی کہوں گا' تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو وجدان!'' وہ سراسیمہ لہجے میں بولا ''ساحل آدھی رات کے بعد یہاں سے چلی گئی تھی۔''

''چلی گئی تھی؟'' اس کے انکشاف نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا ''کہاں چلی گئی وہ؟''

''جہاں سے آئی تھی'' کلاڈیا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''واپس وہیں چلی گئی۔''

میں نے سوال ڈین ہاروے سے کیا تھا لیکن جواب کلاڈیا نے دیا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اور ہاتھ جکڑے ہوئے تھے تاہم آلۂ گفتار آزاد تھا۔ میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ ڈین ہاروے کے بالعکس وہ دہشت اور وحشت سے بہت دور تھی۔

''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو' ساحل اسرائیل چلی گئی ہے؟'' میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈین ہاروے نے بتایا ''گزشتہ رات وہ رائل نیپال ائرلائنز کی نائٹ کوچ سے گئی ہے۔ اس کی عارضی منزل نئی دہلی تھی' وہاں ایک گھنٹا گزارنے کے بعد وہ صبح پانچ بجے دوسری فلائٹ کے ذریعے نیو دہلی سے اسرائیل روانہ ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ تل ابیب میں ہے۔''

ڈین ہاروے کے انکشافات حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ اگر واقعی سب کچھ یونہی پیش آیا تھا تو اس سیٹ اپ سے ''ہنود و یہود گٹھ جوڑ'' کی بو آتی تھی۔ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''ساحل کی صحت اور حالت اس قابل نہیں تھی کہ وہ تن تنہا سفر کر سکے۔ کیا یہاں سے اس کے ساتھ بھی کوئی گیا ہے؟''

اس نے جواب دیا ''محترم ربی کا ایک خاص آدمی اپنی حفاظت اور نگرانی میں اسے کھٹمنڈو سے تل ابیب تک لے کر گیا ہے۔''

''ساحل چلی گئی تو پھر تم دونوں یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

''ہم تمہاری وجہ سے یہاں رکے ہوئے ہیں۔''

''میری وجہ سے...... کیوں؟''

''ساحل کا یہاں کام ختم ہو گیا تھا اس لیے فلیمنگ اسے اپنے ساتھ لے گیا'' وہ میرے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولا ''لیکن ہمارا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ محترم ربی کا حکم ہے' ہم تمہیں قابو کر کے اسرائیل پہنچائیں لیکن وقت سے پہلے ہی کھیل بگڑ گیا۔''

اس نے کھیل بگڑنے کے سلسلے میں ''وقت'' کا ذکر کچھ اس طرح کیا کہ مجھے محسوس ہوا' انہوں نے مجھے گرفت میں لینے کے لیے کوئی خاص منصوبہ ترتیب دے رکھا تھا۔ میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا' میں نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

''بتاؤ' تم لوگوں نے مجھے گرفت میں لینے کے لیے کیا منصوبہ بنا رکھا تھا؟''

''چھوڑو...... اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''فائدہ ہے!'' میں نے دہاڑ سے مشابہ انداز میں کہا۔ ''تمہیں بتانا ہو گا ورنہ......؟''

بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر کی دھار کو اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ وہ کمزور سے لہجے میں منمنایا۔

''کیا کرو گے پوچھ کر؟''

''اٹ از نن آف یور بزنس!'' میں نے بے رحمی سے کہا اور خنجر کے دستے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا ''میں جو پوچھ رہا ہوں' اس کا سیدھا سیدھا جواب دو ورنہ میں تمہیں سر کٹا شیطان بنانے میں بہت لطف محسوس کروں گا۔''

موت کی دہشت نے اس کے سرخ و سفید چہرے کو سیاہی مائل کر دیا۔ زندگی بڑی پیاری شے ہے اور موت کو سامنے کھڑا دیکھ کر تو یہ اور بھی حسین لگنے لگتی ہے۔ انسان اپنی زندگی بچانے کے لیے موت سے ہر قسم کی مفاہمت پر تیار ہو جاتا ہے۔ ڈین ہاروے بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گیا۔

''ہمیں پتا چلا تھا' تم آج رات نو اور دس بجے کے درمیان اس بنگلے میں داخل ہو گے۔''

وہ سرسراتی ہوئی آواز میں گویا ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کمرے کے در و دیوار گردش میں آ گئے ہوں۔

ہمارے خفیہ منصوبے کی خبر وہاں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ میری طرح لی یان بھی متعجب نظر سے ڈین ہاردے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے مزید بتایا۔

''جوگندر پال نے آج رات یہاں ایک پارٹی کا اہتمام کیا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا' تم اس کیٹرنگ کمپنی کے ایک ملازم کی حیثیت سے بنگلے میں داخل ہو گے جو آج کی پارٹی کے لیے یہاں سروس دے رہی ہے۔ تم ہمیں ایک یادگار سبق سکھانے کا ارادہ لے کر یہاں گھستے لیکن ہم تمہارے استقبال کے لیے تیار ہوتے۔ تمہیں فوراً گرفت میں لے کر کلاڈیا کے حوالے کر دیا جاتا'' وہ تھوڑی دیر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کلاڈیا ہپناٹزم کی ماہر ہے۔ محترم ربی نے بڑے خاص انداز میں اس کی تربیت کی ہے۔ یہ چند منٹ میں تمہیں اپنا مطیع و فرمانبردار بنا لیتی'' وہ سانس لینے کو رکا تو مجھے یاد آیا' کلاڈیا نے میرے سینے پر سواری ڈال کر ایسی کوشش کی تو تھی! وہ حسرت ناک انداز میں بولا ''ایک مرتبہ تم ہماری مٹھی میں آ جاتے تو پھر تمہیں محترم ربی کے قدموں تک پہنچانا ہمارے لیے مشکل نہ ہوتا مگر......''

اس نے ''مگر'' پر جملہ ادھورا چھوڑا تو میرا ذہن تیز آندھیوں کی زد میں آ گیا۔ ہمارے منصوبے کو صرف تین افراد جانتے تھے یعنی...... میں' لی یان اور جانوس۔ ہم تینوں میں سے کسی نے یہ معلومات دشمنوں تک پہنچائی تھیں۔ میں اور لی یان تو ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے تھے۔ آ جا کر تان جانوس پر ٹوٹتی تھی...... تو کیا جانوس' دوستی کی آڑ میں ہم سے کوئی بھیانک دشمنی کرنے جا رہا تھا؟

اس سوال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے دل نے کہا' فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن جیسا محاورہ بنانے والا کوئی ایویں سا آدمی نہیں ہو سکتا۔ جانوس سے پہلی ہی ملاقات نے مجھے اس کی طرف سے آف کر دیا تھا۔ اس کے تازہ ترین رویے نے اگرچہ پہلے تاثر کو کافی حد تک زائل کر دیا تھا لیکن اب ثابت ہو رہا تھا' جانوس کسی آستین کے سانپ سے کم نہیں تھا! حیرت ہے' ڈاکٹر مونگ جیسا زیرک آدمی بھی اس کی اصلیت کو نہ جان سکا؟

ایک حتمی نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے اپنے ذہن کو جھٹکا اور ڈین ہاردے سے استفسار کیا۔ ''میرے پروگرام کے حوالے سے یہ خطرناک معلومات تم لوگوں تک کس نے پہنچائی ہیں؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا'' وہ خوف زدہ انداز میں بولا ''یہ جوگندر پال کی محنت کا ثمر ہے۔''

میں نے لی یان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''لی یان! تم ان دونوں کو اسی طرح کور کیے رکھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اگر ان میں سے کوئی کارکردگی دکھانے کے موڈ میں نظر آئے تو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس کی کھوپڑی میں ہوادان بنا دینا۔''

لی یان نے پُراعتماد انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

میں اس کمرے سے نکل کر دوسرے کمروں میں ''تاکا جھانکی'' کرنے لگا۔ ڈین ہاردے نے ساحل کے سلسلے میں جو بیان دیا تھا' اس میں شک کی گنجائش نہیں تھی لیکن میں اپنی تسلی کی خاطر اس بنگلے کے ایک ایک کمرے کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ اس تلاش کے نتیجے نے ڈین ہاردے کے بیان کی تصدیق کر دی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ میں نے تھوڑی دیر پہلے ساحل کو جس بیڈروم میں' بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا' وہ بیڈروم کھنڈر میں نہیں بلکہ تل ابیب میں تھا۔

میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ فائر کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ گولی چلنے کی آواز اس طرف سے آئی تھی جہاں لی یان نے ڈین ہاردے اور کلاڈیا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ فائر کی آواز کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ...... ان دونوں میں سے کسی کے ذہن میں کارکردگی دکھانے کا کیڑا کلبلایا تھا۔

میں مذکورہ کمرے میں پہنچا تو ڈین ہاردے کو فرش پر چت پڑے دیکھا۔ اس کا زیریں بدن' جان کی رخصتی پر جھٹکے لے رہا تھا۔ ڈین ہاردے کے لباس کو سینے پر سے سرخ دیکھ کر میں جان گیا کہ لی یان نے اس کے دل کو چھید ڈالا تھا۔

''یہ...... یہ اس کی آنکھوں والی پٹی کھولنا چاہتا تھا'' لی یان نے کلاڈیا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے صورتِ حال کی وضاحت کی۔

''تاکہ یہ اپنی آنکھوں کی مدد سے تمہیں ٹرانس میں لے لے'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔

ڈین ہاردے کے جسم نے ایک دو جھٹکے کھائے اور ٹھنڈا ہو گیا۔

لی یان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا ''وجدان! تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ اس بنگلے میں ساحل تمہیں کہیں نہیں ملی!''

''تم فیس ریڈنگ میں غلطی نہیں کر رہی ہو۔''

''ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔

میں نے کہا ''بالکل' ہم نکل رہے ہیں'' پھر کلاڈیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا ''اس ناگن کو بھی ہم اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ یہ سینے پر سوار ہو کر اپنی زہرناک آنکھوں سے ڈستی ہے۔''

''تم لوگ بڑا خطرناک کھیل' کھیل رہے ہو'' کلاڈیا نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''کلاڈیا! اس سنگین ڈرامے میں تمہارا کردار پورا ہو گیا' اب کس بل بوتے پر دھمکا رہی ہو۔ تم اپنی صلاحیت سے دوسروں کو زیرِ دام لاتی رہی ہو' میں تمہیں بتاؤں گا کہ دام کیا ہوتا ہے...... اور اسے زیر و زبر کیسے کیا جاتا ہے'' ایک سانس کا توقف دے کر میں نے سفاک لہجے میں اپنی بات کو آگے بڑھایا۔

''کلاڈیا! ہم خطروں کے کھلاڑی ہیں۔ افسوس کہ تمہارے ساتھ کسی پُرسکون ماحول میں بیٹھ کر ''اکڑ بکڑ بمبے بو'' نہیں کھیل سکتے۔''

پتا نہیں' میری بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں' وہ جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی ''تم جو کچھ کر رہے ہو' اس کی تمہیں بڑی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔''

اس سے قبل کہ میں کلاڈیا سے قیمت کے بارے میں کوئی استفسار کرتا' مجھے اپنی بائیں ران میں تیز تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے موبائل فون کو جینز کی اسی جیب میں رکھا تھا۔ یقیناً اس سیل پر کسی کی کال آ رہی تھی۔ سیل کا سائلنٹ الرٹ مجھے باخبر کر رہا تھا۔ فون کی جملہ گھنٹیاں میں نے سوئچ آف کر رکھی تھیں۔

میں نے موبائل کو جیب سے نکالا اور ڈسپلے پر جانوس کا موبائل نمبر دیکھ کر چونک اٹھا۔ اسی لمحے میرے دل و دماغ سے شدید نفرت کی ایک لہر اٹھی اور میں نے ''یس'' کا بٹن دبا کر سیل کو کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!'' میں نے آواز کو حتی الامکان معتدل رکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''وجدان! تم کہاں غائب ہو یار!'' اس نے منافقانہ بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ''ابھی ابھی میری کاشا لوک سے بات ہوئی ہے۔ اس نے بتایا ہے' تم ابھی تک واپس فلیٹ پر نہیں پہنچے۔ تم لوگوں کے لیے وہ بھی بڑا فکر مند ہے۔''

''ہمارے لیے فکر مند ہونے کی کسی کو کوئی ضرورت نہیں'' میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''ہم جہاں بھی ہیں' خیر و عافیت سے ہیں۔''

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں' تم اس وقت کہاں ہو؟''

''جاننا چاہتے ہو یا تصدیق کے لیے فون کیا ہے؟''

''تصدیق...... کیا مطلب؟''

''کاش! اس وقت میں تمہارا منافقانہ چہرہ ملاحظہ

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

مجاہد

کتابی صورت (گیارہ حصوں میں) تیار ہے

قیمت فی حصہ 60 روپے

ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

گیارہ حصے ایک ساتھ منگوانے پر رعایتی قیمت صرف 600 روپے ڈاک خرچ معاف

کرسکتا" میں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنے جن دو سادہ لباس بندوں کو جوگندر پال کے بنگلے کی نگرانی پر مامور کررکھا ہے' انہوں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"وجدان! تم بداعتمادی کی باتیں کیوں کررہے ہو؟"

اس کے لہجے میں اگرچہ خفگی شامل تھی لیکن مجھے یہ محسوس کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ خفگی سراسر مصنوعی تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"اعتماد اور بداعتمادی کے چکر میں نہ پڑو۔ یہ چیزیں بہت پیچھے رہ گئی ہیں۔ یہ بتاؤ' اس وقت تم کہاں ہو؟"

وہ جھوٹ کا عظیم الشان مظاہرہ کرتے ہوئے بولا" میں اس وقت بھیم سین ٹیمپل کے قریب' اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوں۔"

میں نے آنکھیں بند کیں اور تصور کے گھوڑے کو ایمرجنسی ووڑ میں ڈال دیا۔ جانوس سے بات کرتے ہوئے اس کا سراپا میرے تصور میں زندہ تھا۔ رخشِ خیال' تھرڈ آئی کے دروازے سے جیسے ہی نکلا۔ اس کا اگلا قدم منزل پر تھا۔ میری باطنی آنکھ نے مجھے جانوس کے ماحول میں پہنچادیا اور اسی وقت میں نے اس کی دروغ گوئی پکڑلی۔

جانوس سرخ رنگ کی ایک اسٹیشن ویگن میں سوار تھا اور وہ ویگن اس وقت مین روڈ کو چھوڑ کر بڑے رف انداز میں' شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہورہی تھی۔ شیوالی اسٹریٹ بھیم سین ٹیمپل سے میلوں دور لازم پت کے علاقے میں واقع تھی اور دلچسپ بات یہ کہ اسی اسٹریٹ پر جوگندر پال کا بنگلا نمبر "جے۔ٹو ہنڈریڈ" واقع تھا' جس کے اندر ہم موجود تھے۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور جانوس سے کہا "تم اپنے اسی دوست کے پاس بیٹھے رہو' میں ناراد یوی کے مندر کے پاس سے گزر رہا ہوں۔ دریائے دشنومتی کو کراس کرکے میں ابھی تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ وش یو بیڈ لک مسٹر منحوس!"

بات ختم کرتے ہی میں نے سیل کو آف کردیا۔ لی یان نے یہ تمام تر گفتگو سنی تھی اور حالات کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کررہی تھی۔ اس نے بھی اپنی جیب میں سے موبائل فون برآمد کیا اور میری تقلید میں اسے آف کردیا۔ اس کے بعد ہم کلاڈیا کی جانب بڑھ گئے۔

کلاڈیا کی آنکھوں پر میں نے ایسی مضبوطی سے پٹی باندھی تھی کہ وہ کچھ بھی دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ میری کوشش تھی کہ ہم جانوس کے وہاں پہنچنے سے پہلے بنگلے سے نکل جائیں۔ وہ بنگلا شیوالی اسٹریٹ کے آخری کنارے پر تھا۔ ہمارے پاس فرار کے لیے صرف دو تین منٹ ہی تھے۔ جانوس میرے سامنے بے نقاب ہوچکا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ ہمارے ملک کے سیاست دانوں کی طرح جانوس اور جوگندر بھی ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود آپس میں مل گئے تھے۔ جانوس نے ہمیں جس جہنم میں پھینکنے کا منصوبہ بنایا تھا' اس سے "جانوس' جوگندر گٹھ جوڑ" کی قلعی کھل گئی تھی۔

جانوس ہمارے انتہائی قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا' اس نے جوگندر کو ان حالات سے باخبر نہ کیا ہو۔ ہمارے سامنے بہ یک وقت کئی محاذ کھلنے والے تھے۔ میری چھٹی حس نے فضا میں پھیلی ہوئی بارود کی مہلک بو کو پیشگی محسوس کرلیا' میرا وجدان چیخ چیخ کر مجھے مطلع کررہا تھا...... ایک بڑی خوں ریزی کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔

ہم کلاڈیا کو اپنے ساتھ ایک کمرے سے دھکیل کر دوسرے کمرے میں پہنچے تو فون کی مخصوص گھنٹی نے میری سماعت پر دستک دی۔ پھر اس کمرے میں اسٹینڈ پر رکھا ہوا وہ ٹیلی فون سیٹ بھی نظر آگیا جس میں سے گھنٹی کی آواز ابھری تھی۔ مخصوص توقف کے بعد دوبارہ گھنٹی گونج اٹھی۔

وہ بڑے نازک لمحات تھے' اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں رک کر فون اٹینڈ کرتا۔ حالات کی سنگینی کسی اور ہی عمل کا تقاضا کررہی تھی لیکن پتا نہیں' میرے جی میں کیا آئی کہ میں کمرے کے دروازے کی سمت قدم اٹھانے کے بجائے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا' ان لمحات میں میرا وجود آہن کے کسی ذخیرے میں بدل گیا ہو اور ٹیلی فون کسی طاقت ور مقناطیس کے مانند مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہو...... اور پھر میں بے اختیار ادھر کھنچتا چلا گیا۔ گھنٹی کی آواز بڑے دل نشیں انداز میں مجھے پکار رہی تھی۔

میں نے میکانکی انداز میں ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا اور خاموش رہا۔ اسی لمحے ائرپیس میں ایک رعب دار آواز ابھری۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ بولنے والا تحکمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ڈین! اپنی آواز سناؤ تاکہ میں کال تھرو کروں۔ محترم ربی' تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں!"

حالات کی اس ستم ظریفی پر میں چکرا کر رہ گیا۔

وقت بڑا بے رحم اور سفاک ہے!

بعض اوقات یہ انسان کو اس طور باندھ کر رکھ دیتا ہے کہ گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنے کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔ میں بھی اس وقت کچھ اسی نوعیت کے حالات سے دوچار تھا۔ موت ہم سے دو تین منٹ کی دوری پر تھی۔ مجھے یقین تھا' جانوس نے جوگندر پال کو بھی یہاں ہونے والی گڑبڑ کے بارے میں بتادیا ہوگا...... اور جانوس کے پیچھے جوگندر بھی اپنے لاؤلشکر کے ساتھ وہاں پہنچنے والا تھا۔ ان سنگین ترین لمحات میں مجھے فوری اور ہنگامی فیصلہ کرنا تھا۔

"ڈین! تم خاموش کیوں ہو؟" دوسری طرف تحکمانہ انداز میں بولنے والے نے متعجب سا ہوکر استفسار کیا تو میں چونک اٹھا۔ وہ پوچھ رہا تھا "تم نے ریسیور اٹھایا ہے تو بولو بھی۔ محترم ربی......"

"ڈین اور کلاڈیا کی کہانی ختم ہوگئی۔" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "اس لیے ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بولے گا۔"

"کک...... کس کا فون ہے؟" کلاڈیا بے اختیار بول اٹھی۔

اس کا جملہ مکمل ہونے پر کمرے میں ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز ابھری۔ لی یان نے کلاڈیا کے منہ پر ایک کرارا طمانچہ رسید کیا تھا۔ کلاڈیا کی آنکھوں پر میں نے ایک مضبوط پٹی کس کر باندھ دی تھی' اس کے دونوں ہاتھ بھی پشت پر جکڑے ہوئے تھے۔ زبان آزاد تھی' چنانچہ وہ اس کے استعمال سے باز نہ آئی۔ لی یان نے اسی آزادروی پر اسے سزا دی تھی' جواب میں کلاڈیا اسے سلینگو میں تولنے لگی۔

کلاڈیا کی گالم گفتار آمیز چیخ پکار فون کے ذریعے کھٹمنڈو سے اسرائیل پہنچ گئی۔ دوسری طرف بولنے والے ربی کے غلام نے بے چین ہوکر اضطراری لہجے میں استفسار کیا "کلاڈیا! وہاں کیا ہورہا ہے...... ڈین کہاں ہے......؟"

"میں نے کہا ہے نا' کلاڈیا اور ڈین کو بھول جاؤ!" میں نے اپنے لہجے کو حتی الامکان سنگین بناتے ہوئے کہا "ربی سے کہو' وہ اپنے موبائل فون کو آن رکھے۔ میں کسی بھی لمحے اس کی خبر لینے آسکتا ہوں۔"

اس نے نہایت ہی برہم لہجے میں مجھ سے استفسار کیا "تم کون ہو؟"

"میں تمہارے ربی کا معالج ہوں!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "سمجھ گئے نا؟"

"نہیں سمجھا۔" وہ دانستہ مجھے چکر دینے کے لیے بولا۔

"تم اپنے تعارف میں کوئی گڑبڑ کررہے ہو۔"

میں نے کہا "میں تعارف میں روکھی سوکھی نہیں بلکہ عملاً گڑبڑ کرتا ہوں۔ کیا تم' جدان کے نام سے واقف نہیں ہو؟"

"وجدان......!" اس کی آواز ڈانواں ڈول ہوگئی۔

"دی موسٹ وانٹیڈ پرسن فار یور ربی!" میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور کریڈل کردیا۔

لی یان' کلاڈیا کو سنبھالے تیار کھڑی تھی۔ اس کے طمانچے نے اچھا خاصا اثر دکھایا تھا' کلاڈیا اس وقت بڑی شرافت کا مظاہرہ کررہی تھی۔ پتا نہیں' اس نے حالات کی سنگینی کو محسوس کرلیا تھا یا اس خاموشی کے پیچھے وہ کسی گہری چال کی منصوبہ بندی کررہی تھی!

ہم آگے پیچھے اس کمرے سے نکل آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم وہاں پہنچ گئے جدھر سے میں اس بنگلے کی اندرونی عمارت میں داخل ہوا تھا۔ سامنے نظر آنے والے اس آخری دروازے کو کھول کر اگر عمارت سے باہر نکل جاتے تو ہم بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ سکتے تھے۔ ابھی تک بنگلے کے بیرونی حصے میں کسی قسم کی افراتفری کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے اور اگر کوئی گڑبڑ پھیل چکی تھی تو اس کی آواز ہم تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ کیونکہ اس وقت ہم اس بنگلے کے ساؤنڈ پروف زون میں تھے۔ اس کی وجہ سے باہر ہونے والی کسی سرگرمی کی آواز ہماری سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔

لی یان بھی غالباً اسی دروازے سے گزر کر ساؤنڈ پروف زون میں پہنچی تھی لہٰذا اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موجود سوال کو پڑھ لیا اور پُراعتماد انداز میں کہا "تم چند سیکنڈ کے لیے یہاں رکو۔ میں باہر کی خیرخبر لے کر آتا ہوں۔"

لی یان نے خاموش رہتے ہوئے آنکھوں سے کلاڈیا کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سفاکی سے کہا "اگر یہ اسمارٹ بننے کی کوشش کرے تو اسے بھی ڈین ہاروے کے پاس پہنچادینا۔ ویسے بھی میں نے ان دونوں کی کہانی ختم ہونے کا اعلان کردیا ہے!"

لی یان نے اثبات میں گردن ہلائی تو میں دروازہ کھول کر عمارت کے اندرونی حصے سے باہر نکل آیا۔ میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے عقبی لان تک پہنچا ہی تھا کہ بنگلے کے گیٹ کے سامنے ایک ہیوی گاڑی آکر رکی پھر اس کے دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی مخصوص آواز ابھری اور مجھے یہ سمجھنے میں چنداں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ جانوس سرخ اسٹیشن ویگن میں وہاں پہنچ گیا تھا۔

میری احتیاط بروقت کام آ گئی۔ اگر میں لی یان اور کلاڈیا کے ساتھ بے دھڑک بنگلے سے باہر نکل آتا تو ایک ناگہانی پلے پڑ جاتی۔ میں ویسے بھی جانوس سے کنی کاٹ کر وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جیسے کردار کا مظاہرہ کیا تھا' اس کے لیے وہ بدترین سزا کا مستحق ٹھہر چکا تھا......اور یہ سزا اسے میرے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔

جانوس اگر اس بنگلے تک پہنچ گیا تھا تو اسے اندر آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بنگلے میں داخل ہونے کے بعد میں نے وجے اور راجیش کو چھٹی کا دودھ یاد دلا کر انٹاغفیل کر دیا تھا۔ ان کی گنز بھی میرے پتے پر محفوظ پڑی تھیں اور اب ان کے استعمال کا وقت آ گیا تھا۔ میں اس مقام کی جانب بڑھ گیا جہاں میں نے دو گنز چھپائی تھیں۔ اس سے قبل کہ جانوس بنگلے کے اندر پہنچتا' میں نے گنز کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ ہلاکت خیز ہتھیار موت کے خریدار تھے!

وجے اور راجیش سے نمٹنے کے بعد میں نے بنگلے کے بیرونی گیٹ کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی۔ جتنی دیر میں جانوس گیٹ کھلوا کر اندر آتا' میں گنز بدست واپس لی یان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''باہر کیا صورتِ حال ہے؟''

''اچھی نہیں ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''پھر؟'' وہ یک لفظی جملہ بول کر خاموش ہو گئی تو میں نے کہا۔

''باہر کی صورتِ حال کو فی الحال ہم اندر رہتے ہوئے کنٹرول کریں گے۔''

ساحل کو کمرا در کمرا تلاش کرتے ہوئے میں اس بنگلے کے اندرونی حصے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ میرے اشارے پر لی یان کلاڈیا کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ میں چند سیکنڈ بعد انہیں ایک ایسے کمرے میں لے آیا جو کسی بڑے ہال سے مشابہ تھا۔ اس ہال کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چاروں جانب قیمتی صوفے لگے ہوئے تھے۔ جوگندر پال نے آج رات اپنے اسرائیلی مہمانوں کے اعزاز میں جو ڈانس پارٹی رکھی تھی وہ اسی ہال میں ہونے والی تھی۔ میری معلومات کے مطابق' اس پارٹی کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے ایک بدنام زمانہ نائٹ کلب سے دو ''ماہرین'' ڈانسرز کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

لی یان نہیں جانتی تھی' میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ فیصلہ میرے ذہن نے ہنگامی طور پر کیا تھا اور اب اس پر عمل کرنا تھا۔ میں نے ایک گن لی یان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم لیڈی پسٹل کو اپنے لباس میں چھپا لو۔ وہ پھر کسی موقع پر کام آ جائے گا۔ فی الحال' اس گن کا استعمال ضروری ہے۔''

لی یان نے برسٹ فائر کرنے والی خطرناک گن کو تھام لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''کرنا کیا ہے؟''

''اس صوفے کی آڑ لے کر اطمینان سے یہاں بیٹھ جاؤ۔'' میں نے ایک کنگ سائز صوفے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس ہال کے داخلی دروازے کے قریب ہی تھا ''ہمارا جو بھی دشمن اس دروازے میں نظر آئے اسے بھون کر رکھ دینا۔ بس' اتنی سی بات ہے۔ کیا یہ مشکل کام ہے؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ پوری مستعدی سے بولی۔

میں نے جس صوفے کے پیچھے لی یان کو مورچا سنبھالنے کی ہدایت دی وہ خاصی محفوظ پوزیشن میں تھا۔ باہر سے آنے والے اگر بے دریغ فائرنگ بھی شروع کر دیتے تو لی یان کا بال بانکا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے کلاڈیا کو ایک طرف چلنے کے لیے ٹہوکا دیا۔

وہ بپھرے ہوئے لہجے میں غرائی ''وجدان! تم اچھا نہیں کر رہے ہو......''

میں نے ایک ہاتھ سے اس کا کھلا ہوا منہ ڈھانپ دیا۔ میری گرفت اتنی مضبوط تھی کہ وہ سسک کر رہ گئی۔ میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔

''کلاڈیا! میں نہیں جانتا' کلاڈیا کارڈنیل سے تمہاری کیا رشتے داری ہے بہرحال' کلاڈیا کارڈنیل تو بہت اچھی تھی لیکن تم نے جس انداز کا مظاہرہ کیا ہے اس نے مجھے تمہاری طرف سے چوکنا کر دیا ہے۔ بس سمجھ لو' میں اسی لیے کچھ اچھا نہیں کر رہا ہوں!''

میں نے ذومعنی انداز میں اپنی بات مکمل کی تو لی یان نے پوچھا ''تم کہاں جا رہے ہو وجدان؟''

''میں بھی اسی ہال میں ہوں اور کہاں جاؤں گا؟'' میں نے کلاڈیا کو ایک طرف لے جاتے ہوئے جواب دیا ''میں نے تمہیں جو ذمے داری سونپی ہے۔ اس کے لیے شکاروں کا بندوبست بھی کرنا ہوگا ورنہ کیا تم ادھر صوفے کے پیچھے' گن پر ہاتھ رکھے بیٹھی مکھیاں مارتی رہو گی!''

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھ دبا کر لی یان کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ اس کے بعد اس نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ میں کلاڈیا کو دھکیلتے ہوئے ہال کے دوسرے سرے پر پہنچ گیا۔ اس طرف بھی ایک دروازہ موجود تھا۔ لی یان کو میں نے جس دروازے کے قریب متعین کیا' وہ بنگلے کی اندرونی جانب

کھلتا تھا جبکہ یہ دروازہ بیرونی سمت میں۔ میں بھی کلاڈیا کے ساتھ ایک صوفے کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اس کے منہ کو اپنے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

''کلاڈیا! میں نے لی یان کے سامنے خاصی رعایت سے کام لیا ہے لیکن اب اگر تم نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا کیا تو میں تمہارے منہ کو بند کرنے کے لیے کسی ہاتھ کا سہارا نہیں لوں گا!''

میرے لہجے میں اس قدر سنگینی اور سفاکی بھری ہوئی تھی کہ وہ سہم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں دبیز پٹی کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ میں ان حسین آنکھوں میں ابھرنے والی سراسیمگی کے تاثرات کو تو نوٹ نہ کر سکا۔ تاہم اس کے مرمریں بدن کی اضطراری جنبشوں نے اس کے اندر پھیلے ہوئے ہراس کو میرے وجود تک ضرور منتقل کر دیا۔ ہم اس وقت ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے۔ اس باہم پیوستگی کے عالم میں جب وہ سانس لیتی تو اس کے سینے کا زیروبم میرے جسم میں بجلی سی چمکا دیتا۔

میں نے ٹانگ دراز کر کے اپنی جینز کی جیب میں سے ٹرائی بینڈ جی ایس ایم موبائل فون نکالا اور اسے آن کرنے کے بعد کلاڈیا سے کہا ''میں اس شخص کو کال کرنے جا رہا ہوں جس کے توسط سے تم لوگ مجھے قابو میں کرنے والے تھے۔ اتفاق سے وہ تم ... لوگوں کا دوست تھا اور میں اسے اپنا دوست سمجھتا رہا۔ خیر' اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!''

میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر خطرناک گن کی نال کو اس کی نسوانی پسلیوں سے ٹکاتے ہوئے نہایت ہی سفاکی سے کہا ''تم جیسی مکھن ملائی عورت کو موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے مجھے بہت افسوس ہوگا لہٰذا زندہ رہنے کی تمنا ہے تو چپ چاپ شرافت سے بیٹھی رہنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا؟'' میں نے اس کی پسلیوں کے ساتھ لگی ہوئی گن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

وہ صورتِ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے بولی ''ٹھیک ہے' میں تمہارے کام میں کوئی مداخلت نہیں کروں گی۔''

''کلاڈیا کارڈنیل بھی کسی کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کرتی تھی!'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا ''اسی لیے وہ بہت اچھی تھی۔''

میں نے بات ختم کرتے ہی آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کے توسط سے جانوس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ مجھے اس بات کا ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ کلاڈیا کی آنکھوں پر دبیز پٹی بندھی ہوئی تھی ورنہ مجھے آنکھیں بند کرتے دیکھ کر وہ کوئی بھی ایفی شینسی دکھانے کی کوشش ضرور کرتی۔

میں نے تھوڑی دیر پہلے جب جانوس کو سرخ ویگن میں سوار' شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا تو اس کے ساتھ دو افراد بھی اسٹیشن ویگن کے اندر موجود تھے۔ ویگن نے جس طوفانی انداز میں' مین روڈ کو چھوڑا اس سے اندازہ ہوتا تھا' وہ انتہائی خطرناک موڈ میں تھے اور واقعی ایسا ہی تھا۔ اس وقت وہ تینوں مجھے بنگلے کے اندر دکھائی دیے۔ جانوس خالی ہاتھ تھا جب کہ دوسرے دو افراد خوفناک گنز سے لیس تھے۔ وہ کسی طرح گیٹ کو کھولنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں بنگلے کے اندر سامنے والے حصے میں دیکھا اور آنکھیں کھول دیں۔

اگلے ہی لمحے میں نے جانوس کا نمبر ڈائل کیا اور سیل کو کان سے لگا لیا۔ دوسری گھنٹی پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ میں نے اس کے ''ہیلو'' کے جواب میں کہا۔

''بھیم سین ٹیمپل اور تمہارے دوست کا کیا حال ہے؟''

''وجدان! تم کسی غلط فہمی......''

''بکو مت!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تت......تم میری بات تو سنو۔'' وہ گڑبڑا گیا۔

''میں تمہاری بات سننے کے لیے ہی تو یہاں آیا ہوں۔'' میں نے زہر آلود لہجے میں کہا ''سوچا' تم بھیم سین ٹیمپل میں بیٹھے سوکھتے رہو گے۔ میں ہی تمہارے پاس پہنچ جاتا ہوں۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' وہ ہیجانی انداز میں بولا۔

''اسی بنگلے کے اندر جس میں تم ابھی اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ داخل ہوئے ہو!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''کیا وجے اور راجیش کے بےسدھ وجود یہ سمجھانے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اس بنگلے میں وجدان قدم رکھ چکا ہے؟''

اس نے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں لائن کاٹ دی۔

میں نے لی یان کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ''جانوس اپنے دو ساتھیوں سمیت بنگلے میں داخل ہو چکا ہے۔ میں انہیں گھیر گھار کر ادھر لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم تیار رہنا......اور اپنے سیل کو بھی آن کر لو' صرف میری کال سننے کے لیے۔ اب میں یوں بہ آوازِ بلند تمہیں نہیں پکاروں گا۔ اوکے؟''

''اوکے وجدان! آئی ایم ایور ریڈی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے جانوس سے بڑے دھیمے لہجے میں بات کی تھی۔ میری آواز لی یان تک تو نہیں پہنچ سکی۔ تاہم کلاڈیا نے من و

عن وہ مختصر سی گفتگو سن لی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

''وجدان! تم کیا چکر چلانے والے ہو؟'' اس کا انداز حیرت اور برہمی سے لبریز تھا۔

میں نے کہا ''تم مجھے چکر چلانے پر مجبور کر رہی ہو۔ میرے ایک ہاتھ میں گن اور دوسرے میں سیل ہے۔ اگر تمہاری زبان کو قرار نہ آیا تو مجھے کوئی اور راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ یہ آخری وارننگ ہے' بعد میں مجھ سے شکوہ نہ کرنا۔''

وہ کسمسائی اور ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ اس کے بدن کی جنبش تو یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ میری دھمکی سے خوف زدہ ہوگئی ہے۔ میں اسے باور کرانے میں کامیاب ہوگیا ہوں کہ اگر اب اس نے زبان کھولی تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کی زبان پر قفل ڈال دوں گا۔ اگرچہ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ بہرحال' وہ جو بھی سمجھی ہو' مجھے تو اس بات سے غرض تھی کہ وہ شانت پڑی رہے۔ گن کی نال کو بدستور اس کی نازک پسلیوں سے ٹکائے میں نے آنکھیں بند کیں اور جانوس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ اس وقت تک بنگلے کے اندرونی حصے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ وہ اس کے ہمراہ ہی اندرونی عمارت میں پہنچے تھے۔ جانوس نے انہیں ہماری ہی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑایا ہوگا۔ ایک بات کی میں نے تصدیق کرلی کہ ہمیں صرف انہی تین افراد سے نمٹنا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں براہ راست بھی ان سے ٹکرا سکتا تھا لیکن اس طرح آنکھ مچولی میں گھیر کر انہیں شکار کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا۔

میں نے جانوس کے سیل نمبر کو ری ڈائل کیا۔ موبائل کے دیگر فوائد تو اپنی جگہ ہوں گے لیکن ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ برابر والے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے رہیں مگر دوسرے شخص کو یہ پتا نہیں چل سکتا کہ آپ اس سے کتنے فاصلے پر موجود ہیں۔ یہ بے وقوف بننے اور بنانے کا ایک عمدہ ذریعہ ہے البتہ' آج کل وڈیو فون کی ٹیکنالوجی بھی متعارف کرائی جا چکی ہے۔ ڈبل کیمرا موبائل فون نے اس ''آنکھ مچولی'' میں بہت بڑا رخنہ ڈال دیا ہے۔

جانوس نے کال ریسیو کی اور جھلائے ہوئے لہجے میں بولا ''تم کہاں ہو شیطان؟''

''بری بات!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں اسے سرزنش کی ''اپنے دوستوں کو اس قسم کے القابات سے یاد نہیں کیا کرتے۔ لگتا ہے' تمہاری دوستی اور خیر خواہی کی بلی اچھل کر ایک ہی جھٹکے میں تھیلے سے باہر آگئی ہے۔''

وہ سٹپٹا گیا ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا......''

''یہ تمہارے اختیار میں نہیں جانوس!'' میں نے زہریلے انداز میں کہا ''اول تو میری جان اس ذات کے قبضۂ قدرت میں ہے جو زندگی دیتی بھی ہے۔ دوم' تم جن لوگوں کے سامنے دم ہلا کر اپنے لیے ہڈی کی توقع لگائے بیٹھے ہو وہ مجھے زندہ پکڑنے کے خواہاں ہیں۔ مجھے معمولی سا ضرر پہنچا کر بھی تم ان کے غیظ کو آواز دو گے۔ اس کوتاہی پر تمہارے آقا تمہیں چیل کودں سے نچوا سکتے ہیں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جانوس! یہ لوگ تمہیں گندی نالی کے کسی حقیر اور غلیظ کیڑے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے جن کی خوش نودی کی خاطر تم نے مجھے اور ڈاکٹر مونگ کو دھوکا دیا ہے۔ میں تمہارے آقاؤں کے دانت تو کھٹے کر چکا ہوں' اب تمہاری تکا بوٹی کرنے والا ہوں۔ بولو' میں تمہیں کہاں سے کاٹنا شروع کروں؟''

سیل پر بات کرنے کے دوران میں' میں نے آنکھیں بند کرلی تھیں اور تیسری آنکھ کے طفیل جانوس کے ماحول میں بھی موجود تھا۔ وہ میری نمک پاشی سے بری طرح تلملا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہو رہے تھے کہ اگر میں اس کے سامنے موجود ہوتا تو وہ مجھے کچا چبا جاتا۔ تیسری آنکھ کا تعلق پنیل گلینڈ کی باطنی چمتکاری سے ہوتا ہے جو بے آواز وڈیو تک محدود ہے۔ آپ تھرڈ آئی کے توسط سے کسی بھی منظر تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس ماحول میں پیدا ہونے والی آوازوں کو نہیں سن سکتے۔ یہ کمی میرا سیل بڑے بھرپور انداز میں پوری کر رہا تھا۔ میری طنزیہ گفتگو نے جانوس کو چراغ پا کر دیا' بڑے بے ہودہ انداز میں وہ مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تم کس چوہے دان میں چھپے بیٹھے ہو۔ سامنے کیوں نہیں آتے؟''

میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں جانوس! یہ بنگلا واقعی کسی چوہے دان سے کم نہیں۔ میں نے اسی چوہے دان کی مدد سے پہلے وجے اور راجیش کو شکار کیا ہے' اس کے بعد تم لوگوں کے اسرائیلی معزز آقاؤں کی ''عزت افزائی'' کی ہے......اور اب تم تینوں کی باری ہے۔'' میں سانس لینے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں کہیں چھپ کر نہیں بیٹھا ہوں جانوس! تم نے مجھ

بتایا تھا نا' اس بنگلے کے بڑے ہال میں آج رات ایک بڑی کھلی ڈلی ڈانس پارٹی ہونے والی ہے جس میں کسی نائٹ کلب سے آنے والی دو ڈانسرز اپنے فن اور ننگے پن کا مظاہرہ کریں گی۔ اتفاق سے وہ پارٹی وقت سے پہلے ہی شروع ہوگئی ہے۔ میں ادھر ہال میں بیٹھا ہوں۔ مجھ سے ملاقات کا شوق ہو تو چلے آؤ۔ تم مجھ سے دو تین کمروں کی دوری پر ہی تو ہو!''

میری بات کے اختتام پر وہ بری طرح چونکا اور بے اختیار پوچھ بیٹھا ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم تین افراد ہیں؟''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی اس کے دونوں ساتھی لوٹ آئے۔ ان کے چہروں سے ناکامیابی اور مایوسی جھلکتی تھی۔ میں نے جانوس سے کہا۔

''کیا میں نے غلط کہا تھا۔ دیکھ لو' تمہارے دونوں ساتھی مختلف کمروں میں چکرانے کے بعد خالی ہاتھ واپس آگئے ہیں۔ اب یہ تمہیں اپنی ناکامیابی کا قصہ سنائیں گے۔''

جانوس میری بات سن کر ایسے اچھلا جیسے میں نے واش روم میں جھانک کر اسے نہاتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ میں نے اس کی بوکھلاہٹ میں دھماکے دار اضافہ کرتے ہوئے کہا ''بیڈ لک مسٹر منحوس!''

اس کے ساتھ ہی میں نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔

کلاڈیا چپ نہ رہ سکی۔ میں نے ابھی جانوس سے جو گیم کھیلا تھا وہ اسے ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا' اس کی جگہ اگر کوئی اور بھی ہوتا تو اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی۔ کلاڈیا کی جھرجھراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''وجدان! تم بڑے خطر......!''

اس کا جملہ بیچ راہ میں دم توڑ گیا۔ اس کی زبان سے ادا ہونے والے ''خطر'' نے مجھے یک لخت بے خطر کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے الفاظ ''ناک'' تک پہنچتے' میں نے زیر ناک رسائی حاصل کرلی۔ لی یان کی طرح میں اس دلکش عورت کے گلاب گال پر چانٹا مار کر اسے خاموش نہیں کر سکتا تھا۔ کلاڈیا حسن و رعنائی کا ایک ایسا انمول خزانہ تھی جو دیکھنے والی آنکھ کو للچاتا اور چوری پر اکساتا تھا۔ چند لمحات کے لیے میں بھی چور بن گیا اور سیپ سے موتی چرانے لگا۔ وہ ذرا سا کسمسائی پھر شانت ہوگئی۔

کچھ دیر پہلے کلاڈیا نے میرے سینے پر سوار ہو کر مجھے زیر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ غضب کی ساحرہ تھی اور مجھے اپنا معمول بنانے کی خواہش مند تھی۔ میں اسے دھوکا دینے کے لیے بالکل انجان بن گیا تھا' اس کے شاداب بدن کو اپنے سینے پر سہارے یہی ظاہر کرتا رہا کہ میں اس کے ٹرانس میں آ گیا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے سجیشنز دیتی رہی لیکن اب حالات بدل گئے تھے' مجھے زیر کرنے والی خود زیر ہو رہی تھی۔ کلاڈیا کی ساحر آنکھوں پر دبیز پٹی بندھی تھی۔ میں آنکھوں کے راستے سجیشنز نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ دوسری راہ اپنا لی۔

☆☆☆

بند آنکھوں کے پیچھے' کھلی ہوئی آنکھ کے توسط سے میں نے دیکھا۔ جانوس جھنجلاہٹ بھرے انداز میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ ان کی آوازیں مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ تاہم میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ جانوس انہیں میری تلاش میں' ہال کی جانب بھیجنے کی بات کر رہا ہے۔ وہ دونوں جانوس کے احکام لے کر کمرے سے نکلے تو میں ان کے ماحول کا حصہ بن گیا۔

وہ ایک سے دوسرے کمرے میں سے گزرتے ہوئے ہماری طرف بڑھنے لگے تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ میں نے لی یان کے سیل پر اسے دو دشمنوں کی آمد کی اطلاع دے دی اور کلاڈیا کو کنٹرول کرنے لگا۔

وہ دونوں گن بردار بنگلے کی عمارت کے اندرونی حصے سے آ رہے تھے اس لیے ہال میں داخل ہونے کے لیے انہیں وہی دروازہ استعمال کرنا تھا جدھر لی یان مورچا سنبھالے تیار بیٹھی تھی۔ میں تھرڈ آئی کو دوبارہ زحمت دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ہال کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

میں جس مقام پر پوزیشن سنبھالے بیٹھا تھا وہاں سے دروازے میں نمودار ہونے والے چہروں کو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن لی یان یہ کام بخوبی کر سکتی تھی ......اور اس نے کیا بھی!

اگلے ہی لمحے ہال ایک خوفناک برسٹ کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں کی فضا میں کرب ناک انسانی چیخوں کی فریاد بھی نفوذ کر گئی۔ موت کا قہقہہ اتنا طاقت ور تھا کہ دو انسانوں کی زندگی کی آخری فریاد' نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

میں اگر چاہتا تو جانوس اور اس کے ساتھیوں کو خود بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا لیکن لی یان کے ہاتھوں یہ کام کروانے کا میرا ایک خاص مقصد تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کا نفسیاتی ٹریٹ منٹ بھی تھا۔ شون کی الم ناک موت نے اسے گم صم کر دیا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دشمنوں کو شکار کرنے سے اس کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہوتی اور وہ بہت جلد اس ذہنی

صدمے سے باہر آجاتی۔ میں اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہا۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور ان دو افراد کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے سینے سے ایک بوجھل سانس خارج ہوئی۔ لی یان کے برسٹ نے انہیں بھون کر رکھ دیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور جانوس کے سیل کے نمبر پر ری ڈائل مارا پھر دوبارہ آنکھیں بند کر کے تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

اس وقت میں باطنی اور ظاہرہ دونوں اقسام کی سائنس کو بروئے کار لا رہا تھا۔ میری تیسری آنکھ نے پلک جھپکتے میں مجھے جانوس کے ماحول میں پہنچا دیا اور جب اس نے میری کال ریسیو کی تو اس ماحول کا آڈیو سسٹم بھی میرے لیے آن ہو گیا۔ میرے لیے یہ ایک خوشگوار تجربہ تھا۔

آنجہانی محترم سانگ فو نے سختی سے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں کبھی پچیوٹری گلینڈ کو متحرک کرنے کی کوشش نہ کروں اور میں اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ پنیل گلینڈ کی تحریک نے مجھے اس قابل بنا دیا تھا کہ میں کسی بھی شناسا کردار کے ماحول تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ یہ محض بصری رسائی ہوتی۔ میں اس ماحول میں پیدا ہونے والی آوازوں کو سن نہیں سکتا تھا۔ پنیل گلینڈ تصور کے وڈیو سسٹم کو کنٹرول کرتا ہے جبکہ پچیوٹری گلینڈ آڈیو سسٹم کو۔ بہر حال کمپیوٹر سائنس کی یہ تازہ ترین ایجاد ننھا سا ٹرائی بینڈ جی ایس ایم سیل بڑی حد تک پچیوٹری گلینڈ کا کام کر رہا تھا۔

میں جانوس کے ''پاس'' پہنچا تو اسے شدید افراتفری کے عالم میں پایا۔ اس نے کال ریسیو کی تو میں نے کہا ''جانوس! یہاں ہال میں بیٹھا میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا اور تم نے قربانی کے دو بکروں کو میری طرف بھیج دیا' قربانی کے بکروں کے لیے میں نے ''بھینٹ کے جانوروں'' کے الفاظ استعمال کیے تھے ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم جتنے بودے دوست ثابت ہوئے ہو اس سے کہیں بڑھ کر بودے دشمن ثابت ہو رہے ہو۔ تمہارے پاس بھینٹ کا کوئی جانور نہیں رہا۔ بتاؤ' اب کسے میرے چرنوں میں کاٹو گے؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے سٹپٹائے ہوئے انداز میں ایک جانب دوڑ لگا دی۔ یہ خیال بلکہ احساس اسے وحشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا کہ میں کہیں بیٹھا اس کی ایک ایک حرکت کو مانیٹر کر رہا ہوں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہ چمتکار کس طرح دکھا رہا ہوں۔

جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو وہ ذہن کو الجھاتی ہے۔ وہ بھی الجھ رہا تھا اور اسی الجھن میں' ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جانوس! کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟''

''تت..... تم کسی آسیب سے کم نہیں ہو۔'' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا ''تم نے واقعی میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ پتا نہیں' تم کون سا جادو جانتے ہو؟''

میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا ''میں کالا' سفید' نیلا' پیلا..... ہر قسم کا جادو جانتا ہوں۔ اگر تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تو سیدھے میرے پاس ہال میں آ جاؤ۔ میں چٹکی بجاتے میں تمہارا علاج کر دوں گا۔''

''تم راکشس ہو..... کوئی خوفناک بلا ہو۔'' وہ دہشت زدہ انداز میں بولا ''تم نے میرے دو آدمیوں کی جان لے لی۔ میں نے درد میں ڈوبی ہوئی ان کی چیخیں سنی ہیں۔ میں..... میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔''

میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا ''ٹھیک ہے' تم وہیں ٹھہرو' میں تمہیں دیکھنے آ رہا ہوں۔ بعض اوقات لاچار مریضوں کو گھر پر جا کر بھی اٹینڈ کرنا پڑتا ہے۔''

''میرے پاس مت آنا۔'' وہ دیوانگی کے عالم میں چلایا اور اس کے ساتھ ہی اس نے موبائل فون کو کھینچ کر سامنے والی دیوار پر دے مارا۔

یہ اس کی ایک اضطراری اور سراسیمہ حرکت تھی۔ میرے اسٹائل نے اسے بری طرح دہشت زدہ کر دیا۔ موبائل فون دیوار سے ٹکرانے کے بعد کھل گیا۔ باڈی ایک طرف اور بیٹری دوسری جانب جا گری۔ روح کے بغیر جسم کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی' اسے مردہ تصور کیا جاتا ہے۔ وہ موبائل بھی بیٹری نکل جانے کے بعد ڈیڈ ہو گیا تو میں جانوس سے صوتی رابطے کے قابل نہ رہا۔ میں نے اپنے سیل کو جیب میں رکھا ہی تھا کہ جانوس نے عمارت کے عقبی کمرے میں پہنچنے کے بعد لان کی سمت کھلنے والے دروازے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اوہ! یہ تو فرار ہو رہا ہے۔'' میں بے اختیار بڑبڑا اٹھا اور آنکھیں کھول دیں۔

اسی لمحے میں نے لی یان کو بھی بولتے ہوئے سنا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی ''کیا ہوا ودان؟''

میں صوفے کی آڑ میں سے نکل آیا اور بہ آواز بلند کہا ''جانوس فرار ہو رہا ہے۔''

لی یان بھی اپنی ''پناہ گاہ'' سے نکل آئی اور گن کو لہراتے ہوئے پرعزم لہجے میں بولی ''کدھر گیا ہے وہ؟''

میں نے کہا ''تم کلاڈیا کے پاس آ جاؤ' میں جا کر اسے دیکھتا ہوں۔''

وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند اس طرف آئی۔ مجھے اس کے انداز سے یوں محسوس ہوا جیسے کلاڈیا کو سنبھالنا اس کا پسندیدہ کام ہو۔ میں ان زیر زبر عورتوں کو وسیع و عریض ہال میں' ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

جب میں تقریباً دوڑتے ہوئے عقبی لان میں پہنچا تو جانوس نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ بنگلے کے پہلو سے نکل کر سامنے والے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ میں ممکنہ رفتار سے اس کے پیچھے لپک گیا۔

انسان کے دوڑنے کی رفتار کا دارومدار حالات اور موقع کی نزاکت پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی خاص مقصد یا مجبوری پیش نظر نہ ہو تو کس کافر کا دوڑنے میں جی لگے گا۔ اس کے برعکس اگر شکاری کتے کسی کے تعاقب میں ہوں تو وہ چیتے جیسی رفتار کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ میرے تعاقب میں تو نہیں البتہ پیش نظر انہی خصائل کا حامل ایک جان دار اس بنگلے سے فرار کی کوشش کر رہا تھا لہٰذا میں نے چیتے کے سے انداز میں لپک کر اسے جا لیا۔

جانوس ابھی عمارت کے پہلو ہی میں تھا کہ میں نے اس سے آگے نکل کر راستہ روک لیا۔ وہ ٹھٹک کر رکا اور دہشت زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا۔

''کہاں جا رہے ہو مہاراج؟''

اس کے سیاہ چہرے پر ملٹی کلر جھلملاہٹ ہونے لگی۔

میری دہشت اور وحشت نے اسے بری طرح بدحواس کر رکھا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ میں یوں اچانک اس کے سر پر آن کھڑا ہوں گا لیکن اس حقیقت کو بدلنا اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ میں بہ نفس نفیس اس وقت اس کے سامنے موجود تھا۔

اس نے جب ''نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن'' جیسی صورت حال دیکھی تو مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔ میں اس کی طرف سے بہت سا ادھار کھائے بیٹھا تھا جس کی سود در سود واپسی بہت ضروری تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں بڑے جنگلی پن کا مظاہرہ کیا اور کسی ریچھ کے مانند مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔

میں نے اسے جھکائی دی اور کمر کو ٹوئسٹ کرتے ہوئے ایک طرف نکل گیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں جھک کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے پہلو میں آنے کے بعد اس کی تشریف پر ایک جرکی سائیڈ کک جڑ دی۔

میری زبردست کک کا پاپش لے کر وہ اس طرح ''روانہ'' ہوا جیسے کسی غریب کے دل سے آہ رخصت ہوتی ہے۔ میں نے اس کی پرواز میں قطعی کوئی مداخلت نہیں کی۔ اس کی فلائٹ کا اختتام پختہ دیوار کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں ہوا۔ جانوس کے حلق سے بڑی وحشت ناک بلبلاہٹ خارج ہوئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر زمین بوس ہو گیا۔

میں اچھل کر اس کے قریب پہنچا اور تنقیدی نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ دیوار سے تصادم کے نتیجے میں اس کا مکروہ سیاہ چہرہ بری طرح بگڑ چکا تھا۔ تکلیف کی شدت نے اسے بے حال کر دیا۔ وہ زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔

اس کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت اور غصے کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ دوستی کی آڑ میں دشمنی کرنے والے اور کسی کے اعتماد کو دھوکا دینے والے کسی رو رعایت کے مستحق نہیں ہوتے۔ انہیں طرح دینا گویا بہت سے لوگوں کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے کیونکہ موذی کو اگر بے مہار چھوڑ دیا جائے تو وہ گا ہے گا ہے مخلوقِ خدا کو ڈسنے کا کام جاری رکھتا ہے..... قتل الموذی قبل الایذا۔

میں نے ایک غصیلا ٹھڈا جانوس کی کھوپڑی پر رسید کرنے کے لیے جیسے ہی اپنے پاؤں کو عقبی سمت کھینچا' اس نے ایک خلافِ توقع حرکت کی۔ اس نے اپنے انتہائی قریب میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے مجھ سے ایک محدود فاصلے پر چلا گیا۔ اب اگر میں ٹھڈا برساتا بھی تو اس کی منحوس کھوپڑی کو ٹارگٹ نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے اسے ضرب شدید پہنچانے کا ارادہ ترک کیا ہی تھا کہ اس نے مجھ پر فائر کر دیا۔

لوٹ پوٹ ہو کر پیچھے جانے کے دوران میں اس نے بڑی ہوشیاری سے جیب میں ہاتھ ڈال کر پسٹل نکال لیا تھا اور اسی گن سے اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اگر لیفٹ سائیڈ رولنگ میں ایک لمحے کی تاخیر بھی کرتا تو عین ممکن تھا' اس کے پسٹل سے نکلنے والی گولی میرے جسم کے کسی حصے میں پیوست ہو جاتی۔

میں نے ہنگامی انداز میں رولنگ کی تھی اور فوراً ہی مجھے اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ میرا لیفٹ شولڈر پہلے ہی گھائل تھا۔ اس بازو کے ٹرائی سپس کو ایک گولی نے اچھا خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ چوٹ پر چوٹ لگے تو ایک قیامت برپا

ہو جاتی ہے اور اس کندھے کی چوٹ دوسری مرتبہ "متاثر" ہوئی تھی۔ اس سے پہلے جب بدھ تیل کنڈ والی عبادت گاہ اچانک خوف ناک دھماکوں سے گونج اٹھی تھی تو ایک ایسی ہی خطرناک رولنگ نے میرے دکھتے ہوئے ٹرائی سیپس میں تکلیف کا سمندر موجزن کر دیا تھا۔

سائیڈ رولنگ کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہوا تو جانوس بھی زمین پر ہاتھ ٹیک کر ایسی ہی کوشش کر رہا تھا۔ پہلا فائر اس نے لیٹے لیٹے کیا تھا اور اب ذرا سنبھل کر مجھے نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

میں نے لگا تار تین بیک فلیک لگائیں اور اس سے ایک گز کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس لمحے مجھ پر فائر کرے۔ میری فاریمیشن میں بجلی جیسی لپک اور تیزی شامل تھی۔ بیک فلیک کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے اچھل کر اس کے سینے پر ایک فرنٹ پش کک رسید کر دی۔

یہ ایک جھٹکے دار کک تھی جو کسی ہتھوڑے کے مانند اس کے سینے پر لگی تو وہ حلق سے "اوں" کی آواز نکالتے ہوئے پیچھے کو الٹ گیا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ اب خطرناک نہیں رہا تھا۔ اس زمیں بوسی کے دوران میں پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر بہت دور جا گرا تھا۔

جانوس چاروں خانے چت پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب اٹھ نہیں سکے گا لیکن میں اپنے طور پر محتاط رہا۔ اس کی ایک چالاکی میں ملاحظہ کر چکا تھا۔ وہ کسی دوسرے انداز سے بھی مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔

میں جلد از جلد جانوس سے نمٹ کر اس بنگلے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے چند لمحے پہلے مجھ پر جو فائر کیا تھا' اگر کوئی اس کی آواز پر توجہ دیتا تو میرے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔ قبل ازیں لی یان نے عقبی حصے میں ایک سیکیورٹی گارڈ کو زندگی کی قید سے نجات دلائی تھی۔ تاہم خیریت گزری کہ اس فائر کی آواز نے کسی بندے بشر کو اس بنگلے کی طرف دھیان دینے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ بنگلے کے اندر' ساؤنڈ پروف زدن میں ہم نے جو فائرنگ کی تھی وہ ہمارے لیے مسائل کھڑے نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے جانوس کی کیفیت کو چیک کرنے کے لیے اس کے پیٹ کے زیریں حصے میں ایک دھواں دھار ٹھوکر رسید کی۔ وہ پیٹ پکڑ کر تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ چہرے کے کرب ناک تاثرات سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا مثانہ پھٹ گیا ہے۔

میں نے نیچے جھک کر اس کے کالر میں ہاتھ ڈالا اور کسی بوری کے مانند گھسیٹتے ہوئے اسے بنگلے کے عقبی لان میں لے آیا۔ میں اس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا تھا اس کام کے لیے یہ جگہ انتہائی موزوں تھی۔ میں نے اسے لان کی لش گرین گھاس پر پٹخا اور اس کے سینے پر پاؤں کا دباؤ ڈالتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"آنکھیں کھول دو...... آستین کے سانپ!"

اس کے جسم میں ایک بے معنی سی حرکت ہوئی۔ تاہم اس نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔

میں نے غراہٹ آمیز انداز میں کہا "تم نے پچھلے ایک دو دن میں وجدان کی دوستی دیکھی ہے' اس کی دشمنی کا نظارہ نہیں کرو گے؟"

وہ بدستور آنکھیں بند کیے ہولے ہولے کراہتا رہا۔

"لگتا ہے' مجھے تمہاری آنکھوں کا آپریشن کرنا ہوگا۔"

میں نے تھوڑا جھک کر پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کیس میں سے نکال لیا "تم نے مجھے جو آلۂ جراحت خرید کر دیا ہے' اس کی دھار کو تمہارے نرخرے پر ہی آزما کر دیکھنا چاہیے۔ اس طرح آلے کی کارکردگی بھی چیک ہو جائے گی اور تمہاری نیت بھی!"

اس نے عالم وحشت میں آنکھیں کھول دیں۔ میرے ہاتھ میں چمکتے ہوئے خنجر کو دیکھ کر کھلی ہوئی آنکھیں ساکت ہو کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں موت ہلکورے لینے لگی۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں کسی بھی صورت اسے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

موت کو چند سانس کی دوری پر کھڑے دیکھ کر ہر انسان زندگی کے لیے حتی الامکان کوشش ضرور کرتا ہے۔ اس نے بھی گھبرا کر میرے نیچے سے نکلنے کی ٹرائی ماری لیکن میں نے اس کے سینے پر جھٹکے کا دباؤ ڈال کر اسے وہیں جام کر دیا پھر خنجر کی نوک کو اس کی شہ رگ پر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا تم نے یہ سب کچھ؟"

"مم...... مجھے معاف کر دو۔" وہ گھگھیایا "مجھ سے غلطی ہو گئی...... جسٹ اے مسٹیک......"

"جسٹ اے مسٹیک!" میں نے اسی کے الفاظ کو زہریلے انداز میں دہرایا "میں بھی ایسی ہی جسٹ اے مسٹیک کرنے جا رہا ہوں تاکہ تمہارے گندے خون سے اس گھاس کا کچھ بھلا ہو سکے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے خنجر والے ہاتھ پر دباؤ بڑھا

دیا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں منت کرنے لگا "مجھے نہ مارو وجدان! میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں جوگندر پال اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔ میں تمہارے کندھے سے کندھا ملا کر جوگندر کی صفوں کو الٹا دوں گا۔ تم مجھے ایک موقع دے دو...... بس ایک چانس! میں خود کو تمہارا وفادار غلام ثابت کر کے دکھا دوں گا۔"

میں نے بڑی سفاکی سے اس مکار کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا اور وہاں ادھر سے ادھر تک مجھے دروغ گوئی اور ریاکاری کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ وہ مجھے شیشے میں اتار کر ایک مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ جوگندر پال وہاں پہنچ جائے اور مجھے جوگندر کی آمد سے پہلے وہاں سے اڑن چھو ہو جانا تھا لہٰذا میں نے جانوس سے اختتامی اور الوداعی گفتگو کی۔

"میں آقا ہوں اور نہ ہی مجھے غلاموں کی فوج تیار کرنے کا کوئی شوق ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا "تم جوگندر کی مخالفت کا جھانسا دے کر مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ جوگندر سے نمٹنے کے لیے مجھے تمہارے غلیظ کندھے کی بھی ضرورت نہیں۔ اگر کبھی وہ کھل کر تمہاری طرح دشمن کی صورت میں میرے سامنے آیا تو میں اس کا حشر تم سے بھی زیادہ عبرت ناک کروں گا۔ تمہارے لیے کسی معافی تلافی کی گنجائش باقی نہیں رہی جانوس۔ تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی جا چکی ہے!"

میرے لہجے کی سفاکی اور قطعیت نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ اس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے جھوٹ اور منافقت کا آخری کارڈ کھیلا تھا جسے میں نے تڑپ کے ذریعے کاٹ دیا۔

موت کو یقینی پا کر اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی سیاہ بھینسے کو اچانک شدید یرقان نے اپنے چنگل میں لے لیا ہو!

میں نے فنا و بقا کے آفاقی اصول پر عمل کیا۔ جن پتوں کو خزاں لگ جائے وہ پیلے پڑ جاتے ہیں پھر زندگی سے معمور دوسرے پتوں کے بیچ' درخت کے اوپر ان کے موجود رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا لہٰذا انہیں جھڑنا ہی ہوتا ہے۔ جانوس معاشرے کا ایک ناسور تھا۔ اس کا زندہ رہنا بہت سے انسانوں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ میں اپنے خنجر کی پیاس بجھانے پر مجبور ہو گیا!

جانوس کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے بعد میں سیدھا ہوا ہی تھا کہ لی یان سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس نے ایک ہاتھ میں وہی گن تھام رکھی تھی جو میں اسے سونپ آیا تھا۔ وہ عمارت کی عقبی سمت سے نمودار ہوئی تھی اور میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ اس وقت اکیلی تھی!

میں لی یان کو اندرونی ہال میں کلاڈیا کے پاس چھوڑ کر آیا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہ اس کا خیال رکھے چنانچہ اسے تنہا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں تیزی سے اس کی جانب بڑھ گیا۔

"کلاڈیا کہاں ہے؟" میں نے اس کے قریب پہنچ کر اضطراری انداز میں پوچھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی "ڈین ہاروے کے پاس!"

"اوہ!" میں گہری نظر سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"کیا تمہیں اس کی موت کا افسوس ہو رہا ہے؟" اس نے خالص بیویوں والے انداز میں پوچھا۔

"نن...... نہیں!" میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ کلاڈیا بے طرح میری نگاہ میں گھوم گئی۔

"وہ اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہی تھی۔" لی یان نے اس انداز میں کہا جیسے کسی سوتن کا ذکر کر رہی ہو "میں نے اس زہریلی ناگن کو ختم کر دیا۔" پھر وہ تھوڑا توقف کر کے پوچھنے لگی "یہ نام اسے تم نے ہی دیا تھا نا؟"

"ہاں...... ہاں......" میں گڑبڑا گیا "کلاڈیا بڑی خطرناک عورت تھی۔"

لی یان یک ٹک میری آنکھوں میں دیکھتی چلی گئی۔ دراصل جب اس نے کلاڈیا کی موت کا ذکر کیا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ شاید میں لاشعوری طور پر اس کی موت کا خواہاں نہیں تھا۔ حسن' خوب صورتی' دلکشی اور شادابی کو ہمیشہ زندہ رہنا چاہیے۔ اگر یہ کائنات تازگی اور تابندگی سے خالی ہوتی رہی تو دیکھنے والی آنکھ پتھرا جائے گی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کلاڈیا کی موت کا مجھے واقعی بہت افسوس ہوا تھا...... اور لی یان بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی مگر ہم دونوں کے اندازِ نظر میں بہت فرق تھا۔

ویسے ایک بات ہے' عورت مرد کی بہ نسبت زیادہ جذباتی اور حساس ہوتی ہے۔ وہ کہیں زیادہ تیزی سے معاملے کی تہ تک پہنچ جاتی ہے۔ پتا نہیں' لی یان اس وقت میرے بارے میں کیا سوچ رہی تھی۔ میں نے اس سے نگاہ چراتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"ہمیں فوری طور پر اس بنگلے سے نکل جانا چاہیے۔ جوگندر پال اپنے پالتو کتوں کے ساتھ یہاں پہنچنے ہی والا ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی "اب اس

بنگلے میں ہمارے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچا!''

لی یان نے وہی بات کی تھی جس کا اظہار میں نے کیا تھا لیکن الفاظ ایسے ذو معنی استعمال کیے کہ بہ آسانی ان الفاظ کی مدد سے اس کے بیان کو کوئی اور رنگ بھی دیا جا سکتا تھا...... اور میں کوئی اور رنگ دینے کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو رہا تھا۔ شاید یہ چور کی داڑھی میں تنکے والی بات تھی!

ہم دونوں گنز سونتے' پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے بنگلے کے سامنے والے حصے میں پہنچے۔ وہاں پورچ میں ایک قیمتی گاڑی کھڑی تھی۔ بنگلے میں داخل ہوتے وقت ہم نے سوچا تھا' واپسی میں اگر ہنگامی طور پر ہمیں کسی گاڑی کی ضرورت پیش آئی تو ہم یہ بیش قیمت گاڑی استعمال کریں گے۔ مذکورہ گاڑی کے نزدیک پہنچ کر لی یان نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے حتمی لہجے میں کہا ''نہیں...... ہم یہاں سے نکلنے کے لیے کسی گاڑی کا سہارا نہیں لیں گے۔ خوامخواہ ایک چیختی چنگھاڑتی شناخت کو اپنے ساتھ ساتھ دوڑاتے پھرنا عقل مندی نہیں۔''

''اور اس اسٹیشن ویگن کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ہم گیٹ کے قریب پہنچے تو لی یان نے اس اسٹیشن ویگن کی جانب اشارہ کیا جس میں جانوس اور اس کے دو ساتھی وہاں پہنچے تھے اور لی یان اس بات سے آگاہ نہیں تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا ''نہیں!''

''پھر؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے بنگلے کے گیٹ کے نزدیک بے سدھ پڑے وجے اور راجیش پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر میرے ''تماشے'' سے محظوظ ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں جس قسم کی نیند میں پہنچایا تھا وہاں سے ان کی فوری واپسی کے امکانات نہیں تھے۔ لی یان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا۔

''ہم یہاں سے پیدل ہی نکلیں گے۔ اس علاقے سے تھوڑے فاصلے پر پہنچنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا کہ کدھر کا رخ کیا جائے اور......'' میں نے ہاتھ میں موجود گن کو ڈرائیو وے میں دور اچھال دیا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا ''یہ ان لوگوں کی امانت ہے۔ اسے ادھر بنگلے ہی میں رہنا چاہیے۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے وجے اور راجیش کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

لی یان نے چشم زدن میں میری تقلید کی اور اپنے ہاتھ کی خطرناک گن کو وہیں ایک طرف ڈال دیا پھر ہم تیزی سے گیٹ کی سمت بڑھ گئے۔

ہم نے جیسے ہی بنگلے سے باہر قدم نکالا' ایک ٹیکسی تیزی سے شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوئی۔ شیوالی اسٹریٹ' اسرائیل ایمبیسی کے تقریباً عقب میں واقع تھی جس میں جوگندر پال کا بنگلا نمبر ج۔ دو سو تھوڑی دیر پہلے میدانِ کارزار بنا ہوا تھا۔

اس ٹیکسی کا شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہونا کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن اس کے انداز نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ طوفانی رفتار سے سیدھی ہماری ہی طرف بڑھتی آ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ٹیکسی ڈرائیور ہمیں کچلنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں نے پہلو بچا کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔ لی یان بھی میرے تعاقب میں بھاگی۔ ہم ٹیکسی کی مخالف سمت میں دوڑنے لگے۔ ٹیکسی کے خوف ناک تیور دیکھ کر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ جوگندر پال کے بندے ہمارے فرار کو ناکام .... بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اس وقت جن حالات سے گزر رہے تھے' ان میں اسی انداز میں سوچا جا سکتا تھا۔

چند سیکنڈ ہی میں ٹیکسی نے ہمیں آ لیا۔ وہ ہمارے انتہائی قریب پہنچ گئی۔ اس سے قبل کہ میں پلٹ کر عقب میں دیکھتا' میری سماعت سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔

''وجدان' رک جاؤ...... آگے تمہارے لیے خطرہ ہے۔''

کوئی مجھے میرے نام سے پکار رہا تھا اور کسی بڑے خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔ اب رکنا اور رک کر اس کی بات سننا ضروری ہو گیا۔ میرے قدم تھمے تو لی یان بھی رک گئی۔ ہم نے بیک وقت پلٹ کر اپنے پیچھے دیکھا اور چونک اٹھے۔ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر وہ ٹیکسی بھی ٹھہر گئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی سائیڈ والے شیشے سے گردن باہر نکالی ہوئی تھی اور ہاتھ سے ہمیں اشارہ بھی کر رہا تھا۔ میں اس کی صورت پہچان کر ٹھٹک گیا۔ وہ جانوس کا خاص آدمی کاشانوک تھا!

دشمن کے ایک اہم آدمی نے مجھے اتنی خیر خواہی سے پکارا تو حیرت ہوئی۔ ہمیں رکتا دیکھ کر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''وجدان! ٹیکسی کے اندر آ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں!''

میں اس وقت عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ لی یان بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ کاشانوک کی اس بات میں

کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ گلی ہمارے لیے ڈیتھ اسٹریٹ کی حیثیت حاصل کرنے والی تھی۔ کاشانوک ہمیں جس دوستانہ انداز میں ٹیکسی کے اندر بلا رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا' اسے جانوس کو پیش آنے والے حالات کی خبر نہیں۔

ایک لمحے کے تامل کے بعد میں نے لی یان کو اشارہ کیا' دوسرے ہی لمحے ہم کاشانوک کی ٹیکسی کی عقبی نشست پر موجود تھے۔ میں نے اس رسک پر ٹیکسی میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا کہ کاشانوک تو تازہ ترین حالات سے آگاہ نہیں اور وہ ہمیں جانوس کے معزز مہمان ہی سمجھ رہا ہے۔ ویسے آگے جا کر اگر اس کی سوچ کا کوئی گھپلا سامنے آ بھی جاتا تو میں اس چکنے سر والے کاشانوک سے بخوبی نمٹ لیتا۔

ہم نے جیسے ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر دروازہ بند کیا' کاشانوک نے ٹیکسی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا' پھر وہ ہوائی رفتار کے ساتھ ٹیکسی کو شیوالی اسٹریٹ میں دوڑانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد ہم اسٹریٹ کے آخری سرے پر پہنچ گئے۔ کاشانوک نے ٹیکسی کی رفتار کم کی اور بڑی مہارت سے اسے مین روڈ پر لے آیا۔ میں نے گردن موڑ کر اسٹریٹ کی طرف ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور مجھے ایک مرتبہ پھر چونک جانا پڑا۔

ہماری مخالف سمت سے تین گاڑیاں یکے بعد دیگرے شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوئی تھیں جن میں سے آخری گاڑی پر میں نے اسرائیل کا جھنڈا بھی لگا ہوا دیکھا۔ میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

اسرائیل ایمبیسی چند قدم کے فاصلے پر واقع تھی۔ جھنڈے والی گاڑی کا سیدھا سیدھا ایک ہی مطلب تھا کہ یہودی میرے خلاف سرگرم ہو گئے تھے۔ ڈین ہاروے اور کلاڈیا کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ میری زبانی' ربی موشے بائمن کے کسی نائب تک یہاں کی تازہ ترین صورتِ حال کی خبر پہنچ گئی تھی۔ عین ممکن تھا' ربی ہی کے حکم پر اسرائیل ایمبیسی والے متحرک ہوئے ہوں۔ باقی دو گاڑیوں میں جوگندر پال وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ربی کی طرف دھیان جاتے ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے تھوڑی دیر بعد اس کے موبائل پر رابطہ کرنے کا ''وعدہ'' کیا تھا۔ کاشانوک کی موجودی میں' میں نے یہ رابطہ مناسب نہ سمجھا۔ پہلے اس کی پوزیشن کا اندازہ لگانا ضروری تھا۔ ربی سے بعد میں بھی بات ہو سکتی تھی۔

کاشانوک بڑی مستعدی اور مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جلد ہی وہ ٹیکسی نیپال راسترا بینک کے پاس سے گزرتے ہوئے بالودتر روڈ پر آ گئی۔ کاشانوک کی پُراسرار خاموشی مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ ہم لگ بھگ ساڑھے تین بجے اپارٹمنٹ سے نکلے تھے اور اس وقت وہ وہیں پر موجود تھا۔ میری معلومات کے مطابق کاشانوک' جانوس کا جاں نثار اور وفادار تھا...... پھر وہ ہمیں کسی بڑے خطرے سے آگاہ کرنے کے بعد ٹیکسی میں اپنے ساتھ کیوں لے جا رہا تھا؟ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کیسے معلوم ہوا' ہم اس وقت جوگندر پال کے بنگلے میں سے نکل رہے ہیں۔ وہ نیکسل سے لازم پت کے علاقے میں کیوں پہنچا؟

یہ تمام تر سوالات ایسے تھے جن کے درست جوابات کاشانوک ہی دے سکتا تھا۔ اس نے ابھی تک دشمنوں والی کوئی حرکت نہیں کی تھی لہٰذا میں نے اسے ٹٹولنا ضروری سمجھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کاشانوک! تم تو وہاں نیکسل والے اپارٹمنٹ میں تھے۔ تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہاں ہم پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے؟''

لی یان بھی میری طرح کاشانوک کی طرف متوجہ تھی۔ تازہ ترین صورتِ حال اس کی سمجھ سے بھی باہر تھی۔ کاشانوک نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے رویے نے مجھے اور زیادہ تشویش میں ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ اس سے استفسار کرتا' اس نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے ایک ہاتھ میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے دیکھا' اس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا موبائل فون موجود تھا۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا ''یہ کیا ہے؟''

''میں نے اس سیل پر ایک نمبر ڈائل کیا ہے۔ تم بات کر لو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے وہ سیل اس سے لے کر اپنے کان سے لگایا اور مائیک میں کہا ''ہیلو!''

''گڈ ایوننگ!'' سیل کے اسپیکر سے خارج ہونے والی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''یہ سب کیا چکر ہے ڈاکٹر مونگ؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس نے مختصراً کہا ''کاشانوک بھروسے کا آدمی ہے!''

''جانوس پر بھی تم نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا تھا۔'' میرا لہجہ خود بخود تلخ ہو گیا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا ''جانوس کی اصلیت مجھ پر کھل گئی

تھی لیکن میں نے دانستہ اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ رتنا پارک والے بنگلے میں جو افسوس ناک واقعات پیش آئے ان کے پیچھے جانوس ہی کا ہاتھ ہے۔''

میرے لہجے میں احتجاج شامل ہوگیا ''اس کے باوجود بھی تم نے ہمیں اس آستین کے سانپ کے حوالے کر دیا؟''

''وجدان! میں جو کچھ جانتا ہوں' ممکن ہے تم اس سے زیادہ جانتے ہو۔ اسی طرح میں بھی بعض معاملات میں تم سے زیادہ معلومات رکھ سکتا ہوں۔'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''ہر کام کا ایک وقت اور طریقۂ کار مخصوص ہوتا ہے۔ جانوس تمہارے ہاتھوں ہی اپنے قرار واقعی انجام کو پہنچا؟'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا ''بہر حال' لی یان کیسی ہے؟''

میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ''تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔'' وہ مشفقانہ انداز میں بولا ''تمہیں ابھی بہت سے محاذوں پر اسے استعمال کرنا ہے۔''
اس کا اشارہ میرے ذہن کی طرف تھا۔ بات کے اختتام پر اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھ لیا ''لی یان کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا؟''

''ہم دونوں خیریت سے ہیں۔'' میں نے گول مول جواب دیا ''کیا تم یہاں کے تازہ ترین حالات سے آگاہ ہو؟''

''بڑی حد تک!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''جب آج سہ پہر میں تم دونوں اپارٹمنٹ سے نکلے تو کاشانوک نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ میں نے اسے ہدایت کردی تھی کہ تمہارا ''خیال'' رکھے۔ تم اسے جانوس کے وفادار کی حیثیت سے جانتے ہو۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ کبھی اس حوالے سے کوئی غلط فہمی پیدا ہونے لگے تو وہ مجھ سے رابطہ کرکے تمہاری بات کرادے...... اور ہم بات کر رہے ہیں۔'' وہ سانس لینے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کاشانوک پر اعتماد کرو۔ یہ تمہارے بہت کام آئے گا۔''

ڈاکٹر مونگ کا انداز الجھا دینے والا تھا۔ میں نے پوچھا ''کیا تم جانتے ہو' جانوس کے ساتھ کیا واقعات پیش آچکے ہیں؟''

''جانوس' ڈین ہاروے اور کلاڈیا کے عبرت ناک انجام کی مجھے خبر مل چکی ہے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

اس کے مبہم مگر اٹل انداز نے مجھے گڑبڑا دیا۔ چاہنے کے باوجود بھی میں اس سے نہ پوچھ سکا کہ اس کی معلومات کا ذریعہ کیا ہے۔ اگر میں یہ سوال کرتا تو وہ مجھے کسی بھی غیر واضح جواب سے اطمینان دلانے کی کوشش کرتا لہٰذا میں نے ایسا ارادہ ترک کرنا ہی بہتر سمجھا۔

''ربی سے بات ہو تو خوب بڑھ چڑھ کر بولنا۔'' ڈاکٹر مونگ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''اس سے ڈرنے یا دبنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہر صورت میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہے اسی لیے اس نے تمہاری ساتھی کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ جب تک تم اس کے قابو میں نہیں آجاتے' وہ ساحل کو بہت سنبھال کر رکھے گا۔ ساحل کی سلامتی تمہارے حصول کے لیے بہت ضروری ہے۔ ربی اسے کوئی گزند نہیں پہنچنے دے گا اور یہ تمہارے لیے ایک پلس پوائنٹ ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہاری طرف سے مایوس ہو جائے' تم اس تک رسائی حاصل کرلو۔ وہ جانتا ہے' تم ساحل تک پہنچنے کی پوری کوشش کرو گے...... اور اسی کوشش کے دوران میں وہ تمہیں اچک لے گا لہٰذا پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے!''

میں اس وقت ساحل کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا جب ڈاکٹر مونگ نے یہ بات کی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری سوچ پڑھ رہا ہو۔ اگر ایسا نہیں بھی تھا تو بھی ڈاکٹر کچھ نہ کچھ ضرور کر رہا تھا۔ اس نے اپنے بڑے محترم سانگ فو کی صحبت میں عمر گزاری تھی۔ سانگ فو کی روحانی اور باطنی صلاحیتوں کا میں بھی معترف تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اب ڈاکٹر مونگ ہی ''بڑا'' تھا۔ اس کی پُراسرار صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ ساحل اور ربی کے بارے میں مزید کیا جانتا ہے۔

''تھوڑی دیر بعد ربی سے میری بات ہونے والی ہے۔'' میں نے کہا ''اس نے کچھ عرصے سے مجھے جس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے وہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے تو وہ حاصل کر سکے گا یا نہیں لیکن میں اپنی ساحل تک ضرور پہنچ جاؤں گا۔ مجھے ہر صورت اسرائیل جانا ہوگا۔''

میرا لہجہ اتنا ٹھوس تھا کہ خود مجھے بھی اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ ساحل کے حصول کے لیے بہت آنکھ مچولی ہو چکی تھی۔ اگر ربی بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ قیمتی پتھروں پر رال نہ ٹپکا رہا ہوتا تو وہ ساحل کو اسرائیل سے نکال کر کھٹمنڈو تک کبھی نہ بھیجتا۔ یہاں کھٹمنڈو میں

اسے تلخ تجربات سے گزرنا پڑا تھا۔ وہ اپنے ارادے سے باز آیا تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور اس پر واضح ہوگیا تھا کہ اگر وہ پانچ نایاب پتھروں کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو مجھے اپنے قبضے میں کرنا ہوگا۔ ایک میں ہی ایسا شخص تھا جو ان انمول پتھروں کو عبادت گاہ کے تہ خانے سے نکال کر باہر لا سکتا تھا...... اور مجھے قابو کرنے کے لیے ساحل کو اپنی تحویل میں رکھنا بہت ضروری تھا لہٰذا یہ بات طے تھی کہ وہ اب ساحل کو اسرائیل سے باہر نہیں نکالے گا' مجھے ہی اپنی جانِ تمنا تک پہنچنا ہوگا۔

یہ تمام تر خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزرے' اگلے ہی لمحے ڈاکٹر مونگ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! تم نے اسرائیل کا ذکر کیا ہے تو یہ بات ذہن میں نقش کرلو کہ اس وقت کھٹمنڈو میں اسرائیل ایمبیسی پوری طرح متحرک ہو چکی ہے۔ تم یہودیوں کی طاقت اور وسیع اختیارات سے بخوبی واقف ہو۔ تمہیں اور لی یان کو کھٹمنڈو کے چپے چپے پر تلاش کیا جا رہا ہے۔'' وہ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''میں نہیں جانتا' تم نے آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل ترتیب دیا ہے لیکن جب تک کھٹمنڈو میں ہو' تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میری مانو تو ایک آدھ دن کے لیے بالکل منظر سے آؤٹ ہو جاؤ۔ کاشانوک اس سلسلے میں تمہاری ہر قسم کی مدد کر سکتا ہے۔''

یقیناً اسی نوعیت کی ہدایات اس نے کاشانوک کو بھی دے رکھی ہوں گی۔ میں نے ڈاکٹر مونگ سے سرسری لہجے میں کہا ''ٹھیک ہے' میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔''

''لی یان کا بہت خیال رکھنا۔'' اس نے سفارش کرنے والے انداز میں مجھے تاکید کی۔

میں نے ترچھی نظر سے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی لی یان کو دیکھا اور کہا ''بہت خیال رکھا ہوا ہے۔''

الوداعی کلمات کے بعد ہمارے درمیان سیلولر رابطہ موقوف ہوگیا۔ جب ہم بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ سے رخصت ہوئے تھے تو اس وقت بھی ڈاکٹر مونگ نے لی یان کا خیال رکھنے کے سلسلے میں مجھے تاکید کی تھی اور اس کی یہ تاکید خالی از علت نہیں تھی۔ لی یان میرے مشن میں شامل تھی اور اسی شمولیت نے اس کے شوہر شون کی جان لے لی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں بالکل تنہا تھی۔ اس کا خیال رکھنا مجھ پر لازم ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر مونگ اگر نہ بھی کہتا تو میں اس ذمے داری میں کوئی کوتاہی نہ برتتا۔

ان لمحات میں شون کی خواہش شدید میرے ذہن میں ابھر گئی۔ اسے اولاد کی بڑی تمنا تھی لیکن اس سلسلے میں لی یان اس سے تعاون پر آمادہ نہیں تھی۔ ان کی شادی لگ بھگ چار سال رہی لیکن وہ اولاد ایسی نعمت سے محروم ہی رہے۔ اس دوران میں ضد کرکے' لی یان نے دو تین مرتبہ ابارشن کرا لیا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اسے بچوں سے نفرت ہو۔ وہ بچہ تو چاہتی تھی لیکن ان طویل مراحل کو طے کرتے ہوئے وہ گھبراتی تھی جن سے گزرے بغیر کوئی عورت فطری ماں نہیں بن سکتی۔ اس کا رجحان اڈاپشن کی جانب تھا مگر شون اس کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان کی شادی شدہ زندگی کے یہ چار سال بڑی جذباتی اور نفسیاتی کشمکش میں گزرے تھے۔ اس سلسلے میں شون کا مطالبہ جائز تھا مگر پتا نہیں' لی یان اپنے سینے میں کس قسم کی ممتا چھپائے بیٹھی تھی!

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور موبائل فون کاشانوک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''تم میری نظر میں معتبر تو ہوگئے ہو۔ اب یہ بھی بتا دو' ہمیں کہاں لے کر جا رہے ہو؟''

کاشانوک بڑی روانی سے انگلش بولتا تھا۔ اس نے جواب دیا ''فی الحال ہم بودھ ناتھ ویلی کی طرف جا رہے ہیں۔ آئندہ کا پروگرام وہاں پہنچنے کے بعد ترتیب دیں گے۔''
''کیا یہ ویلی بودھ ناتھ اسٹوپا کے نزدیک ہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''اسٹوپا کے گرد و نواح میں زیادہ تر بدھسٹ آباد ہیں اسی لیے یہ علاقہ ایک وادی کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ بودھ ناتھ اسٹوپا کی موجودگی کے باعث یہ وادی ''بودھ ناتھ ویلی'' کہلاتی ہے۔'' ویلی میں میرا ایک محفوظ ٹھکانا ہے جہاں تم بے فکری سے جتنا چاہو' وقت گزار سکتے ہو۔''

اس گفتگو کے دوران میں کاشانوک نے ٹیکسی کو مختلف سڑکوں پر سے گزارتے ہوئے بالآخر رنگ روڈ پر ڈال دیا تھا۔ بودھ ناتھ کا اسٹوپا شہر کے شمال مشرقی حصے میں آخری کنارے پر واقع تھا۔ اس کے جنوب میں کھٹمنڈو کا تری بھون انٹرنیشنل ائرپورٹ تھا۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ مختصر بات چیت کے بعد کاشانوک خاموش ہوگیا تو میں لی یان کی طرف متوجہ ہوا۔

بودھ ناتھ ویلی تک پہنچنے میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔ میں نے اس سے کہا ''تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟''
میرے استفسار پر اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی ''نہیں' بوریت والی کیا بات ہے؟''

’’ٹھیک ہے‘ تم بیٹھو...... میں آتا ہوں۔‘‘ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

وہ چونک اٹھی ’’تم کہاں جارہے ہو وجدان؟‘‘

’’ابھی واپس آکر بتاتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

اس کی الجھن دوچند ہوگئی۔

میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور ٹیکسی کی نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے مجھے ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اب میری اس عادت کی عادی ہوگئی تھی۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ میں بند آنکھوں کے پیچھے کون سا کھیل کھیلتا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ میں دھیان گیان کرتا ہوں۔ وہ میری بہت سی دیکھی اور ان دیکھی صلاحیتوں سے یکساں طور پر متاثر تھی۔

جالوس نے مجھے جو تین پوسٹ کارڈ تصاویر دکھائی تھیں۔ ان میں ایک تصویر جوگندر پال کی بھی تھی۔ میں جوگندر کی تازہ ترین خبر لینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے شک تھا کہ اسرائیلی جھنڈے والی گاڑی کے علاوہ جو دو گاڑیاں شیوالی اسٹریٹ میں داخل ہوئی تھیں ان میں جوگندر پال اور اس کے آدمی ہوسکتے تھے۔ اس وقت اسرائیل ایمبیسی میں‘ ربی کے اشارے پر ایک ہلچل سی مچی ہوگی۔ دیکھنا تو چاہیے تھا‘ شیوالی اسٹریٹ کے بنگلا نمبر ۔جے۔ٹوڈبل زیرو میں کیا ہورہا ہے؟

جوگندر پال کے ماحول تک میں پہلے بھی رسائی حاصل کرچکا تھا لہٰذا اس سلسلے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا اور اس کے خدوخال کو ذہن میں لاتے ہی میں تیسری آنکھ کے توسط سے بنگلا نمبر ۔جے۔ٹو ہنڈریڈ میں پہنچ گیا۔

وہاں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ کوئی درجن بھر افراد ادھر سے ادھر چکراتے پھر رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ انہوں نے وجے‘ راجیش‘ جالوس‘ ڈین ہاروے‘ کلاڈیا اور اس سیکیورٹی گارڈ کی لاشیں دریافت کرلی ہوں گی جو لی یان کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنا تھا۔ جوگندر پال کو جالوس کے ذریعے‘ بنگلے میں میری سرگرمی کی اطلاع مل گئی تھی۔ ازیں علاوہ‘ میں نے ربی کے کسی غصیلے پی اے سے جس انداز میں بات کی تھی وہ بھی میری ’’کارکردگی‘‘ کو سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ میں سب کو چھوڑ کر جوگندر پال سے چپک گیا جو چٹی چمڑی والے دو افراد کے ساتھ ایک کمرے میں کوئی خفیہ میٹنگ کررہا تھا۔ ان دونوں سفید فام افراد کا تعلق یقیناً اسرائیل ایمبیسی سے تھا۔ میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو تو نہیں سن سکتا تھا البتہ‘ میرا اندازہ تھا کہ ان کے درمیان اس وقت میں ہی موضوع بنا ہوا ہوں گا۔ وہ لوگ جلد از جلد مجھے چھاپنے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔

میں نے ان سب پر لعنت بھیجی اور اس ماحول سے نکل آیا۔ مجھے جو کرنا تھا وہ کرگزرا تھا۔ اب ان کی باری تھی۔ مجھے خاموشی سے ان کا تماشا دیکھنا تھا۔

میں نے بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے تھرڈ آئی کو تھوڑی اور زحمت دی اور پلک جھپکتے میں اپنی رگِ جاں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اس وقت بھی اسی کمرے میں تھی جہاں میں نے آج سہ پہر میں اسے دیکھا تھا مگر اس وقت وہ جاگ رہی تھی۔ میں نے دیکھا‘ وہ باہوش وحواس کھانے میں مصروف تھی۔ اس لمحے کھٹمنڈو میں شام کے پانچ‘ سوا پانچ بجے تھے۔ اس حساب سے وہاں اسرائیل میں دوپہر کا لگ بھگ ایک بجا ہوگا۔ یہ لنچ کا وقت تھا اور ساحل بڑے سلیقے طریقے سے لنچ کررہی تھی۔

کھٹمنڈو کے مقامی وقت کے مطابق سہ پہر تین بجے جب میں نے ساحل کو جھانکا تھا تو اس وقت بیڈروم میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا لیکن اس وقت یہ کمرا باقاعدہ پوری طرح روشن تھا۔ میں نے ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے نگاہ دوڑا کر اس بیڈروم کا تنقیدی جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی کہ ساحل کے سوا وہاں اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا‘ اگر اور کوئی شخص وہاں دکھائی دیتا تو میں اس کا ماحول پکڑ کر اس بیڈروم سے باہر نکل جاتا‘ پھر یہ جاننے میں مجھے قطعاً کوئی پریشانی نہ ہوتی کہ ساحل والا بیڈروم کس عمارت میں واقع ہے...... اور وہ عمارت تل ابیب کے کس حصے میں پائی جاتی ہے۔

مجھے یہ معلوم تھا‘ اسرائیل میں ربی نے اپنا ٹھکانا تل ابیب میں بنا رکھا تھا اور یہ بھی یقینی تھا کہ ساحل کو اس نے خود سے دور نہیں ٹھہرایا ہوگا۔ مجھے اول آخر ساحل تک پہنچنا تھا اور میری آئندہ منزل اسرائیل کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔ مجھے قوی امید تھی‘ یہودیوں کی اس سرزمین پر قدم رکھنے سے پہلے‘ میں ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی لائٹ ہاؤس دریافت کرہی لوں گا۔

ویسے ایک بات سے مجھے بڑا اطمینان حاصل ہوا تھا کہ اب میں بہ آسانی اپنی ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہونے لگا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے ربی نے اپنے کسی پراسرار عمل کے ذریعے میری تیسری آنکھ کی راہ میں حد درجہ رکاوٹیں ڈال رکھی تھیں۔ میرے تصور کی پرواز اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے ہی دم توڑ جاتی...... مگر اب ایسا نہیں ہورہا تھا اور...... یہ بہت اچھا ہورہا تھا۔

میں بڑی لگاوٹ اور توجہ سے ساحل کو کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہمیں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائے ہوئے مدتیں گزر گئی تھیں۔ کراچی میں جب وہ مجھ سے جدا ہوئی اس کے بعد سے میری زندگی ایک عذابِ مسلسل بن کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی یاد میں پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور نہ ہی آنکھ بھر کر سوسکا تھا۔ رسمِ دنیا اور دستورِ زمانہ الگ بات ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہی میرا سب کچھ بھی لے گئی تھی۔ اس کے بغیر میں خود کو خالی خالی سا محسوس کرتا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری زندگی کا کوئی مقصد نہ رہا ہو۔ وہ میری زندگی کا حاصل تھی مگر مجھے حاصل نہیں تھی۔ کیا میں زندہ تھا؟

آہ! کتنی راتیں میں اس کی صورت دیکھے بغیر سویا تھا اور کتنی صبحیں میری آنکھوں نے اس چہرے کو دیکھے بنا آغاز کی تھیں۔ ان بے کیف صبحوں اور روکھی پھیکی شاموں کے ساتھ میری زندگی گویا ایک رستا ہوا ناسور بن گئی تھی جسے ساحل کا مرہم ہی شفا دے سکتا تھا۔

میں ساحل کے بارے میں سوچتے ہوئے یک ٹک اسے دیکھتا جارہا تھا۔ وہ میری دسترس سے باہر تھی۔ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو نہیں سکتا تھا‘ دور بیٹھ کر دیکھنے پر مجبور تھا اور وہ بھی تصور کی نگاہ سے۔ انسان کے بس میں جتنا ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کرسکتا۔ میں بھی تخیل کی نگاہ سے اسے چومنے لگا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک ہاتھ کی دوری پر بیٹھی محسوس ہوئی۔ انسان کا تخیل اگر طاقتور ہو تو ہر شے سمٹ کر اس کی آنکھ میں آجاتی ہے۔ ساحل بھی میری آنکھ بن گئی تھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کھینچ کر ساحل کو مجھ سے جدا کررہا ہو۔ میں نے بڑی مضبوطی سے اسے تھام لیا لیکن یہ مضبوطی کسی کام نہ آئی۔ وہ میرے تصور کی گرفت سے نکلتی چلی گئی۔ دور...... اور دور...... پھر وہ نگاہ تصور سے اوجھل ہوگئی۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔

اسی لمحے ایک مانوس قہقہہ میری سماعت سے ٹکرایا۔ میں نے اس نقرئی آواز کو سیکنڈ کے لاکھ دیں حصے میں شناخت کرلیا۔ وہ ٹیلگری کا مخصوص قہقہہ تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں ٹیکسی کی عقبی نشست پر لی یان کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

’’کوئی پرابلم ہے وجدان؟‘‘

’’نو پرابلم!‘‘ میں نے مختصر جواب دیا اور ٹیکسی کے باہر دیکھنے لگا۔

کاشانوک کی ٹیکسی اس وقت تاراگون ہوٹل کے قریب سے گزر رہی تھی۔ بودھ ناتھ دیلی‘ تاراگون ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی‘ گویا ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے تھے۔ میں گہری سنجیدگی سے اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

اس بات میں کسی شک کی گنجائش تلاش کرنا ناممکنات میں سے تھا کہ میں نے ٹیلگری کا ہی مخصوص قہقہہ سماعت کیا تھا۔ وہ ایک سو ایک فیصد ٹیلگری تھی۔ میں اس کی آواز کو لاکھوں کروڑوں آوازوں میں بالکل الگ پہچان سکتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوسکتا تھا۔ میں بے طرح‘ پربتوں کی اس ملکہ کے بارے میں سوچنے لگا اور اسی لمحے ایک اور حیرت انگیز انکشاف ہوا۔

میں نے ٹیکسی کی اندرونی فضا میں ایک مخصوص خوش بو رچی بسی محسوس کی۔ میں اس خوش بو سے اچھی طرح آشنا تھا۔ یہ ٹیلگری کے وجود کی منفرد مہک تھی۔ وہ جس ماحول میں بھی جاتی اسے مہکا کر رکھ دیتی تھی...... تو کیا ٹیلگری تھوڑی دیر پہلے اس ٹیکسی میں موجود تھی؟

اس سوال نے میرے اندر بے چینی بھردی۔ میں بے قرار ہوکر ٹیلگری کے بارے میں سوچنے لگا۔ کوئی اور اس کے بدن کی نشیلی خوشبو کو چرا سکتا تھا اور نہ ہی اپنا سکتا تھا۔ میں بارہا اس طلسمی خوشبو کے تجربے سے گزرا تھا اور وہ رات تو میری زندگی کی ایک ناقابلِ فراموش رات تھی جب کے‘ ڈی‘ اے اسکیم ون کے ایک بنگلے میں اس نے مجھے لذتِ حیات سے روشناس کرایا تھا۔ وہ میری زندگی کا ایک انوکھا اور منفرد تجربہ تھا۔

میں نے محسوس کیا‘ اس دوران میں لی یان مسلسل میرا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے چہرے کے تاثرات سے میری بدلتی ہوئی کیفیت کا اندازہ لگایا تھا۔ میں اس کی معیت میں پہلے بھی دوتین مرتبہ ایسی کیفیت سے گزرا تھا اور جب اس نے مجھ سے استفسار کیا تو میں ’’کچھ نہیں......!‘‘ کہہ کر ٹال گیا تھا۔ اس دفعہ اس کے استفسار کا انداز بالکل جدا تھا۔

’’وجدان! کوئی یاد آرہا ہے؟‘‘ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں گڑبڑا کر رہ گیا ’’مجھے کون یاد آئے گا!‘‘ میں نے جلدی سے کہا۔

’’کوئی یاد آنے والی شے......؟‘‘ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’پتا نہیں‘ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟‘‘ میں جھلا کر رہ گیا۔

’’میں کلاڈیا کی بات کررہی ہوں!‘‘ وہ معنی خیز انداز

میں بولی۔

''اوہ!'' میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

وہ زیرِ لب مسکرا دی۔

میں اس کی شوخ مسکراہٹ اور شریر نظر کی تاب نہ لا سکا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ نگاہ چرانے کا اس سے زیادہ فوری طریقہ میری سمجھ میں نہ آ سکا۔

کلاڈیا کے حوالے سے وہ پہلے بھی مجھے چھیڑ چکی تھی۔ اگر چہ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتے لیکن لی یان کا انداز ایک مخصوص پہلو کی جانب اشارہ کرر ہا تھا اور میں بخوبی سمجھ رہا تھا' وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

عورت بڑی زود حس اور کھوجی فطرت کی مالک ہوتی ہے۔ مرد کو جس بات کا شک ہو' وہ اس بارے میں پُر یقین ہوتی ہے۔ کلاڈیا کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے' لی یان کی آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات چغلی کھاتے تھے کہ اس نے میری چوری پکڑ لی تھی!

☆☆☆

بودھ ناتھ کا اسٹوپا کھٹمنڈو کے شمال مشرقی حصے میں شہر کے آخری کنارے پر واقع ہے۔ اس کے گرداگرد بدھ مت افراد کی ایک بڑی تعداد آباد ہے اس طرح بودھ ناتھ ویلی وجود میں آ گئی ہے۔ ویلی میں بسنے والے بدھ مت کی اکثریت کا تعلق تبت سے ہے۔ کاشالوک خود بھی اسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اتفاق سے وہ بھی تبت سے آ کر کھٹمنڈو میں آباد ہوا تھا۔ ویلی میں رہنے والے نوّے فیصد بدھ مت غالیچہ بانی کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ کاشالوک ہمیں ویلی کے اندر سے گزارتے ہوئے آخری سرے پر لے گیا اور ایک گھر کے سامنے لے جا کر ٹیکسی روک دی۔

اس گلی میں بمشکل پانچ چھ گھر ہوں گے۔ کاشالوک نے ہمیں ٹیکسی میں سے اترنے کو کہا اور خود بھی ہمارے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ ہم دونوں ٹیکسی کے قریب ہی ایک طرف کھڑے ہو گئے تو کاشالوک نے اس گھر کے دروازے پر دستک دے دی۔

میں نہیں جانتا تھا' وہ کس کا گھر ہوگا۔ راستے میں کاشالوک نے صرف اتنا بتایا تھا' وہ ہمیں اپنے کسی خفیہ اور محفوظ ٹھکانے پر لے جا رہا ہے۔ عین ممکن تھا' یہی گھر اس کا ٹھکانا ہو۔

دستک کے جواب میں ایک شخص نے دروازہ کھول دیا۔ میرے اندازے کے مطابق' تبتی نقوش والے اس بوڑھے شخص کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہو گی لیکن میرا یہ اندازہ سراسر غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ تبت میں رہنے والے بڑی عمدہ صحت اور طویل عمر پاتے ہیں۔ عین ممکن تھا' وہ شخص پچاسی یا نوّے کے پیٹے میں ہو۔

اس شخص نے عقیدت اور احترام کے جذبات کے ساتھ کاشالوک کا استقبال کیا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد ہم اس گھر کے اندر موجود تھے۔ کاشالوک ہمیں ایک کمرے میں لے آیا اور کہا۔

''آپ لوگ جب تک جی چاہے' یہاں رہ سکتے ہیں۔ دشمن کا بھولے سے بھی اس طرف دھیان نہیں جائے گا۔ میرا یہ ٹھکانا ہر طرح سے محفوظ اور آرام دہ ہے۔''

میں نے ایک اہم سوال کیا' 'یہ بوڑھا کون ہے؟''

''میرا ملازم ہے۔'' کاشالوک نے بتایا' 'یہ اسی گھر کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ میری غیر موجودی میں یہ یہاں کی چوکیداری کرتا ہے۔ اس کا نام فلوجی ہے۔ تم فلوجی پر بھروسا کر سکتے ہو۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا' 'آؤ' پہلے میں تم لوگوں کو اس گھر کا معائنہ کرا دوں۔''

ہم اس کے ساتھ ہو لیے۔

وہ گھر چار بیڈرومز اور ایک ڈرائنگ روم پر مشتمل تھا۔ ڈرائنگ روم اور ایک چھوٹا بیڈروم بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں بائیں واقع تھے۔ مذکورہ چھوٹے بیڈروم میں فلوجی رہتا تھا۔ دیگر تین بیڈرومز گھر کے عقبی حصے میں واقع تھے جن کے آگے ایک کشادہ صحن تھا۔ کاشالوک نے مجھے بتایا کہ اس گھر کو وہ ''پے انگ گیسٹ ہاؤس'' کے طور پر استعمال کرر ہا تھا۔ بودھ ناتھ اسٹوپا کی یاترا کے لیے دور دراز سے آنے والے لوگ انتہائی کم کرایے پر وہاں قیام کرتے تھے۔ قیام کے ساتھ ساتھ وہاں طعام کی سہولت بھی مہیا تھی۔ یہ کام فلوجی خود اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا جب بھی کسی خاص تہوار کا موقع ہوتا تو بودھ ناتھ ویلی یاتریوں سے بھر جاتی تھی۔ ان دنوں کاشالوک کا گیسٹ ہاؤس بھی آباد ہو جاتا تھا ورنہ اِکا دُکا افراد ہی وہاں قیام کرتے تھے۔ آج کل وہ گیسٹ ہاؤس مہمانوں کے وجود سے خالی تھا۔

کاشالوک ہمیں گھر میں گھما پھرا کر واپس کمرے میں لایا تو میں نے اس سے پوچھا' 'تم نے فلوجی کو ہمارے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''میں نے مختصر الفاظ میں اسے تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔'' کاشالوک نے جواب

دیا' 'تم لوگ میرے خاص مہمان ہو۔ تم دونوں جب تک یہاں قیام کرو گے' فلوجی تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھے گا اور اس دوران میں وہ کسی اور مہمان کو بھی گیسٹ ہاؤس میں نہیں ٹھہرائے گا۔ وہ بہت اچھا باورچی بھی ہے۔ تم مقامی کھانوں کے علاوہ فرمائش کر کے بھی اس سے کوئی ڈش تیار کروا سکتے ہو۔ مجھے امید ہے تمہیں یہاں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہو گی۔''

کاشالوک کی باتوں سے میں نے محسوس کیا کہ وہ ہمیں وہاں چھوڑ کر کہیں جانا چاہتا تھا۔ میں نے پوچھا' 'تم کہاں جا رہے ہو؟''

''مجھے فوری طور پر نیکسل والے فلیٹ پر جانا ہوگا۔'' اس نے بتایا' 'وہاں کے حالات اور معاملات کو نارمل انداز میں ٹیکل کرنا ضروری ہے۔ آن ریکارڈ میں جانوس کا ایک خاص آدمی ہوں۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ میری وفاداریاں ڈاکٹر مونگ کے لیے ہیں لہٰذا مجھے وہاں بہت سے معاملات کو نمٹانا ہوگا۔ دشمنوں کے بیچ رہتے ہوئے مجھے تازہ ترین حالات کی خبر بھی رہے گی۔ میں اب کل صبح ہی اس طرف آؤں گا۔ تم لوگ اطمینان سے یہاں آرام کرو......اور اگر گھر سے باہر نکلنے کا موڈ ہو تو بہت زیادہ محتاط رہنا۔ ویلی سے باہر قدم نکالنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے خیال میں اس ویلی کے اندر تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے' میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا' 'تم کل جب یہاں آؤ تو میرا ایک کام کرتے آنا۔''

''ہاں' ہاں......'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے جینز کی جیب میں سے موبائل فون نکال کر اسے دکھایا اور کہا' 'مجھے اس سیل کا چارجر چاہیے ہوگا!''

جانوس نے مجھے اور لی یان کو جو موبائل فونز دیے تھے وہ ایک ہی کمپنی کے تھے لہٰذا ایک چارجر ہم دونوں کے استعمال میں آ سکتا تھا۔ جانوس کے ساتھ ہی اس کی یادداشت اور معاملات بھی فنا ہو گئے تھے چنانچہ ہم ان موبائل فونز کو بے فکری سے اپنے کام میں لا سکتے تھے۔ اس بات کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا کہ فوری طور پر کوئی ہمارے کنکشنز کو بند کروا دے گا۔ جب تک گاڑی چل سکتی تھی اسے چلانا چاہیے تھا۔

کاشالوک نے ہائی فائی ٹرائی بینڈ جی ایس ایم موبائل فون کو ہاتھ میں لے کر تعریفی نگاہ سے دیکھا اور بولا' 'ٹھیک ہے' میں اس کمپنی کا چارجر لے آؤں گا...... اور اسکریچ کارڈز بھی۔'' پھر ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے پوچھا' 'تمہارے پاس لائن کون سی ہے؟''

میں نے اسے اپنے موبائل کا نمبر بتا دیا اور کہا' 'اسے نوٹ کر لو۔ کسی ہنگامی صورت میں کام آئے گا۔ لی یان کے پاس بھی اسی کمپنی کی لائن ہے۔''

اس نے میرا نمبر اپنے موبائل میں فیڈ کرنے کے بعد اپنا نمبر بھی مجھے دے دیا اور بولا' 'نیکسل والے اپارٹمنٹ میں تم لوگوں کا سامان بھی رکھا ہے۔ میں وہ بھی ساتھ لے آؤں گا۔ ویسے اس کمرے کی الماری میں میرے کچھ کپڑے رکھے ہیں۔ فی الحال تم ان سے گزارہ کر لو۔ میں کبھی کبھی ایک آدھ رات یہاں بھی ٹھہر جاتا ہوں۔''

''گزارہ تو ہم کر ہی لیں گے لیکن تم ہمارے سامان کو اسی اپارٹمنٹ ہی میں رہنے دو تو اچھا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' 'جانوس نے جوگندر پال کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا رکھا تھا لہٰذا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ شک تمہاری طرف چلا جائے۔ تم ہمارے سامان کو نارمل انداز میں جوں کا توں وہیں چھوڑ دو ہاں البتہ' موبائل فونز والی پیکنگ کو پہلی فرصت میں ضائع کر دینا۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا' 'ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔ میں کل آتے ہوئے تمہارے لیے' ضروری سامان اور کپڑوں وغیرہ کا بندوبست بھی کر دوں گا۔''

اس کے بعد وہ اپنی ٹیکسی میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

کاشالوک کے جانے کے بعد فلوجی ہمارے پاس آیا اور رات کے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ گزارہ چلاؤ انگریزی بول لیتا تھا۔ میں نے اس سے جو بھی مختصر گفتگو کی اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک بردبار اور معاملہ فہم انسان تھا۔ میں نے اسے کھانے کے بارے میں بتا دیا کہ دو گھنٹے بعد کھائیں گے۔ وہ ہمیں اس کمرے میں چھوڑ کر گھر کے دوسرے حصے میں چلا گیا۔

میں نے لی یان سے کہا' 'کیا نہانے کا موڈ ہے؟''

ہم نے ایک بجے دوپہر نیکسل والے اپارٹمنٹ میں بھرپور باتھ لیا تھا لیکن جوگندر پال والے بنگلے میں ہم جن حالات سے گزرے' وہ ایک طویل شاور کا تقاضا کرر ہے تھے۔ تھکن نے ہمارے جسموں کو بے حال کرر کھا تھا۔ پچھلے دو دن سے ہم مار اماری میں اس قدر مصروف رہے تھے کہ پوری طرح آرام کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس حوالے سے آنے والی رات ہمارے لیے کسی تحفے سے کم نہیں تھی۔ ہم بے فکری سے اپنی نیند پوری کر سکتے تھے......اور سونے سے قبل اگر گرم شاور لے لیتے تو یہ سونے پہ سہاگا والی بات

ہوتی۔

''اس میں موڈ کی کیا بات ہے۔'' اس نے جواب میں کہا ''میں ایک بھرپور باتھ کی ضرورت محسوس کررہی ہوں لیکن کیا نہانے کے بعد بھی ہم یہی لباس دوبارہ پہنیں گے؟''

اس کا سوال بہت اہم تھا۔ جواب دینے سے پہلے میں اس دیوار گیر الماری کی جانب بڑھ گیا جس کا ذکر کاشانوک نے کیا تھا۔ میں نے مذکورہ چوبی الماری کھول کر اندر جھانکا۔ وہاں اچھے خاصے کپڑے موجود تھے جو باقاعدہ کسی لانڈری سے دھل کر آئے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد جینز اور ہر قسم کی شرٹس کی تھی۔ ایک جانب ہینگر پر دو گرم جیکٹس بھی ٹنگی دکھائی دیں۔ جینز ایک ایسا لباس ہے جسے مرد و زن ایک سا استعمال میں لا سکتے ہیں۔ کاشانوک کی ہاسیٹ ہم دونوں کے درمیان تھی۔ اس کی جینز میرے جسم پر تو چل جاتی البتہ لی یان کو پائنچے فولڈ کرنا پڑتے۔ تھوڑا سا مسئلہ کمر کے ساتھ بھی پیش آ سکتا تھا بہرحال مجبوری شکریے کا نام ہے۔ سو کررات گزارنے کے لیے وہ لباس برا نہیں تھا۔

''کام بن گیا!'' میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''پہلے تم شاور لے لو۔ بعد میں میں لوں گا اور اپنے لیے کسی لباس کا بھی انتخاب کرلو۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے الماری کی جانب اشارہ کردیا ''نہانے کے بعد تمہیں میلا لباس پہننے کی ضرورت نہیں۔''

لی یان نے نظریۂ ضرورت کے تحت اپنے لیے لباس منتخب کرلیا۔ جب وہ واش روم کی طرف جانے لگی تو میں نے کہا ''اپنا سیل مجھے دے دو۔''

اس نے اپنی جیب میں سے موبائل فون نکال کر میرے حوالے کردیا۔

میں اپنے سیل کو کافی استعمال کرچکا تھا لہٰذا اس کی بیٹری تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ جب کہ لی یان کے سیل کی بیٹری فل چارج شو کررہی تھی اس نے موبائل فون کو برائے نام ہی استعمال کیا تھا اور وہ بھی کال سننے کی حد تک۔

اس وقت میں ربی موشے ہائمن سے ہم کلام ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے جوگندر پال کے بنگلے میں سے اس تک یہ اطلاع پہنچا دی تھی کہ وہ اپنے موبائل کو آن رکھے۔ میں تھوڑی دیر بعد اس سے رابطہ کروں گا...... اور یہ تھوڑی دیر اب لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے میں بدل چکی تھی۔

میں ایک آرام چیئر پر ایزی ہوکر بیٹھ گیا اور لی یان والے موبائل سے ربی موشے ہائمن کے سیل پر فون کیا۔ شاید وہ بڑی بے تابی سے میری کال کا انتظار کررہا تھا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے ریسیپشن دیا۔

''ہیلو!'' اس کی مخصوص آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

''بیڈ آفٹر نون موشے ہائمن!'' میں نے کہا ''تم قیلولہ تو نہیں کررہے تھے؟''

''اوہ' یہ تم ہو!'' اس نے میری آواز پہچان لی۔

''کیا کوئی اور بھی ہوسکتا ہے؟'' میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔

''تم نے اپنے جرائم میں بڑا سنگین اضافہ کرلیا ہے وجدان!'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا۔ میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''اور تم قدم قدم پر نیکیاں کمارہے ہو نا؟''

وہ میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا ''بتاؤ' تم نے ڈین اور کلاڈیا کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''میرا خیال ہے تمہیں ان کے حسرت ناک انجام کی خبر مل چکی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''وہاں جوگندر پال کے بنگلے پر اسرائیل ایمبیسی کے عملے کے چند افراد موجود ہیں جو تمہارے اشارے پر ہی حرکت میں آئے ہیں۔ تم یوں انجان بن کر اپنا دامن بچانے کی کوشش نہ کرو!''

''ہوں!'' اس نے گمبھیر آواز میں کہا ''تم نے جوگندر پال کے بنگلے کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے وہاں سے کافی دور ہو؟'' وہ ٹٹولنے والے انداز میں بولا۔

''اس بنگلے سے تو کیا' میں تمہارے وہم و گمان سے بھی دور نکل چکا ہوں۔'' میں نے اسے چکر دینے کی خاطر کہا ''تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ میں اس وقت کھٹمنڈو سے باہر...... بلکہ نیپال سے باہر جاچکا ہوں۔''

''ناممکن!'' وہ قطعیت سے بولا ''تم ایسا نہیں کرسکتے۔''

''تم کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کے لیے میری طرف سے آزاد ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ بڑی رعونت سے بولا ''میں نے کھٹمنڈو میں تمہارے لیے ایسا جال بچھا دیا ہے کہ تم اب کسی بھی راستے وہاں سے باہر نہیں جاسکتے۔ بہت جلد تمہیں پکڑلیا جائے گا۔''

''ایسے کئی جال تم نے امریکا میں بھی' میری راہ میں بچھائے تھے۔'' میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا ''لیکن دیکھ لو' میں نے کس طرح تمہارے جالوں کا ستیاناس مار کے رکھ دیا۔'' میں ایک لمحے کے لیے رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہاری تعلیاں سننے کے لیے فون نہیں کیا۔ بتاؤ میری ساحل کو کب واپس کررہے ہو؟''

''تم جب چاہو گے' ساحل مل جائے گی!''

''میں نے کب اس کی چاہت نہیں کی؟''

''تمہاری چاہت کھوکھلی ہے وجدان!''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا ''میں تمہیں ایک شرط پر ساحل دینے کو تیار ہوں۔''

''اور وہ شرط یہ ہے کہ میں خود کو تمہارے حوالے کردوں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''پہلے یہی شرط تھی لیکن اب میں نے تمہاری خاطر اپنے مطالبے کو تھوڑا نرم کرلیا ہے۔''

''میں تمہاری نرمی کا لفظی مظاہرہ دیکھنے کو بے قرار ہوں۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا ''بتاؤ تم مجھ پر کون سی مہربانی کرنے والے ہو؟''

وہ میرے ترش الفاظ کو برا منہ بنائے بغیر پی گیا اور گمبھیر انداز میں بولا ''وجدان! تم نے مجھے' یہودی قوم کو اور امریکا کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ تمہارے جرائم کی فہرست اتنی طویل اور سنگین ہے کہ تمہیں کم از کم پانچ سو سال کی سزائے سخت ملنی چاہیے......''

''جانتا ہوں۔'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''تم لوگوں نے مجھے ''امریکا دشمن'' کا ٹائٹل دے رکھا ہے۔ میں تمہاری نظر میں دہشت گرد نمبر ون ہوں اور تمہارے لیے ''موسٹ وانٹیڈ'' کی حیثیت اختیار کرچکا ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو یہ سب کچھ تم ہی لوگوں کا کیا دھرا ہے!''

میں ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''میں نے جو کچھ بھی کیا' حفاظتِ خود اختیاری میں کیا یا پھر تمہاری اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لو۔ تم لوگ جو بھی کردہ جرائم کی بیخ کنی کہلائے گا اور تمہاری زیادتی و ظلم کے خلاف اگر کوئی آواز بلند کرے تو تم لوگ اسے دہشت گرد قرار دے دیتے ہو۔ تمہارا یہ خود ساختہ اصول بہت ہی منافقانہ اور ظالمانہ ہے۔ درحقیقت تم لوگ اس زمین کے سب سے بڑے غنڈے اور دہشت گرد ہو۔''

میں نے دل کا غبار نکالنے کے لیے ربی کو کھری کھری سناڈالیں۔ وہ متحمل لہجے میں بولا ''وجدان! تم بہت عمدہ جذباتی تقریر کرلیتے ہو۔ بہرحال میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تمہارے سلسلے میں' میں نے اپنی پالیسی کو بڑی حد تک نرم کرلیا ہے۔ میں تمہارے سنگین ترین تمام جرائم معاف کرنے کو تیار ہوں اور اس کے ساتھ ہی ساحل کو بھی تمہارے حوالے کردوں گا۔ بس تمہیں میری صرف ایک بات ماننا ہوگی۔''

''جلدی سے وہ بات بھی بتادو۔'' وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا ''مجھے صرف وہ پانچ نایاب پتھر چاہئیں جو بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کے تہ خانے میں محفوظ ہیں۔ ایک ہاتھ دو' ایک ہاتھ لو...... کے اصول کے مطابق' تم وہ پتھر میرے حوالے کردو میں ساحل کو تمہیں سونپ دوں گا۔''

وہ کم بخت میری ساحل کو رنگ برنگ پتھروں میں تول رہا تھا' ایک انسان کو مٹی میں رول رہا تھا۔ اس کی بات سن کر میں تاؤ میں آگیا۔ میں نے کٹیلے لہجے میں کہا۔

''تم تو اس دنیا کے سب سے زیادہ بااختیار انسان ہو۔ پھر ایک معمولی سے کام کے لیے میرے محتاج کیوں ہو؟''

''یہ معمولی کام نہیں ہے وجدان!'' اس کی آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا ''میرے تجربے اور مشاہدے نے مجھے بتایا ہے' یہ کام اتنا سہل نہیں جتنا بہ ظاہر دکھائی دیتا ہے...... اور میں اس نتیجے پر بھی پہنچ گیا ہوں کہ یہ مشکل کام تمہارے سوا اور کوئی نہیں کرسکتا!''

گویا ربی موشے ہائمن نے کھل کر اپنی ناکامی... کا اعتراف کرلیا تھا۔

میں نے کہا ''ربی! تم بھی عجیب متضاد باتیں کررہے ہو۔ ایک طرف کہتے ہو' تم نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کھٹمنڈو کے چپے چپے پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دوسری جانب یہ بھی وعدہ کررہے ہو کہ اگر میں عبادت گاہ کے تہ خانے سے وہ پانچ قیمتی پتھر نکال کر تمہارے حوالے کردوں تو تم بڑی شرافت سے میری ساحل کو آزاد کردو گے۔ یہ منافقانہ پن کی انتہا نہیں ہے؟''

''تمہاری سمجھ کا ہیر پھیر ہے وجدان!'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا ''ورنہ میں نے تو ایک نہایت ہی سمپل بات کی ہے۔ تم جذبات میں بہے جارہے ہو۔ شاید تم نے میری بات کو توجہ سے نہیں سنا۔''

میں نے کہا ''میں توجہ سے سنوں یا عدم توجہی سے' اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم مجھے کوئی نیا فریب دینے کی کوشش میں ہو۔''

''میں تمہاری بدگمانی کا کوئی علاج نہیں کرسکتا۔'' وہ برہمی سے بولا۔

میں نے کہا ''علاج کی مجھے نہیں بلکہ تمہیں ضرورت ہے اور تمہارا علاج میں ہی کروں گا۔''

''تم الٹی کھوپڑی کے آدمی ہو۔'' وہ میرے الفاظ کی کڑواہٹ کونظر انداز کرتے ہوئے بولا'' میں نے تم سے ایک سیدھی اور کھری بات کی ہے۔ تم پتانہیں' کیا کیا مطلب نکال رہے ہو؟''

''تم اور سیدھے...... اور کھرے بھی!'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا'' میرا قہقہہ لگانے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''قہقہہ لگانا یا رونا' یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا'' میں اپنی پیشکش کو دہرا رہا ہوں۔ میری بات کو غور سے سنو۔''

میں نے کچھ نہ کہا اور سیل کو کان سے لگائے خاموش بیٹھا رہا۔

اسی دوران میں لی یان واش روم سے نکل آئی۔ مجھے سیل کے ساتھ مصروف دیکھ کر وہ چپکے سے بیڈ کے کنارے پر آ بیٹھی۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ربی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''وجدان! اگر تم میرے مطلوبہ پانچوں پتھر عبادت گاہ کے تہ خانے سے نکال لاؤ تو میں' جہاں تم کہو گے تمہاری ساحل کو وہیں پہنچا دوں گا۔ پہلے تم ساحل کو وصول کرنا پھر پتھر میرے آدمی کے حوالے کر دینا۔ بولو منظور ہے؟''

''اور اس کے بدلے تم میری اگلی پچھلی ساری خطائیں معاف کر دو گے؟''

''بالکل!'' وہ قطعیت سے بولا'' تم اسے ایک صاف شفاف قسم کی سودے بازی سمجھ لو۔''

''میں اپنی مرضی سے سوداگری کرتا ہوں۔'' میں نے کہا ''اس لیے تمہاری پیشکش مجھے منظور نہیں۔''

''تم اپنی زندگی کے آخری گولڈن چانس کو گنوا رہے ہو!'' اس کے لہجے میں دھمکی شامل ہوگئی۔

میں نے اسی کے انداز میں کہا'' میں اپنا اچھا برا بخوبی سمجھتا ہوں۔ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو کہ وہ قیمتی پتھر تم اپنی زندگی میں کبھی حاصل کر سکو گے۔ تم انہی کے تصور میں حسرت ناک موت مرو گے۔''

کاش اس وقت میں وڈیو فون پر ربی سے ہم کلام ہوتا۔ میرے تیکھے الفاظ نے اس کے چہرے کے نقوش کو جس طرح بگاڑا ہوگا وہ نظارہ بڑا محظوظ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ میں تصور میں اسے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''وجدان! میرے پاس طاقت اور اختیار کی کوئی کمی نہیں اور تم جوانی و تجربے کی طاقت سے مالا مال ہو۔ یاد رکھو' جب بھی اختیار اور جوانی کی طاقت آپس میں ٹکراتی ہے تو بڑی آفت مچاتی ہے پھر سب کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''یہ دونوں قوتیں پچھلے کچھ عرصے سے آپس میں ٹکراتی چلی آ رہی ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا'' اور فریقین اس ٹکراؤ سے خاطر خواہ نقصان بھی اٹھا رہے ہیں۔ تم اس وقت مجھے کون سی نئی پٹی پڑھا رہے ہو؟''

''افسوس......!'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا'' اس وقت تمہارا دماغ کام نہیں کر رہا اس لیے فائدے کی کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی بہرحال' میں نے تمہارے سامنے جو پیشکش رکھی ہے وہ محدود مدت کے لیے ہے۔ اس کے بعد ہمارے درمیان مصالحت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔''

میں نے دوٹوک انداز میں اس پر واضح کر دیا'' دیکھو موشے ہائمن! یہ محترم اور قابل صد تقلید ربی تم دوسروں کے لیے ہوگے۔ میں اول آخر تمہیں اپنا دشمن سمجھتا ہوں چنانچہ اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہاری کسی چال میں آ جاؤں گا۔ ان پانچ پتھروں کی طرف سے تو تم منہ دھو رکھو...... اور مجھے بھی دوست بنانے کی کوشش ترک کر دو۔''

میں سانس لینے کے لیے تھوڑا متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا'' سچی بات یہ ہے کہ تم ان پتھروں کے حصول کے سلسلے میں بری طرح مایوس اور ناکامیاب ہو چکے ہو اس لیے میری منت خوشامد پر مجبور ہو جبکہ میں نے کبھی مایوس ہونا نہیں سیکھا۔ مجھے پورا یقین ہے' میں ایک دن اپنی ساحل کو تمہارے چنگل سے ضرور آزاد کرا لوں گا...... اور وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے۔ کیپ ان مائنڈ موشے ہائمن!''

اس نے جھلا کر فون بند کر دیا۔ یہ بھی اس کی ناکامی...کا ایک بین ثبوت تھا۔

یہودیوں کی چالبازی اور مکاری پوری دنیا میں مشہور ہے۔ میں اگر یہ سوچتا کہ ربی میرے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھتا ہے تو ایسا سوچنا سراسر حماقت ہوتی۔ اس کی رگوں میں کینہ پرور اور منتقم المزاج خون دوڑ رہا تھا۔ وہ میری ہمدردی اور بھلائی کے بارے میں کیسے سوچ سکتا تھا۔ امریکا اور پوری یہودی قوم مجھے ایک خطرناک دہشت گرد قرار دے چکے تھے۔ یہ لوگ تو اپنے خلاف ایک لفظ بولنے والے کو معاف نہیں کرتے۔ اس پر ڈھیروں الٹے سیدھے مقدمے بنا کر ساری زندگی کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے فٹ

کر دیتے ہیں۔ میں نے تو ربی اور اس کی لابی کو جتنا نقصان پہنچایا تھا وہ دن رات اس کے شمار میں مصروف تھے اور اسے ضرب در ضرب کرنے کے چکر میں تھے۔ میں ربی کی کسی سازشانہ چال میں کیونکر آ جاتا۔

لی یان میرے اور ربی کے درمیان جاری رسا کشی سے پوری طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ بھی ربی کے لیے اپنے دل و دماغ میں بہت زیادہ غصہ رکھتی تھی۔ اس کے شوہر کی المناک موت کا ذمے دار بھی ربی ہی تھا۔ میں نے سیل کو آف کر کے ایک طرف رکھا تو وہ میری جانب متوجہ ہوگئی۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں' ربی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ گفتگو کا آخری حصہ اس نے بھی سن لیا تھا۔ میری بات مکمل ہوئی تو اس نے کہا۔

''وجدان! ربی کسی بھی طریقے سے تمہیں اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے۔ یہ نئی چال بھی اس نے اسی سلسلے میں چلی ہے۔''

میں نے کہا'' میں اس کی چالبازیوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔''

''تم نے اس سے ساحل کی خیر خیریت بھی پوچھی؟''

''ہاں' وہ اس کی قید میں ٹھیک ہے۔''

لی یان کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے یہ بات اپنی طرف سے کہہ دی تھی۔ اس کے علم میں نہیں تھا کہ میں ٹیکسی میں سفر کے دوران میں ساحل کی خیریت معلوم کر چکا تھا۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ میں جب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو کسی خاص کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ کس کام میں......؟ شاید اس بات کا اسے ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں تھا۔ لی یان جتنی میرے تجربے میں آئی تھی اس کی بنا پر میں نے اسے بھروسے کے قابل پایا تھا۔ اس نے اب تک ڈٹ کر میرے دشمنوں کا صفایا کیا تھا۔ مجھے یقین تھا' وہ میری خاطر اپنی جان کو تو داؤ پر لگا سکتی ہے لیکن مجھے نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس کے بارے میں' میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ کسی مناسب موقع پر میں اسے اپنی آنکھیں بند کرنے کے ''راز'' سے آگاہ کر دوں گا تاکہ اس کا ذہن خوامخواہ کسی الجھن میں گرفتار نہ ہو۔

لی یان ایک بھرپور باتھ لے چکی تھی۔ اب میری باری تھی۔ ربی موشے ہائمن نے اپنی منافقانہ باتوں سے میرے دماغ کا درجۂ حرارت خاصا بلند کر دیا تھا۔ لوہا' لوہے کو کاٹتا ہے۔ میں بھی گرم شاور کے ذریعے اپنے وجود میں پھیلی ہوئی تپش کو ٹھنڈا کرنے لگا۔

رات کا کھانا ہم نے آٹھ بجے کھایا۔ کاشالوک نے فلوجی کی بجا تعریف کی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں واقعی بہت لذت تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے لی یان سے کہا۔

''باہر کا راؤنڈ لگانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''اس ڈریس میں تو میں ہرگز باہر نہیں نکلوں گی۔'' اس نے جینز کی طرف اشارہ کیا۔

میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ تھوڑا سا خفیف ہوئی تاہم خاموش رہی۔

بات دراصل یہ تھی کہ کاشالوک کا لباس میرے لیے تو بڑی حد تک مناسب رہا تھا۔ جینز کی لمبائی ویسے بھی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے جس نے ہمارے درمیان قامت کے تفاوت کا مسئلہ حل کر دیا تھا لیکن لی یان اس سلسلے میں خاصا ان ایزی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے جینز کے پائنچے تو موڑ لیے تھے لیکن ویسٹ' پرابلم کر رہی تھی حالانکہ اس نے جینز میں بیلٹ بھی لگا لیا تھا۔ کمر میں ایک دو انچ کا فرق ہو تو چل جاتا ہے مگر چار پانچ انچ کا فرق بیلٹ لگانے کے باوجود بھی ایک مصیبت کھڑی کر دیتا ہے۔ نتیجتاً' ہم نے گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

وہ پورا دن اور اس سے گزشتہ والی رات ہم نے مسلسل سفر اور مارا ماری میں گزاری تھی۔ اس دوران میں اگرچہ عبادت گاہ کی طرف سے کھٹمنڈو آتے ہوئے ہمیں تھوڑی نیند پوری کرنے کا موقع ملا تھا لیکن کسی آرام دہ بستر پر دراز ہو کر لی جانے والی پُرسکون نیند اور جیپ کی ہچکولے دار سیٹ پر مجبوری کی حالت میں آ جانے والی نیند میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے چنانچہ جب ہمارے پیٹ میں خوش ذائقہ کھانے نے جگہ بنائی اور ہمارے سامنے فی الحال کوئی مصروفیت بھی دکھائی نہ دی تو جسم و جان کی ساری تھکن اچانک ہی ہم پر حملہ آور ہوگئی۔

لی یان نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا'' میرا تو جی چاہ رہا ہے' ایسی لمبی تان کر سوؤں کہ پھر روزِ حشر ہی آنکھ کھلے۔''

''تم لمبی تان کر ضرور سو جاؤ لیکن روزِ حشر کو ذہن میں لانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی نیند بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا'' بس زیادہ سے زیادہ کل صبح تک بیدار ہو جانا۔ ہمیں آئندہ کا پروگرام بھی بنانا ہے۔ میں تمہارے جاگنے کے انتظار میں قیامت تک یہاں بیٹھا نہیں سوکھ سکتا۔''

اس لطیف مذاق پر وہ دھیرے سے مسکرا دی اور کمرے

میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی ''ہم سوئیں گے کس طرح؟''

میں اس کے سوال کی تہ میں پہنچ گیا۔ اس کمرے میں درمیانے سائز کا صرف ایک ہی بیڈ بچھا ہوا تھا۔ اس بیڈ کے علاوہ ایک آرم چیئر' چھوٹی سی ڈریسنگ' ایک دیوار گیر چوبی الماری وہاں موجود تھی۔ کمرے کا فرش قالین پوش تھا۔ لی یان نے ایک بیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے سونے والی بات کی تھی۔ میں ناراض وقت کی کلفت کو دھونے کے لیے تھوڑا غیر سنجیدہ ہو گیا' لی یان سے تفریح لیتے ہوئے کہا۔

''سونے کا ایک نہایت ہی آسان ٹوٹکا مجھے معلوم ہے!''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی ''تم کون سے ٹوٹکے کی بات کر رہے ہو؟''

''کہیں بھی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا پھر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لو۔'' میں نے انتہائی سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ''اور بس...... سو جاؤ۔''

''وجدان! کیا تم ایسے حالات میں بھی مذاق کر لیتے ہو؟'' وہ حیرت سے بولی۔

میں نے بھی حیران ہو کر پوچھا ''کیا ہنسی مذاق کے لیے کسی خاص قسم کے حالات درکار ہوتے ہیں؟''

''مم...... میرا مطلب تھا کہ......''

''مطلب کی بات بعد میں کریں گے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''فی الحال' سب سے اہم موضوع اور ضرورت ہماری نیند ہے۔ شرافت سے اس بیڈ پر لیٹ جاؤ اور پلک جھپکتے میں وادیٔ نیند میں اتر جاؤ۔''

''اور تم......!'' وہ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی ''کیا تمہارا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟''

''میں آرم چیئر پر اپنی نیند پوری کر لوں گا۔'' میں نے سادگی سے جواب دیا۔

وہ معنی خیز انداز میں بولی ''یہ آرام چیئر نہیں' آرم چیئر ہے!''

''تم نے سنا نہیں' نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے؟''

''تو پھر اس سولی پر مجھے ہی چڑھنے دو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا لی یان!''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''

میں نے اس سے بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور ٹالنے والے انداز میں کہا ''میں تھوڑی دیر بعد سوؤں گا۔ اگر آرم چیئر پر نیند نہ آ سکی تو نیچے قالین پر لیٹ جاؤں گا۔ فی الحال میں فلوجی سے تھوڑی گپ شپ کرنے جا رہا ہوں۔ تم اطمینان سے بیڈ پر سو جاؤ۔''

اس نے بھی زیادہ مزاحمت نہیں کی اور جا کر بستر پر دراز ہو گئی۔ میں کمرے سے جانے لگا تو اس نے کہا ''جلدی آ جانا وجدان!''

''کیا تمہیں میری غیر موجودگی میں ڈر محسوس ہو گا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی ''میں تمہارے آرام اور نیند کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے' میں تمہاری بات کو ذہن میں رکھوں گا۔'' میں نے اس پر الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''بہرحال' میرا اتنا خیال رکھنے کا بہت بہت شکریہ۔''

وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔

کاشالوک نے فلوجی کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ اعتماد اور بھروسے کا آدمی ہے لیکن میں اس رائے پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ہم جس نوعیت کے سنگین حالات سے گزر رہے تھے ان میں بعض اوقات اپنے سائے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنا پڑتا ہے کہ کہیں یہ ہمارے کسی دشمن کا ہیولا تو نہیں۔ لہٰذا فلوجی کو چیک کرنا از حد ضروری تھا۔

فلوجی اس گھر اور گھر میں قیام کرنے والوں کی حفاظت اور نگہداشت پر مامور تھا لہٰذا جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس کا کمرا آٹھ بائی دس فٹ کا رہا ہو گا۔ یہ گھر کے ابتدائی حصے میں لمبوترے ڈرائنگ روم کے سامنے واقع تھا۔ ڈرائنگ روم کی پیمائش میرے اندازے کے مطابق کوئی آٹھ ضرب چوبیس فٹ کے قریب تھی جس کے ایک حصے میں بڑی سی ڈائننگ ٹیبل بھی بچھی ہوئی تھی۔ ہم نے ڈنر اسی ٹیبل پر کیا تھا۔ مذکورہ ٹیبل پر بیک وقت درجن بھر افراد بیٹھ کر کھانا کھا سکتے تھے۔ ڈرائنگ کم ڈائننگ روم کی سیٹنگ یقیناً ان گیسٹ ہاؤس کی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی۔

میں لگ بھگ آدھے گھنٹے تک فلوجی کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا رہا اور کاشالوک کی رائے سے اتفاق کرنے کو تیار ہو گیا۔ فلوجی اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک سادہ مزاج' فرض شناس اور وفادار شخص تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں میرا خدشہ بالکل درست ثابت ہوا۔ میں نے اس کی صورت کو دیکھتے ہوئے بچپن سے ساٹھ تک کا اندازہ قائم

کیا تھا لیکن وہ میرے خدشے کے عین مطابق ستر کا نکلا تھا۔ تبت اور چین کے باسی خاصے عمر دراز اور عمر چور واقع ہوئے ہیں۔

جب میں فلو جی کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں واپس آیا تو ایک حیرت انگیز منظر نے میرا استقبال کیا۔ کمرے کی لائٹ آن تھی اور لی یان سکڑی سمٹی ہوئی آرم چیئر کے اندر گھسی بیٹھی تھی۔ میں یہی سمجھا شاید وہ میرے انتظار میں جاگ رہی ہے۔ اس نے کہنے کو تو کہہ تو دیا تھا کہ اسے کمرے میں ڈر محسوس نہیں ہوگا لیکن اس حوالے سے میں عورتوں کی ایک مخصوص نفسیات سے بخوبی واقف تھا۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے بہ آہستگی اسے آواز دی ''لی یان......!''

جب اس نے میری پکار کا جواب نہ دیا تو میری حیرت دو چند ہوگئی۔ کرسی کی پشت میری جانب تھی چنانچہ میں فوری طور پر اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں لپک کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ گھٹنوں کو پیٹ میں دبائے اور ٹھوڑی کو سینے پر ٹکائے بے خبر سو رہی تھی۔ میں جب فلو جی کی طرف گیا تھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ میری جانے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر اس کرسی میں دھنسی تھی اور مقصد بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی، میں آرام سے بیڈ پر سو جاؤں۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آرام سے پھیل کر پورے بیڈ پر سوؤں اور وہ بے سکونی سے آرم چیئر میں گھسی رہے وہ موسم سرما کی ایک سرد رات تھی۔ سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے کمرے میں ہیٹنگ سسٹم موجود تھا لیکن اس کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ اوڑھنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے وہاں گرم کمبل موجود تھے۔

میں چند لمحے خاموش کھڑا سوئی ہوئی لی یان کو دیکھتا رہا۔ اس کی سانس لینے کی آواز کمرے میں ابھر رہی تھی جس سے پتا چلتا تھا، وہ گہری نیند میں ہے۔ پہلے میرے جی میں آئی کہ اسے جگا کر بستر کی طرف جانے کو کہوں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ ضد کر سکتی تھی کہ میں ادھر بستر پر سو جاؤں۔

میں ایک فوری خیال کے تحت نیچے جھکا اور دونوں طرف سے ہاتھ ڈال کر اسے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ میری اس عمل سے کہیں اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔ میرا خدشہ غلط ثابت ہوا۔ میں نے اسے کسی بے خبر سوئے ہوئے بچے کے مانند اٹھا کر کرسی سے باہر نکال لیا۔ میرا ایک بازو اس کی گردن کے نیچے اور دوسرا گھٹنوں کے نیچے تھا۔ میں نے اسی طرح اٹھائے اٹھائے اسے لا کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔

وہ واقعی گہری نیند میں تھی۔ میں نے گٹھری کی صورت جیسے ہی اسے بستر پر ڈالا وہ اسی پوزیشن میں بے حس و حرکت پڑی رہی۔ میں نے گھٹنوں پر مڑی ہوئی اس کی ٹانگوں کو بہ آہستگی سیدھا کر دیا اور اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔

لی یان نے جینز کو کمر پر سہارا دینے کے لیے چوڑے بکل والا بیلٹ لگا لیا تھا اور احتیاط میں وہ اس حد تک گزر گئی کہ اس نے بیلٹ کو کچھ زیادہ ہی ٹائٹ کر دیا تھا۔ شکم سیری کے بعد ظاہر ہے، پیٹ کا پھیلاؤ بڑھ جاتا ہے لہٰذا وہ بیلٹ ضرورت سے زیادہ ٹائٹ ہو گیا تھا، خاص طور پر اس کا چوڑا دھاتی بکل لی یان کے پیٹ میں بڑی بے دردی سے دھنسا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند میں نہ ہوتی تو اس دشمن کو فوراً محسوس کر لیتی۔ میں نے بے خبری کی اس تکلیف سے اسے نجات دلانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے بہ آہستگی وہ بیلٹ کھول ڈالا۔ اس کی کمر جکڑ سے آزاد ہو گئی اور جینز، عرب گلوکارہ شاکرہ کی جینز کا نقشہ پیش کرنے لگی۔ میں نے یک لخت اس کے پیٹ پر سے نگاہ ہٹائی اور اسے گرم کمبل اوڑھانے کے بعد آرم چیئر کی طرف آ گیا۔ لی یان کی کیفیت کو دیکھ کر میری کن پٹیاں سلگنے لگی تھیں۔

میں آرم چیئر میں بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ یوگا کے مخصوص سانس لینے کے انداز میں جب میں نے ان ہیل اور ایگز ہیل کیا تو میرے وجود میں پھیلنے والے انتشار کو قرار آ گیا۔ پرانایام کی مشق نے مجھے شانت کر دیا۔

میں تھوڑی دیر تک اسی طرح خاموش بیٹھا رہا پھر آنکھیں کھول دیں۔ اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ ذرا نیلگری کی خبر لینا چاہیے۔ اس نے یہ کیا تماشا لگا رکھا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ چپ چپاتے میرے پاس آنے لگی تھی حالاں کہ کراچی میں جب ہماری آخری بالمشافہ ملاقات ہوئی تھی تو اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ وہ اب از خود کبھی میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس ہمالیہ کی گود میں آنے پر مجبور کر دے گی اور اس وقت میں ہمالیہ کی گود سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر کھٹمنڈو میں تھا۔ ان حالات میں خوامخواہ ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کہیں میں نیلگری کے چلائے ہوئے کسی چکر میں ٹریپ ہو کر تو ادھر کھنچا چلا نہیں آیا؟

بہ ظاہر ایسا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے امریکا سے کھٹمنڈو تک پہنچنے کی ٹھوس وجوہات تھیں اور اس مشن میں میرے

ساتھ اور بھی بہت سارے لوگ شامل تھے لیکن ملکۂ کوہسار نیلگری سے بھی کچھ بعید نہیں تھی۔ وہ عظیم ساحرہ تھی اور ہر قسم کا سحر پھونکنا جانتی تھی۔ افسوس کہ اس کا کوئی جادو مجھ پر نہ چل سکا اور اسی سبب وہ مجھ سے خفا ہو کر چلی گئی تھی۔

میں کچھ عرصہ پہلے تک یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہے لیکن اس کی دوبارہ پُر اسرار آمد و شد نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ اگر واقعی وہ مجھ سے خفا تھی تو دوبارہ میرے پاس کیوں آنے لگی تھی اور اگر ناراض نہیں تھی تو پھر وہ پُراسرار انداز میں خاموشی سے آ کر کیوں چلی جاتی تھی۔ ابھی شام میں، جوگندر پال کے بنگلے سے اس طرف آتے ہوئے بھی میں نے ٹیکسی میں اس کی موجودی کو محسوس کیا تھا۔ اس کے بدن کی مخصوص خوش بو میری سانسوں کے راستے تن من میں اتر کر مجھے سرشار کر گئی تھی۔ پتا نہیں، یہ کیسا طلسم تھا؟

میں اس ساحرہ کے بارے میں جتنا بھی سوچتا، ذہن اتنا ہی الجھتا چلا جاتا۔ تیسری آنکھ کے توسط سے میں نے جب بھی اس کے ماحول میں جھانکنے کی کوشش کی، مجھے کام یابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ اس مرتبہ بھی مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ابھی تک نیلگری اور ربی موشے ہائمن ہی دو ایسی ہستیاں تھیں جن تک میں اور میری تھرڈ آئی رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی اور یہ دونوں اپنے شعبے کے مہا ساحر تھے۔ پتا نہیں، انہوں نے میری رسائی کی راہ میں اپنے عمل کی کون سی دیوار چین اٹھا رکھی تھی!

ربی کا خیال آئے اور ساحل کی یاد نہ ستائے، یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا! میں نے بند آنکھوں کے پیچھے تھرڈ آئی کو زحمت دی اور پلک جھپکتے اسی مہلت میں ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اسرائیل کے وقت کے مطابق اس لمحے شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ ساحل اسی کمرے میں دکھائی دی جہاں گزشتہ دو مرتبہ میں نے اسے پایا تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور ایک ایزی چیئر پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ٹی وی پر اس وقت اسپورٹ کا کوئی پروگرام نشر کیا جا رہا تھا۔ حسب معمول وہ کمرے میں تنہا تھی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میں جب بھی اس کے ماحول میں پہنچتا تو وہ اکیلی ہوتی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور شخص اس کمرے میں قدم ہی نہ رکھتا ہو۔ کھانا اور اس کی ضرورت کی دیگر اشیا تو اسے کسی انسان کے توسط ہی سے پہنچائی جاتی ہوں گی!

میں بڑی دل چسپی اور دل ربائی کے ساتھ اسے ٹی وی دیکھتے ہوئے تکتا رہا۔ وہ بہت ہی پُرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ان لمحات میں مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ جی میں آئی کہ میں کوئی پرندہ بن جاؤں اور پرواز کرتے ہوئے آن واحد میں اپنی ساحل تک پہنچ جاؤں مگر عملاً یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ میں دل مسوس کر رہ گیا۔ پھر یہ کہتے ہوئے خود کو تسلی دی کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے کہ میں اس تک تصوراتی رسائی حاصل کرنے کے قابل ہو گیا ہوں ورنہ پہلے تو ربی نے ظلم کی انتہا کر رکھی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں ساحل کو بڑی محبت سے پکارا ......فکر نہ کرو تمہاری اسیری کے بہت ہی کم دن باقی رہ گئے ہیں۔ میں بہت جلد تمہارے پاس اسرائیل پہنچنے والا ہوں اور تمہیں ربی موشے ہائمن کی قید سے نکالنے والا ہوں۔ ہماری جدائی کی گھڑیاں اختتام پذیر ہو رہی ہیں۔ اب کوئی ہمیں ملنے سے روک نہیں سکتا!

میں جانتا ہوں، میرے یہ جذبات اور عزائم ساحل تک نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن اس اظہار سے میں خود کو بہت پُرسکون محسوس کرنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں واقعی چند روز بعد اپنی ساحل کے پاس ہوں گا۔ ان احساسات کا تعلق میری سوچ اور ارادے سے تھا۔ میں نے ہر قیمت پر اسرائیل میں داخل ہونے کا مصمم فیصلہ کر لیا تھا اور مجھے صد فی صد یقین تھا، میں ایسا کر گزروں گا!

میں نے آنکھیں کھولیں تو لی یان سے نظریں چار ہوئیں۔ اسے اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی میں نے اسے گہری نیند میں اس کرسی میں سے نکال کر وہاں بیڈ پر پہنچایا تھا۔ پتا نہیں، وہ کب اور کیسے بیدار ہو کر میرے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ میری الجھن اور حیرت زبان پر آ گئی۔

''لی یان! تم گہری نیند سو رہی تھیں؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

وہ خمار آلود جماہی لیتے ہوئے بولی ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں واقعی بے خبر سو رہی تھی۔ پتا نہیں، اس کرسی سے بیڈ پر کیسے پہنچ گئی!''

''میں نے تمہیں اٹھا کر وہاں ڈالا تھا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''کمال ہے، مجھے ذرا پتا نہیں چلا!'' اس نے سرخی مائل آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''اس لیے کہ تم ہاتھی گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں۔''

''تم کب واپس آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پندرہ بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔''

اس نے ایک اور مخمور جماہی لی اور خاصی بے تکلفی سے بولی ''چلو' یہ کرسی خالی کردو۔ میں یہاں سوؤں گی۔'' اس کا لہجہ حتمی تھا ''تم ادھر بیڈ پر جا کر سو جاؤ۔''

''یہ مناسب نہیں کہ میں بیڈ پر سوؤں اور تم کرسی میں پڑی اکڑتی رہو۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی یہ ٹھیک نہیں سمجھتی ہوں کہ تم کرسی پر بے آرام ہوتے رہو۔''

''چلو' میں نیچے قالین پر بستر لگا لیتا ہوں۔''

''پھر میں بھی نیچے ہی سو جاتی ہوں۔''

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''ہم دونوں ایک جیسے تھکے ہوئے ہیں اور تمہارا تو بازو بھی زخمی ہے۔ تمہیں مجھ سے زیادہ آرام دہ بستر کی ضرورت ہے یا تو ہم دونوں بیڈ پر سوئیں گے یا پھر نیچے قالین پر۔ میں تمہیں تکلیف میں ڈال کر آرام نہیں کروں گی۔''

اس کے لہجے کی قطعیت نے مجھے باور کرادیا کہ اگر میں نے اس کی تجویز پر غور نہ کیا تو وہ خود بھی بے آرام ہوگی اور مجھے بھی بے آرام کرے گی۔ ہمیں آرام اور پُرسکون نیند کی اشد ضرورت تھی لہٰذا اس کی بات ماننے پر تیار ہوگیا۔

بیڈ کی موجودگی میں' قالین پوش فرش پر رات بسر کرنا خاصا نان ٹیکنیکل تھا چنانچہ ہم بستر پر' ڈبل گرم کمبل میں دبک کر موسم کی شدت کا مقابلہ کرنے لگے۔

☆☆☆

اگلی صبح بڑی اجلی اور نکھری سی تھی!

گزشتہ رات کے بھرپور آرام اور پُرسکون نیند نے ہمارے جسم میں سرایت کرنے والی تھکن کو چپکے سے زائل کردیا تھا۔ ہم خود کو بہت ہلکا پھلکا اور زندگی سے معمور محسوس کررہے تھے۔ ٹھنڈے ٹھار موسم میں گرم شاور نے ہمارے بدن میں مزید تازگی بھردی۔ اس دوران میں فلوجی نے ہمارے لیے ناشتا لگادیا۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو کاشالوک آگیا۔ وہ آج بھی اسی ٹیکسی سے آیا تھا جس کے ذریعے کل شام ہم یہاں پہنچے تھے۔ میں اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''کیا فارغ وقت میں تم یہ شغل بھی کرتے ہو؟''

وہ میرا اشارہ نہ سمجھ سکا اور الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب ہے' کیا تم ٹیکسی ڈرائیوری بھی کرتے ہو؟''

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا ''یہ میرے ایک دوست کی ہے۔ ہنگامی حالات میں استعمال کے لیے میں کبھی کبھار اس سے لے لیتا ہوں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں یہ خاصی محفوظ سواری ہے۔''

وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ میں نے استفسار کیا ''شہر کی کیا خبریں ہیں؟''

''کھٹمنڈو شہر اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے۔'' اس نے جواب دیا ''لیکن تم دونوں کے لیے حالات انتہائی ناسازگار ہوچکے ہیں۔ شہر کے ایک ایک انچ پر تمہیں تلاش کیا جارہا ہے۔ دہاں جوگندر پال کے بنگلے پر جو کچھ ہوا ہے' اس پر پولیس ہیڈ کوارٹر میں بڑی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ دو اسرائیلی معزز افراد کا بہیمانہ قتل کوئی معمولی بات نہیں۔ اس کے علاوہ ایک دلچسپ بات بتاؤں تمہیں!''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں جواب میں خاموش رہا تو وہ خود ہی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جانوس اور جوگندر پال آپس میں بدترین حریف ہیں۔ بنگلا نمبر بے' ٹو ہنڈریڈ میں پیش آنے والا خونچکاں واقعہ پریس سے چھپا نہیں رہا۔ عوام کی سوچ یہ رخ اختیار کررہی ہے کہ اس واردات میں ہو نہ ہو' جوگندر پال ہی کا ہاتھ شامل ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''جوگندر بے چارہ تو بڑی مصیبت میں آگیا ہوگا!''

''ہاں' عوامی سطح پر یہی صورتِ حال ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''لیکن جوگندر پال کو اس کی زیادہ پروا نہیں۔ وہ جن طاقت ور اسرائیلیوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے وہ حقیقت سے واقف ہیں لہٰذا جوگندر کے لیے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ وہ عوامی ردِعمل سے بخوبی نمٹ لے گا۔ پولیس والے اسے پریشان نہیں کررہے' اس کے لیے یہ اطمینان بخش بات ہے۔''

''اس کا مطلب ہے' پولیس والے بھی یہودی لابی کے دباؤ کے تحت کام کررہے ہیں؟'' لی یان نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

کاشالوک اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا ''تمہارے لیے یہاں کے حالات کیسے ہیں۔ تم جانوس کے خاص آدمی تھے؟''

''جوگندر پال یہ بات جانتا ہے کہ میں جانوس سے وابستہ تھا۔'' اس نے جواب دیا ''لہٰذا اس نے مجھ سے رابطہ

کرکے مجھے اپنے بنگلے پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں مختصراً بتایا ہے اور تاکید کی ہے کہ میں اب اس کے پاس آجاؤں ورنہ میری جان کو بھی خطرہ ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بنگلے پر رکھنا چاہتا ہے۔''

''پھر تم نے اس کی تجویز کے جواب میں کیا کہا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''ہمارے درمیان گزشتہ رات بات ہوئی تھی۔'' کاشالوک نے بتایا ''اور میں نے اس سے کہا تھا کہ میں کل کسی وقت اس کے پاس آجاؤں گا...... یعنی آج......!'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''میں اگر جوگندر کے بنگلے پر یا اس کے ساتھ رہوں گا تو مجھے اس کی سرگرمیوں کی تازہ ترین اطلاعات ملتی رہیں گی۔ اس طرح میں تمہیں ان کی ممکنہ منصوبہ بندی سے آگاہ کرتا رہوں گا۔ ہمارے درمیان سیلولر رابطہ رہے گا تو کافی آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ تمہارے خیال میں' میں نے درست فیصلہ کیا ہے نا؟''

''تم پہلے بھی دشمنوں کی صفوں میں گھسے بیٹھے تھے اور یہ بھی اسی نوعیت کا فیصلہ ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا ''ویسے اس سلسلے میں تمہیں ڈاکٹر مونگ سے مشورہ کرنا چاہیے!''

''اس سے میں مشورہ کرچکا ہوں۔'' اس نے بڑے رسان سے کہا ''اسے میرا یہ فیصلہ بہت پسند آیا ہے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا ''تم آج کب تک جوگندر پال کی طرف روانہ ہوگے؟''

''میں نے دوپہر کے بعد ادھر جانے کے بارے میں سوچا ہے۔''

''ہمارے کام کا کیا ہوا؟'' میں نے سوال کیا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے ایک درمیانے سائز کے بیگ کو کھول لیا۔ یہ بیگ وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ اس بیگ میں ہمارے لیے کی گئی تازہ ترین شاپنگ کا سامان بھرا ہوا تھا۔ یہ سامان ہمارے لباس' میک اپ کی ضروری اشیا اور موبائل چارجر پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے موبائل فون میں جو سیلولر لائن استعمال ہورہی تھی اس کے مختلف اسکریچ کارڈز بھی شامل تھے۔ بیگ کے اندر' کھٹمنڈو سے شائع ہونے والا صبح کا ایک اخبار بھی رکھا تھا۔ کاشالوک نے وہ اخبار نکال کر ہمارے سامنے پھیلا دیا اور ہمارے بارے میں چھپنے والی خبروں کی نشان دہی کرنے لگا۔

ان خبروں کے مطابق' وجدان نامی ایک خطرناک پاکستانی دہشت گرد پچھلے دو تین دن سے کھٹمنڈو میں سرگرم عمل تھا۔ وہ اپنی ایک فلپائنی ساتھی لی یان کے ہمراہ امریکا سے یہاں پہنچا تھا۔ ان دونوں مجرموں نے وہاں امریکا میں بھی متعدد وارداتیں کی تھیں۔ ان کی زندگی کا مقصد امریکا خصوصاً یہودیوں کو شدید ترین نقصان پہنچانا ہے۔ ہمارے مشن کو انتہائی خوفناک قرار دیا گیا تھا۔

اس کے بعد ڈین ہاردے اور کلاڈیا کی موت کا بڑا وحشت ناک نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جوگندر پال کے بنگلے پر جو واقعات پیش آئے انہیں بہ بانگِ دہل ہم سے منسوب کرکے کھٹمنڈو کے عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ہم پر گہری نظر رکھیں اور ہم جہاں کہیں بھی دکھائی دیں' وہ فوراً پولیس کو مطلع کردیں۔ ان خبروں کے ساتھ ہی میری اور لی یان کی تصاویر بھی شائع کی گئی تھیں جو یقیناً ربی کے احکام پر متعلقہ افراد نے اخبار والوں کو فراہم کی ہوں گی۔

ہمیں انتہائی خطرناک ثابت کرنے کے لیے اخبار نے دو چار اور واقعات بھی ہم سے جوڑ ڈالے تھے جن میں جانوس کے باڈی گارڈ ڈرائیور سنگھا کی موت' کماری چوک پر پیش آنے والے خون ریز واقعات' رتنا پارک کے بنگلے میں پھیلنے والی ابتری' ہائی وے پر ہونے والی معرکہ آرائی' بستی میں رونما ہونے والا خونچکاں واقعہ اور بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں برپا ہونے والی قیامت شامل تھی۔ عوام کے دلوں میں ہمارے لیے غم و غصے کو اجاگر کرنے کے لیے عبادت گاہ کے تقدس وغیرہ کا بڑھ چڑھ کر ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا۔

ویسے یہودی بڑے ہی شاطر اور مکارانہ ذہنیت کے مالک ہیں۔ یہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنا جانتے ہیں۔ اس اخبار کی خبروں میں ہمارے کردار کو بالکل الٹ کر منفی انداز میں پیش کیا گیا تھا جس کی تردید کے لیے ہم کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ہماری ایسی کوئی بھی حرکت خود ہمارے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتی۔ سامنے آتے ہی ہمیں دھرلیا جاتا۔

عوام کا ذہن بنانے میں اخبارات اور نیوز چینلز کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر امریکا کی اجارہ داری ہے۔ آپ اسے صحافت اور سیاست کا عالمی غنڈا کہہ سکتے ہیں۔ عوام چاہے کسی بھی ملک کی ہو وہ ''بے چاری'' ہی ہوتی ہے۔ ان کا وژن محدود ہوتا ہے۔ وہ حالات اور تصاویر کے پیچھے چھپے ہوئے حقائق تک رسائی نہیں رکھتے چنانچہ اخباری خبروں

کی سنسنی خیزی کو دیکھتے ہوئے وہ اسی پر اعتبار کر لیتے ہیں۔ آج کے اخبارات میں شائع ہونے والی ہماری خبروں نے عوام کے دلوں میں ہمارے لیے نفرت بھر دی ہوگی۔ خصوصاً عبادت گاہ میں پیش آنے والے واقعات نے انہیں جذباتی صدمات سے دوچار کیا ہوگا اور...... ان کی نظر میں اس افسوس ناک واقعے کے ذمے دار صرف اور صرف ہم تھے!

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور اخبار کو ایک طرف پھینک دیا۔ کاشانوک نے کہا ''یہ تو وہ باتیں ہیں جو عوام تک پہنچائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ' نیپالی پولیس کے ذریعے یہودی تم لوگوں کے خلاف جو کارروائی کروا رہے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے تم حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہو۔''

''میں تو جہاں بھی جاتا ہوں' حالات خود بخود سنگین ہوجاتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولا ''ظاہر ہے' یہ اخبار بودھ ناتھ ویلی میں بھی پہنچا ہے۔ یہاں بدھ مت افراد کی اکثریت آباد ہے اور یہ لوگ عبادت گاہوں کے تقدس کے حوالے سے بہت حساس ہوتے ہیں۔ میں چونکہ خود بھی بدھسٹ ہوں اس لیے یہ بات زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ عوام چونکہ حقائق کی اصل تصویر سے عموماً بے خبر ہوتی ہے لہٰذا اس ویلی کے لوگ بھی اس وقت تم دونوں کے خلاف بھرے بیٹھے ہوں گے۔ ان حالات میں میرا مشورہ یہی ہے کہ تم لوگ اس گھر سے 'فی الحال باہر نکلنے کی غلطی نہ کرنا ورنہ کوئی بھی شخص اپنے مذہبی جذبات سے مغلوب ہوکر یا پھر کسی انعام کے لالچ میں تمہارے لیے کوئی سنگین مسئلہ کھڑا کرسکتا ہے!''

میں کاشانوک کی بات کو بڑی وضاحت سے سمجھ رہا تھا۔ یہودی لابی مقامی پولیس کو ٹائٹل پر رکھ کر یہاں بھی ہمارے خلاف سرگرم ہوگئی تھی۔ یہ ربی کا اصلی چہرہ تھا۔ وہ منافقت کا نقاب لگا کر بڑے دوستانہ انداز میں مجھ سے سودے بازی بھی کررہا تھا اور دوسری طرف میرے خلاف اس کی سنگین کارروائی بھی جاری تھی۔ اگر میں یہودی ذہنیت اور ربی کی مکاری سے آگاہ نہ ہوتا تو اس کی باتوں پر یقین کرکے کسی بھی لمحے بے موت مارا جاتا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا ''کاشانوک! فلوجی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا اس کے دل میں انعام حاصل کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہوسکتی؟''

''وہ سب سے زیادہ مجھ پر اعتبار کرتا ہے۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا ''میں اسے حقیقت سے آگاہ کردوں گا۔ لہٰذا تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ہوں!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کاشانوک نے پوچھا ''وجدان! ویسے تمہارے ذہن میں آیندہ کے لیے کیا پروگرام ہے؟''

''میں پہلی فرصت میں کھٹمنڈو سے نکل کر اسرائیل پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے تمہیں ایک آدھ دن انتظار کرنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔

''ڈاکٹر موئنگ نے کہا تھا' تم اس سلسلے میں میری ہر قسم کی مدد کروگے۔'' میں نے کہا ''مجھے نیپال سے اسرائیل تک پہنچنے کے لیے اہم کاغذات کی ضرورت پیش آئے گی جن میں سرِفہرست پاس پورٹ کا معاملہ ہے۔''

''کیا تم دونوں ایک ساتھ ہی اسرائیل جانا چاہتے ہو؟''

''ڈاکٹر موئنگ کی خواہش تو یہی ہے!''

کاشانوک ڈاکٹر موئنگ کے لیے کام کرتا تھا اور اس کا وفادار تھا۔ وہ ڈاکٹر کی خواہش کے آگے دم مارنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا' ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا ''تم دونوں کے ضروری کاغذات اور پاس پورٹس وغیرہ بنوانا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن میں اس سلسلے میں تم دونوں کو ایک مشورہ دینا چاہوں گا اور اس کی ایک وجہ بھی ہے۔''

''پہلے وجہ بتاؤ اور پھر مشورہ دو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا ''کھٹمنڈو کے حالات کا تم نے بخوبی اندازہ لگالیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق' کھٹمنڈو سے باہر نکلنے والے ہر فضائی اور زمینی راستے پر' تمہاری تلاش کے لیے انتہائی سخت چیکنگ کا بندوبست کردیا گیا ہے' خصوصاً کھٹمنڈو ائرپورٹ تو تمہارے لیے بہت خطرناک ہوچکا ہے اور اسرائیل جانے کے لیے تمہیں ائرپورٹ کو استعمال کرنا ہوگا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اب میرا مشورہ بھی سن لو۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی اور ملک سے اسرائیل۔ کے لیے پرواز کرو۔''

''یعنی تمہارا مطلب ہے' ہم نیپال سے پہلے کسی اور ملک میں جائیں؟''

''بالکل' میرا یہی مطلب ہے!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

لی یان نے کہا ''آئیڈیا اچھا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی نگاہیں کھٹمنڈو یا زیادہ سے زیادہ نیپال کے ائرپورٹس پر لگی ہوئی ہیں۔ اگر ہم کسی طرح نیپال سے نکل کر کسی اور ملک میں پہنچ جائیں تو وہاں سے زیادہ محفوظ انداز میں اسرائیل کی طرف پرواز کرسکتے ہیں۔''

''میرے ذہن میں بھی یہی ہے۔'' کاشانوک نے کہا ''میں چاہتا ہوں' تم دونوں کے پاس پورٹس اور دیگر ضروری کاغذات بھی اسی ملک کی مناسبت سے تیار کروائے جائیں جہاں سے تم اسرائیل روانہ ہوگے تاکہ تمہارے دشمنوں کو ذرا سا بھی شک نہ ہو اور تم بخیر و عافیت اسرائیل پہنچ جاؤ۔''

میں نے تعریفی نگاہ سے کاشانوک کو دیکھا۔ آئیڈیا وہ واقعی بہت عمدہ لایا تھا۔ میں نے پہلی ملاقات میں' اس کی آنکھوں میں ذہانت کی جو چمک دیکھی تھی وہ اب اس کا عملی ثبوت بھی دے رہا تھا۔ تاہم میرے ذہن میں کچھ باتیں کھٹک رہی تھیں۔ اپنی تسلی کے لیے میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''تمہارے خیال میں نیپال سے نکل کر ہمیں کس ملک میں جانا چاہیے اور کیا وہاں تمہارے لیے یہ آسانی ہوگی کہ تم ہمارے پاسپورٹس اور دوسرے ضروری کاغذات تیار کرواسکو؟''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''نیپال سے قریب ترین ممالک میں انڈیا' بنگلہ دیش' بھوٹان اور تبت کا شمار ہوتا ہے اور...... میرے خیال میں' ان میں تبت ایک ایسا ملک ہے جہاں کام کرنے کے لیے مجھے زیادہ سے زیادہ آسانیاں حاصل ہوں گی۔ میں خود بھی تبت کے مشہور شہر لہاسا کا رہنے والا ہوں۔ میں اپنے تعلقات کے زور پر وہاں کی مناسبت سے تمہارے ضروری کاغذات تیار کرواسکتا ہوں۔ اگر تم دونوں کو تبت کی شہریت حاصل ہوجائے تو پھر لہاسا سے اسرائیل کی طرف موو کرنا تمہارے لیے انتہائی آسان اور محفوظ ہوجائے گا۔''

تبت' نیپال کے شمال میں واقع تھا۔ میں نے اس پُراسرار سرزمین سے متعلق بہت سی حیرت انگیز داستانیں سن رکھی تھیں۔ کاشانوک نے تبت کا ذکر کیا تو ازخود میرے دل میں خواہش جاگی کہ مجھے وہاں ضرور جانا چاہیے۔ ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے میں نے کاشانوک سے پوچھا۔

''کیا لہاسا سے اسرائیل کے لیے کوئی ڈائریکٹ فلائٹ ہے؟''

''میں معلوم کرلوں گا۔'' وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا۔

''ویسے لہاسا (LHASA) اور کھٹمنڈو کے درمیان تو باقاعدہ پروازیں آتی جاتی ہیں۔''

میں نے استفسار کیا ''کھٹمنڈو سے باہر جانے والے تمام راستوں کی ناکابندی کردی گئی ہے اور بڑی شدومد سے ہمیں تلاش کیا جارہا ہے۔ ان حالات میں ہم کھٹمنڈو سے تبت تک کیسے پہنچیں گے؟''

''اس مسئلے کا حل میں سوچ چکا ہوں۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا ''کھٹمنڈو سے تبت کی طرف اور تبت سے ادھر بدھ یاتریوں کے چھوٹے بڑے قافلے سفر کرتے رہتے ہیں خصوصاً بودھ ناتھ کے اسٹوپا میں ان کا لازمی آنا ہوتا ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں' آج کل میں ادھر سے کون سا قافلہ تبت کی طرف جارہا ہے۔ چاہے ہمیں ایک دو دن تک انتظار کیوں نہ کرنا پڑے لیکن یہ ذریعۂ سفر ہمارے لیے زیادہ محفوظ رہے گا۔''

''کیا ہم ٹرین کے ذریعے کھٹمنڈو سے تبت تک نہیں جاسکتے؟'' لی یان نے پوچھا۔

میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا ''نیپال میں ریلوے کا نظام وجود نہیں رکھتا لہٰذا ٹرین کے چلنے یا رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

کاشانوک مزید دس منٹ تک ہمارے پاس رکا پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا ''میں معلومات حاصل کرکے گھنٹے' دو گھنٹے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ بدھ یاتریوں کا کوئی قافلہ کب یہاں سے روانہ ہونے والا ہے۔''

میں نے کہا ''کاشانوک! تمہارے ترتیب دیے ہوئے پروگرام کے مطابق تو تم بھی ہمارے ساتھ تبت جاؤ گے۔ کیا اس صورت میں یہاں کھٹمنڈو میں تمہارے لیے مسائل کھڑے نہیں ہوجائیں گے۔ جوگندر پال تمہارے لیے کوئی مشکل تو پیدا نہیں کردے گا؟''

''ہرگز نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا ''جوگندر نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی ہے۔ میں نے ڈاکٹر موئنگ کی ہدایت کے مطابق' جوگندر سے ہامی بھرلی ہے۔ اس فیصلے کو بدلا بھی جاسکتا ہے۔ جوگندر مجھے زبردستی اپنے ساتھ تو نہیں رکھ سکتا۔ میں نے تو ادھر کی ''خیر خبر'' رکھنے کے لیے اس کی پیشکش کو قبول کرلیا تھا' بہرحال!'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اس سلسلے میں مجھے ڈاکٹر موئنگ سے ضرور مشورہ کرنا ہوگا۔''

میں نے کہا ''یہ تو تمہارے فرائض کا حصہ ہے۔''

ہم سے دوبارہ رابطہ کرنے کا وعدہ کرکے وہ وہاں سے

رخصت ہوگیا۔

کاشانوک کے جانے کے بعد ہم اس بیگ کا معائنہ کرنے لگے جو وہ ہمارے لیے لایا تھا۔ وہ میرے اور لی یان کے آؤٹ فٹ کا خیال رکھتے ہوئے مختلف لباس بھی خرید لایا تھا۔ لی یان نے اپنے ناپ کی ایک جینز اٹھائی اور بڑبڑاتے ہوئے واش روم کی جانب لپک گئی۔

''میں پہلے اس تنبو سے تو نجات پاؤں!''

تنبو کا لفظ اس نے شاکرہ قمیض اس جینز کے لیے استعمال کیا تھا جو اس کی کمر پر بے حد ڈھیلی تھی۔ میں بے ساختہ زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ جھنجلاہٹ میں گویا' شاکرہ سے شکریہ بننے جارہی تھی!

میں نے اپنے موبائل فون کو چارجنگ پر لگانے کے لیے جیب سے نکالا تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ اس کا اسکرین بالکل ڈیڈ ہورہا تھا جیسا کہ عموماً موبائل کو آف کرنے کے بعد ہوجاتا ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے سیل کو آف نہیں کیا تھا۔

میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ ممکن ہے بیٹری ختم ہوجانے کے بعد یہ خود بخود آف ہوگیا۔ میں نے اس خیال کی تصدیق کے لیے لی یان کے موبائل کا معائنہ کیا تو وہاں بھی یہی کیفیت دیکھنے میں آئی۔ اب میری حیرت دو چند ہوگئی۔ میں نے رات اسی سیل پر ربی سے بات کی تھی اور بات کے اختتام پر سیل مناسب بیٹری شو کررہا تھا۔ جب یہ الجھی ہوئی صورتِ حال میری سمجھ میں نہیں آئی تو میں نے دونوں موبائل کو ایک طرف رکھ دیا اور لی یان کے' واش روم سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ باہر آئی اور میری ''فرمائش'' پر اس نے اپنے اور میرے موبائل کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد یہ فتویٰ صادر کردیا ''سم کارڈز کام نہیں کررہے۔ لگتا ہے' ہمارے کنکشنز کو منسوخ کردیا گیا ہے!''

سیل کے حوالے سے میری معلومات لی یان سے زیادہ نہیں تھیں۔ لہٰذا اس کے فتوے کو ماننا پڑا اور اس کے ساتھ ہی میرا دھیان ربی موشے ہائمن کے وسیع وعریض اختیارات کی طرف چلا گیا۔ میں نے رات لی یان والے موبائل سے ربی کو کال کی تھی۔ لازمی بات ہے' یہ نمبر اس کے پاس پہنچ گیا ہوگا۔ یہ دونوں موبائل فون ہمیں جہنم مکانی جانوس نے فراہم کیے تھے گویا ان کے کنکشنز اسی کے حاصل کردہ تھے۔ میں نے جوگندر پال والے بنگلے میں جانوس سے تمام تر گفتگو اپنے سیل سے کی تھی لیکن میرا نمبر اس کی کال ریسیونگ سے نہیں پکڑا جاسکتا تھا۔ میری دہشت نے وہاں بنگلے میں اسے اتنا بوکھلا دیا تھا کہ اس نے اپنا سیل ایک دیوار سے دے مارا تھا جس کے نتیجے میں اس کی بیٹری نکل کر دور جا گری تھی' گویا ریسیونگ ریکارڈ ایک جھٹکے سے تلف ہوکر رہ گیا تھا۔ ہم دونوں کے نمبر اوپر نیچے کے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا' سیریز کی وجہ سے یہ معلوم کرلیا گیا ہو کہ یہ دونوں کنکشنز جانوس نے حاصل کیے تھے۔ بہرحال' جو بھی صورت رہی ہو' حقیقت یہ تھی کہ ہمارے موبائلز سرِدست استعمال کے قابل نہیں رہے تھے۔

ہم موجودہ صورتِ حال پر غور وخوض کرتے رہے لیکن اس مسئلے کا کوئی حل سامنے نہ آسکا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم موبائل کنکشن والوں کے پاس پہنچ جاتے اور انہیں کھری کھری سناتے کہ انہوں نے ہمارے سم کارڈز کیوں بلاک کردیے ہیں۔ یہ گویا' از خود کسی بڑی مصیبت کو گلے لگانے والی بات ہوتی۔ اگر ربی کے اشارے پر ہمارے کنکشنز منسوخ کیے گئے تھے تو پھر اس بات کے قوی امکانات موجود تھے کہ مختلف کسٹمرز سروس سینٹرز پر ہماری گرفتاری کا معقول بندوبست بھی موجود ہوگا۔

دوپہر کے کھانے سے تھوڑی دیر پہلے کاشانوک ہمارے پاس پہنچ گیا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے شکوہ کیا ''میں کافی دیر سے تم دونوں کے نمبرز ٹرائی کررہا تھا لیکن رابطہ نہیں ہوسکا۔ مجبوراً مجھے خود یہاں آنا پڑا۔ کیا تم لوگوں نے اپنے موبائل آف کررکھے ہیں؟''

''ہاں' ہمارے فون آف کردیے گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے' وجدان؟'' وہ الجھ کر رہ گیا۔

میں نے وضاحت کردی۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر دونوں موبائلز کو مختلف طریقوں سے ''چیک'' کرنے لگا۔ بالآخر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے ہمارے خدشات کی تصدیق کردی۔ کمپنی کی جانب سے ہمارے سم کارڈز بلاک کردیے گئے تھے یقیناً یہ کام کسی اونچی سورس سے کیا گیا تھا کیونکہ جانوس تو اب زندہ نہیں رہا تھا۔

کاشانوک نے کہا ''وجدان! تم فی الحال میری سم استعمال کرلو۔ میرے پاس ایک اور کنکشن بھی ہے۔ میں اس سے گزارہ چلالوں گا۔ بعد میں کچھ سوچیں گے۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ موبائل فون میری فوری ضرورت نہیں تھی۔ میں جلد از جلد کھٹمنڈو سے نکل کر اسرائیل پہنچنا چاہتا تھا، باقی سب باتیں ثانوی اور فروعی تھیں۔ میں نے

کاشانوک سے کہا۔

''موبائل فون کے موضوع کو بعد میں ڈسکس کریں گے، پہلے تو یہ بتاؤ' ہمیں فون کیوں کررہے تھے؟''

اس نے جواب دیا ''میں نے تم لوگوں کے، بہ حفاظت کھٹمنڈو سے نکل کر تبت پہنچنے کا بندوبست کرلیا ہے کل صبح سات افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ بودھ ناتھ اسٹوپا سے روانہ ہوگا۔ اس قافلے میں پانچ مرد اور دو عورتیں شامل ہیں۔ تم دونوں کو شمولیت کے بعد یہ تعداد بڑھ کر نو ہوجائے گی، یعنی چھ مراد اور تین عورتیں میں نے قافلے کے سردار بدھ بھکشو تھا چو کو اعتماد میں لے کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کردیا ہے۔ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے لہٰذا پریشانی والی کوئی بات نہیں......''

''ایک منٹ!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا ''کیا تم ہمارے ساتھ تبت نہیں جارہے ہو؟''

''میں تو ضرور جاؤں گا'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پھر یہ کیوں کہہ رہے ہو کہ قافلے میں شامل افراد کی تعداد دس ہوجائے گی!''

''اوہ سوری!'' وہ چونک کر بولا ''میں خود کو شمار کرنا بھول گیا تھا''

''لیکن دیکھ لو' ہم ہرگز تمہیں نہیں بھولے'' لی یان نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد کاشانوک ہمیں بدھسٹ قافلے کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا۔ بدھ بھکشو ''تھاچو'' ان کا راہ نما تھا۔ وہ سب بدھ کے پیروکار تھے اور کھٹمنڈو سے تبت کی طرف جارہے تھے۔ اس طرح کے چھوٹے بڑے قافلے ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے رہتے تھے۔ لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور حتی الامکان ان کی مدد بھی کرتے تھے۔ جس طرح ہر مذہب میں، اس مذہب کے عالم کو عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ایسے ہی بدھ کے پیروکار بھی ان راہبوں اور بدھ بھکشوؤں کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ یہ جہاں بھی جاتے، ان کے کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے اور آرام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، یہ الگ بات کہ یہ لوگ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں اور آرام وآسائش سے انہیں بدھ واسطے کا بیر ہے۔ بہرحال، ہم ایسے کسی قافلے کی معیت میں، دشمنوں کی نظروں میں آئے بغیر بہ حفاظت تبت پہنچ سکتے تھے۔ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک سبب بن گیا تھا۔

کاشانوک نے مزید بتایا ''کل علی الصباح یہ قافلہ بودھ ناتھ اسٹوپا سے روانہ ہوجائے گا۔ ہمیں ان کی روانگی سے پہلے قافلے میں پہنچنا ہوگا۔ یہ لوگ یہاں سے سیدھے بدھانلکا نتھا پہنچیں گے۔ مذکورہ مقام کھٹمنڈو سے نو کلومیٹر شمال میں، شیو پوری ہل کے دامن میں واقع ہے۔ ''بدھانلکا نتھا'' میں تھوڑے آرام اور یاترا کے بعد قافلہ آگے روانہ ہوگا اور وہاں سے کم وبیش چار کلومیٹر مزید شمال میں سفر کرنے کے بعد ہم سندری جل پہنچ جائیں گے۔ ''سندری جل'' پہاڑی آبشاروں پر مشتمل ایک حسین اور دل کش وادی ہے۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے ہم تھوڑا سا زاویہ تبدیل کریں گے اور تبت کی سرحد پر واقع ایک چھوٹے سے قصبے ''کوداری'' پہنچ جائیں گے......''

''کیا یہ وہی قصبہ کوداری ہے جو چائنا روڈ پر واقع ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اضطراری لہجے میں کہا۔

''کوداری'' کے ذکر پر اچانک مجھے مایامتی یاد آگئی تھی۔ میں نے مایامتی کے ساتھ ماضی میں بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ مایامتی کھٹمنڈو کے ٹیکو اسپتال میں نرس تھی۔ وہ تبت کی سرحد کے نزدیک، چائنا روڈ پر واقع کوداری قصبے کی رہنے والی تھی اور کئی سال پہلے کھٹمنڈو میں آبسی تھی۔ مایامتی کو یاد کرکے میرا دل افسردہ ہوگیا کیوں کہ وہ اب آنجہانی ہوچکی تھی!

کاشانوک نے گہری نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ''بالکل، میں اسی کوداری کی بات کررہا ہوں۔ کیا تم اس سے واقف ہو؟''

''صرف نام کی حد تک واقف ہوں، وہاں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا'' میں نے بوجھل آواز میں کہا ''میری ایک دوست کا تعلق اسی قصبے سے تھا جو اب زندہ نہیں''

لی یان نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن خاموش رہی۔

کاشانوک نے کہا ''ہمیں اس قافلے میں شامل ہونے کے لیے خاص اہتمام بھی کرنا ہوگا۔ بدھ بھکشوؤں والے مخصوص لباس کا میں بندوبست کرلوں گا لیکن اس سلسلے میں ایک قربانی تمہیں بھی دینا ہوگی وجدان!''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ''کیسی قربانی؟''

''تمہیں میری طرح سر کے بال منڈانا ہوں گے!''

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

کاشانوک نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' یہ تمہاری سیفٹی کے لیے بہت ضروری ہے۔ دشمن جتنے خطرناک انداز میں جگہ جگہ تمہارے تلاش میں گھات لگائے بیٹھے ہیں انہیں جُل دینے کے لیے یہ تو کرنا ہوگا۔''

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا'' ٹھیک ہے، میں یہ کرلوں گا۔''

لی یان میرے اس فیصلے پر عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میری نگاہ میں کئی سال پہلے کا ایک ایسا ہی منظر گھوم گیا۔ اس وقت میں بارہ تیرہ سال کا ایک چھوٹا سا لڑکا تھا۔ دارا اور اس کے حواری میرے لہو کے پیاسے ہو رہے تھے۔ چاچا پرتاب سنگھ میرے والد کا ایک سچا اور مخلص دوست تھا۔ وہ دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مجھے سنگاپور سے انڈونیشیا اور انڈونیشیا سے تھائی لینڈ لے کر آیا تھا۔ تھائی لینڈ کے شہر بنکاک میں چاچا پرتاب کے استادِ محترم مہاراج وانگ ونگ پائے کا ایک بہت بڑا مارشل آرٹس سینٹر تھا۔ چاچا نے مجھے مہاراج کے پاس تربیت کے لیے چھوڑا اور خود زندگی ہار گیا۔ انہی دنوں میرا سر مونڈ دیا گیا تھا اور مجھے مونک والا لباس بھی پہنایا جاتا تھا۔ اب میں بچہ رہا تھا، نہ ہی چاچا... پرتاب سنگھ اور مہاراج وانگ ونگ پائے اس دنیا میں باقی رہے تھے۔ سب کچھ خواب وخیال ہو کر رہ گیا تھا۔

کاشانوک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا'' میں رات کو دیر سے کسی وقت یہاں آ جاؤں گا۔ پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے ہم اپنی تیاری مکمل کرلیں گے۔ آپ لوگ اس منصوبے پر عمل کرنے کو تیار رہونا؟''

''ڈن!'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

میں نے جو فیصلہ سنایا تھا وہ لی یان کے لیے بھی قابلِ قبول تھا۔

کاشانوک نے جانے سے پہلے اپنے سیل میں سے سم کارڈ نکال کر مجھے دے دیا، اور بولا'' تم فی الحال اس سے کام چلاؤ۔ میں دوسرا نمبر استعمال کرلوں گا۔ ہمارے درمیان رابطے کا وسیلہ بہرحال ضرور رہنا چاہیے''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سم کارڈ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

میں کاشانوک کو گھر کے دروازے پر چھوڑ کر واپس کمرے میں آیا تو لی یان نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی نگاہ میں ایک عجیب سا تاثر ابھرتا دکھائی دیا۔ پتا نہیں، وہ ان لمحات میں کیا سوچ رہی تھی بہرحال، اس کی سوچ مضحکہ خیز ہو سکتی تھی۔

میں نے اس کی ذہنی کیفیت کے بارے میں جاننے کے لیے پوچھ لیا'' کیا بات ہے لی یان! تم مجھے معنی خیز نظر سے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

جواب میں وہ بے طرح ہنس دی۔

اس کی اس حرکت پر مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا'' یہ کیا مذاق ہے لی یان؟''

اس نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا اور قہقہے پر قہقہے لگاتی چلی گئی۔ اب میں الجھن محسوس کرنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے ہنسنے کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اس کا جن اتارنا مجھے آ گیا تھا۔ میں نے مجرب منتر پھونکا تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

جب وہ اعتدال پر آئی تو میں نے پوچھا'' اب بتاؤ' تم مجھے دیکھ کر ہنستی کیوں چلی جا رہی تھیں؟''

'' میں تمہیں دیکھ کر تھوڑی ہنس رہی تھی!'' وہ شوخی سے بولی۔

''پھر؟'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

'' میں تو گنجے وجدان کو دیکھ رہی تھی۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ شرارت بھرے لہجے میں بولی'' وجدان! تم سر منڈوا کر کیسے لگو گے؟''

'' جیسے دوسرے'' فارغ البال'' لگتے ہیں۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا'' کاشانوک کو نہیں دیکھا؟''

'' کاشانوک کی بات دوسری ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی'' اسے تو میں نے اول آخر بغیر بالوں کے ہی دیکھا ہے نا۔ اس لیے میرے ذہن میں اس کا ایک تاثر بن گیا ہے مگر تم......!''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر پھر ہنسنے لگی۔

میں نے کہا'' گھر کی کھیتی ہے' کچھ ہی دنوں بعد سرسبز وشاداب نظر آنے لگے گی۔''

پتا نہیں' وہ میری بات کے مفہوم تک پہنچی کہ نہیں البتہ اس کی شوخ وشریر ہنسی میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہوئی۔ میں مطمئن تھا کہ وہ جنونی انداز کے قہقہوں سے باہر نکل آئی تھی۔ اب اسے کسی مجرب نسخے کی ضرورت نہیں تھی۔

☆☆☆

کسی سرگرم اور عملی انسان کو اگر چند گھنٹوں کے لیے فارغ بٹھا دیا جائے تو وہ خود کو اپاہج سا محسوس کرنے لگتا ہے۔ میری ساری زندگی بے پناہ مصروفیت میں گزری ہے اور مصروفیت بھی ایسی کہ ایک ایک لمحہ میدانِ جنگ کا آئینہ

دار ہے۔ گزشتہ شام سے لے کر اب تک مجھے کوئی سرگرمی دکھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا عجیب سی بیزاری کا احساس ہو رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے ایک بھرپور نیند لی اور سورج غروب ہونے سے کوئی گھنٹا بھر پہلے ہم تیار ہو کر اس گھر سے نکل گئے۔ فلوجی نے ہمارے باہر جانے پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔ تاہم اس کے چہرے کے تاثرات سے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہمارے اس عمل سے مطمئن نہ ہو۔ یقیناً کاشانوک نے اس سلسلے میں اسے خصوصی ہدایات دے رکھی ہوں گی۔

ہم نے گھر سے باہر نکلتے وقت البتہ' تھوڑی احتیاط ضرور برتی اور وہ یہ کہ اپنے چہروں پر ہلکا پھلکا میک اَپ کرلیا۔ کاشانوک میک اپ کا ضروری سامان صبح چھوڑ گیا تھا جواب ہمارے کام آ رہا تھا۔ لی یان والے سیل کو گھر ہی میں رہنے دیا اور اپنے سیل میں' میں نے کاشانوک کا دیا ہوا سم کارڈ لوڈ کرلیا تھا۔ اس نے جاتے وقت مجھے اپنا دوسرا نمبر بھی دے دیا تھا۔

کاشانوک کا وہ گھر بودھ ناتھ دیلی کے عین وسط میں واقع تھا۔ اس علاقے میں تقریباً تمام گھر ایک ہی طرز پر بنے ہوئے تھے۔ ہم پیدل ہی چلتے ہوئے گلی در گلی خاصے فاصلے پر نکل آئے۔ اس سمت بودھ ناتھ کا اسٹوپا اپنی آن بان کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس اسٹوپا کا شمار دنیا کے چند بڑے اسٹوپاز میں ہوتا ہے۔

اسٹوپا میں اس وقت یاتریوں اور عبادت کے لیے آنے والے مقامی لوگوں کا اچھا خاصا رش تھا۔ ہم بدھ عبادت گاہ کے اندر تو نہیں گئے۔ تاہم باہر ایک محفوظ کونے میں کھڑے' لاتعداد افراد کو وہاں آتے جاتے دیکھتے رہے۔ ان لوگوں میں مجھے کوئی بھی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا اور نہ ہی کسی شخص نے ایسی نظر سے ہمیں دیکھا کہ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

بدھا کے ماننے والے عام طور پر بہت ہی صلح جو اور امن پسند ہوتے ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہوئے وہ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ بودھ ناتھ دیلی کے باسیوں کا بھی یہی عالم تھا۔ ہم وہاں سے ہٹ گئے اور دیلی کی دوسری گلیوں میں مٹرگشت کرنے لگے۔ یہیں ایک کافی ہاؤس سے ہم نے خوش ذائقہ کافی نوش کی اور واپسی کی راہ لی۔

میں درحقیقت اس دیلی کا جائزہ لینا چاہتا تھا تاکہ جس گھر میں ہم مقیم تھے اس کا محل وقوع معلوم ہو سکے اور میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ اب کسی ایمرجنسی کی صورت میں گھر سے باہر نکل کر میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم واپس آئے تو فلوجی کچن میں مصروف تھا۔ اس نے ہمیں اطلاع دی کہ ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہمیں رات کا کھانا مل جائے گا۔ لی یان کو میں نے کمرے میں بھیجا اور خود وہیں کچن میں رک کر فلوجی سے گپ شپ کرنے لگا۔ میں دراصل اس سے دیلی کی صورتِ حال کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

کاشانوک نے اسے ہمارے بارے میں تفصیلاً بتا رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا' ہمیں کھٹمنڈو میں کس قسم کے حالات درپیش ہیں۔ میری ٹٹول کا مقصد وہ بہ آسانی سمجھ گیا اور اطمینان بخش لہجے میں بولا۔

'' ابھی تک تو اس وادی میں سب امن وامان ہی ہے۔ تم لوگوں کی تلاش کے لیے سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی' ویسے تمہیں یوں آزادانہ گھومنے کے لیے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ تھوڑی احتیاط کرلو گے تو کوئی مسئلہ سر نہیں اٹھائے گا۔''

میں فلوجی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بات چیت میں مصروف رہا۔ وہ اپنی عمر کی ستر بہاریں گزار چکا تھا۔ تاہم صحت عمدہ تھی۔ گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا' اسے زندگی گزارنے کا بھی وسیع تجربہ ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں لی یان کے پاس آ گیا۔

وہ لباس تبدیل کر چکی تھی اور چہرے پر سے اس نے عارضی میک اپ بھی صاف کر دیا تھا۔ میں نے بھی گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا... پھر ہمارے درمیان تازہ ترین صورتِ حال پر بات چیت ہونے لگی۔ اسی دوران میں کچھ دیر بعد کاشانوک کا فون آ گیا۔

میں نے اپنے سیل پر اس کی کال ریسیو کی۔ اس نے کہا۔ '' ڈاکٹر مونگ سے میری بات ہوگئی ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہے کہ میں تم دونوں کے ساتھ تبت جا رہا ہوں۔ میں نے اسے اس قافلے کے بارے میں بھی تفصیلاً بتا دیا ہے۔ جس میں شامل ہو کر ہم بودھ ناتھ دیلی سے روانہ ہوں گے۔''

'' چلو' اچھا ہوا کہ ہمارے پروگرام کو ڈاکٹر مونگ کی تائید حاصل ہوگئی۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا'' تم نے جوگندر پال کے حوالے سے بھی ڈاکٹر سے بات کی ہے؟''

میرا آخری جملہ سوالیہ انداز کا حامل تھا۔ اس نے پوچھا ''جوگندر پال کے کون سے حوالے کی بات کررہے ہو؟''

میں نے جواب دیا ''جوگندر نے تمہیں اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کی تھی نا۔ کل صبح تم ہمارے ہمراہ یہاں سے روانہ ہورہے ہو۔ اپنی روانگی کو کس طرح جسٹی فائی کرو گے؟''

''اوہ...... ہاں!'' وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر موتگ سے تذکرہ کیا تھا۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ میں جوگندر سے ہفتے بھر کی چھٹی لے لوں۔ اس طرح سارے معاملات بخوبی نمٹ جائیں گے۔''

''پھر تم نے اپنی چھٹی منظور کرالی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میں نے اس سلسلے میں جوگندر پال سے بات کی ہے۔'' اس نے بتایا ''وہ اس بات کے لیے راضی ہوگیا ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ میں چندروز کے لیے اپنے گاؤں جانا چاہتا ہوں' واپس آ کر اس کی خدمت میں جت جاؤں گا۔ اس نے مجھے گاؤں جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے اسے بتادیا ہے کہ کل صبح میں کھٹمنڈو سے نکل جاؤں گا۔''

''لیکن تمہیں تو آج رات کسی وقت ہمارے پاس آنا ہے؟''

''ہاں' وہ تو ہے!'' اس نے جواب دیا۔

''پھر گڑبڑ نہیں ہوجائے گی؟''

''کیسی گڑبڑ؟''

''جوگندر پال تمہارے رات ہی کو غائب ہوجانے پر تشویش میں مبتلا ہوسکتا ہے!'' میں نے کہا۔

وہ بے پروائی سے بولا ''جوگندر پال اس وقت بہت زیادہ مصروف ہے۔ مجھے نہیں امید کہ دوبارہ اس سے میرا سامنا ہو۔ اسے میرے غائب ہوجانے کی خبر نہیں ہوسکے گی۔ اس طرح یہ معاملہ نبھ جائے گا۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جوگندر پال کے ایک دوسرے بنگلے پر۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوہ! تو کیا تم شیوالی اسٹریٹ میں واقع بنگلا نمبر جے۔ دوسو میں نہیں ہو؟''

''میں اس وقت جوگندر کے جس بنگلے میں ''ڈیوٹی'' دے رہا ہوں وہ شیوالی اسٹریٹ سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔'' کاشانوک نے جواب دیا ''مذکورہ بنگلا اروڑا کا مپج کے نزدیک ہے اور اس بنگلے کا نمبر ہے آر۔ ٹوٹنٹی!''

کاشانوک یہ ایک نئی اطلاع دے رہا تھا۔ اروڑا کامپج دراصل دلی بازار' سینٹرل امیگریشن آفس اور رشین ایمبیسی کے وسط میں واقع تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''ادھر سے ادھر تمہاری منتقلی کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''میں وجہ معلوم کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔'' کاشانوک نے پُراسرار انداز میں جواب دیا ''اس بنگلے پر میں نے کچھ خفیہ سرگرمیاں محسوس کی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے' آج رات یہاں کچھ ہونے والا ہے۔''

اس کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے۔ میں نے زور دے کر کہا ''اپنے کام سے لگے رہو...... اور جیسے ہی کوئی اہم بات تمہیں معلوم ہو' فوراً مجھے اطلاع دینا۔''

''ٹھیک ہے وجدان! میں بعد میں تمہیں کال کروں گا۔'' وہ آواز دبا کر بڑے محتاط انداز میں بولا ''کوئی میری طرف آرہا ہے۔''

''وِش یو گڈ لک!''

میرے دعائیہ کلمات کے ساتھ ہی اس نے سیلولر رابطہ منقطع کردیا۔

کاشانوک کے اس مبہم مگر سنسنی خیز انکشاف نے مجھے بے چین کردیا۔ اس تمام تر گفتگو کے دوران میں لی یان میرے قریب موجود رہی تھی۔ میں نے سیل کو ایک طرف رکھا تو وہ میرے چہرے پر پھیلی ہوئی تشویش کو دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔ وہ یک طرفہ گفتگو سن پائی تھی اس لیے بھی زیادہ الجھ رہی تھی۔

''خیریت تو ہے وجدان؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

میں چونکہ خود بھی اس بارے میں ابھی زیادہ نہیں جانتا تھا لہٰذا ہماری گفتگو قیاسات تک محدود رہی۔ اسی دوران میں فلوجی نے ہمیں اطلاع دی کہ رات کا کھانا میز پر لگایا جاچکا ہے۔

سرد موسم میں انسانی جسم کو زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا نظام انہضام کی کارکردگی کئی گنا بڑھ جاتی ہے جس کے نتیجے میں زیادہ بھوک لگتی ہے۔ ہم نے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک لمبی چوڑی نیند لی تھی اس کے باوجود بھی میں اس وقت اچھی خاصی بھوک محسوس کررہا تھا۔

ہم نے ڈٹ کر ڈنر کیا اور ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں آگئے۔ فلوجی نے ڈائننگ کم ڈرائنگ روم ہی سے ہمیں

''گڈ نائٹ'' بول دیا۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ جب تک جاگ رہا ہے' پوری طرح چوکنا رہے اور سونے سے پہلے کھڑکیوں دروازوں کو اچھی طرح چیک کرلے۔

''آپ فکر نہ کریں جناب۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا ''میں نصف صدی سے چوکیداری اور نگرانی کا کام کررہا ہوں۔ آپ پورے اطمینان کے ساتھ جاکر سو جائیں۔ رات کو جس وقت بھی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو' آپ بے دھڑک میرے پاس آسکتے ہیں۔ میں' رات میں نہیں بلکہ دن میں نیند پوری کرلیتا ہوں۔''

کمرے میں آنے کے بعد ہم نے دروازے کو بند کرلیا۔ اس وقت ہم دونوں میں سے کسی کو بھی نیند نہیں آرہی تھی لہٰذا فوری طور پر سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہم گزشتہ رات اور آج دن میں کئی روز کے بعد پُرسکون نیند سو سکے تھے' ایک گہری اور آسودگی سے بھرپور نیند!

لی یان نے نرسنگ کورس کر رکھا تھا اور میڈیکل کے شعبے میں اس کی معلومات اور تجربہ کسی کوالی فائیڈ ڈاکٹر سے کم نہیں تھا۔ ذرا فرصت میسر آئی تو وہ میرے بازو کی تیمارداری میں لگ گئی۔ کاشانوک سے ہم نے فرسٹ ایڈ کا ضروری سامان بھی منگوالیا تھا جو اس وقت کام آرہا تھا۔

ڈاکٹر موتگ کے ساتھ رتنا پارک والے بنگلے سے ہائی وے والی بستی کی طرف جاتے ہوئے دشمنوں سے جو مارا ماری ہوئی تھی اس میں میرے بائیں بازو کا ٹرائی سیپس زخمی ہوگیا تھا جو اس وقت لی یان کے ہاتھوں تیمارداری کا ''لطف'' اٹھا رہا تھا۔ لی یان کی شخصیت میں کئی تضاد پائے جاتے تھے۔ وہ ایک طرح سے مجموعۂ تضادات بن کر رہ گئی تھی۔ میدانِ کارزار میں وہ مارشل آرٹس کا اعلیٰ نمونہ پیش کرکے مدِمقابل کے چھکے چھڑادیتی تھی لیکن ہر نوعیت کی تیمارداری کے دوران میں وہ موم کی گڑیا بن جاتی' نازک اور نرم و ملائم۔ معمولی سی آنچ اس کی نرمی میں کئی گنا اضافہ کردیتی۔ اسے پگھلتے دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ وہی لی یان ہے' کھلے میدان میں جس کے ہاتھ پاؤں تیز دھار خنجروں کے مانند شائیں شائیں کرتے ہوئے دشمنوں کا صفایا کرتے چلے جاتے ہیں۔

جب تک وہ میری مرہم پٹی میں مصروف رہی' میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی انگلیوں میں مسیحائی کا ایسا انداز اور لمس کا ایسا گداز پنہاں تھا کہ اس کے چھوتے ہی بیمار خود کو شفایاب ہوتا محسوس کرنے لگتا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو مجھ سے پوچھا۔

''یہ مایا متی کون تھی؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دن میں جب کاشانوک نے کوداری قصبے کا ذکر کیا تو میں نے اسے بتایا تھا کہ میری ایک دوست کا تعلق بھی اسی قصبے سے تھا۔ کاشانوک کے جانے کے بعد لی یان نے میری اس دوست کا نام پوچھ لیا تھا اور مزید تفتیش اب کررہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

''تمہاری طرح مایا متی بھی ایک نرس تھی...... اور میری ایک اچھی دوست تھی۔''

''کیا تم مجھے بھی اپنی ایک اچھی دوست سمجھتے ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''اس میں شک والی کون سی بات ہے؟'' الٹا میں نے اسی سے پوچھ لیا ''کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتی ہو؟''

''میں اپنے نہیں' تمہارے احساسات جاننا چاہتی ہوں؟'' وہ ڈٹی رہی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''ہم قربت کی جن منزلوں سے گزر چکے ہیں وہ مضبوط دوستی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ میں اپنے احساسات کو اس سے زیادہ واضح انداز میں بیان نہیں کرسکتا۔''

''ہوں!'' وہ ایک معنی خیز سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''کیا تم مایا متی کے بھی اتنے ہی گہرے دوست تھے؟''

میں نے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس کے چہرے پر ایک بے نام سا اطمینان جھلکنے لگا' پھر وہ مایا متی کے بارے میں کرید کرید کر پوچھنے لگی۔ میں نے اس کی تشفی کی خاطر بتایا کہ مایا متی کا تعلق بدھ مت سے تھا۔ وہ تبت کے سرحدی قصبے کوداری (KODARI) کی رہنے والی تھی اور کھٹمنڈو کے معروف ''ٹیکو اسپتال'' میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ یہاں کھٹمنڈو میں اس کی رہائش آرنیکو ہائی وے پر' اندرا چوک سن کوسی بازار میں تھی۔ مجھے اس کے گھر میں رہنے کا اتفاق بھی ہوا تھا۔

''تم نے بتایا ہے' مایا متی اب اس دنیا میں باقی نہیں۔'' لی یان کی کرید کا سلسلہ جاری رہا ''اس کی موت کیسے واقع ہوئی تھی؟''

''اسے میری دوستی نے مار ڈالا۔'' میں نے بوجھل آواز میں کہا ''میں جہاں بھی جاتا ہوں' اپنے تعاقب میں دشمنوں کی ایک فوج کو بھی لے جاتا ہوں چنانچہ مجھ سے دوستی رکھنے والے خاصے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں کھٹمنڈو میں اور نیپال کے دیگر علاقوں میں ناگ پال اور اس کے غنڈوں

سے میری طویل معرکہ آرائی رہی تھی۔ وہ بھی اسی چپقلش کی بھینٹ چڑھ گئی۔“

لی یان کافی دیر تک خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر عام سے لہجے میں بولی ”وجدان! ذرا سوچ کر بتاؤ‘ تمھیں دوست بنانے میں زیادہ وقت لگتا ہے یا دشمن بنانے میں؟“

”تم بھی پچھلے کچھ عرصے سے میرے ساتھ ہو!“ میں نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے استفسار کر ڈالا ”تم نے میری دوستیوں اور دشمنیوں کو بنتے اور بگڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟“

”میرا خیال ہے‘ تم دوست زیادہ آسانی سے بنا لیتے ہو۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”بلکہ تمھیں تو دشمنوں کو بھی دوست بنانے کا فن آتا ہے۔ میں اس سلسلے میں تازہ ترین مثال پیش کرسکتی ہوں۔“

لی یان کے آخری جملے نے مجھے کھٹکنے پر مجبور کردیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی شرارت کے موڈ میں ہو۔ میں نے اس کی شریر سوچ کو بے نقاب کرنے کے لیے سادگی سے کہا ”ہاں‘ وہ تازہ ترین مثال کیا اور کس کی ہے؟“

”بھئی‘ میں کلاڈیا کی بات کر رہی ہوں۔“ اس کے لبوں پر تبسم کھیلنے لگا۔

تو ثابت ہوگیا‘ میرا کھٹکنا بے سبب نہیں تھا۔ وہ کلاڈیا کے حوالے سے مجھے ”کہنی“ مارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ میں مزید انجان بن گیا اور بڑی شرافت سے اپنی ”پسلی“ پیش کرتے ہوئے کہا ”ہاں‘ تو کیا ہوا تھا کلاڈیا کو؟“

”یہ بھی میں ہی بتاؤں؟“ وہ تیز نظر سے مجھے گھورنے لگی۔

”اور کون بتائے گا؟“ میں نے کہا ”یہ ذکر کس نے نکالا ہے!“

وہ اچانک پٹری بدلتے ہوئے بولی ”سیدھی سی بات ہے۔ کلاڈیا ایک خطرناک دشمن کی حیثیت سے تمہارے سامنے آئی اور اس نے شیوالی اسٹریٹ والے بنگلے پر اپنی بھرپور دشمنی کا ثبوت بھی دیا لیکن جب ہم بڑے ہال میں مورچے لگائے بیٹھے تھے تو تم نے کلاڈیا کی دشمنی کو دوستی میں بدل دیا۔ وہ تمہاری ایسی فرماں بردار دوست بن گئی کہ تمہارے اشاروں پہ ناچنے لگی۔ تم نے کہا ”خاموش! میں آواز نہیں سنوں......اور وہ واقعی خاموش ہوگئی؟“

میں لی یان کی چھیڑ خانی کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ اس کی بات کے اختتام پر میں نے بھی ایک داؤ مار دیا ”لی یان! میں نے تو لمحاتی اور عارضی طور پر کلاڈیا کو خاموش کیا تھا مگر تم نے میری تازہ بہ تازہ دوست کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا؟“

”کیا تمھیں کلاڈیا کی موت کا دکھ ہو رہا ہے؟“

”میرا خیال ہے‘ حسین اور دلکش چیزوں کے فنا ہونے کا سب کو دکھ ہونا چاہیے۔“

میرے منہ سے کلاڈیا کی تعریف لی یان کو اچھی نہ لگی‘ جلدی سے بولی ”ہاں‘ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

میں نے کہا ”ویسے تو اپنے اپنے خیال اور محسوسات کی بات ہے لیکن میرے نزدیک ایک سچے آرٹسٹ کو خوددار اور حسن پرست ہونا چاہیے۔ ہم دونوں مارشل آرٹسٹ ہیں۔ کیا تم میرے خیالات کی نفی کرتی ہو؟“

میں نے اس سے خاصا مشکل سوال کر ڈالا تھا لیکن وہ جواب دینے کے مرحلے سے بچ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ زبان کھولتی‘ میرے سیل کا بزر بج اٹھا۔

میں نے سیل کو فوراً ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس کے ڈسپلے پر کاشانوک کا نمبر فلیش کر رہا تھا۔ میں نے یس کا بٹن پریس کرنے کے بعد سیل کو کان سے لگا لیا اور کہا ”ہیلو!“

”ہیلو وجدان!“ کاشانوک کی مانوس آواز میری سماعت میں سرسرائی ”میں اس وقت لمبی چوڑی بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ کیا تم فوری طور پر اس بنگلے میں آسکتے ہو؟“

کاشانوک کے انداز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”آخر ہوا کیا ہے؟“

”مجھے بڑی پکی خبر ملی ہے کہ آج رات دس بجے اس بنگلے پر تمہارے سلسلے میں ایک خفیہ ہنگامی اجلاس ہونے والا ہے۔“ کاشانوک نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ”اس ایمرجنسی میٹنگ میں جوگندر پال کے علاوہ چند اسرائیلی معزز افراد بھی شرکت کریں گے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جو بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں ہونے والی مذموم کارروائیوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ ملوث رہے ہیں۔ میں انہیں آج ہی فنا کے گھاٹ اتارنا چاہتا ہوں اور اس نیک کام کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

جو لوگ ربی موشے ہائمن کے ایما پر بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں کسی بھی قسم کی تخریبی کارروائی میں شامل رہے تھے‘ وہ براہِ راست میرے بھی دشمن تھے کیونکہ پچھلے چند دنوں میں انسانی خون کے زیاں سے یہاں جو کھیل کھیلا جا رہا تھا اس میں میری ساحل کو ایک مہرے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ مجھے اس بات کا بڑا قلق تھا اور یہ قلق

میری روح میں کسی پھانس کے مانند پیوست تھا۔ ان تمام ”ذمے دار“ افراد کو سزا دینا میرا فرض بنتا تھا۔ اس طرح ربی کا کچھ نہ کچھ قرض ”چکتا“ کیا جاسکتا تھا۔ اس سنگین خیال نے میرے وجود میں سنسنی سی دوڑا دی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کاشانوک سے پوچھا۔

”تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو؟“

”ہر قسم کی!“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔

”ٹھیک ہے‘ میں آرہا ہوں۔“ میرے لہجے میں بھی قطعیت شامل ہوگئی۔

”ایک کام کرتے آنا۔“ اس نے اضطراری انداز میں کہا ”میری کپڑوں والی الماری کے زیریں حصے میں دھماکا خیز مواد کی اچھی خاصی مقدار موجود ہے۔ وہ بھی اپنے ساتھ لے آنا۔ اسی خانے میں آتشیں اسلحہ بھی رکھا ہوا ہے۔ اس میں سے اگر کسی ہتھیار کی ضرورت محسوس کرو تو اپنے پاس رکھ لینا۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس سلسلے میں‘ میں نے ڈاکٹر مونگ سے بھی بات کرلی ہے۔ وہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا فیور کر رہا ہے۔ یہودیوں نے ہماری عبادت گاہ کے تقدس کو پامال کرکے جس طرح درجنوں افراد کا خون بہایا ہے‘ اس کے لیے انہیں سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور یہ موقع اس کام کے لیے انتہائی موزوں ہے۔“

پھر وہ مجھے الماری کے خفیہ خانے کو کھولنے کے لیے خصوصی ہدایات دینے لگا۔ میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور کہا ”تم فکر نہ کرو۔ میں وہ میٹنگ شروع ہونے سے پہلے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اس وقت رات کے نو بجے ہیں۔ ہمارے پاس پورا ایک گھنٹا پڑا ہے۔ بتاؤ‘ میں کہاں آکر تم سے ملوں؟“

”میری ڈیوٹی بنگلے کے عقبی حصے میں لگائی گئی ہے۔ میرے علاوہ ایک اور شخص بھی وہیں متعین ہے لیکن مجھے یہ سہولت حاصل ہے کہ بوقتِ ضرورت میں بنگلے کے اندر بھی آجا سکتا ہوں۔ میں نے اپنے سیل کو سائلنٹ الرٹ پر لگا رکھا ہے اور اس کی جملہ گھنٹیوں کو بھی آف کر دیا ہے۔ تم بنگلے کی عقبی سمت میں پہنچ کر مجھے بیل مار دینا پھر میں تم سے ضروری سامان لینے اور تمھیں اندر پہنچانے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لوں گا۔“

ایک لمحے کو رک کر اس نے مجھے بنگلے کی لوکیشن بتائی ”بنگلا نمبر آر۔ ٹوزیرداروڑا کا میج اور سینٹرل امیگریشن آفس کے درمیان واقع ہے۔ اس کی پشت شمالی سمت میں‘ دلی بازار کی طرف پڑے گی۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”ٹھیک ہے‘ میں آرہا ہوں۔“

سیلولر رابطہ ختم ہوا تو مجھے لی یان کے سامنے حالات کی وضاحت کرنا پڑی۔

وہ حتمی لہجے میں بولی ”وجدان! میں تمھیں اکیلے نہیں جانے دوں گی۔“

”تمہارا وہاں کوئی کام نہیں ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”تم ادھر ہی آرام کرو‘ میں بہت جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

”نہیں وجدان!“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے رات والی ضد پر اتر آئی ”یا تو میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی یا پھر تم بھی ادھر ہی رہو گے۔“

میں نے کہا ”لی یان! صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرو!“

”سمجھنے کے بعد ہی تو کہہ رہی ہوں۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

لی یان مجھے بدلی بدلی سی نظر آئی۔ بولڈ اور بے باک تو وہ پہلے بھی تھی۔ امریکی معاشرت انسان کو اور کچھ دے یا نہ دے لیکن بولڈنیس اور بے باکی ضرور دیتی ہے مگر گزشتہ رات کے تجربے کے بعد سے میں اس میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا انداز جل ککڑی کا سا ہوگیا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے وہ میرے کندھوں پر سوار ہو۔

یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں بحث میں پڑ کر وقت برباد کرتا۔ جب وہ کسی بھی طور سمجھنے میں نہ آئی تو میں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

کاشانوک نے اپنی الماری میں سے دھماکا خیز مواد لانے کو کہا تھا۔ میں نے دیوار گیر چوبی الماری کو کھول لیا پھر اس کی ہدایت کے مطابق زیریں دراز کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ دراز والا ہاف باکس نما چوکھٹا پوری طرح باہر نکل آیا تو اس کے نیچے مجھے وہ خفیہ خانہ نظر آگیا جس کا ذکر کاشانوک نے کیا تھا۔ میں نے اس کی بتائی ہوئی ٹیکنیک استعمال کرکے مذکورہ خفیہ خانے کو کھول لیا۔

اس خانے کے اندر چھوٹے بڑے ہر قسم کے آتشیں ہتھیار موجود تھے۔ میں نے ایک خوب صورت پسٹل کا انتخاب کرلیا۔ لی یان کے پاس جانوس جہنم مکانی کا فراہم کردہ ننھا سا لیڈی پسٹل موجود تھا۔ اس خانے میں آتشیں

ہتھیاروں کے علاوہ وافر تعداد اور مقدار میں آتش گیر دھماکا خیز مواد بھی موجود تھا۔ جس میں ٹائم بم، ہینڈ گرینیڈ، ڈائنا مائٹ اور بارودی سرنگیں شامل تھیں۔ میں نے حالات اور موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے بارودی سرنگوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور کاشانوک کی فرمائش پوری کرتے ہوئے ٹائم بم، ڈائنا مائٹ اور ہینڈ گرینیڈ کی بھاری مقدار اس بیگ میں بھر لی جس میں آج صبح کاشانوک ہمارا سامان لے کر آیا تھا۔ اس خطرناک اسلحے کو محفوظ کرنے کے لیے میں نے بیگ میں اوپر سے نیچے تک اپنے اور لی یان کے میلے کپڑوں کی ایک دبیز تہ لگا دی۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم گرم لباس میں ملبوس ہو کر پوری تیاری کے ساتھ گھر سے نکل پڑے۔ ہماری اس ہنگامی روانگی پر فلو جی نے حیرت کا اظہار کیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ ہم اس کے صاحب کے بلانے پر اس کے پاس جا رہے ہیں اور جلد ہی تینوں واپس آ جائیں گے تو وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔

ہم پیدل چلتے ہوئے بودھ ناتھ ویلی سے باہر آ گئے پھر مین روڈ پر آتے ہی ہمیں ایک ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی والے سے میں نے دلی بازار چلنے کو کہا اور ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔

ٹیکسی میں سفر کے دوران میں میرے اور لی یان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں زیادہ تر کھڑکی سے باہر ہی دیکھتا رہا۔ رات زیادہ نہیں بھیگی تھی۔ تاہم موسم کی شدت نے لوگوں کو گھروں کے اندر بند رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سڑکوں اور بازاروں کی وہ رونق کہیں نظر نہیں آ رہی تھی جو دن میں دیکھنے کو ملتی تھی۔

ہماری ٹیکسی تاراگون ہوٹل کے پاس سے گزری۔ ہوٹل کے نیون سائن نے ٹھٹھرتی ہوئی رات میں زندگی اور تابندگی کا یقین دلایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم رنگ روڈ پر تھے۔ کھٹمنڈو میں کہیں سے کہیں بھی جائیں گا ہے بہ گاہے رنگ روڈ سے ضرور واسطہ پڑتا ہے۔ اس سڑک نے کسی بیلٹ کی طرح پورے کھٹمنڈو کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

گوسالا کے قریب سے ہم نے رنگ روڈ کو چھوڑ دیا اور داور کا ویلیج کامیج کے پاس سے گزرتے ہوئے بانیسور کے علاقے میں پہنچ گئے۔ چند لمحات کے بعد پورس ریسٹورنٹ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہماری ٹیکسی نے دریائے دھوبی کھولا کو عبور کیا پھر کچھ ہی دیر بعد ہم رشین ایمبیسی اور اروڑا کامیج کے درمیان سے گزر کر سیدھے دلی بازار پہنچ گئے۔

دلی بازار میں ہم نے ٹیکسی والے کو فارغ کر دیا اور پیدل ہی اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے رات ہم بنگلا نمبر آر۔ ٹوئنٹی کے پچھواڑے موجود تھے۔

میں نے جینز کی جیب میں سے سیل نکالا اور کاشانوک کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

☆☆☆

چی لوشے جائمن المعروف بہ ربی موشے ہائمن کے اشارۂ ابرو پر نیپال کی دھرتی نے پچھلے چند دنوں میں مجھے ان گنت صدمات سے دوچار کیا تھا۔ ماضی میں ناگ پال نے مجھے اسی سرزمین پر تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ میں نے ناگ پال اور اس کے چھوں کا جو عبرتناک حشر کیا تھا اس کا احوال آپ اس داستان کے ابتدائی حصے میں پڑھ چکے ہیں۔ اب ربی کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیوں کا نمبر تھا۔ میں انہیں ایسے زخم دینا چاہتا تھا جنہیں وہ زندگی بھر چاٹتے رہیں اور ان زخموں کی تپش ربی تک بھی پہنچتی رہے۔

میرے فون کے ٹھیک دس منٹ بعد کاشانوک ہمارے پاس موجود تھا۔ وہ میرے ساتھ لی یان کو دیکھ کر چونکا تاہم اس نے کوئی تبصرہ یا اعتراض نہیں کیا۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم نے دس پندرہ منٹ کے اندر ہی تمام امور نمٹانا ہیں۔ میں واپس اندر جا رہا ہوں۔ وہاں کے حالات کو سازگار بنانے کے بعد میں تمہیں بیل دوں گا۔ اس کے بعد تم بنگلے کی عقبی دیوار...... کود جانا۔ باقی معاملات میں خود سنبھال لوں گا۔''

''مشن کی تکمیل کے بعد واپسی کے بارے میں بھی تم نے کچھ پلان کر رکھا ہے یا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے بتایا ''دو بنگلے چھوڑ کر سامنے والی طرف اروڑا کامیج کے قریب میری ٹیکسی کھڑی ہے۔ وہی ٹیکسی جس میں تم دونوں کو میں نے شیوالی اسٹریٹ سے بودھ ناتھ ویلی پہنچایا تھا۔''

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات تیرھویں (آخری) حصے میں
ملاحظہ فرمائیں جو کہ اس کے ساتھ ہی شائع کر رہا ہے

سوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
حصہ 9

آتش فشاں

راوی: وجدان علی
تحریر: حُسام بٹ

اس کا نام وجدان رکھا گیا مگر زمانے کی سختیوں اور حالات کی چیرہ دستیوں نے اُسے آتش فشاں بنادیا۔ اس کے سینے میں ایک قبرستان آباد تھا۔ وہ اپنے دُشمنوں کو خوب جانتا تھا اور اُنہیں ''انصاف'' کے ترازو میں تولنے کا خواہاں تھا۔ یہی خواہش اُسے ایک ایسی تربیت گاہ میں لے گئی جہاں پہنچ کر اُس کی دنیا ہی بدل گئی۔ شاؤلن ٹیمپل میں فنونِ حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اُس گوشت و پوست کے انسان میں پارا بھر کر اُسے آتش و آہن کا ایک بے مثال شاہ کار بنادیا۔ اُس کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساس اور ہاتھ پائوں کسی برقی مشین سے زیادہ فعال ہوگئے۔ وہ ایک ایسے طوفان کا رُوپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی، تلواروں کی جھنکار اور چیتے کی للکار تھی۔ پھر وہ اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہوا اور اُنہیں حرفِ غلط کی طرح مٹاتا چلا گیا۔

ظلم و جبر کی فضا میں سانس لینے والے ایک سراپا انتقام چھلنی کلیجا شخص کی لرزہ خیز داستان

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کون سا راگ سنا رہا ہوں۔ میں جہانگیر کو دانستہ اس الگ تھلگ کمرے میں لے آیا تھا۔ شہزاد کے سامنے شعیب غوری اور اس کی تنظیم ''سی ایف کے'' کے بارے میں اچھی خاصی گفتگو ہو چکی تھی۔

جہانگیر کو تو میں نے فواد کی دائمی زبان بندی کا مشورہ دے دیا تھا لیکن میں اپنے ساتھی پر یہ فارمولا ہرگز نہیں آزما سکتا تھا تاہم اتنا میں ضرور کرسکتا تھا کہ وہ میرے اور ''سی ایف کے'' کے باہمی معاملات سے کم از کم واقف ہو۔

جہانگیر نے تامل کرتے ہوئے کہا ''تم مجھے زندہ کیوں رکھنا چاہتے ہو؟''

''تا کہ تم ''سی ایف کے'' کے اندر رہتے ہوئے میرے لیے کام کرسکو!''

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی ''اس کا مطلب ہے، تم پہلے ہی سے بگ باس کی طرف سے خاصے بدگمان ہو؟''

''ہاں، مجھے شروع ہی سے اس کی نیت پر شک رہا ہے۔'' میں نے واشگاف جھوٹ بولا اور یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے دل کو ایک ٹھیس پہنچی کیوں کہ درحقیقت میں شعیب غوری کو اپنا سچا اور مخلص دوست سمجھتا آیا تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''میں بس موقع کی تلاش میں تھا کہ اس کے خلاف مجھے پکا ثبوت مل جائے تا کہ میں کوئی انتقامی کارروائی کرسکوں۔'' میں چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر اس سے پوچھا ''تمہارے خیال میں شعیب غوری نے امتیاز علی اور روبی کو کیوں قتل کروایا تھا؟ امتیاز تو اس کی آنکھ کا تارا تھا، وہ اس پر بہت بھروسا کرتا تھا۔''

''شعیب غوری کے نزدیک آنکھ کا تارا اور جوتے کا مارا کی کوئی حیثیت واہمیت نہیں۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا ''وہ جس تیزی سے کسی ورکر کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے اسی تندی سے وہ اسے اپنے قدموں میں بھی پٹخ سکتا ہے۔ وہ امتیاز دراصل تم سے بہت زیادہ کلوز ہوگیا تھا۔ وہ تم سے اپنے دل اور دماغ کی ہر بات کہنے لگا تھا۔ شعیب غوری کا خدشہ تھا کہ کہیں وہ اہم تنظیمی راز بھی تمہاری طرف منتقل نہ کر دے۔ امتیاز کو اس طرح ختم کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک حادثہ معلوم ہو......اور پھر ایسا ہی ہوا۔ روبی اور میر بخش، امتیاز کے ساتھ گھن کی حیثیت سے پس گئے۔''

جہانگیر کی باتیں میری رگوں میں آگ لگا رہی تھیں۔ وہ شعیب غوری کے ایک ایسے چہرے کو اجاگر کر رہا تھا جو انتہائی قبیح اور مکروہ تھا۔ میں وہ چہرہ دیکھنے کا روادار نہیں تھا کیوں کہ

میں نے ہمیشہ اس کا مخلصانہ اور دوستانہ چہرہ ہی دیکھا تھا۔

میں نے جہانگیر کی باتوں پر صد فیصد یقین نہیں کیا البتہ شک کا سیاہ ناگ میرے ذہن میں پھن پھیلا چکا تھا۔ میں نے اپنے اندر کی ایک الجھن کی خاطر جہانگیر سے پوچھا۔

''بوٹ بیسن والے واقعے سے بہت سے عوامل وضاحت طلب ہیں۔ تم ان کی کیا توجیہ پیش کرو گے؟''

''مثلاً کون سے عوامل؟'' وہ اپنی زخمی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا ''اس رات تم دونوں خالی کلاشنکوفز کے بل پر ہمیں گھیرنے کیوں پہنچے تھے اور پھر ہماری کارروائی پر موقع سے فرار کیوں ہو گئے تھے؟ دوسری بات یہ کہ جب وہاں پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز پہنچی تو گرے پجارو سڑک پر جوں کی توں کیوں کھڑی رہی۔ تم دونوں تو جیپ کے عقبی حصے سے برآمد ہوئے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ پولیس کا سائرن سن کر وہ وہاں سے فرار کیوں نہ ہوگیا۔''

''تم دونوں'' سے میری مراد جہانگیر اور فواد نہیں تھی بلکہ جہانگیر اور اس کا دوسرا گن بردار ساتھی تھا جو گرے پجارو میں تعاقب کرتے ہوئے بوٹ بیسن تک پہنچے تھے۔ اگر اس کا دوسرا ساتھی فواد ہوتا تو میں پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیتا۔

جہانگیر نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ''وہ سب ایک ڈراما تھا۔ تمہارا ذہن بنانے کے لیے ایک کھیل رچایا گیا تھا۔ اس تعاقب اور پھر بوٹ بیسن والے واقعے کا صرف یہ مقصد تھا کہ تمہیں باور کرایا جائے کہ دشمن ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے تاکہ بعد میں جب امتیاز علی وغیرہ کی موت کی خبر تم تک پہنچے تو تم واقعات کے تسلسل کو آپس میں منسلک کرسکو۔ وہ تو تمہاری بروقت چالاکی بلکہ اس خبیث جانور کی کمینی حرکت سے پاسا پلٹ گیا اور ہماری خالی گنوں کا راز تم پر کھل گیا ورنہ ہمارا پروگرام تو یہی تھا کہ وہاں تمہارے ساتھ چند ڈائیلاگ ہوں گے۔ اسی دوران میں پولیس جیپ کا سائرن سنائی دے گا اور ہم اپنی پجارو میں بیٹھ کر اس موقع سے فرار ہو جائیں گے جیسے پولیس کی آمد نے ہمیں بھاگنے پر مجبور کر دیا ہو۔''

''تو گویا، وہ پولیس جیپ اور اس کا سائرن بھی اس ڈرامے کا ہی حصہ تھا؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا ''ہاں، اس گاڑی میں ہمارے ہی ساتھی تھے۔''

جہانگیر کے انکشاف نے جہاں میرے ذہن کی بہت سی الجھنوں کو سلجھا دیا تھا۔ وہیں شعیب غوری اور ''سی ایف کے'' کے معاملے میں میری سوچ کو بہت پراگندہ کر دیا تھا۔ اب تک شعیب نے میرے ساتھ کوئی ایسا رویہ نہیں اپنایا تھا جس سے مجھے کوئی شکایت پیدا ہوئی بلکہ اس نے قدم قدم پر میری بھرپور مدد کی تھی۔ ساحل سمندر والا لگژری فلیٹ، چمچاتی نیلی شیرڈ اس کا تحفہ تھی۔ اس نے سنگاپور سے آنے والی میری کثیر رقم کو بہت ایمانداری اور خوش اسلوبی سے میرے بینک اکاؤنٹس تک پہنچایا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کثیر المالیت سونے کی بازیابی کے لیے ایک ناقابلِ فراموش اور اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ اس نے آج رات کو اس سلسلے میں مجھے بہت بڑی خوش خبری سنائی تھی۔ سونے والے معاملے پر آ کر میری سوچ مسٹر نیل آرمر کی جانب مڑ گئی۔ سونے کی بازیافت اسی کی نگرانی میں عمل میں آئی تھی اور اب وہی شخص اس سونے کو ٹھکانے لگانے والا تھا۔

نیل آرمر کے بارے میں سوچنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہودی النسل تھا۔ انگلینڈ کا ایک ارب پتی سرمایہ دار بزنس مین۔ وہ گولڈ اکاؤنٹ بینک کا مالک تھا اور ہیروں کے بیوپار میں اسے یورپ کا بے تاج بادشاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہی نیل آرمر شعیب غوری کا گہرا دوست تھا اور اکثر و بیشتر اس سے ملنے کراچی آتا رہتا تھا۔ شعیب غوری ''سی ایف کے'' کا بگ باس تھا اور ایک یورپی یہودی سے اس کا ربط ضبط اسی حقیقت کو سوچنے پر مجبور کرتا تھا جو تحقیق منہاس باقر نے اب تک فرمائی تھی۔ یہ عین ممکن تھا، شعیب غوری یہودی لابی ہی کا نمائندہ ہو اور ان کے مقاصد کے لیے کام کر رہا ہو!

میں فوری طور پر شعیب غوری کے خلاف محاذ نہیں بنا سکتا تھا۔ مجھے ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ اگر وہ میرے عزائم سے آگاہ ہو جاتا تو پھر اس پر قابو پانا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ نہایت ہی کائیاں اور طاقتور شخص تھا۔ اسے بے خبر رکھ کر ہی شکار کیا جا سکتا تھا اور میں نے ایسا ضرور کرنا تھا! میں اپنے ملک کو نقصان پہنچتے اور اسے بدنام ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے، میری تمام عمر پاکستان سے باہر گزری تھی مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں پیدا تو اسی دھرتی پر ہوا تھا۔ یہ میرے اور میرے آباؤ اجداد کا ملک تھا، ان کی ملکیت تھا۔ کوئی اپنی پراپرٹی کو نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ انسان کو اتنا غیرت مند تو ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملک کی جانب اٹھنے والی اغیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکے!

یہ تمام خیالات مشکل سے پانچ سیکنڈ میں میرے ذہن

سے گزرے ہوں گے۔ ہاں، ذہن اتنا ہی تیز رفتار ہے۔ یہ پلک جھپکتے میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچتا ہے۔ اس کی پرواز، خیالات کے چپوار پر ہوتی ہے جن کی راہ میں کوئی سگنل یا ٹریفک جیم نہیں آتا۔ ان کا انجن فیل ہوتا ہے اور نہ ایندھن ختم ہوتا ہے۔ یہ اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں رہتے ہیں۔

جہانگیر کی آنکھوں سے اضطراب چھلک رہا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت رات کے...... یعنی صبح کے پونے چار بجے تھے۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''جہانگیر! میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مزید زندگی کے لیے تمہیں اپنے ساتھی فواد سے کس طرح ''نمٹنا'' ہے، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر اس کی بے ہوشی ہی میں کوئی کارروائی کر ڈالو تو اچھا ہے، تمہیں کہانی بنانے میں آسانی رہے گی۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا ''تم سے میں کس حد تک توقع رکھوں؟''

اس کے چہرے پر ایک چمک سی ابھری اور وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولا ''تم مجھ پر بھرپور اعتماد کر سکتے ہو۔ میں بظاہر ''سی ایف کے'' میں کرتا رہوں گا لیکن میں درپردہ تمہارا حکم مانوں گا۔''

''اگر تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا!''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا وجدان!'' وہ پُرجوش انداز میں بولا ''تم نے اختیار اور موقع رکھتے ہوئے بھی میری جان بخشی کی ہے، میں تمہیں دھوکا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ زندگی اب تمہاری امانت ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو تم پر نثار کر دوں گا۔''

وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس کی آواز کی لرزش بتا رہی تھی، وہ کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے اس موقع پر ایک مستند فارمولے پر عمل کیا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا...... مارنے سے ڈرانا زیادہ بہتر ہوتا ہے اور موت دکھا کر بیماری پر راضی کر لینا چاہیے۔ میں نے جہانگیر کو ڈرا کر اپنا بیمار بنا لیا تھا۔ مجھے امید تھی، وہ زندگی کی آخری سانس تک وفاداری نبھاتا رہے گا۔

اگر میں چاہتا تو اسے فوراً ختم کر کے اپنے ساتھیوں کی بہیمانہ موت کا انتقام لے سکتا تھا لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا؟ صرف یہ کہ میرے انتقامی جذبے کی تسکین ہو جاتی مگر اسے زندہ اور اپنا اسیر بنا کر چھوڑ دینے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ ''سی ایف کے'' میں اس کی موجودگی کے باعث میں اس تنظیم کی جڑوں کو کھوکھلا کر سکتا تھا۔ گویا، یہودی لابی کو بے بہا نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس طرح میرا ملک بڑے نقصان

سب رنگ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونیوالا سلسلہ

اقابلا

تاریک برِاعظم کے پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے جادو اور سفلی کے مقابلے برملا ہوتے تھے۔ وحشی قبائل اور ان کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابلِ یقین سرگزشت...... ان تاریک اور گمنام جزیروں کی کہانی......

اقابلا

وحشی قبیلوں کی ایک سرکش حسینہ جس کا حسن لازوال تھا جس کے حصول کیلئے موت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا...... خون کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز واقعات جسے سمندر کی سرکش موجوں نے اٹھا کر اقابلا کے دیس میں اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

کتابی شکل میں پہلی بار منظرِ عام پر آ گئی ہے

قیمت فی حصہ 60 روپے ●●●● ڈاک خرچ 23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802551-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کے لئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

اور بدنامی سے بچ جاتا۔ ذاتی مقاصد کو وطن عزیز کی بقا اور نیک نامی پر کبھی ترجیح نہیں دینا چاہیے۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایک گھنٹی اندرونی کمرے میں بھی بجی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا، اس فون کی ایک ایکسٹینشن اندر بھی موجود تھی۔ میں نے جہانگیر کو رکنے کا اشارہ کیا اور اندر بیڈ روم میں جا کر فواد کو فون ریسیو کرنے سے منع کر دیا۔ میں واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو تیسری گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے جہانگیر سے کہا۔

''تم نارمل انداز میں فون اٹینڈ کرو۔ یہ تمہارے لیے ایک ٹیسٹ کیس بھی ہے۔''

چوتھی گھنٹی پر اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور نہایت ہی معتدل لہجے میں اس نے ماؤتھ پیس میں کہا ''ہیلو!''

اس نے دوسری جانب کی آواز سنی اور بولا ''ہاں، میں جہانگیر بات کر رہا ہوں۔ یہاں کے تمام انتظامات تسلی بخش ہیں۔''

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ یقیناً دوسری طرف بولنے والے کی بات سن رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے متحمل آواز میں کہا ''آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ انشاءاللہ یہ آپریشن نہایت کامیاب رہے گا۔''

پھر وہ ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا ''ٹیسٹ کیس کی رپورٹ کیا ہے جہانگیر؟''

وہ بے انتہا سنجیدہ نظر آنے لگا پھر اس نے جواب دیا ''وجدان! اچھا ہوا، یہ ٹیسٹ اس موقع پر سامنے آ گیا اس طرح مجھے تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس ٹیسٹ رپورٹ سے تم میری وفاداری کا یقین کر لو گے۔''

''اسی لیے تو میں نے رپورٹ کے بارے میں سوال کیا ہے!'' میں نے کہا۔

''میں تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں وجدان۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا پھر اس نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں ایک خوفناک انکشاف کیا۔ میں حیرت آمیز انداز میں اسے سن رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا، وہ بہت ہی خوفناک اور تباہ کن تھا۔ میرے دل و دماغ میں ''سی ایف کے'' کے لیے غم و غصے کی ایک لہر بلند ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ماؤنٹ ایورسٹ کی شکل اختیار کر لی۔ جہانگیر نے بتایا کہ کل...... یعنی آنے والی صبح دس بجے ایک یورپی ملک کا سفیر کراچی پہنچ رہا ہے (بہ وجوہ ملک کا نام ظاہر نہیں کیا جا رہا)۔

جم براؤن نامی وہ سفیر ائیر پورٹ سے سیدھا ہوٹل پہنچے گا اور اس سفر کے دوران میں اسے زیادہ تر شاہراہِ فیصل سے گزرنا ہو گا۔ مذکورہ یورپی ملک پاکستان کے لیے خیر سگالی اور ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں مگر یہودی لابی کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انہوں نے ''سی ایف کے'' کے ذریعے پاکستان اور اس ملک کی دوستی کو کھٹائی میں ڈالنے کا خطرناک پروگرام بنایا ہے۔

''کیسا پروگرام؟'' میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

جہانگیر نے بتایا ''جم براؤن نامی اس یورپی سفیر کو ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ یہ سیدھی سادی دہشت گردی کی ایک واردات ہو گی۔ یہودی پہلے ہی پاکستان کو دنیا میں دہشت گرد نمبر ون ملک گردانتے ہیں۔ اس واردات کے بعد ان کے موقف کو مزید توانائی ملے گی اور مذکورہ دونوں ملکوں کے باہمی دوستانہ تعلقات پر جو اثرات مرتب ہوں گے، اس کا اندازہ تم خود لگا سکتے ہو!''

میں بخوبی اندازہ لگا چکا تھا۔ میں اس وقت اپنے وجود میں ایک سنسنی خیز کرنٹ سا دوڑتا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے تشویش ناک نظر سے اسے دیکھا اور الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''میں نے سفیروں اور وزیروں یا دوسری ''وی وی آئی پی'' شخصیات کو ہوٹل سے ائیر پورٹ یا ائیر پورٹ سے کسی سرکاری رہائش گاہ کی طرف متعدد بار آتے جاتے دیکھا ہے۔ پاکستان میں تو ان لوگوں کی حفاظت کا بڑا تسلی بخش بندوبست کیا جاتا ہے۔ میلوں تک ٹریفک کو روک کر ان کے لیے روڈ خالی کر دیا جاتا ہے پھر پروٹوکول کی تمام گاڑیاں بشمول مہمان کی گاڑی، ایک سو ساٹھ کی اسپیڈ سے بھی اوپر دوڑتی ہے۔ اس محفوظ ترین صورتِ حالات میں کسی کو قتل کرنا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے!''

''سی ایف کے کا پلیٹ فارم ناممکن کو ممکن بنانا جانتا ہے۔'' وہ اسی سنجیدگی سے بولا ''تم دیکھنا، یہ ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔''

''ون سکسٹی سے اوپر والی گاڑی کو کس طرح نشانہ بنایا جا سکتا ہے؟'' میں نے متعجب انداز میں اسے دیکھا۔

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا ''مصنوعی ایمرجنسی کی صورتِ حال پیدا کر کے گاڑی کی اسپیڈ کو کم کیا جا سکتا ہے، ائیر پورٹ سے نکلتے وقت یا پھر ہوٹل میں داخلے کے وقت بھی تو جم براؤن کو نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔''

''جم براؤن کے قتل کے لیے مقام کا انتخاب تو ہو چکا ہو گا؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا ''ہاں، اس آپریشن میں مقام کا انتخاب سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ جم براؤن کے لیے نرسری کا ایک انتہائی حساس حصہ چُنا گیا ہے۔ اس مقام پر مصنوعی ایمرجنسی پیدا کر کے غیر ملکی مہمان کو شکار کیا جائے گا۔''

میں نے بے یقینی سے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا ''اس مصنوعی ایمرجنسی کی نوعیت کیا ہو گی؟''

''اس معاملے سے مجھے بے خبر رکھا گیا ہے۔''

''پھر تھوڑی دیر پہلے تم نے فون پر کسی کو کس بات کی تسلی دی ہے؟'' میں نے استفسار کیا ''تم نے کہا تھا، آپ بے فکر ہو جائیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ یہاں کے انتظامات تسلی بخش ہیں۔ انشاءاللہ یہ آپریشن ضرور کامیاب رہے گا۔'' میں نے ایک سانس میں متعدد سوالات کر ڈالے ''اور یہ تم نے بتایا ہی نہیں، فون پر تم کس سے بات کر رہے تھے؟''

وہ ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا ''یہ فون کال میرے باس سلیم واسطی کی طرف سے تھی۔ وہ ''ملیر'' کا کرتا دھرتا ہے۔ آج کل میں اسی کے اسٹاف میں شامل ہوں۔ سلیم واسطی نے جن انتظامات کی رپورٹ مجھ سے مانگی تھی ان کا تعلق سراسر اس فلیٹ سے ہے۔ نرسری والا آپریشن ''ساؤتھ'' کی زیرِ نگرانی میں ہو گا اور قاتلوں کو تحفظ ہم فراہم کریں گے۔ واردات کے بعد، ایک طے شدہ پروگرام کے مطابق مختلف مراحل سے گزر کر وہ افراد اس فلیٹ پر پہنچیں گے اور کچھ دنوں تک وہ یہاں روپوش رہیں گے۔ میں نے باس کو یہاں کے انتظامات کے بارے میں بتایا ہے۔''

میں نے چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے جہانگیر کا جائزہ لیا پھر حتمی لہجے میں کہا ''ابھی تم نے مجھے جو خطرناک معلومات فراہم کی ہیں یہ تمہارے ٹیسٹ کی ابتدائی رپورٹ ہے۔ اس کو فائنل رپورٹ ہی سے چیک کیا جائے گا۔''

''فائنل رپورٹ!'' اس نے چونکے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''اگر کل دس بجے تمہارے کہنے کے مطابق جم براؤن پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے تو مجھے یقین آ جائے گا، تم مجھ سے واقعی مخلص ہو اور تم نے مجھے بالکل درست معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ ہو گی فائنل رپورٹ جو اس ابتدائی رپوٹ کو ٹیلی کرے گی۔''

اس نے کہا ''میں نے تو خلوص نیت سے تمہیں سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔ آگے جو بھی ہو لیکن میں محسوس کر رہا ہوں۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''اب شاید ایسا نہ ہو سکے۔ تم جم براؤن کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرو گے۔''

''تم بالکل درست اندازہ لگا رہے ہو۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ''میں اس غیر ملکی سفیر کو بچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے تمہارے بیان کو چیک کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ میں یہ جان لوں گا کہ تمہارے مطابق نرسری کے اس حساس مقام پر قاتل موجود تھے یا نہیں۔ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ بس اس مقام کی درست نشان دہی کر دو۔''

اس نے میری فرمائش پوری نہیں کی اور معذوری ظاہر کرتے ہوئے بولا ''میں اس مقام سے واقف نہیں ہوں۔ میں جتنا جانتا تھا وہ تمہیں بتا چکا۔''

میں نے اس کی کم علمی اور معذوری کو مان لیا۔ اگر نرسری والا آپریشن ''ساؤتھ'' کی نگرانی میں ہو رہا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا، اس کی کمان کبیر شاہ کے ہاتھ میں ہو گی لیکن اس سلسلے میں شاہ جی سے کوئی سوال کرنا انتہائی خطرناک ہوتا۔ وہ کبھی بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا بلکہ سرے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کر دیتا اور اس کے ساتھ ہی وہ میری جانب سے محتاط ہو جاتا...... اور میں یہ کسی بھی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔ ''سی ایف کے'' کے جوڑوں میں بیٹھنا اور اس کی جڑوں میں بارود فٹ کرنے کے لیے ضروری تھا، ان کو میرے خیالات اور عزائم کی بھنک بھی نہ پڑے۔ اس سلسلے میں رازداری ہی کامیابی کی ضمانت تھی!

جہانگیر کے ساتھ میں ایک مضبوط گٹھ جوڑ کر چکا تھا۔ اس کی طرف سے لیکیج کا امکان نہیں تھا اور رہا میرا سوال تو میں اہم رازوں کی حفاظت کرنا جانتا تھا۔ البتہ منہاس باقر کو کسی حد تک اس معاملے میں شیئر کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس کا بندہ شہزاد علی ہمارے درمیان ہونے والی چیدہ چیدہ باتوں سے آگاہ ہو چکا تھا اس لیے یہ میری مجبوری تھی۔

میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے قبل جہانگیر سے کہا ''تمہاری گردن شدید زخمی ہے اور تمہارا ساتھی بے ہوش پڑا ہے۔ تمہارے باس نے پونے چار بجے فون کیا تھا۔ ان حقائق اور اعداد و شمار کو نظر میں رکھتے ہوئے کوئی زبردست اور قابلِ یقین کہانی گھڑ لو تا کہ تمہارے معاملات کو تنظیم شک کی نظر سے نہ دیکھے۔ تمہاری سلامتی اور بقا اسی میں ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''تم جو کہو گے، میں وہی کروں گا۔ میں نے تم سے وفاداری کا عہد کر لیا ہے لیکن میری تم سے ایک درخواست ہے!''

''کہو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''وجدان!'' وہ کرب انگیز لہجے میں بولا ''کسی طرح مجھے اس دلدل سے نکالو۔ میں گناہ اور جرائم کی زندگی گزارتے گزارتے تنگ آ گیا ہوں۔ تم چاہو تو مجھے اس راستے سے ہٹا سکتے ہو۔ میں اس راہ پر چلتے چلتے اتنی دور نکل آیا ہوں کہ از خود میری واپسی ممکن نہیں رہی، میں خود میں اتنی ہمت نہیں پاتا۔''

وہ ایک لمحے کے توقف سے نہایت سنجیدگی سے گویا ہوا ''یقین جانو، کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، میں ایک دیوانگی اور مجبوری کے عالم میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ میرا اندر، میرا ضمیر مسلسل ملامت کرتا رہتا ہے۔''

اس کے انداز میں دکھ ہی دکھ بھرا ہوا تھا۔ وہ مجھے اس وقت ایک بے بس اور بے کس، مجبور ولاچار بوڑھا نظر آیا جس کا اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہو۔ بری اور بھلی جیسی بھی گزری ہو، اس میں اس کی منشا شامل نہ ہو۔ اس نے زندگی کو نہیں بلکہ زندگی نے اسے گزارا ہو۔

جرائم کی دنیا اور مجرموں کو مجھ سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ میں نے اس ''کمر خمیدہ نحیف ونزار بوڑھے'' کے شانے پر ہاتھ رکھا اور حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

''جہانگیر! کوئی بھی انسان پیدائشی طور پر مجرم نہیں ہوتا۔ حالات اسے تاریک راہوں کی طرف لے جاتے ہیں اور زندگی کے کسی مرحلے پر اس کا ضمیر ضرور ملامت کرتا ہے۔ انسان کا اندرون اسے کچوکے لگاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، وہ غلط ہے مگر وہ پھر بھی کرتا چلا جاتا ہے۔''

''کیا تم مجھے اس تاریک راہ سے روشنی کی طرف واپس نہیں لا سکتے؟''

''لا سکتا ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے صدقِ دل سے کہا ''اور انشاءاللہ، ایسا بہت جلد ہوگا...... بلکہ ایسا ہو چکا ہے۔''

''کیا...... کیسے؟'' وہ روانی میں بول گیا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''آج سے ہم دوست ہیں۔'' پھر میں نے مصافحے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے کہا ''میں جتنی جلدی ممکن ہو سکا، تمہیں ''سی ایف کے'' سے نکال لوں گا۔ فی الحال تمہارا اس تنظیم میں رہنا ہم دونوں کے لیے سودمند ہے۔ تم اندر سے اور میں باہر سے اس تنظیم پر حملے کروں گا، نادیدہ حملے! اور ایک روز اس تنظیم کا ڈھانچا زمین بوس ہو جائے گا لیکن۔'' میں نے رک کر اس کی طرف دیکھا اور اضافہ کیا ''اگر ہم نے جلد بازی دکھائی تو کوئی نہ کوئی سنگین غلطی کر بیٹھیں گے جو ہمارے مقصد کے لیے نقصان دہ ہوگی۔ اتنی منظم اور مربوط تنظیم کو گہری پلاننگ ہی سے تباہ کیا جا سکتا ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان! ہمیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا۔''

''میں آج لاہور جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''چند روز بعد واپس آ جاؤں گا اور اس دوران میں بھی تم سے رابطہ رکھوں گا۔ تمہارا فون نمبر میں اپنے ذہن میں محفوظ کر رہا ہوں۔ تم نمبر دہراؤ۔''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں نے کہا ''میں شعیب غوری یا کبیر شاہ پر یہ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ ہم دونوں کس قسم کے عزائم باندھ چکے ہیں۔ میں پہلے کی طرح اس سے دوستی نبھاتا رہوں گا۔ تم بھی یہی کرنا۔ اپنے باس سلیم واسطی کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہونے دینا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے کہا ''تنظیم میں رہتے ہوئے تم مجھ سے کلوز ہونے کی کوشش بھی نہ کرنا!''

''میں امتیاز علی کا حشر دیکھ چکا ہوں۔'' وہ ایک جھرجھری لے کر بولا۔

''شعیب غوری اور اس کی تنظیم کا حشر اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا ''میں لاہور والے معاملات نمٹا آؤں، پھر اس کے خلاف بھرپور پلاننگ کریں گے۔''

اس نے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ میں نے اس سے معانقہ کیا اور ہم دونوں اس کمرے میں آ گئے جہاں شہزاد علی موجود تھا۔ وہ ہمیں اس انداز میں دیکھ کر چونکا تو میں نے کہا۔

''شہزاد! اب ہم واپس جائیں گے۔''

''اور یہ دونوں؟''

''ان کو تم بھول جاؤ۔''

اس نے پسٹل کو جیب میں رکھتے ہوئے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا ''میں تمہاری بات کو سمجھ نہیں سکا۔''

''راستے میں سب سمجھا دوں گا۔'' میں نے اسے رخصت ہونے کا اشارہ کیا۔

''ہم یہاں جس مقصد سے......''

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''...... آئے تھے، وہ پورا ہو چکا ہے شہزاد اس لیے اب ہمیں جلد از جلد یہاں سے پھوٹ لینا چاہیے۔''

شہزاد نے پہلے جہانگیر اور پھر فرش پر بے حس و حرکت

پڑے فواد کو دیکھا اور متذبذب قدموں سے میری تقلید کر دی۔

ہم اس اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر آ کر گرین ہائی روف میں بیٹھے تو میری رسٹ واچ چار دس کا وقت بتا رہی تھی۔ شہزاد کے چہرے پر بے جواب سوالات نے ایک جال سا بُن دیا تھا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

واپسی کے راستے میں پہلے پانچ منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ میں نے کوئی بات کی اور نہ ہی شہزاد منہ سے کچھ بولا۔ وہ ایک کائیاں اور سمجھ دار بندہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور مہارت ٹپکتی تھی۔ فلیٹ سے نکلتے وقت اس نے میرے انداز کو دیکھ کر محسوس کر لیا تھا کہ میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچ چکا ہوں اور اس نتیجے سے اسے آگاہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

اگرچہ اس کی اس سوچ میں حقیقت پنہاں تھی تاہم میں اسے زیادہ مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کو مسلسل خاموش دیکھ کر میں نے کہا ''تم گہری سوچ میں کیوں ڈوب گئے شہزاد؟''

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا ''جب انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کے جواب نہ ملیں تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

''تمہارا اشارہ حالیہ واقعات کی طرف تو نہیں؟''

''تم مجھ سے زیادہ سمجھ دار ہو!''

اس نے دانش مندی کی بات کی تھی۔ میں نے کہا ''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کو تیار ہوں۔ بتاؤ، تمہیں کون سی بات الجھا رہی ہے؟''

وہ سنجیدگی سے بولا ''فلیٹ سے رخصت ہونے سے قبل تم نے جس رویے کا مظاہرہ کیا ہے وہ میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔''

''مثلاً؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''مثلاً...... جہانگیر اور فواد کو یونہی چھوڑ دینا مناسب نہیں تھا۔'' اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے کہا ''وہ بعد میں ہمارے خلاف کوئی بھی کارروائی کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا ''تم سے یہ بات کس نے کہہ دی کہ میں نے انہیں یونہی چھوڑ دیا ہے!''

''کیا مطلب۔'' وہ چونکا ''یونہی نہیں چھوڑا تو پھر......؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''دیکھو شہزاد! ہم جس مقصد سے یہاں آئے تھے وہ ہم نے حاصل کر لیا یعنی جہانگیر اور فواد کون سی مقامی تنظیم سے وابستہ ہیں اور وہ تنظیم یہودی لابی کے لیے کس طرح کام کرتی ہے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ میں مذکورہ تنظیم یعنی ''سی ایف کے'' سے پہلے ہی واقف ہوں مگر بڑے مثبت انداز میں۔ ہماری مطلوبہ معلومات ہمیں حاصل ہو چکیں۔ ہم جب چاہیں اس تنظیم کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان دونوں سے زیادہ میں جانتا ہوں ''سی ایف کے'' کے بارے میں۔ انہیں چھوڑ کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔'' چند لمحات کے لیے میں سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''میرے اور جہانگیر کے درمیان ڈرائنگ روم میں جو گفتگو ہوئی ہے، تم اس سے واقف نہیں ہو، شاید اس لیے بھی تمہیں میرے رویے سے زیادہ الجھن ہو رہی ہے۔''

وہ چونک کر میری جانب دیکھنے لگا ''کیا وہاں کوئی خاص بات سامنے آئی ہے؟''

''بات نہیں، بلکہ باتیں کہو۔'' میں نے پُرسوچ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''ان میں سے بہت سی سامنے آئی ہیں اور چند ایک پیچھے چلی گئی ہیں۔ نتیجہ ہمارے حق میں برآمد ہوا ہے۔''

وہ شکایتی لہجے میں بولا ''مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے وجدان!''

''کیوں نہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا ''ضرور بتاؤں گا مگر اس وقت میں مختصر الفاظ کا سہارا لوں گا۔ بعد میں بھی زندگی نے فرصت دی تو تمہیں تفصیل سے بھی آگاہ کر دوں گا۔''

میں ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے یوں ظاہر کرنے لگا جیسے کسی گہری سوچ میں ہوں۔ شہزاد ڈرائیونگ کے شعبے میں اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمہ تن گوش ہو گیا۔

میں نے کوئی جواب دینے سے پہلے ماضی قریب کے واقعات پر غور کیا۔ شہزاد کے سامنے میرے اور جہانگیر کے درمیان جو مکالمت ہوئی تھی اس سے شہزاد صرف یہی جان سکا تھا کہ ان دونوں کا تعلق ''سی ایف کے'' نامی ایک تنظیم سے تھا جو یہودی لابی کے اشاروں پر ناچ کر شہر کا امن و امان غارت کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ وہ اغیار کے مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر اپنوں کا لہو اچھالنے میں کوئی دریغ نہیں کرتی تھی۔ ان لوگوں کی وجہ سے ملک اور مسلمان پوری دنیا میں کتنے ذلیل و رسوا ہو رہے تھے اس بات سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسی تنظیم کے باس شعیب غوری کے ایک اشارے پر میرے تین ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ شہزاد اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا اور فی الحال اسے جاننا بھی نہیں چاہیے تھا۔ میں ان تمام معاملات اور معلومات کو اپنے ذہن میں مسلسل (FILTER) اور

(CENTRIFUGE) کر رہا تھا اور اس سے ایک ایسا (EXTRACT) حاصل کرنے کی کوشش میں تھا جو محفوظ بھی ہو اور منہاس باقر کے ذہن کے لیے قابلِ قبول بھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس کے سامنے بھی رپورٹ پیش کرنا تھی۔

میں نے ایک حتمی نتیجے پر پہنچتے ہوئے شہزادے سے کہا ''ڈیئر! دشمن کو ختم کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے، اسے اپنا مطیع وفرماں بردار بنالیا جائے۔''

''تم باتیں بہت گہری کرتے ہو۔'' وہ چہرے پر خوشگوار تاثرات سجاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تم نے جو بات کی ہے وہ بہت بڑی حقیقت ہے مگر یہ کام اتنا ہی زیادہ مشکل بھی ہے۔''

میں نے کہا ''انسان کوشش کرے تو مشکل کام آسان ہو جاتا ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میں تمہاری بات میں پوشیدہ نکتے تک پہنچ رہا ہوں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو...... میرے اندازے کے مطابق تم جہانگیر کو اپنے قابو میں لا چکے ہو!''

''تم واقعی غلطی نہیں کر رہے۔'' میں نے تصدیق کرتے ہوئے کہا ''جہانگیر اب ''سی ایف کے'' میں رہتے ہوئے میرے لیے کام کرتا رہے گا۔ دنیا کی ہر تنظیم میں کچھ ایسے کردار بھی ہوتے ہیں جو بہ یک وقت اپنے اور اپنے دشمن کے لیے خدمات انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ڈبل ایجنٹ کہا جاتا ہے۔ درحقیقت وہ کسی کے دوست ہوتے ہیں اور نہ دشمن۔ وہ سب کچھ اپنا ہی ہوتے ہیں۔ اپنے دوست، اپنے دشمن!''

''ایسے لوگ تو بہت خطرناک ہوتے ہیں!''

''میں ان کی خطرناکی سے فائدہ اٹھانا جانتا ہوں۔''

وہ بولا ''تمہارے ساتھ رہتے ہوئے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

منہاس باقر بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں ٹھیک ساڑھے چار بجے اس کے دفتر پہنچا تو اس نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔ منہاس کے اخبار کا دفتر میکلوڈ روڈ پر واقع تھا۔ وہ شام کے ایک اخبار کا ایڈیٹر وپبلشر تھا۔ صبح وشام کے بیشتر اخبارات کے دفاتر میکلوڈ روڈ (آئی آئی چندریگر روڈ) پر ہی پائے جاتے ہیں، علاوہ ازیں مختلف ڈائجسٹ و رسائل کی تیاری کے مراکز بھی اسی تاریخ ساز سڑک پر یا اس کے دائیں بائیں موجود ہیں۔ میکلوڈ روڈ پبلشنگ مارکیٹ کی سی حیثیت کی حامل ہے۔

منہاس باقر نے حالیہ حالات پر ڈسکس کرنے سے پہلے ایک عجیب وغریب سوال کیا ''بھئی! یہ تم کیا شے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ تمہاری طرح یہ بھی انتہائی حیران کن ہے!''

میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور اس شے کو تلاش کرنے لگا جس کا ذکر منہاس باقر نے کیا تھا۔ مجھے اس کوشش میں ناکامیاب پاکر اس نے کہا۔

''بھئی، میں تمہاری بلی کی بات کر رہا ہوں!''

''اوہ!'' بے ساختہ میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوگئی ''تو آپ ڈارلنگ کی بات کر رہے ہیں۔''

میں شہزاد علی کے ساتھ گلستانِ جوہر روانہ ہوتے وقت اپنی نیلی شیرڈ اور ڈارلنگ کو یہیں چھوڑ گیا تھا۔ منہاس باقر نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''تو تمہاری اس بلی کا نام ڈارلنگ ہے!''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی ''یہ کل...... یعنی آج میرے ساتھ لاہور جارہی ہے۔'' پھر میں نے ذرا توقف کے بعد پوچھا ''آپ نے اسے حیران کن کیوں کہا۔ کیا اس نے آپ کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کردیا تھا؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا ''دراصل، میں نے اپنے ایک ملازم سے کہہ کر تمہاری ڈارلنگ کی کچھ خاطر داری کرنا چاہی لیکن اس نے ہماری کوششوں کو لفٹ نہیں دی بلکہ وہ تو تمہاری گاڑی سے باہر آنے پر ہی تیار نہیں۔ کیا یہ کچھ کھاتی پیتی نہیں؟''

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے آج تک اسے کھاتے پیتے نہیں دیکھا تھا۔ ہا نہیں، وہ اپنی ضروریات کب اور کس طرح پوری کرتی تھی۔ اسی طرح رفعِ حاجات کا بھی اس کا اپنا ہی کوئی شیڈول تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کبھی گھر کو گندا کیا تھا اور نہ ہی کسی اور طور مجھے شکایت کا موقع دیا تھا۔

''بس جناب! یہ بڑی موڈی بلی ہے۔'' میں نے اسے ٹالنے کی خاطر کہا۔

وہ زیرِ لب مسکرایا ''ڈارلنگ کو موڈی ہی ہونا چاہیے۔''

پھر ہم اصل موضوع کی طرف آگئے۔ میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں اسے حالیہ مشن کے بارے میں بتایا۔ میں نے اس پر واضح کردیا کہ جہانگیر کو میں نے اپنی مرضی اور دوررس مفید نتائج کی خاطر چھوڑ دیا ہے، وہ اب میرے ایک وفادار کی حیثیت سے ''سی ایف کے'' میں کام کرتا رہے گا۔

میں نے اسے اپنے متعلق صرف اتنا بتایا کہ اتفاق سے اس تنظیم کے بگ باس سے میرے دوستانہ مراسم ہیں لیکن یہ بات میرے علم میں بھی نہیں تھی کہ ''سی ایف کے'' بظاہر ایک اصلاحی اور سماجی تنظیم ہونے کے ساتھ ساتھ یہودی لابی کی بھی آلۂ کار ہے۔

''اب تو تمہیں یقین آگیا نا؟'' اس نے نہایت ہی سنجیدگی سے پوچھا۔

''صد فیصد!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا ''تم میرے خیالات اور عزائم سے بخوبی آگاہ ہوچکے ہو وجدان!''

''ہاں، میں جانتا ہوں، آپ ایک سچے پاکستانی اور محبِ وطن انسان ہیں۔ پاکستان کی سالمیت اور اس شہر کے امن و امان کو غارت ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔'' میں نے اس کے خیالات کی حقیقی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ''جو بھی بیرونی قوت کسی بھی اندرونی قوت کے توسط سے اینٹی پاکستان سرگرمیوں میں ملوث پائی گئی، آپ اس کے خلاف جنگ کریں گے۔ یہودی لابی، سی ایف کے کے پلیٹ فارم سے کراچی میں دہشت گردی کی وارداتیں کروارہی ہے تاکہ پاکستان کو ''دہشت گرد نمبر ایک'' ملک ثابت کیا جاسکے، ایسا کہہ تو وہ کافی عرصے سے رہے ہیں۔''

منہاس باقر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا ''یہود وہنود کبھی مسلمان کے دوست اور خیر خواہ نہیں ہوسکتے حالانکہ اس دعوے کا سب سے زیادہ ڈھنڈورا یہی دونوں قومیں پیٹتی ہیں۔ یہ مختلف قسم کی سنہری چالوں اور دلفریب آئیڈیاز کے ذریعے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں خصوصاً یہودی اس ''کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ایک طرف وہ مسلمانوں کے بہی خواہ نظر آتے ہیں اور دوسری جانب وہ اسلام کے قلعے کو ''نمبر ون دہشت گرد'' ثابت کرنے کے لیے خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں بھی ملوث دکھائی دیتے ہیں۔'' وہ سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''ابھی تم نے جم براؤن کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اگر یہودی لابی، 'سی ایف کے' کے توسط سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتی ہے تو ہمارے ملک خصوصاً اس شہر کراچی کے لیے یہ کتنی بڑی بدنامی کا مقام ہوگا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''میں آپ کے خیالات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''صرف اتفاق؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

''پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔

''چند روز قبل میں نے تم سے ذکر کیا تھا کہ میں تمہیں ایک نہایت ہی اہم مشن سونپنے والا ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا ''میرا مشن اب تمہارے سامنے کھل چکا ہے۔ میں اپنے شہر، اپنے ملک سے یہودی لابی کی جڑیں اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہوں ......اور اس سلسلے میں میرا پہلا نشانہ ''سی پی ایف'' ہوگی۔''

''سی پی ایف؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

وہ بولا ''ہاں، میں نے ''سی ایف کے'' کا نام تبدیل کر دیا ہے۔ اب میرے ذہن میں یہودی لابی کی آلۂ کار اس تنظیم کا نام ''سی پی ایف'' ہی نقش رہے گا...... یعنی ''کرائم پروڈیوسنگ فیکٹری!''

''ونڈر فل!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا، بولا ''کیا تم مجھ سے مکمل تعاون کرنے کے لیے تیار ہو؟ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا کیوں کہ اس تنظیم کا باس تمہارا دوست بھی ہے!''

میں نے ٹھہری ہوئی نگاہ سے اسے دیکھا اور ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا ''اس کا دارومدار آپ پر ہے منہاس باقر صاحب!''

''وہ کس طرح؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا ''پاکستان صرف آپ کا نہیں، بلکہ میرا بھی ملک ہے۔ یہ کم از کم چودہ کروڑ افراد کا ملک ہے۔ آپ کی طرح اس ملک کا کوئی بھی دشمن میری آنکھ میں بھی خار کی طرح کھٹکتا ہے، چاہے وہ یہود ہو یا ہنود ہو...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کا اس مشن میں آپ کا ساتھ دوں تو پھر آپ کو میری بھی ایک تجویز ماننا ہوگی۔''

''کون سی تجویز؟'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''منہاس صاحب! ''سی ایف کے'' یا بقول آپ کے ''سی پی ایف'' کینسر کے مرض کے مانند ہے جو پورے شہر میں پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔ اس کے کسی ایک حصے کے آپریشن سے بات نہیں بنے گی بلکہ ہمیں آہستہ آہستہ اسے اندر سے کمزور کرنا ہوگا تاکہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کیا جاسکے۔ میں نے تنظیم کے خفیہ معاملات کی خبر گیری کے لیے جہانگیر کو مقرر کردیا ہے۔ وہ میرے دوست کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب شعیب غوری بھی میری دوستی کا دم بھرتا ہے۔ میں اس پر ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ میں

اس کی اصلیت جان چکا ہوں۔ شعیب کا ایک برطانوی یہودی دوست مسٹر نیل آرمر بھی مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔" میں نے کثیر المالیت سونے اور اس کی بازیابی کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا۔ منہاس باقر میرے موجودہ بینک بیلنس سے بھی واقف نہیں تھا۔ سنگاپور سے آنے والی رقم کے بارے میں صرف شعیب غوری ہی جانتا تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں شعیب غوری کا دوست رہتے ہوئے بہ آسانی نیل آرمر کے قریب ہو سکوں گا۔ مجھے شک ہے، نیل آرمر یہودی لابی کی نمائندگی کر رہا ہے۔ لابی اور شعیب کے درمیان رابطے کا ذریعہ یہی شخص ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے، اس تنظیم سے تعلق رکھتے ہوئے زیادہ بہتر طور پر اس کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ اسے وقتی اور عارضی طور پر ختم کرنا سودمند نہیں ہوگا بلکہ مضبوط پلاننگ سے ہم اسے نیست و نابود کر سکتے ہیں اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ آپ فی الحال "سی ایف کے" کو بھول جائیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا "یہ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہے!"

میں نے کہا "منہاس صاحب! معذرت کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ واقعی مجھے اس مشن میں شامل رکھنا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو میرے ذہن سے سوچنا ہوگا اور میری پلاننگ کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔ میں ایسے سیٹ اپ میں موو نہیں کر سکتا جہاں میری حیثیت کسی آلۂ کار کی سی ہو اور مجھے کسی دوسرے کے اشاروں پر ناچنا پڑے۔"

"تمہاری صاف گوئی مجھے پسند آئی وجدان!" منہاس نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "قاضی سلطان اور اس کی بیٹی ممتاز کی زبانی میں نے تمہارے بارے میں جو کچھ سنا ہے اور ابھی ممتاز اور ساحل کے تازہ ترین اغوا سے متعلق بھی جو حالات سامنے آئے ہیں ان کے پیش نظر میں تمہاری بہادری، جرأت مندی، ذہانت اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا ہوں۔ تمہاری کارکردگی تسلی بخش ہی نہیں بلکہ قابل رشک ہے۔ اسی بنا پر میں نے یہودیوں کی سرکوبی والا مشن تمہیں سونپنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میری طرف سے تم اپنی مرضی سے موو (MOVE) کرنے کے لیے آزاد ہو۔ تمہیں جس قسم کا تعاون اور مدد درکار ہو، میں تمہیں فراہم کرنے کو تیار ہوں۔ ایک اخبار کے مالک کی حیثیت سے میری پہنچ بہت دور تک ہے۔ شہری انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ افسران سے میں تقریباً ہر نوعیت کی مدد اور سہولت حاصل کر سکتا ہوں۔ بولو، تم کیا چاہتے ہو؟ تمہارے ذہن میں کیا پلان ہے؟"

میں نے اسے پکا کرنے کی خاطر کہا "منہاس صاحب! اگر آپ کو میری کوئی بات تلخ محسوس ہوئی ہو تو میں ایک مرتبہ پھر معذرت چاہوں گا۔ آپ میرے بزرگوں کی طرح ہیں، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آپ قاضی سلطان کے دوست بھی ہیں اس لیے میں واضح الفاظ میں کہوں گا، اگر آپ کو میری بات سے اتفاق نہ ہو تو میں اس صورت میں ایک حد سے زیادہ آپ سے تعاون نہیں کر سکوں گا۔"

اس نے کوئی سوال نہیں کیا، خاموش اور کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "سر دست میں آپ کو "سی ایف کے" کے دو ٹھکانوں اور وہاں کے نگرانوں کے نام اور پتے بتا سکتا ہوں۔ تیسرے ٹھکانے کے نگران کا صرف نام مجھے معلوم ہے، ٹھکانے کا ایڈریس میں نہیں جانتا۔" پھر میں نے اسے "ساؤتھ" اور "ایسٹ" کا مکمل پتا سمجھانے کے بعد کہا "ساؤتھ اور ایسٹ میں میرا جانا ہوا ہے۔ ساؤتھ کا کرتا دھرتا کبیر شاہ ہے جبکہ ایسٹ کی کمان سراج الدین کے ہاتھ میں ہے۔ جہانگیر کی زبانی "ملیر" کے باس کا نام سلیم واسطی معلوم ہوا ہے۔ اس کے علاوہ "سی ایف کے" کا "سینٹرل" اور "ویسٹ" میں بھی ایک ایک ٹھکانا موجود ہے۔ آپ اپنے طور پر جس طرح چاہیں کسی بھی قسم کی کارروائی کر سکتے ہیں، مجھے آپ سے کوئی شکوا گلہ نہیں ہوگا۔ اس بات کو ایک لمحے کے لیے بھی ذہن میں نہ لائیں کہ اس پراسرار تنظیم کا بگ باس شعیب غوری میرا دوست ہے...... اور اس کو پہنچنے والا نقصان میرے لیے تکلیف کا باعث......"

منہاس باقر قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "مجھے کچھ نہیں کرنا، بس ایک بات ذہن نشین کر لو وجدان!" وہ چند لمحے بڑی گہری نگاہ سے مجھے تکتا رہا پھر گمبھیر آواز میں بولا "میرا مشن اور تم لازم و ملزوم ہو چکے ہو۔ اب یہ تمہارے ہی ہاتھوں تکمیل کو پہنچے گا۔ تم بتاؤ، فوری طور پر تمہیں کیا کرنا ہے! اس پلان کے ماسٹر تمہی ہو۔"

میں نے اطمینان بھری سانس کھینچی اور کہا "ٹھیک ہے، میں نے یہ ذمے داری قبول کرتا ہوں لیکن آپ سے ایک درخواست ہے، اس معاملے کو بہت رازداری میں رکھا جائے۔"

"ایسا تو یقیناً کرنا ہوگا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "یہ بات میرے، تمہارے اور شہزاد کے درمیان رہے گی۔"

"اور اگر آئندہ کسی مرحلے پر آپ کو پولیس وغیرہ کی مدد لینا پڑی تو پھر کیا صورت رہے گی؟" میں نے ایک امکانی بات کی "ایسا موقع کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔"

وہ بولا "ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے معاملات کو چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "آپ معاملات کو چھپائیں یا سامنے لائیں، یہ میں آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔ بس میں اتنا چاہوں گا، اس سلسلے میں میرا کہیں ذکر نہیں آنا چاہیے۔ آپ شہزاد کو یا خود کو آگے رکھ کر کھیلیں، میں در پردہ آپ کی مدد و رہنمائی کرتا رہوں گا۔"

"مجھے منظور ہے!" وہ میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں تو لاہور جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد کامیاب لوٹوں گا۔ اس کے بعد ہم پوری طرح "سی ایف کے" کے خلاف سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ اس دوران میں آپ ایک چھوٹا سا کام نمٹا لیں۔"

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "کون سا کام وجدان؟"

"آج ٹھیک دس بجے یورپی ملک کا سفیر جم براؤن ائرپورٹ پہنچے گا۔ ازاں بعد اسے سرکاری تزک و احتشام کے ساتھ ائرپورٹ سے ہوٹل تک پہنچایا جائے گا۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا "میں آپ کو تمام امور سے آگاہ کر چکا ہوں کہ وہ کس طرح نرسری کے مقام پر شکار کیا جائے گا۔ آپ کو اس پیشگی اطلاع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ آپ کی پہنچ دور تک ہے۔ آپ ہی بہتر جانتے ہیں، کس طرح آپ ذمے دار افراد تک اس خطرناک خبر کو پہنچا سکتے ہیں اور کیسے وہ لوگ اپنے مہمان سفیر جم براؤن کی زندگی کی حفاظت کریں گے۔ بہرحال، یہ آپ کے لیے بڑی کریڈٹ کی بات ہوگی کہ آپ کے تعاون سے ملک کی عزت محفوظ رہی ورنہ جم براؤن کے بہیمانہ قتل سے ہمارے ملک کا نام کتنا بدنام ہوگا، یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں!"

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، بوجھل آواز میں بولا "میں تمہارے مشورے پر ضرور عمل کروں گا بلکہ میں ابھی سے اپنے گھوڑے دوڑانا شروع کرتا ہوں۔ اب وقت بہت کم رہ گیا ہے مگر......" وہ کہتے کہتے رکا اور کچھ سوچنے کے بعد بولا "مجھ سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے، ایسی بھیانک سازش کی پیشگی اطلاع مجھ تک کیسے پہنچ گئی؟"

میں نے محسوس کیا، منہاس باقر کچھ زیادہ ہی مجھ سے متاثر ہو گیا تھا۔ وہ ایک کامیاب صحافی تھا، شام کے معروف اخبار کا ایڈیٹر و پبلشر تھا لیکن یہ سوال اس نے مجھ سے کچھ ایسے انداز میں کیا تھا جیسے وہ میری انگلی پکڑ کر چل رہا ہو۔

میں نے کہا "جناب! آپ کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے۔ آپ کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہیں پھر کیا ضروری ہے، آپ ان لوگوں کو اپنا سورس (SOURCE) بھی بتائیں!" آخر میں، میں نے مذاق کے رنگ میں کہا "باخبر ذرائع" اور "نامعلوم افراد" کے معاملے میں تو ویسے بھی شام کے اخبارات خاصے ماہر ہیں!"

وہ زیر لب مسکرایا "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کچھ کرتے ہیں۔"

"ایک بات یاد رہے منہاس صاحب!" میں نے کہا "جم براؤن والے معاملے کے بارے میں، میں نے شہزاد کو کچھ نہیں بتایا۔ آپ بھی اس پر یہی ظاہر کریں کہ آپ کو کسی اور ذریعے سے پتا چلا ہے...... یا جو بھی آپ مناسب سمجھیں۔"

میں خاموش ہو کر اپنی کلائی پر بندھی رسٹ واچ کو دیکھنے لگا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ اب مجھے وہاں سے اٹھ جانا چاہیے تھا۔ میرا بیگ فلیٹ پر رکھا تھا جس میں میرے دیگر سامان کے ساتھ، پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ بھی موجود تھے۔ میں نے منہاس باقر سے رخصت کی اجازت چاہی تو وہ دعائیہ انداز میں بولا۔

"میری دلی خواہش ہے کہ تم اپنی ساتھی ساحل کے ہمراہ بہت جلد واپس آؤ۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے اپنے ایک دوست کا پتا لکھ کر دیا اور کہا "فرید پاشا میرا دیرینہ دوست ہے۔ تم اس کے پاس جا کر میرا نام لو گے تو وہ لاہور میں تمہارا ہر مسئلہ حل کر دے گا۔" پھر احتیاطاً منہاس باقر نے فرید پاشا کا فون نمبر بھی اسی پرچے پر درج کر دیا۔ "مجھے امید ہے، یہ شخص تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔"

میں منہاس باقر سے معانقہ کر کے اس کے دفتر سے نکل آیا۔

☆☆☆

ٹھیک سوا پانچ بجے میں اپنے فلیٹ میں تھا۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں بچا تھا کہ ایک بھرپور نیند لے سکتا۔ مجھے ساڑھے چھ بجے ائرپورٹ پہنچنا تھا جس کے لیے چھ بجے گھر سے نکلنا ضروری تھا۔ گزشتہ پوری رات پے درپے

معرکہ آرائی میں گزری تھی۔ مجھے آرام کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آ سکا تھا۔ بدن ٹوٹ رہا تھا اور جی چاہتا تھا، لمبی تان کر سو جاؤں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ اگر میں بے فکری سے ٹانگیں پسار کر سو جاتا تو فلائٹ میرا انتظار نہ کرتی۔ فلائٹ، ٹرین اور اسی قسم کی دوسری سواریاں وقت کے مانند ہوتی ہیں اور وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

یوگا...... ہمیشہ سے میرے لیے ایک ایسی نعمتِ خداوندی ثابت ہوا ہے جس کا میں جتنا بھی شکر ادا کروں، کم ہوگا۔ اس کی بعض مشقیں گھنٹوں، بلکہ دنوں کی تکان چٹکیوں میں اتار دیتی ہیں۔ ایسے یوگی بھی میری نظر سے گزرے ہیں جو باقاعدہ سوئے بغیر سالوں گزار دیتے ہیں۔ وہ ''جھپکی نیند'' کے سہارے ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں۔ ''جھپکی نیند'' ایک مخصوص اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں لمحاتی نیند۔ اس نیند کے ماہر یوگی کو جب بھی چند لمحات سکون کے میسر آتے ہیں، وہ آرام دہ جگہ پر بیٹھ کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے پھر آنکھیں بند کر کے لمبی سانسیں لی جاتی ہیں اور اس کے بعد ''جھپکی نیند''۔ اس نیند کا دورانیہ چند سیکنڈ سے چند منٹ تک ہو سکتا ہے لیکن اس کے طفیل انسان گھنٹوں نیند کی ضرورت محسوس نہیں کرتا...... اور جب ضرورت پڑی، ایک اور ''جھپکی'' لگالی۔

میرا جھپکی نیند سے استفادہ کرنے کا تو کوئی ارادہ نہیں تھا تاہم سانس کی بعض مشقیں بہت ضروری تھیں۔ میں آج کل ''جی'' کی ایڈوانس پریکٹس کر رہا تھا اس لیے اس نیک کام کا تسلسل جاری رکھنا بھی ازحد ضروری تھا۔ اگلے دس منٹ میں، میں نے ایک مرتبہ پھر شاور لیا اور تازہ دم ہو کر یوگا کی مشق میں مصروف ہو گیا۔

میں نے سمندر کی جانب کھلنے والا سلائیڈنگ ڈور مکمل طور پر سلائیڈ کر دیا۔ ٹھنڈی اور نمکین سمندری ہوا کے جھونکے کمرے میں پہنچنے لگے جو بدن سے ٹکرا کر ایک عجیب سی گدگدی کا احساس جگاتے تھے۔ رگوں میں ایک خوشگوار سنسنی دوڑنے لگتی اور کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی جانب دل مائل ہو جاتا۔ علی الصباح کی سمندری ہوا بڑی تحریک آمیز ہوتی ہے۔ اس کی جذبات انگیزی کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔

میں اپنے بیڈروم میں قالین پر شمال رخ کھڑا ہو گیا اور پہلے ہتھ یوگ (باڈی یوگا) کی ایک سادہ اور آسان سی مشق کرنے لگا۔ یوگا میں ''رخ'' کی بڑی اہمیت ہے، خاص طور پر اگر سانس کی مشق کرنا ہو تو پھر شمال رخ کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ دراصل شمالی اور جنوبی دو قطبین کے درمیان مسلسل مقناطیسی لہروں کا سفر جاری رہتا ہے۔ اگر شمال کی جانب رخ کر کے کوئی مشق کی جائے تو اس کی نہ صرف افادیت بڑھ جاتی ہے بلکہ مقصد کے حصول کے لیے ٹائم پیریڈ میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ شمال سے جنوب کی طرف پھیلے ہوئے مقناطیسی جال میں انسان کا جسم اور ذہن اگر ٹیون (TUNE) ہو جائے تو کیا کہنے! اس بات کو آسانی سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح سیٹلائٹ ریسیور کی مدد سے فضا میں بکھری ہوئی لہروں کو کیچ کر کے ٹی وی سیٹ میں ٹیون کر لیا جاتا ہے۔ ریسیور کی فریکوئنسی جس ٹی وی چینل سے میچ کر جائے۔ اس کی نشریات ٹی وی تک پہنچنے لگتی ہیں۔ ٹی وی ٹرانسمشن میں جو رول سیٹلائٹ ریسیور ادا کرتا ہے، اسی سے ملتا جلتا کردار یہ مقناطیسی لہریں بھی ادا کرتی ہیں۔ ان کی (TUNING) کے سبب کسی بھی مشق سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

میں نے شمال کی سمت رخ کر کے دونوں پاؤں کو آپس میں ملایا، ہاتھوں کو پہلوؤں پر ٹکایا اور ہلکی پھلکی مشق کا آغاز کر دیا۔ اس دوران میں میری آنکھیں بند تھیں۔ میں نے دھیرے دھیرے (INHALE) کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھانا شروع کیا اور سانس کے اختتام پر میرے دونوں ہاتھ سر سے بلند، نوے درجے کا زاویہ بنا رہے تھے۔ اس مقام پر میں نے تین سیکنڈ اسٹے (STAY) کیا۔ اس وقت کو شمار کرنے کے لیے باقاعدہ کسی گھڑی کی ضرورت نہیں۔ آپ نہایت دھیمے انداز میں تین تک گنتی بھی گن سکتے ہیں۔ اس لمحاتی قیام کا مطلب یہ ہوا کہ تین سیکنڈ تک ہوا میرے پھیپھڑوں میں مقید رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے (EXHALE) کرتے ہوئے بازو نیچے آنے لگے۔ نہ صرف بازو بلکہ کمر سے اوپر کا پورا بدن بھی زمین کی جانب جھکنے لگا۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہا جب تک میری ہتھیلیوں نے فرش کے قالین کو نہیں چھو لیا۔ اس مقام پر پہنچ کر میں نے پھر تین سیکنڈ کا قیام کیا، گویا اس پوزیشن میں، میں نے تمام سانس جسم سے خارج کر دی تھی۔ لمحاتی قیام کے بعد (INHALE) کے ساتھ ساتھ میرا بدن پھر بلند ہونے لگا اور واپس ابتدائی حالت میں آ گیا۔ اس سادہ اور معصوم سی مشق کا ایک چکر مکمل ہو گیا تھا۔ میں نے تین چکر کی تکمیل کے بعد مشق ختم کر دی۔

اس مشق میں سانس کی آمد و شد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سانس کھینچنے یعنی (INHALE) اور سانس چھوڑنے یعنی (EXHALE) میں ایک ردھم (RHYTHM) قائم رہنا چاہیے اور اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ سانس کو ناک

کے راستے پھیپھڑوں میں اتارا جائے اور منہ کے راستے خارج کیا جائے۔

اس کے بعد میں نے (HEAD STAND) لگایا۔ یہ بہت ہی نازک، حساس اور خطرناک مشق ہے جس پر بعد میں کبھی تفصیلی روشنی ڈالوں گا۔ فی الحال اتنا جان لیں کہ جس طرح جنگل کا بادشاہ شیر ببر، پھولوں کا راجا گلاب، پھلوں کا شہنشاہ آم اور قیمتی پتھروں کا سرتاج ڈائمنڈ ہے، بالکل اسی طرح ہتھ یوگ (باڈی یوگا) اور راج یوگ (دماغی یوگا) میں ہیڈ اسٹینڈ (HEAD STAND) کو تمام مشقوں کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یوگا کی اس مشق کو ماہرینِ فن، یوگا کے دو شعبوں یعنی ''ہتھ'' اور ''راج'' یوگ میں بہ یک وقت شمار کرتے ہیں۔ میں نے ہیڈ اسٹینڈ (CANDLE POSTURE) کو بہت ہی مفید اور مشقِ کل پایا ہے۔ اس مشق کو عام اور سادہ الفاظ میں ''سر کے بل کھڑے ہونا'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس پوسچر کے درجنوں انداز اور طریقے رائج ہیں۔

ہیڈ اسٹینڈ یعنی کینڈل پوسچر کے بعد میں نے سانس کی مشقوں کا شعبہ یعنی پرانایام (PRANAYAM) آزمایا اور ''چی'' میں اپنی استعداد بڑھانے کے لیے اسٹروک بریتھنگ (STROKE BREATHING) کرنے لگا۔ میں نے بمشکل تمام پندرہ منٹ میں یوگا کا سیشن مکمل کرلیا۔ اس کے بعد کرسی پر نیم دراز ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد مجھے فلیٹ سے نکل جانا تھا۔ اس لیے میں تھوڑا ریلیکس ہو رہا تھا۔

اچانک میرے سر کو ایک جھٹکا سا لگا، جیسا اونگھنے کے دوران میں ہوتا ہے۔ میں یہی سمجھا، شاید چند سیکنڈ کے لیے واقعی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں بند رکھتے ہوئے کمرے کے ماحول کو محسوس کرنا چاہا اور دوسرے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی کا احساس ہوا۔

میرے چونکنے کا سبب ایک مخصوص قسم کی خوشبو تھی۔ میں اس خوشبو کو ہزاروں، لاکھوں خوشبوؤں کے درمیان شناخت کرسکتا تھا۔ یہ خوشبو ایک پراسرار ذات سے منسوب تھی اور اس کی آمد کے ساتھ ہی آتی تھی۔ میں نے بے ساختہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

کمرا خالی تھا۔ میں نے متلاشی نگاہ در و دیوار پر ڈالی لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی جس کی مخصوص خوشبو سے کمرا بھرا ہوا تھا۔ میرا دل یک بارگی دھڑکنے لگا اور اسی لمحے میری نظر سلائیڈنگ ڈور سے باہر چلی گئی۔ یوگا کی مشق سے پہلے میں نے سلائیڈنگ ڈور کو پوری طرح کھول دیا تھا اور اس کھلے ہوئے دروازے کے باہر میں نے اس کے آثار دیکھ کر ایک جھرجھری لی۔ اس وقت تاریک رات کا اندھیرے دھیرے دھیرے چھٹنے لگا تھا۔ اس نیم تاریک فضا میں وہ کسی مشعل کے مانند روشن روشن میری سمت تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی پھر دیکھتے ہی دیکھتے روشنی کا وہ ہالہ سلائیڈنگ ڈور سے اندر داخل ہوگیا۔ میں کھلی آنکھوں سے اس عجوبۂ روزگار کو دیکھ رہا تھا۔ پربتوں کی وہ شہزادی، مجسمۂ حسن و جمال میرے سامنے ہوا میں معلق تھی۔ اس کے بدن سے ٹھنڈی آنچ والی دلکش و دلنشیں روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں یک ٹک ہمالیہ کی اس ساحرہ نیلگری کو دیکھتا چلا گیا۔

وقت گویا تھم کر رہ گیا۔ اچانک نیلگری کے یاقوتی لبوں پر ملکوتی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر میں نے ان نازک لبوں میں ان دیکھی جنبش محسوس کی۔ اسی وقت میری سماعت میں شہد کی مکھیوں ایسی بھنبھناہٹ گونج اٹھی۔

نیلگری کے کلام کا یہی طور تھا۔ وہ ہونٹوں سے کچھ نہیں بولتی تھی مگر اپنی بات کو سامنے والے تک پہنچانے کا ہنر اسے بخوبی آتا تھا۔ وہ پہلے بھی کئی مرتبہ مجھ سے اسی انداز میں گفتگو کرچکی تھی۔ میں نے واضح طور پر سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''وجدان! کیسے ہو؟''

بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ''جیسا بھی ہوں، تم سے پوشیدہ نہیں۔''

اس کے چہرے پر تکدر، ظاہر ہوا۔ مجھے یوں لگا، میرے جواب نے اسے تکلیف پہنچائی ہو مگر میں بھی کیا کرتا۔ اس نے چند روز قبل لیلیٰ کے جلو میں مجھے جو چوٹ دی تھی، میں اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ میرے لہجے میں آپوں آپ تلخی در آئی تھی۔

نیلگری نے گہری نظر سے مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہ مجھے اپنے بدن سے پار ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے دیکھن اور دکھن میں ایک عجیب قسم کا طلسم پایا جاتا تھا۔ اس نے قدرے نرم اور دل جویانہ انداز میں استفسار کیا ''مجھ سے ناراض ہو؟''

''ہاں نیلگری!'' میں تم سے خفا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''اس خفگی کی وجہ کیا ہے؟''

''تم میری ناراضی کا سبب اچھی طرح جانتی ہوں۔''

''اگر تمہارا اشارہ لیلیٰ والے واقعے کی جانب ہے تو میں بھی کہوں گا، تمہاری خفگی، ناراضی اور شکوہ جائز نہیں۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی۔

میں نے تیز آواز میں پوچھا ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

نیلگری کی بات نے مجھے غصہ دلا دیا تھا تاہم میں نے اس پر اپنے غصے کا اظہار کیے بغیر ہی سوال کیا تو وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

''دیکھو وجدان! میں تمہیں اپنا محبوب مانتی ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ اس روز سے جب تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ تم نیپال کے رتنا پارک میں میرا ٹوٹا ہوا کرسٹل کا مجسمہ اٹھا کر اپنے فلیٹ پر لے گئے تھے۔ تم نے اس رات نہ صرف میری حفاظت کی بلکہ باقاعدہ اسکاچ ٹیپ سے تم نے میری ''مرہم پٹی'' بھی کر ڈالی۔''

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئی ''اس کے بعد بھی تم وقتاً فوقتاً میرے کام آتے رہے جس سے میرے قلب کی نظر میں تمہاری محبوبیت بڑھتی چلی گئی۔ مجھ پر تمہارا سب سے بڑا احسان تو وہ ہے جب تم نے مجھے یوگی گوتم بھوش کے قبضے میں جانے سے بچایا۔ ''گومپو'' کی بدھ عبادت گاہ میں تم نے بدی کی قوتوں کے خلاف ایک کھلم کھلا جنگ لڑی جس میں تمہیں فتح نصیب ہوئی اور......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''یہ تمام واقعات میری یادداشت میں محفوظ ہیں لہٰذا انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ تم ٹو دی پوائنٹ بات کرو اور مجھے بتاؤ، لیلیٰ والے واقعے پر میری خفگی، ناراضی اور شکوہ کیوں جائز نہیں؟''

اس کے چہرے پر دکھ کے سائے بکھر گئے۔ شکوا کناں لہجے میں بولی ''تم بڑے کٹھور ہو وجدان!''

میں خاموش نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ حسن بے مثال کی مالک ایک پراسرار ہستی تھی جس کی شکتیوں کو میں دیکھتا اور مانتا چلا آیا تھا لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے اس نے میری زندگی میں جو رول پلے کیا تھا، اس نے مجھے اس کی طرف سے خاصا بدگمان کر دیا تھا، خاص طور پر، لیلیٰ کے بنگلے پر پیش آنے والے واقعات کا تصور کر کے مجھے اپنی شکست کا احساس ہوتا تھا۔

میں بچپن سے اب تک بڑی دربدری کی زندگی گزارتا آیا تھا اور اس نگر نگر بیتنے والی زندگی میں خوبصورت لڑکیوں کی بہتات رہی تھی جن میں سے اکثر مجھ پر مرتی تھیں، بعض نے تو مجھے حاصل کرنے کی جیسی تیسی کوششیں بھی کر ڈالیں۔ جانکی دیوی، رانی روپ متی، سونیا، تھائی وانگ...... ایک طویل فہرست ہے۔ بنکاک میں، مارشل آرٹس سینٹر چلانے والی کوشلیا نامی ایک لڑکی نے تو زبردستی مجھے حاصل کرنی کی کوشش بھی کی تھی جو میں نے ناکامیاب بنادی تھی مگر لیلیٰ...... میں اس سرمئی حسینہ کی طلسم گری کے سامنے بے بس ہوگیا تھا۔ اس شعلہ جوالہ، آفت کی پرکالہ نے وہ کام دکھایا کہ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔

نیلگری نے میرے خیالات پڑھ لیے۔ وہ خیال خوانی کی بھی ماہر تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے انداز سے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میں نے مضطرب نظر سے اسے دیکھا۔ وہ بولی۔

''وجدان! تم لیلیٰ اور اس کے ''کارنامے'' پر برہم بھی ہو اور اس کے بارے میں مسلسل سوچتے بھی جا رہے ہو!''

''اس کا یہ ''کارنامہ'' تمہارا رہینِ منت ہے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ شوخی سے بولی ''پھر تو تمہیں میرے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''تم پھر اصل موضوع سے ہٹ رہی ہو نیلگری!''

''میں اسی کی طرف آ رہی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا اور خاموش ہوگئی۔

اس کی خاموشی اور اس کی سنجیدگی میں بڑا رعب و دبدبہ تھا۔ یہ درحقیقت رعبِ حسن اور دبدبۂ قوت تھا۔ وہ لازوال حسن اور بے پناہ قوتوں کی مالک تھی۔ میں ٹھہری ہوئی نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ کبھی یوں محسوس ہوتا، اس نے نہایت ہی مہین لباس زیب تن کر رکھا ہے اور کبھی یہ احساس آنکھوں کا دھوکا لگنے لگتا۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا، اس نے لباس کو پہن رکھا ہے یا لباس نے اسے!

''میں نے تمہیں اپنا بنانے کی ہر کوشش کر ڈالی۔'' نیلگری کی شیریں بیانی کا سلسلہ جاری ہوگیا ''مگر تم نے میری ہر کوشش ناکام بنا دی۔ اس کے بعد ہی میرے ذہن میں یہ آئیڈیا آیا کہ اب میں تمہارے پیچھے نہیں بھاگوں گی بلکہ تمہیں اپنے تعاقب میں دوڑاؤں گی۔ تم کچے دھاگے سے بندھے اور سر کے بل چلتے ہوئے میرے پاس آؤ گے...... میرے استھان پر۔ وہاں تک پہنچنے کا راستہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میرا مسکن کہاں ہے؟ جلد یا بدیر، آج نہیں تو کل تمہیں آنا ہی ہوگا...... آنا ہی ہوگا وجدان!''

وہ خاموش ہوگئی اور بڑی فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں گویا موتی کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ میں نے اتنی روشن اور گہری آنکھیں اور کسی کی نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے بڑی معنی خیز، تجسس آمیز اور فکرانگیز بات کہہ کر

خاموشی اختیار کر لی تو میں اضطرار میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے الفاظ کی معنی آفرینی اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ جب کسی معاملے میں انکار ناممکن اور اقرار لازم ٹھہرے تو انسان کی بے کلی میں حد درجہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

''تمہاری باتوں میں بڑے پیچ و خم ہیں نیلگری!'' میں نے تڑپ کر کہا۔

''اپنے محبوب کی زبان سے میں اسے اپنی تعریف سمجھوں گی۔'' وہ ایک ادا سے مسکرائی۔

میں نے بے قراری سے پوچھا ''تم آج میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟''

''صرف تمہیں یہ بتانے کہ اب میں تمہارے پاس کبھی نہیں آؤں گی۔'' وہ ایک دم بہت اداس دکھائی دینے لگی ''میں تمہارا انتظار کروں گی۔ ہمالیہ کی گود میں تمہاری راہ دیکھوں گی اور میری......''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا ''......اور میری کیا؟''

''رہنے دو...... کچھ آنے والے وقت کے لیے بھی چھوڑ دو۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی ''مستقبل کا ایک ایک لمحے تمہارے سامنے کسی کتاب کی طرح کھلتا چلا جائے گا۔ انتظار کرو اس وقت کا جب مستقبل، حال میں اور حال، ماضی میں بدل جائے گا۔'' وہ چند لمحے خاموش رہ کر بڑی والہانہ نگاہ سے مجھے دیکھتی رہی پھر بڑی لگاوٹ سے بولی ''میں نے تو اپنے محبوب کو حاصل کر لیا ہے، اب تم اپنی محبوبہ کو تلاش کرتے پھرو۔ الوداع میرے محبوب، الوداع! اس کائنات کی سُپر شکتی تمہیں سلامت رکھے!''

اپنی بات ختم کر کے وہ ہوا میں تیرتی ہوئی میری جانب بڑھی، پھر وہ میرے انتہائی نزدیک پہنچ گئی۔ ان لمحات میں، میں گویا کوئی سنگی بت بن گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں حرکت کا خیال نہ آیا۔ نیلگری نے اپنے مرمریں ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ سجایا، پھر صراحی دار گردن جھکا کر اپنے شنگرفی لب میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔

ان لمحات میں زمین کی گردش رک گئی تھی، وقت گویا ایک مقام پر تھم گیا ہو۔ میں نہیں جانتا، سیکنڈ کا وہ کون سا حصہ تھا جس میں نیلگری نے اپنی خواہش کی تکمیل کی۔ اس کا بوسہ لازوال اور باکمال تھا۔ مجھے اپنی پیشانی میں ایک لطیف احساس اترتا ہوا محسوس ہوا جس نے میری روح کو سرشار کر دیا۔ میں کیف و انبساط کی جادونگری میں کھو کر رہ جاتا اگر نیلگری مجھے مخاطب نہ کرتی۔ اس کی شہد یلی بھنبھناہٹ نے میری ساعت کا دروازہ تھپتھپایا۔ میں نے اسے کہتے ہوئے محسوس کیا۔

''وجدان! میں جا رہی ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کسی ابر پارے کے مانند ہوا میں تیرتے ہوئے مجھ سے دور ہونے لگی۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ وہ الٹے قدموں یعنی اپنے عقب میں سفر کر رہی تھی۔ اس کی فضائی چال میں سبک خرامی اور مستی کی سی کیفیت بھری تھی۔

میں نے لحہ بہ لمحہ دور ہوتی ہوئی نیلگری کے نورانی پیکر سے مخاطب ہوتے ہوئے بس اتنا کہا ''جاتی ہو...... جاؤ۔ میرا اللہ تمہیں بھی سلامت رکھے......اور یہ سلامتی تا قیامت ہو!''

''شکریہ میرے محبوب!'' اس کے ہونٹ تبسم ریز انداز میں متحرک ہوئے۔

اس کی مسکراہٹ کا ملکوتی حسن ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مجھے اپنا دل زیر و زبر ہوتا محسوس ہوا۔ اسی وقت میرے ذہن میں ایک فوری اور نہایت ہی اہم سوال نے سر ابھارا۔ میری سوچ دلی کیفیت پر حاوی ہو گئی اور میں نے نیلگری سے سوال کیا۔

''جاتے جاتے میری ایک الجھن ہی ختم کرتی جاؤ!''

اس کی مسکراہٹ میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تاہم آنکھوں میں سوالیہ تاثر ابھر آیا۔ میں نے محسوس کیا، وہ میری الجھن جاننا چاہتی ہے۔

میں نے کہا ''پچھلے کچھ عرصے سے ایک سفید بلی میرے ساتھ تھی۔ وہ مجھ سے اتنی مانوس اور میری مزاج آشنا ہو چکی ہے کہ میں نے خوش ہو کر اس کا نام ''ڈارلنگ'' رکھ دیا ہے۔ ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر کبھی کبھی مجھے شک ہوتا ہے، کہیں اس کے روپ میں تم نہ ہو!''

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی ''وجدان! تمہیں بار بار یاد دلانا پڑتا ہے کہ میں تمہیں اپنے من کا دیوتا سمجھتی ہوں۔ تم میرے محبوب ہو۔ یاد رکھو، محبوب کی قربت حاصل کرنے کے لیے جو بھی جتن کیے جاتے ہیں ان میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہم اپنے محبوب کو خوبصورت اور خوش نما نظر آئیں۔ اس عمل کے پیچھے ہماری لاشعوری کوشش ہوتی ہے کہ محبوب ہم پر نظرِ کرم کرے، ہماری جانب متوجہ ہو...... اور ہمیں اپنا محبوب بنا لے۔ اس بات کا ہمیں خود بھی احساس نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔''

وہ چند لمحات کو ساکت ہو کر مجھے دیکھتی رہی پھر بڑے معنی خیز انداز میں بولی ''تم نے محبت کی راہ پر قدم رکھ دیا ہے۔ آہستہ آہستہ تمہیں بھی ان منزلوں سے گزرنا ہے۔ جب تجربے سے گزرو گے تو بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔

بہر حال، میں تمہارے نزدیک آنے کے لیے کسی حقیر جانور کا سہارا نہیں لے سکتی۔ میرے پاس حسن ہے، جوانی ہے اور بے پناہ ایسی شکتیاں ہیں جن کی مدد سے میں اور بہت کچھ حاصل کر سکتی ہوں۔ تمہیں لبھانے اور اپنی جانب مائل کرنے کے لیے میں خود کو مزید تو نکھار سکتی ہوں لیکن ایک بلی کے جسم میں روپوش نہیں ہو سکتی۔ تمہارا خیال یکسر غلط ہے۔''

''میں نے ڈارلنگ کی غیر معمولی اور پراسرار حرکتوں کے باعث ایسا سوچا تھا۔''

''ڈارلنگ غیر معمولی شے ہی کا نام ہے!'' اس نے اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ دوبارہ اپنے فضائی سفر کو جاری رکھتے ہوئے بولی ''اور جہاں تک تمہاری ڈارلنگ کی پراسرار حرکتوں کا تعلق ہے، تو یہ راز بہت جلد تم پر کھل جائے گا۔''

''راز...... کیسا راز......؟''

''دھیرج وجدان!'' وہ مجھ سے دور ہوتے ہوئے زیرِ لب مسکرائی ''ہر کام کا ایک سمے (وقت) مقرر ہے۔ نہ اس سمے سے پہلے اور نہ ہی بعد میں۔ ہمیں ہر حال میں اس سمے کا انتظار کرنا ہوتا ہے۔ تم بھی انتظار کرو...... ڈارلنگ کا راز کھلنے کا، تمہاری محبوبہ ساحل کے ملنے کا، میرے محبوب وجدان کے ملنے کا...... انتظار، انتظار...... بس انتظار!''

اس کی آواز معدوم ہوتی چلی گئی، اس کے ساتھ ہی میری نگاہ میں اس کا نورانی پیکر بھی دھندلانے لگا۔ وہ پتا نہیں، کہاں سے آئی تھی! میں نے دور آسمان پر، بادلوں کے اندر سے اسے نمودار ہوتے دیکھا تھا اور وہ واپس انہی بادلوں کا حصہ بن گئی تھی۔

میں سلائیڈنگ ڈور سے باہر، نیلے آسمان پر نگاہ جمائے بیٹھا تھا کہ اچانک میں نے اپنے قدموں میں ایک سرسراہٹ سی محسوس کی۔ ایک کے ساتھ ہی ایک مانوس آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

''میاؤں!''

میں یک لخت ڈارلنگ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو کر اپنی محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اسے اٹھا کر گود میں لے لیا۔ وہ میرے سینے پر اپنا منہ رگڑنے لگی۔ میں دھیرے دھیرے اس کے بدن پر اپنا ہاتھ پھیرتا رہا۔ میرے ہاتھ کے پیار بھرے لمس نے اس کے وجود میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ وہ تھوڑی دیر اٹکھیلیاں کرتی رہی پھر شانت ہو گئی۔

میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اس کا منہ اوپر اٹھایا اور بڑی توجہ سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ میں غیر ارادی طور پر ڈارلنگ کی آنکھوں میں نیلگری کو تلاش کر رہا تھا۔ اگرچہ نیلگری نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ ڈارلنگ سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں مگر پتا نہیں مجھے یقین کیوں نہیں آ رہا تھا اور پھر نیلگری نے ڈارلنگ کا اسرار جلد کھلنے کی بات کر کے ڈارلنگ کی طرف سے مجھے اور زیادہ متجسس کر دیا تھا۔

ڈارلنگ میرے اس گھورنے کو پتا نہیں، کیا سمجھی۔ اس نے اپنے اگلے پنجے منہ پر رکھ لیے۔ چہرہ چھپانے کی اس کی یہ معصوم کوشش بڑی دلفریب تھی۔ مجھے بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ میں نے اس کے سر پر ایک رومانوی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

''تم بہت شریر ہوتی جا رہی ہو!''

''میاؤں!'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔

میں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا ''جانتی ہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں کون آیا تھا؟''

ایک مرتبہ پھر مجھے ''میاؤں'' کی آواز سنائی دی۔

میں نے ایسے ہی پوچھ لیا ''کیا تم نیلگری کو جانتی ہو؟''

اس نے رٹا رٹایا جواب دیا ''میاؤں!''

میں نے اسے گود میں سے اتار کر قالین پوش فرش پر رکھ دیا۔ وہ تیز قدمی سے باہر کی جانب دوڑ گئی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کلاک پانچ پچاس کا وقت بتا رہا تھا۔ میں نے فوراً اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ وہاں بھی اتنے ہی بجے تھے۔ مجھے اس بات پر سخت حیرت ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے پونے چھ بجے یوگا کی مشق ختم کی تھی۔ تو کیا تب سے اب تک صرف پانچ منٹ ہی گزرے تھے؟ یہ کیسے ممکن تھا! کم از کم چار منٹ تو میں نے ڈارلنگ کے ساتھ بھی گفت و شنید کی تھی اور نیلگری سے گفتگو کا وقفہ تو کسی بھی طرح دس منٹ سے کم نہیں تھا۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ نیلگری سے میری ملاقات وقت کی قید سے آزاد تھی۔ وہ وقت کو روک پایا ان میں سے چند لمحات کو چرانا جانتی تھی۔ میں نیلگری کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنا سفری بیگ ری چیک کرنے لگا۔

نیلگری نے اپنی بات چیت میں ایک دو مرتبہ ساحل کا تذکرہ بھی کیا تھا اور اس کا انداز بڑا سرسری تھا۔ نیلگری اپنے دعوے کے مطابق مجھے چاہتی تھی اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک

نہیں کہ میں دل و جان سے ساحل کا تمنائی تھا۔ اس کے اغوا کے بعد سے تو یہ تمنا اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ اگر ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز رفتار کوئی سواری ہوتی تو میں یقیناً ساحل تک پہنچنے کے لیے اسی ذریعے کا انتخاب کرتا۔ آج صبح ساحل لاہور پہنچائی جانے والی تھی اور میری فلائٹ لگ بھگ سوا نو بجے وہاں پہنچتی۔ ہم دونوں آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ لاہور پہنچنے والے تھے مگر یہ ''ساتھ ساتھ'' اور ''آگے پیچھے'' الفاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہوئے جسمانی طور پر ایک دوسرے سے دور ہی تھے...... اور اس دوری کے باوجود بھی ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔

یہ ملن اور جدائی کا رشتہ بھی بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی ہجر کا مزہ وصل کی گھڑیوں پر بھاری پڑنے لگتا ہے اور کبھی شب وصال، فرقت کے لمحات کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اس کیفیت کا ادراک وہی لوگ رکھتے ہیں جو کبھی اس تجربے سے گزرے ہوں۔

☆☆☆

ییلو کیب آندھی کی رفتار سے ائیر پورٹ کی جانب اڑی چلی جا رہی تھی۔ میں نے نیلی شیرڈ کو اپارٹمنٹس بلڈنگ کی پارکنگ میں چھوڑ دیا تھا اور چائنا ٹاؤن والے کارنر سے یہ ٹیکسی پکڑی تھی۔ صبح کے وقت اور وہ بھی ائیر پورٹ کی طرف جاتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور منہ پھاڑ کر تقاضا کرتے ہیں۔ میں نے ڈرائیور کی خواہش پوری کرتے ہوئے ٹیکسی ہائر کی تھی۔ رقم میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا اور پھر میں اس وقت ایک ایسی ہستی کی سمت سفر کر رہا تھا جس کے حصول کی خاطر دولت کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔

ڈارلنگ میرے پہلو میں عقبی نشست پر بڑی شان سے براجمان تھی۔ ڈرائیور نے ایک دو مرتبہ اسے اپنے سر کے اوپر لگے آئینے میں حیرت سے دیکھا اور پھر اس سے صبر نہ ہو سکا۔ بالآخر وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا۔

''صاحب! آپ کی بلی کے تو بہت مزے ہیں۔ لگتا ہے، آپ کو اس سے بہت محبت ہے۔''

''ہاں، وہ تو ہے۔'' میں نے اس کی باتوں میں دلچسپی نہ لیتے ہوئے کہا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا ''کیا یہ آپ کی پالتو بلی ہے؟''

اس کا سوال بڑا احمقانہ تھا۔ اگر اس موقع پر میں اسے شافی جواب نہ دیتا تو وہ سارے راستے میرے کان کھاتا رہتا اور میں اس قسم کی فضول گفتگو میں الجھ کر اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''دیکھو میاں!'' میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو خاصے بارعب انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا ''بلیاں صرف دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک پالتو اور دوسری فالتو! کوئی فالتو بلی نہ تو ٹیکسی میں سفر کرتی ہے اور نہ ہی بائی ائیر کراچی سے لاہور جاتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ڈارلنگ نامی یہ بلی سراسر پالتو ہے۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے تحکمانہ انداز میں کہا ''اب تم اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھ کر مجھے جلد از جلد ائیر پورٹ پہنچانے کی کوشش کرو۔ سمجھ گئے نا؟''

''جی صاحب، بالکل سمجھ گیا۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

میں نے عقبی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر کے کل رات آخری پہر کے واقعات کو ذہن میں دیکھنے لگا۔ جہانگیر نے بڑے ہوشربا انکشاف کیے تھے ''سی ایف کے'' کا اصلی چہرہ میری نگاہ میں آیا تو اس تنظیم اور شعیب غوری کے لیے میرے دل میں نفرت کا سیلِ آب آ گیا۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت شعیب کو فون کر کے کھری کھری سنا ڈالوں مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا، الٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ یہ تو اچھا ہوا، منہاس باقر کی سمجھ میں بھی میری بات آ گئی۔ میں لاہور سے واپسی پر شعیب غوری اور اس کی تنظیم کی طرف رخ کرنے والا تھا۔ جب تک سونے والا معاملہ بھی صاف ہو چکا ہوتا۔

شعیب غوری اور جہانگیر کے بارے میں سوچتے ہوئے رخشِ خیال امتیاز علی کی جانب بڑھ گیا۔ یہ شخص جتنی تیزی سے میرے قریب آیا تھا، اسی رفتار سے دائمی جدائی دے کر رخصت ہو گیا۔ میر بخش، روبی اور امتیاز علی کا اصل قاتل شعیب غوری تھا اور میں اسے کسی قیمت پر معاف نہیں کر سکتا تھا۔ میں شعیب کو ایسے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنا چاہتا تھا جو رونگٹے کھڑے کرنے کی ایک مثال بن کر رہ جائے۔

امتیاز علی کے علاوہ روبی اور میر بخش کی موت نے بھی میرے سینے میں گہرے گھاؤ ڈالے تھے۔ میر بخش نے میری خاطر بہت قربانیاں دی تھیں۔ وہ ایک جانثار ساتھی تھا۔ میں اس کے زیاں کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا اور شہابی رنگت کی مالک روبی! اس نے تو مجھے بھائی بنا لیا تھا۔ میری کوئی سگی بہن نہیں۔ روبی سے منہ بولا رشتہ قائم ہوا تو وہ بھی قائم نہ رہ سکا۔ شعیب نے محض امتیاز علی کا پتا صاف کرنے کے لیے روبی اور میر بخش کو بھی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہ سفاک شخص کسی بھی طور معافی کے

قابل نہیں تھا۔

شروع میں، جہانگیر کے انکشاف کے بعد میرے ذہن میں فوری طور پر یہ سوال آیا تھا کہ امتیاز تو ''سی ایف کے'' کا بہت اہم رکن تھا پھر شعیب نے اس کا قصہ کیوں تمام کر دیا؟ پھر جلد ہی میں اس راز کو پا گیا۔ شعیب غوری نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ امتیاز مجھ سے بہت کلوز ہو گیا تھا۔ اسے ڈر ہو گا کہ کہیں امتیاز مجھے تنظیم کی اصلیت سے آگاہ نہ کر دے۔ ایک دو موقع پر میں نے محسوس بھی کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، کوئی بہت ہی خاص، ذاتی اور اہم بات۔ شاید وہ راز کی بات یہی تھی! مگر امتیاز کی لب کشائی سے پہلے ہی شعیب غوری نے اس کے لبوں پر دائمی مہرِ سکوت ثبت کر دی تھی۔ امتیاز مجھ سے گہری دوستی کی پاداش میں جان گنوا بیٹھا تھا۔ گہری دوستی تو شعیب بھی مجھ سے ظاہر کر رہا تھا بلکہ اس دوستی کے ثبوت کے طور پر اس نے میرے لیے بہت کچھ کیا بھی تھا۔

اب مجھے اس کے لیے کرنا تھا۔ دوستی کا جواب دوستی سے نہ دیا جائے تو پھر مزہ نہیں۔ شعیب کی زہریلی دوستی، زہر آلود جواب ہی کی متقاضی تھی اور میں...... اس ناقابلِ فراموش جواب کے لیے ذہن و دل سے پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ میرے اندر اتنا زہر بھرا ہوا تھا کہ اس کو سنبھالنے اور سمیٹنے میں شعیب غوری کی سانسیں پھول جاتی۔

میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ ٹیکسی نے مجھے ائیر پورٹ پہنچا دیا۔ خدا کا شکر ہے، میں بروقت وہاں پہنچ گیا تھا۔ پہلے میں نے ریسٹورنٹ میں جا کر ہلکا پھلکا ناشتا کیا پھر ضروری معاملات کی انجام دہی کے لیے ائرپورٹ کے عملے سے بھرپور تعاون کرنے لگا۔ پاکستان میں ائرپورٹ کا اسٹاف ظاہر یہی کرتا ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں پیش پیش ہے، ورنہ درحقیقت آپ ان سے تعاون کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے دیس کی بات ہی نرالی ہے۔

میں ڈارلنگ کو اپنے بازو پر اٹھائے لائیو اسٹاک بکنگ کاؤنٹر پر پہنچا اور انہیں ڈارلنگ کی بکنگ کے بارے میں بتایا۔ میرے کاغذات اور اپنے ریکارڈ کو چیک کرنے کے بعد انہوں نے مجھے ایک چوبی پنجرہ (WOODEN CAGE) مہیا کیا۔ میں نے ڈارلنگ کو اس کیج میں داخل کر دیا۔ وہ کسی سمجھ دار اور فرمانبردار بچے کی طرح شرافت سے کیج میں بیٹھ گئی۔ اس کی حرکات و سکنات سے محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اپنے سفر کی پوری خبر ہو۔

اس پنجرے کو بند کرنے کے بعد اس کے ساتھ ضروری کارروائی کی گئی پھر اسٹاف کا ایک شخص پنجرے کو ٹرالی پر رکھ کر اس راہداری کی جانب بڑھ گیا جو سیدھی جہاز تک جاتی تھی۔ پالتو جانوروں کو بائی ائر لانے لے جانے کے لیے بڑا خوبصورت بندوبست کیا جاتا ہے۔ ہر جہاز کی دم میں، کیبن کے پیچھے لائیو اسٹاک کنٹینرز موجود ہوتا ہے جس میں مختلف جانوروں کے پنجروں کو فکس کرنے کا نظام بڑے اچھے انداز سے کام کرتا ہے۔ پنجروں کو کنٹینرز کی دیواروں پر اس طرح نصب کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ، کسی بھی صورت میں ہل نہ سکیں۔ جہاز کے اس حصے میں بڑی بھرپور کولنگ ہوتی ہے تاکہ لائیو اسٹاک کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچنے پائے۔ جانوروں کے لیے انسانوں کا یہ حسنِ سلوک قابلِ رشک ہے!

میں دیگر مراحل سے بحسن و خوبی گزر کر ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچ گیا۔ مجھے بورڈنگ کارڈ مل گیا تھا اور یہاں سے مجھے سیدھا جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ میں نے اس ویٹنگ روم میں بیٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ میرے علاوہ اور بھی بہت سے افراد وہاں موجود تھے وہ یقیناً پسنجرز تھے اور تھوڑی دیر بعد جہاز میں سوار ہونے والے تھے۔

میں وقت گزاری کے لیے انگلش میگزین کا مطالعہ کرنے لگا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ مجھے میگزین سے نگاہ ہٹا کر سامنے دیکھنا پڑا۔ کسی نے مجھے پکارا تھا اور آواز خالص نسوانی تھی۔

''ہیلو وجیہ! تم یہاں؟''

میں نے خود کو ''وجیہ'' کہہ کر پکارنے والے کی جانب دیکھا اور میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ صدف تھی۔ بھرے بھرے جسم اور پستہ قامت والی صدف جو میڈیکل کے فائنل ائیر میں تھی۔

میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا ''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔ تمہیں تو اس وقت میڈیکل کالج میں ہونا چاہیے تھا!''

اس نے چونکہ مجھے ''تم'' سے مخاطب کیا تھا اس لیے میں نے بھی یہی طرزِ تخاطب اختیار کیا تھا۔ اس انداز میں بے تکلفی کی خاصی گنجائش ہوتی ہے۔ وہ کندھے سے بیگ کو اتار کر ایک سیٹ پر بیٹھ گئی اور میرے سوال کے جواب میں بولی۔

''اگر مجھے اس وقت میڈیکل کالج میں ہونا چاہیے تو تمہیں بھی اب تک لاہور پہنچ ہی جانا چاہیے تھا۔ میرے حساب سے تو تم کافی دن پہلے لاہور روانہ ہونے والے تھے!''

اس نے بات ختم کر کے شرارت آمیز انداز میں مجھے

دیکھا پھر میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''خیر، میں تو اپنی ننھیال......یعنی لاہور جا رہی ہوں۔''

''میں بھی اپنے گھر لاہور ہی جا رہا ہوں۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا ''تم اکیلی ہی ہو یا تمہارے ساتھ بھی کوئی ہے؟''

''بالکل اکیلی ہوں۔'' وہ سادگی سے بولی ''ایک ہفتے کے لیے جا رہی ہوں پھر امتحانات شروع ہو جائیں گے اور فرصت نہیں ملے گی۔''

صدف خاصی بولڈ اور باتونی لڑکی تھی۔ اس نے پہلی ملاقات ہی میں میرے کان کھڑے کر دیے تھے۔ یہ ملاقات چند روز قبل ''ساؤتھ'' کے نزدیک ایک خوب صورت پارک میں ہوئی تھی۔ اس کا مشاہدہ اور حافظہ بہت قوی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ مجھے پہلے بھی دیکھ چکی ہے۔ اس کے ماموں سرفراز خان جے پور (انڈیا) میں لیدر کا بزنس کرتے تھے۔ اس نے مجھے وہیں دیکھا تھا۔ میں ان دنوں جے پور میں ٹھاکر بھانوت سنگھ اور رانی روپ متی کے ساتھ تھا اور وہاں کے ہندو پنڈتوں سے میری خوب ٹھنی ہوئی تھی۔ صدف نے کسی مقامی اخبار میں میری تصویر دیکھی اور ''کارنامے'' پڑھے تھے۔ اسے میرا نام بھی اچھی طرح یاد تھا مگر میں نے اس کے ان تمام سنسنی خیز انکشافات پر یہ کہتے ہوئے خطِ تنسیخ کھینچ دیا کہ نہ تو میرا نام وجدان ہے اور نہ ہی میں کسی ٹھاکر بھانوت سنگھ یا رانی روپ متی کو جانتا ہوں۔ جے پور تو کیا، میں زندگی میں کبھی انڈیا بھی نہیں گیا۔ میں نے صدف کو اپنا نام وجیہ اور تعلق لاہور سے بتایا تھا۔ انار کلی میں میرے والد کی جیولری کی دکان تھی اور ہم اچھرہ میں رہتے تھے۔

صدف نے اس روز بڑی بے یقینی سے میری وضاحت سنی تھی۔ اس کی بے یقینی مجھے محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی اور میری یہ محتاط روی اس وقت اسے چھیڑ چھاڑ پر اکسا رہی تھی ورنہ ہمارے درمیان بے تکلفی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے سوچا، صدف کے سامنے مجھے اپنے تاثرات اور حرکات و سکنات کو بالکل نارمل رکھنا چاہیے ورنہ اس کا شک یقین میں بدل جائے گا۔ ہم دونوں چونکہ ایک ہی فلائٹ سے لاہور جا رہے تھے اس لیے گفتگو کے معاملے میں کہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ میں کسی بھی طور اس پر کھلنا نہیں چاہتا تھا۔

اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے اس سے پوچھا ''تمہاری ننھیال تو لاہور میں ہے مگر تم نے اپنی ددھیال کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

وہ بولی ''میرے پاپا سرمد بخاری کا تعلق کراچی سے ہے۔ وہ بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ ان کے بزنس کا تعلق شومیکنگ انڈسٹری سے ہے۔ لیدر کا بزنس ہماری خاندانی شناخت ہے۔''

ہمارے درمیان اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک اس نے مجھ سے پوچھا ''مسٹر وجدان! یہ کتنی عجیب سی بات ہے!''

وہ لڑکی میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہو رہی تھی بلکہ اس کے لیے ''خطرناک'' کا لفظ زیادہ موزوں تھا۔ اس نے روا روی میں مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا تاکہ میں انجانے میں غلطی کر بیٹھوں مگر میں اسے ڈیپارچر لاؤنج میں دیکھتے ہی انجانا نہیں رہا تھا بلکہ بہت زیادہ جانا ہو گیا تھا۔

''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ وجدان نامی شخص سے میرا کوئی تعلق نہیں۔'' میں نے اپنے لہجے میں نرمی کو برقرار رکھتے ہوئے سرزنش والے انداز میں کہا ''مگر تمہاری سوئی ابھی تک وجدان اور جے پور پر ہی اٹکی ہوئی ہے۔''

''سوری مسٹر وجیہ!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ اس کی معذرت میں پشیمانی یا ندامت شامل نہیں تھی جس کا یہی مطلب تھا، وہ اب بھی گڑبڑ کر رہی ہے۔

مجھے خاموش پا کر اس نے کہا ''میں نے تھوڑی دیر پہلے جس عجیب بات کا ذکر کیا ہے نا، اس نے میرے ذہن کو الجھا رکھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے، اتنی زیادہ مشابہت! اس وجدان اور اس وجیہ میں۔ میں تمہاری بات کو بھی نہیں جھٹلا سکتی اور اپنی یادداشت کو نظر انداز کرنا بھی میرے لیے ممکن نہیں۔ پلیز، تم ہی اس مسئلے کو حل کرو۔''

اس کی بے بسی میں اداکاری رچی بسی تھی۔ میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا ''صدف! اگر تمہاری جگہ اور کوئی شخص اس حیرت کا اظہار کرتا تو مجھے اچنبھا نہ ہوتا مگر تم تو میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو پھر مشابہت والا معاملہ تمہارے ذہن کو کیوں الجھا رہا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے، جے پور میں وجدان نامی کوئی شخص مجھ سے ملتی جلتی شکل و صورت کا ہو۔ اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔''

وہ میری جانب بڑے غور سے دیکھتے ہوئے بولی ''یہ کہیں ہم شکل والی اسٹوری تو نہیں؟''

''ہم شکل اور جڑواں والی اسٹوری فلم میں ہوتی ہے مس صدف۔''

''تم کہیں مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہے ہو؟''

''اس میں میرا کیا فائدہ ہو گا؟''

''تفریح کی خاطر۔''

''میں ایسی تفریح کا قائل نہیں جس میں دوسروں کو ذہنی اذیت اور جذباتی کوفت سے گزارا جائے۔'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا تو تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ میں تمہیں اپنے والدین سے ملواؤں گا پھر تمہاری تسلی ہو جائے گی کہ میں وجدان ہوں یا وجیہ۔ اگر تمہاری خواہش ہوگی تو میں تمہیں اپنا برتھ سرٹیفکیٹ بھی دکھا دوں گا۔''

میں نے یہ جملے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہے تھے ورنہ میں اپنے وجیہ ہونے کا ایسا کوئی خاندانی ثبوت پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میری چال کامیاب رہی اور وہ لاجواب ہو کر بے بسی سے میرا منہ تکنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی بے یقینی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا، وہ میری وضاحت سے قائل نہیں ہوئی۔

انسانی دماغ بہت ہی حیرت انگیز مشین ہے۔ کوئی دوسرا ذہن اپنے دلائل سے اسے لاجواب تو کر سکتا ہے مگر قائل کرنا ممکن نہیں، خاص طور پر اس صورت میں کہ سامنے والا کسی بہت ہی خطرناک شک میں مبتلا ہو۔ کہتے ہیں، وہم اور شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ صدف کسی اور زاویے سے مجھ پر کوئی اور سوال کرتی، اے ایس ایف (پرائیویٹ سکیورٹی فورس) کے تین افراد بہت تیزی سے چلتے ہوئے ڈیپارچر لاؤنج میں داخل ہوئے۔ ان کے چہروں سے حد درجہ پریشانی مترشح تھی۔ انہوں نے متلاشی نظروں سے چاروں جانب دیکھا پھر ان میں سے جو سینئر تھا، اس نے بہ آوازِ بلند استفسار کیا۔

''آپ میں سے مسٹر وجیہ کون ہیں؟''

اپنا اختیاری نام اس کی زبان سے سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں نے ایک ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا ''میں ہوں وجیہ۔ کیا بات ہے؟''

وہ تینوں جلدی سے میرے پاس آ گئے۔ اسی سینئر نے مجھ سے پوچھا ''کیا ڈارلنگ نامی بلی آپ ہی کی ہے؟''

''بالکل، وہ میری ہی بلی ہے۔''

ان تینوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

اب مجھے بھی تشویش ہونے لگی۔ میں نے پوچھا ''آپ ڈارلنگ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟''

''وہ تو خیریت سے ہے مگر اس کی وجہ سے دوسرے جانوروں کی خیریت خطرے میں پڑ گئی ہے۔'' مجھے بتایا گیا۔

میں بھی الجھ گیا ''ایسا کیا ہو گیا جناب؟''

''آپ کی ڈارلنگ نے بڑی گڑبڑ کر دی ہے وجیہ صاحب۔'' سینئر نے مجھے بتایا ''متعلقہ اسٹاف نے جیسے ہی ڈارلنگ کے پنجرے کو لائیو اسٹاک کنٹینر میں پہنچایا، وہاں پہلے سے موجود جانوروں نے اودھم مچا دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان پر بہت بڑا عذاب نازل کر دیا گیا ہو۔ وہ مچل رہے تھے، پھڑک رہے تھے اور اپنے اپنے پنجروں میں اچھل اچھل کر احتجاج کر رہے تھے ان کا بس چلتا تو اپنے پنجرے توڑ کر باہر آ جاتے۔ مجبوراً ہمیں ڈارلنگ والے پنجرے کو کنٹینر سے باہر لانا پڑا۔'' وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کے لیے رکا پھر جھرجھری لیتے ہوئے بولا ''لگتا ہے، آپ کی بلی میں کوئی شیطانی روح حلول کر گئی ہے۔ آپ نے یہ بلی کہاں سے لی تھی؟''

ائیرپورٹ سکیورٹی فورس کا وہ سینئر کسی شیطانی روح کا ذکر کر رہا تھا اور میرا ذہن نیلگری کی پیش گوئی میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے دو گھنٹے پہلے بتایا تھا، ڈارلنگ کا اسرار بہت جلد کھلنے والا ہے......تو کیا وہ اسرار یہی تھا؟

فلائٹ کی روانگی میں صرف دس منٹ باقی تھے اور میں سوچ رہا تھا، موجودہ صورتِ حال میں پتا نہیں، میں لاہور جا بھی سکوں گا یا نہیں؟

آئن اسٹائن ایک عبقری تھا، اپنے دور کا جینئس۔ اس جہانِ رنگ و بو کی حقیقت کو اس نے بخوبی پا لیا تھا۔ اس کے مطابق یہ دنیا اور اس میں پائی جانے والی ہر شے دھوکا ہے...... ایک خوبصورت اور دلفریب دھوکا۔ جو چیز جیسی نظر آتی ہے وہ ویسی نہیں ہوتی۔ انسان اپنے مقصد کے پیچھے اندھا دھند دوڑتا ہے اور گوہرِ مقصود ہاتھ آنے پر پتا چلتا ہے، یہ وہ نہیں، جس کی طلب میں ہم بے قرار تھے۔ یہ اب ویسا نہیں رہا جیسا حصول سے قبل دکھائی دیتا تھا۔ ہم ایک فریبِ مسلسل میں سانس لیتے ہوئے اس طلسم کدے میں زندگی گزار دیتے ہیں۔

ڈارلنگ کے حوالے سے سیکورٹی آفیسر کا انکشاف حیرت انگیز اور تعجب خیز تھا۔ وہ معصوم سی نرم و نازک بلی ایسی بھی ہوسکتی ہے کہ متعدد جانور اس کو دیکھتے ہی خوفزدہ ہو جائیں، ایسا تو میں نے کبھی سوچا تھا اور نہ ہی اب تک محسوس کیا تھا۔ چند گھنٹے پہلے نیلگری نے صرف اتنا بتایا تھا، ڈارلنگ کا بھید بہت جلد کھلنے والا ہے۔ سیکورٹی آفیسر نے خدشہ ظاہر کیا تھا، اس بلی میں کوئی شیطانی روح حلول کر گئی ہے جس سے دوسرے جانور وحشت زدہ ہوگئے ہیں۔ اس میں کیا حقیقت تھی اور کتنا فسانہ، اس بارے میں حتمی طور پر فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ زندگی کے تجربے نے اب تک مجھے یہی سکھایا ہے کہ آئن اسٹائن جیسا سپر جینئس غلط نہیں ہوسکتا۔ اس نے جو بھی کہا ہے، کچھ سوچ کر ہی کہا ہوگا اور تاریخ گواہ ہے، مستند ہے اس شخص کا فرمایا ہوا!

ائرپورٹ سیکورٹی فورس کے وہ تینوں جوان یک ٹک میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہے تھے۔ ان میں سے جو سینئر تھا، اس کی نگاہ میں متعدد سوالات تھے۔ اس کی فراہم کردہ اطلاع کو میں نے بے یقینی سے سنا، تھوڑا الجھا اور تامل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے آفیسر! ڈارلنگ تو بہت تمیز دار بلی ہے۔''

''یہ ہو چکا ہے مسٹر وجیہ!'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا ''مجھے خواہ مخواہ جھوٹ بول کر آپ کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اس نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا ''اور آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ ڈارلنگ نے لائیو اسٹاک کنٹینر میں کوئی بدتمیزی کی ہے! میں تو آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ جیسے ہی متعلقہ عملے نے ڈارلنگ والا کیج کنٹینر میں پہنچایا، وہاں پہلے سے موجود درجن بھر جانور بری طرح چلا اٹھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی بے پناہ خوفزدہ ہوگئے اور اچھل اچھل کر پنجروں سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کا یہ احتجاجی شور و غل بتا رہا تھا، وہ ڈارلنگ کو اس کنٹینر میں داخل کرنے کے خلاف ہیں۔ ان کی یہ مخالفت کسی ڈر خوف کے سبب ہے یا کوئی اور وجہ رہی ہو بہرحال، آپ کی ڈارلنگ اس فلائٹ سے نہیں جاسکتی۔''

''لیکن میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''اور جہاز کی پرواز میں چند منٹ باقی ہیں۔''

''یہ بات ہمیں زیادہ اچھی طرح معلوم ہے کہ فلائٹ میں کتنا وقت باقی ہے۔'' سیکورٹی آفیسر نے کہا ''اگر آپ اسی فلائٹ سے جانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو اکیلے ہی جانا ہوگا، ڈارلنگ آپ کے ساتھ نہیں جائے گی۔ فی الحال ہم نے اس کے کیج (CAGE) کو ہنگامی کاؤنٹر پر رکھوایا ہے۔ آپ فوراً فیصلہ کرلیں۔ تمام مسافروں کو بورڈنگ کارڈز جاری ہوچکے ہیں اور اب ہم انہیں جہاز میں سوار کرنے ہی والے ہیں۔''

سیکورٹی آفیسر خاموش ہوا تو میں نے کہا ''پلیز، آپ ڈارلنگ والا کیج یہاں لے کر آئیں یا مجھے وہاں لے چلیں۔ میں ڈارلنگ سے بات کروں گا، اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

''آپ ایک بلی سے بات کریں گے، اسے سمجھائیں گے؟'' اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''ہاں، وہ میری بات سمجھتی ہے اور میرے کہے کی تعمیل بھی کرتی ہے۔ آپ اسے میرے پاس لائیں۔ میں معلوم کرلوں گا، وہاں کنٹینر میں کیا حالات پیش آئے ہیں۔ اگر آپ کا بیان درست ہے تو پتا چل جائے گا، وہاں موجود جانوروں نے اس کی آمد کو ناپسند کیوں کیا؟ ان کے خوف کی وجہ کیا ہے؟ ان کا احتجاج کیا معنی رکھتا ہے؟''

''آپ تو یہ بات اتنے وثوق اور اعتماد سے کر رہے ہیں جیسے ڈارلنگ کسی انسان کی طرح آپ کی بات کو سنے سمجھے گی اور آپ کے سوالات کا جواب بھی دے گی!'' سیکورٹی آفیسر نے طنزیہ لہجے میں کہا ''ایسی بلی میں نے کہیں دیکھی ہے اور نہ ہی اس کا ذکر سنا ہے!''

اس کی بات سن کر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے برہمی سے کہا ''آفیسر! آپ اپنے تجربے اور مشاہدے کو بڑھائیں۔ دنیا میں بہت کچھ دیکھنے، سننے اور پرکھنے کو موجود ہے۔ میں نے ڈارلنگ کے حوالے سے جو باتیں کی ہیں وہ مبنی بر سچ ہیں۔ میں اپنے الفاظ کو ثابت کرسکتا ہوں۔''

''آپ فضول بحث کر رہے ہیں۔'' وہ سخت لہجے میں بولا۔

''اپنی گفتگو کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

صدف پہلی مرتبہ ہماری بات چیت میں شامل ہوئی۔ اس نے آفیسر کی جانب دیکھتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا ''دیکھیں جناب! ڈارلنگ، مسٹر وجیہ کی ملکیت ہے، اس کی چہیتی پالتو بلی ہے لہٰذا وجیہ سے زیادہ اس کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ اگر کہہ رہا ہے کہ ڈارلنگ کو سمجھا لے گا تو یقیناً یہ ایسا کر کے دکھائے گا۔ پلیز، آپ ڈارلنگ والے کیج کو یہاں لے آئیں یا ہمیں وہاں لے چلیں، جہاں وہ کیج رکھا ہے۔''

سیکورٹی آفیسر نے کھوجتی ہوئی نظر سے اس خوبرو اور بھرپور حسینہ کو دیکھا پھر سرسری انداز میں پوچھا ''آپ بھی مسٹر وجیہ کے ساتھ ہیں؟''

''جی، میں مسٹر وجیہ کے ساتھ ہوں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔

صدف ایک موقع شناس لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔ ڈارلنگ والا معاملہ اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔ میں نے ابھی تک اسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اس نے بڑی خوب صورتی سے معاملے کو ٹیکل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے انداز سے ناواقفیت یا کسی قسم کا تردد ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس کا رویہ میری فیور میں تھا جو میرے لیے قابلِ غور بات تھی۔

سیکورٹی آفیسر نے کہا ''آپ کو ہمارے چیف کے پاس جانا ہوگا۔ یہ معاملہ یہاں نمٹتا نظر نہیں آتا۔ آپ کی وجہ سے دوسرے مسافر خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔''

اس کے لہجے سے ظاہر تھا، وہ کسی صورت ڈارلنگ والے کیج کو یہاں نہیں لائے گا۔ وہاں موجود مسافروں کے چہروں سے تکدر اور بیزاری جھلکنے لگی۔ میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ ان کے چیف سے مل لیا جائے۔ شاید وہ شخص میری بات کو بہتر طور پر سمجھ جاتا۔

''تمہارے چیف صاحب کہاں بیٹھتے ہیں؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بولا ''آپ ہمارے ساتھ آئیں۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔ اس کے دونوں ساتھی بھی اس کی تقلید کرنے لگے۔ میں نے ایک نظر صدف کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑا۔

ہم دونوں ائرپورٹ سیکورٹی فورس والوں کی راہنمائی میں ان کے چیف کے پاس پہنچ گئے۔ ہم سے پہلے ڈارلنگ کا ''قصہ'' وہاں تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والے سیکورٹی آفیسر ہمیں اپنے چیف کے کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ اس نے یقیناً چیف کو ہمارے بارے میں بریف کردیا ہوگا۔ چیف کے اشارے پر ہم نے کرسیاں سنبھال لیں۔ وہ چند لمحے گہری نظر سے باری باری ہمیں دیکھتا رہا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''مسٹر وجیہ! ہمیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کی بلی کون ہے، کیسی ہے اور کہاں سے آئی ہے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے امن و امان کی صورت حال میں کوئی رخنہ نہ پڑے...... اور ڈارلنگ نے لائیو اسٹاک کنٹینر میں جو اودھم مچایا ہے اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''

چیف نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں حد درجہ معقولیت پائی جاتی تھی۔ چہرے سے وہ ایک ذہین اور معاملہ فہم شخص نظر آتا تھا۔ میں نے اس کے خاموش ہونے پر ڈارلنگ کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''سر! حقیقت یہ ہے کہ اودھم ڈارلنگ نے نہیں بلکہ وہاں موجود دوسرے جانوروں نے مچایا ہے۔''

''بہرحال اس اودھم کی وجہ آپ کی بلی ہے!'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''مجھے تو ابھی اس واقعے کا یقین نہیں آرہا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے یقین ہے، ایسا ہوا ہوگا۔'' چیف نے زور دے کر کہا ''میرے آدمی مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتے، خاص طور پر جو سیکورٹی آفیسر آپ کو لے کر میرے پاس آیا ہے، وہ میرا برسوں کا آزمایا ہوا قابلِ بھروسا آدمی ہے۔''

سی ایس او (چیف سیکورٹی آفیسر) کی آنکھوں سے ذہانت مترشح تھی۔ میں نے اس سے بحث مباحثہ مناسب نہ جانا اور درخواست آمیز لہجے میں کہا۔

''سر! اگر واقعی لائیو اسٹاک کنٹینر میں ایسا کوئی واقعہ ڈارلنگ کی وجہ سے پیش آیا ہے تو آپ مجھے اس سے ملنے کا موقع دیں۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں، وہ میری بات سمجھ لے گی۔ ان شاء اللہ! اب ایسا نہیں ہوگا۔''

''پلیز! آفیسر، آپ ڈارلنگ والا کیج یہاں منگوائیں۔ ابھی مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' صدف نے سی ایس او سے کہا ''میں آپ کو یقین دلاتی ہوں سر!''

مجھے ہر گزرتے لمحے کے ساتھ صدف پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس شیر کی بچی نے ابھی تک مجھ سے ڈارلنگ کے

بارے میں ایک بھی سوال نہیں کیا تھا اور ظاہر یہی کر رہی تھی، وہ مجھے اور میری ڈارلنگ کو برسوں سے جانتی ہے۔ وہ میری توقع سے زیادہ گہری لڑکی ثابت ہو رہی تھی۔

چیف سیکورٹی آفیسر نے صدف کی بات سننے کے بعد متحمل لہجے میں کہا ''بالفرض، آپ اپنی بلی کو کسی طرح کچھ بھی سمجھانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہاں موجود درجن بھر جانوروں کو کون سمجھائے گا۔ انہوں نے کسی بھی سبب، ڈارلنگ کی آمد پر شدید احتجاج کیا ہے، ان کے ردِعمل کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''پھر تو انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا ''ڈارلنگ کو نہیں!''

''یہ ہمارے لیے ممکن نہیں۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا ''اس لیے آپ کی بلی اس فلائٹ سے نہیں جاسکے گی۔ آپ اپنے بارے میں پانچ منٹ میں فیصلہ کرلیں۔ آپ اس بلی کے بغیر جانا چاہتے ہیں یا اس کے ساتھ ہی یہاں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے دوسرے مسافروں کو کوفت اٹھانا پڑ رہی ہے۔''

میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''آفیسر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے ڈارلنگ سے چند باتیں کرنے کا موقع دیا جائے تو میں اس پیچیدگی کو حل کرلوں گا۔ مجھ سے ہدایت لینے کے بعد جب وہ لائیو اسٹاک کنٹینر میں جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی جانور اس کی وجہ سے ان ایزی (Uneasy) نہیں ہو گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

''میں آپ کے وعدے پر کیسے اعتبار کرلوں؟''

''میں مسٹر وجیہ کے وعدے کی گارنٹی دیتی ہوں۔'' صدف نے سنجیدگی سے کہا۔

سی ایس او نے چونک کر صدف کو دیکھا اور پوچھا ''کیسی گارنٹی مس؟''

''یہ گارنٹی کہ مسٹر وجیہ جیسا کہہ رہے ہیں، ایگزیکٹلی ویسا ہی ہوگا۔''

''آپ کے اس وثوق کو پرکھنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟''

''آپ کو میری زبان پر یقین کرنا ہوگا۔''

''مگر یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تو آپ کو نہیں جانتا۔'' وہ الجھ کر بولا۔

صدف نے بااعتماد لہجے میں کہا ''اس سلسلے میں، میں آپ کو ایک معتبر ضمانت دے سکتی ہوں، ایک شخصی ضمانت۔''

''کس شخص کی ضمانت؟'' آفیسر نے دلچسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔

صدف نے کہا ''ذوالفقار زیدی صاحب کی ضمانت۔''

''اوہ! آپ کا اشارہ کہیں ائرپورٹ منیجر کی طرف تو نہیں!'' سی ایس او چہرے کے تاثرات میں تبدیلی لاتے ہوئے بولا۔

''بالکل، میں انہی ذوالفقار زیدی صاحب کی بات کر رہی ہوں۔'' صدف نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''زیدی صاحب میرے پاپا کے بہت اچھے دوست ہیں۔ آپ نے سرمد بخاری کا نام تو سنا ہوگا۔ میرے پاپا اس شہر کے معروف صنعتکار ہیں۔''

صدف کے اس تازہ ترین انکشاف نے جہاں مجھے حیرت میں مبتلا کیا، وہیں چیف سیکورٹی آفیسر کو بھی خاصی حد تک متاثر کیا۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اگر ائرپورٹ منیجر آپ کے اتنے کلوز ہیں تو پھر آپ کا مطالبہ پورا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔'' سی ایس او نے کہا ''لیکن میں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ اگر ڈارلنگ کے دوبارہ داخلے پر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر میں کسی کی نہیں سنوں گا۔''

''آپ کو اس کا حق ہے۔'' میں نے کہا ''اب آپ جلدی سے ڈارلنگ والا کیج یہاں منگوائیں یا مجھے وہاں جاکر اس سے بات کرنے کی اجازت دیں۔''

سی ایس او کی اس معاملے میں دلچسپی خاصی بڑھ گئی تھی۔ اس نے کہا ''آپ کہیں جانے کی زحمت نہ کریں، میں ڈارلنگ کا کیج یہیں منگوالیتا ہوں۔''

پھر اس نے مذکورہ کیج کو اس کے کمرے میں لانے کے احکام صادر کردیے۔ اس سے پہلے اس نے ائرپورٹ منیجر سے رابطہ کر کے صدف کے بیان کی تصدیق کر لی تھی۔ ذوالفقار زیدی نے اس کی تسلی کروادی تو وہ ہمیں ٹھنڈا گرم پوچھنے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی آفر میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

میں نے اس کی پیشکش کے جواب میں کہا ''آفیسر! آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ ہمیں جلد از جلد فارغ کردیں تاکہ ہماری وجہ سے دوسرے مسافروں کو جو پریشانی اٹھانا پڑ رہی ہے اس کا خاتمہ ہو سکے۔''

میں یہ جملے ادا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈارلنگ والے چوبی پنجرے کو وہاں پہنچا دیا گیا۔ ڈارلنگ مذکورہ پنجرے میں بڑی معصوم صورت بنائے بیٹھی تھی۔ سی ایس او سمیت، اسے

اس حالت میں دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی وجہ سے لائیو اسٹاک کنٹینر میں کسی قسم کا کوئی ہنگامہ ہوا ہوگا۔ وہ ایک صلح جو اور پُرامن بلی دکھائی دیتی تھی۔

چیف نے دلچسپ آمیز نظر سے ڈارلنگ کو دیکھا اور کہا ''یہ تو بڑی پیاری بلی ہے!''

میں نے ڈارلنگ والے پنجرے کو اپنے سامنے میز پر رکھ لیا اور گہری نظر سے اسے گھورنے لگا۔ چیف نے کہا ''یہاں میری موجودگی سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔ اگر آپ لوگوں کو پرائیویسی کی ضرورت ہو تو میں کچھ اور بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا اور دوبارہ ڈارلنگ کی جانب متوجہ ہوگیا۔

میں چند ثانیے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر دھیمے لہجے میں کہا ''ڈارلنگ! تم پر ریسرچ تو میں بعد میں فرصت سے کروں گا۔'' میرے انداز میں بڑی معنی خیزی تھی ''فی الحال تو میں یہ چاہتا ہوں، اسی فلائٹ سے لاہور پہنچ جاؤں۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

اس کی آنکھوں میں ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اس نے میری بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا ہو۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت آمیز انداز میں خفیف سا مسکرائی اور جواب میں بولی ''میاؤں!''

اس کی مسکراہٹ کو سی ایس او دیکھ نہیں پایا تھا تاہم اس قسم کی دلچسپ مکالمت سے وہ حیران ضرور ہو رہا تھا۔ میں نے بدستور ڈارلنگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس ''میاؤں'' سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے ہر صورت میں جلد از جلد لاہور پہنچنا ہے۔ میں اپنا راستہ کھوٹا نہیں کرسکتا۔ اگر تمہاری وجہ سے گڑبڑ ہوتی رہی تو میں تمہیں یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ کیا تم میرے ساتھ نہیں جانا چاہتی ہو؟''

''میاؤں!'' وہ ایک ادا سے بولی۔

''میرے ساتھ جانا چاہتی ہو؟''

''میاؤں!''

وہ ایک ہی طرح کا رٹا رٹایا جواب دے رہی تھی مگر میں اس کی اس ''میاؤں میاؤں'' کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس رفاقت سے مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اس کی کون سی ''میاؤں'' کا مطلب ''ہاں'' ہے اور کس کا مطلب ''نہ'' ہے۔ دونوں طرح کی ''میاؤں'' کے وقت اس کے چہرے کے تاثرات میں تھوڑا سا فرق ہوتا تھا اور اس تفاوت کو صرف میں ہی سمجھ سکتا تھا۔

میں نے اس کی ''میاؤں، میاؤں'' کا مفہوم پا کر بڑی سنجیدگی سے کہا ''دیکھو ڈارلنگ! میں تمہاری خواہش پوری کرتے ہوئے تمہیں اپنے ساتھ لاہور لے جا رہا ہوں۔ تم بھی مجھ سے وعدہ کرو، تمہاری وجہ سے لائیو اسٹاک کنٹینر میں کسی قسم کی بدنظمی دیکھنے میں نہیں آئے گی۔''

وہ وعدہ کرتے ہوئے بولی ''میاؤں!''

اس کے بعد وہ اگلے پنجوں پر منہ رگڑنے لگی۔ میں نے سی ایس او کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر! بات بن گئی ہے۔ آپ ڈارلنگ کے کیج کو لائیو اسٹاک کنٹینر میں پہنچوا دیں۔ اب ان شاء اللہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

اس نے متعجب نگاہ سے مجھے دیکھا اور بولا ''مجھے شدید حیرت ہو رہی ہے۔ آج تک میں نے انسان اور جانور کے درمیان اس قسم کی مکالمت نہیں دیکھی اور نہ ہی سنی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔'' وہ ذرا رک کر ڈارلنگ کو حیران کن نظر سے دیکھنے لگا پھر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ''اگر اب لائیو اسٹاک کنٹینر میں پہنچ کر ڈارلنگ نے آپ کی ہدایت پر عمل بھی کیا تو میری حیرت کس درجے پر جا پہنچے گی!''

''آپ یقین کریں سر، یہ میری ہدایت پر ضرور عمل کرے گی۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ لیتے ہیں۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے ڈارلنگ والے کیج کو لائیو اسٹاک کنٹینر میں بھجوا دیا ''اس کو کنٹینر میں رکھنے کے بعد صرف تین منٹ تک دیکھا جائے گا اور فیصلہ ہو جائے گا۔''

ہم واپس ڈیپارچر لاؤنج میں آبیٹھے۔ صدف نے تشویش ناک لہجے میں مجھ سے پوچھا ''وجیہ! کیا تمہیں یقین ہے، اب کوئی ناخوشگوار صورتِ حال پیش نہیں آئے گی؟''

''ہاں، مجھے یقین ہے۔'' میں نے پورے وثوق سے کہا۔

''کیا واقعی وہ بلی تمہاری بات کو سنتی ہے؟''

''ہاں، یہ حقیقت ہے۔'' میں نے کہا ''ڈارلنگ ایک حیرت انگیز بلی ہے۔''

''تم نے اس کے بارے میں پہلے نہیں بتایا!''

''تم نے پوچھا ہی کب تھا؟''

وہ میرے اس جواب پر تھوڑی سی جھینپ گئی۔ ہم نیچی آواز میں یہ باتیں کر رہے تھے اور وہاں موجود دیگر مسافروں میں سے اکثر ہمیں ہی دیکھ رہے تھے۔ ہماری وجہ سے فلائٹ کی روانگی میں چند منٹ کی دیر ہو رہی تھی۔ وہ بیزاری سے ہماری جانب دیکھنے میں حق بجانب تھے۔

میں نے صدف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ”تم نے اپنی ذہانت سے صورتِ حال کو کنٹرول کرلیا ہے ورنہ یہ لوگ میرے لیے کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور کھڑی کردیتے۔ تمہارے پاپا کے دوست ذوالفقار زیدی کا حوالہ خوب کام آیا۔“

”وہ حوالہ ہی کیا جو وقت پر کام نہ آئے۔“ وہ چہک کر بولی ”تم نے وہ محاورہ تو سنا ہوگا، دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔ انکل زیدی اگر آج میرے کام نہ آتے تو پاپا سے ایسی دوستی کا کیا فائدہ!“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر پوچھا ”ایک سوال کروں، ٹھیک ٹھیک جواب دوں گی؟“

”پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے کہا ”جب پارک میں تم مجھ سے ملی تھیں تو میرا حلیہ خاصا مختلف تھا۔ اب اس بدلے ہوئے حلیے میں تم نے مجھے دیکھتے ہی کیسے پہچان لیا ہے؟“

”میں نے تمہیں دیکھتے ہی نہیں بلکہ تھوڑی محنت اور غوروفکر کے بعد پہچانا ہے۔“ وہ انتہائی سادگی سے بولی ”کوئی اور سوال؟“

”تم نے کس برتے پر میری ضمانت دی ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا ”اگر ڈارلنگ نے میری ہدایات کے مطابق عمل نہ کیا تو تمہاری سبکی ہوگی اور تمہارے ساتھ، تمہارے انکل ذوالفقار زیدی کی بھی۔ تم نے ایک انجانے معاملے میں قدم رکھ کر غلطی نہیں کی؟“

وہ گمبھیر آواز میں بولی ”پہلی بات تو یہ کہ میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے امید ہے، بلی تمہارے کہنے پر ضرور عمل کرے گی۔ بالفرضِ محال اس نے اب بھی کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو کیا کیا جاسکتا ہے بھئی! بلی تو پھر بلی ہے۔ ایک جانور سے کسی بھی قسم کے رویے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ میں نے ......“ وہ سانس لینے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی ”دراصل تمہاری بلی پر نہیں، بلکہ تم پر اعتماد کرتے ہوئے گارنٹی دی ہے۔“

اس کی بات ختم ہوئی تو میں بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور ہوچکا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ”مجھ پر اس اندھے اعتماد کی وجہ؟“

”میں نے اندھا نہیں، بلکہ آنکھیں کھول کر تم پر اعتماد کیا ہے۔“

”چاہے جیسے بھی کیا ہے، میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے کرید جاری رکھتے ہوئے کہا ”ہماری یہ دوسری سرسری ملاقات ہے۔ اتنے کم عرصے میں کسی پر اعتماد......“

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی ”کسی پر بھروسا کرنے کے لیے ایک لمحہ بھی کافی ہوتا ہے مسٹر وجدان!“

میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اس کی سوئی وجدان پر اٹک کر رہ گئی تھی۔ میری اب تک کی ساری وضاحتیں، ساری محنت برباد ہوگئی تھی۔ میں اسے یہ یقین دلانے میں ناکامیاب رہا کہ میں وجدان نہیں، وجیہ ہوں۔ جب اس نے میری اس بات کا یقین نہیں کیا تو پھر یہ بھی نہیں مانا ہوگا کہ میں کبھی جے پور یا انڈیا نہیں گیا، میں کسی رانی روپ متی اور ٹھاکر بھانوت سنگھ کو نہیں جانتا اور یہ کہ پنک سٹی (جے پور) کے پنڈتوں اور پجاریوں سے میرا کوئی پھڈا نہیں رہا۔ وہ اپنی سوچ اور بیان پر ثابت قدمی سے جمی تھی اور...... خطرناک بات یہ تھی کہ اس کی اس سوچ اور بیان میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی!

اس دوران میں وہ بڑی گہری نظر سے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا ”مجھے بہلانے کے لیے کوئی نیا بہانہ سوچ رہے ہو؟“

”تم کوئی بچی نہیں ہو جو میں تمہیں بہلاؤں گا۔“ میں نے چڑ کر کہا ”اور مجھے کوئی نیا یا پرانا بہانہ سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ تم خواہ مخواہ وجدان کا راگ آلاپ رہی ہو۔ اگر تم یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کسی منصوبے کے تحت کررہی ہو تو تمہارا یہ منصوبہ تمہیں مبارک ہو۔ میں آئندہ اس سلسلے میں کوئی وضاحت کروں گا اور نہ ہی صفائی پیش کروں گا۔ تم میری باتوں پر یقین کرو یا مجھے جھوٹا سمجھتی رہو، اس بات سے میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا!“ میرے انداز میں خفگی، ناراضی اور بیزاری کی آمیزش تھی تاہم مجموعی طور پر میرا لہجہ قابلِ اعتراض یا تکلیف دہ نہیں تھا۔

”اس پوری تقریر میں، میں صرف تمہاری ایک بات سے اتفاق کرتی ہوں۔“

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ”کون سی بات؟“

وہ بولی ”یہی کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں!“

میں نے پلک جھپکتے میں اس کے سراپا کا جائزہ لیا اور میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوکر رہ گئی۔ وہ واقعی بچی نہیں تھی! کوئی بچی میڈیکل کے آخری سال کی اسٹوڈنٹ کیسے ہوسکتی ہے؟

اسی وقت ڈیپارچر لاؤنج میں موجود مسافروں کو جہاز میں لے جانے کی کارروائی کا آغاز ہوگیا۔ اس سرگرمی کا واضح مطلب یہی تھا کہ ڈارلنگ نے اس مرتبہ کوئی گڑبڑ نہیں کی تھی۔ میں نے ایک اطمینان بخش سانس لیتے ہوئے فاتحانہ نظر سے صدف کی طرف دیکھا۔

وہ پُراعتماد انداز میں بولی ”دیکھا، تم پر میرا بھروسا کتنا سچا نکلا۔ ڈارلنگ نامی اس بلی نے تمہاری ہدایات پر عمل کیا ہے ورنہ کوئی اور بدمزگی یا پیچیدگی سامنے آتی۔“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا اور اپنے سفری بیگ کا جائزہ لینے لگا۔ میری یہ سنجیدگی اسے پسند نہ آئی۔

”سوری مسٹر وجیہ!“ میری سماعت سے صدف کی آواز ٹکرائی ”میں نے خواہ مخواہ آپ کو وجیہ اور وجدان کے چکر میں الجھا دیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔ وجدان آپ سے ملتا جلتا کوئی اور شخص ہوگا۔ آپ تو وجیہ ہیں...... صرف وجیہ! مجھ سے سنگین غلطی ہوگئی۔“

وہ اپنی بھرپور اداکاری سے مجھے ایک مرتبہ پھر چکر دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ پہلے اس سے کوئی سنگین غلطی نہیں ہوئی تھی بلکہ غلطی تو وہ اب کررہی تھی...... اس غلطی کی چغلی اس کا طرزِ تخاطب کھا رہا تھا۔ وہ فوراً ”تم“ سے دوبارہ ”آپ“ پر آگئی تھی۔

اس ذہین وفطین لڑکی سے بے تکلفی انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ اگر مجھے اپنا وجیہ والا بھرم قائم رکھنا تھا تو پھر صدف سے کنی کاٹنا ازحد ضروری تھا!

☆☆☆

کراچی سے لاہور تک کم وبیش اسی منٹ کی فلائٹ ہے۔ اس حساب سے ہمیں مقررہ وقت کے مطابق نو بجے پر لینڈ کرلینا چاہیے تھا لیکن ڈارلنگ والے معاملے نے چند منٹ کی تاخیر کردی تھی چنانچہ وہ جہاز لگ بھگ پونے دس بجے لاہور ائرپورٹ پر اترا۔ مختلف مراحل سے گزر کر ہم ائرپورٹ کی عمارت سے باہر آئے تو صدف نے کہا۔

”وجیہ! تمہارے پاس سواری کا بندوبست ہے یا تم ٹیکسی لوگے؟“

کبیر شاہ نے جس ہوٹل میں میرے لیے بکنگ کروائی تھی اس کی ٹرانسپورٹ ائرپورٹ پر موجود تھی لیکن میں نے دانستہ اس سے استفادہ نہیں کیا تاکہ صدف کے کان نہ کھڑے ہوں۔ میں اسے اپنے تئیں کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

”میں ٹیکسی میں گھر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ جلدی سے بولی ”پھر کیوں نہ ہم ایک ٹیکسی لے لیں۔ میں تمہیں چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چلی جاؤں گی۔“

وہ نہایت ہی عیاری کا مظاہرہ کررہی تھی۔ اس آفر کے ذریعے وہ میرا گھر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے عمل سے میرے یقین کو پختہ کرنے کا کوئی موقع نہیں گنوا رہی تھی۔ میں اس ٹھوس نتیجے پر پہنچا کہ وہ مجھے وجیہ کی حیثیت سے کسی بھی صورت قبول نہیں کرے گی۔ وہ مجھے وجدان سمجھتی ہے اور یہی سمجھتی رہے گی۔ اس کی سوچ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ چاہے مجھے کچھ بھی سمجھتی رہتی، قابلِ توجہ بات یہ تھی کہ وہ پنجے جھاڑ کر میری ٹوہ میں لگ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا، وہ میری وضاحت کو غلط اور اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھی۔ اس پڑھی لکھی مگر سرپھری لڑکی کو ہینڈل کرنے میں مجھے خاصی دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس سے پیچھا چھڑانا اب بہت ضروری ہوگیا تھا۔

میں نے اس کی چال اسی پر لوٹاتے ہوئے کہا ”یہ بھی ہوسکتا ہے، میں تمہیں چھوڑتے ہوئے اپنے گھر کی طرف نکل جاؤں۔ تم اس وقت میرے شہر میں ہو، گویا میری مہمان ہو۔ اتنی سی مہمان داری کا حق تو مجھے بھی ملنا چاہیے۔“

”میں نے ایسا میزبان زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی ”جو مہمان کی خاطر مدارات کے لیے اپنے گھر کے بجائے اسی کے گھر کو استعمال کررہا ہو۔ خیر؟“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی اور بولی ”ایز یو وش مسٹر وجیہ!“

ہم دونوں ٹیکسی تک پہنچے۔ صدف نے مجھے بتایا تھا، اس کی ننھیال لاہور کے ایک پوش علاقے شادمان کالونی میں ہے۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے شادمان جانا ہے۔ اس کے بعد اچھرہ۔“ پھر اس نے میری جانب دیکھا اور استفسار کیا ”وجیہ! تم اچھرہ میں کس جگہ جاؤ گے؟“

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ”سلطان احمد روڈ۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی ”مجھے شادمان کالونی کے چائنا چوک پر ڈراپ کر کے تم مسٹر وجیہ کو اچھرہ لے جانا۔ یہ سلطان احمد روڈ پر جہاں کہیں، تم انہیں پہنچا دینا۔“

ٹیکسی ائرپورٹ کے علاقے سے نکل کر شادمان کالونی کی سمت بڑھنے لگی۔ سلطان احمد روڈ کا نام بوٹا سنگھ کے حوالے

سے میرے ذہن میں نقش تھا۔ وہ موتا سنگھ اچھرہ میں سلطان احمد روڈ پر ہی رہتا تھا۔ اس مردوفا نے خشونت سنگھ سے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ میرے والد صاحب مرحوم کی قیمتی ڈائری کو اس نے بڑی حفاظت سے اپنے پاس سنبھالے رکھا اور جب لاہور میں ملک نوازش علی کے غنڈوں نے اس کا رخ کیا تو وہ اس ''رازدار'' ڈائری کو سینے سے لگائے کراچی پہنچ گیا۔ کروڑوں کی مالیت کے سونے کا راز اس ڈائری میں رقم تھا۔ شاید بوٹا سنگھ اس ڈائری کو مجھ تک پہنچانے کے لیے ہی اب تک زندہ تھا۔ جس روز وہ ڈائری میری تحویل میں آئی، اسی رات بوٹا سنگھ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ وہ ملک نوازش علی کے نمک خوار، میاں زاہد حسین کے بندوں کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ ڈائری کی حفاظت والے جرم بے گناہی میں بوٹا سنگھ کو دردناک موت کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے اس کی موت سے دلی رنج ہوا تھا اور ازاں بعد میں نے اس کا بدلہ بھی لے لیا تھا۔

یہ تمام باتیں سوچتے ہی مجھے اپنے اعصاب میں تناؤ سا محسوس ہوا۔ میاں زاہد حسین اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکا تھا تاہم ان جرم زادوں کا باوا آدم ملک نوازش علی ابھی زندہ تھا۔ نہ صرف زندہ تھا بلکہ اس نے میری رگِ جاں پر اپنے خون آشام دانت بھی گاڑ دیے تھے۔ ساحل اب تب میں اس کے پاس پہنچنے والی تھی۔ مجھے نہ صرف اس کے قبضے سے ساحل کو نکالنا تھا بلکہ اس سے برسوں کا حساب بھی کرنا تھا۔ وہ حساب جو نسل در نسل چلتا آ رہا تھا۔ میں چوہدری نوازش کے ''قرض'' میں گردن تک ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے حرامی باپ نے میرے دادا پر...... اور خود اس نے میرے باپ پر جو ''قرض'' چڑھایا تھا۔ وہ تمام کا تمام میں نے ''ادا'' کرنا تھا...... اور سود در سود ''ادا'' کرنا تھا۔ اس ادائی میں اب زیادہ وقت نہیں بچا تھا۔

اس وقت میرے سامنے دو محاذ کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرف مجھے شعیب غوری اور اس کی تنظیم سے نمٹنا تھا، اس کا قلع قمع کرنا تھا، مگر نہایت ہی خاموشی اور رازداری کے ساتھ۔ دوسری جانب نوازش علی تھا۔ اس محاذ پر مجھے بے دریغ اور کھلم کھلا جنگ کرنا تھی۔ وہ جنگ جو میرے دادا کے وقتوں سے جاری تھی۔ یہ جنگ مرحلہ وار آگے بڑھی تھی اور اب اس کا ڈراپ سین ہونے والا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیکسی ایک شان دار کوٹھی کے سامنے رکی۔ چائنا چوک شادمان کالونی کا بہت ہی خوبصورت اور دلکش علاقہ ہے۔ سرسبز شاداب۔ اس کے پہلو سے ایک نہر گزرتی ہے جس کے کناروں پر استادہ بلند و پست درخت، سبک خرام اور ٹھنڈی میٹھی ہوا میں جھومتے ہیں۔ وہ فضا کی فرحت آفرینی کو اپنے تن من میں اتار کر مستی میں بے خود حرکتیں کرتے ہیں۔ ان کی شاخیں اور پتے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر اٹکھیلیاں کرتے ہیں۔ پانی کی محوِ خرام سطح پر ان کا عکس بڑا دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ درخت ہوا میں نہ جھوم رہے ہوں بلکہ نہر کے پانی میں اپنے حسن کا نظارہ کر رہے ہوں!

صدف نے ٹیکسی ڈرائیور کو ادائی کے لیے پرس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے اس حرکت سے روکتے ہوئے کہا ''مہمان کو یہ زیب نہیں دیتا جو تم کرنے کا ارادہ رکھتی ہو!''

اس کا ہاتھ رک گیا پھر اس نے میری جانب شکست خوردہ نظر سے دیکھتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، اپنی منزل پر پہنچ کر ٹیکسی ڈرائیور سے تم خود ہی نمٹنا۔'' ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا ''آئندہ تم سے رابطہ کیسے ہوگا وجیہ! میں نے تو تمہارا گھر بھی نہیں دیکھا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''میں نے تو تمہارا ٹھکانہ دیکھ لیا ہے نا۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔ ویسے تم احتیاطاً یہاں کا فون نمبر بھی دے دو۔ ممکن ہے، کسی وقت مجھے تمہاری ضرورت پڑ جائے۔ بڑے بڑے افسروں سے تمہارے بہت اچھے مراسم ہیں۔''

میرا اشارہ کراچی ائرپورٹ والے واقعے کی طرف تھا۔ صدف کے پاپا سرمد بخاری کے دوست اور ائرپورٹ منیجر ذوالفقار زیدی نے واقعی ڈارلنگ والے معاملے میں ہم سے بہت تعاون کیا تھا۔

''میں ہفتہ دس دن ہی یہاں قیام کروں گی۔'' صدف نے ڈارلنگ کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''اس کے بعد اگر رابطہ کرنا ہو تو میں کراچی میں ملوں گی۔ تم وہاں کا فون نمبر بھی نوٹ کر لو۔'' پھر اس نے مجھے دونوں مقامات کے فون نمبرز لکھوا دیے اور ڈارلنگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ''پیاری بلی! اب اودھم والی کوئی حرکت نہ کرنا۔ انشا اللہ! ہم پھر ملیں گے...... بہت جلد۔ او کے، سی یو!''

وہ ڈارلنگ کی طرف دیکھتے ہوئے یہ الفاظ ادا کر رہی تھی لیکن میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا، وہ مجھے سنانے کے لیے وہ کلمات دہرا رہی تھی۔ اس نے مجھے اپنی ننھیال میں تھوڑا وقت گزارنے کی پیشکش بھی کی لیکن میں نے معذرت پیش کر دی وہ مجھے ''اللہ حافظ'' کہتے ہوئے ٹیکسی سے اتر گئی تو میرے کہنے پر ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ یقینی طور پر اب وہ اچھرہ کی سمت سفر کر رہا تھا۔

میں لاہور پہلی مرتبہ آیا تھا اور یہاں کے بارے میں میری معلومات صفر کے انتہائی نزدیک تھی۔ جب ڈرائیور نے لگ بھگ ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا تو میں نے اس سے کہا۔

''ٹیکسی کو مال روڈ کی طرف موڑ لو۔'' پھر میں نے اسے اپنے مطلوبہ ہوٹل کا نام بھی بتا دیا۔

کبیر شاہ نے جس ہوٹل میں میرے لیے سوئٹ (Suite) بک کروایا تھا، وہ مال روڈ (شاہراہِ قائداعظم) پر واقع تھا۔ یہ ہوٹل خاصا معروف تھا۔ میرا سوئٹ اس ہوٹل کی دوسری منزل پر تھا اور اس کا نمبر دو سو آٹھ تھا۔ اس سوئٹ میں ایک بیڈ روم، ایک سٹنگ روم کے علاوہ دیگر تمام سہولیات بھی موجود تھیں۔ یہ معلومات کبیر شاہ نے مجھے پہلے ہی فراہم کر دی تھیں۔

ڈرائیور نے میری ہدایت پر ٹیکسی کا رخ تو موڑ لیا لیکن یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا ''صاحب! آپ کو تو اچھرہ جانا تھا، سلطان احمد روڈ پر؟''

''اب مجھے مال روڈ جانا ہے، اپنے ہوٹل۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا ''تم اچھرہ وچھرہ کو ذہن سے نکال دو۔''

اس کے چہرے پر مجھے تذبذب کے آثار نظر آئے۔ میں نے پوچھا ''تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟''

''وہ صاحب جی!'' وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''بات یہ ہے کہ مال روڈ کا فاصلہ اچھرہ کی نسبت......''

میں نے جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی اس کی بات کاٹ دی اور کہا ''ٹھیک ہے۔ تم فاصلے کی پروا نہ کرو۔ میں تمہیں زیادہ کرایہ دے دوں گا۔ اس بارے میں تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔''

وہ مطمئن ہو کر لاہور کی شفاف سڑکوں پر ٹیکسی دوڑانے لگا۔ جب میں نے مذکورہ ہوٹل پہنچ کر اپنے سوئٹ میں قدم رکھا تو میری رسٹ واچ ساڑھے گیارہ کا وقت بتا رہی تھی۔

میں کوئی لمبی فضائی مسافت طے کر کے یہاں نہیں پہنچا تھا کہ تھکن کا سوال پیدا ہوتا لیکن اس کے باوجود بھی میرا پورا وجود تکان سے چور چور تھا اور آنکھوں میں شدید قسم کی جلن بھی ہو رہی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ ساری رات میں بے حد ''مصروف'' رہا تھا اور مجھے ایک لمحے کو بھی آرام کا موقع نہیں مل سکا تھا، نیند لینا تو دور کی بات ہے۔ اس رات پے در پے ایسے ہنگامہ خیز حالات پیش آئے کہ مجھے مارا ماری سے فرصت نہ ملی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا، ایک بھرپور نیند کے لیے جوتوں سمیت بستر میں گھس جاؤں اور جب تک میرا جسم پھول ایسا ہلکا نہ ہو جائے، آنکھ کھولنے کا تکلف نہ کروں۔ مگر فوری طور پر اس خواہش کی تکمیل ممکن نہیں تھی۔ اس سے پہلے چند ایک اہم کام نمٹانا ضروری تھے۔

میں نے واش روم میں جا کر خود کو فریش کیا اور تھوڑا ایزی ہونے کے بعد کراچی فون گھما دیا۔ ہوٹل میں قیام کی وجہ سے ظاہر ہے، یہ فون اس ہوٹل کے توسط سے ہی کیا گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے جہانگیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ شب میں نے اس کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی جس کے نتیجے میں ہماری دوستی وجود میں آئی تھی۔ اس کا بایاں شانہ جوڑ سے خاصا متاثر ہوا تھا، اوپر کا سامنے والا ایک دانت جڑ سے اکھڑ گیا تھا اور میرے دلدار خنجر نے اس کی گردن پر متعدد مہلک کٹس (Cuts) لگائے تھے۔ اس کے کیے کی فی الحال اتنی سزا کافی تھی۔ باقی سزا وہ مرحلہ وار، مجھ سے دوستی نبھا کر کاٹ لیتا۔

تیسری یا چوتھی گھنٹی پر دوسری طرف ریسیور اٹھا لیا گیا۔ میں نے ائرپیس میں جہانگیر کی انتہائی محتاط ''ہیلو'' سنی۔ اس کی آواز میں بے پناہ خوف اور تردد پایا جاتا تھا۔

''ہیلو جہانگیر! یہ میں ہوں۔ وجدان۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

''اچھا تم ہو۔'' اس کے منہ سے اطمینان بھری آواز برآمد ہوئی ''کیا تم لاہور پہنچ گئے یا ابھی کراچی ہی میں موجود ہو؟''

''میں اس وقت لاہور سے بات کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اوہ!'' وہ طویل سانس کھینچ کر رہ گیا۔

''کیا بات ہے جہانگیر! تم کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، بلکہ بہت زیادہ گھبرایا ہوا ہوں۔'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے استفسار کیا ''آخر بات کیا ہے۔ تمہاری گھبراہٹ کا سبب کیا ہے؟''

''وجدان! تمہارے جانے کے بعد یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے پوچھا۔

''فواد ہاتھ سے نکل گیا ہے۔''

''یہ کیسے ہو گیا بھائی! وہ تو تمہارے فلیٹ میں بے ہوش پڑا تھا؟''

''ہاں وجدان! وہ بے ہوش پڑا تھا۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا ''لیکن پتا نہیں، اس کی بے ہوشی کب ختم ہوئی اور وہ کس وقت فلیٹ سے نکل گیا!''

میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا ''تم یہ کیسی عجیب بات کر رہے ہو۔ جب میں تمہارے فلیٹ سے رخصت ہوا تو فواد بیڈروم کے فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ ڈرائنگ روم والی ''میٹنگ'' کے دوران میں ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ ہمارے جاتے ہی تم فواد کا ایسا ''بندوبست'' کر دو گے کہ وہ تمہارے پاس سلیم واسطی کے سامنے زبان کھولنے کے قابل نہیں رہے گا۔ کیا تم نے اس سلسلے میں کوئی غفلت برتی تھی؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان۔'' وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا ''میں شدید قسم کی غفلت کا مرتکب ہو چکا ہوں اور اب سو ایک فیصد امکان اس بات کا ہے کہ فواد یہاں سے نکلنے کے بعد باس سے رابطہ کر چکا ہوگا یا کرنے ہی والا ہوگا۔'' وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ''مجھے محسوس ہو رہا ہے وجدان، جیسے میرا وقت پورا ہو گیا ہے۔ موت اب تب میں مجھے اپنے خونیں جبڑوں میں دبوچنے والی ہے۔ میں سخت خوفزدہ ہوں وجدان! تم سے مجھے دشمنی راس آئی ہے اور نہ ہی دوستی پھل رہی ہے۔''

وہ خوف اور گھبراہٹ کے باعث بے ربط باتیں کر رہا تھا۔ میں نے لگ بھگ چار دس پر اس کے فلیٹ کو خیر باد کہا تھا۔ اس بات کو اب سات گھنٹے سے زیادہ گزر گئے تھے۔ اس تناظر میں، میں نے جہانگیر سے سوال کیا۔

''فواد کتنے بجے وہاں سے غائب ہوا تھا؟''

''پانچ اور چھے بجے کے درمیان۔'' اس نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

''تم اس دوران میں کیا کر رہے تھے؟'' میں نے پوچھا ''تم نے تھوڑی دیر پہلے اپنی کسی غفلت کا ذکر کیا تھا!''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ''وجدان! میں تمہیں دل میں اپنا سچا دوست تسلیم کر چکا ہوں اس لیے تم سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کروں گا۔'' اس نے یہاں تک پہنچ کر ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بتانے لگا ''میری اس غفلت کا تعلق تابندہ سے ہے۔ وہی کال گرل جسے تم نے باتھ روم میں بند رہنے کا حکم دیا تھا۔''

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تاہم وضاحت کی خاطر میں نے پوچھا ''تابندہ بیچ میں کہاں سے آ گئی؟''

اس نے بتایا ''جب تم دونوں یہاں سے رخصت ہو گئے تو اسی وقت تابندہ باتھ روم سے نکل آئی۔ شاید اس نے تمہاری گفتگو سن لی تھی۔ تمہارے جاتے ہی اس نے خود کو محفوظ سمجھا اور تمہاری اجازت کے بغیر وہ باتھ روم سے باہر آ گئی...... اور اسی وقت میرے دماغ کو پتا نہیں کیا ہو گیا!''

اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا ''وہ حرافہ اس وقت مجھے پہلے سے کہیں زیادہ حسین و سنگین نظر آ رہی تھی۔ ہم اسے دو ہزار روپے کے عوض رات بھر کے لیے اپنے فلیٹ پر لائے تھے۔ رقم کی ادائی پیشگی اس کے ایجنٹ کو ہم کر چکے تھے۔ تابندہ فوری طور پر وہاں سے جانا چاہتی تھی۔ وہ چلی جاتی تو ہمارے دو ہزار بھی چلے جاتے۔ تابندہ کے سراپا میں ایسا خمار تھا کہ میں بے خود ہو گیا۔ فواد والے انتہائی اہم معاملے کو بھول کر میں تابندہ کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اس وقت میرے سر پر صرف ایک ہی بھوت سوار تھا...... اور وہ یہ کہ مجھے اپنے دو ہزار ڈوبنے سے بچانا ہیں۔ اس رقم کی ایک ایک پائی تابندہ سے وصول کرنا ہے۔'' وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا ''اس کے بعد کیا ہوا ہوگا، تم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہو!''

''اندازہ تو میں لگا چکا ہوں جہانگیر!'' میں نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا ''ہوس نے تمہاری آنکھوں پر ایسی دبیز پٹی باندھ دی تھی کہ تم اپنے دو ہزار پورے کرنے کے چکر میں نہایت قیمتی آدمی فواد کو گنوا بیٹھے ہو۔ وہ تمہاری اس غفلتانہ مصروفیت سے فائدہ اٹھا کر رفو چکر ہو گیا۔ یہ دو ہزار روپے وصول کر کے تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے جہانگیر۔ وہ ہماری ابتدائی گفتگو سن چکا تھا۔ تم نے جو مجھے وجدان کی حیثیت سے اور میں نے تمہیں گرے بچارو کے حوالے سے شناخت کر لیا تھا پھر ہمارے درمیان کسی یہودی لابی اور ''سی ایف کے'' کے باہمی رابطے اور تعلق پر بھی مکالمے بازی ہوئی تھی۔ فواد نے سلیم واسطی کو اس واقعے سے باخبر کر دیا ہوگا اور اس نے بگ باس شعیب غوری تک یہ اطلاع پہنچا دی ہو گی جس کا مطلب یہ ہوا کہ شعیب غوری میری اس کارروائی اور آئندہ عزائم سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہے لہٰذا......'' میں نے پرسوچ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا اور تھوڑے توقف کے بعد گمبھیر آواز میں کہا ''اب مجھے شعیب غوری کی جانب سے محتاط رہتے ہوئے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا۔ جہانگیر! تمہاری ذرا سی جذباتی بھول اور نفسانی خواہش نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا ہے۔ بتاؤ، اب میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں!''

''وجدان! تم بہت باتدبیر انسان ہو۔'' وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا ''خدا کے واسطے مجھے بگ باس کے عتاب سے بچا لو۔ میں حرام موت نہیں مرنا چاہتا۔''

اس کا گڑگڑانا سن کر مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''اگر تم اپنے دل میں زندہ رہنے کی خواہش رکھتے ہو تو اب تک اس فلیٹ میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ فواد چھے بجے سے پہلے وہاں سے نکل گیا تھا۔ اور اب ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔ موت کسی بھی لمحے تمہیں اپنے نکیلے پنجوں میں دبوچ سکتی ہے۔ کیا تم بھیانک اور حسرت ناک موت کا انتظار کر رہے ہو؟''

اس کی سراسیمہ آواز سے میں نے محسوس کیا کہ اس نے میری بات کے اختتام پر ایک خوفناک جھرجھری لی ہوگی۔ ایئر پیس...(EARPIECE) میں اس کی ڈری سہمی آواز ابھری ''وجدان! تم ہی بتاؤ، میں کہاں جاؤں۔ اوپر خدا ہے اور نیچے تم...... تم دونوں کے سوا میرا کوئی سہارا اور آسرا نہیں!''

میں نے کہا ''اوپر والے پر بھروسا رکھو اور میری ہدایت پر عمل کرو۔ انشاء اللہ نتیجہ تمہارے حق میں برآمد ہوگا۔''

''تم مجھے حکم دو، میں کیا کروں!''

''تمہیں فوری طور پر اس منحوس فلیٹ کو چھوڑ دینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں نکل رہا ہوں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا ''بتاؤ، یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں؟''

میں نے اسے منہاس باقر کے دفتر کا پتا سمجھایا اور کہا ''جب تک میں وہاں فون کر کے تمہارے بارے میں آسانیاں فراہم نہ کر دوں، تم اس دفتر سے ہلنا بھی نہیں۔ یہ فیصلہ بعد میں کریں گے کہ اس کے بعد تمہیں کہاں جانا ہے۔''

''اوکے وجدان! میں تمہارا یہ احسان بھی زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''تم یہ بات کہہ کر اس دوستی کی توہین کر رہے ہو جو ہمارے درمیان قائم ہو چکی ہے۔'' میں نے برہمی سے کہا ''دوستوں پر احسان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے کام آنا فرضِ اوّلین ہوتا ہے۔''

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا ''میں آئندہ اس بات کا خیال رکھوں گا۔''

فون بند کرنے سے پہلے میں نے اس سے چند ایک ضروری سوال کیے۔ میں نے کہا ''آج صبح، تمہارے بیان کے مطابق پاکستان کے ایک دوست یورپی ملک کا سفیر مسٹر جم براؤن کراچی پہنچنے والا تھا۔ اس کے جہاز نے ٹھیک دس بجے لینڈ کرنا تھا اور ہوٹل پہنچنے سے قبل ہی ''سی ایف کے'' کے دو دہشت گردوں نے مہمان سفیر کو نرسری کے مقام پر قاتلانہ حملے کے بعد موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اس سلسلے میں تازہ ترین رپورٹ کیا ہے؟ قاتلوں نے تمہارے فلیٹ پر پناہ لینا تھی۔ کیا وہ تمہارے پاس پہنچ گئے ہیں؟''

جہانگیر کی اب تک کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا تھا، وہ اس وقت فلیٹ پر بالکل اکیلا تھا۔ اگر وہ اکیلا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا، نرسری والے ''آپریشن'' میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اور وہ دونوں قاتل جہانگیر کے پاس پہنچنے سے قاصر رہے تھے۔ دس گزرے ہوئے بھی...... ڈیڑھ گھنٹا بیت گیا تھا۔

جہانگیر نے میرے سوالات کے جوابات میں بتایا ''اس سلسلے میں خود میں بھی بہت پریشان ہوں۔ نجیب اللہ اور سراج احمد نے جم براؤن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد مختلف مراحل سے گزر کر ٹھیک ساڑھے دس بجے میرے پاس آنا تھا لیکن ابھی تک نہ تو وہ آئے ہیں اور نہ ہی اوپر سے کسی قسم کے احکام۔ لگتا ہے، کوئی لمبی ہی گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''ہاں، لگتا تو یہی ہے۔'' میں نے پرخیال انداز میں کہا ''جتنی لمبی گڑبڑ ہو چکی ہے اس سے بھی کہیں زیادہ طویل و عریض گڑبڑ ہونے والی ہے لہٰذا تم فی الفور اس فلیٹ سے نکل کر میرے بتائے ہوئے مقام پر پہنچنے کی کوشش کرو۔ میں بعد میں پھر کسی وقت تم سے رابطہ کروں گا۔''

پانچ منٹ کے وقفے سے میں نے دوسرا فون منہاس باقر کو کیا۔ اس وقت میری رسٹ واچ گیارہ پچاس بجا رہی تھی۔ منہاس سے فوراً رابطہ ہو گیا کیونکہ وہ دفتر ہی میں موجود تھا۔ فون پر میری آواز سنتے ہی وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔

''وجدان! تمہارے لیے ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔''

''جم براؤن کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوا۔ ہے نا؟''

''رائٹ یو آر!'' وہ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا ''تفصیلات بڑی سنسنی خیز ہیں۔ ہم نے متوقع قاتلوں کو گرفتار کر لیا ہے...... ہم سے مراد، ہماری پولیس ہے۔''

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''مبارک ہو منہاس صاحب! آپ کی زبانی اس کامیابی کی تفصیل سننے سے پہلے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ابھی تھوڑی دیر بعد جہانگیر آپ کے دفتر پہنچنے والا ہے۔ اس کی جان کو سخت خطرہ ہے۔ آپ اسے پناہ دیں گے اور اس کی حفاظت کا بھی بندوبست آپ ہی کے ذمے ہے۔ اس کے بارے میں تفصیلی بات بعد میں ہو گی۔ فی الحال آپ ذہن میں یہ بات رکھیں کہ جہانگیر کی حیثیت میرے ایک دوست کی سی ہے!''

"تم جہاں گیر کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ وجدان!" وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا "اس کی حفاظت اور نگہداشت اب میرے ذمے ہے۔ وہ تمہارا دوست ہے، میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔"

میں نے مطمئن ہونے کے بعد کہا "ٹھیک ہے منہاس صاحب! اب آپ مجھے سفیر مسٹر جم براؤن کے بارے میں بتائیں؟"

وہ بتانے لگا "تمہاری فراہم کردہ اطلاعات نے میرے اندر کھلبلی مچادی تھی۔ کوئی اور شخص اگر مجھے اس بارے میں بتاتا تو میں اس کی بات پر دھیان نہ دیتا مگر تمہاری تو بات ہی دوسری ہے۔ میں تم پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کرنے لگا ہوں وجدان!"

"یہ آپ کی محبت ہے منہاس صاحب!" میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

وہ بولا "محکمۂ پولیس کے ایک ڈی ایس پی خورشید شاہ سے میرے دوستانہ مراسم ہیں۔ خورشید ایک ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر ہے۔ تمہارے جاتے ہی میں نے خورشید کو فون کیا اور اسے تازہ ترین متوقع پیش آمدہ صورتِ حالات کے بارے میں بتایا۔ اس نے فون پر بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً مجھ سے ملنے چلا آیا۔ خورشید شاہ جم براؤن کی آمد سے آگاہ تھا اور حسنِ اتفاق دیکھو وجدان کہ خورشید شاہ پروٹوکول کے اس دستے میں شامل تھا جو سفیر جم براؤن کے ساتھ ائر پورٹ سے ہوٹل تک پہنچنے والا تھا۔ خورشید شاہ نے پہلی فرصت میں اپنے اعلیٰ آفیسرز سے رابطے کیے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر مہمان یورپی سفیر کی حفاظت اور متبادل قیام کا بندوبست کر لیا گیا۔"

"متبادل قیام......؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

اس نے بتایا "ہاں وجدان! اعلیٰ عہدوں پر فائز ذمے دار افراد نے آپس میں ہنگامی میٹنگ کی اور یہ طے پایا کہ مہمان سفیر کو اس کی طے شدہ قیام گاہ کے بجائے کہیں اور پہنچایا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ہوٹل ائر پورٹ کا انتخاب کیا گیا اور نہایت ہی رازداری کے ساتھ وہاں مہمان سفیر جم براؤن کو ٹھہرانے کے انتظامات کر دیے گئے۔ مذکورہ ہوٹل ائر پورٹ سے چند قدموں کی دوری پر ہے لہٰذا جم براؤن کو بہ حفاظت وہاں پہنچا دیا گیا ہے۔"

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا تو میں نے پوچھا "منہاس صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ متوقع قاتلوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ لوگ کس طرح پولیس کے ہتھے چڑھ گئے؟ انہوں نے تو نرسری کے قریب گھات لگا کر جم براؤن کو شکار کرنا تھا!"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان!" وہ تائید کرتے ہوئے بولا "مہمان کو بحفاظت ہوٹل ائرپورٹ پہنچانے کے ساتھ یہ پروگرام بھی طے پایا تھا کہ ملک دشمن متوقع قاتلوں کو ضرور گرفتار کیا جائے گا۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر نرسری کے پورے علاقے کو سادہ لباس پولیس والوں نے اپنی نگاہ میں رکھ لیا۔ خاص طور پر لال کوٹھی سے لے کر گورا قبرستان تک شارع فیصل کی دونوں جانب چوکنا نظر رکھنے والا مسلح پولیس اہلکار متعین کر دیے گئے تاکہ کسی بھی غیر معمولی حرکت پر وہ فوراً عقاب کے مانند جھپٹا مار کر مشتبہ افراد کو اپنی گرفت میں لے لیں۔"

منہاس باقر کے بیان میں خاصا جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ کامیابی اور ناکامیابی ایک انتہائی جذباتی اور حساس معاملہ ہوتا ہے۔ اس میں انسان خود پر اختیار نہیں رکھ پاتا۔ بعض اوقات کسی خوشی کے موقع پر فرطِ جذبات سے انسان کے آنسو نکل آتے ہیں اور کبھی غم کی صورتِ حالات میں آنکھ سے ایک قطرہ نہیں ٹپکتا۔ غم و خوشی اور کامیابی و ناکامیابی انسان کو بے اختیار کر دیتی ہے۔ منہاس باقر بھی اس وقت کچھ اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔

وہ بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا "وجدان! متوقع قاتلوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پولیس کو ایک ڈراما اسٹیج کرنا پڑا۔ مہمان سفیر جم براؤن کو تو چپکے سے ائر پورٹ سے نکال کر ہوٹل پہنچا دیا گیا تھا لیکن ڈمی پروٹوکول کو ائر پورٹ سے اس ہوٹل کی جانب روانہ کیا گیا جہاں پہلے جم براؤن کے قیام کا پروگرام تھا۔ اس پروٹوکول میں وہ گاڑی شامل نہیں تھی جو سفیر کو ہوٹل لے جانے کے لیے استعمال ہوتی۔

"تم جانتے ہو وجدان! پروٹوکول کی گاڑیاں ہائی اسپیڈ پر چلتی ہیں تاکہ کہیں سے انہیں نشانہ نہ بنایا جا سکے۔ ایک سو ساٹھ سے اوپر رفتار کو ٹارگٹ بنانا ناممکنات میں سے ہے پھر جو تم نے بتایا تھا کہ نرسری کے مقام پر کوئی مصنوعی ایمرجنسی پیدا کر کے اس پروٹوکول کی اسپیڈ کو کم کرنے یا انہیں روکنے کی کوشش کی جائے گی تو بالکل ویسا ہی ہوا۔ پروٹوکول میں سب سے آگے ٹریفک پولیس کا دستہ ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پولیس والوں کا دستہ۔ پولیس والوں کے عقب میں مہمان شخصیت کو رکھا جاتا ہے۔ اس وی وی آئی پی شخصیت کے پیچھے پھر پولیس کا ایک کورنگ (COVERING) دستہ موجود ہوتا ہے۔ ہمارے اس ڈرامے میں جم براؤن کی گاڑی موجود نہیں تھی

چنانچہ طے یہ پایا تھا کہ پولیس کے دونوں دستوں میں فاصلہ بڑھا دیا جائے اور اگر نرسری کے کسی مقام پر رکاوٹ پیدا کی جائے تو وہاں ضرور بریک لگائے جائیں۔ متوقع قاتلوں کو پکڑنا مقصود تھا اس لیے ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے سب کے ذہن تیار تھے۔ جم براؤن کی گاڑی کو غیر موجود پا کر قاتل بوکھلا جاتے اور اس بوکھلاہٹ میں ان سے کوئی ایسی فاش غلطی سرزد ہو جاتی جس کی بنا پر وہ پولیس کی پکڑ میں آ جاتے۔"

منہاس باقر ذرا دیر کو رکا تو میں نے کہا "قاتلوں کو پکڑنے کا منصوبہ خاصا دلچسپ ہے لیکن خطرناک بھی۔ پولیس نے اس قسم کا فیصلہ کر کے ہائی رسک لیا تھا۔"

"وجدان! عام طور پر ہماری پولیس کسی طرح کا رسک لینے کی عادی نہیں۔" منہاس باقر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "لیکن ڈی ایس پی خورشید شاہ کا شمار ان پولیس آفیسرز میں ہوتا ہے جو اپنے مقصد کے حصول کی خاطر جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے پھر جم براؤن والا معاملہ ملکی عزت و وقار کا مسئلہ تھا۔ اگر اس یورپی سفیر کو کچھ ہو جاتا تو پوری دنیا میں پاکستان کی بہت رسوائی ہوتی۔ ان حالات میں پولیس کو ہائی رسک (HIGH RISK) لینا پڑا۔ جانتے ہو، اس چال کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ متوقع قاتلوں کو کیسے گرفت میں لیا گیا؟"

میں نہیں جانتا تھا اس لیے جلدی سے کہا "آپ بتائیں منہاس صاحب!"

اس نے بتایا "پروٹوکول میں شامل ٹریفک پولیس کے ہر اول دستے نے جیسے ہی نرسری کا پل کراس کیا، فٹ پاتھ کے قریب کھڑا ایک نو عمر لڑکا بھاگتا ہوا سڑک پر آ نکلا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو بالٹیاں اٹھا رکھی تھیں۔ ایک بالٹی میں بھنے ہوئے چنے اور دوسری میں بھنی ہوئی مکئی تھی۔ لڑکے کی عمر بارہ تیرہ سال رہی ہوگی۔ اس عمر کے بچوں کو تم نے بالٹیاں اٹھائے شہر میں مونگ پھلی، مکئی اور چنے بیچتے دیکھا ہوگا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس لڑکے کے تعاقب میں ایک شخص بھی سڑک پر آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے مسلسل باآواز بلند گالیاں دے رہا تھا اور ساتھ ہی اسے "جیب کترا، چور، حرامی" اور جانے کیا کیا کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔ ان دونوں کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ اس آدمی کی جیب کاٹ کر فرار ہو رہا تھا۔

"سڑک کے عین وسط میں پہنچ کر بالٹی بردار لڑکا منہ کے بل گرا۔ بالٹیاں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دور جا گریں اور ان میں موجود مکئی و چنے کے دانے سڑک پر دور دور تک بکھر گئے۔ وہ لڑکا اپنے تعاقب کی پروا کیے بغیر بڑی تیز رفتاری سے اپنے "مال" کو سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔

وہاں موجود ٹریفک پولیس والے چیخ چیخ کر انہیں روڈ سے ہٹنے کو کہہ رہے تھے مگر وہ دونوں جیسے کسی کی بات پر دھیان نہیں دے رہے تھے۔ لڑکا تن دہی سے اپنے کام میں مصروف تھا اور اس کے پیچھے آنے والا شخص لڑکے کو پکڑنے کی کوشش میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ یہ پورا واقعہ بمشکل پانچ سیکنڈ میں پیش آیا ہوگا۔ اگلے ہی لمحے پولیس کی گاڑیاں موقع پر پہنچ گئیں پھر ان کے ٹائروں کی تیز چرچراہٹ فضا میں گونجی۔ طے شدہ پروگرام کے تحت پولیس والوں نے گاڑیاں روک لی تھیں۔

بریکس کی آواز کے ساتھ ہی سروس روڈ سے ایک ہونڈا ون ٹو فائیو تیزی سے نکلی۔ اس موٹر سائیکل پر دو افراد سوار تھے جنہوں نے اپنے چہروں کو چھپانے کے لیے ہیلمٹ لگا رکھے تھے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ایک خطرناک گن واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کا رخ شارعِ فیصل کی جانب تھا۔ وہ یقینی طور پر جم براؤن کی گاڑی پر فائرنگ کی خاطر آگے بڑھے تھے لیکن اسی اثنا میں پولیس والوں کا پچھلا دستہ بھی موقع پر پہنچ گیا۔ پولیس والے متوقع قاتلوں کی سازش سے پیشگی آگاہ تھے اور یہ سارا ڈراما محض انہیں گرفتار کرنے کے لیے رچایا گیا تھا لہٰذا موٹر سائیکل سوار فوراً ان کی نگاہ میں آ گئے۔ پہلے سے ریڈ الرٹ پولیس والوں نے ہونڈا ون ٹو فائیو کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے اپنی تیار گنوں کے دہانے کھول دیے۔ اس فائرنگ میں ان دونوں کے پاؤں بھی شدید زخمی ہو گئے اور موٹر سائیکل سڑک کے کنارے الٹ گئی۔ مستعد پولیس والوں نے پیچھے بیٹھے ہوئے مسلح شخص کو گن سیدھی کرنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا پھر چند سیکنڈ میں ان دونوں موٹر سائیکل سواروں کو پولیس نے اپنی تحویل میں لے کر آہنی زیور سے آراستہ کر دیا۔ گن بردار کا نام سراج احمد اور اس کے ساتھی کا نام نجیب اللہ معلوم ہوا ہے۔ پولیس کی تفتیش جاری ہے تاہم ابھی تک انہوں نے زبان نہیں کھولی لیکن ان کی مزاحمت طول نہیں پکڑے گی۔ پولیس زبان بندی اور لب کشائی کے ایک سو ایک "ہنر" جانتی ہے۔"

میں حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ منہاس باقر کی رپورٹ سن رہا تھا۔ جہاں گیر نے مجھے متوقع قاتلوں کے یہی نام بتائے تھے جو پولیس والوں کے ہتھے چڑھے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ میرا ملک ایک بہت بڑی بدنامی سے بچ گیا تھا۔ میں نے منہاس باقر سے پوچھا۔

"وہ چنے مکئی والے لڑکے اور اس کا غصیلا تعاقب کرنے

والے شخص کا قصہ کیا ہوا؟ وہ اس معاملے کے اہم کردار ہیں۔"

"پولیس نے ان دونوں کو بھی گرفتار کرلیا ہے۔" منہاس باقر نے بتایا "انہیں اس ڈرامے میں کردار ادا کرنے کے لیے خریدا گیا تھا۔ بھاری معاوضے کے لالچ نے انہیں یہ خطرناک رول کرنے پر مجبور کردیا۔ لڑکے کا نام بخت واحد ہے اور دوسرے شخص کا نام امداد علی پتا چلا ہے۔ بخت واحد کا تعلق ایک مفلوک الحال گھرانے سے ہے اور چنے مکئی وغیرہ بیچنا اس کا ذریعۂ روزگار ہے۔ بخت واحد اور امداد علی نے وہ خطرناک "حرکت" نجیب اللہ وغیرہ کے کہنے پر بھاری رقم کے لالچ میں کی تھی۔"

"حصولِ رزق حلال کو اسی لیے عین عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔" میں نے پرخیال انداز میں کہا "ورنہ پیٹ کا دوزخ جانے کیسے کیسے شرمناک چکروں میں پھنسانے کے لیے تیار رہتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان!" وہ تائیدی انداز میں بولا "اب پولیس اس غریب چنے بیچنے والے لڑکے کو ناکوں چنے چبانے پر مجبور کردے گی۔"

ہمارے درمیان اس تازہ ترین موضوع پر مزید چند باتیں ہوئیں پھر منہاس باقر نے پوچھا "تم تو خیریت سے لاہور پہنچ گئے ہونا!"

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا "اب تک تو اس طرف مکمل خیریت ہے۔"

"انشاء اللہ! آئندہ بھی خیریت ہی رہے گی۔" وہ پُریقین لہجے میں بولا "فرید پاشا میرا بہت ہی پرخلوص دوست ہے۔ میں نے آج صبح فون کرکے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔ اس سے کسی قسم کی مدد لینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کرنا۔ وہ تمہارے لیے بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔"

میں نے پوچھ لیا "مثلاً کس سلسلے میں وہ مفید ثابت ہوسکتا ہے؟"

"بھئی، تمہارے مشن کے سلسلے میں!"

میں چونکا "میں آپ کی بات سمجھا نہیں؟"

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا "وجدان! تم اپنی ساتھی ساحل کی بازیابی کے لیے لاہور گئے ہونا۔ وہ تمہارے ایک دیرینہ دشمنِ اول کے قبضے میں پہنچ چکی ہے یا پہنچنے والی ہے۔ تمہارا دشمن لاہور کے ایک سرحدی گاؤں موضوع رکھاں والی کا بااثر زمیں دار اور چوہدری ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں جناب۔" میں ابھی تک الجھن زدہ تھا "مگر آپ کے دوست فرید پاشا کا رکھاں والی یا چوہدری نوازش علی سے کیا تعلق ہے؟"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "ان دونوں چیزوں سے بلاشبہ اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ اس سلسلے میں تمہاری بھرپور مدد کرسکتا ہے۔ دراصل فرید پاشا ایک صاحبِ حیثیت زمیں دار خاندان کا فرد ہے۔ اس کے خاندان کے دیگر افراد اب بھی گاؤں میں رہتے ہیں اور زمیں داری کرتے ہیں۔ ان کا گاؤں لاہور کے نواح میں واقع ہے۔ سیاست میں بھی ان لوگوں نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے ہیں۔ صرف فرید پاشا ہی نے شہر کا رخ کیا اور وہ بھی مہ جبینوں کی نگری کا رخ۔ فرید کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی لہٰذا اس نے فلم انڈسٹری میں کشش محسوس کی اور آج کل وہ ایک کامیاب پروڈیوسر کی حیثیت سے فلمیں بنا رہا ہے۔ لاہور میں اس کی ایک عالیشان رہائش گاہ ہے جہاں کا میں نے تمہیں پتا لکھ کر دیا تھا۔ میں جب بھی لاہور جاتا ہوں تو اسی کے یہاں ٹھہرتا ہوں۔ فرید اگرچہ بہت مصروف رہتا ہے لیکن دوستوں کے لیے وقت نکالنا اسے خوب آتا ہے۔ حسینوں کے جھرمٹ میں گھرے اس شخص سے مل کر تمہیں یقیناً خوشی ہوگی۔ کسی فلم پروڈیوسر کی اپروچ سے تم بخوبی آشنا ہو۔ مجھے یقین ہے، فرید پاشا ہر حوالے سے تمہارے لیے مفید ثابت ہوگا۔ تم رکھاں والی والے مشن میں اس سے مدد لے سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے، میں اس کام کے بندے سے ضرور ملوں گا۔" میں نے کہا۔

"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو ہوں وجدان!"

"شکریہ منہاس صاحب۔" میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اضافہ کرتے ہوئے اسے بتایا "آپ کو جہانگیر کی حفاظت اور پناہ کا بندوبست کرنے کے ساتھ ایک اور اہم کام بھی کرنا ہوگا۔ تازہ ترین صورتِ حالات کے پیشِ نظر میں نے کچھ ہنگامی فیصلے کیے ہیں۔"

"ہاں کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" وہ یک دم سنجیدہ ہوگیا۔

میں نے کہا "یہودی لابی اور "سی ایف کے" یا بقول آپ کے "سی پی ایف" کے سلسلے میں آپ کو میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ کو "سی ایف کے" والوں کے دو اڈوں "ساؤتھ" اور "ایسٹ" کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا ہے۔ وہاں کا ایڈریس اور قائم مقام کا نام آپ کے پاس درج ہے۔ تیسرے اڈے "ملیر" کے بارے میں جہانگیر کو ہر قسم کی معلومات حاصل ہیں کیونکہ اس کا تعلق "ملیر" ہی سے تھا۔ آپ اپنے دوست ڈی ایس پی خورشید شاہ اور دیگر فرض

شناس پولیس آفیسرز کو اعتماد میں لے کر ان اڈوں پر ریڈ (RAID) کریں اور اس خبیث تنظیم کو جتنا زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، اس میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کریں۔ ان لوگوں کو موقع دینا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا "اب تو آپ کے لیے اس جواب دہی کا مسئلہ بھی نہیں رہا کہ ان خطرناک لوگوں کے بارے میں آپ کو کہاں سے معلومات حاصل ہوئیں۔ "سی ایف کے" کے "ساؤتھ" والے اڈے سے وابستہ دو افراد قاتلانہ حملے کے الزام میں پولیس کے قبضے میں ہیں۔ ان پر دباؤ ڈال کر بہت کچھ اگلوایا جاسکتا ہے۔ اگر پولیس کا کوئی بااختیار اعلیٰ آفیسر آپ کی بات کو سمجھ جائے تو آپ کامیابی کے بہت سے جھنڈے اپنے نام سے گاڑ سکتے ہیں۔"

"یہ سب تو میں کرلوں گا۔" وہ متذبذب انداز میں بولا "مگر تم نے اچانک اپنے پروگرام میں تبدیلی کیوں کر ڈالی۔ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا، جب تم لاہور سے واپس آؤ گے تو......"

"قطع کلامی کے لیے معذرت چاہتا ہوں منہاس صاحب!" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "اب حالات یکسر بدل چکے ہیں اس لیے مجھے بھی اپنے پروگرام کو تبدیل کرنا پڑ رہا ہے۔"

"حالات کی تبدیلی کی کچھ وضاحت کروگے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "ایک تو پولیس براہِ راست اس معاملے میں کود پڑی۔ آپ کے یا میرے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بال کی کھال اور کھال کے بال ضرور نکالیں گے۔ نجیب اللہ اور سراج احمد رنگے ہاتھوں موقع پر گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس والے اپنی مخصوص تفتیش سے ان دونوں کے "آباؤاجداد" کو بھی کھوج نکالیں گے۔ اس کے بعد شعیب غوری اور اس کی شیطانی تنظیم "سی ایف کے" کے خلاف قانونی کارروائی لازم ہوجائے گی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جہانگیر کا ساتھی فواد منظر سے غائب ہوگیا ہے۔ اس قسم کی انڈر گراؤنڈ تنظیموں میں ہر رکن دوسرے پر نگران ہوتا ہے۔ فواد کی موجودگی میں میرے اور جہانگیر کے درمیان کچھ اس نوعیت کی گفتگو ہوئی تھی جس میں ان کا بگ باس شعیب غوری میرے سامنے ایک مجرم کی حیثیت سے عیاں ہوگیا۔ وہ اب تک میری دوستی کا دم بھرتا رہا ہے مگر اس کی اصلیت مجھ پر کھل جانے کے بعد وہ میرا بدترین دشمن بن جائے گا۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ میری مکمل "صفائی" کے لیے وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ فواد کا پراسرار غیاب بھی ظاہر کرتا ہے کہ اس نے اپنے باس کو رپورٹ پیش کردی ہوگی اور پھر ملیر کا کرتا دھرتا نے شعیب کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔ حالات کی یہ نئی کروٹ بہت احتیاط کی متقاضی ہے۔ ہمیں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہوگا۔ میں ازخود شعیب غوری سے ملوں گا اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی رابطہ رکھوں گا۔ اگر اس نے رابطہ کیا تو میں موقع محل کی مناسبت سے اسے ٹریٹ کروں گا۔ فواد کی روپوشی نے بڑی گڑبڑ پیدا کردی ہے۔ آپ تو سمجھتے ہیں، ایسی تنظیموں میں راز کی کتنی اہمیت ہوتی ہے!"

"ہاں، میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" منہاس باقر کی گمبھیر آواز میری سماعت سے ٹکرائی "تم نے حالات کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ وہ بہت توجہ طلب اور قابلِ فکر ہے۔ شعیب غوری اب واقعی تمہارا دشمن اول بن جائے گا۔ تمہیں حد سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔"

"وہ میں کرلوں گا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "آپ فوراً سی ایف کے کے خلاف ایکشن میں آجائیں۔ بعد میں، میں بھی کراچی آکر آپ کو جوائن کرلوں گا۔"

"ایک بات کا خیال رکھیں منہاس صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "کہیں بھی، کسی بھی مرحلے پر میرا ذکر نہیں آنا چاہیے۔ آپ اپنے کرائم رپورٹر شہزاد کو سامنے رکھ کر یہ کھیل بڑی خوبصورتی سے کھیل سکتے ہیں۔ شہزاد ایک بیدار مغز اور خاصا چلتا پھرتا پرزہ قسم کا بندہ ہے۔ مجھے امید ہے، وہ ضرور کوئی بڑا کام کر دکھائے گا۔ ویسے میں بھی گاہے بگاہے آپ سے رابطہ کرتا رہوں گا۔"

وہ جذباتی ہوگیا "اوکے مائی سن۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

منہاس کا "مائی سن" کہنا مجھے بہت اچھا لگا۔ سنگاپور والا انسپکٹر چیانگ شو بھی مجھے اسی انداز میں پکارتا تھا جو من کو بہت بھلا لگتا تھا۔ اس انداز میں جو اپنائیت اور خلوص پنہاں ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

الفاظ چاہے کسی بھی زبان کے کیوں نہ ہوں۔ وہ انسانی جذبات اور احساسات کی مکمل ترجمانی یا عکاسی نہیں کرسکتے۔ الفاظ کو محض ایک وسیلے یا سہارے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ جذبات کا نعم البدل نہیں ہوسکتے۔ اپنے محبوب سے بے پناہ محبت کا اظہار ممکن نہیں، یہ کہہ کر کام چلا لیا جاتا ہے......
جاں تم پر نثار کرتا ہوں!

میری سماعت سے منہاس باقر کی اپنائیت آمیز آواز ٹکرائی "وجدان! تمہیں رقم وغیرہ کی ضرورت پڑے......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ”منہاس صاحب! میرے پاس اچھی خاصی رقم موجود ہے۔ اگر مجھے مزید رقم کی ضرورت پڑی تو اس کے حصول کے لیے میرے پاس آن لائن بینکنگ کارڈز موجود ہیں۔ ان میں ایک سلور اور ایک گولڈ کارڈ ہے۔ انشا اللہ ملک کے کسی بھی حصے میں اور ملک سے باہر پوری دنیا میں مجھے رقم وغیرہ کا مسئلہ کبھی نہیں پیش آئے گا۔ آپ کی پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔“

”تم نے میری ایک بہت بڑی فکر ختم کردی ہے۔“ وہ مطمئن لہجے میں بولا۔

اے ٹی ایم کارڈ (آٹومیٹڈ ٹیلر مشین کارڈ) موجودہ دور کی ایک حیرت انگیز اور سہولت بخش ایجاد ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی نے جس تیز رفتاری سے ہماری زندگی میں جگہ بنائی ہے اور مزید جگہ بنارہی ہے اسے دیکھتے ہوئے بلاتردد کہا جاسکتا ہے، عنقریب کمپیوٹر انسانوں پر حکمران ہو جائے گا۔ ہم اب بھی خاصی حد تک کمپیوٹر کے محتاج ہو چکے ہیں۔ اس عفریت کی مکمل حکمرانی میں زیادہ عرصہ باقی نہیں۔ آنے والے وقت میں یہ جن انسانوں کو اپنے اشاروں پر نچائے گا۔

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل اور تکلیف دہ ہے کہ آیا مشین نے اتنی ترقی کرلی ہے یا حضرت انسان بتدریج اپنے مقام و مرتبے سے گرتا چلا جارہا ہے یا پھر یہ تنِ آسان مخلوق خداوندی اپنا ذہن اور صلاحیت دیدہ و دانستہ مشین کے حوالے کرکے چین کی بانسری بجانے کا پروگرام بنائے بیٹھی ہے۔!

بہرحال، ATM Card خاصے کی چیز ہے۔ کمپیوٹر کے ماہرین نے Automated Teller Machine بنا کر اکاؤنٹ ہولڈرز کے لیے بہت آسانیاں پیدا کردیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بعض عقل کل قسم کے لوگ اے ٹی ایم کارڈ کو آل ٹائم منی کہہ کر اپنی علمیت جھاڑتے رہتے ہیں!

منہاس باقر نے حسرت آمیز لہجے میں کہا ”وجدان! کتنا ہی اچھا ہوتا کہ تم شبانہ کی شادی کے موقع پر میرے پاس ہوتے۔ اس کی رخصتی میں اب چند روز باقی ہیں۔“

”مجھے اس غیر حاضری کا سخت افسوس ہے جناب۔“ میں نے تہہ دل سے کہا ”میری دلی دعا ہے، آپ خوش اسلوبی سے اپنا فریضہ ادا کرسکیں۔ آپ میری مجبوریوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔“

الوداعیہ کلمات کے بعد میں نے ریسیور کو کریڈل کردیا۔

صبح کراچی ائرپورٹ پر میں نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ اب مجھے ٹھیک ٹھاک بھوک محسوس ہورہی تھی۔ میں نے روم سروس کو کہہ کر اپنے کمرے میں ہی لنچ منگوالیا۔ گرما گرم خوش ذائقہ کھانا معدے میں اترا تو بدن میں سوئی ہوئی تھکن انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی۔ کوئی جائے فرار نہ پاکر میں بیڈ پر دراز ہوگیا اور آئندہ پانچ منٹ میں، میں نیند کی حسین اور کیف آور وادی میں قدم رکھ چکا تھا۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی گھنٹی پر میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے آنکھیں ملتے ہوئے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کلاک تین کا وقت بتارہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں بمشکل ڈیڑھ گھنٹا سویا ہوں گا۔ مجھے سونے سے قبل ہوٹل والوں کو یہ ہدایت کردینا چاہیے تھی کہ نیند کے دوران میں وہ کوئی کال نہ دیں۔ اسی بھول کا خمیازہ تھا کہ فون کی گھنٹی نے مجھے بیدار ہونے پر مجبور کردیا۔ میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو!“ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

دوسری جانب ہوٹل کا آپریٹر تھا۔ اس نے جلدی سے کہا ”سر! آپ کے لیے کراچی سے کال ہے۔ شعیب غوری صاحب بات کریں گے۔“

شعیب غوری کے نام نے مجھے چونکا دیا اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”ٹھیک ہے، لائن تھرو کرو۔“ میں نے تحکمانہ لہجے میں آپریٹر سے کہا۔

دوسرے ہی لمحے شعیب کی تھرتھراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”ہیلو وجدان!“

”ہاں شعیب، کیا ہوا؟ تم خاصے گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو!“ میں نے حتی الامکان معتدل لہجے میں کہا

وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے ایک مطمئن سانس لیتے ہوئے بولا ”شکر ہے، تم ہوٹل میں مل گئے ورنہ میں ڈر رہا تھا، کہیں تم لاہور پہنچتے ہی رکھاں والی روانہ نہ ہوگئے ہو!“

میں نے اپنے دلی جذبات اور احساسات کو چھپاتے ہوئے پوچھا ”یار! اس میں ڈرنے والی کون سی بات ہے۔ اگر میں رکھاں والی روانہ ہو چکا ہوتا تو کون سی قیامت آجاتی؟“

”تم نے برمحل لفظ بلکہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ اس کے اندر سے اضطرار اور عدم اطمینان جھلکتا تھا۔ بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا ”اگر اس وقت میں تم سے رابطہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو سمجھو، واقعی ایک قیامت ٹوٹ پڑتی۔“

آج شعیب غوری کا لب ولہجہ اور انداز بہت بدلا ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پرسکون اور متحمل مزاج پایا تھا لیکن

اس وقت کی گفتگو کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا تھا، وہ بڑی حد تک متفکر اور نروس ہے۔ گھوم پھر کر میرا دھیان فواد کی طرف جاتا تھا۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ شعیب غوری کو حقیقت حال کی خبر ہو چکی ہوگی۔ اس باخبری کے بعد اس کا خاموش بیٹھے رہنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے بات چیت کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ ”شعیب! میں تمہاری پریشانی کو سمجھ نہیں پارہا ہوں ذرا کھل کر بتاؤ، آخر مسئلہ کیا ہے؟“

”میں پریشان نہیں بلکہ متذبذب ہوں۔“ وہ بڑی سرعت سے بولا۔

میں نے پوچھا ”اس تذبذب کا سبب کیا ہے؟“

”تم فوراً کراچی چلے آؤ، پھر تفصیل سے بات ہوگی۔“

گویا بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ میں سمجھ گیا، وہ جلد از جلد مجھے کراچی کیوں بلوانا چاہتا ہے۔ میں گزشتہ رات جن حالات سے گزرا تھا ان کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگانا بہت آسان تھا کہ شعیب غوری پہلی فرصت میں مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔ میں پلک جھپکتے میں ریڈ الرٹ ہوگیا۔

میں نے معتدل اور محتاط انداز میں کہا ”تم جانتے ہو شعیب! میں کتنے اہم اور حساس مشن پر کراچی سے لاہور پہنچا ہوں اور...... اب تم مجھے فوراً واپس بلا رہے ہو!“

”یار، بات ہی کچھ ایسی ہے کہ تمہیں پہلی فرصت میں کراچی آجانا چاہیے۔“

”آخر ایسی کیا بات ہوگئی؟“

”وجدان! تمہارے لیے میرے پاس دو نہایت ہی اہم اور سنسنی خیز خبریں ہیں۔“ اس کا لب ولہجہ واپس لوٹ آیا۔ اس کا مطلب یہی تھا، وہ اب تک اپنے تئیں بھرپور اداکاری کررہا تھا۔ اگر میں حقیقتِ حال سے آگاہ نہ ہوتا تو اس کی ایکٹنگ کو سچ مان لیتا۔ میں نے کہا۔

”شعیب، وہ دو خبریں جلدی سے مجھے سنادو۔“

”ایک خبر خوشی کی ہے اور دوسری افسوس ناک۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

میں نے کہا ”تم جانتے ہو، میں کوئی کمزور انسان نہیں ہوں۔ بری سے بری خبر کو بھی نہایت تحمل سے سن سکتا ہوں۔ تم بے فکر ہوکر مجھے کوئی بھی اچھی بری خبر سنا سکتے ہو۔“

”میں نے سن رکھا ہے، جب آپ کے پاس کسی لیے بیک خوشی اور غمی کی خبریں موجود ہوں تو پھر پہلے خوشی کی خبر سنانا چاہیے اور بعد میں غمی کی۔“ وہ فلسفیانہ انداز میں بولا ”پہلی خبر ذہن پر جو تاثر قائم کرے گی اس کے بل بوتے پر دوسری خبر سے نمٹا جاسکتا ہے اس لیے میں تمہیں فون پر صرف خوشی کی خبر سناؤں گا، دوسری خبر کراچی آنے پر تم تک پہنچائی جائے گی۔“

میں نے اس کھیل میں اپنی شراکت جاری رکھتے ہوئے کہا ”کیا خوشی کی خبر اتنی ہی زیادہ اہم ہے کہ میں اپنا مشن نامکمل چھوڑ کر فوراً کراچی آجاؤں؟“

”اس خبر کا تعلق براہِ راست تمہارے مشن ہی سے ہے؟“ اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں اچھل کر رہ گیا۔

وہ بولا ”میں نے تمہاری ساتھی ساحل کو ٹریس کرلیا ہے۔ وہ ادھر کراچی ہی میں ہے۔ جہنم مکانی میاں زاہد حسین نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“ میں نے الجھن زدہ لہجے میں بے ساختہ کہا۔

وہ حتمی لہجے میں بولا ”یہ ہو چکا ہے وجدان۔ میں بھلا کیا تم سے جھوٹ بولوں گا۔ تم یہاں آکر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو۔ آج رات کو میں تمہاری ساتھی کو بحفاظت اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ تھوڑی سی پلاننگ کے بعد میں ساحل کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ تم سیدھے ساؤتھ چلے آؤ۔ میں نے کبیر شاہ کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔“

میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سمجھ گیا کہ شعیب مجھے گھیرنے کے لیے ایک گہری سازش کے تانے بانے بن رہا تھا۔ وہ مجھے جلد از جلد اپنے ”ہاتھ“ میں لینا چاہتا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مجھے شکار کرنے کے لیے ساحل سب سے زیادہ دلکش چارا ثابت ہوگی۔ اس نے جہانگیر اور فواد کو پیش آنے والے واقعات کا ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی ساؤتھ کے ناکامیاب مشن کا کوئی تذکرہ کیا تھا۔ اس کی سوچ تمام تر اس نقطے پر فوکس تھی کہ کسی طرح مجھے اپنے قابو میں کرلے۔ اس کے ارادے اس کی بدنیتی کی چغلی کھاتے تھے۔

میں نے ...... لوہا لوہے کو کاٹتا ہے کے مصداق شعیب سے کہا ”یار! یہ تو بہت بڑی خبر ہے۔ تم اتنے یقین سے بتا رہے ہو تو مجھے بھی مان لینا چاہیے۔ تم نے متعدد مواقع پر میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ میں تم جیسے مخلص دوست پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرسکتا ہوں لیکن......“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا وہ جلدی سے بولا ”لیکن کیا وجدان؟“

میں نے تامل کرتے ہوئے کہا ”لیکن پتا نہیں، فوری طور پر کراچی کے لیے کوئی فلائٹ مل بھی سکے گی یا نہیں اور اس ہوٹل

میں بھی دو دن کی بکنگ تھی پھر......"

"ہوٹل کی بکنگ کو جہنم میں ڈالو وجدان۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "اور فلائٹ وغیرہ کے لیے تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہاری واپسی کا بندوبست کر دیا ہے۔"

"وہ کیسے شعیب؟" میں نے حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

شعیب غوری جیسے بااثر شخص کے لیے یہ چنداں مشکل نہیں تھا کہ کراچی میں رہتے ہوئے لاہور سے میری بکنگ کروا دے مگر میں حیرت کا اظہار کر کے اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر رہا تھا۔ ہمارے درمیان جو کھیل شروع ہو چکا تھا۔ اس میں اعتماد اور اداکاری کی بہت اہمیت تھی۔ اعتماد اپنی ذات پر اور اداکاری دوسرے کے سامنے اِلّا یہ کہ ہم کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ جاتے۔ شعیب جب تک بند رہ کر کھیلتا رہتا، میں بھی اس کے سامنے کھلنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا "وجدان! تمہیں فون کرنے سے پہلے میں نے تمہارے لیے ٹکٹ اور پہلی ممکنہ فلائٹ میں کراچی آنے کا انتظام کر دیا ہے۔ تمہیں صرف اتنی زحمت کرنا ہو گی کہ اپنے کمرے سے نکل کر ہوٹل کے گراؤنڈ فلور پر پہنچو۔ وہاں مختلف ٹریول ایجنسیز والے ایک قطار سے آفس سجائے بیٹھے ہیں۔ تمہیں صمد ٹریولز میں جانا ہے۔ وہاں صمد بخاری صاحب سے میرا ریفرنس استعمال کر کے ملو۔ وہ تمہیں ٹکٹ دے دیں گے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا "تمہاری فلائٹ میں لگ بھگ ڈھائی گھنٹا باقی ہے۔ اب تم وہاں کمرے میں ایک سیکنڈ ضائع نہیں کرو گے او کے!"

"او کے مائی ڈیئر!" میں نے منافقت آمیز لہجے میں کہا "میں نکل رہا ہوں۔" پھر میں نے پوچھا "کیا میں باقاعدہ چیک آؤٹ ہو جاؤں یا......"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "سب سے اہم یہ ہے کہ تمہیں ہوٹل سے نکلنا ہے۔ بس اسی پر توجہ دو۔"

"اور وہ بری خبر!" میں نے اچانک پوچھا "اس کے بارے میں کوئی کلیو نہیں دو گے؟"

"میں چاہتا ہوں، خوش خبری تمہارے ذہن پر اپنا تاثر پختہ کر لے تو میں تمہیں اس بری خبر سے آگاہ کروں۔" اس نے دوستانہ انداز میں کہا "جب تک میں تمہاری ساتھی ساحل کو تمہارے پاس نہیں پہنچا دیتا، وہ بری خبر میرے ہونٹوں سے نکل کر تمہاری سماعت سے رسائی حاصل نہیں کرے گی۔"

"اتنا تو بتا سکتے ہو، اس خبر کا تعلق کس چیز سے ہے؟"

وہ گمبھیر آواز میں بولا "متروک کنوئیں سے برآمد ہونے والے سونے سے۔"

"سونے کو کیا ہوا ہے؟" میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

"جو بھی ہوا ہے، میں سنبھال لوں گا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا "تم اس خوشی کے موقع پر اپنے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالو۔ میں ہوں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ او کے! گڈ لک وجدان!"

پھر اس سے قبل کہ میں کوئی اور سوال کرتا، اس نے فون کا رابطہ منقطع کر دیا۔ بے اختیار میرے منہ سے شعیب غوری کے لیے خاصے سخت الفاظ نکل گئے۔ اس کی نیت کا احوال اب پوری طرح مجھ پر عیاں ہو چکا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے جن معاملات میں نوے فیصد انداز ہ قائم کیا تھا، اس کی شرح اب صد فیصد کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

شعیب غوری نے جلد از جلد مجھے قابو کرنے کے لیے ساحل کا شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ ساحل میری زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے، اس کی حیثیت میرے لیے ایک اٹوٹ انگ ایسی ہے، اس کے بارے میں سن کر میں آنکھیں بند کیے دوڑا آؤں گا لیکن میں اب اس کے فریب میں آنے والا نہیں تھا بلکہ اسے فریب دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ساحل کے حوالے سے میں میاں زاہد حسین کے بیان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ موت کے سامنے کھڑے کسی بھی شخص سے دروغ گوئی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ میاں زاہد حسین کی شہ رگ میرے خنجر کی دھار تلے دبی تھی۔ وہ ان لمحات میں کسی بھی قیمت پر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس نے بالکل سچ بتایا تھا، میری ساحل کو چوہدری نوازش علی کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا، اور مجھے اسی سمت میں سفر کرنا تھا، جہاں میری ساحل گئی تھی۔ شعیب غوری اپنی چال بازی سے میرا راستہ کھوٹا کرنا چاہتا تھا مگر میں اب اس کی چال میں آنے والا نہیں تھا۔

دوستی کی آڑ میں انسان اپنی گردن بھی کٹوا دیتا ہے۔ ہیں، اگر آپ کسی کا سر قلم کرنا چاہتے ہیں تو ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں پھولوں کا ہار لے کر اس کی طرف بڑھو۔ اس کی گردن میں پھول پہنانے کے لیے ہار والا ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ جب سامنے والا ہار پہننے کے لیے اپنی گردن جھکائے تو بجلی کی سرعت سے اس کی گردن مار لو۔

دوستی پھولوں کے ہار ایسی ہوتی ہے۔ شعیب غوری نے کثیر المالیت سونے تک پہنچنے کے لیے مجھ سے دوستی کی اور بہت کم عرصے میں میرا اعتماد حاصل کر لیا پھر جیسے ہی اسے پتا چلا، میں اس کی اصلیت سے واقف ہو چکا ہوں، اس نے پینترا بدل لیا۔ چند روز قبل وہ بڑی شد و مد سے سونے کی بازیابی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کل رات ہی اس نے مجھے بتایا تھا، مسٹر نیل آرمر نے اپنی ٹیم کی مدد سے وہ سونا حاصل کر لیا تھا اور اب مجھے اسی سونے سے متعلق کوئی بری خبر سنانے والا تھا۔ اگر میں نے اس کا اصل چہرہ نہ دیکھ لیا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ ممکن ہے، اس سلسلے میں واقعی کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہو گی مگر اب تو اس کی ہر بات مجھے فریب دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کر لیا کہ سونے والے معاملے میں اس کی نیت خراب ہو چکی ہے حالانکہ ابھی تک اس نے مجھے کی تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا تاہم کسی بدنیت اور دھرتی دشمن شخص پر آنکھیں کھول کر بھی ایک لمحے کے لیے بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے اس کی دوستی پر بھروسا کر کے سونے والا راز اس تک پہنچا دیا تھا۔ اس نے دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا، وجدان دوستی میں اگر جان دے سکتا ہے تو دشمنی میں جان لے بھی سکتا ہے۔ شعیب غوری کی تمام تر دوستی کا بھانڈا پھوٹ چکا تھا۔ اب میں اس کا دشمن تھا، کھلا دشمن! دوستی کو یاد نہ بھی رکھا جائے تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا مگر دشمنی کو ہر حال میں یاد رکھنا پڑتا ہے...... اپنی بقا کے لیے ...... دشمن کی فنا کے لیے!

شعیب غوری اگر یہ سمجھ رہا تھا کہ چھل فریب یا چکر بازی سے وہ سارا سونا ہڑپ کر جائے گا تو یہ اس کی بھول تھی۔ پہلے تو میں ایک مخصوص حصے پر آمادہ تھا لیکن اب، شعیب کی نیت کھل جانے کے بعد مجھے اس سے سارا سونا حاصل کرنا تھا۔ وہ ایک بسکٹ بھی ہضم نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس کے جبڑے چیر کر، حلق میں ہاتھ ڈال دیتا اور معدے سمیت اس کی آنتیں کھینچ کر باہر لے آتا۔ وجدان کی دشمنی دارا، تارا اور میاں زاہد کو کب راس آئی تھی جو شعیب بچ کر نکل جاتا۔ میں اس کی یہودیت نوازی اور سی ایف کے کو ناک کے راستے نکالنے کا پختہ عزم کر چکا تھا۔

یہی سب سوچتے ہوئے میں نے اپنا بیگ ریڈی کیا۔ اس دوران میں ڈارلنگ یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے سوچا تھا، ذرا فرصت ملے گی تو میں ڈارلنگ کا راز جاننے کے لیے ریسرچ کروں گا۔ ڈارلنگ پر کام کرنے کے لیے ارتکاز کی ضرورت تھی۔ میں اپنی ''جی'' کی قوت کو استعمال کر کے اس کے اندر اتر سکتا تھا اور اس کے اندر پوشیدہ اس سربستہ راز کو افشا کر سکتا تھا جس نے پچھلے کچھ عرصے سے مجھے حیرت آمیز الجھن میں ڈال رکھا تھا ''جی'' کی ایڈوانس مشقیں میں باقاعدگی سے کر رہا تھا جس کے نتیجے میں، اس قوت میں بڑا خوشگوار اضافہ بھی ہو رہا تھا۔

میں نے ڈارلنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''میرے پاؤں میں چکر ہے۔ میرے ساتھیوں کو اس چکر میں در در کی ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ رفتہ رفتہ تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔''

''میاؤں!'' اس کی مخصوص آواز میری سماعت تک پہنچی۔

شعیب غوری سے رابطہ کے بعد میں جلد از جلد اس ہوٹل کو خیر باد کہہ کر شہر کے ہنگاموں میں گم ہو جانا چاہتا تھا تاکہ وہ کہیں بھی میرا سراغ نہ پا سکے۔ میں نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے حیرت انگیز پراسرار بلی سے کہا۔

''ڈارلنگ! ہم اس ہوٹل کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آر یو ریڈی؟''

اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، کہاں جا رہے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی ادا سے آواز نکالی ''میاؤں!''

میں نے کہا ''یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ باہر نکل کر فیصلہ کروں گا۔''

اس نے ایک مرتبہ پھر ''میاؤں'' کیا اور ایک طویل انگڑائی لے کر جسم کو کھینچنے کے بعد تیار ہو گئی۔ یہ سچ ہے، اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا کہ میری اگلی منزل کیا اور کہاں ہو گی۔ بہر حال، اس ہوٹل کو چھوڑنا ناگزیر تھا۔ اس کے ساتھ ہی شعیب کو فریب میں مبتلا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا، میں صمد ٹریولز سے اپنا ٹکٹ حاصل کر لوں تاکہ شعیب آئندہ تین چار گھنٹوں کے لیے میری جانب سے بے فکر ہو جائے۔

صمد بخاری کے پاس میں نے صرف دس منٹ گزارے اور اپنا ٹکٹ لے کر اس کی ایجنسی سے باہر آ گیا۔ صمد ٹریولز میں مختصر وقت میں مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ شعیب غوری بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ اسی بوکھلاہٹ اور جلد بازی میں اس سے سنگین قسم کی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ میں نے صمد بخاری کے سامنے اپنی کسی الجھن کا مظاہرہ نہیں کیا اور خاموشی سے باہر آ گیا۔

شعیب غوری نے میرا ٹکٹ وجدان کے نام سے بنوایا تھا۔ ذہنی ابتری اور افراتفری میں یہ بات اس کی یادداشت سے نکل گئی کہ میں دستاویزی طور پر وجیہ کی شخصیت اختیار کر

چکا، حالانکہ تبدیلی کے تمام مراحل اس کے ہاتھوں طے ہوئے تھے، دوسرے وہ میری ڈارلنگ کی بکنگ کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ شعیب سے میں اس قسم کی غلطیوں کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سامنے ایک نیا شعیب ظاہر ہو رہا تھا جو کل والے شعیب سے بہت مختلف تھا۔ یہ تمام حقائق ایک ہی طرف اشارہ کرتے تھے کہ حالات کی اس ٹیڑھی کروٹ نے اس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔

میرے لیے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ اس نے ڈارلنگ کی بکنگ کیوں نہیں کروائی تھی یا یہ کہ میرا ٹکٹ بنواتے ہوئے اس نے وجیہ کے بجائے وجدان کیوں لکھوا دیا تھا۔ مجھے تو کسی بھی قیمت پر فی الحال واپس کراچی نہیں جانا تھا، لہٰذا ان امور کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

میں انہی سوچوں میں گم ٹہلتے ہوئے مین مال روڈ (شاہراہِ قائداعظم) پر پہنچ گیا اور اسی وقت مجھے چونک جانا پڑا۔ میرے قریب ہی سے ایک نیلی شیرڈ تیزی سے مڑ کر ہوٹل کے مین گیٹ کی جانب بڑھی تھی۔ وہ گاڑی بالکل نیو برانڈ تھی، میری نیلی شیرڈ کی طرح مگر میرے چونکنے کا سبب وہ نیلی شیرڈ نہیں بلکہ اس میں موجود ہستی تھی۔

یقیناً اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی ورنہ ٹائروں کی چرچراہٹ فضا میں ضرور بلند ہوتی۔ اس گاڑی میں دو لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا اور دوسری پسنجر سیٹ پر براجمان تھی اور میں اسی چہرے کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ وہ صدف تھی!

صدف قدم قدم پر مجھے اچنبھے میں ڈال رہی تھی۔ لگ بھگ پانچ گھنٹے پہلے میں نے اسے شادمان کالونی کے چائنا چوک پر ڈراپ کیا تھا یہ الفاظ دیگر میں نے بمشکل اس سے جان چھڑائی تھی لیکن یہ میری خام خیالی تھی، وہ تو اب بھی میرے پیچھے پڑی نظر آ رہی تھی۔ اس ہوٹل تک اس کی آمد خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اتنی جلدی اس نے میرا سراغ کیوں کر لگا لیا!

ایک لمحے کو میرے جی میں آئی، میں چپ چپاتے وہاں سے کھسک لوں۔ صدف نے مجھے وہاں کھڑے نہیں دیکھا تھا اور دوبارہ ہوٹل جانے کا میرا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ صدف سے جان چھڑانے کا اس سے موزوں موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میرے ذہن نے اس کی نفی کر دی۔ میں نے سوچا، اس طرح بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ وہ پھر کسی نہ کسی راستے مجھ تک پہنچ جائے گی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا پرابلم معلوم کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اس پرابلم کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح کی آنکھ مچولی کو فروغ دینے سے کوئی خطرناک صورت حالات جنم لے سکتی تھی۔ بعض اوقات متعاقب کا تعاقب کرنے سے بھی مسئلہ حل ہوتا ہے۔

میں وہیں کھڑے ہو کر نیلی شیرڈ کا انتظار کرنے لگا پندرہ منٹ بعد میرا انتظار رنگ لے آیا۔ وہ ہوٹل میں اپنی ''تفتیش'' کے بعد واپس آ رہی تھی۔ میں نے شیرڈ کے، اپنے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھ کے اشارے سے صدف کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

میرا اشارہ اس تک پہنچا تو اس کے چہرے پر ایک خوشگوار چمک نمودار ہوئی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود اپنی ساتھی کی جانب دیکھتے ہوئے کچھ کہا۔ وہ بھی دلچسپ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ صدف کی آواز تو مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی البتہ اگلے ہی لمحے نیلی شیرڈ میرے پہلو میں آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔

صدف نے شیشہ گرا کر بڑی سرعت سے سر باہر نکالا اور اضطراری لہجے میں بولی ''مسٹر اچھر ہوی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

اس کے طنز میں شرارت پنہاں تھی۔ میں نے ایک بھرپور نظر ڈرائیونگ سیٹ والی پر ڈالی پھر صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتا ہوں۔ چائنا چوک والی اس ہوٹل میں کیا کرنے آئی تھی؟'' اس کے ساتھ ہی میں نے مذکورہ عظیم الشان ہوٹل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

صدف نے گاڑی کے پچھلے دروازے کا لاک ہٹا دیا پھر زیر لب مسکراتے ہوئے بولی ''وجدان! اندر آ جاؤ۔ یوں لبِ سڑک کھڑے ہو کر سوال و جواب کرنا اچھا نہیں لگتا!''

میں دروازہ کھول کر شیرڈ کی عقبی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈارلنگ کو بھی میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ سفری بیگ میرے قدموں میں پڑا تھا۔ میں ڈرائیور کے پیچھے اور ڈارلنگ صدف کے عقب میں تھی۔ دوسرے ہی لمحے شیرڈ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شاہراہِ قائداعظم کے سیلِ آب ٹریفک میں شامل ہو گئی۔

صدف نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''وجدان! یہ میری کزن نادیہ ہے۔ میرے ماموں کی اکلوتی بیٹی جیسے میں اکلوتی ہوں۔ ہم میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اس لیے ہم میں بڑی انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے۔''

''ماشاءاللہ!'' میں نے جواباً بس اتنا ہی کہا۔

اس کا بے دریغ مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کرنا ظاہر کر رہا

تھا کہ وہ اپنی دھن کی پکی تھی۔ وہ اپنی کزن سے کہہ رہی تھی ’’نادیہ! میں تمہیں وجدان اور اس کی ڈارلنگ کے بارے میں تو تفصیلاً بتا چکی ہوں۔ دیکھ لو، میں انہیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔‘‘

نادیہ ڈرائیونگ کو جاری رکھتے ہوئے بولی ’’ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے صدف۔ یہ تو ایک انسان اور ایک جانور کا کیس تھا۔‘‘

’’تم نے میرا سراغ کس طرح لگایا صدف؟‘‘ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ’’یہ کہانی بہت طویل ہے۔ مختصراً اتنا جان لو کہ میں نے اس ٹیکسی کا نمبر اپنے ذہن میں نوٹ کرلیا تھا جو ہمیں ائرپورٹ سے لے کر آئی تھی اور...... یہ کہ نادیہ کے ڈیڈی اورنگ زیب خان، میرے ماموں ڈی ایس پی ٹریفک ہیں۔ اب اس سے زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ٹیکسی کا سراغ لگانے کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ تم اس ہوٹل پہنچے تھے۔ میں نادیہ کے ساتھ یہاں آ گئی پھر ہوٹل کے اندر تو نہیں البتہ ہوٹل کے باہر تم سے ملاقات ہوگئی۔‘‘

’’ہوٹل والوں نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟‘‘

’’انہوں نے کہا، مسٹر وجیہ سیر وتفریح کے لیے ہوٹل سے باہر گئے ہیں۔ جیسے ہی واپس آئیں گے، انہیں میرے بارے میں بتادیا جائے گا۔‘‘ وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ ’’تم اس ہوٹل کے سوئٹ نمبر دو سو آٹھ میں ٹھہرے ہوئے ہو اور مذکورہ سوئٹ میں تمہارا قیام دو روز کا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟‘‘

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ لڑکی شرلک ہومز کی خالہ ثابت ہو رہی تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا ’’اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے تلاش نہیں کیا بلکہ میں خود تمہارے ہاتھ آیا ہوں۔‘‘

’’کیا مطلب!‘‘ وہ میری طرف گردن گھماتے ہوئے بولی ’’کیا تم اس ہوٹل میں نہیں ٹھہرے ہوئے؟ کیا ہوٹل والوں نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے؟‘‘

میں نے کہا ’’ایسی کوئی بات نہیں۔ ہوٹل والوں نے تمہیں مس گائیڈ نہیں کیا۔ ان کی فراہم کردہ معلومات بالکل درست ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔‘‘

’’حالات میں کیا تبدیلی آئی ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’یہی کہ میں نے وہ ہوٹل چھوڑ دیا ہے۔‘‘ میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا ’’اور اگر میں تمہیں ازخود اشارہ نہ کرتا تو تم میری گرد کو نہیں پاسکتی تھیں۔‘‘

’’مم...... مگر ہوٹل والے تمہارے چیک آؤٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے!‘‘

’’میں نے کہا نا، ان کی معلومات اب پرانی ہو چکی ہیں۔‘‘

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ’’کہیں تم مجھے ایک مرتبہ پھر الو بنانے کے چکر میں تو نہیں؟‘‘

’’اللہ نے تمہیں ایک پرکشش اور حسین لڑکی بنایا ہے۔‘‘ میں نے فراخدلی سے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ’’میں تمہیں الو بنانے والا کون ہوتا ہوں؟‘‘

’’اب تک تم متعدد بار مجھے بے وقوف بنا چکے ہو۔‘‘ وہ شکایتی لہجے میں بولی ’’وجیہ، اچھرہ، جیولری کی دکان، انارکلی، وغیرہ وغیرہ...... یہ سب کیا ہے وجدان!‘‘

میں نے گمبھیر آواز میں کہا ’’اس سے پہلے کہ ہم اپنی گفتگو کو آگے بڑھائیں، تم مجھے بتا دو کہ اس ملک کے اور کون کون سے بڑے لوگوں سے تمہاری رشتے داری یا تمہارے ڈیڈی کی شناسائی ہے۔ کراچی ائرپورٹ پر ذوالفقار زیدی نے تمہاری سفارش نما ضمانت دی اور یہاں پہنچتے ہی ڈی ایس پی ٹریفک تمہارے ماموں نکل آئے!‘‘

’’نکل نہیں آئے۔‘‘ نادیہ نے پہلی مرتبہ ہماری گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا ’’میرے ڈیڈی پہلے صدف کے ماموں ہیں اور بعد میں ڈی ایس پی ٹریفک۔ صدف نے تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔‘‘

میں نے نادیہ سے کہا ’’تم تو مجھے خاصی معقول لڑکی دکھائی دیتی ہو۔ یہ تمہاری کزن کو کیا ہوگیا ہے۔ یہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے؟ اسے تو اپنی میڈیکل کی موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپانا چاہیے۔ اس نے خواہ مخواہ کے ’’پی ایچ ڈی‘‘ کے لیے مجھے کیوں منتخب کرلیا۔ آخر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ میں وجیہ ہوں یا وجدان اس سے مطلب؟‘‘

’’کسی نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔‘‘ صدف نے سنجیدگی سے کہا ’’تم خود کو وجدان تسلیم کرلو، میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گی۔‘‘

’’اگر تمہارا مطالبہ یہیں تک ہے تو چلو، میں وجدان ہوں۔‘‘ میں نے سرسری انداز میں کہا ’’اتنی آسانی سے جان چھوٹ سکتی ہے تو ایک جھوٹ بولنے میں کوئی قباحت نہیں۔ میں وجیہ ہوں، وجیہ ہی رہوں گا۔ ایک جھوٹ سے وجدان نہیں بن جاؤں گا۔‘‘ صدف کی گردن میری ہی جانب مڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں کی گہرائی ناپتے ہوئے کہا ’’کہو، اب تو تمہاری تسلی ہوگئی؟‘‘

صدف تفتیشی نظر سے مجھے ٹٹولتی رہی۔ نادیہ نے کہا ’’مسٹر وجدان! بات دراصل یہ ہے کہ صدف بہت ہی متجسس لڑکی واقع ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے، اس نے زندگی میں کبھی ہار کا منہ نہیں دیکھا۔ اسے اپنے مشاہدے پر اندھا اعتماد ہے۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے تمہیں جے پور (انڈیا) میں دیکھا تھا یعنی اخبارات میں تمہاری تصاویر دیکھی تھی اور تمہارے کارناموں کے تذکرے پڑھے تھے۔ اسے سو فیصد یقین ہے کہ تم وجدان ہو لیکن تمہارا مسلسل انکار اس کے مشاہدے کی نفی کر رہا ہے جو صدف کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک یہ تمہیں وجدان ثابت نہیں کرلے گی، چین سے نہیں بیٹھے گی۔ میں نے اس کی قوتِ مشاہدہ کے بہت سے نمونے دیکھے ہیں۔‘‘

’’لیکن یہ تو بلاوجہ کی ضد ہوئی۔‘‘ میں نے چڑ کر کہا ’’اس کا مشاہدہ کیا ہوا، کوئی حدیث شریف ہوگئی جو کسی بھی صورت غلط نہیں ہوسکتی۔ میرے خیال میں تو اسے میڈیکل چھوڑ کر پولیس کے انویسٹی گیشن ڈیپارٹمنٹ میں چلے جانا چاہیے۔ یہی شعبہ اسے سوٹ کرسکتا ہے۔ اگر یہ ڈاکٹر بن گئی تو صحت مند افراد کے اندر وہ بیماریاں بھی ڈھونڈ نکالے گی جو تا حال دریافت نہیں ہوئیں۔‘‘

نادیہ نے کہا ’’وہ اپنے شک میں بڑی حد تک حق بجانب بھی ہے۔ تمہارے متعدد جھوٹ اور پھر اس لگژری ہوٹل کے عالی شان سوئٹ میں قیام سے ثابت ہوتا ہے، تم اچھرہ جیسے متوسط علاقے میں رہنے والے وجیہ نہیں ہوسکتے۔ وہاں رہنے والے بیشتر افراد کی ماہانہ آمدنی اس ہوٹل کے دو روزہ قیام کے اخراجات سے بھی کم ہوتی ہے!‘‘

وہ دونوں مجھے بری طرح گھیر چکی تھیں۔ میں نے صدف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ’’اب تو میں خود کو وجدان تسلیم کر چکا ہوں۔ تمہارے تجسس کی تسکین ہوگئی؟‘‘

وہ مجھے کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی ’’وجدان! تم بہت پراسرار ہو۔ تمہاری طرح تمہاری ڈارلنگ بھی عجوبۂ روزگار ہے۔ میں اس کے چمتکار کی گواہ ہوں۔ کراچی ائرپورٹ پر صبح اس نے جس نوعیت کا ہنگامہ کھڑا کیا تھا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میرے اندر سے کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے، تم وہ نہیں ہو، جو نظر آتے ہو!‘‘

’’اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟‘‘ میں نے کہا۔

’’تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہوگا لیکن مجھے پڑتا ہے۔‘‘ وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ میں تمہارے اسرار کو کھول کر رہوں گی۔ میرے اندر تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔‘‘

آخری جملہ اس نے ایک ادا سے ادا کیا تو میرے جی میں آئی کہہ دوں، تمہارے اندر تو بارود کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کہیں سے ڈاکٹر نہیں لگتی ہو۔ ڈاکٹر تو ایک مسیحا ہوتا ہے، دکھ درد کی دوا کرتا ہے۔ تم تو اپنے آتش فشانی انداز سے ہوش وخرد پر بجلیاں گراتی ہو اور دل ودماغ کو تہ وبالا کر کے رکھ دیتی ہو...... لیکن یہ خیالات میری سوچ تک محدود رہے، میں انہیں الفاظ کے قالب میں نہ ڈھال سکا۔ صرف اتنا کہہ کر رہ گیا۔

’’مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اب میں اجازت چاہوں گا...... پلیز!‘‘

صدف نے معنی خیز لہجے میں کہا ’’تم نے نیم دلی یا بددلی سے خود کو تسلیم کیا ہے۔ وجدان کی حیثیت سے اقرار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ تم کچھ عرصہ قبل پنک سٹی (جے پور) میں موجود تھے اور اپنے دوست ٹھاکر بھالوت سنگھ کی مدد سے تم نے وہاں کے پنڈتوں اور پجاریوں کی اینٹ سے اینٹ بجا رکھی تھی۔ کیا تم اس دشمنی پر کچھ روشنی ڈالو گے؟‘‘

’’میں تمہاری ہر فرمائش پوری کرنے کا پابند نہیں ہوں۔‘‘ میں نے مصنوعی رکھائی سے کہا۔

وہ بولی ’’چلو اتنا ہی بتا دو، پاکستان میں کس مشن پر آئے ہو؟‘‘

’’میں نے کہا نا، میں اب تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔‘‘

’’چلو، سوال کا جواب نہ دو مگر اتنا تو کرو، جب تک میں لاہور میں ہوں، تم مجھ سے رابطے میں رہو۔‘‘ وہ مفاہمانہ انداز میں بولی۔

میں نے پوچھا ’’تم مجھ سے ٹچ میں کیوں رہنا چاہتی ہو؟‘‘

’’تمہارے بارے میں جاننے کے لیے میرے اندر بے پناہ تجسس ہے۔‘‘

’’تم اپنے تجسس کو اسٹڈی میں استعمال کرو تو تمہارے لیے مفید رہے گا۔‘‘ میں نے مشورۃً کہا ’’میڈیکل کی ایک اسٹوڈنٹ کو اس قسم کے فضول کاموں میں اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہیے اور وہ بھی ایسی اسٹوڈنٹ کہ جس کا فائنل ائیر چل رہا ہو۔ ایک سال بعد تم ڈاکٹر بننے والی ہو۔ تمہیں اپنے پروفیشن پر توجہ دینا چاہیے۔‘‘

وہ بے پروائی سے بولی ’’میڈیکل میں تو مجھے پاپا نے

پھنسا دیا ہے۔ پتا نہیں، میں ہر سال کس طرح پاس ہو جاتی ہوں۔ ویسے میں نے فیصلہ کر لیا ہے، ڈاکٹر بننے کے بعد پریکٹس نہیں کروں گی۔"

"پھر کیا کرو گی؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

وہ بولی "گھوموں پھروں گی، سیر سپاٹا کروں گی۔ مجھے مہم جوئی سے بھرپور زندگی پسند ہے جیسی زندگی تم گزار رہے ہو۔"

"تم نے تو کھوتا ہی کھوہ میں ڈال دیا۔" میں نے افسوس ناک انداز میں کہا "تمہارے ڈیڈی نے تو تمہیں ڈاکٹر بنانے کے لیے لاکھوں روپیا خرچ کیا ہی ہے۔ کیا تم جانتی ہو، ایک ڈاکٹر کی تیاری پر گورنمنٹ کتنا خرچ کرتی ہے؟"

"ہاں، مجھے سب معلوم ہے۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا "اگر ڈاکٹر بننے کے بعد تم نے اس پروفیشن کو خیر باد کہہ دیا یا باقاعدہ اختیار نہ کیا تو ایک طرح سے تم بہت بڑی زیادتی کی مرتکب ہو گی۔"

"کیسی زیادتی؟' اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا "اگر تم میڈیکل کالج کے لیے ایمپٹ نہ کرتیں تو آج تمہاری جگہ کوئی اور ڈاکٹر بن رہا ہوتا۔ کوئی ایسا اسٹوڈنٹ جو چند نمبروں کی کمی کے باعث میڈیکل کالج نہیں پہنچ سکا۔ تم نے ایک اسٹوڈنٹ کا راستہ روکا ہے یعنی اس کے مستقبل کو بہت بڑی چوٹ پہنچائی ہے۔"

پوری بات سننے کے بعد وہ بولی "کیا تم کسی تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی کام کر چکے ہو؟"

میں نے صدف کو نظر انداز کرتے ہوئے نادیہ سے پوچھا "تم کیا اسٹڈی کر رہی ہو؟"

"میں انگلش میں ماسٹرز کر رہی ہوں۔"

"کیا تعلیم مکمل کرنے کے بعد تم بھی کوئی سلائی کڑھائی کا اسکول کھولنے والی ہو؟ یا پھر تم نے بھی عملی زندگی کو سیر و تفریح کی نذر کرنا ہے؟" میں نے خاصے تیکھے لہجے میں دریافت کیا "صدف نے بتایا ہے کہ تم دونوں بہت ہم خیال اور ہم مزاج ہو!"

وہ گہری سنجیدگی سے بولی "آگے چل کر میرا سی ایس ایس کرنے کا پروگرام ہے۔ میرے ڈیڈی بہت سخت ہیں۔ میں صدف کی طرح لاابالی پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔ ڈیڈی قیامت کھڑی کر دیں گے۔"

"اپنی کزن کو بھی ایسی ہی کسی قیامت کا خوف دلاؤ۔" میں نے کہا "اور اگر ہو سکے تو اپنے پھوپا کے بھی کان ضرور بھر دو۔ ممکن ہے، تمہاری بات سرمد بخاری کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اپنی چہیتی بیٹی کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائے!"

میری اس بات پر صدف نے گھور کر مجھے دیکھا، میں نے نادیہ سے کہا "اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو گاڑی ایک سائیڈ پر روک دو۔ میں آپ لوگوں کو مزید وقت نہیں دے سکتا۔"

اس وقت نادیہ کی نیلی شیرڈ چیئرنگ کراس سے گزر کر ریگل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ایک بات کی وضاحت کر چلوں کہ میں اپنے ہوش میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور یہاں کی عمارتوں سڑکوں اور دیگر مقامات کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا البتہ ازاں بعد تھوڑے ہی عرصے میں، میں نے لاہور کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل کر لی تھیں لہٰذا اپنی اس داستانِ حیات میں خود کو لاہور سے شناسا ظاہر کروں گا اگرچہ شناسائی رفتہ رفتہ ہوئی تھی۔

نادیہ نے گاڑی روکے بغیر کہا "یہاں ریگل کے نزدیک ہی ایک بہت عمدہ ریسٹورنٹ ہے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھتے ہیں، کچھ کھاتے پیتے ہیں پھر جہاں تمہارا دل چاہے، چلے جانا۔"

نادیہ کا آئیڈیا مجھے پسند آیا۔ میں اس وقت چائے کی شدید طلب محسوس کر رہا تھا۔ میں نے خوش دلی سے کہا "اوکے، ڈن!"

چند منٹ بعد ہم تینوں پرسکون ماحول کے حامل ایک معیاری ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ میری فرمائش پر چائے کا آرڈر دیا گیا۔ چائے کے ساتھ لوازمات بھی ضروری تھے، وہ بھی منگوا لیے گئے۔ اس دوران میں ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو بھی جاری رہی۔

کچھ دیر بعد ریسٹورنٹ میں چار افراد داخل ہوئے اور ہال کے کونے میں ایک میز سنبھال کر بیٹھ گئے۔ میں سرسری انداز میں ان پر ایک نظر ڈال کر اپنی ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان چاروں نے ہماری جانب توجہ نہ دی۔ میری طرح نادیہ اور صدف نے بھی نو وارد افراد کو دیکھ لیا تھا اور نادیہ ان کی آمد سے کچھ بے چین سی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کی بے چینی خاص طور پر نوٹ کی اور کہا۔

"کیا بات ہے نادیہ! تم اتنی نروس کیوں ہو رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ کن انکھیوں سے ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

صدف نے کہا "کچھ تو ہے نادیہ۔ میں نے محسوس کیا ہے، تم اچانک مضطرب اور گھبرائی ہوئی لگنے لگی ہو؟"

بات ختم کرتے ہی صدف نے بھی اس میز کی طرف دیکھا جہاں وہ چاروں بیٹھے تھے۔ نادیہ کی بے کیفی کا تعلق انہی لوگوں سے تھا۔ میں نے ان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نادیہ سے پوچھا "کیا تم ان چاروں کی وجہ سے پریشان ہو گئی ہو؟"

"چاروں نہیں، صرف ایک کی وجہ سے۔"

"کون ایک؟" صدف نے استفسار کیا۔

وہ بولی "سکندر...... ان چاروں میں سکندر بھی موجود ہے۔"

"اوہ!" صدف نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "وہی سکندر نا، جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا، وہ ایک ایم پی اے لالہ بشیر کا بگڑا ہوا بیٹا ہے اور تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا ہے؟"

نادیہ نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

صدف نے پوچھا "ان چاروں میں سکندر کون ہے؟"

"وہ جس نے سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔"

"تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں نادیہ۔" صدف نے گمبیر آواز میں کہا "آج ہم اس لالہ کے بچے کو چھٹی کا دودھ یاد دلا کر رہیں گے۔" پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے نادیہ سے بولی "میں تمہیں وجدان کے کارناموں سے آگاہ کر چکی ہوں۔ جے پور کے اخبارات اس کی خبروں کے ساتھ اس کی صلاحیتوں کا تذکرہ بھی بطورِ خاص کرتے رہے ہیں اور تم تو جانتی ہو کہ میرا حافظہ کس بلا کا ہے۔ میں ان خبروں کی جزئیات کو بھی ابھی بھول نہیں پائی ہوں۔ وجدان مارشل آرٹس اور یوگا کا بہت بڑا ماہر ہے۔ یوگا کی مشقیں کرتے ہوئے تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔"

میرے ذہن میں فوراً وہ صبح تازہ ہو گئی جب ساؤتھ کے قریب ایک خوبصورت پارک میں، میں نے یوگا کی چند مشقیں کی تھیں۔ میں اور کبیر شاہ ڈیفنس کے ایک بنگلے میں زبردست مارا ماری کے بعد واپس ساؤتھ پہنچے تھے۔ بنگلہ غربی بی تھری ایٹ سے میاں زاہد حسین ہمیں جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تاہم جمال اور بھولا ناتھ اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے تھے۔

یہ خیالات ایک لمحے میں میرے ذہن سے گزر گئے۔ میں صدف کی حاضر دماغی، مشاہدے اور حافظے کو مان گیا۔ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور ملاقات بھی چند لمحوں کی مگر اس ملاقات کا ایک ایک اسٹیپ اس کے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں نے ایک اور بات خاص طور پر نوٹ کی اور وہ یہ کہ نادیہ سکندر کی آمد سے خاصی ڈسٹرب بلکہ خوفزدہ ہو گئی تھی لیکن صدف پر اس کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش اور چاق و چوبند تھی بلکہ تھوڑی دیر قبل اس کو جس سنجیدگی نے اپنے حصار میں لے رکھا تھا اب وہ بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں شوخی سی در آئی تھی۔ یا تو وہ اتنی ہی باحوصلہ اور پراعتماد تھی یا پھر وہ میری موجودگی میں وہ ہر خوف اور چنتا سے بے نیاز ہو گئی تھی۔

شاید ہماری اس معنی خیز اور گمبیر گفتگو کی تاثیر ان کی میز تک پہنچ گئی۔ میں نے سکندر نامی اس آوارہ نوجوان کو وہاں سے اٹھ کر ہماری جانب آتے دیکھا۔ اس نے جینز پر سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ چھے فٹ قد اور صحت قابلِ رشک تھی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیوں کو دیکھ کر پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا، وہ باقاعدگی سے باڈی بلڈنگ کرتا ہو گا۔

ہمارے قریب آ کر اس نے باری باری ہم تینوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر نادیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس ریسٹورنٹ کے باہر تمہاری گاڑی کھڑی دیکھی تو تمہیں دیکھنے اندر چلا آیا۔ بھئی، تم نے اپنی گاڑی کا ایسا نمبر لیا ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان چونک اٹھتا ہے۔" پھر اس نے بڑے بھونڈے انداز میں نیلی شیرڈ کا نمبر دہرایا "نائن ون ون۔ اسٹیٹس میں نائٹ ڈبل ون ایمرجنسی پولیس کالنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے تم بھی کسی ایمرجنسی سے کم نہیں ہو!"

بات ختم کرتے ہی اس نے بے ہودہ انداز میں ایک نیچا قہقہہ لگایا۔

یہاں تک اس کی بات درست تھی کہ "نائن ڈبل ون" فون نمبر امریکا میں فوری مدد کے حصول کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اس بات میں سچائی ہوتی تو وہ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے کے بعد سیدھا ہماری طرف آتا۔ وہ چاروں بڑی بے پروائی سے اندر آ کر ایک میز کے گرد بیٹھ گئے تھے۔ وہ میز چونکہ میری نظر کے بالکل سامنے تھی اس لیے میں نے ان کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر لیا۔ ابھی چند لمحے پہلے سکندر اچانک نادیہ کی جانب دیکھ کر چونکا تھا۔ اس کے بعد ہی وہ اٹھ کر ہماری طرف بڑھا تھا۔ نیلی شیرڈ اور نائن ڈبل ون کا حوالہ اس نے فلوک (Fluke) میں دیا تھا جو اتفاق سے بالکل درست تھا۔ مذکورہ گاڑی ریسٹورنٹ سے باہر موجود تھی۔

نادیہ جز بز ہوتے ہوئے بولی "میں اس وقت اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ ہوں۔ تم یہ بے ہودگی بند کرو اور یہاں سے دفعان ہو جاؤ۔'

"معزز مہمان!" وہ استہزائیہ انداز میں بولا "پھر میری جانب اشارہ کر کے نادیہ سے پوچھنے لگا "یہ پنچھی کہاں سے پکڑا ہے تم نے؟"

''اسٹوپڈ...... یو بلڈی۔'' نادیہ غصے سے بولی۔
''نو...... نو......'' وہ بچوں کی طرح اسے پچکارتے ہوئے بولا ''انگلش میں ماسٹرز کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تم ہر جگہ ''گٹ پٹ، گٹ پٹ'' کرتی پھرو۔''
بات ختم کرتے ہی اس نے بڑی بدتمیزی سے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا اور نادیہ کے گال کو چھونے کی ناکامیاب کوشش کی۔ ناکامیاب اس لیے کہ اس کا ہاتھ حرکت میں آتے ہی میرے تن بدن میں ایک آگ سی بھر گئی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی یادگار سبق سکھانے کے لیے اپنی جگہ سے جنبش کرتا، میری آنکھوں نے ایک تحیر خیز منظر دیکھا۔
صدف کا دایاں ہاتھ بجلی کی سرعت سے حرکت میں آیا۔ واقعی میری نگاہ میں ایک بجلی سی کوندی تھی۔ پلک جھپکنے سے قبل صدف کے ہاتھ نے، سکندر کے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو ایک طرف جھٹکا اور پھر ایک دھواں دھار پنچ اس کی ناک پر پڑا۔ صدف نے رائٹ بلاک کے بعد لیفٹ اسٹریٹ پنچ (Straight Punch) چلایا تھا۔
صدف کے پنچ میں طوفانی طاقت تھی، سکندر جیسا ہٹا کٹا باڈی بلڈر لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گیا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ ناک پر چلا گیا۔ صدف نے ایک پنچ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ سکندر کی ناک پر سلامی دیتے ہی وہ کرسی کھینچ کر اٹھ کھڑی ہوئی پھر دونوں ہاتھ میز پر ٹکا کر اس نے کسی جمناسٹ کی طرح اپنی باڈی کو ہوا میں جھلایا اور اس کی ڈبل کک زخمی سکندر کے تھوبڑے پر پڑی۔ وہ آنِ واحد میں پشت کے بل زمین پر جا گرا۔
صدف کی ان لمحاتی حرکات نے مجھے بتا دیا، وہ مارشل آرٹس میں مہارت رکھتی تھی۔ یہ لڑکی مجھے حیران کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک طویل سانس خارج کی۔ اسی لمحے وہ اچھل کر میز سے کود گئی۔
سکندر میز سے اٹھ کھڑا ہوا ہی تھا کہ صدف نے اس کے سینے پر ایک زوردار فرنٹ کک رسید کردی۔ اس نے اپنے تئیں ایک ہائی کک چلائی تھی لیکن دونوں کی قامت میں واضح فرق ہونے کے سبب صدف کا پاؤں سکندر کے سینے تک ہی پہنچ پایا۔ صدف کا قد پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے بھر بھرے وجود میں بجلی بھری ہوئی تھی۔
صدف کی کک کھانے کے بعد سکندر ایک قدم پیچھے ہٹا پھر اس نے بڑے وحشیانہ انداز میں صدف کو راؤنڈ ہاؤس کک ماری۔ صدف نے ایک اسٹیپ اندر آ کر کک کو بلاک کیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کا پنچ اس کے ڈایافرام پر رسید کردیا۔ اس اٹیک کے نتیجے میں سکندر کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس کے بیک فٹ پر جاتے ہی صدف نے ایک بھرپور سائیڈ کک اس کے پیٹ میں رسید کردی۔
سکندر ایک مرتبہ پھر چاروں خانے چت ریسٹورنٹ کے فرش پر پڑا تھا۔ صدف کی کارکردگی میرے لیے اطمینان بخش تھی، میں نے اپنے قریب بیٹھی نادیہ سے کہا ''تمہاری کزن واقعی غلط شعبے میں چلی گئی ہے۔ اسے میڈیکل فیلڈ میں نہیں بلکہ مارشل فیلڈ میں ہونا چاہیے۔''
وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی ''وجدان! میں جانتی ہوں صدف ایک اچھی مارشل آرٹسٹ ہے لیکن ریسٹورنٹ میں اسے کوئی پھڈا مول نہیں لینا چاہیے تھا۔ سکندر کے ساتھ تین لڑکے اور بھی ہیں اور وہ تینوں بڑے باپوں کے بیٹے ہیں۔ خواہ مخواہ کوئی مصیبت کھڑی نہ ہو جائے۔''
''تم ان چاروں سے خوفزدہ ہو یا ان کے باپوں کے اثر ورسوخ سے؟''
وہ بولی ''ان کے باپوں سے تو میرا باپ نمٹ لے گا۔ مجھے ڈر ہے، اگر سکندر کے ساتھی بھی صدف پر پل پڑے تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ مجھے دنگا فساد اور لڑائی جھگڑے کا کوئی تجربہ نہیں۔''
میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''فی الحال تو مقابلہ ون ٹو ون چل رہا ہے اور صدف، سکندر پر بھاری پڑ رہی ہے۔ اگر اس کے ساتھی بیچ میں کودے تو میں انہیں دیکھ لوں گا۔ تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ ریسٹورنٹ میں ہمارے علاوہ درجن بھر افراد اور بھی موجود تھے جن میں مرد وزن کی تعداد برابر تھی۔ وہ سب لائیو فائٹ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ البتہ ریسٹورنٹ کا منیجر خاصا حواس باختہ اور پریشان نظر آتا تھا۔
سکندر جلدی سے اٹھ کر صدف کے مدِمقابل کھڑا ہو گیا پھر اس نے نفرت انگیز انداز میں صدف کو ایک ناقابلِ اشاعت گالی دی۔ صدف کے ہاتھ پاؤں میکانکی انداز میں حرکت میں آ گئے۔ وہ کسی پھرکی کی مانند اپنے جسم کو حرکت دیتے ہوئے سکندر پر لات گھونسے برسانے لگی۔ اس کے اسٹیپس (Steps) سے ظاہر ہوتا تھا، مارشل آرٹس کے ساتھ ساتھ جمناسٹک میں بھی اسے خاصی مہارت حاصل ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کی نپی تلی ضربوں سے اس نے حریف کا کباڑا کر دیا۔ اس کے ساتھیوں کو جوش آ گیا۔

وہ تینوں طیش کے عالم میں اٹھے اور بھاگتے ہوئے صدف کی جانب بڑھے لیکن میں ان کے راستے میں ایک دیوار بن گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر ایک کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا، دوسرے کے منہ پر کہنی ماری اور تیسرے کو اپنے کندھے کے اوپر سے گزار کر دور اچھال دیا۔
وہ دراز قامت دبلا پتلا نوجوان ہوا میں پرواز کرتے ہوئے ایک میز کی ٹاپ پر گرا۔ اس میز پر ایک جوڑا موجود تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ لڑکی کے حلق سے تو ایک سریلی چیخ بھی برآمد ہوئی تھی۔ میز خاصی مضبوط ثابت ہوئی تاہم اس پر رکھے ہوئے برتن اپنی اپنی اصل کے مطابق آواز پیدا کرتے ہوئے ریسٹورنٹ کے فرش پر ادھر ادھر بکھر گئے۔ میں نے ایک نظر اپنے مجروح شکار پر ڈالی۔ اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ میز کی ٹاپ پر پڑا کراہ رہا تھا۔
اسی وقت مجھے اپنی گردن پر کسی کے دباؤ کا لمس محسوس ہوا۔ مجھے غافل پا کر کہنی کھانے والے نوجوان نے میری گردن کو اپنے بازو میں کسنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے پیٹ میں، میں نے گھٹنا رسید کیا تھا وہ بھی اٹھ کر تیزی سے میری جانب بڑھا۔
میں نے اپنے عقب میں موجود حریف کے بازو اور اپنی گردن کے درمیان ہاتھ پھنسایا اور دونوں پاؤں فضا میں بلند کرتے ہوئے ایک ڈبل جرکی کک سامنے سے آنے والے کے سینے پر ثبت کردی۔
اس ڈبل کک میں کسی وزنی ہتھوڑے ایسی ضرب پوشیدہ تھی۔ سینے پر کک کھانے والا توپ میں سے نکلنے والے گولے کے مانند بیک گیئر میں سفر کرتے ہوئے دور تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ اس کک کی تکمیل کے ساتھ ہی میں نے اپنی پشت پر موجود شخص کے بازو کو گرفت میں لیا اور اپنی باڈی کو ٹوئسٹ کرتے ہوئے اسے تھرو مار دیا۔ وہ میرے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے میرے سامنے فرش پر گرا۔ تھرو (Throw) اگر پوری ٹیکنیک کے ساتھ مارا جائے تو اپنے سے دس گنا بھاری شخص کو بھی زمین پر پٹخا جا سکتا ہے۔
مجھ سے پٹنے والا ابھی اٹھ کر کھڑا بھی نہیں ہو پایا تھا کہ سکندر دھڑام سے اس کے اوپر آ کر گرا۔ صدف نے بھی تھرو ہی کا کوئی انداز استعمال کرتے ہوئے سکندر کو یہاں پہنچایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی لپک کر ''جائے وقوعہ'' پر پہنچ گئی۔
میں نے کہا ''صدف! حریفوں کا تبادلۂ فائٹ کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ تم سکندر کو میرے لیے چھوڑ دو اور ان دونوں کی طرف چلی جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے میز پر پڑے اور کراہتے ہوئے شخص کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔
وہ گہری سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میری بتائی ہوئی سمت کی جانب بڑھ گئی۔ اسی وقت میں نے اپنے پاؤں کے نزدیک ایک حرکت محسوس کی۔ سکندر نے میرے ٹخنوں کو گرفت میں لیتے ہوئے مجھے گرانے کی کوشش کی تھی۔ وہ میرے پاؤں کو اتنے زور سے جھٹکا دے چکا تھا کہ اگر میں بروقت کارروائی نہ کرتا تو میرا زمین بوس ہونا لازمی تھا۔
میں نے اپنے قدموں پر کھڑے کھڑے ہوا میں جمپ کی اور بڑی تیز رفتاری سے بیک سمر سالٹ (Back Somersault) لگا دیا۔ سکندر کے دونوں ہاتھ میرے پاؤں کے ساتھ ہی فضا میں بلند ہوئے، وہ میرے ٹخنوں پر گرفت قائم نہ رکھ سکا اور میرے پاؤں اس کی ٹھوڑی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر سمر سالٹ کی تکمیل کے لیے روانہ ہو گئے۔ سکندر ایک تیز چیخ کے ساتھ پیچھے کو الٹ گیا۔
سکندر مارشل آرٹس سے نابلد نہیں تھا۔ میں نے صدف کے مقابل اسے ہاتھ پاؤں چلاتے دیکھا تھا لیکن اس غم کا کوئی علاج نہیں تھا کہ اس کا واسطہ مجھ سے پڑ گیا۔ میرے حصے میں آنے والا دوسرا شخص بھی مارشل آرٹس جانتا تھا البتہ صدف نے اب جس طرف رخ کیا تھا، وہ دونوں اسٹریٹ (Street) اور دیسی قسم کے فائٹر تھے۔
وہ دونوں بہ یک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ ایک دائیں سے اور دوسرا بائیں سے۔ انہوں نے مجھ پر راؤنڈ ہاؤس ککس (Round House Kicks) چلائیں۔ میں نے بڑی سرعت سے اپنے بازوؤں کو کام میں لاتے ہوئے آؤٹر (Outer) بلاک کیا پھر سکندر کے منہ پر ایک کریسنٹ (Crescent) ماری۔ یہ لیفٹ کریسنٹ کک تھی۔ جیسے ہی میرا پاؤں زمین پر آیا، میں نے گھوم کر ایک وہیل کک چلائی جو سیدھی جا کر دوسرے مدِمقابل کی کنپٹی پر لگی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر جھومنے لگا۔
وہیل کک (Wheel Kick) بڑی خطرناک کک ہے۔ یہ گراؤنڈ ہو یا فلائنگ، ہر صورت میں اپنے ٹارگٹ کا سوا ستیاناس مار کر رکھ دیتی ہے اور خاص طور پر سر میں لگنے والی کک تو مدِمقابل کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔
مجھ سے کنپٹی پر کک کھانے والا تھوڑا جھوما، لڑکھڑایا اور اناج کی بوری کی مانند دھپ سے زمین پر جا گرا۔ اس کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، وہ کچھ عرصے کے لیے فرش نشین ہی رہے گا۔ میں سکندر کی جانب متوجہ ہو گیا۔
وہ بڑے خونخوار انداز میں مجھ پر جھپٹا۔ پے در پے پہنچے

والی چوٹوں نے اس کے مارشل آرٹس کی سٹی گم کردی تھی۔ اس کے جارحانہ انداز میں کہیں بھی مارشل آرٹس کی جھلک نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے کو اپنے مکے کا نشانہ بنانا چاہا، میں نے نیک جرک (Neck Jerk) سے چہرے کو بچایا، اس نے دوسرا مکا میرے سینے پر مارا پھر دونوں بازوؤں کے گھیرے میں مجھے مقید کرنے کی کوشش کی۔

میں نے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کا گھیرا مکمل ہونے سے پہلے ہی بڑی سرعت سے اس کی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیا پھر ایک جھٹکے سے باہر کو مروڑ دیا۔ اس عمل میں سکندر کا سینہ کھل گیا۔ ابھی وہ کلائیاں مڑنے کی تکلیف کو پوری طرح محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ اس کے کھلے ہوئے سینے پر میں نے فرنٹ تھرسٹ کک ماری۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کلائیوں کو آزاد کردیا۔

تھرسٹ کک (Thrust Kick) میں ایک خوفناک دھکا پوشیدہ تھا پھر سکندر کی کلائیاں آزاد ہوتے ہیں۔ اس دھکے کے اثرات میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ وہ ہوا میں پسپا ہوتے ہوئے صدف کے نزدیک پہنچ گیا۔ اسی لمحے مجھے صدف کی طرف دھیان دینے کا موقع ملا۔ اس نے پستہ قامت اسٹریٹ فائٹر کو لمبا لٹا دیا تھا اور دراز قد دبلے پتلے حریف سے نبرد آزما تھی۔ یہ شخص پہلے ہی میز سے ٹکرا کر اپنی کمر پر شدید چوٹ کھائے بیٹھا تھا۔ اس سے نمٹنے میں صدف کو زیادہ مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔

صدف کو اپنے نزدیک دیکھ کر سکندر پر جنون سوار ہوگیا۔ وہ اس کے لیے دشمنِ اول کا درجہ رکھتی تھی۔ صدف ہی نے اس گرم جنگ کا آغاز کیا تھا۔ سکندر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک کرسی اٹھائی اور اسے بڑے وحشیانہ انداز میں صدف کے سر پر دے مارا۔

اسی لمحے نادیہ کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ خارج ہوئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی دانست میں سکندر کے ہاتھ میں موجود کرسی نے صدف کی کھوپڑی چٹخا دی تھی مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

صدف کی پھرتی...... بروقت پھرتی نے ایک لمحے کے لیے مجھے بھی ساکت کردیا۔ جیسے ہی سکندر نے کرسی کو فضا میں بلند کیا، صدف فرنٹ رول (Front Roll) کرتے ہوئے میز کے اوپر سے گزر گئی۔ کرسی صدف کی کھوپڑی کے بجائے میز پر لگی اور اس کے اعضا چاروں جانب بکھر گئے۔

سکندر نے اپنی ناکامی پر جھنجلا کر صدف کو ایک غیر اخلاقی لقب سے نوازا اور غرا کر اس کی جانب بڑھا۔ صدف رولنگ کے بعد اٹھ کر کھڑی ہوچکی تھی۔ اس نے اندھے بیل کے مانند اپنی جانب بڑھتے ہوئے سکندر کو ڈاج دیا۔ وہ اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھ گیا۔ صدف نے بڑی تیکنیک سے نیچے بیٹھ کر اس کے پاؤں میں اپنی ٹانگ پھنسادی۔ صدف کی اس ہاف سوئپ (Half Sweep) نے بڑا عمدہ کام دکھایا۔ سکندر طوفانی رفتار سے منہ کے بل ریسٹورنٹ کے پختہ فرش پر گرا۔

اسی وقت سکندر کے دبلے پتلے ساتھی نے اپنے لباس میں سے ایک خطرناک پسٹل نکال کر صدف کو نشانے پر رکھ لیا اور دہشت ناک انداز میں غرایا۔

"ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔"

صدف اسٹل (Still) ہوگئی۔ ریسٹورنٹ میں موجود ہر شخص کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ بڑی دلچسپی سے یہ فائٹ دیکھ رہے تھے لیکن پسٹل کی رونمائی کے بعد ان کے چہرے سراسیمگی کی لپیٹ میں آگئے۔

میں نے پسٹل بردار پر ایک تجزیاتی نگاہ ڈالی اور پلک جھپکتے میں بھانپ لیا کہ وہ فائرنگ کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فرار کی خواہش ہلکورے لے رہی تھی۔ شاید وہ صدف کو دھمکا کر وہاں سے رفو چکر ہونے کے چکر میں تھا۔

صدف نے اپنے چہرے سے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس کی دھمکی میں آگئی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے وہ حرکت کی جس کی میں توقع نہیں کررہا تھا۔ یقیناً اس نے مسلح شخص کے عزائم اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا ورنہ وہ اتنا بڑا رسک نہ لیتی۔ وہ سہم کر بڑے بزدلانہ انداز میں ایک قدم پیچھے سرکی پھر اس نے اپنے دائیں پاؤں کے نزدیک پڑی ہوئی ایک کرسی پر زوردار ٹھوکر ماری۔

کرسی فٹ بال کے مانند ٹھوکر کھا کر ہوا میں اچھلی اور سیدھی پستول بردار کی جانب پرواز کرگئی۔ اگلے ہی لمحے صدف اچک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔

ایک نرم و نازک پانچ فٹ کی حسین و جمیل لڑکی سے اس قسم کی مردانہ حرکت کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ صدف ثابت کررہی تھی کہ وہ ایسی کرسیوں اور میزوں کو اپنے پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ مارشل آرٹس میں یہ مرحلہ بہت دیر سے آتا ہے اور خاص طور پر لڑکیاں ان دقت آمیز کٹھنائیوں میں نہیں پڑتیں۔

کرسی سیدھی جا کر پسٹل پر لگی۔ اس سے پہلے پستول بردار بوکھلاہٹ میں صدف کے لیے حملے کی راہ ہموار کرچکا تھا۔ کرسی کو اپنی جانب آتے دیکھ کر بچاؤ کے انداز میں اس کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔ ان لمحات میں وہ یہ بھول گیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پسٹل بھی موجود ہے۔ اس نے اپنے چہرے کو بچانے کے لیے عین فطری انداز سے ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

صدف نے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی پروا کیے بغیر آگے بڑھ کر اس کے پیٹ، سینے اور چہرے پر مکوں کی برسات کردی۔ کرسی کے خوفناک ٹکراؤ کے سبب پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا، صدف کے پے در پے حملوں نے چند لمحوں میں اسے ادھ موا کردیا۔ اس کی کمر پہلے ہی شدید زخمی تھی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہوگیا۔

اسی وقت ریسٹورنٹ کے باہر پولیس کے مخصوص سائرن کی آواز ابھری۔ اگلے ہی لمحے ریسٹورنٹ کے دروازے کے قریب کسی بھاری گاڑی کے رکنے کی آواز آئی پھر چار گن بردار پولیس والے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی وہاں موجود ہر شخص کو "ہینڈز اپ" کردیا۔

ان چاروں میں ایک عہدے کے لحاظ سے سب انسپکٹر تھا۔ باقی تین کانسٹیبل رینک کے تھے۔ سب انسپکٹر کے ہاتھ میں ریوالور تھا جب کہ باقی تین پولیس اہلکاروں نے کلاشنکوفز اٹھا رکھی تھیں۔ وہ کسی اتفاق سے ادھر نہیں آنکلے تھے بلکہ انہیں باقاعدہ فون کرکے ریسٹورنٹ میں پیش آنے والے حالات سے آگاہ کیا گیا تھا...... اور یہ حرکت ریسٹورنٹ کے منیجر کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی۔ پولیس کی آمد کے بعد وہی بڑھ چڑھ کر بولنے لگا۔ ہماری "معروفیت" کے دوران میں اسے پولیس کو بلانے کا موقع مل گیا تھا۔

پولیس والوں نے جائے فساد کا تفصیلی جائزہ لیا اور ریسٹورنٹ کے منیجر سمیت ہم سب کو پولیس اسٹیشن چلنے کے احکام صادر کردیے۔

میں نے سب انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آفیسر! ریسٹورنٹ کا منیجر اس واقعے کا عینی شاہد ہے۔ آپ اس سے پوچھ سکتے ہیں، ہم قصوروار نہیں۔ انہی بدمعاشوں نے ہمیں ہاتھ اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔"

"کون بدمعاش ہے اور کون شریف، اس کا فیصلہ تو تھانے چل کر ہی کیا جائے گا۔" ایس آئی نے سخت لہجے میں کہا "ہم منیجر کو بھی تم لوگوں کے ساتھ ہی لے کر جارہے ہیں۔ جو بھی بیان دینا ہے، وہیں چل کر دینا۔"

سکندر نے آگے بڑھتے ہوئے کہا "سب انسپکٹر صاحب! میرا نام سکندر ہے۔ میں لالہ بشیر کا بیٹا ہوں۔ ہمیں تھانے لے جانا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ میرے یہ تینوں ساتھی بھی معمولی نہیں ہیں۔ بابر معروف صنعت کار فرقان خان کا بیٹا ہے، توصیف کے باپ مجیب راٹھور کو کون نہیں جانتا۔ یہ سیاست کے میدان کا ایک جانا پہچانا نام ہے اور سلیم کے والد ایک تھانے میں ایس ایچ او ہیں۔ ملک برکت علی کا نام، آپ نے ضرور سنا ہوگا؟" وہ ایک لمحے کو رک کر بڑے طنزیہ انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اگر آپ کو تھانے لے جانے کا زیادہ ہی شوق ہے تو ان تینوں کو لے جائیں۔" پھر اس نے بے ہوش پڑے اپنے ساتھیوں کی جانب اشارہ کیا "نقصان ہمارا ہوا ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ان تینوں میں سے کسی کو کچھ ہوگیا تو آپ کے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے۔"

سکندر بڑے واضح الفاظ میں سب انسپکٹر کو دھمکا رہا تھا اور میں نے دیکھا "ایس آئی اس کی دھونس میں آچکا تھا۔ وہ بہت متفکر نظر آنے لگا۔ اس وقت وہ تمام قانون کو فراموش کرکے صاحبِ رسوخ افراد سے مرعوب نظر آتا تھا۔

اس نے ہماری جانب اشارہ کرتے ہوئے کانسٹیبلز کو حکم دیا "اوئے، ان تینوں کو پکڑ کر موبائل میں ڈالو...... اور منیجر کو بھی اٹھالو۔ ہم اتنی کھلی غنڈا گردی نہیں ہونے دیں گے۔"

میں نے آفیسر سے کہا "یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ آپ قانون کے محافظ ہیں۔ اگر آپ ہی قانون شکنی کریں گے تو یہ ملک کیسے چلے گا؟"

"اوئے، تم مجھے قانون سکھاؤ گے؟" سب انسپکٹر نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا "یہ ملک چل رہا ہے اور بہت خوبصورتی سے چل رہا ہے۔ تمہارے مشوروں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔"

"یہ ملک چل نہیں رہا، جل رہا ہے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا "اور اس کو جلانے والے تمہارے ہی جیسے قانون شکن ہیں جو طاقتور افراد سے مرعوب ہوکر مجرموں اور جرائم کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔"

سب انسپکٹر بے یقینی سے مجھے تکنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے ایسی زبان درازی بھی کرسکتا ہے۔ اس نے مجھے کھا جانے والی نظر سے گھورا اور سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"لگتا ہے تمہارا کبھی کسی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا!!"

"بہت پڑا ہے۔" میں نے جواباً اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "صرف یہاں ہی کی نہیں بلکہ دنیا کے کئی

ممالک کی پولیس کو میں بھگت چکا ہوں مگر یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔"

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا "یہی باوا آدم تمہیں تھانے لے کر جائے گا اور قانون سے گفتگو کرنے کے آداب بھی سکھائے گا۔"

"تھانے جانا ہے تو سب جائیں گے۔" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا "تم ان امیر اور وزیر زادوں سے خصوصی برتاؤ نہیں کر سکتے۔" میرا لہجہ خود بخود ترش ہو گیا۔ میں نے نازیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہارے لالہ بشیر کے سپوت سکندر نے میری اس ساتھی سے بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے جو کچھ بھی کیا، اپنی حفاظت میں کیا ہے۔ اس واقعے کے یہاں کئی گواہ ہیں۔" پولیس کی آمد کے بعد وہاں موجود افراد کو نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "آپ یہاں موجود افراد کا بیان لے سکتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے منیجر کا بیان بھی ہمارے حق میں جائے گا۔" میں نے تھوڑا سا توقف کیا پھر ٹھوس لہجے میں کہا "آفیسر! آپ میری ساتھی نادیہ کو کوئی معمولی لڑکی نہ سمجھیں۔ یہ ایک حاضر ڈیوٹی ڈی ایس پی کی بیٹی ہے۔"

سب انسپکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا "ڈی ایس پی؟"

"ہاں، ڈی ایس پی ٹریفک اورنگ زیب خان۔" نادیہ نے فخریہ انداز میں بتایا۔

نادیہ کے جملے نے سب انسپکٹر کا چہرہ متغیر کر دیا۔ وہ بے چارہ اچانک پاٹن کے میں آ گیا تھا۔ اگر وہ ڈی ایس پی کی بیٹی یا اس کے ساتھیوں کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا تو یہ، آ بیل مجھے مار والی بات ہوتی۔ دوسری طرف وہ سکندر کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس صورت میں کہ زیادہ نقصان بھی سکندر اور اس کے ساتھیوں کو ہی پہنچا تھا۔

موقع پرست سب انسپکٹر نے ایک چال چلی اور وہاں موجود افراد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "آپ لوگ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"

وہ سب ہماری حمایت میں بولنے لگے۔ جب وہ اپنا غبار نکال چکے تو سب انسپکٹر نے ان کے نام پتے نوٹ کیے اور تحکمانہ انداز میں کہا "اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ اگر کسی مرحلے پر آپ کی ضرورت پڑی تو بلا لیا جائے گا۔ میں دونوں پارٹیوں کو اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔ ان کے بیانات وہیں چل کر ہوں گے۔"

عام شہریوں میں پولیس کا تصور یہی ہے کہ وہ عوام کو خواہ مخواہ پریشان کرتی رہتی ہے اور بے قصور کو بھی گھیر گھار کر الٹے سیدھے کیس میں الجھا دیتی ہے۔ اس وقت پولیس کا ایک سب انسپکٹر انہیں بڑی نرمی اور شرافت سے جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ انہوں نے اسے موقع غنیمت جانا اور خاموشی سے کھسک لیے۔

اس دوران میں سب انسپکٹر کے ساتھی کانسٹیبلوں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے ہلا جلا کر بابر، توصیف اور سلیم کو ہوش دلا دیا تھا۔ دبلے پتلے، دراز قامت توصف کے پسٹل کو بھی پولیس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ معروف سیاست داں بشیر راٹھور کے بگڑے ہوئے اس بیٹے کو اچھا خاصا سبق مل چکا تھا۔ وہ بڑی کینہ توز نظر سے صدف کو گھور رہا تھا۔ بابر اور سلیم کے چہروں سے بھی ہمارے لیے بے پناہ نفرت جھلک رہی تھی۔ انہوں نے اپنے اس حشر کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا!

سب انسپکٹر مجھے اور سکندر کو ایک طرف لے گیا اور نہایت ہی رازدارانہ لہجے میں بولا "آپ لوگ ایک دوسرے کا بہت کچھ بگاڑ سکتے ہیں لیکن میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تھانے پہنچتے ہی دونوں پارٹیوں کے لواحقین کی طرف سے ٹیلی فونز کا تانتا بندھ جائے گا۔ حاصل وصول کچھ نہیں، یہ بات تم لوگ بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ آپس میں تصفیہ کر لو۔ منیجر کو مطمئن کرنے کے لیے میں تم سب کو موبائل میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ اس طرح قانونی کارروائی بھی عمل میں آ جائے گی۔ تھانے پہنچنے تک تم لوگ کوئی فیصلہ کر لو۔"

"تصفیہ تو میں کسی صورت نہیں کروں گا۔" سکندر نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا "میرا اور میرے ساتھیوں کا بہت نقصان ہوا ہے۔ میں اس کا بدلہ ضرور لوں گا۔"

میں نے سکندر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم نے میری ساتھی نادیہ کی نہ صرف انسلٹ کی ہے بلکہ اسے درجن بھر افراد کے سامنے تماشا بھی بنایا ہے۔ اس "کارنامے" پر تمہیں کوئی بہت بڑا "انعام" ملنا چاہیے۔ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تھوڑی بہت مرمت تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی، تم اس سے کہیں زیادہ کے مستحق ہو مگر......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سب انسپکٹر کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا "اس کے باوجود بھی میں تصفیے کے لیے تیار ہوں۔" میں خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔

"تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔" وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھور کر بولا "تم مجھے جانتے نہیں ہو، میں لالہ بشیر کا بیٹا ہوں۔ ایم پی اے لالہ بشیر۔"

میں نے اسے مزید سلگانے کے لیے کہا "کیا ہی اچھا ہوتا اگر تمہارے پاس اپنی کوئی شناخت ہوتی۔ میں مانتا ہوں، تمہارا باپ ایم پی اے ہو گا مگر تم کیا ہو، یہ حقیقت مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ میں نے تو ابھی ابھی تم سے دو دو ہاتھ کیے ہیں!"

وہ مجھ سے بری طرح درگت بنوائے بیٹھا تھا۔ ان طنزیہ الفاظ نے نمک پاشی کا کام کیا، وہ تڑپ کر بولا "تمہیں تو میں دیکھ لوں گا رستم خان کے چتر......اور تمہاری اس ساتھی کو بھی۔" اس نے صدف کی جانب اشارہ کیا پھر نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کمینے پن سے ہنسا "تم کب تک مجھ سے بچو گی!" بات ختم کرتے ہی اس نے نادیہ کے لیے چند نازیبا الفاظ ادا کیے۔ وہ پولیس کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔

صدف اچھل کر آگے بڑھی لیکن وہ حملے کے ارادے سے نہیں بڑھی تھی۔ سکندر یہی سمجھا کہ وہ اس پر وار کرنے والی ہے۔ وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اب اگر تم نے کوئی بکواس کی تو......!"

صدف نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا "صدف! بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ایک سب انسپکٹر کے سامنے لالہ بشیر کا صاحب زادہ تم سے گت بنواتا کیا اچھا لگے گا۔ زندگی رہی تو پھر سامنا ہو گا اور...... جب سامنا ہو گا تو تم رہے سہے ارمان بھی نکال لینا۔"

سکندر نے اپنی رسوائی ہوتے دیکھی تو کھسیانی بلی کے مانند کھمبا نوچنے لگا۔ وہ سب انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہنے لگا۔

"ان دونوں کو لے جا کر تھانے میں بند کر دیں۔" اس کا اشارہ صدف اور میری جانب تھا۔ "انہی کی وجہ سے ساری گڑبڑ ہوئی ہے۔ پتا نہیں، نادیہ نے یہ مصیبتیں کہاں سے اٹھائی ہیں؟"

صدف نے تفریح لیتے ہوئے کہا "میں نادیہ کی سگی کزن ہوں۔ اس کی سگی پھوپی کی سگی بیٹی صدف۔" پھر اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ وجدان ہے، میرا کلاس فیلو۔ ہم کراچی سے آئے ہیں۔ اتنے اہم لوگوں کو مصیبتیں کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟"

بات کے اختتام پر صدف کا لہجہ بڑا زہریلا ہو گیا تھا۔ جذبات بھرے مکالمات کے دوران میں وہ ایک سنگین غلطی کر بیٹھی تھی۔ اس نے مجھے وجدان کے طور پر پیش کیا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا، وہاں وجدان یعنی میرا کوئی شناسا نہیں تھا ورنہ کوئی نئی افتاد ٹوٹ پڑتی۔ میں نے صدف کی اس حماقت پر اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلے ہوئے تیر واپس نہیں آ سکتے۔

صدف کے طنز کے جواب میں سکندر بھی بڑھ چڑھ کر بولنے لگا نتیجتاً سب انسپکٹر ہمیں تھانے لے جانے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بے چارہ ہمارے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ دونوں پارٹیوں کو اپنے تھانا انچارج کے روبرو پہنچا دے۔ تاہم اتنا ہوا کہ ہم لوگ پولیس کی موبائل کے بجائے اپنی اپنی گاڑیوں میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ سکندر اور اس کے تینوں ساتھیوں کے پاس ایک نئے ماڈل کی کھلی جیپ تھی جسے موٹے پائپس اور رنگین لائٹس کی مدد سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ ایک ایک کلاشنکوف بردار کانسٹیبل دونوں گاڑیوں میں سوار ہو گیا۔

میں نیلی شیراڈ کی عقبی نشست پر پہنچا تو ڈارلنگ اچھل کر میری گود میں چڑھ گئی۔ میں ریسٹورنٹ میں جاتے ہوئے اپنا سفری بیگ اور ڈارلنگ کو گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ گن بردار کانسٹیبل عقبی نشست پر میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ ڈارلنگ سے دلداری کو جی مچل گیا لیکن کانسٹیبل کی موجودگی میں خاموش رہنا زیادہ بہتر تھا لہٰذا میں ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ڈارلنگ کی پشت کو سہلانے لگا۔

تھانے میں کوئی ایسی کارروائی نہیں ہوئی جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے۔ قارئین بخوبی واقف ہیں کہ جب بااختیار اور بااقتدار افراد کی اولادیں ان کے ہتھے چڑھتی ہیں تو وہ ان سے کس طرح "پیچھا" چھڑاتے ہیں۔ دونوں جانب سے سورس کا بھرپور استعمال ہوا اور شام چھے بجے ہمیں پندرہ منٹ کے وقفے سے یکے بعد دیگرے تھانے سے "رخصت" کر دیا گیا۔

واپسی میں ڈی ایس پی بہ صد اصرار مجھے اپنے ساتھ لے آیا "رات کا کھانا کھائے بغیر میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ تم نے میری بیٹی اور بھانجی کی بہت مدد کی ہے۔"

نادیہ نے کہا "ڈیڈی! وہ لوگ ہم سے پندرہ منٹ پہلے نکلے ہیں۔ راستے میں، ہمیں گھیرنے کی کوشش تو نہیں کریں گے!"

"اس بات کے امکانات صفر سے زیادہ نہیں۔" صدف نے کہا "بالفرض محال، اگر انہوں نے ایسی غلطی کی تو اس کا خمیازہ بھی بھگتیں گے۔"

ڈی ایس پی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "بیٹی! تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے پہلے ہی مجھے اس

لفنگے کے بارے میں بتا دیا ہوتا تو یہ نوبت ہی نہیں آتی۔ اب تو میں لالہ بشیر کے اس گندے خون کو ایسا فٹ کروں گا کہ ساری زندگی یاد کرے گا اور بھول کر بھی تمہاری طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جھک نہیں ماری۔ میرے مراسم کی بلندی بھی کچھ کم نہیں۔"

میں نہیں جانتا تھا، صدف نے اپنے ماموں کو میرے بارے میں کیا بتا رکھا تھا۔ اس نے اورنگ زیب خان ہی کی مدد سے میرا سراغ لگایا تھا اس لیے یہ تو ممکن نہیں تھا، کچھ بھی نہ بتایا ہو۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ اگر ڈی ایس پی نے براہِ راست مجھ سے گفتگو شروع کر دی تو میں کس حیثیت میں اس سے بات چیت کروں گا۔ وجدان یا وجیہ؟ ڈی ایس پی اورنگ زیب ایک گھاگ پولیس والا تھا۔ وہ سوال کر کر کے میرا ناطقہ بند کر دیتا۔

شاید ڈی ایس پی نے غیر محسوس انداز میں میرے خیالات پڑھ لیے تھے یا کوئی اور بات تھی کہ اس نے میرا ہی موضوع چھیڑا۔ اپنی بھانجی صدف سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"صدف! مسٹر وجیہ تک پہنچنے میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ صدف نے یہ عقلمندی دکھائی تھی کہ مجھے وجیہ کے طور پر اپنے ماموں سے متعارف کرایا تھا۔

وہ بولی "نہیں ماموں جان! ہم سیدھے اس کے ہوٹل پہنچے تھے جہاں وجیہ سے ملاقات ہو گئی...... اور اسے ہار ماننا پڑی یعنی اس نے تسلیم کر لیا کہ میں اپنی دھن کی پکی ہوں۔"

یہ ایک گول مول جواب تھا۔ صدف خاصی موقع شناس اور باتدبیر ثابت ہو رہی تھی۔

"مسٹر وجیہ! میری بھانجی بہت ضدی ہے۔" ڈی ایس پی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "اس سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ اس نے یہاں پہنچتے ہی مجھے تمہارے بارے میں بتایا، تم اس کے کلاس فیلو ہو۔ اتفاق سے تم دونوں ایک ہی فلائٹ سے لاہور پہنچے ہو لیکن صدف کو تنگ کرنے کے لیے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ تم مسٹر وجیہ ہو۔ یہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے پیچھے پڑ گئی پھر میری مدد سے اس نے تمہارا کھوج لگا لیا" ایک لمحے کو رک کر اس نے سنجیدگی سے پوچھا "تم ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو۔ کیا لاہور میں تمہارا کوئی عزیز رشتے دار یا دوست نہیں ہے؟"

صدف نے بڑی ذہانت اور چالاکی سے اپنے ماموں کو میرے بارے میں ایک فرضی کہانی سنائی تھی تاکہ اس کے جذبۂ تجسس کی تسکین بھی ہو جائے اور میرا بھید بھی نہ کھلنے پائے۔ وہ اپنے ایک انتہائی قریبی رشتے دار کے سامنے میری طرف داری کیوں کر رہی تھی، اس بات نے میرے ذہن کو بری طرح الجھا دیا۔ اس نے میرا پردہ رکھنے کے لیے اپنے ماموں سے غلط بیانی کی تھی۔ میں نے سوچا، موقع ملتے ہی میں صدف سے اس بارے میں استفسار کروں گا۔ البتہ یہ بات واضح تھی کہ اس نے اپنی کزن نادیہ کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ نادیہ جے پور کے حوالے سے مجھ سے گفتگو کر چکی تھی اور متعدد بار اس نے مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

یہ خیالات بجلی کی سی سرعت سے میرے ذہن سے گزرے اور میں نے ڈی ایس پی اورنگ زیب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں اس ہوٹل میں اپنے ایک پرانے شناسا سے ملنے گیا تھا۔ اس کے رشتے دار کراچی میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اس کے لیے کچھ پیغامات اور تحائف بھیجے تھے۔ وہ اس تک پہنچانا ضروری تھے، مجھے یہ جھوٹ بولتے ہوئے ندامت کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، بعد میں کسی مناسب موقع پر میں ڈی ایس پی کے سامنے اس کی وضاحت پیش کر دوں گا۔

اس نے پوچھا "لاہور میں کتنے دن کا قیام ہے اور کہاں ٹھہرو گے؟"

"یہاں گلبرگ میں میرے ایک دوست رہتے ہیں۔" میں نے فوری طور پر جان چھڑانے کے لیے فرید پاشا کا حوالہ دے دیا "وہ درحقیقت میرے والد کے دوست ہیں اور ایک فلم پروڈیوسر ہیں۔ آپ نے شاید ان کا نام سنا ہو؟" پھر میں نے فرید پاشا کا نام لے دیا۔

ڈی ایس پی نے کہا "سوری مسٹر وجیہ! مجھے فلم اور فلم والوں سے زیادہ دلچسپی نہیں اس لیے پروڈیوسر فرید پاشا کے بارے میں نہیں جانتا۔"

میں نے کہا "میں فرید پاشا کے پاس ہفتہ بھر ٹھہروں گا۔ مجھے فلم کی شوٹنگ دیکھنے کا بہت شوق ہے پھر فرید پاشا کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے ہے۔ میں اس کے گاؤں جا کر دیہاتی زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔" اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "لاہور میں تمہیں کوئی مسئلہ ہو یا کبھی میری مدد کی ضرورت پیش آئے تو کسی قسم کا تکلف مظاہرہ نہیں کرنا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے جناب! اگر ایسا کوئی موقع آیا تو میں آپ کو ضرور زحمت دوں گا۔"

"بھئی! آج تم نے ان بچیوں کی مدد کر کے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔" اس نے کہا "میں تمہارے اس سلوک کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

میں نے کہا "جناب! میں نے ان کی کیا مدد کی ہے۔ یہ سارا کریڈٹ تو صدف کو جاتا ہے۔ اس نے جمناسٹک اور مارشل آرٹس کا ایسا مظاہرہ کیا ہے کہ میں دنگ رہ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، یہ اتنی بڑی مارشل آرٹسٹ ہو گی۔" میں نے بات کے اختتام پر حقیقی حیرت سے صدف کی طرف دیکھا۔

"تم اس کے کلاس فیلو ہو اور تمہیں اس کی اس صلاحیت کی خبر نہیں؟" ڈی ایس پی نے مجھ سے پوچھا۔

"اس نے کبھی اپنی اس جنگجویانہ صلاحیت کا تذکرہ ہی نہیں کیا۔" میں نے اپنی کہی ہوئی بات کو نبھاتے ہوئے کہا "میں کیا، کلاس میں کسی اور کو بھی یہ بات معلوم نہیں۔"

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے بھی صرف اتنا پتا ہے، صدف نے کچھ جوڈو کراٹے اور سیلف ڈیفنس سیکھ رکھا ہے۔ میں نے اسے اپنی آنکھوں سے کبھی عملی مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے کارناموں کا تذکرہ سننے میں آیا۔ آج یہ پہلا موقع ہے۔"

اسی نوعیت کی گفتگو کرتے ہوئے ہم چائنا چوک کے نزدیک واقع ڈی ایس پی اورنگ زیب کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈی ایس پی نے کہا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

"مجھے چند ضروری کام نمٹانا ہیں اس لیے دو تین گھنٹوں کے لیے جاؤں گا۔ انشاء اللہ ڈنر پر پھر ملاقات ہو گی" پھر وہ صدف اور نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ لوگوں کو کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ میں لالہ بشیر کے بیٹے سکندر ہی کے سلسلے میں کوئی مناسب بندوبست کرنے جا رہا ہوں۔ جب تک سانپ کا زہر نہ نکال لیا جائے، اس کی طرف سے ڈسنے کا خطرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ میں پہلی فرصت میں اس موذی کے دانت توڑ دینا چاہتا ہوں۔"

ڈی ایس پی رخصت ہو گیا تو موقع ملتے ہی میں نے صدف کو گھیر لیا۔ اس گھر میں ڈی ایس پی اورنگ زیب خان، اس کی بیوی شائستہ بیگم، نادیہ، نادیہ کی نانی زہرہ بیگم کے علاوہ صرف ملازمین تھے۔ زہرہ بیگم ستر سے متجاوز تھی، زہرہ بیگم کو اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ وہ بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھی اور اس قسم کی خبروں سے انہیں دور رکھا جاتا تھا۔ شائستہ بیگم اپنی بیٹی نادیہ کے ساتھ باتیں کرنے لگی چنانچہ مجھے تنہائی میں صدف سے بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

"تم نے وہ کیا حماقت کی تھی؟" میں نے برہمی سے کہا۔

وہ چونک کر بولی "کون سی حماقت؟"

"ایک پولیس آفیسر سب انسپکٹر اور لالہ بشیر کے تلنگے بیٹے کے سامنے میرا تعارف کروانے کی کیا ضرورت تھی۔ تم نے مجھے وجدان کی حیثیت سے متعارف کروا ڈالا!"

وہ جلدی سے بولی "میں جوش میں آ گئی تھی۔ سچ کہتے ہیں، جوش میں ہوش نہیں رہتا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ بہرحال، سوری۔"

"کس کس بات کی سوری کرو گی؟" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیوں؟ کیا اور کوئی غلطی بھی ہو گئی؟"

"تم نے ڈی ایس پی صاحب کو میرے بارے میں کیا الٹی سیدھی کہانی سنا ڈالی۔ مجھے اپنا کلاس فیلو بتا کر تم نے میرے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔"

میں نے کہا "اپنوں سے جھوٹ اور غیروں سے سچ بولنا کہاں کا دستور ہے۔ تمہیں دوست اور دشمن کا فرق نہیں معلوم؟"

وہ بڑی رسان سے بولی "اگر میں ماموں کو تمہاری ہسٹری سنانے کے بعد اپنا "عزم" ظاہر کرتی تو وہ کبھی بھی مجھے اس کی اجازت نہ دیتے بلکہ وہ الٹا ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑ جاتے۔ تم جانتے ہو، وہ پولیس والے ہیں اور تم جیسی ہنگامہ خیز اور ولولہ انگیز شخصیت ان کے لیے گہری دلچسپی کا باعث ہوتی، تمہیں جان چھڑانا مشکل ہو جاتی اور جہاں تک وجدان کی حیثیت سے تمہارے تعارف کی بات ہے تو میں اس کے لیے سوری کر چکی ہوں لہٰذا زیادہ بگڑنے کی ضرورت نہیں!"

اس کی باتوں میں وزن تھا۔ وہ دوٹوک اور جارحانہ انداز میں بات کرتی تھی۔ ایسی مدلل باتوں کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بوجھل سانس خارج کی تو اس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"وجدان! ایک بات کو اپنے ذہن میں نقش کر لو اور وہ یہ کہ مجھے دوست اور دشمن کی خوب پہچان ہے۔ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور وہ کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس بارے میں، میں نے اپنا کوئی خیال ظاہر کرنے کے بجائے اس سے پوچھا "نادیہ کی باتوں سے میں نے محسوس کیا ہے کہ تم اسے میرے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا چکی ہو۔

اگر اس نے اپنے ڈیڈی کو میری اصلیت سے آگاہ کر دیا تو تمہیں اپنے ماموں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ تیقن سے بولی ''نادیہ میری کزن ہی نہیں بلکہ ایک راز دار گہری دوست بھی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے ہر قسم کی بات شیئر کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے، وہ تمہارے سلسلے میں احتیاط برتے گی۔ بہرحال، میں اسے خاص طور پر سمجھا دوں گی۔''

میں نے ڈی ایس پی کی فیملی کو خاصا آزاد خیال اور ماڈرن پایا۔ صدف کی بے باکی میں پہلے ہی مشاہدہ کر چکا تھا۔ یہ بے باکی اور آزاد خیالی درحقیقت ایک اعتماد تھا۔ جو ان لوگوں کو اپنی ذات پر تھا۔ وہ تعلیم یافتہ اور صاحبِ حیثیت لوگ تھے۔ علم، دولت اور اختیار انسان کو بے پناہ اعتماد بخشتا ہے اور یہ تینوں خوبیاں اس فیملی میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ مجھے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ صدف کے سامنے ''وجدان اور وجیہ'' کا مسئلہ اٹھانا فضول ہے۔ اب تک کا تجربہ یہی تھا کہ اس نے میری کسی وضاحت کو مان کر نہیں دیا ہے۔ ویسے وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس پر بھروسا کرنے میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی لہٰذا میں نے اسے اور اس کی سوچ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آگے جو ہوتا، میں اسے بھی بھگت ہی لیتا!

مجھے خاموش پا کر اس نے کہا ''کیا سوچ رہے ہو؟ ایک دم سنجیدہ کیوں ہو گئے؟''

''میں سنجیدگی سے تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''میرے بارے میں کون سی بات تمہیں سوچنے پر مجبور کر رہی ہے؟''

''تمہارا مارشل آرٹس اور فائٹ کا انداز۔''

''اوہ۔'' اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے ''یہ کوئی خاص بات نہیں۔''

''تم تو چھپی رستم نکلی ہو!'' میں نے کہا ''کیا تم ہمیشہ ایسے ہی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہو؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''نہیں، اس کا موقع کبھی کبھار ہی ملتا ہے۔ اب تو میں ان فنون کو بھولتی جا رہی ہوں۔ کافی عرصے سے باقاعدہ ایکسرسائز نہیں کی۔''

''ایکسرسائز نہ کرنے پر یہ عالم ہے!'' میں نے سراہنے والے انداز میں مسکرا کر کہا۔

وہ بولی ''میں نے آٹھویں کلاس میں ایک کراٹے کلب جوائن کیا تھا۔ انٹر تک یہ شوق بڑے ذوق سے جاری رہا۔ جوڈو کراٹے کے ساتھ ساتھ میں نے جمناسٹک بھی سیکھا ہے مگر میڈیکل کالج میں جانے کے بعد سب شوق ایک طرف رکھے رہ گئے۔ میڈیکل میں اتنا اسٹڈی کرنا پڑتا ہے کہ سر کھجانے کی فرصت بھی نہیں ملتی، شوق کیسے پورے کیے جائیں اور پھر مارشل آرٹس یا کوئی بھی اسپورٹس ایک فل ٹائم جاب ہے۔ اسے لولا لنگڑا اور پارٹ ٹائم جاری رکھنے میں مزہ نہیں آتا۔ میرا یہ شوق بھی مجھ سے چھن گیا۔ بس کبھی کبھار ہاتھ پاؤں سیدھا کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔''

اس وقت وہ نہایت ہی سنجیدگی اور مدبرانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا، وہ پہلے والی ایک چلبلی لڑکی ہے۔ اس کا سارا لاابالی پن رخصت ہو چکا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ مارشل آرٹس سے اسے دلی لگاؤ رہا تھا۔ مارشل آرٹس ایسی ہی شے ہے۔ پوری توجہ، لگاؤ اور انوالومنٹ مانگتا ہے۔ یہ شوقیہ فنکاروں کے قابو میں آنے والے جن نہیں! صدف اپنی پستہ قامتی کے باوجود بھی دور مار اٹیک کرتی تھی۔

میں نے صدف کے چٹکی لیتے ہوئے کہا ''تم نے بتایا تھا، میڈیکل میں تمہیں زبردستی دھکیلا گیا ہے اور یہ کہ پڑھائی میں تمہارا کوئی خاص دل نہیں لگتا۔ تمہیں خود معلوم نہیں کہ ہر سال کس طرح پاس ہو جاتی ہو۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''اس صورت میں تو تمہارے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ تم جی جان سے مارشل آرٹس اور جمناسٹک کی پریکٹس جاری رکھ سکتی ہو۔''

''سب کہنے کی باتیں ہیں۔'' وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی ''میڈیکل میں چاہے کتنا ہی کم کیوں نہ پڑھو، آگے بڑھنے کے لیے اتنا وقت دینا ہی پڑتا ہے کہ کسی اور چونچلے کی گنجائش نکالنا ممکن نہیں رہتا بہرحال۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر خالصتاً امریکی انداز میں کندھے اچکائے اور خاموش ہو گئی۔

''تم نے ووڈ بریکنگ (Wood Breaking) بھی کی ہے؟''

''ہاں کی ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''ووڈ بریکنگ کے ساتھ ساتھ میں نے ٹائل بریکنگ (Tile Breaking) بھی کی ہے مگر تم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا؟''

میں نے کہا ''تم نے جس بے خوفی سے کرسی کو کک مار کر پستول بردار توصیف کی طرف اچھالا تھا میں اس منظر کو بھول نہیں سکتا۔ یہ اعتماد کافی عرصے کی کٹھن محنت اور ریاضت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔''

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی ''مگر تمہارا فائٹنگ اسٹائل بالکل جداگانہ ہے۔ لگتا ہے، تم کنگ فو

(Kung-Fu) میں بہت اوپر تک گئے ہو۔ میں تو کراٹے (Karate) میں بلیک بیلٹ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔''

''یہ بھی بہت ہے۔'' میں نے کہا ''ایک ڈاکٹر کو شاید ہی زندگی میں کبھی مارشل آرٹس کی ضرورت پیش آتی ہو۔ جب تم تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنا کلینک کھولو گی تو تمہیں یہ سب کچھ قصۂ پارینہ لگے گا۔''

وہ مضبوط لہجے میں بولی ''مگر میں اسے قصۂ ماضی نہیں بننے دوں گی بلکہ اپنے فن کو آگے بڑھاؤں گی۔'' پھر اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھڑلے سے پوچھا ''کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے؟''

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' میرے لہجے میں بوکھلاہٹ تھی۔

وہ پوری سنجیدگی سے بولی ''تم مجھے کنگ فو اور یوگا کے گر سکھا سکتے ہو۔ میں تمہیں گرو بنانا چاہتی ہوں۔''

''میں نہ تو کوئی گرو ہوں اور نہ ہی مجھے چیلے چیلیاں پالنے کا شوق ہے۔'' میں نے رکھائی سے کہا ''ایک کو ہاتھ پاؤں چلانا سکھایا تو وہ......!''

باتوں ہی باتوں میں آپوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا اور میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا وہ تو ہر وقت میرے دھیان میں براجمان رہتی تھی۔ میں نے محاورتاً یہ بات کہی ہے، ورنہ ساحل تو میرے دل پر کندہ تھی اور میری روح میں کسی خوش بو کے مانند نفوذ ہو چکی تھی۔ میں اسی کی فضا میں سانس لیتا تھا۔ اس وقت صدف کے سامنے ساحل کا ذکر کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا لیکن میرے اس طرح اچانک خاموش ہو جانے نے اس تجسس کی ماری کو پھڑکا دیا، میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بڑے سنسنی خیز انداز میں پوچھنے لگی۔

''تو وہ...... کیا؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''کچھ نہ کچھ ضرور ہے وجدان!'' وہ کریدنے والے انداز میں بولی ''شاید تم اپنے کسی شاگرد کے بارے میں بتانے جا رہے تھے جو تمہیں دھوکا دے کر چلا گیا یا چلی گئی!''

اس نے اپنے طور پر تجزیہ کر کے ایک اندازہ قائم کر لیا تھا جو کہ حقیقت سے بہت دور تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ایسی کوئی بات نہیں صدف۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' اس کی تشویش جاری رہی۔

میں نے کہا ''دراصل بات کرتے کرتے مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔ اس لیے میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ تم خواہ مخواہ کے نتائج اخذ کر کے اپنی توانائی ضائع نہ کرو۔'' پھر میں نے بات کو گھما دیا اور مزاح کے رنگ میں کہا ''تمہیں اپنی توانائی کی ایک ایک کیلوری بچا کر رکھنا ہے۔ میڈیکل کے فائنل ایگزامز تمہارے سر پر منڈلا رہے ہیں۔''

وہ سمجھ گئی کہ میں دانستہ اسے ٹال رہا ہوں۔ اس نے بھی زیادہ زور نہیں دیا اور خلافِ عادت موضوعِ گفتگو بدل دیا، سنجیدگی سے بولی۔

''تم نے اپنے والد کے جس پروڈیوسر دوست کا ذکر کیا ہے، اس کہانی میں کس حد تک سچائی ہے؟''

صدف کو میں نے اب تک ایک ضدی اور اولوالعزم لڑکی پایا تھا۔ وہ اپنی ہٹ سے ہٹنے والی نہیں تھی۔ اس نے اگر موضوع بدلا تھا تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا، اس میں کوئی بڑی تبدیلی واقع ہو رہی تھی یا پھر یہ بھی اس کی کوئی چال تھی، وہ مجھے کسی اور زاویے سے گھیرنا چاہتی تھی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ''فرید پاشا واقعی ایک فلم پروڈیوسر ہے اور اس کی شاندار کوٹھی یہاں گلبرگ میں واقع ہے۔''

''اور تم اس کے پاس ہفتہ بھر رکو گے؟'' وہ سوالیہ انداز میں بولی ''اسٹوڈیو جا کر فلموں کی شوٹنگ دیکھو گے اور ازاں بعد اس کے گاؤں جا کر دیہاتی زندگی کا نظارہ بھی کرو گے؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''فرض کرو۔'' وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولی ''اگر یہی دونوں شوق مجھے بھی شدت سے ہوں تو تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکو گے!''

''میں فرض نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا ''یہ میتھ نہیں ہے کہ میں ''ایکس'' وغیرہ سے کام چلاتا رہوں۔''

وہ جھٹ سے بولی ''چلو فرض نہ کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں، یہ حقیقت ہے۔ اب بولو؟''

وہ میرا سایہ بننے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے کہا ''تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہو؟''

''میں آٹھ دس دن لاہور ہی میں ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''ایک آدھ دن کے لیے مجھے بھی اپنی کمپنی دے دو۔ اسی بہانے میں فلم اسٹوڈیو اور دیہاتی زندگی کو دیکھ لوں گی۔'' اس نے ذرا رک کر رواج ھاتے ہوئے کہا ''تم تو جانتے ہی ہو، ماموں کو فلموں اور فلم انڈسٹری سے کوئی لگاؤ یا دلچسپی نہیں اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی سے وہ اتنا وقت نہیں نکال سکتے کہ مجھے گاؤں دیہات گھماتے پھریں۔ ابھی تو میں اتفاق سے لاہور آئی ہوئی ہوں۔ پتا نہیں پھر کب گھر سے نکلنا ہو!''

اس کے بعد وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی "ویسے بھی بقول تمہارے میرے سر پر میڈیکل کا فائل منڈلا رہا ہے!"

اگر میں اس سے یہ کہتا کہ تمہارے ڈی ایس پی ماموں کے ایک اشارے پر درجن بھر افراد تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے دن رات ایک کر سکتے ہیں تو بحث کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا اور میں کھلے ہوئے دروازوں کو بند کرنے کے موڈ میں تھا۔ ڈنر میں چونکہ اچھا خاصا وقت باقی تھا اس لیے میں وقت گزاری کے لیے صرف صدف سے بات چیت کر رہا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اسے خود پر سوار کر لوں۔ صدف کے عزائم کچھ اسی نوعیت کے دکھائی دیتے تھے۔

میں نے کہا "دیکھو صدف! میں اس حوالے سے کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا۔ میں پہلے فرید پاشا سے پوچھ لوں پھر تمہیں بتاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ مفاہمانہ انداز میں بولی پھر پوچھا "فرید پاشا کی کوٹھی گلبرگ میں کس طرف ہے؟"

میں اس کے تیور بھانپ گیا اور کہا "کوٹھی کا پتا معلوم کرنے کے بعد تم وہاں کا فون نمبر جاننا چاہو گی اس لیے......"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اپنی جیب میں سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اسے کھول کر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "......نوٹ کر لو دونوں چیزیں۔ فرید پاشا کی کوٹھی کا ایڈریس اور فون نمبر۔ وہ ایک مشہور و معروف فلم پروڈیوسر ہے۔ تم پوچھتے پاچھتے بھی وہاں تک پہنچ سکتی ہو!"

وہ اس کاغذ پر ایک بھرپور گہری نظر ڈالنے کی بعد بولی "اس کی ضرورت نہیں۔ تم خود فرید پاشا سے بات کر کے مجھے فون نمبر بتا دینا۔ میں نے تمہیں ماموں کی کوٹھی کا فون نمبر صبح ہی لکھوا دیا تھا۔"

میں سمجھ گیا، وہ کاغذ کے مندرجات کو ذہن میں نقش کر چکی تھی۔ صرف مجھے مطمئن کرنے کے لیے بے اعتنائی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ میں اس کی چالوں کو سمجھنے لگا تھا۔

میں نے اسی کے انداز میں کہا "جیسے تمہاری مرضی!"

پھر نادیہ بھی وہیں چلی آئی اور ہمارے درمیان ریسٹورنٹ میں پیش آنے والے واقعے پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کہا "میں ایک دو فون کرنا چاہتا ہوں۔ کیا یہاں سے یہ ممکن ہے؟"

"کیوں نہیں۔" نادیہ جلدی سے بولی۔

پھر وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے آئی جو اپنی وضع قطع اور سیٹنگ کے اعتبار سے بیڈروم نظر آ رہا تھا۔ اس کے بیڈ سائیڈ پر رکھے ہوئے ایک انٹرکام ٹیلی فون سیٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اطمینان سے یہاں بیٹھ کر فون کر سکتے ہو۔ ضرورت محسوس کرو تو بیڈروم کا دروازہ بھی بند کر لو۔"

"تھینک یو۔" میں نے شائستگی سے کہا "تم جاتے ہو خود ہی دروازہ بند کر دو ورنہ تمہاری کزن کو اچانک کچھ آ گیا تو وہ وجیہہ نمبر کی بس پکڑ کر وجدان نام کے اسٹاپ جائے گی۔"

وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی "صدف کریزی ہے، ایک دم پاگل...... اور تم گریزی ہو، ایک محتاط!"

پھر وہ دروازہ بند کر کے بیڈروم سے نکل گئی۔ نادیہ نے ابھی جس ذہانت اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا اس کی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس نے اردو اور انگلش کو خوبصورتی سے ہم آہنگ کیا تھا۔ کریزی اور گریزی کا استعمال مجھے لطف دے گیا۔

نادیہ کی عمر بائیس تیئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا قد ساڑھے پانچ فٹ تھا۔ موزوں قامت اور متناسب نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا۔ اس پر بڑی بڑی آنکھیں اسے دلکش اور جاذب نظر بنانے کے لیے ہر وقت چہرے پر موجود تھیں۔ نادیہ کے دائیں گال پر، ہونٹوں سے تھوڑا اوپر مسور کے برابر گہرے بھورے رنگ کا ایک تل بھی تھا، مقناطیس سے کم پرکشش نہیں تھا۔

میں نے نادیہ کے بارے میں سوچتے ہوئے فرید پاشا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ گھر پر ہوگا۔ شوبزنس کے لوگ سر شام گھر سے نکل جاتے ہیں اور رات گئے تک ان کی واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض اوقات تو وہ دوسری صبح ہی لوٹتے ہیں۔ فلم اسٹوڈیو ایک ایسی نگری ہے جہاں کے دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں!

دوسری گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا گیا۔ میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد فرید پاشا کے بارے میں استفسار کیا تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ دوسری طرف فرید پاشا موجود تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے خوش دلی سے کہا۔

"یار! تم لوگ کراچی والے بڑا انتظار کرواتے ہو۔ منہاس نے صبح فون کر کے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا اور تم اب رابطہ کر رہے ہو۔ میں تو تمہاری خاطر آج اسٹوڈیو بھی نہیں گیا۔ گھر میں جما بیٹھا ہوں۔ منہاس نے تمہارا اتنا تعارف کچھ اس انداز سے کرایا ہے کہ تم سے ملنے اور

دیکھنے کو بے چین ہو گیا ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

فرید پاشا کے انداز اور لب و لہجے میں زندہ دلی اور دوستانہ پن پایا جاتا تھا۔ میں نے کہا "پاشا صاحب! اس انتظار اور کوفت کے لیے میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں، بس میں پے در پے ایسے مسائل میں الجھتا چلا گیا کہ آپ سے رابطہ کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔"

"اس معذرت وعذرت کی ضرورت نہیں یار۔" وہ بڑی محبت سے بولا "تم منہاس کے بھیجے ہوئے ہو اس لیے ہماری آنکھوں کے تارے ہو۔ سارے مسائل کو لپیٹو اور اپنے ساتھ لے کر فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں ان مسائل کو خود حل کر لوں گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "ٹھہرو! تمہیں اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے لیے گاڑی بھیج رہا ہوں۔ تم مجھے اپنا پتا بتاؤ۔"

میں نے کہا "میں اس وقت چائنا چوک، شادمان کالونی کی ایک کوٹھی میں ہوں۔" پھر میں نے کوٹھی کا نمبر دہراتے ہوئے کہا "یہاں ڈی ایس پی ٹریفک اورنگ زیب خان کی رہائش ہے مگر میں فوری طور پر آپ کے پاس نہیں آ سکتا۔"

"اس کی وجہ؟" وہ جلدی سے بولا "کیا وہاں بھی تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ وسئلہ ہے؟ چائنا چوک گلبرگ سے زیادہ دور نہیں۔ میں فوراً وہاں پہنچ سکتا ہوں۔"

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا "کوئی مسئلہ نہیں پاشا صاحب! میں اس وقت اپنے خیر خواہوں کے درمیان ہوں۔ بات اتنی سی ہے کہ میں میزبان کی خواہش پر ڈنر کے بعد یہاں سے رخصت ہو سکوں گا۔ لگ بھگ دس بجے رات۔"

"دس بجنے میں تو ابھی پورے دو گھنٹے باقی ہیں۔" فرید پاشا نے کہا "ٹھیک ہے، تم وہاں ضرور ڈنر کرو مگر تمہیں میرے ساتھ بھی ڈنر کرنا ہوگا، یہ بات ذہن میں رکھنا۔" پھر اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور بولا "تم درحقیقت میرے مہمان ہو۔ ڈی ایس پی صاحب تو تمہیں درمیان سے لے اڑے۔ میرے پاس صبح ہی سے تمہاری ایڈوانس بکنگ ہو چکی ہے۔"

وہ فلم انڈسٹری سے وابستہ ہونے کے ناتے سنیما انڈسٹری کی ٹرمز (Terms) بڑے فراٹے سے استعمال کر رہا تھا۔ زندہ دلانِ لاہور کے بارے میں، میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ میں نے بھی جواباً خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پاشا صاحب! میں اپنے معدے میں گنجائش رکھوں گا۔"

"شاباش!" اس نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا "میں ٹھیک دس بجے تمہیں لانے کے لیے گاڑی بھیج دوں گا۔"

فرید پاشا سے رابطہ ختم کرنے کے بعد میں نے منہاس باقر کے نمبر ڈائل کیے۔ حال احوال کے بعد میں نے اس سے جہانگیر کے بارے میں پوچھا "سی ایف کے کے ڈال سے ٹوٹا ہوا یہ پات آپ تک پہنچ گیا منہاس صاحب؟"

اس کے جواب نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا "نہیں وجدان! تا حال جہانگیر کی کوئی خبر نہیں۔"

"اس کا ایک ہی مطلب ہے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا "وہ شکار ہو گیا۔"

"میں تمہارے ہی انداز میں سوچ رہا ہوں۔" منہاس نے کہا "جہانگیر یا تو اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا یا پھر سی ایف کے والوں کے ہتھے چڑھ کر کسی عقوبت خانے میں پہنچ گیا ہے۔ فواد کی پراسرار روپوشی نے کوئی نہ کوئی رنگ تو دکھانا ہی تھا۔"

میں نے کہا "فی الحال جہانگیر کے قصے کو پس پشت ڈال کر ہم تازہ ترین صورتِ حال پر بات کرتے ہیں۔"

"کیا کوئی نئی بات ہو گئی؟" منہاس نے پوچھا "تم فرید پاشا کے پاس پہنچ گئے یا......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "میں آپ کے دوست کے پاس پہنچنے ہی والا ہوں اس سلسلے میں تو آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ اپنی تمام تر توجہ سی ایف کے اور شعیب غوری پر مرکوز کر دیں۔"

"یہ بات تو تم پہلے بھی کہہ چکے ہو اور میں نے اس سلسلے میں کوششیں شروع بھی کر دی ہیں۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا "مگر تمہاری آواز سے لگتا ہے، صورتِ حال نے اچانک کوئی نئی کروٹ لے لی ہے۔"

میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا "ایسی ہی بات ہے منہاس صاحب۔ دوپہر میں آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد شعیب غوری سے بھی میں نے رابطہ کیا تھا...... بلکہ یوں کہیں، شعیب نے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ اس نے مجھے ہوٹل فون کیا تھا۔ مذکورہ ہوٹل کی بکنگ اسی کے توسط سے ہوئی تھی اس لیے رابطہ کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ شعیب سے ہونے والی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ میری طرف سے نہ صرف محتاط ہو گیا ہے بلکہ فوری طور پر مجھے اپنے قابو میں بھی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے فوراً کراچی بلایا ہے۔"

پھر میں نے منہاس باقر کو شعیب غوری کی ان عجلت

پروازیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا جو میرے ٹکٹ اور ڈرائنگ کی بکنگ کے سلسلے میں اس کے کھاتے میں آ گئی تھیں پوری بات سننے کے بعد منہاس نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو وجدان۔ تم نے شعیب کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ وہ تمہاری طرف سے بری طرح ہراساں اور محتاط ہو گیا ہے اور اسی بوکھلاہٹ میں اس سے اس نوعیت کی سنگین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر حیرت آمیز لہجے میں بولا "اس نے تمہیں کراچی کیوں بلایا ہے؟"

"تاکہ مجھے ساحل سے ملوا سکے۔"

"مگر......" منہاس کچھ کہتے کہتے رکا پھر بولا "وجدان! تمہاری ساحل کو تو اغوا کے بعد تمہارے ایک دشمن دیرینہ چوہدری نوازش علی کے پاس پہنچایا جانے والا تھا جس کی بازیابی کے لیے تم نے کراچی سے لاہور تک کا سفر کیا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پھر شعیب غوری کی بات کیا معنی رکھتی ہے؟"

"جھانسا معنی!" میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ میری بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے بولا "او! وہ تمہیں دھوکے سے کراچی بلانا چاہتا ہے!"

"ہاں۔" میں نے کہا "تاکہ مجھے اپنی دوستی اور ہمدردی کی بھینٹ چڑھا سکے۔"

منہاس نے پوچھا "وہ تمہیں کب اور کہاں ساحل سے ملوانے والا ہے؟"

"اس نے مجھے ساؤتھ بلایا ہے۔" میں نے جواب دیا "اس کا کہنا ہے، ساحل کو کراچی میں دیکھا گیا ہے۔ میں جیسے ہی اس کے اڈے ساؤتھ پر پہنچوں گا، وہ ساحل کو مجھ تک پہنچا دے گا۔ میں جانتا ہوں، وہ اس گہری سازش کے ذریعے مجھ پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے لیکن میں اب اس کے دام میں آنے والا نہیں ہوں۔ ایک بار دھوکا کافی ہے۔ آزمائے ہوئے کو آزمانا حماقت کے زمرے میں آتا ہے اور میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اس کی فرمائش پر دوڑا دوڑا کراچی چلا آؤں۔"

"پھر تم نے کیا سوچا ہے؟" میری بات کے اختتام پر اس نے استفسار کیا۔

میں نے پرعزم لہجے میں کہا "میں اپنے مشن کی تکمیل سے پہلے ہرگز کراچی کا رخ نہیں کروں گا۔ اس وقت تک کراچی کے معاملات کو آپ ہی دیکھیں گے۔"

"مجھے فوری طور پر کیا کرنا ہوگا؟" وہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔

"میں آپ کو سی ایف کے کے ساؤتھ والے ٹھکانے کے بارے میں پوری تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ وہاں کا نظام شعیب کا اسسٹنٹ کبیر شاہ چلاتا ہے جسے "شاہ جی" بھی کہا جاتا ہے۔ میں نے ساؤتھ کی لوکیشن اور اس کی اندرونی مکانیت کے بارے میں بھی آپ کو بتایا تھا۔ جم براؤن کو گھیر کر کرنے والا پروجیکٹ ساؤتھ ہی کی زیر نگرانی تکمیل تک پہنچ جانے والا تھا جسے ہم نے...... بلکہ آپ نے اپنی حکمت سے ناکامیاب بنا دیا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ نہایت ہی رازداری سے ساؤتھ کی نگرانی کروائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو اس اڈے کے اندرونی حالات سے بھی باخبر ہونے کی کوشش کریں۔ مجھے پھانسنے کے لیے جو بھی جال بچھایا جا رہا ہے اس کا تعلق ساؤتھ اور کبیر شاہ سے ہے۔ آپ اپنے کرائم رپورٹر شہزاد علی کو اس کام کی نگرانی سونپ سکتے ہیں۔ وہ خاصا مستعد اور جواں ہمت بندہ ہے۔ مجھے امید ہے، کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔ میں دشمن کی چالوں کو اسی پر لوٹانے کا عادی ہوں۔ جب تک شعیب کو میں اپنا دوست سمجھتا تھا، اس کی طرف سے میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں لیکن اب میں چار آنکھوں سے اس کی واچ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے، وہ مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کسی نقلی ساحل کا سہارا لینے کی کوشش کرے گا!"

"نقلی ساحل!" منہاس باقر کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"وہ کسی اور لڑکی کو ساحل کے گیٹ اپ اور میک اپ میں سامنے لا سکتا ہے۔" میں نے کہا "وہ مجھے اپنے شکنجے میں کسنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے منہاس صاحب۔ اگر کسی نقلی ساحل کا چکر چلنے کا امکان ہوا تو ایسی لڑکی نگرانی کرنے والا کی نگاہ میں فوراً آ جائے گی۔ آپ نے ساحل کو دیکھ رکھا ہے شہزاد علی کو اس کے قد کاٹھ اور حلیے کی تفصیل بتائی جا سکتی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے شعیب کے بارے میں بات کرتے ہوئے کہا "تھوڑی دیر پہلے تک تو وہ یہی سمجھ رہا ہوگا کہ میں کراچی پہنچنے والا ہوں۔ عین ممکن ہے، ائرپورٹ پر بھی اس نے اپنے بندے لگا رکھے ہوں۔ جب میں فلائٹ سے کراچی نہیں پہنچوں گا تو وہ زیادہ شد و مد سے میری تلاش میں لگ جائے گا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

وہ مضبوط لہجے میں بولا "میں تمہاری بات اور اپنا فرض سمجھ رہا ہوں۔ تم کراچی کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر اپنے مشن پر دھیان دو۔ میں تمہیں بہت جلد سرخ رو ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ان شاء اللہ! آپ کی زبان مبارک ثابت ہوگی۔"

"میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔" وہ دل کی گہرائی سے بولا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "منہاس صاحب! آپ نے اپنے دوست فرید پاشا کو میرے بارے میں کیا پٹی پڑھا دی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے کا مشتاق ہو گیا ہے؟"

"وہ کچھ کہہ رہا تھا؟" منہاس نے سرسری انداز میں کہا۔

"ابھی تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ وہ شدت سے میرا انتظار کر رہا ہے۔" میں نے کہا "تھوڑی دیر پہلے اس سے فون پر میری بات ہوئی تھی۔ وہاں جاؤں گا تو اس کی بے تابی کی تفصیل معلوم ہوگی۔"

منہاس نے کہا "میں نے تمہاری صلاحیتوں کی تھوڑی تعریف اس سے کر دی تھی اور بس۔ یا پھر یہ کہا تھا کہ تم ایک بنے بنائے ہیرو ہو۔"

"مروا دیا منہاس صاحب!" بے ساختہ میرے ہونٹوں سے یہ جملہ ادا ہوا۔

اس نے کہا "فرید پاشا ایک کامیاب فلم پروڈیوسر ہے اور...... اور میں نے کوئی تمہاری جھوٹی تعریف بھی نہیں کی۔"

اب میں منہاس باقر کو کیا بتاتا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا چنداں...... شوق نہیں ہے۔ میں کسی اور ہی دنیا اور کسی اور ہی راہ کا مسافر ہوں۔ ہر مسافر کی کوئی منزل بھی ہوتی ہے لیکن میں تو ایک ایسا مسافر تھا کہ جس کی منزل کا تعین کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ہر منزل میرے لیے کسی نئی منزل کی تلاش کا پیغام لے کر آتی تھی!

چند ضروری باتوں کے بعد میں نے ٹیلی فونک رابطہ ختم کر دیا۔

☆☆☆

فلم پروڈیوسر فرید پاشا کی کوٹھی گلبرگ تھری میں واقع تھی۔ یہ ایک شاندار اور پوش علاقہ تھا۔ فرید پاشا نے حسب وعدہ ٹھیک دس بجے میرے لیے گاڑی بھیج دی تھی جس نے چند منٹ میں مجھے چائنا چوک سے گلبرگ پہنچا دیا۔

ڈی ایس پی اورنگ زیب نے میری شان میں بڑا بھرپور ڈنر دیا تھا۔ نہایت ہی کم وقت میں درجنوں ڈشوں کا بندوبست کر لیا گیا۔ میں نے تقریباً ہر ڈش کو چکھا مگر ہاتھ روک روک کر کیوں کہ فرید پاشا کی "دھمکی" میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ بھی دوبارہ ڈنر کرنا تھا۔ اورنگ زیب نے نیک خواہشات کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ اس موقع پر نادیہ کی آنکھوں میں تشکرانہ تاثرات تھے جب کہ صدف کے چہرے سے کسی خفیہ دھمکی کا اعلان ہو رہا تھا جیسے کہہ رہی ہو، چھوڑوں گی نہیں! میں نے مسکرا کر سب کو الوداع کہا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

فرید پاشا نے میرا پرتپاک استقبال کیا اور بیرونی گیٹ سے اپنے ساتھ کوٹھی کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ وہ دہری ازدواجی زندگی گزار رہا تھا یعنی اس نے دو شادیاں کر رکھی تھی۔ ایک شہری بیوی اس کے ساتھ کوٹھی میں رہتی تھی جب کہ پہلی بیوی کی رہائش گاؤں میں تھی۔ وہ دونوں بیویوں سے پوری طرح انصاف کرتا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہمارے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم ہو گئی۔ پاشا ایک زندہ دل اور مخلص انسان تھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی تاہم صحت کے اعتبار سے وہ تیس سے زیادہ کا نہیں لگ رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد نے اس کی شخصیت کے تاثر کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس نے میرے لیے ایک پرتکلف ڈنر کا انتظام کر لیا تھا۔ اس کی ڈائننگ ٹیبل خاصی طویل و عریض تھی۔

میں نے کہا "پاشا صاحب! میں تو بس آپ کا ساتھ دوں گا۔ کھانا تو آپ ہی کھائیں گے۔ میں وہاں بھی اچھا خاصا کھا کر آیا ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے یار۔" وہ خوش دلی سے بولا "وہاں کھا آئے ہو، یہاں بھی کھاؤ۔ شاید تمہیں پتا نہیں......"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور ایک پلیٹ میں میرے لیے کوئی خاص شے نکالنے لگا پھر بولا "اللہ نے انسانوں کے لیے جتنی نعمتیں پیدا کی ہیں، معدے میں اتنے ہی خانے بھی بنائے ہیں۔ ہر نعمت کے لیے ایک الگ خانہ موجود ہے اس لیے تھوڑا تھوڑا سب کچھ کھانا چاہیے۔ جو ڈشیں وہاں موجود نہیں تھیں، تم ان کے ساتھ یہاں انصاف کر سکتے ہو۔"

"آپ کا فلسفہ عجیب اور دلچسپ ہے پاشا صاحب۔" میں نے کہا۔

"اس فلسفے پر عمل کرنے سے یہ اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔" پاشا نے زور دیتے ہوئے کہا "آزمائش شرط ہے۔"

ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں کھانا چلتا رہا۔ پاشا کی شہری بیوی نائلہ بھی ہمارے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھی۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ نائلہ نہایت ہی حسین و جمیل اور طرح دار عورت تھی بلکہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی

شادی ہو چکی ہے، تو وہ ایک لڑکی ہی لگتی ہے۔ اس کے بارے میں بلامبالغہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک نئی بنائی ہیروئن ہے لیکن پاشا نے مجھے بتایا "نائلہ ایک مرتبہ بھی فلم کیمرا کے سامنے نہیں گئی، باقاعدہ شاٹس دینا تو دور کی بات ہے۔"

"پاشا صاحب! یہ تو زیادتی نہیں کیا؟" میں نے چھیڑنے کی خاطر کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں نے بڑی مشکل سے نائلہ کو حاصل کیا ہے۔ اب کیا اسے کیمرے کے حوالے کر دوں!" پھر وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "نہ بابا! نائلہ صرف اور صرف میرے لیے مخصوص ہے۔ اسٹوڈیو کے سیٹ پر جانے کے بعد ہیرو یا ہیروئن، کسی کام کا نہیں رہتا۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ نائلہ گھر کے سیٹ پر ہی سیٹ ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پایا ہے۔"

نائلہ کو حاصل کرنے والی بات کو اس نے دہرایا تھا، میں پوچھے بنا نہ رہ سکا "پاشا صاحب! آپ نے ان کو کہاں سے حاصل کیا ہے؟" بات ختم کرتے ہی میں نے کن انکھیوں سے نائلہ کی جانب دیکھا۔ وہ خاصی جز بز ہو رہی تھی۔ اس کیفیت میں اس کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔

"بہت لمبی اور سنسنی خیز داستان ہے۔" وہ خیال انگیز لہجے میں بولا "فرصت میں بیٹھ کر سناؤں گا یار۔ ایسے جلدی میں کیا خاک مزہ آئے گا۔"

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ نائلہ نے اس دور میں اس حد تک ہمارا ساتھ دیا کہ چائے کی پیالی خالی ہونے تک وہاں بیٹھی رہی۔ جیسے ہی اس نے پیالی میز پر رکھی، پاشا نے کہا۔

"نائلہ تم جا کر آرام کرو۔" پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "یار! آج صبح ہی سے اس کے سر میں درد ہے۔"

"کیا اس درد کی وجہ یہ تو نہیں کہ آج آپ گھر پر ہیں؟" میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔

میرے اس مذاق کو دونوں نے انجوائے کیا، خاص طور پر نائلہ کا چہرہ میری بات سنتے ہی مسکرا اٹھا تھا۔ جس سے پتا چلا، اس کا ذوق بھی اعلیٰ ہے۔

فرید پاشا مجھے ایک عالی شان بیڈ روم میں لے آیا۔ مذکورہ بیڈ روم کوٹھی کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں باہر کو کھلتی تھیں اور کوٹھی کا سامنے والا حصہ دور دور تک نظر آتا تھا۔ ڈارلنگ بھی میرے ساتھ بالائی منزل پر پہنچ گئی تھی۔

"تم اس بیڈ روم میں آرام کرو گے۔" فرید پاشا نے کہا "کل تمہیں پوری کوٹھی کا معائنہ کراؤں گا۔ میں نے یہ کوٹھی بڑے چاؤ سے بنوائی ہے۔ اس کی تکمیل میں کروڑوں روپے اور ایک سال کا عرصہ خرچ ہوا ہے۔"

وہ میرے پاس ایک گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا "یار! یہ باتیں تو چلتی رہیں گی۔" اس نے کہا "تم مجھے اپنے مشن کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ تاکہ میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو۔"

"آپ کے ذہنی بوجھ کا تعلق میرے مشن سے ہے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا "ہاں یار! منہاس نے تمہارے بارے میں مجھے اتنی تاکیدیں کی ہیں کہ میں ذہن پر دباؤ محسوس کر رہا ہوں۔ جب تک میں تمہارے کام نہیں آ جاؤں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ منہاس باقر نے مجھے بہت کم کام کہے ہوں گے..... اور اتنی تاکید پہلے کبھی نہیں کی۔ لگتا ہے، تم کسی خاص الخاص مشن پر ہو!"

"آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے پاشا صاحب!" میں نے کہا "میرا مشن واقعی بہت خاص ہے۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا تو سمجھ لوں گا، میں نے زندگی میں سب کچھ پا لیا۔" ساحل کے تصور نے میری آواز کو خاصا رنجیدہ کر دیا۔

فرید پاشا ایک مردم شناس شخص تھا، میرے چہرے کے تاثرات اور آواز کے بوجھل پن سے اس نے بھانپ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، راز دارانہ لہجے میں بولا۔

"مجھے تو کوئی دل کا معاملہ معلوم ہوتا ہے؟"

"ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں فرید پاشا مجھے اپنا اپنا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پل بھر میں دل میں اتر جاتے ہیں۔ پاشا کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ منہاس کا گہرا دوست تھا اور منہاس سے ساحل والے واقعے اور معاملے سے پوری طرح آگاہ تھا اس لیے فرید پاشا سے کوئی بات چھپانا مناسب نہیں تھا۔ وہ اس مشن میں میرا معاون بھی بننے والا تھا اس کے استفسار پر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے چوہدری نوازش علی سے اپنی دشمنی اور ساحل سے گہری وابستگی کے بارے میں بتایا اور یہ کہ ساحل کو کراچی سے اغوا کر کے نوازش علی کے پاس رکھاں والی پہنچا دیا گیا ہے۔ میں نے اسے حاصل کرنے کے لیے ہی ادھر کا رخ کیا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ شعیب غوری کا تذکرہ میں نے دانستہ گول کر دیا تھا۔

پوری بات توجہ سے سننے کے بعد اس نے کہا "میں چوہدری نوازش علی اور رکھاں والی سے بخوبی واقف ہوں وجدان۔ میرا گاؤں رکھاں والی سے صرف پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے بلکہ یوں سمجھو کہ اگر لاہور سے جائیں تو ہمارے گاؤں سید پور سے گزر کر رکھاں والی جانا پڑتا ہے۔ ہمارا گاؤں راستے میں پڑتا ہے۔"

پھر اس نے مجھے چوہدری نوازش علی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ چوہدری نوازش سے ان لوگوں کی ہلکی پھلکی دشمنی چلتی رہتی تھی۔ فرید پاشا کا باپ پرانا سیاست داں تھا اور چوہدری نوازش کا پس منظر بھی سیاسی تھا۔ وہ دونوں آپس میں حریف بھی تھے کیوں کہ وہ دو مختلف سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔

"یار! تم مجھے صرف ایک دن کی مہلت دے دو۔" فرید پاشا دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا "میں کل شام سے پہلے پہلے تمہاری تمام مطلوبہ اور تازہ ترین معلومات حاصل کر لیتا ہوں۔ پہلے پتا لگایا جائے کہ تمہاری ساتھی رکھاں والی پہنچی بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ چوہدری نوازش کی حویلی میں پہنچ چکی ہے تو پھر باقاعدہ پلاننگ کر کے اسے وہاں سے نکالنا ہوگا۔ جلد بازی میں اٹھایا ہوا کوئی قدم ہمارے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔" وہ تھوڑی دیر رک کر بولا "اور تمہاری ساحل کے لیے بھی!"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ساحل کے معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔" میں نے دل کی گہرائی سے کہا۔ "وہ میرے لیے بہت قیمتی ہے، میری جان سے بھی زیادہ۔"

وہ پرسوچ انداز میں بولا "میں ابھی نوید کو فون کرتا ہوں۔ نوید پاشا میرا چھوٹا بھائی ہے اور آئندہ الیکشن میں کھڑا ہونے والا ہے۔ سیاست میں رہتے ہوئے آنکھیں، کان اور زبان تینوں کو کھلا رکھنا پڑتا ہے۔ مجھے تو اس شعبے سے زیادہ دلچسپی نہیں مگر نوید ابا جی کا سچا جانشین ثابت ہو رہا ہے۔ اس نے بہت ہی کم عرصے میں بہت زیادہ سیاسی ترقی کر لی ہے اسی لیے ابا جی اب پس پردہ رہ کر نوید کے ذریعے چوہدری نوازش علی کو پیٹنا چاہتے ہیں۔ اس وقت چوہدری نوازش علی کی پارٹی کی گورنمنٹ ہے یعنی ان کی پارٹی کی حکومت ہے لیکن عوام میں سیاسی بیداری بڑھ رہی ہے اور ہوا کا رخ تبدیل ہو چکا ہے۔ انشا اللہ آنے والے الیکشن میں چوہدری کو ہار کا منہ دیکھنا

کیا
آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کی شخصیت کی اہمیت کو تسلیم کریں؟
آپ لوگوں سے اپنے احکامات کی تعمیل کروانا چاہتے ہیں؟
ہر انسان میں ایک مقناطیسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس قوت سے کام لینے کیلئے ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم کی طرح مشقیں نہیں کرنا پڑتیں۔
جدید اور سائنٹیفک اصولوں پر مبنی حیرت انگیز کتاب
مقناطیسیت
آپ کی شخصیت میں انوکھا نکھار پیدا کر دیگی
آپ خود میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کرینگے
اس کتاب کا مطالعہ کیجئے
اور اپنے وجود کو ایک بہتر ذات بنا لیجئے!
قیمت 50 روپے ڈاک خرچ 23 روپے
خط و کتابت کا پتہ
C-63 نمبر 11 ایس مینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ
(اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے) کراچی 75500

پڑے گا۔ نویدا سے بری طرح شکست دے گا۔"

مجھے سیاست یا سیاست دانوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے لیے خوشی کی بات صرف اتنی ہی تھی کہ میں چوہدری نوازش علی کے مخالف دھڑے سے آملا تھا جو پہلے ہی اس کی طرف سے بہت سا ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اب مجھے چوہدری کا قرض ادا کرتے ہوئے بہت لطف آتا۔ دو قرض دار ایک قرض خواہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے والے تھے۔

فرید پاشا کہہ رہا تھا "میں کل کا دن نوید کو تفتیش و تحقیق کے لیے دے دیتا ہوں۔ مجھے امید ہے وہ تمہاری ساتھی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لے گا۔ ہمارے کچھ خاص آدمی رکھاں والی میں موجود ہیں، جیسا کہ دنیا کی ہر سیاست میں ہوتا ہے، مخالف کیمپ میں اپنے بندے چھوڑنا پڑتے ہیں تاکہ وہ وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہیں، جیسے ہی نوید کو یہ کنفرم ہوا کہ ساحل چوہدری نوازش علی کی حویلی میں موجود ہے، وہ سیدھا یہاں چلا آئے گا پھر تم اس کے ساتھ "رکھاں والی مشن" پر روانہ ہو جانا۔ سید پور میں ہماری بہت بڑی حویلی ہے۔ تم وہاں رہتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر لینا۔ نوید تمہارے مشن کے لیے بہت ہی مفید اور معاون ثابت ہو گا۔" وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہو کر میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا "یا اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور آئیڈیا ہو تو بتاؤ۔ اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔"

"فی الحال آپ کی تجویز پر عمل کرنا زیادہ موزوں نظر آ رہا ہے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا "میں بہت سوچ سمجھ کر چوہدری نوازش علی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے جوش و جذبات میں کوئی قدم اٹھانا ہوتا تو میں لاہور کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی سیدھا رکھاں والی پہنچ جاتا اور چوہدری کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ چوہدری سے میری دشمنی کوئی سال چھ مہینے سے نہیں ہے، یہ برسوں کا قصہ ہے اور اس دوران میں ہم نے ایک دوسرے کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ہم دونوں پول میچ، کوارٹر فائنل اور سیمی فائنل کھیل چکے ہیں۔ اب فائنل کا مرحلہ ہے۔ میں اس فائنل راؤنڈ کو بہت سوچ سمجھ کر کھیلنا چاہتا ہوں اور اس طرح کھیلنا چاہتا ہوں کہ یہ میچ ایک یادگار کی حیثیت حاصل کر لے۔ ہارنے والا اپنے زخم چاٹ کر اسے یاد رکھے اور جیتنے والا شادیانے بجا کر اس کی یاد کو تازہ کرے۔"

"انشاء اللہ! ایسا ہی ہو گا۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا "اب تم آرام کرو، کل ملاقات ہو گی۔ میں تمہارے چہرے اور آنکھوں میں تھکن کو واضح طور پر محسوس کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے تم نے ایک خطرناک جماہی بھی لی تھی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "گزشتہ دو روز سے مجھے آرام کا موقع نہیں ملا اور اچھی خاصی نیند بھی جمع ہو چکی ہے پھر آج کے ڈبل ڈنر نے نیند کے خمار میں بے پناہ اضافہ کر دیا ہے۔ میں صبح تک سکون سے سونا چاہتا ہوں۔"

"یہاں تمہیں سکون ہی سکون ملے گا۔ وجدان!" وہ دوستانہ انداز میں بولا "منہاس جب بھی لاہور آتا ہے تو میرے پاس ہی ٹھہرتا ہے...... اسی بیڈروم میں اس کا قیام ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "ایک بات تو بتائیں پاشا صاحب! آپ کو میں نے انتہائی زندہ دل اور خوش مزاج پایا ہے، بات بات پر ہنسنے مسکرانے اور قہقہہ اچھالنے والا جب کہ منہاس باقر ایک سنجیدہ اور کسی حد تک خشک مزاج شخص ہے۔ آپ دونوں کی دوستی کس طرح قائم ہے؟ دوستی کے لیے بنیادی شرط ہم مزاج اور ہم خیال ہونا ضروری ہے۔"

"میں تمہاری آدھی بات سے اتفاق کروں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا "یعنی دوستی کے لیے ہم خیال ہونا ہی کافی ہے اور جہاں تک منہاس کے مزاج کا تعلق ہے تو وہ دہری شخصیت بلکہ دہرے مزاج کا بندہ ہے۔ وہ عام طور پر جیسا خشک اور ٹو دی پوائنٹ نظر آتا ہے، بے تکلف دوستوں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ مجھ سے وہ میرے ہی انداز میں ملتا ہے۔"

پاشا کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ منہاس کو ابتدائی ملاقاتوں میں، میں نے جیسا پایا تھا، اب اس میں خاصا فرق آ گیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ اب ہمارے درمیان بے تکلفی کی فضا قائم ہو چکی تھی۔ یہود اور یہودیت کے خلاف سرگرمیوں نے ہمیں بہت قریب کر دیا تھا۔

فرید پاشا نے ڈارلنگ کی جانب اشارہ کیا اور کہا "تمہاری اس لاڈلی کے لیے مجھے شب بسری کا علیحدہ بندوبست کرنا ہو گا یا......؟"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "ڈارلنگ میرے ساتھ اسی بیڈروم میں رات گزارے گی۔ کوئی بھی شخص اپنی ڈارلنگ کو خود سے جدا کرنا پسند نہیں کرتا۔ آپ اس کے لیے فکرمند نہ ہوں۔ یہ ہر معاملے میں "فرینڈ" ہے۔ اس نے کبھی میرے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔"

اس نے بڑی محبت سے ڈارلنگ کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا "تمہاری ڈارلنگ تمہیں مبارک ہو۔ میں تو اپنی ڈارلنگ کے پاس جا رہا ہوں۔ شب بخیر!"

"گڈ نائٹ!" میں نے کہا۔ وہ بیڈروم سے رخصت ہو گیا۔

فرید پاشا کے جاتے ہی ڈارلنگ میرے پاس آ گئی۔ میں نے اسے پیار کیا اور گھوم پھر کر بیڈروم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ خاصا کشادہ بیڈروم تھا۔ میں نے وہاں موجود ہر شے کو تنقیدی اور تفتیشی نظر سے دیکھا اور مطمئن ہونے کے بعد دروازہ بند کر کے واش روم میں گھس گیا۔ پندرہ منٹ میں، میں لباس تبدیل کر کے فریش اپ ہو چکا تھا۔ اس وقت دیوار گیر کلاک اور میری رسٹ واچ میں سوا ایک بجے تھے یعنی نئے دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں بیڈ پر دراز ہوا تو ڈارلنگ میرے پہلو میں آ کر لیٹ گئی۔

میں نے اپنے ہاتھوں کے گنگنے لمس کو اس کے وجود میں اتارنا شروع کیا۔ وہ کسی دلنشین محبوبہ کی مانند مست ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور دھیرے دھیرے اپنے منہ کو میری پسلی پر مساج کے انداز میں رگڑ رہی تھی۔ میں نے سرگوشیانہ لہجے میں اسے پکارا "ڈارلنگ!"

اس کی بند آنکھوں کے پیچھے سے جواب آیا "میاؤں!"

"تم میری ڈارلنگ ہو نا!"

"میاؤں۔"

"ڈارلنگ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ کھلتی نہیں۔" میں نے بدستور اس کے بدن پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "لیکن میں کسی بند شے کے ساتھ بہت بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ تم جب سے میری زندگی میں آئی ہو، مجھے تم نے قدم قدم پر حیران کیا ہے۔ یہ مسلسل حیرانی مجھے الجھا رہی ہے، مجھے پریشان کر رہی ہے۔ میں تمہاری حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔ تمہیں کھولنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے، تم کوئی عام بلی نہیں ہو۔ میں تمہارے اسرار کو پانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے یہ موقع بہترین ہے۔ میں آج رات تمہارے اندر اتر کر سب کچھ جان لوں گا...... سب کچھ!"

اس نے شدت سے میرے پہلو میں اپنا منہ رگڑا پھر آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور اپنی مخصوص آواز میں بولی "میاؤں!"

اس کی آواز تو وہی تھی تاہم میں نے اس کی کھلی آنکھوں میں تبدیل شدہ تاثر واضح طور پر نوٹ کیا۔ اس "میاؤں" میں "نہ" کی کیفیت پائی جاتی تھی، گویا وہ کھلنے پر آمادہ نہیں تھی۔ میں نے اس کے وجود میں اضطراب سا محسوس کیا۔ میں بھی اس وقت ضد پر اتر آیا تھا۔ ایسی تنہائی، سکون اور فرصت جانے پھر کب میسر آتی!

"میں کھولوں گا، تمہیں ضرور کھولوں گا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بڑی شدت سے "میاؤں میاؤں" کرتے ہوئے اپنے چہرہ میرے پہلو میں رگڑنے لگی لیکن مجھ پر ایسی ضد سوار ہوئی تھی کہ میں نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ التجائیں کرتی رہ گئی۔ وہ زبان سے انسانوں کی طرح الفاظ تو ادا نہیں کر سکتی تھی تاہم میں اس کے اعضا کی حرکات و سکنات کو اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وہ اس وقت سراپا احتجاج بنی ہوئی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے اپنے سامنے قالین پوش فرش پر رکھ دیا۔ اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے وہاں سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میں نے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں اس کے ارادے کو بھانپ لیا پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتی، میری آنکھیں اس کی آنکھوں سے چپک گئیں۔

ہم دونوں ساکت نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور ایک دوسرے کو اپنے ٹرانس میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چند سیکنڈ تک ہمارے درمیان نظربازی اور تسخیر کا یہ مقابلہ برابر رہا پھر میں اس پر حاوی آنے لگا۔ اس وقت میں پورے ارتکاز کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھا۔ "چی" کی قوت نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں ڈارلنگ کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے، اپنے ذہن میں اس کے لیے سجیشنز (ترغیبات) بھی تخلیق کرنے لگا۔ یہ سارا کھیل ہی خیالات اور ترغیبات کا ہے۔ اگر خیالات توانا اور ترغیبات مضبوط ہوں تو تسخیر چٹکیوں کا عمل بن کر رہ جاتا ہے، میری

مشہور مصنفین کی مشہور کتابیں
بزرگان دین کے ایمان افروز واقعات
روشنی کے مینار
قیمت
-/150 روپے
ڈاک خرچ
-/25 روپے
مصنف: ضیاء تسنیم بلگرامی
کتابیات پبلی کیشنز پوسٹ بکس 23 کراچی نمبر 1

Suggestions (ترغیبات) کام دکھا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں تخلیق پانے والے خیالات کی لہریں ڈارلنگ کے دماغ پر اثر انداز ہونے لگیں۔ میں نے خاموشی کی زبان میں سوچا۔

"تمہاری آنکھیں بوجھل ہو رہی ہیں...... تمہیں نیند آ رہی ہے۔"

عام ہپناٹزم میں آواز کی بڑی اہمیت ہے۔ سجیشن آواز کی محتاج ہوتی ہے مگر اس وقت ڈارلنگ ایک مخصوص قسم کے ہپناٹزم کے تجربے سے گزر رہی تھی جس میں سجیشن کے لیے آواز کی ضرورت نہیں تھی، صرف سوچنا ہی کافی تھا۔ "چی" بہ زبان خامشی اپنا کام کر رہی تھی اور بہت خوب کر رہی تھی!

میں نے ترغیبات کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج اس اسرار سے پردہ اٹھ جانا چاہیے تھا جو سایہ بن کر میرے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کوئی بچہ آپ کی انگلی پکڑ کر چلتا رہے اور آپ یہ نہ جانتے ہوں...... وہ بچہ کس کا بچہ ہے؟ تو عجیب سی بے سکونی دماغ کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ ڈارلنگ کے حوالے سے میں اپنے دماغ کو ہر حصار سے نکالنا چاہتا تھا۔

وہ یک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری طرح اس کا وجود بھی ایک دم ساکت تھا۔ ہمارے جسموں کے اندر دل دھڑک رہے تھے یا پھر بیڈروم میں ہمارے سانس لینے کی مخصوص آواز پیدا ہو رہی تھی، باقی ہر طرف سکون ہی سکون اور خاموشی ہی خاموشی تھی۔

"نیند نے تمہاری آنکھوں کو ہلکان زدہ اور تمہارے پپوٹوں کو بوجھل بنا دیا ہے۔" میں خاموشی کی زبان میں پورے اعتماد سے سوچ رہا تھا۔ میرے چٹانی خیالات کی لہروں (Thought Waves) کو "چی" کی قوت نے مہمیز کیا اور ڈارلنگ کی آنکھوں میں، میں نے سرخ ڈورے نمودار ہوتے دیکھے۔

پچھلے چند روز سے میں یوگا کی پریکٹس کے ساتھ ساتھ چی کی ایڈوانس مشقیں بھی کر رہا تھا جس سے میری باطنی قوتوں اور حواس میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ ان تجربات کا احساس بڑا نیا، انوکھا اور نرالا تھا۔

ڈارلنگ کی آنکھوں میں نمودار ہونے والے سرخ ڈورے بھیگنے لگے، گویا اس کی آنکھوں میں پانی اترنے لگا تھا۔ میں نے ترغیبات میں شدت پیدا کرتے ہوئے سوچا۔

"ان بوجھل آنکھوں اور بھاری پپوٹوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔"

ڈارلنگ کی پلکیں بے اختیار جھپک گئیں۔

"اور وہ علاج ہے...... نیند۔ گہری نیند!" میں نے کوشش جاری رکھتے ہوئے سوچا "تمہیں اپنی تکلیف اور درد سے نجات پانے کے لیے سونا ہوگا...... گہری نیند سونا ہوگا اور تم سونے جا رہی ہو۔" اس کی پلکیں دوبارہ جھپکیں اور اس نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں "...... تم سو رہی ہو...... تمہاری نیند گہری ہو رہی ہے اور گہری...... اور گہری...... سمندر سے بھی زیادہ گہری...... گہری گہری...... اور گہری......"

میں نے نتیجہ خیز نظر سے ڈارلنگ کا جائزہ لیا۔ وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کا نگاہی رابطہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کی ترغیبات اس کے دماغ نے براہ راست میرے دماغ میں وصول کی تھیں۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈارلنگ کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ دیکھنے میں وہ بے جان نظر آئی۔ اس کی سانس اتنی مدھم چل رہی تھی کہ میں نے بڑی مشکل سے اس کی زندگی کا سراغ لگایا۔ اسے زندہ پا کر مجھے خوشی ہوئی۔ یہ خوشی اس بات کی تھی کہ اس کا اسرار مجھ پر عیاں ہونے میں اب چند لمحات کی دیر تھی۔

میں نے بے سدھ ڈارلنگ کو بڑی حفاظت سے اٹھایا اور لے جا کر ایک میز پر رکھ دیا پھر بہ آہستگی ایک کرسی کھینچ کر میز سے اس سے تین فٹ کی دوری پر بیٹھ گیا۔ مجھے "چی" کی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے اسرار کے بند کھولنا تھے۔ "چی" کی قوت سے کام لینے کا یہی فائدہ ہے کہ ذہنی رابطہ منقطع ہونے کے بعد دوبارہ قائم کیا جا سکتا ہے چاہے آپ کا معمول ہوش میں ہو یا بے ہوش۔

میں نے ایک طویل سانس کھینچ کر پھیپھڑوں کو تازہ ہوا سے بھرا، چی کو جسم کے زیریں حصے میں مرتکز کیا اور نظر ڈارلنگ کے ساکت جسم پر گاڑ دی۔

اسی وقت میری سماعت سے ایک دلخراش چیخ ٹکرائی اور میرے ارتکاز کو پاش پاش کر گئی۔ وہ ایک نسوانی چیخ تھی اور کوٹھی کی زیریں منزل سے ابھری تھی۔

میرے اعصاب تن گئے۔ ڈارلنگ پر سے میری توجہ ہٹ گئی۔ زیریں منزل پر صرف ایک عورت تھی، فرید پاشا کی بیوی نائلہ۔ یکبارگی میرا ذہن وسوسوں سے بھر گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ دی۔ وہ کسی فوری فیصلے کا وقت تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی عملی قدم اٹھاتا، کوٹھی کا زیریں حصہ سماعت شکن فائرنگ سے گونج اٹھا!

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں بیڈروم سے نکل آیا۔ بالائی اور زیریں منازل کے درمیان ایک خوبصورت اور طرح دار زینہ حائل تھا، یہی زینہ انہیں آپس میں ملانے کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ میں تیز قدموں سے اس زینے کو پاٹنے لگا۔ سوچنے، سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ جو بھی قدم اٹھانا تھا، فی الفور اور آن واحد میں اٹھانے کی ضرورت تھی۔ وہ دل خراش نسوانی چیخ نائلہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ نائلہ کے سوا اس کوٹھی میں اور کوئی عورت موجود نہیں تھی۔ برسٹ فائر کی سماعت شکن آواز سے میں نے اندازہ لگا لیا، نیچے کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔

دو دو اسٹیپس پھلانگ کر میں چند سیکنڈ میں زیریں منزل پر پہنچ گیا۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہونے سے قبل بے ساختہ میری نگاہ مین گیٹ کی جانب اٹھ گئی۔ گیٹ کے ساتھ ہی سیکورٹی گارڈ کا کمرا بنا ہوا تھا۔ کمرا اپنی جگہ موجود تھا مگر سیکورٹی گارڈ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ گارڈ فائرنگ کی آواز سن کر صورت حال جاننے کے لیے کوٹھی کے اندر پہنچا ہوگا۔ میں نے بھی ادھر ہی کا رخ کیا۔

اسی لمحے اندرونی حصے میں کچھ اس قسم کی آوازیں ابھریں جیسے اندر اٹھا پٹخ کی جا رہی ہو۔ میں نے جست بھر کر ایک دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دروازہ دھماکے کی آواز پیدا کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے کھل گیا۔

کھلے ہوئے دروازے میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ان کی حرکات و سکنات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ انسان ہیں ورنہ اپنی حالت سے وہ کالی بلائیں نظر آتے تھے۔ دونوں نے سیاہ چست لباس پہن رکھے تھے جو ان کے اجسام پر چپک کر رہ گئے تھے اور لباس سر تا پا تھے۔ یوں لگتا تھا، کپڑے کو ان کے بدن پر رکھ کر سلائی کی گئی ہو، صرف آنکھوں کے سامنے سے دیکھنے کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی ورنہ بدن کا کوئی حصہ کھلا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ماضی کی ایک انگلش فلم "گولڈ مین" میں فلم کے ہیرو ڈینجر ڈیبولک نے اسی قسم کا چست سیاہ لباس زیب تن کر کے بیش قیمت نگینوں سے مرصع ایک تاریخی نیکلس کو چرایا تھا۔

دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا لہٰذا مجھے چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ دونوں کالی آندھی کے مانند اندر سے برآمد ہوئے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان میں سے ایک ٹھٹکا۔ دوسرے کی گردن جھکی ہوئی تھی اور اس جھکاؤ کا سبب اس کے کندھے پر لدا ہوا ایک بوجھ تھا۔ وہ بوجھ ایک بیڈشیٹ میں لپٹا ہوا تھا اور پہلی ہی نگاہ میں اپنی حقیقت کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک انسانی جسم تھا جسے بیڈشیٹ میں لپیٹ کر وہاں سے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا۔ کندھے پر لدے ہوئے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی جس کا مطلب تھا، وہ بے ہوش ہے!

میرے ذہن میں جو پہلا خیال چمکا وہ یہی تھا کہ فرید پاشا کی خوب رُو بیوی نائلہ کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ اس کوٹھی میں فرید پاشا اور نائلہ کے علاوہ صرف سیکورٹی گارڈ تھا۔ میں نے چادر میں لپٹے ہوئے جسم کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ کوئی عورت ہی ہو سکتی تھی۔

یہ تمام خیالات اور اندازے بڑی سرعت سے پایۂ تکمیل کو پہنچے تھے اور اغوا والے خیال نے جیسے میرے ہاتھ پاؤں کو 'آن' کر دیا۔ نگاہ ملنے پر ٹھٹکنے والے شخص کو میں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ میری رائٹ فرنٹ پش کک چلی۔ میرے پاؤں کے تلوے نے مذکورہ سیاہ لباس شخص کے سینے پر بوسہ دیا۔ وہ پیچھے کو الٹ کر دوسرے شخص سے ٹکرایا۔

اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس شخص کے کندھے پر لدی ہوئی نائلہ (متوقع) ہوا میں اچھلی اور چادر میں لپٹے لپٹے کسی بوری کی مانند دھپ سے زمین پر جا گری۔ پختہ فرش سے تصادم پر چادر کے اندر سے ایک نسوانی کراہ بلند ہوئی اور پوشیدہ جسم میں کچھ حرکت دیکھنے میں آئی۔ اگر اس چادر کے اندر نائلہ تھی تو خدا کا شکر ہے، وہ تا حال زندہ تھی۔

اس دوران میں وہ دونوں چھلاوے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور بڑی خوفناک نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کی آنکھوں میں مجھے شناسائی کی جھلک دکھائی دی۔ مجھے ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے وہ آنکھیں ماضی قریب میں کہیں دیکھی ہوں۔ یہ وہی شخص تھا جس سے دروازہ کھلنے کے بعد میری آنکھیں چار ہوئی تھیں اور وہ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور صحت مند شخص تھا۔

اچانک وہ دونوں بہ یک وقت مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ دراز قامت 'اجنبی شناسا' نے مجھ پر راؤنڈ ہاؤس چلائی، دوسرا عقب سے مجھ پر پل پڑا۔ میں نے جس اثنا میں راؤنڈ ہاؤس کو بلاک کیا، دوسرے کی سائیڈ کک میری پسلیوں سے ٹکرا چکی تھی۔ میں تھوڑا سا لڑکھڑایا تو عقب میں موجود شخص نے مجھے اٹھا کر پٹخنے کی کوشش کی۔

میں نے، گرفت میں لینے کے لیے آگے بڑھے ہوئے اس کے بازوؤں کو ایک زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دراز قامت کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ وہ

دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ اسی وقت دراز قامت نے جانے اپنے لباس کے کون سے حصے میں ہاتھ ڈالا، اگلے لمحے مجھے اس کے ہاتھ میں ایک خطرناک پسٹل نظر آیا۔ اسی دوران میں دوسرا دوبارہ چادر میں لپٹی ہوئی نائلہ کی جانب پیش قدمی کر چکا تھا۔ پستول بردار نے اسے اشارہ کیا کہ وہ نائلہ کو پہلی فرصت میں کندھے پر ڈال کر وہاں سے نکل جائے۔

میں سمجھ گیا، وہ ہر صورت میں نائلہ کو وہاں سے لے کر جانا چاہتے تھے۔ اگر میں انہیں روکنے کی کوشش کرتا تو مارنے مرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ میں نے پسٹل کو دیکھ کر یوں ظاہر کیا جیسے میں ڈر گیا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پسپائی کے انداز میں ایک قدم اٹھایا۔ پستول بردار سمجھا، میں وہاں سے فرار ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہوں لیکن میری وہ حرکت محض ایک جھانسا تھی۔ وہ میرے جھانسے میں آ گیا۔

مجھ پر سے نگاہ ہٹا کر وہ اپنے ساتھی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کی یہ توجہ لمحے بھر کی تھی اور میرے لیے وہ لمحہ صدیوں کے برابر تھا۔ میں نے مہیا اس لمحے کے دسویں حصے میں حرکت کی۔ میرا جسم ہوا میں بلند ہوا۔ یہ ایک ہائی جمپ تھی۔ پستول بردار دراز قامت شخص مجھ سے پانچ فٹ کی دوری پر تھا۔ ہوا میں بلند ہوتے ہی میں نے ایک زوردار سائیڈ فلائنگ کک اس کے پسٹل والے ہاتھ پر رسید کی۔ پسٹل اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔ پسٹل نے جس سمت پرواز کی، ادھر اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ اس لیے اس کی لوکیشن کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

سائیڈ فلائنگ کک کھانے والے دراز قامت شخص نے ردِعمل کے طور پر پسٹل کی جانب دوڑ لگا دی مگر میں اب اسے کوئی مہلت یا سہولت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے دوڑتے ہوئے قدموں پر میں نے بڑی سرعت سے ایک بیک سوئپ ماری۔ نتیجے کے طور پر وہ منہ کے بل پختہ فرش پر گرا۔ اس کے حلق سے ایک دردانگیز آواز خارج ہوئی۔

میں نے زمین سے کھڑا ہوتے ہی دراز قامت کے ساتھی کی مزاج پرسی کی۔ وہ اس وقت تک متوقع نائلہ کو دوبارہ اپنے کندھے پر ڈال چکا تھا۔ چادر کے اندر لپٹی ہوئی نائلہ نے احتجاجی انداز میں ہاتھ پاؤں کو حرکت بھی دی تھی۔ یہ ایک خوش آئند علامت تھی۔ نائلہ کی زندگی کے آثار مضبوط اور یقینی ہوتے جا رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص اپنے عقب میں میری موجودگی سے آگاہ ہوتا، میں نے جن جپھا ڈال دیا۔ وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں میری گرفت سے نکلنے کے لیے زور مارنے لگا۔ اس زور آزمائی میں، چادر میں لپٹی ہوئی نائلہ پر سے اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے اسے دائیں بائیں اس طرح جھکولے دیے جیسے کسی تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں اپنی اس چال میں کامیاب رہا۔ نائلہ کا لپٹا ہوا بدن اس کے ہاتھوں سے آزاد ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نائلہ کو تھامتے ہوئے اس شخص کی 'تشریف' پر ایک تھرسٹ (Thrust) کک رسید کر دی۔

وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کی مانند ناک کی سیدھ میں 'روانہ' ہو گیا۔ چادر میں لپٹا ہوا بدن میرے بازوؤں میں آیا تو اس کے خال و خط نے تصدیق کر دی، وہ نائلہ ہی تھی۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے اس کے چہرے سے چادر کھینچ کر دیکھا اور اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی کہ وہ خبیث کالی بلائیں نائلہ کو اغوا کر کے لے جا رہی تھیں۔

میں نائلہ کو بہ آہستگی فرش پر رکھنے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے سیدھا ہوا ہی تھا کہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی۔ پہلے میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ دونوں وہاں سے فرار ہونے کی کوشش میں تھے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنا خیال رد کرنا پڑا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز کا رخ کوٹھی کے بیرونی حصے سے ہماری جانب تھا۔ اگلے ہی لمحے میری نگاہ میں ایک کالی بلا کا اضافہ ہو گیا۔ نووارد انہی کا ساتھی تھا۔ اس نے بھی بالکل انہی جیسا لباس پہن رکھا تھا۔ اندھیرے میں اس کی دھیمی مگر خونخوار آواز ابھری۔ وہ اپنے ساتھیوں سے استفسار کر رہا تھا۔

''اتنی دیر کیوں ہو گئی۔ تم لوگ ابھی تک......'' اچانک اس کی آواز میں تحیّر شامل ہو گیا۔ ''نائلہ کہاں ہے۔ تم دونوں خالی ہاتھ کیوں ہو؟''

وہ تینوں مجھے نظر آ رہے تھے مگر میں نائلہ کو فرش پر رکھتے ہی ایک ستون کی آڑ میں آ گیا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اپنے سیاہ لباس کے سبب اندھیرے کا ایک متحرک حصہ ہی لگتے تھے۔ اس شخص کے سوال کے جواب میں دراز قامت نے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔

''ادھر بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ نائلہ کو ہم سے چھین لیا گیا ہے۔''

''کس نے چھینا ہے؟'' اس شخص نے محتاط انداز میں دریافت کیا۔

دراز قامت کے ساتھی نے بتایا ''پتا نہیں، وہ شیطان

کون ہے اور اچانک کہاں سے آن ٹپکا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے وہ میری سمت دیکھتے ہوئے بولا ''پتا نہیں، کہاں چلا گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ وہاں تھا۔ وہ دیکھو، نائلہ چادر میں لپٹی وہیں پڑی ہے۔''

''اس شیطان کو ڈالو جہنم میں۔'' نووارد نے غصیلے لہجے میں کہا ''ہم نائلہ کو اٹھانے آئے ہیں۔ وہ سامنے پڑی ہے۔ فوراً اسے اٹھا لو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں، ساجد باہر گاڑی میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ تم نے گارڈ اور پاشا کا بندوبست تو کر دیا ہے نا؟''

''ہاں، وہ دونوں اس وقت انٹاغفیل ہیں۔'' دراز قامت نے بتایا۔

''پھر دیر کس بات کی ہے۔ فوراً نائلہ کو اٹھا لو۔''

''مگر وہ شیطان......'' دراز قامت نے متذبذب انداز میں کچھ کہنا چاہا۔

''اس شیطان کی تو میں ایسی کم تیسی کرتا ہوں۔'' نووارد چیلنج کرنے والے انداز میں بولا ''تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔''

میں سمجھ گیا، وہ نائلہ کو ساتھ لے جائے بغیر نہیں ٹلیں گے اور میں انہیں کسی بھی قیمت پر اس مقصد میں کامیاب ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نووارد کے پاس مجھے آتشیں اسلحے کے نام پر کسی ہتھیار کی جھلک نظر نہ آئی۔ اگر اس کے پاس ایسی کوئی شے موجود تھی تو وہ اس نے اپنے سیاہ پراسرار لباس میں چھپا رکھی ہو گی۔ میں ستون کے پیچھے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ان چنے گنے لمحات میں درجنوں فوری فیصلے کرنے کی ضرورت تھی اور میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔

سب سے آگے نووارد تھا اس لیے پہلے وہی میرا نشانہ بنا۔ ستون کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے جیسے ہی نائلہ کی سمت قدم اٹھایا، میں اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ وہ ابھی پوری طرح ٹھٹک بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے ایک دھواں دھار پنچ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ حلق سے 'اوں' کی آواز نکالتے ہوئے پیچھے کو الٹا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گیا اور سنبھلتے ہی اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں اس حملے کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ اس کا حملہ بڑا دیسی قسم کا تھا۔ اس نے پہلوانوں کے انداز میں مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے بیٹھک کے انداز میں غوطہ لگاتا اور کھڑے ہوتے ہی اس کے چہرے پر ایک اور پنچ جڑ دیا۔

اس دوران میں دوسرے دونوں بھی مجھ پر پل پڑے۔ دراز قامت نے سامنے سے مجھے کک کا نشانہ بنانا چاہا، میں نے بیک فٹ پر جا کر اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش کی تو عقب سے دوسرے نے مجھے دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے زور لگانا شروع کر دیا۔ وہ شاید میری کمر کو توڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کی گرفت میں بڑی سختی تھی۔

میں نے اپنے جسم کے زیریں حصے کو ہوا میں اٹھایا اور دونوں پاؤں پش اسٹائل میں دراز قامت کے سینے پر رسید کر دیے۔ میری اس حرکت سے دو فوری نتیجے برآمد ہوئے۔ دراز قامت میری زبردست ڈبل کک کھا کر پشت کے بل زمین پر گرا جب کہ مجھے دبوچنے والے کے بازوؤں کو زبردست جھٹکا لگا اور میری کمر اس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ میں نے گردن کو خم دے کر ایک دھانسو قسم کی بیک کک اس کی تھوڑی پر رسید کر دی۔

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھامتے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے لیفٹ، رائٹ راؤنڈ ہاؤس ککس سے نہلا دیا۔ میری ٹانگیں اس رفتار سے چل رہی تھیں کہ اسے بلاک کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے حتمی فیصلہ کیا اور میری فرنٹ پش کک نے اسے چاروں خانے چت کر دیا۔

اسی وقت مجھے اپنے عقب میں دھمکی آمیز آواز سنائی دی ''ہینڈز اپ۔ اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو بھیجا اڑا دوں گا۔''

بھیجا اڑا دوں گا کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ دھمکی دینے والا مسلح تھا۔ آواز سے میں نے پہچان لیا، وہ ان لوگوں کا تیسرا ساتھی نووارد تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اپنے جسم کو گھما کر سیدھا کر لیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ نووارد کے ہاتھ میں ایک خطرناک پسٹل نظر آ رہا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ دراز قامت کا 'کھویا ہوا' پسٹل ہی تھا یا کوئی دوسرا۔

پستول بردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا ''نائلہ کو اٹھاؤ اور فوراً باہر لے جا کر گاڑی میں ڈال دو۔ میں اس بدمعاش کو دیکھتا ہوں۔''

وہ دونوں پستول بردار کی بات ختم ہوتے ہی آگے بڑھے۔ میں نے اپنے اور پستول بردار کے درمیانی فاصلے کو نگاہ میں ناپا۔ ہم دونوں لگ بھگ بارہ فٹ کی دوری پر تھے اور وہ ستون جس کے پیچھے تھوڑی دیر پہلے میں چھپا تھا، وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔ میں کسی اسپرنگ کی مانند اچھل کر ستون کے پیچھے پہنچ گیا۔

یہ ایک فوری اور خطرناک حرکت تھی اور اس کی خطرناکی فوراً ظاہر ہو گئی۔ پستول بردار نے میری سمت فائر کر دیا۔ میں نشانے پر نہیں رہا تھا، گولی ستون کے ایک کنارے کو توڑتے ہوئے نکل گئی۔ فائر کی آواز کے ساتھ ہی میں نے بڑی سرعت سے بیک فلیک لگائی۔ بیک فلیک کی تکمیل پر میں ہوا میں اچھلا اور بیک سمر سالٹ لگاتے ہوئے پستول بردار کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ میری ان حرکات پر بوکھلا کر رہ گیا پھر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ مجھے گولی سے نشانہ بنانے کی کوشش کرتا، میں نے زمین پر آتے ہی اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ میرے تابڑتوڑ مکوں نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر ایک بھرپور ٹھوکر مار کر اسے غیر مسلح کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک سائیڈ کک مار کر اسے دور پھینک دیا۔

دوسرے دونوں اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر تذبذب میں پڑ گئے۔ وہ چادر میں لپٹی نائلہ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں غرا کر ان کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے کھلے ہوئے دروازے میں مجھے فرید پاشا کی جھلک دکھائی دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی جملہ تھا۔

''نائلہ! تم کہاں ہو؟...... نائلہ! تم کہاں ہو؟''

تھوڑی دیر پہلے ان تینوں کالی بلاؤں کی گفتگو سے مجھے پتا چلا تھا، فرید پاشا اور سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کو انہوں نے بے ہوش کر دیا تھا۔ فرید پاشا کی حالت سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ بے ہوشی سے نکل کر آیا ہے۔ اس کی متلاشی نظر اندھیرے میں نائلہ کو تلاش کر رہی تھی۔

میں نے باآوازِ بلند فرید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''پاشا صاحب! آپ کی بیوی نائلہ ادھر فرش پر بے ہوش پڑی ہے۔'' پھر میں نے اس کی جانب اشارہ بھی کر دیا ''آپ اسے سنبھالیں۔ میں ان کالی بلاؤں کو جہنم کی راہ دکھا کر آتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں حملہ آوروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نائلہ کو وہاں سے اٹھا کر لے جانے والے دونوں افراد ایک ساتھ میری جانب پلٹے۔ میں ان کے وار کے لیے تیار تھا۔ دراز قامت کا پنچ بڑی تیزی سے میرے چہرے کی طرف آیا۔ میں نے آؤٹر بلاک کے بعد اسے ہینڈ پش سے دور دھکیل دیا۔ دوسرے کی ایک نیچی فرنٹ کک میری کمر میں لگی۔ میں نے بڑی سرعت سے گھوم کر اس کا پاؤں ٹخنے کے مقام سے گرفت میں لیا اور خوفناک ٹوئسٹ دے کر اسے ایک طرف پھینک دیا۔

دراز قامت اس کی راہ میں کھڑا تھا۔ دونوں میں زبردست تصادم ہوا اور وہ ایک دوسرے کو لیتے ہوئے زمین بوس ہو گئے۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ان کا جوشیلا ساتھی اچانک کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی ناک اور منہ کو بری طرح لہولہان کر دیا تھا۔ اگر وہ اندھیرے میں سے پلٹ کر نہیں آیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ یا تو جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا تھا یا پھر کہیں بے سُدھ پڑا تھا۔

زمین بوس ہونے والے دونوں افراد اٹھ کر کھڑے ہوئے تو میں کسی چیتے کی مانند ان پر جھپٹا۔ ان کے انداز میں پیش قدمی کے بجائے مجھے پسپائی نظر آئی۔ میں نے ان کے گریز کی پروا کیے بغیر انہیں ہاتھ اور پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ مجھ سے بے تحاشا پٹتے ہوئے قدم قدم پیچھے سرکنے لگے پھر اچانک مجھے اپنے عقب میں فرید پاشا کی للکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ سیاہ پوش حملہ آوروں سے مخاطب تھا۔

''اگر اپنے باپ کے تخم ہو تو، دم دبا کر بھاگنا نہیں، میں ابھی تمہاری لاشیں گراتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی پاشا نے ایک ہوائی فائر کر دیا۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ فرید پاشا کے ہاتھ میں مجھے ریوالور نظر آیا۔ نائلہ کو وہ اندر کہیں چھوڑ آیا تھا کیوں کہ وہ اب اس مقام پر دکھائی نہیں دے رہی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ بیڈشیٹ میں لپٹی پڑی تھی۔

پاشا کی للکار کا حملہ آوروں پر الٹا اثر ہوا یعنی وہ دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس عمل سے انہوں نے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے تخم نہیں تھے۔

پاشا نے ان کی طرف ریوالور کا رخ پھیر کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ اندھیرے کے باعث اس کا نشانہ خطا گیا۔ پاشا نے ان کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ ہم دوڑتے ہوئے کوٹھی کی عقبی سمت نکل آئے کیوں کہ وہ دونوں اسی جانب گئے تھے۔ ہمارے درمیان بیس سے زیادہ قدموں کا فاصلہ تھا لیکن یہ فاصلہ بتدریج بڑھ رہا تھا۔ لگتا تھا، انہیں وہاں سے فرار ہونے کی بہت جلدی ہو گئی کہ وہ اندھادھند بھاگتے ہوئے کوٹھی کی عقبی دیوار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں پاشا نے یکے بعد دیگرے ان پر تین گولیاں بھی چلا ڈالیں اور دھمکی آمیز انداز میں انہیں للکارتا بھی رہا مگر انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور نہ ہی رکنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر سرپٹ بھاگے رہے۔

جب بھگوڑوں نے عقبی دیوار پھلانگنے کے لیے دیوار پر چڑھنا شروع کیا تو پاشا نے ایک مرتبہ پھر انہیں گولی کا نشانہ بنانا چاہا پھر اس کے ریوالور سے گولی کے بجائے 'کھٹ' کی آواز برآمد ہوئی۔ وہ اپنے ریوالور کے چیمبرز کی تمام گولیاں فائر کر چکا تھا۔ ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں دوڑ کر انہیں دیوار پھلانگنے سے نہیں روک سکتا تھا اس کے باوجود بھی میں نے یہ کوشش ضرور کی لیکن مجھے اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں دیوار کے قریب پہنچا تو وہ دونوں دوسری طرف کود چکے تھے۔

میں نے دیوار پر چڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ عقب سے پاشا کی آواز آئی ''رک جاؤ وجدان۔ اب وہ ہاتھ نہیں آئیں گے۔ تعاقب کا کوئی فائدہ نہیں۔''

فرید پاشا کی بات ختم ہوئی تھی کہ کوٹھی کے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ سڑک پر ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ ابھری اور گاڑی کا انجن شور مچاتا ہوا ہماری سماعت سے دور جانے لگا۔

''بھاگ گئے کم بخت۔ کسی بزدل کی اولاد۔'' فرید پاشا نے زہریلے لہجے میں کہا۔

میں نے اس کے قریب آ کر پوچھا ''پاشا صاحب! یہ کون لوگ تھے اور آپ کی بیوی کو کیوں اغوا کر کے لے جا رہے تھے؟''

''تمہارے تمام سوالوں کا جواب میں بعد میں دوں گا۔'' وہ اضطراری لہجے میں بولا ''پہلے اندر چلو، نائلہ کو اس وقت میری اشد ضرورت ہے۔''

''آپ کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے، آپ حملہ آوروں کو شناخت کر چکے ہیں؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے۔'' وہ جلدی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ اندر جائیں۔'' میں نے مصلحتاً کرید سے اجتناب برتا ''میں ذرا سیکیورٹی گارڈ کی خبر لے لوں۔'' پھر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''آپ نے گارڈ خادم حسین کو کہیں دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے حیرت زدہ انداز میں گردن کو نفی میں جھٹکا ''میں خود سوچ رہا ہوں، گارڈ کے ہوتے ہوئے یہ لوگ اندر کیسے آ گئے!'' پھر وہ وہیں سے پکارنے لگا ''خادم حسین...... خادم حسین!''

میں نے کہا ''پاشا صاحب! آپ نائلہ کے پاس جائیں۔ میں خادم حسین کو دیکھتا ہوں۔ وہ یہیں کہیں بے ہوش پڑا ہو گا۔''

''بے ہوش!'' فرید پاشا بڑبڑاتے ہوئے کوٹھی کے اندرونی حصے میں غائب ہو گیا۔

میں سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کی تلاش میں ادھر ادھر جھانکنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اس تیسرے شخص کی بھی تلاش تھی جو پہلے دو کی مدد کرنے وہاں پہنچا تھا۔ اس پستول بردار کی میں نے اچھی خاصی مرمت کر ڈالی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے ایک ٹھیک ٹھاک سائیڈ کک مار کر اسے اندھیرے میں اچھال دیا تھا۔ اس کے بعد وہ دکھائی نہیں دیا۔ ہم نے صرف دو افراد کو دیوار پھلانگ کر فرار ہوتے دیکھا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد سیکیورٹی گارڈ مجھے نظر آ گیا۔ وہ اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دیوار کے ساتھ، مورپنکھ کے پودے کے پیچھے پڑا تھا۔ مورپنکھ کے پودے کے قریب ہی مختلف پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے اور بے سُدھ گارڈ ان پودوں کے پیچھے چھپ کر رہ گیا تھا۔ میں نے گارڈ کے بدن کو ٹٹول کر دیکھا اور چند لمحوں میں مجھے اندازہ ہو گیا، اسے بے ہوش کرنے کے لیے کنپٹی پر کسی ٹھوس شے سے وار کیا گیا تھا۔ اس کی کلاشنکوف بھی تھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔

میں نے بڑے ماہرانہ انداز میں گارڈ کو ہلایا جلایا اور اس کی گردن پر موجود ایک مخصوص نس پر ہلکا سا مساج کیا۔ میرے ہاتھ کی حرارت اس کی زندگی کی حرارت میں شامل ہوئی تو چند لحات کے بعد اس نے کسمسا کر آنکھیں کھول لیں۔

میں نے شانہ تھپتھپا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کیا اور اس جانب بڑھ گیا جدھر میں نے کک مار کر پستول بردار کو پھینکا تھا۔ اس سے پہلے دراز قامت سیاہ پوش کا پسٹل بھی ادھر اندھیرے ہی میں کہیں غائب ہوا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد، وہ دونوں مجھے پستول مل گئے لیکن بھگوڑوں کے ساتھی کا نام پتا نہ مل سکا، اس سے میں نے یہی اندازہ قائم کیا کہ وہ شخص ان سے پہلے ہی کوٹھی سے رفوچکر ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی ایسی دُھلائی کی تھی کہ اس نے وہاں رکنے پر فرار کو فوقیت دی۔ اسی شخص کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ ساجد نامی کوئی شخص باہر گاڑی میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ گویا، نائلہ کو اغوا کرنے کے لیے چار افراد اس کوٹھی میں پہنچے تھے۔

میں اور سیکیورٹی گارڈ ایک ساتھ اندر داخل ہوئے۔ فوراً ہی فرید پاشا تک ہماری رسائی ہو گئی میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں فرید پاشا کو ان حالات سے آگاہ کیا جو خادم حسین کو دیکھ کر میری ذہن میں آئے تھے۔ اس نے مجھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وجدان! تم اندر چلو...... اندر کمرے میں۔ تم سے میں

بعد میں بات کروں گا۔ پہلے خادم حسین سے پوچھ گچھ کر لوں۔“

میں سمجھ گیا، وہ خادم حسین سے کس قسم کی پوچھ تاچھ کرنا چاہتا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ کا مطلب ہوتا ہے، جان و مال کی حفاظت کرنے والا۔ خادم حسین کے ہوتے ہوئے تین خطرناک افراد کوٹھی کے اندر گھس آئے تھے۔ نہ صرف وہ اندر داخل ہوئے تھے بلکہ انہوں نے اس کوٹھی کی نہایت اہم شخصیت نائلہ کو اغوا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اگر میں بروقت وہاں پہنچ کر ان کی راہ کی رکاوٹ نہ بنتا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔

اس کوٹھی میں مالکان اور سیکیورٹی گارڈ کے علاوہ صرف دو افراد کا آنا جانا تھا۔ ان میں ایک تو گھریلو ملازمہ اللہ رکھی تھی اور دوسری اللہ رکھی کی بیٹی آمنہ۔ یہ دونوں دن بھر کوٹھی میں کام کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔ ان کا جھونپڑی نما گھر ایک نزدیکی کچی آبادی میں تھا۔ کوٹھی کے اندر ایک اور شخص بھی رہتا تھا اور وہ تھا خانساماں اللہ دتا۔ اس بے چارے کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اسی لیے کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں اس نے مستقل ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ پاشا کے مطابق اللہ دتا، پاکستانی اور انگلش کھانے بنانے کا ماسٹر تھا۔ میں فرید پاشا کے کہنے پر اندرونی کمرے میں آ بیٹھا۔

لگ بھگ دس منٹ بعد پاشا میرے پاس آیا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گیا۔ وہ کمرا اپنی ترتیب کے اعتبار سے ڈرائنگ روم کم بیڈ روم نظر آتا تھا۔ مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ کمرے سے نکل گیا۔ جاتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

”وجدان! تم اطمینان سے یہاں بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔“

”پاشا صاحب، آپ کی اہلیہ......“

میں نے نائلہ کی خیریت دریافت کرنا چاہی تو اس نے جلدی سے کہا ”نائلہ ہوش میں آ چکی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دے دو پھر میں تم سے تفصیلی بات کروں گا۔“

وہ مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر چلا گیا تو میں نائلہ اور ناکام اغوا کنندگان کے بارے میں سوچنے لگا۔ گھوم پھر کر میرا خیال پاشا کی ایک بات کی طرف چلا جاتا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد پاشا نے گفتگو کے دوران میں دو تین مرتبہ کہا تھا کہ نائلہ کو اس نے بڑی مشکلوں سے حاصل کیا تھا۔ حاصل کیا تھا کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ جن لوگوں سے نائلہ، پاشا کے پاس پہنچی تھی، اب وہ اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ممکن ہے، یہ ادھورا اغوا بھی اسی سلسلے کی کوئی کڑی ہو!

تھوڑی دیر بعد فرید پاشا میرے پاس آ گیا اور دونوں بازو کھول کر میری جانب بڑھا اس کے معانقانہ انداز کو دیکھ کر میں کھڑا ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے پوری قوت سے بھینچا پھر میری پشت کو تھپک کر بولا۔

”وجدان! آج تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، میں اسے زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”پاشا صاحب! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بھرّائی ہوئی آواز میں بولا ”تم نے کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کیا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر تم ان خبیثوں کی راہ میں بروقت رکاوٹ نہ ڈالتے تو وہ اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو جاتے۔ تم نے میری نائلہ کو اغوا ہونے سے بچایا ہے...... گویا، میرے جسم کو روح سے خالی ہونے سے بچایا ہے۔ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن کی مدد سے میں تمہارا شکریہ ادا کر سکوں۔“

”آپ مجھے شرمندہ نہ کریں پاشا صاحب!“ میں نے کہا ”آپ میرے محسن میزبان ہیں۔ آپ کی عزت میری عزت ہے۔ میں نے اپنی عزت کو بچانے کی کوشش کی ہے اور...... یہ تو میرا فرض تھا۔“

وہ ممنونیت آمیز لہجے میں بولا ”تم جتنے خوبرو ہو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت باتیں کرتے ہو۔ تمہاری سیرت، صورت پر حاوی ہے۔ تم نے مجھے خرید لیا ہے وجدان۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے، اس وقت میرے دل میں تمہارے لیے کون سے جذبات ہیں!“

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا ”میں آپ کے جذبات سے بہ خوبی آگاہ ہوں۔ چہرہ دل کی کتاب ہوتا ہے اور میں آپ کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا ہوں اس لیے آپ کے دل کا حال مجھ سے پوشیدہ نہیں۔“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے استفسار کیا ”بائی دا وے، یہ کون لوگ تھے! آپ ان سے شناسائی کا اقرار کر چکے ہیں۔“

”یہ میرے تازہ ترین دشمن ہیں۔“ فرید پاشا نے بتایا۔

میں نے کہا ”نائلہ کو اغوا کرنے کے حوالے سے میرا دھیان آپ کی اس بات کی طرف جاتا ہے کہ آپ نے نائلہ کو بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے۔ کیا میں غلط سوچ رہا ہوں۔“

”تمہاری سوچ کا رخ بالکل درست ہے۔“ وہ تصدیقی انداز میں بولا ”ان لوگوں سے میری دشمنی کی وجہ نائلہ ہی ہے۔ میں نے نائلہ سے شادی کر کے ان کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ رانا عظمت نائلہ کو اپنی جاگیر سمجھتا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نائلہ اس کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دے گی۔ اس کا خیال ہے، میں نے نائلہ کو ورغلایا ہے۔ اسے رانا عظمت کے خلاف کر کے حاصل کر لیا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو دلوں کے سودے ہیں یار۔ اس میں زور زبردستی تھوڑی چلتی ہے۔“

وہ چند لمحات کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”ہمارے درمیان ہلکی پھلکی جھڑپیں تو ہوتی رہتی ہیں۔ اس قسم کا اوچھا وار رانا عظمت نے پہلی مرتبہ کیا ہے۔“

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا ”پاشا صاحب! وہ تینوں تو سرتاپا سیاہ لباس میں چھپے ہوئے تھے پھر آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ رانا عظمت کی طرف سے آئے تھے؟“

اس نے بتایا ”میں نے اندر آنے والے افراد میں سے ایک کو پہچان لیا تھا۔ وہ جو قد میں خاصا اونچا تھا۔“

پاشا کی بات سنتے ہی میرے ذہن میں دراز قامت سیاہ پوش کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ وہ آنکھیں، مجھ پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک اٹھی تھیں۔ مجھے بھی ان آنکھوں میں شناسائی کی جھلک نظر آئی تھی لیکن بہتیرا سوچنے کے باوجود یہ یاد نہیں آ سکا تھا کہ میں نے ان آنکھوں اور ان آنکھوں کے حامل شخص کو پہلے کہاں دیکھا تھا!

میں نے اضطراری انداز میں کہا ”پاشا صاحب! عجیب بات ہے، جس دراز قامت کا آپ ذکر کر رہے ہیں، مجھے لگتا ہے میں پہلے بھی اسے کہیں دیکھ چکا ہوں۔ وہ بھی مجھے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا تھا۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ قطعیت سے بولا ”تم آج پہلی مرتبہ لاہور آئے ہو۔ اس لیے اس شخص سے تمہاری شناسائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمہیں دھوکا ہوا ہوگا۔“

میری یادداشت اور مشاہدے نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔ اس لیے میں فرید پاشا کی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”پاشا صاحب! آپ مذکورہ شخص کے جغرافیے اور تاریخ وغیرہ کے بارے میں کچھ بتائیں۔ میری یادداشت نے کبھی گڑبڑ نہیں کی۔ میں اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا۔“

وہ بولا ”میں نے جس دراز قامت شخص کا ذکر کیا ہے۔ وہ رانا عظمت کا بھتیجا ہے اور اس کا نام ہے، سکندر!“

سکندر کا نام سنتے ہی میں اچھل پڑا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا ”وہی سکندر نا، جو کسی ایم پی اے لالہ بشیر کا بگڑا ہوا بیٹا ہے؟“

”تم لالہ بشیر اور سکندر کو کس طرح جانتے ہو؟“ وہ حیرت سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کی الجھن نما حیرت کے پیش نظر مختصر الفاظ میں اسے ریسٹورنٹ میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔ میں نے اور صدف نے جس دھواں دھار انداز میں سکندر اور اس کے ساتھیوں کی پٹائی کی تھی اس کا احوال سن کر فرید پاشا کو بے حد مسرت حاصل ہوئی۔ ان واقعات کے ذیل میں ڈی ایس پی ٹریفک اورنگ زیب خان اور اس کی اکلوتی بیٹی نادیہ کا ذکر بھی آیا۔ پوری بات سننے کے بعد فرید پاشا نے کہا۔

”وجدان! سکندر اور اس کا خاندان تو ہمارا مشترک دشمن نکل آیا۔ اب ان سے دو دو ہاتھ کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔“

”ہاں، اگر ایسے کسی معرکے کا موقع آیا تو واقعی بہت مزہ آئے گا۔“ میں نے کہا ”آپ نے ابھی تک مجھے رانا عظمت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

وہ بولا ”نائلہ کے حصول اور رانا عظمت سے دشمنی کا قصہ تو بہت دلچسپ اور فرصت سے سننے سنانے کا ہے۔ فی الحال میں تمہیں اتنا بتا دوں کہ رانا عظمت میری طرح ایک فلم پروڈیوسر ہے اور ایم پی اے لالہ بشیر کا چھوٹا بھائی ہے۔ جب سے لالہ بشیر وزیر بنا ہے، رانا عظمت کی بدمعاشیوں اور تخریب کاریوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ وہ بڑے بھائی کی طاقت اور اختیار کے بل بوتے پر پتا نہیں کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ ہم پیشہ ہونے کے باوجود بھی میرے اور رانا کے درمیان کبھی نسل بازی نہیں ہوئی کیوں کہ ہم دونوں کے پروڈیوسر ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“

وہ ایک لمحے کو سانس ہموار کرنے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”میں فلم انڈسٹری اور تماشائیوں کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلاحی اور تفریحی فلمیں بناتا ہوں کہ جب رانا عظمت اول تو فلم بناتا ہی نہیں اور اگر کبھی کبھار اس کی کوئی فلم ریلیز ہو بھی جاتی ہے تو بس عریانی اور فحاشی کے سبب تھوڑی بہت چل جاتی ہے۔ وہ اپنی ذہنیت کی

عکاس فلمیں بناتا ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ کسی فلم کی کامیابی میں سب سے زیادہ ہاتھ اسٹوری اور گانوں کا ہوتا ہے۔ اگر فلم کی اسٹوری جاندار اور اس کے گانے مسحور کن دھنوں پر مشتمل ناقابلِ فراموش ہوں تو وہ فلم بہت کم عرصے میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیتی ہے۔ دوسرے نمبر پر اداکاری آتی ہے مگر رانا عظمت کی پروڈیوس کی ہوئی فلموں میں نہ اسٹوری ہوتی ہے، نہ یادگار گانے اور نہ ہی ڈھنگ کی اداکاری۔ لچر پن اور فحش ڈانسز کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مکالمے بھی انتہائی گھٹیا اور عامیانہ رنگ لیے ہوتے ہیں اس لیے نتیجے کے طور پر فلم چند ہفتوں میں بیٹھ جاتی ہے۔''

''اس کے باوجود بھی رانا عظمت فلم انڈسٹری میں موجود ہے۔'' میں نے متعجب انداز میں پاشا کی طرف دیکھا ''پے در پے نقصانات اٹھانے کے بعد اسے اس کام سے توبہ کر لینا چاہیے۔ میرا خیال ہے، ایک فلم کی تیاری پر کروڑوں روپیا خرچ آتا ہے!''

''ہاں۔'' پاشا نے اثبات میں سر ہلایا ''معقول قسم کی ٹیم اور معروف کاسٹ کے ساتھ فلم بنائی جائے تو واقعی فلم کا بجٹ کروڑوں میں پہنچ جاتا ہے لیکن رانا بہت کائیاں اور بدمعاش شخص ہے، وہ ایک ڈبا فلم بنا کر بھی فائدے میں رہتا ہے۔''

میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں ''وہ کس طرح پاشا صاحب؟ اور یہ ڈبا فلم کیا ہوتی ہے؟''

وہ متحمل انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ڈبا فلم انڈسٹری کی اصطلاح میں ایسی فلم کو کہا جاتا ہے جو نمائش کے چند روز بعد بری طرح فلاپ ہو کر واپس ڈبے میں بند ہو جائے یعنی ایک انتہائی ناکامیاب فلم۔''

''ایسی فلاپ فلمیں بنا کر رانا فائدے میں کس طرح رہتا ہے؟'' میری حیرت دوچند ہو گئی۔

''اس طرح کہ'' فرید پاشا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''وہ غیر معروف کاسٹ اور ایکسٹراز سے کام چلا لیتا ہے اپنے جسم کی نمائش کرنے والی ڈانسرز اور شوقیہ اداکاری کے مارے ہوئے اداکار اونے پونے پر راضی ہو جاتے ہیں اور اس طرح چند لاکھ میں فلم تیار ہو کر نمائش کے لیے پیش کر دی جاتی ہے۔''

''لیکن فلم فلاپ ہونے کی صورت میں یہ چند لاکھ کا نقصان تو ہوتا ہوگا نا!''

''ہاں، ہوتا ہے۔'' وہ تصدیقی انداز میں بولا ''مگر یہ نقصان رانا کا نہیں بلکہ اس پارٹی کا ہوتا ہے جسے گھیر گھار کر رانا فلم میں سرمایہ کاری کے لیے پھانس لیتا ہے اور اگر گہرائی میں جائیں تو اس پارٹی کا بھی کچھ نہیں جاتا۔ سب فائدے میں رہتے ہیں۔''

''آپ کی وضاحت میں بہت تضاد پایا جاتا ہے صاحب!'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے ممکن ہے، میں آپ کی بات کو پوری طرح سمجھ نہ پا رہا ہوں۔''

وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا ''روشنیوں کی یہ نگری بڑی نرالی ہے۔ سلور اسکرین پر نظر آنے والے ہیروز کی اکثریت حقیقی زندگی میں کسی ولین سے کم نہیں۔ اسی طرح فلم میں جن اداکاروں کو ولین کے رول جاتے ہیں ان میں سے زیادہ تر نجی اور معاشرتی زندگی میں ہیرو سے کم نہیں ہیں۔ سب دھوکا ہے، ایک کھلا دھوکا دھوکا جاننے والے بھی کھاتے ہیں اور انجان بھی۔''

بولتے بولتے اس کی آواز بوجھل ہو گئی۔ میں اس کے مزید کلام کے انتظار میں خاموش بیٹھا بڑی توجہ سے اسے رہا۔ چند لمحے خیالات میں ڈوبے رہنے کے بعد اس نے شروع کیا۔

''میں بھی ہیروز اور ولینز کی کیا کہانیاں لے بیٹھا وجدان! دراصل، میں تمہیں رانا عظمت اور اس کی فلم ساز کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' اس پر پھر تھوڑا سا توقف کیا بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''تم یوں سمجھ لو کہ شیطانوں ایک ٹولا ہے جس کا سرغنہ رانا عظمت ہے۔ یہ لوگ فلم سازی نہیں کرتے بلکہ اپنی ہوس کی تسکین کے لیے اس پیشے کو استعمال کرتے ہیں۔ شوبز کی کشش سے ہر شخص واقف ہے رانا عظمت کا فلم ساز ادارہ کسی پھندے سے کم نہیں۔ فلم میں کام کرنے کی شائق لڑکیوں اور عورتوں کو بہلا پھسلا کر اونچے خواب دکھا کر یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ٹولا منشیات دھندے میں بھی ملوث ہے۔ اب میں تمہیں کیا کیا وجدان!'' اس کے لہجے میں بے چارگی اتر آئی ''ہم نائلہ جیسی ہیرا لڑکی کو بڑی کوششوں کے بعد رانا عظمت چنگل سے نکال کر اپنایا ہے...... اس واقعے کی تفصیل میں پھر کبھی بتاؤں گا۔''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز میں موہوم سا کرب شامل ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا، نائلہ کے کے پاس پہنچنے کے درمیان بہت سے پیچ و خم ہیں، بہت اور ناخوشگوار یادیں ہیں جن کا ذکر پاشا کو ملول اور آزردہ دیتا ہے۔ میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا، آئندہ میں پاشا سامنے نائلہ کا اس حوالے سے ذکر نہیں چھیڑوں گا۔

اگر از خود کچھ بتایا تو دوسری بات ہے۔ میں اتنا اندازہ لگا چکا تھا، وہ نائلہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنی محبت کو کس طرح حاصل کیا تھا، یہ تفصیل جاننے کی کیا ضرورت تھی!

پاشا کی محبت کے بارے میں سوچتے ہوئے آپوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ میں اپنی رگِ جاں سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اس کی قربت میں گزرا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے تڑپاتا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرا سینہ اعضائے رئیسہ سے خالی ہو گیا ہو۔ محبوب کے بچھڑنے کا غم وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو کبھی محبت کے عملی تجربے سے گزر رہے ہوں۔

ساحل کے بارے میں اگر میں زیادہ سوچتا تو شاید یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سوچ کا البم جب ماضی قریب کے عکس دکھاتا ہے تو ہجر و فراق میں بڑی تندی آ جاتی ہے۔ ساحل تک پہنچنے اور اسے حاصل کرنے کے لیے میں اپنے دل و دماغ کو حاضر و ناظر اور نارمل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر میں اس کے تصور میں نکل جاتا تو یادوں کا طوفانی ریلا مجھے اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ میں کسی ریلے میں بہنا نہیں چاہتا تھا، کسی میلے میں کھونا نہیں چاہتا تھا اس لیے ضروری تھا، میں اپنے جذبات پر کنٹرول رکھوں۔ یہ کنٹرول حاصل کرنے کے لیے مجھے ساحل کی یاد سے حتی الامکان دور رہنا تھا اور میں اسی قسم کی کوششیں کر رہا تھا، گویا خود کو دھوکا دے رہا تھا!

ساحل تو میرے جسم کے ایک ایک سُوت پر کندہ تھی۔ اس کے مخملیں لمس نے میرے تصور کو گودر کھا تھا۔ میں اس کو اور اس کے خیال کو اپنے اندر سے کیسے نکالتا۔ یہ تو بالکل ایسا ہوتا جیسے کوئی شخص اپنا دل و دماغ، گردے پھیپھڑے نکال کر جسم سے باہر پھینک دے اور پھر بھی زندہ رہے۔ میں صرف خود کو بہلا رہا تھا۔ بہلاوا اور امید بھی عجیب چیزیں ہیں۔ دھوکے کے دو خوبصورت نام جن کے سہارے زیست قدرے آسان محسوس ہونے لگتی ہے...... اور میں بھی انہی سہاروں سے کام چلا رہا تھا۔

میری زندگی میں بے پناہ جذباتی موڑ آئے ہیں لیکن میں نے خود کو اتنا بے بس اور بے قرار کبھی محسوس نہیں کیا جو حال، ساحل کی جدائی نے کیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میرے لیے ساحل کے بغیر زندگی کا تصور محال تھا۔

فرید پاشا کے جذباتی کلمات نے مجھے خاصا دلگیر کر دیا تھا۔ میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لیے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

''پاشا صاحب! آپ نے سیکیورٹی گارڈ سے پوچھ گچھ کر لی۔ اس نے اس واقعے کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

فرید پاشا نے مجھے بتایا کہ سیکیورٹی گارڈ کے مطابق، وہ حسبِ معمول اپنے کیبن میں موجود تھا کہ اسے کوٹھی کے عقبی حصے میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ صورتِ حال جاننے کے لیے اس طرف بڑھا تو دیوار کے نزدیک مورپنکھ کے پودوں کے پاس اسے دو ہیولے نظر آئے۔ اس نے انہیں للکار کر رکنے کو کہا لیکن وہ رکے بغیر کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئے۔ تب گارڈ نے انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی۔ اسی لمحے عقب سے کسی نے اس کی کنپٹی پر وار کر دیا۔ وہ کٹے ہوئے کسی شاہ تیر کی مانند زمین پر جا گرا۔ ازاں بعد میرے ہوش دلانے پر اس نے آنکھ کھولی تھی۔''

سیکیورٹی گارڈ کے بیان میں مجھے دروغ گوئی نظر آئی۔ میں نے اپنے شک کی تصدیق کے لیے پاشا سے پوچھا ''اور کوٹھی کے اندر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''میں اس وقت واش روم میں تھا جو وہ دونوں تحریم نا تصدیق ہمارے بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی نائلہ کو قابو میں کر لیا۔ میں نائلہ کی مزاحمت کی آواز سن کر واش روم سے نکلا تو ایک عجیب منظر نے میری نگاہ کا سامنا کیا۔ دراز قامت یعنی سکندر کی مدد سے دوسرا شخص نائلہ کو بیڈ شیٹ میں لپیٹ کر کندھے پر ڈال رہا تھا۔ مجھے بیڈ روم میں موجود پا کر سکندر میری جانب بڑھا۔ میں نے اس کی آواز اور آنکھوں سے اسے پہچان لیا۔ جب میں نے اس کا نام لے کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو سکندر مجھ سے گتھم گتھا ہو گیا۔ ایک نازک موقع پر، وہ مجھ پر غالب آ رہا تھا کہ سکندر کے ساتھی نے نائلہ کو بیڈ پر ڈال کر میرا رخ کیا اور میرے سر پر کسی وزنی آہنی شے سے بھرپور ضرب لگائی۔ میری آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔ اس دوران میں نائلہ چادر میں سے اپنا منہ باہر نکال چکی تھی۔ اس نے مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت دیکھی تو اس کے حلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔ میری سماعت سے ٹکرانے والی وہ آخری آواز تھی، اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔ سر پر لگنے والی قیامت خیز چوٹ نے مجھے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔'' اس نے ایک جھرجھری لی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا ''میں نہیں جانتا، میرے بے ہوش ہونے کے بعد انہوں نے نائلہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اٹھک پٹخ کی آوازوں سے جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنا ریوالور لے کر بیڈ روم سے باہر آ گیا۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات تمہارے سامنے ہیں وجدان!'' اس کے لہجے میں حد درجہ شکر گزاری بھری ہوئی تھی ''تم نے بروقت مداخلت کر کے نائلہ کو اغوا ہونے سے بچایا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا، کس زبان

سے اور کن الفاظ میں تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"آپ کو یہ سمجھنے اور جاننے کی ضرورت بھی نہیں پاشا صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اور وعدہ کریں، آئندہ آپ اس حوالے سے کوئی ذکر کر کے مجھے نادم نہیں کریں گے۔ میں آپ کو اپنا محسن سمجھتا ہوں اور محسنوں پر احسان نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے کام آ کر اپنا فرض ادا کیا جاتا ہے۔ میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، میں نے کچھ بھی نہیں کیا، صرف اپنا فرض نبھایا ہے۔"

وہ بے حد جذباتی ہو گیا "میں بھی پھر اپنا فرض نبھاؤں گا اور اس طرح نبھاؤں گا کہ چوہدری نوازش علی کی سات پشتیں کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر یاد کریں گی اور آنسو بہا بہا کر فریاد کریں گی۔ میں کل شام سے پہلے پہلے تیاری مکمل کر لوں گا۔ انشاءاللہ پرسوں صبح ہم سید پور روانہ ہو جائیں گے۔ سید پور میں رہتے ہوئے ہم چوہدری نوازش علی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔" وہ ذرا توقف کرنے کے بعد ہیجان خیز لہجے میں بولا "وجدان! تم میری بات کا کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ میں خلوصِ دل سے کہہ رہا ہوں اور یہ کوئی بدلہ چکانے والی بات نہیں۔ تم نے میری نائلہ کو بچایا ہے، میں تمہاری ساحل کو صحیح سلامت چوہدری کے قبضے سے نکل کر تمہارے حوالے کروں گا۔ اس لیے کہ چاہے مجھے کسی بھی انتہا سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ تم دیکھ لینا...... تم دیکھنا وجدان! میں کیا کر دکھاتا ہوں۔"

وہ اس وقت انتہائی جذباتی ہو رہا تھا اس لیے میں نے اس کا دھیان ہٹانے کی خاطر کہا "پاشا صاحب! پرسوں کی صبح ابھی خاصی دور ہے۔ اس سے پہلے ہمیں یہاں بہت سے ضروری کام نمٹانا ہیں۔"

"مثلاً کون سے ضروری کام؟" وہ استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا "رانا عظمت اور اس کے شیطان خیر خواہوں کا بندوبست میں کر دوں گا، کہیں تمہارا اشارہ اس طرف تو نہیں!"

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا "میرا اشارہ سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کی طرف ہے۔"

"کیا مطلب وجدان!" وہ چونکا نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "مجھے یقین ہے خادم حسین نے اپنے بیان میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ وہ حقیقت کو مسخ کر کے پیش کر رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے، وہ یا تو آپ کے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یا ان کا خیر خواہ بنا ہوا ہے۔"

"وجدان! تم ناقابلِ یقین بات کر رہے ہو۔" دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "خادم حسین میرا برسوں کا آز... ہوا ہے۔ یہ ریٹائرڈ فوجی ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ چا... چوبند اور فرض شناس پایا ہے۔ تمہاری باتیں مجھے الجھن... ڈال رہی ہیں۔"

میں نے گمبھیر آواز سے کہا "پاشا صاحب! وہ آ... برسوں کا آزمایا ہوا ہو گا لیکن وہ ایک ہی واقعے میں... آزمائش پر پورا نہیں اترا۔ اس کی باقی خصوصیات کوئی اہم... نہیں رکھتیں۔ انسان عجیب و غریب مخلوق ہے۔ اسے بدل... ہوئے دیر نہیں لگتی۔ کل کے بااعتماد آج بے اعتماد بھی ثابت... سکتے ہیں۔"

"تم جتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہو اس سے... ہے، تمہارے ذہن میں کوئی خاص نکتہ ہے۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا "کیا تم مجھے اس بارے میں کچھ بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "ضرور بتاؤں گا۔" پھر چند لمحے سوچنے... بعد میں نے سنجیدہ لہجے میں بتایا "مجھے اچھی طرح یاد ہے، م... نے پہلے ایک دلخراش نسوانی چیخ سنی تھی۔ اس کے کچھ دیر... زیریں منزل پر فائرنگ کی آواز گونجی تھی۔ اس تناظر میں سیکیورٹی گارڈ کا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔"

"ذرا وضاحت کرو!" وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "آپ کے مطابق آپ کے سر پر کسی وز... شے سے ضرب لگائی گئی تو اس منظر نے نائلہ کو چیخنے پر مجبور... جب کہ گارڈ کا کہنا ہے کہ دو سیاہ پوش افراد کو روکنے کے... اس نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ان دونوں بیانوں میں بہت... تضاد ہے۔ میں آپ کو جھٹلا نہیں سکتا اس لیے سیکیورٹی گارڈ مشکوک نظر آتا ہے۔ اگر سیکیورٹی گارڈ کی بات کو درست... لیا جائے تو پھر پہلے فائرنگ کی آواز اور بعد میں چیخ کی آ... آنا چاہیے کیوں کہ ان لوگوں نے کوٹھی کے اندر داخل ہو... کے بعد نائلہ کو قابو کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب کہ ایسا... ہے۔ چیخ کی آواز پہلے بلند ہوئی اور فائرنگ کی آواز بعد... ابھری ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے، آپ کے بے... ہونے کے بعد فائرنگ کی گئی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہوئی، و... سے بولا "وجدان! کیا تمہیں یقین ہے، تم نے فائرنگ... آواز نائلہ کی چیخ کے بعد سنی تھی؟"

"مجھے اس بات کا ایک سو ایک فیصد یقین ہے... صاحب!" میں نے تیقن سے کہا۔

وہ پُرسوچ انداز میں بولا "اگر تمہاری بات کو سچ مان لیا جائے تو پھر سیکیورٹی گارڈ کی بے ہوشی کس کھاتے میں جائے گی۔ تم نے خود اسے پودوں کے عقب سے برآمد کیا ہے اور اس کی کنپٹی پر کسی وزنی شے سے لگائی جانے والی ضرب کا نشان بھی موجود تھا جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے اسے بے خبری میں ضرر پہنچا کر بے ہوش کیا گیا تھا!"

"آپ کا اعتراض بجا ہے۔" میں نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا "اگر سیکیورٹی گارڈ سچا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دو سیاہ پوش اغوا کنندہ آپ کے بیڈروم تک با آسانی کیسے پہنچ گئے۔ کیا آپ اپنی کوٹھی کے اندرونی حصے میں موجود تمام کمروں کے دروازے کھلے چھوڑ کر سوتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا "میں سونے سے پہلے تمام دروازے چیک کرتا ہوں، خاص طور پر ہمارا بیڈروم تو ضرور لاک کیا جاتا ہے۔ کوٹھی کے اندرونی حصے میں کسی سے رابطہ کرنے کے لیے انٹرکام سسٹم موجود ہے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال میں مجھے بیڈروم میں بھی کال کیا جا سکتا ہے۔"

"جب کہ سیکیورٹی گارڈ نے انتہائی ہنگامی صورتِ حال میں بھی آپ کو مطلع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اغوا کنندگان نے آپ کے بیڈروم تک کس طرح رسائی حاصل کی۔"

وہ تشویش ناک لہجے میں بولا "اس تناظر میں تو خادم حسین کی ہی طرف شک جاتا ہے۔ میں ابھی اسے بلا کر تمہارے سامنے......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا "آپ ابھی اسے نہ چھیڑیں...... اس پر بہت سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اگر وہ واقعی آپ کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے تو کچا ہاتھ ڈالنے سے وہ محتاط ہو جائے گا۔ آپ اسے میرے لیے چھوڑ دیں۔ میں کل رات اس پر 'کام' کروں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ ایک بات کا خیال رہے، خادم حسین کو اس بات کا شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اس کی طرف سے محتاط ہو چکے ہیں۔"

"تم بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس کے ساتھ نارمل رویہ رکھوں گا۔"

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا "پاشا صاحب! کیا آپ کا باورچی اللہ دتا کوئی نشہ وغیرہ بھی کرتا ہے؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا "تم یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "یہاں کوٹھی میں گھنٹے، ڈیڑھ گھنٹے سے مارا ماری ہو رہی ہے اور وہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ آپ نے تو بتایا تھا، وہ یہیں ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے۔"

"میں نے تمہیں غلط نہیں بتایا تھا۔" فرید پاشا نے کہا "آج جمعرات ہے بلکہ اب تو جمعہ شروع ہو چکا ہے۔ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب وہ کوٹھی سے غیر حاضر رہتا ہے۔"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟"

فرید پاشا نے بتایا "یہاں لاہور میں ایک بہت بڑے روحانی بزرگ اور ولی اللہ کا مزار ہے جو داتا دربار کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے مزار پر جمعرات کی رات محفلِ سماع ہوتی ہے۔ اللہ دتا رات داتا دربار پر گزارتا ہے۔ یہ اس کا برسوں کا معمول ہے۔ میں نے بھی کبھی اسے منع نہیں کیا۔ جہاں سے دلی سکون اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہو، اس راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔"

"یہ اللہ دتا تو بہت ہی دلچسپ شخصیت ہے۔" میں نے کہا "اگر مجھے کبھی فرصت ملی تو اس سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔"

فرید پاشا نے کہا "اللہ دتا دیکھنے میں کھسکا ہوا لگتا ہے مگر کبھی کبھی بڑی معرفت کی بات کرتا ہے۔ تم اس سے بات چیت کر کے حیران رہ جاؤ گے۔"

میں نے گفتگو کے موضوع کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے کہا "پاشا صاحب! آپ نے سیاہ پوشوں کے تعاقب میں پوری چھ گولیاں فائر کر ڈالیں مگر آس پاس سے کسی نے یہاں جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ کی فائرنگ سے پہلے سیکیورٹی گارڈ کی کلاشنکوف بھی گرجی تھی۔ آپ کے پڑوسی اپنے ماحول سے اتنے لاتعلق ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ ہے وجدان کہ میرے پڑوس کی دونوں کوٹھیاں آج کل خالی ہیں۔" فرید پاشا نے بتایا "ایک کے مالکان پچھلے دو ہفتوں سے اسٹیٹس گئے ہوئے ہیں اور دوسری کوٹھی "برائے فروخت" کے ذیل میں خالی پڑی ہے۔ دوسرے یہ صاحب ثروت لوگوں کی رہائش کا علاقہ ہے۔ گلبرگ تھری اور دوسرے پوش علاقوں میں بسنے والے اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور دوسروں کے معاملات میں خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرتے۔" پھر پاشا نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی اور ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولا "ویسے بھی اس وقت رات کے تین بج رہے ہیں!"

وقت گزرنے پر مجھے یاد آیا کہ رات ڈیڑھ بجے میں

ڈارلنگ کی اصلیت جاننے کے لیے 'جی' کی قوت کو آزمانے میں مصروف تھا۔ زیریں منزل پر تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال نے مجھے نیچے آنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس بات کو لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹا بیت چکا تھا۔ کیا ڈارلنگ اب تک بے ہوشی کی حالت میں ٹیبل پر پڑی ہوگی؟

اس سوال نے مجھے یک لخت کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ فرید پاشا میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ''کیا ہوا وجدان؟'' اس کے استفسار میں گہری تشویش تھی۔

''میں ذرا اوپر جا رہا ہوں۔'' میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خیریت تو ہے، ایسی کیا بات ہوگئی؟''

''ابھی آ کر بتاتا ہوں۔''

میں کوٹھی کے اندرونی حصے سے نکل کر خوش نما اور طرح دار زینے کی جانب بڑھ گیا۔ بالائی منزل پر قدم رکھنے سے پہلے مجھے معلوم ہوگیا، فرید پاشا بھی میرے تعاقب میں چلا آیا تھا۔ میں نے اس کی جانب توجہ دیے بغیر اس کمرے میں قدم رکھ دیا جو شب بسری کے لیے مجھے دیا گیا تھا۔

بیڈروم میں قدموں سے پہلے میری نگاہ داخل ہو چکی تھی اور یہ نگاہ کمرے میں موجود ہر شے کو فراموش کر کے سیدھی اس میز تک جا پہنچی جہاں کچھ دیر میں نے ڈارلنگ کو بے ہوشی کی حالت میں چھوڑا تھا۔

وہ میز خالی تھا۔ ڈارلنگ کا وجود اس پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس منظر نے میری نگاہ کو دھچکا پہنچایا۔ ایک بے نام سے اضطراب نے میرے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا۔ میں متلاشی نظر سے بیڈروم کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لینے لگا۔ چند لمحات کی تلاش سے مجھے اندازہ ہوگیا، ڈارلنگ اس میز پر تو کیا، اس کمرے ہی میں کہیں موجود نہیں تھی۔ میرے ذہن نے تشویش کے عالم میں سوچا ''یہ پراسرار بلی کہاں چلی گئی؟''

اپنے اس خیال پر مجھے ہنسی بھی آ گئی۔ اگر میں ڈارلنگ کو ایک پراسرار بلی تسلیم کر رہا تھا پھر ''کہاں چلی گئی؟'' کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی تھی۔ جو چیز اسرار سے بھری ہو، وہ کہیں بھی، کسی بھی وقت جا سکتی ہے۔

اپنے عقب میں مجھے فرید پاشا کی آواز سنائی دی ''وجدان! تم مجھے خاصے پریشان نظر آ رہے ہو۔ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟''

''ڈارلنگ کی۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

''ڈارلنگ!'' اس نے حیرت سے دہرایا پھر اسے فوراً یاد آ گیا، میں کس ڈارلنگ کا تذکرہ کر رہا ہوں، جلدی سے بولا ''اچھا اچھا، تم اپنی بلی کو ڈھونڈ رہے ہو۔ کہاں چلی گئی تمہاری وہ چہیتی بلی؟''

''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا، ڈارلنگ کہاں گئی ہے تو میں اسے وہیں جا کر تلاش کرتا۔''

اس نے میری اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ڈارلنگ کی تلاش میں میرا ساتھ دینے لگا۔ اگلے پندرہ منٹ میں ہم نے کوٹھی کی ہر اس جگہ کو دیکھ لیا جہاں ڈارلنگ کے پائے جانے کے امکانات ہو سکتے تھے مگر وہ ہمیں کہیں ملی اور نہ ہی اس کا کوئی سراغ ہاتھ آیا۔ اسی تلاش میں ٹہلتے ہوئے ہم سکیورٹی گارڈ کے پاس بھی گئے۔ اس سے ڈارلنگ کے بارے میں استفسار کیا۔ اس کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی۔ اس نے ڈارلنگ کو کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

میں نے سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''تم تھوڑی دیر پہلے ایک سنگین حادثے سے گزرے ہو۔ اب تمہیں آرام کرنا چاہیے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب وہ لوگ واپس نہیں آئیں گے، تم آرام سے سو جاؤ۔''

''میں ٹھیک ہوں سر۔'' وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بولا ''بس ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔ یہ تکلیف قابلِ برداشت ہے۔ فوج کی ملازمت کے دوران میں اس سے کہیں بڑی بڑی چوٹیں آئی ہیں۔ میں اگر سو گیا تو یہ فرائض میں کوتاہی ہوگی۔''

اس کے لہجے میں مجھے مکاری کی بُو آئی۔ فرید پاشا نے کہا ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم اسی کیبن میں رہ کر تھوڑا سا آرام کرلو اور چوکنا نظر سے گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتے رہو۔ سونے کے لیے کل کا دن پڑا ہے۔'' پاشا کے لہجے میں رکھائی واضح تھی۔

ہم گیٹ کے پاس سے واپس کوٹھی کے اندرونی حصے میں آ گئے۔ میرے ذہن میں ایک ہی جملے کی گردان تھی۔ ڈارلنگ کہاں غائب ہوگئی؟

ڈارلنگ کے غیاب سے مجھے وہ رات یاد آ گئی جب سرمئی رنگت والی لیلیٰ نے مجھے تسخیر کیا تھا۔ میں کے ڈی اے اسکیم کے اس بنگلے میں گزاری ہوئی رات کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ پراسرار شکتیوں کی مالک نیلگری نے اس رات لیلیٰ کے جلو میں مجھے پچھاڑا تھا اور ڈارلنگ آج اسی طرح غائب ہوگئی تھی۔ تو کیا نیلگری پھر کوئی چمتکار دکھانے والی تھی؟

اس سوال نے مجھے جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا۔ میں اس تجربے کو کسی بھی قیمت پر دہرانے کے حق میں نہیں تھا۔

خوشگوار تجربات ایسے ہوتے ہیں جن کے مابعد اثرات میں تلخیوں اور سنگینیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس رات تو لیلیٰ نے جامِ امید نامی کندنی مشروب کی مدد سے مجھے ہوش و خرد سے بیگانہ کر کے کمزور بنا دیا تھا اس لیے ٹیلگری بہ آسانی مجھے شکار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب ایسی کوئی صورتِ حال پیش نہیں آ سکتی تھی۔ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے، میں ایک ایک قدم سنبھل کر اٹھانا چاہتا تھا۔ تاکہ بلندی اور پستی میں امتیاز باقی رہے۔

اچانک فرید پاشا کی آواز نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا ''وجدان! تم کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو۔ کیا تم پریشان ہو؟''

''ہاں، میں تھوڑا سا پریشان ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''ڈارلنگ کی اچانک روپوشی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔''

میں فرید پاشا کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈارلنگ کوئی عام بلی نہیں بلکہ اسرار و رموز میں لپٹا ہوا ایک سلکی تھان ہے جس کی ایک ایک تہہ میں ناز و ادا کی بھول بھلیاں ہیں ان پیچ در پیچ بھول بھلیوں میں انسان کھوتا نہیں بلکہ پھسلتا ہے اور پھسل کر اس طرح چاروں خانے چت ہوتا ہے کہ چشمِ فلک مسکرا اٹھتی ہے۔ اس حیرت آفرین اور دلنشین بلی کا اسرار مجھ پر کھلنے ہی والا تھا کہ وہ منظر سے غائب ہو گئی۔ میں یہ تفصیل پاشا کے سامنے لا سکتا تھا اور نہ ہی لانا چاہتا تھا۔

وہ مجھے خاموش پا کر گمبھیر آواز میں بولا ''یار وجدان! تمہاری حالت دیکھ کر تو لگتا ہے، ڈارلنگ کی روپوشی نے تمہیں گہرے صدمے سے دوچار کر دیا ہے۔''

''ڈارلنگ کی جدائی ایسا ہی ستم ڈھاتی ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''اس سلسلے میں، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''وہ جس طرح گئی ہے ویسے ہی واپس بھی آ جائے گی۔''

''کیا پہلے بھی وہ اس قسم کی حرکت کر چکی ہے؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولا ''پھر تو زیادہ پریشانی کی بات نہیں۔ تم اوپر جا کر آرام سے سو جاؤ۔ رات تو اب ختم ہونے والی ہے۔ تم کل رات دیر تک سونا تاکہ فریش ہو کر دشمنوں کا سامنا کر سکو۔ اب کئی حوالوں سے ہمارے دشمن مشترک ہو گئے ہیں، خاص طور پر سکندر اور اس کا ایم پی اے باپ لالہ بشیر سے۔''

اچانک میرا دھیان صدف کی طرف چلا گیا۔ میں فرید پاشا کے پاس اور صدف نادیہ کی کوٹھی میں ٹھہری ہوئی تھی۔ یہاں پر تو اتفاقیہ سکندر سے میری آنکھیں چار ہو گئی تھیں۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، فرید کی کوٹھی پر مجھ سے سامنا ہو جائے گا مگر صدف کو وہ کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ صدف ہی نے ریسٹورنٹ میں اسے سب سے زیادہ رسوا کیا تھا۔ اپنی رسوائی کے بدلے میں کوئی بھی اوچھا ہتھکنڈا آزما سکتا تھا۔ اگرچہ وہ ڈی ایس پی اورنگ زیب خان کی کوٹھی میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا تاہم ایسے کمین فطرت لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا اور اب تو وہ مجھے فرید پاشا کی کوٹھی میں نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اچھی خاصی درگت بھی بنوا کر گیا تھا۔ اس کی جانب سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

میں نے فرید پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں؟''

''اس کوٹھی کی کوئی بھی شے استعمال کرنے کے لیے تمہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں یار۔ یو آر آلویز پرمیٹیڈ۔'' فرید پاشا گفتگو کے دوران میں کبھی کبھار کوئی انگریزی کا جملہ بھی ٹانک دیا کرتا تھا۔ اس نے پوچھا ''ویسے رات کے آخری پہر تم کسے فون کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''میں ذرا صدف اور نادیہ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

سکندر کے حوالے سے میں نے فرید پاشا کو نادیہ، صدف اور ڈی ایس پی اورنگ زیب خان کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

اس نے کہا ''ٹھیک ہے، تم ان کی خیریت معلوم کر لو تاکہ مطمئن ہونے کے بعد تم گہری اور پرسکون نیند سو سکو۔''

ایک لمحے کو میرے ذہن میں آیا کہ رات کے اس پہر فون کر کے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں۔ اگر میں نے صدف یا کسی اور سے سکندر کے تازہ ترین ناکام مشن کے بارے میں کوئی بات کی تو وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے اور رات کا باقی حصہ آنکھوں میں کٹ جائے گا مگر ان لوگوں کی خیریت معلوم ہونا بھی ضروری تھا۔

میں نے فرید پاشا سے کہا ''پاشا صاحب! میں اورنگ زیب خان کی کوٹھی کا نمبر ملاتا ہوں بات آپ کریں۔ اگر ان میں سے کسی نے میری آواز سن لی تو گفتگو کا ایک دفتر کھل جائے گا اور وہ بے چارے الجھن میں پڑ جائیں گے۔''

''میں کیا بات کروں گا؟'' فرید پاشا نے پوچھا۔

میں نے کہا ''جو بھی شخص ریسیور کرے اس پر آپ

ظاہر کریں کہ فون اس نے کیا ہے۔ ظاہر ہے، فون اس نے نہیں کیا ہوگا اس لیے آپ کو دوسری جانب سے جھنجلاہٹ آمیز باتیں سنا پڑیں گی۔ اس سے کم از کم یہ تو اندازہ ہو جائے گا، اِدھر کیا صورتِ حال ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ وہ لوگ میری آواز پہچان لیں گے۔''

میری بات فرید پاشا کی سمجھ میں آ گئی اور اگلے دو منٹ میں اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نہایت ہی صفائی سے معلوم کر لیا کہ چائنا چوک والی کوٹھی میں سب خیریت ہے۔ میں یہ مطمئن ہو کر وہاں سے اٹھا اور کوٹھی کی بالائی منزل پر آ گیا۔ بیڈروم میں قدم رکھتے ہی میں چونک اٹھا۔

وہ آفت کی پرکالہ، شیر کی خالہ بڑے طمطراق سے بیڈ پر براجمان تھی۔ مجھ سے نگاہ ملنے سے وہ بڑی ادا سے مسکرائی اور اس نے اپنے حلق سے بڑی کراری آواز نکالی ''میاؤں!''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چڑانے کے لیے مسکرائی ہو۔ میں اسے گہری نیند میں پہنچا کر اس کے اسرار کے بند کھولنے والا تھا لیکن زیریں منزل والی ہنگامی صورتِ حال نے مجھے اس کا موقع نہ دیا بلکہ ہاتھ آئے ہوئے اچھے خاصے موقع کو ضائع کر دیا تھا۔ اگر مجھے ڈارلنگ پر کام کرنے کے لیے پندرہ بیس منٹ اور مل جاتے تو میں اس کی حقیقت کو پا لیتا۔

میں بیڈ کی جانب بڑھا تو وہ یہ سمجھی کہ میں اسے پکڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے ایک زقند بھری اور دور پڑی میز پر جا بیٹھی۔ یہ وہی میز تھی جہاں میں نے دو گھنٹے قبل اسے لٹایا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ اس کی گہری نیند کیسے ٹوٹی تھی اور از اں بعد تلاش کرنے پر وہ مجھے ملی کیوں نہیں تھی۔

''تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نگاہ چراتے ہوئے آواز نکالی ''میاؤں!''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا، ڈارلنگ مجھ سے نگاہ نہیں ملا رہی تھی شاید اس لیے کہ وہ مجھ سے نگاہی ملاپ کے نتائج دیکھ چکی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے اسرار تک پہنچ پاؤں۔ دو گھنٹے قبل جب میں نے اسے اپنے ٹرانس میں لانے کا آغاز کیا تھا تو ڈارلنگ نے حتی المقدور مزاحمت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ تو 'چی' کی قوت نے میرا ساتھ دیا اور میں اسے اپنے دام میں لانے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ورنہ ڈارلنگ ہما شما کے بس کی نہیں تھی۔

میں نے اسے پچکارتے ہوئے زبان سے کہا ''اِدھر آؤ میرے پاس!''

وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرائی اور میز پر سے اچھل کر بیڈروم کے دور افتادہ کونے میں پہنچ گئی اور میری سماعت سے اس کی مانوس آواز ٹکرائی ''میاؤں!''

آج وہ مجھ سے دور بھاگ رہی تھی، میری پکار پر دوڑی چلی آنے والی کترا کر فاصلہ بڑھا رہی تھی مگر اس کے فرار اور گریز میں نافرمانی یا سرکشی کا شائبہ تک نہیں تھا بلکہ اس کی ان اٹکھیلیوں نما حرکات میں شوخی تھی جیسے وہ ناز و عشوہ دکھا کر اپنا بھاؤ بڑھا رہی ہو۔ اس وقت وہ کسی شریر اور دل پذیر بیوی سے کم نظر نہیں آتی تھی۔

میرا پورا بدن تھکن اور نیند سے چور ہو چکا تھا۔ پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں مجھے آرام کرنے کا کوئی معقول موقع نہیں ملا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو نیند کی دیوی کے حوالے کر دیتا، ڈارلنگ نے مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

میں اس کی ''میاؤں'' پر اٹھ کر بیٹھا تو وہ قلانچیں بھرتی ہوئی ایک پردے کے پیچھے جا چھپی اس کے انداز میں ایک کھلا چیلنج تھا کہ کیچ می، اف یو کین! ڈارلنگ اس وقت مجھے مشہور انگریز شاعر رابرٹ براؤننگ (Robert Browning) کی محبوبہ لگی۔ موصوف کا اپنی محبوبہ سے عشق کا بیشتر حصہ پردوں کی اوٹ پر مشتمل ہے۔ پردے کے پیچھے پہنچ کر بھی ڈارلنگ کو چین نہ آیا اور وقفے وقفے سے اس کی ''میاؤں، میاؤں'' جاری رہی مگر میں اس کی چال میں نہ آیا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے دوڑانے کے موڈ میں تھی۔ میں اس قسم کی خواری کے بعد اسے پکڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ بلی کو زبردستی پکڑنے والوں کے انجام سے میں واقف ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا، صبح فرید پاشا کے سامنے مجھے جواب دہ ہونا پڑے۔ وہ میرے حلیے اور حشر کو دیکھ کر پوچھ سکتا تھا ''وجدان! یہ تو بتاؤ، تم نے بلی پکڑی کیسے!''

میں نے ڈارلنگ اور اس کی ''میاؤں، میاؤں'' کو نظر انداز کر دیا۔ یہ بات یقین کی طرح میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ جب اسے میرے قریب یا آس پاس ہی رہنا تھا تو پھر کسی اور مناسب موقع پر اسے ٹرائی کیا جا سکتا تھا۔ فی الحال نیند پوری کرنا اور تھکن اتارنا زیادہ ضروری تھا۔

میں نے چند گہری سانسیں لے کر بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا پھر اپنے دماغ کو ہدایت دی۔ ''میں نہایت ہی پرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور جب تک میں ذہنی و جسمانی طور پر فریش نہیں ہو جاتا، سوتا رہوں گا البتہ اگر اس بیڈروم اور اس کوٹھی میں، میری نیند کے دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش

آنے کے اسباب نمودار ہوئے تو میری آنکھ فوراً کھل جائے گی۔"

میں سونے سے قبل اپنے دماغ کو مخصوص قسم کی ہدایات دینے کا عادی تھا اور میرے دماغ نے کبھی نافرمانی نہیں کی۔ دماغ اور جسم کے مختلف حصوں کو ترغیبات (Suggestions) اور ہدایات (Instructions) دینے کا طریقۂ کار مجھے ماسٹر ہینگ پائی نے سکھایا تھا۔ ماسٹر ہینگ پائی یوگا اور مارشل آرٹس کا منتہی تھا۔ میں نے اس شخص سے جو کچھ سیکھا وہ ایک یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

تھکن اور نیند کے خمار نے میرے جسم اور دماغ کو سونے کے لیے پہلے ہی ہموار کر رکھا تھا اس لیے "ہدایات" کے اختتام پر میں نیند کی حسین و پرکیف وادی میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

دوسرے دن قبل از دوپہر میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے ایک طویل انگڑائی لے کر بدن کو کھینچا پھر آہستہ آہستہ تناؤ کم کرتے ہوئے نارمل حالت میں آ گیا۔ اسی وقت دیوار گیر کلاک پر میری نظر گئی۔ کلاک کے ڈائل پر ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے کم از کم آٹھ گھنٹے کی نیند لی تھی۔ اگرچہ یہ جمع شدہ نیند کا ازالہ تو نہیں تھا تاہم اس بھرپور نیند کے بعد میں خود کو ہلکا پھلکا اور فریش محسوس کر رہا تھا۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور بیڈ سے اترنے لگا تو مجھے اپنے پاؤں کے قریب مخملیں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ نیچے فرش پر، میرے پاؤں کے پاس ڈارلنگ موجود تھی۔ وہ گویا سلیپرز سے لگی بیٹھی میرے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے گداز لمس نے میرے وجود میں گدگدی جگا دی۔ میں نے جھک کر ڈارلنگ کو بازوؤں میں اٹھایا پھر گود میں لے کر پیار کیا۔ میرا شفقت بھرا ہاتھ اس کے بدن پر مخصوص حرکت کرنے لگا تو وہ آنکھیں موند کر شانت ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اسے فرش پر چھوڑ دیا۔

وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے بیڈ روم کے داخلی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے اس کی فطری ضروریات کا احساس کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا، وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔ میں دروازہ کھلا چھوڑ کر واش روم میں گھس گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں فریش اپ ہو کر واش روم سے نکلا تو فرید پاشا بیڈ روم میں موجود تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ فراخ دلی سے مسکرایا اور دوستانہ انداز میں بولا۔

"وجدان! اگرچہ صبح کو گزرے ہوئے کافی وقت بیت گیا ہے مگر پھر بھی میں یہی کہوں گا، گڈ مارننگ!"

"مارننگ پاشا صاحب!" میں نے جواباً کہا۔

"تمہارے چہرے سے لگتا ہے، نیند اور تھکن کو تم کہیں دور دھکیل آئے ہو۔"

"کوشش تو یہی کی ہے۔" میں نے کہا پھر رسمی انداز میں پوچھا "کیا خبریں ہیں؟"

"خبریں خاصی گرما گرم ہیں۔" وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "آپ کا انداز بتا رہا ہے، آپ کے پاس میرے لیے کوئی خاص خبر ہے۔"

"خبر نہیں، خبریں ہیں۔" وہ ہیجان خیز لہجے میں بولا "تم نیچے چلو، پھر پتا چلے گا، کیسی کیسی خبر تمہاری منتظر بیٹھی ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے جلدی سے اضافہ کیا "اور ہاں، وہ تمہاری لاڈلی بلی بھی مجھے تھوڑی دیر پہلے نظر آئی تھی۔ میں نے اسے دیوار پھلانگ کر باہر جاتے دیکھا ہے۔"

"ڈارلنگ نے رات میرے ساتھ بیڈ روم میں گزاری ہے۔" میں نے شوز پہنتے ہوئے سرسری انداز میں کہا "وہ رات جیسے اچانک غائب ہوئی تھی ویسے ہی ظاہر ہو گئی۔"

"وجدان! تمہاری ڈارلنگ بڑی حیرت انگیز بلی ہے!" فرید پاشا نے کہا۔

میں نے اس کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پوچھا "پاشا صاحب! آپ کی وائف کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ایک دم نارمل۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا "نائلہ بڑی ہمت والی ہے۔ بحرانی صورتِ حال نے اسے وقتی طور پر نروس کر دیا تھا مگر اب سب ٹھیک ہے۔ وہ تمہاری بے حد شکر گزار ہے اور ڈائننگ ٹیبل پر تمہارا انتظار کرنے والوں میں وہ بھی شامل ہے۔"

"کیا مطلب!" میں اس کی بات سن کر چونکا "کیا کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود ہیں؟"

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ منہ سے کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا۔

میں نے پوچھا "وہاں اور کون کون ہے؟"

"نیچے چل کر خود ہی دیکھ لو یار۔" وہ بے تکلفی سے بولا "اب کیا میں ساری "اسٹوریاں" تمہیں یہیں سنا دوں۔ کچھ باتیں لوکیشن اور سیٹ کے لیے بھی رہنے دو۔"

میں سمجھ گیا وہ مجھے کس قسم کا سرپرائز دینا چاہتا تھا اسی لیے کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے بھی اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی معیت میں زینہ اترتے ہوئے پوچھا "کیا آپ لوگوں نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟"

"یار وجدان! تم بھی بعض اوقات عجیب سوال کرتے ہو۔" پاشا نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "میں میزبان ہیں، مہمان سے پہلے کیسے کھا پی سکتے ہیں؟"

میں نے اس کے مذاق کو مذاق ہی سمجھا اور زیریں منزل پر چلا آیا۔ ڈائننگ روم میں طویل و عریض میز پر انواع و اقسام کی نعمتیں موجود تھیں۔ تھوڑی دیر بعد پاشا کی بیوی نائلہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی رات والے واقعے پر اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

میں نے کہا "بھابی! آپ کے یہ شوہر نام دار پہلے ہی مجھے اس قدر شرمندہ کر چکے ہیں کہ اب مزید شکریے کی گنجائش باقی نہیں۔"

"آپ کو گنجائش نکالنا ہوگی۔" وہ قطعیت سے بولی "میں آپ کا شکریہ ادا کیے بغیر رہ نہیں سکتی۔ آپ یہ شکریہ اپنے دل سے قبول کر لیں۔ دل میں گنجائش ہو تو دنیا جہاں کی چیزیں اس میں سما سکتی ہیں۔ میرا یہ چھوٹا سا شکریہ کیا معنی رکھتا ہے۔"

"آپ نے مجھے لاجواب کر دیا بھابی!" میں نے تہ دل سے کہا "میرے دل میں بے پناہ وسعت ہے۔ میں آپ کے لاکھوں کروڑوں شکریے وصول کرنے کو تیار ہوں۔"

فرید پاشا نے کہا "ایسی باتیں کرنے میں نائلہ کا جواب نہیں۔ یہ بڑی حاضر جواب ہے۔"

"میری نظر میں یہ خود بھی لاجواب ہیں!" میں نے نائلہ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ پتا نہیں، میری تعریف نے کس طور اس پر اثر کیا تھا۔ میں نے فرید پاشا کی طرف رخ پھیرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

"آپ تو کہہ رہے تھے، ڈائننگ ٹیبل پر کچھ اور لوگ بھی میرے منتظر ہیں۔" میں نے استفساریہ انداز میں کہا "مگر یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا۔"

"ابھی نظر آ جائے گا۔ تم ذرا......"

فرید پاشا کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ گھریلو ملازمہ اللہ رکھی دو جانی پہچانی ہستیوں کو لے کر ڈائننگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ صدف اور نادیہ تھیں۔ میں انہیں وہاں دیکھ کر چونکا ضرور مگر اس پر مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی۔ صدف ایسی منہ زور اور تند لڑکی تھی کہ وہ کہیں بھی پہنچ سکتی تھی۔ اللہ رکھی انہیں وہاں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔

ہمارے درمیان "ہیلو ہائے" کا تبادلہ ہوا اور وہ دونوں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئیں۔ فرید پاشا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان! یہ تمہاری دوست صبح سے تین مرتبہ فون کر چکی ہے۔" اس کا اشارہ صدف کی طرف تھا "میں نے ہر بار اسے یہی بتایا کہ تم سو رہے ہو اور یہ واقعہ بھی ہے پھر تھوڑی دیر پہلے یہ اپنی کزن کے ساتھ خود یہاں چلی آئی۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر انتظار کرنے کو کہا کیوں کہ تم اس وقت واش روم میں تھے اور اب۔" اس نے ذرا توقف کر کے ان کی طرف دیکھا اور بولا "تمہارا انتظار کرنے والیاں تمہارے سامنے ہیں لہٰذا ہمیں ناشتا نما لنچ یا لنچ نما ناشتا شروع کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔"

"انکل! ہم بھرپور ناشتا کر کے آئے ہیں۔" صدف نے فرید پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس لیے آپ کے ساتھ صرف چائے چلے گی۔"

میں اس وقت بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ فرید پاشا نے تھوڑی دیر پہلے مجھے وجدان کے نام سے مخاطب کیا تھا گویا، صدف کے یقین کو مزید پختگی حاصل ہو گئی تھی۔ پھر پاشا نے صدف کو میری دوست کہا تھا۔ یہ پٹی یقیناً صدف ہی نے پاشا کو پڑھائی ہوگی۔ پتا نہیں، اس دوران میں اس قیامت لڑکی نے کیا کیا حشر برپا کیے ہوں گے۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پاشا نے کہا۔

"وجدان! تم کہاں گم ہو گئے۔ کھانا شروع کرو۔ کیا لنچ کو ڈنر کے ساتھ ملانے کا پروگرام ہے!"

آدھے گھنٹے بعد ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو چائے کا دور چلا۔ اس دور کے لیے ہمیں نائلہ کے مشورے پر عمل کرنا پڑا۔ اس کی خواہش تھی، ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پئیں۔ اس طرح وہ یہ چاہتی ہوگی، میں آنے والیوں سے زیادہ کھل کر بات کر سکوں گا۔ اس کا ثبوت اس نے اس طرح دیا کہ خود کسی کام کے بہانے غائب ہو گئی۔

چائے کی پیالی خالی کرتے ہی پاشا بھی اٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا "وجدان! تم لوگ گپ شپ لگاؤ، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔ مجھے چند ضروری فون کرنا ہیں۔"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ ہمیں بات چیت کا موقع دینے کے لیے وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ اس کے جاتے ہی صدف میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"وجدان! گزشتہ رات اس کوٹھی میں اتنا بڑا واقعہ پیش آ گیا اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں جب کہ اس واقعے کے کرداروں میں سکندر بھی شامل تھا؟"

میرے سینے سے ایک بوجھل سانس خارج ہوئی ”تو تمہیں سب پتا چل گیا!“

”مجھے فرید انکل نے اس افسوس ناک واقعے کے بارے میں مختصراً بتایا ہے۔“

”انہوں نے تمہیں اور کیا کیا بتایا ہے؟“ میرے انداز میں بیزاری تھی۔

وہ چٹکی لیتے ہوئے بولی ”میں نے جو پوچھا، انہوں نے بتا دیا۔“

یہ خاصی خطرناک صورتِ حال تھی۔ صدف سے مزید گفتگو کرنے سے پہلے پاشا کو چیک کرنا ضروری تھا۔ میں نے صدف کو اپنی سوچ سے آگاہ نہیں ہونے دیا اور اسے باتوں میں لگاتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کا بہانہ سوچنے لگا۔

”ہاں صدف، یہ ایک اتفاق ہی ہے۔“ میں نے کہا ”سکندر، فرید پاشا کا دشمن نکل آیا۔ سکندر کے چچا رانا عظمت سے پاشا کا کوئی تنازع چل رہا ہے۔ نائلہ کا ناکامیاب اغوا اسی زنجیر کی ایک کڑی تھی۔“

پھر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر کیا جیسے اچانک مجھے کوئی نہایت ہی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ میں نے بڑی سرعت سے اٹھتے ہوئے کہا ”ایکسکیوز می! میں ابھی آیا۔“

پھر اس سے پہلے کہ ان دونوں میں سے کوئی مجھ سے سوال کرتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، میں ڈرائنگ روم سے نکل آیا۔ چند لمحات بعد میں فرید پاشا کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

”کیا ہوا وجدان! تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو؟“

”ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے مبہم انداز میں کہا ”آپ نے صدف کو میرے بارے میں کیا بتا دیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہمارے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولا ”کل تم نے، یہاں آنے سے پہلے فون پر مجھے بتایا تھا کہ اپنے خیر خواہ ڈی ایس پی اورنگ زیب خان کی کوٹھی پر ہو اور ڈنر کے بعد آؤ گے پھر رات والے واقعے کے بعد تمہاری زبانی مجھے پتا چلا کہ کل جب تم صدف اور نادیہ کے ساتھ مال روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے تو سکندر سے تمہاری خوب مار اماری ہوئی تھی۔ میں تو یہی سمجھا کہ صدف وغیرہ تمہارے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔“ وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”تمہاری نیند کے دوران میں جب دو تین مرتبہ تمہارے لیے صدف کا فون آیا اور اس نے اپنے تعارف کے ذیل میں بتایا کہ وہ تمہاری دوست ہے تو میں نے اسے تمہاری دوست ہی سمجھا اور اسی حوالے سے، اس کی یہاں آمد پر میں نے انہیں ٹریٹ کیا ہے۔ یہ تو ان سے بات چیت کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ نادیہ، صدف کی کزن اور ڈی ایس پی کی بیٹی ہے۔ ہمارے درمیان اب تک نارمل انداز میں گفتگو ہوئی ہے۔ میں سمجھ نہیں سکا، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”ابھی تک تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی پاشا صاحب!“ میں نے تامل کرتے ہوئے کہا ”لیکن کوئی بھی بڑی گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ آپ یہ بتائیں، نارمل انداز میں آپ لوگوں کے درمیان کس قسم کی باتیں ہوئی ہیں؟ خاص طور پر صدف نے آپ سے اور آپ نے صدف سے کیا کہا ہے؟“

”سچی بات تو یہ ہے کہ مجھ سے صدف ہی نے گفتگو کی ہے۔“ وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ”نادیہ نے تو جیسے اپنے ہونٹوں پر خاموشی سجا رکھی ہے۔ اس کی حیثیت مجھے شامل باجا سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔“ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا ”صدف سے بھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ اس نے فلم انڈسٹری اور گاؤں کا ماحول دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ فلم کی شوٹنگ اور دیہات کے فطری ماحول کو دیکھنے کی شائق ہے اور مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اس سلسلے میں اس سے تعاون کروں۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے پاشا کو دیکھا۔

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا ”میں کیا کہتا وجدان! ظاہر ہے فلم انڈسٹری اور گاؤں دیہات کی سیر میری رسائی میں ہے۔ میں تمہاری دوست کو کیسے انکار کر سکتا تھا۔ میں نے صدف سے وعدہ کیا ہے، اس کی خواہش پوری کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا؟“

میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ”آپ نے اسے یہ تو نہیں بتایا کہ میں کل ”رکھاں والی“ روانہ ہونے والا ہوں، میرا مطلب ہے، میں آپ کے گاؤں بے پور جانے والا ہوں؟“

”نہیں، ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔“ وہ قطعیت سے بولا پھر پوچھا ”وجدان! میں ابھی تک تمہاری اور صدف کی دوستی کو کسی مروج خانے میں فٹ نہیں کر پایا ہوں۔ تمہاری حالیہ پوچھ تاچھ سے اندازہ ہوتا ہے، تم صدف پر زیادہ بھروسا نہیں کرتے؟“

”پاشا صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود ابھی تک صدف کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”اس کی حیثیت میرے ایک دوست کی سی ہے لیکن میں اپنے نجی معاملات اس سے شیئر نہیں کر سکتا۔ ہماری ملاقات کو چند روز سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میں نہیں چاہتا، اسے ساحل یا ”رکھاں والی“ کے معاملات کی بھنک بھی پڑے۔“

”تم اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ وجدان!“ پاشا نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ”تم ان دونوں سے نمٹ کر فارغ ہو جاؤ پھر تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

میں نے ”ضروری باتوں“ کے ذکر پر چونک کر فرید پاشا کو دیکھا، وہ میری سوالیہ نظر کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔

”ان باتوں کا تعلق سیکیورٹی گارڈ خادم حسین اور چوہدری نوازش علی سے ہے۔“

”سیکیورٹی گارڈ اور چوہدری میں کیا تعلق ہو سکتا ہے!“

”ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”میرے پاس، تمہارے لیے ان دونوں سے متعلق کچھ اہم اطلاعات ہیں۔“

میں فرید پاشا کے پاس سے دوبارہ ڈرائنگ روم میں آنے لگا تو ایک خیال کے تحت میں نے پاشا سے کہا ”اگر کل میرا یہاں سے روانہ ہونا یقینی ہو جاتا ہے تو میرے جانے کے بعد صدف آپ کے کان اور دماغ کھائے گی لیکن آپ کسی بھی صورت اسے میرے پروگرام اور عزائم کے بارے میں نہیں بتائیں گے البتہ اگر ممکن ہو تو اسے ایک آدھ فلم کی شوٹنگ دکھانے ضرور لے جائیں۔“

”میں نے کہا نا، تم ان معاملات کو مجھ پر چھوڑ دو۔ میں صدف سے ہونے والی مختصر گفتگو سے اس کے ”منصوبہ جات“ کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ یار! میں ایک کامیاب فلم پروڈیوسر ہوں۔ اعلیٰ کوالٹی کے اداکاروں سے دن رات میرا واسطہ رہتا ہے۔ میں نے فن کاروں کے کون کون سے رنگ ڈھنگ نہیں دیکھے۔ طرح طرح کی کہانیاں اور ان کہانیوں میں آنے والے پیچیدہ پوشیدہ موڑوں پر میری نگاہ رہتی ہے۔ میں ایک چاول کو دیکھ کر دیگ کا حال بتا سکتا ہوں۔ تمہاری کہانی کے تمام گوشے بھی مجھ پر آشکار ہو چکے ہیں۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ اس کے دیکھنے میں بڑی خطرناکی پنہاں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی نظر سے میرے دل و دماغ کی اسکیننگ کر رہا ہو۔

میں نے محتاط انداز میں دریافت کیا ”مثلاً کون سے گوشے؟“

”گھبرا گئے!“ وہ میری حالت کے پیشِ نظر ایک نپا تلا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا ”یار! تمہارا معاملہ تو کھلی کتاب کے مانند ہے۔ یہ ایک ہیرو اور دو ہیروئن کی کہانی ہے۔ ہیرو ایک ہیروئن کی تلاش میں دنیا جہاں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے جب کہ دوسری ہیروئن اس کی توجہ حاصل کرنے اور اس کے دل تک رسائی پانے کے لیے اس کا سایہ بننے کی کوشش میں ہے۔ ہیرو جسے چاہتا ہے، وہ اس سے دور ہے اور جو ہیرو کو چاہتی ہے، ہیرو اس سے دور بھاگتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

اس کے سوال میں بڑی شدت تھی۔ میں مکمل طور پر انکار نہ کر سکا اس لیے صرف اتنا کہا۔ ”پاشا صاحب! آپ کا خیال بڑی حد تک درست ہے مگر میں کسی فلمی سچویشن میں نہیں پڑنا چاہتا میرے پاس اتنی فرصت نہیں۔“

”مگر لگتا ہے، صدف کے پاس بہت فرصت ہے۔“

”یہ اس کا پاگل پن ہے۔“ میں نے زور دے کر کہا ”وہ ایک بے وقوف اور سر کی ہوئی لڑکی ہے۔“ پتا نہیں کیوں، میں صدف کے لیے اس وقت خاصے سخت الفاظ استعمال کر بیٹھا تھا۔ میں نے پاشا کو بتایا ”صدف میڈیکل کے فائنل ائیر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کے امتحانات ہونے والے ہیں اور اس جنونی لڑکی کو اس نازک موقع پر مہم جوئی کی سوجھی ہے۔“

پاشا زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا ”وجدان! دل کے معاملات میں انسان کو بہت دور کی سوجھتی ہے۔ اہم اور غیر اہم کے لیے اس کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کر سکتا ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد تنبیہی انداز میں بولا ”نوٹ کر لو وجدان! آگے چل کر یہ لڑکی تمہاری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرے گی!“

”کیا آپ نے اس کا زائچہ کھینچا ہے یا اس کے ستاروں کی چالیں ناپ کر بتا رہے ہیں؟“ میں نے نیم مزاحیہ انداز میں کہا۔

وہ بڑے پرمعنی انداز میں نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”وجدان! میں کوئی نجومی یا دست شناس نہیں بلکہ میں تو صرف مردم شناس ہوں اور یہ بات میں اپنے تجربے اور صدف کے تیور دیکھنے کے بعد کہہ رہا ہوں۔ اگر مجھے موقع ملا تو

میں اس کہانی پر ایک سپرہٹ فلم ضرور بناؤں گا۔"

"آپ تو ہر بات میں فلم کو لے کر آ جاتے ہیں!" میں نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا "یار! میں فلم والا ہوں۔ میرے دن رات اسٹوڈیو میں گزرتے ہیں۔ میں اپنے پروفیشن سے باہر کیسے آ سکتا ہوں۔ یہ تو میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔" تھوڑی دیر رک کر وہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا "تم دیکھ لینا وجدان! میرا تجربہ اور مشاہدہ سچ ہو کر رہے گا۔"

میں فرید پاشا کے پاس سے اٹھ کر صدف اور نادیہ کے پاس آ گیا۔ صدف جھٹ سے بولی "تم اچھے شریف آدمی ہو۔ ہم یہاں تمہارے انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور تمہاری کچھ خبر نہیں۔ تم تو "میں ابھی آیا" کہہ کر گئے تھے اور پورے بیس منٹ بعد لوٹے ہو۔ کیا کوٹھی سے باہر کہیں چلے گئے تھے؟"

"ایسا ہی سمجھ لو۔" میں نے جان چھڑانے کی غرض سے کہا "خیر، تم بتاؤ۔ کیسے آنا ہوا؟"

"کیا تم سے ملنے کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری ہے؟" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

نادیہ نے کہا "وجدان! یہ صبح ہی سے ادھر آنے کی ضد کر رہی تھی۔ میرے مشورے پر اس نے پہلے تمہیں فون کرنے کی کوشش کی۔ جب دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد تم سے رابطہ نہ ہو سکا تو ہم یہاں چلے آئے۔ اب تم خود ہی اس سے پوچھ لو، یہ تم سے کیا چاہتی ہے!"

نادیہ کا آخری جملہ بڑا خطرناک تھا۔ میں صدف سے یہ پوچھنے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ اس نے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک مجھے قدم قدم پر گڑبڑایا تھا اور...... فرید پاشا کی پیش گوئی نے تو میرے کان یک بہ یک کھڑے کر دیے تھے۔

میں نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے عام سے لہجے میں کہا "یہ اپنی زبان ہی سے بتا دے تو اچھا ہے۔ میں نے اگر کچھ کہا تو پھر وجیہ اور وجدان کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔"

"وہ جھگڑا تو نمٹ گیا وجدان!" صدف نے بڑے تفاخر سے کہا "تمہارے وجدان ہونے میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ وہی وجدان جو پنک سٹی واقع جے پور (انڈیا) میں پنڈتوں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا رہا ہے۔"

"پھر کیا مسئلہ ہے؟" میں نے جلدی سے کہا "وجیہ اور وجدان پر تمہارا تھیسس مکمل ہو گیا۔ ٹائیں ٹائیں فش۔ اب میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟"

وہ جواب دینے کے بجائے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھ رہی۔ اس کے انداز نے مجھے ایک بے نام سی جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ نادیہ نے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"وجدان! بات دراصل یہ ہے کہ جب سے صدف نے فرید انکل کے بارے میں سنا ہے، اسے ایک ضدی ہو گئی ہے اور تم تو جانتے ہو، یہ کتنی ضدی ہے!"

میں نے حیرت آمیز نظر سے صدف کو دیکھا "کس قسم کی ضد؟"

وہ اب بھی خاموش رہی، نادیہ نے کہا "اس بات کی ضد کہ یہ فلم کی شوٹنگ اور خالص دیہاتی ماحول دیکھے بغیر واپس کراچی نہیں جائے گی۔"

"یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے اتنی بے تابی کا مظاہرہ کیا جائے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا "میں پاشا صاحب سے سفارش کر دوں گا۔ وہ اسے کسی سیٹ پر لے جا کر فلم کی شوٹنگ دکھا دیں گے، اسی طرح ان کے گاؤں جانے کا پروگرام بھی بنایا جا سکتا ہے۔"

صدف بڑی مکاری اور خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔ اس مرتبہ نادیہ نے بولنے میں کچھ تاخیر کی تو صدف کو لب کشائی کرنا پڑی۔

"وجدان! میں نے تو فلم کی شوٹنگ اور دیہاتی ماحول دیکھنے کا ارادہ تمہاری وجہ سے باندھا تھا۔ اب تم یہ کیا بے رخی کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ تم نے تو کہا تھا، تم اسی مقصد سے لاہور فرید انکل کے پاس آئے ہو۔"

"میں نے غلط نہیں کہا تھا۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

وہ بولی "اگر واقعی تم نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تو ہم اپنے یہ دونوں شوق پورے کرنے کے لیے کوئی مشترکہ پروگرام بنا سکتے ہیں۔" وہ ایک لمحے کا توقف کر کے شکایتی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگی "مگر تمہاری باتوں سے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھے دودھ کی مکھی سمجھ رہے ہو اور فرید انکل سے سفارش کر کے مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہو۔ تم میرے ساتھ کہیں نہیں جانا چاہتے۔"

میں نے اس کی شرارت آمیز بلکہ شر انگیز باتوں کو توجہ سے سنا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "دیکھو صدف! میں تمہیں دودھ کی مکھی سمجھتا ہوں اور نہ کباب کی ہڈی۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا، کسی کے ساتھ بھی کوئی مشترکہ پروگرام نہیں بنا سکتا۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ پتا نہیں ہوتا۔ میرے شام وسحر کب، کہاں اور کس طرح

بسر ہوں گے۔ تم خواہ مخواہ کی ضد سے باز آ جاؤ۔ اگر تم محض کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنا چاہتی ہو یا کسی دیہات میں جا کر واقعی کسی فطری ماحول کا نظارہ کرنا چاہتی ہو تو میں اس کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ بولو، کیا کہتی ہو؟"

اس نے مجھے گہری اور والہانہ نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو، چھوڑو گی نہیں! پھر زبان سے شکست خوردگی کی اداکاری کرتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے وجدان! تم میری ان دو خواہشات کی تکمیل کے لیے فرید انکل سے سفارش کر دو، میں اس سلسلے میں تمہیں تنگ نہیں کروں گی البتہ!"

اس نے رک کر بڑی معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ میں سمجھ گیا، وہ کسی خاص قسم کی عیاری کے لیے پر تول رہی ہے۔ تھوڑے توقف کے بعد اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"البتہ، ایک معاملے میں تمہیں مجھ سے تعاون کرنا ہو گا...... شخصی تعاون!"

"شخصی تعاون!" میں نے چونک کر اسے دیکھا "یہ کس قسم کا تعاون ہوتا ہے؟"

اس نے مدبرانہ انداز میں بتایا "شخصی تعاون سے میری مراد ہے، ذاتی تعاون۔ میں ایک معاملے میں تم سے ذاتی طور پر مدد چاہتی ہوں۔ تمہاری انوالومنٹ کے بغیر وہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔"

"تمہیں ایسا کون سا مسئلہ درپیش ہے؟" میں نے الجھن زدہ انداز میں دریافت کیا۔

وہ بولی "میں تم سے کنگ فو (Kung-Fu) کی کچھ ٹیکنیکس سیکھنا چاہتی ہوں۔ تم خود ہی بتاؤ، گہری انوالومنٹ کے بغیر یہ ممکن ہے!"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا۔ "ابھی تو میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھا لیا ہے لہٰذا کسی قسم کی ایکسرسائز یا مشق کرنا مناسب نہیں۔ ایسا کرو، تم شام میں آ جاؤ۔ تم جو سیکھنا چاہو گی، میں تمہیں بریف کر دوں گا۔ اور کوئی بات؟"

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "ایسا کیوں نہ کریں کہ تم ہماری طرف آ جاؤ۔ ماموں کے گھر کے نزدیک ہی ایک خوبصورت پارک ہے۔ میں جب بھی لاہور آتی ہوں، جاگنگ اور واکنگ کے لیے اس پارک میں ضرور جاتی ہوں "ریس کورس پارک" کا نظارہ تمہارے لیے یادگار ثابت ہو گا۔"

میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا "ٹھیک ہے، میں شام میں فون کر کے تمہیں اپنے پروگرام سے آگاہ کر دوں گا۔ اگر اور کوئی مصروفیت نہ ہوئی تو ہم پارک میں ملیں گے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہو گئی۔ میں اٹھ کر فرید پاشا کے پاس آ گیا۔

ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو صدف کے بارے میں ہوئی پھر میں نے پاشا کو یاد دلایا کہ وہ مجھے چند اہم باتیں بتانے والا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں یار! پہلی بات تو میں تمہیں خادم حسین کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں ایک اہم فیصلہ کیا ہے۔"

میں کوئی سوال کیے بغیر استفساریہ نظر سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ خادم حسین میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ میں نے گزشتہ رات کے واقعے پر بہت غور کیا ہے۔ تمہارا کہنا بالکل درست ہے آج میں اس کی چھٹی کر رہا ہوں۔ میں نے خادم حسین کی جگہ ایک دوسرے سیکیورٹی گارڈ کا انتظام کر لیا ہے۔"

"کیا خادم حسین کو یونہی سوکھا سوکھا جانے دیں گے؟"

"کیا مطلب وجدان؟"

میں نے کہا "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی پاشا صاحب! ایک شخص کی غداری اور نمک حرامی کے سبب آپ بہت بڑا نقصان اٹھانے والے تھے۔ اگر میں بروقت مداخلت نہ کرتا تو وہ کچھ ہو جاتا جس کے لیے آپ کسی دوسرے کو تو کیا، شاید خود کو بھی کبھی معاف نہ کرتے۔ اس ناکامیاب واردات کی راہ ہموار کرنے والے کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال میں خادم حسین کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملنا چاہیے مگر اقرار جرم کے بعد!"

وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر مشورہ طلب انداز میں بولا "اس سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"یہ سلسلہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔" میں نے کہا "میں چٹکی بجاتے میں اس کی زبان کھلوا لوں گا۔ آپ یہ بتائیں، اس کوٹھی میں کوئی تہ خانہ وغیرہ بھی ہے؟ کوئی ایسی جگہ جہاں پیدا ہونے والا شور شرابا ایک محدود اور مخصوص جگہ سے باہر نہ آ سکے؟"

اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا "وجدان! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"آپ فکرمند نہ ہوں پاشا صاحب!" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ صرف یہ بتائیں، آپ مجھے میرا مطلوبہ مقام مہیا کر سکتے ہیں؟"

''ہاں، ایسی جگہ کا بندوبست ہو جائے گا۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا ''مگر......''

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''پاشا صاحب! اس سلسلے میں آپ اپنے ذہن کو نہ الجھائیں۔ انشاءاللہ آج کی رات خادم حسین کا بھید آپ پر عیاں ہو جائے گا۔''

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے پوچھا ''رات آپ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی نوید پاشا سے فون پر بات کریں گے۔ افراتفری میں، میں تو اس بارے میں آپ سے پوچھنا ہی بھول گیا۔ جب تک مجھے ''رکھاں والی'' کی خیر خبر نہیں مل جاتی، میں آئندہ کا لائحہ عمل نہیں بنا سکتا۔ کل ''سید پور'' روانگی بھی اس سے مشروط ہے؟''

''یار! اصل میں تو میں تمہیں نوید ہی کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔'' فرید پاشا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ''خادم حسین کا ذکر ضمناً آ گیا۔ میں نے رات تمہیں ''شب بخیر'' کہنے کے بعد سید پور فون کیا تھا۔ نوید سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ آج دو بجے کے بعد وہ مجھے فون کر کے تازہ ترین اطلاعات فراہم کرے گا۔ اس کے بعد ہم کوئی عملی اقدام اٹھانے کے بارے میں شیڈول بنائیں گے۔''

میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا ''سوا دو تو بج رہے ہیں۔''

''نوید نے دو اور تین کے درمیان فون کرنے کو کہا تھا۔''

فرید پاشا کی بات ختم ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ تیسری گھنٹی پر پاشا نے ریسیور اٹھا لیا ''ہیلو'' کے جواب اور تبادلے کے بعد تھوڑی سی رسمی علیک سلیک ہوئی پھر پاشا نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھے بتایا ''نوید کا فون ہے۔'' اس کے بعد وہ دوسری جانب گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

میں پاشا کے سامنے بیٹھا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی یک طرفہ گفتگو بھی میری سماعت تک پہنچتی رہی۔ چند لمحات کے بعد پاشا نے ایک مرتبہ پھر ماؤتھ پیس کو ہاتھ سے ڈھانپا اور مجھ سے استفسار کیا۔

''وجدان! کل دوپہر کو رکھاں والی، چوہدری نوازش علی کی حویلی میں ایک غیر ملکی لڑکی کو پہنچایا گیا ہے۔ چوہدری کا بیٹا فیصل بھی اس کے ساتھ ہی پہنچا ہے۔ نوید کی اطلاعات کے مطابق، اس لڑکی کا تعلق چائنا یا تھائی لینڈ سے ہو سکتا ہے۔ مگر تم تو کہہ رہے تھے، تمہاری ساتھی کا نام ساحل ہے۔ کیا ساحل کو......''

میں نے اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اضطراری انداز میں کہا ''ہاں، وہی لڑکی میری ساحل ہے۔''

پاشا نے پوچھا ''کیا ساحل کا تعلق پاکستان سے نہیں؟''

''اس کا تعلق درحقیقت نیپال کے ایک گاؤں سے ہے۔'' میں نے بتایا ''مجھ سے وابستہ ہونے سے قبل اس کا نام دھنو تھا۔ میں نے اس کا نام تبدیل کر کے دھنو سے ساحل کر دیا۔ وہ اپنے نقش و نگار سے تھائی یا چینی لگتی ہے۔''

ساحل کے سراغ نے مجھے یکدم بے کل کر دیا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا، ساحل کو چوہدری نوازش علی کی حویلی میں پہنچایا جائے گا۔ اب نوید کی فراہم کردہ اطلاع کے بعد یہ عین الیقین کے درجے کو پہنچ گیا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں پہلی فرصت میں اڑ کر ساحل تک پہنچ جاتا۔

مجھ سے تصدیق کے بعد پاشا اپنے چھوٹے بھائی سے ٹیلی فونک بات چیت میں مصروف ہو گیا تھا۔ لگ بھگ پانچ منٹ کی مزید گفت و شنید کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے کہا۔

''وجدان! نوید آج رات کسی وقت یہاں پہنچ رہا ہے۔ کل صبح تم اس کے ساتھ سید پور روانہ ہو جانا۔ آج رات ہم تینوں مل کر بھرپور میٹنگ کریں گے۔ اگر میری ضرورت ہوئی تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

میں نے کہا ''ساحل چوہدری کی حویلی میں پہنچ گئی ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ اس تصدیق کے بعد میری منزل کا تعین ہو گیا۔ میرا خیال ہے، آپ کو ہمارے ساتھ جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ویسے بھی آپ کی یہاں موجودگی زیادہ ضروری ہے۔ نائلہ بھابی ذہنی طور پر منتشر ہو گئی ہے۔ گزشتہ رات والے واقعے نے اسے اچھا خاصا متاثر کیا ہے۔ اگرچہ وہ خود کو بہت سنبھلا ہوا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں، وہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ پوری طرح سنبھلنے میں بھابی کو کچھ وقت لگے گا۔''

''ہاں، وجدان! میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ویسے اگر مجھے تمہارے ساتھ سید پور جانا پڑا تو میں نائلہ کو بھی اپنے ہمراہ لے کر جاؤں گا۔ اسے کسی بھی قیمت پر یہاں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔''

پھر ہمارے درمیان موجودہ صورت حال پر بات چیت ہونے لگی۔ اسی گفتگو کے دوران میں پاشا نے مجھ سے پوچھا ''وجدان! تم چوہدری نوازش کے بیٹے فیصل کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' میں نے جواب دیا ''پچھلے دنوں کراچی میں اس کا تذکرہ سننے میں آیا تھا۔ وہ چوہدری کے ایک خاص کارندے میاں زاہد حسین سے ملنے وہاں گیا تھا۔'' فیصل کے بارے میں مجھے سب سے پہلے ڈیفنس سوسائٹی کے بنگلے ''بی تھرٹی ایٹ'' میں پتا چلا تھا۔ گرے پچارو والے یعقوب عرف تو با کی مرمت کے دوران میں اس نے انکشاف کیا تھا کہ ان دنوں، رکھاں والی سے چوہدری نوازش کا بیٹا فیصل کراچی آیا ہوا ہے۔ ازاں بعد، جب ساحل اور ممتاز کو بہادر آباد چورنگی سے اغوا کیا گیا تو مجھے خبر ملی، اغوا کے بعد اغوا شدگان کو نیپا چورنگی کے نزدیک ایک بنگلے میں پہنچایا جائے گا۔ میں نے جب اس بنگلے کا حدود اربعہ ''ناپنے'' کی کوشش کی تو انکشاف ہوا، وہ لوگ کشمیر روڈ والے ایک بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہیں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا، فیصل اور اس کے حواریوں نے گلشن والے بنگلے میں رات گزاری تھی۔ اس سے زیادہ میں فیصل کے بارے میں اور کچھ نہیں جانتا تھا۔ میاں زاہد حسین کو جہنم رسید کرتے وقت میں یہ نہ پوچھ سکا کہ ساحل کو کن لوگوں کے ہمراہ کراچی سے رکھاں والی روانہ کیا گیا تھا۔ میرا اپنا قیاس تھا، یہ مشن فیصل کی نگرانی میں انجام دیا گیا ہوگا...... اور اب نوید کے فون نے میرے اس قیاس کی تصدیق کر دی تھی۔ فیصل کا ساحل کے ساتھ رکھاں والی پہنچنا ہی ظاہر کرتا ہے، ساحل کو مجھ سے جدا کرنے کی تمام تر ذمہ داری فیصل پر آتی تھی۔

مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر فرید پاشا نے کہا ''اس کا مطلب ہے، تم فیصل کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے جس طرف میرا اشارہ ہے!''

''آپ کا اشارہ کس طرف ہے پاشا صاحب؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تمہارے اس سوال کا جواب میں ضرور دوں گا لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا!'' فرید پاشا نے معنی خیز نظر سے مجھے دیکھا۔

''کیسا وعدہ؟'' میرے لہجے میں الجھن تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، نائلہ نے وہاں آ کر کہا ''اگر آپ لوگ پسند کریں تو چائے کا ایک اور دور چلایا جائے؟''

میں نے کہا ''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو چائے پی ہے۔ فی الحال اس کی طلب نہیں۔''

''یار! تم بھی کمال کرتے ہو۔'' پاشا اپنے مخصوص یارباش انداز میں بولا ''چائے تو ہم نے آدھا گھنٹا پہلے ہی پی تھی۔ کیا وہ اب تک پیٹ میں رکھی ہو گی۔ پانی اور دیگر مشروبات دس پندرہ منٹ بعد معدے سے رخصت ہو جاتے ہیں اس لیے چائے کا دور چلانے میں کوئی حرج نہیں۔''

میں نے زیادہ ضد نہیں کی اور جب نائلہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تو میں نے اپنی تمام تر توجہ پاشا کی جانب مبذول کر دی۔ وہ میری نگاہ میں پوشیدہ سوال کو سمجھتے ہوئے بولا۔

''دیکھو وجدان! ہمارے درمیان قائم ہونے والی رفاقت کو لگ بھگ سترہ گھنٹے گزر گئے ہیں لیکن میں محسوس کر رہا ہوں، تم ابھی تک تکلف سے کام لے رہے ہو!''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا پاشا صاحب!''

''بات یہ ہے وجدان کہ تمہارے منہ سے بار بار ''پاشا صاحب'' کا تکلم مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' فرید پاشا دوستانہ انداز میں بولا ''جب میں تمہیں بے تکلفی سے وجدان کہتا ہوں تو تم بھی مجھے فرید یا فرید پاشا کہہ سکتے ہو۔ یہ ''صاحب'' کا دم چھلا لگانا کیا ضروری ہے؟''

''اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''

''ہاں نا یار!'' وہ خوش دلی سے بولا ''ہمارے درمیان اعتماد اور دوستی کی فضا قائم ہو چکی ہے۔ اگر ہم بے تکلف دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو مخاطب کریں تو زیادہ مزہ آئے گا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے شرارت آمیز انداز میں اضافہ کیا ''اس انداز سے مجھے ایک بڑا فائدہ بھی حاصل ہوگا۔''

میں نے جب اس سے حاصل ہونے والے فائدے کے بارے میں استفسار کیا تو وہ خود ہی بتانے لگا۔

''یار! جب تم مجھے پاشا یا فرید کہہ کر مخاطب کرو گے تو میں سمجھوں گا، تمہارے ہی بیج کا ہوں۔ اس بیج (Badge) میں آتے ہی میری عمر کم از کم آدھی ہو جائے گی۔ خود کو ینگ مین محسوس کرنا بڑا مسرور کن ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے مسٹر پاشا!'' میں نے بے تکلفی سے اسے مخاطب کیا ''میں آئندہ تمہیں خوشی دینے کا کوئی موقع ضائع نہیں کروں گا۔''

''یہ ہوئی نا بات!'' وہ نعرہ لگانے والے انداز میں بولا۔

میں نے کہا ''اب واپس تم وہیں آ جاؤ جہاں سے ہماری گفتگو نے رخ موڑا تھا۔ تم مجھے فیصل کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے!''

''ہاں فیصل۔'' وہ پرمعنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''شاید تمہیں نہیں معلوم، فیصل بھی تمہاری طرح مارشل آرٹسٹ ہے۔''

''مجھے واقعی یہ بات معلوم نہیں۔'' میں نے کہا ''میرے لیے تو یہ خوشی کا مقام ہے کہ میرے دیرینہ دشمن کا بیٹا مارشل آرٹس سے واقف ہے۔ فیصل سے دو دو ہاتھ کرنے میں خوب لطف آئے گا۔''

فرید پاشا نے بتایا ''چوہدری نوازش علی کی صرف دو اولادیں ہیں۔ سولہ سالہ صاعقہ اور اٹھارہ سالہ فیصل۔ فیصل نے یہاں لاہور ہی کے ایک مارشل آرٹ کلب سے یہ فن سیکھا ہے۔ اور بیرونِ ملک بھی جا چکا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ بلیک بیلٹ سیکنڈ ڈان ہے۔''

''ونڈرفل!'' میں نے اپنے وجود میں سنسنی محسوس کرتے ہوئے کہا ''فیصل سے سامنا یقیناً یادگار کی حیثیت حاصل کر لے گا۔ پاشا! تمہارے بیان سے میں نے دو اندازے لگائے ہیں۔ نمبر ایک، تمہارے شہر میں اچھے مارشل آرٹ سینٹرز موجود ہیں۔ نمبر دو، چوہدری نوازش علی کا نیٹ ورک یہاں بھی خاصا فعال ہے!''

بات ختم کرتے ہی مجھے احساس ہو گیا، پاشا کے سامنے نیٹ ورک کا ذکر کرنا مناسب نہیں تھا۔ ابھی تک ہمارے درمیان چوہدری نوازش علی کی اسمگلنگ زیرِ بحث نہیں آئی تھی۔ میری بات کے جواب میں وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ اور بہت ہی محتاط لہجے میں صرف اتنا کہا۔

''تمہارے دونوں اندازے درست ہیں۔''

ہمارے درمیان مزید تھوڑی دیر تک تازہ ترین حالات پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا پھر پاشا نے مجھ سے کہا ''میں آج رات بھی اسٹوڈیو نہیں جا سکوں گا۔ اس لیے بکھرے ہوئے کام کا کوئی بندوبست کرنا ہو گا تاکہ سیٹ پر موجود فلموں کی شوٹنگ متاثر نہ ہو۔ اس لیے میں تم سے دو تین گھنٹے کی رخصت چاہوں گا۔'' پھر اس نے رک کر مجھ سے پوچھا ''تمہارا کیا پروگرام ہے وجدان!''

میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ''میں تھوڑی دیر مزید سونا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میں ایک بھرپور نیند لے چکا ہوں مگر ابھی کسر باقی ہے۔ پتا نہیں، پھر کب سونے کا موقع ملے!''

''اچھی بات ہے۔ تم بالائی منزل والے بیڈروم میں آرام کرو۔'' پاشا نے کہا ''جب تک میں ٹیلی فونک رابطے پر اپنے کام نمٹاتا ہوں۔ تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت محسوس ہو تو بلاتردد اور بلاتکلف کوٹھی کے ملازمین کو حکم دینا۔''

میں پاشا کے پاس سے اٹھ کر اوپری خواب گاہ میں آ گیا۔ میں عام طور پر دن میں سونے کا عادی نہیں ہوں۔ پاشا سے میں نے سونے کی بات اس لیے کی تھی کہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔ میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر غور کرنا چاہتا تھا۔ فرید پاشا اور نوید پاشا کا تعاون اپنی جگہ لیکن مجھے اپنے لیے ایک لائن آف ایکشن تیار کرنا تھی جو صرف اور صرف مجھ تک محدود رہتی۔ میں اپنی ناواقفیت اور اجنبی ماحول سے آشنائی کے ذیل میں پاشا برادران سے ضرور مدد لیتا مگر ساحل کو چوہدری نوازش علی کے چنگل سے چھڑانا خالصتاً میرا مشن تھا۔ میں اس پروجیکٹ میں کسی اور کا حصہ شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور مجھے اپنے زورِ بازو پر کامل بھروسا تھا!

میں نے بیڈروم میں داخل ہونے کے بعد دروازہ اندر سے بند کر دیا پھر میں جیسے ہی پلٹا، بیڈ پر اداؤں کی دیوی ڈارلنگ کو براجمان پایا۔ جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تھا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی یا تھی تو کسی ایسے زاویے سے فروکش تھی کہ میری نظر اس تک رسائی حاصل نہ کر سکی۔ بہرحال، مجھ سے نگاہ ملتے ہی وہ مخصوص انداز میں مسکرائی اور ''میاؤں'' کی آواز نکالتے ہوئے ایک لمبی جمپ کے ساتھ بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

میں نے دانستہ اسے نظرانداز کیا اور بیڈ کے بجائے ٹیبل چیئر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ سمجھی، میں اسے دبوچنے کے لیے آگے بڑھا ہوں۔ وہ اٹکھیلیوں کے انداز میں اچھل کر مچاتے ہوئے مجھ سے دور چلی گئی۔ میں نے آرام دہ کرسی پر خود کو گرایا اور نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

بند آنکھوں کے پیچھے ساحل کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس وقت ساحل کے چہرے سے واقعی ایک نور سا پھوٹ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے اس شدت سے کسی کو نہیں چاہا ہو گا جتنا میں ساحل کے لیے بے قرار تھا۔ وہ میری رگِ جاں کی حیثیت اختیار کر چکی تھی اور اس نازک ترین رگ پر ایک خون آشام عفریت چوہدری نوازش علی نے اپنے نکیلے دانت گاڑ رکھے تھے۔ مجھے ان سفاک دانتوں کو توڑنا تھا، انہیں جڑ سے اکھاڑنا تھا اور اپنی ساحل کو رہائی دلانا تھی۔ ساحل کی رہائی میں میری بقا تھی۔ پتا نہیں کیوں، میں نہیں جانتا کیوں! ساحل کے بغیر مجھے زندگی کا تصور محال اور ادھورا لگتا تھا۔ ہر انسان اپنی تکمیل چاہتا ہے۔ میں بھی ساحل کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے اتنی شدت سے یاد آ رہی تھی کہ دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں!

چوہدری نوازش بہت ہی کائیاں اور دشمن کمینہ ثابت ہو

رہا تھا۔ میں نے اسے جتنا خبیث اسٹیمیٹ کیا تھا وہ ہزار گنا اس سے بڑھ کر تھا۔ پاکستان میں آمد کے بعد مجھے اس کی طاقت اور اختیار کا صحیح طور پر اندازہ ہو رہا تھا۔ ویسے تو اس نے سنگاپور اور تھائی لینڈ میں بھی مجھے سکون کا سانس نہیں لینے دیا تھا۔ خود در پردہ رہ کر اپنے مہروں کی مدد سے اس نے میری زندگی کو مشکل سے مشکل تر بنانے کی کوشش کی تھی اور میں نے ہمیشہ بڑی چابک دستی سے اس کے مہروں کو پیٹا تھا۔ مگر میرے پاکستان میں آنے کے بعد وہ اچانک حد سے زیادہ گرم ہو گیا تھا۔ تاہم یہاں بھی میں نے اسے اتنی چوٹیں دی تھیں کہ اسے زخم چاٹنے کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا، خاص طور پر میاں زاہد حسین کا حشر کسی عبرتِ نگاہ سے کم نہیں تھا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ پاکستان میں میری آمد کے بعد اس کی یہی کوشش رہی کہ میں اس تک نہ پہنچ سکوں۔ وہ میرے مشن کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا رہا اور میں ایک ایک کر کے ان رکاوٹوں کو صاف کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چوہدری کے اس طرزِ عمل یا پالیسی سے یہ بات صاف واضح ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے خوف زدہ ہے، بے حد خوف زدہ! ایک طرف وہ مجھے خود سے دور رکھنا چاہتا تھا اور دوسری جانب اسے اس دفینے کی بھی تلاش تھی جس کی کنجی میرے پاس تھی۔ وہ دفینہ تو اب اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔ آخری اطلاعات کے مطابق، متروک کنوئیں کا ''قیمتی راز'' یہودی النسل مسٹر نیل آرمر کی نگرانی میں حاصل کر لیا گیا تھا جو بہت جلد شعیب غوری تک پہنچنے والا تھا۔ اور اب تک پہنچایا جا چکا تھا۔ اس خزانے کا ایک حصے دار میں بھی تھا۔ یہ حصہ مجھے ایک ایسے شخص سے وصول کرنا تھا جو دوستی کی آڑ میں دشمنی کا ماہر تھا۔ اس ماہر کی مہارت کو میں ہر ممکنہ مخرج سے خارج کرنے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔

ساحل اور چوہدری نوازش علی کے بارے میں سوچتے ہوئے اچانک رخشِ خیال شعیب غوری کی طرف مڑ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے آستین کے اس سانپ کی ''کارفرمائیاں'' یاد آنے لگیں۔ شعیب کا چہرہ میری نظر میں جس قدر مکروہ شکل اختیار کر چکا تھا اس کے بعد اس کے ساتھ جتنا بھی سفاک سلوک کیا جاتا، کم تھا۔ وہ صرف میرا ہی نہیں، اس قوم، اس ملک اور اس سرزمین کا بھی مجرم تھا۔ ایسے مجرموں کا بڑا بھیانک انجام ہونا چاہیے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھ پر نگاہ گاڑے بیٹھا ہو۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ڈارلنگ بھی مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں اپنے اس اچھوتے احساس کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ ''جی'' کی ایڈوانس مشقوں نے میرے باطنی حواس کو بڑی تیزی سے بیدار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور آئے روز مجھے نت نئے تجربات ہو رہے تھے مگر ان تجربات کو رقم کرنے کی مجھے مہلت نہیں مل رہی تھی۔ زندگی اس قدر مصروف ہو کر رہ گئی تھی کہ اپنے بارے میں سوچنے کے لیے بھی بڑی مشکل سے فرصت ملتی تھی۔

دوبارہ مجھے وہی احساس ہوا تو میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے مجھے اپنے عقب میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس جانب دیوار میں ایک کھڑکی بنی ہوئی تھی جس پر دبیز پردے کھنچے تھے۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ ڈارلنگ مجھے چھیڑنے کے لیے کسی کارروائی میں مصروف ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنا خیال تبدیل کرنا پڑا۔ میں نے اس پردہ دار کھڑکی کے پیچھے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی وہاں سے ہٹ رہا تھا، دور جا رہا تھا۔ وہ انسانی قدموں کی چاپ تھی لہٰذا اس آواز کو ڈارلنگ کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ میرا احساس غلط نہیں ہو سکتا تھا، جس دوران میں ۔۔۔ میں آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھا رہا، کوئی کھڑکی کے پیچھے چھپ کر مجھے دیکھتا رہا تھا۔ میں کھڑکی کے نزدیک آیا تو اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ کھڑکی کے کونے سے ذرا سا پردہ سرکا ہوا تھا جو پہلی نظر میں، دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ اور ...... وہ پردہ دانستہ سرکایا گیا تھا تاکہ کمرے کے اندر مجھے واچ کیا جا سکے اور یہ حرکت کسی بیرونی شخص کی نہیں ہو سکتی تھی!

اس آخری خیال نے مجھے ریڈ الرٹ کر دیا۔ میں تیزی سے سوچتے ہوئے دروازے کے پاس آیا۔ بولٹ کو میں نے آواز پیدا کیے بغیر گرایا اور بہ آہستگی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر کھڑکی کا وہ بیرونی حصہ نظر آ رہا تھا، جہاں چند لمحے پہلے میں نے گڑبڑ محسوس کی تھی۔ مگر اب وہاں کسی گڑبڑ تو کیا، گڑبڑ کرنے والے کے بھی آثار موجود نہیں تھے۔ میں دروازہ بند کر کے بیڈروم میں ٹہلنے لگا اور ٹہلتے ٹہلتے سوچنے لگا، میری خفیہ نگرانی کی ضرورت کسے پیش آ سکتی ہے؟

فرید پاشا اور اس کی بیوی نائلہ کو میں نے فوراً ذہن سے جھٹک دیا۔ ان دونوں سے اس قسم کی حرکت کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد گھریلو ملازمین کی طرف دھیان جاتا تھا جس کے بارے میں سوچتے ہوئے میں سیکیورٹی گارڈ خادم حسین پر اٹک کر رہ گیا۔ گزشتہ رات ہونے والے واقعے کے بعد خادم حسین ہٹ لسٹ پر تھا اور آنے والی رات میں اس کا تیا پانچا ہونے والا تھا۔ میں خادم حسین پر توجہ مرکوز رکھتے

ہوئے، بیڈروم کی بیرونی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ اس کھڑکی سے کوٹھی کا سامنے والا حصہ دور تک نظر آتا تھا۔ میں نے ذرا سا پردہ ہٹایا اور کوٹھی کے داخلی گیٹ پر نظر ڈالی۔ میری سوچ میں چوں کہ خادم حسین تھا اس لیے غیر ارادی طور پر اسے دیکھ رہا تھا۔

گارڈ روم خالی تھا۔ میں محتاط نظر سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگا اور جلد ہی میری مراد بر آئی۔ میں نے سیکیورٹی گارڈ کو کوٹھی کے گیٹ پر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ یقیناً کوٹھی کے اندر سے آیا تھا۔ مستقل طور پر، گیٹ پر متعین رہنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ وہ گیٹ کو چھوڑ کر اگر بن بلائے کہیں گیا تھا تو یہ بات اس کے ذہنی فتور کی نشان دہی کرتی تھی پھر جلد ہی اس فتور کی تصدیق بھی ہوگئی۔

سیکیورٹی گارڈ نے گیٹ سے ملحق، اپنے چھوٹے سے کمرے میں داخل ہونے کے بعد چوکنا نظر سے بالائی منزل کی جانب دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ براہِ راست مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں پردے کی اوٹ میں تھا اس لیے اس کی نظر مجھ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی تھی البتہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے تردد اور الجھن کے آثار دکھائی دیے۔ دو تین مرتبہ اس نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا پھر نگاہ ہٹالی۔

میں خادم حسین کی دروغ گوئی سے اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ نمک حرامی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ پاشا کے دشمنوں سے مل گیا تھا۔ گزشتہ رات والے واقعہ اس کی زندہ مثال تھی۔ پاشا کے دشمنوں کی ناکامی کا سبب میں بنا تھا اور اب خادم حسین چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا، رانا عظمت کی طرف سے اسے میرے لیے کوئی تازہ حکم ملا تھا۔

رانا عظمت کا خیال آتے ہی میں سکندر کے بارے میں سوچنے لگا۔ دو مرتبہ میرا اس سے سامنا ہو چکا تھا اور دونوں ہی بار اسے منہ کی کھانا پڑی تھی۔ وہ یقیناً میرے بارے میں سخت ترین اقدامات کی منصوبہ بندی کر رہا ہوگا۔ وہ ایک طاقتور پی ایم اے لالہ بشیر کا بگڑا ہوا بیٹا تھا، اس سے کسی بھی اوچھی حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی۔

میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک مرتبہ پھر فرید پاشا کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر بھانپ گیا، کوئی گڑبڑ ہے۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔

"وجدان! تم تو آرام کرنے کی غرض سے اوپر گئے تھے مگر تمہاری صورت کسی اندرونی بے آرامی کی نشان دہی کر رہی ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے مختصراً الفاظ میں اسے خادم حسین کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ کیا اور پوچھا "وہ جگہ کہاں ہے جس کا بندوبست کرنے کا تم نے یقین دلایا تھا۔ میں فوری طور پر خادم حسین کو وہاں لے جانا چاہتا ہوں۔ اس بندے کو مزید ڈھیل دینا مناسب نہیں ہوگا۔"

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ یہ تمہارے پیچھے کیوں لگ گیا ہے!"

میں نے کہا "اس کی بہت ہی خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ میں نے دو مرتبہ سکندر کا مشن فیل کیا ہے۔ وہ میری طرف سے بہت ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ حالات سے یہی ظاہر ہوتا ہے خادم حسین تمہارے دشمنوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے اور سکندر بھی انہی میں سے ایک ہے۔ یہ عین ممکن ہے، سکندر نے خادم حسین کو میری نگرانی اور ٹوہ کے سلسلے میں کچھ خصوصی ہدایات جاری کی ہوں!"

"ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔" وہ پرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اب میں خادم حسین کو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے ہو پہلی فرصت میں کر ڈالو۔"

میں نے کہا "یہ ابھی لمحے سے میرے حوالے سمجھو۔ تم نے بتایا تھا، دوسرے سیکیورٹی گارڈ کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں خادم حسین کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں، تم دوسرے گارڈ کو ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا کہہ دو۔" میں نے ذرا توقف کے بعد اضافہ کیا "اس کے ساتھ ہی چند روز کے لیے اپنی حفاظت کے نظام پر گہری نظر رکھو۔ دشمنوں کو اپنی طرف سے کوئی موقع نہ دو۔"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھے اس مقام کا پتا سمجھانے لگا جہاں میں خادم حسین کو "ٹریٹ" کرنے لے جانے والا تھا۔ وہ ایک خالی کوٹھی تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے فرید پاشا کی رہائش ہوا کرتی تھی۔ گلبرگ تھری والی کوٹھی میں منتقل ہونے کے بعد مذکورہ کوٹھی میں تالا لگا دیا گیا تھا۔ پاشا اس کوٹھی کو فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اس کوٹھی میں ایک خفیہ تہ خانہ موجود تھا۔

بات ختم کرنے کے بعد پاشا نے کہا "میں تمہیں اس کوٹھی کی چابیاں دے دیتا ہوں۔ کیا تم اکیلے وہاں پہنچ جاؤ گے؟"

میں نے کہا "کیا خادم حسین نے وہ کوٹھی دیکھ رکھی ہے؟"

"ہاں، یہ ایک دو مرتبہ وہاں گیا ہے۔" پاشا نے کہا "پارٹیوں کو کوٹھی دکھانے کے لیے میں اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے، بات بن گئی۔" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

پاشا نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے بات اس کے پلے نہ پڑی ہو۔ میں نے وضاحتی انداز میں کہا "تم نے خادم حسین کو میرے بارے میں کیا بتایا ہے، میرا مطلب ہے، وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے، خصوصاً میری یہاں آمد اور تم سے ملاقات کے حوالے سے؟"

"اس کے علم میں یہی ہے کہ تم میرے دوست ہو اور کراچی سے آئے ہو۔" پاشا نے بتایا "چند روز تک یہاں قیام کرو گے پھر واپس چلے جاؤ گے۔"

میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "تم خادم حسین کو یہاں بلاؤ۔ اب تمہارا یہ دوست یعنی میں تمہاری سابق کوٹھی کو خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہوں اور خادم حسین مجھے وہ کوٹھی دکھانے اپنے ساتھ لے جائے گا۔"

"گڈ آئیڈیا!" وہ توصیفی انداز میں بولا "وجدان! تمہیں تو اسپائی رائٹر ہونا چاہیے بخدا! اتنی تیزی سے کسی رائٹر کا دماغ ہی سوچ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "دماغ کا تو کام ہی سوچنا ہے۔ یہ مسلسل سوچتا رہتا ہے، اس کی سوچ سے فائدہ اٹھانا ہنرمندی ہے۔ لکھاری حضرات اپنے تخیل کے زور پر اس سوچ کو کاغذ پر منتقل کر دیتے ہیں اور عمل کی ذمے داری دوسری کے کندھوں پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں مگر میں ایک عملی انسان ہوں اس لیے مجھے تم اسپائی رائٹر (Spy Writer) نہ ہی بناؤ تو اچھا ہے پاشا! میں سوچ بچار کے بعد جس نتیجے پر پہنچا ہوں، فوراً اسے اپنے عمل میں لے آتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو یار۔" وہ تبسم ریز لہجے میں بولا "میں ابھی اس مردود خادم حسین کو بلا کر تمہارے ساتھ روانہ کرتا ہوں۔"

خادم حسین کو اپنے پاس بلانے سے قبل فرید پاشا نے مجھے اس تہ خانے کا محلِ وقوع اور اس میں داخلے کے راستے سے تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولا "میرے گیراج میں اس وقت تین گاڑیاں کھڑی ہیں۔ تم جو بھی لے جانا چاہو لے جا سکتے ہو۔"

"میں نے وہ گاڑیاں دیکھی ہیں۔" میں نے کہا "وہ تینوں جدید اور قیمتی گاڑیاں ہیں لیکن ایک بات کی مجھے حیرت ہے۔ تم نے ان گاڑیوں کو ڈرائیو کرنے کے لیے کوئی ڈرائیور وغیرہ نہیں رکھا ہوا۔"

وہ زیرِلب مسکراتے ہوئے بولا "ڈرائیور ہے لیکن آج کل وہ اپنے گاؤں چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ دو تین دن میں واپس آنے والا ہے۔ مشتاق ڈرائیور کی بہن کی شادی ہے۔ وہ تینوں گاڑیوں کو بڑی مہارت سے چلاتا ہے۔ نائلہ کا خیال تھا، ہم دس دن کے لیے کسی اور ڈرائیور کو ارینج کر لیتے ہیں لیکن میں نے یہ مناسب نہ سمجھا، کبھی کبھار خادم حسین بھی ڈرائیور کے فرائض سرانجام دے لیتا ہے مگر اب تو میں اسے کسی گاڑی کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گا۔"

"وہ آج آخری مرتبہ تمہاری گاڑی کو ڈرائیو کرے گا فرید۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا "اس کے بعد تو اسے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ بتاؤ، اس دفعہ خادم حسین سے کون سی گاڑی کی ڈرائیوری کرائی جائے؟"

"میرا خیال ہے، تم نسان لے جاؤ۔" فرید پاشا نے کہا "نسان پٹرول عام طور پر میرے استعمال میں رہتی ہے۔ یہ بڑی قابلِ اعتماد جیپ ہے۔"

نسان پٹرول (Nissan Patrol) کے علاوہ پاشا کے گیراج میں ہونڈا اکارڈ اور ٹویوٹا کرولا گاڑیاں موجود تھیں۔ ان قیمتی گاڑیوں اور عالی شان کوٹھی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، فرید پاشا اپنے شعبے میں کسی کنگ کی طرح ہے۔ پھر اس کے فیملی بیک گراؤنڈ نے بھی اس کی ثروت کو آٹھ چاند لگا رکھے تھے۔ وہ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھا جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں اور ساری زندگی سونے کا تاج پہن کر گزار دیتے ہیں!

☆☆☆

وہ کوٹھی فاضلیہ کالونی اور شاہ جمال کے سنگم پر واقع تھی۔ کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد میں ایسی اداکاری کرتا رہا جیسے کوئی خریدار ہوں۔ تھوڑی دیر تک میں کوٹھی کی ایک ایک چیز کا تنقیدی جائزہ لیتا رہا پھر گھما پھرا کر میں خادم حسین کو اس مقام پر لے آیا جہاں خفیہ تہ خانے کا راستہ تھا۔ ویسے تو وہ پوری کوٹھی ہی میرے مشن کے لیے موزوں تھی۔

"اب ہم اس کے اندر جائیں گے۔" میں نے خادم حسین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بولا "اس کے اندر کیا ہے؟"

میں نے کہا "زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس

دیوار کے پیچھے ایک خفیہ تہ خانے کا راستہ ہے۔ دراصل میں اس تہ خانے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی تہ خانے کی وجہ سے میں یہ کوٹھی خریدنے میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ مجھے کسی ایسی ہی کوٹھی کی تلاش تھی جس میں ایک خفیہ تہ خانہ موجود ہو!"

وہ چند لمحے بے یقینی اور تذبذب کے انداز میں مجھے تکتا رہا پھر الجھن زدہ لہجے میں بولا "جناب! میں اس کوٹھی پر بھی کچھ عرصہ ڈیوٹی دے چکا ہوں۔ آپ جس تہ خانے کا ذکر کر رہے ہیں، میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔"

"ضروری نہیں کہ پاشا تمہیں اپنی ہر بات سے آگاہ کرے۔"

"آپ پاشا صاحب کے دوست ہیں اس لیے میں آپ کی بات کا یقین کر لیتا ہوں۔" وہ تفہیمی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ تہ خانہ میرے لیے کسی انکشاف سے کم نہیں۔"

"چلو، اسے انکشاف ہی سمجھ لو۔" میں نے قدرے سخت کے لہجے میں کہا "مگر سوال و جواب میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"مگر جناب!" وہ سوال کرنے سے باز نہ آیا "ہم اس تہ خانے کے اندر جائیں گے کیسے۔ کیا پاشا صاحب نے آپ کو خفیہ تہ خانے تک رسائی کا طریقہ بتا دیا ہے۔"

"ہاں، بتا دیا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ناقابلِ یقین نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اگلے پانچ منٹ میں ہم اس خفیہ تہ خانے کے اندر پہنچ چکے تھے۔ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ وہاں لائٹ اور وائر کا معقول بندوبست ہے لہٰذا مجھے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس تہ خانے میں پہنچنے کے بعد خادم حسین بوکھلاہٹ کا شکار نظر آنے لگا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ کچھ بدکا ہوا لگ رہا تھا جیسے لاشعوری طور پر اس نے کسی خطرے کی بو سونگھ لی ہو۔

اس نے بغور تہ خانے کا جائزہ لینے کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں کہا "ہم اس تہ خانے کے اندر کیوں آئے ہیں؟"

"اس لیے آئے ہیں!"

جملہ ختم کرتے ہی میں نے اسے ایک زوردار دھکا دیا اور پلٹ کر بڑی سرعت سے تہ خانے کا دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔

وہ میرا غیر متوقع دھکا کھانے کے بعد منہ کے بل تہ خانے کے پختہ فرش پر گرا اور اس کے حلق سے ایک وحشت ناک کراہ برآمد ہوئی لیکن اس کی آہ و بکا اور چیخ و پکار تہ خانے سے باہر جانے والی نہیں تھی، اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہوتا، میں اس سے ایک قدم کی دوری پر پہنچ گیا۔

خادم حسین نے فرش پر پڑے پڑے سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میرے تازہ ترین سلوک سے وہ بھانپ چکا تھا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ چوکنا نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھ بیٹھا۔

"آپ نے مجھے دھکا کیوں دیا؟"

"اس لیے......!"

میرے بھاری بوٹ کی طوفانی ضرب اس کے چہرے پر پڑی تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ پیچھے کو گیا۔ میں نے پھر اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور آگے بڑھ کر ٹھوکروں میں رکھ لیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں مشینی انداز میں حرکت کر رہے تھے، وہ مجھ سے بری طرح پٹنے لگا تو اس کے ذہن میں مدافعت اور جوابی حملے کا خیال آیا۔ شاید صورتِ حال بہت دیر سے اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

اچانک وہ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے ایک نیچی راؤنڈ ہاؤس چلائی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بچا اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑنے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے میں اس کی بانہوں میں جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا چنانچہ اسے اپنی پھیلی ہوئی بانہوں کے ساتھ پیچھے کو الٹنا پڑا۔ میں نے جھکائی دے کر ایک زبردست سوئپ ماری تھی۔

خادم حسین کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ وہ ریٹائرڈ فوجی تھا اس لیے اس کا بدن اور قویٰ تسلی بخش تھے۔ وہ اپنے تئیں ڈٹ کر میرا مقابلہ کر رہا تھا مگر اس کے ڈٹنے کی میرے سامنے پیش نہیں چل رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ منہ کے بل تہ خانے کے پختہ فرش سے ٹکرایا تھا لہٰذا جب وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو اس کی ناک سے خون جاری ہو چکا تھا۔

میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا "خادم حسین! سیکیورٹی و کیورٹی کا کام چھوڑ کر چوڑیاں پہن لو۔ خواہ مخواہ اپنی جان کو عذاب میں کیوں ڈالتے ہو۔ تم تو اپنی حفاظت نہیں کر سکتے، پاشا اور اس کی کوٹھی کی خاک حفاظت کرو گے؟"

اس نے نفرت آمیز انداز میں مجھے دیکھا اور بولا "تمہارا بڑا عبرت ناک حشر ہونے والا ہے وجدان۔ تم کچھ نہیں جانتے، کچھ نہیں جانتے!"

اس کے معنی خیز الفاظ نے مجھے کچھ زیادہ نہیں چونکایا۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا "میں یہی سب کچھ جاننے کے لیے تو تمہیں یہاں لایا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے، تمہارے پاس مفید معلومات کا ایک ذخیرہ جمع ہے۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے اس پر حملہ کر دیا۔ وہ اس وقت ہاتھ کی پشت سے، ناک سے بہنے والے خون کو صاف کر رہا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے کک چلائی، وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا مگر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور ایک زوردار سائیڈ کک مار کر دور پھینک دیا۔

وہ کسی گٹھڑی کے مانند ہوا میں پرواز کرتے ہوئے دیوار سے جا ٹکرایا۔ میں جست بھر کر اس کے سر پر پہنچ گیا اور لات کے سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ بری طرح ہانپنے لگا۔ میرے دھواں دھار پنچ نے اس کے چہرے کی کھال کو جابہ جا ادھیڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ لہولہان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے گریبان کو پکڑ کر ایک زوردار جھٹکا دیا اور وحشت ناک لہجے میں دریافت کیا۔

''اتنا کافی ہے یا میں تمہاری زبان کھلوانے کے لیے اپنے ہاتھ پاؤں کو اور زحمت دوں؟''

''تت...... تم...... مجھ سے...... کیا چاہتے ہو؟'' وہ ہکلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''میں تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''کون سا سچ؟''

''کل رات کو پاشا کی کوٹھی میں جو واقعہ پیش آیا تھا اس کی حقیقت کیا ہے؟''

اس نے گھسا پٹا جواب دیا ''چند غنڈے کوٹھی میں گھس آئے تھے اور انہوں نے نائلہ بی بی کو اغوا کرنے کی کوشش......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک قیامت خیز چانٹا اس کے گال پر جڑ دیا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے گریبان سے پکڑ کر اسے جھنجوڑا اور وحشت ناک انداز میں پوچھا۔

''تم مجھے فرید پاشا نہ سمجھنا جو تمہارے اس بوگس جواب سے مطمئن ہو جائے گا۔ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے، تم اس حقیقت سے باخبر ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس کی آنکھوں میں مجھے خوف کے سائے لہراتے ہوئے نظر آئے۔ جواب دینے سے پہلے وہ تذبذب کا شکار ہو گیا تھا۔ میں نے اس موقع پر اس کی خوفزدگی میں اضافہ کرتے ہوئے تھوڑی سی اور مرمت کر ڈالی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کسی بھی صورت میں اس کی جان چھوڑنے والا نہیں ہوں تو وہ ''تعاون'' کے لیے آمادہ ہو گیا۔ سچ بولنے کی صورت میں، میں نے اس سے جان بخشی کا وعدہ کر لیا۔

خادم حسین نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتایا کہ وہ رانا عظمت کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس کے بیان سے میرے شکوک کی تصدیق ہو گئی تو میں نے پوچھا ''ٹھیک ہے، میں نے مانا اس وقت تم دو افراد کا نمک کھا رہے ہو۔ ایک کا نمک حلال کر رہے ہو اور دوسرے کا حرام۔ ہر دو صورت میں میری نظر میں تم نمک حرام ہی ہو، بہر حال!'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکا پھر خونخوار لہجے میں دریافت کیا ''تم کس کے دوست ہو اور کس کے دشمن، مجھے اس سے غرض نہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم میری ٹوہ میں کیوں لگے ہوئے ہو؟ مجھے پاشا کی کوٹھی میں آئے ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے؟''

وہ سمجھ گیا، میرا اشارہ کس طرف تھا تاہم انجان بنتے ہوئے بولا ''میں نے تمہاری ٹوہ کب لی ہے؟''

''یہاں آنے سے تھوڑی دیر پہلے'' میں نے سفاک لہجے میں کہا ''جب میں پاشا کی کوٹھی کی بالائی منزل کے ایک بیڈ روم میں آرام کر رہا تھا تو تم کھڑکی کے ایک کونے سے مجھے جھانک رہے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور اندھیرے میں تیر چھوڑنا ضروری سمجھا ''میں نے خود تمہیں اوپر سے نیچے جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر اپنے گارڈ روم میں پہنچنے کے بعد بھی تم نے کن انکھیوں سے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ کیا تم میری باتوں کو جھٹلا سکتے ہو؟''

کوئی جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ''جب تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''جو نہیں معلوم، وہ جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا ''تمہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے، یہ بات تو تم ہی بتاؤ گے؟''

وہ شکست خوردہ انداز میں بولا ''مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں، تمہارا اصل دشمن رانا عظمت کا بھتیجا ہے...... لالہ بشیر ایم پی اے کا بیٹا سکندر!'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ''تم نے پچھلے ایک دو دن میں اسے خود اپنا دشمن بنایا ہے۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے تمام تر خدشات صحیح ثابت ہوئے تھے۔ گزشتہ روز میں نے اور صدف نے سکندر کو خاص ذلت اور رسوائی سے دوچار کیا تھا۔ گزشتہ رات بھی وہ میرے ہاتھوں بری طرح پٹا تھا لیکن اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ وہ سکندر ہے البتہ وہ مجھے اچھی طرح پہچان

گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، پاشا کی کوٹھی سے فرار ہونے کے بعد سکندر نے خادم حسین کو میری نگرانی کا فریضہ سونپا تھا۔ یہ بھلے ہے، اسے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں فرید پاشا کے پاس ایک مہمان دوست کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں! اسی تناظر میں، میں نے خادم حسین سے استفسار کیا۔

''کیا آج دن میں کسی وقت سکندر سے تمہاری بات یا ملاقات ہوئی تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں جواب دیا ''ملاقات یا بات تو نہیں ہوئی لیکن اس کا پیغام مجھ تک پہنچا تھا۔ تمہارے بارے میں مجھے خصوصی ہدایات دی گئی تھیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں، تم ویسے ہی ثابت ہو رہے ہو۔''

میں نے پوچھا ''میرے بارے میں تمہیں کس قسم کی ہدایات دی گئی ہیں؟''

''یہی کہ تم ایک خطرناک قسم کے مجرم ہو۔ مسلمانوں والا نام رکھ کر کافروں کے لیے کام کرتے ہو۔ تم چند روز پہلے غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوئے ہو۔ انڈیا کی بدنام زمانہ تنظیم ''را'' سے تمہارا تعلق ہے۔ تم پاشا کے پاس پناہ لے کر کسی خطرناک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس لیے مجھے تم پر کڑی نظر رکھنا چاہیے، اس وقت تک، جب تک تم کوٹھی کے اندر ہو۔ جیسے ہی تم کوٹھی سے باہر نکلو گے، وہ لوگ تمہیں اپنی نگرانی میں لے لیں گے اور میرا خیال ہے، اس کوٹھی سے نکل کر اس کوٹھی تک آنے کے دوران میں ہمارا تعاقب کیا گیا ہے۔''

خادم حسین یہ خوفناک معلومات میری سماعت میں انڈیل کر خاموش ہوا تو میں حیرت اور تشویش کے سمندر میں غوطہ زن ہو چکا تھا۔ سکندر کو میں نے اور مجھے سکندر نے کل زندگی میں پہلی مرتبہ اس ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے اور نہ ہی پہچانتے تھے، دوسری ''ملاقات'' گزشتہ شب سرسری انداز میں ہوئی تھی مگر خادم حسین نے جو تشویش ناک انکشاف کیا تھا وہ مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔

میرے خلاف اسی قسم کا پروپیگنڈا اس وقت کیا گیا تھا جب میں اندرون سندھ سے ہوتے ہوئے کراچی پہنچا تھا تو مجھے ''را'' کا ایجنٹ اور ایک خطرناک مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس کوشش کے پیچھے جہنم مکانی میاں زاہد حسین کا ہاتھ تھا۔ تو کیا...... سکندر بھی کسی طور چوہدری نوازش علی کی مشینری ہی کا کوئی پرزہ ہے؟

یہ سوال بڑی سرعت سے میرے ذہن میں ابھرا تو میری تشویش سوچند ہو گئی۔ اسی وقت مجھے یاد آیا، ایک موقع پر کل صدف نے میرا تعارف کرواتے ہوئے سکندر کے سامنے کہا تھا...... یہ وجدان ہے، میرا کلاس فیلو۔ ہم کراچی سے آئے ہیں۔ اتنے اہم لوگوں کو مصیبتیں کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی!

صدف نے جوش جذبات میں وجدان کی حیثیت سے میرا تعارف تو کروا دیا تھا لیکن اس کی یہ حماقت مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ بعد میں جب میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے حل المشکلات ایک انگلش لفظ ''سوری'' سے کام چلا لیا تھا لیکن موجودہ صورتِ حال بتا رہی تھی، کام چلا نہیں، بلکہ بری طرح بگڑ کر رہ گیا ہے۔

اس موقع پر سکندر کے علاوہ پولیس آفیسر سب انسپکٹر مجیب راٹھور کا بیٹا توصیف، فرقان خان کا سپوت بابر اور مقامی ایس ایچ او کا لڑکا سلیم بھی ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ وجدان کی حیثیت سے میرا تعارف کوئی بھی قیامت ڈھا سکتا تھا۔ یہ تمام افراد سیاسی، مالی اور قانونی طور پر مضبوط پارٹیاں تھیں۔ تازہ ترین حالات کے مطابق، سکندر کا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ جانا یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ چوہدری نوازش علی یا اس کے گماشتوں سے متعلق تھا اور میرے لیے یہ نہایت ہی سنسنی خیز اطلاع تھی۔ حالات کی سنگینی سے اندازہ ہو رہا تھا، چوہدری تک پہنچنے سے پہلے مجھے چوہدری کے بہت سے نمک خواروں کی لاشیں گرانا ہوں گی۔

ایک بات کی مجھے حیرت تھی کہ فرید پاشا سکندر کے اس روپ سے واقف کیوں نہیں تھا۔ اگر وہ چوہدری نوازش علی اور سکندر کے کسی تعلق سے آگاہ ہوتا تو مجھے ضرور بتاتا۔ یہی بات سمجھ میں آتی تھی، ان واہیات حالات سے سکندر کی وابستگی تازہ بہ تازہ تھی!

بالکل یہی بات تھی ورنہ فرید پاشا اس سلسلے میں ضرور مجھے کچھ بتاتا۔ سکندر کل ریسٹورنٹ میں مجھ سے متعارف ہوا اور آج کسی دیرینہ دشمن کے مانند میرے تعاقب میں لگ گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا، چوہدری نوازش علی کے گروپ سے وہ نیا نیا بندھا تھا۔ خادم حسین نے میری جن خطرناک خصوصیات کو گنوایا تھا ان کے پیش نظر مجھے ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ میں دوبارہ سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''خادم حسین! میں تمہاری فراہم کردہ اطلاعات پر یقین کر لیتا ہوں لیکن بعد میں اگر ان میں سے کوئی بھی بات غلط ثابت ہوئی تو تمہارا وہ حشر کروں گا جو دیکھنے والوں کے رونگٹے

بکھرے کر دے گا۔"

وہ سپاٹ آواز میں بولا "میں نے ایک ایک لفظ تمہیں سچ بتایا ہے۔ یقین کرنا یا نہ کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔"

میں نے کہا "تھوڑی دیر پہلے تم نے بڑے وثوق سے کہا ہے، پاشا کی کوٹھی سے نکلنے کے بعد سے یہاں پہنچنے تک ہمارا تعاقب کیا گیا ہے۔ کیا تم تعاقب کرنے والوں کو جانتے ہو؟"

"نہیں، میں انہیں جانتا ہوں اور نہ ہی پہچانتا ہوں۔" وہ قطعیت سے بولا "لیکن میرا خیال ہے، وہ سکندر کے آدمی ہو سکتے ہیں۔"

خادم حسین کے بیان سے ظاہر ہوتا تھا، تعاقب کرنے والوں میں سکندر شامل نہیں تھا۔ یہاں تک آتے ہوئے نسان پیٹرول کو خادم حسین نے ڈرائیو کیا تھا اور وہ اس وقت اس "برائے فروخت کوٹھی" کے اندر کھڑی تھی۔ میں متعاقب افراد کو دیکھ نہیں پایا تھا۔ میں نے خادم حسین سے پوچھا۔

"ہمارا تعاقب کرنے والوں کی تعداد کیا ہے اور انہوں نے ہمارے تعاقب کے لیے کون سی سواری استعمال کی ہے؟"

خادم حسین نے بتایا "وہ تین افراد ہیں۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دو پیچھے ان کے پاس سفید ہائی روف ہے۔ وہ ہمارے پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہوتے ہی پیچھے لگ گئے تھے اور یہاں تک جیسے ہماری دم سے بندھے چلے آئے ہیں۔ میں نے اس کوٹھی میں داخل ہوتے وقت بھی ان کی جھلک دیکھی تھی۔ انہوں نے اپنی ہائی روف کو شاہ جمال روڈ پر ایک ایسی جگہ روکا تھا جہاں سے اس کوٹھی کا گیٹ نظر آتا رہے۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کو رکا پھر مزید کہا "مجھے یقین ہے، وہ اس وقت بھی وہاں موجود ہوں گے۔"

اس کا یقین میرے لیے تشویش کا پیغام بر تھا۔ میں نے گہری نظر سے اسے گھور کر دیکھا اور سخت لہجے میں سوال کیا "جب پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہوتے ہی تمہیں اپنے تعاقب کا احساس ہو گیا تھا تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔" وہ سادگی سے بولا۔

میں نے کہا "اور اگر میں تمہارا یہ "حال" نہ کرتا تو تم اب بھی زبان نہ کھولتے!"

"ظاہر ہے۔" اس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے درشت لہجے میں کہا "جانتے ہو، اس نمک حرامی کے بدلے میں، میں اور پاشا تمہارا کیا حشر کرنے والے ہیں؟"

"مجھے اس کی پروا نہیں۔" وہ بے نیازی سے بولا "میدان جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ کسی ایک پارٹی کا ساتھ دو تو دوسری سے دشمنی کرنا پڑتی ہے...... اور کس کا حشر کیا ہوگا، یہ قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ تم اپنے حشر کے بارے میں پوچھو، مجھے نہیں لگتا کہ تم زندہ بچ سکو، سکندر اور رانا عظمت بہت خطرناک لوگ ہیں۔ لالہ بشیر کی طاقت اور اختیار نے ان کی خطرناکی کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں، وہ تمہاری تلاش اور حصول میں کہاں تک جا سکتے ہیں۔"

میں نے دانت پیستے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا "تم اپنے آقاؤں سے مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کرو۔ اس قسم کے طاقتور غنڈا عناصر میرے بوٹوں کے تسموں سے بندھے رہتے ہیں۔ میں ان کی ساری بدمعاشی اور اکڑفوں ناک کے راستے نکال دوں گا۔"

اس نے میری اس دھمکی کے جواب میں کچھ نہ کہا اور بڑی کینہ توز نظر سے مجھے تکتا رہا۔ وہ شکست خوردگی کی حالت میں تہ خانے کے پختہ اور سیلن زدہ فرش پر بیٹھا تھا اور مجھ سے ہر ممکنہ تعاون کے لیے تیار نظر آتا تھا۔ سکندر اور رانا عظمت کے حوالے سے اس نے مجھے جتنی بھی معلومات فراہم کی تھیں ان سے میں نے اپنے طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ رانا عظمت کی دشمنی سراسر فرید پاشا سے تھی اور وجۂ نزاع نائلہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ گزشتہ رات پاشا کی کوٹھی پر پیش آنے والا واقعہ بھی اسی جانب اشارہ کرتا تھا اور سکندر خم ٹھونک کر خالصتاً میرے مقابلے میں میدان میں اتر آیا تھا اور اس دشمنی کے تعاقب میں اگر بہت دور تک جھانکا جاتا تو اس کھیل کے ڈانڈے چوہدری نوازش علی سے ملتے نظر آتے تھے۔ سکندر حال ہی میں یا پہلے سے چوہدری نوازش علی سے منسلک ہوا تھا۔ میرے لیے یہ بات جاننا بہت ضروری تھا کہ سکندر کا چوہدری سے کس قسم کا تعلق تھا۔ ویسے میرا خیال یہ تھا کہ سکندر کل ریسٹورنٹ میں ہونے والی "ملاقات" سے پہلے مجھ سے واقف نہیں تھا ورنہ صدف کی زبانی میرا نام سنتے ہی وہ چونک اٹھتا۔ اس سے ایک بات واضح ہو گئی کہ وہ تازہ تازہ میری مہماتی زندگی میں وارد ہوا تھا۔

اتمام حجت کے طور پر میں نے خادم حسین سے پوچھا "کیا تم چوہدری نوازش علی کو جانتے ہو؟"

"کون چوہدری نوازش علی؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

اس کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ وہ چوہدری نوازش علی سے واقف نہیں تھا۔ میں متلاشی نظر سے تہ خانے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ خادم حسین سے مزید معلومات حاصل نہیں کی تھیں اور جب تک میں اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرتا، اس کا قید و بند میں رہنا ضروری تھا۔ خادم حسین کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے فرید پاشا سے مشورہ کرنا بھی اہم تھا۔

تھوڑی سی کوشش اور تلاش کے بعد وہیں تہ خانے کی ایک الماری میں مجھے اپنی مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ ایک مضبوط نائیلون کی موٹی ڈوری تھی۔ میں ڈوری کے گچھے کو کھولتے ہوئے خادم حسین کی طرف بڑھا تو اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ وہ سراسیمہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

"تت...... تم...... کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"تمہارا شائی بندوبست۔" میں نے سفاکی سے کہا۔

وہ ہکلایا "مم...... مگر...... تم نے وعدہ کیا تھا، اگر میں تمہارے سوالوں کے ٹھیک ٹھاک جواب دے دوں تو تم میری جان کے دشمن نہیں بنو گے!"

"میں زبان کا دھنی ہوں خادم حسین!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں نے تعاون کی صورت میں تمہیں جان بخشی کا یقین دلایا تھا۔ میں تمہیں جان سے نہیں گزاروں گا بلکہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اسی تہ خانے میں چھوڑ جاؤں گا۔ یہاں تہ خانے میں ہوا اور روشنی کا مناسب گزر ہے، تمہیں کسی قسم کی گھٹن کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور بھوکے پیاسے تم اس وقت تک زندہ رہ سکتے ہو جب تک کاتبِ تقدیر نے تمہاری زندگی لکھ رکھی ہے۔" میں نے تھوڑا سا توقف کرنے کے بعد اضافہ کیا "ویسے، تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد پاشا سے بات کر کے تمہارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ لے لوں گا۔ تمہیں زیادہ دنوں تک اس تہ خانے میں بھوکا پیاسا نہیں رہنا پڑے گا۔"

وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس نے میرے عزائم کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کسی بھی قیمت پر اپنے ارادے سے باز نہیں آؤں گا تاہم مزاحمت کرنا اس کا حق تھا میں نے جب اسے نائیلون کی مضبوط ڈوری سے جکڑنے کی کوشش کی تو اس نے بری طرح ہاتھ پاؤں پھڑکائے۔ اسے قابو کرنے کے لیے مجھے کچھ تادیبی اور مؤثر حربے استعمال کرنا پڑے۔ مزید تھوڑی سی ٹھوکا پٹی کے بعد وہ "نارمل" ہو گیا۔

میں مذکورہ ڈوری کو کھینچ تان کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگا چکا تھا۔ اسے اگر جلایا یا تیز دھار آلے کی مدد سے نہ کاٹا جاتا تو وہ زور آزمائی کے نتیجے میں ٹوٹنے یا کھلنے والی نہیں تھی۔ اگر اس کی گرہوں کو کھولنے یا ڈھیلا کرنے کے لیے زور لگایا جاتا تو وہ مزید بندشی ہو جاتیں۔ گویا ان کی عذاب ناکی میں ستر گنا اضافہ ہو جاتا۔

میں نے خادم حسین کو اوندھا فرش پر گرا دیا اور اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ پہلے میں نے اس کے دونوں بازوؤں کو عقبی جانب موڑ کر کلائی پر کلائی کو کراس کیا اور دونوں کلائیوں کے سنگم کو نائیلون کی ڈوری سے کس کر باندھ دیا۔ اس کے بعد، میں نے اپنا رخ تبدیل کر کے اس کی دونوں ٹانگوں کو گھٹنوں کے جوڑوں سے موڑ لیا اور دونوں پاؤں کو اس کے کولہوں کے نزدیک کراس کر کے ٹخنوں کو بھی اسی طرح مضبوطی سے باندھ دیا جیسے کلائیوں کو باندھا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کی پشت سے اتر آیا اور دونوں بندھے ہوئے مقامات کو ڈوری کے کئی پھیرے دے کر انٹرلنک کر دیا۔ جس طرح تنکوں کی ٹوکری کو اٹھانے کے لیے ہینڈل ہوتا ہے، بالکل اسی شکل کی ایک نائیلونی گرفت تیار ہو گئی تھی۔ کوئی بھی طاقت ور آدمی اس ہینڈل نما گرفت سے سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کو اوپر اٹھا سکتا تھا لیکن میرا آئیڈیا ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کی گرفت کو مزید مضبوط کرنے کے لیے نائیلون کی ڈوری کو پانچ مرتبہ اس کی کمر اور گرفت میں سے گزار کر پیچیدہ گرہیں لگا لیں۔ بچی ہوئی ڈوری کو میں نے دہرا تہرا کر کے قدرے موٹی ڈوری تیار کر لی اور اس موٹی ڈوری کے ایک سرے کو پہلے سے تیار شدہ "گرفت" سے تسلی بخش انداز میں منسلک کرنے کے بعد مجھے کسی کرسی یا میز کی تلاش ہوئی جس پر، خادم حسین کے جکڑے ہوئے جسم کو رکھ کر میں موٹی ڈوری کے دوسرے سرے کو چھت میں نصب کنڈے میں باندھ سکتا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے ایک بوسیدہ میز مل گئی۔ میں نے اس میز کو تہ خانے میں لانے کے بعد عین کنڈے کے نیچے رکھ دیا۔ مذکورہ میز کی چاروں ٹانگوں میں بے حد نحیفی و نزاری پائی جاتی تھی۔ مجھے ایک لمحے کو خدشہ محسوس ہوا کہ میں جیسے ہی خادم حسین کے بندشی بدن کو اس پر رکھوں گا، یہ چاروں پائے چت ہو جائے گی مگر عملاً اس میز نے میرے خدشے کی نفی کر دی۔ پرانے زمانے کی چیزیں اور انسان بے پناہ قوت برداشت کے مالک ہوتے ہیں۔ انسانوں کی خالص اشیا سے کھلائی پلائی ہوتی تھی اور چیزوں کی تیاری میں خالص مال لگایا جاتا تھا۔ وہ بظاہر مخدوش نظر آنے والی میز بہت تسلی بخش اور قابلِ اعتماد ثابت ہوئی۔ اس نے نہ صرف خادم حسین کو بلکہ میرے بوجھ کو بھی نہایت خاموشی سے برداشت کر لیا۔ میں نے نہایت مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موٹی ڈوری کے

آخرالذکر سرے کو چھت والے کنڈے میں مضبوطی سے باندھ دیا۔

میز سے نیچے اترنے کے بعد میں نے خادم حسین کی گردن کو اوپر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ”اللہ حافظ سیکیورٹی گارڈ صاحب! مجھے امید ہے، تم پاشا کے یہاں پہنچنے تک زندہ رہو گے۔ اگر تمہارا اِٹّا بہت کمزور ہے تو زیادہ سے زیادہ تم بے ہوش ہو سکتے ہو۔ اس خیال کو بھی اپنے ذہن سے نہ گزرنے دینا کہ تمہارا کوئی خیر خواہ یہاں آئے گا اور تمہیں بچا کر لے جائے گا۔ اس تہ خانے کا راز صرف دو افراد جانتے ہیں۔ ایک فرید پاشا اور دوسرا میں! میں تمہیں نشانِ عبرت بنا کر یہاں چھوڑے جا رہا ہوں، فرید پاشا جلد یا بدیر تمہاری خیر و عافیت دریافت کرنے آئے گا۔“

میں نے اس کی زبان بندی کرنے کے لیے منہ میں کپڑا وغیرہ ٹھونسنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کیوں کہ اس زیرِ زمین کمرے میں پیدا ہونے والی آوازیں باہر کوٹھی میں یا کوٹھی سے باہر کہیں سنائی نہیں دے سکتی تھیں۔ اپنے منہ کو آزاد پا کر خادم حسین مغلظات پر اتر آیا۔ پہلے وہ مجھے مادر پدر آزاد گالیوں میں تولتا رہا پھر دھمکیاں دینے لگا۔

”وجدان! اچھی طرح سن لو۔ تم اچھا نہیں کر رہے۔ میرے حمایتی مجھے یہاں سے آزاد کرا کر لے جائیں گے پھر تم ان کے بہیمانہ سلوک کا نشانہ بنو گے۔ سکندر اور رانا عظمت کی سفاکی اور درندگی سے تم واقف نہیں ہو، وہ تمہارا حشر خراب کر دیں گے۔“

”نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی“ میں نے زہر خند لہجے میں کہا ”تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ شاید تم نے میری بات کو توجہ سے نہیں سنا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہا ہے، تمہارے حمایتی اس تہ خانے تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔“ میں نے اس کی دھمکی آمیز آواز میں ایک خاص قسم کی جھرجھراہٹ محسوس کی تھی اور اس کی آنکھوں میں بھی سرخی اتر آئی تھی۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا ”ابھی تک تو تم رن دے پر کھڑے ہو۔ تمہاری آواز اور آنکھوں میں خوف و دہشت نے جو تبدیلیاں پیدا کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ٹیک آف کر دو گے تو تمہاری سٹی ہی گم ہو جائے گی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بے پناہ سراسیمہ نظر آنے لگا ”اب تم اس سے زیادہ میرے ساتھ اور کیا کرنا چاہتے ہو؟“

میں نے مضحکہ خیز انداز میں اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کا جائزہ لیا اور سنسنی خیز لہجے میں کہا ”مسٹر خادم حسین عرف خدمت گار! کاش، تم نے اپنے نام ہی کی لاج رکھی ہوتی۔ خادم حسین کا مطلب ہے، حسین کا خادم مگر تم تو رسوائے زمانہ رانا عظمت کے خادم نکلے۔ اس کا نمک حلال کرنے کے لیے تم پاشا سے نمک حرامی پر تیار ہو گئے۔ تمہارا جرم ناقابلِ معافی ہے اور تم مجھ سے پوچھ رہے ہو..... میں اس سے زیادہ تمہارے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ابھی تو تمہاری پرواز یہاں سے روانہ ہو گی جو اس تہ خانے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک سفر کرے گی پھر تمہیں پتا چلے گا، کن تلوں میں کتنا تیل ہے؟“

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے قوت صرف کر کے خادم حسین کے نیچے دبی ہوئی میز کو دھکیلا۔ وہ میز اپنی کہنہ سالی اور مضبوطی کا ثبوت دیتے ہوئے، مختلف قسم کی آوازیں پیدا کرنے کے بعد اس کے بدن کے نیچے سے سرک گئی۔ میز کھسکتے ہی خادم حسین کا مضحکہ خیز انداز میں بندھا ہوا بدن ہوا میں جھولنے لگا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر مار کر میز کو دور پھینک دیا۔

خادم حسین بڑی کسمپرسی کی حالت میں چھت سے لٹکا ہوا میں جھول رہا تھا۔ میں نے اسے ”الوداع“ کہتے ہوئے ایک زوردار دھکا دیا اور تہ خانے کے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

تہ خانے کو چھوڑنے سے پہلے میں نے پلٹ کر خادم حسین کو دیکھا۔ وہ سوزو واٹر پارک لاہور کے ایک جھولے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس فلک بوس جھولے میں، نارنجی لباس والا ایک جن، اسی طرح اپنے پاؤں کو پکڑے اِدھر سے اُدھر جھولتا رہتا ہے جس کی پشت میں تفریح کرنے والوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ ہوتی ہے۔ اسی قسم کی حرکت والا ایک جھولا کشتی کی صورت کلفٹن کے ساحل پر بھی موجود ہے لیکن سوزو (Sozo) واٹر پارک والے جھولے کی اپنی ایک شان ہے۔

جب میں تہ خانے سے نکل کر کوٹھی کے بیرونی حصے میں پہنچا تو میرا دماغ بڑی تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ خادم حسین کے مطابق ایک سفید ہائی روف ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہنچی تھی اور شاہ جمال روڈ پر ایک ایسی جگہ رک گئی تھی جہاں سے اس کوٹھی کے گیٹ پر نگاہ رکھی جا سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جیسے ہی کوٹھی کے گیٹ سے باہر نکلتا، تعاقب کرنے والوں کی نظر میں آ جاتا۔ ابھی تک کوٹھی کی اندرونی فضا میں امن و امان قائم تھا اس کا یہ مقصد نہیں تھا کہ یہ امن ہمیشہ قائم رہے گا۔ وہ لوگ زیادہ انتظار سے اکتا کر کوٹھی کے اندر داخل ہو سکتے تھے۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت کم وقت میں کرنا تھا۔

میں نے اپنی کارروائی کے لیے پندرہ منٹ کا وقت لے

لیا اور دبے قدموں چلتے ہوئے کوٹھی کے عقبی حصے میں آ گیا۔ کوٹھی کی چار دیواری لگ بھگ پانچ فٹ تھی۔ میں نے ایک مناسب جگہ سے عقبی دیوار کو پھلانگا اور کوٹھی سے باہر آ گیا۔ یہ ایک ویران عقبی گلی تھی۔ کسی نے مجھے کوٹھی سے باہر کودتے ہوئے نہیں دیکھا کیوں کہ کسی ذی روح کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں تیز قدموں سے چلتے ہوئے گلی کے سرے پر پہنچا اور گھوم کر سامنے والی سڑک پر آ گیا۔ یہاں سے کوٹھی کا بیرونی گیٹ اور شاہ جمال روڈ واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اس سفید ہائی روف کو دیکھ لیا جو خادم حسین کے قول، ہمارے تعاقب میں وہاں پہنچی تھی۔ میں اس وقت ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ سوزوکی ہائی روف تو مجھے دکھائی دے رہی تھی مگر میں ان لوگوں کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تینوں ابھی تک ہائی روف کے اندر ہی اطمینان سے بیٹھے تھے جس سے لگتا تھا، فی الحال ان کا ریڈ (Raid) کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مجھے اسی موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔

میں محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ایک کولڈ ڈرنکس کی دکان پر پہنچ گیا۔ میں نے دور سے اس دکان پر پبلک کال آفس کا مخصوص بورڈ لٹکا دیکھ لیا تھا۔ کولڈ ڈرنکس کی مذکورہ دکان سفید سوزوکی ہائی روف سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اور اتفاق سے یہ اس کے عقب میں واقع تھی۔

میں جب کولڈ ڈرنکس کی دکان پر پہنچا تو اس وقت ایک شخص فون بند کر کے دکان سے نکل رہا تھا۔ یہ میرے حق میں اچھا ہی ہوا۔ میں نے دکان کے مالک کی اجازت سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور فرید پاشا کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس دوران میں، میں نے خود کو ایک ایسے رخ پر پھیر لیا جہاں سے مجھے سفید ہائی روف اور اس میں موجود تینوں افراد واضح طور پر نظر آتے رہیں۔

تیسری گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا گیا۔ میری سماعت سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اس کی آواز کو پہچان لیا۔ وہ فرید پاشا کی بیوی نائلہ تھی۔ میں نے شائستہ لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو بھابی! کیسی ہیں آپ؟“

وہ چہکی ”اپنے دیور کی دعاؤں کے طفیل بخیریت ہوں، تم کہاں پر ہو؟“

میرے پاس چہکاروں کے تبادلے کا وقت نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے سوال کیا ”پاشا کہاں ہے؟“

نائلہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی تھی کہ فرید پاشا مجھ سے کس نوعیت کا بے تکلف تکلم چاہتا ہے اس لیے وہ میرے طرزِ تخاطب کا برا نہیں مانتی تھی۔ پاشا اسے اپنے چھوٹے چھوٹے معاملات سے آگاہ رکھتا تھا۔ نائلہ کو میری موجودگی میں اس نے بتایا تھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کی بے تکلفی کا خواہاں ہے، جواب میں، میں نے پاشا پر واضح کر دیا تھا کہ میں نائلہ کو آپ جناب ہی سے مخاطب کروں گا۔ میرے اس رویے نے نائلہ کو بہت متاثر کیا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا۔

”وہ واش روم میں ہیں۔ تم ذرا ہولڈ کرو۔ میں...... ٹھہرو، ہولڈ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی ”وہ واش روم سے نکل آئے ہیں اور اسی طرف آ رہے ہیں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد ائرپیس میں مجھے فرید پاشا کی آواز سنائی دی ”ہاں وجدان! اِدھر کیا رہی؟“

اس نے براہِ راست مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا، فون کا ریسیور تھمانے سے قبل نائلہ اسے میرے بارے میں اشارے دے چکی تھی۔ میں نے پاشا کے سوال کے جواب میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔

پوری بات سننے کے بعد اس نے تشویش ناک لہجے میں کہا ”خادم حسین کے ساتھ تو تم نے بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ ایسے نمک حرام اس سے بھی زیادہ بدترین سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔ دو چار دن تک اسے وہیں تہ خانے میں الٹا لٹکا رہنے دو، پھر اس کی خبر لیں گے۔ وہاں چکرانے والی چمگادڑوں کو بھی تو معلوم ہو کہ اللہ نے کیسے کیسے جناور پیدا کیے ہیں“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا ”تم نے تعاقب کرنے والے جن افراد کا ذکر کیا ہے وہ خاصی فکر انگیز صورتِ حال ہے۔ ان حالات میں تمہیں میری مدد کی ضرورت تو ہو گی؟“

”فی الحال مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔“ میں نے نیچی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی میں سفید ہائی روف کو بھی نگاہ میں رکھے ہوئے تھا ”پاشا! میں نے ان تین افراد سے نمٹنے کے لیے ایک شارٹ عمل لائحہ ایکٹ اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے۔ میں ان لوگوں کو کسی طرح گھیر گھار کر کوٹھی میں داخل ہونے پر مجبور کروں گا پھر ان کی اصلیت اور مجھ سے دشمنی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔“

پاشا نے دوستانہ انداز میں کہا ”مجھے یقین ہے، تم ان تینوں پر بھاری پڑو گے لیکن پھر بھی میں یہی مشورہ دوں گا کہ

اگر کسی دنگا فساد کے بغیر وہاں سے نکل کر میرے پاس آ سکتے ہو تو چلے آؤ۔"

"دنگا فساد اور اٹھا پٹخ تو اب بہت ضروری ہو گئی ہے پاشا۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا "مجھے پورا یقین ہے، سکندر کا رابطہ میرے دشمن اول چوہدری نوازش علی کے کسی کارندے سے ہو گیا ہے۔ سفید ہائی روف میں سکندر تو مجھے نظر نہیں آ رہا مگر ان افراد میں سے کسی نہ کسی کی زبان یہ راز ضرور اگل دے گی۔ میں یہ راز جانے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے، تم جو مناسب سمجھتے ہو وہ کرو۔" پاشا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں پورے خلوص سے تمہاری کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ مجھے امید ہے، تم ان لوگوں سے چار چار ہاتھ کر کے بہت جلد میرے پاس آ جاؤ گے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا "بالفرض، اگر میں کسی لمبے چوڑے نٹنے میں الجھ جاتا ہوں اور تمہاری توقع کے مطابق مجھے تمہارے پاس پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے تو میرے بارے میں فکر مند نہ ہونا۔ میں رات کے کسی پہر تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا یا تم سے ٹیلی فونک رابطہ کروں گا۔ تمہاری نسان پٹرول کوٹھی کے اندر محفوظ کھڑی ہے۔ تم جب چاہو، اسے وہاں سے نکال سکتے ہو۔"

"یار! تم نسان کی فکر میں خود کو دبلا مت کرو۔ وہ کہیں نہیں جاتی۔"

"پاشا! وہ ایک نئی نویلی جیپ ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اور لاکھوں کی مالیت ......"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں یار کہا ہے وجدان۔ تم نے مجھے دیکھا ہے، ابھی میری یاری نہیں دیکھی۔ میں اپنے دوستوں کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہوں، چالیس پچاس لاکھ کی جیپ کیا حیثیت رکھتی ہے۔"

"مجھے تمہاری زبان کا اعتبار ہے پاشا۔" میں نے کہا "میں بھی اسی قسم کی دوستی کا قائل ہوں۔ لگتا ہے، ہماری خوب نبھے گی۔"

"انشاء اللہ۔" وہ تہ دل سے بولا۔

غنیمت یہ تھا کہ ہماری اس گفتگو کے دوران میں فون کو استعمال کرنے والا اور کوئی ضرورت مند اس پی سی او پر نہیں آیا حتیٰ کہ کولڈ ڈرنک کا کوئی خریدار بھی ادھر نہیں پھٹکا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا، وہ دکان زیادہ نہیں چلتی تھی جو میرے لیے خاصی سود مند ثابت ہوئی۔

میں نے اس گفتگو کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا "پاشا! تم نے مجھے بتایا تھا، خادم حسین ایک دو مرتبہ تمہارے ساتھ اس کوٹھی پر آیا تھا مگر اس کا کہنا ہے، وہ یہاں باقاعدہ ڈیوٹی کر چکا ہے!"

"اس کا دعویٰ درست ہے۔" پاشا نے تصدیقی انداز میں کہا "خادم حسین کو میں نے اس کوٹھی میں قیام کے بالکل آخری دنوں میں ملازم رکھا تھا پھر ہم گلبرگ تھری والی کوٹھی میں شفٹ ہو گئے تھے۔"

"کیا نیا سیکیورٹی گارڈ ڈیوٹی پر آ گیا؟"

"ہاں، میں نے تمہارے جاتے ہی اسے کال کیا تھا۔" پاشا نے بتایا "وہ آدھے گھنٹے کے اندر یہاں موجود تھا...... اور اس وقت وہ باقاعدہ ڈیوٹی پر ہے۔ عمر دین نامی اس گارڈ کو میں نے ایک پرائیوٹ سیکیورٹی گارڈ کمپنی سے حاصل کیا ہے جو اپنے ملازمین کا باقاعدہ ریکارڈ رکھتی ہے۔ خادم حسین کسی ریفرنس کے بغیر میرے پاس آیا تھا، اس کا کہیں کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ میں نے عمر دین کو یہی بتایا ہے کہ سابق گارڈ کو غیر ذمے دارانہ رویے پر میں نے نوکری سے نکال دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اس طرح نیا گارڈ زیادہ فرض شناسی کا مظاہرہ کرے گا۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی تمہیں اپنی حفاظت کے نظام کو زیادہ مضبوط اور فعال بنانے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ یاد رکھو، اب تمہارا واسطہ بہت ہی خطرناک لوگوں بلکہ مجرموں سے ہے جو سفاکی میں اپنی مثال آپ ہیں۔"

"میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں اس لیے تم بھی میری ایک بات نوٹ کر لو وجدان!" وہ اپنے مخصوص اسٹائل میں بولا۔

اسی وقت پی سی او میں دو افراد داخل ہوئے اور مجھے فون کے ساتھ مصروف دیکھ کر ایک جانب خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھ گیا، وہ میرے ریسیور رکھنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس پی سی او میں صرف ایک ہی فون سیٹ رکھا تھا۔ میں نے پاشا سے بات کے جواب میں کہا۔

"ہاں بولو، میں نوٹ کر رہا ہوں۔" اس مرتبہ میں قدرے بلند آواز سے بولا تھا۔

اس نے کہا "اگر خطرناک مجرموں سے میرا پالا پڑا ہے تو تم جیسا ایک جگری دوست بھی میری فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ میں آج ہی منہاس باقر کو فون کر کے تمہیں یہاں بھیجنے پر اس کا شکریہ ادا کروں گا۔"

اس سے پہلے کہ وہ اس رو میں مزید قدم آگے بڑھاتا، میں نے گفتگو کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے کہا "اچھا، میں فون بند کر رہا ہوں۔ وہ لوگ ہائی روف سے باہر آ رہے ہیں۔"

پھر دوسری طرف کی بات سنے بغیر میں نے "اللہ حافظ" کہہ کر واقعی ریسیور رکھ دیا۔

☆☆☆

قدرت کے کارخانے میں ہر کام کا ایک ایک وقت مقرر ہے۔ کوئی کام اس مقررہ وقت سے پہلے نہیں ہو سکتا، اسی طرح کسی کام میں تاخیر بھی ممکن نہیں۔ بعض عقل کے اندھے، بزعم خود عقل کل قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مستقبل کا حال جانتے ہیں اور آنے والے وقت اور کاموں کے ظہور پذیر ہونے کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ اندازوں اور قیاسات کی بات الگ ہے۔ کبھی کبھار تکے، تیر سے زیادہ سیدھے میں لگتے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ کوئی عامل یا کامل قدرت کے فیصلوں سے قبل از وقت آگاہ ہو جاتا ہے یا ہو سکتا ہے تو اس سے زیادہ جہالت اور حماقت کی بات اور کوئی نہیں ہو گی۔ یہ علیحدہ امر ہے کہ بعض اوقات ہم کوئی بات کہتے ہیں اور وہ اسی وقت ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ کام ہمارے کہنے سے ہوا یا ہم اس کام کے اس وقت ہونے کے بارے میں جانتے تھے۔ ان لمحات میں درحقیقت ہماری آگہی، قدرت کے نظام پر کہیں ٹیون (Tune) ہو جاتی ہے اور قدرت کا کوئی راز ہم پر منکشف ہو جاتا ہے۔ جو خیال کی صورت میں ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور بے اختیار زبان سے پھسل جاتا ہے۔ یہ محض ایک اتفاق ہوتا ہے اور خاصا حسین اتفاق ہوتا ہے جو ہمیں مسرت کے ساتھ ساتھ ایک حیرت سے بھی دوچار کر دیتا ہے۔

میں بھی اس وقت ایک دلچسپ حیرت سے دوچار تھا۔ جیسے ہی میں نے فون پر پاشا سے کہا، وہ لوگ ہائی روف سے باہر آ رہے ہیں...... میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسی لمحے ہائی روف کا دروازہ کھلا اور پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں افراد باہر نکل آئے۔ ڈرائیور البتہ اپنی سیٹ پر موجود رہا۔ میں ان سے اتنے فاصلے پر تھا کہ ان کی باتوں کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یقینی بات ہے، انہوں نے گاڑی سے باہر آنے سے پہلے آپس میں کوئی بات چیت بھی کی ہو گی۔ بہر حال، جیسے ہی میرے ذہن میں ان کے بارے میں خیال ابھرا، وہ گاڑی سے باہر آ گئے تھے۔

میں پچھلے کئی دنوں سے "چی" کی ایڈوانس مشقیں کر رہا تھا۔ جس سے میری باطنی قوتوں میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ ممکن ہے، میری آگہی، چی کی قوت کے طفیل ہی متحرک ہو گئی اور اس کی فعالیت اچانک بڑھ گئی ہو۔ مخصوص اوقات میں انسان کے سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی صلاحیت ویسے بھی بڑھ جاتی ہے۔ چی کی افادیت اور کارفرمائیاں رفتہ رفتہ مجھ پر منکشف ہو رہی تھیں۔

چی (Chi) بہت ہی پراسرار اور حیرت انگیز قوت کا نام ہے۔ یہ پیٹ کے زیریں حصے میں، ناف اور ریڑھ کی ہڈی کے آخری مہرے کے درمیان خوابیدہ حالت میں موجود رہتی ہے۔ اس سے کام لینے کے لیے مخصوص مشقوں کے ذریعے اسے بیدار کیا جاتا ہے اور بڑی مہارت سے اسے قابو میں لا کر بہت سے مفید کام لیے جا سکتے ہیں۔ یہ قوت انسانی جسم میں کسی جنریٹر کے طور پر کام کرتی ہے اور اس کی مدد سے جسم کے تمام نظاموں کو فعال اور زود حس بنایا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ چی کا تلفظ "شی" بھی کرتے ہیں۔

بدھ بھکشوؤں کا ایک راہ نما اور شاؤلن ٹیمپل میں مارشل آرٹس کا بانی "بودھی دھرما" چی کی قوت پر بہت زور دیتا تھا اور اس کی بیداری کے لیے اپنے شاگردوں کو سانس کی مخصوص مشقیں اپنی نگرانی میں کراتا تھا۔ انہی میں سے چند مشقیں ماسٹر ہنگ پائی (Hang Pai) نے مجھے بھی کروائی تھیں اور وہ دوسری ایڈوانس مشقوں کے بارے میں مجھے تفصیلاً بتا دیا تھا جو آج کل میں باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ بودھی دھرما کے مطلب، جس شخص کے جسم کے بالائی حصے میں چی ہو اور سینہ گندی ہوا سے بھرا ہو، اسے نہایت آسانی سے گرایا جا سکتا ہے۔ اس کے بالعکس، وہ شخص جس کا سینہ یعنی پھیپھڑے تازہ ہوا سے بھرے ہوئے ہوں اور چی جسم کے زیریں حصے میں مرتکز ہو، وہ ناقابلِ تسخیر ہو جاتا ہے۔

میں یہی سب سوچتے ہوئے پبلک کال آفس سے باہر نکل آیا۔ اس وقت تک ہائی روف سے باہر آنے والے افراد کوٹھی کی جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔ وہ کوٹھی جو ابھی تک فرید پاشا کی ملکیت تھی اور اس کے ایک خفیہ تہ خانے میں سیکیورٹی گارڈ کسی دھاتی پنڈولم کے مانند ٹو اینڈ فرو (To and Fro) حرکت کر رہا تھا۔ نائیلون کی مضبوط ڈوریوں میں جکڑے ہوئے اس کے بدن کی یہ "آگے پیچھے" حرکت کسی نشانِ عبرت سے کم نہیں تھی۔

میری نگاہ انہی دو افراد پر جمی تھی اور میں دبے قدموں، سفید ہائی روف کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی جب کہ دوسرے نے لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ موسم میں اگرچہ خنکی در آئی تھی مگر ایسی بھی سردی نہیں تھی کہ گرم کپڑوں کا استعمال کی ضرورت پیش آتی۔ گاڑی

میں موجود ڈرائیور نے سلیولیس سوئٹر پہن رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا، انہوں نے اپنے لباسوں میں کسی قسم کے آتشیں ہتھیاروں کو چھپانے کے لیے وہ سوانگ بھرا تھا۔ کوٹھی کی جانب بڑھتے ہوئے دو افراد کے قدموں سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کسی وقت کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ میری خبر گیری کے لیے اس طرف جا رہے تھے۔

وہ دونوں کوٹھی کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رک گئے اور چوکنا نظر سے دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ ان کے انداز میں بڑی پراسراریت پائی جاتی تھی۔ وہ کوٹھی میں داخل ہونے سے قبل اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں اس دوران میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے سفید ہائی روف کے نزدیک پہنچ گیا۔ گاڑی کے اندر موجود ڈرائیور کی نظر بھی انہی پر لگی تھی اس لیے اسے وہاں میری موجودگی کا احساس نہ ہو سکا۔

اس وقت لگ بھگ شام کے پانچ بجے تھے اور شام، رات سے گلے ملنے کی تیاری میں تھی۔ سفید ہائی روف، شاہ جمال روڈ کے جس حصے میں کھڑی تھی وہاں اِکا دُکا گاڑیوں کے گزرنے کے سوا کسی قسم کا رش وغیرہ نہیں تھا۔

میں نے دیکھا، کوٹھی کے گیٹ پر پہنچنے والے وہ دونوں افراد یکے بعد دیگرے اندر کود گئے۔ گیٹ کو ہم نے اندر سے بند کر رکھا تھا اس لیے انہیں پھلانگ کر اندر جانا پڑا تھا۔ جب ہمارا تعاقب کر کے وہاں پہنچنے والے افراد کوٹھی کے اندر غائب ہو گئے تو میں بہ آہستگی ہائی روف کے ڈرائیور کی سمت بڑھ گیا۔

اس وقت میں ہر نوعیت کی کارروائی کے لیے تیار تھا۔ مجھے کوٹھی کے اندر جا کر کسی بھی قسم کی واہیات صورتِ حال سے سابقہ پڑ سکتا تھا اس لیے ضروری تھا، کسی بیرونی مداخلت کو روکنے کا بندوبست کر لیا جائے۔ اس وقت میری نظر میں ڈرائیور سے زیادہ بڑا مداخلت کار اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں خاموشی سے اس کے پہلو سے ریگ گیا۔

''بھائی صاحب!'' میں نے اچانک بھرائی ہوئی آواز میں اسے مخاطب کیا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ وہ چونکا اس لیے کہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا ہے لیکن اگلے ہی لمحے میرا خیال باطل ثابت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے شناسائی کا شائبہ تک نظر نہ آیا۔ اس کے چونکنے کی وجہ محض یہ تھی کہ اس وقت وہ پورے انہماک سے کوٹھی کی سمت دیکھ رہا تھا اور میرے اچانک مخاطب کرنے نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔

میں نے اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں پوچھا ''بھائی صاحب! شاہ جمال کا مزار کس طرف ہے؟''

وہ مجھے کوئی بھٹکا ہوا راہگیر سمجھا۔ سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اِدھر چلے جاؤ، تھوڑے ہی فاصلے پر تمہیں مزار نظر آ جائے گا۔''

یہ تو اچھا ہوا کہ وہ مجھے پہچانا نہیں تھا، بصورتِ دیگر بھی میرے پاس اس کا شافی علاج موجود تھا۔ فریدہ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں ایک روحانی بزرگ حضرت شاہ جمالؒ کا مزار بھی واقع ہے۔ یہ معلومات اس وقت کام آ گئی تھیں۔

میرے پاس بہت کم مہلت تھی۔ کوٹھی کے اندر داخل ہونے والے اگر باہر نکل آئے تو ان سے نمٹنے میں قدرے مشکلات پیش آتیں۔ کوٹھی کے اندر وہ بہ آسانی ٹریٹ کیے جا سکتے تھے۔ میں نے ڈرائیور پر چند لمحات صرف کیے اور بجلی کی سی سرعت سے اس کی گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو مسل کر میں نے اسے تھوڑی دیر کے لیے اناً فاناً معطل کر دیا۔ اس کے سر کو میں نے گاڑی کے اسٹیئرنگ پر اس طرح ٹکا دیا کہ دور سے دیکھنے والا کوئی بھی شخص یہی سمجھے کہ وہ اونگھ رہا ہے۔ اگلے چند سیکنڈ میں، میں آواز پیدا کیے بغیر کوٹھی کے اندر پہنچ چکا تھا۔

جب میں سیکیورٹی گارڈ خادم حسین کے ہمراہ کوٹھی میں داخل ہوا تھا تو میری حیثیت ایک خریدار ایسی تھی اس لیے مختلف کمرے دکھاتے وقت خادم حسین ان کی لائٹس آن کرتا رہا تھا جن میں سے بیشتر کمروں میں روشنی ہو رہی تھی۔ مجھے امید تھی، لو وار دان پہلے روشن کمروں ہی میں جھانکتے۔ ان روشن کمروں کی بدولت کوٹھی کے باقی حصوں میں اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ میں اندھیرے کی آڑ لیتے ہوئے قدم قدم محتاط انداز سے آگے بڑھانے لگا۔

پھر وہ مجھے دکھائی دے گئے۔ وہ ایک ایسے کمرے میں داخل ہو رہے تھے جس کی حیثیت ہال ایسی تھی اور اس کی ایک دیوار میں خفیہ تہ خانے کا چور راستہ بھی نہایت ہی پراسرار انداز میں موجود تھا۔ مجھے اپنی کارروائی کے لیے وہ ہال نما بڑا کمرا نہایت ہی مناسب اور موزوں نظر آیا۔

وہ دونوں جیسے ہی ہال میں داخل ہو کر میری نگاہ سے اوجھل ہوئے، میں بڑی تیزی سے ان کی جانب لپکا۔ انہوں نے ہال کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے کمرے میں ان ہوتے ہی دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔

وہ پلٹ کر حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا ''تم لوگ مجھے کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ میں تو یہاں ہوں۔''

انہوں نے ایک لمحے کے لیے معنی خیز نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ میں نے ان کا نگاہی مفہوم پڑھ لیا۔ وہ مجھے دہران کی حیثیت سے پہچان گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات تھے جیسے انہیں اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر یقین نہ آیا ہو۔

چادر کی بکل والے شخص نے اچانک ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے اپنے بدن سے چادر کھینچ کر میری جانب اچھال دی۔ میں نے ہاتھ کے دھکے سے اپنی سمت آنے والی چادر کو ایک طرف پھینکا، اس دوران میں وہ شخص اپنے لباس سے ریوالور برآمد کر چکا تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ رہا ہوگا۔

جیکٹ والے پستہ قامت گینڈا نما شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا، تم خود ہمارے سامنے آ گئے ورنہ ہمیں تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ کر سامنے لانا پڑتا۔''

''چلو، کوئی بات نہیں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''یہ حسرت اب نکال لو۔ میں بھی یہاں موجود ہوں اور میرے ہاتھ پاؤں بھی سلامت ہیں۔''

میں یہ جملے ادا کرتے ہوئے بڑی جچی تلی نظروں سے دبلے پتلے ریوالور بردار شخص کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ میرا اصل ٹارگٹ وہی تھا اور میں مناسب موقع ہاتھ آتے ہی اسے نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

پستہ قامت جیکٹ پوش شخص نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تمہارے ہاتھ پاؤں تو ہم ضرور توڑیں گے مگر تمہیں زندہ سلامت رکھنا ہماری مجبوری ہے۔ تم کسی ہاتھی کے برعکس ہو۔ تمہاری زندہ ڈلیوری ہمارے لیے زیادہ سود مند ثابت ہوگی۔ مرنے کے بعد تو تم لکھ (لاکھ) کے کیا، ککھ (تنکے) کے بھی نہیں رہو گے۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور غیر محسوس پیش قدمی کرتے ہوئے اس سے سوال کیا ''تم مجھے پکڑ کر کسے ڈلیور کرنا چاہتے ہو۔ تم نے ابھی کس ڈلیوری کا ذکر کیا ہے؟''

میری ''حرکت'' کو ریوالور بردار نے محسوس کر لیا، اس سے پہلے کہ اس کا گینڈا نما ساتھی میرے سوال کا جواب دیتا، اس نے ریوالور کو وارننگ کے انداز میں لہراتے ہوئے کہا۔

''دہران! کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔''

''اگر میں جان سے چلا گیا تو تمہارے لیے بے کار ہو جاؤں گا۔'' میں نے ریوالور بردار کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا ''تمہارا اس گینڈے ساتھی نے بتایا ہے کہ میں کوئی ہاتھی نہیں ہوں جو زندہ ایک لاکھ کا اور مرا ہوا سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔''

مذکورہ شخص تنبیہی انداز میں مجھ سے گویا ہوا ''تم زیادہ باتیں نہ بناؤ اور خاموشی سے خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ اگر ہمیں مجبور کرو گے تو ہمیں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ سنا ہے، تم نے کراچی میں بڑی تھرتھلی مچائی ہوئی تھی لیکن بچو! ایک بات ذہن میں رکھنا، یہ لاہور ہے۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک اتھرا پڑا ہے۔ تم کسی غلط فہمی کا شکار نہ رہنا۔ ادھر بندہ گزارتے ہوئے ذرا دیر نہیں لگاتے۔''

اس کی بکواس کے دوران میں، میں نے ہم تینوں کے درمیان قدمی فاصلے کو ذہن نشین کر لیا تھا لہٰذا ایکشن میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ میرے ذہن نے ایک ایک سُوت کا حساب کر لیا تھا۔

میں نے دھمکی دینے والے گینڈا صورت شخص کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے بھولے پن سے کہا ''یار! ناراض کیوں ہوتے ہو۔ مجھے پکڑنے آئے ہو، لو پکڑ لو۔ میں کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے دونوں ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ یہی سمجھا، میں اس کی طرف قدم بڑھانے والا ہوں۔ وہ بڑی تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس طرح اس نے مجھے میرا مطلوبہ زاویہ فراہم کر دیا تھا۔ اب میں بہ آسانی ان دونوں کو شکار کر سکتا تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ میرے ارادے کو بھانپنے کی کوشش کرتے، ایک بجلی سی چمکی۔ میں نے پلک جھپکتے میں ایک بیک فلیک (Back Flick) لگائی اور پستہ قامت جیکٹ پوش کے سامنے پہنچ گیا، اس طرح کہ اس گینڈے کی آڑ بھی مجھے میسر تھی۔ اگر ریوالور بردار مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتا تو گولی گینڈے کی موٹی پشت میں پیوست ہو جاتی۔

میری اس غیر متوقع حرکت پر ریوالور بردار بوکھلا گیا۔ اس کی بوکھلاہٹ سے فائدہ نہ اٹھانا عظیم ترین حماقت ہوتی۔ میں نے گینڈا نما شخص کی تھوڑی پر ایک فولادی پنچ رسید کیا اور فرنٹ رول کرتے ہوئے ریوالور بردار کے پاس پہنچ گیا پھر میں نے اسے فائر کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی میں حرکت میں آ چکا تھا۔

میں نے بڑی سرعت سے اس کے بازو کو بلاک کیا اور پش لاک لگاتے ہوئے مروڑ دے کر اس کی پشت پر ایک زوردار کک رسید کر دی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے ساتھی کی جانب گیا اور اس سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گیا۔ اس تصادم کے نتیجے میں ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

یہ تمام عمل بیان کرنے میں خاصا طویل اور پیچیدہ نظر آتا

ہے لیکن میں نے اس کی تکمیل میں صرف پانچ سیکنڈ صرف کیے تھے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے، میرے ایکشن میں کس قدر برق رفتاری پائی جاتی تھی۔ یہ سب مرتب کمبی نیشن کا کھیل تھا۔ بیک فلیک، پنچ، فرنٹ رول، بلاکنگ، پش کک اور کک ایک ہی لمحاتی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔

میں نے ایک طویل جمپ لگائی اور کمرے کے فرش سے ریوالور اٹھا لیا۔ قریبی دیوار پر کپڑے لٹکانے والی کھونٹیاں نصب تھیں۔ میں نے ریوالور کو ایک کھونٹی پر ''لٹکا'' دیا۔ اس دوران میں وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔

میں پلٹ کر ان کی طرف بڑھا تو مجھے ایک مرتبہ پھر چونکنا پڑا۔ اس دفعہ مجھے پستہ قامت گینڈے کے ہاتھ میں ایک پسٹل چمکتا ہوا نظر آیا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے، پسٹل کو دھمکی آمیز انداز میں لہراتے ہوئے مجھے وارننگ دی۔

''ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھانا، ورنہ میں بھون کر رکھ دوں گا!''

''تم جھوٹ بولتے ہو، بکواس کرتے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''اگر تم نے فائرنگ کر کے مجھے بھون ڈالا تو میری زندہ ڈیلیوری کیسے کرو گے؟ اور......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا وقفہ دیا پھر کہا ''میں نے تو پہلے بھی تمہیں پیش کش کی تھی کہ میں کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ آؤ، مجھے پکڑ لو۔ میں ایک مرتبہ پھر یہی پیش کش دہراتا ہوں۔ آؤ، میری طرف بڑھو......'' میں نے اس کے ساتھ ہی ہلکی پیش قدمی شروع کر دی۔

میری اس حرکت کے جواب میں ہال نما کمرا فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ گینڈے نے مجھے روکنے کے لیے، میرے قدموں میں فائر کیا تھا، گویا میں اپنی چال میں کامیاب ہو گیا۔

میں جوابی کارروائی کے طور پر دونوں پاؤں سے ہوا میں اچھلا۔ میں نے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ فائرنگ سے خود کو بچا رہا ہوں۔ میری جگہ کوئی اور شخص بھی ہوتا تو غیر ارادی طور پر وہ بھی ایسی ہی حرکت کرتا مگر میں نے وہ سب کچھ بالا رادہ کیا تھا اس لیے وہ لوگ میری چال میں آ گئے۔

میرا ہوا میں اچھلنا قیامت ڈھا گیا۔ یہ اچھال سمر سالٹ کے لیے تھی۔ شاؤلن ٹیمپل میں مجھے کھڑے کھڑے قدموں پر اچھلنے کی پریکٹس کروائی گئی تھی۔ میں بہ آسانی چھے فٹ تک جمپ کر سکتا تھا، بعض مخصوص حالات میں یہ بلندی آٹھ سے دس فٹ تک پہنچ جاتی۔ اس بلندی کا انحصار اس زمین پر ہوتا جہاں سے اچھلنے کی کوشش کی جاتی۔

میرا بدن زن سے ہوا میں رول ہوا اور میں فرنٹ سمر سالٹ لگاتے ہوئے پسٹل والے گینڈے کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس دوران میں اس نے مجھے فائرنگ کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پستول سے فائر ہونے والی گولیاں چھت اور دیواروں کے پلاسٹر کو ادھیڑنے کے سوا کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔ اس فائرنگ سے مجھے ایک فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ اس کے پستول کا کلپ خالی ہو گیا۔ جب میں نے اس کے سامنے ''لینڈنگ'' کی تو اس کے پسٹل سے ''ٹھک ٹھک'' کی آواز خارج ہوئی۔

پھر اسی لمحے پستول کی مخصوص ٹھک ٹھک میں گینڈے کی کراہ بھی شامل ہو گئی۔ میں نے زمین پر قدم ٹکاتے ہوئے ایک طوفانی مکا اس کی پکوڑا ناک پر جڑ دیا تھا۔

وہ لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے گیا پھر سنبھل کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ پستول کا کلپ خالی ہو چکا تھا۔ اس نے خالی پسٹل کھینچ کر مجھے مارنے کی کوشش کی۔ کوشش ان معنوں میں کہ میں نے اس کے ارادے کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بازو کے حرکت میں آتے ہی بیٹھک لگانے والے انداز میں نیچے بیٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران میں خالی پسٹل میرے سر کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے اس دیوار سے جا ٹکرایا تھا۔ جہاں ایک کھونٹی میں پہلے ہی ایک ریوالور کو ''لٹکا'' چکا تھا۔

اس حملے میں ناکامی کے بعد وہ گینڈا صورت شخص اصلاً نسلاً گینڈے کے مانند چنگھاڑتے ہوئے میری جانب بڑھا۔ اس کی پکوڑا ناک میرا دھواں دھار پنچ کھانے کے بعد پھول کر کُپا ہو گئی تھی اور اس میں سے باقاعدہ خون بھی رس رہا تھا۔ ان حالات میں اس کا چہرہ بڑا وحشت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔ میں جی جان سے اس کی خاطر تواضع کے لیے تیار تھا۔

وہ بڑے جارحانہ انداز میں مجھ پر پل پڑا، میں نے اس کے مکے کو کامیابی سے بلاک کیا پھر اپنے پیٹ کی جانب آنے والے اس کے گھٹنے کو روکا۔ میری ہر روک کے جواب میں وہ وار کرتا۔ میں اس کے پے در پے حملوں کو روکنے کے بعد جواب آں غزل کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کے ساتھی کو میں نے ایک جانب بڑھتے دیکھا۔

وہ ہمیں مصروف پا کر مکاری دکھانا چاہتا تھا۔ وہ دیوار کی جانب بڑھ رہا تھا جہاں میں نے اس سے چھین کر ریوالور لٹکا رکھا تھا۔ اس کی چالاکی کو سمجھتے ہی میں نے گینڈے شخص کو اڑنگا لگا کر ایک طرف پھینکا اور تیزی سے دوسرے مکار شخص کی طرف بڑھا پھر قبل اس کے کہ وہ ریوالور تک پہنچ پاتا، میں نے اسے جا لیا۔ وہ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ریوالور کھونٹی سے اتارا اور اسے اپنی جیب میں ٹھونسنے کے بعد اپنے دشمن کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس عمل میں مجھے تھوڑی تاخیر ہو گئی کیوں کہ اسی لمحے مجھے اپنے کندھے پر اس کے پاؤں کی ضرب محسوس ہوئی۔ اس نے موقع پا کر مجھے ایک کک مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی کک میں زیادہ فورس (Force) نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ مارشل آرٹسٹ نہیں تھا، بس لڑائی بھڑائی والا لگتا تھا۔

اس کی کک کھا کر میں پلٹا اور جوابی حملے کے طور پر میں نے ایک بیک پش کک اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ وہ پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے لیفٹ اینڈ رائٹ راؤنڈ ہاؤس میں ککس چلائیں۔ وہ خود کو بچاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اسے سائیڈ کک ماری۔ وہ کسی فٹ بال کی مانند سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کا جسم ہوا میں اچھلا پھر وہ دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ اسی وقت گینڈا نما شخص بھی میری جانب بڑھا۔ ہم نے بہ یک وقت زمین پر پڑے ہوئے شخص کو ملاحظہ کیا۔ ہمارا تنقیدی جائزہ بڑے سنگین نتائج کا حامل تھا۔ زمین بوس شخص کے سر سے خون جاری ہو گیا تھا۔ سنگی دیوار سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کی حالت نے گینڈے کو خون میں جلا کر دیا۔ وہ بڑے وحشت ناک انداز میں مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں اس کی تمام تر وحشت اور دہشت کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس نے بالکل کسی اصلی گینڈے کے مانند میرے پیٹ میں ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اپنے قاتل ''سینگوں'' سے میرا پیٹ پھاڑ ڈالے گا۔

میں ایک قدم پیچھے کو اچھلا اور کسی ماہر بل فائٹر کی طرح دو ہاتھوں کا ڈبل چوپ اس کے سر پر رسید کر دیا۔ یہ ایک بھرپور ضرب تھی۔ معتوب، زخمی گینڈے کی طرح ڈکراتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے کو ہٹنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام رکھا تھا اور اس کے چہرے سے بے پناہ تکلیف ظاہر ہو رہی تھی۔

ایک حملہ آور پہلے ہی، میری مار پیٹ سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے ہوش میں آنے کے بارے میں کوئی حتمی وقت نہیں بتایا جا سکتا تھا۔ کوئی بھی شخص پورے وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی آنکھ اسی جہان میں کھلے گی یا اگلے جہان میں!

میں دوسرے دشمن یعنی گینڈا نما حملہ آور کو بے ہوشی میں پہنچانے کے حق میں نہیں تھا۔ مجھے ان لوگوں سے بہت سی معلومات حاصل کرنا تھیں۔ اگر گینڈا بھی بے ہوش ہو کر کسی بے زبان شخص کی صورت دھار لیتا تو پھر سوال کس سے کرتا؟

اس احتیاط کے پیش نظر میں نے گینڈے کے سر اور جسم کے بالائی حصے کو نشانہ نہ بنانے کا فیصلہ کیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھوں کے پیالے میں سے سر کو نکال کر مجھے سراسیمہ نظر سے دیکھا۔ میں نے لگاتار بڑے طوفانی انداز میں چار پانچ نی شاٹس (Knee Shots) اس کی ٹانگوں خصوصاً گھٹنوں اور پنڈلیوں پر رسید کر دیے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں اور کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ زمین پر گر گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے پیٹ میں ایک ٹھڈا مارا۔

وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب اذیت ناک آوازیں خارج ہونے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو دبا رکھا تھا اور کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح تڑپ رہا تھا۔ میرے ٹھڈے نے اس کی پیٹ کے کسی اندرونی اعضا کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔

میں نے تڑپتے پھڑکتے اس گراں ڈیل شخص کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹا اور اس کے بے ہوش ساتھی کے پاس لے آیا پھر میں نے اسے بے ہوش شخص کے اوپر پھینکتے ہوئے خونخوار لہجے میں استفسار کیا۔

''زندہ رہنا چاہتے ہو یا تمہیں موت کی لوری سنا دوں؟''

خوف و شرم
اور اس کا سدباب
کا مطالعہ کیجیے
اور ان کمزوریوں سے نجات حاصل کر کے
کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزاریے
قیمت: 50 روپے
ڈاک خرچ: 23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802551-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کے لیے C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

وہ مجھ سے بے دریغ پٹنے کے بعد بری طرح دہشت زدہ ہو چکا تھا، لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

''م...... مجھے...... مت مارو...... میں...... زندہ...... رہنا چاہتا ہوں۔''

''زندہ رہنے کے لیے تمہیں زبان کھولنا ہوگی۔'' میں نے پوری سفا کی سے کہا ''بولو، زبان کھولو گے یا میں تمہاری زندگی کا بند کھول دوں؟''

وہ اس وقت ہمت ہار بیٹھا تھا اور ہارے ہوئے شخص کی کوئی مرضی نہیں ہوتی، اسے جیتنے والے کی مرضی پر چلنا پڑتا ہے، اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔ یہ میدان جنگ کا اصول ہے۔ اس اصول کو توڑنے کا حوصلہ وہی لوگ رکھتے ہیں جو جرات مند اور خوددار ہوتے ہیں۔ جنہیں اپنی خودی جان و مال سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی عزت و آبرو کی خاطر سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ وہ زبان نہیں کھولتے، زندگی ہار جاتے ہیں!

میرے دام میں آیا ہوا وہ شخص اتنا غیرت مند اور خوددار نہیں تھا۔ اگر وہ اس قبیل کا ہوتا تو برائی اور جرم کی راہ پر قدم ہی نہ رکھتا۔ میرے سنسنی خیز سوال نے اس کی آنکھوں میں دنیا جہاں کا خوف بھر دیا۔ اس کے چہرے پر سرسوں کھل اٹھی۔ وہ پہلی فرصت میں اپنی جان بچانا چاہتا تھا اس لیے اس کے ڈرے سہمے ہونٹوں میں کپکپی نما جنبش ہوئی اور وہ لرزیدہ آواز میں بولا۔

''پپ...... پوچھو، کیا...... پوچھنا چاہتے...... ہو......!''

میں نے پوچھا ''کس کے لیے کام کرتے ہو؟''

''چوہدری دلدار کے لیے۔'' اس کے حلق سے نحیف سی آواز برآمد ہوئی۔

میں نے سنگین الفاظ میں دریافت کیا ''یہ تمہاری ماں کا یار چوہدری دلدار کون ہے؟''

''ہمارا باس ہے۔'' اس نے بمشکل اگلا۔

''باس تو ہے۔'' میں نے اسے گھر کا ''مجھے بتاؤ، تمہارا باس چوہدری دلدار کہاں رہتا ہے اور کیا بیچتا ہے؟'' میرے استفسار میں دنیا جہاں کی سنگینی سمٹ آئی تھی۔

وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا ''تم یقین جانو، مجھے باس کی رہائش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں، وہ ڈیفنس سوسائٹی میں رہتا ہے۔ میں نے آج تک اسے دیکھا نہیں۔''

''تم لوگوں تک باس کے احکام کس طرح پہنچتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کسی نہ کسی ذریعے سے پہنچ ہی جاتے ہیں۔'' اس نے بتایا ''میں ابھی ان لوگوں میں نیا ہوں۔ زیادہ نہیں جانتا۔ تم نہ سمجھنا کہ میں تم سے کسی قسم کی غلط بیانی کر رہا ہوں۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے، تمہیں بتا دیا ہے۔''

''میں کیا سمجھتا ہوں اور کیا نہیں سمجھتا اس کے لیے تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں۔'' میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا ''تمہارے باس سے خود نمٹ لوں گا۔ تم صرف اتنا بتاؤ کہ تمہارے باس کا چوہدری نوازش علی سے کیا تعلق ہے؟''

''میں کسی چوہدری نوازش علی کو نہیں جانتا۔''

''اور رانا عظمت کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں نے یہ نام بھی پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

مجھے اس کے لہجے سے سچائی کی مہک آئی۔ ننانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ وہ اس سیٹ اپ میں واقعی نیا لگتا تھا۔ میں نے ازراہِ حجت کے طور پر اس سے دریافت کیا۔

''سکندر کو جانتے ہو؟''

وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا ''یہ ساری آگ اسی ... کی لگائی ہوئی ہے۔''

''سکندر کا تمہارے باس چوہدری دلدار سے کیا تعلق ہے؟''

اس نے جواب دینے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اسی وقت کوٹھی کے اندر ''دھپ دھپ'' کی مخصوص آوازیں ابھریں۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا، درجن بھر افراد دیوار پھلانگ کر کوٹھی کے اندر کودے تھے۔

وہ بڑے سنسنی خیز اور نازک لمحات تھے۔ اس سے پہلے میں کسی عملی اقدام کے بارے میں ذہن کو زحمت دیتا، کوٹھی کا اندرونی حصہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ کئی گنوں کے دہانے بہ یک وقت کھول دیے گئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ فائرنگ کسی ایک انسان کو شکار کرنے کے لیے نہ کی جا رہی ہو بلکہ حملہ آور پوری کوٹھی کو ''بھوننے'' کا ارادہ رکھتے ہوں۔

ان ہلاکت خیز لمحات میں ساعتی خاموشی کا وقفہ آیا تو ... کے کسی دور افتادہ حصے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسرے ... گھنٹی کی آواز میری سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکی کیونکہ برسٹ فائرنگ کا دوسرا راؤنڈ شروع ہو گیا تھا۔

میں نے اس گینڈا نما شخص کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے اور اسے گھسیٹتے ہوئے اس دیوار کی جانب بڑھ گیا جس کے پیچھے ... خانے تک پہنچنے کا راستہ تھا!

تہ خانے کے اندر صورت حال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں جو چیز جہاں چھوڑ گیا تھا، وہ وہیں ویسے ہی پڑی تھی۔ میں نے بڑی سرعت اور چابک دستی کے ساتھ اس وزنی بدن گینڈا نما شخص کو گھسیٹ کر تہ خانے کے اندر پہنچایا اور مخصوص تکنیک استعمال کرتے ہوئے داخلی دروازہ بند کر دیا۔

اس تہ خانے میں روشنی اور ہوا کا معقول انتظام تھا۔ مصنوعی اور قدرتی، دونوں قسم کا۔ دن کے وقت سورج کی جزوی روشنی سے کام چل جاتا جو ایک مختصر سے روشن دان سے چھن کر اندر پہنچتی تھی اور رات کے اندھیرے میں بلب وغیرہ روشن کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت لگ بھگ رات کے چھے بج رہے تھے اس لیے میں نے تہ خانے میں داخل ہونے سے قبل دیوار پر نصب بجلی کے سوئچ کو آن کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی، بلب کی دھیمی روشنی باہر کہیں نظر نہیں آئے گی۔ روشنی کا ذریعہ وہ مختصر سا روشن دان بہت محفوظ زاویے پر بنا ہوا تھا۔

خادم حسین کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کا دہانہ کسی گٹر کے مانند ابلنے لگا۔ اس نے مجھے بے نقط سنانا شروع کر دیں۔ میں نے کچھ دیر پہلے اسے جس حال کو پہنچایا تھا، اس کے پیش نظر یہ اس کا حق بنتا تھا لیکن اس کی بدکلامی میرے لیے سنگین مسائل کھڑے کر سکتی تھی اس لیے خادم حسین کو تنبیہہ کرنا ضروری تھا۔

میں نے پستہ قامت گینڈے کو تہ خانے کے پختہ فرش پر پھینکا اور زمین سے صرف دو فٹ اوپر چھت سے لٹکے ہوئے خادم حسین کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا جس کے سبب اس کا چہرہ خاصا خوفناک ہو گیا تھا۔ یہ بات میری نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہی کہ وہ فرش پر پڑے ہوئے گینڈا نما شخص کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ میں نے نزدیک آ کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا تو وہ پھنسی پھنسی آواز میں مستفسر ہوا۔

''کک...... کوٹھی کے اندر کیا ہو...... رہا ہے۔ میں نے...... چند لمحے پہلے فائرنگ کی آواز سنی تھی!''

''وہ فائرنگ نہیں تھی احمق!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سفا کی سے کہا۔

''یہ خوشی میں چھوڑے جانے والے پٹاخے اور گولے ہیں۔''

''پٹاخے اور گولے؟'' اس نے حیرت سے دہرایا۔

میں نے کہا ''خادم حسین! تم بھی بہت بے خبر ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آج تمہارے ولی نعمت کی محبوبہ کی شادی ہے۔ باہر فرید پاشا کی برات آئی ہے۔ یہ سب شور شرابا اسی سلسلے میں ہے مگر لڑکی کا بھائی مارے شرم کے منہ چھپائے ادھر بیٹھا ہے۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے جیکٹ پوش گینڈے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

اسی وقت کوٹھی کے مختلف اندرونی حصوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ دیوار پھلانگ کر اندر آنے والوں میں سے میں نے کسی کو نہیں دیکھا تھا لیکن ان کے سرگرم قدم اور فائرنگ سے واضح تھا، وہ کسی خاص الخاص مشن پر ہیں۔ اس خفیہ تہ خانے کا راستہ جس ہال نما کمرے میں تھا اسے میں نے وہاں پہنچتے ہی اندر سے بولٹ کر دیا تھا اور اسی ہال کی ایک دیوار کے ساتھ گینڈے کا دبلا پتلا ساتھی نیم مردہ یا نیم زندہ حالت میں پڑا تھا۔ بیرونی حملہ آور اس ہال میں داخل نہیں ہو سکتے تھے اور اگر کسی طرح وہ اندر پہنچنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تو تہ خانے تک ان کی رسائی ناممکنات میں سے تھی۔ تہ خانے میں داخلے کی تکنیک پاشا اور میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اس لحاظ سے یہ تہ خانہ خاصی محفوظ پناہ گاہ تھا۔

خادم حسین، پاشا کی برات کے حوالے سے میرے طنز کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ بے بسی اور بے چارگی نے اسے ہاتھ پاؤں کا محتاج بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی صرف زبان آزاد تھی جس کا وہ بے دریغ استعمال کر سکتا تھا۔ ان سنگین لمحات میں، خادم حسین کو میں کسی قسم کی زبان درازی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ تہ خانے سے خارج ہونے والی کوئی بھی ہلکی پھلکی آواز اوپر والوں کو ہماری جانب متوجہ کر سکتی تھی جن کے بارے میں ابھی واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کس مقصد سے آئے ہیں؟

''تم بہت ہی غلط کر رہے ہو وجدان۔'' خادم حسین کے ہونٹ دھمکی آمیز انداز میں تھرتھرائے ''مجھے یقین ہے، رانا عظمت اور سکندر کے آدمی کوٹھی میں پہنچ چکے ہیں اور وہ تمہیں......''

''تمہیں'' کے بعد اس کا جملہ نامکمل رہ گیا۔ میں نے الٹے ہاتھ کا ایک بھرپور تھپڑ اس کے ہونٹوں پر رسید کر دیا تھا۔ اس کے لبوں سے باقاعدہ خون رسنے لگا اور اس کے پہلے سے خون آلود چہرے کی ''رونق'' میں اضافہ کرنے لگا۔

''اب اگر تمہاری زبان سے ایک لفظ بھی خارج ہوا تو میں تمہیں سدا کے لیے قوتِ گویائی سے محروم کر دوں گا۔'' میں نے دھمکیلے لہجے میں کہا ''تمہاری للو کو گدی سے کھینچتے وقت مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا!''

میرے لہجے میں پوشیدہ سفا کی نے اسے مہر بہ لب کر دیا۔

میں فرش پر پڑے ہوئے گینڈا نما شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ وہ خادم حسین کو مضحکہ خیز انداز میں، چھت سے لٹکے دیکھ کر اپنی رہی سہی ہمت بھی ہار بیٹھا تھا۔ میں نے اس کی موٹی کھال والے توانا وجود میں نمایاں لرزش محسوس کی۔ اس کی دہشت میں مزید اضافہ کرنے کی خاطر میں نے کہا۔

''رانا عظمت اور سکندر کے اس مخبر کو تم نے اچھی طرح پہچان لیا ہوگا!'' میرا اشارہ خادم حسین کی جانب تھا ''یہ اپنے آقاؤں سے وفاداری کا مزہ چکھ رہا ہے۔ کان کھول کر سن لو، اگر تم نے مجھ سے تعاون نہ کیا تو مجبوراً مجھے تمہارے لیے اسی چھت سے ایک ایکسٹینشن باندھنا ہوگی۔ کیا تم خادم حسین کی طرح جھجھو جھولے کرنا پسند کرو گے؟''

''تت...... تم...... مجھ سے کس طرح کا...... تعاون چاہتے ہو؟'' گینڈا مریل سی آواز میں ہکلایا۔

''اس کی باتوں میں نہ آنا۔'' خادم حسین نے چلا کر کہا ''یہ اول درجے کا جھوٹا اور مکار ہے۔ یہ سب کچھ اگلوانے کے بعد بھی تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ میرا حشر دیکھ لو! میں نے اس شیطان کے ہر سوال کا جواب دیا تھا لیکن اس نے......''

''تمہارا کیس دوسرا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''تم دراصل فرید پاشا کے مجرم ہو۔ تمہارا فیصلہ پاشا کی عدالت میں ہوگا۔ میں نے تمہیں صرف جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں لٹکایا ہے۔''

وہ گینڈا نما شخص کو ورغلانے سے باز نہ آیا تو مجھے مجبوراً اس کی بولتی کو کنٹرول کرنا پڑا۔ میں نے اپنی پاکٹ سے جیبی رومال نکالا اور اسے خادم حسین کے ڈاؤن ورڈ منہ پر اچھی طرح کس کے باندھ دیا۔ رومال کی موٹی پٹی نما تہ نے اس کے منحوس دہانے کو پوری طرح ڈھانپ لیا۔ اب اگر وہ داد فریاد کی کوشش بھی کرتا تو بمشکل تمام اس کے حلق سے ''غوں غاں'' کی آوازیں ہی خارج ہوتیں۔ مزید احتیاط کے لیے میں تہ خانے کے اکلوتے مختصر سے روشن دان کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے پہلے میں نے گینڈے کے بدن سے چمڑے کی جیکٹ اتروالی تھی۔

''تمہارے بدن میں تہ در تہ چربی کا ایک خزانہ پوشیدہ ہے۔'' میں نے اسے حقارت سے ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا ''کیا تم نے کبھی رینو (گینڈے) یا ہاپو (دریائی گھوڑے) کو کسی گرم جیکٹ میں دیکھا ہے؟''

اس نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ چرمی جیکٹ میرے حوالے کر دی، منہ سے ایک لفظ ادا نہ کیا۔ میں مذکورہ روشن دان کے قریب آ گیا۔ وہ روشن دان تہ خانے کی ایک دیوار میں، چھت کے نزدیک بنا ہوا تھا۔ اس کا سائز آدھا ضرب تین فٹ تھا اور اس پر مہین جالی لگی ہوئی تھی۔ اس روشن دان کا بیرونی حصہ پائیں باغ میں کھلتا تھا مگر باہر سے دیکھنے میں نظر نہیں آتا تھا کیوں کہ باغ کے اس حصے میں کانٹے دار جھاڑیاں موجود تھیں جن سے سورج کی جزوی روشنی اور ہوا تو چھن کر تہ خانے میں پہنچ سکتی تھی مگر اندر کی مدھم روشنی باہر سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے تہ خانے میں بہت کم پاور کا بلب لگایا گیا تھا۔

میں نے احتیاطاً گینڈے کی جیکٹ کو روشن دان کے سامنے پھیلا کر اس کی آستینوں کو گرل کے کونوں میں پھنسا دیا۔ اس تسلی بخش انتظام کے بعد میں واپس اپنے شکار کی طرف آ گیا۔ پہلے بھی، اور اس وقت بھی میرے ذہن میں ایک سوال شدت سے سر اٹھا رہا تھا اور وہ یہ کہ فرید پاشا نے کیوں اور کس مقصد سے وہ تہ خانہ بنوایا تھا؟ اس خطرناک سوال کا اطمینان بخش جواب صرف پاشا ہی دے سکتا تھا۔

میں گینڈے کے قریب پہنچا تو کوٹھی کے اندر پیدا ہونے والی آوازوں میں اضافہ ہو گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کے کھلنے، بند ہونے کی مخصوص آوازیں، مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے مشابہ انسانوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں۔ الغرض، اوپر کوٹھی میں ایک افراتفری کا عالم تھا۔ میں نے اس عرصے کے دوران میں، اوپر ہونے والی ہلچل سے بخوبی اندازہ لگا لیا کہ وہ لوگ وہاں کسی کو تلاش کر رہے تھے جو ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب ہنگامہ آرائی اسی تلاش کے سلسلے میں تھی۔

وہ مخصوص آوازیں کچھ دیر تک تواتر سے پیدا ہوتی رہیں لیکن ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے مزید فائرنگ نہیں کی۔ ان کی کوٹھی میں آمد کے ساتھ اور چند لمحے بعد میں نے شدید فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں اور اس دو فائرنگ کے دوران میں ٹیلی فون کی گھنٹی سنائی دی اور نہ ہی کسی گن کے دہانے نے سیسا اگلا۔ وہ لوگ فائرنگ کا خیال دل سے نکال کر بڑی شد و مد سے اس ہستی کی تلاش میں لگ گئے تھے جس کا تعاقب کرتے ہوئے وہ وہاں پہنچے تھے۔

یہ میرا قیاس تھا جو غلط بھی ہو سکتا تھا۔ پہلی فائرنگ کے نتیجے میں خادم حسین کی طرح میرے ذہن میں بھی یہی خیال آیا تھا کہ وہ سکندر یا رانا عظمت کے آدمی ہو سکتے ہیں، جو میری سرکوبی اور اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے وہاں پہنچے تھے۔

اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا کیوں کہ مذکورہ عزائم کے ساتھ کوٹھی میں داخل ہونے والوں کو یوں بے دریغ فائرنگ نہیں کرنا چاہیے تھی۔

ہم تینوں دم سادھے اس تہ خانے میں موجود تھے۔ خادم حسین کی کسمپرسی عروج پر تھی اور گینڈا نما شخص کا دہشت سے برا حال تھا۔ میں مطلقاً خاموش بیٹھا کسی نادیدہ آنکھ سے کوٹھی کے اندر ہونے والی سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگا۔ میری ظاہرہ آنکھیں معروب گینڈا نما شخص پر لگی تھیں اور میں اپنے باطنی حواسوں سے باہر کی صورت حال کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی کیفیت میں لگ بھگ آدھا گھنٹا گزر گیا پھر میں نے محسوس کیا، بیرونی حملہ آور واپس جا رہے تھے۔ اٹھا پٹخ کی آوازیں تھم سے کم ہونے لگیں اور انسانی قدموں کی مخصوص چاپ بھی دائرہ سماعت سے دور ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد کوٹھی کی اندرونی فضا میں سناٹا چھا گیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، مسلح متلاشی ٹولا ناکام وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس سے ایک اور بات بھی ثابت ہو گئی کہ وہ لوگ میری یا رانا عظمت کے آدمیوں کی تلاش میں وہاں نہیں آئے تھے۔ یہ کوئی اور ہی چکر تھا اور خدا جانے، کیا چکر تھا؟

جب امن و سکون پوری طرح قائم ہو گیا تو میں گینڈا نما شکار کی طرف متوجہ ہوا ''او دھرتی کے بوجھ! تم نے ابھی تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا؟''

وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا ''میرا نام قادر بخش ہے۔''

''اور تمہارے اس زخمی ساتھی کا کیا نام ہے جو اوپر بے ہوش پڑا ہے؟''

''فیض احمد۔'' اس نے بتایا ''اور اب تم ڈرائیور کے بارے میں سوال کرو گے اس لیے میں تمہیں خود ہی بتا دیتا ہوں۔''

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''نیک کام میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔ تم میری مرضی کے مطابق عمل کر رہے ہو۔''

قادر بخش نامی اس گینڈے نے اپنے تیسرے ساتھی کا نام ریاض علی بتایا جو کوٹھی سے باہر شاہ جمال روڈ پر ایک سفید ہائی روف کے اسٹیئرنگ پر سر ٹکائے دنیا و مافیہا سے غافل بیٹھا تھا۔ یہ بات میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ ڈرائیور ریاض علی کی اس ''غفلت'' میں کس کا ہاتھ تھا۔

میں نے اپنے سامنے فرش پر موجود گینڈے سے کہا۔ ''قادر بخش! میں وہیں سے پوچھ تاچھ شروع کرتا ہوں جہاں سلسلہ ٹوٹا تھا اور......'' میں نے ذرا توقف دینے کے بعد کہا ''یہ بات تمہیں ذہن میں نقش کر لینا چاہیے کہ غلط بیانی اور ہیر پھیر کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ میں اس سلسلے میں کسی رو رعایت کا قائل نہیں ہوں۔ تم اس ''مثال'' کو دیکھ سکتے ہو!'' بات کے اختتام پر میں نے چھت سے لٹکے ہوئے سیکیورٹی گارڈ کی طرف اشارہ کر دیا۔

قادر بخش نے ایک تگڑی جھرجھری لی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی بل ڈاگ نے اپنے شرابور بدن کو جھرجھرا کر پانی جھٹکنے کی کوشش کی ہو۔ اس مضحکہ خیز اور وحشت انگیز حرکت کے بعد اس نے بڑے فدویانہ انداز میں کہا ''پوچھو، میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا۔''

میں نے پوچھا ''تم سکندر کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے لیکن تمہاری بات ادھوری رہ گئی۔ تم نے کہا تھا، یہ ساری آگ اس نامراد کی لگائی ہوئی ہے۔ میں نے پوچھا تھا، سکندر کا تمہارے باس چوہدری دلدار سے کیا تعلق ہے؟''

وہ آنکھیں جھپکتے ہوئے بولا ''دراصل سکندر کی دوستی منشا سے ہے جو باس کا خاص آدمی ہے۔ ہم تینوں (قادر+فیض+ریاض) منشا کے لیے کام کرتے ہیں۔ سکندر نے تمہارے بارے میں منشا کو کوئی خاص پٹی پڑھائی ہے۔ ہم تمہیں پکڑ کر منشا کے حوالے کرنے والے تھے مگر......''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تم مجھے منشا تک ڈیلیور کرتے اور وہ مجھے چوہدری دلدار کے پاس پہنچا دیتا۔ میرا اصل طلب گار چوہدری دلدار ہے جو ڈیفنس سوسائٹی میں رہتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا ''سکندر کا براہِ راست چوہدری دلدار سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نے پتا نہیں، اپنے دوست منشا کو تمہارے بارے میں کیا بتایا ہے کہ وہ لوگ تمہارے لیے انتہائی فعال ہو گئے ہیں۔ میری معلومات کے مطابق، منشا نے باس سے تمہارا ذکر کیا تو وہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اس نے تمہارے ''حصول'' کا مشن منشا کے سپرد کر دیا۔ ہم تینوں منشا کے حکم پر تمہیں پکڑ کر یہاں سے لے جانے والے تھے اور پھر......''

''ایک منٹ!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''اوپر ہال نما کمرے میں تم نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ تمہیں معلوم نہیں، باس کے احکام تم لوگوں تک

کس طرح پہنچتے ہیں کیوں کہ تم ان لوگوں میں ابھی نئے ہو مگر تمہارے حالیہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے، باس اور تمہارے درمیان منشا نامی کوئی شخص بھی موجود ہے جو تمہارے باس چوہدری دلدار کے بہت قریب ہے۔ میں تمہارے کون سے بیان کو درست سمجھوں؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنی پینٹ کی جیب سے ریوالور برآمد کیا اور بڑی بے پروائی سے اس کے چیمبرز کو چیک کرنے لگا۔ یہ ریوالور میں نے فیض احمد سے چھینا تھا۔ فیض اوپر ہال نما کمرے میں بے سدھ پڑا تھا۔ قادر بخش کا ناکام خالی پسٹل بھی اسی ہال میں کہیں موجود تھا۔ فیض احمد والا ریوالور پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ اس ریوالور کو میرے ہاتھ میں دیکھ کر قادر بخش گینڈا کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھیل گئیں، گویا میرا مقصد پورا ہو گیا۔

میں نے سنسنی خیز سوالیہ نظر سے اسے دیکھا تو وہ کھکھیانے والے انداز میں بولا "وجدان، یقین جانو، میں نے تم سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ اس وقت میں تمہیں منشا کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا۔ دراصل، تمہارے رویے نے میری مت ماردی تھی۔"

"تم اپنی مت کو قابو میں رکھو قادر بخش!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر اب تم نے جواب میں کوئی گڑبڑ کی تو میں تمہیں مارنے میں بھی کسی حیل وحجت سے کام نہیں لوں گا۔"

جواب میں وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ بس سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکتا رہا۔

میں نے سوال کیا "تم لوگ مجھے پکڑ کر اپنے بڑے، منشا کے پاس پہنچانے والے تھے۔ یہ منشا کہاں رہتا ہے؟"

"منشا کا ٹھکانا مسلم ٹاؤن میں ہے، آب پارہ مارکیٹ کے نزدیک۔" اس نے جواب دیا پھر میرے استفسار پر اس ٹھکانے کا مکمل ایڈریس بھی بتا دیا۔

"تم نے چوہدری نوازش علی اور رانا عظمت سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "جب کہ میری اور میرے دوست پاشا کی دشمنی انہی دو افراد سے ہے۔ ہم کسی منشا یا چوہدری دلدار کو نہیں جانتے پھر تمہارے بڑے مجھ میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی؟"

"تمہارے اس سوال کا جواب سکندر ہی دے سکتا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "اسی نے تمہارے بارے میں منشا کو کچھ پھونکا تھا۔ ویسے میں نے اتنا اندازہ ضرور لگالیا ہے کہ تم باس کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہو۔ وہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے فوراً سرگرم ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "اور جب تم لوگ مجھے منشا کے پاس لے کر پہنچاؤ گے تو تمہارے باس چوہدری دلدار کا کیا حال ہوگا؟"

"وہ تمہاری اور ہماری تلاش میں پورے لاہور کو الٹ کر رکھ دے گا۔" قادر بخش نے بڑے اعتماد سے یہ جملہ ادا کیا تھا۔ ویسے تو ہر شخص اپنے باس کی طاقت کے بارے میں انتہائی پراعتماد ہوتا ہے لیکن قادر بخش کی بات میں پائی جانے والی سنجیدگی نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تمہارا چوہدری دلدار اتنا ہی بااختیار ہے؟"

"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا "تم تینوں ہائی روف میں ہمارا تعاقب کرتے ہوئے اس کوٹھی تک پہنچے اور مجھے یقین ہے، اس تعاقب کا آغاز گلبرگ تھری والی کوٹھی سے ہوا تھا۔ اگر تم رانا عظمت اور فرید پاشا کے بارے میں نہیں جانتے تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا، میں اس کوٹھی میں مقیم ہوا ہوں؟"

"تمہارے بارے میں ہر قسم کی معلومات سکندر لے کر تک پہنچائی تھیں۔" قادر بخش نے تحمل لہجے میں جواب دیا "کل تو صرف تمہارا سرسری ذکر ہوا تھا جس پر چوہدری دلدار تمہارے لیے بے قرار ہو گیا اور آج صبح سکندر نے تمہاری قیام گاہ کے بارے میں منشا کو بتا دیا۔ اس کے بعد ہم تمہاری نگرانی کے لیے گلبرگ والی کوٹھی کے آس پاس تھے پھر جیسے ہی تم سیکیورٹی گارڈ کے ساتھ کوٹھی سے نکلے ہم نے تمہارا تعاقب شروع کر دیا مگر یہاں آکر صورت حال بالکل بدل گئی۔ تم نے اپنی چالاکی سے ہم پر غلبہ پالیا۔"

الجھی ہوئی صورت حال بڑی حد تک مجھ پر واضح ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا، چوہدری دلدار کسی نہ کسی حوالے سے چوہدری نوازش علی سے منسلک ہے ورنہ وہ میرے نام پر اتنی تیزی سے عملی اقدام نہ کرتا۔ سکندر نے سرسری انداز میں اپنے دوست منشا سے میرا تذکرہ کیا تو اس نے یہ خبر چوہدری دلدار تک پہنچا دی۔ اگر چوہدری دلدار مجھ سے واقف تھا تو اس کا آگاہی بھی لازمی بات تھی۔ دشمنوں میں اس وقت میرا طلب گار صرف اور صرف چوہدری نوازش علی ہی تھا۔ چوہدری دلدار مجھے پکڑنا چاہتا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ مجھے چوہدری نوازش علی تک پہنچانا چاہتا تھا۔ یہ تمام کڑیاں ایک ہی سلسلے کی تھیں۔ سب سے زیادہ تشویش ناک بات

کہ چوہدری نواز ش علی لاہور میں میری موجودگی سے آگاہ ہو گیا تھا۔ چوہدری دلدار نے کل رات ہی یہ اطلاع رکھاں والی پہنچادی ہوگی۔ اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ سب امکانی اور خدشاتی باتیں تھیں اور میرے خدشات ہمیشہ سچے ثابت ہوئے تھے۔ میرے اور چوہدری نواز ش علی کے درمیان کوئی نیا کھیل شروع ہونے والا تھا اور اس کھیل میں مجھے ہر قدم پھونک کر رکھنا تھا۔ میری محبوبہ اس کے قبضے میں جا چکی تھی اور وہ مجھ پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ آزما سکتا تھا۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں پہلی فرصت میں اس تہ خانے کو خیر باد کہہ دوں!

فرید پاشا کی کوٹھی سے، ہمارا تعاقب کر کے یہاں تک پہنچنے والے، منشا کے تین آدمیوں میں سے ایک قادر بخش بے دست و پا میرے سامنے موجود تھا، فیض نامی بندہ اوپر والے ہال میں بے ہوش پڑا تھا اور تیسرا ڈرائیور ریاض وہائٹ ہائی روف میں موجود تھا۔ قادر بخش اور فیض احمد تو کسی "حرکت" کے قابل نہیں تھے البتہ ریاض علی کی جانب سے کوئی بھی شرارت سامنے آسکتی تھی۔ خصوصاً تھوڑی دیر پہلے اس کوٹھی میں جو دھواں دھار فائرنگ ہوئی تھی وہ ریاض کی "غفلت" کو توڑ سکتی تھی اور...... دیگر افراد، خاص طور پر قانون کے محافظوں کو اس کوٹھی کی جانب متوجہ کرنے کا باعث بھی بن سکتی تھی چنانچہ اس کوٹھی سے نکلنا از حد ضروری ہو گیا تھا۔ دنوں تک اس خفیہ تہ خانے میں چھپ کر بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔

میں نے گینڈے نما قادر بخش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میرے سارے ارادے اور فیصلے تو تم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔" وہ برہمی سے بولا "میں تو یہی چاہوں گا، تم پہلی فرصت میں مجھے یہاں سے جانے دو۔"

"تاکہ تم باہر جا کر کوئی بڑی گڑبڑ کر سکو!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "اس سے تو کہیں بہتر ہوگا، میں تمہارے ساتھیوں کو بھی کھینچ تان کر اسی تہ خانے میں لے آؤں تاکہ تم خبیثوں کا خاندان ایک ہی جگہ آباد ہو جائے۔"

میری بات کے جواب میں قادر بخش تو کچھ نہیں بولا لیکن چمگادڑ کے مانند چھت سے لٹکے ہوئے خادم حسین کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ قادر بخش سے یہ کہنا چاہ رہا ہو...... بے وقوف! یہ شخص تمہیں کبھی بھی نہیں چھوڑے گا!

اس کا منہ بندھا ہوا تھا اس لیے وہ گویائی کی صلاحیت سے محروم ہو کر رہ گیا تھا ورنہ وہ اس موقع پر بہت شور و غوغا مچانا چاہتا تھا۔ میں نے قادر بخش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں تھوڑی دیر کے لیے تہ خانے سے باہر جا رہا ہوں۔ اگر تم شرافت کا ثبوت دینے کا ارادہ نہیں رکھتے تو میں تمہیں بھی ہاتھ پاؤں سے "معذور" بنا دیتا ہوں۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے میں بتا دوں کہ باوجود ہر کوشش کے بھی تم میری مرضی کے بغیر اس تہ خانے سے باہر نہیں نکل سکو گے اس لیے ایسی کوئی زحمت نہ ہی کرو تو تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔"

شاید میری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اثباتی تاثرات کو ابھرتے دیکھا۔ آئندہ چند لمحوں میں، مخصوص تکنیک استعمال کرتے ہوئے میں تہ خانے سے باہر آ گیا۔

ہال نما کمرے میں قدم رکھتے ہی میں چونک اٹھا۔ اس کمرے کا داخلی دروازہ کھلا پڑا تھا۔ یہ وہی دروازہ تھا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے بولٹ کیا تھا۔ نامعلوم حملہ آوروں نے اس کمرے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کسی طرح دروازہ کھول لیا تھا۔ ہال کی ظاہرہ حالت بھی یہی بتاتی تھی، وہاں "تلاش" کا کام بڑی شد و مد سے ہوا تھا۔ جب میں نے ہال سے، تہ خانے کی طرف کوچ کیا تو وہاں کی لائٹ جل رہی تھی۔ اسی روشنی نے حملہ آوروں کو اس جانب متوجہ کیا ہوگا۔ گینڈے قادر بخش کے ساتھی فیض احمد کا بے حس و حرکت جسم ابھی تک دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔

اس صورت حال نے میرے خدشات کی تصدیق کر دی۔ ہنگامی انداز میں کوٹھی کے اندر کودنے والے مسلح افراد کا تعلق سکندر یار انا عظمت سے تھا اور نہ ہی منشا یا چوہدری دلدار سے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو فیض احمد کو وہ یوں نظر انداز کر کے چپ چپاتے غائب نہ ہو جاتے!

نامعلوم فتنہ پرور افراد کے بارے میں سوچتے ہوئے میں عقبی سمت میں کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ بے ہوش فیض احمد کو تہ خانے میں منتقل کرنے سے قبل ان کے تیسرے ساتھی کی خبر گیری ضروری تھی۔ میں محتاط قدموں سے چلتے ہوئے اس مقام تک آیا جہاں سے سفید ہائی روف بہ آسانی نظر آتی تھی۔ رات کی جزوی تاریکی کے باوجود بھی مجھے ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر ریاض علی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ہنوز اسٹیئرنگ پر سر رکھے خاموش بیٹھا تھا جس کا ایک ہی مطلب تھا، میں نے اسے اتنا غفیل بنانے میں کچھ زیادہ ہی سے کام لے لیا تھا یا پھر وہی کم ہمت اور بودا ثابت ہوا۔ اس کی مستقل غفلت خطرناک نتائج لا سکتی تھی!

ریاض کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں کوٹھی کی عقبی دیوار پھلانگ کر ایک مرتبہ پھر اندر پہنچ گیا پھر اس

پہلے کہ میں ہال نما کمرے کی طرف قدم اٹھاتا، مجھے چونکنا پڑا۔ میری نگاہ نے بائیں باغ میں ایک پراسرار حرکت دیکھی تھی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ کوئی انسان تھا جو اکڑوں چلتے ہوئے ان جھاڑیوں کی طرف چلا گیا جن کے پیچھے تہ خانے کا روشن دان تھا۔ پتا نہیں، وہ کون تھا اور اس وقت وہاں کیا کر رہا تھا۔ فوری طور پر میرا ذہن نامعلوم مسلح حملہ آوروں کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر پہلے انہوں نے کسی کی تلاش میں کوٹھی کے اندر بڑی افراتفری مچائی تھی۔ تو کیا وہ اس شخص کی تلاش میں تھے؟

اس سوال نے مجھے بے حد محتاط بنا دیا۔ میں بڑی احتیاط سے دبے قدموں اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ جو کوئی بھی تھا، جھاڑیوں کے پیچھے غروب ہو گیا تھا۔ میں نہایت مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ میری طرف سے بے خبر اس جالی دار روشن دان کی سمت بڑھ رہا تھا جس کے پیچھے تہ خانے میں کم پاور کا بلب روشن تھا۔ اندر سے جیکٹ کے پھیلاؤ کے باوجود بھی ہلکی سی روشنی باہر سے نظر آ رہی تھی کیوں کہ میں اس وقت روشن دان کے انتہائی قریب کھڑا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان چار فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ تاہم زاویے مختلف تھے۔

پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ روشن دان سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنا چاہتا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ارادہ بدل دیا۔ شاید وہ اپنے آس پاس میری موجودگی کا احساس کر چکا تھا۔ اس نے بڑی سرعت سے پلٹ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔

میں ایسی کسی صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار کھڑا تھا، حملہ آور اس طرح میری جانب لپکا جیسے اپنے وجود سے ڈھانپ کر نیچے گرانا چاہتا ہو۔ اگر میں پہلے سے محتاط نہ ہوتا تو وہ اپنی چال میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی بدقسمتی کہ میں اس کے قابو میں نہ آسکا، جیسے ہی وہ میری جانب لپکا، میں نے پہلو کے بل جھک کر اسے سائیڈ تھرو مار دیا۔ وہ میرے اوپر سے ہوتے ہوئے جھاڑیوں کے پار جا گرا۔ بائیں باغ کی زمین سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے حلق سے ایک نفیس کراہ برآمد ہوئی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خالصتاً ایک نسوانی آواز تھی۔

میں حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ زمین بوس کو دیکھنے لگا۔ اس نے مردانہ شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی۔ سر کے بالوں کو بڑی صفائی سے سمیٹ کر قمیص کے کالر کے اندر چھپایا گیا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک عورت تھی...... اور نہایت ہی حسین و جمیل بھی!

میں اچھل کر ایک قدم پیچھے ہٹا اور اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا "کون ہو تم...... اور یہاں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور زمین پر ہاتھ ٹیک کر دھیرے دھیرے کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت میری نگاہ اس کے کندھے کی جانب گئی اور ایک لمحے میں، میں نے اندازہ لگا لیا، اس کا دایاں شانہ جوڑ کے مقام سے شدید زخمی تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا اور دائیں شانے سے اس کی قمیص خون آلود ہو رہی تھی۔ میرے سامنے کھڑی اس جنس مخالف کی عمر پچیس کے قریب ہوگی۔ اس کے حسن میں ایک خاص قسم کی تازگی پائی جاتی تھی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا، وہ کوئی لڑکی ہے یا عورت! بہر حال، اسے عورت کہنے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا۔ جب وہ منہ سے کچھ نہ بولی تو میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"کون ہو تم...... تمہیں کس نے زخمی کر دیا؟"

"میرے دشمنوں نے۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

میرے ذہن میں، گھنٹا بھر پہلے ہونے والی شدید فائرنگ تازہ ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا، مسلح حملہ آور اسی عورت کی تلاش میں کوٹھی میں کودے تھے۔ میں نے اپنے یقین کو آزمانے کے لیے اس سے پوچھا۔

"تمہارے دشمن ناکام ہو کر اس کوٹھی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی فائرنگ کے نتیجے میں صرف تمہارا شانہ زخمی ہوا ہے۔ تم کہاں چھپ گئی تھیں جو وہ تمہیں تلاش نہیں کر سکے؟"

"میں اپنی جان بچانے کے لیے ان جھاڑیوں میں دبک گئی تھی۔" وہ بہت صاف اردو بول رہی تھی تاہم اس کے لہجے میں سرحدی رنگ نمایاں تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا، اس کا تعلق کسی پشتون فیملی سے تھا۔ اس کی رنگت اور خال و خط بھی اسی جانب اشارہ کرتے تھے۔

میں نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے اور ان لوگوں کی تم سے کیا دشمنی ہے؟"

"میں اپنے بارے میں کچھ بتانے سے پہلے تمہارے بارے میں جاننا چاہوں گی۔" اس نے زخمی بازو کو دباتے ہوئے کہا "میں تمہیں اپنا خیر خواہ سمجھوں یا دشمن؟"

اس کے سوال میں بڑی قوت تھی جس سے مجھے یہ بھی پتا چلا کہ وہ ایک نڈر عورت تھی۔ زخمی بازو کے سبب اس کے چہرے پر تکلیف کے تاثرات ظاہر ہو رہے تھے تاہم وہ ہونٹوں کو بھینچ کر ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

میں نے کہا "میں اس کوٹھی کا مالک ہوں اور تمہارا دشمن نہیں ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے، میرے دوست ہو!" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ایک بلند حوصلہ اور پُراعتماد عورت تھی۔ حسن کے ساتھ ساتھ قدرت نے اِسے بے خوفی کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ میں نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھ سکتی ہو۔ دوستی کا فیصلہ بعد میں ہو جائے گا۔"

اس نے معنی خیز انداز میں سرتاپا میرا جائزہ لیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولی "اگر تم میرے خیر خواہ ہونے کا دعوے دار ہو تو پھر خیر خواہی کا ثبوت بھی دو۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"فی الحال صرف اتنا کہ تم مجھے یہ رات اپنی کوٹھی کے کسی کونے کھدرے میں گزارنے دو۔" اس نے سادگی سے کہا "میرے دشمن یہاں تلاش میں ناکام ہونے کے بعد جا چکے ہیں۔ انہوں نے یہی نتیجہ نکالا ہوگا کہ میں اس کوٹھی سے نکل گئی ہوں لہٰذا وہ پلٹ کر ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ یہ کوٹھی میرے لیے محفوظ مسکن ثابت ہوگی۔ تم مجھے یہ رات یہاں گزارنے کی اجازت دے دو۔ میں صبح ہوتے ہی کہیں چلی جاؤں گی۔ بھلا ہو ان جھاڑیوں کا!" اس نے دیوار کے ساتھ ایک قطار میں موجود جھاڑیوں کی جانب اشارہ کیا "اس آڑ کے سبب میں اپنے دشمنوں کی نظر میں نہ آسکی...... اور یہیں پر مختصر روپوشی کے دوران میں، میری نگاہ میں آگیا کہ اس کوٹھی کے اندر کوئی تہ خانہ بھی موجود ہے۔ میں نے ایک ننھے منے روشن دان کے پیچھے ہلکی روشنی دیکھی تھی پھر اندر کسی نے روشن دان کے آگے کوئی کپڑا تان دیا۔ روشنی کا اخراج پوری طرح بند تو نہیں ہوا تاہم اب اندر دیکھنا ممکن نہیں رہا۔"

"تو ابھی ابھی تم اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا "تم نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا؟"

"زرگل!" اس نے دو لفظی جواب دیا۔

اس کے جواب نے اس بات کی مزید تصدیق کر دی کہ وہ کسی پشتون فیملی سے تھی۔

"اور تمہارا دشمن کون ہے؟" میں نے پوچھا "جو اس بری طرح ہاتھ دھو کر تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ تھوڑی دیر پہلے اس کوٹھی میں ہونے والی فائرنگ کو معمولی نہیں کہا جا سکتا!"

وہ بولی "میرے دشمن کا نام حکمت یار ہے۔ یہ سب اسی کے بندے تھے جو مجھے شکار کرنے کے لیے تمہاری کوٹھی میں گھس آئے تھے۔"

"حکمت یار سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟"

"میں اس کی دشمن نہیں بلکہ وہ میرا دشمن ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" میں نے کہا "تم حکمت یار کے بارے میں بتاؤ؟"

"حکمت یار رشتے میں میرا چاچا ہے۔" اس نے بتایا "اس خاندانی دشمنی کی کہانی بہت طویل ہے۔ کبھی فرصت اور موقع ملا تو تمہیں ضرور سناؤں گی۔ فی الحال تو تم مجھے رات گزارنے دو۔ میرے بازو میں بھی شدید تکلیف ہے۔"

میں اس کی تکلیف کو سمجھ رہا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔ میں نے زرگل سے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔"

بات ختم کرتے ہی میں نے ہال نما کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ بھی میرے پیچھے آنے لگی۔ میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے زرگل کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ زخمی تھی اور رات اس کوٹھی میں گزارنا چاہتی تھی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ مجھ پر بھروسا کر رہی تھی۔ اس کے بھروسے پر پورا اترنا ضروری تھا تاہم اس نے تہ خانے کے بارے میں انکشاف کر کے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ اگر اس نے اندر جھانک کر "دلچسپ" مناظر دیکھ لیے تھے تو وہ میرے اور اس کوٹھی کے بارے میں جانے کیا سوچ رہی ہوگی۔ اتنی نیو امکان اس بات کا تھا کہ وہ ابھی تک تہ خانے کے اندرونی "حالات" سے آگاہ نہیں ہوگی۔ اگر اس نے تہ خانے کے اندر خادم حسین، قادر بخش اور مجھے دیکھ لیا ہوتا تو اس کوٹھی میں رات گزارنے کا فیصلہ ہرگز نہ کرتی۔

میں نے تصدیق کی خاطر اس سے سوال کیا "تم نے اس کوٹھی میں تہ خانہ تو دریافت کر لیا۔ کیا تمہیں اس کے اندر جھانکنے کا موقع بھی ملا؟"

اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولی "جب اندر دیکھنا ممکن تھا تو میں نے کوشش نہیں کی۔ اس وقت میری پوری توجہ حملہ آوروں کی طرف لگی ہوئی تھی۔ میرے تمام حواس صرف اور صرف حکمت یار کے بندوں کی طرف متوجہ تھے۔ جب مصیبت ٹل گئی اور وہ لوگ یہاں تلاشی میں ناکامی کے بعد واپس ہو گئے تو مجھے سکون کی سانس لینا نصیب ہوئی۔ میرے دیا نارمل انداز میں فعال ہوئے تو مجھے روشن دان کا خیال آیا۔ اس وقت تک روشن دان کے اندر کوئی پردہ تان دیا گیا تھا۔ میں نے اندر جھانکنے کے لیے روشن دان کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ تم ادھر آ نکلے۔"

میرے سینے سے اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ زرگل تہ خانے کے اندرونی حالات سے آگاہی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ ہم باتیں کرتے ہوئے ہال نما کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جاتے ہوئے میں دروازے کو بھیڑ گیا تھا تاہم وہ لاک نہیں کیا تھا۔ ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو زرگل ٹھٹک کر رک گئی۔

میں پلک جھپکتے میں اس کے ٹھٹکنے کا سبب جان گیا۔ ہال کی ایک دیوار کے ساتھ زخمی فیض بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا اور زرگل یک ٹک اسی کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے صورت حال کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا۔ یہ جملہ غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا تھا۔

"یہ سب تمہارے دشمنوں کا کیا دھرا ہے۔"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور تشویش ناک لہجے میں پوچھا "کیا یہ شخص مر چکا ہے؟" اس نے انگلی سے فیض احمد کو اشارہ بھی کر دیا۔

"فی الحال اس کی زندگی اور موت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے گول مول جواب دیا "اس کا یہ حال حملہ آوروں کی فائرنگ سے ہوا ہے۔"

"اور تم اب تک کیا کرتے پھر رہے ہو؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "فائرنگ کرنے والوں کو یہاں سے رخصت ہوئے کافی دیر ہو گئی۔ تم نے ابھی تک اس شخص کو کوئی طبی امداد نہیں دی۔ اگر یہ جان سے گزر گیا تو......"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "کیا یہ شخص تمہارا ہی بندہ ہے؟"

"یہ اللہ کا بندہ ہے۔" میں نے مبہم انداز میں کہا۔

"تت...... تم بھی مجھے عجیب لگ رہے ہو!" وہ مشکوک انداز میں میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے بولی "تم نے خود کو اس کوٹھی کا مالک ظاہر کیا ہے لیکن تمہارا رویہ اس کی نفی کر رہا ہے۔"

میں نے ہال نما کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا اور زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں کیا ہوں، کیوں ہوں اور کون ہوں...... تم اس چکر میں نہ پڑو۔ ایک بات کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم یہاں پوری حفاظت کے ساتھ رات گزار سکتی ہو۔ یہاں پائی جانے والی کوئی بھی شے تمہیں ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچائے گی اور......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کہا "اگر تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہی ہو یا یہ کوٹھی تمہیں محفوظ نظر نہیں آ رہی تو تم جہاں جانا چاہو، جا سکتی ہو۔ میں کوٹھی کے گیٹ پر جا کر خود تمہیں رخصت کروں گا۔ ویسے تو تھوڑی دیر میں، میں بھی یہاں سے جانے والا ہوں۔ تم اگر کہو گی...... تو میں تمہیں کہیں بھی چھوڑ دوں گا۔ میرے پاس ایک بڑی جیپ ہے۔ شاید تم نے اس جیپ کو کوٹھی میں کھڑے دیکھا ہو۔ میں تمہیں، تمہارے پسندیدہ محفوظ مقام پر پہنچا کے آگے نکل جاؤں گا۔"

"ہاں، میں نے وہ جیپ دیکھی ہے۔" اس نے اپنی لانبی پلکوں کو اثباتی جنبش دی اور کہا "مگر تم کہاں جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟ تم تو اس کوٹھی کے مالک ہو۔" وہ کھوجنے والے انداز میں چند لمحے خاموشی سے مجھے تکتی رہی پھر بڑے یقینی لہجے میں بولی "تم چاہے کچھ بھی کہو لیکن میں کسی بھی طور تمہیں اس کوٹھی کا مالک تسلیم کرنے کو تیار نہیں یقیناً تم بھی میری طرح کسی مصیبت سے دوچار ہو کر یہاں پہنچے ہو۔ میں نہیں جانتی، تمہارے عزائم کیا ہیں؟ تاہم تم بہت ہی پراسرار اور گہرے آدمی ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

وہ اتنے اعتماد سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی کہ مجھے دل میں ماننا پڑا، وہ خاصی جہاں دیدہ اور تجزیہ نگار عورت تھی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے میرے بارے میں اندازے قائم کیے تھے۔ میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ حسن اور ذہانت خال خال ہی یکجا نظر آتے ہیں!

میں نے بڑی گہری نظر سے زرگل کی آنکھوں میں جھانکا اور نہایت ہی ٹھہرے لہجے میں کہا "میرا نام وجیہ ہے...... اس سے زیادہ جاننے کے چکر میں نہ پڑو تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ ہاں، اگر مناسب سمجھو تو یہ ضرور بتا دو، تم نے کس بنا پر اتنے وثوق سے کہا ہے کہ میں اس کوٹھی کا مالک نہیں ہوں؟"

"اس بنا پر کہ کوٹھی کا مالک، کوٹھی میں آمد و شد کے لیے عقبی دیوار پر کودا پھلانگی نہیں کرتا۔" وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے جھاڑیوں کے عقب میں چھپ کر تمہاری وہ حرکت دیکھ لی تھی۔ تم نے نہایت ہی محتاط انداز میں دیوار پھلانگی اور باہر چلے گئے۔ میں یہ سمجھی کہ تم اب واپس نہیں آؤ گے یا کچھ دیر بعد آؤ گے۔ یہی سوچتے ہوئے میں روشن دان کی طرف بڑھی مگر تم میری توقع سے بہت پہلے نہ صرف واپس آ گئے بلکہ بڑے غیر محسوس انداز میں میرے سر پر بھی پہنچ گئے۔" وہ خود اعتمادی سے مجھے دیکھ رہی تھی "البتہ، میں اس بات کا اعتراف کروں گی کہ تمہاری، کوٹھی میں واپسی کا مجھے مطلق احساس نہیں ہوا۔" اچانک رک کر اس نے مجھ سے استفسار کیا "کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ یقینی طور پر غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کے اندازے اور معاملہ فہمی بہت مضبوط تھی۔ میں اس کے سوال کا جواب دینے

کے بجائے بے ہوش فیض کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے نزدیک ہی وہ گرم چادر بھی موجود تھی جس کی بکل مار کردہ اس کوٹھی میں ''وارد'' ہوا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کر کے، اس چادر میں سے تین انچ چوڑی کوئی گز بھر کی پٹی پھاڑ لی اور زرگل کے قریب آ گیا۔

''کون کیا غلط کہہ رہا ہے اور کیا درست، اس کا فیصلہ بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا ''تمہارے زخمی بازو سے رسنے والے خون کو روکنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر تم اپنا بازو مجھے دے دو تو میں اس کا معائنہ کر کے پٹی باندھ دیتا ہوں۔''

''میرے خیال میں زخم زیادہ گہرا یا تشویش ناک نہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولی ''شاید کوئی گولی گزرتے ہوئے میرے بازو کی مزاج پرسی کر گئی ہے۔''

وہ بڑی روانی اور صفائی سے اردو بول رہی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا، سرحدی لوگ خصوصاً عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتیں۔ لڑکیوں کو اسکول کالج بھیجنے کا رواج نہیں ہوتا۔ بس وہ اپنی مادری زبان ہی سے آشنا ہوتی ہیں یا پھر پشتون لہجے میں ٹوٹی پھوٹی اردو بول کر گزارہ چلا لیتی ہیں لیکن زرگل کی بات چیت سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اس سے میرے ذہن میں یہ بھی نقش ہو گیا کہ وہ فارمولا درست نہیں، سرحدی لوگ بھی تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں اور حتی الوسع تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، چاہے دوسروں کی نسبت یہ تناسب کم ہی کیوں نہیں ہو! زرگل نے پائیں باغ میں مجھے بتایا تھا، اس کے زخمی شانے میں شدید تکلیف ہے لیکن اب وہ گھائل بازو کی طرف سے بے پروائی برت رہی تھی۔ اس موقع پر بحث مباحثہ مناسب نہیں تھا۔

میں نے زرگل کی بات کے جواب میں کہا ''زخم کی گہرائی یا تشویش ناکی کے بارے میں معائنے کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ اگر تم اپنے بازو میں تکلیف محسوس نہیں کر رہی تو دوسری بات ہے۔''

اس نے بے دھڑک اپنا بازو میرے سامنے کر دیا اور کف کا بٹن کھول کر آستین الٹنے لگی۔ اگلے ہی لمحے اس کا ریشمی دودھیا بازو میری نگاہ میں چمکنے لگا۔ بعض تجربہ کار لوگ عورت کے ہاتھ اور پاؤں کو دیکھ کر اس کے حسن کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ میں زرگل کا چہرہ دیکھتے ہی اسے ایک حسین و جمیل عورت قرار دے چکا تھا اور اب اس کا ایک بازو میری نظر کے سامنے کھلا ہوا تھا جو بہ زبان خموشی اس کے سراپا ناز ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

زرگل کا اندازہ بالکل درست تھا۔ گولی اس کے کندھے کی کھال کو چھیلتے ہوئے گزری تھی اور خون نے کندھے کے مقام سے اس کی قمیص کو بھگو دیا تھا۔ وہ زخم تین پٹیوں کی مار تھا۔ میں نے چادر سے پھاڑی ہوئی پٹی نہایت مہارت کے ساتھ زرگل کے زخمی کندھے پر باندھ دی۔ اس نے آستین گرا کر کف کا بٹن لگا دیا۔

میں نے پوچھا ''زرگل! تم نے یہ مردانہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟''

''اس کا تعلق بھی میری اسی طویل کہانی سے ہے جو ابھی تمہیں سنا نہیں سکتی۔'' وہ تشکر آمیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''آسانی کے لیے یہ سمجھ لو کہ میں نے خود کو دشمنوں سے چھپانے کے لیے عارضی طور پر یہ سوانگ بھرا ہے۔'' وہ ذرا توقف کرنے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوئی ''اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ وجیہ۔ یہ نہ کہنا کہ تم اس کوٹھی کے مالک ہو اور......''

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بڑے ہوئے انداز میں مجھے تکنے لگی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ میں جیسے ہی اس سے کوئی ذاتی سوال کرتا وہ پلٹ کر میری ذات کے بارے میں پوچھنے لگتی۔ میں نے چھڑانے کی غرض سے کہا۔

''تمہاری طرح میری داستان بھی بہت طویل ہے، فرصت ہی سے سنی اور سنائی جا سکتی ہے۔'' ایک لمحے توقف سے میں نے اس سے پوچھا ''تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟''

''میں گریجویٹ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ویری گڈ۔'' میں نے اختیار سراہنے والے انداز میں کہا ''اسی لیے تمہاری اردو صاف شفاف ہے۔ تعلیم انسان کو بنانے سنوارنے میں بہت مدد دیتی ہے۔''

اس نے میری رائے پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور بائیں ہاتھ سے اپنے گھائل دائیں کندھے کو دبانے لگی۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''زرگل! تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

اس نے الجھن زدہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ شاید وہ میری بات سمجھ نہیں پائی تھی۔

میں نے کہا ''کیا تم یہ رات اسی کوٹھی میں گزارنا چاہتی ہو؟''

''تم اپنے بیان کے مطابق تھوڑی دیر بعد یہاں سے چلے جاؤ گے۔'' اس نے بہ دستور الجھے ہوئے لہجے میں

جبکہ میں محسوس کر رہی ہوں، اس کوٹھی میں اور کوئی ذی نفس موجود نہیں۔ میں اس زخمی بے ہوش کے ساتھ تو اس کوٹھی میں رات نہیں گزار سکتی۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے فیض کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا ''اس کا بندوبست تو میں ابھی کر دیتا ہوں۔''

''اس کے باوجود بھی میں یہاں سے جانا چاہوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی ''اگر تم میرے ساتھ یہاں سے نکلنا چاہتی ہو تو پھر ذرا رک کر انتظار کرو۔ میں اس بندے کو تھوڑی ''عزت'' دے دوں...... اور اگر تم اکیلی جانا چاہتی ہو تو میری طرف سے اجازت ہے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دو؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا ''تم اس بے ہوش بندے کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟''

اس کے استفسار سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ وہ میری معیت میں اس کوٹھی کو خیرباد کہنے کا ارادہ رکھتی تھی ورنہ وہ سوال و جواب کے چکر میں پڑے بغیر پہلی فرصت میں وہاں سے کھسک لیتی۔

میں نے کہا ''میں اس کے ساتھ اچھا برا جو کچھ بھی کروں گا تمہاری نظر کے سامنے ہی کروں گا۔ دیکھتی جاؤ!''

اتنا کہہ کر میں اپنے زخمی شکار فیض احمد کی جانب بڑھ گیا۔ اس سے چھینا ہوا لوڈڈ ریوالور اس وقت میری جیب میں موجود تھا جب کہ گینڈا نما قادر بخش کا خالی پستول اسی ہال کے ایک کونے میں بے وقعت پڑا تھا۔ زخمی گینڈے نے وہ خالی پسٹل مجھے کھینچ مارنے کی کوشش کی تھی مگر اسے شکست کے ساتھ ہی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

میں نے فیض کے نزدیک جھک کر اس کا ماہرانہ معائنہ کیا اور جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا، وہ ابھی اسی جہاں میں تھا تاہم اس کی سانسیں بڑی مدھم چل رہی تھیں۔ دیوار سے ٹکراؤ کے بعد اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی جہاں سے اچھا خاصا خون نکل کر فرش پر پھیل گیا تھا۔

اس کوٹھی سے نکلنے سے قبل فیض کو تہ خانے میں منتقل کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر اسی دیوار کی جانب لے جانا چاہا جس کے پیچھے خفیہ تہ خانے کا راستہ تھا تو زرگل میرے قریب آ گئی اور تعاون آمیز لہجے میں بولی۔

''وجیہ! تھوڑی جگہ دو۔ میں بھی تمہاری مدد کرتی ہوں۔''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی خواہش کے پیش نظر فیض کا ایک بازو اس کے حوالے کر دیا۔ ہم دونوں مل کر اسے گھسیٹتے ہوئے دیوار کے نزدیک لے آئے۔

زرگل کو کچھ معلوم نہیں تھا، اب میں فیض کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا۔

''مجھے لگتا ہے، اس بندے کا تعلق تمہارے مخالفین سے ہے؟''

''تمہیں درست لگتا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا ''یہ کوٹھی میرے دوست فرید پاشا کی ملکیت ہے۔ وہ اس وقت یہاں موجود نہیں...... اور باقی جو بھی موجود ہیں وہ میرے دشمنوں ہی میں شمار ہوتے ہیں۔''

''کیا میں بھی؟'' اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

اس کے سوال نے مجھے بوکھلا دیا۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ بدستور گہری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی ''میں نے تو ابھی تک تمہارے خلاف کسی دشمنی کا ثبوت نہیں دیا!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے سنبھل کر کہا ''تم نے مجھ سے کوئی دشمنی کی ہے اور نہ ہی کسی دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ تمہارے بارے میں، میں بعد میں فیصلہ کروں گا...... فی الحال تم خود کو نیوٹرل سمجھو۔''

وہ غیر مطمئن انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''اچھی بات ہے۔'' پھر اس نے فیض کی طرف اشارہ کیا ''اب اس بندے کا کیا کرنا ہے؟''

''اس کو تہ خانے میں پہنچانا ہے۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''یہ یہاں اچھا نہیں لگ رہا، وہاں اس کے دو ساتھی پہلے سے موجود ہیں۔ یہ اپنے قبیلے میں پہنچ کر خاصا...... ریلیکس محسوس کرے گا۔''

وہ لانبی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی ''پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو۔ یہ سب کچھ کہیں تم مذاق میں تو نہیں کر رہے ہو وجیہ؟''

اس کوٹھی کے خفیہ تہ خانے کا راز فرید پاشا اور مجھ سے آگے بڑھ کر خادم حسین اور قادر بخش تک پہنچ چکا تھا۔ اس راز میں فیض کی شمولیت بھی ہونے والی تھی چنانچہ زرگل بھی اس تہ خانے کی جھلک دیکھ لیتی تو اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اس تہ خانے میں آمد و شد کی تکنیک صرف فرید پاشا اور مجھ تک ہی محدود تھی۔

''میرا تمہارا کوئی مذاق نہیں ہے زرگل!'' میں نے اس حسین صورت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا ''اس ہال نما کمرے کے نیچے واقعی ایک تہ خانہ موجود ہے جسے ابھی تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گی۔ تم اس تہ خانے کے نیم روشن، روشن دان کو دیکھ چکی ہو۔''

اس نے سرہلانے پر اکتفا کیا تاہم اس کی مقناطیسی آنکھوں میں حیرت نما الجھن بدستور ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ خاصی متذبذب نظر آتی تھی۔

اگلے دو منٹ کے اندر میں نے مخصوص تکنیک کا استعمال کر کے فیض کو، زرگل کی مدد سے گھسیٹ کر قادر بخش کے قریب لا چھوڑا۔ تہ خانے کے اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازے کو بند کر دیا تھا۔ زرگل کو یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ اس نے اسی تہ خانے کے مختصر روشن دان سے بلب کی ملگجی روشنی پھوٹتے دیکھی تھی۔

میرے ساتھ ایک سراپا حسن عورت کو دیکھ کر گینڈا نما قادر بخش کے دیدے حیرت سے پھیل گئے۔ خادم حسین کی سرخ آنکھوں میں بھی تعجب کی سیاہ پرچھائیاں لہرائیں۔ میں نے ان کے تاثرات سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ زرگل سے آشنا نہیں تھے اور زرگل کی بھی کچھ ایسی ہی پوزیشن تھی۔ یہ ایک اطمینان بخش بات تھی۔ وہ دونوں زرگل کو میری ساتھی سمجھے تھے۔

خادم حسین کو چھت کی ''زینت'' بنانے سے پہلے میں نے اس کی تفصیلی جامہ تلاشی لے لی تھی اس کی ضروری اور غیر ضروری اشیا کے ساتھ کوٹھی اور گاڑی کی چابیاں میرے قبضے میں آ چکی تھیں۔ لہٰذا میں نے اس جہاز منحوس سیکیورٹی گارڈ کو نظر انداز کرتے ہوئے قادر بخش سے کہا۔

''میں تم تینوں کو اس تہ خانے میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تمہارا فیصلہ فرید پاشا خود کل صبح آ کر کرے گا۔ خادم، فرید کا مجرم ہے لیکن تم دونوں بھی بلا اجازت غیر قانونی طور پر اس کی کوٹھی میں داخل ہوئے ہو۔ نہ صرف داخل ہوئے ہو بلکہ تم نے یہاں خاصی افراتفری بھی مچائی ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ کر لیا۔ باقی کا انٹرویو پاشا کرے گا۔''

''تم اب بھی خود کو بچا سکتے ہو وجدان!'' گینڈے قادر بخش نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا ''منشا اور چوہدری دلدار بہت خطرناک لوگ ہیں۔ تم ان کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر نہیں سکو گے۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو ہمیں شرافت سے، یہاں سے جانے دو۔''

مجھے اس نامعقول شخص پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا ''میں انتہائی شرافت کا ثبوت ہی دے رہا ہوں جو تم لوگوں کو زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں ورنہ تم خبیثوں کے اعمال تو ایسے ہی ہیں کہ تمہیں فرصت نکالے بغیر گولیوں سے بھون دینا چاہیے۔'' میں نے ریوالور کی نال کو اس کی پیشانی کی طرف کر دیا۔

وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ منہ سے ایک لفظ نہ بولا۔

میں نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا ''تم اسے، منشا اور چوہدری دلدار کی خطرناکی دیکھی ہو گی، ابھی میرے غضب اور سفاکی سے تم واقف نہیں ہو۔ اگر تمہاری زندگی نے وفا کی تو اس تہ خانے سے باہر آ کر منشا اور چوہدری دلدار کا حشر دیکھ لینا۔ میرے آئندہ ٹارگٹ وہی ہیں۔ تم لوگوں نے بہت عذاب ناک شکنجے میں ہاتھ ڈال دیا ہے!''

وہ کینہ توز انداز میں مجھے تکنے لگا۔ اگر وہ اس وقت میرے سامنے بے بس نہ ہوتا تو پتا نہیں، کیا کر گزرتا! میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں اور اب آخری مرتبہ تنبیہ کر رہا ہوں کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہاری ایسی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکے گی، خواہ مخواہ خود کو اور اپنے ساتھی کو ہلاکت میں ڈالو گے۔ اگر اب بھی میری بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو تم لوگ اپنی جانوں کو داؤ پر لگا سکتے ہو!''

اس وارننگ کے بعد میں زرگل کے ساتھ تہ خانے سے نکل آیا۔ دروازہ ایک مرتبہ پھر بند ہو گیا جسے مخصوص کوڈ کے بغیر کسی صورت کھولا نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے ہال کمرے میں آتے ہی زرگل سے کہا۔

''اس کمرے کے فرش سے ہمیں زخمی فیض کا خون صاف کرنا ہے۔ اس سلسلے میں تم میری مدد کرو گی۔''

اس نے تعاون آمیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے فیض کی باقی ماندہ چادر کو پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ہم کپڑے کے دو ٹکڑے پانی میں بھگو کر اپنے کام سے جت گئے۔ اگر وہ کوٹھی میرے دوست کی ملکیت نہ ہوتی تو میں اس تکلف میں نہ پڑتا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس ہال کمرے کو تسلی بخش بنا چکے تھے۔

جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ زرگل کو میں نے احتیاطاً جیپ کی عقبی نشست پر لٹا دیا تا کہ باہر سے دیکھنے والوں کو وہ دکھائی نہ دے۔ اس بات کو خارج از امکان نہیں سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کے دشمنوں میں سے کوئی ایک آدھ اب بھی کوٹھی کے باہر گھات لگائے انتظار کر رہا ہو۔ دشمن کو کبھی کمزور اور بے وقوف نہیں سمجھنا چاہیے!

☆☆☆

احتیاط کا شمار ان چیزوں میں ہوتا ہے۔ جو مختصر طور پر مفید اور کار آمد کہلاتی ہیں۔ محتاط شخص، کسی غیر محتاط آدمی کی بہ نسبت کم سے کم نقصان اٹھاتا ہے۔ میری احتیاط نے کوٹھی سے نکلتے ہی کام دکھانا شروع کر دیا۔

دو تین سڑکوں پر جیپ دوڑانے کے بعد میں شادمان کالونی کی طرف نکل آیا اور اسی وقت مجھے اپنے تعاقب کا احساس ہوا۔ وہ ایک سرخ جیپ تھی جو ایک خاص فاصلہ رکھتے ہوئے میرے پیچھے آ رہی تھی۔ اس سرخ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر کسی انسان کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ جیپ میں مزید کتنے افراد موجود تھے، اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان دو سو گز سے زیادہ کا فاصلہ تھا۔ اس فاصلے سے جیپ والے افراد زرگل کو عقبی نشست پر لیٹے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سرخ جیپ میں کون لوگ ہیں، کس مقصد کی خاطر وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں اور اس تعاقب کا آغاز کہاں سے ہوا ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا، ان لوگوں کا تعلق میرے دشمنوں سے ہے یا زرگل کے۔ اگر سفید ہائی روف بھی فریضہ انجام دے رہی ہوتی تو کہا جا سکتا تھا، وہ لوگ سراسر میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ جس وقت میں زرگل کے ساتھ کوٹھی سے نکلا تھا، سفید ہائی روف ہنوز اپنی جگہ کھڑی تھی اور گاڑی کا ڈرائیور ریاض بھی اسی پوزیشن میں اسٹیئرنگ پر ''موجود'' تھا۔ ریاض کی یہ طویل ''موجودگی'' خاصی تشویش ناک تھی۔ مجھے خدشہ ہونے لگا تھا، کہیں وہ انا للہ نہ ہو گیا ہو!

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے زرگل سے کہا ''جہاں لیٹی ہو، خاموشی سے لیٹی رہو۔ اٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں جو کچھ کہوں، اس پر فوراً عمل کرنا۔ تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ ہمارا تعاقب ہو رہا ہے۔ ایک سرخ جیپ کو میں اپنی دم سے بندھا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم ہے، یہ جیپ کن لوگوں کی ہے؟''

میرے سوال کے جواب میں عقبی نشست پر خاموشی طاری رہی۔

میں نے اپنا سوال دہرایا اور پوچھا ''زرگل! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

وہ بولی ''تم نے خود ہی تو کہا ہے، خاموش لیٹی ہوں۔ صرف تمہارے کہنے پر عمل کروں اگر میں تمہارے کسی سوال کا جواب دوں گی تو خاموشی ٹوٹ جائے گی۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی ''مجھے ڈر ہے، اگر میں نے تمہاری بات نہ مانی تو تم ناراض ہو جاؤ گے اور ناراضی میں تم مجھے اپنی گاڑی سے اتار بھی سکتے ہو۔ میں گاڑی سے نکلتے ہی غیر محفوظ ہو جاؤں گا۔ چاروں طرف میرے دشمن میری تلاش میں چکراتے پھر رہے ہیں۔''

زرگل کی دہشت اور خوف پوری طرح زائل ہو چکے تھے اور اس وقت وہ خاصی زندہ دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس حاضر جواب اجنبی حسینہ نے اپنے جواب سے مجھے تھوڑا سا گڑبڑا دیا تاہم میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''میں تمہاری خاموشی کو واپس لیتا ہوں۔ تم میری بات کا جواب دے سکتی ہو۔ ہماری آواز سرخ جیپ میں موجود لوگوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ کیا تم ان لوگوں کو جانتی ہو؟''

وہ قطعیت سے بولی ''میں سرخ جیپ سے متعلق کچھ نہیں جانتی۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ڈرائیونگ پر اپنی توجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا ''میں مختلف سڑکوں پر جیپ دوڑاتے ہوئے تعاقب کرنے والوں کو اپنے قریب آنے کا موقع دوں گا پھر ان کے عزائم کا پتا چل جائے گا لیکن اس سے پہلے تمہیں ایک کام کرنا ہو گا۔''

''کیسا کام؟'' اس نے لیٹے لیٹے استفسار کیا۔

میں نے کہا ''تم نہایت ہی صفائی اور آہستگی کے ساتھ اپنے وجود کو سیٹ سے لڑھکا کر نیچے گرا دو۔ اس طرح تم دو سیٹوں کے درمیان آ جاؤ گی۔ گویا، ایک طرح سے تم باہر سے دیکھنے والوں کی نظر میں پوشیدہ ہو جاؤ گی۔ تعاقب کرنے والے تمہیں اس جیپ میں دیکھ نہیں پائیں گے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، تمہیں غیر موجود پا کر وہ کس قسم کے ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا، وہ تمہاری تلاش میں ہیں یا میری؟ اگر وہ تمہاری وجہ سے تعاقب کر رہے ہیں تو پھر ہماری جیپ کو اوورٹیک کرنے کے بعد وہ اس تعاقب کو ختم کر کے کہیں اور نکل جائیں گے۔''

''یہ میں بہت آسانی سے کر لوں گی۔'' زرگل کی پرعزم آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''میں دو سیٹوں کے درمیان پہنچتے ہی اپنے وجود کو گٹھڑی بنا لوں گی۔ اگر سرخ جیپ میں حکمت یار کے بندے ہوئے تو وہ مجھے دیکھ یا پہچان نہیں پائیں گے۔ تمہاری تجویز قابل عمل اور مؤثر ہے۔''

میں نے جیپ کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، تم ایکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں انہیں اپنے قریب آنے کا موقع دیتا ہوں۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر زرگل معمولی سی آواز پیدا کرتے ہوئے دو سیٹوں کے درمیان جیپ کے قالین پوش

فرش پر پہنچ گئی۔ اس نے میری توقع سے زیادہ تیز رفتار حرکت کی تھی۔ اس کے عمل نے مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ کوئی چھوٹی موٹی لڑکی یا عورت نہیں، بلکہ سنگین نوعیت کی صورت حال سے نمٹنے کا اسے وسیع تجربہ تھا۔ اس کی زندہ مثال تو وہ واقعہ تھا جب درجن بھر افراد کوٹھی کے اندر اسے نشانہ بنانے کے لیے برسٹ فائرنگ کر رہے تھے۔ مجھے یقین تھا، زرگل کو پیش آمدہ حالات بڑے سنسنی خیز ہوں گے!

میں شادمان کالونی سے نکل آیا۔ چائنا چوک سے گزرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ صدف کے ماموں ڈی ایس پی اورنگ زیب خان کی طرف نکل جاؤں۔ اس کی کوٹھی چائنا چوک سے زیادہ دور نہیں تھی لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اس وقت دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کے موڈ میں تھا۔

میں غیر ارادی طور پر جیپ کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ مسجد تجلیِ کعبہ کے پاس سے گزرتے ہوئے میں شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) پر آ گیا پھر میری گاڑی پے در پے مختلف سڑکوں پر مڑتی رہی۔ مال روڈ، ریس کورس روڈ، لارنس روڈ اور گلبرگ روڈ سے گھوم کر میں کینال بینک روڈ پر آ گیا۔ یہ روڈ نہر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ فرید پاشا کی کوٹھی تک جانے کے لیے اصولی طور پر مجھے گلبرگ روڈ کو نہیں چھوڑنا چاہیے تھا اور نہر کا پل کراس کر کے گلبرگ کی طرف بڑھ جانا چاہیے تھا لیکن متعاقب جیپ کا راز افشا کرنا بہت ضروری تھا۔ میں اس قسم کی کسی مصیبت کو اپنے پیچھے لگا کر پاشا کی کوٹھی کی راہ نہیں دکھانا چاہتا تھا اور جیپ میں موجود ڈھیٹ افراد میری توقع کے خلاف عمل کر رہے تھے۔ میں ان کی تعداد اور رنگ و نسل کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

انہوں نے اس دوران میں وہ محدود فاصلہ قائم رکھا تھا جو ابتدا سے دونوں جیپوں کے درمیان موجود تھا۔ ان کی پالیسی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف اور صرف ہماری منزل کا سراغ لگانا چاہتے ہیں، راستے میں ہم سے چھیڑ چھاڑ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ایسے خیال رکھنے والے ''خیر خواہوں'' کو بے نقاب کرنا تو اور بھی اہم تھا۔

میں نہر کے ساتھ ساتھ کینال بینک روڈ پر آگے بڑھتا رہا۔ گلبرگ خاصا پیچھے رہ گیا تھا اور نسان پٹرول کا رخ مغل پورہ کی جانب تھا۔ رات کے وقت کینال بینک روڈ پر زیادہ رش نہیں ہوتا۔ ایک قطار میں بنی ہوئی نرسریز اور نہر کے کنارے استادہ بلند و پست درختوں کے باعث فضا میں خنکی در آئی تھی۔ میں نے ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر نسان پٹرول سڑک کے کنارے روک دی پھر زرگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں جیپ سے باہر جا رہا ہوں۔ ظاہر یہی کروں گا جیسے گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہے جس نے ہمیں یہاں رکنے پر مجبور کر دیا۔ میں جب تک تم سے نہ کہوں، گاڑی سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔'' پھر میں نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی طرف پھینک دیا اور کہا ''میں نے اگرچہ تمہیں عارضی پناہ دی ہے لیکن تمہاری حفاظت کی ذمے داری بھی فی الحال میرے ہی کندھوں پر آتی ہے۔ مجھے امید تو نہیں کہ مارا ماری کی کوئی صورت حال پیش آئے بہرحال، تم یہ ریوالور کسی نازک موقع کے لیے اپنے پاس رکھ لو۔ وقت کا کچھ بھروسا نہیں، یہ کسی سے صلاح مشورے کے بعد کروٹ نہیں بدلتا!''

میں زرگل کا جواب سنے بغیر جیپ سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ میں نے کھلا رہنے دیا اور جیپ کے اگلے حصے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے متعاقب جیپ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا، میرے اندازے کے عین مطابق وہ سرخ جیپ بھی سڑک کے کنارے رک چکی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ اب بھی کم و بیش دو سو گز ہی تھا۔ میں نے اپنی جیپ کا بونٹ اٹھا لیا اور متعاقب پراسرار جیپ کے بارے میں سوچنے لگا۔

ہم کینال بینک روڈ کے ایک ایسے حصے میں رکے تھے جو ہمارے دشمنوں کی کسی خطرناک سرگرمی کے لیے بہترین مقام تھا لیکن یہ دیکھ کر مجھے شدید حیرت ہوئی کہ سرخ جیپ میں سے کوئی برآمد نہ ہوا اور نہ ہی کسی قسم کی پیش رفت کی گئی۔ تقریباً دو منٹ انتظار کے بعد میں نے ایک حتمی فیصلہ کر لیا۔

میں سرخ جیپ کی مسٹری کو اپنے ذہن میں لے کر پاشا کے بنگلے میں نہیں جانا چاہتا تھا، جب جیپ والوں کی طرف سے کوئی پیش قدمی نہ ہوئی تو میں نے ازخود انہیں چیک کرنے کا عزم کیا اور بونٹ گرا کر میں ڈرائیونگ سائیڈ میں آ گیا پھر میں نے قالین پوش فرش پر موجود زرگل سے کہا۔

''جیپ والوں کی ڈھٹائی کو ناپنا ضروری ہے۔ وہ تو لگتا ہے، جیسے پاؤں میں مہندی لگائے بیٹھے ہیں۔''

زرگل نے اپنی جگہ پر موجود رہتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہاری بات سے اندازہ ہوتا ہے، تم ازخود ان کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ کیا جیپ والوں میں سے کوئی باہر نہیں آیا؟''

''اگر ادھر سے کوئی باہر نکلتا تو سسپنس ٹوٹنے کے امکانات روشن ہو جاتے۔'' میں نے کہا ''میں اس سسپنس کو تحفے کے طور پر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا اس لیے جیپ والوں کی ''خیریت'' پوچھنے ادھر جا رہا ہوں۔''

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی ''یہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے!''

''ہاں، ہو سکتا ہے۔'' میں نے بے پروائی سے کہا ''رسک لیے بغیر اس تجسس کو نہیں توڑا جا سکتا۔ تم گاڑی کے اندر ہوشیار اور محتاط رہنا۔ ادھر کے معاملات کو میں دیکھ لوں گا۔ تم اپنی حفاظت کا خیال رکھ لو تو یہ بھی کافی ہوگا۔ ویسے ایک بات کا مجھے پورا یقین ہے!''

''کس بات کا؟'' زرگل نے پوچھا۔

میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''وہ جو کوئی بھی ہیں، ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ دشمن ایسے ڈھیلے رویے کا مظاہرہ نہیں کرتے۔''

''یہ ان کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے وجیہ!'' زرگل محتاط لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ''یہ ممکن ہے۔ اس صورت میں بھی میں یقین کے ساتھ یہ کہوں گا کہ وہ چالباز دشمن ہماری جان کے طلب گار نہیں ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں دشمنوں اور ان کے سیکڑوں انداز کا مشاہدہ اور تجزیہ کیا ہے۔ جان کے دشمن یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھے نہیں رہتے۔ میرے تجربے میں چونکہ ایسے دشمنوں کا اندراج نہیں ملتا اس لیے بھی میں سرخ جیپ والوں کو ضرور چیک کروں گا۔''

اس کے بعد زرگل نے مجھ سے کوئی بحث نہ کی اور میں محتاط قدموں سے مذکورہ جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے درمیان بتدریج فاصلہ کم ہونے لگا۔ سرخ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کا ہیولا آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا۔ اگرچہ اس وقت کینال بینک روڈ پر اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ تاہم نزدیک جانے کے سبب اس شخص کے خال و خط مجھ پر ظاہر ہونے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑتی محسوس ہونے لگی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے خبردار کر رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ ہے؟ میں سردست اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا، پھر جب ہمارے درمیان چند قدم کا فاصلہ رہ گیا تو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں مجھے ایک سرد لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یکایک بے اختیار میرے قدم رک گئے۔

میں حیرت اور بے یقینی سے، سرخ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو دیکھ رہا تھا۔ ونڈ اسکرین کے پار اب وہ مجھے واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اس شخص نے کسی انڈے کے مانند سفید سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بے داغ پینٹ کوٹ میں تھا اور اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے کسی بت کی طرح خاموش جامد بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا۔

میں یک ٹک اسے تکے جا رہا تھا۔ اس کے حلیے کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد میرے ذہن میں جو تصور اجاگر ہوا، وہ بڑا ہولناک اور ناقابلِ تسلیم تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ کیا میری آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں؟ کیا میرا ذہن میری غلط راہنمائی کر رہا ہے؟ یا میں مشاہدے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں؟ کہیں یہ میرا واہمہ تو نہیں؟ کسی لاشعوری خیال نے مجسم صورت تو اختیار نہیں کر لی؟

اس نوعیت کے متعدد سوالات میرے دماغ میں چکرا رہے تھے اور ہر بار میں ایک ہی نتیجے پر پہنچ رہا تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ پلکیں جھپکائیں کہ کہیں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ اپنی آنکھوں کو مل کر دیکھا کہ کہیں میری بصارت تو متاثر نہیں ہو گئی۔ دو ایک بار اپنے سر کو جھٹکا کہ ایسا نہ ہو، میری بصیرت میں کوئی خلل واقع ہو گیا ہو...... مگر صورت حال ٹس سے مس نہ ہوئی۔ میرے مشاہدے کے نتیجے میں سرمو فرق نہ آیا۔ میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، سب ویسا ہی تھا اور یہ سب...... نہایت ہی سنسنی خیز تھا۔ میں گویا اس وقت کسی آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ سرخ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر میں بیٹھا تھا...... یعنی ہو بہو وجدان علی ابن عابد علی!

کیا آنکھوں دیکھی یہ حقیقت دماغ گھما دینے کے لیے کافی نہیں تھی؟ میں سفید چھت والی اس سرخ جیپ سے چند قدموں کی دوری پر کھڑا استعجابیہ انداز میں یہ سب سوچ رہا تھا اور اسی فور وہیل ڈرائیو، ٹویوٹا لینڈ کروزر سرخ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی میں موجود تھا۔ وہ جیپ جس کا نمبر فور سیون تھری سیون تھا...... اور اس کی پشت پر ایک اسپیئر ٹائر سفید کور میں اپنے مخصوص اسٹینڈ پر فکس تھا۔

میں جتنی دیر اس ناقابلِ یقین کیفیت میں مبتلا رہا، سرخ جیپ والے ''وجدان'' نے ذرا سی جنبش نہ کی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جادو کے زور پر کسی نے اسے ساکت کر دیا ہو۔ میں حیرت کے جھٹکے سے سنبھلا تو اس اسرار کو حل کرنے کی خواہش ہوئی۔

وہ اگرچہ ہنا ہنایا وجدان تھا مگر میں کسی بھی صورت اسے وجدان تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وجدان...... یعنی میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا اور...... کسی ہم شکل والی فلمی کہانی کے لیے میرے ذہن میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی

تھا، ایک سراب تھا، کوئی گہری چال ہو سکتی تھی اور امکان اس بات کا تھا کہ یہ خطرناک چال میرے دشمنوں کی طرف سے تھی۔ وہ میرے جیسے کسی کردار کو سامنے لاکر کوئی بڑا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے ابھی میں اس فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ چال میرے کس دشمن کی طرف سے ہے اور اس چال سے اس کے کیا عزائم وابستہ ہیں یہ سب کچھ جاننے کے لیے آگے بڑھنا ضروری تھا۔ اسی سوچ کے زیر اثر میں نے سرخ لینڈ کروزر کی سمت قدم اٹھا دیئے۔

میری اس پیش قدمی کے جواب میں دوسری طرف سے حیران کن ردِعمل ظاہر کیا گیا۔ وہ جیپ اگرچہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ تاہم ہماری نیسان پٹرول کی طرح اس کا انجن بھی بیدار تھا۔ میں نے اس نقلی وجدان کی جانب ابھی ایک قدم ہی بڑھایا ہوگا کہ سرخ جیپ اچانک حرکت میں آگئی اور...... یہ حرکت بیک ورڈ تھی۔

یوں محسوس ہوا، وہ پہلے ہی گاڑی کو بیک گیئر میں ڈالے بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیپ کو الٹا چلاتے ہوئے پیچھے لے گیا...... اور پیچھے...... اتنا پیچھے کہ رات کے اندھیرے نے گاڑی کے وجود کو نگل لیا۔ سرخ جیپ مجھ سے اتنے فاصلے پر چلی گئی کہ میرے لیے اس کو دیکھنا ممکن نہ رہا۔ میں سڑک کے کنارے ہکا بکا کھڑا، جیپ نشین کی اس عجوبہ روزگار حرکت کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری ہوبہو نقل نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ اسے رات کے اندھیرے نے اس طرح اپنی گود میں سمیٹا کہ پھر اس کی ایک جھلک دیکھنے کو نہ ملی۔ فوری طور پر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ پہلی ملاقات میں نقلی وجدان کو اتنی ہی ہدایت ملی ہوگی کہ وہ مجھ سے آمنا سامنا ہونے کے بعد پھوٹ لے۔ صرف مجھے یہ باور کرانا مقصود ہوگا کہ میری نقل تیار کرلی گئی ہے۔ کیوں؟ یہ ایک ایسی گتھی تھی جسے فی الوقت سلجھانا ممکن نہیں تھا۔ بہرحال، میں اس واقعے کو غیر معمولی سمجھنے پر مجبور ہوگیا۔

اپنی جیپ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں سوچنے لگا، جس دشمن نے بھی میری نقل تیار کی ہے اسے بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر وہ احمق یا بزدل ہوتا تو چھپ کر وار کرتا، اپنی ”پروڈکٹ“ کو یوں میرے سامنے نہ لاتا۔ یہ تو ایک کھلا چیلنج تھا میرے لیے۔ میرے پردہ نشیں پراسرار دشمن نے پتے میز پر پھیلا کر کھیل کا آغاز کیا تھا اور اتنا بہادر چوہدری نوازش علی بہرحال نہیں ہو سکتا تھا۔

میں اس نئی بساط پر غور کرتے ہوئے گاڑی کے پاس آگیا پھر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد زرگل سے
”اب تم آرام سے اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ سکتی ہو۔ خطرہ ٹل گیا ہے۔“

”تم یہ بات اتنی آسانی سے کہہ رہے ہو جیسے دودھ میں گری ہوئی مکھی کو نکال باہر کیا ہو۔“ وہ حیرت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے اٹھی اور نشست سنبھالنے سے قبل اس نے عقبی شیشے کے پار دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی
”وجیہ! سرخ جیپ کہاں چلی گئی؟“

”جہاں سے آئی تھی وہیں چلی گئی۔“ میں نے جیپ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں اسے گاڑی کے عقبی حصے کا منظر دکھانے والے آئینے میں تک رہا تھا۔ اس کا چہرہ الجھن کے جال میں جکڑا نظر آتا تھا اور اس کی یہ کیفیت حالات کے عین مطابق تھی۔ بالآخر اس نے متذبذب انداز میں دریافت کیا۔

”وجیہ! میں تمہاری بات سمجھ نہیں سکی ہوں۔ سرخ جیپ والوں نے اتنی دیر تک ہمارا تعاقب کیا اور پھر اچانک غائب ہوگئے۔ ایسے متعاقب دشمن پہلے میں نے کہیں دیکھے اور سنے!“

میں نے کہا ”میں بھی ایسا ہی محسوس کررہا ہوں۔“ پھر میں نے کندھے اچکائے ”کیا کیا جا سکتا ہے۔ ان کی مرضی ہے!“

زرگل کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات نمودار ہو[ئے]۔ اس نے شک آمیز لہجے میں استفسار کیا ”وجیہ! تم تو [سرخ] جیپ والوں کا حال احوال معلوم کرنے کے لیے گاڑی [سے] نکلے تھے۔ اس کا کیا رہا؟“

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر مڑ کر [عقبی شیشے] سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر ظاہر ہے، ہماری جیپ کے [عقب] میں دور دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہا ”میں جس مقصد کے لیے اپنی جیپ سے [اترا] تھا وہ پورا ہونے کی نوبت نہیں آئی اور میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی سرخ جیپ الٹے قدموں فرار ہوگئی۔“

اس کی آنکھوں میں موجود بے یقینی میں کوئی فرق نہیں [آیا] پھر یہی کیفیت الفاظ کا لبادہ اوڑھ کر اس کی زبان سے پھسل [پڑی] ”کہیں تم مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہے وجیہ؟“

”میں ایسی کوئی کوشش کیوں کرنے لگا؟“ میں نے [مغل] پورہ کے پل پر سے جیپ کو گزارتے ہوئے کہا ”اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟“

”فائدے اور نقصان کا تو مجھے پتا نہیں۔“ وہ بدستور الجھن زدہ انداز میں بولی ”لیکن سچ سچ بتاؤ، کیا واقعی کوئی سرخ جیپ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچی تھی؟“

وہ اس سوال میں حق بجانب تھی۔ فاضلیہ کالونی والی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں نے اسے عقبی نشست پر لیٹنے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے اپنے تعاقب کا احساس شادمان کالونی سے ہوا تو میں نے اسے نشست سے لڑھک کر جیپ کے فرش پر پہنچنے کا حکم دے دیا جہاں سے تھوڑی دیر قبل وہ اٹھی تھی۔ اس دوران میں اسے ایک لمحے کے لیے موقع نہ مل سکا کہ وہ متعاقب جیپ کی ایک جھلک بھی دیکھ پاتی۔ وہ اب تک میرے بتائے ہوئے پر یقین کرتی آئی تھی لہٰذا اسے یہ شک ہو سکتا تھا کہ میں نے اسے بے وقوف بنانے کے لیے تو کہیں سرخ جیپ کا چکر نہیں چلایا تھا۔

”یہ سچ ہے زرگل!“ میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

”پھر وہ کچھ کیے کرائے بغیر واپس کیوں چلے گئے؟“

”میں بھی ان کے اس رویے پر حیران ہوں۔“

وہ خاموش ہوگئی لیکن کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنا جاری رکھا۔

میں نے اپنی جیپ کو نہر کے پل کے اوپر سے گزارنے کے بعد واپسی کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اب ہمارا رخ مغل پورہ سے گلبرگ کی جانب تھا۔ میں نے نہر کے کنارے سفر جاری رکھتے ہوئے زرگل سے پوچھا۔

”کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے؟“

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی ”بات یقین اور بے یقینی کی نہیں وجیہ!“

”پھر کیا بات ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

وہ بولی ”مجھے منافقت سے شدید نفرت ہے۔“

”یہاں منافقت کا ذکر کہاں سے آگیا!“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”بتا رہی ہوں۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا ”اب تک تم نے میرے ساتھ دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا ہے اس لیے میں تم سے کسی قسم کی منافقت نہیں برت سکتی۔ تمہارے لیے میرے دل اور ذہن میں جو کچھ ہے، وہ تم سے کہنا چاہتی ہوں...... بالکل صاف صاف!“

میں نے سنجیدگی سے کہا ”میں بھی صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں۔ تم جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہو، بے دھڑک کہہ ڈالو۔“

”وجیہ!“ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے دوٹوک لہجے میں کہا ”سچی بات تو یہ ہے کہ تم بہت پراسرار ہو۔ میں تمہارے بیان کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ رہی۔ یقیناً کسی سرخ جیپ نے ہمارا تعاقب کیا ہوگا پھر وہ ہم سے کوئی زبانی یا عملی مکالمہ کیے بغیر واپس چلے گئے، یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔ تم کہہ رہے ہو تو ایسا ہی ہوا ہوگا اور...... یہ تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہوگا۔ متعاقب جیپ والوں کو تم ہی نے فرار ہونے پر مجبور کیا ہوگا!“

میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا ”تم بھی عجیب بات کر رہی ہو زرگل!“

”ہاں، بات تو عجیب ہے مگر تمہاری پراسراریت کی دلیل ہے۔“

”یہ تم مجھے پراسرار ثابت کرنے پر کیوں تلی بیٹھی ہو؟“

”اس لیے کہ تم جو نظر آرہے ہو، وہ نہیں ہو!“

زرگل کی اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا پھر اس چونکنے میں تشویش بھی شامل ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا، کیا زرگل میری اصلیت جان گئی ہے؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ ہماری ملاقات کو لگ بھگ دو گھنٹے گزرے تھے۔ اس مختصر سی مدت میں وہ میری حقیقت تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ مجھے پراسرار کیوں سمجھ رہی ہے، میں نے اس سے سوال کیا۔

”زرگل! میرے اندر تمہیں ایسی کون سی پراسرار بات نظر آئی ہے؟“

وہ گمبھیر آواز میں بولی ”تم نے مجھے اپنا نام وجیہ بتایا ہے جبکہ تہ خانے کے اندر، اس گینڈے نے تمہیں وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا جس پر تم نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔ غالباً اس نے تمہیں کسی منشا اور چوہدری دلدار نامی خطرناک افراد سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی دھمکی کو تم خاطر میں نہیں لائے اور ان تینوں کو تہ خانے میں بند کر کے چلے آئے ہو۔ میں تمہیں وجیہ سمجھوں یا وجدان؟“

اس کے سوال میں بڑی طاقت تھی۔ اس سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ بہت ہی موقع شناس اور بہترین قوت مشاہدہ کی مالک تھی۔ اس کی یادداشت بھی بلا کی تھی۔ میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”زرگل! میں دراصل دہری زندگی گزار رہا ہوں۔ کہیں وجیہ بن کر اور کہیں وجدان کی حیثیت سے۔ تم نے تہ خانے میں میرے تین دشمنوں کو دیکھا ہے، وہ مجھے وجدان کے نام سے جانتے ہیں۔ اس میں راز یا اسرار والی کوئی بات نہیں۔“

اس نے کہا ”یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اپنے تین خطرناک دشمنوں کو ایک ایسے تہ خانے میں چھوڑ آئے ہو جس کا روشن دان پائیں باغ میں کھلتا ہے۔ کیا وہ لوگ روشن دان کے راستے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کر سکتے۔ تم شکل سے اتنے بے احتیاط تو نظر نہیں آتے!“

وہ بڑے کانٹے کے سوال پوچھ رہی تھی۔ میں نے اپنی جیپ کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا ”پہلی بات تو یہ کہ اس روشن دان سے فرار کی کوشش کامیاب ہونا ممکن نہیں۔ اگر وہ کسی طرح اس پر نصب گرل کو اکھاڑ بھی لیں، تب بھی تین ضرب آدھا فٹ خلا میں سے کسی انسان کا گزرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ البتہ اگر وہ دیوار توڑنے کی مہم میں لگ جائیں تو بات دوسری ہے۔ اس کوشش میں بھی ان کی کامیابی کے امکانات اس لیے نظر نہیں آتے کہ اول تو تہ خانے میں ایسی کوئی شے دستیاب نہیں جس کی مدد سے وہ تہ خانے کی مضبوط دیوار میں توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر سکیں۔ بہ فرضِ محال، وہ لوگ یہ کام شروع کر بھی دیتے ہیں تو کنکریٹ بھری اس دیوار کو کاٹتے کاٹتے صبح ہو جائے گی جبکہ میں انہیں اتنی مہلت دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ میری بات ختم ہوئی تو اس نے جلدی سے پوچھا ”کیا تم اس طرف واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

میں نے کہا ”فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے اس دوست کی کوٹھی پر پہنچنے والا ہوں جس کی سابق کوٹھی میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔“ میں نے ذرا توقف کرنے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے زرگل کو بتایا ”میں پہلی فرصت میں فرید پاشا کو تہ خانے کا احوال سناؤں گا۔ وہ خود ہی ان تینوں کا کوئی معقول بندوبست کر دے گا اور کوئی سوال؟“

”اور سرخ جیپ والوں کے بارے میں کیا وضاحت کرو گے؟“

”میں ابھی خود ان کے رویے کو سمجھ نہیں پایا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اپنے ہم شکل نقلی وجدان کے سلسلے میں زرگل کے سامنے میں لب کشائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے کوئی پراسرار شخصیت قرار دینے کی مہم پر نظر آتی تھی۔ سرخ لینڈ کروزر سیون تھری سیون میں، میں نے جو کچھ دیکھا تھا اگر اس کا ذکر کر بیٹھتا تو زرگل سوالات کر کر کے میری جان کھا جاتی۔ اسی لیے میں نے گول مول جواب دیا ”جب میری سمجھ میں کچھ آ جائے گا تو تمہیں بھی بتا دوں گا۔ ویسے تم خواہ مخواہ اپنے ذہن کو مت کھپاؤ۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔“

وہ مجھ پر نگاہ گاڑے خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے گلبرگ روڈ کو کراس کرنے کے بعد جیپ کو اقبال روڈ پر ڈال دیا۔ یہ سڑک گلبرگ کے وسط سے گزرتی ہے۔ اس دوران میں، میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے بیک ویو مرر میں بھی جھانکتا رہا لیکن سرخ یا کسی بھی اور رنگ کی کوئی گاڑی مجھے تعاقب میں دکھائی نہ دی۔ فرید پاشا کی جانب سے پہلے میں نے تھوڑی اور احتیاط برتی اور گلبرگ مارکیٹ دمراتب علی روڈ سے گھومتے پھرتے ہوئے ایک لمبا چکر کاٹ کر نسان پٹرول کو ”گلبرگ تھری“ کی طرف موڑ لیا۔ اب اس جیپ کو فرید پاشا کی کوٹھی کے سامنے ہی جا کر رکنا تھا، بلکہ اس کوٹھی کے اندر جا کر۔

”زرگل! تم نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا، تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟“ میں نے اپنی ساتھی مسافر سے پوچھا ”میری منزل تو اب بہت قریب ہے۔“

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ”تم نے اب تک میری جو مدد کی ہے، میں اس کے لیے جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ جاتے جاتے ایک اور احسان بھی کر جاؤ۔“

”کیسا احسان زرگل؟“

اس نے کہا ”رات کا باقی حصہ اگر میں تمہاری منزل پر گزار لوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ میں علی الصبح روانہ ہو جاؤں گی۔“

”میں اعتراض کا حق نہیں رکھتا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”میری منزل دراصل میرے دوست کی کوٹھی ہے۔ یہ حق اسے حاصل ہے۔ اس سلسلے میں فرید پاشا کی اجازت ضروری ہے۔“

”اگر وہ تمہارا دوست ہے تو تمہارے ساتھ جانے والے کے لیے بھی اس کی کوٹھی میں ضرور گنجائش نکل آئے گی۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولی ”دو گھنٹے پہلے تم اپنے دوست کی ایک کوٹھی میں میری بھرپور مدد کر چکے ہو اور وہ بھی...... اس کی اجازت کے بغیر!“ تھوڑے توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ”میرا خیال ہے، فرید پاشا اعتراض نہیں کرے گا۔“

وہ بڑے منطقی انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ میں ایک طرح سے لاجواب ہو گیا۔ میں نے کہا ”چلو ٹھیک ہے، اس طرح مجھے تمہاری کہانی سننے کا موقع بھی مل جائے گا۔ تم بھی کچھ کم پراسرار کردار نہیں ہو۔“

”مگر تم زیادہ گہرے ہو!“ وہ تیقن سے بولی۔

"اچھا!" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "لیکن تمہارے ہاتھ میں تو مجھے ایک ریوالور نظر آ رہا ہے۔"

"تو!" زرگل نے اچنبھے نظر سے پہلے ریوالور کو اور پھر مجھے دیکھا "یہ ریوالور حفاظت کے خیال سے تم نے ہی مجھے دیا تھا۔ کیا اسے میرے ہاتھ میں نہیں ہونا چاہیے؟"

"کم از کم اس وقت نہیں!" میں نے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔

اس نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا "اس وقت کیوں نہیں؟"

"کیونکہ اس وقت تم میری گہرائی ناپ رہی ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میں توقع کر رہا تھا، تمہارے ہاتھ میں فیدم (FATHOM) ہوگا۔"

وہ اب بھی کچھ نہ سمجھی۔ مجھے یقین ہو گیا، وہ اس شے سے واقف نہیں تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں الجھن کے سائے لہراتے دیکھے۔ بالآخر وہ پوچھ بیٹھی۔

"یہ فیدم کیا ہوتا ہے؟"

"گہرائی ناپنے کا پیمانہ۔" میں نے گہری سنجیدگی سے بتایا "جس کی لمبائی چھ فٹ ہوتی ہے۔"

وہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نسان پٹرول میں جگنو سے جگمگا اٹھے ہوں۔ اس کی ہنسی بڑی روشن اور مترنم تھی۔ اب وہ پہلے سے کہیں مختلف زرگل نظر آ رہی تھی۔ وہ زرگل جو زندگی بچانے کے لیے پریشان نہ ہو بلکہ بچی ہوئی زندگی کو گزار کر خوش ہو۔ اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر اس بات پر میرا یقین مزید پختہ ہو گیا کہ انسان کی راحت اور کلفت حالات اور ماحول کی رہین منت ہیں۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہا ہوتا ہے، اس کی سوچ، مزاج اور رویے پر اسی نوعیت کے اثرات مرتب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

زرگل کی ہنسی نے مسکراہٹ کا روپ دھارا اور وہ بڑی زندہ دلی سے بولی "تم صرف گہرے ہی نہیں بلکہ شریر بھی ہو۔ تمہاری شرارت نے مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔"

"مجھ میں شرارت سے زیادہ حماقت بھری ہوئی ہے۔" میں بھی اس وقت شوخی پر اتر آیا تھا۔

"حماقت!" زرگل کے لہجے میں حیرت در آئی "مجھے تو کہیں نظر نہیں آ رہی؟"

"یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے جو میں تمہارے ہاتھ میں پیمانہ ڈھونڈ رہا ہوں!" میں نے بے دھڑک کہہ دیا "پیمانے تو تمہاری آنکھوں میں فٹ ہیں۔"

اس کو چپ سی لگ گئی۔ نظر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

میں نے کہا "بے چارہ چھ فٹا فیدم ان کے سامنے کیا بیچتا ہے۔ تمہارے پیمانوں کی رینج تو پتا نہیں......"

بے ساختہ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میری زبان کو پکڑ لیا ہو۔ شاید میرے اندر کوئی بیٹھا ہوا تھا جس نے ہاتھ بڑھا کر میری بولتی بند کر دی تھی، اس کے ساتھ ہی مجھے لگا، میں کوئی جرم کرنے جا رہا تھا۔ مجھے اپنے عمل پر پشیمانی کا احساس ہوا۔ کسی کے حسن کی تعریف کرنا بری بات نہیں لیکن میں اپنے اندرون سے مجبور تھا۔ جب سے ساحل مجھ سے جدا ہوئی تھی، گویا خوشیاں مجھ سے روٹھ گئی تھیں۔ شاید اسی سبب میں اپنے فعل پر ندامت محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنے اندر ساحل کو اس گہرائی میں سجایا تھا کہ اس کا احساس میرے وجود کا حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ میری ہر سانس اس کی یاد سے مہکتی تھی، اس کے تصور نے میری ذات کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میری اپنی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ اب میں صرف اور صرف اسی کے لیے زندہ تھا۔

میرے نامکمل جملے نے زرگل کو خاموشی توڑنے پر مجبور کر دیا "تم کچھ کہتے کہتے رک کیوں گئے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تھوڑی دیر پہلے تو بہت کچھ تھا۔ اچانک سب کیسے ختم ہو گیا؟"

"جو انسان کے اختیار میں نہیں ہو، اس پر "اچانک" حملہ آور ہو جاتا ہے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔"

"تم اپنی سمجھ کو گھائل نہ کرو۔"

"پھر کس کو کروں؟"

"مجھے نہیں معلوم!" میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور ونڈ اسکرین کے پار سیاہ سڑک کو گھورنے لگا۔

اس کے بعد زرگل نے کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ ہم دونوں کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ اس نے خاموشی اختیار کر کے سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا ورنہ میں ساحل کے تصور میں خلل پڑنے پر کوئی الٹا سیدھا سا جواب بھی دے سکتا تھا۔

محبوب کی یاد کا بھی ایک عجیب سا نشہ ہوتا ہے۔ یہ ہلکی ہلکی آنچ دیتی ہے۔ اس کیف آگیں کیفیت کو وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جنہوں نے زندگی میں محبت کی ہو، کسی کو ٹوٹ کر چاہا ہو۔ چاہت کے اپنے آداب ہیں۔ یہ آگ کا ایک دریا ہے جس میں ڈوب کر پار اترنا پڑتا ہے۔ من میں کبھی کی شمع روشن نہ ہو تو یہ دریا تن پر آبلے ڈال دیتا ہے!

☆☆☆

فرید پاشا کے بنگلے پر ایک اور حیرت میری منتظر تھی!

فرید کی زبانی مجھے یہ تو معلوم ہو چکا تھا، عمر دین نامی نئے سیکیورٹی گارڈ نے ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے صورت آشنا نہیں تھے چنانچہ گیٹ پر جب ہمارا سامنا ہوا تو تعارف کے باوجود بھی اس نے مجھے بنگلے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ اس کے رویے نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں پاشا کا بہت ہی قریبی دوست ہوں۔ کیا انہوں نے میرے بارے میں تمہیں بتایا نہیں؟"

وہ شک زدہ نظر سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا "سب کچھ بتایا تھا جی لیکن......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر زرگل کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ میری دوست ہے۔" میں نے گارڈ کی الجھن کے پیش نظر کہا "کیا تم اس کی وجہ سے پریشان ہو؟"

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا "میں آپ کو دیکھ کر الجھ گیا ہوں کیونکہ آپ تھوڑی دیر پہلے بھی یہاں آئے تھے......" وہ اپنی بات کو نامکمل چھوڑ کر جلدی سے بولا "ٹھہریں! میں اللہ دتا کو بلاتا ہوں۔"

یہ کہتے ہی وہ کیبن سے نکل کر کوٹھی کے اندر غائب ہو گیا۔ میں اس وقت عجیب و غریب صورت حالات سے دوچار تھا۔ گارڈ کا یہ کہنا کہ میں تھوڑی دیر پہلے بھی وہاں آیا تھا ناقابل یقین اور سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ زرگل بھی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تامل کرتے ہوئے بولی۔

"یہ کیا ماجرا ہے وجیہ۔ تم تو لگ بھگ ڈھائی گھنٹے سے میرے ساتھ ہو؟"

میں نے کہا "ماجرا تو میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا۔ اللہ دتا کو آ جانے دو پھر ہی کچھ پتا چلے گا۔"

"یہ اللہ دتا کون ہے؟" زرگل نے پوچھا۔

"فرید پاشا کا ملازم ہے۔ باورچی کے فرائض انجام دیتا ہے۔"

"کمال ہے، گارڈ ایک خانساماں کو بلانے گیا ہے۔ کیا تمہارا دوست فرید پاشا کوٹھی میں موجود نہیں۔"

"اسے کوٹھی میں ہی موجود ہونا چاہیے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "فون پر میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ اگر اسے کہیں جانا ہوتا تو مجھے ضرور بتاتا!"

ہماری بات چیت کے دوران میں گارڈ، اللہ دتا کے ساتھ گیٹ پر نمودار ہوا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اللہ دتا چونکا پھر نسان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں بولا "جناب! یہ گاڑی اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہو گئی...... اور یہ آپ کے ساتھ کون ہے؟" بات ختم کرتے ہی اس نے زرگل کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے اللہ دتا؟" میں نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا "کوٹھی کا گیٹ کھولنے کے بجائے تم لوگ میرا انٹرویو کیوں کر رہے ہو؟ پاشا کہاں ہے......؟ اور جیپ خراب ہونے کا کیا قصہ ہے۔ تم نے اس کے ٹھیک ہونے کی بات کیوں کی؟"

"آپ نے بہت زیادہ سوالات کر ڈالے ہیں۔" اللہ دتا ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا "کیا آپ تھوڑی دیر پہلے یہاں نہیں آئے تھے؟"

"یہ کیا بکواس ہے!" میں نے تقریباً چیخ کر کہا "پاشا کو فوراً یہاں بلاؤ۔"

وہ میرے جارحانہ انداز سے سہم گیا پھر میرے استفسار پر اس نے جو بتایا وہ "یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے!" والی بات تھی۔ اس کے شروع ہوتے ہی میرا دھیان آپوں آپ ایک ناقابل حل مسئلے کی طرف چلا گیا۔ اللہ دتا کے بیان کے مطابق، میں ایک سرخ لینڈ کروزر میں تھوڑی دیر پہلے اس کوٹھی پر آیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ نسان پٹرول اچانک خراب ہو گئی تھی اور میں اسے ایک گیراج میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے کوٹھی میں پندرہ بیس منٹ گزارے اور ڈارلنگ کو لے کر پھر کہیں نکل گیا۔

ڈارلنگ والی بات نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ یہ تو میں سمجھ گیا تھا، سرخ جیپ میں یہاں آنے والا وہی بہروپیا تھا جو شادمان کالونی سے میرا تعاقب کرتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچا تھا اور مجھ سے کلام کیے بغیر رفوچکر ہو گیا تھا۔ یقیناً اس کے بعد اس نے ادھر ہی کا رخ کیا تھا۔ یہ کم بخت نقلی وجدان بہت ہی خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ ڈارلنگ کو وہ اگر اپنے ساتھ لے گیا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ شاطر بلی بھی اس سے دھوکا کھا گئی۔ یہ تو بہت ہی تشویش ناک صورت حال تھی۔ ڈارلنگ کا دھوکے میں آ جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"وہ کس طرف گیا ہے اور کب واپس آئے گا؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا حالانکہ مجھے یقین تھا، وہ واپسی کے ارادے سے نہیں گیا ہوگا۔

اللہ دتا گمبھیر آواز میں بولا "جناب! آخر معاملہ کیا ہے۔ آپ دونوں میں اصلی کون ہے۔ یہ تو میں نے محسوس کر لیا ہے،

کوئی بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے۔''

اللہ دتا ایک معاملہ فہم اور دور اندیش شخص ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''وہ ایک بہروپیا ہے۔ بہت ہی خطرناک انسان۔ میں اصلی وجدان ہوں۔ تم جلدی سے گیٹ کھلواؤ اور پاشا کو بتاؤ، میں واپس آ گیا ہوں۔''

اللہ دتا نے موقع محل دیکھتے ہوئے گارڈ کو اشارہ کیا کہ وہ ہمارے لیے کوٹھی کا گیٹ کھول دے۔ میں جیپ کو اندر لے گیا پھر ہم دونوں گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اللہ دتا ہمارے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک اور انکشاف کیا۔

''صاحب! پاشا صاحب تو اس وقت کوٹھی میں موجود نہیں ہیں۔''

''وہ کہاں چلے گئے بھئی؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

اللہ دتا نے بتایا ''انہیں اچانک سید پور جانا پڑ گیا ہے۔ بڑے پاشا صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ فرید صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ادھر گئے ہیں۔''

بڑے پاشا سے اس کی مراد فرید کا باپ کمال پاشا تھی۔ یہ خبر بڑی ہولناک اور سنسنی خیز تھی۔ میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''وہ لوگ یہاں سے کتنے بجے روانہ ہوئے ہیں؟''

''سات بجے۔'' اللہ دتا نے بتایا۔

اس وقت رات کے نو بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا، پاشا کو گئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ یہ لگ بھگ وہی وقت تھا جب میں گینڈا نما قادر بخش کا انٹرویو کر رہا تھا۔ حالات نے اچانک سنگین صورت حال اختیار کر لی تھی۔

میں نے اللہ دتا سے پوچھا ''اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، وہ شاطر بہروپیا کتنی دیر پہلے یہاں سے گیا ہے اور اس نے اپنی واپسی کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''میرے خیال میں اسے گئے ہوئے بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔'' اس نے بتایا ''اس نے جاتے ہوئے یہی کہا تھا کہ تھوڑی دیر میں واپس آ جائے گا۔''

''وہ اپنے ساتھ میری چہیتی بلی کو بھی لے گیا۔'' میں نے ترش لہجے میں کہا ''اور تم لوگوں نے اسے روکا تک نہیں؟ یہ کیسی غیر ذمے داری ہے۔ کیا میں اسے خیانت سمجھوں؟''

وہ افسوس ناک انداز میں بولا ''ہم کیا کرتے جناب! ہم تو یہی سمجھے، آپ ہیں۔ آپ کو ہم کس طرح منع کر سکتے ہیں کہ ڈارلنگ کو اپنے ساتھ نہ لے کر جائیں۔''

وہ بے چارہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا ''چلو، گاڑی کے حوالے سے تو اس نے یہ جواز پیش کر دیا کہ وہ خراب ہو گئی ہے۔ تم لوگوں نے اس کے لباس پر بھی دھیان نہیں دیا۔ اس نے سفید پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور...... میرا لباس تم دیکھ ہی رہے ہو؟''

ہم باتیں کرتے ہوئے کوٹھی کے اندر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تو اللہ دتا نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا ''صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اسے ذہنی طور پر چونکہ وجدان ہی سمجھ رہے تھے اس لیے اس کے لباس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آ رہا ہے، اس چکر باز نے واقعی سفید کوٹ پہن رکھا تھا حتیٰ کہ اس کے پاؤں میں جوتے بھی سفید ہی تھے۔ اوہ میرے خدایا! یہ تو بہت غضب ہو گیا۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا ''ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ واقعی، آپ تو اسی لباس میں کوٹھی سے روانہ ہوئے تھے۔ آپ ہی اصلی وجدان ہیں۔'' پھر اس کا انداز ملتجیانہ ہو گیا ''صاحب! میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔'' اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''مجھ سے ایک سنگین خطا ہو گئی۔ اب اگر وہ بہروپیا مجھے نظر آ گیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے قدرے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا ''غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور اس غلطی میں تم بہت زیادہ قصور وار نہیں ہو۔ جو معاملات حالات کی ستم ظریفی نے بگاڑ دیے ہیں ان سے میں نمٹ لوں گا۔ تم اپنے ہاتھوں کو کنٹرول میں رکھو۔''

آخری جملہ میں نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ شرمندہ صورت بنا کر بولا۔

''اگر پاشا صاحب کو میری اس حماقت کا پتا چل گیا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔''

میں نے کہا ''یہ واقعہ پاشا سے چھپا نہیں رہ سکتا اور ممکن ہے، وہ تم سے سخت خفا بھی ہو بہر حال، گئے ہوئے وقت کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔''

وہ ندامت آمیز انداز میں گردن کو جھٹکنے لگا۔

میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے پوچھا ''کیا تم نے نقلی وجدان کو پاشا کی، سید پور روانگی کے بارے میں بتایا تھا؟''

''ہاں، بتایا تھا جناب۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

بولا ''اس پر اس نے پوچھا تھا، وہ واپس کب آئیں گے۔ ظاہر ہے میرے لیے وہ وجدان تھا اس لیے میں نے اسے ایک ایک بات ٹھیک ٹھیک بتا دی۔ پاشا صاحب سید پور کس وجہ سے گئے ہیں اور یہ کہ کل سے پہلے ان کی واپسی ممکن ہے۔ میں پاشا صاحب کے عزیز دوست وجدان سے کیونکر جھوٹ بولتا!''

اللہ دتا اپنی جگہ درست کہہ رہا تھا لیکن اس کی فراہم کردہ اطلاع میرے لیے قیامت در قیامت تھی۔ وہ چالباز بہروپیا میری ڈارلنگ کے ''اغوا'' کے ساتھ اس کوٹھی سے یہ معلومات بھی حاصل کر کے لے گیا تھا کہ صاحب خانہ آج کی رات کوٹھی پر نہیں۔ وجدان اور دو ملازم اس رات کوٹھی میں ہوں گے۔ پاشا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی حفاظت کا کوئی ٹھوس بندوبست کر لے گا لیکن کوٹھی کے اندر فی الوقت مجھے ایسے آثار نہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ خانساماں اللہ دتا اور سیکیورٹی گارڈ عمر دین کے علاوہ کوٹھی میں یا تو میں تھا یا پھر زرگل۔

اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ میرا ہو بہو بہروپ بھرنے والا وہ نقلی وجدان کسی بھی طور میرا دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھ سے مکالمہ کیے بغیر دم دبا کر موقع سے فرار نہ ہو جاتا۔ وہ یقیناً میرے دشمنوں کا بھیجا ہوا تھا جو میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ڈارلنگ کو بڑی صفائی سے کوٹھی سے نکال لے گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک کھلا چیلنج تھا، گویا اس نے شیر کے جبڑوں میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ایک کامیاب کوشش! ازاں بعد عی ہی، مگر مجھے اس جی دار بازو کو اپنے دانتوں تلے پیسنا تھا جو میری ڈارلنگ کو مجھ سے چھین کر لے گیا تھا۔

اس وقت میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ میرے دشمن اس بات سے آگاہ ہو گئے تھے کہ اس رات میں کوٹھی میں با آسانی شکار کیا جا سکتا ہوں۔ کسی بڑے بیرونی حملے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں بے اختیار سنسنی خیز نظر سے اللہ دتا کو دیکھنے لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ندامت سے نگاہ جھکا لی۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ''پاشا صاحب نے میرے لیے کیا پیغام چھوڑا ہے؟''

میں نقلی وجدان کی شرانگیز حرکت سے اس قدر کبیدہ خاطر ہوا تھا کہ پاشا کے باپ کا معاملہ نادانستہ طور پر پس پشت چلا گیا۔ پاشا کو میں دل سے دوست تسلیم کر چکا تھا۔ اس کے باپ کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا، یقینی طور پر یہ میرے لیے بھی کسی صدمے سے کم نہیں تھا۔ دوست کی مصیبت کو نظر انداز کرنا اعلیٰ درجے کی کم ظرفی کہلاتی ہے۔

اللہ دتا نے مجھے بتایا ''پاشا صاحب کو جیسے ہی فون پر پتا چلا کہ بڑے پاشا صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے تو انہوں نے سب سے پہلے آپ ہی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے آپ کو فاضلیہ کالونی والی کوٹھی پر فون کیا تھا لیکن آپ نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک دوست ڈاکٹر ریاض سے بات کی۔ ریاض صاحب دل کے ڈاکٹر ہیں اور بڑے پاشا صاحب کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ پاشا صاحب کے ساتھ ہی سید پور گئے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''آپ کے لیے انہوں نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ جب آپ واپس آ جائیں تو پھر تمام وقت کوٹھی کے اندر ہی موجود رہیں۔ وہ سید پور پہنچنے کے بعد کسی بھی وقت آپ کو فون کریں گے؟''

میرے سینے سے ایک طویل اور گہری سانس خارج ہوئی۔ فون کے ذکر پر وہ واقعہ میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جب فاضلیہ کالونی والی خالی کوٹھی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی تھی۔ میں نے دو فائرنگ برسٹ کے دوران میں، کوٹھی کے کسی حصے میں فون کی گھنٹی کی آواز واضح طور پر سنی تھی۔ ازاں بعد کی افراتفری اور ہلچل نے میرا دھیان اس طرف سے ہٹا دیا تھا۔ اگر اس وقت مجھے معلوم ہوتا کہ پاشا مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو میں کسی طرح فون اٹینڈ کرنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا لیکن افسوس کہ میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

کمان سے نکلا ہوا تیر اور بیتا ہوا لمحہ لوٹ کر واپس نہیں آتا اس لیے پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اللہ دتا سے کہا۔

''کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں تم نے کوئی بندوبست کیا ہے؟''

وہ دھیمی آواز میں بولا ''پاشا صاحب جس افراتفری کے عالم میں یہاں سے رخصت ہوئے ہیں اس واقعے نے مجھے بہت دل شکستہ کر دیا ہے۔ باقاعدہ کھانے کا اہتمام تو نہیں کیا گیا لیکن میں پندرہ بیس منٹ میں تیار کر لوں گا۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ خود میرا کھانے پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کھانے والا سوال میں نے محض زرگل کی وجہ سے کیا تھا۔ جن حالات میں ہماری ملاقات ہوئی تھی اس سے لگتا تھا، پچھلے کئی گھنٹوں سے، زندگی بچانے کی سعی نے اسے کھانا کھانے کی مہلت نہیں دی ہوگی۔ دل بوجھل اور ذہن پراگندہ ہی سہی مگر

زندگی کے تقاضے نبھانا پڑتے ہیں جن میں اولین تقاضا یہ ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا چاہیے، چاہے وہ کھانا زہر مار ہی کیوں نہ کیا جائے۔

میرے اشارے پر اللہ دتا اٹھ کر کچن کی طرف جانے لگا تو میں نے تاکیدی لہجے میں کہا ''کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس تھوڑا سا سیدھا سادہ کھانا تیار کرلو۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اضافہ کیا ''اور کچن میں مصروف ہونے سے پہلے ذرا سیکیورٹی گارڈ کی طرف بھی چکر لگالو۔ وہ نیا بندہ ہے۔ شروع ہی سے ٹائٹ کر کے رکھو گے تو بعد میں پریشانی نہیں ہوگی۔ اسے اچھی طرح سمجھادو، اپنی آنکھیں کھلی اور حواس بیدار رکھے۔''

اللہ دتا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رخصت ہوگیا۔

اللہ دتا سے ہونے والی گفتگو کے دوران میں زرگل بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی لیکن جیسے ہی اس نے دیکھا، ہمیں تنہائی میسر آگئی ہے، اس کی زبان کھل گئی۔ اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''وجیہ! یہ نقلی وجدان یا بہروپے کا کیا چکر ہے؟''

میں نے جواب دیا ''یہ چکر! ابھی پوری طرح میری بھی سمجھ میں نہیں آسکا۔ میرا خیال ہے، یہ میرے دشمنوں کی کوئی گہری چال ہے لیکن......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر زرگل کو دیکھا اور کہا ''مجھے امید ہے، میں اس سازش کو بہت جلد بے نقاب کردوں گا۔''

''وہ تو اس کوٹھی سے تمہاری ڈارلنگ کو بھی لے گیا۔'' زرگل نے مزید کہا ''اس ڈارلنگ کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ یہ کردار بھی میرے ذہن کو اچھا خاصا الجھا رہا ہے!''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''ڈارلنگ دراصل میری بلی کا نام ہے۔ وہ بہت ہی کیوٹ پالتو بلی ہے مگر اس بہروپیے کے جھانسے میں آگئی۔ وہ اسے وجدان ہی سمجھی ہوگی۔''

''میں اسی پہلو سے الجھ رہی ہوں وجیہ۔'' وہ سنجیدگی سے بولی ''جانور اور خاص طور پر پالتو جانور تو بہت ہی سمجھ دار اور مالک شناس ہوتے ہیں۔ ان کی حس نہایت ہی تیز ہوتی ہے۔ وہ تو اپنے آقا کے قدموں کی چاپ سے اس کی موجودگی کا اندازہ لگالیتے ہیں۔ ان کی حساسیت جسم کی مخصوص بو کو بھی الگ الگ شناخت کرلیتی ہے۔ تمہاری ڈارلنگ یقیناً تمہارے لمس اور جسم کی مخصوص مہک سے آشنا ہوگی۔ تمہارا سوانگ بھرنے والا کوئی بہروپیا اسے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ ان لوگوں کے بیان کے مطابق ڈارلنگ بڑی شرافت سے اس نقلی وجدان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ یہ واقعہ مجھے تو ہضم نہیں ہو رہا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

زرگل نے بہت ہی اہم سوال اٹھایا تھا۔ واقعی ڈارلنگ ایک جانور ہونے کے ناتے مجھے اور میرے لمس کو بہت اچھی طرح جانتی اور پہچانتی تھی۔ وہ نقلی اور اصلی وجدان میں بخوبی تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور پھر ڈارلنگ کوئی عام جانور بھی نہیں تھی۔ اب تک اس بلی کے جتنے روپ اور کارنامے میرے سامنے آچکے تھے وہ حیران کن اور بعض ناقابل یقین تھے۔ اسے دھوکا یا جھانسا دینا ہما شما کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بہروپیا اگر اس کوٹھی سے ڈارلنگ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا تو یقیناً اس نے کوئی بہت بڑا اچنبھا دکھایا ہوگا۔ اب رفتہ رفتہ اس نقلی وجدان کی کاریگریاں مجھ پر کھل رہی تھیں۔ وہ میری کامیاب ڈمی کا بھرپور رول ادا کر رہا تھا۔

زرگل ڈارلنگ کے کارناموں سے واقف نہیں تھی اس لیے اس کے ذہن میں ڈارلنگ کا تصور کسی عام بلی ایسا ہوگا۔ میں سردست اسے ڈارلنگ کے بارے میں کسی تفصیل میں لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اسی لیے مبہم انداز میں کہا۔

''تم نے بات تو بہت پتے کی کی ہے۔ لگتا ہے، وہ بہروپیا کوئی جادو وغیرہ بھی جانتا ہے!''

''گویا نقل بمطابق اصل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی ''تم بھی کون سے کم تھی ہو۔ میں نے تمہیں پراسرار ایسے ہی تو نہیں کہہ دیا۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تمہارے کندھے کا درد اب کیسا ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' وہ گھائل شانے کو اچکاتے ہوئے بولی ''میں تو اسے بھول ہی گئی تھی۔''

میں نے کہا ''کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تم لباس تبدیل کرلینا۔ میں تمہیں ڈھنگ کا کوئی زنانہ لباس نکلوا دوں گا۔ اسی وقت تمہارے کندھے کا معائنہ بھی کرلوں گا۔ میرا خیال ہے، پاشا کی کوٹھی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہوگا۔ تمہاری معقول سی ڈریسنگ ہوجائے تو آرام سے سوجانا۔ کیا پتا نہیں، کل کی صبح تمہارے لیے کن ہنگاموں کا تحفہ لے کر آئے گی۔''

اس کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر تھا، وہ اچھی طرح سمجھ رہی ہے کہ میں نے گفتگو کا موضوع کیوں بدلا ہے۔ دل کی بات کو زبان پر نہ لاتے ہوئے بولی ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو وجیہ! کل کی صبح کا کوئی بھروسا نہیں۔ آج کی رات خ

خیریت سے گزر جائے تو غنیمت ہوگا۔''

''انشاء اللہ سب خیریت رہے گی۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''اگرچہ حالات ایسے نظر نہیں آرہے۔'' وہ خیال افروز انداز میں بولی ''مجھے خدشہ ہے، وہ بہروپیا ضرور کوئی نیا گل کھلائے گا۔ اس کی حرکت کو میں سمجھ نہیں پارہی ہوں۔''

''کون سی حرکت؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی ڈارلنگ کے اغوا والی حرکت۔'' اس نے لفظ اغوا پر زور دیتے ہوئے کہا ''وہ یہاں آیا، اس کوٹھی کے ملازمین کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور صرف ایک پالتو بلی پر قناعت کر کے خاموشی سے چلا گیا۔ اگر وہ واقعی تمہارا دشمن ہے تو بڑا عجیب دشمن ہے...... اور اگر وہ واقعی صرف تمہاری بلی حاصل کرنے یہاں آیا تھا تو پھر تمہاری بلی نہایت ہی غیر معمولی ہوگی!''

وہ بہت مہارت سے حالات کا تجزیہ کر رہی تھی۔ میں اس کے دلائل کو رد نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی کہ وہ مکار صرف ڈارلنگ پر ہی اکتفا کر کے کیوں چلتا بنا؟ فوری طور پر اس کا جو جواب ذہن میں آرہا تھا وہ یہی تھا کہ وہ شخص یا اس کے پیچھے کام کرنے والا دماغ ڈارلنگ کی پراسراریت والا راز ضرور جانتا ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں......''

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال چمکا ''کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈارلنگ کو کسی خاص مقصد کے تحت اغوا کیا گیا ہو۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے میری ڈمی سے کام لیا گیا تھا۔ عین ممکن تھا، یہ کام میرے یا ڈارلنگ کے کسی نئے دشمن نے کروایا ہو؟

یہ سوال سیکڑوں مختلف النوعیت سوالات کو جنم دیتا تھا جن کے جوابات کے بارے میں فی الوقت کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ بہرحال، میری زندگی میں نقلی وجدان والا ایک نیا سلسلہ چل نکلا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، آگے چل کر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ صورت حالات اچانک ہی گمبھیر اور الجھن زدہ ہوگئی تھی۔

اس دوران میں زرگل ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے چلے جارہی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے جو نکات اٹھائے تھے میں نے ان کے جواب میں ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا ''ان تمام پہلوؤں پر فرصت سے غور کروں گا۔''

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا ''اس کوٹھی میں آنے کے بعد تم نے ملازمین سے جو بات چیت کی ہے اس سے میں اندازہ لگا چکی ہوں کہ ہمارا تعاقب کرنے والی سرخ لینڈ کروزر میں یہی بہروپیا موجود تھا لیکن وہاں نہر کے کنارے تم نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''اس وقت اس بارے میں تمہیں کچھ بتانا میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔''

''بتایا تو اب بھی نہیں، میں نے خود اندازہ لگایا ہے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''تم نے اپنی ذہانت کا اظہار کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ پینترا بدلتے ہوئے بولی ''یہاں سب دوست اور دشمن تمہیں وجدان کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں، اس سے میں الجھن محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے اس بات کی کرید نہیں کہ تم وجدان ہو یا وجیہ؟ میں اپنی آسانی کے لیے اگر تمہیں وجدان ہی سمجھوں تو تمہیں اس پر اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے قطعیت سے کہا ''اپنے ذہن کو الجھانے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ تم مجھے وجدان سمجھتی اور پکارتی رہو۔''

ہمارے درمیان اسی نوعیت کی چھوٹی موٹی باتیں جاری تھیں کہ اللہ دتا نے ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگنے کی نوید سنائی۔ ہم ڈرائنگ روم سے اٹھ کر اس جانب بڑھ گئے۔

کھانے کے بعد میں نے اللہ دتا کے توسط سے نائلہ کا ایک دھلا ہوا لباس حاصل کر کے زرگل کو تھما دیا۔ اللہ دتا کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ ایک طویل عرصے سے پاشا کی کوٹھی میں کام اور آرام کر رہا تھا۔ اس وجہ سے اس کی حیثیت گھریلو ملازم کے ساتھ ساتھ ایک فیملی ممبر ایسی تھی۔ اللہ رکھی اور اس کی بیٹی آمنہ کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جاتی تھیں۔

زرگل لباس تبدیل کر کے واش روم سے نکلی تو میں نے اس کے زخمی بازو کا جائزہ لیا۔ میرے استفسار پر اللہ دتا فرسٹ ایڈ باکس اٹھا لایا۔ کندھے کا زخم تشویش ناک نہیں تھا۔ میں نے متاثرہ حصے کو ایک اینٹی سیپٹک لوشن سے صاف کیا اور واؤنڈ ہیلنگ کریم لگا کر پٹی باندھ دی۔ مذکورہ واؤنڈ ہیلنگ (WOUND HEALING) کریم کسی غیر ملکی کمپنی کی بنی ہوئی تھی جو زخم کی مزاج پرسی کے لیے بڑی مستند سمجھی جاتی تھی۔

اس ضروری کام سے نمٹنے کے بعد میں زرگل کو اپنے ساتھ بالائی منزل والے بیڈروم میں لے گیا اور کہا ''آج کل میں کوٹھی کے اس کمرے میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تم آرام سے یہاں ایک محفوظ اور گہری نیند لے سکتی ہو، کوئی تمہیں ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ میں نچلی منزل کے کسی کمرے میں رات گزار لوں گا، تم چاہو تو دروازے کو اندر سے بند بھی کرسکتی ہو۔''

وہ کمرے کے در و دیوار اور کھڑکیوں پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی ''ٹھیک ہے، تم کہہ رہے ہو تو میں یقین کرلیتی ہوں۔ تم نے اب تک میری حفاظت کی ہے اس لیے میں تمہاری باتوں کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتی۔''

''ویسے تو اس بیڈروم میں ہر ضروری چیز موجود ہے۔'' میں نے زرگل کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ''اگر پھر بھی تمہیں کچھ چاہیے ہو تو بلاتکلف بتادینا۔''

''بتادوں گی۔'' اس نے مختصر گوئی پر اکتفا کیا۔

اس وقت زرگل کے بدن پر نائلہ کا گلابی لباس تھا جو بڑھ چڑھ کر پھب رہا تھا۔ زرگل کی رنگت میں پہلے ہی دودھ اور گلاب کی آمیزش تھی، اس گلابی پہناوے نے اس کے حسن بے داغ میں چاندنی بھردی۔ وہ اس وقت بلاشبہ گلاب بدن نظر آرہی تھی۔ میرے پاس خوشہ چینی کی گنجائش تھی اور نہ ہی بھوراکاری کا وقت لہٰذا اس اجنبی اور مصیبت زدہ لڑکی پر ایک بھرپور نظر ڈال کر میں بیڈروم سے نکل آیا۔

زیریں منزل تک پہنچانے والے زینے طے کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا، کہیں زرگل کو یہاں لاکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ اگر یہ غلطی تھی بھی تو بہرحال اب ہوچکی تھی پھر میرا خیال اپنے سامان کی طرف چلا گیا۔ میں چونکہ بالائی منزل کے اسی بیڈروم میں ٹھہرا ہوا تھا اس لیے میرا اسفری بیگ اسی کمرے کی ایک الماری میں رکھا تھا اور وہ الماری لاک تھی۔ اول تو زرگل اس بیگ تک پہنچ نہیں سکتی تھی اور بالفرض پہنچ بھی جاتی تو وہاں اس کے مطلب کی کوئی چیز نہیں تھی۔

میں زیریں منزل پر واقع ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔ فرید پاشا کے فون کا انتظار کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک بڑی مصیبت سے نبردآزمائی کے لیے گیا تھا۔ اسے کسی بھی وقت میری مدد کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اگر ان نازک ترین حالات میں، میں اس کے کام نہ آتا تو ایسی دوستی اچار مربا ڈالنے کے سوا کس کام کی تھی۔

اللہ دتا بھی میرے پاس آ بیٹھا۔ کھانے کے بعد چائے کا ایک دور چل چکا تھا پھر بھی وہ میرے لیے عمدہ قسم کی کافی بنا لایا۔ کافی اور چائے وغیرہ مجھ پر معکوس اثرات مرتب کرتی ہیں۔ عام طور پر ان مشروب سے نیند اڑ جاتی ہے اور بھوک مرجاتی ہے لیکن چائے کافی کے استعمال کے بعد میں واضح طور پر بھوک محسوس کرنے لگتا ہوں، گویا میرے لیے یہ دونوں اشتہا انگیزی کا کردار ادا کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی سلیپنگ پلز کے طور پر بھی کام کرتی ہیں۔

اللہ دتا نے اتنی محبت سے کافی پیش کی کہ میں انکار نہ کرسکا۔ ہمارے درمیان ہلکی پھلکی بات چیت ہونے لگی تو موضوع گفتگو کو نقلی وجدان کی طرف لے گیا۔ اس حوالے سے اس کا ذہن کسی گہرے تجسس کی لپیٹ میں تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ میں خود اس بدمعاش کی ''شیطانی'' کے سبب بری طرح الجھا ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ ہمارے درمیان گفتگو دراز ہوجاتی، ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اللہ دتا کے منہ سے بے اختیار نکلا ''یہ اسی لڑکی کا فون ہوگا!''

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا ''کون لڑکی؟''

''وہ اپنا نام صدف بتاتی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس لی اور فون کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

ریسیور اٹھانے سے قبل میں نے دوسری گھنٹی بجنے کا انتظار کیا۔ پہلی گھنٹی پر فون اٹینڈ کرنے پر عموماً لائن کٹ جاتی ہے۔ میرا انتظار طول کھینچ گیا مگر دوسری گھنٹی نہ بجی۔ ایک گھنٹی کے بعد ٹیلی فون سیٹ خاموش ہوگیا تھا۔

میں نے اللہ دتا سے پوچھا ''کیا صدف نے پہلے بھی فون کیا تھا؟''

''کم از کم دس مرتبہ۔'' اس نے جواب دیا ''پاشا صاحب کی روانگی کے فوراً بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور آپ کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے اس نے آخری فون کیا تھا...... اور ہر مرتبہ اس نے آپ کا پوچھا۔ لگتا ہے، اسے آپ سے کوئی بہت ہی ضروری کام ہے لیکن حیرت مجھے اس بات پر ہورہی ہے کہ جب سے آپ آئے ہیں، اس کا فون نہیں آیا۔ پتا نہیں، اس کا کیا مسئلہ ہے؟''

میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''اس کا مسئلہ تمہاری سمجھ میں آنے والا نہیں۔''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

صدف کو میں کافی دیر سے بھولا ہوا تھا۔ دوپہر میں وہ اپنی کزن نادیہ کے ساتھ مجھ سے ملنے یہاں آئی تھی اور بوقت رخصت میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں شام میں اسے فون کروں گا۔ وہ مجھ سے کنگ فو (KUNG- FU) کے چند داؤ پیتر ے سیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے ریس کورس پارک میں آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن جس شام کو ہمیں اس پارک میں ملنا تھا وہ شام تو میں نے ایک خفیہ تہ خانے میں ''بتا'' دی تھی۔ میری طرف سے رابطہ نہ ہونے پر وہ یقیناً پریشان ہوئی ہوگی اور ٹیلی فون کا تانتا اسی سبب تھا۔

بعض اوقات انسان عجیب و غریب حالات سے گزرتا ہے۔

اسے جہاں جانا ہوتا ہے وہ اس مقام کے قریب سے گزرتا ہے لیکن بے بسی اسے کچھ یاد نہیں آنے دیتی۔ وہ اپنے مسائل کے چکر میں ایسا گھن چکر بنتا ہے کہ اپنا مطلوبہ مقام اسے دکھائی ہی نہیں دیتا یا اگر نظر آتا ہے تو اس تک رسائی اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتی۔

میں گزشتہ شام اور رات کے پہلے حصے میں شادمان کالونی اور ریس کورس پارک کے پاس سے گزرا تھا۔ کالونی میں صدف کا قیام تھا اور پارک میں وہ مجھ سے استفادہ کرنا چاہتی تھی مگر ان دونوں مقامات پر اس سے رابطے میں نہ آسکا۔ سرخ لینڈ کروزر والے نقلی وجدان نے مجھے مہلت نہ دی اور میں اسے چکر دینے کے لیے سڑکوں پر سڑکیں بدلتا یہاں تک چلا آیا تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں ایک ٹک ٹیلی فون سیٹ کو بھی دیکھ رہا تھا مگر پہلی گھنٹی کی تکمیل کے بعد وہ ایسا خاموش ہوا تھا جیسے زبان پر مہر لگوالی ہو۔ میں اللہ دتا کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''صدف نے پاشا کی موجودگی میں بھی فون کیا تھا؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا ''کیا ہو تو مجھے معلوم نہیں کیونکہ وہ فون پاشا صاحب نے اٹینڈ کیا ہوگا۔ میں تو ان کے جانے کے بعد فون سن رہا ہوں۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا ''صدف نامی یہ لڑکی بہت باتونی ہے، سوالات کر کر کے مغز پچی کردیتی ہے۔ اس نے تمہاری جان تو بہت کھائی ہوگی؟''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وجدان صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''اس نے ہر مرتبہ مجھ سے چند مخصوص سوال پوچھے ہیں اور سب آپ سے متعلق۔ مثلاً آپ کہاں گئے ہیں؟ کب گئے ہیں؟ کیوں گئے ہیں؟ اور واپس کب آئیں گے؟'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''میں بھلا ان سوالات کے کیا جواب دے سکتا تھا۔ مجھے آپ کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں تھا لہٰذا ہر مرتبہ معذرت کردی، البتہ۔'' اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اچانک کوئی بات یاد آگئی ہو پھر جلدی سے بولا ''ایک مرتبہ اس نے پاشا صاحب کے بارے میں بھی پوچھا تھا اور میں نے اسے بتادیا کہ پاشا صاحب کے والد صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اس لیے وہ اپنی بیوی کے ساتھ باپ کو دیکھنے سید پور گئے ہیں۔ اس کے بعد جانتے ہیں، اس لڑکی نے کیا سوال کیا؟''

وہ خاموش ہوکر استفساریہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں چونکہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے کہہ دیا ''میں نہیں جانتا۔ یہ بات بھی تم ہی بتادو!''

اس نے بتایا ''وہ پوچھنے لگی، وجدان تو پاشا انکل کا بہت گہرا دوست ہے۔ اگر پاشا صاحب کے والد کی طبیعت اتنی خراب ہے تو یقیناً وہ بھی انہیں دیکھنے جائے گا؟ میں صدف کو بتاچکا تھا کہ پاشا صاحب آپ سے ملے بغیر یہاں سے گئے ہیں، شاید اسی حوالے سے اس نے یہ بات کی تھی۔ میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا کہ پاشا صاحب سید پور سے فون کرکے وہاں کے حالات سے آگاہ کریں گے اور اگر ضرورت محسوس کریں گے تو وجدان کو اپنے پاس بلالیں گے۔ اس نے پوچھا، وجدان کی روانگی جلدی سے جلدی کب تک ممکن ہے؟ میں نے بتادیا، وہ کل صبح ہی جاسکیں گے۔ اس کے بعد بھی اس نے دو تین مرتبہ فون کیا اور آپ ہی کے بارے میں پوچھا کہ آپ واپس آگئے یا نہیں!''

میں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ''میری سید پور جانے والی بات تم نے اپنی طرف سے کی تھی یا پاشا نے ایسا کوئی اظہار کیا تھا؟''

''میں اپنی طرف سے کیوں کروں گا جی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا ''پاشا صاحب نے واضح الفاظ میں کہا تھا، وہ صبح آپ کو بھی بلائیں گے۔ شاید آپ پہلے ہی سید پور جانے والے تھے اور آپ نے کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ چھوٹے پاشا صاحب آپ کو لینے آنے والے تھے لیکن ان کی آمد سے پہلے ان کا فون آگیا۔ نوید پاشا صاحب ہی نے والد کے ہارٹ اٹیک کی خبر فون پر دی تھی۔'' میں گمبھیر انداز میں اسے سن رہا تھا۔ اس نے مزید کہا ''صدف آپ کے لیے بہت پریشان تھی اس لیے میں نے اسے آپ کے بارے میں بتادیا کہ آپ کل صبح سید پور جانے والے ہیں۔''

''یہ سن کر اس کی پریشانی اور بڑھ گئی ہوگی۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''خیر، اب اس کا فون آیا تو میں خود بات کرلوں گا۔''

اللہ دتا ایسی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے صدف کے بارے میں، میں نے کوئی عجیب بات کردی ہو۔ اس بے چارے کو کیا معلوم کہ میرے سید پور جانے سے صدف کی پریشانی کا کیا تعلق ہوسکتا تھا۔

اس نے اچانک کچھ یاد آجانے کے انداز میں پوچھا ''وجدان صاحب! یہ صدف بی بی وہی لڑکی تو نہیں جو آج دن میں آپ سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ماموں زاد

بھی تھی؟"

"بالکل وہی ہے۔ کیا آج دن میں تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"دیکھ تو نہیں سکا جناب۔" وہ بتانے لگا "بس اتنا ہی پتا چلا تھا، دو لڑکیاں آپ سے ملنے آئی تھیں۔ صدف کے بارے میں تو میں نے خود ہی اندازہ لگایا ہے۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا پھر فون کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا "یہ تو جیسے بولنا ہی بھول گیا ہے!"

وہ بھی الجھن بھری نظر سے ٹیلی فون سیٹ کو گھورنے لگا۔

میں نے کہا "اللہ دتا! نقلی وجدان کی طرف سے ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تم ایک مرتبہ پھر سیکیورٹی گارڈ کو ہوشیار رہنے کی تاکید کردو۔ اس سے کہو کہ وہ چوکنا نظر سے کوٹھی کا سامنے والا حصہ واچ کرتا رہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنے کیبن سے نہ ہلے۔ یہ رات جاگ کر گزارنے کی ہے۔ وہ کل دن میں اپنی نیند پوری کرسکتا ہے اور ہاں......" میں نے ذرا توقف کیا پھر کہا "گارڈ کو یہ تاکید بھی کردینا کہ اگر وہ کوئی غیر معمولی حرکت نوٹ کرے تو فوراً انٹرکام پر مجھے اطلاع دے۔ میری ہدایات کے بغیر اسے کوئی قدم نہیں اٹھانا۔ میں یہیں، ڈرائنگ روم میں موجود رہوں گا۔"

یہ فیصلہ میں نے اس لیے بھی کیا تھا کہ ڈرائنگ روم سے بالائی منزل کا زینہ اور بیرونی گیٹ بہت نزدیک تھے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے یہ جگہ نہایت ہی موزوں اور مناسب تھی۔ میں بہت آسانی سے موو کرسکتا تھا۔

اللہ دتا نے پوچھا "لگتا ہے، آپ کا سونے کا ارادہ نہیں!"

میں نے مبہم انداز میں جواب دیا "کم از کم پاشا کے فون آنے تک تو مجھے جاگنا ہے۔ سونے کے بارے میں بعد میں سوچوں گا۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"جو آپ کا حکم ہو۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے کہا "ابھی تین چار گھنٹے تک تو میرا سونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس دوران میں تم ایک نیند لے لو۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا "بہتر ہوگا، تم کسی ایسی جگہ پر نیند لو جو کوٹھی کے عقبی حصے سے قریب ہو تاکہ اگر اس طرف کسی گڑبڑ کے آثار پیدا ہوں تو تمہاری آنکھ کھل جائے۔ کوٹھی کے سامنے والے حصے کی نگرانی تو سیکیورٹی گارڈ کر ہی رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر سوجاتا ہوں۔" اللہ دتا نے کہا "یہ کمرا کوٹھی کے عقبی حصے میں بنا ہوا ہے۔"

پانچ منٹ بعد وہ مجھے ڈرائنگ روم میں تنہا چھوڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں نے صدف کے بارے میں اللہ دتا سے زیادہ بات نہیں کی تھی لیکن میں اس کی فون کالز کا سن کر پریشان ہوگیا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ میں کل صبح سید پور جانے والا ہوں وہ خود بھی دیہاتی زندگی کا مشاہدہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرچکی تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا، گاؤں کی سیر اور کنگ فو کی ٹیکنیک سیکھنا محض ایک بہانہ تھا۔ درحقیقت وہ میرے قریب آنے کا موقع ڈھونڈ رہی تھی اور میں...... اپنے آپ سے اتنی دور جاچکا تھا کہ بعض اوقات خود کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔

نقلی وجدان کی کارستانی نے مجھے ذہنی طور پر بری طرح الجھا رکھا تھا۔ اب صدف کی جانب سے بھی چند شرارتوں کا امکان تھا۔ وہ آج رات کے کسی حصے میں یا کل صبح یہاں پہنچنے والی تھی اور اس سے پہلے اس کا فون آنے والا تھا۔

فون والے خیال پر میں نے کن انکھیوں سے ٹیلی فون سیٹ کو دیکھا اور اسی لمحے اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ تیسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھالیا اور میرے "ہیلو" کے جواب میں ایک شناسا سا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس آواز میں دنیا جہان کا درد بھرا ہوا تھا۔

میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "پاشا! میں وجدان بول رہا ہوں۔ اباجی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وجدان!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اباجی ہم سے روٹھ گئے ہیں۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ بڑے پاشا کے لیے دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ یہ ایسا وقت اور موقع نہیں تھا کہ میں دکھڑا رونے بیٹھ جاتا۔ میں نے پاشا کو یہاں کے حالات سے بے خبر رکھتے ہوئے چند تعزیت بھرے جملوں میں تسلی دی اور کہا۔

"میں ابھی آرہا ہوں۔ تم مجھے راستے اور گاؤں کی لوکیشن کے بارے میں کچھ بتاؤ میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں گا۔"

وہ شکستہ لہجے میں بولا "میں تمہارے خلوص اور جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں وجدان! رات میں سفر کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم کل صبح اللہ دتا کے ساتھ آجانا۔ سید پور کا راستہ اس کا دیکھا بھالا ہے۔ یہ تمہیں یہاں پہنچا کر واپس چلا جائے گا۔

میں اس کے ساتھ یہاں سے چند قابلِ اعتماد اور نمک حلال قسم کے افراد کو بھی کوٹھی پر بھیج دوں گا۔ وہاں کی حفاظت کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" میں نے خلوص بھرے لہجے میں کہا "تم سید پور کے معاملات کو دیکھو۔ یہاں سب خیریت ہے۔ صبح ملاقات ہوگی۔"

ٹیلی فونک رابطہ ختم ہوگیا۔ میرا دل اچانک ہی کسی بہت بڑے بوجھ تلے دب گیا۔ فرید پاشا آج پدرانہ سایے سے محروم ہوگیا تھا۔ میری نگاہ میں وہ منظر گھوم گیا جب میرے والدین کو میری ننھی بصارت نے خاک و خون میں لوٹتے دیکھا تھا۔ اس وقت میں پختہ سوچ کا حامل نہیں تھا لیکن وہ خونچکاں منظر گویا میری یادداشت میں گڑ گیا تھا۔ میں اپنے والدین کی حسرت ناک موت کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس محرومی، اس زیاں اور اس دائمی جدائی کو وہی لوگ محسوس کرسکتے ہیں جو اس تجربے سے عملی طور پر گزرے ہوں۔

میں کافی دیر تک سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ فرید پاشا اور دیگر لواحقین اس وقت جس صدمۂ جانکاہ سے گزر رہے ہوں گے اس کا تصور غم زدہ اور اداس کردینے والا تھا۔ میں صوفے سے اٹھا اور ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔ اچانک ایک اضطرار نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔

تھوڑی دیر پہلے اللہ دتا سے ہونے والی گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوچکا تھا، بڑے پاشا صاحب کو دل کا یہ تیسرا دورہ پڑا تھا۔ اس سے پہلے دو مائنر اٹیک ہوچکے تھے۔ دل کا تو ایک ہی دورہ جان زیاں ہوتا ہے اور تیسرے دورے کے بارے میں تو کہا جاتا ہے، یہ موت کا دوسرا نام ہے۔ تھرڈ اٹیک سے بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔ چونکہ معجزے عموماً رونما نہیں ہوتے اس لیے کمال پاشا زندگی ہار گیا۔

فرید پاشا کا باپ کمال پاشا تو اپنی زندگی کی پینسٹھ بہاریں دیکھ چکا تھا اور گزشتہ چند سال سے وہ عارضۂ قلب میں بھی مبتلا تھا۔ موت نے اسے خالص طبعی انداز میں زندگی سے چھین لیا لیکن میرے والد اور والدہ کا کیا قصور تھا؟ وہ تو بھرپور جوانی میں اس دنیا سے اٹھ گئے۔ ان دونوں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا، نہ ہی کسی بیماری سے ان کی تعلق داری تھی بے رحم قاتلوں نے ایک سفاک اور ظالم شخص کے اشارے پر انہیں بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میں اضطرابی قدموں سے دو دیواروں کے درمیان ٹہل رہا تھا اور میرے تصور کی نگاہ میں چند چہرے جل بجھ رہے تھے۔ وہ شقی القلب انسان نما جانوروں کے چہرے تھے۔ ان چہروں کو دیکھ کر حیوانوں کے سر شرم سے جھک جاتے تھے۔ دارا، جی فانگ اور کم کے چہرے۔ ان درندوں نے میرے والدین کو مجھ سے چھین لیا تھا پھر آپوں آپ میرا دھیان چوہدری نوازش علی کی طرف چلا گیا۔ میرے والدین کا قتل اسی چوہدری کے ایما اور اشارے پر ہوا تھا اور...... اب میری رگِ جاں، میری سانس ساحل بھی اسی شیطان صفت کے چنگل میں تھی۔

ساحل کے تصور اور خیال نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے اس وقت خود کو کسی دہکتے ہوئے تنور میں پایا۔ وہ تنور جسے چوہدری نوازش کے ظلم نواز ایندھن نے دہکایا تھا۔ اس کی دہک اور تپش نے میرے احساسات، جذبات اور سوچ کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ میں جوں جوں سوچ رہا تھا، میری ہیجانی کیفیت میں اضافہ ہورہا تھا۔ میرے بدن کا سارا خون دماغ کی طرف رواں ہوکر کن پٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اب تب میں میرے دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی۔ میں اپنی اس بدلتی ہوئی حالت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

میں ٹہلتے ٹہلتے اچانک رکا اور دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر حلق کے بل چلایا "اللہ دتا......!"

میری اس پکار نے فوری اثر دکھایا۔ اگلے ہی لمحے اللہ دتا میرے سامنے موجود تھا ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کے بعد اس نے دہشت زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور پریشانی سے بولا۔

"کیا ہوا صاحب جی! آپ چیخ کیوں رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے اپنی کیفیت کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور پوچھا "کوئی بات ضرور ہے۔ آپ چہرے سے بہت پریشان نظر آرہے ہیں؟"

میں اسے اپنی دلی کیفیت سے روشناس نہیں کراسکتا تھا لہٰذا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا "تم تو سونے کے لیے اپنے کوارٹر میں چلے گئے تھے لیکن تمہاری فوری آمد بتارہی ہے، تم یہیں کہیں آس پاس ہی تھے؟"

اس نے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا "میں نے سونے کی تھوڑی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ دل بہت بوجھل ہے وجدان صاحب۔ میں نے سوچا، جب نیند نہیں آرہی تو کوارٹر میں پڑا کیا کروں گا۔ میں آپ کی طرف ہی آرہا تھا۔ ڈرائنگ روم سے دو قدم کے فاصلے پر تھا کہ آپ کی چیخ سن کر اندر لپک آیا۔" اتنا کہہ کر وہ کچھ تلاش کرنے والے انداز میں میری آنکھوں میں دیکھنے لگا "وجدان صاحب! کچھ بتائیں، کیا مسئلہ ہے۔ آپ کی چیخ

میں بڑی وحشت تھی؟‘‘

’’بتاتا ہوں۔‘‘ میں نے سرسری لہجے میں کہا پھر پوچھا ’’فریج میں ٹھنڈا پانی تو ہوگا؟‘‘

وہ حیران نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ’’بہت ہے۔‘‘

’’تم ٹھنڈا پانی کسی بالٹی یا تسلے میں بھر کر یہاں لے آؤ۔‘‘

اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور اٹھ کر جانے لگا۔ میں نے تاکیدی لہجے میں کہا ’’ذرا سیکیورٹی گارڈ کی بھی خیر خیریت پوچھ لینا اور بالائی منزل پر بھی جھانک کر دیکھ لینا۔‘‘

وہ فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلا کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

اس بات کے امکانات موجود تھے کہ اللہ دتا کے علاوہ میری وہ بے اختیار اور اضطراری چیخ زرگل اور سیکیورٹی گارڈ نے بھی سنی ہوگی۔ مجھے اپنے چیخنے پر خود حیرت ہو رہی تھی۔ میں مضبوط اعصاب اور بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک ہوں۔ تھوڑا غور کیا تو دل نے چغلی کھائی۔ ساحل کے لمحاتی تصور نے مجھے آؤٹ آف کنٹرول کر دیا تھا۔ میری برداشت کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ چوہدری نوازش کے ناپاک حصار میں ایک سانس بھی لے۔ میں اس وقت اپنی ساحل سے چند گھنٹوں کی مسافت پر تھا۔ یہ مسافت عنقریب گھٹ کر منٹوں میں بدلنے والی تھی۔

میں نے خود کو سمجھایا، وجدان! اس میچ کے آخری اوورز چل رہے ہیں لہٰذا اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ اگر دل پر قابو رکھو گے تو اعصاب پر بھی کنٹرول رہے گا۔ یہ اوورز بہت سوچ سمجھ کر کھیلنے کے ہیں۔ ایک ایک گیند کو ناپ تول اور دیکھ بھال کر کھیلو۔ منزل پر پہنچ کر کھیل کو بگاڑ نہیں دینا۔ یہ بازی تم نے جیتنا ہے......صرف تم نے!

اسی وقت اللہ دتا ایک بڑے ٹب میں یخ بستہ پانی بھر کر لے آیا۔ اس نے میرے قریب آ کر پوچھا ’’وجدان صاحب، پانی آ گیا ہے۔‘‘

’’یہاں رکھ دو۔‘‘ میں نے اپنے قدموں کی جانب اشارہ کیا۔

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی اور خاموشی سے ایک جانب کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور الجھن کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میری چیخ پر مبنی پکار نے اسے بوکھلا دیا تھا۔

’’بیٹھ جاؤ اللہ دتا۔‘‘ میں نے نرمی سے کہا پھر اپنے دونوں پاؤں ٹھنڈے پانی والے ٹب میں ڈال دیے ’’زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘

اللہ دتا بدستور حیران نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ’’باہر سب خیریت ہے نا؟‘‘

’’جی، سب خیریت ہے۔ گارڈ اپنی ڈیوٹی پر موجود ہے۔‘‘

’’اور بالائی منزل کا کیا حال ہے؟‘‘ میرا اشارہ زرگل کی طرف تھا۔

’’وہاں سکون اور خاموشی ہے۔‘‘ اس نے بتا دیا ’’آپ کے ساتھ آنے والی وہ لڑکی گہری نیند میں ہے۔‘‘

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ میں نے بند آنکھوں کے پیچھے سے کہا ’’اللہ دتا! میں چند منٹ خاموش رہنا چاہتا ہوں۔ تم تھوڑا انتظار کرو پھر میں تمہیں اپنے چیخنے کا سبب بتاتا ہوں۔‘‘

رات کے اس پہر موسم خاصا خنک ہو چلا تھا۔ میں نے ٹھنڈے ٹھار پانی میں پاؤں ڈالے تو مجھے اپنے پورے بدن میں حرارت بخش لہریں سی دوڑتی محسوس ہوئیں۔ ’’ٹھنڈے گرم‘‘ کا ایک عجیب سا تجربہ ہوتا ہے۔ آزمائش شرط ہے! سخت ترین گرم موسم میں اگر آپ گرم پانی میں ہاتھ پاؤں ڈالیں تو اچانک جسم میں ایک ٹھنڈی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب موسم سرما میں ٹھنڈے پانی کے اندر ہاتھ پاؤں ڈالیں تو گرمی کا احساس ہوتا ہے۔ درحقیقت ایسے تجربے کے موقع پر ہمارے جسم میں موجود، موسم گرما میں سردی اور موسم سرما میں گرمی بیرونی ’’حملے‘‘ کے خلاف ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتی ہے۔ یہ احساس بہت ہی انوکھا اور منفرد ہے اور تجربے کے بغیر اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا۔

حرارت بخش لہریں چشم زدن میں سفر کرتے میرے پیروں سے ہوئے دماغ تک جا پہنچیں اور دھیرے دھیرے وہاں موجود گرمی کو چوسنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یوگا سے استفادہ کرتے ہوئے گہری سانسیں لینا بھی شروع کر دیں۔ میں تھوڑی ہی دیر میں نارمل ہوگیا۔

میں نے آنکھیں کھول کر اللہ دتا کو دیکھا اور ٹب کے اندر سے دونوں پاؤں باہر نکال لیے۔ وہ استعجابیہ نظر سے مجھے تکے جا رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے مبہم آواز میں کہا۔

’’اللہ دتا! تمہارے لیے ایک بری خبر ہے۔ بڑے پاشا صاحب کا انتقال ہوگیا!‘‘

’’اوہ!‘‘ وہ افسوس ناک انداز میں گردن کو ہلاتے ہوئے زیر لب اناللہ...... پڑھنے کے بعد بولا ’’کیا وہاں سے کوئی فون آیا ہے؟‘‘

میں نے اسے فرید پاشا کے فون کے بارے میں بتانے کے بعد کہا ’’کل صبح ہمیں سید پور جانا ہے۔ تم گائیڈ کے طور پر میرے ساتھ جاؤ گے۔ فرید نے کہا ہے، تم مجھے وہاں پہنچا کر واپس آ جانا۔‘‘

’’فون کی گھنٹی میں نے بھی سنی تھی لیکن میں سمجھا، شاید صدف بی بی کی کال ہو۔‘‘ اللہ دتا نے کہا پھر پوچھا ’’کیا آپ کی ساتھی بھی ہمارے ہمراہ جائے گی؟‘‘

’’اس کے بارے میں کل صبح ہی کوئی فیصلہ کریں گے۔‘‘ میں نے کہا ’’فی الحال اسے چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں، کتنے عرصے بعد اسے گہری نیند سونے کا موقع ملا ہے!‘‘

اللہ دتا نے کہا ’’ٹھیک ہے وجدان صاحب! آپ بھی تھوڑا آرام کر لیں۔ میں تو اب بڑے پاشا صاحب کے لیے کچھ پڑھوں گا۔ کمال صاحب بہت ہی مہربان اور غریب پرور انسان تھے۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے۔‘‘ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا ’’میں وضو کرنے کے بعد اپنے کوارٹر میں چلا جاؤں گا۔ اگر آپ کو میری ضرورت پڑے تو بلا تکلف بلا لیں۔‘‘ اس کے بعد وہ پانی والے ٹب کو اٹھا کر وہاں سے جانے لگا۔

میں نے کہا ’’فی الحال سیکیورٹی گارڈ کو بڑے پاشا کی موت کے بارے میں کچھ نہ بتانا کل صبح موقع محل کو دیکھتے ہوئے اس اندوہناک خبر کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔‘‘

اللہ دتا کے جانے کے بعد میں اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ کیا ہم صبح محض سیکیورٹی گارڈ کے بھروسے پر ایک بھری پُری کوٹھی کو چھوڑ کر سید پور جا سکتے ہیں اور وہ بھی ایسا گارڈ جس کی ملازمت کو ابھی چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے؟

میرے ذہن نے اس سوال کا جواب انکار میں دیا تو میں گہری تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ فون میرے نزدیک ہی رکھا تھا اور ٹیلی فون انڈیکس میں سید پور کا فون نمبر موجود تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں فرید پاشا سے رابطہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں اس سے ہمکلام تھا۔

میں نے اسے اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوال کے بارے میں بتایا تو وہ جلدی سے بولا ’’یار! میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ یہ مسئلہ میرے ذہن میں بھی آیا تھا اور میں نے اس کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔‘‘

پھر وہ مجھے متذکرہ بندوبست کے بارے میں بتانے لگا۔ تحسین نامی کوئی شخص پاشا کا اسسٹنٹ تھا۔ ایک ماہ پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور وہ سمن آباد میں کرایے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہا تھا پاشا نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ چند روز کے لیے اپنی بیوی کو لے کر اس کوٹھی میں چلا آئے۔ پاشا نے مجھے بتایا کہ وہ نو بیاہتا جوڑا گیارہ بجے تک کوٹھی میں پہنچ جائے گا۔

میں نے ان حالات میں اسے ڈسٹرب کرنے پر معذرت کی۔ اس نے کہا ’’کل دوپہر تک تو سید پور والے محافظ بھی وہاں پہنچ جائیں گے، پھر کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔‘‘ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد اس نے کہا ’’وجدان! تم ایک کام کرنا۔ ویسے تو میں نے اپنے تمام رشتے داروں اور ملنے والوں کو فون کر کے اس سانحے کی اطلاع دے دی ہے لیکن باوجود کوشش کے بھی میں منہاس باقر سے رابطہ نہیں کر سکا۔ تم وہاں سے ٹرائی کرتے رہو۔ اگر فون لگ جائے تو منہاس کو اباجی کی ڈیتھ کے بارے میں بتا دینا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔‘‘ میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

ہمارے درمیان رابطہ ختم ہوا تو میں ڈرائنگ روم سے نکل کر کوٹھی کے داخلی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ سیکیورٹی گارڈ کو یہ بتانا ضروری تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہاں دو افراد پہنچنے والے تھے۔ میں اسے یہ ہدایات انٹرکام پر بھی دے سکتا تھا لیکن میں نے بہ نفس نفیس وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح میں ٹھنڈی فضا میں گہری سانسیں لے کر خود کو چاق و چوبند کرنا چاہتا تھا۔ اسٹرونگ کافی کے سبب مجھے نیند کا احساس ہونے لگا تھا۔ ازیں علاوہ میں سیکیورٹی گارڈ کو یہ باور بھی کروانا چاہتا تھا کہ میں ابھی تک جاگ رہا ہوں تاکہ وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی نہ برتے۔ اس کی ڈیوٹی کی یہ پہلی رات تھی......اور بڑی ہنگامہ خیز رات تھی!

میں نے پانچ منٹ تک گارڈ سے گپ شپ کی پھر اسے نو بیاہتا جوڑے کی متوقع آمد کے بارے میں بتایا اور کہا ’’وہ لوگ کم و بیش گیارہ بجے تک آ جائیں گے۔‘‘

اس وقت میری رسٹ واچ میں ساڑھے دس بجے تھے۔ گارڈ عمر دین نے پوچھا ’’سر جی! وہ لوگ اپنی گاڑی میں آئیں گے نا؟‘‘

پاشا مجھے تحسین کی مالی حیثیت کے بارے میں بتا چکا تھا۔ سمن آباد کے ایک چھوٹے سے کرایے کے مکان میں رہنے والے شخص کے پاس اپنی گاڑی کی توقع کرنا بیکار ہی تھا۔ میں

نے سیکیورٹی گارڈ سے کہا۔
''وہ رکشا ٹیکسی میں آئیں گے۔ ویسے زیادہ امکان رکشے کا ہے۔ تمہارے شہر میں ٹیکسیاں تو سرے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کبھی کبھار ہی کوئی ٹیکسی آنکھ میں ڈالنے کو مل جاتی ہے ورنہ ہر طرف، چھوٹے بڑے سائز کے رکشا ہی ٹرٹراتے چکراتے دکھائی دیتے ہیں۔''
اس نے سعادت مندی سے کہا ''سر جی! میں پھر بھی انتر کام پر پہلے آپ کو ان کے بارے میں اطلاع دوں گا، پھر اندر آنے دوں گا۔''
''شاباش!'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہا ''میں فرید پاشا سے تمہاری سفارش کروں گا۔''
وہ خوش ہوگیا۔ میں بالائی منزل کی طرف جانے والے زینے پر دبے قدموں سفر کرتے ہوئے اوپر پہنچ گیا۔ زرگل والے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ میں نے بڑے دھیمے انداز میں دروازے پر دستک دی۔ اگر وہ جاگ رہی ہوتی تو فوراً دروازے پر آجاتی اور اگر وہ ایسا ردِعمل ظاہر نہ کرتی تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہوتا، وہ گہری نیند میں ہے۔ میں نے یہ ترکیب آزمانے کے بارے میں اس لیے سوچا تھا کہ کمرے کے اندر لائٹ آف تھی۔ کھڑکی کی ایک جھری میں سے میں نے روشنی کا اخراج دیکھ لیا تھا۔
میری دستک کے جواب میں کمرے کے اندر مطلق خاموشی طاری رہی۔ زرگل واقعی بے خبر سو رہی تھی۔ لائٹ اس نے دانستہ کھلی چھوڑ دی ہوگی تاکہ کسی بھی قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے میں آسانی رہے۔ وہ اگرچہ مجھ پر بھروسا کر کے یہاں تک چلی آئی تھی مگر وہ جن حالات سے گزر کر مجھ تک پہنچی تھی ان کا اولین تقاضا یہی تھا کہ ہر پل، ہر گام محتاط رہا جائے۔
میں مطمئن ہو کر واپس ڈرائنگ روم میں آگیا۔ میں نے منہاس باقر کو کراچی فون کرنے کے لیے ٹیلی فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور کہا ''ہیلو!''
دوسری طرف سے بے تابی سے پوچھا گیا ''وجدان واپس آگیا؟''
میں استفسار کرنے والی اس نسوانی آواز کو سیکنڈ کے دسویں حصے میں پہچان گیا۔ وہ آفت کی پڑیا صدف کی شوخ آواز تھی جس میں کسی حد تک تشویش بھی شامل تھی۔ درجنوں فون کرنے والی اس انقلابی حسینہ سے مجھے بات کرنا پڑی۔
''میں وجدان ہی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اوہ، تھینکس گاڈ!'' اس نے ایک طویل سانس چھوڑتے ہوئے کہا ''میں پریشانی میں تمہاری آواز پہچان نہیں سکی۔''
میں نے پوچھا ''صدف! تمہیں ایسی کون سی پریشانی لاحق ہوگئی۔ مجھے پتا چلا ہے، تم پہلے بھی متعدد فون کر چکی ہو؟''
''تمہیں بالکل درست بتایا گیا ہے۔'' وہ جلدی سے بولی ''اب کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جانا۔ میں پچیس تیس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہی ہوں۔''
اس نے پچیس تیس منٹ احتیاطاً بتائے ہوں گے ورنہ چائنا چوک سے گلبرگ تھری میں آنے کے لیے اس سے کہیں کم وقت لگتا ہے۔ میں نے اس کے الجھے ہوئے انداز کے پیشِ نظر کہا۔
''آخر مسئلہ کیا ہے، کچھ بتاؤ تو سہی؟''
''وہیں آکر بتاؤں گی۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے رابطہ موقوف کر دیا۔
میں ہکا بکا اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بے جان ریسیور کو تکنے لگا۔
منہاس باقر کو فون کرنے کا ارادہ میں نے کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دیا۔ تحسین اور صدف آگے پیچھے ہی اس کوٹھی میں پہنچنے والے تھے۔ میں پہلے ان سے نمٹ لیتا کیونکہ منہاس سے گفتگو کا سلسلہ طول بھی پکڑ سکتا تھا۔ میں شعیب غوری اور اس کی تنظیم ''سی ایف کے'' کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لاہور آتے ہی میں پے در پے مسائل میں اس قدر الجھا تھا کہ کراچی والے مشن سے میرا دھیان وقتی طور پر ہٹ گیا تھا۔ آج رات اگر جاگ کر گزارنا ہی نصیب میں رقم تھا تو پھر اس معاملے کو دیکھ لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ جم براؤن کیس میں گرفتار شدگان کے بارے میں مجھے بہت تشویش تھی۔
میں نے پونے گیارہ بجے ایک مرتبہ پھر سیکیورٹی گارڈ کو جا کر بتایا کہ ایک اور مہمان لڑکی بھی وہاں پہنچنے والی ہے۔ اس نے پوچھا، کیا وہ بھی انہی دونوں کے ساتھ آئے گی؟ میں نے بتایا، نہیں۔ وہ ان دونوں سے الگ ہے اور اپنی گاڑی میں آئے گی پھر میں نے گارڈ کو صدف کے حلیے سے آگاہ کر دیا۔
میں واپس ڈرائنگ روم میں آیا تو اللہ دتا میرے پاس آگیا۔ پاشا کے اسسٹنٹ تحسین اور اس کی بیوی کی آمد کے بارے میں، میں نے اللہ دتا کو بتایا تو اس نے کہا۔
''میں تحسین کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہاں آتا رہتا ہے لیکن سیکیورٹی گارڈ نیا ہے اس لیے اسے......!''
میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''میں نے گارڈ کو ان کی آمد کے بارے میں ہدایات جاری کر دی ہیں۔'' پھر بتایا ''اور وہ پریشان صدف بی بی بھی یہاں پہنچنے والی ہے۔ ابھی اس کا بھی فون آیا تھا۔''
''کیا یہ لوگ رات یہیں گزاریں گے؟'' اس نے پوچھا۔
''تحسین اور اس کی بیوی تو چند روز تک یہاں قیام کریں گے۔'' میں نے بتایا ''لیکن صدف سے متعلق میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کی پریشانی سننے کے بعد ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔''
اللہ دتا نے کہا ''تحسین کی شادی کو ابھی صرف ایک ماہ ہی ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ چند روز یہاں رکے گا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی پرائیویسی کا بھی خیال رکھا جائے۔ میں ایک بیڈ روم کو کھولتا ہوں۔ یہ کمرا عموماً مہمانوں کے قیام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔''
''ٹھیک ہے، تم جا کر اس کمرے کو سیٹ کر لو۔ نو بیاہتا جوڑا کسی بھی وقت پہنچنے والا ہے۔''
اللہ دتا میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا تو میں صدف کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسے اچانک مجھ سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی۔ وہ صبح بھی یہاں آسکتی تھی۔ یقیناً اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ تھی۔ اپنی اس سوچ پر مجھے خود ہی ہنسی آگئی۔ صدف تو بذاتِ خود ایک چلتی پھرتی گڑبڑ تھی، اس کے ساتھ بھلا کیا گڑبڑ ہو سکتی تھی۔ اس نے صرف دوسروں کے لیے مسائل پیدا کرنے کی ذمے داری لے رکھی تھی۔
ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ میں صدف کے تصور کو ذہن سے جھٹک کر فون کی جانب متوجہ ہوا اور ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا ''ہیلو'' کے جواب میں جو آواز میری سماعت سے ٹکرائی، میں نے اس کے حامل کو پہچاننے میں ذرا غلطی نہ کی۔
''منہاس صاحب! میں وجدان بات کر رہا ہوں۔'' میں نے جوشیلے لہجے میں کہا۔
''کیسے ہو وجدان؟'' اس نے پوچھا ''تمہارے لیے میرے پاس ایک بہت بڑی خوش خبری ہے۔''
میں نے بے ساختہ کہا ''اور میں آپ کے لیے، اپنے پاس ایک بری خبر رکھتا ہوں۔ میں تھوڑی دیر میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔''
دوسری جانب خاموشی چھا گئی پھر منہاس نے تشویش ناک انداز میں دریافت کیا ''وہ بری خبر کیا ہے؟''
''پہلے آپ اچھی خبر سنائیں۔'' میں نے اصراری لہجے میں کہا ''بری خبر کا نمبر بعد میں آئے گا۔''
وہ مصلحت آمیز آواز میں بولا ''چلو ٹھیک ہے۔ فون میں نے کیا ہے اور جس مقصد سے کیا ہے، پہلے اسے پورا ہونا چاہیے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے بتایا ''ہم نے ''سی ایف کے'' کے خلاف ایک بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔''
''کیسی کامیابی منہاس صاحب؟'' اچانک میرا دل کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔
وہ فخریہ لہجے میں بولا ''ہم نے کل رات ''ساؤتھ'' پر یلغار کی تھی جس کے نتیجے میں بہت سارا ناجائز اسلحہ اور منشیات کی بھاری مقدار ہتھے چڑھی ہے لیکن افسوس کہ وہاں کا قائم مقام کبیر شاہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔''
''یہ تو بہت ہی سنسنی خیز خبر ہے منہاس صاحب۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا ''ذرا تفصیل سے بتائیں۔''
منہاس باقر نے بتایا کہ گزشتہ رات ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان پولیس نے ساؤتھ پر چھاپا مار کارروائی کی تھی۔ منہاس کے دوست ڈی ایس پی خورشید شاہ نے اس سلسلے میں خاصی سرگرمی دکھائی تھی۔ جم براؤن والے کیس میں دو دہشت گرد نجیب اللہ اور سراج احمد گرفتاری کے بعد پولیس کی تحویل میں جا چکے تھے۔ پولیس نے اسپیشل تفتیش کے دوران میں ان سے کافی کچھ اگلوا لیا۔ نجیب اور سراج کا تعلق ساؤتھ سے تھا اور ان کے اقراری بیان کے مطابق یورپی سفیر جم براؤن کے قتل کی سازش کا سرغنہ کبیر شاہ نامی ایک شخص تھا جو ڈیفنس فیز ون کے ایک بنگلے میں رہتا تھا۔ میں منہاس باقر کو بتا چکا تھا کہ شعیب غوری کا ڈیفنس والا ٹھکانا ''ساؤتھ'' کے نام سے موسوم ہے۔ گرفتار شدگان نے اسی ٹھکانے کی نشان دہی کی تھی۔ ازیں علاوہ، چنا کمی فروش بچہ بخت واحد اور اس کا تعاقب کرنے والا امداد علی بھی نجیب کے خلاف بیان دے چکے تھے۔ انہوں نے شارع فیصل والا ڈراما نجیب کی ہدایات پر ایک بھاری رقم کے لالچ میں کیا تھا تاکہ جم براؤن کو گھیر کر شکار کیا جا سکے۔ تاہم سازش کا یہ حصہ بخت واحد اور امداد علی سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ ان دونوں کا کردار بہت معمولی نوعیت کا تھا۔
منہاس باقر کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا ''اگرچہ یہ چھاپا ہماری کامیابی ہی میں شمار ہوگا لیکن میرا خیال ہے، ہم شعیب غوری کو بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکے!''

"ان شا اللہ! بہت زیادہ نقصان بھی پہنچائیں گے۔" اس نے ولولہ انگیز لہجے میں کہا "شعیب غوری ہمارا خصوصی ٹارگٹ ہے۔ ساؤتھ پر جو کچھ بھی ہوا، وہ پولیس والوں کی ایک معمول کی کارروائی تھی۔ یورپی سفیر کے قتل کی سازش میں شریک دو اہم افراد ہمارے ہتھے چڑھ گئے اور ہم نے ان سے حاصل شدہ معلومات کے بل پر ساؤتھ کو نشانہ بنالیا۔ شعیب غوری کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں آسکے گا کہ اس مشن میں ہمارا بھی کوئی ہاتھ تھا، یعنی وجدان کا کوئی ہاتھ!"

میں نے پوچھا "کیا اس مشن میں پولیس کے علاوہ آپ کا کوئی بندہ بھی شامل تھا؟"

"صرف دو افراد۔" اس نے جواب دیا "شہزاد علی اور امجد۔ شہزاد نے پولیس کی بہت مدد کی ہے۔ اس کے تعاون کے بغیر بنگلے کی اندرونی کارروائی مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ مختلف نوعیت کی جتنی منشیات اور اسلحہ پولیس کے ہتھے چڑھا ہے وہ ان لوگوں کے خلاف کیس کو بہت مضبوط بنادے گا۔ دہشت گردی، ناجائز اسلحے کی ذخیرہ اندوزی اور خطرناک منشیات کا اسٹاک کوئی کم سنگین جرائم نہیں ہیں پھر جم براؤن کے طفیل حکومتِ پاکستان بھی اس معاملے میں ملوث ہوگئی ہے۔ وہ لوگ بچ نہیں سکیں گے۔"

"آپ کن لوگوں کی بات کررہے ہیں منہاس صاحب!" .... میں نے استفسار کیا "کبیر شاہ تو صاف بچ نکلا۔ شعیب غوری ابھی بیچ میں نہیں آیا۔ نجیب اور سراج نے کبیر شاہ تک راہنمائی کردی۔"

منہاس نے کہا "وجدان! تم پولیس والوں کو جانتے ہو۔ یہ کھال کے بال اور بال کی کھال نکالنا خوب جانتے ہیں۔ کبیر شاہ وقتی طور پر فرار ہوا ہے۔ پولیس بہت جلد اس تک پہنچ جائے گی۔ خاص طور پر حکومتی دباؤ کے زیرِ اثر یہ لوگ بہت فعال ہوجاتے ہیں۔ نجیب اور سراج تو پولیس کی تحویل میں آ ہی چکے ہیں، ساؤتھ والے آپریشن میں کبیر شاہ کے تین مزید ساتھیوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ ان سے پوچھ تاچھ جاری ہے۔ صابر علی، وحید خان اور منظور الٰہی نامی یہ تین بندے بھی بہت انکشافات کریں گے۔ جلد یا بدیر، پولیس کبیر شاہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گی اور..... کبیر شاہ کے بعد نام آتا ہے شعیب غوری کا۔ اس یہودنواز شرپسند شخص کا بہت برا وقت شروع ہوچکا ہے۔ وجدان! تم میری یہ بات نوٹ کرلو!"

ایک چھوٹی سی کامیابی کے باعث منہاس باقر خاصا جذباتی ہورہا تھا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا، کبیر شاہ اور شعیب کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ حائل تھا۔ کبیر شاہ کی حیثیت "سی ایف کے" میں لگ بھگ امتیاز علی کے برابر تھی۔ از... شعیب غوری نے جس طرح صفحۂ ہستی سے مٹایا یہ مجھ سے ... اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ شعیب جیسے شقی القلب باس ٹائپ لوگ اپنی بقا کے لیے کسی کو بھی قربان کرسکتے ہیں، چاہے وہ ان کا ... ہی قریبی کیوں نہ رہا ہو! شعیب کے ایک اشارے پر میرے بہترین ساتھی المناک موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ میں امتیاز علی، میر بخش اور روبی کی جدائی کو بھی بھول نہیں ... تھا۔

میں نے منہاس باقر کی خوشی میں شامل ہوتے ہوئے "جناب! یہ ہمارا پہلا قدم تھا، سی ایف کے کے خلاف آئندہ کوئی چال چلنے کے لیے ہمیں زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

وہ جوش بھرے لہجے میں بولا "وجدان! میرا اگلا ٹارگٹ "ایسٹ" ہوگا۔ بل پارک کے نزدیک واقع شعیب کے اس ٹھکانے سے ممکن ہے، ہمیں مفید اشیا اور ثبوت مل جائیں۔ تم نے اس ٹھکانے کے قائم مقام کا نام سراج الدین بتایا تھا نا!"

"مجھے ایک دو مرتبہ "ایسٹ" جانے کا اتفاق ہوا ہے۔" میں نے کہا "وہاں کے کرتا دھرتا کا نام سراج الدین ہی ہے۔ شعیب غوری نے کراچی کے ہر ڈسٹرکٹ میں ایک نام سے ایک اڈا بنا رکھا ہے۔ "ساؤتھ" کے قائم مقام کو آپ نے فرار ہونے پر مجبور کردیا۔ "ایسٹ" کا نظم سراج الدین کے ہاتھ میں ہے۔ لاپتا جہانگیر کی زبانی "..." کے باس کا نام سلیم واسطی معلوم ہوا۔ "سینٹرل" اور "ویسٹ" سے ابھی میرا واسطہ نہیں پڑا۔ ویسے ہر ٹھکانے کا "اسٹاف" الگ ہے اور وہ لوگ بوقتِ ضرورت ہی ایک دوسرے سے رابطہ کرتے ہیں۔ ان پانچوں باسز کا بگ باس شعیب غوری ایک کمانڈر کی حیثیت سے "سی ایف کے" کا نظام چلاتا ہے۔ اس کا اصل ٹھکانا کہاں ہے؟ اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ وہ حسبِ حال کہیں بھی پہنچ کر احکامات صادر کردیتا ہے لیکن......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا۔ منہاس باقر سے پوچھا "آپ نے مفید اشیا اور ثبوت کا ذکر کیا ہے، اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

اس نے کہا "وجدان! یہ بات تم مجھ سے زیادہ بہتر طرح جانتے ہو کہ شعیب غوری ایک دہشت گرد تنظیم کا باس ہے۔ اس دنیا میں ہر بگ باس کسی اپنے سے بڑے کا آلۂ کار ہوتا ہے۔ شعیب بھی یہودی لابی کے اشاروں پر ناچ رہا ہے۔ یہودی لابی پاکستان کو دہشت گرد نمبر ون ...

ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ تم نے ہی مجھے بتایا تھا، ایک یہودی النسل برطانوی بزنس مین مسٹر نیل آرمر کے شعیب سے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں شعیب کے ٹھکانوں سے کچھ ایسے ثبوت حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا کر اسے یہودی لابی کا آلۂ کار ثابت کیا جاسکے۔ اب تو تم میری بات سمجھ گئے ہونا؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اسی وقت اللہ دتا میرے پاس آ گیا۔ مجھے فون پر مصروف دیکھ کر وہ ایک طرف خاموش کھڑا ہوگیا۔ میں نے منہاس صاحب سے ایک منٹ ہولڈ کرنے کو کہا پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اللہ دتا کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس نے کہا ''جناب! صدف بی بی آ گئی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ اسے کسی دوسرے کمرے میں آرام سے بٹھاؤ۔'' میں نے کہا ''میں فون سے فارغ ہونے کے بعد خود اس سے ملوں گا۔''

اگر صدف فوری طور پر میرے پاس آ جاتی تو میں منہاس باقر سے کام کی کوئی بات نہیں کر پاتا۔ ویسے بھی میں ''سی ایف کے'' سے متعلق کوئی بھی معاملہ صدف کے سامنے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تجسس کی ماری پہلے ہی میری جان کا عذاب بنی ہوئی تھی۔

اللہ دتا جانے لگا تو میں نے اسے مزید ہدایت دی ''اگر اس دوران میں پاشا صاحب کا اسسٹنٹ تحسین اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ یہاں پہنچ جائے تو اسے سیدھا اسی کمرے میں لے جانا جو تم نے ان دونوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ میں اس وقت فون پر نہایت ہی اہم گفتگو کر رہا ہوں۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہی میں کسی سے مل سکوں گا لہٰذا مجھے خواہ مخواہ ڈسٹرب نہ کیا جائے۔''

اللہ دتا فرماں برداری سے گردن جھکا کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

میں نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹایا اور کہا ''جی منہاس صاحب!''

وہ بولا ''میں نے تو تمہیں اپنے فون کرنے کا مقصد تفصیلاً بتا دیا ہے۔ اب تم بھی بتا دو، تمہارے پاس میرے لیے کون سی بُری خبر ہے؟''

بری خبر آخر بری شے ہی ہوتی ہے اور اسے سنانا ناگزیر۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں منہاس باقر کو اس کے دوست فرید پاشا کے والد کے انتقال کی خبر سنا دی۔

''اوہ!'' ایک افسوس ناک آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''یہ کب ہوا؟''

میں نے بتایا ''آج ہی۔ کوئی دو تین گھنٹے پہلے کی بات ہے۔ کمال پاشا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ فرید سات بجے سید پور روانہ ہوگیا تھا، اپنی بیگم کے ساتھ۔''

''وجدان! تمہیں بھی جانا چاہیے تھا۔'' منہاس نے بوجھل آواز میں کہا۔

میں نے کہا ''میں صبح سید پور روانہ ہو جاؤں گا۔ دراصل جس وقت فرید کو یہ اندوہناک اطلاع ملی کہ کمال پاشا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے، میں کوٹھی میں موجود نہیں تھا۔ فرید ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کو اپنے ساتھ لے کر فوراً سید پور روانہ ہوگیا۔ میں نو بجے یہاں پہنچا ہوں۔ دس بجے پاشا نے فون پر مجھے بتایا کہ کمال پاشا دل کے دورے میں چل بسا۔ فرید نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے ٹرائی کیا مگر آپ سے رابطہ نہیں ہوا۔ پھر اس نے میری ڈیوٹی لگا دی کہ میں آپ کو فون کر کے سانحے سے آگاہ کر دوں۔''

منہاس باقر نے کہا ''بڑے پاشا کو پہلے بھی دو اٹیک ہو چکے تھے۔ وہ ہارٹ اسپیشلسٹ ڈاکٹر ریاض کے زیر علاج تھا۔ فرید نے بہت کوشش کی کہ اس کا باپ لاہور شفٹ ہو جائے تاکہ مناسب انداز میں اس کی دیکھ بھال کی جا سکے لیکن کمال پاشا نے دل کی بیماری کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ پرہیز کے معاملے میں بھی وہ خاصا بے پروا واقع ہوا تھا۔ تیسرے اٹیک نے اس کی جان لے لی۔''

''فرید اس مرتبہ بھی ڈاکٹر ریاض ہی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''وجدان! موت بڑی سفاک اور ظالم حقیقت ہے۔'' منہاس نے گمبیر آواز میں کہا ''اسے صرف ایک موٹا بہانہ چاہیے ہوتا ہے...... اور یہ بہانہ ڈھونڈنے میں یہ حقیقت بڑی مشاق اور تجربے کار ہے۔ بہرحال...'' ایک طویل بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''کمال پاشا کی موت کا مجھے بہت دکھ ہے۔''

''کیا آپ بڑے پاشا صاحب کے جنازے میں شرکت کے لیے سید پور آئیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کہا ''آنا تو چاہیے، بہرحال میں ابھی فرید سے رابطہ کر کے تعزیت کرتا ہوں۔''

''اگر آپ وہاں آئے تو پھر مجھ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

منہاس بولا ''اس ملاقات کا انحصار تجہیز و تکفین کے پروگرام پر ہے۔ میں فرید سے جب تک تفصیلی بات نہ کرلوں، حتمی طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ تم تو جانتے ہی ہو، کراچی سے سید پور براستہ لاہور اور پھر سید پور سے کراچی بہ راستہ لاہور آمد و رفت کے لیے دو دن درکار ہیں۔ جمعے کا دن اس وقت اختتام پذیر ہے۔ کل ہفتہ ہے۔ میں اگر کل بھی کراچی سے روانہ ہوں تو اتوار شام سے پہلے واپس اپنے گھر نہیں پہنچ سکتا...... اور اتوار کو میری بیٹی شبانہ کی رخصتی ہے۔ یعنی پرسوں۔''

شبانہ کی شادی والی بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔ واقعی، یہ تو بہت ہی اہم معاملہ تھا۔ اس شادی میں شرکت کے لیے نبی سر سے قاضی سلطان کی بیٹی ممتاز بھی منہاس باقر کے گھر پہنچی تھی اور اسی شادی کی شاپنگ کے دوران میں ممتاز اور ساحل کو میاں زاہد حسین کے گن بردار غنڈوں نے اغوا کیا تھا۔ ازاں بعد ممتاز کو تو عمر کوٹ سے برآمد کرلیا گیا لیکن میری ساحل جو میرا ساحل بھی تھی، ہنوز مجھ سے دور تھی۔ میں مطمئن تھا کہ اس کا اتا پتا مجھے معلوم ہوگیا تھا اور مجھے پورا یقین تھا کہ میں اپنی محبت کو چوہدری نوازش علی کے بے رحم چنگل سے بہت جلد آزاد کرا لوں گا۔ میں کل سید پور میں ہوتا اور موضع رکھاں والی سید پور سے صرف پانچ کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ میں فوراً سے پیشتر رکھاں والی پہنچ کر وہاں کے مطلق العنان شیطان صفت حاکم چوہدری نوازش علی کی ''مزاج پرسی'' کرسکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں ساحل کی یاد میں آگے بڑھتا، اِئر پیس میں منہاس باقر کی آواز سنائی دی ''وجدان! تم تو جانتے ہو، بیٹیوں کے معاملات کتنے نازک ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں تو پہلے ہی ممتاز اور ساحل کے اغوا والا افسوس ناک واقعہ پیش آچکا ہے۔ میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں۔ میرا مسلسل کراچی میں رہنا ضروری ہے اور اب تو شعیب غوری جیسے بدنامِ زمانہ شریف بدمعاش سے ٹھن گئی ہے۔''

''میرا خیال ہے، آپ فون پر ہی فرید پاشا سے بھرپور تعزیت کرلیں۔ وہ آپ کی مجبوری کو سمجھ جائے گا۔ شبانہ، ساحل اور ممتاز والا واقعہ اس سے پوشیدہ نہیں۔'' میں نے حالات کے تقاضوں کے مطابق اسے مشورہ دیا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو وجدان۔ شاید قسمت کو یہی منظور ہے۔ میں پاشا کی غمی میں اور وہ میری خوشی میں شریک نہیں ہوسکتا۔ ہمیں اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے ٹیلی فون کو ہی وسیلہ بنانا پڑے گا۔''

''مجبوری میں یہ سب تو کرنا اور سہنا پڑے گا منہاس صاحب!''

''تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔'' وہ موضوعِ گفتگو کو بدلتے ہوئے بولا ''میں نے تمہیں فرید پاشا کے پاس بھیج کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔ میرا مطلب ہے، وہ تمہارے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے یا نہیں؟''

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''منہاس صاحب! آپ نے مجھے بالکل ٹھیک بندے کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے امید ہے، میں فرید پاشا کے تعاون سے پہلے جلد ساحل کو حاصل کرلوں گا۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے وجدان۔'' وہ خلوصِ دل سے بولا ''میں تمہیں بہت جلد کراچی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ مل کر کام کرنے میں جو مزہ آئے گا وہ اکیلے میں یا پولیس کے سنگ کہاں!''

میں نے کہا ''یہ تو ایک اتفاق ہے کہ کمال پاشا کا انتقال ہوگیا۔ بصورتِ دیگر فرید کے چھوٹے بھائی نوید کو آج یہاں آنا تھا اور میں صبح اس کے ساتھ سید پور روانہ ہو جاتا۔ میں اپنے مشن میں لیٹ نہیں ہوں اور......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ذرا توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''جب سے میں یہاں آیا ہوں، نہایت ہی مصروف اور برسرِ پیکار رہا ہوں۔''

پھر میں نے منہاس باقر کو اپنی اب تک کی لاہوری ''مصروفیات'' کے بارے میں آگاہ کیا۔ سکندر، لالہ بشیر ایم پی اے، ڈی ایس پی اورنگ زیب خان، نادیہ، صدف، فرید پاشا کی بیوی نائلہ کے اغوا کا واقعہ اور تہ خانے کے اندر اور باہر پیش آنے والے تازہ ترین واقعات کو سن کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''وجدان! تم جہاں بھی جاتے ہو، اپنے ساتھ ہنگاموں کا میلہ بھی لے کر جاتے ہو۔ نائلہ والا واقعہ بہت افسوس ناک ہے۔ شکر ہے، تمہاری وجہ سے رانا عظمت اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ بہرحال، سب سے زیادہ دلچسپ کردار صدف اور نقلی وجدان کا ہے۔ ان کا تذکرہ سنسنی خیز اور حیرت آمیز ہے۔''

میں نے کہا ''نقلی وجدان اور اس کی پھیلائی ہوئی شر انگیزیوں سے تو میں کسی نہ کسی طور نمٹ ہی لوں گا لیکن صدف والا معاملہ خاصا ٹیڑھا ہے۔ وہ اس وقت بھی یہاں آئی بیٹھی ہے۔''

''وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟'' منہاس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''وہ مجھ سے کچھ نہیں چاہتی بلکہ میرے توسط سے چاہتی ہے۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''ویری انٹرسٹنگ۔ کچھ تفصیل بتاؤ؟''

میں نے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا ''وہ چاہتی ہے، میں کچھ وقت نکال کر اسے مارشل آرٹس کی چینی ٹیکنیکس سکھاؤں۔ وہ چاہتی ہے، میرے ساتھ فلم اسٹوڈیوز جاکر فلموں کی شوٹنگ دیکھے اور فرید پاشا کے گاؤں سید پور جاکر فطری زندگی کا مشاہدہ کرے۔ یہ اس کی سب وہ ''چاہتیں'' ہیں جواب تک میرے علم میں آئی ہیں۔ تازہ ترین وہ کون سا منصوبہ اپنے ساتھ لائی ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ بڑے ہنگامی انداز میں یہاں پہنچی ہے۔''

''میں نے صدف کے رویے سے صرف ایک بات اخذ کی ہے۔'' منہاس باقر نے کہا ''وہ ہر حال میں تمہارے قریب رہنا چاہتی ہے اور...... کوئی لڑکی ایسا کب اور کیوں چاہتی ہے، اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ ماشاءاللہ، تم خاصے سمجھ دار ہو!''

ہمارے درمیان صدف کے بارے میں تھوڑی دیر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے منہاس کو بتایا کہ وہ ایک معروف صنعت کار سرمد بخاری کی بیٹی ہے۔ سرمد بخاری جوتا سازی کی صنعت سے وابستہ ہے اور اس کی رہائش ڈیفنس سوسائٹی کے ایک ایسے بنگلے میں ہے جو ''ساؤتھ'' کے بہت قریب واقع ہے۔ منہاس باقر، سرمد بخاری سے بخوبی واقف تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اپنے اخبار میں، سرمد بخاری کی فیکٹری کا ایک سپلیمنٹ شائع کیا تھا۔

☆☆☆

اللہ دتا نے میری ہدایت کے عین مطابق اسسٹنٹ تحسین اور اس کی بیوی کو ان کے لیے کھولے گئے بیڈ روم میں پہنچا دیا تھا۔ تحسین کی بیوی کا نام ناہید معلوم ہوا۔ میں نے اسی بیڈ روم میں جاکر ان سے سرسری ملاقات کی۔ سرسری اس لیے کہ وہ ایک نوبیاہتا جوڑا تھا اور رات لگ بھگ آدھی بیت چکی تھی۔

صدف خاصی تیاری سے مجھے ملنے آئی تھی۔ چست بلیو جینز پر اس نے لوز ہائی نیک ریڈ سوئٹر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ صدف کا بھرا بھرا جسم پستہ قامتی پر سربستہ قیامت ڈھاتا تھا۔ وہ اپنے سراپا میں شاعرانہ محبوبیت کا پورا سامان رکھتی تھی۔ وہ...... دم بھر نہ ٹھہرے دل میں نہ آنکھوں میں ایک پل، اتنے سے قد پر بھی قیامت شریر ہو...... کی جاگتی جیتی مثال تھی۔

سفری بیگ کی ہمراہی نے اس کے عزائم کو میرے ذہن میں اور بھی پختہ کر دیا۔ وہ میرے اشارے پر ایک صوفے پر بیٹھ چکی تو بولی۔ اس کے لہجے میں شکایت کا عنصر نمایاں تھا۔

''تمہیں بڑی فرصت سے فرصت ملی ہے وجدان۔ کیا لاہور والے اپنے مہمانوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں؟''

میں اس کی چوٹ کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ ابتدا میں، میں نے اسے بتایا تھا کہ میرا تعلق لاہور سے ہے۔ یہ بات کوئی اتنی زیادہ غلط بھی نہیں تھی۔ تاہم پیش آمدہ حالات کی روشنی میں اس کا شمار غلط بیانی کے زمرے میں آتا۔

میں نے گہری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ''سوری صدف! تمہیں میرا انتظار کرنا پڑا۔ بہرحال بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ مجھے پتا چلا ہے، تم نے پہلے بھی اس کوٹھی پر متعدد فون کیے تھے!''

''تمہیں بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی ''میں تمہاری وجہ سے خاصی پریشان تھی۔ تم نے شام میں مجھے فون کرنا تھا۔ ہم ریس کورس پارک میں ملنے والے تھے۔''

''چلو اب تو تمہاری تسلی ہوگئی۔'' میں نے سادہ لہجے میں کہا ''تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے فون پر بات کی اور اب اپنی آنکھوں سے مجھے زندہ سلامت دیکھ رہی ہو۔''

وہ میری وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی ''تم نے شام میں مجھے رنگ کیوں نہیں کیا؟''

''ایک مسئلے میں پھنس گیا تھا۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''ہوں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ہنکارا ابھرا اور بولی ''مجھے پتا چلا ہے، تم صبح سید پور جارہے ہو، پاشا انکل کے گاؤں۔ پاشا صاحب کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہاں سے جاچکے ہیں۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا ''اگر میں سید پور جانے والا ہوں تو؟''

''تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' وہ اپنے سفری بیگ کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

میں نے برہمی سے کہا ''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟''

''کہہ سکتے ہو۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر بولی ''سب لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ تم بھی ان لوگوں میں شامل ہو جاؤ گے تو کیا فرق پڑے گا!''

میں نے چڑ کر کہا ''تمہارے رویے اور عمل کو دیکھ کر ہی لوگ ایسا سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ تم کیوں کرتی ہو بچے کی حرکتیں؟''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' اس کی شوخی کو اچانک معصومیت نے اپنے آنچل میں چھپا لیا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ''کیا یہ بے وقوفی نہیں کہ تمہارے فائنل ائیر کے امتحانات سر پر کھڑے ہیں اور تمہیں سیر و تفریح کی سوجھ رہی ہے اور وہ بھی ایک ایسے میزبان کے پاس جس کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے پوچھ بیٹھی۔

''اور کیا وجدان؟''

''اور یہ کہ ہارٹ اٹیک کو کامیابی مل گئی!'' میں اپنے لہجے کے بوجھل پن کو چھپا نہ سکا۔

''اوہ...... ویری سیڈ!'' وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''وجدان! مجھے پاشا انکل کے والد کی ڈیتھ کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ آئی ایم ریئلی سوری۔ مجھے اس انداز میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ایگین سوری!''

میں اس کی ''سوری'' کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکا اور خاموش نظر سے اس کے سفری بیگ کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ''وجدان! تم صبح سید پور تو جارہے ہونا؟''

''یقیناً جاؤں گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

وہ یک دم سنجیدہ ہوچکی تھی، گمبھیر آواز میں بولی ''میں تمہارے ساتھ سید پور جانے کا پروگرام بنا کر یہاں آئی تھی۔ واقعی میرا ارادہ سیر و تفریح کا تھا لیکن ماتمی فضا میں کسی تفریح کا تصور نہیں کیا جاسکتا البتہ، اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تعزیت کی غرض سے تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولی ''میں نے سید پور روانگی کے سلسلے میں پاپا سے بھی بات کر لی تھی اور ماموں کو بھی آمادہ کر لیا تھا۔ میں تو ماموں کے گھر سے پوری تیاری کے ساتھ یہاں آئی ہوں وجدان!''

اس کی انکشاف انگیز اطلاع نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ''تم نے اپنے پاپا سرمد بخاری سے کیا کہا ہے؟''

''میں پاپا سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''میں نے انہیں بتایا کہ اتفاق سے ایک کلاس فیلو مجھے یہاں مل گیا ہے۔ وہ دو دن کے لیے سید پور نامی ایک نواحی گاؤں جارہا ہے، میں اس کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔ پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اور مجھ پر اندھا اعتماد بھی۔ انہوں نے بخوشی مجھے اجازت دے دی۔ ازاں بعد ماموں کو منانا چنداں مشکل ثابت نہیں ہوا۔ نادیہ جیسی لڑکی میری سپورٹر تھی، ناکامیابی کیسے ہوتی وجدان!''

بات ختم کر کے اس نے فخریہ نظر سے مجھے دیکھا، میں نے نیم طنزیہ انداز میں کہا۔

''صدف! ایک طرف تمہارا دعویٰ ہے، تم اپنے پاپا سے کچھ نہیں چھپاتی ہو اور دوسری جانب تم ان سے غلط بیانی کرتی ہو۔ یہ کس قسم کی محبت اور اعتماد ہے؟''

وہ حیرت سے پلکیں جھپکا کر بولی ''میں نے کون سی غلط بیانی کی ہے؟''

''کیا یہ دروغ گوئی نہیں کہ تم نے مجھے اپنے ایک کلاس فیلو کی حیثیت سے غائبانہ طور پر سرمد بخاری سے متعارف کروایا ہے؟'' میں نے ترش لہجے میں کہا ''یقیناً تم نے میرا نام وجیہ بتایا ہوگا۔ اس سے پہلے تم اپنے ڈی ایس پی ماموں اور رنگ زیب خان سے بھی کچھ اسی قسم کا میرا تعارف کروا چکی ہو؟''

وہ چند لمحے ٹٹولنے والے انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی ''وجدان! اگر تم دوستانہ فضا میں مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو تو میرا جواب ہوگا، یار! ایسی چھوٹی موٹی چیٹنگ تو چلتی ہے۔ میری اس غلط بیانی سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''چیٹنگ چھوٹی ہو یا بڑی، بہرحال یہ بے ایمانی ہی کہلائے گی۔''

''اس کا مطلب ہے، تم دوستانہ فضا قائم نہیں کرنا چاہتے؟''

''میں نے تو تم سے دشمنوں والی کوئی بات نہیں کی صدف!''

وہ خفگی سے بولی ''اور دوستوں والی بات بھی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے تم نے۔''

''یہ تمہارا پاگل پن ہے!'' میں نے چڑ کر کہا ''تم ہر بات کا الٹا مطلب نکالتی ہو۔''

وہ بے اختیار ہنس پڑی ''اس او کے!''

صدف کی ہنسی بڑی دل آویز تھی۔ ہموار، موتیوں ایسے دانت جب جلوہ افروز ہوئے تو یوں محسوس ہوا، اس کے دہانے سے نور پھوٹ پڑا ہو۔ اس کی شبنمی ہنسی میں بڑی مٹھاس اور ٹھنڈک تھی، وہ بکھرے ہوئے حواس اور تنے ہوئے اعصاب کو بڑی شانتی سے سمیٹ لیتی تھی۔ میں نے اپنے احساسات میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اس وقت میں جس نوعیت کے کشیدہ حالات سے گزر رہا تھا، انہوں نے مجھے خاصا چوکنا اور اضطراری بنا دیا تھا۔ ایسے میں صدف کی مترنم

ہنسی نے مجھے بہت سکھ پہنچایا۔
میں نے کہا ''صدف، مجھے اچھی طرح یہ اندازہ ہو چکا ہے کہ تم کتنی محنتی ہو۔ کس کاوش سے تم نے وجیہ کے اندر سے وجدان برآمد کیا ہے لیکن میں تم سے یہی درخواست کروں گا کہ تم جدھر سے آئی ہو، ادھر واپس چلی جاؤ۔ تم خواہ مخواہ اپنا وقت برباد کر رہی ہو۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں اس وقت کتنے سنگین حالات سے گزر رہا ہوں۔ موت میرے ہم رکاب ہے اور کسی بھی وقت اس کوٹھی پر زبردست حملہ ہو سکتا ہے۔ تم اپنی جان کو جانتے بوجھتے کیوں ہلاکت میں ڈالتی ہو؟''
''ہاؤ انٹرسٹنگ!'' وہ سنسنی خیز لہجے میں بولی ''کیا سسپنس ہے، کیا تھرل ہے، کیا ایڈونچر ہے؟ میں ایسی کسی صورتِ حال ہی کی تو تلاش میں تھی۔'' پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے اس نے پوچھا ''بائی دا وے وجدان! تم مجھے اپنے موجودہ حالات کے بارے میں تھوڑا بریف کرو گے؟''
''صرف بریف ہی نہیں بلکہ پورا بریف کیس تمہاری نذر کرنے کو تیار ہوں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اس انکار میں یہ تاثر عیاں تھا کہ تم نہیں سدھرو گی صدف! تمہارا علاج صرف یہی ہے کہ تمہیں، تمہارے حال پر چھوڑ دیا جائے۔
اسی وقت اللہ دتا ہمارے لیے کافی بنا کر لے آیا۔ ساتھ ہی موسم کی مناسبت سے کچھ خشک میوہ جات بھی تھے جن میں پی نٹ، چلغوزے اور نمکین کاجو شامل تھے۔ میں نے اللہ دتا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
''بھئی! میں تو مزید کافی نہیں پیوں گا۔ میرے لیے یہ ڈرائی فروٹ ہی کافی ہے۔ میں پہلے ہی اچھی خاصی نیند محسوس کر رہا ہوں۔ میرے حصے کا کافی والا مگ تم لے جاؤ اور خود پی لو۔''
اللہ دتا ''جی صاحب'' کہتے ہوئے، کافی کا مگ اٹھا کر رخصت ہو گیا۔
میں اسے حالات حاضرہ کی طرف لے آیا۔ میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا ''وجدان! تم مجھے اپنے ساتھ سید پور لے کر جاؤ یا نہیں، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے لیکن میں محسوس کر رہی ہوں، یہ رات مجھے اسی کوٹھی میں گزارنا چاہیے۔ ایک سے دو بھلے اور ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ میں مانتی ہوں، میرا مارشل آرٹ بس ایویں سا ہی ہے لیکن اگر آج رات کسی قسم کا کوئی بیرونی اٹیک ہو جاتا ہے تو میں تمہاری بھرپور مدد کر سکوں گی۔''

اس کی تجویز میں کافی وزن تھا۔ میں نے کہا ''میں نے تمہارے مارشل آرٹ کا عملی مظاہرہ مال روڈ وا... ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ تم جسے ایویں کہہ رہی ہو وہ فن ا... اچھوں سے زیادہ اچھا ہے۔ تم یہ رات اس کوٹھی پر گزار... ہو۔''
''تمہارے منہ سے اپنے فن کی تعریف سن کر بہت ا... لگ رہا ہے۔'' وہ پُرجوش انداز میں کافی کا سپ لیتے ہو... بولی ''یقین جانو وجدان! اگر کوئی مجھے ڈاکٹر کہہ کر پکارتا تو ش... اتنی خوشی نہ ہوتی۔''
''میں نے یقین جان لیا ہے۔'' میں نے معنی خیز ... میں کہا۔
وہ جلدی سے بولی ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
شاید میرے چہرے کے تاثرات نے چغلی کھائی... جبھی وہ فوراً ہوشیار ہو گئی تھی۔ میں نے نہایت ہی ٹھہر... ہوئے اور دوٹوک لہجے میں کہا ''مجھے ایک سو ایک فیصد ... ہے کہ تم اپنے پاپا کے لاکھوں روپے برباد کر کے چھوڑو... ازیں علاوہ ان کے ارمانوں کا جو خون ہوگا، سو الگ ... ہے۔''
وہ شکایتی نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ منہ سے کچھ نہ بولی... میں نے کہا ''اللہ کی بندی! لوگ میڈیکل کالج... داخلے کے لیے ترستے ہیں اور ایک تم ہو کہ فائنل ایئر میں... جانے کے باوجود بھی سنجیدہ نہیں ہو۔ ڈاکٹری کے پیشے کو ... کر ایک طرف رکھنے کے بعد مہم جوئی پر نکلنے کا ارادہ رکھتی... اس سے بڑا مذاق اور کیا ہوگا!''
''یہ مذاق نہیں ہے وجدان! میں بالکل سنجیدہ ہوں...'' وہ ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''میں تمہیں... بھی بتا چکی ہوں، میڈیکل میں نے پاپا کی خواہش پر ... تھا۔''
''اور اپنی ضد پر اسے ترک کر دو گی؟''
''مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔''
''اس کے باوجود بھی تم فائنل ایئر میں پہنچ گئی؟'' میرے لہجے میں کاٹ تھی۔
وہ معلومات افزا انداز میں بولی ''وجدان! شاید تم... جانتے کہ میڈیکل کالج میں فرسٹ اور فائنل ایئر ہی سب... زیادہ اہم ہوتے ہیں جن کو کلیئر کرنے کے لیے زمین آ... ایک کرنا پڑتے ہیں۔ بہت پڑھنا پڑتا ہے وجدان... فرسٹ ایئر میں تو بہت جوش میں تھی اس لیے بھی سیکنڈ ایئر... پہنچ گئی۔ اس کے بعد کے سال قدم قدم آگے بڑھتے...

اور اب فائنل مرحلہ آ گیا ہے۔ دیکھو، کیا ہوتا ہے!''
''تمہارے تیور سے تو کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔'' میں نے کہا۔
''اللہ مالک ہے!'' وہ بے پروائی سے بولی۔
''وہ تو سب کا مالک ہے۔'' میں نے بھی بے پروائی سے کہا ''چاہے کوئی سائنس پڑھے یا آرٹس۔ میڈیکل میں جائے یا انجینئرنگ میں یا پھر بزنس میں!''
اس نے تھوڑی دیر تک مجھے یک ٹک دیکھا پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''وجدان! سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس میڈیکل ویڈیکل سے سخت بور ہو گئی ہوں اور جب سے تم سے ملاقات ہوئی ہے، میرے مہم جوئی کے جراثیم کچھ زیادہ ہی فعال ہو گئے ہیں۔ میں تمہاری طرح ایڈونچرز بننا چاہتی ہوں، کچھ عرصہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔'' پھر اس نے دونوں ہاتھوں کو ایک مخصوص حرکت دی اور رشک آمیز انداز میں بولی ''وجدان! کیا سنسنی خیزی ہے تمہاری زندگی میں!''
میں تصور میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کریزی لڑکی کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ اس کے ساتھ دماغ سوزی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایسی کوئی کوشش وقت کی بربادی کے مترادف ہوتی۔ وہ اول آخر سمجھنے یا سنبھلنے کے موڈ میں نظر نہیں آتی تھی۔
اسی لمحے میرے تصور میں دو مہربان چہرے جلنے بجھنے لگے۔ یکے بعد دیگرے فرید پاشا اور منہاس باقر کی کہی ہوئی باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ انہوں نے صدف کے حوالے سے کم و بیش ملتے جلتے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ یہ اظہار بہت ہی سنگین اور خطرناک تھا۔ وہ قیامت قد لڑکی میری زندگی کے بکھیڑوں کا حصہ بننے والی تھی۔

☆☆☆

اس رات کو اگر ''ٹیلی فون نائٹ'' کا ٹائٹل دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لگ بھگ ساڑھے بارہ بجے ایک مرتبہ پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ صدف کو میں نے ڈرائنگ روم سے ملحقہ ایک بیڈ روم میں آرام کی غرض سے بھیج دیا تھا اور خود بھی کمر سیدھی کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔
دوسری گھنٹی پر میں نے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والے نے استفسار کیا ''کیا میں مسٹر پاشا سے بات کر رہا ہوں؟''
اس آواز اور لب و لہجے نے میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑا دی۔ فرید پاشا کے بارے میں استفسار کرنے والا

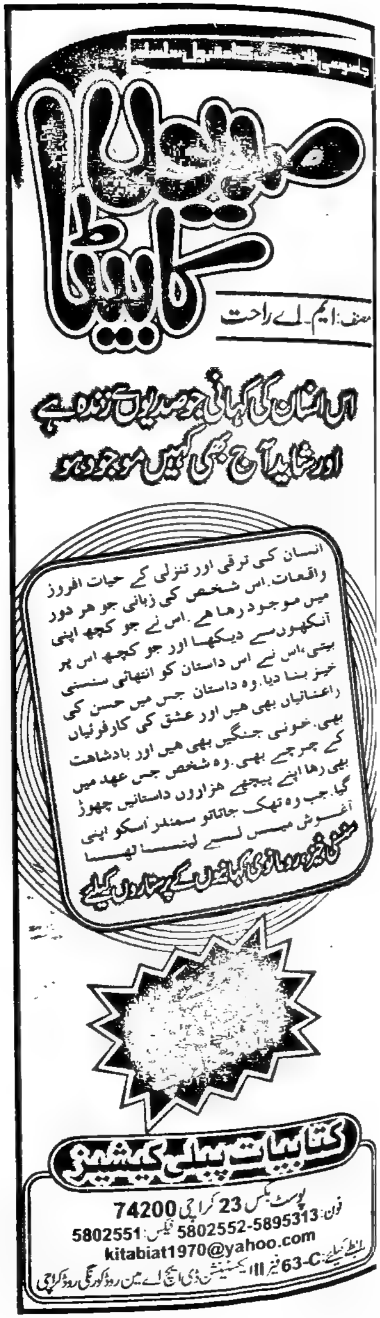

شعیب غوری تھا۔ میں اس وقت حیرت اور تعجب کی آخری حدود کو چھو رہا تھا۔ شعیب کو میرے موجودہ ٹھکانے کا کس طرح پتا چلا؟ یہ سوال بہت وزنی تھا اور میرے دماغ پر کسی ہتھوڑے کے مانند ضربیں لگا رہا تھا۔ میں نے کسی ڈرامے بازی کے بجائے کھل کر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ شعیب نے اگر کسی طور پر میرا سراغ لگا ہی لیا تھا تو پھر کیسی پردہ داری۔

مجھے خاموش پا کر اس نے دوبارہ پوچھا ''ہیلو! کیا یہ فلم پروڈیوسر فرید پاشا کا گھر ہے؟''

''تم پاشا کے توسط سے وجدان تک پہنچنا چاہتے ہو نا شعیب!'' میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا ''اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ یقیناً اس نے میری آواز پہچان لی تھی ''تم کہاں غائب ہو گئے تھے وجدان؟'' وہ دوستانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔

''میں نے کہا نا، کسی تکلف کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی منافقت کی۔'' میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''بولو، تمہیں یہاں کا فون نمبر کس نے دیا اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تم نے آدھی رات کو مجھے فون کیوں کیا؟''

وہ سنجیدہ آواز میں بولا ''وجدان! لگتا ہے، تمہیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے اور......''

''بکواس بند کرو غلط فہمی کی اولاد۔'' میں نے تقریباً چیخ کر کہا ''تمہارا مکروہ چہرہ میرے سامنے کھل چکا ہے لیکن تمہاری کوئی مکاری مجھے متاثر نہیں کر سکے گی۔ تم نے دوستی کی آڑ میں مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ نہ صرف مجھے، بلکہ اس ملک کو عالمی سطح پر بدنامی اور رسوائی دلوانے میں بھی تم پیش پیش ہو!''

میں نے مال روڈ والے ہوٹل کو چھوڑتے ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ از خود شعیب غوری سے رابطہ نہیں کروں۔ ہاں، اگر وہ مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو موقع محل کی مناسبت سے اسے ٹریٹ کروں گا۔ میں اپنے فیصلے پر قائم و دائم تھا۔

اس نے آخری مرتبہ مجھے غچا دینے کی کوشش کی اور اپنی مخصوص معتدل آواز میں بولا ''وجدان! یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟''

''زیادہ بگلا بھگت بننے کی کوشش نہ کرو شعیب۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''اب تمہاری کوئی چال کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ میں تمہاری اصل و نسل سے واقف ہو چکا ہوں۔ تمہارا بہروپ مجھ پر کھل چکا ہے۔ تم اور تمہاری ''سی ایف کے'' ایک ڈراما ہے۔ تم اصلاحی کاموں کی آڑ میں اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہو۔ تم یہودیوں کے ہو۔ انہی اپنے اصلی باپوں کے اشاروں پر ناچتے ہو۔ دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے سوا کچھ نہیں آتا۔''

''بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔'' وہ گونج دار میں بولا ''شاید اس طرح تمہارے دل کا غبار ہلکا ہو جائے۔''

وہ اب بھی منافقانہ چال چل کر بازی کو پلٹنے میں نظر آتا تھا لیکن اب میں اس کے کسی فریب میں آنے والا نہیں تھا۔ دوستی کی آڑ میں، میں پہلے ہی بہت نقصان اٹھا چکا تھا۔ میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا

''شعیب! تم نہایت ہی گھٹیا اور کمینے شخص ہو۔'' میں خاصا جذباتی ہو رہا تھا مگر اس جذباتیت میں غصے کا عنصر تھا ''تم نے امتیاز علی، روبی اور میر بخش کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان تینوں کا کیا قصور تھا۔ صرف یہ نا کہ امتیاز میرے بہت قریب ہو گیا تھا اور تمہیں ڈر تھا کہ وہ مجھ پر ''سی ایف کے'' کی اصلیت نہ ظاہر کر دے۔ روبی اور میر بخش گندم کے ساتھ گھن کی طرح پس گئے۔ پھر ساؤتھ والے واقعے کو لے لو، یورپی سفیر جم براؤن کے قتل کی سازش میں تمہارا ''ساؤتھ'' پوری طرح ملوث تھا۔ نجیب اور مراد کی گرفتاری نے تمہارے سی ایف کے کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اب تم ایک دہشت گرد ملک دشمن عنصر کے طور پر سامنے آ چکے ہو میں......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ''میں نہیں، کبیر شاہ''

''اوہ، تو تم نے حقیقت کا اعتراف کر لیا۔'' میرے سینے سے ایک اطمینان بخش سانس خارج ہوئی ''اب تم سے دو ہاتھ کرنے میں مزہ آئے گا شعیب! تم یہ مت سمجھو کہ کبیر شاہ کے فرار کے بعد پولیس خاموش ہو کر بیٹھ جائے گی۔ جرم کا معاملہ حکومتی سطح کا ہے۔ ساؤتھ سے صابر علی، وحید اور منظور الٰہی پولیس کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ پولیس بہت جلد کبیر شاہ کا سراغ لگا لے گی اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا، تم اچھی طرح جانتے ہو!''

وہ گمبھیر آواز میں بولا ''وہ تین گرفتار شدگان پولیس کے لیے بیکار ثابت ہوں گے۔ شعیب تک پہنچنا ناممکنات میں سے ہے۔ وہ سر پٹختے رہ جائیں گے۔ میں ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا اور نہ ہی میرے خلاف کوئی ثبوت وہ حاصل کر سکیں گے۔''

''کیونکہ تمہارے عقب میں یہودی لابی ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''جب تک تم ان کے بنے رہو گے، وہ تم پر اور تمہاری دہشت گرد تنظیم سی ایف کے پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔ یہ تو ان کا طریقۂ کار ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی وتیرہ اپنایا ہے۔ وہ لوگ پوری دنیا میں یہی کر رہے ہیں۔ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے وہ لوگ تم جیسے مخبوط افراد کو کسی ''برائے استعمال یک وقت'' شے کے مانند اپنے کام میں لاتے ہیں اور کام نکل جانے کے بعد بڑی حقارت سے ''ڈسپوزیبل'' کہہ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیتے ہیں۔'' میں ایک لمحے کو رکا اور زہریلے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''شعیب تمہارا انجام بہت حسرت ناک ہو گا!''

''تم اپنے انجام کی فکر کرو وجدان جو میرے ہاتھوں ہونے والا ہے۔'' وہ پھنکار سے مشابہ آواز میں بولا ''تم نے گزشتہ رات ساؤتھ میں جو کچھ کروایا ہے، میں اسے بھولنے والا نہیں۔''

میری باتوں کی آواز سن کر صدف دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی تھی اور خاموشی سے مجھے دیکھے چلے جا رہی تھی۔ میں نے شعیب غوری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''ساؤتھ میں جو کچھ ہوا وہ پولیس کی چھاپا مار کارروائی تھی۔ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔ البتہ اس واقعے نے میرے لیے دلی طمانیت کا سامان کیا ہے۔''

''تم صرف اپنے ہاتھ کے نہ ہونے کی بات کر رہے ہو؟'' وہ غرایا ''جبکہ میں تمہارے سرتاپا ملوث ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں۔ پولیس نے وہ کارروائی تمہاری نگرانی میں کی ہے۔''

''تم نے کوئی خواب دیکھا ہو گا۔''

''میں نے خواب نہیں دیکھا بلکہ تمہیں ساؤتھ کے آس پاس دیکھا گیا ہے۔''

میں حیرت اور بے یقینی سے اچھل پڑا ''شعیب، کیا یہ کوئی تمہاری نئی چال ہے؟''

جس وقت کراچی میں شعیب غوری کے اڈے ساؤتھ پر پولیس نے ریڈ کیا یعنی رات ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان، ان لمحات میں، میں لاہور میں پاشا کی کوٹھی میں چند فتنہ پرور افراد سے نبرد آزما تھا۔ رانا عظمت کا بھتیجا سکندر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پاشا کی بیوی نائلہ کو اغوا کرنے کوٹھی میں گھس آیا تھا جنہیں میں نے وہاں سے ناکام دُم سمیٹ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شعیب غوری کا دعویٰ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔

اس نے کہا ''میری چالیں تو سب پرانی ہیں اور خاصی آزمودہ بھی البتہ تم نے نیا نیا اڑنا سیکھا ہے۔''

''میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، تم نے کوئی نہایت ہی واہیات خواب دیکھا ہے۔ ایسے اوٹ پٹانگ خواب ہاضمے کی خرابی کے باعث وجود پاتے ہیں۔ تم کسی اچھے ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کراؤ۔''

وہ دہاڑ کر بولا ''چیک اپ تو میں عن قریب تمہارا کرانے والا ہوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے منجھے ہوئے قسائیوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ بہرحال، تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں، ساؤتھ کے باہر بھی میرے چند نمک خوار نگرانی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ پولیس کے ریڈ کی اطلاع مجھے فوراً مل گئی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی انکشاف ہوا کہ موقع پر تم بہ نفسِ نفیس موجود ہو۔ ایک لینڈ کروزر میں جس کا رنگ سرخ ہے اور چھت سفید۔ چوڑے ٹائروں والی یہ جیپ بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ تم جس چھوٹی جیپ میں دیکھے گئے، اس کا نمبر ہے، فور سیون تھری سیون۔ تم نے وہائٹ بے داغ پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور آنکھوں پر سیاہ اندھا چشمہ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ سراسر غلط کہہ رہا تھا۔ یہ نقلی وجدان کی کارستانی تھی۔ میں نے نہر کے کنارے، اس آفت زادے کو اسی لباس، اسی حلیے اور اسی سرخ جیپ میں دیکھا تھا اور جیپ کا نمبر بھی وہی تھا جو ابھی شعیب نے بتایا تھا۔ تو کیا گزشتہ رات نقلی وجدان کراچی میں تھا؟ یہ سوال بڑا ہولناک تھا۔ ساؤتھ کے آس پاس اس کی موجودگی کے بارے میں منہاس باقر نے مجھ سے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہوا، وہ بہروپیا صرف شعیب کے بندوں کو نظر آیا تھا مگر کیوں؟ وہ موقع پر نظر آ کر کیا ظاہر کرنا چاہتا تھا؟ سیدھا اور واضح جواب تو یہی تھا کہ وہ اس کارروائی کو میرے سہرے میں ٹانکنا چاہتا تھا اور اس مقصد میں وہ کامیاب بھی رہا تھا۔ شعیب غوری جیسا تجربے کار شخص بھی یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا کہ میں اس جگہ پر موجود تھا۔ میرا یہ نیا دشمن بڑے نرالے ڈھنگ سے دشمنی فرما رہا تھا۔

''تمہیں چپ کیوں لگ گئی وجدان!'' شعیب کی سرسراتی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا ''ایک ہی انکشاف نے تمہاری سٹی گم کر دی۔ ابھی تو اور بہت کچھ باقی ہے۔ تمہیں میری دانائی اور بینائی کا یقین آ جانا چاہیے کہ میں اس وقت تم تک کیسے پہنچ گیا؟ یہ نہیں پوچھو گے، میں نے تمہارا سراغ کیسے لگایا؟''

''خود ہی بتا دو۔'' میں نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا ''میرے جن آدمیوں نے تمہیں ساؤتھ کے قریب سرخ لینڈ کروزر میں دیکھا، انہوں نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ پولیس کے علاوہ دو سویلین بھی اس کارروائی میں شریک تھے۔ ایک کا نام شہزاد علی اور دوسرے کا نام امجد معلوم

ہوا ہے۔ یہ دونوں افراد منہاس باقر کے لیے کام کرتے ہیں جو شام کے ایک اخبار کا ایڈیٹر و پبلشر ہے۔ شہزاد علی تو خاصا تیز بندہ ہے، وہ ہمارے ہاتھ نہ آسکا البتہ آج دن میں میرے آدمی امجد کو اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔"

اس نے ذرا توقف کیا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا "تم مجھے دہشت گرد اور پتا نہیں، کیا کیا کچھ کہہ چکے ہو وجدان۔ یہ بات تم سے چھپی نہیں ہو سکتی کہ میرے پاس عبرت اثر ٹارچر سیل بھی ہوں گے۔ شام سے ذرا پہلے امجد نامی اس شخص نے خاصے اہم انکشاف کیے ہیں۔ وہ ساؤتھ میں تمہاری موجودگی سے تو آگاہ نہیں تھا البتہ موت کے منہ میں جانے سے پہلے اس نے جو کچھ بتایا میں اسی کے سہارے تم تک پہنچا ہوں۔"

"تو...... کیا تم نے...... امجد کی جان لے لی؟" میں نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایک امجد کیا، میں اپنے ہزاروں دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں۔" وہ سفاکی سے بولا "اس راہ میں ناموں کی تخصیص بھی نہیں۔ اس فہرست میں کسی وجدان کا نام بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم دنیا کے ذلیل ترین انسان ہو شعیب!" میں نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ ڈھٹائی سے بولا "یہی الفاظ میں تمہارے لیے اور تمہارے دوستوں کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہوں لیکن یہ میرا موضوع نہیں، اس وقت تو میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ امجد کی زبان کھلنے کے بعد میں تم تک کیسے پہنچا!"

پھر اس نے بتایا کہ امجد کی زبانی اسے معلوم ہو گیا کہ میں لاہور میں منہاس باقر کے ایک دیرینہ دوست کے پاس ٹھہروں گا جو فلم انڈسٹری میں ایک معروف پروڈیوسر ہے۔ فرید پاشا کا نام معلوم ہونے کے بعد اس کے گھر کا فون نمبر جان لینا چنداں مشکل نہیں تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے کہا "اب تو تمہیں یقین آگیا ہوگا کہ میں اپنے دشمن کو کھوجنے کے لیے کہاں تک جا سکتا ہوں؟"

"میں تمہاری ہر کمینگی پر یقین رکھتا ہوں شعیب۔" میں نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "تمہاری زبان سے اپنے لیے دشمن کا لفظ سن کر مجھے خوشی ہوئی ورنہ میں تو اب تک تمہیں اپنا دوست سمجھ کر فریب کھاتا آیا تھا۔"

"میری دشمنی تمہاری زندگی کا آخری تجربہ ہوگی۔" وہ رعونت سے بولا "تم اس تجربے سے گزر کر اپنے سابق دشمنوں کو بھول جاؤ گے کہ چوہدری نوازش علی کو بھی۔ تمہارے ذہن میں صرف ایک ہی نام کی گونج ہوگی۔ شعیب غوری......! اور یہ گونج تمہاری راتوں کی نیند اور دن کا آرام تم سے چھین لے گی۔"

"ایسی گیدڑ بھبکیوں والے میں نے لاکھوں دیکھے ہیں۔" میں نے کہا "جب ہاتھوں میں ہاتھ ڈالو گے تو تمہارا پیشاب خطا ہو جائے گا۔"

وہ تلملا کر بولا "تم میری دہشت سے واقف نہیں، وجدان!"

"میں ایسی دہشت کو اپنے جوتے کی نوک پر رکھتا ہوں۔"

"بہت جلد تمہیں میری طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"منافقت کا اندازہ ہو چکا، اب طاقت بھی دیکھ لوں گا۔" میں نے ترکی بہ ترکی کہا "تم نے اپنی منافقت اور گھٹیاپن کی بدولت مجھ سے دھوکا کیا۔ میں نے تمہاری دوستی میں فریب کھایا۔ تمہیں کثیر المالیت سونے کا راز بتا دیا۔ تم نے مسٹر نیل آرمر کے توسط سے وہ خفیہ دفینہ حاصل کر لیا لیکن اب میں وہ دوست نہیں رہا جسے تم دوستی کی آڑ میں مسلسل فریب دیتے آئے ہو۔ دشمنی ظاہر ہو جانے کے بعد تم میرا مال ہضم نہیں کر سکو گے۔ میں اپنا حصہ تم سے وصول کر کے رہوں گا چاہے اس کے لیے مجھے تمہاری آنتیں ہی کیوں نہ پیٹ سے باہر کھینچنا پڑیں۔ کسی بھی طرح، کسی بھی راستے! میں تمہیں بے ایمانی نہیں کرنے دوں گا۔"

وہ گمبھیر آواز میں بولا "میں دوستی اور دشمنی اپنے طریقے سے نبھاتا ہوں اور تمہاری معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ میں بے انصاف نہیں ہوں۔ تمہارا طے شدہ حصہ میں نے الگ نکال کر رکھ لیا ہے۔ اسے میں تمہاری فلاح و بہبود پر خرچ کروں گا!"

اس کے لہجے میں پوشیدہ سنگین دھمکی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے پوچھا "کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"فلاح و بہبود کا مطلب نہیں سمجھتے وجدان!" وہ استہزائیہ انداز میں بولا "حکومت نے بہبود آبادی کے مراکز جگہ جگہ کھول رکھے ہیں۔ میں نے تمہاری فلاح و بہبود کے لیے ایک مستند اور کہنہ مشق قسائی سے رابطہ کر لیا ہے۔ وہ تمہاری ایسی نس بندی کرے گا کہ پھر تم ساری زندگی صف بندی کے قابل نہیں رہو گے۔"

وہ یقینی طور پر مجھے غصہ دلانا چاہتا تھا لیکن اس کے الفاظ میں پوشیدہ دھمکیوں کو میں نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے بارے میں کوئی خطرناک قسم کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں

اپنے لہجے کو حتی الامکان معتدل رکھنے کی کوشش کی اور کہا۔ "تمہاری بکواس اگر ختم ہو چکی ہو تو میں ریسیور رکھ دوں۔"

جواب میں اس لعین کی اولاد نے ایک لفظ کہے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے جھنجلاہٹ میں ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ریسیور نہ ہو، میرا فولادی مکا ہو...... اور میں نے وہ مکا کریڈل پر نہیں بلکہ شعیب غوری کے نحوست مآب چہرے پر رسید کیا ہوا۔

صدف نے تشویش ناک لہجے میں کہا "وجدان! لگتا ہے، معاملات کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہیں۔ یہ کال کراچی سے تھی نا؟"

اس سے پہلے کہ میں صدف کے سوال کا جواب دیتا، انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر انٹرکام کا ریسیور اٹھا لیا، دوسری طرف سیکیورٹی گارڈ عمر دین تھا۔ اس نے وحشت زدہ لہجے میں بتایا۔

"وجدان صاحب! سرخ جیپ والا وہ نقلی وجدان واپس آگیا ہے۔"

"کہاں ہے وہ شیطان؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"اس نے گاڑی کھڑی کی ہے اور نکل کر میری طرف آرہا ہے۔" گارڈ نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا "اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا باکس ہے۔"

میں نے کہا "میں آرہا ہوں۔ تم اسے روکنے کی کوشش کرو۔ اسے باتوں میں لگاؤ یا جو بھی کرو۔ زبردستی کی ضرورت پیش آئے تو بھی دریغ نہ کرو۔ اوکے!"

"اوکے!" سیکیورٹی گارڈ نے فرماں برداری سے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

صدف میرے عزائم کو بھانپ چکی تھی۔ میں نے دیگر باتوں کے ساتھ ہی اسے نقلی وجدان کی کہانی بھی سنا دی تھی "تم کہاں جا رہے ہو وجدان؟" اس نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا۔

"اس بہروپیے نقلی وجدان سے نمٹنے!" میں نے کہا "وہ اس وقت کوٹھی کے باہر گیٹ پر موجود ہے۔"

اس کے بعد میں صدف کی بات سنے بغیر باہر کی جانب لپک گیا۔ ڈرائنگ روم سے نکل کر میں راہداری میں آیا پھر برآمدے سے ہوتے ہوئے کوٹھی کے صحن میں پہنچ گیا۔ صحن کا حصہ میں نے دوڑ کر عبور کیا اور گیٹ پر پہنچ گیا۔

دنیا کے حیرت انگیز فن
تحریر شناسی
اردو میں پہلی بار
تحریر شناسی کے فن پر ایک نادر اور رہنما کتاب
تحریر اور شخصیت
یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ......
- یہ شخص کس کام کے لئے موزوں ہے؟
- کیا یہ حالات سے لڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے؟
- کیا اسے جلد غصہ آتا ہے؟
- کیا یہ جھوٹ بولنے کا عادی ہے؟
- کیا اس کے ساتھ شادی کی جاسکتی ہے؟
- کیا اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟
- کیا یہ ایماندار اور ہمدرد ہے؟
- اس کا جنسی رویہ کیسا ہے؟
- اس میں برائیاں زیادہ ہیں یا اچھائیاں؟
- اور ایسی دوسری بہت سی باتیں۔
ہر شخص کیلئے یکساں طور پر کارآمد کتاب
قیمت 30 روپے ڈاک خرچ 23 روپے

اسی وقت میں نے کوٹھی کے باہر کسی گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھتے ہوئے سنا۔ انجن کی مخصوص غراہٹ اور بریج اسٹون ٹائروں کی فلک شگاف آواز یہ سمجھنے کے لیے کافی تھی کہ وہ شیطان بہروپیا وہاں سے فرار ہو رہا تھا۔ میں سیکیورٹی گارڈ کی طرف گھوم گیا۔

''وہ فرار ہو گیا سر!'' اس نے مایوسی سے بتایا۔

میں نے گیٹ سے باہر نکل کر سڑک کا جائزہ لیا۔ سوگز دور مجھے سرخ جیپ کی پشت دکھائی دی۔ وہاں سفید کور میں اسپیئر ٹائر مخصوص انداز میں ٹنگا ہوا تھا۔ سرخ لینڈ کروزر میری پہنچ سے نکل چکی تھی۔ میں دوڑ کر اسے نہیں پکڑ سکتا تھا اور جب تک گاڑی نکال کر اس کا تعاقب کرتا، وہ نو دو گیارہ ہو چکی ہوتی۔

میں واپس آ کر سیکیورٹی گارڈ پر برس پڑا ''اسے روکا کیوں نہیں؟ میں نے کہا تھا، ہر صورت اسے جانے نہیں دینا، چاہے زبردستی کرنا پڑے، تم گن کے زور پر اس کا راستہ کھوٹا کر سکتے تھے۔ جیپ کے ٹائروں پر ایک برسٹ ہی مار دیتے!''

سیکیورٹی گارڈ میری ڈانٹ ڈپٹ سے سہم گیا پھر معذرت آمیز لہجے میں بولا ''سر! آپ جس وقت مجھے یہ ہدایات دے رہے تھے، وہ منحوس، باکس کو ایک طرف رکھ کر دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھا تھا، پھر اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتا، اس نے طوفانی رفتار سے جیپ آگے بڑھا دی۔''

گارڈ نے انٹرکام پر بھی کسی باکس کا ذکر کیا تھا۔ میں نے عجلت آمیز لہجے میں دریافت کیا ''کہاں ہے وہ باکس؟''

''وہ ادھر رکھا ہے سر!'' گارڈ نے سڑک کے ایک کنارے کی طرف اشارہ کیا۔

اس دوران میں صدف اور اللہ دتا بھی باہر نکل آئے تھے۔ ہم چاروں ایک ساتھ مذکورہ باکس کی جانب بڑھے۔ وہ کسی کوریئر سروس کا جمبو باکس تھا اور اس کے اوپر ایک چٹ لگی تھی۔ میں نے چٹ کی تحریر پڑھی۔ وہاں صرف یہ درج تھا...... ''وجدان علی ابن عابد علی۔''

واضح طور پر وہ باکس میرے لیے تھا اور تحفے کے انداز میں اسے پیک کیا گیا تھا۔ اس پر مخصوص گفٹ پیپر بھی لپٹا ہوا تھا۔ صدف نے کہا ''وجدان! یہ دشمن کی کوئی خطرناک چال بھی ہو سکتی ہے۔ تم اس باکس کو ہاتھ نہ لگانا۔ تحفہ یوں تو نہیں پہنچایا جاتا!''

میں نے کہا ''میں اس چال کو بے نقاب کرتا ہوں۔'' پھر میں نے گارڈ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''ذرا اپنی گن مجھے دینا۔''

گارڈ نے کلاشنکوف میرے حوالے کر دی۔ اللہ د
خوف زدہ لہجے میں کہا ''وجدان صاحب! اگر اس میں
آتش گیر مادہ یا کسی قسم کا بم وغیرہ ہوا تو بہت خطرناک
بھی ہو سکتا ہے!'' وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا
ہوں۔ اس کا اندازہ درست تھا۔

میں نے کلاشنکوف کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور سیکیو
گارڈ سے کہا ''نقلی وجدان نے یہ تو ثابت کر دیا کہ اس باکس
اٹھانے میں کوئی خطرہ پنہاں نہیں۔ لہٰذا تم اسے اٹھا کر
فاصلے پر رکھ دو۔ وہاں، اس کوٹھی کے سامنے جس کے مالک
اسٹینس گئے ہوئے ہیں۔ میں جو تجربہ کرنا چاہتا ہوں، اس
کسی کو نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔''

گارڈ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے ان تینوں
پاشا کی کوٹھی کے اندر کھڑا ہونے کی ہدایت کی پھر ایک محفوظ
فاصلے سے نشانہ لے کر باکس پر فائر کر دیا۔ میں اپنے ذہن
میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر کسی قسم کا بلاسٹ ہوا تو میں کس طرح
ردِعمل کروں گا۔

مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ باکس گولی کھانے کے بعد ہوا میں
اچھلا اور کچھ دور جا گرا۔ ہم چاروں دوڑ کر اس گھائل باکس
کے نزدیک پہنچ گئے...... اور حیرت کے ایک شدید جھٹکے
ہمیں بیک وقت متاثر کیا۔ ہم ہونقوں کے مانند ایک دوسرے
کی صورت تکنے لگے۔

زخمی باکس کی ایک دیوار میں شگاف بن گیا تھا۔
ہماری حیرت کا سبب یہ تھا کہ اس شگاف میں سے کسی لڑکی کی
سفید ٹانگیں جھانک رہی تھیں۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں
حصے میں پہچان لیا۔ وہ میری ڈارلنگ کی عقبی ٹانگیں تھیں!

میں لپک کر اس باکس کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے چاروں
جانب گھپ اندھیرا چھا گیا۔ شاید کوئی بڑا بریک ڈاؤن ہوا
تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والی تاریکی میں صدف اچانک
مجھ سے ٹکرائی اور پوری شدت سے اس نے مجھے اپنی بانہوں
میں بھینچ لیا۔

میں نے اپنی پشت پر اس کے دل کو دھڑکتے محسوس کیا
پھر اس سے قبل کہ تاریکی میں میری آنکھ کچھ دیکھنے کے قابل
ہوتی، کوٹھی کی بالائی منزل سے ایک وحشت ناک چیخ بلند
ہوئی۔

میری نگاہ بے اختیار بالائی منزل کے اس بیڈروم کی
طرف اٹھ گئی جس میں زرگل گہری نیند سو رہی تھی۔ ایک لمحہ
ضائع کیے بغیر میں نے صدف کے ہاتھ کو گرفت میں لیا اور
کے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی!

کوٹھی گہری تاریکی کی لپیٹ میں تھی!

میں اندازے کی بنا پر صدف کے ساتھ دوڑتے ہوئے اس زینے کی جانب بڑھا جو زیریں اور بالائی منزل کے درمیان رابطے کا وسیلہ تھا۔ اچانک لائٹ چلے جانے کے سبب یوں محسوس ہو رہا تھا، کسی دبیز سیاہ چادر نے کوٹھی اور اس کے پیش و گرد کو اپنی کشادہ آغوش میں سمیٹ لیا ہو۔

زینہ طے کرتے ہوئے ہاتھ میں ہاتھ دیے رکھنا ممکن نہیں تھا چنانچہ ہم آگے پیچھے بالائی منزل پر پہنچے۔ بے ساختہ میری نگاہ اس دروازے کی جانب اٹھ گئی جس کے پیچھے میں نے زرگل کو آرام کرنے کی غرض سے پہنچایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کوٹھی کے باہر میں نے جو وحشت ناک نسوانی چیخ سنی تھی وہ یقیناً اسی بیڈروم سے ابھری تھی۔

بیڈروم کا دروازہ نیم وا تھا۔ ہم دونوں نے معنی خیز اور فیصلہ کن نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور بہ یک وقت آگے بڑھے۔

اسی لمحے اندھیرے میں سے ایک شخص نکل کر سامنے آ گیا۔ اس کا رخ بھی بیڈروم کے ادھ کھلے دروازے کی جانب تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا کم تھا کہ تاریکی کے باوجود بھی ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ ویسے بھی اب تک ہماری آنکھیں اندھیرے میں اندازے لگانے کے قابل ہو گئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کو سیاہ ہیولوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے۔

وہ شخص ہمارے اور بیڈروم کے دروازے کے درمیان رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا پھر ایک ہاتھ کو قدرے بلند کرتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں بولا ''خبردار! ایک انچ بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گا۔''

بیڈروم کے اندر سے کچھ اس قسم کی آوازیں ابھر رہی تھیں جیسے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو دبوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کمرے میں زرگل تھی لہٰذا صورتِ حال خاصی تشویش ناک بلکہ لائٹ نہ ہونے کے طفیل خطرناک تھی۔ یقیناً وہ اس وقت کسی مشکل سے دوچار تھی۔

ہمارے سامنے کھڑے ہوئے شخص کی دھمکی اور اٹھا ہوا ہاتھ یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ اس نے کوئی ریوالور یا پستول وغیرہ تھام رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود ہتھیار سے نکلنے والی کوئی اندھی گولی ہماری زندگی کا چراغ گل کر سکتی تھی۔

صدف نے ہمت کرتے ہوئے اس متوقع مسلح شخص سے پوچھا ''کون ہو تم اور ہماری کوٹھی میں کیا کرتے پھر رہے ہو؟'' جملہ ختم ہوتے ہی اس نے مجھے ایک زور کا دھکا دیا۔ میں فوری طور پر صدف کی اس حرکت کو سمجھ نہ سکا۔ اس کا بھرپور پش لے کر سائیڈ میں لڑھکا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مجھے ایک جانب دھکیلنے کے بعد صدف کا جسم ہوا میں بلند ہوا پھر وہ فضا میں رہتے ہوئے کسی پھرکی کی مانند گھوم گئی۔ اگلے ہی لمحے ایک طوفانی فرنٹ وہیل فلائنگ اسلحہ بردار کی کنپٹی پر پڑی۔

صدف کی یہ حرکت اتنی سریع اور بروقت تھی کہ مجھے یوں لگا، اندھیرے میں کوئی برق سی کوند گئی ہو۔ اس نے ایک نہایت ہی رسکی اسٹیپ لیا تھا لیکن اس نے جس اعتماد سے کک چلائی تھی اس سے یہ ثابت ہو گیا، صدف کا فن سچا اور نشانہ پکا ہے۔ صدف کی کک کھانے کے بعد مدِمقابل بری طرح لڑکھڑایا پھر تیورا کر زمین بوس ہو گیا۔ اس کے بھاری بدن نے زمین سے ٹکرا کر ایک مخصوص آواز پیدا کی۔ دراصل، اس کے زمین پر گرتے ہی دو مختلف قسم کی آوازیں پیدا ہوئیں۔ ایک تو اس کے بھاری بدن اور پختہ فرش کے ٹکراؤ کی ''دھپ'' نما آواز تھی اور دوسری آواز کسی دھاتی شے کے زمین سے ٹکرانے سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس شخص کے ہاتھ کا ریوالور یا پسٹل تھا جو پیش و گرد میں کہیں اندھیرے کی نذر ہو گیا۔ اس ہتھیار کو تلاش کرنا ایسا ہی مشکل تھا گویا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنا!

اسی وقت بیڈروم کے اندر سے کسی نے الجھن زدہ لہجے میں دریافت کیا ''عمران! باہر کیا ہو رہا ہے۔ یہ آوازیں کیسی ہیں۔ تم کسے دھمکی دے رہے تھے؟''

اس سے پہلے کہ عمران نامی وہ شخص اپنے ساتھی کے سوالات کا جواب دیتا، صدف ایک جست بھر کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ اس وقت فل فارم میں نظر آتی تھی۔ وہ اندھیرے میں کسی بجلی کے مانند چمک کر آگے بڑھی اور لپک لپک کر زمین بوس شخص کی مزاج پرسی کرنے لگی۔ اس بدبخت کو اپنے بچاؤ میں ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع نہیں مل رہا تھا، زبان کیا چلاتا۔

یہ میرے لیے ایک تسلی بخش صورتِ حال تھی۔ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور پٹنے والے شخص کو صدف کے رحم و کرم پر چھوڑا پھر تیزی سے بیڈروم کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے کمرے میں پہلا محتاط قدم رکھا ہی تھا کہ لائٹ آ گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دقت نہ ہوئی کہ یہ واپڈا کی فراہم کردہ لائٹ نہیں تھی۔ زیریں منزل پر کسی انجن سے ملتی جلتی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ غالباً اللہ دتا نے یا سیکیورٹی گارڈ نے کوئی جنریٹر آن کیا تھا۔ میری نگاہ نے روشن کمرے کے اندر جو پہلا منظر دیکھا اس نے میری رگوں میں

شرارے سے بھرے ہیں۔

زرگل مجھے بڑی مشکل میں نظر آئی۔ ایک دراز قامت بٹے کٹے شخص نے اسے اپنے بازو کی گرفت میں دبوچ رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا، زرگل خطرناک نیک لاک (Neck Lock) کی زد میں تھی۔ اس پشتون حسینہ کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ ایک دہشت ناک چیخ مارنے کے بعد زرگل نے خاموشی کیوں اختیار کرلی تھی۔ وہ بے چاری اس وقت جس مصیبت میں مبتلا تھی اس میں چیخنا تو در کنار، یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ اب تک سانس کی آمدوشد کا سلسلہ برقرار رکھے ہوئے تھی۔

مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ صیاد چونکا اور اس نے میری توقع کے خلاف ایک حرکت کی۔ اس نے زرگل کی گردن کو اپنے بازو کی گرفت سے آزاد کردیا پھر اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے غرا کر میری جانب بڑھا۔ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا۔

میں نے اس شخص پر نگاہ رکھتے ہوئے زرگل کا جائزہ لیا۔ وہ دھکا کھانے کے بعد بستر پر گری تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو سہلا رہی تھی۔ اس کا یہ عمل فطری اور وقت کی عین ضرورت تھا۔ اسی لمحے میری سماعت پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے دستک دی۔ کوٹھی کی زیریں منزل پر خاصی ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔ گارڈ اور اللہ دتا وغیرہ شاید بالائی منزل کی خبر گیری کے لیے زینے طے کر رہے تھے۔ ان کے قدموں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ میں صدف کی طرف سے بالکل بے فکر ہو کر بیڈروم میں حاضر ہو گیا۔

میری لحاتی غفلت سے مدمقابل نے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں اس کے تیور اور انداز سے سمجھ گیا، وہ مارشل آرٹس سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس نے ہوا میں اچھل کر ایک فرنٹ فلائنگ کک چلائی۔ اس کے وار میں جھنجلاہٹ پائی جاتی تھی۔ شاید بیڈروم سے باہر تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال نے اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے نیک جرک (Neck Jerk) سے اپنے چہرے کو بچایا پھر بیک فٹ پر جاتے ہوئے ٹی اسٹانس (T-Stance) بنا کر کھڑا ہو گیا۔

اپنے پہلے ہی وار کی ناکامی پر وہ تلملا اٹھا اور یکے بعد دیگرے اس نے مجھ پر دو راؤنڈ ہاؤس ککس چلائیں۔ میں بیک فٹ پر بلاکنگ کرتے ہوئے چار فٹ مزید پیچھے چلا گیا۔ اس مسلسل ناکامی نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا اور اس نے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے مجھے سائیڈ فلائنگ کک ... چاہی۔ اس کے ایکشن میں کسی چیتے ایسی پھرتی بھری ہوئی ... میں نے پہلو پر جھک کر کراؤ تر بلاک کیا پھر ایک ... کے ساتھ ڈبل ہینڈ پنچ اس کی تشریف پر رسید کیا۔ وہ ... چھے فٹ کی دوری پر ایک چوبی میز کی ٹاپ سے ٹکرایا پھر ... سے لڑھک کر قالین پر آن گرا۔ ایسے درجنوں ... دشمنوں کو میں مزہ چکھا چکا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو جھاڑتے ہوئے ... مدمقابل کو دیکھا۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر زمین سے اٹھ ... تھا۔ میں نے بہ آہستگی دروازے کو بند کر کے بولٹ چڑھا ... اب میری مرضی کے بغیر کوئی شخص باہر سے اندر آ سکتا تھا ... ہی اندر سے باہر جا سکتا تھا۔

میں جیسے ہی اپنے دشمن کی طرف پلٹا، زرگل کی دھمکی ... لب ریز آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”خبردار! وہ ... ہاتھ نہ لگانا، ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔“

زرگل کے ہاتھ میں مجھے وہی ریوالور نظر آیا جو میں ... شہر کے کنارے، حفاظت کے پیش نظر اسے دیا تھا۔ ... پھرا ہوا وہ ریوالور اس سے واپس نہیں لیا تھا۔ غالباً سونے ... قبل زرگل نے وہ ریوالور تکیے کے نیچے رکھ دیا تھا اور اب ... ملتے ہی وہ ہتھیار نکال کر حملہ آور کو دھمکا رہی تھی۔ زرگل ... جس انداز میں حملہ آور کو دھمکی دی تھی اس سے میرا ... آپوں آپ حکمت یار کی طرف چلا گیا۔ زرگل کا چاچا حک... یار اس کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ممکن تھا، حکمت یار ... بندوں نے زرگل کا سراغ لگا لیا ہو۔

مجھ سے پٹنے والا دراز قامت شخص آہستہ آہستہ ... سے اٹھنے لگا۔ میں نے دشمن پر نگاہ رکھتے ہوئے زرگل ... استفسار کیا ”کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟“

زرگل نے نفی میں گردن ہلائی۔ میں نے پوچھا ”کہیں حکمت یار کا بھیجا ہوا تو نہیں۔“

”نہیں وجدان!“ وہ قطعیت سے بولی ”میں نے ... شخص کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔“

اس دوران میں دراز قامت شخص اٹھ کر پوری طرح ... ہوگیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا ”کسی زرگل یا ... یار سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں تو تم سے کچھ حساب ... کرنے آیا ہوں وجدان۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ... خواب گاہ میں تمہیں ہونا چاہیے تھا لیکن تمہارے بجائے ... پٹھان دوشیزہ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس پر لائٹ چلے جانے ... میں مزید الجھ گیا۔ بہرحال۔“ وہ ٹرانس بنا کر کھڑا ہو گیا ...

ہے، تم نے بہت مارشل آرٹس سیکھ رکھا ہے۔ تم سے دو دو ہاتھ کرنے میں بہت مزہ آئے گا۔“

میں نے زرگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”تم بے شک اس خبیث کو ریوالور کے نشانے پر رکھو لیکن اس وقت تک گولی نہ چلانا جب تک ناگزیر نہ ہو جائے۔ یہ سراسر میرا شکار ہے، میری طرف اس کا حساب نکلتا ہے۔ اس نے قرض کی وصولی کے لیے ہاتھ پاؤں چلا کر دکھائے ہیں۔ اسے میں ہی دو چار ہاتھ دکھاؤں گا۔ تم خود کو شانت رکھو۔“

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ اس شخص نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں اس کی طرف سے چنداں غافل نہیں تھا لہٰذا میں نے فوراً اس کی خاطر داری شروع کر دی۔ وہ جیسے ہی ہوا میں اچھلا، میں نے ہائی جمپ کی۔ ہم دونوں نے بہ یک وقت ایک دوسرے کو سائیڈ فلائنگ ککس مارنے کی کوشش کی تھی۔ دونوں کی یہ کوشش کامیاب ہوئی۔ ہمارے پاؤں کے بلیڈ ایک دوسرے سے ٹکرائے اور ردعمل کے طور پر ہم دونوں ہوا میں رہتے ہوئے پیچھے کی جانب کھسکے اور زمین پر آتے ہی اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی پھر اللہ دتا نے چلا کر پوچھا ”صاحب جی! آپ خیریت سے تو ہیں۔ آپ کی ساتھی کا کیا حال ہے؟“ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی ”اندر کی صورت حال کیسی ہے۔“

”تم اندر کی فکر نہ کرو۔“ میں نے تیز آواز میں کہا ”باہر کے حالات کو قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔“

”اس سانڈ کو ہم نے پوری طرح قابو کر لیا ہے۔“ اس کا اشارہ عمران کی طرف تھا جسے میں تھوڑی دیر پہلے صدف کے حوالے کر آیا تھا۔ اللہ دتا بتا رہا تھا ”صدف بی بی نے اس شخص کو لہولہان کر دیا ہے۔“

میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا ”تم گارڈ کے ساتھ گرد و نواح کا جائزہ لو۔ تحسین کو بھی ساتھ لے لو۔ دشمن کا جو بھی ساتھی نظر آئے اسے فوراً بے بس کرنے کی کوشش کرو۔ میں اندر والے سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”صاحب جی! آپ نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے، ہمیں آپ کی بڑی فکر ہے۔“

”اندر پردے والا کام ہو رہا ہے۔“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ بولا ”صدف بی بی آپ کے پاس آنا چاہتی ہیں۔“

”تم صدف کو اپنے ساتھ رکھو۔“ میں نے دوٹوک لہجے میں کہا ”کمرے سے باہر، کوٹھی میں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔“

میں اللہ دتا سے مزید گفتگو جاری نہ رکھ سکا۔ اسی وقت دراز قامت شخص نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔ میں نے اس کی فرنٹ کک سے بچنے کے لیے پہلو تہی کی۔ وہ راؤنڈ ہاؤس آزماتے ہوئے مجھ پر چڑھ دوڑا۔ میں نے ہوا میں اٹھی ہوئی اس کی ٹانگ کو اپر بلاک کی مدد سے مزید اٹھا دیا۔ زمین پر موجود اس کا پاؤں تھوڑا ڈگمگایا، اسی لمحے میں نے اسے پیچھے دھکا دے دیا۔ وہ پشت کے بل زمین پر گرا۔

اس مرتبہ میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور اچھل کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے زمین پر لیٹے لیٹے میری ٹانگوں پر ایک خطرناک فرنٹ سوئپ (Front Sweep) مارنا چاہی، میں نے ہوا میں ہائی جمپ کی۔ اس نے کمر کو مرکز مان کر اپنے بدن کو ہوا میں گھمایا اور پھرتی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑا ہوتے ہی اسے میرے پاؤں کا ایک شاندار تحفہ وصول کرنا پڑا۔ میں نے زمین پر آتے ہی ایک پاؤں پر گھوم کر اسے جرک والی بیک کک مار دی تھی۔

یہ دھواں دھار کک اس کے تھوبڑے پر پڑی۔ وہ کراہ کر پیچھے گیا۔ میں نے ایک لمبا اسٹیپ لے کر اسے زوردار سائیڈ کک ماردی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے بڑھتے ہوئے دیوار سے جا لگا۔

اسے توقع ہو گی کہ دو چار ہاتھ مار کر مجھے زیر کر لے گا لیکن یہاں معاملہ اس کی توقع کے خلاف پیش آ رہا تھا۔ ابھی تک میں یہ جان نہیں سکا تھا کہ وہ مجھ سے کس قسم کا حساب چکانے آیا تھا۔ پتا نہیں، اس کا تعلق میرے دیرینہ دشمنوں سے تھا یا تازہ ترین دشمنوں سے۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ منشا کا آدمی ہو گا۔

میرے ان خیالات کے دوران میں اس شخص نے ایک نئی حرکت کی۔ وہ بلیو جینز پر کاؤبوائے جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خالی ہاتھ وہ مجھے زیر نہیں کر پا رہا تو اس نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک ہتھیار برآمد کر لیا۔ مجھے اس کے دائیں ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا نن چکو نظر آیا (نن چکو...... مارشل آرٹس کا ایک مخصوص ہتھیار ہے جو کم و بیش فٹ بھر لمبائی کے دو ڈنڈوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ دونوں ڈنڈے ایک مضبوط آہنی زنجیر سے منسلک ہوتے ہیں۔ دونوں ڈنڈے لکڑی، ربر یا کسی بھی دھات کے ہو سکتے ہیں) میں نے شاؤلن ٹیمپل میں قیام کے دوران میں سیلف ڈیفنس کی تربیت لیتے ہوئے ٹو پیس اور تھری پیس نن چکو نہ صرف چلانا سیکھا تھا بلکہ اس سے بچاؤ کی ٹریننگ بھی لی تھی۔ شاؤلن ٹیمپل

(Shaolin Temple) دنیا میں مارشل آرٹس کی سب سے بڑی تربیت گاہ ہے جہاں پر شاؤلن مارشل آرٹس کے نام پر ایک جہانِ حیرت سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

اس مرتبہ میرے مدِمقابل نے فوراً حملہ نہیں کیا۔ وہ نن چکو کو اپنے بالائی بدن کے مختلف حصوں سے گزارنے کے بعد ایک دائرے میں قدم اٹھانے لگا۔ نن چکو کا ایک ڈنڈا (اسٹک) اس کی بغل میں دبا تھا جب کہ دوسری اسٹک کو اس نے مضبوطی سے ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ اسے حملہ کرنے کی جلدی نہیں تھی لہٰذا میں نے اس پر نگاہ رکھتے ہوئے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''تم کون ہو، مجھ سے کیا دشمنی ہے، تمہیں یہاں کس نے بھیجا اور کیوں بھیجا ہے؟''

وہ غرایا ''تم کسی اسکول ماسٹر کی طرح مجھ سے سوال نہ کرو مجھے بتاؤ، تم نے قادر بخش اور فیض احمد کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''میرا تو اندازہ درست تھا۔ تم منشا کے آدمی ہو؟''

''مجھے تمہاری خیال آرائی یا اندازوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' وہ دائرے میں پیش قدمی کرتے ہوئے باہمی فاصلہ بتدریج کم کرتے ہوئے بولا ''ریاض علی نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر تم نے قادر بخش اور فیض کے بارے میں مجھے نہ بتایا تو میں تمہارا برا حشر کردوں گا۔''

ریاض علی وہی شخص تھا جسے میں نے وہائٹ ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر مخصوص داؤ آزماتے ہوئے اناٹفیل کر دیا تھا۔ اس شخص کی بات سے ظاہر ہوا کہ ریاض ہوش میں آنے کے بعد اپنے کیمپ میں پہنچ چکا تھا۔

میں نے نن چکو بردار دشمن کی اسٹیپنگ پر نگاہ رکھتے ہوئے پوچھا ''ریاض نے آنکھ کھولنے میں بہت دیر لگا دی کیا تمہارے باس محمد منشا کے پاس اس قسم کے بودے آلہ کار ہیں؟''

''تم اس قسم کی اشتعال انگیز باتیں کر کے مجھے غصہ دلانے کی کوشش نہ کرو وجدان!'' وہ گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''تم سیدھی طرح میرے ساتھیوں کے بارے میں بتاتے ہو یا میں کوئی الٹا طریقہ استعمال کروں۔''

''مجھے الٹا طریقہ زیادہ راس آتا ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''بہتر یہی ہوگا کہ اپنے ارادے پر عمل کر ڈالو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ تمہارے مطلوبہ دونوں بندے اس کوٹھی میں موجود نہیں ہیں۔''

''پھر کہاں ہیں؟'' اس نے جارحانہ انداز میں پوچھا
''وہ وہاں ہیں جہاں کی تمہیں خبر نہیں۔'' میں نے اس کے اسٹیپ کی مناسبت سے موافق اسٹیپ اٹھاتے ہوئے کہا
وہ تپتپائے ہوئے لہجے میں بولا ''میں وہی تو جاننا چاہتا ہوں، وہ اس وقت کہاں ہیں؟''

''وہ دونوں فاضلیہ کالونی والی اس کوٹھی میں ہیں جہاں انہوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔'' وہ درشت لہجے میں بولا ''یہاں آنے سے پہلے ہم وہاں گئے تھے۔ ہم نے اس کوٹھی کا کونا کونا چھان مارا لیکن قادر بخش اور فیض احمد کا کوئی سراغ نہیں ملا۔''

''میں نے انہیں وہاں بڑی حفاظت سے رکھا ہے'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''انہیں پانے کے لیے تمہیں میرے ساتھ فاضلیہ کالونی والی اس کوٹھی پر جانا ہوگا لیکن ایک مسئلہ ہے!''

''کیا مسئلہ ہے؟'' وہ میری باتوں میں آتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''تم اس حالت میں جیتے جاگتے وہاں نہیں جا سکتے'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا ''تمہیں اس مقام میں داخلے کی شرائط پر پورا اترنا ہوگا یعنی بے دست و پا ہونا پڑے گا۔''

وہ بھناتے ہوئے لہجے میں بولا ''یہ کیا بکواس ہے؟''

''اگر میری بات کا یقین نہیں تو زرگل سے پوچھ لو۔'' میں نے زرگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس نے تمہارے دونوں ساتھیوں کی حالت کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ ایسی کیفیت میں ہیں کہ میری مرضی سے جیتے ہیں، میری مرضی سے مرتے ہیں۔'' پھر میں نے زرگل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تم کب تک ریوالور کو اس مردود پر تانے بیٹھی رہو گی۔ اس کے ساتھی یا ساتھیوں پر باہر قابو پالیا گیا ہے اور یہ بھی قادر بخش اور فیض احمد کے پاس جانے کا متمنی ہے۔ میں جب تک اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دوں، تم باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لو۔ ہو سکے تو اپنے آدمیوں کی مدد بھی کرو۔ اس ریوالور کو اپنے پاس ہی رکھو کسی بھی لمحے اس کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔'' ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا ''ویسے مجھے امید نہیں کہ صدف کے ہوتے ہوئے کسی اور کو ہاتھ پاؤں کا نذرانہ دینا پڑے۔''

زرگل میری ہدایت پر بستر سے نیچے اتری اور اگلے ہی لمحے وہ بیڈروم کا دروازہ کھول کر باہر جا چکی تھی۔ میں نے مدِمقابل کا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مجھے فر

ہراس نظر آیا۔ اس کمرے سے باہر کی صورتِ حال اس کی مخالفت میں ہموار ہو چکی تھی اور بیڈ روم کے اندر میں اس کے ہاتھ پاؤں توڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔

اس نے چوکنا نظر سے بیڈ روم کے کھلے ہوئے دروازے کو دیکھا اور لپک کر میرے سر پر نن چکو کا کھڑا وار کرنے کی کوشش کی۔ میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نن چکو کی اسٹک پر نگاہ رکھتے ہوئے فوراً اندر آیا، ہم دونوں کے جسم ایک دوسرے سے ٹکرائے اور نن چکو کی اسٹک میرے سر کے اوپر سے ہوتے ہوئے پشت کی طرف چلی گئی۔ اسی وقت میں نے اس کے سینے پر ہینڈ پش (Hand Push) آزمایا۔ وہ نن چکو سمیت دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنے قدموں پر جم کر اس ہتھیار کو ہوا میں گھمانے لگا۔ وہ نن چکو کی آزاد اسٹک سے ہوا میں انگلش کا آٹھ بنا رہا تھا۔ یہ نن چکو کی خود حفاظتی میں استعمال ہونے والی ایک مخصوص حرکت ہوتی ہے۔

میں نے اس کی کمر پر نگاہ رکھتے ہوئے پنچ مارنے کا جھانسا دیا۔ وہ میرے جھانسے میں آ گیا۔ اس نے نن چکو کی آزاد اسٹک سے میرے بازو پر لاک لگانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ میں نے نن چکو کی اسٹک کو اپنے ہاتھ میں قابو کیا پھر دوسرے ہاتھ کا ایک زوردار پنچ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔

اس دھواں دھار گھونسے نے اس کے ہاتھ سے نن چکو چھڑا دیا جو نتیجے کے طور پر اب میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ میرا پنچ اپنے چہرے پر کھا کر وہ بری طرح ڈکرایا اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر لڑکھڑاتے قدموں سے پیچھے کی جانب گیا۔ میں نے ایک اسٹیپ لے کر فرنٹ وہیل کک چلائی اور اسے چاروں خانے چت کر دیا۔

وہ چند ثانیے تک فرش پر پڑا حیران نظر سے بیڈ روم کی چھت کو دیکھتا رہا پھر دونوں ہاتھ فرش پر مارتے ہوئے ہینڈ اسپرنگ (Hand Spring) کے سے انداز میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے نن چکو کو ہاتھ میں لینے کے بعد ایک لمحے کے لیے کہیں ٹھہرنے نہیں دیا۔ وہ کسی ونڈمل (Wind Mill) کے پنکھے کے مانند میرے ہاتھوں میں گردش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بروس لی سے زیادہ نن چکو کا ماہر اور کوئی نہیں دیکھا تھا۔ شاؤلن ٹیمپل میں، میں نے بروس لی کے ہر ہر اسٹائل کی وڈیو دیکھی تھی اور اس کے بہت سے اسٹیپ کو اپنے فن میں شامل کر لیا تھا۔ اس وقت بھی میں نن چکو کے جو گردشی کمالات دکھا رہا تھا انہوں نے مدِمقابل کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ نن چکو میرے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتے ہوئے خوبصورت فارمیشن پیش کر رہا تھا۔ دونوں اسٹک باری باری ہوا کو چیرتیں تو ایک مخصوص قسم کی "شائیں شائیں" کی آواز پیدا ہوتی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ظالم اور چابک دست شخص ہوا پر کوڑا زنی کر رہا ہو۔

میں چند لمحات کا یہ برق رفتار مظاہرہ کر کے تھما تو مدِمقابل کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ پلکیں جھپکا کر مجھے تکنے لگا پھر اس سے پہلے کہ میں اس پر کوئی اٹیک کرتا، اس نے ایک انتہائی بزدلانہ حرکت کی۔ اس نے ایک لمحے کو ٹھٹک کر مجھے دیکھا اور بیڈ روم کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی۔

یہ اس کی ایک اضطراری حرکت تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس کوٹھی میں داخل ہو کر بری طرح پھنس چکا تھا۔ اسے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو فرار ہی میں عافیت سمجھی مگر میں اتنی آسانی سے اسے نکل بھاگنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے ایک نیچی پرواز کی اور کسی چیتے کے مانند جست بھر کر اس کی جانب لپکا۔ اسی وقت مجھے بیڈ روم کے کھلے دروازے میں صدف کی جھلک نظر آئی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس پرواز کے نتیجے میں، میں فرار ہونے والے شخص کو چھاپنے میں کامیاب ہو گیا اور ہم دونوں سامنے سے آتی ہوئی صدف سے جا ٹکرائے۔ ہمارا تصادم بیڈ روم سے باہر ہوا تھا۔

سب سے پہلے صدف فرش سے اٹھی اور کسی بپھری ہوئی شیرنی کے مانند وہ مفرور پر ٹوٹ پڑی۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ قدرت نے صدف کو ڈاکٹر بننے کے لیے پیدا نہیں کیا تھا۔ میں اس کے خیالات سے متفق ہو گیا کہ وہ اپنے باپ کی فرمائشی خواہش پر ایک غلط فیلڈ میں چلی گئی تھی۔ اس وقت وہ کسی فیلڈ مارشل سے کم نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس شخص کی اتنے شان دار طریقے سے درگت بنا رہی تھی کہ مجھے خاموش تماشائی کا کردار ادا کرنا پڑا۔

صدف کے سامنے ایک مارشل آرٹسٹ تھا اس لیے بھی اسے اپنے فن کے جوہر دکھانے کا بھرپور موقع مل رہا تھا۔ میں نے دیکھا، صدف کے اٹیک میں مارشل آرٹ سے زیادہ جمناسٹک شامل تھی۔ وہ ہوا میں الٹی سیدھی قلابازیاں لگا کر دشمن کا... سوا ستیاناس مار رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں نشانے پر اس نمک خوار نے ہاتھ پاؤں چھوڑ دیے۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا جب کہ عمران نامی اس کے پہلوان نما ساتھی کو صدف نے لہولہان کر کے گہری بے ہوشی میں پہنچا دیا تھا۔

صدف ہاتھ جھاڑتے ہوئے ایک طرف ہٹی تو میں نے اس شخص کے نزدیک پہنچ کر کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"جمشید!" اس نے نقاہت آمیز لہجے میں بتایا۔

"صرف جمشید یا جامِ جمشید؟" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "بہرحال، اب تم اس کنڈیشن میں آ چکے ہو کہ تمہیں تمہارے سانڈ نما ساتھی کے ہمراہ وہاں پہنچا دیا جائے جہاں تمہارے مطلوبہ دو بندے قادر بخش اور نفیس احمد پہلے سے موجود ہیں۔"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے وجدان!" وہ تنبیہ والے انداز میں بولا "منشا صاحب سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

میں نے کہا "میں دوستی اور دشمنی کا کاروبار کرتا ہوں اور اس میں مہنگا سستا نہیں دیکھتا۔ یہ سوچنا تمہارے باس منشا کا کام ہے کہ اس نے مجھے چھیڑ کر گھاٹے کا سودا کیا ہے یا پھر مارکیٹ لوٹ لی ہے۔"

"تم ہمارے ساتھی واپس کر دو، ہم اپنی راہ بدل لیں گے۔" اس نے کہا۔

میں نے کہا "تم اس راہ پر اپنی مرضی سے آئے ہو، میری مرضی کے بغیر تم راہ نہیں بدل سکو گے اور یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ زیرِ دام آئے ہوئے کسی بھی شخص کو مطالبے یا تجویز کا حق نہیں ہوتا۔ تمہارے اور تمہارے باس منشا کے بارے میں جو بھی فیصلہ کروں گا وہ میں ہی کروں گا اس لیے اب تم اپنی چونچ بند ہی رکھو تو تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ میں تم جیسے منحوس پرندے کے فرزندار جمند کی چونچ کاٹنے اور جڑ سے اکھاڑنے کے ایک سو ایک طریقے جانتا ہوں۔"

وہ سہم کر مجھے تکنے لگا۔ اسی وقت زرگل اللہ دتا کے ساتھ بالائی منزل پر آ گئی۔ صدف نے اللہ دتا سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا "شکار کا کیا حال ہے؟"

میں نے چونک کر صدف کو دیکھا اور اللہ دتا کے جواب دینے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ "کون سا شکار صدف؟ عمران اور جمشید تو یہ پڑے ہیں؟" پھر میں نے بیرونی حملہ آوروں کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

صدف نے بتایا "وجدان! ان کا تیسرا ساتھی بھی ہمارے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ وہ کوٹھی کے عقب میں ایک گرے ہائی روف میں موجود تھا۔ میں نے سیکیورٹی گارڈ کی مدد سے جلال نامی اس شخص پر قابو پا کر کوٹھی کے اندر پہنچا دیا ہے۔ جلال کے قبضے سے ہمیں ایک کلاشنکوف بھی ملی ہے۔"

صدف کی اس کامیابی پر مجھے جس درجہ خوشی ملی، اس سے کہیں بلند درجہ رنج جمشید کو ہوا۔ اس کی رہی سہی امید بھی ختم ہو گئی ورنہ شاید وہ جلال کی طرف سے کسی مدد کی امید کر رہا ہوگا۔ اس نے کسی ہارے ہوئے جرنیل کے مانند گردن جھکا دی۔

اللہ دتا نے صدف کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا "بی بی جی! جلال پوری طرح قابو میں ہے۔ تحسین نے اسے گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جلال سے چھینی ہوئی کلاشنکوف اسے حدود میں رکھنے کے لیے ہی استعمال ہو رہی تھی۔ میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا "کیا ان لوگوں کی گرے ہائی روف ابھی تک عقبی سڑک پر ہی کھڑی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے اللہ دتا سے کہا "اس گاڑی کو فوراً کوٹھی کے اندر لے آؤ جب تک میں ان لوگوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرتا، ہائی روف کوٹھی میں رہے گی۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے سوال کیا "کیا چابی وغیرہ گاڑی میں لگی ہوئی ہے؟"

"جی ہاں، چابی اگنیشن میں موجود ہے۔" اللہ دتا نے بتایا۔

"تب فوراً میری ہدایت پر عمل کیا جائے۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

آئندہ پندرہ منٹ میں ہم سب فرید پاشا کی کوٹھی کی زیریں منزل پر پہنچ چکے تھے اور دشمن کی آمد کا ذریعہ وہ گرے ہائی روف بھی کوٹھی کے اندر اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ میں نے سیکیورٹی گارڈ کو گیٹ پر چوکس رہنے کی تاکید کی اور منشا کے بھیجے ہوئے تینوں افراد کو ایک باتھ روم میں بند کر دیا۔ انہیں اس ضروری کمرے میں پہنچانے سے پہلے میں نے تحسین اور اللہ دتا کی مدد سے ان کے ہاتھ پشت پر اچھی طرح کس کر باندھ دیے تھے۔ ان میں سے عمران ہنوز بے ہوش تھا جب کہ جمشید اور جلال بھی کسی قسم کی مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ لیکن احتیاط لازم تھی اس لیے میں نے ان کے ہاتھوں کو نائیلون کی بندشوں کے سپرد کر دیا تھا۔

وہ تینوں تسلی بخش انداز میں، واش روم نشین ہو چکے تو میں نے تحسین سے کہا "تم یہ گن زرگل کے حوالے کر دو...... اور خود جا کر آرام کرو۔ تم ہماری خاطر اپنا ہنی مون خراب نہ کرو۔ وہاں بیڈ روم میں آمنہ تمہارے لیے فکرمند ہوگی۔ نوبیاہتا دلہن کو انتظار اور تشویش کی ان منزلوں سے گزارنا ٹھیک نہیں۔"

"وجدان صاحب! آمنہ واقعی اس واقعے سے بہت خوفزدہ ہے۔" تحسین نے کہا "ایک مرتبہ تو اس نے مجھ سے یہ بھی پوچھا، تحسین! کیا تمہارے سسر کے گھر پر کسی فلم کی شوٹنگ ہو

رہی ہے۔“

تحسین، فرید پاشا کا اسسٹنٹ تھا اور ظاہر ہے فلم لائن کا بندہ ہونے کے سبب اس کی گفتگو میں فلمی سچویشن کا آ جانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

میں نے اس سے کہا ”تم اپنی بیوی کو جا کر سمجھاؤ کہ زندگی کسی فلم کے مانند ہی ہے۔“

”سر!“ وہ ممنون نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ”ان حالات میں آپ کو چھوڑ کر بیڈروم میں جانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ آمنہ کو بھی یہیں بلا لیتا ہوں۔“

”اور اگر یہاں پھر کسی حقیقی منظر کی شوٹنگ شروع ہو گئی تو......!“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا ”تحسین! تم نے متعدد فلموں کے سیٹ پر فائٹ کے سین دیکھے اور شوٹ کروائے ہوں گے لیکن میں فلمی دنیا کا بندہ نہیں۔ میری حقیقی زندگی میں فلموں سے کہیں زیادہ مار دھاڑ اور تھرل موجود ہے۔ اور میں ہر قسم کی سچویشن سے نمٹنا جانتا ہوں۔ تم میری فکر نہ کرو اور اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ۔ اگر تمہاری مدد کی ضرورت پیش آ گئی تو میں تمہیں فوراً بلا لوں گا۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے مشورے پر اس بیڈروم کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی نو بیاہتا دلہن اس کے لیے تشویش بھرے اندیشے اپنے ذہن میں سمائے بیٹھی تھی۔ ویسے تینوں حملہ آور ہمارے قابو میں آ چکے تھے اس لیے زیادہ فکرمندی کی بات نہیں تھی۔ اس وقت میرا ذہن ان تینوں کو فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے تہ خانے میں منتقل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انہیں پاشا کی اس کوٹھی میں رکھنا مناسب نہیں تھا۔

اس دوران میں واپڈا کی مہربانی سے لائٹ آ گئی اور اللہ دتا نے جنریٹر آف کر دیا۔ لائٹ آنے سے آپوں آپ میرا دھیان ڈارلنگ کی طرف چلا گیا پھر وہ منظر میری نگاہ میں گھوم گیا جب میں نے ایک زخمی باکس میں سے اس کی عقبی ٹانگیں جھانکتے دیکھی تھیں اس کے بعد لائٹ چلی گئی تھی اور زرگل کی وحشت ناک چیخ نے ہمیں سب کچھ چھوڑ کر اس کی جانب دوڑ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اللہ دتا خاصا مردم شناس واقع ہوا۔ اس نے میرے چہرے سے میری سوچ کا اندازہ لگا لیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا ”صاحب جی! وہ ڈبا اندر لے آیا ہوں جس پر آپ نے فائر کیا تھا۔“

”کہاں ہے وہ باکس؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے بتایا ”ادھر ڈرائنگ روم میں رکھا ہے جہاں آ... رات آپ نے ڈیرا جما رکھا ہے۔“

میں اضطراری انداز میں اٹھ کھڑا ہو گیا۔ صدف بھی کھڑی ہو گئی۔ میں نے زرگل کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”... گن سمیت یہیں موجود رہو۔ اللہ دتا تمہارے ساتھ ہے۔ ... یہ تینوں خبیث واش روم کے اندر کسی قسم کا ادھم مچانے کی کوشش کریں تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔ ویسے مجھے امید نہیں... تمہارے لیے کوئی پریشانی پیدا کریں۔“

”تم ادھر سے بے فکر ہو کر ادھر جاؤ۔“ وہ کلاشنکوف... مخصوص انداز میں تھپتھپاتے ہوئے بولی ”میں یہاں... صورتِ حال سے نمٹ لوں گی۔“

اس پشتون دوشیزہ کے ہاتھ میں گن بہت جچ رہی تھی۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ اس ہتھیار کو بخوبی استعمال کرنا بھی جانتی ہے۔ میں مطمئن ہو گیا۔ پہلو... نما عمران نے مجھے اور صدف کو جس پسٹل سے دھمکانے کی کوشش کی تھی، لائٹ آنے پر اسے تلاش کر لیا گیا تھا اور... نے اسے اللہ دتا کے حوالے کر دیا تھا۔ فیض احمد سے چھینا ہوا... لوڈڈ ریوالور میں نے حفاظت کی غرض سے زرگل کو دیا... اسے تحسین کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح میرے تمام ساتھی مسلح ہو گئے سوائے میرے اور صدف کے......اور ہمیں اپنے معاملات سے نمٹنے کے لیے آتشیں اسلحے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ویسے جمشید کا نن چکو میری تحویل میں تھا لیکن میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس قسم کے ہتھیار میرے لیے اہمیت کے حامل نہیں رہے تھے۔ مارشل آرٹس کے ... فائٹرز، فائٹنگ کے دوران میں گاہے بہ گاہے جمناسٹک ... ٹیکنیکس کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔ انہیں نن چکو، اسٹک، تلوار اور ننجا اسٹارز کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

میں نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو بے اختیار میری نگاہ اس باکس کی طرف اٹھ گئی جو سینٹرل ٹیبل پر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے اس جمبو باکس پر فائر کیا تھا جس کے نتیجے میں اس میں پیدا ہونے والے شگاف نے مجھے ڈارلنگ کی ... ٹانگوں کی جھلک دکھائی تھی۔ اس منظر نے میرے دل کی دھڑکن کو حد درجہ بڑھا دیا تھا۔

میں اور صدف آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ... باکس ہمارے درمیان ٹیبل پر موجود تھا۔ اور میری فائرنگ سے اس میں بننے والے شگاف میں سے ڈارلنگ کی ٹانگیں ... بھی جھانک رہی تھیں اللہ دتا نے بہت ہی احتیاط اور حفاظت سے اس باکس کو یہاں پہنچایا تھا۔

فائرنگ نے صدف اور اللہ دتا کے خدشے کی تردید کر دی تھی کہ کہیں اس باکس میں کوئی بم یا آتش گیر مادہ نہ ہو لہٰذا اسے ہاتھ لگانے میں کسی قسم کا رسک پوشیدہ نہیں تھا۔ میں نے اس پرچیاں چٹ کو ایک مرتبہ پڑھا اور پھر بے دھڑک وہ باکس کھول ڈالا۔

باکس کے اندر ڈارلنگ کی گردن کٹی لاش رکھی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس منظر نے مجھے سرتاپا لرزا دیا تھا۔ وہ میری محبوبہ کی حیثیت میں جلوہ گر ہونے لگی تھی اور بعض نازک لمحات میں اس نے ایک محسن کی طرح میری بھرپور مدد بھی کی تھی۔ کسی عزیز ہستی کی کٹی ہوئی گردن کو دیکھنا کس قدر تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے اس کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

باکس کے اندر خون کی زیادہ مقدار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا، ڈارلنگ کو کہیں اور قتل کیا گیا تھا اور بعد میں اس کی گردن کٹی لاش کو اس کنگ سائز ڈبے میں پیک کر کے وجدان علی ابنِ عابد علی کو پیش کیا گیا۔ میں نقلی وجدان کی اس بہیمانہ حرکت پر تلملا کر رہ گیا۔ میری ڈارلنگ کا قاتل وہی تھا۔ اسی شیطان نے اسے پاشا کے بنگلے سے اغوا کیا تھا۔ وہ ڈارلنگ سمیت اللہ دتا اور سیکیورٹی گارڈ کو جل دینے میں کامیاب رہا تھا۔

اچانک صدف کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ”وجدان! ڈارلنگ کے نیچے بھی مجھے کچھ نظر آ رہا ہے۔ ذرا ادھر دیکھو۔“

ڈارلنگ کی اس حالت نے صدف کو بھی گہرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ میں نے اس کی آواز میں غم کی پرچھائیں کو لہراتے محسوس کیا۔ اس کی توجہ دلانے پر میں نے بھی ڈارلنگ کے نیچے کسی دھاتی شے کو دیکھ لیا۔ میں نے اس باکس کو پہلو کے بل جھکایا تو مذکورہ شے کھل کر سامنے آ گئی۔

میں اس وفادار خنجر کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے مرحوم دوست امتیاز علی کی یادگار تھا اور میں نے اس کی پیاسی دھار کی مدد سے میاں زاہد حسین سمیت بہت سے بھیڑیوں کی شہ رگ کی مزاج پرسی کی تھی۔ لیکن یہ خنجر یہاں کیسے پہنچ گیا۔ میں تو شعیب غوری کے مشورے پر اس خنجر کو کراچی ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ ڈارلنگ کی لاش کے ساتھ اس خنجر کو مجھ تک پہنچانے کا ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ مجھے بتایا جا رہا تھا، وہ میرے ہاتھوں میری گردن بھی کاٹ سکتا تھا۔ یہ نقلی وجدان تو بہت ہی کمینہ واقع ہو رہا تھا۔

پھر میرا دھیان شعیب غوری کی طرف چلا گیا۔ ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میں وہ بہت بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا اور اس نے یہ انکشاف بھی کیا تھا بلکہ مجھ پر الزام لگایا تھا کہ میں گزشتہ رات کراچی میں موجود تھا اور اس کے اڈے ساؤتھ پر میں نے ہی اپنی نگرانی میں کارروائی کروائی تھی۔ اس نے جس حوالے سے میرا ذکر کیا وہ نقلی وجدان پر فٹ بیٹھتا تھا۔ اور اب کراچی میں چھوڑا ہوا خنجر بھی یہاں پہنچ گیا تھا۔ نقلی وجدان نے اگر واقعی اس خنجر سے ڈارلنگ کی گردن کاٹی تھی تو پھر اس کی سفاکی اور پہنچ میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

میں نے اس باکس کو تھوڑا ہلایا جلایا تو ایک تہ شدہ کاغذ پر نظر پڑی۔ مذکورہ کاغذ ڈارلنگ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ صدف نے بھی وہ کاغذ دیکھ لیا اور بے اختیار انگلی سے اس جانب اشارہ بھی کر دیا۔ میں نے خنجر اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی نوک سے وہ تہ شدہ کاغذ ڈارلنگ کے مردہ وجود کے نیچے سے کھینچ لیا۔

تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر صدف اپنے صوفے سے اٹھی اور میرے پہلو میں جڑ کر بیٹھ گئی۔ اس دوران میں، میں وہ تہ شدہ کاغذ کھول چکا تھا۔ کاغذ کی تحریر پڑھتے ہی مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ ہو بہ ہو میری تحریر تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے لکھے کو پڑھ رہا ہوں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت میں کس کیفیت سے گزر رہا تھا۔ نقلی وجدان نہ صرف کمال کا بہروپیا تھا بلکہ وہ تو بہترین نقال بھی ثابت ہو رہا تھا۔ میں حیرت اور تجسس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ وہ تحریر پڑھنے لگا۔ وہاں میری ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

”وجدان! ڈارلنگ نامی یہ بلی اب تمہارے لیے بہت خطرناک ثابت ہونے والی تھی۔ اسی لیے میں نے اسے ختم کر دیا۔ شاید تمہیں میری بات کا یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پچھلے چند گھنٹوں سے اس کے اندر ایک بری طاقت نے بسیرا کر لیا تھا۔ بدی کی وہ طاقت آگے چل کر تمہیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے والی تھی لہٰذا میں نے تمہیں محفوظ رکھنے کے لیے ڈارلنگ کا قصہ تمام کر دیا۔ بدی کی وہ قوت ایک بلی سمیت اپنے انجام کو پہنچ گئی اور تمہارا خنجر تمہارے پاس۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا، عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے!“

میں نے اس عجیب و غریب تحریر کو بار بار پڑھا اور ہر بار ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا اور وہ یہ کہ نقلی وجدان میرا دشمن نہیں بلکہ دوست ہے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس قسم کی دوستی نبھا رہا تھا اور کیوں؟ وہ کون ہے جو میرے بہروپ

میں کبھی لاہور میں موجود ہے تو کبھی کراچی میں نظر آتا ہے۔ ان حرکات سے وہ کیا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ سچے دوست تو کھل کر سامنے آتے ہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر دوستی کا عملی ثبوت دیتے ہیں۔ یہ بہروپیا تو عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔ اس کا انداز چوروں والا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خطرناک سوال ابھرا...... کہیں یہ میرے دشمنوں کی کوئی نہایت ہی گہری چال تو نہیں وہ دوستی کی آڑ میں مجھے گھیرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟

صدف نے میرے خیالات پڑھ لیے۔ ظاہر ہے، وہ ٹیلی پیتھی نہیں جانتی تھی۔ اس نے میرے چہرے کے تاثرات اور موجودہ صورتِ حال سے وہ اندازہ لگایا ہوگا جو الفاظ کا روپ دھار کر اس کی زبان سے پھسل گیا۔ میں نے اس کی آواز میں بڑی واضح تھرتھراہٹ محسوس کی۔

''وجدان! یہ دوستی کوئی خطرناک چال بھی ہو سکتی ہے۔ جس کے ذریعے دشمن تمہیں ٹریپ کرنا چاہتا ہو!''

''میں بھی اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

اسی وقت اللہ دتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور یہاں کی صورتِ حال اس سے پوشیدہ نہ رہ سکی تاہم نقلی وجدان کے خط کو میں نے اس سے چھپانا مناسب سمجھا اور پوچھا ''تم خیریت سے آئے ہو نا؟''

''جی صاحب!'' وہ ڈارلنگ کے مردہ وجود کو حسرت ناک انداز میں دیکھتے ہوئے بولا ''میں یہ پوچھنے آیا تھا، آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کوئی چائے یا کافی وغیرہ؟''

میں نے صدف کا عندیہ لیے بغیر دوٹوک انداز میں کہا ''فی الحال نہیں ہم فوری طور پر ان تین شیطانوں کو ٹھکانے لگانے جا رہے ہیں جو واش روم میں بند ہیں۔ اتنی دیر میں تم ڈارلنگ کو ٹھکانے لگا دو۔ ہمیں اب اس سے جدا ہونا ہی پڑے گا۔''

حقیقت کو تسلیم کر لیں تو بڑے سے بڑے سانحے کا غم بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ لیکن عموماً انسان غیر حقیقت پسند واقع ہوا ہے اسی لیے زندگی بھر دکھ اور پریشانیاں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں جن میں سے زیادہ تر خود اس کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ ڈارلنگ کو واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ نقلی وجدان کے تحریری پیغام میں کس حد تک صداقت تھی اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کر سکتا تھا۔ وقت...... جو بہت ظالم ہے۔ اس کا ظلم نظر نہیں آتا الزام انسان ہی کے سر جاتا ہے۔ یہ ظالم اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔

اللہ دتا چند لمحے خاموش رہا پھر تشویش ناک لہجے میں پوچھنے لگا ''صاحب جی! یہ بلی تو مر چکی ہے۔ میں اسے کہیں بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔ کیا آپ بھی ان تینوں کو ٹھکانے لگانے......''

اس نے جملہ نامکمل چھوڑا اور سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں اس کے ادھورے جملے کا مفہوم سمجھ گیا تھا، میں نے جلدی سے کہا ''نہیں اللہ دتا! تم جیسا سمجھ رہے ہو میرا ویسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں انہیں ایسی جگہ پہنچانے جا رہا ہوں جہاں یہ زندہ رہیں لیکن کسی بے ضرر کیچوے کی طرح۔ فرید پاشا کے آنے تک انہیں زندہ رکھنا ضروری ہے۔ پاشا ہی ان کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرے گا۔''

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگا۔

میں نے کہا ''ہم واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ تم اچھی سی چائے بنا کر پلا دینا، اس رات کی ساری کوفت دور ہو جائے گی۔''

پھر میں صدف کے ساتھ اس کمرے میں آیا جس کے ملحقہ واش روم میں تینوں حملہ آور مقید تھے۔ زرگل نے مجھ سے پوچھا ''وجدان! ان کے بارے میں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

وہ کلاشنکوف تھامے بڑی چاق و چوبند اور مستعد دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کہا ''فی الحال تو میں انہیں اسی خفیہ مقام پر پہنچانے جا رہا ہوں جو تمہارا دیکھا بھالا ہے۔ اور جہاں ان کے دو ساتھی پہلے سے موجود ہیں۔ یہ انہی کو ڈھونڈتے ڈھانڈتے تو یہاں پہنچے ہیں۔ کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راہ دکھانا تو ثواب کا کام ہے۔''

اس نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور خاموش ہو گئی۔

میں نے اللہ دتا سے کہا ''تم نسان پٹرول (Nissan Patrol) کو گیرج سے باہر نکالو۔ میں آ رہا ہوں۔''

اس کے بعد میں نے تحسین اور زرگل کو چند ضروری ہدایات دیں پھر تحسین اور اللہ دتا کی مدد سے ہم نے زیرِ حراست ان تین افراد کو ہیوی ڈیوٹی جیپ کے اندر پہنچا دیا۔ اس موقع پر سیکیورٹی گارڈ عمر دین نے بہت تعاون کیا۔ میں نے کوٹھی سے رخصت ہونے سے پہلے اسے چوکنا رہنے کی تلقین کی۔ عمر دین خاصا سمجھ دار گارڈ تھا۔ اس کے ساتھ زیادہ دماغ نہیں کھپانا پڑتا تھا۔ جب ہماری جیپ کوٹھی سے رخصت ہوئی تو رات کے دو بج رہے تھے، گویا ہفتے کا دن شروع ہو چکا تھا!

☆☆☆

سرِ شام جس خنکی نے لاہور کی فضا میں اپنی آمد کا اعلان کیا تھا، وہ رات کے تیسرے پہر اچھی خاصی ٹھنڈ میں بدل چکی تھی۔ میرے ساتھ گرمی سردی کا زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ میری تربیت اس انداز میں ہوئی تھی کہ موسمی سختیاں مجھے زیادہ پریشان نہیں کرتی تھیں البتہ صدف کو میں نے سکڑ کر بیٹھے دیکھا تو کہا ''اچھا ہوتا، تم کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت کوئی گرم شال وغیرہ لے لیتیں!''

''میں کسی گرم کپڑے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی ''یہ سوئٹر کافی ہے۔''

صدف نے چست جینز پر سفید ہائی نیک لوز سوئٹر پہن رکھا تھا۔ میں نے کہا ''اگر تمہیں سردی نہیں لگ رہی تو یوں سکڑ سمٹ کر کیوں بیٹھی ہو؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے اپنے بدن کے زاویے تبدیل کرتے ہوئے بولی۔

میں سمجھ گیا، وہ عورت کی مخصوص نفسیات کے زیرِ اثر اس انداز میں بیٹھی تھی۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی ''کیا ہمیں بہت زیادہ دور جانا ہے؟''

صدف نے اپنے سوال میں بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا اور مطلوبہ مقام کے بارے میں نہیں پوچھا۔ اسے خیال تھا کہ جیپ میں تین دشمن بھی موجود ہیں۔ یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ میں جمشید نامی دراز قامت شخص کو بتا چکا ہوں کہ ان کے دیگر دو ساتھی کہاں ہیں۔ بہرحال، صدف کا محتاط انداز موقع محل کی مناسبت سے بہت موزوں تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''کچھ زیادہ دور نہیں۔ تم یوں سمجھ لو کہ پاشا کی اس کوٹھی اور اس کوٹھی کے درمیان تمہارے ماموں اورنگ زیب خان کی رہائش گاہ ہے۔''

''اوہ!'' اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی ''اس کا مطلب ہے، ہم پاشا انکل کی کسی دوسری کوٹھی میں جا رہے ہیں۔ میرے خیال میں ہم دس منٹ بعد وہاں ہوں گے۔''

''تمہارا خیال درست ہے'' میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے صدف کو مختصراً اپنے حالات سے آگاہ کر دیا تھا تاہم تہ خانے کا راز اس پر عیاں نہیں کیا تھا اور اب یہ بات اس سے چھپی نہ رہتی۔ میرے خیال میں، اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ صدف کو مجھ سے ملے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن دو تین مواقع پر اس نے جس طرح اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کی میں اسے فراموش یا نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اگر فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے تہ خانے کا راز اس پر کھل جاتا تو اس میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ وہ اب میرے دوستوں میں شمار ہوتی تھی، اچھے دوستوں میں!

اس کے بعد صدف نے کوئی سوال نہیں کیا اور ہم شادمان کالونی کو پیچھے چھوڑ کر شاہ جمال روڈ پر آ گئے۔ ہماری منزل وہ کوٹھی شاہ جمال اور فاضلیہ کالونی کے سنگم پر واقع تھی تاہم اس کا شمار فاضلیہ کالونی میں ہی ہوتا تھا فرید پاشا نے مجھے بتایا تھا، کسی زمانے میں اس کے علاوہ دیگر چند معروف آرٹسٹ بھی فاضلیہ کالونی میں رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ گلبرگ اور ڈیفنس سوسائٹی کا رخ کرنے لگے بعض ماڈل ٹاؤن میں جا بسے مجھے فلم اور فلم والوں سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی اس لئے میں نے پاشا کی فراہم کردہ معلومات پر زیادہ توجہ نہ دی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہماری جیپ مطلوبہ کوٹھی کے قریب پہنچ گئی اور اسی لمحے ایک ناخوش گوار واقعہ پیش آ گیا نسان پٹرول کے انجن نے احتجاجی آواز خارج کی اور بڑی نفاست سے خاموش ہو گیا۔ میں نے مجبوراً جیپ کو روڈ سے نیچے اتار لیا مجھے اس دوران میں اتنا موقع مل گیا تھا کہ اسٹیئرنگ گھما کر جیپ کو ایک جانب کر لوں وہ مقام کوٹھی سے سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ یہ بڑی واہیات صورتِ حال تھی۔ مجھے اس دوران میں اتنا موقع مل گیا تھا کہ اسٹیئرنگ گھما کر جیپ کو ایک جانب کر لوں۔

میں نے ڈرائیونگ میں مہارت تو حاصل کر لی تھی لیکن گاڑی کے تکنیکی معاملات کا مجھے زیادہ علم نہیں تھا۔ دراصل مکینکل باتیں میرے لئے غیر دلچسپ اور بور ثابت ہوتی تھیں اس لئے میں نے گاڑی اور انجن کے بارے میں جاننے کے سلسلے میں کبھی بھی سنجیدگی نہیں دکھائی۔

میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جیپ کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ صدف نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''وجدان! اس کے انجن سے کچھ چھیڑ چھاڑ کرو، شاید بات بن جائے'' وہ یہ مشورہ دیتے ہوئے میری جانب اتنا زیادہ جھک آئی تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود سے چھیڑ چھاڑ کی پیش کش کر رہی ہو۔ میں نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مارتے ہوئے کہا۔

''میں اس معاملے میں اناڑی ہوں صدف!''

''کیا واقعی؟'' اس نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں

دیکھا۔

''کیا واقعی؟'' اس نے بے یقینی سے میری آنکھوں میں دیکھا۔

میں نے کہا ''ہاں، واقعی۔ میں صرف ڈرائیونگ جانتا ہوں، مکینک نہیں ہوں۔''

اس کی تشویش میں اضافہ ہوگیا، بولی ''میرے استعمال میں بھی اسی موٹر کمپنی کی گاڑی ہے لیکن تمہاری طرح میں بھی ڈرائیونگ تک محدود ہوں۔''

صدف کے پاس ایک چمچماتی ہوئی وہائٹ سٹی میں نے دیکھی تھی یہ ایک اتفاق تھا کہ اس وقت بھی ہم نسان کمپنی کی ایک جیپ میں بیٹھے تھے جس نے لبِ بام ہمیں دھوکا دے دیا تھا۔ میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے، ہم دونوں ہی اس معاملے میں اناڑی ہیں!''

میرا جملہ ذومعنی تھا اور اس وقت میں براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ پتا نہیں، میری اس بات کا کیا مطلب سمجھی کہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو اپنی گاڑی میں جب بھی کوئی پرابلم پیش آتی ہے، میں گیراج والوں کو فون کردیتی ہوں۔ پاپا ڈیفنس کے ایک معروف گیراج سے اپنی گاڑیوں کا کام کراتے ہیں''

میں نے اس کی بوکھلاہٹ کو انجوائے کرتے ہوئے کہا ''تمہارے پاپا اور وہ معروف گیراج کراچی میں ہے ہم انہیں فون کرکے کسی قسم کی مدد حاصل نہیں کرسکتے''

''پھر کیا کریں؟'' وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی ''ان تین لفنگوں کے ساتھ سرِراہ کھڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ گشتی پولیس کی کوئی موبائل اس طرف آسکتی ہے۔ اگر ان تینوں کو انہوں نے اس حالت میں دیکھ لیا تو ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی ہوجائے گی۔''

وہ بالکل درست کہہ رہی تھی۔ ہم اس وقت ایک نازک صورتِ حال سے دوچار تھے میں نے کہا ''ہمیں دھکا لگا کر جیپ کو کوٹھی تک لے جانا ہوگا۔ اور کوئی صورت فی الحال ممکن نہیں''

صدف نے پوچھا ''وہ کوٹھی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے جہاں تم جانا چاہتے ہو؟''

میں نے انگلی سے فاصلیہ کالونی والی کوٹھی کی جانب اشارہ کیا اور کہا ''میرے خیال میں یہ فاصلہ سو گز کے لگ بھگ ہوگا!''

''یہ تو اچھا خاصا فاصلہ ہے وجدان!'' وہ پریشان لہجے میں بولی ''ہمارے پاس ایک ہیوی ڈیوٹی جیپ ہے پش دے کر وہاں تک اسے لے جانا آسان نہیں ہوگا۔''

''میری زندگی میں کچھ بھی آسان نہیں صدف!'' میرا لہجہ اچانک قدرے تلخ ہوگیا ''دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہم ان تینوں کو اپنے کندھوں پر ڈھو کر کوٹھی کے اندر لے جائیں''

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پُرسوچ انداز میں بولی'' یہ صورت تو پہلی شکل سے بھی زیادہ مشکل ہے''

''تب ہم پہلی صورت کو ہی اپنائیں گے'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا ''تم ڈرائیونگ سیٹ پر آجاؤ۔ میں نیچے جاکر جیپ کو پش دیتا ہوں''

پھر قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی، میں ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھول کر جیپ سے باہر نکل آیا میں نے جیپ کو دھکا لگانے سے پہلے پچھلے حصے میں فرش پر پڑے ان تینوں کا جائزہ لیا۔ وہ بڑی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چپ چاپ وہاں موجود تھے۔ ان میں پہلوان نما سانڈ عمران نامی شخص تو ہنوز بے ہوش تھا۔ جمشید کا شمار بھی نیم بے ہوش میں کرنا چاہئے البتہ گرے ہائی روف سے ہتھے چڑھنے والا جلال اپنے حواس میں نظر آتا تھا لیکن بے بسی و بے کسی کی تصویر کو شرمارہا تھا۔

میں نے جیپ کو دھکا لگانا شروع کیا تو ایک احساس نے بری طرح مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ سچ ہے نسان پٹرول جیسی بھاری جیپ کو دھکیلنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی اور میں اس کام کے لئے جی سے مدد لے رہا تھا لیکن میں نے جس عجیب احساس کا ذکر کیا ہے وہ یہ تھا کہ میرے ساتھ کوئی ....اور شخص بھی اس جیپ کو دھکیل رہا ہے اس احساس نے میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑادی۔

میں نے بہ دستور جیپ کو پش کرتے ہوئے سر کو جھٹکا لیکن اس احساس سے نجات نہ ملی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ احساس میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے پیش و گرد کا جائزہ لیا چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ رات کے اس پہر شاہ جمال روڈ سنسان پڑی تھی اور دور دور تک کسی جان دار کے آثار نظر نہیں آتے تھے اس کے باوجود بھی میں اپنے احساس سے چھٹکارا نہیں پاسکا۔

جب میں اپنی کیفیت کی کوئی وضاحت نہ کرسکا تو میں نے ایک تجربہ کرنا چاہا۔ میں نے جیپ کو پش دینے سے ہاتھ روک لیے اور ساتھ ساتھ دوڑتا رہا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جیپ کو بہ دستور پش مل رہا تھا۔ اگر وہ میرے کی باقیات ہوتی تو تھوڑی دیر بعد پہیوں کی گردش رک جاتی

مگر میں دیکھ رہا تھا کہ جیپ کی رفتار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی گویا اسے مسلسل دھکیلا جا رہا تھا۔ ایسا کون شخص تھا جو مجھے نظر نہیں آرہا تھا لیکن جیپ کو پش دے رہا تھا پہلے میں اسے اپنے احساس کا دھوکا سمجھا تھا کہ کوئی میرے ساتھ موجود ہے مگر اس عملی تجربے نے ثابت کردیا کہ میرے احساس کو دھوکا نہیں ہوا، کوئی پراسرار قوت میرے آس پاس موجود تھی جو جیپ کو دھکیل کر فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے گیٹ کی سمت بڑھا رہی تھی۔

پراسرار قوت کے خیال نے مجھے لامحالہ چی کی جانب متوجہ کردیا۔ اس میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں کہ میں نے جیپ کو دھکیلنے کے لئے چی کی قوت سے مدد لی تھی۔ میرا اپش ہٹا دینے کے بعد بھی اگر جیپ کی رفتار میں کمی نہیں آئی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، میں چی کی لامحدودیت کے تجربے سے گزر رہا تھا۔ ان دنوں نہایت ہی پابندی کے ساتھ میں چی کی ایڈوانس مشقیں کر رہا تھا۔ یہ ممکن تھا، میرے اندر بیدار چی کی قوت کی کوئی ارفع واعلیٰ شکل تک میری رسائی ہو گئی ہو۔ پراسرار قوتوں کا کوئی آخیر نہیں ہوتا۔ ان کی حدود کا تعین کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ کوئی بھی عامل ان کا منتہی نہیں ہو سکتا۔ یہ لامحدود (INFINITE) ہوتی ہیں۔

چی بھی ایک پراسرار اور حیرت انگیز قوت ہے۔ شاؤلن ٹیمپل میں تربیت کے دوران میں، میں نے اس قوت کے ایسے ایسے کمالات دیکھے تھے کہ آنکھیں خیرہ اور ذہن دنگ ہو کر رہ گیا۔ میرا دادا استاد ماسٹر ہینگ پائی اس قوت کا ماہر تھا۔ میں نے اس کی شاگردی میں رہتے ہوئے عجب عجب نظارے دیکھے جن کا تصور بھی محال ہے ماسٹر ہینگ پائی ہی نے مجھے چی کی ایڈوانس مشقوں کے بارے میں بتایا تھا۔

چی (CHI) کو چائنا والے اپنے تلفظ کے لحاظ سے (Q I) لکھتے ہیں اور اس کا پورا نام چی کونگ (QIGONG) ہے۔ تبت کے بعض لاما اس قوت کوشی کا تلفظ دیتے ہیں۔ بہرحال یہ وہ ہی قوت ہے جو پیٹ کے زیریں حصے میں پچھلی جانب ناف کے مقام پر خوابیدہ حالت میں موجود ہے۔ ناف کے مقام سے اگر پیٹ کے پچھلے حصے کی طرف سفر کیا جائے تو ریڑھ کی ہڈی کے نزدیک اس حیرت انگیز قوت کا مسکن واقع ہے۔ جو لوگ مخصوص مشقوں کے ذریعے اس خوابیدہ قوت کو بیدار کر لیتے ہیں وہ پھر اس کی مدد سے بڑے بڑے کمال دکھا سکتے ہیں چینی روحانیت کی یہ قوت ہندو یوگ میں کنڈلینی شکتی کے نام سے موجود ہے۔ مسلم صوفیا اسی قوت کو تصرف کا نام دیتے ہیں۔ کان کہیں سے بھی پکڑا جائے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہم اپنی مطلوبہ کوٹھی تک پہنچ گئے اور اس دوران میں، میں جس حیرت انگیز تجربے سے گزرا تھا اور گزر رہا تھا اس نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کردیا۔ میری سوچ میں حیرت اور الجھن کا تناسب یک سا تھا۔ اگر میں جیپ کو بغیر دھکیلے کوٹھی تک پہنچنے والے معاملے کو چی کے کھاتے میں ڈال دیتا تو پھر اس احساس کو کیا نام دیتا جواب تک موجود تھا میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا، کوئی میرے آس پاس موجود ہے۔ موجود تو ہے مگر مجھے نظر نہیں آرہا۔ مجھے نظر نہیں آرہا تو اس کا یہ مطلب تھا، کسی اور کو بھی نظر نہیں آرہا۔ آخر وہ کون تھا۔ کون تھا وہ؟

یہ سوال بڑی شدت سے میرے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ شاید میں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے بہت دور تک خیالی سفر طے کر لیتا کہ صدف کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ''وجدان! کیا ساری رات یہیں کھڑے رہو گے یا کوٹھی کے اندر بھی جانا ہے؟''

میں نے اپنے سر کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور صدف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ جیپ سے باہر نکل آئی تھی اور حیران نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جلدی سے کوٹھی کا گیٹ کھول دیا۔ گلبرگ والی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کی چابیاں ساتھ لے آیا تھا۔

میں نے صدف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تمہیں انجن کی مدد کے بغیر تھوڑی سی ڈرائیونگ اور کرنا ہوگی۔ تم جیپ میں بیٹھو، میں پش دیتا ہوں، گاڑی کو کوٹھی کے اندر لے جانا ضروری ہے''

وہ اپنی جگہ کھڑی یک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ بتا رہی تھی، وہ مجھے نہیں، کسی عجوبے کو دیکھ رہی ہے۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم جیپ کے اندر کیوں نہیں بیٹھ رہی ہو؟''

وہ شک زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے سرسراتی آواز میں بولی ''میں گاڑی میں بیٹھ کر کیا کروں گی۔ تم جس قوت سے جیپ کو دھکیل کر یہاں تک لائے ہو اسی کے ذریعے اسے کوٹھی کے اندر بھی پہنچا دو''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' میں نے چور لہجے میں کہا۔

''وجدان!'' وہ چٹانی لہجے میں بولی ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی، تم اس درجہ پراسرار ہو گے!''

''اب سوچ لو...... اور اس سوچ میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں'' میں نے کہا ''ہمیں فوراً کوٹھی کے اندر پہنچنا ہے''

اس نے مزید کوئی بات نہیں کی اور نسان کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھی۔ میں نے جیپ کو پش دیا اور ہم کوٹھی کے اندر پہنچ گئے۔ جس دوران میں، میں نے گیٹ کو اندر سے بند کیا، صدف جیپ سے باہر آچکی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنی کارروائی کا آغاز کرتے، صدف نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وجدان! فی الحال میں تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی۔ ہم ضروری کام نمٹا لیں تو پھر تمہیں میرے بہت سے سوالوں کے جواب دینا ہوں گے'' اس کی آواز میں تجسس کا سمندر موجزن تھا۔

میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، وہ مجھ سے کس قسم کے سوالات پوچھے گی۔ ابھی تک میرے لئے بہت سے معاملات جواب طلب تھے، میں اسے کیا بتاتا۔ بہرحال، کوٹھی کے اندر پہنچ جانے کے بعد میں مطمئن ہو گیا تھا کہ اب کسی بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہیں رہا تھا۔ اس دوران میں صدف بڑی کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے اسے ٹالنے کیلئے کہہ دیا ''ٹھیک ہے، بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ فی الحال یہ کام زیادہ ضروری ہے''

اس نے پوچھا ''تم نے ان تینوں کو کہاں اور کس طرح ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچا ہے؟''

''انہیں کوٹھی کے اندر ایک ہال نما کمرے میں لے جانا ہوگا'' میں نے جواب دیا۔ پھر تھوڑا توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''جیپ تو ہال نما کمرے میں جا نہیں سکے گی۔ تم میری مدد کرو تو ہم انہیں گھسیٹ کر وہاں پہنچا سکتے ہیں''

وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی ''وجدان! اگر تم چاہو تو یہ جیپ کہیں بھی جا سکتی ہے بلکہ تمہاری انگلی کے اشارے پر تو یہ تینوں ہوا میں تیرتے ہوئے بھی ہال نما کمرے میں پہنچ سکتے ہیں!''

صدف کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا، اس نے ڈرائیونگ کے دوران میں بیک ویو مرر میں سارا تماشا دیکھ لیا تھا۔ میں جیپ سے لاتعلق اس کے پیچھے پیچھے دوڑا چلا آیا تھا۔ اس منظر نے اسے جتنا بھی حیران کیا ہو کم ہے۔ وہ لمحات کسی بات کی وضاحت کیلئے مناسب نہیں تھے۔ جب تک میں جیپ میں موجود تین افراد کو ان کے ساتھیوں کے پاس نہ پہنچا دیتا، مجھے کلی اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے صدف کی بات پر توجہ دیئے بغیر کہا۔

''تم ہال نما کمرے تک جانے کیلئے راستہ کلیئر کرو جب تک میں انہیں جیپ سے باہر نکالتا ہوں۔ تمہیں صرف دو کمروں کے دروازے کھولنا ہوں گے''

''موضوع سے پہلو تہی تمہیں مزید پراسرار بنا رہی ہے'' وہ سنسناتی ہوئی آواز میں بولی ''میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے، اگر کسی کی زبانی سنا ہوتا تو ہرگز ہرگز یقین نہ کرتی'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''وجدان!'' اگر تم نے اس واقعے کی وضاحت نہ کی تو میرا دماغ پھٹ جائے گا''

پھر وہ پلٹ کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے ان تینوں کو یکے بعد دیگرے کھینچ کر نسان سے باہر ڈھیر کردیا۔ عمران اور جمشید تو کسی قسم کی مدافعت یا مزاحمت کے قابل نہیں تھے البتہ جلال نے نحیف سی آواز میں مجھ سے پوچھا۔

''تم ہمارے ساتھ کیا کرنے والے ہو؟''

''کمال ہے، تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ ہم نے تم لوگوں کے لئے اتنی مصیبت کیوں اٹھائی ہے؟'' میں نے کہا۔

وہ سراسیمہ لہجے میں بولا ''واقعی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا''

''تم باہر ہائی روف میں تھے شاید اس لئے تمہیں پتا نہیں'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا پھر جمشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا ''اس شخص نے مجھے بتایا تھا کہ تم لوگ قادر بخش اور فیض احمد کی تلاش میں ہم تک پہنچے تھے۔ میں تمہیں تمہارے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملانے لایا ہوں''

''کک...... کیا فیض اور قادر بخش اس کوٹھی میں ہیں؟'' وہ بےیقینی سے بولا۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''مم...... مگر......'' حیرت نے اس کی زبان میں لکنت پیدا کردی تھی'' ہم تو اس کوٹھی کی تلاشی لینے کے بعد ادھر گئے تھے۔ فیض اور قادر بخش تو اس کوٹھی میں نہیں ہیں۔''

میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا ''پہلے تم بغیر اجازت اس کوٹھی میں داخل ہوئے تھے جیسے کوئی شخص چھپتے چھپاتے غیرقانونی طور پر سرحد پار کرکے کسی دوسرے ملک میں داخل ہوتا ہے اسی لئے تمہیں وہ یہاں نہیں ملے لیکن اب تم ہماری مرضی سے یہاں پہنچے ہو اور وہ بھی ملن ایکسپریس میں بیٹھ کر اس لئے تمہارے بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملن ضرور ہوگا۔''

''ملن ایکسپریس؟'' اس کے لہجے سے شدید نوعیت کی حیرت ٹپکی تھی۔

میں نے خاموش نسان پٹرول کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے کہا ”وہ رہی ملّن ایکسپریس افسوس کہ یہ راستے ہی میں جواب دے گئی اور ہمیں دھکیلتے ٹھیلتے ہوئے اسے یہاں پہنچانا پڑا۔ گاڑی مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانے کی ذمہ دار... ہوتی ہے۔ لیکن کبھی یہی فریضہ مسافروں کو انجام دینا پڑتا ہے۔ ہوتا ہے بھائی، سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔“

اسی وقت صدف میرے پاس پہنچ گئی پھر ہم دونوں نہایت ہی اہم کام میں مصروف ہوگئے۔ اس رات کے پہلے حصے میں زرگل نے بھی مجھ سے اسی قسم کا تعاون کیا تھا جیسا اب صدف کررہی تھی۔ میں نے زرگل کی مدد سے ہال نما کمرے سے فیض احمد کو گھسیٹ کر خفیہ تہ خانے میں پہنچایا تھا اور اب صدف کی مدد حاصل کررہا تھا۔ ہم نے پہلے جلال پر کام کیا اس کے بعد باقی دونوں افراد کو ہال نما کمرے میں پہنچادیا۔

اس مشقت کے نتیجے میں صدف واضح طور پر ہانپنے لگی، میں نے اس سے کہا ”تم تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنی سانس ہموار کرلو۔ باقی کام بعد میں کریں گے“

”میں ٹھیک ہوں“ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی ”بتاؤ، اب ان تینوں کا کیا کرنا ہے۔ تمہارے لہجے سے اندازہ ہوتا ہے، انہیں اس کمرے تک پہنچانا کافی نہیں!“

”تم نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے“ میں دانستہ اسے باتوں میں لگا کر تھوڑا ریسٹ دینا چاہتا تھا۔ ”ان کے ساتھ ابھی مزید بہت کچھ کرنا ہے۔ تم جا کر جیپ میں سے رسی کا گچھا نکال لاؤ“

پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میں نے نائیلون کی مضبوط ڈوری کا ایک گچھا بھی ساتھ لے لیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد صدف ڈوری لے کر آگئی۔ اب اس کی سانس بڑی حد تک ہموار ہوچکی تھی۔ اس دوران میں، میں نے مخصوص ٹیکنیک کو استعمال کرکے تہ خانے کا راستہ وا کردیا تھا۔ صدف پر جب تہ خانے کا راز کھلا تو اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ ”میں جب ڈوری لینے باہر گئی تو اس ہال کی چاروں دیواروں کو دیکھ کر گئی تھی“ اس نے تہ خانے کے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”لیکن یہ...“

میں اس کے نامکمل جملے کو سمجھ گیا اور کہا ”اس طرف ایک خفیہ تہ خانہ ہے۔ ان تینوں کے بچھڑے ہوئے ساتھی وہاں آرام فرمارہے ہیں۔ انھیں بھی وہیں پہنچانا ہوگا۔ تمھیں ایک مرتبہ پھر میری مدد کرنا ہوگی“

”تمہارے ایک دفعہ کہنے پر میں ہزار بار تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی پھر ہائی نیک کی آستینیں چڑھاتے ہوئے میری جانب بڑھی۔

صدف کا یہ انداز خاصا متاثر کن تھا۔ ہم ایک مرتبہ... بے ہوش افراد کو گھسیٹنے لگے البتہ جلال کے لیے ہانکنے کا... زیادہ مناسب ہوگا۔ کچھ دیر بعد ہم تہ خانے کے اندر موجود تھے۔

تہ خانے کے اندرونی مناظر نے صدف کو چونکنے پر مجبور کردیا۔ خاص طور پر سابق سیکورٹی گارڈ خادم حسین کو دیکھ کر صدف کافی دیر تک بے یقینی میں گرد جھٹکتی رہی پھر بولی۔

”یہ سب کیا ہے وجدان؟“

رفتہ رفتہ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ ذہن پر زیادہ زور نہ دو“ میں نے کہا۔

وہ بولی ”یہ تمہارا کارنامہ ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو“ میں نے مبہم انداز میں کہا ”باقی باتیں بعد میں کریں گے، پہلے ضروری کام نمٹالیں“

گینڈا نما قادر بخش صدف کو میرے ساتھ دیکھ کر... حیرت زدہ تھا۔ اس سے پہلے زرگل کی موجودگی نے اسے... یا تھا۔ عمران، جمشید اور جلال کو بے بسی کی حالت میں دیکھ... قادر بخش خاموش نہ رہ سکا، اس نے تلخ لہجے... کہا ”وجدان! میں ایک مرتبہ پھر یہی کہوں گا، تم اچھا نہیں کررہے ہو!“

”میں اچھوں کے ساتھ اچھا اور بروں کے ساتھ برا... ہوں“ میں نے سفاکی سے کہا ”اب تم خود اندازہ لگالو میں... کے ساتھ کیا کررہا ہوں“

وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا ”تم اپنے انجام سے بے... تاریک کنوئیں کی جانب بڑھ رہے ہو۔“

”میں نے کہا ”تم صرف اپنے انجام پر نظر رکھو... قادر۔ میں اپنے کہے، سنے اور کیے کا خود ذمے دار ہوں“

”تمھیں ایک دن بری طرح پچھتانا پڑے گا“ وہ... دینے والے انداز میں بولا۔

”وہ دن کبھی نہیں آئے گا“ میں نے کہا ”تم اس فکر... خود کو دبلا نہ کرو“

وہ اپنے تازہ ترین مہمان ساتھیوں کی طرف دیکھ... ہوئے بولا ”تم انہیں کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟“

”یہ لوگ تمہاری تلاش میں بھٹک رہے تھے“ میں... کہا ”میں نے انھیں سیدھا راستہ دکھادیا۔“

وہ بے بسی اور غصے کی شدت سے کپکپانے لگا ”تم... اور چوہدری دلدار کے......“

میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا ایک زناٹے دار... رسید کرکے اس کا جملہ نامکمل چھڑادیا اور غضب ناک...

...نے کہا ”کسی جائز وقت کی ناجائز اولاد! تم پہلے بھی مجھے فشا... اور چوہدری دلدار کے نام سے دھمکا چکے ہو لیکن یاد رکھو، تمہارے وہ دادا پردادا تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکیں گے۔ میں نے تمھیں بتایا تھا نا، میرے اگلے ٹارگٹ یہی دونوں افراد ہیں۔ اگر انہوں نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو وہ بھی تمھیں یہیں نظر آئیں گے۔ اسی تہ خانے میں، اسی سنگین اور ٹھنڈے فرش پر پھر آقا اور غلام ایک ہی فرش پر بچھ جائیں گے۔ نہ کوئی خادم رہے گا اور نہ ہی کوئی مخدوم۔“

میرے لہجے میں اس قدر سختی اور قطعیت تھی کہ قادر بخش کو چپ لگ گئی تاہم وہ سہمی ہوئی معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے تہ خانے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کمرے کے واحد روشن دان کا جائزہ لیا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ روشن دان کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ قادر بخش کوئی نہایت ہی شریف النفس اور فرماں بردار شخص تھا! دراصل، زرگل کے ساتھ اس تہ خانے سے رخصت ہوتے وقت میں نے اس بات کی تسلی کرلی تھی کہ روشن دان پر طبع آزمائی کا سامان وہاں موجود نہ ہو۔ اگر گینڈا طاقت آزمائی پر ہی اڑ جاتا تو زیادہ سے زیادہ وہ روشن دان کی آہنی گرل کو ہی اکھاڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد بھی انہیں وہاں سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل نہ ہوتی کیوں کہ اس روشن دان میں سے کسی انسان کا گزر ممکن نہیں تھا۔ وہ محض چھے انچ چوڑا اور تین فٹ لمبا ایک شگاف تھا جو روشنی اور ہوا کی آمد و شد کے لیے چھوڑا گیا تھا۔

گینڈا نما قادر بخش کا ساتھی فیض احمد ہنوز بے ہوش مگر زندہ تھا۔ اس کے دو بے ہوش ساتھی مزید وہاں پہنچادیے گئے تھے۔ جلال کا ہوش و حواس میں رہنا بھی کسی لنگڑی مدد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے صدف کے ساتھ مل کر ان پانچوں کے ہاتھ پاؤں نائیلون کی مضبوط ڈوری سے کس کر باندھ دیے۔ وہ اس طرح بے دست و پا ہوگئے کہ صرف امداد طلب نظروں ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے، کسی کے کام آسکتے تھے اور نہ ہی کسی کو اپنے کام میں لاسکتے تھے۔

میں نے قادر بخش سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ”مجھے امید ہے، تم اب بھی اسی شرافت کا ثبوت دو گے جس کا مظاہرہ پہلے کرچکے ہو۔ اگر زندہ سلامت رہنا چاہتے ہو تو صبح ہونے کا انتظار کرو۔ کل فرید پاشا یہاں آکر تمہاری قسمت کا فیصلہ کرے گا......اور اگر کل کا سورج نکلنے کا انتظار نہیں کرسکتے ہو تو پھر قسمت آزما کر دیکھ لو۔“

اس کے بعد میں جلال کی طرف متوجہ ہوا ”تمھیں میں اس لیے ہوش و حواس میں چھوڑے جارہا ہوں کہ قادر بخش کو سمجھا سکو۔ اگر یہ کسی نادانی کا ارادہ کرے تو اسے ٹوک دینا۔ تم تینوں ملّن ایکسپریس میں بیٹھ کر یہاں پہنچے ہو۔ اپنے حالات سے تمھیں سمجھوتا کرنا ہوگا۔ ورنہ ملّن ایکسپریس ابدی جدائی کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے!“

وہ بے اختیار اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس کی ان جنبشوں میں بے پناہ خوف اور دہشت سمٹ آئی تھی۔ میں نے تہ خانے میں موجود ہر شے پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور صدف کے ساتھ باہر آگیا۔ واپسی پر میں نے اسی مخصوص ٹیکنیک سے دروازہ بند کیا اور ہم ہال نما کمرے میں پہنچ گئے۔

صدف کی حالت بہت عجیب ہورہی تھی۔ وہ پھٹ پڑنے کو تھی۔ میں اگر اس کو نہ سنتا تو جانے اس پر کیا قیامت گزر جاتی۔

”کیسا لگ رہا ہے صدف؟“ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے معتدل لہجے میں دریافت کیا۔

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ”خدا کی پناہ! یہ سب بہت سنسنی خیز ہے!“

”تمھیں ایسی سنسنی ہی کی تلاش تھی؟“

”وہ کچھ نہیں بولی اور تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگی۔

”کیا ہوا صدف، تم خاموش کیوں ہو؟“

”وجدان!“ وہ سرسراتی آواز میں بولی ”تمھیں لاہور میں قدم رکھے ابھی چند روز ہوئے ہیں اور تم نے اتنی زیادہ دشمنی بڑھالی؟“

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”یہ میرے اور پاشا کے مجموعی دشمن ہیں۔ اب تمہارے پاشا انکل تو یہاں ہیں نہیں۔ ان کی شفٹ میں بھی مجھے ہی چلنا پڑ رہا ہے۔ اس وقت میں ڈبل ڈیوٹی پر ہوں۔“

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگی جسے میں کوئی مفہوم یا معنی نہ پہنا سکا۔ اس نگاہ میں حیرت بھی تھی اور دلچسپی بھی، فخر بھی تھا اور ستائش بھی، محبت بھی تھی اور فرمائش بھی۔ میں نے اس کی ہزار معنی نگاہ سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

”صدف تمھیں تو ان حالات میں بہت مزہ آرہا ہوگا۔ تم بہ قول خود، خاصی مہم جو واقع ہوئی ہو!“

اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں موضوع بدل دیا ”اگر اس کوٹھی کی مہم جوئی نمٹ چکی ہو تو ہمیں فوراً یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ ادھر پاشا انکل کی دوسری کوٹھی پر بھی ہماری اشد ضرورت ہے۔ وہاں کے حالات کو یقینی نہیں کہا جاسکتا۔“

’’میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا ’’لیکن فوری طور پر روانہ ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں!‘‘

’’کیوں ممکن نہیں۔‘‘ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے کہا: ’’شاید تم بھول گئی ہو کہ ہم جس جیپ کے ذریعے یہاں پہنچے تھے وہ ہینڈز اپ ہو چکی ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں فاضلیہ کالونی سے گلبرگ تھری تک گاڑی کو دھکا لگاؤں۔‘‘

دھکا لگانے کے ذکر پر اس نے استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھا پھر تشویش ناک انداز میں بولی ’’پھر ہم واپس کیسے جائیں گے۔‘‘ ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا ’’اگر کہو تو میں اپنے ماموں کو فون کر دیتی ہوں۔‘‘

فون کے ذکر پر میں چونک اٹھا اور مجھے یاد آ گیا کہ جب آج شام کے وقت میں اس کوٹھی میں برسرِ پے کار تھا تو کسی حصے میں فون کی گھنٹی بجی تھی۔ ازاں بعد اللہ دتا نے مجھے بتایا کہ فرید پاشا نے فون کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کوٹھی میں فون کی موجودگی ہی خوش کن تھی۔

میں نے صدف سے کہا ’’ان معاملات میں تمہارے ماموں کو انوالو کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ ویسے بھی پولیس والے ہیں۔ ایک بات کے سو مطالب اور ایک مطلب کے ہزار مفہوم نکالیں گے۔ میں اللہ دتا سے رابطہ کرتا ہوں۔‘‘

’’کیا اس ویران کوٹھی میں فون موجود ہے؟‘‘

’’ہے تو...... لیکن تلاش کرنا پڑے گا۔ آؤ میرے ساتھ۔‘‘ میں نے کہا۔

صدف میرے ہم قدم ہو گئی۔

تھوڑی سی دیر بعد ہم ایک ایسے ڈرائنگ روم نما کمرے میں پہنچے جہاں فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے فرید پاشا کی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی پر فون اللہ دتا نے ریسیو کر لیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اس سے وہاں کی خیر و عافیت دریافت کیا۔ جواباً اس نے کہا۔

’’صاحب جی! یہاں تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ اپنے بارے میں بتائیں؟‘‘

’’ہمارے ساتھ ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔‘‘ میں نے کہا ’’ہمیں فوری طور پر ایک گاڑی کی ضرورت ہے تاکہ ہم یہاں سے نکل کر تمہارے پاس پہنچ سکیں۔ جیپ میں کچھ ایسی خرابی ہو گئی ہے کہ وہ ہمارا کہنا ماننے سے انکاری ہے۔‘‘

’’آپ جس مشن پر گئے تھے اس کا کیا رہا؟‘‘

’’مشن کامیاب رہا ہے۔‘‘

اللہ دتا نے کہا ’’وجدان صاحب! اس وقت گیراج میں ٹویوٹا کرولا اور ہائی روف کھڑی ہیں۔ آپ کے لیے کون سی گاڑی مناسب رہے گی؟‘‘

میں نے کہا ’’دشمنوں سے چھینی ہوئی ہائی روف کو فی الحال باہر نکالنا ٹھیک نہیں ہوگا اس لیے ٹویوٹا چلے گی۔ کیا تم خود گاڑی لے کر آؤ گے؟‘‘

’’جو آپ کا حکم۔‘‘ وہ فرماں برداری سے بولا ’’ویسے تحسین نے بھی پاشا صاحب کی وہ کوٹھی دیکھی ہوئی ہے۔‘‘

’’تحسین کو ڈسٹرب نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔‘‘ میں نے کہا ’’وہ بے چارہ اس کوٹھی میں آرام و آسائش کے لمحات گزارنے آیا تھا۔ یہاں پر قیام کی پہلی رات اس پر بھاری گزر گئی۔‘‘ تھوڑا وقفہ دے کر میں نے پوچھا ’’وہ اپنی بیوی کے پاس ہی ہے نا!‘‘

’’نہیں جناب! وہ اس وقت میرے پاس بیٹھا ہے۔‘‘ اللہ دتا نے بتایا ’’میں نے زرگل کو آرام کرنے کے لیے زہرہ کے پاس بھیج دیا ہے۔ تحسین کا کہنا ہے، جب تک آپ خیریت سے واپس نہیں آ جاتے، وہ بھی میرے ساتھ جاگتا رہے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، پھر تم دونوں آپس میں صلاح کر کے فیصلہ کر لو۔ میں نے کہا ’’جسے بھی ہماری طرف آنا ہے، فوراً نکل پڑے۔ میں یہاں پر انتظار کر رہا ہوں۔‘‘

رابطہ ختم ہوا تو صدف نے استفسار کیا ’’وجدان! کیا خیال ہے، پندرہ منٹ میں ان میں سے کوئی یہاں پہنچ جائے گا۔ رات کے اس پہر تمام سڑکیں خالی ملیں گی۔ کیا ہم یہیں بیٹھ کر انتظار کریں یا گیٹ پر چلیں؟‘‘

میں نے کہا ’’میرے خیال میں ہم نسان میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ وہ فی الحال سفر کے قابل نہیں رہی تو کیا ہوا، ایک بہترین نشست گاہ وہ اب بھی ہے۔‘‘

صدف نے میری بات سے اتفاق کیا اور ہم تمام کمروں کے دروازے بند کرنے کے بعد کوٹھی کے کھلے صحن میں آ گئے۔ گیٹ کے نزدیک ہی وہ جیپ کھڑی تھی جہاں ہم نے بیٹھ کر سواری کا انتظار کرنا تھا۔ رات ٹھنڈی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند اپنی مخصوص آب و تاب دکھا رہا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ چاند مجھے دیکھ رہا ہو۔

یہ چاند بھی اللہ نے خوب تخلیق کیا ہے۔ جو بھی اس کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ اسی کو دیکھنے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسا وجود ہے جو کسی سے جیلس نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو حسد میں مبتلا کرتا ہے۔ بعض لوگوں کو تو چاند میں اپنے محبوب کا چہرہ بھی نظر آتا

ہے۔ مغرب میں تو باقاعدگی کے ساتھ اس نسبت سے ایک مخصوص تہوار بھی منایا جاتا ہے۔ جسے روزِ محبوب (St. Valentine's Day) کہا جاتا ہے۔ ہر سال چودہ فروری کو منائے جانے والے اس دن لوگ اپنے محبوب کا انتخاب کرتے ہیں اور اس محبوب ہستی کے ساتھ وہ دن گزارتے ہیں۔

میں غیر ارادی طور پر چاند اور محبوب کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیسرا شخص بھی ہمارے پیچھے آ رہا ہو۔ میں نے بے اختیار پلٹ کر عقب میں دیکھا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کوٹھی کے صحن میں ہر جانب خاموشی اور چاندنی کا بسیرا تھا۔

صدف نے پوچھا ’’وجدان! کیا ہوا؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ میں نے الجھن زدہ نظر سے اسے دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اپنے عقب میں نگاہ دوڑائی۔

وہ بولی ’’تم اچانک اس طرح پلٹے تھے جیسے پیچھے سے تمہیں کسی نے آواز دی ہو۔‘‘

’’مجھے یوں لگا تھا، کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

’’لیکن یہاں تو کوئی بھی نہیں۔‘‘ وہ دوبارہ میرے ساتھ جیپ کی طرف قدم بڑھانے لگی ’’وہ تمہارا وہم ہوگا۔ بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’ہاں، وہ میرا وہم ہی ہو سکتا ہے۔‘‘

’’مجھے حیرت ہے وجدان!‘‘ وہ ایک دم گہری سنجیدگی سے بولی ’’تم جیسا پراسرار اور عجوبہ شخص بھی وہم میں مبتلا ہو سکتا ہے۔‘‘

میں سمجھ گیا، وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کر رہی تھی ’’تم نے مجھ میں ایسی کون سی پراسرار اور عجیب بات دیکھی ہے؟‘‘ جب بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں نے اسی سے استفسار کر ڈالا۔

وہ تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی۔ میرے استفسار نے اس کے ضبط کے بند کھول دیے۔ اس نے جیپ کے بیک ویو مرر میں جو حیرت ناک مناظر دیکھے تھے انہیں دہرایا تھا پھر ایک لمحے کو سانس لینے کے لیے رکی اور پوچھا ’’میں ان واقعات کو کیا سمجھوں وجدان! اب یہ نہ کہہ دینا کہ وہ سب میری نظر کا دھوکا تھا!‘‘

’’وہ تمہاری نظر کا دھوکا نہیں تھا صدف۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ’’چلو، آرام سے گاڑی میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔‘‘

ہم دونوں، خاموش کھڑی نسان پٹرول میں آ کر بیٹھ گئے۔

میں نے مختصر مگر جامع الفاظ میں صدف کو شاؤلن ٹیمپل میں اپنی مارشل آرٹس کی تربیت کے بارے میں بتایا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری کہانی سنتی رہی۔ وہ خود بھی مارشل آرٹس کی ماہر تھی اس لیے بھی یہ موضوع اسے زیادہ کشش کر رہا تھا۔ دنیا کا ایک کوئی اسٹوڈنٹ یا ماسٹر نہیں، جو شاؤلن ٹیمپل سے ناواقف ہو، ہر مارشل آرٹسٹ کا یہ خواب ہے کہ اسے شاؤلن ٹیمپل نامی اس سب سے بڑی مستند تربیت گاہ سے فیض اٹھانے کا موقع ملے لیکن یہ سعادت خوش قسمتی ہی سے ہاتھ آتی ہے۔

’’تو تم نے چینی کنگ فو شاؤلن ٹیمپل سے سیکھا ہے!‘‘ وہ حیرت بھری آواز میں بولی ’’جبھی میں کہوں، تمہاری موومنٹس میں اتنی پرفیکشن کیوں ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’شاؤلن ٹیمپل میں سکھایا جانے والا کنگ فو (Kung-Fu) درحقیقت شاؤلن کنگ فو (Shaolin Kung-Fu) کہلاتا ہے جس کی بنیاد جانوروں کی لڑائی کے انداز پر رکھی گئی ہے۔ شاؤلن کنگ فو کی تربیت صرف قابلِ اعتماد اور اہل اسٹوڈنٹ ہی کو دی جاتی ہے۔‘‘

’’تم تو وہاں بھی اپنے ماسٹرز کی آنکھ کا تارا رہے ہو!‘‘ صدف نے کہا ’’تمہاری داستان کے خلاصے سے تو میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’تم ایسا نتیجہ اخذ کرنے میں حق بہ جانب ہو۔ شاؤلن ٹیمپل میں مجھے دو وجوہات کی بنا پر بہت اہمیت دی گئی تھی اور ازاں بعد میں نے خود کو اس سلوک کا حق دار بھی ثابت کیا۔‘‘

’’اور وہ دو وجوہ کون سی ہیں؟‘‘

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ’’پہلی وجہ تو یہ تھی کہ میرے استادِ محترم مہاراج وانگ ونگ پائے نے مجھے بنکاک سے شاؤلن ٹیمپل بھیجنے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ میں بنکاک میں مہاراج کے جمنازیم میں رہتے ہوئے عام باکسنگ، کک باکسنگ اور موئے تھائی باکسنگ کی تربیت لے چکا تھا۔ موئے تھائی باکسنگ تھائی لینڈ کا معروف مارشل آرٹ ہے۔ مہاراج نے مجھ میں کوئی خاص بات نوٹ کی اور فیصلہ کیا کہ وہ مجھے اپنے استاد ماسٹر ہینگ پائی کے پاس شاؤلن ٹیمپل بھیجیں گے۔ ہینگ پائی اس وقت شاؤلن ٹیمپل کا سب سے بڑا ماسٹر تھا اور وہاں انتظام و انصرام اسی کے اشارے پر چلتا تھا۔ اسی حوالے سے وہ میرا دادا استاد تھا۔‘‘

میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ''اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے شاؤلن ٹیمپل میں پہنچ کر ماسٹرز کو اپنے فن کی سچائی سے متاثر کر لیا تھا۔ پہلے مجھے عام چھوٹے ماسٹرز کے حوالے کیا گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ماسٹر ہینگ پاکی براہِ راست مجھے تربیت دینے لگا۔ میں نے اسی گرینڈ ماسٹر سے کنگ فو، یوگا اور چی کی خصوصی تربیت حاصل کی۔'' میں اچانک خاموش ہو گیا پھر دل گرفتہ لہجے میں کہا ''افسوس کہ میرے استاد مہاراج وانگ ونگ یائے اور دادا استاد ماسٹر ہینگ پاکی اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے۔ میں اپنے حقیقی والدین سے تو بچپن ہی میں محروم ہو گیا تھا، اب روحانی والدین کا سایہ بھی میرے سر پر نہیں رہا۔''

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ ان افسردہ لمحات میں اس نے میرے نجی معاملات کو نہیں چھیڑا اور سنجیدگی سے بولی ''پراسرار قوت چی کے بارے میں مجھے کچھ تفصیل بتاؤ۔ میں نے جیپ کے حوالے سے تھوڑی دیر پہلے چی کا جو مظاہرہ دیکھا ہے وہ ناقابلِ یقین اور سنسنی خیز ہے۔''

''مجھے بھی اس پر حیرت ہے۔'' میں نے کہا ''شاید چی کی ایڈوانس مشقوں کی بدولت میں اس کی کوئی ارفع شکل حاصل کر رہا ہوں۔ چھوٹے موٹے تجربات تو پہلے بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن آج تو حد ہی ہو گئی۔''

''کیا تم کنگ فو کے ساتھ ساتھ مجھے چی کی تربیت بھی دو گے؟''

صدف کے اس سوال نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا اور بے ساختہ میرے لبوں سے پھسل گیا ''اسے بھی بہت شوق تھا یہ سب کچھ سیکھنے کا!''

''تم کس کا ذکر کر رہے ہو وجدان؟'' وہ سنجیدگی سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو سنبھل کر جلدی سے کہا ''میں کسی خاص شخص کا ذکر نہیں کر رہا۔ ''چی'' ایسا دلچسپ موضوع ہے کہ ہر کوئی اسے حاصل کرنے کا خواہاں نظر آتا ہے۔''

''تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی ''تمہاری آنکھیں، زبان کا ساتھ نہیں دے رہیں۔ تم یقیناً کسی خاص ہستی کا ذکر کرنے والے تھے۔ ایسی ہستی جو تمہاری زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہو۔ اب تم بات کو بدل کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

وہ صفر فی صد بھی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ میں بے خیالی م ساحل کا ذکر کرنے والا تھا۔ احتیاط کے باوجود بھی اس دفتر میں ساحل کا تذکرہ کر بیٹھا تھا۔ ساحل کو بھی مارشل آرٹس او چی کی تربیت کا بہت شوق تھا بلکہ میں نے اس کی ٹریننگ ب شروع کر دی تھی۔ کراچی میں، امتیاز علی کے فلیٹ میں قیا کے دوران میں ایک روز علی الصباح ہل پارک میں، میں اسے اس سلسلے میں ایک طویل اور معلومات سے بھرپور لیکچر تھا۔ چی کی بیداری کے سلسلے میں ابتدائی مشق اپنی نگرانی م کرائی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں اسے مزید کچھ سکھاتا، وقت کے دستِ ظلم نے اسے مجھ سے جدا کر دیا۔ میں ساحل کی تلاش میں دن درات انگاروں پر لوٹ رہا تھا اور اب میری منزل سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ طلوعِ آفتاب ساتھ ہی مجھے سید پور روانہ ہو جانا تھا...... اور رکھاں والی پور سے چند منٹ کی دوری پر تھا۔ جہاں میری روح، میرا جانِ تمنا ساحل ایک جابر شخص کے قبضے میں تھی۔

میں بے ساختہ ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اندرون اور بیرون کا معاملہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ ہم بیرو چیزوں کے بارے میں ساختہ سوچتے ہیں۔ ہماری سوچ ارادے کا دخل ہوتا ہے اور یہ ایک خود ساختہ عمل ہوتا ہے اندرونی معاملات میں ہمیں اپنی سوچ اور عمل پر اختیار ن ہوتا۔ ہم بے ساختہ حرکت کرتے ہیں، اس کے لیے نہ باندھنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ ہی ارادہ کرنے کی۔

ساحل میرے اندرون کے ایک ایک گوشے پر قابض تھی، اس کا احساس میری سانس میں بسا رہتا تھا اور میرا اس کے بارے میں مہکتا تھا لیکن میں بھی ایک انسان تھا انسان اپنے فطری و جبلی مطالبات سے مجبور ہوتا ہے۔ تقاضے نظر انداز کرنے کے لیے حد درجہ بے حسی کی ضرورت ہوتی ہے اور میں ایک درجہ بھی بے حس نہیں تھا۔ میرے حواس خمسہ فعال تھے۔ میں چھونے والی شے کو چھونا اور دیکھنے چیز کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنی قوتِ شامہ کو آزمانا چاہتا تھا قوتِ گویائی اور قوتِ ذائقہ کو پرکھنا برتنا چاہتا تھا اور سب ''چاہتا'' کے لیے ساحل کی ضرورت تھی۔ مجسم ساحل میرے اختیار میں ہو! ہجر کے کرب اور وصل کے سرور وہی لوگ آشنا ہیں جو کبھی ان کیفیات سے گزرے ہوں خوش نما شراروں کو کسی لذیذ شے کی طرح نگلنا پڑتا ہے احتیاط اور ظرف کے ساتھ کہ نہ آپ کی زبان پر آبلہ پڑے اور نہ ہی چہرے سے کسی تکلیف کا اظہار ہو!

صدف ٹکٹکی باندھے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی

میں نے اس کو مطمئن کرنے کی خاطر کہا ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ کے مطالب نہ نکالو۔''

''تم بتانا نہیں چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی۔'' وہ عقل مندی سے موضوع بدلتے ہوئے بولی ''خیر، تم ''چی'' کے بارے میں مجھے کچھ بتانے جا رہے تھے۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ میری بات سے قطعاً مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور اسے چی کونگ (Qi Gong) کے بارے میں تفصیلاً بتانے لگا۔ وہ یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئی کہ چی کی مدد سے کسی بھاری بھرکم شے کو پلک جھپکتے میں اٹھایا جا سکتا ہے، اپنی گردن پر تلوار کا وار سہہ کر زندہ رہا جا سکتا ہے، نیزے کی انی پر شہ رگ ٹکا کر اپنے جسم کو ہوا میں بلند کیا جا سکتا ہے۔ ایک عام سوئی کو دو انگلیوں کی چٹکی میں دبوچ کر اگر اسے کسی چیز پر پھینکا جائے تو وہ تباہ و برباد کر سکتی ہے، یخ بستہ پانی میں گھنٹوں بیٹھا جا سکتا ہے، لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ کو مسکراتے ہوئے پکڑا جا سکتا ہے اور سیکڑوں قسم کی بیماریوں کا شافی علاج کیا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ تمام مظاہرے شاؤلن ٹیمپل میں دیکھے تھے لیکن اس کے لیے ''چی'' پر مکمل عبور حاصل ہونا ضروری ہے۔

بات بہت سادہ اور موثر ہے۔ ناف کے عقب میں، ریڑھ کی ہڈی کے نزدیک موجود اس خوابیدہ قوت کو بیدار کرنا اتنا مشکل کام نہیں جتنا اس پر قابو رکھنا اہم ہے۔ قدرت نے جانوروں کے پیٹ کے اندر بڑے اسرار رکھے ہیں۔ اس تھیلے میں پوشیدہ قوتیں بہت ہی کیف آور، خواب ناک، لذت آفریں اور حیات بخش ہوتی ہیں۔ یہ یوز اور مس یوز (Use & Miss Use) کا کھیل ہے۔ درست استعمال کرنے والے فائدہ اٹھاتے اور فیض پہنچاتے ہیں جب کہ غلط کاروں کو اپنے کرتوتوں کے سبب ذلت اور رسوائی اٹھانا پڑتی ہے۔ وہ مخلوقِ خدا کو جو نقصان پہنچاتے ہیں، وہ الگ ہیں۔

کہنے اور سننے کا سلسلہ جاری تھا کہ کوٹھی کے باہر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔

''لگتا ہے، یہ گاڑی ہمارے لیے آئی ہے۔'' صدف نے خیال آرائی کی۔

مذکورہ گاڑی ... کوٹھی کے گیٹ کے قریب آ کر رک گئی۔ صدف کا خیال درست ثابت ہوا۔ میں نے ادھ کھلے گیٹ میں سے فرید پاشا کی ٹویوٹا کرولا کو پہچان لیا۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر تحسین کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس نے اپنی نو بیاہتا بیوی کو کوٹھی پر چھوڑ کر ہماری طرف آنے کا قصد کیا تھا تو یہ بڑی ہمت کی بات تھی۔ میں اللہ دتا کی آمد کی توقع کر رہا تھا۔

تحسین اور ناہید کی جوڑی دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا تھا۔ جو بھی انہیں دیکھتا اور اسے بتایا جاتا کہ وہ میاں بیوی ہیں تو وہ ضرور حیران ہوتا۔ ناہید دراز قامت اور خوش شکل عورت تھی۔ قدرے فربہ جسم اور سانولی رنگت نے اسے جاذبِ نظر اور پرکشش بنا دیا تھا جب کہ تحسین میں مردانہ وجاہت والی کوئی بات دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ پستہ قامت اور بس ایویں سی صورت کا مالک تھا۔ سب چہرے اسی خالق کے بنائے ہوئے ہیں، کسی کم رُو کی تحقیر نہیں کرنا چاہیے تاہم میری نظر میں وہ ایک بے میل جوڑا تھا۔

تحسین ٹویوٹا کو کوٹھی کے باہر چھوڑ کر اندر آ گیا۔ اس دوران میں ہم دونوں بھی نسان پٹرول سے باہر آ گئے تھے۔ تحسین نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا ''وجدان صاحب! جیپ میں کیا خرابی پیدا ہو گئی؟''

''اگر میں فالٹ کے بارے میں کچھ جانتا تو ممکن ہے، اسے ٹھیک بھی کر لیتا۔'' میں نے کہا ''اس معاملے میں مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

وہ اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے بولا ''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس کے انجن کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کرتا ہوں۔ فلم لائن میں آنے سے پہلے میں نے بہت دھکے کھائے ہیں۔ میں مختلف کام کرتا رہا جس میں موٹر مکینکی بھی شامل ہے۔''

''اگر تم ٹرائی کرنا چاہتے ہو تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا ''چابی اگنیشن میں لگی ہے۔ تم کوشش کر کے دیکھ لو۔ جب تک ہم ٹویوٹا میں جا کر بیٹھتے ہیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا ''اسے ہوا کیا تھا؟''

''انجن اچانک بند ہو گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''کوٹھی میں اندر آنے کے بعد یا باہر کہیں؟''

میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہہ دیا ''کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ کر۔ میں نے دھکیل کر اسے اندر پہنچایا ہے۔''

میں صورتِ حال سے آگاہ کر کے اپنے لیے سوالات کے دروازے نہیں کھولنا چاہتا تھا۔

تحسین نے عدسہ نما گلاسز والا چشمہ ایک مرتبہ پھر درست کیا اور نسان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں نے صدف کی معیت میں کرولا کی جانب قدم بڑھا دیے۔ چاند اب مزید کھل کر سامنے آ گیا تھا اور اس کی رومان پرور چاندنی میں ہر شے چمکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس خواب ناک ماحول میں ٹھنڈک کو سانس کے ذریعے اپنے اندر اتارتے ہوئے ہم

ابھی باہر کھڑی گاڑی تک پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ عقب میں نسان کے اسٹارٹ ہونے کی مخصوص آواز ابھری۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ جیپ واقعی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ صدف نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ''یہ تو واقعی موٹر مکینک نکلا۔ اس نے اپنی مہارت سے جیپ کا انجن بیدار کر دیا۔''

ہم چلتے چلتے رک چکے تھے۔ تحسین جیپ سے نکل کر ہمارے پاس آیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کس گاڑی میں چلیں گے؟ کرولا یا پٹرول؟''

''تم نے جیپ کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' میں نے حیرت آمیز لہجے میں کہا ''اس میں کون سی ایسی خرابی پیدا ہو گئی تھی جو تم نے پلک جھپکتے میں ٹھیک کر دی؟''

وہ موٹی تہ والے گلاسز کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا ''یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک کھڑی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کرنے کی شریفانہ کوشش کی اور اس نے کسی فرماں بردار بیوی کی طرح فوراً بات مان لی!''

اس کے بیان پر مجھے حیرت ہوئی تاہم میں نے اپنی سوچ کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس سے پوچھا ''تمہاری شادی کو تو ابھی صرف ایک مہینا ہوا ہے۔ یہ فرماں بردار اور نافرمان بیویوں کا تجربہ تمہیں کہاں سے ہو گیا؟''

وہ ایک دم جھینپ گیا پھر کھسیانا ہو کر بولا ''وہ جی تجربہ تو نہیں۔ میں نے تو بس ایسے ہی ایک سنی سنائی بات کہہ دی تھی۔''

''تم نہیں جانتے کہ سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا ''اس سے اکثر دھوکا ہو جاتا ہے اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔''

میں نے محض اس سے تفریح لینے کی غرض سے وہ انداز اپنایا تھا۔ فرید پاشا کا دوست ہونے کے ناتے وہ مجھ سے اس قدر مرعوب تھا کہ فوراً عاجزی سے بولا ''میں آئندہ خیال رکھوں گا جناب!''

میں نے کہا ''جب تمہاری شادی کو دو چار سال گزر جائیں اور آئندہ کبھی ہماری ملاقات ہو تو پھر میں تم سے بیویوں کے تجربات کے بارے میں سوال کروں گا۔ تم اس وقت جو بھی جواب دو گے، اس میں وزن ہو گا۔ بیوی اور شوہر کے بارے میں تجربہ کیے بغیر جو بھی رائے دی جائے گی، اس کی صحت مشکوک ہو گی۔''

وہ خاموشی سے اثباتی انداز میں سر کو جھٹکا دیتے ہوئے بولا ''آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ہم واپس کس گاڑی میں جائیں گے؟''

میں نے کہا ''نسان پٹرول کو تم ڈرائیو کرو... ہم کرولا میں جائیں گے لیکن اس سے پہلے تسلی کر لو کہ جیپ راستے میں تمہیں پریشان نہیں کرے گی۔ اگر یہ پھر کسی مقام پر بند ہو گئی تو ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ تم یا تو رات کا باقی حصہ اپنی بیوی سے دور اسی جیپ کے اندر گزارو گے یا پھر تمہیں دھکا لگا کر اسے گلبرگ تھری تک پہنچانا ہو گا۔ اگر تم کسی طرح دھکے والے مشن میں کامیاب ہو بھی گئے جو کہ ایک ناممکن کام ہے، تو پھر بھی تمہاری رات کالی ہو جائے گی۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔''

''میں نے فیصلہ کر لیا جناب۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں بولا ''میں اسی جیپ میں جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے، یہ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں کرے گی۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے کہا ''مجھے تو ایک بات کی حیرت ہے کہ آپ...... آپ......''

اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا ''تم رک کیوں گئے۔ کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''آپ میری بات کا برا تو نہیں منائیں گے!''

''بالکل نہیں، آئندہ پانچ منٹ میں تم جو کچھ بھی کہو گے میں اس پر ناراض نہیں ہوں گا۔'' میں نے فرید پاشا کے اسسٹنٹ سے مزید تفریح لیتے ہوئے کہا ''اس کے بعد کی میں گارنٹی نہیں لیتا ہوں اور...... تمہارے وہ پانچ منٹ شروع ہوتے ہیں۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے ایک چٹکی بجائی۔

صدف میری شرارت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس لیے وہ خاموش کھڑی تھی۔ تحسین نے محدود مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دی ''میں اس بات پر حیران ہوں وجدان صاحب کہ جیپ تو بالکل ٹھیک ہے۔ کہیں آپ نے میرا مذاق اڑانے کے لیے تو نہیں بلا لیا!''

مجھے اس کی سوچ پر ہنسی آ گئی لیکن اس ہنسی کے پہلو بہ پہلو ایک تشویش بھی مجھے لاحق ہو گئی۔ تحسین اگر یہ کہہ رہا تھا کہ جیپ میں کوئی خرابی موجود نہیں تو وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا پھر میری ڈرائیونگ کے دوران میں وہ اچانک بند کیوں ہو گئی تھی؟ یہ ایک غور طلب اور سنسنی خیز سوال تھا...... اس سنسنی خیزی کو بے پناہ تقویت اس واقعے سے ملتی تھی کہ پیش دستی میں گاڑی کو دھکیل کر کوٹھی تک لے آیا تھا۔ اس احساس کے ساتھ کہ کوئی دوسرا ابھی میرے قدم بہ قدم جیپ کو پش دے رہا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، مجھے نظر نہیں آیا تھا تاہم میں اس احساس کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے محسوس کیا تھا جیسے کوئی شخص میرے پیچھے آ رہا ہو۔ صدف نے اسے وہم قرار دیا تھا اور میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے

اس کی تائید بھی کر دی تھی لیکن میرے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا...... وجدان! یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ کیا چکر ہے، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب کوئی بات واضح نہ ہو تو انسان کا ذہن الجھتا ہے اور میں واقعی اس وقت بہت الجھا ہوا تھا اور یہ الجھن اس وقت تک برقرار رہتی جب تک وہ نادیدہ شخص میرے سامنے نہ آ جاتا۔ یا نہیں، وہ کوئی شخص تھا یا کوئی نادیدہ قوت تھی یا پھر جن بھوت کی کوئی کارفرمائی؟ فی الحال، میں اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

تحسین اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد میرے جواب کا منتظر تھا اور اسے تسلی بخش جواب دینا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس نے واقعی ایک احمقانہ بات کی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''تحسین! تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔ اوّل تو میرا تم سے کوئی مذاق نہیں اس لیے میں ایسی کوئی حرکت نہیں......''

''یہ تو میں جانتا ہوں۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''اسی لیے تو میں پریشان ہو رہا ہوں۔''

''تمہاری پریشانی خود ساختہ ہے۔'' میں نے کہا ''اگر تم بیچ میں مداخلت نہ کرو تو میں اپنی بات پوری کر لوں!''

''جی، جی۔ آپ کہیں۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔''

میں نے کہا ''تمہاری تسلی کے لیے اتنا ہی بتا دینا کافی ہو گا تو میں نے براہِ راست تم سے یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے فون پر اللہ دتا کو اپنی مجبوری بتائی تھی۔ تم یا تو اس کے کہنے پر آئے یا پھر اپنی مرضی سے اس لیے تمہارا خیال وہم سے زیادہ کچھ نہیں۔ بات آئی سمجھ میں؟''

''سوری سر۔'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا ''دراصل ٹھیک ٹھاک جیپ نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔''

''پھر تم اسی جیپ میں جا کر بیٹھو جو ایسے غلط قسم کے خیالات تمہارے ذہن میں پیدا کر رہی ہے۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا ''اب ہمیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔''

کوٹھی کو بند کرنے کے بعد جب ہم وہاں سے رخصت ہونے لگے تو اچانک میرے ذہن میں ایک خیال نے سر ابھارا۔ میں نے تحسین کو اپنے پاس بلایا اور استفسار کیا۔ ''کیا تم لاہور ہی کے رہنے والے ہو؟''

''جی ہاں، باپ دادا کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا ''میں بھی یہیں کی پیدائش ہوں۔''

''پھر تو تم اس شہر سے اچھی طرح واقف ہو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''چپے چپے سے واقف ہوں جناب۔'' اس نے کہا ''بے کاری اور بے روزگاری کے دنوں میں، میں نے بہت سفر کیا ہے۔ اردو کا بھی انگریزی کا بھی!''

میں نے پوچھا ''یہ انگریزی کا سفر کیا ہوتا ہے بھئی؟''

''وجدان صاحب! میں دراصل ایس یو ڈبل ایف ای آر، والے (Suffer) کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''بہت خوب۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''میں گلبرگ تھری جانے سے پہلے ذرا مسلم ٹاؤن کی طرف ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک کوٹھی کی جھلک دیکھنا ہے۔''

یہ خیال اچانک ہی میرے ذہن میں چمکا تھا۔ آج شام سے اب تک میں کسی طرح خان محمد منشا کے چمچوں سے نبرد آزما رہا تھا۔ اتفاق سے گینڈا نما قادر بخش نے اپنے باس منشا کا پتا اگل دیا تھا لہٰذا میں نے سوچا، کیوں نہ اس نئے دشمن کا ٹھکانا بھی دیکھ لوں۔ کسی وقت بھی ان معلومات کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔

تحسین نے پوچھا ''آپ مسلم ٹاؤن میں کسی خاص جگہ جانا چاہتے ہیں یا بس ایسے ہی چکر لگانا ہے؟''

''میں نے بتایا ہے نا، مجھے ایک کوٹھی کی جھلک دیکھنا ہے۔''

''اس کوٹھی کا پتا کیا ہے؟''

میں نے تحسین کو منشا کی آب پارہ مارکیٹ والی کوٹھی کا پتا سمجھا دیا۔

وہ بولا ''میری معلومات کے مطابق یہ کوٹھی آب پارہ کے قریب ہی پڑے گی۔ وہاں تک جانے کے لیے ہمیں وحدت روڈ پکڑنا ہو گی۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا ''تم پہلی فرصت میں وحدت روڈ پکڑ لو۔ جب تم میری مطلوبہ کوٹھی کے سامنے پہنچو تو انڈی کیٹر دینا۔ ہم جیپ کے پیچھے تھوڑا فاصلہ رکھ کر چلیں گے۔ مجھے معلوم ہو جائے گا، وہ کوٹھی کون سی ہے اور کہاں پر واقع ہے۔ رکنا بالکل نہیں۔''

''ٹھیک ہے وجدان صاحب! میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔'' تحسین نے کہا ''اگر آپ کی بتائی ہوئی کوٹھی دائیں طرف پڑی تو میں دایاں اور بائیں طرف پڑی تو میں بایاں انڈی کیٹر دوں گا۔''

پھر ہم آگے پیچھے فاضلیہ کالونی والی پاشا کی کوٹھی سے روانہ ہو گئے۔ ہم شاہ جمال روڈ پر آنے کے بعد شادمان

کالونی کی طرف نہیں گئے بلکہ ہمارا رخ اس وقت فیروز پور روڈ کی جانب تھا۔ تحسین جیپ میں ہم سے آگے تھا اور ہم لگ بھگ سو گز کا فاصلہ رکھ کر اس کے عقب میں جا رہے تھے۔ گاڑیوں کی رفتار معتدل تھی۔

مین فیروز پور روڈ خاصی کشادہ سڑک ہے پھر وہ رات کا آخری پہر تھا اس لیے بھی وہ ہمیں خالی ملی۔ ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے کلیکسی اور رحمان پورہ سے گزرے پھر آئندہ سگنل سے تحسین نے جیپ کو دائیں طرف موڑ لیا۔ رات کے اس وقت سگنلز کی پابندی ضروری نہیں رہتی۔ اس لیے تمام سگنلز کو فری کر دیا جاتا ہے سرخ اور سبز بتیاں لمبی اوڑھ کر سو جاتی ہیں۔ صرف پیلی لائٹ نائٹ واچ مین کا کردار ادا کرتی ہے اور مسلسل جل بجھ میں مصروف رہتی ہے۔"

میں نے بھی تحسین کی تقلید میں کرولا کو دائیں جانب ٹرن کیا۔ اب ہم وحدت روڈ پر تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد آب پارہ مارکیٹ آ گئی پھر تحسین رہائشی علاقے میں گھس گیا۔ دو منٹ بعد اس کی گاڑی کا انڈی کیٹر اپنا فنکشن کرنے لگا۔ میں نے اس اشارے پر اپنی مطلوبہ کوٹھی کو دیکھ لیا۔ وہ ایک چھوٹی دو منزلہ سفید رنگ کی کوٹھی تھی۔ میں نے مذکورہ کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے نیم پلیٹ پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں کسی شمشاد علی ایڈووکیٹ کا نام لکھا تھا۔ پتا وہی تھا جو قادر بخش کی زبانی میری یادداشت میں محفوظ ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں منشا نامی اس شخص کی چالاکی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وکیل والی آڑ اس نے خوب لی تھی۔ یہ تو مجھے توقع تھی کہ کوٹھی کی نیم پلیٹ پر مجھے محمد منشا کا نام نظر نہیں آئے گا لیکن کسی "ایڈووکیٹ" کا بھی میں نے تصور نہیں کیا تھا!

چند گلیوں میں گھوم کر تحسین ہمیں نہر کے کنارے لے آیا پھر ایک جگہ اس نے جیپ روک دی۔ میں نے اس کے برابر کرولا روکی اور سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے پوچھا "وجدان صاحب! آپ کا مقصد پورا ہو گیا یا نہیں؟"

"تم نے اس کوٹھی کی بھرپور نشان دہی کر دی ہے۔" میں نے جواباً کہا "میں نے وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی ازبر کر لیا ہے۔ اب ہمیں فوری طور پر واپس چلنا چاہیے۔"

تحسین نے سفید کوٹھی اور اس کے مکین کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور بولا "ٹھیک ہے، آپ میرے پیچھے آئیں۔ اب ہم دوسرے راستے سے گھر جائیں گے جو شارٹ کٹ بھی ہے۔"

ایک مرتبہ پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے ہم نے فیروز پور روڈ کو عبور کیا پھر ایف سی کالج کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم تھوڑا آگے جا کر گلبرگ میں داخل ہو گئے۔ لاہور کے قلب سے گزرنے والی یہ نہر درحقیقت ایک برانچ کینال ہے جو ایک بڑی نہر اپر باری دو آب سے نکلتی ہے۔ یہ برانچ کینال لاہور میں شمال مشرق کی طرف سے داخل ہو کر جنوب مشرق کی سمت چلی جاتی ہے۔ اس کے اطراف میں، سڑک کے ساتھ ساتھ سرسبز و شاداب "زرِ ریز" کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس کے بعد صاحب ثروت افراد کا رہائشی علاقہ ہے۔ یہ نہر اور اس کے کناروں پر استادہ بلند و پست درخت ہوا سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے جنت نظیر مناظر تخلیق کرتے ہیں۔"

ہم آگے پیچھے سفر کرتے ہوئے فرید پاشا کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔

کوٹھی پر امن و امان کی صورت حال نے ہمارا استقبال کیا۔ مستعد سیکیورٹی گارڈ عمر دین اپنی ڈیوٹی پر مخصوص کیبن میں موجود تھا۔ اس نے ہمیں "سب ٹھیک ہے" کا سگنل دیا۔ ہم گاڑیوں کو گیراج میں پہنچا کر کوٹھی کے اندر آ گئے۔ اس وقت رات کے ساڑھے تین بجے تھے۔ ہمارے پاس ڈھائی تین گھنٹے کا وقت تھا۔ اسی دوران میں ہمیں نیند لینا تھی اور آرام کرنا تھا۔"

میں نے اللہ دتا سے پوچھا "زرگل سو گئی یا ابھی تک جاگ رہی ہے؟"

"صاحب جی! ان حالات میں سو کون سکتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا "وہ دونوں جاگ رہی ہیں۔"

میں نے تحسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تم اپنی بیوی کے پاس چلے جاؤ اور زرگل کو باہر بھیج دو۔ مجھے امید ہے، تمہیں مزید ڈسٹرب نہیں ہونا پڑے گا۔"

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کی۔ زرگل ہمارے پاس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اللہ دتا نے پوچھا "وجدان صاحب! اب تو چائے چلے گی نا؟"

میں نے کہا "رہنے دو۔ تم بھی تھوڑا آرام کر لو۔ کل کا پتا نہیں، کیا حالات پیش آئیں۔ تمہیں ہمارے ساتھ سید پور بھی جانا ہے۔ میں بھی ایک ہلکی سی نیند لینا چاہتا ہوں۔"

اللہ دتا سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگا تو اس نے کہا "آپ لوگ جہاں اور جس طرح چاہیں آرام کریں۔ دو بیڈ روم زیریں منزل پر بالکل تیار حالت میں خالی ہیں اور تیسرا بالائی منزل پر ہے۔ میں نے آپ کی غیر موجودگی میں کمرے کی ہر شے ضرورت کے مطابق سیٹ کر دی ہے۔"

اللہ دتا رخصت ہوا تو میں صدف اور زرگل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے باری باری انہیں دیکھا اور کہا "میں تو یہیں ڈرائنگ روم کے صوفے پر کمر سیدھی کر لوں گا۔ تم دونوں کا کیا ارادہ ہے؟"

"مجھے تو بالکل نیند نہیں آ رہی۔" صدف نے کہا "دراصل میں نے دن میں، یہاں سے جانے کے بعد ایک بھرپور نیند لے لی تھی۔"

زرگل نے کہا "وجدان! تم جانتے ہو، میں کس قسم کے حالات سے گزر رہی ہوں۔ میری نیند بھی اچاٹ ہو گئی ہے لہٰذا صبح تک جاگنا ہی ہو گا۔"

میں نے محسوس کیا وہ دونوں سونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھیں۔ ایک مرتبہ میں نے پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"نیند نہ بھی آئے پھر بھی آرام بہت ضروری ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میرا مشورہ تو یہ ہے کہ زیریں منزل والے دونوں بیڈ روم تم سنبھال لو۔ میں یہاں ڈرائنگ روم میں موجود ہوں۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس دفعہ انہوں نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اور یکے بعد دیگرے ڈرائنگ روم سے اٹھ کر کمروں کی طرف چلی گئیں۔ زرگل کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن میں اس وقت قصے کہانیوں کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کی داستان صبح بھی سنی جا سکتی تھی۔ کل کے حالات کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پوری طرح چاق و چوبند رہنے کے لیے تھوڑی نیند از حد ضروری تھی!

میں ایک آرام دہ صوفے پر دراز ہو گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگرچہ مجھے کوئی خاص نیند نہیں آ رہی تھی پھر بھی مجھے سونا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میرا دھیان فرید پاشا کی طرف چلا گیا۔ فرید ایک مخلص اور سچا جاں نثار دوست ثابت ہو رہا تھا لیکن میری وجہ سے وہ بے چارہ اچانک مشکلات میں گھر گیا تھا۔ زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے باپ کے انتقال میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن اس کی دیگر مصیبتیں میرے ہی سبب تھیں۔ سکندر اور رانا عظمت کی دشمنی ہی کیا کم تھی جو اب منشا کا سلسلہ بھی نکل آیا۔ یہ سلسلہ اگر دراز ہو جاتا تو بات چوہدری دلدار تک پہنچ سکتی تھی...... اور یہ سب کچھ میری موجودگی کی وجہ سے تھا۔ اگر میں پاشا کا مہمان نہ ہوتا تو وہ اس قسم کے سنگین حالات سے دوچار نہ ہوتا۔

اس تناظر میں سوچتے ہوئے میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ مجھے پہلی فرصت میں فرید پاشا سے دور ہو جانا چاہیے۔ دوستی دور رہ کر بھی تو نبھائی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کی دوستی، دوست کے لیے مشکلات کھڑی کر رہی ہو تو ایک فاصلہ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میں تو ایسا شخص تھا کہ ہر پل دشمن میرے ہم رکاب رہتے تھے۔ مجھے ان کی عادت ہو گئی تھی اور ان سے نمٹنے میں مجھے مزہ آتا تھا۔ میں کچھ دشمن پیشہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے ایک اٹل فیصلہ کر لیا کہ کل صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا اور ساحل کو حاصل کرنے کے بعد میں فرید پاشا سے فاصلہ بڑھا لوں گا۔ ویسے بھی یہ کوٹھی اب میرے لیے زیادہ محفوظ پناہ گاہ نہیں رہی تھی۔ شعیب غوری میرے اس ٹھکانے سے واقف ہو چکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ اس نے اب تک کوئی اوچھی حرکت نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں چوہدری نوازش علی کے بعد وہ شخص میرا دشمنِ اوّل تھا۔ میں اسے اور وہ مجھے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ شعیب یا اس کے بندے پنجے جھاڑ کر اس کوٹھی کا پیچھا کرتے، مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔

پھر مجھے شعیب غوری کی دھمکی یاد آ گئی۔ اس نے ٹیلی فون پر رابطے کے دوران میں بڑے سنگین الفاظ میں کہا تھا...... میں نے تمہاری فلاح و بہبود کے لیے ایک مستند اور کہنہ مشق قسائی سے رابطہ کر لیا ہے۔ وہ تمہاری ایسی نس بندی کرے گا کہ پھر تم ساری زندگی صف بندی کے قابل نہ رہو گے!

شعیب غوری کوئی غیر سنجیدہ یا کمزور شخص نہیں تھا کہ میں اس کی وارننگ کو کوئی خالی خولی دھمکی سمجھتا۔ وہ ایک فعال تنظیم "سی ایف کے" کا باس تھا اور یہودی لابی اس کی پیٹھ ٹھونک رہی تھی۔ وہ بہت ہی خطرناک اور سفاک شخص جو کسی لمحے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے اس کی سفاکی کا مظاہرہ اپنے تین ساتھیوں کی بھیانک موت کی صورت دیکھا تھا۔ شعیب غوری کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا خیال منشا کی طرف چلا گیا۔ کہیں یہ منشا ہی وہ قسائی تو نہیں جس کا ذکر غوری نے کیا تھا۔ شعیب کا لاہور میں نیٹ ورک نہیں تھا لیکن یہ عین ممکن تھا، اس نے میری سرکوبی کے لیے منشا جیسے شخص سے گٹھ جوڑ کر لیا ہو! سکندر اور منشا کا ربط ضبط بھی یہی ظاہر کرتا تھا کہ انہیں میری تلاش تھی۔ کیا یہ تلاش شعیب غوری کی فرمائش پر شروع کی گئی تھی؟

میں اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ منشا اور چوہدری دلدار کا تعلق چوہدری نوازش علی سے ہو گا۔ اب نظر آ رہا تھا کہ یہ سارا معاملہ

کھیل شعیب غوری کا بھی ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں فرید پاشا کو کسی وبال سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ میں فوری طور پر اس سے کنارہ کش ہو جاؤں، چاہے عارضی طور پر ہی سہی! اس کی کوٹھی کا راستہ میرے اتنے دشمنوں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ جاتی۔ انہی دشمنوں میں وہ بہروپیا بھی شامل تھا...... نقلی وجدان!

میں اس شخص کے بارے میں ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا کہ وہ میرا دشمن ہے یا دوست! اگرچہ ڈارلنگ والے باکس میں سے جو تہ شدہ پرچہ برآمد ہوا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ میرا خیر خواہ ہے۔ ڈارلنگ کے شر سے مجھے بچانے کے لیے اس نے اس بلی کو ذبح کر ڈالا تھا۔ اس کا خیال تھا، کوئی بدروح ڈارلنگ کے اندر گھس آئی تھی جو مجھے شدید قسم کا نقصان پہنچانے والی تھی۔ ماضی میں، بدی کی قوتوں سے مجھے قدم قدم پر واسطہ پڑتا رہا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا، تعاقب کا سلسلہ ابھی موقوف نہ ہوا ہو اور میری دشمن پراسرار قوتوں کی باقیات ڈارلنگ کو وسیلہ بنا کر مجھ تک پہنچ گئی ہو۔ ڈارلنگ نے متعدد مواقع پر میری مدد کی تھی اس لیے اس کی موت کا مجھے بہت زیادہ غم تھا۔ اگر بہروپیے وجدان کا کہا درست تھا تو پھر میں یہی کہوں گا کہ ڈارلنگ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے مجھے ایک مرتبہ پھر محفوظ کر دیا تھا۔ افسوس صرف اس بات کا تھا کہ میں ڈارلنگ کے لیے کچھ نہیں کر پایا تھا۔

پھر اس رات کا منظر میری نگاہ میں گھوم گیا جب میں نے اس کی اصلیت جاننے کے لیے اس پر تنویمی عمل کیا تھا اس تنویمی عمل میں جی کا بگھار بھی شامل تھا لیکن عین آخری لمحات میں، جب کہ میں ڈارلنگ کا راز پانے ہی والا تھا کہ فرید پاشا کی بیوی نائلہ کی دلخراش چیخ نے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔ میں انگلش فلم ''گولڈ مین'' کے ہیرو ڈینجر ڈیبولک سے مشابہ تین افراد سے نمٹنے کے لیے ہر شے کو فراموش کر کے نائلہ کی طرف دوڑ پڑا تھا۔

اگر اس وقت مجھے چند لمحات کی مہلت مل گئی ہوتی تو ممکن ہے میں ڈارلنگ کی اصلیت کو پا لیتا۔ وہ کسی بدی کی قوت کے زیر اثر تھی یا نیکی کی قوت اس کے اندر کارفرما تھی اس کا فیصلہ ہو جاتا۔ بہر حال، اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ ڈارلنگ ایک حیرت انگیز اور پراسرار بلی تھی۔ میں اپنی زندگی میں آنے والے اس کردار کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے دل و دماغ میں ایک محسن کی حیثیت سے نقش ہو کر رہ گئی تھی!

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ آواز سرگوشیانہ اور واضح تھی۔ میں نے بے اختیار آنکھیں کھول دیں اور ڈرائنگ روم میں نظر دوڑانے لگا۔ میری متلاشی نظر کو ناکامی ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی۔ کیا میری سماعت کو دھوکا ہوا تھا؟''

میں بے چین ہو گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ میں نے بڑے کھلے اور واضح الفاظ میں اپنا نام سنا تھا۔ کسی نے مجھے پکارا تھا لیکن یہاں کسی متنفس کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرنے سے پہلے ڈرائنگ روم کی لائٹ آف نہیں کی تھی۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ مجھے پکارنے والا آواز دے کر چھپ گیا ہو۔ میں نے اپنا نام سنتے ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔

میں تشویش ناک انداز میں بڑی سرعت سے سوچنے لگا۔ میری سماعت کو بار بار دھوکا کیوں ہو رہا تھا؟ فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے صحن میں بھی مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی ہمارے پیچھے آ رہا ہو۔ میں نے قدموں کی باقاعدہ آواز سنی تھی لیکن صدف نے اسے میرا وہم قرار دے کر بات ختم کر دی۔ اس سے قبل نسان پٹرول کو پش دیتے وقت بھی میں نے جو کچھ محسوس کیا، وہ ناقابل فہم اور حیرت انگیز تھا۔ تو کیا کوئی قوت میری ہم سفر بن چکی تھی۔ یہ قوت نیکی کی تھی یا بدی کی، اس کا فیصلہ کرنا ناممکن نہیں تھا کیوں کہ اس نے ابھی تک ذاتی طور پر مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی فائدہ! البتہ ایک بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی تھی کہ میرے ساتھ کوئی پراسرار معاملہ شروع ہو چکا تھا جسے میں فی الحال سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پراسراریت کے حوالے سے میرا دھیان ایک لمحے کے لیے بیلگری کی طرف بھی گیا جو پچھلے کئی روز سے غائب تھی۔ آخری خواب ناک ملاقات میں اس نے بڑے فخر سے دعویٰ کیا تھا کہ اب وہ کبھی بھی میری طرف نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی...... مجھے ہمالیہ کی ... میں اس کے مسکن تک جانا ہوگا اور ہر حال میں جانا ہوگا۔ یہ ممکن تھا، بیلگری نے اپنی کسی پراسرار کارروائی کا آغاز کر دیا ہو۔

بیلگری کی دو خواہشیں میں نے نوٹ کی تھیں۔ ایک ... حصول اور دوسرے مجھے ساحل سے دور رکھنا۔ وہ اپنے ... میں جزوی طور پر کامیاب رہی تھی۔ ساحل کا اغوا اور ... اے اسکیم کے بنگلے میں پیش آنے والے واقعات اسی سلسلے کی کڑیاں تھے۔ سرمہ بدن لیلیٰ کے جلو میں اس نے جو کا...

دکھائی، میں ابھی تک اس کے سحر میں تھا!
دیوار گیر کلاک نے صبح کے چار بجنے کا اعلان کیا تو میں ان نے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کے لیے خود کو ہدایات دینے لگا...... میں نہایت ہی پرسکون میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک سات بجے میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن میری اس نیند کے دوران میں اگر اس کوٹھی کی حدود میں کوئی غیر معمولی یا سنگین واقعہ پیش آنے کی توقع یا آثار نمودار ہوئے تو وقتِ مقررہ سے پہلے ہی میری آنکھ فوراً کھل جائے گی۔
آئندہ چند لمحوں میں، میں نیند کی مہربان آغوش میں سر رکھ چکا تھا۔

☆☆☆

عملی لوگ بہت کم خواب دیکھتے ہیں، انہیں عمل ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ تھک ہار کر سونے کے لیے اگر کچھ وقت میسر آتا ہے تو وہ ایسا بے خبر سوتے ہیں کہ پھر اگلے دن ہی کی خبر لاتے ہیں۔ میری ساری زندگی پریکٹیکل گزری تھی اس لیے مجھے بہت کم خواب دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے جو بھی خواب دیکھا وہ لایعنی اور بے معنی کبھی نہیں رہا۔
اس رات میں لگ بھگ چار بجے سویا تھا۔ یہ رات نہیں بلکہ صبح ہی تھی۔ میں نے صبح سات بجے تک سونے کے لیے ذہن کو ہدایت دی تھی لیکن ساڑھے پانچ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں پورے بدن سے پسینے میں نہایا ہوا ہوں۔ یہ مزید حیرت کی بات تھی۔ ایک ٹھنڈی ٹھار رات میں پسینا! ہدایت کے خلاف قبل از وقت آنکھ کھل جانا یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اس کوٹھی میں کوئی غیر معمولی واقعہ ہو چکا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔
پھر مجھے یاد آیا کہ میں ایک انوکھا خواب دیکھ رہا تھا کہ اچانک آنکھ کھل گئی۔ میں نے بہ آہستگی صوفہ چھوڑا اور ڈرائنگ روم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ہر شے معمول کے مطابق اور اپنی جگہ پر تھی۔ میں اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ محتاط قدموں سے چلتے ہوئے میں نے کوٹھی کے اندرونی حصے کو ہر طرف جھانک کر دیکھ لیا۔ ہر جانب امن و امان کی صورتِ حال تھی۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں سکون تھا۔ گیٹ پر چوکیدار عمر دین المعروف بہ سیکیورٹی گارڈ مستعد کھڑا تھا۔ جب سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا تو پھر میری آنکھ خلافِ معمول کیوں کھل گئی؟ کیا میرے دماغ نے مجھے دھوکا دیا تھا؟
یہ میرے لیے ایک ناقابلِ یقین بات تھی اس لیے میرا دھیان لامحالہ اس انوکھے خواب ہی کی طرف چلا گیا۔ واپس ڈرائنگ روم میں آیا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر خواب کے بارے میں سوچنے لگا۔ نیند کا اب سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے جو خواب دیکھا وہ اپنی نوعیت کا خواب تھا۔ میں نے خواب میں خود کو دیکھا یعنی اپنے علاوہ وہ ہو بہو میں ہی تھا۔ وجدان! میں اور وجدان ایک مختلف مناظر کے کردار بنے ہوئے تھے اور اس بات پر الجھن یا حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ میں خواب میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چونکا کہ جب وجدان میں ہوں تو پھر وجدان کیا معنی رکھتا ہے۔ میرے علاوہ کوئی اور وجدان کیسے ہے؟ اس قسم کا کوئی سوال یا اعتراض میرے ذہن میں نہیں ہوا۔ خواب کے دوران میں دوسرا وجدان اچانک میرے اندر داخل ہو کر میرے وجود کا حصہ گیا تو اسی لمحے آنکھ کھل گئی۔
مجھے اچھی طرح یاد ہے، خواب دیکھتے وقت ایک لمحے کے لیے مجھے نقلی وجدان کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ بہروپیا میرے خواب میں داخل نہیں ہوا لیکن اب میرا خیال اس کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے جب سنجیدگی سے اپنا تجزیہ کیا تو نتیجے پر پہنچا کہ پچھلے آٹھ دس گھنٹے میں اس بہروپیے کے حوالے سے جو واقعات پیش آ چکے تھے۔ شاید انہی کی خیالی بازگشت نے مجھے وہ خواب دکھا دیا تھا۔ میں نے ان تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔
اسی وقت ڈرائنگ روم کے نیم وا دروازے پر صدف کی صورت نظر آئی۔ وہ کسی بلی کی مانند دبے قدموں وہاں آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس سے کہا ”تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟“
”میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی۔“ وہ میرے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی، پوچھنے لگی ”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم میرے بیڈروم کے سامنے سے گزرے تھے؟“
”ہاں گزرا تھا۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟“
”دیکھا تو نہیں، بس یوں محسوس ہوا جیسے وہاں سے کوئی گزر رہا ہو!“
مجھے اس کے بیان پر شک ہوا۔ دیکھے بغیر وہ اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتی تھی کہ گزرنے والا میں ہی ہوں؟ میرے علاوہ بھی تو کوئی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔

”کیا تمہیں کوئی پراسرار شکتی حاصل ہو گئی ہے۔ جو تم بغیر دیکھے اتنا درست اندازہ لگا لیتی ہو؟“
”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ بات بناتے ہوئے بولی ”میں نے ایک اندازہ لگایا جو اتفاق سے سچ نکلا، اس میں کسی شکتی کا کوئی دخل نہیں، تم خواہ مخواہ کسی وہم میں مبتلا نہ ہو۔“
میں نے اس سلسلے میں صدف سے زیادہ جرح نہیں کی۔ پر مجھے یقین تھا کہ اس نے کسی نہ کسی طرح مجھے دیکھ لیا ہو گا اور اب یہ بات مجھ سے چھپا رہی تھی۔ میں نے سرسری انداز میں کہا۔
”آج تو وہم ڈے ہے۔ فاضلیہ کالونی والی کوٹھی میں مجھے وہم ہوا کہ ہمارے پیچھے بھی کوئی آ رہا ہے اور اب بھی تم مجھے کسی وہم میں مبتلا نہ ہونے کا مشورہ دے رہی ہو۔“
وہ اچانک بات بدلتے ہوئے بولی ”کیا تم کسی خاص کام سے اٹھے تھے؟“
”نہیں، کوئی خاص کام نہیں تھا۔“ میں نے کہا۔
”تم نے تھوڑی بہت نیند لے لی یا میری طرح ابھی تک جاگ رہے ہو؟“
”میں نے ڈیڑھ گھنٹے کی نیند لے لی ہے۔“ میں نے کہا۔
اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”اگر تمہارا چائے کا موڈ ہو تو میں بنا لاتی ہوں۔ میں تو اس وقت خواہش محسوس کر رہی ہوں۔ دراصل، میں بیڈ ٹی لینے کی عادی ہوں۔“
میں نے کہا ”اگر تمہیں خواہش ہو رہی ہے اور یہ تمہاری عادت بھی ہے تو تم ضرور چائے بنا کر پی لو۔ میرا تو اس وقت موڈ نہیں ہو رہا۔“
”اگر تم نہیں پی رہے ہو تو پھر کیا فائدہ۔“ وہ بے پروائی سے بولی ”میں نے سوچا تھا، اگر تم ساتھ دو تو پھر ہمت کی جا سکتی ہے۔“
میں نے کہا ”یہ ہمت کی نہیں بلکہ عادت کی بات ہے۔ میرے ساتھ دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم بیڈ ٹی کی عادی ہو تو تمہیں ضرور چائے لینا چاہیے۔“
”تمہیں فرق نہیں پڑتا ہو گا لیکن مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔“
”چائے پینے سے یا نہ پینے سے؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔
”تمہارے ساتھ دینے یا نہ دینے سے۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے دھڑک انداز میں بولی۔

انکا
دو حصے مکمل
قیمت فی حصہ -/60 روپے
ڈاک خرچ -/23 روپے
اقابلا
دو حصے مکمل
قیمت فی حصہ -/60 روپے
ڈاک خرچ -/23 روپے
غلام روحیں
مکمل ناول
قیمت -/40 روپے
ڈاک خرچ -/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

اس کے انداز نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ میں نے پوچھا "کیا ایسی ہی بات ہے؟"

"بالکل ایسی ہی بات ہے!" وہ قطعیت سے بولی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور کہا "میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

ہمارے درمیان بڑے مبہم انداز میں بات چیت ہوئی تھی لیکن صدف کے تیور مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہے تھے اور اسی دوری میں فرید پاشا و منہاس باقر کے کہے ہوئے الفاظ کی بازگشت بھی شامل تھی۔ ان دو مردم شناس افراد نے فتویٰ دیا تھا کہ صدف آگے چل کر میری زندگی کا ایک حصہ بن جائے گی۔ ان حضرات کی پیش گوئی کے پورا ہونے کے آثار دکھائی دینا شروع ہو گئے تھے۔

صدف بلا کی پُراعتماد اور بے باک لڑکی تھی۔ اسے کوئی بات کہنے میں دریغ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہ اس کی مارشل آرٹس کی ٹریننگ کا نتیجہ تھا۔ سخت اور مشقت دار ایکسر سائزز نے اس کی نسوانیت میں قدرے کمی کر کے اس کے اندر مردانیت کا سا انداز پیدا کر دیا تھا۔ وہ بڑے دھڑلے سے بات کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ ڈرائنگ روم میں نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی ٹرے بھی موجود تھی جس میں چائے کی دو پیالیاں رکھی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے ٹرے کو میز پر میرے سامنے رکھا اور ایک پیالی اٹھالی۔ مطلب یہی تھا کہ دوسری پیالی میرے لیے ہے۔

"میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا۔" میں نے چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے اس وقت چائے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ اگر میں نے یہ پیالی معدے کے اندر اتار لی تو مجھے فوراً نیند آنا شروع ہو جائے گی۔ چائے اور کافی میرے لیے کسی اپی ٹائزر (Appetizer) یا سلیپنگ پلز (Sleeping Pills) سے کم نہیں ہے۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی "میں اتنی محنت سے تیار کر کے لائی ہوں۔ اپنے معمول کو ایک دن کے لیے توڑ دو گے تو کون سی قیامت آ جائے گی؟"

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ واقعی اگر میں ایک روز بیڈ ٹی لے لیتا تو اس سے کسی قسم کی قیامتِ صغریٰ یا کبریٰ نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے کندھے اچکائے اور میز پر رکھی ٹرے میں سے چائے اٹھا لی۔

"شکریہ وجدان۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "تم نے میرا مان رکھ لیا۔"

میں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

صدف نے استفسار کیا "وجدان! ویسے تمہارا روز کا معمول ہے۔ تم صبح اٹھ کر، ناشتے سے پہلے کیا کرتے ہو؟"

"میں علی الصباح اٹھتا ہوں اور سب سے پہلے یوگا کی چند مشقیں کرتا ہوں جن میں جی کی ایڈوانس مشقیں بھی شامل ہیں۔" میں نے بتایا "اس کے تھوڑی دیر بعد ناشتا کرتا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولی "جی کے حوالے سے یاد آیا کہ جب ہم فاضلیہ کالونی والی کوٹھی میں تھے اور میں نے اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے تمہاری راہ نمائی والی بات کی تھی تو تم نے بے ساختہ چونک کر کہا تھا...... اسے بھی یہ سب کچھ سیکھنے کا شوق تھا۔ میں نے جب "اسے" کے بارے میں پوچھا تو تم نے مجھے ٹہلانے کی کوشش کی۔ اس وقت تو میں نے تم پر زیادہ زور نہیں دیا لیکن اب ضرور پوچھوں گی، وہ کون ہے اور اب کہاں ہے؟" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی "تمہارے لہجے کی اداسی نے مجھے اتنا تو بتا دیا ہے کہ وہ ہستی اب تمہارے ساتھ نہیں۔ کیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے جدا ہو گئی ہے یا......"

"صدف!" اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

میری آواز اچھی خاصی بلند تھی اور اس میں ایک خاص قسم کا جارحانہ پن پایا جاتا تھا، اسے دیوانگی بھی کہا جا سکتا ہے۔ صدف نے بات کے اختتام پر مؤنث کا صیغہ استعمال کر کے یہ تو ثابت کر دیا تھا کہ وہ کسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہی ہے لیکن اس کے الفاظ "ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تم سے جدا" نے میرے اندرون کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور غیر ارادی طور پر میں دیوانگی کے سے انداز میں غرایا تھا۔ صدف کو اتنے جذباتی اور وحشیانہ انداز میں پکار کر میں نے اس کے خیال پر مہرِ ثبوت بھی لگا دی تھی۔

وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ندامت آمیز لہجے میں بولی "وجدان سوری! خدانا خواستہ، میں تمہیں کسی جذباتی یا روحانی صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بس ایک بات روانی میں میری زبان سے پھسل گئی۔ آئی ایم رئیلی سوری!"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور دوبارہ چائے کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

صدف نے پھر اس سلسلے میں کوئی مزید کرید نہیں کی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس ہستی سے میرا کوئی جذباتی تعلق ہے، جس نے مجھے بے اختیار کر دیا۔ صدف نے حالانکہ ایک عام سی بات

تھی لیکن ساحل کا معاملہ میرے لیے اتنا نازک تھا کہ میں نے اسے خاص لیا اور بے ساختہ ردِعمل کا اظہار کر دیا۔ میں بھولے سے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ ساحل مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئی۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...... الفاظ بہت ہی سنگین تھے اور اپنے اندر موت کی سفاکی لیے ہوئے تھے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے، کوئی ذی روح اس سے انکار نہیں کر سکتا اور ہر نفس کو اس کا ذائقہ چکھنا ہے لیکن اپنی عزیز ترین ہستی کی موت کا تصور یا ذکر کس طرح قلب و روح پر آبلے ڈال دیتا ہے اس بات کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جس نے کسی کو چاہا ہو، کسی سے محبت کی ہو۔ ساحل میری چاہت تھی، میری محبت تھی۔ میں نے اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ خیال کی تنہائیوں اور وقت کی کٹھنائیوں سے گزر کر اس سے محبت کی تھی۔

میں اس کی ابدی جدائی کا تصور کیونکر کر سکتا تھا۔ میں تو اس کی عارضی اور وقتی جدائی میں آبلہ پا اس کے سراغ کی جانب محوِ سفر تھا۔

ہمارے درمیان اچانک خاموشی نے ایک دبیز چادر تان دی۔ صدف منہ سے بولی اور نہ ہی میں نے زبان سے ایک لفظ ادا کیا۔ ہم اپنے اپنے خیالوں میں گم سر جھکائے وقفے وقفے سے چائے کی تلخی شیرینی سے اپنے لب سینکتے رہے اور تصور میں اپنے ٹارگٹ کو دیکھتے رہے۔

چھ اور سات بجے کے درمیان گھر کے دیگر افراد بھی یکے بعد دیگرے بیدار ہو گئے۔ موسم کی مناسبت سے سات بجے کے وقت کو علی الصباح کہا جا سکتا تھا۔ ساڑھے سات بجے ہم سب ناشتے کی میز پر تھے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں زرگل کو لے کر ایک کمرے میں بیٹھ گیا۔ ابھی تک اس سے کھل کر بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مصیبت زدہ پشتون دوشیزہ مجھے اپنی طویل داستان سنانا چاہتی تھی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا، ہمیں جتنی جلدی ممکن ہو، وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ فشا کی طرف سے پھر کسی اوچھی اور ناخوشگوار حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ پتا نہیں، وہ اب تک دم سادھے کیوں بیٹھا تھا۔ جمشید، عمران اور جلال کی واپسی کی کوئی صورت نظر نہ آنے پر اسے فوراً ایکشن میں آ جانا چاہیے تھا۔ اس کا پہلا اور آخری نشانہ فرید پاشا کی کوٹھی ہی ہوتی!

میں نے زرگل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "اب تک تم یہ بات تو اچھی طرح جان چکی ہو کہ چند لمحات کے بعد مجھے اپنے دوست فرید پاشا کے گاؤں سید پور روانہ ہو جانا ہے۔ فی الحال میرے پاس تم سے تفصیلی گفتگو کا وقت نہیں۔ اگر تم ایسا چاہتی ہو تو چند روز کے لیے اسی کوٹھی میں رک جاؤ۔ میں دو تین روز میں واپس آ جاؤں گا۔" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا "ویسے تو تمہارے لیے صرف ایک رات گزارنے کا مسئلہ تھا۔ تم نے کہا تھا کہ صبح تم اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاؤ گی۔ تم جہاں بھی جانا چاہو، تمہیں بہ حفاظت پہنچا دیا جائے گا۔ بولو، کیا کہتی ہو؟"

جس طرح یہ طے تھا کہ صدف میرے ساتھ سید پور جائے گی بالکل اسی طرح میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ زرگل کو اپنے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔ وہ چند لمحے دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔

"فی الحال تو میرے سامنے کوئی متعین منزل نہیں ہے۔ حکمت یار کے بندوں سے میری جان محفوظ ہو چکی ہے۔ آئندہ لائحہ عمل بہت سوچ سمجھ کر بنانے کی ضرورت ہے۔ ابھی تک میں ذہنی طور پر اس قدر الجھی ہوئی ہوں کہ اس بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی سوچ نہیں سکی۔"

میں نے حتمی انداز میں کہا "ٹھیک ہے، تم جب تک چاہو، اس کوٹھی کی پناہ میں آرام کر سکتی ہو۔ اس دوران میں تمہیں سکون سے سوچنے کا موقع بھی مل جائے گا۔ میری واپسی سے قبل اگر تم یہاں سے رخصت ہونا چاہو تو تمہیں کوئی نہیں روکے گا بلکہ تمہیں تمہارے بتائے ہوئے مقام پر بہ حفاظت پہنچا دیا جائے گا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی وجدان!" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور سرسری انداز میں کہا "ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ چلو اسی بہانے مجھے تمہاری سنسنی خیز کہانی سننے کا موقع مل جائے گا۔"

"اور مجھے بھی!" وہ جلدی سے بولی "میں بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ تم نے وعدہ کیا تھا، مجھے اپنی کہانی سناؤ گے۔"

میں نے کہا "تم بھول رہی ہو۔ میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، صرف اتنا کہا تھا، اگر کبھی فرصت ملی تو میں تمہیں اپنے بارے میں تفصیلاً بتاؤں گا۔"

وہ بولی "تم سید پور کے معاملات نمٹا آؤ تو پھر فرصت کے لمحات بھی میسر آ جائیں گے۔"

"اس بارے میں صرف اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے اپنے سابق تجربے کی روشنی میں کہا "یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا خیال درست ثابت ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے، میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو جاؤں۔"

''اللہ مالک ہے!'' میری صاف گوئی کے نتیجے میں اس نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہوگئی۔

اس کے بعد میں نے سیکیورٹی گارڈ عمردین اور پاشا کے اسسٹنٹ تحسین کو باری باری اپنے پاس بلا کر ضروری ہدایات دیں پھر اللہ دتا سے معلوماتی گفتگو کرنے لگا۔

''اللہ دتا!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میں اپنے ہوش وحواس میں پہلی مرتبہ لاہور آیا ہوں اس لیے اس شہر اور اس کے گردونواح میں واقع گاؤں دیہات سے واقف نہیں۔'' تم مختصر الفاظ میں ہمیں بتاؤ کہ یہاں سے سید پور جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کیا جائے گا؟''

اس وقت صدف بھی میرے پاس بیٹھی تھی۔ اللہ دتا نے کہا ''صاحب جی! میں آپ کے ساتھ جا رہا ہوں پھر آپ کو راستوں کے لیے فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

اس نے بروقت اور اہم سوال کیا تو مجھے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا پڑا۔ وہ فیصلہ جس کے بارے میں، میں نے ابھی صدف کو بھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اللہ دتا کو ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کوٹھی پر اس کا موجود رہنا زیادہ ضروری تھا۔ تحسین، ناہید اور زرگل کا درحقیقت اس کوٹھی سے کوئی تعلق نہیں تھا جب کہ اللہ دتا سال ہا سال سے اس کوٹھی کا ایک حصہ رہا تھا۔ وہ وہاں نمودار ہونے والی ناخوشگوار اور ہنگامی صورتِ حال سے زیادہ بہتر طور پر نمٹ سکتا تھا۔ میں اور صدف اس کے بغیر سید پور جا سکتے تھے۔ میں نے اللہ دتا کے سوال کے جواب میں کہا۔

''میں چاہتا ہوں، تم یہیں کوٹھی پر موجود رہو۔''

''پاشا صاحب تو ناراض نہیں ہوں گے!'' اس نے ایک امکانی بات کی ''انہوں نے آپ کو ساتھ لانے کے لیے کہا تھا۔''

میں نے کہا ''میں پاشا کو سمجھا دوں گا۔ اگر آج رات والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو میں تمہیں ساتھ لے کر جاتا لیکن موجودہ صورتِ حال میں تمہارا یہاں رکنا زیادہ ضروری ہے۔''

''آپ کہہ تو ٹھیک ہی رہے ہیں صاحب جی۔''

''بس تو پھر تم مجھے سید پور جانے والے راستے کے بارے میں تفصیلاً بتا دو۔''

وہ بتانے لگا ''وجدان صاحب! گلبرگ سے نکل کر آپ کو پہلے تو نہر کے ساتھ ساتھ سفر کرنا ہوگا۔ میاں میر، دھرم پورہ اور مغل پورہ سے ہوتے ہوئے آپ فتح گڑھ پہنچ جائیں گے۔''

میں نے پوچھا ''نہر کے ساتھ سے تمہاری مراد ہے کینال بینک روڈ پر؟''

''جی ہاں، میں کینال بینک روڈ کی ہی بات کر رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''اس سڑک پر چلتے ہوئے آپ نہر کی مخالف سمت میں سفر کریں گے یعنی جدھر سے نہر آ رہی ہے آپ ادھر جائیں گے۔ فتح گڑھ کے بعد راستہ تھوڑا پیچیدہ ہے۔ اس راستے پر بہت احتیاط سے ڈرائیونگ کرنا ہوگی۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو، میں پیچیدہ راستے سے نمٹ لوں گا۔'' میں نے کہا ''آگے بتاؤ۔''

اللہ دتا نے مجھے فتح گڑھ سے سید پور کے راستے کی تفصیل بتائی پھر کہا ''سید پور سے آگے لگ بھگ پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر موضع رکھاں والی ہے۔ اس کے بعد پاک بھارت سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ سرحد کے اس پار امرتسر ہے۔''

اللہ دتا نے تو یہ معلومات عام انداز میں مجھ تک پہنچائی تھیں لیکن رکھاں والی کے ذکر پر آ یوں آپ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ساحل کی یاد نے میرے سینے میں ایک خوفناک انگڑائی لی تھی۔ میری محبوبہ رکھاں والی کے جابر چوہدری نوازش علی کی قید میں تھی اور میں نے یہ سارا کھٹ راگ ساحل کے حصول کے لیے ہی پھیلایا تھا، اس کے ساتھ ہی میں اس ظالم چوہدری سے برسوں پہلے کا حساب بھی کرنا چاہتا تھا۔ اس قرض کی چند گٹھریاں میرے شانوں پر بھی دھری تھیں۔ سب سے بڑی گٹھری ساحل کی تھی جو مجھے پہلی فرصت میں اتار پھینکنا تھی!

ہمارے درمیان مزید چند منٹ تک ضروری بات چیت ہوتی رہی پھر اللہ دتا نے پوچھا ''آپ کون سی گاڑی لے جانا پسند کریں گے؟''

نسان پٹرول ایک مرتبہ دھوکا دے چکی تھی۔ میں اسے لے جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا حالانکہ ازاں بعد یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اس جیپ میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں ہوئی تھی۔ یہ گتھی سلجھانا ابھی باقی تھی۔

میں نے کہا ''ہم یہاں سے ٹویوٹا کرولا میں جائیں گے۔''

''صاحب جی! ویسے تو آپ کی مرضی ہے، لیکن میں تو ضرور کہوں گا، گاؤں دیہات کے راستے کے لیے جیپ زیادہ موزوں رہے گی۔'' اللہ دتا نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

اس کی تجویز میں اگرچہ وزن تھا تاہم میں نے اس سے

پوچھا ''کیا سید پور کا راستہ کار کے لیے مناسب نہیں؟''

''ایسی بات نہیں ہے وجدان صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''پاشا صاحب خود اپنی دوسری کار میں گئے ہیں۔ میں تو اس حوالے سے کہہ رہا تھا کہ جیپ کا ایک اپنا رعب و دبدبہ ہوتا ہے، راستے کا ذکر تو بس ایسے ہی نکل آیا۔''

مجھے یہ بات معلوم تھی کہ پاشا کل شام اپنی ہونڈا اکارڈ میں سید پور گیا تھا جس کا یہی مطلب تھا کہ کار کے لیے وہ راستہ ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔ میں نے اللہ دتا سے کہا کہ میں کرولا میں جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں تو بس اسی میں جاؤں گا۔ ظاہر ہے، وہ میرے اس فیصلے کو ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے ایک ضروری امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے پوچھا۔

''اور گرے ہائی روف کا کیا کرنا ہے؟''

مذکورہ گاڑی اس وقت کوٹھی کے گیرج میں کھڑی تھی۔ میں نے کہا ''اس گاڑی سے جلد از جلد چھٹکارا پانا ضروری ہے۔'' پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے کہا ''تم ایسا کرو اللہ دتا! جا کر ہائی روف کے کاغذات وغیرہ چیک کرو۔''

''میں اس گاڑی کی مکمل تلاشی لے چکا ہوں۔'' اللہ دتا نے بتایا ''اس گاڑی کے کاغذات پورے ہیں اور ڈیش بورڈ کے اندر رکھے ہیں۔'' بات ختم کر کے اس نے ایسی نظر سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟

میں نے اس کی نگاہ کے جواب میں کہا ''میں نے رات واپسی پر، نہر کے مسلم ٹاؤن والے پل کے نزدیک مٹھائی کی ایک دکان دیکھی تھی۔ تم اس گاڑی کو لے جا کر اس دکان کے سامنے کھڑا کر دو اور خود کسی ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس آ جاؤ۔''

''آپ غالباً عریبین ڈیلائٹ کا ذکر کر رہے ہیں!'' اللہ دتا نے کہا۔

میں نے کہا ''ہاں اس مٹھائی کی دکان کا کچھ ایسا ہی نام تھا۔''

اللہ دتا نے پوچھا ''بس ہائی روف کو عریبین ڈیلائٹ کے سامنے چھوڑ کر واپس آ جاؤں؟''

''تم ہائی روف کو وہاں کھڑا کرو گے اور اس کا دروازہ لاک کیے بغیر دکان کے اندر جاؤ گے۔'' میں نے وضاحتی لہجے میں کہا ''گاڑی کے کاغذات اور چابیاں اس کے اندر ہی رہیں گے۔ تم مٹھائی کی اس دکان سے دو کلوگرام مٹھائی خریدو گے اور کسی رکشا ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس آ جاؤ گے پھر اس مٹھائی پر فاتحہ پڑھ کر بڑے پاشا کے لیے دعا وغیرہ مانگ لینا۔ تم ان کے جنازے میں تو شرکت نہیں کر سکو گے، اسی طرح تمہاری حاضری لگ جائے گی!''

''یہ سب ٹھیک ہے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا ''لیکن گاڑی کو کھلا چھوڑ کر آنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

میں نے کہا ''تم جب واپس آ جاؤ گے تو ہر بات واضح طور پر سمجھ میں آ جائے گی۔''

صدف استعجابیہ نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میں نے اس کا استعجاب دور کرنے کے لیے کوئی وضاحت نہ کی اور نہ ہی اللہ دتا نے مجھ سے مزید کوئی سوال کیا۔ ہم لگ بھگ آٹھ بجے کوٹھی سے سید پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ میں نے اور صدف نے اپنا اپنا بیگ کرولا میں رکھ لیا۔ میرے بیگ میں شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور ڈرائیونگ لائسنس وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ کرولا کے کاغذات وغیرہ میں نے چیک کر لیے تھے تاکہ راستے میں کسی بھی مرحلے پر ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اللہ دتا ہم سے چند لمحے پہلے نکلا تھا اور مجھے امید تھی، وہ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ میں واپس کوٹھی پہنچ جائے گا۔ میں نے کرولا کو جب گلبرگ تھری سے نکالنے کے بعد بائیں جانب موڑا تو صدف نے کہا۔

''وجدان! میرے خیال میں تم غلط رخ پر جا رہے ہو۔ اس راستے پر چل کر تو ہم شادمان کالونی کی طرف پہنچ جائیں گے۔ تمہیں گاڑی کو دائیں طرف موڑ کر کینال بینک روڈ پر لینا چاہیے۔''

میں نے اطمینان سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا ''ہم شادمان کالونی ہی کی طرف جا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس وقت وہ میرے برابر میں پسنجر سیٹ پر بیٹھی تھی ''کیا ہم ماموں کی طرف جا رہے ہیں؟'' اس نے استفسار کیا۔

میں نے قطعیت سے کہا ''بالکل نہیں!''

''پھر؟'' اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔

میں نے کہا ''ہم فاضلیہ کالونی والی کوٹھی میں جا رہے ہیں۔''

''وہاں کیوں جا رہے ہیں؟''

''بس ایسے ہی۔ کیا تمہیں وہاں جانے میں کوئی اعتراض ہے؟''

''نہیں، مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی الجھن کو دور کرتے ہوئے کہا ''دراصل

میں ایک نظر اس کوٹھی کا تنقیدی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی میں سید پور جاؤں گا۔ پتا نہیں، پھر کبھی اس طرف آنے کا موقع ملے بھی یا نہ ملے!"

"تم آج صبح ہی سے خاصی کھوئی کھوئی باتیں کر رہے ہو۔" وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی "تھوڑی دیر پہلے تم نے اللہ دتا سے بھی گرے ہائی روف کے حوالے سے جو کچھ ڈسکس کیا ہے، اس میں سے میرے پلّے کچھ بھی نہیں پڑا۔"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "پلّے پڑ بھی کیسے سکتا ہے۔ تم نے میری باتوں کو 'کھوئی کھوئی' کا ٹائٹل دیا ہے کھوئی ہوئی چیز کو پانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔"

"تمہیں اگر میری بات کا جواب نہیں دینا تو نہ دو لیکن فلسفیانہ وضاحتوں کی کیا ضرورت ہے؟" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی

"ایسی بات نہیں ہے صدف!" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا "فاضلیہ کالونی والی کوٹھی میں جانے کا سبب میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ ہائی روف کو مٹھائی کی دکان کے سامنے میں اس لیے چھڑوانا چاہتا ہوں کہ وہاں سے اس گاڑی میں ہم سفر کریں گے۔"

"یہ تم کہہ رہے ہو وجدان؟" وہ ایسے اُچھلی جیسے سیٹ میں اچانک کوئی اسپرنگ نمودار ہو گیا ہو۔

میں نے اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "میں وہی کہہ رہا ہوں جو تم نے سنا۔"

"گرے ہائی روف ہمارے دشمنوں کی ملکیت ہے۔" صدف نے دلیل دی "اس گاڑی میں سفر کرنا ہمارے لیے کوئی بڑی مصیبت بھی کھڑی کر سکتا ہے۔"

"مجھے امید ہے، ایسا کچھ نہیں ہو گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا "کوئی انتہائی خطرناک مجرم جس کی پورے شہر میں تلاش جاری ہو، اگر وہ تھانے کے سامنے واقع بلڈنگ میں پناہ گزین ہو جائے تو پولیس کا باپ بھی اسے ڈھونڈ نہیں سکتا کیوں کہ اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا۔ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ پولیس سے چھپتا پھرنے والا مجرم اسی کے سائے میں قیام کرے گا۔ بعض معاملات میں عمومی سوچ اور عوامی نفسیات (Mob Psychology) بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔" میں نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے، ہم گرے ہائی روف میں زیادہ حفاظت کے ساتھ سفر کریں گے۔ گاڑی کے کاغذات مکمل ہیں، میرے پاس ڈرائیونگ لائسنس موجود ہے اس لیے قانون کی طرف سے مجھے مکمل بے فکری ہے اور جہاں تک دشمنوں کا سوال ہے تو بھئی، دشمن تو دشمن ہوتا ہے۔ وہ آدھی رات کو دیوار پھاند کر بھی گھر میں گھس آتا ہے۔ دشمنوں سے نمٹنا مجھے خوب آتا ہے۔"

وہ پوری توجہ سے میری بات سنتی رہی پھر بولی "اگر میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کر بھی لوں تو مجھے یہ بتاؤ، اس مقصد کے لیے اتنا لمبا چوڑا ڈراما رچانے کے لیے کیا ضرورت تھی؟ ہم پاشا انکل کی کوٹھی سے اسی ہائی روف میں بیٹھ کر جاتے!"

"ایسا کیا جا سکتا تھا۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا "لیکن میں نے دانستہ نہیں کیا۔"

"اب خود ہی یہ بھی بتا دو، تم نے ایسا کیوں کیا؟"

"اس لیے۔" میں نے کرولا کو شاہ جمال روڈ پر ڈالتے ہوئے کہا "میں چاہتا ہوں، اللہ دتا وغیرہ ہائی روف کے حوالے سے بالکل مطمئن رہیں۔ وہ یہی سمجھیں کہ دشمنوں کی گاڑی سے نجات مل گئی اس طرح انہیں ذہنی سکون حاصل رہے گا۔ میں اپنی پوری زندگی غیر یقینی حالات سے گزرتا رہا ہوں اور گزر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، سید پور کے راستے میں کس وقت، کس قسم کی صورتِ حال سے میرا واسطہ پڑ جائے۔" میں چند لحات کے لیے رکا پھر کہا "صدف! ایک بات میں تمہیں واضح طور پر بتا دوں کہ میں اب واپس فرید پاشا کے پاس نہیں آؤں گا۔ میری وجہ سے اس نے بڑی مصیبت اٹھائی اور آئندہ بھی اس کے دشمنوں میں مزید اضافہ ہونے والا ہے۔ میں ایک دشمن دار شخص ہوں، مجھے اپنے مخلص اور خیر خواہ دوستوں سے فاصلہ رکھنا چاہیے، کہیں وہ لوگ میرے پاؤں سے بندھے بگولوں کے چکر میں نہ آ جائیں۔ میں تو دہکتے ہوئے الاؤ کی لپٹوں پر محوِ سفر ہوں۔ میرے ماحول کی تپش کسی بھی شخص کو بری طرح جھلسا سکتی ہے۔"

"تو تم سید پور محض اس لیے جا رہے ہو کہ پاشا انکل کی تجہیز و تکفین میں شرکت کر سکو۔" صدف نے گمبھیر آواز میں کہا "اس کے بعد تم اپنا راستہ الگ کر لو گے؟"

"ہاں، فی الحال تو یہی سوچا ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا "میں اس سے فاصلہ رکھ کر اس کی ہر قسم کی مدد کروں گا، اس سے میل ملاپ بھی رکھوں گا لیکن اس کے یہاں ڈیرا نہیں ڈالوں گا۔ بڑے پاشا کی موت تو ایک بہانہ بن گئی ہے۔ درحقیقت میں ویسے آج ضروری کام سے سید پور جانے والا تھا۔"

"اس ضروری کام کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ گے" وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

میں ساحل کے بارے میں صدف کو کچھ بتانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا لہٰذا میں نے اسے ٹال دیا "تم تو میرے ساتھ ہی جا رہی ہو۔ کوئی بھی ضروری اور غیر ضروری کام تم سے پوشیدہ نہیں رہے گا۔ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"

"اس گاڑی کا کیا کرو گے؟" اس نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مار کر تھپتھپاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں ٹویوٹا کرولا کو فی الحال فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے کار پورچ میں کھڑا کر دوں گا۔" میں نے کہا "وہاں سے ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر نہر کے پل تک پہنچ جائیں گے۔ بعد میں سید پور پہنچنے کے بعد میں پاشا کو گاڑی کے بارے میں بتا دوں گا۔"

"تمہاری پلاننگ اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ اسے سمجھنے کے لیے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے بولی "تم جانو اور تمہارے کام جانیں۔ اب میں اس سلسلے میں تم سے کوئی سوال نہیں کروں گی۔"

میں نے کرولا کو کوٹھی کے سامنے روکتے ہوئے کہا "یہ تم میرے اور اپنے دونوں کے حق میں بہت بہتر کرو گی!"

اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ میں نے کوٹھی کا گیٹ کھولا اور گاڑی کو اس کے جائز مقام پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ صدف نے پچھلے چند روز سے مجھے بہت زچ کیا تھا۔ وہ وجیہہ اور وجدان کے چکر کو اتنی سنجیدگی سے لے کر میرے پیچھے پڑ گئی تھی کہ میں ایک طرح کی کوفت محسوس کرنے لگا تھا۔ اب اسے زچ دیکھ کر میں مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

آئندہ پندرہ منٹ میں، میں نے کوٹھی کے پائیں باغ میں جھانک کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے تہ خانے کا روشن دان اپنی جگہ پر صحیح و سالم حالت میں موجود تھا۔ میں نے کوٹھی کا ایک چکر لگایا اور صدف کے ساتھ باہر نکل آیا۔ شاہ جمال روڈ پر آنے کے بعد ہمیں تھوڑی دیر تک ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا پھر ہم اپنی منزل کی جانب چل پڑے۔

عریبین ڈیلائٹ کے سامنے دیگر گاڑیوں کے ساتھ گرے ہائی روف موجود تھی۔ ہم اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ میں نے ڈرائیونگ سائیڈ کا دروازہ کھولا اور اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ صدف کے لیے میں نے دوسری جانب کے دروازے کا لاک ہٹا دیا۔ وہ بھی گاڑی کے اندر داخل ہو کر پسنجرز سیٹ پر آ بیٹھی۔ اپنے سفری بیگز کو ہم نے عقبی نشست پر ڈال دیا۔

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور گھما کر اسے کینال بینک روڈ کی طرف لانے کا ارادہ .... کر ہی رہا تھا کہ مجھے بڑی شدت سے چونک جانا پڑا اور میرے چونکنے کا سبب ایک سرخ لینڈ کروزر تھی۔ وہ ٹویوٹا فور وہیل ڈرائیو جیپ جس کی پوری باڈی سرخ اور چھت سفید تھی۔ اتنی دور سے میں اس کی نمبر پلیٹ نہ پڑھ سکا۔ وہ جیپ فیروز پور روڈ پر نہر کے پل کو عبور کر رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پل عبور کیا اور وحدت روڈ پر مڑ گئی۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنی گاڑی کو سرخ لینڈ کروزر کے پیچھے دوڑا دیا۔

صدف بھی اس جیپ کو دیکھ چکی تھی، سنسنی خیز لہجے میں بولی "وجدان! تم نے مجھے جس بہروپیے کی کہانی سنائی ہے، کہیں اس گاڑی میں وہی تو نہیں۔ تمہاری اضطراری حالت بھی اس کی نشان دہی کر رہی ہے؟"

"ننانوے فی صد امکان تو اسی بات کا ہے۔" میں نے ہیجانی انداز میں کہا "میں ذرا اس کی نمبر پلیٹ دیکھ لوں، پھر صد فی صد بات کر سکوں گا۔ اگر یہ وہی بدمعاش ہے تو آج میرے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔"

میں نے وحدت روڈ پر اپنی گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی۔ سرخ لینڈ کروزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی پشت مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شخص سفید سوٹ میں ملبوس تھا۔ میں نے اسے وحدت روڈ پر مڑتا دیکھ کر ایک لمحے کے لیے سوچا تھا کہ کہیں اس مکار کا تعلق منشا سے نہ ہو! منشا کی چھوٹی دو منزلہ سفید کوٹھی بھی اسی علاقے میں تھی لیکن جب آب پارہ مارکیٹ بہت پیچھے رہ گئی اور سرخ لینڈ کروزر سیدھی آگے نکلتی چلی گئی تو مجھے اپنی سوچ کی نفی کرنا پڑی۔

میں نے کوشش کر کے گاڑی کی رفتار بڑھا کر جیپ کی نمبر پلیٹ پڑھ لی اور میرے سینے سے ایک اطمینان سانس خارج ہوئی۔ وہ نقلی وجدان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ مذکورہ سرخ جیپ کا نمبر فور سیون تھری سیون ہی تھا۔ میں نے صدف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "صدف! یہ وہی بہروپیا ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔"

صدف نے پُرعزم انداز میں کہا "وجدان! تم گاڑی کی رفتار کو اور بڑھاؤ اور اسے گھیر کر روکنے کی کوشش کرو آج ہم دونوں مل کر اسے ایسا سبق سکھائیں گے کہ اس کا سارا بہروپ ناک کے راستے نکل جائے گا۔ یہ مت بھولو کہ یہی خبیث تمہاری ڈارلنگ کا قاتل بھی ہے۔"

"میری یادداشت بہت اچھی ہے صدف۔" میں نے برج اسٹون ٹائروں والی اس سرخ جیپ کا تعاقب جاری رکھتے ہوئے کہا "اگرچہ اس بہروپیے نے اپنی تحریر کے

ذریعے ڈارلنگ کی موت کو بڑے جاندار انداز میں جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جب تک میں اس معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ جاتا، کسی بات پر یقین نہیں کر سکتا۔"

ہم آگے پیچھے وحدت روڈ پر گاڑیاں دوڑاتے ہوئے بینک اسٹاپ، پائلٹ ہائی اسکول اور موڑ پیکھے وال سے گزرے لیکن حیرت مجھے اس بات کی تھی کہ میں اپنی گاڑی کی جتنی رفتار بڑھاتا، وہ بھی جواب میں جیپ کو اتنا ہی تیز کر دیتا اور اس دوران میں اس نے ایک مرتبہ بھی مڑ کر عقب میں دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے اپنے تعاقب کا علم ہو چکا ہے یا نہیں البتہ ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار تھا۔

تھوڑا آگے جا کر بہروپیے نے اپنی جیپ اسکیم موڑ کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لی۔ میں نے بھی وحدت روڈ کو چھوڑ دیا۔ کچھ سفر طے کرنے کے بعد ہم ملتان روڈ پر آ گئے۔ میں باوجود کوشش کے بھی درمیان حائل فاصلے کو کم نہیں کر پایا تھا۔ پتا نہیں، وہ منحوس کس طرح میرے ارادے سے واقف ہو جاتا تھا اور اپنی جیپ کی اسپیڈ بھی بڑھا کر مجھے پریشان کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں نہیں بلکہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہو!

چوبرجی پر پہنچ کر اس نے جیپ کو بہاول پور روڈ پر موڑ لیا۔ اس روڈ کے دونوں اطراف میانی صاحب قبرستان کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سڑک تنگ ہونے کے باعث بے پناہ رش رہتا ہے لہٰذا مجھے یہاں فاصلہ کم کرنے میں تھوڑی کامیابی حاصل ہو گئی لیکن مزنگ چونگی پر آ کر اس نے پھر وہ سابق فاصلہ برقرار کر لیا۔ اب اس کی سرخ جیپ فاطمہ جناح روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ ہم پلازا سینما کے پاس سے گزر کر مال روڈ پر پہنچے اور آگے پیچھے بائیں جانب مڑ گئے۔ اب ہمارا رخ ریگل سینما کی طرف تھا۔ یہاں ایک ٹریفک سگنل نے ہمارا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا اور بہروپیے کو میری پہنچ سے نکلنے کا موقع مل گیا۔

صدف نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا "بے کار ہے وجدان! یہ چھلاوا ہے تمہارے قابو میں نہیں آئے گا۔ اس کا تعاقب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم اتنی جلدی حوصلہ ہار گئیں۔" میں نے کہا "بڑی بازیاں اتنی کم ہمتی سے تو نہیں جیتی جا سکتیں۔"

وہ بولی "انسان کا مقابلہ انسان سے ہو تو ہمت اور جرأت دکھانے کا مزہ آتا ہے مگر میں تو دیکھ رہی ہوں اس بہروپیے میں جناتی قوت بھری ہے۔ یہ شیطان کی طرح پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں مسلسل جل دے رہا ہے اور اب تو اس بند سگنل نے اسے ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔"

اسی وقت سگنل کھل گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے بائک روف آگے بڑھا دی۔ میری متلاشی نظر دور دور تک شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) کا جائزہ لے رہی تھی پھر وہ سرخ جیپ مجھے ایک جانب کھڑی نظر آ گئی۔ وہ ایک بہت بڑا ڈیپارٹ مینٹل اسٹور تھا۔ جس کی پارکنگ میں جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے اندر بہروپیا موجود نہیں تھا۔ بے ساختہ میری نگاہ ڈیپارٹ مینٹل اسٹور کے داخلی دروازے کی طرف اٹھ گئی اور میرے وجود میں سنسناہٹ سی بھر گئی۔

انڈے کی طرح سفید سوٹ میں ملبوس وہ دراز قامت نقلی وجدان دروازے سے اسٹور کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی لیکن میں حلیہ، شکل اور جسامت میں ہو بہو اپنی کاپی کو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پہچان گیا۔ میں بائک روف کو روکنے کے بعد باہر آیا اور صدف کے ساتھ ڈیپارٹ مینٹل اسٹور کے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

صدف نے کہا "وجدان! اسٹور کے اندر اسے گھیرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس سے سامنا ہوتے ہی ہنگامہ آرائی ہو سکتی ہے جو ہماری راہ کھوٹی کر دے گی، ہم سید پور جانے کے لیے گھر سے نکلے ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے؟"

"ہمیں اس کے باہر آنے کا انتظار کرنا چاہیے، اس کی جیپ کے قریب رہ کر۔" اس نے کہا "وہ آخر کتنی دیر اندر رہ سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اسے باہر آنا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "تمہاری تجویز تو معقول ہے لیکن اس شیطان نے مجھے جتنا پریشان کیا ہے اس کا تقاضا ہے کہ میں اس کے تعاقب میں اندر جاؤں۔ ویسے میں اسٹور کے اندر کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں کروں گا، صرف نقلی وجدان پر نظر رکھوں گا۔ گھیریں گے ہم اسے باہر نکلنے کے بعد ہی اور۔" میں نے تھوڑا توقف کیا اور کہا "میرا تو خیال ہے، تم بائک روف کے اندر جا کر بیٹھو، میں اسٹور کے اندر جاتا ہوں۔ اگر وہ میری نظر بچا کر باہر نکل آیا تو تم اسے چھاپنے کی کوشش کرنا۔" پھر میں نے استفساریہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا "اس کام کے لیے تم کسی قسم کا ڈر خوف تو محسوس نہیں کر رہی ہو؟"

"ڈر اور خوف!" وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی "تمہارے جیسا مارشل آرٹسٹ اور جی کا ماہر میرے ساتھ ہو تو کیسی پریشانی۔ تم مطمئن ہو کر جاؤ۔ میں اس کی ایک نہ لگاؤں گی کہ زندگی بھر پھر اسے بہروپ بھرنے کا خیال نہ آئے گا۔"

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے کہ تم حوصلہ اور جرأت کی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے کہا "ورنہ تھوڑی دیر پہلے تم بہت مایوس ہو رہی تھیں۔"

وہ بولی "انسانی جذبات و احساسات موقع محل کی مناسبت سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے وہ ہمارے قابو میں نہیں آ رہا تھا اس لیے بد دلی نے مجھے گھیر لیا تھا لیکن اب تو ہم ذرا سی کوشش کر کے اسے اپنے دام میں لا سکتے ہیں۔" پھر وہ جوشیلے لہجے میں بولی "اور تم یہاں باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ وہ اگر اس اسٹور سے نکل کر کہیں اور چلا گیا تو میں انتظار میں سوکھتی رہوں گی اور تمہیں بھی خاصی دربدری ہو گی۔ میں گاڑی کی طرف جا رہی ہوں۔"

"او کے!" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر اسٹور کے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

وہ ایک شعبہ جاتی (ڈیپارٹ مینٹل) اسٹور تھا جس کی غالباً دو سے زیادہ منزلیں تھیں۔ میں کسی عجلت یا بدحواسی کا مظاہرہ کیے بغیر اپنی کاپی کو تلاش کرنے لگا۔ میرے انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا، میں شاندار شوکیسز میں سجے آئٹمز کو دیکھ رہا ہوں لیکن درحقیقت میں نقلی وجدان کو کھوج رہا تھا۔ جو ایک جھلک دکھا کر اوجھل ہو گیا تھا۔

میں اس تلاش کے دوران میں داخلی دروازے کو بھی نظر میں رکھے ہوئے تھا کہ کہیں وہ بدبخت نگاہ بچا کر اسٹور سے نہ نکل جائے۔ میں نے نہایت ہی چابک دستی سے اسٹور کی دونوں منزلیں دیکھ لیں لیکن اس کی صورت کہیں نظر نہ آئی۔ پتا نہیں، وہ کم بخت کہاں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسی وقت میرے ذہن میں اس خیال نے بھی سر ابھارا کہ کہیں وہ کسی اور دروازے سے باہر نہ چلا گیا ہو!

ایسا سوچتے ہی میں نے سیکیورٹی کے ایک جوان سے دریافت کیا "کیا اس اسٹور میں آمد و شد کا صرف ایک ہی دروازہ ہے یا اس کے علاوہ بھی ہے؟"

اس نے جواب دیا "جناب! اسٹور میں آنے جانے کے لیے تین دروازے ہیں۔ ایک وہ جو سامنے کی طرف ہے، جس میں سے آپ اندر داخل ہوئے تھے۔ باقی دو دروازے پہلوؤں میں ہیں۔"

وہ سیکیورٹی والا خاصا مستعد اور عقاب نگاہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اسٹور میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔

ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس سے پوچھا "میں دراصل یہاں کسی قسم کی خریداری کے لیے نہیں آیا ہوں......"

"پھر؟" اس نے محتاط نظر سے مجھے دیکھا جیسے اس کا

ذاتی ہپناٹزم

مصنف: ڈاکٹر اے ایم ہچنسن ایم ڈی

اپنے آپ کو ہپناٹائز کر کے اپنی کمزوریاں اور خرابیاں دور کریں

- ہپناٹیزم کی تاریخ
- ہپناٹک نیند پیدا کرنے کے طریقے
- ظہورات ہپناٹیزم
- مشورات
- ہپناٹیزم کی مختلف تھیوریاں
- ذاتی مشورات
- طبی علاج

قیمت:-/25 روپے

ڈاک خرچ:-/23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200

فون: 5802552-5895313 فیکس: 5802551

kitabiat1970@yahoo.com

رابطے کیلئے: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

خیال ہو کہ اگر میں خریداری کے لیے نہیں آیا تو پھر کیا چوری یا ڈکیتی کے لیے آیا ہوں۔

میں نے اس کی الجھن دور کرنے کی خاطر کہا ”میں نے ایک دوست کو اس اسٹور میں داخل ہوتے دیکھا تھا تو ادھر چلا آیا۔ اس سے ملے کافی عرصہ گزر گیا تھا۔“

”تو؟“ سیکیورٹی گارڈ کے استفسار میں تشویش در آئی۔

میں نے کہا ”کیا تم نے میرے اس دوست کو کہیں دیکھا ہے۔ اس نے بے داغ سفید پتلون کوٹ پہن رکھا ہے اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ ہے، اس نے جوتے بھی سفید ہی پہن رکھے ہیں۔ میں نے اسے اوپر نیچے تلاش کر لیا لیکن مجھے وہ کہیں ملا نہیں!“

سیکیورٹی گارڈ نے شک زدہ انداز میں مجھے سرتاپا دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ”نہیں سر، میں نے ایسے کسی شخص کو یہاں نہیں دیکھا۔“

”کیا تمہاری ڈیوٹی صرف بالائی منزل تک ہی محدود ہے؟“

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے سوچا، ممکن ہے نقلی وجدان اس منزل پر آیا ہی نہ ہو اور نیچے ہی سے کہیں غائب ہو گیا ہو۔ میں نے فی الفور نیچے کا رخ کیا، تیزی سے زینے طے کرتے ہوئے میں دوبارہ زیریں منزل پر پہنچ گیا۔ ایک مرتبہ پھر میں نے تنقیدی نگاہ سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور قدرے مایوس ہو کر بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ نوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ وہ بہروپیا ایک مرتبہ پھر مجھے چکر دینے میں کامیاب رہا تھا۔ اس خیال سے ذرا تقویت ملی کہ اس کی گاڑی، صدف کی نگرانی میں تھی۔ وہ کہیں بھی جاتا، اپنی سرخ لینڈ کروزر ہی میں بیٹھ کر جاتا اور ایسا کرتے وقت وہ فوراً صدف کی نگاہ میں آ جاتا...... اس کے بعد یقینی طور پر ایک طویل فائٹ شروع ہو جاتی۔

میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس جدید ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے باہر آیا اور جیسے ہی پارکنگ کی جانب قدم بڑھائے، ایک جھٹکے سے رک گیا۔ میری نگاہ نے ایک ایسا منظر دیکھا جس کے لیے میں ذہنی طور پر قطعاً تیار نہیں تھا۔ پارکنگ میں نقلی وجدان کی لینڈ کروزر تو اپنی جگہ موجود تھی لیکن ہماری گرے ہائی روف کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے ہائی روف کو فور ڈبلیو ڈی لینڈ کروزر کے پیچھے پارک کیا تھا تاکہ وہ بہروپیا کسی بھی طور بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو لیکن ہائی روف کا دور دور تک نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب ہماری گاڑی وہاں موجود نہیں تھی تو پھر صدف کی موجودگی بھی کیا معنی رکھتی تھی۔ میرا ذہن لاکھوں قسم کے خطرناک اندیشوں میں گھر گیا۔ صدف کہاں گئی؟ اس نے گرے ہائی روف کو کہاں پہنچا دیا؟ میرا انتظار کیے بغیر وہ اچانک وہاں سے کیوں ہٹی جبکہ وہ نقلی وجدان کے ”استقبال“ کے لیے وہاں انتظار کر رہی تھی؟ کہیں اسے کوئی حادثہ وغیرہ تو نہیں پیش آ گیا؟

آخری سوال بہت ہی سنگین تھا۔ میں تڑپ کر رہ گیا۔ ویسے ایک خوش امیدی یہ بھی تھی کہ نقلی وجدان کی لینڈ کروزر ابھی پارکنگ میں نظر آ رہی تھی جس کا مطلب تو یہی تھا کہ وہ مکار ابھی وہاں سے روانہ نہیں ہوا۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے نکل کر وہ کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پیش آمدہ صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران میں میری سوچ صرف ایک ہی نقطے پر مرکوز تھی کہ صدف کہاں غائب ہو گئی اور وہ بھی ہائی روف سمیت؟ میں اسے تلاش بھی کروں تو کہاں؟

اسی سوچ کے دوران میں میرے ذہن میں ایک نہایت ہی خطرناک سوال نے سر ابھارا اور میرے پورے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ خیال بہت ہی سنگین اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، کہیں صدف نقلی وجدان کے جھانسے میں آ کر اس کی کسی سازش کا شکار تو نہیں ہو گئی!

ایسا سوچتے ہوئے خود بخود میرا دھیان ڈارلنگ کی طرف چلا گیا۔ گزشتہ شام میری غیر موجودگی میں وہ عیار شخص فرید پاشا کی کوٹھی پر پہنچا تھا اور وہاں میرا بھرپور کردار ادا کر کے ڈارلنگ کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب رہا۔ کہیں نقلی وجدان نے پھر وہی چال یہاں بھی تو نہیں چل دی؟ ممکن تھا، وہ میری حیثیت میں صدف کے پاس آیا ہو اور اسے اپنے ساتھ لے کر گرے ہائی روف میں وہاں سے روانہ ہو گیا ہو۔ نقلی وجدان نے مغوی ڈارلنگ کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی روشنی میں صدف کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دل ہولنے لگا، کیا عنقریب صدف بھی کسی باکس......!

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا، میرے ذہن نے فوراً اس واہیات خیال کی تردید کر دی۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ صدف کو بے وقوف بنا کر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ اس نے جو مخصوص لباس پہن رکھا تھا اسے دیکھ کر صدف سمجھ جاتی کہ وہ میں نہیں بلکہ میری نقل ہے۔ وہ اس کے ساتھ ایک قدم کا بھی فاصلہ طے نہ کرتی۔ ڈارلنگ کو جھانسا دینا دوسری بات تھی۔

صدف کی جانب سے میرا دل قدرے مطمئن ہو گیا لیکن گاڑی سمیت اس کا منظر سے ہٹ جانا مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ میں وہ جگہ چھوڑ کر کہیں آ جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں وہاں سے ہٹتا تو عین ممکن تھا وہ سرخ لینڈ کروزر کو نکال لے جاتا۔ اسی جیپ کی موجودگی میں اطمینان بخش امکان اس بات کا تھا کہ وہ وہاں ضرور آئے گا، جلد یا بدیر!

میں بے قراری سے ٹہلتے ہوئے لینڈ کروزر کے پاس آ گیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی نمبر پلیٹ کو دیکھا کہ کہیں مجھے کوئی دھوکا نہ ہوا ہو۔ میں غلطی پر نہیں تھا۔ یہ وہی جیپ تھی جسے شعیب غوری کے بندوں نے کراچی میں ”ساؤتھ“ کے قریب دیکھا تھا۔ فور سیون تھری سیون نمبر والی یہ سرخ جیپ کل رات مجھے بھی نہر کے کنارے کھڑی ملی تھی اور اسی منحوس جیپ نے شادمان کالونی سے نہر تک ہمارا تعاقب بھی کیا تھا۔

اسی انداز میں تیزی سے سوچتے ہوئے میرا دھیان گزشتہ رات کے اس واقعے کی طرف چلا گیا۔ جب شاہ جمال روڈ پر نسان پٹرول نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں تحسین کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ جیپ میں کسی قسم کی کوئی خرابی نہیں تھی۔ اسی جیپ کے خراب ہونے کے حوالے سے نقلی وجدان نے اللہ دتا کو چکر دیا تھا۔ جب وہ ڈارلنگ کو اغوا کرنے فرید پاشا کی کوٹھی پر پہنچا تو اللہ دتا کے ایک سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا، نسان میں اچانک کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور وہ اسے کسی گیراج میں ٹھیک ہونے کے لیے چھوڑ آیا ہے۔

نسان پٹرول کی خرابی کا حوالہ مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ مسلم ٹاؤن سے یہاں تک میں سرخ لینڈ کروزر کا تعاقب کرتے ہوئے جن تجربات سے گزرا، وہ نقلی وجدان کو خاصا پراسرار ثابت کر رہے تھے۔ میں باوجود انتہائی کوشش کے بھی اسے چیز (CHASE) نہیں کر پایا تھا۔ میں ہائی روف کی جس قدر اسپیڈ بڑھاتا، وہ خبیث بھی اپنی جیپ کو اتنا ہی تیز کر دیتا۔ ہمارے درمیان ایک مخصوص فاصلہ برقرار رہا تھا۔ اس دوران میں اس شخص نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا حالانکہ وحدت روڈ سے جب وہ اسکیم موڑ کی طرف بڑھا تھا تو سڑک کے اس ٹکڑے پر ٹریفک بھی زیادہ نہیں تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا، اسے اپنے تعاقب کا احساس نہ ہو۔ اس کی بے پروائی اور اعتماد ظاہر کرتا تھا، وہ ہر شے سے باخبر ہے۔ یہ بات اس کی پراسراریت پر دلالت کرتی تھی۔ میں لامحالہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے پیش آنے والے پراسرار واقعات کا تعلق کہیں نقلی وجدان ہی سے تو نہیں؟

اسی وقت میں نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا، کسی نے مجھے پکارا تھا۔ میں نے واضح طور پر اپنا نام سنا تھا لیکن جس سمت سے وہ آواز ابھری تھی وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میری سماعت نے یہ دھوکا کیوں دیا۔ میں نے اس واقعے کو موجودہ صورتِ حال کی افراتفری کے کھاتے میں ڈال دیا۔ میرا ذہن اس وقت صدف کے لیے خاصا پریشان تھا۔ اس کیفیت میں انسان کے حواس اکثر دھوکا دینے لگتے ہیں۔

جب مزید پانچ منٹ تک صدف اور نقلی وجدان کے آثار نظر نہ آئے تو میری پریشانی انتہا کو پہنچ گئی۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مجھے سید پور جانا تھا اور یہ ایک عجیب مصیبت میرے راستے کی رکاوٹ بن گئی تھی۔ میں اس لمحے کو کوسنے لگا جب میں نے فیروز پور روڈ پر سرخ لینڈ کروزر کو دیکھ کر اس کے تعاقب کا فیصلہ کیا تھا۔ اس منحوس کے سبب میری راہ کھوٹی ہوتی نظر آ رہی تھی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس بہروپیے کو اسٹور کے اندر جا کر چیک کرنے کے بارے میں سوچا اور خود بخود میرے قدم ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں کسی سے صدف، ہائی روف یا نقلی وجدان کے بارے میں کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں پوچھتا تو کیا پوچھتا؟ کوئی مجھے کچھ بتاتا تو کیا بتاتا؟

ایک مرتبہ پھر مجھے ناکام و نامراد اسٹور سے لوٹنا پڑا لیکن جب میں نے دروازے سے باہر قدم رکھا تو ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ پارکنگ میں سرخ لینڈ کروزر کے عقب میں گرے ہائی روف کھڑی تھی اور اس میں صدف بھی موجود تھی۔

میں تیزی سے چلتے ہوئے صدف کے پاس پہنچا اور اضطراری لہجے میں کہا ”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”میں کہاں چلی گئی تھی؟“ اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا ”میں تو تمہارے انتظار میں یہاں سوکھ رہی ہوں تم نے اسٹور کے اندر اتنی دیر کیوں لگا دی؟ اس بدمعاش کا کوئی سراغ ملا؟“

صدف کے پے در پے سوالات نے میرا دماغ جھنجھنا کر رکھ دیا۔ وہ اس وقت انتہائی سنجیدہ اور کوفت زدہ دکھائی دیتی تھی لیکن وہ جو کچھ بیان کر رہی تھی وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اگر میں نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ نہ دیکھا ہوتا تو ممکن تھا، میں صدف کی بات کا یقین کر لیتا۔

میں نے ایک جھٹکے سے ڈرائیونگ سائیڈ والا دروازہ کھولا پھر ہائی روف کا اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے صدف سے

کہا ''دیکھو صدف! میں اس وقت کسی تفریح یا مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا ہے۔ تم سچی سچی بتادو، کہاں گئی تھیں؟''

صدف سے بات کرنے کے دوران میں، میں وقفے وقفے سے سرخ لینڈ کروزر کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ میری سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''وجدان! میں ایک لمحے کے لیے بھی اس جگہ سے نہیں ہٹی۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں تمہارا اور نقلی وجدان کا انتظار کر رہی تھی۔''

''تھوڑی دیر پہلے تم یہاں تھیں اور نہ ہی یہ ہائی روف!''

''تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو وجدان۔'' اس مرتبہ صدف کے لہجے میں احتجاج در آیا تھا ''کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں۔ میں تم سے جھوٹ بولوں گی...... میں؟''

صدف کے لہجے کی شدت نے مجھے گڑبڑا دیا تاہم میں اپنے تجربات کی بھی نفی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گمبھیر آواز میں اس سے کہا ''صدف، میں کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا اور تمہیں گاڑی سمیت غیر موجود پا کر میری جو حالت ہوئی ہوگی اس کا تم اندازہ لگا سکتی ہو۔''

''میں بخوبی اندازہ لگا رہی ہوں کہ اس وقت تمہاری کیا حالت ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی ''اگر یہ کوئی سنجیدہ مذاق ہے تو پلیز اسے ختم کردو۔ میں بہت الجھن محسوس کر رہی ہوں۔''

میں چند لمحے اسے گہری نظر سے دیکھتا رہا پھر مختصر الفاظ میں اسے تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والے واقعے اور اپنی پریشانی کے بارے میں بتا دیا۔ وہ توجہ سے پوری بات سننے کے بعد بولی۔

''وجدان! اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو پھر میں یہی کہوں گی، تمہارے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ ان واقعات کو نارمل نہیں کہا جا سکتا۔ ایک چیز تم دیکھتے ہو لیکن وہ مجھے نظر نہیں آتی، ایک منظر تمہیں دکھائی دیتا ہے مگر میں اس سے محروم رہتی ہوں۔ اسی طرح تم جو آواز سنتے ہو وہ میری سماعت تک رسائی حاصل نہیں کرتی کیوں؟'' اس نے ذرا توقف کر کے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اس وقت وہ ایک ڈاکٹر نظر آتی تھی ''کیا پہلے بھی تمہارے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے؟''

''نہیں، اس نوعیت کے یہ ابتدائی اور انوکھے تجربات ہیں۔''

''تمہیں پہلی فرصت میں کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

میں کسی اور ہی سوچ میں کھو گیا۔ میرے اندر سے کوئی آواز اٹھی تھی، وجدان! پراسرار معاملات اور واقعات کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا ہے۔ پراسرار واقعات کا خیال آتے ہی میرا دھیان نیلگری کی طرف چلا گیا پھر اس کی سحر انگیز ذات سے وابستہ ہوش رُبا اور مسحور کن یادیں مجسم ہو کر سامنے آنے لگیں۔ میں خیالات کی جادو نگری میں جانے اور کتنی دیر تک بھٹکتا رہتا کہ صدف کی آواز نے میری سماعت پر دستک دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔

''وجدان! کیا آج کا دن یہیں کھڑے کھڑے گزارنا ہے؟''

میں ہائی روف میں حاضر ہو گیا اور سرخ لینڈ کروزر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اس کا ڈراپ سین نہیں دیکھو گی؟''

''ابھی تو اس کا ٹائٹل شروع ہوا ہے۔'' وہ بوجھل لہجے میں بولی ''اگر اس کہانی کے اختتام تک ہم گاڑی میں بیٹھے رہے تو سید پور پہنچنے کے امکانات مائنس میں چلے جائیں گے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو، مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا ''آج ظہر اور عصر کے درمیان بڑے پاشا صاحب کی تدفین ہے۔ ہمیں اس سے پہلے سید پور میں ہونا چاہیے۔''

''اور اس کے لیے ہمیں یہاں سے روانہ ہونا پڑے گا۔'' وہ بولی ''وجدان! میں تو کہتی ہوں، گاڑی کو فوراً یہاں سے نکالو۔ اگر پھر کبھی یہ بہروپیا ہماری راہ میں آیا تو اس سے بڑے تسلی بخش طریقے سے نمٹ لیں گے۔''

صدف کی تجویز معقول اور بروقت تھی لہٰذا میں ہائی روف کو اسٹارٹ کر کے مال روڈ پر لے آیا۔ اگلے کٹ سے میں نے گاڑی کو موڑا اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ مال روڈ کا یہ سفر نہر کے قریب پہنچ کر کینال بینک روڈ تک لے جاتا پھر ہم نہر کے ساتھ ساتھ یہ سفر جاری رکھتے ہوئے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔

میں ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے حالیہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین واقعے کے بارے میں سوچنے لگا۔ صدف کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی وہاں سے ادھر ادھر نہیں ہوئی تھی۔ اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی اور میں اپنے تجربے کو نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ میں نے لگ بھگ آٹھ منٹ پریشانی کی حالت میں ٹہلتے ہوئے گزارے تھے۔ یہ واقعہ میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گیا تھا اور میں ابھی تک اس کی کوئی حتمی توجیہہ نہیں کر پایا تھا۔

چیئرنگ کراس کا سگنل کراس کیا تو صدف مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ''وجدان! تمہیں کیوں چپ لگ گئی۔ کیا میری کسی بات کا تم نے برا منایا ہے؟''

''کیا تم نے ایسی کوئی بات کی ہے؟'' میں نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

وہ سوچتے ہوئے بولی ''اپنی دانست میں تو نہیں کی۔''

''تب میری دانست میں بھی نہیں کی۔''

''پھر تم خاموش کیوں ہو؟''

''میں بہروپیے نقلی وجدان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

وہ پوچھنے لگی ''کیوں اس فضول کے چکر میں پھنس کر اپنی سوچ کو پراگندہ کرتے ہو؟''

''جو بات مجھے ہضم نہ ہو، میں اس کے بارے میں اس وقت تک سوچتا اور کھوجتا رہتا ہوں جب تک اس کی تہ تک نہ پہنچ جاؤں۔ یہ شخص آسانی سے جان نہیں چھڑا سکے گا، نہ میری سوچ سے اور نہ ہی نظر سے۔''

اس نے استفسار کیا ''پھر اس کے سلسلے میں کوئی بات سمجھ میں آئی؟''

''ہاں، میں تمہاری بات سے متفق ہو گیا ہوں۔''

''میری کون سی بات سے؟''

''تم نے کہا تھا، نقلی وجدان انسان نہیں، شیطان ہے۔ بے پناہ چالاک اور مکار ہے۔ اس کے پاس بہت سی قوتیں ہیں۔'' میں نے کہا ''میں بھی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بہروپیا وجدان واقعی کسی پراسرار قوت کا مالک ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ وہ نظر بندی کا علم جانتا ہے۔''

''نظر بندی کے بارے میں، میں نے بہت کچھ پڑھ اور سن رکھا ہے۔'' صدف نے سنسنی خیز لہجے میں کہا ''وجدان، تمہاری نقل سے واسطہ پڑا تو وہ بھی پراسرار اور باہنر نکل آیا۔ بڑا ایڈونچر ہے!''

میں نے کہا ''اس شخص سے نمٹنے میں بہت لطف آئے گا۔''

صدف نے پوچھا ''تم نے نظر بندی کا ذکر کیا ہے۔ اس حوالے سے بہروپیے کا کون سا کمال تمہارے سامنے آیا ہے؟''

''یہی کیا کم ہے کہ میں نے اسٹور سے باہر آ کر دیکھا تو نہ تم نظر آئیں اور نہ ہی یہ گرے ہائی روف۔'' میں نے بتایا ''میں تمہیں دروغ گو نہیں سمجھتا۔ تمہارا کہنا ہے، ایک لمحے کے لیے بھی تم اور گاڑی موقع سے نہیں ہٹی۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ نقلی وجدان نے نظر بندی کے عمل سے مجھے وہ منظر دکھایا ہوگا۔''

''ایسے شخص سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تمہیں جی کی قوت آزمانا ہوگی۔''

''وہ میرے دائرۂ کار میں تو آئے!'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔

اسی وقت صدف نے سنسنی خیز انداز میں ایک جانب اشارہ کیا اور ہیجانی لہجے میں بولی ''وہ رہا!''

''کیا رہا بھئی؟'' میں نے اس کے اشارے پر دائیں جانب گردن گھما کر دیکھا۔

صدف نے کہا ''جس شیطان کا ہم ذکر کر رہے تھے۔''

سرخ لینڈ کروزر میری نگاہ میں آ گئی۔ مذکورہ جیپ چڑیا گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ہمیں ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے روانہ ہوئے جتنا وقت ہوا تھا اس میں ممکن نہیں تھا کہ بہروپیا چڑیا گھر تک پہنچ جاتا۔ مال روڈ لاہور کی سب سے زیادہ صاف ستھری اور ''سلجھی'' ہوئی سڑک ہے۔ ٹریفک قوانین کی سب سے کم بے قاعدگی اور خلاف ورزی یہاں نظر آتی ہے۔ دو طرفہ ٹریفک نہایت ہی طریقے سلیقے سے رواں دواں رہتا ہے اور وہ سرخ جیپ تو سامنے سے آ کر چڑیا گھر کی طرف مڑی تھی گویا نقلی وجدان پی سی کی طرف سے آ رہا تھا۔ ایک دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں یا تو وہ واقعی پراسرار اور ماورائی علوم کا ماہر تھا کہ ناممکن کو ممکن کر دکھاتا تھا یا پھر چڑیا گھر کے گیٹ سے داخل ہونے والی لینڈ کروزر میں کوئی اور تھا۔ میں سڑک کی دوسری طرف سے جیپ میں بیٹھے ہوئے شخص کی جھلک نہیں دیکھ پایا تھا۔

صدف نے کہا ''یہ واقعی کسی شیطان سے کم نہیں۔ ابھی یاد کیا، ابھی حاضر۔''

میں نے اگلے کٹ سے ہائی روف کو موڑا اور واپسی کی سڑک پر ڈال دیا۔

صدف نے تشویش ناک انداز میں کہا ''وجدان! اس مردود پر لعنت بھیجو۔''

وہ سمجھ گئی تھی کہ میں نقلی وجدان کے تعاقب میں چڑیا گھر کی طرف جا رہا ہوں۔

میں نے کہا ''میں صرف اپنے تجسس اور شک کی تصدیق چاہتا ہوں۔ ہم نے سرخ جیپ کو دیکھا ہے۔ یہ بات یقینی نہیں کہ اس میں ہمارا مطلوبہ بندہ ہی ہو۔ وہ کوئی اور جیپ بھی ہو سکتی ہے۔ میں نمبر پلیٹ دیکھے بغیر مطمئن نہیں ہوں گا۔''

''اور اب اس لینڈ کروزر کا نمبر فور سیون تھری سیون ہے

ہوا تو؟"

"تو ہم بھی اس کے پیچھے چڑیا گھر میں داخل ہوں گے۔"

"میں تمہارے فطری تجسس سے انکار نہیں کرتی۔" وہ معتدل انداز میں بولی "میں خود بھی بہت متجسس واقع ہوئی ہوں لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا وجدان! کہیں ہم اس بہروپیے کے چکر میں الجھ کر بڑے پاشا کے جنازے میں شرکت سے نہ رہ جائیں!"

میں نے کہا "اللہ دتا نے مجھے بتایا تھا، لاہور سے سید پور ڈیڑھ دو گھنٹے سے زیادہ کا فاصلہ نہیں۔ اس وقت نو بجے ہیں۔ اگر ہم بارہ بجے بھی لاہور سے نکلیں تو بہ آسانی وقت پر وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مزید کمی بیشی تیز رفتار ڈرائیونگ سے پوری کی جاسکتی ہے۔" میں نے ذرا رکنے کے بعد اضافہ کیا "ہمارے پاس تین گھنٹے کا وقت ہے۔ اس عرصے میں ہم نقلی وجدان پر اچھی خاصی ریسرچ کر سکتے ہیں۔"

"مجھے نہیں امید، وہ ہمارے ہاتھ آ سکے۔" صدف نے کہا "اگر وہ واقعی نظر بندی کا علم جانتا ہے تو اس مرتبہ بھی وہی ہوگا جو تھوڑی دیر پہلے ڈیپارٹمنٹل اسٹور پر تمہارے ساتھ پیش آ چکا ہے۔ نظر بندی کا علم بہت کرشمے دکھاتا ہے۔"

میں نے کہا "بندش کسی بھی قسم کی ہو اس کا توڑ بھی موجود ہوتا ہے!"

میری اس دلیل کے بعد صدف نے کچھ نہ کہا اور ہم چڑیا گھر میں داخل ہو گئے۔ لینڈ کروزر کی نمبر پلیٹ کا جائزہ لیا گیا تو وہ اسی بہروپیے کی جیپ ثابت ہوئی۔ اس انکشاف نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ چند لمحات بعد ہم دو ٹکٹ حاصل کر کے چڑیا گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہو چکے تھے۔ اس مرتبہ صدف نے باہر رک کر بہروپیے کا انتظار کرنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا کیوں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تجربے میں ناکامی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

ہم پندرہ بیس منٹ تک مختلف جانوروں کے پنجروں کے پاس چکراتے رہے لیکن اس بندۂ پراسرار کی ایک جھلک دکھائی نہ دی۔ میں وہاں سے واپسی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ اچانک مجھے نظر آ گیا۔ وہ ایک بچے کی انگلی تھامے اسے شیر ببر دکھا رہا تھا۔ صدف کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"یہ اس کے ساتھ بچہ کیسا ہے، تھوڑی دیر پہلے تو یہ اکیلا تھا!"

میں نے کہا "میں خود حیران ہوں۔ میڈیکل سائنس نے ابھی اتنی زیادہ ترقی بھی نہیں کی۔"

صدف میڈیکل فائنل ائیر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ میری بات کو بڑی وضاحت سے سمجھتے ہوئے بولی "ہاں، یہ تو ناممکنات میں سے ہے۔"

"چلو، اسی سے جا کر پوچھتے ہیں۔" میں نے کہا اور بہروپیے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

ہم اس وقت پلے لینڈ کے پاس کھڑے تھے۔ یہاں سے شیر ببر کے پنجرے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن شاید اس نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔ وہ پنجرے سے ہٹ گیا اور بچے کی انگلی کو تھامے ایک ڈھلوانی راستے کی اونچائی چڑھنے لگا۔

میں نے صدف کے ساتھ اپنی پیش قدمی میں تیزی لاتے ہوئے کہا "کتنی عجیب سی بات ہے۔ عام طور پر ایسے مواقع پر بچے بڑوں کی انگلی تھامتے ہیں۔ اس بہروپیے نے اگر کوئی بچہ پایا بھی ہے تو اس کی انگلی پکڑے گھوم رہا ہے۔"

صدف نے گہری سنجیدگی سے کہا "ان عجیب و غریب باتوں کو تو رکھو ایک طرف۔ میں کسی اور ہی نکتے پر غور کر رہی ہوں۔"

"وہ نکتہ کون سا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تک ہم نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔" صدف نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا "صرف پشت ہی ہمارے سامنے آئی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے، وہ نقلی وجدان کے بجائے کوئی اور شخص ہو!"

صدف کی بات میں وزن تھا۔ واقعی مسلم ٹاؤن والے پل سے لے کر اب تک ہم اس کی پشت ہی دیکھتے آئے تھے مگر میں مخصوص جیپ اور ڈریسنگ کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو کل رات نہر کے کنارے میرے سامنے آیا تھا۔ وہاں میں نے اس کی شکل و صورت دیکھی تھی۔ وہ ہوبہو میں تھا۔ ہم دونوں کے قد کاٹھ، نقش و نگار اور خدوخال میں سرِ مو فرق نہیں تھا پھر اس کی پراسراریت بھی اسے نقلی وجدان ثابت کر رہی تھی۔

میں نے کہا "اس وقت ہم اس کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں، تم اس کی شکل بہ آسانی دیکھ سکو گی۔"

جب تک ہم مصنوعی ڈولفن والے فوارے کے پاس سے گزر کر اس ڈھلوانی راستے کی جانب بڑھتے، بہروپیا ہماری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے ڈھلوان چڑھنے لگے۔ اس راستے کے اختتام پر معلوم ہوا، اس طرف مختلف رنگ و نسل کے ٹائیگرز کے پنجرے ہیں۔ ایک قطار میں پانچ چھے پنجرے بنے ہوئے تھے جن میں خوش نما جلد اور بے

پناہ طاقت کے مالک شیر چیتے بند تھے۔

چڑیا گھر کے اس حصے میں لوگوں کا بہت رش تھا۔ مرد و زن اور ہر عمر کے بچے بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ میں متلاشی نظر سے بہروپیے کو ڈھونڈنے لگا۔ صدف کا حال بھی مجھ سے زیادہ مختلف نہیں تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔

"عجیب مصیبت ہے یہ شخص بھی!" صدف کی جھنجلائی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں بھی حیران تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ وہاں موجود افراد میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے سراسر سفید لباس پہن رکھا ہو۔ ہم تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس حصے کے آخری حصے میں پہنچ گئے۔ آگے راستہ بند تھا۔ اس راستے کو چڑیا گھر کی انتظامیہ نے عارضی طور پر بند کر رکھا تھا۔ وہاں کوئی تعمیری کام ہو رہا تھا۔ شیروں والا آخری پنجرہ بھی خالی تھا۔ ایک چھوٹے سے بورڈ پر وارننگ نما ہدایت بھی درج تھی کہ کوئی بھی شخص اس طرف آنے کی کوشش نہ کرے ورنہ اپنے نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔

"وہ تو یہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا وجدان!" صدف نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "کہیں ادھر تو نہیں کود گیا!"

اس کا اشارہ اسی خطرناک حصے کی جانب تھا جدھر جانے سے عوام الناس کو منع کیا گیا تھا۔

میں نے کہا "بظاہر تو یہی لگتا ہے ورنہ اگر وہ یہاں ہوتا تو ہم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے ممنوعہ حصے کی دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا "چلو، واپسی کے راستے سے ہو کر ادھر جاتے ہیں۔"

اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور ہم واپسی کے لیے پلٹ گئے۔ اسی وقت ہم دونوں کو ایک ساتھ حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ کمینہ شخص ڈھلوانی راستہ اتر کر اس حصے سے نکل رہا تھا۔ میں نے صدف سے کہا "بھاگو! ورنہ وہ نکل جائے گا۔"

ہم نے دوڑنے والے انداز میں قدم اٹھائے ہی تھے کہ عقب میں آوازیں ابھریں "پکڑو...... جانے نہ پائیں دوڑو...... وہ نکل رہے ہیں......"

پھر اس سے پہلے کہ ہم رک کر صورتِ حال کا جائزہ لیتے، ہمیں درجن بھر افراد نے گھیرے میں لے لیا۔ صدف کو تو کسی نے چھونے یا پکڑنے کی کوشش نہیں کی البتہ مجھے بازوؤں سے تھام لیا گیا۔

میں نے غصے سے جھٹک کر اپنے بازو چھڑائے اور سخت لہجے میں کہا "یہ کیا بدتمیزی ہے، مجھے اس طرح کیوں پکڑ رہے ہو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"اس طرح نہ پکڑیں تو پھر کس طرح پکڑیں۔" ایک نوجوان نے جوشیلے لہجے میں کہا "تم نے ہمارا نہیں بلکہ اس عورت کا کچھ بگاڑا ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے ایک خوش لباس خاتون کی جانب اشارہ کر دیا۔ اسی وقت انکشاف ہوا کہ مجھے ایک جیب کترے کی حیثیت سے دبوچنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مذکورہ عورت کا دعویٰ تھا کہ میں نے اس کے پرس میں ہاتھ ڈالا تھا۔

میں نے برہمی سے کہا۔

"کیا آپ نے مجھے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالتے دیکھا تھا؟"

"ہاں دیکھا تھا۔" وہ ڈھٹائی سے بولی "تم نے میرے پرس میں سے چھوٹا بٹوا اڑایا ہے۔ یہ دیکھو، پرس کی زپ کھلی ہوئی ہے۔"

پھر اس نے مجھے اپنا کھلا ہوا پرس دکھایا۔ اس وقت تک چڑیا گھر کے سیکیورٹی اسٹاف کے دو افراد بھی اس ہنگامہ آرائی کی بو سونگھ کر ہمارے نزدیک آ گئے۔ وہ دونوں بڑی خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "محترمہ لگتا ہے، آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اگر واقعی آپ کا بٹوا نکلا ہے تو پھر آپ راستہ پیٹ رہی ہیں، میرے خیال میں سانپ نکل چکا ہے۔"

"تم تلاشی دو۔" سیکیورٹی کے ایک شخص نے مجھ سے کہا۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کا ایک ہی آسان طریقہ تھا کہ میں جامہ تلاشی میں رکاوٹ نہ بنتا۔ میں نے کوئی بٹوا نہیں مارا تھا اس لیے فکرمندی کی کوئی بات نہیں تھی۔

"آپ خوشی سے میری تلاشی لے سکتے ہیں۔" میں نے سیکیورٹی والے سے کہا۔

وہ آگے بڑھا اور مجھے ٹٹولنے اور پرکھنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا "بٹوا تو اس کے پاس نہیں ہے۔"

مجمع میں موجود ایک شخص نے خیال آرائی کی "اس نے بٹوا اپنی ساتھی کو دے دیا ہوگا۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے چیخ کر کہا "میں تم لوگوں کے چیف سے بات کرتا ہوں۔"

"صاحب! اس میں غصہ کرنے کی کون سی بات ہے۔"

سیکیورٹی والا قدرے نرمی سے بولا ”بٹوا آپ کے پاس سے برآمد نہیں ہوا۔ اگر آپ لوگوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تو آپ کی ساتھی کے پاس بھی وہ بٹوا نہیں ملے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہمارا لیڈیز اسٹاف ان کی تلاشی لے گا۔ ویسے آپ چاہیں تو ہمارے چیف سے بات کر سکتے ہیں۔“

اس کی بات معقول تھی۔ جب ایک عورت دعوے دار تھی کہ میں نے اس کے پرس میں سے بٹوا نکالا ہے تو سیکیورٹی والا میری اور صدف کی تلاشی لینے میں حق بجانب تھا۔ اس مصیبت سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کے لیے یہ از حد ضروری تھا۔ میں نے سیکیورٹی والے کی بات مان لی۔ ایک کمرے میں ایک لیڈی سیکیورٹی گارڈ نے صدف کی تلاشی لی اور نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مذکورہ بٹوا اس کے پاس بھی نہیں ہے۔ اب سیکیورٹی والوں کے پاس ہمیں روکنے یا ہمارے خلاف کسی قسم کی کارروائی کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا، لہٰذا معذرت کے بعد ہمیں فارغ کر دیا گیا۔

ہم چڑیا گھر سے نکل کر گرے ہائی روف کی طرف آئے تو صدف نے پوچھا ”وجدان! یہ سب کیا تھا؟“

”مہم جوئی۔“ میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا ”تمہاری تفریحِ طبع کے لیے قدرت نے کچھ سامان کر دیا تھا۔ تمہیں ایڈونچر بہت پسند ہے نا!“

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی ”قدرت نے یا اس کم بخت بہروپیے نے؟“

”جب اس کے بارے میں ہم اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ وہ نظر بندی کے ساتھ ساتھ کچھ پراسرار علوم سے بھی واقف ہے تو پھر کیوں، کون، کیا اور کیسے جیسے الفاظ بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ تمہاری طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ نقلی وجدان نے ہم سے جان چھڑانے کے لیے کسی بھی طرح وہ ناٹک رچایا ہے۔ وہ ہمیں اس معاملے میں الجھا کر ہماری توجہ خود سے ہٹوانا چاہتا تھا۔ اس سے ایک یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ وہ یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ ہو گیا تھا۔“

”بھاڑ میں گیا وہ بہروپیا اور اس کے پراسرار علوم۔“ صدف نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بیزاری سے کہا ”خواہ مخواہ بار بار ہمیں پریشان کرنے چلا آتا ہے۔“

میں نے ہائی روف اسٹارٹ کی اور چڑیا گھر سے باہر نکل کر اسے مال روڈ پر لے آیا۔ اب ہمارا رخ ریگل کی جانب تھا۔ میں نے صدف کو چھیڑنے کی غرض سے کہا ”اگر بہروپیا تمہارے خیالات سے آگاہ ہو گیا تو تمہاری شامت آ جائے گی۔“

وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی ”میری بلا سے۔ میں اس سے نہیں ڈرتی۔ اگر اس میں ہمت ہے تو سامنے آ کر مقابلہ کرے۔ وہ تو ابھی تک ایک بھگوڑے کا کردار ادا کر رہا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی ”ویسے وجدان! تمہاری یہ نقل بالکل تمہاری ہی طرح پیچیدہ ہے!“

”مجھ میں ایسی کیا پیچیدگی دیکھ لی تم نے؟“

”اچھا سوال ہے۔“ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بولی ”خیر، تمہارے سوال کا میں کسی مناسب موقع پر جواب دوں گی۔“

”گویا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ یہ موقع مناسب نہیں؟“

”خیر، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیسی بات ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

اس کے گریز اور ہچکچاہٹ نے مجھے اُکسایا۔ نقلی وجدان نے اپنے رویّے سے خاصی کوفت میں مبتلا کیا تھا، میں نے صدف سے تفریح لیتے ہوئے کہا ”میں نے تمہاری بات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تم دل میں بہروپیے سے ڈر رہی ہو اسی لیے لب کشائی میں ہچکچا رہی ہو ورنہ میرے سوالات اتنے پیچیدہ یا مشکل نہیں ہیں کہ ان کے جواب دینے کے لیے کسی خاص موقع کا انتظار کیا جائے۔“

میری بات ختم ہوئی تو وہ تڑخ کر بولی ”وجدان! اس بھگوڑے سے ڈرتی ہے میری جوتی۔“

”جوتا اور جوتی!“ میں نے گاڑی کو بائیں جانب فاطمہ جناح روڈ پر موڑتے ہوئے کہا ”یہ دونوں بے زبان اور بے جان ہیں اس لیے یہ کسی سے نہیں ڈرتیں بلکہ حضرتِ انسان دوسرے انسانوں کو ڈرانے کے لیے بعض اوقات ان سے کام لیتا ہے۔“

وہ جلے کٹے انداز میں بولی ”وہ خبیث مجھے کہیں سے بھی انسان نہیں لگتا، حضرتِ انسان تو بہت دور کی بات ہے۔ اب اگر وہ میرے سامنے آیا تو میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔“

”بہت خوب!“ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”وجدان! کمال ہو گیا!“ صدف کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ”شاید اس بہروپیے نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ وہ دیکھو۔“ اس نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا ”وہ اس کی...... سرخ جیپ......“

میں نے صدف کے اشارے کی تقلید میں نگاہ دوڑائی اور مجھے لینڈ کروزر نظر آ گئی۔ وہ پلازا سنیما سے ذرا آگے گاڑیوں کے ایک شوروم سے باہر آ رہا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی جیپ کی نمبر پلیٹ دیکھ لی۔ وہ واقعی نقلی وجدان ہی تھا۔ اس مرتبہ بھی ہماری نگاہیں اس کی پشت تک ہی محدود رہیں۔ دونوں گاڑیوں میں ایک مخصوص فاصلہ برقرار تھا۔ اس وقت ہم فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے سامنے سے گزر رہے تھے جب صدف نے ششپٹائے ہوئے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ”آخر یہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟“

”ہم سے نہیں بلکہ صرف مجھ سے۔“ میں نے تصحیح کرتے ہوئے کہا ”اس کی دوستی اور دشمنی صرف اور صرف مجھ تک محدود ہے۔ اب تک میں فیصلہ نہیں کر پایا ہوں کہ اسے دوست سمجھوں یا دشمن!“

صدف نے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا ”ایسے شخص سے دوستی کیسے ہو سکتی ہے جو قدم قدم پر تکلیف کا باعث ہو؟“

میں نے کہا ”ابھی تک اس نے مجھے واضح طور پر کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے اور نہ ہی فائدہ!“ میں ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”اور جہاں تک اس کے موجودہ رویّے کی بات ہے تو اس میں اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہم اپنی مرضی سے اس کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں اور...... کوفت اٹھا رہے ہیں۔“

”یہ اچھی منطق ہے۔“ وہ خفگی سے بولی ”وجدان! تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے، تم نقلی وجدان کی فیور کر رہے ہو۔ کہیں اس نے کچھ پڑھ کر تم پر پھونک تو نہیں دیا؟“

میں نے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ٹھنڈے دل و دماغ سے حالات کا تجزیہ کرو تو تم بھی اسی نتیجے پر پہنچو گی جہاں میں پہنچ چکا ہوں۔“

”میں ایسے فضول تجزیوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔“ وہ لاتعلقی کا رویّہ اپناتے ہوئے بولی ”تم مجھے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بتاؤ؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”ہم سید پور جا رہے ہیں۔“

”کیا اس کے ساتھ ساتھ۔“ وہ بھویں سکیڑتے ہوئے بولی ”اس کی راہ نمائی میں؟“

”مجھے سید پور تک جانے کے لیے کسی کی راہ نمائی کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا ”اللہ دتا نے راستے کی تفصیل بڑی تسلی سے مجھے سمجھائی ہے۔ میں ذہن میں طے کردہ راستے پر گاڑی دوڑاؤں گا۔ سرخ جیپ کی وجہ سے کوئی راستہ تبدیل نہیں کروں گا۔ اب یہ جہاں تک چلتا ہے، چلے۔ جس رفتار سے چلنا چاہتا ہے، اس کی مرضی۔“

وہ شک آمیز نظر سے مجھے گھورتے ہوئے بولی ”لگتا ہے، تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو اسی لیے نقلی وجدان کو اہمیت نہیں دے رہے ہو؟“

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں، تم خواہ مخواہ وہم میں نہ پڑو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں یا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے؟“

”واقعی ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے قطعیت سے کہا ”اور اگر میں کسی نتیجے پر پہنچ گیا تو سب سے پہلے میں تمہیں ہی آگاہ کروں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“

وہ مطمئن ہو کر ونڈ اسکرین کے پار سرخ لینڈ کروزر کو تکنے لگی۔

میں نے صدف سے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں ابھی کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا تاہم میں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر وہ بہروپیا میرے ساتھ برا نہیں کر رہا تو میں بھی فی الحال اسے فراموش کر دوں۔ مجھے سب سے پہلے سید پور اور رکھاں والی مشن دیکھنا تھا پھر نقلی وجدان سے بھی نمٹ لیا جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اگر از خود میری راہ کی رکاوٹ بنتا تو میں اسے بھی دیکھ لیتا۔

مزنگ چونگی پر میں نے فاطمہ جناح روڈ کو چھوڑ دیا اور ہائی روف کو گلبرگ روڈ پر ڈال دیا۔ یہ سڑک اپوا کالج ... اپنے

سے گزر کر کینال بینک روڈ سے جاملتی پھر ہمارا راستہ سیدھا ہو جاتا۔ سرخ لینڈ کروزر مخصوص فاصلے سے ہمارے آگے جارہی تھی لیکن کینال بینک روڈ پر آنے کے بعد اس نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور مال روڈ کی کراسنگ پر وہ بائیں جانب مڑ کر مال روڈ پر رواں دواں ٹریفک کا حصہ بن گیا۔

صدف نے اطمینان کا سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''شکر ہے، اس مصیبت سے تو جان چھوٹی۔''

میں نے نقلی وجدان کی ''رخصتی'' پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور کینال بینک روڈ پر گاڑی کو آگے بڑھاتا چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم فتح گڑھ کو پیچھے چھوڑ کر سید پور کی جانب گامزن تھے۔

دو تین کلومیٹر آگے آنے کے بعد سڑک اتنی ہموار نہ رہی جتنی پہلے تھی۔ مجھے ہائی روف کی رفتار قدرے کم کرنا پڑی۔ س کے ساتھ ہی سڑک بھی کچی ہونے کے سبب دھول مٹی بھی اڑا رہی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔

اس دوران میں ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہ کرید کرید کر میری گزری ہوئی زندگی کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ اس کا یہ استفسار یہ مارشل آرٹس اور ''جی'' تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ وہ معاشی اور معاشرتی ٹوہ میں بھی لگی ہوئی تھی۔

ہم بات چیت کرتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ سید پور کے نزدیک پہنچ رہے تھے کہ ونڈ اسکرین کے پار دور سڑک پر میں نے گرد وغبار کا ایک طوفان اٹھتے دیکھا۔ یہ منظر صدف کی نگاہ سے بھی پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ وہ خیال آرائی کرتے ہوئے بولی۔

''میرے خیال میں کوئی گاڑی تیز رفتاری سے ہماری جانب آرہی ہے۔''

''میں تمہارا ہم خیال ہوں۔'' میں نے کہا۔

اسی وقت فضا میں ایک مخصوص قسم کے سائرن کی صدا گونج اٹھی۔ ایسا ہارن یا تو پولیس موبائل پر نصب ہوتا ہے یا پھر ایمبولنس پر۔

صدف چونکے ہوئے لہجے میں بولی ''یہ کوئی ایمبولنس ہو سکتی ہے۔ کسی ایمرجنسی مریض کو اسپتال پہنچانے کے لیے وہ اس تیز رفتاری پر مجبور ہیں۔''

''ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''اور اس کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟'' وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''کوئی عجب نہیں، یہ پولیس موبائل ہو!''

صدف نے تشویش ناک نظر سے مجھے دیکھا۔ اس دوران میں متذکرہ گاڑی کھل کر سامنے آچکی تھی۔ وہ گرد کی لپیٹ میں تو اب بھی تھی تاہم ہمارے درمیان فاصلہ چونکہ بتدریج کم ہو رہا تھا اس لیے اسے دیکھنا ممکن ہو گیا تھا۔

میں نے محدود فاصلے سے اسے پہچان لیا۔ وہ سفید رنگ کی ایک ٹویوٹا ہائی ایس تھی جس کے ماتھے پر مخصوص سرخ بتی اپنی گردشی حرکت جاری رکھے ہوئے تھی۔ اس گردش کا ساتھ دینے کے لیے ہارن کی آواز بھی مسلسل فضا کا حصہ بنتی جارہی تھی۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب ہمارے درمیان انتہائی کم فاصلہ رہ گیا۔ چند لمحوں بعد ہم ایک دوسرے کے پہلو سے گزرنے والے تھے اور اسی وقت میری نگاہ ایمبولنس کی پسنجر سیٹ پر گئی اور...... وہ وہیں چپک کر رہ گئی۔

پسنجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ کر مجھے اپنے وجود میں زلزلے کے آثار محسوس ہوئے۔ میں نے اسے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں پہچان لیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ شعیب غوری کا قابلِ اعتماد نائب کبیر شاہ عرف شاہ جی تھا۔

مجھے اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ شاہ جی کا لاہور کے گرد ونواح سے دور کا بھی تعلق، واسطہ نہیں تھا اور وہ ایک ایمبولنس کی پسنجر سیٹ پر بیٹھ کر سید پور سے لاہور کی جانب آرہا تھا! یہ حیرت انگیز کے ساتھ ساتھ ایک ناقابلِ یقین بات بھی تھی۔

''وہ سید پور سے نہیں بلکہ رکھاں والی سے آرہا ہے!'' میرے اندر کسی نے سرگوشی کی۔ میں نے چھٹی حس کی اس پکار کو فوراً سے پیشتر سمجھ لیا۔

اسی وقت دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو آگئیں اور بے ساختہ میری نگاہ ایمبولنس کے پچھلے حصے کی جانب اٹھ گئیں۔ وہاں اسٹریچر پر کوئی لیٹا تھا۔ یقینی طور پر یہ وہی شخص تھا جسے ایمرجنسی میں اسپتال پہنچایا جارہا تھا۔

میرے بدن کا سارا خون دل میں جمع ہو گیا اور دل نے پوری شدت سے دھڑک کر کہا ''یہ میری رگِ جاں ساحل ہے......!''

میں نے ہر قسم کی احتیاط اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر جسم وجاں کی ساری توانائی صرف کرکے بریک پیڈل کو دبا دیا۔

ہائی روف میں زلزلے کے آثار پیدا ہوئے اور وہ ایک ...ناک جھٹکا کھا کر رک گئی۔ ریڈیل پلائی (RADIAL-PLY) ...ٹروں کی گرفت ایسی ہی مضبوط ہوتی ہے، گاڑی کو روڈ پر باندھ ...رکھ دیتی ہے۔ ان نازک لمحات میں صدف نے خاصی ہوش ...مندی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ میں نے جیسے ہی میکانکی ...انداز میں بریک لگائے، اس نے بے اختیار اپنے دونوں بازو ...سامنے پھیلائے اور ڈیش بورڈ کا سہارا لے کر خود کو کسی بڑے ...نقصان سے بچالیا۔ ممکن ہے، یہ اس کا غیر ارادی عمل ہو۔ ...بہرحال وہ شدید زخمی ہونے سے محفوظ رہی۔ اس کی احتیاطی ...جنبش نے مفید کام دکھایا۔

ہائی روف آناً فاناً رکی تو اس کا انجن خاموش ہو گیا۔ ...اصولی طور پر ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع ...کیے بغیر انجن کو دوبارہ بیدار کرنے کی کوشش کی لیکن میری یہ ...کوشش ناکامیاب رہی۔ دوسری تیسری کوشش میں ناکامیاب ...ہونے کے بعد میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی کا دروازہ کھولا ...اور باہر نکل آیا۔ اس وقت مجھ پر ایک وحشت سی سوار تھی۔ ...میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، ساحل لمحہ بہ لمحہ مجھ سے ...دور ہوتی جارہی ہے!

میں اپنے اندر ... کی اس آواز پر دھیان دینے کے لیے ...مجبور تھا۔ میں گاڑی سے نیچے اترا تو صدف نے جھنجلائے ...ہوئے لہجے میں کہا ''وجدان! تم کہاں جارہے ہو؟''

''وہ...... وہ ساحل کو لے گئے......'' میں نے بے خودی کے عالم میں کہا۔

صدف اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر ہائی روف سے نیچے ...اتر آئی اور حیرت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی ''تم کس ...ساحل کا ذکر کر رہے ہو؟''

''وہ ہائی ایس میں اسٹریچر پر تھی۔'' میرے لہجے میں ...جنون کی آمیزش تھی ''کبیر شاہ اسے کہیں لے جارہا ہے...... ...مجھے پہلی فرصت میں ساحل تک پہنچنا ہے۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی میں نے ہائی روف کی باڈی پر ...ایک زوردار تھپڑ مارا ''تم نے بھی اسی وقت دھوکا دینا تھا!'' ...میں نے زہر خند انداز میں کہا اور اچانک پلٹ کر اس سمت دوڑ ...پڑا جدھر ٹویوٹا ہائی ایس گئی تھی۔

یہ میرا ایک اضطراری عمل تھا۔ ساحل کے خیال نے مجھے ...بے اختیار کر دیا تھا۔ میں چاہے جتنی بھی تیز رفتار سے کیوں نہ ...دوڑتا، ہائی ایس کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں ان جنونی لمحات میں جو ...کچھ بھی کر رہا تھا وہ میرے بس میں نہیں تھا۔ یوں محسوس ہو رہا ...تھا کوئی نادیدہ قوت مجھے اپنی انگلی کے اشارے پر نچا رہی ہو۔

میں ہر صورت میں ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا۔

مجھے اپنے عقب میں صدف کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی ''وجدان! تمہارا پاگل پن میری سمجھ سے باہر ہے۔ پتا نہیں، تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟''

اپنی باتوں کی اقسام گنوانے اور بتانے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں صدف کی سنی، ان سنی کرتے ہوئے اندھا دھند دوڑتا چلا گیا۔ اس وقت میری سوچ ایک نقطے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھی اور وہ نقطہ تھا...... ساحل!

صدف کی طرح بعض لوگ میری ان حرکات کو پاگل پن کے کھاتے میں ڈال رہے ہوں گے لیکن میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا تھا، اضطراری انداز میں مجھ سے جو بھی سرزد ہو رہا تھا اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میرا کوئی مضبوط جذبہ مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں ساحل کا تعاقب کروں۔ اگر آج مجھے تاخیر ہو گئی تو پھر میں زندگی میں کبھی اسے حاصل نہیں کر سکوں گا، وہ مجھ سے اتنی دور چلی جائے گی جہاں شاید میری سوچ بھی نہ پہنچ سکے!

بعض اوقات انسان کے اندر اتنا طاقت ور جذبہ پیدا ہوتا ہے جو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو اپنے تابع کر لیتا ہے۔ اس جذبے کے زیرِ اثر انسان بڑی سے بڑی قوت سے بھی ٹکرا جاتا ہے اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، صحیح کر رہا ہے۔ ایمبولینس کے عقبی حصے میں، میں نے ایک اسٹریچر رکھا دیکھا تھا جو سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ اسٹریچر پر لیٹا ہوا شخص چادر کے نیچے نظر نہیں آرہا تھا لیکن میرے دل کی دھڑکن بار بار مجھے یقین دلا رہی تھی کہ اس اسٹریچر پر ساحل ہے...... ساحل کے سوا اور کوئی نہیں!

سفید ایمبولینس گرد وغبار کے طوفان میں میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے مخصوص سائرن کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔ اس کا مطلب یہی تھا، وہ بہت دور نکل گئی تھی۔ اس احساس نے مجھے حد درجہ تکلیف پہنچائی کہ میں دوڑ کر اس ایمبولینس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو کیا، میں ساحل کو نہیں پا سکوں گا؟

اس سوال نے مجھے سرتاپا لرزا دیا۔ میں نے ساحل کی جدائی میں پہلے ہی بہت تکلیف اٹھائی تھی۔ لاتعداد نامہربان لمحات ہمارے درمیان حائل ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے کئی بے قرار شامیں اور بے کیف صبحیں اس کے بغیر گزاری تھیں۔ میرے قدم یک بیک رک گئے اور میں حقیقت پسندانہ انداز میں ایک عملی انسان کی طرح ساحل کے بارے میں سوچنے لگا۔

میں نے ایمبولینس کی پسنجرز سیٹ پر کبیر شاہ کو بیٹھے دیکھا تھا اور میرے دل میں یہ احساس جاگا تھا کہ وہ ”رکھاں والی“ سے آ رہا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ایمبولینس والوں نے ایک لمحے کے لیے بھی گاڑی روکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کبیر شاہ عرف شاہ جی نے مجھ پر توجہ نہیں دی تھی۔ یقینی طور پر اس نے مجھے دیکھا نہیں ہوگا۔

کبیر شاہ میرے دشمنِ جاں شعیب غوری کا دستِ راست تھا۔ اگر اس نے ہائی روف میں مجھے دیکھ لیا ہوتا تو وہ رکے بنا رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ خوفناک بریک کی آواز نے بھی انہیں ہماری طرف متوجہ نہیں کیا۔ شاید وہ کسی ایمرجنسی میں بھاگے چلے جا رہے تھے۔

میں نے اسی سوچ بچار میں پلٹ کر دیکھا تو تھوڑے فاصلے پر مجھے صدف اپنی سمت آتی دکھائی دی۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں دو بیگز بھی اٹھا رکھے تھے۔ یہ یقیناً وہی بیگز تھے جو ہائی روف کی عقبی نشست پر رکھے تھے۔ صدف نے بیگز اپنے ساتھ لا کر عقل مندی کا ثبوت دیا۔ ہائی روف کسی خرابی یا پھر ہماری ناواقفیت کے باعث ہمارے کام کی نہیں رہی تھی۔ ہمیں لاہور کی طرف جانے کے لیے کسی اور سواری کا بندوبست کرنا تھا......اور جلد از جلد کرنا تھا۔

صدف کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں سفید ایمبولینس کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس گاڑی کا نمبر میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ ون تھری سکس نائن...... میں نے زیرِ لب نمبر کو دہرایا پھر وہ لوگو (LOGO) میری یادداشت میں چمکنے لگا جو میں نے اس ایمبولینس کی باڈی پر بنا دیکھا تھا۔ وہ ایک معروف پرائیویٹ اسپتال کا مخصوص لوگو تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ اسپتال نیو کیمپس کے علاقے میں واقع تھا۔ اس وقت مجھے اپنی مضبوط یادداشت اور قوتِ مشاہدہ پر از حد مسرت ہوئی۔ میں اسپتال کے مخصوص لوگو اور ایمبولینس کے نمبر کے ذریعے یہ معلوم کر سکتا تھا کہ ایمبولینس نے میری ساحل کو کہاں پہنچایا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ اسے مذکورہ پرائیویٹ اسپتال ہی پہنچایا ہوگا۔

پھر میرا دھیان ایمبولینس میں موجود افراد کی طرف چلا گیا۔ ڈرائیور اور کبیر شاہ کے علاوہ گاڑی کے پچھلے حصے میں بھی دو افراد موجود تھے۔ میں ان کی عمروں یا حلیوں کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے سے قاصر تھا کیونکہ میں نے ان کی لمحاتی جھلک دیکھی تھی۔ ان نازک ساعتوں میں میرا قلب و جگر ساحل کے خیال کے زیرِ اثر تھا اور بے اختیار میں نے بریک لگا دیے تھے۔

صدف قریب پہنچ کر وحشت زدہ نظر سے مجھے [illegible] لگی۔ میرے اس اضطراری عمل نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا [illegible] اس کا الجھنا غلط نہیں تھا۔ میرے چہرے پر نظر جما کر اس [illegible] ”وجدان! کیا میں اسے تمہارا کوئی بھیانک مذاق سمجھوں [illegible]“

”نہیں۔“ میرے لہجے کی قطعیت نے اسے چونکا [illegible] میں نے بپھرے ہوئے انداز میں کہا ”یہ مذاق نہیں بلکہ حقیقت ہے...... ایک سنگین حقیقت۔“ میں نے [illegible] جانب، سڑک پر دور تک نگاہ دوڑائی۔ مجھے کسی سواری کی [illegible] تھی تاکہ جلد از جلد سفید ایمبولینس کا تعاقب کر سکوں۔

صدف نے میری کیفیت سے یہ تو بھانپ لیا کہ میں [illegible] درجہ سنجیدہ ہوں لیکن وہ میرے حالات اور عزائم کو [illegible] پہنانے سے قاصر تھی چنانچہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”یہ ساحل کون ہے جس کے لیے تم اتنے بے [illegible] ہو رہے ہو؟“

”ساحل......“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ”میری رگِ جاں ہے۔“ آیوں آپ میری آواز بلند ہوتی چلی [illegible]

مجھے حیرت تھی کہ ان لمحات میں، میں ایسا بے خود [illegible] ہو گیا تھا۔ میں نے صدف کے سامنے اعترافِ محبت [illegible] جھجک محسوس کی تھی اور نہ ہی کسی مصلحت کی آڑ لینے کی کو [illegible] تھی جبکہ مجھے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا، صدف میرے [illegible] اپنے دل میں کس قسم کے جذبات رکھتی ہے۔

ساحل سے اظہارِ تعلق میرے دل کی زبان تھی اور دل [illegible] زبان مصلحت کوش نہیں ہوتی۔ وہ سچ بولنے کے لیے کسی [illegible] سہارا نہیں لیتی اور...... سچ یہ تھا کہ ساحل میرے لیے [illegible] زندگی سے زیادہ اہم ہو چکی تھی۔ میں اپنے جذبات [illegible] پوشی کس طرح کرتا۔ میرے انکشاف نے صدف کو ایک [illegible] جھٹکا پہنچایا، وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تو...... یہ تمہارا...... دل کا معاملہ ہے!“

صدف کے الفاظ میں پوشیدہ چھناکا بڑی وضاحت [illegible] ساتھ میری سماعت تک پہنچا۔ میں نے محسوس کیا، اس [illegible] کوئی کانچ محل مسمار ہوا تھا جس کی مہلک کرچیوں نے [illegible] اندر کو لہولہان کر کے رکھ دیا تھا۔ تکلیف کے آثار [illegible] چہرے کے ایک ایک نقش سے ہویدا تھے۔ میں ان [illegible] صدف کی دل جوئی کا سامان کرنے سے قاصر تھا [illegible] موقع ہوتا تو شاید میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا [illegible] سرِدست اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور کسی سواری [illegible] میں میری نگاہ بل کھاتی کچی پکی سڑک کو ناپنے لگی۔

اسی لمحے سید پور کی جانب سے اٹھنے والا گرد و غبار کا ایک [illegible] میری نظر میں آ گیا۔ کوئی ہیوی گاڑی بڑی تیزی سے [illegible] ہماری جانب آ رہی تھی۔ وہ گاڑی میرے لیے کسی امید کی [illegible] کے مانند تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، [illegible] روکنے کی کوشش کروں گا اور ہر ممکن طور پر اسے لاہور کی [illegible] لے کر جاؤں گا۔

صدف نے بھی اس دھول اڑاتی گاڑی کو دیکھ لیا۔ وہ [illegible] نزدیک آ گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ دوڑائی [illegible] مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کا چہرہ غم و [illegible] کا مرقع بنا ہوا تھا لیکن اب وہ بڑی پُرسکون دکھائی دے [illegible] تھی۔ اس کا تو یہی مطلب تھا یا تو اس نے ساحل کے [illegible] سے انکشاف کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی یا پھر وہ [illegible] کا ضبط رکھتی تھی۔ دوسری بات ہی درست لگتی تھی کیونکہ [illegible] اس نے ساحل کے معاملے کو نظر انداز کیا ہوتا تو پھر اس [illegible] چہرے پر دکھ کے آثار نمودار نہ ہوتے۔ میں فوری طور پر [illegible] نتیجے پر پہنچا کہ وہ سب کچھ پی گئی تھی، چاہے وقتی طور پر ہی [illegible] لیکن اس نے بڑی خوب صورتی سے اپنے جذبات پر قابو [illegible] پا لیا تھا۔ میں اس کی مضبوط قوتِ ارادی کا ایک مرتبہ پھر قائل [illegible] ہو گیا۔

گرد کے طوفان میں لپٹی ہوئی وہ گاڑی لمحہ بہ لمحہ قریب [illegible] رہی تھی۔ صدف نے سپاٹ لہجے میں کہا ”ساحل کے [illegible] بارے میں تو پھر کبھی فرصت سے بات ہوگی لیکن اتنا تو بتا دو، تم [illegible] نے کیسے اندازہ لگایا، اس ایمبولینس میں کوئی عورت بھی موجود [illegible] ہے۔ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ کہیں تمہیں کوئی دھوکا تو نہیں [illegible] ہوا؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا صدف۔“ میں نے دو ٹوک [illegible] میں کہا ”ایمبولینس میں رکھے اسٹریچر پر ساحل کے سوا اور [illegible] کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔“

”وہ بے یقینی سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے محسوس کیا، اسے [illegible] میری دماغی کیفیت پر جیسے شبہ ہو رہا تھا۔ اسٹریچر سفید چادر سے [illegible] ڈھکا ہوا تھا لہٰذا وہ اس قسم کا شک کرنے میں حق بجانب بھی [illegible] تھا۔

چند لمحے میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے [illegible] بھرائی آواز میں کہا ”میں تمہاری حالت کو دیکھتے ہوئے کسی [illegible] بحث و تکرار کو مناسب نہیں سمجھتی۔ ذرا فرصت میسر آ جائے پھر [illegible] تفصیلی بات ہوگی۔ ویسے پچھلے پندرہ منٹ میں یہاں جو کچھ [illegible] ہوا ہے وہ میرے لیے ناقابلِ یقین اور الجھن کا سبب [illegible]

”میں تمہاری ہر الجھن کی سلجھن پیش کر دوں گا۔“ میں نے گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا ”فی الحال تو مجھے پہلی فرصت میں ساحل تک پہنچنا ہے۔“

وہ خاموش ہو کر ہمدردانہ نگاہ سے مجھے تکنے لگی۔

میں اپنی جانب آتی گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگا۔ میں واضح طور پر اسے رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے میرے اشارے کو سمجھ لیا اور وہ گاڑی ہمارے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔

وہ ایک کھلی ٹویوٹا ہائی لکس تھی جس کے عقبی کھلے حصے میں لگ بھگ دو درجن دودھ کے ڈرم رکھے نظر آ رہے تھے۔ وہ بار برداری میں استعمال ہونے والی ہیوی گاڑی تھی جو دودھ کے ڈرمز کو کہیں پہنچانے جا رہی تھی۔ میں نے گردن جھکا کر ڈرائیونگ کیبن میں نظر دوڑائی۔ وہاں ڈرائیور کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا۔

میں نے ہٹے کٹے ڈرائیور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہماری گاری میں کوئی سنجیدہ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ تم ہمیں اپنی گاڑی میں لفٹ دے سکتے ہو؟“

اس نے پہلے سر تا پا میرا جائزہ لیا پھر اس کی نظر میرے پیچھے کھڑی صدف کے سراپا سے جا ٹکرائی۔ وہ چند لمحات تک اسی نظارے میں کھویا رہا۔ مجھے ڈرائیور کی یہ عامیانہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ تاہم میں نے کسی سنگین ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہمیں فوری طور پر اس کی گاڑی کی ضرورت تھی۔

ڈرائیور نے بدستور صدف کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”کہاں جاؤ گے باؤ جی؟“

”جانا تو لاہور ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا ”تم جہاں تک ممکن ہو، ہمیں لفٹ دے دو۔ آگے ہم کوئی ٹیکسی وغیرہ پکڑ لیں گے؟“

”اور آپ لوگوں کی گاڑی؟“ اس نے ہائی روف کی جانب اشارہ کیا۔

”اس کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ہائی روف کی طرف دیکھا اور قیاس آرائی کرتے ہوئے بولا ”آپ تو لاہور کی مخالف سمت میں جا رہے تھے!“ اس کی آنکھوں میں شک کی پرچھائیں نمودار ہوئی۔

میں اگر چاہتا تو اس تنومند ڈرائیور کی موٹی گردن پر دو ہاتھ آزما کر اسے ہائی لکس سے باہر نکال پھینکتا اور گاڑی لے کر چمپت ہو جاتا لیکن ابھی انگلی ٹیڑھی کرنے کی نوبت نہیں آئی

تھی۔

میں نے کہا ''یار! تم تو ہم سے اس طرح جرح کر رہے ہو جیسے ہم عدالت میں مجرموں کی طرح کھڑے ہوں۔ ہماری گاڑی اور اس کا رخ گیا جہنم میں۔ تم اس مشکل وقت میں ہمیں اپنی گاڑی میں لفٹ دے سکتے ہو یا نہیں؟'' میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے اضافہ کیا ''ویسے اتنا بتا دیں کہ ہم سید پور جا رہے تھے۔''

وہ میرے جارحانہ انداز سے متاثر ہوا تھا یا کوئی اور بات تھی، بہر حال اس نے معتدل لہجے میں کہا ''میں نصیر آباد سے آ رہا ہوں اور فتح گڑھ تک جاؤں گا۔ تم لوگ فتح گڑھ تک میری گاڑی میں سفر کر سکتے ہو۔''

نصیر آباد، فتح گڑھ اور سید پور کے تقریباً درمیان واقع تھا۔ اگر ہم فتح گڑھ تک بھی پہنچ جاتے تو ہماری مشکل آسان ہو سکتی تھی۔ فتح گڑھ ضلع لاہور کی شہری حدود میں واقع تھا۔ ہم وہاں سے کوئی رکشا یا ٹیکسی پکڑ کر سیدھے نیو کیمپس تک پہنچ سکتے تھے۔

ہائی لکس کے موٹے ڈرائیور نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے پسنجرز سائیڈ کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے گاڑی کے اندر بیٹھنا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا اور صدف کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ''یہاں صرف ایک آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ باؤ جی، آپ گاڑی کے پچھلے حصے میں بیٹھ جاؤ اور اپنی ساتھی کو ادھر بیٹھنے دو۔''

میں نے ڈرائیونگ کیبن کا جائزہ لیا تو وہاں سیٹ پر مجھے دو پیٹیاں رکھی نظر آئیں۔ میں نے پوچھا ''ان پیٹیوں میں کیا ہے؟ تم انہیں گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھ دو۔ ہم دونوں آسانی سے آگے بیٹھ جاتے ہیں۔''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''ان پیٹیوں میں دیسی مرغیوں کے انڈے ہیں۔ میں انہیں پیچھے نہیں رکھ سکتا۔ تم میں سے کوئی ایک عقبی حصے میں بیٹھنے کو تیار ہے تو بتاؤ ورنہ میں جا رہا ہوں۔''

صدف کا گاڑی کے کھلے حصے میں دودھ کے ڈرموں کے ساتھ بیٹھنا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے پسنجر سیٹ پر بیٹھنے کا موقع فراہم کیا اور خود اچک کر ہائی لکس کے پچھلے حصے میں سوار ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے ہیوی گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

میں نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت دوپہر کے پونے بارہ بجے تھے۔ سفید ٹویوٹا ہائی ایس ایمبولینس کے روپ میں پندرہ بیس منٹ ہم سے آگے تھی اور اس کی رفتار بھی ہم سے کہیں زیادہ تھی۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اگر میں ہائی لکس کے ڈرائیور کے رحم و کرم پر رہا تو میرے اور ساحل کے درمیان فاصلہ بتدریج بڑھتا چلا جائے گا۔ ہائی لکس جس رفتار سے ہم تک پہنچی تھی وہ اب برقرار نہیں تھی۔ ڈرائیور نہایت ہی سست رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا۔ مجھے اس تازے مونچھوں والے ڈرائیور پر سخت غصہ آیا۔ میں اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ڈرائیونگ کیبن میں ایک طوفان امڈ آیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس طوفان کا سبب سمجھ پاتا، ہائی لکس کے بریک چرچرائے اور گاڑی ایک جھٹکا لے کر رک گئی۔

میں اچھل کر عقبی حصے سے نیچے اترا۔ اسی وقت میرا دھیان صدف کی طرف چلا گیا۔ وہ مجھے ایکشن میں نظر آئی۔ اس کے ہاتھ مشینی انداز میں حرکت کرتے ہوئے ڈرائیور کی گت بنا رہے تھے۔ ایک پل میں، میں نے اندازہ لگا لیا کہ موٹے سؤر نے صدف کے ساتھ کسی بدتمیزی کی کوشش کی ہے۔ پھر میرے ذہن میں ڈرائیور کی وہ حریصانہ نظر چمکی جو وہ صدف پر ڈال رہا تھا...... اور اب وہ اپنی اسی گندی نظر کا خمیازہ بھی بھگت رہا تھا۔

میں ڈرائیونگ سائیڈ کی طرف بڑھا تاکہ دروازہ کھول کر بٹے کٹے ڈرائیور کو باہر کھینچ سکوں لیکن اس سلسلے میں مجھے اپنے ہاتھوں کو زحمت دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ''دھڑ'' سے دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے سے ایک کنگ سائز فٹ بال لڑھکتا ہوا باہر آن گرا۔ موٹے ڈرائیور کی کسمپرسی کا نظارہ بڑا ہی دلچسپ تھا۔ اس کا تہ بند الٹ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ صدف کی نظر اس نظارے تک پہنچتی، میں نے ڈرائیور کو اپنے پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ دیا۔ اس کی خاطر داری بہت ضروری تھی۔

وہ اس وقت واقعی میرے قدموں میں ایک فٹ بال بنا ہوا تھا۔ میرے وزنی بوٹ کی ہر ٹھوکر پر وہ بلبلا اٹھتا اور لڑھک کر کچھ اور آگے چلا جاتا۔ پانچ دس سیکنڈ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر وہ موٹا ڈرائیور چاروں خانے چت ہو کر ہانپنے لگا۔ غنیمت بات یہ تھی کہ اس حالت میں تہ بند نے اس کی ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ میں نے تحقیر آمیز نظر سے اسے دیکھا اور پلٹ کر ہائی لکس کی طرف بڑھ گیا۔

صدف نے ایک عقل مندی یہ کی کہ ہمارے پیچھے نہیں آئی۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے گاڑی کے قریب ہی کھڑی تھی۔ میں اس کے پاس آیا اور پوچھا ''کیا ہو گیا تھا صدف

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”وجدان! تمہیں اپنی ساحل تک پہنچنا ہے اور ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، جلدی سے گاڑی میں آجاؤ، ہری اپ۔“

صدف کے اس لب و لہجے نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ اس وقت ایک بدلی ہوئی صدف نظر آ رہی تھی جس کے انداز میں صرف اور صرف میرا ہی خیال تھا۔ وہ سرتاپا میری ہمدرد دکھائی دیتی تھی۔ میں نے ایک لفظ ادا کیے بغیر اس کی بات مان لی۔

آئندہ دس سیکنڈ کے اندر ہم نے انڈوں والی پیٹیوں کو ڈرائیونگ کیبن سے باہر پھینکا۔ صدف کی کارروائی نے بیشتر انڈوں کا کباڑا کر دیا تھا۔ اس حوالے سے میں نے صدف سے کوئی سوال نہ کیا۔ یہ بات تو طے تھی کہ صدف نے جو کچھ بھی کیا اس کے لیے موٹے حریص ڈرائیور ہی نے اسے مجبور کیا ہوگا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔ جب ہائی لکس اپنے باقاعدہ ڈرائیور کے پاس سے گزری تو اس توندیلے شخص نے اٹھ کر ہماری جانب دوڑ لگا دی۔ اس کوشش میں اس کا تہ بند ایک مرتبہ پھر دغا دینے لگا۔ وہ اس فریبی پوشاک کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے بہ آواز بلند ہمیں صلواتیں سنانے لگا۔

وہ بے چارہ بھی کیا کرتا۔ ہم اس کی پہنچ سے دور نکلے جا رہے تھے۔ وہ اپنی چربیلی توند کو سنبھالتا یا تہ بند کو۔ وہ بڑے مضحکہ خیز انداز میں دوڑنے کی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن بے بسی نے اس کی ہر کوشش ناکامیاب بنا دی۔ اپنی ناکامیابی کے ماتم کے طور پر وہ ہمیں مغلظات میں تول رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کی خرافات ہماری سماعت کی پہنچ سے بہت پیچھے رہ گئی۔ ٹویوٹا ہائی لکس نے اچھی خاصی رفتار پکڑ لی تھی۔

صدف نے ایک طویل سانس خارج کی اور زہریلے لہجے میں کہا ”اس بدتمیز کی یہی سزا تھی۔“

صدف کے اس جملے نے میرے خیالات کی تصدیق کر دی۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس موٹے چھچھورے نے صدف کے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہوگی۔ صدف ایک درجن اوچھوں سے تنہا نمٹ سکتی تھی۔ میں نے سڑک پر نگاہ جمائی اور گاڑی کی رفتار کو بتدریج بڑھاتا چلا گیا۔

ٹویوٹا ہائی لکس میں بہت ہی طاقت ور انجن نصب ہوتا ہے جس کے بل بوتے پر گاڑی کو نہایت ہی تیز رفتاری سے دوڑایا جا سکتا ہے۔ اس گاڑی کی مستعدی اور فعالیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے پولیس والے خاص طور پر موبائل کی صورت میں استعمال کرتے ہیں۔

گاڑی کے ڈرائیونگ کیبن میں خاموشی طاری تھی۔ جلد ہی ہم نے فتح گڑھ کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارے درمیان حائل خاموشی کو صدف نے توڑا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔

”وجدان! ہمارے درمیان اچھا خاصا فاصلہ قائم ہو چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم چاہے جتنی بھی رفتار بڑھا لو، ایمبولینس کو نہیں پکڑ سکتے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ نظر آ رہا تھا۔ وہ طوفانی رفتار سے ہوا میں اڑی جا رہی تھی۔ تم کس توقع پر اس کا تعاقب کر رہے ہو؟“

میں نے صدف کی بات پر غور کیا تو اس کے الفاظ کی صداقت کو ماننا پڑا۔ تاہم میں نے اپنی وحشت کے زیر اثر جواب دیا ”میں اسی توقع پر ساحل کا تعاقب کر رہا ہوں، جس پر دنیا قائم ہے۔“ پھر ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے مزید کہا ”میرے نزدیک توقع اور امید میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔“

صدف نے سفید ایمبولینس کے تعاقب کی بات کی تھی لیکن میں نے اسے جواب ساحل کے حوالے سے دیا تھا۔ اس وقت ساحل میری سوچ کا محیط بنی ہوئی تھی۔ میرے تمام تر خیالات اس کی ذات کے اندر گردش کر رہے تھے۔

صدف نے بدستور ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا ”خدا کرے! وہ لوگ اسی سڑک پر سیدھے سفر کریں۔ اگر ایمبولینس راستے میں کہیں مڑ گئی تو پھر اس تک پہنچنے کے امکانات صفر کے برابر ہو جائیں گے۔“

”وہ اسی سڑک پر سفر کریں گے۔“ میں نے تیقن سے کہا ”اور سیدھے نیو کیمپس کے علاقے میں پہنچیں گے۔ تم فکر نہ کرو صدف! اگر ہم راستے میں انہیں نہ بھی پکڑ سکے تو منزل پر پہنچ کر ان کی گردن ناپ لیں گے۔“

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی ”وجدان! یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟“

”اس لیے کہ میں جانتا ہوں، اس سفید ایمبولینس کا تعلق کسی پرائیویٹ اسپتال سے ہے۔“ میں نے فتح گڑھ اور مغل پورہ کے درمیان گاڑی دوڑاتے ہوئے کہا ”مذکورہ اسپتال نیو کیمپس کے علاقے میں واقع ہے۔“

پھر میں نے اسے ایمبولینس پر موجود مخصوص لوگو (LOGO) کے بارے میں بتایا اور یہ بھی کہ میں اس پرائیویٹ اسپتال کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میری باتوں سے خاصی متاثر ہوئی کہ میں نے چند روز کے اندر لاہور کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں۔

”اللہ کرے، وہ لوگ سیدھے اسپتال ہی جائیں۔“ صدف نے صدقِ دل سے کہا۔

میں نے دل میں اس کی نیک خواہشات پر ”آمین!“ کہا اور پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز رکھی۔ ہم مغل پورہ کے قریب پہنچ رہے تھے۔ نہر کے کنارے کنارے یہ سفر ہمیں سیدھا نیو کیمپس پہنچا دیتا۔ شہری حدود میں داخل ہونے کے بعد سڑک نہایت ہی ہموار ہو گئی تھی جس کے سبب رفتار بڑھانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تک اس سفید ایمبولینس کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس وقت نیو کیمپس میں داخل ہو چکی ہوگی یا داخل ہونے ہی والی ہوگی۔ جس نہر کے کنارے ہم محوِ سفر تھے، وہ نیو کیمپس کے علاقے کے قلب سے گزرتی تھی۔ اگر میں اسی رفتار سے ہائی لکس بھگاتا رہتا تو زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں مذکورہ اسپتال کے گیٹ کے سامنے کھڑا ہوتا۔

صدف کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ساحل کے بارے میں بہت محتاط روی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے ڈرائیونگ کے دوران میں ایک دو مرتبہ نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ میری جانب متوجہ ہو گئی۔

”وجدان! تم نے کسی کبیر شاہ کا ذکر کیا تھا؟“ اس نے سرسری لہجے میں پوچھا ”اسے تم سے کیا دشمنی ہے جو وہ ساحل کو کہیں لے جا رہا ہے؟“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”دوستی اور دشمنی پر بعد میں تفصیلی بات ہوگی۔ فی الحال اتنا جان لو کہ کبیر شاہ میرے ایک خطرناک دشمن کا دستِ راست ہے جس کا اڈا تمہارے کراچی والے بنگلے سے زیادہ دور نہیں...... اسی پارک کے پاس جس میں ایک خوب صورت مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔“

”جہاں پر ہماری پہلی باقاعدہ ملاقات ہوئی تھی؟“ صدف کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”وقت بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔ ان دنوں یہ کبیر شاہ اور اس کا باس شعیب غوری میرے دوستوں میں شمار ہوتے تھے اور میں انہی کے ٹھکانے پر ٹھہرا ہوا تھا۔ آج میں اور شعیب ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔“

”تم مجھے کبیر شاہ کے اڈے کے بارے میں بتاؤ۔“ وہ پُرجوش انداز میں بولی ”میں اپنے پاپا کے ذریعے اس کا بندوبست کروا دوں گی۔ تم نہیں جانتے، میرے پاپا کے تعلقات کتنے اوپر تک ہیں کئی پولیس آفیسرز سے......“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے بڑے سخت انداز میں کہا ”تم اپنے پاپا کو اس جنگ میں نہ جھونکو۔ یہ بہت ہی خطرناک کھیل ہے۔ میں جانتا ہوں، یہ کھیل مجھے کس طرح کھیلنا ہے۔“

”میں اس کھیل میں تمہارے قدم بہ قدم رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ ونڈ اسکرین کے پار سڑک کو گھورتے ہوئے بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔

میں نے اسی سختی سے کہا ”صدف! اب بھی وقت ہے۔ تم اپنا راستہ الگ کر لو۔ تم نہیں جانتی ہو...... خدا کی قسم، نہیں جانتی ہو...... میں آتش و خون کے کس کھیل کا حصہ بنا ہوا ہوں۔ میرے ساتھ رہو گی تو تمہارا سکھ چین چھن جائے گا۔ ساحل کو بھی میری وجہ ہی سے سزا مل رہی ہے۔ تم میرے دشمنوں کو شمار کرنے بیٹھو گی تو گنتی ختم ہو جائے گی۔“

”تم مجھے اتنے دشمنوں سے ڈرانے کی کوشش نہ کرو وجدان!“ اس کے لہجے میں چٹان ایسی سختی تھی ”اور جہاں تک راستہ الگ کرنے کا تعلق ہے تو اس کا وقت گزر چکا۔ میں اس راہ پر، تمہارے ساتھ اتنا آگے بڑھ چکی ہوں کہ واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔“ ایک لمحے کو رک کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور فولادی لہجے میں بولی ”تمہیں چاہے اس کا احساس ہو یا نہ ہو!“

اس کے آخری جملے نے میرے دل پر ایک زوردار گھونسا مارا۔ مجھے اپنے تن بدن میں جھنجھناہٹ سی محسوس ہوئی۔ صدف نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں بہت گہری بات کہہ دی تھی۔ میں ایسا بھی نادان بچہ نہیں تھا کہ اس کی بات کو سمجھ نہ پاتا۔ میں تو اس کے کچھ کہے بغیر بھی اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ فرید پاشا اور منہاس باقر جیسے تجربہ کار جو پیش گوئی کر چکے تھے وہ کیونکر غلط ثابت ہو سکتی تھی۔ صدف کے انداز و اطوار مجھ سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ میں نے بہت پہلے اس کے عزائم کو بھانپ لیا تھا۔ اس کے جذبات قابلِ قدر تھے لیکن میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ صدف ایک اچھی اور جانثار ساتھی تھی جس کی خاطر میں خود کو بڑے سے بڑے خطرے میں ڈال سکتا تھا لیکن کسی بھی صورت وہ ساحل کی جگہ نہیں لے سکتی تھی۔

حقیقت پسندی بہت مشکل کام ہے اور حقیقت وہی تھی جو میں نے بیان کر دی لیکن صدف سے کھل کر یہ سب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ آنے والے حالات اسے سمجھا دیتے۔ میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے صدف کو دیکھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے اپنے سامنے پھیلی ہوئی سڑک کو تک رہی تھی۔ میں اندازہ نہ کر سکا کہ وہ اس وقت کیا سوچ

رہی تھی؟ بہر حال، وہ جس قسم کے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی وہ اس کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ میں گلبرگ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے کبیر شاہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

میری چھٹی حس نے آج تک مجھے دھوکا نہیں دیا تھا۔ کبیر شاہ کو ایمبولینس میں دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ یہی تھا کہ وہ رکھاں والی سے آرہا تھا۔ کبیر شاہ ''ساؤتھ'' کا نگران اور شعیب غوری سے بہت قریب تھا۔ لاہور کے مضافات میں شاہ جی کا پایا جانا خالی از علت نہیں ہوسکتا تھا پھر مجھے شعیب غوری کی دھمکی یاد آگئی۔ اس نے فرید پاشا کے بنگلے پر فون کرکے مجھے دھمکی دی تھی کہ عن قریب وہ مجھے بہت بڑا نقصان پہنچانے والا تھا۔ جب میں نے متروک کنویں سے برآمد ہونے والے سونے کے بارے میں اسے باور کرایا کہ میں اسے اپنا حصہ ہضم نہیں کرنے دوں گا تو شعیب نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ اس نے میرے حصے کو استعمال کرکے میرے لیے کوئی بہت بڑی مصیبت خریدی ہے اور جلد ہی وہ مصیبت میری سامنے کھڑی ہوگی۔

شعیب غوری جیسا طاقت ور شخص کھوکھلی باتیں نہیں کرسکتا تھا۔ متروک کنویں سے برآمد ہونے والا سونا کم از کم پچیس کروڑ روپے مالیت کا تھا اور معاہدے کی رو سے میرا حصہ دس کروڑ طے ہوا تھا۔ کہیں دس کروڑ کی یہ رقم خرچ کرکے شعیب نے میرے دشمنِ اول چوہدری نوازش علی سے الحاق تو نہیں کرلیا تھا؟

اس سوال نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا کیونکہ اس سوال میں واقعاتی صداقت موجود تھی۔ عین ممکن تھا، شعیب غوری نے دس کروڑ روپے کے بجائے آدھا سونا چوہدری کے حوالے کردیا ہو اور اس کے بدلے ساحل کو حاصل کرلیا ہو......!

میرا دماغ تپتے ہوئے تنور کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ میری سانسوں میں ایک پھنکاری اتر آئی۔ یہ بات صدف سے چھپی نہ رہ سکی اور وہ تشویش ناک نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے وجدان۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی!''

''کچھ نہیں۔ تھوڑا ذہنی دباؤ ہے۔''

''اس دباؤ کو ذہن پر سے ہٹانے کی کوشش کرو۔'' وہ کسی اتالیق کے انداز میں بولی ''تم ایک بہت بڑا معرکہ کرنے جارہے ہو۔''

میں نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا ''مشورے کا شکریہ۔ میں کوشش کررہا ہوں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ بہر حال، ایک مرتبہ پھر شکریہ۔''

وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی ''تمہارا یہ بیگانگی کا انداز مجھے بہت دکھ پہنچا رہا ہے۔ اس طرح بار بار شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''سوری! میں آیندہ خیال رکھوں گا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ میری سوچ دوبارہ چوہدری نوازش علی اور شعیب غوری کی طرف مڑ گئی۔ یہ دونوں میری زندگی کے اہم کردار ثابت ہورہے تھے۔

چوہدری نوازش علی مدفون سونے کے لیے باؤلا ہوا جارہا تھا۔ سونے کے راز والی ڈائری حاصل کرنے کے لیے اس نے قدم قدم پر میرے لیے مشکلات کھڑی کی تھیں۔ ایک موقع پر اسے اپنی شکست واضح نظر آنے لگی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے بہت خائف تھا۔ میں نے اندرون سندھ اور پھر کراچی میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس نے اپنے نمک خواروں کو واضح احکام دے رکھے تھے کہ مجھے رکھاں والی تک پہنچنے سے پہلے پہلے ختم کردیا جائے۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ اب تک بچتا چلا آیا تھا ورنہ دارا جیسے بدقماش اور بدنام زمانہ لوگوں نے بچپن ہی سے میرا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس طویل اعصابی اور جسمانی جنگ نے چوہدری نوازش کو یہ باور کرادیا تھا کہ اگر میں اس تک پہنچ گیا تو پھر اس کی خیر نہیں ہوگی۔ اس نے مجھے ہمیشہ خود سے دور رکھ کر الجھانے کی کوشش کی تھی اور اس کی خواہش رہی تھی کہ کسی طرح سونے کے راز والی ڈائری اس تک پہنچ جائے۔

اب کھیل دلچسپ مرحلے میں داخل ہوچکا تھا۔ میں نے دوستی کا فریب کھا کر وہ ڈائری بلکہ ڈائری کے ''مفید صفحات'' شعیب غوری کے حوالے کردیئے تھے۔ ڈائری کا غیر مفید حصہ ایک ڈرامے سے گزر کر چوہدری نوازش تک پہنچا تھا جسے دیکھ کر اس نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ مجھ سے کارآمد صفحات حاصل کرنے کے لیے اس بدبخت نے ساحل کو اغوا کروالیا۔ وہ جانتا تھا کہ میں ساحل کے پیچھے موضع رکھاں والی پہنچوں گا اور وہ مجھے ٹریپ کرلے گا۔

میں چوہدری کی خواہش اور اپنے مشن کے مطابق ساحل کو حاصل کرنے کے لیے رکھاں والی کی جانب رواں دواں تھا کہ سفید ایمبولینس والا واقعہ پیش آگیا۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے آگاہ کررہی تھی کہ شعیب غوری اور چوہدری نوازش کے

درمیان کوئی بہت بڑی ڈیل ہوئی ہے اور اب وہ دونوں مل کر میرا جینا حرام کردیں گے۔ میں نے گزشتہ دو تین ماہ میں شعیب غوری کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں اس کی اصلیت سے واقف ہوگیا تھا۔ وہ یہودی لابی کا آلۂ کار بنا ہوا تھا اور پاکستان خصوصاً کراچی کو دہشت گرد خطہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ شعیب غوری میری صلاحیت سے آگاہ تھا اس لیے وہ ہر حال میں مجھے مردہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ میری کمزوری سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا، اگر ساحل اس کے قبضے میں آگئی تو مجھے چھاپنا بہت آسان ہوجائے گا۔ ساحل اور ساؤتھ کے حوالے سے مجھے وہ جھانسا دینے کی کوشش بھی کرچکا تھا لیکن میں اس کی چال میں نہیں آیا تھا۔

میں نے مدفون سونے کا راز منتقل کرتے ہوئے شعیب غوری کو چوہدری نوازش علی اور اپنی دشمنی کے بارے میں تفصیلاً بتادیا تھا۔ شعیب مجھے قابو کرنے کے لیے چوہدری کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتا تھا اور فون پر ہونے والی گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا، شعیب نے اس دوستی کی خاطر میرے حصے کا سونا یا پھر دس کروڑ روپے چوہدری کی نذر کردیئے ہوں گے۔

ان دونوں شیطانوں کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا پھر سفید چادر سے ڈھکا ہوا اسٹریچر میرے تصور میں گھوم گیا۔ میرے دل کی گواہی تو یہ تھی کہ اس اسٹریچر پر ساحل کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ اس سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا تھا کہ میرے دشمنوں نے کندھے سے کندھا ملا کر مجھ سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا...... اور میری ساحل اب چوہدری کی کورٹ سے نکل کر شعیب کی کورٹ میں پہنچ چکی تھی یا پہنچنے والی تھی۔

مجھے بیک وقت دو فرنٹ پر لڑنا تھا اور اس طرح لڑنا تھا کہ لڑائی کا حق ادا ہوجاتا۔ ساحل...... میری جانِ تمنا میرے لیے بہت اہم تھی۔ میں اسے حاصل کرنے کے لیے ہر حد سے گزر سکتا تھا، چاہے وہ میری زندگی کی حد ہی کیوں نہ ہوتی!

☆☆☆

میں نے ہائی لکس کو اسپتال کے سامنے سے گزارا اور دو سو گز کے فاصلے پر ایک سڑک کے کنارے روک دیا۔ دودھ کے ڈرموں سے لدی پھندی گاڑی کو اسپتال کے اندر لے جانا کسی بھی طور مناسب نہیں تھا۔ صدف میرے اشارے کی منتظر تھی۔ ہم دونوں ٹویوٹا ہائی لکس سے نیچے اتر آئے۔ چند لمحات کے بعد ہم مذکورہ پرائیویٹ اسپتال کے اندر تھے۔

نیو کیمپس کا علاقہ بہت صاف ستھرا اور سرسبز و شاداب ہے۔ بعض لوگ اسے جنت نظیر بھی کہتے ہیں۔ بیچوں بیچ بہتی ہوئی برانچ کینال نے علاقے کے حسن اور خوب صورتی میں بے پناہ اضافہ کردیا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی جیسی عظیم الشان درس گاہ نیو کیمپس کی پہچان ہے۔

ہم دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں داخل ہوگئے۔ میں نے چاروں جانب ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور پھر میری نظر اس پارکنگ پر رک گئی جہاں تین چار ایمبولینس گاڑیاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ میں نے مذکورہ پارکنگ کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ صدف نے میری تقلید کی۔ ہم نے اپنا اپنا بیگ کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔

میں نے پارکنگ میں پہنچ کر تمام ایمبولینس کو دو تین مرتبہ چیک کیا۔ ان سب پر اسپتال کا مخصوص لوگو بنا ہوا تھا مگر وہ ٹویوٹا ہائی ایس مجھے کہیں دکھائی نہ دی جس کی تلاش نے مجھے ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔

''وہ ان میں نہیں ہے۔'' میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ''مجھے تو تمام ایمبولینس ایک جیسی لگ رہی ہیں۔ تم نے کیسے جانا، ہماری مطلوبہ گاڑی یہاں موجود نہیں۔''

''جس سفید ایمبولینس کا تعاقب کرتے ہوئے ہم یہاں پہنچے ہیں، میں نے اسی وقت اس کا نمبر ذہن نشین کرلیا تھا۔'' میں نے اضطراری انداز میں کہا ''کیا تمہیں ون تھری سکس نائن نمبر کی کوئی ایمبولینس یہاں نظر آرہی ہے؟''

صدف نے وہاں کھڑی ایمبولینس کی نمبر پلیٹس پر نگاہ دوڑائی اور مایوسی سے نفی میں گردن ہلادی۔

میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے، وہ ایمبولینس ابھی تک یہاں نہیں پہنچی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے وجدان!'' صدف نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا ''وہ تو لگ بھگ آدھا گھنٹا ہم سے آگے تھی۔''

میں نے کہا ''ممکن ہے، انہوں نے ادھر کا رخ ہی نہ کیا ہو۔ وہ لوگ کسی اور منزل کی جانب بڑھ گئے ہوں۔''

''مگر تم نے تو کہا تھا، وہ سیدھے اسپتال ہی پہنچیں گے۔'' وہ مزید الجھ گئی ''اس کے علاوہ وہ لوگ اور کہاں جاسکتے ہیں؟''

صدف بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ ساحل کو اسپتال پہنچایا جائے گا لیکن ''شعیب چوہدری'' تعلق کے بارے میں سوچنے کے بعد میرے خیال میں بہت نمایاں تبدیلی واقع ہوگئی تھی۔ اس صورت میں ممکن نہیں تھا کہ

وہ ایمبولینس سیدھی اسپتال آتی۔ پہلے وہ ساحل کو ان کی مطلوبہ منزل تک پہنچاتی، پھر اسپتال کا رخ کرتی۔ موجودہ صورتِ حالات اور دن تھری سکس نائن نمبر والی ایمبولینس کی غیر موجودگی بھی اسی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ یقینی طور پر اس ایمبولینس کو ''استعمال'' کیا گیا تھا۔ یہ حالات خاصے تشویش ناک تھے۔ اگر میں جلد از جلد ساحل کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوتا تو پتا نہیں، اسے کہاں سے کہاں پہنچایا جاتا۔

میں نے صدف کی بات کے جواب میں کہا ''میں نے پہلے تم سے جو کچھ کہا تھا، وہ یہاں پہنچ کر غلط ثابت ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے، حالات بہت تیزی سے بدل رہے ہیں۔''

وہ بولی ''ہم کسی اور جگہ رک کر انتظار کر لیتے ہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں سے پارکنگ ایریا ہمیں دکھائی دیتا رہے لیکن ہم کسی کی نظر میں نہ آئیں۔ ممکن ہے، اگلے چند لمحوں میں ہماری مطلوبہ ایمبولینس اسپتال میں داخل ہو!''

اس کی تجویز معقول تھی لہٰذا میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک ایسے گوشے میں آن کھڑا ہوا جہاں سے اسپتال کا مین گیٹ اور پارکنگ پر گہری نظر رکھی جا سکتی تھی۔ ہم لگ بھگ دوپہر ایک بجے اسپتال پہنچے تھے، مزید پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ جب برآمد نہ ہوا تو میری بے قراری آسمان کو چھونے لگی۔

میں نے صدف سے کہا ''مزید انتظار وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ ساحل کو اسپتال نہیں لایا جائے گا۔ میرے خیال میں اسے کہیں اور پہنچایا جا چکا ہے۔''

''مگر کہاں؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا ''ہم ساحل تک کیسے پہنچیں۔ ہمیں کیسے معلوم ہوگا، اسے کہاں پہنچایا گیا ہے؟''

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر ایک جانب بڑھتے ہوئے کہا ''آؤ، اسپتال کے معلوماتی کاؤنٹر سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساحل کا نہ سہی، ایمبولینس ہی کا کوئی سراغ مل جائے تو میں اس سراغ کو تھام کر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔''

ہم دونوں چلتے ہوئے ایک ایسے کاؤنٹر پر پہنچے جہاں سے ہماری مطلوبہ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ وہ جدید سہولیات سے لیس ایک مہنگا پرائیویٹ اسپتال تھا جہاں کا ہر شعبہ کمپیوٹر کے ذریعے آپس میں منسلک تھا۔ وہاں کی صفائی اور نظام نے مجھے خاصا متاثر کیا۔

میں نے کاؤنٹر کے پیچھے موجود خوش شکل لڑکی سے استفسار کیا ''سنیے! مجھے اپنی ایک عزیزہ کے بارے میں معلوم کرنا ہے!''

''آپ کی عزیزہ کا نام کیا ہے۔'' اس لڑکی نے پوچھا ''کوئی پیشنٹ آئڈنٹیٹی ہو تو وہ بھی بتا دیں۔''

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''مریضہ کا نام ساحل ہے۔ میں اس کی کسی آئڈنٹیٹی سے واقف نہیں۔ بس اتنا جانتا ہوں، اسے ابھی ابھی اسپتال لایا جا چکا ہے یا لایا جانے والا ہے۔''

کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا ''آپ بھی عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ خیر، میں دیکھتی ہوں، ساحل نام کی کوئی پیشنٹ ہماری اسپتال میں ایڈمٹ ہوئی ہے یا نہیں۔''

بات کرنے کے دوران میں وہ کمپیوٹر اسکرین کو بھی دیکھتی رہی اور کی بورڈ پر اس کی انگلیاں بھی حرکت میں رہیں۔ آدھے منٹ کی کوشش کے بعد اس نے اعلان فرماتے ہوئے کہا۔

''سوری سر! ساحل نام کی کوئی مریضہ ہمارے اسپتال میں داخل نہیں۔''

''ممکن ہے، ابھی اس کا ریکارڈ میں اندراج نہ ہوا ہو۔'' میں نے ایک موہوم امید کی انگلی تھامتے ہوئے کہا ''اسے اسپتال میں آئے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوا۔''

اس نے میری تشفی کے لیے فون کا ریسیور اٹھایا اور دوسری طرف کسی سے بات کرنے لگی۔ وہ اسپتال میں آنے والے نئے مریضوں کے بارے میں دریافت کر رہی تھی۔ اس گفتگو میں دو تین مرتبہ ساحل کا نام بھی آیا پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ کی عزیزہ کہاں سے آنے والی تھی؟''

''موضع رکھاں والی۔'' میں نے بے ساختہ کہا ''یہ ایک سرحدی گاؤں ہے۔ اسے آپ کی بھیجی ہوئی ایمبولینس نمبر ون تھری سکس نائن میں اسپتال لایا جانے والا تھا۔''

اس نے پھر دوسری طرف کسی سے بات کی اور ریسیور رکھنے کے بعد بولی ''سر! آپ کی مریضہ ابھی تک اس اسپتال میں نہیں پہنچی۔ میں ایمبولینس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ توفیق صاحب سے معلوم کر لیں۔''

''یہ توفیق صاحب کہاں ملیں گے؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے کوریڈور کی جانب اشارہ کیا اور توفیق نامی اہم شخص کے دفتر کی لوکیشن بتا دی۔ ہم دونوں فوراً اسے پیشتر توفیق کے پاس پہنچ گئے۔ اس کا تعلق اسپتال کی انتظامیہ سے تھا۔

اس دوران میں، میں نے اپنے ذہن میں ایک نیا لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔ میں توفیق سے ساحل کے بارے میں کچھ نہیں پوچھتا بلکہ مطلوبہ ایمبولینس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا۔ ایک بات کا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ ساحل کو اس اسپتال میں لایا گیا تھا اور نہ ہی لایا جانے والا تھا پھر میں اس کا ذکر چھیڑ کر خوامخواہ خود کو کیوں مشکوک کرتا۔ اگر مجھے مطلوبہ ایمبولینس کے بارے میں معلومات حاصل ہو جاتیں تو میں ساحل تک پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

توفیق سے مختصر گفتگو کے بعد پتا چلا کہ ہماری مطلوبہ ایمبولینس صبح سے گئی ہوئی ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں واپس آنے والی ہے پھر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا ''کریم کو اب تک آ جانا چاہیے۔''

عبدالکریم اس ایمبولینس کے ڈرائیور کا نام تھا۔ میں نے پوچھا ''ایمبولینس صبح سے کہاں گئی ہوئی ہے؟''

توفیق کے انکشاف نے میرے دل کی دھڑکن کو حد درجہ بڑھا دیا تھا۔ وہ جواب میں بتانے لگا ''ایک ڈیڈ باڈی کو احمد نگر پہنچانا تھا۔ چوہدری نظام دین پچھلے ایک ہفتے سے ہمارے اسپتال میں داخل تھے۔ گزشتہ رات ان کا انتقال ہو گیا۔ انہی کی میت کو احمد نگر پہنچانے کے لیے کریم ایمبولینس لے کر گیا ہے۔ میرا خیال ہے، وہ اب آنے ہی والا ہوگا۔''

میں نے توفیق سے یہی بہانہ کیا تھا کہ میں ایمبولینس کے ڈرائیور سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے وہ مجھے تسلی دے رہا تھا کہ کریم اسپتال پہنچنے ہی والا ہے۔ میں نے توفیق سے مزید کوئی بات نہ کی اور ہم اس کے کمرے سے نکل آئے۔ میں نے توفیق سے عبدالکریم کی رہائش گاہ کا پتا معلوم کر لیا تھا۔

توفیق کے انکشاف نے مجھے بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر دیا۔ احمد نگر رکھاں والی کے شمال میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں چوہدری نظام دین کے نام سے بھی واقف تھا اس کی زمینیں چوہدری نوازش علی کی زمینوں سے ملی ہوئی تھیں۔ جب میں شعیب غوری کے ساتھ، متروک کنویں والے سونے کو بازیاب کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تو چوہدری نظام دین کی اراضی بھی زیرِ بحث آئی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اس کی زمین استعمال کر کے ہم کنویں کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کریں لیکن کنویں اور چوہدری نظام دین کی زمین میں ڈیڑھ میل کا فاصلہ حائل تھا اس لیے شعیب نے نظام دین کے نام پر کراس لگانے کے بعد رام داس کی زمین کا انتخاب کیا تھا۔ رام داس کی زمین سرحد کی دوسری طرف واقع تھی جہاں سے متروک کنواں چند گز کے فاصلے پر تھا پھر یہ کہ رام داس اور چوہدری نوازش علی میں دشمنی بھی چل رہی تھی، چنانچہ ازاں بعد یہودی النسل برطانوی بزنس مین مسٹر نیل آرمر نے رام داس اور اس کی زمین کو استعمال کر کے برسوں سے دفن متروک کنویں کا راز پا لیا تھا۔

توفیق کے انکشاف کے بعد یہ تمام باتیں میرے دماغ میں چکرا رہی تھیں۔ اگر وہ ایمبولینس چوہدری نظام دین کی ڈیڈ باڈی کو احمد نگر چھوڑنے گئی تھی تو پھر کبیر شاہ کے ہتھے کیسے چڑھ گئی، ساحل تو رکھاں والی میں چوہدری نوازش کی قید میں تھی، وہ ایمبولینس میں کس طرح پہنچی؟ یہ اور اسی نوعیت کے دیگر درجنوں سوالات کے جواب صرف اور صرف ایمبولینس کا ڈرائیور عبدالکریم ہی دے سکتا تھا۔ اگر وہ میرے ہتھے چڑھ جاتا تو میں اس کی زبان کھلوا لیتا پھر ساحل تک پہنچنا میرے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ صدف کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''وجدان! آیندہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے۔ کیا ہم اسپتال میں رک کر عبدالکریم کا انتظار کریں یا کسی اور طرف چلنا ہے؟''

میں نے کہا ''میں مزید آدھا گھنٹا انتظار کروں گا اس کے بعد کوئی اور قدم اٹھاؤں گا۔''

ہم چلتے ہوئے اسی مقام پر آ گئے جہاں سے گیٹ اور پارکنگ کی نگرانی کی تھی۔ صدف نے کہا ''اگر ہم پروگرام کے مطابق سفر کرتے رہتے تو اس وقت سید پور میں فرید انکل کے پاس ہوتے لیکن تازہ ترین صورتِ حالات میں مجھے نہیں لگتا کہ آیندہ چند روز تک ہم سید پور کا رخ کر سکیں۔ تم کم از کم ایک فون کر کے انکل کو اس واقعے کی اطلاع تو دے دو۔''

میں نے ستائشی نظر سے صدف کو دیکھا اور کہا ''تم یہیں رک کر نگرانی جاری رکھو۔ میں ادھر فون کی طرف جاتا ہوں۔ ابھی واپس آ جاؤں گا۔''

اسپتال میں آنے والوں کی سہولت کے لیے کئی مقامات پر پبلک کال کاؤنٹر بنے ہوئے تھے۔ میں ایسے ہی ایک کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے سید پور میں فون ملوایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد فرید پاشا لائن پر آ گیا۔

''یار وجدان! تم کہاں غائب ہو؟'' میری آواز سنتے ہی وہ جلدی سے بولا۔

میں نے کہا ''میں اس وقت نیو کیمپس لاہور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں کھڑا ہوں۔'' پھر میں نے اسپتال کا نام بھی بتا دیا۔

''تم وہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس کی آواز میں تشویش در

آئی ”خیریت تو ہے نا!“

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں فرید پاشا کو بتایا کہ میں مذکورہ اسپتال میں کیا کر رہا ہوں اور یہ کہ خیریت بالکل نہیں ہے۔

وہ گمبھیر آواز میں بولا ”وجدان! تم نے جو حالات بتائے ہیں ان کی روشنی میں، میں کہہ سکتا ہوں، ساحل کو اسپتال میں نہیں لایا جائے گا۔ مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہو رہا ہے۔ تم وہاں وقت ضائع نہ کرو۔“

”پھر کیا کروں؟“ بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا۔ ان الفاظ میں اچھی خاصی کڑواہٹ تھی۔

وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا ”تم اس وقت بہت زیادہ پریشان ہو۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلی فرصت میں اس ایمبولینس یا اس کے ڈرائیور کو ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔ اگر تمہاری یہ کوشش کامیاب ہوگئی تو ساحل تک پہنچنا آسان ہوجائے گا۔“

”میں اسی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔“ میں نے کہا۔

فرید پاشا نے بتایا ”چوہدری نظام دین کی موت کی خبر سید پور پہنچ چکی ہے۔ کیسی اتفاق کی بات ہے کہ آج اباجی کی تدفین بھی ہے اور چوہدری نظام دین کی بھی۔ وہ دونوں بہت اچھے دوست تھے۔“ بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی۔

”مجھے افسوس ہے پاشا کہ میں تمہارے والد کے جنازے میں شرکت نہیں کرسکوں گا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ”ساحل کا معاملہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”میں تمہاری مجبوری کو سمجھ رہا ہوں۔“ وہ برا منائے بغیر بولا ”اس لیے تمہیں پریشان یا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم فکر نہ کرو، ان نازک ترین حالات میں بھی میں تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔“

”تم مجھے نادم کر رہے ہو فرید۔“ میں نے جلدی سے کہا ”تم پر جو گزر چکی ہے، مجھے اس کا احساس ہے۔“

فرید پاشا نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ تاہم اس قہقہے میں وہ مخصوص ترنگ موجود نہیں تھی جو پاشا کا خاصا تھی بہرحال، اس کی زندہ دلی کسی چیلنج کی محتاج نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کن آہنی اعصاب کا مالک ہے۔ قہقہے کے اختتام پر اس نے کہا۔

”وجدان! مجھ پر تو گزر چکی جو گزرنا تھی لیکن تم پر گزر رہی ہے اس لیے میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ پاشا ہر حال میں دوستی نبھانا جانتا ہے۔“ اس کی آواز جذبات سے لبریز تھی۔

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے کہا ”اباجی کی تدفین عصر اور مغرب کے درمیان ہوگی۔ تم ایک گھنٹے بعد مجھے فون کرو۔ میں معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ”رکھاں والی“ میں کیا پوزیشن ہے۔ اگر ساحل وہاں سے رخصت ہوچکی ہے تو مجھے معلوم ہوجائے گا۔ میں نے رکھاں والی میں موجود اپنے آدمیوں کو خاصا ٹائٹ کر رکھا ہے۔ میں ابھی ان سے رپورٹ لیتا ہوں۔“

باوجود کوشش کے بھی میں پاشا سے یہ نہ کہہ سکا کہ وہ خود کو اس بکھیڑے میں نہ ڈالے اور پوری توجہ سے اپنے معاملات نمٹائے۔ انسان بنیادی طور پر بہت ہی خود غرض واقع ہوا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ فرید پاشا خود ایک بہت بڑے امتحان میں مبتلا تھا لیکن مجھے اپنی جتا کی پڑی تھی۔ ساحل کے معاملے میں، میں بے اختیار سا ہوکر رہ گیا تھا، اس کے سوا مجھے کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا...... اور اب تو وہ بھی کئی دنوں سے دکھائی نہیں دی تھی، صرف اس کی یاد زندگی کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گھنٹے بعد پاشا کو فون کرنے کا وعدہ کرلیا۔

اس نے پوچھا ”گلبرگ اور فاضلیہ کالونی والی کوٹھیوں کا کیا حال ہے؟“

میں نے اس کی پریشانیوں کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور کہا ”تم ادھر سے بے فکر رہو، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔“

حالانکہ بہت کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں تھا۔ پاشا کے چلے آنے کے بعد وہاں جو حالات پیش آئے تھے وہ خاصے سنگین اور غیر معمولی تھے۔ اگر میں اس تفصیل میں پڑ جاتا تو پاشا کی ذہنی الجھن میں اضافہ ہی ہوتا۔ ساحل والا معاملہ تو بیچ میں آ گیا تھا۔ میں تو صرف اسے اپنے سید پور نہ پہنچنے کی وجہ بتانا چاہتا تھا۔

مزید چند باتوں کے بعد میں نے فون بند کردیا اور آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے صدف کے پاس آ گیا۔ ہماری مطلوبہ ایمبولینس ابھی تک وہاں نہیں پہنچی تھی۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ ساحل کو نہایت ہی صفائی کے ساتھ کہیں ادھر ادھر کردیا گیا تھا۔

صدف نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا ”کہیں ایسا تو نہیں کہ ایمبولینس کا ڈرائیور عبدالکریم تمہارے دشمنوں کے ساتھ مل گیا ہو اور انہیں ان کے حسبِ منشا کہیں پہنچانے جا رہا ہو!“

”اس بات کے امکانات کم از کم ہیں۔“ میں نے

...کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”اگر ڈرائیور اپنی مرضی ...کی جانب ... رہا ہوتا تو اب تک اسے اسپتال میں ...کبیر شاہ کا ساتھ دے ... تاخیر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اسے گن پوائنٹ پر ...ہا ہے تھا۔ ... کیا گیا ہے۔ ویسے......“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ...ی سانس لی اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”قبل از ...کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ عین ممکن ہے، عبدالکریم ...مرضی سے کبیر شاہ کے ساتھ ہو اور ساحل کو کسی خفیہ ٹھکانے ...پہنچانے کے بعد ادھر کا رخ کرے۔“

صدف نے کہا ”اس واقعے نے تمہارے ذہن پر بہت ...اثر کیا ہے۔ تم پہلے ایک بات کہتے ہو پھر خود ہی کمزور ...ی کے ساتھ اس کی نفی کردیتے ہو۔ تم ایسے تو نہیں تھے ...دان!“

”ہاں، میں ایسا نہیں تھا!“ میں نے غراہٹ سے مشابہ ...از میں کہا۔

وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی ”پاشا انکل نے کیا کہا ...ہے؟“

”اس نے ایک گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا ہے۔“ میں نے ...تال کے مین گیٹ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ”جب تک وہ ...ھاں والی کے حالات سے باخبر ہوجائے گا۔“

میں صدف کو بتا چکا تھا کہ ساحل میرے ایک دشمن دیرینہ ...ہدری نواز علی کی قید میں تھی جو رکھاں والی کا بے تاج ...شاہ ہے۔ اسی حوالے سے اس نے سوال کیا ”کیا رکھاں ...گاؤں سید پور سے نزدیک ہی ہے؟“

”دونوں گاؤں میں پانچ کلومیٹر کا فاصلہ حائل ہے۔“ ...میں نے بدستور گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے مجھے تکتی رہی پھر ...رے ہوئے لہجے میں بولی ”تو اس کا مطلب یہ ہوا، تم ...حقیقت سید پور نہیں بلکہ رکھاں والی جانے والے تھے۔ وہ تو ...پاشا انکل کے والد کی ڈیتھ بیچ میں آ گئی ورنہ تمہارا پروگرام ...تو اور ہی تھا!“

وہ زود فہم لڑکی میری کمزوری کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ ...کے خیال کی انگلیوں نے میری دکھتی ہوئی رگ سے چھیڑ ...ا تو میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے صدف۔ میں سید پور ...بیٹھ کر ”رکھاں والی“ کے معاملات کو دیکھنا چاہتا تھا۔ فرید ...اس سلسلے میں میری بھرپور مدد کرنے والا تھا۔“ ایک لمحے کا ...توقف کرنے کے بعد میں نے مزید بتایا ”میں کراچی سے یہی ...سوچ کر لاہور پہنچا تھا اور آگے سید پور جانے والا تھا۔“

وہ اثبات میں اس طرح سر ہلانے لگی جیسے میری باتوں کی تہ تک پہنچ رہی ہو پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی بات کرتی یا مجھ سے کوئی اور سوال پوچھتی، مجھے چونکنا پڑا۔ میں مسلسل اسپتال کے مین گیٹ کو دیکھ رہا تھا اور میرے چونکنے کا سبب یہ تھا کہ وہاں سے ایک سفید ٹویوٹا ہائی ایس اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہی ایمبولینس جس کا نمبر ون تھری سکس نائن تھا اور جو میری ساحل کو رکھاں والی سے لے کر لاہور پہنچی تھی۔

صدف نے میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کو نوٹ کرلیا اور میری نگاہ کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی نظر بھی ایمبولینس تک جا پہنچی۔ ایمبولینس گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد آہستہ روی سے پارکنگ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس میں سوائے ڈرائیور کے اور کوئی بھی نہیں تھا۔ میرے مطلوبہ افراد کو وہ کسی خاص مقام پر پہنچا آیا تھا۔

صدف نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا ”وجدان! یہ تو وہی ایمبولینس ہے!“

”ہاں، بالکل وہی ہے۔“ میں نے خوابناک لہجے میں کہا ”تم عبدالکریم کے پیچھے لگ جاؤ۔ تھوڑا فاصلہ رکھ کر میں بھی آ رہا ہوں۔ اسپتال کے اندر کسی قسم کی جارحانہ کارروائی مناسب نہیں ہوگی۔ ہم اسے کسی طرح گھیر کر باہر لے چلتے ہیں پھر اس کی زبان کھلوالیں گے۔“

صدف نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ہم یکے بعد دیگرے اس کے تعاقب میں لگ گئے، ٹھیک دس منٹ بعد وہ ہمارے ساتھ اسپتال سے باہر آ رہا تھا۔ توفیق کی زبانی مجھے عبدالکریم کے بارے میں ابتدائی معلومات حاصل ہوچکی تھیں۔ میں ان سے کام چلا کر مزید بہت کچھ اگلوا سکتا تھا۔ وہ راولپنڈی کے علاقے ڈھوک کھبا کا رہنے والا تھا اور لاہور میں کوٹ لکھپت میں اس نے رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ وہ عموماً یہاں اکیلا ہی رہتا تھا، اس کے بیوی بچے ڈھوک کھبا (راولپنڈی) میں رہتے تھے لیکن سال میں ایک دو ماہ کے لیے وہ انہیں اپنے پاس لاہور بلا لیتا تھا۔ اسی طرح ایک آدھ مرتبہ وہ آٹھ دس دن کے لیے راولپنڈی چلا جاتا۔ ان دنوں عبدالکریم کی فیملی لاہور، کوٹ لکھپت آئی ہوئی تھی جہاں وہ کرائے کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ توفیق نے مجھے اس کے کوارٹر کا ایڈریس سمجھا دیا تھا۔

میں نے عبدالکریم کو ہائی لکس کی جانب لاتے ہوئے کہا ”راولپنڈی سے تمہارے کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں جو ہمارے گھر میں ٹھہرے ہیں۔ تم انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا ”کیا

تھوڑی دیر پہلے آپ ہی اسپتال میں مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا ہے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی میرے بارے میں پوچھ رہے تھے۔''

''تمہیں بالکل صحیح بتایا گیا ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا ''اب تم فوراً ہمارے ساتھ چلو۔''

''کیا آپ لوگ مجھے اپنے گھر لے کر جاؤ گے؟''

''اور کہاں لے کر جائیں۔'' صدف نے کہا ''جہاں تمہارے مہمان انتظار کر رہے ہیں تمہیں وہیں جانا ہوگا۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے شک آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔ اگر میرے ساتھ صدف نہ ہوتی تو شاید وہ میری بات پر اعتبار نہ کرتا لیکن صدف کی موجودگی میں وہ زیادہ پس و پیش نہ کر سکا، صرف اتنا پوچھا ''میں تو آپ لوگوں کو نہیں جانتا۔ میرے مہمان آپ کے گھر میں کیسے پہنچ گئے؟''

''وہ ہمارے گھر میں خود نہیں پہنچے بلکہ ہم از راہِ ہمدردی انہیں اپنے ساتھ لے گئے تھے۔'' میں نے اسے چکر دیا ''وہ پہلی مرتبہ لاہور آئے ہیں۔ تمہارا پتا ڈھونڈتے پھر رہے تھے، ہم سے ملاقات ہوگئی۔ ہمیں ایک مریض کو دیکھنے اس طرف آنا تھا۔ سوچا، جاتے ہوئے تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ ہم کافی دیر سے ادھر تمہارا انتظار کر رہے تھے۔''

وہ میری باتوں میں آ گیا اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ میں نے اس کی مزید تسلی کے لیے کہا ''تم راولپنڈی میں، ڈھوک کھبہ کے علاقے میں رہتے ہو نا، وہ ادھر ہی سے آئے ہیں۔''

توقع سے حاصل شدہ معلومات نے کام دکھایا اور وہ مطمئن ہو کر ہمارے ساتھ ٹویوٹا ہائی لکس میں بیٹھ گیا۔ میں فی الحال اس گاڑی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ہائی لکس کیمپس کے علاقے سے نکلنے لگی تو صدف نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں سمجھ گیا، وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے، وہ آئندہ منزل کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی الجھن دور کرنے کے لیے عبدالکریم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''فاضلیہ کالونی یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ ہم تمہیں بہت جلد فارغ کر دیں گے۔''

صدف کے ہونٹوں سے ایک اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ عبدالکریم سے پوچھ تاچھ کے لیے پاشا کی اس کوٹھی سے زیادہ موزوں اور کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ کوٹھی پچھلے کچھ عرصے سے خالی پڑی تھی لیکن میری لاہور میں آمد کے ساتھ ہی جیسے خدا نے اس کی سن لی تھی۔ اب صبح شام وہاں اچھی خاصی ''رونق'' رہنے لگی تھی۔ وہ کوٹھی میرے لیے ایک تفتیشی سیل کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ عبدالکریم بھی جار... کے لیے چند لمحوں بعد وہیں پہنچنے والا تھا۔

میں نے فیروز پور روڈ پر آنے کے بعد گاڑی ... اچانک بڑھا دی۔ ہمارے درمیان گاہے بہ گاہے ... نظروں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ ہمارے سے مراد میرے اور ... کے درمیان۔ عبدالکریم خاموش بیٹھا کسی گہری سوچ ... تھا۔ وہ ہمارے ساتھ تو چلا آیا تھا لیکن گاڑی میں بیٹھنے ... وہ کسی الجھن کا شکار نظر آنے لگا تھا جیسے وہ یہ فیصلہ نہ کر ... کہ اس نے ہمارے ساتھ آ کر اچھا کیا تھا یا اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی تھی۔

خاموشی کے طویل وقفے کے دوران میں اس نے ... مرتبہ مجھ سے پوچھا ''میں اسپتال سے صرف ایک گھنٹے کی ... لے کر آیا ہوں۔ مجھے تین بجے سے پہلے واپس ڈیوٹی ... ہوگا۔ مجھے امید ہے، آپ لوگ ہمیں اپنے گھر میں ... کوشش نہیں کریں گے۔''

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔'' میں نے ... تمہاری مجبوری ہے تو ہم تمہیں کیوں روکیں۔ تمہیں ... کرنا ہے۔ ٹھیک دس منٹ بعد ہم اپنے گھر میں ہوں گے۔

میرے اطمینان دلانے سے اس کے چہرے ... آثار نمودار ہوئے اور اس نے ہمت کر کے پوچھا ''کیا ... لوگ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں؟''

ہماری شخصیت، لباس اور حلیہ کسی بھی طور دودھ کا ... کرنے والوں جیسا نہیں تھا اس لیے عبدالکریم کا ... تھا۔ دودھ کے ڈرم سے لدی پھندی ٹویوٹا ہائی لکس ... ہم کہیں بھی فٹ نہیں ہوتے تھے۔ جو اس سیٹ اپ ... تھا، اسے ہم کہیں اور پھینک آئے تھے۔

میں نے عبدالکریم کے استفسار کے جواب میں ... سے کہا ''ہم مختلف قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ ہمارا ... فارم ہے۔ دودھ، دہی، مکھن اور کریم...... ہر شے ... کرتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے پاس ایسی ایسی مشینیں بھی ... کریم کی کریم بھی نکال سکتے ہیں۔''

''کریم کی کریم؟'' اس نے چونک کر سوالیہ نظر ... دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے سفاکی سے کہا ''کریم ... اور...... نہایت ہی عمدہ کریم۔''

عبدالکریم متوحش انداز میں مجھے تکنے لگا۔ ... میں چھپی سنگینی کو شاید اس نے محسوس کر لیا تھا ... میں بولا ''مگر آپ لوگوں کو دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ ... چلاتے ہوں گے؟''

''...ہمیں دیکھ کر تمہیں کیا اندازہ ہوا ہے؟'' میں نے ... آواز میں پوچھا۔

...گڑبڑا گیا ''م...... میرا مطلب ہے، آپ تو پڑھے ... بابو ٹائپ نظر آتے ہیں۔ دودھ کا کاروبار تو......''

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا ''عبدالکریم! کیا پڑھے ... صاف ستھرے نظر آنے والے لوگ دودھ کا کاروبار ... کر سکتے؟'' وہ ندامت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں ... کہا ''ویسے تم اتنا جان لو کہ ہم ڈیری فارم کے مالک ... بیٹھے ہیں۔ کام ہمارے درجنوں ملازم کرتے ہیں۔ ... دیر بعد تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔''

''ت...... تو کیا آپ لوگ مجھے اپنے ڈیری فارم پر لے ... رہے ہو؟''

میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے اثبات میں ... ہلا دی۔

وہ اور زیادہ الجھ گیا اور سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا ''مگر ... تو آپ نے بتایا تھا کہ میرے مہمان آپ کے گھر ...رے ہوئے ہیں؟''

''میں نے تمہیں غلط نہیں بتایا تھا۔'' میں نے گاڑی کی ... بڑھاتے ہوئے کہا ''دراصل ہمارا ڈیری فارم گھر کے ... میں پڑتا ہے۔ مجھے پانچ منٹ کا ایک ضروری کام ہے ... لیے ڈیری فارم کو چیک کرتے ہوئے گھر کی طرف جائیں ...''

میری اس مبہم وضاحت سے وہ مزید الجھ گیا۔ اس کی ... میں خوف کی آمیزش تھی۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے ... اس نے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے کہا ''آپ نے اپنا نام کیا ... تھا......؟''

اس کا یہ سوال ذہنی انتشار کا غماز تھا کیونکہ میں نے ابھی ... اسے اپنے نام وغیرہ نہیں بتائے تھے۔ اس کی پریشانی کا ... اٹھاتے ہوئے میں نے کہا۔

''عبدالکریم! لگتا ہے، تمہاری یادداشت خاصی کمزور ... چند لمحے پہلے بتائے ہوئے ہمارے نام بھی تم بھول ...''

اس دوران میں صدف بالکل خاموش رہی۔ وہ ... انداز کو بخوبی سمجھ رہی تھی۔ میں نے عبدالکریم سے کہا ... نہیں، کوئی بات نہیں۔ انسان خلافِ معمول کوئی بہت بڑا ... انجام دے کر فارغ ہوا ہو تو اس کے انداز میں بے ... سی آجاتی ہے...... اور بے پروائی کا سب سے زیادہ اثر ... پر ہی ہوتا ہے۔''

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگا ''خلافِ معمول کوئی بڑا کارنامہ؟'' اس کی زبان سے صرف اتنا ادا ہوا۔

میں نے کہا ''تم نے آج صبح ہی صبح بہت طویل سفر کیا ہے۔ تیز رفتاری سے کچے پکے راستے پر ایمبولینس دوڑانا کوئی عام یا آسان کام تو نہیں۔''

اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں سراسیمگی اتر آئی۔ خوف میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے کہا ''آپ...... وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں۔ م...... میں نے آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر سخت غلطی کی ہے۔''

''اب تو یہ غلطی ہو چکی عبدالکریم۔'' میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا پھر اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے معتدل انداز میں کہا ''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو۔ ہم وہی ہیں جو تمہیں بتایا تھا۔ تم نے ہمارے نام بھولنے کی غلطی کی ہے۔ چلو کوئی بات نہیں، میں دوبارہ بتا دیتا ہوں۔'' میں نے فیروز پور روڈ کو الوداع کہتے ہوئے شاہ جمال روڈ پر گاڑی موڑ لی پھر عبدالکریم سے کہا ''میرا نام وجیہ ہے اور یہ میری بزنس پارٹنر صدف ہے۔'' میں نے صدف کی جانب اشارہ بھی کر دیا ''اور یہ تو تمہیں یاد ہے نا، ہمارا دودھ کا بزنس ہے...... یعنی ڈیری فارم!''

میری اس طنز آمیز وضاحت سے اس کی الجھن میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی، اس نے متذبذب انداز میں پوچھا ''لیکن آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ میں نے آج ایک طویل سفر طے کیا ہے؟''

''تمہاری صرف یادداشت ہی کمزور نہیں بلکہ تم احمق بھی ہو۔'' میں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''تم ایمبولینس ڈرائیو کرتے ہو۔ اسپتال سے مجھے تمہارے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ تم آج صبح ایک ڈیڈ باڈی احمد نگر چھوڑنے گئے ہو۔ احمد نگر دور دراز کا ایک گاؤں ہے۔ کیا میں ان معلومات کی روشنی میں یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ تم نے طویل اور پُرمشقت سفر کیا ہے!''

''اوہ!'' اس نے اطمینان بخش سانس خارج کی ''میں کچھ اور سمجھا تھا!''

آخری الفاظ ادا کرنے کے بعد وہ خاصا ریلیکس دکھائی دینے لگا۔ میں ''میں کچھ اور سمجھا تھا'' کا مفہوم اور تشریح جانتا تھا۔ وہ یہ جان کر مطمئن ہوگیا تھا کہ اس کے واپسی کے سفر کی تفصیلات سے میں آگاہ نہیں تھا۔ چوہدری نظام دین کی ڈیڈ باڈی کو اسپتال سے احمد نگر پہنچانا ایک نصابی کارروائی تھی لیکن ساحل کو رکھاں والی سے لے کر آنا اور کسی خفیہ مقام تک پہنچانا

سراسر غیر نصابی سرگرمی تھی۔ عبدالکریم کی دانست میں، میں اس کے کچے چٹھے سے ناواقف تھا۔ میں نے اسے اسی خوش فہمی میں رہنے دیا اور پوچھا۔

''ڈھوک کھتا میں تم کہاں کے رہنے والے یعنی تمہارا گھر کس طرف ہے؟''

اس نے جواب دیا ''کینفے نثار کے نزدیک۔''

''آج کل تمہارے بیوی بچے یہیں آئے ہوئے ہیں!''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور اثبات میں گردن ہلادی۔

میں نے کہا ''تم اُدھر کوٹ لکھپت میں کرایے کے کوارٹر میں رہتے ہو؟''

اس کی حیرت سوا ہوگئی ''آپ...... تو میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔''

''تمہارے مہمانوں نے چند باتیں بتائی ہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''وہ تمہارے سسرالی رشتے دار ہیں۔ شاید تمہاری بیوی انہیں جانتی ہو۔ وہ بتا رہے تھے، تم سے پہلے کبھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ تم ان سے مل کر حیران رہ جاؤ گے۔''

''ابھی تو میں آپ سے مل کر حیران ہوں۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

میں نے فرید پاشا کی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر ہائی لکس روک دی۔ کوٹھی کے بند گیٹ کو دیکھ کر عبدالکریم کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر الجھن تیر گئی اور جب کسی ملازم نے آ کر گیٹ کو نہیں کھولا بلکہ یہ کام میں نے انجام دیا تو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''وجیہ صاحب! کیا آپ کا ڈیری فارم یہی ہے؟''

تھوڑی دیر پہلے اس کا جو خوف قدرے زائل ہوگیا تھا اس میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ میں نے ہائی لکس کو کوٹھی کے اندر پہنچایا پھر گیٹ کو بند کرنے کے بعد عبدالکریم کے سوال کا جواب دیا۔

''ہاں، یہ ہمارے ڈیری فارم کا ایک حصہ ہے۔ کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟''

''یہ بات نہیں جناب۔'' وہ کوٹھی کے اندر چاروں جانب نگاہ دوڑانے کے بعد متعجب انداز میں بولا ''یہاں تو خاموشی اور سناٹا ہے۔ کوئی بھی ورکر نظر نہیں آرہا۔ یہ کس قسم کا ڈیری فارم ہے، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔''

''تم اپنے ذہن پر زیادہ زور ڈالنے کی کوشش نہ کرو۔'' صدف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''ابھی اس نے بہت مفید معلومات اُگلنا ہیں۔ وجیہ نے تم سے جھوٹ نہ بولا۔ یہ کوٹھی ہمارے ڈیری فارم کا ایک حصہ ہے۔ یہاں صرف کریم نکالنے والی دو مشینیں نصب ہیں۔ ہم تمہیں دکھائیں گے، ہم نے پچھلے دو دنوں میں کتنی کریم نکالی ہے۔ سارا مال ایک تہ خانے میں رکھا ہے، سنبھال کر۔''

میں نے کوٹھی کے ہال نما کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا ''صدف! تم اس بے چارے کو آدھی بات کیوں بتا رہی ہو۔ صاف کیوں نہیں کہتی کہ یہ دو مشینیں کریم کی کریم نکالتی ہیں۔''

عبدالکریم ٹھٹک کر رک گیا پھر خوف زدہ لہجے میں بولا ''آپ لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں نے آپ کی بات کا یقین کر کے سخت غلطی کی ہے۔ یہ کوئی ڈیری فارم ہے اور نہ ہی یہاں پر میرے مہمان موجود ہیں۔ آپ لوگ بہت معنی خیز اور خوفناک باتیں کر رہے ہو۔ مجھے جانے دو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا اور سفاکی سے کہا ''جب تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا ہے تو پھر اس غلطی کی سزا بھی ضرور ملے گی۔ ویسے ہم نے تم سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔ تمہارے مہمان ڈیری فارم پر نہیں بلکہ ہمارے گھر پر موجود ہیں۔ ایک ضروری کام سے نمٹنے کے بعد ہم گھر کی طرف جائیں گے۔ اگر تم امتحان میں کامیاب ہو گئے تو تمہیں اپنے ساتھ گھر لے جائیں گے۔''

اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ اسے کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کا یقین ہوگیا تھا۔ میری بات کے اختتام پر اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تت...... تم لوگ...... میرا کیسا...... امتحان لو گے؟''

میں اسے دھکیلتے ہوئے ہال نما کمرے میں لے آیا۔ یہ وہی وسیع و عریض کمرا تھا جہاں دو روز قبل میں نے فیض احمد کے آدمیوں کی ٹھکائی کی تھی۔ فیض احمد اور گینڈا نما قادر بخش اس وقت خفیہ تہ خانے میں موجود تھے۔ مذکورہ تہ خانے کا خفیہ راستہ بھی اسی ہال کی ایک دیوار میں تھا۔

میں نے عبدالکریم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ''امتحان بہت سادہ اور آسان ہے۔ ہم دونوں کریم نکالنے والی مشینیں ہیں اور تم ہو کریم۔ ہم کریم کی کریم نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر تم نے تعاون کیا تو فبہا ورنہ تم بھی وہیں پہنچو گے جہاں تمہارے جیسے چند افراد آرام فرما رہے ہیں۔''

''تم لوگ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہو؟'' وہ بولا۔

میں نے سنگین لہجے میں پوچھا ''ساحل کو تم نے کہاں پہنچایا ہے؟''

''ساحل......!'' وہ ہونقوں کی طرح میرا چہرہ تکنے لگا۔

میں نے ایک زنّاٹے دار چانٹے سے اس کا گال سُلگا دیا پھر کہا ''میں اس ساحل نامی لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے تم اپنی ایمبولینس میں رکھاں والی سے لے کر آئے ہو۔ وہ گاڑی میں اسٹریچر پر ایک سفید چادر کے نیچے لیٹی تھی۔ بتاؤ، تم نے میری ساحل کو کہاں پہنچایا ہے؟''

اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈ گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ ہم اسے آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔ تاہم اس نے ہمیں چکر دینے کی کمزور سی کوشش کی۔

''آپ میری بات کا اعتبار کریں۔ میں کسی ساحل کو نہیں جانتا۔'' اس کا لہجہ کھوکھلا اور الفاظ اعتبار سے خالی تھے ''شاید آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی......''

میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے سینے پر ایک زوردار فرنٹ پش کک رسید کی۔ وہ چھ فٹ پیچھے، پشت کے بل زمین بوس ہوگیا۔ میں اچھل کر اس کے قریب پہنچا اور اس کے سینے پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس فیلڈ کے نہیں ہو اس لیے بہتر ہے، راہِ راست پر آجاؤ۔'' میں نے غراہٹ آمیز آواز میں کہا ''خوامخواہ مجھ سے ہاتھ پاؤں نہ تڑواؤ۔ اپنے بیوی بچوں ہی کا کچھ خیال کرو۔ اگر تم زندہ نہ رہے یا اپاہجوں کی طرح زندگی گزارنے کے قابل بنا دیئے گئے تو کیا کرو گے۔ تمہاری بیوی اور بچے کہاں کہاں بھیک مانگتے پھریں گے۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر تنبیہی انداز میں کہا ''یہ بات ذہن سے نکال دو کہ مجھے کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔ سید پور اور فتح گڑھ کے درمیان تمہاری ایمبولینس میرے نزدیک سے گزری تھی۔ اگر میری گاڑی میں خرابی پیدا نہ ہو گئی ہوتی تو میں تمہیں فتح گڑھ کے قریب ہی گھیر لیتا۔ تمہارے ساتھ پسنجر زسیٹ پر کبیر شاہ بیٹھا تھا اور دو افراد ہائی ایس کے پچھلے حصے میں تھے۔ کیا تمہیں یقین آیا؟''

وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے سینے پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے مزید کہا ''تم جانتے ہو، میں تمہارے بارے میں کتنی گہری معلومات رکھتا ہوں۔ ہمارے دو مسلح ساتھی اس وقت تمہارے گھر میں موجود ہیں جنہوں نے تمہارے بیوی بچوں کو نشانے پر لے رکھا ہے۔ اگر تم نے ہم سے تعاون کیا تو تمہارے بیوی بچوں کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' مسلح ساتھیوں والا قصہ میں نے اس کی ہمت کم کرنے کے لیے گھڑا تھا۔ وہ مجھے خاصا ''متاثر'' نظر آیا۔ میں نے کہا ''عبدالکریم! زندگی ایک بار ملتی ہے۔ کیوں اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی زندگی کو عذاب میں ڈالتے ہو۔ اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو ادھر تم جان سے جاؤ گے، ادھر تمہارے بیوی بچوں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔ بولو، کیا کہتے ہیں؟ میری بات مانو گے یا میں اپنے ساتھیوں کو کوٹ لکھپت فون کروں؟''

اس کی مزاحمت جواب دے گئی۔ اپنے پیاروں کی زندگی کا سوال بہت ہی آزمائشی ہوتا ہے۔ میں نے مجبوراً ایک جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ تھوڑی مار پیٹ کے بعد بھی اس کی زبان کھلوائی جا سکتی تھی لیکن اس کارروائی میں وقت ضائع ہوتا اور عبدالکریم کا شدید زخمی ہونا بھی لازمی بات تھی۔ وہ بے چارہ لڑائی بھڑائی کے معاملات میں کچا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے آمادگی کے تاثرات نظر آئے تو میں نے اس کے سینے سے پاؤں ہٹا دیا۔

وہ ڈرتے ڈرتے اٹھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔ کمزور سی آواز میں اس نے سوال کیا ''آپ لوگوں کی مجھ سے اور میرے بیوی بچوں سے کیا دشمنی ہے؟''

''کوئی نہیں۔'' میں نے سادگی سے کہا ''لیکن اگر تم نے میری بات کا جواب نہ دیا تو تم ہی میرے دشمنِ اول ہو گے۔ میں تمہیں صرف دو منٹ کی مہلت دیتا ہوں اور یہ مہلت میرے خاموش ہوتے ہی شروع ہو جائے گی۔ بولو، میری ساحل کو تم نے کبیر شاہ کے ایما پر کہاں پہنچایا ہے؟''

''میں کسی کبیر شاہ کو نہیں جانتا۔'' وہ گھگیایا ''میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ وحید صاحب کے کہنے پر کیا ہے۔''

''گویا تم اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ تم نے ساحل کو رکھاں والی سے لاہور پہنچایا ہے؟''

''مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس لڑکی کا نام ساحل ہے جو میری ایمبولینس میں یہاں پہنچی ہے۔'' اس نے سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''آپ میری بات کا یقین کریں، میں ساحل یا کبیر شاہ سے واقف نہیں۔ وحید صاحب نے کہا کہ ایک لڑکی کو لانا ہے۔ میں نے ان کا کہنا مان لیا، کیونکہ میں ان کا کہا ٹال ہی نہیں سکتا۔''

میں نے ساحل اور کبیر شاہ کا حلیہ بیان کیا تو عبدالکریم نے تصدیق کر دی۔ میرے سینے سے ایک طویل اور اطمینان بخش سانس خارج ہوئی۔ گویا اپنی چھٹی حس کی پکار پر کان دھر کر میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ سفید چادر سے ڈھکے ہوئے اسٹریچر پر ساحل کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مجھے اپنے تن بدن

میں ایک راحت سی اترتی محسوس ہوئی۔ ساحل کا سراغ مل گیا تھا تاہم وہ ابھی تک میری پہنچ سے دور تھی اور اس تک مجھے صرف عبدالکریم ہی پہنچا سکتا تھا۔

میں نے کہا ''تم نے زبان کھول کر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے ورنہ تم اور تمہارے بیوی بچے آج جان ہار جاتے۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ اب ساحل کا پتا بھی جلدی سے بتادو تاکہ تمہاری جان چھوٹ جائے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے پوچھا ''اور یہ تمہارے وحید صاحب کون ہیں، کیا بیچتے ہیں؟ تم ان کا کہا ٹال کیوں نہیں سکتے؟''

وہ بولا ''وحید صاحب کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ اس اسپتال میں انہوں نے ہی مجھے ملازمت دلوائی تھی ورنہ اس سے پہلے میں چار نمبر روٹ کی ویگن چلاتا تھا۔ کام زیادہ اور آمدن کم تھی لیکن اب اللہ کا شکر ہے، گزارہ بہت اچھا ہوجاتا ہے۔ میں وحید صاحب کو دعائیں دیتا ہوں۔''

کسی وحید صاحب کا میری ساحل میں دلچسپی لینا میرے لیے نہایت ہی اہم تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا تعلق کبیر شاہ ہی نے ہوگا یعنی...... شعیب غوری سے۔ کبیر شاہ اپنے اڈے سے غائب ہوگیا تھا۔ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب پولیس نے ''سیاذتھ'' پر بھرپور کارروائی کی تو کبیر شاہ کو فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ شعیب غوری نے اپنے دستِ راست کے فرار اور روپوشی سے لاعلمی ظاہر کی تھی۔ گزشتہ رات فون پر اس سے میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔ اس گفتگو میں ہم دو کھلے دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے آگئے تھے اور شعیب نے بڑے واشگاف الفاظ میں، مجھے دھمکی دی تھی کہ اس نے میرا بندوبست کرانے کے لیے نہایت ہی خطرناک لوگوں سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ شعیب کی دھمکی کا نتیجہ بھی مجھے فوراً ہی دیکھنے کو مل گیا تھا۔ کبیر شاہ کا ساحل کے ساتھ رکھاں والی سے لاہور پہنچنا ثابت کرتا تھا کہ شعیب غوری اور چوہدری نوازش علی میں کوئی نہایت ہی اہم ڈیل ہوئی ہے۔ میرے خدشات صد فیصد درست ثابت ہو رہے تھے۔ میرے دو دشمنوں نے آپس میں الحاق کرلیا تھا۔

عبدالکریم کے جواب نے اگرچہ میری الجھن کو بڑی حد تک دور کردیا تھا۔ تاہم ابھی بھی بہت سے گوشے جواب طلب تھے۔ میں نے اس سے پوچھا ''تم تو آج صبح چوہدری نظام دین کی لاش کے ساتھ اسپتال سے احمد نگر روانہ ہوئے تھے پھر رکھاں والی کیسے پہنچ گئے؟''

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا ''بات دراصل یہ ہے جناب کہ کل رات گئے وحید صاحب نے مجھ سے رابطہ کرکے کہا تھا کہ انہیں چند گھنٹوں کے لیے اسپتال کی ایمبولینس چاہیے۔ ایک مریضہ کو کسی گاؤں سے لاہور پہنچانا ہے اور یہ کام آف دی ریکارڈ ہوگا۔ میں نے کہا، میں کوشش کرتا ہوں۔ معلومات کرنے پر مجھے پتا چلا کہ اسپتال میں داخل ایک مریض کا انتقال ہوگیا ہے اور صبح اس کی لاش احمد نگر پہنچائی جائے گی۔ احمد نگر جانے والے ایمبولینس ڈرائیور سے میں نے بات چیت کی اور اسے اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اس کی جگہ میں جاؤں گا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی جگہ ڈیوٹی کرلیتے ہیں، یہ کوئی خاص بات نہیں۔ وحید صاحب مجھے بتا چکے تھے کہ مریضہ کو رکھاں والی سے لانا ہوگا۔ احمد نگر رکھاں والی کے شمال میں، دو ڈھائی کلومیٹر دور واقع ہے اس لیے بھی یہ کام آسانی سے ہوگیا۔''

عبدالکریم کی بات ختم ہوئی تو مجھے اپنے دل سے ایک ٹیس اٹھتی محسوس ہوئی۔ اس نے دو مرتبہ ساحل کے لیے مریضہ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے تڑپ کر پوچھا ''کیا ساحل بیمار ہے؟''

''اگر وہ بیمار ہوتی تو اسے اسپتال میں داخل کیا جاتا۔'' وہ بولا ''میں نے اسے وحید صاحب کی کوٹھی پر پہنچایا ہے۔ میں نہیں جانتا، اس لڑکی کا کیا قصہ ہے جناب۔ وہ تو اس سفر کے دوران میں بالکل بے ہوش پڑی رہی ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ''آپ کے رویّے سے تو لگتا ہے، وہ آپ کی کوئی قریبی رشتے دار ہے!''

میں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھال رکھا تھا۔ ساحل کی تصدیق ہوجانے کے بعد ایک ایک پل مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے عبدالکریم کی سنی ان سنی کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وحید کی کوٹھی کس طرف ہے؟''

وہ ایک لمحے کے لیے مجھے متامل نظر آیا۔ میں نے پھنکار کر کہا۔

''عبدالکریم! اگر اس مرحلے پر تم نے کسی گڑبڑ کی کوشش کی تو میں تمہارا نرخرا کاٹنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کروں گا اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ اس کے بعد تمہارے بیوی بچوں کا کیسا حسرت ناک انجام ہوگا؟''

میرے لہجے کی وحشت نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا ''وحید صاحب...... ادھر مسلم ٹاؤن میں رہتے ہیں...... مم...... مگر خدا کے واسطے...... آپ مجھے اس چکر سے الگ کردیں۔ میں نے آپ کا کچھ نہیں بگاڑا......''

''ساحل میرے لیے سب کچھ ہے۔'' میں نے گونجتی آواز میں کہا ''تم نے میرا سب کچھ بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ تم خود اس چکر میں کودے ہو...... خود!'' میرے لہجے کی سفاکی بڑھتی چلی گئی ''اب تم کس طرح الگ ہونا چاہتے ہو؟ مسلم ٹاؤن کافی بڑا علاقہ ہے۔ وحید کی کوٹھی کا ٹھیک پتا بتاؤ۔''

بات ختم کرتے ہی میں دونوں بازو پھیلا کر اس کی جانب بڑھا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میں اس کی گردن دبوچنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ وحشت زدہ ہوکر نفی میں گردن جھٹکنے لگا پھر تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ب...... بتاتا ہوں...... ابھی بتاتا ہوں۔ خدا کے لیے، مجھے جان سے نہ مارنا۔ وحید صاحب آب پارہ مارکیٹ کے قریب رہتے ہیں......''

پھر اس نے کوٹھی کا جو نمبر اور لوکیشن بتائی اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ صدف بھی حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ عبدالکریم منشا کی کوٹھی کا ایڈریس بتا رہا تھا۔ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ سفید رنگ کی ایک چھوٹی دو منزلہ کوٹھی ہے نا؟''

''جی جی، وہی۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''لیکن یہاں پر تو محمد منشا نامی کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا ہے۔'' میں نے کہا ''کوٹھی کے گیٹ پر کسی شمشاد علی ایڈووکیٹ کے نام کی تختی لگی ہے؟''

عبدالکریم نے کہا ''جی، میں نے اس لڑکی کو اسی کوٹھی میں پہنچایا ہے۔ شمشاد علی وحید صاحب کے بڑے بھائی ہیں لیکن منشا نامی کوئی بھی جرائم پیشہ شخص وہاں نہیں رہتا۔''

''ایک بے ہوش لڑکی کو ایمبولینس میں ڈال کر کسی دور دراز گاؤں سے لاہور جیسے شہر لایا گیا پھر اسے کسی اسپتال پہنچانے کے بجائے ایک کوٹھی میں لے جایا گیا!'' میں نے سخت لہجے میں کہا ''جرم اور کس کو کہتے ہیں؟ تمہارے وحید صاحب اور اس کا بڑا بھائی شمشاد علی کوئی شریف لوگ نہیں ہوسکتے۔ میں ایسے شریف بدمعاش قسم کے معاشرتی ناسوروں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔''

پھر میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''ہم نے بہت وقت ضائع کردیا۔'' میری آواز میں بھراہٹ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔

وہ بولی ''جو وقت ہاتھ سے نکل گیا، اس کا ماتم کیا کرنا۔ اب ہمیں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کرنا چاہیے۔ منشا کی کوٹھی ہم پچھلی رات دیکھ چکے ہیں۔ ایڈریس مشکل نہیں۔ وہ راستہ ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔'' پھر وہ عبدالکریم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''اس کا کیا کرنا ہے۔ کیا اسے بھی وہیں پہنچا دیں؟''

صدف کا اشارہ واضح تھا۔ ''وہیں پہنچادیں'' سے اس کی مراد خفیہ تہ خانہ تھا جہاں ہمارے چند دشمن پہلے ہی پہنچائے جاچکے تھے۔ انہی میں سے ایک شخص قادر بخش عرف کی زبانی مجھے منشا کے بارے میں پتا چلا تھا۔ محمد منشا ان لوگوں کا باس تھا جو کسی چوہدری دلدار کے لیے کام کرتا تھا، گویا منشا کا باس چوہدری دلدار تھا۔ اس تناظر میں اگر دیکھا جاتا تو منشا اور چوہدری دلدار کے ڈانڈے رکھاں والی کے چوہدری نوازش علی سے جا ملتے تھے کیونکہ ساحل کو رکھاں والی سے منشا کی کوٹھی پر پہنچایا گیا تھا۔ اب یہ کھیل واضح ہوتا جارہا تھا۔ منشا کے بھیجے ہوئے آدمیوں کی دشمنی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ لوگ اگر میری تلاش میں تھے تو اس کا ایک ہی مطلب تھا، چوہدری نوازش علی کو میری تلاش تھی! گویا، وہ اب تک ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

سیکنڈ کے دسویں حصے میں یہ تمام باتیں میرے ذہن سے گزر گئیں۔ صدف نے استفسار تو مجھ سے کیا تھا لیکن میرے جواب سے پہلے ہی عبدالکریم نے منت آمیز لہجے میں کہا ''میں نے آپ سے تعاون کیا ہے، آپ کے ہر سوال کا جواب دیا ہے۔ اب آپ مجھے جانے دیں۔ مجھے تین بجے اسپتال پہنچنا ہے!''

''اسپتال کو فی الحال بھول جاؤ۔'' میں نے رکھائی سے کہا ''اور یہ بتاؤ، آج تمہیں گھر کتنے بجے پہنچنا تھا؟ اگر زندگی نے وفا کی تو تم صحیح سلامت گھر ضرور پہنچو گے۔''

''آپ...... لوگ وعدہ خلافی کر رہے ہو۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا ''عبدالکریم! میں آنکھیں بند کرکے تمہاری باتوں پر یقین نہیں کرسکتا۔ تمہارے بیان کی تصدیق ضروری ہے اور میں اس تصدیق کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ جب تک تم ہمارے مہمان رہو گے۔ میں تمہیں خفیہ مہمان خانے میں پہنچا دیتا ہوں جہاں ہمارے چند اور بھی خیر خواہ موجود ہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا ''اگر تمہارا کہا ہوا درست ثابت ہوا تو تم زندہ سلامت اپنے بیوی بچوں کے پاس جانے کے لیے آزاد ہوگے۔''

وہ گھگھیا کر منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور خفیہ راستہ استعمال کرکے اسے کوٹھی کے تہ خانے میں پہنچا دیا۔ وہاں کا نظارہ دیکھ کر اس کے ہوش خطا ہوگئے۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے ایک ایک کا چہرہ تکنے لگا پھر اس کی

نگاہ چھت سے جھولتے ہوئے سابق سیکیورٹی گارڈ خادم حسین پر جا کر ٹک گئی۔ میں نے اسے رج کر حیران ہونے کا موقع فراہم کیا اور تہ خانے کی صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں مطمئن ہو کر تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ وہاں پر موجود افراد نے خاصی شرافت کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ایسے شریف تو نہیں تھے، حالات نے انہیں بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ وقت بڑا ستم ظریف ہے۔ یہ بڑے سے بڑے فتنہ پرور کو بھی شرافت کے مظاہرے پر مجبور کر دیتا ہے۔

میں تہ خانے سے باہر آنے سے پہلے ایک فیصلہ کر چکا تھا اور وہ فیصلہ تھا، اپنی جنگ آپ لڑنے کا۔ مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ دوسروں کو اس جنگ کا ایندھن بناؤں۔ صدف ہال نما کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس کے پاس آ کر کہا ’’چلیں۔‘‘

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ’’فوراً چلیں۔ ایک لمحے کی تاخیر مناسب نہیں۔‘‘

’’صدف!‘‘ میں نے اس کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کہا ’’تم یہاں سے سیدھی فرید پاشا کی گلبرگ والی کوٹھی جاؤ گی یا تم چاہو تو اپنے ماموں کے گھر بھی جا سکتی ہو۔ میں تمہیں ٹیکسی میں بٹھا دیتا ہوں۔‘‘

وہ یک دم رک گئی۔ میں نے بات ہی ایسی کی تھی کہ اسے ٹھٹکنا پڑا ’’وجدان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔‘‘ میں بے حد سنجیدہ تھا ’’ساحل تک پہنچنا اور اسے حاصل کرنا میرا مسئلہ ہے۔ تم خوامخواہ خود کو کسی مصیبت میں نہ ڈالو۔‘‘

’’یہ تم اچانک بے رخی کی باتیں کیوں کرنے لگے؟‘‘

’’ہاں، میں ایسا ہی بے رخ ہوں۔‘‘ میں نے سفاکی سے کہا۔

’’میں ان حالات میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔‘‘ وہ چٹانی لہجے میں بولی ’’تم اگر چاہو بھی تو مجھے روک نہیں سکو گے۔‘‘

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ایک طرح سے مجھے چیلنج کر رہی تھی۔ اس کا جذبہ بڑا طاقت ور اور سچا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی راہ بدلنے کی کوشش کی تو وہ باقاعدہ مجھ سے بھڑ جائے گی۔ اس کے تیور میں جارحانہ پن جھلک رہا تھا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ’’مجھے کچھ نہیں ہوگا صدف! تم بلاوجہ ضد نہ کرو۔ میں گھنٹے بھر میں واپس آ جاؤں گا۔‘‘

’’تم ایک گھنٹے کی بات کر رہے ہو۔‘‘ وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی ’’میں ایک لمحے کے لیے تم سے الگ نہیں ہو سکتی اور...... میری یہ ضد بلاوجہ نہیں ہے۔ ساحل تمہارے لیے بہت...... بہت اہم ہو گی لیکن تم بھی میرے لیے کچھ کم اہم نہیں ہو!‘‘

صدف نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ میرے پاؤں میں گویا ایک زنجیر سی پڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ اٹل ہے۔ اس کا عزم اور ارادہ ماؤنٹ ایوریسٹ کو شرما رہا تھا۔ اس ضدی لڑکی کی سنجیدگی نے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ صدف کی ضد میں اتنی اپنائیت اور جاں نثاری تھی کہ میں نے ہتھیار پھینک دیے۔

☆☆☆

فرید پاشا نے ایک گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا تھا اور اب اس بات کو لگ بھگ دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ میری رسٹ واچ چار بجا رہی تھی۔ میں نے کوٹھی سے روانہ ہونے سے پہلے پاشا کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ عین ممکن تھا، کوئی چونکا دینے والی اہم بات پتا چل جاتی۔ میں جس مہم کے لیے نکلنا چاہتا تھا اس کے انجام کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں صدف کو لے کر اس کمرے میں پہنچا جہاں ٹیلی فون کی سہولت موجود تھی۔ ہم نے گزشتہ رات یہیں سے فون کر کے اپنے لیے ٹویوٹا کرولا منگوائی تھی جو اس وقت کار پورچ میں خاموش کھڑی تھی۔ میں نے رکھاں والی میں پاشا کی حویلی کا نمبر ملایا۔ اب یہ فون نمبر مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اہم چیزوں کو یاد رکھنے کے لیے کوشش کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تیسری گھنٹی پر فون ریسیو کر لیا گیا۔ ریسیور پاشا کے چھوٹے بھائی نوید نے اٹھایا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد اس سے بھرپور تعزیت کی اس نے فرید پاشا سے میری بات کروا دی۔ فرید نے آن لائن ہوتے ہی پوچھا۔

’’یار! میں ایک گھنٹے سے تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟‘‘

میں نے اسے اپنی ’’مصروفیات‘‘ سے مختصراً آگاہ کیا اور پوچھا ’’کیا رکھاں والی سے کوئی خاص خبر آئی ہے؟‘‘

’’بہت ہی خاص خبر ہے۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا ’’وجدان! تمہارے وجدان نے بہت ٹھیک کام کیا ہے۔ ساحل کو آج صبح رکھاں والی سے ایک سفید ایمبولینس میں روانہ کیا گیا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے، گزشتہ رات کراچی سے دو بندے رکھاں والی پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک نے چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے۔ وہ دونوں بھی ایمبولینس میں ساحل کے ساتھ گئے ہیں اور چوہدری نوازش علی کا بیٹا فیصل بھی ان کے ہمراہ ہے۔ وہی جس نے مارشل آرٹس وغیرہ بھی سیکھ رکھا ہے۔‘‘

یہ اطلاع چونکا دینے والی تھی۔ میری معلومات کے مطابق، جب میاں زاہد حسین (حالیہ مقیم فرسٹ ڈگری دوزخ) نے ساحل کو کراچی سے بائی روڈ لاہور روانہ کیا تھا تو فیصل اس وقت بھی اس قافلے کے ساتھ تھا۔ چھوٹی داڑھی والے جس آدمی کا پاشا نے ذکر کیا، وہ کبیر شاہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے ایمبولینس کے پچھلے حصے میں جو دو افراد دیکھے تھے، ان میں ایک فیصل اور دوسرا کبیر شاہ کا ساتھی تھا۔ ایمبولینس اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزری تھی کہ میں ان کی شکل یا حلیے پر غور نہیں کر سکا تھا۔

میں نے فرید پاشا سے کہا ’’چھوٹی داڑھی والے شخص کا نام کبیر شاہ ہے اور یہ میرے ایک تازہ بہ تازہ دشمن کا خاص بندہ ہے۔‘‘

میں نے فرید پاشا کو شعیب غوری اور اس کی تنظیم سی ایف کے بارے میں کوئی خاص بات ابھی تک نہیں بتائی تھی لیکن اب بھی مبہم انداز ہی اختیار کیا۔ وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

’’وجدان! لگتا ہے، چوہدری نوازش اور کراچی سے آنے والے بندوں میں کوئی خاص ڈیل ہوئی ہے جس کے نتیجے میں ساحل کو یہاں سے روانہ کیا گیا ہے۔‘‘

’’تمہارا اندازہ بالکل درست ہے پاشا۔‘‘ میں نے تائیدی انداز میں کہا ’’یہ لگ بھگ دس کروڑ روپے کی ڈیل ہے۔ میرے دو دشمن آپس میں مل گئے ہیں اور اب مجھے ان دونوں ہی سے ان کی اوقات کے مطابق نمٹنا ہے۔‘‘

وہ میرے لہجے کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے بولا ’’تم نے تھوڑی دیر پہلے کسی محمد منشا کا ذکر کیا ہے جہاں ساحل کو پہنچایا گیا ہے۔ منشا کا چوہدری نوازش اور کبیر شاہ سے کیا تعلق ہے؟‘‘

’’کوئی بہت ہی گہرا تعلق ہوگا جبھی تو ساحل کو اس کی کوٹھی پر پہنچایا گیا ہے۔‘‘ میں نے کہا ’’ویسے اتنا بتا دوں کہ منشا کا تعلق جرائم کی دنیا سے ہے۔ میں پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کے اہلکاروں سے نمٹ رہا ہوں۔‘‘

’’یہ کیا کہہ رہے ہو وجدان۔‘‘ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا ’’کیا وہاں لاہور میں کوئی گڑبڑ ہے؟‘‘

اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں پاشا کو یہاں کے حالات کے بارے میں مختصراً بتاؤں۔ اس کے غیاب میں، میں جن سرگرمیوں میں مصروف رہا تھا اس سے آگاہ کرنے کے بعد میں نے کہا ’’پاشا! تم اس طرف سے بالکل بے فکر رہو۔ میں سنبھال لوں گا۔ میرے خیال میں تمہارے والد کی تدفین میں اب زیادہ وقت نہیں۔ تم وہاں کے معاملات پر دھیان دو۔ میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں۔ قسمت کو یہ منظور نہیں کہ ان صبر آزما لمحات میں، میں تمہارے ساتھ ہوتا۔‘‘

اسی وقت کسی نے فرید کو پکارا اور اس نے ’’خدا حافظ‘‘ کہہ کر فون بند کر دیا۔

ہم ٹیلی فون والے کمرے سے نکلے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیسرا شخص بھی وہاں سے ہمارے پیچھے آیا ہو۔ اس احساس نے بے اختیار مجھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔

صدف نے پوچھا ’’کیا ہوا وجدان؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘ میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس کے ساتھ قدم بڑھانے لگا۔

میں اپنے احساس کے بارے میں کھل کر اسے بتانا نہیں چاہتا تھا وہ مجھے پہلے بھی اس حوالے سے .... کسی ماہرِ نفسیات سے ملنے کا مشورہ دے چکی تھی۔ اس نے میرے احساس کو وہم اور دماغ کے خلل کا نام دیا تھا۔ ہم دونوں کوٹھی کے بیرونی حصے میں آ گئے لیکن وہ احساس بھی میرے ساتھ چلا آیا۔ میں نے اس کے بعد پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ احساس میرے قریب سے قریب تر آتا جا رہا ہے، پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ احساس انتہائی نزدیک پہنچنے کے بعد میرے وجود میں داخل ہو گیا ہو، پلک جھپکتے میں وہ میرے جسم، میری ذات کا حصہ بن گیا۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ میرے لیے ایک انوکھا اور حیرت انگیز تجربہ تھا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں مجھے بہت سے طلسمی واقعات سے واسطہ پڑا تھا، پھر نیپال اور رشی کیش میں بھی بہت سے سفلی اور علوی نظارے دیکھنے کو ملے تھے لیکن تھوڑی دیر پہلے میں جس احساس سے گزرا، وہ ان سب سے منفرد اور نرالا تھا۔

گزشتہ رات جب میں صدف کے ساتھ اس کوٹھی پر آیا تھا تو بھی مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اگر اس نوعیت کے واقعات صرف کوٹھی کے اندر ہی پیش آئے ہوتے تو میں سمجھتا کہ اس کوٹھی کے ساتھ کوئی پُراسرار یا ماورائی چکر ہے۔ پچھلی رات جب ہم کوٹھی کی طرف آ رہے تھے تو ہماری جیپ اچانک ’’ناراض‘‘ ہو گئی تھی پھر جیپ کو پش دیتے وقت میں جن سنسنی خیز تجربات سے گزرا انہیں نظر انداز نہیں کیا

جاسکتا تھا۔ ازیں علاوہ، گلبرگ تھری والی کوٹھی میں بھی مجھے اس سے ملتے جلتے تجربات ہوئے تھے۔ میں نے اپنا نام لے کر پکارا جانا تو بہت ہی واضح سنا تھا اور پھر وہ خواب...... جس میں، میں نے اپنے علاوہ خود کو دیکھا تھا۔ یعنی بیک وقت دو وجدان!

یاالٰہی! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ میں ان دنوں چونکہ ''جی'' کی ایڈوانس مشقیں بھی باقاعدگی سے کر رہا تھا اس لیے اپنی ان کیفیات کے بارے میں، میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شاید میری کوئی باطنی قوت بیدار ہو رہی ہے۔ اس موقع پر...... استادِ محترم آں جہانی ماسٹر ہینگ پائی (HANG PAI) بہت شدت سے یاد آیا۔ اگر آج وہ زندہ ہوتا اور میں اس سے واسطے میں ہوتا تو وہ ان پُراسرار واقعات کی توجیہ کر سکتا تھا۔ یہ سچ ہے، دنیا کا کوئی بھی علم ہو، وہ استاد کی نگرانی اور راہنمائی کے بغیر صحیح طور پر سیکھا نہیں جا سکتا۔ میں نے اس لمحے فیصلہ کیا کہ ذرا فرصت نصیب ہو تو میں کسی ماہر روحانیات سے ضرور رابطہ کروں گا تاکہ معاملات کی اس گتھی کو سلجھایا جا سکے۔ ''جی'' کا دائرہ کار بہت وسیع تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا، اپنی بے خبری میں کوئی نقصان اٹھا بیٹھوں۔ اس بات کے امکانات بہرحال تھے کہ کہیں جی کی ایڈوانس مشقوں میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو گئی ہو۔ کوئی بھی انسان ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف تو اس نظر نہ آنے والے احساس کا معاملہ تھا اور دوسری جانب اس نقلی وجدان نے مجھے ذہنی طور پر الجھا رکھا تھا۔ اس کی کرشمہ کاریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ ابتدا میں، ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ کہیں میرے اورا (AURA) کا کمال نہ ہو! انسانی جسم سے چند انچ کے فاصلے پر دکھائی نہ دینے والی روشنیوں کا ایک پیکرِ لطیف بھی موجود ہوتا ہے، جسے نسمہ یا ہمزاد بھی کہا جاتا ہے لیکن جب میں نے غور کیا تو میں نے اپنے خیال کو رد کر دیا۔ جس بہروپیے نے پچھلے کئی گھنٹوں سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو پریشان کر رکھا تھا، وہ ''اورا'' ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ ماسٹر ہینگ پائی نے شاؤلن ٹیمپل میں ہمزاد (AURA) پر مجھے جو لیکچر دیا تھا وہ ابھی تک من و عن میرے ذہن میں نقش تھا۔ نقلی وجدان یا وہ بہروپیا ہمزاد کی حقیقت پر پورا نہیں اترتا تھا۔ ویسے تو قصے کہانیوں اور مسالے دار واقعات میں ہمزاد کو بہت ہی بھونڈے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اپنا کاروبار چمکانے کے لیے بعض عاملین کاملین اس سے بڑے بڑے مادی کام لینے کے دعوے دار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے اعمال و افعال کے خود ذمے دار ہیں۔

میں ان خیالات میں جانے کہاں بہہ جاتا کہ صدف کی آواز نے مجھے چونکا دیا ''وجدان! کیا ہم اسی دودھ والی گاڑی میں یہاں سے روانہ ہوں گے؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

میں نے ہم زاد اور اپنے انوکھے احساس کے بارے میں، سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا بلکہ چلنے کے دوران ہی میں وہ خیالات بجلی کے کوندے کے مانند میرے ذہن میں چمک گئے تھے۔ انسانی ذہن بھی حیرت کا کارخانہ ہے۔ سوچ کی رفتار کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پلک جھپکتے میں صدیوں کے معاملات کو نمٹا سکتی ہے۔ میں نے صدف کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہائی لکس کو تو یہاں سے نکالنا ہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم کرولا کو بھی لے جائیں گے۔''

اس نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں؟ میں نے ٹویوٹا ہائی لکس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور صدف کرولا میں بیٹھ گئی۔ دونوں گاڑیاں کوٹھی سے باہر آ گئیں۔ میں نے گیٹ کو دوبارہ مقفل کر دیا پھر صدف کے نزدیک آ کر کہا۔

''تم کرولا لے کر آگے چلو۔ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ شاہ جمال روڈ کے اختتام پر ایک نشیبی پارک ہے جسے شریف پارک کہا جاتا ہے۔ میں دودھ والی گاڑی کو اس پارک کے کنارے چھوڑ دوں گا۔ تم فیروز پور روڈ پر مڑنے کے بعد پیٹرول پمپ میں داخل ہو جانا۔ کرولا کی ٹنکی فل کرانا ضروری ہے۔ جب تک تم ایندھن بھرواؤ گی، میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا پھر ہم ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔''

اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور کرولا کو بڑھا دیا۔ پچاس گز کے فاصلے سے میں اس کے پیچھے جانے لگا۔ شریف پارک ایک اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس پارک میں زیادہ تر کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ دو تین سیمنٹ کی پچز موجود ہیں۔ ایک غریب گھرانے کا لڑکا اسی پارک میں سیمنٹ پچ پر نیٹ پریکٹس کرنے کے بعد قومی ٹیم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہ برسوں پہلے کا واقعہ ہے۔ فرید پاشا ایک باتونی، قصہ گو اور دلچسپ انسان تھا۔ دیگر واقعات کے ساتھ اسی نے مجھے غریب کرکٹر کی روداد سنائی تھی۔ وہ لڑکا زیادہ عرصے تک ٹیم میں شامل نہ رہ سکا۔ وہ ایسا اسٹار تھا جس کی چمک بہت جلدی ماند پڑ گئی۔ کرکٹ کے افق سے وہ کس طرح غروب ہوا، یہ ایک الگ کہانی ہے۔

میں نے ٹویوٹا ہائی لکس کو سڑک کے کنارے کھڑا کیا اور پیٹرول پمپ کی جانب بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم دونوں

کرولا میں سوار مسلم ٹاؤن کی جانب اڑے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ ڈرائیونگ سیٹ پر صدف موجود تھی۔ گزشتہ رات کے آخری حصے میں یہی گاڑی میں چلا رہا تھا۔ اس وقت فرید پاشا کا اسسٹنٹ تحسین نسان پٹرول میں ہماری راہنمائی کرر ہا تھا۔ منشا کی سفید کوٹھی تک جانے والا راستہ مجھے ازبر تھا۔

گزشتہ رات اس طرف آتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے خیال نہیں آیا کہ میری ساحل کو آج اسی کوٹھی میں پہنچایا جائے گا۔ بظاہر اس بات کے امکانات نہیں تھے، اس لیے میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تقدیر اور تدبیر کی جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گی۔ اکثر تقدیر کی جیت ہوتی ہے لیکن باتدبیر انسان ہمت نہیں ہارتا اور اپنی پلاننگ سے تقدیر کو بدلنے یا چت کرنے کی کوشش میں جتا رہتا ہے۔ فیض احمد، قادر بخش، ریاض علی، جمشید، عمران اور جلال کے کرتوتوں سے میں یہ اندازہ تو لگا چکا تھا کہ منشا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کیوں؟ یہ واضح نہیں ہو سکا تھا۔ لالہ بشیر ایم پی اے کے سپوت سکندر کے ڈانڈے بھی منشا سے ملتے نظر آرہے تھے اور یہ سب بدمعاش غنڈے کسی نہ کسی طور چوہدری دلدار سے وابستہ تھے جو ڈیفنس سوسائٹی کی ایک عالیشان کوٹھی میں مقیم تھا۔ میں نے ان حالات میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کیا تھا کہ ساحل کو منشا کے پاس پہنچا دیا جائے گا اور وہ بھی چوہدری نوازش علی کی مرضی اور خوشی سے! میں اب چوہدری نوازش علی کے لاہور نیٹ ورک سے ٹکرانے والا تھا۔ میں نے اس کا کراچی نیٹ ورک بری طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میاں زاہد حسین جیسے شخص کا خاتمہ چوہدری کے لیے بہت بڑا زیاں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کراچی میں سی ایف کے کی مدد مجھے حاصل تھی جبکہ لاہور میں شعیب جیسا کمینہ اور سفاک شخص میرے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا۔

پچھلے تین چار گھنٹوں سے میں مسلسل ساحل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس دوران میں، میں نے جو کچھ بھی کیا، وہ صرف اور صرف اسی کا سراغ لگانے کے لیے تھا اور میں اس مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد میں منشا کی سفید کوٹھی کے سامنے ہوتا جہاں ایمبولینس ڈرائیور عبدالکریم کے بقول، ساحل کو پہنچایا گیا تھا۔

اس نے گاڑی کو وحدت روڈ پر ڈالا تو مجھ سے پوچھا ''وجدان! تم نے کارروائی کے لیے کوئی منصوبہ سوچا ہے یا اندھا دھند کوٹھی کے اندر داخل ہونا ہے؟''

''یہ وقت اندھا دھند عمل کا نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا ''منزل پر پہنچ کر میں نشانِ منزل کھونا نہیں چاہتا۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ اس مرتبہ اگر ساحل ہاتھ سے نکل گئی تو......''

میں اس سے آگے کچھ کہہ نہ سکا۔ غیر ارادی طور پر زبان نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پتا نہیں، کیا بات تھی کہ ساحل کے حوالے سے میرا ذہن خدشات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اور خاص طور پر یہ اندیشہ تو بار بار سر ابھار رہا تھا کہ اگر اس بار میں نے ساحل کا سراغ کھو دیا تو پھر اسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس جائیں گی یا برس جائیں گی۔ میں اس وہم کی توجیہ کرنے سے قاصر ہوں۔

صدف نے میرے ادھورے جملے پر چونک کر کہا ''تو...... کیا؟''

''تو...... تو...... بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

وہ میری دلی کیفیت اور ذہنی حالت کو بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی لہٰذا اس حوالے سے اس نے زیادہ کرید نہ کی اور تسلی آمیز لہجے میں بولی ''کچھ نہیں ہوگا وجدان۔ تم خوامخواہ وہم میں نہ پڑو۔''

''کیا کروں، پچھلے چند گھنٹوں سے میں کچھ وہمی سا ہو گیا ہوں۔'' میرے لہجے کی سنجیدگی برقرار تھی۔

وہ بولی ''یہ موجودہ حالات کے اثرات ہیں۔ تمہارے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ کرے، سب ٹھیک ہو جائے!'' میں نے مباک آواز میں کہا اور صدف نے آب پارہ مارکیٹ کے نزدیک سے کرولا اندر موڑ لی۔

میں اس وقت خود اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں خود کو نہایت ہی مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتا ہوں اور میں نے ہر امتحان میں خود کو ایسا ثابت بھی کیا ہے لیکن ساحل کے معاملے نے مجھے ذہنی اور اعصابی طور پر ریخت و شکست کا شکار کر کے رکھ دیا تھا۔ ساحل کا معاملہ خالصتاً دل کا معاملہ تھا۔ آج سے پہلے مجھے اس نوعیت کے معاملے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ شاید اسی لیے بھی میں نے کبھی خود کو اتنا جذباتی اور بے بس محسوس کیا تھا۔

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ چوہدری نوازش علی نے شعیب غوری کے ساتھ کوئی پیکٹ کر لیا تھا، میری تشویش میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر کسی ڈیل کے نتیجے میں ساحل کو شاہ کے حوالے کیا گیا تھا تو یہ بھی ظاہر تھا کہ اسے جلد از جلد کراچی پہنچایا جائے گا...... شعیب غوری کے پاس!

دوسری جانب منشا کی دشمنی بھی بہت واضح ہو گئی تھی۔ گینڈا نما قادر بخش نے مجھے بتایا تھا کہ سکندر منشا کا دوست تھا جس نے اسے میرے بارے میں بتایا تھا۔ منشا اپنے باس چوہدری دلدار کی خوشنودی کی خاطر مجھے چھاپنے کی کوشش میں تھا۔ ساحل کو منشا کی کوٹھی میں پہنچائے جانے کے بعد یہ بھی ثابت ہو گیا کہ منشا اور چوہدری دلدار، چوہدری نوازش ہی کے بندے تھے۔

میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ صدف نے کرولا کو اس گلی میں داخل کیا جس میں پچاس گز آگے منشا کا ٹھکانا تھا۔ گزشتہ رات میں نے اس سفید کوٹھی کو بغور دیکھا تھا۔ میں نے صدف سے کہا۔

''تم منشا کی کوٹھی کے سامنے رکنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ گاڑی کو آگے نکال لے جاؤ۔''

اس نے میری بات پر عمل کیا۔ جب کرولا گلی کے نکڑ پر پہنچی تو میں نے صدف سے کہا کہ وہ گاڑی کو بغلی گلی میں داخل کر کے روک دے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر میری ہدایت پر عمل کیا اور گاڑی کو میرے مطلوبہ مقام پر روک دیا۔ یہ جگہ منشا کی کوٹھی سے نظر نہیں آتی تھی۔ تاہم وہاں خاصی خاموشی اور سناٹا تھا۔ یہ مقام کوٹھی کی عقبی گلی سے ملحق تھا جہاں ہماری گاڑی کسی دشمن کی نظر میں آئے بغیر محفوظ رہ سکتی تھی۔

میں نے گاڑی سے باہر آنے سے پہلے صدف سے کہا ''ہم دو طرف سے کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ دونوں کا طریقۂ کار مختلف ہوگا لیکن مقصد ایک ہی ہوگا۔'' وہ پوری توجہ اور سوالیہ نگاہ سے مجھے تکتی رہی۔ میں نے مزید کہا ''ہم اپنا اپنا بیگ ساتھ لے کر جائیں گے۔ تم خود کو گھریلو استعمال کی اشیا کی سیلز گرل ظاہر کرو گی اور چوکیدار کو باتوں میں لا کر کوٹھی کے گیٹ سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرو گی۔ جب چوکیدار تمہاری لچھے دار باتوں میں الجھا ہوا ہوگا، میں کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو جاؤں گا۔ کیا تم ایسا کر لو گی؟''

میرا آخری جملہ کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ وہ ٹھوس لہجے میں بولی ''یقیناً کر لوں گی۔ تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ لیکن کیا ضروری ہے کہ میں سیلز گرل کا رول ہی ادا کروں۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی تو یہ کام نکال سکتی ہوں۔ ایک ایسی ڈاکٹر جو کسی خطرناک مرض سے آگاہی اور اس کے علاج کے سلسلے میں لوگوں کو مفید معلومات فراہم کر رہی ہو۔ میڈیکل میرا شعبہ ہے۔ اس حوالے سے میں زیادہ اچھی اداکاری کر سکوں گی۔ کیا خیال ہے؟''

''گڈ آئیڈیا!'' میں نے سنجیدہ الفاظ میں اس کی تجویز کو سراہا ''تم ایک ڈاکٹر کا ناٹک ہی کرو۔''

''وجدان! اس طرف آتے ہوئے کوٹھی کے گیٹ پر کوئی چوکیدار وغیرہ نظر نہیں آیا۔'' اس نے سرسری لہجے میں کہا ''اور خاصی خاموشی بھی محسوس ہو رہی ہے۔ یوں لگتا ہے، کوٹھی کے اندر کوئی موجود نہ ہو۔''

میں نے کہا ''یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے لہٰذا ہمیں کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔''

''او کے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی ''میں ہر قدم پر محتاط رہوں گی۔''

پھر ہم دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ ہم نے خاصی گرمجوشی سے ہاتھ ملائے اور اپنی اپنی سمت کو روانہ ہو گئے۔ میں سفید کوٹھی کے عقبی حصے میں پہنچا ہی تھا کہ کوٹھی کے اندر کہیں گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ صدف نے ڈور بیل پر انگلی رکھ دی تھی۔

وہ دن کا وقت تھا۔ اگرچہ عقبی گلی میں کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم پھر بھی احتیاط کی ضرورت تھی۔ کوئی ذرا سی کوتاہی کام بگاڑ سکتی تھی۔ میں نے چوکنا نظر سے کوٹھی کی بالائی منزل کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی نظر نہ آیا۔ اس دوران میں صدف نے دوسری مرتبہ گھنٹی بجا دی۔ میں کان لگا کر اندر پیدا ہونے والی آوازیں سننے لگا۔ اگلے ہی لمحے میری امید بر آئی۔

میں نے کوٹھی کا گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ صدف کی گھنٹی نے کام کر دکھایا تھا۔ میں نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ اچھل کر عقبی دیوار کی منڈیر پکڑی اور اچک کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا پھر اگلے ہی لمحے میں کوٹھی کے اندر کود چکا تھا۔

میرے قدموں کو نرم اور دبیز گھاس نے بوسے دیے۔ وہ عقبی لان تھا۔ میں اٹھ کر پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ کوٹھی کے سامنے والے حصے میں مجھے غیر معمولی شور سنائی دیا۔ اس شور میں مار پیٹ کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ میں ایک لمحے میں سمجھ گیا، وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ دوڑتے ہوئے قدموں کی مخصوص دھمک کے بیچ میں نے صدف کی مخصوص چیخ سنی۔ یہ چیخ ہر مارشل آرٹسٹ کا خاصہ ہوتی ہے جو (YELLING) کہلاتی ہے۔ مارشل آرٹسٹ اپنے مدمقابل پر بھرپور حملہ کرتے وقت تیز آواز میں (YELL) کرتا ہے۔ صدف کے عمل نے مجھے پلک جھپکتے میں باور کرا دیا کہ وہ طمطراق سے میدانِ عمل میں کود پڑی تھی۔ انتظار کے لمحات گزر چکے تھے۔ میں نے ایک پل ضائع کیے بغیر صدف

سمت دوڑ لگادی۔

کوٹھی کے سامنے والے حصے میں پہنچتے ہی میری نگاہ نے ایک دلچسپ منظر دیکھا۔ صدف دو ہٹے کٹے اور دراز قامت افراد سے نبرد آزما تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں کسی مشین کے مانند حرکت کررہے تھے۔ میں لپک کر اس کی مدد کو آیا اور ایک شخص کے کالر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا پھر میری جانب ہوا، میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ منشا کا دوست اور ایم پی اے لالہ بشیر کا بگڑا ہوا بیٹا سکندر تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک دھانسو قسم کا پنچ مارا۔ اس نے سر کو پیچھے جھٹکا تو میں نے اس کے فراخ سینے پر ایک زوردار فرنٹ کک جڑ دی۔ وہ الٹ کر عقب میں گرا۔

اسی وقت صدف نے اپنے مدِمقابل کو ایک سائیڈ کک مار کر دور اچھال دیا پھر میری طرف دیکھ کر تیز لہجے میں بولی ”میں ان دونوں سے بخوبی نمٹ لوں گی۔ تم یہاں کی فکر نہ کرو اور کوٹھی کے اندر پہنچو۔“ وہ اس وقت ایک بپھری ہوئی شیرنی نظر آرہی تھی۔

صدف نے جس شخص کو دور پھینکا تھا، وہ کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ گویا وہاں کی صورتِ حال پوری طرح صدف کے کنٹرول میں تھی۔ میں مطمئن ہوکر اندر کی جانب بڑھا۔ اسی لمحے سکندر ایک مستعد ٹائیگر جمپ لگا کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس پر حقارت کی نگاہ ڈالی اور اپنی راہ ہولیا۔

سکندر اس سے پہلے دو مرتبہ میرے راستے میں آیا تھا اور دونوں ہی مرتبہ اس نے بڑی ذلت اٹھائی تھی۔ مال روڈ والے ریسٹورنٹ میں تو صدف نے اس کی عظیم الشان گت بنائی تھی اور فرید پاشا کے گھر پر میں نے اسے ناکوں چنے چبوا ڈالے تھے حالانکہ اس وقت سکندر نے جو لباس پہن رکھا تھا اس میں اس کی ناک کو تلاش کرنا خاصا مشکل تھا۔ ڈینجرڈ یبولک جیسے لباس میں وہ اور اس کے ساتھی بڑے مضحکہ خیز نظر آرہے تھے۔ فلم ”گولڈ مین“ کا متذکرہ بالا ہیرو اگر انہیں اس حلیے میں دیکھ لیتا تو ہنسی ضبط کرنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا۔

میں تیز قدموں سے دوڑتے ہوئے کوٹھی کی عمارت میں داخل ہوگیا۔ صدف کی طرف سے اطمینان نے میری مستعدی میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا۔ میں نے برآمدے کو عبور کرکے جیسے ہی ایک راہداری میں قدم رکھا، سامنے سے ریاض علی آتا دکھائی دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ریوالور پکڑ رکھا تھا۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں نے وہائٹ ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر اسے انٹا غفیل کیا تھا۔ ازاں بعد اسی نے منشا کو میرے بارے میں اطلاع فراہم کی تھی۔

ریاض علی نے بھی مجھے فوراً پہچان لیا۔ اس نے ریوالور والا ہاتھ سیدھا کیا اور مجھ پر گولی چلادی۔ راہداری فائر کی مخصوص آواز سے گونج اٹھی۔

ریاض نے راہداری میں دوڑتے ہوئے میرا نشانہ لینے کی کوشش کی تھی لہٰذا میں اس کے دام میں نہ آسکا۔ ایک تو ہدف زیادہ فاصلے پر تھا، دوسرے میں نے اس کا ہاتھ بلند ہوتے ہی ہوا میں جمپ کی اور زمین پر آتے ہی میں نے پھرتی سے فرنٹ رول کردیا۔ یہ فال اور رول کا ایک سرعتی کمبی نیشن تھا چنانچہ میں گولی لگنے سے محفوظ رہا۔ اب میں ریاض کے بہت قریب آگیا تھا۔

اسی دوران میں اس نے دوبارہ مجھ پر فائر کرنا چاہا لیکن اب میں اسے کوئی موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ سیدھا ہونے سے پہلے ہی زمین سے کھڑے ہوکر ایک چکردار بیک کک چلائی۔ میری ایڑی اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹا، میں نے آگے بڑھ کر اسے ایک نپی تلی راؤنڈ ہاؤس کک ماردی۔ وہ تکلیف کی شدت سے چلا اٹھا۔

یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، اس کوٹھی میں اور کتنے دشمنوں سے واسطہ پڑے گا۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں ساحل تک پہنچنا چاہتا تھا۔ میں نے ریاض کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور وہ جیسے ہی سیدھا ہوا، میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ میں نے اس کے بلند ہوتے ہوئے ریوالور والے بازو کی بغل میں ایک کک رسید کی، ریوالور اس کی گرفت سے نکل کر راہداری کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔

نہتا ہوتے ہی اس نے کوٹھی کے اندرونی حصے کی جانب دوڑ لگادی۔ میں اس کے پیچھے لپکا اور ایک کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے جالیا۔ وہ میری دسترس میں آیا تو میں نے تابڑتوڑ گھونسے برسا کر اس کا چہرہ لہولہان کردیا۔ وہ لڑائی بھڑائی کا زیادہ ماہر نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے اس کی کنپٹی پر ڈبل چوپ رسید کیا۔ یہ ایک ایسی ضرب تھی جس کے نتیجے میں گھنٹا، دو گھنٹا کے لیے وہ دنیا و مافیہا سے کٹ جاتا۔ میرے عمل کے اگلے ہی لمحے وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند میرے بازوؤں میں جھول گیا۔ میں نے اسے راہداری کے پختہ فرش پر پھینکا اور ریوالور کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ اس کے بعد میں نے کوٹھی کے اندرونی حصے کا رخ کیا۔ یکے بعد دیگرے میں نے کئی کمرے دیکھ ڈالے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ میں بے تابی سے

دوڑتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ میں نے زینے کے اختتام پر پہنچ کر ایک کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک باتھ روم کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک پستہ قامت سیاہ رو شخص نمودار ہوا۔ مجھ سے نگاہ ملی تو وہ ٹھٹکا پھر اس نے ایک میز کی طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔

میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور ایک کلاشنکوف تک بھری رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ پستہ قامت کی عجلت سے ظاہر ہوتا تھا کہ باتھ روم کے اندر رہتے ہوئے اسے بیرونی گڑبڑ کا فوراً احساس ہوگیا تھا، پھر زیریں منزل پر ریاض نے ایک فائر بھی کیا تھا لہٰذا اس کا متوحش اور چوکنا ہوجانا لازمی امر تھا۔

میں نے اس سیاہ رُو شخص کے ارادے کو بھانپ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ کلاشنکوف تک پہنچتا، میں نے ہوا میں پرواز کی اور اس میز تک رسائی حاصل کرلی جس پر کلاشنکوف رکھی تھی۔ ہم دونوں نے یکے بعد دیگرے کلاشنکوف پر جھپٹا مارا اور وہ ہتھیار ہم دونوں کی مشترکہ گرفت میں آگیا۔

اسی وقت مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے ستارے سے جھلملاتے نظر آئے اور میرے سر میں ایک دھماکا سا ہوا۔ مدِمقابل نے ایک زوردار ٹکر مجھے رسید کی تھی۔ اس کی ٹکر میں فولاد ایسی سختی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے چکرایا پھر سنبھل گیا۔ میری جگہ اگر یہ ٹکر کسی اور شخص کے پڑی ہوتی تو وہ فوراً بے ہوش ہوجاتا۔ پستہ قامت شخص نے وار کرتے ہوئے بہت پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں نے بھی ادھار چکانے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لیا اور اگلے ہی لمحے اس کی ناک پر ایک طوفانی مکا جڑ دیا۔ اس عمل کے لیے مجھے کلاشنکوف کو چھوڑنا پڑا تھا۔ مدِمقابل پنچ کھانے کے بعد پیچھے الٹ گیا پھر اس نے بڑی سُرعت سے کلاشنکوف میری جانب سیدھی کردی۔

میں کسی چیتے کے مانند جست بھر کر اس کے اوپر سے گزر گیا۔ اسے مجھ پر نشانہ لینے کے لیے پوزیشن بدلنا پڑی۔ اس عمل میں جتنا وقت صرف ہوا، میں نے اس دوران میں اس کے کلاشنکوف والے ہاتھ پر ایک دھواں دھار ٹھوکر ماردی۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جاگری۔ وہ گن کی طرف بڑھا تو میں نے اس کی پشت پر ایک زوردار سائیڈ کک لگائی۔

پستہ قامت شخص چوتھے گیئر میں نیچی پرواز کرتے ہوئے سامنے والی دیوار سے جاٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے چہرے کو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑا۔ جب وہ میری جانب گھوما تو میں نے دیکھا، اس کے ناک اور منہ سے خون جاری تھا۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک منظر پیش کررہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

مجھے یہ ماننا پڑا کہ اس شخص میں کسی سانڈ کی سی طاقت بھری ہوئی تھی۔ میں اپنے داؤ پیچ سے اسے زیر کررہا تھا ورنہ طاقت کے مظاہرے میں وہ کسی سے کم نہیں تھا۔ آئندہ پندرہ سیکنڈ میں اس نے مزاحمت ترک کردی اور زمین پر گر کر بری طرح ہانپنے لگا۔

اسی وقت مجھے زیریں منزل پر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ میں نے محتاط نظر سے اپنے مدِمقابل کو دیکھا پھر اس کی گن اٹھا کر دوسرے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں نے بالائی منزل کا کونا کونا جھانک لیا لیکن ساحل کہیں دکھائی نہ دی۔ اس دومنزلہ کوٹھی میں ان چار افراد کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ میں تو توقع کررہا تھا کہ وہاں سخت ترین مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا اور ساحل کو چھڑانے کے لیے مجھے دانتوں پسینہ آجائے گا مگر ساحل وہاں پائی گئی تھی اور نہ ہی دانتوں پسینہ چھڑانے کے آثار!

میں نے ایک مرتبہ پھر بالائی منزل کے ہر کمرے کو چیک کیا اور دوبارہ اس کمرے میں آگیا جہاں پستہ قامت سیاہ رُو شخص کو چھوڑا تھا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کہ وہ بدبخت اب وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے چاروں جانب متلاشی نگاہ دوڑائی لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ زیریں منزل کی طرف فرار ہوگیا ہوگا۔

میں نے نیچے جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر بالائی منزل کے کمروں میں جھانکا اور زینہ طے کرکے نیچے آگیا۔ نچلی منزل پر بھی وہ پستہ قامت شخص مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں کلاشنکوف تھامے راہداری میں نکل آیا جہاں میں نے ریاض علی کو بے ہوش چھوڑا تھا۔ اب کوٹھی کے اس حصے میں صدف معرکہ آرا تھی۔ وہ اپنے مدِمقابل چوکیدار کو بری طرح ٹھوکروں میں اڑا رہی تھی۔ سکندر اس کے آس پاس کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی صدف نے ہاتھ روک دیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

”وجدان! وہ مردود بھاگ گیا۔“

اس کا واضح اشارہ سکندر کی جانب تھا۔ میں نے تشویش ناک لہجے میں پوچھا ”کہاں گیا وہ بھگوڑے کی اولاد؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ سرسری انداز میں بولی ”میں چوکیدار سے نمٹ رہی تھی کہ سکندر کو موقع مل گیا اور وہ کوٹھی کا گیٹ کھول کر کھسک لیا۔ ویسے میں نے اس کا حلیہ اس بری

طرح بگاڑا ہے کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔" پھر اس نے پوچھا "ساحل کا کوئی سراغ ملا؟"

"میرے خیال میں، وہ اس کوٹھی میں موجود نہیں۔" میں نے کہا۔

اسی لمحے میں نے صدف کے عقب میں چوکیدار کو متحرک پایا۔ وہ بری طرح پٹنے کے بعد زمین بوس ہوگیا تھا اور اب صدف کو باتوں میں لگا دیکھ کر اس نے طالع آزمائی کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے فوراً کلاشنکوف کا رخ چوکیدار کی جانب کر دیا۔

صدف نے میری اس جنبش کو بہت وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا اور برق رفتاری سے اس کی ٹانگ چلی۔ ایک زوردار کک چوکیدار کے سینے پر پڑی اور وہ چاروں خانے چت ہوگیا۔ اس کے نزدیک ہی تھوڑے فاصلے پر ریاض علی بے ہوش پڑا تھا۔ صدف اچھل کر چوکیدار کے پاس پہنچی اور اس کے چہرے کو اپنے جوگرز کی ٹھوکروں سے بگاڑنے لگی۔ اس دوران میں اس کی کھوپڑی پر کوئی ایسی ضرب پڑی کہ وہ گردن ایک طرف ڈال کر بے ہوش ہوگیا۔

صدف نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا تو میں نے کہا "تم نے کسی پستہ قامت شخص کو اس جانب آتے ہوئے تو نہیں دیکھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا "کیا کوئی اور شخص بھی یہاں موجود ہے؟" اس کے ساتھ ہی اس نے بے ہوش ریاض علی کی طرف دیکھا۔

میں نے اسے بالائی منزل والے واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوگئی، جلدی سے بولی "وجدان! وہ بزدل کی نسل تو فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔" اس کا اشارہ سکندر کی جانب تھا" اور یہ دونوں یہاں بے ہوش پڑے ہیں۔ اگر کوئی اور شخص بھی اس کوٹھی میں موجود ہے تو ہمیں فوری طور پر اسے ڈھونڈنا چاہیے تاکہ ساحل کے بارے میں کچھ پتا چل سکے۔"

صدف کی تجویز معقول تھی۔ اس نے پستہ قامت شخص کو نیچے آتے نہیں دیکھا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا، وہ بالائی منزل پر ہی کہیں چھپا ہوگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور مجھے وہ منظر یاد آ گیا جب وہ شخص بڑے افراتفری کے عالم میں باتھ روم سے برآمد ہوا تھا۔ عین ممکن تھا، اس نے اپنی بچت کے لیے دوبارہ اسی گوشۂ عافیت میں پناہ لے لی ہو۔

میں صدف کے ساتھ زینہ طے کرتے ہوئے تیزی سے اوپر پہنچا۔ صدف نے پوچھا "فشا کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"ابھی تک تو وہ سورما مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا۔" میں نے کہا "لیکن ہوسکتا ہے، میں نے جس پستہ قامت، سیاہ رو شخص کے بارے میں تم سے استفسار کیا وہی فشا ہو۔ میں نے اسے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا اس لیے اس کی صورت سے واقف نہیں ہوں۔"

ہم بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ میں تقریباً دوڑتے ہوئے اسی کمرے میں آیا جہاں پستہ قامت شخص سے پہلی "ملاقات" ہوئی تھی۔ میرا رخ باتھ روم کی طرف تھا۔ ایک خیال ذہن میں جم گیا تھا تو سوچا، پہلے اسی کی تصدیق کرلوں۔

میں نے باتھ روم کے دروازے پر دباؤ ڈالا تو چونک پڑا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا، کوئی باتھ روم کے اندر بند ہے۔ میں نے گن کی نال سے دروازے پر دستک دی۔ اسی لمحے اندر کسی چیز کے گرنے کی آواز ابھری۔ اس آواز نے تصدیق کر دی کہ اندر کوئی موجود تھا۔

میں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا "ہم نے کوٹھی اور یہاں کے حالات پر پوری طرح قابو پالیا ہے اس لیے اگر زندگی چاہتے ہو تو خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔"

اندر سناٹا طاری تھا، شاید میری دھمکی نے اس شخص کو سناٹے میں پہنچا دیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اندر سے آنے والی آواز نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ وہ خبیث باتھ روم میں موجود ہے۔ پتا نہیں، وہ کس خیال کے تحت خاموش ہوگیا تھا۔

مجھے اپنے کان کے نزدیک صدف کی سرگوشی سنائی دی "وجدان! جو بھی کرنا ہے، جلدی کر گزرو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ سکندر کے فرار نے حالات کو مخدوش بنا دیا ہے۔ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

زخمی سکندر کے فرار نے مجھے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں خود جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے دوبارہ باتھ روم کے دروازے پر زوردار دستک دی اور تحکمانہ انداز میں کہا۔

"میں تمہیں صرف دس سیکنڈ کی مہلت دیتا ہوں اور یہ مہلت میری بات ختم ہوتے ہی شروع ہو جائے گی۔ اگر زندگی کو مزید انجوائے کرنا چاہتے ہو تو فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل آؤ۔ وقت گزرنے کے بعد میں دروازے پر اندھا دھند فائرنگ کر دوں گا۔ اس کے بعد جو بھی ہوگا، تم اس کا تصور کر سکتے ہو۔ پہلے یہ دروازہ چھلنی ہوگا اور پھر تمہارا جسم۔ دس سیکنڈ کو شمار کرنا شروع کر دو۔"

میں نے خاموش ہو کر صدف کو دیکھا۔ وہ الجھن زدہ نظر سے باتھ روم کے دروازے کو تک رہی تھی۔ میں باتھ روم کے دروازے پر گولیاں برسانے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ دروازے کو زبردستی توڑنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ یہ دروازہ "کی" بھرپور قوت کے ساتھ میرے کندھے کی ایک ضرب دروازے کو چوکھٹ سے اکھاڑ دیتی۔ خوامخواہ فائرنگ کر کے لوگوں کو اس جانب متوجہ کرنا حماقت میں شمار ہوتا۔ ریاض کی چلائی ہوئی ایک گولی ہی کافی تھی۔ اس بات کا خدشہ پیدا ہو چکا تھا، کوئی کسی بھی وقت حالات کی بو سونگھتا ہوا اس طرف آ نکلے!

باتھ روم کے اندر موجود شخص نے اس نازک موقع پر عقل مندی کا ثبوت دیا۔ زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے اور جرائم پیشہ شخص کو تو کچھ زیادہ ہی پیاری ہوتی ہے۔ گناہ کی لذت بڑا انوکھا تجربہ ہے۔ اس سے انسان کی نیت کبھی نہیں بھرتی۔ وہ اس تجربے سے بار بار گزرنے کے لیے طویل عرصے تک جینا چاہتا ہے۔

میری دی ہوئی مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی باتھ روم کا دروازہ کھل گیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں مجھے وہی شخص کھڑا دکھائی دیا جس کی کلاشنکوف اس وقت میرے قبضے میں تھی۔ اس نے نہایت شرافت کے ساتھ دونوں ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ اس کا مکروہ چہرہ لہولہان ہونے کے بعد خاصی بھیانک صورت اختیار کر چکا تھا۔ یہ میری پٹائی اور دیوار سے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔

میں نے گن کو ایک خطرناک جنبش دی اور تحکمانہ انداز میں کہا "باہر نکلو!"

وہ "ہینڈز اپ" پوزیشن میں رہتے ہوئے باتھ روم سے نکل آیا۔ میں نے جس میز پر وہ کلاشنکوف رکھی دیکھی تھی، اس کے قریب ہی ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تو میں نے نہایت سنگین الفاظ میں استفسار کیا۔

"زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اس شخص کے انداز و اطوار سے میں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ فشا کسی صورت نہیں ہوسکتا تھا۔ فشا درجنوں افراد کا باس تھا۔ اس طرح دم دبا کر باتھ روم میں چھپ کر بیٹھنا اس جیسے آدمی کو زیب نہیں دیتا تھا۔ وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتا یا پھر سکندر کی طرح موقع سے فرار ہو جاتا۔

میں نے پستہ قامت کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے سوال کیا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"آفتاب خان۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا "فشا کہاں ہے؟"

"فشا!" اس نے خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور جھوٹ بولنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "یہاں تو کوئی فشا نہیں رہتا۔ یہ تو شمشاد صاحب کی کوٹھی ہے۔ وہ امریکا گئے ہوئے ہیں۔"

اگر میں اس کوٹھی میں سکندر اور ریاض کو نہ دیکھ لیتا تو شاید اس کی بات کا اعتبار کر لیتا لیکن اب میں اس کے کسی چکر میں نہیں آ سکتا تھا۔ وہ مجھے کسی شمشاد علی ایڈووکیٹ کی فرضی کہانی سنا کر بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ میں نے پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا۔

"تم اسی شمشاد کا ذکر کر رہے ہو نا جس کے چھوٹے بھائی کا نام وحید ہے؟"

اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا "جی، جی۔ وہی شمشاد صاحب۔ وحید صاحب آج کل راولپنڈی گئے ہیں۔"

ایمبولینس کے ڈرائیور عبدالکریم نے مجھے بتایا تھا، اس نے کسی وحید کے ایما پر ساحل کو رکھاں والی سے لاہور پہنچایا تھا اور اب آفتاب نامی یہ پستہ قامت شخص مجھے کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔ گویا وہ مجھے مس گائیڈ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اچانک اس کے سینے پر ایک زوردار فرنٹ کک جڑ دی۔ میری یہ حرکت اس کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ کرسی سمیت پیچھے الٹ گیا۔ میں اچھل کر اس کے سر پر پہنچا اور گن کی نال کا رخ اس کی پیشانی کی جانب کرتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا۔

"تم اپنی باتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز نہیں۔"

وہ میری آواز میں موجود سنگینی کو محسوس کر کے خوف زدہ ہوگیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر سخت لہجے میں پوچھا "بتاؤ، فشا کہاں گیا ہے اور وہ لڑکی کہاں ہے جسے آج دوپہر یہاں پہنچایا گیا تھا؟"

اس کے خوف میں بے پناہ اضافہ ہوگیا۔ اس نے میری باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ میں نے اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالا اور یہ کہ میں اس سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں، پوچھ کر ہی جان چھوڑوں گا۔ میں نے اس کی دہشت کو بڑھانے کے لیے مزید کہا۔

"آج دوپہر لگ بھگ ایک بجے میری ایک ساتھی کو

سفید ایمبولینس میں یہاں لایا گیا ہے۔ اس لڑکی کا نام ساحل ہے جو رکھاں والی کے چوہدری نوازش علی کی تحویل میں تھی۔ اسی ایمبولینس میں ڈرائیور کے علاوہ دو اور افراد بھی موجود تھے جن کا تعلق کراچی سے ہے۔ ان میں سے داڑھی والے ایک شخص کا نام کبیر شاہ ہے۔ ازیں علاوہ رکھاں والی سے چوہدری نوازش علی کا بیٹا فیصل بھی ان کے ساتھ آیا ہے۔ میں نے جس سفید ایمبولینس کا ذکر کیا ہے اس کا ڈرائیور عبدالکریم میری قید میں ہے۔ میں اسی کی نشان دہی پر یہاں آیا ہوں۔“

میں نے محسوس کیا، آفتاب خان کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ یک لخت برسوں کا بیمار نظر آنے لگا۔ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا ”اگر تم نے اب بھی زبان نہ کھولی تو کسی پچھتاوے کو محسوس کرنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔ میں تمہاری کھوپڑی میں اتنی گولیاں اتاروں گا کہ بھیجے کو اٹھانا ممکن نہیں رہے گا۔ بولو، کیا کہتے ہو؟“ میں نے گن کی نال کو اس کی پیشانی کے وسط میں ٹکا دیا ”مجھے منشا، ساحل فیصل اور کبیر شاہ وغیرہ کے بارے میں بتاتے ہو یا میں اپنی دھمکی پر عمل کر ڈالوں؟“

میرے الفاظ میں پوشیدہ وحشت اور سفاکی نے اس کے اعصاب کا کچومر نکال دیا۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا ”ب...... بتاتا...... ہوں...... تم گن کو ادھر سے ہٹاؤ۔“

میں نے کلاشنکوف کی نال کو اس کی پیشانی میں گھسانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”یہ نال اسی وقت یہاں سے ہٹے گی جب تم میرے سوالات کے جواب دے دو گے، ورنہ نہیں!“

میرے دوٹوک اور سنگین انداز...... نے اس کی زبان کھول دی۔ اس نے سراسیمہ لہجے میں مجھے بتایا کہ دو بجے کے قریب وہ لوگ یہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔ ایک گھنٹے تک صرف اس لیے ساحل کو روکا گیا تھا کہ اگر کوئی تعاقب میں ہو تو اس کا سراغ لگایا جا سکے۔ مطمئن ہونے کے بعد ساحل کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کبیر شاہ، اس کا ساتھی، چوہدری نوازش کا بیٹا فیصل اور منشا بھی ساحل کے ساتھ ہی گئے تھے۔ میں نے جب آفتاب سے پوچھا کہ وہ کہاں گئے ہیں تو اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔

میں نے غرا کر کہا ”مجھے گولی چلانے پر مجبور نہ کرو۔ اگر ایک مرتبہ ٹریگر دب گیا تو پھر جب تک تم ریشہ ریشہ نہیں ہو جاؤ گے، میرا ہاتھ نہیں تھمے گا۔ تمہیں تمہارا باس اور اس کا باپ بھی نہیں بچا سکے گا!“

وہ ہکلایا ”سب لوگ چوہدری صاحب کی کوٹھی پر گئے ہیں...... چوہدری صاحب نے اپنی خصوصی گاڑی بھیجی تھی۔ وہ اسی گاڑی میں گئے ہیں......“

اس کے انکشاف نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ”تم چوہدری دلدار کی بات کر رہے ہو نا؟“

اس نے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ وہ اس وقت بہت زیادہ مصیبت میں نظر آ رہا تھا۔ خوف اور دہشت نے اسے پوری طرح اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے سے حقارت جھلک رہی تھی۔

”تم چوہدری دلدار کے سامنے دم ہلانے اور اس کے تلوے چاٹنے والا ایک ادنیٰ سا دوپایہ ہو۔ وہ تمہارے باس کا بھی باس ہے، یعنی تمہارے باپ کا باپ ہے۔ تم اپنے دادا جان کے ٹھکانے سے ضرور واقف ہو گے۔ مجھے چوہدری کی کوٹھی کا پتا بتاؤ؟“

”تم یقین جانو، میں چوہدری صاحب کی کوٹھی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا“ وہ ملتجیانہ انداز میں بولا ”مجھے صرف اتنا معلوم ہے، وہ ڈیفنس سوسائٹی کی کسی عظیم الشان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ میں کبھی وہاں نہیں گیا، صرف سنا ہی سنا ہے۔“

”قادر بخش نے بھی صرف سنا ہی سنا تھا“ میں نے سخت لہجے میں کہا ”اس لیے میں نے اسے ایسی جگہ پہنچا دیا ہے جہاں وہ سب کی سنے گا، کوئی اس کی نہیں سنے گا۔ لگتا ہے تمہیں بھی قادر بخش کے پاس ہی پہنچانا ہو گا۔ تم دونوں ساتھی ایک ہی پنجرے میں اچھے لگو گے۔“

قادر بخش کے ذکر پر اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”تو کیا قادر بخش تمہاری قید میں ہے؟“

”صرف وہی نہیں بلکہ تمہارے گم شدہ تمام ساتھی“ میں نے گمبھیر آواز میں کہا پھر میں نے اسے مزید خوف زدہ کیا ”اور ان سب کا یہی قصور ہے کہ انہوں نے چوہدری دلدار کی کوٹھی کو دیکھا ہے اور نہ ہی اس کا پتا جانتے ہیں۔“

وہ تیز آواز میں چیخا ”یہ سچ ہے...... سولہ آنے سچ ہے۔ صرف منشا صاحب ہی چوہدری صاحب کی کوٹھی میں آتے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی وہاں نہیں گیا۔ بگ باس کو تو ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”قسم کھانے یا زہر پینے سے بات نہیں بنے گی“ میں نے ایک فوری اور اچھوتے خیال کے تحت اسے دوسرے زاویے سے گھسا ”میں تمہاری زبان پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ اب

ہوں کی طرح مجھے صرف اتنا بتا دو، چوہدری دلدار نے ان لوگوں کے لیے کون سی خصوصی گاڑی بھیجی تھی اور اس گاڑی کا نمبر کیا ہے؟“ ایک لمحے کے توقف سے میں نے دھمکی آمیز لہجے میں اضافہ کیا۔ ”اب یہ نہ کہنا کہ تم نے گاڑی دیکھی ہے اور نہ ہی اس کا نمبر تمہیں یاد ہے۔“

”وہ نئے ماڈل کی کنگ سائز لینڈ کروزر تھی۔“ اس نے ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بتایا ”باڈی بھی سیاہ اور شیشے بھی۔ ان شیشوں کے پیچھے دیکھا نہیں جا سکتا جبکہ گاڑی کے اندر موجود افراد باہر کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ اس سیاہ جیپ کا نمبر ہے، سیون نائن تھری فائیو۔“

”اگر تمہاری بتائی ہوئی باتیں غلط ثابت ہوئیں تو میں تمہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دوں گا“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ویسے مجھے امید تھی کہ آفتاب خان نے جھوٹ نہیں بولا ہو گا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا ”میں نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا۔ جتنا میں جانتا تھا، وہ تمہیں بتا دیا۔ اب ایک درخواست تم سے بھی ہے۔“ اس نے التجا آمیز نظر سے مجھے دیکھا۔

”ہاں، ہاں۔ جلدی بولو“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ بولا ”مجھ پر صرف اتنا احسان کرنا کہ کہیں میرا نام نہ آئے۔ میں نے تمہیں کسی قسم کی معلومات فراہم نہیں کیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں“ میں نے اثبات میں سر ہلایا ”تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے میں تمہیں باتھ روم میں بند کر کے جا رہا ہوں۔“ پھر میں نے اسے گن کی نال سے ٹھوکا دیا ”چلو اٹھو، تمہیں باتھ روم پکار رہا ہے۔ پہلے تم اپنی مرضی سے اس میں روپوش ہوئے تھے، اب میرے حکم پر وہاں بند ہو گے اور...... اس بار دروازہ اندر سے نہیں بلکہ باہر سے بولٹ کیا جائے گا۔ ویسے تم اپنا شوق پورا کرنے کے لیے اندر سے بھی کنڈی لگا سکتے ہو۔“

وہ کسی زر خرید غلام کی طرح گن کے اشارے پر اٹھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے باتھ روم کے دروازے کو اچھی طرح باہر سے بند کر دیا۔ اب وہ اپنی خواہش پر باتھ روم سے نہیں آ سکتا تھا۔ باہر سے کھولنے کے لیے اس کوٹھی میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

اس کوٹھی میں ایک پل مزید رکنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا لہٰذا ہم دونوں وہاں سے نکل آئے۔ آفتاب کی کلاشنکوف کو میں نے کوٹھی کی بالائی منزل پر ہی پھینک دیا تھا۔ البتہ ریاض علی کا ریوالور میں اپنے ساتھ لے آیا۔۔۔ یہ چھوٹا سا ہتھیار لباس کے اندر بہ آسانی چھپایا جا سکتا تھا اور کسی نازک موقع پر کام میں بھی لایا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

سکندر کے بزدلانہ فرار نے حالات کی سنگینی کو اور بڑھاوا دے دیا تھا۔ وہ مجھے اور صدف کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور یہ بات بھی اسے معلوم ہو چکی تھی کہ چوہدری دلدار میرا طلب گار ہے۔ سکندر کی منشا کی کوٹھی پر موجودگی سے ظاہر ہوتا تھا، وہ ساحل والے معاملے سے باخبر ہو چکا ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ وہ یہاں سے فرار ہونے کے بعد سیدھا ڈیفنس سوسائٹی پہنچا ہو گا تاکہ چوہدری دلدار اور منشا کو ان تازہ ترین حالات سے باخبر کر سکے۔

ایک موہوم سا امکان یہ بھی تھا کہ دیگر افراد کی طرح سکندر بھی چوہدری دلدار کی کوٹھی سے واقف نہ ہو لیکن اس صورت میں وہ کسی بھی طرح منشا تک ہماری اطلاع ضرور پہنچاتا۔ حالات نے اچانک ایسا پلٹا کھایا تھا کہ میں ساحل کے قریب ہوتے ہوئے بھی اس تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ میرا ذہن اس وقت بہت تیزی سے چوہدری دلدار تک پہنچنے کی پلاننگ کر رہا تھا اور اس سلسلے میں، میں ایک نہایت ہی اہم کلیو حاصل کر چکا تھا۔

میں نے آفتاب خان سے چوہدری دلدار کی بھیجی ہوئی گاڑی اور اس کے نمبر کے بارے میں خوامخواہ نہیں پوچھا تھا بلکہ اس کے ذریعے میں چوہدری دلدار کا سراغ لگا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا، جب میں لاہور آنے کے بعد صدف سے الگ ہوا تھا تو اس ضدی لڑکی نے کس طرح میرا سراغ لگایا تھا۔ میں بھی اسی کی ترکیب آزمانا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں صدف کے ماموں اورنگ زیب خان کا نام میرے ذہن میں جل بجھ رہا تھا۔ وہی اورنگ زیب جو ڈی ایس پی ٹریفک تھا۔

منشا کی کوٹھی سے واپسی کے وقت بھی صدف ہی گاڑی کو ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ نیو کیمپس کے علاقے سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ اس کی کزن نادیہ کا یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا کیونکہ وہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس سے انگلش میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

نیو کیمپس اور مسلم ٹاؤن کے درمیان نیو مسلم ٹاؤن کا علاقہ تھا اور پتا نہیں کیوں، صدف وحدت روڈ کی طرف جانے کے بجائے اس طرف نکل آئی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ کے دوران میں مجھ سے پوچھا۔

''وجدان! اب کیا ارادہ ہے؟'' اس کے لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی ''آئندہ کے لیے تم نے کیا سوچا ہے؟''

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا ''میں تمہارے ڈی ایس پی ماموں سے مدد لینا چاہتا ہوں۔ وہ سیاہ لینڈ کروزر کے نمبر سے پتا چلا سکتے ہیں کہ اس جیپ کا مالک ڈیفنس سوسائٹی میں کہاں رہتا ہے۔ تم نے بھی انہی کے تعاون سے میرے ہوٹل تک رسائی حاصل کی تھی۔''

''اچھا آئیڈیا ہے'' اس نے سراہا ''لیکن اس کے لیے ہمیں ان کے پاس جانا ہوگا اور وہ پوچھیں گے کہ ہم تو سید پور چلے گئے تھے پھر سیاہ لینڈ کروزر درمیان میں کہاں سے آ گئی؟''

اس پولیس والے سے سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو بہت سا وقت ضائع ہوتا اور اسے مطمئن بھی کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے کہا ''اس سلسلے میں نادیہ کو بیچ میں ڈالا جا سکتا ہے۔ تم اسے اعتماد میں لے کر بتا سکتی ہو کہ ہم ناگزیر وجوہ کی بنا پر سید پور نہیں جا سکے اور یہ کہ سیاہ لینڈ کروزر کا سراغ لگانا بہت اہم ہے۔ ممکن ہے وہ اپنے ڈیڈی سے کوئی چکر چلا کر ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دے۔''

''ٹھیک ہے، میں نادیہ سے رابطہ کرتی ہوں'' وہ مضبوط لہجے میں بولی ''یہیں کیمپس ہی سے میں اسے فون کرتی ہوں۔''

میں نے کہا ''تم فون کرنے کے بجائے اگر براہِ راست اس سے جا کر مل لیتیں تو زیادہ اچھا تھا۔''

''تاکہ ہمارے سید پور نہ جانے کی خبر عام ہو جائے اور ماموں مجھے گھر میں بٹھا دیں'' وہ روانی میں بولتی چلی گئی ''وجدان! میں ان حالات میں تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ یہ بات تم اپنے ذہن میں بٹھا لو۔ نادیہ سے میں کس طرح کام نکلواتی ہوں، یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''

میں نے ایک گہری اور طویل سانس خارج کی۔ اگرچہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی کہ صدف گھر جا بیٹھے لیکن وہ عجیب لڑکی اس حوالے سے خاصی بدکی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ بات خارج نہیں ہوئی تھی کہ میں اسے حیلے بہانے سے خود سے دور رکھنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔ شام کے پانچ بجنے والے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شام اور پھر رات ہو جائے گی۔ یہ رات مجھ پر بہت ستم ڈھائے گی صدف!''

آخری جملہ میں نے اتنی شدت سے ادا کیا کہ مجھے اپنی آواز اور لہجے پر خود حیرت ہوئی۔ اس وقت میری دلی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ صدف میری حالت سے بے خبر نہیں تھی۔ اس نے ایک بوتھ سے نادیہ کو فون کیا۔ میں اس دوران میں گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ تین منٹ بعد وہ واپس آ گئی پھر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد بولی۔

''نادیہ سے میری بات ہو گئی ہے۔ اس نے آدھے گھنٹے بعد فون کرنے کو کہا ہے۔''

میں نے پوچھا ''اس نے کام ہونے کی امید دلائی ہے؟''

''بالکل دلائی ہے'' وہ قطعیت سے بولی۔

میں نے پوچھا ''وہ اپنے ڈیڈی کو کیا کہانی سنائے گی؟''

''وہ ماموں جان کو بیچ نہیں کرے گی۔''

''یہ اچھی بات ہے'' میں نے مطمئن انداز میں کہا۔

وہ بولی ''لیکن نادیہ نے مجھ سے ایک وعدہ لیا ہے'' میں نے چونک کر اسے دیکھا، اس نے مزید بتایا ''اس کا کہنا ہے میں گاہے بہ گاہے رابطہ کر کے اسے اپنے حالات سے باخبر رکھوں، چاہے دن میں صرف ایک بار ہی رابطہ کروں۔''

''تو کیا تم نے اسے ان حالات کے بارے میں بتا دیا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

اس نے کہا ''میں نے واضح طور پر اس سے کوئی بات نہیں کی۔ ساحل کا کہیں ذکر نہیں کیا، بس اتنا کہا ہے، وجدان کے ایک خاص مشن میں، میں اس کے ساتھ ہوں۔ یہ اتنا اہم معاملہ ہے کہ ہمیں سید پور کا پروگرام کینسل کرنا پڑا۔''

''تمہارا دماغ خوب چلتا ہے جبکہ......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولی ''جبکہ...... کیا مطلب؟''

''جبکہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ تمہاری صرف زبان چلتی ہے'' میں نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا ''یا پھر تمہارے ہاتھ پاؤں چلتے ہوئے دیکھے ہیں میں نے۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی ''یہ تمہارے لیے اچھا ہے۔''

''کیا اچھا ہے؟'' میں بدستور ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہا تھا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولی ''میں یہ بات ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں۔ تم اسے ایک طبی مشورہ بھی سمجھ سکتے ہو۔ یہ کسی ٹانک سے کم نہیں۔''

صدف کی ان بے ربط اور بے محل باتوں نے مجھے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ اس کا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ہم ہنسنے مسکرانے یا قہقہہ لگانے والے حالات سے نہیں گزر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں، اسے تفریح کی سوجھ رہی تھی۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا ''صدف! یہ سب کیا ہے۔ تمہاری ایک بات بھی میرے پلے نہیں پڑی۔''

وہ مجھے انتہائی سنجیدہ اور الجھا ہوا دیکھ کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''تم نے میرے دماغ، زبان اور ہاتھ پاؤں کے چلنے کی جو بات کی تھی، اس سے شگفتگی پھوٹتی ہے جبکہ تم انتہائی ٹینس اور ناقابلِ یقین حالات سے گزر رہے ہو۔ یہ تبدیلی امید افزا ہے۔ دشوار ترین حالات میں بھی اگر انسان کی حسِ مزاح زندہ رہے تو وہ تمام مشکلوں کو پاؤں کی ٹھوکروں میں اڑا سکتا ہے۔ میں نے اسی حوالے سے تمہاری بات کو سراہا تھا'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے بے نیازی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا ''کیا کروں، ڈاکٹر ہوں نا۔ تم میری ڈاکٹری کو تسلیم کرو یا نہ کرو لیکن میں تمہیں طبی مشورے دینے سے باز نہیں آ سکتی'' بات کے اختتام پر اس نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

میں اس منی پیک حسینہ کو حیرت بھری نظر سے تکنے لگا۔ اسے کتنا خیال تھا میرا۔ صدف میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھی اور اب تب میں ڈاکٹر بننے ہی والی تھی۔ اگر وہ واقعی ڈاکٹر بن جاتی تو میرے نزدیک یہ کسی معجزے سے کم نہ ہوتا۔ میں نے پچھلے چند روز سے اس کی جو سرگرمیاں نوٹ کی تھیں اور اس کے جن عزائم سے مجھے آگاہی ہوئی تھی، وہ بہت ہی تشویش ناک اور سنگین تھے۔

وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں لیکن وہ میری طرف سے انجان بنی گاڑی چلا رہی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میں اس کے سراپا میں کھو کر رہ گیا۔ اس بے خودی کا سبب صدف کے وہ جذبات تھے جن کا اظہار اس نے تھوڑی دیر پہلے کیا تھا۔ کسی بھی مرد کے لیے یہ بات بڑی اہم اور قابلِ قدر ہوتی ہے کہ کسی صنفِ مخالف کو اس کا خیال ہے۔ صدف کی زندگی کے جو لمحات میرے ساتھ گزرے، ان میں اس نے بارہا اس حقیقت کو ثابت کیا۔ میں اس مہرباں دوست کے خلوص کو محسوس کر رہا تھا، اس کے جذبات قابلِ ستائش تھے لیکن خیال کی دنیا بڑی نرالی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ میں کسی اور کا خیال ہوں، وہ میرے خیال میں لگی ہوئی تھی!

میں چند لمحات تک اس پاکٹ سائز زرخیز بدن دوشیزہ کی جانب بے ساختہ دیکھتا رہا پھر میری نگاہ جھک گئی۔ میں زانو پر رکھے اپنے ہاتھوں کو تکنے لگا۔ اسی لمحے صدف کی مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وجدان! تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا ''میں تو اچھی خاصی بھوک محسوس کر رہی ہوں۔ ناشتے کے بعد سے اب تک میں نے کچھ نہیں کھایا۔''

کھایا تو میں نے بھی کچھ نہیں تھا۔ حالات میں اتنی تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ ہمیں کھانے کا خیال ہی نہ آیا۔ اب صدف نے تذکرہ کیا تو مجھے بھی بھوک محسوس ہونے لگی۔ میں نے کہا ''کوئی ریسٹورنٹ تلاش کرو۔ ہمارے پاس آدھا گھنٹا ہے۔ اس وقفے سے مہلت حاصل کر کے کھانا ہی کھا لیتے ہیں، پھر پتا نہیں کب اس کا موقع ملے۔''

''میں ریسٹورنٹ ہی کی طرف جا رہی ہوں'' صدف نے کہا۔

میں نے پوچھا ''مسلم ٹاؤن سے نکلنے کے بعد تم نیو کیمپس کی طرف کیوں آ گئی ہو؟ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟''

''کوئی سبب نہیں'' وہ سادگی سے بولی ''بس بے دھیانی میں، میں اس طرف نکل آئی ہوں۔'' پھر ایک لمحے کو رک کر اس نے کہا ''چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ادھر نزدیک ہی ایک بہت عمدہ ریسٹورنٹ ہے۔ ہم وہیں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہم مذکورہ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ وہ باقاعدہ کھانے کا وقت تو نہیں تھا لیکن صدف کے اصرار پر ہم نے ڈٹ کر کھایا۔ پھر وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی کہ نادیہ کو فون کر کے آتی ہے۔ پہلے فون کو آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔

صدف کے جانے کے بعد میں خود کو پیش آمدہ حالات پر غور کرنے لگا۔ اب تک کی تحقیق یہی ظاہر کرتی تھی کہ ساحل کو چوہدری دلدار کی کوٹھی پر پہنچایا گیا ہے۔ اگر مجھے اس چوہدری کا پتا معلوم ہو جاتا تو میں اڑ کر اپنی ساحل تک پہنچ جاتا۔ پتا نہیں، وہ کس حال میں تھی؟ اس کے ساتھ آئندہ کیا حالات، واقعات پیش آنے والے تھے۔ کبیر شاہ اسے رکھاں والی سے اپنے ساتھ لایا تھا تو آگے اس کا کیا پروگرام تھا؟ زیادہ امکانات اسی بات کے تھے کہ ساحل کو کراچی پہنچایا جائے گا، شعیب غوری کے پاس...... جس نے مجھ سے نئی نئی دشمنی اور چوہدری نوازش سے دوستی گانٹھی تھی۔ اگر ساحل، شعیب غوری کی تحویل میں چلی جاتی تو یہ ایسا ہی تھا جیسے میری شہ رگ اس کے خنجر تلے آ جائے۔ چوہدری نوازش علی نے میری بہت بڑی کمزوری کا سودا کر دیا تھا۔

ساحل کو کراچی جانے سے روکنا تھا...... ہر صورت روکنا تھا۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اور کٹھن امتحان تھا اور ہر

قیمت پر مجھے یہ امتحان پاس کرنا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ساحل کے تصور میں کھوگیا۔ پھر جیسے وقت تھم گیا ہو...... یا کئی صدیاں ایک ساتھ گزر گئی ہوں۔

اس حسین اور دل نشین تصور کو ایک مانوس آواز نے توڑ دیا۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ صدف ابھی تک فون کرکے واپس نہیں آئی تھی۔ میری متلاشی نگاہ غیر ارادی طور پر اس آواز کے حامل شخص کو کھوجنے لگی جس کی پکار نے ساحل کا تصور توڑا تھا۔ ریسٹورنٹ میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد میری نگاہ خود پر مرکوز ہوگئی۔ میں نے مطلوبہ شخص کو تلاش کرلیا تھا۔

اس وقت میرے عجیب وغریب احساسات تھے۔ میں کوئی غلطی نہیں کررہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے، ساحل کے تصور کے دوران میں، میں نے خود اپنی آواز سنی تھی۔ یعنی میں نے خود کو پکارا تھا۔ میں اپنی آواز کے سلسلے میں بھلا کس طرح دھوکا کھا سکتا تھا۔

یہ جو کچھ بھی تھا، بہت ہی پراسرار اور حیران کن تھا۔ اس قسم کا ایک آدھ تجربہ مجھے گزشتہ روز بھی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ غیر مرئی احساسات مجھے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھے۔ یقیناً کوئی بہت بڑا واقعہ پیش آنے والا تھا۔ میری زندگی کو کوئی نیا رخ ملنے والا تھا۔ کسی نئے افق کی جلوہ گری میری منتظر تھی۔ میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا کہ یہ ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز واقعات کس طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔

صدف کو اپنی جانب آتے دیکھ کر میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ آڑا ٹیڑھا تو میں پہلے بھی نہیں بیٹھا ہوا تھا، بس ذہنی انتشار نے مجھے تھوڑا ڈگمگا دیا تھا۔ صدف کے وہاں پہنچنے سے پہلے میں نے خود کو سنبھال لیا۔

''ابھی کچھ دیر اور لگے گی'' وہ کرسی سنبھالتے ہوئے بولی۔

''کتنی دیر؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''لگ بھگ آدھا گھنٹا'' صدف وضاحت کرتے ہوئے بولی ''رجسٹریشن آفس کے جس شخص سے ہماری مطلوبہ معلومات حاصل ہوسکتی ہیں، اس نے آدھا گھنٹا مانگا ہے۔ کام انشاء اللہ ہوجائے گا۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، آدھا گھنٹا اور سہی لیکن اس دوران میں ہم ایک اور کام کرلیتے ہیں'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

''کون سا کام وجدان؟'' صدف الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''ہم نے ایمبولینس کے ڈرائیور عبدالکریم کو فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے تہ خانے میں بند کر رکھا ہے۔ وہ عادی مجرم معلوم نہیں ہوتا، بس ساحل والے معاملے میں اسے آلہ کار بنایا گیا ہے۔ اس کے بیوی بچے کوٹ لکھپت میں انتظار کررہے ہوں گے۔ آیندہ حالات کا کچھ پتا نہیں، ہمیں اس طرف آنے کی کب مہلت ملے۔ اس نے ہماری درست راہنمائی کی ہے۔ میرا خیال ہے، اسے رہا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

صدف نے میری تائید کی اور ہم بل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ سے نکل آئے۔ اس مرتبہ کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔ اس وقت میرا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کررہا تھا۔ میری سوچ کا مرکز ساحل تھی اور وہ تازہ ترین گٹھ جوڑ جو شعیب غوری اور چوہدری نوازش علی کے درمیان ہوا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس گٹھ جوڑ کی حتمی تفصیل مجھے معلوم نہیں ہوسکی تھی۔ تاہم ساحل کا لاہور پہنچایا جانا یہی ظاہر کرتا تھا کہ اسے مزید آگے کراچی پہنچایا جائے گا۔

میرے پاس (ATM-CARDS) موجود تھے۔ نیو کیمپس سے فاضلیہ کالونی کی طرف جاتے ہوئے میں نے اپنے سلور اور گولڈ کارڈز کا استعمال کیا اور زیادہ سے زیادہ جتنی رقم حاصل کرسکتا تھا، وہ میں نے ڈرا کرلی۔ میرے اکاؤنٹس میں ایک کثیر رقم موجود تھی لیکن کارڈز کی مدد سے ایک مخصوص اماؤنٹ سے زیادہ ڈرا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ویسے میرے پاس پہلے سے بھی کچھ رقم موجود تھی۔ صدف نے میری اس کارروائی پر کسی حیرت کا اظہار کیا اور نہ ہی کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔

ہم فاضلیہ کالونی پہنچے، عبدالکریم کو تہ خانے سے نکالا۔ باہر ہال نما کمرے میں لانے کے بعد میں نے اس سے کہا ''عبدالکریم! تم نے ہم سے غلط بیانی نہیں کی لہٰذا ہم تمہیں آزاد کررہے ہیں لیکن تم اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھانا ورنہ بہت گھاٹے میں رہوگے۔''

وہ روہانسی آواز میں بولا ''جناب! آپ ناجائز فائدے کی بات کرتے ہیں، میں تو اس آزادی سے کوئی جائز فائدہ بھی نہیں اٹھاؤں گا۔ میں نے یہ دو ڈھائی گھنٹے بڑے عذاب میں گزارے ہیں۔''

''اور تمہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہم کتنے خطرناک ہیں!'' میں نے سفاکی سے کہا۔

وہ بڑی شدت سے اثبات میں گردن ہلانے لگا پھر بولا ''تہ خانے کے حالات آپ کی طاقت اور پہنچ کو سمجھنے کے لیے

کافی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، تم باہر جاکر اپنی زبان بند رکھو گے؟''

''جی، میں نے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی سنا ہے۔'' وہ سمجھ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ''آپ فکر نہ کریں، میں کسی کو آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

میں نے اس کے ذہن میں بیٹھے ہوئے خوف کو پختہ کرتے ہوئے کہا ''اگر تمہارے دل میں، ہمارے بارے میں کسی کو بتانے کا شوق پیدا ہو تو تم اپنا شوق پورا کرکے دیکھ لینا۔ اگلے ہی لمحے تمہارے بیوی بچے تم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گے۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا ''میں نے اپنے جن ساتھیوں کو کوٹ لکھپت روانہ کیا تھا، وہ مسلسل تمہارے گھر کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ اِدھر تم نے کوئی غلطی کی، اُدھر ان کا کام تمام۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا ''بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب!''

''کیا تم تہ خانے میں موجود افراد میں سے کسی کو جانتے ہو؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے مطمئن ہونے کے بعد اسے جانے کی اجازت دے دی۔

نادیہ نے جو مزید آدھے گھنٹے کی مہلت لی تھی اس میں سے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ دس منٹ بعد اس سے دوبارہ رابطہ کیا جاتا۔ میں نے یہ دس منٹ کوٹھی ہی میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور اس کمرے میں آ بیٹھا جس میں فون تھا۔

صدف نے کہا ''کیا تم یہیں سے نادیہ کو فون کروانا چاہتے ہو؟''

''ہاں، ارادہ تو یہی ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن اس سے پہلے میں ایک ضروری کال کراچی کروں گا۔''

کراچی کے ذکر پر وہ تھوڑی سی چونکی لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں منہاس باقر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ آج ہفتہ تھا اور یہ دن تقریباً گزر ہی چکا تھا۔ کل یعنی اتوار کو منہاس باقر کی بیٹی شبانہ کی برات آنا تھی۔ وہ اس وقت بے پناہ مصروف ہوگا۔ شادی اور پھر بیٹی کی شادی والدین کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کسی بیٹی کا باپ یا ماں ہونا ضروری ہے!

میں نے اس کی مصروفیات کے پیشِ نظر گھر پر فون کیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس سے رابطہ ہوگیا۔ ریسیور سے میری آواز سنتے ہی اس نے سوال کیا ''وجدان خیریت تو ہے۔ اس وقت تو تمہیں پاشا کے گاؤں سید پور میں ہونا چاہیے۔''

''میں لاہور میں ہوں جناب۔'' میں نے بتایا ''سید پور جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔'' وہ اپنی مخصوص گمبھیر آواز میں بولا۔

میں نے جواباً اسے مختصراً تازہ ترین سنگین حالات بتائے۔ وہ لمحاتی تجزیہ کرنے کے بعد تشویش ناک لہجے میں بولا ''میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تمہارے دو دشمنوں میں کوئی خفیہ ڈیل ہوئی ہے اور وہ ڈیل ساحل کے حوالے سے ہے۔ دشمنی اور دوستی کی دنیا میں ایک اور ایک دو نہیں بلکہ گیارہ ہوتے ہیں، اس حساب سے اب تمہیں گیارہ خطرناک اور طاقت ور دشمنوں سے نمٹنا ہوگا۔''

''میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے۔'' میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا ''قوی امکان اس بات کا ہے کہ ساحل کو بہت جلد لاہور سے کراچی پہنچایا جائے گا۔ میں لاہور میں اس کے ٹھکانے کا سراغ لگانے کی کوشش کررہا ہوں۔ میں ہر ممکن طریقے سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کسی طور چوہدری دلدار مجھے جل دینے میں کامیاب ہوگیا یا کبیر شاہ میرے ہتھے نہ چڑھا تو آپ کو کراچی میں ان کے اڈوں کی نگرانی کا بندوبست کرنا ہوگا۔ میں نے آپ کو شعیب غوری کے ''ساؤتھ'' اور ''ایسٹ'' والے ٹھکانے کے بارے میں تفصیلاً بتایا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ساحل کو ساؤتھ یا ایسٹ ہی پہنچایا جائے۔ ممکن ہے، وہ ملیر، ویسٹ یا پھر سینٹرل پہنچادی جائے!''

منہاس باقر نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''ساؤتھ کو تو اس سلسلے میں خارج از امکان ہی سمجھو۔ ابھی پرسوں رات ہی کو تو وہاں پولیس نے ریڈ (RAID) کیا تھا۔ شعیب غوری اس سلسلے میں ضرور احتیاط برتے گا۔ ساؤتھ کا قائم مقام کبیر شاہ مفرور اور پولیس کو مطلوب ہے۔ وہ ساؤتھ کا رخ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ البتہ میں ''ایسٹ'' کی کڑی نگرانی کا انتظام کردیتا ہوں۔ تم اس حوالے سے بےفکر ہوجاؤ۔''

منہاس باقر کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ پولیس نے جس انداز میں ساؤتھ پر کارروائی کی تھی اس کے پیشِ نظر کبیر شاہ کو بھولے سے بھی اُدھر نہیں جانا چاہیے تھا۔ اس تناظر میں تو ایسٹ کو بھی نظر انداز کیا جاسکتا تھا کیونکہ میں وہاں ایک دو مرتبہ جاچکا تھا۔ شعیب غوری میری صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا، پھر اس کا دعویٰ تھا کہ ساؤتھ والا آپریشن میری نگرانی میں

ہوا ہے چنانچہ وہ ساحل کو ایسٹ میں رکھنے کی بھی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ اب آجا کر ملیر، سینٹرل اور ویسٹ ہی رہ جاتے تھے...... اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ انہی ٹھکانوں میں سے کسی ایک پر پہنچائی جائے۔ شعیب غوری کے کراچی میں اور کتنے خفیہ اڈے تھے، میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

منہاس باقر سے مزید دو منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے رابطہ موقوف کردیا۔ مخلص اور خیرخواہ افراد ہر حال میں مفید ہوتے ہیں۔ وہ آپ کے کسی کام آسکیں یا نہیں لیکن ان سے پرابلم شیئر کرنے کے بعد دل و دماغ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ انسان کو محسوس ہوتا ہے، وہ اکیلا نہیں۔ کچھ اور لوگ بھی اس کے ساتھ ہیں۔ یہ احساس، یہ تصور حوصلے کے لیے ٹانک کی حیثیت رکھتا ہے!

ریسیور رکھنے کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے صدف کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے فون کے پاس چلی آئی پھر اس نے نادیہ سے رابطہ کرنے کے لیے ڈائلنگ کی۔ تھوڑی دیر تک وہ دوسری طرف کی گفتگو سنتی رہی۔ اس نے کچھ "ہوں ہاں" بھی کیا۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات کو نوٹ کررہا تھا۔ وہاں ہر لمحے کے ساتھ کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ دو منٹ بعد اس نے ریسیور کریڈل کردیا۔

میں نے پوچھا "کیا پتا چلا؟"

"سیاہ لینڈ کروزر کے مالک کا نام اور ایڈریس معلوم ہوگیا ہے۔"

"کون ہے وہ!" میں نے اضطراری انداز میں پوچھا "اور کہاں رہتا ہے؟"

صدف نے جوشیلے لہجے میں بتایا "اس شخص کا نام چوہدری دلدار ہے اور وہ ڈیفنس فیز ٹو میں رہتا ہے یعنی ہمارا مطلوبہ بندہ!" ایک لمحے کے توقف سے اس نے چوہدری دلدار کا ایڈریس بھی دہرایا۔

میرے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں اس مقام کا پتا ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگیا تھا جہاں میری راحتِ جاں کو رکھا گیا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا "ہمیں جلد از جلد اس کوٹھی پر پہنچنا ہے!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا "کیا تم ڈیفنس سوسائٹی میں پہلے کبھی جاچکی ہو؟"

صدف بھی میری تقلید میں کھڑی ہوگئی اور بولی "ایک دو مرتبہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ نادیہ کی ایک کلاس فیلو ادھر رہتی ہے۔ بہرحال، کراچی والے ڈیفنس کی بہ نسبت یہاں ایڈریس ڈھونڈنا آسان ہے۔ ہمیں زیادہ پریشانی نہیں ہوگی!"

جب ہم پاشا کی فاضلیہ کالونی والی کوٹھی سے روانہ ہوئے تو مہربان رات کے ٹھنڈے اندھیرے نے شہر میں پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ میرے قبضے میں تھی اور صدف پسنجر سیٹ پر خاموش بیٹھی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھی۔

میں نے سنجیدہ لہجے میں اسے مخاطب کیا "صدف! میری تو ساری زندگی اسی ہنگامہ خیزی میں گزری ہے، تمہارے لیے یہ نیا تجربہ ہوگا!"

"ہاں، تجربہ تو نیا ہے لیکن بڑا سنسنی خیز ہے۔" وہ جواب میں بولی "اگرچہ اس بھاگ دوڑ میں میرے مہم جوئی کے جذبات کی تسکین کا بے پناہ سامان موجود ہے لیکن دل سے میری یہی خواہش ہے کہ یہ حالات طوالت اختیار نہ کریں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں نے پوچھا "اس کا مطلب، مہم جوئی سے تمہارا دل بھر گیا ہے؟"

"ایسی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولی "اگر موجودہ حالات طویل ہوگئے تو اس کا یہی مطلب ہوگا کہ ہمیں اپنے مقصد میں فی الحال کامیابی نہیں ہوئی اور میں...... تمہیں ناکامیاب نہیں دیکھنا چاہتی۔"

صدف کے آخری جملے میں بے پناہ گہرائی پائی جاتی تھی۔ میں اس کی بات کی تہ میں پہنچ گیا اور اس کی خواہش کو پکڑنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں جلد از جلد ساحل تک پہنچ جاؤں۔ اس کی خیرخواہی نے مجھے متاثر کیا۔ میں حیرت سے مستقبل کی اس ڈاکٹر کو دیکھنے لگا جو اپنے عزائم اور حرکات کی بدولت کہیں سے بھی ڈاکٹر نظر نہیں آتی تھی۔

میں نے کہا "اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ میں خود بھی اس مشن میں ناکامیابی کا تصور نہیں کرسکتا۔ آگ اور خون کا ہر دریا عبور کرکے میں ساحل تک پہنچوں گا لیکن تم......"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ متعجب لہجے میں بولی۔

"لیکن تم...... کیا؟"

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا "لیکن تم خوامخواہ خود کو اس آگ میں کیوں جھونک رہی ہو؟"

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ کچھ بجھ سی گئی۔ مجھے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر دکھ ہوا۔ میرے سوال نے شاید اسے کسی دلی صدمے سے دوچار کیا تھا۔ میں نے دانستہ اس کی دل آزاری کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اسے سمجھانے کی آخری سعی کی تھی۔ ٹھیک ہے، وہ میری خیرخواہ تھی۔ ایک اچھی جاں نثار دوست تھی لیکن میں جتنے خطرناک لوگوں

سے ٹکرانے والا تھا ان کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ چوہدری نوازش علی اور شعیب غوری سے خالصتاً میری ذاتی جنگ تھی۔ صدف کو اس آگ کا ایندھن بنانا اچھی بات نہیں تھی تب میں نے ان سنگین ترین لمحات میں اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی تھی۔

وہ مجھ سے مخلص اور وفادار تھی چنانچہ میرے سمجھانے بجھانے کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ وہ دُزدیدہ انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر شکوہ بھرے لہجے میں بولی "کیا میں یہ سمجھوں کہ تم صرف زبان سے مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو، دل سے اس تعلق کو تسلیم نہیں کرتے؟"

"ایسی بات نہیں صدف!" میں اس وقت بے حد سنجیدہ تھا۔

"پھر کیسی بات ہے۔" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی "تمہارے رویّے سے تو یہی محسوس ہو رہا ہے، تمہیں میرے خلوص اور مدد کی ضرورت نہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

وہ غلط کہہ رہی تھی۔ میں اس کے خلوص اور دوستی کو دل سے مانتا تھا اور اسی لیے اسے محفوظ رکھنا چاہتا تھا ورنہ حقِ دوستی نبھاتے ہوئے کتنی ہی لڑکیاں اور عورتیں جان ہار بیٹھی تھیں۔ سُنا جانکی دیوی، تھائی وانگ اور انہی جیسی کئی اور لڑکیوں کو میں بھولا نہیں تھا اسی لیے صدف کو اس جنگ میں کودنے سے باز رکھنا چاہتا تھا۔

وہ اس وقت خاصی دل شکستہ ہو رہی تھی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "صدف! تمہیں اندازہ نہیں، چوہدری نوازش علی اور شعیب غوری کتنے خطرناک لوگ ہیں!"

"میں یہ اندازہ کرنا بھی نہیں چاہتی۔" وہ بے پروائی سے بولی "میرے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اس لیے وہ میرے بھی دشمن ہیں۔ کیا مجھے اپنے دشمنوں سے نمٹنے کا حق حاصل نہیں۔" وہ ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "وجدان! تم چاہے سمجھو یا نہ سمجھو لیکن میں تمہاری سچی دوست ہوں۔ دوست مصیبت کے وقت کام آتا ہے، ساتھ چھوڑ کر الگ نہیں ہو جاتا۔ اگر اب بھی تم اس بات پر اصرار کرو گے کہ میں اپنی راہ تم سے الگ کرلوں تو مجھے یقین ہو جائے گا، تمہیں میری دوستی کی ذرا پروا نہیں!"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ میں سمجھ گیا کہ اسے اس سلسلے میں سمجھانا ممکن نہیں۔ وہ یک ٹک ونڈ اسکرین کے پار تک رہی تھی۔ میں نے نرمی سے کہا۔

"صدف! میں لاہور سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔ اگر راستے میں کوئی ٹریول ایجنسی آئے تو مجھے بتانا۔"

"ٹریول ایجنسی!" وہ ایک جھٹکے سے میری طرف دیکھنے لگی "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے دو ٹکٹ چاہییں، لاہور سے کراچی کے۔" میں نے کہا "کسی بھی پہلی ممکنہ فلائٹ کے۔"

"کیا تم کراچی جانا چاہتے ہو؟" اس کے لہجے کی حیرت دور نہیں ہوئی تھی۔

"اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔" میں نے کہا "تم اسے میری احتیاطی تدبیر کہہ سکتی ہو۔"

وہ معنی خیز لہجے میں بولی "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ دوسرا ٹکٹ کس کے لیے ہوگا؟"

"کیا تم نے پہلے ٹکٹ کے بارے میں معلوم کرلیا ہے؟" میں نے الٹا اسی سے سوال کردیا۔

وہ بولی "ظاہر ہے، ایک ٹکٹ تو تمہارے لیے ہوگا۔"

"بالکل اسی طرح ظاہر ہے، دوسرا ٹکٹ میں تمہارے لیے بنوانا چاہتا ہوں۔"

"اور ساحل......!" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "ان ٹکٹ کو میں صرف اس صورت میں استعمال کروں گا اگر لاہور میں ساحل کو نہ پاسکا۔ کیونکہ پھر ہمیں پہلی فرصت میں کراچی جانا ہوگا۔ اگر ساحل لاہور میں نہ رہی تو سیدھی کراچی پہنچا دی جائے گی۔ میں ناکامیابی کے ایک فیصد امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا صدف۔ ساحل کا حصول میری زندگی کی سب سے بڑی بازی ہے...... اور میں یہ بازی مار کر رہوں گا۔"

"انشاء اللہ، ایسا ہی ہوگا۔" وہ گمبھیر آواز میں بولی "مجھے امید ہے، ہم ساحل کو لاہور ہی میں بازیاب کرلیں گے۔"

میں نے اس کی نیک خواہشات پر دل میں "آمین!" کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی "وجدان! وہ اس طرف ایک ٹریول ایجنسی نظر آرہی ہے۔"

میں نے اس کے اشارے کا نگاہی تعاقب کیا اور "پی آئی اے" کے نیون سائن پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ اگلے ہی لمحے میں ٹویوٹا کرولا کو اس سمت موڑ رہا تھا جدھر وہ ٹریول ایجنسی واقع تھی۔ چند لمحات کے بعد میں ایجنسی میں داخل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

کراچی کی طرح لاہور کی ڈیفنس سوسائٹی بھی متمول لوگوں کا رہائشی علاقہ ہے۔ میں صدف کی راہنمائی میں وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے اگرچہ خاصا طویل راستہ اختیار کیا تھا تاہم یہ بالکل سیدھا اور آسان تھا۔ جب ہم اس علاقے میں داخل ہوئے تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

میں نے گاڑی کو مختلف گلیوں میں گھمانے کے بعد وہ کوٹھی تلاش کرلی جس کی تلاش میں، میں ادھر آیا تھا۔ کوٹھی کے مین گیٹ پر چوہدری دلدار کے نام کی تختی دیکھ کر مجھے دلی سکون محسوس ہوا۔ اس وقت میں کچھ اس قسم کی کیفیت سے گزر رہا تھا جو اپنی نگاہ کے سامنے منزل دیکھ لینے والے کسی مسافر کی ہوتی ہے۔

چوہدری دلدار کی کوٹھی خاصی وسیع وعریض اور شان دار تھی۔ ڈیفنس فیز ٹو میں قدرے بڑی کوٹھیاں تھیں۔ ہمارا ٹارگٹ کوٹھی کارنر پر واقع تھی۔ میں رکے بغیر اس کوٹھی کے سامنے سے گاڑی نکال لے گیا۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر نے مجھے بتا دیا کہ کوٹھی کے احاطے میں، لان پر شامیانے لگے ہوئے تھے جیسے وہاں کسی تقریب کی آمد آمد ہو۔ کوٹھی کے باہر دونوں گلیوں میں چند گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں۔ کارنر کوٹھی ہونے کے باعث اسے دو گلیاں لگتی تھیں۔ کچھ آگے آنے کے بعد میں نے گاڑی روک دی۔ یہ جگہ اس کوٹھی سے نظر نہیں آتی تھی۔

صدف نے کہا "لگتا ہے، وہاں کسی تقریب کا آغاز ہونے والا ہے!"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا "ہمیں کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے تھوڑا سا ہوم ورک کرلینا چاہیے۔ کہیں اندازے کی کوئی غلطی ہمیں کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار نہ کردے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" صدف نے استفسار کیا۔

"کسی طرح یہ معلوم کرلیا جائے کہ وہاں کس قسم کی تقریب ہونے والی ہے۔" میں نے کہا "کوٹھی کے باہر نصف درجن کھڑی گاڑیاں تو یہی ظاہر کرتی ہیں کہ مہمان آنا شروع ہوگئے ہیں۔"

صدف نے کہا "لاہور میں موسم سرما کا آغاز ہوچکا ہے اور اس وقت رات کے آٹھ بج رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، اگر وہاں رات کی تقریب ہے تو نو بجے تک اپنے عروج پر ہوگی۔ کراچی کے بالعکس لاہور والے جلدی سونے کے عادی ہیں۔ یہاں پر نیا دن شروع ہونے سے پہلے ہی تقریب اپنے اختتام کو پہنچ جاتی ہے۔"

میں نے چند لمحے سوچا پھر فیصلہ کن لہجے میں کہا "صدف! میں گاڑی سے اتر رہا ہوں۔ تم اسے ڈرائیو کرکے چوہدری کی کوٹھی تک لاؤ اور اس پہلو میں کھڑی کردو جدھر آخری گاڑی رکی ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد گاڑیاں ہماری گاڑی کے بعد آکر کھڑی ہوجائیں گی اس طرح یہ کرولا مہمانوں کی گاڑیوں میں شامل ہوجائے گی اور کسی کو ہماری گاڑی پر شک نہیں گزرے گا۔ ہمیں جب بھی وہاں سے نکلنا ہوگا، اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوجائیں گے۔"

میں نے صدف کو جس جگہ کرولا کھڑی کرنے کا مشورہ دیا، اس طرف قدرے اندھیرا تھا۔ اس گلی میں بھی کوٹھی کا ایک گیٹ واقع تھا لیکن وہ بند تھا۔ آمد و شد کے لیے کوٹھی کا مین گیٹ ہی استعمال میں نظر آرہا تھا جو کہ اس وقت پوری طرح کھلا تھا۔

صدف نے پوچھا "میں وہاں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد کیا کروں؟"

"تم گاڑی کو پارک کرنا پھر کوٹھی کے اندر جانے کے بجائے دوسری جانب نکل جانا" میں نے کہا "تم بغلی گلی کے کنارے پر رک کر میرا انتظار کرنا۔ تمہاری کسی حرکت سے بے چینی یا اضطراب نہیں جھلکنا چاہیے۔"

وہ اعتماد سے بولی "یہ تو میں کرلوں گی۔ تم اس دوران میں کیا کرو گے؟"

"میں یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ تقریب کس سلسلے میں منعقد ہورہی ہے" میں نے کہا "اگر ممکن ہوا تو کوٹھی کے اندرونی حالات کے بارے میں بھی کچھ جاننے اور جانچنے کی کوشش کروں گا۔"

"اچھی بات ہے" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی پھر پوچھا "کیا ہمارے بیگز گاڑی کے اندر ہی رہیں گے؟"

میں نے کہا "بالکل گاڑی کے اندر ہی رہیں گے۔ بیگز کو ہم کہاں ساتھ ساتھ اٹھائے پھریں گے۔ کوٹھی کے اندر جانے کیا حالات پیش آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے ہمارے لیے خود کو اٹھائے رکھنا بھی دشوار ہوجائے، پھر سامان والا معاملہ الگ ہے۔"

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی اور میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ میں نے ایک گلی کا فاصلہ پیدل طے کیا حالانکہ اس وقت دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر کوٹھی کے اندر پہنچ جاؤں۔ مگر احتیاط اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ میں ایک ایک قدم پھونک کر اٹھاؤں۔ آخری مرحلے میں مس فیلڈنگ شکست سے ہم کنار کردیتی ہے۔

چوہدری دلدار کی کوٹھی سے لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ یہ گلی کا آخری سرا تھا۔ اس گلی کے دوسرے سرے پر میں نے صدف کو انتظار کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس وقت میں جس کوٹھی کے سامنے کھڑا تھا اس کے گیٹ پر ایک ملازم قسم کا شخص موجود تھا۔

میں نے قریب جا کر اسے سلام کیا۔ اس نے میرے سلام کا جواب دیا۔ میں نے دو گلیاں بعد کا ایڈریس بتا کر اس سے پوچھا "بھائی صاحب! یہ کوٹھی کس طرف ہے؟"

اس نے چند لمحے میرے بتائے ہوئے ایڈریس پر غور کیا پھر بولا "آپ تو بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اس طرف دو گلیاں پیچھے چلے جائیں۔ یہ کوٹھی اُدھر ہی ملے گی آپ کو۔"

میں نے ممنون نظر سے اسے دیکھا اور چوہدری دلدار کی کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں تو اس شامیانے سے دھوکا کھا کر ادھر نکل آیا ہوں۔ دراصل میں نے جس کوٹھی میں جانا ہے وہاں بھی ایک تقریب ہے۔ بہر حال، تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"اس قسم کا دھوکا ہوجاتا ہے جناب!" وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا "کیا یہاں کوئی شادی کی تقریب ہورہی ہے؟"

میرا اشارہ چوہدری دلدار کی کوٹھی کی جانب تھا۔ اس نے جواب دیا "نہیں جی۔ یہاں کوئی میوزک کی محفل ہے۔ اللہ رکھا بتارہا تھا، اس کے صاحب کے کوئی خاص مہمان آئے ہوئے ہیں جن کے لیے محفلِ موسیقی سجائی جارہی ہے۔ چوہدری صاحب نے اپنے دوستوں کو بھی اس پروگرام میں مدعو کر رکھا ہے۔"

وہ شخص خاصا باتونی نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "یہ اللہ رکھا کون ہے بھئی؟"

"اپنا یار ہے جی، ادھر چوہدری دلدار کی کوٹھی میں ڈرائیور لگا ہے" اس شخص نے بتایا "ہمارے درمیان حالات حاضرہ پر گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ میں بھی اس کوٹھی میں خانساماں ہوں" بات ختم کرتے ہی اس نے اس کوٹھی کی جانب اشارہ کیا جس کے سامنے وہ کھڑا تھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

وہ خوش دلی سے بولا "مجھے نیاز احمد کہتے ہیں جی۔"

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی نیاز احمد!" میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "ویسے یہ چوہدری دلدار بھی عجیب آدمی ہے۔ اتنی سردی میں کوٹھی کے باہر لان میں شامیانہ لگادیا۔ بھئی، اگر اپنے مہمانوں کا اتنا ہی خیال تھا تو کوٹھی کے اندرونی حصے میں انتظام کرتا۔"

میرے اس خوامخواہ کے تبصرے پر اس نے چونکنا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے جس مقصد کی خاطر وہ تیر چھوڑا تھا، وہ پورا ہوگیا۔ میرا تیر نشانے پر جا کر لگا۔ وہ باتونی نیاز احمد بے نیازی سے بولا "بس صاحب جی! کیا کہیں، بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہیں۔ یہ لوگ جو چاہیں، جہاں چاہیں کرسکتے ہیں۔ ویسے انہیں سردی کہاں لگتی ہوگی۔ اللہ رکھا بتارہا تھا، اس محفلِ موسیقی میں شراب اور شباب کی کمی نہیں ہوگی۔ چوہدری دلدار کے مہمانوں کا تعلق کراچی سے ہے جہاں سردی آتی ہی نہیں...... لاہور کی سردی بھی انہیں محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ان کے اندر گرمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔"

اپنی نادانستگی میں وہ میرے لیے ایک بہت بڑی تصدیق کر بیٹھا تھا۔ کراچی کے مہمانوں کا حوالہ ہی یہ سمجھنے کے لیے کافی تھا کہ کبیر شاہ اور اس کا ساتھی کوٹھی میں موجود ہیں۔ اگر وہ اس محفلِ موسیقی کے مہمان خصوصی تھے تو پھر ان کی وہ رات چوہدری دلدار کی کوٹھی پر ہی گزرنے والی تھی جس کا واضح مطلب یہی تھا، ساحل بھی اسی کوٹھی میں موجود تھی۔

میں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "بھائی نیاز علی! میں جن لوگوں کی تقریب میں جارہا ہوں، وہ تو شراب اور شباب سے بہت دور رہتے ہیں۔ تم نے تو چوہدری دلدار کے بارے میں بتا کر مجھے حیران کردیا ہے۔ کیا پولیس والے شراب اور شباب کی ایسی محفلوں پر کوئی اعتراض نہیں کرتے؟"

نیاز علی نے سرتاپا مجھے بے یقینی سے دیکھا اور بولا "لگتا ہے، آپ بہت ہی سیدھے سادے اور ناواقف آدمی ہو۔ او اللہ کے بندے! یہ طاقت ور لوگوں کا رہائشی علاقہ ہے۔ پولیس والوں کا ان پر ہاتھ ڈالتے ہوئے پیشاب خطا ہوتا ہے۔ میرا صاحب بھی بڑی پہنچ والا ہے۔ تم نہیں جانتے ان لوگوں کو۔"

"نہ ہی جانوں تو اچھا ہے بھائی، توبہ توبہ!" میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے کانوں کو چھوا اور نیاز علی کا شکریہ ادا کرکے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ وہ اپنی بے خبری میں میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔

ایک گلی کا چکر لگانے کے بعد میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں صدف کو آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ وہاں موجود تھی۔ میں نے نیاز علی سے حاصل ہونے والی معلومات اس کے گوش گزار

کہیں تو وہ پرسوچ انداز میں بولی۔

''وجدان! میرا خیال ہے، ہمیں دس بجے سے پہلے کوٹھی کے اندر داخل نہیں ہونا چاہیے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے استفسار کیا۔ وہ کوئی بھی بات خوامخواہ نہیں کہتی تھی۔

وہ بولی ''دس بجے یہ محفل موسیقی اپنے جوبن پر ہوگی یعنی میزبان اور مہمان تمام اس شامیانے کے نیچے ہوں گے جو چوہدری کے لان میں کھڑا نظر آ رہا ہے۔ کوٹھی کے بیشتر ملازمین بھی اب صاحب لوگوں کی خدمت کے لیے آس پاس ہی موجود ہوں گے۔ اس بات کے امکانات صفر کے برابر ہیں کہ تمہاری ساحل کو وہاں لایا جائے۔ وہ کوٹھی کے کسی دور افتادہ حصے میں کڑی نگرانی میں ہوگی چنانچہ اس موقع پر اگر ہم کوٹھی کے اندر داخل ہوں تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوں گے۔''

اس کی تجویز انتہائی معقول اور بروقت تھی۔ میں نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا ''چوہدری دلدار کی کوٹھی دو منزلہ ہے اور یہ ایک وسیع و عریض کوٹھی ہے۔ کوٹھی کا لان ہی اتنا بڑا دکھائی دے رہا ہے کہ وہاں لگ بھگ سو افراد کے بیٹھنے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ اس صورتِ حالات میں، میں سمجھتا ہوں کہ ساحل کو بالائی منزل کے کسی کمرے میں رکھا گیا ہوگا۔''

''یہ ضروری نہیں ہے وجدان!'' وہ شدت سے بولی ''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے زیریں منزل ہی کے کسی محفوظ ترین کمرے میں رکھا گیا ہو۔ ہم کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ کوٹھی میں خفیہ طور پر داخل ہونے کے بعد پہلے ہم زیریں منزل کو چیک کریں گے۔ اس کے بعد ہی بالائی منزل کا رخ کیا جائے گا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''ہم کوٹھی کے عقبی حصے سے بہ آہستگی اندر داخل ہوں گے اور سب سے پہلے کوٹھی والوں کی نظر بچا کر وہ گیٹ کھول دیں گے جو باہر سے بند نظر آیا تھا۔ ہم اس کنڈی کو گرا کر ایسا کر دیں گے کہ بہ وقتِ ضرورت اسے استعمال میں لایا جا سکے۔ ہماری گاڑی اسی گیٹ کے نزدیک، کوٹھی سے باہر کھڑی ہے۔''

''اور اگر اس گیٹ پر اندر سے کوئی تالا وغیرہ لگا ہوا ملا تو؟'' صدف نے ایک خدشے کا اظہار کیا۔

میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''تو میں اس موقع پر ''جی'' کی قوت کو بروئے کار لاؤں گا۔''

میں نے جیسے ہی بات ختم کی، مجھے یوں محسوس ہوا، کوئی اور بھی ہمارے علاوہ وہاں موجود ہو۔ یہ احساس پچھلے دو دنوں سے اتنی مرتبہ ہو چکا تھا کہ اب میں نے اس پر چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا، وہ احساس میرا سایہ بن گیا ہے۔ پتا نہیں کون سی پراسرار اور غیر مرئی قوت میری نگرانی پر مامور ہوگئی تھی۔ اگر یہ ''جی'' کی قوت کا کوئی کرشمہ تھا تو پھر جلد از جلد اس کی حقیقت جان لینا ضروری تھا۔ وہ احساس میرے لیے ایک چیلنج کی حیثیت اختیار کرتا چلا جا رہا تھا۔

صدف کو اس مرتبہ میں نے باور نہیں ہونے دیا... کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں۔ وہ میری بات کے ختم ہونے پر بولی ''کیا جی کی قوت سے کوئی بند تالا کھولا جا سکتا ہے؟''

''بالکل کھولا جا سکتا ہے'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر موضوع گفتگو کو تھوڑا موڑتے ہوئے صدف سے پوچھا ''کیا تمہیں پائپ کے ذریعے زیریں منزل سے بالائی منزل کی طرف سفر کرنا آتا ہے، میرا مطلب ہے اوپر چڑھنا؟''

''کبھی عملی تجربے سے تو نہیں گزرنا پڑا لیکن مجھے یقین ہے، میں ایسا کر لوں گی'' وہ مضبوط لہجے میں بولی پھر پوچھا ''تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

میں نے وضاحت کی ''کوٹھی کے اندر پہنچنے کے بعد جب ہم نچلی منزل چیک کر لیں گے تو عین ممکن ہے، زینے کے ذریعے ہمیں اوپر جانے کا موقع نہ مل سکے۔ اس صورت میں ہمیں پائپ لائن کو وسیلہ بنانا ہوگا۔''

''ہوں'' وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی ''ایک ترکیب اور بھی ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟'' میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

وہ بولی ''تم نے بتایا ہے کہ چوہدری دلدار کا باورچی اللہ رکھا ہمارے ہتھے چڑھ جائے تو اس سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ساحل کو کوٹھی کے کون سے حصے میں رکھا گیا ہے۔ اس طرح ہمارا بہت سا وقت بچ جائے گا اور ہم نہایت ہی کم وقت میں اپنا کام نمٹا لیں گے۔''

''آئیڈیا اچھا ہے'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ''لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ رکھا کو کس طرح قابو میں لایا جائے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی ''ایک کام ہو سکتا ہے وجدان! میں نیاز احمد سے جا کر ملتی ہوں۔ وہ مجھے شکل سے نہیں جانتا، اسی طرح اللہ رکھا بھی مجھے نہیں پہچانتا۔ میں کوئی چکر چلا کر نیاز احمد کو اس بات کے لیے تیار کر لوں کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے اللہ رکھا کو بلا دے۔ ایک مرتبہ اللہ رکھا کو

جب پہنچ گیا تو میں اسے باتوں میں لگا کر دوسری طرف لے جاؤں گی۔ ادھر اچھا خاصا اندھیرا ہے۔ دو تین خالی پلاٹ پڑے ہیں'' پھر اس نے اس سمت اشارہ بھی کر دیا اور بولی ''تم پہلے سے وہاں پہنچ جاؤ۔ تاریکی کے باعث تم اسے نظر نہیں آؤ گے۔ میں جیسے ہی اللہ رکھا کو وہاں لے کر آؤں، تم اسے اپنی گرفت میں لے لینا۔ جب اس کی گردن تمہارے چنگل میں ہوگی تو پھر اس کی زبان تمہاری مرضی کی بولی بولے گی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

میں تعریفی نگاہ سے اس پانچ فٹ کی مہ جبیں کو تکنے لگا۔ اس توصیف میں حیرت کا عنصر غالب تھا۔ پستہ قامتی پر اس کا بھرا بھرا بدن قیامتِ صغریٰ کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ وہ اہلِ حسن ہی نہیں، اہلِ عقل بھی تھی۔ اس کا منصوبہ میرے دل کو لگا۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اس تاریک گوشے کی طرف جا رہا ہوں۔ تم اپنے حسن کا جادو جگانے کی کوشش کرو۔''

بات ختم کرتے ہی میں عمل میں آ گیا۔ اسی لمحے مجھے محسوس ہوا، کوئی اور بھی میرے ساتھ ہی حرکت میں آیا ہے۔ میں اپنے نادیدہ احساس کی معیت میں مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا۔ اس خالی احاطے میں جا بہ جا آدم قد جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ میں ایک جھاڑی کے عقب میں کھڑا ہو کر صدف کا انتظار کرنے لگا۔

انتظار پانچ منٹ سے زیادہ طوالت اختیار کر گیا تو میں نے اپنے احساس کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں اس وقت جھاڑی کے پیچھے کھڑا محسوس کر رہا تھا کہ کوئی میرے قریب موجود ہے۔ میں نے سرگوشیانہ انداز میں اسے پکارا۔

''ہیلو!''

مجھے سرگوشیانہ انداز ہی میں جواب ملا ''ہیلو!''

پہلے تو میں نے یہی سمجھا کہ میری سماعت کو دھوکا ہوا ہے۔ بالکل میرے ہی لب و لہجے میں اس پراسرار قوت نے بھی ''ہیلو'' کہا تھا۔ میں اسے اپنی آواز کی بازگشت نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس وقت میں جس مقام پر کھڑا تھا وہاں بازگشت (ECHO) کے پیدا ہونے کے آثار نہیں تھے۔ ایکو نامی کوالٹی آف ساؤنڈ مخصوص حالات ہی میں پیدا ہوتی ہے۔

میرے پورے بدن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ میرے انتہائی قریب کوئی موجود تھا جو میرے لیے نادیدہ تھا لیکن اس کی آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر میں اس پراسرار قوت سے خوف زدہ نہیں تھا۔ مجھے وہ سب کچھ عجیب سا تو لگ رہا تھا لیکن اس میں ڈروالی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے سوچا، جب تک صدف اللہ رکھا کو لے کر یہاں آتی، مجھے اس نادیدہ ہستی سے کلام کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ میری ہی آواز میں بولتا/بولتی تھی۔ بولتا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کا لب و لہجہ میری طرح مردانہ تھا اور بولتی کا امکان اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ ممکن ہے، وہ ہستی کوئی نی میل ہو۔ ابھی تک میں اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

پھر قبل اس کے کہ میں اس ہستی سے باقاعدہ مکالمہ کرتا، نزدیک آتے ہوئے قدموں کی آواز مجھ تک پہنچی۔ اس کے ساتھ ہی صدف کے کسی کے ساتھ باتیں کرنے کی آواز بھی ابھر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا، صدف ہمارے مطلوبہ شکار کو گھیر لائی تھی۔ میں نے نادیدہ ہستی سے گفتگو کو فی الحال پسِ پشت ڈالا اور پوری توجہ سے صدف کا انتظار کرنے لگا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک آ رہی تھی۔

میں نے نادیدہ پراسرار قوت کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن وہ مجھے نہیں بھولی۔ اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے مقناطیسی لہروں سے بنا ہوا کوئی جسم میرے اندر داخل ہو رہا ہو۔ میں نے واضح طور پر اس قوت کو اپنے بدن کا حصہ بنتے ہوئے محسوس کیا۔ یہ ایک انوکھا احساس تھا جسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

میں نے اپنی توجہ صدف اور اللہ رکھا کی جانب مبذول کر دی۔ اس وقت میں کسی چاق چوبند چیتے کے مانند الرٹ کھڑا تھا پھر جیسے ہی شکار میری رینج میں آیا، میں نے ایک طویل جست بھر کر اسے دبوچ لیا۔ اگلے ہی لمحے میں اسے گھسیٹ کر جھاڑی کے پیچھے لا چکا تھا۔ اللہ رکھا کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں اس طرح کس چکی تھی کہ وہ کسی قسم کی حرکت کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ ایک نہایت ہی خطرناک قسم کا نیک لاک(NECK LOCK)تھا۔

اللہ رکھا کی عمر پچپن کے قریب رہی ہوگی۔ اس کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی اسی لیے اس نے کسی خاص مزاحمت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے اس کی گردن پر بازو کا دباؤ قدرے کم کرتے ہی دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''اللہ رکھا! تمہیں اللہ نے صرف اس لیے رکھا ہوا ہے کہ تم بھولے بھٹکے لوگوں کی راہ نمائی کر سکو۔ اگر تم نے مجھ سے تعاون نہیں کیا تو سمجھ لینا، آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

میں نے پوری سفاکی سے کہا" ہمارے بارے میں کوئی سوال نہ کرو۔ بس اتنا جان لو کہ ہم موت کے فرشتے ہیں۔ اگر تم نے میرے سوالات کے بالکل درست جواب نہ دیے تو....."

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا۔ مجھے اس کمزور باورچی پر طاقت آزمانے کا کوئی شوق نہیں تھا بلکہ اپنے اس عمل سے مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا لیکن یہ وقت کی مجبوری تھی۔ اگر وہ پوری طرح میری دہشت کے ٹرانس میں نہ آتا تو عین ممکن تھا، وہ میرے سوالات کا جواب دینے کے بجائے چیخنا چلانا شروع کر دیتا یا پھر اچانک دوڑ بھی لگا سکتا تھا۔ اس موقع پر میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ میں بنے بنائے کھیل کو بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تعاون پر تیار ہو گیا۔ مجھے اس پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے جب اس سے ساحل کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا" رکھاں والی سے لائی جانے والی لڑکی اوپری منزل کے کسی کمرے میں ہے۔"

میرے سینے سے ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا" بالائی منزل کے کس کمرے میں؟"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب!" وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔

"بالائی منزل پر اور کون کون موجود ہے؟"

"اس لڑکی کے علاوہ دو مسلح محافظ ہیں" اس نے بتایا" جو اسے کڑی نگرانی میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک آدمی کراچی سے آیا ہے، دوسرا چوہدری صاحب کا ملازم ہے۔"

میں نے پوچھا" اس لڑکی کو چوہدری دلدار نے اپنی کوٹھی میں کیوں قید رکھا ہے؟"

"میں اس لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا" جب سے وہ اس کوٹھی میں آئی ہے، کسی کو بالائی منزل پر جانے کی اجازت نہیں۔ میں نے سنا ہے، وہ لڑکی انتہائی خطرناک ہے، جس کا تعلق بڑے چوہدری صاحب کے کسی دشمن سے ہے۔"

"بڑے چوہدری سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اکھڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وہ منمنایا" رکھاں والی کے چوہدری نوازش علی بڑے چوہدری ہیں اور چوہدری دلدار کو چھوٹے چوہدری صاحب کہا جاتا ہے۔ چوہدری دلدار صاحب ہی جانتے ہیں کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟"

ہر بات روزِ روشن کے مانند عیاں ہو گئی۔ چوہدری نوازش علی اور چوہدری دلدار کا تعلق ثابت ہونے کے بعد سارا کھیل میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے اللہ رکھا سے پوچھا۔

"رکھاں والی سے بڑے چوہدری کا بیٹا فیصل بھی یہاں پہنچا ہے۔ وہ کہاں ہے؟"

"فیصل صاحب، کراچی کے مہمان کبیر شاہ اور دوسرے سارے افراد کوٹھی کے نچلے حصے میں ہیں۔" اس نے جواب دیا" کبیر شاہ کے ساتھ کراچی سے جو دوسرا شخص یہاں پہنچا ہے، وہ چوہدری دلدار کے مسلح ملازم کے ساتھ بالائی منزل پر اس لڑکی کی حفاظت اور نگرانی کر رہا ہے۔"

میں نے پوچھا" کوٹھی کے لان میں شامیانہ وغیرہ کیوں تانا گیا ہے؟"

اللہ رکھا نے بھی اس شامیانے کی وہی توجیہ پیش کی جو اس سے پہلے اس کا بیلی نیاز احمد پیش کر چکا تھا۔ میں نے اس سے مزید دو چار سوالات کیے۔ جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ مجھے مزید مفید معلومات فراہم نہیں کر سکتا تو میں نے اس کی گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو دبا کر اسے دنیا و مافیہا سے لاتعلق کر دیا۔ اب وہ کم از کم تین گھنٹے تک ہوش و حواس میں نہیں آ سکتا تھا۔ اللہ رکھا کے بدن پر گرم کپڑے کا شلوار قمیص تھا اور قمیص کے اوپر اس نے گرم کوٹ بھی پہن رکھا تھا لہٰذا موسم کی سختی اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے ایک دور افتادہ جھاڑی کے پیچھے لمبا لٹا دیا اور صدف کے ساتھ اس خالی احاطے سے باہر آ گیا۔

ہم چوہدری دلدار کی کوٹھی کی مخالف سمت چلنے لگے۔ صدف نے کہا" اللہ رکھا تو بہت کام کا بندہ ثابت ہوا ہے۔ اب ہم با آسانی اپنا پروگرام ترتیب دے سکتے ہیں۔ اس وقت لگ بھگ نو بج رہے ہیں۔ تم نے آئندہ کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟"

میں نے کہا" کوٹھی کے اندر ہم دس بجے ہی داخل ہوں گے تاکہ ہمیں اپنے کام میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چلو کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ میں ایک اچھی چائے کی طلب محسوس کر رہا ہوں۔"

"میرا بھی یہی حال ہے وجدان۔" وہ تائیدی انداز میں بولی" اس طرف آتے وقت میں نے دو تین گلیاں پیچھے ایک ریسٹورنٹ دیکھا تھا۔ ہماری ضرورت وہاں پوری ہو سکتی ہے لیکن......" وہ یک لخت خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ تاہم اس کے قدم نہیں رکے۔

"لیکن کیا؟" میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

وہ تشویش ناک لہجے میں بولی" میں اللہ رکھا کی طرف سے فکر مند ہوں۔ اگر اسے جلدی ہوش آ گیا تو کوئی بڑی گڑبڑ

ہو جائے گی۔ وہ ایک طرح سے اس جھاڑی میں آزاد ہی پڑا ہے۔ وہاں اس کی نگرانی کرنے والا کوئی بھی نہیں۔"

"تم کیا سمجھ رہی ہو صدف۔" میں نے اس سے پوچھا" اللہ رکھا کب تک ہوش میں آ جائے گا؟"

"میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔

"تب تم اللہ رکھا کی طرف سے پوری طرح مطمئن رہو" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا" وہ کم از کم تین گھنٹے تک ہوش و حواس میں نہیں آ سکتا۔ اس سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔ ایک بات یقینی ہے کہ اس کی جب آنکھ کھلے گی تو نئی تاریخ شروع ہو چکی ہوگی۔"

"تب تو ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن انداز میں بولی" اتنی مہلت ہمارے لیے کافی ہوگی۔"

میں نے کہا" فوری طور پر میرے ذہن میں جو منصوبہ ہے، میں اس سے تمہیں آگاہ کر دیتا ہوں۔ یہ بات تو ہمیں معلوم ہو ہی چکی ہے کہ بالائی منزل پر صرف دو مسلح پہرے دار ساحل کی نگرانی پر مامور ہیں۔ زیریں منزل کے بیشتر افراد اس وقت لان میں یا اس کے آس پاس موجود ہوں گے لہٰذا ہم کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر با آسانی اندر پہنچ سکتے ہیں۔"

میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا" اندر جانے کے بعد تم زیریں منزل پر ہی کسی گوشے میں رک جاؤ گی جہاں پر تمہیں کوئی دیکھ نہ سکے مگر تم بالائی منزل کی جانب جانے والے راستے پر نگاہ رکھ سکو۔ اوپر میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم نیچے رہ کر مجھے کور دو گی۔"

"لیکن اوپر نگرانی کرنے والے دونوں افراد مسلح ہیں۔" صدف نے ایک باریک نکتہ اٹھایا" تمہیں کوئی خطرناک صورت حال بھی پیش آ سکتی ہے۔"

میں نے کہا" ہم کسی دعوتِ شیراز میں شرکت کرنے نہیں جا رہے کہ کسی قسم کی مشکل پیش آنے کا امکان نہ ہو۔ یہ ایک انتہائی خطرناک مشن ہے۔ انسان نما درندوں سے ہمارا سابقہ ہے۔ کسی بھی خون ریزی کی نوبت آ سکتی ہے۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں متعدد مسلح افراد سے نہتا بھڑ سکتا ہوں۔ یہاں تو صرف دو سے پالا پڑنے والا ہے۔ ویسے میں ایک خاص وجہ سے تمہیں خود سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور وہ خاص وجہ کیا ہے؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا" ہمارے پاس جو بھی قوت ہے اسے ایک جگہ مرتکز نہیں رہنا چاہیے۔ اس سے نقصان کا اندیشہ ہے۔ جس طرح سفر کے دوران میں تمام نقدی کو کسی ایک جیب میں نہیں رکھنا چاہیے بلکہ مختلف جگہوں پر بانٹ کر رقم کو محفوظ کرنا چاہیے تاکہ جیب کٹنے یا کسی قسم کی چوری کے سبب انسان بالکل ہی خالی ہاتھ نہ ہو جائے...... بالکل اسی طرح خطرناک قسم کے مشن میں اپنی طاقت کو ایک جگہ جمع نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم ساتھ ہوں گے تو کسی نازک موقع پر دونوں ہی دشمن کی گرفت میں آ سکتے ہیں بصورتِ دیگر ہم تھوڑے فاصلے پر رہ کر زیادہ بہتر انداز میں ایک دوسرے کی مدد کر کے اس مہم کو سر کر سکتے ہیں۔"

"تم بالکل درست کہہ رہے ہو وجدان!" وہ میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بولی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے مذکورہ ریسٹورنٹ میں آ بیٹھے۔ تین چار گھنٹے پہلے ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا تھا اس لیے بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی صرف چائے کا موڈ تھا، لہٰذا اسی کا آرڈر دیا گیا۔ یہ بات صدف بھی جانتی تھی کہ چائے کافی مجھ پر الٹا اثر کرتی ہے۔ اسی حوالے سے اس نے پوچھا۔

"وجدان! تمہیں تو ان حالات میں چائے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کہیں اس کے اثر سے تمہیں نیند نہ آنے لگے!"

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا" ایسا نہیں ہوگا صدف! چائے کافی میرے لیے اپی ٹائزر اور سلیپنگ پلز ضرور ہے لیکن میں جس قسم کے حالات سے گزر رہا ہوں ان میں چائے میرے ذہن پر ہلکا اثر کرے گی۔ میں تھوڑا موڈ میں آنا چاہتا ہوں اور اس سے معدے کا بوجھ بھی کم ہوگا۔ میں نے اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ کھانا کھا لیا ہے۔ ایک ہلکے سے سرور کی مجھے ضرورت ہے۔ جیسے ایک آدھ جام سے انسان موڈ میں آ جاتا ہے، میں اسی کیفیت میں آنا چاہتا ہوں اور ......بس"

وہ عجیب سی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی" تم بہت زیادہ ڈسٹرب ہو وجدان!"

"جبھی تو ...... جبھی تو ......" میں بس اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

چائے پینے کے دوران میں صدف خاموش رہی اور گہری نظر سے مجھے دیکھنے پر اکتفا کرتی رہی۔ میں نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ چائے ختم کرنے کے بعد ہم تھوڑی دیر تک ریسٹورنٹ میں بیٹھے رہے پھر اٹھ گئے۔ باہر آنے کے بعد میں نے کہا۔

"ہم سیدھے چوہدری دلدار کی کوٹھی کے عقب میں جائیں گے۔ اب ایکشن میں آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ کیا تم ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو اس کے لیے تیار محسوس کر رہی ہو؟"

"ایک دم تیار!" وہ حتمی لہجے میں بولی۔

میں نے کہا" ویری گڈ مائی فرینڈ!"

اس نے میرے الفاظ پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے اس موڑ تک آ گئے جہاں سے چوہدری دلدار کی کوٹھی والی گلی شروع ہوتی ہے اور اسی لمحے ہم دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ گلی دور دور تک گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی جو یقیناً چوہدری دلدار کے مدعوئین کی گاڑیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا، دعوت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہمارے ٹھٹکنے اور رکنے کا سبب وہ جیپ تھی جو گاڑیوں کی قطار کے آخری سرے پر کھڑی تھی اور...... اس جیپ کا فاصلہ ہم سے صرف اتنا تھا کہ ہم بہ آسانی اس کی نمبر پلیٹ پڑھ سکتے تھے۔

''فور سیون تھری سیون'' صدف کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ''یہ تو وہی شیطان ہے...... بہروپیا وجدان!''

میں بھی اس سفید چھت والی سرخ لینڈ کروزر کو دیکھ رہا تھا جس کے سیاہ چوڑے ٹائر اس بدبخت نقلی وجدان کے کسی سیاہ کرتوت کی اطلاع دے رہے تھے۔ جیپ اس وقت خالی تھی۔ وہ بہروپیا اس کے اندر موجود نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ چوہدری دلدار کی کوٹھی میں موجود ہوگا۔ اس کی ٹویوٹا فور ڈبلیو ڈی مہمانوں کی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی تھی، جس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ بھی چوہدری کی دعوت میں مدعو ہے..... تو کیا یہ نقلی وجدان چوہدری دلدار کی تخلیق ہے؟

یہ سوال کسی زہریلے ناگ کے مانند میرے ذہن میں پھنکارا اور میں نے صدف کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندھیرے میں کھینچ لیا۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے عقبی گلی میں پہنچے۔ وہاں نیم تاریکی تھی۔ صدف نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''لگتا ہے، وہ مردود اس وقت چوہدری کی کوٹھی کے اندر ہے۔''

''ہوا کرے!'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ میرا لہجہ اچانک سنگین ہو گیا تھا۔

صدف نے میرے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا ''کیا ان حالات میں بھی ہم اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل کریں گے یا کسی تبدیلی کا امکان ہے؟''

''کسی تبدیلی کا امکان ہے اور نہ ہی وقت'' میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''آج ہر الجھن سلجھن میں بدل جائے گی۔ اگر نقلی وجدان چوہدری دلدار کا مہرہ ہے تو اس کے پٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ اصل کے سامنے نقل کا چراغ نہیں جلے گا۔ چوہدری دلدار کو شہ مات ہو کر رہے گی۔''

میرے تیور دیکھتے ہوئے صدف نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہم جلدی سے چوہدری دلدار کی کوٹھی کے عین عقب میں پہنچ گئے۔ یہاں مکمل اندھیرا تھا۔ گلی کی نکڑ پر جلنے والے بلب کی روشنی یہاں تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ یہ ہمارے حق میں اچھا ہی تھا۔ ہم جس قسم کی کارروائی کرنے جا رہے تھے، اس کے لیے مکمل تاریکی زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی۔

صدف میرے ساتھ جڑ کر کھڑی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کے قریب اپنا منہ لے جاتے ہوئے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا ''میں تمہیں اوپر اٹھاتا ہوں۔ تم دیوار کے اوپر سے جھانک کر اندر دیکھو۔ اگر اس جانب کوئی موجود نہ ہو تو دیوار پر چڑھ جانا۔ تم نے جو گرز پہن رکھے ہیں۔ اندر کودنے میں تمہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

''اور تم؟'' اس کی آواز نے میری سماعت میں سرسراہٹ پیدا کی۔ میں نے اپنے گال پر اس کی سانسوں کی تپش بہت واضح طور پر محسوس کی۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا ''میں تمہارے بعد اندر کود جاؤں گا، کیا تم ایکشن کے لیے تیار ہو؟''

اس نے کسی مستعد کمانڈو کی طرح اثبات میں سر کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ میں نے اس پاکٹ سائز سرمایۂ حسن و ادا کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا، اس کا چہرہ دیوار کی جانب تھا۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھایا جیسے ویٹ لفٹر ایک جھٹکے سے ویٹ اٹھاتے ہیں۔ اس کا گداز بدن ہوا میں اٹھ گیا۔ میں نے اس کے کولھوں کو سہارا دے کر مزید بلند کر دیا۔ وہ دیوار کا کنارہ پکڑ کر اوپر اٹھ گئی۔ اب وہ میرے سہارے کے بغیر دیوار پر ٹکی ہوئی تھی۔

میں اس کی جانب سے کسی اشارے کا منتظر تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ''سب ٹھیک ہے'' کا اشارہ دیا اور میری ہدایت پا کر کوٹھی کے اندر کود گئی۔ میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

اس اطمینان کی عمر ایک لمحے سے بھی کم ثابت ہوئی کیونکہ اسی لمحے کے آخری حصے میں کوٹھی فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ فائرنگ کوٹھی کے اس حصے میں ہو رہی تھی جدھر شامیانہ لگا ہوا تھا۔ گویا تقریب میں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں یہ فیصلہ کرتا، کوٹھی کے اندر کود جاؤں یا نہیں، ایک یخ بستہ آہنی نال میری گدی سے آ کر ٹک گئی۔ پھر ایک غراتی ہوئی آواز نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ہینڈز اپ!''

بے ساختہ میں نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیے۔

ہر کمزور، طاقت ور سے ڈرتا ہے' اس کے آگے جھکتا ہے۔ اپنی سالمیت اور بقا کی خاطر اسے زبردست کی بات ماننا پڑتی ہے ورنہ وہ اپنی طاقت اور اختیار کے بل پر زیردست کو کچل کر رکھ دیتا ہے لیکن بعض اوقات سیر کو سوا سیر پر سبقت حاصل ہو جاتی ہے۔ کمزور کا کوئی داؤ چل جاتا ہے اور وہ طاقتور کو مجبور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

میں نے وقتی مجبوری کے تحت دونوں ہاتھ اٹھا دیے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اسے زبردست تسلیم بھی کر لیتا۔ اس کے احکام کی تعمیل کرنا میرا ایک جھانسا تھا۔ کسی کو زیرِ دام لانے کے لیے فرماں برداری سے بڑا ہنر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے گن بردار کی غراہٹ سے لبریز دھمکی پر خود کو ہینڈز اپ کر لیا تھا۔ وہ یہی سمجھا' مجھے زیر کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے مگر یہ اس کی بھول تھی اور...... وقت کے ایسے سنگین لمحات کسی کی ننھی سی بھول کو بھی معاف نہیں کرتے!

میں نے پلک جھپکتے میں اپنی گدی پر ٹکی سفاک آہنی نال کے لمس سے اندازہ لگا لیا کہ مجھے "ہینڈز اپ" ایسے احکام دینے والے کے ہاتھ میں ایک خطرناک "کے کے" موجود ہے۔ مجھے ہوا میں ہاتھ بلند کرتے دیکھ کر اس کے حلق سے ایک غراہٹ خارج ہوئی۔

"خاموشی سے گھوم جاؤ!"

اور میں واقعی خاموشی سے گھوم گیا۔ میری زبان سے ایک لفظ ادا نہ ہوا' البتہ میرے ہاتھ پاؤں تاریکی کا فائدہ اٹھا کر خاموش زبان درازی پر اتر آئے۔ میں جیسے ہی گھوما' اس شخص نے اپنی کلاشنکوف کو میری گردن سے ہٹا لیا۔ میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ میں نے ایک طویل جست بھری' پھر میں نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو دشمن کے کندھوں پر ٹکا کر بجلی کی سی سرعت سے ایک ہینڈ اسپرنگ لگا دیا۔ اس کے شانوں نے میرے ہاتھوں کے لیے پش پیڈ کا کام کیا' اگلے ہی لمحے میں اس کے اوپر سے گزر کر پشت پر پہنچ گیا۔ اتنے بلند اور متحرک ٹارگٹ سے پش لینا آسان کام نہیں' رومانیا کی مونیکا اس فن میں طاق ہے۔ یہ جمناسٹک کا ایک مشکل اسٹیپ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں ذرا سی کوتاہی خطرناک چوٹ دے سکتی ہے۔

میں نے پرواز کے دوران میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ گن بردار شخص مجھے نشانہ بنا کر فائرنگ نہ کر سکے۔ مجھے اپنے مقصد میں صد فی صد کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ شخص بوکھلاہٹ اور حیرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ میری جانب پلٹا لیکن اب میں اس سے اتنے فاصلے پر پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنی جانب گن سیدھی کرنے کا موقع فراہم نہیں کر سکتا تھا۔

اس شخص نے جیسے ہی مجھے نشانہ بنانے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی' میں نے تیزی سے ایک خطرناک کریسنٹ کک اس کے چہرے پر جڑ دی بے ساختہ اس کے گن بردار ہاتھ اوپر کو اٹھ گئے' اسی لمحے میں نے نیچے بیٹھتے ہوئے اسے بیک سوئپ ماری۔ وہ پہلے ہی اپنا توازن کھو بیٹھا تھا۔ اس سوئپ نے اسے زمین بوس کر دیا۔

اسی لمحے کوٹھی کے سامنے والے حصے میں دوبارہ فائرنگ ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخوں پر مشتمل شور بھی بلند ہوا۔ ان چیخوں میں بعض لوگوں کی احکام بردار آوازیں بھی شامل تھیں' وہ نہایت ہی تشویش ناک لمحات تھے اور ان لمحات کی سنگینی اس صورت میں اور بھی بڑھ جاتی تھی کہ میری جاں نثار ساتھی صدف کوٹھی کے اندر پہنچ چکی تھی۔ مجھے بھی پہلی فرصت میں اندر جانا تھا اور اس اقدام سے قبل گن بردار سے تسلی بخش نمٹاؤ بھی ضروری تھا۔

زمین بوس ہوتے وقت کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری تھی۔ وہ زمین سے اٹھنے کے بعد اسی سمت بڑھا جہاں کلاشنکوف پڑی تھی لیکن میں نے اس کی یہ کوشش ناکامیاب بنا دی۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے کالر سے دبوچا اور ایک جھٹکے سے پیچھے کھینچ لیا۔ ہمارے درمیان فاصلہ کم ہوا تو اسے طالع آزمائی کا شوق چرایا۔ اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور میرا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے کالر کو آزاد کیے بغیر اس کے' اپنی جانب بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا اور دوسرا ہاتھ اس کی کھلی بغل میں دے کر ایک نپی تلی جرک کے ساتھ اسے فضا میں بلند کر دیا پھر میں نے اسے ہاتھ پاؤں جھٹکنے کا موقع نہیں دیا اور تھرو کے انداز میں اسے دور اچھال دیا۔ وہ کمر کے بل پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے حلق سے ایک وحشت ناک چیخ بلند ہوئی اور ٹکراؤ کے بعد وہیں عقبی گلی کی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ کوٹھی کی نگرانی پر مامور چوہدری دلدار کا آدمی تھا جس نے نظر بچا کر ہماری "سرگرمی" نوٹس کر لی تھی اور روک تھام کے لیے ہماری جانب آ گیا تھا...... اور یہ روک تھام اسے خاصی مہنگی پڑی تھی۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ مجھے خاصا کسمپرسی کی حالت میں نظر آیا۔ دیوار کے ٹکراؤ نے کمر کے علاوہ اس کی کھوپڑی کو بھی شدید نقصان پہنچایا تھا اور اس کے چٹخے ہوئے ناریل سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس کے

ہونے کا انتظار کرتا۔ کوٹھی کے اندر کی صورتِ حالات خاصی سنگین ہو چکی تھی۔ ویسے اس زخمی شخص کی کنڈیشن بتا رہی تھی کہ وہ خود اپنے پاؤں پر چل کر وہاں سے جا نہیں سکے گا وہ فوری طور پر ہمارے لیے خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا اس لیے میں نے اس پر اور اس کی کلاشنکوف پر لعنت بھیجی اور بڑی مہارت سے کوٹھی کی عقبی دیوار پھاند کر اندر پہنچ گیا۔

صدف ایک آڑ میں کھڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میری نگاہ نے بہت جلد اس شیر دل حسینہ تک رسائی حاصل کر لی۔ میں ذرا سے پیش تر اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے میری سماعت میں سرگوشی کی۔

"وجدان! کوٹھی کے اگلے حصے میں زبردست گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔ لگتا ہے وہاں کوئی ہنگامہ وغیرہ ہو گیا ہے۔ میں نے دو مرتبہ فائرنگ کی آواز سنی ہے اور مسلسل افراتفری کی آوازیں بھی آ رہی ہیں۔"

"فائرنگ کی آواز میں نے بھی سنی ہے" جواباً میں نے بھی سرگوشیانہ انداز اختیار کر لیا "ہماری کارروائی کے لیے اس سے زیادہ موزوں موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں کی توجہ باہر کی طرف ہو گی"

"تم ٹھیک کہتے ہو" وہ اثباتی انداز میں اپنے سر کو حرکت دیتے ہوئے بولی پھر پوچھا "تمہیں اندر آنے میں اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ میں تمہارے بارے میں پریشان ہو رہی تھی"

"میں صحیح سلامت اور زندہ تمہارے سامنے موجود ہوں" میں نے کہا "تمہیں اطمینان ہو جانا چاہیے بعد میں اپنی تاخیر کا سبب بھی بتا دوں گا"

ہمارے درمیان اس مشن کے لیے منصوبہ بندی پہلے سے طے ہو گئی تھی۔ صدف نے کوٹھی کی زیریں منزل پر رک کر مجھے کور دینا تھا اور مجھے بالائی منزل پر ساحل کی طرف جانا تھا۔ دو پردو مستعد اور مسلح پہرے دار ساحل کی نگرانی پر مامور تھے۔ اس وقت میرے پاس اسلحے کے نام پر صرف ایک ریوالور تھا جو فنشا کی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی میں' میں نے ڈرائیور ریاض علی سے چھینا تھا۔ ریاض علی اس وقت پتا نہیں' کس حال میں ہو گا۔ میں اسے وہاں بے ہوش چھوڑ آیا تھا۔

ہم نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا اشارہ دیا پھر اس سے پہلے کہ ہم اپنی اپنی راہ پکڑتے' حدود دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ چند افراد بڑی افراتفری کے عالم میں کوٹھی کے بیرونی حصے کی جانب آ رہے تھے۔ ہم اس وقت پائیں باغ کے ایک تاریک اور کھوئے کوشے میں کھڑے تھے۔ ہم پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

اس اچانک ہونے والی فائرنگ نے بڑی گڑبڑ پھیلا دی تھی۔ ابھی تک ہمیں فائرنگ کا سبب معلوم نہیں ہو سکا تھا تاہم اس افتاد نے وقتی طور پر ہمارے پروگرام میں رخنہ ضرور ڈال دیا۔ میں خاموش کھڑا چوکنا نظر سے اندرونی حصے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جگہ ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

پھر ان دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ چند انسانی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ چڑھی ہوئی سانسیں ظاہر کرتی تھیں' وہ آوازیں دوڑنے والوں ہی کی ہیں۔ کسی کی بھاری بھرکم جھنجلاہٹ میری سماعت تک پہنچی۔ اس آواز میں ایک مخصوص قسم کی گونج اور رعب پایا جاتا تھا۔

"یار فیصل! تمہارے ابا جی نے خواہ مخواہ اس شخص کا ہوا بنا دیا ہے۔ مجھے تو یہ بہت ہی ڈرپوک لگا ہے۔ دیکھا کس طرح دم دبا کر بھاگ گیا!"

میں تن کر کھڑا ہو گیا۔ میرے تمام ظاہرہ اور باطنی حواس ایک نقطے پر مجتمع ہو گئے۔ فیصل بڑے چوہدری نوازش علی کا بیٹا تھا۔ ابھی تک میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا تاہم اس کے بارے میں' میں نے اچھی خاصی معلومات جمع کر لی تھیں۔ اسے مخاطب کرنے والا یقینی طور پر چھوٹا چوہدری دلدار تھا۔ میں نے فیصل کا جواب بھی سنا۔ اس کے انداز میں جھنجلاہٹ تھی۔

"چوہدری صاحب! اس شخص نے ابا جی کو ایک طویل عرصے سے مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے" فیصل کے لہجے میں حرارت در آئی لیکن میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ یہ شخص بزدل یا کمزور نہیں۔ میں نے کراچی میں اس کے کارناموں کے بارے میں بہت سنا ہے۔ اس نے ہمارے خاص آدمی میاں زاہد حسین کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ میں خود بھی اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہوں مگر میں نے جب بھی ابا جی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا' انہوں نے یہ کہہ کر سختی سے منع کر دیا کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا' میرے بجائے وہ اپنے ہرکاروں دارا اور تارا سے کام لیتے رہے"

وہ لوگ میرے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور میرے ڈرپوک یا بزدل ہونے کو بھی زیر بحث لا رہے تھے۔ فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کوٹھی میں مچنے والی موجودہ ہل چل سے میرا کیا تعلق تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے میری الجھن کی سلجھن مل گئی۔

ایک مانوس آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کی' "کراچی میں وہ اس لیے بھی شیر ہو گیا تھا کہ ہم اس کی

پشت پر موجود تھے'' یہ کبیر شاہ عرف شاہ جی تھا۔ میں اس کے لب و لہجے کو سیکڑوں آوازوں میں پہچان سکتا تھا ''سی ایف کے کے پلیٹ فارم پر وجدان نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان میں ہمارا تعاون شامل تھا۔ ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!'' کبیر شاہ کی آواز میں تذبذب کی جھلک تھی ''اگر وجدان کو اس کوٹھی پر کوئی کارروائی کرنا ہی تھی تو وہ کھلم کھلا اندر کیوں چلا آیا۔ انتہا کو چھوتا ہوا یہ اعتماد بے وقوفی کے زمرے میں آتا ہے اور میرے خیال میں' وجدان اتنا احمق نہیں ہوسکتا!''

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ اسی وقت چوہدری دلدار کے الفاظ مجھ تک پہنچے۔ ''اس حماقت کا مزہ بھی چکھ لیا اس نے۔ اپنی سرخ لینڈ کروزر کے ساتھ ہی اسے سر پر پاؤں رکھ کر فرار ہونا پڑا۔ میرے آدمیوں کی فائرنگ نے اس کے چھکے چھڑا دیے ہیں اور......'' وہ ذرا متوقف ہونے کے بعد بولا ''میں نے اپنے جو خطرناک آدمی اس کے تعاقب میں روانہ کیے ہیں وہ اس کی جان کا عذاب ہو جائیں گے۔ تم دیکھ لینا شاہ جی' وجدان اور اس کی سرخ جیپ بہت جلد ہمارے سامنے ہوگی''

کبیر شاہ نے کہا ''یہ منحوس اسی سرخ جیپ کے ساتھ ''ساؤتھ'' کے قریب بھی دیکھا گیا تھا۔ میں اس واقعے کی تفصیل آپ کو بتا چکا ہوں''

وہ تینوں زیریں منزل کے ایسے حصے میں رک گئے تھے جہاں سے ان کی آوازیں بہ آسانی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ آنے والے لوگ تسلی کے لیے کمروں کی چیکنگ میں لگ گئے ہوں گے خصوصاً بالائی منزل کی چیکنگ جہاں میری کمزوری ساحل کو رکھا گیا تھا۔

اب ساری بات مجھ پر کھل گئی تھی۔ میں جب صدف کے ساتھ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف آ رہا تھا تو کوٹھی کے باہر کھڑی گاڑیوں میں' میں نے نقلی وجدان کی سرخ لینڈ کروزر بھی دیکھی تھی۔ کبیر شاہ اور چوہدری دلدار کی باہمی گفتگو بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت بہروپیے ہی کو اصلی وجدان سمجھ رہے تھے۔ یہ بہروپیا تو میرے لیے بڑی آسانیاں فراہم کر رہا تھا۔ پہلے اس نے لاہور کی سڑکوں پر مجھے الجھا کر کافی وقت برباد کیا۔ اگر میں اس کے چکر میں نہ پھنستا تو بروقت سید پور پہنچ جاتا۔ اس صورت میں' میں ٹویوٹا ہائی ایس کا نظارہ دیکھنے سے محروم رہ جاتا اور ایمبولینس میں موجود کبیر شاہ میری نظر سے اوجھل رہتا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا ہو۔ بہروپیے نے مجھے ساحل تک پہنچانے کے لیے ساری تگ و دو کی ہو!

یہ تمام خیالات سیکنڈ کے دسویں حصے میں میرے ذہن سے گزرے۔ نقلی وجدان کی ہر حرکت میری فیور میں جا رہی تھی۔ اس لمحے ڈارلنگ والا واقعہ بھی میرے ذہن میں گھوم گیا' بہروپیے وجدان نے اپنی تحریروں میں دعویٰ کیا تھا کہ اس نے ڈارلنگ کا قصہ تمام کر کے مجھے اس کے شر سے محفوظ کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں' کوئی بدروح ان دنوں ڈارلنگ پر قابض ہوگئی تھی جو مجھے کوئی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے والی تھی۔

میں نے سرِدست اس کے دعوے کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن موجودہ واقعے نے میری توجہ پھر اسکی جانب مبذول کر دی تھی۔ اس نے چوہدری دلدار کی کوٹھی پر اپنی موجودی ظاہر کر کے ان لوگوں کا دھیان میری طرف سے ہٹا دیا تھا۔ یہ اس کا ایک دوستانہ اقدام تھا' اس طرح وہ مجھے ساحل کو حاصل کرنے کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی' چوہدری دلدار کے بھیجے ہوئے بندے اسے پکڑنا تو درکنار' وہ اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔ نقلی وجدان کا مجھے اچھی طرح تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ کسی چھلاوے سے کم نہیں تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ بہروپیا درحقیقت تھا کون...... اور وہ میری مدد پر کیوں کمربستہ تھا۔ اس عمل میں اس کا کیا مفاد پوشیدہ تھا۔ کوئی کسی کے لیے خواہ مخواہ کچھ نہیں کرتا اور وہ بھی اس کے روپ میں آ کر! میرے سوال کا جواب صرف اور صرف نقلی وجدان ہی دے سکتا تھا' اگر وہ میرے ہاتھ آ جاتا تو!

کوٹھی کے اندرونی حصے سے آوازیں آنا بند ہو چکی تھیں۔ نہ تو دوڑتے ہوئے قدموں کی اور نہ ہی چوہدری دلدار' نبیل اور کبیر شاہ کے باتیں کرنے کی۔ میرا خیال ہے' وہ یہ تسلی کرنے اندر آئے ہوں گے کہ ساحل تو اپنے ''ٹھکانے'' پر محفوظ اور موجود ہے اور اطمینان ہونے کے بعد واپس چلے گئے ہوں گے۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ میں نے ان کی باتیں سن لیں اور مجھ پر حقیقت کھل گئی۔

کوٹھی کے سامنے والے حصے سے اب بھی لوگوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ راگ رنگ کی محفل تو برقرار نہ رہی تاہم اس واقعے پر تبصرے جاری تھے۔ ان لوگوں کی ہنگامی باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ میری طرح صدف نے بھی چوہدری دلدار کی گفتگو سنی تھی۔ وہ بھی معاملے کی تہ تک پہنچ گئی تھی۔

اس نے میرے ہاتھ کو دباتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں کہا ''وجدان! یہاں کی صورتِ حال تو ہمارے حق میں ہموار ہو رہی ہے۔ نقلی وجدان کا رویہ تو دوستوں جیسا نظر آ رہا ہے؟''

میں ابھی اس آفت زادے کی طرف سے کلی طور پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جو سچے دوست ہوتے ہیں وہ یوں سات پردوں کے پیچھے چھپ کر دوستی نہیں نبھاتے' روبرو آ کر مصافحہ اور معانقہ کرتے ہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر دشمن کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں''

وہ بولی ''ممکن ہے' اس کی کوئی مجبوری آڑے آ رہی ہو!''

''دوستی میں کوئی مجبوری اور محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی'' میں نے کہا۔

صدف نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا لیکن دوستی' محبت اور نقلی وجدان کے معاملے میں اس نے مجھ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ موضوع بدلتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

''اب ہمیں کیا کرنا ہے؟'' وہ پوری طرح مستعد نظر آ رہی تھی۔

''وہی' جو کوٹھی میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے طے کیا تھا'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''ٹھیک ہے'' اس نے تائیدی انداز میں کہا ''میں یہیں رک کر تمہارا انتظار کروں یا تمہاری نظر میں کوئی اور جگہ زیادہ موزوں ہے؟'' اس کا انداز مشورہ طلب کرنے والا تھا۔

''فی الحال یہی جگہ زیادہ مناسب ہے'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا'' یہاں سے کوٹھی کا وہ پہلو والا گیٹ زیادہ دور نہیں جس کے باہر ہماری ٹویوٹا کرولا کھڑی ہے اور'' میں ذرا دیر کے لیے رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تم یہیں ٹھہرو' میں مذکورہ گیٹ کا جائزہ لے کر آتا ہوں''

وہ سمجھ گئی کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ ہمارے درمیان طے ہوا تھا کہ اس گیٹ کو ''استعمال'' کے قابل بنایا جائے گا اور میں اسی کام کی تکمیل کے لیے اس طرف گیا تھا۔ مذکورہ گیٹ کے آس پاس نیم تاریکی تھی مجھے اس کے نزدیک جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے محدود فاصلے سے دیکھ لیا کہ اس گیٹ پر تالا موجود نہیں تھا' صرف اس کی اندرونی کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ بہ وقتِ ضرورت ہم اس کنڈی کو کھول کر وہاں سے روانہ ہو سکتے تھے۔ بیرونی جانب سے اس گیٹ کے پاس ہی ہماری گاڑی موجود تھی۔ گاڑی کی پارکنگ کے سلسلے میں' میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔

میں دبے قدموں واپس اس تاریک گوشے میں آ گیا جہاں صدف کھڑی تھی۔ بغلی گیٹ کا جائزہ لیتے وقت میں نے اس طرف بھی نگاہ دوڑائی تھی جہاں شامیانہ تنا تھا۔ کوٹھی کے اس حصے میں مجھے خاصی افراتفری نظر آئی۔ محفلِ موسیقی درہم برہم ہو چکی تھی اور مدعوئین میں سے اکثر واپسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ یہ صورتِ حال ہمارے لیے ذرا مشکل تھی۔ اگر وہ لوگ راگ رنگ میں مصروف رہتے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ نقلی وجدان نے ان لوگوں کی سوچ کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ اب ہمیں اسی رخ کو استعمال کر کے موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ چوہدری دلدار اور اس کے مہمان وغیرہ سب یہ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ انہوں نے وجدان کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ نادان یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا باپ' اصلی وجدان اس وقت ان سے چند قدموں کے فاصلے پر کوٹھی میں موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ اس نے چوہدری دلدار کے ایک مسلح پہرے دار کو چند گھنٹوں کے لیے انٹا غفیل بھی کر دیا تھا۔ جو کوٹھی کی عقبی گلی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

ہم دونوں اس کوٹھی کے بائیں باغ میں موجود تھے۔ صدف نے جس تاریک گوشے میں پناہ لے رکھی تھی وہ درحقیقت ایک چھوٹا سا شیڈ تھا جس کے نیچے پانی والی دو موٹریں نصب تھیں۔ ہماری طرف کسی کا دھیان نہیں جا سکتا تھا ہم حسبِ ضرورت وہاں رک کر وقت گزار سکتے تھے۔ میں صدف کے پاس آیا تو اس نے پوچھا۔

''وجدان! ادھر کیا صورتِ حال ہے؟''

''اطمینان بخش سمجھو'' میں نے کہا ''گیٹ پر صرف کنڈی چڑھی ہے' ہم اسے آسانی سے اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں اور دوسری جانب شامیانہ بھی کسی اجڑی بچھڑی بیوہ کا منظر پیش کر رہا ہے مجھے امید ہے' مزید آدھے گھنٹے کے بعد تمام مہمان رخصت ہو جائیں گے''

''اور وہی ہمارا ایکشن کا وقت ہوگا'' صدف نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک بھرپور نگاہ ڈال کر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا' اس کے لیے مجھے واچ کی لائٹ کا سہارا لینا پڑا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ صدف کے مطابق ہمیں گیارہ بجے ریڈ کرنا چاہیے تھا۔ موسم کی خنکی میں بہ تدریج اضافہ ہو رہا تھا میں نے صدف کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں استفسار کیا۔

''تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟''

میرے لہجے میں پوشیدہ اپنائیت نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی اور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''نہیں' میں ٹھیک ہوں''

اس کے انداز سے خفگی جھلکتی تھی۔ میں نے پوچھا ''کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''وہ ایک جھٹکے سے پلٹی'' وجدان! ایسا خیال تمہارے ذہن میں کیوں آیا''

''تمہارے انداز کو دیکھتے ہوئے'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کیوں' میرے انداز کو کیا ہوا ہے!''

''میں نے پوچھا' تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی اور تم جواب دے رہی ہو' میں ٹھیک ہوں'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''یہ تو وہی بات ہوگئی' اینٹ کا جواب پتھر''

وہ میرے نزدیک کھسکتے ہوئے بولی ''ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ سب تمہارے ذہنی دباؤ کا ثمر ہے۔ اس پریشانی کی کیفیت میں تم میری بات کا کچھ اور مطلب لے گئے ورنہ میں تو یہی کہہ رہی تھی کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی۔ بھلا کسی آتش فشاں کی قربت میں سردی کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔''

وہ بڑی خوبصورتی سے ایک گہری بات کہہ گئی تھی۔ اس نے کسی آتش فشاں کی قربت کا ذکر کیا تھا' اور میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا' وہ ''کسی'' کون ہے۔

میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا ''آتش فشاں سے' حد سے بڑھی ہوئی قربت نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ تمہیں آتش فشاں کی خصوصیات تو معلوم ہی ہوں گی؟''

''اچھی طرح معلوم ہیں'' وہ بہ دستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ''میں نے جاپان اور ہوائی کے خوف ناک آتش فشانوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا ہے اور ان کی ہلاکت خیزی سے بھی اچھی طرح واقف ہوں لیکن میں آج کل جس آتش فشاں کی قربت میں ہوں' اس کا شمار فی الحال خاموش آتش فشانوں میں ہوتا ہے اس لیے خطرے والی کوئی بات نہیں اور ویسے بھی'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر چند لمحات کے لیے خاموش ہوگئی پھر بڑے معنی خیز انداز میں بولی۔

''وجدان! تم جانتے ہو...... اور اگر نہیں جانتے تو جان لو' میں نفع و نقصان کے شمار کو بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں۔ اگر یہ خاموش آتش فشاں بیدار ہوکر کسی قسم کی تباہ کاری پر اتر بھی آیا تو مجھے پروا نہیں ہوگی۔ میں اس کی ذات سے خود کو پہنچنے والے ہر نقصان کو اپنا فائدہ سمجھوں گی۔''

میں حیرت زدہ انداز میں صدف کو تکتا چلا گیا۔ تنہائی کے ان لمحات میں وہ مجھے بہت پیاری لگی۔ پیاری لگنے والے شے کو پیار کیا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں شدت سے یہ خیال ابھرا کہ صدف کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر جی بھر کر پیار کروں لیکن اگلے ہی لمحے کسی قوی جذبے نے اس خیال کو پچھاڑ دیا اور میں بے ساختہ نفی میں سر جھٹک کر رہ گیا۔

''کیا ہوا وجدان؟'' صدف نے تشویش ناک لہجے میں دریافت کیا۔

ہمارے درمیان سرگوشیوں میں بات چیت ہورہی تھی۔

''کچھ نہیں'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور اس گیٹ کی جانب دیکھنے لگا جو ہمارے فرار کا وسیلہ بننے والا تھا۔

''شاید تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہے ہو!''

اس کا اندازہ صد فی صد درست تھا لیکن اس کی تائید نہیں کرسکتا تھا' اس طرح میری سوچ اس پر عیاں ہوجاتی اور اس کا پلا جھکنے لگتا۔ انسان بنیادی طور پر بہت ہی چال باز اور چکر دار ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ذہن کسی کے سامنے کھل جائے۔ میں بھی انسان ہوں اس لیے یہ انسانی ''خوبی'' مجھ میں بھی موجود ہے۔ ساحل والا معاملہ خالصتاً دل کا تھا اس لیے میں بعض اوقات بے اختیار ہوجاتا تھا!

میرا ذہن ایک لمحے کے لیے صدف کی جانب پوری طرح مائل ہوگیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے دل نے میرے خیال کی تکمیل میں روڑا اٹکا دیا۔ میرا دل تو کہیں اور اٹکا ہوا تھا' وہ مجھے بھٹکنے کا موقع کیوں کردیتا۔ ساحل کی محبت نے بروقت میرے باغی خیال کے پاؤں میں احساس کی زنجیر ڈال دی تھی لیکن صدف نے میری کیفیت کو سمجھ لیا۔ وہ زود فہم سراپا قیامت لڑکی ایسی ہی سمجھ دار تھی!

''اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گی!'' میری طویل خاموشی کے جواب میں اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں ناراضی نہیں تھی۔

میں نے گفتگو کے اس انداز کو بدلنے کے لیے دوبارہ رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور وقت دیکھنے کے بعد کہا ''میرا خیال ہے اب مجھے بالائی منزل کی طرف روانہ ہوجانا چاہیے۔ گیارہ بجنے ہی والے ہیں اور کوٹھی میں بھی سکون محسوس ہورہا ہے۔''

''اس سکون سے مطمئن نہیں ہوجانا چاہیے'' صدف نے کہا ''یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہوسکتا ہے۔ نقلی وجدان والے واقعے کے بعد ساحل کی حفاظت کا انتظام اور سخت کردیا گیا ہوگا۔ مجھے تو خطرہ ہے' اگر عقبی گلی والے مسلح پہرے داروں کی حقیقت کھل گئی تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں''

تھوڑی دیر پہلے ہونے والی سرگوشیانہ گفتگو میں' میں نے صدف کو اس شخص کے بارے میں بتادیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم از کم دو گھنٹے تک کسی قابل نہیں ہوسکتا تھا۔ صدف کے خدشات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر وہ بے بس و لاچار شخص کسی کی توجہ حاصل کرلیتا تو کوئی نئی مصیبت کھڑی ہونے کا امکان پیدا ہوجاتا۔ میں نے ریاض علی والا ریوالور اپنے لباس سے نکال کر صدف کے حوالے کردیا۔ اس نے ذرا سے تامل کے بعد وہ ریوالور میرے ہاتھ سے لے لیا۔ مذکورہ ریوالور میں پانچ گولیاں اب بھی لوڈ تھیں۔

''میں تمہارے اندیشوں کی تائید کرتا ہوں'' میں نے کہا ''اس لیے مجھے فوراً ایکشن میں آجانا چاہیے'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا ''تم اپنی جگہ پر چوکنا اور ہوشیار رہنا''

وہ سینہ ٹھونکتے ہوئے بولی ''تم میری طرف سے بے فکر ہوکر جاؤ''

اور میں واقعی بے فکر ہوگیا!

☆☆☆

وہ دو قسم کے پائپس تھے جو کوٹھی کے عقبی حصے میں عمارت کے ساتھ ساتھ زمین سے بالائی منزل کی جانب چلے گئے تھے۔ ان کی ساخت اور سائز کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ چوڑی موری والا پائپ سیوریج کا تھا جب کہ دوسرا آہنی پائپ پانی کے لیے تھا۔ میں نے بالائی منزل تک رسائی کے لیے سیوریج پائپ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور محتاط قدموں سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

میں نے پائپ پر دونوں ہاتھ جما کر اس کی مضبوطی اور نصب کا اندازہ لگانا چاہا تو ماضی کا ایک منظر میرے تصور میں گھوم گیا۔ پلک جھپکتے میں وقت کی اڑان مجھے آٹھ سال پیچھے لے گئی۔ اس وقت میری عمر لگ بھگ بارہ سال تھی۔ میرے والدین کو بے دردی سے قتل کیا جاچکا تھا اور ان کا قاتل دارا میرے تعاقب میں تھا۔ میں اس شیطان صفت انسان سے بچتے بچاتے ایک اسکول کی عمارت میں جا چھپا تھا اور خطرہ ٹل جانے کے بعد میں نے ایک سیوریج پائپ کے سہارے اسکول کی بالائی حصے سے نیچے تک ''سفر'' کیا تھا۔ فرق صرف سمت اور مقامات کا تھا۔ یا پھر حالات کا بھی۔

وہ سنگاپور کے ایک اسکول کی عمارت تھی اور میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر اوپر سے نیچے سفر کیا تھا اور اب میں لاہور (پاکستان) میں تھا' اس وقت میں اپنی عزیز ترین ہستی ساحل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نیچے سے اوپر جارہا تھا۔

انہی خیالات کے دوران میں' میں بہ حفاظت اس کوٹھی کی بالائی منزل تک پہنچ گیا۔ ایک روشن دان کے نزدیک میں نے سیوریج پائپ کو الوداع کہا' اور اچک کر اس روشن دان کے چھجے پر چڑھ گیا۔ میں نے یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ وہ روشن دان مجھے کھلا نظر آیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں اس کھلے ہوئے روشن دان سے جھانک کر اس کمرے کے اندرونی حالات سے واقف ہوسکتا تھا۔

اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہورہا تھا لیکن میں جتنے اہم اور سنسنی خیز مشن پر تھا اس میں موسموں کی سختی بے اثر ہوجاتی ہے اور میں تو اس حوالے سے پہلے ہی بہت سخت جان تھا۔

میں روشن دان کے چھجے پر بیٹھا تھا اور میرا ایک ہاتھ چھت کی منڈیر پر ٹکا تھا۔ اس چھجے اور چھت میں بہ مشکل ایک فٹ کی بلندی حائل تھی۔ ابھی تک کوئی ایسے آثار نظر نہیں آئے تھے کہ وہاں ہماری موجودی کا راز کھل گیا ہو۔ یہ ہمارے لیے ایک مثبت اور مفید بات تھی۔

میں نے بہ دستور چھت کی منڈیر کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اوپری دھڑ کو نیچے جھکایا۔ یہ ایک مشکل عمل تھا جس میں کمر کی لچک نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میں اس پوزیشن میں آگیا کہ کمرے کے اندر جھانک سکوں۔ روشن دان سے ہلکی روشنی پھوٹتے میں پہلے دیکھ چکا تھا اور جب میں نے باقاعدہ اندر کا جائزہ لیا تو مجھ پر عیاں ہوا کہ وہ روشنی اس کمرے سے خارج نہیں ہورہی تھی۔ اس کمرے کی تمام لائٹس آف تھیں اور اس کا داخلی دروازہ آدھا کھلا تھا۔ وہ روشنی اس آدھ کھلے دروازے میں سے کمرے کے اندر پہنچ رہی تھی۔

میں نے بہ غور وہاں کا جائزہ لیا تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ کمرے کے سامنے راہ داری میں لائٹ آن تھی۔ یہ روشنی اسی راہ داری سے آرہی تھی۔ میں نے اسی پوزیشن سے جھکے جھکے راہ داری میں ممکنہ حد تک دیکھنے کی کوشش کی اور اور میری یہ کوشش خاصی سودمند ثابت ہوئی۔ میری نگاہ کے اختتام پر' راہ داری کی دوسری جانب ایک بند دروازہ موجود تھا جو یقیناً مخالف سمت میں پائے جانے والے کسی کمرے کا تھا۔ میں اس کمرے اور بند دروازے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ راہ داری میں کسی کی موجودی کے آثار پیدا ہوئے' پھر ایک مسلح گارڈ میری نظر میں آگیا۔ میرے بدن کا ایک ایک گوشہ پوری طرح الرٹ ہوگیا۔

دراز قامت مسلح گارڈ کے ہاتھ میں ایک نئی نویلی کلاشنکوف اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ گن کا سپورٹنگ بیلٹ گارڈ کے کندھے پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی داڑھی بے ترتیب اور آنکھوں میں سرخی تھی۔ وہ بڑے مستعد قدموں سے چلتے

ہوئے اس کمرے میں داخل ہوا جس کے روشن دان پر میں نے اپنی دور بین آنکھیں فٹ کر رکھی تھیں۔ اگلے ہی لمحے اس نے کمرے میں سے دو کرسیاں اٹھائیں اور باہر نکل گیا۔ اس عمل کے دوران اس نے کلاشن کو ہاتھ سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی کا مالک ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔

میں بڑی باریک بینی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا کہ مجھے چونک جانا پڑا۔ اس شخص نے ایک کرسی راہ داری کی مخالف سمت میں پائے جانے والے بند دروازے کے قریب رکھی اور دوسری کرسی سمیت میری نگاہ کے فریم سے نکل گیا۔ دوسری کرسی وہ کہیں اور رکھنے گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا' اس کے علاوہ بھی وہاں کوئی موجود تھا۔ میری معلومات کے مطابق کوٹھی کی بالائی منزل پر ساحل کی نگرانی کے لیے چوہدری دلدار نے دو مسلح گارڈز کو متعین کر رکھا تھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے جس کلاشنکوف بردار کی جھلک دیکھی' وہ یقیناً انہی گارڈز میں سے ایک تھا۔

میں راہ داری کے پار' بند دروازے والے کمرے اور وہاں رکھی خالی کرسی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ دوسرا پہرے دار بھی مجھے نظر آ گیا۔ وہ ایک دبلا پتلا اور متناسب القد شخص تھا اور اس نے بھی ایک خوف ناک کلاشنکوف اپنے ہاتھوں میں اٹھا رکھی تھی۔ وہ اس بند دروازے کے پاس پہنچ کر رکا۔ اس نے کھلے ہوئے کمرے میں سرسری انداز میں جھانکا اور پھر بڑے چاق و چوبند انداز میں کرسی پر براجمان ہو گیا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں تیز روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور بند دروازے کی مسٹری مجھ پر عیاں ہو گئی۔

اس کمرے میں یقیناً ساحل کو رکھا گیا تھا اور یہ دونوں مسلح گارڈ اس کی نگرانی پر مامور تھے۔ دراز قامت گارڈ واپس نہ پلٹا تو مجھے یقین ہو گیا۔ وہ بالائی منزل کی طرف آنے والے راستے کی نگرانی کر رہا ہوگا' ممکن ہے اس نے زینے کے ساتھ ہی اپنی کرسی ڈال لی ہو۔

اس احساس نے میرے رگ و پے میں بجلیاں سی بھر دیں کہ اس بند دروازے کے پیچھے میری ساحل موجود تھی۔ وہ ایک فلش ڈور تھا اور اس میں ہمیشہ قفل نصب تھا جو یقیناً لاک ہوگا۔ میرے جی میں آئی کہ پرواہ کرتے ہوئے اس دروازے تک پہنچ جاؤں اور اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر شے کو تہ و بالا کر کے رکھ دوں اور میرے لیے یہ سب کچھ ممکن تھا۔ دو مسلح گارڈز کو میں پلک جھپکتے میں چٹکیوں میں اڑا سکتا تھا۔

میں نے روشن دان کے فریم کے وسط میں نصب آہنی راڈ پر ہاتھ ڈالا تو مجھے یوں محسوس ہوا' کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ لامحالہ میری نگاہ کرسی پر بیٹھے مسلح گارڈ کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ میں ساکت ہو کر رہ گیا۔ اگر اس موقع پر وہاں میری موجودگی کھل جاتی تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی لیکن خیریت گزری' گارڈ نے چند لمحے اس سمت دیکھنے کے بعد اپنی توجہ ہٹالی اور بند دروازے کے لاک کو گھورنے لگا۔

اسی لمحے میرے ذہن میں ایک زوردار خیال چمکا۔ اگر میں چھت کے اوپر سے ہوتے ہوئے دوسری سمت چلا جاتا تو اس روشن دان میں جھانکنا ممکن ہو سکتا تھا جس کمرے میں ساحل کی موجودگی یقینی نظر آتی تھی۔ اس طرح مجھے فوری طور پر مسلح گارڈز سے بھی نہ الجھنا پڑتا اور میں اپنی رگِ جاں تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا!

اس خیال کے ساتھ ہی' میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے جسم کو سیدھا کیا اور کوئی آواز پیدا کیے بغیر اچک کر چھت پر پہنچ گیا۔ پھر میں اپنے اندازے کی بنا پر دبے قدموں چلتے ہوئے اپنی مطلوبہ سمت میں آ گیا۔ اگر میں ایک مرتبہ کسی طرح ساحل والے کمرے میں داخل ہو جاتا تو پھر بند دروازہ اور قفل میرے لیے غیر اہم ہو جاتے۔

کھلی چھت پر چاروں جانب اندھیرے کا راج تھا۔ اور یہ میری کارروائی کے لیے خاصا مفید ثابت ہو رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے سردی کا احساس ہوا لیکن میں نے اس احساس کو جوتے کی نوک پر رکھا اور چھت کی دوسری سمت آ گیا۔ میں نے منڈیر کے پاس بیٹھ کر نیچے جھانکا اور ساحل والے متوقع کمرے کی دیوار کا جائزہ لینے لگا۔ حیرت انگیز طور پر اس دیوار میں مجھے کوئی روشن دان دکھائی نہ دیا۔ خاصی نیچے ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی جس کا فاصلہ چھت سے لگ بھگ چار فٹ رہا ہوگا۔ یہ ایک تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

میں نے منڈیر پر بیٹھے بیٹھے گرد و پیش کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس حصے سے میں بہ آسانی ٹیرس پر اتر سکتا تھا۔ ٹیرس پر سے ہوتے ہوئے اس سمت بڑھنا آسان تھا جہاں سے بالائی منزل کے کوری ڈور (راہ داری) تک رسائی حاصل ہو سکے۔ اگر میں اس راستے کو استعمال کرتا تو کہیں نہ کہیں دراز قامت گارڈ سے سامنا ضرور ہوتا۔ یہ تو وہی بات ہوتی کہ میں زینے کے راستے زیریں سے بالائی منزل کی طرف جا رہا ہوں۔ اس صورت میں بھی کچھ اس قسم کی سچویشن پیش آتی۔

بالائی منزل کی چھت پر منڈیر کے ساتھ ساتھ' تھوڑے تھوڑے فاصلے پر آہنی ہک نصب تھے۔ یہ ایک ایسا بندوبست

تھا کہ بہ وقتِ ضرورت چھت پر شامیانہ لگایا جا سکتا تھا۔ میں نے ساحل والے کمرے کی کھڑکی تک پہنچنے کے لیے انہی ہکس کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ دو ہکس کے درمیان تقریباً دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے منڈیر پر بیٹھے ہوئے اپنے دونوں پاؤں کو دو ہکس میں پھنسایا اور بہ آہستگی جسم کو نیچے کی جانب الٹا دیا۔ یہ ایک خطرناک حرکت تھی۔ اگر میرا پاؤں ہک سے نکل جاتا یا سلپ ہو جاتا تو میں سر کے بل ٹیرس پر جا گرتا لیکن خیریت گزری اور میں الٹے لٹکے لٹکے اس کھڑکی تک پہنچ گیا جس کے راستے میں ساحل والے کمرے تک پہنچنا چاہتا تھا۔

وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ کھڑکی اندر سے بند تھی یعنی مکمل بند۔ اس کے ذریعے اندر پہنچنا تو در کنار' کمرے کے اندر جھانکنا بھی ممکن نہیں تھا اِلّا یہ کہ اس کھڑکی پر ''زور آمائی'' نہ کی جاتی...... اور نصف شب کو زور آزمائی کا ایک ہی مطلب ہوتا کہ سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا جائے۔

اب ساحل والے کمرے میں تک پہنچنے کا ایک ہی خاموش وسیلہ باقی رہ گیا تھا۔ میں روشن دان کے ذریعے پہلے اس کمرے میں پہنچتا جہاں سے مسلح گارڈ نے دو کرسیاں اٹھائی تھیں۔ پھر کسی طرح دونوں گارڈز پر قابو پاتا اور اس کے بعد ساحل والے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کرتا۔

میں نے اپنے جسم کو سیدھا کیا اور واپس چھت پر حاضر ہو گیا۔ دبے پاؤں چلتے ہوئے میں نے تاریک چھت کو عبور کیا اور واپس روشن دان والے شیڈ پر پہنچ گیا۔ میں نے سابق طریقے پر عمل کرتے ہوئے اس روشن دان سے کمرے کے اندر جھانکا اور مسلح گارڈ کی پوزیشن کا جائزہ لیا۔ دبلا پتلا گارڈ کرسی پر موجود تھا تاہم اس وقت اس کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بہ آسانی کمرے کے اندر پہنچ سکتا تھا۔

میں نے روشن دان کے شیڈ (چھجے) پر رہتے ہوئے فریم میں نصب آہنی راڈ پر ہاتھ ڈالا اور اسے ایک طرف سے پکڑ کر ہلکی پھلکی زور آزمائی کرنے لگا۔ راڈ کا سرا لکڑی کے فریم میں پیوست تھا۔ میں نے ''جی'' کی قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی توجہ اس نقطے پر مرکوز کر دی کہ وہ راڈ درحقیقت لوہے کی نہیں بلکہ کسی ایسے میٹریل کی بنی ہوئی ہے جس پر تھوڑی سی طاقت صرف کر کے اسے چوبی فریم سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔

جی میں دو عوامل سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک آپ کا ارتکاز اور دوسرے آپ کا یقین یعنی آپ کی طاقتور سوچ۔ میں اس وقت اتنے انہماک کے ساتھ راڈ پر طاقت صرف کر رہا تھا کہ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ میں اسے چوبی فریم سے باہر لانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ جی کی قوت نے کام دکھایا اور میرے ہاتھ میں موجود آہنی راڈ مڑنے لگی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی لیکن میں ان چھوٹی موٹی حیرتوں سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی راڈ کو ایک جھٹکا دیا اور وہ فریم میں سے باہر آ گئی۔ راڈ کے سرے نے فریم کو چھوڑا تو اسے مکمل موڑنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اگلے ہی لمحے میں اس راڈ کو دوسرے نصب سرے پر موڑ کر روشن دان کے فریم سے ہٹا چکا تھا۔ اس کے بعد روشن دان کے پٹ کو الگ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں نے شیشہ جڑے لکڑی کے اس مستطیل تختے کو چھت پر ڈال دیا۔

اب میرے سامنے روشن دان کے نام پر ایک شگاف تھا جس کا سائز ڈیڑھ بائی دو فٹ رہا ہوگا۔ اس مناسب خلا سے جسم کو گزارنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے اپنے اطمینان کے لیے ایک نظر مسلح گارڈ پر ڈالی پھر اس کھلے ہوئے روشن دان میں سے ہوتے ہوئے کمرے کے اندر کود گیا۔

روشن دان سے کمرے کا فرش دس بارہ فٹ کے فاصلے پر رہا ہوگا۔ اس بلندی کا فال (Fall) میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ میں پنجوں کے بل جیسے ہی کمرے کے فرش پر پہنچا' میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ فرنٹ رول کرتے ہوئے خود کو ایک تاریک گوشے میں پہنچا دیا۔ میرا یہ عمل اتنا میکانکی اور سوفٹ تھا کہ اس میں بہ مشکل ایک سیکنڈ صرف ہوا ہوگا۔ کمرے کے اندر کودنے سے لے کر اندھیرے میں پہنچنے تک میں نے سانس روک کر فال اینڈ رول کے اصول پر پوری طرح عمل کیا تھا۔

میں اس وقت کمرے کے جس تاریک گوشے میں موجود تھا وہاں سے ساحل والے کمرے کا دروازہ اور اس کے پاس کرسی پر موجود مسلح گارڈ واضح طور پر مجھے دکھائی دے رہا تھا لیکن گارڈ اگر کوشش بھی کرتا تو میں اسے نظر نہ آتا۔ میں اندھیرے کی آڑ لے کر بہ آسانی اس کا شکار کر سکتا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلانے کے لیے اپنی آواز کو چارے کے طور پر استعمال کیا اور اپنے حلق سے ایک دیسی ''میاؤں'' خارج کی۔

بلی کی مصنوعی آواز نے گارڈ کی سماعت تک رسائی حاصل کی تو وہ چونک کر کمرے کے اندر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں موجود تشویش کو واضح طور پر پڑھ لیا۔

بڑے چوکنا انداز میں' کمرے میں دیکھنے کے بعد وہ راہ داری کی دوسری سمت تکنے لگا میں سمجھ گیا' اس کی توجہ اپنے ساتھی مسلح گارڈ کی طرف پلٹ گئی تھی۔ اسی دوران میں' میں نے نیچے سروں میں ایک اور مصنوعی ''میاؤں'' خارج کی اور آدھ کھلے دروازے کی آڑ میں پہنچ گیا۔ یہ بات خارج از امکان تھی کہ ان میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں کمرے کے اندرونی صورتِ حالات جاننے کے لیے ادھر کا رخ نہ کرتے!

میں سانس روکے ان کا انتظار کرنے لگا۔ چند لمحات کے بعد مجھے دروازے کے قریب قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں پوری طرح الرٹ ہو گیا۔ آنے والے نے کمرے کے اندر قدم رکھنے سے پہلے کسی متوقع بلی کو ہشکارا ''ہش......!''

وہاں کوئی بلی موجود ہوتی تو اس کے عمل کا ردعمل پیش کرتی لیکن اس شخص نے بڑے واضح طور پر بلی کو دو مرتبہ ''میاؤں'' کرتے سنا تھا لہٰذا وہ صرف ایک ''ہش'' پر اکتفا کر کے واپس نہیں جا سکتا تھا چنانچہ اگلے ہی لمحے اس نے ادھ کھلے دروازے کو پوری طرح وا کیا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ گارڈ کی نفسیات کے زیر اثر اس نے ہاتھوں میں دبی کلاشن کو تیار انداز میں تان رکھا تھا جیسی کمرے کے اندر کوئی بلی نہ ہو بلکہ شیر ببر چھپا بیٹھا ہو!

میں اسی موقع کی تاک میں تھا۔ اس شخص کی پشت جیسے ہی میری نگاہ کے سامنے آئی' میں نے ایک جست بھر کر اسے گردن سے دبوچ لیا پھر اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا' میں نے زنبور میں پھنسے ہوئے دانت کی طرح اسے ایک جھٹکے سے تاریک گوشے میں کھینچ لیا۔

یہ وہی دبلا پتلا مناسب قد و قامت کا مالک گارڈ تھا جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے ساحل والے کمرے کے سامنے کرسی پر بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بری طرح میرے بازو کی گرفت میں مچل رہا تھا۔ میں نے اپنا مضبوط بازو اس کی گردن کے گرد بڑے ماہرانہ انداز میں لپیٹ رکھا تھا۔ نیک لاک نامی یہ گرفت بڑی عذابِ جاں ہوتی ہے۔ گرفتار شدہ شخص آزادی کی خاطر زیادہ زور آزمائی کا رسک نہیں لے سکتا ورنہ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ ہر لمحے موجود ہوتا ہے۔

میرے بازو میں دبا ہوا گارڈ گرفت سے نکلنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی ہر کوشش ناکامیاب بنا دی حتی کہ اسے گن استعمال کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ''بلی'' کسی طرح اس کی جان نہیں چھوڑے گی تو اس کے اعصاب کو قدرے قرار آ گیا۔ میں نے محسوس کیا' وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں وہاں اس کی سننے نہیں آیا تھا۔

میں نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جاتے ہوئے سفاک لہجے میں دریافت کیا ''جس کمرے کے سامنے تم پہرا دے رہے ہو' ساحل اس کے اندر ہی ہے نا؟''

میری اس سرگوشی میں ہزار ہا دھمکیاں پوشیدہ تھیں۔ میں نے اس گارڈ کو پشت کے بل اپنے سینے کے ساتھ دبا رکھا تھا لہٰذا وہ مجھے اور میرے چہرے کو دیکھ نہیں سکتا تھا حالانکہ اس کی پہلی کوشش یہی تھی کہ میرا دیدار کر لے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر لب وا کرنا چاہے لیکن میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کا دباؤ بڑھا دیا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی ہلکی سی آواز بھی ان نازک لمحات میں کوئی بہت بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔

میں ایک مرتبہ پھر اپنا منہ اس کی سماعت کی رینج میں لے گیا اور غرا کر دھیمے انداز میں کہا ''جواب دینے کے لیے تمہاری ناپاک زبان کا کھلنا ضروری نہیں۔ تم گردن کو ہاں بانہ میں ہلکی جنبش دے سکتے ہو۔ بتاؤ میری ساحل اسی کمرے میں موجود ہے نا؟''

اس کے کسی جنبش جواب سے پہلے ہی کمرے کے باہر راہ داری میں اس کے ساتھی کے قدموں کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی ایک استفسار یہ جملہ بھی اندر پہنچا۔

''پرویز! تم نے اتنی دیر لگا دی کیا واقعی اندر کوئی بلی موجود ہے؟''

وہ یقیناً اس کا ساتھی گارڈ تھا۔ اس کی بات سے یہ بھی ظاہر ہوا' بلی کی مصنوعی آواز اس دراز قامت بے کلے شخص تک بھی پہنچی تھی۔ میں مزید انتظار کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ گرفت میں آئے ہوئے مسلح گارڈ کا نام میں جان چکا تھا اس لیے میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''گڈ بائے مسٹر پرویز!'' میرے لہجے میں دنیا جہان کی سفاکی سمٹ آئی ''میں اب اپنے سوال کا جواب تمہارے ساتھی سے پوچھوں گا۔ تم نے موقع ضائع کر دیا۔''

پھر میں نے ایک مخصوص تکنیک سے اس کی گردن کی ''مزاج پرسی'' کی۔ اگلے ہی لمحے وہ کسی پژمردہ ترکی کے مانند میرے بازو میں جھول گیا۔ میں نے بہ آہستگی اسے کمرے کے پختہ فرش پر ڈال دیا۔ وہ دو تین گھنٹے کے لیے زندگی کے جھمیلوں سے دور چلا گیا تھا۔

اسی دوران میں دوسرے گارڈ کی تشویش بھری آواز ابھری ''پرویز! تم خاموش کیوں ہو۔ کیا اندر کوئی گڑبڑ ہے؟'' پرویز نامی وہ شخص فی الحال کسی سوال کا جواب دینے کے

قابل نہیں رہا تھا۔ اسی لمحے مجھے ایک خطرناک احساس نے جھنجوڑ ڈالا۔ اگر پرویز کی جانب مکمل خاموشی طاری رہتی تو اس کا ساتھی اندر کی صورتِ حال کی جاننے کے بجائے کوئی اور قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔ اس بات کے ففٹی ففٹی امکانات تھے کہ وہ بھاگ کر دوسرے لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔

ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا! میرے ذہن نے ایک اٹل فیصلہ صادر کیا...... ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اور یہ سوچتے ہی میں تاریک گوشے سے نکل کر اچانک اس شخص کے سامنے آ گیا۔ وہ مسلح گارڈ اپنے ساتھی پرویز کی یا اس کی آواز کی توقع کر رہا تھا' مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ گڑبڑا گیا۔

اور اسی گڑبڑاہٹ میں اس نے اپنے ہاتھ میں دبی کلاشن کا رخ میری جانب کرنے کی کوشش کی۔

کوشش کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ میں نے اس کے ارادے کو عملی جامہ پہننے کا موقع فراہم نہیں کیا۔ ہمارے درمیان بہ مشکل تین فٹ کا فاصلہ تھا' میں نے کسی اسپرنگ کی طرح اچھل کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس کے دونوں بازو میرے جپھے میں آ گئے۔ گن کے استعمال کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور میں نے زبان کے استعمال پر بھی کامل پابندی "عائد" کر دی۔

میں نے ایک دھواں دھار ٹکر اس کے چہرے پر رسید کی۔ اس ٹکر کا خصوصی ہدف اس کی ناک اور ہونٹ بنے لیکن میں نے اسے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ اس تصادم کے نتیجے میں پہنچنے والی تکلیف پر وہ کوئی احتجاج بلند کر سکے۔ میں نے یکے بعد دیگرے اس کے چہرے پر چار پانچ ٹکریں برسائیں تو اس کی بوکھلاہٹ ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔ اسی لمحے میں نے اپنے سر کو اس کی پیشانی سے ٹکرایا۔ یہ ٹکر اتنی شدید اور زوردار تھی کہ اس کے قدم ڈگمگا گئے۔

وہ بڑے خطرناک انداز میں لڑکھڑانے لگا میں کسی آفت کی طرح سے چمٹا ہوا تھا۔ اگر وہ زمین بوس ہو جاتا تو مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑتا اور اس طرح فرش سے ہمارے مشترکہ ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک عظیم الشان دھمک پیدا ہوتی جو زیریں منزل والوں کو اس طرف متوجہ کر سکتی تھی لہٰذا میں نے اس کے گرنے سے پہلے ہی اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور ایک بازو سے پکڑ کر کمرے کے اندر کھینچ لیا۔

اندر پہنچتے ہی گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے زخمی چہرے کو تھام لیا۔ میں نے اس کی کس مپرسی کی پروا کیے بغیر اسے کمرے کے فرش پر اوندھا کیا اور اس کی کمر پر سوار ہو گیا۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ اچانک کس افتاد میں گرفتار ہو گیا ہے۔ میں اسے حالات کو سمجھنے کو موقع نہیں دے سکتا تھا لہٰذا اس کی گردن کو بائیں بازو کی لپیٹ میں لے کر میں نے بالوں سے پکڑ کر اس کے سر کو فرش سے تھوڑا بلند کر لیا' اس کے ساتھ ہی میں نے غراہٹ آمیز انداز میں اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی۔

"پرویز نے مجھے بتا دیا ہے کہ سامنے والے کمرے میں ساحل موجود ہے۔ وہی ساحل جسے آج دوپہر کو موضع رکھاں والی یہاں سے پہنچایا گیا ہے۔ تم دونوں کی نگرانی پر مامور ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کا دباؤ قدرے کم کیا تاکہ وہ کوئی واضح جواب دینے کی پوزیشن میں آ سکے۔

اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز بلند ہوئی "تت...... تم...... کون ہو؟"

"صرف میرے سوال کا جواب دو" میں نے اس کے دبوچے ہوئے بالوں کو ایک زوردار جھٹکا دیا "اگر اب تم نے کوئی سوال کیا تو میں تمہیں بھی وہیں پہنچا دوں گا جہاں پرویز کو پہنچایا ہے۔"

"پرویز...... کہاں...... ہے......؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس کا یہ سوال فطری اور صورتحال کے عین مطابق تھا۔ میں نے سفاکی سے کہا "وہیں جہاں سے کوئی پلٹ کر نہیں آتا۔ کیا ارادہ ہے' تم وہاں جانے کے لیے تیار ہو؟"

اندھیرے کے باعث میں اس کے چہرے کے تاثرات کو انجوائے کرنے سے قاصر رہا تاہم اس کی آواز میں پوشیدہ سراسیمگی نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ وہ میرے "اسٹائل" سے خاصا مرعوب نظر آتا تھا۔

"تت...... تم...... بہت غلط کر رہے...... ہو!" وہ لکنت زدہ انداز میں منمنایا۔

"غلط اور صحیح کا فیصلہ کرنے کے لیے میں نے تمہیں جج مقرر نہیں کیا" میں نے وحشت کے عالم میں کہا "مجھے صرف جواب چاہیے۔ کیا میری ساحل اس بند کمرے میں موجود ہے؟ اگر تم نے دائیں بائیں کی کوئی پھینکی تو میں تمہاری گردن کا کچومر نکال دوں گا"

بات ختم کرتے ہی میں نے اس کی گردن پر دباؤ اچانک بڑھا دیا پھر اسے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن کو اس طرح اضطراری انداز میں جھٹکنے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

اس کا یہ ردعمل میرے عمل کا نتیجہ تھا۔ انتہائی بے بسی کے عالم میں اس نے پھنسی پھنسی آواز میں اس بات کی تصدیق کی کہ مذکورہ کمرے میں ساحل کو نظربند کر دیا گیا ہے۔

میرے رگ و ریشے میں بجلیاں سی کوندگئیں۔ میں اگلے ہی لمحے اس کمرے میں پہنچنے کا خواہش مند تھا لہٰذا اپنی گرفت میں آئے ہوئے شخص کا حساب نمٹانا ضروری ہو گیا۔ میں نے اسے خوف زدہ کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔ پرویز نے مجھے ساحل کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور نہ ہی میں نے اسے عدم آباد روانہ کیا تھا لیکن میری یہ چال کامیاب رہی اور پرویز کا ساتھی دہشت زدہ نظر آنے لگا۔ میں نے اس غفلت کی دنیا میں پہنچانے سے پہلے چند ضروری اور مفید سوالات کیے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میری سرگوشی سے وحشت ٹپکتی تھی۔

"سلیم" اس نے بتایا۔

"مجھے پتا چلا ہے' تم دونوں میں سے ایک چوہدری دلدار کا بندہ ہے اور دوسرا کبیر شاہ کے ساتھ کراچی سے آیا ہے" میں نے پوچھا "تم کس کے بندے ہو' کبیر شاہ یا چوہدری دلدار کے؟"

وہ ہکلایا "میں چوہدری صاحب کا بندہ ہوں۔ کراچی سے آنے والا پرویز تمہارے ہاتھوں جان سے ہار گیا"

اس کے آخری جملے نے ثابت کر دیا کہ وہ میری بات پر کن و عن یقین کر بیٹھا تھا جس کا یہی مطلب تھا' میری دہشت نے اس کے دل و دماغ پر بسیرا کر لیا تھا۔

میں نے استفسار کیا "اس وقت تم دونوں کے علاوہ بالائی منزل پر اور کون کون ہے۔ میرا مطلب ہے ساحل کو چھوڑ کر؟"

"کوئی نہیں" اس نے تعاون آمیز انداز میں بتایا۔

"ساحل اس کمرے میں بالکل اکیلی ہے؟" میں نے پوچھا۔

مجھے اثبات میں جواب ملا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔

"زیریں منزل پر کتنے افراد موجود ہیں؟"

اس نے بتایا "چوہدری صاحب کے علاوہ کبیر شاہ' فیصل صاحب' دو محافظ اور دو عورتیں ہیں"

اس کے جواب سے اندازہ ہو گیا' وہ زیریں منزل سے پوری رپورٹ میں تھا اور تازہ ترین معلومات اسے حاصل تھیں اس کا مطلب ہے' وہ خاصا ہوشیار اور کام کا بندہ تھا پھر میں نے عورتوں کے حوالے سے پوچھا۔ اس باخبر آدمی کو نچوڑنا ازحد ضروری تھا۔

"تم نے جن دو عورتوں کا ذکر کیا ہے' کیا ان کا تعلق چوہدری کی فیملی سے ہے؟"

اس نے نفی میں گردن کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ ناکامیابی کے بعد اس کی زبان سے ادا ہوا "وہ دونوں پیشہ ور عورتیں ہیں"

میں ایک لمحے میں سمجھ گیا کہ انہیں وہاں کس مقصد سے لایا گیا ہوگا۔ میں نے سلیم نامی اس شخص سے پوچھا "میری معلومات کے مطابق مسلم ٹاؤن والا منشا بھی دوپہر میں ساحل کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ کیا وہ واپس چلا گیا؟"

"منشا صاحب اپنے تین آدمیوں کے ساتھ وجدان کے تعاقب......" وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو پھر متذبذب لہجے میں بولا "میں نے صرف تمہاری ایک جھلک دیکھی ہے اور مجھے یاد آ رہا ہے تم وجدان سے گہری مشابہت رکھتے ہو' کہیں تم......" اس نے دوبارہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں سمجھ گیا' وہ اس وقت کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا تم نے وجدان کو دیکھ رکھا ہے؟"

"وجدان کو تو نہیں دیکھا البتہ اس کی تصویر دیکھنے کا مجھے موقع ملا ہے" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا "میں نے سنا ہے وجدان بہت ہی سفاک اور خطرناک انسان ہے"

"تم نے بالکل درست سنا ہے" میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا "خیر' اب تو تم عملی طور پر مجھے بھگت رہے ہو۔ تمہیں میری سفاکی اور خطرناکی کا کامل یقین آ گیا ہوگا!"

"تت...... تو میرا اندازہ صحیح ہے" وہ ہکلایا "تم وجدان ہی ہو؟"

"کیا تمہیں کسی قسم کا شک و شبہ ہے؟"

ہمارے درمیان وہ سرگوشیانہ گفتگو اندھیرے میں ہو رہی تھی۔ زیریں منزل والوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اوپر بازی کس طرح پلٹ چکی ہے۔ سلیم کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

"اگر تم وجدان ہو تو پھر تمہاری دلیری کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے شدید فائرنگ کے نتیجے میں تمہیں یہاں سے اپنی جیپ میں فرار ہونا پڑا تھا اور اب تم دوبارہ یہاں نظر آ رہے ہو......"

میں نے ان تعریفی کلمات کو نظرانداز کرتے ہوئے قطع کلامی کی "کیا واقعی میں اس اندھیرے میں تمہیں نظر آ رہا ہوں؟"

''مم...... میرا مطلب ہے تم نے بتایا ہے کہ تم ہی وجدان ہو!'' وہ گڑبڑا گیا۔

''تو تم نے میرے کہے کا یقین کرلیا ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ساتھ سوال و جواب میں زیادہ وقت صرف کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے اس کی ''گلوخلاصی'' کرنے سے پہلے ''ساحل والے کمرے کو یقینی طور پر لاک کیا گیا ہوگا؟''

اس نے ہاں میں جواب دیا۔ میں نے جاننا چاہا ''اس کمرے کی چابی کس کے پاس ہے؟''

''چوہدری صاحب کے پاس''

''تم مجھے چکر دینے کی کوشش تو نہیں کررہے؟''

''تم چاہو تو مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لو'' وہ گھگیاہٹ سے مشابہ آواز میں بولا'' میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ چابی واقعی چوہدری صاحب کے پاس ہے۔ ہمیں صرف اس کمرے کی نگرانی کا حکم ہے۔ ہم تو اس کمرے کے دروازے کو چھو بھی نہیں سکتے۔ چوہدری صاحب نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ اس لیے تھوڑا فاصلہ رکھ کر ہم یہاں پہرا دے رہے ہیں''

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا ''اس ممانعت کی وجہ کیا ہے۔ کیا اس کمرے کے دروازے کے ساتھ کوئی مخصوص قسم کا بم منسلک ہے جو اسے چھوتے ہی بلاسٹ ہو جائے گا؟''

''پتا نہیں' ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں'' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولا'' ہم چوہدری صاحب سے کسی قسم کا سوال نہیں کرسکتے۔ بس گردن جھکا کر ان کا حکم سنتے ہیں اور اس حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔''

میں نے بم اور بلاسٹنگ کی بات خواہ مخواہ ہی کردی تھی۔ دراصل سلیم کی بات نے مجھے جھنجلا دیا تھا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ دروازے کو چھونا تک نہیں۔ اس معاملے کی وضاحت تو صرف اور صرف چوہدری دلدار ہی کرسکتا تھا۔

میں نے سلیم نامی اس مسلح محافظ جواب غیر مسلح ہوچکا تھا' سے الوداعی انداز میں کہا'' تم نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے اس لیے تمہیں اس کا انعام ملنا چاہئے میں تمہیں جان سے نہیں گزار رہا البتہ دو تین گھنٹوں کے لیے تمہارا ناتا اس دنیا سے کٹ جائے گا۔''

پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا' میں نے بڑی سرعت کے ساتھ اسے بھی اسی سلوک کا مستحق ٹھہرایا جو سلوک میں اس کے ساتھی پرویز کے ساتھ کرچکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے نیند کے مارے کسی فرماں بردار بچے کی طرح گردن ایک طرف ڈال دی۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس کی پشت سے نیچے اتر آیا۔ اب میرا راستہ صاف ہوچکا تھا۔ بالائی منزل پر میرے اور ساحل کے سوا کوئی تیسرا شخص موجود نہیں تھا۔ سلیم اور پرویز کو سردست موجودات میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں کہ انہیں مطلق خبر نہیں تھی وہ اس وقت کہاں ہیں ...... اور جہاں بھی ہیں' وہاں مزید کتنی دیر تک رہیں گے۔

اس احساس نے میری دھڑکن کو بے طرح بڑھا دیا کہ اب میرے اور ساحل کے درمیان کوئی بھی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر اندر جانا تھا اور اپنی ساحل سے جا لگنا تھا۔ ایک صبر آزما انتظار اور زبردست مارا ماری کے بعد وہ لمحات گرفت میں آئے تھے۔

اس وقت میرا دل شوریدہ سر جذبات سے لب ریز تھا۔ میں اپنی کیفیت کی حقیقت کو بیان سے کرنے سے قاصر ہوں۔ شاید کوئی بھی ان لمحات کی تفصیل کو بیان نہیں کرسکتا۔ میرا پورا وجود سمٹ کر ایک طوفان کی شکل اختیار کرچکا تھا جس کی موجوں میں بڑی تڑپ تھی۔ یہ موجیں بڑی شدت سے اپنے ساحل تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا کہ مجھ سے پہلے میرا دل سینے کا پنجرہ توڑ کر بند کمرے میں پہنچ جائے گا!

میں نے کارروائی زدہ کمرے کو چھوڑنے سے پہلے سلیم اور پرویز کی کلاشنکوفز کو اپنے قبضے میں کیا۔ ان گنوں کے ساتھ مضبوط بیلٹ بھی منسلک تھے اور انہیں بہ آسانی شولڈر پر ٹانگا جاسکتا تھا۔ میں نے پرائمری اسکول کے کسی بچے کی طرح ایک کلاشن کے بیلٹ میں سے گردن کو گزارا اور اسے کندھے پر سنبھال لیا' دوسری گن میں نے ہاتھ میں لے لی۔ وہ دونوں نئی نکور اور پوری طرح لوڈڈ خطرناک گنیں تھیں جن کی ضرورت کسی بھی موقع پر پیش آسکتی تھی۔

میں نہیں جانتا تھا' ساحل کس حال میں ہوگی۔ میری اب تک کی معلومات کے مطابق اسے بے ہوشی کی حالت میں رکھاں والی سے لاہور پہنچایا گیا تھا۔ پتا نہیں' یہ کسی خواب آور دوا کا اثر تھا یا خدانخواستہ وہ بیمار تھی! بہرحال' واپسی کے راستے میں کسی بھی سنگین ترین صورتِ حال سے سامنا ہوسکتا تھا۔

میں نے کمرے سے باہر آکر راہ داری میں دونوں جانب محتاط نظر سے دیکھا اور اپنے مطلوبہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ زیریں منزل سے کسی قسم کی آواز نہیں ابھر رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہاں موجود لوگ پرسکون اور آرام سے

سو رہے ہیں اور اب فکرمندی یا خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ وہ وجدان کو پسپا کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور اب فکرمندی یا خطرے والی کوئی بات نہیں' ویسے بھی منشا اپنے تین حواریوں کے ساتھ ''وجدان'' کے تعاقب میں گیا تھا۔ وہ خالی ہاتھ یا ناکامیاب ہونا برداشت نہ کرتا' چاہیے اس کے لیے اسے یہ رات کوٹھی سے باہر کالی کرنا پڑتی۔ منشا میری طرف سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا جس کی وجہ سے چوہدری دلدار کی نظر میں اس کی سابق پوزیشن متاثر ہورہی تھی۔ وہ اپنی صفائی میں کسی بھی حد سے گزر سکتا تھا۔

اس بات کی امید کم ہی تھی کہ آج کی رات اس کوٹھی میں کوئی سوسکے۔ میری دہشت سے وہ انکار نہیں کرسکتے تھے اور خاص طور پر نقلی وجدان نے وہاں انٹری دے کر صورتِ حالات کو بہت سنسنی خیز بنادیا تھا۔ جب تک منشا اور اس کے ساتھ جانے والے واپس نہ آجاتے یا ان کی طرف سے کوئی خبر یہاں موصول نہ ہوجاتی' کوٹھی کے مکین چوہدری دلدار اینڈ کمپنی آنکھ نہیں لگا سکتے تھے...... اور ویسے بھی ان لوگوں نے جاگنے اور جگانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ دو پیشہ ور عورتیں وہاں نیند پوری تو نہیں کرنے آئی تھیں!

میری اس طویل داستان کو پڑھنے والے چند قارئین کا خیال ہے' بعض اوقات میں کسی واقعے کی تفصیل میں بہت دور چلا جاتا ہوں جس سے بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ شکایت اگرچہ درست ہے لیکن بیان کردہ تفصیل کا تعلق میری سوچ سے ہوتا ہے نہ کہ کسی حالیہ منظر کی جزئیات سے۔ انسانی دماغ کے سوچنے کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک لمحے میں جانے کتنے واقعات دماغ کے اسکرین پر جل بجھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

بہرحال' راہ داری کی صورت حال سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے بند دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تاکہ وہ بند دروازہ کھولنے یا کھلوانے کا فیصلہ ہوتا لیکن میں نے جیسے ہی ہینڈل کے لٹو کو گھمانے کی کوشش کی' ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔

پوری راہ داری ایک مخصوص قسم کے سائرن سے گونجنے لگی۔ سائرن کا انداز ایسا تھا جیسے کوٹھی کے مکینوں کو کسی خطرے سے آگاہ کیا جارہا ہو۔ عام طور پر اینٹی برگلری سائرن اسی انداز میں شور مچاتے ہیں۔

میں اس غیر متوقع صورتحال سے بوکھلا گیا۔ یہ ممکن نہیں تھا' اس سائرن کی آواز چوہدری دلدار اور دیگر افراد تک نہ پہنچے۔ یہ سائرن تو اسی آگاہی کے مقصد سے نصب کیا گیا تھا۔ دروازے کے ہینڈل کے ساتھ کوئی ایسی ''کاری گری'' کی گئی تھی کہ چوہدری دلدار کے علاوہ اگر کوئی شخص اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتا تو فوراً پکڑ میں آجاتا۔ شاید اس لیے وہاں متعین گارڈز کو دروازہ چھونے سے منع کیا گیا تھا۔ وہ دونوں اس دروازے کی حقیقت سے ناواقف تھے یا یہ بھی ہوسکتا تھا' سلیم کو اس سائرن کی اچھی طرح خبر ہو اور اس نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے یہ نکتہ مجھ سے چھپالیا ہو۔ بہرحال' ساحل کو بڑے انتظامی انداز میں اس کمرے میں بند کیا گیا تھا۔ وہ لوگ ساحل کی اہمیت کو اچھی طرح جانتے تھے۔

جو لمحہ میں نے بوکھلانے میں صرف کیا' اس کے اختتام پر زیریں منزل بیدار ہوگئی اور بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ آوازیں بہ تدریج بالائی منزل کی طرف آرہی تھیں۔ اب تک سب ٹھیک تھا مگر اس بدمعاش سائرن نے بالکل آخری مرحلے پر گڑبڑ کردی اور گڑبڑ بھی ایسی جس کی گونج پوری کوٹھی میں سنائی دے رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھ تک پہنچ پاتے' میں نے زبردستی کمرے میں گھسنے کا فیصلہ کرلیا یہ فیصلہ سیکنڈز کے ہزارویں حصے کا کرشمہ تھا میں نے ہاتھ میں دبی ہوئی کلاشنکوف کو بھی گردن پر سے گزار کر گلے میں لٹکایا پھر ایک طویل سانس کھینچی اور ''چی'' کی قوت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کیا پھر میں نے دروازے کے ہینڈل کے نزدیک ہی' ایک جھٹکے سے سانس چھوڑتے ہوئے ڈبل ہینڈ پش آزمایا۔

میری ہتھیلیوں کی مربوط ٹھوکر میں اس بلا کی قوت پوشیدہ تھی کہ دروازے کا لاک آن واحد میں ٹوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی فلش ڈور کا سنگل پٹ اس طرح کھلا جیسے کسی خوفناک سمندری طوفان کی زد میں آئے ہوئے بحری جہاز کا کوئی تختہ جدا ہوتا ہے۔ میں لپک کر کمرے کے اندر پہنچا اور بڑی سرعت سے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔

دروازے کی پشت پر ایک مضبوط کنڈی نصب تھی' میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو بولٹ کردیا۔

اسی وقت باہر سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اب وہ لوگ دروازہ توڑے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے اور اگر وہ واقعی ایسا کر گزرتے تو میں انہیں بھون کر رکھ دیتا۔ میرے بدن پر دو بھری ہوئی ہلاکت خیز کلاشنکوفز تمغوں کی طرح سجی تھیں جن کے استعمال میں کسی قسم کی مصلحت یا دریغ کا وقت گزر چکا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے ساحل کی طرف بڑھ گیا لیکن...... میری جانِ تمنا اس کمرے میں موجود نہیں تھی!

یاالٰہی! یہ کیا ماجرا تھا؟ میں اس مایوس کن صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے چند سیکنڈ کے اندر اس کمرے کا

کو کونا چھان مارا لیکن وہ کمرا ساحل کے وجود سے خالی تھا۔ اس کے در و دیوار اور اس کے اندر موجودات سے ساحل کی خوشبو نہیں آ رہی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے کسی خفیہ جگہ چھپا کر رکھا گیا ہو۔ وہاں چھپنے اور چھپانے والا کوئی قصہ ہی نہیں تھا۔

اس کمرے کے اندر برائے نام سامان تھا۔ ایک اسٹینڈ پر دیوار کے ساتھ بڑے اسکرین والا ٹی وی رکھا تھا۔ اس کے سامنے والی دوسری دیوار کے نزدیک ایک صوفہ سیٹ نظر آ رہا تھا اور بس! کمرے کے اندر مناسب روشنی کا بندوبست تھا۔ ان مختصر ترین لوازمات میں، میں اپنی ساحل کو کہاں تلاش کرتا۔ وہ کوئی ننھی سی سوئی نہیں تھی کہ اسے کہیں بھی رکھ کر نظروں سے اوجھل کر دیا جاتا۔ میرا دماغ اس صورت حال پر گھوم کر رہ گیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا، دروازے کو پیٹنا بند کر دیا گیا تھا یا تو وہ لوگ واپس چلے گئے تھے یا پھر ناکام ہو کر انہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور دروازے کے باہر ہی موجود تھے۔ بے مہار شور بلند کرنے والا وہ بدمعاش سائرن بھی خاموش ہو چکا تھا۔ یقینی طور پر اسے آف کیا گیا ہو گا! اس سے پہلے کہ میں کوئی قدم اٹھاتا، اسٹینڈ پر رکھے ٹی وی کا اسکرین روشن ہو گیا پھر اس روشن مستطیل پر ایک انسانی چہرہ نمودار ہوا۔

وہ بڑے جاہ و جلال اور کر و فر والا چہرہ تھا۔ کلوز اپ میں وہ شخص بڑا بارعب نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچپن کے قریب لگایا۔ اس کے گیٹ اپ اور حلیے کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو نام چمکا وہ چوہدری دلدار کا تھا۔ ازاں بعد اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ چوہدری دلدار بڑی حد تک انڈین فلموں کے ایک معروف ویلن سے مشابہ تھا۔

میں یک ٹک اسے دیکھے چلا جا رہا تھا کہ وہ زیر لب مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ نے مجھے بتا دیا کہ اس وقت کہیں بیٹھا وہ بھی مجھے دیکھ رہا ہے اور میری حیرت آمیز جھنجلاہٹ سے محظوظ بھی ہو رہا ہے۔ اچانک اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"ویل کم مسٹر وجدان!" اس کے لب و لہجے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی روایتی قسم کا ان پڑھ اور جاہل چوہدری نہیں جو صرف ظلم کرنا جانتا ہے بلکہ وہ مجھے تعلیم یافتہ محسوس ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا "اس طرح چوہے دان میں پھنسنے پر تمہیں افسوس تو ہو رہا ہو گا لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔ شکار اور شکاری کا کھیل ایسے ہی تماشے دکھاتا ہے۔" وہ ایک لمحے کو رکا پھر سلگانے والے انداز میں بولا "ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تم جھلک دکھا کر غائب ہو گئے تھے۔" اس کا اشارہ یقیناً نقلی وجدان کی طرف تھا "میں تو یہی سمجھا تھا کہ اب تم ادھر کا رخ نہیں کرو گے اسی لیے میں نے تمہاری تلاش میں اپنے بندے دوڑا دیے تھے [illegible] بھی۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ستائشی نظر سے مجھے دیکھنے لگا اور بولا "تم نے جس جی داری کا ابھی مظاہرہ کیا ہے، میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میرے دو مسلح گارڈز کو تم نے پہلے سے انا غفیل کر دیا اور اس کمرے میں پہنچ گئے۔ چوہدری دلدار تم جیسے بہادر دشمن سے مل کر خوش ہوا ہے! کیونکہ اس واقعے سے پہلے میرا خیال تھا، تم بہت ہی بزدل اور ڈرپوک ہو مگر بھئی، تم بھی کیا کرو!" وہ ذرا دیر کو چپ ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے تمہارے لیے چارا ہی اتنا زبردست لگایا ہے کہ تم اس کی بو سونگھتے ہوئے ایک بار کیا، دو مرتبہ کیا، ہزار دفعہ ادھر آؤ گے۔"

چارے سے اس کی مراد ساحل تھی۔ میں ساحل کے لیے اس قسم کی گھٹیا تشبیہ سے سلگ اٹھا بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔

"چوہدری دلدار! اگر تمہاری بکواس ختم ہو چکی ہو تو مجھے بتاؤ، میری ساحل کو تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"غصے کے بہت تیز اور زبان دراز بھی ہو۔" وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولا "دشمن جی دار ہو اور غصہ ور بھی تو اس سے دو دو ہاتھ کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہارے ہاتھ پاؤں بڑے تسلی آمیز انداز میں توڑوں گا۔"

وہ یقیناً مجھے غصہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میرے چہرے کے تاثرات کو بھی بخوبی ملاحظہ کر رہا تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ اس وقت کبیر شاہ اور نیفل بھی اس کے آس پاس موجود ہوں گے اور مجھے کسی ٹی وی اسکرین پر جھنجلاتے ہوئے دیکھ رہے ہوں گے۔ میں جس کمرے میں کھڑا تھا اسے کلوز سرکٹ ٹی وی نظام کی بدولت کہیں اور دیکھا جا رہا تھا۔ چوہدری دلدار نے اس کمرے کو چوہے دان کا نام دیا تھا اس کا یہی مطلب تھا، وہ کمرا خاص طور پر اسی مقصد کے لیے "تیار" کیا گیا تھا۔

چوہدری دلدار نے شاید میرے خیالات پڑھ لیے، معلومات افزا لہجے میں بولا "میں نے یہ کمرا اپنے دشمنوں کی بے خبری میں انہیں واچ کرنے کے لیے خصوصی طور پر سیٹ کروایا ہے اور بوقتِ ضرورت میں ان سے رابطہ بھی کر لیتا ہوں جیسا کہ اس وقت تم سے بات ہو رہی ہے۔ اگر میں خود کو تم پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تو ٹی وی اسکرین روشن نہ ہوتا اور تم اسے کوئی خراب ٹی وی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے مگر میں تمہاری

حرکات کو نوٹس کرتا رہتا۔ اس کمرے اور کمرے میں ...ے کو دیکھنے کے لیے میں نے چار مختلف مقامات پر ... انہیں نصب کروا رکھا ہے جو میری مرضی کے ... وہاں کی تفصیل دکھاتی ہیں۔" وہ اس کمرے میں ... کیمراز کا ذکر کر رہا تھا جن کی بدولت یہاں کے ... اور دیکھے جا رہے تھے "میں نے ایک بہت بڑے ... خدمات حاصل کر کے یہ نظام نصب کروایا ہے۔ اس ... ٹی سی (ٹیلی کمیونی کیشن) کے شعبے میں بہت ... انجام دیے ہیں۔"

"...گر یہ سب کچھ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو۔" میں نے چڑ ... میں شارٹ کٹ ٹی وی نظام اور اس کی کارکردگی سے ...ف ہوں۔"

...میری بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "فرق ... کہ آج سے پہلے میں اپنے شکار کو خود اس کمرے ... کرتا تھا۔ تم پہلی مرتبہ از خود اس میں داخل ہوئے ... داخل ہوئے ہو بلکہ تم نے اندر سے دروازہ بھی ...ے۔ میں چاہوں تو دروازہ تڑوا کر کمرے کے اندر پہنچ ... لیکن میں خوامخواہ کی توڑ پھوڑ کا قائل نہیں۔ تمہیں اس ...ے باہر لانے کے میرے پاس ایک سو ایک طریقے ..." چند لمحے خاموش رہا پھر تنبیہ کرنے والے انداز میں ... بات ذہن میں رکھنا وجدان! از خود یہاں سے فرار ... کوشش نہ کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔ کمرے کے ...ے مستعد گن برداروں کو متعین کر دیا ہے اور انہیں حکم ... تمہیں دروازے سے باہر آتا دیکھتے ہی گولیوں ...اڑا دیں۔ تم جانتے ہو، طاقت ور لوگوں کے نمک خوار ... مطیع و فرماں بردار ہوتے ہیں؟"

... مجھے ڈرانے اور دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ... اس قسم کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں تھا۔ میں ... آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"چوہدری دلدار! تم بہت ہی ذلیل اور گھٹیا انسان ہو۔ ...ت ور کہتے ہو مجھے بہادر دشمن مان کر دو دو ہاتھ کرنے ... مند بھی ہو اور کسی پردہ نشین بیوہ کی طرح سات ... چھپ کر بیٹھے ہو۔ شرم میں ڈوب مرو کسی زنخے کی ... دانستہ اسے برہم کرنے کی کوشش کر رہا تھا "مجھ ... زمائی کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو سامنے آؤ۔ تمہیں پتا ... گا کہ وجدان کس طوفان کا نام ہے!"

"حوصلہ رکھو، حوصلہ۔" وہ پھنکار سے مشابہ لہجے میں بولا "...ان گندی حرکتوں سے مجھے غصہ نہیں آئے گا۔ میں جانتا ہوں، چھری کے نیچے آیا ہوا شکار اسی قسم کی اوچھی اچھل کود کرتا ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہیں ہر نوعیت کی زور آزمائی کا موقع دوں گا۔"

مجھے اس وقت دو ہستیوں کی فکر نے گھیرے رکھا تھا۔ اول، ساحل کہاں تھی؟ دوئم، صدف کیا کر رہی تھی؟ ساحل اس کمرے میں نہیں پائی گئی تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ زیریں منزل پر کہیں موجود تھی اور صدف...... اس نے بھی کوٹھی میں گونجنے والے خطرناک سائرن کی آواز سنی ہو گی اور اس کے بعد وہاں مچنے والی افراتفری بھی اس سے پوشیدہ نہیں رہی ہو گی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اب تک خاموش کیوں ہے! اس قسم کی صورت حالات میں تو اسے فوراً میدان میں کود جانا چاہیے تھا۔ میں اس کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

ساحل کے لیے میری تشویش بھی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ اس کوٹھی کے باورچی اللہ رکھا سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق ساحل کو کوٹھی کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا۔ سلیم کا بھی یہی بیان تھا لیکن ساحل اس کمرے میں نہیں پائی گئی تو اس سے واضح ہو گیا، چوہدری دلدار بہت ہی گہرا آدمی ہے۔ وہ بعض حساس اور نازک معاملات کے بارے میں اپنے قریبی لوگوں کو بھی کچھ نہیں بتاتا۔ سلیم اور پرویز بڑی تن دہی سے اس کمرے کے باہر پہرا دے رہے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہیں دروازے کو چھونے سے بھی منع کر دیا گیا۔ درحقیقت اس دروازے کے ہینڈل کے ساتھ کوئی ایسا میکنزم کام کر رہا تھا جو سائرن کو آپریٹ کرتا تھا۔ یہ فریکوئنسی اور الیکٹرونکس کا دور ہے۔ اس قسم کے کھیل تماشے عام سی بات ہے۔

ایک مرتبہ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے چوہدری دلدار میری سوچ تک پہنچ گیا ہو۔ اس نے معتدل انداز میں کہا "اس کمرے کی مسٹری میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے صوفے پر بیٹھ جاؤ، پھر بات کرتے ہیں۔"

دراصل وہ کسی دوسرے کمرے میں بیٹھا میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا اور چہرہ دل و دماغ کی کتاب کہلاتا ہے۔ وہ میری سوچ اور خیالات کو نہیں بلکہ میرے چہرے کو پڑھ رہا تھا اور سچویشن کے مطابق بالکل درست اندازے لگا رہا تھا۔

میں نے کھڑے کھڑے کمرے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ٹیلی کیمراز مجھے کہیں نظر نہ آئے۔ ظاہر ہے، وہ کیمراز اس لیے نصب نہیں کیے گئے تھے کہ ہر خاص و عام کی نظر ان پر پڑے۔ چوہدری دلدار کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سلیم اور پرویز کی حالت تو میرے علم میں آ چکی ہے۔

تم نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن ابھی تک میرے خانساماں اللہ رکھا کا سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس بے چارے بوڑھے کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا ہے؟''

میں نے زہرخند لہجے میں کہا ''چوہدری! تم ابھی تک اپنے اس آدمی کو بھولے بیٹھے ہو جو تمہاری کوٹھی کے عقب میں نگرانی پر مامور تھا۔ وہ وہاں گندی گلی میں بے ہوش پڑا ہے۔ ذرا اس کی کیفیت بھی معلوم کرلو۔ میں نے جو کچھ اس کے ساتھ کیا ہے، اسی سے ملتا جلتا سلوک اللہ رکھا کے ساتھ بھی کیا گیا ہے۔''

مجھے اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ عقبی گلی میں پڑے ہوئے، میرا نشانہ بننے والے شخص کا راز کھل جانے کے بعد کیا ہوگا۔ میری سوچ گھوم پھر کر ساحل کی طرف آجاتی تھی۔

''تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی شاندار سلوک کیا جائے گا۔'' چوہدری اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا ''میں ابھی رکھاں والی میں بڑے چوہدری صاحب سے فون پر بات کروں گا۔ تمہیں کل صبح یہاں سے روانہ کردیا جائے گا...... ہاتھ پاؤں باندھ کر...... کسی ایمبولینس میں ڈال کر...... اور اس سے پہلے تمہیں بڑے تسلی بخش طریقے سے بے ہوش کیا جائے گا تاکہ تم کسی قسم کی گڑبڑ نہ پھیلا سکو۔ چوہدری نوازش علی صاحب تم سے برسوں کا حساب کتاب کریں گے۔ تم دراصل ان کے شکار ہو۔ ہم تو محض ہانکا کررہے ہیں۔''

بات کے اختتام پر وہ بڑے بے ہودہ انداز میں مسکرایا۔

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''تمہارا وہ بڑا چوہدری مجھ سے خائف ہے۔ میرا نام سن کر اس کا پیشاب خطا ہوتا ہے اسی لیے اپنے مہروں کو آگے بڑھاتا رہتا ہے تاکہ میں اس سے دور رہوں اور اس کی گردن محفوظ رہے۔''

''چلو کوئی بات نہیں، اس بار تمہارا یہ شکوہ بھی دور ہوجائے گا۔'' وہ کمال ضبط بہ الفاظِ دیگر ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ''ہم خود تمہیں چوہدری صاحب کے پاس، ان کی خدمت میں پہنچائیں گے۔ ویسے عجیب اتفاق ہے!'' وہ اپنے چہرے پر مکروہ تاثرات سجاتے ہوئے بولا ''تمہاری محبوبہ آج صبح تک چوہدری صاحب کی تحویل میں تھی۔ وہ چند دن وہاں رہی اور اچھے داموں نکل گئی۔ بھئی، یہ اسٹاک...... اور وہ بھی لائیو اسٹاک کا کاروبار بہت منافع بخش ہے۔ دس کروڑ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔ تم بھی کچھ دن ان کے ''گودام'' میں رہو گے تو کروڑوں کا بزنس دے جاؤ گے۔ تمہارا ابھی کوئی نہ کوئی گاہک مل ہی جائے گا جیسے تمہاری محبوبہ کے طلبگار سامنے آگئے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا، میرے جذبات کو کند چھری کے حوالے کرتے ہوئے بولا ''تو چوہدری صاحب کو مشورہ دوں گا، وہ اپنے دشمنوں کو اپنے ہاتھ سے ختم نہ کریں بلکہ ان کے گاہک تلاش کرکے رقم کھری کریں۔''

چوہدری دلدار نے جتنی بک بک کرلی، میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ میں اس کے اشاروں، کنایوں کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میرے اندیشے صد فیصد درست ثابت ہورہے تھے۔ چوہدری نوازش علی نے میرے حصے کی دس کروڑ کی رقم حاصل کرکے ساحل کو شعیب غوری کے حوالے کیا تھا اور ایک نئی دوستی کی داغ بیل بھی ڈال دی تھی۔

میں نے ٹی وی کے روشن اسکرین پر چوہدری دلدار کو نفرت آمیز نظر سے گھورا اور بڑے ہی جارحانہ لہجے میں دریافت کیا ''میری ساحل کہاں ہے؟''

''بھئی، جب رقم وصول کرلی جائے تو ڈلیوری لازمی ہوجاتی ہے۔'' وہ میرے زخمی کلیجے پر نمک پاشی کرتے ہوئے بولا ''تمہاری محبوبہ کو کراچی روانہ کردیا گیا ہے۔ یہ سارا ڈراما ہم نے تمہیں ٹریپ کرنے کے لیے رچایا تھا اور ہم اس کوشش میں کامیاب رہے۔ تم اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔''

''تم بکواس کرتے ہو رحم و کرم کے بچے!'' میں نے کرکہا ''ساحل کہیں نہیں گئی۔ وہ اسی کوٹھی میں موجود ہے، میں...... میں بہت جلد اسے تمہارے پنجے سے نکال لوں گا۔''

جذبات کے جوش میں، میں خاصا آؤٹ ہورہا تھا۔ چوہدری دلدار نے بھویں سکیڑتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

''تمہیں اس بات کا یقین کیوں ہے کہ ساحل ابھی اسی کوٹھی میں موجود ہے؟''

''اس لیے کہ وہ تمہاری ماں کا خصم کبیر شاہ ابھی تمہارے آس پاس ہی کہیں بیٹھا ہے۔'' میرا دماغ تنور کے مانند دہک رہا تھا ''وہ کسی حرامی کی اولاد میری ساحل کو رکھاں والی سے لے کر لاہور پہنچا ہے اور یہاں سے وہی اسے اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔ تمہارے بڑے چوہدری کا بڑبولا لختِ جگر فیصل بھی ان کے ساتھ یہاں آیا ہے۔ تمہارے ساتھی پرویز کو تو میں نے لمبا لٹا دیا ہے۔ اب یقین کی وجہ سمجھ میں آگئی ہوگی؟''

''تم نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ معلومات حاصل کرلی ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''لیکن اس میں سے بعض معلومات ناقص اور ادھوری ہیں...

دی ہے جو میں نے تمہیں بتادی۔ تمہاری محبوبہ کو آج ...بجے یہاں سے روانہ کیا گیا ہے۔ تمہیں میری بات ...نہ ہو تو شعیب غوری سے رابطہ کرلو۔''

...ذ پھر یہ نطفہ ناتحقیق کبیر شاہ تمہاری بغل میں بیٹھا ...ہے؟'' میں نے حقارت سے لبریز لہجے میں کہا ''کیا ...بغل بچہ بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے؟''

...پکارنے والے انداز میں بولا ''میں نے کہا نا، ...اندازے اور معلومات بعض مقامات پر بہت ردی ...راچی سے کل چار افراد یہاں پہنچے تھے۔ کبیر شاہ اور ...کام رکھاں والی اور لاہور کے درمیان مال کی ترسیل ...ود تھا۔ باقی دو افراد ''مال'' کو لاہور سے کراچی لے ...۔ کراچی کی تیز رفتار زندگی کا مارا ہوا شاہ جی کچھ عرصہ ...ا قیام کرکے اپنے اعصاب کو سکون پہنچانا چاہتا ہے۔ ...ی بات ہے!''

...سمجھ گیا، وہ مجھے سیدھی بات کبھی نہیں بتائے گا اور میں ...راہم کردہ معلومات پر یقین نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لمحے ...دماغ نے فیصلہ دیا کہ جیسے بھی ممکن ہو مجھے چوہدری ...ں سے باہر آنا ہے اور اس کا پہلا ذریعہ یہ تھا کہ ...درمیان ٹیلی کمیونی کیشن کا سلسلہ موقوف ہوجاتا۔ ...نا فوری طور پر ان ٹیلی کیمراز کو تلاش نہیں کرسکتا تھا جن ...سا مجھے اور اس کمرے کو کسی دوسری جگہ نشر کیا جارہا تھا ...بہرحال، یہ میرے اختیار میں تھا کہ اس کمرے میں گھپ ...کرکے کیمراز کی آنکھوں کو ''پھوڑ'' دوں۔ دنیا کی کوئی ...کو ہو، وہ دیکھنے کے لیے روشنی کی محتاج ہوتی ہے۔ اگر ...کمرے کی لائٹ بجھا دیتا تو چوہدری دلدار بے بسی کے ...ے میں ڈوب جاتا۔

...یہ سوچتے ہی میں نے ہوا میں پرواز کی اور روشنی کے ...پہنچ گیا۔ اس لائٹ کا بٹن کمرے میں موجود نہیں تھا ...ں نے ایک زوردار جھانپڑ رسید کرکے اسے فارغ ...اس کے ساتھ ہی چوہدری دلدار کے چودہ طبق گل ...

...گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا ''یہ...... یہ کیا ...ہو؟''

...تمہاری ماں کا سر کررہا ہوں۔'' میں نے ٹی وی کے ...سکرین پر موجود اس کے فرعونی چہرے پر تھوکتے ہوئے ...

...رے میں جزوی تاریکی چھانے کے بعد وہ مجھے واضح ...نہیں پارہا تھا لیکن میں اس کی منحوس صورت دیکھ رہا تھا۔ وہ دھمکی آمیز انداز میں غرّایا ''تم بہت برا کررہے ہو وجدان!''

''اس برائی میں کچھ اور بھی شامل کرلو۔'' میں نے تمسخرانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس سے قبل کہ وہ کوئی اور بکواس کرتا، میں نے اپنی جگہ سے ایک لمبا اسٹیپ لیا اور میری طوفانی سائیڈ کک نے ٹی وی کے روشن اسکرین کو چکنا چور کردیا۔ میری کک میں لامحدود غم و غصہ شامل تھا اور میں نے وہ کک گویا چوہدری دلدار کے خبیث چہرے پر رسید کی تھی۔

چھناکے کی ایک تیز آواز کے ساتھ کمرا گہری تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

یہ وہی کھڑکی تھی جس نے تھوڑی دیر پہلے مجھے اس کمرے میں آنے سے روک دیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کھڑکی اندر سے بند تھی اور میں باہر سے اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھا لیکن اب صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ میں کمرے کے اندر بند تھا اور بآسانی کھڑکی کھول کر باہر جاسکتا تھا۔

باہر جانے کے لیے تو میں کمرے کا دروازہ بھی استعمال کرسکتا تھا لیکن اس دروازے کی دوسری طرف موت اپنے خوفناک جبڑے کھولے میرا انتظار کررہی تھی۔ خوامخواہ خود کو ہلاکت میں ڈالنا بے وقوفی ہوتی۔ دو بھری ہوئی کلاشنکوفز پر میرا قبضہ تھا لیکن اگر فیس ٹو فیس گنز کے دہانے کھل جاتے تو دونوں پارٹیز کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا۔ میں اس کمرے میں زیادہ دیر رک کر اپنے لیے کوئی نئی مصیبت نہیں خرید سکتا تھا۔ اس صورتِ حال میں وہ تاریک کمرا میرے لیے واقعی ایک چوہے دان ثابت ہوتا۔

میں نے اندھیرے میں اندازے کی انگلی پکڑی اور سبک قدمی سے اس دیوار کی طرف بڑھ گیا جس میں مذکورہ کھڑکی موجود تھی۔ مجھے اس کام میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ روشن کمرے میں، میں نے کھڑکی کی لوکیشن کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد میں وہ کھڑکی کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ چھت کے اوپر سے لٹک کر میں یہ اندازہ کرچکا تھا کہ کھڑکی اور چھت کی منڈیر میں صرف چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے کھڑکی کا ایک پٹ وا کیا اور اپنے بدن کو بڑی مہارت سے، کھلی ہوئی کھڑکی میں سے گزار کر کھڑا ہوگیا۔

اب میں عمارت سے باہر تھا۔ اس وقت میرے سامنے دو راستے تھے یا تو میں چھت کی منڈیر پکڑ کر اوپر پہنچ جاتا، یا پھر

نیچے کود کر ٹیرس تک رسائی حاصل کر لیتا۔ میں نے دوسری راہ کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔

میں کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ میں بیٹھ گیا پھر فریم پر ہاتھ جما کر میں نے اپنے جسم کو نیچے گرا دیا اس طرح کھڑکی میں لٹکنے سے ٹیرس اور میرے قدموں کے بیچ فاصلہ بہت کم رہ گیا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا تو میرا قد ہی تھا اور لٹکتے وقت بازوؤں کی لمبائی بھی اس میں شامل ہو گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ مجھ پر کسی کی نظر پڑتی، میں باآسانی ٹیرس پر پہنچ گیا۔ اسی لمحے مجھے کوٹھی کے عقبی حصے میں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ بائیں باغ کی طرف سے کچھ اس قسم کی آوازیں ابھری تھیں جیسے دو افراد آپس میں گتھم گتھا ہوں۔ صدف کو میں موٹرز والے ایک شیڈ کے نیچے چھوڑ آیا تھا اور وہ شیڈ اسی بائیں باغ میں تھا۔ لگتا تھا، ایک طویل انتظار کے بعد وہ شیر کی بچی میدانِ حرب و ضرب میں اتر آئی تھی۔

اس کوٹھی میں لڑائی بھڑائی کے ماہر شیطان صفت انسانوں کی کمی نہیں تھی۔ صدف کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں تیز قدموں سے دوڑتے ہوئے صدف کی جانب بڑھا۔ ٹیرس خاصا وسیع و عریض تھا اور بالائی منزل کو زیریں منزل سے ملانے والا زینہ بھی اسی طرف کھلتا تھا آنکھ مچولی کا وقت گزر چکا تھا لہٰذا میں نے نیچے جانے کے لیے زینے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ ایک کلاشنکوف کو میں نے تیار حالت میں اپنے ہاتھوں میں کر لیا تھا۔

میں جیسے ہی زینے کے قریب پہنچا، دو افراد سے سامنا ہو گیا۔ وہ دونوں ملازم صورت اور مسلح تھے۔ سلیم نے شاید انہی دو محافظ افراد کا ذکر کیا تھا۔ وہ دونوں میرے ہاتھوں میں دبی کلاشن کو دیکھ کر ٹھٹک گئے پھر ایک نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ماؤزر میری جانب سیدھا کیا۔

اس کا اندازہ ایسا ہی تھا کہ فوراً مجھے شوٹ کر دے گا مگر میں نے اس کے ارادے کو ناکامیاب بنا دیا۔ اس نے جیسے ہی فائر کرنا چاہا، میں ایک بیک تھرو رول کرتے ہوئے دھڑام سے فرش پر گرا۔ گولی میرے بدن کے اوپر سے گزر گئی۔ میں جس انداز سے چت گرا تھا، وہ یہی سمجھا کہ اس نے مجھے پھڑکا دیا ہے۔ اس کے اس خیال کو تاریکی نے تقویت پہنچائی اور وہ بے خوفی سے میرے نزدیک آ گیا۔

پھر اسے اس غلطی کا بڑا بھیانک خمیازہ بھگتنا پڑا۔ وہ میرے پاس آ کر مجھے دیکھنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ میں نے کسی اسپرنگ کے مانند اپنے جسم کو ٹیرس کے فرش سے اٹھایا اور اس کے اوپر سے ہوتے ہوئے دوسری طرف پہنچ گیا۔

وہ اس صورت حال کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ ایک چت پڑا مردہ (اس کی دانست میں) کسی عفریت کی طرح اس کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے گزر گیا تو وہ بڑی سرعت سے پلٹا اور بے دریغ مجھ پر فائرنگ کرنے لگا۔ اس بے تکی فائرنگ کی لپیٹ میں اس کا ساتھی آ گیا۔ اس نے اسے اور بھی وحشت زدہ کر دیا کیونکہ اس کا زخمی ساتھی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند زمیں بوس ہو گیا تھا۔

میں نے اس کی وحشت سے فائدہ اٹھایا۔ اس سے پہلے کہ وہ میری جانب متوجہ ہوتا، میں نے اپنے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف کا بٹ اس کی کھوپڑی پر رسید کیا۔ وہ اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ اپنے سر کو تھام کر لڑکھڑایا تو میں نے ایک پش کک مار کر اسے دور پھینک دیا۔ اس کارروائی میں مشکل سے بیس سیکنڈ صرف ہوئے ہوں گے۔ ان دونوں محافظوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں زینے کی طرف بڑھ گیا۔ اس معرکے میں، میں نے دشمن کے دو افراد ناکارہ بنا دیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ فائرنگ کی زد میں آنے والا ریوالور بردار شخص دنیائے دیگر میں پہنچ چکا ہو۔ وہ دنیا جہاں جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔

کوٹھی کی زیریں منزل پر خاصی افراتفری کے آثار نظر ہو رہے تھے۔ میری معلومات کے مطابق وہاں اب چوہدری دلدار، بیرشاہ، فیصل اور دو پیشہ ور عورتوں کے سوا کوئی اور نہیں بچا تھا یا پھر میری ساتھی صدف تھی جو کسی عظیم الشان معرکہ آرائی میں مصروف تھی۔

میں نے زیریں منزل پر قدم رکھا تو عورتوں کے چیخنے کی آوازیں میری سماعت تک پہنچیں۔ اس کے ساتھ ہی قدموں کی چاپ بھی ابھری۔ کوئی اس سمت آ رہا تھا۔ میں اچک کر ایک ستون کی آڑ میں پہنچ گیا۔

اسی وقت فائر کی آواز گونجی اور ستون کا پلاسٹر اکھڑ کر میرے سر پر گرا۔ اس کا مطلب یہی تھا، مجھے وہاں چھپتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ یہ ایک خطرناک صورتِ حال تھی۔ میں نے خود کو ستون کی آڑ میں سمیٹتے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے جھکانا شروع کیا۔ اس دوران میں دوبارہ مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں دوسری طرف کا پلاسٹر اکھڑ کر میری پشت پر گرا کیونکہ اس وقت تک میں مکمل جھک چکا تھا اور میرے ہاتھ فرش کے قریب پہنچ چکے تھے۔ فائرنگ کرنے والے کے زاویے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میری نئی پوزیشن سے واقف نہیں تھا ورنہ وہ میرے سر کی بلندی پر فائر نہ داغتا۔ میں ساری عمر اس ستون کی آڑ میں چھپ کر نہیں رہ سکتا

تھا اس لیے جوابی کارروائی ضروری ہو گئی۔ آگے بڑھنے کے لیے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ضروری تھا۔ میں نے اسی جھکی ہوئی پوزیشن میں رہتے ہوئے کلاشنکوف کی نال کا رخ گھمایا اور اپنے عقب میں ایک طویل برسٹ فائر کر دیا۔

اسی لمحے فضا کربناک چیخوں سے گونج اٹھی پھر ان چیخوں میں گالیاں بھی شامل ہو گئیں وہ گالیاں میری طرف ارسال کی جا رہی تھیں اور بھیجنے والے کی جھنجلاہٹ آمیز آواز بھی میں نے پہچان لی۔ وہ کبیر شاہ تھا جو میری فائرنگ سے شدید زخمی ہو گیا تھا۔

میں ستون کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے کسمپرسی کی حالت میں نظر آیا۔ اس کے جسم کا زیریں حصہ بری طرح زخمی تھا اور وہاں سے خون جاری ہو چکا تھا۔ وہ افسوس ناک حالت میں فرش پر پڑا تھا۔ میں نے گن کی نال کا رخ اس کے سینے کی جانب رکھا اور لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر مجھے وہ پسٹل بھی نظر آ گیا جس کی مدد سے اس نے دو بار مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے مذکورہ پسٹل کو اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور کبیر شاہ کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ از خود فرش سے اٹھنے کی پوزیشن میں پہلے بھی نہیں تھا، میرے پاؤں کی دہشت نے اسے مزید توڑ دیا لیکن اس کی اکڑ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے نفرت کی چنگاریاں دکھائی دیں۔

میں نے اس کی منحوس صورت پر تھوک دیا پھر زہریلے انداز میں کہا "کبیر شاہ! تم اپنے پرائیویٹ باپ چوہدری دلدار کے پاس چند دنوں کے لیے آرام کرنے آئے تھے نا۔ اب چاہو تو لمبے آرام کے لیے ادھر ہی پڑے رہو۔ تم دو چار ماہ میں ٹھیک ہونے والے نہیں ہو۔ اگر تم زندہ بچ گئے تو میں کراچی پولیس کو تمہارے اس سیاسی ٹھکانے پر بھیج دوں گا۔ وہ لوگ ساؤتھ والے چھاپے کے بعد بڑی شدت سے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔"

"تمہیں باس کی طاقت کا اندازہ نہیں وجدان۔" وہ دانتوں پر دانت جماتے ہوئے بولا "تم کسی بھی بل میں چھپ بیٹھو، وہ تمہیں شکار کر لے گا۔"

میں نے نفرت سے اسے گھورا اور پوچھا "تم کس باس کی بات کر رہے ہو۔ شعیب غوری یا چوہدری دلدار ... یا پھر چوہدری نوازش علی؟"

اس نے جواب نہیں دیا، برہمی سے بولا "تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکو گے۔"

"کبیر شاہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تمہارے کالے کرتوتوں کی فہرست تو اتنی طویل ہے کہ "انعام" کے طور پر تمہیں دیکھتے ہی گولیوں سے چھلنی کر دینا چاہیے لیکن میں تمہیں اس طرح جہنم واصل کروں گا کہ تم زندہ رہو اور سپردِ عذاب رہو...... دیکھنے والوں کے لیے تم عبرت کا نمونہ بن جاؤ۔"

پھر میں نے اس کے گھٹنوں اور ٹخنوں پر فائرنگ کی اور ہڈیوں کا کچومر نکال دیا۔ کولھے کے جوڑ کے ساتھ بھی میں نے کچھ اسی قسم کا برتاؤ کیا۔ کلاشنکوف کا میگزین خالی ہو گیا۔ میں نے بھری ہوئی گن اپنے ہاتھ میں کر لی اور بیکار گن کو اتار پھینکا، پھر میں کبیر شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب وہ پوری زندگی اپنے قدموں پر چلنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا اور عین ممکن تھا، ہر نوعیت کے آپریشنز میں ناکامیاب ہو کر ڈاکٹرز اس کی دونوں ٹانگیں باقی جسم سے علیحدہ کر دیتے۔ وکٹم کی زندگی بچانے کے لیے ڈاکٹرز کو بعض اوقات ایسے سنگین فیصلے بھی کرنا پڑتے ہیں۔

کبیر شاہ درد کی شدت اور وحشت کی انتہا کے باعث بے ہوش ہو گیا۔ میں نے اس کے سینے پر سے اپنا پاؤں ہٹایا اور اس کے سر پر ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے خوں خوار لہجے میں کہا۔

"اگر تمہاری سماعت میں زندگی کی ایک رمق بھی باقی ہے تو سن لو اور آنکھوں میں ایک جھلک دیکھنے کی سکت موجود ہے تو دیکھ لو، میں یہاں سے زندہ سلامت جا رہا ہوں۔"

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ سامنے سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میں نے ایک جھٹکے سے کلاشنکوف کو اس سمت اٹھا دیا لیکن فائرنگ کی نوبت نہیں آئی۔

وہ دو عورتیں تھیں جن کے جسم پر ناکافی لباس نظر آ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، انہوں نے ہنگامی حالات میں خود کو ڈھانکنے کی کوشش کی تھی۔ کلاشنکوف کی خطرناک نال اپنی جانب اٹھے دیکھ کر وہ سہم گئیں۔ ایک نے دہشت آمیز آواز میں کہا۔

"تت..... تم دونوں جو کوئی بھی ہو، ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ ہمیں جانے دو۔"

اس پیشہ ور عورت نے لفظ "دونوں" استعمال کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ صدف کی وہاں موجودگی سے آگاہ تھی۔ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ہم دونوں سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

اس مرتبہ دوسری عورت نے جواب دیا "تمہاری ساتھی

لڑکی اس طرف ایک شخص سے مقابلہ کر رہی ہے۔ ہم نے یہی اندازہ لگایا ہے، تم دونوں کی اس کوٹھی کے مکینوں سے کوئی زبردستی کا معاملہ ہے۔ تم لوگ ہمیں اس آگ میں نہ جھونکو۔ ہم فوری طور پر اس کوٹھی سے نکلنا چاہتے ہیں۔''

اس کی ساتھی نے بھی جانے کی بات کی تھی۔ میں نے پوچھا ''تم دونوں آدھی رات کو کہاں جاؤ گی؟''

''ہم آدھی یا پوری رات کا حساب نہیں کرتے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی ''ہمارا ساری رات آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ویسے اس وقت ہم سیدھے اپنے اڈے پر جائیں گے۔''

''اس حالت میں؟'' میں نے سرتاپا ان کا جائزہ لیا۔

''یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔'' اس نے مخصوص انداز میں آنکھ دبائی ''لفٹ دینے کے لیے کوئی نہ کوئی مہربان مل ہی جائے گا۔ ویسے ہمارا اڈا یہاں سے زیادہ دور نہیں۔''

اندھیرا گناہ کو جنم دیتا ہے اور برائی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ وہ دونوں اسی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر اس کوٹھی پر رات جگانے اور کچھ پیسے کمانے آئی تھیں۔ مجھے ان سے اور ان کے پیشے سے کوئی مطلب نہیں تھا اس لیے انہیں روکنا یا کسی قسم کا کوئی نقصان پہنچانا مناسب نہ سمجھا تاہم ان کے جانے سے پہلے یہ ضرور پوچھا۔

''تم لوگوں کا میزبان کہاں ہے۔ اسے چاہیے تھا، تمہیں چھڑوانے کا بندوبست کرتا۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی ''چوہدری دلدار اس وقت اپنی جان چھڑانے کے بندوبست میں لگا ہوا ہے۔ تمہاری ساتھی نے چوہدری اور اس کے نوجوان مہمان کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔''

دوسری نے کہا ''جب کوئی مصیبت آتی ہے تو انسان سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے یا پھر اپنے پیاروں کے بارے میں۔ ہم نہ تو چوہدری کے اپنے ہیں اور نہ ہی پیارے!''

میں نے انہیں وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا، صدف چوہدری اور فیصل سے نبرد آزما تھی۔ اب ویسے بھی وہی دونوں اس کوٹھی میں باقی بچے تھے۔ کبیر شاہ عالم حواس سے خاصے فاصلے پر جا چکا تھا۔

یہ بات مجھے معلوم تھی کہ چوہدری نوازش علی کے بیٹے فیصل نے مارشل آرٹس میں بہت محنت کر رکھی تھی لیکن صدف کی سابق کارکردگی بھی میری یادداشت میں محفوظ تھی لہٰذا میں چوہدری دلدار اور فیصل کو صدف کے رحم و سلوک پر چھوڑ کر ساحل کی تلاش میں زیریں منزل کی ہنگامی تلاشی لینے لگا۔ اس دوران میں کوٹھی کے کسی قریبی حصے سے ییلنگ اور اٹھا پٹخ کی آوازیں آتی رہیں۔

کوئی مارشل آرٹسٹ جب کسی پر اٹیک کرتا ہے تو حلق سے ایک تاثر انگیز آواز نکالتا ہے۔ اس مخصوص آواز کو YELL کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ اتنی ہیبت ناک ہوتی ہے کہ مدِمقابل کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ ایک سچا مارشل آرٹسٹ ییلنگ کر کے فضا میں محوِ پرواز کسی پرندے کو خاک چاٹنے پر مجبور کر سکتا ہے!

میں نے اس کوٹھی کا ایک ایک کمرا اور کمروں کا ایک ایک گوشہ جھانک لیا لیکن کہیں بھی میری ساحل نظر نہ آئی۔ اسی لمحے میرے ذہن میں لعین عظیم چوہدری دلدار کی منحوس بات روشن ہو گئی کہ آج سہ پہر تین بجے ساحل کو کراچی روانہ کر دیا گیا تھا۔ میں اس سے یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ لوگ بائی روڈ گئے ہیں یا بائی ائر! بہرحال، اس وقت یہ سوچتے ہوئے میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ اگر ساحل کو واقعی آج تین بجے سہ پہر یہاں سے رخصت کر دیا گیا تھا تو پھر وہ مجھ سے لگ بھگ نو گھنٹے کے فاصلے پر جا چکی تھی اور...... اگر انہوں نے بائی ائر سفر کیا تھا تو اس وقت میری شہ رگ شعیب غوری کے خنجر کی دھار تلے پہنچ چکی تھی!

اس احساس نے میرے رگ و پے میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ میں ایک مرتبہ پھر ساحل کے قریب پہنچ کر اسے کھو چکا تھا۔ درد کی شدت نے میرے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ تو وہی بات تھی کہ منزل پر پہنچ کر انسان منزل کا نشان کھو دے۔ میں ان شکست خوردہ لمحات میں جس اذیت سے گزر رہا تھا اسے بیان کرنا ممکن نہیں۔

اسی وقت دیوار کی دوسری جانب مجھے کسی عظیم الشان معرکے کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی بھاری بھرکم شے اس دیوار سے آ کر ٹکرائی تھی۔ میں پلک جھپکتے میں سمجھ گیا، اس طرف صدف معرکہ آرا تھی۔ ساحل کی تلاش میں بس وہی ایک کمرا بچا تھا۔ ورنہ میں نے ہر طرف دیکھ لیا تھا۔

میں نے اپنے اور دروازے کے درمیان حائل فاصلے کو دوڑ کر طے کیا اور دروازے کے قریب پہنچ کر خود کو ہوا میں بلند کر لیا پھر اگلے ہی لمحے میری رائٹ سائیڈ فلائنگ کک نے چوبی دروازے پر دھواں دھار ''دستک'' دی۔ اس دستک کے نتیجے میں وہ دروازہ جھٹ سے کھلا اور میں کمرے کے اندر پہنچ کر پٹ سے اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک وسیع و عریض ہال نما کمرا تھا۔ اس کشادہ کمرے کے ایک سنگین منظر نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ صدف

کمرے کے وسط میں کھڑی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کے بازو پر ایک جگہ سے سفید سوئٹر سرخ ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ زخمی تھی۔

میں کمان سے نکلے ہوئے تیر کے مانند اس کی جانب لپکا۔ اس کے زخمی بازو نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔ اس وفا شعار لڑکی نے وہ ساری مارا ماری میری خاطر کی تھی۔ اپنی جان کو وبال میں ڈال کر وہ میرا ساتھ دے رہی تھی اور اس طرح دوستی نبھا رہی تھی کہ کوئی کیا نبھائے گا!

مجھے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بڑی وارفتگی کے عالم میں میرے گلے آ لگی۔ اس کی اس جذباتی خواہش کی تکمیل کے لیے مجھے تھوڑا سا جھکنا پڑا۔ اس نے مجھے اتنی مضبوطی سے دبوچ لیا کہ جیسے خطرہ ہو، اگر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تو میں بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاؤں گا۔

میں اس کی دلی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھا لہٰذا اس جاں نثار ساتھی کے لیے مجھے خود کو فراموش کرنا پڑا۔ میں بھول گیا، کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر آیا ہوں اور کس مقصد کے لیے آیا ہوں؟ اس ہال نما کمرے میں صرف دو دل دھڑک رہے تھے اور وقت جیسے تھم کر رہ گیا تھا۔

اگر وقت آگے نہ بڑھے تو تاریخ رقم نہیں ہوتی، کوئی واقعہ کوئی سانحہ تاریخ کے ریکارڈ میں نہیں آتا شاید اسی لیے یہ ظالم اپنی مخصوص رفتار سے دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہتا ہے اور ہماری بے خبری میں یہ ہمارا اچھا برا ریکارڈ مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ ہم چاہے اسے تسلیم کریں یا نہ کریں!

اگرچہ ہمیں یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وقت تھم گیا ہے لیکن یہ ہماری بے خودی اور خود فراموشی کا ثمر تھا ورنہ یہ شاطر تو لمحہ لمحہ اپنا راستہ پاٹ رہا تھا اور اس دوران میں یہ ہماری تاریخ بھی رقم کر رہا تھا کہ ہم نے...... ہم دونوں نے اپنی زندگی سے چرائے ہوئے کتنے لمحات کن حالات میں گزارے، کس نے کس کو کس کیفیت سے گزارا اور کون کون احساسات سے آشنا ہوا؟ حال کا گزرا ہوا ہر لمحہ۔ ماضی میں بدل رہا تھا۔ ایک دوسرے کی قربت میں بتائی ہوئی یہ ساعتیں امر ہو رہی تھیں۔ ماضی کو بدلنا کسی کے اختیار میں نہیں!

آشنائی اور آگاہی کی صفات رکھنے والے خود فراموشی کے وہ لمحات دیرپا ثابت نہ ہوئے اور ہم دونوں واپس آ گئے۔ صدف کا بدن جذبات کی شدت سے ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی پر ایک سچا بوسہ ثبت کیا اور تھپکنے والے انداز میں اس کے کندھوں کو سہلانے لگا، وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔

''وجدان! میں نے مار ڈالا...... تمہارے دو دشمنوں کا صفایا کر دیا۔''

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا، پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے دوسرے کمرے میں اس کے کارنامے کی آوازیں سنی تھیں۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھا ہوا اور اس ہال نما کمرے میں نظر دوڑائی۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے صدف کے سوا کسی شے پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ایک دیوار کے نزدیک مجھے چوہدری دلدار بے سدھ پڑا دکھائی دیا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک نوجوان بھی زمیں بوس تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ چوہدری نوازش علی کا سپوت فیصل تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں صدف کے الفاظ گونجے...... وجدان، میں نے مار ڈالا۔ تمہارے دو دشمنوں کا صفایا کر دیا۔

تو کیا چوہدری دلدار اور فیصل جہنم مکانی ہو چکے تھے؟

اس سنسنی خیز سوال سے میرے قدموں میں جنبش پیدا ہوئی اور میں لپک کر چوہدری دلدار کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے بغور اس کا معائنہ کیا لیکن کوئی بھی وائٹل سائن میری پکڑ میں نہ آ سکا۔ میں کوئی سند یافتہ ڈاکٹر نہیں تھا کہ اس کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کر دیتا تاہم مجھے ننانوے فیصد یقین تھا کہ چوہدری دلدار اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔

میں جلدی سے فیصل کے قریب آیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ صرف بے ہوش تھا۔ میں نے اس کے جسم میں زندگی کو تلاش کر لیا۔ فیصل کا سر شدید زخمی تھا اور وہاں سے خون بھی نکل رہا تھا۔ میں نے دوسرے کمرے میں جس بھاری بھرکم شے کو دیوار کے ساتھ ٹکراتے سنا تھا، وہ فیصل ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے صدف کی طرف مڑتے ہوئے کہا ''فیصل زندہ ہے لیکن چوہدری کی زندگی کے امکانات معدوم ہیں۔''

پھر میرا دھیان صدف کے زخمی بازو کی طرف چلا گیا۔ اس کے بائیں بازو پر کہنی سے ذرا اوپر والا سوئٹر کا حصہ خون آلود نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کے زخمی بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''یہاں کیا ہوا ہے صدف؟''

اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا ''کیا ساحل کا کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔'' میں نے دکھی دل کے ساتھ نفی میں گردن ہلائی ''کم از کم اس کوٹھی کے اندر تو وہ مجھے کہیں نہیں ملی۔ میں نے زیریں اور بالائی دونوں منزلیں چھان لی ہیں۔''

وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولی ''وہ مجھے بھی کہیں دکھائی نہیں دی۔''

"لیکن تم تو اسے شکل و صورت سے نہیں پہچانتی ہو؟"
"تمہیں تو پہچانتی ہوں!" وہ بے ساختہ بولی۔
اس نے ذو معنی جواب دیا تو میں گڑبڑا گیا پھر دوبارہ اس کے زخمی بازو کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا، فیصل نے خنجر کا وار کر کے اسے زخمی کر دیا تھا ..... ازاں بعد صدف نے وہ خنجر فیصل سے چھین کر پائیں باغ کی تاریکی میں کہیں پھینک دیا تھا۔
"میرا خیال ہے، کوئی سیریس زخم نہیں ہوگا۔" وہ زخمی بازو کو دباتے ہوئے بولی "ورنہ میں تکلیف کی شدت سے بے حال ہو جاتی۔"
ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوتے دیکھے۔ اس کا مطلب تھا، وہ "سب ٹھیک ہے" کی اداکاری کر رہی تھی ورنہ اس کے بازو میں اچھی خاصی تکلیف موجود تھی۔ خون کا پھیلاؤ بھی یہی ظاہر کرتا تھا۔
میں نے کہا "تم اپنے زخمی بازو پر سے سوئٹر کو اوپر اٹھاؤ۔ میں زخم کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔"
میرے انداز میں تحکم کی آمیزش تھی۔ صدف نے ایک لمحہ متاملانہ نظر سے مجھے دیکھا پھر وہ با آہستگی سوئٹر کی آستین کو اوپر اٹھانے لگی۔ اگلے ہی لمحے اس کا مومی بازو میری نگاہ میں چمکا مگر میں اس بازو کی لحمیاتی صفات کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ بازو کے خطرناک کٹ نے میری تمام تر توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔
"اوہ! یہ تو خاصا گہرا کٹ ہے!" میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔
وہ جبڑے بھینچتے ہوئے بولی "سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"خود بہ خود کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔" میں نے اس کے زخم کو گھما پھرا کر دیکھا "تمہیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ٹھہرو!" میں اسے چھوڑ کر کمرے میں کچھ تلاش کرنے لگا "فی الحال اگر تمہارے زخم کو کسی کپڑے سے باندھ بھی دیا جائے تو کام چل جائے گا۔ ٹریٹمنٹ بعد میں ہوتا رہے گا۔"
جلد ہی مجھے چادر نما ایک کپڑا مل گیا۔ میں نے اس کپڑے میں سے مناسب لمبائی کی ایک پٹی پھاڑی اور کس کر اسے صدف کے زخمی بازو پر باندھ دیا۔ اس طرح کم از کم خون کا اخراج تو بند ہو جاتا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے ایک مرتبہ پھر ساحل کو اس کوٹھی میں تلاش کیا لیکن اس تلاش کا نتیجہ بھی صفر کے برابر ہی برآمد ہوا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ چوہدری دلدار نے ٹھیک ہی کہا ہوگا ... ساحل کو میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ہٹا دیا گیا تھا۔
اس کوٹھی میں اب ہماری دلچسپی کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ میرا دل جہاں چسپاں تھا جب وہ ہی نہ تھی تو کیا فائدہ۔ کوٹھی میں اوپر نیچے کوئی بھی شخص ایسا نہیں تھا جو ہماری راہ کی رکاوٹ بنتا۔ سب اپنی اپنی "نیند" میں تھے!
صدف نے پوچھا "سمجھ میں نہیں آ رہا، ان لوگوں نے ساحل کو کہاں بھیج دیا؟"
"میری سمجھ میں آ رہا ہے۔" میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔
اس وقت ہم دوبارہ اسی ہال نما کمرے میں آ چکے تھے جہاں چوہدری دلدار اور فیصل مذکورہ حالتوں میں پڑے تھے۔
"تمہاری سمجھ میں کیا آ رہا ہے؟" صدف نے پوچھا۔
"وہ اب تک میرے، ساحل، شعیب غوری، چوہدری نوازش علی اور دیگر اہم افراد کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں وہ حقیقت بیان کر دی جو چوہدری دلدار کی زبانی مجھے پتا چلی تھی۔
"اوہ!" اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" پھر وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی "ساحل کو بائی روڈ بھیجا گیا ہے یا بائی ائر؟"
"مجھے یہ جاننے کا موقع نہیں مل سکا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔
وہ بے تابی سے بولی "تب ہمیں فوری طور پر کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ تم نے تو صبح کے ٹکٹ بھی بنوا رکھے ہیں۔ انہیں اور پیچھے کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔"
میں نے کہا "اس سے بھی مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔"
"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔
"مطلب یہ کہ اگر ساحل کو بائی روڈ کراچی بھیجا گیا ہے تو وہ کل دوپہر تک یا اس کے بعد وہاں پہنچے گی۔ ہم صبح یہاں سے روانہ ہوں تو اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہم کراچی میں ہوں گے لہٰذا فوری طور پر روانہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں ایک لمحے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور اگر وہ بائی ائر گئی ہے تو اس وقت تک وہ شعیب غوری کے قبضے میں جا چکی ہوگی۔ ہم صبح سے پہلے کراچی پہنچیں یا دوپہر سے پہلے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"
وہ بیزاری سے بولی "کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے اسی کوٹھی میں بیٹھے رہیں گے؟"
"ہرگز نہیں۔" میں نے بے سدھ پڑے فیصل کی طرف دیکھا اور سفاکی سے کہا "میرے دیرینہ دشمن کی ایک نازک کمزوری اس وقت میری دسترس میں ہے۔ میں اسے اپنے

ہاتھ جاؤں گا ... زندگی میں پہلی مرتبہ چوہدری نوازش کو ... ہم مہرو میرے ... چڑھا ہے۔" بے اختیار میری آواز ... تلخی بڑھتی چلی گئی "اب میں دیکھوں گا، چوہدری ... کیا ... ہوتا ہے، جب اپنے کلیجے پر ہاتھ پڑے تو کیسا محسوس ہوتا ... چوہدری نوازش اور شعیب غوری نے ساحل کو ... سے ... کرکے اسے جس پنجرے میں چھپایا ہے اس پنجرے کا تالا ... اسی چابی سے کھلے گا۔" میں نے بڑی بے رحمی سے فیصل کی طرف اشارہ کیا اور پھر صدف کی جانب دیکھتے ہوئے کہا "تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے صدف! فیصل تمہاری ہی وجہ سے میرے ہتھے چڑھا ہے۔ میں تمہارا یہ احسان ..."
"تو اب تم میری دوستی کا کر جوتے مارو گے۔" وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔
"سس ..... سوری!" مجھے احساس ہو گیا کہ احسان والی بات اسے ناگوار گزری تھی۔ میں نے کہا "اتنی بڑی کامیابی کے بعد میں تھوڑا ..... میرا مطلب ہے، پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ..."
"کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" وہ میرے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "ہمیں پہلی فرصت میں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے ورنہ فشا اور اس کے حواری کسی بھی وقت ... سکتے ہیں۔ ... نقلی وجدان کی تلاش میں گئے ہوئے کافی دیر ہو ..."
میں نے ... وقت دیکھا، رات کے ساڑھے بارہ ... تھے۔ فشا وغیرہ کو گئے ہوئے واقعی لگ بھگ ڈھائی ... گھنٹے بیت چکے تھے۔ یہ تاخیر سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی لیکن صدف نے جس پہلو کی طرف توجہ دلائی وہ میری سمجھ میں آ گیا۔
اگلے پانچ چھ منٹ کے اندر ہم نے جیسے تیسے کر کے فیصل کو ٹویوٹا کرولا کی ڈکی میں پہنچایا اس سے پہلے ہم نے وہاں سے اپنے بیگز نکال لیے تھے۔ اگلے ہی لمحے ہماری گاڑی ڈیفنس فیز ٹو کی اس کوٹھی سے رخصت ہو رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر میں قابض تھا۔
جب ہم اس گلی میں سے نکل کر مین روڈ پر آئے تو اسی وقت ایک جیپ فراٹے سے گلی میں داخل ہوئی۔ اس جیپ میں کل چار افراد سوار تھے۔ میں فشا کو صورت سے نہیں پہچانتا تھا لیکن کوئی امید تھی کہ وہ نقلی وجدان کی تلاش میں ناکام لوٹنے والے افراد کا "قافلہ" تھا۔ میں نے رک کر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ لوگ کس کوٹھی میں داخل ہوتے ہیں۔ میں اس وقت ایک ایسے ہوائی گھوڑے پر سوار تھا جو اپنی منزل تک نان اسٹاپ فلائی کرتا ہے، دائیں بائیں دیکھے بغیر ناک کی سیدھ میں سفر کرتا ہے۔
نئے ماڈل کی وہ ٹویوٹا کرولا گلبرگ تک ... بات سے ... نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

گلبرگ تھری والی وہ کوٹھی تاریکی اور سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی!
اس وقت رات کا ایک بجا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ فرید پاشا کی کوٹھی ایسا ویران منظر پیش کرنے لگے۔ کم از کم گیٹ پر مسلح گارڈ کو تو نظر آنا چاہیے تھا۔ کوٹھی کے کسی اندرونی حصے میں کوئی لائٹ آف ہو تو ہو مگر گیٹ اور سامنے کا حصہ اندھیرے کی لپیٹ میں دکھائی دے رہا تھا۔ میری طرح صدف نے بھی صورت حالات کی سنگینی کو محسوس کر لیا، تشویش بھرے لہجے میں بولی۔
"وجدان! اس کوٹھی میں کوئی گڑبڑ ہو چکی ہے!"
"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کوٹھی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
وہ بولی "ہم جب صبح یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا!"
"سب کچھ ہمیشہ ٹھیک ٹھاک نہیں رہتا صدف۔" مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگی "آؤ دیکھیں، اس کوٹھی پر کیا بیت چکی ہے!"
فرید پاشا کے پڑوسی ویسے بھی ان دنوں اپنی کوٹھیوں میں موجود نہیں تھے۔ دائیں جانب والی کوٹھی کے مکین کچھ عرصے کے لیے اسٹیٹس گئے ہوئے تھے اور بائیں طرف والی کوٹھی برائے فروخت ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی کو گیٹ کے سامنے روکا اور صدف سے گاڑی کے اندر ہی رہنے کو کہا۔
"میں تمہیں اکیلے کوٹھی کے اندر نہیں جانے دوں گی۔" وہ چٹانی لہجے میں بولی۔
"ضد نہ کرو صدف! تم زخمی ہو۔" میں نے کہا "میں ذرا ... کا جائزہ لے آؤں پھر تمہیں بھی بلا لوں گا۔"
وہ جلدی سے بولی "کچھ بھی ہو، میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"
مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی، کیونکہ با آسانی وہ میری بات نہیں مان رہی تھی۔ میں نے گاڑی کو کوٹھی کے اندر پہنچایا۔ گیٹ کو کھلوانے کے لیے کسی سے کہنا نہیں پڑا کیونکہ وہ آل ریڈی کھلا ہوا تھا۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہاں کی لائٹس کو کس طرح "آف" کیا گیا ... میں نے جدھر بھی نگاہ

اٹھائی، لائٹ کوٹوٹا پایا اور...... یہ فائرنگ کا نتیجہ تھا۔

سب سے پہلے میں نے سیکیورٹی گارڈ عمر دین کے کیبن نما کمرے میں جھانکا۔ وہاں کا منظر بڑا وحشت ناک تھا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود بھی میں نے دیکھ لیا، گارڈ کیبن کے فرش پر آڑا ٹیڑھا پڑا تھا۔ قریب ہی اس کی گن بھی موجود تھی۔ میں نے گارڈ کو چھو کر دیکھا تو مجھے یقین ہوگیا، وہ دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا "صدف! ہماری غیر موجودگی میں یہاں پر کوئی سنگین کارروائی ہو چکی ہے اور میرا خیال ہے، اس واقعے کو زیادہ وقت نہیں گزرا۔"

کیبن میں اگرچہ اندھیرا تھا۔ تاہم باہر سے آنے والی ناکافی لائٹ نے وہاں دیکھنے کی آسانی پیدا کردی تھی۔ صدف بھی سیکیورٹی گارڈ کو ملاحظہ کر چکی تھی۔ اس نے کہا۔

"وجدان! ہمیں فوری طور پر اپنے ساتھیوں کی خبر لینا چاہیے۔"

پھر ہم آناً فاناً کوٹھی کے اندرونی حصے میں داخل ہوگئے۔ اندر کا جائزہ لینے کے لیے لائٹس کا ہونا بہت ضروری تھا کیونکہ باہر والی جیسی تیسی روشنی وہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے بڑی سرعت سے سوئچ بورڈز تلاش کر کر کے وہاں موجود تمام بٹن آن کرنا شروع کردیئے۔ اس وقت مجھ پر ایک وحشت سی سوار تھی۔

میری یہ کوشش جزوی طور پر بار آور ہوسکی۔ میں چند لائٹس کو آن کرنے میں کامیاب رہا۔ ان لائٹس کی بدولت دوسرے کمروں میں دیکھنا بھی ممکن ہوگیا۔ اس کا مطلب یہی تھا، کچھ لائٹس کو توڑ دیا گیا تھا۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس ایک کلاشنکوف اور ایک پسٹل موجود تھا۔ میں نے صدف کو جو ریوالور دیا تھا وہ اس نے چوہدری دلدار ہی کی کوٹھی میں کہیں پھینک دیا تھا چنانچہ کبیر شاہ والا پسٹل میں نے اس کے حوالے کردیا اور ہم بے قرار روحوں کے مانند کوٹھی کے مختلف کمروں میں چکرانے لگے۔

یہ چکر ہمارے جی کا آزار بن گئے۔ ہماری بے قرار روحیں ایک کربناک عذاب سے دوچار ہوئیں۔ ہم نے اس کوٹھی کا جو معائنہ کیا اس کی تفصیل بڑی لرزہ خیز تھی۔ وہاں پر بڑے وحشت ناک انداز میں خونی کارروائی کی گئی تھی۔ کمروں کے مختلف حصوں سے شدید فائرنگ کے آثار مل رہے تھے اور سب سے بڑا "آثار" وہ ہلاکتیں تھیں جو اس فائرنگ کے نتیجے میں ہوئیں۔

اللہ دتا، سیکیورٹی گارڈ عمر دین، فرید پاشا کا اسسٹنٹ تحسین اور اس کی نو بیاہتا بیوی ناہید اب اس دنیا میں موجود نہیں رہے تھے۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر بہت دور جا چکے تھے۔ اتنی دور کہ جہاں سے ان کی خیریت ہم تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے ساتھیوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور...... اس کارروائی کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ لاشیں پکار رہی تھیں، ان میں سے خارج ہونے والا لہو اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ گھنٹا دو گھنٹا پہلے وہ لوگ "لاشے" نہ تھے، اس دنیا کے دیگر انسانوں کی طرح وہ بھی ہنس بول سکتے تھے اور دوسروں کو بھی ہنسنے بولنے پر مجبور کرسکتے تھے لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا، سب ملیامیٹ ہوگیا تھا...... فنا ہوگیا تھا سب کچھ!

میں نے اس خونی کارروائی کے ذمے داروں کے بارے میں سوچا تو میرے ذہن میں منشا کا نام چمک اٹھا۔ پچھلے دو دنوں میں، میں نے اسے بہت زک پہنچائی تھی۔ اس کے بندے پے در پے منظر سے غائب ہو کر فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے تہ خانے میں پہنچ رہے تھے۔ وہ ان کے "قیام" کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا البتہ اس بات کا اسے یقین تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ وہ میرے اس ٹھکانے سے بخوبی آگاہ تھا اور آج رات کے پہلے پہر چوہدری دلدار نے اسے وجدان کی تلاش میں بھی روانہ کیا تھا۔

میں جیسے جیسے سوچتا گیا، حالات کے ڈانڈے آپس میں ملنے لگے۔ جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ وحشت ناک "کارنامہ" منشا کے سوا کسی اور کا نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لمحے صدف نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"وجدان! زرگل کہیں نظر نہیں آرہی!"

"زرگل!" میں اچھل پڑا اور یہ اچھلنا بے اختیار تھا۔

مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں اب تک اس پشتون دوشیزہ کو کیوں بھولا ہوا تھا۔ زرگل کا خیال آتے ہی اس کے دشمن چاچا حکمت یار کا نام بھی میرے ذہن تازہ ہوگیا اور میں نے ایک لمحے کے لیے یہ بھی سوچا کہ کہیں یہ کارروائی حکمت یار ہی کی تو نہیں! ممکن ہے، اس نے زرگل کا سراغ لگا لیا ہو اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے یہ خون ریزی کی ہو۔

ہم نے ایک مرتبہ پھر کوٹھی کی دونوں منزلیں دیکھ ڈالیں لیکن وہ کوٹھی زرگل کے وجود سے خالی ہی رہی۔ صدف نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "یہ کہاں چلی گئی؟؟"

میں خود بھی بہت الجھا ہوا تھا۔ میں نے کہا "اس کوٹھی میں تو موجود نہیں اس کا یہی مطلب ہے، وہ کہیں چلی گئی ہے یا پھر اسے اپنے ساتھ زبردستی لے جایا گیا ہے۔"

زبردستی ساتھ لے جانے والا خیال میرے ذہن میں حکمت یار کے حوالے سے آیا تھا لیکن صدف اس کہانی سے واقف نہیں تھی اس لیے اس کی الجھن بڑھ گئی۔

"وجدان! جہاں تک میں اندازہ لگا پائی ہوں، یہ تمہارے دشمن منشا کی کارروائی ہوسکتی ہے۔" صدف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "اگر وہ زرگل کو اپنے ساتھ لے جاتا تو وہ ہمیں جیپ کے اندر کہیں نظر آجاتی۔ تمہاری طرح میں نے بھی اس جیپ میں چار مردوں ہی کو دیکھا تھا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے۔ میں نے کہا "تمہاری بات میں وزن ہے۔ ہم نے جس جیپ کو بڑی تیزی سے چوہدری دلدار والی گلی میں مڑتے دیکھا تھا، اگر اس جیپ میں منشا اور اس کے تین ساتھی ہی تھے تو پھر وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ لوگ زرگل کو اپنے ساتھ نہیں لے کر گئے۔" میں ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا "ابھی تک تو یہ بھی طے نہیں کہ اس کوٹھی پر ہونے والی کارروائی کا ذمے دار منشا ہی ہے۔"

"اگر یہ لرزہ خیز کارروائی منشا نے کی ہے تو اسے بھی وہاں پہنچ کر اینٹ کا جواب پتھر سے ہی ملے گا۔" صدف نے کہا "ہم نے بھی چوہدری دلدار کی کوٹھی پر کچھ کم "ہنگامہ آرائی" نہیں کی۔"

وہ ایک لمحے کو رکی پھر چونکی ہوئی آواز میں بولی "وہ کیا ہے!"

اس جملے کی ادائیگی کے بعد وہ ایک دیوار کی جانب بڑھ گئی۔ میں نے اس کے تعاقب میں نگاہ دوڑائی تو مذکورہ دیوار پر مجھے ایک پرچہ چسپاں نظر آیا۔ میں بھی صدف کی تقلید میں آگے بڑھ گیا اور دیوار کے قریب پہنچ کر صورت حال واضح ہوگئی۔ اس پرچے کی تحریر نے میرے خدشات کی تصدیق کردی۔ وہ ایک وارننگ تھی، ایک پیغام تھا جو کہ میرے نام تھا۔

"وجدان! تم نے یقیناً اب تک اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ لیا ہوگا۔ ذرا تصور کرو، اگر تم بھی ان کے ساتھ کوٹھی کے اندر موجود ہوتے تو کیا ہوتا؟ تم نہیں جواب دے سکتے۔ کیونکہ جواب دینے کے لیے تم زندہ ہی نہ ہوتے بلکہ اپنے انہی جاں نثار پشت پناہوں کے ساتھ اس وقت خاک و خون میں لوٹ رہے ہوتے۔ وجدان! میں منشا، تمہارا اصلی باپ تمہیں بتا رہا ہوں کہ تم واقعی بہت خوش قسمت ہو، ہاتھ میں آتے آتے نکل جاتے ہو لیکن اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ ہمیشہ قسمت تمہارا ساتھ دے گی۔ یقین جانو، میں بہت جلد تمہاری شہ رگ تک پہنچ جاؤں گا۔ تم نے اب تک مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جس کی وجہ سے باس کے سامنے میری بہت سبکی ہو چکی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا وجدان!"

وجدان سے شروع ہونے والا یہ "اطلاع نامہ" وجدان پر ہی ختم ہوگیا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور زیر لب بڑبڑایا "حرام زادے! یہ تو تمہیں اپنے باس کی کوٹھی میں داخل ہونے کے بعد پتا چلے گا کہ کون کس کا اصلی باپ ہے!"

صدف نے کہا "زرگل کو ہم کہاں تلاش کرسکتے ہیں؟"

میں نے اس کے ادا کردہ الفاظ میں تکلیف کو محسوس کرلیا۔ یقینی طور پر بازو کا زخم اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہاں اتنا گہرا کٹ تو نہیں آیا تھا کہ اسٹیچنگ کی ضرورت پیش آتی، بہرحال فوری مرہم پٹی ضروری تھی۔ میں نے ہنگامی پٹی باندھ کر خون کے اخراج کو وقتی طور پر روک دیا تھا لیکن باقاعدہ ٹریٹ منٹ ہونا چاہیے تھا۔

اس کوٹھی میں فرسٹ ایڈ باکس موجود تھا۔ میں نے زرگل کے زخمی بازو کی "تیمارداری" بھی خود اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میرے نزدیک رہنے والی دونوں خواتین کے بازو زخمی ہوگئے تھے۔ زرگل کا دایاں شانہ گھائل تھا اور صدف کا بایاں بازو زخمی ہوگیا تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد میں فرسٹ ایڈ باکس تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے صدف کا ہائی نیک لوز سوئٹر اتروایا۔ اس نے سوئٹر کے نیچے گرے کلر کی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر "GUESS" کے نام کی چھاپ تھی۔ یہ ایک بہت بڑی غیر ملکی گارمنٹ کمپنی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کے بہت سے کاروبار ہیں۔

میں نے باریک بینی سے صدف کے زخم کا معائنہ کیا۔ وہ کٹ لگ بھگ دو انچ کا تھا۔ میں نے اینٹی سیپٹک لوشن سے زخم کو صاف کیا اور بینزین کو (BENZENE CO) کی پٹی کردی۔ یہ دوا خون روکنے کے ساتھ ساتھ زخم کو بھی ٹھیک کردیتی ہے۔ یہ ایک قسم کا ٹنکچر ہے اور بہت ہی موثر ثابت ہوا ہے۔

صدف کی ڈریسنگ ہو چکی تو اس نے کہا "وجدان! تمہارا شکار فیصل بھی شدید زخمی ہے۔ اگر اس کو استعمال کرکے تم نے چوہدری نوازش علی کو جھکانا ہے تو پھر اس کی دیکھ بھال ضروری ہے۔"

وہ ایک اہم بات کی طرف میری توجہ دلا رہی تھی۔ واقعی اس سنپولیے کو دودھ پلانا بہت ضروری تھا۔ میں نے صدف

سے آرام کرنے کو کہا اور خود باہر کھڑی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ ٹویوٹا کرولا گیٹ کے نزدیک ہی کوٹھی کے اندر کھڑی تھی اور فیصل کو ہم اسی گاڑی کی ڈکی میں ڈال کر یہاں تک لائے تھے۔

میں نے فیصل کو ڈکی سے نکالا اور کھینچ کر اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا پھر میں اپنا اور صدف کا سفری بیگ بھی اٹھا لایا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں فیصل کو ضروری ٹریٹ منٹ دے چکا تھا۔ اس کے زخم زیادہ خطرناک نہیں تھے۔ میں نے اس سے فارغ ہونے کے بعد صدف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہاری دہشت سے بے ہوش ہوا ہے۔''

''میری دہشت سے'' وہ حیرت سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے کہا ''اس نے مارشل آرٹس کے بہت سے میدان دیکھے ہوں گے لیکن تم جیسی جنگ جو لڑکی سے پہلی مرتبہ اس کا واسطہ پڑا ہوگا۔ تم واقعی حیران کر دیتی ہو، مارشل آرٹس کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کر کے مدمقابل کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہو۔ خاص طور پر جب مارشل آرٹس کے ساتھ جمناسٹک بھی شامل ہو جائے تو دید کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ بے چارہ حیرت کی شدت سے اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے۔''

''کیا میں تمہارے اس بیان کو اپنی تعریف سمجھوں؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے اوپر دیکھا اور بے نیازی سے کہا ''تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا ہے!''

وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ان ڈائریکٹ وے میں اسی کی تعریف کی تھی صدف کے ردعمل کو دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ اسے شرمانا بھی آتا ہے۔ اس کی شرماہٹ اور گھبراہٹ میں بڑا انوکھا پن تھا۔ اس کے بدن کی بے ترتیب جنبشوں نے کمرے کی فضا میں ایک سوندھا سا ارتعاش پیدا کر دیا۔ سوندھا ارتعاش دیکھنے اور سننے کی نہیں بلکہ محسوس کرنے کی شے ہے جو لطیف احساسات کو جگمگا کر رکھ دیتی ہے۔

صدف کا وہ ناقابل فراموش ریشمی ردعمل لمحاتی ثابت ہوا، دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی اور گہری سنجیدگی سے بولی۔

''وجدان! ہمیں اس کوٹھی میں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ یہاں جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھگتانا ہمارے بس میں نہیں اور نہ ہی ہمارے پاس اتنا وقت ہے۔ میں تو کہتی ہوں، تم فوراً پاشا انکل کو فون کر کے یہاں کے حالات سے باخبر کر دو اور میرے ساتھ ماموں کے گھر چلو۔''

''یعنی ڈی ایس پی اورنگ زیب خان کے گھر؟''

''ہاں ہاں...... اور میرا ماموں کون ہے یہاں!''

''اور اس زخمی مغوی کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں؟'' میں نے فرش پر بے ہوش پڑے فیصل کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سمجھانے والے انداز میں بولی ''وجدان! اس وقت ہم بہت ہی نازک حالات سے گزر رہے ہیں۔ میں کسی نہ کسی طرح ماموں کو مطمئن کر دوں گی۔ تم میری بات مان لو۔''

''میں پولیس والوں کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا ''ہم اس کوٹھی میں تو مزید نہیں رکیں گے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ہم تمہارے ماموں کے پاس شادمان کالونی میں پہنچ جائیں گے۔''

اس نے سمجھ لیا کہ میں اس کی بات نہیں مانوں گا، لہٰذا بحث کا دروازہ کھولنے کے بجائے اس نے مصلحت کی راہ اپنائی اور پوچھنے لگی۔

''تمہارے ذہن میں کیا ہے۔ ہم یہاں سے نکلنے کے بعد کہاں جائیں گے؟''

''فی الحال میری نظر میں فاضلیہ کالونی والی کوٹھی سے زیادہ موزوں جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔'' میں نے پرسوچ انداز میں کہا ''بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔''

''اور پاشا انکل کو فون بھی تم وہیں سے کرو گے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا ''پاشا کے علاوہ مجھے کراچی میں منہاس باقر سے بھی ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میرا خیال ہے فاضلیہ کالونی والی کوٹھی ہی ان کاموں کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔''

صدف نے مجھ سے کوئی اختلاف نہ کیا اور ہم وہاں سے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم دونوں نے کوٹھی چھوڑنے سے پہلے لباس تبدیل کر لیے کیونکہ دلدار کی کوٹھی پر ہم جن حالات سے گزرے تھے انہوں نے ہمارے پہناوے کا کباڑا کر دیا تھا۔ خاص طور پر صدف کا سفید سوئٹر تو کریم کلر میں بدل چکا تھا اور کہنی کے اوپر سے سرخ بھی ہو رہا تھا۔

میں نے فیصل کے ساتھ ساتھ فرسٹ ایڈ باکس کو بھی گاڑی کی ڈکی میں پہنچایا۔ اس زنبیل کی کسی بھی وقت ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ ہم ٹویوٹا کرولا میں بیٹھ چکے تو صدف نے تیز آواز میں استفسار کیا ''وجدان! نسان پیٹرول نظر نہیں آ رہی؟''

میں نے بے اختیار گردن گھما کر اس سمت دوڑائی جدھر

گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ مجھے وہاں فرید شاہ کی عظیم الشان جیپ کھڑی نظر نہ آئی۔ ہم جس قسم کے حالات سے گزر رہے تھے اس نے ہمیں جیپ کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی ہم اندرونی سنگینیوں میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ بہرحال، نسان پیٹرول اپنی جگہ پر موجود نہیں تھی۔

''ہو سکتا ہے جیپ کو زرگل اپنے ساتھ لے گئی ہو'' میں نے ایک امکانی بات کی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو وجدان'' صدف میری تائید کرتے ہوئے بولی ''وہ دونوں ہی غائب ہیں تو اس سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ جہاں بھی ہوں گے ایک ساتھ ہوں گے''

میں نے کہا ''وہ جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں''

''آمین!'' صدف نے صدق دل سے کہا۔

میں نے ٹویوٹا کرولا کو کوٹھی سے نکال کر فاضلیہ کالونی کی جانب دوڑانا شروع کر دیا۔

☆☆☆

یہ دنیا ایک حیرت کدہ ہے اور قدم قدم پر ایسے واقعات سے سابقہ پڑتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چوں کہ یہ دنیا اور اس کا ہر کاروبار انسانوں کے دم قدم سے ہے اس لیے ہر انسان اپنی جگہ کسی مجسم حیرت سے کم نہیں۔ ہم جیسے ہی فاضلیہ کالونی والی کوٹھی کے نزدیک پہنچے ایک نئی حیرت سے سامنا ہو گیا۔

نسان پیٹرول مذکورہ کوٹھی کے سامنے کھڑی تھی۔ صدف نے بھی دور ہی سے جیپ کو دیکھ لیا تھا۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا ''ارے یہ جیپ یہاں کیسے پہنچ گئی؟''

میں نے گاڑی کی رفتار انتہائی کم کر دی اور کہا ''ایک بات تو طے ہے کہ گاڑی خود بہ خود یہاں نہیں پہنچی ہوگی۔ کوئی انسان ہی اسے ڈرائیو کر کے یہاں لایا ہوگا'' میں نے ذرا توقف دینے کے بعد کہا ''زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ زرگل اس جیپ میں یہاں پہنچی ہوگی۔ ہمیں قریب جا کر دیکھنا چاہیے۔ پتا نہیں بے چاری کس حال میں ہوگی''

بات ختم کرتے ہی میں نے کرولا کی اسپیڈ بڑھانا چاہی تو صدف نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور گہری سنجیدگی سے بولی ''وجدان! اپنی گاڑی کو یہیں روک دو!''

''کیوں بھئی؟'' میں نے بریک پیڈل کو دباتے ہوئے اس سے پوچھا۔

ٹویوٹا کرولا چند گز آگے جا کر سڑک کے کنارے رک گئی۔ اس وقت تک ہم شاہ جمال روڈ پر ہی تھے۔ صدف نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔

''وجدان! اس وقت ہم انجانی راہ پر چل رہے ہیں۔ میں تمہاری اس بات سے جزوی طور پر اتفاق کرتی ہوں کہ نسان پیٹرول میں زرگل یہاں پہنچی ہوگی مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے ہمارا کوئی دشمن اسے یہاں لایا ہو۔ ہم اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتے''

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ''چلو ٹھیک ہے نہیں کرتے نظر انداز۔ پھر؟''

''پھر یہ کہ ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر احتیاط سے اٹھانا ہوگا'' صدف نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اندھا دھند جیپ کی طرف جانا ٹھیک نہیں، ہمیں پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ اس وقت وہ جیپ خالی ہے یا اس کے اندر کوئی موجود ہے''

''تجویز معقول ہے'' میں نے اتفاق رائے سے کام لیتے ہوئے کہا ''یہ جاننے کے لیے بھی تو جیپ کے نزدیک جانا ضروری ہے!''

''ہاں یہ تو ہے'' وہ متاسفانہ انداز میں بولی ''ایسا کرتے ہیں، تم یہیں گاڑی کے اندر موجود رہو میں جا کر صورت حال کا جائزہ لیتی ہوں''

''تمہارے لیے بھی میرا یہی مشورہ ہوگا'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا ''کیوں کہ تم زخمی بھی ہو!''

وہ شکست خوردہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میری دلیل کے آگے بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ میں کوئی بات کیے بغیر گاڑی سے باہر نکل آیا۔

کوٹھی کا گیٹ کرولا سے لگ بھگ دو سو گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے اس سمت بڑھنے لگا۔ اس وقت میرے لباس میں کبیر شاہ والا پسٹل موجود تھا۔ کلاشنکوف کرولا کے اندر تھی۔ اس اسلحے کو کالبرگ تھری والی کوٹھی میں چھوڑنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

چند لمحات کے بعد میں نسان پیٹرول کے پاس پہنچ گیا۔ اتنا قریب کہ اس کے اندر کا جائزہ لے سکوں۔ میں نے جیپ کے اندر جھانکا تو میری نگاہ کو چونک جانا پڑا۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود تھا اور اس طرح موجود تھا کہ اس کا سر نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ گاڑی کا اسٹیئرنگ سر کے اوپر نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس گٹھڑی نما انسان کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ وہ زرگل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے فرید پاشا کی کوٹھی پر زرگل کو ایک گلابی رنگ کا لباس پہننے کو دیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہستی اسی لباس میں نظر آ رہی تھی۔ یہ گلابی لباس پاشا کی خوب رو بیوی نائلہ کا

تھا۔ یہ انکشاف ہوتے ہی کہ جیپ کے اندر زرگل موجود ہے اور خاصی تکلیف دہ حالت میں ہے' میں لپک کر جیپ کے پاس آ گیا۔

میں نے ڈرائیونگ سائیڈ والے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں بے اختیار دروازے کو بجانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی۔ زرگل نے کسمسا کر آنکھیں کھول دیں' پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کھل اٹھی۔

میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا "زرگل! دروازہ کھولو"

وہ اس وقت تک سیدھی ہو کر بیٹھ چکی تھی۔ میرے اشارے کو اس نے وصول کر لیا اور اگلے ہی لمحے اس نے لاک اٹھا کر دروازہ کھول دیا پھر تیزی سے باہر آنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری برآمد ہوئی اور بے ساختہ اس کا ہاتھ اپنی ٹانگ کی طرف چلا گیا' میں سمجھ گیا اس کی ٹانگ کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔

"رک جاؤ" میں نے منع کرنے والے انداز میں کہا "گاڑی کے اندر ہی بیٹھی رہو۔ میں خود تمہیں باہر نکالوں گا۔ ذرا میں صدف کو یہاں لے آؤں"

میں نے نسان پیٹرول کا دروازہ بند کیا اور دوڑتے ہوئے قدموں کے طفیل کرولا کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں صدف کو صورتِ حال سے آگاہ کیا پھر کرولا کو ڈرائیو کر کے پاشا کی کوٹھی کی طرف آ گیا۔ زرگل والی جیپ کوٹھی کے سامنے کھڑی تھی لیکن اس کی وجہ سے کوٹھی کے اندر جانے والے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

میں نے ٹویوٹا کرولا کو گیٹ کے قریب پہنچایا پھر گاڑی سے باہر آ گیا۔ صدف زرگل کے مسائل سے واقف ہو چکی تھی۔ ہم دونوں نے کوشش کر کے زرگل کو نسان پیٹرول کی ڈرائیونگ سیٹ سے اٹھا کر پسنجر سیٹ پر منتقل کیا۔ اس کے بعد میں نے کوٹھی کا گیٹ کھول دیا۔ تھوڑی دیر بعد یکے بعد دیگرے دونوں گاڑیاں کوٹھی کے اندر پہنچ کر اپنے جائز مقامات پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ کوٹھی کے گیٹ کو میں نے اندر سے لاک کرنے کے بجائے باہر سے تالا لگایا۔ یہ عمل میں نے احتیاط کے پیشِ نظر کیا تھا۔ باہر سے گزرنے والا جو بھی شخص کوٹھی کے گیٹ کو دیکھتا تو وہاں جھولتے ہوئے تالے کی وجہ سے وہ یہی سمجھتا کہ کوٹھی کے اندر کوئی موجود نہیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کوٹھی کی باؤنڈری وال عبور کی اور اندر پہنچ گیا۔ آئندہ پانچ منٹ میں' میں نے اور صدف نے زرگل کو سہارا دے کر کوٹھی کے اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں ٹیلی فون موجود تھا۔ پاشا نے وہ کوٹھی فروخت کرنے کا اعلان کر رکھا تھا اور آن ریکارڈ وہاں کسی کی رہائش نہیں تھی لیکن اب بھی اچھا خاصا فرنیچر وہاں موجود تھا۔ ٹیلی فون والے کمرے میں بیٹھنے اٹھنے کی مکمل سہولت تھی۔

اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ یعنی اتوار کا دن آغاز ہو چکا تھا۔ اتوار کو سنڈے کہا جاتا ہے یعنی "سورج کا دن"۔ سورج اس کائنات کو روشنی اور حرارت بخشتا ہے لیکن اس وقت فضا میں اچھی خاصی ٹھنڈک اتری ہوئی تھی۔ یہ بیری رات کا کمال تھا۔ کیوں کہ رات میں آسمان پر چاند کی حکم رانی تصور کی جاتی ہے۔ چاندنی ہمیشہ ٹھنڈک ہی پہنچاتی ہے۔ شاید اسی وصف کی بنا پر چاند کو محبوب کا درجہ دیا جاتا ہے!

زرگل اندر کمرے میں پہنچی تو اس کی حالت قدرے بے حال نظر آنے لگی۔ میں گلبرگ والی کوٹھی پر پیش آنے والے واقعات جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا لیکن پہلے زرگل کی کیفیت معلوم نہ کرنا خود غرضی اور غیر اخلاقی حرکت ہوتی۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کے بائیں پاؤں میں موچ آ گئی تھی اور ٹھنڈک کے باعث یہ تکلیف اتنی بڑھ گئی کہ وہ پاؤں کو حرکت دیتے ہی سسک اٹھی تھی۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "یہ موچ ووچ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں پلک جھپکتے میں تمہارا پاؤں ٹھیک کر دوں گا"

"تکلیف تو نہیں ہوگی؟" زرگل نے بڑی معصومیت سے پوچھا "میں نے سن رکھا ہے' ہڈی اور جوڑ بٹھانے والے بڑا ظالمانہ انداز اختیار کرتے ہیں"

میں نے اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا "نہیں بھئی! ایسا کچھ نہیں ہوگا' میں کوئی اعضا بند نہیں ہوں' میں تو بالکل سائنسی بنیاد پر ایک مخصوص تکنیک کے ذریعے موچ وغیرہ کا علاج کرتا ہوں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے ہاتھ میں ایک ہنر ہے' تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں' تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا' کب تمہارے پاؤں کی موچ رخصت ہوگئی۔ میں اتنی نزاکت اور آہستگی سے کام کروں گا جیسے چھری مکھن میں اترتی ہے"

"تم کہہ رہے ہو تو پھر ایسا ہی ہوگا" وہ سادگی سے بولی "پاؤں کی تکلیف سے تو مجھے یونہی محسوس ہو رہا ہے جیسے ٹخنے کی ہڈی میں کوئی بڑی گڑبڑ ہوگئی ہو"

میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "ایسی تشویش کی کوئی بات نہیں میں نے بڑی توجہ سے تمہارے پاؤں کا معائنہ کیا ہے' فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں"

وہ میری وضاحت اور صدف کی تائید سے خاصی مطمئن دکھائی دینے لگی۔ اس دوران میں صدف بڑی گہری اور خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔ میری ذات کا یہ طبی پہلو پہلی مرتبہ اس کے سامنے آ رہا تھا۔ ممکن ہے وہ اس وجہ سے اتنی سنجیدہ ہو!

"تم لوگ آپس میں گپ شپ کرو" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں پانچ منٹ میں واپس آتا ہوں"

زرگل نے پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو وجدان؟"

"اس کوٹھی کے ایک خفیہ گوشے کا جائزہ لینے جا رہا ہوں"

میں نے اگرچہ واضح طور پر خفیہ تہ خانے کا ذکر نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں میرا اشارہ سمجھ گئیں۔ وہ میری معیت میں اس "شاندار" کمرے کا دورہ کر چکی تھیں۔

صدف نے کہا "ٹھیک ہے وجدان' تم گھوم پھر کر کوٹھی کا جائزہ لو۔ میں اتنی دیر میں تھوڑا پانی گرم کر کے لے آتی ہوں۔ زرگل کے پاؤں کو ٹکور کی ضرورت ہوگی۔ کچھ میں بھی تو اپنی ڈاکٹری دکھاؤں"

زرگل نے ممنون نظر سے صدف کو دیکھا میں نے کہا "زرگل! تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ صدف نے ڈاکٹری والی بات ایسے ہی کہہ دی ہے یہ واقعی ایک ایلوپیتھک ڈاکٹر ہے"

"بہت خوب!" پشتون دوشیزہ نے حیرت اور ستائش کی ملی جلی نظر سے صدف کو دیکھا "میں تو واقعی وہی سمجھی تھی جو تم کہہ رہے ہو...... یعنی"

زرگل نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر تعریف آمیز انداز میں صدف کو دیکھا۔ میں نے کہا "صدف اس وقت میڈیکل فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو یہ بہت جلد ڈاکٹر کی ڈگری بھی حاصل کر لے گی" ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے معنی خیز انداز میں اضافہ کیا "میں نے "خدا نے چاہا" پر زور اس لیے دیا ہے کہ یہ خود تو ہرگز ہرگز ایسا نہیں چاہتی"

"کیوں بھئی؟" زرگل نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور صدف کی طرف دیکھنے لگی۔

صدف نے مجھے گھور کر دیکھا اور زیرِ لب مسکرا دی۔ گھورنے کا انداز تنبیہی تھا جبکہ خفیف سی مسکراہٹ میں بے نیازی اور درگزر کے اشارے ملتے تھے۔ صدف اندر باہر سے بڑی عجیب لڑکی تھی۔ میں اسے جتنا سمجھ پاتا وہ اس سے آگے کھڑی نظر آتی۔ یہ پستہ قامت قیامت پتا نہیں' میرے اندازے کو کہاں تک دوڑانا چاہتی تھی۔ اب تک میں نے اس کے جتنے رنگ دیکھے تھے وہ عام رنگوں سے بہت مختلف تھے۔

وہ زندگی کے ست سے اپنی مرضی کا موسم تخلیق کرنے اور اپنی خواہش کی فضا بنانے میں ماہر تھی جس طرح کوئی مکمل آرٹسٹ چار بنیادی رنگوں کی مدد سے ہزاروں' لاکھوں نئے رنگ اور رنگوں کے شیڈ تخلیق کر لیتا ہے! میں نے اس مختلف لڑکی پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے تہ خانے کے اندر جانے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ بائیں باغ کی جانب کا علاقہ اچھی طرح دیکھ لیا اور جھاڑیوں کی عقب میں اس روشن دان کو صحیح سلامت پایا جو تہ خانے کا واحد روزن تھا۔ پتا نہیں' اسے روزن کہنا کس حد تک درست تھا۔ بہر حال وہ تہ خانے کے اندر قدرتی روشنی پہنچانے کا تھوڑا بہت وسیلہ ضرور تھا۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے باؤنڈری وال کے ساتھ کوٹھی کے اندر ایک چکر لگایا سب کچھ معمول کے مطابق اور خیریت سے تھا۔ میں واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں زرگل اور صدف کو چھوڑ کر گیا تھا۔ مجھے وہاں زرگل اکیلی نظر آئی۔ صدف شاید پانی گرم کرنے کچن کی طرف نکل گئی تھی اور ابھی تک لوٹی نہیں تھی۔

میں زرگل کے پاس پہنچا تو اس نے شک بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا تمہاری یہ ساتھی واقعی ڈاکٹری پڑھ رہی ہے؟"

"بالکل!" میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

"اس نے پوچھا "کس میڈیکل کالج میں؟"

اس کا انداز بتا رہا تھا' وہ صدف کے حوالے سے اندر سے مطمئن نہیں تھی۔ میں نے بتایا "صدف ڈاؤ میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے"

"یہ کالج تو کراچی میں ہے!"

وہ شک زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے پوچھا "تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا۔ کیا میں تم سے غلط بیانی کروں گا؟"

"یہ بات نہیں وجدان!" وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

میں نے اصرار کیا "پھر کیا بات ہے زرگل؟"

وہ تامل کرتے ہوئے بولی "وجدان! اس مختصر سے عرصے میں' میں تمہیں جس حد تک سمجھ پائی ہوں اس کے مطابق تم ایک دشمن دار انسان ہو اور تمہاری زندگی کا بیش تر حصہ ہنگامہ خیزی اور مار دھاڑ میں گزرا ہے کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"تم بالکل درست کہہ رہی ہو" میں نے تائیدی انداز میں کہا "لیکن تمہاری ان باتوں سے اس شک کی وضاحت

نہیں ہوگی جو صدف کی ذات کے حوالے سے تمہیں بے چین کیے ہوئے ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی "دراصل میں یہ کہنا چاہتی ہوں یا یوں سمجھو کہ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی کہ میڈیکل کی ایک اسٹوڈنٹ اس ہنگامہ خیزی میں تمہارے ساتھ ساتھ نظر آ رہی ہے ... اور اسٹوڈنٹ بھی ایسی جس کا ذہن چل رہا ہو!"

"اس سوال کا جواب تمہاری ہی کہی ہوئی ایک بات کے اندر پوشیدہ ہے" میں ... اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کون سی بات؟" وہ پوری طرح میری جانب متوجہ تھی۔

"... توجہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ ان لمحات ... یاد دلانے کی ...

... ساتھی واقعی ...

... نظر سے ...

میں نے کہا "تو پھر جب صدف میری ساتھی ہے تو اسے میرے ساتھ ہی ڈھالی دینا چاہیے' چاہے میں دشمن دار ہوں یا دوست دار ... اور صدف چاہے میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہو یا امور خانہ داری سیکھ رہی ہو میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟" بات کے اختتام پر میں نے اپنے چہرے کو معصومیت کے لبادے میں چھپالیا۔ بعض اوقات اداکاری ضروری ہو جاتی ہے۔

اس نے سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلائی اور اپنے چہرے کے تاثرات سے ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ اسے میری وضاحت کا یقین آ گیا ہے لیکن اس کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں۔ وہ مجھے مطمئن کرنے کے لیے بھرپور ایکٹنگ کر رہی تھی ورنہ اس کے ذہن کا شک رفع نہیں ہوا تھا۔

جہاں تک چہرے کے تاثرات کا تعلق ہے تو میں نے بھی اسے ... کرنے کی کوشش کی تھی جو میرے دل و دماغ میں نہیں تھا۔ ممکن ہے اس نے بھی میری چوری پکڑی ہو لیکن مجھ پر ظاہر نہ کیا ہو جیسا کہ میں اپنے خیالات اس سے چھپا رہا تھا۔ اگر میں اس کی آنکھوں میں ... دیکھ رہا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ بھی میری آنکھوں میں ... رہی تھی۔ اگر انسان میں ذرا سی بھی مردم شناسی ... بتا دیتی ہیں کہ ... دل و دماغ میں کیا ... ہے۔ چہرے کو ... لیے دل و دماغ کی کھلی کتاب کہا گیا ہے کہ چہرے پر یہ ... بڑی مہارت کے ساتھ روشن رہتے ہیں ... والی روشن بصیرت اور بصارت سے مالا مال ہوتی ہے۔

... ہو رہی تھیں کہ صدف کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ایک پین میں پانی گرم کر کے ... فرسٹ ایڈ باکس میرے ... سے نکال کر لے آئی تھی۔ باکس میں ابتدائی طبی امداد کا سارا سامان موجود تھا بلکہ ... سے کچھ بڑھ کر ہی تھا۔ میں نے انہی خصوصیات کی بنا پر اسے زنبیل کا خطاب دیا تھا۔

میں نے زرگل کے متاثرہ پاؤں کو پہلے نیم گرم پانی سے اچھی طرح دھویا۔ اس نیم گرم ... نے اسے خاصا آرام پہنچایا۔ میں نے باکس میں سے ایک آئنٹ منٹ نکالا اور اسے زرگل کے ٹخنے پر لگا کر ہلکے ہاتھ سے مالش کرنے لگا۔ یہ ... سے ملتا جلتا آئنٹ منٹ تھا اور اپنے اندر ... کے علاوہ لبری کیشن کی صفات بھی رکھتا تھا۔ میں نے زرگل کو باتوں میں لگایا اور اس کا دھیان پاؤں کی ... میری گفتگو کے ٹرانس میں آ گئی تو میں نے ایک جھٹکا ... کر اس کے پاؤں کی موچ نکال دی۔ ... ایک جھٹکی جوڑا تھا اور آزمودہ کار بھی!

اس کے ہونٹوں سے ایک طویل "سی" خارج ہوئی اور وہ پلٹ کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے نرمی سے کہا "تیز دھار چھری مکھن کی ٹکیا میں اتر گئی' کیا تمہیں کچھ محسوس ہوا؟"

اس نے جو کچھ بھی محسوس کیا تھا' اس کے ہونٹوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن اس "سی" کے بعد وہ نارمل ہو گئی۔ گویا میں نے اس کی موچ نکال دی تھی۔

اس کے بعد کے مراحل بہت سادہ اور آسان تھے۔ صدف نے اس کے پاؤں کے متاثرہ حصے کو ایک گرم پٹی میں اچھی طرح لپیٹ کر باندھ دیا۔ وہ خاصا ریلیکس محسوس کرنے لگی۔

میں نے فرید پاشا کی کوٹھی پر جو لرزہ خیز مناظر دیکھے تھے وہ کسی بھی نارمل انسان کے ہوش گنوانے کے لیے کافی تھے لیکن زرگل نے مردانہ وار ان حالات کے اثرات کو جھیلا اور اس کوٹھی سے نکل کر اس کوٹھی تک آ گئی تھی۔ جب میں نے نسان پٹرول کی ڈرائیونگ سیٹ پر اسے دیکھا تو وہ حد درجہ خوف زدہ تھی۔ اسے ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ واقعات بہت غیر معمولی اور ناقابل فراموش تھے لیکن اب بڑی حد تک اس کا خوف زائل ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے ان واقعات کے بارے میں استفسار کیا تو وہ گہری سانس لے کر مجھے ان کی

تفصیل بتانے لگی جس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب ایک جیپ اس کوٹھی پر پہنچی اور اس میں سے برآمد ہونے والے چار افراد نے بے دریغ کوٹھی پر دھاوا بول دیا پھر وہاں دہشت و خون نظر آنے لگا۔ فائرنگ کی آواز کے علاوہ کوئی آواز کان نہیں پڑتی تھی۔ زرگل اس وقت کوٹھی کی بالائی منزل پر تھی۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف بھاگی اور اسی تیزی میں اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ منہ کے بل فرش پر آ رہی۔ جتنی دیر میں وہ اٹھ کر کھڑی ہوتی' کوٹھی کی زیریں منزل کو ویران کر دیا گیا تھا۔ وہ سب کچھ آناً فاناً ہوا تھا جب دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازوں نے بالائی منزل کا رخ کیا تو زرگل نے خود کو ایک جگہ چھپا لیا۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو آن واحد میں اس کے جسم میں اتنے سوراخ نمودار ہو جاتے جنہیں شمار کرنا ناممکن ہوتا کیوں کہ اوپر آنے والوں نے اس کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی گنوں کے دہانے کھول دیے تھے اور وہاں سے پگھلا ہوا سیسہ روشنی کی رفتار سے خارج ہو رہا تھا۔ زرگل نے خود کو چھپا کر دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔

"تھوڑی دیر بعد وہاں سناٹا چھا گیا" زرگل نے ایک جھرجھری لیتے ہوئے بتایا "میں کافی دیر تک چھپی بیٹھی رہی وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں تم لوگوں کو زندہ سلامت نظر آ رہی ہوں ورنہ اگر ان لوگوں کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ اس کمرے میں کوئی موجود ہے تو وہ گولیوں کی بوچھار سے میرے بدن کو تار تار کر دیتے"

"کیا تمہیں حملہ آوروں کے بارے میں کچھ اندازہ ہے؟" میں نے پوچھا حالانکہ اس سلسلے میں' میں حقیقت جان چکا تھا۔

وہ بولی "میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی' بس اتنا جان پائی ہوں کہ وہ بہت ہی سفاک اور درندہ صفت لوگ تھے۔ میں نے ان کی درندگی اور سفاکی کا ثبوت کوٹھی کی زیریں منزل پر دیکھ لیا۔ سیکیورٹی گارڈ عمر دین' اللہ دتہ' تحسین اور ذہین ..." وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ایک جھرجھری لے کر خاموش ہو گئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر سراسیمہ نظر آنے لگی تھی۔

... اس واقعے کے بارے میں زیادہ گفت و شنید ... اثرات مرتب کرے گی۔ اس نے حملہ آوروں کی کار... جو وقت بتایا تھا' اس سے ایک گھنٹہ پہلے وہ لوگ چوہدری دلدار کی کوٹھی سے علی وجدان کو کھوجنے نکلے تھے۔ واقعات سے اندازہ ہو رہا تھا' تلاش میں ناکامی کے بعد انہوں نے ادھر کا رخ کیا تھا اور گلبرگ والی کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ وہ لوگ مجھے تو نہ پا سکے لیکن میرے ساتھیوں کو خون میں نہلا کر چلے گئے۔ وہ بیچارے میری وجہ سے موت کے منہ میں چلے گئے' اس خیال نے مجھے بہت غم زدہ کر دیا۔ میں ان کی بربادی کا ذمے دار بڑی حد تک خود کو محسوس کر رہا تھا۔

دشمنی کی دنیا میں یہی سب کچھ ہوتا ہے' یہ نہیں دیکھا جاتا اصل دشمنی کس شخص سے ہے۔ کسی فرد واحد سے انتقام لینے کی خاطر پورے پورے خاندان کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسے افراد بھی اس انتقام کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں جن کا کوئی قصور ہوتا ہے اور نہ ہی دشمنی میں حصہ' گیہوں کے ساتھ گھن کا پسنا اسی حوالے سے مشہور ہے۔

بہرحال' فنشا اینڈ کمپنی نے اپنی شکست کا بدلہ لینے اور کھسیاہٹ مٹانے کے لیے پاشا کی کوٹھی میں کشت و خون کا بازار گرم کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے شیطان صفت اور فرعون مزاج انسان کی خوشنودی حاصل کرنے میں درندہ بن گیا تھا جو ہمارے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکا تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ چوہدری دلدار نے دھرتی ماں کے سینے سے اچھا خاصا بوجھ اتار دیا ہوگا۔ اس کے بچنے کی امید بہت کم تھی۔

کچھ لوگ دھرتی کا بوجھ اٹھانے کا فخر حاصل کرتے ہیں اور کچھ اس کے لیے بوجھ ہوتے ہیں یعنی ان کی ذات باعث ندامت و ملامت ہوتی ہے۔ چوہدری دلدار کا شمار آخر الذکر افراد میں ہوتا تھا ... اور یہ فخر کا نہیں بلکہ ڈوب مرنے کا مقام تھا!

اپنی داستان غم کے آخر میں زرگل نے بتایا کہ وہ کس طرح نسان پٹرول میں بیٹھ کر اس کوٹھی سے اس کوٹھی میں پہنچی تھی۔ "وجدان! تم یقین کرو ... ان درندوں نے اس کوٹھی میں وہ وحشت ناک مناظر تخلیق کیے ہیں کہ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی وہاں نہیں رک سکتا"

"میں جانتا ہوں' سب جانتا ہوں" میں نے ... انداز میں کہا "کیوں کہ یہاں آنے سے قبل ہم وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہاں کی صورت حالات کو ملاحظہ کیا ہے"

وہ یک ٹک مجھے تکے جا رہی تھی۔ اس کے بیان سے واضح تھا کہ اس نے فنشا کا تحریر کردہ نوٹس نہیں پڑھا تھا۔ دیوار پر چسپاں اس اطلاع نامے پر اس کی نظر نہیں پڑی ہو گی ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتی۔

وہ بتانے لگی "میں نسان جیپ میں کس طرح یہاں پہنچی

ہوں' یہ میں اور میرا خدا ہی جانتا ہے میں جانتی تھی' تم سے ملاقات صرف دو جگہوں پر ہی ہوسکتی ہے' ایک اس کوٹھی میں اور دوسرے اس کوٹھی میں۔ میں اس کوٹھی میں تو ایک لمحہ رکنے کی ہمت نہیں کر رہی تھی اس لیے ادھر نکل آئی حالانکہ مجھے معلوم تھا' تم تو سید پور جاچکے ہو مگر کیا کروں' اس وقت جو میری سمجھ میں آیا' میں نے کیا'' وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوگئی' اس کی باتوں میں کبھی تو تسلسل نظر آتا اور کبھی بے ترتیبی جھلکنے لگتی۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''یہاں پہنچ کر مجھے کوٹھی کا گیٹ بند ملا۔ اگر یہ صرف بند ہوتا تو میں اسے باہر سے یا اندر جاکر کھول لیتی لیکن اس پر موجود تالے نے مجھے بے بس کردیا اور میں گاڑی میں رہتے ہوئے تمہارا انتظار کرنے لگی...... جب کہ تم تو سید پور روانہ ہوچکے تھے'' وہ پھر رکی اور دیوانوں کی طرح گردن کو جھٹکتے ہوئے بولی ''پتا نہیں' ان لمحات میں' میں پاگل ہوگئی تھی...... اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں' کب میری آنکھ لگ گئی' پھر دروزے پر تمہاری زوردار دستک ہی نے مجھے بیدار کیا تھا''

میں نے اس کی حالت کے پیش نظر دل جوئی ضروری سمجھی ''زرگل! جن لوگوں نے ہمارے آشیانے کو سپرد عذاب کیا ہے اور ہمارے ساتھیوں کی ہلاکت کے ذمے دار بنے ہیں' ہم نے انہیں بھی شدید نقصان پہنچایا ہے تم فکر نہ کرو' ہم آئندہ بھی ان کا چین وسکون غارت کرتے رہیں گے''

وہ میری بات سنتے سنتے اچانک چونکی پھر پوچھنے لگی ''وجدان! تم تو سید پور جاچکے تھے وہاں تمہارے دوست فرید پاشا کے والد کی تدفین ہونے والی تھی پھر یہاں واپس کیسے آگئے۔ تمہاری واپسی تو ایک دو روز بعد میں ہونے والی تھی؟''

''ہاں پروگرام تو یہی تھا'' میں نے اثبات میں سر ہلایا ''لیکن حالات کی سنگینی نے ہمیں سید پور پہنچنے ہی نہیں دیا اور ہم مجبور ہوکر واپس لاہور آگئے اور...... یہاں آتے ہی ایسی معرکہ آرائیاں کھل گئیں کہ آدھی رات ہی کو گلبرگ والی کوٹھی کی طرف پلٹ سکے۔ بہرحال'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس کی تفصیل میں تمہیں بعد میں کبھی سناؤں گا۔ فی الحال مجھے ایک دو ضروری فون کرنا ہیں''

صدف نے میری توجہ ایک نہایت ہی اہم امور کی طرف موڑ دی۔ وہ بولی ''وجدان! ہمارے معرکوں کا ثمرا بھی تک کرولا کی ڈکی میں رکھا ہے'' وہ بہت محتاط الفاظ استعمال کر رہی تھی ''اس کی نگاہ داشت بہت ضروری ہے' وہ ہمارے لیے ترپ کا پتا ہے۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ میں نہ رہا تو بازی مارنا بہت مشکل ہوجائے گی''

''ٹھیک ہے'' میں نے بھی ڈھکا چھپا انداز اختیار کیا۔ ''میں اس قیمتی تحفے کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ ڈکی سے نکال کر اندر پہنچاتا ہوں تاکہ اس کی نگرانی اور نگاہ داشت موثر انداز میں ہوسکے''

میں نے فون کے ارادے کو چند منٹ موقوف کردیا اور باہر جاکر فیصل کو ڈکی سے نکال لایا میں نے اسے اپنے کندھوں پر لاد کر اسی کمرے میں پہنچایا تھا' فیصل ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر تھی۔ وہ کامل زندہ تھا اور اسے زندہ ہی رہنا چاہئے تھا' کم از کم اس وقت تک جب تک میں اسے استعمال کرکے چوہدری نوازش علی کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب نہ ہوجاتا...... اور اپنی زندگی ساحل تک رسائی حاصل نہ کرلیتا۔

میں نے کوٹھی کے اندر ہی سے ایک مضبوط رسی تلاش کی' اب اس کوٹھی کے اندرونی راستوں اور کمروں کے بارے میں' میں اچھی طرح جان چکا تھا اور کون سی چیز کہاں پڑی ہے یہ بھی مجھے معلوم ہوگیا تھا حالانکہ وہاں بہت ہی کم اشیا باقی تھیں کیوں کہ وہ کوٹھی ان دنوں ''فاریسل'' کا تمغا سجائے بیٹھی تھی اور اتفاق ایسا تھا کہ جب سے پاشا کی زندگی میں میری انٹری ہوئی تھی' وہاں ''رونقیں'' سی لگ گئی تھیں اور ان رونقوں کا مرکز ومحور وہ تہ خانہ تھا جہاں تک رسائی کے لیے ایک مخصوص تکنیک کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے فیصل کے ہاتھ پاؤں کو رسی کی مدد سے اس طرح جکڑ ڈالا کہ وہ اپنی مرضی سے انھیں استعمال میں نہ لا سکے' ویسے سردست تو اس کے جنبش کرنے کی امید بھی نہیں تھی لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے کبھی نہ کبھی تو ہوش آنا ہی تھا...... اور جب بھی ہوش آنا تھا تو اس نے رج کر ہنگامہ آرائی بھی کرنا تھی' وہ ایک مارشل آرٹسٹ تھا۔ اس کے فن کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی جون میں آنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہ بیٹھا رہے حالانکہ میں نے رسی کی نہ کھلنے والی بندشوں سے اسے پاؤں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کردیا تھا۔ یہ دشمنوں کو باندھنے کی ایک مخصوص تکنیک ہوتی ہے جس سے وہ بے دست د ہوکر رہ جاتا ہے!

فیصل کی طرف سے تسلی بخش انداز میں فارغ ہونے کے بعد میں فون کی طرف بڑھ گیا۔ صدف اور زرگل کو میں نے کمرے ہی میں رہنے دیا۔ ان سے چھپانے والی کوئی بات وہاں نہیں ہو رہی تھی اس لیے ان کی موجودی سے کوئی فرق نہ پڑتا۔

سب سے پہلے میں نے کراچی میں منہاس باقر سے رابطہ کیا۔ آج اس کی اکلوتی بیٹی شبانہ کی شادی تھی۔ اس وقت رات کے ڈھائی بج چکے تھے یعنی اتوار کا دن شروع ہوگیا تھا۔ تیسری گھنٹی پر فون اٹینڈ کرلیا گیا۔ میں نے منہاس باقر کے بنگلے پر فون کیا تھا۔

ایرپیس میں مجھے ایک مانوس آواز سنائی دی ''ہیلو! کون ہے''

میں نے استفسار کرنے والی کو پلک جھپکتے میں پہچان لیا۔ وہ ممتاز تھی مجھے اس کی وہاں موجودی پر حیرت بھی ہوئی کیوں کہ چند روز قبل اس کے ساتھ جو اندوہناک واقعہ پیش آچکا تھا اس کے بعد تو اسے گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالنا چاہئے تھا۔ قاضی سلطان نے پتا نہیں اپنی بیٹی کو دوبارہ کیسے کراچی بھیج دیا تھا۔

شبانہ کے گھر میں موجود ممتاز کے ''ہیلو! کون ہے؟'' کے جواب میں' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ''ممتاز! تم کہاں؟''

''اوہ! تو تم وجدان بات کر رہے ہو!'' وہ بھی لب ولہجے سے مجھے پہچان گئی تھی۔ بتانے لگی

''میں بابا سے ضد کرکے دوبارہ آگئی ہوں تم تو جانتے ہی ہو وہ آسانی سے میری بات ٹال نہیں سکتے۔ میں شبانہ کی شادی میں شرکت کیے بنا رہ نہیں سکتی اور......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا ''اچھا ہوا تم کراچی آگئیں'' یہ جملہ میں نے صرف اس لیے ادا کیا تھا تاکہ قطع کلامی کو وہ برا محسوس نہ کرے ''میں بعد میں تم سے تفصیلی گفتگو کروں گا۔ اس وقت میں نے منہاس صاحب سے ایک ضروری بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ ذرا ان سے بات کروادو''

''ٹھیک ہے' میں انہیں بلوا دیتی ہوں'' وہ جلدی سے بولی ''جب تک انکل یہاں آئیں' تم مجھ سے بات کرلو۔ میں نے سنا ہے تم آج کل لاہور بلکہ اس سے بھی آگے ایک گاؤں سید پور گئے ہوئے ہو؟''

''تم نے بالکل درست سنا ہے۔'' میں نے کہا اور اسے مصروف رکھنے کی خاطر اپنی مرضی کی گفتگو کرنے لگا ''تم اتنی رات کو جاگ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ہم دونوں ہی جاگ رہے ہیں۔'' اس نے بتایا ''میرے ساتھ شبانہ بھی ہے۔ میں نے اسے انکل منہاس کو اطلاع دینے بھیجا ہے۔''

میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا ''دونوں دوستوں میں کیا راز ونیاز ہو رہے تھے؟''

''بس، ہماری آپس کی باتیں ہیں۔'' وہ شوخی سے بولی ''تمہیں ایسی نسوانی باتوں کے بارے میں نہیں جاننا چاہیے۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے، تم مجھے اپنے بابا اور اماں کے بارے میں بتاؤ۔ وہ دونوں کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں اور تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ خاص طور پر بابا تو تمہارے گرویدہ ہوگئے ہیں۔ تم نے دو مرتبہ مجھے بچایا ہے۔ وہ تم سے ملنے اور تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔'' پھر وہ یک لخت خاموش ہوگئی جیسے اسے کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔

میں نے پوچھا ''کیا ہوا ممتاز؟''

''سوری وجدان! میں ایک غیر اخلاقی حرکت کر بیٹھی ہوں۔''

''بابا، کچھ بتاؤ تو سہی؟'' میں نے اس کے کلچر کے لہجے میں پوچھا ''ایسی کون سی غیر اخلاقی حرکت تم سے سرزد ہوگئی؟''

وہ گہری سنجیدگی سے بولی ''میں اور تمہاری ساتھی ساحل ایک ساتھ اغوا ہوئے تھے۔ مجھے سب سے پہلے ساحل کے بارے میں پوچھنا چاہیے تھا اور میں کوئی دوسرے ہی قصے لے بیٹھی ہوں۔ میں ایک مرتبہ پھر تم سے معذرت چاہتی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''اگر تمہیں یہ معلوم ہوچکا ہے کہ میں آج کل سید پور نامی گاؤں کی طرف گیا ہوا ہوں تو یہ بات بھی تمہارے علم میں آگئی ہوگی کہ ساحل کو کہاں پہنچادیا گیا ہے۔ کیا انکل منہاس نے تمہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''ہاں، مجھے تمہارے اور ساحل کے بارے میں کافی کچھ بتایا گیا ہے۔'' وہ اقراری لہجے میں بولی پھر جلدی سے کہا ''لو، انکل آگئے ہیں۔ تم ان سے بات کرو۔''

تھوڑی دیر بعد میں منہاس باقر سے ہم کلام تھا۔ اس نے پہلے میری خیریت دریافت کی کیونکہ رات کے ابتدائی حصے میں بھی میں اسے کال کرچکا تھا اور یہاں کی صورتِ حال کے بارے میں اسے بتادیا تھا۔ میں نے دوبارہ سے تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حالات سے آگاہ کیا تو اس نے پوچھا۔

''ساحل کو بائی ائر کراچی بھیجا گیا ہے یا بائی روڈ؟''

یہ وہ سوال تھا جو صدف نے بھی مجھ سے کیا تھا لیکن افسوس کہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا ''منہاس صاحب! میں صرف اتنا جان سکا ہوں کہ اسے سہ پہر تین بجے کے قریب لاہور سے کراچی روانہ کیا گیا ہے۔ کس

ذریعے سے، یہ مجھے معلوم نہیں ہوسکا۔"

"یہ ایک ایسی اندھیری گلی ہے کہ ہم فوری طور پر کوئی اقدام اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔" منہاس باقر نے متاسفانہ انداز میں کہا "بہرحال، تم فکر نہ کرو۔ میں کوئی نہ کوئی بندوبست تو کروں گا ہی اور آنے والی رات سے پہلے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ تمہیں تو معلوم ہے......"

"اچھی طرح جانتا ہوں جناب۔" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا "کل رات آپ کی صاحب زادی کی برات آنے والی ہے۔ اب تو میں بھی اس شادی میں شرکت کرسکوں گا۔"

"میرے لیے یہ بے حد خوشی کی بات ہے۔" وہ خلوصِ دل سے بولا "تم کل کتنے بجے تک کراچی پہنچ جاؤ گے؟"

"دوپہر سے پہلے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ بولا "وجدان! تم نے کبیر شاہ اور چوہدری دلدار کے ساتھ جو شاندار سلوک کیا ہے، اس سے میرے کلیجے میں ٹھنڈ سی اتر گئی۔ چلو، تمہارے دشمنوں کے ساتھ کچھ تو حساب کتاب ہوا۔ میں پہلی فرصت میں اپنے ڈی ایس پی دوست کو اس مردود کے پیچھے لگاتا ہوں۔ ساؤتھ والے آپریشن کے حوالے سے کبیر شاہ زندہ یا مردہ بڑی شدت سے کراچی پولیس کو مطلوب ہے۔"

میں نے دانستہ منہاس باقر سے یہ بات چھپالی کہ چوہدری دلدار کی زندگی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس دروغ گوئی سے میرا کوئی خاص مقصد نہیں تھا۔ اسے مصلحت کا ایک تقاضا سمجھ لیں۔ بعض اوقات ایسا بھی کرنا پڑتا ہے!

میں نے کہا "منہاس صاحب! آپ کی مصروفیات کو دیکھتے ہوئے میں شرمندہ ہوں کہ بار بار آپ کو زحمت دیتا ہوں لیکن یہ سب اشد ضروری تھا۔"

"ایسی بات نہ کہو کہ مجھے نادم ہونا پڑے۔" وہ اپنائیت سے بولا "میں تمہارے لیے ہر وقت فرصت نکال سکتا ہوں۔" پھر اس نے استفسار کیا "کیا تم نے اپنے تازہ ترین حالات سے فرید پاشا کو آگاہ کردیا ہے؟"

"آپ کے بعد میں پاشا صاحب ہی کو فون کرنے والا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے پوچھا "چوہدری نوازش علی کے بیٹے فیصل کا کیا کرو گے؟"

"اپنے ہاتھ میں دبوچ کر رکھوں گا۔" میں نے سفاکی سے کہا "یہ چوہدری نوازش کی ایک ایسی رگ ہے جسے دبانے سے وہ خبیث انگاروں پر لوٹنے لگے گا۔ اب ہی تو دشمنی کے اس کھیل کا مزہ آئے گا۔"

منہاس باقر نے کہا "وجدان! تمہاری دوست ساحل کو کراچی پہنچایا جارہا ہے یا پہنچایا جاچکا ہے اور تم بھی کل یہیں آجاؤ گے۔ اس لیے بہتر یہی ہوگا، تم فیصل کو بھی کسی طرح کراچی ہی میں منتقل کرلو۔ یہاں بیٹھ کر چوہدری نواز سے ٹاکرے کا لطف دوبالا ہوجائے گا۔"

"ہاں، میری کوشش تو یہی ہوگی۔"

"اس سلسلے میں تم فرید پاشا سے مدد لے سکتے ہو۔" اس نے کہا "وہ بہت اثر رسوخ والا بندہ ہے۔"

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میرے ذہن میں بھی یہی نام ہے۔"

"تمہیں یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ ممتاز یہاں پہنچ گئی ہے؟" ایرپیس میں منہاس باقر کی مخصوص آواز ابھری "بڑی ضدی لڑکی ہے یار۔"

میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا "قاضی سلطان صاحب کو بہرحال سوچنا چاہیے تھا۔ کراچی میں اس کے لیے خطرات کی کمی نہیں۔ میاں زاہد حسین تو جہنم واصل ہوچکا۔ اب اس کی جگہ کوئی اور آگیا ہوگا۔ قاضی صاحب کا ازلی دشمن وڈیرا اکبر سومرو کسی نئے شخص سے بھی گٹھ جوڑ کرسکتا ہے۔ وہ عمر کوٹ کا طاقت ور آدمی ہے اور چوہدری نوازش علی سے اس کے دوستانہ مراسم بھی ہیں۔"

"میں تمہاری بات کو جھٹلاؤں گا اور نہ ہی تمہاری تشویش کو نظر انداز کروں گا۔" منہاس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "خطرات بہرحال موجود ہیں لیکن یار! قاضی اپنی بیٹی کی ضد کے آگے مجبور ہوجاتا ہے۔ ممتاز مچل گئی تھی کہ وہ ہر قیمت پر شبانہ کی شادی میں شرکت کرے گی۔"

"اس کی ضد اپنی جگہ لیکن ایسے حالات میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔" میں نے کہا "اگر انسان اپنی اولاد سے محبت کرتا ہو تو یہ بھی ضروری نہیں کہ اس کی ضد سے مجبور ہوکر خطرات مول لے لے۔ یہ تو اولاد سے دشمنی والی بات ہوگی!"

"تم نہیں جانتے...... بالکل نہیں جانتے وجدان!" منہاس نے احساس کی شدت میں ڈوبے ہوئے انداز میں کہا "بیٹیوں کی ضد کیا ہوتی ہے اور کسی اکلوتی بیٹی کے بااختیار باپ کو کن کن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور صرف اتنا کہا "آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں جناب کیونکہ آپ کی بھی ایک ہی بیٹی ہے۔"

وہ بولا "قاضی سلطان نے اس مرتبہ بیٹی کے ساتھ دو ... سیکیورٹی گارڈز بھی بھیجے ہیں اور میں نے بھی ممتاز کی ... کا معقول بندوبست کردیا ہے۔ آگے اللہ کو جو منظور ..."

"بالکل! اس کی منظوری کی بڑی اہمیت ہے۔" میں نے کہا۔

منہاس نے پوچھا "اس لڑکی کا کیا حال ہے؟" یہ اتنا اچانک سوال تھا کہ میں نے بے ساختہ پوچھا "کون سی لڑکی؟"

"بھئی وہی، جو آج کل تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ صدف کی بات کررہا ہوں۔"

"وہ بڑی ثابت قدمی سے میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔" ... نے اپنے قریب بیٹھی صدف کی طرف معنی خیز انداز میں ... اور ماؤتھ پیس میں منہاس سے کہا "اور میرے ساتھ ہی ... آرہی ہے۔"

"خدا خیر کرے!" اس نے ذومعنی لہجے میں کہا۔

"آمین!" بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

مزید دو چار باتوں کے بعد ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوگیا۔

میں نے ریسیور کریڈل کیا تو زرگل کے چہرے پر مجھے ... بے قراری دکھائی دی۔ وہ بڑے انہماک سے میری گفتگو ... رہی تھی۔ خاموش نہ رہ سکی۔

"وجدان! کیا تم دونوں کل صبح کراچی جارہے ہو؟"

"ارادہ تو یہی ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا پھر منہاس باقر کا انداز اختیار کیا "آگے اللہ کو جو منظور ہوا!"

وہ بجھ سی گئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا، خفگی آمیز انداز میں ... میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے اس سے پوچھا "زرگل! تم نے اپنے آئندہ ... کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ تم کسی فیصلے پر ... پہنچی ہو؟"

"نہیں!" وہ قطعیت سے بولی "کوشش کررہی ہوں۔ ... تم لوگوں کو کراچی رخصت ہونے سے پہلے میں کوئی ... فیصلہ کرہی لوں گی۔"

"یہ بہت اچھی بات ہے۔" میں نے پھر پوچھا "تمہارے پاؤں کا درد اب کیسا ہے؟"

"میں خود کو بہت بہتر محسوس کررہی ہوں۔" اس نے جواب دیا "تم نے مالش کے دوران میں پتا نہیں، کیا جادو کیا ہے۔ لگتا ہے، تمہارے رخصت ہونے سے پہلے میں بھلی چنگی ہوجاؤں گی۔"

میں نے اس کے پاؤں پر آئنٹ منٹ کا مساج کرتے ہوئے کسی حد تک "جی" کی قوت کو بھی آزمایا تھا۔ یہ سب اسی کے ثمرات تھے کہ زرگل کو کافی افاقہ محسوس ہورہا تھا۔ اس سے پہلے میں یہ تجربہ ساحل کے پاؤں پر بھی کرچکا تھا لیکن اس وقت ساحل دھنو ہوا کرتی تھی اور...... میرے بہت قریب بھی!

ساحل کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے قدرے اطمینان بھی تھا۔ جب سے فیصل میرے ہتھے چڑھا تھا، مجھے ساحل کا حصول آسان نظر آنے لگا تھا۔ اگر میں اس کارڈ کو مناسب طریقے سے کھیلتا تو چوہدری نوازش علی کیا، اس کا باپ ملک رمضان بھی قبر سے نکل کر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجاتا...... اور اس کے اریب قریب ہی وہ گھوڑی بھی سرنگوں نظر آتی، رکھاں والی کے کھیتوں میں فیصل کا دادا جس کی پشت سے گر کر جہنم مکانی ہوا تھا۔ کیسا عجیب اتفاق تھا۔ فیصل کا دادا ملک رمضان، میرے دادا چوہدری حاکم علی کا دشمن تھا۔ پھر یہ دشمنی ایک نسل آگے بڑھی اور فیصل کا باپ چوہدری نوازش علی، میرے والد عابد علی سے کھلی دشمنی پر اتر آیا اور میرے والدین اسی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے اور اب تیسری پود آمنے سامنے تھی۔ ہماری خاندانی دشمنی کسی موروثی مرض کے مانند نسل در نسل آگے بڑھتے ہوئے فیصل اور مجھ تک آپہنچی تھی۔ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا، اس دیرینہ دشمنی کا اونٹ آگے چل کر کس کروٹ بیٹھے گا!

میں انہی سوچوں میں ڈوبنے ابھرنے کے دوران میں زرگل کی طرف بھی متوجہ رہا اور اس سے پوچھا "تم مجھے اپنے چاچا حکمت یار کے بارے میں بہت کچھ بتانے والی تھیں کہ اس کی تم سے کیا دشمنی ہے۔ میں ایک ضروری فون کرلوں پھر تمہاری داستان بھی سنتے ہیں۔"

اس نے گہری سنجیدگی سے کہا "ہاں ہاں، تم ایک چھوڑ دس فون کرو۔ میری داستان سننے کے لیے چاہے تمہارے پاس کتنا ہی کم وقت کیوں نہ بچے مجھے یقین ہے، میں تمہارے رخصت ہونے سے پہلے اپنی داستان مکمل کرلوں گی۔"

میں نے چونک کر زرگل کو دیکھا۔ چونکنے کا سبب اس کا سنجیدہ جواب نہیں بلکہ وہ مخصوص چنیدہ الفاظ تھے جو اس نے تین مرتبہ ایک ہی انداز میں استعمال کیے تھے...... مجھے امید ہے، تم لوگوں کے کراچی رخصت ہونے سے پہلے میں کوئی حتمی فیصلہ کرہی لوں گی... لگتا ہے، تمہارے رخصت ہونے سے پہلے

میں بھلی چنگی ہوجاؤں گی اور مجھے یقین ہے، میں تمہارے رخصت ہونے سے پہلے اپنی داستان مکمل کرلوں گی۔
سارا زور میرے رخصت ہونے پر تھا۔ وہ دلکش و دل نشین پشتون دوشیزہ اپنے سمندر دل میں پتا نہیں، کیا ٹھانے بیٹھی تھی!

☆☆☆

رات کے تین بج رہے تھے۔ کوئی شریف انسان جو کسی دور دراز گاؤں میں ہو، ٹھنڈی ٹھار رات کے اس پہر اسے نیند سے جگانا کہیں کی بھی شرافت نہیں تھی، کجا یہ کہ وہ شخص چند گھنٹے قبل ایک ایسی ہستی کو حوالۂ لحد بھی کر کے آیا ہو، دنیا میں جس کا کوئی نعم البدل نہ ہو لیکن بعض اوقات اشد ضرورت ایسا کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ ایسے ہی مواقع کے لیے کہا جاتا ہے، دوست وہ جو مصیبت کے وقت کام آئے کیونکہ مصیبت میں کسی سچے دوست ہی کی طرف دیکھا جاتا ہے!
فرید پاشا ایک کھرا اور مثالی دوست تھا۔ وہ رات کے آخری پہر بھی فون اٹینڈ کرنے میں کسی کوتاہی یا سستی کا مرتکب نہیں ہوا۔ اس کی مخصوص ''ہیلو'' میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے کہا۔
''میں وجدان بات کررہا ہوں۔''
''یار خیریت تو ہے۔'' وہ تشویش ناک لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''اتنی رات گئے فون؟''
میں نے گمبھیر آواز میں کہا ''پاشا! میرے پاس تمہارے لیے خوشی اور غمی کی ملی جلی خبریں ہیں اور یہ خبریں ایسی سنسنی خیز ہیں کہ میں صبح ہونے کا انتظار نہ کرسکا اسی لیے اس وقت تمہیں پریشان کرنے چلا آیا ہوں۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ......''
''بکواس بند کرو!'' ایرپیس میں پاشا کی خفگی آمیز آواز ابھری۔ اس آواز میں پھٹکار نہیں بلکہ اپنائیت تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے بے تکلف دوستوں کو کوئی بات سمجھانے کے لیے بعض اوقات ہلکی پھلکی گالی بھی دے دی جاتی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا ''تمہیں شرم نہیں آتی یہ ''پریشان'' اور ''شرمندہ'' جیسے الفاظ استعمال کرتے ہو؟''
اس کی دوستی کے اسٹائل نے میرے دل کے ایک ایک گوشے کو ایک خاص قسم کی مسرت سے معمور کردیا۔ اس مسرت میں فخر کا احساس بھی شامل تھا۔ میں جذبات سے مغلوب بھیگی ہوئی آواز میں بولا ''اب میں واقعی شرمندگی محسوس کررہا ہوں۔ تم نے شرم دلائی اور مجھے آگئی!''
''فضول تمہید میں وقت برباد نہ کرو اور پہلے مجھے غمی کی خبر سناؤ۔ تمہارے یار کے پاس بہت بڑا دل ہے۔'' وہ زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا ''خوشی کی خبر بعد میں سن لوں گا۔''
میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے گلبرگ تھری والی کوٹھی پر پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ بات گہری تشویش کی تھی لہٰذا وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔
''وجدان! میرے آدمی کل کسی وقت اس کوٹھی کا ''چارج'' سنبھال لیں گے۔ وہاں کے حالات کو کس طرح ہینڈل کرنا ہے، یہ میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ اچھا ہوا تم نے مجھے بروقت اطلاع دے دی۔ بہرحال، یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔''
''جو کہ سراسر میری وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔
وہ بولا ''تم پھر پٹڑی سے اترنے لگے۔ میں تمہیں ایک بزرگ دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ پہلی فرصت میں اس کوٹھی سے دور ہوجاؤ۔''
''وہ تو میں ہوچکا۔'' میں نے کہا ''اس وقت میں تمہاری فاضلیہ کالونی والی کوٹھی سے بات کررہا ہوں جس کے خفیہ تہہ خانے میں فشا کے کئی وفادار میری مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے سے میں نے اضافہ کیا ''میرے ساتھ صدف اور زرگل بھی ہیں۔''
صدف کے بارے میں وہ اچھی خاصی واقفیت حاصل کرچکا تھا اور گزشتہ ٹیلی فونک رابطے پر میں نے اسے زرگل کے بارے میں بھی مختصراً بتادیا تھا۔ اس نے کہا ''تو اس کا مطلب ہے، میری پیش گوئی کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں!''
میں نے کہا ''یہ پیش گوئی فرید اور منہاس جیسے دو ماہرین فلکیات و ارضیات نے کی ہے جو کسی طور ستاروں سے رابطے میں رہتے ہیں، چاہے وہ ستارے ٹی وی اسکرین کے ہوں یا سلور اسکرین کے۔ یہ بات تو طے ہے ان اسکرینز کے ستارے، آسمانی ستاروں سے کہیں زیادہ ہوشیار ہیں کیونکہ یہ اشرف المخلوقات ہیں جو فلکی ستاروں پر کمند ڈالنے کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ میں بھلا آپ بزرگوں کی پیش گوئی کو رد کرنے کی جسارت کیسے کرسکتا ہوں!''
اس نے ہلکا پھلکا قہقہہ لگایا اور بولا ''اب خوشی کی خبر بھی سنادو۔''
اس کے قہقہے سے کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اسے اپنے باپ کی موت کا غم نہیں تھا۔ فرید پاشا بہت ہی زندہ دل اور یار باش شخص تھا اور اپنے دوستوں کی دل داری کے ہزار ڈھنگ جانتا

تھا۔ جب بہت موڈ میں ہوتا تو اکثر کہتا تھا، جس طرح اللہ نے معدے کے اندر مختلف خانے بنائے ہیں تاکہ اس کی پیدا کی ہوئی نعمتیں اپنے اپنے ٹھکانے لگ سکیں، بالکل اسی طرح انسان کے دل میں بھی مختلف قسم کے جذبات کے لیے الگ الگ خانے موجود ہیں اس لیے خوشی کو غمی سے اور غمی کو خوشی سے گڈمڈ نہیں ہونے دینا چاہیے۔ اس کا فلسفہ حقیقت سے کتنا قریب تھا، اس بحث میں پڑے بغیر میں دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ اس کی دوستی ایک حقیقت تھی۔
میں نے دوبارہ مناسب الفاظ کا استعمال کیا اور چند گھنٹے قبل چوہدری دلدار کی کوٹھی پر ہونے والی مار اماری کے بارے میں اسے بتادیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے کہا ''اس خوش خبری میں دو سین بہت اہم ہیں۔ نمبر ایک، یہ پتا چل گیا کہ فیصل کو لاہور سے کراچی روانہ کردیا گیا۔ نمبر دو، فیصل ایسا مہرہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا۔ تم اسے ''حرکت'' دے کر ہلاک کرسکتے ہو۔''
میں نے کہا ''فیصل فی الوقت ایک ایسی گن ہے جس کے استعمال کے لیے مجھے ٹارگٹ چاہیے۔''
''چوہدری نوازش علی سے زیادہ موزوں ٹارگٹ اور کون ہوگا؟''
''ٹارگٹ تو اول آخر وہی ہے لیکن وہ میرے رابطے میں نہیں تھا۔''
''تم کیا چاہتے ہو'' اس نے پوچھا ''کیا رکھاں والی یا سید پور آنے کا ارادہ ہے؟''
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتایا ''فی الحال تو میں زرگل اور صدف کے ساتھ کراچی جارہا ہوں۔ یہ جنگ میں وہیں بیٹھ کر لڑوں گا اور چوہدری نوازش علی کی ساری چوہدراہٹ میں اس کی ناک کے راستے نکال دوں گا۔''
''ٹارگٹ تمہارے پاس ہے، گن تمہارے ہاتھ میں ہے اور تم لائحہ عمل بھی ترتیب دے چکے ہو پھر کیسی الجھن؟'' وہ حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔
میں نے کہا ''پاشا! تمہیں کل صبح سے پہلے میرے دو کام کرنا ہیں!''
رات اپنے آخری پہر میں داخل ہوکر بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور میں اسے وہ ایمرجنسی کام بتا رہا تھا۔ پاشا نے سچے ہمدرد کی طرح فراخ دلی سے کہا ''ہاں بولو کیا کام ہیں؟''
''اول تو میں اس وقت رکھاں والی میں چوہدری نوازش علی سے بات کرنا چاہتا ہوں'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''اس کا ٹریٹمنٹ شروع کرنے میں کسی تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اور فی الفور پہلا ڈوز اسے مل جانا چاہیے۔ چوہدری سے رابطے کے لیے مجھے اس کا فون نمبر چاہیے۔''
''یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں'' وہ بے پروائی سے بولا ''ابا جی کی ڈائری میں چوہدری نوازش کا فون نمبر موجود ہے۔ میں ابھی دیکھ کر تمہیں بتادیتا ہوں' تم دوسرا کام بتاؤ؟''
میں نے کہا ''دوسرا کام یہ ہے کہ فیصل کو کسی بھی طرح کراچی پہنچانا ہے' چاہے اس میں کچھ وقت بھی لگ جائے۔ میں تو کل صبح روانہ ہوجاؤں گا۔ وہ بھلے ایک دو روز بعد وہاں پہنچا دیا جائے۔ اس وقت وہ بے ہوش بھی ہے۔ یہ کام مجھے خاصا دشوار نظر آرہا ہے۔''
''دشوار تو نہیں مگر تیز حاضر ور ہے'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ''فیصل کو بائی روڈ ہی کراچی لے جانا زیادہ مناسب رہے گا اور اس سلسلے میں...... خیر! میں کچھ سوچتا ہوں' کچھ کرتا ہوں۔ تم جب تک چوہدری نوازش کی نیند اڑا دو۔ میں نے تم سے گفتگو کے دوران میں تمہارا نمبر تلاش کرلیا ہے۔ تم بھی نوٹ کرلو اپنے پاس' بہت کام آئے گا۔''
میں وہ نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کرچکا تو فرید پاشا نے کہا ''جب تک تم چوہدری کو فرسٹ ڈوز دے کر فارغ ہوتے' میں فیصل کا کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔ اس سلسلے میں تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' تمہارے یار کی بات مانی جاتی ہے۔''
میں فیصل والے معاملے سے بے فکر ہوگیا۔ فرید پاشا واقعی ایک ایسا آدمی تھا کہ زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں اس کا کہا ٹالا نہیں جاتا تھا۔ فلم پروڈیوسر ہونے کے ناتے اس کی پہنچ دور تک تھی اور حلقہ احباب بھی کافی وسیع و عریض تھا۔
میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے کہ مجھے اس کی ڈانٹ نہ سننا پڑے فون بند کرنے سے پہلے اس نے کہا ''تمہاری بھابی دو تین مرتبہ تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہے یار۔''
''کون سی بھابی؟'' میں نے کہا ''شہری یا دیہاتی؟''
فرید پاشا نے دو شادیاں کررکھی تھی۔ اس کی ایک بیوی لاہور میں اس کے ساتھ گلبرگ تھری والی کوٹھی میں رہتی تھی جب کہ پہلی بیوی سید پور والی حویلی میں رہتی تھی۔ شاہین نامی اس عورت سے فرید کی تین اولادیں تھیں جب کہ شہری بیوی نائلہ کی گود ابھی ہری نہیں ہوئی تھی۔
اس نے کہا ''یار! میں نائلہ کی بات کررہا ہوں۔ تم نے اس کے اغوا کی کارروائی کو ناکام بنایا تھا نا' وہ تمہارے

لیے اپنے دل میں شکر گزاری کے جذبات رکھتی ہے اس لیے لگا ہے لگا ہے تمہارے بارے میں پوچھتی رہتی ہے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا "انہوں نے تو تمہیں ابھی دیکھا بھی نہیں اور نہ [illegible] تعارف کا بھی موقع نہیں مل سکا۔ وہ بس اتنا ہی جانتی [illegible] ہو میں میری کوٹھی پر کوئی دوست ٹھہرا ہوا ہے جو فون پر مجھ سے بات کرتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے، تم اپنی دونوں بیویوں کو میرا اسلام [illegible]" میں نے کہا "میں چوہدری نوازش کی طرف جا رہا ہوں"

"وش یو گڈ لک!" اس نے نیک خواہشات کے [illegible] رابطہ ختم کر دیا۔

میں نے اپنے ذہن میں نقش نمبر ڈائل کیا اور رکھاں والی میں چوہدری نوازش علی کی حویلی سے میرا رابطہ [illegible] اپنے اختتامی مراحل طے کر رہی تھی۔ [illegible] فون ریسیو کیا گیا۔ نیند سے بوجھل [illegible] استقبال کیا گیا۔

میں نے ٹھوس لہجے میں کہا [illegible] سے بات کرنا چاہتا ہوں"

"چوہدری صاحب تو اس وقت سو رہے ہیں" دوسری طرف سے مجھے بتایا گیا۔ وہ کوئی خاص ملازم تھا یا پھر قریبی رشتے دار ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "یہ کون سا سونے کا وقت ہے۔ جگاؤ [illegible] سے

میرے لب و لہجے نے دوسری جانب فون سے چپکے ہوئے شخص کے ہوش اڑ دیے ہوں گے۔ چوہدری نوازش کی مرضی کے بغیر اس کی عمل داری میں کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا کجا یہ کہ میں اس کی ٹھیک ٹھاک توہین کر رہا تھا، میرا انداز اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔

تم کون ہو؟" اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا گیا۔

میں نے بولنے والے کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا "میں تمہارے چوہدری کا باپ ہوں اور اگر تم نے اس سے رابطے میں تاخیر کر دی تو میں اس کا دادا بن جاؤں گا"

"کیا تم نے اسی قسم کی بکواس کے لیے اتنی رات کو فون کیا ہے؟" وہ شخص برہمی سے بولا۔

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے، تم چوہدری نوازش کا دادا بنانے کے خواہش مند ہو۔ اس کو جگاؤ اور بتاؤ کہ وجدان کا فون ہے۔ اگر وہ ایک منٹ کے اندر فون پر حاضر نہ ہوا تو میں وجدان سے طوفان بن جاؤں گا اور اسے بھولنا [illegible] ہونا پڑے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

وجدان کے نام پر اسے سپ سی لگ گئی [illegible] بات سمجھ گیا تھا۔ چند لمحات کے بعد اس نے کہا [illegible] میں ہونا!"

اس کی بات سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف [illegible] نام سے واقف تھا بلکہ اسے تازہ ترین حالات سے [illegible] حاصل تھی۔ میں نے خصیلے لہجے میں کہا۔

"میرا خیال ہے تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ [illegible] بھی ہوا [illegible] اس کا تذکرہ ضروری نہیں بلکہ اہم بات یہ [illegible] چوہدری کی ایک بہت بڑی کمزوری اس وقت میرے قبضے [illegible] ہے۔ اگر بعد میں اسے معلوم ہوا کہ تم نے اسے اطلاع [illegible] میں [illegible] سے کام لیا تھا تو ممکن ہے وہ تمہیں بھوسے [illegible] پھنسوا دے"

[illegible] میں پوشیدہ سنگینی و سفاکی نے اسے باور [illegible] کہ میں [illegible] نہایت [illegible] معاملے پر چوہدری نوازش [illegible] بات کرنا چاہتا ہوں۔ [illegible] میں اس کی سمجھی ہوئی [illegible]

[illegible] چوہدری صاحب کو [illegible]

[illegible]

وہ منٹ کے بعد چوہدری نوازش کی [illegible] رکھاں والی کا مطلق العنان حکمراں [illegible] ملک کے [illegible] بھی اس کا نیٹ ورک موجود تھا۔ بیرون ملک [illegible] نے اسے خاصا طاقتور بنا [illegible] نے اسے خاصا مضبوط [illegible] کاروبار [illegible] بوتے پر بہت دور تک ہاتھ پاؤں پھیلانے میں کامیاب [illegible]

"ہیلو وجدان!" چوہدری کی غراہٹ سے [illegible] میری سماعت تک پہنچی "کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

اس نے گفتگو کا آغاز بڑے بے ہودہ انداز میں [illegible] اور میں نے بھی دہلی، علی گڑھ یا لکھنؤ کا کلچر متعارف کرانے کے لیے اسے فون نہیں کیا تھا۔ اس وقت میرا [illegible] کے مانند کھول رہا تھا۔ میں نے اس کی غراہٹ [illegible] جواب دیا۔

"کم بخت [illegible] زندگی میں پہلی مرتبہ تمہارا [illegible] اور تمہیں گفتگو کا سلیقہ بھی نہیں [illegible] میری [illegible] تکلیف [illegible] کرتے ہو تو تمہارا سر تن سے [illegible] کے [illegible] دوں گا۔ تمہیں [illegible] رکھ دوں گا۔ تم نے اپنے [illegible] بہت سی مناسب [illegible] جمع کر رکھی ہیں [illegible] حساب [illegible] نہیں ہوتا [illegible] سال تو صرف میرے [illegible]

[illegible] بہت سا قرض تمہاری طرف [illegible] تمہیں ایک ایک پائی کا حساب دینا ہوگا"

وہ بڑے [illegible] میری بات کی تکمیل تک سنتا رہا پھر [illegible] "کیا تم نے کسی بک بک کرنے کے [illegible] مجھے [illegible] جگایا ہے؟"

"میں نے [illegible] نیند سے نہیں بلکہ غفلت سے جگانے کی کوشش کی ہے چوہدری!" میں نے حقارت آمیز انداز میں اسے مخاطب کیا "اور اب تمہیں ایک لمحے کو بھی آنکھ لگانے کا موقع نہیں ملے گا"

"تم اس وقت کہاں ہو؟" اچانک اس نے پینترا بدلا۔

میں نے بھی چال چلی "کراچی میں!"

"جھوٹ مت بولو" وہ دہاڑا

اس زمانے میں سی ایل آئی کی سہولت ابھی متعارف نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ فوراً جان جاتا کہ میں کس اسٹیشن اور کس نمبر سے اسے فون کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی دہاڑ کے جواب میں کہا۔

"چوہدری! جھوٹ اور فریب تمہارا شیوہ ہے اور تمہیں ہی سجتا ہے۔ میں واقعی اس وقت کراچی میں ہوں"

"وہ پھنکارا "تم لاہور میں ہو اور یہ بھی یقین رکھو کہ میری نگاہ میں [illegible] میں بہت جلد تمہیں اپنی گرفت میں لینے والا ہوں [illegible] تمہاری مسلسل نگرانی کر رہے ہیں"

[illegible] ہوتو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے میں لطف آتا ہے۔ آج میں پہلی دفعہ اس لعین سے بات کر رہا تھا لہٰذا میں نے بھی خوب [illegible] نکالے۔

"تم اپنے جن نگران آدمیوں کا ذکر کر رہے ہو میں نے ان کا بھٹا بٹھا دیا ہے"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" وہ متذبذب انداز میں مستفسر ہوا۔

میں نے کہا "چوہدری دلدار، منشا اور کبیر شاہ سے رابطہ کر کے دیکھ لو تمہیں ساری کہانی معلوم ہو جائے گی ویسے مجھے نہیں امید [illegible] ڈیفنس فیز ٹو والی کوٹھی سے تمہیں کوئی خوش کن خبر مل سکے۔ وہاں اب الو بولتے ہیں یا پھر وحشی چمگادڑیں بین کرتی ہیں۔ اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو وہاں فون کر کے حالات سے آگاہی حاصل کر لو"

ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے کوئی عریاں گالی بکنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا اور گونج دار لہجے میں بولا "میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات کا اس لیے بھی یقین نہیں کر سکتا کہ اول تو اس کوٹھی تک تمہاری رسائی ہی ممکن نہیں اور بالفرض، تم وہاں کسی طرح پہنچ بھی جاتے ہو تو تمہیں سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے فرار ہونا پڑے گا یا پھر کسی بدنصیب چوہے کی مانند کڑکی میں گردن پھنسانا ہوگی"

چوہدری دلدار نے ٹی وی اسکرین پر مجھے بتایا تھا کہ وہ میرے بارے میں بڑے چوہدری کو مطلع کرے گا اور اگلی صبح مجھے پکڑ جکڑ کر رکھاں والی روانہ کر دیا جائے گا لیکن بڑے چوہدری کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ چھوٹے چوہدری کی اس سے بات نہیں ہو سکی تھی ورنہ چوہدری نوازش میری "اسیری" سے آگاہ ہوتا۔

میں نے کہا "چوہدری! میں نے نہ صرف ڈیفنس سوسائٹی والے اس چوہے دان کا سوا ستیاناس مار دیا ہے بلکہ تمہارا لختِ جگر فیصل بھی مالِ غنیمت کے طور پر میری تحویل میں آ گیا ہے"

"کیا بکتے ہو؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھو چوہدری" میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا "ورنہ تمہاری ذرا سی گستاخی فیصل کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے"

"م ... میں ... تمہیں چیر کر رکھ دوں گا" وہ خوں خوار انداز میں غرایا۔

"اب پتا چلا، رشتوں کی تکلیف کیا ہوتی ہے" میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا "اپنی آنتوں پر ہاتھ پڑا ہے تو اندازہ ہو رہا ہوگا"

تمہاری یہ بلیک میلنگ نہیں چلے گی وجدان!" وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "فیصل تمہارے قبضے میں نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر تم میری اس سے بات کراؤ"

اس کے ادا کردہ آخری جملے سے تشویش جھلکتی تھی، وہ اپنی بات میں دم خم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کوشش میں وہ جزوی طور پر ناکامیاب تھا۔ میں نے اس کے لہجے سے اس کی اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا۔

میں نے کہا "چوہدری! سوری، میں اس وقت فیصل سے تمہاری بات نہیں کروا سکتا کیوں کہ وہ بے ہوش ہے، اس کی ایسی درگت بنائی گئی ہے کہ خود فراموشی کی حالت میں بھی اسے چھٹی کا دودھ یاد آ رہا ہوگا۔"

"میں تمہاری زبان کو گدی سے کھنچواؤں گا" وہ اعصاب پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

"اس قسم کی بدتمیزیاں فیصل کے لیے مشکلات کھڑی کریں گی"

"تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو" وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا" میں ابھی چوہدری دلدار کو فون کرتا ہوں پھر تمہاری مکاری کا راز کھل جائے گا۔ تم خواہ مخواہ مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہو۔"

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی کچھ خواہ مخواہ نہیں کیا چوہدری!" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا "تم جس طرح چاہو میرے بیان کی تصدیق کرسکتے ہو"

وہ پھنکارا "تمہارا جھوٹ تو اسی بات سے کھل رہا ہے کہ تم اس وقت کراچی میں ہو"

"اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"ڈیفنس سوسائٹی کے حوالے سے تمہاری بک بک تو یہی ظاہر کرتی ہے' تم اس وقت لاہور میں کہیں چھپے بیٹھے ہو!"

"تمہیں ہر قسم کے اندازے لگانے کی آزادی ہے" میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا "تمہارے دعوں کی تصدیق تو میں ابھی کرلوں گا۔ ذرا یہ بتاؤ تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے؟"

"اب آئے نا مطلب کی طرف" میں نے اس کی چٹکی لی۔

وہ بولا "مطلب کی بات تم کرو...... کیوں کہ فون تم نے کیا ہے"

"او کے" میں نے تحقیر آمیز انداز میں اس کی بات کاٹی اور سخت انداز میں کہا "مجھے میری ساتھی چاہئے...... ساحل کہاں ہے؟"

اس نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا پھر بولا "وجدان! میں نے تمہاری محبوبہ کو فروخت کردیا ہے۔ اس کے بڑے اچھے دام مل رہے تھے میں نے پہلی فرصت میں' سے نکال دیا۔ دس کروڑ کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ اب وہ کراچی پہنچ چکی ہوگی۔ اگر تمہیں اپنی محبوبہ سے ملنا ہے تو شعیب غوری کے پاس چلے جاؤ۔ وہ کبھی تمہارا خیر خواہ تھا' اب میں اس کا خیر خواہ ہوں اور ...... ساحل والی ڈیل کے علاوہ بھی ہمارے درمیان آئندہ کے لیے بہت کچھ طے ہوا ہے۔ ویسے ایک بات ہے وجدان!" وہ خاصی کھلی ڈلی گفتگو کررہا تھا' وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا "ساحل کسی قیمتی نگینے سے کم نہیں وہ جس کے ہاتھ میں بھی سجے گی' اس کی شان اور آن بان کو دوبالا کردے گی۔ میں نے چند روز اسے اپنے پاس رکھا اور وہ مجھے دس کروڑ کا پرافٹ دے گئی۔ نیلام کی دنیا میں شاید ہی کوئی بردہ اتنے مہنگے داموں فروخت ہوا ہو!"

وہ ساحل کے حوالے سے نہایت ہی ہتک آمیز الفاظ استعمال کررہا تھا۔ یہ واضح تھا وہ مجھے غصہ دلانا چاہتا تھا۔ میں نے جوابی وار کرتے ہوئے تحمل لہجے میں کہا۔

"تم تو فی الحال اپنے بیٹے کی فکر کرو۔ میں اس کے جسم کے ایک ایک ریشے سے دس کروڑ وصول کروں گا اور خریدار جانتے ہو کون ہوگا؟" میں ذرا دیر کو رکا پھر کہا "نہیں جانتے نا! میں بتاتا ہوں چوہدری! ...خریدار تم ہوگے' تم۔ اگر تم اپنے بیٹے کو دردناک عذاب سے بچانا چاہتے ہو تو میری ساحل میرے حوالے کردو"

"میں نے بتایا ہے نا' شعیب غوری کے پاس پہنچ چکی ہے"

"تو پھر تم بھی سمجھ لو' اپنی بچی کھچی زندگی میں تم فیصل کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گے"

"تمہاری تو میں......" اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی اور دھڑ سے فون بند کردیا۔

میں سمجھ گیا' اب وہ ڈیفنس سوسائٹی والی کوٹھی میں فون کرے گا۔ جب تک وہ میری باتوں کی تصدیق نہ کرلیتا' میرے سامنے کمزور نہیں پڑسکتا تھا اور مجھے کامل اطمینان تھا' فیز ٹو والی کوٹھی کے حالات جاننے کے بعد اس کی ساری اکڑفوں نکل جائے گی۔ وہ میرے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوجائے گا۔ مزید یقین دہانی کے لیے میں فیصل سے اس کی بات بھی کروا سکتا تھا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ اب کراچی پہنچنے کے بعد ہی چوہدری نواز ش علی سے رابطہ کروں گا۔

میں ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد اپنی ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی میں نے دوسری گھنٹی پر فون اٹینڈ کیا۔ وہ فرید پاشا کی کال تھی۔

"میں نے سوچا' اس مرتبہ میں تم سے رابطہ کرتا ہوں" اس نے کہا "لیکن فون مسلسل انگیج جارہا تھا"

میں نے اسے بتایا "چوہدری نوازش علی سے بڑی دھواں دھار بات ہورہی تھی"

"کیا کہتا ہے وہ؟" پاشا نے پوچھا۔

"وہ فیصل والے معاملے کی تصدیق کے بغیر یقین کرنے کو تیار نہیں"

"یہ تو قدرتی بات ہے" وہ سادگی سے بولا

میں نے پوچھا "پاشا! میرے کام کا کیا ہوا؟"

"تمہارا کام ہوگیا ہے۔ میں نے فیصل کو بہ حفاظت کراچی پہنچانے کے لیے عنایت اللہ باجوہ سے تفصیلی بات چیت کرلی ہے۔ تم صبح سات بجے اس شخص سے جاکر مل لو۔

میں نے اسے تمہارے بارے میں اچھی طرح بتا دیا ہے۔ تمہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا"

میرے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ صبح نو بجے ہمیں ائرپورٹ پہنچنا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ فیصل والا معاملہ سات بجے نمٹ رہا تھا۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے پاشا سے دریافت کیا "یہ عنایت اللہ باجوہ کون ہے اور وہ کس طرح فیصل کو لاہور سے کراچی پہنچائے گا؟"

"عنایت اللہ باجوہ میرا ایک بہت ہی قریبی آدمی ہے" پاشا نے بتایا "ادھر بادامی باغ کے قریب اس کا ٹرکوں کا اڈا ہے۔ وہ وہاں "ویلکم گڈز فارورڈنگ کمپنی" کے نام سے کاروبار کرتا ہے۔ اس کے ٹرک ملک کے طول و عرض میں مال کی ترسیل کرتے ہیں۔ لاہور اور کراچی کے درمیان بھی اس کے کئی ٹرک چلتے ہیں۔"

"تو کیا وہ فیصل کو کسی ٹرک میں ڈال کر کراچی پہنچائے گا؟" میں نے پوچھا۔

فرید پاشا نے وضاحت کی "پہنچایا تو اسے ٹرک میں ڈال کر ہی جائے گا لیکن ایسے نہیں کہ وہ کسی کی نظر میں آجائے۔ وہ اناج والی بوریوں کے درمیان کہیں ہوگا جہاں وہ بے ہوش اور زندہ پڑا رہے گا۔ سانس کی آمدورفت کے لیے مناسب ہوا کا بندوبست چھوڑا جائے گا۔"

"پاشا! فیصل مارشل آرٹس کا بھی ماہر ہے۔" میں نے ایک خدشے کی جانب اشارہ کیا "اگر وہ ہوش میں آگیا تو بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔ وہ کسی کو نقصان پہنچائے یا نہ پہنچائے مگر وہ فرار ہوگیا تو میرے لیے یہ بہت خراب بات ہوگی۔ میں اس کی وجہ سے خاصا مضبوط ہوگیا ہوں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔ اس کا مارشل آرٹ میرے علم میں ہے۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولا "میں نے ہر پہلو کا اچھی طرح جائزہ لے لیا ہے۔ فیصل کو اچھی طرح باندھ کر ٹرک کے اندر پہنچایا جائے گا۔ وہ کسی بھی طور اپنی بندشیں کھول نہیں سکے گا۔ ویسے ہر ٹرک کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ دو تین کلینرز بھی ہوتے ہیں جو ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنا جانتے ہیں۔ پھر بھی تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑے گا۔"

اگر ساحل کراچی نہ پہنچ چکی ہوتی تو میں خود ٹرک میں فیصل کے ساتھ کراچی تک سفر کرتا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میں ایک دو دن کے لیے یہ گشت اٹھا کر ساحل کی طرف سے غافل ہوجاؤں۔ میرا کراچی پہنچنا بہت ضروری تھا لہٰذا مجھے پاشا کی بات ماننے کے لیے مجبور اہونا پڑا۔

ٹیلی فونک سلسلہ ختم ہوا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔

ہمارے پاس صرف تین گھنٹے تھے۔ ٹھیک سات بجے مجھے "ویلکم گڈز فارورڈنگ کمپنی" پہنچنا تھا۔ میں نے دونوں ساتھیوں کو تھوڑی نیند لینے کا مشورہ دیا۔ صدف نے کہا "اور تم جاگتے رہوگے؟"

"ہاں، مجھے نیند نہیں آرہی۔" میں نے کہا "ویسے بھی تم دونوں زخمی ہو۔"

زرگل نے مشورہ دیا "ہم تینوں باری باری کچھ نیند لے لیتے ہیں۔"

"اس طرح ہمارے حصے میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کی نیند نہیں آئے گی۔" میں نے کہا "گویا کسی کی نیند بھی پوری نہیں ہوگی۔ بہتر یہی ہے، تم دونوں سو جاؤ۔ مجھے واقعی نیند کی حاجت محسوس نہیں ہورہی۔"

انہیں میری بات ماننا پڑی اس لیے خاموش ہوگئیں۔

☆☆☆

ہم لگ بھگ سوا چھ بجے کوٹھی سے نکلے۔ اس وقت اندھیرا ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ فاضلیہ کالونی سے بادامی باغ کم از کم آدھے گھنٹے کا راستہ تھا۔ صدف اور میں لاہور سے زیادہ واقف نہیں تھے البتہ زرگل کو راستوں سے اچھی خاصی شناسائی تھی تاہم اس نے بھی اس وقت سیدھے راستے کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا اور ہماری راہ نمائی کرنے لگی۔

یہ راستہ قدرے طویل تھا مگر صاف ستھرا اور سیدھا تھا۔ اس میدان میں ہمارے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو بھی ہورہی تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ میں زرگل کی کہانی نہیں سن سکا تھا۔ حالات نے اس کا موقع ہی نہیں دیا حالانکہ مجھے یقین تھا، اس

…نا کہانی میں بڑی سنسنی خیزی ہوگی۔ میں نے اس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور...... فیصلہ تو اسی کو کرنا تھا۔

میں نے سوچا، بادامی باغ والے معاملے سے نمٹ لوں پھر کہیں بیٹھ کر ناشتا کریں گے اسی دوران میں اس مسئلے پر بھی ڈسکس ہو جائے گی۔

مزنگ چونگی، جنازگاہ اور بھاٹی سے ہوتے ہوئے ہم کی شاہ پہنچ گئے۔ ابھی تک اجالا نہیں پھوٹا تھا۔ زرگل نے بتایا کہ آزادی چوک سے ہمیں دائیں جانب مڑنا ہوگا پھر بادامی باغ کا راستہ آسان اور سیدھا ہو جائے گا۔

میں نے تھوڑا آگے جا کر کرولا کو رائٹ ٹرن دیا اور گاڑی کو مینار پاکستان اور بادشاہی مسجد کے درمیان سے گزارتا چلا گیا لیکن پچاس گز آگے جانے کے بعد مجھے چونکنا پڑا۔ ایک تشویش ناک صورتِ حال سے سامنا ہو گیا تھا۔

وہاں پولیس نے ناکا لگا رکھا تھا اور ادھر سے گزرنے والی گاڑیوں کی باقاعدہ چیکنگ ہو رہی تھی۔ حالات کی اس واہیات صورت نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ ایک درجن کے قریب پولیس والوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا، وہاں کوئی زبردست قسم کی کارروائی ہو رہی تھی۔

ایک پولیس اہل کار کے اشارے پر مجبوراً مجھے بھی ٹویوٹا کرولا روکنا پڑی۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ ناکے کو توڑ کر فرار ہونا سراسر نقصان دہ ثابت ہوا۔ پولیس کی دو سارٹ موبائلز بھی وہاں دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ بڑے سنگین لمحات تھے۔ میرا ذہن برق رفتاری سے کام میں مصروف ہو گیا۔ چیکنگ کے مناظر مجھے بہت دور تک سوچنے کے لیے مجبور کر رہے تھے۔ اس خطرناک خیال نے مجھے ہلا کر رکھ دیا کہ اگر پولیس والوں نے ہماری گاڑی کی تلاشی کے دوران میں ڈکی کو کھول کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

اس ڈکی میں رکھاں والی کے فرعون صفت چودھری نوازش علی کا لختِ جگر بے سدھ پڑا تھا۔ اس حالت میں کسی شخص کو ڈکی میں ڈال کر کہیں لے جانے کا کوئی جواب یا جواز ہمارے پاس نہیں تھا۔ ہم قانون کی نظر میں سراسر مجرم ٹھہرتے۔

میں ان مہلک خیالات کو اپنے ذہن سے گزار ہی رہا تھا کہ ایک باوردی پولیس اہل کار تیزی سے ہماری گاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔

پتا نہیں، اس نازک موقع پر تقدیر کون سا سنگین مذاق کرنے جا رہی تھی!

اس داستان کا 10 واں حصہ
مئی 2005ء میں شائع ہوگا

سوسی ڈائجسٹ کا تہلکہ خیز سلسلہ
آتش فشاں
1412.10
حصہ 13

میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کے مانند لہرایا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''لی یان! تم ادھر ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر بیٹھو۔ ہم اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد جیسے ہی بنگلے سے نکلنے لگیں گے تمہیں فون کر دیں گے۔ تم ٹیکسی کو فوراً ادھر لے آنا۔ اس طرح اس مشن میں تمہاری شمولیت بھی ہو جائے گی اور ہمیں بھی زیادہ کھٹ راگ نہیں پھیلانا پڑے گا۔'' پھر میں نے لی یان کی ہاں یا نہ دیکھے بغیر کاشانوک سے کہا۔

''یار! ٹیکسی کی چابیاں تم لی یان کے حوالے کر دو۔''

یہ اسکیم کاشانوک کو بھی بہت پسند آئی تھی لہٰذا لی یان کو طوعاً و کرہاً ہم سے اتفاق کرنا پڑا۔ کاشانوک نے جیب کی جیب..... میں سے چابیوں والا گچھا نکال کر لی یان کی طرف بڑھا دیا اور اسے بتانے لگا کہ مذکورہ ٹیکسی کس لوکیشن پر کھڑی تھی۔

میں نے کہا ''تم ٹیکسی میں ہمارے فون کا انتظار کرنے کے دوران میں اندرونی لائٹ کو آف ہی رکھنا تاکہ باہر سے گزرنے والا کوئی بھی شخص براہِ راست تمہارے چہرے کو نہ دیکھ سکے۔ ویسے تمہارے پاس لیڈی پسٹل موجود ہے۔ ضرورت پڑنے پر تم اسے استعمال کر سکتی ہو اور اگر کسی ہنگامی صورتِ حال میں تمہیں ہماری آمد سے پہلے وہاں سے کھسکنا پڑے تو تم فون کر کے ہمیں بتا دینا۔'' میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''ویسے مجھے امید نہیں ہے کہ ایسا کوئی اپ سیٹ ہو۔ میں نے احتیاطاً تمہیں یہ سب کچھ بتایا ہے۔''

لی یان کے چہرے کے تاثرات یہی بتاتے تھے کہ دل سے اسے ہماری پلاننگ پسند نہیں آئی۔ تاہم اس نے کھل کر ہماری مخالفت نہیں کی۔ وہ درحقیقت ہمارے کندھوں سے کندھا ملا کر اس کارروائی میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر جب اس نے زبان کھولی تو لہجے سے برہمی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''وجدان! تم دو تین مرتبہ مجھے فون استعمال کرنے کی ہدایت دے چکے ہو حالانکہ تم جانتے ہو میرے والا سیل تو وہیں گھر پر رکھا ہے!''

اس کے جھنجلاہٹ بھرے اعتراض پر مجھے بہت پیار آیا۔ وہ اپنی بے بسی کو یوں ظاہر کر رہی تھی۔ میں نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا ''چندا! غم کیوں کرتی ہو۔ میں اپنا سیل تمہیں دے کر ہی ٹیکسی کی جانب روانہ کروں گا۔ مجھے تو صرف کاشانوک کی کال کا انتظار کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ سیل فارغ ہو جائے گا۔ بعد میں ہم کاشانوک کے سیل سے تمہیں اپنے رابطے میں لے آئیں گے۔ کہو کیسا آئیڈیا ہے؟''

اس نے چوں نہ کی تاہم چہرے کا اتار چڑھاؤ یہی بتا رہا تھا کہ مجبوری کا نام شکریہ کے مصداق وہ ہم..... سے اتفاق کرنے پر تیار ہوئی ہے۔ بہرحال' آئندہ پانچ منٹ میں ہم نے لیعنی' میں نے اور کاشانوک نے آدھے ڈائنا مائٹ' ہینڈ گرینیڈ اور ٹائم بم کو بڑی مہارت سے اپنے لباس میں چھپالیا۔ اس خطرناک اسلحے کا کچھ ذخیرہ ہم نے بیگ کے اندر ہی رہنے دیا تاکہ واپسی میں بوقتِ ضرورت کام میں لایا جا سکے۔ اس ہلاکت خیز اسلحے میں زیادہ تعداد ہینڈ گرینیڈ کی تھی جنہیں ہم اپنی ٹیکسی کے اندر رہتے ہوتعاقب میں آنے والوں پر استعمال کر سکتے تھے۔ ٹائم بم اور ڈائنا مائٹ کی زیادہ مقدار ہم اپنے ساتھ بنگلے کے اندر لے کر جاتے۔

جب آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے ہو گیا تو کاشانوک ہم سے رخصت ہو کر بنگلے کی سامنے والی سمت چلا گیا۔ لی یان نے تنہائی میسر آتے ہی گلوں اور شکووں کا پنڈورا باکس کھول کر رکھ دیا۔ مجھے چونکہ اس کی کوئی بات ماننا نہیں تھی لہٰذا پوری توجہ سے اس کی شکایات سنتا رہا اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''تم خود کو اس مشن سے الگ کیوں سمجھ رہی ہو۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر تم جو ذمے داری پوری کرو گی وہ بھی بہت اہم ہے۔''

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''میں خود کو اس مشن سے نہیں' بلکہ تم سے الگ محسوس کر رہی ہوں۔''

میں اس کے نزدیک چلا گیا اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''میں تمہیں اتنا کمزور تو نہیں سمجھتا تھا۔ ان لمحات میں تم خاصی جذباتی ہو رہی ہو۔''

ہم اس وقت جس مقام پر کھڑے تھے وہاں ہمارے علاوہ صرف تاریکی ہی تاریکی تھی لہٰذا اس بات کا ایک فیصد بھی امکان نہیں تھا کہ کوئی ہمیں دیکھ لے گا۔ کاشانوک کے جانے کے بعد ہم اس تاریک گوشے میں آ گئے تھے۔ ورنہ پہلے جہاں کھڑے تھے وہاں ملگجا اجالا موجود تھا۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں لی یان سے بات کی تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم کہہ رہے ہو تو غلط نہیں ہوگا لیکن مجھے کم زور بھی تو تم نے بنایا ہے نا۔"

میں گہری تاریکی کے باوجود بھی اس کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے میں کامیاب رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہمارے درمیان اس وقت نہ ہونے کے برابر فاصلہ حائل تھا۔ میں نے اس قربت میں لی یان کے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ کو محسوس کرلیا۔ اس کا پورا بدن غیر محسوس انداز میں لرز رہا تھا۔ میں جانتا تھا' وہ کوئی کمزور یا بزدل لڑکی نہیں تھی۔ یہ اس نفسیاتی برتری کا اثر تھا جو مجھے اس پر حاصل تھی۔ وہ جن حالات سے گزر کر مجھ تک پہنچی تھی اور پھر میرے ساتھ رہتے ہوئے اسے مزید جن اعصاب شکن حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے لی یان کو خاصا بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ مجھ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگی تھی۔ خاص طور پر شون کی موت کے بعد وہ بالکل تنہا ہوگئی تھی لیکن میری دل جوئی اور پُرخلوص ہمدردانہ رویے نے اس کی تنہائی اور آزردگی کو پاٹ ڈالا تھا۔ وہ بہت کم وقت میں میری بہت زیادہ عادی ہوگئی تھی۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کے شانوں سے اٹھا کر رخساروں تک پہنچا دیا اور حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا "میں جانتا ہوں' تم بہت بہادر لڑکی ہو۔ اس وقت جذباتی ابال نے تمہیں ایسا کردیا ہے لیکن فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

وہ خاموش رہی۔ زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ تاہم اس کے وجود کے اندر پھیلا ہوا اضطراب' میرے ہاتھوں کے راستے مجھ تک پہنچتا رہا۔ میں دھیرے دھیرے اس اضطراب کو اپنے ہاتھوں سے کشید کرتا رہا تاکہ اس کے اندر مچلنے والا طوفان تھم جائے' وہ پُرسکون ہوجائے مگر میری اس کوشش نے الٹا اثر دکھایا۔

وہ شانت ہونے کے بجائے بپھر گئی۔ ہاتھوں سے اسے سنبھالنا ممکن نہ رہا تو مجھے مجبوراً دو ہاتھ آگے بڑھنا پڑا۔ اس سنبھلنے اور سنبھالنے پر تاریک رات نے رضاکارانہ طور پر آنکھیں بند کرلیں۔

میری ران پر ہونے والی تھرتھراہٹ نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور کردیا۔ میں نے سیل کی جملہ گھنٹیاں بند کرکے اسے سائیلنٹ الرٹ پر ڈال رکھا تھا۔ یہ یقیناً کاشانوک کی کال تھی۔ میں نے جینز کی جیب میں سے سیل نکالا تو میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔

میں نے سیل کو کان سے لگایا تو کاشانوک کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! میں نے ادھر کا میدان صاف کردیا ہے۔ پانچ منٹ سے پہلے پہلے تم اندر پہنچ جاؤ۔"

میں نے سیل کو' رابطہ ختم ہونے کے بعد لی یان کے حوالے کردیا اور تاکیدی لہجے میں کہا "جاؤ' ادھر ٹیکسی میں بیٹھ کر میری کال کا انتظار کرو۔ میں بہت جلد تم سے رابطہ کروں گا۔"

اس نے سیل کو جیب میں ٹھونسا' ہینڈ گرینیڈ والے بیگ کو اٹھایا اور "گڈ بائے" کا عملی مظاہرہ کرنے کے بعد ٹیکسی کی جانب بڑھ گئی۔

کاشانوک نے پانچ منٹ کے اندر مجھے عملی قدم اٹھانے کی ہدایت کی تھی۔ میں نے بنگلے کی عقبی دیوار کو اپنی نگاہ میں ناپ تول کر اندازہ لگایا پھر اس کے اوپر چڑھنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ بنگلے کے پچھواڑے گہری تاریکی کا راج تھا۔ ادھر سے کسی بندے بشر کے گزرنے کے امکانات نہیں تھے اسی لیے بھی میں نے بڑے مطمئن انداز میں دیوار کی بلندی تک رسائی حاصل کرلی۔ اس کے بعد میں نے ایک نظر اندر کا جائزہ لیا اور کاشانوک کو دریافت کرلیا۔

بنگلے کے عقبی حصے میں ایک وسیع و عریض لان تھا اور کاشانوک اسی لان میں کھڑا منتظر نگاہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیوار پر موجود پا کر اس نے ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا اور میں اس کا اشارہ پا کر بہ آہستگی بنگلے کے اندر کود گیا۔

نرم اور دبیز گھاس سے میرے قدم ٹکرائے تو ایک موہوم سی آواز پیدا ہوئی لیکن اس سبک آواز نے اس وسیع و کشادہ لان سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی۔ میں اطمینان سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور سیدھا کاشانوک کی سمت بڑھ گیا۔

کاشانوک مجھے اپنے ساتھ لے کر ایک کونے میں چلا گیا۔ ادھر قدرے تاریکی تھی۔ ہم اس تاریک گوشے میں پہنچے تو اس نے ایک گرم جیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

"اسے اپنے لباس کے اوپر پہن لو۔"

میں نے جیکٹ کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ ویسی ہی جیکٹ کاشانوک نے بھی اپنے لباس کے اوپر زیب تن کر رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا اس جیکٹ کا تعلق سیکیورٹی گارڈز سے تھا۔ پتا نہیں کاشانوک نے وہ فاضل جیکٹ میرے لیے کہاں سے اور کیسے حاصل کی تھی۔ میں نے جیکٹ پہنتے

ہوئے جب اس بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا۔

"پہلے جیکٹ پہن لو' پھر تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں۔"

میں جیکٹ کو اپنے لباس کے اوپر جما کر فارغ ہوا تو وہ مجھے لان کے ایک دور افتادہ کونے میں لے گیا۔ اس طرف ایک چھوٹا سا کمرا بنا ہوا تھا جس میں ناکارہ سامان بھرا ہوا تھا۔ وہیں مجھے ایک ہٹا کٹا شخص بے سدھ پڑا ہوا نظر آیا۔

میرے سینے سے ایک گہری اور متاسفانہ سانس خارج ہوئی۔ یہ سمجھنے میں مجھے ایک لمحے کی دیر نہ لگی کہ وہ بے ہوش نظر آنے والا شخص اس بنگلے کا سیکیورٹی گارڈ تھا جسے کاشانوک نے اپنے کسی کمال سے اناً فاناً غیر فعال کردیا تھا۔ اس نے مجھے جو جیکٹ پہننے کو دی تھی وہ اسی گارڈ کی تھی۔ بے سدھ پڑے ہوئے گارڈ کے نزدیک ہی مجھے ایک آٹو میٹک گن بھی رکھی دکھائی دی۔ کاشانوک نے وہ گن اٹھا کر میرے ہاتھوں میں تھما دی۔

"یہ رکھ لو۔ کسی برے موقع پر کام آئے گی۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

ویسی ہی ایک گن کاشانوک نے بھی اٹھا رکھی تھی۔ جب موبائل فون پر اس نے مجھے اس بنگلے میں کسی ہنگامی میٹنگ کی اطلاع دی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا' اس کی ڈیوٹی جوگندر پال نے بنگلے کے عقبی لان والے حصے میں لگائی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گارڈ بھی وہیں ڈیوٹی دے رہا تھا لیکن اس گارڈ کی بہ نسبت کاشانوک کو یہ سہولت اور آسانی حاصل تھی کہ وہ بنگلے کے اندرونی حصے میں بھی آجا سکتا تھا۔ اب اس دوسرے گارڈ کی جگہ میں وہاں آگیا تھا اور وہ بے چارہ دو تین گھنٹے کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر اسٹور روم میں آرام فرما رہا تھا۔

میں نے کاشانوک سے پوچھا "اندر کی کیا صورتِ حال ہے؟"

"صورتِ حال اطمینان بخش ہے۔" اس نے بتایا "جوگندر پال اندر موجود ہے لیکن اسرائیلی مہمان ابھی تک نہیں پہنچے۔ ان کا بڑی شدت سے انتظار ہو رہا ہے۔ ویسے سننے میں آرہا ہے وہ وقت کے بہت پابند ہیں۔ اصولاً اس کی آمد میں پندرہ منٹ ابھی باقی ہیں۔"

"ہمیں ابھی پندرہ منٹ میں اپنے کام مکمل کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"بالکل۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "میں یہ کام بہ آسانی کرلوں گا۔"

"میں......" میں نے اس کے جملے کا ایک لفظ پکڑ کر دہرایا اور حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا "کیا تم اکیلے یہ کام کرو گے۔"

"ہاں وجدان! اسے تم ہماری مجبوری سمجھ لو۔" وہ آہستگی سے بولا "تم بنگلے کے اندر نہیں جاؤ گے۔ میں نے اس سکیورٹی گارڈ کو اسی لیے آرام کی نیند سلایا ہے کہ تم یہاں لان میں اس کی پوزیشن سنبھال سکو تاکہ میں اطمینان سے ڈائنامائٹ کی تنصیب اور ٹائم بم کی پلیسنگ کا کام مکمل کرسکوں۔"

"اوہ!" میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا "تو کیا میں اس کھیل میں تمہارا اسلیپنگ پارٹنر ہوں۔"

"ایسی بات نہیں وجدان۔" وہ جلدی سے بولا "تم اس گیم میں اپنا بھرپور متحرک پارٹ ادا کرو گے۔ ڈائنا

مائٹ اور ٹائم بم ان لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے استعمال ہوں گے۔ اس بلاسٹنگ کے نتیجے میں اگر ان کو کوئی شدید جانی نقصان پہنچتا ہے تو یہ ہمارے لیے بونس ہوگا ورنہ میرا منصوبہ یہ ہے کہ انہیں وحشت میں مبتلا کر کے بنگلے کے میٹنگ ہال سے باہر لایا جائے اور جب وہ افراتفری کے عالم میں باہر نمودار ہوں گے تو ہم انہیں اپنی گنوں سے بھون کر رکھ دیں گے۔"

"آئیڈیا بہت عمدہ ہے۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا پھر پوچھا "ہمیں اس بنگلے میں زیادہ سے زیادہ کتنے افراد سے نمٹنا ہوگا؟"

"ایک سے تو میں نمٹ چکا ہوں۔" اس نے اسٹور روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "دوسرا چھت پر پہرا دے رہا ہے۔ میں کسی حیلے وسیلے سے اسے تمہارے پاس بھیج رہا ہوں' میری طرح اس سے تم نمٹ لینا۔ باقی صرف دو سکیورٹی گارڈ بچیں گے یعنی ہم دونوں۔ اس کے علاوہ ایک مسلح چوکیدار گیٹ پر متعین ہے۔ اس سے کسی بھی وقت نمٹا جاسکتا ہے۔"

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا "بنگلے کے اندر دو ملازمین اور باقی مہمان ہوں گے جن کی تعداد تین سے پانچ ہوسکتی ہے۔ ویسے وہ تین سے پانچ درجن بھی ہوں تو پروا نہیں ہے۔ وہ جس کسمپرسی کے عالم میں جان بچانے کے لیے بنگلے کے اندرونی حصے سے نکلیں گے انہیں شکار کرنا ہمارے لیے چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی الجھن ہو تو بتاؤ۔"

"کوئی الجھن نہیں ہے۔" میں نے کہا "کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم اس ہنگامی میٹنگ کی زندہ کارروائی کا نظارہ کرسکیں؟"

"ایسا کرنا انتہائی خطرناک ہوگا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "ہمیں صرف اپنے مطلب سے غرض رکھنا چاہیے۔ تم نے ڈین ہاروے اور کلاڈیا کو مار کر اپنے دشمنوں کے دلوں پر ایک دہشت سی بٹھا رکھی ہے۔ اس واقعے کے بعد ان کا پتا پانی ہوجائے گا۔ جب ہم یہاں سے کامیاب واپس جائیں گے تو تم ربی سے اکڑ کر بات کرسکتے ہو۔"

اس نے میرے دشمنوں اور ربی کا ذکر روانی میں کیا تو ہمیں یہ سمجھے بنا نہ رہ سکا کہ ڈاکٹر مونگ نے اسے میرے معاملات سے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ اس سے ایک بات یہ بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی تھی کہ کاشانوک ڈاکٹر مونگ کے لیے واقعی بھروسے کا آدمی تھا اور میں نے بھی اب تک اسے ایسا ہی پایا تھا۔

"ٹھیک ہے کاشانوک میں تمہارے منصوبے سے اتفاق کرتا ہوں۔" میں نے کہا "جیسے بھی سہی چلیں میں اپنے یہودی دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ نقصان تو پہنچا سکوں گا۔"

"اسی طرح جوگندر پال کے نامۂ اعمال کا حساب بھی ہوجائے گا۔" کاشانوک نے کہا "اس نے ان چپٹی چمڑی والوں کو اس دھرتی میں قدم جمانے کا موقع دیا ہے۔ وہ غدارِ وطن ہے اور غدار چاہے کسی بھی شعبے کا ہو' اس کی کم از کم سزا عبرت ناک موت ہوتی ہے۔"

بات کے اختتام پر اس کا لہجہ بے انتہا کڑوا ہوگیا۔

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے تسلی دی "فکر نہ کرو' سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

وہ اٹل لہجے میں بولا "اچھا' میں چلتا ہوں۔ پہلے میں چھت والے سکیورٹی گارڈ کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ اس کے بعد دھماکا خیز مواد کو نصب کروں گا۔"

"یہ کام تمہیں بہت احتیاط سے کرنا ہوگا۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

"میں نے ہر قسم کے ایمونیشن کے استعمال کی خصوصی ٹریننگ لے رکھی ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا "تم فکر نہ کرو' میں ڈائنا مائٹ کی تنصیب اور ٹائم بم کی پلیسنگ میں خاص احتیاط برتوں گا اس طرح کہ کسی کا میری طرف یا ان خطرناک اشیا کی طرف دھیان نہ جائے۔"

پھر وہ مجھ سے گرم جوش مصافحہ کر کے بنگلے کے پہلو میں نکل گیا۔

کاشانوک نے پندرہ منٹ کی جو مہلت بتائی تھی' اس میں سے تین منٹ گزر گئے تھے۔ میں ان اسرائیلوں کے بارے میں سوچنے لگا جو ابھی اس بنگلے میں نہیں پہنچے تھے اور اگر یہاں پہنچ جاتے تو پھر میں انہیں کہیں اور بھیجنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ وہاں...... جہاں سے وہ پھر کبھی واپس نہ آتے۔

دو منٹ بعد کاشانوک کی محنت رنگ لے آئی۔ میں نے ایک باوردی سکیورٹی گارڈ کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً یہ وہی گارڈ تھا جو بنگلے کی چھت کی نگرانی پر مامور تھا۔ وہ مجھ سے دس قدم کی دوری پر تھا کہ اس نے مجھے پکارا۔

"منگ! کیا بات ہے۔ تم نے مجھے کیا دکھانے کے لیے بلایا ہے؟"

کاشانوک نے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ میں نے جس گارڈ

کی پوزیشن سنبھالی تھی اس کا نام منگ تھا جبھی وہ گارڈ مجھے اس نام سے مخاطب کر رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس گارڈ کا نام تھاپا تھا۔

میں نے پُراسرار انداز میں اپنی جیب کو ٹٹولتے ہوئے کہا "تھاپا! اتنی دور سے تمہیں کیا دکھاؤں۔ قریب آؤ تو کوئی بات بھی بنے۔"

میں دانستہ ایک ایسی تاریک اوٹ میں کھڑا تھا جہاں تھاپا میرا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کاشانوک نے مجھے تھاپا کی ایک کمزوری بھی بتا دی تھی۔ وہ ذہنی آوارگی کا شوقین تھا۔ برہنہ عورتوں کی تصاویر دیکھنا اور اپنے پاس رکھنا اس کا محبوب مشغلہ تھا حتیٰ کہ اس نے اپنے موبائل فون کے ایم ایم سی (ملٹی میڈیا کارڈ) کی ساری میموری ایسی ہی تصاویر اور متحرک کلپس سے بھر رکھی تھی۔

للک کسی بھی شے کی ہو بری ہوتی ہے۔ جب انسان کی طلب و رسد میں توازن قائم نہ رہے تو پھر وہ جنونی ہوجاتی ہے' ہر وقت اس کے ذہن پر ایک سنک سی سوار رہتی ہے جو اسے ذہنی اور جسمانی طور پر نچوڑ کر رکھ دیتی ہے۔

تھاپا ایک حد تک نفسیاتی مریض ہو چکا تھا۔ وہ ذہنی آوارگی کی تمام حدود کو پھلانگ چکا تھا۔ میں نے اس کے آتشِ شوق کو ہوا دینے کے لیے اپنی جیب کو بہ دستور ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں کہاں رکھ دی ہیں۔ بڑا تازہ اور کرارا مال آیا ہے میرے پاس۔"

وہ کسی بھوکے پیاسے کی طرح رال ٹپکاتا ہوا ایسے میری جانب بڑھا جیسے کمان سے تیر نکلتا ہے۔ میں اسے سنبھالنے کے لیے پہلے ہی تیار کھڑا تھا۔ وہ جیسے ہی مجھ سے تین فٹ کے فاصلے پر پہنچا' میں نے اسے شکار کرلیا۔

میری ایک تیز رفتار سائیڈ کک اس کے سینے پر پڑی۔ میں نے اچانک ہی ایک لمبا اسٹیپ لے کر اسے خطرناک کک جڑ دی تھی۔ وہ میری طرف سے کسی ایسے ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا اسی لیے مار کھا گیا۔ وہ اپنی آنکھوں کو سینکنے کے لیے میری طرف بڑے اشتیاق سے بڑھا تھا۔ اس کی ہوس تو تسکین نہ پا سکی البتہ سینے پر ایک زبردست کک کا تمغا سج گیا۔

اس کے حلق سے "اوں" کی ایک مبہم سی صدا خارج ہوئی اور وہ پہلو میں لڑکھڑاتے ہوئے پختہ دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں شاید اس کی کھوپڑی کچھ زیادہ ہی متاثر ہوئی تھی کیونکہ دیوار سے تصادم کے بعد وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

میں لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ وہ اپنے جذبے کی تسکین کے لیے ایسا اندھا ہوگیا تھا کہ ہر شے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس کی کھوپڑی میں صرف ایک ہی تصور قائم تھا...... اور اس روشن تصور نے اس کی کھوپڑی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

اس کے سرسری معائنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کم از کم دو گھنٹے تک ہوش میں نہیں آسکتا تھا تاہم میں نے احتیاطاً پھر بھی اس کی گردن پر موجود مخصوص رگ کو مہارت سے مل دیا۔ اب اس کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت کی توقع نہیں رہی تھی۔

اس کے بعد میں اسے گھسیٹ کر اسی اسٹور روم میں لے آیا جس میں اس کا بھائی بند ہر شے سے بے گانہ پڑا تھا۔ میں نے تھاپا کو اصلی منگ کے اوپر ڈالا اور اسٹور روم کے دروازے کو بہ آہستگی بند کر کے وہاں سے ہٹ گیا۔

تھاپا! اندھیرے کے باعث میری صورت نہیں دیکھ سکا تھا ورنہ وہ چونک جاتا اور کوئی بھی گڑبڑ پیدا ہوسکتی تھی۔ بہرحال وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے منگ کے پاس آیا تھا اور میں نے ایک گائیڈ کا کردار ادا کرتے ہوئے اسے اصلی منگ تک پہنچا دیا تھا۔ اب وہ کسی طرح اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔

میں بڑے اعتماد سے بنگلے کے عقبی لان پر "پہرا" دینے لگا۔ پانچ منٹ بعد میں نے بنگلے کا مین گیٹ کھلنے کی آواز سنی۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ گیٹ کھلنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ کوئی گاڑی یا تو اندر آرہی تھی یا پھر باہر جارہی تھی۔ اس وقت معزز اسرائیلی مہمانوں کا بڑی شدت سے انتظار ہو رہا تھا لہٰذا اس بات کے امکانات زیادہ روشن تھے کہ کوئی گاڑی آہی رہی ہوگی۔

میں ایک دیوار کی اوٹ لے کر گیٹ کو دیکھنے لگا۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں مجھے کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا جب کہ میں بیرونی گیٹ کا منظر بڑی وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔

گیٹ پوری طرح کھل چکا تو میں دھڑکتے دل کے ساتھ وہاں کسی گاڑی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی لمبا چوڑا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چوکیدار نے اگر گیٹ کھولا تھا تو کسی گاڑی کو دیکھ کر ہی یہ "حرکت" فرمائی تھی۔ اگلے ہی لمحے یکے بعد دیگرے دو عالی شان گاڑیاں گیٹ میں سے بنگلے کے اندر داخل ہوگئیں۔

ان گاڑیوں کی آب و تاب اور لمبائی چوڑائی کو دیکھ کر

ایک لمحے میں یہ فیصلہ سنایا جا سکتا تھا کہ ان میں وی وی آئی پی شخصیات تشریف فرما ہوں گی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ...... تھا جن کا انتظار وہ شاہکار آ گئے۔ دوسرے ہی لمحے میرے اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔

مجھے ڈرائیو وے کا ایک بڑا حصہ بہ خوبی نظر آ رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے رکیں۔ اسی دوران میں جوگندر پال بھی بنگلے کے اندر سے نکل کر ان کے استقبال کے لیے ڈرائیو وے میں پہنچ گیا۔ پھر وہ معزز مہمان گاڑیوں سے باہر آ گئے۔

وہ کل پانچ افراد تھے اور رنگ و روپ سے سفید فام دکھائی دیتے تھے۔ یہ وہی پانچ اسرائیلی یہودی تھے جو میری گرفتاری اور سرکوبی کے لیے وہاں کوئی ہنگامی میٹنگ کرنے آئے تھے۔ میرے دل و دماغ میں غصے کی ایک شدید لہر اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے ماؤنٹ ایوریسٹ کی بلندی کو چھونے لگی۔ اس لہر کے اندر غصے کے ساتھ ہی نفرت کی بھی وافر مقدار شامل تھی۔

میرے دل میں آئی کہ ابھی اپنی کمین گاہ سے نکلوں اور جوگندر پال سمیت ان پانچ یہودیوں کو ان ہی کے گندے خون میں غسل دلا کر ٹھنڈے ٹھار فرش پر لمبا لٹا دوں لیکن میں نے اپنی اس خواہش کو زبردستی دبا لیا۔

ایسا کرنے سے بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ ہم جو منصوبہ لے کر اس بنگلے میں گھسے تھے وہ یہودیوں اور ان کے میزبانوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے زیادہ مؤثر اور کامل تھا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہی یہ بنگلا دھماکوں اور چیخ پکار کی عالمی منڈی بننے والا تھا۔ وہ لرزہ خیز مناظر زیادہ جان دار ہوتے۔

میں نے خود ترغیبی کے ذریعے اپنے ذہن کی تپش کو ٹھنڈا کیا اور گہری سانسیں لینے لگا۔ اس دوران میں ڈرائیو وے خالی ہو چکا تھا۔ معزز مہمان بنگلے کے اندر داخل ہو گئے تھے اور دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور انہیں باقاعدہ پارک کرنے کے بعد اندر چلے گئے تھے۔ گیٹ پر متعین چوکیدار نے دوبارہ گیٹ بند کر دیا اور اپنے مخصوص چھوٹے سے گارڈ روم میں بیٹھ گیا۔

میں اپنی جگہ سے نکلا اور ایک مرتبہ پھر ٹہلتے ہوئے عقبی حصے میں ''پہرا'' دینے لگا۔ اب مجھے کاشانوک کا انتظار تھا۔ وہ دس منٹ کے بعد مجھے دکھائی دیا۔ وہ سیدھا میرے پاس چلا آیا۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی میں نے پوچھ لیا۔

''کیا تمام انتظامات مکمل ہو گئے ہیں؟''

''ہاں میں نے نوّے فی صد کام کر لیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس سے ہماری ضرورت تو پوری ہو جائے گی نا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل۔'' وہ قطعیت سے بولا ''تم دیکھنا وجدان! تھوڑی دیر بعد اس بنگلے میں کیسی قیامت برپا ہوتی ہے۔''

''میں نے ان افراد کو گاڑیوں میں سے نکل کر بنگلے کے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا ہے جن پر یہ قیامت نازل ہونے والی ہے وہ کل پانچ تھے۔''

''پانچ وہ...... اور دو ان کے ڈرائیور۔'' کاشانوک... تصحیح کرتے ہوئے بولا ''بہت مزہ آئے گا وجدان! جب یہ تمام لوگ زندگی کی تلاش میں دوڑتے ہوئے اندر سے نمودار ہوں گے لیکن بنگلے کے بیرونی حصے میں موت اپنے خوف ناک جبڑے کھولے ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی!''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''میں اب اسی وقت تمہارے پاس آؤں گا جب دھماکے آغاز ہونے میں چند سیکنڈ رہ جائیں گے۔ اب تم فیصلہ کر لو کہ تمہیں کون سے محاذ کو سنبھالنا ہے؟ بنگلے کا عقبی حصہ یا سامنے والا حصہ؟''

میں نے کہا ''اس بات کے امکانات برابر ہیں کہ وہ لوگ بنگلے کے سامنے والے حصے سے نمودار ہوں گے یا عقبی حصے سے۔ ہم جگہ کو بانٹنے کے بجائے شکاروں کو تقسیم کر لیتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے؟'' کاشانوک نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا ''تم بنگلے کے اندر چوکنا رہو۔ میں ادھر باہر ہوشیار رہتا ہوں۔ میں نے اپنے شکار مارک کر لیے ہیں۔ یعنی پانچ اسرائیلی معزز یہودی۔ یہ مجھے جدھر سے بھی آتے یا جاتے دکھائی دیں گے، میں انہیں روسٹ کر کے رکھ دوں گا۔'' میں نے دانت پیستے ہوئے تھوڑا توقف کیا پھر کہا ''باقی تمام دشمن تمہارے شکار ہیں۔ بولو منظور ہے؟''

''منظور ہے!'' وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ رکھتے ہوئے پُرعزم لہجے میں بولا ''لیکن فائرنگ والی کارروائی ہم ان کے افراتفری میں مبتلا ہونے کے بعد شروع کریں گے۔''

''اوکے ڈن!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، میں اب چلتا ہوں۔'' وہ جانے کے لیے مڑا پھر معنی خیز انداز میں پوچھ بیٹھا ''وجدان، تم نے تماپا کو شاہکار تصاویر دکھا دی ہیں؟''

''کوئی ایسی ویسی دکھائی ہیں۔'' میں نے بھی تفریح لینے والے انداز میں کہا ''وہ ان فن پاروں کی تاب نہیں لا سکا اور ادھر اپنے ساتھی منک کے پاس بے ہوش و حواس پڑا ہے۔''

وہ معنی خیز انداز میں سر کو ہلاتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں آنے والے سنگین اور سنسنی خیز لمحات کا تصور کر کے محظوظ ہونے لگا۔ انسانوں کو لاشوں میں بدلتے دیکھنا کوئی خوش کن نظارہ نہیں ہوتا لیکن ربی اور اس کے درندہ صفت آلۂ کار یہودیوں نے انسانی خون کو جتنا ارزاں کر دیا تھا اس کے پیشِ نظر یہ لوگ کسی رو رعایت کے قابل نہیں رہے تھے۔ جوگندر پال ان کے آگے پیچھے دم ہلانے والا خوشامدی بنا ہوا تھا لہٰذا وہ بھی عبرت ناک سزا کا مستحق ٹھہرتا تھا۔

اس کمینے نے جانوس کے ساتھ مل کر مجھے پھانسنے کے لیے جو منصوبہ بندی کی تھی، اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو اس وقت میں ربی کا قیدی ہوتا۔ کلاڈیا اپنے کسی مسمریزائی عمل سے مجھے قابو کر کے یہاں سے لے جاتی اور لے جا کر ربی کے قدموں میں ڈال دیتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

میں زندہ سلامت تھا۔ جانوس، ڈین ہاروے اور کلاڈیا مجھے پھانستے پھانستے موت کے حصار میں بند ہو چکے تھے۔ یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ یہ بڑی اچھلتی کودتی ہے۔ اتراتی اٹھلاتی ہے اور اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتی لیکن موت ایک ہی جھٹکے میں اس کی تر کی تمام شُد کر کے رکھ دیتی ہے۔

کلاڈیا کے بارے میں سوچتے ہوئے آیوں آپ میرا تصور بنگلا نمبر جے۔ دو سو میں پہنچ گیا۔ اس بنگلے کے ایک کمرے میں اس حسین ساحرہ نے مجھے زیر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اس کے پھیلائے ہوئے دام میں نہ آ سکا لیکن اسی بنگلے کے بڑے ہال میں وہ مجھ سے زیر ہو گئی تھی۔ اسی زیر و زبر کے حوالے سے لی یان مجھے بڑے تیکھے انداز میں چھیڑتی تھی۔ پتا نہیں، اسے میری اس کارروائی کی کیسے بھنک مل گئی تھی؟

لی یان میں اچانک بہت زیادہ تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے اس کے نئے انداز کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ پتا نہیں، آگے چل کر وہ مجھ پر حیرتوں کے کون کون سے پہاڑ گرانے والی تھی!

اچانک مجھے ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے سوچا، مجھے جوگندر پال کی خبر لینا چاہیے۔ وہ اس وقت میرے خلاف ایک اہم ترین سازشی میٹنگ میں معروف تھا۔ میں پہلے بھی تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں رسائی حاصل کر چکا تھا۔ اگرچہ اس میٹنگ میں ہونے والی گفتگو مجھ تک نہ پہنچتی لیکن میں وہاں کے گرما گرم ماحول میں چند سانسیں تو لے سکتا تھا اور وہ منظر تو یادگار کی حیثیت کا حامل ہوتا جب بنگلے کے اندر پہلے دھماکے کی گونج سنائی دیتی۔ اس دہشت ناک آواز پر ان چھ افراد کا کیا ردِعمل ہوتا یہ ان کے چہروں کو جھانک کر ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

میں نے ایک محفوظ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تیسری آنکھ کے سامنے میں نے جیسے ہی جوگندر پال کے خدوخال کو ابھارا، مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

وہ جھٹکا دراصل اس خوفناک دھماکے کے سبب تھا جو عین اسی لمحے بنگلے کے اندر ہوا تھا۔ میں تھرڈ آئی کے استعمال کو یکسر ترک کر کے اپنی جگہ پر حاضر ہو گیا۔ اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میرے شکار وحشت زدہ بھیڑ بکریوں کے مانند بنگلے سے باہر نکلنے والے تھے۔

میں ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر بنگلے کے سامنے والے حصے کی جانب دوڑ گیا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ میرے مطلوبہ شکار اسی طرف ابھریں گے۔ انہیں غروب کرنے کے لیے مجھے وہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔

جتنی دیر میں، میں اپنے مطلوبہ حصے میں پہنچا، یکے بعد دیگرے دو اور لرزہ خیز دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی انسانی چیخیں بھی فضا میں بلند ہوئیں پھر میں نے افراتفری کے عالم میں چٹی چمڑی والے اسرائیلیوں کو بنگلے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی گن کو خوفناک برسٹ کے لیے زحمت دیتا، بنگلے کا گیٹ کھل گیا...... اور کھلے ہوئے گیٹ میں سے مجھے ایک ٹیکسی بنگلے کے سامنے رکتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اس ٹیکسی کو پہچان لیا۔

وہ کاشانوک والی ٹیکسی تھی اور ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر لی یان بھی موجود تھی۔ میں اس منظر کو دیکھ کر الجھ گیا۔

لی یان کو تو ہمارے بلاوے پر ادھر آنا تھا پھر وہ وقت سے پہلے کیسے وہاں پہنچ گئی۔ میں نے اسی ادھیڑ بن میں ایک سیکنڈ ضائع کیا۔ اگلے ہی لمحے کاشانوک کی چیختی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وجدان! پلٹ کر دیکھو...... ورنہ بازی پلٹ جائے گی!''

کاشانوک کی چیخ سے مشابہ تنبیہی پکار میں بلا کی قوت شامل تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے بالکل درست کہا تھا۔ واقعی، اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو جاتی تو یہ بازی پلٹ گئی تھی، پھر میں اپنی داستان سنانے کے لیے آج زندہ نہ ہوتا!

وہ انسانوں کا ایک پورا گروہ تھا۔ میرے ہاتھوں نے بجلی ایسی سرعت دکھائی۔ وہ بڑے وحشت زدہ انداز میں اندر سے باہر نکلے تھے۔ میری گن نے جی جان سے ان کا "استقبال" کیا۔ میرے ہاتھوں کی میکانکی حرکت نے ان کے سامنے موت کا دہانہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے بنگلے کی فضا ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھی۔

اسی لمحے دوسری جانب سے کاشانوک نے بھی محاذ کھول دیا دوطرفہ فائرنگ نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ میں نے لگ بھگ دس افراد کو موت کی سوغات وصول کرتے اور زمین بوس ہوتے ہوئے دیکھا۔ ان کی فلک شگاف چیخوں اور خوف ناک فائرنگ کے پس منظر میں ڈائنامائٹ اور ٹائم بم وغیرہ بھی اپنی "کارکردگی" دکھانے میں پیش پیش تھے۔

میں نے پہلی نظر میں جب انہیں بنگلے کے اندرونی حصے سے نمودار ہوتے دیکھا تھا تو ان کی تعداد پر توجہ نہیں دے سکا تھا لیکن اب وہ اور ان کی عبرت ناک موت کا لرزہ خیز منظر میری نگاہ کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس شیطانی ٹولے میں پانچ اسرائیلوں کے علاوہ ان کے ڈرائیورز، جوگندر پال اور اس کے ملازمین سب ہی شامل تھے۔ جوگندر پال اور اس کے ملازموں نے معزز مہمانوں کو رد کے رکھا تھا اور جس لمحے کاشانوک نے چیخ کر مجھے ان کی طرف متوجہ کیا، وہ اپنی گنز سے مجھے نشانہ بنانے والے تھے۔ میری گن کی آٹو میٹک جنبش نے انہیں ٹریگرز دبانے کا موقع نہ دیا اور دوطرفہ ہلاکت خیز فائرنگ نے پلک جھپکتے میں ان کے اجسام کو چھلنی میں بدل دیا۔

میں نے اور کاشانوک نے اپنے اپنے شکار مارک کر لیے تھے لیکن ان کی بدقسمتی کہ اتفاق سے وہ ایک ہی جگہ پر "جمع" ہو گئے تھے لہٰذا ہم دونوں کو بیک وقت شکار کھیلنا پڑا۔ جب وہ سب فنا کے گھاٹ اتر چکے تو میں نے ان کی لاشوں کے عقب سے کاشانوک کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ان کا جائزہ لینے کے لیے بڑی تیزی سے اس طرف بڑھ رہا تھا۔ میں لی یان کی جانب مڑ گیا۔

وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ یہ بات ذہن کو الجھا دینے والی تھی۔ چند لمحے پہلے میں نے اسے ٹیکسی سمیت بنگلے کے کھلے ہوئے گیٹ میں سے دیکھا تھا۔ میرے لیے تو یہ بھی حیران کن تھا کہ ان قیامت خیز لمحات میں گیٹ کس نے اور کیوں کر کھولا تھا۔ پھر میرا دھیان مسلح گارڈ کی طرف چلا گیا جو اس بنگلے کی چوکی داری پر مامور تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق صرف وہی شخص باقی بچتا تھا جو کسی نوعیت کی مزاحمتی کارروائی کی اہلیت رکھتا ہو۔ دیگر دو گارڈز، منگ اور تھاپا بنگلے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے ایک چھوٹے سے اسٹور روم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑے تھے۔ ان کی اس "بے خبری" میں میرا اور کاشانوک کا ہاتھ تھا۔

میں لپک کر گارڈ روم کے قریب پہنچ گیا۔ گارڈ روم خالی تھا۔ کھلے ہوئے گیٹ کے باہر کاشانوک والی ٹیکسی اب بھی نظر آ رہی تھی لیکن وہ لی یان کے وجود سے خالی تھی۔ میں گارڈ اور لی یان کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑا ہی رہا تھا کہ گیٹ کے باہر ایک ہیوی جیپ آ کر رکی۔ میں اچک کر ایک اوٹ میں ہو گیا۔ یہ اوٹ گارڈ روم کی ایک دیوار کے طفیل تھی۔

میں نہیں جانتا تھا، اس جیپ میں کتنے افراد ہوں گے لیکن یہ بات یقینی تھی کہ ان کا تعلق ہمارے دشمنوں سے ہوگا۔ بنگلا نمبر آر۔ ٹوکٹی میں جو کچھ پیش آیا تھا ان حالات میں وہاں پہنچنے والے جوگندر پال اور اس کے اسرائیلی مہمانوں کے خیر خواہ ہی ہو سکتے تھے۔

جیپ کے دروازے دھڑا دھڑ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ انہوں نے جیپ کو بنگلے کے اندر لانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا، وہ لوگ انتہائی ایمرجینسی میں وہاں پہنچے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ بنگلے کا گیٹ ان جیپ والوں کے لیے نہیں کھولا گیا تھا۔

فوری طور پر گیٹ کے بارے میں میرا ذہن یہی اندازہ لگا پایا تھا کہ اس کے کھولنے میں گارڈ کے سوا کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا، عین ممکن ہے، جب خوف ناک دھماکوں نے بنگلے کے اندر قیامتِ صغریٰ برپا کی تو جوگندر پال نے انٹر کام پر چوکی دار کو حکم دیا ہو کہ وہ بنگلے کا گیٹ کھول دے تاکہ انہیں وہاں سے فرار ہونے میں کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ وہ لوگ جس افراتفری کی کیفیت میں بنگلے کے اندرونی حصے سے برآمد ہوئے تھے اس سے تو یہی لگتا تھا، وہ پہلی فرصت میں بنگلے کو چھوڑنا چاہیں گے...... وہ بنگلا جس کے در و دیوار ایک ہلاکت خیز زلزلے کی لپیٹ میں تھے۔ اگر وہ لوگ بنگلے سے لپٹے رہتے تو وہ ان کے لیے عظیم الشان مدفن ثابت ہوتا!

اور ایسا تو ہو چکا تھا۔ موت سے فرار، دراصل زندگی

سے فرار ہے۔ جو لوگ موت سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت اسے اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں اس طرح وہ زندگی ہار جاتے ہیں۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہی زندہ رہنا بہادری ہے۔ وہ دس افراد زندگی بچانے کے لیے بے دریغ بنگلے سے نکلے لیکن موت نے انہیں ایسا دبوچا کہ زندگی سے باہر نکال دیا......!

مجھے سب سے زیادہ تشویش لی یان کی طرف سے تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، وہ ٹیکسی سے نکلنے کے بعد بنگلے کے اندر داخل ہوئی تھی یا باہر ہی کہیں محفوظ جگہ پر موجود تھی۔ ان تمام تر خیالات کے ساتھ ہی میری سماعت جیپ اور جیپ میں سے برآمد ہونے والوں پر لگی ہوئی تھی۔ میں اس وقت جس آڑ میں کھڑا تھا وہاں سے گیٹ کے باہر کا منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں ان کے اندر پہنچنے تک انتظار کرنے پر مجبور تھا اور اس سلسلے میں مجھے کوئی لمبا چوڑا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اگلے ہی لمحے چار گن بردار محتاط انداز میں بنگلے کے اندر داخل ہوگئے۔

ان کی پشت میری جانب تھی تاہم وہ جلد ہی میری نگاہ میں آگئے۔ مجھے صد فی صد یقین تھا کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا ورنہ پہلے وہ میری خبر لیتے پھر بنگلے والوں کی خیریت پوچھنے کے لیے آگے بڑھتے۔ وہ رات کا وقت تھا اور مجھے اس آڑ میں اچھی خاصی تاریکی میسر تھی۔

میں گارڈ روم کی دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے کھسکنے لگا۔ وہ جب میرے اور لاشوں کے درمیان پہنچے تو میں نے انہیں نشانہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس لمحاتی فیصلے کے ساتھ ہی میں نے اپنی گن کو سیدھا کیا لیکن ٹریگر دبانے کی نوبت نہ آئی، اسی لمحے مجھے اپنی پسلیوں میں چبھن کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھمکی آمیز آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''گن پھینک کر ہاتھ اوپر اٹھا لو ورنہ میں تمہارے گردے کو چھید ڈالوں......''

''اس کھلونے کو ہٹا لو لی یان......!'' میں نے جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اسے پہچان لیا۔

اس نے بھی میری آواز کو پہچان لیا تھا۔ اس کا پسٹل بردار ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ میری پسلیوں سے دور چلا گیا۔ میں جس مقام پر کھڑا تھا وہاں گہری تاریکی کا راج تھا اسی لیے لی یان مجھے دیکھ نہیں پائی تھی اور اس نے مجھے دشمن سمجھتے ہوئے ٹارگٹ بنا لیا تھا۔ پتا نہیں، وہ یہاں چھپی کیا کر رہی تھی!

میں اس کی طرف پلٹ گیا ''تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں'' وہ سرگوشیانہ لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ''میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں باہر ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر دیکھا تھا'' ہمارے درمیان وہ گفتگو نہایت ہی دھیمے انداز میں ہو رہی تھی۔ ''یہاں کب سے چھپی بیٹھی ہو؟''

''مجھے اس بدبخت کی وجہ سے یہاں آنا پڑا'' اس نے ایک سمت تاریکی میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ گیٹ کھولنے کے بعد میرے پیچھے پڑ گیا تھا''

میں فوراً ہی پیش تر سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ اس مسلح چوکی دار کی جانب تھا جو مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں اس سے پوچھا ''اس بدبخت سے پیچھا چھوٹ گیا یا کوئی کسر باقی ہے؟''

وہ بتانے لگی: ''میں ٹیکسی سے نکل کر تمہاری طرف آ رہی تھی کہ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی چال چلتی، اس نے بڑی پھرتی سے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا۔ مجھے مجبوراً اس کے حکم پر بنگلے کے اندر آنا پڑا۔ ایک طرح سے اس نے میرا مقصد پورا کر دیا تھا، میں بھی فوراً تمہارے پاس پہنچنا چاہتی تھی لیکن میں اس وقت گارڈ کی گن کے نشانے پر تھی۔۔۔ پھر جب بنگلا تڑاتڑ فائرنگ سے گونج اٹھا تو مجھے گارڈ سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع مل گیا۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر بات کو پورا کرتے ہوئے بولی ''اب شاید یہ کبھی اٹھ نہیں سکے گا!''

لی یان نے یقیناً یہ کارروائی اس وقت کی تھی جب میں گولیوں کی بوچھار میں جوگندر پال اور اس کے آقاؤں کو بھوننے میں مصروف تھا۔ لی یان کی اچانک اور غیر متوقع آمد کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک خار سا کھٹک رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تمہیں تو ہمارے بلانے پر اس طرف آنا تھا پھر......!''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اسی لمحے بنگلا ایک قیامت خیز دھماکے سے لرز اٹھا۔ یہ دھماکا پہلے ہونے والے دھماکوں سے زیادہ خوف ناک تھا۔ لی یان نے اضطراری انداز میں مجھے دبوچ لیا۔ وہ کوئی بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن اس دل دوز دھماکے نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بڑی حفاظت سے اسے تھام لیا۔

اس سماعت شکن دھماکے نے مجھے بھی ایک لمحے کے لیے لرزا دیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سننے کی صلاحیت سے تو گیا۔ کانوں میں بڑی وحشت ناک ''شائیں شائیں'' ہونے لگی۔ ردِعمل کے طور پر میں نے لی یان کو اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ وہ تو پہلے ہی میرے اندر گھسی چلی آ رہی تھی۔ ہم اس وقت یک جان دو قالب کی عملی تفسیر پیش کر رہے تھے۔ ہمارے دل دھڑک رہے تھے لیکن اس دھڑکن کو ہم ایک دوسرے کے وجود کی مخصوص جنبشوں سے محسوس کر رہے تھے۔

سماعت قدرے بحال ہوئی تو اس قیامتی دھماکے کے خوف ناک نتائج ''گھڑ گھڑاہٹ'' کی صورت ہمارے کانوں تک پہنچنے لگے۔ وہ کسی پہاڑ کے منہدم ہونے کی ہیبت ناک آواز تھی۔ یقیناً اس بلاسٹنگ نے بنگلے کی عمارت کو گھٹنے ٹیکنے اور زمین بوس ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں کاشانوک کے لیے خاصا فکر مند تھا۔ میں نے آخری مرتبہ اسے درجن بھر افراد کی لاشوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ایسا زاویہ میسر نہ آسکا کہ میں اسے دیکھ سکتا۔ میں اس کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بنگلے کی ماتمی فضا میں خوفناک فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ میں نے خود کو لی یان سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کاشانوک کی طرف جانا ہوگا۔ وہ چار کے مقابلے میں اس وقت اکیلا ہے......!''

''کون چار؟ وہ چونکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی ''کیا تم لوگوں نے بنگلے میں موجود دشمنوں کا صفایا نہیں کیا؟''

میں نے کہا ''جو یہاں موجود تھے انہیں تو آنجہانی کر دیا گیا ہے لیکن یہ چار ابھی ابھی جیپ میں یہاں پہنچے ہیں۔ میں انہیں بھوننے ہی والا تھا کہ تم نے میری پسلیوں سے اپنا ننھا سا پسٹل ٹکا دیا تھا۔''

''اوہ......!'' وہ متاسفانہ انداز میں بولی ''باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز تو میں نے بھی سنی تھی لیکن میں یہ نہ جان سکی کہ وہ کوئی جیپ ہے اور اس میں سوار ہو کر مزید چار دشمن یہاں پہنچ گئے ہیں'' وہ ایک لمحے کو ایسے انداز میں رکی جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آگئی ہو پھر تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کہیں یہ وہی جیپ تو نہیں!''

میں لی یان سے یہ نہ پوچھ سکا کہ وہ کون سی جیپ کا ذکر کر رہی تھی کیوں کہ اسی لمحے ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی خوفناک صدائیں سنائی دی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی درد میں ڈوبی ہوئی انسانی چیخیں بھی بلند ہوئیں۔ میں نے لی یان کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''تم یہیں ٹھہرو۔ میں کاشانوک کی خبر لے کر آتا ہوں۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی!'' وہ ایک دم تن کر کھڑی ہوگئی۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا ''وہاں بہت خطرہ ہے لی یان ضد نہ کرو۔''

''کیا یہ خطرہ صرف میرے لیے ہے......تمہارے لیے نہیں؟'' وہ میرے بازو کو مضبوطی سے تھام کر بولی' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، آؤ!''

عورت بڑی دلچسپ پہیلی ہے۔ جس سے ایک مرتبہ زیر ہو جائے، زندگی بھر زبر بن کر اس پر چھائے رہنے کی کوشش کرتی ہے!

ہم تاریک اوٹ سے باہر نکلے تو ایک دہشت ناک منظر نے ہمارا استقبال کیا۔ بنگلے کی عمارت کسی کھنڈر کا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ رات کی تاریکی نے اس دہشت میں سراسیمگی اور قنوطیت بھی بھر دی تھی۔ کاشانوک مجھے کہیں دکھائی نہ دیا تو میری پریشانی دو چند ہوگئی۔ میرے ذہن میں اس تشویش ناک سوال نے سر ابھارا...... کہیں وہ بھی عمارت کے ملبے میں تو نہیں......؟

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ کاشانوک کی موت کا تصور میرے بس میں نہیں تھا۔ میں دل سے اس کی زندگی کا خواہاں تھا۔ اس سے ملاقات ہوئے ابھی ایک آدھ دن ہی ہوا تھا لیکن اس مختصر سی مدت میں وہ مجھے اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا اور...... اپنوں کی موت کے بارے میں سوچنا کوئی آسان کام نہیں!

ہم دونوں نے بڑی سرعت سے عمارت کا سامنے والا حصہ دور ہی دور رہتے ہوئے دیکھ ڈالا۔ عمارت کے بچ رہنے والے حصے میں داخل ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کاشانوک ہمیں کہیں نظر آیا اور نہ ہی ان چار افراد میں سے کوئی دکھائی دیا جو ہیوی جیپ میں اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کے لیے وہاں پہنچے تھے۔

میں بنگلے کے پہلو میں سے ہوتے ہوئے عقب میں پہنچ گیا اور اسی لمحے میں نے کاشانوک کی جھلک دیکھ لی۔ وہ اپنے ''فارغ البال'' سر کے سبب فوراً میری نگاہ میں آگیا تھا۔ وہ اس وقت دو افراد سے نمٹنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھ گیا۔

نزدیک پہنچنے پر مجھے معلوم ہوا کہ کاشانوک کے مدِ مقابل انہی چار افراد میں سے دو تھے جنہیں جیپ نے یہاں پہنچایا تھا۔ کاشانوک بڑے تسلی بخش انداز میں ان کی ''آؤ بھگت'' کر رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ہر نوعیت کے ایمونیشن کے استعمال میں تربیت یافتہ ہے لیکن میں پہلی مرتبہ

دیکھ رہا تھا کہ وہ آتشیں ہتھیاروں سے زیادہ ہاتھ پاؤں کے استعمال میں مہارت رکھتا تھا۔ اب تک میرے مشاہدے اور تجربے میں یہی آیا تھا کہ اسی فی صد بدھسٹ مرد مارشل آرٹس اور دیگر فنونِ حرب وضرب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے مذہب میں اگرچہ کسی زندہ شے کو ذرا سا بھی ضرر پہنچانا گناہِ عظیم سمجھا جاتا ہے مگر اس قسم کے فنون وہ حفاظت خود اختیاری اور امدادِ باہمی کے لیے سیکھتے ہیں۔ انہیں کم زور کی مدد اور حفاظت کا درس دیا جاتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس کے مارشل آرٹ کا مظاہرہ ضرور دیکھتا لیکن ان سنگین لمحات میں اس تفریح کی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ بٹایا اور آیندہ چند سیکنڈ میں وہ دونوں افراد زمین چاٹ کر ''سکون'' کی نیند سو چکے تھے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے کاشالوک سے پوچھا ''میری گنتی کے مطابق' چار افراد باہر سے اس بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔ باقی دو کا کیا ہوا؟''

''یہ ادھر اور ادھر برابر ہوگئے ہیں'' کاشالوک نے اپنے ہاتھ کو ایسے جنبش دی جیسے اس نے انصاف کی ترازو اٹھا رکھی ہو''دو ملبے میں دبے ہیں' دو یہاں پڑے ہیں!''

''اوہ!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اب ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ ان چار کی تلاش میں مزید چالیس افراد یہاں پہنچ جائیں۔''

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور میرے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے بولا ''تم تو ٹھیک ہونا؟''

''ہم دونوں بالکل خیریت سے ہیں'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''دونوں؟'' وہ ٹھٹک کر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس نے یقیناً ابھی تک لی یان کو نہیں دیکھا تھا۔

میں نے ایک طرف اشارہ کر دیا ''وہ دیکھو۔''

''اوہ!'' وہ پریشان لہجے میں بولا ''یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟''

''یہ سوال تم اسی سے پوچھنا' پہلے یہاں سے نکلو'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کھینچتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں لی یان بھی ہمارے قریب آگئی تھی۔ ہم تینوں ممکنہ تیزی سے بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھ گئے۔ کاشالوک نے، لی یان سے استفسارات کا سلسلہ شروع نہ کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس وقت ہماری پہلی ترجیح بنگلے سے نکلنا تھا، وہ بنگلا جواب ایک کھنڈر کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ باقی باتیں تو ہم اطمینان سے کہیں بیٹھ کر بھی کر سکتے تھے۔

ہم بہ حفاظت بنگلے سے نکل آئے۔ ہماری ٹیکسی اور وہ ہیوی جیپ آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ جیپ پر نگاہ پڑتے ہی لی یان نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''وجدان! یہ تو وہی جیپ ہے!''

میں سمجھ گیا، وہ کسی خاص جیپ کا ذکر کر رہی تھی، کوئی ایسی جیپ جو اس نے پہلے بھی دیکھ رکھی ہو۔ اس کے انکشاف کو کاشالوک سن نہیں سکا تھا کیونکہ اس دوران میں وہ ٹیکسی کے قریب پہنچ چکا تھا پھر اس کی آواز بھی خاصی دھیمی تھی۔ یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ گاڑی کے حوالے سے میں وہیں اس کا انٹرویو شروع کر دیتا میں نے ہاتھ سے تھام کر اسے ٹیکسی کی جانب کھینچ لیا۔ اگلے ہی لمحے ہم نے اس جیپ اور اس کے چار سواروں پر لعنت بھیجی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔ پتا نہیں، اس جیپ نے ہمارا بھیجا ہوا ''تحفہ'' وصول کیا یا نہیں البتہ' اس میں بیٹھ کر وہاں پہنچنے والے چاروں افراد پوری طرح اس ''عنایت'' سے مستفید ہو چکے تھے۔

کاشالوک کی ڈرائیوری میں مجھے پہلے بھی سفر کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک مشاق ڈرائیور تھا۔ ہم جیسے ہی اسٹریٹ سے نکل کر مین روڈ پر چڑھے، پولیس کے مخصوص سائرن کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ پھر یہ مخصوص آواز لحہ بہ لحہ بڑھتی چلی گئی۔ اغلب امکان یہی تھا' وہ اروڑا کاٹیج کے نزدیک واقع بنگلا نمبر آر...... ٹوئنٹی کی جانب بڑھنے والی کوئی پولیس گاڑی تھی۔ نیپال کی پولیس اس معاملے میں اسرائیلیوں کی بھرپور مدد کر رہی تھی...... اور یہ تمام تر کارروائی ڈنڈے کے زور پر ہو رہی تھی۔

''پولیس اس اسٹریٹ میں دوسری سمت سے داخل ہو رہی ہے'' کاشالوک کی ٹھہری ہوئی آواز نے ٹیکسی کی اندرونی فضا پر طاری خاموشی کو توڑ دیا'' سائرن کی چیخ پکار سے تو یہی محسوس ہوتا ہے، وہ لوگ متاثرہ بنگلے کے نزدیک پہنچنے ہی والے ہیں'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''اچھا ہوا' میں نے دوسرے رخ سے ٹیکسی نکالی ہے۔''

کاشالوک کی بات سن کر میں نے غور کیا تو پتا چلا' ہم جنوب سے شمال کی سمت سفر کر رہے تھے۔ میں لی یان کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر بودھ ناتھ دیلی سے دلی بازار تک پہنچا تھا اور یہ تمام تر سفر ہم نے تقریباً مشرق سے مغرب کی جانب طے کیا تھا۔

میں نے کاشالوک سے پوچھا ''کیا ہم کہیں اور جا رہے

ہیں؟''

''کہیں اور...... کیا مطلب؟'' وہ چونک کر بولا۔

''ہمارا رخ بودھ ناتھ دیلی کی طرف تو نہیں!''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا '' میں خواہ مخواہ چند سڑکیں بدل کر یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ کہیں ہمارا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ جب تسلی ہو جائے گی تو پھر میں بے فکری سے بودھ ناتھ دیلی کا رخ کروں گا''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا '' لگتا ہے' نیپالی پولیس نے اسرائیلی مہمانوں کے ساتھ خاصا مضبوط گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔''

''میں تمہیں اس بارے میں تفصیلاً بتا چکا ہوں'' کاشالوک مہارت سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم آج کے اخبارات میں اپنے بارے میں گرما گرم خبریں بھی پڑھ چکے ہو۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ تمہیں کتنی شدومد اور سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔''

''ہاں، مجھے اس بات کا اندازہ ہو رہا ہے'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا'' مجھے گھیرنے اور قابو کرنے کے لیے ہی تو آر۔ ٹوئنٹی میں ہنگامی میٹنگ رکھی گئی تھی۔ میں سمجھ سکتا ہوں، ربی کو میری کتنی اشد ضرورت ہے''

''اس ہنگامی میٹنگ کا انجام بھی خاصا ہنگامہ خیز ہوا ہے!'' لی یان نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا'' میں نے کسی کھنڈر پر بھی ایسی وحشت برستے ہوئے نہیں دیکھی جیسی اس بنگلے پر برس رہی ہے۔''

کاشالوک نے براہِ راست لی یان کو مخاطب کر لیا اور الجھن زدہ لہجے میں پوچھنے لگا'' میں نے تو تمہیں اس بنگلے کی طرف آنے کے لیے فون نہیں کیا تھا پھر تم کیسے ادھر چلی آئیں؟''

یہ سوال کافی دیر سے میرے ذہن میں بھی کلبلا رہا تھا اور میں نے ایک موقع پر لی یان سے پوچھا بھی تھا مگر اس کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ خوف ناک دھماکا ہوگیا جس نے بنگلا نمبر آر۔ ٹوئنٹی کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا تھا۔ کاشالوک کا سوال سن کر میں بھی لی یان سے مستفسر ہوا۔

''تم نے بنگلے کے باہر کھڑی جیپ کو پہچان لیا ہے۔ یہ سب کیا چکر ہے؟''

''بتاتی ہوں' بتاتی ہوں'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''مجھے تم لوگوں نے جہاں انتظار کرنے کو کہا تھا' میں نے وہاں سے اس جیپ کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے ٹیکسی کی اندرونی لائٹ آف کر رکھی تھی اس لیے بھی مطمئن تھی کہ کوئی مجھے ٹیکسی کے اندر بیٹھے دیکھ کر پہچان نہیں سکے گا لیکن جب دو منٹ کے بعد دوبارہ یہ جیپ میرے قریب سے گزری تو میری چھٹی حس نے بتایا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی'' میں الرٹ ہوگئی چند منٹ کے وقفے سے اس جیپ نے ایک اور چکر لگایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ خصوصی گشت پر ہو۔ میں تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ ہم جتنے اہم مشن پر تھے اس کے پیشِ نظر مجھے یہی لگا کہ اس جیپ کا تعلق ہمارے دشمنوں ہی سے ہو سکتا ہے جو بنگلا نمبر آر...... ٹوئنٹی کے آس پاس کی اسٹریٹس کی نگرانی کر رہے ہیں۔

''ظاہر ہے' یہ خیال بہت ہی خطرناک تھا اور کسی فوری عمل کا تقاضا بھی کرتا تھا۔ میرے جی میں یہی آئی کہ تمہارے فون کا انتظار کرنے کے بجائے میں ہی تم سے رابطہ کر کے تمہیں یہاں کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کروں۔ میں نے سیل نکالنے کے لیے جینز میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ مذکورہ جیپ ایک مرتبہ پھر نمودار ہوئی۔ میں نے اپنا ارادہ ترک کر کے ہاتھ جیب سے باہر نکال لیا۔

''اس مرتبہ جیپ والوں میں سے ایک شخص نے عجیب حرکت کی۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ''بائے بائے'' کرنے والے انداز میں ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گئے مجھے اس بات کا تو اطمینان تھا' وہ میرا چہرہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکے ہوں گے لیکن کیا بھروسا، اگلی مرتبہ وہ لوگ جیپ روک کر میری طرف بڑھ آئیں؟

''اس خیال نے مجھے تھوڑا سا نروس کر دیا۔ مجھے اس جیپ اور جیپ والوں سے کوئی ڈر خوف نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس سے الجھنے کے بعد کہیں ہمارے مشن میں کوئی رخنہ نہ پڑ جائے۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا لیکن اس مرتبہ انہوں نے واپسی میں تاخیر کا مظاہرہ کیا، پتا نہیں کسی لمبے راؤنڈ پر نکل گئے تھے۔ مجھے اس مہلت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں نے بڑی سرعت سے سیل نکالا اور اس کے کی پیڈ پر کاشالوک کو نمبر پنچ کرنے ہی والی تھی کہ ایک خوفناک دھماکا ہوا۔ میں سمجھ گئی کہ تم لوگوں نے کارروائی آغاز کر دی ہے۔ ان لمحات میں تمہیں ڈسٹرب کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے میں ٹیکسی کو لے کر بنگلے کی طرف آگئی۔''

وہ چند لمحات کے لیے رکی پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے بولی'' اس کے بعد بنگلے کے گیٹ پر جو واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل میں تمہیں بتا چکی ہوں۔''

آخری جملہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تو

میں جان گیا، اس کا اشارہ چوکی دار سے نمٹنے کی طرف تھا۔ جیپ میں سوار جن چار افراد کو میں نے اور کاشانوک نے آر ٹوئنٹی میں فٹ کیا وہ وہی لوگ تھے جو اس بنگلے کی نگرانی پر مامور تھے۔ اب وہ کسی بھی قسم کی نگرانی سے مجبور ہو چکے تھے۔ باہر پڑے دو کے بارے میں تو کہا جا سکتا تھا، شاید وہ بچ جائیں لیکن عمارت کے ملبے کے نیچے دب جانے والوں کے حوالے سے کوئی بھی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی۔ بہر حال، یہ لی یان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جیپ والوں سے الجھے بغیر بنگلے کے گیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی...... اور مسلح چوکی دار کی بدقسمتی کہ وہ نادانی میں لی یان سے الجھ بیٹھا تھا......!

لی یان کے خاموش ہونے پر میں نے قدرے اطمینان بھرے لہجے میں کہا ''اللہ کا شکر ہے کہ ہم اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ ہمارے خلاف سازش کرنے والا اسرائیلی ٹولا اور ان کے سامنے دُم ہلانے والے جوگندر پال جیسے لوگوں کا صفایا ہو گیا۔ جو بھی ہوا، اچھا ہی ہوا!''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں وجدان!'' کاشانوک کی گمبھیر آواز ٹیکسی کے اندر گونجی تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کہہ رہا تھا ''اب تک تو جو بھی ہوا، اچھا ہی ہوا مگر...... اب اچھا نہیں ہو رہا!''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

وہ بولا ''ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے!''

''اوہ!'' میں نے بے اختیار پلٹ کر پیچھے دیکھا اور دنگ رہ گیا۔

حیرت اس بات پر نہیں ہو رہی تھی کہ کوئی ہمارے تعاقب میں لگ گیا تھا بلکہ میرے اچھلنے کا سبب یہ تھا کہ تعاقب کرنے والی وہی جیپ تھی جسے میں بنگلا نمبر آر۔ ٹوئنٹی کے سامنے کھڑا چھوڑ آیا تھا۔ جب ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو وہ جیپ خالی تھی۔ اس پر سوار ہو کر وہاں پہنچنے والوں کو ہم نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہمارا پیچھا کرنے کی ''جراُت'' فرماتے پھر یہ کیا چکر تھا۔ ہماری ٹیکسی اور اس جیپ کے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ میں اس کے اندر موجود افراد کی تعداد کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ ممکن ہے، یہ اسی جیسی کوئی دوسری جیپ ہو!

مگر دوسرے ہی لمحے لی یان نے اس خوش گمانی کی.... یکسر تردید کر دی۔ کاشانوک کی بات پر وہ بھی مڑ کر میری طرف عقب میں دیکھ رہی تھی۔ وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے! وجدان! یہ تو وہی جیپ ہے۔''

لی یان ٹیکسی میں بیٹھے رہنے کے دوران میں اس گشتی جیپ پر مشاہداتی ''پی ایچ ڈی'' کر رکھا تھا لہٰذا مستند تھا اس کا فرمایا ہوا۔ اس کی طرح حیرت مجھے بھی تھی کہ اتنی جلدی وہ خالی جیپ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک کیسے چلی آئی تھی۔ بہر حال، یہ جیسے تیسے اور کیسے بھی ہوا تھا...... ہو چکا تھا۔

میں نے کاشانوک کو مخاطب کرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں کہا ''اس جیپ سے جلد از جلد پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔''

''یہی کوشش کر رہا ہوں باس!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں ٹیکسی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس وقت ہم دلی بازار اور کمل پوکھاری کے درمیان جنوب سے شمال کی طرف جا رہے تھے۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے۔ موسم انتہائی سرد تھا جس کی وجہ سے اس سڑک پر رش نہ ہونے کے برابر نظر آ رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں جیپ والے رفتار بڑھا کر آناً فاناً میں ہمارے سر پر پہنچ سکتے تھے اور میں نے عقبی تاکا جھانکی کے دوران میں بہ خوبی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لوگ بہ تدریج اپنی رفتار میں اضافہ کر رہے تھے۔ نتیجے کے طور پر ہمارے درمیان حائل فاصلہ کم سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

ہوٹل لہاتسے گزرنے کے بعد کاشانوک نے ٹیکسی کو دائیں جانب موڑ لیا اور بولا ''وجدان! میں انہیں ڈاج دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم پوری طرح تیار رہنا۔''

اس نے لفظ ''تیار'' پر خاصا زور دیا تھا اور میں اس زور کا مطلب جانتا تھا۔ بنگلہ نمبر آر ٹوئنٹی سے نکلتے وقت ہم نے وہ خطرناک گنز بھی اپنے ساتھ رکھ لی تھیں جن کے بل بوتے پر اس بنگلے کے ''مکینوں'' کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ازیں علاوہ ہمارے پاس ہینڈ گرینیڈ کا بھی اچھا خاصا اسٹاک موجود تھا۔ میں نے کاشانوک سے پوچھا۔

''گن یا گرینیڈ؟''

''فی الحال گن کا استعمال زیادہ مناسب رہے گا'' وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم فائرنگ کر کے انہیں تعاقب سے روکو گے، میں ڈاجنگ کروں گا۔ اگر یہ حکمت عملی کامیاب رہی تو کام چل جائے گا ورنہ پھر ہم دوسرا طریقہ اپنانے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''اوکے! آئی ایم ریڈی'' میں نے گن پر گرفت کو مضبوط کرتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا پھر لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے تاکید کی۔

''میں جیسے ہی فائرنگ کروں، تم خود کو سیٹ پر گرا لینا۔''

''ٹھیک ہے، تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔''

اس دوران میں متعاقب جیپ ہم سے اور قریب آ گئی۔ اب وہ بڑی تیزی سے رفتار میں اضافہ کر رہے تھے۔ یہ سڑک قدرے ویران اور کم مصروف تھی۔ شاید وہ ہمیں یہیں گھیرنے کا ارادہ رکھتے تھے مابین فاصلہ کم ہو جانے کے باعث میں جیپ کے اندرونی ماحول کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔ اس جیپ میں صرف دو افراد موجود تھے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا عقبی نشست پر۔ عقبی نشست والے مذکورہ شخص کے ہاتھوں تک میری نگاہ نے رسائی حاصل کی تو مجھے چونک جانا پڑا۔

وہ ہاتھ ایک گن کو تھامے آہستہ آہستہ بلند ہو رہے تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ شخص ہماری ٹیکسی پر فائرنگ کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاید وہ اس موقع کے انتظار میں تھا کہ ان کی جیپ ہماری ٹیکسی کے متوازی آ جائے...... میں اسے یہ موقع کیوں کر دے دیتا......!

''ڈاؤن...... ڈاؤن!'' میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے اضطراری انداز میں کہا اور اپنی سائیڈ کے شیشے کو گرا کر گن سمیت اپنے بالائی دھڑ کو ٹیکسی سے باہر نکال لیا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ دونوں جانب سے بیک وقت فائرنگ ہوئی۔

فضا میں مخصوص ہولناک ''تڑتڑاہٹ'' گونج اٹھی۔ میں نے جیپ کے اگلے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے ایک مختصر برسٹ فائر کیا تھا تاکہ انہیں تعاقب سے روکا جا سکے۔ اس کے برعکس جیپ میں موجود گن بردار نے ٹیکسی کو روکنے کے لیے اس کے عقبی ٹائروں کو پھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

دونوں گاڑیاں بری طرح ڈگمگائیں تاہم ہر دوسری کے متذکرہ ٹائر محفوظ رہے، اس ڈگمگاہٹ کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ میری فائرنگ کے نتیجے میں جیپ کی رفتار میں کمی واقع ہوئی تھی جب کہ کاشانوک نے ٹیکسی کی رفتار کو خطرناک حد تک بڑھا دیا تھا۔

لی یان نے خود کو سیٹ پر گرا رکھا تھا، وہیں پڑے پڑے بولی ''یہ کم بخت ایسے نہیں مانیں گے۔ انہیں ہینڈ گرینیڈ سے اڑا دو وجدان!''

''وہ باز نہیں آئے تو مجھے یہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔

کاشانوک کی گمبھیر آواز ابھری ''وجدان! آگے تھوڑے فاصلے پر ہوٹل ریڈ ہاؤس ہے۔ میں وہاں سے ٹیکسی کو بائیں جانب موڑوں گا۔ وہاں سے آگے نسبتاً زیادہ سنسان علاقہ ہے۔ وہاں خاموشی اور سناٹے کا راج ہو گا۔ تم جج کر لو۔ اگر فائرنگ سے کام نہ چل سکے تو ہینڈ گرینیڈ کو آزمایا جا سکتا ہے لیکن جو بھی کرنا ہے، فوراً ہی کر ڈالو'' وہ لمحے بھر کر متوقف ہوا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دو طرفہ ہونے والی فائرنگ نے قانون کے محافظوں کو اس طرف متوجہ کر دیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے، جلدی ہی ہمارا کسی پٹرولنگ کار سے واسطہ پڑ جائے!''

میں نے چٹانی لہجے میں کہا ''انشا اللہ! اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ پولیس کی توجہ سے پہلے ہی ہم ان کا صفایا کر دیں گے۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے عقبی منظر کا جائزہ لیا۔ متعاقب جیپ خاصی مشتعل نظر آئی۔ میری فائرنگ نے شاید اسے آتش زیر پا کر دیا تھا۔ وہ طوفانی رفتار سے ہم پر چڑھ دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اس بار میں نے دو طرفہ ایک کا فیصلہ کیا۔ ہینڈ گرینیڈز والا بیگ عقبی نشست پر رکھا تھا۔ میں نے لی یان کے تعاون سے ایک گرینیڈ کو ہاتھ میں لیا، بڑی مہارت اور احتیاط سے اس کی پن کو کھینچا اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اسے متعاقب جیپ پر اچھال دیا۔

اگلے ہی لمحے ایک قیامت خیز دھماکا سنائی دیا۔ گرینیڈ اپنی منزل پر پہنچ کر پھٹ گیا تھا۔ اس کی کارکردگی کو چیک کرنے کے لیے میں نے گن تھامے، اپنے بالائی دھڑ کو کھڑکی سے باہر نکالا۔ میں اس گن سے سونے پر سہاگا کے مصداق...... جیپ پر ایک خطرناک برسٹ فائر کرنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے کہ میں ٹریگر پر جمی انگلی کو زحمت دیتا، ایک خوں چکاں منظر نے میری قوتِ حرکت سلب کر لی۔

وہ متعاقب جیپ کا تباہ کاری کا خوف ناک منظر تھا۔ میرے پھینکے ہوئے ہینڈ گرینیڈ نے جیپ کے پرخچے اڑا دیے۔ اس کے وجود کا بچا کھچا حصہ جو اس وقت سڑک پر دکھائی دے رہا تھا اس نے آگ کے کسی بھڑکتے ہوئے گولے کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یقین سے کہنا مشکل تھا کہ ہمارے دشمنوں کے پرخچے اڑ گئے تھے یا وہ آگ کے اس گولے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے؟

کچھ بھی تھا، وہ واصل جہنم ہو چکے تھے۔ نارِ جہنم میں جلیں یا خارِ جہنم میں تڑپیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خس کم، جہاں پاک!

ان لمحات میں، میں ایک عجیب سی تسکین محسوس کر رہا تھا۔ یہ تسکین اس شدید ترین نفرت کا نتیجہ تھی جو میں.... اپنے

دل میں ربی موشے ہائمن اور اس کی یہودی کٹھ پتلیوں کے لیے رکھتا تھا۔ اس نفرت کے بڑے طاقت ور اسباب تھے۔ یہ میری انتہا پسندی یا خواہ مخواہ کی دشمنی نہیں تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے یہودیوں کے باوا آدم ربی موشے ہائمن اور اس کے فرماں برداروں نے اپنے ظلم و ستم سے مجھے نفرت اور عداوت کے اس مقام تک پہنچا دیا تھا۔ ان کی طرف سے میرا دل پک چکا تھا، ذہن ہر لمحہ کھولتا رہتا تھا۔

پوری دنیا یہودیوں کی عیاری اور مکاری سے بہ خوبی آگاہ ہے۔ یہ بڑی شرافت اور معصومیت سے ظلم کرتے ہیں اور منافقانہ سیاسی چال بازیوں سے الٹا مظلوم ہی کو قصور وار ٹھہرا کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل راست اور ناگزیر ہے۔ اگر وہ یہ قدم نہیں اٹھاتے تو پتا نہیں، کون سی قیامت آ جاتی۔ فلسطین، عراق، ایران اور افغانستان میں ہونے والی غیر انسانی کارروائیاں ان کی زیادتی اور ہٹ دھرمی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

تاریخ گواہ ہے' یہودیوں کو" راہ راست" دکھانے کا سہرا ہٹلر کے سر جاتا ہے۔ میں انہیں صراطِ مستقیم پر چلانے کا ٹھیکے دار تو نہیں تھا تاہم خود پر چڑھے ہوئے قرض کو سود در سود اتارنے کے لیے ان دنوں میں ان کی جان کو ہٹلر ہو گیا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر، میں سود خود یہودیوں کو سود کی مار مار رہا تھا!

یہ تمام تر انتقامی خیالات ایک لمحے میں' میرے ذہن سے گزرے اور میں ٹیکسی کے اندر حاضر ہو گیا۔ میرے" خس کم، جہاں پاک" کے اظہار پر ان دونوں نے سکھ کی سانسیں لیں۔ کاشالوک نے کہا۔

" وجدان لارڈ بدھا کی مہربانی سے ہم نے ان خبیثوں سے نجات تو پالی ہے لیکن ابھی تک میرا ذہن اسی نکتے پر اٹکا ہوا ہے کہ ایک خالی جیپ ہمارے تعاقب میں کیسے لگ گئی؟"

میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا مگر صورتِ حال کی کشیدگی کو دور کرنے کے لیے میں نے سنجیدہ لہجے میں چھیڑا" عجیب بات کرتے ہو ــــ تم بھی۔ بھئی' وہ جیپ خالی کہاں تھی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس کے اندر دشمنوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ کیا کوئی خالی جیپ یوں فراٹے سے سڑک پر دوڑ سکتی ہے؟ نہ صرف وہ جیپ ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی بلکہ ہماری ٹیکسی کا شکار کرنے کے لیے اس میں سے باقاعدہ فائرنگ بھی کی گئی ہے......!"

وہ گڑبڑا گیا، جلدی سے بولا" م...... میرا یہ مطلب نہیں......"

" میں تمہارا مطلب بہ خوبی سمجھ گیا ہوں" میں نے تسلی آمیز لہجے میں اسے اطمینان دلایا۔

لی یان اٹھ کر سیٹ پر بیٹھ چکی تھی، جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولی" اس لعنتی جیپ کا ذکر بعد میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال فوری طور پر ہمیں کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانا چاہیے۔"

" او کے میڈم!" کاشالوک نے سپاٹ آواز میں کہا۔

بات ختم کرتے ہی اس نے اپنے دوست کی ٹیکسی کو ہوا کا گھوڑا بنا دیا۔

ہم نے متعاقب جیپ کو ہوٹل ریڈ ہاؤس سے تھوڑا پہلے شکار کیا تھا۔ اس وقت ہماری ٹیکسی مذکورہ ہوٹل کو اپنے پیچھے چھوڑنے کے بعد تیزی سے شمال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کاشالوک نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ یہ سڑک اس وقت انتہائی کم مصروف تھی۔ اس کی ایک وجہ تو موسم کی شدت تھی۔ اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس علاقے میں زیادہ تر مختلف ممالک کے سفارت خانے واقع تھے جو سرِشام ہی اپنی مصروفیات کو موقوف کر کے عالی شان عمارتوں پر تالے ڈال دیتے تھے لہٰذا رات کے اس حصے میں رونق اور چہل پہل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گینیشور کے علاقے سے گزرتے ہوئے کاشالوک نے مجھ سے استفسار کیا" دائیں ٹرن لوں یا بائیں؟"

تھوڑا آگے بائیں جانب ایک سڑک مڑتی تھی جو بنگلا دیش ایمبیسی، ایکسپریس ہاؤس وغیرہ سے گزرتے ہوئے ٹیکسل کے علاقے میں داخل ہو جاتی۔ ٹیکسل کے پینورامہ اپارٹمنٹس میں ہم نے کاشالوک کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا۔ جانوس نے ہمیں شکار کرنے سے پہلے وہاں' اپنے اپارٹمنٹ میں ٹھہرایا تھا لیکن خدا کی قدرت کہ شکاری خود شکار ہو گیا تھا اور ہم زندہ و تابندہ اپنے دشمنوں کا قلع قمع کرتے پھر رہے تھے۔

ٹیکسل کی طرف جانا مناسب نہیں تھا لہٰذا میں نے کاشالوک سے کہہ دیا" گینیشور سے گزرنے کے بعد تم ٹیکسی کو دائیں جانب موڑ لینا۔ ہم دریا عبور کر کے سیدھا بودھ ناتھ ویلی جائیں گے۔"

بودھ ناتھ ویلی سے دلی بازار کی طرف آتے ہوئے بھی ہم نے دریائے دھوبی کھولا کو کراس کیا تھا مگر وہ دوسری سڑک تھی۔ اس وقت ہم دوار کا ویلیج کا نیچ اور بورس ریسٹورنٹ کی طرف سے آئے تھے۔ دریائے دھوبی کھولا کھٹمنڈو میں شمالاً جنوباً بہتا ہے اور اسے عبور کیے بغیر ہم بودھ ناتھ ویلی نہیں پہنچ سکتے تھے۔

کاشانوک نے میری ہدایت کے مطابق ڈرائیونگ جاری رکھی اور جلد ہی ہم دریائے دھوبی کھولا والے پل پر پہنچ گئے۔ پھر جیسے ہی ہماری ٹیکسی نے پل پر "قدم" رکھے' ایک بڑی گڑبڑ نے ہمیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔

پل کے دوسرے کنارے پر دو گاڑیاں ایک دوسرے سے منہ جوڑے ایسے کھڑی تھیں کہ آگے بڑھنے کی راہ مسدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یقیناً یہ بندوبست ہمارے فرار کو ناکامیاب بنانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہ رہی کہ ہمارے دشمن ہمیں گھیرنے کے لیے خاصے وسیع پیمانے پر سرگرم ہو چکے تھے۔ میں نے اس صورتِ حال میں کاشانوک کو ہدایت جاری کی۔

"ٹیکسی کو واپس موڑ لو۔ آگے بڑھنا ممکن نہیں رہا!"

پیش آمدہ سچویشن میں کاشانوک نے ٹیکسی کو روک لیا تھا۔ میری ہدایت پاتے ہی اس نے آناً فاناً میں بیک گیئر لگایا اور بڑی تیزی سے ٹیکسی کو پیچھے لانے کی کوشش کی۔ اس دوران میں ہماری راہ کھوٹی کرنے والے بھی نمودار ہو گئے۔ پتا نہیں، وہ گاڑیوں کے اندر سے برآمد ہوئے تھے یا ان کے عقب میں "نشست" سنبھالے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ کل چار افراد تھے اور چاروں ہی مسلح!

یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ پل کی لمبائی زیادہ نہیں تھی اور وہ چاروں مسلح افراد بھاگتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ اگر وہ اپنی گنز کے دہانے کھول دیتے تو ہماری ٹیکسی کو چھلنی میں بدلتے ہوئے ذرا دیر نہ لگتی اور میں انہیں فائرنگ کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے ایمونیشن والے بیگ میں سے ایک اور ہینڈ گرینیڈ نکالا اور اس کی پن نکالنے کے بعد اسے دشمنوں کی سمت اچھال دیا۔ اگلے ہی لمحے ایک دل دوز دھماکا ہوا اور رات کی تاریکی میں جیسے بھڑکتا ہوا الاؤ روشن ہو گیا۔

میں نے گرینیڈ کو پھینکنے میں کچھ زیادہ ہی قوت صرف کر دی تھی۔ وہ مسلح افراد کو نشانہ بنانے کے بجائے ان کی "منتظر" گاڑیوں کی طرف جا نکلا تھا۔ خوف ناک دھماکا انہی گاڑیوں کے پھٹنے اور پرزہ پرزہ ہو کر فضا میں بکھرنے کے سبب تھا۔ ان گاڑیوں کے جو بچے کھچے حصے پل پر رہ گئے تھے انہوں نے آگ پکڑ کر وہاں ایک الاؤ روشن کر دیا تھا۔

اس قیامت خیز منظر کو "انجوائے" کرنے کا موقع تھا اور نہ ہی مہلت! میں نے بڑی سرعت سے گن سنبھالی اور تعاقب میں آنے والوں پر فائر کھول دیا۔

وہ اپنے عقب میں برپا ہونے والی قیامت سے بوکھلا گئے تھے لہٰذا میری فائرنگ کی زد میں آ گئے۔ انہیں اپنی گنز استعمال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے آن واحد میں انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ہلاکت خیز فائرنگ کی خوف ناک "تڑ تڑاہٹ" نے رات کے یخ بستہ سناٹے کو تار تار کر دیا۔ یہ اس سناٹے پر دوسرا حملہ تھا۔ ازیں قبل، ہینڈ گرینیڈ کے نتیجے میں ہونے والی بلاسٹنگ نے اسے بری طرح مجروح کر دیا تھا۔

اچانک مجھے ایک شدید جھٹکا لگا اور خطرناک گن ہاتھوں سے نکل کر باہر جا گری۔ ٹیکسی سے نکل کر تاریکی میں گن تلاش کرنے کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی ایک اور جھٹکا محسوس ہوا۔ اس جھٹکے نے ہماری ٹیکسی کو بری طرح لہرا دیا اور وہ پل کی ریلنگ سے جا ٹکرائی۔

میں نے گردن اٹھا کر عقب میں دیکھا تو صورتِ حال مجھ پر کھل گئی۔ کاشانوک ٹیکسی کو ریورس گیئر میں پیچھے لے جا رہا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی کو پل سے اتار کر واپس سڑک پر لے جاتا، اس کی کوشش کو ناکامیاب بنا دیا گیا اور ایسا کرنے والا ایک چھوٹا ٹرک تھا۔

ہم ایک واہیات صورتِ حال میں پھنس کر رہ گئے۔ عقب سے آنے والے اس چھوٹے ٹرک نے دیدہ و دانستہ ہماری ٹیکسی کو "ٹھوکروں" پر رکھ لیا تھا جس سے، اس کے دشمن ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا۔ پے در پے پہنچنے والے دو خطرناک جھٹکوں نے مجھے بتا دیا کہ اگر فوری طور پر اس ٹرک کی پیش قدمی کو نہ روکا گیا تو وہ ہماری ٹیکسی کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دے گا۔

ہماری ٹیکسی پل کی ریلنگ سے ٹکرانے کے بعد آڑی ہو کر مختصر سی فٹ پاتھ پر چڑھ "بیٹھی" تھی۔ ریلنگ کے ساتھ ساتھ پل کی دونوں جانب تین فٹ چوڑی فٹ پاتھ بنی ہوئی تھی اور ہماری ٹیکسی اس ٹرک سے ٹکریں کھانے کے بعد اس فٹ پاتھ پر نکل آئی تھی۔

وہ بڑے نازک اور فیصلہ طلب لمحات تھے۔ ٹیکسی کو ریورس کر کے پیچھے لانا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا اگلا حصہ ریلنگ سے جڑا ہوا تھا۔ کاشانوک نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"وجدان! اسے روکو ورنہ......"

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی لی یان چلائی "ہمیں فوراً ٹیکسی سے باہر نکل جانا چاہیے ورنہ یہ ظالم ٹرک ہمیں ٹیکسی سمیت دریا میں پھینک دے گا!"

لی یان کا خدشہ برمحل تھا۔ اس نے موقع کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا۔ میں نے کمر کو حتیٰ المقدور موڑ کر اس

خونی ٹرک کی طرف دیکھا۔ وہ چند "قدم" پیچھے ہٹنے کے بعد بڑے وحشت ناک انداز میں ہماری سمت آ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ایک دیوانگی پائی جاتی تھی۔ میں نے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں محسوس کر لیا کہ وہ اپنی ایک خوف ناک ٹکر کے نتیجے میں ہمیں بڑے حسرت ناک اسٹائل میں دریا برد کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے بجلی ایسی سرعت سے اس طوفانی ٹرک پر ایک طویل برسٹ مارا اس قاتل ٹرک کی ہیڈ لائٹس چکنا چور ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اگلے ٹائرز بھی پھٹ گئے۔ ونڈ اسکرین کا بھی کباڑا ہو گیا۔ اس اسکرین کے پیچھے موجود افراد پر کیا بیتی ہو گی۔ یہ دیکھنے کی میرے پاس مہلت نہیں تھی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی سائیڈ کا دروازہ کھول کر باہر لڑھک گیا۔ اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔

میں ٹیکسی سے باہر آنے کے بعد رولنگ کرتے ہوئے، فٹ پاتھ پر دور تک لڑھکتا چلا گیا اور اسی "لڑھکن" کے دوران میں، میں نے ایک خوف ناک دھماکے کی آواز سنی۔ یہ ایسی ہی دل دوز آواز تھی جیسے کوئی عظیم الجثہ پہاڑ کسی "رائی" سے ٹکرا گیا ہو اگلے ہی لمحے نشیب میں، ایک چھپاکے کی مخصوص آواز ابھری۔ یہ سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ یہ مخصوص آواز ہماری ٹیکسی کے، دریا کی سطح سے ٹکرانے کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔

میری بے دریغ فائرنگ کے باوجود بھی وہ ٹرک رکا نہیں تھا۔ حرکت کرنے والا جسم جس قدر بھاری ہو، اس کا مومینٹم اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ ٹائر برسٹ ہو جانے کے باوجود بھی وہ ٹرک اپنے مومینٹم کے زور پر چیختا چنگھاڑتا ہوا آگے بڑھا تھا اور ہماری ٹیکسی کو ایک خوف ناک ٹکر مار کر اس نے دریا میں پھینک دیا تھا...... اور اس ٹیکسی میں لی یان و کاشانوک بھی موجود تھے!

اس تشویش ناک صورتِ حالات نے مجھے بری طرح بوکھلا کر رکھ دیا۔ میں نے اضطراری انداز میں گردن اٹھا کر دیکھا۔ میں رولنگ کرتے ہوئے جائے وقوعہ سے دس بارہ فٹ مشرق کی سمت نکل آیا تھا۔ میری نگاہ نے ایک وحشت ناک منظر دیکھا۔ ہماری ٹیکسی کا وہاں نام ونشان نہیں تھا۔ ہمیں کچلنے اور روندنے والا ٹرک فٹ پاتھ پر چڑھا' ریلنگ سے ٹکا کھڑا تھا۔

میں نے بے ساختہ لی یان اور کاشانوک کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی لیکن وہ دونوں مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔ پول لائٹس کے سبب پل پر مناسب روشنی ہو رہی تھی۔ اگر انہوں نے میری طرح دریا برد ہونے والی ٹیکسی میں کودنے کی کوشش کی ہوتی تو وہ کہیں نہ کہیں ضرور نظر آ جاتے۔ تو کیا وہ دونوں بھی ٹیکسی کے ساتھ ہی دریا میں چلے گئے؟

اس ہولناک خیال نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ دریائے دھوبی کھولا میں ان دنوں بہت زیادہ پانی تو نہیں تھا لیکن اتنا ضرور تھا کہ ایک ٹیکسی کیا، کوئی ڈبل ڈیکر بس بھی بہ آسانی اس کی تہ میں بیٹھ کر دیکھنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی تھی۔

میں نے خطرناک آٹومیٹک گن کو مضبوطی سے سنبھالا اور محتاط قدموں سے ٹرک کی جانب بڑھنے لگا۔ ٹرک والے دشمنوں کا رویہ مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ ان کی پُراسرار خاموشی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ یا تو وہ سب میری خوف ناک فائرنگ کے نتیجے میں جہنم واصل ہو چکے تھے یا پھر اس قابل نہیں رہے تھے کہ ٹرک میں سے باہر نکلنے کی سکت رکھتے ہوں!

میں ٹرک سے چند فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو فائرنگ کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ یہ آواز ٹرک کی دوسری جانب یعنی پل کی مغربی سمت سنائی دی تھی۔ اس طرف پل کا ابتدائی حصہ تھا۔ برسٹ فائر کے جواب میں لمحاتی خاموشی کا وقفہ آیا پھر سنگل شاٹ فائر کی آواز گونجی۔ اس فائر کے ساتھ ہی ایک دردناک انسانی چیخ بھی بلند ہوئی۔ مجھے یہ جاننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ چیخ کسی مرد کے حلق سے خارج ہوئی تھی کیونکہ چیخ کے فوراً بعد اس شخص نے اپنے منہ نما گڑ کا ڈھکنا اٹھا دیا تھا اور وہاں سے ناقابلِ تحریر اور ناقابلِ اشاعت گالیاں ابل ابل کر باہر آنے لگی تھیں۔

اس صورتِ حال سے مجھے خاصی تقویت محسوس ہوئی۔ مادر پدر آزاد گالیاں دینے والی آواز ہرگز ہرگز کاشانوک کی نہیں تھی اور سنگل شاٹ فائر کسی ہلکی گن سے کیا گیا تھا۔ میرے ذہن نے فوراً اس سین کا نتیجہ اخذ کر لیا اور یہ نتیجہ بڑا حوصلہ افزا تھا۔ کوئی میرے اندر پکار پکار کر اطلاع دے رہا تھا کہ لی یان نے اپنے ننھے سے لیڈی پسٹل سے فائر کر کے کسی دشمن کو گھائل کر دیا ہے۔

میں نے محتاط روی کو بالائے طاق رکھا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے ٹرک کی دوسری جانب پہنچ گیا۔ اس لمحے نشیب میں مجھے قدموں کی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی کسی کا تعاقب کر رہا ہو۔ صورتِ حال سے یہ ظاہر ہو رہا تھا

کہ میری طرح لی یان نے بھی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر رولنگ کی تھی اور اب دشمن اسے چھاپنے کی تگ و دو میں تھے۔ میں نے بے دریغ نشیب کی جانب دوڑ لگا دی۔

دریائے دھوبی کھولا کھٹمنڈو شہر میں شمالاً جنوباً بہتا تھا اور جس پل پر یہ مارا ماری ہو رہی تھی وہ دریا پر شرقاً غرباً استادہ تھا۔ پل کے اوپر تو پول لائٹس نصب کر کے روشنی کا معقول بندوبست کر دیا گیا تھا لیکن اس طرف نشیب میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میں پتھریلے راستے پر، نیچے کی جانب بھاگتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچ گیا اور اسی لمحے ایک شخص پر میری نگاہ پڑی۔

وہ چاروں خانے چت، پتھریلی زمین پر بڑا بری طرح کراہ رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود بھی میں نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ اس شخص نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا رکھا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ متوقع طور پر لی یان نے اسی نامراد کو نشانہ بنایا تھا جس کے نتیجے میں اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان امڈ پڑا تھا مگر اس وقت وہ بدبخت بڑی حد تک شانت ہو چکا تھا۔ اس کی تمام تر کوشش محض کراہنے تک محدود تھی،

ان دشمنوں نے میری خاطر بہت ''تکالیف'' اٹھائی تھیں لہٰذا اس کڑے وقت پر میرا بھی فرض بنتا تھا کہ ان کی ''مدد'' کروں۔ میں اسی ''نیک'' مقصد کی خاطر جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گرم سوٹ میں ملبوس ایک سفید فام تھا۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ اسرائیلی یا پھر کم از کم یہودی ضرور ہوگا۔ لمحاتی معائنے نے مجھے بتا دیا، لی یان کی چلائی ہوئی گولی نے اس کا پیٹ چھید ڈالا تھا، تاریکی کے باعث وثوق سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا تاہم میرا اندازہ یہی تھا کہ گولی اس کے دائیں گردے کے آر پار ہو گئی تھی۔

وہ آر پار جیسی کیفیت میں اپنی زندگی کی آخری تکلیف دہ سانسیں لے رہا تھا۔ اسے اس اذیت سے نجات دلانا مجھ پر لازم ہو گیا۔ میں نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو اس کی ٹھوڑی کے نیچے جمایا اور دوسرا ''شفقت بھرا'' ہاتھ اس کے سر کے اوپر رکھتے ہوئے ایک جرک کے ساتھ کلاک وائز (گھڑی وار) جھٹکا دیا۔

اس کم بخت کی گردن میرے ہاتھوں میں یوں جھولنے لگی جیسے کسی پژمردہ بیل پر مردہ تری جھولتی ہے۔ میں نے نفرت انگیز انداز میں اسے پرے پھینکا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دریا کا کنارا کچا اور پتھریلا تھا جس پر پہاڑی درختوں کی بہتات تھی اور انہی بلند و بالا درختوں کے درمیان چلتے ہوئے میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے خاموشی اور سناٹے کی دبیز تہ میں اتر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی فائرنگ کے بعد اچانک سکوت کی سی فضا قائم ہو گئی تھی۔ کوئی گولی چلی اور نہ ہی دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں لی یان کی فائرنگ کا شکار ہونے والے شخص کو دیکھ چکا تھا۔ سردست تو یہی نتیجہ سامنے آ رہا تھا کہ خونی ٹرک میں سے صرف ایک دشمن ہی نکل کر لی یان کی طرف لپکا تھا جسے لی یان نے موت کی نیند سلا دیا۔ اس کا مطلب تھا، اس ٹرک میں سوار دیگر دشمنوں کو میری فائرنگ نے سپردِ جہنم کر دیا تھا۔

واضح رہے کہ میں لی یان کا ذکر اپنے مضبوط اندازے کی بنا پر کر رہا ہوں۔ میں نے ابھی تک اس کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ سنگل شاٹ فائر کرنے والی لی یان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا میں اس یقین کی، سردست کوئی وضاحت نہیں کر سکتا۔

میں انہی ہنگامہ خیز خیالات کے ہمراہ محتاط قدم اٹھاتے ہوئے دریا کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ سب سے زیادہ تشویش مجھے لی یان کی طرف سے تھی۔ قرائن سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہ حفاظت ٹیکسی میں سے باہر نکل آئی تھی۔ گولی کی آواز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی لیڈی پسٹل سے فائر کی گئی تھی لیکن لی یان اچانک کہاں غائب ہو گئی، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی تک کاشانوک کی موجودگی کے کوئی آثار سننے یا دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ اغلب امکان یہی تھا کہ اسے ٹیکسی میں سے باہر کودنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ٹرک کی پہلی خوف ناک ٹکر نے ٹیکسی کو پل کی ریلنگ کے ساتھ بری طرح ٹکرایا تھا جس کے نتیجے میں اس کا سامنے والا حصہ بڑے بھیانک انداز میں متاثر ہوا تھا۔ اگر کاشانوک ٹیکسی کے اندر ہی اندر دریا کی تہ میں پہنچ گیا تھا تو یہ بھی کچھ کم تشویش ناک صورتِ حال نہیں تھی۔

میں نے دکھتے ہوئے دل کے ساتھ، پہلو میں بہتے ہوئے، دریائے دھوبی کھولا کی سطح کو دیکھا۔ سناٹے بھری تاریکی میں دریا کی سطح بڑی ہیبت ناک دکھائی دی۔ میں یکا یک رک کر بہتے پانی کی اس ہیبت ناک اور پرہول سطح کو گھورنے لگا۔ میرا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ کاشانوک ختم ہو گیا۔ اس کی موت کا تصور میری سوچ کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ شاید یہ اس جذباتی وابستگی اور انسیت کا نتیجہ تھا جو بہت ہی کم وقت میں ہمارے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ اس مختصر سی میل ملاقات میں کاشانوک مجھے اپنا اپنا سا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں دریا کی سطح پر نگاہ جمائے کاشانوک کے بارے میں گہری سنجیدگی سے سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔ پانی کی سطح پر میں نے ایک غیر معمولی حرکت دیکھی تھی۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا کہ کوئی شخص تیراکی کر رہا ہے۔ میں نے تمام تر توجہ اس منظر پر مرکوز کر دی جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، کوئی شخص باقاعدہ تیرتے ہوئے کنارے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس یخ بستہ اور رگوں میں خون منجمد کر دینے والے موسم میں، نصف شب کے قریب کسی شوقین تیراک کے، دریائے دھوبی کھولا میں شوق پورا کرنے کے بارے میں تو سوچنا ہی حماقت ہوتا وہ جو کوئی بھی تھا، مصیبت زدہ اور آفت رسیدہ تھا......اور اس وقت کاشانوک سے زیادہ اور کوئی شخص مشکل میں نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بہ قول کسے، سانس روک کر اس کے کنارے تک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک میری محویت ٹوٹ گئی۔ میں کاشانوک کا پانی کی سطح پر ابھرتے اور کنارے لگتے ہوئے نہ دیکھ سکا کیونکہ اس سے پہلے ہی مجھ پر ایک ناگہانی آن پڑی تھی۔ میں ایک درخت کے نیچے کھڑا نظارہ کر رہا تھا اور مذکورہ ناگہانی اسی درخت پر سے نازل ہوئی تھی۔

گرم لبادے میں ملبوس وہ کوئی بہت ہی دھواں دھار آفت تھی اور اس نے مجھ پر وارد ہوتے ہی مجھے اپنے مضبوط جپھے میں جکڑ لیا۔ اس افراتفری میں گن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ادھر ادھر ہو گئی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کے جسم میں کسی بپھرے ہوئے سانڈ جیسی طاقت بھری ہوئی تھی میں نے اس کے قوی و توانا بازوؤں کی گرفت میں خود کو مجبور پایا۔

یہ مجبوری لمحاتی ثابت ہوئی کیونکہ میں نے چشم زدن میں اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا۔ وہ شخص میرے عقب میں موجود رہ کر، دائیں بائیں جھٹکے دیتے ہوئے مجھے نیچے گرانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اچانک اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

میری مزاحمت کو دیکھتے ہوئے مد مقابل میری طرف سے ایسے کسی ردعمل کی توقع نہیں رکھتا تھا لہٰذا وہ بڑی آسانی سے میری چال میں آ گیا۔ میں نے بدن کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے آگے کو گرایا تھا۔ وہ بھی طاقت کی جھونک میں میرے اوپر ہی گرتا چلا آیا۔ اس کا یہ عمل غیر ارادی تھا جب کہ میں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وہ حرکت کی تھی چنانچہ وہ مار کھا گیا۔

میں نے زمین کی طرف آتے ہوئے اپنے ذہن کو پوری طرح بیدار رکھا اور میرے ذہن نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے کو بھی شمار کیا۔ ہم دونوں اوپر تلے زمین کی جانب جھکے تھے میں نے جیسے ہی محسوس کیا' مجھ پر لدا ہوا شخص اپنا توازن کھو بیٹھا ہے، میں نے سوچا سمجھا داؤ آزما ڈالا۔

ہم زمین سے چند انچ کی دوری پر تھے کہ میں نے بجلی ایسی سرعت سے اپنی باڈی کو سائیڈ رول کیا۔ وہ شخص مجھ پر گرفت کھو چکا تھا لہٰذا اس کے نیچے سے نکلنے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ میں رول کرتے ہوئے ایک سمت نکل گیا اور وہ ''دھپ'' کی مخصوص آواز کے ساتھ' منہ کے بل پتھریلی زمین پر جا گرا۔

اس کے حلق سے ایسی دردناک آواز خارج ہوئی جیسے کسی جانور کی گردن پر چھری چلا دی گئی ہو۔ میں فوراً سے پیش تر سنبھلا اور تیزی سے اس کے قریب آ گیا۔

ہم دریا کے کنارے، درختوں کے بیچ جس مقام پر ایک دوسرے کو تولنے کی کوشش میں مصروف تھے وہاں اچھی خاصی تاریکی تھی تاہم قرب کے باعث ہم ہیولوں کے مانند بہ آسانی ایک دوسرے کو دیکھ پا رہے تھے۔ دریا کی دوسری جانب شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ادھر موجود کوئی شخص ہمیں اس تاریکی میں نہیں دیکھ سکتا تھا مگر ہم ان روشنیوں کی خیرات میں اپنے اردگرد کے ماحول کو کسی حد تک سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

وہ شخص جلد ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پہلے سے اس کے انتظار میں محتاط فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے محسوس کر لیا اور مجھ پر ایک جارحانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کوشش کی کمر توڑ ڈالی۔ اس کے ہاتھ خود تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے اس کے کشادہ سینے پر ایک بھرپور فرنٹ کک رسید کر دی۔

وہ اپنے سینے پر میرے جوتے کی مہر لگوانے کے بعد تھوڑا سا لڑکھڑایا اور دو قدم پیچھے چلا گیا۔ میں نے اس کی ڈگمگاہٹ کا فائدہ اٹھایا اور ایک لمبا اسٹیپ لے کر اس کے پیٹ میں ایک جرکی سائیڈ کک جڑ دی۔

میری یہ غضب بردار کک انگوٹھی میں نگینے کے مانند ثابت ہوئی۔ وہ بڑے برے انداز میں پیچھے کو الٹا اور ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرایا۔

اس شخص کے وجود میں لہریں لیتی ہوئی طاقت اور توانائی سے انکار ممکن نہیں تھا لیکن میں نے چند سیکنڈ میں محسوس کر لیا کہ وہ لڑائی بھڑائی کے صرف دیسی طور طریقے جانتا تھا۔ ہنگامی فائٹ میں طاقت سے زیادہ تیکنیک موثر ثابت ہوتی ہے اور اگر تیکنیک کو طاقت کے ساتھ استعمال کیا جائے تو یہ

سونے پر سہاگے کا اثر رکھتی ہے۔ اس حوالے سے مجھے اپنے مدِمقابل پر ایک خوش گوار برتری حاصل تھی۔

وہ درخت کے تنے کا سہارا لے کر اٹھا اور دونوں بازو پھیلاتے ہوئے میری جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ میں اس کے، خود سے ایک مخصوص فاصلے پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ جیسے ہی اس مقام پر پہنچا جہاں سے وہ دوبارہ چھاڈال کر مجھے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرتا، میں نے اپنے قدموں پر کھڑے کھڑے ایک ہائی جمپ لگائی۔

وہ مجھ سے ایسی حرکت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اپنے اوپر سے پرواز کرتے دیکھا تو وہ بری طرح بوکھلا گیا اور اس انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرائے جیسے اپنے سر کے اوپر اڑنے والے کسی پرندے کو پکڑنا چاہتا ہو!

میری اڑان اس کی پکڑ سے بالاتر تھی لہٰذا میں اس کی گرفت میں آئے بغیر اس کے عقب میں پہنچ گیا۔ قدم زمین پر لگتے ہی میں نے باڈی کو آگے جھکایا اور ایک جھٹکے دار ریئر کک اس کی پشت پر رسید کردی۔

وہ میری پرواز سے پہلے ہی سٹ پٹایا ہوا تھا، کمر پر جو ریئر (بیک) کک لگی تو وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور ایک مرتبہ پھر منہ کے بل پتھریلی زمین سے جا ٹکرایا۔ اس بار کراہوں کے ساتھ ہی اس کے منہ سے غلیظ گالیوں کا دریا بھی بہہ نکلا۔

وہ مقامی زبان اور انگلش کے مکسچر میں مجھے بڑی ننگی لفظی سنا رہا تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ انتہائی کھلش دلانے والا تھا۔ میں بڑی حد تک نیپالی زبان سمجھ لیتا تھا۔ میں تو پہلے ہی ان لوگوں کی طرف سے بہت ادھار کھائے بیٹھا تھا، یہ لاف گزاف میری سماعت سے ٹکرائی تو میں نے بھی اپنا غبار نکالنے کے لیے اسے دو چار تحفے پیش کردیے تاہم میرے۔ "مراسلات" میں کوئی رکیک جملہ شامل نہیں تھا۔

اچانک ایک مانوس آواز سن کر میں چونک اٹھا اور بے اختیار میری گردن اوپر کو اٹھ گئی کیوں کہ وہ آواز ایک قریبی درخت کی بلندی سے آئی تھی۔

"وجدان! کیا یہ تم ہو؟"

میں نے بولنے والی کو پلک جھپکتے میں پہچان لیا۔ وہ لی یان تھی۔ میں نے جب اپنے مدمقابل گینڈے کو کھری کھری سنائیں تو لی یان نے میرے لب و لہجے کو شناخت کرلیا تھا۔ وہ قریب ہی کسی درخت پر چھپی بیٹھی، ہمارے درمیان ہونے والے معرکے کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسے زندہ سلامت پا کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ میں نے اس کی آواز کے ماخذ کی سمت گردن موڑ کر جواب دیا۔

"ہاں، یہ میں ہی ہوں۔ تم بے خوف و خطر نیچے آؤ......!"

میرا جملہ نامکمل رہ گیا کیوں کہ اسی لمحے میرے وجود کو ایک زبردست دھکا لگا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ میری لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھا کر، مجھ سے چٹنے والا متحرک ہوگیا تھا۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چند فٹ آگے گیا پھر سنبھل کر پلٹ پڑا۔

وہ مجھ سے دو فٹ کی دوری پر "نظر" آیا۔ میں نے برق رفتاری سے اسے مہلک ککس پر رکھ لیا۔ میں اس کی کمزوری اور طاقت سے یک سا واقفیت حاصل کرچکا تھا لہٰذا اسے دام میں لانے کے لیے مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں اس کے انتہائی قریب آئے بغیر ہاتھ پاؤں کی خطرناک ٹھوکروں سے اس کی تواضع کرنے لگا۔ وہ گرفت میں لے کر دبوچنے، نچوڑنے، پھینکنے اور پٹخنے کا ماہر تھا۔ میں نے اسے ایسا کوئی موقع فراہم نہ کیا اور چند منٹ میں' کاسٹک سوڈا سے اس کی دھلائی کرکے پتھریلی زمین پر لمبا لٹا دیا۔

وہ میری "خاطر داری" سے ایسا مستفید ہوا کہ مجھے امید نہیں تھی، دو گھنٹے سے پہلے آنکھ کھول کر اس جہان رنگ و بو کو دیکھ بھی سکے گا اور ان دو گھنٹوں میں کھٹمنڈو کا قیامت خیز سرد موسم اس کی ہڈیوں کے ساتھ جو سلوک کرتا' اس کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

اس دوران میں لی یان درخت سے نیچے اتر آئی تھی۔ وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی "میں اسی شیطان سے چھپ کر ادھر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے دو ساتھیوں کو تو ٹھنڈا کردیا ہے۔ یہی منحوس قابو نہیں آرہا تھا۔ پتا نہیں، کس سانڈنی نے اسے جنم دیا ہے۔"

آخری جملہ اس نے بڑی تلخی سے ادا کیا تھا لیکن میں اس کے ابتدائی جملوں میں الجھا ہوا تھا' میں نے اسے اپنے مزید قریب کرتے ہوئے استفسار کیا۔ میرا اشارہ بے ہوش ہونے والے گینڈے کی جانب تھا۔

"اس کے ایک ساتھی کو تو میں نے اس طرف آتے ہوئے راستے میں زخمی پڑے دیکھا ہے۔ تم کسی تیسرے بندے کا ذکر کررہی ہو؟"

"وہ چند گز ادھر اتنا غفیل پڑا ہے" اس نے اندھیرے میں ایک سمت اشارہ کیا "میں نے مارشل آرٹس کے دو چار کاری ہاتھ دکھا کر اسے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا تھا۔"

"اوہ!" میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ "اس کا مطلب ہے، ٹرک میں سے صرف تین افراد نکل کر

تمہارے تعاقب میں دوڑے تھے!" پھر میں نے اس کے بدن کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ "تم خیریت سے تو ہونا؟"

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی "م...... میں ٹھیک ہوں۔"

"اس طرف ہونے والی فائرنگ کی آواز سن کر تو میں گھبرا گیا تھا!" میں نے کہا۔

وہ کسمساتے ہوئے بولی "وہ جو ادھر پڑا ہے اس نے مجھے ختم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی" اس کا اشارہ اپنے اس شکار کی طرف تھا جس کا تھوڑی دیر پہلے اس نے ذکر کیا تھا "میری زندگی باقی تھی کہ بچ گئی" وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی "جواب میں' میں نے پسٹل سے فائر کیا تو اس کا تیسرا ساتھی میری گولی کا نشانہ بن گیا۔ میں نے اس کی' درد میں ڈوبی ہوئی چیخ بلند ہوتے ہوئے سنی تھی۔ پتا نہیں، وہ اب کس حال میں ہوگا!"

لی یان اس شخص کا تذکرہ کررہی تھی جسے "دردِ گردہ" سے نجات دلانے کے لیے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جھٹکے دار حرکت کرنے کی زحمت دی تھی۔ میں نے لی یان کو اس شخص کے بارے میں مختصراً بتایا اور کہا۔

"وہ بے چارہ اب بڑے اچھے حال میں ہے۔ ایسا حال جس کا ماضی اور مستقبل منہ پھاڑ پھاڑ کر جائز و ناجائز تقاضے کر رہا ہوتا ہے!"

پتا نہیں' وہ میری بات کی سنگینی کو سمجھی کہ نہیں، ایک طویل و عریض جھرجھری لیتے ہوئے بولی "مجھے تو یہ سب کسی خواب و خیال کے مانند محسوس ہورہا ہے...... جیسے میں نے کوئی زبردست ایکشن مووی دیکھی ہو!"

اس کا اشارہ ان واقعات کی طرف تھا جو بنگلا نمبر آر۔ ٹونٹی سے لے کر یہاں پہنچنے تک رونما ہوئے تھے۔ واقعی یہ تمام تر مناظر کسی فلم کا حصہ ہی معلوم ہوتے تھے، خاص طور پر پل پر پیش آنے والے خونیں مناظر تو شوٹ کرنے کے قابل تھے۔ اس نوعیت کے تاثر انگیز اور اوریجنل سین تو باقاعدہ پروڈکشن اور ڈائریکشن کی مدد ہی سے فلمائے جاسکتے ہیں۔ بہرحال، یہاں جو کچھ پیش آیا تھا وہ کسی فلم کا سین نہیں بلکہ حقیقی زندگی کا ایک رخ تھا اور میری زندگی ایسے رخوں سے بھری ہوئی تھی۔

"لی یان...... یہ خواب و خیال نہیں، بلکہ حقیقت ہے" میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "تم جانتی ہو' حقیقت بڑی تلخ ہوتی ہے اسی لیے زندگی کو کڑوا کر...... دیتی ہے۔ ذہن میں رکھو کہ یہ ایکشن مووی ابھی "دی اینڈ" نہیں ہوئی" میں نے ایک لمحے کے توقف کرنے کے بعد اضافہ کیا۔

"اس سنسنی خیز فلم کا ایک کردار اس وقت منظر سے غائب ہے۔ ہمیں فوری طور پر کاشالوک کی خبر لینا چاہیے!"

"کاشالوک!" اس نے یہ الفاظ ایسے دہرائے جیسے اسے کوئی بھولی بسری کہانی یاد آگئی ہو۔ پھر غیر یقینی اور سراسیمہ لہجے میں بولی "کاشالوک تو ٹیکسی سمیت دریا میں چلا گیا......" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"چلا گیا تھا" میں نے گمبھیر آواز میں کہا "لیکن میرا خیال ہے، اب وہ دریا سے باہر آچکا ہے!"

وہ الجھ کر رہ گئی "تت...... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "تم تھوڑی دیر تک دوسری طرف رخ پھیر کر کھڑی ہوجاؤ۔ مجھے ایک ضروری کام کرنا ہے؟"

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اندرونی تجسس کے باعث وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"میں اس سانڈنی کی اولاد کے کپڑے اتارنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ مزید الجھ گئی "وجدان! تمہیں اس سچویشن میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے؟" وہاں پر اتنی تاریکی تھی کہ میں۔ لی یان کو ایسی ہدایت دیے بغیر بھی یہ کام کرسکتا تھا، وہ کچھ بھی دیکھ نہ پاتی لیکن اگر ذہن میں کپڑے اترنے کا تصور موجود ہو تو کچھ نظر نہ آنے کے باوجود بھی بہت کچھ دکھائی دینے لگتا ہے۔ تصور بہرحال، بصارت سے کم طاقت ور نہیں ہوتا!

"یہ مذاق نہیں بلکہ میں انتہائی سنجیدہ ہوں!" میں نے کہا۔

"بعض اوقات تم بہت مشکل ہوجاتے ہو!" اس کے لہجے میں ایک شکوا پنہاں تھا۔

"اس کے بدلے میں پھر آسان بھی تو ہوجاتا ہوں!" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی "وجدان......! تم میری سمجھ سے باہر ہو۔"

"میں چند منٹ بعد تمہاری سمجھ دانی میں سما جاؤں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "فی الحال' میں جو کہہ رہا ہوں، وہ سنو اور میری بات مان لو۔"

مان جانے میں اکثر لوگوں کا مان جاتا ہے لیکن لی یان مجھے مانتی تھی اس لیے مان گئی۔ ایک سوال بھی مزید پوچھے بغیر وہ رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ میں زمین بوس گینڈے کے ساتھ مصروف ہوگیا۔

میں اس کا لباس ایک خاص مقصد کے تحت اتارنا چاہتا تھا۔ میں نے کاشالوک کو تیزی سے تیر کر دریا کے اسی

کنارے کی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ تو اس سانڈ نے اچانک مجھ پر وارد ہو کر منظر کی ایسی کم تیسی کر دی تھی ورنہ میں کشادہ بازوؤں کے ساتھ کاشانوک کو دیل کم کہتا۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ وہ جب دریا سے باہر نکلے گا تو اس کا لباس ٹھنڈے ٹھار پانی میں بھیگا ہوا ہوگا۔ اسے فوری طور پر ایک گرم اور خشک لباس کی ضرورت ہوگی...... اور میں اس وقت کاشانوک کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کے بندوبست میں لگا ہوا تھا۔

تھوڑی آسانی، تھوڑی مشکل کے بعد میں نے، دنیا و مافیہا سے بے خبر گینڈے کو بے لباس کر دیا۔ موسم پہلے ہی کچھ کم شدید نہیں تھا۔ اس پر لباس سے عاری اس کا بدن دُہری قیامت سے گزرتا۔ اب ہڈیوں کے اندر گودا جمنے کے امکانات صدفی صد سے بھی تجاوز کر چکے تھے۔ میں نے اس۔ ننگ دھڑنگ ہاتھی نما انسان پر حقارت بھری نگاہ ڈالی اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آؤ چلیں!''

وہ میرے ساتھ ہولی۔

میں مانتا ہوں کہ میں نے اس سانڈ کے ساتھ کوئی زیبا سلوک نہیں کیا تھا لیکن میں ان تپش انگیز لمحات میں ایک عجیب سی وحشت میں مبتلا تھا۔ ربی موشے ہائمن اور اس کے دیسی، بدیسی چمچوں کے لیے میرے دل و دماغ میں جنون ہی جنون بھرا ہوا تھا...... اور یہ جنون و وحشت بھرنے والے بھی یہی لوگ تھے۔ پل پر ان کے ٹرک نے جس وحشیانہ انداز میں ہماری ٹیکسی کو ''ٹھوکروں'' میں اڑاتے ہوئے سپردِ دریا کیا تھا وہ ان کی سفاکی اور بربریت کا کھلا مظاہرہ تھا، جواب میں وہ بھی کسی ایسے ہی شان دار سلوک کے مستحق تھے۔ میں نے تو اس سانڈ کے استحقاق کا پاس کیا تھا۔ اس طرح تو ہوتا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں......!

اگر شوگر مل لگانے کا ارادہ ہو تو ساتھ ہی گتا فیکٹری بھی قائم کرنا پڑتی ہے۔ اسی طرح گھی کا کارخانہ چلانے والا، صابن کی انڈسٹری بھی کھولتا ہے۔ اس طریقے سے بائی پراڈکٹ کو کھپانا مفید اور آسان ہو جاتا ہے۔ ظلم و زیادتی کی راہ اپنانے والوں کو بھی اپنے بائی پراڈکٹس کا ''خیال'' رکھنا چاہیے۔ ایسے پراڈکٹس اینڈ بائی پراڈکٹس فائدہ پہنچانے کے بجائے ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں......!

میں لی یان کا ہاتھ تھامے تیزی سے دریا کی جانب بڑھ رہا تھا کہ اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ''وجدان! ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''کاشانوک کے پاس!'' میں کہا۔

اس نے میرے ہاتھ میں تھامے ہوئے ''گینڈے'' کے لباس پر ایک نظر ڈالی اور گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی ''اوہ! میں اب سمجھی''

''شکر ہے، سمجھ تو گئیں میں نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا'' ورنہ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھے بہ نفسِ نفیس تمہاری سمجھ دانی میں اترنا ہوگا''

اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی۔

جلد ہی ہم کاشانوک کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ دریا میں سے نکلنے کے بعد ہماری ہی طرف آرہا تھا۔ اسے وہاں ہماری موجودگی کا علم نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کو تلاشنے میں زیادہ خواری نہیں اٹھانا پڑی۔

وہ سر سے پاؤں تک شرابور تھا اور یہ شرابوری کپکپی طاری کر دینے والی تھی مگر کاشانوک بلا کی قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ اس کے تاثرات سے بالکل یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اندر سے کانپ رہا ہے۔ لگتا تھا، اس نے مارشل آرٹس کے میدان میں کافی ریاضت کر رکھی تھی!

کسی قسم کی بحث یا تفصیل میں پڑے بغیر کاشانوک نے میری ہدایت پر فوراً لباس تبدیل کر لیا۔ اس دوران میں، میں اور لی یان موجودہ حالات پر باتیں کرتے ہوئے مسلسل دریائے دھوبی کھولا کے اس پل کی سمت دیکھتے رہے جہاں ایک خون ریز معرکہ آرائی کے بعد ہم یہاں پہنچے تھے۔

وہاں پل پر اب خاصی گہما گہمی اور روشنی نظر آرہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا، ہمارے دشمنوں اور پولیس کی بھاری جمعیت وہاں پہنچ چکی ہے۔ ان لوگوں کے پاس فلڈ لائٹ کا بھی بندوبست تھا۔ تیز روشنی کا بڑا سا دائرہ دریا کی سطح پر ادھر اُدھر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً انہیں اسی ٹیکسی کی تلاش تھی جس پر سوار ہو کر ہم لوگ اس پل تک پہنچے تھے...... اور قرائن کے مطابق، وہ ٹیکسی دریا برد ہو چکی تھی۔

ٹیکسی اتنی اہم نہیں تھی جتنے ہم ان کے لیے اہم تھے۔ ہم نے بلاشبہ انہیں عظیم الشان نقصان سے دوچار کیا تھا۔ وہ ٹیکسی کی آڑ میں دراصل ہماری تلاش میں تھے اور بہت جلد وہ ادھر کا رخ بھی کرنے والے تھے۔ ہمیں جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔

کاشانوک نے لباس تبدیل کر لیا تو ہم خود کو گھنے درختوں کی اوٹ میں رکھتے ہوئے دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ جنوب کی سمت قدم بڑھانے لگے۔ دریائے

دھوبی کھولا پر دوسرا پل وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا اور ہم مذکورہ دریا کو عبور کیے بغیر بودھ ناتھ دیلی میں نہیں پہنچ سکتے تھے، جہاں پہنچنا ہمارے لیے ازحد ضروری تھا۔

کاشانوک کے حوالے سے میرے ذہن میں کئی سوالات کلبلا رہے تھے۔ اگر کوئی بند گاڑی کسی حادثے کے نتیجے میں، گہرے پانیوں میں اتر جائے تو اس کے اندر موجود افراد موت سے پہلے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ چاروں طرف سے پانی کا پریشر اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ گاڑی کے دروازے کھولنا تقریباً ناممکن ہو کر رہ جاتا ہے اور کاشانوک یہ ناممکن کام سرانجام دے کر بہ حفاظت باہر آ چکا تھا۔

میں نے اس بارے میں اس سے سوال کیا تو وہ بولا ''جب ٹیکسی کو آخری دھکا لگا اس وقت تم لوگوں کی طرح میں بھی اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ میں دروازہ کھولنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا لیکن اس قیامتی پش نے مجھے ٹیکسی سے باہر قدم رکھنے کی مہلت نہ دی اور میں کھلے ہوئے دروازے کو تھامے تھامے، ٹیکسی سمیت دریا میں پہنچ گیا۔''

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا ''میری خوش قسمتی کہ ان لمحات میں لارڈ بدھا مجھ پر مہربان ہو گیا اور جیسے ہی ٹیکسی نے پانی کی سطح کو بوسہ دیا، کھلا ہوا دروازہ اپنے قبضوں سے جدا ہو کر ٹیکسی سے الگ ہو گیا۔ اس طرح مجھے ٹیکسی سے باہر آنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے بعد تیراکی کی صلاحیت نے کام دکھایا اور دیکھ لو......'' وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''اس وقت میں تم لوگوں کے سامنے صحیح سلامت موجود ہوں۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور گمبھیر آواز میں کہا ''کاشانوک......! تمہاری سلامتی میں سب سے بڑا ہاتھ تمہاری قوتِ ارادی اور برداشت کا ہے ورنہ اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں بدن کی قلفی تو بعد میں جمتی ہے، انسان کی ہمت پہلے ہی جواب دے جاتی ہے۔ بہرحال......''

میں نے نامکمل جملے پر اپنی بات ختم کر دی۔ وہ کچھ نہیں بولا، خاموشی سے ہمارے ساتھ قدم اٹھاتا رہا۔ کچھ دیر تک ہم اسی اونچی نیچی پتھریلی راہ پر بچتے بچاتے چلتے رہے اور بالآخر دریا کے دوسرے پل کے قریب پہنچ گئے۔

لی یان نے تجویز پیش کی ''ہمیں فوری طور پر کوئی ٹیکسی پکڑ کر دیلی میں پہنچ جانا چاہیے!''

میرے اور کاشانوک کی طرح اس نے بھی اچھی خاصی مارا ماری کی تھی۔ ہم تینوں ہی کا تھکن سے برا حال تھا۔ کھٹمنڈو ایک زندہ اور ہنستا بستا شہر ہے۔ موسم سرما میں اتنی رات کو اگرچہ ٹیکسی وغیرہ کم ہو جاتی ہیں تاہم ان کا کال نہیں پڑ جاتا۔ تھوڑی سی کوشش اور انتظار کے بعد بہرحال سواری مل ہی جاتی ہے۔

''پہلے ہم اس پل پر سے دریائے دھوبی کھولا کو عبور کر لیں'' میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا ''دوسری طرف پہنچنے کے بعد کوئی سواری دیکھ لیں گے۔''

دونوں نے میرے مشورے کو راست جانا اور ہم نے نہایت ہی محتاط قدموں سے پل پر چلنا شروع کر دیا۔ دریا کی مغربی سمت ہمارے لیے نہایت ہی حساس اور رسکی ہو چکی تھی۔ اگر ہم پل کو پار کر کے مشرقی سمت میں پہنچ جاتے تو ہماری ''پوزیشن'' بہ نسبت زیادہ محفوظ ہو جاتی۔

میں نے کاشانوک سے کہا ''ہمیں اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ دشمنوں نے ٹیکسی کے نمبر کو نظر انداز کر دیا ہو گا۔ ٹیکسی تو گئی دھوبی کھولا کی تہ میں لیکن اس کے نمبر کی مدد سے وہ تمہارے دوست تک ضرور پہنچ جائیں گے اور یہ تمہارے دوست کے لیے اچھا نہیں ہو گا!''

''میں تمہاری بات کی گہرائی کو سمجھ رہا ہوں وجدان'' وہ گمبھیر آواز میں بولا ''لی یان نے جیپ والوں کی ''اٹکھیلیوں'' کا جو قصہ ہمیں سنایا ہے اس کی روشنی میں وہ ٹیکسی صد فی صد انفیکٹیڈ ہے۔ وہ ٹیکسی کے نمبر کی مدد سے مہندر کا سراغ لگا لیں گے۔''

جس ٹیکسی میں ہم نے اب تک سفر کر کے دشمنوں کے دانتوں پر لیموں نچوڑا تھا' وہ کاشانوک کے ایک دوست کی ملکیت تھی۔ اس نے اپنے اس دوست کا نام پہلی مرتبہ ہمارے سامنے لیا تھا۔

''پھر تم نے مہندر کے بارے میں کیا سوچا ہے کاشانوک؟'' میں نے استفسار کیا۔

''پل کی دوسری جانب چند گز کے فاصلے پر ایک فلنگ اسٹیشن ہے'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''وہاں فون کی سہولت موجود ہے۔ میں مہندر کو فون کر کے ہدایت کرتا ہوں کہ وہ اپنی ٹیکسی کی چوری کی رپورٹ درج کروا دے۔ اس طرح ایک طرف تو اس کی پوزیشن صاف ہو جائے گی اور دوسری جانب کسی کو یہ پتا بھی نہیں چل سکے گا کہ مہندر نے وہ ٹیکسی مجھے دے رکھی تھی۔''

اس کے ذہن میں بروقت ایک مفید بات آئی تھی۔ کاشانوک نے بتایا کہ مہندر نامی وہ شخص اس کا بے لوث دوست تھا۔ کسی مشکل وقت میں وہ اس پر آنچ بھی نہیں آنے دے گا۔ مہندر کی رہائش مہاراج گنج کے علاقے میں تھی۔

ہم پل کو عبور کر کے فلنگ اسٹیشن (پیٹرول پمپ) پر پہنچ گئے۔ کاشانوک اپنے دوست کو فون کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ ہمیں ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ کاشانوک نے نیپالی میں اس سے ''مذاکرات'' کیے اور اگلے ہی لمحے ہم اس ٹیکسی کے اندر بیٹھے تھے۔

مغرب کی سمت سفر کرتے ہوئے تھوڑی دیر بعد ہم گوسالا پہنچے پھر کاشانوک کی ہدایت کے مطابق ڈرائیور نے ٹیکسی کو رنگ روڈ پر ڈال دیا۔ رنگ روڈ کے ذریعے ہم دریائے بھاگ متی کے اوپر سے گزرے اور بائیں سمت مڑ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد، ہم شمال میں سفر کرتے ہوئے پشوپتی ناتھ ٹیمپل پہنچ گئے۔ کاشانوک دانستہ ٹیکسی والے کو اِدھر اُدھر گھما رہا تھا تاکہ اگر ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہو تو پتا چل سکے لیکن سوئے اتفاق، اس وقت ہم بالکل محفوظ انداز میں سفر کر رہے تھے۔

پشوپتی ناتھ ٹیمپل کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم دیو پٹن پہنچے اور پھر ایک ہی سڑک کو پکڑ کر ہم سیدھے بودھ ناتھ دیلی کی جانب بڑھ گئے۔ کاشانوک نے' ٹیکسی میں سفر کے دوران میں عقل مندی کا ایک کام یہ بھی کیا کہ باہمی گفتگو سے پرہیز برتا۔ میں نے اور لی یان نے بھی خاموش رہنے پر ہی اکتفا کیا۔ ٹیکسی کو ہم نے بودھ ناتھ دیلی سے تھوڑا پہلے ہی فارغ کر دیا اور پیدل چلتے ہوئے دیلی میں داخل ہو گئے۔

جب ہم گھر پہنچے تو رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

کاشانوک نے ہمیں ہمارے کمرے میں پہنچایا اور ''ایک منٹ' ابھی آیا!'' کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے آرام چیئر پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ لی یان بستر پر دراز ہو گئی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ہمیں ایک فرحت کا احساس ہوا تھا۔ فلوجی نے ہمارے جانے کے بعد کمرے کا ہیٹنگ سسٹم آف نہیں کیا تھا۔ اگرچہ وہ سسٹم پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا لیکن کھٹمنڈو کی کھلی فضا کی بہ نسبت، کمرے کا ماحول کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا۔ ہم نے اچھا خاصا وقت کھلے میں گزارا تھا اس لیے بھی وہ کمرا اس وقت ہمارے لیے ایک مہربان، نرم اور گرم آغوش کی حیثیت رکھتا تھا۔

''وجدان! میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی!'' لی یان کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس کا اشارہ گزشتہ دو گھنٹے میں پیش آنے والے واقعات کی جانب تھا۔ اس کے اظہار اور انداز سے میں محسوس کر سکتا تھا۔ اس نوعیت کی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور سچویشن سے زندگی میں اس کا پہلے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

میں نے وقت کی کلفت کو دور کرنے کے لیے ازراہِ مذاق کہہ دیا ''اپنے گال پر چٹکی بھر کر دیکھو!''

''اس سے کیا ہو گا؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''خواب اور حقیقت کا فرق واضح ہو جائے گا!''

''کیا میں یہ تجربہ تمہارے ساتھ دُہرا سکتی ہوں؟'' وہ شوخی سے بولی۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''میرا خواب تو ایک عرصے سے ٹوٹا ہوا ہے۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں......!''

اس سے پہلے کہ لی یان مزید کچھ کہتی، کاشانوک ہمارے پاس آ گیا لہٰذا معنی خیز گفتگو کو بریک لگ گئے۔ میں کاشانوک کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ دیکھ کر متعجب ہوا۔ وہ شیونگ کٹ سے ملتا جلتا ایک بیگ تھا۔ میں نے اس بیگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''کاشانوک! یہ تم کہاں سے لائے ہو......اور اس میں کیا ہے؟''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''یہ فلوجی کی شیونگ کٹ ہے۔ ایک شیونگ کٹ میں کیا کچھ ہو سکتا ہے، اس سے تم بھی اچھی طرح واقف ہو!''

لی یان، کاشانوک کی آمد کے بعد اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی، وہ لقمہ دیتے ہوئے بولی ''اور اس بات سے میں بہ خوبی آگاہ ہوں کہ تم اس کٹ کو کس استعمال میں لاؤ گے!'' اس کا مخاطب کاشانوک تھا۔

لی یان کے لہجے میں پوشیدہ شرارت کو میں نے پلک جھپکتے میں محسوس کر لیا، چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا ''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''کھچ......کھچ......کھچ!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''وہاٹ؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک ہاتھ سے سر کی جانب اشارہ کیا اور اسی ہاتھ کی دو انگلیوں کو کسی قینچی کے مانند حرکت دیتے ہوئے شوخی سے بولی۔ ''آئی مین......کھچ کھچ کم!''

بات سمجھ میں آئی تو میں نے سرزنش کے انداز میں اسے گھورا۔ کاشانوک کا منصوبہ تھا کہ بودھ ناتھ دیلی سے روانہ ہونے سے پہلے مجھے ایک مونک کا روپ دھارنا ہوگا۔ اگر میں اپنی وضع قطع اور حلیے سے کوئی بدھ بھکشو دکھائی دوں گا تو یہ ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس تیاری کے لیے لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی مجھے بدھ راہبوں کی طرح اپنا سر بھی منڈوانا تھا۔ لی یان نے اس حوالے سے پہلے بھی میرا اچھا خاصا مذاق اڑایا تھا اور اب بھی وہ اسی قسم کی حرکت کررہی تھی۔

کاشانوک گہری سنجیدگی سے بولا ”میں نے آگے روانگی کے سلسلے میں پوری تیار کرلی تھی۔ تم دونوں کے روایتی لباس اور اشیائے ضرورت کو ایک بڑے بیگ میں بھر کر میں نے ٹیکسی کی ڈکی میں رکھ چھوڑا تھا جو اس ٹیکسی کے ساتھ ہی دریا برد ہوگیا۔“

وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ”فلوجی کو میں نے تمہارے لباس کے بندوبست کے لیے بھیجا ہے اور اس کی شیونگ کٹ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ اب تم میرے ساتھ واش روم کی طرف چلو۔ میں دس پندرہ منٹ میں تمہارا سر منڈ ڈالوں گا لیکن اس سے پہلے مجھے ایک ضروری کام کرنا ہوگا“ اس نے چونکنے والے انداز میں توقف کیا اور اضافہ کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”وجدان! ذرا وہ بیگ نکالو جس میں میک اپ وغیرہ کا سامان رکھا ہے؟“

”کیا تم سر مونڈنے کے ساتھ ساتھ میرے چہرے پر بھی کام کروگے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا، فی الحال تو مجھے ہیئر ڈرائر کی ضرورت ہے!“

میں نے حیرت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا ”ہیئر ڈرائر کا کیا کروگے کاشانوک؟“

”تم نکالو تو سہی، ابھی بتاتا ہوں“ وہ اپنی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے بولا۔

آج صبح ...... یعنی کل صبح کاشانوک ہمارے لیے جو شاپنگ کرکے لایا تھا اس میں کپڑوں کے علاوہ میک اپ کا ضروری سامان بھی موجود تھا۔ جتنی دیر میں، میں بیگ میں سے ہیئر ڈرائر نکالتا، وہ اپنی جیب میں سے موبائل فون برآمد کرچکا تھا۔ دریائے دھولی کھولا کے کنارے لباس تبدیل کرتے وقت کاشانوک نے اپنی جیبوں کا سارا سامان خشک لباس کی جیبوں میں منتقل کردیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دیگر جیبی اشیا کے ساتھ ہی وہ سیل بھی ٹھنڈے ٹھار پانی میں شرابور ہوگیا تھا۔

کاشانوک نے سیل کو کھول لیا۔ اس کی بیٹری اور سم کارڈ کو سیل سے جدا کیا اور ہیئر ڈرائر کو آن کرنے کے بعد اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ سیل کے تمام ”اعضا“ جب اچھی طرح سوکھ گئے تو اس نے انہیں اسمبل کرنے کے بعد سیٹ کو آن کرنے کی کوشش کی ”کوشش“ کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ متعدد بار ایسا کرنے کے بعد بھی اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ وہ سیل ”زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد“ کی عملی تفسیر پیش کرتا رہا تو کاشانوک مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”اس کی چھٹی ہوگئی۔ ٹائیں ٹائیں فش!“

لی یان نے کہا ”اب تو کافی دیر گزر گئی۔ اگر بھیگنے کے ساتھ ہی اسے کھول کر خشک کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس بات کے امکانات تھے کہ یہ دوبارہ ”زندہ“ ہوجاتا۔“

”مگر وہاں ہمیں کوئی ڈرائر میسر نہیں تھا“ کاشانوک نے کہا ”ہمیں اپنی زندگی بچانے کے لالے پڑے تھے، سیل کے بارے میں کب اور کیا سوچتے!“

میں نے پوچھا ”کاشانوک! کیا یہ ریپئر نہیں ہوسکتا؟“

”اس میں ریپئرنگ والا ہوتا ہی کیا ہے!“ وہ سادگی سے بولا ”یہ سسٹم آئی سی کے تحت کام کرتا ہے۔ یا تو خراب ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوجاتا ہے تو پھر اسے ٹھیک نہیں کیا جاسکتا۔ اب یہ ایک بے جان پتھر ایسی حیثیت کا مالک ہوگیا ہے۔“

کاشانوک اور لی یان ...... اور انہی کی طرح کے دیگر لوگ جو موبائل فون، دستی گھڑی اور الیکٹرک اینڈ الیکٹرانکس کی ایسی ہی روزمرہ استعمال کی اشیا کو ڈسپوزیبل سمجھتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ہمارے وطنِ عزیز کی الیکٹرانس مارکیٹس میں کیسے کیسے چیتے بیٹھے ہیں جو ایسے ہی اچانک ”خاموش“ ہوجانے والے آلات میں زندگی دوڑا دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ٹیکنالوجی بعد میں آتی ہے، جوگاڑ پہلے تیار کرلی جاتی ہے۔ اس پاک دھرتی کی زرخیز فضا میں سانس لے کر پروان چڑھنے والوں کو اگر اپنے جوہر آزمانے کے بھرپور مواقع ملیں تو یہ زندگی کے ہر شعبے میں دیگر اقوامِ عالم کو سر پاس کرتے ہوئے اپنے تابندہ ودرخشندہ ماضی کی یاد تازہ کردیں گے۔

مغرب، خصوصاً امریکا کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کو پھلنے پھولنے نہ دے۔ ایسی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں کہ انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی سے دور رکھا جائے اور انہیں سیکھنے کے صرف اتنے ہی مواقع فراہم کیے جائیں کہ یہ ان کے سامنے سر اٹھا کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرسکیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے پاکستانی طالب علموں کو یورپ اور امریکا ہی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں؟ اور جو لوگ لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرکے وہاں کی تربیت گاہوں میں سائنس، ٹیکنالوجی اور زندگی کے دیگر اہم شعبوں میں یدِطولیٰ حاصل کرلیتے ہیں ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو واپس لوٹ کر ملک وقوم کی بہتری اور ترقی کے لیے کام کرتے ہیں؟ ایسے عبقریوں کو تو ناقابلِ تصور بھاری معاوضوں پر ایک گہری سازش کے تحت وہیں روک لیا جاتا ہے کہ بچو! اب تم نے کہاں جانا ہے۔ یہیں رہو اور ہماری ترقی کے لیے کام کرو۔ امریکا اور یورپ آج ترقی کے جس زینے پر کھڑے نظر آتے ہیں اس میں زیادہ ہاتھ غیر امریکی اور غیر یورپی افراد کا ہے جن میں غالب تعداد پاکستانیوں اور بھارتیوں کی ہے۔ یہ دونوں ملک ایک ساتھ کم وبیش ایک جیسا مقدر لے کر آزاد ہوئے تھے اور اب تک لگ بھگ ایک ہی جیسے مسائل کا شکار ہیں۔

کسی بھی قوم کی انفرادی کوتاہیوں سے انکار ممکن نہیں لیکن آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں۔ اس کا ذمے دار، بے حس ومفاد پرست سیاست دانوں اور یورپ وامریکا کی خوش نودی کو ملک وقوم پر فوقیت دینے والے حکمرانوں کے سوا اور کوئی نہیں!

میں نے کاشانوک سے کہا ”ہمارے پاس ایک اور جی ایس ایم موبائل اسپیئر میں رکھا ہوا ہے۔ تم اپنا سم کارڈ اس میں لوڈ کرلو“ میرا اشارہ لی یان والے موبائل کی طرف تھا۔

”کوشش کرکے دیکھتا ہوں“ اس نے کہا ”اگر سم کارڈ میں زندگی باقی ہے تو کام چل جائے گا“

آئندہ پانچ منٹ میں اس کی کوشش بارآور ثابت ہوئی اگرچہ اس کا سم کارڈ بھی سیل کے ساتھ ہی بھیگ گیا تھا تاہم وہ شارٹ سرکٹ جیسے نقص سے محفوظ رہا تھا، یعنی ابھی اس میں زندگی باقی تھی۔ اس طرح کاشانوک کی ایک سم میرے سیل میں اور دوسری لی یان والے سیل میں کام کرنے لگی۔ میں نے لی یان والا سیل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کاشانوک! یہ تم اپنے پاس رکھ لو“

”اودم کیا کروگی؟“ اس نے لی یان سے پوچھا۔

”ہم دونوں ایک ہی سیل سے گزارہ کرلیں گے!“ لی یان نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، پھر تم میرے والے سیل کو چارجنگ پر لگا دو“ کاشانوک نے کہا ”اس دوران میں ہم ایک ضروری کام نمٹالیں“

”ضروری کام“ کے الفاظ پر لی یان زیرِ لب مسکرا کر رہ گئی۔ میں اس کی مسکراہٹ کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ رہا تھا۔ جب سے اس نے یہ سنا تھا، سر مونڈ کر مجھے گنجا کردیا جائے گا۔ وہ گاہے بگاہے مجھے اس حوالے سے چھیڑ رہی تھی۔ میں اس پر ایک گہری نظر ڈال کر کاشانوک کے ساتھ واش روم میں گھس گیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد جب میں واش روم سے برآمد ہوا تو میری ”کایا“ پلٹ چکی تھی اور اس ”لوٹ پلٹ“ کو میں نے واش روم کے آئینے میں ملاحظہ کرلیا تھا۔ میں امید کررہا تھا کہ لی یان کی جیسے ہی مجھ پر نظر پڑے گی، اس کی ہنسی چھوٹ جائے گی لیکن اس نے میری توقع کو کلین بولڈ کردیا۔ وہ چند لمحے گہری اور سنجیدہ نگاہ سے میرا اور میرے سر کا جائزہ لیتی رہی پھر بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔ شاید وہ کاشانوک کی موجودی کا لحاظ کررہی تھی۔ اگر واقعی یہی بات تھی تو پھر اس کا مطلب تھا، اس کے جاتے ہی وہ کھِل کھِلے گی۔

تھوڑی دیر بعد فلوجی لوٹ آیا۔ وہ ہمارے لیے مناسب لباس کا انتظام کرلایا تھا۔ میری بدلی ہوئی دنیا کو دیکھا تو وہ چونکا اور نہ ہی کسی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ بہت ہی جہاں دیدہ اور گہرا شخص تھا اور مجھے یقین تھا، کاشانوک نے اسے ہمارے بارے میں بڑی وضاحت کے ساتھ بریف کررکھا تھا۔

”کھانے کی کیا صورتحال ہے؟“ کاشانوک نے فلوجی سے پوچھا۔

”کھانا موجود ہے۔ آپ کہو تو لگا دیتا ہوں“

ہم رات کا کھانا بڑے ٹھیک ٹھاک انداز میں کھا کر گھر سے نکلے تھے لیکن سرد ترین موسم میں اچھا خاصا وقت گزارنے کے بعد ہمیں ہلکی ہلکی بھوک محسوس ہورہی تھی، ویسے بھی کھانا کھائے ہوئے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزر گئے تھے۔ موسم سرما میں جسم کو اپنا درجۂ حرارت برقرار رکھنے کے لیے بہ نسبت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ توانائی ظاہر ہے، خوراک ہی سے حاصل ہوتی ہے لہٰذا نتیجے کے طور پر نظامِ انہضام کی رفتار کئی گناہ بڑھ جاتی ہے۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا پھر ہم ایک مرتبہ پھر کمرے میں آبیٹھے اور ہمارے درمیان، پچھلے چار پانچ گھنٹوں میں رونما ہونے والے واقعات پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں تھی کہ

ان سنگین واقعات کے بعد کھٹمنڈو کی فضا ہمارے لیے انتہائی مہلک ہوگئی تھی۔ اگر ہمیں کھٹمنڈو میں رہنا تھا تو روپوشی بہت ضروری تھی اور میں پردہ نشین بی بیوں کی طرح منہ چھپا کر زندگی گزارنے کا عادی نہیں تھا لہٰذا ہمیں اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے صبح' بدھ بھکشوؤں کے بھیس میں کھٹمنڈو سے نکل جانا ہے، آگے جو بھی ہوتا، اللہ مالک تھا!

اٹھنے سے پہلے کاشالوک نے تاکیدی انداز میں کہا ''تم لوگوں کو ایک مختصر سی نیند لینا ہوگی'' اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے ''صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے بیدار ہو جانا۔ ناشتا ہم گھر سے باہر کریں گے، کسی ایسے چھوٹے سے ہوٹل میں جہاں زیادہ تر بھکشو ہی کھاتے پیتے دکھائی دیتے ہیں ہم انہی بھکشوؤں میں شامل ہو کر اِدھر اُدھر سے ہوتے ہوئے تھاچو کے گروپ تک پہنچ جائیں گے۔''

''کیا تم نے تھاچو کے ساتھ سفر کرنے والے تمام بھکشوؤں کو ہمارے بارے میں بتا دیا ہے؟'' میں نے ایک ضروری سوال کیا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''نہیں وجدان! ہمارے راز سے صرف تھاچو واقف ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس سانس سے اطمینان جھلکتا تھا۔

لی یان کاشالوک سے دریافت کیا ''ہم کھٹمنڈو سے تبت تک کس ذریعے سے پہنچیں گے؟''

''یاتریوں والے قافلے ... میں شامل ہو کر ہم مقامی بس کے ذریعے کھٹمنڈو کے ایک معروف مقام سندھارا جائیں گے'' کاشالوک نے بتایا ''سندھارا سے سوئس منی ایکسپریس کوچ چلتی ہے۔ یہ کوچ ہمیں کوداری تک پہنچائے گی۔ اس سرحدی قصبے سے آگے پیدل سفر کر کے ہم تبت میں داخل ہو جائیں گے۔''

''مگر تم نے تو بتایا تھا، یہ بدھ یاتری راستے میں بھی ایک دو مقام پر رک کر کچھ وقت گزاریں گے!'' لی یان نے پوچھا ''کیا سوئس منی ایکسپریس انہیں یہ سہولت فراہم کرے گی؟''

''اس کوچ میں زیادہ تعداد ایسے ہی بدھ پیروکاروں کی ہوگی جو مختلف بدھ اسٹوپاز کی یاترا کو نکلے ہوئے ہیں۔ تھاچو کا قافلہ بھی تبت سے اسی مقصد کی خاطر کھٹمنڈو تک آیا ہوا ہے لہٰذا ٹرانسپورٹ والے ان کی ضرورت کا خیال رکھتے ہیں۔ ہم جس کوچ سے روانہ ہونے والے ہیں وہ کھٹمنڈو سے نکل کر شمال کی سمت میں سفر کرتے ہوئے' نو کلومیٹر کے بعد بدھانلکا نتھا پہنچے گی۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ بدھانلکا نتھا سے مزید آگے شمال کی طرف بڑھے گی اور چار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے سندری جل جا پہنچے گی۔ سندری جل کھٹمنڈو سے تیرہ کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ سندری جل میں مختصر قیام کے بعد ہم آگے کوداری کی طرف بڑھ جائیں گے'' کاشالوک نے اس سفر کا ایک نقشہ سا کھینچتے ہوئے بتایا ''ذہن میں رہے کہ یہ تمام تر سفر ہم شمال میں' بلندی کی طرف طے کریں گے۔ تبت کو دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ یہ اوسطاً گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ تبت کے بعض مقامات پر یہ بلندی ساڑھے تیرہ ہزار فٹ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے''

''تبت میں قدم رکھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوگا کہ ہم چائنا میں داخل ہو گئے!'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

کاشالوک یک دم افسردہ دکھائی دینے لگا پھر آہستہ سے بولا ''بالکل، بالکل!''

میں اس کی افسردگی کا سبب جانتا تھا۔ کاشالوک بدھسٹ تھا اور بدھ کے پیروکاروں کے لیے تبت کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ ایک طرح سے ان کا مکہ مدینہ ہے۔ کسی زمانے میں تبت ایک آزاد اور خودمختار ملک تھا۔ پھر انیس سو انسٹھ عیسوی میں، چودھویں دلائی لاما کے دور میں کمیونسٹ چینی فوج نے اس پر لشکر کشی کی اور ایک بڑی خون ریزی کے بعد اس ارضی جنت کو ہڑپ کر لیا۔ تبت اب چین کے ایک صوبے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صوبے کا صدر مقام لہاسا ہے۔ اس خطے کو اپنے ملک کا حصہ بنانے کے بعد چین نے اس کا نام بھی تبدیل کر دیا تھا۔ سرکاری کاغذات میں اب تبت، ژی زانگ xizang کے نام سے موجود ہے لیکن تبت کے باسیوں اور بدھ کے پیروکاروں کے لیے یہ اب بھی تبت ہی ہے۔ ''ژی زانگ'' کا لفظ ان کی یادداشت میں بیٹھتا ہی نہیں۔ اس تاریخی زیادتی کے حوالے سے کشمیری عوام' فلسطینیوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی دکھائی دیتی ہے...... اگر دیکھنے والی آنکھ موجود ہو تو!

کاشالوک بھی تبت کو تبت ہی سمجھتا تھا لہٰذا ژی زانگ، چین کے ایک صوبے کے ذکر پر اس کا غم زدہ ہو جانا عین فطری بات تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہم سے رخصت ہو گیا اور جاتے جاتے یہ ہدایت بھی کر گیا کہ صبح ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہوگا لہٰذا ہمیں پیکنگ وغیرہ کر کے سونا چاہیے!

ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے آئندہ پندرہ منٹ میں پیکنگ کر لی۔ اس دوران میں لی یان بار بار میرے

منڈے ہوئے سر کی طرف دیکھتی اور معنی خیز انداز میں مسکرا دیتی۔ اس کا انداز مضحکہ اڑانے والا نہیں تھا بلکہ وہ شرارت کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ ہم پیکنگ سے فارغ ہوئے تو میں نے اس سے کہا۔

''شاید تم نے کاشالوک کی بات کو غور سے نہیں سنا۔ ہمیں صبح جلدی اٹھنا ہے!''

''جلدی اٹھنا ہے...... تو؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تو یہ کہ جلدی بیدار ہونے کے لیے جلدی سونا بھی ضروری ہے!'' میں نے اس کی شوخی بھری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''ارلی ٹو بیڈ اینڈ ارلی ٹو رائز...... کے بارے میں تو تم نے سن رکھا ہوگا؟''

''ہاں، سنا بھی ہے اور پڑھ بھی رکھا ہے'' وہ بڑی معصومیت سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''لیکن یہاں پر ان دانش بھری باتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ رات کے سوا دو بج رہے ہیں۔ اس وقت کو ارلی ٹو بیڈ تو نہیں کہا جا سکتا نا؟''

''نہیں کہا جا سکتا، میں بھی مانتا ہوں'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا ''لیکن بیدار ہونے کے لیے سونا ضروری ہے!''

''ضروری تو ہے مگر کیا کروں، مجھے نیند نہیں آ رہی'' اس نے کہا ''کافی نے نیند اڑا دی ہے۔''

''اس سلسلے میں کوشش تو کر سکتی ہو'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

وہ میری بات پر غور کرنے کے بجائے چونک کر مستفسر ہوئی ''وجدان! تمہیں تو جماہیوں پر جماہیاں آنا چاہئیں لیکن تمہاری آنکھوں میں تو نیند کا شائبہ تک نہیں؟''

''مجھے اتنی جماہیاں کیوں آنا چاہئیں؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کیا تم اپنا دعویٰ بھول گئے ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ''تمہی نے تو بتایا تھا کہ چائے کافی وغیرہ پینے کے بعد تم پر الٹا اثر ہوتا ہے؟''

میں پلک جھپکتے میں لی یان کی بات کی تہ میں پہنچ گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ چائے، کافی اور ایسی ہی دیگر اشیا مجھ پر الٹا اثر کرتی ہیں۔ عام طور پر لوگ ان اشیا کو نیند بھگانے اور اعضا کو مستعد رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں لیکن میں چائے کافی پینے کے بعد نیند اور آرام کی طلب محسوس کرنے لگتا ہوں۔ لی یان نے اس طرف توجہ دلائی تو مجھے خود بھی حیرت ہوئی اور پھر فوراً ہی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ حالات اور واقعات کی سنگینی کے بارے میں غور و فکر کرنے کے دوران میں شاید میرے ذہن نے کافی کے مذکورہ اثرات کو کوئی خاص لفٹ نہیں کرائی تھی۔

لی یان کو بات کا جواب دیتے ہوئے میں نے کہا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اس وقت نیند کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں لیکن سونے سے پہلے مجھے ایک نہایت ہی اہم کام کرنا ہے۔''

''کون سا اہم کام؟'' اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک نمودار ہوئی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ربی کو ''گڈ نائٹ'' کہنا ہے۔''

''اوہ!'' وہ ایک طویل، بوجھل سانس خارج کر کے رہ گئی۔

اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہوتا تھا، میں نے اس کی توقع کے خلاف جواب دیا تھا۔ بہرحال، وہ موبائل لے کر میرے پاس آ گئی۔ اس دوران میں وہ موبائل پوری طرح چارج ہو چکا تھا۔ وہ سیل کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ اس کا انداز یاددہانی کرانے والا تھا۔

''ایک بات کو ذہن میں رکھنا وجدان! ربی کے اشارے پر ہمارے دو سم کارڈز پہلے ہی ناکارہ ہو چکے ہیں۔ تیسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہو سکتا ہے۔''

''مجھے اس کی پروا نہیں'' میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا ''ویسے بھی اس فون کے بعد میں اس سے رابطہ نہیں کروں گا۔ سیل میرے کام کا رہے یا بےکار ہو جائے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب میں اسی وقت ربی کی خبر لوں گا جب ہمارے درمیان چند فٹ یا چند گز یا چند میل کا فاصلہ باقی رہ جائے گا'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

''میں اسرائیل میں قدم رکھنے سے پہلے اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک وہ بھی میرے انتظار کا ''مزہ'' چکھے۔ میں روپوش اور گمنام رہ کر اسے تڑپاؤں گا' اذیت کی سولی پر چڑھاؤں گا۔ وہ مجھے دیکھنے، مجھ سے رابطہ کرنے اور مجھے چھاپنے کی خواہش کی پھانسی پر لٹکا رہے گا مگر میں اس کے ہاتھ آؤں گا، نہ نگاہ میں سماؤں گا اور نہ ہی سماعت تک رسائی پاؤں گا۔ ذرا اس کو بھی پتا چلنا چاہیے کہ نارسائی کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس کیفیت میں اپنا سینہ جہنم بنا رکھا ہے، کچھ دن وہ بھی تو انہی انگاروں کی تپش کا لطف اٹھائے۔''

ربی موشے ہائمن نے ساحل کو مجھ سے دور کر کے بلکہ ناقابلِ پہنچ بنا کر جتنا بڑا ستم ڈھایا تھا، وہ میرے سابق ریکارڈ کو توڑنے کا باعث تھا۔ میری زندگی میں آنے والے تمام دشمنوں نے مجموعی طور پر بھی مجھے اتنی اذیت نہیں پہنچائی ہو گی جتنی اس ایک شخص کے ہاتھوں، مختصر سی مدت میں، میں نے اٹھائی تھی۔ مجھے تسلیم ہے کہ ربی میرا ایک ایسا حریف ثابت ہو رہا تھا جس سے نمٹنے کے لیے مجھے دانتوں پسینہ آ رہا تھا، دوسری طرف میں بھی اس کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا تھا جو اس کے دانتوں کی داب میں آنے کے بجائے ناک میں گھس بیٹھا تھا اور میری کوشش تھی کہ اس کا بھی وہی حشر ہو جو ماضی بعید میں نمرود کا ہوا تھا!

ربی کے بارے میں بات کرتے ہوئے خود بہ خود میرا لہجہ تلخ ہو جاتا تھا، الفاظ زہر میں بجھ جاتے اور میں خود کو نفرت کے ایک اتھاہ سمندر میں پاتا۔ ظلم و جبر کا ایک ایسا سمندر جو تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی ساحل کی صورت دکھائی نہ دیتی اور میں اپنے آپ کو اس بھیانک، موت کے علم بردار سمندر کے بیچ بے یار و مددگار...... ایک خونی شارک کے رحم و کرم پر پاتا جو جبڑے کھولے، اپنے تیز دھار نوکیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بڑے خوں خوار انداز میں مجھ پر جھپٹ رہی ہوتی۔ اس خون آشام شارک کا تصور کرتے ہوئے میرے ذہن میں ربی کی صورت اجاگر ہو جاتی تھی...... اور یہ کچھ غلط بھی نہیں تھا!

مجھے اس وحشی شارک کے اندر اترنا تھا اور پھر، پیٹ پھاڑ کر باہر نکلنا تھا۔ اس کو ہلاک کیے بغیر میں اپنی ساحل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس ایک کی ہلاکت بہتیروں کی سلامتی کی ضمانت بن جاتی، گویا یہ ایک کارِ ثواب تھا، ایک ایسا عمل جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے مفید ثابت ہوتا۔

لی یان مجھے ''چینج'' کا بتا کر واش روم میں داخل ہوئی تو میں سیل پر ربی موشے ہائمن کے نمبرز پنچ کرنے لگا۔ یہ نمبرز مجھے بالکل ایسے ہی یاد ہو گئے تھے جیسے اپنا نام ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ میں نے پچھلے پانچ چھ گھنٹوں میں اسے جتنا نقصان پہنچایا تھا، اس کی اطلاعات اس تک پہنچائی جا چکی ہوں گی۔ خاص طور پر، بنگلا نمبر آرٹونکٹی میں عبرت ناک انجام سے دوچار ہونے والے اسرائیلیوں کی ''خبر'' نے تو اسے اذیت ناک چرکے لگائے ہوں گے۔ وہ اس وقت انگاروں پر لوٹ رہا ہو گا۔ ان لمحات میں اس کی ''عیادت'' نہ کرنا سخت بے حسی ہوتی چنانچہ میں نے تصور میں، ایک مٹھی میں نمک بھرا اور دوسرے ہاتھ میں پیٹرول کی بوتل تھامی پھر سیلولر ٹریک کی انگلی کے اشارے پر ربی کی ''تیمارداری'' کے لیے کھٹمنڈو سے اسرائیل پہنچ گیا۔ یہ نمک پاشی اور آتش زنی کا ایک مناسب موقع تھا۔ اسے گنوا کر میں پچھتاوے سے کیوں کر دوچار ہوتا!

اسرائیل کے مقامی وقت کے مطابق، اس وقت رات کے گیارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ ابھی تک جاگ رہا تھا۔ کال اس ہی نے ریسیو کی۔ ان سنسنی خیز حالات میں اس کے سکون کی نیند سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہی لمحے ربی کی پھنکار سے مشابہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے ''ہیلو'' ہی سے مجھے پہچان لیا تھا۔

''تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو وجدان!''

''میں تو تم سے محبت کرتا ہوں ربی!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''تم خواہ مخواہ میری نیت پر شک نہ کیا کرو۔ اب تو میں نے تمہاری بات ماننے کا فیصلہ بھی......''

''بکومت!'' وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دہاڑا ''تم وہاں کھٹمنڈو میں جو کچھ کرتے پھر رہے ہو، وہ دشمنی کی بدترین مثال ہے۔ میں تمہاری نیت پر شک نہ کروں تو اور کیا کروں؟ یہ تمہاری محبت ہے یا شدید ترین نفرت؟''

میں بالکل انجان بن گیا ''کھٹمنڈو میں کیا ہوتا پھر رہا ہے؟''

''زیادہ معصوم بننے کی کوشش نہ کرو وجدان!''

''میں نے بتایا تھا نا، کھٹمنڈو کو چھوڑ چکا ہوں۔''

''تم جھوٹ پر جھوٹ بول کر اپنی پوزیشن کو مزید خراب کرتے جا رہے ہو؟'' وہ منتقم انداز میں بولا ''تم ابھی تک کھٹمنڈو ہی کے کسی بل میں چھپے بیٹھے ہو لیکن یاد رکھو، میں بہت جلد تمہیں کسی مردہ چوہے کے مانند اس بل سے نکال لوں گا۔''

میں نے اس کے جلتے ہوئے ذہن پر پیٹرول کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا ''دھمکیاں ہی دیتے رہو گے یا یہ بھی بتاؤ گے، ادھر کھٹمنڈو میں کس نے تمہاری دم پر پاؤں رکھ دیا ہے جو تم یوں ناچے ناچے پھر رہے ہو۔ میں تو تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے والا تھا لیکن تم نے میرے خیر سگالی کے جذبات کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دی ہے۔''

وہ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد مستفسر ہوا۔ اس مرتبہ اس کے لہجے میں قدرے اعتدال تھا ''ہاں ہاں، بتاؤ...... تم نے میری بات ماننے کے سلسلے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

گھاگ بڈھا بڑا عیار تھا۔ اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ اس نے شدید ترین غصے میں بھی میرے جملے کی کنسٹرکشن کو یاد رکھا

تھا۔ میں نے اس کے برانگیختہ جذبات سے کھیلتے ہوئے کہا۔

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم سے جیت نہیں سکتا اس لیے یہی فیصلہ کیا ہے کہ وہ پانچ انمول پتھر تمہارے حوالے کر کے اپنی ساحل کو وصول کر لوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''تم اتنے سیدھے تو نہیں ہو وجدان!'' وہ گمبیھر لہجے میں بولا۔

میں نے برہمی سے کہا ''یہی تو مصیبت ہے، جب بھی میں تمہارے قریب ہونے کے بارے میں سوچتا ہوں، تم فوراً بدگمانی کا شکار ہو جاتے ہو۔ اس طرح تو یہ بیل کبھی بھی منڈھے نہیں چڑھ سکے گی۔''

''میں تمہاری بات کا کیسے یقین کر لوں؟'' وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔

''تم میری بات کا یقین کرو یا اس سم کو بھی بلاک کرنے کے احکام صادر کر دو، یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔'' میں نے مصنوعی جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''کھٹمنڈو میں مجھے تمہارے وسیع اختیارات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ نیپالی پولیس آج کل تمہارے اشاروں پر ناچ رہی ہے اور وہاں کے ہر ادارے میں تمہیں عمل دخل کی آسانی فراہم ہے......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ''کیا تم واقعی کھٹمنڈو سے نکل چکے ہو؟''

''میں تمہیں یقین دلانے کے لیے کوئی قسم نہیں کھا سکتا۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ وہ پتھر کیسے مجھ تک پہنچا رہے ہو؟''

''پہلے تم مجھے کھٹمنڈو میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتاؤ'' میں نے اس کے چرے ہوئے زخموں میں نمک بھرتے ہوئے کہا ''ذرا مجھے بھی تو پتا چلے کہ تم کون سی قیامت کو مجھ سے منسوب کر رہے ہو؟''

مجھے امید نہیں تھی، وہ میری فرمائش پوری کرے گا لیکن لگتا تھا، عبادت گاہ کے تہ خانے میں پوشیدہ وہ قیمتی پتھر اس کی سب سے بڑی کمزوری کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ وہ ان کے حصول کی خاطر کسی بھی حد سے گزرنے کو تیار بیٹھا تھا۔ اس کے دستِ راست جہنم مکانی برنارڈ لیو اور میرے خیر خواہ.... آنجہانی محترم سانگ فو کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ قدیم عبرانی کتابوں میں ان پانچ پتھروں کے حوالے سے ایک طویل باب رقم ہے جس کی رو سے یہ پتھر جس بھی شخص کے قبضے میں ہوں گے، وہ پوری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے کی قدرت کا مالک بن جائے گا۔ ربی موشے ہائمن، زمینی خدا بننے کی خواہش میں ان پتھروں کے حصول کے لیے باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں وہ مجھے اسی لیے رعایت دینے پر تیار ہو جاتا تھا کہ ان پتھروں تک صرف اور صرف میں ہی رسائی حاصل کر سکتا تھا لہٰذا اس نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں مجھے بتا دیا کہ اروڑا کاٹیج والے بنگلے آرٹونکٹی میں کون سے قیامت خیز واقعات پیش آئے ہیں اور بعد ازاں جیپ اور منی ٹرک پر گزرنے والی بپتا کے بارے میں بھی بتا دیا۔ آخر میں اس نے متاملانہ انداز میں کہا۔

''وجدان! آثار سے یہی پتا چلتا ہے کہ ان واقعات میں سراسر تمہارا ہاتھ ہے۔ اگر تم وہ پانچ پتھر میرے حوالے کرنے پر تیار ہو جاؤ تو میں تمہاری اس نادانی کو بھی معاف کر دوں گا۔''

''معافی کا سوال تو اس وقت پیدا ہو گا اگر میں ان واقعات کی ذمّے داری قبول کر لوں گا'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا پھر بڑے میٹھے انداز میں اسے کاٹنے کی کوشش جاری رکھی اور اضافہ کیا ''مجھے تو یہ کوئی اور ہی چکر دکھائی دے رہا ہے۔''

آخری جملہ میں نے اتنے پُراسرار انداز میں ادا کیا کہ وہ تڑپ کر بولا۔ ''تم کس چکر کی بات کر رہے ہو؟''

''پہلے یہ بتاؤ، کیا تمہیں یقین ہے کہ کھٹمنڈو والے واقعات میں میرا ہی ہاتھ ہے؟''

''تمہیں باقاعدہ وہاں دیکھا گیا ہے وجدان!'' وہ وثوق سے بولا۔

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا ''پھر تو میرا اندازہ بالکل درست ہے۔''

''تم نے ابھی تک اپنے اندازے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

''میرا خیال ہے، میرا پرتو تمہارے خلاف اس قسم کی انتقامی کارروائی کر رہا ہے'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو وہ سٹپٹا گیا، جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔ نقلی وجدان کو تو تم نے مین ہیٹن (نیویارک) کے سب وے میں ہلاک کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ کس طرح متحرک ہو سکتا ہے؟''

''وہ نہ سہی، کوئی دوسرا تو متحرک ہو سکتا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ چونک اٹھا ''کوئی دوسرا...... کیا مطلب ہے تمہارا؟''

میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا ''ربی! نیویارک میں نیست و نابود ہونے والا نقلی وجدان میری ایڈوانس مشقوں کے طفیل تشکیل پا کر متحرک ہوا تھا۔ اس

میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا لیکن اب میں نے اس ''ٹیکنالوجی'' پر تصرف حاصل کرلیا ہے۔ میں اپنی مرضی سے جتنے چاہوں، نقلی وجدان تخلیق کرسکتا ہوں۔''

یہ بات میں نے محض اسے ڈرانے کے لیے کی تھی، حقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ مجھے شوق تھا اور نہ ہی اتنی فرصت مجھے میسر تھی کہ اس قسم کی مشقوں اور مراقبوں کو افورڈ کرسکوں۔ مین ہیٹن کے انڈر گراؤنڈ ریلوے ٹریک پر میں نے ایک طویل معرکے کے بعد اپنے ہیکلو سے نجات حاصل کر لی تھی تو یہی بہت تھا۔

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ میں اتنی دیر سے اسے الو بنا رہا تھا۔ اس کا سنجیدہ اور معتدل انداز یکدم جارحانہ ہوگیا، بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ اس بوگس کہانی کو رہنے ہی دو۔''

وہ ایک ایسی حقیقت سے انکار کر رہا تھا جو واقعتاً پیش آ چکی تھی۔ بے وقوف بنانے کے بعد ہی تو میں دیدہ و دانستہ اس سے کھیل رہا تھا اور وہ اتنی دیر سے، بڑی شرافت کے ساتھ میرے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ اس وقت میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی کہ کاش...... ان لمحات میں، میں ربی کے روبہ رو ہوتا اور اس کے چہرے پر برسنے والی خجالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔ فی الحال ایسا ممکن نہیں تھا لہٰذا میں اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں کہتا چلا گیا۔

''اس لاٹ میں، میں نے ایک درجن نقلی وجدان تیار کیے ہیں جن میں سے گیارہ اس دنیا کے مختلف محاذوں پر تمہاری مٹی پلید کرتے رہیں گے اور بارھواں نقلی وجدان، اصلی پتھروں کے ساتھ تمہارے پاس اسرائیل پہنچے گا۔ مجھے امید ہے، تم میرے اس نمائندے کا فقید المثال استقبال کرو گے۔ ''اس ہاتھ دو، اس ہاتھ لو'' کے اصول کے مطابق، تم میری ساحل کو اس نمائندے کے حوالے کر دینا......''

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود ہی سے باتیں کیے جا رہا ہوں، مجھے کوئی سامع میسر نہیں تھا۔ میں اسے ''ہیلو ربی۔ ہیلو ربی!'' پکارنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے احساس ہوگیا، دوسری طرف وہ لائن پر موجود نہیں۔ میں ایسے جذب کے عالم میں اسے چرکے لگا رہا تھا کہ پتا ہی نہ چلا، کب وہ فون بند کر کے ندارد ہوگیا تھا۔

میں نے سیل کو ایک طرف ڈال دیا اور ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے لی یان کی طرف دیکھنے لگا۔ ربی سے ہونے والی گفتگو کے دوران میں وہ ''چینج'' کے مراحل سے گزر کر دوبارہ میرے پاس آ گئی تھی۔ اس نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''اب تو یہ سم کارڈ بھی گیا کام سے۔ ربی اس کنکشن کو بھی منسوخ کروا دے گا۔''

''میرا خیال تم سے قطعی مختلف ہے'' میں نے کہا۔

''کیا مختلف ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے بتایا ''اس وقت یہ فون ہی وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے وہ مجھ سے رابطہ کرسکتا ہے۔ وہ اس لائن کو کاٹنے یا کٹوانے کی حماقت نہیں کرے گا۔''

''تم بھول رہے ہو، وہ پہلے بھی ہمارے دو کنکشنز ختم کروا چکا ہے۔'' وہ بولی ''اور تھوڑی دیر پہلے تو تم کہہ رہے تھے کہ اب ربی سے رابطہ نہیں رکھو گے، اسرائیل پہنچنے کے بعد ہی اس کی خبر لو گے؟''

میں نے کہا ''پہلے کی بات دوسری تھی۔ اب حالات میں خاصی بڑی تبدیلی آ چکی ہے۔ اسے یقین ہوگیا ہے، وہ مجھے اپنی منافقانہ دوستی کے فریب میں نہیں جکڑ سکے گا، اس کا کوئی داؤ مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ میں نے اسے جن کانٹوں پر گھسیٹا ہے، وہاں وہ کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس کرسکتا ہے'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا ''حقیقت یہی ہے کہ میں ازخود اس سے رابطہ نہیں کروں گا، وہ مجھے فون کر بیٹھے تو دوسری بات ہے۔''

لی یان نے اس سلسلے میں مجھ سے زیادہ بحث نہیں کی اور سرسری انداز میں بولی ''ممکن ہے، تمہارا اندازہ درست ہو لیکن میرا نہیں خیال، یہ کنکشن زیادہ دیر تک تمہارے لیے کارآمد رہ سکے گا۔''

اس کی اس پیش گوئی نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا ''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''ہم چند گھنٹے کے بعد یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں'' اس نے کہا ''نیپال کی حدود سے نکلتے ہی یہ کنکشن بے کار ہو جائے گا کیونکہ رومنگ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ میں نہیں جانتی، اس سروس کی رومنگ ہے بھی یا نہیں، بہرحال'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

''اگر یہ کمپنی اپنے یوزرز کو بیرون ملک رومنگ فراہم کرتی بھی ہے تو پھر نیٹ ورک والوں سے رابطہ کر کے تمہیں رومنگ کھلوانا ہوگی اور میں سمجھتی ہوں، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے، پھر ایک دوسرا مسئلہ کنکشن کی نوعیت کا بھی ہے۔

میری معلومات کے مطابق، پری پیڈ کنکشن پر رومنگ کی سہولت فراہم نہیں کی جاتی۔ اس کے لیے پوسٹ پیڈ لائن لینا ضروری ہے۔ بہرحال، میں نیپال کی موبائل سروس کمپنیز کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی!''

وہ جتنا بھی جانتی تھی، وہ علم اس میدان میں مجھ سے یقیناً زیادہ ہی تھا۔ وہ مجھے پری پیڈ، پوسٹ پیڈ، رومنگ اور جی ایس ایم کے بارے میں بتانے لگی۔ مجھے اس ٹیکنیکل گفتگو سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی لہٰذا اپنے ماتھے کو سہلاتے ہوئے میں نے اکتاہٹ بھرے لہجے میں کہہ دیا۔

''بھاڑ میں جائے یہ موبائل کنکشن اور ربی موشے ہائمن!''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھنے لگی ''وجدان! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں'' میں نے کہا ''بس سر میں تھوڑا درد محسوس ہو رہا ہے۔''

''کہیں تمہارے اس سر کو ٹھنڈ تو نہیں لگ گئی؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''یہ فارغ البال ہوا ہے، فارغ الحال نہیں۔ اس بیڈ روم کا موسم ایسا سرد بھی نہیں کہ اسے ٹھنڈ لگ جائے۔''

''پھر یہ موجودہ حالات کا اثر ہوگا'' وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بولی ''لاؤ، میں تمہارا سر دبا دیتی ہوں۔''

اس نے یہ پیش کش اتنے خلوص اور لگاوٹ سے کی کہ میں انکار نہ کرسکا۔ اس وقت میں واقعی اس کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا۔

میرے چہرے پر آمادگی کے تاثرات دیکھتے ہی وہ بیڈ پر چلی گئی۔ اس نے بیڈ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آلتی پالتی مار لی پھر میرے منڈے ہوئے سر کو اپنے زانو پر رکھ کر مجھے چت لیٹنے کی ہدایت کی۔ میں نے بلاچون و چرا اس کی ہدایت پر عمل کر ڈالا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑنے کے بارے میں سن رکھا تھا لیکن میرے ساتھ اس کے بالعکس صورتِ حال پیش آ رہی تھی۔ لی یان اپنی مہربان انگلیوں کی جنبشوں سے میرے ذہن پر چھائے ہوئے غبار کو دھونے لگی۔

مجھے دوسروں سے خدمت لینے کا شوق نہیں لیکن کوئی خود ہی محبت بھری پیش کش کر بیٹھے تو اس کا دل توڑنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اسی لمحے میرے ذہن میں ایک گورا چٹا پشتون چہرہ ابھر آیا۔ انسان کی یادداشت بھی بعض اوقات عجیب وغریب کرشمے دکھاتی ہے۔ میں لی یان سے سر کا مساج کرا رہا تھا اور یادداشت کے البم نے اپنے کئی صفحے پلٹ کر مجھے ماضی میں، پشتون دوشیزہ زرگل کے پاس پہنچا دیا۔

میں کراچی میں، طارق روڈ والے فلیٹ پر گزاری ہوئی اس رات کو یاد کرنے لگا جب زرگل بھی میرے ساتھ تھی۔ اس نے بھی میری ذہنی تھکن اور حالات کی تپکن کو زائل کرنے کے لیے کوکونٹ آئل سے میرے سر کا مساج کیا تھا اور میں اسی کی مہربان آغوش میں سو گیا تھا۔

زرگل ایک جی دار اور حالات کی ماری ہوئی لڑکی تھی جسے لاہور میں، ایک اتفاق کے تحت میرا ساتھ حاصل ہوگیا تھا۔ کراچی میں میرا ایک جگری دوست شہزاد علی جب بڑی سنجیدگی سے اس میں دلچسپی لینے لگا تو میں نے ان کے ملن کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔

کراچی کا ذکر ہو اور صدف کی یاد نہ آئے، یہ کیسے ممکن تھا۔ میری زندگی میں بے شمار لڑکیاں آئیں لیکن صدف جیسی فراخ دل اور کھلے ذہن کی مالک کوئی اور نہیں تھی۔ اس کا نام ذہن میں آیا تو دل میں کھد بد ہونے لگی کہ اس کی خبر لوں۔ میں صدف کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لی یان نے مجھے مخاطب کرلیا۔

''کن سوچوں میں گم ہو وجدان!''

''سونے کی کوشش کر رہا ہوں'' میں نے مخمور لہجے میں کہا۔

وہ بولی ''میں محسوس کر رہی ہوں، تم یہاں نہیں...... بہت دور پہنچے ہوئے ہو۔''

''ابھی پہنچا تو نہیں البتہ پہنچنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں'' میں نے گول مول انداز میں کہا۔

وہ چونک کر پوچھنے لگی ''کہاں؟''

''نیند کی آغوش میں'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''اوہ!'' وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔

اس معنی خیز سانس کی تپش کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ مجھے اپنے وجود میں ایک چلبلی سی حرارت دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لی یان کی ''اوہ!'' سے ظاہر ہوتا تھا، اسے میرے جواب سے مایوسی ہوئی تھی۔ پتا نہیں، وہ مجھ سے کس جواب کی توقع کر رہی تھی۔ ہوسکتا ہے، وہ میرے منہ سے یہ سننا چاہتی ہو کہ میں ساحل تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ اب بڑی حد تک سمجھنے لگی تھی کہ جب میں آنکھیں بند کر کے

خاموش ہوتا ہوں تو پھر جائے وقوعہ سے کہیں اور چلا جاتا ہوں۔

”دیکھو، میں نے تمہاری بے خبری میں کیسا چکر چلایا ہے؟“ اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا، آنکھیں کھولتے ہوئے میں نے جلدی سے پوچھا ”کیسا چکر لی یان!“

وہ اپنی شرارت کو سنجیدہ الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے بولی ”اگر میں تم سے کہتی کہ ذرا اپنے سر کو چھونے دو تو تم خفا ہو جاتے لیکن دیکھ لو، میں کئی منٹ سے ایسا کر رہی ہوں اور تم نے کوئی خفگی ظاہر کی ہے اور نہ ہی کوئی اعتراض اٹھایا ہے!“

”لی یان! یہ مذاق کا نہیں، سونے کا وقت ہے“ میں نے میٹھی ناراضی سے کہا۔

وہ یک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ”پہلے تم سو جاؤ، پھر میں بھی سو جاؤں گی۔ کافی کے اثرات زائل ہونے میں تھوڑی دیر لگے گی۔“

”میں تو گہری نیند میں قدم رکھنے ہی والا تھا“ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرتے ہوئے شکوا بھرے انداز میں کہا ”اگر تم تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھے یوں مخاطب کرتی رہو گی تو پھر سو چکا میں۔“

”ٹھیک ہے، میں اب تمہیں ڈسٹرب نہیں کروں گی، وعدہ!“ اس نے کہا۔

میں نے اس کے وعدے کا اعتبار کر لیا اور واقعی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اس نے بات ختم کرتے ہی اپنی وہ ٹانگ پھیلا لی جس پر میرا سر نہیں رکھا ہوا تھا‘ پھر ہاتھ بڑھا کر گرم کمبل کھینچ لیا۔ اس نے مجھے اور خود کو بہ آہستگی وہ کمبل اوڑھا دیا پھر باقی وجود کو ساکت رکھتے ہوئے اپنی مشاق انگلیوں کو متحرک کر دیا۔

نرسنگ اور ٹیچنگ دو ایسے شعبے ہیں کہ جن سے تعلق رکھنے والوں کو نرم خو اور گداز دل ہونا چاہیے۔ لی یان نے بھی نرسنگ کورس کر رکھا تھا۔ وہ اس کورس کے ست کو اپنی انگلیوں کے گداز میں ملا کر میرے سر میں اتارنے لگی۔ میں گہری نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا پھر پتا نہیں‘ کس سمے وہ بھی چپکے سے کمبل کے اندر اتر آئی!

اگلی صبح بڑی روشن اور فرحت بخش تھی!

اگرچہ گزشتہ رات کو سونے کے لیے بہت کم وقت ملا تھا لیکن اس محدود وقت نے پچھلی رات ہونے والی مارا ماری کی ساری کلفت کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور ریلیکس محسوس کر رہا تھا۔ لی یان کے چہرے سے بھی آسودگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ہم یکے بعد دیگرے گرم شاور لے کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ کاشالوک ہمارے کمرے میں پہنچ گیا۔ اس نے بدھ راہبوں والا مخصوص لباس پہن لیا تھا۔

”کیا تم دونوں چلنے کے لیے تیار ہو؟“ اس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا ”بس تمہاری طرح مونک بننا باقی ہے۔“

”ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ کا وقت ہے۔“ گہری سنجیدگی سے بولا ”کیا تم لوگ بھکشوؤں والے لباس خود ہی نہیں لو گے؟“

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ”میں نے بہت کم عمری میں ایسا لبادہ پہننے کا طریقہ سیکھ لیا تھا اور یہ طریقہ میرے ذہن میں محفوظ بھی ہے۔ تم فکر نہ کرو‘ میں اپنے ساتھ ساتھ لی یان کا لباس بھی بدلوا دوں گا۔“

”لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے!“

”او کے! اس سے پہلے ہی ہم فارغ ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

وہ مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گیا تو میں لی یان کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

کاشالوک کی دی ہوئی مہلت سے پہلے ہی ہم تیار ہو کر بیڈ روم سے نکل آئے۔ بدھ بھکشوؤں کی طرح اپنے ضروری سامان کو ہم نے مخصوص پوٹلیوں کی صورت میں باندھ لیا تھا۔ کاشالوک تو تھا ہی بالکل اصلی بدھسٹ‘ ہم بھی کسی سے کم نظر نہیں آ رہے تھے۔

سورج کی پہلی کرن نے ابھی کھٹمنڈو کی زمین کو نہیں چھوا تھا کہ ہم اس گھر سے روانہ ہو گئے۔ بوقتِ رخصت فلوجی مجھے گھر میں کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس کے بارے میں جب کاشالوک سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ فلوجی کو اسی نے کسی ضروری کام سے کہیں بھیجا تھا۔ میں نے ضروری کام کی تفصیل پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ گھر سے نکلتے وقت اس نے دروازے کو محض بھیڑ دیا تھا‘ تالا وغیرہ لگانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ فلوجی زیادہ دور نہیں گیا تھا۔

ناشتے کے لیے‘ دیلی کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے کاشالوک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ”وجدان! تم دونوں روپ بدل کر بدھ بھکشو بن گئے ہو لہٰذا تمہارے نام بھی بدل جانا چاہئیں۔ میں نے تمہارے لیے نام سوچ لیے ہیں۔ جب تک ہم کسی محفوظ فضا میں نہیں

پہنچ جائیں‘ تم چینگ اور لی یان منچوری ہو۔ تم دونوں اپنے ناموں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔“

”یہ اچھی ترکیب ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا ”کیا تم حسبِ معمول کاشالوک ہی رہو گے؟“

”نہیں‘ میں اب کھام ہوں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ”تم مجھے کھام کے نام ہی سے مخاطب کرو گے۔“

”او کے!“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد ہم ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ بدھ بھکشو نہایت ہی سادہ خوراک پر گزارہ کرتے ہیں اور اس خوراک میں بھی زیادہ تر اناج ہی شامل ہوتا ہے۔ کاشالوک نے ایک مناسب سے ناشتے کا آرڈر دیا اور ہم دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگے۔

اس ہوٹل میں زیادہ رش نہیں تھا۔ میں نے اندر قدم رکھتے ہی تنقیدی نگاہ سے وہاں کا جائزہ لے لیا تھا۔ ہم سے پہلے وہاں لگ بھگ دس افراد مختلف میزوں پر بیٹھے ناشتا کرنے میں مصروف تھے۔

کاشالوک نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ”تم اس بھاری اور گرم لباس میں حرکت کرتے ہوئے دقت تو محسوس نہیں کر رہی ہو؟“

”مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔“ لی یان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ”بہر حال‘ مجبوری کا نام شکریہ ہے۔ تم فکر نہ کرو‘ میں کام چلا لوں گی۔“

کاشالوک نے لباس کے سلسلے میں مجھ سے قطعی کوئی استفسار نہ کیا شاید اس لیے کہ اس نے میری حرکات و سکنات میں کوئی الجھن نوٹ نہیں کی تھی۔ لباس کی تبدیلی کے ساتھ ہی کاشالوک نے ہمارے چہروں پر بھی تھوڑا کام کیا تھا۔ یہ انتہائی معمولی نوعیت کا میک اپ تھا مگر اس نے ہماری صورتوں کو ایسی لک دے دی کہ پہلی نظر میں یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ ہم بدھ بھکشو نہیں ہیں!

ناشتا کرنے کے دوران میں لی یان نے کاشالوک سے سوال کیا ”ہمارے کاغذات کا کیا ہو گا۔ ہم ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں داخل ہونے جا رہے ہیں؟“

لی یان کا سوال بہت اہم تھا۔ کاشالوک نے جواب دیا ”میرا خیال ہے‘ ہمیں کسی قسم کی دستاویزات کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ شاید تمہیں نہیں معلوم کہ بدھ بھکشوؤں کو کتنی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ ان کی خدمت کر کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ انہیں قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے لہٰذا قانون کے محافظ ان کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہم (بدھ بھکشو) کسی بات پر ان سے خفا ہو گئے تو انہیں بہت زیادہ نقصان پہنچے گا۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر نہایت ہی رازدارانہ انداز میں بولا۔

”عام طور پر جو لوگ اپنی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات کے باعث مذہب سے دور ہو جاتے ہیں۔ لازمی عبادت اور ریاضت کے لیے وقت نہیں نکال پاتے وہ بدھ راہبوں کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے ہیں۔ اپنی دانست میں وہ اس طرح معاملات کو بیلنس کر رہے ہوتے ہیں۔ الغرض‘ مجھے امید ہے کہ ہم جس بھیس میں سفر پر روانہ ہونے والے ہیں اس میں ہمیں کسی بڑی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بدھ یاتریوں کے لیے سب کے دلوں میں ایک نرم گوشہ موجود ہوتا ہے۔ ویسے بھی......“ وہ سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا ”کوداری تک تو ہم نیپال ہی کی حدود میں ہیں لہٰذا کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہو گا۔ آگے کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال تو ہمیں کھٹمنڈو سے نکلنا ہے۔ اگر ہم نے بہ خیریت کھٹمنڈو کی حدود سے باہر قدم نکال لیا تو پھر لارڈ بدھا کی مدد سے ہم بڑی سہولت سے تبت میں بھی داخل ہو جائیں گے۔“

اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پوری توجہ سے ہماری گفتگو کو سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ بڑا ناقابلِ یقین احساس تھا کیونکہ ہم نہایت ہی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے اس احساس کے ساتھ ہی بے اختیار نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا اور چونک گیا۔

ہم سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر‘ ایک میز پر کوئی بدھ بھکشو بیٹھا ناشتا کر رہا تھا لیکن میرے چونکنے کا سبب یہ تھا کہ وہ اس وقت سیدھا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں چار ہوئیں تو اس نے اضطراری انداز میں نگاہ چرا لی اور ٹیبل پر موجود ناشتے کے لوازمات کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میرا احساس یکسر غلط نہیں تھا۔ اگر کوئی ہماری گفتگو نہیں سن رہا تھا تو کم از کم ہمیں دیکھ ضرور رہا تھا۔ پتا نہیں، کیا بات تھی کہ میرا دل اس بھکشو کی طرف سے کھٹک گیا۔ اس نے جس انداز میں نگاہ چرائی تھی وہ شک میں مبتلا کر دینے والا تھا۔

میں چند لمحات تک یک ٹک اسے دیکھتا رہا وہ گردن جھکائے ناشتا کرنے میں مصروف رہا، میں نے نوٹ کیا کہ اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی بوکھلاہٹ پائی جاتی تھی۔ میں نے اسے چیک کرنے کے لیے اپنی نگاہ کا زاویہ تبدیل کر لیا تاکہ وہ یہ محسوس نہ کرے کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اس پر نگاہ رکھتے ہوئے میں اپنے

ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کاشانوک لی یان سے کہہ رہا تھا۔

''جس کا احترام کیا جائے اس میں کیڑے نکالنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا اس لیے بدھ راہبوں سے زیادہ پوچھ پڑتال نہیں کی جاتی بلکہ صحیح معنوں میں تو انہیں اس دنیا کا باسی ہی نہیں سمجھا جاتا۔ بہر حال'' وہ متوقف ہونے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے تھاچو کو صورتِ حال سے تفصیلاً آگاہ کردیا ہے۔ وہ ہمارے معاملات کو سنبھال لے گا۔ ہم اس کی سالاری میں تبت جارہے ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورنہیں، میں نے کوشش کر کے......''

اس کے بعد کاشانوک نے کیا کہا، میں اس پر دھیان نہ دے سکا کیوں کہ زیرِ مشاہدہ بھکشو کو میں نے ایک مرتبہ پھر کن انکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تھا۔ میں اس کی طرف سے چوکس ہوگیا اور دانستہ ایک ایسے رخ پر گردن کو موڑلیا کہ اسے احساس نہ ہونے پائے، میں اسے واچ کررہا ہوں، میری یہ اسکیم خاصی کامیاب رہی اور وہ شخص زیادہ آزادی اور بے فکری سے ہمیں تاڑنے لگا۔

لی یان اور کاشانوک کو اس شخص کی ''سرگرمی'' کی خبر نہیں تھی کیونکہ اس کی میز ان دونوں کے عقب میں واقع تھی لیکن میں برابر اس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ خاص طور پر ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ہماری نگرانی کیوں کررہا تھا؟ اس سوال کا جواب تو وہی دے سکتا تھا۔ میں نے اسے ''چھیڑنے'' کا فیصلہ کرلیا۔

کاشانوک اور لی یان کو میری نئی مصروفیت کا علم نہیں تھا۔ میں ناشتا کرنے کے دوران میں، ان کی گفتگو میں بھی شریک رہا اور اشارے سے ویٹر کو اپنے پاس بلالیا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ وہ دونوں چونک جاتے۔ انہوں نے سوچا ہوگا، شاید میں کوئی اور آئٹم منگوانا چاہتا ہوں۔ میں دراصل ویٹر کے توسط سے اس بدھ بھکشو کو ''ڈسٹرب'' کرنا چاہتا تھا۔

ویٹر جیسے ہی میرا اشارہ پاکر ہماری میز کی جانب بڑھا، میرا منصوبہ عمل سے پہلے ہی ناکامیاب ہوگیا۔ زیرِ مشاہدہ بھکشو نے شاید میری حرکت کو نوٹ کرلیا تھا۔ میں نے اس کی حرکات وسکنات میں ایک بے چینی سے پھیلتی محسوس کی اور اس افراتفری کے عالم میں وہ ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر تیزی سے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔ میری نگاہ بھی اس کا تعاقب کرتے ہوئے کاؤنٹر تک پہنچ گئی۔

اس لمحے ویٹر ہماری میز کے قریب آگیا۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا تھا تو کچھ کہنا بھی ضروری تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں جو آیا وہ میں نے کہہ دیا۔

''ہمارے ناشتے کا بل کتنا بنا؟''

وہ گردن کو تعظیم دینے والے انداز میں جھکاتے ہوئے بولا ''ابھی بتاتا ہوں جناب!''

اسکے ساتھ ہی وہ پلٹ کر ہوٹل کے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

کاشانوک اور لی یان سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگے مگر میں تو کسی اور ہی شخص کو دیکھ رہا تھا جس نے کاؤنٹر سے فارغ ہونے کے بعد باہر کی جانب قدم بڑھا دیے تھے۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

لی یان نے کہا ''وجدان! ایسی جلدی کیا ہے۔ تم نے ویٹر کو بول دیا ہے نا، وہ بل لے آئے گا۔''

''مجھے تو یہ کسی اور ہی چکر میں نظر آرہا ہے!'' کاشانوک نے لی یان سے کہا۔

میں نے ان کی باتوں پر دھیان دیے بغیر کہا ''تم لوگ ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں......''

''تم کہاں جارہے ہو وجدان؟'' لی یان نے آواز دبا کر استفسار کیا۔

''واپس آکر بتاتا ہوں۔''

میں انہیں متعجب اور متامل چھوڑ کر تیزی سے چلتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔

باہر آکر میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن وہ شخص مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ پتا نہیں، وہ کہاں غائب ہوگیا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ جب اس بھکشو کے آثار نظر نہ آئے تو میں واپس ہوٹل کے اندر آگیا۔ وہ دونوں اسی میز پر بیٹھے منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

کاشانوک نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا ''مسئلہ کیا ہے وجدان! تم یوں اچانک ہی اٹھ کر کہاں چل دیے تھے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں ''مسئلے'' سے آگاہ کیا۔ لی یان نے فوراً گردن موڑ کر اس میز کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ بدھ بھکشو بیٹھا ناشتا کررہا تھا۔ وہ پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''لیکن جب ہم ہوٹل کے اندر آئے تھے تو وہ میز خالی تھی!''

کاشانوک نے بھی اس بات کی تصدیق کی تو میری تشویش میں اضافہ ہوگیا۔ اس کا یہی مطلب تھا۔ وہ شخص ہمارے بعد ہوٹل میں داخل ہوا تھا...... یعنی ہمارا تعاقب

کرتے ہوئے! یہ صورتِ حال اس شخص کو اور بھی خطرناک ظاہر کرتی تھی۔

''کیا تم اس کی صورت دیکھ کر پہچان لوگے؟'' کاشانوک نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا ''ہاں پہچان لوں گا اگر تمام بدھ بھکشو پہلی نظر میں ایک ہی جیسے دکھائی دیتے ہیں!''

کاشانوک گمبھیر لہجے میں بولا ''ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے!''

اس کے بعد ہم نے بل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

میں نے حالات کا تقاضا نبھاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس بھکشو کی تلاش میں اپنی نگاہ کو دوڑایا لیکن اس بار بھی وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر تک پیدل چلنے کے بعد ہم کاشانوک کی معیت میں تھاچو کے پاس پہنچ گئے۔

تھاچو سادہ طبیعت کا مالک ایک مہربان مونک تھا۔ اس نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا اور کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہم اصل نہیں بلکہ بنے ہوئے بھکشو ہیں۔ تھاچو اور اس کے قافلے والے روانگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمارے ہی انتظار میں بیٹھے ہوں۔ تھاچو نے قافلے کے دیگر افراد سے اس طرح ہمارا تعارف کرایا جیسے وہ پہلے سے ہم سے واقف ہو۔ جب اس نے ہمارے اختیار کیے ہوئے نام بھی لیے تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کاشانوک نے نہیں بلکہ ہمارے فرضی ناموں کا انتخاب تھاچو ہی نے کیا ہوگا۔ تھاچو بہت ہی بردبار اور گہرا شخص تھا۔ اس کے رویے سے ظاہر ہوتا تھا، کاشانوک نے اسے ہمارے بارے میں اچھی طرح بریف کررکھا ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم بودھ ناتھ ویلی سے روانہ ہوگئے۔

جب ہم لوگ سندھارا پہنچے تو سورج طلوع ہوچکا تھا اور اس کی روشنی دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔ بس اسٹینڈ پر سوئس منی ایکسپریس موجود تھی۔ ہم نے ٹکٹ حاصل کیے اور کوچ میں آبیٹھے۔ کھٹمنڈو سے کوداری تک کا کرایہ فی سواری ایک سو بیس روپے تھا جب ہم کوچ میں سوار ہوئے تو پہلے سے بھی کچھ مسافر اس میں موجود تھے۔ ہمارے بیٹھنے کے پندرہ منٹ بعد کوچ بھر گئی۔

کاشانوک نے بالکل ٹھیک کہا تھا، ان مسافروں میں زیادہ تعداد بدھ بھکشوؤں کی تھی جو اپنی عبادت گاہوں کی یاترا کے لیے اِدھر سے اُدھر سفر جاری رکھتے تھے۔

موسم خاصا سرد تھا اور ٹھنڈی ٹھار ہوا نے موسم کی شدت میں کئی گناہ اضافہ کردیا تھا۔ اگر ہمارے جسموں پر مخصوص گرم لباس نہ ہوتا تو اب تک ہماری قلفی جم چکی ہوتی۔ ہمارے بدن کے جو حصے کھلے تھے وہ موسم کی بے رحمی کو یونہی محسوس کررہے تھے جیسے ہم کسی وسیع وعریض فریزر میں آن کھڑے ہوئے ہوں! جب تک ہماری کوچ (سوئس منی ایکسپریس) سندھارا کے بس اسٹینڈ سے روانہ نہیں ہوئی' میں غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار رہا۔ ہر لمحے دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اچانک کہیں سے نیپالی پولیس والے برآمد ہوں گے اور چیکنگ کے نام پر اپنی کارروائی شروع کردیں گے لیکن خیریت گزری اور کوچ نے بڑے امن وامان سے سفر کا آغاز کردیا۔

ہم جس نوعیت کے حالات سے دوچار تھے' ان میں ہر ساعت چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ ربی موشے ہائمن کوئی معمولی شخص نہیں تھا اور اس کی پشت پر امریکا بہادر کا ہاتھ بھی تھا بلکہ صحیح معنوں میں ربی کا ہاتھ امریکا کے سر پر تھا۔ پوری یہودی لابی اس کی انگلیوں کے اشاروں پر ناچتی تھی اور اب تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ امریکا کی خارجہ اور داخلہ پالیسی میں یہودی کس حد تک دخیل ہیں۔

میں نے ربی اور اس کے یہودی چیلوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔ نیپال میں اسرائیل ایمبیسی اور یہودی لابی کی طاقت بھی دیکھنے میں آچکی تھی۔ ربی پورے طمطراق اور وسائل کے ساتھ مجھے تلاش کروا رہا تھا۔ ایسی صورت میں جب تک ہماری کوچ کھٹمنڈو شہر کی حدود سے نہ نکل جاتی' سکون کی سانس نہیں لی جاسکتی تھی۔

کوچ مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے رنگ روڈ پر آئی پھر بڑی تیزی سے سفر کرتے ہوئے کھٹمنڈو کے آخری شمالی کنارے پر پہنچ گئی۔ میں اور لی یان ایک ہی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دو مسافروں کے لیے بنائی گئی ایک آرام دہ سیٹ تھی۔ لی یان کھڑکی کی جانب شیشے سے لگی بیٹھی تھی۔ ہمارے آگے واقع ایسی ہی ایک سیٹ پر کاشانوک' تھاچو کے پہلو میں براجمان تھا۔ کوچ کا ہیٹنگ سسٹم بڑے موثر انداز میں کام کررہا تھا جس کی مہربانی سے باہر کا موسم ہم پر اثر انداز نہیں ہورہا تھا۔ وہ ایک مکمل ائرکنڈیشنڈ کوچ تھی۔

شہر کے اختتام پر پہنچ کر ہمیں رکنا پڑا۔ وہاں سڑک پر ان گاڑیوں کی لائن لگی ہوئی تھی جو علی الصباح کھٹمنڈو شہر کو چھوڑ کر باہر جارہی تھیں۔ شاید کوئی چیکنگ وغیرہ کا معاملہ تھا اور اس وقت کھٹمنڈو کے جو حالات چل رہے تھے' ان میں سب سے زیادہ چیکنگ تو ہماری تلاش کے سلسلے ہی کی کڑی ہوسکتی تھی۔

لی یان نے بھی صورتِ حال کو بھانپ لیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولی ''چینگ! مجھے تو کوئی گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔''

اس نے احتیاط کا تقاضا پورا کرتے ہوئے مجھے اختیاری نام

سے مخاطب کیا تو میں نے باہر دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا ''ہاں' مجھے بھی یہی نظر آ رہا ہے۔''

''ہمارے لیے کوئی مشکل تو نہیں کھڑی ہو جائے گی؟'' اس نے بدستور دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے سادگی سے کہا ''اگر کھڑی ہو جائے گی تو دو تھپڑ مار کر بٹھا دیں گے۔''

''تمہیں تو ہر وقت مذاق کی سوجھتی ہے!'' وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولی۔

''میرا خدا' تمہارا یسوع مسیح اور کھام کا لارڈ بدھا ہماری مدد کرے گا۔'' میں نے چہرے کو سنجیدہ رکھتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی ''کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟''

وہ پورے اعتماد سے بولی ''ہاں' یقین ہے۔''

''پھر اطمینان سے بیٹھی رہو۔'' میں نے کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''ہم اس وقت بدھ بھکشو ہیں جن کے حالات میں کوئی ہلچل اور افراتفری نہیں ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہو' کوچ میں سوار باقی بدھ راہب کس سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں جیسے انہیں دنیا میں اپنے سوا کسی کی خبر ہی نہ ہو!''

وہ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی ''ان میں بعض تو ایسے ہیں جنہیں خود اپنی بھی خبر نہیں۔''

''بس تو پھر تم بھی ویسی ہی نظر آنے کی کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔

وہ خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

اندر اور باہر کے موسم میں زمین آسمان کا فرق تھا اور اس تضاد و تفاوت نے کھڑکی کے شیشے کو دھندلا دیا تھا جس کے سبب باہر کے مناظر کو واضح طور پر دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ قدرتی اور مصنوعی موسم میں اچھی خاصی ''گرمی سردی'' ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہی اپنے اپنے محاذ پر ڈٹ کر ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے تھے۔

ہماری کوچ رکتی اور آگے بڑھتی گئی۔ یہ بڑھنا' کھسکنے کے مترادف تھا۔ بالآخر ہماری کوچ کی باری آ گئی۔ اب ہمیں اور اس کوچ کو چیکنگ کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ میں پوری طرح ''تیار'' ہو کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں کاشانوک نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر ہماری جانب نہیں دیکھا اور یہ اس نے بہت ہی اچھا کیا تھا۔

اچانک نیپالی پولیس کے دو مسلح اہلکار کوچ کے اندر داخل ہوئے اور ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ایک مسافر کے چہرے کو بغور دیکھنے لگے۔ میں اور لی یان نارمل انداز میں بیٹھے رہے جیسا کہ دوسرے بھکشو بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پولیس والے مطمئن ہو کر کوچ سے نیچے اتر گئے۔ لی یان نے ایک طویل سانس خارج کی۔

یہ ایک معمولی اور سرسری نوعیت کی چیکنگ تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کوچ کے مسافروں میں غالب تعداد بدھ بھکشوؤں کی تھی چنانچہ انہوں نے ہمیں ''توجہ'' کے قابل نہ سمجھا۔ دیگر چار پانچ افراد جو بھکشوؤں کے بھیس میں نہیں تھے' پولیس والوں نے باقاعدہ صرف انہیں چیک کیا اور مطمئن ہو کر چلے گئے کیونکہ ان افراد میں کوئی بھی وجدان یا لی یان نہیں تھا۔

دس منٹ کے بعد سوئس منی ایکسپریس دشوار گزار راستے پر شمال کی سمت بڑھنے لگی۔ یہ پہاڑی سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ہم چونکہ مسلسل بلندی کی طرف جا رہے تھے اس لیے کوچ کی رفتار بہت کم ہو گئی تھی۔ چڑھائی کی جانب سفر کرتے ہوئے کوچ کے انجن کو پوری طاقت صرف کرنا پڑ رہی تھی۔

کھٹمنڈو کی حدود سے بہ حفاظت باہر نکل آنے کے بعد میں قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ لی یان مجھے کسی گفتگو میں الجھا دیتی' میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میری بند آنکھوں کو دیکھ کر وہ سمجھ جاتی کہ میں اس وقت کہیں اور مصروف ہوں ...... اور میں نے واقعی کہیں مصروف ہونے کے لیے ہی آنکھیں بند کی تھیں۔

ساحل کی خبر گیری کیے کافی دیر ہو گئی تھی۔ ربی نے پتا نہیں' کیا سوچ کر مجھ پر اتنی مہربانی کر دی تھی کہ میں اب بہ آسانی ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی میں نے اپنی جانِ تمنا کا تصور کیا اور اس کے ماحول کو چھونے کے لیے تھرڈ آئی کو آزمایا لیکن اگلے ہی لمحے مجھے مایوسی کا دھکا لگا۔ میں ساحل کے ماحول تک پہنچنے میں ناکام رہا تھا۔

یہ صورتِ حال میرے لیے خاصی پریشان کن تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک مرتبہ پھر زیرو پر آ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین چار مرتبہ ساحل کے ماحول میں کودنے کی کوشش کی مگر ہر بار نتائج ایک ہی جیسے برآمد ہوئے۔ اب اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ ربی نے دوبارہ میری راہ کھوٹی کرنے کے لیے ساحل کو کسی ایسے عمل سے گزارا تھا کہ وہ میری تیسری آنکھ کی رسائی میں نہیں رہی تھی۔ وہ ایک ماہر عامل تھا اور اس سے پہلے بھی میرے راستے میں ایسی ہی نادیدہ رکاوٹ کھڑی کر چکا تھا۔ میں نے پچھلے دو دن میں پے در پے اسے جتنے نقصانات پہنچائے تھے' اس کے بعد یہی ہونا تھا پھر ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو بھی اسے کوئی انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرنے والی ہی تھی۔ جب میں اپنی ساحل کے ماحول میں داخل ہونے میں کامیاب نہ ہو سکا تو دل ہی دل میں ربی

موشے ہائمن کو کھری کھری سنانے لگا۔

میں نے آنکھیں کھولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میرے نتھنوں سے ایک فرحت بخش' جاں فزا خوشبو ٹکرائی۔ اس منفرد خوشبو کو میں نے ایک لمحے میں پہچان لیا۔ وہ نیلگری کے بدن سے اٹھنے والی مخصوص نشاط انگیز مہک تھی۔ اس وقت میرے پہلو میں کھڑکی کے ساتھ لی یان بیٹھی ہوئی تھی۔ نیلگری کی شناخت وہ بھینی بھینی خوشبو ظاہر کر رہی تھی کہ پربتوں کی ملکہ بہ نفسِ نفیس اس کوچ میں موجود ہے۔

میں بدستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے اسے محسوس کرنے لگا۔ وہ مجھے اپنی ذات کا حصہ ہی لگی۔ مجھے احساس ہوا جیسے میں اس کے ماحول میں سانس لے رہا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں دھیرے سے اسے پکارا۔

''نیلگری......!''

اس کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ وہ یکسر خاموش تھی لیکن اس کے جسم کی مخصوص مہک سانس کے راستے میرے وجود میں اتر رہی تھی۔ اس خوشبو نے میرے تن بدن کو مہکا کر رکھ دیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر بہ زبانِ خاموشی اسے آواز دی۔

''تم خاموش کیوں ہو نیلگری' کچھ کہو! میرے کان میں رس گھولو' میری سماعت میں کوئی دل نشیں سرگوشی کرو۔ میں محسوس کر رہا ہوں' تم میرے آس پاس...... بہت قریب موجود ہو۔ میں تمہاری سانسوں کی خوشگوار تپش اپنے چہرے پر محسوس کر رہا ہوں۔ بولو' تم بولتی کیوں نہیں ہو؟''

جواب میں پُراسرار خاموشی کا تسلسل قائم رہا۔ میں ایک بے نام سی بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ اگر آپ کے فون کی گھنٹی بجے اور آپ ریسیور اٹھا کر ''ہیلو'' کہیں لیکن دوسری جانب ایک سناٹا طاری ہو اور آپ کے بار بار ''ہیلو'' کہنے پر بھی وہ سناٹا برقرار رہے تو آپ یقیناً جھنجلائیں گے پھر اسی جھنجلاہٹ میں آپ ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیں گے۔

مجھ پر بھی کچھ اسی قسم کی کیفیت طاری تھی۔ جب بار بار پکارنے پر بھی نیلگری کی جوابی سرگوشی میری سماعت سے نہ ٹکرائی تو مجھے کوفت ہونے لگی اور میں نے اس سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے' تم میرے پاس آ کر گونگی ہو گئی ہو نا لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں ابھی تمہارے پاس آ کر تمہارے گونگے پن کا علاج کرتا ہوں۔''

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ وہ مخصوص ہوش ربا خوشبو غائب ہو گئی۔ وہ جس طرح ''چھم'' سے میرے ماحول میں سرایت کر گئی تھی اسی طرح جھٹ پٹ رخصت بھی ہو گئی۔ میرا ماحول اس کے بدن سے اٹھنے والی مدہوش کن مہک سے خالی ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نیلگری کو ٹرائی کرنے لگا۔

دو تین مرتبہ کی کوشش کے بعد میں تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ میں اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ پتا نہیں' اس نے میری تیسری آنکھ کے سامنے کیسی طلسمی بندش لگا رکھی تھی۔ اس کے طلسم کی کاٹ فی الحال میرے پاس نہیں تھی۔ میں بے اختیار اس حسین ساحرہ کے بارے میں سوچنے لگا جو پُراسرار اور نادیدہ شکتیوں کی مالک تھی۔ نیلگری بلاشبہ' میری داستانِ حیات کا ایک انوکھا کردار تھی۔ اس نے میری زندگی میں ڈبل رول پلے کیا تھا۔ اس کا کردار تحلیلی اعتبار سے دو حصوں پر مشتمل تھا۔

پہلے حصے میں وہ براہِ راست مجھ سے رابطہ کرتی تھی۔ وہ حد سے زیادہ مجھ پر مہربان دکھائی دیتی تھی لیکن میں اسے وہ مقام نہ دے سکا جس کی وہ تمنائی تھی اور اسے اس بات کا شدید قلق بھی تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ زندگی بھر میری کنیز بن کر رہے۔ مجھے کنیزیں اور غلام پالنے کا کبھی بھی شوق نہیں رہا تاہم نیلگری کا قرب میرے لیے فرحت کا باعث تھا مگر اس قربت کے لیے اس نے بڑی کڑی شرط لگا دی تھی جو میں' ایک مسلمان ہونے کے ناتے کبھی بھی پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا ''وجدان! تم زندگی میں ایک مرتبہ ضرور بھٹکو گے۔ اس وقت تمہاری تمام قوتیں تم سے چھن جائیں گی۔ اگر اس وقت تک تم اپنا جاپ مکمل کر لو گے تو میں تمہاری کنیز بن جاؤں گی۔'' اس نے مجھے انمول پتھروں والی ایک مالا بھی تحفے میں دی تھی۔ وہ مالا اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور نایاب مالا تھی جس میں سیاہ چپٹے پتھر پروئے گئے تھے۔ یہ چپٹے سیاہ پتھر تعداد میں اکیس تھے۔ بیس چھوٹے والے اور ایک بہ نسبت بڑا پتھر۔ دونوں جانب دس دس پتھر اور بیچ میں' ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن کے سائز کا بڑا سا سیاہ پتھر موجود تھا۔ نیلگری نے مجھے بتایا تھا' اگر میں اس بڑے سیاہ پتھر کو چوسوں گا تو وہ میرے پاس حاضر ہو جائے گی۔ نیلگری کو یوگی گوتم بھوش کے شیطانی چکر سے نجات دلانے کے بعد جب تلکو جھیل سے میری واپسی ہوئی تھی' میں نے اپنے ملک آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ٹھاکر بھانوت سنگھ کے توسط سے جب میں غیر قانونی طور پر پاک بھارت سرحد پار کر رہا تھا تو سرحدی محافظوں سے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی تھی اور اسی افراتفری میں نیلگری کی دی ہوئی نایاب مالا ریگزار کی نذر ہو گئی۔ رات کے اندھیرے میں اس مالا کو تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ بعدازاں ... جب نگرپارکر کے ایک تھانے میں' میں بند تھا تو نیلگری مجھ سے ملنے .... حوالات میں بھی چلی آئی تھی۔ وہ مالا کھو جانے پر مجھ سے شاکی تھی اور اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ میں اس کے

حسبِ منشا جاب مکمل نہیں کروں گا۔ ان حالات میں' مجھے حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنا ایک خطرناک منصوبہ بھی بیان کیا تھا۔ تاہم میں نے کوشش کی کہ وہ اپنے منصوبے پر عمل نہ کر سکے۔ پاکستان میں قیام کے دوران میں وہ بہت دفعہ میرے پاس آئی۔ اپنے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے سنسنی حالات کے پیشِ نظر جب میں اس کی طرف سے غافل ہوگیا تو اسے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ میں کراچی کے ایک پوش علاقے کے ڈی اے' اسکیم ون کے ایک بنگلے میں گزاری ہوئی اس رات کو کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا جب نیلگری' لیلیٰ کا روپ دھار کر مجھے زیر کرنے آئی تھی ......اور اس رات وہ اپنی خواہش کی تکمیل میں کامیاب رہی تھی۔

پھر وہ مجھ سے بچھڑ گئی۔ یہ بچھڑنا اس کی مرضی کے تابع تھا۔ کراچی میں' جب میں کلفٹن کے ایک فلیٹ میں قیام پذیر تھا تو وہ بڑے دکھی انداز میں مجھ سے الوداعی ملاقات کرنے آئی تھی اور اس وقت نیلگری نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ از خود وہ کبھی میرے پاس نہیں آئے گی بلکہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کردے گی۔ نیلگری کوہسار کی ملکہ تھی۔ اس کا مسکن ہمالیہ کی گود میں واقع تھا۔ تلکو جھیل سے آگے کل چھ چوٹیاں ایک خاص ترتیب سے موجود تھیں جو نیلگری نارتھ اور نیلگری ساؤتھ کے نام سے موسوم تھیں۔ ان چوٹیوں کی بلندی چوبیس سے پچیس ہزار فٹ تک تھی۔ انہی برف پوش پہاڑی چوٹیوں میں سے کسی ایک میں نیلگری کا قیام تھا۔ نیلگری نے آخری ملاقات میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کردے گی۔ اس کا دعویٰ کسی حد تک درست بھی ثابت ہو رہا تھا۔ میں اس وقت نیپال سے تبت کی طرف جا رہا تھا اور ہمالیہ رینج کا بڑا حصہ نیپال کے شمال میں پایا جاتا تھا۔ دنیا کا بلند ترین پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ بھی نیپال کی شمالی سرحد پر سر اٹھائے کھڑا تھا۔ میں کراچی سے امریکا اور پھر امریکا سے نیپال جن حالات کے تحت پہنچا تھا اور اب نیپال سے تبت کی طرف جا رہا تھا اس میں میرے ارادے اور پروگرام کا کوئی دخل نہیں تھا' گویا نیلگری کی پیش گوئی کے عین مطابق' میں مجبوراً اس سمت بڑھ رہا تھا۔ یہ مجبوری آگے جا کر کیا رنگ دکھلانے والی تھی' اس کے بارے میں فی الحال میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

نیلگری کے کردار کا دوسرا رخ امریکا میں سامنے آیا۔ اب وہ غیر محسوس انداز میں گاہے بہ گاہے میرے قریب آنے لگی تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتی اور نہ ہی میری پکار کا جواب دیتی تھی۔ میں اس کے بدن کی مخصوص مہک سے اسے اپنے ماحول میں محسوس کرلیتا تھا۔ جیسے تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے اپنا احساس دلا کر گئی تھی۔ اس کی آمد و شد یقینی تھی۔ کسی بھی قیمت پر میں اسے اپنے محسوسات کا دھوکا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ وہ واقعی میرے پاس آ رہی تھی مگر بہ اندازِ دگر!

یہ ایک طرح کی وعدہ خلافی تھی۔ وہ اتنے پُراسرار انداز میں اس عہد شکنی کی مرتکب کیوں ہو رہی تھی' مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کی یہ حرکات بے مقصد اور بلاوجہ تو نہیں ہوسکتی تھیں۔ وہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مجھ سے کھیل رہی تھی۔ میں ایک طرح سے اس کے ہاتھ کا کھلونا بنا ہوا تھا لیکن اسے ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ فیصلہ تو بہرحال' وقت ہی نے کرنا تھا کہ اس کھیل کا انجام دل خوش کن ہوگا یا دردناک؟

میں آنکھیں کھول کر اپنے ماحول میں حاضر ہوگیا۔ سب سے پہلے لی یان کے چہرے پر نگاہ گئی۔ وہ اس وقت براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا' جب میں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں تو وہ میرے چہرے پر نظر ٹکائے بیٹھی تھی۔ ہماری نگاہیں چار ہوئیں تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

مجھے ان لمحات میں اس کی آنکھیں بولتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بہ زبانِ خاموشی مجھ سے کہہ رہی تھیں "وجدان! تم نہیں بتانا چاہتے' مت بتاؤ لیکن سمجھ لو کہ میں بہت کچھ جانتی ہوں!"

میں لی یان سے نظر چرا کر کوچ کے دیگر مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔ کوچ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک امن و امان اور سکون کی صورتِ حال تھی۔ کاشانوک' تھاچو کے ساتھ ہمارے سامنے والی سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں لی یان کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں سرگوشی کی۔

"لی یان! کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہی ...... کہ مجھے کیا سوچنا چاہیے!"

"کیا مذاق کا موڈ ہو رہا ہے؟" میں نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

وہ اسی سنجیدگی سے بولی "انسان کو سب کے لیے ایک ہی اصول بنانا چاہیے ...... خود اپنے لیے بھی وہی ......!"

اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے پوچھا "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"سیدھی سی بات ہے۔" وہ اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے سرگوشیانہ لہجے میں بولی "تم جیسی بھی مبہم اور بنا سر پاؤں کی باتیں کرتے رہو تو وہ مذاق نہیں ہے' میں نے اس قسم کا ایک جملہ بول دیا تو تم پوچھ رہے ہو' کیا مذاق کا موڈ ہو رہا ہے؟" وہ لمحے بھر کو رکی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی "یہ کہاں کا انصاف ہے وجدان؟"

"یہ اندھیر نگری کا انصاف ہے!" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی چبھتا ہوا جواب دیتی' کوچ کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ رفتار میں واقع ہونے والی یہ کمی اتنی زیادہ اور واضح تھی کہ ہم چونک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگے۔ اس وقت تک سورج کچھ اوپر اٹھ آیا تھا اور کھڑکی کے شیشے پر صبح جو دھند دکھائی دیتی تھی' وہ چھٹ گئی تھی۔ کھڑکی کے باہر تا حدِ نگاہ برف پوش پہاڑی چوٹیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ کوچ کی رفتار کم ہونے کا سبب بھی فوراً سمجھ میں آ گیا۔ بیرونی مناظر کے زاویوں نے مجھے بتایا کہ اس وقت ہماری کوچ تنگ سی سڑک پر کچھ ایسے آگے بڑھ رہی تھی جیسے کوئی اسپائڈر دیوار پر چڑھتا ہے۔ بلندی کی طرف ہمارے سفر کا زاویہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے کوچ کے انجن کو بے پناہ قوت صرف کرنا پڑ رہی تھی۔

لی یان نے کہا "وجدان! مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی کوچ میں سڑک پر سفر نہیں کر رہی بلکہ ایک ایلی ویٹر (لفٹ) کے ذریعے نیچے سے اوپر جا رہی ہوں۔"

اس کی آواز میں ایک خاص قسم کی تشویش پائی جاتی تھی۔ اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے میں نے ایک خاص نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول کرائی۔

"اگرچہ ہم نہایت ہی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے ہیں لیکن ایک غلطی ہم دونوں سے بہرحال' سرزد ہو رہی ہے۔" میں نے ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا "ہمیں کسی بھی صورت لوگوں کے سامنے ایک دوسرے کو اصلی ناموں سے مخاطب نہیں کرنا ہے۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی "ہاں' ہاں" پھر کہا "لیکن اب تو ہم کھٹمنڈو کی خطرناک فضا سے بہت دور نکل آئے ہیں!"

"مگر ابھی تک نیپال کی غیر یقینی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔" میں نے تنبیہی انداز میں کہا "تبت پہنچنے تک ہمیں اس بات کا خیال کرنا چاہیے۔"

"اوکے چینگ!" وہ مجھے میرے اختیاری نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی "آئندہ میں اس پوائنٹ کو یاد رکھوں گی۔"

میں نے کہا "منچوری! ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے اپنے احساس کا ذکر کیا ہے۔ اگر اسی نوعیت کا سفر تم کسی جانور کی پشت پر بیٹھ کر کرو تو یہ تجربہ اور زیادہ سنسنی خیز اور خطرناک ثابت ہوگا۔"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی "تو ٹھیک ہے کہ میں ایڈونچر پسند ہوں لیکن اس قسم کے جان لیوا تجربات کرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں چینگ۔"

"پھر میں یہی کہوں گا' تمہیں مہم جوئی کا کوئی شوق نہیں۔" میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا "ایڈونچر تو نام ہے' موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا۔ وہ سامنے دیکھ رہی ہو؟"

میں نے کھڑکی سے باہر عظیم المرتبت پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بھی میرے اشارے کی سمت دیکھنے لگی۔ میں نے مزید کہا۔

"یہ دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے جس کی بلندی انتیس ہزار اٹھائیس فٹ بتائی جاتی ہے۔ اس فلک بوس پہاڑ کو سر کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں لیکن موت سے ٹکرانے والے مہم جو اس کی خوفناک بلندی اور خطرناک راستوں کو خاطر میں نہیں لاتے!"

وہ تیزی سے اثبات میں سر ہلانے لگی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی کیونکہ اس دوران میں کوچ کی رفتار مزید کم ہونے کے ساتھ ہی اونچائی کی جانب اس کا زاویہ کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اس وقت تو واقعی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی شٹل کاک میں بیٹھ کر زمین سے آسمان کی طرف جا رہے ہوں۔

بلندی کی طرف جاری یہ سفر ایک پہاڑی وادی میں جا کر ختم ہوا۔ یہ وادی "بدھا نلکا نتھا" تھی۔ بدھا نلکا نتھا کھٹمنڈو سے محض نو کلومیٹر شمال میں واقع ہے لیکن یہ مختصر سا سفر ہم نے بڑی مشکل سے طے کیا تھا۔ یہاں تھوڑی دیر کا قیام تھا۔ سوکس منی ایکسپریس ایک قدرے مسطح جگہ پر رکی تو مسافر نیچے اترنے لگے۔ اپنی باری پر ہم بھی کوچ سے باہر نکل آئے۔

بدھا نلکا نتھا کا علاقہ شیو پوری ہل کے قدموں میں واقع ہے۔ شیو پوری ہل کی بلندی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بدھا نلکا نتھا میں نارائن (وشنو) کا ایک بہت بڑا سنگی مجسمہ بھی موجود ہے جو ایک بیڈ پر کسی شیش ناگ کے مانند کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ بدھ بھکشوؤں کی تمام تر دلچسپی وہاں پائے جانے والے اسٹوپا تک محدود تھی لہٰذا ہم تینوں اپنے قافلے کے ساتھ قدیم بدھ اسٹوپا کی طرف چلے گئے۔

کاشانوک تو بدھسٹ تھا۔ لہٰذا وہ دیگر بھکشوؤں کے ساتھ یاترا میں مصروف ہوگیا۔ میرے اور لی یان کے لیے اس یاترا میں کوئی چارم نہیں تھا مگر تھوڑی دیر تک ہم حالات کے تقاضے نبھاتے رہے پھر اسٹوپا کے وسیع و عریض صحن کی طرف نکل آئے۔ ہم چونکہ بدھ بھکشوؤں کے بھیس میں تھے اس لیے قافلے سے بالکل ہی کٹ کر رہنا دوسروں کو ہمارے حوالے سے شک میں ڈال سکتا تھا چنانچہ دنیا دکھاوے کے لیے ہی سہی' ہم نے بھی اس بدھ اسٹوپا کی تھوڑی بہت یاترا کر ہی ڈالی تھی۔

اسٹوپا کا صحن خاصا کشادہ تھا اور بڑے بڑے سنگی تختوں کو •

باہم جوڑ کر تیار کیا گیا تھا۔ ہم ننگے فرش پر ہی ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس طرف بیٹھنے کا میرا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ اسٹوپا کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لیے لوگ اِدھر ہی سے گزر کر بیرونی زینوں کی جانب بڑھتے تھے۔ میں اسٹوپا کی اندرونی عمارت سے نکلتے وقت کاشانوک کے کان میں یہ پھونک کر آیا تھا کہ ہم اسے کس طرف ملیں گے۔

لی یان نے اسٹوپا کے مخصوص گنبد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''بدھسٹ اپنی عبادت گاہ کی تعمیر وتزئین میں بڑی دل جمعی سے کام لیتے ہیں۔ پیگوڈا طرز کی یہ بلند وبالا عمارتیں کھڑی کرنا کوئی آسان کام تو نہیں پھر اسٹوپا کے کلس وغیرہ کی تیاری میں بھی وافر مقدار میں سونا استعمال کیا جاتا ہے۔''

مجھے مندر' کلیسا' سائناگاگ اور بدھ اسٹوپاز میں جانے کا بارہا اتفاق ہوا تھا۔ خاص طور پر مندر اور اسٹوپاز کے تہ خانوں میں' میں نے مختلف حوالوں سے سونے کا بے دریغ استعمال دیکھا تھا' خاص طور پر مورتیوں کی صورت میں۔ لی یان کی بات سن کر بدھ نیل کنٹھ والی عبادت گاہ کے تہ خانے کا منظر میری نگاہ میں گھوم گیا جہاں ایک حصے میں بدھا کا طلائی مجسمہ نصب تھا۔

ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک مجھے چونک جانا پڑا۔ اسٹوپا کی عمارت کے اندرونی حصے میں سے ایک جوڑا باہر نکلا تھا۔ ان دونوں نے بدھ راہبوں والے مخصوص لباس زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ دونوں تقریباً جڑ کر چل رہے تھے اور میرے چونکنے کا سبب مرد بھکشو تھا۔ اس کے چہرے پر نگاہ جاتے ہی میں نے پلک جھپکتے میں اسے پہچان لیا۔

یہ وہی بدھ بھکشو تھا جو بودھ ناتھ دیلی کے ہوٹل میں بیٹھا صبح ہمیں تاڑ رہا تھا۔

اس شخص کو ایک عورت کے ساتھ یہاں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ دونوں اب کشادہ صحن میں قدم اٹھا رہے تھے لیکن ان کا رخ اور زاویہ قدرے مختلف تھا۔ قبل اس کے کہ وہ ایک مرتبہ پھر میری نگاہ سے اوجھل ہو جاتا' میں نے اس کی خبر لینے کا فیصلہ کر لیا۔

''لی یان! تم ادھر ہی بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

''میں نے کہا ہے نا' یہیں بیٹھی رہو۔'' میں نے اس کا شانہ دباتے ہوئے کہا ''اگر میری واپسی سے پہلے کاشانوک لوٹ آئے تو اس سے کہنا' مجھے سیل پر رنگ کر لے۔''

دیگر ضروری سامان کے ساتھ ہی ہم اپنے موبائل فون بھی لے آئے تھے۔ لی یان واپس بیٹھ گئی اور میں اپنے ٹارگٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس بدھ بھکشو کو یہاں دیکھ کر مجھے تشویش ہوئی تھی۔ پتا نہیں' کیوں وہ میری سوچ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

اس وقت ان دونوں کی پشت میری جانب تھی لہٰذا وہ مجھے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں دبے پاؤں احتیاط کے ساتھ ان کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ اسٹوپا کی حدود سے باہر جانے والے پتھریلے زینے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ عبادت گاہ کے اندر ان پر ہاتھ ڈالنا ٹھیک نہ ہوتا۔ اگر وہ اس اسٹوپا سے باہر نکل جاتے تو میرا کام آسان ہو جاتا اور محسوس یونہی ہو رہا تھا' وہ وہاں سے رخصت ہو رہے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اسٹوپا کے زینے طے کر کے عبادت گاہ سے باہر نکل آئے۔ میں تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کا پیچھا کرتا رہا۔ جب سے میں نے اس بھکشو کو دیکھا تھا' میرے ذہن میں بار بار یہ خدشہ سر اٹھا رہا تھا کہ وہ ضرور کسی مشن پر ہے۔ کس مشن پر؟ میں فی الحال اس بارے میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا البتہ' یہ ضرور تھا کہ وہ مشن ہمارے ہی خلاف ہوگا۔ اگر صبح وہ ہوٹل سے نکل کر اچانک غائب نہ ہو جاتا تو میں اس کے منہ سے سب کچھ اگلوا چکا ہوتا!

بدھ اسٹوپا سے کچھ فاصلے پر وہ سوئس منی ایکسپریس کھڑی تھی جس میں بیٹھ کر ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ جب میرا ٹارگٹ اس کوچ کی جانب بڑھنے لگا تو میں چونک اٹھا اور اس وقت تو میں حیرت کے ایک شدید جھٹکے سے گزرا جب وہ بدھ بھکشو اپنی ساتھی کے ہمراہ مذکورہ کوچ میں سوار ہو گیا۔ وہ کوچ کے اندر پہنچے اور اطمینان سے ایک سیٹ پر جا بیٹھے۔ یہ وہ سیٹ تھی جو کاشانوک کی سیٹ کے آگے واقع تھی۔

میرے لیے یہ ایک اور حیرت ناک بات تھی۔ ان کے اسٹائل سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ اسی کوچ میں سفر کرتے ہوئے کھٹمنڈو سے یہاں تک پہنچے تھے اور آگے بھی جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس وقت تک کوچ میں اِکّا دُکّا افراد بیٹھ چکے تھے اور باقی کا انتظار ہو رہا تھا۔ ہمارے قافلے والوں میں سے ابھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ سب تھاچو کے ساتھ ہی واپس آتے۔

میں کوچ کے عقب میں کھڑا ہو کر حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ ہماری ہی کوچ میں بیٹھ کر یہاں تک چلا آیا تھا اور مجھے اس کا احساس تک نہ ہو سکا۔ یقیناً اس کی یہی وجہ ہوگی کہ وہ ہمارے' کوچ میں بیٹھنے سے پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ اس لیے میں اسے سوار ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ یہ اور بھی زیادہ تشویش ناک بات تھی۔ اس کا صاف صاف یہی مطلب نکلتا تھا کہ اگر وہ واقعی ہمارے خلاف

کسی خاص مشن پر تھا تو پھر اسے یہ بھی معلوم تھا' ہم اس کوچ میں سفر کرنے والے ہیں!

میں نے اپنے سیل پر وائبریٹر کی مخصوص تھرتھراہٹ محسوس کی تو چونک اٹھا۔ سیل پر کوئی کال آ رہی تھی۔ میں نے سیل کی رنگ ٹونز کو آف کر کے اسے سائیلنٹ الرٹ پر ڈال رکھا تھا۔ میں نے موبائل نکال کر کال ریسیو کی۔ اگلے ہی لمحے مجھے کاشانوک کی آواز سنائی دی۔

''ہاں چینگ! تم اس وقت کہاں پر ہو؟'' اس نے احتیاطاً مجھے اختیاری نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا' وہ اس وقت دوسرے لوگوں کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''ہم یہیں رک کر تمہارا انتظار کریں یا......؟''

''سیدھے کوچ کی طرف چلے آؤ۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''میں تم کو ادھر ہی ملوں گا۔''

کاشانوک نے یہ نہیں پوچھا کہ میں وہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا ''اوکے' ہم آ رہے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد لی یان اور کاشانوک بدھ بھکشوؤں کے قافلے کے ساتھ مجھے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو کاشانوک نے دور ہی سے ہاتھ ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ اس کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔ لی یان نے بھی اس کی تقلید میں قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ ان کی کوشش تھی کہ قافلے کے دیگر افراد سے پہلے وہ مجھ تک پہنچ جائیں۔ وہ اس کوشش میں کامیاب رہے اور جب تک' باقی لوگ کوچ تک رسائی حاصل کرتے' ہمیں دو باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ ان کے چہرے اندرونی تشویش کا کھلم کھلا اظہار کر رہے تھے۔

کاشانوک نے سنسنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے استفسار کیا ''کوئی گڑبڑ؟''

''میں نے صبح' ہوٹل میں جس بھکشو کو دیکھا تھا وہ ہمارے ساتھ ہی یہاں بھی پہنچ گیا ہے!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

ان دونوں نے چونک کر متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا' کاشانوک نے دھیمے لہجے میں پوچھا ''یہاں کہاں؟''

''وہ کوچ میں' تمہاری والی سیٹ سے اگلی سیٹ پر ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا ''اور وہ دونوں اسی کوچ میں سفر کرتے ہوئے کھٹمنڈو سے یہاں تک پہنچے ہیں۔'' یہ میرا محتاط اندازہ تھا۔

''اوہ! یہ تو بڑی تشویش ناک صورتِ حال ہے۔'' وہ ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولا ''انہیں یہاں پہ چھیڑنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ کوچ کے اندر جا بیٹھے ہیں تو اس کا یہی مطلب ہے' ہمارے ساتھ ہی آگے بھی جائیں گے آؤ' دیکھتے ہیں کہ وہ کس موڈ میں ہیں!''

ہم یہ باتیں اس انداز میں کر رہے تھے کہ دیکھنے والوں کو ''میٹنگ'' کا احساس نہ ہو۔ کوچ کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے لی یان نے سرگوشیانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا ''اس بھکشو نے تمہیں دیکھ تو نہیں لیا؟''

''کمال کی بات کرتی ہو تم بھی!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''وہ تو ہم پر نظر رکھ کر کھٹمنڈو سے یہاں تک پہنچا ہے' تم دیکھنے کی بات کر رہی ہو؟''

ہم کوچ کے اندر آ کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کوچ کے دیگر مسافر بھی آ گئے تو ڈرائیور نے آگے کے سفر کا آغاز کیا۔ ہماری اگلی منزل سندری جل تھی جو یہاں سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھی۔

میرے اندر ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ میری چھٹی حس کی پکار بے معنی نہیں تھی۔ اب اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ بدھ بھکشو ہمارے ہی تعاقب میں لگا ہوا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ایک چیز بری طرح میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ صبح ہوٹل میں' میں نے اسے تاڑنے والے انداز میں اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ جب میں اس کے پیچھے لپکا تو وہ ایک گلی میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ وہ مجھے بدھا ناکا نتھا والے اسٹوپا میں دکھائی دیا اور اس وقت بھی وہ مجھے نظر انداز کر کے کوچ کی طرف چلا آیا تھا جس کہ کوچ میں بھی اس کی سیٹ مجھ سے آگے تھی۔ نگرانی اور تعاقب کرنے والے شخص کے لیے لازم تھا کہ وہ مجھ پر نگاہ رکھنے کے لیے میرے پیچھے لگا رہتا۔ اس بدھ بھکشو کی اب تک کی کارکردگی تو یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ ہمارے بارے میں پُراعتماد ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمیں اس کوچ کے ذریعے کہاں تک جانا ہے لہٰذا وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر ہمیں گھیر لے گا۔

اور میں...... اسے ہرگز ایسا کوئی موقع دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ایک ٹائم بم کو اپنے ساتھ باندھے پھرنا اور مسلسل اس کی ''ٹک ٹک'' سماعت کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ سندری جل میں' پروگرام کے مطابق ہمیں کم وبیش آدھا گھنٹا قیام کرنا تھا۔ میں نے اسے اسی مقام پر ''چیک'' کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے کے بعد میں نے لی یان کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی ''میری باتوں کو بڑے غور سے سننا۔ میں سندری جل میں اپنے ہاتھ پاؤں کو تھوڑی زحمت دینا چاہتا ہوں۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی ''تم کیا کرنے کا

ارادہ رکھتے ہو؟"

میں نے مختصر اور جامع الفاظ میں اسے بتایا "جب ہماری کوچ سندری جل میں رکے تو تم کاشانوک کے ساتھ کوچ میں سے نکل جانا۔ میں بدستور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہوں گا۔ اگر یہ بدھ بھکشو میرے تعاقب میں ہے تو یہ بھی کوچ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ میں اسے سندری جل ہی میں گھیر کر اس کی زبان کھلوانا چاہتا ہوں۔"

لی یان نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور بولی "اگر یہ بھکشو کوچ سے نکل جاتا ہے تو پھر اس صورت میں تم کیا کرو گے؟"

"پھر میں اس کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ کسی بھی صورت میں اسے سندری جل سے آگے نہیں بڑھنے دوں گا!" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "بس' بہت کرلیا اس نے ہمارا تعاقب اور نگرانی!"

اس نے پوچھا "کاشانوک سے کیا کہنا ہوگا۔ وہ تمہارے اس پروگرام سے تو آگاہ نہیں ہے؟"

"تم کوچ سے باہر نکلنے کے بعد اسے میرے پروگرام کے بارے میں بریف کر دینا۔" میں نے جواب دیا "آدھا گھنٹا اچھا خاصا وقت ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے' میں دس پندرہ منٹ ہی میں اسے "نمٹا" دوں گا اور جب تم لوگ واپس آؤ گے تو میں تمہیں کوچ کے پاس ہی ملوں گا۔" میں ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس دوران میں اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے تو ہم آپس میں رابطہ کر سکتے ہیں۔ میرے اور کاشانوک کے پاس موبائل فون موجود ہیں۔"

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور بولی "اگر میں بھی تمہارے ساتھ یہاں رک جاؤں تو؟"

میں سمجھ گیا' بھکشو سے "نمٹاؤ" والے مشن میں وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ میں نے اس کے عزائم سے آگاہی حاصل ہوتے ہی کہا "اگر تم میرے ساتھ کوچ میں ٹھہر گئیں تو کاشانوک کو میرے پروگرام کے بارے میں کون بتائے گا؟"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا "میں تمہاری ہدایت کے مطابق کوچ سے اتر تو جاؤں گی لیکن اس قافلے کے ہمراہ کسی اسٹوپا وغیرہ کی طرف نہیں جاؤں گی بلکہ کاشانوک کو تمہارے پروگرام سے آگاہ کرنے کے بعد میں کوچ کے قریب ہی کسی آڑ میں کھڑی ہو جاؤں گی' پھر تم جیسے ہی حرکت میں آؤ گے' میں تمہیں جوائن کرلوں گی۔"

اس کی تجویز خاصی صحت مند اور میرے لیے قابلِ قبول تھی۔ میں نے اس کے مشورے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا "کاشانوک نے' بہت چھانٹ کر تمہارا نام رکھا ہے!"

"کیا مطلب؟" وہ متذبذب انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "اپنی کنسٹرکشن کے اعتبار سے تمہارا نام چینی زبان کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا' چینی زبان میں اس لفظ کے کیا معنی ہیں البتہ' ہماری قومی زبان اردو میں یہ لفظ بڑے رومانٹک معنی رکھتا ہے۔"

"کیا...... مثلاً کیا؟" وہ گہری دلچسپی لیتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

"میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "من چوری...... یعنی من چوری کرنے والی!"

"اوہ!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی "یو مین ہارٹ تھیف؟"

"یس' آئی مین اٹ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"آر یو سرٹیفائی؟" اس نے پوچھا۔

"آئی ایم سیٹیسفائی!"

میرے اس بے ساختہ جملے پر وہ قدرے جز بز ہوئی' پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

دوپہر کے وقت ہم سندری جل میں داخل ہو گئے۔ پُر ہیبت شان و شوکت کا حامل پہاڑ ہمارے پیشِ نظر ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ماؤنٹ ایورسٹ کے قدموں میں کھیل رہے ہوں۔ ماؤنٹ ایورسٹ نامی دنیا کا یہ بلند ترین پہاڑ نیپال اور تبت کی سرحد پر واقع ہے اور دونوں ہی ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔

سندری جل کی وجۂ شہرت وہاں پائے جانے والے خوب صورت آبشار ہیں جو اپنے دلکش اور محظوظ کن نظاروں کے ساتھ دیکھنے والوں کو لبھاتے ہیں۔ پکنک کے لیے یہ ایک عمدہ مقام ہے۔ خاص طور پر' مون سون کے فوراً بعد تو اس وادی کی دلکشی اور حسن میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ آبشاروں کی اسی خوب صورتی کے باعث اس وادی کا نام سندری جل رکھا گیا ہے۔

ہماری کوچ ایک بدھ اسٹوپا کے قریب رکی تو ہم نے پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔

کاشانوک اور تھاچو دروازے کے قریب والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لہٰذا وہ ہم سے پہلے باہر نکلے۔ میں نے ٹانگیں سکیڑ کر لی یان کو راستہ دیا اور خود کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میں بھی کوچ سے نیچے اتروں گا لیکن نہایت ہی اطمینان کے ساتھ۔ کاشانوک اور تھاچو کے بعد وہ بدھ بھکشو اور اس کی ساتھی بھی کوچ کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ لی یان ان کے پیچھے

تھی۔ میں نے دانستہ کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا تا کہ اگر بھکشو سے نظر مل جائے تو وہ دیکھ کر چونک اٹھے۔ میں اسے صورت سے پہچانتا تھا۔

بدھ بھکشو کا یہ رویہ قدم قدم پر مجھے حیرت میں ڈال رہا تھا۔ اس نے لی یان پر بھی کوئی دھیان نہ دیا اور کاشانوک وغیرہ کے بعد کوچ سے اتر گیا اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب باہر جانے کے بعد وہ اپنی ساتھی کے ہمراہ انتہائی لاتعلقی اور بے پروائی سے ایک سمت کو چل پڑا۔ یہ سمت اسٹوپا والی نہیں تھی!

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن سے یہ سوال بھی گزرا کہ میں خوامخواہ کیوں اس کی طرف سے شک بلکہ وہم میں مبتلا ہو رہا ہوں؟ یہ بھی تو ممکن ہے' وہ کبھی بھی میرے تعاقب میں نہ رہا ہو!

لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں اس بھکشو کے حوالے سے کسی شک یا وہم میں مبتلا نہیں تھا۔ میری چھٹی حس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا اور مذکورہ حس بار بار مجھے وارن کر رہی تھی کہ وہ بھکشو میرے خلاف کسی مشن میں مصروف ہے۔ میں چھٹی حس کی اس وارننگ کو نظر انداز کر کے کوئی نقصان نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ میرے لیے ایک عطیۂ خداوندی تھا جس کی وجہ سے میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کاشانوک اور لی یان آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے پھر کاشانوک' تھاچو کے قافلے کے ساتھ بدھ اسٹوپا کی طرف بڑھ گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا' لی یان اسے اپنی بات سمجھانے میں کامیاب رہی تھی۔ لی یان نے میری سمت نگاہ اٹھا کر دیکھا تو میں بڑی سرعت کے ساتھ سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب مزید کوچ کے اندر بیٹھے رہنا میرے لیے بیکار تھا۔ میں نے جس بدھ بھکشو کو اپنا ٹارگٹ بنایا ہوا تھا' وہ اپنی ساتھی کے ہمراہ نپے تلے قدموں سے ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ جب میں کوچ سے نیچے اترا تو اس وقت بھی تین چار مسافر اندر موجود تھے۔ میں نہیں جانتا تھا' میرے بعد وہ بھی اتر جائیں گے یا کوچ ہی میں بیٹھے رہیں گے۔ اس کوچ میں ستر سے اسی فیصد تک بدھ یاتری سوار تھے' باقی روزمرہ کے عام مسافر تھے۔ ایک دو مسافر پیچھے بدھا نلکانتھا میں بھی اترے تھے اور ان کی جگہ' وہاں سے سوار ہونے والے نئے مسافروں نے لے لی تھی۔ یہ تو سفر کا ایک مروج اصول ہے۔ سواری وہی رہتی ہے اور مسافر بدلتے رہتے ہیں!

میں کوچ سے باہر آنے کے بعد تیزی سے لی یان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی میرے ٹارگٹ کی جانب قدم اٹھا چکی تھی۔ میں اس کے قریب پہنچا تو وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وج...... چینگ! مجھے تو لگتا ہے' تمہیں کوئی دھوکا ہوا ہے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی کہ اگر یہ بھکشو واقعی ہمارے تعاقب میں ہے تو پھر ہم سے اتنا لاتعلق کیوں دکھائی دیتا ہے۔ ہماری نگرانی کے لیے تو اسے ہمارے آس پاس رہنا چاہیے مگر وہ ہمیں نظر انداز کر کے کیوں جا رہا ہے؟"

میں نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بظاہر تو مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے لیکن میں اپنے اندر کی آواز کو غلط نہیں سمجھ سکتا!"

"اندر کی آواز؟" اس کے استفسار میں بے پناہ حیرت شامل تھی۔

میں نے بدستور آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "میری چھٹی حس چیخ چیخ کر مجھے بتا رہی ہے کہ یہ شخص ہمارے خلاف کسی سازش میں ملوث ہے۔"

"اگر یہ کسی سازش میں ملوث ہے تو پھر ادھر پہاڑیوں میں کیا لینے جا رہا ہے؟" لی یان نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اچنبھے انداز میں کہا "ہم تو ادھر ہیں!"

وہ منطقی طور پر بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن میں اپنے محسوسات سے مجبور تھا' سرسری انداز میں' میں نے اس سے کہا "آؤ' چل کر دیکھتے ہیں' وہ اس طرف کیوں جا رہا ہے!"

اس کے ساتھ ہی ہم نے اپنی رفتار میں اضافہ کر دیا۔ اس بات پر مجھے بھی حیرت تھی کہ وہ بدھ بھکشو آبادی سے منہ موڑ کر اپنی ساتھی کے ہمراہ ان ویران پہاڑیوں کی طرف کیوں جا رہا تھا۔ اس کا انداز قدم قدم پر شک میں ڈالنے والا تھا۔ ویسے اس کی تازہ ترین حرکت میرے لیے خاصے اطمینان کا باعث تھی۔ وہ جس سمت بڑھ رہا تھا' ادھر خاموشی اور ویرانی تھی۔ گویا اس سے نمٹنے میں مجھے کسی بیرونی مداخلت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں ایسی ہی کسی سچویشن کی خواہش کر رہا تھا۔

ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار نے شاید اسے چوکنا کر دیا تھا۔ تعاقب کو محسوس کرتے ہوئے اس نے یکا یک پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ ٹھٹکا پھر اگلے ہی لمحے وہ آندھی طوفان کی رفتار سے پہاڑیوں کی سمت دوڑتا چلا گیا۔

میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "منچوری! میری بات کا یقین آیا کہ نہیں؟"

"چینگ! ہمیں فوری طور پر ان کا پیچھا کرنا چاہیے۔" وہ تشویشناک لہجے میں بولی۔

"ان کا نہیں' صرف اس کا!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "تم اس عورت کو سنبھالو' میں اس بھکشو کی خبر لیتا ہوں۔" بات ختم

کرتے ہی میں نے بھی اس بھکشو کے پیچھے دوڑ لگادی۔

فرار ہوتے وقت اس بدھ بھکشو نے ایک عجیب حرکت یہ کی کہ اپنی ساتھی کو یکسر فراموش کردیا اور خود اکیلا ہی پہاڑیوں کی سمت دوڑ پڑا۔ اس سے بھی زیادہ حیران کن ردِعمل اس کی ساتھی نے پیش کیا کہ وہ وہیں کھڑی ہوکر ہکا بکا بدھ بھکشو کو پہاڑیوں کی جانب جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ ان دونوں کے متضاد رویوں سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ ''ساتھی'' بہرحال نہیں تھے۔ اگر ساتھی ہوتے تو مشکل وقت میں ساتھ کیوں چھوڑ جاتے!

میں جب بھکشو سے پندرہ فٹ کے فاصلے پر پہنچا تو وہ ایک پہاڑی چٹان کے پیچھے غائب ہوگیا۔ میں نے قدم نہیں روکے اور اس کے تعاقب میں لپک گیا پھر جیسے ہی میں اس چٹان کے پیچھے پہنچا' مجھے ایک زوردار دھکا لگا۔ یہ اسی مفرور بدھ بھکشو کی کارستانی تھی۔

میرے قدم لڑکھڑائے لیکن اگلے ہی لمحے میں سنبھل گیا۔ اس وقت تک وہ دوبارہ حملہ آور ہونے کے لیے پَر تول چکا تھا مگر اب میں اس کا دھکا کھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ جیسے ہی مجھ پر جھپٹا' میں نے کمر کی ٹوئسٹ کے بل پر اسے جھکائی دی اور دونوں ہاتھ اس کی پسلیوں میں ڈال دیئے۔

وہ تقریباً میرے اوپر لدسا گیا تھا۔ میں نے اس کے جسم کو ایک جھٹکے دار پش دیا اور تھرو کے سے انداز میں اپنے اوپر سے' عقبی سمت پھینک دیا۔ وہ اندھے راکٹ کے مانند پرواز کرتے ہوئے ایک پتھریلی چٹان سے ٹکرایا۔ میں فوراً اس کی جانب پلٹ گیا۔ مجھے کم وقت میں زیادہ کام نمٹانا تھا۔

چٹان سے تصادم نے اسے حلق کے بل چیخنے پر مجبور کردیا۔ اس کی حرکات نے اب ثابت کردیا تھا کہ وہ ہمارے خلاف کسی گہری سازش کا ایک کردار بنا ہوا تھا ورنہ اگر اس کے ہاتھ پاؤں صاف ہوتے تو وہ مجھے دیکھ کر اس طرح راہِ فرار اختیار نہ کرتا۔ وہ جس بھی چکر میں تھا اس کو اگلوانا اب میرے ذمے تھا۔

وہ کراہتا ہوا اٹھا اور چوکنا نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی نگاہ میں فرار کی خواہش کو واضح طور پر محسوس کرلیا۔ اس کے عقب میں وہی پتھریلی چٹان تھی' میں نے تھرو مار کر اسے جس پر پھینکا تھا۔ فرار ہونے کے لیے اسے ہر حال میں مجھے راہ سے ہٹانا تھا اور میں اس کی راہ میں' ماؤنٹ ایورسٹ کے مانند قدم جمائے کھڑا تھا۔ اس نے ''نہ پائے رفتن' نہ جائے ماندن'' ایسی صورتِ حال دیکھی تو فوراً اپنے لباس میں ہاتھ ڈال کر ایک خنجر برآمد کرلیا' پھر وہ خنجر بدست مجھ پر حملہ آور ہوا۔

میں نے یہ تو محسوس کرلیا تھا کہ مارشل آرٹس سے اسے دور کی نسبت بھی نہیں تھی۔ وہ دیسی دنگا فساد والے اسٹائل میں مجھ سے نبرد آزما تھا۔ میں نے بھی سیلف ڈیفنس کی ٹیکنیکس پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ جیسے ہی میرے چہرے کے قریب پہنچا' میں نے فرنٹ فٹ پر تیزی سے حرکت کی اور مڈل آؤٹر بلاک سے وار روک لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بلاک کے لیے آگے بڑھنے والے اپنے ہاتھ کو مخصوص انداز میں سوئنگ کیا جس کے نتیجے میں اس کا خنجر والا ہاتھ میری بغل کی گرفت میں آ گیا۔ یہ ایک طرح کا خطرناک لاک تھا۔ اس کا بازو کہنی والے جوڑ سے آہنی شکنجے میں کس گیا۔

میں نے گرفت میں آئے ہوئے اس کے بازو کو جوڑ پر سے ایک خطرناک عمودی جھٹکا دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہڈی ٹوٹنے کی مخصوص کڑاکے دار آواز پیدا ہوئی' دوسرے ہی لمحے وہ کسی ذبح کیے ہوئے جانور کے مانند بلبلانے لگا۔ کہنی پر سے جوڑ کی ہڈی تڑخ گئی تھی۔ میں نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس کے چہرے پر لگاتار کئی خوفناک پنچ رسید کردیئے' پھر میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا۔

خنجر اس کے ''مردہ'' ہاتھ سے نکل کر دور جاگرا اور وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے پیچھے کو جانے لگا۔ میں نے اس ''سفر'' میں اس کی مدد کی اور ایک خطرناک سائیڈ کک اس کے پیٹ میں جڑ دی۔ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے گولے کے مانند ایک مرتبہ پھر اسی چٹان سے جاٹکرایا۔

اسی لمحے پہاڑی کی دوسری سمت مجھے اٹھا پٹخ کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا' ادھر لی یان نے محاذ سنبھال لیا تھا۔ اس کا مطلب تھا' اس بھکشو کی ساتھی عورت نے بھی لی یان پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ دوسری جانب میں انہی دو کو چھوڑ آیا تھا۔ پہاڑی کا وہ حصہ ادھر سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس بدھ بھکشو کا چہرہ لہولہان ہورہا تھا۔ میرے طوفانی پنچز نے چہرے کی کھال کو ادھیڑ رکھ دیا تھا۔ رہی سہی کسر چٹان سے بار بار ٹکراؤ نے پوری کردی تھی۔ کہنی سے ٹوٹا ہوا بازو کسی مردہ ترکی کے مانند ہوا میں جھول رہا تھا۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ دہشت میں مبتلا کرنا ضروری تھا لہٰذا میں اس کے پاس چلا گیا۔

وہ اس وقت سنبھلنے کی کوششِ لاحاصل میں مصروف تھا۔ میں نے اس نے کوشش کو سولی چڑھادیا۔ میں نے اس کے گریبان کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں جکڑا اور اس کے پیٹ میں گھٹنوں کی ٹھوکروں کی یلغار کردی۔ اس کا دہانہ خون اگلنے لگا۔ میرے دائیں بائیں گھٹنوں کی مہلک ضربات نے اس کے گردوں' معدے' آنتوں اور مثانے کی خوب ''عیادت'' کی۔ یہ حملے اتنے

مربوط اور سریع تھے کہ اسے چیخنے یا چلانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ آخرکار' میں نے اسے پتھریلی زمین پر چت گرا کر اس کے سینے پر پاؤں رکھ دیا اور خوں خوار لہجے میں پوچھا۔

''کون ہو تم؟''

''بھگوان کے لیے مجھے نہ مارو......'' وہ خوف میں ڈوبی ہوئی' دہشت زدہ آواز میں منمنایا۔

اس کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ نے مجھے چونکا دیا۔ میں اب تک اسے بدھ بھکشو سمجھ رہا تھا مگر وہ اس کڑے وقت میں لارڈ بدھا کے بجائے' مجھے بھگوان کا واسطہ دے رہا تھا۔ وہ جس قسم کی صورتِ حال سے گزر رہا تھا' اس میں غلط بیانی کا امکان نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ ہندو تھا اور بدھ بھکشو کا بھیس بھر کر ہمارے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔

میں نے اس کے سینے پر اپنے پاؤں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا ''اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو میرے سوالوں کا صحیح جواب دینا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ نقاہت بھرے انداز میں بولا ''پہلے میرے سینے پر سے اپنا پاؤں ہٹاؤ' پھر تم جو پوچھو گے' میں بتاؤں گا...... مجھے بولنے میں بہت دشواری محسوس ہورہی ہے۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ مجھے چکر دے کر وہاں سے فرار کی کوشش کرنا چاہتا ہو لیکن اس احساس کے باوجود بھی میں نے اس کی فرمائش پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ اگر واقعی فرار کی کوشش کرتا تو اس کی ایسی کوشش کو میں پلک جھپکتے میں ناکام بنا دیتا۔

میں نے اس کے سینے پر سے اپنا پاؤں ہٹالیا اور قریب ہی زمین پر پڑے ہوئے اس کے خنجر کو اٹھالیا۔ اس کے بعد میں اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا اور خنجر کی دھار کو اس کی شہ رگ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم ہندو ہو؟''

اس نے آنکھوں کو اثباتی جنبش دی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

''نارائن!'' وہ خوف زدہ انداز میں بولا۔ میں نے سوال کیا۔

''تم نے بدھ بھکشوؤں والا روپ کیوں دھار رکھا ہے اور ہمارے تعاقب میں کس مقصد سے لگے ہوئے تھے؟''

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں ایسا تاثر ابھرا جیسے وہ دروغ گوئی کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے خنجر والے ہاتھ پر دباؤ بڑھادیا۔ نتیجے میں خنجر کی دھار زیرِ دام آئے ہوئے نارائن کی شہ رگ سے پُرجوش ''معانقہ'' کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں وحشت بھرے انداز میں پھیلنے لگیں۔

میں نے خطرناک لہجے میں کہا ''تمہاری گردن کاٹ کر مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا نارائن۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور میں محسوس کررہا ہوں' تم ابھی جینے کی خواہش رکھتے ہو۔ آج تمہاری جان صرف ایک ہی صورت بچ سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم سچ بولو۔ بتاؤ' زندہ رہنا چاہتے ہو یا پھر تمہارے ہی خنجر سے تمہیں اس پہاڑی کی بھینٹ چڑھادوں!''

میرے لہجے میں حد سے زیادہ سنگینی اور قطعیت بھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں موت کے سائے لہرانے لگے۔ موت کو سامنے دیکھ کر زندگی بہت حسین نظر آنے لگتی ہے اور انسان ہر قسم کی مصلحت اور تعاون پر تیار ہوجاتا ہے۔ نارائن کو بھی ایک سو ایک فیصد یقین ہوگیا تھا کہ اگر اس نے میری بات نہ مانی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

اس دوران میں پہاڑی کی دوسری جانب سے لی یان کی ییلنگ اور حملوں کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا' وہ بھکشو عورت ابھی تک اس کے مقابلے پر ڈٹی ہوئی تھی۔ میں نارائن کی جانب متوجہ ہوگیا کیونکہ زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اس جیسی درجنوں عورتوں سے نمٹنا بہ خوبی آتا تھا۔

''تت...... تم...... اس خنجر کو میری گردن پر سے ہٹادو۔'' وہ سراسیمہ انداز میں ہکلایا ''میں تمہیں سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتادوں گا۔''

''لیکن میں تمہیں صرف پانچ منٹ دوں گا۔'' میں نے اس کی فرمائش پوری کرتے ہوئے کہا ''تمہیں اسی وقت کے اندر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مجھے حقیقت سے آگاہ کرکے زندہ رہنے کا ارادہ ہے یا غلط بیانی کرکے حرام موت مرنا چاہتے ہو؟''

آئندہ پانچ منٹ میں نارائن نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا اور میرے سوالات کے جواب میں صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے مجھے بتایا کہ وہ کسی شرما صاحب کے لیے کام کرتا تھا۔ شرما نے گزشتہ روز اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے ارد گرد پر نگاہ رکھے اور اگر کوئی ایسا شخص دکھائی دے جس کا تازہ تازہ سر منڈا ہوا ہو تو وہ فوراً شرما کو اطلاع دے۔ آج صبح جب ہم بودھ ناتھ دیلی والے گھر سے نکلے تو ایک گلی میں نارائن مجھے دیکھ کر ہمارے تعاقب میں لگ گیا۔ اسے شک ہوا تھا کہ میرا سر تازہ تازہ مونڈا گیا ہے یعنی ایسا سر جس پر پہلے بال موجود رہے ہوں۔ بالوں والے سر کو اگر صاف کردیا جائے تو اس کی رنگت اور باقاعدگی سے مونڈے جانے والے سر کی رنگت میں بہت فرق ہوتا ہے اور یہ فرق نارائن نے نوٹ کرلیا تھا پھر ہوٹل میں مناسب روشنی میں میرے سر کو دیکھ کر اس نے اپنے اندازے کی تصدیق

کر لی اور فوراً شرما کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی۔ شرما نے اسے مزید ہدایت کی کہ وہ ہمارا پیچھا پکڑ لے۔ نارائن نے اپنے تعلقات اور بدھی استعمال کر کے یہ معلوم کرلیا کہ ہم تینوں بدھ بھکشوؤں کے ایک قافلے کے ساتھ کھٹمنڈو سے باہر جا رہے ہیں۔ کوچ کے اسٹینڈ سے اسے ہماری منزل کا پتا بھی چل گیا۔ اس نے یہ معلومات شرما تک پہنچائیں تو اسے تازہ احکام ملے' ہمارے ساتھ ہی ''سوکس منی ایکسپریس'' میں سوار ہو جائے اور ہمیں چھیڑے بغیر وہ ہماری نگرانی کرتا رہے۔ بدھ بھکشوؤں والا روپ بھی اس نے شرما کی ہدایت پر ہی دھارا تھا۔ شرما نے اسے بتایا تھا کہ ایک نہایت ہی خطرناک مجرم بدھ بھکشوؤں کے قافلے میں شامل ہو کر کھٹمنڈو سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور نارائن نے اس کی گرفتاری کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانا تھی۔

نارائن کے انکشافات نے میرے اندر سنسنی سی دوڑا دی۔ یہ شرما کوئی بہت ہی چیتا چال باز قسم کا بندہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ راز صرف چار افراد تک محدود تھا کہ ہم آج صبح بھکشوؤں کے قافلے میں شامل ہو کر کھٹمنڈو سے نکلیں گے۔ میں' کاشالوک اور لی یان تو اس راز کو کسی اور سینے میں منتقل نہیں کر سکتے تھے۔ آجا کر میرا دھیان تھاچو کی طرف جا رہا تھا۔ کہیں اس نے ہمارے خلاف مخبری تو نہیں کر دی تھی؟

تھاچو یعنی اس قافلے کا راہ نما کاشالوک کی نظر میں انتہائی قابلِ اعتماد شخص تھا۔ اس نے ہمارے خلاف کوئی مذموم قدم اٹھایا تھا یا نہیں' اس بارے میں' فوری طور پر میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ شرما نامی شخص میرے دشمنوں سے ضرور تعلق رکھتا تھا اور یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔ شرما اس وقت اس بات سے آگاہ تھا کہ ہم کھٹمنڈو سے کوداری کی طرف سفر کر رہے ہیں...... گویا ربی اور اس کے اشاروں پر ناچنے والے شیاطین میرے فرار سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔

مجھے اپنے وجود میں بے پناہ اضطراب پھیلتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ تو منزل پر پہنچ کر منزل کا نشان کھو دینے والی صورتِ حال ہو گئی تھی۔ میں نے نارائن سے پوچھا ''تمہارے ساتھ وہ بھکشو عورت کون ہے؟''

''اس کا میرے مشن سے کوئی تعلق نہیں۔'' اس نے نحیف سی آواز میں بتایا ''اس سے میری ملاقات ادھر کھٹمنڈو میں کوچ کے اسٹینڈ پر ہوئی تھی۔ پھر ہمارے درمیان دوستی ہو گئی۔ بدھانلکا نتھا تک پہنچتے پہنچتے یہ دوستی بہت گہری ہو گئی۔ اس کا نام شنگی ہے۔ یہ سندری جل کی رہنے والی ہے۔ اسے تو یہاں اترنا ہی تھا لیکن میں نے بھی یہیں رکنے کے لیے ایک چکر چلا دیا اور اس میں کامیاب بھی رہا مگر تم نے بیچ میں کود کر سب کچھ خراب کر دیا ہے۔''

اس کی بات نے مجھے الجھا دیا۔ میں نے پوچھا ''تم تو کسی شرما کے حکم پر ہماری نگرانی کرتے ہوئے کوداری تک جانے والے تھے پھر شنگی کی خاطر یہاں رکنے کا فیصلہ کیسے کر لیا؟''

''یہی تو بتا رہا ہوں' میں نے اپنے باس شرما کو ایک چکر دیا ہے۔'' نارائن نے خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھا ''شنگی کی دوستی نے مجھے اپنے فرض سے غافل کر دیا تھا' شاید مجھے اسی کی سزا مل رہی ہے۔ جب باس کو میری اس حرکت کا پتا چلے گا تو وہ میری کھال اتار کر پورے بدن پر مرچوں کا لیپ کر دے گا۔''

''شرما تو بعد میں تمہارے ساتھ کچھ اچھا برا کرے گا۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''میں ابھی تمہارا جو حشر کرنے والا ہوں اس کے تصور ہی سے تمہاری روح فنا ہو جائے گی۔''

''تت...... تم نے مجھے زندہ...... چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے......!'' وہ کسی بھکاری کے مانند گھگیایا۔

''تمہیں زندگی کی بھیک مانگتے دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ تم واقعی کوئی بھکشو ہو مگر تم بدھ بھکشو نہیں بلکہ ہندو بھکاری ہو۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے زہریلے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''بتاؤ' تم نے اپنے باس شرما سے کون سا جھوٹ بولا ہے؟''

میں شرما کے بارے میں نارائن کو اس لیے بھی کرید رہا تھا تاکہ یہ جاننے کی کوشش کر سکوں کہ اس کے ڈانڈے میرے دشمنوں سے کس طور ملے ہوئے ہیں۔ یہ شرما ایک نئے فتنے کے روپ میں میرے سامنے ابھر رہا تھا۔ مجھ میں اس کی دلچسپی تو یہی ظاہر کرتی تھی کہ وہ بھی میرے دشمنوں کا رشتے دار ہے!

نارائن نے بتایا ''میں نے بدھانلکا نتھا میں شرما سے رابطہ کر کے اسے بتایا ہے کہ مجھے شک ہے' میں تم لوگوں کی نظروں میں آ گیا ہوں۔ میں نے شرما سے یہ جھوٹ بھی بولا کہ اس وقت میں بدھانلکا نتھا اور سندری جل کے درمیان سفر کر رہا ہوں۔ شرما نے مجھے حکم دیا کہ میں سندری جل میں کوچ سے اتر جاؤں۔ وہاں سے دو نئے افراد تم لوگوں کے تعاقب میں لگ جائیں گے اور اسی کوچ میں سفر کرتے ہوئے کوداری تک پہنچیں گے۔ میں نے جھوٹ بول کر سندری جل میں رکنے کا جواز تو پیدا کر لیا تھا مگر تم نے بازی ہی پلٹ دی۔''

''تم شنگی کے ساتھ ان ویران پہاڑیوں کی طرف کیا کرنے آ رہے تھے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ترش لہجے میں پوچھا ''کیا اس نئی نویلی دوستی کو ایک ہی ملاقات میں نچوڑنے کا ارادہ تھا؟''

وہ میرے الفاظ میں چھپی ہوئی تلخ حقیقت تک پہنچ گیا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے ندامت سے نظر جھکائی۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا لہٰذا اس کے ''عزائم'' کے قصے کو گول کرتے ہوئے میں نے نہایت ہی اہم سوال کیا۔

''سندری جل سے تمہارے کون سے دو آدمی کوچ میں سوار ہوں گے؟''

''میں ان سے واقف نہیں ہوں۔'' اس نے جواب دیا ''شرما کو میں نے تم تینوں کے حلیوں اور وضع قطع کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا ہے۔ یہ معلومات ان دو افراد تک پہنچا دی گئی ہیں۔ عین ممکن ہے وہ اس وقت کوچ میں بیٹھے تم لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں۔ ان دونوں افراد کا تعلق سندری جل ہی سے ہے۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایک پورا نیٹ ورک ہمارے خلاف متحرک ہو چکا تھا۔ میں نے نارائن سے دریافت کیا ''تم اپنے باس شرما سے کس طرح رابطہ کرتے ہو۔ کیا تمہارے پاس کوئی موبائل فون وغیرہ موجود ہے؟''

میں نے اس سے جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا اور ان لمحات میں وہ ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتا تھا لہٰذا وہ چپ چاپ شرافت سے تعاون کرتا چلا گیا۔ اس نے اپنے لباس میں ہاتھ گھمایا اور ایک موبائل فون نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔

میں نے وہ سیل اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پھنکار سے مشابہ لہجے میں کہا ''ہمارے ساتھ تو تم نے جو کیا سو کیا مگر اپنے باس شرما سے تم نے کھلی غداری کی ہے اور تم جانتے ہو' غدار کی سزا کیا ہوتی ہے؟''

''مم...... مگر تم نے مجھے چھوڑنے کا وعدہ کیا ہے......!'' اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔

میں نے اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا' تمہیں جان سے نہیں ماروں گا لیکن اس نئے دشمن شرما کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس نے مجھ سے نئی نئی دشمنی کی ہے اور اس دشمنی کے پہلے ہی راؤنڈ میں اس نے اچھے خاصے پوائنٹ حاصل کر لیے ہیں۔ پتا نہیں وہ تمہیں کوئی سزا دے پائے گا یا نہیں' سوچتا ہوں کہ میں ہی اس کا تھوڑا ہاتھ بٹا دوں!''

''تت...... تم...... کیا کرنا چاہتے ہو......؟'' وہ وحشت زدہ انداز میں ہکلایا۔

میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے سفاکی سے کہا ''دیکھتے جاؤ میں کچھ چھپا کر تھوڑی کر رہا ہوں!''

پھر میں نے دو منٹ کے اندر اس کا بالائی لباس کھینچ کر جسم سے الگ کر لیا۔ وہ ہکا بکا میری ظالمانہ کارروائی کو دیکھتا رہا۔ خوف کے مارے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ آئی ہوئی ایک چادر کو خنجر کی مدد سے لمبائی کے رخ دو حصوں میں تقسیم کیا اور ان دو حصوں کا برمحل استعمال کرنے لگا۔

نارائن کے ''نہ نہ'' کرتے ہوئے میں نے ایک کپڑے سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر خوب کس کے باندھ دیے۔ دوسرے کپڑے میں سے ایک مربع پارچہ الگ کیا اور باقی ماندہ مستطیل پارچے سے اس کی دونوں ٹانگیں' ٹخنوں پر سے باندھ دیں۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ میں اس کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیوں کر رہا ہوں۔ دشمنوں کی پے در پے کمینی حرکتوں نے مجھے واقعی وحشی بنا دیا تھا۔ ایک وحشی سے یہ پوچھنا کتنی فضول بات ہے کہ وہ وحشیانہ رویے کا مظاہرہ کیوں کر رہا ہے!

میں نے ایسا فضول سوال کرنے والے واہیات نارائن کو گھسیٹ کر چٹان کی چوٹی پر پہنچایا۔ وہ پہلے ہی میرے ہاتھوں بڑی پُرتکلف ''تواضع'' کرا چکا تھا۔ پتھریلی زمین پر ''گھسیٹ کھینچ'' نے اس کی جسمانی اذیت میں لگ بھگ سولہ چاند لگا دیے۔ اس چٹان کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے مجھے بہ مشکل پچیس فٹ تک اس کے لرزتے کانپتے وجود کو گھسیٹنا پڑا ہو گا لیکن چٹان کی دوسری طرف کم از کم دو سو فٹ گہری ڈھلوان تھی اور وہ بھی عمودی! اس ڈھلوان کے اختتام پر کوئی اندھی کھائی واقع تھی۔ اس گڑھے کو میں نے اندھی کھائی اس لیے کہا کہ مجھے اس کی تہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے مربع پارچے کا گولا سا بنا کر نارائن کے منہ میں ٹھونسا تاکہ وہ کسی قسم کی فریادی بکواس نہ کر سکے اس کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا ''دیکھو! میں اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے تمہیں جان سے نہیں مار رہا ہوں' صرف تمہیں تمہارے بھگوان کے حوالے کر رہا ہوں۔ اگر تمہاری زندگی ابھی باقی ہے تو تم بچ جاؤ گے اور اگر تمہاری سانسیں پوری ہو چکی ہیں تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ وش یو ویری ویری بیڈ لک نارائن!''

بات ختم کرتے ہی میں نے پاؤں کا ایک غصیلا ٹھڈا اس کی تشریف پر رسید کیا۔ وہ کسی بھاری پتھر کے مانند ٹاپ گیئر میں گہرے نشیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اس ''روپوشی'' کے تین سیکنڈ بعد میں نے اس کے کھائی کی تہ میں پہنچنے کی مخصوص آواز سنی۔ پھر میں ہاتھ جھاڑتے ہوئے بڑے مطمئن انداز میں چٹان سے نیچے اتر آیا۔

بلندی سے پستی کی جانب کا سفر بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔

اس الٹی راہ کا مسافر بہت چیختا چلاتا ہے۔ نارائن نے بھی حلق پھاڑ کر واویلا مچانے کی کوشش کی ہوگی مگر میں نے اس کی گویائی پر جو ڈاٹ لگادی تھی وہ اس بندش کے سامنے مجبور و بے بس ہو کر رہ گیا ہوگا۔ اس کی آواز کہیں سے ابھری اور نہ ہی کہیں سنائی دی۔

میں نے چٹان کی اس سمت قدم بڑھادیے جدھر لی یان اس بدھ بھکشو عورت سے نبرد آزما تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے لی یان کی صورت دکھائی دی۔ وہ میری ہی طرف آرہی تھی مجھے اکیلا دیکھ کر حیرت بھرے انداز میں مستفسر ہوئی۔

''کیا وہ بھکشو ایک مرتبہ پھر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا؟''

میں نے کہا''ہاں ...... لیکن ہوسکتا ہے یہ فرار اس کی زندگی کا آخری فرار ثابت ہو!''

وہ میرے لہجے سے ٹپکتی سنگینی سے سمجھ گئی کہ میں نے اس بھکشو کو کسی اور ہی دنیا کا ویزا دلایا ہے۔ اس نے سرسری انداز میں کہا''اس طرف میں نے بھی بھکشو کے ایک ساتھی کو لمبا لٹا دیا ہے۔''

''بھکشو کے ساتھی کو!'' اس کی بات سن کر میں چونک اٹھا''مگر تم کو تو میں نے بھکشو عورت کے پاس چھوڑا تھا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی''وہ تو کوئی بہت ہی بے چاری عورت ہے' ادھر بیٹھی رو رہی ہے۔ میں جس شخص کی بات کر رہی ہوں وہ تو اچانک ہی عقب سے نمودار ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوگیا تھا۔''

میرا دھیان فوراً شرما کے ان دو بندوں کی طرف چلا گیا جن کے بارے میں نارائن نے مجھے بتایا تھا۔ وہ دونوں سندری جل سے کوداری تک ہمارے ساتھ جانے والے تھے۔ ممکن ہے ان میں سے ایک نے ہمارا تعاقب کیا ہو اور دوسرا وہیں کوچ کے آس پاس ہماری واپسی کا منتظر ہو!

میں لی یان کے ساتھ چلتے ہوئے فنگی نامی اس بدھ راہبہ کے پاس آیا اور ڈانٹ سے مشابہ لہجے میں اس سے کہا۔

''انسان اپنی فطری خواہشات اور جبلی تقاضوں... کو کچل کر بھی نارمل معاشرتی زندگی نہیں گزار سکتا۔ اگر نفس پر کنٹرول نہ ہو تو راہبانیت کی طرف نہیں آنا چاہیے۔''

وہ اٹھ کر میرے قدموں میں گر گئی' پھر زار و قطار روتے ہوئے بولی''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہونے والی تھی۔ لارڈ بدھا مجھے معاف کرے!'' شاید وہ مجھے بھی کوئی مونک وغیرہ سمجھی تھی!

میں نے شانوں سے تھام کر اسے کھڑا کیا۔ کسی لمبے چوڑے لیکچر کا میرے پاس وقت نہیں تھا اس لیے مختصر اور دوٹوک الفاظ میں اس سے کہا۔

''فنگی! میں جانتا ہوں تم سندری جل ہی کی رہنے والی ہو۔ اطمینان سے اپنے ٹھکانے پر چلی جاؤ اور جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ سمجھو کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ لارڈ بدھا تمہیں سکون دے گا۔''

پھر میں لی یان کا ہاتھ پکڑ کر واپس ہولیا۔ وہ تازہ ترین حالات جاننے کے لیے خاصی متجسس تھی۔ میں نے نارائن سے جو سنسنی خیز معلومات حاصل کی تھیں' مختصر الفاظ میں وہ لی یان کے گوش گزار کر دیں۔ وہ گہری تشویش سے بولی۔

''میں نے جس شخص کو ادھر لمبا لٹایا ہے' ہوسکتا ہے کہ یہ انہی دو افراد میں سے ایک ہو۔''

''اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے' یہ ان دو کا کوئی تیسرا ساتھی ہو!''

''بہرحال' ہمیں فوراً کاشانوک تک پہنچنا چاہیے۔''

ادھر لی یان کی بات ختم ہوئی ادھر میرے موبائل فون میں سائیلنٹ الرٹ کی مخصوص تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے اپنے لبادے میں سے سیل نکال کر کان سے لگالیا۔ دوسری طرف کاشانوک تھا۔

میرے ''ہیلو'' کے جواب میں اس نے کہا۔

''تم دونوں کہاں رہ گئے۔ ہم ادھر کوچ میں تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟''

''بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔'' میں نے تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے محتاط انداز میں پوچھا''خیریت تو ہے نا چینگ؟''

''خیریت بالکل نہیں ہے کھام!'' میں نے واپسی کا سفر جاری رکھتے ہوئے کاشانوک کو اس کے اختیاری نام سے پکارا، پھر نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے سنگین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''اوہ!'' میں نے کاشانوک کی تشویش سے لبریز مختصری آواز سنی۔

میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی''مجھے تم پر شک ہے کھام!''

''تم سراسر غلط انداز میں سوچ رہے ہو!'' وہ قطعیت سے بولا۔

میں نے پوچھا''کیا تم کوچ پر سوار ہو چکے ہو یا باہر ہی کہیں کھڑے ہو؟''

''میں کوچ سے باہر...... کھڑا تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا''کیا تم کھٹمنڈو میں رہنے والے کسی باس ٹائپ مسٹر شرما کو جانتے ہو؟'' پھر میں نے جلدی سے اضافہ

کیا''اس شخص کا نام زبان پر لائے بغیر جواب دینا کیوں کہ میں نے جن دو نئے متعاقبین کا ذکر کیا ہے وہ اسی شرما کے حکم کے غلام بن کر سندری جل سے کوداری تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔ ممکن ہے، ان میں سے کوئی اس وقت تمہیں تاڑ رہا ہو اور تمہاری زبان سے شرما کا نام سن کر محتاط ہو جائے......!''

''میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں چینگ!'' اس نے کہا''میرا جواب ''ہاں'' میں ہے۔ تم دونوں جلدی سے آجاؤ۔ کوچ روانہ ہونے ہی والی ہے، ان متعاقبین سے بھی نمٹ لیتے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی کاشانوک نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا۔ اس نے بڑے واضح انداز میں مجھے اشارہ دے دیا تھا کہ وہ شرما کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے لی یان کو بھی کاشانوک کی معلومات کے بارے میں بتا دیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ہم کوچ تک پہنچ گئے۔

کاشانوک کوچ کے داخلی دروازے کے پاس ہی ہمارا منتظر تھا۔ ہم اس کے ساتھ ہی کوچ پر سوار ہوگئے۔ نارائن اور فنگی سندری جل میں اتر گئے تھے۔ ان کی سیٹ پر میں نے ایک کرخت صورت شخص کو بیٹھے پایا، وہ ہمارے آگے کوچ پر سوار ہوا تھا۔ اس نے تنقیدی نظر سے ہم تینوں کا جائزہ لیا اور بے چینی سے کھڑکی کے باہر نگاہ دوڑانے لگا۔ اس کی بے تاب نظر کسی خاص شے کو تلاش کر رہی تھی۔ جب نارمل انداز میں ہم اپنی متعلقہ سیٹوں پر بیٹھ چکے تو کوچ حرکت میں آگئی۔ اسی وقت وہ شخص اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور ڈرائیور سے مخاطب ہوتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔

''گاڑی روکو...... ابھی میرا ساتھی نہیں آیا ہے!''

''تم تو یہیں سے کوچ میں سوار ہوئے ہو'' ایک مسافر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''تمہارا ساتھی کہاں سے آگیا؟''

اس شخص پر نظر پڑتے ہی ہم تینوں بہ خوبی سمجھ گئے تھے کہ وہ ان دو افراد میں سے ایک ہے جو سندری جل سے کوداری تک ہمارے ساتھ جانے والے تھے۔ اسے اکیلے دیکھ کر یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ اپنے جس ساتھی کا انتظار کر رہا تھا، وہ فوری طور لوٹ کر نہیں آسکتا تھا، لی یان نے اسے ادھر پہاڑیوں میں انٹاغفیل کر دیا تھا۔

اس شخص نے بپھرے ہوئے لہجے میں، سوال کرنے والے سے کہا''میں نے کوداری تک سفر کرنے کے لیے دو ٹکٹ خریدے ہیں۔ اگر میرا کوئی ساتھی نہیں تو کیا میں تمہیں پاگل نظر آتا ہو جو دو ٹکٹ خرید کر اکیلا سفر کروں گا؟''

کوچ کے ڈرائیور نے بریک لگادیے اور اس کی تائید کرتے ہوئے کہا''بے شک تم نے مجھ سے دو ٹکٹ حاصل کیے ہیں لیکن تمہارا ساتھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا!'' پھر اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں صرف پانچ منٹ تک یہاں رک سکتا ہوں۔ اس کے بعد اگر ہم یہاں سے روانہ نہ ہوئے تو پھر دن ڈھلنے سے پہلے کوداری نہیں پہنچ سکیں گے۔ میں رات ہو جانے کے بعد اس خطرناک راستے پر ڈرائیونگ کا رسک ہرگز نہیں لے سکتا۔''

دوسرے مسافر بھی شور کرنے لگے کہ ایک مسافر کے لیے ان کی راہ کیوں کھوٹی کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے، کوئی بھی یہ رسک لینے کو تیار نہیں تھا کہ رات کی تاریکی میں سفر کرتے ہوئے وہ موت کے منہ میں چلا جائے! ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

''اگر تمہارا ساتھی نہیں پہنچا تو تم بھی نیچے اتر جاؤ۔ تم دونوں کسی اور بس سے آجانا۔''

اس شخص نے خوں خوار نظر سے مشورہ دینے والے کو گھورا اور جیب سے موبائل فون نکال کر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ ڈرائیور چونکہ اسے پانچ منٹ کی مہلت دے چکا تھا لہٰذا فی الحال کوچ کے آگے بڑھنے کا امکان نہیں تھا۔ سب یہی سمجھے کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی کو فون کر رہا ہے

ہم سب کی نگاہیں اسی پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس نے نمبر ملانے کے بعد دھیمی آواز میں ایک دو مرتبہ''ہیلو مک ...... ہیلو مکل آنند'' کے الفاظ دہرائے اور پھر رابطہ منقطع کر کے وہ موبائل کے کی پیڈ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ جب اس نے کافی دیر تک سیل کو کان سے نہیں لگایا تو میں سمجھ گیا، اس نے کسی کو شارٹ میسج کیا تھا۔ اس میسج کے جواب میں اسے بھی پیغام موصول ہوا اور وہ سیل کو جیب میں رکھتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔

''تم گاڑی آگے بڑھا سکتے ہو۔ میرے ساتھی نے سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے......!''

اتنا کہہ کر وہ اطمینان کے ساتھ سیٹ پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

کوچ دوبارہ حرکت میں آئی اور جیسے ہی وہ سندری جل کی حدود سے نکلی تو لی یان نے تشویش بھرے انداز میں سرگوشی کی''کیا اس نے اپنے ساتھی ہی سے رابطہ کیا ہوگا؟''

''پہلے اس نے اپنے ساتھی مکل آنند کو فون کرنے کی کوشش کی تھی'' میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا''لیکن مکل آنند کو تو تم نے بڑی گہری نیند سلا دیا ہے۔ مکل کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد اس نے یقیناً اپنے باس مسٹر شرما کو میسج کیا ہے اور وہاں سے نئی ہدایات پانے کے بعد ہی یہ شانت ہو کر بیٹھا ہے۔''

''کیا ہم کوداری تک اسے اپنے ساتھ لے کر جائیں

گے؟'' اس کی تشویش میں اضافہ ہوگیا۔ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کو داری میں ہمارے ''استقبال'' کا خاطر خواہ بندوبست کردیا گیا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ راستے ہی میں اس ''میزبان'' کی تھوڑی خاطر داری کردی جائے۔''

''تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' وہ میرے الفاظ کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر کاشانوک کے کندھے پر ''دستک'' دی۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تو میں نے نگاہ کے اشارے سے اسے کچھ پوچھا۔ اس کی آنکھوں نے تائیدی جنبش کی۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

میں اپنی سیٹ سے اٹھا اور اس شخص کے سامنے آکر تحکمانہ انداز میں کہا ''گیٹ اپ!''

وہ مجھے اپنے مقابل پاکر ایک لمحے کو ٹھٹکا پھر اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ نے بڑی سرعت سے حرکت کی۔ میرے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے وہ اپنی جیب کو ٹٹول رہا تھا۔ میں سمجھ گیا، وہ گن نکالنے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ جیب سے باہر آتا، میں نے اس کے چوڑے جبڑے پر ایک دھانسو قسم کا پنچ جڑ دیا۔

میرا خطرناک پنچ کھا کر وہ بوکھلا گیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے مجھے دھواں دھار ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ میں پہلے سے اس کے ردعمل کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میں نے اس کے اچھلتے ہوئے سر پر یک بہ یک دو طرفہ چوپ رسید کردیے۔ میرے کھلے ہاتھوں کی خطرناک ضربات نے اس کی کن پٹیوں کا مزاج پوچھ لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے سیٹ پر ڈھیر ہوگیا۔

ڈرائیور نے اسی لمحے کوچ روک دی۔ ہم سندری جل سے کافی آگے نکل آئے تھے اور کوچ جس مقام پر ٹھہری تھی، وہاں سے چاروں جانب تاحدِ نگاہ پہاڑ ہی پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ اس کوچ کے مسافروں میں بدھ بھکشوؤں کی اکثریت تھی اور وہ سب میری اس جرأتِ رندانہ پر انگشت بہ دنداں تھے۔

بدھ مت کے پیروکار ایک چیونٹی کو مارنا بھی گناہ عظیم سمجھتے ہیں۔ ان کی حیرت اور تشویش کا سبب یہ تھا کہ میں اس وقت ایک بدھ بھکشو کے روپ میں ان کا ہم سفر تھا!

وہ سب سہمی ہوئی نگاہوں سے کبھی مجھے اور کبھی بے حس و حرکت پڑے اس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ اس وحشت ناک منظر نے ان پر سناٹا طاری کردیا تھا۔ میں انہیں نظر انداز کرکے اپنے دشمن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے فوری طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ اسے کوچ سے باہر پھینک کر ہم آگے بڑھ جائیں گے۔

میں نے اس شخص کا جائزہ لیا تو اس کی کیفیت کو خاصا تشویش ناک پایا۔ جبڑے پر پڑنے والے میرے طوفانی پنچ نے اس کے دہانے کو مکمل طور پر رنگین بنا دیا تھا اور کن پٹیوں کا مزاج پوچھنے والے چوپس نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ ہاتھ کیا، مجھ پر انگلی بھی اٹھا سکے۔

میں نے اپنے ارادے پر عمل کرنے کے لیے اس کی جانب ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ اس کے لباس میں کہیں موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ٹٹول کر وہ موبائل دریافت کرلیا پھر ''یس'' کا بٹن پریس کرنے کے بعد اسے کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف سے بولنے والے نے تحکمانہ لہجے میں کہا ''سوریا! تم ٹھیک دس منٹ کے بعد گاڑی کور کوا دینا۔ ہم پہنچ رہے ہیں!''

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہوگیا۔ حکم دینے والے نے سوریا نامی اس شخص کی زبان سے ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، وہ اس کا باس شرما ہوگا۔ میرے پاس عمل کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ آئندہ دو منٹ میں، میں نے کاشانوک کی مدد سے سوریا کو کھینچ کر کوچ سے باہر پھینک دیا پھر دروازہ بند کرتے ہوئے چیخ کر ڈرائیور سے کہا۔

''گاڑی کو آگے بڑھاؤ..... فوراً!''

ڈرائیور نے میرے احکام کی تعمیل میں کوچ کو آگے بڑھا دیا۔

میں واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک مخصوص آواز سن کر چونک اٹھا۔ میری طرح لی یان اور کاشانوک نے بھی وہ آواز سماعت کرلی تھی اور وہ بھی کوچ کی کھڑکیوں سے باہر نظریں دوڑا رہے تھے۔ ہم سب کی نگاہوں کا ٹارگٹ نیلا جاودانی آسمان تھا کیونکہ وہ مخصوص آواز اسی سمت سے آرہی تھی۔ پھر وہ آواز بتدریج تیز ہوتی چلی گئی۔

ہم تینوں نے بہ یک وقت سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ہمارے ذہنوں میں اس وقت ایک ہی سوچ تھی۔ وہ مخصوص آواز کسی ہیلی کاپٹر کی تھی جو لمحہ بہ لمحہ قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ اگلے ہی لمحے ہم نے دھلی دھلائی فضا میں ایک سیاہ نقطے کو نمودار ہوتے دیکھا جو آناً فاناً..... اپنا سائز بڑھاتا چلا گیا۔ اس سیاہ دھبے نے چند سیکنڈ میں ہیلی کاپٹر کی شکل اختیار کرلی۔

دیکھتے ہی دیکھتے، وہ دشمن ہیلی کاپٹر ہمارے سر پر پہنچ گیا!

وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ وقت کی ایک نامہربان کروٹ نے ہمیں موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بس ایک بے رحم تھپیڑے کی کسر باقی تھی، اس کے بعد ہم ڈھیر دیلی میں پڑے نظر آتے۔ ہمارے سروں پر منڈلانے والا سیاہ ہیلی کاپٹر بڑے خطرناک موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس ہوائی رتھ پر سوار ہو کر آنے والے موت کے بیوپاری تھے۔ اور خاص طور پر ہمارے لیے وہاں پہنچے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی جاں لیوا کارروائی کا آغاز کر کے ہمیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے، میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر کوچ کے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے میں نے چیخ کر کہا۔

''کاشا لوک، لی یان...... کم آن، ہری اپ...... تو ٹیک تو ٹیک!''

وہ ایسی صورتِ حال نہیں تھی کہ میں مصلحت کے تقاضے نبھاتے ہوئے انہیں اختیاری ناموں سے پکارتا۔ ہم نے جن سے چھپنے کے لیے وہ نام اپنائے تھے، ہماری روپوشی ان کے سامنے کھل چکی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں ڈرائیور پر چلایا ''گاڑی کو فوراً روک دو!''

میں نے تھوڑی دیر پہلے جس قسم کے رویے کا مظاہرہ کر کے سوریا کو ناک آؤٹ کیا تھا' وہ تمام مسافروں کے دلوں میں میری دہشت بٹھانے کے لیے کافی تھا۔ خاص طور پر کوچ کا ڈرائیور مجھ سے کچھ زیادہ ہی ''متاثر'' دکھائی دیتا تھا جیسے اس نے پہلے، میرے حکم پر کوچ کو فوراً آگے بڑھا دیا تھا، بالکل ایسے ہی اس نے اس بار بھی میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ اگلے ہی لمحے سوئس منی ایکسپریس سڑک کے کنارے رک گئی۔

اس دوران میں ہیلی کاپٹر ہم سے سو گز آگے اس مشکل اور دشوار گزار سڑک پر لینڈ کر چکا تھا۔ اس محفوظ لینڈنگ سے پائلٹ کی مہارت کا پتا چلتا تھا...... میں جانتا تھا، اس ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر کتنے لوگ ہم پر ہلہ بولنے آئے ہیں۔ البتہ، یہ بات یقینی تھی کہ وہ فوری طور پر کوئی خوں ریز کارروائی نہیں کریں گے۔ میرے اس یقین کی ٹھوس وجوہات تھیں۔ میں نے سوریا کے سیل پر اس کے باس کے احکام کو خود سنا تھا۔ سوریا کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ٹھیک دس منٹ بعد کوچ رکوا دے اور اب وہ کوچ سڑک کے کنارے رک چکی تھی، یہ الگ بات کہ کوچ کو سوریا نے نہیں بلکہ میں نے رکوایا تھا لہٰذا زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ ہیلی کاپٹر والے یہی سمجھیں گے، سوریا ایکشن میں آ چکا ہے۔ وہ سوریا سے رابطہ کیے بغیر کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ اگر مجھے فوری طور پر موت کے گھاٹ اتارنے کا منصوبہ ہوتا تو وہیں کھٹمنڈو میں نارائن (نقلی بدھ بھکشو) سے یہ کام لیا جا سکتا تھا۔ میرے دشمن مجھے زندہ پکڑ کر زیادہ خوشی محسوس کرتے...... اور میرا یہ فرض بنتا تھا کہ انہیں ایک عظیم خوش فہمی میں مبتلا رکھوں!

جب تک میں کوچ کے دروازے تک پہنچتا، کاشا لوک اور لی یان نے بھی سیٹ چھوڑ دی۔ تھاچو بھی ان کی تقلید میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تاہم قافلے میں شامل دیگر بھکشو اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہے۔ میں نے بدھانلکانتھا سے روانہ ہوتے وقت کاشا لوک کو نقلی بدھ بھکشو نارائن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور سندری جل والے واقعے سے بھی وہ آگاہ تھا۔ تھاچو اور کاشا لوک کوچ کی ایک ہی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے لہٰذا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے درمیان موجودہ صورتِ حال پر بات نہ ہوئی ہو۔ تھاچو کے دیگر ساتھیوں کی پُرامن خاموشی سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس نے انہیں خصوصی ہدایات دے دی تھیں اسی لیے وہ کوچ سے نکلنے کے سلسلے میں تھاچو کی تقلید نہیں کر رہے تھے۔

میں نے دروازہ کھولنے کے لیے جیسے ہی ہینڈل پر ہاتھ رکھا، میرے لباس میں موجود موبائل کا بزر بج اٹھا۔ گھنٹی کی مخصوص ٹون سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ سوریا والا موبائل تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ اس کا باس شرما، اس سے رابطہ کر کے موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ سوریا کو کوچ سے ''بے دخل'' کرتے وقت میں نے اس کے سیل کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

میں نے سیل کو لباس سے برآمد کیا اور کان سے لگا کر بدلی ہوئی آواز میں ''ہیلو'' کہا۔

سوریا جب کوچ کے ڈرائیور اور دیگر مسافروں سے ہم کلام ہوا تھا تو میں نے لب و لہجے کو بہ غور سنا تھا اور اس وقت میں نے آواز بدل کر اسی کے لب و لہجے کی نقالی کرنے کی کوشش کی تھی اور میری یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب رہی۔ میرے ''ہیلو'' کے جواب میں تحکمانہ انداز میں پوچھا گیا۔

''سوریا! اندر کی کیا صورتِ حال ہے؟''

میں نے بولنے والے کی آواز کو فوراً شناخت کر لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے تھوڑی دیر پہلے سوریا کو ہدایت دی تھی کہ وہ ٹھیک دس منٹ بعد کوچ رکوا دے...... اور میرے قیاس کے مطابق وہ سوریا کے باس شرما کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں بھی کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ اس وقت بہ نفسِ نفیس ہیلی کاپٹر میں موجود ہو گا۔ اس کے لہجے کے اعتماد سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ مذکورہ کوچ، اس کے حکم پر سوریا ہی نے رکوائی ہے، اس بے چارے کو کیا معلوم کہ میں اس کے مہرے سوریا کو تین سو گز پیچھے پھینک آیا تھا!

میں نے سوریا کی آواز کی نقالی جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور بدلے ہوئے لہجے میں کہا ''باس! یہاں کی صورتِ حال مکمل طور پر میرے کنٹرول میں ہے۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں ان لوگوں کو گن پوائنٹ پر رکھ کر کوچ سے نیچے اتار لوں۔''

دوسری جانب لمحاتی تذبذب اور تامل سے کام لیا گیا۔ میں نہیں جانتا تھا، یہ مختصر سا تردد میری آواز کے سلسلے میں تھا یا اس فیصلے کے بارے میں جو تجویز میں نے آگے بڑھائی تھی۔ موجودہ صورتِ حال میں سب کچھ ممکن تھا۔ اگلے ہی لمحے متوقع شرما نے جو جواب دیا اس سے مجھے خاصا اطمینان... و سکون محسوس ہوا۔

''ٹھیک ہے، تم انہیں گن پوائنٹ پر گاڑی سے باہر لاؤ۔'' مجھ سے کہا گیا ''میں ہیلی کاپٹر میں موجود ہوں اور دو مسلح افراد کو تمہاری مدد کے لیے نیچے اتار رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور سوالیہ نظر سے کاشا لوک کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے جادو کا ہاتھ گھمایا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں سے ایک خطرناک گن نکال کر میری سمت بڑھا دی۔ وہ اوزی تھی۔ آتشیں اسلحے سے واقفیت رکھنے والے اوزی کی ہلاکت خیزی کے بارے میں بہ خوبی جانتے ہیں۔ یہ ایک کم وزن اور زیادہ مار کرنے والی آٹو میٹک گن ہے۔ کاشا لوک نے ایمونیشن کے استعمال کی خصوصی ٹریننگ لے رکھی تھی اور اس کے ذخیرے میں، میں نے ہر نوعیت کا آتشیں اسلحہ دیکھا تھا۔ یہ اوزی گن اس ذخیرے کا ایک دانہ تھی۔

لگتا تھا، ان لمحات میں' حالات اور ستارے اچانک ہماری موافقت میں چلنے لگے ہوں، ورنہ شرما یہ بھی کہہ سکتا تھا، سوریا! تم ادھر کوچ میں ہی رکو۔ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ اگر تقدیر نے ہمیں ایک موقع فراہم کر دیا تھا تو اس سے فائدہ اٹھانا ہم پر فرض تھا۔ میں نے اوزی کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد کوچ کے شیشے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ ایک بے حد گہری ڈھلوان دکھائی دی۔ میں نے ایک فوری فیصلے پر پہنچتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ میرے لہجے میں موت کی سی سرسراہٹ تھی۔

''تم سب گن پوائنٹ پر میرے آگے آگے کوچ سے باہر نکلو گے اور سڑک کے کنارے پہنچتے ہی تم حتی الامکان تیزی سے ڈھلوان میں اترتے چلے جاؤ گے۔ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، عقب میں، میں کور دینے کے لیے موجود رہوں گا!''

سب نے میکانکی انداز میں اپنے اپنے سر کو جنبش دی۔

کوچ میں موجود تمام مسافروں کو جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ کسی نے ہماری ہنگامی کارروائی میں مداخلت کی اور نہ ہی ایک لفظ زبان سے ادا کیا۔ میں نے خاص طور پر کوچ کے ڈرائیور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اپنے دشمنوں سے نمٹ کر ہم جلد ہی واپس آ جائیں گے۔ تم اپنی کوچ کے ساتھ یہیں پر ہمارا انتظار کرنا!''

میرا لہجہ اتنا اٹل تھا کہ وہ اثبات میں سر جھکانے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے کوچ کے ڈرائیور کو احتیاطاً اس قسم کی ہدایت دی تھی۔ اس طرح یہ سہولت فراہم ہو جاتی کہ اگر ہم واقعی اپنے دشمنوں سے جلدی نمٹ لیتے تو آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ سوئس منی ایکسپریس ہمارے سفر کے تمام مسائل حل کر دیتی۔

میں نے تنقیدی نگاہ سے ونڈ اسکرین کے پار سڑک کا جائزہ لیا۔ وہ سیاہ ہیلی کاپٹر کوچ سے لگ بھگ سو گز کے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس دوران میں دو مسلح افراد ہیلی کاپٹر میں سے برآمد ہو کر ہماری جانب پیش قدمی کر چکے تھے۔ اب ایک ایک سیکنڈ نہایت ہی قیمتی اور سنسنی خیز تھا۔

میری آنکھ کے اشارے پر کاشا لوک نے کوچ کا دروازہ کھول دیا۔ سب سے آگے وہی تھا۔ وہ ''ہینڈز اپ'' کے انداز میں دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے کوچ سے نیچے اتر گیا۔ اس کے پیچھے لی یان اور تھاچو نے کوچ کو خیرباد کہا۔ سب سے آخر میں، میں خطرناک اوزی تھامے باہر آ گیا۔ پلک جھپکتے میں، ہم سڑک کے کنارے پہنچ گئے۔

''گو......!'' میں نے بلند آواز میں کہا اور تیزی سے پلٹ گیا۔

اب میری گن کا منہ ان دو افراد کی طرف اٹھا ہوا تھا جو مسلح ہو کر ہماری جانب آ رہے تھے۔ میں اپنے عقب میں نہیں دیکھ سکتا تھا، میرے ساتھیوں نے کس انداز میں نشیب کی سمت دوڑ لگائی ہو گی، البتہ مسلح افراد کے چونکنے نے مجھے بہت کچھ بتا دیا۔ انہوں نے نشیب کی طرف دیکھتے ہوئے فائرنگ شروع کر دی۔

پُرسکون اور خاموش فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ یہ ان گن بردار افراد کا ایک اضطراری ردِعمل تھا کہ انہوں نے بھاگنے والوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی ورنہ

ٹارگٹ کے اعتبار سے میں ان کے زیادہ قریب تھا۔ ان کی برسٹ فائرنگ بے سود ثابت ہوئی تو انہوں نے میری جانب رخ پھیر لیا۔

میں تو ان کے استقبال کے لیے پہلے سے تیار کھڑا تھا۔ اوزی کے ایک مختصر اور سریلے برسٹ نے انہیں گولیاں کھا کر زمین بوس ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اس اثنا میں وہ کوچ اور ہیلی کاپٹر کے درمیان پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا میری فائرنگ نہایت ہی موثر ثابت ہوئی۔

میں نے ان کے ٹھنڈا ہوتے ہی ہیلی کاپٹر کی سمت نگاہ دوڑائی اور یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہاں سے دو افراد نکل کر نشیب کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ دونوں پوری طرح مسلح تھے اور ان کی چال درفتار سے مستعدی ٹپکتی تھی۔ وہ دونوں فائرنگ رینج سے باہر تھے۔ لہٰذا میں نے راؤنڈز ضائع کرنے کی غلطی نہ کی اور ایک محفوظ زاویے سے اپنے ساتھیوں کی جانب بڑھنے لگا۔

میں نے نشیب میں تھوڑا آگے آنے کے بعد پلٹ کر دیکھا تو پیچھے سڑک پر ایک شخص کو تحکمانہ انداز میں چلاتے ہوئے پایا۔ وہ کاشالوک، لی یان اور تھاچو کی طرف جانے والے اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کر ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے رعب اور اسٹائل نے مجھے سمجھا دیا، وہ مسٹر شرما کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں اونچے نیچے پتھروں کی آڑ لیتے ہوئے تیزی سے نشیب میں اترتا چلا گیا۔

ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر وہاں پہنچنے والوں میں سے دو افراد کو میں نے سڑک پر بھون ڈالا تھا، دو ہمارے تعاقب میں تھے، شرما ادھر سڑک پر ہی کھڑا ہو کر اپنے مہروں کو ہدایات دے رہا تھا۔ پتا نہیں، ہیلی کاپٹر کے اندر ہمارے اور کتنے دشمن موجود تھے۔ اگر ہم جلد از جلد کسی پناہ گاہ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو جاتے تو موجودہ صورتِ حال ہمارے لیے بڑی تشویش ناک ہو جاتی۔

میں نے زگ زیگ بھاگتے ہوئے، نشیب میں اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ ان میں سے کوئی بھی مجھے دکھائی نہ دیا۔ اس خطرناک نشیبی راستے پر جا بہ جا چھوٹی بڑی پتھریلی چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اغلب امکان یہی تھا کہ کاشالوک وغیرہ اس وقت کسی بڑی چٹان کے عقب میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں اپنے مخصوص زاویے پر محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

اس دوران میں وقفے وقفے سے میں مڑ کر پیچھے بھی دیکھ لیتا تاکہ ہمارے تعاقب میں آنے والے دشمنوں کی پوزیشن کا اندازہ ہو سکے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد حیرت انگیز طور پر وہ بھی میری نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ وہ دونوں مسلح افراد لی یان، کاشالوک اور تھاچو کے تعاقب میں لپکے تھے اور میری پیش قدمی کا زاویہ قدرے مختلف تھا، شاید اسی لیے بھی میں انہیں دیکھنے سے قاصر تھا۔ آگے بڑھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا میں نے ایک لمحے بھی رک کر انہیں تلاش کرنے کا رسک نہ لیا۔

لگ بھگ دو منٹ بعد یکا یک مجھے رک جانا پڑا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے گویا ہاتھ بڑھا کر میرے قدم پکڑ لیے ہوں۔ اس ٹھہراؤ کا سبب عقب میں ابھرنے والی شدید ترین فائرنگ کی آواز تھی۔ میں نے میکانکی انداز میں پلٹ کر دیکھا۔ وہاں سے سڑک واضح طور پر نظر تو نہیں آتی تھی جہاں ہم کوچ اور ہیلی کاپٹر کو کھڑا ... چھوڑ آئے تھے۔ تاہم فائرنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخصوص آوازوں نے مجھے بتا دیا کہ وہ فائرنگ کوچ کے ٹائروں کو نشانہ بناتے ہوئے کی گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے ٹائر پھٹنے کی آوازیں ابھریں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ فوری طور پر یہی بات سمجھ میں آئی کہ شرما یا اس کے کسی ساتھی نے کوچ کے قریب پہنچ کر اس کے ٹائروں پر بے دریغ فائرنگ کی تھی تاکہ کسی بھی صورت وہ کوچ آگے سفر جاری نہ رکھ سکے۔

ایک بات سے مجھے قلبی اطمینان حاصل ہوا کہ اس فائرنگ نے بس کے کسی مسافر کو زندگی کی آخری چیخ مارنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ شرما نے فائرنگ سے قبل کوچ کے اندر جھانک کر ضرور دیکھ لیا ہوگا۔ اپنے شکاروں کو وہاں موجود نہ پا کر وہ بے طرح جھلایا ہوگا اور اسی جھلاہٹ میں اس نے کوچ کے ٹائروں کو برسٹ کر کے اسے ناکارہ بنا دیا تھا۔ میں نے شرما، ہیلی کاپٹر اور کوچ کو اپنے ذہن سے جھٹکا اور نشیب کی سمت قدم بڑھا دیے۔

اب میں نے پیش قدمی کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کر دیا۔ اس زاویے پر سفر کرتے ہوئے میں کچھ آگے جا کر اپنے ساتھیوں سے مل سکتا تھا۔ اس رخ پر تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ سڑک پھر دکھائی دینے لگی جہاں سے ہم نے اس نشیبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بجا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا تاہم اس کی فراہم کردہ حرارت، فضا میں رچی بسی خنکی کو پوری طرح زائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ اس وقت حرارت اور خنکی کے درمیان زبردست مقابلہ جاری تھا اور قرائن سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ بالآخر جیت خنکی کے حصے ہی میں آئے گی۔ کوئی لمحہ

جاتا تھا کہ حرارت کا منبع، عظیم الجثہ اور پُرہیبت پہاڑ کی اوٹ میں چہرہ چھپانے والا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ اپنی تمام تر شان و شوکت اور جاہ و جلال کے ساتھ استادہ تھا۔ اس کی بلندی اور جسامت کے آگے ہر شے بہت ہی چھوٹی ...... بہت ہی حقیر دکھائی دیتی تھی۔ اس کی برف پوش چوٹیوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے سفید اور اجلی اون کی ٹوپیاں پہن رکھی ہوں۔ یہ ایک دل کش اور نظر فریب نظارہ تھا...... مبہوت کر دینے والا!

میں نشیب میں کافی نیچے اتر آیا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے دشمنوں یا دوستوں میں سے کسی کی صورت نظر نہیں آئی۔ وہ دن کا وقت تھا اور اجالے نے ہر منظر کو واضح کر رکھا تھا، پھر وہ مجھے کیوں دکھائی نہیں دے رہے تھے؟ اس صورتِ حال نے مجھے الجھا دیا۔ میں رک گیا اور پلٹ کر بلندی کی طرف نگاہ دوڑائی۔

ایک شخص کو میں نے سڑک سے اتر کر اس طرف آتے ہوئے پایا۔ میرے اور سڑک کے درمیان اب اس قدر فاصلہ حائل ہو چکا تھا کہ فوری طور پر میں یہ اندازہ قائم نہ کر سکا کہ وہ دشمن کا کوئی آدمی تھا یا کوچ کا کوئی مسافر! اس شخص کے بارے میں، میں غور ہی کر رہا تھا کہ یک لخت مجھے چونک جانا پڑا۔ میری بائیں جانب، ایک چٹان کے عقب سے فائرنگ کی آواز سنائی دی تھی۔ میں ایک محفوظ آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔

وہ ایک سنگل شاٹ تھا۔ اس فائر کا جواب فوری طور پر دیا گیا۔ فضا ایک خوف ناک برسٹ سے گونج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کی دردناک آواز ابھری۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ ہوئی کہ موت کا فرشتہ میرے آس پاس ہی کہیں منڈلا رہا تھا۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کون لقمۂ اجل بنا تھا اس کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کوئی دشمن بھی ہو سکتا تھا اور دوست بھی!

میرے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑنے لگی۔ صورتِ حال بڑی تشویش ناک ہو گئی تھی۔ ایسی غیر یقینی پوزیشن تو میں نے کبھی رات کی تاریکی میں بھی نہیں دیکھی تھی جو دن دہاڑے پیش آ رہی تھی۔ پہاڑوں کے دامن میں واقع اس چٹانی اونچ نیچ نے نگاہ کے زاویے کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا۔ میدانی علاقے کی بہ نسبت پہاڑی علاقے میں کسی کا تعاقب جاری رکھنا بہت زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ میں اس محفوظ آڑ میں محتاط قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ چٹان کے آخری سرے پر پہنچ کر میں نے گردن نکال کر دیکھا۔

دوسری طرف بیس گز کے فاصلے پر مجھے ایک شخص کی خوں چکاں لاش پڑی ہوئی نظر آئی۔ وہ انہیں مسلح دو افراد میں سے ایک تھا جو میرے ساتھیوں کے تعاقب میں ہیلی کاپٹر سے یہاں تک پہنچے تھے۔ اگلے ہی لمحے اس لاش کو وہیں چھوڑ کر میری نگاہ آگے کو اٹھ گئی۔ میں نے ہلاک ہونے والے دشمن کے ساتھی کو بڑی تیزی سے بلندی کی جانب دوڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کے دوڑنے کا زاویہ بالائی سڑک کی سمت نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ فرار نہیں ہو رہا تھا بلکہ کاشالوک وغیرہ کے تعاقب میں اس طرف جا رہا تھا۔ ساتھ ہی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ میں نے ابھی جس دشمن کی لاش کو خون میں لت پت پڑے دیکھا تھا، وہ میرے ساتھیوں میں سے کسی کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا۔

میں اوزی تھامے اپنے دشمن کے تعاقب میں لگ گیا۔ یہ گن مجھے کاشالوک نے فراہم کی تھی۔ اس بات کے قوی امکان تھے کہ اس نے اپنے لباس میں اور بھی خطرناک ہتھیار چھپا رکھے ہوں گے۔ کاشالوک ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے مزاج کا مالک ایک گہرا شخص تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے مجھے بہت کم وقت ملا تھا اور اس قلیل مدت میں، میں اسے اچھا خاصا سمجھ گیا تھا۔

انہی خیالات کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جب تک میں اس شخص کے قریب پہنچتا، وہ ایک بڑی چٹان کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے فضا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی مخصوص تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ میں نہیں جانتا تھا، کس نے کس پر گولیاں برسائی ہوں گی۔ وہ یک طرفہ فائرنگ کی آواز تھی اور اس آواز کے نتیجے میں کرب ناک انسانی چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے گن کو تیار حالت میں تھامے تھامے ممکنہ تیزی سے چٹان کی جانب دوڑ لگا دی۔ ان سنگین لمحات میں میرے ساتھیوں کو میری مدد کی اشد ضرورت تھی۔

میں مذکورہ چٹان تک گیا، پھر جیسے ہی گھوم کر میں نے دوسری طرف جانا چاہا، میں نے اپنے عقب میں کوئی گڑبڑ محسوس کی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں نے بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور ایک دشمن میری نگاہ میں آ گیا۔

یہ یقیناً وہی شخص تھا جسے تھوڑی دیر پہلے میں نے سڑک سے اتر کر، اس سمت بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جس قسم کی حرکت کرنے جا رہا تھا اس سے واضح ہو گیا کہ وہ بھی شرما کے گروہ ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں تھامی ہوئی گن کو میرے قدموں کی جانب جھکا رکھا تھا اور قبل اس

کے کہ وہ ٹریگر پر انگلی دباتا، میں نے ایک ہائی جمپ لگاتے ہوئے اس پر فائرنگ کردی۔

میری اچھلنے والی احتیاط بروقت کام آگئی۔ دوطرفہ فائرنگ نے ایک مرتبہ پھر کوہستانی فضا کو پاش پاش کردیا۔ اگر میں اپنے جسم کو ہوا میں بلند نہ کرتا تو وہ شخص میرے پاؤں کا قیمہ بنا چکا ہوتا۔ میں نے اسے ارادہ بدلنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ وہ میرے قدموں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کرچکا تھا لہٰذا میرے ہوا میں اچھلنے کے ساتھ وہ گن کی نال کو اوپر نہ اٹھا سکا۔ میں نے اس کی توقع کے برعکس یکایک پیچھے مڑکر، جمپ لگاتے ہوئے اس پر فائرنگ کردی تھی۔ میں تو اس کی فائرنگ سے محفوظ رہا...... مگر اوزی کے دہانے سے نکلنے والی گولیوں نے اس کے جسم کو چھلنی میں بدل دیا۔ اس کا بے جان بدن ایک نکیلے پتھر پر بے حس وحرکت پڑا تھا۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کے پاس جاکر تفصیلی معائنہ کرتا۔ میں تیزی سے اپنی راہ کو ہولیا۔ ایک لاش کے بجائے اپنے دوستوں کی خبر گیری زیادہ ضروری تھی۔

میں دوڑتے...... قدموں کے ساتھ اس چٹان کی دوسری سمت پہنچ گیا۔ میری آنکھ نے سب سے پہلے ایک لاش کا منظر دیکھا۔ یہ اسی مردہ شخص کا جسم تھا جس کے تعاقب میں، میں اس طرف آیا تھا۔ میری متلاشی نگاہ قرب وجوار کا جائزہ لینے لگی مگر جن کی مجھے تلاش تھی وہ کہیں دکھائی نہ دیے۔

اس صورتِ حال نے میری الجھن کو بڑھا دیا۔ میں گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تاحدِ نگاہ چھوٹی بڑی چٹانوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دشمنوں کی ہلاکت اور خوفناک فائرنگ سے یہ تو ثابت تھا کہ میرے ساتھی آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ وہ کسی بڑی چٹان کی اوٹ میں ہوں گے۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور پلک جھپکتے میں، میں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنا ڈالا۔

میں نے لباس میں سے اپنا سیل نکالا اور پھر اس کے کی پیڈ پر کاشانوک کے نمبرز پنچ کرنے لگا۔ ان کی لوکیشن اور وقوع پذیری جاننے کے لیے یہی سیلولر وسیلہ اختیار کیا جاسکتا تھا۔ ڈائلنگ کی تکمیل پر دوسری جانب سے گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کاشانوک کا سیل ان تھا، بصورتِ دیگر رابطے کا یہ ذریعہ بھی جاتا رہتا۔ آٹھویں گھنٹی پر کال اٹینڈ کرلی گئی۔ میں نے اپنے سیل کے اسپیکر میں لی یان کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔ اس نے بڑے تشویش ناک انداز میں استفسار کیا۔

''ہاں، وجدان! تم کہاں ہو؟''

میں لی یان کی آواز چونک اٹھا کیوں کہ میری توقع کے مطابق کاشانوک کو کال اٹینڈ کرنا چاہیے تھی، پھر اس کی آواز میں شامل گھبراہٹ بھی مجھے گہری تشویش میں مبتلا کررہی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''یہی تو میں بھی جاننا چاہتا ہوں، تم لوگ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہے؟ میرے اندازے کے مطابق، ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ تم تینوں کہاں چھپے ہوئے ہو؟''

''تم ٹھیک کہتے ہو، ہم ایک دوسرے کے قریب ہی ہیں۔'' لی یان نے بتایا ''میں نے تمہیں نشیب میں اتر کر، اس طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ابھی ابھی جو فائرنگ ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے، تم نے کسی دشمن کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔ اوزی کی فائرنگ اپنی مخصوص آواز سے پہچانی جاتی ہے۔''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' میں نے تصدیقی لہجے میں کہا ''دشمنوں کے حوالے سے میں نے عقبی میدان صاف کردیا ہے۔ اب تم مجھے اپنی درست لوکیشن بتاؤ تاکہ میں تمہارے پاس پہنچ سکوں۔ ان خطرناک چٹانوں نے تو بہت مشکل میں ڈال رکھا ہے۔''

''اوکے!'' وہ سرسری انداز میں بولی پھر مجھے اپنے بارے میں بتانے لگی ''نشیب میں تمہیں بھورے رنگ کی ایک تکونی چٹان دکھائی دے رہی ہے؟'' اس کا انداز سوالیہ تھا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا۔ پچاس گز کے فاصلے پر وہ بھوری چٹان موجود تھی جس کا حوالہ لی یان نے دیا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ''ہاں، دکھائی دے رہی ہے!''

''ہم لوگ اسی چٹان کے عقب میں موجود ہیں۔'' لی یان نے بتایا۔

اچانک میری زبان سے پھسل گیا ''کاشانوک کہاں ہے؟''

''وہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہے۔'' وہ مبہم انداز میں بولی۔

''میری اس سے بات کراؤ!'' لی یان کے انداز نے مجھے نامعلوم سی تشویش میں مبتلا کردیا۔

''تم یہاں آتو جاؤ، پھر سب سے بات کرلینا!'' وہ ڈھکے چھپے لہجے میں بولی۔

''لی یان! تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی

ہو؟''

''کاشانوک شدید زخمی ہے۔'' اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اوکے! میں آرہا ہوں!'' یہ کہتے ہوئے میں نے سیلولر رابطہ منقطع کردیا۔

ٹھیک دس منٹ بعد میں مذکورہ بھوری چٹان کے عقب میں ان تینوں کے پاس موجود تھا۔ لی یان نے غلط نہیں کہا تھا، کاشانوک واقعی شدید زخمی تھا۔ اس کے پیٹ میں، گولیاں لگی تھیں۔ گھٹنوں کے مقامات سے بھی بدھ بھکشوؤں والا لباس سرخ ہورہا تھا، مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جن دو دشمنوں کی لاشوں کو میں نے دیکھا تھا، انہی میں سے کسی کی فائرنگ نے کاشانوک کو شدید زخمی کردیا تھا۔ وہ اس وقت مکمل بے ہوشی میں تھا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے فکرمندی سے استفسار کیا۔

''یہ...... یہ سب کیسے ہوا؟''

جواب میں لی جان نے مجھے جو کچھ بتایا اس نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔ میں نے کاشانوک کی حالت کے پیشِ نظر پوچھا ''یہ وہاں سے یہاں تک کیسے پہنچا ہے؟''

لی یان نے خاموشی سے تھاچو کی جانب اشارہ کردیا۔

میں نے چونک کر تھاچو کو دیکھا۔ اس کا لباس کندھے سے سرخ ہورہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ تھاچو نے کاشانوک کو اپنے کندھے پر اٹھا کر یہاں تک پہنچایا تھا۔ اس کی عمر کے پیشِ نظر یہ ایک بڑا کارنامہ تھا اور کیوں نہ ہوتا! تھاچو کا تعلق بہشتِ ارضی ''تبت'' سے تھا جہاں کے باسی طویل العمر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم الصحت بھی ہوتے ہیں۔

مجھ سے نگاہ ملی تو تھاچو نے مہربان انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں۔ ہمیں فوراً کوئی محفوظ پناہ گاہ تلاش کرلینا چاہیے۔''

کاشانوک نے تھاچو کے بارے میں مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں ان کے مطابق تھاچو کو تبتی اور چینی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ وہ گزارہ چلاؤ انگلش بھی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ ابھی اس نے مجھ سے جو کچھ کہا اس کے لیے اس نے انگلش کا سہارا لیا مگر چینی لب ولہجے میں۔ اس کی تشویش بجا تھی، میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

''یہاں آس پاس ہمیں کوئی محفوظ پناہ گاہ کہاں مل سکتی ہے؟''

لی یان نے کہا ''وجدان! جو بھی کرنا ہے، جلدی کرو۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔'' اس کا اشارہ کاشانوک کی جانب تھا جسے پتھریلی ڈھلوان پر لٹا دیا گیا تھا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں گردن ہلائی پھر تھاچو کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''ہم اس وقت ایک محفوظ چٹان کی آڑ میں کھڑے ہیں لیکن ہمیشہ یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔'' اگر اسی آڑ میں ہم چٹان کے ساتھ ساتھ بڑھتے جائیں تو ممکن ہے، کوئی پناہ گاہ نظر آجائے۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہمارے عقب میں کافی دیر سے خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، کوئی اور دشمن ہمارے تعاقب میں اس طرف نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہمیں تلاش کیا جائے، ہمیں کہیں پناہ گزیں ہوجانا چاہیے۔''

بات ختم کرتے ہی اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا جیسے مذکورہ ہیلی کاپٹر کو تلاش کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ میں نے بے سدھ پڑے گھائل کاشانوک کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے! اب میں اسے اپنے کندھے پر اٹھاؤں گا۔''

تھاچو نے میرے شانے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور بولا ''میں اتنا بھی ضعیف اور کمزور نہیں ہوں جتنا دکھائی دیتا ہوں۔ یہ کام تم میرے لیے ہی رہنے دو۔ ویسے بھی میرا لباس کو آلودہ ہو ہی چکا ہے، تم کیوں خواہ مخواہ اپنے لباس کو داغ دار کرتے ہو!''

تھاچو کی آنکھوں میں ایسی مہربان ہمدردی تھی کہ میں اس سلسلے میں کوئی مزاحمت نہ کرسکا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بے ہوش کاشانوک کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

''ایک منٹ...... آپ لوگ یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔''

ان دونوں نے یکے بعد دیگرے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا لیکن کوئی استفسار نہ کیا۔ میں اپنے فوری خیال کی تکمیل کے لیے چٹان کے عقب میں پہنچ گیا۔ وہاں ہمارے ایک دشمن کی لاش پڑی تھی۔ ایسے ہی دو دشمنوں کی لاشیں دوسری جانب بھی بے گور وکفن کھلے آسمان کے نیچے پڑی تھیں جن

میں سے ایک بد بخت میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا۔ میں نے بجلی ایسی سرعت کے ساتھ ان لاشوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ان میں سے دو کے لباس ایسے تھے کہ انہیں دوبارہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔

میں نے تھوڑی سی کوشش کر کے آناً فاناً..... مذکورہ لباس ''حاصل'' کر لیے۔ ہم اپنے ساتھ پوٹلیوں کی صورت میں، کٹھمنڈو سے جو سامان لے کر چلے تھے اس میں دیگر ضروری اشیا کے علاوہ ہمارے فاضل لباس بھی تھے۔ اپنے دشمنوں کا لباس میں نے اس لیے بھی حاصل کر لیا کہ بہ وقتِ ضرورت دشمن کو دھوکا دیا جا سکے۔

میں واپس لی یان اور تھاچو کے پاس پہنچا تو وہ میرے ہاتھوں میں دشمنوں کے لباس کو دیکھ کر صورتِ حال کی تہ میں پہنچ گئے۔ کسی سوال و جواب کے بغیر ہم نے خاموشی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا، اس طرح کہ بے سدھ کاشانوک ایک مرتبہ پھر تھاچو کے کندھے پر لدا ہوا تھا۔ میں سب سے پیچھے چل رہا تھا۔ لی یان آگے تھی جبکہ تھاچو، کاشانوک کو اٹھائے ہوئے ہمارے بیچ میں تھا۔ میں چوکنا انداز میں قدم بڑھاتے ہوئے پیش آمدہ صورتِ حال پر بھی غور کر رہا تھا۔

ہمارا سفر کھوٹا کرنے کی تمام تر ذمے داری شرما کے سر جاتی تھی۔ میں نے سندری جل کی پہاڑیوں میں نقلی بدھ بھکشو نارائن کی ٹھکائی کر کے اس کی زبان سے ان کے باس شرما کا نام اگلوا لیا تھا پھر جب میں نے کاشانوک سے شرما کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے تصدیق کر دی کہ وہ شرما نامی اس شخص کو بہ خوبی جانتا ہے۔ میں شرما کے حوالے سے بہت متجسس تھا۔ سوچا تھا، ذرا سکون ہو تو کاشانوک سے اس نئے دشمن کے بارے میں تفصیل معلوم کروں گا لیکن اس کا موقع نہ مل سکا۔ سندری جل سے روانہ ہوتے وقت ہم جس افراتفری کا شکار رہے وہ آگے چل کر ہنگامہ خیزی میں بدل گئی اور مجھے کاشانوک سے بات کرنے کی مہلت میسر نہ آ سکی اور اب..... کاشانوک اس حالت میں تھا کہ فی الحال اس سے کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔

میں کاشانوک کی طرف سے گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ میری تجربہ کار نگاہ نے اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا، خصوصاً اس کے پیٹ میں لگنے والی گولیاں کوئی بھی بے موسم گل کھلا سکتی تھیں۔ تھاچو نے سیلانِ خون روکنے کے لیے اس کے پیٹ پر ایک کپڑا کس کر باندھ دیا تھا لیکن میرے خیال میں اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی جو اس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک ہم کسی پُرسکون اور محفوظ مقام پر ٹھہر نہ جاتے۔

دوپہر رفتہ رفتہ ڈھل رہی تھی۔ بلند و بالا پہاڑی علاقوں میں دوپہر ڈھلنے کا مطلب ہوتا ہے، شام بلکہ رات کی آمد۔ سورج اگر طلوع ہو جائے تو چار پانچ گھنٹوں سے زیادہ درشن نہیں دیتا۔ اس کی چمک اور خوش گوار رومانٹک تپش جلد ہی سایہ دار برفیلی فضا میں سر ڈال دیتی ہے۔ میدانی علاقے کی بہ نسبت پہاڑی علاقے کی شامیں اور شامیں زیادہ فعال و چنچل ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہمیں کسی محفوظ جگہ ٹھہرنا تھا ورنہ روشنی کی کمی اور سردی کی زیادتی اس پہاڑی سلسلے کو ہمارے لیے سرد جہنم میں بدل دیتی!

اس وقت ہم جس رخ پر سفر کر رہے تھے وہاں سے ساگر ماتا (ماؤنٹ ایورسٹ) دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک طرح سے ہم اس طویل چٹان کی آغوش میں آگے بڑھ رہے تھے۔ ہم سطح سمندر سے ہزاروں فٹ کی بلندی پر گامزن تھے اور اس بلندی میں دھیرے دھیرے اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

اچانک ہم تینوں چونک اٹھے اور اس چونکنے کا سبب وہ مخصوص آواز تھی جو ہماری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بے ساختہ ہماری نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ ہماری نظروں کو کسی ہیلی کاپٹر کی تلاش تھی جو فوری طور پر ہمیں کہیں دکھائی نہ دیا۔ ہماری تشویشناک نگاہیں واپس پلٹیں اور ایک دوسرے کے چہرے کو سوالیہ انداز سے گھورنے لگیں۔ اس وقت ہم تینوں کے ذہنوں میں ایک جیسے خیالات تھے یعنی ...... شرما ہیلی کاپٹر کی مدد سے ہمیں تلاش کرنے اس طرف آ رہا ہے!

یہ بڑی ہنگامہ خیز صورتِ حال تھی۔ ہیلی کاپٹر میں سوار دشمنوں کو بہرحال، یہ ایڈوانٹیج حاصل تھا کہ بلندی پر ہونے کے باعث وہ بہ نسبت زیادہ آسانی سے ہمیں شکار کر سکتے تھے۔ لی یان نے متوحش لہجے میں کہا۔

''وجدان! وہ ہماری تلاش میں ادھر آ رہے ہیں۔''

''آنے دو۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''ہمیں فوری طور پر کہیں چھپ جانا چاہیے!'' اس کی تجویز میں خوف کی جھلک شامل تھی ''تم لوگ رک کیوں گئے ہو، آگے بڑھو۔''

''کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔'' تھاچو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میرا خیال ہے، ہم ایک محفوظ پناہ گاہ سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

بات ختم کرتے ہی وہ چٹان کے سائے سے نکل کر

بلندی کی طرف قدم بڑھانے لگا۔ میں نے اور لی یان نے سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تھاچو کا رویہ ہماری سمجھ سے باہر تھا۔ پتا نہیں، وہ ہمیں کہاں لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی پیروی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لہٰذا ہم بھی اس کی تقلید میں اوپر چڑھنے لگے۔ یہ پیش قدمی ایسی ہی تھی جیسے ہم کسی عمودی دیوار پر چڑھ رہے ہوں۔ تھاچو کے اطمینان اور توازن کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ بڑے اعتماد اور ثابت قدمی سے آگے بڑھ رہا تھا حالاں کہ اس نے اپنے کندھے پر کاشانوک کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

دس منٹ کے بعد یہ تھکا اور ہانپا دینے والا سفر اختتام پذیر ہوا اور تھاچو ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ میری اور لی یان کی سانس بری طرح پھول گئی تھی۔ اس وقت ہمارے سینوں کا زیر و بم کسی لوہار کی دھونکنی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس ''ایکسر سائز'' کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ موسم کی شدت کی کمر ٹوٹ گئی۔ پسینے میں نہائے ہوئے ہمارے بدن، فضا میں رچی بسی ٹھنڈک کا بڑا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا، یہ عارضی اطمینان ہے۔ اگر ہم چند منٹ تک یونہی کھلے میں کھڑے رہے تو ہماری قلفی جم جائے گی۔

تھاچو قدم قدم پر مجھے حیران کر رہا تھا۔ وہ عمر میں ہم سے کم از کم تین گنا ہوگا لیکن اس جبری مشقت سے اس کی سانس پھولی تھی اور نہ ہی چہرے پر تھکن کے آثار دکھائی دیتے تھے۔ میری جانب انگلی اٹھاتے ہوئے اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وجدان! اس پتھر کو تم ہٹاؤ گے ...... جلدی!''

''کون سا پتھر؟'' میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔

''یہ!'' اس نے پہاڑی کو چھوا۔

اس کی گہری سنجیدگی دیکھتے ہوئے میں نے بہ غور اس مقام کا جائزہ لیا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا اور اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ وہ پتھر میری نگاہ میں آ گیا جس کو ہٹانے کی بات تھاچو کر رہا تھا۔ بادی النظر میں وہ پتھر اس طویل القامت پہاڑ کا حصہ ہی دکھائی دیتا تھا جس کے سائے میں اس وقت ہم کھڑے تھے، اسی لیے میں پہلے اس پتھر کو جج نہیں کر سکا تھا۔ وہ دو ضرب تین فٹ کا ایک مستطیل پتھر تھا جو کسی دروازے کی صورت اس پہاڑ میں ''نصب'' تھا۔

تھاچو کا اعتماد اور لہجے کا ٹھہراؤ یہی ظاہر کرتا تھا، وہ اس پتھر کے پیچھے کسی محفوظ پناہ گاہ کے بارے میں پُریقین ہے۔ اس کے یقین کا سبب کیا تھا؟ وہ کس سراغ کا سرا پکڑ کر یہاں تک آیا تھا؟ اس قسم کے سوالات پوچھنے کا موقع نہیں تھا کیوں

کہ ہیلی کاپٹر کی آواز میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کا مطلب تھا، وہ لوگ ہمارے قریب تر پہنچ رہے تھے۔ ان لمحات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ پہلے خود کو محفوظ کیا جاتا، باقی مسائل پر بعد میں بھی غور کیا جا سکتا تھا۔

اس دوران تھاچو نے ایک لمحے کے لیے بھی کاشانوک کو اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز سے یوں معلوم ہوتا تھا، وہ آنِ واحد میں نمودار ہوگا اور ہم پر گولیاں برسانا شروع کر دے گا۔ میں اردگرد کے ماحول کو نظر انداز کر کے اس پتھر کی جانب متوجہ ہو گیا جو اس پہاڑی میں دروازے کا کردار ادا کر رہا تھا...... ایک جادوئی خفیہ دروازہ!

وہ پتھر دروازہ اس انداز میں پہاڑ کا حصہ بنا ہوا تھا کہ اسے کھینچ کر باہر کی جانب ''کھولنا'' ممکن نہیں تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ اس پتھر کو اندر کی طرف دھکیل دوں۔ میں مذکورہ پتھر کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اگرچہ اس پہاڑ کے مقابلے میں ایک ذرے کی حیثیت کا حامل تھا لیکن اس کا وزن منوں میں تھا۔ میں جس طریقۂ کار کے سہارے اسے دھکیلنے والا تھا اس میں وزن بے اہمیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس مخصوص طریقۂ کار کو بارہا آزما کر میں فائدہ اٹھا چکا تھا۔

میں نے ہارس اسٹانس اپنایا اور بازوؤں کی مخصوص حرکات کے ساتھ اپنے سینے کو صاف و شفاف ہوا سے بھر لیا۔ اب میرے ہاتھ پہلوؤں میں ٹکے ہوئے تھے۔ اگلے ہی لمحے میں نے سانس خارج کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو پتھر کی سمت کھول دیا۔ یہ بریدنگ کا ایک مخصوص انداز ہے جس میں اگر، چی کی قوت بھی شامل کر لی جائے تو اس کی اثر پذیری میں حیرت انگیز اضافہ ہو جاتا ہے...... اور مجھے یہی کرنا تھا!

میں نے دو تین مرتبہ اسی انداز میں، انہیل اور ایگزہیل کر کے چی کی قوت کو اپنے ہاتھوں میں مرتکز کیا پھر ایک ایگزہیل کے ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کا حتمی پش پتھر پر آزمایا۔ یہ پش نتیجہ خیز ثابت ہوا اور وہ پتھر اپنی جگہ سے سرک کر اندر کو ہو گیا۔ میں نے داخلے کا راستہ بنانے کے لیے پتھر پر ایک اور بھرپور پش آزمایا اور پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

لی یان حیرت اور دل چسپی کے ملے جلے تاثرات سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی اسی نوعیت کا کارنامہ انجام دیتے ہوئے مجھے دیکھ چکی تھی، جب ہم دونوں ڈاکٹر مونگ ریفوشے کے ساتھ کٹھمنڈو سے بدھ نیل کنڈ والی

عبادت گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں، میں نے اس سے بھی بڑے ایک پتھر کو سڑک سے ہٹایا تھا۔ میری نگاہ لی یان کے چہرے سے ہو کر تھاچو کی طرف ٹلی گئی۔ اس کے چہرے پر مجھے گہری سنجیدگی نظر آئی۔ مجھ سے آنکھ ملی تو اس نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''وجدان! باہر کھڑے ہو کر وقت برباد نہ کرو۔ فوراً اندر چلے جاؤ!''

اور ہم دونوں فی الفور اندر چلے گئے۔

ازاں بعد، تھاچو ہماری مدد سے کاشانوک کو لے کر اندر آ گیا۔ پھر تھاچو ہی کی ہدایت پر میں نے اس پتھر کو دھکیل کر داخلی راستے پر ''فٹ'' کر دیا۔ اب باہر سے دیکھنے والے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے مطلوبہ افراد اس پہاڑ کے اندر بند ہیں!

پہاڑ کے اندر نیم تاریکی کا راج تھا۔ میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم اس وقت کتنی لمبی چوڑی کھوہ میں موجود ہیں۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی ایک غار ہی غار دکھائی دیتا تھا۔ وہ نیم تاریکی بہ الفاظِ دیگر ملگجا اجالا یہ ظاہر کرتا تھا کہ دور...... کہیں اس غار کا کوئی حصہ فضا میں کھلا ہوا ہے جہاں سے یہ روشنی داخل ہو کر یہاں تک پہنچ رہی ہے۔ باہر کی نسبت اندر کا موسم خاصا خوش گوار تھا۔ اس غار میں پائی جانے والی خنکی کو بہ آسانی برداشت کیا جا سکتا تھا۔ اندر پہنچنے کے بعد پہلا جملہ لی یان کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے سرسراتی آواز میں بولی۔

''وجدان! کاشانوک کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے!''

لی یان کی تشویش میں شدت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ نرسنگ کے پیشے سے بھی وابستہ تھی اپنے ایک قریبی ساتھی کو زخموں سے چور دیکھ کر اس کی پیشہ ورانہ تمام تر حسیات یک بہ یک بیدار ہو گئی تھیں۔ کاشانوک کے لیے میں بھی بہت فکرمند تھا۔ وہ ایک طرح سے ہمارا راہ نما تھا۔ اسے شدید زخمی حالت میں دیکھ کر پریشان ہونا ایک فطری بات تھی، میں نے اضطراری انداز میں تھاچو کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''ہم ہنگامی بنیادوں پر کاشانوک کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

اس غار میں محض اتنا اجالا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ہیولوں کی صورت دیکھ سکتے تھے۔ تھاچو نے میری جانب رخ پھیرتے ہوئے جواب دیا ''میں اسی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، لارڈ بدھا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ہم دونوں خاموش رہ کر تھاچو کی حرکات کا ''جائزہ'' لینے لگے۔

اس نے اپنی پوٹلی میں سے ایک ٹارچ نکالی.... اور اسے روشن کر کے غار کی سنگلاخ دیواروں کا جائزہ لینے لگا۔ پہاڑ سے باہر چوں کہ دن کا سماں تھا اس لیے ٹارچ کی روشنی کو ادھر دیکھ لیے جانے کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ جلد ہی تھاچو کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ ایک دیوار پر مشعل سے مشابہ کسی شے کو پیوست دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس مشعل کو روشن کر چکا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی وہ جانوروں کی چربی کے بل بوتے پر جلنے والی ایک مشعل تھی۔ غار میں مناسب روشنی پھیلی تو ہم ایک دوسرے کو واضح طور پر دیکھنے کے قابل ہو گئے۔

لی یان نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے دشمن اس روشنی کی طرف متوجہ ہو کر ادھر تو نہیں آ جائیں گے؟''

تھاچو نے تسلی آمیز لہجے میں جواب دیا ''فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، یہ روشنی باہر سے دکھائی نہیں دے گی۔''

''کیا تم پہلے بھی اس غار میں آ چکے ہو؟'' لی یان کے لہجے میں بے پناہ تجسس تھا۔

تھاچو نے قطعیت سے کہا ''نہیں!''

''پھر تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟''

''اپنے تجربے کی بنا پر'' اس کے جواب دیا۔

لی یان سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔ تھاچو اپنے ہاتھوں کو پوٹلی کے ساتھ مصروف رکھتے ہوئے بولا ''ہم بدھ بھکشو انہی پہاڑی علاقوں میں سفر کرتے رہتے ہیں اور ہمیں مختلف غاروں میں قیام بھی کرنا پڑتا ہے۔ میں کسی بھی غار کی بناوٹ دیکھ کر فوراً اس کے بارے میں اندازہ قائم کر لیتا ہوں۔''

اس کے آخری جملے نے میرے ذہن میں سوال پیدا کیا۔ میں نے اس سے پوچھا ''اس پہاڑی غار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں بتا چکا ہوں نا، یہاں ہونے والی روشنی کو باہر سے دیکھا نہیں جا سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''جب تم پہلے کبھی اس غار میں نہیں آئے تو پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اس پتھر کے پیچھے ہمیں چھپنے کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ میسر آ سکتی ہے؟''

ذہین آدمی سوچتا ہے اور سوچنے والے افراد کے ذہنوں

میں سوالات ضرور ابھرتے ہیں۔ ان نازک لمحات میں میرا اور لی یان کا ذہن ایک کے بعد ایک سوال اٹھا رہا تھا۔ تھاچو نے پوٹلی نما اس تھیلے میں سے ایک چھوٹا سا باکس برآمد کیا اور میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''دراصل، بات یہ ہے کہ میں نے نیچے کسی پہاڑی جانور کا فضلہ پڑا دیکھا تھا۔ میری تجربہ کار نگاہوں نے فوراً اندازہ قائم کر لیا کہ چرواہوں کو یہاں آس پاس ہی کہیں قیام کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے ان آثار کو ایک سراغ جانا پھر میں اسی سراغ کے سہارے چلتے ہوئے اس غار کے سامنے آ پہنچا۔ تمہارا کہنا درست ہے کہ پہاڑ کو باہر سے دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ ایک مخصوص پتھر کو ہٹانے کے بعد کسی محفوظ غار کا راستہ کھل جائے گا۔'' وہ ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''بس یہی سمجھو کہ یہ بھی میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کے طفیل جان لیا تھا۔ شاید تم نے غور نہیں کیا کہ وہ فضلہ ایک خاص مقام پر ناپید ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں آس پاس پڑاؤ کی کوئی محفوظ جگہ موجود ہے۔ بہرحال!'' وہ سانس لینے کو رکا پھر بولا ''یہ باتیں ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں!'' اس کا انداز جان چھڑانے اور کنّی کاٹنے والا تھا۔

لی یان نے اس پہاڑی غار کے دور دراز حصے کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے پوچھا ''اس طرف کچھ روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ تمہارا تجربہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ کیا ادھر سے بھی اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ موجود ہو گا؟''

''ایسا ہو سکتا ہے!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''تم لوگ ایسا کرو، جب تک میں اس طرف مصروف ہوں، تم ادھر کا جائزہ لے کر آ جاؤ۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہو جائے گا، ہماری یہ پناہ گاہ کس قدر طویل و عریض ہے!''

میں اس کا مشورہ سن کر چونک اٹھا۔ مجھے حیرت اس کی تجویز پر نہیں تھی بلکہ اس نے اپنی مصروفیت کا جو تذکرہ کیا تھا اس نے مجھے الجھا دیا تھا۔ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تھاچو! تم ہمیں ادھر بھیج کر یہاں کس کام میں مصروف ہونا چاہتے ہو؟''

''میں کاشانوک کو دیکھوں گا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''اس کا فوری آپریشن بہت ضروری ہے۔''

''آپریشن؟'' میں نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔

وہ گمبھیر انداز میں بولا ''کاشانوک کی حالت فی الحال خطرے سے باہر نہیں ہے۔ اگر اس کے جسم سے گولیاں باہر نہیں نکالی گئیں تو پیٹ کے اندر زہر پھیلنے کا اندیشہ ہے، پھر اس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔''

وہ ایک سفاک حقیقت بیان کر رہا تھا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس طرح سے کاشانوک کا آپریشن کرے گا؟ ہم اس وقت کسی پرائیویٹ اسپتال میں نہیں بلکہ میڈیکل کی سہولیات سے میلوں دور ایک پہاڑی غار میں پناہ گزیں تھے۔ لی یان نے شاید میرا دماغ پڑھ لیا۔ اس نے تھاچو سے، میری سوچ میں ابھرنے والا سوال پوچھ لیا۔

''آپریشن کر کے پیٹ کے اندر پیوست گولیاں نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھاچو!'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی ''تم بہت بڑا رسک لینے جا رہے ہو!''

''میں جانتا ہوں، آپریشن بچوں کا کھیل نہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا ''شاید تم تبتی طب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہو۔ تبتی طب میں علاج کے چار طریقے مروج ہیں۔ نمبر ایک، خوراک کے ذریعے علاج۔ نمبر دو، ادویات کے ذریعے علاج۔ نمبر تین، حرارت کے ذریعے علاج، اور نمبر چار، جراحت کے ذریعے علاج۔ یہ آخری طریقۂ علاج انتہائی ناگزیر حالت میں اپنایا جاتا ہے اور میں......'' وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے باکس کو کھولنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا ''اور میں اس وقت کاشانوک کی جراحت پر مجبور ہوں۔ آپریشن کے سوا اس کی زندگی بچانے کا اور کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا!''

ہم حیران و پریشان کھڑے یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے، وہ اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا ''جہاں تک رسک لینے کا تعلق ہے تو اس وقت کاشانوک کی زندگی انتہائی رسک پر ہے۔ ''لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے'' کے مصداق، یہ رسک لینا ہی ہو گا۔ تم دونوں بے فکر ہو کر غار کے دوسرے حصوں کا جائزہ لو۔ میں اپنا کام خوش اسلوبی سے کر لوں گا۔ اگر لارڈ بدھا کو اس کی زندگی منظور ہے تو کاشانوک کو کچھ بھی نہیں ہو گا!''

بدھ مت، ہندو مت کے بہت قریب ہے۔ بدھ مت میں آخرت کا کوئی تصور نہیں۔ یہ انسانی اعمال کو مستقبل کی بنیاد گردانتا ہے۔ یعنی ہر عمل کا ایک ردِعمل۔ نیکی کے بدلے نیکی اور برائی کے بدلے برائی۔ اس مذہب کے پیروکار خدا جیسی کسی ماورائی ہستی پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہندوؤں کی طرح آواگون کے عقیدے کو اپنی زندگی کی اساس سمجھتے ہیں، یعنی انسان مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے، پھر مرتا ہے، پھر پیدا ہوتا ہے۔ ایک نیک انسان اگلے جنم میں بھی انسان ہی رہے گا

جب کہ ایک برا انسان اگلے جنم میں کسی جانور یا شیطان کے روپ میں بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ بہرحال، میں نے تھاچو سے آواگون کے عقیدے میں الجھنا مناسب نہ سمجھا اور لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے ایک تجویز پیش کی۔

''یہ میڈیکل کے شعبے سے وابستہ رہی ہے۔ اس نے نرسنگ کورس کر رکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں، یہ تمہاری مدد کے لیے یہاں رک جائے!''

''اس کی ضرورت نہیں!'' وہ بغور لی یان کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ''تمہاری ترقی یافتہ دنیا کی جدید میڈیکل سائنس یہاں کام نہیں آئے گی۔ تم دونوں بےفکر ہو کر جاؤ۔ میں اپنے کام کو کسی کی مدد کے بغیر بھی کرلوں گا۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا، وہ اپنے طریقۂ کار کو ہمارے سامنے نہیں لانا چاہتا جیسے کہ حکیم لوگ اپنے نسخہ جات کو دوسروں سے چھپا کر رکھتے ہیں اور اکثر تو یہ رازہائے بیش بہا اپنے سینے میں لے کر مٹی میں اتر جاتے ہیں۔ یہ میرا ایک خیال تھا۔ ممکن ہے، تھاچو کسی اور مصلحت کی بنا پر ہمیں وہاں سے دور رکھنا چاہتا ہوں! میں نے تبتی لاماؤں، ان کی پُراسرار صلاحیتوں اور ناقابلِ یقین تحیر آمیز چمتکاروں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ اور سن رکھا تھا۔ موجودہ حالات بتاتے تھے، اب دیکھنے کی باری ہے!

میں نے لی یان کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں تھاچو ہمیں نظرانداز کرکے مکمل یکسوئی کے ساتھ کاشانوک کی جانب متوجہ ہوچکا تھا۔ اس کے ہاتھ چھوٹے سے باکس کے ساتھ اس طرح مصروفِ عمل تھے جیسے اس کے سوا اس غار میں اور کوئی وجود نہ ہو۔ وہ ہمیں یکسر فراموش کرچکا تھا۔

لی یان نے میرا اشارہ سمجھ لیا اور ہم کاشانوک کو تھاچو کے رحم و کرم پر، غار کے پتھریلے ''فرش'' پر چت، بےہوش پڑے چھوڑ کر خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ تھوڑی دور آنے کے بعد لی یان نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''وجدان! وہ کاشانوک کے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟''

''اس نے بتایا تو ہے آپریشن کرے گا۔'' میں نے کہا۔

''آپریشن!'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''میری...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا......''

اس نے الجھن زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے اس کے شانے پر اپنا بازو دراز کرکے اسے اپنے قریب کرلیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا ''تم خوامخواہ اپنی سمجھ کو نہ تھکاؤ۔ تھاچو نے یقین دلایا ہے نا' وہ اپنا کام اچھی طرح کرنا جانتا ہے۔ ہمیں اس پر بھروسا رکھنا چاہیے۔''

''لیکن......!''

وہ اپنی ذہنی پراگندگی کو واضح کرنے کے لیے کوئی سوال اٹھانا چاہتی تھی کہ یک لخت خاموش ہوگئی۔ میں بھی چونک کر غار کے آخری سرے کی جانب دیکھنے لگا۔ ہمارے ٹھٹکنے کا سبب فائرنگ کی آواز تھی۔ ہم نے استعجابیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

بادی النظر میں یہی محسوس ہوا جیسے وہ آواز غار کے اندر پیدا ہوئی ہو لیکن اگلے ہی لمحے ہماری غلط فہمی دور ہوگئی۔ فائرنگ کی مخصوص آواز ایک مرتبہ پھر گونجی تھی اور اس کے ساتھ ہی ہیلی کاپٹر کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ یقیناً یہ فائرنگ اسی ہیلی کاپٹر سے کی جارہی تھی جو ہماری کھوج میں اس سلسلۂ کوہسار میں چکراتا پھر رہا تھا۔ دراصل ہم باتیں کرتے ہوئے کافی آگے غار کے اس حصے میں نکل آئے تھے جہاں کا کوئی حصہ کھلا ہوا تھا' اسی سبب پہاڑی کے باہر کی آوازیں اندر پہنچ رہی تھیں۔

ہم تھوڑی دیر تک چوکنا کھڑے اپنی سماعت کے بل پر پہاڑی کے باہر ہونے والی ''نقل و حمل'' کی آوازیں سننے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن اس کے بعد فائرنگ کی آواز سنائی نہ دی۔ ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز بھی معدوم ہوتے ہوئے ناپید ہوگئی۔

لی یان نے کہا ''وہ ہماری تلاش میں ناکام ہوکر کہیں اور نکل گئے ہیں۔''

''میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

''تھینکس گاڈ! ہمیں بروقت چھپنے کے لیے یہ جگہ مل گئی۔''

''اللہ ہر حال میں اپنے بندوں کا خیال رکھتا ہے!''

''کیا خیال ہے' واپس چلیں؟'' وہ بولی۔

''آگے چلتے ہیں!'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں' یہ غار کتنا طویل ہے!'' وہ متذبذب لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ''یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔''

وہ میرے ساتھ ہولی۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس غار میں کسی قسم کی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا تھا یعنی ہمیں سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں ہورہی تھی۔ غار کی اندرونی فضا میں آکسیجن کا مناسب تناسب موجود تھا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے لیکن وہ غار کسی بھی طور ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا' یوں محسوس ہوتا تھا' ہم شیطان کی آنت کے اندر محو سفر ہوں!

ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے' غار کی چوڑائی کم سے کم تر ہوتی جارہی تھی البتہ' روشنی اور تازگی میں اضافہ ہورہا تھا۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوتا تھا' ہم اس غار کے کسی کھلے ہوئے حصے کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ وہ حصہ کب ہماری نگاہوں میں آئے گا اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

اچانک مجھے اپنی ران پر' وائبریٹر کی مخصوص تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ میری جینز کی جیب میں موجود سیل پر کسی کی کال آرہی تھی۔ کاشانوک اس حالت میں نہیں تھا کہ مجھ سے رابطہ کرتا۔ یہ کسی اور کا فون تھا۔ میری جیب میں اس وقت دو موبائل فونز موجود تھے اور کوچ سے روانہ ہوتے وقت اپنے سیل کی طرح میں نے سوریا کے سیل کی جملہ گھنٹیاں آف کردی تھیں۔ اب دونوں سیل سائیلنٹ الرٹ پر سیٹ تھے۔ میں نے لی یان کو رکنے کا اشارہ کرکے سیل کو جیب میں سے باہر نکال لیا۔

یہ سوریا والا سیل تھا۔ میں نے یس کا بٹن پریس کرنے کے بعد سیل کو کان سے لگالیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ہیلو۔''

''ہیلو...... تم کون ہو؟'' بھاری بھرکم آواز میں استفسار کیا گیا۔

میں نے پورے اعتماد سے کہا ''شرما! میں تمہارا باپ بات کررہا ہوں۔''

اس تحکمانہ آواز کو میں پہلے بھی سن چکا تھا اور مجھے یقین تھا وہ شرما ہی ہوگا۔

دوسری طرف ایک لمحے کا توقف آیا' پھر اس شخص نے کہا ''وجدان! تم مجھ سے چھپ نہیں سکتے۔''

''پتا نہیں' تم کس وجدان کا ذکر کررہے ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''حالانکہ میں تھوڑی دیر پہلے اپنا تعارف کرواچکا ہوں۔ تم کیسی ناخلف اولاد ہو کہ اپنے باپ کو بھی نہیں پہچانتے؟''

وہ غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے پھنکارا ''وجدان! تم پہلے سوریا بن کر مجھے بےوقوف بناچکے ہو۔ اب میں تمہارے کسی چکر میں نہیں آؤں گا۔ تم چاہے کسی بھی بل میں گھس کر بیٹھ جاؤ' میں تمہیں دُم سے پکڑ کر باہر کھینچ لوں گا۔''

''تم صرف ناخلف ہی نہیں بلکہ کسی بدبخت کی اولاد مشکوکہ ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا ''میں خوامخواہ تمہاری سرپرستی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تم فوری طور پر اپنے برتھ سرٹیفکیٹ میں' ولدیت کے خانے کے اندراج میں درستی کرلو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں شرما!''

''اگر تم میرے نام سے واقف ہوگئے ہو تو یہ بھی جان چکے ہوگے کہ میں اپنے دشمنوں کا قبر تک پیچھا کرتا ہوں وجدان!'' وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا ''اگر بدترین موت سے بچنا چاہتے ہو تو خود کو میرے حوالے کردو۔''

وہ اس بات کے لیے کنفرم تھا کہ میں وجدان ہی ہوں۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا ''شرما! اول تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ تم اچانک بیٹھے بٹھائے میرے دشمن کیوں ہوگئے ہو۔'' میں نے ایک لمحے کا توقف کرکے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''میں تم سے یہ سوال اس لیے نہیں کروں گا کہ مجھے پورا یقین ہے' تم اس کا جواب نہیں دو گے اس لیے......''

''میں نے تمہاری فضول باتیں سننے کے لیے فون نہیں کیا!'' قطع کلامی کرتے ہوئے وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے نمک پاشی کرتے ہوئے اس سے پوچھا ''تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتے ہو شرما؟''

وہ بےساختہ پوچھ بیٹھا ''تم اس وقت کہاں چھپے ہوئے ہو؟''

''میں کھٹمنڈو میں ہوں۔'' میں نے سادگی سے اسے چکر دینے کی کوشش کی ''اور اس میں چھپنے چھپانے والا کوئی چکر نہیں شرما! میں اس وقت رتنا پارک کے ایک بنگلے کے لان میں ایزی چیئر پر بیٹھا آج کے رخصت ہوتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کی رومانی حرارت کو اپنے بدن میں جذب کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔''

میرے اس پیچ در پیچ الجھے ہوئے جواب نے اسے سٹپٹاہٹ میں مبتلا کردیا' جھلا کر بولا ''تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو وجدان!''

''میری بات کا یقین نہیں تو یہاں آکر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔'' میں نے اس کی برہمی میں لگ بھگ سولہ چاند ٹانکتے ہوئے کہا ''اور اگر واقعی رتنا پارک آنے کا موڈ ہے تو شام چار بجے سے پہلے پہنچ جانا ورنہ مجھ سے ملاقات نہیں

ہو سکے گی۔"

میرے اس داؤ نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ سوچ سمجھے بغیر وہ بے تابی سے پوچھ بیٹھا "کیوں' چار بجے کے بعد تم کہاں جانے والے ہو؟"

میں نے ایک فوری خیال کے تحت کہہ دیا "ٹھیک پانچ بجے شام میں کھٹمنڈو سے شنگھائی جا رہا ہوں۔ مجھے "تری بھون" ائر پورٹ سے "سی اے اے سی" کی فلائٹ پکڑنا ہے اور......"

"بکواس بند کرو۔" وہ ایک مرتبہ پھر میری بات کاٹتے ہوئے بولا "اگر تم ادھر کھٹمنڈو میں بیٹھے ہو تو پھر ادھر سندری جل کی پہاڑیوں میں کس نے تہلکہ مچا رکھا ہے؟"

"میرے نومولود' شیر خوار دشمن!" میں نے مذاق اڑانے والے رنگ میں کہا "جن لوگوں نے مجھے پکڑنے کے لیے' تمہیں اس کارِ بے کار پر مامور کیا ہے' شاید انہوں نے میرا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔" میں نے لحاتی توقف کے بعد سنسنی خیز لہجے میں کہا "چلو' کوئی بات نہیں۔ میں بتا دیتا ہوں۔ برخوردار شرما! دراصل میں بلیک میجک جانتا ہوں۔ یہاں کھٹمنڈو میں بیٹھ کر میں دنیا کے کسی بھی حصے میں ایسے کھیل تماشے پیش کر سکتا ہوں۔ اگر یقین نہیں آ رہا تو بارائن' مکل آنند اور سوریا داس کا حشر دیکھ لو۔ ان کے علاوہ اپنے پانچ ان چمچوں کی خوں چکاں لاشیں بھی ملاحظہ کر لو جو سندری جل کی پہاڑیوں میں موت کو گلے لگائے چین کی بنسی بجا رہے ہیں۔"

ایک لمحے کے سکوت کے بعد اس کی تشویش میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی "لیکن...... سوریا داس کا سیل تمہارے پاس کیسے پہنچ گیا؟"

"بتایا ہے نا' میں بلیک میجک جانتا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "جادو کے زور پر میں اپنے دشمنوں کو ننگی کا ناچ نچاتا رہتا ہوں۔ تم سے نیا نیا رشتہ مخالفت استوار ہوا ہے۔ کہو تو ایک چھوٹا سا آئٹم پیش کروں؟"

میں نے مبہم الفاظ میں اپنے خطرناک عزائم کا اظہار کیا تو وہ ہراساں لہجے میں پوچھ بیٹھا "تت...... تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"کچھ نہیں' بس چھوٹا سا آئٹم۔ میری طرف سے اس دشمنی کا براہ راست پہلا تحفہ!" میں نے اس کے خوف میں اضافہ کرنے کی غرض سے الجھن زدہ انداز جاری رکھا "اس وقت تم ایک سیاہ ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر میری تلاش میں سرگرداں ہو۔ سوچتا ہوں' تمہیں اس خواری سے بچا لوں۔ تم کہاں کہاں بھٹکتے پھرو گے۔ میں ہی موت کے روپ میں آگے بڑھ کر تمہیں گلے لگا لیتا ہوں۔ بس ایک دل دوز دھماکا اور...... سب کچھ ختم!"

اس نے گھبرا کر سیلولر رابطہ منقطع کر دیا۔

لی یان اس دوران میں یہ گفتگو سنتے ہوئے مسلسل میری جانب دیکھ رہی تھی۔ رابطہ ختم ہونے پر میں نے چونک کر اس کی جانب نگاہ اٹھائی تو وہ سچویشن کو بھانپتے ہوئے فوراً مستفسر ہوئی۔

"خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا کیا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولی "اب وہ بھول کر بھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔"

اس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ دوسرے سیل کا وائبریٹر بیدار ہو گیا۔ میں نے چونک کر لی یان کی طرف دیکھا اور پوچھا "کاشالوک والا سیل کہاں ہے؟"

"ادھر تھاچو کے پاس ہی ہے۔" اس نے بتایا "میں نے تم سے بات کرنے کے بعد وہ سیل تھاچو کو دے دیا تھا۔ کیوں' کیا بات ہے؟"

اس دوران میں' میں نے مذکورہ سیل کو جنجر کی جیب سے برآمد کر لیا اور کہا "شاید تھاچو ہمیں کال کر رہا ہے۔" پھر فون اٹینڈ کرتے ہوئے میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "ہیلو!"

جواب میں تھاچو کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی "وجدان! کیا تم لوگ کہیں دور نکل گئے ہو۔ میں نے تھوڑا آگے جا کر تمہیں دیکھا تھا لیکن تم کہیں نظر نہیں آئے۔ کاشالوک کو اکیلے چھوڑنا ٹھیک نہیں اس لیے میں نے موبائل فون کا سہارا لیا ہے۔"

"کاشالوک کیسا ہے؟" میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

"تمہیں یاد کر رہا ہے۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں انکشاف کیا "وہ اس وقت ہوش میں ہے۔"

تھاچو کے اطمینان نے مجھے مضطرب کر دیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ کیا "کیا تم نے ابھی تک اس کا آپریشن شروع نہیں کیا؟"

ہمیں تھاچو کے پاس سے آئے ہوئے اب اتنی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک شخص کے پیٹ کا آپریشن کر کے اندر سے گولیاں نکال لی جاتیں اور وہ باقاعدہ ہوش میں بھی آ جاتا۔ پتا نہیں' تھاچو نے تبتی طب کا کون سا چمتکار دکھا ڈالا تھا۔ میں اس کے کمال کو سمجھنے سے قاصر تھا اسی لیے وہ سوال

میری زبان سے پھسل گیا تھا مگر اس کے جواب نے میری حیرتوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

وہ نہایت ہی سادگی سے بتا رہا تھا "آپریشن تو کب کا ہو چکا۔ یہ تو آپریشن کے بعد والی بیداری ہے۔ تم اسے پوسٹ آپریٹیو ویک نیس کہہ سکتے ہو!"

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے تھاچو کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ ایک ناممکن اور ناقابلِ یقین سی بات کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "کاشالوک سے میری بات کراؤ۔"

"وہ خاصی نقاہت محسوس کر رہا ہے۔" تھاچو نے کہا "تم لوگ فوراً یہاں آ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم آ رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے فون بند کر دیا۔

لی یان نے اگرچہ یک طرفہ گفتگو سماعت کی تھی لیکن وہ نفسِ بات چیت بخوبی سمجھ گئی۔ رہی سہی کسر واپسی کے سفر میں' میں نے پوری کر دی۔ تھاچو سے ہونے والی باتوں کا خلاصہ میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے وجدان! بائی گاڈ' ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"مگر ایسا ہو چکا ہے' تھاچو ہم سے جھوٹ کیوں بولے گا؟"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ نفی میں گردن جھٹکنے لگی۔

"وہیں چل کر دیکھتے ہیں' کیا ہوا ہے اور کیا نہیں ہوا!"

تھوڑی دیر کے بعد ہم غار کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں تھاچو اور کاشالوک کو چھوڑ کر گئے تھے۔ سب سے پہلے ہماری نگاہیں کاشالوک کی جانب اٹھیں۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل خاموش چت لیٹا ہوا تھا۔ تھاچو نے ایک پوٹلی کو تکیہ بنا کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا تھا۔ کاشالوک کی حالت کو دیکھ کر فوری طور پر ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا' وہ پُرسکون اور گہری نیند سویا ہوا ہے۔

میں نے قریب جا کر اس کے پیٹ کا معائنہ کیا۔ مذکورہ خطرناک گھاؤ اب ایک تازہ ترین پٹی کے پیچھے مکھڑا چھپا چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ تھاچو نے آپریشن کے بعد یہ ڈریسنگ کی ہوگی۔ ابھی تک ہم نے زبان سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے تھاچو کی طرف دیکھا تو وہ ہمیں ایک جانب آنے کا اشارہ کر کے چل دیا۔ اس نے اپنا وہ چھوٹا سا باکس (سرجیکل کٹ) بھی اٹھا رکھا تھا۔

ہم نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس کے پیچھے چل دیئے۔

تیس چالیس گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جگہ پر رک گیا۔ اس کی تقلید میں ہمیں بھی رکنا پڑا۔ وہ اپنا پُراسرار باکس کھولتے ہوئے بولا۔ انداز سرگوشیانہ تھا۔

"جب میں نے تمہیں فون کیا اس وقت وہ جاگ رہا تھا اور تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نیند میں چلا گیا۔ تین چار گھنٹے تک وقفے وقفے سے سونے اور جاگنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا پھر وہ مکمل طور پر ہوش میں آ جائے گا۔ میں نے محسوس کیا ہے' وہ تم سے کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔"

میں تھاچو کی بات سن کر خاموش رہا لیکن لی یان اس سے پوچھے بنا نہ رہ سکی "آپریشن کا کیا رہا؟" اس کے لہجے سے بے یقینی عیاں تھی۔

"بدھا کی مرضی سے آپریشن کامیاب رہا ہے۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا "میں نے کاشالوک کے پیٹ اور پنڈلی سے گولیاں نکال لی ہیں اور متاثرہ حصوں پر مخصوص مرہم لگا کر ڈریسنگ بھی کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے' وہ ایک آدھ دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔"

"کیا......؟" لی یان اور میں بیک وقت چلا اٹھے۔

تھاچو نے بات ہی ایسی کی تھی کہ ہمیں اپنے والیوم پر کنٹرول نہ رہا۔ وہ ہماری حیرت' استعجاب اور بے یقینی کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "کاشالوک کے پیٹ میں سے تین اور بائیں پنڈلی میں سے ایک گولی برآمد ہوئی ہے۔"

بات ختم کرتے ہی اس نے باکس میں سے وہ چاروں گولیاں نکال کر ہمیں دکھائیں۔ ہم مذکورہ گولیوں سے زیادہ اس کے چہرے کو تک رہے تھے جہاں بلا کا ٹھہراؤ موجود تھا۔ میں اندازہ نہ لگا سکا کہ اس وقت تھاچو کے چہرے پر کوئی تاثرات تھے یا نہیں...... اور اگر تھے تو ان کی نوعیت کیا تھی؟

"کیا تمہیں یقین ہے' یہ ایک آدھ دن میں اٹھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے گا؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اسی لمحے لی یان نے بھی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا "تم قدموں پر کھڑا ہونے کی بات کر رہے ہو۔ تھاچو تو یہ دعویٰ کر چکا ہے کہ کاشالوک ایک آدھ دن میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا؟"

"ہاں ہاں' بالکل ایسا ہی ہوگا!" تھاچو باری باری ہمارے چہروں پر مرتسم حیرت کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "یہ تو

تبتی طب کا ایک چھوٹا سا شعبدہ ہے۔ اگر تمہیں تبت میں طویل قیام کا موقع ملا تو قدم قدم پر حیرتوں کے پہاڑ تمہاری نگاہوں کے سامنے آن کھڑے ہوں گے..... اور ان میں سے ہر پہاڑ تمہیں ماؤنٹ ایورسٹ سے نکلتا ہوا نظر آئے گا۔"

اس کے بعد لگ بھگ پندرہ منٹ تک تھاچو ہمیں تبتی طب' وہاں کے لاماؤں اور دیگر اسرار کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس میں سے بیشتر باتیں میرے علم میں اضافے کا باعث تھیں۔ اس گفتگو کے اختتام پر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"احتیاط اور کاشالوک کی صحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ دن اور آنے والی رات اسی غار میں بسر کریں گے۔ آئندہ روز آگے کا پروگرام بنائیں گے اور وہ بھی حالات وواقعات کو دیکھتے ہوئے۔ کیا تم دونوں میری بات سے متفق ہو؟"

تھاچو کا فیصلہ بروقت اور راست تھا۔ اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ کار باقی نہیں بچا تھا۔ ہم نے اس کی بات سے اتفاق کیا پھر ہمارے درمیان حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیالات ہونے لگا۔

اس غار کے اندر رہتے ہوئے ہم دستی گھڑیوں ہی سے وقت کا اندازہ کر سکتے تھے اور اس وقت شام کے چار بجے تھے۔ میں بھوک محسوس کر رہا تھا۔ لی یان کا بھی یہی حال تھا۔ ہم کھٹمنڈو سے نکلتے وقت اپنی اپنی پوٹلی میں ہر قسم کا زادِراہ لے کر چلے تھے جس میں خور ونوش کا سامان بھی موجود تھا۔ کھانے کی اشیا میں زیادہ تر خشک آملو اور ڈرائی فروٹس شامل تھے۔ ہم نے مناسب سی پیٹ پوجا کرنے کے بعد پانی پیا اور ایک مرتبہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ تھاچو نے نام کرنے کو دو چار لقمے لیے تھے۔

اس بار تھاچو ہماری گفتگو میں شریک نہیں تھا۔ وہ تیمارداری کی غرض سے کاشالوک کے قریب چلا گیا تھا اور ہم دونوں ذرا ہٹ کے' غار کی ایک سنگلاخ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ مشعل کی ہلکی ہلکی روشنی ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس وقت ہمارے درمیان دھیمے لہجے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ لی یان نے غار کے دوسرے حصے میں کاشالوک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وجدان! یہ تھاچو تو مجھے کوئی جادوگر معلوم ہوتا ہے!"

"اگر کاشالوک واقعی کل اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو بھئی اسے جادوگر ماننا ہی ہوگا۔"

وہ بولی "میں ڈاکٹر نہ سہی لیکن ایک طویل عرصے تک میڈیکل کے شعبے سے وابستہ رہی ہوں اور اس سلسلے میں میری معلومات بھی وسیع ہیں۔ تھاچو نے جو دعوے کیے ہیں وہ میری سمجھ سے بالاتر ہیں!"

وہ کچھ بھی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ جو بھی غیر تبتی ایسی باتیں سنتا وہ یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا۔ تبت کو دنیا کی چھت کہا جاتا ہے۔ انسانوں کے بسنے کا' دنیا کا یہ بلند ترین خطہ اراضی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں سر کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اسی طرح تبت کو بھی اس دنیا کا سر سمجھا جاتا ہے۔ سر کے اندر دماغ ہوتا ہے اور دنیا کے اس سر یعنی تبت کے اندر دماغ والے باکمال لوگ بستے ہیں۔ صدیوں سے یہ سرزمین "خطۂ اسرار" کے طور پر مشہور ہے۔ وہاں کے پُراسرار لاماؤں' جادوگروں' طبیبوں اور بعض ایسے علاقوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو عام آدمی کی نگاہ میں نہیں آتے۔ یہ ان کی آنکھ کا دھوکا ہوتا ہے یا کوئی اور طلسم! بہرحال سننے میں یہ آیا ہے کہ وہاں ایسے مقامات موجود ہیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ایسا ہی ایک شہر شیم بالا (شنگریلا) بھی ہے۔ تبت کے اکثر لاما خود پر مصنوعی موت طاری کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہ مراقبے کا نام دیتے ہیں۔ مونکس کا فلسفہ یہ ہے کہ موت کا خوف انسان میں' دنیا کے لذائذ کو بدمزہ کر دیتا ہے اسی لیے وہ خود پر مصنوعی موت طاری کر کے موت سے پہلے موت کا مزہ چکھتے رہتے ہیں۔ اس حالت میں' طبی نقطہ نظر سے ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ دل کی دھڑکن اور سانس باقاعدہ رک جاتی ہے اور دیگر کوئی وائٹل سائن بھی پکڑ میں نہیں آتا لیکن بہرحال' وہ مراقبے کی اس کیفیت سے نکلنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں۔

ہمارے درمیان کافی دیر تک تبت اور اس سے منسوب اسرار و رموز موضوعِ گفتگو بنے رہے۔ لگ بھگ آٹھ بجے رات تھاچو ہمارے پاس آیا اور اس نے دھیمی آواز میں مجھ سے کہا۔

"اب وہ مکمل ہوش میں ہے۔" اس کا اشارہ کاشالوک کی طرف تھا "وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن میرا مشورہ ہے کہ اس سے لمبی چوڑی گفتگو شروع نہ کر دینا۔ اس کی دو چار باتیں سن لو تاکہ وہ مطمئن ہو جائے۔ میرا خیال ہے' اسے رات بھر آرام کرنا چاہیے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری دیکھا دیکھی لی یان بھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی اس تقلیدی حرکت کا یہی مطلب تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ کاشالوک کو

دیکھنے جانا چاہتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے تھاچو نے اسے روک دیا اور مناسب الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے بولا۔

''صرف وجدان کو جانے دو' ورنہ خوامخواہ وہ باتوں میں لگ جائے گا اور اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھے گا۔ میں نے اسے اعصاب کو پُرسکون رکھنے والی دوا کھلائی ہے۔'' پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم بھی نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس سے بات کرنا۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

اس میں نہ سمجھنے والی کوئی بات نہیں تھی لہٰذا میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں تھاچو!''

وہ مڑا اور خاموشی کے ساتھ غار کے اس حصے کی جانب بڑھ گیا جدھر کاشانوک موجود تھا۔ میں نے تسلی آمیز نظر سے لی یان کو دیکھا اور تھاچو کے پیچھے ہولیا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے غار کے اس حصے میں پہنچے جہاں تھوڑی دیر پہلے تھاچو نے پُراسرار انداز میں کاشانوک کا آپریشن کر کے اس کے جسم میں سے گولیوں کو نکال باہر کیا تھا۔ تھاچو لگ بھگ دس فٹ پیچھے رک گیا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مشعل کی روشنی اگرچہ اس غار کو پوری طرح اجالنے میں ناکام تھی تاہم ہم ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔

میں نے تھاچو کی آنکھوں میں موجود تاثراتی اشارے کا مفہوم پالیا۔ وہ مجھے کاشانوک کی طرف جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس کے ٹھہر جانے کا یہی مطلب تھا کہ وہ چاہتا تھا' میں کاشانوک سے علیحدگی میں بات کروں۔ میں نے اس کی خواہش پر صاد کیا اور خاموشی سے کاشانوک کی طرف بڑھ گیا۔

کاشانوک چت لیٹا غار کی سنگلاخ چھت کو گھور رہا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس نے گردن گھما کر میری جانب دیکھا۔ اس دوران میں' میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ تاہم اس کی مسکراہٹ میں خزاں رسیدگی جھلکتی تھی۔ میں اس کے پاس ہی پہلو میں' زمین پر بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے آہستہ سے پوچھا۔

''کاشانوک! کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''ٹھیک ہوں۔'' وہ نقاہت بھری آواز میں بولا ''پہلے سے بہت بہتر ہوں۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا ''تم اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ نہ ڈالو۔ انشاء اللہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''درست کہتے ہو وجدان!'' وہ نحیف اور عجیب سے لہجے میں بولا ''میرے ٹھیک ہونے کا وقت دور نہیں۔ لارڈ بدھا نے چاہا تو میری تمام تکالیف اور پریشانیاں ختم ہو جائیں گی' میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ نزوان کی تلاش کا یہ سفر......!'' جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میرے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ کاشانوک کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا' وہ اپنی زندگی کے لیے پُریقین نہیں۔ یہ اس کی فطری اور برمحل سوچ تھی۔ وہ جن خوں چکاں حالات سے گزر کر اس غار تک پہنچا تھا' ان میں انسان اسی طرح مایوسی سے سوچنے لگتا ہے۔ اس میں کاشانوک کا زیادہ قصور نہیں تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو دھیرے دھیرے سہلاتے ہوئے کہا ''کاشانوک! تمہاری زبان سے ایسی کم ہمتی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تھاچو نے ایک کامیاب آپریشن کر کے تمہارے جسم میں پیوست گولیاں نکال دی ہیں۔ تم ایک آدھ دن میں بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔''

میں اس موقع پر ایسی ہی تسلی تشفی کی باتوں سے اسے حوصلہ دلا سکتا تھا۔ اس نے میری باتوں کو غور سے سنا اور گمبھیر لہجے میں بولا ''وجدان' میری زیادہ فکر نہ کرو۔ میں تمہاری باتوں اور تھاچو کے تجربے کو جھٹلا نہیں رہا بلکہ......'' اس نے ایک مرتبہ پھر جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور وہ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ یہ سمجھنے میں مجھے ذرا بھی دقت محسوس نہ ہوئی کہ سانس لینے میں اسے خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے نزار سے لہجے میں اپنی بات پوری کر دی۔

''بلکہ میں تو تمہیں یہ بتا رہا ہوں' نزوان کی تلاش کا یہ سفر اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو گیا ہے' مجھے مکتی حاصل ہونے والی ہے۔ زندگی کے چکر میں یہی سب ہوتا ہے۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی زندگی کے خاتمے کا اعلان کر رہا تھا۔ میں نے اتنی مایوسی اس کے الفاظ میں پہلے کبھی نہیں پائی تھی لیکن نہیں...... یہ مایوسی نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا اطمینان تھا۔ اس کے چہرے پر آسودگی اور سرخ روئی بھی تھی۔ وہ درحقیقت اپنے مذہبی عقائد بیان کر رہا تھا۔ بدھ ازم میں زندگی کے چکر کی بڑی اہمیت ہے جسے ''کرم'' کہا جاتا ہے۔

کرم (KARMA) یعنی ''زندگی کا چکر'' آواگون کے نظریے پر قائم ہے۔ اسی لیے بدھ ازم' ہندو ازم کے بہت

قریب تصور کیا جاتا ہے۔ ''کرم'' کے مطابق' انسان بار بار جنم لیتا ہے۔ ایک نیک انسان اگلے جنم میں بھی انسان ہی کے روپ میں پیدا ہوتا ہے جب کہ ایک بُرا انسان کسی جانور یا شیطان کی شکل میں جنم لے سکتا ہے۔ جو شخص ہر جنم میں نیک اعمال و افعال کو اپنائے رکھتا ہے وہ بالآخر نیکی کی معراج پا لیتا ہے جو کہ حقیقی خوشی اور بدھ مت کی اصل منزل بھی ہے۔ یہی حقیقی منزل نزوان کہلاتی ہے۔ اس منزل کے حصول کے بعد جنموں کا چکر ختم ہو جاتا ہے۔

میں یک ٹک کاشانوک کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں بند اور چہرے پر گہرے اطمینان کی جھلک تھی۔ مجموعی تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا' وہ ایک ایسا شخص ہے جس نے اپنے ذمے کا تمام کام نمٹا لیا ہو۔ اب جسے کسی بات کی فکر نہ ہو۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''کاشانوک! موجودہ حالات میں تم ایسا سوچنے پر مجبور ہو لیکن دیکھ لینا' ایک آدھ دن میں جب تم زندگی کے تمام معاملات میں بھرپور حصہ لینے لگو گے تو تمہاری یہ ذہنی کیفیت جاتی رہے گی۔ تم پہلے والے کاشانوک نظر آؤ گے۔ یاد رکھو' مصیبت کے بعد راحت ضرور آتی ہے!''

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھول دیں اور ٹٹولتی ہوئی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا ''میں لارڈ بدھا کا یہ سبق کبھی نہیں بھولا کہ ہر مصیبت کے پیچھے ایک راحت اور ہر تاریکی کے عقب میں ایک نئی روشنی موجود ہوتی ہے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا وجدان! راحت آنے والی ہے......خیر!''

وہ ''خیر'' پر جملہ ادھورا چھوڑ کر یکا یک انتہائی سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ میں خاموشی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے' وہ کوئی نہایت ہی اہم بات کرنے والا ہے۔ غار کے اس حصے میں بڑی دہشت ناک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مشعل کی ناکافی روشنی نے وہاں کے ماحول کو حد سے زیادہ پُراسرار بنا دیا تھا' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی طلسم کدے میں موجود ہوں۔

جب کاشانوک کی چپ طول پکڑنے لگی تو میں نے مڑ کر اپنے عقب میں نگاہ ڈالی۔ میں تھوڑی دیر پہلے تھاچو کو چند قدم پیچھے چھوڑ کر آیا تھا لیکن اب وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ پتا نہیں' وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں تھاچو کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ کاشانوک کی نحیف مگر گمبھیر آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''وجدان! میری بات کو دھیان سے سنو اور ایک ایک لفظ کو ذہن نشین کر لو۔ بیچ میں کوئی سوال نہ کرنا۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم ایک اتفاق کے تحت تھاچو کے قافلے کا حصہ بن گئے تھے بلکہ......''

''پھر؟'' میں نے چونک کر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا ہے نا' بیچ میں سوال نہیں کرنا!'' اس نے کمزور سی تنبیہ کی ''اس مداخلت کے سبب ہو سکتا ہے' کام کی بات رہ جائے!'' وہ ذرا دیر کو خاموش ہوا پھر اپنے نحیف بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تھاچو ایک نہایت ہی ذمے دار مونک ہے۔ یہ خاص الخاص تمہارے لیے ایک طویل اور کٹھن سفر طے کر کے تبت سے کھٹمنڈو پہنچا تھا۔ تم نے اس کے ساتھ جو دیگر بدھ بھکشو دیکھے ہیں' ان کا اصل مشن سے کوئی تعلق نہیں اور وہ تمام کے تمام کھٹمنڈو ہی سے اس کی ہمراہی میں آئے تھے۔''

وہ لمحے بھر کو رکا تو میں سوچے بنا نہ رہ سکا کہ وہ کس مشن کا ذکر کر رہا تھا۔ تاہم اس بار میں نے کوئی سوال نہ کیا اور گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''تھاچو کا تعلق لہاسا کی سب سے معروف بدھ عبادت گاہ ''جوکھانگ ٹیمپل'' سے ہے۔ اسے یہ مشن سونپا گیا ہے کہ یہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر کھٹمنڈو سے تبت پہنچے گا۔ میں نے اس سلسلے میں جو بھی کردار ادا کیا ہے......اور کر رہا ہوں اس کا مجھے حکم تھا۔ تم درحقیقت تھاچو کی نگرانی اور مہربانی میں تبت کے صدر مقام لہاسا پہنچنے والے ہو۔''

اس نے چونکہ مجھے سختی سے' سوال کرنے سے منع کر دیا تھا لہٰذا اس دفعہ جب وہ متوقف ہوا تو میں چپ چاپ بیٹھا استفساریہ نظر سے اسے دیکھتا رہا البتہ اس کے انکشافات نے میرے اندر کھلبلی سی مچا دی۔ اگر مجھے پری پلان تبت پہنچایا جا رہا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا' اس سے آگے کی پلاننگ بھی کی جا چکی ہوگی۔ ان خیالات نے میرے ذہن کو قدرے الجھا دیا۔ اپنی دانست میں تو میں فوری طور پر اسرائیل جا رہا تھا۔ چونکہ میں کھٹمنڈو سے براہِ راست اسرائیل کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں تبت کو بطور بریک لینڈ استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر دوسری طرف یہی کام ایک خاص منصوبے کے تحت انجام دیا جا رہا تھا۔ پتا نہیں' آنے والا وقت مجھے کیا دکھلانے والا تھا!

کاشانوک نے شاید میری سوچ پڑھ لی' اپنے انکشافات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''وجدان! آنے والا وقت تمہیں بہت سے معجزے دکھائے گا۔ یہ سب کچھ تمہاری ضرورت اور خواہش کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ تم اپنی ساتھی ساحل کے حصول کے لیے اسرائیل جانا چاہتے ہو نا۔ تم ضرور اسرائیل پہنچو گے اور اس سلسلے میں چنگ فورن پوشی تمہاری مدد کرے گا۔''

''کون چنگ فورن پوشی؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

اس مرتبہ کاشانوک نے میرے سوال پر کوئی اعتراض یا تبصرہ نہیں کیا۔ لمحے بھر کے لیے اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں نے تھوڑی دیر پہلے لہاسا کے جوکھانگ ٹیمپل کا ذکر کیا ہے۔ اس بدھ عبادت گاہ کو لہاسا کا دل اور روح ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ تھاچو تمہیں بحفاظت اپنی نگرانی میں جوکھانگ ٹیمپل (JOKHANG TEMPLE) تک پہنچائے گا۔ جوکھانگ ٹیمپل کا روحِ رواں چنگ فورن پوشی ہے۔ جوکھانگ ٹیمپل کا چیف لاما چنگ فورن پوشی تمہاری راہنمائی اور مدد کرے گا۔''

میں حیرت اور دلچسپی سے کاشانوک کو دیکھتا چلا گیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے میں بدھ مت افراد کے زیادہ نزدیک رہا تھا جس کے سبب مجھے بدھ ازم اور اس کے سیٹ اپ کے بارے میں جاننے کا خاصا موقع ملا تھا۔ چنگ فو نامی اس شخص کے نام کے ساتھ ''رن پوشی'' کا اضافہ اس کی قدر و منزلت ظاہر کرنے کے لیے کافی تھا۔ رن پوشی (RINPOCHE) کے معنی اعلیٰ تعلیم یافتہ یعنی پروفیسر کے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ جوکھانگ ٹیمپل کا چیف لاما بھی تھا۔ ان لمحات میں یکایک میرے دل میں یہ احساس جاگا کہ مجھے اس نادرِ روزگار شخص سے ضرور ملنا چاہیے۔

میں نے محسوس کیا' کاشانوک کو بولنے میں اچھی خاصی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آواز میں رچی بسی نقاہت اور نزاری اس کی مجموعی حالت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی تھی۔ چنگ فورن پوشی کا ذکر کرنے کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

میں تھاچو کی ہدایت کو نہیں بھولا تھا۔ اس نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں کاشانوک سے بات کروں۔ اسی کی زبانی مجھے پتا چلا تھا' کاشانوک مجھ سے کوئی ضروری بات کہنا چاہتا تھا۔ اس وقت کاشانوک کی خاموشی اور اطمینان سے یہی ظاہر ہوتا تھا' اسے جو کچھ بھی کہنا تھا' وہ کہہ چکا لیکن میں بھی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا جس میں سب سے زیادہ اہم معاملہ شرما کا تھا۔ کاشانوک' شرما کو جاننے کا اقرار کر چکا تھا۔

میں چند لمحات تک متذبذب نظر سے کاشانوک کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر نہایت ہی دھیمی آواز میں اسے پکارا ''کاشانوک......!''

''ہوں!'' اس نے آنکھیں کھولے بغیر میری پکار کا جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''تم مسٹر شرما سے واقفیت کا اقرار کر چکے ہو مگر ابھی تک تم نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

وہ کمزور سی آواز میں بولا ''شرما کا تعلق کھٹمنڈو کی انڈر ورلڈ سے ہے۔ وہ نہایت ہی خطرناک اور چھٹا ہوا گینگسٹر ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اسے نہایت ہی خفیہ طور پر جالوس سے ملاقات کرتے دیکھا ہے۔'' وہ اپنی آنکھوں کو بدستور بند رکھتے ہوئے حیرت انگیز انکشاف کر رہا تھا ''شرما کا شمار جالوس کے گہرے دوستوں میں ہوتا ہے۔''

''اوہ!'' میں ایک طویل اور بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کھنکارنے کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میں نے بڑی سرعت سے پلٹ کر دیکھا تو تھاچو پر نگاہ پڑ گئی۔ پتا نہیں' وہ کب اور کس وقت وہاں آن موجود ہوا تھا۔ مجھ سے نظر ملتے ہی اس نے ہاتھ سے مجھے اپنی جانب آنے کا اشارہ کر دیا۔ اس کے اشارے کے جواب میں' میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کاشانوک کے شانے پر میں نے ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''کاشانوک! تمہیں اس وقت آرام کی اشد ضرورت ہے۔ تم اطمینان سے سو جاؤ' کل بات کریں گے۔''

پھر میں اس کے پاس سے اٹھ کر تھاچو کی طرف چلا گیا۔ میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے قدرے شکایتی لہجے میں کہا ''تم نے کافی دیر لگا دی حالانکہ میں نے تمہیں تاکید بھی کی تھی کہ......''

میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا ''کاشانوک کو اپنی بات کہنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی اس لیے تاخیر ہو گئی!''

وہ چند لمحات تک یک ٹک مجھے دیکھتا رہا پھر گمبھیر انداز میں بولا ''تو اس کی بات تمہاری سمجھ میں آ گئی؟''

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تم اپنی ساتھی کے پاس جاؤ۔ تمہیں جیسے تیسے اسی غار میں رات گزارنا ہے' ٹھیک ہے؟''

اس کا جملہ سوالیہ انداز میں ختم ہوا تو میں نے پوچھ لیا ''اور تم؟''

''میں کاشانوک کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا ''وہ خاصا دل شکستہ دکھائی دیتا ہے۔ بڑی مایوسی کی باتیں کر رہا تھا۔''

تھاچو نے مجھ سے ان مایوس باتوں کی تفصیل نہیں پوچھی اور گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سرسری انداز میں بولا ''وہ جن حالات سے گزر رہا ہے ان میں ذہنی کیفیت ایسی ہی ہو جاتی ہے لیکن تم پریشان نہ ہو' لارڈ بدھا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ایک لمحے کو متوقف ہونے کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسے ایک پرسکون' گہری اور بھرپور نیند کی ضرورت ہے۔ صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اس نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا ابھی تک......؟'' میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

تھاچو نے معتدل لہجے میں کہا ''اس کیفیت میں ٹھوس غذا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو گی۔ میں نے محلول کی صورت میں اسے رقیق مادہ پلا دیا ہے جو غذا کے علاوہ ایک موثر دوا بھی ہے۔ یہ محلول اس کی متاثرہ آنتوں کو بھی بھلا چنگا کر دے گا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا ''ویسے کاشانوک کو اس وقت جس شے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے نیند! مجھے امید ہے' وہ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے تھاچو سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور لی یان کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اس وقت میرا ذہن مسلسل مسٹر شرما کی گتھی سلجھانے میں مصروف تھا۔ کاشانوک کے مطابق' وہ جالوس کا گہرا دوست تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ وہ جوگندر پال کا بھی دوست تھا۔ دوست کا دوست ہمیشہ دوستوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جوگندر پال اور جالوس اپنے بھیانک اور عبرت ناک انجام کو پہنچ چکے تھے۔ ان کی موت کے بعد' شرما کا اچانک میرے خلاف متحرک ہو جانا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ اس کی پشت بھی میرے وہی اسرائیلی یہودی دشمن ٹھونک رہے تھے جو اس سے پہلے اول الذکر دونوں آنجہانی دشمنوں کی پشت تھپکتے چلے آئے تھے۔ یہ دراصل ربی موشے ہائمن کے مختلف روپ تھے جو ایک کے بعد ایک میری مخالفت میں' میدان میں اتر رہے تھے......اور اللہ کا شکر ہے' میں اپنے ان دشمنوں کو بے پناہ ہزیمت پہنچا رہا تھا۔ سندری جل کی پُراسرار پہاڑیوں میں' نہایت ہی مختصر وقت میں' میں نے مسٹر شرما کو اتنے زخم دے ڈالے تھے کہ ان کو چاٹتے چاٹتے اس کی زبان گھس جاتی' یہ الگ بات کہ اس معرکہ آرائی میں' کاشانوک کی صورت میں' ہمیں بھی ایک کڑی آزمائش سے گزرنا پڑ رہا تھا۔

شرما کے بعد' میرا دھیان جوکھانگ ٹیمپل کی طرف چلا گیا جو لہاسا کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے قبل' زندگی میں شاؤلن ٹیمپل سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ شمالی چائنا میں واقع مارشل آرٹس کی اس عظیم الشان تربیت گاہ میں مجھے مختلف فنونِ حرب و ضرب سیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ماسٹر ہینگ پائی نے ''چی'' کا پہلا سبق بھی مجھے شاؤلن ٹیمپل ہی میں دیا تھا اور اب......میں تبت کے جوکھانگ ٹیمپل کی طرف جا رہا تھا۔ پتا نہیں' کاتبِ تقدیر نے میری زندگی میں اور کیا کچھ سیکھنا لکھ رکھا تھا۔

چیف لاما چنگ فورن پوشی کے تصور سے میرا خیال محترم سانگ فو کی طرف چلا گیا جس سے میری پہلی اور آخری ملاقات سیٹل (واشنگٹن) میں ہوئی تھی۔ اس مختصر اور انتہائی پرائیویٹ ملاقات میں آنجہانی نے اپنے وسیع تجربے کی روشنی میں مجھے عملی زندگی کے رازہائے سربستہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس ملاقات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں محسوس کر رہا تھا' تبتی علوم کا پروفیسر (رن پوشی) چنگ فو مجھے کچھ آگے کا سبق پڑھانے والا تھا۔

میں انہی خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا لی یان کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی منتظر نگاہ سے نگاہ ملی تو اس نے پوچھا ''وجدان! کاشانوک کا کیا حال ہے؟''

اس کے لہجے سے بے پناہ تشویش جھلکتی تھی۔ میں نے ایک لمحے تک اس کی آنکھوں میں دیکھا اور مبہم سے انداز میں کہا ''بظاہر تو سب کچھ ٹھیک نظر آ رہا ہے لیکن پتا نہیں کیوں' میرا دل مطمئن نہیں۔''

''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔'' اس کی تشویش سوا ہو گئی۔

میں ابھی کاشانوک کو جیسا دیکھ کر آیا تھا' مختصر الفاظ میں لی یان کے گوش گزار کر دیا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا ''تھاچو کیا کہتا ہے اس سلسلے میں؟''

''وہ تو بہت پُرامید ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔

''گاڈ بلیس ہیم!'' اس نے کہا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے دریافت کیا ''تھاچو نے بتایا تھا' کاشانوک تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کچھ بتایا؟''

تھاچو اور چنگ فو رن پوشی کے بارے میں مجھے کاشانوک کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ میں نے لی یان کو بتا دیا اور آخر میں کہا ''پتا نہیں' تبت..... پہنچ کر کون سا پُراسرار چکر چلنے والا ہے!''

وہ بڑی محویت سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی ''میں مانتی ہوں' لہاسا کے جوکھانگ ٹیمپل میں جو کچھ بھی ہوگا' وہ انتہائی تحیر آمیز اور پُراسرار ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس تمام تر چکر کی جڑ تم ہی ہو!''

''میں...... وہ کیسے؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہ ایسے کہ تم خود اسرار و رموز میں لپٹے ہوئے ہو!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی ''کیا کسی عام آدمی کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو تمہارے ساتھ پیش آ رہے ہیں؟''

بالفاظِ دیگر وہ مجھے ایک خاص آدمی ثابت کرنے کی تگ و دو میں تھی' مجھے اس موضوع پر بحث کا کوئی دروازہ نہیں کھولنا تھا لہٰذا کوئی سوال کرنے کے بجائے میں نے عام سے لہجے میں کہہ دیا ''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔ دیکھتے ہیں' آگے آگے کیا ہوتا ہے!''

''جو بھی ہوگا' بڑا انٹرسٹنگ اور ایڈونچرس ہوگا۔'' وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے موضوع کا زاویہ تبدیل کرنے کے لیے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ پہاڑی علاقے میں رات بہ نسبت جلدی ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے اس وقت رات کم و بیش نصف سفر طے کر چکی تھی۔ میں نے لی یان سے کہا۔

''کیا خیال ہے' تھوڑی نیند نہ لے لی جائے۔ آج کی رات تو اپنی ہی ہے۔ پتا نہیں' پھر کب سونے کا موقع ملے!''

اس نے غار کی پتھریلی زمین کی طرف دیکھا۔ مشعل کی ہلکی ہلکی روشنی اس مقام تک پہنچ رہی تھی۔ جہاں اس وقت ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی نظرہ تعاقب کرتے ہوئے میری نگاہ بھی سنگلاخ زمین کی جانب اٹھ گئی۔ اسی لمحے لی یان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''سنا ہے' نیند بڑی ظالم شے ہے۔ یہ سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ مجھے تو اس وقت نیند نہیں آ رہی۔ کیا تم اس کی ضرورت محسوس کر رہے ہو؟''

میں نے کہا ''مجھے بھی کوئی خاص نیند نہیں آ رہی۔ سونے والی بات میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کہی تھی۔ ویسے تم فکر نہ کرو۔'' میں نے سنگ ریز زمین کی سمت انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ''یہاں سولی اور نیند والے حالات پیش نہیں آئیں گے۔ میں تمہارے آرام کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لی یان نے پوچھا ''کہاں جا رہے ہو؟''

''اپنے ''سفری بیگ'' لینے جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

ہم کھٹمنڈو سے پوٹلی نما سفری بیگ لے کر چلے تھے۔ یہ بیگ تھے یا پوٹلیاں' اس سے قطع نظر ان میں ہماری سفری ضرورت کا تمام سامان موجود تھا۔ اضافی کپڑوں کے علاوہ میں نے دشمنوں کے وہ دو لباس بھی اپنی پوٹلی (بیگ) میں ڈال لیے تھے جو بوقتِ ضرورت استعمال میں لائے جا سکتے تھے۔ ہمارے سفری بیگ غار کے اس حصے میں رکھے تھے جہاں اس وقت کاشانوک اور تھاچو موجود تھے۔

میں نے مذکورہ حصے کی جانب قدم اٹھایا ہی تھا کہ ادھر سے تھاچو آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنی پوٹلیاں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ پتا نہیں' یہ ایک اتفاق تھا یا تھاچو نے ہماری ضرورت کو محسوس کر لیا تھا بہرحال' وہ بروقت پوٹلیاں لے کر ہمارے پاس آ گیا تھا۔

اس نے مذکورہ سامان میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ رکھ لو۔ تمہارے اوڑھنے بچھونے کے کام آئیں گے۔ ان پوٹلیوں میں لباس کی صورت میں کچھ کپڑے موجود ہیں۔ مجبوری کے لمحات میں ایسے ہی گزارہ چلایا جاتا ہے۔''

''تم ہماری فکر نہ کرو تھاچو۔ ہم بہت اچھی طرح گزارہ کر لیں گے۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے وہ سامان لیتے ہوئے معتدل لہجے میں کہا ''تم پوری توجہ سے کاشانوک کا خیال رکھنا۔ اسے ہم سب سے زیادہ نگہداشت کی ضرورت ہے!''

''میں اپنے فرائض کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا ''کاشانوک والا موبائل تمہارے پاس ہی ہے نا؟''

''ہاں' کسی ہنگامی رابطے کے لیے وہ میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا ''یہ تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ اگر میری ضرورت پیش آئے تو بتا دینا۔''

''ضرور بتاؤں گا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔

میں نے دونوں پوٹلیاں کھول لیں اور ان میں موجود کپڑوں کا جائزہ لینے لگا۔ لی یان کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ''وجدان! یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تھاچو نے ہماری گفتگو سن لی ہو!''

''تم کس حوالے سے یہ بات کہہ رہی ہو؟'' میں نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے ادھر اوڑھنے بچھونے کا ذکر کیا' ادھر وہ یہ سامان لے کر آ گیا۔''

''یہ محض ایک اتفاق ہے۔ تم اس سلسلے میں اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔''

''لیکن...... لیکن میں ہر بات کو اتفاق کے کھاتے میں نہیں ڈال سکتی وجدان!''

''تو پھر یہ اتفاق نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا ''تھاچو نے واقعی ہماری گفتگو سن لی ہوگی۔''

میرا انداز ایسا تھا کہ لی یان نے سختی سے کہا ''وجدان! میں کوئی مذاق نہیں کر رہی ہوں۔''

''میں بھی یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔'' کام سے ہاتھ روک کر میں نے اس کی طرف دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تھاچو ایک سینئر اور قابلِ بھروسا مونک ہے۔ جوکھانگ ٹیمپل میں اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنگ فو رن پوشی نے کچھ دیکھ کر ہی اسے یہ مشن سونپا ہے۔ یقیناً تھاچو بھی پُراسرار صلاحیتوں کا مالک ہوگا۔''

وہ یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ میری بات سنتی رہی پھر جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''وجدان! میں جب سے تمہارے ساتھ ہوں' ایک سے ایک پُراسرار ہستی سے ملنے کا اتفاق ہو رہا ہے اور...... یہ سب کچھ تمہاری وجہ سے ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گی کہ اس تمام تر پُراسراریت کی جڑ تمہی ہو۔''

میں نے اس کی بات کا جواب دیا اور نہ ہی اس پر کوئی تبصرہ کیا۔ اس دوران میں' میں دونوں پوٹلیوں میں موجود کپڑوں کا معائنہ کر چکا تھا۔ میں نے اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے کہا۔

''میرا خیال ہے' ہم بدھ بھکشوؤں والے یہ ڈھیلے ڈھالے لباس اتار کر دشمنوں کے لباس پہن لیتے ہیں۔ یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ہمیں ایک پستہ قامت شخص کا لباس بھی میسر آ گیا ہے جو تمہارے ناپ پر پورا اترے گا۔''

مذکورہ دونوں لباس عمدہ جینز اور گرم فل شرٹس پر مشتمل تھے۔ اس کے علاوہ گرم جیکٹس بھی ان کے ساتھ تھیں۔ اگر ہم ان کپڑوں کو زیبِ تن کر لیتے تو اپنے استعمال شدہ بدھ بھکشوؤں والے لبادوں کو بچھونا بنا کر غار کے فرش کی سختی کو حتی الامکان کم کر سکتے تھے۔ دیگر غیر استعمال شدہ کپڑوں کو اوڑھ کر گزارہ چلایا جا سکتا تھا۔

لی یان نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا ''کسی کے بدن سے اترے ہوئے لباس کو پہننا عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجبوری کی بات دوسری ہے لیکن محض رات بسر کرنے کے لیے میں وہ کپڑے نہیں پہنوں گی۔''

اس کی بات میں وزن تھا لہٰذا میں نے اس سے اتفاق کر لیا۔ دشمنوں کے کپڑوں کا استعمال میں نے یہ نکالا کہ اسے بچھونے کے طور پر غار کے فرش پر پھیلا لیا۔ ہم بدستور بدھ بھکشوؤں والے لبادے ہی میں ملبوس رہے اور فاضل لباس کو اپنے اوپر اوڑھ کر نیم دراز ہو گئے۔ ہم نے غار کی ایک دیوار سے ٹیک لگا لی تھی۔

اس غار سے باہر' اس وقت تاریکی کا راج تھا اور تاریکی بھی وہ جو برف کو شرما دے۔ سورج ''غروب'' ہوئے لگ بھگ پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اگرچہ غار کے اندر کا درجۂ حرارت باہر کی بہ نسبت زیادہ تھا لیکن اسے خوشگوار حرارت والا ماحول ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ہم اپنی قوتِ ارادی' قوتِ برداشت اور ڈرائی فروٹس پر مشتمل کھانے سے حاصل ہونے والی توانائی سے موسم کی شدت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی تو میں ایک قدم اور آگے بڑھ آیا۔

میری دیکھا دیکھی لی یان بھی سرک کر میرے قریب آ گئی۔ موسم کی سختی کو قرب کی نرمی سے شکست دی جا سکتی تھی۔ اس قربت نے غار کے اندرونی ماحول کو خاصا حرارت بخش اور خوشگوار بنا دیا۔ میں نے سوریا داس والے موبائل کو ہاتھ میں لیا اور لی یان کے کان میں سرگوشی کی۔

''میں ذرا شرما کے چٹکی لینا چاہتا ہوں۔''

''تم اس سے کیا کہو گے؟'' وہ میرے ہاتھ میں موبائل دیکھتے ہوئے بولی۔

''کہنا کیا ہے' اس کے تازہ تازہ زخموں پر تھوڑی نمک پاشی ہی کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔

لی یان معنی خیز لہجے میں بولی ''تم اسے شاید یہ بتانا چاہتے ہو کہ اس کا پیچھا آسانی سے نہیں چھوڑو گے؟''

''یہی سمجھ لو!'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور موبائل سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

کال ریسیوڈ میں شرما کا سیل نمبر موجود تھا۔ میں نے آپشنز میں جاکر اس نمبر کو استعمال کیا اور سینڈ کا بٹن پریس کردیا۔ دوسری جانب شرما کی آواز سنائی دینے کے بجائے ایک ریکارڈ شدہ مخصوص آواز ابھرنے لگی جس کا مفہوم کچھ یوں بنتا تھا' میرا مطلوبہ نمبر فی الحال کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ تین چار مرتبہ کی کوشش کے بعد میں نے موبائل کو ایک طرف رکھ دیا۔

لی یان نے شرارت بھرے لہجے میں سرگوشی کی ''وجدان! تم نے شرما کے کس جگہ چٹکی لی؟''

میں نے جس انداز میں سیل کو رکھا تھا اس سے وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ شرما سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ اگر میں اس سے کوئی بات کرتا تو وہ لی یان سے ڈھکی چھپی نہ رہتی اس کے باوجود بھی وہ مجھے چھیڑنے کی غرض سے شریر سوال کررہی تھی۔ اس کی شرارت بھری پیش قدمی کو میں اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

شرارت کا جواب شرارت سے ہی دینا ضروری تھا۔ میری میکانکی حرکت سے وہ بدک کر چند اونچ دور ہوگئی' پھر میٹھی خفگی سے بولی ''یہ کیا کررہے ہو؟''

''تمہارے سوال کا جواب دے رہا ہوں!''

''اس طرح؟'' اس کی خفگی مٹھاس ٹپکاتی رہی۔

میں نے کہا ''تم نے پوچھا' میں نے شرما کے کس جگہ چٹکی لی۔ میں نے عملاً بتادیا۔ شرما' شرما ہوتے ہوئے بھی ذرا نہیں شرمایا اور تم لی یان ہوکر خوامخواہ پریشان ہورہی ہو!''

''تم بڑے چکر باز ہو وجدان!'' اس نے مبہم انداز میں کہا۔

''بہانے باز تو نہیں ہوں نا!'' میں نے اسے اپنی جانب کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ کسی پس و پیش کے بغیر کھنچتی چلی آئی پھر میرے بازو کو تکیہ بناتے ہوئے بولی ''وجدان! کہیں ہماری باتیں تھاچو تک تو نہیں پہنچ رہی ہوں گی؟''

''امید تو نہیں ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

اس نے ایک اور خدشے کا اظہار کیا ''وہ غار کے اس حصے میں بیٹھا ہمیں دیکھ تو نہیں رہا؟''

ادھر اس کی بات ختم ہوئی ادھر غار میں گھپ اندھیرا بھر گیا بے ساختہ لی یان مجھ سے پیوست ہوگئی۔ میں نے اس کے بائیں کان پر ہونٹ رکھ کر سرگوشی کی ''چلو تمہارا یہ اندیشہ تو جاتا رہا کہ تھاچو ادھر بیٹھا ہمیں دیکھ تو نہیں رہا!''

وہ میری گرفت میں تھوڑا سا کسمسائی۔ انداز الگ ہونے والا نہیں تھا۔ اس کے بدن کی اضطراری جنبشوں نے مجھ پر واضح کردیا کہ وہ مجھ سے پیوستہ رہ کر آمدِ بہار کی متمنی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے فطری تجسس کے ہاتھوں بھی مجبور تھی' تشویش ناک لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''کاشالوک تو ٹھیک ہوگا نا؟''

''ابھی معلوم کرلیتے ہیں!''

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا سیل ہاتھ میں لے لیا پھر کاشالوک والے سیل کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ ڈسپلے کی مخصوص لائٹ میں یہ کام بہ آسانی ہوگیا۔ کاشالوک والا سیل تھاچو کے پاس تھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے سیل کے اسپیکر میں تھاچو کی ''ہیلو'' سنائی دی۔

میں نے پوچھا ''تھاچو! تمہاری طرف خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں' ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''مشعل کو تم نے خود بجھایا ہے یا......؟''

''یہ اپنی مرضی سے بجھی ہے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ''لگتا ہے' اس کا ''ایندھن'' ختم ہوگیا۔ بہرحال' فکر والی کوئی بات نہیں۔''

تھوڑی دیر پہلے تک جس مشعل نے اس غار کو کسی حد تک روشن کر رکھا تھا اس کے بارے میں میری معلومات اس حد تک تھیں کہ وہ جانوروں کی چربی سے جلنے والی ایک مشعل تھی۔ مشعل کا ایندھن ختم ہوجانے والی بات کو سمجھنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ میں نے تھاچو سے کہا۔

''تمہارے پاس ایک ٹارچ بھی تھی۔ اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے نا؟''

جب ہم آج سہ پہر اس غار میں داخل ہوئے تھے تو غار کے اندرون کا جائزہ لینے کے لیے تھاچو نے اپنی پوٹلی میں سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کی تھی۔ میرا اشارہ مذکورہ ٹارچ کی جانب ہی تھا۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''تم فکر نہ کرو' میں نے اپنی ہر شے کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

''کاشالوک کیسا ہے؟'' یہ سوال بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا تھا۔

تھاچو نے بتایا ''اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔ تم لوگ بھی سونے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے' کل کا دن آج سے بھی زیادہ تلف ہو۔ ہوسکتا ہے' ہمیں ایک لمحے کو بھی آرام کرنے کا موقع نہ ملے۔''

''او کے۔ گڈ نائٹ!'' میں نے یہ کہتے ہوئے سیلولر رابطہ موقوف کردیا۔

لی یان سیل سے کان لگائے لیٹی تھی اس لیے ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ اس نے سن لیا۔ وہ سیل ہمارے بیچ سینڈوچ بن گیا تھا۔ میں نے سیل کو کان سے جدا کرکے ایک طرف رکھا تو وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''تھینکس گاڈ! میں کاشالوک کے لیے بہت ٹینس تھی۔''

''اب تو تمہاری ٹینشن دور ہوگئی ہوگی؟'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''ہاں' کافی حد تک!'' اس نے جواب دیا پھر میرے پہلو میں سرسراتے ہوئے بولی ''میری دعا ہے کہ وہ کل اپنے قدموں پر کھڑا ہوجائے!''

قدرت نے عورت کی فطرت میں تجسس اور تشویش کا مادہ بہ نسبت زیادہ رکھا ہے اور اپنے ان جذبات کے اظہار میں وہ یکسر فراموش کر بیٹھتی ہے' وہ کہاں اور کس ماحول میں سانس لے رہی ہے۔ لی یان میرے پہلو میں لیٹی تھی لیکن اس کا ذہن' غار کے دوسرے حصے میں موجود کاشالوک کے لیے متفکر تھا۔ میں نے کاشالوک سے جو مختصر سی گفتگو کی تھی اس نے میری سوچ کو تلپٹ کر رکھا تھا' لی یان کی تسلی کے لیے میں نے کہہ دیا۔

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔''

لی یان باتوں کے موڈ میں دکھائی دیتی تھی۔ باتوں کے لیے ایک عمر پڑی تھی۔ میں نے اس کے موڈ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنی گردن کو جھکایا اور بیک جنبش لب اس کا ناطقہ بند کردیا۔ اس نے ایک نشاط انگیز جھرجھری لی اور میرے وجود میں پیوست ہوتی چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک دوسرے کو اوڑھ کر سونے کی کوشش کررہے تھے۔

اگلی صبح بہت جلدی میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ایک بھرپور' آسودگی بخش انگڑائی لے کر خود کو نئے دن کے لیے تیار کیا۔ اس انگڑائی نے میرے بدن کے ایک ایک حصے کو بیدار کردیا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہ گھما کر اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن غار میں چھائی ہوئی تاریکی نے میری کوشش کو ناکامیاب بنادیا۔ میں محسوس کررہا تھا' اس پہاڑی کے باہر کہیں سورج طلوع ہوچکا ہے مگر طلوعِ آفتاب کے آثار بھی اس طرف نہیں پہنچ پائے تھے۔ میں نے اپنے پہلو میں لی یان کو ٹٹولا لیکن وہ مجھے ''محسوس'' نہ ہوئی۔ میرا یہ پہلو رات بھر اس کے وجود سے آباد رہا تھا پھر وہ کہاں چلی گئی؟

میں یکایک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لی یان کو اپنے قریب نہ پاکر میں پریشان ہوگیا تھا۔ میں غار کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں موبائل فون کا خیال آیا۔ اس کے ڈسپلے کی روشنی میں' میں بہ آسانی لی یان کا سراغ لگا سکتا تھا۔

میں نے سیل کو آن کیا تو اس کی اسکرین روشن ہوگئی۔ ڈسپلے پر نمودار ہونے والی معلومات سے مجھے پتا چلا کہ اس وقت صبح کے سات بج رہے تھے۔ گویا میرے احساسات میری درست راہنمائی کررہے تھے۔ پہاڑی سے باہر کہیں سورج واقعی طلوع ہوچکا تھا' یہ الگ بات کہ اس کی روشنی پہاڑی غار کے اندر نہیں پہنچ پارہی تھی۔ میں نے کلاک سے نگاہ ہٹائی اور ڈسپلے کی محدود روشنی میں لی یان کو تلاش کرنے لگا۔ اگلے ہی لمحے وہ مجھے نظر آگئی۔

اسے پُرسکون' آسودگی کی نیند سوتے دیکھ کر مجھے حیرت کا بھی ایک جھٹکا لگا۔ یہ حیرت اس کی نیند کے سبب نہیں تھی بلکہ میں اس بات پر حیران تھا کہ وہ مجھ سے دور کیسے چلی گئی؟ وہ اس وقت مجھے چار فٹ کی دوری پر دکھائی دے رہی تھی اور دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ بچھونے کے بجائے پتھریلی زمین پر پڑی تھی۔

میں موبائل فون کی روشنی میں بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور اگلے ہی لمحے اس کے قریب پہنچ گیا پھر میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اٹھایا اور اندازے کی بنا پر لاکر' بچھونے پر لٹادیا۔ اس حالت میں ڈسپلے کی روشنی سے استفادہ ممکن نہیں تھا۔ بچھونے پر ڈالتے ہی میں نے موبائل کو اس کی طرف کرتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس نے سوتے ہوئے کسی بچے کے مانند' نئی جگہ پر پہنچتے ہی اپنے ہاتھ پاؤں کو بے معنی حرکت دی اور کروٹ کے بل لیٹ کر پُرسکون ہوگئی۔ میں نے وہاں موجود تمام کپڑوں کو تہ در تہ اس پر ڈال دیا پھر

ڈھیلے کی روشنی میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے نیند کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا تھا' اس کے لیے موسم جیسے بے اثر ہو کر رہ گیا تھا!

لی یان نیند کی حالت میں اور بھی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اس خوابیدہ حسن کی معصومیت کو میں چند لمحات تک نظر ٹھہرا کر دیکھتا رہا پھر غار کے اس حصے کی سمت قدم بڑھا دیئے جو آگے جاتے ہوئے بتدریج تنگ ہوتا چلا گیا تھا۔ میں لی یان کے ساتھ' شام سے تھوڑی دیر پہلے بھی اس طرف آیا تھا لیکن کسی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں واپس تھاچو کے پاس جانا پڑا تھا۔

اس وقت مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ لی یان گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ تھاچو کی طرف چھائی خاموشی سے ظاہر ہوتا تھا' ادھر سب خیریت ہوگی۔ یہ اچھا موقع تھا۔ جب تک وہ لوگ بیدار ہوتے اور سورج کی ناکافی روشنی اس غار کی تاریکی میں سیندھ لگانے کی کوشش کرتی' میں غار کے دوسرے سرے کا سراغ لگا سکتا تھا۔ تھاچو کے تیور تو یہی بتاتے تھے' وہ آگے بڑھنے کے لیے غار کے اسی حصے کو استعمال کرے گا۔

میں تاریکی میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ موبائل فون کو میں نے لباس میں محفوظ کر لیا تھا۔ ان اندھے غار میں مجھے اندازے کی بنا پر قدم اٹھانا پڑ رہے تھے۔ اگرچہ وہ تاریکی' ''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے'' والی نہیں تھی۔ تاہم غار کا اندرونی منظر ایسا واضح بھی نہیں تھا کہ میں بے دھڑک آگے بڑھتا چلا جاؤں۔

دس منٹ کے بعد میری مشکل آسان ہوگئی۔ غار کے اس حصے میں' مہربان اجالا بڑی نرمی سے قدم رکھ رہا تھا۔ موہوم سی رنگین روشنی میرے لیے آسانیاں فراہم کرنے لگی۔ میں اس دل گداز مہمان کے توسط سے کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ غار کے اس حصے میں' ارضی تنگی کے باوجود بھی فرحت اور شگفتگی کا احساس تھا۔ شاید قریب ہی کہیں اس پہاڑی کا کوئی حصہ فضا میں کھلا ہوا تھا جہاں سے تازہ حیات بخش ہوا غار کے اندر پہنچ رہی تھی۔

میں مزید آگے بڑھ گیا۔ اب اس غار نے ایک تنگ سی سرنگ کی صورت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سرنگ اتنی کشادہ ضرور تھی کہ دو افراد پہلو بہ پہلو بہ آسانی آگے بڑھ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ تنگ سا پہاڑ دوز راستہ ایک خاص زاویے سے مڑ رہا تھا۔ میں اس راستے پر سفر کرتے ہوئے اسی سمت میں مڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ایک کشادہ جگہ پر کھڑا تھا۔

وہ مقام مستطیل شکل کا تھا جس کی پیمائش میرے اندازے کے مطابق لگ بھگ بارہ بائی پندرہ فٹ رہی ہوگی۔ اس جگہ سے آگے وہ راستہ ایک مرتبہ پھر بتدریج تنگ ہوتے ہوئے ایک طرف مڑتا چلا گیا تھا۔ میں اس مقام پر ٹھہر کر سوچنے لگا کہ منزل کی تلاش میں آگے کا سفر جاری رکھوں یا واپسی کی راہ اختیار کروں؟

میرے ذہن نے فوری طور پر ایک متوازن فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا تعلق آگے بڑھنے سے تھا اور نہ ہی پیچھے پلٹنے سے۔ اس ''قطعہ زمین'' کو دیکھ کر میرے دل میں خواہش جاگی کہ مجھے کچھ وقت یہاں گزارنا چاہیے۔ کیوں......؟ ذہن نے اس بارے میں بھی سوچ لیا۔ ذہن کی اس سوچ میں اعضا کی بے قراری کو بھی دخل تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضا ایکسر سائز کو مچل رہے تھے۔ یہ میرے جسم کی ایک فطری خواہش تھی۔ پچھلے دنوں سے میں مارشل آرٹس کی ایکسر سائز ز اور یوگا کی مخصوص مشقوں سے بہت دور ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے جسم' دماغ اور روح کو تھوڑی ''زحمت'' دینے کے فیصلے پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

بدھ بھکشوؤں والے مخصوص ڈھیلے ڈھالے لباس کے نیچے میں نے انڈر ویئر پہن رکھا تھا۔ میں نے اس لبادے کو اتار کر ایک طرف پتھریلی زمین پر رکھ دیا اور محض انڈر ویئر بدن پر سجائے ایکسر سائز میں مصروف ہو گیا۔ یوگا' جمناسٹک اور مارشل آرٹس کی ایکسر سائز ز بھی عجیب و غریب اثرات کی حامل ہوتی ہیں۔ موسم چاہے کتنا بھی سرد کیوں نہ ہو' یہ پسینہ نکال کر رکھ دیتی ہیں۔

میں نے وارم اپ ہونے کے لیے تھوڑی جمپنگ کی پھر لیگ اسٹریچنگ کرنے لگا۔ اسٹریچنگ چاہے بدن کے کسی بھی حصے کی ہو' اگر صحیح طور پر کی جائے تو لگ پتا جاتا ہے۔ بھرپور اسٹریچنگ کے بعد میں نے چھوٹی بڑی ہر نوعیت کی کلکنگ کی۔ اس کے بعد پنچنگ اور بلاکنگ کا نمبر آیا۔ میں نے کراٹے کے زین زے' لی لونگ اور ہوما گاچی کا تاز کے ساتھ ساتھ کنگ فو کے چند فارمز کی پریکٹس بھی کی۔ خاص طور پر ''لو یگ شو'' فارم کی تکمیل کے دوران میں میرے بدن کا ایک ایک مسام پسینہ اگلنے لگا تھا۔ یہ نہایت ہی محدود جگہ پر کیا جانے والا ایک مشکل ترین فارم تھا جس کی تربیت میں نے شاؤلن ٹیمپل میں حاصل کی تھی۔

مارشل آرٹس کو خیر باد کہہ کر میں یوگا کی طرف آ گیا۔ ہتھ یوگ اور راج یوگ کے مسائل سے الجھے بغیر میں نے پرانا

یم (PRANAYAM) کی مشق کی۔ پرانا یم کا تلفظ ''پرانا یام'' بھی کیا جاتا ہے۔ یوگا کا یہ شعبہ سانس کی مشقوں یعنی بریدنگ سے متعلق ہے۔ میں دس منٹ تک اسٹروک بریدنگ سے اپنے جسم و جان کو نئی تندرستی اور تازگی بخشتا رہا۔ مشق کے اختتام پر میں نے خود کو چاق و چوبند پایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میرے اندر نئی توانائی اتر آئی ہو۔

میں آنکھیں کھول کر اپنے ماحول میں حاضر ہوا تو میری سماعت ایک نئے انکشاف سے آشنا ہوئی۔ قریب ہی کہیں پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا' جب میں نے وہاں ایکسرسائز کا آغاز کیا تو ایسی کوئی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ ایکسرسائز کے دوران میں بھی ایسا کوئی احساس نہ ہوا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا' پرانا یم کی مشق کے دوران ہی میں پیش آیا تھا۔ بریدنگ...... خاص طور پر اسٹروک بریدنگ کرتے ہوئے انسان اپنے ماحول سے غافل ہو جاتا ہے۔ پانی گرنے کی یہ مخصوص آواز شاید اسی عرصے میں آغاز ہوئی تھی۔

میں نے پوری توجہ اس آواز پر مرکوز کر دی۔ جلد ہی میں یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ آواز اس سمت سے آ رہی تھی جدھر اس غار کا دوسرا سرا متوقع تھا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں آگے بڑھنے لگا۔ ایک پہاڑی غار کے اندر' پانی گرنے کی مترنم آواز بڑی پُرکشش اور سریلی ہوتی ہے۔ میں اس کشش میں کھنچ کر تھوڑا اور آگے بڑھا تو صورتِ حال مجھ پر عیاں ہو گئی۔

میں اس غار کے اندر پانی کے ایک چھوٹے سے تالاب کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس تالاب کی پیمائش کم و بیش چھ ضرب چھ فٹ رہی ہوگی۔ گہرائی کا اندازہ میں نے دو فٹ کے قریب لگایا۔ مذکورہ تالاب پر کوئی منڈیر وغیرہ نہیں بنی ہوئی تھی بلکہ وہ سارا سیٹ اپ قدرتی دکھائی دیتا تھا۔ اس میں انسانی ہاتھ کی کوشش کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ میں کشاں کشاں اس تالاب کے قریب چلا گیا۔

تالاب میں جمع ہونے والا پانی اتنا صاف اور شفاف تھا کہ تہ کی پتھریلی زمین آئینے کے مانند دکھائی دیتی تھی۔ یہ پانی غار کی چھت سے کسی چھلنی کے مانند تالاب کے اندر سے ٹپک رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' چھت میں بڑے سوراخوں والا کوئی کنگ سائز شاور نصب ہو۔ تالاب لبالب پانی سے بھرا ہوا تھا اور کناروں کے اوپر سے بہنے والا پانی اپنا راستہ خود بناتے ہوئے پتھریلی زمین میں جذب ہو کر پتا نہیں کہاں جا رہا تھا۔ جس طرح اس پانی کے بارے میں' میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پہاڑی کے اندر ہی اندر سفر کرتے ہوئے کہاں سے آ رہا ہے' بالکل ویسے ہی یہ بتانا بھی ناممکن تھا کہ تالاب سے رخصت ہونے والا پانی کہاں جائے گا۔

میں محویت کے عالم میں کھڑا چند لمحات تک دستِ قدرت کے اس کرشمے کو دیکھتا رہا۔ وہ بہت ہی خوش ساعت اور نظر فریب منظر تھا۔ اس منظر کی دلکشی اور حسن سے محظوظ ہونے کے لیے جتنا وقت بھی میسر آ جاتا' کم تھا۔ کچھ دیر بعد میرے دل میں اس تالاب کے پانی کو ''چیک'' کرنے کی خواہش جاگی۔ یہ ایک فطری اور بے اختیاری خواہش تھی۔

میں نے کنارے پر اکڑوں بیٹھ کر تالاب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اگلے ہی لمحے میں ایک خوشگوار تجربے سے گزرا۔ تالاب کا پانی اچھا خاصا حرارت بخش تھا۔ اسے گنگنا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں نے سن رکھا تھا' پہاڑوں کے اندر مختلف اقسام کی دھاتیں اور معدنیات پائی جاتی ہیں جن میں چونے اور گندھک کے ذخائر بھی شامل ہیں۔ ان ذخائر کے آس پاس سے گزرنے والا پانی غیر معمولی حرارت حاصل کر لیتا ہے اور اگر یہ پانی ان ذخائر کو باقاعدہ چھو کر آ رہا ہو تو ان کے طبعی اور کیمیائی خواص کو بھی اپنے اندر شامل کر لیتا ہے۔ ایسا پانی خطرناک ہو جاتا ہے۔ میں نے تالاب کے پانی کی ''خطرناکی'' کو بھی چیک کرنا ضروری سمجھا۔

میں نے جھک کر ایک چلو میں پانی بھرا' ابھرا اسے ناک کے قریب لا کر سونگھا۔ اس پانی میں سلفر یا کیلشیم کی مخصوص بو نہیں تھی۔ میں نے تھوڑا سا پانی زبان پر ڈال کر اسے چکھا اور ایک مرتبہ پھر حیران رہ گیا۔ وہ گنگنا پانی انتہائی خوش ذائقہ تھا۔ عمدہ قسم کا امپورٹڈ پانی پینے والے صاحبِ ثروت حضرات اگر اس تالاب سے دو گھونٹ پانی پی لیتے تو فرانس اور ناروے کا رخ کرنا بھول جاتے۔

میرے دل میں غسل کی خواہش مچل اٹھی۔ میں نے اپنی اس خواہش پر عمل کرنے میں ذرا سی تاخیر بھی مناسب نہ سمجھی اور اس تالاب میں اتر گیا پھر پندرہ منٹ تک میں اس فرحت بخش پانی سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے اپنے بدن کے مضمحل حصوں کو نشاط انگیز لہروں سے سیراب کرتا رہا۔ جب میں نے دوبارہ بدھ بھکشوؤں والا لباس پہنا تو خود کو روئی کے گالوں کے مانند ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس اوپن باتھ نے جسم و جان کی ساری تھکن کو چوس کر مجھے ایک دم فریش کر دیا تھا۔

میں واپس غار کے اس حصے میں آیا جہاں میں نے بھرپور ایکسرسائز کی تھی۔ میں اس کمرا نما جگہ کے ایک کونے

میں کنول آسن کی صورت زمین پر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے ساحل کی طرف پرواز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس وقت میرا ذہن تر و تازہ تھا۔ ظاہرہ آنکھیں بند ہوتے ہی تھرڈ آئی نے کام شروع کر دیا لیکن اس کی کارکردگی کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔

میں نے دوبارہ' سہ بارہ ٹرائی کی لیکن ربی موشے ہائمن نے تیسری آنکھ کی راہ میں اتنی بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی تھی کہ مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس وقت اسرائیل میں صبح کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ ربی اور ساحل یقیناً نیند میں ہوں گے۔ میں نے مزید ایک دو کوشش کے بعد آنکھیں کھول دیں۔

اسی لمحے موبائل فون کی گھنٹی کی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ سیل کو جیب سے نکال کر باہر رکھنے کی ضرورت پیش آ رہی تھی لہٰذا میں نے اس کی جملہ گھنٹیاں آن کر دی تھیں۔ جسم سے دور ہونے کی صورت میں وائبریٹر مجھے کال سے آگاہی نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے سیل کو لباس میں سے برآمد کیا اور کال اٹینڈ کرنے کے لیے کان سے لگا لیا۔ دوسرے ہی لمحے لی یان کی گھبرائی ہوئی آواز سننے کو ملی۔ وہ کاشالوک والے سیل سے بات کر رہی تھی۔

''وجدان! تم کہاں ہو۔ فوراً یہاں آ جاؤ۔''

''یہ سیل تو تھاچو کے پاس تھا۔ تم وہاں......؟''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے جلدی سے بولی ''میں اس وقت تھاچو کے پاس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ۔''

''آخر مسئلہ کیا ہے؟'' میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی ''وہ...... وہ کاشالوک......!''

''کیا ہوا......'' میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا' ''کاشالوک کو کیا ہوا؟''

دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔ لی یان نے بات ادھوری چھوڑ کر سیلولر رابطہ موقوف کر دیا تھا۔ میرے اندر ایک نامعلوم سا اضطراب پھیلتا چلا گیا۔ میں کاشالوک کی طرف سے پہلے ہی گہری تشویش میں مبتلا تھا۔ اگرچہ تھاچو نے اس کی صحت یابی کا مجھے یقین دلایا تھا لیکن میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ کاشالوک کی الوداعی گفتگو مجھے آگے کے حالات سے بہ خوبی آگاہی دے گئی تھی۔ لی یان کی گھبرائی ہوئی ادھوری کال مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اگر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تھاچو کے پاس پہنچی ہوئی تھی تو اس کا ایک ہی مطلب تھا یعنی وہاں کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی تھی!

میں ممکنہ تیزی سے بھاگتے ہوئے غار کے اس حصے میں پہنچا جہاں تھاچو کو کاشالوک کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ تھاچو اور لی یان کی صورتوں کو دیکھتے ہی میں سب کچھ سمجھ گیا۔ کسی سوال کی گنجائش باقی نہیں تھی تاہم بے اختیار میری زبان سے یہ استفسار پھسل ہی گیا۔

''تھاچو! کاشالوک کو کیا ہو گیا ہے؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے خاموشی سے آگے بڑھ کر میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہایت ہی گمبھیر آواز میں بولا ''اس جنم میں اس کی سانسیں پوری ہو گئی تھیں۔ لارڈ بدھا اسے سکون دے!''

''مم...... مگر تم نے تو اس کا کامیاب آپریشن کیا تھا!'' میری آواز نہ چاہتے ہوئے بھی بلند ہو گئی اس آواز میں ایک احتجاج بھی شامل تھا ''اور...... اور اس کی بحالیِ صحت کا یقین بھی دلایا تھا؟''

وہ میرے شانے کو تھپکتے ہوئے بولا ''میں نے تم سے کوئی بھی غلط بیانی نہیں کی تھی وجدان مگر لارڈ بدھا کی مرضی......!''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر مسلسل میرا شانہ تھپکتا چلا گیا۔

میں یک ٹک خاموش لیٹے کاشالوک کو دیکھتا چلا گیا۔ تھاچو نے پتا نہیں...دیوار میں نصب مشعل پر کون سا طلسم پھونکا تھا، بہرحال وہ اس وقت روشن تھی اور اپنی ملگجی روشنی سے وہاں کے ماحول کو حتی الامکان اجالنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، کسی مصلحت کی بنا پر تھاچو نے رات مشعل کو خود ہی بجھا دیا ہو! یہ مصلحت مشعل کا ''ایندھن'' بچانا بھی ہو سکتی تھی۔

میری نگاہ کاشالوک کی لاش پر جمی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا جیسے وہ گہری نیند میں ہو۔ ایک لمحے کے لیے بھی دل یہ یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ وہ آن جہانی ہو چکا ہے۔ پتا نہیں کیوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ تھاچو کو پیش آمدہ حالات سے پیشگی آگاہی تھی۔ اس نے اب تک جو کچھ بھی کیا، اپنا فرض جان کر کیا تھا۔ وہ چاہے کاشالوک کا آپریشن ہو یا ہمیں اس کی صحت یابی کے بارے میں تسلی تشفی دینا!

کاشالوک کی موت سے مجھے ذہنی اور قلبی دھچکا لگا تھا۔ وہ نہایت ہی کم وقت میں میرے بہت زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ میرے بہت سے قریبی افراد کی اموات ہوئی تھیں لیکن امتیاز علی کے بعد کاشالوک وہ شخص تھا جس کے زیاں نے مجھے اندر

سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اپنوں کی جدائی کا یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بے یقینی صدمے کی انتہا ہوتی ہے۔ امتیاز علی اور کاشانوک میرے ایسے ہی اپنوں کی فہرست میں تھے...... آہ تھے!

لی یان بھی ایک جانب سر جھکائے کھڑی تھی۔ میں نے پچھلے کئی گھنٹوں سے اسے کاشانوک کے لیے گہری تشویش میں مبتلا دیکھا تھا۔ اس کے غم کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ ہم تھوڑی دیر تک یونہی ماتمی فضا میں خاموش کھڑے رہے پھر تھاچو کی بھرائی ہوئی آواز نے ہمیں چونک کر اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"تم دونوں ادھر چلے جاؤ۔ میں کاشانوک کے آخری فرض کو نبھا کر تمہارے پاس آتا ہوں۔" اس نے اس جانب اشارہ کیا جہاں ہم نے رات بسر کی تھی "اب ہمیں کاشانوک کے بغیر ہی آگے بڑھنا ہوگا۔"

تھاچو کے آخری جملے پر میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا، بدھ کے پیروکار آں جہانی ہو جانے والوں کے آخری معاملات کو کیسے نبھاتے ہیں لیکن تھاچو کی بات سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ غار کے اس حصے میں کاشانوک کی لاش کے ساتھ کچھ ہی کرنے جا رہا تھا کہ اس کا تعلق کاشانوک کی آخری رسومات ہی سے تھا۔

میں نے غم زدہ اور بوجھل آواز میں کہا "ہم دونوں اپنے سامان کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ تم اپنے فرض سے نمٹنے کے بعد ادھر ہی آجانا۔ ویسے اندازاً تمہیں کتنا وقت لگے گا؟"

"لگ بھگ ایک گھنٹا!" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا "اس غار کے دوسرے سرے کی جانب میں نے صاف شفاف پانی کا ایک قدرتی تالاب دریافت کرلیا ہے۔ ہم اس تالاب پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" پھر میں نے اپنی تسلی کے لیے اس سے پوچھ لیا "ہمیں واپسی کی راہ اختیار کرنے کے لیے غار کے اسی سرے کی طرف جانا ہے نا؟"

"بالکل، ہم اسی جانب سے اسی پہاڑی سے باہر نکلیں گے۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"او کے! ہم جا رہے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

تھاچو ہمیں یک سر نظر انداز کر کے کاشانوک کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے لی یان کا ہاتھ تھاما اور گردن جھکا کر اس سمت چل پڑا جدھر ہمارا سامان پڑا تھا۔ اس وقت میرا دل غم سے بوجھل تھا۔ لی یان کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے ہمارے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ جن لوگوں کے محسوسات کام کرتے ہیں، انہیں زبان سے ایک لفظ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی!

پیکنگ کے دوران میں میرا ذہن مسلسل کاشانوک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی ادائیں، اس کی باتیں رہ رہ کر یاد آرہی تھیں۔ میں نے اس کی زندگی میں بڑا توازن، بڑی پرفیکشن پائی تھی۔ وہ ایک سچا بدھسٹ تھا۔ ہمارا ساتھ نہایت ہی مختصر دورانیے کا تھا لیکن اس قلیل مدت میں اس نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا...... اور یہ متاثر پن اس کی جدائی کے بعد کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ انسان جس کے جتنا قریب ہوتا ہے، اس کی جدائی اس قربت کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ اس کیفیت کی لذت سے صرف وہی لوگ آشنا ہیں جو کسی اپنے کی فرقت کو قربت کے پتے پر رقم کیے بیٹھے ہوں!

کاشانوک کے بارے میں سوچتے ہوئے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ صرف تھاچو ہی کو نہیں بلکہ کاشانوک کو بھی یہ احساس تھا کہ ہمارا ساتھ طویل نہیں ہے۔ اسے یقین تھا، وہ ہمارے ساتھ تبت کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکے گا اور اس یقین کا غیر ارادی اظہار اس کی زبان سے اس وقت ہوا تھا جب ہم کھٹمنڈو سے نکل کر تبت جانے کی پلاننگ کر رہے تھے۔

اس کے الفاظ میرے ذہن میں گونجنے لگے...... تھاچو کے قافلے کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا، میں نے تم لوگوں کے بہ حفاظت کھٹمنڈو سے نکل کر تبت پہنچنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ کل صبح سات افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا قافلہ بودھ ناتھ استوپا سے روانہ ہوگا۔ اس قافلے میں پانچ مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ تم دونوں کی شمولیت کے بعد یہ تعداد بڑھ کر نو ہو جائے گی یعنی، چھ مرد اور دو عورتیں۔ میں نے اس قافلے کے سردار بدھ بھکشو تھاچو کو اعتماد میں لے کر ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے......

کاشانوک کے اظہار سے واضح تھا کہ وہ ہمارے ساتھ تبت نہیں جا رہا۔ یہ بات محسوس کرتے ہی جب میں نے اس بارے میں اس سے استفسار کیا تو وہ جلدی سے بات بناتے ہوئے بولا، اوسوری! میں خود کو شمار کرنا بھول گیا تھا۔

وہ کچھ بھی نہیں بھولا تھا بلکہ جب میں نے اس کی 'چوری' پکڑ لی تو وہ اپنی حمایت میں جواز پیش کرنے لگا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے، اسے اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ ہمارا ساتھ عارضی ہے، وہ بیچ راہ میں ہمیں داغِ مفارقت

دے جائے گا!

انسان چلا جاتا ہے اور اس کی باتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ کاشانوک کے بعد ہم شخص اس کی باتوں ہی کو یاد کر سکتے تھے۔ اسے واپس لانا تو کسی کے اختیار میں نہیں تھا۔ بدھ مت کو ماننے والے آواگون (Reincarnation) کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں تاہم ان کا آواگون ہندو مت کے آواگون سے تھوڑا مختلف ہے بہرحال معنوی اعتبار سے ایک ہی بات ہے یعنی انسان مرنے کے بعد پھر جنم لیتا ہے، پھر مرتا ہے، پھر پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بدھا کے پیروکاروں کو چونکہ یہ یقین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوبارہ پیدا ہوں گے اس لیے کسی کی موت پر وہ زیادہ دل گرفتہ اور ملول نہیں ہوتے۔

پیکنگ کے بعد ہم غار کے اس حصے کی جانب چل پڑے جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نے غسل کیا تھا۔ ہمارے درمیان کاشانوک کے انجام کے بارے میں نہایت ہی مختصر بات چیت ہوئی پھر لی یان نے مجھ سے پوچھ لیا۔

"وجدان! تم نے اس غار کے اندر کسی قدرتی تالاب کا ذکر کیا تھا؟"

"ہاں، ایک حیرت انگیز تالاب واقعی یہاں موجود ہے۔"

"حیرت انگیز کیوں؟" اس نے سوال کیا۔

"دیکھو گی تو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "لگتا ہے تم نے پتا چلا لیا ہے؟"

"میں نے اس قدرتی تالاب میں ایک حیات آفرین اور فرحت بخش باتھ لیا ہے!" میں نے بتایا۔

"باتھ!" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی "اس ٹھنڈے ٹھار موسم میں تو تالاب کا پانی برف سے بھی زیادہ یخ بستہ ہوگا۔ تمہاری قلفی نہیں جمی؟"

میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا "میں نے اس تالاب کو حیرت انگیز کہا ہے اور باتھ کے حوالے سے فرحت بخش اور حیات آفرین جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اگر قلفی جمنے والی صورتِ حال سے نمٹ کر آرہا ہوتا تو میرے بیان میں تمہیں ایسا اطمینان نظر نہ آتا۔"

"پھر؟" وہ ذرا یک رک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کے ذہن کو زیادہ الجھانا مناسب نہ سمجھا اور اس تالاب کے خواص کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ پوری دلچسپی سے میری بات سننے کے بعد اس نے کہا۔

"واقعی! یہ سب تو انتہائی حیرت انگیز ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا!"

"جب اپنی آنکھوں سے دیکھو گی اور ہاتھ سے تالاب کے پانی کو چھوؤ گی تو یقین بھی آجائے گا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے اس کمرا نما جگہ پر پہنچ گئے جہاں میں نے بھرپور ایکسرسائز کی تھی۔ مذکورہ تالاب یہاں سے چند قدم آگے موجود تھا۔ میں لی یان کو اس تالاب پر لے آیا۔ جب وہ بھی اس تالاب کے پانی کو 'چیک' کرنے کے تجربے سے گزری تو حیرت زدہ رہ گئی۔ میری جانب دیکھتے ہوئے ہیجانی لہجے میں بولی۔

"وجدان! تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا!"

"میں نے غلط کب کہا ہے؟"

"میں بھی غسل کی ضرورت محسوس کر رہی ہوں۔" وہ سادے سے لہجے میں بولی۔

میں نے کہا "بالکل ضرور، بدن کو صاف ستھرا رکھنا صحت کا پیغام ہے۔ اس سے پہلے کہ تھاچو یہاں پہنچ جائے، تم ایک گنگنا باتھ لے کر فریش ہو جاؤ۔"

وہ تذبذب بھری سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے اس کی نگاہ میں موجود الجھن کو بھانپ لیا اور اس کے اطمینان کی خاطر کہا "تم بے فکر ہو کر لباس اتارو اور تالاب میں اتر جاؤ میں ادھر کمرے میں بیٹھا ہوں۔ اس دوران میں اگر تھاچو یہاں پہنچ گیا تو میں اسے ادھر ہی روک لوں گا۔ جب تک تم لباس پہن کر ہمارے پاس نہیں آجاتیں، ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔"

وہ مطمئن ہو کر اپنے لباس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

میں گردن جھکا کر غار کے اس کمرا نما حصے کی جانب چل پڑا جہاں میں نے یوگا اور مارشل آرٹس کی بھرپور ایکسرسائز کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لی یان تر و تازہ ہو کر میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ شبنم میں دھلے ہوئے کسی گلاب کے مانند کھل گئی تھی۔ میں اس گنگا جل میں نہائی ہوئی اجنتا کی مورت کو شایانِ شان نظر سے نہ دیکھ سکا...... وہ نظر اس کا حسن جس کا متقاضی تھا کیوں کہ اس وقت میرے قلب و نظر کو کاشانوک کی جدائی نے دھندلا رکھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد تھاچو اپنا سامان اٹھائے ہمارے پاس پہنچ گیا۔ وہ حد سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دیتا تھا۔ سامان کی پوٹلی کو اس نے مخصوص انداز میں کندھے پر لٹکا رکھا تھا۔ اس نے باری باری سوالیہ نظر سے ہم دونوں کو دیکھا اور یک لفظی

استفسار کیا۔

''چلیں؟''

ہم خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیے۔

اب ہم غار کے اس حصے کی جانب بڑھ رہے تھے جدھر سے ہمیں اس پہاڑی سے باہر نکلنا تھا۔ تالاب کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم غار کے بہ نسبت تنگ حصے کی جانب قدم اٹھانے لگے۔ ہمارے درمیان ایک بے نام سی خاموشی حائل تھی۔ ہم بہ خوبی جانتے تھے، اس اداس خاموشی کا سبب کیا ہے لیکن ہم اسے کوئی معنی پہنانے، کوئی نام دینے سے قاصر تھے۔ کاشانوک کے غم نے ہماری زبانوں پر برداشت کا قفل ڈال رکھا تھا۔

ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، اس غار کا راستہ زیادہ چکر دار ہوتا جا رہا تھا۔ خم دار موڑ کے ساتھ ساتھ سفر جاری رکھتے ہوئے بڑے واضح انداز میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم آگے بڑھنے کے ساتھ ہی نشیب میں بھی اتر رہے ہیں، یعنی ہماری یہ مسافرت بلندی سے پستی کی جانب تھی۔ کچھ آگے جا کر ڈھلوان کا زاویہ اتنا بڑھ گیا کہ مجھے اس اندیشے نے آن گھیرا کہ خدانخواستہ یونہی چلتے چلتے ہم کہیں پاتال میں نہ اتر جائیں!

اس دوران میں تھاچو نے ایک مرتبہ بھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں یک سر فراموش کر بیٹھا ہو۔ اس تنگ غار میں ہم تین افراد کا پہلو بہ پہلو چلنا ممکن نہیں تھا لہٰذا ہم تھاچو کی تقلید میں اس طرح اس کے پیچھے چل رہے تھے کہ کھوے سے کھوا چھلنے والی صورتِ حال تھی۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد ڈھلوانی سفر میں خاطر خواہ تبدیلی آئی۔ اب ہم بالکل ہموار چل رہے تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ تنگ سا راستہ بلندی کی طرف ہولیا۔ یہ سفر پچھلے سفر سے بہ نسبت کٹھن اور دشوار گزار تھا۔ تھاچو کی گمبھیر خاموشی بتاتی تھی کہ وہ اپنے اندر کوئی خطرناک طوفان چھپائے ہوئے ہے۔ ابھی تک اس نے کاشانوک کے ''آخری معاملات'' کے بارے میں ہمیں کچھ بتایا تھا اور نہ ہی ہم دونوں میں سے کسی نے کوئی سوال کیا تھا۔ یہ ایسا موضوع تھا کہ فی الحال اس پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اس پُر اسرار پہاڑی کے اچنبھک غار میں لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹے تک ہمارا سفر جاری رہا اور بالآخر ہم اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جسے ہماری عارضی منزل کہا جا سکتا تھا یعنی ہم نے غار کے دوسرے سرے تک رسائی حاصل کر لی۔

ہم تینوں نے اطمینان بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور یکے بعد دیگرے پہاڑی کے اندر سے نکل کر ایک مسطح چٹان پر پہنچ گئے۔ میں نے اپنے عقب میں اس مقام کو دیکھا جہاں سے ہم باہر نکلے تھے پہلی نظر میں، میں اندازہ نہ لگا سکا کہ کیا واقعی اس جگہ سے پہاڑی کے اندر اترا جا سکتا ہے۔ وہ پہاڑی خلا ایسے زاویے پر واقع تھا کہ بادی النظر میں اس کی طرف دھیان نہیں جاتا تھا۔ بلاشبہ، وہ پہاڑی اندر باہر سے ایک طلسم کدہ تھی۔

میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ جو بھی ہو، ہم اس پہاڑی سے باہر آ گئے تھے۔ اسی لمحے لی یان کی متلاطمانہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وجدان! میں دیکھ رہی ہوں۔ ہم کسی اور علاقے میں نکل آئے ہیں!''

''کیا مطلب؟'' میں نے بے ساختہ کہا اور گہری نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا۔

لی یان واقعی درست کہہ رہی تھی۔ یہ وہ علاقہ نہیں تھا جہاں سے ہم اس پہاڑی کے اندر داخل ہوئے تھے۔ میں نے اس لوکیشن کو ذہن میں نقش کر لیا تھا۔ اس وقت ہم ایک بالکل مختلف لوکیشن میں کھڑے تھے۔ میں نے تھاچو سے استفسار کیا۔

''یہ کیا ماجرا ہے تھاچو؟''

''ماجرا کچھ نہیں!'' وہ نگاہ کے سامنے پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہ پر ایک شناسا نظر ڈالتے ہوئے سنجیدگی سے بولا ''دراصل ہم اس عظیم الجثہ پہاڑی کے اندر ہی سفر کرتے ہوئے اس کے عقب میں نکل آئے ہیں۔ اسی لیے تمہیں یہ ماحول بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دیکھو!'' اس نے شمال کے رخ پر اشارہ کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''یہاں سے ساگر ماتا کتنا واضح نظر آ رہا ہے!''

ساگر ماتا یعنی ماؤنٹ ایورسٹ واقعی اس زاویے سے زیادہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ سورج آسمان پر موجود تھا اور میٹھی حرارت والی گداز دھوپ نے قرب و جوار میں خیمے ڈال رکھے تھے۔ موسم انتہائی خوش گوار اور ''نکوری'' تھا۔ دھوپ میں تمازت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لیے اس کی نرم و ملائم حرارت بدن کے ایک ایک حصے کی بڑی آسودگی بخش سکائی کر رہی تھی۔ اس اجلی اور دھلی دھلائی فضا میں ماؤنٹ ایورسٹ کا پُر ہیبت مگر دل کش نظارہ مبہوت کر دینے والا تھا۔ میں نے اس عظیم المرتبت پہاڑ کی جانب دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا۔

اس کرۂ ارض پر قدرت کی ایسی ایسی نشانیاں موجود ہیں جو انسان کو اپنا عزم اور حوصلہ آزمانے پر اکساتی ہیں۔ خدا کا یہ نائب صلاحیتوں اور ہمت و استقلال میں دوسری تمام مخلوقات پر بھاری ہے۔ قدرت نے اپنے خلیفہ یعنی حضرت انسان کو اعلیٰ و افضل بنا کر اشرف المخلوقات ہونے کا اعزاز بخشا ہے لہٰذا یہ ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا ہنر جانتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ وہ واقعی انسان ہو!

ماؤنٹ ایورسٹ حضرت انسان کے لیے کسی وقت بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس چیلنج کو سب سے پہلے اس اشرف مخلوق کے دو نمائندوں سر ایڈمنڈ ہیلری اور تنگ زنگ نارگے نے قبول کیا اور اپنی سرتوڑ جاں لیوا کوشش کے بعد بالآخر انیس سو ترپن عیسوی میں اس انتیس ہزار اٹھائیس فٹ بلند دیوزاد کو سر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ کارنامہ انجام دینے سے قبل انہوں نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ یہ اعزاز ان کے حصے میں آئے گا۔ بہر حال، قدرت کسی کی محنت کو ضائع نہیں جانے دیتی۔ سچی لگن سے کوشش کرنے والے کو اس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ قدرت کے نوازنے کا اپنا ایک انداز اور معیار ہے جس میں کسی گورے کالے یا عربی عجمی کی کوئی تفریق نہیں!

اب ہمارے سامنے آگے بڑھنے کا مسئلہ تھا۔ دن کا نصف اول تقریباً گزر چکا تھا۔ پہاڑی علاقوں میں دن کا نصف ثانی زیادہ تیزی سے گزرتا ہے۔ میں نے تھاچو کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''تمہارے اطمینان کو دیکھتے ہوئے میں محسوس کر رہا ہوں، تم اس علاقے سے ناواقف نہیں ہو۔ ہمیں اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے کدھر کا رخ کرنا ہوگا؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ یہ گویا میرے سوال کے پہلے حصے کا جواب تھا۔ اس کے بعد وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تم سوچ بھی نہیں سکتے، ہم نے اس پہاڑی کے اندر جو چکر دار فاصلہ طے کیا ہے اس نے باہر سے ہماری مسافت کو کس قدر کم کر دیا ہے۔ اگر ہم شمال مغرب کی جانب سفر جاری رکھیں تو مجھے یقین ہے، آدھے گھنٹے بعد ہم ڈلوگھاٹ پہنچ جائیں گے۔''

''ڈلوگھاٹ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ''ڈلوگھاٹ ایک چھوٹا سا پہاڑی قصبہ ہے اور یہ سن کر تمہیں حیرت ہوگی یہ قصبہ کھمنڈو سے لگ بھگ ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔''

''کیا واقعی؟'' میں یک لخت اچھل پڑا۔

''میں نے کہا تھا نا، تم حیرت زدہ رہ جاؤ گے!'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا ''تھاچو! تم نے بات ہی ایسی ناقابلِ یقین سی کی ہے۔ ہم نے کھمنڈو سندری جل تک پہنچنے کے لیے تیرہ کلومیٹرز کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس سے آگے جہاں ہم نے کوچ کو چھوڑا اگر اس کو زیادہ سے زیادہ سات کلومیٹرز بھی شمار کر لیں تو یہ کل فاصلہ بیس کلومیٹرز ہو جائے گا۔ کہاں بیس اور کہاں ستر۔ کیا ہم نے اس پہاڑی کے اندر پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر لیا ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ''دراصل پہاڑی اور زمینی راستے کا حساب ایک دوسرے سے بہت مختلف ہے۔ زمین پر جو مقام دس کلومیٹرز کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقے میں بعض اوقات، اتنے ہی فاصلے پر موجود مقام تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں دشوار گزار تیس چالیس کلومیٹرز طے کرنے پڑتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ناک کی سیدھ میں آگے بڑھنا ممکن نہیں ہوتا لہٰذا پہاڑی کی بناوٹ اور زاویوں کو دیکھتے ہوئے راستہ بنایا جاتا ہے۔''

اس کی وضاحت نے مجھے مطمئن کر دیا۔ اس اطمینان میں غالب ہاتھ اس خوش خبری کا تھا کہ ہم کھمنڈو سے لگ بھگ ستر کلومیٹرز دور نکل آئے تھے۔ لی یان اپنے خدشے کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکی۔ وہ تھاچو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تھاچو! تمہارا کیا خیال ہے، اس طرف نکل آنے کے بعد ہمیں ہیلی کاپٹر والے دشمنوں کی جانب سے کوئی خطرہ تو باقی نہیں رہا؟''

ہم نے ابھی تک تھاچو کو مسٹر شرما اور اس کے گینگ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اسی لیے لی یان دشمنوں کا ذکر کرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کا حوالہ دے رہی تھی۔

تھاچو بے پروائی سے بولا ''وہ لوگ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے، اس وقت ہم کہاں ہیں؟''

''ٹھہرو، میں چیک کرتا ہوں'' میں نے اپنی جیب میں سے سوریا داس والا موبائل برآمد کرتے ہوئے کہا ''ابھی پتا چل جائے گا وہ بے شرم شرما کہاں جھک مار رہا ہے!''

میں سیل پر اپنی انگلی کو متحرک کرنے ہی والا تھا کہ ڈسپلے پر سگنلز والے کالم کو دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہاں سگنلز نہیں آ رہے تھے۔ میں نے اس حقیقت کا انکشاف کیا تو لی یان نے کاشانوک والے سیل کو چیک کیا۔ وہ سیل بھی سگنلز سے محرومی

ظاہر کررہا تھا۔ گویا، نیپال والا نیٹ ورک یہاں کام نہیں کررہا تھا۔ ہمارے اردگرد کوئی ایسا انٹینا موجود نہیں تھا جو سگنلز کی فراہمی کا سبب بنتا۔

میں نے سوالیہ نظر سے لی یان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ اس دوران میں تھاچو بڑی دلچسپی سے باری باری ہمارے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہمیں الجھن میں گرفتار پاکر اس نے پوچھ لیا۔

"کیا مسئلہ ہے؟ تم دونوں کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو!"

ہم نے بیک زبان ہوکر کہا "مسئلہ ہمارے ساتھ نہیں بلکہ موبائل فونز کے ساتھ ہے!"

اس نے استفساریہ نظر سے ہمیں دیکھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

وہ بولا "جدید سائنس کی یہ ایجاد اب تمہارے لیے بے کار ہوچکی ہے۔ بہتر ہوگا، اپنے موبائل فونز کو لباس میں محفوظ کرلو۔ یہ اس وقت چھوٹے چھوٹے کھلونوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور کھلونے بھی بے جان جن سے کھیلنا بھی بے مزہ!"

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا "اب ہمیں فوراً آگے بڑھ جانا چاہیے۔"

اس کی تجویز انتہائی معقول تھی لہٰذا ہم نے باہمی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے ڈولوگھاٹ کی جانب قدم بڑھادیے۔ یہ سفر بہ خیر و عافیت طے ہوا اور ہم دوپہر بارہ بجے سے پہلے ڈولو گھاٹ میں تھے۔

قسمت بھی اپنی مرضی سے مہربان اور نامہربان ہوتی ہے۔ کہاں تو ہماری زندگی، موت کی دھار پر تھی اور کہاں ہمارے قدموں میں بچھی راہ کا ایک ایک خار چن لیا گیا تھا۔ ہم جیسے ہی ڈولوگھاٹ پہنچے، کوداری کی جانب جانے والی ایک ویگن تیار کھڑی تھی جیسے ہمارا ہی انتظار ہورہا ہو!

ہم اس ویگن میں سوار ہوکر تبت کے سرحدی قصبے کوداری کی جانب روانہ ہوگئے۔

ڈولوگھاٹ سے کوداری تک سفر کے دوران میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور ہم خیریت کے ساتھ شام ساڑھے چار بجے کوداری پہنچ گئے۔ یہ قصبہ تبت کی سرحد کے قریب چائنا روڈ پر واقع ہے۔ کھٹمنڈو سے کوداری کا فاصلہ لگ بھگ ڈھائی سو کلومیٹرز ہے اور یہ سفر کسی بھی طور چھ گھنٹے سے پہلے طے نہیں کیا جاسکتا لیکن سندری جل کی پہاڑی کے اندرونی سفر نے ہمارے بہت سے کام آسان کردیے تھے جس کے نتیجے میں فاصلے گھٹ کر رہ گئے تھے۔

میں اور لی یان تھاچو کی راہنمائی میں اس قصبے کے ایک چھوٹے سے گھر میں پہنچے۔ تھاچو نے بتایا کہ وہ اس کے کسی شناسا کا گھر تھا۔ ہمیں ایک کمرے میں پہنچا کر تھاچو اپنے اس شناسا کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہوگیا۔ اس کمرے میں یاک کی کھال کا فرشی بستر بچھا ہوا تھا۔ پہاڑی مسافرت نے ہمارا جوڑ جوڑ کھول کر رکھ دیا تھا۔ ہم آرام کی غرض سے اس بستر پر دراز ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا بڑی سی ٹرے میں ہمارے لیے کھانے پینے کا کچھ سامان لے کر کمرے میں آگیا۔ اس کی آمد پر ہم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جب وہ کھانے کے برتن رکھ کر جانے لگا تو میں نے اس سے تھاچو کے بارے میں استفسار کیا۔ وہ حیران و پریشان مجھے دیکھتا چلا گیا۔ واضح طور پر محسوس ہوتا تھا' وہ میری بات سمجھ نہیں پایا۔ میں نے انگلش کی ناکامی کے بعد نیپالی کو آزمایا مگر پھر بھی اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ لڑکا مقامی کوداری زبان کے سوا اور کسی زبان سے واقف نہیں تھا۔ میرے سوالات کے جوابات میں اس نے کوداری میں جو کچھ کہا' میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ تبھی وہ بہرحال نہیں بول رہا تھا۔ ان حالات میں مجبوراً مجھے گونگوں کے مانند اشاروں کی زبان استعمال کرنا پڑی۔

وہ بڑی دلچسپی سے میرے ہاتھ' ہونٹ اور گردن کو ہلتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اپنے ہاتھوں سے کچھ مخصوص اشارے کرنے کے بعد وہ غائب ہوگیا۔ اس کے اشاروں کا مطلب بہت واضح تھا۔ اس نے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ تھاچو کو میرے پاس بھیج رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ میرے اشاروں سے سمجھا تھا' میں تھاچو کو اپنے پاس بلا رہا ہوں۔

لی یان نے کہا "یہ عجیب قسم کا گونگا تھا۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا!"

"وہ گونگا نہیں' بلکہ ہماری زبان سے نابلد تھا!"

"پتا نہیں' اور کس کس سے واسطہ پڑے گا؟"

"فی الحال تو اس سے پڑا ہے!"

اس بات پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں نے فرش پر پڑی کھانے کی ٹرے کی جانب اشارہ کردیا۔ وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی "میرا کھانے کو جی نہیں چاہ رہا حالانکہ میں اس وقت شدید بھوک محسوس کررہی ہوں۔"

لی یان کی طرح میں بھی اچھی خاصی بھوک محسوس کررہا

تھا۔ گزشتہ رات ہم نے پہاڑی غار کے اندر ڈرائی فروٹس پر مشتمل کھانا اپنے معدوں میں اتارا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ایک کھیل اڑ کر ہمارے منہ میں نہیں گئی تھی۔ پے در پے ایسے حالات پیش آئے کہ ہمیں کھانے پینے کا ہوش ہی نہ رہا۔ ہمیں باقاعدہ کچھ کھائے پیے لگ بھگ بیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ کاشالوک کی موت نے ابھی تک دل و دماغ کو ماتمی گرفت میں لے رکھا تھا۔ کھانے کو تو میرا موڈ بھی نہیں ہورہا تھا لیکن بہرحال' اس میں کھانے بے چارے کا کوئی قصور نہیں تھا۔

میں نے ٹرے کو اپنے سامنے رکھ لیا۔ ٹرے میں موجود کھانا ایک ٹرانسپیرنٹ نیپکن سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے وہ ٹرانسپیرنٹ نیپکن ہٹادیا تو کھانے کی تفصیل سامنے آئی...... اور یہ بھی پتا چلا کہ وہ کھانا گرما گرم تھا۔ اس کھانے میں یاک کے گوشت کی' ایک سالن نما ڈش' ابلے ہوئے چاول' مکئی کی روٹی اور چائے شامل تھی۔ کھانے سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔

میں نے اپنی ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "لی یان! یہ ٹھیک ہے کہ ہم کاشالوک کی المیہ جدائی سے بہت دل گرفتہ اور ملول ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاسکتا۔ زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری ہے۔ ہمارا غم اپنی جگہ مگر اللہ کی نعمتوں سے رخ پھیرنا مناسب نہیں!"

میری بات اس کی سمجھ میں آگئی اور ہم دونوں نے بیک وقت کھانے والی ٹرے کی جانب ہاتھ بڑھادیے۔ سادگی کا علم بردار وہ کھانا لذیذ اور خوش ذائقہ تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے چائے پی۔ تبت اور اس کے مضافات میں چائے بے حد ذوق شوق سے پی جاتی ہے مگر اس میں دودھ اور چینی استعمال نہیں کی جاتی بلکہ قہوے کے اندر مکھن ڈال کر یہ گرم مشروب بنایا جاتا ہے جو توانائی بخش ہونے کے ساتھ ساتھ لذت سے بھی معمور ہوتا ہے۔ پتا نہیں' کیوں' چینی لوگ بہت کم چینی استعمال کرتے ہیں۔

بھوک بہت کڑاکے کی لگی تھی لہٰذا ہم ہاتھ نہ روک سکے اور زہر مار کرتے کرتے بھی خوب شکم سیر ہوکر کھانا کھایا۔ اس "ڈنر" کے اختتام پر لی یان نے کہا۔

"پتا نہیں' تھاچو نے بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ وہ تو یہاں آتے ہی گم سا ہوکر رہ گیا ہے۔"

"حالانکہ کھانا لانے والے لڑکے نے تو اشاراتی زبان میں مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ تھاچو کو یہاں بھیج رہا ہے۔" میں نے قدرے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

اسی لمحے تھاچو بہ نفسِ نفیس کمرے میں حاضر ہوگیا۔ اس نے سب سے پہلے کھانے والی ٹرے کی جانب دیکھا۔ کھانے کے تمام برتن تقریباً خالی ہوچکے تھے۔ اس نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر مطمئن انداز میں ہماری صورت پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"یہ میرے ایک عقیدت مند کا گھر ہے۔ ہم اس کے توسط سے "نیپال تبت" سرحد کو عبور کریں گے لیکن ابھی نہیں' نصف شب کے بعد کسی وقت بھی۔"

میں نے کہا "نصف شب کے بعد سے طلوع سحر تک تو رات ہی ہوتی ہے۔ کچھ تو اندازہ ہوگا' ہم یہاں سے کب تک رخصت ہوں گے؟"

"میرا اپنا خیال ہے' ہم رات کے آخری حصے میں یا پھر علی الصباح اس گھر سے روانہ ہوسکیں گے۔" تھاچو پرسوچ انداز میں بولا "ویسے صحیح صورت حال کے بارے میں کانگ ہی بتاسکتا ہے۔" کانگ اس کے میزبان شناسا کا نام تھا۔ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ اگر چاہو تو تھوڑی نیند لے لو۔ میں رخصت کے وقت سے پہلے تمہیں جگادوں گا۔"

تھاچو کی تجویز خاصی معقول تھی۔ لگ بھگ بیس گھنٹے کے بعد ہمارے شکم میں اناج پہنچا تھا۔ اس کا خمار اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔ میں نیند کی اشد ضرورت محسوس کررہا تھا۔ شاید اس میں غالب ہاتھ مکھن والی اس خوش ذائقہ توانائی بخش چائے کا بھی تھا۔ ایک تو ویسے بھی نیند اڑانے والی اشیا سے مجھے زیادہ نیند آتی تھی' اس پر وہ چائے خاصی مقوی الاعصا بھی تھی۔ انسان کے بدن کو طاقت و توانائی پہنچانے والی ہر غذا یا ایکسرسائز بالآخر نیند کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ انسان نہ سونا چاہے یا نہ سوپائے' یہ الگ بات ہے مگر سونے' آرام کرنے کو جی بہت چاہتا ہے۔

لی یان نے تھاچو سے پوچھ لیا "تم نے کھانا کھالیا؟"

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

"ہماری نیند کے دوران میں تم کیا کروگے؟" میں نے استفسار کیا۔

"اگر موقع ملا تو میں بھی کچھ وقت کے لیے آنکھ لگانے کی کوشش کروں گا۔" وہ سادگی سے بولا۔

اس کے بعد وہ کھانے کے خالی برتنوں والی ٹرے اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کمرے کا داخلی دروازہ اس طرح بھیڑ دیا تھا کہ تازہ ہوا کی آمد و شد کے لیے جھری موجود رہے۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا بھی اظہار تھا کہ اب ہمیں خوامخواہ ڈسٹرب کرنے کے لیے اس

طرف کوئی نہیں آئے گا۔

''کیا تمہیں واقعی نیند آ رہی ہے وجدان؟'' تنہائی میسر ہوتے ہی لی یان نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں' نیند تو آ رہی ہے۔'' میں نے جواب دیا ''کیوں' کوئی خاص بات ہے؟''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی ''ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے!''

''کون سی بات' مجھے بھی تو بتاؤ؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں مسٹر شرما کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔''

''مثلاً کیا سوچ رہی ہو؟''

اس نے جواب دیا ''نقلی بدھ بھکشو نارائن کے بیان' مکل آنند وسوریا داس کی کارکردگی اور مسٹر شرما کے مذموم عزائم کو دیکھتے ہوئے تو یہی لگتا تھا وہ لوگ یعنی ہمارے دشمن اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہم کھٹمنڈو سے کوداری جا رہے ہیں۔ اس تناظر میں توقع کی جا رہی تھی کہ یہاں کوداری میں ہمارے ''استقبال'' کا خاطر خواہ بندوبست ہوگا' خاص طور پر اس صورت میں کہ ہم بیچ راہ میں مسٹر شرما کو غچا دے کر اڑن چھو ہو گئے تھے لیکن......''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی ''لیکن یہاں کوداری میں ہمارے ساتھ جتنے نارمل حالات پیش آ رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی محسوس ہو رہا ہے' ہمارے دشمنوں نے ہماری طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ یہ کچھ عجیب سی اور ناقابلِ یقین بات نہیں ہے؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا ''اس غیر معمولی اور ذہن کو الجھانے والی بات کو میں نے بھی محسوس کیا ہے اور فوری طور پر یہی وجہ سمجھ میں آ رہی ہے کہ شاید شرما نے میری بات کا یقین کر لیا ہے۔''

''کون سی بات کا؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''میں نے چکر دینے کے لیے فون پر اسے بتایا تھا نا کہ آج شام کو پانچ بجے میں ''سی اے اے سی'' کی فلائٹ سے' کھٹمنڈو سے شنگھائی جا رہا ہوں۔''

''میں نہیں سمجھتی' شرما اتنا ہی احمق ہے کہ اس نے تمہاری ایسی بے سر و پا بات پر یقین کر لیا ہو!'' وہ مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''جب گیم انتہائی اونچے لیول کا ہو رہا ہو تو بعض بظاہر انتہائی فضول نظر آنے والی باتوں کو بھی اہمیت دینی پڑتی ہے۔ میں نے اپنے دشمنوں کو ایسے ایسے چکمے دیے ہیں کہ وہ میری کوئی احمقانہ بات بھی نظر انداز کرنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ نیو جرسی سے کھٹمنڈو کس طرح پہنچے تھے' یہ کارنامہ تمہارے سامنے ہے۔''

اس نے اس موضوع پر بحث میں الجھنے کے بجائے گفتگو کا زاویہ تبدیل کر دیا اور کاشانوک کے بارے میں بات کرنے لگی۔ ہم کافی دیر تک اس مختصر ساتھ کے ہمراہی کی خوبیوں اور ایثار کو یاد کرتے رہے پھر پُرسکون نیند کے لیے آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔ دل و دماغ کاشانوک کی جدائی کے غم سے بوجھل تھے اس پر مستزاد خوراک نے خالی معدے میں پہنچتے ہی کام شروع کر دیا لہٰذا تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم مہربان نیند کی گداز آغوش میں پناہ گزیں ہو چکے تھے۔

اگلی صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی تھاچو نے ہمیں جگا دیا۔ ہم نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھاچو کے شناسا میزبان کانگ کی راہنمائی میں گھر سے نکل پڑے۔ ایک گھنٹے بعد جب سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا تو ہم نے چین کے نئے صوبے ژی زانگ (XIZANG) المعروف ''بہ تبت'' کی سرزمین پر قدم رکھ دیا۔ کانگ ہم سب سے الوداعی ملاقات کر کے واپس چلا گیا۔

''لارڈ بدھا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں بہ حفاظت تم لوگوں کو اپنی دھرتی تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا ہوں!'' تھاچو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں تبت میں داخل ہونے کے بعد اپنے رگ و پے میں ایک عجیب سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔ اس جنت نظیر گوشۂ ارض کے بارے میں اب تک صرف سنا ہی سنا تھا' دیکھنے کا موقع پہلی مرتبہ مل رہا تھا۔ ہم کھٹمنڈو سے جس نوعیت کی چڑھائی طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے اس کو دیکھ کر ذہن فوری طور پر تسلیم کر لیتا تھا' اگر تبت کو دنیا کی چھت کہا گیا ہے تو یہ بات ایک سو ایک فیصد درست ہے۔ ان لمحات میں اچانک آپوں آپ میرا دھیان ساحل کی طرف چلا گیا۔ اس وقت وہ دھنو ہوا کرتی تھی' میں نے نام بدل کر اسے ساحل نہیں بنایا تھا۔

ساحل کے والدین تھوپچی اور بھیر جانی کا تعلق اسی سرزمین سے تھا لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ اس نے اپنے آبائی وطن کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب وہ میرے ساتھ پاکستان پہنچی تو ایک موقع پر میں نے اس سے سوال کیا تھا' کیا تبت کی طرف جانے کو تمہارا دل نہیں چاہتا؟ جواب میں اس نے کہا تھا' بہت دل چاہتا ہے کہ میں اس حیرت آفرین لختِ ارض کو دیکھوں۔ میں نے تو بس وہاں کی پُراسرار اور تحیر آمیز کہانیاں ہی سنی

ہیں۔ اس پر میں نے کہا تھا' میں نے بھی تبت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ زندگی میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور میں اسراروں کی اس سرزمین کو دیکھنے جاؤں گا۔ میرے اس ارادے کو دیکھتے ہوئے ساحل مچل گئی تھی۔ اس نے بڑی بے ساختگی سے کہا تھا' میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی وجدان ..... اور میں نے پتا نہیں' کس رو میں کہہ دیا تھا' بشرطیکہ اس وقت تم میرے ساتھ ہوئیں۔ وہ فرطِ جذبات سے مغلوب لہجے میں بولی تھی ''لارڈ بدھا مجھے زندگی بھر تمہارے ساتھ رکھیں۔''

اس کا انداز دعائیہ تھا۔ گویا' ان لمحات میں وہ اپنے لارڈ بدھا سے یہ درخواست کر رہی تھی کہ ہمارا ساتھ زندگی بھر کا ہو جائے۔ شاید اس کے لارڈ نے یہ درخواست قبول کر لی تھی۔ ہم زندگی کے ساتھی تو بن گئے تھے مگر بہ اندازِ دگر۔

ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھے' ایک دوسرے کے پاس پاس تھے اور دھڑکن بن کر ایک دوسرے کے دل میں دھڑکتے تھے لیکن وقت کی نامہربان کروٹوں نے مختلف مواقع پر چوہدری نوازش علی' شعیب غوری اور ربی موشے ہائمن کی صورت اختیار کر کے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر رکھا تھا۔ آج میں ساحل کے بغیر ہی اس کے آبائی ملک میں داخل ہو چکا تھا لیکن مجھے یقین تھا' اب میں زیادہ عرصے تک اس کے بغیر نہیں رہوں گا۔ یہ ملک ہمارے ملن میں کوئی اہم کردار ادا کرے گا۔

مجھے یہ یقین کیوں تھا' میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ ایک آواز میرے اندر بڑے جنونی انداز میں سر پٹختی تھی اور پھر پھر کر کہتی تھی۔ وجدان! تم نے اپنی منزل پانے کے لیے بہت صعوبتیں اٹھا لیں...... قلب و روح کا کوئی مقام ایسا نہیں بچا جہاں تم نے حالات کی ستم ظریفی کو مہمان نہ ٹھہرایا ہو۔ تم جس ساحل کی تڑپ میں بے ساحل زمینوں کو کھوجتے رہے ہو' وہ اب تمہاری نگاہ میں ابھرنے ہی والا ہے۔ بہت جلد تم اپنی منزل' اپنی ساحل کے آثار دیکھ پاؤ گے اسی لیے.... اپنی سانس کو ٹوٹنے نہ دو' ظلمتوں کے اس اتھاہ ساگر میں تیرتے جاؤ۔ تیرتے چلے جاؤ!

میں اپنے اندرون کی اس امید افزا' حوصلہ بردار آواز کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس میں یقین کی بڑی توانا قوت جھلکتی تھی اور اس کائنات میں یقین سے بڑی اور کوئی طاقت نہیں۔ یہ بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ خالق اور مخلوق کا تعلق بھی اسی ڈور سے بندھا ہوا ہے۔

ہم تبت میں داخل ہونے کے بعد ایک وین کے ذریعے سہ پہر تین بجے تبت کے صدر مقام لہاسا (LHASA) پہنچ گئے۔ تھاچو ہمیں جوکھانگ ٹیمپل میں پہنچا کر اس طرح غائب ہو گیا جیسے ہم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

جوکھانگ ٹیمپل' لہاسا کے قلب میں واقع ہے اور اسے تبت کی آن' بان' شان سمجھا جاتا ہے۔ یہ پورے تبت میں روحانیت کا سب سے بڑا مرکز ہے اور ''اسپرچول سینٹر'' کہلاتا ہے۔ یہ ٹیمپل ساتویں صدی میں شہنشاہ سانگ سین گامپو (SONGTSEN GAMPO) نے تعمیر کروایا تھا۔ سانگ سین گامپو بہت کامیاب بادشاہ گزرا ہے۔ ملک کو متحد کرنے کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے صدر مقام کو تبت کے دوسرے علاقے سے لہاسا میں منتقل کیا۔ گامپو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تبت میں بدھ مت کو متعارف کرایا۔ اس سے پہلے وہاں کے باسی بدھ ازم سے آشنا نہیں تھے اور اس کام کے لیے اس نے بڑا انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ کنگ سانگ سین گامپو نے دو بدھ مت عورتوں سے شادی کر لی جن میں سے ایک پرنسس ٹرائی سن کا تعلق نیپال سے تھا جبکہ دوسری ''پرنسس وین چینگ'' چین سے تعلق رکھتی تھی۔ واضح رہے کہ گامپو کی اس سے پہلے تین تبتی بیویاں بھی موجود تھیں۔ کنگ سانگ سین گامپو اور اس کی دونوں بدھ مت بیویوں ٹرائی سن (TRITSUN) اور وین چینگ (WEN CHENG) کے مجسمے تبت کے ہر ٹیمپل اور مونسٹری میں ملیں گے۔ مونسٹری (MONASTERY) مذہبی تعلیم کی درس گاہ کو کہا جاتا ہے۔ یہ ایک کمیونٹی سینٹر ایسا کردار ادا کرتی ہے۔ لہاسا میں دو عظیم الشان مونسٹریز موجود ہیں جو پندرھویں صدی میں تعمیر کی گئیں۔ اب ان کی عظمت گہنا چکی ہے۔ سیرا (SERA) اور ڈری پنگ (DREPUNG) نامی ان دو قدیم مونسٹریز کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ان کا رنگ و روپ اجڑ چکا ہے اور دور سے دیکھ کر پہچاننے میں نہیں آتیں۔ کسی زمانے میں سیرا مونسٹری میں آٹھ ہزار مونکس بدھ ازم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے' آج یہ تعداد گھٹ کر ڈیڑھ سو دو سو تک رہ گئی ہے۔ بڑی مونسٹری ڈری پنگ میں لگ بھگ پندرہ ہزار مونکس بیک وقت درس و تدریس کے مراحل سے گزرا کرتے تھے۔ ان دنوں اس درس گاہ میں محض تین سو طالب علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ نیرنگیِ زمانہ شاید اسی کو کہا جاتا ہے۔ اس تمام تر تباہی و بربادی کا ذمے دار بدھسٹ اور تبتی عوام کی نظر میں صرف اور صرف کمیونسٹ چین ہے۔ جس نے اپنی فوجی قوت کے ذریعے اس جنت مثال قطعہ ارضی پر غاصبانہ قبضہ کر کے اسے اپنے ملک کا ایک صوبہ بنا لیا ہے۔ اسی عظیم خوں ریزی اور وحشیانہ لشکر کشی کے نتیجے میں چودھویں دلائی لاما محترم مہا سو تھونڈپ کو انیس سو

انسٹھ عیسوی میں جلا وطنی اختیار کر کے پڑوسی ملک ہندوستان میں پناہ گزیں ہونا پڑا تھا۔

ہمیں جوکھانگ ٹیمپل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ٹیمپل کے سامنے والے حصے میں ایک بہت بڑا صحن ہے جو بدھ کے پیروکاروں سے ہر وقت بھرا رہتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں عبادت بھی کرتے ہیں اور فرصت کے وقت میں تبادلۂ خیالات بھی ہوتا ہے۔ یہاں پر مہاتما بدھ کا ایک عظیم الجثہ طلائی مجسمہ بھی موجود ہے۔ تھا جو ہمیں ٹیمپل کے جس کمرے میں پہنچا کر غائب ہوا تھا اس کی دو کھڑکیاں دو مختلف سمتوں میں کھلتی تھیں۔ ایک کھڑکی سے ٹیمپل کا مرکزی حصہ دکھائی دیتا تھا جبکہ دوسری کھڑکی سے لہاسا کا معروف بازار ''برکھور'' نظر آتا تھا۔ برکھور بازار (BARKHOR BAZAR) ایک دائرے کی شکل میں جوکھانگ ٹیمپل کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ مذکورہ بازار ایک جہانِ حیرت ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی شے ہو جو اس بازار میں دستیاب نہ ہو سکتی ہو۔ یہ تمام تر معلومات مجھے یہاں قیام کے بعد حاصل ہوئی تھیں مگر میں اسے ترتیب وار بیان کر رہا ہوں۔

ہمیں ٹیمپل کے اس کمرے میں مہمان ہوئے بمشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک تبتی' سنجیدہ چہرے والا شخص ہمارے پاس آیا۔ اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا جس کے مطابق' اس کا نام چن سیان (QINXIAN) تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ چالیس کے قریب لگایا بعد میں میرا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ چن سیان پینسٹھ برس کا تھا۔ عام مونکس کے بالعکس اس کے سر پر بال موجود تھے جو کھچڑی کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ چن سیان کی آنکھوں سے ذہانت اور تجربہ جھلکتا تھا۔ وہ بڑی روانی سے انگلش بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اسے سوچ سمجھ کر ہمارے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

چن سیان نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ہماری خیر خیریت دریافت کی' پھر ہمیں خوش ذائقہ تازہ اور ٹھنڈا پانی پلایا۔ اس کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہیں اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' اس کا اشارہ میری جانب تھا۔

بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ''کہاں؟''

''چنگ فورن پوشی کے پاس!''

میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ چنگ فو' جوکھانگ ٹیمپل کا چیف لاما تھا اور کھٹمنڈو سے یہاں تک میرا پہنچنا اس کے کسی منصوبے کا حصہ تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے لی یان کو دیکھا۔

چن سیان نے میری نگاہ میں پوشیدہ معنی کو سمجھ لیا۔ بدستور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

''صرف تم...... تمہاری ساتھی بڑے آرام سے یہاں رہے گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے چنگ فورن پوشی اور اس کے دیگر عملے پر پورا بھروسا تھا۔ اگر فکر اندیشے والی کوئی بات ہوتی تو میں یہاں آتا ہی نہیں۔ میرا دل کہتا تھا' یہ سب کچھ میرے فائدے کے لیے ہو رہا ہے۔ لی یان کو اسی کمرے میں چھوڑ کر میں اپنے گائیڈ چن سیان کے ساتھ چل پڑا۔

وہ مجھے مختلف راہداریوں میں چلاتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ جوتا بہت پہلے اتر چکا تھا میں ننگے پاؤں چن سیان کی تقلید میں خاموشی کے ساتھ جوکھانگ ٹیمپل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک جگہ رک گیا۔ یہ ٹھہراؤ چن سیان کی وجہ سے تھا۔ اس کے رکنے کے بعد ہی میں نے قدم روکے تھے۔ اس وقت ہم ایک چوبی دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس ٹیمپل کی تعمیر میں لکڑی کا بڑی فراوانی سے استعمال کیا گیا تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے چن سیان کو دیکھا تو وہ مذکورہ دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اندر چلے جاؤ۔ چنگ فو سے یہیں پر ملاقات ہوگی۔''

میں ایک لمحے کے تامل کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

وہ دس ضرب دس فٹ کا ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی دیواریں اور چھت زرد رنگ کی تھیں۔ اس کمرے میں لکڑی کا کام بھی ہوا تھا اور چھت سے فرش تک دو موٹے چوبی ستون بھی استادہ دکھائی دیتے تھے۔ تاہم ان پر بھی زرد رنگ پھیر دیا گیا تھا۔ لگتا تھا' اس کمرے کی ہر شے کو انڈے کی زردی سے بنایا گیا ہے حتیٰ کہ فرش پر بچھا ہوا قالین بھی ہم رنگِ در و دیوار ہی تھا البتہ' وہاں پر دو اشیا ایسی تھیں جو اس ''زرد نگر'' سے میل نہیں کھاتی تھیں اور وہ تھیں اونی چٹائیاں۔ ان میں سے ایک نیلی اور دوسری سفید رنگ کی تھی۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی میں نے سمجھ لیا' وہ چٹائیاں یاک کی اون سے تیار کی گئی تھیں۔ وہ دونوں ہم ساخت و پیمائش تھیں جس کا اندازہ میں نے تین ضرب پانچ فٹ لگایا۔ مذکورہ دونوں چٹائیاں ایک دوسرے کے سامنے فرش پر بچھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان بمشکل دو فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی چن سیان نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

میں زرد قالین پر کھڑا اس کمرے کا بغور جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سامنے والی دیوار میں موجود دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک پُرتاثر شخصیت کا مالک شخص اندر داخل ہوا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ تبت والوں کے حوالے میں یہ اندازہ اکثر غلط ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں' وہ کتنی' دلیل عمر اور کتنی محفوظ صحت لے کر اس دنیا میں آتے تھے۔

کمرے میں وارد ہونے والے شخص کا سر اور چہرہ پوری طرح منڈا ہوا تھا۔ مونچھیں' داڑھی' سر کے بال سب صاف' بھویں البتہ آنکھوں کے اوپر موجود تھیں۔ چہرہ بیضوی اور تاثرات میں بلا کا ٹھہراؤ پایا جاتا تھا۔ کان نسبتاً بڑے طویل العمری کی جانب اشارہ کرتے تھے۔ رنگت جیسے تانبے کو دودھ میں دھو کر بنایا گیا ہو۔ اس نے میرون روب (سرخی مائل گہرے بھورے رنگ کا گاؤن) زیبِ تن کر رکھا تھا جس میں سے کہنیوں سے آگے بازو صاف نظر آ رہے تھے۔ اس کے حیات سے معمور ہاتھوں کی رگیں بڑے دلکش انداز میں پھولی ہوئی تھیں۔ اس شخص پر نگاہ پڑتے ہی مجھے کسی تعارف کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میرے دل نے گواہی دی وہ چنگ فورن پوشی ہے!

چنگ فو نے سر کی خفیف جنبش سے مجھے ویل کم کہا اور سفید چٹائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سلیس انگریزی میں کہا ''بیٹھ جاؤ!''

وہ بولا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے منہ سے موتی بکھرے ہوں۔ اس کی آواز میں بڑی نرمی اور لب و لہجے میں ایک خاص قسم کا گداز پایا جاتا تھا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر بڑی جاندار مسکراہٹ کو مجسم پایا۔

مجھے سفید چٹائی پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ خود نیلی چٹائی کی جانب بڑھ گیا تھا۔ تاہم میں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک چنگ فو نیلی چٹائی پر بیٹھ نہیں گیا۔ وہ جوکھانگ ٹیمپل کا چیف لاما تھا۔ میں اس کے شایانِ شان احترام کو خود پر واجب سمجھتا تھا۔ میرے جسم پر یلو روب (زرد گاؤن) سجا تھا۔

چنگ فو کے منہ سے شستہ انگریزی سن کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ تاہم بعد میں معلومات میں اضافے کے ساتھ یہ حیرت کافور ہو گئی۔ وہاں قیام کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ چیف لاما کے عہدے تک پہنچنے کے لیے چھ اہم اور چھ عمومی مضامین پر مشتمل نصاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب تک کوئی مونک ان بارہ شعبوں میں دسترس اور مہارت حاصل نہ کر لے اسے چیف لاما کا اعزاز حاصل نہیں ہوتا۔ یہ بارہ شعبے کچھ اس طرح ہیں۔ اہم مضامین میں فلسفہ' بدھ فلسفہ' تبتی ثقافت' لسانیات' سنسکرت اور انگلش جبکہ عمومی مضامین میں آسٹرونومی' آسٹرولوجی' شاعری' موسیقی' مختلف زبانوں کی گرامر اور تحریر نویسی شامل ہے۔ بدھ مت کی تعلیمات میں بیان کی گئی جسم' دماغ اور روح کو صحت مند رکھنے والی مخصوص مشقیں اس کے علاوہ ہیں۔

چنگ فو نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں میری خیر و عافیت دریافت کی۔ ہم دونوں متعلقہ چٹائیوں پر روبرو بیٹھ گئے تو وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی ملائم لہجے میں گویا ہوا۔

''وجدان! میں سمجھتا ہوں' تم ان سارے معاملات کو بخوبی سمجھ رہے ہو اس لیے مجھے امید ہے' تم کم سے کم سوالات کرو گے۔''

اس کی آواز میں ایسی سادگی اور پُرکاری تھی کہ میں خاموش بیٹھا اسے سنتا رہا اور اسی لمحے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ میں اس سے ایک سوال بھی نہیں پوچھوں گا۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اسی نرم خوئی سے بولا۔

''ہماری صرف تین ملاقاتیں ہونی ہیں۔ ایک ملاقات اس وقت ہو رہی ہے' دوسری ملاقات ٹھیک دس دن کے بعد ہوگی اور تیسری ملاقات کا دار و مدار صرف اور صرف تمہاری کارکردگی پر ہے کیونکہ اس آخری ملاقات میں تم اکیلے نہیں ہو گے بلکہ تمہارے ساتھ وہ بھی ہوگی جس کے حصول کی خاطر تم نے اپنی زندگی کو سپردِ عذاب کر رکھا ہے!''

اس کا اشارہ سیدھا سیدھا میری جانِ تمنا ساحل کی طرف تھا۔ چنگ فو کی باتیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ عنقریب میں ساحل کو حاصل کر لوں گا۔ سیٹل والے محترم سانگ فو کی باتوں سے بھی اسی قسم کا تاثر ابھرتا تھا۔ ساحل کو پانے کے خیال نے میرے رگ و پے میں بجلی سی دوڑا دی۔ میں تن بدن میں سنسنی سی محسوس کرنے لگا۔ یہ ایسی وارفتگی تھی کہ میں اپنے دلی جذبات کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

چنگ فو گہری مگر گداز نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''اس وقت تم تبت میں ہو اور سمجھ لو کہ یہیں کے رہائشی ہو۔ ٹھیک دس دن کے بعد تم لہاسا سے لندن روانہ ہو جاؤ گے۔ لندن میں مسٹر ہیرالڈ تھامس کے پاس ایک دن گزارنے کے بعد تم برطانیہ سے سیدھے مصر پہنچو گے۔ وہاں قاہرہ میں تمہیں السید مبارک الحسینی سے ملنا ہوگا جو الباقری اسٹریٹ پر رہتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''مبارک الحسینی تمہارے ساتھ بھرپور تعاون کرے گا اور اس کے انتظام سے تم جورڈن سے ہوتے ہوئے اسرائیل میں

داخل ہو جاؤ گے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوگا اس سلسلے میں تمہیں سوچنے اور ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک دس دن کے بعد تمہیں تفصیل بتادی جائے گی۔ دراصل میں چاہتا ہوں' تمہارے سر پر اس قدر بال نکل آئیں کہ تم باقاعدہ کنگھی کرسکو۔''

بدھ بھکشو بننے کے لیے دو روز قبل میرا سر مونڈ دیا گیا تھا۔ چنگ فو محض دس دن کی بات کررہا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ایک مکمل' استرے سے منڈے ہوئے سر پر صرف بارہ دن کے اندر اتنے بال اگ آئیں کہ ان میں باقاعدہ کنگھی بھی کی جاسکتی ہو۔ میں الجھن زدہ سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے مخصوص مہربان انداز میں بولا۔

''میں نے سوال کرنے سے منع نہیں کیا۔'' اس نے میری ذہنی کیفیت کو بھانپ لیا تھا' ''بہت زیادہ سوالات سے اجتناب برتنے کو کہا تھا۔ تم پوچھ سکتے ہو' اتنے کم عرصے میں کنگھی کیے جانے کے قابل بال کس طرح پیدا ہو جائیں گے۔''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری سوچ کو پڑھ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں دل و دماغ کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت سے مالا مال تھیں۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ خود ہی بتادیں میرے محترم؟''

وہ چند لمحات تک خاموش' ٹھہری ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتا رہا پھر زیرِلب مسکراہٹ کی معیت میں بولا ''تبت اسرار و رموز کی سرزمین ہے' اسے طلسم کدہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم لوگ انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں البتہ اپنے جسم' دماغ اور روح کو ہمہ وقت مصروفِ کار رکھتے ہیں۔ ہماری ذات کی یہی مصروفیت ہمیں تفکرات سے دور رکھتی ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔ ہر وقت مصروف رہنے والے لوگ فکر اور اندیشوں سے دور رہتے ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے' انسان کی نوّے فیصد بیماریاں تفکرات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ بہرحال!'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہم نے جہاں غور و فکر اور مسلسل کوشش سے ناقابلِ علاج امراض کا علاج دریافت کیا ہے وہیں ایسی ادویات بھی تیار کی ہیں جو حیرت انگیز اثرات کی حامل ہیں۔ میں ایک خاص تیل ''لومار'' کا ذکر کروں گا۔ یہ تیل ''لومارو'' نامی ایک نایاب جڑی سے تیار کیا جاتا ہے جو تبت کے سوا دنیا میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ لومار تیل کی یہ خاصیت ہے کہ اگر دس روز تک باقاعدگی کے ساتھ سر میں اس کی مالش کی جائے تو اتنے بال نکل آتے ہیں جس کا میں نے تھوڑی دیر پہلے تم سے ذکر کیا ہے۔ تمہاری دنیا میں بالوں کی مذکورہ لمبائی ڈیڑھ ماہ سے پہلے ممکن نہیں۔ ویسے تبت میں ''لومار'' کے نام سے ایک تہوار بھی منایا جاتا ہے جسے ہم نئے سال کا جشن کہتے ہیں یعنی ہیپی نیو ائیر!'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''نئے سال کا یہ جشن جولین کیلنڈر کے مطابق' مارچ کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ جشن آمدِ بہار ہوتا ہے۔ کسی گنجے سر پر بڑی تیزی سے بال اگ آنا بہار ہی کی علامت ہے اس مناسبت سے اس تیل کا نام ''لومار'' بہت ہی موزوں ہے۔''

چنگ فورن پوشی کی انکشاف انگیز باتیں مجھے حیرت زدہ کررہی تھیں۔ میں اس کے روبرو خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اچانک اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کہیں اور چلا گیا ہو۔ تبتی لاماؤں کے دھیان گیان کے بے شمار قصے میں نے سن رکھے تھے۔ چنگ فو بھی شاید اس وقت ایسے ہی کسی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میرون روب (سرخی مائل گہرا بھورا گاؤن) اس کی شخصیت کے تاثر کو اور بھی بڑھاوا دے رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر ایک پیالہ سا بنالیا تھا اور یہ ''دستی پیالہ'' اس وقت اس کی گود میں رکھا تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے لوٹس پوسچر (کنول آسن) میں بیٹھا بہت پُرسکون نظر آتا تھا۔ یوگا کے لوٹس پوسچر یعنی کنول آسن کو ہندو یوگی پدم آسن یا سکھ آسن بھی کہتے ہیں۔ یہ آسن (اندازِ نشست) یوگا میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ''راج یوگ'' کی نوّے فیصد مشقیں اسی آسن میں کی جاتی ہیں۔

اس وقت میرے جسم پر ییلو روب (زرد گاؤن) تھا جبکہ چنگ فو نے میرون روب پہن رکھا تھا۔ عام بدھ بھکشو زیادہ تر زرد گاؤن ہی پہنتے ہیں' مونک اور لاما کے درجے کی طرف بڑھنے والے یا اس درجے پر فائز بدھسٹ میرون گاؤن کا استعمال کرتے ہیں جبکہ ہائی لاماز اور دلائی لاما ایک خاص شیڈ کا میرون گاؤن زیب تن کرتے ہیں۔ ازیں علاوہ انتہائی مخصوص مذہبی تقریبات کے موقع پر دلائی لاما سلک کا سنہری گاؤن پہن کر تقریب میں رونق افروز ہوتا ہے۔ اس تمام تر درجہ بندی میں ''ہائی لاما'' کی حیثیت ماہر روحانیات اور ایک استاد کی سی ہوتی ہے۔

چنگ فورن پوشی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور نہایت ہی گمبھیر لہجے میں بولا ''اب میں تمہیں درپیش سب سے اہم مسئلے کا ذکر کروں گا۔ تم ایک صلاحیت رکھنے کے باوجود

بھی اسے پوری طرح' بھرپور انداز میں استعمال نہیں کرپارہے ہو۔ میرا اشارہ تمہاری باطنی آنکھ کی کارکردگی کی جانب ہے!''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو میں بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ واقعی اس وقت میرے لیے یہ انتہائی سنگین مسئلہ بنا ہوا تھا۔ میں نے گہری دلچسپی سے چنگ فو کو دیکھا تو وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں بولا۔

''تم اپنی اس ناکامیابی کا الزام اپنے سب سے بڑے دشمن کو دیتے ہو کہ اس نے کسی روحانی عمل سے تمہاری تیسری آنکھ کے راستے میں کوئی دیوار کھڑی کردی ہے جبکہ تمہاری یہ سوچ پوری طرح درست نہیں ہے۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن وہ خود ہوتا ہے۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے معنی خیز انداز میں خاموش ہوا تو میرے پورے وجود میں ایک سنسنی خیز بے چینی سی پھیل گئی۔ پتا نہیں' وہ آگے کیا کہنے والا تھا۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔ چند پُرسوچ لمحات گزارنے کے بعد اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وجدان! یہ ٹھیک ہے کہ تمہارا دشمن پُراسرار صلاحیتوں کا مالک ہے' وہ عملیات پر بھی گہری دسترس رکھتا ہے اور اس نے تمہاری تیسری آنکھ پر ''پٹی'' باندھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن تمہاری تمام تر ناکامیابی اس کے کھاتے میں نہیں ڈالی جاسکتی بلکہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے میں تمہارا اپنا ہاتھ بھی شامل رہا ہے۔''

''میں نے ایسا کیا کیا ہے؟'' بے ساختہ یہ سوال میری زبان سے پھسل گیا۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا ''میں کوہسار کی ملکہ نیلگری کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا تھا۔ تاہم تمہارا ذہن صاف کرنے کے لیے محض ایک حوالہ دینا ضروری ہے۔''

چنگ فو کی زبان سے نیلگری کا نام سن کر میں چونک اٹھا۔ پتا نہیں' یہ نادرِ روزگار شخص کہاں کہاں کی خبر رکھتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''نیلگری نے تم سے کہا تھا...... تم زندگی میں ایک موقع پر ضرور بھٹکو گے۔ اس وقت تمہاری تمام شکتیاں (قوتیں) چھن جائیں گی۔ میں نے بتایا ہے نا' میں نیلگری کے معاملات پر کھل کر نہیں بول سکتا۔ بہرحال' زندگی کی شاہراہ پر تمہارے قدم ڈگمگائے ضرور ہیں۔ تم میرا اشارہ بخوبی سمجھ رہے ہو؟''

میرے سامنے اس وقت اگر چیف لاما چنگ فورن پوشی کے بجائے کوئی اور دنیا دار شخص بیٹھا ہوتا تو میں سوال پوچھ پوچھ کر اس کا ناطقہ بند کردیتا مگر اس علم کے سمندر کے سامنے اتمامِ حجت یا بے مقصد لب کشائی بدتہذیبی اور بدتمیزی کے زمرے میں آتی۔ وہ اپنے نام کے معنوی اعتبار سے بھی نہایت ہی پائے کی شخصیت تھا۔ چنگ بہ معنی چنیدہ' فو بہ معنی بدھا' رن پوشی بہ معنی پروفیسر اور لاما بہ معنی معلم' گرو۔ مجھے ان لمحات میں یوں محسوس ہورہا تھا جیسے اونٹ پہاڑ تلے آگیا ہو۔

چنگ فو نے نیلگری کا حوالہ دے کر ایک حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا۔ اس اشارے سے متعلق واقعات کسی فلم کے مانند میرے تصور کے پردے پر ابھرنے لگے۔ کراچی میں کے ڈی اے اسکیم ون کے ایک بنگلے کے اندر لیلیٰ کے ساتھ گزاری ہوئی ایک رات' زونارا آئی لینڈ کے ایک ساحلی کاٹیج میں راکیل اینڈرسن کی قربت میں بتائے ہوئے لمحات اور اب بودھ ناتھ دیلی کھٹمنڈو سے یہاں تک' لی یان کی معیت میں گزارا ہوا وقت......!

میں اس سے آگے نہ سوچ سکا کیونکہ اسی وقت چنگ فو نے بولنا شروع کردیا تھا ''انسان خیر و شر کی آمیزش سے بنا ہے اور یہ دونوں قوتیں ہر وقت اس کے اندر موجود رہتی ہیں۔ کون سی قوت کس قوت پر حاوی ہوجائے اسی سے انسان کی شناخت ہوتی ہے۔ بہرحال' یہ خوشی کی بات ہے کہ تم اکثر خیر کی قوت سے شر کو شکست دینے میں کامیاب ہوجاتے ہو۔ کراچی میں' ایک بنگلے کے آئینہ خانے میں صدف کے ساتھ گزارے ہوئے کڑے امتحانی لمحات تمہاری اس صفت کے گواہ ہیں۔''

مجھے یقین ہوگیا کہ وہ میرا دماغ پڑھ رہا تھا کیونکہ ان لمحات میں' میں صدف ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ منظر میری نگاہ کے سامنے گھوم رہا تھا جب شعیب غوری نے مجھے صدف کے ساتھ ایک مشکل ٹیسٹ سے گزارا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان بے بس اور لاچار لمحات میں' میں قعرِ ذلت میں گرنے سے بار بار بچا تھا۔ یہ بال بال بچنے سے بھی زیادہ کٹھن صورتِ حال تھی۔

چنگ فو کی ٹھہری ہوئی ملائم آواز میری سماعت سے ٹکرائی ''تمہارے اندر چونکہ خیر کا پہلو زیادہ اسٹرانگ ہے' تم مثبت سوچ اور طرزِ عمل کے حامل ہو اس لیے تمہاری لغزشوں نے اتنا خراب نہیں کیا جتنا کسی اور شخص کے ساتھ ہوسکتا تھا۔ تمہاری تھرڈ آئی کے سلسلے میں جو تعطل اور گڑبڑ پیدا ہورہی ہے' یہ عارضی ہے۔ مجھے یقین ہے' ان دس دنوں میں یہاں محسوس اور غیر محسوس دونوں طریقوں سے تمہاری ایسی تربیت ہوجائے گی کہ تیسری آنکھ کی راہ میں کھڑی ہونے والی رکاوٹ خود بخود ہٹ جائے گی۔ تم باطنی آنکھ کے توسط سے بڑے واضح اور صاف مناظر دیکھنے لگو گے' تم اسے ایک طرح کا عملِ تطہیر سمجھ

لو۔"

چنگ فو کی اس خوش خبری نے میرے دل و دماغ پر خوشگوار اثرات مرتب کیے۔ میں خاموش بیٹھا چیف لاما کو سنتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہماری دوسری ملاقات لارڈ بدھا کی مرضی سے' دس روز بعد ہوگی۔ اس دوران میں چمن سیان تمہارے ساتھ رہے گا۔ وہ تمہیں تبت کی خوب سیر کرائے گا۔ تم ذہن اور آنکھیں کھلی رکھنے والے شخص ہو۔ اس دس روزہ پہلے قیام کے دوران میں تمہیں بہت کچھ دیکھنے' سمجھنے' سیکھنے اور سکھانے کو ملے گا۔"

"پہلے قیام" اور "سکھانے" کے الفاظ نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ میں دوبارہ بھی تبت آؤں گا اور ایک شاگرد کے علاوہ مجھے ایک استاد کی حیثیت سے بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

"میں نے چمن سیان کو تمہارے بارے میں خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ اور تجربہ کار شخص ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اور اسے کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔" وہ ذرا دیر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا "ان دس دنوں میں ہر رات نہایت پابندی کے ساتھ چمن سیان لو مار آئل سے تمہارے سر کا مساج بھی کیا کرے گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے احترام میں مجھے بھی اس کی تقلید کرنا پڑی "میں اب چلوں گا۔" اس نے بڑی رسان سے کہا "تم ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔" وہ خاموش ہو کر میرے چہرے کو اپنی نگاہ سے ٹٹولنے لگا۔

میں نے اپنی پیشانی پر ایک خوشگوار سی تپش محسوس کی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پُراسرار توانائی چیف لاما کی آنکھوں سے خارج ہو کر میرے دماغ میں اتر رہی ہو۔ میں اس کیف آگیں تجربے کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہوں۔ وہ انبساط سے لب ریز بڑے ہی نشاط انگیز لمحات تھے۔ شاید وہ کوئی خاص بات مجھے ذہن نشین کرا رہا تھا پھر اس نے وہی بات زبان سے بھی کہہ دی۔

"وجدان! تم تبت کے داماد ہو۔ تمہارے اندر کا آتش فشاں اسی برف پوش خطۂ ارض پر سکون حاصل کر سکتا ہے۔"

وہ ایک نہایت ہی گہری بات کو آسانی سے کہہ کر اس مختصر سے کمرے سے رخصت ہو گیا اور میں حق دق کھڑا اس خواب ناک ملاقات کے بارے میں سوچنے لگا جو ہوئی تھی اور نہیں ہوئی تھی جیسی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا' میں نے وہ وقت کسی طلسم کدے میں گزارا ہو۔ میں سحر زدہ سی کیفیت میں تھا۔

پتا نہیں' چنگ فو رن پوشی مجھ پر کون سا سحر پھونک کر چلا گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور میں چمن سیان کی صورت دیکھ کر چونک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بلاوا تھا۔ وہ بہ زبانِ خاموشی مجھے کمرے سے باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اعتماد سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دروازہ اس کے لیے ٹرانسپیرنٹ وال کی حیثیت رکھتا ہو...... اور اس نے کمرے میں ہونے والی اس اہم ملاقات کو اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا ہو!

میں کمرے سے نکلا اور خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس پر چل کر ہم چنگ فو کے پاس پہنچے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ چمن سیان مجھے ٹیمپل کے دوسرے حصے دکھا رہا ہے لیکن جب مختلف چکر دار راہ داریوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک دروازے کے سامنے رکا تو میرا اندازہ یک سر غلط ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے اندر آنے کو کہا۔ میں خاموشی سے اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جس میں' میں لی یان کو چھوڑ کر گیا تھا۔ اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ وہ کمرا لی یان کے وجود سے خالی تھا!

میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے چمن سیان کو دیکھا۔ وہ میری آنکھوں سے جھلکتے استفسار کو بہ خوبی سمجھ گیا لیکن کسی اور ہی میٹر بینڈ سے بولنے لگا۔

"بدھ ازم انسان کی فطری خواہشات اور جسمانی تقاضوں پر پابندی عائد کرتا ہے اور نہ ہی تجرد یا راہبانیت پر زور دیتا ہے مگر ضبطِ نفس کی تلقین ضرور کرتا ہے۔ بھوک' پیاس اور نیند کی طرح جنس کی خواہش بھی انسان کے اندر سے ابھرتی ہے۔ بے لگام جنسی خواہشات اور کسی بھی شے کی ہوس غلط ہے۔ ہمارے عقائد میں ہر بدھسٹ کو کسی بھی مخصوص عورت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کی اجازت ہے۔"

گویا' دس دن تو دور تھے' اس نے پہلا قدم اٹھاتے ہی میری تربیت آغاز کر دی تھی۔ میں اس کی باتوں کا مطلب بہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن وہ میرے خاموش استفسار سے قطعی لگا نہیں کھاتی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"میں تو بدھسٹ نہیں ہوں۔ یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"تم تبت کے داماد بننے والے ہو!" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

ساحل بدھ مت تھی۔ چمن سیان کا اشارہ سیدھا سیدھا اسی کی طرف تھا۔ اس کی بات سے یہ بھی ظاہر ہوا' وہ چنگ فو کا قابلِ اعتماد بندہ تھا۔ اسے بہت سے اہم معاملات کی بڑی گہری اور وسیع معلومات حاصل تھیں' گویا وہ جوکھانگ ٹیمپل کے داخلی اور خارجی امور میں پوری طرح شامل تھا۔

میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور قدرے تیز لہجے میں استفسار کیا "میری ساتھی لی یان کہاں ہے؟"

"وہ دس پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائے گی۔" چمن سیان نے جواب دیا۔

اس نے مجھے انسانی نفسیات اور خواہش و ضرورت پر بدھ مت کا جو مختصر سا لیکچر پلایا تھا' میں چاہتا تو اس پر پلٹ کر اس سے پوچھ سکتا تھا...... عظیم المرتبت کنگ سانگ سین گامپو کے بارے میں اس کے کیا وچار ہیں؟ یہ شخص تو بدھ مت کو تبت میں متعارف کرانے کا اعزاز رکھتا تھا اور اس نے تین تبتی بیویوں کی موجودگی میں دو بدھ مت شہزادیوں سے شادی کر کے اپنی بیویوں کی تعداد کو پانچ تک پہنچا دیا تھا۔ بدھ ازم کے مہا پرچارک "کنگ گامپو" کے سلسلے میں کسی ایک مخصوص عورت سے جنسی خواہش پوری کرنے کا فلسفہ کیا ہوا؟

ظاہر ہے یہ ایک اختلافی موضوع ہوتا اور مجھے خواہ مخواہ کے اختلافات میں الجھ کر اپنی راہ کھوٹی نہیں کرنا تھی لہٰذا میں چمن سیان اور اس کے بیان کردہ فلسفے کو نظر انداز کر کے کمرے کی جانب متوجہ ہو گیا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق' وہ لمبوترا کمرا دس ضرب بیس فٹ پیمائش کا حامل تھا جس میں تین چھوٹے بیڈ چوڑائی کے رخ ترتیب وار لگے ہوئے تھے۔ بیڈز کی سرہانے والی لمبی دیوار میں دو کھڑکیاں موجود تھیں اور پائنتی صرف اتنی جگہ بچتی تھی کہ بہ آسانی وہاں سے گزرا جا سکے۔

پائنتی والی بیس فٹی دیوار میں کپڑوں والی ایک بڑی الماری بھی نصب تھی۔ وہ کمرا کسی اسپتال کے چھوٹے سے وارڈ کا نقشہ پیش کر رہا تھا حتیٰ کہ تینوں بیڈز کے بیچ' بالائی جانب دو چھوٹی سائیڈ ٹیبلز بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس کمرے میں دخول و خروج کے لیے صرف ایک ہی دروازہ تھا جہاں سے ہم اندر آئے تھے۔

چمن سیان نے کمرے کے آخری سرے کی جانب اشارہ کیا اور بولا "تمہاری ساتھی ابھی یہاں پہنچنے والی ہے۔ وہ بیڈ اس کے لیے ہے۔" پھر اس کی انگلی درمیانی بیڈ کی سمت اٹھی اور اس نے کہا "اس بیڈ پر تم سویا کرو گے۔"

"اور یہ بیڈ؟" میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی پوچھ لیا۔ میرا اشارہ دروازے سے قریب ترین بچھے تیسرے بیڈ کی طرف تھا۔

چمن سیان نے جواب دیا "یہ بیڈ میرے لیے ہے۔ آنے والے دس دن تک میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہوں گا!"

میں ایک طویل' گہری اور بوجھل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ "دادا ابو" کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور ظاہر ہے' یہ ہدایات سے رن پوشی چنگ فو ہی نے دی ہوں گی۔ جب کسی شخص کی شادی کی تاریخ طے ہو جائے تو حفظِ ماتقدم کے طور پر اس پر ایک شخص نگران مقرر کر دیا جاتا ہے جو اس کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ بننے والے دولہا میاں کسی ایسی ویسی سرگرمی میں ملوث نہ ہو جائیں۔ میری متوقع سسرال والے بھی میرے ساتھ کچھ اسی قسم کا سلوک کر رہے تھے۔ آگے کیا ہونے والا تھا' میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کیونکہ بعض اوقات تقدیر انسان کی بے بسی کا مذاق اڑانے کی غرض سے اس کی ساری تدبیروں کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دیتی ہے۔ بہرحال' یہ نگرانی مجھے اچھی نہیں لگی تھی۔

آئندہ روز سے چمن سیان کے ڈسپوزل پر ہماری سیر و تفریح کا آغاز ہو گیا۔ ہم دن بھر جوکھانگ ٹیمپل سے باہر رہتے اور رات کو واپس آ جاتے۔ رات کے کھانے سے پہلے چمن سیان ہمیں ایک جمنازیم میں لے جاتا جو ٹیمپل کے گراؤنڈ فلور' پر ایک دور افتادہ ہال میں واقع تھا۔ وہاں پر میں نے بڑے بڑے ہنر مند مونکس کی فائٹس دیکھیں۔ لی یان کے لیے یہ سب کچھ نہایت ہی سنسنی خیز اور حیرت انگیز تھا۔ میں نے تو شاؤلن ٹیمپل میں ایسے کھیل تماشے بہت دیکھے تھے لیکن مارشل آرٹس کے حوالے سے لی یان کے لیے یہ ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ اس جمنازیم میں فائٹس کے ساتھ ساتھ تجربہ کار اور ماہر مونکس "ڈوجینگ" اور "سل جینگ" کی پریکٹس بھی کرتے تھے۔ ڈوجینگ (DOJANG) میں روحانی مشقیں اور سل جینگ (SULJANG) میں جسمانی مشقیں کی جاتی ہیں۔ ان دونوں شعبہ ہائے کے لیے جمنازیم کے ساتھ ہی دو چھوٹے ہالز بھی مخصوص تھے۔

رات کو سونے سے پہلے چمن سیان میرے سر میں "لو مار آئل" ڈال کر خوب اچھی طرح مالش بھی کرتا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ' میں اس کرشماتی تیل کے اثرات دیکھ کر دنگ تھا۔ کسی شک و شبہے کے بغیر بڑی تیز رفتاری سے میرے سر کے بال بڑھ رہے تھے۔ میرے لیے یہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

میں اور لی یان رات دس بجے تک عموماً سو جاتے تھے۔

چن سیان بھی یہی ظاہر کرتا تھا جیسے وہ ہم سے پہلے ہی سو چکا ہے لیکن مجھے یقین تھا وہ محض سوتا بن کر رات بھر بستر پر پڑا جاگتا رہتا ہے۔ میں نے اس دوران میں اس کی ''نگرانی'' کو ''چیک'' کرنے کو کوئی ''رسک'' نہ لیا۔ لی یان کو میں موقع ملتے ہی چن سیان کے عزائم کے بارے میں بتا چکا تھا لہٰذا کوئی پیچیدگی یا کنفیوژن پیدا نہیں ہوا۔

تبت میں اس مختصر قیام کے دوران میں ہم نے وہاں کے تمام قابلِ ذکر مقامات کی سیر کرلی۔ سب سے پہلے چن سیان لہاسا سے باہر دو دوسرے شہروں میں لے گیا۔ ان میں ایک یارلنگ ویلی (YARLUNG VALLEY) اور دوسرا قابلِ ذکر شہر شیگیٹی (SHIGATSE) ہے۔ لہاسا حکومتی معاملات' شیگیٹی زراعت اور یارلنگ ویلی تاریخی اعتبار سے اپنی خاص شہرت رکھتے ہیں۔

شیگیٹی اول آخر ایک زرعی علاقہ ہے جہاں یاک کی جوڑیوں کی مدد سے ہل چلا کر کھیتی باڑی کی جاتی ہے۔ تبت میں یاک کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لمبے بالوں والا یہ بیل نما جانور ہر طرح سے تبتی لوگوں کے کام آتا ہے۔ شیگیٹی میں تا حد نگاہ چھوٹی بڑی برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں کھیتوں کا سلسلہ دیکھنے کو ملے گا کہیں ہل چلایا جا رہا ہے اور کہیں فصل کھڑی لہلہا رہی ہے۔ شیگیٹی' لہاسا شہر سے تین سو بیس کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سطحِ سمندر سے اس کی بلندی چار ہزار آٹھ سو میٹر یعنی تقریباً! پندرہ ہزار سات سو فٹ ہے۔ یہ دنیا کا بلند ترین خطۂ ارض ہے جہاں بود و باش پائی جاتی ہے۔ شیگیٹی میں ہی پنچن لاما (PANCHEN LAMA) کا بھی قیام ہے۔ پنچن لاما کو دلائی لاما کے بعد سب سے بڑی مذہبی شخصیت سمجھا جاتا ہے یعنی رتبے کے اعتبار سے پنچن لاما کو دلائی لاما کا نائب سمجھ لیں۔

یارلنگ ویلی تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں شرقاً غرباً بہنے والے دریائے یارلنگ سینگ پو (YARLUNG TSANGPO) کو دنیا کا بلند ترین دریا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یارلنگ ویلی' لہاسا سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر واقع ہے۔ یہاں پر ایک عظیم الشان زی ڈینگ (SEDANG) نامی ہوٹل بھی ہے جس میں پانچ سو افراد کے بیک وقت قیام کی سہولت موجود ہے۔ زی ڈینگ ہوٹل میں ..... تمام چائنیز ڈشز دستیاب ہیں۔ جن میں یاک کے گوشت کی میٹھی ڈش خاصے کی چیز ہے۔ شہر سے سولہ کلو میٹر کے فاصلے پر کاسل آف ''یمبولا کانگ'' واقع ہے ''یمبولا کانگ کاسل'' تبت میں قدیم ترین کاسلز میں سے باقی بچ رہنے والا ایک ہے۔ زی ڈینگ سے چند کلو میٹر دور ''چینگ چو ٹیمپل'' بھی دیکھنے کی چیز ہے۔ چینگ چو (CHANG ZHU) ٹیمپل ساتویں صدی میں کنگ سانگ سین گامپو نے تعمیر کرایا تھا۔ زی ڈینگ ہی سے تیس کلو میٹر کے فاصلے پر ''ویلی آف کنگز'' واقع ہے جہاں کنگ سانگ سین گامپو اور تبو (TU BO) سلطنت کے دیگر سات شہنشاہ دفن ہیں۔ کسی زمانے میں ''تبو سلطنت'' کا بڑا رعب و دبدبہ ہوا کرتا تھا۔

سب سے زیادہ لطف لہاسا کی سیر میں محسوس ہوا۔ چینیوں نے تبت کو ''سی زانگ'' بنانے کے بعد تعمیر و ترقی کے ذریعے پوری کوشش کی کہ یہ صوبہ خصوصاً لہاسا شہر ہانگ کانگ نظر آنے لگے مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی! ''لہاسا ہوٹل'' انہی تعمیرات کی ایک مثال ہے۔ پانچ سو کمروں پر مشتمل یہ لگژری ہوٹل شہر کے چینی آبادی والے حصے میں نیو تھیٹر اوپیرا کے نزدیک واقع ہے۔ یہ لہاسا کا پہلا ہوٹل ہے جہاں لفٹ کی سہولت بھی موجود ہے۔ ''لہاسا ہوٹل'' کا انتظام و انصرام ہالینڈ کے ان کے عملے کے ہاتھ میں ہے۔

دریائے لہاسا کے کنارے پر واقع پوٹالا محل (POTALA PALACE) دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے ''ونٹر پیلس'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دراصل دلائی لاما کی رہائش گاہ ہے۔ ہر دور کا دلائی لاما موسمِ سرما اسی محل میں گزارتا تھا لیکن تبت پر چینی قبضے کے بعد اب اس محل کی حیثیت ایک عجائب گھر ایسی ہو گئی ہے۔ یہ محل پانچویں دلائی لاما نے سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ ایک سرخ پہاڑی پر واقع ہے اور لہاسا ویلی سے تین سو میٹر بلندی پر ہے۔ اس محل میں ایک ہزار کمرے ہیں جن کی دیواروں کی موٹائی کم و بیش پانچ میٹر تک ہے۔ کمروں کی چھتوں پر پیتل کی تہیں چڑھائی گئی ہیں۔ زیادہ تر دلائی لاماز یہیں پر دفن ہیں۔ تیرھویں دلائی لاما کا مقبرہ نہایت ہی شان دار ہے۔ چودہ میٹر اونچا یہ طلائی اسٹوپا دیکھ کر آنکھ خیرہ ہو جاتی ہے۔ دلائی لاما کے بیڈ روم کو محل کے استقبالیہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس کشادہ کمرے کی دیواروں پر سابق دلائی لاماز کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں جن میں سے اکثر قلمی تصاویر ہیں۔ اس محل کی چھت کے قریب' ایک چھجے پر طلائی ڈریگون کا عظیم الجثہ مجسمہ استادہ ہے اس ڈریگون کے گلے میں ایک بڑی سی طلائی گھنٹی بھی لٹک رہی ہے۔ بدھسٹ کا یقین ہے کہ یہ طلائی ڈریگون پوٹالا پیلس کو آفات و بلیات سے محفوظ رکھتا ہے۔ کسی زمانے میں' پوٹالا پیلس کے اندر ایک نہایت ہی بلند درجے کی مونسٹری بھی ہوا کرتی تھی جہاں لگ بھگ دو سو مونکس ہمہ وقت تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے مگر اب یہ

سب کچھ قصۂ پارینہ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ انیس سو انسٹھ عیسوی میں جب چودھویں دلائی لاما کو بہ حالتِ مجبوری جلاوطنی اختیار کرنا پڑی تو اس وقت لہاسا شہر میں مونسٹریز کی تعداد ہزاروں میں تھی لیکن اب بیس سے زیادہ نہیں ہوں گی جن میں سے اہم مونسٹیریز سیرا اور ڈری پنگ ہیں۔

لہاسا ہوٹل سے چند قدموں کے فاصلے پر نوربلنگکا محل (NORBULINGKA PALACE) واقع ہے جو سمر پیلس کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی دلائی لاما کی رہائش گاہ ہی ہے۔ ہر دور کا دلائی لاما موسمِ گرما اسی محل میں گزارتا تھا۔ یہ محل ایک بہت بڑے پارک میں واقع ہے۔ یہ چینی طرزِ تعمیر کا حامل ہے اس محل کی عظیم الشان زرد عمارت چاروں جانب سے باغات میں گھری ہوئی ہے۔ یہ محل انیس سو پچاس عیسوی کی ابتدا میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس محل کا دلائی لاما کے لیے مخصوص رہائشی حصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ واش روم جدید مغربی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ چودھویں جلاوطن دلائی لاما کے بیڈ روم میں اس کا فلپس کمپنی کا تیار کردہ ریکارڈ پلیئر یادگار کے طور پر موجود ہے۔

ہم نوربلنگکا پیلس کی سیر سے فارغ ہوئے تو ہمارے گائیڈ چن سیان نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا ''اب میں تمہیں ایک ایسی جگہ دکھا رہا ہوں جو تمہارے لیے مخصوص کر دی گئی ہے!''

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پوچھا ''میں وہاں کیا کروں گا؟''

''یہ ایک دو منزلہ عمارت ہے۔'' وہ بتانے لگا ''زیریں منزل پر ایک تربیت گاہ واقع ہے جب کہ بالائی منزل رہائش کے لیے مخصوص ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا تو میں نے استفسار کیا۔

''لیکن یہ تو بتاؤ' اس دو منزلہ عمارت کو میرے لیے کیوں مخصوص کیا گیا ہے؟''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا ''اس عمارت کی بالائی منزل تمہاری قیام گاہ ہوگی جب کہ زیریں منزل پر تم چی کونگ' نی کونگ' ای کونگ' اور شیم کونگ کی تربیت دو گے!''

میں چی کنگ (QI GONG) سے بہ خوبی واقف تھا کیونکہ یہ پُراسرار قوت میرے اندر بیدار ہو چکی تھی لیکن دیگر تین کونگ کے بارے میں مجھے پتا نہیں تھا۔ میں نے اپنے ذہن کو الجھانے کے بجائے اسی سے پوچھ لیا۔

چن سیان نے بتایا'' نی کونگ (NEA GONG) باطنی قوت سے متعلق ہے' ای کونگ (OE GONG) خارجی قوت کی نمائندگی کرتی ہے جب کہ شیم کونگ (SHIM GONG) روحانی قوت سے تعلق رکھتی ہے۔''

''لیکن......؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہا تو ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے روک دیا اور اپنی بات کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے چی کونگ' تھرڈ آئی' یوگا' شاؤلن مارشل آرٹس یعنی وو شو کنگ فو کے میدان میں اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تمہیں اس تربیت گاہ کا استاد ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ رہی سہی کسر چنگ فورن پوشی کی نظر پوری کر دے گی۔''

اس نے لفظ ''نظر'' پر خاصا دباؤ ڈالا تھا۔ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ چیف لاما نے مستقبل میں' مجھے تبت ہی میں آباد کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ آنے والے وقت کے بارے میں پیش گوئی کرنا اور اس پیش گوئی کی روشنی میں پلاننگ کرنا ایک الگ بات ہے لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ آنے والے وقت کے بارے میں صرف اور صرف خدا ہی بہتر جانتا ہے!

میں خاموشی سے چن سیان کے ہمراہ چلتا رہا۔ لی یان نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ چن سیان کا ساتھ میسر آنے کے بعد میں اور لی یان ایک دوسرے کے لیے ''بیگانہ'' سے ہو کر رہ گئے تھے۔ چن سیان نے میرے مستقبل کے بارے میں ابھی جو اظہارِ خیال کیا تھا مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ساحل کا حصول میری زندگی کا نصب العین بن کر رہ گیا تھا۔ اسے پانے کے بعد میں کہاں جاتا ہوں اور کس قسم کی زندگی گزارتا ہوں' اس کے بارے میں قبل از وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میری زندگی کا کبھی کچھ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ حالات کی ستم ظریف ٹھوکریں مجھے کھدیڑتے ہوئے جدھر لے جاتیں' میں چل پڑتا تھا۔ آئندہ کے بارے میں بھی خدا ہی بہتر جانتا تھا۔

چن سیان کی معیت میں ہمارے سفر کا اختتام ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے جا کر ہوا۔ مذکورہ عمارت نوربلنگکا پیلس کے قریب بہنے والے دریائے ''کائے چو'' کے کنارے پر واقع تھی۔ چن سیان نے عمارت کے داخلی دروازے پر دستک دی اور میری طرف دیکھتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''وجدان! تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب تم اپنے مشن سے کامیاب لوٹنے کے بعد اس تربیت گاہ کا انتظام سنبھالو گے تو تمہیں اپنے کام کا آغاز صرف ایک اسٹوڈنٹ سے کرنا ہوگا۔ میں تمہیں اسی اسٹوڈنٹ سے ملوانے یہاں لایا ہوں...... اور مجھے یقین ہے' تم اپنے اس اکلوتے اسٹوڈنٹ کو

بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔''

چن سیان کے آخری جملے نے مجھے گڑبڑا کر رکھ دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ تبت کی سرزمین پر قدم رکھا تھا پھر وہاں کے کسی باسی سے کیونکر واقف ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی الجھن کو دور کرنے کے لیے چن سیان سے کوئی سوال کرتا' عمارت کا دروازہ کھل گیا۔

کھلے ہوئے دروازے میں ایک معصوم اور خوب صورت بچے کو دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس بچے کی عمر لگ بھگ چار سال رہی ہوگی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں سانگ فو کا نام چمکا۔ اس بچے نے بھی نظر ملتے ہی مجھے پہچان لیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا پھر اس نے تبتی زبان میں کچھ کہا۔

میں تبتی زبان سے آشنا نہیں تھا۔ تاہم اس کے اندازِ اظہار نے اور گردن کی جنبش نے مجھے بتا دیا کہ وہ مجھے وہاں خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میں حیرت کا بت بنا اس بچے کو تکے چلا جا رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں محترم سانگ فو سے ہونے والی پہلی اور آخری ملاقات کا منظر روشن تھا۔ سیئٹل (واشنگٹن۔ امریکا) میں محترم سانگ فو نے آن جہانی ہونے سے پہلے یہ پیش گوئی کی تھی کہ ہماری اگلی ملاقات تبت میں ہوگی اور میں اسے چار سالہ سانگ فو کے روپ میں دیکھتے ہی پہچان لوں گا اور واقعی' ایسا ہی ہوا تھا۔

میری محویت کو چن سیان کی بھرائی ہوئی آواز نے توڑ دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا ''وجدان! ننھا سانگ فو تمہیں ویلکم کہہ رہا ہے اور...... تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہارے جس اکلوتے اسٹوڈنٹ کا ذکر کیا تھا نا' وہ اسٹوڈنٹ یہی سانگ فو ہے۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے قدرے تحکمانہ انداز میں کہا ''اب ہم واپس جوکھانگ ٹیمپل چلیں گے!''

چن سیان کے ان الفاظ پر ننھے سانگ فو نے گردن جھکا کر ایک مرتبہ پھر مجھے تعظیم دی اور دروازہ بند کر کے میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

واپسی کے سفر میں' میں حیران سے زیادہ پریشان رہا۔ میں آواگون اور جنم در جنم کے فلسفے پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا ایمان ہے' انسان اس دنیا میں ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی مرتبہ مرتا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا' سیئٹل والے آنجہانی محترم سانگ فو اور تبت والے اس معصوم سانگ فو میں درحقیقت کیا تعلق تھا بہرحال' اسرار میں لپٹی ہوئی کوئی ایسی حقیقت ضرور وجود رکھتی تھی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس سے ذہن الجھتا ہے' اسی لیے ان لمحات میں' میں شدید ذہنی خلفشار کا شکار تھا۔

رات کے کھانے سے پہلے' جوکھانگ ٹیمپل کے اندر واقع جمنازیم میں حاضری کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری تھا۔ چنگ فورن پوشی سے' دوسری ملاقات سے ایک روز قبل میں اور لی یان چن سیان کے ساتھ جمنازیم میں موجود تھے کہ ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔

میں جمنازیم میں مختلف مونکس کو مارشل آرٹس خصوصاً کنگ فو کی پریکٹس کرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ ان فائٹرز میں چونگ (ZHONG) نامی ایک نوجوان مونک کمال کا ہنرمند تھا۔ میں نے اب تک چونگ کو کسی اور فائٹر سے زیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ اس روز بھی مختلف مونکس کے مابین مقابلوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر میں چونگ اکیلا ہی میدان میں رہ گیا۔ وہ فائٹنگ کے لیے مخصوص جگہ کے وسط میں خاموش کھڑا تھا۔ باقی مونکس ایک بڑا سا دائرہ بنائے پہلو بہ پہلو کنول آسن میں بیٹھے تھے۔ میں' لی یان اور چن سیان بھی اسی دائرے کی تین کڑیاں تھے۔ ہال میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس مہیب خاموشی کو چن سیان کی ٹھہری ہوئی آواز نے توڑ دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''وجدان! تم چونگ سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ!''

یہ ایک کھلا اعلان تھا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے چونگ کے فائٹنگ اسٹائل اور اس آرٹ میں اس کی اسکل کو بڑی باریک بینی سے دیکھ رہا تھا۔ چونگ کی مہارت اور کارکردگی نے مجھے گہرا متاثر بھی کیا تھا۔ میں نے اس پائے کا مارشل آرٹ صرف شاؤلن ٹیمپل کے ماسٹرز کے پاس دیکھا تھا۔ میں چونگ سے متاثر تھا' خائف نہیں لہٰذا چن سیان کی بات ختم ہوتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد میں اور چونگ اپنے اپنے اسٹانس میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

چن سیان نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ریفری کے فرائض کا آغاز کر دیا۔ اس کی اجازت کے بعد ہمارے درمیان فائٹ شروع ہو گئی۔

یہ میری زندگی کی سب سے انوکھی فائٹ تھی۔ وجدان اور چونگ کی شکل میں درحقیقت شاؤلن ٹیمپل اور جوکھانگ ٹیمپل ایک دوسرے کے مقابل آن کھڑے ہوئے تھے۔ یہ چین اور تبت کی ایک دوستانہ خونی جنگ تھی۔ اس جمنازیم میں موجود ہر ذی روح کو جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا تھا۔ دلوں کو دہلا دینے والے سناٹے میں صرف ہم دونوں کے ہاتھ پاؤں کی کامل حرکات کے سبب پیدا ہونے والی مخصوص آوازیں ہی ابھر رہی تھیں۔

چونگ نے ایک مرتبہ بھی مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ تاہم اس کی ایک ایک ادا اکسانے والی تھی جس کے ردِعمل میں' میں بڑھ بڑھ کر اس پر بھرپور اٹیک کر رہا تھا لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ دس منٹ کی مسلسل فائٹ کے دوران میں' میں چونگ کو چھو بھی نہیں پایا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ہوا سے نبرد آزما ہوں۔ میرا ہر اٹیک پرفیکشن کا اعلیٰ نمونہ ہوتا مگر ہاتھ پاؤں ٹارگٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی چونگ اپنی پوزیشن بدل دیتا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا ذہن کس تیز رفتاری سے فیصلے کر رہا تھا۔

پھر ایک موقع پر چونگ سے چوک ہو گئی۔ وہ میری ایک خطرناک سائیڈ کک کی زد میں آ گیا۔ میرے دائیں پاؤں کا بلیڈ ایک دھواں دھار پش کے ساتھ اس کے سینے سے ٹکرایا۔ یہ زوردار دھکا کھا کر چونگ کا جسم ہوا میں بلند ہوا اور وہ مونکس والے دائرے کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے ہال کے فرش پر جا گرا۔

فرش سے ٹکراتے ہی وہ ساکت ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہ آسکا' کون سی قوت نے اسے یوں اٹھا کر دور پھینک دیا تھا۔ میں فائٹنگ سرکل کے اندر خاموش کھڑا' یک ٹک چونگ کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھ کر یونہی لگتا تھا جیسے زندگی اس کے اندر سے رخصت ہو گئی ہو۔ ان لمحات' میں حیرت اور استعجاب کی آخری منزل پر کھڑا تھا۔

جلد ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ میں اکیلا ہی چونگ کے ساکت جسم کو گھورے جا رہا ہوں۔ سرکل میں موجود تمام مونکس بشمول چن سیان' خاموش اور پُرسکون بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اٹھ کر یا جھانک کر چونگ پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ ان کا یہ رویہ میرے لیے الجھا دینے والا تھا۔ میں چونگ پر سے نگاہ اٹھا کر باری باری مونکس کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔

اسی لمحے چن سیان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس وقت براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ کسی بڑے طوفان کی خبر دیتی تھی۔ پتا نہیں' وہ کون سا راز افشا کرنے جا رہا تھا؟ وہ بڑے ہی ناقابلِ یقین اور تشویش ناک لمحات تھے۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے لب وا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سب رنگ ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونیوالا سلسلہ

اقابلا

تاریک برِاعظم کے پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حیرت انگیز داستان جہاں کالے جادو اور سفلی کے مقابلے برملا ہوتے تھے۔ وحشی قبائل اور ان کے وحشیانہ رسم و رواج کی ایک ناقابلِ یقین سرگزشت...... ان تاریک اور گمنام جزیروں کی کہانی..... جہاں تہذیب کا کوئی دخل نہیں تھا...... شگون کی خاطر معصوم اور شیر خوار بچوں کو نیزوں پر اچھالا جاتا تھا عجیب الخلقت اور خوفناک دیوتاؤں کے مجسموں کو تازہ خون سے غسل دیا جاتا تھا...... نوخیز حسیناؤں کی بھینٹ پیش کی جاتی تھی

اقابلا

وحشی قبیلوں کی ایک سرکش حسینہ جس کا حسن لازوال تھا جس کے حصول کیلئے موت کا بازار ہمیشہ گرم رہتا تھا...... خون کی ہولی کھیلی جاتی تھی۔ ایک سیاح کی زندگی کے لرزہ خیز واقعات جسے سمندر کی سرکش موجوں نے اٹھا کر اقابلا کے دیس میں اس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

کتابی شکل میں پہلی بار منظر عام پر آگئی ہے

قیمت فی حصہ 60 روپے ●●●● ڈاک خرچ 23 روپے

کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون 5802551-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کے لیے: C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ کراچی 75500

میری نگاہ چن سیان کے چہرے پر جمی تھی۔ وہ بھی بڑی گہری نظر سے میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ تھا۔ پتا نہیں، وہ کس سنسنی خیز انکشاف کا ارادہ کیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے جھلکتی گمبھیر سنجیدگی کسی بہت بڑے طوفان کی خبر دیتی تھی...... وہ بڑے حیرت آمیز اور نازک لمحات تھے۔ میں ٹک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا چلا گیا۔ میں نے جیسے ہی اس صورت حالات کے بارے میں کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی، چن سیان لب کشا ہوا۔ اس کی سرسراتی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''وجدان! چونگ کو کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں!''

میری نگاہ چن سیان سے ہٹ کر چونگ کی طرف چلی گئی۔

''یہ ابھی تمہارے سامنے اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا'' چن سیان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

ادھر چن سیان کی بات مکمل ہوئی ادھر چونگ صحیح سلامت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کسی کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی، کسی معمول کی طرح گردن جھکائے خاموشی سے وہ اس ہال سے باہر نکل گیا۔

''یہ...... یہ سب کیا ہے؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے چن سیان کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''تم نے ابھی اوریکل کا مظاہرہ دیکھا ہے...... !''

''اوریکل؟'' میرے لہجے میں بہ دستور الجھن موجود تھی۔

چن سیان نے اس ہال میں موجود مونکس پر ایک خاموش اور معنی خیز نظر ڈالی۔ اس نظر کے نتیجے میں وہ مونکس خاموشی سے اٹھے اور یکے بعد دیگرے اس ہال سے رخصت ہو گئے۔ میں، لی یان اور چن سیان جب ہال میں باقی رہ گئے تو چن سیان بہ آہستگی ہمارے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم راز مجھ پر کھولنے والا ہے۔ اوریکل کا لفظ میرے لیے بالکل نیا تھا تاہم میں نے دوبارہ اس حوالے سے سوال نہیں کیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحات کے بعد وہ بڑے گمبھیر انداز میں گویا ہوا۔ اس کا مخاطب میں تھا ''تم اوریکل کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''کچھ بھی نہیں!''

''تمہاری جدید اور ترقی یافتہ دنیا میں یہ لفظ نامانوس نہیں'' وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولتا چلا گیا ''لگتا ہے تمہیں کمپیوٹر کے شعبے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے!''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی ''میں نے کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا صرف نام ہی نام سنا ہے عملاً میں اس شعبے سے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ شاید تم یقین نہ کرو میں نے ابھی تک کسی کمپیوٹر کے کی بورڈ کو چھو کر نہیں دیکھا!''

''میں واقعی یقین نہیں کر سکتا'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا ''میری معلومات کے مطابق، تم پچھلے کچھ عرصے سے ہائی فائی ٹرائی بینڈ جی ایس ایم سیل فون استعمال کر رہے ہو۔ سیل فون کمپیوٹر ہی کی ایک شکل ہے جو کی پیڈ یا کی بورڈ کے بغیر ایک بے جان کا جسم ہے۔''

''ہاں میں سیل فون تو استعمال کر رہا ہوں'' میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا تم صحیح کہتے ہو، سیل فون ایک چھوٹا کمپیوٹر ہی ہے۔''

''بہر حال!'' وہ آنکھیں جھپکائے بغیر معتدل لہجے میں بولا ''میں تمہیں اوریکل اور اس کے مظاہرے کے بارے میں بتا رہا تھا'' اس نے ایک گہری سانس چھوڑی اور سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''تمہاری دنیا کی جدید کمپیوٹر سائنس میں ''اوریکل'' کی ٹرم قدرے مختلف معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ قدیم ترین تبتی روحانی اور پُراسرار علوم کی دنیا میں اوریکل (ORACLE) ایک بہت ہی پہنچے ہوئے روحانی عامل کو کہا جاتا ہے۔ لیکن ٹھہرو......'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''میں پہلے اوریکل کے حوالے سے تمہیں تھوڑی تفصیل بتا دوں۔''

وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ مختلف خیالات کو اپنے ذہن میں مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ہم دونوں اس کے روبرو بیٹھے تھے اور چپ رہ کر اس کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ لی یان کمپیوٹر کی دنیا سے بہ خوبی واقف تھی۔ کوئی شخص امریکا میں رہ رہا ہو اور کمپیوٹر کا استعمال نہ کرتا ہو، یہ اس دور کا سب سے بڑا لطیفہ ہوگا کیونکہ اس دنیا کے اندر ''امریکا'' بہ ذاتِ خود ایک الگ تھلگ اور انوکھی دنیا ہے جہاں کمپیوٹر کے استعمال کے بغیر انسان سانس بھی نہیں لے سکتا لیکن اس موقع پر لی یان نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا اور چن سیان کے استفسارات کے جواب میں، اپنی

زبان سے ایک لفظ جدا نہیں ہونے دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اس وقت چن سیان براہِ راست مجھ سے مستفسر تھا اور لی یان کا اس معاملے میں بولنا مناسب نہ ہوتا۔

چن سیان کی ٹھہری ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچنے لگی۔ اس کا انداز کسی وعظ کا تھا ''تبت اور لاما لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ''لاما'' کے معنی......''زندہ بدھا'' کے ہیں۔ جو لوگ گوتم بدھ کی تعلیمات کی روح کو زندہ رکھتے ہیں وہ لاما کہلاتے ہیں۔ ان میں بھی درجے مقرر ہیں جیسے لاما، چیف لاما، پنچن لاما، دلائی لاما، ہائی لاما۔ درجے کے اعتبار سے ان کی ذمے داریاں مخصوص ہیں۔ لاما اور چیف لاما ٹیمپل اور مونسٹری وغیرہ کا انتظام و انصرام چلاتے ہیں۔ پنچن لاما اور دلائی لاما کا تعلق حکومتی امور سے ہے۔ عیسائیت میں جو حیثیت پوپ کی ہے، بدھ ازم میں دلائی لاما وہی مقام و مرتبہ رکھتا ہے۔ عظیم مذہبی اور روحانی شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ دلائی لاما ملک گیری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔ پنچن لاما کا درجہ اس سے نیچے ہوتا ہے۔ اگر دلائی لاما کو صدر مملکت مان لیں تو پنچن لاما کا کردار ایک وزیر کا سا ہوتا ہے۔ بہر حال، میں تمہیں ہائی لاماز کے بارے میں بتانے جا رہا تھا۔''

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا تو ہال میں گویا سناٹا سا چھا گیا۔ وہ اکیلا ہی بول رہا تھا، ہم تو ویسے بھی چپ سادھے، خاموش بیٹھے اس کا لیکچر سن رہے تھے۔ وہ جو کچھ بیان کر رہا تھا، اس میں سے بہت سی باتیں مجھے پہلے سے معلوم تھیں تاہم اس وقت پوری توجہ سے چن سیان کو سننا میری مجبوری تھی۔ وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''بدھ بھکشو، مونک، لاما...... اس تمام تر زنجیر کا تعلق روحانیت سے ہے۔ دلائی لاما، پنچن لاما، چیف لاما کی پُراسرار صلاحیتوں اور اختیارات سے انکار ممکن نہیں لیکن میں اس وقت تمہیں صرف اور صرف ہائی لاماز کے بارے میں بتاؤں گا۔ لاماز کا یہ طبقہ صرف اور صرف پُراسرار تبتی روحانی علوم سے متعلق ہے۔ یہ لوگ دیگر حکومتی انتظامی امور سے دور رہتے ہیں البتہ اپنے علوم کی مدد سے یہ پنچن لاما اور دلائی لاما کو مفید مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ انہی ہائی لاماز میں سے بعض اوریکل بھی ہوتے ہیں۔ وہ ہائی لاما جو اوریکل بھی ہو اسے دوسروں پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ ابھی تم نے اوریکل کا جو مظاہرہ دیکھا ہے، وہ ہائی لاما گوانگ چی (GUANG-QI) کا کمال تھا۔ چونگ نے تو محض ایک میڈیم کا کردار ادا کیا ہے!''

وہ خاموش ہوا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے چونگ سے ایک انتہائی غیر معمولی فائٹ کی تھی۔ لگ بھگ دس منٹ کے اس مقابلے میں، میں چونگ کو چھو بھی نہیں سکا تھا۔ اس دوران میں مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں محض ہوا سے نبرد آزما رہا تھا۔ چونگ ایک مرتبہ بھی مجھ پر حملہ آور نہیں ہوا تھا اور میرے ہر حملے کے جواب میں وہ اس طرح صاف بچ نکلتا جیسے ہم حقیقی نہیں بلکہ شو فائٹ کر رہے ہوں۔ فلم کے سیٹ پر مختلف اداکار مارشل آرٹس کا جو بھی مظاہرہ کرتے ہیں، وہ ''شو فائٹ'' کہلاتی ہے۔ شو فائٹ (SHOW FIGHT) کی فلم بندی کے لیے بھی پہلے باقاعدہ ریہرسل کرنا پڑتی ہے مگر میں محسوس کر رہا تھا، چونگ نے جو فن پیش کیا تھا، وہ کسی شو فائٹر کے بس کی بات نہیں تھی۔ چن سیان کے مطابق، اس نے ایک معمول کا رول پلے کیا تھا۔ مارشل آرٹس کی کسی فائٹ کے حوالے سے عامل اور معمول کا استعمال میرے لیے ایک نیا موضوع تھا لہٰذا میں پوری دلچسپی اور توجہ سے چن سیان کے مزید بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

''گوانگ چی ایک مستند اور ماہر اوریکل ہے'' چن سیان سلسلۂ معلومات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''اوریکل ہائی لاماز میں اسے ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ تم جب اپنے مشن سے کامیاب لوٹ آؤ گے تو میں تمہیں گوانگ چی سے ملواؤں گا۔ تمہیں اس عامل کامل شخص سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کسی زمانے میں اوریکل اپنے فن کے مظاہرے کے لیے بڑا پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کرتے تھے اور ان کا یہ عمل محض مستقبل بینی تک ہی محدود تھا۔ اوریکل یعنی ہائی لاما ایک مخصوص قسم کا وزنی لباس پہن کر مختلف قسم کے جنگی آلات سے مسلح ہو جاتا۔ ان آلات اور لباس کا وزن بعض اوقات اسّی پاؤنڈز تک جا پہنچتا اور یکل ایک مخصوص بگل بجا کر تقریب کا آغاز کرتا۔ تماشائیوں کے سامنے وہ اپنے معمول یعنی میڈیم کو تنویمی عمل سے گزار کر گہری نیند سلا دیتا، اس کے بعد وہ میڈیم کے سر پر ایک آہنی ہیلمٹ پہنا دیتا جس کے باعث میڈیم کا چہرہ ہر قسم کے جذبات اور تاثرات سے عاری ہو جاتا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پتھر کو تراش کر بنایا گیا ہو۔ ہیلمٹ پہننے کے دس منٹ بعد میڈیم اٹھ کر بیٹھ جاتا تاہم وہ اپنی آنکھوں کو بند ہی رکھتا تھا۔ اس کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا جیسے وہ ٹرانس کی سی کیفیت میں بیٹھا ہو۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اوریکل اپنے میڈیم سے مستقبل کے بارے میں جو بھی سوال کرتا، میڈیم اس کا جواب ضرور دیتا۔ حیرت انگیز طور پر، بعد میں

میڈیم کے یہ تمام جواب درست ثابت ہوتے۔ یہ الگ بات کہ ان میں سے بعض جوابات بہت مبہم، غیر واضح اور عام فہم نہیں ہوتے، بہر حال ہائی لاما اوریکل انہیں بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ جاتا۔ جدید سائنس اس بات کو مانتی ہے کہ مستقبل میں جھانکنا ممکن ہے لیکن اس ذیل میں وہ ''اوریکل'' کی وضاحت نہیں کر سکتی کہ یہ ایک ''فن'' ہے یا محض ''اندازہ'' مگر ہم تبت والے ہائی لاما کے اس عملی مظاہرے کو سو فی صد ایک پُراسرار روحانی عمل سمجھتے ہیں۔ تم اپنی آسانی کے لیے یوں سمجھ لو کہ اوریکل ہائی لاما ایک ساحر، ایک ہپناٹسٹ ہوتا ہے جو اپنے میڈیم کو عملِ تنویم کے ذریعے گہری نیند سلا کر اس کے ذہن کے پوشیدہ گوشوں کو ٹٹولتا ہے اور وہاں پر موجود مخصوص خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتا ہے جس کے بعد میڈیم مستقبل کے بارے میں جوابات دینے کا اہل ہو جاتا ہے۔ ایک ہائی لاما اوریکل کی مدد سے میڈیم انسانی حواسِ خمسہ کے دائرہ کار سے باہر نکل کر مستقبل کا مشاہدہ کرتا ہے۔'' وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکا پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ درحقیقت فطرت اور مابعد فطرت کا رابطہ ہے۔ انسان کا شعور، کائناتی شعور سے کنکٹ ہو جاتا ہے۔ انسان کے اندر پانچ ظاہرہ حسیات کے علاوہ بہت سی باطنی حسیں بھی موجود ہوتی ہیں جن میں سے چھٹی حس کا تجربہ بعض لوگوں کو کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ حس کسی طرح خود متحرک ہو جائے یا کوشش آپ کے تحت اسے متحرک کر لیا جائے تو انسان کے اندر مستقبل بینی کی صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے۔ چھٹی حس اور دیگر باطنی حسیات کی بیداری کے بعد انسان خلافِ فطرت کام کرنے پر قادر ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی جادوگری نہیں بلکہ جسم، دماغ اور روح کے مابین توازن قائم ہونے کا نام ہے۔ اگر یہ تینوں کسی طرح ہم آہنگ ہو جائیں تو انسان کو کائنات کے بہت سے ''معاملات'' پر تصرف اور قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ کہیں تم میری ان باتوں سے بوریت تو محسوس نہیں کر رہے؟''

چن سیان نے سوالیہ جملے پر اپنے بیان کو روکا تو میں نے جلدی سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں، ہرگز نہیں!''

وہ بتانے لگا ''ہائی لاما گوانگ چی نے اوریکل کے عمل کو جدت اور آسانی دی ہے۔ یہ اپنے عمل کے ذریعے کسی نوجوان مونک (میڈیم) کو تنویمی نیند میں پہنچا کر اس کے ذہن میں جو بھی ہدایات نقش کرتا ہے' بیدار ہونے کے بعد میڈیم ان ہدایات کو نہ صرف یاد رکھتا ہے بلکہ احکام کی تعمیل بھی کرتا ہے۔''

''یہ تو سیدھا سیدھا ہپناٹزم ہوا!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ بولا ''ایک حد تک تم کہہ سکتے ہو لیکن اوریکل کسی ہپناٹسٹ سے بہت آگے کی چیز ہے۔'' وہ لمحے بھر کو خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''ایک ہپناٹسٹ اپنے شعور کو مخصوص تکنیکس کے ذریعے معمول یعنی میڈیم کے شعور سے جوڑ کر اس کی میموری تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اور وہاں اپنی ہدایات کو نقش کر کے واپس آ جاتا ہے۔ ہپناٹسٹ کا یہ رابطہ میڈیم کی شارٹ ٹرم میموری تک محدود ہوتا ہے اسی لیے میڈیم، ہپناٹسٹ کی ہدایات کو ایک خاص عرصے تک ہی یاد رکھ پاتا ہے مگر ایک اوریکل ہائی لاما اپنے میڈیم کے باطنی حواس کے علاوہ لانگ ٹرم اور شارٹ ٹرم میموری کو بھی بہ آسانی کنٹرول کر لیتا ہے۔ تم جب اپنے مشن سے واپس لوٹ کر یہاں قیام کرو گے تو تبتی پُراسرار علوم کے وہ مظاہر دیکھو گے کہ عقل دنگ رہ جائے گی تمہاری۔ چونگ والی فائٹ تو اوریکل کا ایک معمولی سا کارنامہ ہے......!''

''گویا میں نے ایک مارشل آرٹسٹ سے نہیں بلکہ کسی روبوٹ سے مقابلہ کیا ہے؟'' میرے لہجے میں خفیف سی تلخی در آئی۔

وہ بڑے اطمینان سے بولا ''تم چونگ کو کسی روبوٹ سے تشبیہ نہیں دے سکتے۔ یہ درست ہے کہ چونگ نے اپنے اوریکل کی ہدایات پر عمل کیا ہے لیکن تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ چونگ بہ ذاتِ خود بھی ایک اعلیٰ درجے کا فائٹر ہے۔ تم پچھلے کئی دنوں سے اس کی فائٹس دیکھتے آ رہے ہو۔ وہ تمام تر اوریجنل فائٹس تھیں!''

میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ واقعی، میں نے چونگ کو مختلف فائٹرز سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ ایک منفرد اور ناقابلِ شکست فائٹر تھا۔ میں نے ابھی تک اسے کسی مارشل آرٹسٹ سے زیر ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ فی الحال میں چن سیان کی اس بات پر یقین کرنے کے لیے مجبور تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ چونگ نے بالکل اوریجنل فائٹس کی تھیں۔ صرف میرے معاملے میں وہ ہائی لاما گوانگ چی کے لیے ایک میڈیم بن گیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اوریکل کے مظاہرے نے مجھے حیران کیا تھا۔ یہ انتہائی قابلِ غور مظاہرہ تھا!

''میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے'' چن سیان اٹھ کر کھڑا ہو گیا ''رات کا کھانا شروع ہونے والا ہے۔''

جوکھانگ ٹیمپل میں رات کا کھانا جلدی کھا لیا جاتا تھا۔ میں اور لی یان چن سیان کی تقلید میں خاموشی کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو گئے پھر اس کی معیت میں چلتے ہوئے جمنازیم والے ہال سے باہر آئے اور مختلف راہ داریوں سے گزرتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔

اس کمرے کے بارے میں، میں پہلے ہی خاصی تفصیل بیان کر چکا ہوں۔ درحقیقت وہ لمبوترا سا کمرا ہمارے لیے کسی قید خانے کی حیثیت کا حامل تھا جس میں چن سیان ایک شاطر نگران کے طور پر ہمارے ساتھ ہی قیام پذیر تھا۔ چیف لاما چنگ فو رن پوشی نے اسے خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں کہ وہ مجھے اور لی یان کو تنہائی میسر نہ آنے دے اور چن سیان ابھی تک اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب تھا۔ پتا نہیں، وہ اللہ کا بندہ کس وقت اپنی نیند پوری کرتا تھا۔ میں نے رات کے کسی بھی پہر جب اسے چیک کرنے کی کوشش کی تو وہ چاق و چوبند اور ہوشیار ہی ملا۔ یہ الگ بات کہ وہ آنکھیں بند کیے سوتا ہوا پڑا دکھائی دیتا لیکن میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا وہ محض سونے کی اداکاری کر رہا ہوتا۔ اس کا انداز اکسا دینے والا ہوتا۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس کی ''نیند'' کے دوران میں لی یان کے پاس پہنچ جاؤں یا اسے اپنے پاس کھینچ لوں مگر میں عملاً یہ ہمت نہ کر سکا۔ اس سوچ کے ساتھ میں نے جب بھی چن سیان کی جانب دیکھا تو مجھے یہی محسوس ہوا کہ ادھر میں نے کوئی ''حرکت'' کی، ادھر وہ آنکھ کھول دے گا!

رن پوشی چنگ فو نے مجھے لی یان سے دور رکھنے کے لیے بڑا صبر آزما طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو لی یان کو میری نگاہ سے دور کسی دوسرے کمرے میں بھی ٹھہرا سکتا تھا لیکن یہ تو ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' والی تڑپا دینے صورتِ حال تھی۔ شاید چیف لاما میرے ضبط کا امتحان لے رہا تھا!

میں نے دل میں سوچا، کوئی بات نہیں۔ تبت میں دس روزہ قیام کی مدت تو پوری ہو گئی آئندہ روز میں اسرائیل روانہ ہونے والا تھا اور ظاہر ہے، لی یان بھی میرے ساتھ ہی ہوتی، پھر چنگ فو کس طرح ہمارے ملاپ پر پہرے بٹھاتا، یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا، چن سیان بھی ظالم سماج کی صورت ہمارے ساتھ ہی تبت سے اسرائیل پہنچتا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ کسی نہ کسی طور میں اس نگران کی آنکھوں میں ضرور دھول جھونک کر رہوں گا۔

ہم رات کے کھانے سے فارغ ہو گئے تو میں نے چن سیان سے پوچھا ''تم نے تبت کے لاماز اور ہائی لاماز کی بہت کہانیاں سنا دیں لیکن ابھی تک اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟''

میرے اس سوال میں تیکھا پن تھا، وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''تم میرے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا سوال کر ڈالا تو میں نے بڑے واضح الفاظ میں استفسار کیا ''یہاں جوکھانگ ٹیمپل میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟''

''میں محترم رن پوشی کا ایک معمولی سا خدمت گار ہوں!'' وہ سادگی سے بولا ''چنگ فو جو بھی حکم دیں، میں بجا لاتا ہوں۔''

میں نے کہا ''تم کسرِنفسی سے کام لے رہے ہو!''

وہ الجھن زدہ نظر سے دیکھتے ہوئے بولا ''میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اس وقت ہمارے درمیان پور انگلش میں گفتگو ہو رہی تھی۔ چن سیان بڑی روانی سے انگلش بول اور سمجھ لیتا تھا۔ میں نے اپنا مافی الضمیر واضح کرنے کے لیے انتہائی سلیس انگلش استعمال کی تھی اور میں یہ بھی جانتا تھا، وہ میری بات کو بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ الجھن پر مبنی اس کا استفسار ایک چالاکی کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ بہر حال، میں نے اس کی فرمائش پر وضاحت کر دی۔

''میں نے پچھلے دس دنوں میں بڑی اچھی طرح یہ اندازہ لگا لیا ہے کہ چنگ فو رن پوشی تم پر بے پناہ اعتماد کرتا ہے۔ جوکھانگ کے دیگر مونکس اور لاماز بھی تمہارے اشاروں کی تعمیل کرتے ہیں۔ تم یقیناً کوئی توپ قسم کی چیز ہو۔ چنگ فو کسی معمولی آدمی پر تو اندھا اعتماد نہیں کر سکتا نا؟''

''محترم رن پوشی اگر مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو ان کی مہربانی ہے۔''

وہ کھلنے کو تیار نظر نہ آیا تو میں نے اپنے اندازے کی روشنی میں براہِ راست کہہ دیا ''چن سیان! میں محسوس کر سکتا ہوں، جوکھانگ ٹیمپل میں تم چنگ فو کے دستِ راست ہو...... یعنی نائب چیف لاما!'' اس کی آنکھوں میں ایک سایہ سا لہرا گیا۔ میں نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا ''اور مستقبل میں جھانکتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جوکھانگ ٹیمپل کا آئندہ روحِ رواں چیف لاما تم ہی ہو گے؟ جواب دینے کے بجائے وہ نگاہ چرا کر کمرے کے باہر راہ داری میں دیکھنے لگا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے راہ داری میں کسی کی موجودگی کو

محسوس کرلیا ہو۔ لامحالہ میں نے بھی اس کی نگاہ کے تعاقب میں، راہ داری میں نظر دوڑائی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں یہی سمجھا' چمن سیان میرے سوال کا جواب دینے سے کترا رہا ہے لہٰذا میں نے قدرے پراصرار لہجے میں کہا۔

''چمن سیان! تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

اسی لمحے راہ داری میں ایک عمر رسیدہ تبتی نمودار ہوا۔ چمن سیان کے چہرے کے تاثرات نے بتا دیا کہ وہ تھوڑی دیر پہلے اسی بوڑھے کی آمد سے ''آگاہ'' ہوا تھا۔ وہ پوری طرح بوڑھے کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''آؤ آؤ فانگ چو...... اندر آجاؤ!''

بوڑھا فانگ چو (Fang Zhou) ایک بریف کیس نما بیگ تھامے کمرے میں داخل ہوا۔ چمن سیان نے اس کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''وجدان! فانگ چو ایک عمدہ فوٹوگرافر ہے۔ تمہاری مدد اور تعاون سے یہ یہاں ایک خاص کام کرنے آیا ہے۔ کیا تم اس کی عمر کا اندازہ لگا سکتے ہو؟''

تبتی افراد کی عمروں کا شمار کرتے ہوئے مجھ سے ہمیشہ غلطی ہوجاتی تھی۔ میں نے اپنے اندازے سے کچھ بڑھا کر جواب دیا ''میرے خیال میں فانگ چو اس وقت اسّی کے پیٹے میں ہوگا!''

''بالکل غلط'' چمن سیان نے حسب توقع میرے اندازے کی ایسی کم تیسی کرتے ہوئے کہا ''فانگ چو اس وقت اپنی زندگی کے ایک سو چالیس ویں سال میں ہے۔''

میں نہیں جانتا، دنیا میں طویل ترین عمر کا حامل کون شخص گزرا ہے تاہم مجھے یقین تھا کہ ایسے کسی ریکارڈ ہولڈر شخص کا تعلق تبت ہی سے ہونا چاہیے۔ ویسے میرا یہ یقین اس حوالے سے غلط ہوسکتا تھا کہ تبت والوں کو شاید اس مقابلے میں شریک نہ کیا جاتا ہو۔ تبت، دنیا کے باقی ملکوں سے کٹا ہوا ایک خطۂ ارض ہے۔ اس نوعیت کے مقابلوں کے لیے انہیں عموماً نظرانداز کردیا جاتا ہے۔ بہرحال، چمن سیان کا انکشاف دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔ ایک سو چالیس سالہ فانگ چو میری طرف دیکھتے ہوئے مسلسل زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ چمن سیان نے اس کا تعارف کراتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کا فوٹوگرافر ہے اور ایک ضروری کام سے وہاں آیا ہے...... ایک ایسا کام جو میرے تعاون اور مدد سے ہونے والا تھا۔ یقینی طور پر وہ فوٹوگرافی کے لیے ہی آیا ہوگا۔

میں نے چمن سیان سے پوچھ لیا ''میں کسی کام کے سلسلے میں فانگ چو سے کیا تعاون کرسکتا ہوں؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے معنی خیز نظر سے عظیم فوٹوگرافر فانگ چو کی طرف دیکھا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے بیگ کو کھولنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ بیگ میں سے کیمرا برآمد کرے گا اور دھڑا دھڑ ہماری تصاویر اتارنے لگے گا مگر اس مرتبہ بھی میری توقع پوری نہ ہوسکی!

فانگ چو نے بیگ کے اندر سے ایک کلپ بورڈ نکالا جس پر سفید ڈرائنگ کارڈز لگے ہوئے تھے۔ وہ لگ بھگ دس کارڈز ہوں گے جو کلپ کی گرفت میں عمدگی سے دبے ہوئے تھے۔ اس کلپ بورڈ کے علاوہ فانگ چو نے بیگ میں سے ایک پین باکس بھی برآمد کیا اور اس کے اندر سے لمبے سکے والی ایک موٹی پینسل نکال کر چمن سیان کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ چمن سیان کچھ بولتا، میں نے اس سے پوچھ لیا ''تم نے تو بتایا ہے کہ فانگ چو ایک فوٹوگرافر......!''

''میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا ''فانگ چو واقعی غضب کا فوٹوگرافر ہے لیکن یہ کیمرا استعمال نہیں کرتا بلکہ قلمی تصاویر بناتا ہے۔''

''پھر تو یہ ایک مصور ہوا نا!'' میں نے لقمہ دیا۔

''تم کچھ بھی کہہ لو'' وہ قطعیت سے بولا ''ہم یہاں تبت میں تصویریں بنانے والے شخص کو فوٹوگرافر ہی کہتے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''میں اس سلسلے میں فانگ چو کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''یہ تمہارے تعاون سے تمہاری اس ساتھی کی قلمی تصویر تیار کرے گا جس کے حصول کے لیے تم ایک مشن سر کرنے والے ہو۔ تم اپنے ساتھی کے خال و خط کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

میں نے گہری نظر سے فانگ چو کو دیکھا وہ بڑی توجہ اور انہماک سے چمن سیان کو سوالیہ نظر سے تک رہا تھا۔ ابھی تک میرے اور فانگ چو کے درمیان ایک جملے کا تبادلہ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ انگریزی سے نابلد تھا۔ چمن سیان نے اس کے ساتھ تبتی زبان میں کوئی کھسر پھسر کی تھی جو میرے پلے نہ پڑ سکی۔ چمن سیان نے اپنی بات کو دہراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''وجدان! تم اپنی ساتھی کے حلیے کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔ فانگ چو اس کی قلمی تصویر بنائے گا۔''

''کیا یہ میری بات سمجھ جائے گا؟'' میں نے چیک کرنے کی خاطر پوچھ لیا۔

''میں اسے تبتی میں سمجھا دوں گا'' اس نے کہا ''تم انگلش میں مجھے بتا دو۔''

میں نے ساحل کے نقش و نگار کو بیان کرنا شروع کردیا ''ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں، صورت سے جھلکتی معصومیت، خدوخال خالص تبتی، گوری چٹی، رنگت گلابی، ناک ستواں، گردن مخروطی، ہونٹ گداز، شوخ، چنچل......'' پھر اس حلیے میں دیگر تفصیل بھی شامل ہوتی چلی گئی ''عمر لگ بھگ اکیس سال، قد دراز کم و بیش پانچ فٹ دس انچ وغیرہ وغیرہ......''

چمن سیان نے اس تفصیل کو تبتی میں بدل کر فانگ چو کے گوش گزار کردیا۔

فانگ چو اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے پوری توجہ سے سنتا رہا۔ میں تبتی زبان سے آشنا نہیں تھا تاہم یہ بات میں نے فوراً محسوس کرلی کہ چمن سیان نے اس چیپٹر کو دہرایا بھی تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی فانگ چو گردن جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

میں' لی یان اور چمن سیان خاموش بیٹھے فانگ چو کی کارگزاری دیکھتے رہے۔ ڈرائنگ شیٹ پر پینسل گھسنے کی مخصوص آواز دس منٹ تک ابھرتی رہی، پھر فانگ چو نے وہ کلپ بورڈ چمن سیان کی طرف بڑھا دیا۔

چمن سیان نے اس شاہکار پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور کلپ بورڈ مجھے تھما دیا۔ میں نے بہ غور اس قلمی تصویر کا جائزہ لیا جو فانگ چو نے بنائی تھی۔ وہ ہو بہو ساحل کا خاکہ تو نہیں تھا تاہم وہ بڑی حد تک میری جانِ تمنا سے مماثلت رکھتا تھا۔

میں نے نظر اٹھا کر چمن سیان کی جانب دیکھا' اس نے پوچھا ''کیا کہتے ہو؟''

''یہ اسکیچ کافی حد تک میری ساتھی سے مشابہ ہے!''

''تم اسے پروف سمجھ لو'' اس نے کہا۔

''پھر؟'' میں نے کہا۔

چمن سیان نے تبتی زبان میں فانگ چو سے کچھ کہا' فانگ چو نے باکس میں سے ایک عام سی پینسل نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اس کے ساتھ ہی مقامی زبان میں کچھ کہا بھی۔ چمن سیان مذکورہ پینسل کو میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''فانگ چو کہہ رہا ہے، یہ اسکیچ جہاں جہاں سے تمہاری ساتھی کی صورت سے میل نہیں کھاتا' ان مقامات کی نشان دہی کردو۔ فانگ چو تمہاری مرضی کے مطابق اس قلمی تصویر کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

میں اس کی بات کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا لہٰذا یہ ''کام'' کردیا۔

چمن سیان نے میری ہدایات کو تبتی زبان میں فانگ چو تک پہنچایا تو وہ ایک مرتبہ پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ اسکیچ ایسا ہوگیا کہ ساحل کی صورت سے نوّے فی صد مشابہت رکھتا تھا۔ میں نے قلمی تصویر کو دیکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کردیا۔

''یہ خاکہ میری ساتھی سے نوّے فی صد میل کھاتا ہے۔''

''بس، ہمیں اتنا ہی چاہیے'' چمن سیان نے حتمی لہجے میں کہا اور فانگ چو کی جانب متوجہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر تک ان دونوں کے درمیان تبتی زبان میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہا پھر فانگ چو اپنا ''سامان'' سمیٹ کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

میں نے سوالیہ نظر سے چمن سیان کو دیکھا اور پوچھا ''یہ تصویر کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے؟'' فانگ چو اپنا شاہکار' وہ قلمی تصویر چمن سیان کے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ چمن سیان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''میں نے یہ کام محترم رن پوشی کی ہدایت کے مطابق کرایا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے'' میں نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں' آخر اس قلمی تصویر کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''میں صرف محترم چنگ فو کے احکام کی تعمیل کرتا ہوں'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''ان سے سوال کرنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔''

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ صورتِ حال سے بہ خوبی باخبر ہے لیکن دانستہ میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا۔ میں نے بھی اس سے زیادہ اصرار نہیں کیا اور بڑی سادگی سے کہہ دیا۔

''ٹھیک ہے، کل چنگ فو سے میری ملاقات تو ہونا ہی ہے۔ یہ سوال میں اسی سے کروں گا'' چمن سیان نے میرے اظہارِ خیال پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔

چمن سیان کے رویے نے مجھے ڈاکٹر موئنگ ریفو شے کی یاد دلا دی۔ اسے بھی جو بات بتانا نہیں ہوتی تھی اس سلسلے میں ایسا ہی مبہم سا ٹالنے والا رویہ ظاہر کرتا تھا۔ میں نے اس رویے کا جواب یہ نکالا کہ کرید سے اجتناب برتنے لگا۔ یہی فارمولا میں نے یہاں چمن سیان پر بھی آزمایا اور تصویر کے معاملے

میں چپ سادھ لی۔

میں سونے کے لیے اپنے مخصوص بستر پر دراز ہوا تو ذہن میں مختلف قسم کی سوچوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ تبت واقعی سر زمین حیرت ثابت ہو رہا تھا۔ آپوں آپ میرا دھیان ننھے سانگ فو کی طرف چلا گیا۔ سٹیل (امریکا) میں محترم سانگ فو نے جو پیش گوئی کی تھی وہ یہاں تبت میں من و عن پوری بھی ہوگئی۔ نور بلنگکا پیلس کے نزدیک' دریائے ''کائے چو'' کے کنارے پر واقع اس دو منزلہ عمارت میں چار سالہ سانگ فو کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ چمن سیان کے مطابق' اسرائیل سے واپسی پر مجھے اسی دو منزلہ عمارت میں رہائش اختیار کرنا تھی......اور وہاں پر مجھے جن علوم وفنون کی تربیت دینا تھی۔ وہ سب کے سب انتہائی اہم تھے۔ اس سلسلے میں ننھا سانگ فو میرا پہلا اسٹوڈنٹ ہوتا۔ پتا نہیں، وہ چھوٹا سا بچہ اتنی بڑی عمارت میں کس کے ساتھ رہتا تھا؟

اس سرزمین پر ایک سے بڑھ کر ایک حیرت میرے پاؤں پکڑ رہی تھی۔ اوریکل گوانگ چی اور اس کے میڈیم چونگ والا واقعہ بھی ذہن کو گھما رہا تھا۔ پھر لو ما رآئل کی کارکردگی بھی حیرت انگیز تھی۔ چمن سیان لگ بھگ دس دن سے میرے سر میں ایک کرشماتی تیل کی مالش کر رہا تھا۔ میں نے جب تبت کی زمین پر قدم رکھا تو میرا سر منڈا ہوا تھا اور اب جادوئی تیل کے مساج نے وہاں اتنے بال اگا دیے تھے کہ میں ان میں بہ آسانی کنگھی کر سکتا تھا۔ عام حالات میں اس سائز کے بال کم از کم ڈیڑھ ماہ میں نکلتے ہیں۔ اس حوالے سے ''لو ما رآئل'' واقعی طلسماتی خواص کا حامل تھا!

میں نہیں جانتا تھا، آگے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ جو بھی ہوتا، یقیناً حیرت انگیز اور چونکا دینے والا ہی ہوتا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا کافی دیر تک اپنے حالات پر غور کرتا رہا۔ اس دوران میں لی یان اور چمن سیان سو گئے۔ لی یان کے بارے میں تو مجھے یقین تھا، وہ وادیٔ نیند میں اتر چکی ہے لیکن چمن سیان کا معاملہ مشکوک تھا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس بندۂ خدا کو چیک کرنا چاہیے۔

چمن سیان کو میں نے ''بندۂ خدا'' اس لیے کہا ہے کہ میرے عقیدے کے مطابق' تمام انسان خدا ہی کی مخلوق ہیں۔ اگر اپنے تئیں چمن سیان ''بندۂ بدھ'' تھا تو میں کیا کروں!

شرارت کا خیال آتے ہی میں نے چمن سیان کی جانب کروٹ لی اور آنکھیں کھول کر بڑی گہری نظر سے اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ میرے اس عمل نے جلد ہی رنگ دکھایا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے آنکھیں بند ہونے کے باوجود اس نے میری ''توجہ'' کو محسوس کر لیا ہو۔ میں دل ہی دل میں مسکرا کر رہ گیا۔ وہ میرے اندازے کے عین مطابق' آنکھیں بند کیے جاگ رہا تھا، گویا میری کڑی نگرانی جاری تھی۔

میں نے چمن سیان کو مزید آزمانے کے بارے میں سوچا ہی تھا کہ اس نے اپنی کہنی پر کھجاتے ہوئے بڑے فطری انداز میں کروٹ بدل دی۔ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو یہی سمجھتا کہ چمن سیان نے گہری نیند میں کروٹ بدلی تھی لیکن میں ہرگز ایسا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ میں گزشتہ کئی روز سے اس کے انداز واطوار کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا جیسا بہ ظاہر دکھائی دیتا تھا۔

میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور ٹانگیں اس طرف لٹکا دیں جدھر ایک بیڈ پر لی یان بے خبر سو رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اپنے بیڈ سے اتر کر لی یان کے بیڈ پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے یہ حرکت جس خاص مقصد کے تحت کی تھی، اگلے ہی لمحے وہ مقصد پورا ہو گیا۔

چمن سیان ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا پھر میری جانب رخ پھیرتے ہوئے تشویش ناک لہجے میں مستفسر ہوا ''وجدان! کوئی پرابلم ہے؟''

میں نے اس کی چال اسی پر لوٹا دی اور ایک بازو کی کہنی کو بڑے نارمل انداز میں کھجاتے ہوئے کہا ''شاید کسی مچھر نے کاٹا ہے، سوتے سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے معنی خیز نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ کھسیانا سا ہو گیا پھر اپنی جھینپ کو مٹاتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بھی ایسی شے نے کاٹ لیا تھا، بہر حال، اس کمرے میں تمہاری آخری رات ہے۔ جب تم اسرائیل سے کامیاب لوٹو گے تو تمہیں دریائے کائے چو والی رہائش گاہ پر ٹھہرایا جائے گا۔ تمہاری آمد سے پہلے میں وہاں ایسے انتظامات کروا دوں گا کہ کبھی مچھر کی شکل تک نہیں دیکھیں گی۔'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں چوٹ کی۔

''چمن سیان! تم واقعی میرا بہت خیال رکھے ہوئے ہو!''

وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا ''سونے کی کوشش کرو۔ کل تمہیں محترم چنگ فو سے ایک اہم ملاقات کرنی ہے۔ اس موقع کے لیے تمہارے دماغ کو تھکن سے پاک اور تر وتازہ ہونا چاہیے۔''

بات ختم کرتے ہی وہ میری جانب رخ کر کے لیٹ گیا پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں چند لمحات تک اس گانٹھ کے پورے کو دیکھتا رہا پھر اس کی ہدایت کے مطابق، اپنے دماغ کو فریش کرنے کے لیے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

ہم اسی چھوٹے سے کمرے میں ایک مرتبہ پھر روبہ رو بیٹھے تھے۔ یہ چنگ فورن پوشی سے میری دوسری ملاقات تھی۔ دس روز قبل، پہلی ملاقات میں ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر تفصیلی بات ہوئی تھی۔ چنگ فو کے مطابق، ہماری صرف تین ملاقاتیں تھیں۔ ایک ہو چکی تھی، دوسری ہو رہی تھی اور تیسری اس وقت ہوتی جب میں ساحل کو ربی موشے ہائمن کے چنگل سے چھڑا کر بہ خیر وخوبی اسرائیل سے تبت پہنچ جاتا۔

میں حسبِ دستور سفید چٹائی پر بیٹھا تھا اور چنگ فو نیلی چٹائی پر کنول آسن میں میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے آج بھی میرون روب (سرخی مائل گہرے بھورے رنگ کا گاؤن) زیب تن کر رکھا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں چنگ فورن پوشی کی شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔ اس کی ذات بھی سرزمینِ تبت کے مانند اسرار اور تحیر کی کئی پرتوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا، وہ اپنے سامنے موجود شخص کے آر پار دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے چنگ فورن پوشی نے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ ہم چند لمحات تک ایک دوسرے کے سامنے خاموش بیٹھے رہے پھر اس خاموشی کو چنگ فو کی مخصوص آواز نے توڑ دیا۔

''وجدان! تبت تمہیں کیسا لگا؟'' اس نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

''اچھا...... بہت اچھا!'' میں نے جواب دیا۔

وہ اپنے مخصوص نرم اور گمبھیر انداز میں بولا ''تم نے دس دن تک تبت کی خوب سیر کی ہے۔ اگرچہ یہ مدت میرے خیال میں بہت کم ہے۔ تبت کے اسرار ورموز کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے لیکن پھر بھی مجھے امید ہے، چمن سیان نے تمہیں بہت کچھ دکھا اور بتا دیا ہوگا؟''

میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا ''جی...... جی ہاں۔''

''اوریکل کا تجربہ تمہیں کیسا محسوس ہوا؟''

''بہت ہی حیران کر دینے والا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس دوران میں ایک خوش گوار سی مسکراہٹ مسلسل اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہی۔ یہ مخصوص مسکراہٹ اور لہجے میں شامل گداز چنگ فو کی شخصیت کا حصہ تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جب تم اپنی ساتھی کو آزاد کروانے کے بعد واپس لوٹو گے تو تمہیں یہ فن بھی سکھایا جائے گا۔ میرے خیال میں، تمہیں اس سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ بنیاد تمہارے اندر موجود ہے۔ تم چی اور تھرڈ آئی کی صلاحیتوں سے مالا مال ہو۔ تھوڑی سی پریکٹس کے بعد تم اوریکل سے مہارت حاصل کر لو گے۔''

میں نے اس سے سانگ فو کے بارے میں پوچھا۔ ساتھ ہی محترم سانگ فو کی پیش گوئی کا تذکرہ بھی کر دیا۔ وہ زیرِ لب مسکراتا رہا۔ جب میں نے اپنی بات مکمل کر لی تو اس نے کہا۔

''سیٹل والے سانگ فو نے تم سے کچھ بھی غلط نہیں کہا تھا۔ تم نے جس چار سالہ بچے کو دیکھا ہے، وہ دراصل سٹیل والے سانگ فو کا اگلا جنم ہے۔ جب ہماری تیسری ملاقات ہوگی تو میں تمہیں جنموں کے اس چکر کے بارے میں تفصیلاً بتاؤں گا۔''

چنگ فو نے ''دوسرا جنم'' کے بجائے ''اگلا جنم'' کے الفاظ استعمال کیے تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ سٹیل والا سانگ فو مجھ سے اپنے پہلے جنم میں نہیں ملا تھا۔ ہو سکتا ہے، بدھ ازم کے مطابق وہ اس کا دوسرا یا تیسرا جنم ہو!

''میں نے کہا ہے نا، تم جنموں کے اس سلسلے میں اپنے ذہن کو مت الجھاؤ'' چنگ فو نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ اس وقت میری سوچ پڑھ رہا تھا۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مزید بولا۔

''تم اس وقت ایک اہم مشن پر روانہ ہو رہے ہو اس لیے ادھر ادھر کی باتوں کو ذہن سے نکال کر صرف اور صرف اپنے مقصد پر دھیان دو۔ تمہاری واپسی پر جب ہماری تیسری ملاقات ہوگی تو میں تمہاری ساری الجھنوں کو سلجھا دوں گا۔''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا ''محترم چنگ فو! کیا آپ کو یقین ہے کہ میں اپنے مقصد کو حاصل کر کے کامیاب لوٹوں گا؟''

یہ سوال خواہ مخواہ ہی میری زبان سے پھسل گیا تھا۔ شاید اس کی کوئی لاشعوری وجہ ہو۔ میں نے اب تک ساحل کے حصول کے لیے جو بھی کوششیں کی تھیں' ان میں عین وقت پر مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ کوئی نہ کوئی ایسی رکاوٹ اور خرابی سامنے آ جاتی کہ میں ہاتھ ملتا رہ جاتا۔ ایک لمحے کو محسوس ہوتا کہ میں ہاتھ بڑھا کر ساحل کو پکڑنے ہی والا ہوں لیکن اگلے ہی لمحے وہ میری پہنچ سے کوسوں دور ہو جاتی تھی۔ اس

مسلسل نارسائی نے شاید میرے اندر خدشات اور اندیشوں کا ایک بلند وبالا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا' اسی سبب اس لمحے میری زبان سے مایوسی بھرا وہ سوال نکل گیا تھا۔ اس سوال سے بڑی واضح بے یقینی جھلکتی تھی۔

چنگ فورن پوشی نے ایک لمحے کا توقف کر کے میری آنکھوں میں جھانکا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ''ہاں، مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ کامیابی ضرور تمہارے قدم چومے گی لیکن......؟''

''لیکن کیا؟'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے تڑپ کر پوچھا۔

چنگ فو نے جواب دیا'' یہ کام اتنا مشکل ہے کہ اپنے دشمن سے نمٹتے ہوئے تمہیں دانتوں پسینہ آجائے گا۔ تمہارا دشمن اسرائیل کی سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت سے کسی شے کو نکال کر لانا کوئی معمولی بات نہیں۔ تمہیں بہترین حکمتِ عملی سے کام لینا ہوگا۔''

میں نے پہلی ملاقات میں بھی اور اب بھی یہ محسوس کیا تھا کہ چنگ فورن پوشی ربی موشے بائمن کا نام زبان پر لانے سے پرہیز کر رہا تھا۔ وہ ربی کا ذکر کرتے ہوئے ''میرا دشمن'' جیسے الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ پتا نہیں، اس انداز کے پیچھے اس کی کون سے مصلحت پوشیدہ تھی۔ بہرحال' میں اس کا اشارہ بڑے واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔ اس کی رائے کے جواب میں، میں نے کہا۔

''میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں میرے محترم! کہ ربی موشے بائمن سے ہونے والا یہ آخری معرکہ بڑا کانٹے دار ثابت ہوگا۔ اگر میری پشت پر آپ کی نیک خواہشات موجود رہیں تو میں انشاءاللہ اپنی ساتھی کو حاصل کر کے ہی رہوں گا!''

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر دعائیہ انداز میں بولا'' لارڈ بدھا تمہاری مدد کرے گا!''

ہم دونوں اپنے اپنے عقائد سے مجبور تھے لہٰذا ہمارے بات کرنے کا انداز بھی جدا جدا تھا۔ میں خاموش رہا تو اس نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم نے ''آخری معرکہ'' کے الفاظ بالکل بجا استعمال کیے ہیں۔ وجدان! ایک نکتے کو ذہن میں رکھنا۔ یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔ اگر تم نے اس موقع کو ضائع ......''

''میں اس موقع کا پاس کروں گا'' چنگ فو کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ میرے لہجے میں اضطراب کا عنصر نمایاں تھا'' آپ فکر نہ کریں' میں اس بار اپنے مقصد کو حاصل کر کے رہوں گا!''

میرے اٹل انداز پر وہ اثبات میں سر ہلانے لگا پھر پُر اعتماد لہجے میں بولا'' میں اس سلسلے میں ذرا بھی فکر مند نہیں ہوں اسی لیے پُریقین ہوں کہ تم کامیاب واپس لوٹو گے۔''

میں ایک اطمینان بھری گہری سانس لے کر رہ گیا۔

چنگ فو نے کہا'' تمہاری ساتھی فلپائنی لڑکی کا کیا حال ہے؟''

اس کا اشارہ لی یان کی طرف تھا۔ میں نے جواب دیا'' میری طرح وہ بھی ٹھیک ہی ہے......!''

میرے اس جواب میں ہلکے طنز کی آمیزش تھی۔ وہ چند لمحات تک معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا'' وجدان! شاید تمہیں نہیں معلوم کہ پُراسرار قوتوں کو حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ ترکِ لذائذ ہے۔ یہ ایک طرح سے اپنے نفس پر قابو پانا ہے۔ انسان جن اشیا کے ذائقے سے واقف ہو، اس نے زندگی کی جن نعمتوں کا مزہ چکھ رکھا ہو، ان کی لذت سے آشنا ہو' اگر ان میں سے انتہائی مرغوب چند اشیا کو وہ ترک کر دے تو کچھ ہی عرصے کے بعد اس کے اندر پُراسرار قوتیں نمو پانے لگتی ہیں۔ اگر انسان ثابت قدمی سے اپنے مقصد کے ساتھ چپکا رہے تو بہت جلد اسے کامیاب حاصل ہو جاتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں میرے محترم!'' میں نے رسانیت سے کہا'' لیکن یہاں میں ایک حوالے سے' آپ سے متفق نہیں ہوں۔''

''کس حوالے سے؟'' اس نے بڑے مہربان انداز میں پوچھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' آپ نے ترکِ لذائذ کو پُراسرار قوتیں حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ بتایا ہے لیکن میرے خیال میں یہ بڑا کٹھن عمل ہے۔ انسان جن چیزوں کی لذت سے آشنا ہو، انہیں یک سر ترک کر دینا کوئی آسان کام نہیں!''

چنگ فو نے جو طریقہ بیان کیا تھا، وہ راہبانیت کی طرف لے جاتا تھا۔ عیسائیت' ہندوازم اور بدھ ازم میں بعض لوگ یہ اختیار کر لیتے ہیں لیکن میں ذاتی طور پر اس کا حمایتی نہیں ہوں۔ میرے خیال میں یہ غیر فطری طرزِ زندگی ہے جو اچھے نتائج کا حامل نہیں۔ اس سلسلے میں بڑی سنسنی خیز اور تحیر آمیز کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ بہرحال، میں کوئی دینی مبلغ نہیں ہوں کہ اس پر سیر حاصل گفتگو کروں۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر دیا ہے۔

چنگ فو نے گہری سنجیدگی سے کہا'' مگر تم نے یہ مشکل کام کر دکھایا ہے!'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا'' پچھلے دس دن سے تم ایک آزمائش میں ڈال دیے گئے تھے۔ اس کڑے امتحان میں تم کامیاب ہو گئے ہو!''

شاید وہ توقع کر رہا تھا کہ اس کی بات کے جواب میں' میں کوئی سوال اٹھاؤں گا لیکن جب میں خاموش رہا تو وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اگر کسی بھوکے شخص کے سامنے کھانا رکھ دیا جائے اور اس سے کہا جائے کہ وہ ایک نوالہ بھی نہیں لے گا...... اور وہ شخص واقعتاً ایسا کر بھی دکھائے تو یہ بڑے کمال کی بات ہوتی ہے۔ ضبطِ نفس اسی کو کہا جاتا ہے۔''

اس کا ہر اشارہ میری اور لی یان کی طرف تھا۔ میں اس کے اشاروں کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا لیکن اس سے الجھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا لہٰذا کسی اختلافی موضوع کو اٹھانے کے بجائے میں براہِ راست اس سے پوچھ بیٹھا۔

''محترم چنگ فو! اگر یہ کمال کی بات ہے تو پھر میں نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا ہے لیکن اس کڑی آزمائش میں ڈالنے سے پہلے آپ نے اس کے جن سودمند نتائج کا ذکر کیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہے؟''

پہلی ملاقات میں چنگ فو نے مجھ پر واضح کیا تھا کہ اگر تھرڈ آئی کے سلسلے میں مجھے دشواریوں کا سامنا ہے تو اس میں ربی موشے بائمن کے کسی عمل سے زیادہ خود میری لغزشوں کا ہاتھ ہے۔ اس حوالے سے اس نے لیلٰی، راکیل اینڈرسن اور لی یان کا خصوصی ذکر بھی کیا تھا۔ گزشتہ دس دنوں میں لی یان کو مجھ سے دور رکھنے کا یہی مقصد تھا کہ میری باطنی آنکھ کے سامنے جو جالا سا آ گیا ہے، وہ دھل کر صاف ہو جائے لیکن اس ذیل میں، میں نے کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں کیا تھا۔ اس دوران میں، میں نے جب بھی ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی، مجھے بری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

چنگ فو نے ٹٹولتی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا'' کیا تم نے اس سلسلے میں ٹرائی کی؟''

''کئی بار'' میں نے جواب دیا'' مگر ہر دفعہ نتیجہ صفر کے برابر رہا۔''

''اوہ!'' وہ بہ دستور مجھے گہری نظر سے دیکھتے ہوئے بولا'' دراصل' اس میں ایک باریک سا نکتہ ہے۔ تم میری نگرانی میں ٹرائی کرو۔ لارڈ بدھا نے چاہا تو تم اپنی ساتھی کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گے لیکن قبل اس کے ایک نہایت ہی اہم بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا تو میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ یہ ایک طرح سے اس کے بولنے کا انتظار تھا۔ وہ کچھ دیر تک سوچنے والے انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر گہری سنجیدگی سے کہنے لگا۔ اس کا ایک ایک لفظ نپا تلا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' وہ کوئی گمبھیر لیکچر دے رہا ہو!

''تبت کے اکثر لاما' موت سے پہلے موت کا مزہ چکھنے کا تجربہ کرتے ہیں۔ وہ ایک خاص ٹیکنیک سے خود پر مصنوعی موت طاری کر لیتے ہیں۔ مصنوعی موت ان معنوں میں کہ وہ بعد میں دوبارہ زندوں جیسے ہو جاتے ہیں لیکن ان کی یہ خود اختیاری مصنوعی موت ایک عظیم راز ہے جو صرف تبتی لاماز تک ہی محدود ہے۔ تمہاری ترقی یافتہ دنیا کی جدید میڈیکل سائنس اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکتی۔ اگر ایسے کسی لاما کو مختلف میڈیکل ٹیسٹ سے گزارا جائے تو ماہرین اس کی موت کا سرٹیفکیٹ پہلی فرصت میں جاری کر دیں گے۔''

''کیا اس صورتِ حال میں لاماز کوما جیسی کیفیت میں پہنچ جاتے ہیں؟'' چنگ فو لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے فوراً سوال داغ دیا۔

اس نے بڑے اعتماد سے نفی میں گردن ہلائی اور رسان سے بولا'' کوما اور لاما کی مصنوعی موت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے بتایا ہے نا۔ مصنوعی موت جیسے الفاظ کا استعمال میں محض تمہیں سمجھانے کی غرض سے کر رہا ہوں ورنہ تمہاری ترقی یافتہ دنیا کا ہر ٹیسٹ مصنوعی موت کا شکار لاما کو مردہ ثابت کر دے گا جب کہ کوما میں جانے والے شخص کو مردوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر اسے رکھنے کے بجائے فوراً ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ کوما میں جانے والے شخص میں ایسا کچھ ضرور ہوتا ہے جو اس کے اندر زندگی کی امید دلاتا۔ کوئی نہ کوئی وائٹل سائن اس امر کی نشان دہی ضرور کرتا ہے کہ وہ شخص ابھی زندہ ہے مگر خود پر مصنوعی موت طاری کرنے والا لاما کا معاملہ بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس پُراسرار عمل سے گزرنے کے لیے لاما کسی خاص پُرسکون جگہ کا انتخاب کرتا ہے۔ کوئی بھی ایسا مقام جہاں اس کیفیت کے دوران میں کسی بیرونی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے لاماز عام طور پر پہاڑی گپھائیں، دراڑیں اور غار وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں۔''

وہ لمحے بھر کو رکا، کھوجنے والی نظر سے میرے آرپار دیکھا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا'' میں ایک خاص

ٹیکنیک کا ذکر کر رہا تھا جس کے استعمال کے بعد لاما دل کی دھڑکن کو روک کر خود پر مصنوعی موت طاری کر لیتے ہیں۔اس ٹیکنیک کا تعلق ''پرانایم'' یعنی سانس کی مخصوص مشق سے ہے۔سانس کو روکنے کے دو طریقے مروج ہیں۔نمبر ایک، جسم کے اندر سانس روکنا۔جسم کے اندر یا تو پھیپھڑوں سے سانس روکی جاسکتی ہے اور یا پھر پیٹ میں۔دوسرا مروج طریقہ جسم سے باہر سانس روکنے کا ہے۔یہ قدرے مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔اگر کوئی شخص جسم سے باہر سانس روکنے پر قادر ہو جائے تو سمجھ لو وہ خود پر مصنوعی موت طاری کرنے کا اہل بن جاتا ہے۔تمام تر سانس کو خارج کر کے اگر روک لیا جائے تو دل کی دھڑکن بتدریج مدھم ہوتے ہوتے ایک مرحلے پر بالکل ختم ہو جاتی ہے یوں سمجھو کہ دل اتنی سست رفتاری سے دھڑکتا ہے کہ انسان کی زندگی کا یقین نہیں ہوسکتا۔دل کو چیک کرنے والا ہر آلہ یہی بتائے گا کہ دل نے اپنا کام بند کر دیا ہے۔سادہ الفاظ میں اس کیفیت کو ''ہارٹ فیلر'' یعنی موت کا نام دیا جائے گا۔''

''کیا مجھے خود پر مصنوعی موت طاری کرنے کے طریقے بھی سکھائے جائیں گے؟'' میں نے رواروی میں پوچھ لیا۔

''اگر تمہاری خواہش ہوگی تو ضرور سکھائے جائیں گے'' چنگ فو نے معتدل لہجے میں کہا'' ویسے اس وقت میں تمہیں کسی اور سبب سے مصنوعی موت کے بارے میں تفصیلاً بتا رہا ہوں۔اس موضوع کا تعلق تمہارے موجودہ معاملے سے ہے......یعنی تھرڈ آئی کی کارکردگی سے!''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا تو میں اضطراری نظر سے اسے دیکھنے لگا۔تیسری آنکھ کا استعمال اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹ واقعی میرے لیے اس وقت سب سے اہم اور نازک مسئلہ بنا ہوا تھا۔اس نارسائی نے مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رکھا تھا۔میں مضطرب خاموشی کے ساتھ چنگ فو کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔وہ گویا ضرور ہوا مگر کسی اور طرف نکل گیا، تاہم جلد ہی وہ اصل معاملے کی طرف لوٹ آیا۔

''وجدان......!'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا'' آج کل جدید اور ترقی یافتہ دنیا میں کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنالوجی کا بڑا شہرہ ہے۔اسی شعبے میں ایک ٹرم ''پاس ورڈ'' استعمال ہوتی ہے۔پاس ورڈ درحقیقت ایک ایسی چابی ہے جس کی مدد سے ہم اس سسٹم کا دروازہ کھول سکتے ہیں۔کمپیوٹر کو استعمال کرنے والا ہر شخص اپنے سسٹم کو پاس ورڈ سے روشناس کراتا ہے۔اس طرح وہ سسٹم صرف اسی کے لیے مخصوص ہوکر رہ جاتا ہے۔جب تک سسٹم کو پاس ورڈ نہ دیا جائے وہ آپریشن کے لیے دروازہ نہیں کھولتا لیکن......''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر ذرا دیر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا'' لیکن اس دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک دماغ موجود ہے۔کمپیوٹر ورلڈ میں ایسے شاطر بھی ہیں جو ہر قسم کا پاس ورڈ توڑنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ان کے لیے کوئی سسٹم لاک نہیں رہ سکتا۔ایسے ماہرین کو کمپیوٹر کے میدان میں ''ہیکرز'' کہا جاتا ہے۔کوئی بھی ہیکر بہت خطرناک شخص ہوتا ہے۔وہ ایک ایسا نقب زن ہوتا ہے' تالے جس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔وہ ماسٹر کی کا رول پلے کرتا ہے''

چنگ فو نے تھوڑا توقف کیا تو میں حیرت اور استعجاب سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ترقی یافتہ تحقیقاتی دنیا سے دور تبت میں بیٹھا ہوا وہ شخص جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ جانتا تھا۔اس کا یہی مطلب تھا، اس نے مطالعے کا عمل مسلسل جاری رکھا ہوا تھا۔

''تمہاری دنیا کا تو بچہ بچہ آج کل کمپیوٹر سے کھیل رہا ہے لہٰذا چھوٹی موٹی ہیکنگ تو سبھی کو آتی ہے'' وہ سادہ سے لہجے میں گویا ہوا'' میں یہاں پر صرف پاس ورڈ کو توڑنے کی اس سادہ سی ٹیکنیک کا ذکر کروں گا جس کا تعلق پاور سپلائی سے ہے۔اگر کسی سسٹم پر پاس ورڈ لگا ہوا ہے تو اس کی پاور سپلائی کو منقطع کر کے دوبارہ بحال کرنے پر وہ پاس ورڈ ٹوٹ جائے گا۔یہی عمل سیل فون پر بھی آزمایا جاسکتا ہے۔اگر کسی سیل فون کا کی پیڈ یا ڈسپلے مخصوص پاس ورڈ سے متحرک ہوتا ہے تو آپ اس سیل فون کی بیٹری کو نکال کر دوبارہ لگائیں تو پاس ورڈ ٹوٹ جائے گا۔تمہارے مسئلے کا معاملہ بھی پاس ورڈ جیسا ہی ہے۔''

وہ ایک ایسے سنسنی خیز جملے پر متوقف ہوا کہ میرے اندر کھلبلی سی مچ گئی۔میرا معاملہ تھرڈ آئی کے راستے میں کھڑی ہونے والی رکاوٹ سے متعلق تھا اور چنگ فو گھما پھرا کر بڑی خوب صورتی سے مجھے کمپیوٹر پاس ورڈ تک لے آیا تھا۔پتا نہیں، وہ آگے کیا انکشاف کرنے والا تھا۔یہی بے خبری میرے اضطراب اور بے چینی کو بڑھا رہی تھی۔وہ دوبارہ گویا ہوا تو میں پوری توجہ سے اسے سننے لگا۔

''وجدان! میں نے بتایا تھا' تمہاری تیسری آنکھ کے راستے میں جو رکاوٹ آجاتی ہے اس کے دو اسباب ہیں۔نمبر ایک، تمہارا بھٹکنا! نمبر دو' تمہارے دشمن کا کوئی طلسماتی عمل! جہاں تک تمہارے بھٹکنے کا تعلق ہے تو یہ معاملہ سراسر تمہارے ہاتھ میں ہے۔البتہ، تمہاری باطنی آنکھ کی رسائی کے راستے میں، کسی دوسرے شخص کے عمل کے نتیجے میں کھڑی ہونے والی

رکاوٹ کا توڑ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ میں نے پاس ورڈ اور پرانایم (PRANAYAM) کی تفصیل اس لیے بیان کی ہے کہ تم میری بات کو آسانی سے سمجھ جاؤ۔''

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا۔ میں بہ دستور ہمہ تن گوش رہا۔

چنگ فو نے کہا ''جب تم کسی مخصوص ماحول میں اترنے کی کوشش کرتے ہو اور اس رسائی میں تھرڈ آئی تمہاری مدد نہیں کرتی تو سمجھ لو اس مخصوص ماحول یعنی اس سسٹم پر کوئی پاس ورڈ لگا ہوا ہے۔ تمہیں ایک ٹیکنیک سے وہ پاس ورڈ توڑنا ہوگا۔ یہ ایک طرح کی ہیکنگ کہلائے گی۔ اگر تم وہ پاس ورڈ توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو یقین کرلو تم اس سسٹم یعنی اپنے چنیدہ ماحول میں بھی داخل ہو جاؤ گے۔''

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں خاموش ہو گیا۔ میرے دل و دماغ کے گوشے گوشے میں تجسس بیدار ہو گیا۔ وہ مجھے میرے مسئلے کے حل کے بالکل قریب لے آیا تھا۔ پرانایم' مصنوعی موت اور پاس ورڈ پر ایک طویل لیکچر دینے کے بعد وہ اس ٹیکنیک کا ذکر کر رہا تھا جس سے میں کسی بھی سسٹم کا تالا توڑ کر اس کے ماحول تک رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ میرا اندروں اس وقت ایک عظیم سنسنی کا شکار تھا۔ اس موقع پر مجھے فطری انداز میں فوراً اس مخصوص ٹیکنیک کے بارے میں سوال کرنا چاہیے تھا اور شاید چنگ فو میری طرف سے ایسی ہی توقع بھی کر رہا تھا اسی لیے وہ چپ چاپ مستفسرانہ نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا مگر میں نے اپنی اندرونی بے تابی کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

چند لمحات کے بعد چنگ فو قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''وجدان! مجھے تسلیم ہے، تم ایک ثابت قدم شخص ہو، تمہاری قوتِ ارادی بڑی مضبوط ہے۔ اس وقت اگر تمہاری جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو پہلی ہی سانس میں اس ٹیکنیک کے بارے میں سوال کرتا جس کا تھوڑی دیر پہلے میں نے ذکر کیا ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے اندر بھی بے چینی و بے قراری نے ایک انتشار کی سی کیفیت پیدا کر رکھی ہے لیکن تمہیں اپنی زبان پر کنٹرول حاصل ہے۔ انسان خیر و شر، تعمیر و تخریب کی آمیزش سے تیار کیا گیا ہے اور یہ دونوں قوتیں ہر لمحے اس کے اندر برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ انسان کی شناخت کی کسوٹی یہ ہے کہ کس وقت اس کے اندر کس قوت پر کون سی قوت غالب آ گئی۔ جن لوگوں کو اپنے نفس پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے وہ برائی کی طاقت کو اچھائی کی طاقت تلے دبائے رکھتے ہیں۔ خیر' میں تمہیں اس مخصوص ٹیکنیک کے بارے میں بتا رہا تھا جس کی مدد سے تم اپنی تیسری آنکھ کی راہ کے پاس ورڈ توڑ سکتے ہو۔ میری بات کو دھیان سے سننا کیونکہ ابھی میرے سامنے تمہیں اس کا عملی مظاہرہ بھی کرنا ہے۔''

اس نے ذرا توقف کر کے سوالیہ نگاہ سے میری جانب دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ میں پوری توجہ سے اس کی جانب تکنے لگا۔ میری کیفیت کسی سحر زدہ شخص کی سی تھی۔

''میری بات ختم ہو جائے تو تم اپنی تھرڈ آئی کے توسط سے اپنی ساتھی کے ماحول میں جھانکنے کے لیے تبت سے اسرائیل پہنچ جانا۔ اگر تم اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو اچھی بات ہے، بہ صورتِ دیگر تم اس مخصوص ٹیکنیک کو آزمانا جو میں تمہیں ابھی بتا رہا ہوں'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے ٹھہرا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ناکامی کی صورت میں تم اپنی سانس کو باہر روک لینا لیکن تھرڈ آئی کے استعمال کو موقوف نہیں ہونے دینا۔ گویا تم اپنی ساتھی کے ماحول کے دروازے پر دستک دو گے۔ دروازہ نہیں کھلا تو تم واپس نہیں آؤ گے بلکہ وہیں ٹھہر کر سانس کو جسم سے باہر نکال کر روک لو گے۔ تمہارے اس عمل سے اس سسٹم کی پاور سپلائی چند لمحات کے لیے منقطع ہو جائے گی۔ تم سانس کو روکے رو کے تھرڈ آئی کو دوبارہ زحمت دو گے تو اس سسٹم کا پاس ورڈ ٹوٹ جائے گا اور تم اپنے منتخب کردہ ماحول میں داخل ہو سکو گے۔ بس اس عمل میں ایک باریک سا نکتہ یاد رکھنے کا ہے۔''

وہ تھوڑی دیر کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''جب تک مطلوبہ سسٹم کا پاس ورڈ ٹوٹ نہیں جاتا، تمہیں بدن سے باہر سانس روک کر بار بار کوشش کرنا ہو گی۔ اس آزمائشی مظاہرے میں تو میں تمہاری سانس کو سہارا دے کر زیادہ دیر کے لیے جسم کے باہر رکنے کی آسانی فراہم کر دوں گا لیکن میرا مشورہ ہے کہ تمہیں اسی لمحے سے اس کی پریکٹس شروع کر دینا چاہیے۔ جس راہ کا سفر اختیار کیا جائے اس کے بارے میں مکمل آگاہی پہلے سے حاصل کر لینا چاہیے ورنہ بعد میں مشکل پیش آتی ہے جیسا کہ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس ملاقات کے اختتام پر میں تمہیں جسم سے باہر سانس روکنے کی مشق سے متعلق ضروری باتیں بھی بتاؤں گا۔ کیا تم اس تجربے کے لیے تیار ہو؟''

میں تیار سے بھی زیادہ تیار تھا لہٰذا فوراً اثبات میں گردن ہلا دی۔ اس نے مجھے تھرڈ آئی کے استعمال کے لیے اشارہ کیا، میں نے وہیں سفید چٹائی پر بیٹھے بیٹھے ظاہرہ دونوں آنکھیں بند کر لیں۔ تیسری باطنی آنکھ کے سامنے میں نے ساحل کے سراپا کو اجاگر کیا اور اس کے خال و خط کی انگلی تھام کر تبت سے اسرائیل کی طرف پرواز کی کوشش کی۔

اگلے ہی لمحے میری یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ میں نے چنگ فو کی ہدایت کے مطابق، پھیپھڑوں اور پیٹ میں موجود سانس کو باہر خارج کر کے تنفسی خاموشی اختیار کر لی۔ میری سانس رک گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرا دم گھٹ جائے گا۔ میں نے پرانایم کی کئی مرتبہ مشقیں کی تھیں ''چی'' کی بیداری کے لیے یوگا کی اسی شاخ میں اسٹروک بریدنگ کی پریکٹس جاری رکھی تھی لیکن سانس روکنے کی کبھی سنجیدہ اور باقاعدہ کوشش نہیں کی تھی۔ جسم کے اندر اور نہ ہی جسم کے باہر۔ اس سلسلے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

اس وقت میں سانس کو جسم کے باہر روک کر ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ بدن سے باہر سانس روکنا کتنا کٹھن اور دشوار کام ہے۔ چند لمحات کے بعد میری سانس اکھڑنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ اگر میں نے اپنے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا سے روشناس نہ کرایا تو میرا خاتمہ بالخیر ہو جائے گا۔ دل کی رفتار بہ تدریج سست ہو رہی تھی۔ یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بند ہونے جا رہا ہے! میں نے شدید ترین گھٹن کا شکار ہونے کے باوجود بھی ہمت نہ ہاری اور تھرڈ آئی کو آزمانے کی کوشش کرتا رہا۔

کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میں بے دم ہو کر ڈھے جاتا، اسی وقت میں نے اپنی تنفسی کیفیت میں تبدیلی محسوس کی۔ میرا اکھڑتا ہوا دم جڑنے لگا۔ چنگ فو نے مجھے سہارا دینے کی بات کی تھی۔ شاید ان نازک لمحات میں وہ میری مدد کو آ گیا تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میں خود کو بہتر سے بہتر محسوس کرنے لگا۔ یہ احساس بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی ماہر تیراک ڈوبتے ہوئے شخص کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے کھینچ کر کنارے کی طرف لا رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے سینے میں ایک اطمینان بخش ٹھنڈک سی بھر گئی۔ اب مجھے دم گھٹنے کا احساس نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں یہ بھی فراموش کر بیٹھا کہ اس وقت میں نے اپنی سانس روک رکھی تھی۔ میں بہت فرحت اور آسانی محسوس کرنے لگا۔

ماحول سے اس خوش گوار بے گانگی نے میرا کام آسان کر دیا۔ میں ساحل کے ماحول پر لگے ہوئے پاس ورڈ کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے خود کو ایک بیڈ روم میں پایا۔

یہ وہی بیڈ روم تھا جہاں میں نے آخری مرتبہ ساحل کو ''دیکھا'' تھا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس وقت میری ساحل بھی بیڈ روم میں موجود تھی۔ وہ ایک قیمتی بیڈ پر محوِ خواب تھی۔ اس کی حالت کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا، وہ گہری نیند میں ہے۔ اسرائیل کے وقت کے مطابق ابھی وہاں سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ رات کا آخری پہر اپنی اختتامی منازل سے گزر رہا تھا۔ میں یک ٹک اپنی جانِ تمنا کو دیکھتا چلا گیا۔

بیڈ روم میں ساحل کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا..... کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے اور داخلی دروازہ بند تھا۔ زیرو پاور کے نائٹ بلب کی نیلگوں روشنی نے کمرے کے ماحول کو بڑا رومینٹک ٹچ دے رکھا تھا۔ ان سنسنی خیز لمحات میں مجھے یونہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں لہاسا (تبت) میں نہ ہوں بلکہ تل ابیب (اسرائیل) میں بہ نفسِ نفیس موجود ہوں۔

میں ان کیف آگیں اور مسرت افروز لمحات میں سے رومان پرورست کشید کر ہی رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ساحل والے بیڈ روم کا دل کش منظر ایک جھماکے کی طرح جل بجھ کر میری تھرڈ آئی کے فریم سے نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے میرے تصور کے سامنے گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ یہ تاریکی اتنی دبیز، مہیب اور خوف ناک تھی کہ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اسی وقت چیف لاما چنگ فو رن پوشی کی گمبھیر آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ اس آواز میں ایک استفسار جھلکتا تھا۔

''کوئی کامیابی ہوئی؟''

''میں نے ساحل کے ماحول کو چھو لیا تھا'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا ''لیکن......؟''

''دراصل، جب تک میں نے تمہاری سانس کی انگلی تھامے رکھی۔ تم اپنی ساتھی کے ماحول میں موجود رہے'' وہ ''لیکن'' پر نامکمل رہ جانے والے میرے جملے کے جواب میں بولا ''تمہیں جسم سے باہر سانس روکنے کی ابھی سے پریکٹس شروع کر دینا چاہیے۔ تمہارے اسرائیل میں داخل ہونے میں تین چار دن باقی ہیں۔ مجھے امید ہے، اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق یہ مشق جاری رکھی تو ان تین چار دنوں میں تم دو منٹ کے لیے سانس روکنے پر قادر ہو جاؤ گے۔ اس وقت سے تمہارا کام بہ خوبی چل جائے گا۔ ویسے تبت کے لاما تو گھنٹوں، بلکہ کئی دنوں تک سانس روکنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ تم یوگا سے متعلق رہے ہو ''چی'' کے سلسلے میں تم نے سانس کی کئی داخلی اور خارجی مشقیں کر رکھی ہیں اس لیے تمہیں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ورنہ جسم سے باہر دو منٹ تک سانس روکنے کے لیے بھی عام لوگوں کو

کافی دن لگ جاتے ہیں۔“

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ”تم صرف اتنا جانتے ہو کہ تمہارے دشمن نے تمہاری ساتھی کو اپنے ہیڈ کوارٹر تل ابیب میں کہیں قید کر رکھا ہے لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تمہاری ساتھی تل ابیب کے کس مقام، کس گھر اور اس گھر کے کس بیڈ روم میں نظر بند ہے۔ ایک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو...... اور وہ یہ کہ ساحل کا سراغ تمہیں ساحل ہی سے ملے گا۔ تم اس کے ماحول میں رہتے ہوئے ہی یہ جان سکو گے کہ وہ تل ابیب میں کہاں پر موجود ہے اس لیے....“

وہ سانس لینے کو رکا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ”اس لیے سانس روکنے کی پریکٹس کے ساتھ ساتھ اپنی ساتھی کے ماحول میں جھانکنے کا سلسلہ بھی جاری رکھو۔ اسی ماحول میں تمہیں کسی وقت کوئی بھی اہم اشارہ مل سکتا ہے جو تمہیں اس کے ”قید خانے“ کے محل وقوع کے بارے میں بتا دے گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”جی میرے محترم! میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں“ میں نے نہایت ہی ادب سے جواب دیا ”میں آپ کی ہدایت کے مطابق آج ہی سے یہ کام شروع کر دیتا ہوں۔“

اس کے بعد چنگ فو مجھے سانس روکنے کے مختلف طریقوں اور ان کی افادیت کے بارے میں تفصیلاً بتاتا رہا، جسم سے باہر سانس روکنے کا میں ایک چھوٹا سا تجربہ کر چکا تھا اور میں نے چند سیکنڈ ہی میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ جسم کے باہر سانس روکنا کتنا کٹھن کام ہے۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے جان جا رہی ہو۔ وہ تو اگر چنگ فو میری سانس کو ماورائی سہارا نہ دیتا تو میرا دم اکھڑ چکا ہوتا یا پھر دم گھٹنے کی کیفیت سے گھبرا کر میں اس ”تجربے“ سے باہر آ جاتا۔

جسم کے اندر سانس روکنا نسبتاً آسان کام ہے۔ آپ ایک طویل اور گہرے انہیل (INHALE) کے بعد اپنے پھیپھڑوں یا پیٹ کو ہوا سے بھر لیتے ہیں۔ اس کے بعد سانس روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہی عمل ہے جیسے آپ اپنے فریج کو خورد و نوش کے سامان سے بھر کر بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیں۔ آپ بڑے دعوے سے کہیں کہ ایک ماہ تک آپ کمرے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ وہ کمرا جو اٹیچڈ واش روم کی سہولت کا حامل ہے اور اس کمرے میں فریج کے اندر مہینے بھر کے لیے کھانے پینے کا ہر قسم کا سامان بھرا ہوا ہے لیکن جسم سے باہر سانس روکنے کا عمل اس کے برعکس اور انتہائی مشکل ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ ایک شخص کسی ایسے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جائے جس میں ایک قطرہ پانی کا میسر نہ ہو اور نہ ہی ایک کھیل اڑ کر اس کمرے کے اندر پہنچ سکتی ہو۔ اس کے باوجود بھی اگر وہ شخص ایک ماہ بعد اس کمرے میں سے زندہ سلامت برآمد ہو تو واقعی کمال کی بات ہو گی!

چنگ فو نے مجھے بتایا کہ میں اٹھتے بیٹھتے ہوئے یہ پریکٹس کر سکتے ہو، بس یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ معدہ خالی ہو یا پھر زیادہ بھرا ہوا نہ ہو۔ کم از کم ایسی صورت ہو کہ معدے کے اندر موجود خوراک میں ڈائجشن (DIGESION) کا عمل یعنی عملِ انہضام مکمل ہو چکا ہو ورنہ معدے کا کام رک جائے گا اور وہ تمام تر خون جو خوراک کو ہضم کرنے کا فریضہ انجام دے رہا تھا وہ کسی دوسرے محاذ پر مصروف ہو جائے گا۔ سانس روکنے کے عمل کے ساتھ ہی خون کا ارتکاز معدے سے ہٹ کر پھیپھڑوں، دل اور دماغ کی طرف ہو جائے گا جس کے نتیجے میں بدہضمی جیسے بداثرات نمودار ہو سکتے ہیں۔ چنگ فو نے مجھے تاکید کی کہ یا تو میں خالی معدے کے ساتھ یہ پریکٹس کروں اور یا پھر اس وقت جب کھانا کھائے ہوئے لگ بھگ چار گھنٹے گزر چکے ہوں۔ میں نے چیف لاما کی ان ہدایات کو ذہن نشین کر لیا۔

چنگ فورن پوشی کی مدد سے میں جس انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا۔ اس نے میرے ذہن میں ایک نظریے، ایک فکر کی بنیاد رکھ دی یعنی کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کسی بھی عمل کو بروئے کار لانے کے لیے اس کے کچھ مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ اگر انسان ان تقاضوں کو پورا کر دے تو مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یہ سیدھی سیدھی ایک ٹیکنالوجی ہے۔ ایسے تمام مظاہر جن کے فارمولے، مساوات اور ٹیکنیک سے ہم واقف نہیں ہوتے، انہیں ہم ماورائی اور جادوئی کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر ہم جانتے ہوں کہ ”یہ یہ یہ برابر ہے یہ یہ یہ“ تو پھر کوئی بھی عمل، کوئی بھی مظہر ہمارے لیے اچنبھک نہیں رہتا ”جاننے“ والوں کی آنکھوں کے سامنے کوئی پردہ حائل نہیں ہو سکتا۔ وہ کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑا کر دیکھ سکتے ہیں بلکہ اگر ان کی مرضی ہو تو دوسروں کو بھی دکھا سکتے ہیں!

”میرا خیال ہے، ایک چائے ہو جائے!“ رن پوشی کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا ”ہم کافی دیر سے صرف باتیں ہی باتیں کیے جا رہے ہیں۔“

میں اس پیش کش کو بھلا کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ یہ تو میرے لیے ایک اعزاز کی بات تھی کہ جو کھانگ ٹیمپل کا چیف لاما میری تواضع کا بندوبست کر رہا تھا۔ جس طرح عیسائیت میں

چرچ، صیہونیت میں سائناگاگ، ہندوؤں میں مندر کی بڑی اہمیت ہے بالکل اسی طرح بدھ مت میں ٹیمپل، مونسٹری اور داٹ کو بہت کچھ سمجھا جاتا ہے۔ جو کھانگ ٹیمپل تبت میں ریڑھ کی ہڈی ایسی اہمیت کا حامل تھا اور چنگ فورن پوشی وہاں کا چیف لاما تھا۔

پانچ منٹ کے بعد چائے اس چھوٹے سے کمرے میں ”حاضر“ ہو گئی۔ تبت والوں کا چائے پینے کا اپنا ایک انداز ہے جو انتہائی سادہ، مقوی اور فرحت بخش ہے۔ قہوے کے اندر یاک کا مکھن ڈال کر پینا چائے نوشی کہلاتا ہے۔ یہ چائے چینی کے بغیر بھی انتہائی خوش ذائقہ ہوتی ہے۔ یاک (YAK) نامی لمبے بالوں والے بیل نما جانور کی طاقت کا اندازہ اس حقیقت سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دنیا کا واحد جانور ہے جو پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی نہ صرف یہ کہ زندہ رہتا ہے بلکہ زندگی کے مختلف امور میں یہ انسانوں کا سب سے بڑا معاون بھی ہے۔ تبت میں تمام تر باربرداری اور کھیتی باڑی یاک ہی کی مرہونِ منت ہے۔ میں نے شیکیٹی کے کھیتوں میں اس جانور کو اپنی آنکھوں سے انسانوں کے احکام کی تعمیل کرتے دیکھا تھا۔ یاک کی فرماں برداری اور کارکردگی لاجواب تھی۔ کسی مریل سے جانور کے دودھ سے حاصل ہونے والا مکھن بھی توانائی کے کسی ذخیرے سے کم نہیں ہوتا، کجا یہ کہ وہ مکھن یاک کے دودھ سے تیار کیا گیا ہو! اس سے آپ تبتی چائے کی طاقت اور توانائی کا اندازہ لگا سکتے ہیں!

چائے کے بعد گفتگو کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور کا تعلق میرے، تبت سے اسرائیل جانے سے تھا۔ چنگ فو نے گمبھیر آواز میں بولنا شروع کیا۔ اس نے اسرائیل اور یہودیوں کے ذکر سے تمہید باندھی۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”وجدان! تم ایک عجیب و غریب اور انوکھے ملک میں قدم رکھنے جا رہے ہو۔ اس ملک کا نام ہے، اسرائیل! میں نے اسے انوکھا اور عجیب اس لیے کہا ہے کہ یہ ”ملک“ کی تعریف پر کہیں سے بھی پورا نہیں اترتا۔ انٹرنیشنل فارمولا تو یہ ہے کہ کسی بھی ملک کو چار امور پر پورا اترنا چاہیے۔ اول، اپنی حدود میں کامل آزادی۔ دوم، آبادی۔ سوم، قبضہ اور چہارم متعین جغرافیائی حد بندی۔ اسرائیل میں یہ چاروں چیزیں نہیں پائی جاتیں لہٰذا منطقی طور پر اسے تسلیم کرنے کا جواز نہیں بنتا۔ اس کے باوجود بھی اب تک سو سے زیادہ نان مسلم اور بارہ مسلم ممالک اس کے وجود کو تسلیم کر چکے ہیں اور اس کے ساتھ باقاعدہ تجارت اور آمد و شد بھی جاری ہے۔ تمہارے ملک (اس کا اشارہ پاکستان کی طرف تھا) نے ابھی تک سرکاری سطح پر اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا مگر مختلف ادوار میں تمہارے ملک کے بعض سرکردہ افراد نے اسرائیل کے خفیہ دورے کیے ہیں اور چند ایک نے تو عوام کو یہودیوں کے حق میں ہموار کرنے کے لیے عملی کوششیں بھی کی ہیں جو بری طرح ناکامیاب رہیں۔ تمہارے ملک کی عوام اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالے سے کبھی کسی حکومتی خفیہ یا ظاہرہ دباؤ میں نہیں آئی۔ عوام کی طاقت کے سامنے کبھی کھلم کھلا ”یہود دوستی“ اور اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے چارہ جوئی نہیں کی گئی لیکن میں دیکھ رہا ہوں، مستقبل قریب میں تمہارا ملک......“

”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مستقبل قریب میں پاکستان، اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر لے گا؟“ میں نے الجھن زدہ انداز میں سوال کیا۔ اس نے ایک تکلیف دہ اور ناقابلِ قبول پہلو کو چھیڑا تھا۔

وہ چند لمحات تک بڑی گہری اور ٹھہری ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا ”مجھے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ دراصل، میں تو تمہیں اسرائیل کے بارے میں مختصر اً بتا رہا تھا۔“

میں نے صاف محسوس کیا، وہ کنی کاٹ کر دوسری سمت نکل گیا تھا۔ اس کے انداز سے تو یہی لگتا تھا، وہ پیش گوئی کرنا چاہتا ہے، آگے چل کر پاکستان بھی ان اسلامی ملکوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا جو اسرائیل کے وجود کو تسلیم کر چکے ہیں۔ بہرحال، مجھے یقین تھا، ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ میری طرح پاکستان کی پندرہ کروڑ عوام کو بھی اتنا ہی پختہ یقین ہے۔ بالفرض، طبقہ خواص میں سے کچھ لوگ اگر ایسا چاہتے رہے ہیں یا آیندہ چاہیں گے تو ان شاء اللہ! انہیں ایسے عزائم میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہو گی۔ یہ عملاً اتنا آسان نہیں، بہ ظاہر جتنا دکھائی دیتا ہے!

چنگ فو کے خاموش ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”محترم! میری فہم و فراست کے مطابق، اسرائیل نے سرزمینِ فلسطین پر ناجائز اور جابرانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ ماضی میں، اسرائیل نے اپنے پڑوسی ممالک مصر، اردن، شام اور لبنان سے کئی جنگیں کی ہیں۔ انہی جنگوں کے نتیجے میں غزہ کی پٹی، گولان کی پہاڑیاں اور بیت المقدس پر اس نے غاصبانہ قبضہ جما لیا تھا لیکن جب کیمپ ڈیوڈ میں یہ معاہدہ طے پایا کہ دریائے اردن کا مغربی کنارہ واپس اردن کو دے دیا

جائے اور غزہ کی پٹی کو خالی کر کے صحرائے سینا مصر کے حوالے کر دیا جائے تو اس قیمت پر، اردن اور مصر نے سیاسی 'بنیادوں' پر بدلے میں اسرائیل کو تسلیم کر لیا تھا۔ اب ان تینوں ملکوں کے مابین دوستانہ مراسم ہیں اور ہر نوعیت کی تجارت بھی کھلم کھلا ہوتی ہے۔ میرا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم کروانے میں امریکا بہادر نے سب سے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس مشن کے لیے وہ اب تک اسرائیل کو کھربوں ڈالرز کی امداد بھی دے چکا ہے۔ مختلف ممالک پر سیاسی دباؤ اس کے علاوہ ہے۔ اس ''تعاون'' کے نتیجے میں اس وقت اسرائیل اتنا طاقت ور ہو چکا ہے کہ غیر اعلانیہ طور پر اسے امریکا کی ایک ''سپر اسٹیٹ'' کا مقام حاصل ہے'' میں سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر حتمی لہجے میں کہا۔

''میرے محترم! ان تمام تر تاریخی حقائق کے باوجود بھی مجھے یقین کامل ہے کہ میرا ملک کسی بھی صورت میں اسرائیل کے وجود کو تسلیم نہیں کرے گا۔ اسرائیل کے خفیہ عزائم اپنی جگہ لیکن پاکستان کی عوام ایک غیرت مند قوم ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی حکومت سے بھی ٹکرا سکتی ہے!''

''لارڈ بدھا تمہاری زبان کو مبارک کرے!'' وہ خلوص دل سے بولا پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنے لگا ''اب ہم سیاست کو ایک طرف رکھ کر اپنے حالیہ مسئلے پر بات کر رہے ہیں۔ تم آج شام کو تبت سے روانہ ہو رہے ہو اور گھومتے پھرتے تمہیں اسرائیل میں داخل ہونا ہے اسی لیے اس عجیب و غریب ملک کا تذکرہ نکل آیا تھا۔ میں نے تمہارے محفوظ سفر اور ممکنہ حد تک کامیاب مشن کے لیے ایک پلان بنایا ہے۔''

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ چپ ہونے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو اپنے ذہن میں ترتیب دے رہا ہو۔ میں ہمہ تن گوش اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ ایک منٹ کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''وجدان! تم آج سہ پہر دو بجے جوکھانگ ٹیمپل سے روانہ ہو گے۔ ٹھیک چار بجے تمہیں چیک ان ہونا ہے۔ ملائشیا ائر لائنز کی چھے بجے والی فلائٹ سے تم پرواز کرو گے، اس طرح تم لہاسا سے لندن پہنچ جاؤ گے۔ لندن میں مسٹر ہیرالڈ تھامس تمہارے استقبال کے لیے موجود ہوگا۔''

اس کی باتوں نے مجھے چونکا دیا۔ وہ واحد کا صیغہ استعمال کر رہا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا ''محترم چنگ فو! آپ کی بات سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ میں یہاں اکیلا جا رہا ہوں؟''

''تم بالکل ٹھیک انداز میں محسوس کر رہے ہو!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

''اور لی یان؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری یہ فلپائنی ساتھی یہیں رہے گی'' وہ قطعیت سے بولا ''لہاسا میں اسے کسی تکلیف یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ جب تم اسرائیلی مشن سے کامیاب واپس لوٹو گے تو تمہیں لی یان سے ملوا دیا جائے گا'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے لی یان اور چن سیان تمہیں چھوڑنے کے لیے ائر پورٹ تک جائیں گے۔ میں نے اس سلسلے میں چن سیان کو بریفنگ دے دی ہے۔ تم جب یہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں پہنچو گے تو چن سیان تمہارے چہرے پر کچھ کام بھی کروائے گا۔''

لی یان کو میرے ساتھ اسرائیل روانہ کرنے کے سلسلے میں چنگ فو نے اتنا واضح اور دو ٹوک فیصلہ سنایا تھا کہ میں کسی قسم کی جرح نہ کر سکا۔ یقیناً کچھ سوچ کر ہی اس نے یہ پلاننگ کی ہوگی۔ ویسے مجھے اس بات کا تو پورا یقین تھا کہ لی یان وہاں محفوظ رہے گی۔ چنگ فو کے آخری جملے میں میرے لیے ایک انوکھا تجسس پنہاں تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اس سے پوچھ لیا۔

''محترم! میرے چہرے پر کچھ کام کرنے کا تو یہ مطلب ہے کہ میں وجدان کی حیثیت یعنی اپنی اصلی حالت میں تبت سے انگلینڈ نہیں پہنچوں گا؟''

''تم درست انداز میں سوچ رہے ہو'' وہ بڑے رسان سے بولا ''تم مسٹر چارلس کے روپ میں لہاسا سے لندن پہنچو گے۔''

''مسٹر چارلس؟'' میں نے تعجب خیز نظر سے اسے دیکھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''مسٹر چارلس دراصل، مسٹر ہیرالڈ تھامس کا نمائندۂ خصوصی ہے۔ چارلس اس وقت تبت میں موجود ہے۔ تم اسی کی ''آئی ڈی'' پر لہاسا سے لندن پہنچو گے۔''

میں نے پوچھا ''مسٹر ہیرالڈ تھامس کون ہے اور اس کا نمائندہ چارلس یہاں تبت میں کیا کرتا پھر رہا ہے؟''

''میرا خیال ہے، اس سلسلے میں تمہیں تھوڑی تفصیل بتانا

پڑے گی ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ذہن الجھتا رہے گا'' اتنا کہہ کر وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''شاید تمہیں معلوم نہ ہو، تبت اور برطانیہ کے ہمیشہ سے اچھے تعلقات رہے ہیں۔ آزاد تبت اور مقبوضہ تبت یعنی ''سی زانگ'' کو برٹش گورنمنٹ سے ہمیشہ تعاون اور مدد کی امید رہی ہے۔ تبت کو کمیونزم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے انگلینڈ نے ہر دور میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہاں کے سیاست داں اور عوام تبت کے مسئلے پر غیر معمولی سرگرم رہے ہیں۔ وہ لوگ ہمیں ایک آزاد اور خود مختار قوم تسلیم کرتے ہیں۔ انگلینڈ ہمارے قریبی دوستوں میں سے ہے۔''

وہ سانس لینے کے لیے ٹھہرا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا ''مسٹر ہیرالڈ تھامس انگلینڈ کے جیالوجی ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ ہے اور ذاتی طور پر میری اس سے گہری دوستی بھی ہے۔ وہ میری فرمائش پر اس منصوبے میں شریک ہوا ہے اور اس نے اپنے بہترین تعاون کا مجھے پورا یقین دلایا ہے۔ ہم دونوں قلبی اور ذہنی طور پر اس لیے بھی ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں کہ ہیرالڈ تھامس روحانی قدروں پر گہرا یقین رکھتا ہے، بہرحال!''

ایک لمحے کا توقف کرنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا ''جیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ آف انگلینڈ کے نمائندے مختلف ممالک میں تحقیقاتی کاموں میں معروف رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں چارلس تبت آیا ہوا ہے۔ جب تک تم اپنے مشن سے کامیاب واپس نہیں لوٹ آتے، چارلس تبت ہی میں قیام پذیر رہ کر ارضیاتی تحقیق کا کام جاری رکھے گا۔ تم چارلس کی آئی ڈی پر لہاسا سے لندن پہنچ جاؤ گے۔ میرا خیال ہے، دوسرے شخص کی آئی ڈی پر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر کرنے والا معاملہ تمہارے ذہن میں کوئی الجھن پیدا نہیں کر رہا ہوگا؟''

اس نے سوالیہ جملے پر اپنے بیان کو روک کر استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ واقعی، یہ معاملہ میرے لیے کسی بھی طور الجھن کا باعث نہیں تھا۔ میں نے الاسکا سے زونارا آئی لینڈ، زونارا آئی لینڈ سے سٹیل، سٹیل سے نیویارک، نیویارک سے نیوجرسی، نیوجرسی سے کھٹمنڈو اور کھٹمنڈو سے تبت ''آئی ڈی'' کے اسی پروسس سے گزرتے ہوئے ایک طویل سفر کیا تھا۔

میرے جواب کو تسلیم بخش پا کر وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''ایک اہم محکمے کا ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہونے کے ناتے ہیرالڈ تھامس بے پناہ اختیارات کا مالک ہے۔ تم صرف ایک دن اس کے پاس قیام کرو گے۔ اس قیام کے دوران میں ایک مرتبہ پھر تمہاری آئی ڈی تبدیل کی جائے گی۔ تم یوسف الظاہری نامی ایک مصری شخص کی آئی ڈی پر لندن سے قاہرہ پہنچو گے۔ یوسف الظاہری قاہرہ کا ایک صاحب حیثیت باشندہ ہے۔ یہ شخص ''کیرو الیگزینڈر یا ڈیزرٹ روڈ'' پر واقع ''اوئسس ہوٹل'' کا سلیپنگ پارٹنر ہے۔ اوئسس (OASIS) ہوٹل کیرو۔ الیگزینڈر یا ڈیزرٹ روڈ کا ایک معروف اور معیاری ہوٹل ہے، یوسف الظاہری آج کل لندن آیا ہوا ہے اور اس کا شمار ہیرالڈ تھامس کے قریبی دوستوں میں ہوتا ہے۔ یوسف الظاہری لگ بھگ ایک مہینے تک وہاں قیام کرے گا۔ اس دوران میں تم اس کی آئی ڈی پر اپنا کام مکمل کر لو گے۔''

یہاں تک پہنچنے کے بعد چنگ فو نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے ملک کے شمالی علاقہ جات میں ہنزہ ویلی نامی ایک جنت نظر خطۂ ارض بھی ہے۔ ہنزہ، چترال اور تبت کے مقامی افراد میں بے حد گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ اپنی شکل صورت سے پہلی نظر میں، ان علاقوں کے لوگ ایک جیسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی ہنزہ ویلی سے تعلق رکھنے والی ایک فیملی سال ہا سال سے انگلینڈ میں مقیم ہے اور اتفاق سے صوفیہ نامی ایک ہنزہ لڑکی سے یوسف الظاہری کی دوستی بھی ہے۔ یوسف جب بھی انگلینڈ جاتا ہے، صوفیہ سے ضرور ملتا ہے۔ صوفیہ بھی دو تین مرتبہ قاہرہ جا چکی ہے۔ ہیرالڈ تھامس کے منصوبے کے مطابق، صوفیہ تمہارے ساتھ لندن سے قاہرہ پہنچے گی۔ اس وقت تم یوسف الظاہری کی حیثیت سے صوفیہ کے ساتھ سفر کرو گے اور یہ سب کچھ انتہائی نیچرل اور نارمل انداز میں ہوگا۔ تم میری بات کو سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

وہ بتانے لگا ''صوفیہ کا ایک دوست کی حیثیت سے تمہارے ساتھ قاہرہ پہنچنا کسی کی نظر میں نہیں کھٹک سکتا۔ لندن میں ہیرالڈ تھامس، یوسف الظاہری اور صوفیہ سب بھروسے کے آدمی ہیں۔ تمہیں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''محترم! آپ نے میری خاطر خاصا لمبا چوڑا کھٹ راگ پھیلا لیا ہے!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، آپ اتنا مربوط انتظام کریں گے!''

''یہ سب تو مجھے کرنا ہی ہوگا وجدان!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا'' آخر کو تم تبت کے داماد بننے والے ہو!''

میں اک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا'' قاہرہ پہنچ ہمارے منصوبے کے مطابق' صوفیہ مچل جائے گی کہ تم اسے جورڈن (اردن) اور اسرائیل کی سیر کراؤ۔ تم اس کی فرمائش کو رد نہیں کرو گے اور اس سلسلے میں تم اپنے ایک دوست السید مبارک الحسینی کی خدمات حاصل کرو گے۔ مبارک الحسینی ایک ''ٹور اینڈ ٹرپ کمپنی'' میں کام کرتا ہے۔ کانٹیکی (CONTIKI) نامی یہی ٹریول کمپنی دنیا کی ایک معروف اور قابلِ اعتماد کمپنی ہے۔ قاہرہ میں ''کانٹیکی'' کے ایجنٹ کا دفتر الباقری اسٹریٹ پر ''اسپرنگ ٹورز کیرو'' کے نام سے واقع ہے۔ تم (یوسف الظاہری) اپنی فرینڈ صوفیہ کے ساتھ اسپرنگ ٹورز کیرو (SPRING TOURS CAIRO) پہنچو گے اور السید مبارک الحسینی تمہارے لیے قاہرہ سے جورڈن اور اسرائیل تک کے سفر کا بندوبست کردے گا۔ سولہ دن کا یہ ٹور بائی روڈ ہوگا۔ تم صوفیہ کے ساتھ ''کانٹیکی'' کی سپر لگژری کوچ میں بیٹھ کر قاہرہ (CAIRO) سے تل ابیب (اسرائیل) پہنچو گے۔ تل ابیب سے پیٹرا (جورڈن) جاؤ گے پیٹرا (PETRA) سے واپس ایلات (اسرائیل) آؤ گے ایلات (EILAT) سے یروشلم اور یروشلم سے واپس قاہرہ (مصر) لوٹ آؤ گے۔''

اس نے سانس لینے کی خاطر تھوڑا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا'' میں نے جس روٹ کی تفصیل تمہیں بتائی ہے وہ کانٹیکی ٹور اینڈ ٹرپ ٹریول کمپنی کا باقاعدہ اسکیجوئل ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تم اس اسکیجوئل کی پیروی بھی کرو۔ جو ٹورسٹ کسی ایک مقام پر زیادہ وقت گزارنا چاہتے ہوں، وہ قافلے سے جدا بھی ہو جاتے ہیں۔ واپسی میں کانٹیکی کی کوچ انہیں اٹھا لیتی ہے۔ کانٹیکی کا ایجنٹ قاہرہ اور تل ابیب میں موجود ہے البتہ، اردن میں ان کا کوئی دفتر نہیں۔ قاہرہ کے بارے میں، میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تل ابیب میں کانٹیکی کا ایجنٹ آفس ہینور اسٹریٹ (HANOAR STREET) پر واقع ہے۔ ''اسرام اسرائیل'' نامی اس آفس کو رابن یعقوبی دیکھتا ہے۔''

وہ تھوڑی دیر کے خاموش ہوا تو میں حیرت بھری نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ ترقی یافتہ دنیا کی چھت پر، جو کھانگ ٹیمپل میں بیٹھا ہوا چیف لاما چنگ فورن پوشی کتنی گہری اور وسیع معلومات رکھتا تھا۔ جدید دنیا کے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے کہ تبت والے معلومات او اختیارات کے شعبے میں اس حد تک بھی مستعدی دکھا سکتے ہیں!

چنگ فو ٹھہرے ہوئے لہجے میں ایک مرتبہ پھر گویا ہوا۔

'' وجدان! سولہ دن کے اس تفریحی دورے میں تمہیں آٹھ دن مصر میں، تین دن اسرائیل میں، ایک دن جورڈن میں اور پھر دوبارہ چار دن اسرائیل میں گزارنے کا موقع ملے گا۔ اسرائیل میں پہلے تین دن یا آخری چار دن میں سے تمہیں اپنے لیے کسی ایک قیام کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں پہلے تین دن کا انتخاب زیادہ مناسب رہے گا۔ جب کانٹیکی کی کوچ تل ابیت سے پیٹرا کی طرف جانے لگے تو تم مزید قیام کا بہانہ کر کے تل ابیب میں رک سکتے ہو کیونکہ واپسی پر کوچ تل ابیب نہیں آئے گی بلکہ ایلات سے یروشلم اور یروشلم سے مصر چلی جائے گی۔ تم کہہ سکتے ہو کہ ٹور کے پندرھویں دن یروشلم میں قافلے کو دوبارہ جوائن کر لو گے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ اس ترکیب پر عمل کرتے ہوئے تمہیں کارکردگی دکھانے کے لیے پورے تین دن مل جائیں گے۔ تمہارے ساتھی کو تل ابیب میں رکھا گیا ہے تم اسے اپنے طاقت ور دشمن کے چنگل سے کس طرح چھڑاتے ہو، اس سلسلے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ اس آپریشن کی ذمے داری صرف اور صرف تم پر ہے۔ تم اپنے حالات اور موقع محل کو دیکھتے ہوئے پلاننگ کر سکتے ہو، البتہ۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا'' جب تم اپنی ساتھی کو حاصل کر لو گے تو صوفیہ تم سے جدا ہو جائے گی۔ تم اپنی ساتھی کے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسے صوفیہ بنا سکتے ہو۔ صوفیہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا ہے۔ تمہاری ساتھی تبتی نقوش کی حامل ہے لہٰذا اہنزا والی صوفیہ بڑی آسانی سے اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ تم اپنی ساتھی کو آزاد کرانے کے بعد صوفیہ کی حیثیت میں، تل ابیب سے یروشلم پہنچو گے اور نہایت ہی خوش سلیقگی سے اپنی ٹور کوچ کو جوائن کر لو گے۔ کسی کو اتنی بڑی تبدیلی کا مطلق احساس نہیں ہوگا۔ اس کے بعد سب کچھ نارمل انداز میں ہوگا۔ تم اسرائیل سے مصر، مصر سے انگلینڈ اور انگلینڈ سے واپس تبت پہنچ جاؤ گے۔ مصر سے انگلینڈ تک تم یوسف الظاہری اور تمہاری ساتھی صوفیہ کی حیثیت سے سفر کرو گے۔ لندن سے لہاسا تک تم چارلس اور تمہاری ساتھی کوئی بھی تبتی لڑکی بن جائے گی لیکن دھنو (ساحل) نہیں۔''

وہ ذرا رکا تو میں نے سنسنی خیز لہجے میں استفسار کیا'' اور اصلی صوفیہ کا کیا ہوگا؟''

''تمہیں صوفیہ کے سلسلے میں اپنے ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے دوٹوک لہجے میں بولا'' جب تم اپنی ساتھی کو حاصل کرنے کی پلاننگ کر لو گے تو تل ابیب ہی میں صوفیہ تم سے الگ ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہیں تن تنہا اپنے مشن کو سر کرنا ہے۔ یہ سراسر جان... جوکھم کا کام ہے۔ تم صوفیہ کو یکسر فراموش کر کے اپنے کام پر دھیان دو گے۔ صوفیہ کو اسرائیل سے مصر اور مصر سے انگلینڈ پہنچانے کی ذمے داری کسی اور شخص کو سونپی جا چکی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس لی اور سوالیہ نظر سے چنگ فو کو دیکھنے لگا۔

وہ بولا'' اسرائیل میں ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا۔ مجھے امید ہے، اگر تم نے سانس کی مخصوص مشق جاری رکھی تو اس وقت تک اس قابل ہو جاؤ گے کہ تھرڈ آئی کو ہر محاذ پر بہ آسانی استعمال کر سکو گے۔ اپنے دشمن کے مقابل تھرڈ آئی ہی تمہاری مدد کرے گی اور مجھے یقین ہے، تم اپنے اس مشن میں کامیاب لوٹو گے!''

''آمین!'' بے اختیار میری زبان سے ادا ہوا۔

چنگ فورن پوشی نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر تک مراقبے کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ میں منتظر اور سوالیہ نظر سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ چند لمحات کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں اور نہایت ہی گمبھیر آواز میں لب کشا ہوا۔

'' وجدان! پہلی ملاقات میں، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہماری صرف تین ملاقاتیں ہونا ہیں۔ آج دوسری ملاقات بھی ہوگئی۔ تیسری اور آخری ملاقات اس وقت ہوگی جب تم اپنے مشن سے کامیاب لوٹو گے'' اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں دوسری ملاقات کے اختتام کا اعلان کر دیا۔

''اب تم اپنے کمرے میں جا سکتے ہو!''

میں اس سے پوچھ نہ سکا کہ تیسری ملاقات آخری کیوں ثابت ہوگی؟ وہ مجھ سے تیسری بار ملنے کے بعد کہاں چلا جائے گا؟ اس نے ایسے تمام تر سوالات کے دروازے بند کر کے آنکھیں موند لی تھیں۔ میں اٹھا اور خاموشی کے ساتھ اس کمرے سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

بوڑھا فانگ چو (FANG ZHOU) اعلیٰ درجے کا فوٹوگرافر ہی نہیں بلکہ وہ ایک مشاق بیوٹیشن بھی تھا۔ فانگ چو کے فن کا مظاہرہ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب اس نے میری راہ نمائی میں ساحل کی قلمی تصویر بنائی تھی۔ وہ پینسل اسکیچ فانگ چو کے سچے فن کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ میں چن سیان کے ساتھ چیف لاما کے پاس سے واپس کمرے میں آیا ہی تھا کہ فانگ چو ایک مرتبہ پھر نازل ہو گیا۔ اس بار وہ قلمی تصویر بنانے نہیں، بلکہ میرے حلیے میں مناسب تبدیلی کرنے آیا تھا۔

سب سے پہلے اس نے میرے بالوں کو نیا انداز دیا۔ لومار آئل کی باقاعدہ مالش نے میرے سر پر اتنے بال اگا دیے تھے کہ ان میں باقاعدہ کنگھی کی جا سکے۔ فانگ چو نے اس وقت چونکہ مجھے مسٹر چارلس بنانا تھا اس لیے میرے بالوں میں گھونگر ڈالے گئے۔ بالوں کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد اس نے میرے چہرے پر کام کیا اور لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ اب میں اپنے حلیے سے کوئی مسٹر چارلس بن گیا تھا۔

یہ ساری کارروائی لی یان کی موجودگی میں ہوئی تھی۔ وہ سمجھ تو گئی تھی کہ مجھے کہیں اور روانہ کرنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔ کہاں؟ اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ اس زاویے سے بھی گہرے تجسس میں مبتلا تھی کہ میں نے جو کھانگ ٹیمپل کے چیف لاما کے ساتھ جو خفیہ ملاقات کی ہے، اس میں ہمارے درمیان کیا کیا باتیں ہوئی ہوں گی۔ چونکہ اس دوران میں چن سیان مسلسل ہمارے پاس موجود رہا تھا لہٰذا اس موضوع پر بات کرنے کا اسے موقع نہیں مل سکا تھا۔ چن سیان، فانگ چو کو رخصت کرنے کے لیے کمرے سے نکلا تو لی یان میرے قریب آ گئی۔ وہ کافی دیر سے اس موقع کی تاک میں تھی۔

''یہ سب کیا چکر چل رہا ہے وجدان؟'' وہ تیز اور تشویش ناک لہجے میں مستفسر ہوئی۔

میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا'' لی یان! میں آج شام لہاسا سے لندن جا رہا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تم اور چن سیان مجھے ائرپورٹ چھوڑنے جاؤ گے۔ میں لندن سے ایک نہایت پیچیدہ روٹ اختیار کر کے اسرائیل پہنچوں گا اور اپنی ساتھی کو ربی موشے ہائمن کے چنگل سے آزاد کرانے کے بعد واپس لہاسا (تبت) آ جاؤں گا اور......''

وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی'' اور میں؟''

اس کے سوال میں بے پناہ حیرت پائی جاتی تھی۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا'' میں تمہارے بارے ہی میں تو بتانے جا رہا تھا، تم نے خواہ مخواہ میری بات کاٹ دی،

خیر......'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''تم اس دوران میں یہیں لہاسا ہی میں رہو گی۔ تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ چنگ نو کے حکم اور ہدایت پر تمہارا ہر طرح کا خیال رکھا جائے گا۔ چنگ نو کی پلاننگ کے مطابق ہی تو تمہیں یہاں روکا جا رہا ہے۔ انشاءاللہ! میں جلد ہی اپنے مشن سے کامیاب لوٹ آؤں گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی ''لیکن میں تمہارے ساتھ کیوں نہیں جا سکتی؟''

میں نے کہا ''میں نہیں جانتا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں چنگ نو کی کوئی مصلحت ہو گی۔ وہ ہمارا سچا خیر خواہ ہے۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ہی تمہیں یہاں روکنے کی بات کی ہے نا!''

''میں چیف لاما کی نیت پر شک نہیں کر رہی ہوں۔'' وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''اس نے ابھی تک ہمارے فائدے کے لیے ہی سوچا ہے لیکن پھر بھی......''

''لیکن پھر بھی کیا؟'' اس کی الجھن کے پیشِ نظر میں نے کہا۔

''تمہیں رن پوشی سے پوچھنا چاہیے تھا'' وہ اصراری لہجے میں بولی۔

''اچھا، ٹھیک ہے۔ آیندہ ملاقات ہو گی تو ضرور پوچھوں گا!''

میرے اس جواب پر وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اس کی سٹ پٹاہٹ سے محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ لی یان نے اس وقت انتہائی بیویوں والے انداز کا مظاہرہ کیا تھا۔

لی یان جب سے میرے ''قریب'' ہوئی تھی، اس کے انداز و اطوار میں ایک تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ اس کی بے تکلفی میں قدرے جارحانہ پن آ گیا تھا تاہم یہ خوش گوار جارحیت بدتمیزی کے زمرے میں نہیں آتی تھی بلکہ اس سے گہری اپنائیت جھلکتی تھی۔ وہ ایک ایک ادا سے مجھ پر استحقاق جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ وہ بہت پیاری تھی اور اس کی ان تازہ ترین اداؤں نے اسے اور بھی دل ربا بنا دیا تھا۔ بہرحال، یہ سب کچھ افسوس ناک صورتِ حال میں بدل جاتا جب چمن سیان کی پہریداری کا خیال آتا۔ اس شخص نے اپنے گرو کی ہدایت پر ہمارے بیچ ایک نادیدہ دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔ اور اب جب کہ اس دیوار کے گرنے کا امکان پیدا ہوا بھی تھا تو ہم دونوں کو بیس پچیس دن کے لیے ایک دوسرے سے دور کیا جا رہا تھا...... کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جدائی کی یہ مدت اتنی ہی رہے گی یا اس میں کمی بیشی واقع ہو جائے گی!

یہ تمام تر خیالات ایک لمحے کے اندر میرے ذہن سے گزرے اور اگلے ہی لمحے میں دوبارہ لی یان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ آج وہ مجھے کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری اور جاذبِ نظر لگی۔ دل چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھولوں اور چھو کر......!

میں اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا، چنگ نو کی ہدایات میرے ذہن میں روشن ہو گئی تھیں۔ اس نے ایک خاص مقصد کی خاطر مجھے لی یان سے دور کر رکھا تھا۔ میں اس مقصد میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا، اس آخری مرحلے میں، کوئی معمولی سی گڑبڑ بھی میری راہ کھوٹی کر سکتی تھی لہٰذا میں نے لی یان کے حصول کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور نہایت ہی معتدل انداز میں کہا۔

''لی یان! چند دن کی تو بات ہے۔ ہم جلد ہی دوبارہ ملیں گے۔''

''اگر تم ایسا چاہو گے تو؟'' وہ روٹھنے والے انداز میں بولی۔

اگر کوئی اور موقع ہوتا تو میں روٹھنے والی کو منانے کا جتن کر سکتا تھا لیکن چمن سیان جس طرح موت کے فرشتے کے مانند ہم پر مسلط تھا اس صورتِ حال میں کسی قسم کا رسک لینا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ میں نے لی یان کو راضی کرنے کی کسی عملی کوشش کے بجائے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں ایسا کیوں نہیں چاہوں گا؟''

وہ خاموش رہی۔ اس کی گمبھیر خاموشی بھی داستان گوئی کا اعلیٰ معیار پیش کر رہی تھی۔ لب اگرچہ ہم کنار تھے، زبان گہرے کنوئیں میں پناہ گزین تھی لیکن اس کا انگ انگ اور سنگ سنگ بڑی اکسانے اور کچھ کر گزرنے والی مہم جوئی میں مصروف تھا۔ میں ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ فی الحال، میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا!

اسی لمحے چمن سیان کمرے میں آ گیا۔ اس نے انٹری تو اس انداز میں دی تھی جیسے فانگ چو کو رخصت کرتے ہوئے تھوڑی دیر ہو گئی ہو لیکن میں اس کی شاطر گری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق، اس نے واپسی میں دانستہ تاخیر کا مظاہرہ کیا تھا تاکہ اس کی غیر موجودی میں ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اسے ہمیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کا موقع مل سکے اور مجھے اور لی یان کو میسر آنے والی تنہائی کے یہ چند لمحات ایسے ہی تھے...... تاہم ''خیریت'' گزری اور وہ شاطر اپنی ناکامی پر صاف ہاتھ ملتا رہ گیا!

کمرے میں داخل ہونے کے بعد چمن سیان نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے باری باری ہم دونوں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس ''جائزہ'' کا مطلب میں بہ خوبی سمجھتا تھا۔ جب اسے ہمارے چہروں پر کچھ بھی لکھا دکھائی نہ دیا تو وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''مسٹر چارلس!'' میں اس وقت جیولوجسٹ ہیر اللہ تھامس کے اسسٹنٹ مسٹر چارلس کے بہروپ میں تھا اس لیے وہ مجھے اس انداز میں مخاطب کر رہا تھا ''ہم دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ ہمیں ٹھیک چار بجے چیک ان ہونا ہے۔ ائرپورٹ، لہاسا شہر سے کافی فاصلے پر واقع ہے۔''

میں نے پوچھا ''چمن سیان! حلیہ تبدیل کر کے مجھے چارلس تو بنا دیا گیا ہے۔ اصلی چارلس کے کاغذات وغیرہ کہاں ہیں...... میرا مطلب ہے، پاس پورٹ......''

وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے بول اٹھا ''پاس پورٹ، ویزا اور ملائشیا ائر لائنز کا کنفرم ٹکٹ، سب ضروری دستاویزات میرے پاس پہنچ چکی ہیں۔ اس سلسلے میں تمہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

سچی بات تو یہ ہے کہ چنگ نو رن پوشی کی تسلی کے بعد مجھے فکر یا پریشانی نہیں رہی تھی۔ میں تو چمن سیان کو کھسکا کر اس کے منہ سے کچھ اگلوانا چاہتا تھا میں نے اس سے استفسار کیا۔

''اس دوران میں اصلی چارلس یہاں کیا کرے گا؟''

''وہ جس مقصد کے لیے یہاں آیا ہوا ہے اس کام میں مصروف رہے گا'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''اس کی طرف سے کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہیں۔''

چمن سیان میرے ہر سوال کا بڑا نپا تلا جواب دے رہا تھا۔ یہ احتیاط روی کسی خاص پروگرام کے تحت نہیں تھی بلکہ میں نے ان دس دنوں میں... روز و شب اس کے ساتھ رہتے ہوئے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ موقع کی مناسبت سے اپنے انداز کو سیٹ کرتا تھا تاہم ہر قسم کی صورتِ حال میں وہ احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا تھا۔

ہمارے درمیان لگ بھگ آدھے گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی پھر کھانے کا وقت ہو گیا۔ میں نے ہاتھ روک کر کھانا کھایا۔ میری ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں اپنے معدے کو بھرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کھانے کا موقع ہو تو بس برائے نام ہی چند لقمے لے لیتا ہوں۔ اس روز کھانے کی میز پر ہم تینوں ہی موجود تھے۔ میں نے تو اپنے کم کھانے کا سبب بیان کر دیا ہے لیکن میں نے محسوس کیا کہ لی یان بھی بس خانہ پری کے لیے ہی ہاتھ چلا رہی تھی۔ وہ خاصی بجھی بجھی اور خاموش تھی۔

میں اس کی خاموشی! اور پژمردگی کی وجہ سے واقف تھا لیکن ہم جس نوعیت کے حالات میں ''جکڑے'' ہوئے تھے ان میں لی یان کی دل داری میرے بس میں نہیں تھی۔ چمن سیان کی پہرے داری میں، میں اس کی پژمردگی کو شگفتگی میں بدل سکتا تھا اور نہ ہی اس کی چپ کو توڑنے کی کوئی سبیل کر سکتا تھا...... اور اس موت کے فرشتے کے ٹلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے!

ٹھیک دو بجے ہم تینوں جوکھانگ ٹیمپل سے باہر نکل آئے۔ میرے ہاتھ میں چارلس کا سفری بیگ موجود تھا تاہم زیادہ سامان نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیگ وزن میں خاصا ہلکا تھا۔ مجھے لہاسا سے لندن تک مسٹر چارلس کا رول پلے کرنا تھا اس لیے میں نے خود کو ابھی سے چارلس سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ چمن سیان نے ہمیں ایک چھوٹی ویگن میں بٹھایا اور ہمارا سفر آغاز ہو گیا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ ویگن ہمیں جوکھانگ ٹیمپل سے سیدھا ائرپورٹ پہنچائے گی لیکن دس منٹ کے بعد جب ویگن ''لہاسا ہوٹل'' کے سامنے جا کر رکی اور چمن سیان نے ہمیں ویگن میں سے باہر نکلنے کو کہا تو میرے اندازے کی تردید ہو گئی۔ چمن سیان خود ہم سے پہلے ویگن کو چھوڑ چکا تھا۔ میں نے باہر آتے ہی اس سے پوچھ لیا۔

''تم نے تو بتایا تھا، ائرپورٹ لہاسا شہر سے کافی فاصلے پر ہے؟''

''میں نے غلط نہیں بتایا تھا'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا ''ہم دس پندرہ منٹ تک اس ہوٹل کی لابی میں انتظار کریں گے۔ یہاں سے ائرپورٹ کی مخصوص وین ہمیں لے کر جائے گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں، لہاسا شہر سے گانگر ائرپورٹ کا فاصلہ لگ بھگ اسی کلومیٹر ہے۔ مجھے پتا چلا تھا، ائرپورٹ کی وین ہوٹل سے چند مسافروں کو لینے کے لیے آ رہی ہے۔ میں نے مذکورہ وین کے ذریعے ائرپورٹ تک جانے کا بندوبست کیا ہے۔''

چمن سیان کی وضاحت کے بعد ہم لہاسا ہوٹل کی لابی میں بیٹھے۔ مذکورہ ہوٹل لہاسا شہر کے چائنز سیکشن میں واقع ہے۔ ہوٹل کو ''ہالیڈے ان'' کی انتظامیہ چلا رہی ہے۔ اس ہوٹل کے پانچ سو کمرے ہیں لہاسا ہوٹل کے نزدیک ہی ''نیو تھیٹرز'' ہے جہاں اوپیرا اور مختلف کلچرل پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

کچھ ہی دیر کے بعد، ہم تینوں ائرپورٹ کی مخصوص وین

میں سوار ہوکر ہوٹل سے روانہ ہوگئے۔ وہ وین ''میڈان جاپان'' تھی۔ راستے بھر میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور ہم ٹھیک پونے چار بجے لہاسا کے گانگر (GONGGAR) ائرپورٹ پہنچ گئے۔ مجھے چار بجے چیک ان ہونا تھا لہٰذا گپ شپ کے لیے ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ تھے۔

اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں رحم ڈالنا جانتا ہے۔ چمن سیان اپنی دانست میں اگرچہ بدھ کا بندہ تھا لیکن میری نگاہ میں وہ اسی قادرِ مطلق کا بندہ تھا' کل کائنات کا جو مالک و مختار ہے! وہ ہاتھ ملتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔

''مسٹر چارلس! آپ دونوں باتیں کرو۔ میں ذرا واش روم سے ہوکر آتا ہوں''

پھر میرا جواب سنے بغیر وہ ایک جانب بڑھ گیا۔ میں نے لی یان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''یہ شخص انتہائی مکار اور چالاک ہے۔ اپنی دانست میں یہ ہم پر احسانِ عظیم کرکے واش روم کی طرف گیا ہے۔''

وہ میری بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ رہی تھی، معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ''وجدان......! کتنا ہی اچھا ہوتا، اس مشن میں، میں بھی قدم سے قدم ملاکر تمہارا ساتھ دیتی!''

اس نے اتنے دھیمے لہجے میں مجھے وجدان کہہ کر مخاطب کیا تھا کہ پاس کھڑا ہوا شخص بھی نہیں سن سکتا تھا۔ اس وقت ہم دونوں ائرپورٹ کی لابی میں بیٹھے تھے۔ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔

''چاہتا تو میں بھی یہی تھا لیکن چنگ فو کی پلاننگ کے تحت یہ ممکن نہیں ہوسکا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا، میں یہاں تمہارے بغیر اتنے دن کس طرح گزاروں گی'' اس کے لہجے میں مایوسی آمیز اداسی کی جھلک تھی ''سخت بوریت ہوگی وجدان!''

''میں تمہارے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں لی یان......!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''اگر سمجھتے تو یوں اکیلے اٹھ کر نہ چل دیتے!''

میں واقعی اس کے احساسات اور جذبات کو سمجھ رہا تھا، اس لیے اس کا خفگی بھرا شکوہ مجھے ذرا بھی برا نہ لگا۔ میں گفتگو کے زاویے کو بدلنے کی خاطر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔

''یہ چمن سیان پتا نہیں، کب آئے گا؟''

ادھر میں نے یہ جملہ ادا کیا، ادھر وہ کسی چراغی جن کے مانند حاضر ہوگیا۔ اس نے اضطراری انداز میں ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، ہم اٹھے اور اس کی تقلید میں چلتے ہوئے لابی سے ڈیپارچر انٹرنس کی طرف بڑھ گئے۔ وہ کسی خاموش روبوٹ کے مانند ہمارے آگے چل رہا تھا۔

اس گیٹ سے مجھے اکیلے ہی اندر داخل ہونا تھا۔ چمن سیان نے بڑے دوستانہ انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنی نیک خواہشات کو مختصر الفاظ میں میری سماعت تک پہنچایا۔ وہ مجھ سے الگ ہوا تو میں نے الوداعی نظر سے لی یان کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں مجھے نمی تیرتی دکھائی دی۔ مجھ سے نگاہ ملی تو اسے خود پر اختیار نہ رہا۔ وہ کمان میں سے نکلے ہوئے کسی تیر کے مانند میری جانب بڑھی اور ایک عالی شان تمغے کی طرح میرے سینے پر سج گئی۔ میں نے فرطِ جذبات سے اسے تھام لیا۔ لی یان کا پورا وجود کسی خزاں رسیدہ پتے کی شکل کانپ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس ایک لمحے کی تلاش میں وہ صدیوں کا سفر کرکے مجھ تک پہنچی ہو!

ڈیپارچر لاؤنج میں بغل گیری کے ایسے مناظر ایک عام سی بات ہے لیکن ہمارے معاملے میں یہ عام سی بات چمن سیان کے لیے بہت خاص ہوگئی تھی۔ دنیا کا کوئی بھی ملک ہو، لوگ اپنے پیاروں کو رخصت کرنے کے لیے ائرپورٹ تک آتے ہی ہیں اور اپنے اپنے کلچر کے مطابق، محبت کا مظاہرہ کرکے انہیں الوداع کہتے ہیں، اس حوالے سے ہمارا معانقہ وہاں موجود افراد کی توجہ کا طالب نہیں تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بعض مشرقی جوڑوں کو باقاعدہ بوس و کنار کرتے دیکھا تھا، میں تو پھر بھی یورپی مسٹر چارلس تھا!

جب یہ معانقہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا تو مجھے اپنے عقب میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی میرے سماعت تک یہ الفاظ بھی پہنچے۔

''چارلس! تمہیں دیر ہورہی ہے۔'' میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پہچان لیا، وہ چمن سیان تھا'' چیک ان ہونے کا وقت ہوگیا ہے۔''

میں نے لی یان سے الگ ہوکر الوداعی مصافحہ کیا اور چمن سیان کی ''فرمائش'' کے مطابق جلدی سے چیک ان ہوگیا۔ پھر مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد میں ملائشیا ائرلائنز کے اس طیارے میں آبیٹھا جو مجھے لہاسا سے لندن لے جانے والا تھا۔

بورڈنگ میں مجھے کافی وقت گزارنا پڑا تھا اور وہیں

بیٹھے میں نے سانس کی اس مشق کی پریکٹس بھی کی تھی جو چنگ فو نے میرے لیے تجویز کی تھی، یہ جسم سے باہر سانس روکنے کی ایک کٹھن مشق تھی۔ اس نوعیت کی بریدنگ مہایوگی اور ہائی لاما اپنے معمولات میں رکھتے ہیں۔ مجھے بھی یہی طریقہ اپنانا تھا ورنہ زندگی کی بے سمت اور بے ہنگم دوڑ مجھے کسی ایک جگہ پر رکنے کی مہلت نہیں دیتی تھی کہ میں باقاعدہ کوئی مشق یا ایکسرسائز کرسکوں۔

میں نے بورڈنگ میں بیٹھے بیٹھے وقفے وقفے سے لگ بھگ آدھا گھنٹا یہ پریکٹس کی جس کے نتیجے میں مجھے اپنا بدن ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔ روح میں تازگی سی بھر گئی اور یوں لگا جیسے میرے دماغ کو کسی قلعی گر کے ہاتھوں نے ایک نیا لک دے دیا ہو۔ سانس روکنے کا یہ طریقہ مشکل ضرور تھا لیکن اس کے ساتھ ہی بے پناہ سودمند بھی تھا۔ اس سے گزرنے کے بعد حاصل ہونے والی آسودگی کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں!

ٹھیک چھے بجے شام طیارے کے ٹیک آف کا اعلان کیا گیا۔ گانگر ائرپورٹ شاید دنیا کا سادہ ترین ائرپورٹ ہے۔ ایک تنگ سی تارکمک اسٹرپ......اور بس!

ٹیک آف کے بعد جیسے ہی فلائٹ ہموار ہوئی، میں نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ ظاہرہ آنکھیں بند ہوتے ہی میں نے اپنی باطنی آنکھ یعنی تھرڈ آئی کو وا کیا اور اس کے سامنے اپنی رگِ جان کے نقوش کو ابھارا۔ اگلے ہی لمحے میں نے ساحل کے ماحول میں جست لگانے کی کوشش کی۔

یہ کوشش ناکام ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے تاریکی میں کسی پتھریلی دیوار سے سر ٹکرا دیا ہو۔ اسی وقت میں نے جوکھانگ ٹیمپل کے چیف لاما چنگ فورن پوشی کی ہدایت کے مطابق، جسم سے باہر سانس روک لی اور ایک مرتبہ پھر ساحل کے ماحول کے بند دروازے پر دستک دی۔

دوسری ناکامی کے بعد تیسری اور تیسری کے بعد چوتھی......اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ میں جسم سے باہر سانس روک کر کوشش کرتا رہا اور اس لمحے جب میرا دم اکھڑنے ہی والا تھا، میں ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامران ہوگیا۔

یہ کامرانی نہایت ہی مختصر ثابت ہوئی اور ساحل کا ماحول بجلی کے مانند میری تیسری آنکھ کے سامنے جل کر بجھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ٹھسکا سا لگا اور میں مسلسل کھانستا چلا گیا۔

یہ ٹھسکا اور کھانسی دم گھٹنے کے سبب تھی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اسی وقت ایک ائرہوسٹس میرے لیے پانی کا گلاس لے کر آگئی۔ وہ مذکورہ گلاس میری سمت بڑھاتے ہوئے بولی۔

''پلیز سر!'' اس کے اس مختصر سے جملے میں گہرا خلوص اور ہمدردی شامل تھی۔

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''نو تھینکس!''

''سر! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' وہ کچھ زیادہ ہی نرس بن رہی تھی۔

اگر مجھے پانی کی ضرورت محسوس ہوتی تو دو چار گھونٹ ضرور لے لیتا۔ ایسی کوئی بات تھی اور نہ ہی میری طبیعت کو کچھ ہوا تھا لہٰذا میں نے دوٹوک انداز میں ائرہوسٹس سے کہہ دیا۔

''آئی ایم او کے!''

وہ گلاس لے کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میں اپنی کھانسی اور ٹھسکے کی وجہ جانتا تھا۔ میں کافی دیر تک جسم سے باہر سانس روکے رہا تھا۔ میں اس شعبے میں ابھی نیا نیا تھا۔ پہلے جوکھانگ ٹیمپل میں' ایسی کوشش کے دوران میں چیف لاما رن پوشی نے میرا ''ہاتھ'' بٹایا تھا اسی لیے میں ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا لیکن جب میں نے اپنی مدد آپ کے تحت یہی کوشش کی تو لمحاتی کامیابی ملتے ہی میری سانس اکھڑ گئی تھی' بہرحال میرے لیے یہ تجربہ خاصا حوصلہ افزا ثابت ہوا تھا۔

اس بات کا تو مجھے یقین ہوگیا کہ میں ساحل کے ماحول کو چھو سکتا ہوں۔ اگر میں سانس روکنے کی پریکٹس جاری رکھوں تو اس شعبے میں اپنی استعداد کو بڑھا سکتا تھا۔ یہ ہوائی سفر کئی گھنٹوں پر محیط تھا۔ میں نے اپنے دل میں اٹل فیصلہ کرلیا کہ لندن کے ائرپورٹ پر اترنے سے پہلے میں جسم کے باہر اتنی دیر کے لیے سانس روکنے کی پریکٹس کرلوں گا جو ساحل کے ماحول میں پوری طرح اترنے کے لیے ضروری ہے۔

انسان اگر خلوصِ نیت سے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرلے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے محنت بھی کرے تو مثبت سودمند نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ میں ''چی'' کی بیداری کے سلسلے میں ''پرانا یم'' کی اسٹروک بریدنگ ایکسرسائز کرتا رہا تھا اس لیے بھی مجھے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تین گھنٹے کی وقفے دار پریکٹس کے بعد میں حیرت انگیز طور پر لگ بھگ پانچ منٹ تک سانس روکنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ وقفہ ہر مرتبہ مختلف ہوتا اور میں نے نوٹ کیا کہ میں تین منٹ تک بہ آسانی اور چھے منٹ تک بہ دقت تمام سانس روک پا رہا تھا۔ یہ ایک حوصلہ افزا اور خوشی کی بات

تھی۔

اس خوش گوار کامیابی کے بعد میں آنکھیں بند کیے' سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا گہری گہری' سانسیں لیتا رہا۔ جب سینے کا تنفس توازن اور قابو میں آیا تو میں ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے کام میں جت گیا۔

کہتے ہیں' مایوسی اور کامیابی کے درمیان ایک بال کے برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ بال سے اس طرف کھڑا آدمی مایوس ہوکر یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ کام اس کے بس کا نہیں' وہ فیل ہوگیا لیکن جو پُرعزم اور محنتی افراد اپنا قدم نکال کر اس بال کو پھلانگ جاتے ہیں' دوسری جانب قدم پڑتے ہی کامیابی ان کی پابوسی کے لیے سربسجود ہوجاتی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے' کسی بھی مرحلے پر حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔ اگر آپ مقصد سے چپک کر سرتوڑ کوشش کرتے رہیں تو کامیابی یقینی ہوجاتی ہے۔

میں بھی دھن کا پکا اور لگن کا سچا تھا۔ جب تک ٹیکنالوجی میرے ہاتھ نہیں آئی تھی' میں بے سمت اپنی سی کوشش کررہا تھا لیکن چنگ فورن پوشی نے مجھے کام کا جو نکتہ سمجھایا تھا اس نے میری مشکل کو آسان بنادیا تھا۔

میں نے بھرپور عزم اور پختہ ارادے کے ساتھ ایک مرتبہ پھر ساحل کو ٹرائی کیا اور اس دفعہ بڑے والہانہ انداز میں کامیابی نے میرا استقبال کیا۔ ساحل کے نقش ونگار کو ذہن میں اجاگر کرنے سے پہلے ہی میں نے سانس کو جسم کے باہر روک لیا تھا۔ اس بار پہلی ہی کوشش میں' میں اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ اسی بیڈروم میں موجود تھی جہاں میں نے آخری کامیاب کوشش کے نتیجے میں دیکھا تھا۔ وہ اس وقت جاگ رہی تھی تاہم بیڈ پر چت لیٹی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ بیڈروم کی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اسرائیل کی مقامی گھڑیوں میں سہ پہر کے پانچ بجے تھے۔ میں ساحل کے ماحول پر غور کررہا تھا کہ مجھے اپنے دم میں گھٹن کا احساس ہوا۔ میرے زیادہ سے زیادہ جسم سے باہر سانس روکنے کی مدت پوری ہورہی تھی۔ اس موقع پر اچانک مجھے ایک نیا تجربہ کرنے کی سوجھی۔

میں نے ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ سانس لینے کی کوشش کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لینڈنگ سے پہلے کسی بھی ہوائی جہاز کے مسافروں کو محسوس ہوتا ہے۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ میں اس وقت جس طیارے میں سفر کررہا تھا' اس نے ڈیسینڈنگ شروع کردی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

آنکھیں کھلتے ہی میری پریشانی دور ہوگئی۔ طیارے کی پرواز متوازن اور ہموار تھی۔ اکثر مسافر سونے کی تیاری کررہے تھے۔ گویا وہ طیارہ اس وقت لینڈنگ کررہا تھا اور نہ ہی دور دور تک اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ میں ان لمحات میں جس نئے تجربے سے گزرا تھا' ذرا غور کیا تو اس کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

دم گھٹنے کی سی کیفیت کا شکار ہونے سے بچنے کے لیے میں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش کے نتیجے میں وہ ساری گڑبڑ پھیلی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا میرا تجربہ ابھی پختہ نہیں ہوا تھا' میرے لیے مزید اور مزید پریکٹس از حد ضروری تھی تاہم اس حقیقت نے میرے ذہن و دل کو مسرت سے بھر دیا کہ چنگ فو کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں اپنا ساحل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا اور اس سے بھی کہیں زیادہ کامیاب ہوسکتا تھا۔

سانس روک کر کسی کے ماحول میں پہنچنے کا معاملہ صرف ساحل تک محدود تھا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میں پرانا یم کی زیادہ سے زیادہ پریکٹس کرسکتا تھا۔ لی یان کے ساتھ چونکہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں اس کے خال وخط کو ذہن میں لاتے ہی' پلک جھپکتے میں اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

لہاسا (تبت) کے مقامی وقت کے مطابق' وہاں رات کے نو بج رہے ہوں گے۔ میں نے تصور کی آنکھ سے لی یان کو ایک بالکل مختلف کمرے میں پایا۔ یہ کمرا مربع شکل کا ایک قدرے چھوٹا کمرا تھا جس میں دو بستر لگے ہوئے تھے۔ ایک بستر پر فلپائنی حسینہ لی یان لیٹی تھی اور دوسرے بستر پر کوئی عورت موجود تھی۔ وہ دونوں خاموش آنکھیں بند کیے اپنے بستر پر پڑی تھیں۔ صاف نظر آتا تھا وہ سونے کی کوشش میں ہیں یا سوچکی ہیں۔ چن سیان کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کمرے کے گمبھیر اور سنا دار ماحول میں موجود رہا پھر آنکھیں کھول کر تھرڈ آئی کو آف کردیا۔ اسی لمحے ایک خیال بڑی سرعت کے ساتھ میرے ذہن سے گزرا۔

مجھے چن سیان کی خبر لینا چاہیے!

یہ خیال آتے ہی میں نے تیسری آنکھ کی چھلانگ لگائی اور پلک جھپکتے میں چن سیان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اگلے لمحے مجھے واپسی کی راہ اختیار کرنا پڑی۔ چن سیان اس وقت مجھے جس حالت میں دکھائی دیا اسے دیکھنا اور بیان کرنا اخلاقیات کے منافی ہے۔ لگتا تھا' چنگ فو نے میری نگرانی کا فریضہ سونپ کر چن سیان کو بھی عارضی ہجر کی آزمائش سے گزارا تھا۔ روزگار کی غرض سے' بیرون ملک قیام پذیر افراد دو چار سال بعد جب چند روز کی چھٹی پر اپنے ملک واپس آتے ہیں تو ان کے رویے میں بھی ایسی ہی تندی اور ولولہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بڑے جوش اور محبت سے پیش آتے ہیں!

چن سیان کے ماحول سے نکلا تو مجھے چنگ فو کی یاد آگئی۔ دل میں خواہش مچلی کہ اگر میں اس وقت تھرڈ آئی کے طفیل جوکھانگ ٹیمپل میں گھوم پھر رہا ہوں تو کیوں نہ وہاں کے کرتا دھرتا چیف لاما چنگ فورن پوشی کو بھی ایک نگاہ جھانک لوں!

میں نے آنکھیں بند کرکے چنگ فو کے ماحول میں چھلانگ لگائی لیکن اگلے ہی لمحے تصور کا پرندہ پھڑ پھڑا زمین بوس ہوگیا۔ میں نے تھوڑے توقف سے ایک مرتبہ پھر ٹرائی کی اور نتیجہ صفر کے برابر آمد ہوا۔ اس کے بعد میں نے چنگ فو کی بتائی ہوئی ترکیب اسی پر آزمانے کا ارادہ کیا اور جسم سے باہر سانس روک کر اس کے ماحول کو اپنی دسترس میں لینے کی کوشش کی۔

سانس ختم ہوگئی لیکن رن پوشی کا ماحول میری تھرڈ آئی کی گرفت میں نہ آسکا۔ اس ناکامیابی سے یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ بلی واقعی شیر کی استانی خالہ ہوتی ہے۔ وہ اسے ہزار ہنر سکھانے کے باوجود بھی یہ نہیں سکھاتی کہ درخت پر کیسے چڑھا جاتا ہے۔ چنگ فو نے مجھے ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کا گر تو سمجھا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ میں اس کے ماحول کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ یا دشواری محسوس کروں تو اسے کیوں کر دور کرسکتا ہوں!

اچانک میرا ذہن سوچنے لگا...... یہ میں کس قسم کی باتوں میں پڑ کر اپنے ذہن کو الجھا رہا ہوں۔ میں جتنے خاص مشن کے لیے نکلا ہوں اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں ہر طرف سے دھیان ہٹا کر صرف اور صرف اپنے ''کاز'' پر توجہ دوں۔ میرا کاز دیگر تمام معاملات سے زیادہ اہم ہے۔

میں یہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ یہ خیالات میری مرضی سے ذہن میں نہیں آئے بلکہ ان کی تحریک کسی اور سمت سے تھی...... اور اس سمت کا تعین کرنے میں بھی مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جوکھانگ ٹیمپل کا چیف لاما اس وقت میرے ذہن سے چھیڑ چھاڑ کررہا تھا۔ میں ایک خاص زاویے سے چونکہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا لہٰذا وہ نہیں چاہتا تھا' میں اس ڈگر پر سوچتا چلا جاؤں۔ ایک بات کا مجھے یقین ہوگیا کہ چنگ فو دیگر ماورائی علوم کے علاوہ ٹیلی پیتھی بھی جانتا تھا!

میرے ذہن میں ڈالے جانے والے خیالات اگرچہ چنگ فو کے رہینِ منت تھے لیکن ذاتی طور پر میں بھی ان سے اتفاق کرتا تھا اس لیے ذہن سے ہر قسم کی سوچ کو جھٹک کر میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پتا نہیں طیارے سے نکلنے کے بعد زندگی کے کون کون سے ہنگاموں سے میرا واسطہ پڑتا اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہی تھا کہ جتنا بھی وقت ہاتھ آرہا ہے اس میں زیادہ سے زیادہ نیند پوری کرلی جائے۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے چند لمحات بعد میں گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔

☆☆☆

ملائشیا ائرلائنز کے طیارے نے مقررہ وقت پر لینڈنگ کی۔

مسٹر ہیراللہ تھامس میرے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر موجود تھا۔ وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر ایک اپارٹمنٹ میں لے آیا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ لندن کے پُرسکون اور پوش علاقے میں واقع تھا۔ اس اپارٹمنٹ میں پہلے سے کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر آنے کے بعد ہیراللہ تھامس نے مجھے سٹنگ روم میں بٹھایا اور فون پر کسی سے رابطہ کرکے اسے مختلف قسم کی ہدایات دیتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا۔

''مسٹر وجدان!'' اس نے مجھے میرے اصل نام سے پکارا ''اس اپارٹمنٹ میں تمہیں سات سے آٹھ گھنٹے گزارنا ہیں۔ اس دوران میں تمہیں بہت سے کام کرنا ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد اصلی یوسف الظاہری اپنی گرل فرینڈ صوفیہ کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔ تم ان دونوں سے گپ شپ کرکے اپنے ذہن میں موجود الجھنوں اور سوالات کو حل کرسکتے ہو۔ اس کے بعد میک اپ کا ماہر ایک شخص تمہیں یوسف الظاہری بنائے گا۔ وہ شخص میرے لیے انتہائی قابلِ اعتماد ہے۔ تمہیں کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ تمہارے اور اصلی یوسف الظاہری کے جثوں میں تھوڑا فرق ہے لیکن خیر' اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیا جائے گا۔'' وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں بہت مصروف رہتا ہوں' تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ البتہ جب تم ائرپورٹ کے لیے روانہ ہونے

والے ہوگے تو میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ میں خود تم دونوں کو سی آف کرنے جاؤں گا۔ تمہارے ذہن میں اگر کوئی الجھن ہو تو بتاؤ؟''

''مسٹر تھامس! الجھن تو کوئی نہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''صرف اتنا بتادیں کہ میرے اس مشن کے دوران میں یوسف الظاہری کہاں رہے گا یعنی اصلی یوسف الظاہری؟''

''شاید تمہیں چیف لاما نے بتایا ہو کہ یوسف الظاہری سے میرے گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔'' وہ بڑے رسان سے بولا تو میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔

''میں یوسف الظاہری سے جو بھی کہہ دوں گا وہ انکار نہیں کرے گا۔ تمہارے مشن کے دوران میں وہ یہیں لندن ہی میں قیام کرے گا البتہ میری کوشش یہ ہوگی کہ وہ منظر عام پر آنے کی کم سے کم کوشش کرے۔ اسے زیادہ وقت گھر کے اندر گزارنا ہوگا۔ میں تمہارے ذہن میں موجود خدشات کو سمجھ رہا ہوں اسی لیے یہ وضاحت کردی ہے۔ اب تو تم مطمئن ہوگئے ہوگے؟''

میں نے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ متعلقہ معاملات کے بارے میں مجھے چھوٹی بڑی اہم باتیں بتانے لگا۔ ان میں سے زیادہ تر نکتے میرے لیے نہایت ہی مفید تھے۔

ہیرالڈ تھامس کی حرکات وسکنات میں ایک خاص قسم کی عجلت پائی جاتی تھی اور انداز پروفیسرز جیسا تھا۔ میں نے محسوس کیا' وہ ایک نفیس اور وضع دار شخص تھا۔ اس کی شخصیت اور دراز قامتی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ وہ ہالی ووڈ کے اداکار شان کونری سے بڑی گہری مشابہت رکھتا تھا۔

میں ایک طرف تو ہیرالڈ تھامس کی باتوں کے جواب میں ''ہوں ہاں'' کررہا تھا اور اس کے ساتھ ہی دوسری جانب جسم سے باہر سانس روکنے کی پریکٹس بھی جاری تھی۔ چنگ فو نے مجھے ایسا مفید نکتہ بتادیا تھا کہ مجھے اٹھتے بیٹھتے کی ایک تفریحی مصروفیت ہاتھ آگئی تھی اور شغل کے اس کام میں' میں بہت انجوائے کررہا تھا۔

ہم باتوں میں مصروف ہی تھے کہ ایک شخص اس اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ وہ ایک پستہ قامت اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ ہیرالڈ تھامس نے اس کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ مسٹر جوزف تھا اور مجھے وجدان سے یوسف الظاہری بنانے آیا تھا۔ میک اپ کا ماہر جوزف ایک خاموش طبع اور سنجیدہ شخص تھا۔

جوزف کی آمد پر ہیرالڈ تھامس سٹنگ روم سے اٹھ کر اپارٹمنٹ کے کسی اندرونی کمرے کی جانب چلا گیا۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ ایک چھوٹا سا' بریف کیس نما باکس ہاتھوں میں اٹھائے دوبارہ سٹنگ روم میں نمودار ہوا۔ اس دوران میں میرے اور جوزف کے درمیان ایک جملے کا تبادلہ بھی نہ ہوا۔ ہم دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف رہے۔ میں نہیں جانتا تھا' جوزف اس وقت کیا سوچ رہا ہوگا البتہ میرا کام ایسے مواقع پر صرف اور صرف اتنا رہ گیا تھا کہ سانس روکنے کی زیادہ سے زیادہ پریکٹس کروں۔

ویسے یہ بندہ جوزف مجھے بڑا عجیب لگا تھا۔ جب تھامس اس کا تعارف کرارہا تھا تو اس وقت بھی اس بندۂ خدا نے اپنی زبان سے ایک لفظ ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا کہیں وہ گونگا نہ ہو!

ہیرالڈ تھامس نے وہ چھوٹا سا بریف کیس کھول لیا اور اس میں سے چند تصاویر باہر نکالیں۔ وہ بڑے سائز میں بنی ہوئی ایک ہی شخص کی تصویریں تھیں۔ تھامس نے وہ تصاویر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس مرتبہ جوزف کی موجودگی کے باعث اس نے مجھے نام سے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''یہ یوسف الظاہری کے فوٹوگراف ہیں!''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان فوٹوگراف کو بہ غور دیکھنے لگا۔ وہ تمام تصاویر کلوز اپ تھیں اور مختلف زاویوں سے بنائی گئی تھیں۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ یوسف الظاہری کے چہرے کی ہڈیوں کی ساخت بڑی حد تک مجھ سے ملتی جلتی تھی۔ مسٹر ہیرالڈ تھامس نے بہت سوچ سمجھ کر یوسف الظاہری کا انتخاب کیا تھا۔ جوزف کو مجھے یوسف الظاہری بناتے ہوئے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

مجھ سے وہ فوٹوگراف لے کر تھامس نے جوزف کو دے دیے اور کہا ''تم ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے اپنی تیاری شروع کردو۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ شخص یہاں پہنچنے والا ہے۔''

جوزف نے چھٹانک بھر کی زبان کو حرکت دینے کے بجائے تین سیر کے سر کو اثبات میں جنبش دی اور واقعی اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کی اس ''ادا'' نے میرے اس یقین کو اور بھی پختہ کردیا کہ وہ قوتِ گویائی سے محروم ہے!

تھوڑی دیر کے بعد اصلی یوسف الظاہری بھی اس اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا اور اس بات نے مجھے چونکادیا۔ ہیرالڈ تھامس مجھے بتاچکا تھا' وہ اپنی گرل فرینڈ

صوفیہ کے ساتھ آنے والا ہے۔ میں نے سوالیہ نظر سے تھامس کو دیکھا لیکن کسی قسم کا کوئی استفسار نہ کیا۔ وہ میرے ذہن کی الجھن کو فوراً سمجھ گیا' میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے تسلی انداز میں گردن ہلائی اور یوسف الظاہری سے کھسر پھسر کرنے لگا۔

پانچ منٹ کے بعد تھامس نے انکشاف انگیز لہجے میں مجھے بتایا ''صوفیہ کو یہاں پہنچنے میں دو سے تین گھنٹے لگیں گے۔ اس دوران میں جوزف تمہارے چہرے پر کام مکمل کرلے گا۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے' میں اس حوالے سے بالکل تیار بیٹھا ہوں۔''

تھامس نے مجھے اور یوسف الظاہری کو الگ کمرے میں بلایا اور ہم سے نہایت ہی اہم امور پر گفتگو کی۔ اس نے مجھے یوسف کی عادات واطوار' نشست برخاست اور دیگر رویوں کے بارے میں تفصیلاً بتایا اور آخر میں کہا۔

''وجدان! میں تمہیں یوسف کے پاس چھوڑ کر جارہا ہوں۔ تم اس سے گپ شپ لگاؤ اور تمہارے ذہن میں اگر کسی بھی قسم کا سوال ابھرے تو اس سے ضرور پوچھو۔ یوسف میرا قابلِ اعتماد دوست ہے۔ یہ تمہیں کسی بھی حوالے سے مایوس نہیں کرے گا۔ میں اسی وقت لوٹوں گا جب تمہاری یہاں سے رخصتی میں چند منٹ باقی رہ جائیں گے۔ اوکے!''

''اوکے!'' میں نے بھی اسی کے انداز میں کہا ''لیکن میرے ذہن میں بعض ایسے سوال ہیں جن کے جوابات صرف اور صرف تم ہی دے سکتے ہو! بعد میں اتنا وقت نہیں مل سکے گا۔''

''ہاں' ہاں پوچھو۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا ''میں تمہاری تسلی کرنے کے بعد ہی روانہ ہوں گا۔''

میں نے پوچھا ''کیا صوفیہ کو حقیقت حال سے آگاہ کردیا گیا ہے؟''

''میں تمہارے سوال کی تہ تک پہنچ گیا ہوں۔'' تھامس نے آہستگی سے سر کو اثباتی جنبش دی ''صوفیہ اور یوسف میرے لیے اتنے ہی قابلِ بھروسا ہیں جیسے تم چنگ فو کے لیے لہٰذا تمہیں کسی بھی حوالے سے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''صوفیہ کو میں نے اس سلسلے میں مکمل بریفنگ دے دی ہے کہ اسے ایک ڈمی یوسف الظاہری کے ہمراہ لندن سے مصر اور مصر سے اسرائیل تک کون سا رول پلے کرنا ہے۔ وہ بہت ہی متعاون لڑکی ہے۔ مجھے امید ہے' وہ اپنے کردار کو بڑی خوبی سے نبھالے گی۔ تمہاری اطلاع کے لیے یہ بھی بتادوں کہ صوفیہ اچھی خاصی اردو بول اور سمجھ لیتی ہے۔''

''اوہ...... کیا واقعی؟'' میں نے شدت حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

وہ بولا ''ہاں واقعی...... لیکن یوسف الظاہری کی حیثیت میں' تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ وہ اردو زبان سے نابلد ہے۔ ہنزہ دیلی سے تعلق اور پاکستان کے حوالے سے صوفیہ اردو کا استعمال جانتی ہے۔ لہٰذا جب بھی تمہیں صوفیہ سے اردو میں بات کرنا ہو تو یہ ضرور دیکھ لینا کہ یوسف الظاہری کا کوئی جاننے والا آس پاس نہ ہو۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟''

اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''تم یوسف سے تبادلۂ خیالات کرو۔ یہ تمہیں اپنے اور صوفیہ کے بارے میں تفصیلاً بتادے گا۔''

''تبادلۂ خیالات تو میں کروں گا ہی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''ابھی تم نے یوسف کے جاننے والوں کا ذکر کیا ہے' اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک اہم سوال ابھرا ہے۔''

میں لمحے بھر کو متوقف ہوا تو ہیرالڈ تھامس گہری سنجیدگی سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی سوالیہ نظر کے جواب میں کہا ''چنگ فو نے مجھے بتایا تھا کہ مصر پہنچ کر قاہرہ میں مجھے یوسف کے ایک دوست السید مبارک الحسینی سے ملنا ہوگا جو کسی ٹور اینڈ ٹرپ ٹریول کمپنی میں کام کرتا ہے۔ غالباً مذکورہ ٹریول کمپنی کا نام ''کانٹیکی'' ہے!''

''ہاں۔ اس کمپنی کا نام کانٹیکی ہی ہے۔'' تھامس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا ''کیا السید مبارک الحسینی یہ بات جانتا ہے کہ یوسف الظاہری کے روپ میں کوئی اور شخص اس سے ملنے آئے گا؟''

''نہیں!'' تھامس نے دوٹوک انداز میں اپنے سر کو منفی جنبش دی ''مبارک الحسینی سے ڈیل کرتے ہوئے تمہیں پورے اعتماد کے ساتھ یوسف کی کاپی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں یوسف تمہیں ضروری بریفنگ دے گا۔ میرے خیال میں تمہارے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا!''

یوسف الظاہری نے کہا ''تھامس! تم بے فکر ہوکر جاؤ۔ میں وجدان کو تمام ضروری باتیں سمجھادوں گا۔''

''ایک آخری سوال!'' میں نے ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے

ڈرامائی انداز میں کہا۔ یوسف اور تھامس متعجب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے تھامس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا ”کیا یہ جوزف قوتِ گویائی سے محروم ہے؟“

تھامس زیرِلب مسکرانے لگا پھر بولا ”جوزف ایک سچا فن کار ہے! ابھی جب وہ تمہارے چہرے پر کام کرے گا تو تمہیں اس کے فن کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا اور...... یہ بات تو تمہیں معلوم ہی ہوگی کہ ایک اور جینئل آرٹسٹ لازماً موڈی ہوتا ہے۔ وہ خود کو فن کا خدا سمجھتا ہے یہی معاملہ جوزف کا بھی ہے۔ اکثر فن کار بد دماغ ہوتے ہیں اور یہ بد دماغی مختلف زاویوں سے جھلکتی ہے۔ ہر آرٹسٹ کا اپنا منفرد زاویہ ہوتا ہے۔ جوزف کا موڈ و مزاج اور بد دماغی ”چپ“ میں ڈھل گئی...... ایک مسلسل چپ! بہت ہی کم لوگوں نے اسے بولتے ہوئے سنا ہوگا۔“ وہ تھوڑا متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جوزف کچھ وقت تمہارے ساتھ بھی گزارے گا۔ ممکن ہے تم بھی ان خوش قسمت افراد کی فہرست میں شامل ہو جاؤ جنہوں نے جوزف کی زبان کو زحمت فرماتے دیکھا ہے!“

”مجھے اس بات کی کوئی امید تو دکھائی نہیں دے رہی!“ میں نے بجھے دل سے کہا۔

اس کے بعد ہیرالڈ تھامس مجھے یوسف الظاہری کے حوالے کر کے اپارٹمنٹ سے رخصت ہو گیا۔

یوسف الظاہری قد و قامت میں مجھ سے آدھ پون انچ کم ہوگا البتہ اس کا وزن مجھ سے کم از کم پندرہ پاؤنڈز زیادہ تھا۔ اس کا جسم قدرے مائل بہ فربہی تھا لیکن یہ اتنا نمایاں فرق نہیں تھا تو پہلی نظر میں آنکھ میں کھٹک جائے۔ اس کی عمر مجھ سے آٹھ دس سال زیادہ ہی تھی لیکن ظاہر ہے یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔

ہم دونوں میک اپ ماسٹر جوزف کے پاس پہنچ گئے اور اس نے یوسف الظاہری کی موجودگی میں مجھے یوسف الظاہری بنانا شروع کر دیا۔ اس دوران میں اس کے ہاتھ مسلسل مصروفِ عمل رہے مگر اس بندۂ خدا نے منہ سے ایک لفظ ادا کر کے نہیں دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا اس نے منہ میں اچھی خاصی گھنگنیاں بھر کر چپ سادھ لی ہو۔ بہت زیادہ پان کھانے والوں کے ساتھ بھی کم و بیش ایسی ہی صورتِ حال پیش آتی ہے ان کا منہ ہمہ وقت پان کے ملغوبے سے بھرا رہتا ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ دوسروں کے سوالات کے جواب میں بے ہنگم ”اوں آں“ ضرور کرتے رہتے ہیں۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کاری محنت کے بعد جوزف نے مجھے یوسف الظاہری بنا دیا۔ آنکھوں کا رنگ میچ کرنے کے لیے کانٹیکٹ لینس استعمال کیے گئے اور میرے بالوں کے گھنگھریالے پن کو کر کے اسے نئے اسٹائل سے روشناس کرایا گیا۔ اصلی یوسف الظاہری کے بال ”اسپائس اسٹائل“ میں سیٹ تھے۔ میرے مختصر بالوں میں جیل لگا کر انہیں بھی مذکورہ اسٹائل دے دیا گیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد جوزف خاموشی سے اٹھا اور ہمیں ”ٹاٹا“ کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا۔

میں یوسف الظاہری کے ساتھ سٹنگ روم میں بیٹھ کر اہم امور پر گفتگو کرنے لگا۔ اس نے بڑی وضاحت سے مجھے بتایا کہ مصر (قاہرہ) میں یوسف الظاہری کی حیثیت سے مجھے کن باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا ہوگا۔ اس دوران میں میں اس کے لب و لہجے انداز و اطوار اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کا بغور جائزہ لینے کے بعد انہیں ذہن نشین کرتا چلا گیا۔ مجھے اس کے روپ میں ایک اہم کردار ادا کرنا تھا اس لیے بھی گہرے مشاہدے کی ضرورت تھی۔ یوسف نے مجھے ہر حوالے سے مطمئن کر دیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہیرالڈ تھامس لوٹ آیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے قبل از وقت اپنی آمد کی وضاحت کر دی ”میں جس ضروری کام سے گیا تھا وہ کچھ جلدی نمٹ گیا اس لیے سوچا تم لوگوں کے پاس آ جاتا ہوں۔“ پھر وہ ہمارے اوپر سے اپارٹمنٹ میں نگاہ دوڑاتے ہوئے تشویش ناک انداز میں مستفسر ہوا۔

”صوفیہ دکھائی نہیں دے رہی۔ کیا وہ ابھی تک پہنچی نہیں؟“

ہم نے اسے بتایا کہ وہ واقعی نہیں پہنچی اور ہم بھی بڑی شدت سے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

”پتا نہیں یہ کہاں رہ گئی؟“ وہ اپنی جیب میں سے سیل فون برآمد کرتے ہوئے بولا ”میں اسے موبائل پر چیک کرتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد تھامس کا صوفیہ سے رابطہ ہو گیا۔ مختصر گفتگو کے بعد تھامس نے سیلولر رابطہ موقوف کر دیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا ”وہ دس منٹ میں پہنچ رہی ہے۔“

ہم نے...... خصوصاً میں نے اطمینان کی سانس لی۔ صوفیہ کو میرے ساتھ لندن سے قاہرہ اور قاہرہ سے اسرائیل تک سفر کرنا تھا اور ہماری روانگی میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔

یوسف الظاہری نے کہا ”مجھے ایک شرارت سوجھ رہی ہے۔ اگر آپ دونوں میرا ساتھ دینے کو تیار ہوں تو صوفیہ کو بے

وقوف بنایا جا سکتا ہے۔“ ایک لمحے کے توقف سے وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا ”یہ دراصل اس کے لیے ایک امتحان بھی ہوگا!“

”کہو! تمہارے ذہن میں ایسا کون سا آئیڈیا آیا ہے؟“ تھامس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا ”اس وقت وجدان بھی یوسف الظاہری بنا بیٹھا ہے۔ صوفیہ کے سامنے یہ سوال رکھا جائے کہ ان...... یعنی ہم میں سے اصلی یوسف الظاہری کون ہے!“

”آئیڈیا اچھا اور خاصا تفریحی ہے۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ اس دوران میں ہمارے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی قائم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی بات کو دراز کرتے ہوئے کہا ”لیکن تمہارے خیال میں وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو جائے گی یا ناکام؟“

”مجھے پورا یقین ہے مجھے تو وہ فوراً ہی شناخت کر لے گی۔“ وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ”یوسف! میرے ذہن میں تمہارے آئیڈیا سے بھی کہیں انوکھا آئیڈیا آیا ہے۔ اگر تم لوگ میرے آئیڈیا کو آزمانے کے لیے تیار ہو جاؤ تو صوفیہ کے ساتھ ساتھ میری کارکردگی کا بھی امتحان ہو جائے گا۔ آپ اسے ایک ٹیسٹ کیس سمجھ لو۔“

”تمہارے ذہن میں ایسا کون سا اچھوتا آئیڈیا کلبلایا ہے؟“ یوسف نے مجھ سے پوچھا۔

ہیرالڈ تھامس بڑی دلچسپی سے ہمارے باتیں سن رہا تھا۔ اس نے اضطراری لہجے میں کہا ”تم لوگوں کو جو کچھ بھی کرنا ہے فوراً کر ڈالو۔ صوفیہ کے یہاں پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔“

میں یوسف کی جانب متوجہ ہو گیا اور پوچھا ”کیا صوفیہ جانتی ہے کہ تم نے یہ لباس پہن رکھا ہے؟“ بات ختم کرتے ہی میں نے اس کے پہناوے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

”نہیں!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی ”ہمیں ایک ساتھ آنا ضرور تھا لیکن صوفیہ میرے ڈریس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میرے پاس آنے سے پہلے سے اس کے شیڈول میں تھوڑی تبدیلی آ گئی تھی۔“

”بس! تو پھر ٹھیک ہے۔“ میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے کہا ”جب صوفیہ اس اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائے گی تو میں اسے ریسیو کرنے کے لیے دروازے تک جاؤں گا۔“ میں نے اپنے آئیڈیا کی تفصیل سے انہیں آگاہ کیا ”میں اس کے سامنے پہنچ کر یہی ظاہر کروں گا کہ اصلی یوسف الظاہری ہوں ہمارے پاس امتحان سے گزرنے کے لیے صرف اتنی مہلت ہوگی جب تک ہم داخلی دروازے سے اس سٹنگ روم تک پہنچتے۔ مجھے خود کو یوسف الظاہری ثابت کرنے کے لیے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو آزمانا ہوگا اور صوفیہ کی ججمنٹ کا امتحان ہو جائے گا کہ وہ کس حد تک اپنے بوائے فرینڈ کو پہچانتی ہے!“

”تم بہت عمدہ آئیڈیا لائے ہو وجدان!“ تھامس نے کہا ”میں نے بھی ڈریس کے فرق ہی سے تم دونوں کو الگ الگ شناخت کیا ہے ورنہ...... جوزف بڑے کمال کا میک اپ کر کے گیا ہے۔“

میں نے جلے کٹے انداز میں کہا ”جوزف بڑے کمال کا چپ شاہ ہے...... واقعی!“

تھامس نے یوسف الظاہری سے پوچھا ”کیوں یوسف! کیا تم اس آئیڈیا پر عمل کرنے کو تیار ہو؟“

وہ تامل کرتے ہوئے بولا ”وجدان کا آئیڈیا تو بلاشبہ نہایت ہی عمدہ ہے لیکن اس میں ایک ٹیکنیکل خرابی موجود ہے۔“

”مثلاً کون سی خرابی؟“ میں نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے بتایا ”اس امتحان میں حصہ لینے والے کنٹیسٹنٹ توازن میں نہیں ہیں۔“

”توازن میں نہیں ہیں کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا ”صوفیہ نہیں جانتی...... یا یوں سمجھ لیں اسے یہ بات نہیں بتائی گئی کہ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اسے ایک آزمائش سے دوچار ہونا ہے جب کہ وجدان کو امتحان والی بات پہلے سے معلوم ہے لہٰذا توازن برابر نہیں۔ کامیابی کے حوالے سے وجدان کا پلڑا پہلے سے جھکا ہوا ہے۔“

”تم نے ذہانت سے معمور نکتہ اٹھایا ہے۔“ میں نے ستائشی نظر سے یوسف الظاہری کو دیکھا ”میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی یہ مقابلہ برابری کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔“

”تو اس کا مطلب ہے اب یہ ٹیسٹ نہیں ہو رہا؟“ تھامس نے ہم دونوں سے پوچھا۔

”ٹیسٹ تو ضرور ہوگا لیکن ذرا مختلف انداز میں!“ میں نے کہا۔

”مختلف انداز کی وضاحت تم کن الفاظ میں کرو گے؟“ تھامس مستفسر ہوا۔

میں نے وضاحت کردی ''صوفیہ کے آنے پر دروازہ کھولنے میں ہی جاؤں گا اور اس کے سامنے خود کو یوسف الظاہری کی حیثیت سے پیش کروں گا۔ وہ مجھے پہچان پاتی ہے یا نہیں مگر میں یہ دیکھنے کی کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی اداکاری میں کس حد تک کامیاب ہوں!''

ان دونوں نے بیک زبان ہوکر کہا ''ہاں...... یہ ٹھیک ہے!''

اسی وقت اطلاعی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے سوالیہ نظر سے تھامس اور یوسف الظاہری کی طرف دیکھا۔ تھامس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''وجدان! لگتا ہے، تمہاری آزمائش کا وقت آ گیا ہے۔ اٹھو ...... اور جاکر صوفیہ کے لیے دروازہ کھول دو۔''

میں خاموشی سے اٹھا اور پُراعتماد قدموں سے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

اس دوران میں ڈوربیل دوسری مرتبہ کسی کی آمد کی اطلاع دے چکی تھی ان لمحات میں ہم تینوں اپارٹمنٹ میں بیٹھے صوفیہ کی آمد کے منتظر تھے لہٰذا ننانوے فی صد امکان اس بات کا تھا کہ دروازہ کھلنے پر صوفیہ ہی سے نگاہیں چار ہوں گی۔ میں نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ میری نگاہ جس چہرے پر پڑی، اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا لیکن میں نے چہرے کے تاثرات سے اپنی اندرونی کیفیت کو آشکار نہیں ہونے دیا اور بعین یوسف الظاہری کے انداز میں اپنی ''گرل فرینڈ'' کو ویل کم کہا۔

وہ بڑے والہانہ انداز میں زیرِلب مسکرائی اور کمان میں سے نکلے ہوئے تیر کے مانند آ کر میرے سینے سے لگ گئی۔ میں نے اس کے عقب میں ہاتھ بڑھا کہ بیرونی دروازہ بند کر دیا پھر پروٹوکول کے مطابق، دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ مغربی روایت کے تحت ہم نے ایک ''بھرپور'' معانقہ کیا پھر وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا مسٹر تھامس اپارٹمنٹ میں موجود ہیں؟''

''سب موجود ہیں......!'' میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

وہ استفساریہ نظر سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے بولی ''سب...... یعنی وہ بھی؟''

میں نے اس نازک موقع پر حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور کہا ''ہاں۔ سٹنگ روم میں ہیرالڈ تھامس' وجدان کے ساتھ ہی بیٹھا ہے۔ بس' ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے'' میں اپنے بارے میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا۔

اس نے اطمینان بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی اور قدرے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ''سوری! میں یہاں پہنچنے میں کافی لیٹ ہوگئی ہوں'' اس کی معذرت سے خانہ پری جھلکتی تھی۔

بات ختم کرتے ہی وہ سٹنگ روم کی سمت قدم اٹھانے لگی۔ میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھا اور اس کے پیچھے خاموشی سے چل دیا۔ میں گویا، اس کڑے امتحان کے پہلے پرچے میں پوری طرح کامیاب ہوگیا تھا!

صوفیہ پر نگاہ پڑتے ہی مجھے شدید حیرت اس لیے ...... ہوئی تھی کہ یہاں بھی تھامس نے انتخاب میں اپنی ذہانت کا بھرپور ثبوت مہیا کیا تھا۔ وہ ''بنی بنائی'' ساحل تھی۔ میرے چونکنے کا سبب یہ تھا کہ میں اسے دیکھتے ہی یہ سمجھا کہ وہ ساحل کی بہن ہے۔ بلا مبالغہ صوفیہ اور ساحل میں مختلف حوالوں سے گہری مماثلت پائی جاتی تھی۔ قد و قامت، رنگ و روپ، وزن، عمر، جسمانی ساخت وغیرہ کے حوالے سے وہ دونوں بہت قریب تھیں۔ اگر تھوڑا بہت فرق تھا تو وہ نقش و نگار کا تھا۔ اس زاویے سے صوفیہ لگ بھگ اسی فی صد ساحل سے ملتی جلتی تھی۔ اس بیس فی صد تفاوت کو میک اپ کے ذریعے مٹا کر صوفیہ کو ساحل یا ساحل کو صوفیہ بنایا جاسکتا تھا۔ صوفیہ کے خدوخال چونکہ تبتی لوگوں سے بہت مماثل تھے لہٰذا مجھے میک اپ میں زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ میں تھوڑی سی کوشش کرکے، بہ آسانی ساحل کو صوفیہ کا ''لک'' دے سکتا تھا۔ قاہرہ سے تل ابیب جاتے ہوئے صوفیہ میری ہم نشیں ہوتی لیکن جب میں تل ابیب سے یروشلم اور یروشلم سے واپس قاہرہ آتا تو صوفیہ کے روپ میں ساحل میرے ساتھ ہوتی۔ ساحل کی ہمراہی کے تصور نے میرے رگ و پے میں خوش گوار اور نشاط انگیز سنسنی دوڑا دی۔ میرے وجود کا ایک ایک حصہ ساحل کی خوش بو سے مہک اٹھا۔ وہ ایک ایسا گلِ بہار تھی جو موسمِ خزاں میں بھی تروتازہ اور شگفتہ رہتا ہے!

داخلی دروازے سے سٹنگ روم اگرچہ دکھائی نہیں دیتا تھا تاہم وہاں تک برائے نام فاصلہ تھا لہٰذا ہم آگے پیچھے سٹنگ روم میں پہنچے جہاں اصلی یوسف الظاہری ہیرالڈ تھامس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ چند لمحات پیش تر میں صوفیہ کو بتا چکا تھا کہ سٹنگ روم میں' میں یعنی وجدان تھامس کے ساتھ موجود ہے لہٰذا اس کا ٹھٹکنا لازمی بات تھی۔ وہ استعجابیہ نظر سے باری باری تھامس اور اصلی یوسف الظاہری کو دیکھنے لگی پھر اس سے قبل کہ اس کا استعجاب الفاظ کی شکل اختیار کر کے اس کی زبان سے پھسل جاتا، میں نے بہ آوازِ بلند اردو میں کہا۔

''صوفیہ! تم نقلی یوسف الظاہری سے تو مل چکی ہو۔ اب اصلی سے بھی علیک سلیک کرلو!'' بات ختم کرتے ہی میں نے تھامس کے ساتھ بیٹھے ہوئے یوسف الظاہری کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

وہ ایک جھٹکے سے پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی۔ میرے الفاظ نے گویا اس کی سماعت میں ایک خوف ناک دھماکا کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید الجھن اور چہرے پر زلزلے ایسے تاثرات تھے۔ وہ ہکا بکا مجھے دیکھتی چلی گئی۔

وہ چند لمحات قبل مجھے اپنا بوائے فرینڈ یوسف الظاہری سمجھ کر بڑے جذباتی انداز میں بغل گیر ہوئی تھی اور وہ نرم و گرم تمام تر تقاضے نبھائے تھے جن کی خواہش اور ضرورت وہ اپنے اندر، یوسف الظاہری کے حوالے سے رکھتی تھی لیکن اب اچانک اس پر آشکار ہو رہا تھا، اس نے یوسف الظاہری کے روپ میں کسی اسٹرینجر کو گرم جوش ریسپشن دیا تھا! میری زبان سے اردو کے الفاظ سن کر وہ بہ خوبی سمجھ گئی تھی کہ اسے یوسف الظاہری کے حوالے سے دھوکا ہوا ہے۔ اس کا دھوکا کھا جانا میری کامیابی کا ثبوت تھا لہٰذا میں نے صوفیہ کو حیران و الجھن زدہ چھوڑ کر یوسف الظاہری سے کہا۔

''یوسف! تمہاری فرینڈ صوفیہ کے سامنے تو میری اداکاری بڑی بھرپور اور کامیاب رہی ہے۔ مجھے یقین ہے، دوسری جگہوں پر بھی میں مار نہیں کھاؤں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

میں نے فخریہ انداز میں اپنی بات مکمل کی تو یوسف الظاہری نے سوالیہ نظر سے صوفیہ کو دیکھا اور پوچھا ''کیا تم واقعی وجدان کو نہیں پہچان پائی تھیں؟''

''اوہ مائی گاڈ!'' اس نے شدت حیرت سے غزالی آنکھیں پھیلائیں پھر قدرے کھسیاہٹ آمیز لہجے میں بولی ''میں وجدان کو دیکھ کر یہی سمجھی کہ تم ہو'' اس کا اشارہ یوسف الظاہری کی طرف تھا۔ ''اسی لیے......!''

صوفیہ نے جھینپ سے مشابہ تامل کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑا تو یوسف الظاہری اس کی ان کہی تک پہنچتے ہوئے بڑی فراخ دلی سے بولا ''اٹ ڈزنٹ میٹر۔ وجدان ہمارے مشترک دوست کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ تم اس سے اردو زبان میں بھی گپ شپ لگا سکتی ہو!''

''اوکے!'' صوفیہ نے ایک گہری سانس لی اور میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

جواب میں، میں بھی مسکرا اٹھا۔

یوسف الظاہری سے میں تفصیلی ملاقات کر چکا تھا۔ اس نے اور ہیرالڈ تھامس نے مجھے تمام اہم امور کے بارے میں بڑی باریک بینی سے سمجھا دیا تھا۔ صوفیہ کی آمد پر مجھے اس سے میٹنگ کا موقع فراہم کیا گیا تاکہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ صوفیہ بے شک اردو سمجھ اور بول لیتی تھی تاہم اس کا لب و لہجہ گلگت اور چترال کے لوگوں ایسا تھا لہٰذا وقت کی کمی کے باعث، آسانی کی خاطر ہم نے انگلش ہی کو وسیلۂ اظہار بنایا کیوں کہ اردو بولتے ہوئے بعض الفاظ اس کے پلے نہ پڑتے اور وہ ''سوری'' بول کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگتی' اسی طرح جب وہ اردو کے کسی جملے میں ہنزہ ویلی کے ٹھیٹ الفاظ شامل کر دیتی تو میں اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا!

آدھے گھنٹے کی اسے ملی جلی گفت گو میں ہم دونوں نے اس حد تک ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ لیا، اس سنسنی خیز ڈرامے میں ہمارا ایک ساتھ جتنا رول تھا۔ ہیرالڈ تھامس نے اسے یہ کردار اچھی خاصی محنت سے ازبر کرا رکھا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اس مشن میں صوفیہ بڑے بھرپور انداز میں میرا ساتھ دینے کی پوزیشن میں ہے۔ وہ خاصی مستعد اور ولولہ انگیز لڑکی تھی!

اس یقین نے مجھے یک سر مطمئن کر دیا کہ صوفیہ اچھی ساتھی ثابت ہوگی۔

☆☆☆

''ایس آئی اے'' کے میگا ٹاپ سیون فور سیون نے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا۔ سنگاپور انٹرنیشنل ائرلائنز کا مذکورہ طیارہ جدید ترین سہولیات سے مزین تھا اور مسافروں کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے میں اپنی مثال آپ! مختلف فلکی نشیب و فراز طے کرنے کے بعد پرواز ہموار ہوئی اور طیارے نے جنوب مشرق کا رخ کرتے ہوئے لندن سے قاہرہ کا سفر آغاز کیا تو میں نے اطمینان بھری سانس خارج کی۔ میرے مشن کا دوسرا مرحلہ بھی بہ خیر و خوبی گزر گیا تھا۔

میگا ٹاپ کے پیٹ کے اندر، میں اور صوفیہ پہلو بہ پہلو دو سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ ہم دونوں گہرے دوست تھے۔ صوفیہ میرے، یعنی یوسف الظاہری کے ساتھ اس لیے لندن سے قاہرہ جا رہی تھی کہ وہ مصر، اسرائیل اور اردن کی سیر کرنا چاہتی تھی اور میں نے اس کے لیے کاسکی ٹور اینڈ ٹرپ ٹریول کمپنی کے تعاون سے اس تفریحی دورے کا بندوبست کرنا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے رول کو ذہن نشین کرلیا تھا اور تنہائی کے علاوہ صوفیہ نے ہر وقت مجھے یوسف الظاہری یا یوسف کہہ کر مخاطب کرنا تھا، اسی طرح میں اسے صوفیہ یا صوفی کے نام سے پکارتا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یوسف! میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی تو تم مجھے جگا دینا۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "اس کا مطلب ہے، تم سو کر آرام کرنا چاہتی ہو؟"

"میں آنکھیں بند کر کے دراصل تھوڑا ایزی ہونا چاہتی ہوں" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "اس دوران میں آنکھ لگ جائے، کیا کہا جا سکتا ہے!"

اس نے آرام دہ نشست کو ایزی بنایا اور اس کی پشت کے سہارے نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے اطمینان سے معمور سانس لی۔ اس کا نیک ارادہ میرے لیے خاصا مفید ثابت ہونے والا تھا۔ میں خود بھی آنکھیں موند کر مخصوص سرگرمیوں میں مصروف ہونا چاہتا تھا۔ اس دوران میں اگر صوفیہ جاگ رہی ہوتی تو اس کی جانب سے کسی بھی وقت مداخلت کا خدشہ بہر حال موجود رہتا!

میں لہاسا سے لندن تک ملائشیا ائرلائنز کے جس طیارے سے سفر کر کے پہنچا تھا اس نے خاصا لمبا اور پے چیدہ روٹ اختیار کر کے مجھے منزل تک پہنچایا تھا۔ راستے میں روس کے اوپر سے گزرتے ہوئے اس نے تین کمیونسٹ ممالک میں مختصر قیام بھی کیا تھا جس کے باعث وہ سفر خاصا طویل ہو گیا تھا لیکن سنگاپور ائرلائنز کی موجودہ پرواز براہِ راست تھی اور اس طیارے نے جنوب مشرق کی سمت سفر کرتے ہوئے یورپ کے اوپر سے گزر کر لندن سے قاہرہ پہنچنا تھا۔ میرے پاس اچھا خاصا وقت تھا۔ اس دوران میں، میں اپنی خفیہ سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکتا تھا۔

میں نے ظاہرہ آنکھیں بند کرتے ہوئے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور دھیرے دھیرے سانس کھینچنے چھوڑنے لگا۔ یہ ایک طرح کی اسموتھ بریدنگ تھی۔ میں یہ آہستگی انہیل اور ایگزہیل کرنے لگا۔ اس عمل نے تن بدن کو فرحت سے بھر دیا۔ چنگ فو رن پوچی سے دوسری ملاقات کے بعد سے اب تک میں اٹھتے بیٹھتے سانس کی مشق کرتا چلا آ رہا تھا۔ میری بنیاد یوگا کے حوالے سے چونکہ خاصی مضبوط تھی لہٰذا اس میدان میں چیف لاما کی ہدایت پر عمل کرنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور مسلسل کوشش نے مجھے اس مقام پر پہنچا دیا کہ میں اپنے جسم سے باہر کم و بیش دس منٹ تک سانس روکنے کے قابل ہو گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز اور مسرت آمیز کامیابی تھی۔

اس دل خوش کن احساس کے ساتھ میں نے تیسری آنکھ کو زحمت دی اور تصور میں اپنی دوست لی یان کے خدوخال کو اجاگر کیا۔ لی یان کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سانس روکنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ لی یان لہاسا کے گانگر ائرپورٹ پر مجھے الوداع کہنے آئی تھی۔ میں اس سے چند روز کے لیے بچھڑ رہا تھا لیکن اس کی حالت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا جیسے یہ جدائی خدانخواستہ ابدی جدائی ہو۔ ان لمحات میں لی یان کا دل ملول، آنکھیں نم اور جذبات کی ندی باڑ پر آئی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے والہانہ اور دل ربانہ انداز میں مجھے رخصت کیا تھا۔ اس کی وہ رخصتی وارفتگی میری یادداشت میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔

میں لی یان کے جذبات اور خواہشات کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ میں جانتا تھا، وہ مجھ سے کس بات کی متقاضی ہے۔ میں اس کے ارمانوں کو بہ خوبی سمجھتا تھا لیکن اپنی جگہ میں بھی مجبور تھا۔ میری منزل کوئی اور تھی، میں لی یان کی منزل نہیں بن سکتا تھا۔ ہاں البتہ، اس کا خیال رکھنا مجھ پر فرض تھا...... اور میں نے اب تک بڑے بھرپور انداز میں اس کا خیال رکھا تھا۔ آئندہ بھی میرا ارادہ یہی تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر اسے بے یارومددگار نہیں چھوڑوں گا۔ مجھ سے جو بن پڑا، اس کے لیے ضرور کروں گا!

میں نے لہاسا سے روانہ ہونے کے بعد، طیارے کے اندر رہتے ہوئے تھرڈ آئی کے توسط سے اس کی خبرگیری کی تھی اور وہ مجھے کسی تنگ کمرے میں، ایک بستر پر سوئی ہوئی نظر آئی تھی۔ اس مرتبہ جو میں نے اس کے ماحول میں انٹری دی تو وہ مجھے گہری نیند میں ملی۔ اس کے برابر بچھے ہوئے دوسرے بستر پر وہ تبتی عورت بھی موجود تھی جسے میں نے پہلے بھی اس کمرے میں دیکھا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تبتی عورت درحقیقت لی یان کی نگران تھی جیسے چند روز پہلے تک چن سیان میرا اور لی یان کا نگران تھا!

تبت کے مقامی وقت کے مطابق، ان لمحات میں رات کے کم و بیش دس بج رہے تھے۔ جوکھانگ ٹیمپل میں شام و سحر کا "آغاز" قدرے جلدی ہو جاتا تھا اس لیے یہی کہا جا سکتا تھا، لی یان اس وقت گہری نیند میں ہو گی۔ یہاں شام و سحر کے آغاز سے مراد ان اوقات سے متعلق معمولات سے ہے۔ میں نے ایک بھرپور نظر لی یان پر ڈالی اور اس کے ماحول سے نکل آیا۔

اس کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے چن سیان اور چنگ فو کے ماحول میں جھانکنے کی سعی کی۔ چنگ فو کے سلسلے میں اس مرتبہ بھی مجھے حسبِ معمول ناکامیابی ہوئی البتہ، چن سیان کسی مراقبے کی سی کیفیت میں پایا گیا۔ وہ ٹیمپل کی خاموشی

اور تنہائی میں کوئی نہایت ہی خاص الخاص مشق میں مصروف تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اس کے ماحول سے باہر آ گیا۔

میں نے بہ دستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے گہری گہری چند سانسیں لیں اور اپنی رگِ جاں کے بارے میں سوچنے لگا۔ میری اس سب سے بڑی کمزوری کو ربی موشے ہائمن نے اپنے خون آشام پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ وہ اب تک میری دسترس سے دور رہی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا، وہ دن دور نہیں جب میں ربی کا وہ ظالم اور سفاک پنجہ توڑ کر اپنی ساحل کو اس کی منحوس گرفت میں سے آزاد کرالوں گا۔ ربی نے میری ساحل کو تل ابیب کے کسی گھر میں مقید کر رکھا تھا اور مجھے اسی قید خانے تک رسائی حاصل کرنا تھی...... اور اس رسائی کے لیے میں سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار بیٹھا تھا۔ چیف لاما نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتلا دیا تھا کہ یہ آخری موقع ہے! میں اس آخری موقع کو اپنی جان کی قیمت پر بھی گنوانا نہیں چاہتا تھا...... اس موقع کو ضائع کرنا زندگی بھر کے لیے ساحل سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا اور میں اس عظیم زیاں کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

ربی موشے ہائمن کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا حلق سوکھنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے کانٹوں بھری جھاڑی کو میرے حلق میں زبردستی ٹھونس دیا ہو۔ وہ شخص میرے لیے اتنا ہی قابلِ نفرین تھا۔ اس سفاک شخص نے میری روح پر اتنے چرکے لگائے تھے کہ میں شمار بھی بھول بیٹھا تھا۔ ربی نے مجھ پر ان گنت ''احسان'' کر رکھے تھے۔ میں اس کا لاکھوں، کروڑوں کا ''مقروض'' تھا۔ یہ قرض سکہ رائج الوقت کی شکل میں نہیں بلکہ میرے احساس پر برسائے جانے والے ظلم و ستم کے کوڑوں کی صورت میں تھا اور...... مجھے اس قرض کی ایک ایک ''پائی'' سود در سود وصول کرنا تھی!

ربی موشے ہائمن کی تلخ یاد نے میرے زخم ہرے کر دیے اور اس کی ایک ایک درندگی مجھے ستانے لگی۔ میں نے اس شخص کے ہاتھوں جتنا نقصان اٹھایا تھا اس کا تصور بھی مجھے بے چین کر کے رکھ دیتا تھا۔ یہ بے چینی اسی وقت ختم ہو سکتی تھی جب اس موذی کی گردن میرے ہاتھ میں ہوتی اور میں اس کی گردن پر ہاتھوں کا شکنجہ کس کر اس سے ایک ایک زیادتی کا حساب لیتا، وہ حساب جو طوالت کے اعتبار سے میرے سابق تمام دشمنوں کا ریکارڈ توڑ چکا تھا۔

ربی کے بارے میں، نفرت انگیز انداز میں سوچتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ ذرا اس کے ماحول میں بھی جھانک کر دیکھوں۔ وہ ایک شاطر عامل تھا۔ پتا نہیں، اس نے اپنے اور میرے بیچ میں ایسی کون سی رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی کہ میں کوشش کے باوجود بھی اس کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے میں ناکامیاب رہتا تھا۔ اس مسلسل ناکامیابی سے تنگ آ کر پچھلے کچھ عرصے سے میں نے ادھر ''دیکھنا'' بھی ترک کر دیا تھا۔

لیکن اب چیف لاما چنگ فورن پوشی نے مجھے ایک ایسی ٹیکنیک بتادی تھی جو ساحل کے سلسلے میں بڑی حد تک سودمند ثابت ہوئی تھی۔ میں اس ٹیکنیک کو اگر ربی پر آزماتا تو خاصے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

اس سوچ کے ساتھ ہی میں نے موشے ہائمن کے نقش و نگار کو اپنے تصور میں ابھارا۔ اس کا حلیہ میری تیسری آنکھ کے سامنے روشن ہو گیا۔ میں نے اس کے تصوراتی چہرے پر نگاہ گاڑ کر ربی کے ماحول میں اترنے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش رائگاں گئی۔

میں نے سانس کو جسم کے باہر روکا اور ربی کے ماحول پر دستک دینے کا سلسلہ جاری رکھا۔ پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ ایک ایسا وقت آیا کہ مجھے اپنے سینے میں گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا، اگر میں مزید چند سیکنڈ تک سانس نہیں لوں گا تو میرا دل بند ہو جائے گا۔ میرے پھیپھڑوں کو تازہ آکسیجن کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ میری اس تکلیف دہ کیفیت کو وہ لوگ بہ آسانی سمجھ اور محسوس کر سکتے ہیں جو سانس کے مریض ہیں۔ وہ جانتے ہیں، آکسیجن کی کمی کے باعث کس طور دم اکھڑتا ہے!

جب یہ تکلیف میری برداشت سے متجاوز ہونے لگی تو میں نے شکست خوردہ انداز میں سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ جان میں جان آئی تو میں نے گردن گھما کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بہ دستور ایزی پوزیشن میں نیم دراز تھی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور پھیپھڑے بھر کر خوب گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

چنگ فورن پوشی کی بتائی ہوئی ترکیب جب نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی تو یہی سمجھ میں آیا کہ ربی نے اپنے ماحول کے دروازے پر ایک خصوصی لاک لگا رکھا ہے۔ وہ مضبوط لاک میری کوشش سے فی الحال ٹوٹنے والا نہیں، آیندہ کے بارے میں قبل از وقت کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ویسے اس بات میں کسی شک شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ ربی موشے ہائمن دنیا بھر کے یہودیوں کے لیے ایک محترم شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ روحانی عملیات کا بھی بہت بڑا ماہر تھا۔ اس شعبے میں اس کی

کچھ بھی بعید نہیں تھا!

میرے سینے کی دنیا میں جب ایک ٹھہراؤ پیدا ہوا تو میں نے اپنی جانِ تمنا کی جانب تخیلاتی پرواز کا قصد کیا۔ گزشتہ کوشش میں، میں نے اس کے ماحول تک رسائی حاصل کر لی تھی اور اب تو میں پہلے سے کہیں زیادہ ''تیار'' تھا۔

ساحل کے نقوش، خال و خط یا حلیے کو اپنی تھرڈ آئی کے سامنے ابھارنے کے لیے مجھے باقاعدہ کوشش نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اس کا ایک ایک نقش میری یادداشت میں کندہ تھا۔ ادھر اس کا نام ذہن میں چمکتا، ادھر اس کا سراپا روشن ہو جاتا۔ میں نے احتیاط کے تقاضے نبھاتے ہوئے پہلے ہی سانس روک لی اور اس کا چہرہ تصور کی نگاہ میں اجاگر ہوتے ہی میں نے اس کے ماحول میں چھلانگ لگادی۔

ملائشیا ایئر لائنز کے طیارے میں سے بھی میں نے ایسی ایک کوشش کی تھی جو بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اس مرتبہ کامیابی فوراً ہی میرے ہاتھ آ گئی۔ میری باطنی آنکھ نے مجھے اسی بیڈروم میں پہنچا دیا جہاں میں نے پچھلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ اسی بیڈروم میں تھی تاہم ایک تبدیلی دیکھنے میں یہ آئی کہ وہ بیڈ کے بجائے ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی تھی۔ پہلے اکثر میرے ساتھ ایسا ہوا تھا کہ میں نے جب بھی اس کے ماحول میں جھانکا، وہ مجھے بیڈ پر لیٹی ہوئی نظر آئی۔ کبھی حالتِ نیند میں اور کبھی چت لیٹے جاگتے ہوئے دکھائی دی۔ اس خوش گوار تبدیلی نے مجھے ایک نئی فرحت سے روشناس کرایا۔

کوئی شخص مسلسل کسی بستر پر پڑا دکھائی دے تو اس کے حوالے سے ذہن میں معذوری اور بیماری کا تصور قائم ہونے لگتا ہے، چاہے وہ بھلا چنگا ہی کیوں نہ ہو۔ پچھلے دنوں اگرچہ ساحل کی طبیعت خاصی خراب رہی تھی لیکن اب وہ صورتِ حال نہیں تھی تاہم اسے مسلسل بیڈ پر دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا میں چاہتا تھا، وہ چلے پھرے اور زندگی کے ہنگاموں میں اسی طرح حصہ لے جیسے ہر نارمل انسان حصہ لیتا ہے مگر میری یہ خواہش پوری ہو کر نہیں دے رہی تھی۔ ساحل سفاک بھیڑیے موشے ہائمن کے قبضے میں تھی اور میری وہاں تک رسائی نہیں تھی اسی لیے جب میں نے اسے ڈریسنگ کے سامنے بیٹھے دیکھا تو مجھے ایک ان جانی سی مسرت کا احساس ہوا۔ میں یک ٹک اسے دیکھتا چلا گیا۔

وہ اس وقت ڈریسنگ کے آگے بیٹھی اپنی زلفوں کو سنوار رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں اور دیگر اعضا کو حرکت کرتے دیکھ کر مجھے جو خوشی حاصل ہوئی میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان لمحات میں ساحل تروتازہ اور صحت مند نظر آ رہی تھی۔ میں ڈریسنگ کے آئینے میں اس کا جائزہ لے رہا تھا اور خواہ مخواہ اس آئینے سے مجھے حسد سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھ سے تو... آئینہ ہی اچھا تھا جس نے پوری طرح ساحل کو اپنی ''آغوش'' میں سمیٹ رکھا تھا۔

ساحل اس وقت پوری تیار نظر آتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ کہیں جانے والی ہو۔ اس کے، بیڈروم سے نکلنے کا تصور بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ ربی نے اسے ہر سہولت، ہر آسائش کمرے میں مہیا کر رکھی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر کہیں بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ساحل ایک وی وی آئی پی قیدی کی حیثیت رکھتی تھی۔

میرے دل میں شدت سے یہ خواہش جاگی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھولوں۔ اگر تصور کی باقاعدہ انگلیاں ہوتیں تو میں پہلی فرصت میں یہ کوشش کر چکا ہوتا۔ ان لمحات میں وہ مجھے بہت پیاری لگ رہی تھی، لامحالہ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' وہ کوئی طاقت ور مقناطیس ہو اور میں لوہے کا ایک ذرہ! ہمارے درمیان پیدا ہونے والی کشش کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔

بے اختیار میری زبان سے پھسل گیا ''ساحل......!''

میں نے اپنی جانِ جگر کو پکارنے کی کوشش کی تھی تاہم اس کوشش میں میرا انداز سرگوشیانہ تھا جیسے اس کے کان میرے ہونٹوں کے قریب ہی ہوں حالاں کہ میں اچھی طرح جانتا تھا، میری یہ سرگوشی اس کی سماعت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ میں آواز کی ترسیل کا ہنر نہیں جانتا تھا اور نہ ہی جاننے کی کوشش کر سکتا تھا، اس کی سختی سے ممانعت کر دی گئی تھی۔ پہلے سانگ فو نے سٹیل میں، اس سلسلے میں مجھے خصوصی ہدایات دی تھیں اور اب جوکھانگ ٹیمپل میں چنگ فو نے بھی کچھ اسی قسم کی تاکید کی تھی۔ مجھے پنیل گلینڈ کے توسط سے تھرڈ آئی ہی کو استعمال میں لانا تھا جس کا تعلق صرف اور صرف دیکھنے سے تھا۔ مجھے اپنے ان محترم خیر خواہوں کی خواہش کا احترام کرنا تھا اور بھول کر بھی پچیوٹری گلینڈ کی مشق نہیں کرنا تھی۔ پتا نہیں، اس ممانعت میں ان عبقریوں کی کون سے حکمت پوشیدہ تھی، بہرحال مجھے اپنے وعدے کا پاس کرنا تھا، میرے نزدیک وعدے کی بڑی اہمیت ہے۔

اگر میں، سر کے عقبی حصے میں واقع پچیوٹری گلینڈ پر توجہ مرکوز کر کے کوئی خاص مشق کرتا تو کام یابی کی صورت میں وہ گلینڈ متحرک ہو جاتا اور اگر میں اس کے تحرک پر کنٹرول بھی حاصل کر لیتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ میں نے باطنی کان کو جگا دیا۔ جس طرح میں تھرڈ آئی کے توسط سے کسی بھی چنیدہ ماحول تک

رسائی حاصل کر لیتا تھا بالکل اسی طرح یہ تھرڈ ایر (باطنی کان) مجھے اس چنیدہ ماحول میں پیدا ہونے والی آوازیں بھی سنا سکتا تھا اور اگر میں اس سے ایک ہاتھ آگے بڑھ کر پنیل اور پچیوٹری کو ہم آہنگ کر لیتا تو یہ بھی ممکن ہو جاتا کہ میں اپنی آواز کو اس خاص ماحول میں پہنچا سکوں۔

چنگ فو اور آنجہانی سانگ فو میرے لیے جید اساتذہ کی حیثیت رکھتے تھے اور کسی استاد کے کہے کو حرفِ آخر ماننے ہی میں کامیابی ہے۔ جب تک انسان اپنے اندر فرماں برداری اور اطاعت گزاری کو پیدا نہ کرے وہ کسی سے کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا۔ یہ ایک چھوٹا سا گر ہے۔ جو شاگرد اس گر کو اپنے دامن میں سمیٹ لے، گوہرِ مقصود اس کے ہاتھ آ جاتا ہے۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ساحل کو آئینے میں دیکھتے ہوئے دس منٹ سے زیادہ ہو گئے ہوں۔ میں نے جسم سے باہر سانس روک کر ساحل کے ماحول تک رسائی حاصل کی تھی اور میرے سانس روکنے کی حد ختم ہو گئی تھی۔ اصولی طور پر مجھے اس وقت دم گھٹنے کا احساس ہونا چاہیے تھا لیکن میں بالکل نارمل تھا اور یہی بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ کیا میرے سانس روکنے کا دورانیہ خود بہ خود بڑھ گیا تھا؟

اس سوال نے مجھے اپنا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے خود پر غور کیا تو ایک اور حیرت سے سامنا ہوا...... میں بالکل، ہموار، نارمل انداز میں سانس لے رہا تھا۔ پتا نہیں، کب رکی ہوئی سانس کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ میں ساحل کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے اس تبدیلی کا احساس تک نہ ہوا اور نہ اس سے پہلے جب میں نے جسم سے باہر سانس روک کر اس سے تصوراتی رابطہ قائم کیا تھا تو سانس روکنے کی مدت ختم ہوتے ہی میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے جہاز لینڈنگ کر رہا ہوں۔ اسی گڑبڑ سے گھبرا کر میں نے بڑبڑاہٹ میں آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اس مرتبہ میں ایک مختلف اور خوش گوار تجربے سے گزرا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سانس روک کر تصوراتی رابطہ قائم کرنے کی مشق میں، میں پختہ ہو گیا تھا...... اور یہ ایک تسلی بخش و خوش آیند بات تھی۔ میں کامیابی کے انتہائی قریب آن کھڑا ہوا تھا۔

ساحل نے اچانک پلٹ کر دیکھا تو میں چونک اٹھا۔ اس بیڈ روم میں ساحل کے سوا اور کوئی نہیں تھا، پھر اس نے کس کو دیکھنے کی کوشش کی تھی، یہی جاننے کے تجسس میں میں نے بھی اس سمت نگاہ دوڑائی جدھر ساحل نے دیکھا تھا، وہاں مجھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اس معمے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔

میں نے اپنی توجہ واپس ساحل پر مبذول کی تو اس دوران میں وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ میں بہ غور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ سوالیہ نظر سے بیڈروم کے دروازے کو دیکھ رہی تھی پھر جب اس نے مذکورہ دروازے کی جانب قدم بڑھائے تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ساحل کے چونکنے کا سبب وہ دستک تھی جو اس نے بیڈ روم کے دروازے پر ابھرتے سنی تھی۔ میں چونکہ اس ماحول میں پیدا ہونے والی کسی آواز کو سننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا اس لیے ساحل کے چونکنے اور دروازے کی جانب بڑھنے نے مجھے الجھا کر رکھ دیا تھا۔

وہ دروازے کے قریب پہنچی تو میں بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تصور کی انگلی پکڑ کر وہاں تک چلا گیا پھر اگلے ہی لمحے اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ ساحل نے دروازے کے ہینڈل کو مخصوص انداز میں گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔

کھلے ہوئے دروازے میں مجھے ایک دراز قامت شخص کھڑا دکھائی دیا۔ مذکورہ شخص کے سر پر گھنے بال تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس نے کوئی جیل یا تیل لگا کر اپنے بالوں کو خوب اچھی طرح جما رکھا ہو۔ اس کا سر قدرے جھکا ہوا تھا لہٰذا میں اس کے چہرے کو مکمل طور پر دیکھ نہ سکا۔

اس شخص نے یقیناً ساحل سے کچھ کہا تھا۔ میں اس کے الفاظ تو نہ سن سکا تاہم یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ ساحل تک کوئی پیغام پہنچانے آیا تھا۔ ساحل نے اس کی بات کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی اور دروازہ بند کرتے ہوئے اپنے بیڈ کی طرف چلی گئی۔

میں ساحل کو چھوڑ کر بیڈ روم کے باہر گھنے بالوں والے اس شخص کے پاس پہنچ گیا۔ ساحل کے بیڈ روم تک رسائی حاصل کرنا اب میرے لیے چنداں مشکل نہیں رہا تھا، بیڈروم کے باہر کا ماحول میرے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ ساحل کو اس بیڈ روم سے نکالنے کے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ اسے کس گھر میں رکھا گیا ہے اور وہ گھر اسرائیل کے کس علاقے یعنی تل ابیب کے کس حصے میں واقع ہے!

میں نے بیڈروم کے کھلے ہوئے دروازے میں اس شخص کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ کسی کوری ڈور تا پ جگہ کھڑا تھا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا وہ کوئی برآمدہ تھا یا محض کوری ڈور۔ جب میں مذکورہ شخص کے ماحول میں پہنچا تو صورتِ حال واضح ہو گئی۔ اس شخص اور اس کے پس منظر کی تازہ تازہ جھلک میرے ذہن میں محفوظ تھی اس لیے تصور کی نگاہ کو زیادہ تردد نہ ہوا اور میں ایک ہی تخیلاتی جست میں بیڈ روم سے باہر پہنچ گیا۔

وہ شخص سر جھکائے باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ماحول میں "قدم" رکھتے ہی یہ جان لیا کہ وہ ایک مختصر سے برآمدے میں کھڑا تھا۔ اس برآمدے سے آگے مجھے کھلا آسمان دکھائی دے رہا تھا اور لوکیشن کے پیشِ نظر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ ساحل کو جس بیڈروم میں رکھا گیا تھا وہ اس عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھا۔

اس شخص کے انداز سے صاف جھلکتا تھا، وہ دروازے کے باہر کھڑا ہو کر ساحل کا انتظار کر رہا ہے۔ اس صورتِ حال نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، ساحل اس شخص کے ساتھ کہیں جانے والی ہے یعنی وہ شخص ساحل کو لینے کے لیے آیا ہے۔ ساحل کا رویہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ اس شخص کی آمد نے اسے حیران یا پریشان نہیں کیا تھا جس سے واضح ہوتا تھا، وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ جا رہی تھی...... کہاں؟ یہ سوال بڑا ہی تجسس آمیز اور سنسنی خیز تھا۔ میں اس شخص کو اس کے حال پر کھڑا چھوڑ کر بیڈروم کے اندر پہنچ گیا۔

اس دوران میں ساحل نے ایک قیمتی سینڈل پہن لی تھی۔ اس سے پہلے، ڈریسنگ کے سامنے بیٹھے ہوئے میں نے اسے سلیپرز میں دیکھا تھا۔ اب اس کی تیاری سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے عمدہ تراش کا لباس زیب تن کر کے مختصر سا بناؤ سنگار بھی کیا تھا، بالوں میں برش کر کے انہیں سنوارا تھا جیسا عام طور پر خواتین گھر سے باہر نکلتے وقت کرتی ہیں۔ اب اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت بیڈ روم سے نکل رہی تھی۔ اس نے کندھے پر ایک خوب صورت چھوٹا سا پرس بھی لٹکا رکھا تھا۔ وہ سبک قدموں سے چلتے ہوئے بیڈروم کے دروازے کی سمت بڑھی تو میں ایک مرتبہ پھر باہر کھڑے شخص کے پاس پہنچ گیا۔

میرے لیے یہ قلابازیاں انتہائی سنسنی خیز ثابت ہو رہی تھیں۔ ساحل تیار ہو کر ایک فرماں بردار شخص کے ساتھ کہیں جانے والی تھی۔ یہ صورتِ حال میرے اندر اضطرار کو جگا رہی تھی۔ میں اس وقت انتہائی غیر یقینی کنارے پر کھڑا تھا۔ آگے کیا پیش آنے والا ہے اس کے بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ دروازے کے باہر کھڑا شخص میری ساحل کو لے کر کہاں جائے گا؟ وہ شخص ساحل کے لیے دوست ثابت ہو گا یا دشمن، اس بارے میں قبل از وقت کوئی اندازہ قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے سوچ رہا تھا۔ میں یہ بات بہ خوبی جانتا تھا، میری ساحل، ربی موشے ہائمن کی قید میں ہے۔ قفس چاہے کتنا بھی آرام دہ اور خوش نما کیوں نہ ہو وہ آزادی کی جھونپڑی سے زیادہ اچھا نہیں ہوتا۔ ربی نے میری ساحل کو ہر قسم کی آسائش اور سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ وہ ایک طرح سے سونے کی تیلیوں والے پنجرے میں بند تھی۔ اطلس و کمخواب پہنتی تھی، لعل و جواہر کھاتی تھی اور پُرسکون نیند سوتی تھی لیکن یہ تمام تر عیش و آرام اسے قید خانے کے اندر میسر تھا لہٰذا اس کی اہمیت دو کوڑی سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کا جسم دیکھنے میں آزاد تھا لیکن اس آزاد جسم کے اندر قید روح دکھائی نہیں دیتی تھی۔

بیڈ روم کا دروازہ کھلا اور ساحل ایک شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے باہر آ گئی۔ اس شخص نے نگاہ اٹھا کر ساحل کی طرف دیکھا اور برآمدے میں ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیا۔ ساحل آگے بڑھی تو اس شخص نے بیڈروم کے دروازے کو لاک کر دیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ خود بھی ساحل کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا احترام پایا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ ساحل کی چاکری پر مامور ہو۔

دروازے کو لاک کرنے والے، اس شخص کے عمل نے مجھے ایک خاص زاویے پر سوچنے کے لیے مجبور کر دیا۔ میری یہ کمزوری تھی کہ میں باطنی آنکھ کے توسط سے جس ماحول میں داخل ہوتا، وہاں ابھرنے والی آوازیں نہیں سن سکتا تھا۔ جب ساحل ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی خود کو سنوارنے میں مصروف تھی اور اچانک اس نے چونک کر پیچھے دیکھا تھا تو میں فوری طور پر یہی سمجھا تھا، دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے متوجہ کیا ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ اس شخص نے دستک دے کر باہر اپنی آمد کی اطلاع دی ہو گی لیکن یہ خیال کہ ساحل نے دستک کے جواب میں دروازہ کھولا تھا، قطعی درست نہیں تھا۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس دروازے کو اپنی مرضی سے کھولنا یا بند کرنا ساحل کے اختیار میں ہرگز نہیں تھا۔ اسی شخص نے دروازے کا لاک کھولنے کے بعد دستک دی ہو گی اور جیسے ہی ساحل بیڈ روم سے باہر نکلی، اس شخص نے دوبارہ دروازہ لاک کر دیا۔

اس حقیقت میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی کہ ساحل وہاں ایک معزز قیدی کی حیثیت سے رکھی گئی تھی اور جس شخص کے ساتھ وہ جا رہی تھی وہ ربی کے لیے انتہائی قابلِ بھروسا ہو گا ورنہ ساحل کو یوں بیڈروم سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دی جاتی...... اور اس سے بھی کہیں بڑھ کر تل ابیب کی وہ عمارت محفوظ ہو گی۔ جس کی بالائی منزل کے ایک بیڈروم میں

ساحل کو رکھا گیا تھا۔

میں یہ سب سوچتے ہوئے ان کے ماحول کی انگلی پکڑ کر چلتا رہا اور تصورات کا یہ تعاقب ایک چکردار زینے پر جا کر ٹھہرا۔ مذکورہ زینہ بالائی منزل کو زیریں منزل سے ملاتا تھا۔ اس زینے کے قریب میں نے دو مسلح افراد کو اٹین شین پایا۔ وہ اپنے لباس اور انداز واطوار سے مستعد سیکیورٹی گارڈز دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یقین تھا، اگر اس زینے کے علاوہ بھی کوئی راستہ بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہوگا تو وہاں بھی اسی نوعیت کا سخت حفاظتی نظام موجود ہوگا!

دونوں گارڈز نے ایک اچٹتی سی نگاہ ساحل اور اس کے ہم راہی پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ شخص پہلے زینے میں داخل ہوا، اس کے بعد ساحل نے چکردار زینے کے اسٹیپ پر قدم رکھا۔ یہ سوچنا سراسر حماقت ہوتا کہ ساحل کے آگے آگے زینہ اترنے والا شخص غیر مسلح ہوگا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں زیریں منزل پر پہنچ گئے۔ اس دوران میں زینے کے اوپری حصے پر متعین دونوں گارڈز انتہائی مستعد اور محتاط رہے تھے۔ میں بھی چونکہ ان کے ماحول کا حصہ بن کر زیریں منزل تک چلا آیا تھا اس لیے میری باطنی آنکھ کو بہت دور تک دیکھنے کا موقع ملا اور میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ وہ دومنزلہ مختصر سی عمارت ایک وسیع وعریض احاطے کے عین وسط میں بنی ہوئی تھی۔ تعمیر شدہ حصے اور باؤنڈری وال کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ موجود تھا۔

میں نے ساحل اور اس شخص کے ماحول میں رہتے ہوئے حتی الامکان دوری تک نگاہ دوڑائی اور یہاں سے وہاں تک مجھے کسی بندے بشر کی شکل نظر نہ آئی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی کہ میری ساحل کو محض تین افراد کی نگرانی میں، اس عمارت کی بالائی منزل پر قید کیا گیا تھا۔

بات چونکہ عجیب تھی اس لیے یقین کرنے کو دل نہیں چاہا اور میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ عمارت کے زیریں حصے میں بھی کچھ لوگ خفیہ نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہوں گے۔ ذہن میں مختلف جوڑتوڑ کرتے ہوئے میں ان کے تعاقب میں جتا رہا۔ میرے اندر بڑی شدت سے یہ سوال ابھر رہا تھا کہ وہ دونوں کہاں جا رہے ہیں؟

اس وقت اسرائیل میں لگ بھگ شام کے چھ بجے تھے۔ یہ سہ پہر اور شام کے درمیان کا وقت تھا۔ چیزوں کے سائے خاصے طویل ہو چکے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک اداس، بے مہر رات عن قریب اس احاطے میں اتر کر اس دومنزلہ عمارت کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے گی۔ میں وہاں ابھرنے والی آوازوں کو اگرچہ سماعت نہیں کرسکتا تھا لیکن مجھے پختہ یقین تھا، اس عجیب وغریب بنگلے میں مہیب سناٹا طاری ہوگا!

میں ان کے ماحول میں بھی تھا اور میری تیسری آنکھ کسی سرچ لائٹ کے مانند گرد وپیش کا تنقیدی جائزہ بھی لے رہی تھی اور اسی جائزے کے دوران میں، میں نے ایک نہایت ہی اہم شے دریافت کرلی۔

وہ اس بنگلے کا داخلی گیٹ تھا۔ نیلے رنگ کا وہ گیٹ نہ تو بڑا تھا اور نہ ہی چھوٹا، بس اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ ایک کسی بھی سائز کی گاڑی بہ آسانی بنگلے کے اندر داخل ہوسکے۔ گیٹ تک نگاہ گئی تو باؤنڈری وال بھی بڑی وضاحت سے نظر میں آگئی۔ اس دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی اور اس کے اوپر خاردار تار کی مخصوص باڑ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس باڑ کی بناوٹ اور لوکیشن کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ حسب ضرورت مہلک بنانے کے لیے اس کے اندر کرنٹ بھی چھوڑ دیا جاتا ہوگا۔ نگاہ اس خطرناک باؤنڈری وال سے واپس آئی تو نیلے گیٹ پر جم گئی۔

گیٹ اس وقت بند تھا اور اس کی اندرونی جانب کوئی مسلح یا غیر مسلح چوکی دار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیرونی طرف اگر کوئی ایسا شخص موجود تھا تو میں اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے تھوڑی بہت اس بات کی امید تھی کہ وہ شخص ساحل کو اپنے ساتھ لے کر بنگلے کے بیرونی گیٹ کی سمت جائے گا لیکن جب اس نے ایسا قدم نہیں اٹھایا تو مجبوراً مجھے تعاقب کا زاویہ درست کرتے ہوئے ان کے ماحول کا حصہ بننا پڑا۔

وہ دونوں نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے گیٹ کی مخالف سمت میں، عمارت کی عقبی جانب بڑھنے لگے۔ ساحل کے انداز میں ایک اعتماد شامل تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، یہ اس کا پہلا تجربہ نہ ہو بلکہ وہ پہلے بھی اس شخص کی معیت میں ادھر آچکی ہو۔ میں بہ قول کسے، سانس روکے اپنے مقصد سے چپکا رہا۔ یہ دم سادھ کر منزل تک پہنچنے کا طریقہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ایک خوش نما پارک دکھائی دیا۔ یہ پارک عمارت کی عقبی سمت میں واقع تھا۔ پارک کے اندر مختلف قسم کے پودے لگے ہوئے تھے جن میں زیادہ تعداد پھول دار پودوں کی تھی اور دل خوش کن بات یہ تھی کہ ان پودوں میں نوع بہ نوع اور رنگ بہ رنگ پھول بھی کھلے ہوئے تھے۔ وہ پارک کسی گارڈن کا منظر پیش کرتا تھا جس کی فضا کو پھولوں کی خوش بو نے یقیناً معطر کر رکھا ہوگا۔ میں ان خوش نما اور دل کش

پھولوں سے اٹھنے والی مہک کو سونگھ نہیں سکتا تھا لیکن مشاہداتی نگاہ مجھے بتا رہی تھی کہ اس گارڈن نما پارک کی فضا بھینی بھینی خوش بو سے مہک رہی ہوگی۔

ساحل اس دل نشیں فضا والے پارک میں داخل ہوگئی۔ اس کا ساتھی چونکہ اس رومینٹک ماحول میں اس کی ہم نشینی کا اہل نہیں تھا اس لیے وہ پارک کے باہر ہی رک گیا۔ ساحل ایسی نازنین کی ہم نشینی کوئی آسان بات نہیں تھی۔ وہ خراماں خراماں چلتے ہوئے پارک کے ایک گوشے میں پہنچی اور وہاں موجود ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ بڑے دل آویز انداز میں مہکتے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگی۔

اس پارک میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بڑی آرام دہ بینچیں بھی نصب تھیں جن کی تیاری اور تنصیب سے شاعرانہ رنگ جھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کام کے لیے باقاعدہ کسی آرٹسٹ کی خدمات حاصل کی گئی ہوں گی۔ ان لمحات میں، ساحل مجھے بہت معصوم اور بھولی بھالی لگی۔ اس کے حسن میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی۔ میرے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کاش! میں بھی اس وقت ساحل کے پہلو میں بیٹھا ہوتا۔

میں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ وہ تھوڑا اور انتظار کرے۔ وہ دن دور نہیں جب ساحل میری دست رس میں ہوگی۔ میں چند دن بعد تل ابیب پہنچنے والا تھا اور جہاں ساحل کو رکھا گیا تھا اس عمارت کا ایک ایک نقش میں نے اپنی یادداشت میں کندہ کرلیا تھا۔ بس، اب صرف اتنا معلوم کرنا تھا کہ مذکورہ عمارت تل ابیب میں کہاں پر واقع ہے، پھر مجھے ساحل تک پہنچنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی تھی!

ساحل بینچ پر بیٹھی، پھولوں کو دیکھنے میں محو تھی۔ میں اس شخص کی خبر گیری کے لیے پارک سے باہر نکل آیا جو ساحل کو یہاں تک پہنچانے کے بعد پارک سے باہر ہی رک گیا تھا۔ وہ اب بھی وہیں موجود تھا اور ایک ایسے زاویے پر چاق چوبند کھڑا تھا جہاں سے ساحل کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ گویا وہ بڑی ہوشیاری سے ساحل پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ ساحل کو اس نگرانی کا مطلق احساس نہیں تھا یا اگر وہ اس بارے میں جانتی بھی تھی تو اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے، یہ اس کا روز کا معمول ہو!

میں چند لمحات اس شخص کے قرب و جوار میں گزار کر واپس اپنی ساحل کے پاس آگیا۔

ساحل بینچ سے اٹھ کر اب ٹہل رہی تھی۔ اس کے انداز میں بڑی سبک خرامی پائی جاتی تھی۔ اس کے ٹہلنے کا طریقہ سیر کرنے والا تھا۔ وہ چلتے چلتے کبھی کسی پھول دار پودے کے قریب رک جاتی۔ کسی پھول کو چھو کر دیکھتی، یوں محسوس ہوتا، وہ بہ زبانِ خامشی پھول سے باتیں کررہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک ادائے ناز سے آگے بڑھ جاتی۔ وہ بڑے بھرپور انداز میں ایوننگ واک کا لطف اٹھا رہی تھی۔

ویسے ربی کی ایک بات تعریف کے قابل تھی اور وہ یہ کہ اس نے ساحل کو اپنے تئیں کافی آرام دہ ماحول میں رکھا ہوا تھا۔ کھانے پینے سے پہننے اوڑھنے تک اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا جارہا تھا۔ کہنے کو وہ اپنے دشمن کی قید میں تھی لیکن اسی قید میں اسے ایوننگ واک کی شاہانہ سہولت بھی حاصل تھی۔ یا اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ربی کوئی اچھا اور بااخلاق آدمی تھا، اس کی وضع داری اور دشمنی میں ایک رکھ رکھاؤ تھا۔ میں اس شخص کی اصلیت کو جانتا تھا، اس کے اندر اتر کر میں نے اس کی حقیقت کو پالیا تھا۔ وہ اوپر سے جتنا عالی مرتبت، وضع دار اور مجسمہ اخلاق دکھائی دیتا تھا، باطن میں وہ اسی قدر گھناؤنا اور سفاک تھا۔ ساحل کے ساتھ وہ اگر اب تک نرمی کا برتاؤ کررہا تھا تو اس کی ایک خاص وجہ تھی۔

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ساحل سے اس کی براہِ راست کوئی دشمنی نہیں تھی۔ مجھے شکار کرنے کے لیے وہ مختلف پھندوں اور پنجروں میں ساحل کو چارے کے طور پر استعمال کررہا تھا۔ اس کی اصل دشمنی مجھ سے تھی۔ وہ جانتا تھا، ساحل میری زندگی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں اس کے پیچھے دوڑا چلا آؤں گا۔

اس کی یہ سوچ بڑی حد تک درست تھی۔ میں دردر کی خاک چھانتے ہوئے بالآخر ساحل کو حاصل کرنے کے لیے اسرائیل میں داخل ہونے ہی والا تھا۔

ہماری دشمنی بھی عجیب تھی۔ وہ تو مجھے دوست بنا کر رکھنا چاہتا تھا، میرا ہی دماغ خراب ہوگیا تھا جو میں نے اس کی دوستی کی قدر نہیں کی اور میرے دماغ کی خرابی کا باعث بھی وہی شیطان تھا۔ میں نے اس کی منافقت اور شیطانی چالوں کو سمجھ لیا تھا اور نتیجے میں، اس کا دوست بننے کے بجائے الٹا دشمن بن کر اسے موقع بہ موقع شدید نقصان پہنچاتا چلا آرہا تھا۔ جس طرح مجھے یقین تھا، میں ایک روز ساحل کو اس کے چنگل سے نکال لوں گا، بالکل ویسے ہی وہ بھی یہ امید لگائے بیٹھا تھا، اسی ساحل کو چارا بنا کر وہ مجھے چھاپ لے گا۔ ساحل پر ساری نوازشات محض اس لیے تھیں کہ اگر بازی پلٹ جائے اور زندگی کے کسی موڑ پر میں اس کی دوستی کا ہاتھ تھامنے کا فیصلہ کرلوں تو وہ ساحل کے ساتھ کیے گئے سلوک کی بنا پر مجھے شرمندہ کرسکے۔

اس کے نرم رویے کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ وہ اپنے اخلاق اور رواداری کے ذریعے ساحل کو متاثر کرنے کے لیے بھی کوشاں تھا۔ اسے امید ہوگی، ممکن ہے کہ ساحل اس سلوک کے نتیجے میں اس کی طرف جھک جائے جس کے ذریعے مجھے جھکانا اس کے لیے آسان ہوجائے! ہنود و یہود ایسی حکمتِ عملی اختیار کرتے رہتے ہیں!

کچھ بھی ہو، میں ربی موشے ہائمن سے خیر اور بھلائی کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے مختلف مواقع پر اس کی درندگی اور سفاکی کے جو مظاہرے دیکھے تھے ان کے پیشِ نظر اس کے بارے میں میری ایک حتمی رائے قائم ہوچکی تھی جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں تھی۔ میں تو اس کم ظرف سے اس کمینگی کی توقع بھی رکھتا تھا کہ اگر کبھی ہمارے درمیان لین دین کے سلسلے میں حساب کتاب کا رجسٹر کھل گیا تو وہ بڑی ڈھٹائی سے ان اخراجات کا تخمینہ لگا کر ایک بل کی صورت میرے ہاتھ میں تھمادے گا جو اس نے ساحل کو "اکاموڈیٹ" کرنے پر اٹھائے تھے!

میرا ذہن اتنی تیز رفتاری سے سوچ رہا تھا کہ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ تیسری آنکھ سے میں ساحل کو واچ کررہا تھا۔ وہ ایوننگ واک کو موقوف کرکے پارک سے باہر نکلی تو مجھے رخشِ خیال کی لگام کو کھینچنا پڑا۔ جب تک وہ چمن میں چہل قدمی کررہی تھی تو دوسری بات تھی، میں خیالات کی ندی میں بہہ کر کہیں کا کہیں نکل جاتا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔

ساحل پارک میں تھی تو پھولوں کے درمیان وہ بھی ایک مہکتا ہوا گل ہی نظر آرہی تھی مگر چمن سے قدم نکال کر وہ سیدھی اس شخص کے قریب پہنچی جس کے ساتھ عمارت کی بالائی منزل سے چل کر وہ پارک تک آئی تھی۔ وہ شخص ساحل کے نزدیک مجھے یوں دکھائی دیتا جیسے پھول کے ساتھ خار ہوتا ہے۔ اب میں اس کا چہرہ واضح طور پر دیکھ چکا تھا۔ اس کے نقش و نگار خالصتاً یہودیوں والے تھے۔ اس حوالے سے وہ ساحل کے ساتھ کسی خار سے کم نہیں تھا۔

ساحل نے اس نگراں شخص کے ساتھ واپسی کی راہ لی تو میں بھی ان کے ماحول میں شامل ہوکر عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔ اب میں سوچنے سے زیادہ غور و فکر کررہا تھا۔ میں نے اپنی مشاہداتی نگاہ کو حد سے زیادہ کھول رکھا تھا اور مجھے کسی ایسے کلیو کی تلاش تھی جو اس بنگلے کے محلِ وقوع کے بارے میں میری راہ نمائی کرتا اور مجھے قوی امید تھی، میں اس تلاش میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔

اس نامعلوم اور بے نام شخص نے ساحل کو بالائی منزل والے بیڈروم میں پہنچا کر دروازے کو باہر سے لاک کردیا، گویا مختصر سی آزادی کے بعد وہ دوبارہ اپنے قفس میں پہنچ گئی تھی۔ میرے اس اندازے کی بھی توثیق ہوگئی کہ اس بیڈروم کے دروازے کو کھولنا اور بند کرنا یعنی مقفل اور غیر مقفل کرنا ساحل کے اختیار میں نہیں تھا!

ساحل ایک مرتبہ پھر اسی ماڈرن پنجرے میں ڈال دی گئی جہاں وہ ایوننگ واک سے قبل قید تھی۔ اب وہاں تک رسائی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا لہٰذا میں اس شخص کے پیچھے لگ گیا جو تھوڑی دیر پہلے ساحل کو سیر کرانے لے کر گیا تھا۔ میں اس یہودی کے ذریعے بنگلے کے ماحول سے باہر نکل کر گرد و نواح کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس بات کی بہرحال توقع کی جاسکتی تھی کہ جلد یا بہ دیر وہ شخص مذکورہ بنگلے سے باہر قدم رکھے گا۔

میں متذکرہ شخص کے ماحول میں پہنچا تو وہ زینے کے قریب کھڑے دو مسلح گارڈز سے گفتگو کررہا تھا۔ واپسی پر ان گارڈز نے ساحل کو اس شخص کے ساتھ دیکھا ضرور تھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اب ان کو بات چیت کرتے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ تینوں آپس میں بڑے گہرے اور بے تکلف دوست ہوں۔ افسوس! میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن نہیں سکتا تھا، محض انہیں ہونٹ ہلاتے دیکھنے پر مجبور تھا۔

بہ مشکل پانچ منٹ تک ان کے مابین مذاکرات ہوئے ہوں گے، اس کے بعد میرا مطلوبہ شخص چکر دار زینہ اترنے لگا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا، وہ زیریں منزل کی طرف جارہا ہے...... اور زیریں منزل کا رخ اختیار کرنے کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جاسکتا تھا کہ وہ بنگلے سے باہر جانے کا ارادہ رکھتا ہے!

میں دم سادھے مذکورہ یہودی کے ماحول سے چپاں رہا۔

وہ دن شاید میرے لیے کامیابیوں کا دن تھا۔ میں سنگاپور ائرلائنز کے طیارے میگا ٹاپ سیون فور سیون میں بیٹھا اپنی زندگی کا اہم ترین کام کررہا تھا۔ یہ پرواز گھنٹا بھر پہلے لندن کے انٹرنیشنل ائرپورٹ سے اڑی تھی اور چند گھنٹے بعد اسے قاہرہ کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترنا تھا۔ یہ ایک نان اسٹاپ فلائٹ تھی۔ شاید یہ اس فلائٹ کی انفرادیت کا اثر تھا کہ مجھے اپنے مقصد میں نان اسٹاپ کامیابی حاصل ہورہی تھی۔

میں تھرڈ آئی کے توسط سے اپنے مطلوبہ شخص کے ماحول

میں شامل رہا۔ وہ محتاط مگر با اعتماد قدموں سے چلتے ہوئے بنگلے کے بیرونی گیٹ پر پہنچا تو میں تصور کی نگاہ سے اس کے ساتھ تھا۔ نیلے رنگ کے گیٹ پر پہنچ کر اس نے مخصوص انداز میں تین مرتبہ دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گیٹ کھل گیا۔ وہ گیٹ سے باہر نکلا تو میں بھی باہر آ گیا۔ آزادی کی اس فضا میں، میں نے گہری ''سانس'' لی!

اس وقت تک رات نے اپنے سیاہ پر پھیلانا شروع کر دیے تھے۔ دن کا اجالا ملگجا ہو گیا تھا اور آثار سے یہی نظر آتا تھا، دس پندرہ منٹ کے بعد چاروں طرف گہری تاریکی چھا جائے گی۔ گیٹ کی بیرونی طرف دو مسلح گارڈ بڑے چوکنا انداز میں پہرا دے رہے تھے۔ میرے ''ڈرائیور'' نے ان پہریداروں کے ساتھ مختصر کلام کیا اور خاموشی سے ایک جانب پیدل ہی چل دیا۔ میں بھی اس کے ہمراہ ہو لیا۔

وہ علاقہ خاموش اور پُرسکون تھا۔ ہر طرف بنگلے دکھائی دیتے تھے۔ وہ سب بنگلے انتہائی شاندار اور وسیع و عریض تھے۔ وہاں کے ماحول میں میرے اندازے کے مطابق شامل سناٹا ایک لاتعلقی اور بے اعتنائی کو ظاہر کرتا تھا۔ ان بنگلوں میں یقیناً صاحب ثروت لوگ رہتے تھے۔ دنیا کے کسی بھی ملک کا پوش رہائشی علاقہ ہو، وہاں بقول شخصے، ایسی ہی ویرانی اور بے رونقی دکھائی دیتی ہے۔

''ڈرائیور'' مجھے جس طرف لے جا رہا تھا، میں اس کی تقلید پر مجبور تھا۔ میں اسے مِس کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ میں ابھی اسرائیل سے کافی دور فضا میں ''پرواز'' کر رہا تھا لیکن تیسری آنکھ کے طفیل اس وقت تل ابیب کے ایک ماڈرن رہائشی علاقے میں بھی موجود تھا لہٰذا اس شخص کے ماحول کو تھامے رکھنا کامیابی کی دلیل تھا۔

وہ یہودی جس انداز میں پیدل چلتے ہوئے ایک طرف جا رہا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا وہ قریب ہی کے کسی بنگلے میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ توقع کی جا سکتی تھی، وہ جس بنگلے میں پہنچے وہاں ربی موشے ہائمن بھی موجود ہو۔ وہ اپنی دن بھر کی کارگزاری کی رپورٹ ربی کو دے اور واپس ساحل والے بنگلے پر آ جائے۔

اگر ایسا ہو جاتا تو میرا کام اور بھی آسانی ہو جانا تھا۔ میں ساحل کے ٹھکانے کے محل وقوع کو اپنے ذہن میں نقش کر چکا تھا۔ ربی کے ٹھکانے کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہو جاتیں تو مجھے اسے ہینڈل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ اس صورت میں، میں قدرے بہتر طور پر پلاننگ کر سکتا تھا۔ اس وقت میرا مشن صرف اور صرف ساحل کی حصول یابی تک محدود تھا۔ اگر ربی کی کسی مداخلت کے بغیر وہ مجھے حاصل ہو جاتی تو میں کسی بھی قسم کی مارا ماری میں پڑے بغیر اسے اپنے ساتھ لے کر رفو چکر ہو جاتا مگر یہ سب پیش آنا اتنا آسان نہیں تھا جتنا سوچتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا، ساحل کا معاملہ ہو اور ربی بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نہ ٹکرائے!

یہ ٹکراؤ تو ہونا تھا اور نہایت ہی خون ریز ہونا تھا۔ ربی موشے ہائمن کے چنگل سے اگر ساحل کو آزاد کرانا اتنا ہی آسان ہوتا تو یہ کام میں بہت پہلے کر چکا ہوتا۔ ابھی تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور سیدھا سادہ نظر آ رہا تھا لیکن کیا پتا، ربی نے ساحل کے سلسلے میں کون کون سے نادیدہ اور خفیہ انتظامات کر رکھے تھے۔ یہ تو اس وقت معلوم ہوتا جب میں بہ نفسِ نفیس اسرائیل میں داخل ہو کر اپنی جان تمنا کی جانب پیش قدمی کرتا اور میں...... اس بار ساحل کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا۔

میرے ''ڈرائیور'' اس یہودی نے پتا نہیں، ذہن میں کیا سوچ رکھا تھا۔ وہ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بنگلے کے درمیان واقع مختلف گلیوں میں سے ہوتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اچانک چابی سے چلنے والا کھلونا بن گیا ہو جو خودکار انداز میں اپنے فنکشن کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے پر مجبور تھا۔

جب وہ بنگلوں والے رہائشی علاقے سے نکل کر قدرے چوڑی سڑک پر آیا تو میں نے سکھ کی سانس لی۔ اس وقت تک رات کی تاریکی پوری طرح پھیل چکی تھی اور تمام لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ وہ جس سڑک پر پہنچا اس کا نام شیرون اسٹریٹ تھا۔ یہاں تک تو وہ پیدل ہی آیا تھا لیکن شیرون اسٹریٹ خاصی کشادہ سڑک تھی جس پر ٹریفک بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے امید تھی، وہ شیرون اسٹریٹ سے کوئی ٹیکسی یا بس پکڑ کر آگے کی طرف روانہ ہو گا لیکن وہ یہودی ہی کیا، جو مسلم کی توقع پر پورا اتر جائے؟ اس قوم نے تو ہمیشہ مسلمانوں کو دھوکے ہی دیے ہیں۔ ان سے کسی بھی موقع پر خیر خواہی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ پتا نہیں، یہ باریک سا نکتہ بعض مسلمانوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا!

میرے ڈرائیور نے شیرون اسٹریٹ پر سانس لینے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر ایک جانب قدم اٹھانے لگا۔ تھوڑا آگے آنے کے بعد وہ ہرمن اسٹریٹ پر مڑ گیا۔ ہرمن اسٹریٹ شیرون اسٹریٹ کے مقابلے میں قدرے کم کشادہ تھی۔ اس اسٹریٹ پر ٹریفک کی رونق بھی زیادہ نہیں تھی مگر میرے

ڈرائیور کو کسی بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ تو اپنی دانست میں شاید پیدل چلنے کا کوئی ریکارڈ قائم کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس دیوانے کا پیچھا نہ چھوڑا اور تھرڈ آئی کے توسط سے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھا۔

ہرمن اسٹریٹ نے جب شالوم اسٹریٹ کو کراس کیا تو اس بندۂ خدا کے قدموں میں مجھے کچھ سستی سی پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ ہرمن اسٹریٹ کو چھوڑ کر شالوم اسٹریٹ پر آ گیا اور قدرے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس کی حالیہ رفتار سے اندازہ ہوتا تھا، وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس خیال نے میرے اندر اطمینان کی لہر دوڑا دی۔

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے شالوم اسٹریٹ کو چھوڑ کر ایک ذیلی گلی میں مڑ گیا اور پھر اس وقت میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی جب ''بہائی گارڈن اپارٹمنٹس'' کے سامنے اس کے قدموں کو بریک لگ گئے۔

''بہائی گارڈن'' ایک دس منزلہ اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ وہ مذکورہ بلڈنگ میں داخل ہو گیا۔ میں چونکہ اس کے ماحول کا حصہ تھا اس لیے میں بھی بہائی گارڈن کے اندر پہنچ گیا پھر ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں داخل ہو گئے۔

ستائیس۔ سی میں قدم رکھتے ہی مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہاں پہلے سے ایک شخص موجود تھا۔ میری حیرت کے دو بڑے اسباب تھے۔ نمبر ون' میرا ''ڈرائیور'' اپارٹمنٹ کا لاک کھول کر اندر آیا تھا۔ کسی بند اپارٹمنٹ میں ایک شخص کا موجود ہونا نارمل بات نہیں تھی۔ نمبر ٹو، اپارٹمنٹ میں پہلے سے موجود شخص میرے ڈرائیور سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک شخص کو دو جگہ دیکھ رہا ہوں!

میں خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات کو نوٹ کرنے لگا۔ وہ دونوں بڑی عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے پہلے کو، دوسرے کی آمد کا شدت سے انتظار ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے، میرے ساتھ آنے والے نے دونوں ہاتھ اپنے سر کی جانب اٹھائے اور بالوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی کو سر سے جدا کر دیا۔ درحقیقت اس نے وگ اتاری تھی۔ اب مجھے اس کے گھنے بالوں کا راز معلوم ہو گیا۔ وگ ہٹ جانے کے بعد اس کا اصل سر اور سر کے اصل بال سامنے آ گئے۔ اس کی چندیا سامنے سے نکل آئی تھی اور وہاں پر واضح ''ایم'' بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

دوسرے شخص کی کیفیت بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ اس نے میرے ''ڈرائیور'' سے وگ لے کر اپنے سر پر جمائی تو وہ ہو بہو میرا ڈرائیور بن گیا۔ اس کے بعد انہوں نے لباس تبدیل کیے اور میرے ڈرائیور کی آنکھوں سے نکلنے والے کانٹیکٹ لینس جب دوسرے نے اپنی آنکھوں میں لگائے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی شخصیت کو اتنی تیزی سے اپنایا کہ میں ہکا بکا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ وہ جو کچھ بھی کر رہے تھے یقیناً اس کا کوئی خاص مقصد تھا لیکن میں ان کے مقصد سے واقف نہیں تھا اس لیے حیرت اور دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

وہ اس تیاری کے دوران میں، آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے لیکن مجھے سخت افسوس ہے، میں ان کی گفتگو کو سن سکتا تھا اور نہ ہی سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا ورنہ میں اب تک جان چکا ہوتا کہ وہ کس ٹاپ مشن پر ہیں۔ مجھے اپنی مجبوری کو دیکھتے ہوئے ان کے اگلے اقدام کا انتظار کرنا تھا۔ ان میں سے جو بھی اپارٹمنٹ سے باہر نکلتا، میں اس کا ماحول پکڑ کر تعاقب میں لگ جاتا، پھر ان کا مقصد مجھ سے چھپا نہ رہتا۔

میں توقع کر رہا تھا، ان میں سے ایک اپارٹمنٹ کے اندر موجود رہے گا اور دوسرا باہر نکلے گا لیکن انہوں نے اس وقت میری توقع کی ایسی کم تیسی پھیر دی جب وہ ایک ساتھ دروازے کی جانب بڑھے۔ وہ چند سیکنڈ کے وقفے سے اپارٹمنٹ سے نکلے اور تھوڑا فاصلہ رکھ کر تیز قدموں سے چلتے ہوئے شالوم اسٹریٹ پر نکل آئے۔ ان کے انداز میں ایک خاص قسم کی بے گانگی اور اجنبیت پائی جاتی تھی۔ شالوم اسٹریٹ کے اختتام پر وہ لمحے بھر کو رکے پھر انہوں نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں چکرا کر رہ گیا۔

میرا ڈرائیور تو شالوم اسٹریٹ سے بائیں جانب مڑ گیا جب کہ دوسرے شخص نے دائیں طرف ہرمن اسٹریٹ کو پکڑ لیا۔ یہ بڑی واہیات صورت حال تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' کس کو چھوڑوں اور کس کا تعاقب کروں! وہ دونوں ہی اچانک بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ پتا نہیں' وہ کس خفیہ مشن کے تحت حرکت کر رہے تھے۔ دونوں نے بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں جس طرح ایک دوسرے کی شخصیت کو اپنایا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' ہرمن اسٹریٹ کا رخ کرنے والا شخص سیدھا اس بنگلے میں پہنچے گا جہاں بالائی منزل پر میری ساحل کو رکھا گیا تھا۔ اس ہنگامی تبدیلی اور روانگی سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا' ساحل والے بنگلے میں موجود دیگر افراد کو بھی بہت سی باتوں سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ میں نے ایک امکان ظاہر کیا ہے' ویسے جس طرح حیرت انگیز طور پر تیزی سے حالات تبدیل ہو رہے تھے اس کے پیش نظر کوئی حتمی رائے

[قا]ئم کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ہرمن اسٹریٹ پر مڑنے والا شخص اگر واقعی۔۔۔ ہل والے [بنگ]لے کی طرف جا رہا تھا تو میں اسے بعد میں بھی ٹریس کر سکتا [تھا]۔ اس بنگلے کے ماحول تک رسائی اب میرے لیے مشکل [نہ]یں رہی تھی۔ سردست میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس شخص کا [پیچھ]ا پکڑ لوں جو مجھے ساحل کے پاس سے یہاں تک لے کر آیا [تھ]ا۔ اس نے اگر اپنی پہلے والی شخصیت میں کوئی تبدیلی کر لی تھی [تو] اس سے کیا فرق پڑتا ہے' ویسے آثار تو یہی بتاتے تھے' بہائی [گا]رڈن اپارٹمنٹس سے نکلنے سے پہلے وہ اپنی اصلی شخصیت میں [آ] گیا تھا۔

ایک بات مسلسل میرے ذہن کو الجھا رہی تھی کہ آخر [ا]سے یہ چکر چلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا مستقبل [قری]ب میں ساحل کسی نئے ہنگامے کا منہ دیکھنے والی تھی؟ اگر یہ [س]ب کچھ ربی موشے ہائمن کے اشارے پر نہیں ہو رہا تھا تو پھر [ا]س سیٹ اپ کی ڈوریاں ہلانے والا شخص کون تھا؟

میں نے ان تمام تر پریشان کن سوالات کو ذہن سے جھٹکا [او]ر پلک جھپکتے میں اپنے ڈرائیور کے ماحول میں پہنچ گیا۔ میں [اس] شخص کا نام نہیں جانتا تھا چنانچہ شناخت کی خاطر میں اسے [با]ر بار ''ڈرائیور'' کہہ رہا ہوں۔ ویسے یہ ٹائٹل اس پر فٹ بیٹھتا [تھ]ا۔ میں نے اس کی ڈرائیوری میں بڑا سنسنی خیز سفر کیا تھا۔

میں ڈرائیور کے ماحول میں اترا تو وہ ایک نئی اسٹریٹ [می]ں داخل ہو رہا تھا۔ جلد ہی میں اس اسٹریٹ کا نام جاننے [می]ں کامیاب ہو گیا۔ وہ افرائم اسٹریٹ تھی۔ بعد میں مجھے [م]علوم ہوا' افرائم اسٹریٹ تل ابیب کی ایک معروف سڑک [ہے]۔ ڈرائیور اس اسٹریٹ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ پیدل کیوں چلا جا رہا تھا۔ اس کے قریب سے میں نے ٹیکسیوں اور دیگر پبلک ٹرانسپورٹ کو گزرتے دیکھا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو کوئی سواری پکڑ کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا اور معقولیت بھی [یہی] تھی لیکن اس کی حرکات و سکنات یہ ظاہر کرتی تھیں کہ اسے پیدل مارچ کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے!

پتا نہیں' یہ اس کے پروگرام کا حصہ تھا یا اس نے میری [موجو]دگی کو ''بھانپ'' لیا تھا۔ جلد ہی وہ افرائم اسٹریٹ کو چھوڑ کر [ب]ن یہودہ اسٹریٹ پر آ گیا۔ بن یہودہ اسٹریٹ پر زیادہ تر [کمر]شل بلڈنگز اور ہوٹل استادہ تھے۔ ڈرائیور کی سست ہوتی رفتار سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اسی اسٹریٹ کی کسی عمارت میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

وہ بن یہودہ اسٹریٹ کی عمارتوں کو بہ غور دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ میں چونکہ اس کے ماحول میں موجود تھا لہٰذا وہ سب کچھ مجھے بھی نظر آ رہا تھا۔ میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے پہلے بھی کئی مناظر دیکھے تھے لیکن آج اس باطنی آنکھ کے استعمال میں جو لطف آ رہا تھا وہ پہلے کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں ان لمحات میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ قربِ یار کا اپنا ہی ایک مزہ ہوتا ہے!

ڈرائیور بن یہودہ اسٹریٹ پر' ہوٹل ٹاپ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ ''ہوٹل ٹاپ'' اس اسٹریٹ کی دوسری جانب استادہ تھا۔ وہ ہوٹل ٹاپ کو ایسی نظر سے دیکھ رہا تھا کہ میں سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اسے اسی ہوٹل میں جانا ہے لیکن اگلے ہی لمحے ایک مرتبہ پھر اس نے میری توقع پر پانی پھیر دیا۔

وہ تھکے ہوئے قدموں سے چلتے ہوئے تھوڑا اور آگے بڑھ آیا اور بن یہودہ اسٹریٹ کے کنارے ایک جگہ رک گیا۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ وہ مقام ''بس اسٹاپ'' تھا۔ اب اس بات میں شک کی گنجائش باقی نہ رہی کہ وہ کسی بس پر سوار ہو کر کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ کہاں؟ اس سوال کا جواب بعد ہی معلوم ہو سکتا تھا! میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈرائیور کی مطلوبہ بس اسٹاپ پر آ کر رکی۔ میں اس بس کا نمبر دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ روٹ نمبر دو سو بائیس کی بس تھی۔ میں نہیں جانتا تھا' ٹریل ٹو روٹ کی یہ بس ڈرائیور کو لے کر کہاں جائے گی۔ البتہ بن یہودہ اسٹریٹ کی رونق اور چکاچوند سے میں نے اندازہ لگا لیا' وہ علاقہ تل ابیب کا مرکزی حصہ یعنی ''سٹی سینٹر'' تھا۔

تھرڈ آئی کے ذریعے سفر کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کہیں بھی آنے جانے کے لیے کوئی ٹکٹ وغیرہ نہیں لینا پڑتا اور نہ ہی مسافر کو بیٹھنے کے لیے کسی سیٹ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ڈرائیور کے پیچھے پیچھے میں بھی بس نمبر ''222'' پر سوار ہو گیا۔ اس سفر کا اختتام بن گورین ائرپورٹ پر ہوا۔

ڈرائیور کے ساتھ ہی میں بھی بس سے نیچے اتر آیا' ''بن گورین'' تل ابیب کا انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔ وہ شخص اگر ائرپورٹ پہنچا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا' وہ تل ابیب سے باہر کہیں جانا چاہتا تھا۔

انسان کو جو شے حاصل نہیں ہوتی وہ اپنی فطرت کے عین مطابق اس کی محرومی کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ان لمحات میں مجھے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ میں تھرڈ آئی کے ساتھ ساتھ تھرڈ ایر کو استعمال کرنا کیوں نہیں جانتا۔ اگر میں تیسرے کان (تھرڈ ایر) کے استعمال پر قدرت رکھتا تو یہ معلوم

کرنے میں ضرور کامیاب ہوجاتا کہ ڈرائیور اس وقت کہاں اور کیوں جارہا تھا؟ بہائی گارڈن اپارٹمنٹس کے اپارٹمنٹ نمبر ''ستائیس-سی'' میں ان دونوں افراد نے پندرہ بیس منٹ تک تبادلۂ خیال کیا تھا۔ یقیناً اس گفتگو میں یہ امور بھی ڈسکس ہوئے ہوں گے۔

جلد ہی میں یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا کہ ڈرائیور تل ابیب سے باہر کہیں نہیں جارہا تھا' بلکہ وہ کسی کو ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ پہنچا تھا۔ اب اس کے ساتھ ہی مجھے بھی ارائیول لاؤنج میں انتظار کرنا تھا۔ اس نازک موقع پر میں اسے چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاسکتا تھا۔

اس انتظار نے زیادہ طوالت نہیں کھینچی اور مسافر یکے بعد دیگرے باہر آنے لگے۔ ڈرائیور بڑے حساب کتاب سے ائرپورٹ پہنچا تھا۔ وہ ایک ایک مسافر کے چہرے کو بہ غور' گہری سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے کسی مخصوص چہرے کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔

پھر یہ انتظار بھی اختتام پذیر ہوا۔ ڈرائیور کے مطلوبہ مسافر کا چہرہ نمودار ہوا تو وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ میں نے بھی اس مسافر کو دیکھ لیا تھا اور یہ دیکھنا بڑا سنسنی خیز تھا۔ میری نگاہ نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پہچان کے تمام مراحل طے کرلیے۔ شناسا چہرے والا وہ شخص پُر وقار انداز میں چلتے ہوئے ڈرائیور کے قریب پہنچا۔ میں اس وقت ڈرائیور کا سایہ بنا ہوا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ میرے نزدیک پہنچا۔ دوسرے ہی لمحے ہم ایک دوسرے کے روبہ رو کھڑے تھے۔

اسی لمحے سب کچھ ختم ہوگیا۔ میری تھرڈ آئی کے سامنے پھیلا ہوا ارائیول لاؤنج کا منظر کسی بجھتی ہوئی شمع کی لو کے مانند پھڑپھڑایا اور گہری تاریکی چھا گئی۔ جلد ہی اس گڑبڑ کا سبب بھی میری سمجھ میں آگیا۔

صوفیہ کندھا تھپکتے ہوئے مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کے اس عمل میں خاصی شدت تھی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں اور گردن موڑ کر الجھن زدہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔ اس نے کہا ''یوسف! کیا تم ساری زندگی کی نیند جہاز ہی میں پوری کرلو گے؟''

''ابھی آتا ہوں!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا اور دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔

اگلے ہی لمحے میں ربی موشے ہائمن کے ماحول کو چھونے کی کوشش کرنے لگا!

اس کوشش کے سلسلے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ ارائیول لاؤنج کے جس منظر کو صوفیہ کی ''تھپکی'' نے زیر زبر کردیا تھا' اس ماحول میں داخل ہونے کے لیے میں ایک کھڑکی کھلی چھوڑ آیا تھا اور اس کھڑکی کا علامتی نام تھا۔ ڈرائیور!

میں نہیں جانتا تھا' ربی موشے ہائمن کہاں سے آرہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا' وہ اسرائیل کے کسی دوسرے شہر سے تل ابیب پہنچا ہو اور یہ بھی ناممکن نہیں تھا' وہ کسی اور ملک سے واپس اسرائیل آرہا ہو۔ بہرحال' میں ربی کا وسیلہ استعمال نہیں کرسکتا تھا چنانچہ اپنے ''ڈرائیور'' پر تکیہ کیا اور اس کے خال و خط کو تھرڈ آئی کے سامنے ابھارنے کے بعد میں ایک مرتبہ پھر بن گورین ائرپورٹ کے ارائیول لاؤنج میں پہنچ گیا۔

اس بار ارائیول لاؤنج کے منظر میں مجھے تھوڑی تبدیلی دکھائی دی۔ ڈرائیور' ربی کے ساتھ ایک طرف ہٹ کر کھڑا نظر آیا۔ میں نے اندازہ لگایا' وہ نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں ربی کو کوئی اہم رپورٹ پیش کررہا تھا۔ افسوس! میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ سماعت نہیں کرسکتا تھا۔

میٹنگ جلد ہی ختم ہوگئی۔ ربی نے سر کو خفیف سی اثباتی جنبش دی اور اسی پُروقار انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائیو وے کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے ڈرائیور کے ماحول میں رہتے ہوئے دیکھا اسی لمحے ڈرائیو وے میں ایک چم چماتی ہوئی لمبی سیاہ گاڑی ... آکر رکی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ربی نے اس گاڑی کی آمد پر ہی ڈرائیور سے میٹنگ ختم کی تھی۔ یہ گاڑی یقیناً ربی کو ائرپورٹ سے ریسیو کرنے آئی تھی۔ مذکورہ گاڑی بیش قیمت اور ٹنٹیڈ گلاسز کی حامل تھی۔ اس کی کھڑکیوں میں نصب سیاہ شیشوں کے اس پار یعنی گاڑی کے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ اندھے شیشے دیکھنے والی آنکھ کی راہ میں تاریک رات بن کر کھڑے ہوجاتے' گویا دیکھنے والے کو اندھا کرکے رکھ دیتے تھے۔

ربی گاڑی کے نزدیک پہنچا تو اس کی عقبی نشست والا دروازہ خودکار نظام کے تحت کھل گیا۔ یقیناً اس گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص نے کوئی بٹن دبا کر یہ سہولت فراہم کی تھی۔ ربی بہ آہستگی گاڑی کے اندر بیٹھ چکا تو میری باطنی نگاہ کو واپسی کی راہ لینا پڑی۔ ربی نے جیسے ہی گاڑی کا دروازہ بند کیا' وہ میری نظر سے اوجھل ہوگیا۔ اب میں اپنے ڈرائیور کے توسط سے محض ایک چم چماتی قیمتی سیاہ گاڑی کو دیکھ رہا تھا جو ربی کے اندر پہنچتے ہی تیزی سے حرکت میں آگئی تھی۔

اس گاڑی کا حرکت میں آنا اس بات کی دلیل تھا کہ ربی اس سیاہ گاڑی سمیت میری تھرڈ آئی کے فریم سے نکلنے ہی والا ہے۔ اس صورتِ حال نے مجھے بوکھلا دیا۔ اگر میں ربی کے ماحول کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا تو یہ جاننے میں کامیاب ہوسکتا تھا' وہ اپنے جس ٹھکانے پر جارہا ہے وہ تل ابیب میں کس مقام پر واقع ہے!

اسی دوران میں' میں نے محسوس کیا کہ میرا ڈرائیور نہایت ہی تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ائرپورٹ پارکنگ کی طرف جارہا تھا۔ اس کی اس حرکت سے مجھے حیرت بھی ہوئی۔ وہ میری باطنی نگاہ کے سامنے ہی بن یہودہ اسٹریٹ سے بس نمبر دو سو بائیس میں سوار ہوکر ائرپورٹ پہنچا تھا۔ اب وہ کار پارکنگ میں پتا نہیں' کیا لینے جارہا تھا؟ بہرحال' ربی تو اندھے شیشوں والی سیاہ گاڑی میں سوار ہوکر کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوگیا تھا' میں نے اپنے ڈرائیور کا پیچھا پکڑے رکھا۔ اب میری ساری امیدیں اسی سے وابستہ تھیں!

ڈرائیور گرے رنگ کی ایک کار میں بیٹھ کر پارکنگ ایریا سے نکلا تو میں بھی تھرڈ آئی کے توسط سے اس کی کار میں موجود تھا۔ اس بات پر میرا ذہن الجھ رہا تھا کہ اس کی گاڑی ائرپورٹ پارکنگ لاٹ میں موجود تھی اور وہ کبھی پیدل اور کبھی پبلک بس میں سوار ہوکر ائرپورٹ تک پہنچا تھا۔

جلد ہی اس نے گاڑی کو پارکنگ سے نکالا اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس روڈ پر چل پڑا جو سٹی سینٹر سے ائرپورٹ کی طرف آتی تھی۔ ''تریپل تو'' روٹ کی بس اسی سڑک سے ائرپورٹ پہنچی تھی۔ یہ ایک کشادہ ہائی وے تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق' بن گورین ائرپورٹ سٹی سینٹر سے لگ بھگ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ازاں بعد عملی تجربے سے مجھے معلوم ہوا' مذکورہ فاصلہ بارہ میل یعنی انیس کلومیٹر تھا۔

ہائی وے پر ڈرائیور نے گرے گاڑی کو ایسا بھگایا کہ چند منٹ بعد مجھے اپنے آگے ربی والی سیاہ گاڑی دکھائی دینے لگی۔ یہ ایک اطمینان بخش اور خوش آیند صورتِ حال تھی۔ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی اور تیسری آنکھ کے طفیل ڈرائیور کے ساتھ گرے گاڑی کے اندر موجود رہا۔ ڈرائیور کے تیور بتاتے تھے' وہ سیاہ گاڑی سے تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرے گا۔ تھوڑی دیر پہلے میں ربی کو ''اپنی نگاہ'' سے اوجھل ہوتے دیکھ کر جو مایوس ہوا تھا' اس نئی صورتِ حال نے وہ کیفیت زائل کردی۔ موجودہ سیٹ اپ بڑا اطمانیت بخش اور

ٹیلی پیتھی
کی جدید
تحقیقات
(باتصویر)
[illegible] اسلام حسین
ٹیلی پیتھی کے موضوع پر جدید ترین اور مکمل کتاب
نئے طریقے، نئی مشقیں، سوال و جواب
کتاب کے چند عنوانات
➤ ٹیلی پیتھی ایک علم، ایک سائنس
➤ ٹیلی پیتھی کا ماضی اور حال
➤ ہفتے کے ساتوں دن کرنے والی مختلف مشقیں
➤ ٹیلی پیتھی میں یوگا کا استعمال
➤ غیر معمولی حس ادراک اور روحانی قوتیں
➤ مستقبل کی پیش گوئی
قیمت:-/45 روپے
ڈاک خرچ:-/23 روپے
کتابیات پبلی کیشنز
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 5802552-5895313 فیکس 5802551
kitabiat1970@yahoo.com
رابطے کیلئے: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین روڈ کورنگی روڈ کراچی

حوصلہ افزا تھا۔ گرے گاڑی کے اندر میری موجودی کوئی اہم خبر لانے والی تھی!

ڈرائیور ایک محدود فاصلے سے سیاہ گاڑی کے پیچھے لگا رہا۔ اس کا انداز حفاظت اور نگرانی ایسا تھا۔ دونوں گاڑیوں نے آگے پیچھے سفر کرتے ہوئے ہائی وے کو چھوڑ دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ بن یہودہ اسٹریٹ پر تھیں' پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ افرائم اسٹریٹ' شالوم اسٹریٹ' ہرمن اسٹریٹ اور شیرون اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے اس رہائشی علاقے میں پہنچ گئیں جہاں سے میں نے اس ڈرائیور کی ''معیت'' میں ایک پُرتجسس اور حیرت انگیز سفر کا آغاز کیا تھا۔

اس وقت تو میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب ربّی والی سیاہ گاڑی پُرسکون رہائشی علاقے کی مختلف گلیوں میں سے گھومتے ہوئے اس نیلے گیٹ کے سامنے پہنچ گئی جس بنگلے کی بالائی منزل کے ایک بیڈروم میں میری ساحل کو رکھا گیا تھا۔ چندگز کے فاصلے سے ڈرائیور نے گرے گاڑی کو بھی بنگلے کی دیوار کے ساتھ روک لیا۔ میں چونکہ اس گاڑی کے ''اندر'' حاضر تھا لہٰذا ڈرائیور کا ماحول مجھے نیلے گیٹ کا منظر بڑی وضاحت سے دکھا رہا تھا۔

بنگلے کا نیلا گیٹ فوراً سے پیش تر کھول دیا گیا اور ربی سیاہ گاڑی سمیت بنگلے کے اندر داخل ہوگیا' گویا ایک مرتبہ پھر وہ میری نگاہ سے اوجھل ہوگیا تھا۔ میرے ڈرائیور نے اس کے پیچھے اپنی گاڑی کو بنگلے کے اندر نہیں پہنچایا بلکہ گاڑی کو بنگلے کی دیوار کے ساتھ ہی چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا پھر گیٹ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میں بھی ''دبے قدموں'' اس کے ساتھ ہولیا۔

گیٹ پر متعین گارڈز نے اسے بنگلے کے اندر جانے سے نہیں روکا۔ اس کا مطلب تھا' وہ مسلح گارڈز اس کے صورت آشنا تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ایک بھاری وگ کے ساتھ قدرے مختلف حلیے میں اس بنگلے سے نکلا تھا اور ان گارڈز نے اس وقت بھی ایسے ہی دوستانہ رویے کا مظاہرہ کیا تھا۔ عقل یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ وہ گارڈز اس ایک شخص کے دو حلیوں سے واقف ہوں گے۔ حالات یہی بتاتے تھے گارڈز کے مطابق' جو شخص گیا تھا وہ کوئی اور تھا اور یہ جو آیا ہے' کوئی اور شخص ہے۔ میں انہی خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا اس بنگلے میں دوسری بار داخل ہوگیا۔

اسی لمحے مجھے اس شخص کا خیال آ گیا' بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں جس نے وگ اور لینس وغیرہ لگا کر میرے ڈرائیور کا روپ اختیار کیا تھا جب وہ شالوم سے ہرمن اسٹریٹ کی طرف مڑا تھا تو میں نے یہی سوچا تھا' وہ میرے ڈرائیور کی جگہ لینے ساحل والے بنگلے میں پہنچے گا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا' موقع ملتے ہی میں تھرڈ آئی کے توسط سے اس طرف جھانکوں گا لیکن افسوس کہ مجھے اتنی مہلت میسر نہیں آئی تھی۔ ڈرائیور جس ڈرامائی انداز میں بن گورین ائرپورٹ پہنچا اور وہاں جس سنسنی خیز منظر نے میری تھرڈ آئی کے قدم پکڑ لیے وہ بیان سے باہر ہے...... اور اب بھی لگ بھگ وہی صورتِ حال تھی!

میں چاہتا تو اس شخص کے ماحول میں جھانک کر اپنے اندازے کی تصدیق کر سکتا تھا مگر اس وقت بھی اور اس وقت بھی ربی موشے ہائمن سب سے زیادہ اہم تھا اور میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی چھوڑ کر کہیں ادھر ادھر نہیں ہو سکتا تھا۔ جب میں ڈرائیور کے ساتھ اس بنگلے کی رہائشی عمارت کے قریب پہنچا تو ربی گاڑی میں سے نکل کر عمارت کی زیریں منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم دونوں بھی اندر پہنچ گئے۔ یہ میری زندگی کا تحیر آمیز اور ناقابلِ فراموش سفر تھا!

ڈرائیور نے بنگلے کی زیریں منزل میں بمشکل دس منٹ گزارے ہوں گے پھر وہ ربی سے رخصت لے کر واپس جانے لگا تو میں ایک مرتبہ پھر الجھ کر رہ گیا۔ ربی زیریں منزل کے ایک بیڈروم میں بند ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ میں ڈرائیور کے بغیر اس کے ماحول میں رہ نہیں سکتا تھا لہٰذا مجبوراً مجھے بھی بنگلے سے نکلنا پڑا۔ پھر جب ڈرائیور گرے گاڑی میں بیٹھ کر کہیں روانہ ہونے لگا تو میں اس کے ماحول سے نکل آیا۔

ربی' ساحل والے بنگلے میں پہنچا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا' وہ جلد یا بدیر ساحل کے پاس بھی جائے گا۔ میں ساحل کے ماحول میں رہتے ہوئے ربی کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے تھرڈ آئی کو زحمت دی اور اس بنگلے کی بالائی منزل پر واقع ساحل کے بیڈروم میں پہنچ گیا۔

میں نے ساحل کو کھانے کے ساتھ مصروف عمل دیکھا۔ وہ اس وقت کمرے میں اکیلی ہی تھی اور بڑے خشوع وخضوع سے ڈنر لے رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور آسودگی جھلکتی تھی۔ لگتا تھا' وہ اس سیٹ اپ میں بڑی پُرسکون ہو لیکن میں جانتا تھا' اس کا یہ ٹھہراؤ اور طمانیت حالات سے ایک عارضی مصالحت تھی...... وہ حالات جو موشے ہائمن کے جبر نے اس کے سامنے پھیلا رکھے تھے۔ مجھے یقین تھا' وہ ایک پل بھی ربی کی قید میں گزارنے کی روادار نہیں ہوگی۔ ربی نے اسے جس خوبصورت اور راحت بخش قفس میں ڈال

رکھا تھا وہ اس کے لیے کانٹوں کے بستر سے کم نہیں ہوگا۔ وہ اس آرام دہ بیڈروم میں ایک ایک دن گن کر گزار رہی ہوگی اور ہر پل وہاں سے نکلنے کی خواہش کرتی ہوگی!

میں پندرہ بیس منٹ تک ساحل کے ماحول میں رہا۔ اس نے ڈنر ختم کیا پھر واش روم میں جا کر برش کرنے لگی۔ فریش اپ ہونے کے بعد اس نے شب خوابی کا مخصوص لباس زیب تن کیا اور بیڈروم میں ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف ٹہلنے لگی۔ میں سمجھ گیا' وہ رات کے کھانے کے بعد کی واک کر رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا' تھوڑی دیر بعد وہ سونے کے لیے بستر پر دراز ہو جائے گی۔ اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا' فی الحال ربی کا اس کی طرف آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

ساحل کی چہل قدمی کے دوران ہی میں ایک مرتبہ بیڈروم کا دروازہ کھلا اور کھلے ہوئے دروازے میں مجھے وہی شخص کھڑا دکھائی دیا جو بہائی گارڈن اپارٹمنٹس سے میرے ڈرائیور کا روپ دھار کر ہرمن اسٹریٹ کی طرف گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی یہ ثابت ہوگیا' وہ میرے ڈرائیور کا کردار ادا کرنے کے لیے اس بنگلے میں پہنچ گیا تھا۔

مذکورہ شخص ساحل کے بیڈروم سے کھانے کے خالی برتن اٹھانے آیا تھا۔ برتن حاصل کرنے کے بعد اس نے بیڈروم کا دروازہ بند کر کے اسے لاک کر دیا' ساحل اس پُرآسائش بندی خانے میں قید ہوگئی۔ میں متذکرہ بالا شخص کے ساتھ ساتھ کچن میں پہنچا۔ یہ کچن عمارت کی بالائی منزل پر ہی تھا۔ کچن میں ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مخصوص شیف کیپ لگا رکھی تھی جس سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ اس بنگلے میں کک (باورچی) کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ ایک عام سی شکل صورت کا مالک یہودی تھا جس کی عمر کا اندازہ میں نے پچپن اور ساٹھ کے درمیان لگایا تھا۔

ڈرائیور کا رول ادا کرنے والا شخص کھانے کے جھوٹے برتن کچن میں پہنچا کر باہر نکلا تو میں نے چند لمحات وہیں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں باورچی کے خال وخط کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہتا تھا۔ بنگلے کے سیٹ اپ میں وہ سب سے زیادہ غیر اہم دکھائی دیتا تھا لیکن ایسے افراد ہی بعض اوقات سب سے زیادہ اہم اور مفید ثابت ہوتے ہیں لہٰذا اس کے حلیے اور نقش ونگار کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا بہت ضروری تھا۔ جب تک اس عمارت میں کوئی ایک شخص بھی قیام پذیر تھا' کھانا بہرحال پکنا تھا یعنی اس باورچی کو وہاں موجود رہنا تھا۔ اگر میں بنگلے کے اس ''گیٹ'' کو اپنی تھرڈ آئی میں ''کھلا'' رہنے دیتا تو میری آمد ورفت کے راستے میں کوئی بھی رکاوٹ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے ''کام'' سے فارغ ہونے کے بعد میں کچن سے باہر نکل آیا۔

اب میں اس شخص کے ماحول میں تھا جو بہائی گارڈن اپارٹمنٹس سے یہاں پہنچا تھا اور میرے ڈرائیور کا رول بڑی کامیابی سے ادا کر رہا تھا۔ وہ اس وقت بالائی منزل والے گارڈز کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھا۔ وہ خاصے بے تکلف انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہی بے تکلفی اس سے پہلے میں نے ڈرائیور اور سکیورٹی گارڈز کی بات چیت میں بھی دیکھی تھی۔ میں ابھی تک اس حتمی فیصلے تک نہیں پہنچا تھا کہ میرا ڈرائیور اس شخص کا کردار ادا کر رہا تھا یا وہ ڈرائیور کی جگہ لے کر اس کی کمی کو پورا کر رہا تھا۔ افسوس کہ میں ان کی باتیں سماعت نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے ایک بات تو نظر آ رہی تھی' وہ دونوں سکیورٹی گارڈز اسے ایک ذرا بھی شک کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے تھے۔

میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور تیسری آنکھ کے ذریعے تخیلاتی پرواز کرتے ہوئے اپنے یہودی ڈرائیور کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اپنی گرے گاڑی کو پارک کرنے کے بعد پارکنگ لاٹ سے باہر آ رہا تھا۔ جلد ہی میں یہ جاننے میں کامیاب ہوگیا' وہ ''ہوٹل ٹاپ'' کی اسٹاف پارکنگ تھی۔ میں اس حیران کن شخص کی اس تازہ حرکت پر ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ رہ گیا۔

جب میں اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا اور وہ ساحل والے بنگلے سے نکل کر ائرپورٹ کی طرف جا رہا تھا تو بن یہودہ اسٹریٹ پر وہ ہوٹل ٹاپ کے سامنے بھی رکا تھا۔ اس وقت میں اس کے انداز سے یہی سمجھا تھا' اسے ہوٹل میں کوئی کام ہے لیکن اس نے میری توقع پر پانی پھیر دیا تھا اور اب ......تو میں پورے یقین سے کہہ سکتا تھا وہ کسی خاص کام سے ہی یہاں آیا تھا۔ میں بڑے تسلی بخش انداز میں اس سے چپکا رہا۔ ہوٹل کی اسٹاف پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرنا بھی میرے ذہن میں ایک نئے تجسس کو جگا رہا تھا۔

وہ ہوٹل ٹاپ کے اسٹاف روم میں پہنچا اور اس نے ایک مجلد رجسٹر میں دستخط کیے۔ اس سے ایک بات واضح ہوگئی اور وہ یہ کہ وہ شخص اس ہوٹل کے باقاعدہ اسٹاف میں شامل تھا۔ جب وہ رجسٹر کے ایک صفحے پر اپنے نام کے سامنے دستخط کر رہا تھا تو میں ایک نہایت ہی اہم بات جاننے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اس کے ماحول میں رہتے ہوئے' اسی کی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے کسی ''سلوان'' کے سامنے چڑیا

بٹھائی تھی۔ گویا وہ سلوان کی حیثیت سے اس ہوٹل میں کام کرتا تھا۔

ویسے کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ سلوان اس شخص کا نام بھی ہوسکتا تھا جو اس وقت ساحل والے بنگلے میں ڈرائیور کی جگہ ''ڈیوٹی'' نبھا رہا تھا جب تک یہ معلوم نہ ہوجاتا کہ کون کس کی اداکاری میں مصروف ہے' کوئی حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا' دونوں ہی ایک دوسرے کی ڈیوٹی نبھا رہے ہوں اور یہ بھی عین ممکن تھا' وہ دونوں اپنے اپنے کام سے لگے ہوئے ہوں۔

یہ ایک ذہن کو الجھا دینے والی صورتِ حال تھی اور فی الحال مجھے اپنے ذہن کو بالکل نہیں الجھانا تھا۔ میں نے اس ڈرائیور کا نام سلوان فرض کرلیا اور اس کے ساتھ چپک کر ہوٹل کے کچن میں پہنچ گیا پھر جب وہ لباس تبدیل کرکے کچن میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کام میں مصروف ہوگیا تو میں نے اس کے ماحول کو خیر باد کہہ دیا۔ میں جس کم بخت کو ڈرائیور کہتا آیا تھا' وہ آخر کو باورچی نکلا!

سلوان نے رات نو بجے (اسرائیل کے مقامی وقت کے مطابق) ڈیوٹی جوائن کی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا' وہ صبح سے پہلے ہوٹل سے آف نہیں ہوگا۔ مجھے کھانا پکتے ہوئے اور باورچیوں کو کھانا پکاتے ہوئے دیکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا اس لیے ہوٹل ٹاپ کے کچن میں وقت برباد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں اس شخص کے ماحول میں پہنچ گیا جسے دو سکیورٹی گارڈز کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف چھوڑ کر گیا تھا۔

وہ اب بھی اسی طرح ماحول بنائے بیٹھے تھے۔ میں دس پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہا کہ ان میں سے کوئی زیریں منزل تک جائے تاکہ میں ربی کی کوئی تازہ بہ تازہ خبر لے سکوں مگر انہوں نے میری توقع کو پورا کرنے والی کوئی حرکت نہیں کی اور نہ زیریں منزل سے کوئی اوپر آیا۔ لگتا تھا' دونوں منزلوں کا اسٹاف بھی علیحدہ علیحدہ ہے۔ ربی تک رسائی کا کوئی وسیلہ نظر نہ آیا تو میں نے براہِ راست اسے ٹرائی کرنے کی ٹھانی۔

موشے ہائمن کے خد و خال اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ مجھے ازبر تھے لیکن میری تیسری آنکھ کی یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔ میں نے جھنجلا کر کوشش ترک کردی۔ ربی نے کسی روحانی عمل سے خود کو ایک نادیدہ حصار میں بند کررکھا تھا مگر یہ نادیدہ بندش میری تھرڈ آئی کو نظر آجاتی تھی اور وہ بے بس ہوکر رہ جاتی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا' ربی نے اس سلسلے میں کون سی ٹیکنیک اپنا رکھی ہے۔ ہزار دشمنی اور ناپسندیدگی کے باوجود بھی میں اس شخص کی عملیت اور علمیت سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں ربی موشے ہائمن کو برا بھلا کہا اور تھرڈ آئی کی چھلانگ لگا کر اپنی جانِ تمنا کے ماحول میں پہنچ گیا۔ ساحل اس وقت تک بیڈ پر دراز ہوچکی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' وہ سونے کی کوشش میں ہے۔ بیڈ روم میں ٹرالی پر' ایک بڑے اسکرین والا ٹی وی موجود تھا۔ اگر اس کا جاگنے کا ارادہ ہوتا تو وہ ٹی وی کو ضرور آن کرتی۔

میں چند لمحات تک بڑی لگاوٹ سے اسے ''دیکھتا'' رہا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ اس نے سونے کی غرض ہی سے آنکھیں بند کررکھی ہیں اور یہ بھی ممکن ہے' وہ اب تک سو بھی چکی ہو...... تو میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور اس کے ماحول کو خدا حافظ کہہ کر سنگاپور ائیر لائنز کے ''میگا ٹاپ سیون فور سیون'' میں حاضر ہوگیا۔

میں نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں' صوفیہ سے نظریں چار ہوئیں۔ وہ پتا نہیں' کب سے میری صورت تک رہی تھی۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھا تو اس کے مرمریں لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ طنز آمیز شکایتی لہجے میں بولی۔

''یوسف! تمہارا ''ابھی آتا ہوں'' تو خاصا لمبا ہے!''

''کیا مطلب؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

ہمارے درمیان یہ گفتگو سرگوشیوں کی صورت ہورہی تھی۔ ویسے جہاز کے مسافروں کو ہم سے کوئی غرض نہیں تھی۔ سب اپنی اپنی مصروفیت میں مشغول تھے لیکن احتیاط کا تقاضا نبھانا بھی ضروری تھا' اسی سبب وہ مجھے یوسف کہہ کر ہی مخاطب بھی کررہی تھی۔ میرے جواب کے بدلے میں اس نے کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے شانے سے جھنجوڑ کر تمہیں بیدار کیا تھا۔ تم نے کہا تھا' ابھی آتا ہوں! میں جب سے تمہاری آمد کا انتظار کررہی تھی؟''

میں نے کہا ''بس دوبارہ آنکھ لگ گئی تھی۔''

''آنکھ لگ گئی تھی؟'' وہ متعجب انداز میں بولی ''تم تو پہلے بھی طویل نیند لے چکے تھے۔ مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے' تم پچھلے کئی سالوں سے سوئے نہیں ہو!''

صوفیہ ایک ذہین اور بے باک لڑکی تھی۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا ''تم ایسا بھی سمجھ سکتی ہو۔ ویسے اس کے علاوہ بھی ایک وجہ ہے۔''

''کیا وجہ ہے؟'' اس کا استفسار خالی از دلچسپی نہیں تھا۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور اس کی جاذب آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میں دراصل تم سے مقابلہ کررہا تھا۔''

اس کی الجھن دوچند ہوگئی ''کیسا مقابلہ؟''

''اس جہاز میں بیٹھنے کے بعد تم نے مجھ سے کہا تھا...... یوسف میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کرنا چاہتی ہوں۔ ہوسکتا ہے' آنکھ بھی لگ جائے۔ اگر کوئی خاص بات ہو تو تم مجھے جگا دینا'' میں نے اس کے کہے ہوئے الفاظ لوٹا دیے ''میں کافی دیر تک الو بنا بیٹھا تمہیں دیکھتا رہا۔ پھر میں نے تمہارا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں یہی سمجھا کہ تم سو گئی ہو...... اور دیکھ لو میں جیت گیا۔ میں تم سے زیادہ سویا ہوں اور اگر تم مجھے جگاتی نہیں تو میں کئی گھنٹے مزید سو سکتا تھا۔''

''وہ تو مجھے نظر آرہا ہے!'' وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ذومعنی لہجے میں بولی ''ویسے تم نے ''اپنے منہ میاں مٹھو'' والی بات کی ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی ''تم نے کہا ہے' الو بنے بیٹھے مجھے دیکھتے رہے تھے۔ اس طرح گویا تم نے خود کو بڑا عقل مند ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغرب میں الو کو دانش کی علامت سمجھا جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''میں جانتا ہوں' تمہارے مغرب میں الو اور خچر کو بڑا دانا و بینا خیال کیا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک الو واقعی الو اور خچر نرا گدھا ہے لہٰذا تم یقین کرلو کہ میں نے تمہاری بیان کردہ کوشش ہرگز ہرگز نہیں کی' جو حقیقت ہے وہ بتلائی ہے۔''

وہ چند لمحات تک خاموش مگر کھوجتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''وجدان! تم بہت گہرے ہو!''

وجدان کا لفظ اس نے اتنے دھیمے انداز میں ادا کیا کہ میرے سوا کوئی نہ سن سکا۔ میں نے جواباً گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ہم اس وقت ہزاروں فٹ کی اونچائی پر ہیں اور تمہیں گہرائی کی سوجھ رہی ہے!''

''تم باتیں بنانا خوب جانتے ہو!'' وہ بدستور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا ''یہ شعبہ سراسر خواتین سے متعلق ہے۔''

''لیکن بعض مرد خواتین سے چار ہاتھ آگے دکھائی دیتے ہیں!''

اس کا واضح اشارہ میری جانب تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے' بعض مرد پیشہ ور باتیں کرنے والے ہوتے ہیں اور انہی باتوں کی کمائی کھاتے ہیں لیکن میرا اس پیشے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''تم گھمانا بھی جانتے ہو'' وہ چوٹ کرنے والے انداز میں بولی ''مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے بھی اپنی ہی بات کہہ ڈالی؟''

''فی الحال تو وہ ہمیں گھمانے آرہی ہیں'' میں نے سیٹوں کے درمیان واقع لمبی گزرگاہ کے آخری سرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ''کیا تم گھومنے کے لیے تیار ہو؟''

صوفیہ نے میری نگاہ کا تعاقب کیا تو وہ ائر ہوسٹیس اسے نظر آگئیں جو کھانے کی ٹرالی کو بڑی سبک خرامی سے چلاتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ جہاز کے مسافروں کو ڈنر دیا جارہا تھا۔ مذکورہ ٹرالی ابھی اتنے فاصلے پر تھی کہ اسے ہمارے پاس پہنچنے میں دس سے پندرہ منٹ لگ سکتے تھے۔ میں اپنی بات کہہ کر بڑی سنجیدگی سے خاموش ہوگیا تو صورتِ حال کو بھانپنے کے بعد صوفیہ نے کہا۔

''تم جتنے تسلسل سے مجھے گھما رہے ہو' اسے دیکھتے ہوئے مجھے نہیں امید کہ ان بے چاریوں کا بھی کبھی نمبر آئے گا؟'' بے چاریوں سے اس کی مراد ائر ہوسٹیس سے تھی۔

میں نے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہ سمجھا اور خاموشی اختیار کیے رکھی لیکن صوفیہ خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ میری پُر اسرار چپ اور بے سروپا گویائی نے اسے مضطرب کرکے رکھ دیا تھا۔ میں اس وقت کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے محض ''ہوں' ہاں'' پر اکتفا کیا۔

میرے ردِعمل سے زچ ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''کیا تم نے پہلے بھی کبھی کسی کا رول کیا ہے؟''

''ہاں'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی ''ایسا موقع مجھے اکثر ملتا رہتا ہے۔''

''جب ہی تو...... میں بھی دھوکا کھا گئی تھی!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کی مسکراہٹ سے جھلکتی معنی خیزی کو مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس گرم جوش اور خوشگوار ''استقبالیہ'' کا ذکر کررہی تھی جو ہیر اللہ تھامس کے لندن والے اپارٹمنٹ میں

اس نے مجھے' اپنا بوائے فرینڈ یوسف الظاہری سمجھتے ہوئے پیش کیا تھا۔ بقول صوفیہ کے' وہ مجھ سے دھوکا کھا گئی تھی۔

اگر واقعی وہ کوئی دھوکا تھا تو بڑا ہی خوب صورت اور والہانہ دھوکا تھا!

میں نے یہ سب سوچتے ہوئے اس سے پوچھ لیا ''دھوکا کھانا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے محسوسات جان سکتا ہوں؟''

''میں یوسف کی رائے سے متفق ہوں!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''یو مین...... اٹ ڈزنٹ میٹر؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''لیس' آئی مین اٹ!'' وہ قطعیت سے بولی۔

ہیرالڈ تھامس کے اپارٹمنٹ میں جب صوفیہ نے کھسیاہٹ بھرے انداز میں یوسف الظاہری کو بتایا تھا کہ وہ مجھے یوسف سمجھ کر گلے لگی تھی تو اس کی جھینپ کے جواب میں یوسف نے کہا تھا...... اٹ ڈزنٹ میٹر۔ وجدان ہمارے مشترک دوست کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اس تناظر میں صوفیہ کا موجودہ جواب خاصا بولڈ تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ اس نڈر اور بے باک لڑکی کے ساتھ مجھے چند روز گزارنا تھے۔ اگر ہمارا ساتھ طویل ہوتا تو پتا نہیں' کون کون سے موسمی اور بے موسمی گل کھل جانا تھے!

میں نے صوفیہ کے قطعیت بھرے جملے کے جواب میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ''تم ایک بے مثال ساتھی ہو۔ میں یوسف الظاہری کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ انسان کو ایسا ہی زندہ دل اور خوش باش ہونا چاہیے۔''

یہ جملے میں نے صوفیہ کے اطمینان اور خوشی کی خاطر ادا کیے تھے۔ وہ بولی ''زندگی صرف ایک بار ہی ملتی ہے اس لیے اسے زندہ دلی سے گزارنا چاہیے۔''

میں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا کیوں کہ کھانے والی ٹرالی کھسکتے پھسلتے ہماری سیٹوں کے قریب پہنچ گئی تھی۔ مجھے جواب نہ دینے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ ویسے میں اس کے جواب میں کہتا بھی کیا؟ وہ چند جملے تو میں نے محض اس لیے کہہ ڈالے تھے کہ اسے آکورڈ محسوس نہ ہو ورنہ چنگ فو رن پوشی سے دوسری ملاقات کے بعد میں نے پختہ تہیہ کر لیا تھا کہ خود کو حتی الامکان اپنے قابو میں رکھنے کی کوشش کروں گا۔

چیف لاما چنگ فو نے ساحل کے حوالے سے مجھے ''تبت کا داماد'' کہا تھا۔ جو کھانگ ٹیمپل کے چیف لاما کی حیثیت ملک کے سربراہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ براہِ راست دلائی لاما کے رابطے میں ہوتا ہے بلکہ بعض معاملات میں وہ دلائی لاما کی تربیت اور راہ نمائی بھی کرتا ہے۔ ملک میں وزیراعظم کا انتخاب اسی کی مرضی اور منشا سے ہوتا ہے۔ اس بات سے چیف لاما کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے اگر تبت کا داماد سمجھا جا رہا تھا تو اس رشتے سے چنگ فو تبت کا باپ تھا' یعنی میرا سسر!

ہر سسر کی' اس بات پر گہری نظر ہوتی ہے کہ اس کی فرزندی میں آنے والا بندہ کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس ناتے سے چنگ فو ساحل کے باپ کا کردار ادا کرنے والا تھا جب ہی پہلی ملاقات میں اس نے میری لغزشوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مجھے ''سیدھی راہ'' دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میری تھرڈ آئی کی راہ میں جو تعطل پیدا ہوا ہے اس کا سبب میری یہی لغزشیں ہیں۔ اگر میں خود پر کنٹرول حاصل کر لوں تو اس عارضی رکاوٹ کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے ''دس روزہ مجاہدے'' سے بھی گزارا گیا تھا جس کے بعد دوسری ملاقات میں چنگ فو نے اپنے کہے کو سچا کر دکھایا تھا۔ میرے کامل پرہیز اور چنگ فو کے تعاون نے میری تھرڈ کے ضعف کو دور کر کے مجھے ساحل کے ماحول میں پہنچا دیا تھا۔ اس کامیابی نے میرے اندر ایک نئے ولولے اور جوش کو ابھارا جس کے نتیجے میں' میں چیف لاما کی بتائی ہوئی سانس روکنے کی مخصوص مشق کر کے اس قابل ہو گیا تھا کہ تیسری آنکھ کی بازی گری اب مجھے بچوں کا کھیل محسوس ہونے لگا تھا۔ میں قدم قدم پر کامیابی حاصل کرتے ہوئے اپنی منزل کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

جب کسی گرو کے بتائے ہوئے گر کے نتائج حسبِ ضرورت نمودار ہونے لگیں تو اس گرو کی کاملیت پر یقین اور بھی پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنگ فو میرے لیے ایک ایسا ہی گرو ثابت ہو رہا تھا لہٰذا اس کی ہدایات کا پاس اور متقاضی احتیاط مجھ پر لازم ہو کر رہ گئی تھی۔

ائر ہوسٹس نے ہمارے سامنے ڈنر چن دیا تو میں نے مذاق کے رنگ میں صوفیہ سے کہا ''کسی سے دھوکا کھانا اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کھانا کھانا۔ میرا خیال ہے' ہمیں پہلی فرصت میں اس کھانے پر توجہ دینا چاہیے۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے ڈنر کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

صوفیہ میری بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ اس نے ڈنر لینا تو شروع کر دیا لیکن میرے مذاق کے جواب میں شرارت سے باز نہ آئی۔ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں تمہارے اسٹیٹ منٹ میں تھوڑا اضافہ کرنا چاہتی ہوں' اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لہٰذا خاموش رہا۔ وہ اضافہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''کسی کو دھوکا دینا اتنا اہم نہیں ہے جتنا کہ کھانا دینا۔ میرا خیال ہے' یہ ایئر ہوسٹیس تم سے زیادہ اہم کام کر رہی ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد انسان اور زیادہ بڑھ چڑھ کر دھوکا دہی کے معاملات پر غور کرنے لگتا ہے۔''

میں اگر صوفیہ کی بات کا جواب دیتا تو بات بہت دور تک نکل جاتی مگر میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس موضوع کو لپیٹ کر شکم سیری میں مصروف ہو گیا۔ صوفیہ نے شکم سیری کے جن نتائج کی نشان دہی کی تھی ان سے انکار ممکن نہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ اقرار کا اظہار بھی کر لیا جائے۔ بعض باتیں ان کہی ہوتی ہیں' انہیں سمجھنے اور سمجھانے کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے!

☆☆☆

رات کے آخری پہر ہم قاہرہ پہنچ گئے۔

صوفیہ یوسف الظاہری سے ملنے پہلے بھی مصر آ چکی تھی لہٰذا ہمیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہم نے قاہرہ ائرپورٹ سے ایک پرائیویٹ ٹیکسی پکڑی اور اس اپارٹمنٹ تک چلے آئے جہاں یوسف کی ہدایات کے مطابق ہمیں ٹھہرنا تھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ قاہرہ کے عین قلب میں' مسجد سلطان حسن کے نزدیک واقع تھا۔ یوسف الظاہری نے ہمیں اس اپارٹمنٹ کی چابیاں دے دی تھیں اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس اپارٹمنٹ کے بارے میں زیادہ لوگوں کو معلوم نہیں لہٰذا ہمارے لیے کسی مداخلت کا اندیشہ نہیں تھا۔ وہ اپارٹمنٹ یوسف کے خفیہ ٹھکانوں میں سے ایک تھا۔

ہم خیر و عافیت سے اپارٹمنٹ کے اندر داخل ہو گئے تو صوفیہ نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا ''میں اس اپارٹمنٹ میں صرف ایک مرتبہ یوسف کے ساتھ ٹھہری ہوں۔''

میں نے استفسار کیا ''میری معلومات کے مطابق' تم کئی بار مصر آ چکی ہو۔ کیا یوسف تمہیں کہیں اور بھی ٹھہراتا رہا ہے؟''

''زیادہ تر وہ میرے لیے ہوٹل اوئسس (OASIS) میں روم بک کرا دیتا تھا۔'' اس نے جواب دیا ''یوسف اس ہوٹل کا سلیپنگ پارٹنر بھی ہے لہٰذا یہ اس کے لیے چٹکی بجانے کے جیسا کام ہے۔''

میں نے اپنی یادداشت کو تر و تازہ کرنے کی غرض سے کہا ''ہوٹل اوئسس غالباً کیرو الیگزینڈریا ڈیزرٹ روڈ پر واقع ہے!''

''غالباً نہیں' یقیناً'' وہ زور دیتے ہوئے بولی ''لگتا ہے' تم قاہرہ (کیرو) اور اسکندریا (الیگزینڈریا) کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو؟''

''تم سے زیادہ نہیں'' میں نے عام سے لہجے میں کہا ''میں نے پہلی مرتبہ مصر کی سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ اس بارے میں میری معلومات محدود ہیں۔''

وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''مصر ایک پُراسرار اور ناقابلِ تسخیر سرزمین کا نام ہے جہاں قدم قدم پر عقل دنگ' ذہن ماؤف اور سوچ مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔''

میں نے مصر اور اس سے متعلق اسرار و رموز کی بہت سی طلسماتی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ تاریخی اعتبار سے اس سرزمین کی جو اہمیت اور قدر و منزلت ہے' وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ میں نے صوفیہ کی بات کے جواب میں کہا۔

''اچھا ہے' تمہاری شکل میں مجھے ایک ایسا ساتھی میسر آ گیا ہے جس نے پہلے بھی کئی بار اس جادو نگری کی سیر کر رکھی ہے۔ میں تمہاری صحبت میں اس طلسم کدے میں اترا ہوں۔ تم انگلی پکڑ کر اس کے ایک ایک اسرار کو کھولتی جانا۔ ہو سکتا ہے' تسخیر کی چند منازل میں بھی طے کر لوں!'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اپنے انداز کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس محیر العقول نگری کی سیاحت کے دوران میں تم ایک لمحے کے لیے بھی میری انگلی نہ چھوڑنا کہیں اس دھرتی کا کوئی ساحر سحر پھونک کر مجھے پتھر کا بت نہ بنا دے۔ میں اپنی عقل کو دنگ کرنا تو افورڈ کر سکتا ہوں لیکن ذہن کو ماؤف اور سوچ کو مفلوج کرانا مجھے گوارا نہیں! میں ایک خاص الخاص اور اپنی زندگی کے سب سے اہم مشن پر نکلا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی یہ چیزیں بہت عزیز ہیں۔''

وہ میرے بولنے کے دوران میں گہری دلچسپی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''وجدان! کیا تمہیں شاعری بھی آتی ہے؟''

یہ جملہ اس نے گزارہ چلاؤ اردو میں ادا کیا تھا۔ میں نے بھی اردو ہی میں فوراً جواب دیا۔

''میں شاعر تو نہیں...... مگر شاید یہ مصر کی پُراسرار زمین کا

اثر ہے۔'' پھر میں اس کے انتہائی قریب چلا گیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا ''ذرا دھیان سے میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ' کہیں میری عقل دنگ' ذہن ماؤف اور سوچ مفلوج تو نہیں ہوگئی۔ میں یہ کس قسم کی بہکی بہکی باتیں کررہا ہوں!''

وہ چند لمحات تک واقعی یک ٹک' سنجیدگی سے میری آنکھوں اور چہرے کو تنقیدی نظر سے گھورتی رہی' پھر یک لخت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی بے ساختہ ہنسی بڑی دلکش و دل نشیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا' اچانک جل ترنگ بج اٹھا ہو۔ اس پر بے خودی کی سی کیفیت طاری تھی۔

وہ مجھ پر شاعری کا ''الزام'' لگارہی تھی اور خود اس کا عملی مظاہرہ پیش کررہی تھی۔ میں اس کے موتیوں ایسے آب دار ہم وار دانتوں اور پوری طرح کھلے ہوئے گلاب چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ وہ ان لمحات میں شگفتگی اور رعنائی کا منہ بولتا شاہکار بن گئی تھی۔ حسن اور فن کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بدذوقی کے زمرے میں آتا ہے۔ میں مبہوت کھڑا انہی تعریفی کلمات کو دل میں دہرا رہا تھا۔

صوفیہ کے دل آویز قہقہوں کا تسلسل کسی بھی طور ٹوٹتا دکھائی نہ دیا تو مجبوراً مجھے کندھوں سے جھنجوڑ کر اسے ''ہوش'' میں لانا پڑا۔ اس کی حالت نارمل ہوئی تو میں نے قدرے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''صوفیہ! یہ کیا دیوانگی ہے؟''

''مجھے تمہاری بات سن کر بے اختیار ہنسی آگئی تھی۔'' وہ اپنی آنکھوں کے نم ہوجانے والے گوشوں کو مخروطی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے بولی ''پھر پوچھتے ہو' یہ کیا دیوانگی ہے!''

اس کے جواب نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے متاملانہ لہجے میں دریافت کیا ''میں نے ایسی کون سی بات کردی ہے؟''

''تم نے کہا نہیں کہ میں تمہاری انگلی کو احتیاط سے پکڑے رکھوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ تم یہاں پہلی مرتبہ آئے ہو۔ سیر تمہیں میں کراؤں گی یا تم مجھے کراؤ گے؟ تم میری انگلی پکڑ کر چلو گے یا مجھے تمہاری انگلی پکڑنا ہوگی؟''

اس نے خاصی سنجیدگی سے یہ سوال اٹھائے تو میں محاورتاً سر پکڑ کر رہ گیا۔ اس نے ایک ٹیکنیکل پوائنٹ اٹھایا تھا پیش آمدہ صورتِ حالات میں اصولاً مجھے اس کی انگلی تھامنا چاہیے تھی' لیکن اتنی معمولی سی تیکنیکی خامی پر یوں نان اسٹاپ ہنستے چلے جانا سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''صوفیہ! بس اتنی سی بات کے لیے تم نے......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولی ''دراصل' دو باتیں ایک ساتھ میرے ذہن میں ابھر آئی تھیں۔'' اس کا انداز وضاحت پیش کرنے والا تھا۔ ''میں پہلے یہ سوچ رہی تھی کہ ایک یوسف الظاہری نے مجھے مصر کی سیر کرائی تھی اور اب میں ایک دوسرے یوسف الظاہری کو مصر کی سیر کرانے والی تھی۔ یہ ستم ظریفی بلکہ ستم ضعیفی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس پر تم نے وہ انگلی پکڑنے والا شگوفہ چھوڑ دیا۔ بتاؤ' میں ہنستی نہیں تو کیا بیٹھ کر رونا شروع کردیتی؟ کوئی لطیفہ سن کر انسان رودیتا ہے کیا؟''

اس نے بات کے اختتام پر دو سوالات داغ دیے لیکن میں نے کسی وضاحت کی ضرورت کو محسوس نہ کیا اور اس قصے کو ختم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم نے درحقیقت اپنے ذہن میں دو یوسف الظاہری کو الگ الگ بٹھا رکھا ہے اس لیے سوچ کی یہ پیچیدگی پیش آرہی ہے۔ تم اپنی یادداشت میں یوسف الظاہری کو سینچ کرنے کی کوشش کرو۔ اصلی یوسف الظاہری کو چند دنوں کے لیے فراموش کردو' صرف اس یوسف الظاہری کو یاد رکھو جو...... اصلی کے بھیس میں نقلی ہے اور تمہارے ساتھ اسے مصر سے اسرائیل جانا ہے۔''

''تمہارا مشورہ تو دل کو لگ رہا ہے'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی ''لیکن اگر میں نے نہایت ہی پختگی سے تمہیں یوسف سمجھنا شروع کردیا تو پیچیدگی اور بھی بڑھ جائے گی۔ تت...... تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟''

اس نے مبہم انداز میں بات کو سمیٹا تو میں اس کے مطلب کو بخوبی سمجھ گیا۔ جان چھڑانے والے انداز میں' میں نے اس سے کہہ دیا ''اٹ ڈزنٹ میٹر۔''

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہم دونوں نے حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صوفیہ نے سوالیہ انداز میں کہا ''کس کا فون ہوسکتا ہے؟''

''یہ تو اٹینڈ کرنے کے بعد ہی معلوم ہوسکے گا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

ہم اس وقت اپارٹمنٹ کے جس کمرے میں بیٹھے تھے فون سیٹ بھی وہیں ایک اسٹینڈ پر رکھا تھا۔ میری تائید پاکر صوفیہ فون کی جانب لپک گئی۔ یہ فون میرے لیے ایک طرح سے باعثِ رحمت ثابت ہوا تھا۔ گھنٹی سنتے ہی صوفیہ اپنے غم

کو بھول گئی تھی ورنہ پتا نہیں' اسے اطمینان دلانے کے لیے مجھے کون کون سے جوابات دینا پڑتے۔ وہ ایک باتونی اور پیچھے ہی پڑ جانے والی لڑکی تھی!

صوفیہ نے فون اٹینڈ کیا۔ ''ہیلو'' کے جواب میں دوسری طرف کی بات سنی اور میری طرف دیکھتے ہوئے مطمئن لہجے میں بولی۔

''وجدان! ہیرالڈ تھامس تم سے بات کرنا چاہتا ہے!''

ہیرالڈ تھامس کا نام سنتے ہی میں فون کے قریب پہنچ گیا۔ تھامس کا تعلق انگلینڈ کے ''جیالوجیکل ڈیپارٹمنٹ'' سے تھا اور وہ اس مشن کے سلسلے میں میری بھرپور مدد کررہا تھا۔ صوفیہ اور یوسف الظاہری اسی کی ''دریافت'' تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے ہمارے سفر کے بارے میں دریافت کیا پھر اصل موضوع کی طرف آگیا۔

''یوسف الظاہری نے تمہارے روانہ ہوتے ہی لندن سے براہِ راست اپنے دوست السید مبارکِ الحسینی سے بات کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ قاہرہ پہنچ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوست بھی ہے جو اسرائیل' مصر اور اردن کی سیر کرنا چاہتی ہے۔''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا ''یوسف نے مبارک الحسینی کو اپنی دوست صوفیہ کے بارے میں تفصیلاً بتادیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے' مبارک الحسینی ''کانٹیکی ٹور اینڈ ٹرپ ٹریول کمپنی'' کا نمائندہ ہے جس کے توسط سے یوسف اور صوفیہ کے دورے کا بندوبست ہونا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟''

''ہاں' بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کو رکا تو میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا ''آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔''

وہ بولا ''کانٹیکی (CONTIKI) والے عموماً سفر کے آغاز سے پینتالیس دن پہلے بکنگ کرتے ہیں لیکن مبارک الحسینی' یوسف الظاہری کا سچا دوست ہے لہٰذا اس نے یوسف اور صوفیہ کے لیے گنجائش نکال لی ہے۔ تمہیں ہر صورت میں کل دونوں پاسپورٹس مبارک الحسینی کے آفس پہنچانا ہوں گے۔ پرسوں یعنی چوبیس اپریل کو ان تین ملکوں کے دورے والا ایک ٹرپ روانہ ہونے والا ہے جو مصر' اسرائیل' اردن سے ہوتے ہوئے سولہ دن کے بعد یعنی نو مئی کو واپس مصر پہنچ جائے گا۔ اگر یہ ٹرپ مس ہوگیا تو پھر تمہیں کم از کم پندرہ دن تک انتظار کرنا ہوگا کیوں کہ اس سال کا دوسرا ٹرپ آٹھ مئی کو روانہ ہوگا۔ یوسف نے مبارک سے پے منٹ کا معاملہ بھی طے کرلیا ہے لہٰذا تمہیں کانٹیکی کے آفس میں کسی قسم کی ادائی نہیں کرنا ہوگی۔ تم اپنے ساتھ جو رقم لے کر گئے ہو اسے دیگر معاملات کے لیے بچا کر رکھو تمہیں کسی وقت کوئی بھی ہنگامی ضرورت پیش آسکتی ہے۔''

ہیرالڈ تھامس نے مجھے اور صوفیہ کو امریکی ڈالرز کی صورت میں اچھی خاصی رقم بطور ''زادِ راہ'' تھمادی تھی۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے' میں آپ کی بات سمجھ گیا۔ ذرا یہ تو بتائیں' اس ٹور کے لیے فی کس کمپنی والے کتنی رقم وصول کرتے ہیں؟''

''مصر' اسرائیل اور اردن کے اس سولہ روزہ دورے کے لیے کانٹیکی والے فی مسافر ایک ہزار' نو سو پچانوے امریکی ڈالرز وصول کرتے ہیں۔''

''یعنی پورے انیس سو پچانوے ڈالرز!'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا ''یہ تو بہت بڑی رقم ہے؟''

''رقم بڑی ہے یا چھوٹی' اس کی تم فکر نہ کرو۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا ''سمجھ لو' یوسف الظاہری اور صوفیہ کے کل تین ہزار' نو سو نوے ڈالرز کمپنی کو ادا کردیے گئے ہیں۔ چوبیس اپریل کی صبح سے تم کانٹیکی کے ڈسپوزل پر ہوگے۔ اس ٹرپ کے دوران میں تمہیں بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ کمپنی اگر بھاری رقم وصول کرتی ہے تو اس کے بدلے میں آرام دہ تفریح بھی مہیا کرتی ہے۔''

''ٹھیک ہے مسٹر تھامس! میں آپ کی ہدایات کو یاد رکھوں گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس نے دعائیہ انداز میں ٹیلی فونک رابطہ موقوف کردیا ''بیسٹ آف لک!''

میں نے ریسیور رکھا تو صوفیہ نے کہا ''یوسف الظاہری تمہارے لیے قدم قدم پر آسانیاں فراہم کررہا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں اس مشن میں زیادہ محنت کرنا پڑے!''

''اگر تم ایسا خیال نہیں کرتی ہو تو میں یہی کہوں گا' تم غلط سوچ رہی ہو'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا ''میں بہت مشکل پسند ہوں اور محنت کرنے سے نہیں گھبراتا۔ تمہیں اس چند روزہ ''ساتھ'' میں بہت کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ مجھے یقین ہے' جب اسرائیل میں تم مجھ سے جدا ہوگی تو میرے بارے میں تمہاری رائے بدل چکی ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے!'' وہ ایک ادائے ناز سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا ''بائی دی وے' تم اسرائیل سے واپس لندن کیسے پہنچو گی؟''

چیف لاما چنگ فورن پوشی نے اس سلسلے میں کوئی واضح

بات نہیں کی تھی۔ صرف اتنا بتایا تھا' جب اسرائیل میں' میں ساحل کو حاصل کرلوں گا تو صوفیہ مجھ سے جدا ہوجائے گی۔ میں نے سوال کیا تھا کہ اصلی صوفیہ کا کیا ہوگا تو اس نے دو ٹوک انداز میں کہا تھا' مجھے صوفیہ کے سلسلے میں ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں اسے اسرائیل سے مصر اور مصر سے انگلینڈ پہنچانے کی ذمے داری کسی اور شخص کو سونپی جاچکی ہے! چنگ فو کے اس دوٹوک جواب کے بعد میں مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں کرسکا تھا اسی لیے اب صوفیہ سے پوچھ رہا تھا۔ اگر صوفیہ کو کسی اور شخص کے ساتھ سفر کرنا تھا تو یقیناً وہ اس شخص کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہوگی۔

وہ میرے سوال کے جواب میں بولی "اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں تمہیں بتانے میں کوئی حرج محسوس نہ کرتی۔"

"کیا مطلب!" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا واقعی تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو؟"

"ہاں واقعی!" وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "تمہیں میری بات کا یقین کرلینا چاہیے۔"

"میں یقین کررہا ہوں لیکن...... یہ سب کیسے ممکن ہے کہ......؟"

میں نے جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی "مسٹر تھامس نے مجھ سے کہا تھا' تم جیسے ہی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرلو' میں تم سے الگ ہوجاؤں اور فوراً تھامس سے رابطہ کروں۔ اس وقت وہ مجھے بتائے گا' میں کیا کروں اور کیسے کروں!"

"اوہ!" بے ساختہ میرے لبوں سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوئی۔ میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تو اس کا مطلب ہے' موجودہ سیٹ اپ کی اچھی خاصی ڈوریاں مسٹر ہیرالڈ تھامس نے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی ہیں۔"

صوفیہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور نہ ہی صاف انکار کیا بلکہ خاموشی سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اس سے قبل کہ میں کچھ بولتا' اس نے منہ کھول کر ایک کشادہ جماہی لی۔ میں نے موقع محل کی مناسبت سے فوراً کہہ دیا۔

"میرا خیال ہے' رات کا جو تھوڑا بہت وقت باقی بچا ہے اس کو سوکر گزارنا چاہیے تاکہ کل صبح فریش حالت میں حالات کا مقابلہ کرسکیں۔"

"سونے کی بات کرتے ہوئے تم تو اچھے نہیں لگتے وجدان!" اس نے ایک اور جماہی لی۔

میں نے کہا "کیا تم چاہتی ہو' میں چاندی کی باتیں کروں؟"

وہ گڑبڑا گئی' جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی "میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی' تم نے جہاز کے اندر کم از کم تین گھنٹے کی نیند لی ہے!"

"ٹھیک ہے' اب میں نہیں لوں گا۔" میں نے صلح صفائی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "تم اطمینان سے لے لو۔ میں خاموشی سے تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ تم چاہو تو جہاز والی کسر اس اپارٹمنٹ میں پوری کرسکتی ہو!" ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے ایک بات کی وضاحت کردوں' جہاز میں تم ہار گئی تھیں' یہاں بھی میں ہی جیتوں گا۔"

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے ایک خاص ادا سے بولی "یہ سب پیٹ بھرے کی باتیں ہیں۔ انسان اپنی طلب پوری کرچکا ہو تو اسے ایسے ہی مقابلوں کی سوجھتی ہے۔ تم خاموشی سے مجھے دیکھو یا بینڈ باجے کے ساتھ' مجھے تو شدید نیند آرہی ہے...... اور میں واقعی سو رہی ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی وہ ایک بیڈ پر دراز ہوگئی۔ اگلے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں یہی سمجھا' وہ کوئی شوخی یا اٹکھیلی دکھا رہی ہے لیکن چند منٹ بعد جب اس بیڈروم میں اس کے سریلے خراٹے ابھرنے لگے تو مجھے یقین کرنا پڑا' صوفیہ دھن کی پکی ہے!

نیند نے مجھے بھی خاصا ستا رکھا تھا۔ صوفیہ کا یہ اندازہ بالکل غلط تھا کہ میں نے دوران سفر میں اچھی خاصی نیند لے لی تھی۔ وہ میری مسلسل بند آنکھوں کو دیکھ کر اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ میں آرام سے سورہا ہوں۔ اس کی جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی خیال کرتا۔ کون جانتا تھا' میں آنکھیں بند کیے جاگ رہا تھا اور ایسی دل دلچسپ سرگرمیوں میں مشغول تھا کہ بیان سے باہر ہے۔

میں چند لمحات تک صوفیہ کو بے فکری سے سوتے ہوئے دیکھتا رہا پھر دوسرے بیڈ پر دراز ہوکر میں نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ سونے سے قبل میں نے تھوڑی سی تصوراتی آوارہ گردی ضروری سمجھی اور ساحل کو سوچ کر اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

مصر' اسرائیل اور اردن کے مقامی وقت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ یہ تینوں ہی ملک "جی ایم ٹی" سے دو گھنٹے آگے ہیں۔ جی ایم ٹی (گرین وچ مین ٹائم) زیرو ڈگری پر لندن کا وقت تسلیم کیا جاتا ہے۔ لندن سے مشرقی سمت میں واقع ہونے کے باعث ان ممالک کا وقت دو گھنٹے آگے ہے۔ پاکستان اور جی ایم ٹی میں لگ بھگ پانچ گھنٹے کا فرق مانا جاتا ہے۔

ساحل اس وقت گہری نیند میں تھی۔ بیڈروم میں زیرو پاور بلب کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چند لمحات تک اس بیڈروم میں موجود رہا پھر اس کے ماحول سے نکل آیا۔

اگلی کوشش میں نے ربی موشے یامن کے ماحول تک رسائی حاصل کرنے کے سلسلے میں کی لیکن نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ بار بار کی ناکامیابی کے بعد بھی میں ہمت نہیں ہارا تھا۔ مجھے مایوسی ضرور ہوتی تھی لیکن میرا عزم مایوسی کے بادلوں کو پلک جھپکتے میں منتشر کردیتا اور میں دوبارہ اس کوشش میں لگ جاتا۔ مجھے یقین تھا' میں چیف لاما کی بتائی ہوئی ٹیکنیک پر عمل کرتے ہوئے ایک روز ضرور ربی کے ماحول کو چھولوں گا...... اور یقین سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہوسکتی!

میں نے اِدھر اُدھر کی دیگر تصوراتی سرگشت میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور دماغ کو ہدایت دینے لگا "میں یعنی وجدان علی ابن عابد علی نہایت ہی پُرسکون' میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک آٹھ بجے صبح میری آنکھ ہشاش بشاش آٹومیٹیکلی کھل جائے گی لیکن اس نیند کے دوران میں اگر اس اپارٹمنٹ کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آنے کا امکان پیدا ہوگیا تو وقت مقررہ سے پہلے ہی فوراً میری آنکھ کھل جائے گی!"

اس ہدایت کے ساتھ ہی آنکھیں بند رکھتے ہوئے میں سونے کی کوشش بھی کرنے لگا۔ میں نے جسم کو بالکل ڈھیلا چھوڑ کر نیند کے حوالے کردیا۔ مجھے اس کوشش میں جلد ہی کامیابی کا منہ دیکھنا پڑا۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے نیند کی مہربان اور خوش آمدید وادی میں اترتا چلا گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز ناشتے کے بعد ہم اپارٹمنٹ سے نکل آئے۔ مذکورہ اپارٹمنٹ جلیل القدر مسجد سلطان حسن کے قریب ہی واقع تھا۔ میری یہ کوشش تھی کہ اپارٹمنٹ سے باہر کم سے کم وقت گزاروں۔ میں اس وقت یوسف الظاہری کے حلیے میں تھا۔ اگر زیادہ دیر تک باہر گھومتا پھرتا تو یوسف کا کوئی بھی جاننے والا مجھ سے ٹکرا سکتا تھا اور مجھے اس سے بچنا تھا۔ کم از کم اس وقت تک یہ احتیاط نہایت ہی ضروری تھی جب تک ہم اپنے دورے کا آغاز نہیں کردیتے۔

جو لوگ دوسروں کا حلیہ اپنا کر سوسائٹی میں موو کرتے ہیں انہیں ایک ایک قدم پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر یہ ناٹک زیادہ دنوں تک چلانا ہو تو میک اپ اور گیٹ اپ کی مکمل رینج اپنے ساتھ رکھنا پڑتی ہے۔ کسی بھی وقت کسی شے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ کانٹی نیوٹی کے تقاضوں کو نبھائے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

میرے پاس میک اپ کا مکمل سامان موجود تھا اور اب تک میں نے اس فن میں اچھی مہارت بھی حاصل کرلی تھی۔ مجھے ساحل کو صوفیہ کا روپ دے کر اسرائیل سے نکالنا تھا اور یہ کام گویا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ساحل کو صوفیہ بنانے میں مجھے زیادہ محنت نہ کرنا پڑتی۔ وہ ایک مرتبہ میری دسترس میں آجاتی تو زیادہ محنت کیا' میں اس کے لیے کچھ بھی کرسکتا تھا!

ہم تھوڑی دور تک پیدل ہی چلتے رہے پھر ایک ٹیکسی پکڑلی۔ ٹیکسی والے نے ہمیں "خان الخلیلی بازار" کے پاس سے گزار کر مختلف سڑکوں پر گھمایا اور کچھ دیر بعد الباقری اسٹریٹ پر واقع کانیکی کے آفس کے سامنے پہنچا دیا۔ آفس کے باہر "اسپرنگ ٹورز کیرو" کا بورڈ دیکھ کر میں مطمئن ہوگیا۔

قاہرہ ائرپورٹ سے باہر آنے سے پہلے میں نے ایک منی چینجر ایجنٹ کے دفتر سے چند ڈالرز کو مصری کرنسی میں تبدیل کرالیا تھا۔ مصر کا سکہ رائج الوقت "مصری پاؤنڈ" ہے جو اس وقت ایک امریکی ڈالر کے مقابلے میں تھری پوائنٹ سیون فائیو کی حیثیت رکھتا تھا یعنی ایک امریکی ڈالر میں لگ بھگ پونے چار مصری پاؤنڈز مل جاتے تھے۔ میں نے ٹیکسی والے کو مقامی کرنسی میں ادائی کی اور ہم "اسپرنگ ٹورز کیرو" کے دفتر میں داخل ہوگئے۔

السید مبارک الحسینی کا حلیہ یوسف الظاہری نے مجھے ازبر کرادیا تھا لہٰذا اس تک رسائی میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ یہ میری اداکاری کا سب سے کڑا امتحان تھا۔ میں یوسف کے ایک بے تکلف دوست سے مل رہا تھا لیکن سب خیریت رہی۔ میری کامل ایکٹنگ اور قدرتی رویے نے مبارک الحسینی کو میرے بارے میں کسی شک میں مبتلا نہیں کیا اور یہ مختصر سی ملاقات انتہائی کامیاب رہی۔ میں نے اپنا یعنی یوسف الظاہری اور صوفیہ کا پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات مبارک الحسینی کو تھمائے اور مصروفیت کا بہانہ کرکے اس کے دفتر سے اٹھ آیا۔

مبارک الحسینی کی ہدایت کے مطابق' آئندہ روز یعنی چوبیس اپریل کو صبح نو بجے سے پہلے ہمیں اوئسس ہوٹل پہنچنا تھا۔ "کانیکی" کے اس تین ملکی ٹرپ کا ڈیپارچر اوئسس ہوٹل سے ہوتا تھا اور یہ بات "مجھ" سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔ "میں" تو اس ہوٹل کا سلیپنگ پارٹنر بھی تھا۔ مبارک الحسینی نے جو کچھ کہا' وہ اس کے پیشہ ورانہ فرائض کا حصہ تھا۔ اب مجھے

اپنے ''فرائض'' سے عہدہ برا ہونا تھا!

ہم اسپرنگ ٹورز کیرہ کے آفس سے باہر نکلے تو صوفیہ نے توصیفی انداز میں کہا ''ایکسیلنٹ! تم نے بڑی بھرپور اداکاری کی ہے۔ مبارک الحسینی کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ یوسف الظاہری کے بجائے کسی بہروپیے سے ملاقات کر رہا ہے۔''

میں نے گہری چوٹ کی ''کیا تمہیں شبہ ہوا تھا؟''

''نن...... نہیں!'' وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

میرا اشارہ اس خوشگوار واقعے کی جانب تھا جب تھامس کے اپارٹمنٹ میں صوفیہ نے مجھے گرمجوشی سے استقبالیہ دیا تھا اور وہ سمجھ دار لڑکی میرا اشارہ بخوبی سمجھ گئی تھی۔

ہمارے درمیان چند لمحات خاموشی سے گزرے۔ مبارک الحسینی کے دفتر سے تھوڑی دور آنے کے بعد ہم نے الباقری اسٹریٹ کے کونے سے ایک ٹیکسی پکڑی اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ مصر میں چلنے والی ٹیکسی کو عموماً ''پسنجر کار'' بھی کہا جاتا ہے۔ میں احتیاط کے دامن کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرا یوں کھلے عام زیادہ گھومنا پھرنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اب تک اس مشن کے تمام مراحل بخیر و عافیت طے ہو گئے تھے۔ اگر میں اسی احتیاط روی کو اپنائے رکھتا تو کامیابی یقینی تھی۔

صوفیہ کے پاس برطانیہ کی شہریت تھی اور اس کا پاسپورٹ ''ای ٹی اے'' لسٹیڈ بھی تھا۔ ای ٹی اے (الیکٹرانک ٹریول اتھارٹی) ایک انٹرنیشنل ادارہ ہے جو دنیا کے تینتیس ممالک سے متعلق افراد کے پاس پورٹس کو اپنے پاس رجسٹریشن کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ ان تینتیس ممالک میں جاپان، کینیڈا، امریکا کے علاوہ چند جنوبی ایشیا کے ملک اور زیادہ تر یورپی ممالک شامل ہیں۔ ای ٹی اے لیسٹیڈ پاسپورٹ کے حامل شخص کو ویزا کے حصول کے لیے ایک بھی پاپڑ نہیں بیلنا پڑتا۔ ہینگ لگتی ہے اور نہ ہی پھٹکری، رنگ چوکھا بھی بعد میں آتا ہے البتہ ویزا پہلے لگ جاتا ہے!

پتا نہیں، یہ کوئی المیہ ہے یا حالات کا جبر اور یا پھر ہماری بدقسمتی کہ بین الاقوامی سطح پر لوگوں کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے لیے جو بھی منصوبہ بندیاں کی جاتی ہیں اور جو بھی قوانین و قواعد وضع کیے جاتے ہیں، ان میں یہ کوشش بہرحال ضرور کی جاتی ہے کہ مسلمان کم سے کم فیض یاب ہو سکیں یا پھر سرے سے محروم ہی رہ جائیں!

وہ پورا دن ہم نے اپارٹمنٹ کے اندر بند رہ کر گزارا۔ اسپرنگ ٹورز کیرو سے واپسی پر ہم نے لنچ کا بندوبست کر لیا تھا لہٰذا دوپہر کے کھانے کے لیے بھی ہمیں باہر نہیں نکلنا پڑا۔ صبح جب ہم اپارٹمنٹ سے نکلے تھے تو خان الخلیلی بازار میں، میں نے کھانے کا ایک معیاری مرکز دیکھا تھا۔ دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ رات بھیگنے لگی تو صوفیہ سے میں نے استفسار کیا۔

''تمہیں گھر کے اندر بند ہو کر بیٹھے رہنا کیسا لگ رہا ہے؟''

''انتہائی بورنگ!'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی ''لیکن تمہاری وجہ سے مجبوری ہے نا۔''

''تمہاری وجہ سے تو کوئی مجبوری نہیں ہے نا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ قطعیت سے بولی ''بالکل نہیں، میں نے کون سا روپ بدل رکھا ہے!''

''سارا مسئلہ میرے روپ کا ہے'' میں نے کہا ''ٹھیک ہے، میں ہی اس میں کوئی ردوبدل کر لیتا ہوں۔ تمہاری بوریت کا کچھ نہ کچھ مداوا تو کرنا ہی پڑے گا نا۔''

''کیا تمہیں بوریت محسوس نہیں ہو رہی؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں بھی اکتاہٹ محسوس کر رہا ہوں'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''میں زیادہ عرصے کے لیے یوں کسی گھر کے اندر بند ہو کر کبھی نہیں بیٹھا ہوں۔''

وہ پُرمعنی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی ''تم نے ابھی یوسف کے بہروپ میں ردوبدل کی بات کی ہے۔ تمہارے ذہن میں کیا آئیڈیا ہے؟''

''مکمل طور پر اس حلیے کو تبدیل کرنا تو مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اگر میں اپنی آنکھوں پر سے کانٹیکٹ لینس ہٹا دوں اور اسپائس اسٹائل بالوں پر کوئی ٹوپی وغیرہ لگا لوں تو دیکھنے والوں کو پہلی نظر میں یوسف الظاہری دکھائی نہیں دوں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی ''میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتی ہوں۔''

''ویسے ہمارے پاس میک اپ کی مکمل رینج ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام لوازمات بھی موجود ہیں جو حلیہ تبدیل کرنے میں خاصے معاون ثابت ہوتے ہیں'' میں نے اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اگر میں زیرِ ناک ہلکی پھلکی مونچھیں چسپاں کر لوں تو ہماری کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہو جائیں گے۔''

اس نوعیت کی باہمی گفتگو کے بعد ہم اس فیصلے پر پہنچ گئے

کہ ڈنر کے لیے ہم اپارٹمنٹ سے باہر جائیں گے۔ میں نے اپنے حلیے میں حسب ضرورت مناسب سی تبدیلی کی اور ہم اپارٹمنٹ سے نکل کر خان الخلیلی بازار کی طرف چل پڑے۔

دنیا کا کوئی بھی ملک اور ملک کا کوئی بھی حصہ ہو، وہاں پاکستانی اور انڈین ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ نہ صرف پہنچ جاتے ہیں بلکہ ذاتی کاروبار بھی شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد خان الخلیلی بازار میں ہمیں ایک دیسی ہوٹل مل گیا۔ درحقیقت وہ ایک ریسٹورنٹ تھا جہاں انڈین اور پاکستانی دونوں ملکوں کی معروف ڈشز دستیاب تھیں۔ دیسی کھانے کھائے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا لہٰذا میں نے صوفیہ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

''میں تو اس ریسٹورنٹ کا ذائقہ چکھوں گا۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟''

''جب صبح ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر اس ریسٹورنٹ کے پاس سے گزرے تھے تو تم نے جن نظروں سے ادھر دیکھا تھا، میں سمجھ گئی تھی، تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہوگا اور اب تم نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔

میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں اور کہا ''تم تو بڑی سمجھ دار ہو...... بلکہ کچھ زیادہ ہی زود سمجھ ہو!''

اس نے میرے اظہارِ خیال پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور بولی ''اگر زیادہ تیز مرچ مسالا نہ ہو تو میں بھی یہیں پر ڈنر لے لوں گی۔''

اس اتفاقِ رائے کے بعد ہم ''خان الخلیلی'' کے مذکورہ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ مینیو دیکھا تو پتا چلا کہ ہمارے مطلب کی خاصی ڈشز موجود تھیں۔ میں نے ویٹر سے مرچ مسالے کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا، وہ ہمارے حسب منشا تیار کروا دے گا۔ ہم نے اس سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آرڈر لکھوا دیا۔ صوفیہ نے اپنے لیے فرائیڈ رائس اور چکن کی ایک سادہ سی ڈش منگوائی۔ میں نے بریانی، چپاتی اور فرائیڈ ویجی منگوائی۔ ان تمام ڈشز کو شیئر کر کے ہم نے ایک بھرپور ڈنر لیا اور بل ادا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔

میں جانتا تھا، اپارٹمنٹ میں پہنچ کر ''بے حرکت'' ہونا پڑے گا لہٰذا تھوڑی سی نائٹ واک ضروری سمجھی۔ ہم پیدل ہی ٹہلتے ہوئے خان الخلیلی بازار سے نکل آئے اور اس جانب بڑھنے لگے جس رخ پر مسجد سلطان حسن واقع تھی۔ ایک بھرپور چہل قدمی کے دوران میں باتیں کرتے ہوئے بالآخر ہم اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔

مذکورہ اپارٹمنٹ دو بیڈرومز، ایک سٹنگ روم اور ایک ڈائننگ پر مشتمل تھا۔ دونوں بیڈرومز میں سے ایک چھوٹا اور دوسرا قدرے کشادہ تھا۔ چھوٹے بیڈروم میں ایک ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا جب کہ بڑے بیڈروم میں دو مختلف دیواروں کے ساتھ، دو چھوٹے بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ہم نے گزشتہ رات اسی بیڈروم میں دو مختلف بیڈز پر سو کر گزاری تھی۔ گزشتہ رات سے مراد رات کا وہ مختصر سا حصہ جو اتفاق سے ہمارے ہتھے لگ گیا تھا۔

میں نے صوفیہ سے کہا ''تم نے بتایا ہے کہ پہلے بھی ایک مرتبہ اس اپارٹمنٹ میں قیام کر چکی ہو۔ اس بار تم کس بیڈروم میں ٹھہری تھیں؟''

اس نے جواب دیا ''ڈبل بیڈ والے بیڈروم میں۔''

''اگر تم یہاں ان ایزی ہو تو اسی بیڈروم میں چلی جاؤ'' میں نے تجویز پیش کرنے والے انداز میں کہا ''وہاں رات گزارنے سے بھولی بسری بہت سی یادیں بھی تازہ ہو جائیں گی!''

میرے الفاظ میں اچھی خاصی معنی خیزی پنہاں تھی۔ وہ میری بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے قدرے جھینپ گئی۔ میں اپنے اس عمل سے خدانخواستہ اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ میں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے موڈ میں تھا۔ ویسے میں چاہتا یہی تھا کہ وہ دوسرے بیڈروم میں چلی جائے۔ مجھے ابھی بالکل نیند نہیں آ رہی تھی اور میں جاگ کر تھرڈ آئی کی کرتب بازیوں میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اگر صوفیہ میرے ارد گرد موجود رہتی تو مداخلت کا ایک سو ایک فیصد امکان تھا۔

میری تجویز کے جواب میں اس نے کہا ''میں محسوس کر رہی ہوں، میری وجہ سے تم کچھ زیادہ ہی ان ایزی ہو رہے ہو۔ اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں دوسرے بیڈروم میں چلی جاتی ہوں۔ ویسے فی الحال تو میں چینج کرنے جا رہی ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ واش روم میں گھس گئی۔ پندرہ منٹ بعد جب وہ دوبارہ نمودار ہوئی تو اچھی خاصی چینج ہو چکی تھی۔ اب اس کے بدن پر لوز ٹراؤزرز اور ٹی شرٹ نظر آ رہی تھی۔ میرے پاس پہنچتے ہی اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میں سونے سے پہلے ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی عادی ہوں۔ گزشتہ رات تو سفر میں گزر گئی لیکن آج کوئی مجبوری نہیں ہے لہٰذا میں کامن روم میں جا رہی ہوں۔''

''تم کامن میں جاؤ یا ریز روم میں، اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "مجھے تو شدید نیند آ رہی ہے اس لیے فوراً سو جاؤں گا۔"

"تمہیں سونے سے کس نے روکا ہے؟" اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

میں نے پوچھا "تم نے فیصلہ کرلیا' کہاں سوؤ گی؟"

"تمہیں میرے سونے کی اتنی زیادہ فکر کیوں لگی ہوئی ہے؟" وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "انداز ایسا ہے جیسے تم میرے سونے کا انتظار کررہے ہو۔ ادھر میری آنکھ لگی' ادھر تم کوئی چیز چرا کر بھاگے!" وہ رک کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی "تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ...... جہاں دل چاہے' سو جاؤ۔ اس بیڈ روم میں یا اس بیڈ روم میں۔ مجھے جہاں بھی سونا ہوگا' سو جاؤں گی۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر کریدنے والے انداز میں بولی۔

"مجھے لگ رہا ہے' تم میری وجہ سے کسی الجھن کا شکار ہو!"

"ہرگز نہیں" میں نے قطعیت سے کہا "تم ایکسر سائز سے دل بہلاؤ۔ میں ڈبل بیڈ پر سونے جا رہا ہوں۔ گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ!" اس نے کہا اور کامن روم کی طرف بڑھ گئی۔

میں اٹھا اور اس چھوٹے بیڈروم میں آ گیا جہاں ایک ڈبل بیڈ بچھا ہوا تھا۔ یہ فوری فیصلہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ اس صورتِ حال میں صوفیہ کی مداخلت کا امکان تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتا۔ اگر میں دو بیڈ والے بڑے بیڈروم میں سونے کی کوشش کرتا تو ممکن تھا' صوفیہ ڈبل بیڈ کا رخ کرنے کے بجائے اسی کمرے کے دوسرے بیڈ پر قبضہ جما لیتی جیسا کہ ہم نے پچھلی رات بسر کی تھی۔ گزشتہ رات ہم دونوں ہی نیند کے طلب گار تھے لیکن آج رات معاملہ بالکل مختلف تھا۔ کسی مداخلت کے بغیر مجھے ایک ضروری کام نمٹانا تھا۔

میں نے بیڈروم کے دروازے کو بند نہیں کیا بلکہ نیم وا رہنے دیا اور بیڈ پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرلیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں سو چکا ہوں یا سونے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں۔ اگر صوفیہ جھانک کر بیڈروم میں دیکھتی تو اس کو یہی تاثر ملتا کہ میں اپنے بیان کے مطابق' گہری نیند میں پہنچ چکا ہوں۔ مجھے یقین تھا' وہ دوسرے بیڈروم میں رات بسر کرلے گی۔ وہ اپارٹمنٹ ہر حوالے سے محفوظ تھا اور میں نے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے پر ڈبل لاک بھی لگا دیا تھا۔ اس کے اندر رات گزارنے والوں کو کسی فکر اندیشے کی ضرورت نہیں تھی۔

ربی موشے ہائمن تک رسائی میں مجھے بار بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا مگر جیسے یہ میری انا کا مسئلہ بن کر رہ گیا تھا لہٰذا میں جب بھی باطنی آنکھ کا شٹر کھولتا تو اس کی "یاد" ضرور آ جاتی اور میں ایک آدھ ٹرائی اس پر ضرور مار دیتا۔ اس روز میں نے اس تخیلاتی سفر کا آغاز ربی ہی سے کیا۔ اس وقت قاہرہ میں رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ تل ابیب میں بھی یہی وقت تھا۔ میں نے ربی کے حلیے کو اپنی تیسری آنکھ کے سامنے اجاگر کیا اور اس کے ماحول میں اترنے کی کوشش کی۔

نتیجہ پہلے سے مختلف برآمد نہیں ہوا۔ میں نے لگ بھگ پندرہ منٹ تک کبھی سانس روک کر اور کبھی بغیر سانس روکے یہ کوشش جاری رکھی اور بالآخر ربی کو صلواتیں سناتے ہوئے یہ سلسلہ موقوف کردیا۔ وہ اور اس کا ماحول ایک لمحے کے لیے بھی میری گرفت یا دسترس میں نہیں آ سکا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنی منزل' ساحل کے ماحول میں اتر گیا۔

وہ بالائی منزل والے اسی بیڈروم میں محوِ خواب تھی۔ میں تھوڑی دیر تک اسے سوتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس کی طرف سے مطمئن ہو کر میں سلوان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اللہ کا بندہ باورچی بنا' ہوٹل ٹاپ کے کچن میں مصروف تھا۔ میں تھوڑی دیر تک اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کے مماثل کی طرف چھلانگ لگائی۔ اس تصوراتی جست نے مجھے اس شخص کے ماحول میں پہنچا دیا جو ساحل والے بنگلے میں سلوان کا خلا "پُر" کررہا تھا۔

وہ مسلح سکیورٹی گارڈز کے ساتھ ایک مختصر سے کمرے میں بیٹھا گپ شپ کررہا تھا۔ میں اب اس بنگلے کی عمارت میں اتنی مرتبہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر گیا تھا کہ وہاں کا محل وقوع اور مکانیت کو بڑی حد تک سمجھنے لگا تھا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ تینوں جس کمرے میں بیٹھے گفتگو میں مصروف تھے' وہ ساحل والے بیڈ روم سے نزدیک ہونے کے علاوہ ایک ایسے زاویے پر واقع تھا کہ وہ اس کمرے کے اندر بیٹھ کر بھی ساحل والے بیڈروم کے دروازے کو واچ کر سکتے تھے۔

میری معلومات کے مطابق' مذکورہ دروازہ باہر سے لاک تھا' ساحل کسی بھی طور اسے اندر سے کھول نہیں سکتی تھی' اس کے باوجود بھی وہ لوگ ساحل کے حوالے سے بے حد محتاط تھے اور میں جانتا تھا' یہ احتیاطی تدابیر ربی کے کڑے احکام کی

رہینِ منت تھیں۔ میں ان کے درمیان ہونے والی بات چیت کو سن سکتا تھا اور نہ ہی سمجھنا میرے اختیار میں تھا' انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر کچن میں پہنچ گیا۔

اس بنگلے کا کچن عمارت کی بالائی منزل پر واقع تھا۔ میں نے وہاں کے کک کو اپنا ٹارگٹ بنالیا تھا لہٰذا اسی کے توسط سے وہاں تک رسائی ممکن ہوسکی...... باورچی' کچن میں موجود تھا۔ اسے کام میں مصروف دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ آدھی رات کے وقت کس کے لیے کون سی ڈش تیار کررہا تھا! میں تصور کی نگاہ سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔ ایک خیال ذہن میں یہ بھی موجود تھا' شاید وہ سکیورٹی گارڈز وغیرہ کے لیے چائے کافی بنا رہا ہو!

جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا' اس نے نہایت ہی احتیاط اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت دودھ ابالا تھا اور ایک خاص طریقے پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ دودھ کو گنگنا بنا کر ایک گلاس میں بھر دیا۔ اس شخص نے اس دودھ کی "تیاری" میں جتنی توجہ اور احتیاط سے کام لیا اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ دودھ کا وہ گلاس کسی اہم شخص کے معدے میں اترنے والا تھا اور اس عمارت میں سب سے اہم شخصیت صرف اور صرف ربی موشے ہائمن ہی کی تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس باورچی کی اگلی حرکت کا انتظار کرنے لگا۔

میں نہیں جانتا تھا' ربی اس وقت بنگلے میں موجود تھا یا نہیں لیکن یہ ضرور تھا کہ باورچی نے دودھ کا جو گلاس تیار کرکے ٹرے میں سجایا تھا' وہ میری نگاہ کے سامنے کوئی نیا دروازہ کھولنے والا تھا۔ میں اس باورچی کے ماحول سے چپکا رہا۔ اس نے دودھ "تیار" کیا تھا تو اسے کہیں پہنچانا بھی ہوگا!

اس نے دودھ کے گلاس کو ٹرے میں رکھنے کے بعد ایک ساسر سے ڈھک دیا۔ میں توقع کررہا تھا' وہ دودھ والا گلاس لے کر کچن سے نکلے گا اور متعلقہ شخص تک پہنچا کر واپس آ جائے گا۔ اس کے طفیل مجھے بھی وہاں سے نکلنے کا موقع مل جاتا اور میں یہ جاننے میں بھی کامیاب رہتا کہ اتنے اہتمام سے تیار کیا جانے والا دودھ کس خوش نصیب کے حصے میں آنے والا ہے لیکن باورچی میری توقع پر پورا نہ اترا۔

اس نے ٹرے کو اٹھانے کی زحمت نہ کی اور دیوار پر نصب انٹرکام کی جانب بڑھ گیا۔ جب اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور کسی سے بات کرنے لگا تو میں سمجھ گیا' وہ کچن سے باہر قدم نہیں نکالے گا بلکہ اس نے دودھ لے جانے کے لیے کسی اور کو کچن میں بلوایا ہے۔

جلد ہی میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ درمیانے قد اور بھاری تن و توش کا مالک' ایک شخص باورچی خانے میں پہنچا اور باورچی نے وہ ٹرے اٹھا کر مذکورہ شخص کی سمت بڑھا دی جس میں دودھ والا گلاس رکھا ہوا تھا۔ باورچی نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس شخص نے کسی قسم کا استفسار کیا۔ وہ خاموشی سے ٹرے اٹھائے کچن سے نکل آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پیش آ رہا ہو!

دودھ لے کر جانے والا کچن سے نکلا تو میں کسی نادیدہ آنکھ کے مانند اس کے ماحول سے چپک گیا۔ وہ چکر دار زینے کے ذریعے زیریں منزل کی طرف بڑھا تو میرے دل کی دھڑکن یک دم تیز ہوگئی۔ مجھے بھی اس کے ساتھ زیریں منزل تک رسائی کا موقع مل رہا تھا لہٰذا میں سانس روک کر اپنے کام سے لگا رہا۔

میں نے سلوان کے ماحول میں رہتے ہوئے زیریں منزل کے کچھ حصے دیکھ لیے تھے اور اس کے ساتھ ہی میں اس بیڈروم کے اندر بھی چلا گیا تھا جہاں موشے ہائمن آرام فرما رہا تھا۔ وہ بھاری بھرکم شخص مجھے پتا نہیں' کہاں پہنچانے والا تھا!

وہ دودھ والے گلاس کے ساتھ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے جا کر رکا اور بڑے خفیف انداز میں مذکورہ دروازے پر دستک دی۔ یہ زیریں منزل کا وہ حصہ نہیں تھا جہاں میں سلوان کی معیت میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ میرے تجسس کو ہوا ملی کہ اس دستک کے جواب میں پتا نہیں' کون شخص نمودار ہوگا!

دروازہ کھلا اور میں فربہ شخص کے ماحول میں رہتے ہوئے' کھلے ہوئے دروازے پر میں نے ایک دراز قامت شخص کی جھلک دیکھی۔ وہ متناسب البدن شخص تھا۔ بال سنہری اور سلکی جنہیں اس نے سائیڈ مانگ کی صورت سنوار رکھا تھا۔ وہ مجھے مکمل سوٹڈ بوٹڈ نظر آیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' وہ کسی ایگزیکٹیو میٹنگ کے لیے روانہ ہونے والا ہو۔ آدھی رات کے وقت اس دراز قامت شخص کی اس "تیاری" نے مجھے خاصا حیران کیا۔

اس حیران کردینے والے شخص نے دودھ کے گلاس والی ٹرے تھام لی' سامنے کھڑے فربہ آدمی کی طرف دیکھ کر اثبات میں گردن ہلائی اور دروازہ بند کردیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی کمرے میں بند ہوگیا۔ اس شخص کو ایک لمحے کے لیے بھی چھوڑنے کا رسک نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اس نے نسبتاً ایک چھوٹے کمرے میں قدم رکھا تو میں بھی وہاں پہنچ گیا۔

یہاں اس نے گلاس والے دودھ کو ایک خاص مشین میں سے گزارا۔ وہ فلٹر پلانٹ سے مشابہ کوئی مشین تھی۔ یہ بھی ممکن ہے' وہ دودھ میں شامل چکنائی کو الگ کرنے والا چھوٹا پلانٹ ہو۔ بہرحال ایک سریع اسکریننگ کے بعد اس دراز قامت شخص نے دودھ کو دوبارہ گلاس میں بھرا اور اپنے اطمینان کو حتمی بنانے کے لیے اس نے گلاس میں سے ایک گھونٹ کے برابر دودھ نکال کر خود پیا۔ اس کے بعد لگ بھگ پانچ منٹ تک اس نے انتظار کیا اور جب دودھ کے کوئی مضر اثرات اس پر ظاہر نہ ہوئے تو وہ ٹرے میں گلاس سجائے عمارت کے اندر ہی اندر ایک اور کمرے میں پہنچ گیا۔ میں بھی مذکورہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

وہ کمرا بیڈ روم کا منظر پیش کر رہا تھا اور اس وقت کمرے میں صرف ایک شخص موجود تھا جو ایک وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ وہیل چیئر کی پشت داخلی دروازے کی جانب تھی .... میں اس شخص کی شکل نہ دیکھ سکا۔

اگلے ہی لمحے میری یہ خواہش پوری ہوگئی۔ دراز قامت شخص سیدھا وہیل چیئر کی سمت بڑھا اور رکوع کے بل جھکتے ہوئے اس نے دودھ کے گلاس والی ٹرے' وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف بڑھا دی۔ اسی لمحے میں وہیل چیئر والے شخص کی صورت دیکھنے میں کامیاب ہوگیا...... وہ ربی موشے ہائمن تھا!

ربی کو وہیل چیئر پر دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہیل چیئر کا تصور ذہن میں معذوری اور اپاہجی کو اجاگر کرتا ہے۔ میں نے موشے ہائمن کو بن گورین ائرپورٹ سے نکل کر سیاہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اور پھر مذکورہ گاڑی سے نکل کر اس بنگلے کی زیریں منزل میں داخل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے کہیں سے بھی معذور یا اپاہج دکھائی نہیں دیا تھا بلکہ وہ کسی جوان کے مانند قدم اٹھا رہا تھا' پھر وہیل چیئر پر بیٹھنے کا کیا جواز بنتا تھا؟ کیا اس کی ٹانگوں میں اچانک کسی قسم کا ضعف اتر آیا تھا؟

انہی سوالات میں ذہن کو الجھاتے ہوئے میں نے ربی پر نگاہ جمائے رکھی۔ یہ تمام تر تجزیاتی خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزرے اور میں نے ربی کو سوالیہ نظر سے اس دراز قامت شخص کی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ جواب میں سنہری بالوں والے سوئیڈ بوئیڈ شخص نے سر کو اثباتی جنبش دی تو ربی نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے سے دودھ کا گلاس اٹھا لیا۔

ربی کی سوالیہ نگاہ اور دراز قامت شخص کی گردن کی اثباتی جنبش نے حقیقتِ حال مجھ پر واضح کردی۔ ربی نے دودھ کے بارے میں استفسار کیا تھا اور دراز قامت شخص نے اس دودھ کے کسی بھی حوالے سے مضرِ صحت نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ بہ یک جنبشِ گردن جاری کردیا تھا۔

دودھ ہر اعتبار سے ایک صحت بخش اور توانائی فراہم کرنے والی نعمت خداوندی ہے۔ یہاں ''مضرِ صحت'' سے میری مراد صرف اتنی سی ہے کہ کہیں اس دودھ میں کچھ ملا کر اسے زہر آلود نہ کردیا گیا ہو۔ ربی اپنی خوراک کے سلسلے میں حد سے زیادہ محتاط نظر آتا تھا اور وہ دراز قامت' سنہری بالوں والا شخص اس کے لیے انتہائی قابلِ اعتماد تھا جس نے دودھ کو ربی تک پہنچانے کے لیے خود پر بھی آزما کر دیکھا حالانکہ قبل اس کے' وہ دودھ کی مکمل اسکریننگ کرچکا تھا۔ بنگلے میں موجود تمام افراد ربی کے لیے انتہائی بھروسے کے لوگ تھے' اس کے باوجود بھی اس نے احتیاط کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس چھوٹے سے ٹرائل میں مجھے بخوبی معلوم ہوگیا' اس بنگلے کی حد تک' موشے ہائمن صرف اور صرف سنہری بالوں والے دراز قامت شخص پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ اب اس شخص کے سوئیڈ بوئیڈ اور ہائی الرٹ ہونے کا سبب بھی میری سمجھ میں آ گیا۔ وہ چوبیس گھنٹے آن لائن ڈیوٹی تھا۔

میں اس شخص کے خال و خط اور نقش و نگار کو بڑی احتیاط سے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے لگا' خاص طور پر اس کی آنکھوں کو حافظے میں چھپانا بہت ضروری تھا۔ اب تک تل ابیب میں ربی کے قریب نظر آنے والے جن افراد سے ''متعارف'' ہوا تھا ان میں مجھے یہ سوئیڈ بوئیڈ شخص سب سے زیادہ اہم دکھائی دے رہا تھا اور اس وقت اسی شخص کے توسط سے ربی کے ماحول میں موجود تھا۔ اس دراز قامت شخص کے حلیے کو ذہن نشین کرنا نہایت ہی ضروری تھا تاکہ بوقتِ ضرورت میں اس کے ماحول کی انگلی تھام کر ربی تک رسائی حاصل کرسکتا۔ اس شخص سے ''فارغ'' ہونے کے بعد میں موشے ہائمن کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ربی وہیل چیئر پر بیٹھا نیم گرم دودھ کا ہلکے ہلکے سپ لے رہا تھا۔ وہ اس وقت جس بیڈ روم میں بیٹھا تھا اس کی ایک دیوار میں بہت بڑی سلائیڈنگ ونڈو نصب تھی اور ربی مذکورہ ونڈو کے پار دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس سلائیڈنگ ونڈو میں لگے ہوئے شیشے کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا' وہ ون وے ٹرانسپیرنسی والا شیشہ تھا...... یعنی اس شیشے کے توسط سے' بیڈ روم میں موجود فرد یا افراد تو باہر دیکھ سکتے تھے مگر باہر والے بیڈ روم کے اندر جھانکنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ میں نے دراز قامت شخص کی ''وساطت'' سے مذکورہ شیشے کی دوسری جانب نگاہ دوڑائی۔

دور...... خاصے فاصلے پر مجھے اس بنگلے کا گیٹ دکھائی دیا۔ پتا نہیں' یہ بنگلے کی زیریں منزل کا کون سا زاویہ تھا جہاں سے مین گیٹ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ رات کی تاریکی میں گیٹ کے نیلے رنگ کا اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا تاہم' میں ینگ سلوان کی مہربانی سے اس گیٹ کے اندرونی اور بیرونی مناظر کو دیکھ چکا تھا لہٰذا مجھے پہچاننے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نے اس بنگلے اور اس کے عین وسط میں تعمیر شدہ اس دو منزلہ چھوٹی سی عمارت کو جس حد تک بھی دیکھا تھا' وہ حیرت انگیز اور عجیب و غریب تھا۔ بنگلے کی باؤنڈری وال رہائشی حصے سے اچھے خاصے فاصلے پر تھی۔ گیٹ کے راستے یا کسی دیوار کو پھلانگ کر بنگلے کے اندر داخل ہونے والا شخص فوراً نظروں میں آ سکتا تھا کیونکہ اسے عمارت کے رہائشی حصے تک پہنچنے میں کافی وقت لگتا' اس دوران میں کوئی نہ کوئی نگران اسے واچ کرلیتا...... پھر رات کی تاریکی میں دیوار پھلانگنے کی کوشش کرنا تو موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ میں نے تجربہ کرکے تو نہیں دیکھا تھا تاہم سابق تجربات اور مشاہدات نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ باؤنڈری وال کے اوپر نظر آنے والی مخصوص خاردار باڑ' رات کی تاریکی میں انتہائی مہلک ہوجاتی ہوگی۔ مجھے یقین تھا' اس حفاظتی باڑ میں کرنٹ چھوڑ دیا جاتا ہوگا لہٰذا کسی شخص کا دیوار پھاند کر زندہ سلامت اس بنگلے کے اندر پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ ربی کے شاطرانہ ذہن کی کرشمہ کاریاں کھل کر میرے سامنے آئیں تو میں اندر سے بے حد محتاط ہوگیا۔ مجھے اس بنگلے میں داخل ہوکر اپنی ساحل کو نکالنا تھا لہٰذا انتہائی بے داغ قسم کی منصوبہ بندی بہت ضروری تھی۔ میری معلومات میں یہ اضافہ خاصا مفید ثابت ہوتا۔

ربی موشے ہائمن اور اس دراز قامت شخص کے درمیان وقفے وقفے سے مکالمہ بھی ہو رہا تھا۔ لیکن افسوس کہ میں اس گفتگو کا ایک بھی لفظ سننے پر قادر نہیں تھا۔ ربی پر نظر جاتی تو وہیل چیئر بھی نگاہ میں آ جاتی جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن الجھنے لگتا۔ مجھے ربی اور وہیل چیئر کے مابین کوئی ربط ضبط نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال' میں اس وقت تک ربی کے بیڈ روم میں موجود رہا جب تک گلاس میں موجود دودھ ختم نہیں ہوگیا۔

دراز قامت سنہری بالوں والا شخص خالی گلاس لے کر وہاں سے رخصت ہوا تو مجھے بھی مجبوراً ربی کے ماحول سے خارج ہونا پڑا۔ میں اپنے واسطے کے ساتھ ساتھ اس مختصر سے کمرے میں پہنچا جہاں ربی تک پہنچائے جانے والے دودھ کی اسکریننگ کی گئی تھی۔ وہ شخص وہاں رکا نہیں بلکہ کمرا در کمرا ہوتے ہوئے وہاں پہنچ گیا جہاں اس نے فربہ شخص سے دودھ کے گلاس والی ٹرے وصول کی تھی۔ اس نے خالی گلاس اور ٹرے کو دروازے کے باہر موجود اسی فربہ شخص کے حوالے کیا اور دوبارہ دروازہ بند کردیا۔ میں فربہ شخص کے ساتھ ہولیا۔

وہ واپس بالائی منزل پر واقع کچن میں پہنچا۔ خالی برتن باورچی کے حوالے کیے اور دوبارہ زیریں منزل پر آ گیا۔ وہ ایک ایسے کمرے میں پہنچا جو دراز قامت شخص کی پہنچ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ فربہ شخص' دراز قامت شخص کا اسسٹنٹ تھا اور سنہری بالوں والا دراز قامت شخص' ربی موشے ہائمن کا معتمدِ خاص!

میں چونکہ ان دونوں کے ناموں سے واقف نہیں تھا لہٰذا گزارہ چلانے کے لیے میں نے حسبِ حال فربہ شخص کو اسسٹنٹ کا نام دے دیا اور دراز قامت شخص کا نام معتمدِ خاص رکھ دیا۔ اس فیصلے کے بعد میں اسسٹنٹ کو چھوڑ کر فوراً معتمدِ خاص کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ چھوٹے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ مذکورہ کمرا ربی کے کمرے سے ملحق تھا۔ میں کافی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ معتمدِ خاص دوبارہ اٹھ کر ربی کے کمرے میں جائے اور میں ربی کی تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہی حاصل کرسکوں لیکن مجھے اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ معتمدِ خاص کے انہماک کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا، ربی موشے ہائمن گہری نیند سو چکا ہے اور معتمدِ خاص وہ ضخیم کتاب ختم کیے بغیر آنکھ نہیں لگائے گا لہٰذا میں نے تھرڈ آئی کی پرواز کو موقوف کیا اور تل ابیب سے واپس قاہرہ آ گیا۔

میں کافی دیر تک آنکھیں بند کیے بستر پر لیٹا رہا اور ساحل و ربی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اب تک میں نے اس سلسلے میں جتنی ''ریسرچ'' کرلی تھی وہ میرے مقصد کے حصول کے لیے کافی تھی۔ جی تو یہی چاہ رہا تھا' ابھی اڑ کر تل ابیب پہنچ جاؤں اور ساحل کو اس ظالم شخص کے چنگل سے چھڑا کر اڑتے ہوئے واپس آ جاؤں لیکن چنگ۔ فورن پوشی نے مجھے ایک پروگرام میں باندھ رکھا تھا۔ مجھے ایک ایک قدم طے شدہ منصوبے کے تحت اٹھانا تھا، اسی میں میری کامیابی چھپی ہوئی تھی۔ اس ٹرپ کے دوران میں صرف تین دن مجھے ایسے ملتے جن میں، میں اپنی مرضی کا مالک ہوتا...... یعنی پانچ مئی سے

آٹھ مئی کی صبح تک۔ ٹریول کمپنی کی بس پانچ سے آٹھ مئی تک بیت شین سے پیٹرا، پیٹرا سے ایلات اور ایلات سے یروشلم پہنچ جاتی۔ میں اسرائیل میں مزید قیام کا بہانہ کر کے صوفیہ کے ساتھ قافلے سے الگ ہوجاتا اور اپنا "کام کر کے" دوبارہ آٹھ مئی کو یروشلم میں قافلے سے جاملتا۔ اس مرتبہ میرے ہمراہ صوفیہ کے روپ میں ساحل ہوتی۔

میرے اندر سے کوئی بار بار مجھے اکساتا تھا، میں تمام تر احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اپنی جانِ تمنا تک پہنچ جاؤں لیکن میں چیف لاما کی ہدایات کو کسی قیمت پر فراموش نہیں کرسکتا تھا۔ ساحل کو حاصل کرنے کا یہ آخری موقع تھا۔ میں اس سنہری موقع کو کیوں کر گنوا دیتا۔ میری کیفیت اس بھوکے شخص ایسی تھی جس کے سامنے اچانک نوع بہ نوع خوش ذائقہ، بھاپ اڑاتے ہوئے کھانوں کی کئی ڈشز سجادی جائیں۔ اس صورتِ حال میں، میں کسی بے صبری یا بچپنے پن کا مظاہرہ کر کے اپنی منزل کو کھونا نہیں کرسکتا تھا۔ گرم گرم نوالہ منہ میں رکھنے سے زبان جل جایا کرتی ہے، میں اس قسم کا کوئی رسک لینے کا تیار نہیں تھا۔ چیف لاما کی ہدایت میرے لیے مشعلِ راہ تھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے علاوہ کوئی اور بھی اس کمرے میں موجود ہو۔ یہ احساس خاصا سنسنی خیز تھا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا اور آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا تھا۔ کسی کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی میں نے یک لخت آنکھیں کھول دیں۔

میں نے صوفیہ کو بیڈ کے قریب کھڑے پایا۔ وہ بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے بیڈ روم کے دروازے کو نیم وا چھوڑ دیا تھا لیکن اب وہ پورا کھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں صوفیہ سے کوئی سوال کرتا، وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اچھا ہوا' تم خود ہی جاگ گئے۔ میں تذبذب میں تھی، تمہیں اٹھاؤں کہ نہیں!"

"صوفیہ! تم اس قدر پریشان کیوں نظر آرہی ہو" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "تم ابھی تک سوئی کیوں نہیں ہو سب خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت نہیں ہے وجدان!" وہ گھبراہٹ میں مجھے میرے اصلی نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی "ساتھ والے بیڈروم میں بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

اس کے مبہم انداز نے مجھے گہری تشویش میں ڈال دیا، میں نے بستر چھوڑتے ہوئے پوچھا "تم کس گڑبڑ کی بات کررہی ہو؟"

"اس بیڈ روم میں کروکوڈائل گھس گیا ہے!" اس نے متوحش لہجے میں بتایا۔

"کروکوڈائل...... یعنی مگر مچھ؟" میری تشویش میں اضافہ ہوگیا۔

"ہاں ہاں" وہ اثبات میں سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

صوفیہ کی بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ وہ اپارٹمنٹ پوری طرح پیک تھا۔ کروکوڈائل تو بہت دور کی بات ہے چوہا کا ایک بچہ بھی ہم سے اجازت حاصل کیے بغیر اس اپارٹمنٹ میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر میں نے داخلی دروازے کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈبل لاک لگایا تھا۔ علاوہ ازیں، قاہرہ کے اس بارونق علاقے میں کسی مگرمچھ کا کیا کام!

میں نے ایک فوری خیال کی تصدیق کی خاطر اس سے پوچھ لیا۔ "کہیں تم نے کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھ لیا صوفیہ؟"

"یہ خواب نہیں، ایک حقیقت ہے" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بیڈ روم سے باہر لاتے ہوئے بولی "آؤ، اس حقیقت کو تم بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لو!"

میں الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ، صوفیہ کا ہاتھ پکڑ کر بڑے بیڈروم میں پہنچ گیا۔ میری متلاشی نظر نے ایک لمحے میں اس کمرے کا تنقیدی جائزہ لے لیا۔ مجھے وہاں پر کوئی مگرمچھ! مگرمچھ کا بچہ تک دکھائی نہ دیا۔ یہ صورتِ حال خاصی حیران کن تھی۔ میری سوالیہ نگاہ صوفیہ کے چہرے پر جم گئی۔

"کہاں ہے وہ کروکوڈائل؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

"وہاں" اس نے کپڑوں والی بڑی چوبی الماری کی جانب اشارہ کیا "اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔"

مجھے صوفیہ کی ذہنی صحت پر شک ہونے لگا۔ اس نے جس قدِ آدم چوبی الماری کی جانب اشارہ کیا تھا ویسی ہی ایک الماری اس بیڈروم میں بھی رکھی تھی جہاں سے صوفیہ مجھے اٹھا کر لائی تھی۔ یہ دونوں الماریاں دیوار گیر نہیں تھیں بلکہ عام سے انداز میں دیوار کے ساتھ استادہ تھیں۔ ان کی پشت اور دیوار کے درمیان اتنا فاصلہ ہرگز نہیں تھا کہ وہاں کوئی بڑا کروکوڈائل یا بے بی کروکوڈائل پناہ گزیں ہوسکے۔ میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"صوفیہ! لگتا ہے' تمہارے دماغ کا کوئی اسکریو ڈھیلا ہوگیا ہے۔"

"تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟" اس نے گہری سنجیدگی سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

"یہ مذاق نہیں تو اور کیا ہے!" میں نے قدرے برہمی سے کہا "کوئی مگرمچھ اس الماری کے پیچھے کیسے چھپ سکتا ہے؟ وہاں اتنی گنجائش کہاں ہے؟"

"وہ کوئی جوان کروکوڈائل نہیں۔" اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا "مجھے وہ کسی کروکوڈائل کا بچہ لگا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے بیڈ کے نیچے سے نکل کر الماری کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا ہے۔"

"کروکوڈائل کا بچہ بھی کوئی چوہا نہیں ہوتا!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تم میری بات کا اعتبار نہیں کررہے۔ مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔" اس کے لہجے...... سے شکوہ جھلکنے لگا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی حالت اور ذہنی کیفیت پر ماتم کیا اور بہ ظاہر سنجیدہ ہوتے ہوئے اس سے پوچھا "کیا تم نے کروکوڈائل کے اس بچے کو الماری کے پیچھے سے نکالنے کی کوشش نہیں کی؟"

"میری ہمت نہیں پڑی" وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی "اسی لیے تمہیں بلانے دوسرے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔"

میں نے محسوس کیا، وہ کسی نادیدہ مگرمچھ کے سبب اچھی خاصی خوف زدہ تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ شاید اسے واہمہ ہوگیا ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہو! بہ بہرحال، اس کی فکر مندی اور ہراس بالکل جینوئن تھا۔ میں سمجھ گیا، اسے نفسیاتی اور عملی دونوں قسم کے علاج کی ضرورت تھی۔ اس کے ذہن پر چھائے ہوئے خوف وہراس کو فوری طور پر زائل کرنا ضروری تھا۔ ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو صوفیہ! میں ابھی دیکھ لیتا ہوں، کون سا کروکوڈائل اس الماری کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے!"

بات ختم کرتے ہی میں آگے بڑھا اور چوبی الماری کو ایک زوردار ٹھڈا مارا۔ اس ضرب کے نتیجے میں الماری کے پیچھے سے "کھڑکھڑاہٹ" ایسی آواز پیدا ہوئی۔ وہاں واقعی کوئی گڑبڑ موجود تھی۔

"دیکھا...... دیکھا......" وہ ہیجانی انداز میں بولی "میں نے کہا تھا نا......" وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر متوحش نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس "کھڑکھڑاہٹ" سے میں یہی سمجھا تھا' الماری کے پیچھے کوئی چوہا چھپا بیٹھا ہے۔ عین ممکن ہے، وہ چوہا معمول کی کسی کارروائی میں مصروف ہو!

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا "تم نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، میں تمہارے سامنے ہی اسے چیک کرتا ہوں۔"

"وجدان! ذرا سنبھل کر" وہ محتاط لہجے میں بولی "ٹھہرو' میں تمہیں کچھ لا کر دیتی ہوں۔ میں نے ادھر واش روم میں ایک چیز رکھی دیکھی ہے۔"

بات ختم کرتے ہی وہ مجھے بیڈروم میں چھوڑ کر کامن روم والے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کی مبنی برحماقت وحشت زدگی پر سر جھٹک کر رہ گیا ہے۔ مجھے یقین تھا، اس چوبی الماری کے عقب سے ایسا کچھ برآمد نہیں ہوگا جسے مگرمچھ یا گھڑیال وغیرہ کے خانے میں فٹ کیا جاسکے لیکن صوفیہ کے اطمینان اور تسلی کی خاطر ایک ڈراما کرنا ضروری تھا۔ جب تک وہ واش روم سے واپس آتی، میں نے اس چوبی الماری کو "چیک" کرلیا۔ وہ ایک بھاری بھرکم الماری تھی جسے اپنی جگہ سے ہٹانے کے لیے تین چار افراد کی ضرورت تھی، ہاں البتہ "چی" کی مدد سے میں تن تنہا اسے کھسکا کر جہاں چاہتا، پہنچا سکتا تھا مگر کسی بھی قسم کی کارروائی صوفیہ کے سامنے کرنا ضروری تھا تاکہ تسلی ہوجائے۔

وہ دوبارہ بیڈروم میں نمودار ہوئی تو اس کے ایک ہاتھ میں مجھے آہنی راڈ نظر آئی۔ وہ مذکورہ راڈ کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ لے لو۔ میں جب چینج کرنے ادھر گئی تھی تو میں نے اسے وہاں پڑے دیکھا تھا۔"

میں نے وہ راڈ اس کے ہاتھ سے لے لی۔ اس آہنی راڈ کی لمبائی تین فٹ کے قریب اور موٹائی لگ بھگ آدھی انچ تھی۔ وہ ایک مضبوط اور خطرناک راڈ تھی۔ میں نے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

"تم اس بیڈ کے اوپر بیٹھ جاؤ" میرا اشارہ جس بیڈ کی جانب تھا' وہ چوبی الماری کی مخالف سمت میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا "میں اس کروکوڈائل کو الماری کے پیچھے سے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں"

"ذرا احتیاط سے وجدان۔" وہ مذکورہ بیڈ کے اوپر چڑھتے ہوئے بولی "کہیں وہ پلٹ کر تم پر حملہ آور نہ ہو جائے!"

میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہہ دیا "تم میری فکر نہ کرو۔ مجھے ایسے خوں خوار جانوروں سے نمٹنے کا وسیع تجربہ ہے" پھر اس کی مزید تسلی کے لیے کہا "شاید تمہیں معلوم نہیں، میں دریائے ایمیزون میں ایک طویل عرصے تک کروکو

ڈائل اور ایلی گیٹر کا شکار کرتا رہا ہوں!''

''کیا تم جنوبی امریکا میں بھی رہے ہو؟'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

دریائے ایمیزون (AMAZON) جنوبی امریکا کے سب سے بڑے ملک برازیل میں بہتا ہے، بلکہ بہتا ہوا کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ ایمیزون کی کل لمبائی چار ہزار میل ہے جس میں سے دو ہزار ترانوے میل برازیل میں واقع ہے۔ ایمیزون دنیا کا دوسرا بڑا دریا ہے۔ نمبرون کا اعزاز مصر میں بہنے والے دریائے نیل کو حاصل ہے جس کی کل لمبائی چار ہزار ایک سو ساٹھ میل ہے۔ میں نے صوفیہ کا دھیان بٹانے اور خوف کم کرنے کے لیے یہ چکر چلایا تھا...... اور وہ میرے چکر میں آ بھی گئی تھی۔

میں نے اس کی حیرت کے جواب میں کہا ''تم اس چکر میں نہ پڑو کہ میں کون کون سے امریکا میں رہا ہوں، صرف یہ دیکھو کہ ایک آہنی سلاخ کی مدد سے کسی وحشی مگرمچھ کا شکار کس طرح کیا جاتا ہے!''

وہ بے یقینی اور الجھن کی ملی جلی کیفیت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے سلاخ کے استعمال سے پہلے چوبی الماری پر اپنے پاؤں سے ایک اور ٹھوکر لگائی۔ اس ٹھوکر کے جواب میں بھی وہی مخصوص کھڑکھڑاہٹ ابھری جو اس سے پہلے سنائی دی تھی۔ یہ تو طے ہوگیا، اس الماری کے عقب میں کوئی جان دار موجود تھا۔ میں سلاخ تھامے، تھوڑا پیچھے ہٹ کر اس جان دار کے برآمد ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ نکل کر نہ دیا تو میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا ''یہ ایسے نہیں مانے گا!''

میں دیوار کے قریب آیا اور فرش پر اکڑوں بیٹھ کر میں نے آہنی سلاخ کو چوبی الماری کی پشت کے ساتھ واقعی خلا میں گھمایا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میں دیوار الماری کے درمیان مختصر سے خلا میں کوئی شے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

میرا ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آیا کہ میں نے محسوس کیا، آہنی سلاخ کا آزاد سرا اس مختصر خلا میں موجود مبینہ جان دار کے وجود سے ٹکرایا ہو۔ اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ایک وحشت ناک بلبلاہٹ ابھری۔ یقینی طور پر سلاخ کا دوسرا سرا وہاں موجود جانور کے جسم میں خاصی شدت سے چبھا تھا۔

میں نے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''کوئی ہے تو سہی۔ تم نے غلط نہیں کہا تھا!''

''ہاتھ پاؤں بچا کر وجدان! وہ خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے'' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

میں کھد بڑنے والے انداز میں الماری کے پیچھے اس آہنی سلاخ کو حرکت دینے لگا۔ وہ مخصوص وحشت ناک بلبلاہٹ ایک مرتبہ پھر ابھری، اس کے بعد وہ خود بھی نمودار ہوگیا۔ میں الماری کے عقب سے اسے گولی کی رفتار سے نکل کر ایک طرف فرار ہوتے ہوئے پایا...... وہ بلی کے سائز کا ایک صحت منداور پلا پلایا چھپکلا تھا!

میں نے اس جسامت کی چھپکلی یا چھپکلا زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے پڑھ اور سن رکھا تھا کہ اس نوعیت کے زہریلے چھپکلے صحرائی ملکوں خصوصاً افریقہ کے بعض ممالک میں پائے جاتے ہیں اور اتفاق سے اس وقت ہم مصر یعنی افریقہ ہی میں تھے۔ صوفیہ نے کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ اس چھپکلے کی صورت بڑی حد تک کسی کروکو ڈائل (مگرمچھ) یا ایلی گیٹر (گھڑیال) سے ملتی جلتی تھی۔

میں اس زہریلے چھپکلے کو فرار ہوتے دیکھ ہی رہا تھا میری سماعت سے صوفیہ کی آواز ٹکرائی ''وجدان! یہی ہے وہ موذی۔ اس کو ختم کردو...... جانے نہ پائے......''

میں آہنی سلاخ تھامے اس مضروب ''مفرور'' کی جانب بڑھا۔ الماری کے عقب میں آہنی راڈ نے اسے اچھا خاصا زخمی کردیا تھا۔ اس کے بدن سے ٹپکتے ہوئے خون کو دیکھ کر اس کی وحشت ناک بلبلاہٹ کا سبب سمجھ میں آگیا جو تھوڑی دیر پہلے دو مرتبہ اس بیڈ روم میں سنائی دی تھی۔ اس کی جان بچانے کی کوشش میں کمرے کا قالین جگہ جگہ سے داغ دار ہو رہا تھا۔ میری اندھادھند حرکت نے اس کے جسم پر کوئی خطرناک گھاؤ ڈال دیا تھا۔

کم وبیش ایک منٹ تک ہمارے درمیان آنکھ مچولی اور بچ بچاؤ کا کھیل جاری رہا وہ خود کو محفوظ کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے خوں خوار انداز میں مجھ پر حملہ آور بھی ہو رہا تھا تا ہم میں نے اس کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ یہ بے قاعدہ مقابلہ چند لمحات تک جاری رہا۔ اس دوران میں صوفیہ کی مدھم اور بلند چلاہٹ وقفے وقفے سے بلند ہوتی رہی۔ چھپکلا جلد ہی میرے داؤ میں آگیا پھر میں نے اسے ٹھنڈا کردیا۔ آہنی سلاخ کی ایک بھرپور ضرب اس کے سر میں ایسی لگی کہ وہ زمین بوس ہوکر تڑپنے لگا۔ اسی لوٹ پوٹ کے دوران میں اس کے حلق سے بڑی دردناک اور دہشت انگیز آوازیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ وہ چند لمحات تک جان کنی کے عالم میں اذیت میں مبتلا رہا پھر بے حس و حرکت ہو۔ یہ بے حسی و بے حرکتی اس کی حسرت ناک موت کا کھلا اعلان تھی!

اس چھپکلے کو ٹائیں ٹائیں فش ہوتے دیکھا تو صوفیہ کی

جان میں جان آگئی۔ اس نے ایک طویل اطمینان بھری سانس خارج کی اور بیڈ سے اتر کر میرے قریب آگئی پھر مردہ چھپکلے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے بولی۔

''اب اس کا کیا کرو گے وجدان؟'' اس کے لہجے کی وحشت پوری طرح زائل نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے مذاق کا رنگ اختیار کیا اور شگفتہ لہجے میں کہا ''اس کم بخت کو شکار کرنے کے بعد پکا کر کھایا بھی نہیں جا سکتا اور اس کا اچار مربہ بنا کر مرتبانوں میں بھرنا بھی مناسب نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے۔ اسے ''ضائع'' ہی کرنا پڑے گا۔''

میں نے لفظ ضائع پر اچھا خاصا زور دیا تو وہ پوچھنے لگی ''یہی تو میں بھی جاننا چاہتی ہوں' تم اس منحوس کی لاش کو کس طرح ضائع...... میرا مطلب ہے ٹھکانے لگاؤ گے؟''

''گاربیج شوٹ کے ذریعے'' میں نے کہا' ''آخر کو یہ کس مرض کی دوا ہے؟''

''اوہ! میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

میں نے کہا ''اس لیے کہ تمہارا دھیان پوری طرح کہیں اور لگا ہوا تھا!''

بات کے اختتام پر میں نے مردہ چھپکلے کی طرف دیکھا تو وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گئی۔

لگژری اپارٹمنٹس میں گاربیج شوٹس کی سہولت مہیا ہوتی ہے جس کے ذریعے آپ اپنے اپارٹمنٹ کا کچرا براہ راست کچرا کنڈی تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ گاربیج (GARBAGE) یعنی کچرے کے شوٹ میں ڈال دیں۔ مخصوص پائپ فوراً اسے کچرے کے ذخیرے تک پہنچا دے گا۔ آئندہ دس منٹ کے اندر میں وائپر اور اسی آہنی سلاخ کو استعمال کر کے چھپکلے کی خوں چکاں لاش سے ''نجات'' حاصل کر لی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ گاربیج شوٹ کتنے کام کی شے ہے!

اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا' صوفیہ نے حتمی لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا ''میں اس بیڈروم میں بالکل نہیں سوؤں گی!''

اس کا اشارہ اس بڑے بیڈروم کی طرف تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں نے ایک خوں ریز مقابلے کے بعد موذی چھپکلے کو جہنم واصل کیا تھا۔ یہ خوف و ہراس پھیلانے والا اتنا بڑا واقعہ تھا کہ صوفیہ کا مطالبہ مجھے بالکل درست لگا۔ بیڈروم کے فرش پر بچھا ہوا قالین بھی جا بہ جا خون آلود ہو چکا تھا۔ یہ ایسے آثار تھے کہ وہاں رات بسر کرنے والے کو لمحہ بہ لمحہ...... اس ''واقعے'' کی یاد دلاتے رہتے۔ آدھی رات کو یہ تو ممکن نہیں تھا کہ میں قالین کو کسی ڈرائی کلینر کے پاس بھجوا دیتا یا خود بیٹھ کر اس کے دھبے دور کرنے میں لگ جاتا، ہاں' البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ میں وہ رات اس بیڈروم میں سو کر گزار لیتا۔ اگلی صبح ہمیں ویسے بھی اس اپارٹمنٹ سے رخصت ہو جانا تھا۔

اسی خیال کے تحت میں نے صوفیہ سے کہا ''ٹھیک ہے' اس بیڈروم میں' میں سو جاتا ہوں۔ تم چھوٹے بیڈروم کے ڈبل بیڈ پر چلی جاؤ۔''

اس نے ایک لمحے کے لیے میری تجویز پر غور کیا پھر سہمے ہوئے لہجے میں بولی ''اگر وہاں بھی کوئی ایسا ہی کرد کوڈائل آئی مین چھپکلا نکل آیا تو؟''

''ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے'' میں نے سرسری انداز میں کہا ''تم یہاں سونے کو تیار نہیں ہو، وہاں بھی تمہیں خدشات ڈرا رہے ہیں۔ بتاؤ، میں اس صورتِ حال میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ اگر تم کہو تو گزشتہ رات کی طرح میں اسی بیڈروم میں تمہارے ساتھ سو جاتا ہوں۔''

وہ خون آلود قالین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی ''اسے دیکھ کر اور سوچ سوچ کر مجھے متلی سی محسوس ہو رہی ہے...... اس کے علاوہ میں بے پناہ خوف زدہ بھی ہوں۔''

''بتاؤ!'' میں نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکا ''میں تمہارا خوف دور کرنے کے لیے فوری طور پر کیا کروں؟''

وہ سادگی سے بولی ''ساتھ رات گزارنے کی تمہاری تجویز خاصی مناسب ہے، اگر اس تجویز پر عمل درآمد کے لیے بڑے بیڈ والا چھوٹا بیڈروم استعمال کیا جائے تو۔ ہم بڑی آسانی سے ڈبل بیڈ پر نیند پوری کر سکتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس کا خیال خاصا پُرکشش تھا لہٰذا میں فوراً اس کا ہم خیال بن گیا۔

ہم واپس ڈبل بیڈ والے بیڈروم میں آئے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اصولی طور پر ہمیں سو جانا چاہیے تھا۔ نیند پوری کر کے کل کے لیے تر و تازہ ہونا ضروری تھا۔ آئندہ روز میری زندگی کا ایک انوکھا اور سنسنی خیز ٹرپ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے خیالات سے صوفیہ کو آگاہ کیا تو اس نے کہا۔

''وجدان! چھپکلے والے واقعے نے مجھے بری طرح اپ سیٹ کر کے رکھ دیا۔ میں سونے کی کوشش میں جیسے ہی آنکھیں بند کرتی ہوں، وہ بدتمیز خبیث چھپکلا کسی کرو کوڈائل کے مانند آنکھیں نکال کر مجھے گھورنے لگتا ہے۔'' ایک لمحے کا

توقف کر کے اس نے جُھرجُھری لی اور بڑی بے بسی سے بولی "پتا نہیں، میں آج کی رات سو بھی سکوں گی کہ نہیں؟"

"سونا بہت ضروری ہے صوفیہ!" میں نے قطعیت سے کہا "اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

"کیا مدد!" وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگی "کیا تم مجھے لوری سنا کر نیند کی وادی میں اتار دو گے؟"

"لوری میں نہیں، بلکہ تم مجھے سناؤ گی" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ مزید الجھ گئی "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں نے اپنے مطلب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "میں تمہارے سر میں اپنی انگلیوں سے ہلکا ہلکا مساج کرتا ہوں۔ تم اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر مجھے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دو۔ پیدا ہونے سے لے کر اب تک اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات۔ ربط اور ضبط کی ضرورت نہیں، بس تم نہایت ہی آہستگی سے دھیمے لہجے میں اپنی داستان حیات بیان کرتی جاؤ مجھے یقین ہے۔ یہ کہانی ختم ہونے سے پہلے تم گہری نیند میں پہنچ جاؤ گی۔"

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور سوال کیا "کیا یہ بھی ہپناٹزم کی کوئی قسم ہے؟"

"تم آم کھانا چاہتی ہو یا تمہیں پیڑ شمار کرنے سے مطلب ہے؟"

"مجھے شماریات کا مضمون ہمیشہ بورنگ لگا ہے!"

"پھر تم صرف آم پر نظر رکھو"

اس نے اپنے سر کو میری گود میں رکھ دیا۔"

میری انگلیوں نے مساج کی ابتدا کی ہی تھی کہ وہ شروع ہو گئی۔ چند لمحات کے بعد اس کی آواز بوجھل ہونے لگی۔ یہ نیند کا خمار تھا جو اس کے الفاظ کو آہنی خود پہنا کر وزنی بنا رہا تھا۔ وہ جس خوف کے باعث آنکھیں بند کرنے سے گریزاں تھی، میری آغوش میں پہنچتے ہی وہ خوف زائل ہو گیا۔ اس کی کہانی سننا تو ایک نفسیاتی بہانہ تھا۔ درحقیقت، میں اسے ایک تحفظ کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ دنیا کی کوئی بھی عورت، مرد کی بانہوں میں خود کو سب سے زیادہ محفوظ سمجھتی ہے۔ میں نے اسے یہی محسوس کرانے کے لیے یہ نفسیاتی پیترا مارا تھا...... اور میری یہ کوشش صدفی صد کامیاب رہی۔

میں نے احساس کی تھپکی دے کر صوفیہ کو گہری نیند میں پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے اپنے جذبات کو تھپکنے میں کافی محنت کرنا پڑی۔ اس رات میں اپنے دماغ کو نیند کی ہدایت دیتے ہوئے ...سو بار گڑ بڑایا توجہ کے سامنے وہ کسی ریشمی تھان کے مانند کھلی پڑی تھی۔ خیال کو پھسلنے سے بچاتا تو نتیجے میں میری سوچ لڑکھڑا کر اس کی طرف چلی جاتی لیکن شاید چنگ فورن پوشی ان لمحات میں براہ راست مجھ پر ناظر تھا۔ میرے پائے استقامت میں ایک ذرا سی ڈگمگاہٹ نہ آئی۔ میں نے اپنے احساسات اور جذبات پر قابو رکھا اور جبلی خواہش کو اسی طرح تھپک تھپک کر سلا دیا جیسے تھوڑی دیر پہلے اس خواہش کی ذمے دار کو سلایا تھا۔

دوسرے کو الزام دینا بہت آسان ہوتا ہے۔ ان لمحات میں شاید میں یہی کر رہا تھا!

☆☆☆

"کانٹیکی" ٹور اینڈ ٹرپ ٹریول کمپنی کی سپر لگژری ائر کنڈیشنڈ کوچ اپنی مثال آپ تھی۔ میں نے اتنی آرام دہ اور سہولیات سے بھرپور کوچ میں پہلے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ بلاشبہ کسی ائر بس کی "بزنس کلاس" کے برابر اس میں سہولیات فراہم کی گئی تھیں۔ کوچ کے پہلوؤں میں کمپنی کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا تھا جس میں لفظ "کانٹیکی" میں ایک ابھرتے ہوئے سورج کو دکھایا گیا تھا۔ اس کے نیچے سرخ، پیلے، سبز، گلابی اور نیلے رنگ کی پانچ پٹیاں بڑے دلکش انداز میں نیچے سے اوپر تک پھیلی ہوئی تھی۔ مخصوص مونوگرام کوچ کی پشت پر بھی موجود تھا۔

کوچ پر سوار ہونے سے پہلے، ہوٹل اوئسس میں کانٹیکی کے عملے نے تمام مسافروں کو متعارف کرایا گیا۔ ان میں سب سے اہم شخص ٹور منیجر بن ہال تھا۔ بن ہال کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ وہ بہت محنتی شخص تھا۔ اس نے کمپنی جوائن کرنے کے بعد جاں فشانی سے کام کیا اور انیس سو پچانوے میں ٹور منیجر بن گیا۔ اب وہ پچھلے چند سال سے اسی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔ یہ کم وقت میں کی جانے والی بڑی ترقی تھی۔ بن ہال فٹ بال کا بہت شوقین تھا۔ اسے جب بھی مہلت میسر آتی، کھیل کے میدان میں نکل جاتا۔ وہ ایک ہنس مکھ، ملنسار اور متعاون پیشہ ور شخص تھا۔ میں نے اسے اچھا خاصا باتونی پایا۔

اہمیت کے لحاظ سے بن ہال کے بعد کوچ کے ڈرائیور وارن ڈکسن کا نمبر آتا تھا۔ وارن ڈکسن نیوزی لینڈ کا رہنے والا تھا۔ کانٹیکی جوائن کرنے سے پہلے وہ ایک تعمیراتی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ انیس سو ستاسی میں ڈرائیور بنا پھر انیس سو نوے میں اس نے "کانٹیکی یورپ" میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کوچ کی ڈرائیوری سے پہلے وہ روس اور اسکینڈے نیویا میں بھی ٹور ٹرپ کی بسیں چلا چکا تھا۔ بن ہال

کی بہ نسبت وہ ایک کم گو، سنجیدہ اور موڈی شخص تھا۔

ان تمام تر خصوصیات کے پیشِ نظر مجھے محسوس ہوا کہ کانٹیکی کمپنی کے توسط سے انیس سو پچانوے امریکی ڈالرز میں تین ملکوں کا سولہ روزہ سیاحتی دورہ زیادہ مہنگا نہیں تھا۔ بعد میں میرا یہ خیال بالکل درست ثابت ہوا۔ اس کمپنی نے آرام، سہولت اور تفریح فراہم کرنے کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

چوبیس اپریل کو ہم کانٹیکی کی کوچ میں بیٹھ کر قاہرہ کے ہوٹل اوئسس سے روانہ ہو گئے۔ ٹور منیجر بن ہال ایک گائیڈ کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا اور راہ میں پڑنے والی ہر قابلِ ذکر جگہ یا مقام کے بارے میں وہ تمام مسافروں کو تفصیلاً بتاتا بھی جاتا تھا۔ میں اس تفصیل سے بچتے ہوئے محض اہم مقامات کا مختصر ذکر کروں گا کیوں کہ میری داستانِ حیات میں اس سیاحت کی پہلی اہمیت نہیں، میں جس مقصد کی خاطر اس کھٹ راگ میں الجھا تھا، وہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھا لیکن یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میں چپ چپاتے اس ذکر کو گول کر کے آگے بڑھ جاؤں۔ جن قارئین کو یہ بیان طوالانی اور بورنگ محسوس ہو، ان سے بھی اور جو اسے پڑھ کر تشنگی محسوس کریں، ان سے بھی میں پیشگی معذرت خواہ ہوں!

پچیس اپریل کی صبح ہمیں ایجپشن میوزیم (مصری عجائب گھر) کی سیر کرائی گئی۔ ہمارا گائیڈ بن ہال اپنے متاثر کن زورِ بیان سے ہمیں قدیم مصری تہذیب کے دور میں لے گیا۔ ہم خود کو ہزاروں سال پہلے کے مصری بادشاہوں کے عہد میں محسوس کرنے لگے۔ یہ ایک سنسنی خیز اور ناقابلِ فراموش محسوساتی تجربہ تھا۔ ازیں علاوہ ہم نے بہت سے بادشاہوں کے مجسمے اور عظیم الشان اہرام بھی دیکھے۔ شام کے وقت کوچ کے تمام مسافروں کو بہ ذریعہ ٹرین اسوان کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ اس ٹرین کو رات بھر سفر کر کے قاہرہ سے اسوان پہنچنا تھا۔

چھبیس اپریل کو اسوان کی سیر کی گئی۔ دیگر چھوٹے موٹے اہم مقامات کا نظارہ کرنے کے بعد ہمارا ٹور منیجر ہمیں اسوان ہائی ڈیم دکھانے لے گیا۔ یہ ڈیم دنیا کا ایک بڑا آبی ذخیرہ مانا جاتا ہے جس کی دیواروں کے اندر ایک سو باسٹھ ارب مکعب میٹر پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، یہ ایک سو باسٹھ ارب کیوبک میٹر پانی، ڈیڑھ ملین ایکٹرز زمین کو بہ آسانی سیراب کر سکتا ہے۔ اسوان ہائی ڈیم انیس سو اکہتر میں مکمل ہوا تھا۔ یہ بڑی دیکھنے کی چیز ہے۔ ڈیم سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے بوٹینیکل گارڈنز دیکھے اور یوں دن کا اختتام ہو گیا۔

ستائیس اپریل کو ہم "نائل کروز" میں بیٹھ کر اسوان سے ایڈفو کی جانب روانہ ہو گئے۔ نائل کروز ایک عالی شان اور آرام دہ شپ ہے۔ انڈے کے مانند سفید رنگ کے اس بحری جہاز کی باڈی پر نیلی، سبز اور پیلی طویل پٹیاں بہت حسین اور خوب صورت دکھائی دیتی ہیں۔ "نائل کروز" پر بنے ہوئے تمام پرائیویٹ کیبن ہر قسم کی سہولت سے لیس ہیں۔ ٹی وی سیٹ اور ائر کنڈیشنر تو لازمی شے ہے۔ اس کے علاوہ، سوئمنگ پول، سن باتھ ڈیک، ریسٹورنٹ، نائٹ کلب اور مختلف نوعیت کی گفٹ شاپس سب کچھ شپ پر موجود ہے۔ نائل کروز NILE CRUISE پانی میں تیرتے ہوئے کسی جہانِ حیرت سے کم نہیں!

ایڈفو تاریخی اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم نے یہاں مصری آرکیٹیکچر کے عظیم الشان شاہ پارے دیکھے جو ساڑھے تین ہزار سال قبل رمسیس دوم کے عہد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی دوران میں "جھیل ناصر" کا نظارہ بھی کیا گیا۔ لنچ کے بعد ہم "کوم ادمبو" پہنچے اور ہم نے ایک ایسا ٹیمپل دیکھا جو منفرد اور باعثِ حیرت ہے "کوم ادمبو ٹیمپل" کو بہ یک وقت دو مصری خداؤں (دیوتاؤں) کی مشترک عبادت گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ آنے والی رات ہم نے نائل کروز ہی میں بسر کی۔

اٹھائیس اپریل کا نائل کروز ہمیں ایڈفو سے لگزر لے گیا۔ لگزر میں ہمیں ایک ایسا ٹیمپل دیکھنے کو ملا جو مصر کا سب سے زیادہ "محفوظ" ٹیمپل کہلاتا ہے۔ محفوظ ان معنوں میں کہ یہ ابھی تک کم و بیش اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ یہ ٹیمپل فالکن دیوتا "ہورس" سے منسوب ہے۔ لگزر ہی میں ہم نے تھیبس کا قدیم شہر بھی دیکھا۔ یہ رات بھی نائل کروز پر ہی بتائی گئی۔

انتیس اپریل کو لگزر میں ہی واقع مشہور معروف وادی "ویلی آف دی کنگز" دیکھی گئی۔ اس وادی میں مشہور زمانہ کنگ طوطخ آمن بھی دفن ہے۔ ہم نے لگزر کی سیر کا سلسلہ جاری رکھا اور سہ پہر کے وقت کانٹیکی کے مخصوص ہوٹل میں چیک ان ہو گئے۔ ان کے ساتھ ہی نائل کروز کا سفر تمام ہوا۔ ہم نے ہوٹل کے سوئمنگ پول میں ایک فرحت بخش تیراکی کی اور آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں گھس گئے۔

تیس اپریل کی صبح، لگزر سے قاہرہ جانے سے پہلے ہم نے "ٹیمپل آف لگزر" کی بھی سیر کی۔ ازیں علاوہ اونٹ کی سواری بھی کی گئی۔ یہ دن بھی سیر و تفریح میں گزر گیا اور ہم بائی ائر قاہرہ کی جانب پرواز کر گئے۔

یکم مئی کو قاہرہ کی تفصیلی سیر کی گئی۔ دیکھنے کی قابل ذکر جگہیں جو رہ گئی تھیں انہیں نمٹایا گیا۔ ان مقامات میں بازار خان الخلیلی، مختلف قدیم اہرام اور دیگر مساجد کے ساتھ ساتھ مسجد سلطان حسن بھی شامل تھی۔ خان الخلیلی بازار اور مسجد سلطان حسن میرے پہلے سے دیکھے ہوئے مقامات تھے۔ اس رات ہوٹل لوکسس میں ایک ''گیٹ ٹوگیدر'' پارٹی کا اہتمام کیا گیا۔ مصر کی آٹھ روزہ سیر مکمل ہو گئی تھی اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ان آٹھ دنوں میں کوئی بھی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

اگلی صبح یعنی دو مئی کو ہم مصر سے اسرائیل روانہ ہو گئے۔ یہ سفر قاہرہ سے تل ابیب تک کا تھا۔ تل ابیب کی فضا میں داخل ہوتے ہی میری عجیب سی حالت ہونے لگی۔ میں نے خود کو جذباتی کش مکش میں مبتلا پایا۔ ربی موشے ہائمن نے اسی شہر کے پوش علاقے کے ایک بنگلے کی بالائی منزل پر میری جانِ تمنا کو ایک طویل عرصے سے قید کر رکھا تھا۔ ساحل تک مکمل رسائی کا ایک ایک راستہ مجھے ازبر ہو گیا تھا

اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا، میں کانٹکی کے قافلے سے بچھڑ جاؤں اور کمان میں سے نکلے ہوئے کسی تیر کے مانند سیدھا اپنے حاصل زندگی تک پہنچ جاؤں۔ ہر مصلحت، ہر احتیاط کا دامن جھٹک کر میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاؤں اور اپنی ساحل کو حاصل کرنے کے بعد کسی ایسی پرسکون وادی کی طرف نکل جاؤں جہاں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ صرف وصال کے رات و دن ہوں، ہجر کی ایک گھڑی ہمارے نزدیک نہ پھٹکے ہم نے بہت جدائی اور فراق سہہ لیا تھا، اذیت ناک لمحات کا زہر اپنے حلق میں ٹپکایا تھا، آبلہ پا راہ پُرخار پر ایک طویل مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ اس وقت ہم ایک ہی شہر میں تھے اور ہمارے بیچ صرف چند کلو میٹر کا فاصلہ حائل تھا۔ یہ فاصلہ میں آنِ واحد میں پاٹ سکتا تھا اور......!

یہ فاصلہ مجھے پاٹنا تھا لیکن...... جذبات کی رو میں بہہ کر نہیں بلکہ مکمل ہوش مندی اور اعتماد میں رہ کر، اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے مجھے ایک مضبوط پلاننگ سے آگے بڑھنا تھا کیونکہ یہ آخری موقع تھا۔ اس مرحلے پر ایک ذرا سی غلطی، کوئی جذباتی لغزش یا غلط سمت میں اٹھنے والا ایک بھی قدم مجھے میرے مقصد، میری زندگی سے بہت دور دھکیل سکتا تھا۔

میں نے ساحل سے دور رہ کر بہت صبر کیا تھا، بہت برداشت کیا تھا۔ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپا تھا اور سیخ میں پروئے ہوئے کباب کے مانند سسکا تھا...... محض اس دن، اس گھڑی اور اس لمحے کے انتظار میں کہ میں جب اپنی ساحل کو حاصل کر لوں اور اب...... وہ دن، وہ گھڑی اور وہ لمحہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے کرب ناک انتظار کے صرف تین دن باقی رہ گئے تھے جس کے بعد مجھے فری ہینڈ ملنے والا تھا۔ اس مدت ہی میں مجھے اپنا کام دکھانا تھا لہٰذا عقل مندی کا تقاضا یہی تھا، میں اپنی آزمائش کے آخری مراحل کو پوری ثابت قدمی سے طے کروں اور جذبات سے مغلوب ہونے کے بجائے اپنے مقصد پر کڑی نظر رکھوں۔

اس توانا اور مثبت سوچ کے ساتھ ہی میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا عزم جوان ہو گیا ہو۔ مجھے اپنے رگ و پے میں ایک نیا جوش اور ایک ایک نئی سنسنی سی اترتی محسوس ہوئی۔ اس دلِ مسرور کن کیفیت نے میرے اندرون کو باغ باغ کر دیا۔

گزشتہ آٹھ دنوں میں، میں گاہے بہ گاہے ساحل اور موشے ہائمن کی ''خبر'' لیتا رہا تھا اور ادھر کے حالات کو اطمینان بخش پا کر میں بھی مطمئن ہو گیا تھا اور اب تو میں بھی ادھر ہی تھا لہٰذا تیسری آنکھ کو زیادہ سے زیادہ کھلا رکھنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ پچھلے آٹھ دنوں میں، میں ٹور منیجر اور گائیڈ مسٹر بن ہال سے خاصا گھل مل گیا تھا۔ یہ سب تیاری میں ایک خاص مقصد سے کر رہا تھا۔ مجھے اس شخص سے ایک کام لینا تھا۔ جب یہ قافلہ بیت شین (اسرائیل) سے پیٹرا (اردن) کی طرف روانہ ہوتا تو مجھے بن ہال کے تعاون سے ''اسٹے لانگر'' کا معاملہ نمٹانا تھا۔ اس سلسلے میں بن ہال سے میری بات ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ مجھے کام یابی کی بڑی امید تھی یہ اس ٹور کا ایک اہم ''معاملہ'' تھا!

قاہرہ سے تل ابیب کی طرف آتے ہوئے ہم نہر سوئز اور وادی سینا کی سیر کرتے ہوئے آئے تھے اس شام تل ابیب میں، ہمیں دنیا کے قدیم ترین سٹی پورٹ جافا کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جافا کی اپنی ایک آن بان اور شان ہے۔ اس کے علاوہ تل ابیب کے قابلِ ذکر مقامات کی سیر بھی کی گئی۔

تین مئی کی صبح ہم تل ابیب سے روانہ ہوئے اور نظارتھ کے راستے سیدھے بیت شین پہنچ گئے تل ابیب سے نکلتے وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم سے روح نکل رہی ہو، میری روح اسی شہر میں قید تھی۔ بہرحال پروگرام پر عمل ضروری تھا۔ قیصریہ کی طرف رخ کرنے سے پہلے ہم نے بیت شین شہر کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا۔ قیصریہ میں ہمیں قدیم رومن تھیٹر اور صلیبی قلعے دیکھنے کو ملے۔ یہاں سے ہم نے شمال میں سفر

جاری رکھا اور حیفہ پہنچ گئے۔ حیفہ، ایلات اور اشدود اسرائیل کی تین اہم بندرگاہیں ہیں۔ حیفہ میں ہم نے مشہور زمانہ باغات ''بہائی گارڈنز'' کی سیر کی اور آکو کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاریخ کے حوالے سے آکو میں بھی دیکھنے کے لائق بہت کچھ ہے۔ اس رات ہم آکو، حیفہ اور نظارتھ سے ہوتے ہوئے گیلیلی آ گئے۔

چار مئی کو گیلیلی کی سیر کی گئی۔ کیپرنام میں سینٹ پیٹر کی جنم بھومی دیکھی۔ دیگر مقامات مقدسہ کے علاوہ ''ماؤنٹ آف دی بیٹی ٹیوڈز'' کا نظارہ بھی کیا گیا۔ یہ پہاڑی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان پر نازل ہونے والی خدا کی رحمتوں سے منسوب ہے۔ اس کے بعد ہم ایک کشتی پر سوار ہو کر بحرِ گیلیلی دیکھنے نکل گئے۔ اس سیر سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم واپس بیت شین لوٹ آئے۔

پانچ مئی کی صبح میرے لیے بڑی سنسنی خیز تھی۔ اس روز ٹرپ کو بیت شین سے پیٹرا کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کوچ شیخ حسین بارڈر کو عبور کر کے اسرائیل سے اردن میں داخل ہو جاتی 'پھر' ''مادابا'' نامی ایک مقام پر مختصر پڑاؤ کے بعد آگے بڑھ جاتی۔ صحرائے اردن کے اندر سفر کرتے ہوئے وہ بالآخر پیٹرا شہر پہنچ جاتی۔ مادابا اور پیٹرا میں دیکھنے کے لیے کافی کچھ تھا۔ بن ہال نے مجھے اس بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ خاص طور پر جب پیٹرا سے ایلات کی طرف سفر کیا جاتا تو ایلات سے تھوڑا پہلے 'وادی رم سے گزر ہوتا جو لارنس آف عریبیا کا گھر مانی جاتی ہے۔

یہ تمام تاریخی مقامات دیکھنے کی خواہش تو دل میں انگڑائی لیتی تھی لیکن اس خواہش کو دبا کر رکھنا ضروری تھا کیونکہ اس عرصے کے دوران میں مجھے کوئی اور اہم فریضہ انجام دینا تھا۔ میرے پاس صرف تین دن کی مہلت تھی۔ ان تین دنوں میں ہمارا قافلہ بیت شین سے پیٹرا، پیٹرا سے ایلات اور ایلات سے یروشلم پہنچ جاتا۔ میں اس عرصے میں ''اپنا کام'' کر کے آٹھ مئی کو یروشلم میں اس سے جا ملتا۔ نو مئی کو ہمیں یروشلم (اسرائیل) سے واپس قاہرہ (مصر) آنا تھا اور اس مرتبہ ساحل میرے ساتھ ہوتی! ساحل کی ہمراہی کے تصور نے مجھے شاد کر دیا۔

بن ہال نے حسب وعدہ میرا کام کر دیا۔ بہ وقتِ رخصت اس نے کہا ''اب ہم آٹھ مئی کو یروشلم میں ملیں گے۔ تمہیں تل ابیب میں کسی مشکل کا سامنا ہو تو کانٹکی کے ایجنٹ سے مل لینا۔''

''تمہارا مطلب ہے، رابن یعقوبی سے؟'' میں نے تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا ''اسرام اسرائیل نامی کانٹکی کا یہ ایجنٹ آفس مکمل طور پر رابن یعقوبی کے کنٹرول میں ہے۔ میں تل ابیب میں رابن کو تم دونوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر جب تم اس سے رابطہ کرو گے تو وہ تمہارے ہر مسئلے کا حل بتا دے گا۔ چاہو تو اس کے توسط سے یا تم خود ہوٹل کا بندوبست بھی کر سکتے ہو۔ ویسے اس سلسلے میں، میں تمہیں ایک مشورہ ضرور دوں گا۔''

وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا ''تل ابیب میں قیام کے لیے ''ہوٹل ٹاپ'' تمہارے لیے زیادہ موزوں رہے گا۔''

''یہ وہی ہوٹل ٹاپ ہے نا' جو بن یہودہ اسٹریٹ پر واقع ہے؟''

''بالکل میں اسی ہوٹل ٹاپ کی بات کر رہا ہوں'' اس نے مجھے حسبِ توقع جواب دیا تو مجھے اپنا پورا وجود سنسنی کی لپیٹ میں محسوس ہوا۔ اسی ہوٹل کے کچن میں سلوان رات بھر مختلف کھانے پکانے میں مصروف رہتا تھا۔ مذکورہ ہوٹل میں قیام مجھے اپنے کام میں بہت ساری آسانیاں فراہم کرتا۔

بن ہال کی آواز پر میں خیالات سے چونکا اور پوری توجہ سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا ''میں ہوٹل ٹاپ کو فوقیت دینے کے لیے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ ہوٹل ہماری کمپنی کے پینل پر ہے، لہٰذا تمہیں وہاں قیام کے دوران میں زیادہ سے زیادہ سہولیات قدرے کم ادائی میں حاصل ہو جائیں گی۔ ہوٹل والے کمپنی کے مسافروں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ میں نے تم دونوں کو ''اسٹے لانگر'' کے سلسلے میں کانٹکی کا ''این او سی'' دے دیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تمہیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا پڑے!''

میں نے ایک اہم سوال کیا ''کیا ان تین روز کے دوران میں مجھے یعنی ہمیں صرف تل ابیب تک ہی محدود رہنا ہو گا؟''

''ایسی کوئی قید نہیں ہے'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولا ''تم دونوں کے پاسپورٹس پر اسرائیل کا ملٹی ویزا لگا ہوا ہے۔ تم اس ویزا کی مدت کے دوران میں پورے اسرائیل کی سیر کر سکتے ہو۔ اگر کبھی یہ سوال سامنے آئے کہ تم دونوں اپنے ٹرپ کے ساتھ کیوں نہیں ہو تو تم پوچھنے والے کو اسٹے لانگر کا این او سی دکھا سکتے ہو۔''

بن ہال کی وضاحت نے میرے ذہن کا بہت سا بوجھ اتار پھینکا۔ میں نے کہا ”ٹھیک ہے مسٹر ہال! ہم آٹھ مئی کو یروشلم میں دوبارہ ملیں گے...... اور اگر کسی وجہ سے تاخیر ہوگئی تو ہم نو مئی کو صبح کمپنی کو جوائن کرلیں گے۔“

یہ بات میں نے احتیاطاً اس کے ذہن میں ڈال دی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، مجھے اپنے مقصد کے حصول میں کتنا وقت لگے گا۔ یہ بھی ممکن تھا، میں وقت سے پہلے ہی فارغ ہو جاتا۔ غیریقینی حالات میں کوئی بھی حتمی بات کہنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ میں نے گنجائش کا دروازہ کھلا رکھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھا تو بن ہال نے کہا ”مجھے نہیں امید کہ تل ابیب میں تمہارا زیادہ دل لگ سکے۔ تل ابیب کے مقابلے میں یروشلم زیادہ تاریخی اور تہذیبی شہر ہے۔ وہاں دیکھنے کو اتنا کچھ ہے کہ مکمل سیر کے لیے ایک ماہ بھی ناکافی ہوگا۔“ وہ ایک لمحے کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”تل ابیب جدید طرز پر تعمیر کیا گیا ایک ماڈرن شہر ہے جہاں تہذیبی اور ثقافتی نشانیاں تلاش کرتے ہوئے آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا، تم نے تل ابیب میں مزید قیام کا فیصلہ کرتے ہوئے کیا سوچا ہے؟“

میں نے دل ہی دل میں کہا ”یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہمارا اسٹے لانگر تمہاری سمجھ میں نہیں آرہا۔ پھر زبان سے کہا ”بس مسٹر ہال! اپنے اپنے چوائس کی بات ہے!“

”یو آر رائٹ!“ اس نے خوش دلی سے کہا ”بہرحال، اگر درمیان میں جی گھبرا جائے تو ہماری طرف چلے آنا۔ کمپنی کا اسکیجوئل ڈے بائی ڈے تمہیں معلوم ہے۔ کاٹنیکی ہر وقت اپنے مسافروں کو ویل کم کہنے کے لیے تیار رہتی ہے۔“

”اوہ شیور!“ میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

پھر ہم دونوں عارضی طور پر اپنے ٹرپ سے جدا ہوگئے۔

☆☆☆

”ہوٹل ٹاپ“ میں کمرا حاصل کرنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کاٹنیکی کا حوالہ کام آیا اور ہم ایک ٹوئن شیئر روم حاصل کر کے چیک ان ہوگئے۔ ٹوئن شیئر روم کا فی کس فی رات کرایہ ساٹھ امریکی ڈالرز تھا، یعنی ہم دونوں کو وہاں ایک رات گزارنے کے ایک سو بیس ڈالرز دینا تھے۔ میں نے کل تین سو ساٹھ ڈالرز ادا کر کے تین راتوں کے لیے وہ کمرا بک کروالیا۔ اب ہمیں آٹھ مئی کی صبح چیک آؤٹ ہونا تھا۔ ہمارے کمرے کا نمبر پانچ سو آٹھ تھا۔

اسرائیل کی کرنسی نیوشیکل کہلاتی ہے۔ ان دنوں ایک امریکی ڈالر ساڑھے تین نیوشیکل کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اس حساب سے ہم نے تین راتوں کے قیام کے لیے مقامی کرنسی میں ایک ہزار، دو سو ساٹھ نیوشیکل ادا کیے تھے۔

ہم جب اپنے کمرے میں پہنچے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ لنچ ہم نے باہر کرلیا تھا اس لیے کھانے کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ صوفیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”میں بہت تھک گئی ہوں اس لیے تھوڑی نیند لوں گی۔ شام کو ہم باہر نکلیں گے۔“ ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولی ”تمہارے ذہن میں کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے؟“

”فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا ”لیکن تمہارے لیے ایک خاص تجویز ہے!“

”وہ کیا؟“ وہ پوری دل چسپی سے میری طرف متوجہ ہوگئی۔

میں نے کہا ”تم اگر چاہو تو کسی وقت بھی مسٹر ہیرالڈ تھامس ....کو فون کرسکتی ہو!“

”کیا مطلب؟“ اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”تم نے بتایا تھا نا، آئندہ کے پروگرام سے تمہیں مسٹر تھامس آگاہ کرے گا۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ”وہ تمہیں بتائے گا کہ تم اسرائیل سے کیسے واپس لندن پہنچو گی؟“

”کیا تم میری صحبت سے اکتا گئے ہو؟“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

میں گڑبڑا گیا ”نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں!“

”پھر مجھ سے جان چھڑانے کی پلاننگ کیوں کر رہے ہو؟“

”میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ”میں مسٹر تھامس کو لندن فون کر کے اپنے لیے ہدایت ضرور لوں گی لیکن اس وقت جب تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ابھی تو تمہارے مشن کے آخری مرحلے کا آغاز ہوا ہے۔ تم اپنی ساتھی کو حاصل کرنے کے بعد اسے میرا ڈراپ دو گے پھر میں تم سے جدا ہو جاؤں گی، یوں سمجھ لو کہ اس وقت ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے۔ میں مسٹر تھامس کے احکام کی پابند ہوں اور

میرا خیال ہے، تمہیں بھی اس کے مفید مشوروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ ہاں' البتہ......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولی ''اگر تم ابھی فوراً سے پیش تر اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دکھا دو تو میں لندن میں مسٹر تھامس.... سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی ہوں۔''

''او کے!'' میں نے اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے کہا ''میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد از جلد اپنے مقصد کو حاصل کر لوں لیکن تم اتنا تو کر سکتی ہونا......''

میں نے بات نامکمل چھوڑی تو وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی ''کتنا......کیا؟''

''تم جانتی ہو، میری ساتھی ساحل اسرائیل بلکہ یہودی قوم کے ایک طاقت ور شخص کے قبضے میں ہے'' میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اسے وہاں سے چھڑانے کے لیے مجھے دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ بے انتہا خون ریزی کا امکان بھی ہے جس میں میری جان ہر لمحہ داؤ پر لگی رہے گی۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ خون اور بارود کے اس خطرناک کھیل میں تم مجھ سے تھوڑے فاصلے پر رہو۔ میں تمہیں ایک جیتے جاگتے جہنم میں نہیں دھکیلنا چاہتا۔ صوفیہ! تم نے اب تک میرا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ تم بڑی پیاری، بڑی ڈیسنٹ لڑکی ہو۔''

یہ حقیقت ہے کہ میں صوفیہ کو کسی اندھی مصیبت سے دوچار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اب تک ساحل کے حصول کے لیے تھرڈ آئی کی مدد سے اچھا خاصا ''ہوم ورک'' کر لیا تھا لیکن میں جانتا تھا، ساحل کو ربی موشے ہائمن کے جبڑوں سے نکالنا اتنا سہل ثابت نہیں ہوگا جیسا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا، کس وقت کون سی غیر یقینی اور مہلک صورت حال پیش آ جائے۔ میرے لیے یہ اپنی زندگی کی سب سے اہم اور کٹھن بازی تھی۔ میں تو اپنے کاز کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتا تھا لیکن وہ کیوں خواہ مخواہ میری وجہ سے متاثر ہوتی!

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم مجھے کوئی ڈرپوک' بزدل اور کم زور قسم کی لڑکی سمجھ رہے ہو؟''

''ایسا نہیں ہے صوفیہ!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''حالات کی سنگینی کو محسوس کرنے کی کوشش کرو۔''

''حالات سنگین کب نہیں تھے؟'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی ''لندن سے اسرائیل تک ہم نے ایک ایک قدم پھونک کر رکھا ہے۔''

میں نے اصراری لہجے میں کہا ''پہلے کی بات اور تھی صوفیہ! اب حالات دوسرے انداز میں پیش آئیں گے۔ یوں سمجھ لو، اس کہانی کا کلائمیکس شروع ہونے والا ہے۔ ابھی تک تو سب کچھ اسموتھلی چل رہا تھا ساری مار دھاڑ، خون ریزی اور چھینا جھپٹی اسی حصے میں ہونا ہے!''

''او کے!'' وہ ہاتھ بلند کرتے ہوئے مصالحت آمیز لہجے میں بولی ''میں تمہاری بات پر بعد میں غور کروں گی۔ پہلے بتاؤ، تم نے اپنی ساتھی کو دشمن کے چنگل سے نکالنے کے لیے کیا لائحہ عمل ترتیب دیا ہے۔ ہو سکتا ہے، میں تمہارے شانہ بہ شانہ نہ سہی مگر پیچھے کی صف میں رہ کر تمہاری بھرپور مدد کر سکوں۔''

''ہاں' یہ بالکل مناسب ہے'' میں نے طمانیت بھری سانس خارج کی ''تم ایک معقول اور ذہین لڑکی ہو۔ اگر ایسی کوئی راہ نکل آئے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔''

میں لمحے بھر کو رکا پھر بات پوری کرتے ہوئے کہا ''میں کل صبح تک اپنا پروگرام فائنل کر لوں گا۔ پھر اس پروگرام اور پیش آمدہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی اپنی ڈیوٹی کا تعین کر لیں گے۔ تم اگر پچھلی صف میں رہو تو میں زیادہ اطمینان اور یک سوئی سے اپنی ڈیوٹی نبھا سکوں گا۔''

اچانک اس نے ایک غیر متعلق سوال کر ڈالا ''وجدا...... یوسف! کیا تمہیں کرکٹ سے کچھ دلچسپی ہے؟'' وجدان اور یوسف کے حوالے سے اب وہ ریڈ الرٹ ہو گئی تھی۔

''ہاں...... کسی حد تک!'' میں نے متذبذب اور متعجب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی ''تم نے ابھی مجھے پچھلی صف میں رہنے کو کہا ہے۔ یہ ایک طرف سے بیک فٹ پر کھیلنے والی بات ہے۔ یقیناً تمہیں معلوم ہوگا، بیک فٹ کا بیٹ مخالف ٹیم کے لیے کس قدر بھاری ثابت ہوتا ہے اور اگر وہ بیٹ لیفٹ ہینڈر ہو تو خدا کی پناہ......؟''

میں اس کے ادھورے جملے کو پکڑ کر بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ صوفیہ لیفٹ ہینڈر تھی۔

میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا اور کہا ''تم مثال تو بہت خوبصورت ڈھونڈ کر لائی ہو۔ تمہیں اب تو خوش ہو جانا چاہیے کہ میں تمہیں بیک فٹ پر کھیلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔''

اور وہ واقعی خوش ہو گئی!

اس ہوٹل کے کمرے میں قدم رکھتے ہی صوفیہ نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ بری طرح تھک چکی ہے لہٰذا تھوڑا آرام

کرے گی۔ میں نے اسے آرام کر کے تھکن اتارنے کا موقع فراہم کیا تو وہ بیڈ پر دراز ہو کر میرے مشورے پر عمل کرنے لگی۔

ٹوئن شیئر روم میں ہم دونوں کے لیے الگ الگ دو بیڈ لگے ہوئے تھے۔ میں نے دوسرے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں اپنے انداز سے یہی ظاہر کر رہا تھا جیسے سو رہا ہوں لیکن یہ اداکاری محض صوفیہ کو مطمئن کرنے کے لیے تھی۔ درحقیقت میرا سونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں تھرڈ آئی کے توسط سے نادیدہ دنیا کی سیر کا ارادہ رکھتا تھا۔

سب سے پہلے میں نے سلوان اور اس کے ڈپلی کیٹ کی خبر لی۔ بہائی گارڈن اپارٹمنٹ میں جس شخص نے سلوان کا روپ دھار کر ساحل کے بنگلے کا رخ کیا تھا اور ازاں بعد، رات میں وہ مجھے وہاں دکھائی بھی دیا تھا، میں ابھی تک اس کے نام سے واقف نہیں ہو سکا تھا لہٰذا آسانی کے لیے میں نے اس کا نام ڈپلی کیٹ رکھ لیا تھا۔ میں پچھلے آٹھ دس روز سے ان دونوں افراد کی مصروفیات کو گاہے بہ گاہے نوٹ کرتا آیا تھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ربی نے انہیں کس کام پر لگا رکھا ہے! وہ ساحل والے بنگلے میں جو ڈیوٹی نبھا رہے تھے اس کی نوعیت ایک جیسی تھی، پھر حلیے کی تبدیلی کی کیا ضرورت تھی۔ یہ بھی قطعاً ضروری نہیں تھا کہ دو افراد ہی یہ ڈیوٹی انجام دیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک شخص مستقل بنگلے میں رہتے ہوئے یہ کام کرتا تو اس سلسلے میں کسی قسم کی دشواری کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ویسے ایک بات ہے، ربی کی کوئی بھی پالیسی خالی از مصلحت نہیں ہو سکتی تھی۔ ان دونوں کو مختلف اوقات میں روپ بدل کر ایک ہی کام کرنے کے احکام کا کوئی خاص مقصد ہو سکتا تھا۔ یہ الگ بات کہ میں ابھی تک اس مقصد تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

ربی کا چاہے کوئی بھی مقصد ہو لیکن ان دونوں کی سرگرمیوں نے مجھے ایک مفید آئیڈیا دیا تھا، میں بہائی گارڈن والے اپارٹمنٹ نمبر ''ستائیس۔سی'' کو ایک خاص زاویے سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ مجھے ایسی ہی ایک خفیہ اور محفوظ جگہ کی ضرورت تھی جہاں میں ساحل کو بہ آسانی صوفیہ کا روپ دے سکتا۔ میں نہیں جانتا تھا، جب میں ساحل کو بنگلے سے نکال لوں گا تو اس وقت پیش آمدہ حالات کیا ہوں گے؟ یہ بھی ہو سکتا تھا، میرے تعاقب میں جہنم کی بلائیں لگی ہوں۔ اس صورت میں ہوٹل ٹاپ کا رخ کرنا خطرے سے خالی نہ ہوتا۔ بہائی گارڈن اپارٹمنٹس کا وہ اپارٹمنٹ ہر لحاظ سے میرے مقصد اور ضرورت پر پورا اترتا تھا کیوں کہ وہ گھر کچھ عرصے کے لیے سلوان اور اس کے ڈپلی کیٹ کے وجود سے خالی رہتا تھا۔

میں نے بڑی محنت اور توجہ سے ان دونوں کے معمولات کا جائزہ لیا تھا۔ ڈپلی کیٹ صبح ساڑھے نو بجے ساحل والے بنگلے سے نکلتا تھا اور نو پچاس پر وہ بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں پہنچ جاتا۔ اس وقت تک سلوان بیدار ہو کر تیار ہو چکا ہوتا۔ ان دونوں میں حلیے کا تبادلہ ہوتا اور پندرہ بیس منٹ بعد سلوان ساحل والے بنگلے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے بنگلے میں ڈیوٹی شروع کر دیتا، پھر شام ساڑھے چھ بجے وہ بنگلے میں سے نکل کر بہائی گارڈن اپارٹمنٹس کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس دوران میں ڈپلی کیٹ اپارٹمنٹ کے اندر ہی موجود رہتا۔ ایک آدھ بار وہ اپارٹمنٹ سے باہر بھی نکلتا اور ضروری اشیا کی خریداری کے بعد واپس آ جاتا۔ اس کے سونے کا وقت دوپہر ایک بجے سے شام چھ بجے تک کا تھا۔ سات بجے تک سلوان اس کے پاس پہنچ جاتا اسی وقت ان میں حلیے کی تبدیلی کے مراحل طے ہوتے اور اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ڈپلی کیٹ ساحل والے بنگلے کی طرف سے سلوان ہوٹل ٹاپ کی جانب روانہ ہو جاتا۔ ان کی سرگرمیاں اگرچہ نہایت ہی مشکوک اور پُراسرار تھیں لیکن اتنے دن کے گہرے ''مشاہدے'' کے بعد مجھے اپنے کام .... کے تین اہم پہلو مل گئے تھے۔ ان ہی میں سے کسی ایک پہلو کا استعمال کر کے میں اپنے لیے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس سی کو حاصل کر سکتا تھا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا، ساحل کو ربی موشے ہائمن کے چنگل سے چھڑانے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے کسی ایسی محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھنا ضروری تھا۔ جہاں مناسب میک اپ کے بعد میں اسے ساحل سے صوفیہ بنا سکتا۔ اس مقصد کے لیے میری نظر میں اپارٹمنٹ نمبر ''ستائیس سی'' نہایت ہی موزوں تھا' یعنی اس اپارٹمنٹ کے تین پہلو! نمبر ایک، جب ڈپلی کیٹ اور سلوان سوا سات بجے رات اس اپارٹمنٹ سے نکل کر اپنی اپنی ڈیوٹی پر روانہ ہوتے۔ رات آٹھ بجے سے صبح تین بجے تک وہ اپارٹمنٹ ہر صورت خالی رہتا تھا۔

نمبر دو، دن کے دس بجے ڈپلی کیٹ کو اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر سلوان ساحل والے بنگلے کی طرف روانہ ہو جاتا تھا۔ دس سے رات سات بجے تک ڈپلی کیٹ اس اپارٹمنٹ میں قبضہ جمائے رکھتا۔

نمبر تین، صبح کے تین بجے سے دن کے دس بجے تک سلوان اس اپارٹمنٹ پر قابض رہتا۔

اب مجھے اپنی پلاننگ کے مطابق، حالات وواقعات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے مقصد کی خاطر متذکرہ بالا تین پہلوؤں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ مجھے امید تھی، دیگر امور کا جائزہ لینے کے بعد میں بہتر طور پر کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس مشن کے سلسلے میں ایک ایک چیز کو ذہن میں رکھنا ضروری تھا۔

جن قارئین کو میری منصوبہ بندی کی طوالت الجھا رہی ہے، ان سے معذرت خواہ ہونے کے ساتھ ہی میں یہ عرض بھی کرنا چاہوں گا کہ دنیا کے تمام بڑے کام مضبوط پلاننگ کے بعد ہی ہوئے ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ ہالی ووڈ کی فلم ''میکناز گولڈ'' کی منصوبہ بندی کئی سال تک ہوتی رہی اور جب شوٹنگ کا وقت آیا تو ایک عظیم الشان میز پر سیٹ لگا کر چند گھنٹوں میں فلم بندی کا کام مکمل کر لیا گیا۔ اس زمانے میں، فلم انڈسٹری میں کمپیوٹر کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ گرافکس اور اسپیشل ایفیکٹس اینڈ اسپیکلس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اوریجنل لوکیشنز کو شوٹ کرنے کے بعد تمام تر عملی کام ٹیبل پر ہوتا تھا۔ ازاں بعد، اِن ڈور اور آؤٹ ڈور فلم بندی کو مہارت سے آپس میں مکس کر دیا جاتا تھا۔ یہ مکسنگ اتنی خوب صورتی سے کی جاتی کہ فلم بین یہی سمجھتا، اس کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ تمام کردار اوریجنل لوکیشنز پر کارنامے انجام دے رہے ہیں!

اس وقت اسرائیل میں سہ پہر کے ساڑھے چار بجے تھے۔ یہ سلوان کی، ساحل والے بنگلے پر ڈیوٹی کا وقت تھا۔ میں تھرڈ آئی کے توسط سے ساحل کے پاس پہنچا تو وہ اسی بیڈ روم میں موجود تھی جہاں پچھلے کچھ عرصے سے میں اسے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی اور فریش ہونے کے لیے واش روم کی طرف جا رہی تھی۔ یہ اندازہ میں نے اس کی حرکات وسکنات کو ''دیکھتے'' ہوئے لگایا' جب وہ واش روم کے اندر داخل ہوئی تو میں اسے چھوڑ کر سلوان کے پاس پہنچ گیا۔

سلوان اس وقت کچن میں موجود تھا۔ وہ کک سے کسی موضوع پر باتیں بھی کر رہا تھا لیکن میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن نہیں سکتا تھا البتہ، باورچی کی سرگرمی سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ چائے بنانے میں مصروف تھا۔

تھوڑی دیر بعد چائے تیار ہوگئی۔ میں ''خاموشی'' کے ساتھ کچن میں موجود رہا۔ باورچی نے چائے اور چائے کے برتنوں کو ایک ٹرے میں سجایا اور سلوان کی سمت بڑھا دیا۔ سلوان وہ ٹرے لے کر کچن سے نکلا اور ساحل والے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں سمجھ گیا، وہ ساحل کو شام کی چائے سرو کرنے جا رہا ہے' یہ اس کا روز کا معمول تھا اور میں کافی دنوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے ساحل والے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازے پر دستک دی تو میں اس کے ماحول سے نکل آیا۔

اب میرا ٹارگٹ ربی کا معتمدِ خاص تھا۔ وہ دراز قامت سنہری بالوں کا سوئیڈ بوٹیڈ شخص اس وقت ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں اندازہ لگانے سے قاصر رہا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اس کے ماحول سے میں نے جانچ لیا کہ وہ اسی چھوٹے کمرے میں موجود تھا جہاں اس نے ربی کو دیے جانے والے دودھ کی اسکریننگ کی تھی۔ جب تک معتمد خاص ربی والے کمرے میں داخل نہ ہوتا' میں ربی کے ماحول تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

ربی تک رسائی کی خواہش نے ایک مرتبہ پھر مجھے براہِ راست کوشش پر اکسایا۔ میں نے حسبِ معمول یہ کوشش کر ڈالی اور اس بار بھی نتیجہ حسبِ سابق ہی برآمد ہوا۔ میں تصوراتی چھلانگ لگا کر واپس معتمد خاص کے ''پاس'' آ گیا۔

وہ ہنوز آنکھیں موندے ایزی چیئر پر نیم دراز تھا۔ چند لمحات تک میں اس کے متحرک ہونے کا انتظار کرتا رہا پھر مایوس ہو کر واپس اپنی ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ ''اپنے'' بیڈ روم میں بیٹھی شام یا سہ پہر کی چائے پی رہی تھی۔ یہ اس کے معمول میں شامل تھا۔ میں جانتا تھا' جب وہ چائے پی کر فارغ ہو جائے گی تو برتن اٹھانے کے بعد سلوان کچن میں پہنچے گا۔ برتن وہاں چھوڑ کر وہ واپس آئے گا اور اسے لے جائے گا۔ میری ساحل' سلوان کی معیت میں ایوننگ واک کرے گی۔ اس بنگلے کے عقبی حصے میں بنے ہوئے خوبصورت پارک کو میں متعدد بار تیسری آنکھ کے توسط سے دیکھ چکا تھا اور ساحل کو وہاں سیر کرتے ہوئے بھی!

اس سیر سے فارغ ہونے کے بعد سلوان اپنی نگرانی میں ساحل کو اس کے بیڈ روم تک پہنچاتا۔ اس کے بعد آج کی' اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی۔ وہ بنگلے سے نکل کر ''بہائی گارڈن اپارٹمنٹس'' پہنچ جاتا۔ اس کے اور ڈیلی کیٹ کے درمیان حلیوں کی تبدیلی کا مرحلہ طے ہوتا پھر وہ اپارٹمنٹ سے نکل کر اپنے نئے فرائض ادا کرنے کے لیے دو مختلف سمتوں میں روانہ ہو جاتے۔ سلوان کے' اس اپارٹمنٹ میں پہنچنے میں ابھی خاصا وقت تھا لہٰذا میں اس کے ماحول سے نکل کر ہوٹل کے کمرے میں حاضر ہو گیا۔

میں نے آنکھیں کھول کر دوسرے بیڈ کی طرف نگاہ دوڑائی۔ صوفیہ بیڈ پر موجود تھی اور جاگ رہی تھی۔ اس کا رخ

میری ہی جانب تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کافی دیر سے مجھے ہی دیکھ رہی ہو۔ میں نے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''تم سوئی نہیں ہو ابھی تک' حالانکہ تم تو بہت زیادہ تھکی ہوئی تھیں؟''

وہ سو کر تھکن اتارنے کا ارادہ ظاہر کر چکی تھی اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے بستر پر دراز ہو کر آنکھیں بند کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر خود بھی سونے کی اداکاری شروع کر دی تھی۔ اس دوران میں' میری آنکھیں چونکہ بند رہی تھیں لہٰذا میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا' وہ سوئی تھی یا میری طرح وہ بھی ایکٹنگ کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ہر سیر کے لیے اللہ نے سوا سیر پیدا کر رکھا ہے!

اس نے ایک لمحے کھوجنے والی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا ''کیا تم سو گئے تھے؟''

''میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تم نے الٹا سوال کر دیا ہے؟''

''میں تو بالکل نہیں سوئی'' وہ جلدی سے بولی ''یہ تمہارے سوال کا جواب ہوا۔ اب تم بھی میرے سوال کا جواب دے دو؟''

صوفیہ بہت تیز طرار لڑکی تھی۔ میں نے اس کی تیزی کو بریک دکھاتے ہوئے کہا ''میں تو گہری نیند سو گیا تھا بلکہ اب بھی مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے ایک اور مصنوعی جماہی لی۔

وہ الجھ کر بولی ''تم گہری نیند سو گئے تھے اور ابھی تک تمہیں نیند آ رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا' پھر تم اٹھ کیوں گئے اور...... اتنے ایکٹیو کیسے دکھائی دے رہے ہو؟''

''میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

''کمال ہے' نیند تمہاری ہے۔ تمہاری سمجھ میں تو آ جانا چاہیے!''

''میں اپنی نہیں' تمہاری بات کر رہا ہوں!''

''میری بات...... کیا بات؟'' اس کی خوبصورت آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

''یہ بات کہ تم شدید تھکن کا شکار تھیں اور آرام بھی کرنا چاہتی تھیں۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''پھر تم بالکل کیوں نہیں سوئیں؟''

''اوہ......!'' اس نے ایک طویل سانس خارج کی ''تم بات کو اس طرح گھما دیتے ہو کہ سر چکرا کر رہ جاتا ہے۔''

''اور تم ایسا چکر چلاتی ہو کہ میں گھوم کر رہ جاتا ہوں!'' میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔

وہ سر تھامتے ہوئے بولی ''شاید ہم دونوں پاگل ہونے جا رہے ہیں!''

''مجھے لفظ ''دونوں'' پر سخت اعتراض ہے صوفیہ!''

وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے کو تھوڑا دراز کرتے ہوئے کہا ''میں تو جانتا ہوں کہ شدید نیند آنے کے باوجود بھی میری آنکھ کیوں کھل گئی ہے۔ لیکن حیرت ہے' تمہیں اپنے نیند نہ آنے کا سبب معلوم نہیں!''

''اچھا بابا! یہی سمجھ لو' مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولی ''اب تم اپنی کہہ بھی ڈالو؟''

میں نے کہا ''میں اپنی تو بعد میں کہوں گا۔ پہلے وہ بتا دوں جو تمہیں معلوم ہونا چاہیے تھا مگر نہیں معلوم!''

وہ ایک مرتبہ پھر تعجب خیز نظر سے مجھے تکنے لگی۔

میں نے لہجے کو نہایت ہی سنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔ ''صوفیہ! تمہیں خوف کی وجہ سے نیند نہیں آئی۔ تم ڈر رہی تھیں کہ ادھر تم نے آنکھ بند کی' ادھر کوئی خوں خوار چھپکلا برآمد ہوا!''

''میں تو اس چھپکلے کو قاہرہ والے اپارٹمنٹ ہی میں چھوڑ آئی تھی۔'' وہ میٹھی ناراضی سے بولی ''تم اس منحوس کم بخت کو اپنے ذہن میں ساتھ ساتھ لیے گھوم رہے ہو اور موقع بہ موقع اس کے حوالے سے مجھے چھیڑتے رہتے ہو۔ کب تک چلے گی یہ ڈرامے بازی؟''

''یہ اس ڈرامے کا آخری سین تھا۔'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''آج کے بعد میں اس ریفرنس سے تمہیں کبھی ٹیز نہیں کروں گا۔ میری زبان پر چھپکلے کا نام آئے گا' نہ کروکوڈائل کا اور نہ ہی کسی ایلی گیٹر کا!''

میری مصنوعی سنجیدگی کو اصلی سمجھتے ہوئے وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔ ''کیا ناراض ہو گئے؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''تمہارے انداز سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا ''نیند کے باعث میرے انداز میں کچھ روکھا پن آ گیا ہے۔ تم پریشان نہ ہو۔ اس میں فکرمند ہونے والی کوئی بات نہیں۔''

''ٹھیک ہے' میں فکرمند نہیں ہوتی'' وہ مصلحت آمیز لہجے میں بولی۔ ''اب جلدی سے بتا دو' شدید نیند کے باوجود

بھی تمہاری آنکھ کیوں کھل گئی تھی؟"

میں نے جواب دیا "دراصل نیند کی حالت میں' مجھے ایک اہم بات یاد آ گئی تھی۔ مجھے تم سے کچھ پوچھنا تھا۔ سوچا' پہلے پوچھ لوں' باقی پلاننگ بعد میں کروں گا۔ اچھا ہوا' تم جاگتی ہوئی مل گئیں ورنہ تمہیں سوتے سے اٹھانا پڑتا۔"

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں کہیں اسے کوئی اور چکر تو نہیں دے رہا ہوں!

تھوڑے سوچ بچار کے بعد اس نے کہا "تم مجھ سے ایسی کون سی اہم بات پوچھنا چاہتے تھے جس کے بغیر تمہاری پلاننگ کو بریک لگ گئے تھے؟" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"اور یہ بھی بتاؤ' تم گہری نیند کے دوران میں کس طرح پلاننگ کرتے رہتے ہو؟"

"اگر میں تمہارے دوسرے سوال کی وضاحت کرنے بیٹھ گیا تو یہ دن اور آنے والی رات گئی ہاتھ سے" میں نے سنجیدگی کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا "اس لیے تم اس موضوع کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ میں تمہاری گہری نیند ہی میں پہنچ کر کبھی اس کا جواب دے دوں گا۔"

میں سانس لینے کے لیے رکا تو وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔

میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "تم نے بتایا تھا' ہیرالڈ تھامس سے تمہارا طے ہے' میں جب اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا تو تم تھامس سے رابطہ کرو گی۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کس طرح تل ابیب سے لندن پہنچو گی۔ پوچھنا مجھے یہ ہے کہ تھامس نے رابطے کے لیے تمہیں کوئی خاص وقت بتایا تھا؟"

"اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت اس سے رابطہ کر سکتی ہوں۔" صوفیہ نے جواب دیا۔ "راؤنڈ دی کلاک وہ میرے فون کا منتظر رہے گا۔ خاص طور پر چھ' سات آٹھ اور نو مئی کو۔ وہ انہی دنوں میں تمہاری کامیابی کی توقع رکھتا ہے۔ وہ اگر سو بھی رہا ہوگا تو اس بندوبست کے ساتھ کہ ادھر میں نے فون کیا' ادھر اس کی آنکھ کھل گئی۔"

میں نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا "تم نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب میں زیادہ آسانی سے پلاننگ کر سکوں گا۔ میں اس الجھن میں تھا کہ اگر میرا مشن رات کے آخری حصے میں تکمیل کو پہنچے تو تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو جائے۔"

"میرے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "تم اپنی سہولت اور آسانی کو دیکھتے ہوئے منصوبہ بندی کرو۔"

میں نے کہا "پانچ مئی تو سمجھ لو' گزر ہی گیا۔ کل میں تمہیں اپنے فائنل پروگرام سے آگاہ کر دوں گا۔ چھ یا سات مئی کو "پیش قدمی" کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے میری آنکھوں میں دیکھ کر بے یقینی سے بولی۔ "تمہیں ہشاش بشاش باتیں کرتے دیکھ کر گمان بھی نہیں ہوتا کہ تم گہری نیند سے اٹھے ہو اور...... دوبارہ سونے والے ہو؟"

"تم گمان کی بات کرتی ہو' لو میں تمہیں ابھی یقین دلاتا ہوں" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی گہری نیند کا سلسلہ جوڑنے جا رہا ہوں۔ مجھے خواہ مخواہ جگانے کی کوشش نہ کرنا' مجبوری یا ایمرجنسی کی بات دوسری ہے۔ رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔ اس وقت تک میں خود ہی بیدار ہو جاؤں گا۔ گڈ آفٹر نون...... گڈ ایوننگ!"

بات ختم کرتے ہی میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے صوفیہ کے ماحول میں جھانکا۔ وہ "ہوٹل ٹاپ" کے ٹوئن شیئر کمرا نمبر پانچ سو آٹھ کے ایک بیڈ پر بیٹھی ہکا بکا دوسرے بیڈ کو دیکھ رہی تھی۔ دوسرے بیڈ پر میں یعنی وجدان علی بصورت یوسف الظاہری آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ تیسری آنکھ کی مدد سے خود کو سوتے ہوئے دیکھنا ایک دلچسپ اور خوشگوار تجربہ تھا۔ میں نے اپنا دھیان صوفیہ کی طرف موڑ دیا۔

چند لمحات تک میں یونہی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ پھر ڈیلی کیٹ کے ماحول میں داخل ہو گیا۔ وہ "بہائی گارڈن" کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں موجود تھا۔ اس کی حالت سے لگتا تھا' وہ ابھی ابھی سو کے اٹھا ہے۔ اس کی ڈیوٹی میں زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سلوان پہنچ جاتا اور ان کے درمیان حلیوں کی تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا۔ ڈیلی کیٹ اس وقت کچن میں چائے بنا رہا تھا۔ چائے تیار کرنے کے بعد وہ کچن سے نکل کر سٹنگ روم میں آ گیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

میں نے ڈیلی کیٹ کے توسط سے اس اپارٹمنٹ کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ پچھلے آٹھ دس روز میں' میں کئی مرتبہ وہاں آیا گیا تھا۔ اس اپارٹمنٹ کی مکانیت میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس اپارٹمنٹ کو اپنے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا لہٰذا وہاں کے ہر ایک پہلو کو نگاہ

میں رکھنا نہایت ہی اہم تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ اطمینان بخش اور سودمند بات یہ تھی کہ ڈیلی کیٹ کی روانگی اور سلوان کی آمد کے دوران میں یعنی رات ساڑھے سات بجے سے لے کر صبح کے ساڑھے تین بجے تک وہ اپارٹمنٹ بالکل فارغ یعنی خالی رہتا تھا۔ اگر اس وقت کو اور بھی محفوظ کر لیا جاتا تو رات آٹھ بجے اور صبح تین بجے کے درمیان کا' سات گھنٹے کا وقفہ انتہائی مفید اور موزوں تھا۔ اگر میں اس دوران میں اس اپارٹمنٹ کو استعمال کرتا تو مجھے اپنے مقصد میں صد فی صد کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ کے "استعمال" کو اپنے ذہن میں اپروو کر لیا!

میں بہائی گارڈن کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس سی میں موجود ہی تھا کہ سلوان وہاں پہنچ گیا تھا۔ ڈیلی کیٹ نے لگے بندھے انداز میں اس کا استقبال کیا۔ ان کے درمیان لباس اور حلیوں کی تبدیلی کے مراحل طے ہونے لگے۔ ابھی تک میں اس حکمت کو سمجھ نہیں سکا تھا کہ وہ دونوں باری باری ساحل والے بنگلے میں یہ کس نوعیت کی ڈیوٹی دے رہے ہیں؟ بنگلے کے دیگر اسٹاف کو دھوکے میں رکھنا کیوں ضروری ہے؟ ربی اس قسم کی حکمتِ عملی سے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے؟

یہ اور...... اسی طرح کے دیگر متعدد سوالات جب میرے ذہن کو الجھانے لگے تو میں نے تصور میں سر جھٹک کر اپنے دماغ کو صاف کر دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اسی وقت وہ دونوں اپارٹمنٹ سے نکل آئے تھے۔ میں بھی ان کا تصوراتی تعاقب کرتے ہوئے ذیلی اسٹریٹ سے نکل کر شالوم اسٹریٹ تک آ گیا۔ یہاں سے ان دونوں کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ میں کئی مرتبہ سلوان کے ساتھ "سفر" کرتے ہوئے ہوٹل ٹاپ تک آیا تھا لیکن ڈیلی کیٹ کے پیچھے کبھی نہیں گیا تھا۔ آج میں نے اس کا تعاقب کرنے کی ٹھانی۔

شالوم اسٹریٹ سے سلوان بائیں جانب مڑ گیا۔ یہ اسٹریٹ کچھ آگے جا کر افرائم اسٹریٹ سے مل جاتی۔ میں دائیں طرف مڑنے والے ڈیلی کیٹ کے ساتھ ہو لیا۔ وہ جب شالوم سے ہرمن' ہرمن سے شیرون اسٹریٹ پر پہنچا تو میں باطنی آنکھ کے توسط سے اس کے ساتھ تھا پھر جب وہ الٹرا ماڈرن رہائشی علاقے کی چند اسٹریٹس میں گھومنے پھرنے کے بعد ساحل والے بنگلے کے عین سامنے پہنچا تو میں اس وقت بھی ڈیلی کیٹ کے ہمراہ تھا۔ بنگلے کے نیلے گیٹ پر متعین مسلح سیکورٹی گارڈز نے اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ ان کی دانست میں وہ (سلوان) گھنٹا بھر پہلے ہی تو بنگلے سے

نکلا تھا۔ حلیے کی تبدیلی کے بعد ڈیلی کیٹ سلوان کے روپ میں آ گیا تھا لہٰذا وہ لوگ اول آخر اسے سلوان ہی سمجھ رہے تھے۔

آپ کے ذہن کو الجھنے سے بچانے کے لیے ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں نے ہوٹل ٹاپ کے اسٹاف کے رجسٹر میں اس شخص کا نام "سلوان" دیکھا تھا جو ہوٹل کے کچن میں شبینہ ڈیوٹی انجام دیتا تھا۔ یہ اس کا اصلی نام تھا یا اختیاری' میں حتمی طور پر اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ابھی جو شخص میرے ساتھ ساحل والے بنگلے پر پہنچا تھا اس نے چونکہ سلوان کا حلیہ اپنا رکھا تھا اس لیے میں اسے ڈیلی کیٹ کا نام دے رہا ہوں۔ ان کی ڈیوٹی کی پُراسرار تبدیلی یہی ظاہر کرتی تھی کہ اس بنگلے کا تمام اسٹاف ڈیلی کیٹ کو سلوان ہی سمجھتا ہوگا۔

میں ڈیلی کیٹ کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ بنگلے کے اندر "دیکھ" چکا تھا لیکن اس کے ساتھ اندر داخل ہونے کا یہ پہلا موقع تھا لہٰذا میں اس کے ماحول کے ساتھ چپکا رہا اور اسی وقت مجھ پر ایک حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشاف ہوا۔

ڈیلی کیٹ نے عمارت والے حصے کا رخ کیا اور سیدھا' بالائی منزل پر واقع کچن میں پہنچ گیا۔ میں چونکہ اس کے ماحول میں شامل تھا لہٰذا کچن میں داخلے کے سلسلے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ ادھیڑ عمر باورچی سے ڈیلی کیٹ نے مختصر بات چیت کی۔ ظاہر ہے' میں اس گفتگو کا ایک لفظ نہ سن سکا۔ اس مکالمے کے بعد باورچی نے اسے فریج میں سے کچھ نکال کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ وہ گوشت کے پارچے تھے جو ایک تھال نما برتن میں رکھے تھے۔

یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی کہ ڈیلی کیٹ کچے گوشت کے ان پارچہ جات کا کیا کرے گا۔ میں خاموشی سے اس کے ماحول کے ساتھ چپکا رہا۔ اس نے کچے گوشت والے تھال کو ایک کپڑے سے ڈھک دیا اور تھال اٹھائے' کچن سے نکل کر زیریں منزل کی طرف آنے لگا۔ میرے اندر شدت سے یہ تجسس جاگا کہ وہ مذکورہ گوشت کو کہاں اور کس کے لیے لے کر جا رہا ہے؟

میں ڈیلی کیٹ کے "ہمراہ" زیریں منزل پر پہنچا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اس تھال کو سنہری بالوں والے دراز قامت معتمدِ خاص تک پہنچائے گا یا پھر درمیانہ قد فربہ اسسٹنٹ کے حوالے کر کے واپس جائے گا لیکن جب اس نے رہائشی حصے کا رخ نہ کیا تو میرے تجسس میں گہری تشویش بھی شامل ہو گئی۔ پتا نہیں' اس گوشت کی مدد سے وہ کون سا گل

کھلانے جا رہا تھا!

اس عمارت میں داخل ہونے کے بعد میں نے سوچا تھا' کسی حیلے وسیلے سے ربی موشے ہائمن کی ''خبر گیری'' کروں گا لیکن ڈیلی کیٹ کی سمجھ میں نہ آنے والی پُرتجسس تازہ ترین سرگرمی نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اس سے جدا نہ ہونے دیا۔ اس کے توسط سے میرے سامنے کوئی نیا راز کھلنے والا تھا اس لیے میں اسے چھوڑ کر کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ڈیلی کیٹ گوشت والے تھال سمیت' نپے تلے قدم اٹھاتے ہوئے رہائشی حصے سے دور جانے لگا۔ اس کا رخ نیلے گیٹ کی سمت نہیں تھا بلکہ وہ عمارت کی عقبی جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس پارک کی طرف جا رہا تھا جہاں ساحل روزانہ ایوننگ واک کیا کرتی تھی۔ یہ اور بھی حیران کن تھا کہ وہ بندۂ خدا کچے گوشت سے بھرا ہوا تھال لے کر چمن کی طرف جا رہا تھا!

میری اب تک کی تحقیق کے مطابق' وہ بنگلا کم و بیش دو ہزار گز کے رقبے پر بنا ہوا تھا۔ جس کے عین وسط میں تعمیر شدہ دو منزلہ رہائشی حصہ لگ بھگ دو سو گز رقبے کو گھیرے ہوئے تھا۔ اس تناسب سے بنگلے کے کورڈ اور ان کورڈ ایریا کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ رخ کے اعتبار سے نیلا گیٹ جنوبی سمت والی دیوار میں واقع تھا۔ دیوار سے مراد دس فٹ بلند وہ باؤنڈری وال ہے جو اس بنگلے کی چوحدی کا کام دیتی تھی۔ اسی باؤنڈری وال کے اوپر زندگی کو موت میں بدل دینے والی خطرناک خاردار باڑ بھی تھی۔ ساحل روزانہ شام کو جس پارک میں چہل قدمی کرتی' وہ عمارت کے عقبی حصے میں بنگلے کی شمالی دیوار کے ساتھ بنا ہوا تھا...... ڈیلی کیٹ اسی پارک کی طرف جا رہا تھا۔

پارک کے قریب پہنچ کر اندر داخل ہونے کے بجائے جب وہ دائیں جانب مڑا تو میرے تجسس کو اور ہوا ملی۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کونے میں پہنچا جو شمالی اور مشرقی دیوار کے ملاپ سے بنا تھا۔ کونے کے نزدیک وہ ایک مقام پر رک گیا۔ گوشت والے تھال کو اس نے زمین پر رکھا اور اس پر ڈھکے ہوئے کپڑے کو ہٹا دیا' پھر وہ اپنی جیب میں کچھ ٹٹولنے لگا۔ میں بڑی توجہ سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا۔

میں نے دیکھا' تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے اپنی جیب میں سے چابیوں کا ایک گچھا برآمد کیا اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر وہ کسی کارروائی میں مصروف ہو گیا۔ گوشت والا تھال اس سے دو فٹ کے فاصلے پر رکھا تھا۔ رات نے پوری طرح اپنے پر پھیلا لیے تھے لیکن بنگلے کے اس حصے میں تاریکی نہیں تھی۔ جلد ہی مجھے ڈیلی کیٹ کے عزائم کا اندازہ ہو گیا۔

دراصل' وہ چابی کی مدد سے ایک تالے کو کھول رہا تھا۔ مذکورہ تالا ایک جالی دار ڈھکن پر لگا ہوا تھا۔ وہ ڈھکن مربع شکل میں تھا تاہم اس کے چوکھٹے کے اندر مضبوط آہنی راڈ کی مدد سے جالی سی بنا دی گئی تھی۔ آہنی راڈز ایک دوسرے کے اوپر سے ''کرس کراس'' بناتے ہوئے ایک مربع جال کی صورت میں' ویلڈنگ کے ذریعے ڈھکن کے فریم سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اس ڈھکن کی پیمائش میرے اندازے کے مطابق تین ضرب تین فٹ رہی ہو گی۔ ڈیلی کیٹ نے تالا کھولنے کے بعد اس جالی دار ڈھکن کو کسی تہ خانے کے داخلی ڈھکن کے مانند اٹھایا اور ایک جانب ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کسی کی آمد کا منتظر ہو۔ میں بھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس خلا میں سے کسی کے نمودار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ بڑی سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ پول لائٹ جس حد تک اس خلا کے اندر کے منظر کو اجاگر کر رہی تھی' اس میں مجھے وہاں ایک پختہ زینہ دکھائی دیا۔ ایسا زینہ جو زمین کی سطح سے کسی تہ خانے تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا ہو۔ پتا نہیں' اس پُراسرار زینے پر قدم رکھ کر کون وہاں جلوہ افروز ہونے والا تھا!

مجھے زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا تھا جس کا انتظار' وہ شاہکار آ گیا۔ جلوہ افروزی سے قبل اس شاہکار کی مخصوص خوف ناک غراہٹ ضرور گونجی ہو گی۔ میں چونکہ تصوراتی سماعت کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے محض اندازہ قائم کرنے تک ہی محدود رہا اور...... جب میں نے اس شخصیت کا دیدار کیا تو پتا چلا' وہ شخصیت نہیں بلکہ ''شخصیات'' تھے۔ میں جس شاہکار کا انتظار کر رہا تھا' وہ شاہکار ثابت ہوئے! وہ شاہکار تہ خانے والے زینے پر نمودار ہوئے اور اس خلا میں سے باہر نکل کر تیزی سے گوشت والے تھال کی جانب لپک گئے۔

وہ دو خطرناک بل ڈاگ تھے۔ میں ان کے خوفناک چہروں اور قوی الجثہ جسامت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ جس تیزی سے گوشت والے تھال کی طرف لپکے تھے' اس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ یہ ان کے ڈنر کا وقت تھا۔ ان کی اضطراری حرکات سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت شدید بھوک محسوس کر رہے تھے۔ گوشت کے پارچہ جات پر وہ اس تیزی سے منہ مار رہے تھے

جیسے کافی دیر سے وہ اس ڈنر کا انتظار کر رہے ہوں!

ان بل ڈاگ کی ''انٹری'' نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ اس سنسنی میں کوئی خوف شامل نہیں تھا بلکہ یہ ایک انکشاف انگیز سنسناہٹ تھی۔ ان کتوں' جالی دار ڈھکن اور ڈھکن کے نیچے دکھائی دینے والے زینے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس جوڑی کو زیرِ زمین رہائش فراہم کی گئی تھی۔ وہ تہ خانہ ان بل ڈاگ کی اقامت گاہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ سمجھنے میں بھی کوئی دقت نہ ہوئی کہ ان بل ڈاگ کو اس بنگلے میں کس مقصد کی خاطر رکھا گیا تھا۔ ان کی ''کارکردگی اور ڈیوٹی'' کا تصور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ یقیناً انہیں رات میں اس بنگلے کی رکھوالی کے لیے رکھا گیا تھا تاکہ اگر رات کی تاریکی میں کوئی شخص ''غیر قانونی'' طور پر اس بنگلے میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ اسے پلک جھپکتے میں بھنبھوڑ کر رکھ دیں۔

میں ان دو دہشت ناک شکاری کتوں کو گوشت والے تھال کے ساتھ ''مصروفِ کار'' دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ کا شکر بھی ادا کرنے لگا کہ اس نے مجھے تیسری آنکھ کی روشنی عطا فرمائی تھی۔ میں اس باطنی آنکھ کے طفیل ہی ان بل ڈاگ اور ان کے مصرف کو دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔ اس حوالے سے تھرڈ آئی میرے لیے ایک عطیۂ خداوندی تھی' مجھے عن قریب اس بنگلے میں داخل ہونا تھا جس کی رکھوالی پر دو خونخوار کتے مامور تھے۔ تھرڈ آئی کے توسط سے میں ان کے وجود اور خطرناکی سے آگاہ ہو گیا تھا۔

اس بنگلے کی حفاظت کے سلسلے میں کیے جانے والے تمام انتظامات یقیناً ربی کے احکام کا نتیجہ تھے۔ میں یہ دیکھ اور سوچ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ساحل کے حوالے سے ربی کس قدر محتاط تھا۔ اس کی اس بندوبستی احتیاط سے ایک طرح کا خوف جھلکتا تھا اور...... یہ خوف میری وجہ سے تھا۔ اس نے ساحل کو جتنے کڑے پہرے میں قید رکھا تھا اس سے یہی ظاہر تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی بھی صورت اس تک رسائی حاصل کر سکوں۔ وہ مجھے عبرتناک سزا دینا چاہتا تھا مگر گرفت میں لائے بغیر کسی قسم کی سزا دینا ممکن نہیں تھا۔ وہ کائیاں شخص یہ بات بخوبی سمجھتا تھا کہ میں جب بھی اس کی پکڑ میں آؤں گا تو ساحل ہی کے حوالے سے آؤں گا اسی لیے اس نے میری کمزوری کو اپنی مٹھی میں ''تھام'' رکھا تھا۔

ہمارے درمیان براہِ راست آخری رابطہ ہوئے کافی دن گزر گئے تھے۔ ان دنوں میں نیپال میں تھا۔ میں بخوبی جانتا تھا' ربی اس وقت تل ابیب میں میری جانِ تمنا کے بہت قریب ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا' وہ میرے بارے میں مطلق نہیں جانتا ہو گا کہ میں کہاں ہوں۔ اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تل ابیب میں میری موجودی سے آگاہ ہو' ورنہ اب تک وہ مجھ تک رسائی حاصل کر چکا ہوتا۔ میں اس کے لیے کئی حوالوں سے ''موسٹ وانٹیڈ'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اپنے تمام تر ذرائع استعمال کر کے پلک جھپکتے میں مجھے چھاپ لیتا۔ وہ مذہبی اور سیاسی لحاظ سے اسرائیل کی ایک طاقتور شخصیت تھا۔ اس کے اشارۂ ابرو پر پوری حکومتی مشینری ہل کر رہ جاتی۔ اس نے اگر اب تک مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا تھا کہ وہ تل ابیب میں میری موجودی سے بے خبر ہے...... اور مجھے اس کی بے خبری ہی میں اسے چونا لگانا تھا!

اس مسرت آمیز خیال نے مجھے شاد کر دیا کہ میں ربی اور اس کی انتہائی فعال مشینری کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اسرائیل میں داخل ہو چکا ہوں۔ اسرائیل میں داخلے کی منصوبہ بندی اگرچہ خاصی صبر آزما اور طویل ثابت ہوئی تاہم یہ اتنی ہی محفوظ رہی۔ ربی پتا نہیں' کس کس ذرائع سے مجھے یقینی وجدان کو تلاش کروا رہا ہو گا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں کسی مصری باشندے یوسف الظاہری کے روپ میں' اس کی شہ رگ پر انگوٹھا گاڑ کر اپنی رگِ جاں کو چھڑانے آ گیا ہوں۔

مصر' اسرائیل کو تسلیم کرنے والے مسلمان ممالک میں سرِفہرست سمجھا جاتا ہے۔ اس تسلیم و رضا کے سلسلے میں مصر کے جو بھی ملکی اغراض و مقاصد رہے ہوں' اس سے کوئی بحث نہیں۔ اس وقت دونوں ممالک میں ہر قسم کی تجارت اور لین دین جاری ہے اور باہمی خوشگوار اقتصادی تعلقات کی نوعیت برادرانہ سے بھی کہیں آگے بڑھ کر دوستانہ ہے۔

میں...... من کہ مسمی یوسف الظاہری...... ایک مصری باشندہ' اسرائیلی ربی موشے ہائمن سے دوستی نبھانے کے لیے ہی تو تل ابیب میں وارد ہوا تھا اور یہ ثابت کر دکھانا چاہتا تھا...... دوستوں سے ملیں دوست' کر کر لمبے ہاتھ!

شکم سیر ہونے کے بعد دونوں کتے آپس میں چہلیں کرنے لگے۔ ان کی اٹکھیلیوں سے سرمستی جھلکتی تھی۔ ان کے رومینٹک انداز و اطوار سے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان میں سے ایک نر اور دوسری مادہ تھی۔ پیٹ میں پہنچنے والی مرغوب غذا نے انہیں بے خود کر دیا تھا۔ شاید وہ ''پہرے داری'' کی تیاری کر رہے تھے۔

جوڑا چاہے انسانوں کا ہو یا جانوروں کا' ان کی پرائیویسی

میں جھانکنا اخلاقی جرم ہے۔ میں انہیں ان کے حال میں خوش چھوڑ کر ہوٹل ٹاپ کے کمرا نمبر فائیو زیرو ایٹ میں حاضر ہوگیا۔ اس حاضری کے ساتھ ہر باطنی آنکھ کا شٹر بند ہوگیا کیونکہ ظاہرہ آنکھوں نے اپنے در وا کر دیے تھے۔

میں نے کھلی ہوئی آنکھوں سے صوفیہ والے بیڈ کی طرف دیکھا۔ مذکورہ بیڈ مجھے خالی نظر آیا۔ صوفیہ بیڈ پر موجود نہیں تھی حالانکہ جب میں اس ماحول سے رخصت ہوا تھا تو وہ اسی بیڈ پر بیٹھی ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھی۔

جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا' وہ واش روم میں ہے۔ پانی گرنے کی مخصوص آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ یہ واش روم میں نصب شاور کی آواز تھی۔ اس ٹوئن شیئر روم میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ میں اگر واش روم سے باہر تھا تو اندر یقیناً صوفیہ ہی ہوسکتی تھی۔ میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ وہاں رات کے آٹھ کا وقت ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً بیڈ چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد صوفیہ واش روم میں سے برآمد ہوئی۔ وہ دھلی دھلائی دکھائی دی۔ اس کا نکھار یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ بھرپور شاور لے کر آ رہی ہے۔ بھیگے ہوئے بال کنگ سائز ٹاول میں ایک خاص انداز سے لپٹے ہوئے تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑی تو چہک کر بولی۔

''واقعی! تم تو میرے گمان سے بھی آگے کی چیز ہو۔ کہا' سونے جا رہا ہوں اور...... یہ کہتے ہی سو بھی گئے۔ پتا نہیں' اتنی نیند تم نے لیز پر لے رکھی ہے یا تمہیں ورثے میں ملی ہے؟''

بات ختم کرتے ہی اس نے شوخ نظر سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ خاصے خوشگوار اور مذاق کے موڈ میں نظر آ رہی تھی۔ کوئی حسینہ مذاق کے موڈ میں ہو اور آپ اس کا خاطر خواہ ساتھ نہ دیں تو اس سے بڑی اور کوئی بدذوقی ہو نہیں سکتی۔ کوئی جواب دینے سے پہلے میں یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ اس کے نکھار میں ایک خاص قسم کی تازگی اور شگفتگی پائی جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی وہ کوئی آسودہ سپنا دیکھ کر فارغ ہوئی ہو۔

''یوں کیا دیکھ رہے ہو!'' وہ میری نگاہ کی گہرائی کو محسوس کرتے ہوئے بوکھلا گئی' ''تم نے میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیا؟''

''میں جواب دوں گا تو تم برا مان جاؤ گی!'' میں نے اسے گھورنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں تعجب ابھرا' ''میں تمہاری بات کا برا کیوں مانوں گی؟''

میں نے سنجیدہ مذاق کو آگے بڑھاتے ہوئے وضاحت کی' ''تم نے مجھے گمان سے بھی آگے کی چیز (CHEESE) کہا ہے۔ اگر جواب میں' میں تمہیں وہم سے بھی آگے کا بٹر کہوں تو......؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو وہ الجھن زدہ لہجے میں جلدی سے بولی' ''میں پنیر والی چیز کی بات نہیں کر رہی تھی۔ تم تو خواہ مخواہ بات کو گھما دیتے ہو!''

''اس فن میں تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔'' میں نے اس کی الجھن کی پروا کیے بغیر ترکی بہ ترکی کہا' ''تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے' میں بھی مکھن والے بٹر کی بات نہیں کر رہا ہوں!''

''اوہ!'' وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بولی' ''تم سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کرتے ہوئے بڑی ادا سے کہا' ''میں تمہاری نیند کی بات کر رہی تھی۔''

اچھا ہوا' اس نے مکھن کے حوالے سے بٹر (BUTTER) کی وضاحت نہیں چاہی ورنہ مجھے بٹر فلائی' بٹر اپف اور جانے کون کون سے بٹر کی مثالیں دینا پڑتیں!

''اوہ...... اچھا' نیند!'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا' ''ہاں ہاں' مجھے یاد آ رہا ہے' تم نے لیز اور ورثے کی بات کی تھی۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''لیز اور ہائر پرچیز کی تو کیا بات ہے' اگر نیند کتنے بھی مہنگے داموں بازار میں دستیاب ہوتی تو پھر کوئی بھی دولت مند اپنی بے خوابی سے نجات کے لیے سلیپنگ پلز اور ٹرینکولائزرز نہ لے رہا ہوتا۔ حسب ضرورت مارکیٹ سے نیند خرید کر وہ اپنا مسئلہ حل کر لیتا اور...... یہ نعمت ورثے وغیرہ میں بھی منتقل ہونے والی شے نہیں ہے۔''

وہ بات کو ختم کرنے والے انداز میں بولی' ''اس بحث کو چھوڑو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔ تم نے کہا تھا' رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے۔''

میں نے واقعی ایسا کہا تھا لہٰذا میں نہایت ہی فرمانبرداری سے اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔ یہ فرمانبرداری اطاعت گزار شوہروں یا خدمت گار شوفروں والی نہیں تھی بلکہ یہ ایک طرح کا مردانہ اقرار تھا' اس بات کا اعتراف تھا کہ میں نے جو کہا ہے' وہ ایک مرد کا وعدہ ہے...... اور مرد اپنا وعدہ نبھانا بخوبی جانتا ہے!

ٹھیک رات نو بجے ہم ''ہوٹل ٹاپ'' سے نکل کر بن یہودہ اسٹریٹ پر آ گئے۔ میں نے ایک نئی نویلی ٹیکسی روکی اور

اس کے ڈرائیور سے ''مذاکرات'' کرنے لگا۔ اس نے پوچھا' کہاں جانا ہے؟ میں نے جواب میں کہا۔

''تم ہمیں اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے تل ابیب کی سیر کراؤ۔ ہم ٹورسٹ ہیں۔''

''ٹورسٹ!'' اس کی باچھیں اور آنکھیں ایک ساتھ کھل گئیں۔

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ پوری دنیا کی طرح اسرائیل میں بھی ٹیکسی ڈرائیور سیاحوں کی کھال اتارنے کے لیے الٹی چھری کا استعمال کرتے ہوں گے۔ میرے منہ سے ''ٹورسٹ'' کا لفظ سن کر اس کے چہرے پر ایک رونق سی آ گئی تھی۔ اس رونق میں میزبانی کی خوشی نہیں بلکہ چوروں اور اٹھائی گیروں والی ہوس شامل تھی!

اس نے بڑی محبت سے کہا' ''بیٹھ جائیں' میں آپ کو سیر کرا دیتا ہوں۔''

''پہلے کرائے بھاڑے کا معاملہ طے کر لو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولا' ''تل ابیب خاصا بڑا شہر ہے۔ آپ سے میں دو سو لوں گا۔''

دو سو سے اس کی مراد دو سو ''نیو شیکل'' تھی۔

میں اس کی بدنیتی اور مکاری کو فوراً سمجھ گیا۔ اس نے تل ابیب کے حوالے سے بڑا شہر کہتے ہوئے اس طرح آنکھیں پھیلائیں جیسے وہ نیویارک یا کیلیفورنیا کا ذکر کر رہا ہو۔ تل ابیب تو رہا اپنی جگہ' پورا ملک اسرائیل اتنا پدا سا ہے کہ دنیا کے نقشے پر اسے ظاہر کرنے کے لیے صرف نام لکھ دیا جاتا ہے' کوئی باقاعدہ جگہ دینے کی نوبت پیش نہیں آتی۔ وہ رات دیہاڑے ہمیں الو بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہم ٹورسٹ ہیں مگر کاٹھ کے الو یا اللہ میاں کی گائے نہیں ہیں یہ جانتے ہیں کہ تل ابیب کتنا طویل و عریض شہر ہے لہٰذا تم کرائے کی رقم پر نظر ثانی کر لو تو اچھا ہے۔''

''گائے'' یہودیوں کا بڑا نازک پہلو ہے۔ میں نے اپنے حوالے سے ''اللہ میاں کی گائے'' کا ذکر کیا تو اس یہودی ٹیکسی ڈرائیور کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ بڑی سرد مہری سے اس نے کہا۔

''میں بس ایک سو اسی سے کم نہیں لوں گا۔''

''چلو اپیل کر دو۔'' میں نے ایک اور تجویز پیش کی۔ ''تم اپنی ٹیکسی کے مائلیج میٹر کے حساب سے ہمیں صرف دس میل تک تل ابیب کی سڑکوں پر گھماتے رہو۔ اس کام کا کتنا کرایہ لو گے؟''

مجھے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ بن گورین ائرپورٹ سے سٹی سینٹر تک آنے والی ٹیکسی پچیس امریکی ڈالرز کرایہ وصول کرتی تھی۔ نیو شیکل میں بدلنے کے لیے اگر اس رقم کو ساڑھے تین سے ضرب دیں تو یہ رقم ساڑھے ستاسی نیو شیکل بن جائے گی۔ ائرپورٹ سے شہر کا مرکز صرف بارہ میل (انیس کلومیٹر) کے فاصلے پر تھا۔ اگرچہ ائرپورٹ سے لانے اور لے جانے والی ٹیکسیوں کا کرایہ بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے مگر اس حساب سے بھی دیکھا جاتا تو دس میل کی سیر کے لیے اس ٹیکسی ڈرائیور کو کم سے' زیادہ سے زیادہ اسی نیو شیکل کا مطالبہ کرنا چاہیے تھا جب کہ وہ منہ پھاڑ کر ایک سو نیو شیکل زیادہ مانگ رہا تھا۔

میری تجویز کے جواب میں اس نے چند لمحے سوچا اور بولا' ''چلیں آپ لوگ ڈیڑھ سو دے دینا۔''

اس کے بعد اس نے ایک ایسا جملہ ادا کیا جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا...... اس سے کم میں وارا نہیں ہے! یہ بھی غنیمت تھا' اس نے پیٹرول اور گیس کی گرانی کا دکھڑا ہمیں نہیں سنایا تھا۔

میں اس کے ''وارے'' کے چکر میں آنے والا نہیں تھا لہٰذا کرایہ جات کی حقیقت اس پر کھول دی۔ میری معلومات سے متاثر ہو کر وہ تھوڑا سا شرمندہ ہوا لیکن اس ندامت کے باوجود بھی وہ ایک سو نیو شیکل سے کم پر راضی نہ ہوا۔ اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی شہرت یافتہ ''یہودی عیاری'' سے کام لیتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں اس دس میل کی سیر میں ایک گائیڈ کے فرائض انجام دیتے ہوئے آپ لوگوں کو مفید معلومات بھی بہم پہنچاؤں گا۔''

ہم نے اس کی تمام تر یہودی چال بازی پر لعنت بھیجی اور ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ میں تل ابیب کو ذرا تفصیل سے دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی بھی بہانے سہی' میرا یہ مقصد پورا ہو رہا تھا لہٰذا میں نے تقریباً انتیس امریکی ڈالرز (سو نیو شیکل) کی قربانی دینا گوارا کر لی۔ انتیس ڈالرز کی ادائی ٹیکنیکلی خاصی پیچیدہ تھی لہٰذا اسے ایک سو نیو شیکل ہی ادا کیے گئے۔ ہوٹل ٹاپ کے گراؤنڈ فلور پر ایک منی چینجر کا آفس بھی کھلا ہوا تھا۔ چیک ان ہونے سے پہلے میں نے ایک ہزار ڈالرز کو نیو شیکل میں بدلوا لیا تھا۔ واضح رہے کہ ٹیکسی ڈرائیور کو یہ کرایہ سفر کے اختتام پر ادا کیا گیا تھا۔

ہم جب ٹیکسی میں بیٹھ گئے تو اس نے ٹیکسی آگے بڑھانے کے ساتھ ہی زبان بھی بڑھا دی۔ راستے میں پڑنے

والی مختلف عمارتوں کے بارے میں اس کا رواں تبصرہ شروع ہوگیا۔ بن یہودہ اسٹریٹ سے نکل کر ہم نے مغرب کی سمت سفر کیا اور جلد ہی ''اسرائیل ٹینس سینٹر'' پہنچ گئے۔ اس سے آگے تل ابیب کا ساحل شروع ہوجاتا ہے۔ ساحل کے قریب سے اس نے ٹیکسی کو شمال کی جانب گھمایا اور ''تل ابیب۔ یافو'' کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہم ''عطائم'' پہنچ گئے۔ اس سے آگے تل ابیب کا ''آرٹ میوزیم'' تھا۔ میوزیم وغیرہ کو اندر سے دیکھنے کا ہمارے پاس وقت نہیں تھا لہٰذا ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے آگے بڑھ گئے۔ یہاں سے یہودی ڈرائیور نے ٹیکسی کو واپس موڑا اور تھوڑا پیچھے آنے کے بعد مشرق کی جانب ایک سڑک پر ڈال دیا۔ چند منٹ بعد ہم ریلوے اسٹیشن کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ اس دوران میں ڈرائیور نے ایک لمحے کے لیے ٹیکسی روکی اور نہ ہی اس کی زبان کو لمحاتی قرار آیا۔ وہ انتہائی باتونی یہودی تھا۔ مجھے تو رہ رہ کر یہی خیال آ رہا تھا کہ وہ سو نیو شیکل کو حلال کرنے کے لیے ضروری کے علاوہ غیر ضروری بکواس بھی کیے جا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے اس نے ایک صاف ستھری اسٹریٹ میں گاڑی روک دی اور بڑے حاتم طائی کے سے انداز میں بولا ''میں نے آپ لوگوں کو دس میل سے کچھ زیادہ ہی سیر کرادی ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو آپ ٹیکسی کا مائیلیج میٹر چیک کرسکتے ہیں!''

میں نے اس کی پیش کش کے ردِعمل کے طور پر مائیلیج میٹر پر نگاہ ڈالی تو اس یہودی کی شاطرانہ ذہنیت پر سلگ کر رہ گیا۔ ٹیکسی کا مسافت بتانے والا ڈائل اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ ہم نے اب تک اس ٹیکسی میں بیٹھ کر دس اعشاریہ دو میل سفر طے کیا تھا۔ جی میں تو آئی کہ اسے چند چنیدہ ''تحائف'' سے نوازوں لیکن صوفیہ کی معیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے زبان اور دماغ کو قابو میں رکھا۔ انتہائی تلخ لہجے میں صرف اتنا کہا۔

''تمہارے اس احسان کو میں زندگی بھر یاد رکھوں گا اور کبھی اگر مصر میں تم سے ملاقات ہوئی تو میں پہلی فرصت میں اس قرض نما احسان کو اتارنے کی کوشش ضرور کروں گا'' پھر میں نے ایک سو نیو شیکل اس کے حوالے کر دیے۔

کم بخت اعشاریہ دو میل کے فاصلے کے لیے ہم پر احسانِ عظیم جتا رہا تھا۔ کاروبار میں ڈیڑھ ہوشیاری کا یہ انداز ہنود و یہود کے لیے مخصوص ہے اور اس سلسلے میں وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

وہ میرے طنز کو شاید سمجھ نہ سکا اور بڑے ندیدے پن سے اس نے وہ رقم میرے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب میں ٹھونس لی۔ میں نے اسی تلخی سے دوبارہ استفسار کیا۔

''تھوڑی سی مہربانی فرما کر یہ بھی بتادو' اس وقت ہم تل ابیب کے کس مقام پر کھڑے ہیں؟''

''یہ ہینورا اسٹریٹ ہے'' اس نے جواب دیا۔

''کیا یہیں آس پاس کوئی اچھا ریسٹورنٹ بھی ہے؟''

''تھوڑے فاصلے پر ''زائن گیٹ'' ریسٹورنٹ موجود ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ٹھیک ہے' تمہارا بہت شکریہ۔'' میں یہ کہہ کر ٹیکسی سے اترنے لگا تو وہ جلدی سے بولا۔

''بیٹھے رہو۔ میں تمہیں زائن گیٹ کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں۔''

''ارے نہیں یار!'' میں نے جوتا کاری والی بے تکلفی سے کہا ''میری گردن میں پہلے ہی دکھن ہو رہی ہے۔ تم نے میرے احسان شناس کندھوں پر پورے ''اعشاریہ دو میل'' کا ماؤنٹ ایوریسٹ لاد دیا ہے!''

وہ میرے اس گہرے طنز کو فوراً سے پیش تر سمجھ گیا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ ٹیکسی سے نیچے اترا اور ہمارے انخلا کے لیے بڑی شرافت سے ٹیکسی کے دروازے کھول دیے۔ ہم نے اس کی ٹیکسی سے باہر نکلنے میں ایک لمحے کی تاخیر مناسب نہ سمجھی۔ ڈر محسوس ہو رہا تھا' کہیں وہ دروازہ کھولنے پر بھی کچھ مانگ نہ بیٹھے!

زائن گیٹ (ZION GATE) نامی وہ ریسٹورنٹ بمشکل سو گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم چند منٹ کے اندر وہاں پہنچ گئے۔ ایک میز پر براجمان ہونے کے بعد مینیو کا معائنہ کیا تو پتا چلا' اس ریسٹورنٹ میں قدیم اور جدید دونوں قسم کی ڈشز کی خاصی وسیع رینج موجود تھی۔ جس میں زیادہ تر ڈشز گوشت کی تھیں۔

اسرائیل میں اور اسرائیل سے باہر کی دنیا میں وہ ریسٹورنٹس جن کے مالکان یہودی ہیں وہاں گوشت کی ڈشز کو بے دھڑک کھایا جاسکتا ہے کیوں کہ ایسے تمام مقامات پر باقاعدہ ذبح شدہ گوشت فراہم کیا جاتا ہے جسے کوشر (KOSHER) کہا جاتا ہے۔ یہودی جانور کو صحیح طریقے سے حلال کرتے ہیں۔ زائن ریسٹورنٹ میں ہم نے خوب ڈٹ کر ڈنر کیا اور باہر نکل آئے۔

صوفیہ نے پوچھا ''کیا پروگرام ہے۔ اب ہوٹل چلیں گے نا؟''

''ہوٹل تو جانا ہی ہے لیکن اس سے پہلے میں بہائی

گارڈن اپارٹمنٹس کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''وہاں کیا ہے؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''بہائی گارڈن اپارٹمنٹس کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں وکٹ کا دوسرا اینڈ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میچ سے پہلے اس کا معائنہ کرنا ضروری ہے۔''

''تم سیدھی بات نہیں کرسکتے؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔

''تم کرکٹ کی مثال دو تو جائز ہے!'' میں نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا ''اور یہی حرکت میں کروں تو یہ الٹی بات ہوگئی۔ یہ کہاں کا دستور ہے؟''

''کرکٹ کی بات...... میں سمجھی نہیں!'' اس کی الجھن برقرار رہی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''تم نے بیک فٹ پر کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ کرکٹ بیٹنگ کے لیے اس وکٹ کے کسی اینڈ پر کھڑے ہونا ضروری ہوتا ہے۔ میں تو فرنٹ فٹ پر کھیلنے کے لیے دوسرے اینڈ یعنی اس بنگلے میں داخل ہوں گا جہاں میری ساتھی کو رکھا گیا ہے اور تم بیک فٹ پر کھیلتے ہوئے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں اس وکٹ کا دوسرا اینڈ سنبھالو گی۔ کچھ سمجھ میں آیا کہ نہیں؟''

''سمجھ تو رہی ہوں'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی ''لیکن مذکورہ اپارٹمنٹ میں کون رہتا ہے؟''

میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا ''پہلے ہم اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی کا سروے کریں گے' اس کے بعد ہوٹل ٹاپ کا رخ کریں گے۔''

اسی وقت ایک ٹیکسی نظر آگئی اور ہم اس میں بیٹھ کر شالوم اسٹریٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ''بہائی گارڈن اپارٹمنٹس'' شالوم اسٹریٹ کے نزدیک' ذیلی گلی میں واقع ایک دس منزلہ رہائشی عمارت تھی۔ جلد ہی ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

عمارت کے انٹرنس کے نزدیک ہی ایک ویل ڈیکوریٹیڈ ریسیپشن بنا ہوا تھا۔ ریسپشنسٹ کی نگاہ بچا کر رہائشی حصے کی جانب قدم بڑھانا ممکن نہیں تھا۔ ریسپشنسٹ ایک طرح دار اور خوبصورت یہودن تھی۔ بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں رہنے والوں کو اور ان کے ریگولر ملاقاتیوں کے چہروں سے تو وہ اچھی طرح واقف تھی لہٰذا انہیں روکنے یا کوئی استفسار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن ہمیں وہ آسانی سے جانے نہ دیتی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی سوال کرتی' میں خود ہی اعتماد سے چلتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گیا۔ صوفیہ میری ہم قدم تھی۔

ریسپشنسٹ نے استفساریہ نظر سے مجھے دیکھا تو میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''ہم اپارٹمنٹ نمبر ٹوئنٹی سیون۔ سی میں جائیں گے۔''

ریسپشنسٹ کے سامنے کاؤنٹر پر مکمل کمپیوٹر سیٹ اپ موجود تھا۔ میں اس کے ہاتھوں کی حرکات سے سمجھ گیا کہ وہ انٹرکام سسٹم سے کھیلنے والی ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے میرے اندازے کی تصدیق کردی۔

''مسٹر بیگن اس وقت اپارٹمنٹ میں موجود نہیں ہے۔''

''اوہ! مگر اس نے تو مجھے ملاقات کے لیے یہی وقت دیا تھا!'' میں نے قدرے پریشانی سے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

ریسپشنسٹ کی زبانی کم از کم مجھے ڈیلی کیٹ کا نام معلوم ہوگیا تھا۔ اب وہ میرے لیے بھی بیگن ہی تھا۔ میری مصنوعی پریشانی کو اصلی سمجھتے ہوئے اس نے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا' بیگن نے آپ کو ملاقات کے لیے یہ وقت کیوں دیا!'' ریسپشنسٹ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولی ''وہ تو رات کی ڈیوٹی پر کہیں جاتا ہے۔ میں جانتی تھی وہ اپارٹمنٹ میں موجود نہیں لیکن آپ لوگوں کی تسلی کے لیے میں نے انٹرکام پر چیک بھی کرلیا ہے۔''

میں نے معاملات کو نبھانے کی اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا ''ہماری ملاقات خاصی پرانی ہے اور یہ بات مجھے معلوم ہے کہ وہ سات' سوا سات بجے ڈیوٹی کے لیے نکل جاتا ہے۔ میں دن میں کئی مرتبہ اس سے ملنے کے لیے یہاں آچکا ہوں'' پھر میں نے اچانک توقف کر کے چونکی ہوئی نظر سے ریسپشنسٹ کو دیکھا اور کہا۔

''میں نے آپ کو پہلی مرتبہ ریسپشنسٹ دیکھا ہے...... دن میں کسی اور کی ڈیوٹی ہوتی ہے!''

وہ جلدی سے بولی ''دن میں یہاں روسلین ہوتی ہے۔ میرا نام ایلڈا ہے۔ میری ڈیوٹی رات کی ہے۔''

اس طرح ایلڈا کی مہربانی سے نہ صرف اس کا بلکہ دن والی ریسپشنسٹ روسلین کا نام بھی مجھے معلوم ہوگیا۔ خوش اعتمادی کے ساتھ کھیلا گیا فلوک ہمیشہ اچھے نتائج لاتا ہے جیسا کہ ابھی ہوا تھا۔

میں نے سرسری انداز میں کہا ''بیگن نے مجھ سے کہا تھا' وہ آج چھٹی کرے گا اسی لیے میں رات میں آ گیا۔ چلو' کوئی بات نہیں' میں کل دن میں اس سے رابطہ کرلوں گا۔ ویسے

تھوڑی دیر بعد میری سلوان سے بھی ملاقات ہونے والی ہے۔ میں اسے بریف کردوں گا!''

آخری دو جملے میں نے بڑبڑانے والے انداز میں ادا کیے تھے جیسے خود کلامی کی ہو۔ دراصل میں سلوان کے ذکر پر ریسپشنسٹ ایلڈا کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ سلوان ابھی اس بلڈنگ کا ایک رہائشی تھا اور رات کی ڈیوٹی پر ہونے کے باعث ایلڈا اسے ضرور جانتی ہوگی۔

مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی' وہ خاصے پُرجوش انداز میں بولی'' یہ دونوں عجیب و غریب روم میٹ ہیں۔ ڈیوٹی بھی دونوں کو قسمت سے رات ہی کی ملی ہے۔ اپارٹمنٹ میں پڑے دن میں سوتے رہتے ہیں یا پھر گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل جاتے ہیں!''

ساحل والے بنگلے کے اسٹاف کی طرح ایلڈا بھی سلوان اور بیگن کی بدمعاشی نما ملی بھگت سے واقف نہیں تھی۔ اسی لیے اس کے بیان میں کسی ناشناس کے لیے کوئی ربط نہیں تھا۔ میں نے ربط پیدا کروانا ضروری نہ سمجھا۔ ایلڈا اس وقت حقیقی اور افسانوی دنیا کے جس ٹرانس میں تھی وہ مزید چند روز تک وہیں رہتی تو اچھا تھا۔ میں اپنا کام کر کے چلا جاتا تو بعد میں یہاں جو بھی ہوتا رہتا' مجھے اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ ایلڈا نے سلوان کو بیگن کا روم میٹ کہہ کر مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی تھیں' اگر چہ اسے اس بات کا کوئی احساس نہیں تھا کیونکہ وہ مجھے ان دونوں کا کوئی قریبی تعلق دار یا دوست سمجھ رہی تھی۔ وہ میری اصلیت سے آگاہ نہیں تھی اس لیے وہ اس معاملے کو بڑا ایزی لے رہی تھی۔ جب میں دن میں روبلین کے ساتھ ''کھیلتا'' تو یقیناً وہ بھی اسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرتی جو میرے منصوبے کی تکمیل میں بہت مددگار ثابت ہوتا۔

میں نے اس سے انڈر اسٹینڈنگ پیدا کرنے کی خاطر دوستانہ لہجے میں کہا'' ایلڈا! تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ بیگن اور سلوان واقعی بڑے عجیب و غریب ہیں۔ یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا۔ میں تو انہیں ایک عرصے سے بھگت رہا ہوں۔ خیر'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر براہِ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم سے ملاقات ہوتی رہے گی ایلڈا!''

وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور بولی ''شیور سر!''

ہم بہائی گارڈن اپارٹمنٹس سے نکل کر شالوم اسٹریٹ پر آ گئے تو صوفیہ نے پوچھا۔

''بس' کرلیا سروے تم نے؟''

میں نے اسے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی سلوان وڈہلا کیٹ اور اپنے منصوبے کے بارے میں ایک حد تک آگاہ کر دیا تھا' ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا'' فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ اس ملاقات کے توسط سے میں دراصل ایلڈا سے شناسائی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ ایک آدھ روز میں جب ہم اس اپارٹمنٹ کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کریں گے تو ہمیں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ ہم بھی ریگولر ملاقاتیوں کی فہرست میں آ گئے ہیں۔''

''لیکن اصل مسئلہ تو بیگن کی نائٹ ڈیوٹی کا ہے۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولی'' جب وہ رات بھر اپارٹمنٹ سے باہر رہے گا تو پھر اس سے ملاقات کا سوال کیسے پیدا ہوگا؟'' وہ لمحے بھر رکی پھر کہا'' سلوان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے!''

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا'' جس رات ہم اپنے مشن کے لیے اس اپارٹمنٹ کو استعمال میں لائیں گے' بیگن ناگزیر وجوہ کی بنا' پر ڈیوٹی پر نہیں جاسکے گا!''

وہ میرے لہجے میں شامل سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے بولی'' اس کا مطلب ہے' تم نے بیگن کے حوالے سے اپنے ذہن میں کچھ خاص پلان کر رکھا ہے...... ویری ویری ڈینجر پلان؟''

''ایسی ہی بات ہے!'' میں نے پوری سفاکی سے کہا۔

وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے تکنے لگی۔ اس کے لبوں سے اتنا نکلا'' اوہ......!''

یہ بات نہیں تھی کہ صوفیہ کوئی ڈرپوک لڑکی ہو۔ اسے میرے لہجے میں سنگینی اور سفاکی نے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان لمحات میں مجھے خود بھی اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی وحشی درندہ غرایا ہو!

جلد ہی میں نے اپنی داخلی کیفیت پر قابو پالیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں صوفیہ سے کہا'' بس، آج رات کی بات ہے، کل میں تمہیں اپنی پلاننگ سے مکمل طور پر آگاہ کردوں گا پھر مشن کے حوالے سے تمہارے ذہن میں کوئی الجھن نہیں رہے گی۔''

''اٹس او کے!'' اس نے گمبھیر انداز میں کہا اور خاموش ہوگئی۔

ہم لگ بھگ آدھی رات کو اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔

سونے سے پہلے میں نے تمام اہم محاذوں کا ''معائنہ'' کیا، تھرڈ آئی کے چمتکار نے مجھے یقین دلایا کہ ہر طرف خیرو عافیت ہے، ربی کو جھانکنے کا موقع نہیں مل سکا، البتہ، اس کے

معتمدِ خاص کو چھوٹے کمرے میں دیکھ کر میری تسلی ہوگئی کہ ربی بڑے کمرے میں موجود ہوگا۔ سنہری بالوں والا وہ سوئیڈ بوٹیڈ شخص اس طور ربی کا سایہ بنا ہوا تھا کہ مجھے شک ہونے لگا، بن گورین ائر پورٹ سے ربی جس سیاہ لگژری گاڑی میں سوار ہو کر اس بنگلے تک پہنچا تھا، اس میں معتمدِ خاص بھی موجود ہوگا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر...... یا پھر پسنجرز سیٹ پر!

نیند کی آغوش میں سر رکھنے سے قبل میں نے اپنے دماغ کو مخصوص ہدایت دی'' میں نہایت ہی پُرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا اور ٹھیک سات بجے صبح میری آنکھ ہشاش بشاش کھل جائے گی لیکن میری اس نیند کے دوران میں اگر تل ابیب میں صوفیہ، میرے، ساحل یا ربی موشے ہائمن کے حوالے سے کوئی غیر معمولی یا میرے خلافِ توقع واقعہ پیش آنے کا امکان پیدا ہوا تو میری آنکھ وقتِ مقررہ سے پہلے ہی ذرا کھل جائے گی۔''

اس ہدایت کے چند لمحات بعد، میں گہری نیند کی گداز بانہوں میں پناہ گزیں ہو چکا تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میرے دماغ نے کسی مرحلے پر مجھے دھوکا دیا ہو۔ نیند کے سلسلے میں، میں نے جب بھی اسے جو ہدایت دی اس نے عین ہدایت کے مطابق عمل کیا۔ چھ مئی کی صبح ساڑھے چھ بجے میری آنکھ اچانک کھل گئی تو مجھے حیرت کے ساتھ ہی تشویش بھی ہوئی۔ میں نے اپنے دماغ کو ٹھیک سات بجے صبح بیدار کرنے کا حکم دیا تھا۔ وقتِ مقررہ سے آدھا گھنٹا پہلے آنکھ کھل جانے کا یہی مطلب تھا، کوئی گڑبڑ ہے!

میں نے کسی غیر متوقع اور غیر معمولی گڑبڑ کو صوفیہ، ساحل، ربی اور خود اپنے آپ سے منسوب کر کے دماغ کو ہدایت دی تھی۔ قبل از وقت آنکھ کھل جانا ظاہر کرتا تھا، انہی چار افراد میں سے کسی کے ساتھ کچھ غیر متوقع ہونے والا تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں، دوسرے بیڈ کی طرف دیکھا۔ سب سے پہلے اپنے قرب کو چیک کرنا ضروری تھا۔

وہاں صوفیہ موجود تھی۔ وہ اس وقت گہری نیند میں تھی۔ میں بھی صحیح سلامت تھا۔ میں نے بستر پر لیٹے لیٹے آنکھیں بند کیں اور باطنی آنکھ کے وسیلے سے اپنی جانِ تمنا ساحل کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اسی بیڈ روم میں تھی جہاں پچھلے کچھ عرصے سے وہ مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بہ خیر و عافیت پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ اب صرف ربی موشے ہائمن کی طرف جھانکنا رہ گیا تھا۔

ربی تک براہِ راست میری رسائی ابھی تک ممکن نہیں ہوسکی تھی لہٰذا میں سوئیڈ بوٹیڈ معتمدِ خاص کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ میری تیسری آنکھ نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی غیر معمولی اور خلافِ توقع تھا۔ سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں، میں سمجھ گیا کہ میری آنکھ مقررہ وقت سے پہلے کیوں کھل گئی تھی۔

میں نے سونے سے پہلے اس سوئیڈ اور بوٹیڈ سنہری بالوں والے معتمدِ خاص کے ماحول میں جھانکا تھا اور اسے اسی چھوٹے سے کمرے میں پایا تھا جہاں اس نے ربی کو پلائے جانے والے دودھ کی اسکریننگ کی تھی، لیکن اب وہ اس کمرے میں نہیں تھا بلکہ ان لمحات میں وہ مجھے ایک بند وین میں دکھائی دیا۔ میرے اب تک کے مشاہدے کے مطابق، وہ ربی کا سایہ بن کر زندگی گزار رہا تھا، اس کا مطلب تھا، ربی بھی اسی وین کے اندر موجود ہوگا!

اس چونکا دینے والے خیال نے مجھے اس ماحول سے چپکا کر رکھ دیا پھر گویا مجھ پر انکشافات کی بارش ہوگئی۔ اسی بند وین میں مجھے ربی موشے ہائمن اور معتمدِ خاص کے علاوہ سلوان بھی نظر آ گیا، سلوان نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی جب کہ معتمدِ خاص پسنجرز سیٹ پر براجمان تھا۔ ربی وین کے عقبی حصے میں ایک نرم اور آرام دہ کاؤچ پر لیٹا ہوا تھا۔

اس وین کا عقبی حصہ ایک چھوٹے سے سٹنگ روم سے مشابہ تھا۔ آپ اسے ایک میٹنگ روم بھی کہہ سکتے ہیں۔ ربی آنکھیں بند کیے جس کاؤچ پر لیٹا تھا۔ وہ اپنی نوعیت اور آرام دہی کے حوالے سے منفرد اہمیت اور حیثیت کا حامل تھا۔ اسی چھوٹے ''میٹنگ روم'' میں مجھے ربی کی وہیل چیئر بھی رکھی نظر آئی۔ اس وہیل چیئر کو ممکنہ حد تک فولڈ کر کے رکھا گیا تھا۔ میں نے اسے اس کے مخصوص ہتھوں کے سبب پہچان لیا۔ اس سے پہلے میں اس وہیل چیئر کو ساحل والے بنگلے کی زیریں منزل کے ایک بیڈ روم میں دیکھ چکا تھا...... اور ربی کو اس وہیل چیئر پر بیٹھے دیکھ کر مجھے شدید حیرت بھی ہوئی تھی۔ یہی وہیل چیئر بند وین میں اب اس کے ساتھ کہیں جارہی تھی۔ پتا نہیں، اچانک بیٹھے بٹھائے وہ کس ضعف کا شکار ہوگیا تھا!

اس کے ضعف اور وہیل چیئر سے بھی زیادہ اہم بات میری نظر میں اس وقت یہ تھی کہ ربی اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ اتنی صبح صبح جا کہاں رہا تھا اور وہ بھی ساحل کو اس بنگلے میں اکیلے چھوڑ کر! یقیناً وہ کسی نہایت ہی اہم اور ایمرجنسی مشن پر تھا۔ میں بھی تھرڈ آئی کے طفیل اس بند وین میں موجود رہا۔

اس وقت میرے پورے بدن میں ایک عجیب سی سنسنی

دوڑ رہی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے پکار پکار کر اطلاع دے رہی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے ربی کے ماحول کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ وہ جو کچھ بھی کرنے جا رہا تھا۔ وہ میرے لیے انتہائی اہم ہو سکتا تھا۔ میں معتمدِ خاص اور سلوان کے پاس رہ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔

اس بند دین کو میں نے جب دیکھا تو وہ بن یہودہ اسٹریٹ سے گزر رہی تھی اور اب وہ ہائی وے پر دوڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہوا کہ اس دین میں ٹینٹڈ گلاس نصب تھے۔ دین کے اندر موجود افراد تو بہ آسانی باہر دیکھ سکتے تھے لیکن باہر والے باوجود کوشش کے بھی اندر جھانکنے کی ''ہمت'' نہیں کر سکتے تھے۔

ہائی وے پر دوڑتی ہوئی دین کو دیکھ کو میرے ذہن میں جو پہلی بات آئی' وہ یہ تھی کہ ربی اس وقت تل ابیب سے باہر کہیں جا رہا تھا کیوں کہ وہ ہائی وے سیدھی بن گورین ائر پورٹ تک پہنچاتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا، وہ اسرائیل سے کسی دوسرے ملک کی جانب پرواز کرنے والا ہو۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میرے لیے ساحل کا حصول قدرے آسان ہو جاتا۔ ربی کی اسرائیل میں موجودگی کے باعث مجھے بہ نسبت زیادہ مشکلات سے گزرنا پڑتا لیکن جلد ہی اس بند دین نے میری توقعات پر پانی پھیر دیا۔

میں نے دین کو ہائی وے پر' ائر پورٹ سے آگے بڑھتے دیکھا تو الجھ کر رہ گیا۔ بن گورین ائر پورٹ کی طرف جانے کے لیے اسے ہائی وے کو چھوڑ کر ایک ذیلی سڑک پر مڑنا چاہیے تھا لیکن وہ مسلسل جنوب کی سمت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا، وہ تل ابیب سے نکل کر اسرائیل ہی کے کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہے تھے۔ میں اس ماحول سے چپکا ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہا۔

جلد ہی وہ بند دین ابی آذر کو پیچھے چھوڑ کر تل ابیب کی حدود سے نکل گئی۔ ابی آذر کا علاقہ تل ابیب کی جنوبی سرحد پر واقع ہے۔ وہ لوگ جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے، میری تشویش اور دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ذہن میں ایک خیال یہ بھی آ رہا تھا کہ شاید وہ ربی کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہے ہیں۔ ڈہیل چیئر بار بار یہ سوچنے پر مجبور کرتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ کوئی میڈیکل پرابلم ہے۔ اس کی یہ پرابلم چوں کہ اچانک ہی میرے سامنے آئی تھی لہٰذا میرا ذہن بہ یک وقت کئی محاذوں پر الجھا ہوا تھا۔ جب تک بلی تھیلے سے باہر نہ آ جاتی، اس الجھن کو رہنا تھا...... رہنا تھا تو لازمی بات ہے، دماغ کو الجھانا بھی تھا۔

ابی آذر سے نکلنے کے بعد دین نے اپنی سمت میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور جنوب مشرق کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کی ہائی اسپیڈ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان لوگوں کو کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ دین نے جنوب مشرق میں ہی اپنا سفر جاری رکھا اور راحیہ، شاعر ہیگیے سے گزرتے ہوئے قریات اناوم کے راستے یروشلم میں داخل ہو گئی۔ یروشلم کا لفظ ذہن میں چپکا تو مجھے اپنے چاروں طرف روشنی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ یہ روشنی اتنی تیز تھی کہ میں نے گھبراہٹ میں آنکھیں کھول دیں۔

ظاہرہ آنکھیں کھلتے ہی باطنی آنکھ کا شٹر بند ہو گیا۔ میں نے اپنی سانس کو غیر ہموار پایا۔ میں اس وقت ہوٹل ٹاپ کے اسی کمرے میں موجود تھا جہاں رات کو سویا تھا۔ میری نظر صوفیہ والے بیڈ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ ہنوز گہری نیند میں تھی۔ میں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ میں مقررہ وقت سے آدھا گھنٹا پہلے بیدار ہوا تھا اور یہ آدھا گھنٹا میں نے ربی اینڈ کمپنی کی ''معیت'' میں گزارا تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے دوران میں وہ لوگ تل ابیب سے یروشلم پہنچ گئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق، انہوں نے لگ بھگ چالیس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ میرے اس اندازے میں دو چار میل کا فرق ہو سکتا ہے، ویسے سٹی سینٹر تل ابیب سے سٹی سینٹر یروشلم کے مابین اوسط فاصلہ پینتیس میل تصور کیا جاتا ہے۔

یروشلم کے خیال نے ایک مرتبہ پھر مجھے ان جانی مسرت سے نہال کر دیا۔ اس وقت میں اپنے ان محسوسات کو کوئی نام نہ دے سکا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے میں تھرڈ آئی کے توسط سے بند دین کے اندر پہنچ گیا۔

وہ دین ربی موشے ہائمن اور اس کے دو چیلوں کو لے کر ''زودا'' سے گزری، پھر ان کے راستے میں ٹومب آف ہرزل آیا۔ یہاں سے وہ اسرائیل میوزیم پہنچے۔ یہ تمام تر سفر جنوب مشرق کی سمت میں ہو رہا تھا۔ اسرائیل میوزیم کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ان کی سواری یروشلم ریلوے اسٹیشن کے پاس سے گزری تو ان کی سمت بھی تبدیل ہو گئی۔ پرانی روش کو چھوڑ کر اب وہ شمال کی جانب، دمشق گیٹ کی طرف بڑھنے لگے۔ مسلسل شمال کی طرف سفر کرتے ہوئے انہوں نے دمشق گیٹ اور مسلم کوارٹر کو پیچھے چھوڑا اور ''بائبلیکل زو'' پہنچ گئے۔ اس چڑیا گھر کے پاس سے وہ دین مشرق کی طرف مڑی اور سیدھی، ماؤنٹ اسکوپس کے قریب واقع 'ہیبرو یونی ورسٹی آف یروشلم' پہنچ گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا۔ یہی یونی ورسٹی ان کی منزل تھی۔ دین یونی ورسٹی کے اندر داخل ہو گئی۔

یروشلم میں، دیگر مقاماتِ مقدسہ کی طرح ماؤنٹ اسکوپس ....کی بڑی اہمیت ہے اور ہیبرو یونیورسٹی کو یہودیوں کا اماں باوا سمجھ لیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ربی موشے ہائمن کو علی الصباح تل ابیب سے یروشلم آنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی اور وہ بھی ہیبرو یونی ورسٹی میں۔ کیا وہ اس یونیورسٹی میں کوئی اہم لیکچر دینے آیا تھا۔

ربی ہیبرو (عبرانی) زبان کا بہت بڑا عالم تھا۔ جس طرح ہندوؤں نے اپنے تمام تر پُراسرار علوم و فنون کو سنسکرت میں چھپا رکھا ہے جہاں تک بڑے بڑے پنڈتوں اور جوگیوں ہی کی رسائی ممکن ہے کیونکہ وہ سنسکرت بھی نہایت ہی پے چیدہ قسم کی ہے۔ ہندی جاننے والا ایک عام ہندو ان اسرار و رموز تک کبھی نہیں پہنچ سکتا' بالکل اسی طرح یہودیوں نے بھی اپنے خفیہ معاملات کو عبرانی زبان کی بھول بھلیوں میں گم کر رکھا ہے تاکہ دوسرے لوگ ان کے راز ہائے سر بستہ تک پہنچنے کی کوشش نہ کریں۔ اس مخصوص ذہنی مماثلت کی بنا پر ہی شاید ان دونوں اقوام کا ذکر ایک ساتھ ''ہنود و یہود'' کے طور پر کیا جاتا ہے......اور مسلمانوں کو خبردار کیا جاتا ہے کہ ہنود یہود کبھی ان کے دوست نہیں ہو سکتے۔ کاش، یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آ جائے!

سب سے پہلے سلوان اور معتمدِ خاص دین سے باہر آئے پھر انہوں نے دین کے عقبی حصے میں سے ڈہیل چیئر کو باہر نکال کر اسے ''سیٹ'' کیا۔ میں یہ سمجھ رہا تھا، وہ ربی کو سہارا دے کر اس ڈہیل چیئر پر بٹھائیں گے لیکن ربی نے انہیں یہ زحمت نہیں دی بلکہ اپنی مدد آپ کے تحت وہ دین سے نکلا اور بڑی آہستگی کے ساتھ ڈہیل چیئر پر بیٹھ گیا۔ ربی کی تازہ ترین حرکت کو دیکھ کر میں یہی اندازہ قائم کر سکا کہ وہ محض زیادہ چلنے سے عاری ہے مگر اس عاریت کا سبب میری سمجھ سے باہر تھا کیونکہ میں اسے نوجوانوں کی طرح بڑے طمطراق سے چلتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ یہ اچانک پتا نہیں، کون سا انقلاب برپا ہو گیا تھا!

وہ دین یونیورسٹی کے اندر، عمارت کے ساتھ آ کر رکی تھی۔ جب ربی ڈہیل چیئر پر بیٹھ چکا تو میں بے خیالی میں اپنے دل میں یہ دعا کر رہا تھا کہ سلوان یا معتمدِ خاص میں سے کوئی ایک اس کے ساتھ اندر ضرور جائے تاکہ میں ربی کے ماحول میں موجود رہ کر اس کے مقاصد کو سمجھ سکوں۔

میری یہ لاشعوری دعا فوراً قبول ہو گئی۔ سلوان تو دین کے اندر پہنچ کر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا اور معتمدِ خاص ڈہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے عمارت کے اندرونی حصے میں داخل ہو گیا۔ اس وقت یونیورسٹی میں آمد و رفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ سلوان نے دین کو وہاں سے ہٹا کر پارکنگ وغیرہ میں لے جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا، ربی یونی ورسٹی میں زیادہ دیر نہیں لگائے گا۔ میں سلوان پر صلواتیں بھیج کر معتمدِ خاص کے پاس آ گیا۔ میری تمام تر امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔

امید اور خدشے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ زندگی کی ریل میں دو پٹریوں کے مانند ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہر پُر امید شخص کو شعوری یا لاشعوری طور پر یہ خدشہ ضرور ہوتا ہے کہ کہیں وہ اپنے مقصد میں ناکامیاب نہ ہو جائے، اسی طرح چاروں جانب سے خدشات میں گھرے ہوئے ہر شخص کو بھی موہوم سی امید بہر حال ہوتی ہے کہ شاید کوئی معجزہ نمودار ہو جائے اور اس کی بگڑی بن جائے!

ان لمحات میں، میں بھی شدید تذبذب کا شکار تھا۔ بہ ظاہر دکھائی تو یہی دیتا تھا، معتمدِ خاص ربی کا سایہ بن کر ہر جگہ اس کے ساتھ جائے گا لیکن اس کے باوجود بھی یہ دھڑکا اپنی جگہ موجود تھا کہ کہیں سفاک ڈائریکٹر ربی موشے ہائمن اچانک اپنے معتمدِ خاص کو ''کٹ'' نہ کر دے اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ میری، ربی کے ماحول تک رسائی اسی معتمدِ خاص کی رہینِ منت تھی۔ اگر ربی اچانک اس دراز قامت، سنہری بالوں والے سوٹیڈ بوٹیڈ شخص کو چھوڑ کر کسی دروازے کے پیچھے اوجھل ہو جاتا تو میں بے بسی کے ہاتھوں اپنا منہ پیٹنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن خیریت گزری اور میرے تمام تر اندیشے و خدشات باطل ہو گئے۔ میں نے اگر اس شخص کا نام معتمدِ خاص رکھا تھا تو یہ نام اس کی شخصیت اور کردار پر بڑا موزوں بیٹھتا تھا۔ وہ ربی کے ساتھ کسی سائے کا ہی رول ادا کر رہا تھا۔ وہ ربی والی ڈہیل چیئر کو بہ آہستگی چلاتے ہوئے مختلف راہ داریوں سے گزرا اور بالآخر ایک منقش چوبی دروازے کے سامنے اس سفر کا اختتام ہوا۔ معتمدِ خاص جب ربی کے ساتھ بہ نفسِ نفیس ایک کمرے میں داخل ہوا تو میرے سینے سے ایک تسلی بخش اور اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ کمرے میں ان کے دخول کے بعد، وہ بھاری بھرکم دروازہ کسی خودکار نظام کے تحت بند ہو گیا۔

وہ کمرا درمیانے سائز کے میٹنگ روم سے مشابہ تھا لیکن اس میں لیکچر روم کی جھلک بھی بہت نمایاں تھی۔ اس کمرے میں ایک ترتیب سے چار کرسیاں' میز لگی ہوئی تھیں ...... یہ مخصوص قسم کی سیٹیں تھیں۔ ان نشستوں سے آگے سامنے والی

ایک دیوار کے قریب چبوترہ نما چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ اس چبوترے پر بھی ایک کرسی اور میز دکھائی دے رہے تھے۔ صاف نظر آتا تھا، وہ نمایاں سیٹ کسی لیکچرر یا مبلغ کے لیے ہے۔

مذکورہ کمرے میں تین افراد پہلے سے موجود تھے جنہوں نے چار مخصوص نشستوں میں سے تین سنبھال رکھی تھیں۔ ربی اور معتمدِ خاص کو دیکھ کر وہ تینوں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے انداز میں ایک خاص قسم کا احترام اور عقیدت پائی جاتی تھی اور یہ سب کچھ یقیناً ربی کے لیے تھا۔ یونی ورسٹی میں داخل ہونے کے بعد سے لے کر اس میٹنگ روم تک پہنچنے کے دوران میں ربی جہاں جہاں سے بھی گزرا تھا، میں نے لوگ کے چہروں اور انداز میں اس کے لیے یہی احترام اور عقیدت دیکھی تھی۔ وہ اس یونی ورسٹی اور وہاں کے لوگوں کے لیے کئی حوالوں سے محترم تھا۔ یہودی قوم ربی موشے ہائمن کو کتنا بلند مرتبہ سمجھتی تھی، یہ مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔

ربی وہیل چیئر میں سے نکلا اور چبوترے کی سیڑھی چڑھ کر اس نمایاں کرسی پر جا بیٹھا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اس کے براجمان ہونے کے بعد معتمدِ خاص اس سیٹ پر آ گیا جو چار کی ترتیب میں خالی تھا۔ اس دوران میں وہ تینوں افراد بیٹھ چکے تھے۔ ان تینوں نے اپنے سامنے رکھی میزوں پر لیپ ٹاپ کھل رکھے تھے۔ معتمدِ خاص نے اپنا لیپ ٹاپ کھول لیا پھر وہ سب سوالیہ نظروں سے ربی موشے ہائمن کی طرف دیکھنے لگے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا، وہ ربی کے بولنے کا انتظار کر رہے ہوں!

میں معتمدِ خاص کے توسط سے اس ماحول میں موجود رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد ربی نے بولنا شروع کیا۔ ان لمحات میں مجھے اپنی محرومی کا کچھ زیادہ ہی شدت سے احساس ہوا۔ کاش، باطنی آنکھ کی طرح میرا باطنی کان بھی بیدار ہو چکا ہوتا تو میں تھرڈ آئی اور تھرڈ ایر کا بیک وقت استعمال کر کے اس خفیہ میٹنگ کا ایک ایک لفظ سن سکتا لیکن یہ ''کاش''، محض کاش ہی رہا، میں ربی موشے ہائمن کو صرف بولتے ہوئے دیکھنے تک محدود رہا۔ اپنی محرومی کا فی الحال میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور میں معتمدِ خاص کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس سمیت وہ تینوں افراد ربی کا لیکچر سننے کے ساتھ ساتھ اپنے لیپ ٹاپ پر بھی مصروف تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کے لیکچر میں سے اہم نکات کو اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کرتے جا رہے ہوں۔ مذکورہ تینوں افراد کے لیپ ٹاپ کا ڈسپلے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، البتہ، معتمدِ خاص کے لیپ ٹاپ تک مجھے تصوراتی رسائی حاصل تھی لہٰذا میں نے اس کے لیپ ٹاپ کے ڈسپلے پر نگاہ جما دی۔

یہودیوں کی متعصبانہ مکاری کو دیکھ کر میں ''اش اش'' کر اٹھا۔ معتمدِ خاص کے لیپ ٹاپ کے اسکرین پر ابھرنے والی تحریر خالص ہیبرو (عبرانی) زبان میں تھی اور وہ بھی انتہائی پے چیدہ۔ اس اہم نکاتی تحریر کا ایک لفظ بھی میرے پلے نہ پڑ سکا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے مایوسی ہوئی۔ میں اس وقت ایک انتہائی سنسنی خیز میٹنگ میں موجود تھا لیکن نہیں جانتا تھا، وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ دل میں افسوس کرتے ہوئے میں وہاں موجود رہا اور کسی موقع کی تلاش میں رہا، اس یقین کے ساتھ کہ قدرت کسی کی محنت کو ضائع یا بے کار نہیں جانے دیتی!

پندرہ منٹ تک ربی کا لیکچر جاری رہا۔ پھر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے ان لوگوں کے ہاتھ منہ کی حرکات و سکنات سے اس سوالیاتی سیشن کا اندازہ قائم کیا۔ یہ سوال و جواب ربی اور ان تین افراد کے درمیان ہو رہے تھے جو پہلے سے اس میٹنگ روم میں ربی کی آمد کے منتظر تھے۔ اس دوران میں معتمدِ خاص اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف رہا۔ ربی اور اس کمرے میں پہلے سے موجود تین افراد کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی لہٰذا میں معتمدِ خاص کے ساتھ چپک گیا اور اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

محنت اور صبر ضرور رنگ لاتے ہیں۔ انسان مضبوط قوتِ ارادی اور پختہ عزم کے ساتھ کسی مہم میں جتا رہے تو بالآخر وہ اپنے مقصد کو حاصل کر کے ہی رہتا ہے۔ سچی لگن نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ میری خوشی کا سبب معتمدِ خاص کی وہ حرکات تھیں جو اس کے لیے ایک روٹین کا کام تھا مگر اس کی یہ روٹین میرے لیے پروٹین سے بھرپور ثابت ہوئی!

اس نے لیپ ٹاپ پر ربی کے لیکچر کے جو اہم نکات محفوظ کیے ان کے آخر میں کوئی نام بھی ٹائپ کیا، پھر لینگویج کنورشن کے آپشن میں جا کر اپنے لیپ ٹاپ کو مختلف کمانڈز دینے لگا۔ میں کمپیوٹر اور اس کے استعمال سے کوئی زیادہ واقفیت نہیں رکھتا تھا، بس میں یہی سمجھ سکا کہ وہ سروائیول ڈکشنری کے پورشن کو آزما رہا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں میں یہی آیا کہ وہ ان خفیہ اہم نکات کو ہیبرو سے دوسری زبانوں میں منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اگلے ہی لمحے میرا یہ اندازہ

درست ثابت ہوا۔

معتمدِ خاص نے لینگویج کنورشن کے عمل سے گزرتے ہوئے سورس لینگویج کے کالم میں ہیبرو کو رکھا اور ٹارگٹ لینگویج کے کالم میں جرمن، فرنچ، اسپینش، اٹالین، پرتگیز اور انگلش ٹائپ کر کے انٹر کلک کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہیبرو HEBREW زبان میں تحریر وہ اہم نکات دنیا کی چھ اہم زبانوں میں منتقل ہو گئے۔

معتمدِ خاص باری باری ایک ایک پیج کا جائزہ لینے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسکرین پر کھلے ہوئے پیج پر غور کرتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ اس تحریر کی کاپیاں مختلف لوگوں کو میل کرے گا۔ جب وہ انگلش پیج پر پہنچا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ وہ کوئی طویل و عریض تحریر نہیں تھی کہ مجھے اسے پڑھنے میں بہت زیادہ وقت لگتا۔ تھرڈ آئی کے توسط سے جو کچھ پڑھا وہ دماغ کی چولیں ہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ایک سناٹے کے عالم میں، میں اس خطرناک اہم نکاتی تحریر کا ایک ایک لفظ اپنی یادداشت کے تخ و ترش خانے میں محفوظ کرتا چلا گیا۔ ربی موشے ہائمن نے اس خفیہ میٹنگ میں فرمایا تھا۔

اسرائیل کو اب تک بائیس فی صد مسلمان ریاستیں تسلیم کر چکی ہیں۔ یہ تعداد میں کل بارہ ملک بنتے ہیں۔ اگرچہ یہ ہماری ایک بڑی کامیابی ہے لیکن ہمیں اسی پر خوش ہو کر نہیں بیٹھ جانا۔ مسلمان ممالک میں ہمارا سب سے بڑا ٹارگٹ پاکستان ہے۔ اگر ہم نے اسلام کے قلعے کو فتح کر لیا تو سمجھ لو، ساری دنیا کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے اب تک اس ملک کو زیرِ دام لانے کے لیے کئی حربے آزمائے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، ہمارے ان آزمودہ کارحربوں کو وہاں کامیاب نہیں ہونے دیا گیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ وہاں کی عوام ہے۔ پاکستانی عوام بہ حیثیت مجموعی، اسرائیل اور یہودی قوم سے سخت نفرت کرتی ہے لیکن آپ لوگ فکر نہ کریں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ہم نے وہاں کی عوامی رائے اور لوگوں کے ذہنوں کو بدلنے کے لیے ایک نہایت ہی زود اثر پلان تیار کیا ہے اور ہمیں یقین ہے، بہت جلد اس ملک میں ''اسرائیل پاکستان دوستی'' اور ''یہودی مسلم بھائی بھائی'' کے نعرے گونجنے لگیں گے۔ بس، ہمیں اس موقع کی تلاش بلکہ انتظار ہے، پھر ہم ان مسلوں کو بتائیں گے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی جاگیر کو ہڑپ کرنے کے لیے کس طرح اس کی گردن پر چھری چلاتا ہے۔ فتح خیبر سے لے کر آج تک مسلمان ہمیں مختلف حیلوں بہانوں سے نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ یہ سارا نقصان سود در سود ہمیں وصول کرنا ہے۔ کسی زمانے میں مسلمانوں کی طرف سے ہمارے بارے میں یہ احکام آئے تھے، یہودیوں کو جزیرۂ عرب سے نکال باہر کرو۔ عن قریب ہم مسلمانوں کو اس دنیا سے نکال باہر کریں گے۔ یہ ہمارا مشن ہے۔ ہم اپنے مشن کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ آج کی میٹنگ کے اہم نکات کو نوٹ کر لو۔

ہمیں اسرائیل کی سرحدوں کو عراق سے مصر تک اور دوسری جانب شام سے مدینہ تک پہنچانا ہے۔

مسجد اقصیٰ کو گرا کر وہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے گا۔

بیت المقدس کی ہر اس عمارت کو مسمار کر دیا جائے گا جو ہمارے نزدیک غیر متبرک ہو۔

فلسطین ریڈیو کو وارننگ دی جائے کہ وہ سورۃ البقرہ کی تلاوت نشر نہ کرے اور نہ ہی وہاں سے کوئی ایسا اشتعال انگیز پروگرام پیش کیا جائے جو مسلمانوں کو بیت المقدس کی واپسی پر اکساتا ہو...... ایک مہینے کے بعد ہم پھر ملیں گے اور میں آپ لوگوں کو اپنے اس خفیہ منصوبے کی تفصیل بتاؤں گا جس پر عمل کر کے ہم مسلمانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر سکتے ہیں!

مذموم عزائم پر مبنی اس خرافاتی لیکچر کی خطرناکی اپنی جگہ لیکن اس تحریر کو آخری لفظ تک پڑھنے کے بعد بے اختیار میرے دل سے نکلا ''ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا...... کبھی نہیں!''

اس اشتعال اور انتشار انگیز تحریر کے آخر میں لکھا تھا......

سیکریٹری ربی موشے ہائمن، ہرشل حنان!

مجھے یہ اندازہ لگانے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگی کہ سیکریٹری موشے ہائمن سے مراد وہی دراز قامت سوٹیڈ بوٹیڈ شخص تھا جسے میں نے ربی کے ''معتمدِ خاص'' کا ٹائٹل دے رکھا تھا۔ اب تو اس کا نام بھی سامنے آ گیا تھا۔ ہرشل حنان کے لیے معتمدِ خاص کا ٹائٹل کسی بھی لحاظ سے غیر موزوں یا مس فٹ نہیں تھا۔

میٹنگ کے اختتام پر وہ تینوں افراد ایک مرتبہ پھر ربی کے احترام میں باادب باملاحظہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ تینوں ربی کے سیٹ اپ میں نہایت ہی اہم افراد معلوم ہوتے تھے۔ پتا نہیں، وہ ایک ماہ بعد، آئندہ میٹنگ میں ان کے سامنے مسلمانوں کے خلاف کون سا منصوبہ کھولنا چاہتا تھا۔ اس خیال نے میرے ذہن میں کھلبلی سی مچا دی لیکن ظاہر ہے، میں فی الحال کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ان یہودی اکابرین کی طرح مجھے بھی ایک مہینے تک انتظار کرنا تھا۔

ویسے اسی لمحے میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ

ایک ماہ بعد، ہیبر دیو نیورسٹی آف یروشلم میں ہونے والی اس خفیہ میٹنگ میں، میں ضرور "شریک" ہوں گا۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ ربی جہاں بھی جائے گا، ہرشل اس کی دم بن کر وہاں پہنچ جائے گا اور یہی سنہری بالوں والا ہرشل مجھے ربی کے قریب رکھ سکتا تھا۔ اگر ایک مرتبہ میں ربی کے خطرناک منصوبے سے آگاہ ہو جاتا تو پھر میں اپنا تن من دھن داؤ پر لگا کر اسے کبھی بھی اس کے ناپاک عزائم میں کامیاب نہ ہونے دیتا۔ ایسا سوچتے ہوئے میرے رگ و پے میں ایک ولولہ انگیز سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا، زندگی کا اصل مقصد اب کھل کر میرے سامنے آیا ہو۔ اپنے ملک کی سلامتی اور عالم اسلام کی بھلائی کے لیے میں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ بھی قربان کر سکتا تھا۔ اس تعمیری اور حب الوطنی کی سوچ نے میری روح کو سرشار کر دیا۔

ربی موشے ہائمن اپنے سیکریٹری ہرشل حنان کے ساتھ یونیورسٹی سے نکلا تو صبح کے آٹھ بجنے والے تھے۔ یہ خفیہ میٹنگ انہوں نے طلبہ و طالبات کی آمد سے قبل ہی نمٹا ڈالی تھی۔ بندوین کی ڈرائیونگ سیٹ پر سلوان قابض تھا۔ جب وہ لوگ بائبلیکل زو، دمشق گیٹ، مسلم کوارٹر، سلطان پول، یروشلم ریلوے اسٹیشن اور اسرائیل میوزیم تک آئے تو مجھے اندازہ ہو گیا، انہوں نے واپسی کی راہ لی تھی۔ اس حساب سے وہ لوگ ساڑھے آٹھ، پونے نو بجے تل ابیب میں ہوتے لیکن اگلے ہی لمحے انہوں نے میرے اندازے کی ایسی کم تیسی کر دی۔

اسرائیل میوزیم سے سلوان نے دین کو جنوب میں موڑ لیا۔ یہ ایک نیا روڑ تھا۔ وہ لوگ شمال مغرب کی جانب بڑھنے کے بجائے جنوبی سمت گھوم گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا۔ ابھی میری تیسری آنکھ کو اور بہت کچھ بھی دیکھنا تھا۔

وہ لوگ "بیت سفافا" اور "شرافت گیلو" کے درمیان سے گزر کر ٹومب آف راکیل پہنچ گئے۔ پرانے شہر میں ویسٹرن وال (دیوارِ گریہ) کو پیچھے چھوڑتے ہوئے وہ دین بیت لحم میں داخل ہو گئی۔ "بیت لحم" یروشلم کا ایک اہم مقام ہے جہاں چرچ آف نیٹی ویٹی کی بڑی قدر و قیمت ہے، چرچ آف دی نیٹی ویٹی (Church Of The Nativity) کو جیزز (JESUS) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا برتھ پلیس مانا جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا، ربی یہ کن دھندوں میں مصروف ہے اور یہی جاننے کے لیے میں اس کے ماحول کے ساتھ چپکا رہا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے، بندوین بیت لحم کو عقب میں چھوڑ کر ایک مرتبہ پھر جنوب مشرق کی سمت تیزی سے بڑھنے لگی۔ وہ لوگ یروشلم کیا، اسرائیل کی جنوب مشرقی سرحد کی طرف جا رہے تھے۔ اس جانب تھوڑا آگے جا کر شیخ حسین بارڈر آ جاتا تھا۔ یہ بارڈر اردن اور اسرائیل کے درمیان ایک چوڑی سرحدی پٹی کے مانند موجود ہے۔ وہ جس جانب بڑھ رہے تھے اس رخ پر بحرِ مردار یعنی "ڈیڈ سی" واقع تھا۔ مردار سمندر (DEAD SEA) اردن اور اسرائیل کی سرحد پر اس طرح واقع ہے کہ آدھا اردن میں اور آدھا اسرائیل میں شمار ہوتا ہے۔

بحرِ مردار میں نمکیات کا تناسب اتنا زیادہ ہے کہ اس میں ڈوبنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص ڈیڈ سی میں کود کر خودکشی کرنا چاہے تو اسے اس مقصد میں ہرگز ہرگز کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ بحرِ مردار سطحِ سمندر سے ایک ہزار، تین سو بارہ فٹ نیچے دنیا کا پست ترین مقام ہے۔ یہ کیسا حسین یا سنگین اتفاق تھا کہ میں اپنی تیسری یعنی باطنی آنکھ سے بحرِ مردار کو دیکھنے جا رہا تھا جب کہ ظاہری دونوں آنکھوں سے چند روز قبل میں نے شیگیٹی کو دیکھا تھا۔ شیگیٹی تبت میں واقع ہے اور سطحِ سمندر سے پندرہ ہزار، سات سو اڑتالیس فٹ بلند ہے، شیگیٹی کو دنیا کا بلند ترین مقام ہونے کا اعزاز حاصل ہے، جہاں انسانی زندگی کا وجود پایا جاتا ہو۔ پتا نہیں، میری یہ "تین آنکھیں" کیسی بلندی کیسی پستی کا کھیل کھیل رہی تھیں!

ربی کی بندوین ڈیڈ سی کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آئے ہوں گے۔ سیر و تفریح کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا "ان سنک ایبل سویم" کے بھی وہ شائق دکھائی نہیں دیتے تھے ورنہ محض تفریح کی غرض سے اس طرف رخ کرنے والے بحرِ مردار میں ان سنک ایبل سویم (Unsinkable Swim) سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ربی موشے ہائمن اور اس کے چیلے چانٹے اتنے بھی حساس اور حمیت دار نہیں تھے کہ ان کا ضمیر ملامت پر اتر آیا ہو، مسلمانوں کے خلاف ایک خوف ناک اور گہری سازش کے تانے بانے بننے کے بعد وہ زبردست احساسِ ندامت میں مبتلا ہو گئے ہوں اور یہ سوچا ہو، چلو یار! روح کے دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے خودکشی ہی کر لیں؟

بالفرضِ محال، اگر انہوں نے ایسا کوئی ارادہ باندھ بھی لیا تھا تو بہر حال بحرِ مردار میں اتنی عزت ضرور موجود تھی کہ وہ ان کی ناپاک روحوں کو قبض کرنے کے لیے کسی بھی صورت تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بحرِ بے جان تھا، بحرِ بے ضمیر نہیں!

میری ان تلخ و ترش سوچوں کے دوران ہی میں بندوین کے دروازے کھلے اور سلوان و ہرشل دین سے باہر آ گئے۔ ان کا انداز یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ربی اور اس کی وہیل چیئر کو بھی باہر لانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں سانس روک کر ان کے ماحول سے چپکا رہا کہ اب کچھ پیش آتا ہے، تب کچھ پیش آتا ہے۔ پھر جیسے ہی وہ دونوں دین کے عقبی حصے کی جانب بڑھے، میری تھرڈ آئی کے سامنے پھیلا ہوا منظر ایک جھماکے سے زیر و زبر ہو گیا۔ ایک تیز نسوانی چیخ نے سب کچھ درہم برہم کر دیا۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں نے خود کو ہوٹل ٹاپ کے ٹوئن شیئر روم نمبر فائیو ناٹ ایٹ میں اپنے بستر پر پایا، بے ساختہ میری نگاہ دوسرے بیڈ کی طرف اٹھ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے اس بیڈ پر صوفیہ گہری نیند سو رہی تھی مگر اب وہ بیڈ خالی نظر آ رہا تھا۔ میں نے نظر گھما کر کمرے میں جہاں تک ممکن تھا' دیکھا لیکن وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ میں صوفیہ کے حوالے سے گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

میں جس دل خراش نسوانی چیخ کے سبب تصوراتی ماحول سے حقیقی ماحول میں پلٹا تھا' اس کا مخرج کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا، وہ اذیت ناک چیخ صوفیہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی...... تو کیا صوفیہ کو کوئی حادثہ پیش آ گیا تھا؟

اس ہول ناک سوال نے مجھے آنِ واحد میں بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اٹھا اور اضطراری انداز میں بے ساختہ اسے پکارا "صوفیہ......!"

میری یہ پکار صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اسی لمحے میرا دھیان واش روم کے بند دروازے کی طرف چلا گیا۔ دروازے کو بند دیکھ کر مجھے اپنی بوکھلاہٹ پر غصہ آیا۔ میں افراتفری میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ واش روم میں بھی تو ہو سکتی ہے!

میں ایک لمحے کو مطمئن ہوا مگر اگلے ہی لمحے اس سوچ نے سارے اطمینان کو کافور کر دیا کہ اگر صوفیہ واش روم میں تھی تو پھر وہ جگر پاش نسوانی چیخ کیا معنی رکھتی تھی؟

"صوفیہ...... صوفیہ......!" میں دیوانہ وار اسے پکارتے ہوئے واش روم کے دروازے کی سمت بڑھا۔

میں واش روم کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا لیکن اندر سے کوئی جواب موصول ہوا اور نہ ہی کوئی ردِ عمل دیکھنے یا سننے کو ملا۔ اس صورتِ حال نے میری تشویش کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا۔ اگر صوفیہ واش روم کے اندر موجود تھی اور

زندگی زدگان کے لیے
ایک زمانہ گزیدہ خون رنگ سرگزشت
ان کے لئے جن کے سینے دھواں دیتے ہیں
آنسوؤں، آہوں، امنگوں اور حوصلوں کی داستان
عبرت اثر، حیرت انگیز و ناقابل فراموش
بابر زمان خان کی آپ بیتی، جگ بیتی
اُس جوانِ رعنا سے زندگی کا رویہ مختلف تھا
دل فگاروں کے لئے سب رنگ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
بازی گر
وہ تحریر جو دلوں کی دھڑکن ہے
قیمت فی حصہ -/60 روپے * ڈاک خرچ فی حصہ -/23 روپے
7
کتابیت حاصل کرنے کے لئے رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی روانہ فرمایئے
7
کتابیات پبلی کیشنز کراچی
پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون: 021-5804300
kitabiat1970@yahoo.com
سول ڈسٹری بیوٹر: رحمان بک ہاؤس اردو بازار کراچی، فون 021-7766751

یہ خیر و عافیت تھی تو پھر میری پکار اس کی سماعت تک کیوں نہیں پہنچ رہی تھی؟

جب میرا پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا تو میں نے واش روم کے دروازے کو دھڑ دھڑا کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہیجانی انداز میں میرا استفسار بھی جاری رہا۔

''صوفیہ! تم ٹھیک تو ہو؟ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟ میں سخت پریشان ہوں۔ بولو، تم واش روم کے اندر موجود تو ہونا؟''

میرے اس رویّے کے جواب میں بھی جب واش روم کے اندر خاموشی طاری رہی تو میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اگلے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوگیا، دروازے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، وہ اندر موجود ہے!

اس سنگین صورتِ حال نے میرے ذہن کو بڑی طرح الجھا کر رکھ دیا۔ اگر وہ واش روم میں تھی تو پھر میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہی تھی؟ میں نے ایک آخری کوشش کے طور پر اسے ایک مرتبہ پھر پکارا۔

''صوفیہ! میری بات غور سے سنو۔ اگر تم نے چند سیکنڈ میں۔ مجھے، واش روم کے اندر اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلایا تو میں اس دروازے کو توڑ کر اندر گھس آؤں گا۔''

میری اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ واش روم کے اندر کچھ ہلچل ہوئی پھر ایک آواز ابھرنے لگی۔ وہ آواز صوفیہ کی نہیں بلکہ شاور کی آواز تھی۔ میں نے ایک طویل سانس خارج کی اور قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خدا کا شکر ہے صوفیہ! تم خیریت سے تو ہو ورنہ میں تو تمہاری وجہ سے پریشان ہو......!''

میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہو پایا تھا کہ واش روم کے اندر سے پانی گرنے کی آواز آنا بند ہوگئی۔ شاید صوفیہ نے شاور بند کردیا تھا۔ میں نے دروازے کے قریب منہ لے جا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''صوفیہ! میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ اچھا ہوا، تم نے شاور کھول بند کر کے مجھے واش روم کے اندر اپنی موجودگی اور خیریت کا یقین دلا دیا تھا۔ تم جب باہر آؤ گی تو میں پوچھ لوں گا کہ تم ایسے بھیانک انداز میں چیخی کیوں تھیں!''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر واش روم کے اندر ایک نقرئی قہقہہ بلند ہوا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوٹل کے اس کمرے میں جل ترنگ بج اٹھے ہوں۔ میں اس شیریں آواز کی چہک اور کھنک کو لاکھوں، کروڑوں آوازوں کے درمیان شناخت کرسکتا تھا۔ اس آواز کا ایک ایک سُر اور اس سُر میں بھرے رس کا میں ذائقہ شناس تھا۔ ایسی کیف آور اور لذت آفریں آواز میں نے اپنی ساری زندگی میں کسی اور کی نہیں سنی تھی۔ وہ طلسماتی آواز مجھے اپنے سحر میں گرفتار کرنے لگی، میں اس مخمور آواز کی شبنمی گداز پرتوں میں خود کو لپٹتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنے حواس کو حتی الامکان قابو میں رکھتے ہوئے اسے آواز دی۔

''اے پربتوں کی شہزادی! تم اس واش روم میں کیا کررہی ہو؟''

میں نے محسوس کیا' جیسے میری آواز کسی اندھے کنوئیں میں سے ابھر رہی ہو۔ مجھے خود اپنی آواز ان جانی اور ناشناسا سی لگی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ مسحور کن نقرئی قہقہہ لگانے والی کوہسار کی ملکہ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگلے ہی لمحے واش روم کا دروازہ کھلا اور وہ میرے سامنے آگئی۔

میری نگاہ نیلگری کے سراپا پر جم کر رہ گئی۔ وہ...... باتھ گاؤن میں لپٹی ہوئی دکھائی دی لیکن وہ گاؤن اتنے مہین کپڑے سے بنا ہوا تھا کہ اس کے اندر نیلگری کے جھلملاتے بدن پر نگاہ ٹکانا مشکل نظر آتا تھا۔ اسے اپنے سامنے اس حالت میں کھڑے دیکھ کر میں مبہوت سا ہو کر رہ گیا...... اس کا ملکوتی حسن ایسے ہی رعب داب والا تھا۔ میں نے بہ دقت تمام اس کے کندن بدن سے نظر چرائی اور اس کے عقب میں، واش روم کے اندر متلاشی نگاہ دوڑانے لگا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے میری متلاشی نگاہ ناکام و نامراد واپس لوٹ آئی۔ میں نے بے ساختہ سوالیہ انداز میں نیلگری کے چہرے کی طرف دیکھا پھر بکھری ہوئی آواز میں پوچھا۔

''صوفیہ کہاں ہے؟''

جواب میں نیلگری کے یاقوتی لب وا ہوئے، ان ادھ کھلے گلابوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور وہ اپنے لچکتے مہکتے سراپا کے ساتھ میری جانب بڑھنے لگی۔ میں غیر ارادی طور پر پسپا ہونے لگا۔ پُراسرار قوتوں کی مالک وہ خود مختار حسینہ اپنے جوبن کے تمام تر ذخیرے کے ساتھ پتا نہیں، مجھے کون سی آزمائش سے دوچار کرنے آئی تھی؟

ان سنگین لمحات میں، مجھے اپنی سانس بغاوت پر آمادہ نظر آئی!

یہ بڑی دو رخی صورت حال تھی!

میں نے ان نازک لمحات میں خود کو ایک دوراہے پر کھڑے پایا۔ اس رنگین و سنگین دوشاخے کی ہر ڈالی حسن سے شروع ہو کر جوانی پر ختم ہو جاتی۔ ایک طرف نیلگری کا پُرکار' بے حجاب شباب حالات میں رنگینی بھر رہا تھا تو دوسری جانب صوفیہ کا پُراسرار' بے حساب غیاب معاملات کو سنگینی کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں صحیح معنوں میں ایک تشویش ناک آزمائش سے دوچار تھا اور اس سچویشن میں اگر میں نے اپنی سانس کو بغاوت پر آمادہ محسوس کیا تھا تو یہ قطعاً غلط نہیں تھا۔

نیلگری شاخِ گل کے مانند بڑے دل کش انداز میں لچکتے ہوئے میری جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے گداز شنگرفی ہونٹوں پر ایک دل آویز' معنی خیز مسکراہٹ سجی تھی۔ اس ملکوتی تبسم نے اس کے رسیلے لبوں میں بڑی کیف آور زندگی بھر دی تھی۔ نیلگری بے پناہ پُراسرار قوتوں کی مالک تھی...... اگر نہیں بھی ہوتی تو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ اس کا حسنِ جاوداں کسی طلسم کدے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنے سراپا کا جادو جگاتی تھی اور انگ انگ سحر پھونک کر سامنے والے کو پتھر میں بدل دیتی تھی۔

اس کی پیش قدمی کے جواب میں' میں پسپا ہو رہا تھا لیکن یہ کوئی اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔ ایک فوری فیصلے کے تحت میں نے پسپائی روک دی اور مضبوطی سے قدموں پر جم کر قدرے سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

''صوفیہ کہاں ہے؟''

اس کی پیش قدمی کو بھی بریک لگ گئے۔ وہ سوچتی ہوئی نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے تیور بڑے خطرناک تھے۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جسے میں سرِدست سمجھنے سے قاصر تھا اور یہی ''ناسمجھی'' میرے رونگٹے کھڑے کررہی تھی۔ اس کے گلاب لب وا ہوئے تو ہوٹل کا کمرا مسحور کن خوش بو سے مہک اٹھا۔ وہ گل رو کا غنچہ عطرداں کی مثال تھی۔

''میں نظر نہیں آ رہی ہوں جو تم صوفیہ کا پوچھ رہے ہو؟''

''تم اپنی جگہ ہو!'' میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے بتاؤ' تم نے صوفیہ کے ساتھ کیا کیا ہے۔ وہ مجھے کہیں دکھائی کیوں نہیں دے رہی۔ میں نے اس کی وحشت ناک چیخ سنی تھی؟''

جواب دینے کے بجائے وہ بڑے دل ربا انداز میں مسکرائی۔ وہ مسکرانے کی نیت کرتی تھی تو اس کے چہرے کا ایک ایک خط مسکرا اٹھتا تھا۔ بدن کے خطوط بھی اس پیروی میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ مسکرانے کے بعد لب کشا ہوگی لیکن اس نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ اتنی آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔

وہ اسی دل خوش کن انداز میں چلتے ہوئے چیئر کے پاس پہنچی' پھر اس چیئر پر بڑی شان سے براجمان ہوگئی۔ اس شان سے بے نیازی اور بے احتیاطی جھلکتی تھی۔ اس نے بڑے واشگاف انداز میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھالی تھی۔ مجبوراً مجھے اسی کی طرف گھومنا پڑا۔ میں سوالیہ نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ چند لمحات تک میری کیفیت کا جائزہ لیتی رہی پھر بڑی ملائمت سے بولی۔ ''وجدان! تم کھڑے ہو' یہ مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ اگر کھڑے کھڑے ہی بات کرنے کا موڈ ہے تو میں بھی کھڑی ہو جاتی ہوں' نہیں تو تم بھی بیٹھ جاؤ۔''

اس کی بات معقولیت سے بھرپور تھی لہٰذا میں اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان لمحات میں میری نگاہ نیلگری کے دشمنِ دین و ایمان سراپا پر ٹھہری ہوئی تھی لیکن ذہن میں صوفیہ کی تشویش نے خیمے ڈال رکھے تھے۔ میں نے واش روم کے اندر ایک کرب ناک چیخ سنی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا' وہ دل خراش چیخ صوفیہ کے حلق سے خارج ہوئی ہوگی مگر جب نیلگری واش روم سے برآمد ہوئی تو صوفیہ اندر کہیں مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے سو فیصد یقین تھا' صوفیہ کے ساتھ جو بھی واقعہ پیش آیا ہے' اس میں نیلگری کے سوا کسی اور کا ہاتھ نہیں ہوسکتا!

میں نے اس غارت گر ہوش کی آنکھوں میں جھانکا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ استفسار کیا۔ ''نیلگری! تم سے اس وقت تک کوئی بات نہیں ہوسکتی جب تک تم صوفیہ کے حوالے سے مجھے اطمینان نہیں دلا دیتیں۔''

''میں تمہیں اطمینان' تسکین اور آسودگی فراہم کرنے کے لیے ہی تو یہاں پہنچی ہوں۔'' اس نے مخصوص نشست میں ٹانگوں کی پوزیشن کو ادل بدل کرتے ہوئے کہا۔ ''وجدان! اس وقت میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں تم سے ایک بہت ہی ضروری میٹنگ کرنے آئی ہوں۔ تم صرف مجھے اٹینڈ کرو۔ صوفیہ کو تم فی الحال بھول جاؤ۔ اس پر بعد میں بھی بات ہوسکتی ہے۔''

''نہیں!'' مجھ پر بھی جیسے ضد سی سوار ہوگئی تھی' شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میں نے کہا۔ ''جب تک مجھے صوفیہ کی خیریت سے آگاہ نہیں کرو گی' دنیا کے کسی موضوع پر تم سے بات نہیں ہوسکتی۔''

''وجدان! میں تم سے ایک نہایت ہی اہم معاملہ ڈسکس کرنے آئی ہوں!''

''چاہے کچھ بھی ہو!'' میں ثابت قدمی سے اپنے مؤقف پر جما رہا۔

''اس معاملے کا تعلق تمہارے مستقبل سے ہے۔'' وہ گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری منزل...... ساحل سے ہے!'' اس نے ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''نیلگری! میں اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اب مجھے ساحل کو حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔''

خود مجھے اپنی آواز بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ ان لمحات میں میرا عزم بلندی اور پختگی میں ماؤنٹ ایورسٹ کو شرمارہا تھا۔ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''یہ بات میں بھی جانتی ہوں' تم اس بار اپنے مقصد میں ضرور کام یاب ہوگے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے چند اہم باتیں کرنے آئی ہوں۔ ہوسکتا ہے' یہ ہماری آخری ملاقات ہو!''

نیلگری نے آخری جملہ اتنی دل شکستگی سے ادا کیا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔ وہ کسی حوالے سے بہت ہی آزردہ اور متفکر تھی۔ پہلے وہ جب بھی پریشان ہوتی تو میں فوراً سے پیش تر اس کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہوجاتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں' ان لمحات میں میرے اندر کوئی پھریری نہیں چکرائی' دل میں کوئی آرزو نہیں جاگی اور تن بدن میں کوئی مہماتی بگولا نہیں اٹھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ ان دنوں میں نے ساحل کے حصول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا' میں پل پل اسی کے بارے میں سوچتا تھا اور میں نے اس مشن کو کچھ اس انداز میں خود پر طاری کر رکھا تھا کہ اور کسی کام کے لیے کوئی امنگ نہیں ابھرتی تھی...... ہاں یہی وجہ تھی۔ نیلگری مجھے کام یابی کی بشارت دے رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی آخری ملاقات کا خدشہ بھی ظاہر کر رہی تھی لیکن میں اس پر بھی چونکا اور نہ ہی مضطرب ہوا کیوں کہ مجھے اس سے بھی زیادہ پختہ یقین تھا کہ میری امنگوں' خواہشوں' امیدوں اور چاہتوں کا سفینہ ساحل سے لگنے ہی والا ہے۔ نیلگری آج مجھ سے پہلی مرتبہ ملنے آئی تھی یا آخری بار...... اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ساحل سے ملنے کے بعد مجھے اور کسی کی حاجت نہیں تھی!

''نیلگری!'' میں نے حریری لبادے میں سے جھلکتے اس کے جسمانی خطوط سے نگاہ چرا کر براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ''تمہیں ہر صورت پہلے میری بات کا جواب دینا ہوگا' ضروری اور غیر ضروری باتیں اس کے بعد...... بس!''

میرا اٹل انداز دیکھتے ہوئے وہ کسمسائی۔ ٹرانسپیرنٹ ٹاول میں لپٹا سمٹا اس کا ان مول سنگ مرمر بدن جز بز ہو کر رہ گیا۔ اس قیامت بدن کی ایک ایک جنبش سانس روک کر دیکھنے کا تقاضا کرتی تھی مگر میں نے بڑی ''محنت'' سے اپنے حواس پر قابو رکھا اور اس حشر خیز نظارے کو نظر انداز کر کے میں بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''وجدان! تم بہت ضدی ہو۔ تم نے اپنی اس ضد سے قدم قدم پر مجھے شکست دی ہے۔ تمہارا گریز ہر بار مجھے تمہاری طرف کھینچ لاتا ہے' حالاں کہ کراچی میں آخری ملاقات کے دوران میں' میں نے تمہیں ایک طرح کا چیلنج دیا تھا کہ اب میں کبھی تمہارے پاس نہیں آؤں گی بلکہ تمہیں اپنے پاس ہمالیہ کی گود میں آنے پر مجبور کردوں گی لیکن میں ہار گئی...... تمہاری ضدی سرشت کے آگے ہار گئی وجدان!'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''لیکن شاید تمہیں یہ بات معلوم نہ ہو کہ عورت کی جیت' ہار میں ہی چھپی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے' میں تمہاری ضد سے ہار کر اپنی محبت میں جیت گئی ہوں۔''

پتا نہیں' نیلگری مجھے محبت کا کون سا فلسفہ پڑھانے آئی تھی۔ میں نے ماضی میں بارہا محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس حصول کے لیے اس نے مختلف حربے آزمائے تھے بلکہ ایک موقع پر تو وہ ساحل کی دشمن بھی بن گئی تھی لیکن میں نے کبھی اسے حصول کی منزل تک نہیں پہنچنے دیا۔ ہمارے تعلق کا آغاز بڑے حیرت انگیز اور پُراسرار انداز میں ہوا تھا۔ میں نے گوتم بھوش کے عمل سے' اسے محفوظ کر کے اس پر اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ وہ عمر بھر میری کنیز بن کر رہنا چاہتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس چاہت کے انداز و اطوار اور زاویے بدلتے رہے اور بالآخر ایک روز وہ مجھ سے مایوس...... بلکہ خفا ہو کر غائب ہوگئی تھی' اس دعوے کے ساتھ کہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کردے گی۔ اس کی یہ دعویٰ نما پیش گوئی ایک حد تک پوری ہوئی تھی کہ میں جہاں نوردی کرتے ہوئے نیپال تک پہنچ گیا تھا لیکن نیلگری کا نشیمن تو اس سے بھی آگے' ہمالیہ کی گود میں تھا۔ ادھر کا رخ کرنے کے بجائے میری مسافرت کا زاویہ بدل گیا اور میں ملکوں ملکوں ہوتے ہوئے اب اسرائیل کے شہر تل ابیب میں تھا اور......

نیلگری میرے پاس آ کر ماضی کے قصوں کو کھول بیٹھی تھی لیکن میرے پاس اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے کوئی وقت تھا اور نہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی تھی لیکن ایک لمحے میں یہ ساری باتیں سوچنے کے بعد میں نے صاف صاف الفاظ میں اس سے کہہ دیا۔

''نیلگری! میرا خیال ہے' تم اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو۔ گزرے ہوئے لمحات کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہاری ہار اور جیت کی کہانی میں صرف ایک ہی شرط پر سن سکتا ہوں اور میری شرط وہی......!''

''ٹھیک ہے' میں تمہاری شرط پوری کیے دیتی ہوں۔'' قطع کلامی کرتے ہوئے وہ شکست خوردہ انداز میں بولی پھر ہوش ربا حرکات سے پہلو بدل کر کہنے لگی۔ ''وجدان! میں تمہیں یقین دلاتی ہوں' تمہاری ساتھی صوفیہ بالکل خیریت سے ہے اور اگر ہمارے درمیان کوئی معاملہ طے نہ ہوسکا تو میں اسے تمہارے حوالے کردوں گی۔''

''اس کا مطلب ہے' صوفیہ اس وقت تمہارے قبضے میں ہے؟''

اس نے اپنی لانبی پلکیں جھپکا کر اثبات میں جواب دیا۔

میں نے ایک اطمینان بھری گہری سانس لی اور یقین کرلیا کہ صوفیہ اس کی پُراسرار تحویل ہی میں ہوگی۔ میں نے نیلگری کی شکتیوں کے درجنوں چمتکار دیکھ رکھے تھے۔ وہ ایسا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے صوفیہ کی طرف سے سکون محسوس کرتے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''اب بتاؤ نیلگری! تم مجھ سے کون سی اہم میٹنگ کرنے آئی ہو؟''

''تم پہلے ہی کچھ کم کٹھور نہیں تھے۔'' وہ ٹٹولنے والی نظر سے میرے جسم کا ایکسرے کرتے ہوئے بولی۔ ''تبت کے لاماؤں نے تمہیں اور بھی پتھر کا بنا دیا ہے۔ میں موم ہوں...... اور اس موم کو تم جیسے پتھر ہی کی ضرورت ہے۔ میں......''

''تم موضوع سے ہٹ رہی ہو نیلگری!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر تنبیہی لہجے میں کہا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''نہیں وجدان! میں تو اصل موضوع ہی کی طرف آ رہی ہوں۔ آج تمہیں انصاف کرنا ہوگا!''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیسا انصاف؟''

''محبت کے حصول کا انصاف!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''میں اب بھی نہیں سمجھ سکا نیلگری!''

وہ یکدم گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا' حسن و شباب کا شاداب ذخیرہ میرے سامنے کرسی پر ڈھیر ہو لیکن اس متاعِ بے بہا کی روح کہیں اور چلی گئی ہو۔ نیلگری کا شفاف بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ لرزاہٹ شدید قسم کی جذباتی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ اس کے مرمریں وجود میں کوئی طوفانی جنگ جاری تھی۔ یہ عین ممکن تھا' اسے اپنے جسم کی اضطراری تھرتھراہٹ کا احساس بھی نہ ہو۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے خود کو جس آزمائش میں مبتلا پایا تھا' ایسی ہی کسی کیفیت سے وہ بھی دوچار تھی۔

''وجدان!'' وہ توبہ شکن انداز میں ٹانگوں کی پوزیشن تبدیل کرتے ہوئے خواب ناک لہجے میں بولی۔ ''جب تک ساحل کا حصول ممکن نظر نہیں آ رہا تھا' میرے سوچنے کا ڈھب کچھ اور تھا۔ میں مطمئن تھی کہ تم میری پیش گوئی کے مطابق' میرے ٹھکانے تک ضرور آؤ گے۔ تم پاکستان سے کس طرح امریکا پہنچے' امریکا سے زدنارا آئی لینڈ اور وہاں سے واپس امریکا آئے' یہ سب میرے علم میں ہے۔ امریکا کی ریاستوں الاسکا' واشنگٹن' نیویارک اور نیوجرسی میں تم نے ربی موشے بائمن اور اس کی ٹیم کے خلاف جو بھی کارنامے انجام دیئے' وہ مجھ سے چھپے ہوئے نہیں پھر جب تم نیوجرسی سے نیپال پہنچے تو میں نے سمجھ لیا' میری پیش گوئی پوری ہونے والی ہے۔ میرا مسکن نیپال سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اسی اطمینان نے مجھے خوش کردیا اور ٹھمنڈو کے رتنا پارک میں' ساحل کے حوالے سے میں نے تمہاری راہ نمائی بھی کی تھی لیکن......''

یہاں تک پہنچ کر نیلگری نے بڑے دل شکستہ انداز میں بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس مرتبہ میں نے اسے ٹوکا اور نہ ہی روکا بلکہ خاموش سوالیہ نظر سے اس کی خواب ناک طلسماتی آنکھوں میں یک ٹک دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوچا' اچھا ہے' وہ اپنے من کو ہلکا کرلے۔ اس طرح اس کا غبار بھی نکل جاتا اور ممکن ہے' مجھے بھی کام کی کوئی بات پتا چل جاتی۔ ویسے بھی نیلگری نے صوفیہ کی خیریت کا یقین دلا کر میری بے کلی دور کردی تھی۔ نشاط افروز لمحاتی توقف کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''لیکن...... میں سُپر شکتی کے سامنے بے بس ہوگئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں بے پناہ پُراسرار شکتیوں کی مالک ہوں اور ہمالیہ کا علاقہ میری عمل داری میں آتا ہے مگر مجھ پر اور میرے ہی جیسی دوسری شکتیوں پر ایک اور بھی شکتی حکمراں ہے' جس

ہے۔ آگے کسی کی پیش نہیں چلتی۔ اس سپر شکتی کی پلاننگ کو سمجھنا کسی عام یا خاص شخص کے اختیار میں نہیں۔ سپر شکتی نے اپنا ایک مربوط اور بے داغ سسٹم رائج کر رکھا ہے۔ وہ خود کسی کے تجربے میں نہیں آتی مگر باقی سب کو اپنے تجربات سے گزارتی رہتی ہے۔ میری اور مجھ جیسی دوسری شکتیوں کی ایک حد ہے لیکن سپر شکتی کے اختیارات لامحدود ہیں۔ وہ کسی وقت کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کوئی اس کے سامنے دم مار سکتا ہے اور نہ ہی سوال کر سکتا ہے۔ میں اسی سپر شکتی کے سامنے بے بس ہو گئی ہوں وجدان!''

وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکی اور بڑی پیوستہ نظر سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کے کندن بدن پر لپٹا ہوا تولیا کسی ہڈ حرام محافظ کا کردار ادا کر رہا تھا۔ ایسا بے پروا محافظ جسے اپنی روزی حلال کرنے کا بھی احساس نہ ہو۔ جو مخالفین سے گٹھ جوڑ کر کے اپنے آقا کا ستیاناس کرے۔ وہ ٹرانسپیرنٹ مہین تولیا بھی آوارہ نگاہ کو روکنے کے بجائے اس کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ یہ تو شکر ہے' اس وقت کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا...... اور میں نے اپنے حواس و نفس کو پوری طرح قابو میں کر رکھا تھا۔

نیلگری نے اپنے بیان شیریں کلام میں کئی مرتبہ لفظ ''سپر شکتی'' کا استعمال کیا تھا۔ اگر محتاط انداز میں اس لفظ کے مفہوم کو مناسب معنی دیے جاتے تو نیلگری کا اشارہ سیدھا سیدھا قادر مطلق کی طرف تھا۔ وہ اپنے اظہار اور انداز میں ہی سہی' خدا کی مطلقیت اور کاملیت کا اعتراف کر رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اس کائنات کے تمام موجودات اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے ڈھنگ سے اسی خالقِ حقیقی کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ دیکھنے والی آنکھ کو وہ کسی بھی رنگ میں نظر آ سکتا ہے۔

''وجدان!'' وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے دوبارہ گویا ہوئی۔ ''تم کھٹمنڈو سے میری طرف آنے کے بجائے تبت کی جانب چلے گئے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ حالات میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ بالکل ویسا نہیں ہے جیسا میں سمجھ رہی تھی۔ سپر شکتی نے کسی خاص مقصد کے تحت تمہیں جوکھانگ ٹیمپل میں پہنچایا تھا اور وہ بھی...... چیف لاما چنگ فورن پوشی کے ہاتھوں میں!

''بلاشبہ' چنگ فورن پوشی روحانیت اور ماورائیت کا بہت بڑا عالم ہے۔ اس نے جوکھانگ ٹیمپل میں قیام کے دوران میں' غیر محسوس انداز میں تم پر بڑا کام کیا ہے۔ اسی کی محنت اور کوشش کے طفیل تم یہاں تک پہنچے ہو۔ میں محسوس کر رہی ہوں' اس وقت بھی تم چیف لاما کے سائے اور نگرانی میں ہو۔ وہ تم پر گہری ''نظر'' رکھے ہوئے ہے لیکن وہ بھی کب تک رہے گا......''

نیلگری نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے رن پوشی کے حوالے سے جس انداز میں بات کی تھی' اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے مستقبل قریب میں کچھ ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال پوچھتا' وہ کہنے لگی۔

''تمہارے تبت میں قیام کے دوران ہی میں مجھے معلوم ہو گیا کہ اپنی منزل کی تلاش میں اب تمہیں زیادہ بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ رن پوشی کی ہدایت پر عمل کر کے تم اپنے مقصد کو حاصل کر لو گے۔ چیف لاما' جوکھانگ ٹیمپل کی آبرو ہے۔ اس جیسا نادر الوجود شخص شاید ایک دہائی تک جوکھانگ ٹیمپل جیسی عظیم المرتبت تربیت گاہ کو میسر نہیں آ سکے گا۔ ویسے بھی مادہ پرستی کے اس دور میں بدھ ازم کی ترقی اور ترویج کی راہ میں بڑی بڑی رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں۔ اس کے مستقبل کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال......''

وہ لمحے بھر کو رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں بتا رہی تھی جب سے مجھے یہ یقین ہوا کہ تم اپنی محبت کو پانے والے ہو' میں نے بھی اپنی محبت کے حصول کی پالیسی تبدیل کر دی ہے۔ اب مزید انتظار کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔ میں یہ نقصان کبھی نہیں اٹھاؤں گی لہٰذا اصول کی بات یہ ہے کہ اگر تمہیں تمہاری محبت مل رہی ہے تو میں اپنے اس حق سے کیوں محروم رہوں۔ تم نے جتنی شدت سے ساحل کو چاہا' ہو سکتا ہے' میں نے اپنے مطلوب کو اس سے بھی زیادہ چاہا ہو۔ میرے ساتھ ناانصافی اور زیادتی کیوں ہو؟ بس' تمہیں یہی انصاف کرنا ہے...... محبت کے حصول کا انصاف!''

اس کی بات بڑی وضاحت سے میری سمجھ میں آ گئی لیکن پھر بھی تسلی کی خاطر میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''نیلگری! تم کس سے محبت کرتی ہو؟''

اس نے الفت بھری مگر شاکی نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''وجدان! کیا یہ بھی مجھے ہی بتانا ہوگا؟''

''ظاہر ہے' محبت تم نے کی ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس سوال کا جواب بھی تمہی کو دینا ہوگا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''تم غلط نہیں کہہ رہے لیکن تمہارا یہ فرمایا ہوا ''صحیح'' بڑا ہی سفاک اور بے مروت ہے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

''میں ''اس'' کے سوا اور کسی کو بھی چاہتی تو فوراً حاصل کر سکتی تھی' میرے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ شخص خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص تصور کرتا لیکن میرا محبوب بڑا ہی کٹھور اور مرضی کا مالک ہے' اس پر میرا بس نہیں چلتا۔ وہ کبھی بھی میرے قابو میں نہیں رہا...... اسی لیے تو میں آج ایک ایگریمنٹ کرنے آئی ہوں۔''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''نیلگری! محبوب ہوا کے مانند ہوتا ہے۔ ہوا کو کبھی کوئی مٹھی میں بند کر سکا ہے؟ نہیں' کبھی نہیں!'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر کہا۔ ''محبوب کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس پر اختیار رہتا ہے اور نہ ہی وہ قابو میں آتا ہے اور...... جو قابو میں ہو' جس تک رسائی اور جس پر دسترس حاصل ہو وہ محبوب نہیں ہو سکتا!'' میں نے اتنا کہہ کر اس کی مدھ بھری آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ''تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا...... اس جواب کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دو' تم مجھ سے کس نوعیت کا ایگریمنٹ کرنے کیوں آئی ہو۔ تمہارے کسی محبوب سے میرا کیا تعلق؟''

''میں ایگریمنٹ کرنے اس لیے تمہارے پاس آئی ہوں کہ تم ہی وہ مذکورہ شخص ہو۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اب تو مل گئے نا تمہیں دونوں سوالوں کے جوابات؟''

میں ایک طویل سانس خارج کر کے رہ گیا۔ اس نے بڑے کھلے انداز میں میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔ اس حوالے سے کسی جرح بحث کی گنجائش اور ضرورت باقی نہیں رہی تھی لہٰذا میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو نیلگری؟''

''وہی جو تم ساحل سے چاہتے ہو!'' وہ اٹل لہجے میں بولی۔

''پاگل پن کی باتیں نہ کرو!'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''یہ اچھا انصاف ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''ایک کام تم کرو تو وہ جائز اور مناسب ہے لیکن اگر وہی کام میں کروں تو تمہاری نظر میں یہ میرا پاگل پن ہوگا۔ اگر کوئی ساحل' وجدان کو حاصل ہو سکتی ہے تو پھر وجدان کسی نیلگری کو حاصل کیوں نہیں ہو سکتا۔ میں تم دونوں کے سنگم میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال رہی ہوں' تم بھی ہمارے ملاپ کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر دوٹوک الفاظ میں اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''وجدان! میں ہر قیمت پر تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔ یہ حصول عارضی یا محدود بھی ہو سکتا ہے اور مستقل یا لامحدود بھی۔ اسی حصول کے سلسلے میں' میں تم سے ایک معاہدہ کرنے آئی ہوں۔ میں تمہارے سامنے دو راہیں رکھ رہی ہوں۔ کسی ایک راہ کا انتخاب کرنے کے لیے تم آزاد ہو۔ اگر تم ایک راہ کا انتخاب کرو گے تو دوسری راہ خود بخود بند ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر تم پہلی راہ کو مسترد کر دو گے تو دوسری راہ پر چلنے کے لیے میں تمہیں مجبور کر دوں گی اور تم جانتے ہو' میں ایسا کر سکتی ہوں۔ ایک بات ذہن میں رکھنا کہ تمہارے سامنے کوئی تیسرا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔''

نیلگری نے کسی ایگریمنٹ کا تذکرہ اتنے سنسنی خیز اور دلچسپ انداز میں کیا کہ میرے اندر ایک تجسس سا جاگ اٹھا۔ نیلگری' ملکۂ کوہسار ایک پُراسرار ہستی تھی۔ اس کا ایگریمنٹ بھی یقیناً اسی کی طرح اسرار و رموز کے حریری پردوں میں لپٹا ہوگا۔ میں نے اس کی بات سننے کا فیصلہ کر لیا اور گہری نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے' بتاؤ کہ تم کون سا منصوبہ لے کر میرے پاس آئی ہو؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر نہایت ہی پُرتاثر انداز میں گویا ہوئی۔ ''وجدان! آج چھ مئی ہے۔ مجھے یقین ہے' تم آٹھ مئی کی صبح تک تل ابیب میں ہو۔ اس کے بعد یروشلم روانہ ہو جاؤ گے...... اپنی ساحل کے ساتھ!'' وہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اپنے منصوبے کی تفصیل کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں یہ چاہتی ہوں' جب تک تم تل ابیب میں ہو' میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ رہوں اور...... ہر لمحہ تمہیں حاصل کرتی رہوں لیکن یہ اصولاً اور عملاً ممکن اور مناسب نظر نہیں آتا کیونکہ اسی عرصے کے دوران میں تمہیں ساحل کو حاصل کرنے کے لیے جان توڑ کوشش کرنا ہے۔ میں تمہاری مجبوری کو سمجھتی ہوں لہٰذا میں نے اپنی خواہش کو تھوڑا محدود کر دیا ہے یعنی اگر تم اس بات کے لیے تیار ہو جاؤ کہ آنے والی دو راتیں تم مکمل طور پر میرے ڈسپوزل پر ہو گے تو میں مصالحت کے لیے تیار ہوں لیکن ان راتوں کا ایک ایک لمحہ تمہیں خود سپردگی کی کیفیت میں گزارنا ہوگا۔ میں تمہیں اس قدر حاصل کرنا چاہتی ہوں کہ دل سے تمہاری تمنا رخصت ہو جائے۔ وجدان! تم میری محبت کی شدت کا تصور نہیں کر سکتے۔''

جذبات کی شدت اور احساسات کی حدت کے باعث

اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور سانسوں کے تلاطم سے ظاہر ہوتا تھا' وہ صدیوں کا سفر بھاگ کر طے کرنے کے بعد میری قربت میں پہنچی ہے۔ اس کے خطرناک عزائم کو سمجھنے کے لیے کسی خاص عقل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اگر زبان کو زحمت نہ بھی دیتی تو اس کا انگ انگ اسی تقاضے کا امین اور پیامبر تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں منزل پر پہنچ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سے گزر رہا ہوں۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا' میں نیلگری کے کسی دام میں قدم نہ رکھوں۔ وہ میرے ارادوں کو آزمانے اور میری نیت کو جانچنے کے لیے اتنی حسین' دلکش اور خود فراموش پیشکش لے کر آئی ہے اور خود کو اس نے اس دلفریب پیشکش کا چیختا چنگھاڑتا ہوا اشتہار بنا رکھا ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی ڈانواں ڈول نہیں ہونا چاہیے۔ اس تنبیہی سوچ کے متوازی ایک اور سوچ کی لہریں بھی بہہ رہی تھیں' کوئی چپکے چپکے میرے ذہن کی سماعت میں یہ الفاظ ٹپکا رہا تھا...... ''وجدان! تم ناپید حسن کے خزانے اور لازوال جوبن کے دفینے سے منہ موڑ کر خود کو دنیا کا احمق ترین ناشکرا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔''

میرا ذہن انہی متضاد سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ نیلگری نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ وہ اس دوران میں کافی حد تک اپنے جذبات پر قابو پا چکی تھی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کا ایک ایک لفظ فیصلہ کن اور اٹل تھا جیسے یہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔

''وجدان! اگر تم یہ دو راتیں میرے نام کر دو' حصول کی راہ میں کسی رکاوٹ کو نہ آنے دو اور کسی ہچکچاہٹ یا گریز سے کام نہ لو تو میں سمجھوں گی میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو گئی۔ میں وعدہ کرتی ہوں اس خواہش کی تکمیل کے بعد میں ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔''

''نہیں...... قطعی نہیں!'' میں یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

وہ بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں جانتی ہوں وجدان! یہ تم نہیں بول رہے ہو بلکہ تمہارے اندر کوئی اور بول رہا ہے۔'' اس کا انداز خوابناک ہو گیا۔ ''وہ جو تم سے ہزاروں میل دور دنیا کی چھت پر بیٹھا ہے اور تمہارا ہونے والا سسر بھی ہے۔ وہی نہیں چاہتا کہ اس کی فرزندی میں آنے والا...... خیر چھوڑو۔ میں تم سے کچھ اور کہہ رہی تھی۔''

اتنا کہہ کر وہ متوقف ہوئی تو مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہ آئی کہ اس کا سیدھا سیدھا اشارہ چیف لاما چنگ فورن پوشی کی جانب تھا۔ عین ممکن تھا وہ صد فیصد درست کہہ رہی ہو۔ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''وجدان! میں نے جن دو راہوں کا تم سے تھوڑی دیر پہلے ذکر کیا ہے' ان میں سے ایک یعنی پہلی راہ کھول کر میں نے تمہارے قدموں میں بچھا دی تھی لیکن تم نے بڑی قطعیت سے میری پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔ میں نے کہا تھا نا' اگر تم پہلی راہ کو مسترد کر دو گے تو میں تمہیں دوسری راہ پر چلنے کے لیے مجبور کر دوں گی۔ میں تو پیار محبت سے یہ مسئلہ حل کرنے آئی تھی لیکن تمہیں زور زبردستی ہی اچھی لگتی ہے تو ٹھیک ہے۔ اب کسی موقع پر مجھے کوئی الزام نہ دینا وجدان!''

اس کے چیلنج کرنے والے انداز نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ پتا نہیں وہ کیسی خطرناک دھمکی دے رہی تھی۔ کرسی سے تو وہ اٹھ کر کھڑی ہی ہو چکی تھی۔ جب اس نے قدم اٹھایا تو ایک تجسس میرے اندر انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ میری اضطراری نگاہ اس کے مخملیں سراپا پر سے پھسل کر نشیلی آنکھوں تک جا پہنچی۔ میں نے گمبھیر آواز میں استفسار کیا۔

''نیلگری! تم اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر جا رہی ہو۔ دوسری راہ کے بارے میں تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔''

''انصاف طلب منصف! تمہارے تقاضے پر مجھے شدید حیرت ہو رہی ہے۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''جہاں تک دوسری راہ کا تعلق ہے تو یہ میں نے کافی عرصہ پہلے تمہیں بتا دی تھی' جب تم نئے نئے ساحل کے قریب آئے تھے۔ تمہاری یادداشت اتنی کمزور کب سے ہو گئی وجدان؟''

اس نے ایک لمحے کا توقف کر کے بڑی شوخ نگاہ سے مجھے دیکھا اور اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے اپنی مرضی سے پہلی راہ کو بند کر کے میری خواہش کی تکمیل کے لیے دوسری راہ کا دروازہ کھول دیا ہے۔ میں تمہارے حصول سے دستبردار نہیں ہو سکتی وجدان!'' اس کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی۔ ''آج کے بعد جو بھی عورت تمہاری تنہائی میں پہنچ کر حصول اور وصول کی حدود کو چھوئے گی' اس کے اندر تم مجھے پاؤ گے...... مجھے' نیلگری کو!''

میں ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ اس نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی کہ دماغ گھوم کر رہ جائے...... اور واقعی اس وقت میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ وہ میری اتھل پتھل کیفیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک شانِ بے نیازی سے میرے پاس سے گزری اور سبک خرامی سے واش روم کی سمت قدم اٹھانے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا' شنیل کا کوئی تھان متناسب جنبشوں کے ساتھ پھسلتے' لچکتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہو۔ وہ متوازن اور دلکش چال کا عمدہ نمونہ پیش کر رہی تھی۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''نیلگری! تم اس خوش فہمی میں نہ رہنا کہ میں تمہاری کسی چال کو کامیاب ہونے دوں گا۔ تم ہمیشہ مجھے آج ہی کی طرح ثابت قدم پاؤ گی۔''

''تمہاری آج کی ثابت قدمی میں تو کسی اور کا ہاتھ ہے۔'' وہ میری جانب رخ پھیرے بغیر بولی۔ ''آئندہ کے لیے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان اپنے مقامات بدلتا رہتا ہے اور یہی ''وقت'' فیصلہ کرے گا کہ مستقبل میں کون کس کو تسخیر کرتا ہے۔ گڈ بائے!''

اس نے الوداع کہتے ہوئے بھی میری جانب دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے انداز میں ایک اعتماد اور یقین جھلکتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا اس نے جو کہا ہے وہ کر گزرے گی۔ اس کا یہ دعویٰ انتہائی تشویش ناک' فکر انگیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے مہین تولیے میں لپٹا سمٹا ہوا وہ ریشمی سراپا اسی ہوش ربا انداز میں واش روم میں داخل ہو گیا جیسے کچھ دیر پہلے وہاں سے نمودار ہوا تھا۔

ایسا شہابی طلوع و غروب میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

☆......☆

پانی گرنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے بے ساختہ واش روم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ پانی گرنے کی آواز واش روم کے اندر سے ابھر رہی تھی۔ نیلگری نے واش روم میں داخل ہوتے ہی ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جھانک کر واش روم کے اندر دیکھا تھا۔ واش روم صوفیہ کے وجود سے خالی نظر آیا تھا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا' اس پانی کے گرنے کا تعلق نیلگری سے ہے۔

لیکن مجھے یقین تھا ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ نیلگری اسرار کے ایک مجموعے کا نام تھا۔ وہ چلتی پھرتی حسن کی جادوگری تھی' جوبن کا طلسم کدہ تھا۔ مجھے یقین تھا' اس مرتبہ جب واش روم کا دروازہ کھلے گا تو وہاں سے صوفیہ نمودار ہو گی...... اور پھر ایسا ہی ہوا۔

پانی گرنے کی آواز اچانک رک گئی۔ چند لمحات تک واش روم میں خاموشی چھائی رہی۔ یوں لگا جیسے اندر موجود شخص لباس پہن رہا ہو۔ پھر اس خاموشی کا دورانیہ ختم ہو گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے اپنے یقین کو عملی صورت اختیار کرتے دیکھا۔ صوفیہ نے واش روم کا دروازہ کھولا اور بڑے نارمل انداز میں باہر نکل آئی۔

میں یک ٹک اس کی شکل دیکھتا چلا گیا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو وجدان؟'' صوفیہ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''کک...... کچھ نہیں!'' میں نے جلدی سے کہا۔

''کچھ تو ہے۔'' وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی۔ ''پندرہ بیس منٹ پہلے جب میں شاور لینے کے لیے واش روم میں گئی تو تم بے خبر سو رہے تھے اور اب......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے متوحش لہجے میں بولی۔ ''...... یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے تم آئن اسٹائن سے بھی بڑا کوئی کارنامہ انجام دینے کے لیے فکر مند ہو۔ کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟''

''ہاں صوفیہ!'' فرار کا راستہ نظر آتے ہی میں نے دوڑ لگا دی۔ ''تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ واقعی میں ایک دہشت ناک خواب ہی سے بیدار ہوا ہوں۔''

وہ میرے چہرے کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ''جاؤ' شاور لے کر اپنے ذہن کو فریش کر لو۔ مجھے یقین ہے رات کو سوتے وقت تم سلوان اور بیگن سے متعلق کوئی خطرناک پلاننگ کرتے رہے ہو۔ تمہارا یہ دہشت ناک خواب اسی پلاننگ کا عکس ہو سکتا ہے۔''

میں کسی بحث میں پڑنے کے بجائے واش روم میں گھس گیا۔

صوفیہ باہر رہ گئی لیکن اس کی ایک بات میرے ذہن سے چپک کر واش روم کے اندر چلی آئی۔ اس نے کہا تھا' پندرہ بیس منٹ پہلے وہ مجھے سوتا ہوا چھوڑ کر شاور کی غرض سے واش روم میں داخل ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق نیلگری نے کم از کم آدھا گھنٹا ہوٹل کے اس کمرے میں سنسنی خیز گفتگو میں مصروف رہ کر گزارا تھا۔ جب صوفیہ نے پندرہ بیس منٹ کا ذکر کیا تو میں نے بے ساختہ دیوار گیر کلاک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ کلاک آٹھ بیس کا وقت بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے صوفیہ نے ٹھیک آٹھ بجے بستر چھوڑ دیا ہو گا۔ آٹھ بجے ہی ربی موشے ہاتمن اپنے سیکرٹری ہرشل حنان کے ساتھ یونیورسٹی سے نکلا تھا۔ میں اس وقت چونکہ آنکھیں بند کیے ربی کے ماحول میں موجود تھا لہٰذا صوفیہ نے مجھے بے خبر سوتا ہوا تصور کر لیا پھر جب ربی اینڈ کمپنی ڈیڈ سی

(بحرِ مردار) کے قریب پہنچے تو لگ بھگ آٹھ بیس کا وقت تھا اور اسی وقت صوفیہ کی دل خراش چیخ نے مجھے تھرڈ آئی کا شٹر گرانے پر مجبور کیا تھا۔ میں نے دونوں ظاہرہ آنکھیں کھول کر کمرے میں اسے بڑی تشویش سے تلاش کیا تھا اور ایک آدھ منٹ کے بعد صوفیہ کے بجائے نیلگری بڑے طمطراق کے ساتھ واش روم سے برآمد ہوئی تھی۔ اگر وہ ٹھیک آٹھ بیس پر بھی میری نگاہ میں آئی تھی تو پھر وہ آدھا گھنٹا کہاں چلا گیا جس میں اس نے مجھ سے ہوشربا آزمائشی میٹنگ کی تھی کیونکہ اس کے جانے کے بعد جب صوفیہ شاور لے کر نکلی تو دیوار گیر کلاک آٹھ بیس کا وقت بتا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا نیلگری نے کائنات کے کونے میں سے آدھا گھنٹا وقت چرا کر مجھ سے ''ملاقات'' کی تھی۔

اس خیال نے میرے اندر ایک سنسناہٹ سی دوڑا دی اور میں شاور لینے کے دوران میں مسلسل اسی کے بارے میں سوچنے لگا...... اور پھر سوچتا ہی چلا گیا۔

نیلگری کا یہ ایک بہت ہی مختلف اور انوکھا انداز سامنے آیا تھا۔ میں اس پر جتنا بھی حیران ہوتا' کم تھا بلکہ میرا خیال ہے میں حیران سے زیادہ پریشان تھا۔ اس نے ایک عجیب و غریب دھمکی نما چیلنج کر کے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے میں اسی نیلگری سے ملا ہوں جو کرسٹل کے ٹوٹے ہوئے مجسمے کی صورت میں پہلی مرتبہ مجھے رتنا پارک کھٹمنڈو میں ''دکھائی'' دی تھی۔ وہ تو ایک دوسری ہی نوعیت کی نیلگری تھی۔ سہمی' سمٹی ہوئی بے بس اور لاچار۔ میں نے اسکاچ ٹیپ کی مدد سے اس کرسٹل کے مجسمے کو بڑی محنت کے بعد جوڑ دیا تھا۔ اس کام کے لیے نیلگری میری احسان مند تھی۔ جب ہم میں تھوڑی بے تکلفی پیدا ہو گئی تو اس نے مجھے اپنے مصائب اور مجبوریوں سے آگاہ کر دیا۔ گوتم بھوش نامی ایک یوگی مخصوص جاپ کر کے اس کو اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا اور نیلگری اسی بات سے خوفزدہ تھی کیونکہ گوتم بھوش منفی سوچ رکھنے والا ایک بدعنوان یوگی تھا۔ نیلگری اپنی آزادی سے محروم ہو کر گوتم بھوش کے ہاتھوں کھلونا بننے کو قطعاً تیار نہیں تھی۔ وہ بدباطن اور خبیث یوگی نیلگری کی پُراسرار شکتیوں پر قابض ہو کر پتا نہیں کون کون سے فتنے کھڑے کرتا اسی لیے نیلگری نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں گوتم بھوش کو اس خطرناک جاپ کی تکمیل سے روک دوں اور میں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہ مشکل کام بھی کر ڈالا تھا۔ گوتم بھوش کے عبرت ناک انجام کے بعد نیلگری کے لیے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ میرے اسی کارنامے سے متاثر ہو کر اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر میں اس کا بتایا ہوا ایک مخصوص جاپ مکمل کر لوں تو وہ میرے قبضے میں آ جائے گی۔ اس کی آرزو تھی کنیز بن کر ساری عمر میرے قدموں میں گزار دے۔

ایک مسلمان ہونے کے ناتے میں جاپ جیسی کسی خرافات میں نہیں پڑ سکتا تھا اور نہ ہی مجھے کنیزیں یا غلامان پالنے کا کوئی شوق تھا۔ نیلگری حسن و خوب صورتی کا مرقع تھی' اس پر اس کی پُراسرار شکتیاں سونے پر سہاگا کا اثر رکھتی تھیں۔ میں اس سے اچھے اور جاں نثار دوستوں والے مراسم تو رکھ سکتا تھا لیکن اس کی خواہش کو پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اپنی ضد پر ڈٹی رہی۔ اس طرح ہمارے درمیان فاصلہ کم ہونے کے بجائے بڑھتا چلا گیا۔ یہ ٹھیک ہے ساحل اور میری تنہائی میں آنے والی دیگر عورتوں کے حوالے سے وہ مجھے پہلے بھی اس قسم کی دھمکی دے چکی تھی جیسے خطرناک عزائم کا اظہار اس نے آج کیا تھا۔ اس وقت میں نے نیلگری کے اس دعوے کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب صورتِ حال خاصی سنگین نظر آ رہی تھی۔ یہ بات وہ پہلے بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے جتا چکی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھے صرف اور صرف اپنی پراپرٹی بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ وہ کسی دوسری عورت کو میری قربت سے فیض یاب ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔

پھر جب وہ اس پیش گوئی کے بعد اچانک غائب ہو گئی کہ مجھے اپنے پاس آنے پر مجبور کر دے گی تو میں یہی سمجھا کہ وہ مجھ سے مایوس ہو گئی ہے چنانچہ آئندہ میری طرف کا رخ نہیں کرے گی۔ ازاں بعد میں سنسنی خیز حالات کی چکر پھیریوں میں اس طرح الجھا کہ نیلگری کے بارے میں سوچنے کا موقع نہ مل سکا۔ جب نیویارک میں اس نے خفیہ انٹری دینا شروع کی تو میں چونکا۔ اس کے بعد سے وہ گاہے بہ گاہے اسی خفیہ اور پُراسرار انداز میں میرے ماحول میں آتی جاتی رہی اور اب...... وہ بہ نفسِ نفیس ایک رنگین اور سنگین معاہدہ کرنے میرے پاس چلی آئی تھی۔

آج کی ملاقات میں اس نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ مجھے چاہتی ہے' میرے حصول کی تمنا میں وہ کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے بڑا خطرناک راستہ نکالا تھا۔ یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا' وہ اپنی آرزو میں کامیابی حاصل کر پاتی ہے یا نہیں۔ بہرحال میں نے اس کی ایک ایک ادا اور انداز میں بغاوت کو جھلکتے دیکھا تھا۔ میرے حصول کی شدت نے اس کی

سوچ کو منفی راہ پر ڈال دیا تھا۔ اس کے خیالات کو معقول اور صحت مند قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کرنے جا رہی تھی' اپنی دانست میں اسے اپنا حق سمجھتی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ کسی دوسرے کا حق چھیننے کی منصوبہ سازی میں مصروف تھی۔

ان نامراد اور ناآسودہ لمحات میں شاید وہ اس فلسفے کی حامی بن گئی تھی کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔

نیلگری کی مثبت اور منفی سوچوں کے ساتھ الجھتے ہوئے میں نے ایک بھرپور شاور لیا اور ٹھیک نو بجے واش روم سے باہر نکل آیا۔ اس شاور نے ذہن کے غبار کو بڑی حد تک دھو کر میری سوچ کو فریش اور بدن کو تر و تازہ کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم تیار ہو کر کمرے سے نکل آئے۔ اس ''تیاری'' میں میرے چہرے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ میں اس وقت مصری باشندے یوسف الظاہری کی آئی ڈی استعمال کر رہا تھا لہٰذا چہرے کی کنٹی نیوٹی کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ میں خود بھی میک اپ کے حوالے سے وسیع معلومات رکھتا تھا اور صوفیہ بھی اس سلسلے میں ایک مشاق معاون کا کردار ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔

نیچے آنے کے لیے ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو صوفیہ نے پوچھا۔ ''ناشتا اسی ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں کیا جائے یا باہر جانے کا ارادہ ہے؟'' ایک لمحے کے توقف سے وہ اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو ٹھیک ٹھاک بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''باہر چلنا زیادہ مناسب ہے۔ ذرا آؤٹنگ بھی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔ ''لیکن کسی قریبی ریسٹورنٹ کا رخ کرو۔ مجھے بھوک......''

''زائن گیٹ ریسٹورنٹ کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''نیک خیال ہے۔ زائن گیٹ کی کوالٹی اور ذائقے کو ہم پہلے بھی چیک کر چکے ہیں اور یہ ریسٹورنٹ ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور بھی نہیں۔''

اتفاقِ رائے کے بعد ہم نے زائن گیٹ ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ زائن گیٹ (ZION GATE) ہینور اسٹریٹ پر واقع تھا۔ گزشتہ رات ہم نے اسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کیا تھا۔ وہاں کے کھانوں کو ہم نے خوش ذائقہ اور صاف ستھرا پایا تھا۔

ایک ''صحت مند'' اور صحت بخش ناشتا سرد کیا گیا تو صوفیہ نے چھری کانٹے کا استعمال کرتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''چپ چپ کیوں ہو؟''

''آں...... نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہوں......!'' وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''اگر ایسی بات نہیں ہے یعنی تم چپ چپ نہیں ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم حلق کے بل چلا رہے ہو۔ اپنے شور سے تم نے یہ ریسٹورنٹ سر پر اٹھا رکھا ہے' ہوں؟''

''نہیں...... اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر کیسی بات ہے؟'' وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

میں سمجھ گیا' وہ سنجیدہ شرارت کے موڈ میں ہے۔ اگر میں نے اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تو وہ بات میں سے بات نکال کر یونہی میرا ناطقہ بند کیے رکھے گی۔ ویسے اس کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ میں قدرے خاموش اور چپ چپ تو تھا اور میری یہ کیفیت نیلگری سے ہونے والی ہوشربا اور توبہ شکن ''ملاقات'' کے سبب تھی۔ میں لاشعوری طور پر شاید اسی کے اور اس کی دھمکی کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن ظاہر ہے' صوفیہ کو میں نیلگری کا قصہ تو نہیں سنا سکتا تھا لہٰذا اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ دیا۔

''ہو سکتا ہے تم نے ایسا محسوس کیا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید نیند پوری نہ ہونے کے سبب میں کچھ ڈل سا ہو گیا ہوں۔ بہرحال ناشتے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔'' وہ ہاتھ روک کر براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکنے لگی' تاہم آواز اتنی دھیمی تھی جو ہمارے سوا کسی اور کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کرتی۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

''تم کبھی لاجواب بھی ہوئے ہو؟'' اس نے استفسار کیا۔

''ہاں' کیوں نہیں۔ حسن اور ہنر کے سامنے لاجواب ہونے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

وہ بولی۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو میں حسین ہوں اور نہ ہی ہنر مند؟''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''تم بلاشبہ ایک حسین و جمیل اور ہنر مند لڑکی ہو۔''

''اگر تم یہ بات تسلیم کرتے ہو تو پھر میں یہی کہوں گی کہ تم

حسن اور ہنر کے سامنے بھی لاجواب نہیں ہوتے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "بلکہ اپنی لاجوابی کو تم اپنی توہین سمجھتے ہو۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں الجھ کر رہ گیا۔ "کیا تم نے مجھے لاجواب کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"تو اور کیا کر رہی ہوں؟" وہ شپٹائے ہوئے انداز میں بولی۔

میں نے بدستور الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "میں اب بھی نہیں سمجھا' تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے میرے دل کا حال جاننے کی کوشش کرتی رہی پھر دوبارہ چھری کانٹے کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے دھیمے لہجے میں بتانے لگی۔

"میں جب نہا دھو کر واش روم سے نکلی تھی تو تمہیں شدید الجھن میں کھڑے دیکھا تھا۔ میں نے جب اس الجھن کا سبب دریافت کیا تو تم نے بتایا کہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھے ہو۔ ابھی ناشتا کرتے ہوئے مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں نے ایک منصوبے کے تحت تم سے پوچھ لیا...... چپ چپ کیوں ہو؟" وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے رکی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا' تم کہو گے کہ یہ اسی ڈراؤنے خواب کا اثر ہے لیکن تم نے میرے منصوبے کی ایسی تیسی کر کے رکھ دی۔ اگر تم میرے حسب توقع جواب دیتے تو میں اس ڈراؤنے خواب کی تفصیل پوچھتی۔ اس طرح مجھے تمہیں لاجواب کرنے کا موقع مل جاتا۔"

"صوفیہ! تم قسطوں میں بات کر کے خواہ مخواہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟" میں نے بےزاری سے کہا۔ "اس تفصیل سے میرے لاجواب ہونے کا کیا تعلق ہے؟"

وہ بڑے رسان سے بولی۔ "مجھے یہ امید تھی کہ ڈراؤنے خواب کے ذیل میں تم کہتے ایک خوفناک صورت والے خبیث چھپکلے کو دیکھ کر تم پر ایسی وحشت طاری ہوئی کہ تم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ اسی لمحے میں تمہیں یاد دلاتی کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا آئندہ کبھی تمہاری زبان پر کسی چھپکلے کا نام آئے گا' نہ کروکوڈائل کا اور نہ ہی ایلی گیٹر کا۔ بتاؤ میری اس بات سے تم لاجواب ہوتے کہ نہیں؟"

سخت احمق ہے وہ شخص جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ عورت کو سمجھ گیا ہے۔ صدیوں سے عورت ایک پہیلی ہے اور پتا نہیں کب تک یہ پہیلی ہی رہے گی۔ اس کو بوجھنے میں توانائی صرف کرنے کے بجائے اس کی قدر کرنا چاہیے کیونکہ اگر یہ سمجھ میں آ سکتی تو پھر پہیلی کیوں ہوتی۔ یہ پہیلی ہے تو پھر سمجھ میں کیونکر آ سکتی ہے؟

میں یک ٹک صوفیہ کے چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ اس کے حسن اور خوب صورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ رعنائی اور دلربائی بھی کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ وہ خود اپنا انٹرو تھی۔ میں جانتا تھا' وہ ایک دلکش اور دلچسپ پہیلی ہے جسے سمجھنا ممکن نہیں لہٰذا میں نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی حالانکہ اس نے مجھے لاجواب کرنے کے لیے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کوڑیاں جمع کی تھیں اور اس مقصد کے لیے اتنا پیچیدہ طریقۂ کار اختیار کیا تھا کہ میں جواب میں کم از کم سوا لٹے سیدھے استفسارات پر مشتمل ایک طویل سوال نامہ اس کی خدمت میں پیش کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا' صرف اتنا کہا۔

"صوفیہ! تم تو اتنی اسمارٹ اور ڈیشنگ ہو کہ اگر مجھے ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتیں تو میں اسی لمحے لاجواب ہو جاتا۔ ایسے معمولی سے کام کے لیے تم نے خواہ مخواہ اتنی زیادہ ذہنی مشقت کی؟"

وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم اتنے سیدھے نظر تو نہیں آتے؟"

اس کے استفسار میں ایک خاص نوعیت کی سنسناہٹ جھلکتی تھی' لہجہ بھی خاصا تمتمایا ہوا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

"ضرور آزماؤں گی۔" وہ بدستور میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

صوفیہ کے اس جملے نے میرے رگ و پے میں ایک اضطراب سا بھر دیا۔ اس نے کچھ ایسے انداز میں یہ جملہ ادا کیا تھا جیسے مجھے کوئی بہت بڑا چیلنج کر رہی ہو۔ میں صوفیہ کی بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ سوچ کے کسی کھلے دریچے سے نیلگری وارد ہو گئی۔ اس کے تصور کے ساتھ ہی میں نے اپنے وجود میں ایک سرد لہر کو گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ سب سے پہلا خیال ذہن میں یہی ابھرا کہ کہیں نیلگری اس وقت صوفیہ کے اندر تو موجود نہیں؟

یہ خیال ایک خطرناک اور سنسنی خیز سوال تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے تشویش میں مبتلا ہوا۔ اس تشویش میں گہرا تفکر بھی شامل تھا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے احساسات پر قابو پا لیا۔ اگر نیلگری صوفیہ کے اندر موجود بھی تھی تو مجھے کسی خدشے یا اندیشے میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میرے اور صوفیہ کے درمیان ایک میز حائل تھی' اس کے علاوہ زائن گیٹ ریسٹورنٹ میں اس وقت ہمارے علاوہ بھی آٹھ دس افراد موجود تھے۔ نیلگری نے اپنی واردات کے لیے تنہائی اور قربت کا جو معیار قائم کر دیا تھا وہ یہاں کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا لہٰذا نیلگری کا خطرہ اس وقت مجھ پر "لاگو" نہیں ہوتا تھا۔

اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہا تھا...... آج کے بعد جو بھی عورت تمہاری تنہائی میں پہنچ کر حصول اور وصول کی حدود کو چھوئے گی' اس کے اندر تم مجھے پاؤ گے...... مجھے نیلگری کو!

اسی سوچ کے ساتھ میں گہری نگاہ سے صوفیہ کو گھورتا چلا گیا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا' نیلگری کے حوالے سے میرا شک بے بنیاد تھا۔ وہ یہاں آس پاس کہیں موجود نہیں تھی۔ اس احساس سے مجھے خاصی تقویت محسوس ہوئی اور یہ بھی پتا چلا کہ نیلگری کی خوفناک دھمکی کے نتیجے میں میرے اعصاب پر اچھا خاصا دباؤ ہے ورنہ صوفیہ کی معنی خیزی کے نتیجے میں میرا دھیان فوراً نیلگری کی طرف نہ جاتا۔ اس اعصابی دباؤ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یوگا کی مشقیں بہت ضروری تھیں خصوصاً سانس کی مشق اور وہ بھی پرانایم...... (PRANYAM) پچھلے کچھ دنوں سے چیف لاما کی ہدایت کے مطابق سانس روکنے کی پریکٹس کر رہا تھا لیکن اسرائیل میں داخل ہونے کے بعد میری ظاہری اور باطنی تینوں آنکھیں اس قدر مصروف رہی تھیں کہ میں خاطر خواہ سانس کی مشق نہیں کر پایا تھا۔

"تم مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟" صوفیہ کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔

سچ بولنا یعنی نیلگری کا ذکر کرنا سوال و جواب کا ایک کشادہ در کھولنے کے مترادف ہوتا لہٰذا میں نے اسے گھما دیا۔ "میں گھور نہیں رہا صوفیہ بلکہ "غور" کر رہا ہوں۔ اس بات پر غور کر رہا ہوں کہ اگر تم اسی رفتار سے ناشتا کرتی رہیں تو پھر ریسٹورنٹ کا بل ادا کرنے کے لیے مجھے ورلڈ بینک سے قرضہ لینا پڑے گا۔ لگتا ہے تم ریسٹورنٹ کا کچن صاف کیے بغیر یہاں سے نہیں اٹھو گی۔"

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر صوفیہ کو اچھو ہو گیا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگی۔ میں نے پانی کا گلاس پیش کر دیا۔ چند لمحات کے بعد اس کی کھانسی ختم ہو گئی۔ وہ بولنے کے قابل ہوئی تو بولی۔

"لگا دی نا نظر!"

"اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے صوفیہ!"

"وجدان!" وہ میٹھی ناراضی سے بولی۔ "تمہاری زبان بڑی کالی ہے۔"

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "میری نظر خراب اور زبان کالی ہے۔ نظر لگی تو تمہیں اچھو ہو گیا۔ اگر غلطی سے زبان لگ گئی تو کیا ہو گا؟"

اس نے مجھے ایسی پُرمعنی نگاہ سے دیکھا جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہی ہو ان تلوں میں تیل کہاں؟ اگلے ہی لمحے کندھے اچکا کر اس نے باڈی لینگویج سے یہ جواب دیا...... آئی ڈونٹ کیئر۔ اِٹ ڈزنٹ میٹر!

تھوڑی دیر بعد ہم ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔ وہ دن میں نے گھوم پھر کر تل ابیب دیکھنے کے لیے مختص کر دیا۔ ساحل کو ربی موشے ہائمن کی کسٹڈی سے نکالنے کا منصوبہ میرے ذہن میں یک گونہ پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ تیاری کرنا تھی۔ میں نے صوفیہ کو سلوان اور بیگن کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ بہائی گارڈن اپارٹمنٹس میں واقع اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی مجھے چند گھنٹوں کے لیے اپنے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ میں ساحل کو آزاد کروانے کے بعد سیدھا اس اپارٹمنٹ پر لے آتا۔ یہ رات آٹھ بجے سے لے کر صبح تین بجے کے درمیان کوئی سے بھی چند گھنٹے ہو سکتے تھے کیونکہ اس دوران میں وہ اپارٹمنٹ بالکل خالی رہتا تھا۔ مذکورہ اپارٹمنٹ پر ساحل کو میک اپ کی جدید ہنرمندی سے صوفیہ بنا دیا جاتا۔ پھر ہمارے راستے جدا ہوتے۔ صوفیہ اپنے بڑے ہیر اللہ تھامس کی ہدایت پر عمل کرتی اور میں ساحل کے ساتھ یروشلم کا رخ کرتا...... جو اس وقت صوفیہ کے روپ میں ہوتی۔

گزشتہ رات ہم نے بہائی گارڈن اپارٹمنٹ کا ایک دورہ کیا تھا اور وہاں کے بارے میں ہمیں اچھی خاصی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اپنی انہی معلومات کو بڑھانے کی خاطر ہم ایک مرتبہ پھر شالوم اسٹریٹ پر واقع مذکورہ اپارٹمنٹ بلڈنگ میں پہنچے۔ اس مرتبہ ہم ایک ساتھ نہیں تھے بلکہ ہم نے اپنی آمد میں پانچ منٹ کا وقفہ کر رکھا تھا تاکہ دن والی ریسپشنسٹ ردلین کو یہ پتا نہ چل سکے کہ ہم کسی خاص مشن پر کام کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اس طرف آتے ہوئے میں نے صوفیہ کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں۔

بہائی گارڈن اپارٹمنٹس بلڈنگ ایک جناتی رہائشی منصوبہ تھا۔ دس منزلہ یہ عظیم الشان عمارت خاصے لمبے چوڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی جس میں پورے نوے

اپارٹمنٹس تھے۔ ہر منزل پر نو اپارٹمنٹس واقع تھے جن میں چھوٹے بڑے ہر کیٹگری کے اپارٹمنٹس شامل تھے۔ اس طرح دس منزلوں میں کل نوے اپارٹمنٹس تھے۔ منزل کی شناخت انگریزی حروف تہجی سے کی گئی تھی۔ یعنی پہلی منزل کے لیے اے (A) استعمال ہوتا تھا اور دسویں منزل کے لیے جے (J) اس ترتیب کے تحت سلوان اور بیگن کا اپارٹمنٹ ستائیس۔ سی دراصل تیسری منزل کا آخری اپارٹمنٹ تھا۔ اٹھائیس نمبر سے چوتھی منزل یعنی ڈی (D) شروع ہو جاتی تھی۔ عمارت میں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے آنے جانے کے لیے تیز رفتار چار لفٹس چوبیس گھنٹے خدمت کے لیے تیار رہتی تھیں۔ تل ابیب کو جدید مغربی طرز پر آباد کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے لہٰذا جہاں جو بھی خودکار نظام نصب کیا گیا تھا 'وہ انتہائی تسلی بخش حالت میں کام کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ چاروں لفٹس بھی کبھی کسی رہائشی کو خراب نہیں ملتی تھیں یا اگر وہ کبھی کسی ''موسمی بیماری'' میں مبتلا ہو بھی جاتیں تو ''ڈاکٹر'' فوراً انہیں ''اٹینڈ'' کر کے ''بھلا چنگا'' کر دیتا تھا۔

میں نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اس بلڈنگ کا انتخاب ایک خاص وجہ سے کیا تھا۔ وہ اتنی آباد اور بھری پری رہائشی عمارت تھی کہ بھول کر بھی کسی کا دھیان اس طرف نہیں جا سکتا تھا کہ کوئی اس عمارت کا ایک اپارٹمنٹ اتنے حساس اور خطرناک کام کے لیے بھی استعمال کر سکتا۔ ایسے کاموں کے لیے عموماً الگ تھلگ اور ویران ٹھکانے تلاش کیے جاتے ہیں۔ زیادہ بھیڑ بھاڑ اور آبادی والے علاقوں سے دور رہنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان مضبوط بنیادوں پر وہ عمارت میرے مشن کی کامیابی کے لیے انتہائی موزوں اور محفوظ تھی خاص طور پر اس حوالے سے بھی کہ رات آٹھ سے صبح تین بجے تک اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی خالی اور لاک رہتا تھا چنانچہ اس پیریڈ کے دوران میں کسی کی مداخلت کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی ناگہانی اُفتاد نہ ٹوٹ پڑتی تو راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

میں بڑے اعتماد سے چلتے ہوئے ریسیپشن پر پہنچ گیا۔ احتیاطاً میں نے اپنی آنکھوں پر سن گلاسز لگا لیے تھے۔ اس چشمے کے سیاہ شیشوں کے عقب میں میری آنکھیں پوشیدہ ہو گئی تھیں۔ میں نے ریسپشنسٹ کی طرف ایک بے باک دعوتی مسکراہٹ اچھالی اور اس کے پیچھے دیوار پر آویزاں بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہیلو روسلین! ڈی۔ تھرٹی فور۔''

میں نے بڑی ہوشیاری سے یہ چال چلی تھی۔ اس جملے کا مطلب تھا میں چوتھی منزل کے اپارٹمنٹ نمبر چونتیس میں جانا چاہتا ہوں۔ دیوار پر آویزاں بورڈ پر ڈی۔ تھرٹی فور کے آگے لکھے کسی مرنڈا ڈیوڈ کا نام بھی میں نے پڑھ لیا تھا۔

روسلین بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔ نام کی طرح اس کی شخصیت اور سراپا بھی بڑا ''روسلینا'' یعنی رسیلا تھا۔ اس نے تعاون آمیز لہجے میں کہا۔ ''ناٹ ڈی۔ تھرٹی فور...... بٹ تھرٹی فور ڈی۔ اوکے؟''

اس نے بڑے شیریں انداز میں میری تصحیح کی تو میں نے جلدی سے کہا۔ ''تھینک یو! آئی مین اٹ۔ میں مرنڈا ڈیوڈ سے ملنے آیا ہوں۔''

اس نے میرا نام دریافت کیا۔ میں نے مائیکل بتایا۔ اس نے انٹرکام کا استعمال کیا اور مجھے اوپر جانے کی اجازت دے دی۔ اس اجازت میں اتفاق اور میرے اعتماد کا برابر کا ہاتھ تھا۔

میں نے روسلین کو اس کے نام سے بھی پکارا تھا جس سے اجنبیت کافور ہو گئی تھی۔ ویسے بھی جنسِ مخالف سے اگر نرمی اور شائستگی سے بات کی جائے تو آدھا کام ویسے ہی ہو جاتا ہے۔

صوفیہ مجھ سے پانچ منٹ پہلے بلڈنگ میں داخل ہوئی تھی۔ اسے بھی اسی طریقۂ کار پر عمل کر کے اوپر جانا تھا۔ وہ جب ریسیپشن اور لابی میں مجھے کہیں نظر نہ آئی تو میں نے سمجھ لیا' میری طرح وہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ میں بہ آہستگی لفٹس کی جانب بڑھ گیا۔

ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ ہم فرداً فرداً تیسری منزل پر پہنچیں گے پھر ایک ساتھ ہو جائیں گے۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں ''سی۔ منزل'' پر تھا۔ جب میں ایک لفٹ سے برآمد ہوا تو دوسری طرف لفٹ کے سامنے صوفیہ کو ایسے کھڑے پایا جیسے وہ لفٹ کا انتظار کر رہی ہو۔ ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو ہم دھیرے سے مسکرائے پھر ایک طرف چل دیے۔ صوفیہ نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنا نام روز مین بتایا تھا اور وہ اس عمارت کے رہائشی ہالون میلکم سے ملنے آئی تھی۔ ہالون میلکم سکسٹی۔ جی میں رہتا تھا۔

اس وقت بہائی گارڈن اپارٹمنٹس کا دورہ کرنے کے میرے دو مقاصد تھے۔ نمبر ایک' میں اس عمارت کو اپنی ظاہری آنکھوں سے اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا' خصوصاً تیسری منزل یعنی ''سی'' کو۔ ستائیس۔ سی کو میں نے باطنی آنکھ کی مدد سے اچھی طرح اندر سے دیکھ اور ذہن نشین کر لیا تھا۔ باہر سے اس کے محل وقوع کو جانچنا باقی تھا۔ نمبر دو' ریسیپشن والی دیوار پر

آویزاں بورڈ پر لکھے ناموں سے ہمیں مزید دو ناموں کا انتخاب کرنا تھا تاکہ آئندہ انہیں کام میں لایا جا سکے۔

ہم نے آئندہ پندرہ بیس منٹ میں یہ دونوں کام بخیر و خوبی انجام دے لیے۔ میں نے ''ایٹ فور جے'' میں رہنے والی سینڈرا روزبنے کو اپنے ذہن میں سرکل کیا اور صوفیہ نے ''فورٹی نائن۔ ایف'' کے رہائشی سیموئل ڈکنز کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا پھر ہم دس منٹ کا توقف رکھ کر بہائی گارڈن اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر نکل آئے۔ رخصت کے وقت میں خوبرو روسلین کو پُرجوش ''بائے' بائے'' کرنا نہیں بھولا تھا۔

بہائی گارڈن اپارٹمنٹ سے وہ بنگلا زیادہ دور نہیں تھا جہاں میری ساحل کو ایک آرام دہ اور پُرآسائش قفس میں رکھا گیا تھا۔ میں صوفیہ کے ساتھ پیدل ہی اس سمت چل پڑا۔ راستے میں' میں نے صوفیہ کو ساحل اور ربی موشے ہائمن کے بارے میں کچھ اور مفید اور ضروری معلومات بھی فراہم کیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ آج رات میں اسے فائنل منصوبے سے آگاہ کروں گا۔

ہم ٹہلنے والے انداز میں شالوم اسٹریٹ سے نکل کر ہرمن اسٹریٹ پر آئے' پھر آگے بڑھتے ہوئے شیرون اسٹریٹ میں داخل ہو گئے۔ اس اسٹریٹ نے بالآخر ہمیں اس پوش رہائشی علاقے میں پہنچا دیا جہاں وہ بنگلا واقع تھا جس پر مجھے دھاوا بولنا تھا۔ اس وقت دوپہر ہونے کو چلی تھی۔ دنیا کے دیگر پوش علاقوں کے مانند وہاں بھی خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہاں کے مکین ماحول سے بے خبر صرف اور صرف اپنے مکانوں سے واسطہ رکھتے تھے۔

ہم لگ بھگ آدھے گھنٹے تک اس علاقے کی مختلف گلیوں میں بڑے نارمل انداز میں سرگشت کرتے رہے۔ میں نے ساحل والے بنگلے کو چاروں جانب سے گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ اس بنگلے کا اندرونی ماحول میری تیسری آنکھ کو ازبر تھا۔ باہر کا محل وقوع اور گرد و پیش کی اونچ نیچ کو ظاہرہ دونوں آنکھوں نے اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا۔ پوری تسلی کے بعد ہم اس علاقے سے نکل آئے۔ اس بنگلے میں داخل ہونے کی باقی پلاننگ مجھے تھرڈ آئی کے توسط سے کرنا تھی۔

ٹھیک دو بجے دوپہر ہم ''رماط رافیل اسٹریٹ'' سے گزر رہے تھے۔ وہ دن تل ابیب کی سیر و تفریح کے لیے مخصوص تھا اس لیے مقصد سے اور بلا مقصد ہم اِدھر سے اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔ رماط رافیل اسٹریٹ میں ہمیں ایک ریسٹورنٹ پسند آ گیا۔ ہم نے ٹیکسی' بس کے علاوہ اچھا خاصا پیدل سفر بھی کیا تھا۔ ناشتا کیے اب لگ بھگ چار گھنٹے گزر گئے تھے لہٰذا ہم دونوں بھوک محسوس کر رہے تھے۔ ہم شیبا ہیبرون (SHEBA HEBRON) نامی اس ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔

''شیبا ہیبرون'' کوئی ''زائن گیٹ'' کے پائے کا ریسٹورنٹ تو نہیں تھا مگر پھر بھی اس کے کھانوں کا معیار کافی اچھا تھا۔ ہمیں وہاں کوالٹی اور ذائقہ دونوں ہی مل گئے۔ ہم نے وہاں کم و بیش ایک گھنٹا گزارا۔ اس دوران میں ہم نے لنچ کے ساتھ ہی اچھا خاصا ریسٹ بھی کر لیا۔ تین بجے کے قریب ہم شیبا ہیبرون سے نکلے اور دوبارہ تل ابیب کی سیر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شام کے وقت ہم ''رماط ریشون'' کی طرف نکل گئے۔ رماط ریشون کا علاقہ زیادہ تر شاپنگ ایریا پر مشتمل ہے۔ یہیں پر ایک بہت بڑی سپر مارکیٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سپر مارکیٹ کا نام ہیروڈ (HEROD) تھا۔ ''ہیروڈ'' کو آپ کراچی کی ایمپریس مارکیٹ یا پھر لاہور کی ٹولنٹن مارکیٹ تصور کر لیں۔ ایک ہی جگہ پر روزمرہ ضروریات کی تمام اشیا دستیاب تھیں۔ میں نے ہیروڈ سے اپنے مطلب کی اچھی خاصی خریداری کر ڈالی جس میں ٹارچ' نائیلون کی مضبوط رسی' کاکروچ اسپرے' چند بجلی کے کم وزنی آلات' ایک خوبصورت خنجر جس کا پھل دو دھاری اور چھ انچ لمبا تھا۔ دستے کی لمبائی کم و بیش چار انچ تھی۔ یہ خنجر اپنے خوشنما کور کے ساتھ تھا۔ ایک شولڈر بیگ جسے بوقتِ ضرورت ہینڈ بیگ بھی بنایا جا سکتا تھا اور اسی نوعیت کی مزید چند چھوٹی موٹی اشیا۔ ان تمام چیزوں کو بیگ میں بھرنے کے بعد ہم ایک کیمسٹ کے پاس پہنچ گئے۔

''شاؤل کیفر'' نامی یہ اسٹور خاصا بڑا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا' وہاں دنیا کی ہر دوا اور کیمیکل دستیاب ہوگا۔ میں نے ایک سیلز مین سے کہا۔

''مجھے چوہے مار دوا چاہیے لیکن وہ ایسی زود اثر ہو کہ چند سیکنڈ میں چوہے کا کام تمام کر دے۔ میں ان خبیثوں سے سخت پریشان ہوں۔''

میں نے سن رکھا تھا مصر میں کنگ سائز چوہے پائے جاتے ہیں اور ان کا سائز کم و بیش بلی کے بچے کے برابر ہوتا ہے اور بعض تو نوجوان بلی کے برابر بھی جسامت رکھتے ہیں۔ ان جسیم چوہوں کے خوف سے مائیں اپنے نوزائیدہ اور شیرخوار بچوں کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑتیں ورنہ بچے کے ''اغوا'' کا کم از کم شدید زخمی ہونے کا خطرہ ہر وقت موجود

رہتا ہے۔ اسرائیل اور اُردن بھی چونکہ مصر ہی جیسی ارضی اور جغرافیائی کیفیات کے حامل تھے اس لیے مجھے امید تھی تل ابیب کے اس کیمسٹ کے پاس ان دیو قامت چوہوں کا کوئی شافی علاج ضرور موجود ہوگا۔

شاؤل کیفر کے سیلز مین نے بڑی توجہ سے میری بات سنی اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ابھی دو دن پہلے ہی ایک زبردست ''ماؤس کلر'' مارکیٹ میں آئی ہے۔ آپ اس کو ضرور ٹرائی کریں۔ یہ ایک بے بو اور بے ذائقہ سفید سفوف ہے۔ چوہے ٹماٹر اور ہری مرچ کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ آپ کے گھر میں جن مقامات پر چوہوں کی زیادہ آمد و رفت ہو' وہاں ان کی مرغوب غذا کو سفوف لگا کر رکھ دیں۔ بے بو اور بے ذائقہ ہونے کے سبب چوہے بڑی آسانی سے دام میں آجائیں گے۔ اس طرح آپ انہیں کامیابی سے شکار کرلیں گے۔ اس دوا کی ایک حیرت انگیز خاصیت بھی بتا دوں۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''عام دواؤں کو کھانے کے بعد چوہے گھر بھر میں دوڑتے پھرتے ہیں اور جہاں قضا لکھی ہو وہاں پاگلوں اور دیوانوں کی طرح گر کر ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ کسی بھاری سامان کے پیچھے موت کو گلے لگالیں تو ان کو وہاں سے نکالنا ایک مصیبت ہے۔ اس سے بھی بڑی مصیبت یہ کہ ان کی ڈیڈ باڈی سے بڑی ناگوار بدبو اٹھ کر پورے گھر میں پھیلنے لگتی ہے جبکہ ''زونا'' ماؤس کلر ایک منفرد انداز میں کام کرتا ہے۔ اس میں زنک اور نائٹروجن کے ساتھ ایک مخصوص پائزن کو شامل کیا گیا ہے۔ جیسے ہی یہ سفوف چوہے کے پیٹ میں جاتا ہے' وہ وہیں پر چند سیکنڈ کے اندر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ڈیڈ باڈی میں ایک خاص انداز کی ڈی کمپوزیشن شروع ہو جاتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مردہ چوہے کا جسم راکھ کے ڈھیر میں بدل جاتا ہے۔ نہ کوئی ناگوار بدبو اور نہ ہی ڈیڈ باڈی کی تلاش کا جھنجٹ۔ ہے نا مزے کی بات؟''

کیمسٹ کے سیلز مین نے بات ختم کر کے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا تو بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''واقعی' زونا ماؤس کلر ایک حیرت انگیز اور قابلِ تعریف سفوف ہے۔''

''پھر کتنی ڈبیا آپ کو دے دوں؟'' سیلز مین نے پوچھا۔

میں نے احتیاطاً استفسار کیا۔ ''ایک ڈبیا کی کیا قیمت ہے؟''

مجھے خدشہ تھا وہ شخص معلومات کی فراہمی کو بھی بل میں کہیں شامل نہ کر دے لیکن خیریت گزری اور یہ ثابت ہوگیا' تمام یہودی ایک ہی درجے کے چالباز اور مکار نہیں ہوتے۔ وہ بھی ہاتھ کی انگلیوں کے مانند ہی ہوتے ہیں۔ سیلز مین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''ایک ڈبیا تین نیوشیکل کی ہے اور یہ کم از کم دس تندرست چوہوں کی موت کا بندوبست کرسکتی ہے۔''

میں نے چھ نیوشیکل ادا کر کے زونا (ZONA) ماؤس کلر کی دو ڈبیا خرید لیں۔ یہ دوا مجموعی طور پر بیس چوہوں کی ہلاکت کے لیے کافی تھی۔ میرا چوہوں کے شکار کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے وہ مہلک اور زود اثر دوا کسی اور ہی مقصد کے لیے حاصل کی تھی۔ شاؤل کیفر کیمسٹ اینڈ ڈرگسٹ سے نکل کر ہم کوشر سینٹر کی طرف بڑھ گئے۔

کوشر سینٹر ہیرو ڈ سپر مارکیٹ کے اندر ہی واقع ہے۔ آپ اسے حلال جانوروں کے گوشت کا مرکز سمجھ لیں۔ ''کوشر سینٹر'' میں چڑیا سے لے کر اونٹ تک ہر حلال پرندے اور جانور کا گوشت دستیاب ہوتا ہے۔ میں نے ایک کلوگرام بیف پارسل کروالیا۔ یہ بیف بغیر ہڈی کے دو بڑے پارچہ جات پر مشتمل تھا جن میں سے ہر پارچہ کم و بیش آدھے کلوگرام وزن کا تھا۔ قصاب نے دونوں پارچوں کو بڑی مہارت سے صاف کر کے دو الگ الگ سیلوفین بیگ میں پیک کر دیا پھر یہ ٹرانسپیرنٹ پیکٹس ایک براؤن کاغذی ہینڈ کیری میں رکھ کر مجھے تھما دیے۔ ہم ''ہیرو ڈ'' سے باہر نکلے تو رات کے نو بج رہے تھے۔

اب واپسی کا مسئلہ درپیش تھا۔ ہوٹل ٹاپ میں قدم رکھنے سے پہلے ہمیں ڈنر سے بھی نمٹنا تھا کیونکہ پھر باہر نکلنے کا موڈ نہ ہوتا۔ ہوٹل ٹاپ کے ڈائننگ ہال اور ریسٹورنٹ میں اعلیٰ قسم کا کھانا دستیاب تھا لیکن ہم دانستہ باہر کھانے کو فوقیت دے رہے تھے تاکہ خود کو کھلنڈرے اور بے پروا قسم کے ٹورسٹ ثابت کرسکیں جو کسی ہوٹل کو محض ایک سرائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ڈنر کے لیے ہم نے ''دی ٹیسٹ'' کا انتخاب کیا۔ یہ ریسٹورنٹ بیت نہام کے علاقے میں واقع ہے۔ دی ٹیسٹ اسمِ بامسمیٰ ثابت ہوا۔ ہم نے وہاں شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئے۔

ٹھیک گیارہ بجے رات ہم ''بیت نہام'' کے علاقے سے واپس بن یہودہ اسٹریٹ پہنچ گئے جہاں ہوٹل ٹاپ استادہ تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرا نمبر ''فائیو زیرو ایٹ۔ ٹوئن شیئر'' میں ہمارا عارضی قیام تھا۔

آج دن بھر ہم اردد میں سفر میں رہے تھے اور اچھا خاصا انگلش والا سفر بھی کیا تھا۔ مٹرگشت اور روڈ ماسٹری نے ہمیں تھکا دیا تھا۔ میں نے ہوٹل کے کمرے کو اندر سے لاک کیا اور فریش اپ ہونے کے بعد ہم اپنے اپنے بیڈ پر پہنچ گئے۔

میں نے آنکھیں بند کر کے یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے سونے جا رہا ہوں۔ یہ محض اس لیے تھا کہ صوفیہ مجھے ''ڈسٹرب'' نہ کرے۔ میں سونے سے پہلے مختلف محاذوں پر جھانکنا چاہتا تھا اور اس کے لیے مکمل یکسوئی کی ضرورت تھی۔ پورا دن ظاہرہ آنکھیں استعمال ہوتی آئی تھیں۔ اب تیسری یعنی باطنی آنکھ کے استعمال کا وقت تھا۔

سب سے پہلے میں نے اپنی جانِ جگر کا تصور کیا۔ نام آتے ہی اس کے خدوخال میری نگاہ میں کھل جاتے تھے۔ اس کا حسین مکھڑا میری تھرڈ آئی کے سامنے چمکا تو میں اس روشنی کی انگلی پکڑ کر اس کے ماحول میں اتر گیا۔

ساحل ''حسبِ دستور'' بیڈروم نامی سونے کے آرام دہ پنجرے میں موجود تھی۔ وہ اس وقت اپنے بیڈ پر دراز تھی اور بند آنکھیں ظاہر کرتی تھیں' وہ یا تو سو چکی ہے اور یا پھر سونے ہی والی ہے۔ بیڈروم میں زیرو پاور بلب کی مخصوص نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چند لمحات تک یک ٹک خوابیدہ حسن کا نظارہ کرتا رہا۔ ساحل کے سینے کا زیر و بم اس کی خیریت اور تندرستی کا پتا دیتا تھا۔ میں مطمئن ہو کر اس کے بیڈروم سے ''نکل'' آیا۔

دوسرا اہم آدمی ربی موشے ہائمن تھا۔ اس تک براہِ راست میری رسائی ممکن نہیں تھی للہٰذا میں نے ہرشل حنان کے نقش و نگار کو اپنے تصور میں اجاگر کیا اور تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے ماحول کا حصہ بن گیا۔

ہرشل بڑا پڑھاکو اور خدمت گزار بچہ ثابت ہو رہا تھا۔ میں جب بھی اس کے ماحول میں پہنچا' اسے یا تو ربی کی ''منھی چاپی'' میں مصروف پایا تھا اور یا پھر کسی کتاب کے مطالعے میں غرق پایا تھا۔ پتا نہیں وہ کس امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک ضخیم کتاب کھولے اسی چھوٹے سے کمرے میں ایزی چیئر پر بیٹھا تھا جہاں اس نے ربی کو پلائے جانے والے دودھ کی اسکریننگ کی تھی۔ میں نے آج صبح ان تینوں کو اسرائیل اردن کی سرحد ''شیخ حسین بارڈر'' پر بحرِ مردار کے قریب چھوڑا تھا۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا تھا وہ ڈیڈ سی کے کنارے کون سا ڈیڈلی گیم کھیلنے گئے تھے۔ ایک تیز اور دل خراش نسوانی چیخ نے مجھے ڈیڈ سی کے قرب سے اٹھا کر ہوٹل ٹاپ کے کمرے میں لا کھڑا کیا تھا۔

ہرشل کی اپنی مخصوص کمرے میں موجودگی ظاہر کرتی تھی کہ ربی موشے ہائمن بھی اس وقت اسی بنگلے میں' اپنے بیڈروم میں ہوگا۔ ہرشل' ربی کا سیکریٹری تھا اور دُم کے مانند ربی کے ساتھ بندھ کر وہیں پہنچ جاتا تھا جہاں ربی کو جانا مقصود ہوتا...... اور یہ میرے لیے تقویت کا باعث تھا۔ ویسے وہاں کے سیٹ اپ سے یہی لگتا تھا وہ بنگلا ربی کی آماجگاہ تھا اور میری ساحل کو اس نے اپنے یہاں ''اکاموڈیٹ'' کر رکھا تھا۔

ہرشل کے انہماک کو دیکھ کر میرے ذہن میں تجسس جاگا کہ دیکھوں تو وہ اتنی دلچسپی سے کون سی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر کر مذکورہ ضخیم کتاب تک پہنچ گیا۔ شکر ہے وہ اس وقت کوئی انگلش تحریر پڑھ رہا تھا۔ میں نے چند سطریں مطالعہ کیں تو میرے پورے وجود میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ کوئی نہایت ہی گھٹیا ڈولا ناول تھا۔ بس یہی غنیمت تھا کہ وہ باتصویر نہیں تھا' تاہم اس کے باتحریر ہونے نے بھی کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ میں تھوڑی سی کوشش کے بعد اس ناول کے ٹائٹل تک نگاہ پہنچانے میں کامیاب ہوگیا اور وہاں پر موجود رائٹر کا نام دیکھ کر ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ جیکی کولنز کا ایک ہوشربا اور تحریکی ناول تھا۔ میں ہرشل حنان کو اس کے شوق میں مشغول چھوڑ کر وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اس کے بعد میں نے بیگن کی خبر لی۔ وہ بالائی منزل والے دونوں سیکورٹی گارڈز کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ میں ان کے ماحول سے نکل کر سلوان کے پاس پہنچا۔ وہ میرے قدموں تلے یعنی ہوٹل ٹاپ کے کچن میں اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ میں نے اس کے ماحول کو بھی خیرباد کہا اور اپنے کمرے میں حاضر ہوگیا۔

اسی لمحے مجھے نیلگری کا خیال آگیا۔ وہ ایک مرتبہ بھی میری تھرڈ آئی کے تجربے میں نہیں آسکی تھی۔ میرے دل میں ایک اور کوشش کی خواہش ہوئی۔ وہ جس نوعیت کی دھمکی دے کر گئی تھی' اس کے بعد ضروری ہوگیا تھا کہ گاہے بہ گاہے اس کی خبر رکھی جائے لیکن افسوس کہ میں اس کے ماحول کو چھونے میں ناکام رہا۔ اس سے مجھے قدرے مایوسی بھی ہوئی۔

انسان کی خواہش بڑی عجیب و غریب شے ہے۔ اس جذبے کو کسی خانے میں فٹ کر کے اس کے لیے کوئی مساوات یا فارمولا وضع نہیں کیا جاسکتا۔ آج صبح ہوٹل کے اسی کمرے میں نیلگری سراپا نیاز بنی میری کرم نوازی کی منتظر تھی۔ حریری تولیے میں سے اس کے بدن کی ایک ایک اٹھان بہ زبانِ

خاموشی مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھی لیکن میں اس کے جسم سے نگاہ چرا کر طویل خشک مکالموں میں مصروف رہا اور اب...... محض اتنی سی بات کے لیے مایوس ہو رہا تھا کہ میری تھرڈ آئی کی بے قرار انگلی اس کے ماحول کو چھونے میں ناکام ہوگئی تھی۔ پتا نہیں یہ گریز اور طلب کا کون سا امتزاج تھا۔ میں ان لمحات میں ایک ایسے جز کے لیے مچل رہا تھا جس کے کل کو صبح نظر انداز کر چکا تھا۔

نیلگری کا خیال کسی بگولے کے مانند میرے ذہن میں چکراتا رہا اور اس چکراہٹ کے دوران میں مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سوچا کیا نیلگری کو دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ وہ مجھے ایک سنگین دھمکی دے کر گئی تھی۔ یہ چیک کرنا چاہئے تھا وہ اپنے دعوے میں کس حد تک راسخ ہے۔ اس کے عزائم وہی ہیں جن کا وہ اظہار کر کے گئی تھی یا پھر وہ اموشنل بلیک میلنگ کے ذریعے اپنے کام نکالنے' اپنی بات منوانے میرے پاس آئی تھی۔

اس خیال کے ساتھ ہی میں نے آنکھیں کھول کر صوفیہ کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہم دونوں ہوٹل کے کمرا نمبر پانچ سو آٹھ میں بند تھے۔ یہ ایک طرح سے نیلگری کی ''واردات'' کے لیے موزوں ترین سیٹنگ تھی۔ اگر میں اپنے اور صوفیہ کے درمیان موجود فاصلے کو کسی طرح ختم کر دیتا تو اصولی طور پر نیلگری کو اپنا دعویٰ پورا کرنے کے لیے صوفیہ کے اندر آ جانا چاہیے تھا۔ میں جو تجربہ کرنے جا رہا تھا' وہ انتہائی خطرناک تھا لیکن اگر میں اپنی اداکاری میں ثابت قدم رہتا اور اسے ایک رول پلے سمجھ کر پلے کرتا تو نیلگری کے دعوے کی صداقت اور خطرناکی کو پرکھا جا سکتا تھا۔ ویسے مجھے خود پر اتنا اعتماد تھا کہ نیلگری مجھے ٹریپ نہیں کر سکے گی۔ اگر اس نے واقعی مجھ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی تو یہ بات مجھ سے چھپی نہیں رہ سکے گی اور پھر اسے منہ کی کھانا پڑے گی۔

اگر کسی شخص کے بدن کے کسی حصے میں کوئی گولی پیوست ہو جائے تو آپریشن کے ذریعے اس گولی کو نکالنا ناگزیر ہو جاتا ہے ورنہ زہر پھیلنے کے بعد زندگی کو موت کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ میں نے نیلگری کا کانٹا نکالنے کے لیے خود کو ایک چھوٹے سے سرجیکل ٹیسٹ کے لیے تیار کر لیا۔

صوفیہ سونے کی کوشش میں بے کیف کروٹیں بدل رہی تھی۔ مہین نائٹی کے اندر اس کے اعضا کی اضطراری جنبشیں بیڈ شیٹ کو شکن آلود کر رہی تھیں۔ میں بڑی محویت سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ وقفے وقفے سے اس کے بدن کا اضطراب بیڈ شیٹ پر شکنوں کی صورت اختیار کرتا رہا لیکن جب اس سے کوئی اطمینان بخش نتیجہ برآمد نہ ہوا تو وہ ریشمیں تکیے کو اپنے سینے میں دبوچ کر نیم اوندھی ہوگئی۔ اس کی گرفت میں آیا ہوا تکیہ مجھے بڑی مشکل میں دکھائی دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اب تب میں اس کی سانس رک جائے گی۔ وہ مقابلۃً گداز سے دستبردار ہونے کے لیے سخت بے چین تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے آواز دی۔

''صوفیہ......!''

''اوں۔'' اس نے اوندھے پڑے پڑے مخمور آواز میں یک لفظی جواب دیا۔

میں نے پوچھا ''تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟''

''سونے ہی کی کوشش کر رہی ہوں۔'' اس نے بوجھل آواز میں کہا۔

میں نے کہا ''لیکن تمہیں اس کوشش میں کامیابی نہیں ہو رہی اور میں اس کی وجہ بھی جانتا ہوں۔''

''کیا وجہ ہے؟'' اس نے اپنی پوزیشن میں کوئی تبدیلی لائے بغیر پوچھ لیا۔

''بزرگوں نے کہا ہے' آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم سے ہی بھول سرزد ہو رہی ہے۔ تمہیں نیند نہ آنے کا سبب بھی یہی ہے۔''

''وہاٹ ڈو یو مین؟'' اس نے بڑی ادا... سے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں اس کے چہرے کو پوری طرح دیکھ نہ سکا۔ سیاہ ناگنوں نے صوفیہ کے دلکش خدوخال کو اپنی آغوش میں سمیٹ رکھا تھا۔ میں نے ایک لمحے تک گہری نگاہ سے اسے دیکھا اور کہا۔

''میں نے تمہیں بتایا تھا نا' رات کو میں تمہیں اپنے فائنل منصوبے سے آگاہ کروں گا لیکن تم میری سنے بغیر ہی بستر پر دراز ہوگئیں۔ آج کا کام تو آج ہی مکمل ہونا چاہیے نا!''

''اوہ! میں تو واقعی اس بارے میں تم سے پوچھنا بھول گئی۔'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی پھر قدرے ہوشیار آواز میں کہا ''میں سن رہی ہوں۔ بتاؤ تم نے کیا فائنل کیا ہے؟''

میں سمجھ رہا تھا' وہ بات ختم کرتے ہی اٹھ کر بیٹھ جائے گی اور پوری توجہ سے میری طرف دیکھنے لگے گی لیکن اس نے میری توقع پوری نہیں کی۔ وہ تکیے کو گرفت میں رکھتے ہوئے بستر پر لیٹے لیٹے ہی میری بات سننا چاہتی تھی۔

میں نے کہا ''اتنی دور سے کیسے بتاؤں۔ میرے پاس

آ جاؤ۔''

اس نے یکلخت گردن اٹھا کر حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں اور چہرے پر بے یقینی کو الجھن کے ساتھ گتھم گتھا پایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اعتبار نہ ہو' میں اسے اپنے پاس بلا رہا ہوں۔ وہ میرے بلاوے کو شاید اپنی سماعت کا دھوکا سمجھی تھی۔

وہ چند لمحات تک متعجب انداز میں مجھے تکتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس مسکراہٹ میں دلکش آزمائش بھی شامل تھی۔ اس نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔

''تم آ جاؤ نا۔''

میں خاموشی سے اٹھا اور صوفیہ کے بستر پر پہنچ گیا۔

آئندہ ایک گھنٹے تک ہم ایک دوسرے کو منصوبے کی باریکیاں سمجھاتے رہے۔

اس دوران میں مجھے ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہ ہوا کہ نیلگری ہمارے درمیان موجود ہے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا' اس نے مجھے اپنے دباؤ میں لانے کے لیے وہ سنگین دھمکی دی تھی ورنہ اسے دعوے کے مطابق فوراً وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ وہ نہیں پہنچی' تاہم اس کی آمد کا دھڑکا ننگی تلوار بن کر ہر پل میرے حواس پر لٹکتا رہا۔ میں اس وقت دو محاذوں پر مصروف تھا۔ یہ مصروفیت قدرے کم ہوئی تو میں نے ایک بے آواز جملے کے ساتھ نیلگری کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا ''چل جھوٹی......!''

پربتوں کی شہزادی نیلگری نے اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ میں بھی شاید یہی کر رہا تھا۔

☆☆☆

سات مئی کی صبح بڑی شفاف اور نکھری نکھری سی تھی۔ ماحول میں ایک خاص قسم کی فرحت اور تروتازگی پھیلی محسوس ہوئی۔ فضا میں آسودگی ہی آسودگی رچی بسی نظر آتی تھی۔ ہم دونوں خود کو مطمئن اور فریش پا رہے تھے۔ ذہن کا غبار ڈھل چکا تھا۔ اس کی جگہ ایک خمار نے لے لی تھی۔ جسم و جاں پر ایک سرور بخش کیفیت طاری تھی۔

اس روز ناشتا ہم نے کمرے ہی میں منگوا کر کیا۔ باہر جانے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی اس ہوٹل میں وہ میرا آخری دن تھا۔ میں نے سات اور آٹھ مئی کی درمیانی رات یعنی آنے والی رات کو ساحل والے بنگلے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں مجھے کچھ ضروری تیاری بھی کرنا تھی۔ میں پورے بندوبست کے ساتھ ہی ہوٹل سے نکلنا چاہتا تھا کیونکہ رات کو مجھے واپس یہاں نہیں آنا تھا۔ جب میں ساحل کو حاصل کر لیتا تو پھر ہمارا رخ تل ابیب سے یروشلم کی طرف ہو جانا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوئے تو صوفیہ نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنے منصوبے کا ایک حصہ تو مجھ سے چھپا ہی لیا؟''

''کون سا حصہ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ''گوشت والا حصہ!''

''جو حصہ چھپ گیا ہے اسے اب ظاہر کر دیتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے میں اٹھا اور بیڈ روم فریج کے پاس آ گیا۔

گزشتہ روز میں کوشر سینٹر سے ایک کلوگرام بیف دو پارچوں کی صورت میں پیک کروا لایا تھا۔ یہ گوشت فریج میں رکھا تھا۔ صوفیہ نے اسی گوشت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے سیلوفین بیگ میں پیک گوشت کے وہ پارچے نکال لیے پھر صوفیہ سے کہا۔ ''آ جاؤ' تمہیں گوشت والا حصہ دکھاتا ہوں۔''

وہ میرے قریب لپک آئی۔ میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے ساحل والے بنگلے میں رات کی تاریکی میں دو خطرناک بل ڈاگز کو ''پہرے داری'' کی تیاری کرتے دیکھا تھا۔ بیگن نے انہیں ڈاگ ہاؤس سے باہر نکالنے کے بعد گوشت کے پارچہ جات سے تواضع کی تھی۔ بل ڈاگز کے اس کپل نے بڑے ذوق و شوق سے بیف کی وہ پارچہ جاتی ضیافت اڑائی تھی جس کے بعد وہ دونوں مخصوص قسم کی چہلوں میں مصروف ہو گئے تھے جس کے نتیجے میں ان کی پرائیویسی کا خیال کرتے ہوئے میں نے اس ماحول کو خیرباد کہہ دیا تھا۔

مجھے بھی آج رات ہی کسی وقت اس بنگلے میں داخل ہونا تھا اور اس امر کے امکانات کو نظر انداز کر دینا سراسر حماقت ہوتی کہ کسی بھی مرحلے میں ان خطرناک چوکیدار کتوں سے ''واسطہ'' پڑ سکتا ہے۔ میں نے بیف کے دو کنگ سائز پارچے اور چوہے مار دوا بل ڈاگز کی اسی جوڑی کے لئے حاصل کیے تھے۔ بیگن تھال میں سجا کر ان کے لیے جو گوشت لایا تھا' وہ اس نے بالائی منزل والے کچن سے لیا تھا۔ میں نے خود اپنی باطنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ ادھیڑ عمر باورچی نے وہ گوشت فریج میں سے نکال کر بیگن کے حوالے کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا بل ڈاگز کی اس جوڑی کو اپنے جسم میں حرارت اور توانائی بھرنے کے لیے خنک گوشت بہت مرغوب تھا۔

میں نے گوشت کے دونوں پارچوں کو سیلوفین بیگز میں

سے باہر نکال لیا پھر خنجر کی مدد سے مخصوص فاصلہ رکھ کر ان پر گہرے ''کٹ'' لگائے۔ صوفیہ بڑی حیرت اور دلچسپی سے مجھے ''کام'' کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔ میں نے گوشت کے ہر ٹکڑے پر دو گہرے کٹ لگائے پھر ''زونا ماؤس کلر'' کی ڈبیا کھول لیں۔ کیمسٹ نے بتایا تھا ایک ڈبیا کا سفوف کم از کم دس صحت مند چوہوں کی ہلاکت کے لیے انتہائی کافی ہے۔ دونوں ڈبیا والا سفوف اگر گوشت کے ساتھ شامل ہو کر ان بل ڈاگز کے معدوں میں اتر جاتا تو ان پر بڑا ''شافی'' اثر ہو سکتا تھا۔ بالفرض محال وہ ختم بھی نہیں ہوتے تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ میری راہ میں کسی قسم کی مزاحمت...... کرنے کے قابل نہ رہتے۔ وہ اتنا غفیل ہو جاتے یا پھر کہیں کونے میں پڑے خاموشی اور شرافت کے ساتھ اپنی اس کیفیت پر غور فرما رہے ہوتے۔ ان کے حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہوتی...... اور میں بس چاہتا بھی اتنا ہی تھا۔

میں نے ایک ڈبیا کے سفید سفوف کو ایک پارچے کے ''زخموں'' میں اچھی طرح بھر دیا۔ یہی عمل دوسرے پارچے کے ساتھ بھی دہرایا۔ اس کے بعد میں نے بیگ میں سے سوئی دھاگا برآمد کر لیا۔ دیگر ضروری اشیا کے ساتھ ہی میں نے یہ سوئی دھاگا بھی ہیروڈ سپر مارکیٹ سے خریدا تھا۔ خاص طور پر دھاگے کے سلسلے میں میں نے سرخ رنگ کا استعمال کیا تھا۔ اگرچہ وہ گوشت رات کی تاریکی میں بل ڈاگز کے معدوں میں اترتا لیکن میں کسی معمولی سے معمولی معاملے میں بھی بے احتیاطی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے بڑی مہارت سے سوئی دھاگے کا استعمال کرتے ہوئے پارچہ جات کے زخموں کو سی دیا۔ وہ سفوف اگرچہ بے بو اور بے ذائقہ تھا لیکن کتے کے سونگھنے کی مخصوص حس کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے یہ احتیاط برتی تھی۔ اب ان پارچہ جات کو اوپر سے دیکھنے سے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی کاریگری کی گئی ہوگی۔ ہم رنگ گوشت اور دھاگے نے میری ''رفوگری'' کے جملہ عیوب پر دبیز پردہ ڈال دیا تھا۔

صوفیہ کو میں نے دیگر تفصیلات کے ساتھ ہی بنگلے میں پہرا دینے والے محافظ کتوں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ گوشت کے ساتھ ابھی میں نے جو کارروائی کی تھی اس کو دیکھنے کے بعد وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔

''ایکسیلنٹ! اب تمہارے منصوبے کا چھپا ہوا گوشت والا حصہ سامنے آ گیا ہے۔''

''اس حصے کو جی بھر کو دیکھ لو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ ممکن ہے آج رات کو یہ بل ڈاگز کے معدوں میں جا چھپے۔''

وہ مجھے گھور کر دیکھنے لگی۔

میں نے ان ''تیار شدہ'' پارچہ جات کو دوبار لباس پہنا دیے۔ وہ سیلوفین بیگز کے اندر پہنچ گئے تو میں نے ایک مرتبہ پھر فریج میں رکھ دیا۔ اب انہیں اسی وقت باہر آنا تھا جب ہم اپنے مشن پر روانہ ہونے کے لیے ہوٹل سے نکلتے۔

اس روز لنچ کے لیے ہم کہیں نہیں گئے بلکہ ہوٹل ٹاپ کے ڈائننگ ہال کو عزت بخشی اور واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ صوفیہ نے مجھ سے استفسار کیا۔

''کتنے بجے تک نکلنے کا ارادہ ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''شام سے تھوڑی دیر پہلے ہم کمرا چھوڑ دیں گے۔''

''کیا چیک آؤٹ ہونے کا ارادہ ہے؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

''ایسا ہو سکتا ہے۔ ہم شام میں نکلیں تو دوبارہ اس ہوٹل میں قدم رکھنے کی نوبت نہ آئے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ہوٹل والوں کو ہم اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں بتائیں گے۔ اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔''

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آئیڈیا؟''

''ہم ہوٹل سے نکلتے وقت اپنا ضروری سامان ساتھ لے لیں گے۔'' میں نے بتایا۔ ''میں اس ہوٹل کے ذمے داروں کو بتاؤں گا کہ ہمیں تل ابیب میں ایک دیرینہ شناسا مل گیا ہے۔ آج رات اس نے ہماری دعوت کی ہے۔ اگر اس دعوت سے جلدی فارغ ہو گئے تو جلد واپس ہوٹل آ جائیں گے اور اگر وہ دعوت ایک حسین رت جگا ثابت ہوئی تو ہم صبح کے وقت وہیں پر سو جائیں گے۔ اس صورت میں ہمیں اس ہوٹل سے چیک آؤٹ ہی سمجھا جائے۔ انہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ میں نے کل شام تک کا کرایہ ادا کیا ہوا ہے۔ یہ کمرا ہم نے تین راتوں کے لیے بک کرایا تھا جن میں سے دو گزر گئیں اور آنے والی رات باقی ہے۔ اصولی طور پر ہمیں کل رات سے پہلے چیک آؤٹ ہونا ہے لہٰذا اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم آنے والی رات کہاں گزارتے ہیں۔ وقت مقررہ تک یہ کمرا ہمارے نام ہی رہے گا۔''

''یہ آئیڈیا بہت ہی مناسب ہے۔'' صوفیہ نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

میں نے اسے مشورہ دیا۔ ''آنے والی رات کو ممکن ہے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ لگانے کا موقع نہ ملے اس لیے تم چاہو تو تھوڑی نیند لے لو۔''

''تم نہیں لوگے؟'' وہ ایک حشر انگیز انگڑائی لیتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔

''کیوں نہیں لوں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''رات کو نیند پوری نہیں ہو سکی۔ میں بھی کم از کم ایک دو گھنٹے ضرور سوؤں گا۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے بڑی کسل مندی سے ایک طویل مصنوعی جماہی لی۔

ہم دونوں اپنے اپنے بیڈ پر آ گئے۔

اس وقت مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ ڈھونگ دو وجوہ کی بنا پر رچایا تھا۔ نمبر ایک میں آنکھیں بند کر کے ''تھرڈ آئی، تھرڈ آئی'' کھیلنا چاہتا تھا۔ نمبر دو میں چاہتا تھا مجھے سوتا دیکھ کر صوفیہ تھوڑی بہت نیند ضرور لے لے۔ آنے والی رات میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ صوفیہ اس مشن میں میرے ساتھ برابر کی شریک تھی۔ پتا نہیں میرا یہ ساتھ اسے کہاں کہاں لیے پھرتا۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی آرام کا موقع ملتا یا نہیں۔ اگر ابھی وہ تھوڑا سو لیتی تو زیادہ اچھے انداز میں حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکتی تھی۔

میں نے بیڈ پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ ظاہرہ آنکھوں کے شٹر بند ہوئے تو باطنی آنکھ کا در وا ہو گیا۔ میں نے تھرڈ آئی کو زحمت دی اور سب سے پہلے اپنی جانِ تمنا کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اب میری اس تصوراتی کارروائی کے دائرے میں وہی لوگ رہ گئے تھے جو اس بنگلے میں موجود تھے، ان میں سب سے اہم ساحل تھی۔

ساحل اپنے مخصوص پُرآسائش قفس میں تھی۔ وہ لنچ سے فارغ ہو چکی تھی اور بستر پر نیم دراز ہو کر ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ٹی وی پر اس وقت کوئی ٹاک شو آ رہا تھا۔ ساحل کی محویت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا وہ شو خاصا دلچسپ ہوگا۔ میرے دل میں اس خواہش نے انگڑائی لی کہ میں ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں کو ساحل کی آنکھوں کے سامنے لہراؤں اور پوچھوں...... کہاں کھوئی ہوئی ہو؟

لیکن افسوس کہ تصوراتی آنکھ کی انگلیاں ہوتی ہیں نہ ہاتھ اور نہ ہی میں اپنی آواز کو ساحل کے ماحول تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر مجھے اپنی اس محرومی کا شدت سے احساس ہوا اور میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ اس سلسلے میں چیف لاما چنگ فورن پوشی سے ضرور بات کروں گا۔ اگر میں تھرڈ آئی کو استعمال کر رہا تھا تو تھرڈ ایئر کو استعمال کرنے کی ممانعت کیوں تھی؟

میں تھوڑی دیر تک ایک جذب کے عالم میں ساحل کو... ٹی وی دیکھتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس کے ماحول میں ایک طویل اور پُرعزم تصوراتی سرگوشی کرتے ہوئے وہاں سے لوٹ آیا۔

''ساحل! تم نے اپنی قید کی آخری رات بھی گزار لی۔ آج تمہاری رہائی کا دن ہے۔ تمہیں جن ناکردہ جرائم کی سزا دی گئی تھی اس کا ذمے دار سراسر میں ہوں۔ ربی نے میری دشمنی میں تمہیں اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ بندی خانہ چاہے سونے چاندی سے کیوں نہ بنا ہوا ہو اور اسے آرام دہ بنانے کے لیے چاہے اس میں دنیا بھر کا ریشم کیوں نہ بچھا دیا جائے...... وہ قید خانہ ہی رہتا ہے۔ آزاد فضا میں لی گئی ایک سانس ایسے تعیشی کمرے میں گزارے گئے سو سال پر بھاری ہوتی ہے۔ میں آ رہا ہوں ساحل! تم میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسی ہو۔ میں ہی تمہیں اس عذاب سے نکالوں گا۔ آج سونا نہیں...... میرا انتظار کرنا۔ میں ضرور آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

میں نے تیسری آنکھ کا زاویہ بدلا اور یکے بعد دیگرے بیگن، سلوان، ادھیڑ عمر باورچی اور ہرشل کی خبر لے لی۔ بیگن اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں موجود تھا۔ سلوان ساحل والے بنگلے کی زیریں منزل پر اس فربہ شخص کے ساتھ بیٹھا تھا جو میری نظر میں ہرشل کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ باورچی بالائی منزل والے کچن میں جھوٹے برتنوں کے ساتھ نبرد آزما تھا اور ہرشل اس وقت ربی کے پاس اس کے مخصوص بیڈ روم میں تھا۔ میں اس بیڈ روم کے ماحول سے چپک گیا۔

ربی موشے ہائمن وہیل چیئر کے بجائے بیڈ پر دراز تھا۔ ہرشل کے علاوہ ایک اور شخص بھی مجھے اس ماحول میں نظر آیا۔ ایک لمحے میں، میں نے اندازہ قائم کر لیا کہ وہ کوئی ڈاکٹر تھا۔ وہ شخص بڑی توجہ اور انہماک سے ربی کو چیک کر رہا تھا۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اچانک بیٹھے بٹھائے ربی کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ پہلے میں نے اسے وہیل چیئر سے مدد لیتے ہوئے دیکھا تھا اور اب یہ سنجیدہ چیک اپ کسی گمبھیر مسئلے کی جانب اشارہ کرتا تھا۔ وہ اپنی عمر کی ایک سینچری مکمل کر چکا تھا۔ اس عمر میں انسان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن میری تشویش اور الجھن کا باعث یہ تھا کہ مجھے معلوم نہیں تھا میرے سب سے طاقتور دشمن کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر نے مکمل چیک اپ کے بعد ربی کے بازو میں ایک انجکشن دیا اور ہرشل کو ضروری ہدایات دینے کے بعد

وہاں سے رخصت ہونے لگا۔ ہرشل اسے عمارت سے باہر تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ پھر وہاں سے یہ ڈیوٹی ہرشل کے اسسٹنٹ نے سنبھال لی اور جب تک ڈاکٹر کی گاڑی اس بنگلے سے روانہ نہیں ہوگئی' وہ واپس نہیں آیا۔ اس کی واپسی کے ساتھ ہی میں بھی پلٹا اور ہرشل حنان کے ماحول کو چھولیا۔

ہرشل ربی والے بیڈروم میں موجود تھا اور اسے ایک ہلکی سی شیٹ اوڑھا رہا تھا۔ ربی نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ چہرے کے پُرسکون تاثر سے ہی اندازہ ہوتا تھا اسے کوئی اندرونی یا بیرونی تکلیف نہیں۔ بغیر کسی تکلیف کے ڈاکٹر کو بلایا جاتا ہے اور ہی نہ وہ آکر اتنی سنجیدگی سے چیک اپ کرتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی۔ میں چونکہ اس گڑبڑ سے واقف نہیں اس لیے میرا الجھنا ایک فطری امر تھا۔

ہرشل' ربی کو اس کے بیڈروم میں آرام کرتا چھوڑ کر اپنے چھوٹے کمرے میں واپس آیا تو میں بھی ربی کے ماحول سے نکلنے کے لیے مجبور ہوگیا۔ میں جس رتھ پر سوار ہوکر وہاں پہنچا تھا جب وہی واپس آگیا تو میں ربی کے پاس کیونکر ٹک سکتا تھا۔

میں مزید دس منٹ تک ہرشل کے ''ساتھ'' رہا پھر آنکھیں کھول کر ہوٹل ٹاپ کے کمرا نمبر فائیو زیرو ایٹ میں حاضر ہوگیا۔ سب سے پہلی نظر صوفیہ پر پڑی۔ وہ مجھے سوتی ہوئی ملی۔ میں اپنے بیڈ سے اٹھا اور اس کے قریب آگیا پھر جھک کر اس کی نیند کا معائنہ کرنے لگا۔

میں نے اس کی مرطوب گرم سانسوں کی تمازت اپنے چہرے پر محسوس کی۔ یوں لگا جیسے کوئی غیر مرئی مہربان ہاتھ دل نشیں انداز میں میرے خدوخال کو تھپتھپا رہا ہو۔ میں نے اس کے گلاب ہونٹوں کو بھی مس کر کے دیکھا کہ وہ واقعی سو رہی ہے یا سونے کی اداکاری کر رہی ہے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا وہ گہری نیند میں ہے۔ میں نے اپنے چہرے کو اس کی حرارت خیز سانسوں کے حصار سے نکالا اور دوبارہ اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا۔

اس وقت میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے ربی موشے ہائمن اور اس کو اٹینڈ کرنے والے ڈاکٹر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ربی کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس نوعیت کی سوچ بچار کے دوران ہی میں میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا پھر ایک تیز اور چمک دار کرن نے راہنمائی کا در کھول دیا۔ میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا اگر میں ربی کی طبیعت کی ناسازی کے بارے میں نہیں جانتا تو کیا ہوا۔ وہ ڈاکٹر تو ضرور جانتا ہوگا جو اس کے بازو میں انجکشن دے کر گیا ہے۔ میں اس سے کیوں نہیں پوچھتا؟

پوچھنا...... تو میرے بس میں نہیں تھا لیکن اتنا ضرور معلوم کرسکتا تھا وہ ڈاکٹر کون ہے۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں جارہا ہے۔ اس کے چہرے کو میں نے بڑے غور سے دیکھا تھا جس کے نتیجے میں اس کی صورت میری یادداشت میں محفوظ ہوگئی تھی بلکہ وہ بنگلے سے رخصت ہورہا تھا تو میں نے اس کی نیوی بلیو گاڑی کا نمبر ''نائن جے ایکس ون ٹو زیرو'' بھی یاد کرلیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کے توسط سے ڈاکٹر کے ماحول میں پہنچ گیا۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی گاڑی میں سوار تل ابیب سے باہر کہیں جارہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا' اس کا رخ یروشلم کی طرف ہے۔ میں اس روٹ پر ربی اینڈ کمپنی کے ''ساتھ'' تل ابیب سے یروشلم تک جاچکا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ ایک ڈاکٹر ربی کو دیکھنے یروشلم سے تل ابیب آیا تھا یا ربی کو دیکھنے کے بعد کسی ضروری کام سے یروشلم جارہا تھا۔ میں بھی اس کی گاڑی میں ٹک کر ''بیٹھ'' رہا۔

جب میں ڈاکٹر کے ماحول میں پہنچا تو وہ ''ابی آذر'' کے علاقے سے نکل رہا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ہی وہ ''رامیہ'' اور ''شاعر ہیگے'' سے گزرا پھر ''قریات اناوم'' سے ہوتے ہوئے اس کی گاڑی یروشلم میں داخل ہوگئی۔ یہ ایسے سنسنی خیز لمحات تھے کہ میں ڈاکٹر کے ماحول سے چپکا رہا۔

اس کی نیوی بلیو گاڑی مختلف سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے وولف سن اسٹریٹ میں داخل ہوگئی۔ وولف سن اسٹریٹ ایک صاف شفاف سڑک تھی جو یروشلم کے پوش علاقے میں واقع تھی۔ ڈاکٹر کی گاڑی پیراڈائز ہوٹل کے قریب سے گزری اور وولف سن اسٹریٹ پر تھوڑا آگے جاکر دائیں جانب مڑگئی۔ اگلے ہی لمحے وہ پارک لین اسپتال میں داخل ہورہی تھی۔

پارک لین اعلیٰ درجے کا ایک مہنگا اسپتال تھا۔ ڈاکٹر گاڑی کو پارک کرنے کے بعد اسپتال کی عمارت میں داخل ہوگیا پھر مختلف راہداریوں...... سے گزرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں پہنچا۔ وہ جس کرسی پر جاکر بیٹھا' اس کی میز پر ''ڈاکٹر مناہم'' کے نام کی تختی رکھی تھی۔ اس نے جتنے اعتماد سے وہ نشست سنبھالی' اس سے مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ وہ کمرا اسی کے لیے مخصوص تھا۔ ڈاکٹر کے ماحول کے ساتھ چپکے رہنے سے مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ اس کا نام مناہم ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی اسسٹنٹ وہاں پہنچ گئی اور ڈاکٹر مناہم اسے ہدایات دینے لگا۔ دس منٹ کے بعد مناہم

اس کمرے سے نکل آیا۔

میں مناہم کے ماحول کو پکڑ کر پارکنگ تک پہنچا پھر جب وہ اپنی نیوی بلیو گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگا تو میں بھی پارک لین اسپتال سے نکل آیا۔ ایک مرتبہ پھر ہم پیراڈائز ہوٹل کے پاس سے گزرے پھر گاڑی وولف سن اسٹریٹ پر آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ دس منٹ کے بعد وہ گاڑی بیت سفافا کے علاقے میں داخل ہورہی تھی۔ میں ڈاکٹر کے ماحول کے ساتھ اٹیچ رہ کر بیت سفافا کے رہائشی علاقے میں پہنچ گیا۔ مناہم کی گاڑی بنگلا نمبر ''این۔ نائنٹی فائیو'' کے سامنے رکی تو مجھے بنگلے کی دیوار پر نصب نیم پلیٹ پڑھنے کا موقع مل گیا۔

میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ اس نیم پلیٹ پر درج تھا...... ڈاکٹر مناہم' کارڈیالوجسٹ۔ پارک لین ہوسپٹل۔ میں نے سوچا تو یہ ڈاکٹر مناہم ماہر امراض قلب ہے۔

مناہم اپنی رہائش گاہ میں داخل ہوگیا تو میں اسے اس کے حال پر چھوڑ کر ہوٹل ٹاپ کے کمرا نمبر ''فائیو نائن ایٹ'' میں حاضر ہوگیا۔

صوفیہ ہنوز گہری نیند میں تھی۔ میں چند لمحات تک گہری اور جاذب نظر سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر ربی موشے ہائمن کے بارے میں سوچنے لگا۔ ڈاکٹر مناہم سے ''ملاقات'' کے بعد ربی کی بیماری کسی نہیں بلکہ بڑی حد تک میری سمجھ میں آگئی تھی۔ دل کا ڈاکٹر جب کسی مریض کو اٹینڈ کرتا تو معاملہ دل کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

میں نے ربی کی کیفیت میں اچانک جو تبدیلی محسوس کی تھی اس کا سبب کھل کر سامنے آگیا۔ وہ وہیل چیئر کا سہارا لینے کے لیے اس لیے ہی مجبور ہوا ہوگا کہ دل زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ انسانی زندگی کا سب سے زیادہ دارومدار اسی گوشت کے لوتھڑے پر ہے۔ اس میں اگر ذرا سا بھی ضعف یا خرابی پیدا ہوجائے تو لگ پتا جاتا ہے۔ اس کا مطلب تھا ربی کو بھی اچھا خاصا پتا چل رہا ہوگا۔ ویسے ایک بات کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا اور وہ یہ کہ ڈاکٹر مناہم ربی کے لیے نہایت ہی قابل اعتماد شخص تھا ورنہ تل ابیب میں ماہر امراض قلب کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے آخری مرتبہ جب ہرشل کے توسط سے اسے جھانکا تھا تو ڈاکٹر مناہم اسے کوئی انجکشن دے رہا تھا۔ ازاں بعد ہرشل نے جس انداز میں ایک شیٹ اوڑھا کر اسے آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا وہ خاصی تشویش ناک صورتِ حال تھی۔

ربی میری زندگی میں آنے والا سب سے زیادہ طاقتور اور بااختیار دشمن تھا جس نے کافی عرصے سے میری جان کو اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ اصولی طور پر مجھے اس کی بیماری سے خوش ہونا چاہئے تھا۔ دشمن کو پہنچنے والا ہر نقصان طمانیت اور راحت کا باعث ہوتا ہے۔ چونکہ میں لاشعوری طور پر اس کے حشر نشر کی خواہش رکھتا تھا اس لیے اس کی بیماری یا ضعف مجھے کھل رہا تھا۔ دشمن کے ہاتھ جتنے زیادہ مضبوط ہوں' اس سے پنجہ آزمائی میں اتنا ہی زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے مجھے تھوڑی مایوسی ہورہی تھی۔

اگلے ہی لمحے میری یہ مایوسی' سکون اور اطمینان میں ڈھلنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر کوئی مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایک آواز تھپک تھپک کر مجھے اس نوعیت کی ترغیبات دے رہی تھی...... مجھے ہر قسم کے غیر متعلق اور فضول خیالات کو ذہن سے جھٹک کر صرف اور صرف اپنے مقصد کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ میں ساحل کے حصول کے لیے یہاں آیا ہوں اور اس حصول میں اب محض چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ مجھے اپنے ذہن کو ایسے تمام خیالات سے پاک رکھنا چاہئے جو سوچ میں انتشار پیدا کرتے ہوں۔ اگر گھی سیدھی انگلی سے نکل رہا ہے تو سوچ کی انگلی کو ٹیڑھا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اِدھر اُدھر میں الجھ کر کہیں اپنے مقصد کو نہ گنوا بیٹھوں؟'

میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں یہ سوچ' یہ خیال اور یہ انداز میرا ہرگز نہیں تھا۔ ان لمحات میں میرے اندر کوئی اور بول رہا تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا' عدم تشدد کا حامی تھا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی میرا دھیان چیف لاما چنگ فورن پوشی کی جانب چلا گیا۔ بدھ ازم میں تشدد کی سختی سے ممانعت ہے۔ مجھے بھی ایسی ہی کارروائیوں سے ممکنہ حد تک بچنے کی ہدایت دی جارہی تھی۔ چنگ فورن پوشی اس بات پر قدرت رکھتا تھا کہ میرے دماغ میں پہنچ کر کوئی مخصوص قسم کی سوچ پیدا کرسکے۔ مجھے ایک دو مرتبہ پہلے بھی اس نوعیت کا تجربہ ہوچکا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ رن پوشی میرے اندر موجود ہے تو میرے ذہن میں ایسے خیالات پیدا ہونے لگے جن سے ظاہر ہو کوئی میرے اندر موجود نہیں بلکہ یہ سراسر میری اپنی سوچ ہے۔ دلائل کے لیے پھر ربی کا حوالہ سامنے آگیا۔ ان لمحات میں' میں کچھ انداز سے سوچ رہا تھا...... ایک ماہ بعد ''ہیبر دنی یونیورسٹی آف یروشلم'' میں ربی' مسلمانوں کے خلاف کسی خاص منصوبے کی نقاب کشائی کرنے والا ہے۔ اسے اتنے اہم اعلان کے لیے زندہ رہنا چاہئے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ

مستقبل قریب میں یہودی مسلمانوں کو کس انداز سے کتنا نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟

یہ سوچ میری تھی یا چنگ فو کی یا پھر کسی بھی اور شخص کی بہرحال تھی بڑی توانا اور معقول سوچ۔ بات میری سمجھ میں آ گئی۔ پاکستان اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والی کسی بھی سازش کی نقاب کشائی میرے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ میں وطنِ عزیز کی جانب اٹھنے والی ہر میلی نگاہ کو اس کے ماخذ سمیت تباہ و برباد کرنے کا پختہ عزم کر چکا تھا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہو۔ اپنے ملک اور قوم کی خدمت کا دور...... دوستوں کا ہاتھ تھامنے اور دشمنوں کا ہاتھ توڑنے کا دور۔ ایک ایسا دور جس کا کینوس لامحدود اور اس کینوس کے اندر ہونے والی جدوجہد بے اندازہ تھی۔

اس سنسنی خیز خیال نے میرے رگ و پے میں بجلی سی دوڑا دی۔

☆☆☆

شام کے سات بجے تھے۔ یہ دراصل رات کا آغاز اور شام کا اختتام تھا۔ اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا' تاہم اس میں ابھی تک شبِ دیجور لبِ لیلیٰ والی سنگینی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ میں پوری جسمانی اور ذہنی تیاری کے ساتھ اپنی زندگی کے سب سے اہم مشن پر نکلا ہوا تھا۔ صوفیہ میری ہم رکاب تھی۔ اس وقت ہم دونوں شالوم اسٹریٹ کے ایک ایسے مقام پر کھڑے تھے جہاں سے اس ذیلی گلی پر نگاہ رکھی جا سکتی تھی جہاں بہائی گارڈن اپارٹمنٹس بلڈنگ استادہ تھی۔ ہمارے عقب میں شالوم اسٹریٹ پر ہی اس علاقے کا پوسٹ آفس واقع تھا جس کی نائٹ شفٹ میں کام ہو رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے صوفیہ سے کہا۔ ''دیکھو' وہ آ رہے ہیں۔''

صوفیہ چوکنا نظر سے میرے اشارے کی سمت دیکھنے لگی اور محتاط لہجے میں بولی۔ ''تم نے ان دونوں کی آمد و شد کا بڑا پرفیکٹ حساب رکھا ہوا ہے۔''

''رکھنا پڑتا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''میں نے پوچھا اور نہ ہی کبھی تم نے ازخود بتایا کہ اس حساب کتاب کے لیے تم کون سا ذریعہ استعمال کرتے ہو۔'' وہ شاکی لہجے میں بولی۔ ''تم میرے ساتھ پہلی مرتبہ اسرائیل آئے ہو۔ اتنی گہری معلومات تمہیں کیسے حاصل ہو گئیں؟''

میں نے آنے والوں پر نگاہ جمائے رکھی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب تم نے اس بارے میں مجھ سے پوچھا ہی نہیں تو پھر گلہ شکوہ کیسا۔ ہو سکتا ہے تم پوچھتیں تو میں بتا دیتا۔''

''چلو' اب ہی بتا دو۔'' وہ سادگی سے بولی۔

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا تم اندازہ لگا سکتی ہو ان میں سلوان کون ہے اور بیگن کون؟''

''اس کا مطلب ہے پوچھنے پر بھی تم بتانا نہیں چاہتے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ ''شاید یہی سوچ کر میں نے اب تک تم سے نہیں پوچھا تھا۔''

''ایسی بات نہیں ہے صوفیہ!'' میں نے اس کی ناراضی دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ''ستائیس۔ سی میں پہنچنے کے بعد ہم اس موضوع پر بات کریں گے۔''

''او کے۔'' وہ تعاون آمیز انداز میں بولی پھر کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے جو شالوم اسٹریٹ کو چھوڑ کر ہرمن اسٹریٹ کی طرف جائے گا وہ بیگن ہے اور جو شالوم کو چھوڑ کر افرائم اسٹریٹ پر قدم رکھے گا' وہ سلوان ہے۔''

''یہ تو وہی بات ہوئی...... یا تو بیٹا ہو گا یا پھر بیٹی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہرحال میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان میں سے جس کے سر پر گھنے بال نظر آ رہے ہیں وہ بیگن ہے اور یہی شخص ہرمن اسٹریٹ کی جانب قدم بڑھائے گا۔ اس کے گھنے بالوں کا راز یہ ہے کہ وہ اس وقت ایک وگ لگائے ہوئے ہے۔ آنکھوں میں کانٹیکٹ لینس لگا کر اس نے آنکھوں کا رنگ بھی تبدیل کر لیا ہے۔ یہ جو بھی حلیہ بنا کر ساحل والے بنگلے پر ڈیوٹی دینے جا رہا ہے اسی حلیے میں تھوڑی دیر پہلے سلوان وہاں ڈیوٹی نبھا کر آ رہا ہے۔ اپارٹمنٹ ستائیس۔ سی میں انہوں نے پندرہ بیس منٹ گزار کر اپنے حلیوں میں تبدیلی کی ہے۔ پتا نہیں ربی نے انہیں یہ قسم کے گورکھ دھندے میں الجھا رکھا ہے۔ اس بنگلے پر سلوان اور بیگن باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں لیکن وہاں کا دیگر عملہ ''انہیں'' ایک ہی شخص سمجھتا ہے البتہ ہوٹل ٹاپ کے کچن میں سلوان اپنی اصلی حلیے کے ساتھ ہی ڈیوٹی انجام دیتا ہے۔ میں اس چکر کو ابھی تک نہیں سمجھ نہیں سکا ہوں اور......''

میں بولتے بولتے اچانک رک گیا کیونکہ اسی وقت وہ دونوں ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔ وہ درمیان میں تھوڑا فاصلہ رکھتے ہوئے چل رہے تھے اور ان کے انداز میں ایک خاص قسم کی اجنبیت پائی جاتی تھی۔ شالوم اسٹریٹ کے اختتام سے وہ دو مختلف راہوں پر چل پڑے۔ میں جانتا تھا

بیگن ہرمن اسٹریٹ' شیرون اسٹریٹ سے ہوتا ہوا اسی پوش رہائشی علاقے میں پہنچ جائے گا جہاں ساحل والا بنگلا واقع تھا اور سلوان شالومن اسٹریٹ سے افرائم اسٹریٹ اور افرائم اسٹریٹ سے بن یہودہ اسٹریٹ کی خاک چھانتے ہوئے بالآخر ہوٹل ٹاپ کے کچن میں جا پہنچے گا۔ سلوان کو صبح کے تین بجے واپس اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں آنا تھا جبکہ بیگن کی واپسی لگ بھگ دس بجے صبح ہوتی۔ میرے مشن کے لیے اب سے لے کر صبح تین بجے تک کا وقت ''پرائم ٹائم'' کی حیثیت رکھتا تھا۔

سلوان اور بیگن کے جانے کے بعد صوفیہ نے کہا۔ ''ان دونوں نے اس بنگلے پر جو چکر چلا رکھا ہے' وہ رہا ایک طرف لیکن میں محسوس کر رہی ہوں اپارٹمنٹ بلڈنگ میں بھی انہوں نے کچھ کم ہیرا پھیری نہیں کر رکھی۔ اس رات ریسپشنسٹ ایلڈا نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا یہ دونوں عجیب و غریب روم میٹ ہیں۔ ڈیوٹی بھی دونوں کو قسمت سے رات ہی کی ملی ہے۔ اپارٹمنٹ میں پڑے دن میں سوتے رہتے ہیں یا پھر گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل جاتے ہیں۔'' وہ تھوڑا توقف کرنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

''لگتا ہے ان اپارٹمنٹس میں رہنے والے دیگر افراد بھی ان دونوں کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔ عام تاثر یہی ہے کہ وہ دونوں نائٹ ڈیوٹی کرتے ہیں اور دن بھر اپارٹمنٹ کے اندر رہتے ہیں۔ ان دونوں کی نائٹ ڈیوٹی کا تاثر بھی اسی وجہ سے ہو گا کہ وہ رات میں ایک ساتھ نکلتے ہیں۔ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے تو میرا دماغ چکرانے لگتا ہے۔ پتا نہیں یہ دونوں کون سا گیم کھیل رہے ہیں؟''

''ان کو اور ان کے گیم کو ڈالو جہنم میں۔'' میں نے صوفیہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''آؤ ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔''

ہم بڑے مزے سے ٹہلتے ہوئے اس ذیلی گلی کی سمت بڑھنے لگے جس میں بہائی گارڈن اپارٹمنٹس بلڈنگ واقع تھی۔ ہم ہوٹل ٹاپ سے نکلتے وقت اپنا تمام ضروری سامان اٹھا لائے تھے اور ریسپشن پر موجود شخص کو اپنے ''چیک ان' چیک آؤٹ'' کے حوالے سے بھی بریف کر دیا تھا۔ اب ہمارا رخ اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی کی جانب تھا جہاں ہیڈ کوارٹر قائم کر کے مجھے اس مشن کا آغاز کرنا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا' ایلڈا اور روسلین کی ڈیوٹی کس وقت تبدیل ہوتی ہے اس لیے ہم دونوں نے اوپر تک رسائی کے لیے دو ''ریفرنس'' ذہن نشین کر لیے تھے۔ اگر دن والی ریسپشنسٹ روسلین موجود...... ہوتی تو ہم پروگرام کے مطابق خود کو الگ الگ ظاہر کرتے اور اپنے اپنے ریفرنس سے اوپر پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ایسی ایک کوشش میں ہمیں پہلے کامیابی حاصل ہو چکی تھی اور اگر ریسپشن پر ایلڈا نظر آتی تو ہمیں کوئی نیا چکر چلانا پڑتا کیونکہ اس کے سامنے سلوان یا بیگن سے ملنے کا بہانہ نہیں چل سکتا تھا اور میں اس نازک موقع پر ان کا ریفرنس استعمال کر کے کسی حماقت کا ثبوت نہیں دینا چاہتا تھا۔

ہماری خوش قسمتی کہ روسلین کی ڈیوٹی ابھی آف نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے اپنے طے شدہ منصوبے پر عمل کیا اور نہایت ہی آسانی کے ساتھ پانچ منٹ کے وقفے سے ''لفٹس'' تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمارا شمار اب وہاں کے معتبر ''ملاقاتیوں'' میں ہونے لگا تھا۔ چاروں لفٹس کو باری باری استعمال کر کے بالآخر ہم آٹھویں منزل پر ایک دوسرے سے مل گئے۔ پھر ہمیں تیسری منزل کے آخری اپارٹمنٹ تک رسائی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی اس منزل کے آخری سرے پر واقع تھا۔ میری معلومات کے مطابق مذکورہ اپارٹمنٹ اس وقت خالی تھا اور لاک بھی۔ ہمیں اس کا تالا کھول کر اندر پہنچنا تھا۔ تالا کھولنے کا ضروری سامان میں نے ''ہیرڈز'' کے ایک ہارڈ ویئر اسٹور سے خرید لیا تھا۔ میں نے راہداری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنقیدی نگاہ دوڑائی اور ہر طرف سکون ہی سکون پایا۔

میں نے صوفیہ سے کہا۔ ''تم لفٹس کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاؤ۔ انداز ایسا ہی ہو جیسے تم لفٹ کا انتظار کر رہی ہو لیکن کسی لفٹ کو کال نہیں کرنا اور جیسے ہی لفٹ اس منزل پر آ کر رکے تو تم میری طرف چل پڑنا۔ میں سمجھ جاؤں گا لفٹ میں سے کوئی اس منزل تک پہنچنے والا ہے۔ ہمارے ٹارگٹ اپارٹمنٹ کا لفٹ سے اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ میں بڑی آسانی سے سنبھل جاؤں گا۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

''بالکل سمجھ رہی ہوں۔'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تم بے فکر ہو کر تالے پر طبع آزمائی کرو۔ میں تمہیں کور دیتی ہوں۔''

آئندہ پانچ منٹ میں' میں نے وہ کام کر دکھایا جو اس بلڈنگ میں ہماری کامیابی کی کلید تھا۔ کسی کی نگاہ میں آئے بغیر ہم اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی کے اندر بخیر و عافیت پہنچ گئے۔ یہ اپارٹمنٹ ہمارے مشن کے لیے ہر حوالے سے محفوظ تھا۔ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ میں ساحل کو ربی موشے ہائمن کے چنگل سے نکالنے کے بعد اتنی بھیڑ بھاڑ

والی جگہ پر رکھوں گا اور وہ بھی ایک ایسے اپارٹمنٹ میں جو ربی کے خاص آدمیوں کے استعمال میں ہو۔ بعض اوقات چیزوں کا تاثر اور افادیت ایک دم برعکس ہو جاتی ہے...... اور وہ بھی ایک ایسا ہی وقت تھا۔

اتنے دنوں میں' میں تھرڈ آئی کے توسط سے اس اپارٹمنٹ میں متعدد بار آ جا چکا تھا۔ اس کی مکانیت اور دیگر ضروری معاملات مجھے اچھی طرح ذہن نشین تھے۔ وہ دو بیڈ' ایک سٹنگ اور ایک کامن پر مشتمل خوبصورت اپارٹمنٹ تھا۔ دیکھنے میں یہ آیا تھا کہ شام کو رخصت ہوتے وقت وہ لوگ کامن کی لائٹ کھلی چھوڑ جاتے تھے اور یہ ہمارے حق میں مفید ہی تھا۔ ہم نے باہر کی جانب کھلنے والی تمام سلائیڈنگ اور مینول ونڈوز کے پردے کھینچ کر اسی کشادہ کامن کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مذکورہ کامن میں ایک دیوار کے ساتھ مکمل صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ ہم نے اپنے سامان کو ایک کونے میں رکھا اور اس صوفے پر قبضہ کر لیا۔

میں نے صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میری غیر موجودگی میں تمہیں یہاں کسی قسم کا خوف تو محسوس نہیں ہوگا؟''

''اگر میرے ذہن میں ایسا کوئی خدشہ موجود ہوتا تو میں اتنی دور سے تمہارے ساتھ آتی ہی نہیں۔'' وہ بڑی ادا سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ویسے بھی یہ اپارٹمنٹ آباد ہے لہٰذا یہاں......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس نے کون سی بات کو زبان سے پھسلنے سے روکا تھا۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو' اب مجھے کوئی الزام نہ دینا۔ تم نے خود ذکر نکالا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ گھور کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب نہیں بلکہ تمہارا مطلب یہ تھا کہ یہ اپارٹمنٹ قاہرہ والے اپارٹمنٹ کی طرح غیر آباد نہیں جہاں کسی ایسی ویسی مخلوق کے اچانک نمودار ہونے کا اندیشہ ہو اور......''

''تمہیں تو اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے بس بہانہ چاہئے ہوتا ہے۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کہا۔ ''ہر شخص یہی کرتا ہے۔ جسے بہانہ مل جاتا ہے وہ اپنا مطلب پورا کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''واقعی تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''تم دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر اپنا مطلب نکالنا بخوبی جانتے ہو۔''

''میں پھر یہی کہوں گا کہ ہر شخص یہی کرتا ہے۔'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی کسی کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتا ہے اور کوئی کسی کی کنپٹی پر گن رکھ کر دھمکاتا ہے لیکن......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لمحے بھر کو توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن صوفیہ! میں نے تم پر تو ان میں سے کوئی بھی طریقہ اپلائی نہیں کیا۔''

''نہیں کیا...... پھر بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''میری ہر فتح کے پیچھے تمہارا ہی ہاتھ ہے صوفیہ۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے مگر شریر لہجے میں کہا۔ ''اگر تم میرا ساتھ نہ دیتیں تو میں یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ افسوس کہ ہمارا ساتھ بہت مختصر سا ہے۔ چند گھنٹوں کے بعد ہم بچھڑ جائیں گے۔ اگر تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملتا تو یقین جانو میں فتوحات کے ''انبار'' لگا دیتا۔''

''دنیا بہت چھوٹی ہے وجدان!'' وہ کھسک کر میرے نزدیک آ گئی۔ ''اگر تم چاہو گے تو ہم بعد میں بھی مل سکتے ہیں۔''

وہ دنیا کے چھوٹے ہونے کو ثابت کرنے کی خواہاں تھی۔ میں نے اس کی خواہش کا احترام کیا اور رہے سہے مابین فاصلے کو بھی مٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو صوفیہ! یہ دنیا واقعی بہت چھوٹی ہے۔''

ہمارے درمیان چند لمحات تک خاموشی اور سناٹا گویائی بن کر گونجتے رہے پھر صوفیہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی۔ ''تم سے باتوں میں کوئی نہیں جیت سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''میری ایک دوست کا دعویٰ ہے کہ عورت کی جیت' مرد کے سامنے ہارنے میں ہے۔ جو ہارنا نہیں جانتا' جیت اس کے قریب آنے سے کتراتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

اس نے اپنا خیال ظاہر کرنے کے بجائے عورت کی مخصوص نفسیات کا مظاہرہ کیا۔ تجسس آمیز لہجے میں پوچھنے لگی۔ ''یہ تمہاری کس دوست کا فرمان ہے؟''

میں نے ہار جیت والی وہ بات نیلگری کے حوالے سے کی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ اچانک اس کے بارے میں استفسار کر بیٹھے گی۔ اس نے پوچھ لیا تھا تو اس کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ میں نیلگری کو تو زیرِ بحث نہیں لانا چاہتا تھا لیکن صوفیہ کو مطمئن کرنا بھی ضروری تھا۔ میں تذبذب کی کیفیت ہی میں تھا کہ میری مشکل آسان ہو گئی۔ اسی لمحے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

ہم دونوں نے باہمی کیفیت سے باہر آتے ہوئے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر ہماری نگاہیں سٹنگ روم کی جانب اٹھ گئیں۔ ٹیلی فون سٹنگ روم میں رکھا ہوا تھا۔ صوفیہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ کس کا فون ہو سکتا ہے؟''

''کس خون تو کر سکتی ہے' فون نہیں۔'' میں نے زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے یہ کسی مس کا فون ہو۔ آؤ' دیکھتے ہیں۔''

ہم جس نوعیت کے اعصاب شکن حالات سے گزر رہے تھے ان میں اپنے حواس پر قابو رکھنا بہت ضروری تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے زندہ دلی سے زیادہ مؤثر اور کوئی شے ہو نہیں سکتی تھی۔

وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم فون اٹینڈ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''ہاں...... مگر محض نظر سے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ریسیور اٹھا کر ''ہیلو'' کہنے والی کسی حماقت کی مجھ سے توقع نہ رکھنا۔ اس وقت یہ اپارٹمنٹ بند ہے۔ اور اس کے اندر کوئی بھی موجود نہیں۔''

اس دوران میں فون کی گھنٹی دو تین مرتبہ بج چکی تھی۔ ہم کامن سے اٹھے اور سٹنگ میں پہنچ گئے۔ ٹیلی فون سیٹ میں ''کالر آئی ڈی'' کی سہولت موجود تھی۔ وہاں پر فلیش ہونے والے نمبر پر نگاہ پڑی تو میں چونک اٹھا۔

''زیرو تھری۔ فائیو ون سیون زیرو نائن فور ون۔'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''اوہ! یہ تو ہوٹل ٹاپ کا نمبر ہے۔''

''ہوٹل ٹاپ!'' صوفیہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا ان لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ہم یہاں چھپے بیٹھے ہیں؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''یہ کوئی دوسرا ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔''

''تم کس چکر کی بات کر رہے ہو وجدان!'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''آؤ' معلوم کرتے ہیں اس چکر کے بارے میں۔''

ہم فون کو بجتا چھوڑ کر دوبارہ کامن روم میں پہنچے۔ میں نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''صوفیہ! مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ صوفیہ بھی اسی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ امید تو یہی تھی کہ میری ہدایت کے مطابق وہ مجھے ڈسٹرب نہیں کرے گی۔ میں نے تیسری آنکھ کو زحمت دی اور پلک جھپکتے میں ہوٹل ٹاپ کے کچن میں پہنچ گیا۔ میرا ٹارگٹ سلوان تھا۔

اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور سلوان کچن میں ایک دیوار گیر فون کے ساتھ مصروف تھا۔ اس نے مخصوص شیف کیپ لگا رکھی تھی اور چہرے سے گہرا تفکر جھلکتا تھا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی وقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس اپارٹمنٹ میں بجنے والی فون کی گھنٹی سلوان ہی کا کارنامہ تھا پھر اگلے ہی لمحے اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ سلوان نے جیسے ہی ریسیور کو دیوار گیر کریڈل پر ٹکایا' اپارٹمنٹ کے فون کی گھنٹی بجنا بند ہو گئی۔

میں اس بات پر الجھ کر رہ گیا کہ سلوان کو اپارٹمنٹ پر فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی۔ وہ بیگن کے ساتھ ہی یہاں سے روانہ ہوا تھا اور جانتا تھا کہ اس وقت اپارٹمنٹ میں کوئی نہیں ہوگا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ کوئی گڑبڑ واقع ہو چکی ہے۔ کیا گڑبڑ؟ اس بارے میں سرِدست کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کچھ مزید جاننے کے لیے میں سلوان کے ساتھ چپکا رہا۔

وہ کچن سے نکلا اور ایک الگ تھلگ کمرے میں پہنچ گیا پھر پتلون کی جیب میں سے ایک سیل فون نکال کر اس کے کی پیڈ پر کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ میں سیل فون کے ننھے سے ڈسپلے پر نگاہ جمائے رہا۔ ڈائلنگ مکمل ہوئی تو میں چونک اٹھا۔ وہ ربی کے پرسنل سیل پر فون کر رہا تھا۔ اس کا یہی مطلب تھا کوئی اونچے پیمانے کی گڑبڑ ہو چکی ہے۔ ذہن میں حسبِ حال خدشے نے بھی سر اٹھا کر دیکھا...... کہیں میرا پلان چاک آؤٹ تو نہیں ہو گیا؟

یہ سوال جتنا سنگین تھا اتنی ہی سفاکی سے میرے ذہن نے اس کی تردید کر دی۔ ''نہیں' یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں۔''

ربی کا پرسنل سیل نمبر میرے حافظے میں نقش تھا۔ میں اسی نمبر پر کئی مرتبہ اس سے بات بھی کر چکا تھا لیکن افسوس کہ میں ربی کے ماحول میں اتر سکتا تھا اور نہ ہی سلوان کی باتیں سن سکتا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں ہرشل حنان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اپنے فربہ اسسٹنٹ سے کسی گمبھیر مسئلے پر بات کر رہا تھا۔ ان دونوں کے چہروں پر چھائی ہوئی گمبھیرتا نے

مجھے بتایا کہ میں جس گڑبڑ کے بارے میں سوچ رہا ہوں' اس کا تعلق ساحل والے بنگلے سے ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں ساحل کے بیڈروم میں پہنچ گیا۔ ان لمحات میں تھرڈ آئی بڑی فرماں برداری سے میرے کام آ رہی تھی۔

ساحل اپنے کمرے میں بالکل خیریت سے تھی۔

میرا دھیان گھوم پھر کر بیگن کی طرف چلا گیا۔ سلوان اگر اپارٹمنٹ پر فون کر رہا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے اسے امید تھی کہ شاید بیگن واپس اپارٹمنٹ میں آ گیا ہو...... یعنی وہ ساحل والے بنگلے پر نہیں پہنچا تھا۔ اس تجزیے کے ساتھ ہی میں نے تھرڈ آئی کا اسٹیئرنگ بیگن کی جانب گھما دیا۔

وہ کم بخت ساؤتھ اسٹار ہاسپٹل کے شعبۂ حادثات میں پڑا تھا۔ میں اس کے ماحول میں پہنچا اور چند لمحات ہی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی سنگین نوعیت کے حادثے کا شکار ہو کر ہی ''ساؤتھ اسٹار'' اسپتال پہنچا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اب اسے دو چار دن کے لیے اسپتال ہی میں رہنا تھا۔ بیگن کو پیش آمدہ حالات کو دیکھ کر ساری کہانی کھل کر سامنے آ گئی۔ وہ وقتِ مقررہ پر اپنی ڈیوٹی پر نہیں پہنچ سکا ہو گا چنانچہ بنگلے والوں کو تشویش ہوئی اور انہوں نے اپنی تشویش دور کرنے کے لیے سلوان سے رابطہ کیا جس کے نتیجے میں سلوان' بیگن کو اپارٹمنٹ پر ''چیک'' کر رہا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اگلے لمحے صوفیہ سے نگاہیں چار ہوئیں۔ وہ سوالیہ نظر سے میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ تشویشناک لہجے میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے فون کا کوئی جواب نہ پا کر سلوان سیدھا یہاں آئے گا۔''

''ایک امکان یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''اس کے علاوہ اور کون کون سے امکانات ہیں؟''

میں نے بتایا۔ ''وہ ساحل والے بنگلے کا رخ بھی کر سکتا ہے اور بیگن کو دیکھنے بھی جا سکتا ہے۔''

''ساحل والے بنگلے کا رخ کرنے کے لیے اسے اپنے حلیے میں مناسب تبدیلی کرنا ہو گی۔'' وہ منطقی انداز میں بولی۔ ''کم از کم سر پر وگ اور آنکھوں میں کانٹیکٹ لینس لگانا ہوں گے اور......'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لیے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بیگن کو دیکھنے وہ اسی صورت میں جا سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور وہ اس وقت کون سے اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔''

''تم موجودہ حالات کا بالکل درست تجزیہ کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے پوچھا۔ ''وجدان! اگر وہ اپارٹمنٹ کی طرف آ گیا تو کیا ہو گا؟''

اس کے لہجے سے گہری تشویش جھلکتی تھی۔ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ''مجھے تو نہیں امید کہ وہ ادھر کا رخ کرے گا کیونکہ فون کا جواب نہ پا کر وہ سمجھ گیا ہو گا کہ بیگن اپارٹمنٹ میں موجود نہیں اور بالفرضِ محال وہ ادھر آ بھی جاتا ہے تو آ جائے۔ اس کا حشر بیگن سے بھی زیادہ عبرتناک ہو گا۔ میں اسے کسی ساؤتھ' نارتھ یا ایسٹ' ویسٹ اسٹار اسپتال میں نہیں جانے دوں گا بلکہ وہ نامراد ''بہائی گارڈن'' اسپتال کے اسپیشل وارڈ نمبر ''ستائیس۔ سی'' ہی میں رہے گا جہاں صوفیہ نامی ایک خوبصورت' ہینڈسم ''نرس'' اسے اٹینڈ کرے گی۔''

وہ الجھن زدہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے سرسری انداز میں یہ کہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ ''ابھی آتا ہوں۔''

آنکھیں بند کرتے ہی میں نے تھرڈ آئی کو زحمت دی اور سیدھا سلوان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہوٹل ٹاپ سے نکل آیا تھا اور اپنی گرے گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جا رہا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا' اس کا رخ اس پوش رہائشی علاقے کی جانب ہے جہاں ساحل والا بنگلا واقع تھا۔ سلوان اس وقت اپنے اصلی حلیے میں تھا۔ میں اسے پہلے بھی ایک مرتبہ اسی حلیے میں بنگلے میں جاتے دیکھ چکا تھا۔ جب وہ ربی موشے ہائمن کو بن گورین ائرپورٹ پر ریسیو کرنے آیا تھا۔ وگ اور کانٹیکٹ لینس لگا کر حلیہ بدلنے والی کہانی ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی اور میرے پاس اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ میں ایسے غیر متعلقہ معاملات میں سر کھپاتا۔ ایک مرتبہ میری ساحل ان خبیثوں کے چنگل سے نکل آتی تو پھر میں فرصت سے ایک ایک کو دیکھ لیتا۔

سلوان' ساحل والے بنگلے پر پہنچ گیا۔ جلد ہی وہ ہرشل سے میٹنگ کر رہا تھا۔ اس میٹنگ میں ہرشل کا فربہ اسسٹنٹ بھی شامل تھا۔ یہ میٹنگ نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور فربہ اسسٹنٹ ایک گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ وہ سلوان والی گرے گاڑی میں گیا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ سلوان اسی بنگلے پر ٹھہرے گا۔ میں فربہ اسسٹنٹ کے ساتھ ہو لیا۔ جب گرے گاڑی ساؤتھ اسٹار ہاسپٹل کے سامنے پہنچی تو میں

واپس آ گیا۔ یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ بیگن کو پیش آنے والے حادثے کی خبر ساحل والے بنگلے تک پہنچ گئی تھی جبھی فربہ اسسٹنٹ کو اس طرف روانہ کیا گیا تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق کم از کم دو دن تک تو بیگن کو اسی اسپتال میں رہنا تھا۔ یہ ایک تسلی بخش صورتِ حال تھی لہٰذا میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

صوفیہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ''ہو آئے؟ کیا رہا؟''

میں نے مناسب الفاظ میں اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے پُرسکون انداز میں ایک تسلی بخش سانس لی اور بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے' معاملہ سنبھل گیا ورنہ میں تو گھبرا ہی گئی تھی۔ اگر سلوان واقعی یہاں آ جاتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔''

''تم اتنی جلد گھبرایا مت کرو' اللہ بڑا کارساز ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ یوں چونکی جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''ایک بات پوچھوں وجدان! سچ سچ بتاؤ گے؟'' اس کے انداز میں مخصوص ٹٹول شامل تھی۔

''ہاں پوچھو' ضرور بتاؤں گا۔'' میں نے فراخ دلی سے کہا۔

''کیا تمہیں ٹیلی پیتھی آتی ہے؟''

''نہیں' مجھے ٹیلی پیتھی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو وجدان!'' وہ جھنجلا گئی۔

''لو ہو گیا سنجیدہ......''

آئندہ دس منٹ تک اسے میری سنجیدگی کا مزہ چکھنا پڑا۔

اس ننھی سی قربانی نے اس کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ میں نے گول مول انداز میں اسے اپنی صلاحیت کے بارے میں بتا دیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ جب میں خاموش ہوا تو وہ ہیجان خیز لہجے میں بولی۔

''وجدان! تم یہ سب کس طرح کر لیتے ہو؟''

''ایسے......''

میں نے اسے اپنے قبضے میں رکھتے ہوئے ایک لفظ ادا کرنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں پھر تھرڈ آئی کے توسط سے تمام اہم محاذوں کے معائنے کو نکل گیا۔ سب طرف خیریت ہی خیریت تھی۔ مطمئن ہونے کے بعد میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''ہاؤ امیزنگ!'' وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

میں نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔

اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''ابھی تم کہاں گئے تھے؟''

میں نے بتایا۔ ''میں دوستوں اور دشمنوں کو جھانکنے گیا تھا۔ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ہمارے لیے کسی قسم کی پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ حالات بتاتے ہیں ہمارا کوئی دشمن اس اپارٹمنٹ کا رخ نہیں کرے گا۔ تم اطمینان سے یہاں بیٹھ کر میرا انتظار کر سکتی ہو۔''

''اوہ!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ''وجدان! تمہاری تھرڈ آئی کی صلاحیت تو بڑی خوفناک اور حیرت انگیز ہے۔ شکل سے تو نہیں لگتا کہ تم اتنے خطرناک ہو گے۔''

''صورتیں اکثر دھوکا دے جاتی ہیں صوفیہ!'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''صورت سے میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟''

''یوسف الظاہری!'' وہ بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''یعنی تمہارا دوست یوسف الظاہری؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تم نے بالکل ٹھیک کہا وجدان! صورتیں اکثر دھوکا دے جاتی ہیں۔ تم یوسف الظاہری نہیں ہو لیکن یوسف الظاہری دکھائی دیتے ہو۔ اگر تم یہ میک اپ اتار بھی دو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تم وجدان نظر آنے لگو گے۔ کوئی اس وجدان کے اندر جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ وہ کتنی تہلکہ خیز صلاحیت کا مالک ہے۔''

اس کا لہجہ خواب ناک سا ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم نے تو میرے اندر اور باہر جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ تمہیں یہ تجربہ کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''مجھے افسوس ہو رہا ہے وجدان!'' وہ کسمسائی۔

''کس بات کا افسوس؟''

''اس بات کا کہ ہمارے ساتھ کے چند گھنٹے باقی ہیں۔'' وہ بوجھل آواز میں بولی۔

''اوہ!'' میں نے ایک طویل سانس لینے پر اکتفا کیا۔

وہ اسی ٹرانس کی کیفیت میں بولی۔ ''وجدان! تمہاری تھرڈ آئی کی صلاحیت نے مجھے متاثر کیا ہے۔ اگر ہمیں کچھ عرصے تک ساتھ رہنے کا موقع ملتا تو میں تم سے اس سلسلے میں ضرور کچھ سیکھتی۔'' پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے

استفسار کیا۔ ''کیا میں بھی اپنی تھرڈ آئی کو بیدار کرسکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے پورے وثوق سے کہا۔ ''اگر تم سنجیدگی اور دل جمعی سے ارتکاز اور سانس کی مخصوص مشقیں کرو تو تمہارے قدموں میں کامیابی کا راستہ کھل سکتا ہے۔ سچی لگن سے محنت کرنے والے لوگ اپنی منزل کو ضرور پا لیتے ہیں۔''

''کیا تم مجھے مخصوص مشقیں بتا سکتے ہو؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''تم چاہو تو انہیں اپنے پاس نوٹ بھی کرلو۔''

اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا۔ میں نے ترتیب وار بڑی تفصیل سے اسے ارتکاز اور سانس کی چار پانچ مخصوص مشقیں لکھوادیں۔ ساتھ ہی ان مشقوں کا دورانیہ اور اس دوران میں پیش آنے والے مختلف مسائل سے بھی آگاہ کردیا۔ میں اس کام سے فارغ ہوا تو وہ کہنے لگی۔

''وجدان! یہ ''تھرڈ آئی'' کے عنوان سے چند صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ سا مرتب ہوگیا ہے۔ میری طرح تم بھی یہ بات اچھی طرح جانتے ہو پُراسرار اور ٹیکنیکل علوم پر دنیا کی کامل ترین کتاب بھی سیکھنے والوں کے لیے کسی استاد کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک نصابی کتابچہ ہے۔ اس میں درج مخصوص احکام کو انجام دینے کے دوران میں مجھے قدم قدم پر نہ سہی البتہ کہیں نہ کہیں تمہاری مدد اور راہنمائی کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایسے مواقع پر میں تمہیں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں گی؟''

اس کے اس ایک سوال میں سیکڑوں استفسارات پوشیدہ تھے جیسے ایک صوفیہ کے اندر میں نے ناز و ادا کی سیکڑوں صوفیہ دریافت کی تھیں۔ اس کی مکمل دریافت کے لیے ایک عمر کی ضرورت تھی لیکن افسوس کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ہمارے راستے جدا ہونے والے تھے اور جب تک جدائی کے سفر کا آغاز نہیں ہوا تھا' ہم افسوس کی ایک ہی کشتی میں سوار تھے۔ یہ الگ بات کہ ہمارے افسوس کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ تھرڈ آئی کی بیداری کے سلسلے میں مجھ سے بہت کچھ سیکھنا چاہتی تھی لیکن ہمارے بچھڑنے کی گھڑی آن پہنچی تھی اور مجھے افسوس تھا کہ ''یہ بچھڑنا'' راحت اور آسودگی فراہم کرنے والی صوفیہ کو ملول کررہا تھا۔

شاید یہ آفاقی اصول ہے کہ دوسروں کو خوشیاں اور آسائشیں فراہم کرنے والے اندر سے دکھی اور ناآسودہ رہتے ہیں۔ یہ بہت ہی باریک نکتہ ہے جسے سمجھنے کے لیے لطیف احساس کا ہونا ضروری ہے۔

میں نے صوفیہ کی آزردگی کو زائل کرنے کے لیے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے ڈھونڈنے کے لیے تمہیں ہل بیل جوتنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں سے سیدھا تبت پہنچوں گا۔ تم یوسف الظاہری اور ہیرالڈ تھامس کے پاس لندن جانے والی ہو۔ ہیرالڈ تھامس' تبت کے چیف لاما چنگ فورن یوشی سے رابطے میں رہتا ہے۔ تم ہیرالڈ تھامس اور چنگ فو کے ذریعے مجھ سے رابطہ رکھ سکتی ہو۔ تمہیں کسی بھی معاملے میں میری رہنمائی کی ضرورت پیش آئے تو میں حاضر ہوں۔''

وہ چند لمحات تک بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''یہ سب کچھ کہنا جتنا آسان ہے عملاً ایسا ممکن نظر نہیں آتا۔ تبت دنیا سے لینڈ لائن ٹیلی فون تک رابطے پر نہیں ہے۔ میں تمہیں کس ذریعے سے اپروچ کروں گی۔''

''انسان اگر چاہے تو رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے لیے لینڈ لائن فون کی کیا شرط ہے۔ آخر کو ہیرالڈ تھامس اور چنگ فو بھی تو کسی نہ کسی طرح آپس میں رابطہ کرتے ہی ہیں نا' بہرحال۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر کہا۔

''صوفیہ! تمہیں جب بھی میری مدد یا رہنمائی کی ضرورت پیش آجائے تم اپنے بیڈروم کی کسی بھی دیوار پر ''ہیلپ'' کا پرچہ چپکا دینا۔ میں خود تم سے رابطہ کرلوں گا۔''

''لیکن تمہیں کیسے پتا چلے گا' میرے بیڈروم کی دیوار......'' وہ بولتے بولتے اچانک رکی۔ ہیجان خیز انداز میں مجھے دیکھا پھر تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''تو......تو کیا تم تھرڈ آئی کے توسط سے میرے بیڈروم میں آتے جاتے رہو گے؟''

''اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو تو مذکورہ پرچہ سٹنگ روم کی دیوار پر چپکا دینا۔'' میں نے کہا۔

''تاکہ جس کی نظر بھی پڑے وہ مجھ سے پوچھے کہ مجھے کس سلسلے میں ہیلپ کی ضرورت ہے۔ ہوں؟'' اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ''تم میرا مذاق بنوانا چاہتے ہو؟''

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں مذاق سے بچانے کے لیے بیڈروم والا آئیڈیا دیا تھا۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔ مجھے تمہارے ماحول میں جہاں بھی ''ہیلپ'' کی سن گن ملی' میں تمہاری خبر گیری کے لیے چلا آؤں گا۔''

ہمارے درمیان تھوڑی دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی

رہیں پھر صوفیہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''وجدان! تم کتنے بجے تک اپارٹمنٹ سے روانہ ہوگے؟''

''میرا پروگرام گیارہ بجے تک نکلنے کا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ بنگلا یہاں سے زیادہ دور نہیں لہٰذا جانے اور آنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوگا نہ ہی اس بنگلے کے اندر مجھے بہت زیادہ محاذ کھولنے کا شوق ہے پھر بھی اس مشن کے لیے میں نے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کا وقت ذہن میں رکھا ہے۔ عین ممکن ہے میں ایک گھنٹے بعد ہی تمہارے پاس ہوں۔ زیادہ سے زیادہ تمہیں رات ایک بجے تک میرا انتظار کرنا ہوگا۔ کیا تم ایسا کرلو گی؟''

وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ ''ہاں تم میری طرف سے بےفکر ہوجاؤ۔ یہاں کے معاملات کو میں سنبھال لوں گی۔''

ٹیلی فون سیٹ کی پیشانی پر ایک چھوٹے سے کیبنٹ میں اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔سی کا فون نمبر درج تھا۔ میں نے وہ نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا...... زیرو تھری۔ فائیو ون سکس ڈبل سیون ڈبل تھری۔ پھر صوفیہ سے کہا۔ میں دراصل اسے زیادہ سے زیادہ اطمینان دلانا چاہتا تھا۔

''یہاں کا فون نمبر مجھے یاد رہے گا۔ میں گاہے بہ گاہے ان تمام کرداروں کے ماحول میں جھانکتا رہوں گا جن میں سے کوئی بھی اس اپارٹمنٹ کی طرف آسکتا ہے۔ اگر مجھے محسوس ہوا' سلوان یا کوئی دوسرا شخص ادھر کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں کہیں سے بھی فون کرکے تمہیں قبل از وقت آگاہ کردوں گا۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تم اپارٹمنٹ سے نکل جانا۔''

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''وجدان! مجھے پورا یقین ہے تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کوئی مشکل یا دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں مطمئن ہوں۔ تم بھی بےفکر ہوکر پیش قدمی کرو۔''

میں اٹھ کر ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہیں اسٹینڈ پر میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری رکھی دیکھی تھی۔ میں اس ڈائریکٹری کو اٹھا لایا اور ''یلو پیجز'' والا پورشن کھول کر مطالعہ کرنے لگا۔

صوفیہ نے پوچھا۔ ''کس کا نمبر تلاش کررہے ہو؟''

''رینٹ اے کار کا۔'' میں نے جواب دیا۔

''رینٹ اے کار!'' وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑائی۔ ''کیا تم یہاں سے کسی کرائے کی گاڑی میں بیٹھ کر اس بنگلے کی طرف جاؤ گے؟''

''نہیں۔'' میں نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔

''یہاں سے بنگلے تک پہنچنے اور وہاں سے واپس آنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں سلوان اور بیگن کی طرح چہل قدمی کرتے ہوئے بنگلے تک چلا جاؤں گا اور اگر کوئی غیر متوقع صورتِ حال پیش نہ آئی تو یہی طریقہ اختیار کرکے ہم واپس بھی آجائیں گے یا پھر کسی ہنگامی حالت میں بنگلے میں موجود گاڑیوں میں سے کسی کو استعمال میں لاسکتے ہیں۔ میری تازہ ترین معلومات کے مطابق بنگلے میں اس وقت تین گاڑیاں کھڑی ہیں۔''

''پھر......'' اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ ''پھر تم رینٹ اے کار والوں کو کیوں تلاش کررہے ہو؟''

''تل ابیب سے یروشلم تک کے سفر کے لیے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے رات کے آخری پہر ہمیں ٹرانسپورٹ کا کوئی مسئلہ پیش آجائے۔''

''اوہ!'' صوفیہ نے ایک طویل سانس خارج کی اور گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اگر تم کہو تو میں اس سلسلے میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہوں گی۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

وہ بولی۔ ''میری مانو تو رینٹ اے کار کا خیال دل سے نکال دو۔''

''پھر کس کو دل میں بساؤں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس مقصد کے لیے ریڈیو کیب زیادہ مناسب رہے گی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے یکلخت نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ صوفیہ کی ذہانت نے مجھے متاثر کیا۔ اس نے ایک معقول بات کی تھی۔ واقعی ان حالات میں مجھے رینٹ اے کار کی نہیں بلکہ ریڈیو کیب کی ضرورت تھی۔ میں نے تل ابیب کی صاف شفاف سڑکوں پر چمچماتی ریڈیو کیبز کو دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ پُرآسائش اور محفوظ ترین کاریں اندرونِ شہر کے علاوہ بیرونِ شہر بھی جاتی تھیں۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''وجدان! کیا میرا خیال تمہیں پسند نہیں آیا؟''

''ایک دم پسند آیا ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''تمہارے مشورے کے مطابق میں نے رینٹ اے کار کو دل و دماغ سے نکال دیا ہے۔ اب میں اپنی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ریڈیو کیب والوں سے رابطہ کرکے معلومات حاصل کرتا ہوں۔''

اگلے ہی لمحے میں ''بلوم اسٹار'' ریڈیو کیب سروس والوں

سے بات کر رہا تھا۔ وہاں سے میرے مختلف سوالات کے جواب میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں' وہ کچھ اس طرح تھیں۔

''بلوم اسٹار'' کی کوئی ریڈیو کیب حاصل کرنے کے لیے ضرورت کے وقت سے آدھا گھنٹا پہلے ''آرڈر'' نوٹ کروانا پڑتا تھا۔ خاص طور پر بیرون شہر جانے کے لیے بکنگ کی شرط لازمی تھی۔ میں نے کرائے وغیرہ کے لیے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح کے چھ بجے سے رات کے بارہ بجے تل ابیب سے یروشلم پہنچانے کے لیے ریڈیو کیب کا ڈیڑھ سو امریکی ڈالر یعنی پانچ سو پچیس نیو شیکل تھا اور رات بارہ بجے سے صبح کے چھ بجے تک یہی کرایہ دو سو امریکی ڈالر بہ الفاظ دیگر سات سو نیو شیکل تھا۔ میں نے بلوم اسٹار والوں سے کہہ دیا کہ اگر مجھے ریڈیو کیب کی ضرورت ہوئی تو میں فون کر کے انہیں مطلع کردوں گا۔

اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے دس منٹ تک تھرڈ آئی کے توسط سے تل ابیب کے مختلف علاقوں کی سیر کی۔ ساحل اپنے بیڈ روم میں سونے کے لیے بیڈ پر دراز ہو چکی تھی۔ ربی بھی لمبی چوڑی تانے سو رہا تھا۔ میں اس کی تازہ ترین ''طبیعت'' کا احوال نہ لے سکا کیونکہ جب میں نے اس بنگلے میں پہنچ کر ہرشل کے ماحول کو چھوا تو وہ ربی کے مخصوص کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ میں ہر محاذ کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو گیا کہ ان میں سے کوئی آج رات اس اپارٹمنٹ کی طرف آنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اگر ان کا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو اب تک ادھر کا چکر لگا چکے ہوتے۔

اپارٹمنٹ کو چھوڑنے سے پہلے میں نے تھوڑا سا وقت صوفیہ کو بھی دیا۔ اس کے بعد ان ہدایات کے ساتھ وہاں سے نکل آیا۔

میری غیر موجودگی میں وہ اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کو اندر سے لاک رکھے گی۔

کسی کال بیل کی آواز پر وہ کوئی توجہ نہیں دے گی نہ ہی کسی دستک کو خاطر میں لائے گی۔

وہ کسی فون کال کو بھی اٹینڈ نہیں کرے گی ماسوائے میری کال کے۔

میں اگر اسے کال کروں گا تو اس کی پہچان یہ ہوگی۔ میں ایک کے بعد رابطہ منقطع کر دوں گا۔ پھر ٹھیک ایک منٹ پر دوبارہ کال کروں گا لیکن حسب معمول ایک بیل کے بعد لائن کاٹ دوں گا اور اس کے فوراً ہی بعد سہ بارہ فون کروں گا۔

اگر ایسی صورت حال اس کے سامنے نمودار ہو تو وہ بے دھڑک فون اٹینڈ کر سکتی ہے۔ ریسیور کو کان سے لگانے کے بعد وہ خاموش رہے گی۔ جو کچھ بھی کہنا ہوگا' میں ہی کہوں گا۔

واپسی...... کامیاب واپسی پر بھی میں ایک خاص انداز میں دروازے پر دستک دوں تو وہ بے خوف ہو کر ہمارے لیے دروازہ کھول سکتی ہے۔

اس نے پوری توجہ سے میری احکام نما ہدایات کو سنا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اوکے!''

میں اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

☆......☆

وہ میری زندگی کی سب سے سنسنی خیز رات تھی۔

میں نے جس منزل کو پانے کے لیے ذہنی اور جسمانی اذیتیں برداشت کیں' وہ منزل آج مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ مجھے یہ چند قدم بڑھا کر آگے آنا تھا اور ہاتھ بڑھا کر اس منزل کو تھام لینا تھا۔ ساحل کا حصول میرے لیے ایسا ہی تھا جیسے جاں کنی کے عالم میں کسی شخص کو زندگی کی نوید سنا دی جائے۔ میں ان مسرور کن خیالات اور طمانیت بخش احساسات کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ آج کی رات ہمارے لیے شب وصال ثابت ہوگی۔ ہمیں جدا ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن محسوس ہوتا تھا صدیاں بیت گئی ہوں۔

میں شالوم اسٹریٹ سے نکل کر پیدل ہی ہرمن اسٹریٹ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے لیکن محسوس یہی ہوتا تھا' تھوڑی دیر پہلے ہی شام ڈھلی ہو۔ تل ابیب کی رونق آدھی رات کو بھی عروج پر تھی۔ رنگ و نور کا ایک سیلاب تھا جو رواں دواں سڑکوں پر دوڑ رہا تھا۔ مجھے یہ رونق اور چکا چوند بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ دل میں اگر کوئی خوشی یا کسی خوشی کا احساس جاگزیں ہو تو ہر شے خوبصورت اور دلکش دکھائی دینے لگتی ہے۔ وصال محبوب کا امکان ویرانے میں بہار اتار دیتا ہے۔

فضا میں اب وہ دن والی حدت اور شدت باقی نہیں رہی تھی۔ تل ابیب ایک ساحلی شہر ہے۔ دنیا کے دیگر ساحلی شہروں کی طرح یہاں کا موسم عموماً دن میں گرم مرطوب اور رات میں قدرے خشک مگر ہوادار ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس نے فضا میں ایک قسم کی خنکی بھر دی تھی۔ میڈی ٹرینین MEDITERRANEAN کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے تل ابیب کے موسم کو خاصا خوشگوار کر دیا تھا اور موسم کی یہ خوشگواریت کچھ کر گزرنے کو اکساتی تھی۔ میں تو پہلے ہی بے حد اکسایا ہوا تھا۔ ''میڈی

ٹرینین سی'' کی مہربان ہواؤں نے اس اکساہٹ میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ میں خراماں خراماں ایک خاص موڈ کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔

ہرمن اسٹریٹ پر سفر ختم ہوا تو میں نے آگے کی مسافرت کے لیے شیردن اسٹریٹ پکڑ لی۔ شیردن اسٹریٹ سیدھی مجھے اس علاقے میں پہنچا دیتی جہاں ساحل والا وسیع و عریض بنگلا واقع تھا۔ یہ ایک پوش اور خاموش رہائشی علاقہ تھا۔ دنیا کے دوسرے پوش رہائشی علاقوں کے مانند اس علاقے کے طور طریقے بھی اپنے ہی تھے۔ یہاں بسنے والے اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کسی دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہتے تھے۔ ہر شخص کی اپنی زندگی تھی اور اس سے کسی دوسرے شخص کی زندگی متاثر نہیں ہوتی تھی۔ یہ خصوصیات اگرچہ خوش اطواری میں آتی ہیں لیکن اپنے پڑوسیوں اور محلے داروں سے اس قدر بے گانگی اور لاتعلقی بھی اچھی نہیں لگتی۔ یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہ انسانوں کی کوئی بستی یا نگری نہ ہو بلکہ صاحب ثروت خواتین و حضرات کا ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہو جس کے ہر ڈیپارٹمنٹ میں ایک الگ ہی آئٹم سجا ہو۔

شیردن اسریٹ۔ کے اختتام پر قریات عطائم کا علاقہ ہے جہاں کھانے پینے کے اچھے اور معیاری ریسٹورنٹ واقع ہیں۔ رات کا کھانا ہم نے بہت جلدی یعنی اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی میں پہنچنے سے پہلے کھا لیا تھا۔ مجھے اس وقت بھوک تو محسوس نہیں ہو رہی تھی' تاہم میں چند منٹ کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر گزارنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے قریات عطائم کا علاقہ انتہائی موزوں تھا۔

میں ایک کافی ہاؤس میں آ بیٹھا۔ میں ان لمحات میں کافی یا چائے پینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ دونوں اشیا مجھ پر الٹا اثر کرتی تھیں یعنی نیند بھگانے کے بجائے یہ میرے اعصاب کی مالش کرنے لگتیں اور دل چاہتا کہ تھوڑا آرام کر لیا جائے۔ مجھے تو چند منٹ کے لیے بیٹھنے کا بہانہ چاہیے تھا۔ ویسے اس کافی ہاؤس کے نیون سائن نے مجھے خاصا متاثر کیا تھا۔ کافی ہاؤس کا نام ''ہاٹ۔ این۔ کولڈ'' تھا۔ اس کے نیون سائن میں آرٹسٹک ٹچ تھا۔ ''ہاٹ'' اور ''کولڈ'' کے الفاظ کے درمیان این (N) شیپ میں ایک ڈانس کرتی ہوئی حسینہ دکھائی گئی تھی جو رقص کرتے ہوئے کبھی ہاٹ کی طرف اشارہ کرتی اور کبھی کولڈ کی جانب۔ مطلب یہ تھا یہاں گرم اور ٹھنڈا دونوں طرح کا مشروب دستیاب ہے۔ اس ہاٹ این کولڈ کے نیچے بڑے اسٹائلش انداز میں ''کافی ہاؤس'' کے الفاظ روشن تھے۔ کسی حد تک اسی سے ملتا جلتا ایک نیون سائن کراچی کے بمبینو سینما پر بھی کسی زمانے میں دکھائی دیتا تھا۔ اچھا کاروباری شخص لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے پبلسٹی کا سہارا ضرور لیتا ہے اور پبلسٹی میں ''اسٹنٹ'' کی بڑی اہمیت ہے۔ یہودیوں سے زیادہ کاروبار کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا۔ مجھے چائے یا کافی کی حاجت نہیں تھی اس کے باوجود بھی میں ''ہاٹ۔ این۔ کولڈ'' کے پبلسٹی اسٹنٹ سے متاثر ہو کر کافی ہاؤس میں جا بیٹھا تھا۔

میں نے آرڈر دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ بنگلے سے اب میں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ میں اس کافی ہاؤس سے اٹھتا اور بمشکل پانچ منٹ میں پوش رہائشی علاقے میں داخل ہو جاتا۔ دو چار گلیاں گھوم کر ساحل والے بنگلے تک پہنچنے میں مزید پانچ منٹ لگ جاتے۔ اس سے پہلے مجھے تھرڈ آئی کے توسط سے فائنل راؤنڈ کھیلنا تھا اور اسی کھیل کے لیے میں نے آنکھیں بند کی تھیں۔ مجھے امید تھی ویٹر پانچ منٹ سے پہلے کافی سرو نہیں کرے گا۔ میرے لیے یہ مہلت کافی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنی جانِ تمنا کے بیڈ روم میں جھانکا۔ آخری بار جب میں ساحل کے ماحول میں داخل ہوا تو وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ اب جو دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔ بیڈ روم میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا جس کی نیلگوں روشنی بڑے رومینٹک انداز میں خواب گاہ کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ میں چند لمحات تک ساحل کو سوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے سینے کا ہموار زیر و بم ظاہر کرتا تھا' وہ اس وقت گہری نیند میں ہے۔ گہری اور پُرسکون نیند!

ساحل کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ آج اس خوبصورت پُرآسائش قید خانے میں اس کی آخری رات ہے اور وہ بھی آدھی رات۔ چند منٹ بعد تو میں اس کے پاس ہوتا پھر وہ میرے پاس ہوتی...... گویا ہم ایک دوسرے کے پاس ہوتے۔ اس یکجائی کے تصور نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی جگا دی۔ میں نے ساحل کے ماحول میں سرگوشی کی اور وہاں سے چلا آیا۔

''ساحل! تمہارے انتظار اور ہمارے وصال کی گھڑیاں تمام ہوئیں۔ میں آ رہا ہوں......''

حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا' میری آواز اس کے ماحول تک نہیں پہنچی ہوگی لیکن میں نے یہ جملہ ادا کر کے بہت اطمینان اور سکون محسوس کیا تھا۔ بعض لوگ تو دیوار کو اپنا احوال سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔ میں نے تو ایک جیتے جاگتے ماحول میں سرگوشی کی تھی۔

ساحل کے بعد ربی موشے ہائمن کا نمبر آتا تھا لیکن اس

تک میں براہِ راست رسائی حاصل نہیں کر پاتا تھا۔ پتا نہیں اس ساحر نے میری تھرڈ آئی کی راہ میں کون سا سنہری جال بن رکھا تھا کہ میرے تصور کی پرواز اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نادیدہ سنہری جال میں پھنس کر رہ جاتی تھی۔ اس روئے زمین پر ابھی تک دو ہی ایسی ہستیاں میرے تجربے میں آئی تھیں جن تک میری رسائی ممکن نہیں ہو سکی تھی۔ ایک ہستی تھی ربی موشے ہائمن اور دوسری ییلگری!

ییلگری کا نام ذہن میں آتے ہی نگاہ کے سامنے اس کا ہوشربا سراپا گھوم گیا۔ پھر اس سراپا کے تقاضے یاد آنے لگے۔ اس یاد نے میرے رگ و پے میں ایک سنسناہٹ سی بھر دی۔ ییلگری کا ایک نیا روپ کھل کر سامنے آیا تھا۔ وہ مجھے اپنا محبوب بھی تسلیم کرتی تھی اور دھونس دھاندلی سے مجھ پر تسلط بھی جما کر رکھنا چاہتی تھی۔ ایسا بھلا کہیں ہوا ہے؟ محبوب نہ ہوا گھڑے کی مچھلی ہو گئی، جب جی چاہا ہاتھ ڈال کر پکڑ لی۔

میں نے ییلگری کے رنگین و سنگین تصور کو ذہن سے جھٹکا اور ربی تک رسائی کے لیے سنہری بالوں والے سوئیڈ بوئیڈ دراز قامت ہرشل حنان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ ربی کا سیکریٹری ہرشل اس وقت اسی چھوٹے سے کمرے میں موجود تھا جو ربی کے بیڈ روم سے ملحق تھا۔ اس کمرے میں، میں نے سب سے پہلے ہرشل کو دودھ کی اسکریننگ کرتے دیکھا تھا اور اب اس اسکریننگ کا سبب واضح ہو چکا تھا۔ ربی ایک کارڈیالوجسٹ کے زیرِ علاج تھا لہٰذا اسے شفاف اور چکنائی سے پاک دودھ پینے کو دیا جا رہا تھا۔ اس کو... ڈاکٹر بھی پسند آیا تھا تو منا ہم! جو بے چارہ یروشلم سے چل کر اسے اٹینڈ کرنے تل ابیب آیا کرتا۔ ربی کی بیماری اب پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی دل کا معاملہ ہو گیا تھا۔ ممکن ہے یہ مجھ سے ''دل'' لگانے کا نتیجہ ہو۔ میں اپنے دشمنوں سے کچھ اسی قسم کی ''دل لگی'' کرتا ہوں۔

ہرشل اس وقت بھی ایک ایزی چیئر میں دبکا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ پچھلی مرتبہ جب میں نے اس کے ماحول میں جھانکا تھا تو وہ جیکی کولنز کے ایک مادر پدر آزاد ناول کے مطالعے میں غرق تھا۔ اس وقت بھی اس کا انہماک کسی غرقابی ہی سے مشابہ تھا۔ میرے دل میں تجسس جاگا کہ معلوم کروں، وہ کون سا ناول پڑھ رہا ہے۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ جیکی کولنز کا ناول نہیں تھا۔ میرے تجسس نے تھوڑی جستجو کے بعد پتا چلا لیا کہ ہرشل کے ہاتھوں میں اس وقت امانڈا الیئر کا ایک بیسٹ سیلر ناول ''بینگ مائی وائف'' تھا۔ امانڈا الیئر، جیکی کولنز سے بھی دو چار ہاتھ آگے کی شے ہے۔ ہرشل حنان کے مطالعاتی ذوق کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بڑھا کو برسوں کا بگڑا ہوا ہے۔

ہرشل، ربی کا پرسنل سیکریٹری تھا اور کسی دم کے مانند اس کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ اس بنگلے میں ہرشل کی موجودگی یہی ظاہر کرتی تھی، ربی بھی اپنے بیڈ روم میں محوِ استراحت ہوگا۔ میں نے ہرشل کو اس کے حال پر چھوڑا اور سلوان کے ماحول کی جانب چھلانگ لگا دی۔

سلوان، ہرشل کے فربہ اسسٹنٹ کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ ایک بیڈ روم تھا اور وہ دونوں اپنے اپنے بستر پر بیٹھے کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ فربہ اسسٹنٹ کی وہاں موجودگی اس بات کی نشاندہی کرتی تھی کہ ساؤتھ اسٹار ہاسپٹل کے معاملے کو نپٹا لیا گیا ہے اور فربہ اسسٹنٹ بیگن کو اسپتال میں محفوظ سمجھ کر واپس آ گیا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ اس وقت سلوان کو وہاں کی رپورٹ پیش کر رہا ہو۔ ان کے بیڈ تک پہنچ جانے کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ سونے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں نے ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد باورچی، بالائی منزل والا مسلح گارڈز، بیرونی گیٹ پر متعین گارڈز اور بیگن کی خبر لی۔

سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ بیگن کی حالت خاصی تشویشناک تھی۔ اس کا منہ، سر سفید پٹیوں میں چھپا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ اور بازو پر بھی لمبی چوڑی بینڈیج نظر آ رہی تھی۔ اسے اس حادثے میں شدید نقصان پہنچا تھا۔ مجھے حادثے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا البتہ یہ بات یقینی تھی کہ وہ دو تین روز تک اس اسپتال کا مہمان رہے گا۔ اس وقت وہ بے ہوش تھا۔

ویٹر کی آمد کو محسوس کر کے میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ میز پر کافی کے برتن چن رہا تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ واپس جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

''کیا مجھے ایک کاغذ اور قلم مل سکتا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔ ''ایک منٹ سر! ابھی لاتا ہوں۔''

وہ ایک منٹ سے بھی پہلے واپس آ گیا پھر کاغذ قلم مجھے تھما کر پلٹ گیا۔

میں نے اس کے دیئے ہوئے رف پیڈ میں سے ایک صفحہ پھاڑ کر الگ کر لیا۔ پھر اس صفحے پر ''بنگلا نمبر بی۔ ایک سو بتیس'' لکھ دیا۔ اس مختصر تحریر شدہ کاغذ کو تہ کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کاغذ کو پیڈ سے الگ کر کے میں نے اس لیے استعمال کیا تھا کہ پیڈ پر میری لکھائی کا عکس نہ آ جائے۔ یہ

احتیاط بہت ضروری تھی جو بعد میں میرے لیے مفید ثابت ہوئی۔ جس بنگلے میں ساحل کو رکھا گیا تھا اس کا نمبر ڈی۔ ایک سو تئیس تھا۔ میں نے اس پرچے پر ''ڈی۔ ایک سو تئیس'' کے بجائے اس سے ملتا جلتا نمبر ''بی۔ ایک سو بتیس'' اس لیے لکھا تھا کہ بنگلے کے گیٹ پر متعین گارڈز کو دھوکا دیا جا سکے۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں ایک خاص پلان تھا۔ میں نے صوفیہ کے ساتھ دن کے وقت جب اس علاقے کی سیر کی تھی تو یہ انوکھا آئیڈیا میرے ذہن میں آ گیا تھا اور اب اس آئیڈیے پر عمل کا وقت تھا۔

مجھے کسی بھی صورت وہ کافی پینا نہیں تھی لیکن یہ ظاہر کرنا بھی ضروری تھا کہ میں کافی پی رہا ہوں لہٰذا محاتی ایکٹنگ سے کام چلایا جا سکتا تھا۔ ویٹر نے سپر ہیٹ کافی سرو کی تھی۔ اچھے ریسٹورنٹس کی ایک اچھی بات یہ ہوتی ہے کہ وہ اشیائے خورد و نوش کو بڑے اچھے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ بعد میں بل بھی اچھا خاصا وصول کرتے ہیں جو ان کا حق بھی ہوتا ہے۔

کافی پاٹ میں کم از کم دو افراد کے لیے کافی موجود تھی۔ اگر میں چاہتا تو اسے ریفل بھی کروا سکتا تھا لیکن ریفل تو بہت دور کی بات ہے، مجھے تو اس کافی کا ایک گھونٹ بھی نہیں لینا تھا۔ میں جس مقصد کے لیے اس کافی ہاؤس میں آ کر بیٹھا تھا، وہ پورا ہو چکا تھا۔ وننگ اسٹروک کھیلنے سے پہلے میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے اچھی طرح فیلڈ کا جائزہ لے لیا تھا۔ ربی کے مہروں کی پلیسنگ میری یادداشت میں نقش ہو گئی۔ میں نے بڑے اطمینان سے ''کافی کافی'' کھیلنا شروع کر دیا۔

کافی پاٹ میں سے ایک اسپون کافی نکال کر میں نے کپ میں ڈالی پھر اس میں اتنی کریم ملائی کہ وہ تیار شدہ کافی کا رنگ دینے لگے۔ اس کے بعد میں نے کپ کو اٹھا لیا اور اسے مختلف زاویوں سے اپنے ہاتھوں میں حرکت دینے لگا۔ اس طرح دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہوتا کہ میں کافی پی رہا ہوں لیکن درحقیقت میں اس کپ کو اندرونی جانب سے ایسا ہنا رہا تھا کہ پہلی نظر میں یوں لگے جیسے اس کپ میں کافی پی گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد میں نے کپ کو میز پر رکھا کیونکہ میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ میں نے ایک بھاری ٹپ کے ساتھ کافی کا بل ادا کیا اور ''ہاٹ این کولڈ'' کافی ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ چند منٹ بعد میں اس گلی میں داخل ہو رہا تھا جہاں ساحل والا بنگلا نمبر ڈی۔ ایک سو تئیس واقع تھا۔

بنگلے کے گیٹ پر دو مسلح پہرے دار مجھے دور ہی سے نظر آ گئے۔ میں نے اپنی جیب میں سے وہ تہ شدہ کاغذ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا جس پر کافی ہاؤس میں بیٹھ کر میں نے بنگلا نمبر بی۔ ون تھری ٹو لکھا تھا۔ میں متلاشی نظر سے ایک ایک بنگلے کی نیم پلیٹ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا رہا پھر جب مسلح پہرے داروں کے نزدیک پہنچا تو بنگلے کے گیٹ کا نیلا رنگ میری نگاہ میں آ گیا۔ میں بڑے بے فکرے انداز میں ٹہلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گیا۔

وہ مجھے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ریڈ الرٹ ہو گئے تھے۔ میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پرچہ ان میں سے ایک کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ اسی بنگلے کا ایڈریس ہے؟''

میں نے جس پہرے دار کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اس نے میرے ہاتھ سے پرچہ لیتے وقت سرتاپا تنقیدی نظر سے مجھے گھورا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے میرے جسم کا ایکسرے کر رہا ہو۔ میں نے اپنے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نمودار نہ ہونے دیا جس سے وہ لوگ کسی قسم کے شبہے میں مبتلا ہو جائیں، تاہم اس دوران میں، میں بڑی بے پروائی سے ان کی پوزیشن اور ان کے پاس اسلحے کے زاویوں کو واچ کرتا رہا۔ انہیں گفتگو میں الجھا کر مجھے اپنا ''کام'' نکالنا تھا۔

اس شخص نے میرے تنقیدی جائزے سے مطمئن ہونے کے بعد پرچے پر نگاہ ڈالی اور بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''بی۔ ون تھری ٹو۔ تم غلط جگہ پر آ گئے ہو باس۔''

''غلط جگہ!'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''کیا یہ اسی بنگلے کا ایڈریس نہیں ہے؟''

اس دوران میں دوسرا گارڈ بھی اس کے قریب آ گیا تھا۔ اس نے پہلے والے سے پوچھا۔ ''یہ شخص کس کا پتا پوچھ رہا ہے؟''

میں نے براہِ راست دوسرے کو جواب دیا۔ ''بھائی! میں یہاں پر اجنبی ہوں۔ قاہرہ سے آیا ہوں۔ مجھے بنگلا نمبر بی۔ ایک سو بتیس میں جانا ہے۔ میڈم شارلٹ اس بنگلے میں رہتی ہیں۔ ان کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ میں وہی پہنچانے آیا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے نیلے گیٹ والے بنگلے کی نیم پلیٹ پر نگاہ دوڑائی جہاں صرف بنگلے کا نمبر درج تھا، اس کے ساتھ کوئی نام وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ دوسرے شخص نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ تم واقعی ایک غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ یہ بنگلا نمبر بی۔ ون تھری ٹو نہیں بلکہ ڈی۔ ون ٹو تھری ہے۔ تمہیں اپنے مطلوبہ بنگلے میں جانے کے لیے دو

گلیاں پیچھے جانا ہوگا لیکن......" وہ لمحے بھر کو رکا' ایک ہاتھ سے سوچنے والے انداز میں اپنی ٹھوڑی کو مسلا اور الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میری معلومات کے مطابق تم جس بنگلے کا ایڈریس پوچھ رہے ہو وہاں کرنل دایان رہتا ہے۔ کہیں یہ میڈم شارلٹ کرنل کی بیوی تو نہیں جم؟"

آخری جملہ اس نے اپنے ساتھی گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا۔ وہ بولا۔ "نہیں فلوس! کرنل دایان کی بیوی کا نام تو نینسی ہے۔"

ان کی باہمی گفتگو سے مجھے ان کے نام معلوم ہوگئے۔ دراز قد دبلا پتلا گارڈ جم تھا اور ہٹے کٹے تنومند پستہ قد گارڈ کا نام فلوس تھا۔ جم کا جواب سننے کے بعد فلوس نے مجھ سے کہا۔

"بہرحال مسٹر! اگر تمہیں بنگلا نمبر بی۔ ون تھری ٹو میں جانا ہے تو اس بنگلے کے عقب میں دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں داخل ہو جاؤ۔ تمہارا مطلوبہ بنگلا اسی گلی میں واقع ہے۔ ان ملتے جلتے نمبروں سے تمہیں مغالطہ ہوگیا ہے۔"

"اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟" میں نے سرسری انداز میں پوچھ لیا۔

"جنرل بائرن!" فلوس نے بڑی رعونت سے جواب دیا۔

میں نے اس دوران میں ان دونوں کو اپنی نگاہ میں اچھی طرح تول لیا تھا اور حملہ آور ہونے کے لیے اپنے ذہن میں ایک اسکیچ بھی تیار کرلیا تھا۔ وہ مجھے کوئی بھولا بھٹکا مسافر سمجھ کر میری طرف سے خاصے بے پروا اور غیر محتاط ہوگئے تھے اور یہی میری کامیابی تھی۔ میرے ایکشن میں آنے کا لمحہ سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔

"آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ "میں ادھر ہی جا کر میڈم شارلٹ کے بنگلے کو تلاش کرتا ہوں۔"

بات ختم کرتے ہی میں اس انداز سے مڑا جیسے وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ ہو لیکن میری یہ عین فطری حرکت ایک سوچا سمجھا دھوکا تھا۔ میں نے ٹارگٹ کو اپنے ذہن میں جما کر بڑی سرعت سے ایک تیز رفتار وہیل کک چلا دی۔

انہیں میری جانب سے کسی ایسے جارحانہ فوری ردِعمل کی توقع نہیں ہوسکتی تھی لہٰذا وہ میرے چلائے ہوئے داؤ میں آگئے۔ میری وہیل کک فلوس کی کنپٹی پر لگی۔ وہ لہرا کر جم پر گرا۔ جم اس سے محض دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ بھاری بھرکم فلوس کا غیر متوقع دھکا کھا کر زمین بوس ہوگیا۔ پھر میں نے انہیں سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

میں تیزی سے گھوما اور زمین بوس جم کی کھوپڑی پر ایک زوردار ٹھڈا رسید کردیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے زمین پر بیٹھتے ہوئے بیک سوئپ چلائی۔ فلوس سنبھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ میری چلائی ہوئی سوئپ اس کی پنڈلی پر لگی اور وہ پشت کے بل گر کر چاروں شانے چت ہوگیا۔ میں ان نازک لمحات میں اس بھڑائی کو طول دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔ ابھی تک کسی شخص کا اس گلی میں گزر نہیں ہوا تھا اور نہ ہی بنگلے کے اندر سے کوئی پہرے داروں کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا لیکن "امن و امان" کی یہ صورتِ حال سدا برقرار نہیں رہ سکتی تھی اس لیے جو بھی کرنا تھا' فوراً سے پیشتر ہی کرنا تھا۔

میں ایک جھٹکے سے نیچے بیٹھا اور چاروں خانے فرش نشیں فلوس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے اس کی تنومند گردن کو اپنے بازو کے شکنجے میں کسا اور گردن پر پائی جانے والی ایک مخصوص رگ کو مسل کر اسے ایک جانب پھینک دیا۔ پھینکنے سے قبل وہ کسی مردہ ترکی کے مانند میری بانہوں میں جھول گیا تھا۔ مجھے توی امید تھی وہ کم از کم تین گھنٹے سے پہلے اس انٹاغفیلی کیفیت سے باہر نہیں آئے گا۔ فلوس سے "فارغ" ہونے کے بعد میں جم کی طرف متوجہ ہوگیا۔

جم اپنی کھوپڑی پر میرا ٹھڈا کھانے کے بعد پیچھے کو الٹا تھا اور جس دوران میں' میں فلوس کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے میں مصروف تھا' جم نے سنبھل کر اپنی گن کی جانب جست لگادی تھی۔ میرے ناگہانی حملوں نے چشم زدن میں ان کے ہاتھوں سے گنز چھڑا دی تھیں۔ فلوس تو اب کوئی ہتھیار اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا لیکن جم نے اس نوعیت کی جسارت کر ڈالی۔

یہ کیسے ممکن تھا کہ میں جم کو اس جرأت پر معاف کردیتا۔ یہ میری زندگی کا ٹاپ مشن تھا جس کا ایک ایک لمحہ گنا چنا اور انتہائی قیمتی تھا۔ جم کی جست کے ساتھ ہی میں نے بھی چھلانگ لگادی۔ اس کا ہاتھ اور میرا پاؤں ایک ساتھ گن تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہ اس طرح کہ سب سے نیچے گن زمین پر پڑی تھی' اس کے دستے پر جم کا ہاتھ اور جم کے ہاتھ پر میرا پاؤں جما ہوا تھا۔ اس فارمیشن کے نتیجے میں جم کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہونا ایک لازمی بات تھی۔ اس صورتِ حال کے سدباب کے لیے میں فوراً زمین پر بیٹھ گیا۔

میرا ایک ہاتھ بڑی سرعت سے اس کے منہ پر آیا اور دوسرے بازو کو میں نے ایک موٹی رسی کے مانند اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا۔ وہ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے زور مارنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلانے کے موڈ میں بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کے موڈ کی ایسی تیسی کردی۔ میں نے بیک وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو میکانکی انداز میں حرکت دی۔

اس کے منہ پر موجود ہاتھ ایک جھٹکے سے بائیں جانب گھوما۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن پر گرفت کو اور مضبوط کردیا تھا۔ گنا ٹوٹنے سے مشابہ ایک مخصوص دھیمی آواز ابھری۔ اگلے ہی لمحے جم کی گردن میرے بازو کی گرفت میں ڈھلک گئی۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ نہ لگا کہ وہ دو تین گھنٹے کیا' آنے والی دو تین صدیوں تک بھی اٹھنے کی کوشش نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی زندگی کو موت نے وجود کی قید سے رہائی دلا دی تھی۔

اللہ کا شکر تھا کہ ابھی تک بنگلے کے اندر موجود افراد کو میری اس ہنگامی کارروائی کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ اگر انہیں ذرا سی بھی بھنک مل جاتی کہ گیٹ کے باہر کیا واقعات پیش آرہے ہیں تو اب تک وہ شہد کی مکھیوں کے مانند مجھ سے چمٹ چکے ہوتے۔

میں نے طوفانی رفتار سے جم اور فلوس کی جامہ تلاشی لی۔ ان کے لباس میں سے کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہ ہوئی سوائے چابیوں کے ایک گچھے کے۔ میں نے اس گچھے کو اپنے قبضے میں کیا اور ان کے بے سدھ جسموں کو گھسیٹ کر گھنی باڑھ کے عقب میں چھپا دیا۔ مذکورہ باڑھ بنگلے کے سامنے والے بیرونی حصے میں دیوار سے آٹھ فٹ دور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس باڑھ کی موٹائی دو فٹ اور اونچائی لگ بھگ تین فٹ تھی۔ میں نے انٹاغفیل فلوس اور جہنم رسید جم کو اس طرح اس باڑھ میں فٹ کیا کہ اندر سے اور باہر سے "وہ" کسی کی نگاہ میں نہیں آسکتے تھے۔

ان کے غیر متحرک اور "لاتعلق" ہوتے ہی دو گنز پر میرا قبضہ ہوگیا۔ میں نے ایک لوڈڈ گن کو گیٹ کی بیرونی جانب گھاس میں چھپا دیا اور دوسری کو اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ بیگ جس میں انواع و اقسام کی کئی کارآمد اشیا پہلے سے موجود تھیں۔ میں نے اس بیگ کی اسٹریپ کی لمبائی کو سیٹ کرکے گردن کے اوپر سے گزار کر اپنے بائیں پہلو میں لٹکا رکھا تھا۔ یہ ایک ایسی پوزیشن میں جھول رہا تھا کہ میں بوقتِ ضرورت اپنا دایاں ہاتھ اس میں ڈال کر اپنے مطلب کی شے برآمد کرسکتا تھا۔ مجھے ایسے ہی بیگ کی ضرورت تھی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے چوکنا نظر سے گردو پیش کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سکون اور سکوت کا راج تھا۔ میں دبے قدموں نیلے گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

گیٹ کو چھوتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا' وہ لاک تھا۔ اسی لمحے وہ چابیوں کا گچھا میرے تصور میں گھوم گیا جو میں نے انٹاغفیل فلوس کے لباس میں سے برآمد کیا تھا۔ میں سانس روک کر بڑی احتیاط سے گچھے میں موجود چابیوں کو اس گیٹ کے تالے پر آزمانے لگا۔ چند سیکنڈ بعد مجھے کامیابی حاصل ہوگئی۔ ایک چابی بڑی شرافت سے تالے کے سوراخ میں گھوم گئی۔ یوں محسوس ہوا وہ چابی اس سوراخ کی اندرونی دنیا سے اچھی طرح شناسا ہو۔ وہ وہاں ڈوبتی ابھرتی رہی ہو۔ اس کی آمدورفت کوئی نئی بات نہیں تھی۔

چابی نے مختلف انداز میں کروٹیں بدل کر ایک چکر مکمل ہی کیا تھا کہ "کلک" کی مخصوص آواز کے ساتھ گیٹ کا تالا کھل گیا۔ میں ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا۔

گیٹ کے راستے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لیے اب مجھے کوئی دشواری نہیں پیش آسکتی تھی لیکن اندر قدم رکھنے سے پہلے چند باتوں کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری تھا۔ مجھے یہ بات معلوم ہوچکی تھی' رات کی تاریکی میں خطرناک بل ڈاگز کی ایک جوڑی بنگلے کے احاطے میں پہرا دیتی ہے جو کسی بھی اجنبی کو دیکھتے ہی چیر پھاڑ کر رکھ دیتے۔ بیگن اپنی ڈیوٹی سنبھالتے ہی انہیں "ڈنر" کراتا تھا لیکن آج وہ بنگلے پر پہنچنے سے پہلے ساؤتھ اسٹار ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا بل ڈاگز کی اس جوڑی نے آج ڈنر نہ کیا ہو۔ کسی اور شخص نے بیگن کی جگہ یہ فریضہ انجام دے دیا ہوگا۔ ویسے بغیر ہڈی والے بیف کے پارچہ جات اس وقت میرے بیگ میں موجود تھے جنہیں میں نے زونا (ZONA) ماؤس کلر سفوف کی مدد سے "تیار" کیا تھا۔ بل ڈاگز کو کنٹرول میں لانے کے لیے میں ان پارچہ جات کو کسی بھی وقت چارے کے طور پر آگے بڑھا سکتا تھا۔ بہرحال ان خوفناک کتوں کو نظر انداز کرکے بنگلے کے اندر قدم رکھنا موت کے دہانے میں کودنے کے مترادف تھا۔

دوسرا بڑا خطرہ ربی موشے ہائمن کی طرف سے تھا۔ میں نے ہرشل حنان کے توسط سے کچھ وقت ربی والے بیڈ روم میں گزارا تھا جس کی ایک دیوار میں بہت بڑی سلائیڈنگ ونڈو نصب تھی۔ اس ونڈو میں اندھا شیشہ لگا ہوا تھا جس کی مدد سے اس کمرے میں موجود کوئی بھی شخص بنگلے کے بیرونی گیٹ

کو نگاہ میں رکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بنگلے کی مغربی باؤنڈری وال بھی اس کی نظر میں رہتی۔ اس دیوار کے ساتھ گیٹ کے قریب ہی ایک وسیع اور کشادہ گیراج بنا ہوا تھا جس میں بیک وقت چار گاڑیاں کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ میری معلومات کے مطابق اس وقت گیراج میں تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک سلوان کی گرے کار' دوسری وہ بند وین جس میں ربی' سلوان اور ہرشل تل ابیب سے یروشلم گئے تھے اور تیسری وہ چمچماتی ہوئی لمبی سیاہ کار تھی جس میں بیٹھ کر ربی بن گورین ائرپورٹ سے اس بنگلے تک پہنچا تھا۔ میں ہنگامی صورتِ حال میں ان سے کسی بھی گاڑی کو اپنے استعمال میں لاسکتا تھا۔ ویسے میری کوشش یہی تھی جیسے دبے پاؤں وہاں آیا تھا ویسے ہی خاموشی سے ''لوٹ'' جاتا۔

میں نے ایک لمحے میں ان خدشات کے بارے میں سوچا پھر آنکھیں بند کرکے ہرشل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اللہ کا بندہ اور ربی کا خدمت گار ابھی تک امانڈا الیئر کی بولڈ تخلیق کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ اس ناول کو ختم کرکے ہی آنکھ لگائے گا۔ ذہنی آوارگی بھی بڑی عجیب شے ہے۔ انسان کو اپنے ماحول سے بیگانہ کردیتی ہے۔ ہرشل بھی گردن گردن تک اس ناول کی فضا میں ڈوب کر اپنے ناآسودہ اور تشنہ جذبات کی تسکین میں مشغول تھا۔ سیرابی کی یہ کیفیت فیض یابی کے ہم پلہ تھی۔ وہ جذب کے عالم میں ناول کی تحریر پر نگاہ باندھے بیٹھا تھا۔

وہ اپنے ربی مربی کی جانب سے اگر اس قدر غافل تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا' ربی اس وقت گہری نیند میں ہوگا لہٰذا سلائڈنگ ونڈو کا اندھا شیشہ اس وقت میرے لیے خطرے کا باعث نہیں تھا۔ دوسرا خطرہ کتوں کی جانب سے تھا۔ میں نے گیٹ کے ساتھ کان لگا کر چند لمحات تک سن گن لی پھر مطمئن ہونے کے بعد بہ آہستگی گیٹ کھول کر اس بنگلے میں داخل ہوگیا۔

وہ نیلا گیٹ بنگلے کی جنوبی دیوار میں آخری سرے پر واقع تھا۔ اس سے دس بارہ فٹ آگے مغربی دیوار شروع ہوجاتی تھی۔ اندر آنے کے بعد میں نے گیٹ کو بند کرکے اندر سے کنڈی لگادی۔ اب دیکھنے والی آنکھ کو یہی نظر آتا کہ وہ گیٹ بند ہے لیکن میں بوقتِ ضرورت اسے کھول کر باہر نکل سکتا تھا۔

میں گیٹ والی جنوبی دیوار کے ساتھ ساتھ بڑی احتیاط سے جھک کر مشرقی سمت بڑھنے لگا۔ یہ بنگلے کی سامنے والی دیوار تھی لیکن رہائشی عمارت سے دوسری دیواروں کی طرح اس کا فاصلہ بھی بہت زیادہ تھا۔ دو ہزار مربع گز پر پھیلے ہوئے اس بنگلے میں رہائشی عمارت محض دو سو مربع گز رقبے پر عین وسط میں تعمیر کی گئی تھی۔ مجھے اس دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر پہنچنا تھا جہاں ایک بیڈروم میں میری جانِ تمنا پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ عمارت کے سامنے والے حصے سے ''ریڈ'' کرنا غیر محفوظ اور خطرناک ہوتا لہٰذا میں محتاط روی سے قدم قدم کھسک کر بنگلے کی عقبی جانب پہنچنے کی کوشش میں تھا۔

خوفناک کتوں سے نمٹنے کے لیے میں نے خود کو تیار کرلیا تھا۔ ان کتوں کو عمارت کی حفاظت کے لیے وہاں چھوڑا گیا تھا یعنی اگر کوئی بھی شخص بلا اجازت اس بنگلے میں داخل ہو تو وہ اس کی تکا بوٹی کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کریں۔ کتے انسانی جسم کی مخصوص بو بخوبی پہچانتے ہیں۔ ان کی سونگھنے کی حس اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ کافی فاصلے سے بھی جان لیتے ہیں کہ کوئی انسان ان کے آس پاس موجود ہے۔ پھر اس جوڑی کو تو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے رکھا گیا تھا۔ میں اور میرا جسم ان کے لیے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا میرے بدن سے اٹھنے والی مخصوص بو انہیں فوراً میری جانب متوجہ کردیتی۔ اگر ابھی تک انہوں نے مجھے ''لفٹ'' نہیں کرائی تھی تو یہ ان کی مہربانی کے علاوہ میری خوش قسمتی بھی تھی بلکہ یہ درحقیقت میری خوش نصیبی ہی تھی۔ یہ ایک گمبھیر مسئلہ تھا اور اسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں ایک جگہ رک گیا۔

یہ جنوبی دیوار کا تقریباً آخری حصہ تھا۔ یہاں دیوار کے ساتھ دو ڈرم رکھے ہوئے تھے جن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ یہاں سے چند قدم آگے مشرقی دیوار شروع ہوجاتی۔ میں لپک کر ان ڈرمز کے عقب میں پہنچ گیا۔ خود کو مکمل طور پر چھپانے کے لیے میں اکڑوں بیٹھ گیا پھر بیگ کھول کر اس میں سے پرفیوم کی تین بوتلیں نکال لیں۔ یہ خریداری میں نے ''ہیروڈ'' سپر مارکیٹ سے کی تھی۔ میں نے یکے بعد دیگرے ان خوشبویات کو اپنے لباس پر اسپرے کرنا شروع کردیا۔ میرا ہاتھ اس وقت تک نہیں رکا جب تک لباس اچھی طرح معطر نہیں ہوگیا۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد میرے جسم کی مخصوص بو ان تیز خوشبویات کے نیچے کہیں گم ہوگئی تھی۔ اب انسان کی بو پر لپکنے والے وہ حساس حیوان مجھے ''محسوس'' نہیں کرسکتے تھے۔ میں ان کی حس بچا کر بہ آسانی بنگلے کی بالائی منزل پر پہنچ سکتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں ڈرمز کے عقب سے نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ چونک اٹھا۔ میری چھٹی حس کسی خطرے سے خبردار کر رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ

نادیدہ خطرہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ میں یکدم ریڈ الرٹ ہوگیا پھر جیسے ہی میں نے ایک ڈرم کے پیچھے سے گردن نکال کر باہر جھانکا' میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

مجھ سے صرف دس فٹ کے فاصلے پر وہ دونوں خطرناک حیوان گردنیں اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ گردنوں کی اضطراری جنبشوں سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ وہ فضا میں سونگھ کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے حلق سے ہلکی ہلکی غراہٹیں بھی خارج ہو رہی تھیں۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ وہ میری بو کو محسوس کرکے مجھے تلاشتے ہوئے اس طرف آنکلے تھے لیکن پرفیوم کے چھڑکاؤ نے انہیں کنفیوز کردیا۔ میرے بدن کی مخصوص بو تک ان کی رسائی نہیں ہو پارہی تھی اور یہی بات ان کی الجھن کا سبب تھی۔

اگر وہ مزید کچھ دیر اسی طرح الجھتے رہتے تو ان کے حلق سے خارج ہونے والی غراہٹوں میں تیزی بھی آسکتی تھی جو عمارت میں موجود میرے دشمنوں میں سے ضرور کسی کو اس جانب متوجہ کردیتی۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ایک ہنگامی فیصلہ کیا اور دونوں ''تیار'' پارچہ جات کو اپنے بیگ میں سے باہر نکال لیا۔

جانور خصوصاً کتے کی ایک مخصوص نفسیات ہوتی ہے۔ اگر ان کے قریب کوئی پتھر وغیرہ پھینکا جائے تو وہ فوراً اس کی طرف لپکتے ہیں۔ میں نے ان خوفناک بل ڈاگز کی جوڑی پر نگاہ رکھتے ہوئے دونوں پارچہ جات ان سے دس فٹ آگے اچھال دیئے۔

''دھپ'' کی ہلکی ہلکی دو مخصوص آوازیں پیدا ہوئیں جنہیں اس علاقے کے مہیب سناٹے نے فوراً نگل لیا۔ اگلے ہی لمحے بل ڈاگز کی وہ جوڑی گوشت کے پارچہ جات کو نگلنے کے لیے ایک سمت لپک گئی۔ میرے سینے سے ایک اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

میں نے ڈرمز کے عقب میں رہتے ہوئے بیس فٹ آگے دیکھا۔ وہ دونوں بڑے خشوع و خضوع سے خطرناک گوشت کی ضیافت اڑا رہے تھے۔ ''زونا'' ماؤس کلر ایک بے بُو بے ذائقہ زہر تھا اس لیے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ ''ناسمجھی'' میں گوشت کی صورت میں سفاک موت کو اپنے شکم میں اتار رہے ہیں۔ میں حیرت اور دلچسپی سے انہیں ان پارچہ جات کو بھنبھوڑتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تاریکی کے باعث وہ منظر زیادہ واضح نہیں تھا' تاہم اس وقت میرے تمام حواس ایک دم چاق و چوبند تھے۔ مجھے یہ محسوس کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔

اور میں بھی بخوبی جانتا تھا۔ اس مہلک ضیافت کے بعد اس مہلک جوڑی کا کیا حشر ہوگا۔ انہوں نے خود اپنے حشر کو آواز دی تھی لہٰذا آئی ہوئی قضا ٹل نہیں سکتی تھی۔ انہیں مرنا تھا......اور بڑی بری موت مرنا تھا۔

میں نے ان دو پارچہ جات میں زونا ماؤس کلر سفوف کی جتنی مقدار ''ٹانک'' رکھی تھی' وہ کم از کم بیس صحت مند چوہوں کی ہلاکت کے لیے بہت کافی تھی۔ صحت مند چوہوں سے مراد مصر کے وہ چوہے ہیں جو بعض اوقات بلی کے سائز کو بھی شرماتے ہیں۔ آج ان بل ڈاگز کی خیر نہیں تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق یہ ان کی زندگی کا آخری کھانا تھا۔

میرا یہ محتاط اندازہ بہت ہی درست ثابت ہوا۔ وہ زہر آلود سارا گوشت جب ان کے معدوں میں اتر چکا تو وہ دیوانوں کے مانند رقص کرنے لگے۔ اس بے ہنگم رقص کے دوران میں ان کے حلق سے کسی قسم کی کوئی اچھی بری آواز خارج نہیں ہو رہی تھی۔ بس وہ ناچتے جا رہے تھے' متواتر اور لگاتار۔ ''زونا'' ماؤس کلر نے شاید ان کے دماغوں کو متاثر کیا تھا۔ سوچنا' سمجھنا اور عمل کرنا ان کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ بے اختیار بے ڈھنگے انداز میں اچھل کود مچا رہے تھے۔

ان کی یہ ہیجانی کیفیت زیادہ دیر برقرار نہ رہی اور وہ دو منٹ بعد ہی بے دم ہوکر زمین پر گر گئے۔ میں نے اندھیرے میں حتی الامکان آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں چت اور خاموش پڑے تھے۔ ان کے جسم میں ایک ذرا سی حرکت باقی نہیں رہی تھی۔ ''زونا'' نے ان کا ''کام'' کردیا تھا۔

اسی لمحے ''شاؤل کیفرکیمسٹ'' کے سیلز مین کی ایک بات میرے ذہن میں گھوم گئی۔ اس نے بتایا تھا ''زونا'' جیسے ہی کسی چوہے کے پیٹ میں جاتا ہے' وہ وہیں ڈھیر ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چوہے کی ڈیڈ باڈی میں ڈی کمپوزیشن کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ راکھ کے ڈھیر میں بدل جاتا ہے۔ ٹائیں ٹائیں فش!

میں نہیں جانتا تھا ان کتوں کی ڈیڈ باڈیز میں ڈی کمپوزیشن ہوگی یا نہیں اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں اس عمل کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کرتا۔ میرا ایک ایک لمحہ نہایت ہی قیمتی تھا جسے میں فضول قسم کے انتظار میں صرف کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے خنجر کو اس کے کور سے جدا کیا اور نہایت ہی بے رحم قدم اٹھاتے ہوئے بل ڈاگز کی ڈیڈ باڈیز کی سمت بڑھ گیا۔

☆......☆

ساحل کے حصول کے سلسلے میں مجھے اتنی بار دھوکا ہوا تھا کہ اس کے انتہائی قریب پہنچ جانے کے باوجود بھی میرا ذہن ہزار قسم کے خدشات میں گھرا ہوا تھا۔ میں منزل پر پہنچتے پہنچتے کسی سیٹ بیک کے سبب تشنہ لب رہ جاتا۔ وہ بار بار مجھے حاصل ہونے سے رہ جاتی اور میں ہر دفعہ ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے حصول کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا لیکن یہ تلاش کے اس سلسلے کی آخری کڑی تھی۔ چند دیواروں کے اس پار میری ساحل موجود تھی اور اب میں اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتا۔

میں رہائشی عمارت کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ وہاں ہر طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ یہ اس بنگلے کی شمالی سمت تھی۔ مین گیٹ سے لے کر یہاں تک میں ٹیلی فون کے تار کی تلاش میں رہا تھا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئے۔ عین ممکن تھا' ٹیلی فون کیبل انڈر گراؤنڈ رہائشی عمارت تک پہنچتے ہوں۔ بیرونی چار دیواری اور اس رہائشی حصے میں اچھا خاصا فاصلہ واقع تھا۔ اگر مذکورہ کیبل مجھے دکھائی دے جاتے تو میں سب سے پہلے انہی کو قطع کرتا۔ میں چند لمحات تک چوکنا نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر پیش قدمی کے لیے مطمئن ہو گیا۔ مجھے کسی بھی طرح بالائی منزل پر پہنچنا تھا جہاں ایک بیڈ روم میں میری ساحل محوِ خواب تھی۔ میں تھرڈ آئی کے توسط سے اتنی مرتبہ اس بنگلے میں آ چکا تھا کہ اس کی تقریباً تمام لوکیشنز اور مکانیت مجھے ازبر ہو چکی تھی۔ میں نے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے ایک لمحہ رک کر حالات کا جائزہ لیا۔

مجھے اس بنگلے میں جن افراد کی طرف سے مزاحمت کا خدشہ تھا ان میں سے نیلے گیٹ پر متعین دو مسلح پہرے دار مسلح رہے تھے اور نہ ہی کسی مزاحمت کے قابل۔ جم کو میں نے جہنم مکانی کر دیا تھا اور فلوس کم از کم تین گھنٹے سے پہلے ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹنے والا نہیں تھا۔ اب اس بلڈنگ میں صرف آٹھ افراد بچے تھے۔ چار زیریں منزل پر اور چار ہی بالائی منزل پر۔ نیچے ربی موٹے ہائمن' اس کا سیکریٹری ہرشل حنان' ہرشل کا فربہ اسسٹنٹ اور سلوان جبکہ اوپر ساحل' ادھیڑ عمر باورچی اور دو مسلح سیکورٹی گارڈز تھے۔ ناگہانی آفت زادوں کو زونا ماؤس کلر کی کامل ڈوز نے ''شفا'' بخش دی تھی۔ میری واپسی کے راستے کھلے ہوئے تھے۔ بس یہاں کے لوگوں سے نمٹنا تھا اور ساحل کو اپنے ہاتھ میں کرنا تھا۔ اس کے بعد میری کامیابی اپنے آخری مرحلے سے گزر جاتی۔

میں نے بالائی منزل تک رسائی حاصل کرنے سے پہلے میدانِ جنگ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ عمارت کے عقبی حصے میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر میں نے ظاہرہ دونوں آنکھیں بند کر لیں پھر تیسری' باطنی آنکھ پر توجہ مرکوز کی۔ تھرڈ آئی یعنی پنیل گلینڈ (PINEAL GLAND) فوراً سے پیشتر متحرک ہو گیا۔ میں نے تیسری آنکھ کے سامنے ساحل کے خال و خط کو اجاگر کیا اور پلک جھپکتے میں' میں نے اس کے ماحول کو چھو لیا۔

وہ اپنے مخصوص بیڈ روم میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ میں وہاں سے سیکورٹی گارڈز کے پاس چلا گیا۔ وہ بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھے تاش کے پتوں سے جی بہلا رہے تھے۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں سے ساحل والے بیڈ روم کا دروازہ بڑے واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ ان دونوں نے اپنی گنز کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر رکھا تھا۔ وہ تاش کی بازی کے دوران میں گاہے گاہے نگاہ اٹھا کر کوریڈور کے پار ساحل والے بیڈ روم کے دروازے کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے آن ڈیوٹی ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ میں انہیں ان کے حال میں ''مست'' چھوڑ کر ادھیڑ عمر باورچی کے ماحول میں داخل ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ اس کے سینے کا تموج اس جانب اشارہ کرتا تھا کہ وہ اس وقت بلند آہنگ خراٹے لے رہا ہو گا لیکن افسوس کہ میں ان بھیانک آوازوں کو سننے کی صلاحیت سے محروم تھا لہٰذا میں بالائی منزل سے اتر کر نیچے آ گیا۔

سلوان اور ہرشل کا فربہ اندام اسسٹنٹ ایک ہی کمرے میں دو مختلف بیڈز پر دراز تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ یا تو وہ سو چکے تھے یا پھر سونے کی کوشش میں تھے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے انہیں انہی بیڈز پر بیٹھ کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔

میں نے تھرڈ آئی کے استعمال سے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ساحل والے کمرے کی چابی سلوان کے پاس ہوتی تھی یا پھر بیگن وہاں آتا جاتا تھا۔ یہ دونوں حضرات ایک ہی روپ میں مختلف اوقات میں اس بنگلے پر ڈیوٹی دیتے تھے اور ساحل کو اٹینڈ کرنا انہی دونوں کی ذمے داری تھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ بنگلے کے دیگر ملازم انہیں ایک ہی سمجھتے تھے...... کیسے؟ یہ تفصیل میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اس بنگلے کے دیگر ملازمین کی نظر میں سلوان کی ایک الگ حیثیت بھی تھی اور اس وقت وہ اپنی اسی اصلی حیثیت کے ساتھ اس بنگلے میں موجود تھا۔ بیگن ایک سنگین حادثے کا شکار ہو کر ساؤتھ اسٹار اسپتال پہنچ گیا تھا لہٰذا ایک سو ایک فیصد امکان اس بات کا تھا کہ ساحل والے بیڈ روم کی چابی سلوان کے پاس ہو گی۔

میں ایک لمحے کے لیے تذبذب میں رہا کہ پہلے سلوان سے نمٹ کر چابی حاصل کروں یا پھر بالائی منزل کا راستہ ''صاف'' کرنے کے بعد ادھر کا رخ کروں۔ جیسا کہ میں نے بیرونی گیٹ پر اپنی راہ میں بکھرے ہوئے کانچ اور کانٹے چن دیے تھے۔ ذہن نے آخر الذکر سوچ کے حق میں ووٹ دیا۔

چابی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ بوقتِ ضرورت میں دروازے کے لاک کو فائرنگ سے بھی اڑا سکتا تھا۔ ویسے اگر حالات مہلت دیتے تو میں اس تالے کو کھول بھی سکتا تھا جیسے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔ سی کا تالا کھول کر ہم نے وہاں قبضہ جما لیا تھا۔ فی الحال اس بنگلے میں اپنی راہ کو سیدھا کرنا زیادہ اہم تھا۔ بالائی منزل کی جانب موو کرنے سے پہلے میں نے ہرشل کے ماحول میں بھی جھانک لیا۔

ہرشل حنان' سنہری بالوں والا سوٹڈ بوٹڈ جوان دھن کا بڑا پکا تھا۔ اس نے عزم کر رکھا تھا کہ جب تک ''بینگ مائی وائف'' کا آخری صفحہ تک نہیں پڑھ چکے گا' کرسی سے نکلے گا اور نہ ہی آنکھ سے آنکھ لگائے گا۔ میں اس پر چار لفظ بھیج کر اپنے ماحول میں حاضر ہو گیا۔

میں نے بیگ کھول کر اس میں سے نائیلون کی مضبوط رسی نکال لی۔ رسی کی لمبائی اتنی تھی کہ بہ آسانی اس کی مدد سے بالائی منزل تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔ دوسری منزل کے اوپر میں نے پانی کی ایک ٹینکی بنی دیکھی تھی جس میں سے پانی والے تین مضبوط پائپ نکلے ہوئے تھے۔ یہ پائپ پانی کو ٹینکی میں پہنچاتے تھے اور پھر ٹینکی میں سے پانی انہی پائپ کے راستے عمارت میں استعمال کے لیے نیچے آتا تھا۔ ان پائپس میں سے ایک پانی کی آمد کے لیے تھا اور دوسرا اشد کے لیے جبکہ تیسرا پائپ سیدھا اوپر کو نکلا ہوا تھا۔ اس کا سرا ٹینکی سے خاصا اوپر اٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا اس آزاد پائپ کا بنگلے میں کیا مصرف ہے البتہ میں نے اپنے ذہن میں اس کا موثر استعمال نکال لیا تھا۔ اس وقت اس پائپ کا آزاد سرا ہی میرا ٹارگٹ تھا۔

میں نے نائیلون کی مضبوط رسی کے ایک سرے پر پھندا بنایا۔ اس پھندے کو کھینچ تان کر اس کی مضبوطی اور استحکام کا اندازہ لگایا اور اللہ کا نام لے کر اسے بالائی منزل پر بنی ہوئی ٹینکی کی جانب اچھال دیا۔ یہ ایک مشکل اور وقت طلب کام تھا لیکن میں نے تیسری کوشش میں کامیابی حاصل کر لی۔ وہ پھندا ٹینکی کے اوپر نکلے ہوئے آزاد پائپ میں جا پھنسا۔ میں نے رسی کو دو دو جھٹکے دیے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس رسی کی مدد سے بہ آسانی نیچے سے اوپر جا سکتا ہوں۔

ٹھیک دو منٹ بعد میں عمارت کی چھت پر تھا۔

اب میرے مشن کا سنسنی خیز مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں بلی کے مانند دبے پاؤں چلتے ہوئے چھت سے نیچے اتر آیا۔ سب سے پہلے کچن سے میری ''ملاقات'' ہوئی۔ کچن کا دروازہ بند تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی کہ باورچی کا کمرا کچن سے ملحق تھا۔ میں کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر اس کمرے میں پہنچ گیا۔

ادھیڑ عمر باورچی بڑے مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے سینے کے تموج کو دیکھ کر بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ باورچی غفلت کی نیند میں تھا لہٰذا میں بے دھڑک اس کے پاس پہنچ گیا پھر اس پر کام کرنے لگا۔

میں صرف اتنا چاہتا تھا کہ اگر بنگلے میں طوفان بھی آ جائے تو باورچی کی آنکھ اسی طرح لگی رہے۔ میں نے گردن پر واقع مخصوص رگ کو مسل کر اسے دو گھنٹے کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔ پھر اس کے کمرے سے خاموشی کے ساتھ نکل آیا۔

باورچی کے کمرے اور ساحل والے بیڈ روم کے درمیان ایک کوریڈور تھا اور اسی کوریڈور میں سیکورٹی گارڈز والا کمرا بھی واقع تھا۔ کوریڈور کے اختتام پر وہ چکردار زینہ تھا جو بالائی اور زیریں منزل کے درمیان رابطے کا وسیلہ بنا ہوا تھا۔ میں گارڈز والے کمرے کے سامنے سے گزرے بغیر ساحل والے بیڈ روم تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس منزل پر نمٹنے کے لیے یہی دو افراد بچے تھے۔

میں محتاط انداز سے آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک خلافِ توقع بات ہو گئی۔ اس کوریڈور میں دائیں بائیں کی دیواروں پر فریم شدہ تصاویر اور خوبصورت مناظر آویزاں تھے۔ پتا نہیں میرا کندھا لگا یا خود ہی ایک فریم شدہ تصویر نیچے گر گئی۔ ایک زوردار چھناکے کی آواز پیدا ہوئی۔ یہ فریم کا شیشہ ٹوٹنے کی مخصوص آواز تھی۔ میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سیکورٹی گارڈز والے کمرے میں سے کسی نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''میچم! لگتا ہے اس خبیث بڈھے نے آج پھر کچن کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے۔ کوئی بلی ادھر اپنی کارروائی دکھا رہی ہے۔''

اس شخص کا اشارہ واضح طور پر ادھیڑ عمر باورچی کی طرف تھا جسے میچم کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہاری

بات سے اتفاق کرتا ہوں رونالڈ! اسمتھ کو اب ریٹائرمنٹ لے لینا چاہیے۔ ہم سیکورٹی کے معاملات کو دیکھیں یا پھر کک اسمتھ کی اسسٹنٹی کرتے پھریں۔ اب بتاؤ بھلا کچن کا دروازہ کھولنا بند کرنا بھی کیا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ایک ایسا بنگلا جہاں کوئی انسان گھسنے کا تصور نہیں کرسکتا وہاں ایک عیار بلی نے ہمارا ناک میں دم کرر کھا ہے۔ اب اگر یہ مجھے کہیں نظر آ گئی تو میں پہلی فرصت میں اسے شوٹ کردوں گا۔"

میچم نامی یہ سیکورٹی گارڈ خاصا باتونی لگتا تھا۔ رونالڈ نے کہا۔ "میچم! تمہیں سیکورٹی کمپنی جوائن کرنے کے بجائے سیاست میں جانا چاہیے تھا۔ تم اچھی خاصی جذباتی تقریر کرلیتے ہو۔"

میچم کی خفگی بھری آواز ابھری۔ "رونالڈ! تم کچن کو دیکھنے جارہے ہو یا میں جاؤں؟"

"تم ہی جاؤ تو اچھا ہے۔" رونالڈ نے معتدل انداز میں کہا۔ "اس وقت تم اس منحوس بلی کا اچھا خاصا ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ گن بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ کیا پتا وہ نظر ہی آجائے۔ اس صورت میں تمہیں اپنے ارادے کی تکمیل کرنے میں آسانی رہے گی لیکن......" وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن......شوٹنگ والا شوق صرف بلی تک ہی محدود رہنے دینا۔ کہیں بے چارے اسمتھ کو بھی نہ اڑا ڈالنا۔"

"ابھی میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔" میچم نے بیزاری سے کہا۔ "لاؤ میری گن پکڑاؤ۔ میں کچن کی طرف ایک راؤنڈ لگا کر آتا ہوں۔"

میں ریڈ الرٹ ہوگیا۔ میچم اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جانے والا تھا اور راستے میں' میں کھڑا تھا۔ میں نے چشم زدن میں فیصلہ کیا اور اس سے پہلے کہ میچم کوریڈور میں قدم رکھتا' میں الٹے پاؤں کچن تک پہنچا۔ اس کا دروازہ کھولا اور فوراً سے پیشتر اسمتھ والے کمرے میں گھس گیا۔ اسی لمحے کوریڈور میں بھاری بوٹوں کی آواز ابھرنے لگی۔ میچم نامی وہ سیکورٹی گارڈ کمرے سے نکل آیا تھا۔ میں سانس روک کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ دروازے کو میں نے نیم وا رہنے دیا تھا۔ میچم کو شکار کرنے کا منصوبہ اچانک ہی میرے ذہن میں ترتیب پا گیا تھا۔

یہ ممکن نہیں تھا۔ کوریڈور کے فرش پر گرا ہوا فریم اور اس فریم کا ٹوٹا ہوا شیشہ میچم کی نگاہ میں نہ آئے۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کا شٹر کھول کر میچم کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اسی ٹوٹے ہوئے فریم کا معائنہ کررہا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنے ساتھی گارڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رونالڈ! یہ شیشہ ٹوٹنے کی آواز تھی۔ ایک فریم دیوار سے نیچے گر گیا ہے۔"

"اوہ!" رونالڈ کی دھیمی آواز مجھ تک پہنچی۔ "بکھرے ہوئے کانچ کو اچھی طرح سنبھال کر سمیٹنا اور ہاں......کچن کا کیا حال ہے؟"

وہ دونوں مجھ سے اتنے فاصلے پر تھے کہ ان کی باہمی گفتگو کو سننے کے لیے کسی تھرڈ ایئر یعنی باطنی کان کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے ظاہرہ دونوں کان اس کام کے لیے بہت کافی تھے۔ رونالڈ کے سوال کے جواب میں میچم نے کہا۔ اس کی آواز میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔

"ارے یار! کچن کی طرف ابھی میں گیا ہی کہاں ہوں۔"

"اگر نہیں گئے تو پہلے ادھر ہی جاؤ۔" رونالڈ نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ "کانچ سمیٹنے کے لیے تمہیں کچن ہی سے کچھ ملے گا اور ممکن ہے اس طرح اس بدبخت بلی سے بھی ملاقات ہوجائے جسے شوٹ کرنے کی تمنا تم اپنے دل میں رکھتے ہو۔"

"اس بلی کے حوالے سے تو تم میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہو رونالڈ!"

"تم بلی کے پیچھے پڑ جاؤ' میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔" رونالڈ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے میچم کو کوریڈور میں چھوڑ کر رونالڈ کے ماحول میں چھلانگ لگادی تاکہ یہ تو معلوم ہو وہ کمرے کے اندر بیٹھا اس قسم کا فلسفہ کیوں جھاڑ رہا ہے۔ وہاں پہنچتے ہی مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ یہ حیرت رونالڈ کی عیاری کے سبب تھی۔

میں نے دیکھا وہ تاش کے گیم میں "چیٹنگ" کا مظاہرہ کررہا تھا۔ فریم ٹوٹنے سے پہلے وہ دونوں بازی جمائے بیٹھے تھے۔ میچم اپنے ہاتھ کے کارڈز وہیں ٹیبل پر چھوڑ کر بلی کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے کمرے سے نکلا تھا۔ اگرچہ اس نے کارڈز کو الٹا کرر کھا تھا لیکن اس کی غیر موجودگی میں رونالڈ بڑی صفائی سے باہمی بات چیت کے دوران میں اس کے پتے تبدیل کررہا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا تھا گیم میں میچم کی پوزیشن اس سے زیادہ مضبوط ہے اور وہ بازی پلٹنے کے لیے یہ "ہیرا پھیری" کررہا ہے۔ میں نے رونالڈ اور اس کی دغا بازی پر لعنت بھیجی اور اپنے ماحول میں لوٹ آیا۔

میچم کے بھاری قدموں کی آواز اس کمرے تک پہنچی پھر

کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے دانستہ کچن کا دروازہ کھول دیا تھا تاکہ ان میں سے جو کوئی بھی ادھر کا رخ کرے' میں اسے بہ آسانی شکار کرسکوں۔ میچم نے کچن میں سے کچھ لے کر کانچ کے ٹکڑوں کو سمیٹا پھر بلی کو کھری کھری سناتے ہوئے کچن کا دروازہ بند کردیا۔ اس کھری کھری میں بلی کے علاوہ ایک بلا بھی شامل تھا جو اسمتھ کے نام سے اس وقت میرے قریب ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔

میچم جب اپنے کمرے کی طرف واپس جانے لگا اور اسمتھ کے کمرے کے دروازے کے پاس سے گزرا تو میں نے بلی ہی کے انداز میں مخصوص آواز نکالی۔ "میاؤں......!"

اس کے ساتھ ہی میں آنکھیں بند کرکے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔ وہ بلی کی "میاؤں" سن کر ٹھٹکا اور پلٹ کر نیم وا دروازے کی طرف دیکھنے لگا پھر اس کے لبوں سے ایک الجھن زدہ بڑبڑاہٹ خارج ہوئی۔ اس کا انداز خودکلامی کا سا تھا۔

"یہ گدھے کی بچی یہاں کیا کررہی ہے؟"

میچم بڑی ہی بے ہودہ بات کررہا تھا۔ وہ شیر کی خالہ کو گدھے کے خاندان سے ملانے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کرنے کے لیے میں نے پھر وہی مخصوص آواز نکالی۔ "میاؤں۔"

اس "میاؤں" نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ وہ محتاط انداز میں نیم وا دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا وہ بڑی رازداری سے بلی پکڑنے کی خواہش رکھتا ہے۔ شاید اسے معلوم نہیں تھا' بلی پکڑنے کا فن ہر ایرے غیرے کو نہیں آتا۔ اگر کوئی اناڑی شوقیہ فنکار اس کام میں ہاتھ ڈال دے تو اسے اپنے ہاتھوں اور چہرے کا حشر بنوانا پڑتا ہے پھر وہ کافی عرصے تک کسی کو اپنا چھلا نچا ہوا چہرہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

میچم نیم وا دروازے کے قریب پہنچا اور بھاری بوٹ کی مدد سے دروازے کو پورا کھول دیا۔ میں ایسی جگہ پوزیشن لیے کھڑا تھا کہ دروازہ کھلنے سے مجھے ایک محفوظ اوٹ میسر آ گئی۔ پھر جیسے ہی میچم نے کمرے میں قدم رکھا' میں نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔

میرا ایک ہاتھ بڑی سرعت سے اس کے منہ پر آیا تاکہ وہ کوئی عجیب و امیر یا یتیم و یسیر آواز خارج نہ کرسکے۔ دوسرے ہاتھ نے اس کی گن پر جھپٹا مارا اور گن اس کے قابو سے نکل کر دور جا گری۔ وہ اس ناگہانی اُفتاد سے اس قدر بوکھلا گیا کہ اس نے میرے ہاتھ پر کاٹنے کی کوشش کی۔

یہ ایک خالصتاً زنانہ حرکت تھی۔ میں نے اس کا بھرپور مردانہ جواب دیا۔ گن کی طرف مصروف کار ہاتھ فارغ ہوچکا تھا۔ میں نے اس بازو کو میچم کی گردن میں ڈال کر اپنی جانب جھٹکا دیا پھر منہ پر جمے ہوئے بائیں ہاتھ کو وہاں سے ہٹا لیا۔

کم بخت نے بڑی بے دردی سے میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر کاٹ لیا تھا۔ میں نے متاثرہ ہاتھ میں جلن محسوس کی۔ وہ میری گرفت میں بری طرح مچل رہا تھا۔ اس کی پہلی اور آخری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح خود کو آزاد کرا لے لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ میں آج اس کی...... کسی کی کوئی کوشش کامیاب ہونے دیتا۔

میں نے حالات پر کنٹرول رکھتے ہوئے گرفت کو تھوڑا ڈھیلا کیا اور غراہٹ بھری آواز میں اس کے کان کے نزدیک سرگوشی کی۔

"ساحل والے بیڈروم کی چابی کس کے پاس ہے؟"

"کون ساحل؟" وہ پھنسی پھنسی وحشت زدہ آواز میں بولا۔

"میں اس لڑکی کی بات کررہا ہوں جو اسی منزل کے ایک بیڈروم میں شاہانہ قیدی ایسی زندگی گزار رہی ہے۔" میرے لہجے کی سفاکی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی گئی۔ "اور جس کی نگرانی پر تم دونوں مامور ہو۔"

میں نے اپنی آواز کو اتنا دھیما رکھا تھا کہ اس کمرے سے باہر کوئی شخص ہمارے درمیان ہونے والی مکالمے بازی کو نہ سن سکے اور...... جو شخص اس کمرے میں موجود تھا' وہ فی الحال سننے اور سنانے کی منزل سے بہت دور پہنچا ہوا تھا۔

میرے انداز کو دیکھتے ہوئے میچم کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ اس کی گردن کچھ اس طور میری گرفت میں جکڑی ہوئی تھی کہ اگر وہ بچاؤ کے لیے اور میں نمٹاؤ کے لیے ذرا سی کوشش بھی کرتا تو اس کی گردن کا کڑاکا نکل جاتا...... اور یہ سفاک حقیقت کسی سنگین سچویشن کے مانند اس کے ذہن نے قبول کرلی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی سلامتی کے لیے کسی قسم کی مہم جوئی کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

اس کی خرخراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔ اس خوفزدہ آواز میں ایک معصوم سا استفسار تھا۔ "تم کون ہو؟"

"میں میچم اور رونالڈ دو نامعقولوں کا معقول واحد پرائیویٹ باپ ہوں۔" میں نے غرا کر کہا۔ "یہ تمہارا پہلا اور آخری سوال ہے تو میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اگر اب لب کشائی کی کوشش کی تو لب رہیں گے اور نہ ہی آلۂ گویائی۔"

اتنا کہہ کر میں نے بازو کے شکنجے کو ٹائٹ کیا اور سنگین الفاظ میں اضافہ کردیا۔

''میں نے پوچھا ہے ساحل والے بیڈروم کی چابی کس کے پاس ہے؟''

اس کا جواب سننے کے لیے میں نے اس کی گردن کو ذرا سی ''آسانی'' فراہم کی تو وہ دہشت بھری آواز میں بڑبڑایا۔ ''سلوان......''

''تم اسی سلوان کی بات کر رہے ہو نا جو زیریں منزل کے ایک بیڈروم میں سویا ہوا ہے۔'' میں نے تصدیق کی خاطر سفاک لہجے میں دریافت کیا۔ ''جس کے سر کے بالوں میں ایم (M) نمودار ہو چکا ہے اور گرے رنگ کی ایک گاڑی میں سوار ہو کر یہاں آتا جاتا ہے؟''

میری فراہم سنگین معلومات نے اس کی دہشت کو ہزار گنا بڑھا دیا۔ وہ سراسیمہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''آں...... ہاں۔ اسی سلوان...... کی بات کر رہا ہوں۔''

''اچھا پیارے! تم سے پھر کبھی ملاقات ہوگی۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے بازو کی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا۔

میری اس حرکت سے میچم کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی جیسے کسی زندہ شخص کو قبر میں دفن کر دیا جائے۔ آکسیجن کی عدم فراہمی کے باعث وہ بری طرح ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا۔ میں نے چند سیکنڈ تک اسے اسی حالت میں دبوچے رکھا۔ جب اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی تو میں سمجھ گیا وہ اب گیا کہ تب گیا۔

میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے مجھے نہایت ہی اہم معلومات فراہم کی تھیں۔ میں اس کی جان کا دشمن کیوں بن بیٹھتا؟

اس کی جان نہ لینے کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ میں اسے اپنے خلاف کوئی مذموم کارروائی کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ گرفت ڈھیلی ہوئی تو اس کی جان میں جان آئی۔ سانس قدرے سنبھلی تو میں نے گردن کی مخصوص رگ کو سہلا کر میچم کو بھی اسمتھ کے پاس پہنچا دیا۔

وہ دونوں پہلو بہ پہلو اتنے اتفاق سے لیٹے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا' تھوڑی دیر پہلے ان میں سے ایک دوسرے کے خلاف کسی تیسرے کے سامنے زہر اگل رہا تھا۔

میچم کو سپرد خود فراموشی کرنے کے بعد میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اب اس منزل پر صرف ایک ہی شخص بچا تھا جس سے نمٹنے کے بعد مجھے زیریں منزل کا رخ کرنا تھا...... یا پھر براہ راست ساحل والے بیڈروم کی طرف بڑھنا تھا۔ میں باقی ماندہ رونالڈ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

میں نے کوریڈور کا ابھی نصف فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ رونالڈ اپنے کمرے سے نکل کر اچانک میرے سامنے آ گیا۔ اگر میں اس کے ماحول میں ہوتا تو اس کے انخلا سے قبل از وقت آگاہ ہو سکتا تھا لیکن اب اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ نکل ہی آیا تھا تو کیا ہو سکتا تھا۔ جہاں اتنوں سے نمٹا تھا' ایک رونالڈ بھی سہی۔

رونالڈ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی بری طرح ٹھٹک گیا۔ گن اس کے ہاتھ میں نظر آ رہی تھی۔ وہ نہایت ہی سنگین اور نازک لمحات تھے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ فائرنگ کر کے مجھے گولیوں کی بوچھار سے زخمی کر دیتا۔ وہ للکار کر مجھ سے یہ بھی پوچھ سکتا تھا...... کون ہو تم' کہاں سے اور کیسے آئے ہو؟ وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں نے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں مابین فاصلے کو ناپا اور ایک ہنگامی فیصلے کے تحت پیش قدمی کے لیے تیار ہو گیا لیکن اسی وقت رونالڈ نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں شپٹا کر رہ گیا۔

وہ جو...... بہت کچھ کر سکتا تھا اس نے کچھ کیا بھی تو انتہائی شرمناک۔ وہ اپنے قدموں پر پلٹا اور کمرے کی جانب دوڑ لگا دی۔

وہ اس وقت کمرے کے سامنے ہی کھڑا تھا لہٰذا ایک سیکنڈ میں وہ اس کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپک گیا۔

میں نے جب اس کمرے میں قدم رکھا تو رونالڈ ایک انتہائی خطرناک چال چلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے سائرن کی مخصوص آواز نے میری سماعت تک رسائی حاصل کر لی۔ یہ آواز عمارت کی زیریں منزل کی طرف سے آ رہی تھی۔ یقیناً رونالڈ نے اپنے کمرے میں نصب کوئی ایمرجنسی بٹن دبا کر زیریں منزل والوں کو بالائی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔

میں نے خونخوار نظر سے رونالڈ کو گھورا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے مجھے گن کے نشانے پر رکھ لیا اور نہایت ہی سرد لہجے میں بولا۔ ''ہینڈز اپ!''

''ہینڈز اپ'' کے اس تحکم کے پیچھے سائرن کی مخصوص آواز گونج رہی تھی پھر اس آواز میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ نیچے سے کوئی اوپر کی خبرگیری کے لیے آ رہا تھا۔

میری آنکھوں کے سامنے ایک سرخ چادر سی تن گئی۔

بہت سوچا تھا...... میں نے اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا کہ یہ مشن بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ یہ کیسے ممکن تھا' میں دشمنوں کی صفوں میں قدم رکھوں اور وہاں امن و امان کی صورتِ حال قائم رہے۔ ہنگامہ تو ہونا تھا اور بڑھ چڑھ کر ہونا تھا۔ سائرن کی مخصوص آواز کسی نقارے کے مانند ایک خون ریز ہنگامہ آرائی کا اعلان کر رہی تھی۔

میں اس واہیات صورتِ حالات سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا۔ میرے فعال ذہن نے سیکنڈ کے لاکھویں حصے میں ایک لائحۂ عمل بنا لیا تھا۔ میں نے رونالڈ کے حکم پر ''ہینڈز اپ' ہو کر بڑے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر تیسری آنکھ کے دریچے سے سلوان کے ماحول میں پہنچ گیا۔

وہ ایسے بے فکرے لمحات نہیں تھے کہ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر تھرڈ آئی کی بازی گری میں مصروف ہو جاتا۔ وہ میری زندگی کے سنگین ترین لمحات تھے لیکن میرے اطمینان کا بھی ایک ٹھوس سبب تھا۔ مجھے ایک سو ایک فی صد یقین تھا کہ رونالڈ مجھ پر فائر نہیں کرے گا۔ چند لمحے پہلے اس نے بڑی فراخ دلی سے جس بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا' وہ میری یادداشت میں نقش تھا۔

ہم دونوں راہ داری میں ایک دوسرے کے رو بہ رو تھے۔ میں نہتا تھا اور وہ گن بردار۔ اگر وہ چاہتا تو ایک برسٹ فائر کر کے میرے وجود کو چھلنی میں بدلنے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن وہ کوری ڈور سے اس طرح دم دبا کر بھاگا تھا جیسے اس نے اچانک اپنے سامنے کسی خوف ناک عفریت کو دیکھ لیا ہو۔

اس نے کمرے میں پہنچتے ہی کوئی خفیہ بٹن دبا کر زیریں منزل والوں کو بالائی منزل پر موجود خطرے سے آگاہ کر دیا تھا جس کے نتیجے میں سائرن کی مخصوص آواز سن کر نیچے سے کچھ لوگ اوپر کی طرف آ رہے تھے، یہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں انہی کی تھیں۔ رونالڈ نے مجھے گن پوائنٹ پر رکھ کر یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ وہ مجھے شوٹ نہیں کرے گا بلکہ وہ ان لوگوں کا انتظار کرے گا جن کو ادھر متوجہ کرنے کے لیے اس نے سائرن کو بیدار کیا تھا۔

میری تیسری آنکھ نے سلوان کے ماحول میں قدم رکھا تو وہ مجھے چکر دار زینے پر نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہرشل حنان کا فربہ اسسٹنٹ بھی تھا۔ وہ دونوں بڑی سرعت کے ساتھ نیچے سے اوپر پہنچنے کی کوشش میں دکھائی دیے، گویا رونالڈ کی برقی پکار پر انہوں نے لبیک کہہ دیا تھا۔

جب انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ گن اس کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ ڈرانے اور دھمکانے کے لیے اٹھائی گئی ہے تو وہ ایک لحاظ سے' اندر سے شیر ہو جاتا ہے۔ میں تو اس وقت آنکھیں بند کیے شیر ببر بنا ہوا تھا۔ رونالڈ میرے اس استحکام اور اطمینان کو دیکھ کر یقیناً حیرت زدہ ہو رہا ہوگا لیکن میرے پاس اس کا استعجاب دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ میں باطنی آنکھ کی انگلی تھامے چکر دار زینے میں چکرا رہا تھا۔

سلوان آندھی اور طوفان کی رفتار سے بالائی منزل پر پہنچا پھر کوری ڈور میں قدم رکھتے ہی وہ ساحل والے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اس ہنگامی صورتِ حال میں سب سے پہلی فوقیت ساحل کو دی تھی، میری جانِ تمنا اس بنگلے میں وی وی آئی پی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں سب سے پہلے اسی کو چیک کیا جاتا اور...... ایسا ہی ہو رہا تھا!

فربہ شخص دوڑتے ہوئے سیکیورٹی گارڈز والے کمرے کی جانب آیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک پسٹل واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ میں اس وقت کمرے کے اندر رونالڈ کے سامنے ''ہینڈز اپ'' کھڑا تھا لہٰذا وہ فربہ شخص کوری ڈور میں مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے جیسے ہی مذکورہ کمرے میں قدم رکھا...... اور کچھ دیکھنے کے قابل ہوا' میں نے اسے کسی قابل نہ چھوڑا۔

میں تھرڈ آئی کے توسط سے لمحہ بہ لمحہ اسے مانیٹر کر رہا تھا۔ وہ کمرے میں پہنچ کر جیسے ہی میری رینج میں آیا' میں برق رفتاری سے مڑا اور فضا میں بلند ہوتے ہوئے میں نے ایک خطرناک فرنٹ فلائنگ کک چلا دی۔

اس غیر متوقع صورتِ حال نے فربہ شخص کو دہرے خطرے سے دوچار کر دیا۔ وہ میری دھواں دھار کک کا تمغا سینے پر سجا کر پیچھے کو الٹا۔ میں کک کی تکمیل کے ساتھ ہی زمین پر گرا اور رولنگ کرتے ہوئے ایک سمت کو نکل گیا۔ مجھے اس کام میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔ اسی لمحے رونالڈ کی گن نے اپنا دہانہ کھول دیا۔ میری اچانک سرگرمی نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ میں جس شرافت سے آنکھیں بند کیے ہینڈز اپ کھڑا تھا' شاید اس سے رونالڈ اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میں نے اس کی گن کے سامنے شکست تسلیم کرتے ہوئے بے بسی سے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ میں نے دفعتاً فربہ شخص پر اٹیک کیا تو اس کی غلط فہمی کافور ہو گئی اور اسی بوکھلاہٹ میں اس کی گن چل گئی۔ فربہ شخص پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ فائرنگ کی مخصوص آواز نے پُرسکوت فضا کا سینہ چیر کر

رکھ دیا' اس کے ساتھ ہی رونالڈ کی گن سے نکلنے والی گولیوں نے فربہ اندام شخص کے بدن میں متعدد چھید بنا دیے۔ رونالڈ نے بے ساختہ مجھے نشانہ بنانے کی غلطی کی تھی۔ میں سریع رولنگ کے سبب اس کے نشانے میں نہ آسکا جس کا خمیازہ فربہ شخص کو بھگتنا پڑا۔ یہ خمیازہ اتنا بھاری تھا کہ اغلب امکان یہی تھا' وہ زندگی کی بازی ہار گیا ہوگا۔ اسٹریٹ فائرنگ بہت خطرناک ہوتی ہے۔

میں رونالڈ کی جانب سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ میں جانتا تھا، اب تو وہ خاص طور پر مجھے ڈھونڈ کر فائرنگ کا نشانہ بنائے گا۔ میں نے ایک خاص لائن آف ایکشن کے تحت اس میز کی سمت رولنگ کی تھی' تھوڑی دیر پہلے جہاں رونالڈ اور میچم بیٹھے تاش کے پتوں سے دل بہلا رہے تھے۔ میری عقابی نگاہ نے سیکنڈ کے دس ویں حصے میں تاڑ لیا کہ میز والی دیوار پر ایک سوئچ بورڈ موجود تھا۔ شاید اسی بورڈ پر موجود کسی سوئچ کو دبا کر رونالڈ نے نچلی منزل والے سائرن کو بیدار کیا تھا۔ سائرن کی مخصوص منحوس آواز مسلسل ایک سماع خراش ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ اس بے ہودہ آلے کا ''گلا دبانا'' ضروری تھا ورنہ اس پوش رہائشی علاقے کے ایک ایک مکین کو پتا چل جاتا کہ جنرل بائرن کے بنگلے میں کوئی خطرناک محاذ کھل گیا ہے۔

اس بنگلے کے گیٹ پر متعین مسلح پہرے داروں میں سے ایک نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جنرل بائرن کی رہائش گاہ ہے اور یہ معلومات فراہم کرتے ہوئے فلوس نامی اس سیکیورٹی گارڈ کی گردن رعونت سے اکڑ گئی تھی۔ جیسے وہ خود ہی جنرل بائرن ہو۔ یقیناً جنرل بائرن کوئی توپ قسم کی چیز ہوگا جس کا بنگلا ان دنوں ربی موشے ہائمن کے تصرف میں تھا یا یہ کوئی فرضی کردار بھی ہوسکتا تھا۔ بہر حال' جنرل بائرن کے ذکر پر گردن اکڑانے اور سینہ پھلانے والا فلوس اس وقت دنیا و مافیہا سے بے خبر بنگلے سے باہر' حفاظتی باڑھ میں اپنے جہنم مکانی ساتھی جم کے ساتھ پڑا تھا۔

میز کے عقب میں پہنچتے ہی میں نے سوئچ بورڈ کو ایک زوردار جھانپڑ رسید کیا۔ میری یہ کوشش خاصی کامیاب رہی۔ سائرن کی مکروہ آواز یک لخت بند ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کمرے میں بھی تاریکی چھا گئی۔ میرے اضطراری جھانپڑ نے اس کمرے کی لائٹ بھی آف کردی تھی۔

میرے لیے یہ بڑی اطمینان بخش صورتِ حال تھی۔ اب رونالڈ مجھے تلاش نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ لگ کر ایک طرف کھسکنا شروع کردیا' اس کے ساتھ ہی آنکھیں بند کرکے رونالڈ کے ماحول میں پہنچ گیا۔ یہ ماحول تاریکی سے نکل کر نیم تاریکی میں آگیا تھا۔ کوری ڈور کی لائٹ ایک خاص زاویے سے کمرے کے اندر پہنچ رہی تھی جس نے وہاں ملگجے اجالے کا سا سماں پیدا کردیا تھا۔

رونالڈ کو میں نے اپنی تلاش میں ادھر ادھر گردن گھماتے ہوئے پایا۔ میں غیر محسوس انداز میں کھسکتے ہوئے تقریباً اس کے عقب میں پہنچ گیا تھا لہٰذا اسے نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے امید تھی' اب وہ پہلے کی طرح بے دریغ فائرنگ نہیں کرے گا البتہ، اگر میں اس کے سامنے موجود ہوتا تو اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ رونالڈ نے پہلے بوکھلاہٹ میں فائرنگ کی تھی چنانچہ اس کی ایک اضطراری غلطی نے ہرشل حنان کے اسسٹنٹ کو کوری ڈور کے فرش پر لمبا لٹا دیا تھا۔ اس کی زندگی کے امکانات صفر کے برابر تھے۔ رونالڈ کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں اور کمرے کے نیم تاریک ماحول میں حاضر ہوگیا۔

اسی لمحے باہر کوری ڈور میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز ابھری۔ میرے اندازے کے مطابق وہ سلوان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ ساحل والے بیڈروم کی طرف سے اطمینان پاکر وہ ادھر چلا آیا تھا۔ میرا بڑا جی چاہ رہا تھا' ذرا جھانک کر تھرڈ آئی کے توسط سے ساحل کی خبر لوں لیکن ان مہلک لمحات میں' میں آنکھیں بند کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے اندازے کا ثبوت مل گیا۔ دوڑتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہی کوری ڈور میں سلوان کی آواز ابھری۔ یہ آواز میں نے پہلی مرتبہ سنی تھی۔ سلوان نے اس کمرے کے دروازے کے سامنے، کوری ڈور میں فربہ اسسٹنٹ کی لاش یقیناً دیکھ لی تھی اسی لیے وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں چیخا تھا۔

''وھاٹ از گوئنگ آن؟''

یہ سوال اس نے رونالڈ اور میچم وغیرہ سے کیا تھا کیونکہ وہی دونوں بالائی منزل کی رکھوالی پر مامور تھے، میچم تو اس وقت ادھیڑ عمر باورچی اسمتھ کے پہلو میں انٹا غفیل پڑا تھا۔ وہ سلوان کے سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ البتہ' رونالڈ اس کام کے لیے آزاد تھا لیکن میں رونالڈ کی زبان کھلنے سے پہلے ہی متحرک ہوگیا۔ اس صورتِ حالات میں ایک لمحہ ضائع نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں اس وقت رونالڈ کی پشت پر لگ بھگ تین فٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ میں نے بجلی کی سی سرعت سے' شارٹ اسٹیپ کے ساتھ ایک بھرپور سائیڈ کک چلا دی۔ میرے دائیں پاؤں کا بلیڈ رونالڈ کی کمر پر' دونوں بازوؤں کے جوڑ کے عین وسط میں لگا۔ اس ناگہانی افتاد نے اسے پاؤں سے نکال دیا۔ اس نے ایک طویل ''اوں'' کی آواز خارج کی اور فضا میں نیچی پرواز کرتے ہوئے، کھلے ہوئے دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک زوردار دھما کا سنائی دیا۔

اس نے سلوان کے سوال کے جواب میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے پاؤں کی زوردار ضرب نے اس کے جواب کو ایک مبہم لایعنی طویل ''اوں'' میں بدل دیا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے کے اندر' کمرے کے فرش پر گرا' چہتے فرش سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اس کے حلق سے ایک دل خراش چیخ برآمد ہوئی۔ اغلب امکان اس بات کا تھا کہ اس کا چہرہ چہتے فرش سے متصادم ہوگیا تھا۔ میں نے اپنی پوزیشن بدلی اور بڑی پھرتی سے لپک کر ایک تاریک گوشے میں چلا گیا۔ یہ مقام دروازے کے قریب ہی' ایک پہلو میں دیوار کے ساتھ تھا۔ اوندھا پڑا رونالڈ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدم یک دم رک گئے۔ یہ رکاؤ دروازے کے سامنے کوری ڈور میں ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کے طفیل رکنے والے کے ماحول میں پہنچ گیا۔ سلوان ششدر کھڑا کبھی اندر اور کبھی باہر دیکھ رہا تھا کہ کمرے کے اندر رونالڈ فرش پر اوندھا پڑا بے کسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اور باہر کوری ڈور میں فربہ اسسٹنٹ کی بے گوروکفن لاش بے بسی کا اشتہار بنی ہوئی تھی۔

سلوان کے حلق سے وحشت زدہ سی آواز خارج ہوئی ''رونالڈ! یہ...... یہ سب کیا ہے؟''

میں نے سلوان کی آواز پر اپنی سماعت کو مامور رکھتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ رونالڈ نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ''وہ...... وہ اندر ہے!''

''وہ کون؟'' سلوان نے تحکمانہ انداز میں استفسار کیا۔

ہرشل حنان کی طرح سلوان بھی اس بنگلے میں ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔ وہ بھی ربی کے قابلِ اعتماد آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ دونوں سیکیورٹی گارڈز سے جواب طلبی کا اسے اختیار حاصل تھا۔

گارڈ رونالڈ نے زمین پر پڑے پڑے پھنسی ہوئی آواز میں بتایا ''میں اس بندے کی بات کررہا ہوں جو کمرے کی تاریکی میں کہیں چھپا ہوا ہے۔''

یہ بات وہ کھڑے ہوکر بھی کرسکتا تھا لیکن اچانک پیش آنے والے حالات نے اسے اس قدر بوکھلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا کہ اسے اپنا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے سہمے ہوئے انداز میں سلوان کو بتایا۔

''اسی کم بخت نے فائرنگ کرکے ابراہام کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اس کمرے کی لائٹ اور سائرن کا سوئچ بھی اسی نے آف کیا ہے۔ تم دھیان سے اندر قدم رکھنا' وہ بہت ہی خطرناک شخص ہے۔'' آخری جملہ اس نے مشورہ دینے والے انداز میں ادا کیا تھا۔

میں رونالڈ کی مکاری پر اش اش کر اٹھا۔ وہ فربہ اندام اسسٹنٹ کی ہلاکت کو میرے کھاتے میں ڈال رہا تھا حالانکہ ابراہام نامی اس فربہ شخص کو رونالڈ کی فائرنگ نے موت کی وادی میں پہنچایا تھا۔ وہ ایک جدی پشتی دروغ گو اور فریب کار شخص تھا۔ اس سے پہلے میں تھرڈ آئی کی مہربانی سے اسے میچم کے پتوں کے ساتھ چیٹنگ کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ بہرحال، اس کی الزام تراشی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

میں نے اپنے بائیں ہاتھ کو اسی پہلو میں لٹکے ہوئے بیگ کی جانب بڑھا دیا۔ وہ بیگ جس میں انواع واقسام کی ''دشمن شکن'' اشیا بھری ہوئی تھیں۔ میری حتی الامکان یہی کوشش تھی کہ فائرنگ سے گریز کروں۔ میں نے بائیں ہاتھ کو بیگ کے اندر گھمایا اور اندازے کی مدد سے کاکروچ کلر اسپرے باہر نکال لیا۔ یہ تمام تر شاپنگ..... رماطریشون کے علاقے میں واقع ایک بہت بڑے شاپنگ سینٹر ہیروڈ (HEROD) سے کی تھی۔

سلوان' رونالڈ کے مشورے سے پہلے ہی قدم روک چکا تھا۔ اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ''میچم کہاں ہے؟''

''وہ کچن کی طرف گیا تھا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا'' رونالڈ نے جواب دیا ''مجھے شک ہے' اسی بدمعاش نے میچم کے ساتھ بھی کوئی گڑبڑ کردی ہے۔ تھوڑی دیر پہلے کوری ڈور کا ایک فریم ٹوٹ کر نیچے گر گیا تھا...... اور اس بدتمیز بلی نے بھی ہمیں خاصا پریشان کر رکھا ہے......''

''میں اس بدمعاش کو دیکھ لوں گا!'' سلوان نے قطع کلامی کرتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا ''تم کچن کی طرف جاؤ اور میچم کی خبر لو۔''

میں نے دیکھا' سلوان کا حکم سن کر رونالڈ کمرے کے

فرش سے اٹھنے لگا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ آنے والے لمحات میں رونالڈ کو کچن کی طرف جانا تھا اور سلوان کو ''مجھ بدمعاش'' سے نمٹنے کے لیے کمرے کے اندر آنا تھا۔ میں سانس روک کر ریڈ الرٹ ہوگیا۔ کاکروچ کلر کے استعمال کا وقت آگیا تھا۔

بائیں ہاتھ میں دکھن کا احساس ہوتے ہی میں نے کاکروچ اسپرے کو دائیں ہاتھ میں لے لیا۔ میرے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں ہیمچ نے بڑی بے دردی سے کاٹ ڈالا تھا جس میں ابھی تک دکھن کے ساتھ ساتھ جلن بھی ہو رہی تھی۔ تاہم یہ تکلیف ان سنسنی خیز لمحات میں کسی خاص توجہ کی طلب گار نہیں تھی۔

رونالڈ نے اٹھنے کے بعد گن سنبھالی اور کمرے سے نکل گیا۔ میں بغیر آواز پیدا کیے غیر محسوس انداز میں سرک کر دروازے کے قریب ہوگیا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ سلوان کے اندر قدم رکھ دیتا اور اسی لمحے مجھے تیزی سے حرکت میں آنا تھا لیکن چند سیکنڈ گزر جانے کے باوجود بھی جب سلوان کی انٹری نہ ہوئی تو مجھے حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش نے بھی گھیر لیا۔ میں نے ظاہرہ آنکھیں بند کیں اور باطنی آنکھ کے توسط سے سلوان کے ماحول میں پہنچ گیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔

یہودی قوم میں عیاری اور مکاری قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان لوگوں کی ایک ایک ''ادا'' کھل کر میرے سامنے آرہی تھی۔ میں جیسے ہی سلوان کے پاس پہنچا، اس کو... رونالڈ کے ساتھ پُراسرار سرگوشیوں میں مصروف پایا۔ وہ دونوں اس وقت کچن اور سیکیورٹی روم کے درمیان' کوری ڈور میں کھڑے تھے۔ انہیں ایک ساتھ وہاں موجود پاکر مجھے تعجب ہوا کیوں کہ سلوان نے رونالڈ کو کچن کی طرف جانے کا حکم دے کر خود کمرے کے اندر داخل ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اس پُراسرار کانا پھوسی کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ سلوان مجھے ''شرفِ میزبانی'' بخشنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

میری بھی کچھ ایسی ہی مرضی تھی۔ میں بھی اس شخص کو کسی بھی قیمت پر بخشنے کو تیار نہیں تھا۔ ان لمحات میں مجھے ایک مرتبہ پھر اپنی محرومی کا شدت سے احساس ہوا۔ اگر تھرڈ آئی (تیسری آنکھ) کی طرح میرا تھرڈ ایر (تیسرا کان) بھی بیدار ہوتا تو میں بہ آسانی سلوان اور رونالڈ کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن سکتا تھا۔ انسان نے بھی عجیب فطرت پائی ہے۔ جو چیز اسے حاصل نہیں ہوتی وہ اسی کے لیے مچلتا ہے۔ اسی کی محرومی کا رونا روتا ہے اور اس ''رونے'' کے دوران میں وہ اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیتا ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہے وہ محرومی سے کہیں بڑھ کر ہے!

میں جانتا تھا...... اور چنگ فو سانگ فو جیسے جید ماہرینِ روحیات نے بھی مجھے بتایا تھا کہ میرا تھرڈ ایر کبھی بیدار نہیں ہوسکے گا چنانچہ اس سلسلے میں مجھے کبھی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ پچیوٹری گلینڈ (PITUITARY GLAND) کے ساتھ ارتکاز کی مشقیں کر کے میں محض اپنا وقت برباد کروں گا۔ اس کے بالعکس میں اگر یہ وقت ''یوگا'' اور ''چی'' کی ایڈوانس مشقوں کو دوں تو میری صلاحیتوں میں اور زیادہ پختگی آجائے گی۔ بین اور صاف الفاظ میں مجھے پنیل گلینڈ (PINEAL GLAND) تک محدود کر دیا گیا تھا۔

چند سیکنڈ ہی میں سلوان اور رونالڈ کی خفیہ میٹنگ ختم ہوگئی جس کے نتیجے میں رونالڈ کچن کی جانب بڑھ گیا اور سلوان کوری ڈور میں اس طرف آنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا، وہ کمرے میں داخل ہوگا یا نہیں لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا' کمرے میں داخل ہو یا اپنی ہی دھن میں آگے بڑھتا چلا جائے' میں اس کاکروچ کی اولاد کو ضرور اسپرے میں نہلا کر تلف کر دوں گا۔ میں تھرڈ آئی اس پر لگا کر عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہوگیا۔

وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے ''قریب'' پہنچا پھر کوری ڈور میں ساحل والے بیڈ روم کی طرف بڑھتا چلا گیا میں نے آنکھیں کھول دیں اور اگلے ہی لمحے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے سلوان کو اپنے آگے چار قدم کے فاصلے پر پایا۔ میں نے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے رعب دار آواز میں اسے مخاطب کیا۔

''سلوان! میں یہاں ہوں۔''

وہ اپنے عقب میں کسی کی موجودی کو محسوس کر چکا تھا اور اس احساس نے اسے ٹھٹکا بھی دیا تھا۔ اس پر میری بہ راہ راست پکارنے اسے چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا میں بھی اسی موقع کی تاک میں تھا۔ وہ جیسے ہی میری سمت مڑا' میں نے آگے بڑھ کر بڑی تیزی سے کاکروچ اسپرے کو اس کے چہرے پر آزما ڈالا۔

اس ناگہانی صورتِ حال نے اسے بوکھلا دیا' بے ساختہ اس کے دونوں ہاتھ چہرے کی جانب اٹھ گئے۔ وہ اپنی آنکھوں کو بچانا چاہتا تھا لیکن بچاؤ کا ہر راستہ میں نے مسدود کر دیا تھا۔ میں نے اسپرے کے بٹن کو اتنی شدت سے پریس کر رکھا تھا کہ آنکھیں کیا' اس کی ناک اور منہ بھی اس

خوش بودار زہر سے تر بہ تر ہو گئے۔ کچھ بھی اس کے اختیار میں نہ رہا۔ وہ بے اختیار ہو کر کھانستا چلا گیا۔ اس کھانسی کے دورے کے دوران میں وہ بڑی سرعت اور بے دردی سے اپنی آنکھوں کو بھی مسلتا جا رہا تھا۔ اس پر اچانک جو افتاد ٹوٹ پڑی تھی اس نے اس کے ہوش و حواس گم کر دیے تھے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا کہ آنکھوں جیسی قدرت کی عظیم الشان نعمت کو ملا جاتا ہے' مسلا نہیں جاتا!

میں نے کاکروچ اسپرے کو بیگ کے اندر پہنچا دیا۔ سلوان کوری ڈور کے اندر جس قسم کا مضحکہ خیز ''ڈانس'' کر رہا تھا اسے انجوائے کرنے کا مجھے کوئی شوق تھا اور نہ ہی اتنی مہلت مجھے میسر تھی۔ میں اس وقت جس دروازے سے چند فٹ کی دوری پر کھڑا تھا اس کی دوسری جانب میری جانِ تمنا ساحل موجود تھی۔ فضول تفریحات کو نظر انداز کر کے مجھے ساحل تک پہنچنا تھا۔

مصدقہ طور پر ساحل والے بیڈ روم کی چابی سلوان کے پاس تھی۔ میں نے اس حواس باختہ اور مصیبت زدہ شخص کی پشت پر ایک زوردار کک رسید کی۔ وہ لڑکھڑایا اور کوری ڈور کی ایک دیوار سے جاٹکرایا۔ اس تصادم کے نتیجے میں اس کے آفت زدہ چہرے نے اس دیوار پر ایک کامل ''بوسہ'' دیا۔ سلوان کے حلق سے بڑی دردناک آواز خارج ہوئی۔ اس ٹکراؤ نے اس کے چہرے کا سوا ستیاناس مار دیا تھا۔ یہ سونے پہ سہاگا والی صورتِ حال تھی۔

میں نے پلٹ کر کوری ڈور کے دوسرے سرے کی جانب نگاہ دوڑائی۔ رونالڈ مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ پتا نہیں' وہ کچن میں تھا' اسمتھ کے بیڈ روم میں تھا یا کہیں اور نکل گیا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ جہاں بھی گیا تھا' سلوان کی ہدایت کے مطابق ہی گیا تھا۔ میں اسی سلوان کی جانب متوجہ ہوگیا۔

اس کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ ناک منہ سے خون پھوٹ گیا تھا۔ کاکروچ اسپرے نے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں۔ وہ آنکھیں کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پیچھے سے زہریلا پانی جاری ہوگیا تھا۔ اس سے ملتی جلتی کیفیت اس کی ناک کی بھی تھی۔ سانس کے راستے کاکروچ کلر کی ایک بڑی مقدار اس کے پھیپھڑوں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ اسی حشرات الارض مار زہر نے اسے شدید کھانسی کے دورے میں مبتلا کر دیا تھا، اگرچہ وہ ہم دردی اور مدد کا مستحق نظر آرہا تھا لیکن میں اس وقت جس کیفیت سے گزر رہا تھا اس میں مجھے اس خبیث پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔

میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر آگے بڑھا اور اس کی موٹی گردن کو اپنے مضبوط بازو کی آہنی لپیٹ میں لے لیا پھر منہ کو اس کے کان کے نزدیک لے جا کر غراہٹ آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''چابی کس جیب میں ہے؟''

''کک...... کون سی چابی؟'' وہ کھانسی اور ہکلاہٹ کی آمیزش سے بولا۔

میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''اس بیڈ روم کے دروازے کی چابی جس میں' ساحل کو قیدی بنا رکھا ہوا ہے تم لوگوں نے!''

''تت...... تم کون ہو......'' وہ متوحش انداز میں منمنایا ''تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے میرے نام سے بھی مخاطب کیا تھا؟''

''میں تمہارے اس سوال کو پہلا اور آخری سوال جانتے ہوئے جواب دے رہا ہوں'' میں نے جارحانہ انداز میں اس کی سماعت میں سرگوشی کی ''میں ساحل کے سوا اس بنگلے میں پائے جانے والے ہر شخص کی موت ہوں۔ اب بتاؤ' چابی کہاں ہے...... کس جیب میں ہے؟''

سلوان سے استفسار کے دوران میں' میں نے کوری ڈور کے ایک ایک انچ کو اپنی نگاہ میں رکھا ہوا تھا۔ سلوان کسی خبیث الاخبث نطفے کا نتیجہ تھا، میری سنگین دھمکی کے باوجود بھی وہ سوال کرنے سے باز نہ آیا۔

''تت...... تم اس لڑکی کو کیسے جانتے ہو......؟''

اس نے محتاط روی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساحل کے لیے لڑکی کا لفظ استعمال کیا تھا۔

میں نے خوں خوار انداز میں جواب دیا۔

''ایسے......!''

اس یک لفظی جواب کے بعد میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کی فولادی گرفت کو شدید کر دیا۔ کھانس کھانس کر سلوان کا پہلے ہی برا حال ہو رہا تھا۔ اس کے متاثرہ پھیپھڑوں میں اتنی سکت کہاں باقی بچی تھی کہ وہ آکسیجن کے بغیر اسے ایک لمحے کا تنفس بھی مہیا کر سکیں۔ وہ میرے بازو کی گرفت میں کسی بِن جل کی مچھلی کے مانند پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ دم گھٹ کی کیفیت نے اسے موت کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کی آنکھیں ابل کر حلقوں سے باہر آ رہی تھیں۔

یہ وہی نامراد آنکھیں تھیں جو تھوڑی دیر پہلے کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ میں نے ان بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں میں پوری سفاکی سے جھانکا۔ وہ ''کھلی'' ہوئی آنکھیں خون

رنگ ہو رہی تھیں۔ کاکروچ کلر اسپرے نے ان دیدوں میں بڑی قیامت ڈھائی تھی۔ میں نے بہ دستور ان حشر بار آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

''میں صرف ایک سیکنڈ کے لیے اپنی گرفت ڈھیلی کروں گا۔ مجھے میرے سوال کا جواب چاہیے۔ بس!''

ایک سیکنڈ کی مہلت کی بات میں نے محض اسے ڈرانے کے لیے کی تھی حالانکہ میں جانتا تھا' ادھر میں نے اسے بولنے کی آسانی فراہم کی ادھر اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ کھانسے بغیر بول نہیں سکتا تھا اور بولے بغیر میرے سوال کا جواب دینا ممکن نہیں تھا۔ اس کی حالت اس قدر افسوس ناک ہو چکی تھی کہ اشاراتی زبان کا سہارا لینا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

میرے اندازے کے عین مطابق' جب میں نے اس کی گردن پر اپنے بازو کی گرفت ڈھیلی کی تو وہ دم توڑنے والے انداز میں کھانسنے لگا پھر تھوڑا سنبھل کر مردہ سے لہجے میں بولا۔

''چا...... چابی میرے پاس نہیں ...... ہے۔''

''اس کمرے کی چابی تمہارے پاس رہتی ...... پھر بیگن کے پاس۔'' میں نے وحشت بھرے انداز میں کہا' ''وہ ...... کی اولاد بیگن تو اس وقت ساؤتھ اسٹار اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں ایک سو ایک فی صد وہ چابی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ مجھے مذکورہ چابی کے بارے میں بتاتے ہو یا میں ......؟''

میں نے دھمکی آمیز انداز میں دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ میری دہشت بھری کارروائی نے پہلے ہی اسے وحشت زدہ کر رکھا تھا۔ بیگن اور اس کے حوالے سے اس انکشاف نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، میں نے اس کی کسمپرسی آنکھوں میں موت کے سایے کو لہراتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھے اس انداز میں دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو آخری بار دیکھا جاتا ہے۔ ان بے وفا اور کج ادا لمحات میں وہ بڑی بے چارگی سے بولا۔ ''چابی ...... چابیاں ...... نیچے والے کمرے میں ہیں ...... ڈریسنگ کی پہلی دراز میں ......''

''چابیاں نیچے پڑی ہیں تو تم اوپر کیا کر رہے ہو!'' اس کی تمام تر بے بسی کے باوجود بھی میں نے انتہائی سنگین لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی سلوان کی گردن پر اپنے بازو کی جکڑ کو شدید کر دیا' ''تمہیں تو اس وقت بہت اوپر ...... چلے جانا چاہیے تھا۔ لو' میں اس پرواز میں تمہاری مدد کرتا ہوں ...... گڈ بائے!''

بات ختم کرتے ہی میں نے اپنے بازو کو مخصوص انداز میں ایک زوردار جھٹکا دیا۔ گنا ٹوٹنے سے مشابہ ایک آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی سلوان کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

میں سلوان کے مردہ جسم کو ایک جانب پھینکنے ہی والا تھا کہ ایک بہ یک تاریکی چھا گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لائٹ چلی گئی ہو۔ اسی لمحے ساحل والے بیڈ روم میں مجھے قدموں کی چاپ ابھرتی سنائی دی اس مرے میں ساحل کے سوا اور کوئی نہیں تھا لہٰذا یہ چاپ ایک سو ایک فی صد اسی کے قدموں کی ہو سکتی تھی۔ بالائی منزل پر ہونے والی ہنگامہ آرائی نے شاید اسے نیند سے بیدار کر دیا تھا اور اب تو لائٹ بھی چلی گئی تھی میرے اور سلوان کے درمیان یہ ساری دھینگا مشتی اسی بیڈ روم کے دروازے کے سامنے ہوئی تھی۔ غالباً ساحل بیڈ سے نیچے اترنے کے بعد دروازے کی طرف آ رہی تھی۔

میں نے سلوان کی لاش کو غصیلے انداز میں ایک طرف پھینک دیا۔ یہ ایک اتفاق تھا یا اندازے کی غلطی کہ وہ منحوس مردار سیدھا اسی... دروازے سے جا کر ٹکرایا جس کی جانب ساحل پیش قدمی کر رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میری سماعت کی عید ہو گئی۔

''یہ باہر کیا ہو رہا ہے!'' ساحل نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں استفسار کیا' ''لائٹ کس نے آف کی ہے؟ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا!''

میں اس آواز کو سننے کے لیے ایک عرصے سے ترس رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے کانوں کی مراد بر آئی ہو۔ ساحل کے استفسار میں اگرچہ صد درجہ جھنجلاہٹ شامل تھی لیکن میری سماعت نے اسے ایک تبرک کے طور پر قبول کیا۔ اپنی جانِ جگر کی آواز کو سن کر میرا تن من سرفراز ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے میں اندر سے جی اٹھا ہوں، میں ان کیف آور مسرور لمحات کی سیرابی اور فیض یابی کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میری جسمانی' ذہنی اور روحانی کیفیت کو وہ لوگ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں جو کبھی میرے ایسے حالات سے گزرے ہوں، جنہوں نے کبھی کسی کو اپنے دل میں بسایا ہو اور آنکھوں سے گنوایا ہو پھر ملن کی آس میں جدائی کی صدیاں بتائی ہوں اور ان صدیوں کا ایک ایک لمحہ انتظار ...... ایک طویل انتظار کی نذر کیا ہو۔ ہر صبح ...... یہ سوچ کر دن کو پاتا ہو کہ یہ انتظار کا آخری روز ہو گا اور ہر شام ...... یہ سوچ کر رات کو کاٹا ہو کہ یہ ہجر کی آخری شب ثابت ہو گی۔

میرا ہجر' فراق' جدائی اور عذاب ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے

ملن میں اب کسی بات کی دیر نہیں تھی، ہمارے درمیان صرف ایک بند دروازہ تھا۔ اس دروازے کی دوسری جانب وہ موجود تھی جس کی تلاش میں' میں دردر کی خاک چھان کر یہاں پہنچا تھا۔ اب اس آخری چوبی دیوار کو گرانا باقی تھا پھر ہمارے ملاپ کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ اٹھ جاتی۔ ہم ایک ہو جاتے۔

یہ تمام تر خیالات ایک سیکنڈ میں میرے ذہن سے گزرے اور میں اگلے قدم کے لیے تیار ہو گیا۔ بے اختیار میرا ہاتھ بیگ کے اندر پہنچ گیا۔ میرے بائیں پہلو میں لٹکنے والے اس بیگ میں دیگر اہم اشیا کے ساتھ ہی ایک خطرناک گن بھی موجود تھی۔ یہ گن میں نے اس بنگلے کے نیلے گیٹ پر متعین گارڈز سے ''حاصل'' کی تھی۔ ان میں سے جم تو... جہنم کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکا تھا جب کہ فلوس حفاظتی باڑھ میں منہ چھپائے مزے کی ''نیند'' سو رہا تھا۔ ان کی گنز میں سے ایک کو میں نے اپنے بیگ میں ڈال لیا تھا۔ جب کہ دوسری کو گیٹ کے باہر گھاس میں ایک جگہ چھپا دیا تھا تاکہ بہ وقتِ رخصت کسی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس گن کو وہاں سے نکال کر استعمال کیا جا سکے۔

سلوان نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں مجھے بتایا تھا، ساحل والے بیڈ روم کی چابی نیچے والے ایک کمرے میں پڑی ہے۔ میرے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں نیچے جاتا اور اس کے بتائے ہوئے ڈریسنگ میں سے وہ چابی نکال کر لاتا، میں ساحل کے اتنا قریب آ چکا تھا کہ اسے حاصل کیے بغیر کہیں آنے جانے کا تصور بھی محال تھا۔

اس کے استفسار کو تین سیکنڈ گزر گئے تھے اور ابھی تک اسے باہر سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا۔ وہ یقیناً تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ میں اس کی کسی پریشانی یا تشویش کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور تھرڈ آئی کے توسط سے ساحل کے ماحول میں پہنچ گیا۔ میں دراصل اس کی لوکیشن معلوم کرنا چاہتا تھا تاکہ میری فائرنگ کے نتیجے میں اس کا بال بھی بانکا نہ ہونے پائے۔

وہ چوبی دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی کمرے میں اس وقت گھپ اندھیرے کا راج تھا تاہم تھرڈ آئی کے علاوہ میری تمام تر حسیات بھی بیدار تھیں۔ میں نے ساحل کو تاریکی کے باوجود بھی اپنی دھڑکنوں کے قریب محسوس کر لیا، میں اس بیڈ روم کے ایک ایک چپے سے ایسے ہی آشنا ہو چکا تھا جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے واقف تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، ساحل کا تشویش بھرا استفسار میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

''کوئی بولتا کیوں نہیں'' اس نے فکر مندی سے پوچھا' ''باہر میں نے یہ کیسی آوازیں سنی ہیں؟''

ساحل نے اس بنگلے میں رہنے والوں سے سوال کیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ میں اس سے چند انچ کے فاصلے پر کھڑا ہوں۔ مجھے بھی یہ کامیابی ایک خوش گوار خواب کے مانند محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ایسے ہی لگا جیسے وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو اور پوچھ رہی ہو' میں بولتا کیوں نہیں؟

میں بولا اور بڑی سنجیدگی سے بولا' ''ساحل! دروازے کے پاس سے ہٹ کر دور چلی جاؤ۔ میں فائرنگ سے اس کے لاک کو اڑا رہا ہوں۔ تمہارے لیے سب سے زیادہ محفوظ مقام ڈریسنگ کا پچھواڑا ہے۔ کم آن ...... ہری اپ!''

میں اس وقت اپنی اصل آواز میں بولا تھا۔ میری اس آواز کو ساحل سے زیادہ اور کون پہچان سکتا تھا اور یقیناً اس نے پہچان لیا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب چھا جانے والی گمبھیر خاموشی اس امر کا ثبوت تھی میرے پاس اس سکوت کو برداشت کرنے کی مہلت تھی اور نہ ہی ہمت۔ میں نے بلند مگر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ساحل! میں صرف تین تک گنوں گا۔ اس کے بعد لاک کو اڑا دوں گا۔ تم تین چار سیکنڈ میں میری بتائی ہوئی محفوظ جگہ پر پہنچ جاؤ۔''

اس کی جذبات سے لب ریز آواز میری سماعت تک پہنچی' ''وج ...... وجدان ......!''

''ہاں' میں ہی ہوں'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا' ''اور میں گنتی شروع کر رہا ہوں ون!''

میں نے ٹٹول کر گن کی نال کو دروازے کے ہینڈل کے قریب پہنچا دیا۔ اسی لمحے کوری ڈور روشنی سے بھر گیا۔ لائٹ آ گئی تھی یا پھر اگر دانستہ لائٹ کو کسی خاص مقصد کے تحت آف کیا گیا تھا تو اب کسی خاص الخاص مقصد کی خاطر آن بھی کر دیا گیا تھا۔

''ٹو ...... تھری ......'' میں نے گنتی پوری کر دی۔

میں نے دانستہ ٹھہر ٹھہر کر گنا تھا تاکہ ساحل بہ آسانی محفوظ مقام تک پہنچ جائے اور اب تو لائٹ بھی آ گئی تھی، میں نے مطمئن ہونے کے بعد اس خطرناک گن کے مہلک دہانے کو لاک پر کھول دیا۔

بنگلا فائرنگ کی خوف ناک آواز سے گونج اٹھا۔ دروازے کا لاک کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تیز رفتار تباہ کار گولیوں

نے اسے اس کے مقام سے ہٹا کر بتا نہیں کس کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دروازے پر ایک غصیلی کک رسید کی اور کمرے کے اندر داخل ہوگیا۔

ساحل جلدی سے ڈریسنگ کے پیچھے سے نکلی اور پھر مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ میں توقع کر رہا تھا، وہ کمان میں سے نکلے ہوئے تیر کے مانند ٹھک سے آ کر میرے سینے میں پیوست ہوجائے گی لیکن وہ ٹھٹک کر استجابیہ نظر سے مجھے دیکھتی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے اس کی ہچکچاہٹ' حیرت اور استعجاب کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔

میں اس وقت یوسف الظاہری کے میک اپ میں تھا۔ وہ اپنے وجدان کو دیکھنے کی توقع کر رہی ہوگی، ایک اجنبی چہرے کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ بری طرح الجھ گئی تھی۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''ساحل! ایک ایک سیکنڈ بہت قیمتی ہے۔ ہمیں فوری طور پر اس بنگلے سے نکلنا ہے۔ اگر آج ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوگئی تو پھر ہم زندگی بھر کبھی مل نہ پائیں گے۔ آؤ...... میرے پاس آؤ...... میرے ساتھ آؤ۔'' یوسف الظاہری کے حلیے کے باوجود بھی وہ مجھے پہچان گئی، کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''وجدان! تم میک اپ میں ہو؟''

''ہاں...... میں نے اپنا حلیہ بدل رکھا ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

زیرو پاور کے بلب کی نیلگوں لائٹ میں' میں نے ساحل کے چہرے پر دھنک رنگ بکھرتے دیکھے۔ یہ خوشی اور کامرانی کے رنگ تھے۔ اتنی بڑی کامیابی کہ چند لمحے پہلے جس کا تصور کرنا بھی محال تھا۔ اگلے ہی لمحے ہم نے بے ساختہ پیش قدمی کی اور ایک جان دو قالب کی عملی تفسیر پیش کرنے لگے۔

ان لمحات میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت ایک مقام پر ٹھہر گیا ہو۔ وقت کے اس ٹھہراؤ میں بڑی گہرائی، گیرائی اور بے پروائی تھی۔ یہ دو انتہاؤں کا امتزاج پیش کر رہا تھا۔ ایک سنگین ترین صورتِ حال میں ہم اپنے آپ سے اور اس ماحول سے یک سر بے گانہ ہوگئے تھے۔ ہمارے دل اتنی شدت سے دھڑک رہے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن کو اپنے سینے پر محسوس کر رہے تھے۔ وہ بڑے ہی مدہوش اور خود فراموش لمحات تھے۔ جی چاہتا تھا، وقت یونہی تھما رہے اور ہم ایک دوسرے میں اس شدت سے پیوست ہو جائیں کہ دوئی کا احساس جاتا رہے۔

یہ ایک غیر فطری خواہش تھی اس لیے پوری نہیں ہوسکتی تھی۔ وقت بڑا ظالم ہے' یہ کسی کے لیے نہیں ٹھہرتا۔ اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہماری بے گانگی نے ہمیں یہ احساس دلایا تھا کہ وقت تھم گیا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جلد ہی یہ سفاک حقیقت ہم پر آشکار ہوگئی۔ بیڈ روم سے باہر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر ہم ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔

خطرناک گن میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ساحل کو دروازے کی اوٹ میں کھڑا رہنے کو کہا اور گن سونت کر بیڈ روم سے باہر نکلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوا کہ کون ہماری طرف دوڑا چلا آ رہا ہے۔ ساحل کے سوا اس بنگلے میں پایا جانے والا ہر شخص میرے لیے دشمن کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور میں انہیں اب تک ان کے شایانِ شان ''اہمیت' دیتا آیا تھا...... اور آئندہ بھی میرا ارادہ یہی تھا۔ ویسے میرے اندازے کے مطابق' بنگلے میں صرف تین افراد ایسے بچے تھے جو میری... راہ میں مزاحم ہو سکتے تھے۔ ان میں سے دو نچلی منزل پر تھے یعنی ربی اور اس کا سیکریٹری اور تیسرا رونالڈ' آنجہانی سلوان کے اشارے پر کہیں نکل گیا تھا۔ زیادہ امکان اسی کی آمد کا تھا لہٰذا میں پلک جھپکتے میں' آنکھیں بند کر کے اس کے ماحول میں پہنچ گیا۔

اگلے ہی لمحے میں نے رونالڈ کو اپنے بہت قریب کوری ڈور میں دوڑتے ہوئے پایا۔ اس نے ایک ہاتھ میں ہلاکت بردار گن بھی اٹھا رکھی تھی۔ یہ دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز اسی کی تھی۔ وہ چکردار زینے کی طرف سے سیدھا اس بیڈ روم کی طرف آ رہا تھا جہاں اس وقت میں اپنے حصول کے ساتھ موجود تھا۔ رونالڈ کا اس سمت سے آنا یہ بھی ظاہر کرتا تھا کہ وہ زیریں منزل پر حاضری لگا کر آ رہا ہے۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے کچن کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا' ادھر سے بھی کوئی خفیہ راستے زیریں منزل تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔

اس کا نیچے سے ہو کر واپس اوپر آنا یہ ظاہر کرتا تھا' اب تب میں ربی موشے ہائمن کا سیکریٹری ہرشل حنان بھی اس طرف چڑھائی کرنے والا ہے۔ ربی دل کا مریض ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی جانب سے کسی عملی پیش رفت کی امید نہیں تھی البتہ اس کے اشارے پر ہرشل ضرور کوئی قیامت ڈھا سکتا تھا۔ وہ اگر اوپر کا رخ نہ بھی کرتا تو نیچے رہ کر بھی کوئی نہایت ہی مہلک دشمنانہ کارروائی کر سکتا تھا۔

انسان کا ذہن ایک اعلیٰ اور پیچیدہ مشین ہے۔ یہ جتنی زیادہ تیز رفتاری سے سوچ سکتا ہے' اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے یہ تمام تر باتیں محض دو تین سیکنڈ میں سوچی ہوں گی' صرف اتنی قلیل مدت میں جب رونالڈ میری باطنی نگاہ میں آنے کے بعد اس بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا۔ وہ جیسے ہی کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچ کر ٹھٹکا' میں آنکھیں کھول کر اس کے سامنے حاضر ہوگیا۔

یہ حاضری اسے بہت مہنگی پڑی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح چونکا پھر ایسے بدکا جیسے کسی خطرناک بچھو کو دیکھ لیا ہو۔ یہ بدکنا اس کی زندگی کا آخری سودا تھا کیوں بدکنے کے ساتھ ہی اس نے گن میری جانب سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی۔

کوشش کی تھی...... ان معنوں میں کہ میں نے اس کی حسرت کو نکلنے نہیں دیا۔ گن کا بیرل اپنی سمت اٹھنے سے پہلے ہی میں نے ایک مہلت برسٹ فائر کر دیا۔ بنگلا ایک مرتبہ پھر فائرنگ کی مخصوص خوف ناک تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔

میں نے رونالڈ کے بدن کو گولیاں کھا کر چھلنی میں بدلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے منحوس وجود میں مضحکہ خیز حرکت جاگی پھر وہ کوری ڈور کے چکنے فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ یہ اس سے میرا پہلا سامنا تھا جو اس کی زندگی کا چراغ گل کر گیا۔ اس سے قبل میں نے گارڈ روم کی تاریکی میں اس کی پشت پر رہ کر تھوڑی ''مرمت'' کی تھی۔

کوری ڈور کے فرش پر رونالڈ کا بدن ہلکے ہلکے جھٹکے لے رہا تھا۔ میں نے درجنوں بار زندگی کو موت کے سامنے سرنگوں ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں جانتا تھا' وہ زندگی ہار رہا ہے لیکن میرے پاس ہار جیت کے اس کھیل کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے ساحل کا ہاتھ تھاما اور کوری ڈور میں نکل آیا۔

میں نے بنگلے کی بالائی منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جو پیچیدہ اور کٹھن طریقۂ کار اختیار کیا تھا' واپسی کے لیے اس پر عمل کرنا ممکن تھا اور نہ ہی موزوں۔ اس وقت میں اکیلا ہی تھا اور اپنی زندگی کو حاصل کرنے کے لیے میں نے تن من داؤ پر لگا رکھا تھا۔ اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر میں وہاں تک پہنچا تھا مگر اب وہ ہستی' میری جانِ تمنا میرے ساتھ تھی۔ میں اسے کسی قسم کی آزمائش یا مصیبت میں ڈالے بغیر اس بنگلے سے نکل جانا چاہتا تھا...... اور اس مقصد کے حصول کے لیے نہایت ہی سیدھا راستہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے ساحل کا ہاتھ تھامے تھامے چکردار زینے کی جانب دوڑ لگا دی۔

ہم زینے کے قریب پہنچے تو نیچے سے ہرشل آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چکردار زینے پر قدم رکھنے ہی والا تھا۔ میں نے اسے سنہری بالوں' سائیڈ مانگ، دراز قامتی اور سوٹڈ بوٹڈ ہونے کے سبب پہچان لیا، اتنے فاصلے سے اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں نے تھرڈ آئی کے توسط سے اتنی مرتبہ اس کے ماحول میں حاضری دی تھی کہ مبینہ خصوصیات اور علامات کے پیشِ نظر اسے شناخت کرنے میں کوئی کوتاہی یا غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس بنگلے میں اب ربی اور ہرشل ہی دو ایسے افراد بچے تھے جو کسی نہ کسی حد تک ہمارے ''فرار' کی راہ میں مزاحمت پیش کر سکتے تھے۔ ہرشل کے ہاتھوں میں پسٹل دیکھ کر میں محتاط ہوگیا۔

میں نے ساحل کو اپنے جسم سے کور کیا اور ہرشل کے پاؤں میں فائرنگ کر دی۔ میں اس کی جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا' اس فائرنگ سے محض اسے خوف زدہ کرنا مقصود تھا۔ اگر میں چاہتا تو اسٹریٹ فائرنگ کر کے اس آوارہ خیال ''نائٹ ریڈر'' کو صفحۂ ہستی سے مٹا سکتا تھا مگر میں اسے ایک خاص مقصد کے تحت زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے پچھلے چند روز میں اپنے مستقبل کے بارے میں بہت سنجیدگی سے سوچا تھا اور اس سلسلے میں ایک لائحہ عمل بھی میرے ذہن میں ترتیب پا چکا تھا۔ ہرشل حنان کا زندہ رہنا بھی اسی زنجیر کی ایک اہم کڑی تھا۔

ہرشل یہی سمجھا کہ میں نے اسے نشانہ بنانے کے لیے فائرنگ کی ہے۔ وہ تیزی سے نیچے کو جھکا پھر ایک پہلو میں رولنگ کرتے ہوئے دور نکل گیا۔ اس نے بڑی پرفیکٹ اور ماہرانہ انداز میں رولنگ کی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ مارشل آرٹس سے بہ خوبی آشنا تھا۔ ہرشل کی زندگی کا یہ ایک نیا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ میں پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا۔

وہ رولنگ کی تکمیل کے بعد کھسک کر میری نگاہ سے اوجھل ہوگیا تھا۔ یہ سوچنا حماقت کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ دم دبا کر فرار ہوگیا ہوگا۔ اس بنگلے میں اب وہ اور ربی موشے ہائمن ہی دو قابلِ حرکت افراد باقی بچے تھے۔ ہرشل' ربی کا معتمد خاص' باڈی گارڈ اور پرسنل سیکریٹری...... سب کچھ ہی تھا۔ اس ساری مارا ماری میں اب تک ربی کی صورت کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ پتا نہیں' وہ اپنے بیڈ روم ہی میں بے خبر سویا پڑا تھا یا کسی اور سنگین کارروائی کی ڈوریاں ہلا رہا تھا۔ اس طاقت ور شخص کے ڈانڈے بہت دور تک ملتے تھے۔ اگر

وہ موجودہ صورتِ حال سے آگاہ ہوگیا تھا تو پھر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ایک لاکھ والا ہاتھی مرنے کے بعد سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ ربی بھی اختیارات کا ہاتھی تھا۔ عارضۂ قلب نے اسے اور بھی بااختیار کر دیا ہوگا ویسے اس کے بارے میں مصدقہ خبریں تو ہرشل حنان ہی دے سکتا تھا۔

میں نے چکردار زینے کے بالائی سرے پر کھڑے رہ کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کی معرفت ہرشل کے ماحول میں اتر گیا۔ وہ زیریں منزل میں کمرا در کمرا گھومتے ہوئے اپنے چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جو ربی موشے ہائمن کے بیڈ روم سے الحاق رکھتا تھا۔ اسی کمرے میں فوڈ اسکیننگ اینڈ اسکریننگ مشین نصب تھی اور یہیں پر رکھی ایک آرام کرسی میں دبک کر وہ تصوراتی عیاشی کا شائق ہرشل حنان جیکی کولنز اور اما نڈا الیئر کے مادر پدر آزاد ناولز کا مطالعہ فرماتا تھا۔

میں نے آنکھیں کھول کر ساحل کی طرف دیکھا اور اضطراری لہجے میں کہا ”آؤ...... خطرہ کچھ فاصلے پر چلا گیا ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

وہ ایک لفظ ادا کیے بغیر میرے ساتھ ہولی۔ میں اس کا ہاتھ تھامے بڑی تیزی سے وہ چکردار زینہ اترنے لگا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے ہرشل کو اس کے مخصوص کمرے میں چھوڑا تھا۔ وہ چھوٹا سا کمرا ربی موشے ہائمن کے بیڈ روم سے ملحق تھا۔ زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ سیدھا اپنے ربی مربی کے پاس پہنچے گا۔ میں اس پر نظر رکھنے کے لیے تیسری آنکھ کو مسلسل استعمال میں نہیں لا سکتا تھا۔ اس مقصد کی خاطر مجھے ظاہرہ آنکھیں بند کرنا پڑتیں اور...... فی الحال میں ایسا کرنا افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

میں ساحل کی معیت میں زیریں منزل پر پہنچ گیا۔ یہ ایسے قیامت خیز اور حشر بپا لمحات تھے کہ میں ساحل سے کوئی بات اطمینان سے نہیں کر سکتا تھا۔ کسی پرسکون مقام پر پہنچنے کے بعد ہی تسلی بخش انداز میں گفتگو ہو سکتی تھی۔

زینہ اترتے ہوئے میرے ذہن میں یہی تھا کہ میں ہرشل اور ربی پر لعنت بھیج کر سیدھا گیٹ کی طرف جاؤں گا اور جلد از جلد اس بنگلے سے نکلنے کی کوشش کروں گا، لیکن زیریں منزل پر قدم رکھتے ہی ایک نئی اور اچھوتی سوچ نے میرے ذہن میں گھر کر لیا۔ جس شخص نے اب تک ساحل کو مجھ سے دور کر کے مجھے سپردِ عذاب کر رکھا تھا اس کا دیدار کیے بغیر وہاں سے رخصت ہو جانا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی بھوکا کھانا کھانے بیٹھے اور پانی کا ایک گھونٹ بھر کر دسترخوان سے اٹھ جائے!

ربی کے رویے نے مجھے شدید الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ میں گزشتہ پندرہ بیس منٹ سے بڑے ”طمطراق“ کے ساتھ اس بنگلے میں سرگرمِ عمل تھا۔ ”میری یہ ”سرگرمی“ اتنی سنگین نوعیت کی تھی کہ اس بنگلے کا کوئی بھی مکین دم سادھ کر اپنے کمرے میں نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ حیرت اور تشویش مجھے اس بات کی تھی کہ ابھی تک کہیں ربی کی شکل دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کی یہ پُراسرار اور طویل خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی ایک ایسا طوفان...... جو ہمارے لیے کسی بھی وقت کوئی مشکل کھڑی کر سکتا تھا۔ میں نے ربی کو چیک کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے زیریں منزل کی اندرونی سمت قدم بڑھا دیے۔

سب سے پہلے وہ کمرا پڑتا تھا جس میں تھوڑی دیر پہلے سلوان اور ہرشل کا فربہ اسسٹنٹ ابراہام آرام فرما رہے تھے۔ وہ دونوں کم بخت آرام تو اس وقت بھی فرما رہے تھے لیکن ان کے آرام کی منزل اور نوعیت یک سر بدل گئی تھی۔ اس سے پیش تر وہ یہ رات گزارنے کے لیے اپنی مرضی سے اس کمرے میں سوئے تھے اور اب وہ میرے حسبِ منشا بالائی منزل کے کوری ڈور میں زندگی گزار چکے تھے۔ میری اس منشا کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رونالڈ نے بھی اچھا خاصا تعاون کیا تھا!

سلوان نے اپنی موت سے چند سیکنڈ قبل معلومات فراہم کرتے ہوئے مجھے بتایا تھا کہ ساحل والے بیڈ روم کی چابی...... بلکہ چابیاں زیریں منزل والے اس کمرے کی ڈریسنگ کی پہلی دراز میں رکھی ہیں۔ لفظ ”چابیاں“ کا یہی مطلب تھا ساحل والے بیڈ روم کے علاوہ اس کی گرے کار کی چابی بھی انہی چابیوں میں شامل ہوگی۔ مجھے وہاں سے فرار ہونے کے لیے ایک گاڑی کی ضرورت تو تھی ہی۔ میں نے سلوان کی گرے کار سے استفادے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کمرے تک رسائی حاصل کر لی۔

کمرے میں لائٹ روشن تھی لہٰذا مجھے مذکورہ ڈریسنگ کی تلاشی لینے میں بہ مشکل پانچ سیکنڈ لگے ہوں گے۔ سلوان نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی عیاری دکھانے میں کسی کنجوسی یا بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ لگتا تھا، دروغ گوئی اس کی حیات کا اول آخر مقصد رہا ہو۔ اس کی بتائی ہوئی ”چابیاں“ ڈریسنگ کی پہلی دراز کیا کسی دراز میں بھی موجود نہیں تھیں۔

میں نے دو آنکھیں بند کیں اور تیسری آنکھ کھول کر ہرشل حنان کے پاس پہنچ گیا۔ وہ چند قدم کی دوری پر اپنے

اسی چھوٹے سے مخصوص کمرے میں موجود تھا جہاں مختلف قسم کے چیکنگ آلات کے علاوہ اسکریننگ اینڈ اسکیننگ کی مشینیں بھی نصب تھیں۔ وہ اس وقت ایک خطرناک آٹومیٹک گن کو بڑی سرعت اور مہارت کے ساتھ لوڈ کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے چکردار زینے کے نچلے حصے میں اسے ایک پسٹل کے ساتھ دیکھا تھا لیکن میری فائرنگ نے اسے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس دوران میں ہرشل نے ربی کے پاس ”حاضری“ دی تھی یا نہیں لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ اس خطرناک لوڈڈ گن کے ساتھ ہماری طرف آنے والا تھا۔ میں بھی اس کے شایانِ شان استقبال کے لیے پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے آنکھیں کھول دیں۔

ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں سلوان اینڈ کمپنی المعروف بہ ”تازہ تازہ آنجہانی“ کے کمرے سے نکلا اور فربہ ابراہام کے کمرے میں ہوتے ہوئے ہرشل والے چھوٹے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ ساحل کو میں نے ابراہام والے کمرے میں روک دیا تھا۔ ہرشل کے کمرے کا ایک دروازہ ربی والے بیڈ روم میں کھلتا تھا اور دوسرے دروازے پر کھڑا میں اس کی نمودار کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ ایک مختصر سا کوری ڈور تھا جو مختلف زاویوں سے ان تین کمروں کو آپس میں ملاتا تھا۔

میں گن سونتے ریڈ الرٹ کھڑا تھا کہ میرے بائیں پہلو پہ آہٹ کی...... وہ دروازہ کھلا جہاں سے ہرشل کی آمد کی امید تھی۔ اس بنگلے میں اچھی خاصی فائرنگ ہو چکی تھی۔ میں مزید تڑتڑاہٹ کو ابھار کر فضا کو مجروح کرنے کے موڈ میں نہیں تھا لہٰذا اس سے پیش تر کہ ہرشل کمرے سے باہر آتا میں نے باڈی کو ٹوئسٹ کرتے ہوئے ایک دھواں دھار گھٹنا اس کے زیرِ ناف رسید کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی باکسنگ کے انداز میں دونوں بازوؤں کے درمیان اپنے چہرے کو محفوظ رکھتے ہوئے میں نے اسے اندر کی جانب دھکیل دیا۔

میری یہ سریع پیش رفت ہرشل کی توقع کے بالعکس تھی۔ وہ تو مجھے زیر کرنے نکلا تھا۔ اسے امید نہیں تھی میں پلک جھپکتے میں زبر ہو جاؤں گا۔ میرا حملہ اچانک اور شدید تھا۔ وہ حلق سے ایک کرب ناک ”اوں“ خارج کرتے ہوئے، ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ پیچھے کو گیا پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔

میں اس کے پیچھے ہی بھرا مار کر کمرے میں داخل ہوا اور پے در پے دو تیز رفتار راؤنڈ ہاؤس ککس چلا دیں۔ وہ میرے ابتدائی اٹیک سے بری طرح بے توازن ہو چکا تھا لہٰذا اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ میری لیفٹ اور رائٹ راؤنڈ ہاؤس نے اس کے چہرے کی بھرپور مزاج پرسی کی۔ اس کے ساتھ ہی..... ایک دھانسو قسم کی سائیڈ کک چلا دی۔ وہ ایک مختصر سا کمرا تھا۔ میری سائیڈ کک کا تحفہ وصول کرنے کے بعد ہرشل فضا میں تھوڑا بلند ہوا پھر صحرائی طوفان کی زد میں آئے ہوئے اونٹ کے کسی بچے کے مانند لڑھکتے ہوئے وہ اسکریننگ مشین سے جا ٹکرایا۔

اس کے حلق سے ایک مرتبہ پھر تکلیف بھری ”اوں“ برآمد ہوئی۔ وہ خاصا سخت جان واقع ہوا تھا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو تکلیف کی شدت سے چلا چلا کر بنگلے کو سر پر اٹھا لیتا لیکن افسوس کہ اس کی سخت جانی کو ”انجوائے“ کرنے کی میرے پاس مہلت نہیں تھی۔ میرا ایک ایک لمحہ انتہائی قیمتی تھا۔ شعوری اور لاشعوری طور پر مجھے اس حیرت انگیز تشویش نے گھیر رکھا تھا کہ اتنی مار دھاڑ اٹھا پٹخ اور فائرنگ کے باوجود بھی ربی موشے ہائمن اپنی آرام گاہ سے باہر کیوں نہیں نکلا تھا۔ اس قیامتی ہنگامے پر تو اسے ذخیرہ اندوز نہیں بلکہ جلوہ افروز ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ ٹھیک ہے وہ دل کا مریض ہو گیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ انسان گھوڑے گدھے بیچ کر اور بھنگ پی کر یوں بےخبر سوتا رہے۔

ایک لمحے کے لیے یہ خطرناک خیال بھی میرے ذہن سے گزرا کہ کہیں ربی چپ چپاتے ابدی سفر پر تو روانہ نہیں ہو گیا؟ اگلے ہی لمحے میں نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور ہرشل حنان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ فوڈ اسکریننگ مشین سے الجھتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور تشویش کی بات یہ تھی کہ اس تمام تر مار اماری کے دوران میں اس نے خطرناک لوڈڈ گن کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا تھا اگر میں اسے ایک لمحے کی مہلت بھی دے دیتا تو وہ گن کے بیرل کو میری سمت سیدھا کر کے زمین سے آسمان کی طرف روانہ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایسے کسی واہیات ارادے پر عمل کرتا میں نے ایک چیتے کے مانند جست بھری اور اس کے انتہائی قریب پہنچ گیا۔

وہ اسکریننگ اور اسکیننگ مشینوں کے درمیان پھیلی ہوئی مختلف نلکیوں اور ٹیوبز سے الجھا ہوا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دو چار مسالے دار پنچ یکے بعد دیگرے اس کے جبڑوں پر رسید کر دیے۔ وہ خود کو میرے خونخوار حملے سے

بچانے کے لیے گردن کو دائیں بائیں جھٹکنے لگا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک عقابی جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے گن کو چھین لیا۔

نہتا ہوتے ہی وہ سراسیمہ دکھائی دینے لگا۔ میرے طوفانی مکوں نے اس کی ناک اور منہ سے خون چھڑا دیا تھا۔ اس کی سراسیمگی میں بے بسی بھی شامل ہوگئی۔ اس نے چند لمحے پہلے چکر دار زینے کے قریب جتنی تو تیک رولنگ کی تھی اس سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا، وہ مارشل آرٹس سے گہری واقفیت رکھتا ہے لیکن شومیٔ قسمت کہ میرے سامنے اسے اپنے فن کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس سے پیش تر کہ وہ صورت حال کو سمجھ پاتا' میں نے پے در پے حملوں سے اسے کارزر کر دیا تھا۔

میں نے اس کی گن کو ایک طرف پھینک دیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ شاید وہ اپنے طور پر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں گن چھینتے ہی اسے شوٹ کر دوں گا۔ اس کم بخت کو کیا معلوم کہ میں ایک خاص مقصد کے تحت اسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔

ارادہ تو یہی تھا کہ میں ہرشل کی تھوڑی اور خاطر تواضع کروں لیکن اپنے عقب میں ساحل کی موجودی کو محسوس کر کے میں نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا وہ مجھے یہاں نبرد آزما پاکر چپکے سے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس کے سامنے میں ہرشل پر تشدد آزما کر اسے کسی ذہنی کوفت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی بہت زیادہ ذہنی اذیتوں کے بعد آج آزاد ہوئی تھی۔ میں ان خونچکاں اور تکلیف دہ مناظر سے جلد از جلد اسے دور کر دینا چاہتا تھا لہٰذا اپنی گن کی نال کو ہرشل کے سینے کی جانب سیدھا کرتے ہوئے میں نے درشت لہجے میں سوال کیا۔

''تمہارا وہ ابی اور ربی مربی موشے ہائمن کہاں ہے؟''

وہ چکر دار زینے کے آخری سرے پر ساحل کو میرے ساتھ دیکھ چکا تھا اور اب بھی وہ بہ نفس نفیس وہاں نظر آرہی تھی۔ اس خوفناک صورت حال نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ جس ہستی کو وہ لوگ سونے اور مخمل کے آرام دہ پنجرے میں قید کر کے اس کی کڑی نگرانی پر مامور تھے' میں نے ان کی نگرانی اور نگہبانی کی ایسی کم تیسی کرتے ہوئے، ان کی لاشوں کے اوپر سے گزر کر اس ہستی کو آزاد کرا لیا تھا۔ یہ تلخ حقیقت ہرشل کو کسی صورت ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ میرے سوال کو فراموش کر کے الٹا مجھ ہی سے مستفسر ہوا۔

''تت ...... تم کون ہو؟''

''میں فاتح ہوں!'' میں نے گن کی ہلاکت بردار نال کو اس کے سینے پر ٹکاتے ہوئے کہا'' سوال کرنے کا حق صرف فاتح کو ہوتا ہے۔ مفتوح گردن جھکا کر جواب دینے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر تمہاری زبان سے اب کوئی سوال پھسلا تو میں اپنے سوال کا جواب سنے بغیر تمہیں جہنم رسید کر دوں گا۔''

موت کو چند انچ کی دوری پر ...... اور یقینی دیکھ کر اس کی آنکھوں میں دہشت بھر گئی۔ میں نے اس کی دہشت کو بڑھانے کی غرض سے پوری سفاکی کے ساتھ کہا۔

''میری معلومات کے مطابق' وہ اس کمرے میں ہونا چاہیے'' میں نے ربی کے بیڈ روم کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔ تم ربی کے سیکریٹری ہو۔ میری معلومات کے بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ خفیف سی آواز میں منمنایا۔ ''محترم ربی بیڈ روم میں سو رہے ہیں'' پھر وہ ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا'' تم کون ہو اور اس لڑکی کو کہاں لے جا رہے ہو؟''

''میں نے تمہیں سوال کرنے سے منع کیا تھا لیکن تم باز نہیں آئے'' میں نے گن کی نال کو اس کے سینے میں گڑاتے ہوئے پھنکار سے مشابہ آواز میں کہا'' اس کا مطلب ہے' تمہیں اپنی زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں۔ موت کو گلے سے لگانے سے قبل اتنا بتا دو کہ تمہارے ربی نے کب سے نشہ کرنا شروع کیا ہے۔ اس بنگلے میں ہونے والی فائرنگ کی آوازوں سے تو قبروں میں لیٹے ہوئے مردے بھی تڑپ کر اٹھ کھڑے ہوں گے' پھر تمہارا ربی کیوں مزے سے پڑا سو رہا ہے؟''

ہرشل نے الجھن زدہ نظر سے میری جانب دیکھا پھر میرا سوال اس کی سمجھ میں آیا وضاحت کرتے ہوئے بولا'' محترم ربی والا بیڈ روم مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے۔ باہر پیدا ہونے والی کوئی آواز اندر تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ انتظام ان کی صحت کے پیش نظر کیا گیا ہے!''

''اچھا انتظام ہے'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا ''اس کا مطلب ہے' اگر میں ایک خطرناک برسٹ فائر کر کے تمہارے سینے کے چیتھڑے اڑا ڈالوں تو اس بیمار ...... مگر با اختیار شخص کو مطلق خبر نہیں ہوگی کہ اس کے معتمد خاص سیکریٹری ہرشل حنان پر کیا بیتی ہے؟''

میں نے ربی کے حوالے سے ''بیمار'' کا لفظ استعمال کیا تھا' اس پر ہرشل کو اس لیے حیرت نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے پہلے ربی کی صحت کا ذکر کر چکا تھا لیکن جب میں نے اس کے مکمل نام اور عہدے کا تذکرہ کیا تو وہ گن کے بیرل کے نیچے اس

طرح ''اچھلا'' جیسے کسی زہریلے کیڑے نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔

''نہیں ...... بالکل نہیں ...... میں تمہاری زبان سے یہ سوالات سننے کے موڈ میں قطعاً نہیں ہوں ...... تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ میرا نام کس نے تمہیں بتایا ہے۔ وغیرہ وغیرہ'' میں نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے یہ ساؤنڈ پروف بیڈ روم والا سیٹ اپ تمہارے لیے بھی خاصا مفید ثابت ہو رہا ہے۔ ربی کو کچھ پتا نہیں چلتا ہوگا' تم اسے چادر اوڑھا کر' آرام سے سلانے کے بعد کس قسم کی غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہو؟''

اس نے متامّلانہ مگر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے فوراً تصحیح کر دی'' سوری ہرشل! میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ تم اپنے نسب نساب اور حسب حساب کے مطابق ہی آرام کرسی میں گھس کر، بڑی ''بے آرامی'' سے کسی سنسنی خیز امتحان کی تیاری کر رہے ہو' یہ الگ بات کہ تمہارے نصاب میں اماٹڈ الیئرا اور جیکی کولنز کی شہرۂ آفاق تخلیقات شامل ہیں!''

ایک لمحے کے لیے اس کی خون آلود صورت پر ندامت کے رنگ ابھرے پھر وہ سہم کر متوحش نظر سے مجھے تکنے لگا، میں نے تھوڑی ''محنت'' کر کے اس سے بند وین کی چابی حاصل کر لی۔ یہ وہی وین تھی جس میں ربی موشے ہائمن سلوان اور ہرشل کے ساتھ تل ابیب سے یروشلم گیا تھا۔ ہمارے فرار کے لیے یہ سب سے زیادہ موزوں سواری ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے سوچے سمجھے مقام تک پہنچانے سے پہلے میں نے اس سے آخری سوال کیا۔

''ربی کے بیڈ روم میں داخل ہونے کا طریقۂ کار کیا ہے؟''

کسی بھی بیڈ روم میں داخل ہونے کا سیدھا سیدھا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دروازہ کھولو اور اندر چلے جاؤ لیکن ربی سیدھا تھا اور نہ ہی اس کا سیکریٹری سادہ چنانچہ مذکورہ بیڈ روم تک رسائی حاصل کرنے کا طریقۂ کار سیدھا سادہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے میرے سوال کا جواب دینے میں لیت و لعل سے کام لیا اور یہ کوشش کرنے لگا کہ میں کسی طرح ٹل جاؤں لیکن میں کوئی ٹلنے کے لیے تھوڑی وہاں آیا تھا۔ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

''تم محترم ربی کو ڈسٹرب نہ کرو۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کی تاکید کی ہے اسی لیے یہاں ہونے والی ہنگامہ آرائی کے بارے میں ابھی تک انہیں کچھ نہیں بتایا گیا۔ ہمارے نزدیک ان کی جان اور صحت سے زیادہ قیمتی کوئی اور شے نہیں ہو سکتی۔ ہم بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتے ہیں لیکن محترم ربی تک ایسی کوئی خبر نہیں پہنچا سکتے۔ جس سے ان کے اعصاب پر کسی قسم کا دباؤ یا تناؤ بڑھے۔ میں ان کا سیکریٹری ہوں۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے' مجھ سے کہہ سکتے ہو!''

اس کی اس جذباتی ''تقریر'' کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑی شدت سے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ کوئی ایسا موقع جس سے وہ ہاری ہوئی بازی کو جیت میں بدل سکے۔ ہزار قسم کی وحشت اور خوف زدگی کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں چھلکنے والی مخصوص یہودی عیاری کو میں نے پلک جھپکنے میں بھانپ لیا مگر میں اس نامراد کو کوئی ایسا موقع کیوں فراہم کر سکتا تھا؟

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نہایت ہی سرد لہجے میں کہا'' یہ بات مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا کہ تم ربی کے سیکریٹری یعنی راز بردار ہو لیکن منے! جو راز و نیاز میں تمہارے ربی سے کرنے آیا ہوں' وہ باتیں تم سے تو نہیں ہو سکتیں نا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں' کارڈیالوجسٹ منا ہم صرف ربی کی خاطر یروشلم سے اسے دیکھنے کے لیے تل ابیب آتا ہے۔ منا ہم پارک لین ہوسپٹل کا ایک چوٹی کا ماہر امراض قلب ہے' جس کی رہائش یروشلم کے ایک پوش رہائشی علاقے بیت سفافہ میں ہے۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہ آرہا ہو تو میں منا ہم کی گاڑی اور بنگلے کا نمبر بھی دہرا دیتا ہوں۔ بنگلا نمبر ایٹ ...... نائنٹی فائیو ...... نیوی بلیو گاڑی کا نمبر نائن ...... جے ایکس ...... ون ٹو زیرو ......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

میں یہ تمام تر معلومات محض اس مقصد کی خاطر اس کے گوش گزار کر رہا تھا کہ اس کے ذہن میں یہ بات کسی بری طرح ہارے ہوئے امیدوار کی طرح بیٹھ جائے کہ میں'' ربی اینڈ کمپنی'' کے بارے میں ان لوگوں سے کہیں زیادہ جانتا ہوں اور اگر چاہوں تو پلک جھپکتے میں ان کا بھٹا بھی بٹھا سکتا ہوں۔ میری اس نفسیاتی چال کا اس پر حد سے زیادہ اثر ہوا۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

''تم کوئی خطرناک قسم کے جادوگر ہو ...... بہت ہی خطرناک ......!''

''میرے بچے!'' میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا یہ پچکار بڑی عجیب و غریب تھی کیونکہ ہرشل عمر میں مجھ

سے کہیں بڑا تھا'' اس لیے تو میں کہہ رہا ہوں' شرافت سے وہ بتا دو جو میں نے پوچھا ہے ورنہ مجھے خواہ مخواہ تم پر کوئی جادوئی محنت کرنا پڑے گی جس کے نتیجے میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے!''

میرے الفاظ کی سنگینی اور لہجے کی قطعیت نے اسے لرزا کر رکھ دیا۔ وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا'' نن ...... نہیں ...... نہیں' نہیں میں بتا رہا ہوں۔ تم مجھ پر کوئی جادوئی عمل نہ کرنا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا ......''

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہرشل حنان کوئی ڈرپوک اور بزدل قسم کا بندہ تھا۔ ربی موشے ہائمن کا پرسنل سیکرٹری ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ اختیارات کے ساتھ ساتھ مارشل آرٹس کے فن سے بھی بہ خوبی واقف تھا لیکن جب وقت ہی الٹا پڑ جائے تو بڑے سے بڑا طرم خان بھی بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت سب سے زیادہ محبت اپنی زندگی سے کرتی ہے۔ جب جان کے لالے پڑ جائیں تو انسان وہ قدم بھی اٹھانے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جس کے لیے عام حالات میں وہ کسی طور بھی تیار ہونے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ اس سچویشن میں میری دہشت کے ساتھ ہی اس کی بے چارگی بھی شامل ہو گئی تھی اس لیے بھی ربی چوکھا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ربی کے انتہائی قابلِ اعتماد افراد بہ نارڈ لیو' فریکلن' سائمن' جمی فونڈا' ڈین ہاروے اور کلاڈیا جیسے خطرناک لوگ کو اپنی دہشت کے سبب عبرت ناک انجام سے دوچار کر چکا تھا۔

ہرشل حنان نے اپنی جان کی سلامتی کے لیے جیسے ہی ربی کے بیڈروم کا ''راز'' اگلا، میں اس کے نزدیک اکڑوں بیٹھ گیا۔ وہ یہی سمجھا کہ میں اپنے وعدے سے پھر کر اس کا کام تمام کرنے والا ہوں۔ زندگی جانے کے احساس نے اس کے مضبوط وجود کو لرزے ایسی کیفیت سے دوچار کر دیا لیکن اس کو ختم کرنے کا میرا ارادہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہی اب میں نے ایسا کچھ سوچا تھا۔ میں نے اس کی گردن کو اپنی گرفت میں لیا اور اس کے ایک حصے پر واقع مخصوص نس کو بڑے ٹیکنیکل انداز میں مسل کر اسے کم از کم تین گھنٹوں کے لیے ہوش و حواس سے بے گانہ کر دیا۔ اب وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے ساتھیوں اسمتھ اور میچم کی دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ وہ دنیا جسے دنیائے انشا غفیلی کہا جاتا ہے! میں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ احتیاطاً اسکیننگ اینڈ اسکریننگ مشینر سے منسلک ربر کی ٹیوبز کی مدد سے اس کے ہاتھ پاؤں کو بھی خوب کس کر باندھ دیا۔

ہرشل حنان سے ''فارغ'' ہونے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ساحل نے یہ تمام تر کارروائی دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہماری گفتگو بھی سنی تھی۔ میں پُرعزم انداز میں ربی کے بیڈروم کی جانب بڑھا تو اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''وجدان! لعنت بھیجو اس شیطان پر۔ ہمیں جلد از جلد اس بنگلے سے نکل جانا چاہیے!''

میں نے کافی عرصے کے بعد اپنی جانِ تمنا کی آواز کو سنا تھا اور سن رہا تھا۔ اس کی آواز سماعت کو بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا وہ نان اسٹاپ بولتی چلی جائے اور میں اس آواز کے دل نشیں پیچ و خم میں گم ہو کر سنتا چلا جاؤں لیکن ہم اس وقت جس نوعیت کی سنگین صورتِ حال سے گزر رہے تھے اس میں اس خواہش کی تکمیل ناممکن کے علاوہ جان لیوا بھی تھی لہٰذا میں جی مسوس کر رہ گیا۔

ویسے ساحل کی تشویش اور مشورہ بجا تھا۔ خود میری بھی یہی کوشش تھی کہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے روانہ ہو جاؤں لیکن ربی کے اتنا قریب آ کر اس کا دیدار کیے بغیر جانے کو من نہیں چاہتا تھا۔ اس شخص نے ایک عرصے تک مجھے سپردِ عذاب کیے رکھا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کی جان نہیں لوں گا لیکن میں اس کی روح پر کوئی ایسا چرکا ضرور لگانا چاہتا تھا جس کی جلن عمر بھر اسے بے چین کیے رہے۔ میں نے جسمانی' ذہنی اور روحانی اذیت کے جتنے بڑے بڑے سمندروں کو پاٹا تھا اس کے جواب میں ربی کو بھی میری جانب سے کوئی چھوٹا موٹا تحفہ ضرور ملنا چاہیے تھا۔ آخر کو اخلاقیات نبھانا بھی تو ضروری ہوتا ہے......!

ساحل کی تشویش کے جواب میں' میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' میں بھی پہلی فرصت میں یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں مگر تمہاری فرمائش پوری کرنا بھی ضروری ہے!''

میرے مبہم انداز پر وہ چونک اٹھی'' کون سی فرمائش؟''

''تم نے اس شخص کے لیے شیطان کا لفظ استعمال کیا ہے'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا'' واقعی' ربی نے ہمیں ہماری جنت سے نکال کر در بہ در کر دیا تھا۔ ہم ایک عرصے تک درد کے صحرا میں آبلہ پا ریگ پھانکتے رہے ہیں۔ ہر صبح حدت ریگ زار سے ہمارا تن من سلگا ہے اور ہر رات صحرائی خنکی میں ہماری روح جھلسی ہے۔ اللہ کے حکم سے ہم دوبارہ مل گئے ہیں۔ یوں محسوس ہو رہا ہے، ہمارا یہ ملن بچھڑنے کے بعد کا نہیں بلکہ مرنے کے بعد کا ہے۔ شاید' ہم دوسرے جہان میں دوبارہ مل رہے ہیں۔''

میں ان لمحات میں قدرے جذباتی ہو گیا تھا۔ ایک سانس کا توقف کرنے کے بعد میں نے کہا'' ساحل! تم نے ابھی ابھی فرمائش کی ہے کہ ...... وجدان! لعنت بھیجو اس شیطان پر! میں لعنت بھیجنے کے لیے ہی تو اس کے بیڈروم میں جا رہا ہوں۔ تم بھی آؤ میرے ساتھ۔ ہم اس پر دہری لعنت بھیجیں گے تاکہ اس کی روح دہرے عذاب میں مبتلا ہو کر دہری، تہری اور چوہری ہوتی رہے۔''

اس نے متلاطمانہ نظر سے مجھے دیکھا اور فکرمند لہجے میں بولی'' کیا تم ربی کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا ......؟''

''تمہاری جان کی قسم ...... نہیں!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے غیر متزلزل لہجے میں کہا'' تم آؤ تو سہی!''

میں نے اتنی لگاوٹ سے اسے پکارا تھا کہ وہ مزید کوئی سوال کیے بغیر چلی آئی۔ اگلے ہی لمحے ہم کندھے سے کندھا ملا کر ربی موشے ہائمن کے ساؤنڈ پروف کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میرے اور ساحل کے درمیان محبت اور چاہت کا جو تعلق استوار ہو چکا تھا اس سے ہم دونوں ہی بہ خوبی واقف تھے لیکن اتنے کھلے ڈلے انداز میں' میں نے کبھی اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ شاید یہ اس انتظار کا نتیجہ تھا جو میں نے ساحل کی تمنا میں' بحرِ ظلمات کے سفاک پانیوں میں رہ کر کیا تھا۔ حصولِ مقصد میں کامیابی نے مجھے بے اختیار کر دیا تھا۔

ہم دروازے کے نزدیک جا کر رکے پھر میں نے ہرشل کی بتائی ہوئی ٹیکنیک استعمال کر کے وہ دروازہ کھول لیا۔ اگلے ہی لمحے ہم دروازہ کھول کر ربی کے بیڈروم میں داخل ہو رہے تھے۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے اپنی پشت پر دروازے کو بند کر دیا۔

میں نے آخری مرتبہ جب ہرشل کے توسط سے ربی کی خواب گاہ میں جھانکا تھا تو ہرشل ربی کو ایک شیٹ اوڑھا کر بیڈروم سے باہر جا رہا تھا۔ ربی بستر پر دراز تھا۔ اس کے سونے یا جاگنے کے بارے میں' میں مصدقہ طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کو دیکھ کر یہی اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ وہ سو چکا ہوگا۔ میں ان لمحات میں اسے ہرشل کے توسط سے دیکھنے پر مجبور تھا۔

پتا نہیں' وہ کب بیدار ہوا تھا' بہر حال ہم کمرے میں پہنچے تو وہ جاگ رہا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش بھی کر ڈالی۔ اس کے اس بری طرح چونکنے کا سبب ساحل تھی۔ وہ اسے اپنے سامنے آزاد کھڑا دیکھ کر متعجب ہوا تھا۔ مجھے وہ یوسف الظاہری کے بھیس میں پہچان نہیں سکا تھا۔

میں بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور کہا'' بُری بات ...... موشے ہائمن ...... تم دل کے مریض ہو۔ یوں اچانک اٹھ کر کہیں چل دینا تمہارے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ری لیکس!''

میں اس وقت اپنے اوریجنل لب و لہجے میں بولا تھا۔ ربی جیسے گرگِ باراں دیدہ کے لیے یہ ایک بہت بڑا اشارہ تھا۔ وہ یوں ساکت ہو گیا جیسے موت کے فرشتے کو اچانک غیر متوقع طور پر اپنی نگاہ کے سامنے دیکھ لیا ہو۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اور غروب ہونے والے رنگوں کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آئی کہ وہ مجھے وجدان کی حیثیت سے پہچان چکا ہے۔ وہ تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا' میری آواز سنتے ہی اس کی جسمانی جنبشوں کو بریک سے لگ گئے۔ میں نے بات مکمل کرنے کے بعد تمسخرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

ربی کمال کا شخص تھا۔ اس کی عمر سوا سو سال کے قریب تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان دنوں عارضۂ قلب میں بھی مبتلا تھا اس کے باوجود بھی اس نے پلک جھپکتے میں خود کو سنبھال لیا۔ ایک لمحہ ساکت کھڑے رہنے کے بعد وہ بڑے سکون سے بستر پر بیٹھ گیا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولا۔

''وجدان! میرے بچے ...... بالآخر تم مجھ تک پہنچ ہی گئے ......!''

''مجھے گالی نہ دو موشے ہائمن!'' میں نے چیخ سے مشابہ لہجے میں کہا'' اگر میرے دماغ کا ٹمپریچر بڑھ گیا تو وہ کچھ ہو جائے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

میں جانتا تھا' اس ساؤنڈ پروف بیڈروم میں سے کوئی آواز باہر نہیں جا سکتی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ ربی کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی شخص میری جانب میلی نظر اٹھانے کے قابل نہیں اور ربی پر میں نے عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی لہٰذا دل کی بھڑاس نکالنے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ اس شخص کے کرتوتوں نے میرے دل و دماغ کو تنور سا بنا دیا تھا۔

وہ میرے چلانے کے جواب میں بڑے صبر سے مسکرایا اور تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے گمبھیر انداز میں بولا'' مجھے یقین تھا' تم ضرور آؤ گے۔ میں تمہارا ہی تو انتظار کر رہا تھا۔''

بولنے کے دوران میں وہ یک ٹک میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ربی بے شمار پُراسرار علوم کے علاوہ ہپناٹزم کا بھی ماہر تھا۔ عمر رسیدہ اور دل کا مریض ہوجانے کے باوجود بھی اس کی آنکھوں میں پائی جانے والی مقناطیسی قوت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں محسوس کرلیا' وہ مجھے اپنی آنکھوں کی گرفت میں لینا چاہتا ہے لیکن آج میں اس کی کسی ایسی ویسی کوشش کو کامیاب کرانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ان لمحات میں' میں نے اپنے اندر ایک ترغیبی آواز کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ آواز چپکے چپکے میری باطنی سماعت میں یہ ہدایات انڈیل رہی تھی۔

''وجدان! اس شخص کی آنکھوں میں لگاتار نہ دیکھو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، یہ مسمریزم اور ہپناٹزم کا بہت بڑا ماہر ہے کہیں یہ اپنی کسی پُراسرار صلاحیت کو استعمال کرکے بازی نہ پلٹ دے۔ یہ محض جسمانی طور پر کمزور ہوا ہے۔ اس کے دماغ اور روح میں اب بھی بے پناہ توانائی بھری ہوئی ہے۔۔۔ تم اس کی نگاہ سے نگاہ ملانے کی کوشش نہ کرو۔ جتنی جلدی ممکن ہو، تم اپنے کام کو نمٹا کر یہاں سے نکل جاؤ۔ بازی کے آخری مرحلے پر کھیل کو بگڑنا نہیں چاہیے۔''

مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ اس وقت میرے اندر کون بول رہا تھا۔ وہ عدم تشدد کے حامی، جو کھا تنگ ٹیمپل کے چیف لاما چنگ نورن پوشی کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ میری اس کامیابی میں بلاشبہ چنگ نو کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ میں اس کی ہدایت کو نظرانداز کرنے کی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔''

وہ کوئی سوال کیے بغیر میرے قریب آگئی۔

ربی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا ''تم کیا کرنا چاہتے ہو وجدان!''

''جو کچھ بھی ہوگا' تمہارے سامنے ہی ہوگا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بنا کہا ''لہٰذا کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ خاموش بیٹھے میری کارروائی اور کارکردگی دیکھتے رہو، اللہ نے پہلی مرتبہ تو تمہاری خاطر تواضع کا موقع دیا ہے۔ تھوڑی سی خدمت مجھے بھی کر لینے دو۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے خطرناک گن ساحل کو تھما دی اور سنسناتے ہوئے لہجے میں اسے ہدایت دی ''تم اپنے قدرداں میزبان کو اس طرح اپنے نشانے پر لیے رکھو کہ یہ میری کسی کارروائی میں کوئی مداخلت نہ کرنے پائے۔ اس نے تمہارا بہت خیال رکھا ہے۔ اس محبت اور نوازش کا کچھ صلا تم بھی دو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا......!''

میں نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا ''بھول کر بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ شخص بہت بڑا نمونہ باز ہے' اپنی آنکھوں کی مدد سے نمونہ بازی کرتا ہے، پچھلے کچھ عرصے میں تم نے اس کی نمونہ بازی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے!''

ساحل نے بڑے اعتماد کے ساتھ گن میرے ہاتھ سے لے لی اور پُرعزم لہجے میں بولی ''تم فکر نہ کرو وجدان! میں تمہاری مرضی کے خلاف اسے ایک سانس بھی نہیں لینے دوں گی۔''

ان دونوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

سب سے پہلے میں نے ربی کے سیل فون پر قبضہ کیا۔ ایک کثیر المالیت موبائل فون کو آف کرکے میں نے اپنے بیگ میں پہنچادیا پھر اسی بیگ میں سے چند ''مفید'' اشیا برآمد کرلیں۔ مذکورہ اشیا کو میں نے ایک ترتیب سے میز پر چن دیا پھر بڑی سرعت سے مصروفِ عمل ہوگیا۔ آئندہ ایک منٹ کے اندر میں اس بیڈروم تک آنے والی ٹیلی فون کی لینڈ لائن کو بھی منقطع کرچکا تھا۔ اس انتظام کے نتیجے میں اتنا ہوگیا کہ اب ربی اس بنگلے سے باہر کسی سے رابطہ کرسکتا تھا اور نہ ہی باہر والے فون کے راستے اس سے کسی قسم کی بات چیت کے قابل رہے تھے۔

ربی نے میری اس کارروائی کو بڑی برداشت سے دیکھا۔ اسے اپنے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ وہ ان لمحات میں بے بسی کی جن منازل سے گزر رہا تھا، اس سفر کا شائبہ تک اس کی صورت پر کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک طاقت ور اور بااختیار شخص تھا۔ اس نے اپنے اثر رسوخ کے بل بوتے پر، مجھے خاصے طویل عرصے تک نارسائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کیے رکھا تھا اور اب اس کی باری تھی۔

ساری بات داؤ چلنے کی ہوتی ہے۔ کبھی ربی کا داؤ چل گیا تھا اور اس نے میری رگِ جان پر تسلط جما کر مجھے ہاتھ پاؤں سے معذور اور دل و دماغ سے مفلوج کردیا تھا۔ اب وہ میرے داؤ پر آیا ہوا تھا۔ دیانت داری کا تقاضا تو یہی تھا کہ اس کا دیا ہوا قرض سود در سود لوٹایا جاتا مگر اس کے ''احسانات'' کا قرار واقعی ''بدلہ'' چکانے کی میرے پاس مہلت نہیں تھی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' چند منٹ میں کرگزرنا

تھا جب کہ اس کے شایانِ شان ''سلوک'' کے لیے ایک عرصہ درکار تھا۔ یہ یک مشت نہیں بلکہ قسط وار اتارنے والا قرض تھا لیکن افسوس کہ میرے پاس صرف ایک قسط کا کوٹا تھا......ایک آخری قسط کا کوٹا!

میں نے نائیلون کی باریک لیکن انتہائی مضبوط ڈوری کی مدد سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاکر باندھ دیے۔ وہ زبان اور جسم کی مختلف جنبشوں سے مزاحمت کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن میں نے اس کی ایسی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہونے دی۔ بعض مقامات پر مجھے قدرے سختی سے بھی کام لینا پڑا مگر بہرحال' میں نے اپنا مقصد پورا کرلیا۔ اس طرح تو ہوتا ہے' اس طرح کے کاموں میں!

یہی سلوک میں نے اس کے پاؤں کے ساتھ بھی کیا۔ میں نے نائیلون کی ڈوری سے بندشیں لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ ہزار کوشش کے باوجود بھی ازخود اس جکڑ بندی سے آزاد نہ ہونے پائے۔ ربی نے موقع کی نزاکت اور صورتِ حال کی سنگینی کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا اس لیے بھی زیادہ چون وچرا نہیں کی۔ میرے خطرناک تیوروں نے اسے باور کرادیا تھا کہ اگر اس نے میری کارروائی میں مزاحم ہونے کی کوشش کی تو میں کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اس کی عزت ایک سنگین اتفاق کے سبب میرے ہاتھ لگ گئی تھی۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ اگر اس نے ہیرو بننے کی کوئی سعی دکھائی تو میں وہ رورعایت واپس لے لوں گا جو میں نے اس کے معاملے میں اب تک روا رکھی ہوئی تھی۔ وہ بے عزتی کے اس موقع پر حد سے گزرنا افورڈ نہیں کرسکتا تھا!

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے میز پر سے مخصوص قسم کا ایڈہیسیو ٹیپ اٹھالیا۔ ان لمحات میں میرے ہاتھ برقی رفتار سے کام کررہے تھے۔ منٹوں کا کام سیکنڈوں میں مکمل ہورہا تھا۔ میں نے ٹیپ کے رول میں سے تین مناسب لمبائی کی پٹیاں کاٹ لیں پھر ایڈہیسیو ٹیپ کی ان پٹیوں کو میں نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ ربی موشے ہائمن کے ہونٹوں پر چپکادیا۔ اس ایڈہیسیو ٹیپ میں قیامت کی جکڑ اور پکڑ تھی۔ وہ کسی چیونٹے کے مانند چپک جاتا تھا اور کسی جونک کی طرح چپکتے ہی چوسنے کا عمل شروع کردیتا تھا۔ میرے چپکائے ہوئے اس خاموش ٹیپ نے ربی کی قوتِ گویائی چوس لی تھی۔ وہ بااختیار شخص اپنی بے اختیاری کی گھڑیوں میں زبان ہلانے کے قابل نہیں رہا تھا' اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ کیسے خارج ہوتا......!

ربی کی بے بسی پر میں اش اش کر اٹھا جب کہ ان لمحات میں وہ ''غش غش'' کرنے کا تمنائی نظر آیا۔ بے چارگی اور احساسِ ذلت کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''موشے ہائمن......! تم میری اس کارروائی پر حیران ضرور ہورہے ہوگے کہ میں نے تمہارے ہونٹوں پر چپکنے والا یہ ماڈرن قفل کیوں ڈالا ہے! اس ساؤنڈ پروف کمرے میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ دینا ہی کافی تھا۔ تمہاری کوئی چیخ پکار یہاں سے باہر نہیں جاسکتی لیکن جان لو کہ میں نے یہ کام ایک خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ دراصل' میں تمہیں ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تمہارے جیسا عالی مرتبت اور جلیل القدر شخص حقیر سے تحفے کے لیے میرا شکریہ ادا کرے۔ میں تمہاری زبان سے مشکوریت کے الفاظ سننے کی گستاخی نہیں کرسکتا اسی لیے تمہاری ''قوتِ گویائی'' کو سلب کرنے کا یہ بندوبست کیا گیا ہے۔'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے علاوہ بھی میرا ایک خاص مقصد ہے۔ ہمارے درمیان ''پیار و محبت'' کی متعدد ضخیم جلدیں مرتب ہوچکی ہیں۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں کہ میں اسی بہی کھاتے کو کھول کر کسی طولانی حساب کتاب میں لگ جاؤں۔ میں صرف تم سے چند ضروری باتیں کروں گا اور یہ چاہوں گا کہ اس موقع پر میں بولوں اور تم سنو۔ تمہیں بولنے سے روکنے کے لیے ہی میں نے تمہاری گویائی کے راستے میں بند باندھا ہے۔''

اس کی بند آنکھوں کے پیچھے سے آنسو نکلتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ یقین ہی نہیں آیا کہ وہ مضبوط شخص رو بھی سکتا ہے مگر سامنے کی حقیقت کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ آنسو اس کے رونے کا ایک جیتا جاگتا ثبوت تھے تاہم میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر رہا کہ وہ مگرمچھ کے آنسو تھے یا بے بسی اور ندامت کے، پشیمانی اور پچھتاوے کے یا فریب اور دکھلاوے کے اور یا پھر شرمندی اور بہلاوے کے!

میں نے گمبھیر انداز میں کہا ''موشے ہائمن! منہ بند ہوجانے کے بعد تم مجھ سے کچھ نہیں کہہ سکتے' صرف سننے پر مجبور ہو۔ میرے جانے کے بعد تم اپنے آپ سے بھی کچھ نہیں کہہ سکوگے۔ یہ تمہارے ہونٹوں پر چپکی ہوئی مصیبت تمہیں ایک لفظ نہیں بولنے دے گی!''

اس نے یک لخت آنکھیں کھول دیں۔ میرے آخری

جملے کا مفہوم اس کے لیے حیرت کا باعث تھا۔ میں نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اسے زندہ چھوڑ کر جاؤں گا اور یہی بات اس کے لیے ناقابلِ یقین تھی۔ وہ مجھ سے کسی قسم کی نرمی، چھوٹ یا رورعایت کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اپنے کہے کی تصدیق اور اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا۔

''میں نے غلط نہیں کہا موشے ہائمن! میں تمہاری جان لینے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ تم اپنی طبعی موت تک زندہ رہنے کی کوشش کر سکتے ہو۔ بہر حال'' میں سانس لینے کے لیے رکا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تمہارے پاس اس وقت صرف سننے کا اختیار ہے اس لیے پوری توجہ سے سنو' میں کیا کہنے جا رہا ہوں۔''

اس نے دوبارہ بہ آہستگی آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا ''ربی! یہ ایک طویل داستان ہے کہ میں تمہارے ملک میں کس طرح داخل ہوا اور کس طرح اپنے مشن میں کامیاب ہونے کے بعد واپس جا رہا ہوں۔ تمہاری معلومات کی خاطر اتنا ضرور ذہن نشین کراؤں گا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد ہم سیدھے بن گورین ائرپورٹ جائیں گے۔ راستے ہی میں' ساحل کے حلیے میں مناسب تبدیلی کر لی جائے گی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم ایک طیارے میں بیٹھ کر اردن کی طرف پرواز کر جائیں گے۔''

میں ربی کو چکر دینے کے لیے یہ من گھڑت کہانی سنا رہا تھا۔ میں نے بات کو پھیلاتے ہوئے مزید بتایا ''میں آج صبح ہی جورڈن (اردن) سے اسرائیل آیا ہوں۔ میرے ساتھ رانیا نامی ایک لڑکی بھی امان (اردن) سے تل ابیب (اسرائیل) پہنچی ہے۔ ساحل' رانیا کے بھیس میں یہاں سے جائے گی۔ رانیا بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے۔ وہ کب اور کس طرح اسرائیل سے نکل کر جورڈن پہنچے گی یہ میں جانتا ہوں اور نہ ہی تمہیں بتا سکتا ہوں بہر حال تم یہ سنو کہ اردن سے ہم دونوں یعنی میں اور ساحل مصطفی اور کلثوم کی حیثیت سے جدہ (سعودی عرب) چلے جائیں گے۔ اس مقدس سر زمین پر پہنچنے کے بعد ہم اپنی اصلی شناخت میں آ جائیں گے پھر عمرہ ادا کرنے کے بعد ہم کے ایس اے سے سیدھے کراچی (پاکستان) روانہ ہو جائیں گے۔''

میں نے لمحے بھر کو رک کر اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا جائزہ لیا۔ اس نے اس مرتبہ آنکھیں تو نہیں کھولیں البتہ اس کے چہرے کی تیزی سے بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شخص اندر ہی اندر زیر و زبر ہو رہا تھا۔ جسمانی جنبشیں اس کے وجود میں اٹھنے والے طوفان کا ثبوت فراہم کر رہی تھیں۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور قدرے بلند آواز میں کہا ''موشے ہائمن! تم ایک بااختیار شخص ہو' اتنے طاقت ور کہ تمہارے اشارۂ ابرو پر امریکا کے ایوانِ صدر میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ یہ ساری تفصیل سنا کر میں تمہیں ایک قسم کا کھلا چیلنج کر رہا ہوں۔ تم اپنے تمام تر وسائل کو استعمال کر کے بھی میرا راستہ نہیں روک سکو گے۔ میں نے آیندہ چند دنوں کا اپنا لائحہ عمل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ تم اپنے اختیار اور اقتدار کے گھوڑے دوڑا کر دیکھ لینا' مجھے یقین ہے کہ تم میرے پاؤں کی گرد کو بھی نہیں پا سکو گے...... پکڑنا اور پکڑ کر کسی قسم کا ''امتحان'' لینا تو بہت دور کی بات ہے......!''

وہ جز بز ہو کر رہ گیا لیکن ''منہ'' سے کچھ نہ ''بولا'' بولتا بھی کیسے؟ میں نے ایڈہیسیو ٹیپ کی مدد سے اس کی بولتی بند کرنے کا بڑا شافی بندوبست کر دیا تھا!

''موشے ہائمن! میں جانتا ہوں' تم دل کے مریض ہو گئے ہو۔'' میں نے اس کے قریب جا کر سنسنی خیز لہجے میں کہا ''اس لیے میں تم پر بڑا ہولا ہاتھ رکھ رہا ہوں۔ بہر حال' میں نے تم سے جس تحفے کا ذکر کیا ہے' وہ دینا تو بہت ضروری ہے!''

تحفے والی بات سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں پتا نہیں کیا تھا!

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کٹیلے لہجے میں کہا ''تحفے کے ذکر سے تم کسی ایسی ویسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو جانا۔ اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے مطلوبہ وہ پانچ قیمتی پتھر تمہاری نذر کرنے آیا ہوں تو اس سوچ کو حماقت کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ نایاب و نادر ڈائمنڈ' ایمرالڈ' روبی، سیفائر اور ٹوپاز تمہیں کبھی نہیں حاصل ہو سکتے۔ یہ پانچوں روحانی اہمیت کے حامل پتھر بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کی امانت ہیں لہٰذا ہمیشہ اس عبادت گاہ کے تہ خانے میں محفوظ رہیں گے' جو شخص بھی ان کے حصول کی تمنا اپنے دل میں جگائے گا، جلد یا بہ دیر وہ دل کا مریض ہو جائے گا جیسا کہ تمہارے ساتھ ہوا ہے؟''

میں نے معنی خیز انداز میں توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''لہٰذا تم ان پانچ پتھروں کا خیال دل سے

نکال دو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ اگر تم پوری دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھتے رہے تو بہت جلد عبرت ناک موت مارے جاؤ گے۔ خیر' تو میں تمہیں تحفے کے بارے میں بتا رہا تھا......اب زبانی کلامی بھی کیا بتانا تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں وہ تحفہ دکھا ہی دیتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی میں مڑا اور اپنے بیگ کے پاس آ گیا۔ بیگ میں سے میں نے فرسٹ ایڈ کا ضروری سامان نکالا اور دوبارہ ربی کے پاس آ گیا۔ اس سامان کو میں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور جھک کر اپنی پنڈلی پر بندھے ہوئے خطرناک خنجر کو اس کے کور سے نکال لیا پھر وہ خنجر ربی کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوری سفاکی سے کہا۔

''اس خنجر کو دیکھ رہے ہو موشے ہائمن؟'' میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے اجتناب برتتے ہوئے کہا ''اس کی قاتل دھار پر تمہیں خون بڑے واضح طور پر نظر آ رہا ہوگا۔ جانتے ہو' یہ کس کا خون ہے؟''

وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا لہٰذا پھٹی ہوئی آنکھوں سے اس قاتل خنجر کو دیکھتا چلا گیا۔ میں نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

''آئی ایم ریلی ویری سوری! میں بھول گیا تھا کہ تم نے تھوڑی دیر پہلے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے اس لیے کسی بھی سوال کے جواب میں کچھ نہیں کہہ سکو گے۔ چلو کوئی بات نہیں' میں ہی تمہیں بتائے دیتا ہوں۔''

میں نے رک کر ایک گہری سانس خارج کی اور نہایت ہی سنگین انداز میں کہا ''یہ آلۂ قتل ہے۔ اس کے مہلک بلیڈ پر تازہ تازہ مقتول ہونے والے دو کتوں کا خون لگا ہوا ہے۔ میں کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے کتوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ میں اعلیٰ نسل والے ان دو کتوں کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے تمہارے حکم پر اس بنگلے میں ''نائٹ واچ ڈاگ'' کی ڈیوٹی سنبھال رکھی تھی۔ میں نے اسی خنجر کی مدد سے بل ڈاگز کی اس جوڑی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہے!''

میں نے ایک ایسے زاویے سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں سے ہماری نظریں براہ راست ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتی تھیں، یہ احتیاط بہت ہی ضروری تھی۔ ربی موشے ہائمن جسمانی طور پر میری گرفت میں آ چکا تھا لیکن میں نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی پُراسرار صلاحیتوں کو ذہن سے فراموش نہیں کیا تھا۔ میں جانتا تھا، ربی دیگر باطنی علوم کے ساتھ ساتھ ہی مسمریزم اور ہپناٹزم کا بھی ماہر تھا۔ اگر ایک مرتبہ اسے آنکھوں کے راستے میرے اندر اترنے کا موقع مل جاتا تو کچھ بعید نہیں تھا' وہ بازی کو پلٹ دیتا۔ اگرچہ مجھے صد فی صد یقین تھا' وہ چاہے کچھ بھی کر لے، مجھے اپنے ٹرانس میں نہیں لے سکے گا لیکن اپنے مشن کے اختتامی مرحلے میں' میں کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے ایک محفوظ ترچھے زاویے سے اس کی جہاں دیدہ آنکھوں میں سراسیمگی کو بڑی تیز رفتاری سے تیرتے ہوئے پایا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس خنجر کو دیکھ کر ربی نے یہ سوچ لیا ہو' میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے والا ہوں۔ میں نے اس کی سوچ کے آشکار ہوتے ہی جلدی سے کہا۔

''دل چھوٹا اور دماغ موٹا نہ کرو ربی!'' میرے لہجے میں گہرے طنز کی کاٹ تھی۔ ''دل کے مریض تو تم ہو ہی چکے ہو، کیا دماغ کا کباڑا بھی کروانا ہے؟ تسلی رکھو' میں نے تم سے وعدہ کیا ہے نا کہ میں یہاں تمہیں زندہ چھوڑ کر جاؤں گا۔ یقین کر لو' تمہارا خون میرے ہاتھوں پر نہیں لکھا ہوا۔ بس' میں تو تمہاری خدمت میں ایک حقیر سا نذرانہ پیش کرنے جا رہا ہوں۔ تم اسے میری نشانی سمجھ کر اپنے پاس محفوظ رکھنا۔ جب جب تمہاری اس نذرانے' تحفے اور نشانی پر نظر پڑے گی' میں تمہیں یاد آؤں گا......اور بہت ٹوٹ کر یاد آؤں گا!''

میرے ان مکالمات کا اس کے چہرے پر یا آنکھوں میں کیا تاثر قائم ہوا' میں نے یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور بڑی بے رحمی سے پلٹ کر اسے اوندھا کر دیا۔ ان لمحات میں' میں بہت سنگ دل اور سفاک ہو گیا تھا۔ ربی کے لیے میرے دل میں ذرا سی بھی نرمی موجود نہیں تھی۔ ٹھیک ہے' میں اسے قتل نہیں کر رہا تھا لیکن میں جو کچھ کرنے جا رہا تھا وہ قتل سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اگر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا تو یہ یک مشت موت ہوتی۔ وہ پلک جھپکتے میں مر کر سارے جھمیلوں سے آزاد ہو جاتا......اور میں یہی نہیں چاہتا تھا!

اس نے ''آ بیل مجھے مار'' والے انداز میں مجھے ایک عرصے تک اذیت ناک جھمیلوں میں ڈالے رکھا تھا' میں کیوں کر اسے ''آزاد'' کر دیتا۔ میں اسے ایک ایسے عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا تھا کہ وہ میرے دیے ہوئے تحفے کو دیکھ کر ہر روز سیکڑوں مرتبہ موت سے معانقہ کرے لیکن موت کی گود میں سر رکھنے کا اسے موقع نہ ملے۔ میں اسے ''ڈیلی ڈیجز'' کے اسکیل پر مارنا چاہتا تھا۔ وہ جب تک بھی زندہ رہتا' اپنے لیے اور پوری یہودی قوم کے لیے نمونۂ عبرت بنا رہتا!

میں نے موشے ہائمن کے دونوں ہاتھوں کو پشت پر باندھا تھا جب وہ اوندھا ہوا تو بندھے ہوئے ہاتھ اس کے

جسم کے اوپر آ گئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر مضبوط بندشیں لگائی تھیں۔ ان ہاتھوں کی انگلیاں حرکت کے لیے آزاد تھیں۔ میں ربی کے اوپر جھکا اور اپنے خنجر کی دھار کو اس کی انگشتِ شہادت پر آزمانے لگا۔

میں نے دو متوازن جھٹکے لگائے اور دونوں ہاتھوں کی انگشتِ شہادت کو جڑ سے کاٹ ڈالا۔ کٹی ہوئی دونوں انگلیاں سیخ کباب کی شکل میں بستر پر جا گریں۔ میں نے ربی کے ہاتھوں پر جس درجے کا ستم توڑا تھا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے' وہ ان لمحات میں درد کے کس سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرا ہوگا اور ابھر ابھر کر ڈوبا ہوگا۔ میں ربی کی کسمپرسی اور بے چارگی کو الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ اپنے احساس کو آزما کر بہ خوبی اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بہر حال' ربی کی حالت سے میرے دل و دماغ نے گہرا سکون محسوس کیا۔

انگلی کٹے ہاتھوں سے خون جاری ہو گیا تھا۔ میں چونکہ ربی کو زندہ رکھنا چاہتا تھا لہٰذا سیلانِ خون کو فوری طور پر روکنا ضروری تھا۔ اس مقصد کی خاطر میں فرسٹ ایڈ کا سامان اپنے ساتھ لایا تھا۔ آئندہ پانچ منٹ کے اندر میں نے اس کے دونوں گھائل ہاتھوں پر شافی ڈریسنگ کر دی پھر اس کے چہرے کو اپنی جانب موڑتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''موشے ہائمن! اب اس خنجر پر تمہارا خون بھی لگ چکا ہے۔'' میں نے مذکورہ خنجر کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا ''تمہیں بتا چکا ہوں، پہلے اس خنجر کی دھار پر کس کا خون موجود تھا۔ یوں سمجھ لو یہ 'بلڈ کراس میچ ٹیسٹ' ہو رہا ہے۔ بہت جلد اس ٹیسٹ کی رپورٹ بھی ''آ جائے'' گی جس سے واضح طور پر پتا چل جائے گا، کس کے خون نے کس کے خون کو آلودہ کر دیا!''

جب انسان جسمانی تکلیف سے گزر رہا ہوتا ہے تو اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی بری طرح متاثر ہوتی ہے اور کسی ایک جانب وہ توجہ کو مبذول نہیں رکھ سکتا۔ اس تناظر میں ربی اب کسی بھی حوالے سے خطرناک نہیں رہا تھا۔ ہپناٹزم کے لیے جس ارتکاز کی ضرورت ہوتی ہے' ربی کے لیے ان اذیت ناک لمحات میں اسے قائم رکھنا ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا میں نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''موشے ہائمن! میں اب یہاں سے رخصت ہو رہا ہوں اور جاتے جاتے میں تمہیں چند اہم نکات ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں۔ اگر میری نصیحت کو پلے باندھ لو گے تو بچی کھچی زندگی کو آرام و سکون سے گزار لو گے۔ بہ صورتِ دیگر، تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آئے گا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

میرے لہجے میں اس درجے کی سنگینی بھری ہوئی تھی کہ وہ سہمی ہوئی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا ہوگا کہ اس وقت تم پوری طرح میرے رحم و کرم پر ہو۔ اس بنگلے کی دونوں منازل میں پائے جانے والے تمہارے تمام حمایتی اور خدمت گزار اس قابل نہیں رہے کہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اڑا سکیں' وہ تمہاری مدد کو کیا خاک آئیں گے! میں چاہوں تو پلک جھپکتے میں تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کر رہا...... میں ایسا کیوں نہیں کر رہا، اس کی دو وجوہات ہیں۔ نمبر ایک، اپنی دونوں انگشتِ شہادت کٹوا کر تم اعضائی یعنی عضوی محرومی کا شکار ہو چکے ہو۔ علاوہ، ان دنوں تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات تو تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے یہاں بیمار اور عیبی جانور کی قربانی قبول نہیں ہوتی!''

میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اسی انداز میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''نمبر دو' تم اپنی قوم کے مذہبی اور روحانی پیشوا ہو اور دنیا کے تمام مذاہب کے بارے میں تمہاری معلومات بہت وسیع ہیں۔ تمام تر منفی سوچ اور تخریبی سرگرمیوں کے باوجود بھی بلاشبہ تم علم کا ایک سمندر ہو۔ کسی عالم کی موت درحقیقت مرگِ علم ہے۔ میرا مذہب اس کی مذمت کرتا ہے۔ میں جس مذہب سے تعلق رکھتا ہوں وہ دیگر مذاہب اور مذہبی راہ نماؤں کے احترام کا درس دیتا ہے۔ میں نے تمہارے دونوں ہاتھوں کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اسے ایک چھوٹی سی تادیبی کارروائی سمجھ لو۔ تمہیں مجھ پر اور میری قوم پر کسی بھی ہاتھ کی انگلی اٹھاتے ہوئے سو مرتبہ سوچنا پڑے گا کیونکہ اس مقصد کے لیے اٹھنے والی انگلیاں تو اپنا وجود کھو بیٹھی ہیں۔ اگر کبھی دوسری انگلیوں کی مدد سے تم نے کوئی بھونڈی کوشش کی تو تادیبی کے بعد تعزیری کارروائی کا نمبر آئے گا!''

میں اس کے پاس سے ہٹا اور اپنے ضروری سامان کو سمیٹ کر بیگ میں ڈالنے لگا۔ پھر میں ساحل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بیڈروم کے دروازے پر پہنچا۔ اب ربی موشے

ہائمن کی صورت مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی کروٹ دوسری جانب تھی۔ میں نے وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے الوداعی انداز میں کہا۔

''موشے ہائمن! میں مانتا ہوں' تمہارے اندر حکمت، علم اور دانش کا ایک انمول خزانہ چھپا ہوا ہے لیکن تم نے اپنی منفی سوچ کے باعث اس صلاحیت کو بتا نگار رکھا ہے۔ پھر میں تمہارے علمی بحرِ بیکراں کا پاس اور عمر کا لحاظ کرتے ہوئے تمہیں اصلاح کا ایک موقع دے رہا ہوں لیکن یاد رکھو' یہ میری جانب سے ملنے والی پہلی اور آخری معافی ہے۔ آج کے بعد اگر تم نے میرے ملک اور قوم کی طرف میلی نظر سے بھی دیکھا یا کسی قسم کی دشمنانہ کارروائی میں ملوث پائے گئے تو...... انگلیوں کے بعد گردن کی باری بھی آ سکتی ہے!''

بات ختم کرتے ہی میں نے ایک جھٹکے سے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور ربی کو اندر بند کر کے اس بنگلے سے نکل آیا۔ آج میں نے دنیا کے ایک طاقت ور اور با اختیار شخص کو ایک سنسنی خیز انگز سے شکست دی تھی۔

☆☆☆

آٹھ مئی کا آغاز ہو چکا تھا!

اس وقت رات کے ، رہ چالیس ہوئے تھے۔ میں نے بندوین کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ میرے پہلو میں پسنجرز سیٹ پر ساحل براجمان تھی اور وہ بندوین بڑے فراٹے سے بن گورین ائرپورٹ کی جانب رواں دواں تھی۔ ساحل نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

''ہم اس وقت کس طرف جا رہے ہیں؟''

''ہمارا رخ تل ابیب کے بن گورین ائرپورٹ کی جانب ہے۔''

''اوہ......!'' اس نے چونکنے والے انداز میں ایک گہری سانس خارج کی' اس کا مطلب ہے' تم نے اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا ہے جس کی تفصیل ربی کو بتائی تھی......''

''کون سا پروگرام؟'' میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

وہ بولی ''یہی کہ ہم اسرائیل سے اردن جائیں گے۔ اردن سے سعودی عرب اور پھر سعودی عرب سے سیدھے پاکستان!''

''وہ تو میں نے ربی کو دھوکا دینے کے لیے ایک فرضی کہانی سنائی تھی'' میں نے کہا ''ایک بوگس پلان...... جس کی روشنی میں وہ ہمیں تلاش کرتے ہوئے جہاں جہاں جی چاہے جھک مارتا پھرے۔''

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور استفسار کیا ''پھر تمہارا اصل پروگرام کیا ہے؟''

''ہم راتوں رات بائی روڈ تل ابیب سے نکل کر یروشلم پہنچیں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا ''یروشلم سے اگلے روز' یعنی نو مئی کو ہم مصر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اس کے بعد مصر سے انگلینڈ اور انگلینڈ سے سیدھے تبت پہنچ جائیں گے۔''

''تبت......!'' اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ''ہم تبت کیوں جا رہے ہیں؟''

یہ تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں تھا اس لیے مختصر الفاظ میں' میں نے اسے بتایا ''میں ایک خاص پروگرام کے تحت لہاسا (تبت) سے لندن (انگلینڈ) اور لندن سے قاہرہ (مصر) پہنچا تھا پھر مصر سے اسرائیل میں داخل ہوا ہوں۔ اسی خاص پروگرام کے بقیہ حصے پر عمل کر کے مجھے واپس تبت پہنچنا ہے۔ تبت جانے کا سبب چنگ فورن پوشی کا حکم ہے۔ چنگ فو لہاسا کے جوکھانگ ٹیمپل کا چیف لاما ہے۔ اس پروگرام کی تفصیل میں تمہیں فرصت ملنے پر بتاؤں گا۔ فی الحال' صرف اتنا سمجھ لو کہ ہماری زندگی میں چنگ فو نہایت ہی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے مجھے تبت کا داماد قرار دیا ہے اور اسی کے حکم پر میں تمہیں ربی کے چنگل سے نکال کر تبت پہنچا رہا ہوں۔ اگر چنگ فو کی مشاورت اور تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو یہ کام اتنی آسانی سے ہونے والا نہیں تھا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو وجدان!'' وہ خواب ناک لہجے میں بولی ''واقعی مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ ہم دونوں آپس میں مل چکے ہیں۔ اس منحوس شخص ربی نے ہمارے درمیان جدائی کی فلک بوس دیوار کھڑی کر دی تھی۔''

میں نے کہا ''یقین کر لو کہ ہم ایک ہو چکے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت اب ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ ربی اور اس کی اٹھائی ہوئی آسمان تک بلند دیوارِ جدائی' دیوارِ گریہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی میں نے تمہاری نظر کے سامنے ایسا بندوبست کر دیا ہے کہ باقی کی عمر یہ شخص اسی خودساختہ دیوار سے سر ٹکا کر گریہ وزاری میں گزار دے گا۔''

دیوارِ گریہ (WAILING WALL) یروشلم میں واقع ہے۔ یہودی قوم اس دیوار کو آہ وزاری کے لیے استعمال کرتی ہے۔ یہ دیوار ''ویسٹرن وال'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔

ساحل نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا ''محترم چنگ فو نے اگر تمہیں تبت کا داماد قرار دیا ہے تو اس کی نظر میں میری کیا حیثیت ہے؟''

ساحل کے والدین بھیر جانی اور تھونچی کا تعلق تبت سے تھا۔ وہ حالات کے چکر میں پھنس کر کھٹمنڈو پہنچے اور پھر بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ کی خدمات کا کام انہوں نے سنبھال لیا۔ ان دنوں ساحل' دھنو ہوا کرتی تھی۔ یہ تو پاکستان میں داخل ہونے کے بعد میں نے اس کا نام دھنو سے بدل کر ساحل رکھ دیا تھا جو اسے بے حد پسند بھی آیا تھا۔ ساحل کا باپ تھونچی کوئی بدھ بھکشو نہیں تھا بہرحال' وہ بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں کسی بدھ بھکشو سے زیادہ اہم کام کر رہا تھا۔ افسوس کہ اب تھونچی اور بھیر جانی آں جہانی ہو چکے تھے۔ ان تمام واقعات کی تفصیل میری داستان کے وسطی حصے میں بیان کی جا چکی ہے۔

ساحل کو تبت دیکھنے کا بڑا اشتیاق رہا تھا۔ اس نے اس جنت نظیر قطعۂ ارض کی صرف تعریف ہی تعریف سنی تھی۔ جب ہم دونوں پاکستان میں تھے تو سوچا تھا' کبھی فرصت ملی تو تبت کی سیر کو ضرور جائیں گے۔ اب ساحل نے جو میری زبان سے تبت جانے کا تذکرہ سنا تو وہ ایک سنسنی خیز جوش خروش سے سرشار ہو گئی۔ اسی جوش میں اس نے اپنی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے وہ اہم سوال کیا تھا۔

میں نے نہایت ہی سادگی سے جواب دیا۔ ''چیف لاما چنگ فورن پوشی تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے...... یعنی تبت کی بیٹی!''

وہ جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے انداز میں وہ تمام رنگ شامل تھے جو ان لڑکیوں کے چہرے پر نمودار ہوتے ہیں جو اپنی شادی کی بات سن کر بے ساختہ شرما جائیں۔ ساحل کا یہ ردِعمل عین فطری تھا۔ میں نے بھی دراصل ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کی شادی کی بات ہی کی تھی۔ یہ الگ بات کہ اس کی شادی کی بات میری شادی کی بات بھی تھی!

میں نے بہ دستور ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے پوچھا ''کیا ہم دونوں کی شادی کا ذکر تمہیں اچھا نہیں لگا جو رخ پھیر کر یوں بے رخی سے دوسری طرف دیکھنے لگی ہو؟''

''نن...... نہیں'' وہ گڑبڑا گئی ''ایسی تو کوئی بات نہیں!''

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ موضوع سے کنی کاٹتے ہوئے ایسے بولی جیسے اچانک اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو' پوچھنے لگی ''جب ہم لوگ بائی روڈ تل ابیب سے یروشلم جائیں گے تو پھر تم ائرپورٹ کیوں جا رہے ہو؟''

''میں کب ائرپورٹ جا رہا ہوں!'' میں نے اس کی الجھن سے محظوظ ہوتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''ابھی ابھی تو تم نے بتایا تھا' ہمارا رخ تل ابیب کے بن گورین ائرپورٹ کی جانب ہے!'' وہ یاد دہانی کرانے والے انداز میں بولی۔

''میں نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ساحل!'' میری آواز میں بلا کا ٹھہراؤ تھا ''اس وین کا رخ یقیناً ائرپورٹ کی طرف ہی ہے لیکن ہائی وے میں داخل ہونے کے بعد میں وین کو چھوڑ دوں گا۔ دراصل' میں ربی اور اس کی ''ٹیم'' پر یہ تاثر قائم کرنا چاہتا ہوں کہ ائرپورٹ کی طرف جاتے ہوئے وین میں کوئی خرابی نمودار ہوئی اور ہم مجبوراً اسے ہائی وے پر چھوڑ کر کسی اور ذریعے سے ائرپورٹ کی سمت گئے ہیں۔''

''اوہ! پھر تو بندوین کو چھوڑنے سے پہلے تمہیں اس میں کوئی خرابی بھی پیدا کرنا ہوگی!'' اس نے تشویش ناک لہجے میں اظہارِ خیال کیا ''تاکہ یہ ڈراما بالکل حقیقت نظر آئے۔''

''وہ میں کر لوں گا'' بے ساختہ میرے زبان سے نکلا ''اس کے انجن کے ساتھ تھوڑی چھیڑ چھاڑ کرنے سے کام بن جائے گا۔''

''وجدان......! تم ذرا بھی نہیں بدلے ہو!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہارا اشارہ خرابی پیدا کرنے کی طرف ہے یا چھیڑ چھاڑ کی جانب؟''

''میرا اشارہ صرف اور صرف تمہاری سمت ہے!''

''اوہ!'' میں نے بے ساختہ ایک گہری سانس خارج کی ''پتا نہیں' تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔ میرے نہ بدلنے سے تمہاری کیا مراد ہے حالاں کہ میں اس وقت اپنی اصل شکل صورت میں نہیں ہوں۔ میں نے ایک مصری باشندے یوسف الظاہری کا بھیس بدل رکھا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی ''میں تو تمہارے مخصوص منصوبہ ساز انداز' مزاج اور فطرت کی بات کر رہی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے' میں تمہارے سامنے فیل ہو گیا'' میں نے معتدل لہجے میں کہا ''میری یوسف الظاہری والی اداکاری ناکام ہو گئی۔''

ساحل نے یہ بات بڑے واضح انداز میں محسوس کر لی تھی کہ میں دانستہ اس سے چھیڑ چھاڑ والے انداز میں دل لگی کر رہا ہوں۔ وہ میرے بہت قریب رہی تھی اس لیے بھی

میری عادات، مزاج اور فطرت سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا۔

"تمہارے ہاتھ میں کوئی تکلیف ہے وہدان؟"

میں ڈرائیونگ کے دوران میں غیر ارادی طور پر وقفے وقفے سے اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کو بند کھول کر رہا تھا۔ یہ وہی گھائل ہاتھ تھا جس کی ہتھیلی میں یحیم نے بے دریغ کاٹ ڈالا تھا۔ زخم کی تکلیف شدید نوعیت کی نہیں تھی۔ مجھے ہلکی ہلکی جلن اور الجھن کا احساس ہو رہا تھا اور یہی احساس غیر ارادی انداز میں متاثرہ ہاتھ کی مٹھی کو کھول بند کر رہا تھا۔

ساحل کے سوال کے جواب میں' میں نے اسے اس واقعے کی تفصیل سنائی پھر بتایا "کوئی خاص تکلیف نہیں۔ اپارٹمنٹ پر پہنچنے کے بعد میں اس کا جائزہ لوں گا۔"

"اپارٹمنٹ!" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگی "کیا ہمیں کسی اپارٹمنٹ میں جانا ہے؟"

میں نے جواباً اسے مختصر الفاظ میں "بہائی گارڈن اپارٹمنٹس" کے اپارٹمنٹ نمبر ستائیس سی کے بارے میں بتا دیا۔ اس بیان میں صوفیہ کا ذکر بھی آیا۔ ساحل صوفیہ کا نام سن کر بڑے معنی خیز انداز میں میری آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ اس کی مخصوص تشویش دور کرنے کے لیے میں نے اسے بتا دیا کہ کس طرح میں صوفیہ کے ساتھ ایک شیڈول سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں ...... اور کس طرح وہ یعنی ...... ساحل صوفیہ کی آئی ڈی پر سرائیل سے لندن تک' میری ایک گہری دوست کی حیثیت سے سفر کرے گی پھر میں نے اس موضوع کو جلد بند کرنے کی خاطر کہا۔

"میں نے صوفیہ سے کہا تھا' کم از کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ ایک بجے تک میں واپس اپارٹمنٹ پر پہنچ جاؤں گا۔ ایک تو بجنے ہی والا ہے۔ مجھے نہیں امید کہ میں ڈیڑھ بجے سے پہلے اپارٹمنٹ پہنچ سکوں لہٰذا مجھے صوفیہ کو فون کر کے اپنی بخیریت کامیابی سے آگاہ کرنا ہوگا۔"

ساحل نے اس سلسلے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ہم اس دوران میں سفر کرتے ہوئے ائرپورٹ کی طرف جانے والی ہائی وے پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے تھوڑا آگے آنے کے بعد وین کو سڑک کے کنارے روک دیا۔ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک کا وہ ازدحام دکھائی نہیں دیتا تھا جو دن اور خصوصاً شام کے وقت نظر آتا تھا۔ اس وین کو "خراب" کرنے کے بعد ہم پیدل ہی واپس چل پڑے' پھر ایک پبلک کال سینٹر سے میں نے صوفیہ کو فون کیا۔

اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔سی کا فون نمبر میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے فون مشین کے کی پیڈ پر "فائیو ون سکس' ڈبل سیون' ڈبل تھری" کے نمبر پنچ کر دیے۔ یہ ایک چونکہ لوکل نمبر تھا اس لیے ایریا کوڈ "زیرو تھری" ملانے کی ضرورت نہیں تھی البتہ' اپارٹمنٹ والے ون سیٹ کے کالر آئی ڈی اسکرین پر پی سی سی (پبلک کال سینٹر) کے لوکل نمبر سے پہلے تل ابیب کا ایریا کوڈ "زیرو تھری" ضرور فلیش کر رہا ہوگا۔

میں نے اپارٹمنٹ ستائیس۔سی سے رخصت ہوتے وقت فون کے سلسلے میں صوفیہ کو چند اہم ہدایات دی تھیں، میں نے انہی ہدایات کی روشنی میں ایک بیل جانے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر ایک منٹ کے بعد دوبارہ رنگ کیا اور دوبارہ ایک گھنٹی بجنے کے بعد لائن کاٹ دی۔ اس کے فوراً بعد ایک مرتبہ پھر وہی نمبر ملایا۔ ہمارے درمیان یہی طریقہ کار طے ہوا تھا۔ اب وہ بے دھڑک فون اٹینڈ کر لیتی ...... اور اس نے ایسا ہی کیا۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "صوفیہ! یہ میں ہوں۔ تم خیریت سے تو ہو؟"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں" اس کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی "تم سناؤ' اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ تم اس وقت کہاں ہو؟ مشن کس مرحلے میں ہے؟"

"ہمارا مشن بہ خیر و خوبی کامیابی سے ہمکنار ہو گیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے مسرت انگیز لہجے میں کہا "ساحل اس وقت میرے ساتھ ہے۔ میں نے ربی اور اس کے بنگلے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں۔"

"اوہ ...... تھینکس گاڈ!" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

میں نے پوچھا "اپارٹمنٹ پر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی نا؟"

"نہیں' یہاں پر امن و امان قائم ہے" اس نے جواب دیا "جلدی چلے آؤ' میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں آ رہا ہوں ......"

میں نے یہ کہتے ہوئے ٹیلی فونک سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس دوران میں ساحل میرے قریب ہی رہی تھی بلکہ میں نے جب صوفیہ سے گفتگو آغاز کی تو وہ کچھ اور ہی نزدیک کھسک آئی تھی، اتنا پاس کہ ریسیور میں ابھرنے والی صوفیہ کی آواز اس کی سماعت تک بہ آسانی رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ اس کا یہ عمل کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھا یا پھر ایک بے ساختہ فعل، بہرحال! اس حرکت کو خالص بیویوں والا انداز

کہا جا سکتا تھا۔

ہم پی سی سی سے باہر نکلے اور ایک ٹیکسی پکڑ کر بہائی گارڈن اپارٹمنٹس چلے آئے۔ میں نے احتیاطاً ٹیکسی کو شالوم اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس کے نزدیک چھوڑ دیا اور پیدل ہی ٹہلتے ہوئے ہم اپارٹمنٹس بلڈنگ کی طرف بڑھ گئے۔ اپارٹمنٹ نمبر ستائیس۔سی کے دروازے تک پہنچنے میں ہمیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

میں نے اسی مخصوص انداز میں دروازے پر دستک دی جو صوفیہ سے طے ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں آنکھیں بند کر کے تھرڈ آئی کے توسط سے اس کے ماحول میں' اپارٹمنٹ کے اندر پہنچ گیا۔ وہ کامن میں موجود تھی اور دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے مطمئن ہونے کے بعد آنکھیں کھول دیں۔

اگلے ہی لمحے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا' کھلے ہوئے دروازے میں صوفیہ کا چہرہ دکھائی دیا۔ میں نے راہداری میں دائیں بائیں چوکنا نگاہ دوڑائی۔ اتفاق سے اس وقت وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ ہم نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔

ہم نے آج شام اس اپارٹمنٹ پر "قبضہ" جمایا تھا اور صرف اس کے کشادہ کامن کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا جہاں ایک دیوار کے ساتھ مکمل صوفہ سیٹ موجود تھا۔ میں سٹنگ روم میں پہنچا اور وہاں سے دو تین آرام دہ کرسیاں بھی اٹھا لایا۔ آنے والے لمحوں میں ہم وہاں جس کارروائی کا آغاز کرنے والے تھے اس کے لیے کسی بھی شے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی!

رسمی علیک سلیک کے بعد صوفیہ نے مجھے اس مشن کی کامیابی پر مبارک باد پیش کی۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ روکھی سوکھی زبانی مبارک باد تک محدود نہ رہتی ...... ساحل کی موجودی نے اسے حد سے تجاوز کرنے سے روکے رکھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی' میں نے ساحل کے حصول کے لیے دنیا بھر کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور اس بات کا بھی اسے بہ خوبی اندازہ تھا کہ عنقریب ساحل سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اس خیال اور احساس نے اسے اندر سے افسردہ کر دیا تھا، وہ بہ ظاہر ہنسی خوشی گھل مل کر ہم سے باتیں کر رہی تھی لیکن میں جانتا تھا' وہ اندر سے خوش نہیں۔ مجھ سے دور ہو جانے کا احساس اسے ملول کر گیا تھا لیکن افسوس کہ میں اس کی اندرونی خوشی کی بحالی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو اس وقت خود جدائی کے زخموں سے چور چور تھا۔ ان زخموں پر ساحل کے حصول کا مرہم رکھ کر ایک طویل عرصے تک آرام کرنا چاہتا تھا۔ ان حالات میں' میں صوفیہ کی دل جوئی کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی طور اس کے دکھ کا مداوا بن سکتا تھا۔

اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی کہ انسان بنیادی طور پر بڑا ہی خود غرض واقع ہوا ہے۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو اسے دوسروں کا غم دکھائی نہیں دیتا۔ وہ یہی فرض کر لیتا ہے کہ وہ خوش ہے تو ساری دنیا ہی خوش ہوگی۔ میں بھی ان لمحات میں کچھ اسی قسم کے رویے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ساحل کو پانے کی خوشی نے صوفیہ کے دکھ کو کیموفلاج کر دیا تھا۔

میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور صوفیہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "باتیں تو ساتھ ساتھ ہوتی رہیں گی۔ یہ بتاؤ' ساحل کو صوفیہ بنانے میں تمہیں کتنا وقت لگے گا؟"

"آدھے سے پونا گھنٹا!" وہ ساحل کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے بولی "اس کے چہرے کی بناوٹ اور ہڈیوں کی ساخت ننانوے فی صد مجھ سے مشابہ ہے لہٰذا اس مقصد میں کامیابی بہت آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔ اگر میں خال و خط میں تھوڑی تبدیلی کر کے اس کا ہیئر اسٹائل اپنے جیسا بنا دوں تو سو فی صد کام چل جائے گا۔ کائیلی ٹور اینڈ ٹرپ ٹریول کمپنی کے اسٹاف اور مسافروں کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ شک نہیں گزرے گا کہ تمہاری مسافر ساتھی بدل گئی ہے۔ وہ یہی سمجھیں گے' جس صوفیہ کے ساتھ تم تل ابیب کی مزید سیر کے لیے رک گئے تھے، اسی کے ہمراہ تم نے انہیں یروشلم میں دوبارہ جوائن کر لیا ہے۔"

"ویری نائس!" میں نے رسٹ واچ پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا "اس وقت رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ اس کا مطلب ہے' تم زیادہ سے زیادہ سوا دو بجے تک فارغ ہو جاؤ گی؟"

"شیور ......!" وہ پورے اعتماد کے ساتھ بولی۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں ڈھائی بجے کے لیے ریڈیو کیب والوں کو فون کر دیتا ہوں۔"

"ریڈیو کیب کے لیے تم دو بجے فون کرنا" صوفیہ نے مشورتاً کہا۔

میں نے اس کی بات مان لی۔

اپارٹمنٹ سے ربی والے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے میں نے "بلوم اسٹار" ریڈیو کیب سروس والوں سے مکمل معلومات حاصل کر لی تھیں۔ شہر سے باہر جانے کی صورت میں آدھا گھنٹا پہلے انہیں کال کرنا پڑتا تھا۔ نصف شب کے

بعد وہ لوگ تل ابیب سے یروشلم تک پہنچانے کے دو سو امریکی ڈالر یعنی سات سو نیو شیکل وصول کرتے تھے۔ ان دنوں ایک یو ایس ڈالر ساڑھے تین نیو شیکل کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ نیو شیکل اسرائیل کی مقامی کرنسی ہے۔

صوفیہ نے ساحل کو ایک آرام کرسی پر بٹھایا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ میں بیگز کی تیاری میں لگ گیا۔ میں صوفیہ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے انگلینڈ سے یہاں پہنچا تھا اور ہمارا تمام تر سامان ایک ہی بیگ میں تھا۔ اسی بیگ کے اندر ایک خالی بیگ کو میں نے تہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ اب ہمیں دو بیگ الگ الگ بنانے تھے۔ میں نے تہ شدہ خالی بیگ کو باہر نکالا اور اسی میں صوفیہ کے لیے ضرورت کی اشیا بھرنے لگا۔ کنٹی نیوٹی کا خیال رکھتے ہوئے مجھے اپنے پاس وہی بیگ رکھنا تھا جس کے ساتھ میں اب تک سفر کرتا آیا تھا۔ میں نے ''ہیروڈ'' سپر مارکیٹ سے ساحل کے لیے بھی ضروری شاپنگ کی تھی۔ دس منٹ کے اندر میں نے دونوں بیگز کو تیار کر لیے۔

ہم جب اس اپارٹمنٹ سے نکلتے تو ہمیں یہاں اپنے مختصر قیام کے آثار کو بھی مٹانا تھا اور یہ کام بہ وقتِ رخصت ہی زیادہ اچھے انداز میں کیا جا سکتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ صوفیہ تھوڑی دیر بعد ہم سے جدا ہو جائے گی۔ اسے ہیرالڈ تھامس کی ہدایات کے مطابق کسی شخص سے جا کر ملنا تھا جو کسی نہ کسی طرح اسے اسرائیل سے نکال کر واپس لندن پہنچا دیتا...... کس طرح؟ یہ ہیرالڈ تھامس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں صوفیہ کو ٹٹولا تو اس نے بھی کوئی حتمی جواب نہیں دیا اور ساری فلم اسی شخص کے گلے میں ڈال دی جس نے اسے اسرائیل سے بہ حفاظت نکالنا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے صوفیہ سے پوچھا۔

''تم ہیرالڈ تھامس سے کب رابطہ کرو گی؟''

پروگرام کے مطابق، میرے مشن کی تکمیل کے بعد صوفیہ نے ہیرالڈ تھامس کو فون کرنا تھا۔ پھر وہ اسے بتاتا کہ اس نے کب اور کہاں، کس شخص سے جا کر ملنا ہے۔ میرا مشن نہایت ہی کامیاب رہا تھا لہٰذا وہ وقت آن پہنچا تھا جب صوفیہ نے اپنے بڑے ہیرالڈ تھامس کو خوشی اور کامیابی کی یہ خبر سنانی تھی۔ میرے استفسار کے جواب میں صوفیہ نے جو کچھ کہا، وہ انتہائی حیرت انگیز تھا۔

''میں ہیرالڈ تھامس سے رابطہ کر کے ہدایات لے چکی ہوں'' وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

''کب؟'' بے ساختہ میری زبان سے یک لفظی سوال پھسل گیا۔

اس نے اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بتایا'' جب تم نے فون کر کے مجھے اپنی کامیابی سے مطلع کیا تھا...... کوئی آدھا پونا گھنٹا پہلے۔''

میں سنسنی خیز نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ اس دوران میں صوفیہ کو ایک لمحے کے لیے بھی اپارٹمنٹ سے باہر نہیں جانا تھا۔ اگر اس نے اپارٹمنٹ کے اندر رہتے ہوئے لندن میں موجود ہیرالڈ تھامس سے رابطہ کیا تھا تو اس کا ایک ہی مطلب تھا...... اس نے اس مقصد کے لیے اپارٹمنٹ والا فون استعمال کیا تھا۔ میں نے اس امر کی تصدیق کے لیے اس سے پوچھ لیا۔

''کیا تم نے اسی فون سے لندن کال کی ہے؟''

وہ اپنا کام جاری رکھتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے بولی'' یہ فون اوورسیز کال کے لیے ویلڈ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا، میں پھر بھی اسے استعمال کرنے کی حماقت نہ کرتی۔''

''اس کا مطلب ہے، تم کچھ دیر کے لیے اپارٹمنٹ سے باہر گئی تھیں؟''

''نہیں...... ایک لمحے کے لیے بھی نہیں!'' وہ قطعیت سے بولی۔

''پھر تم نے کس ذریعے سے لندن رابطہ کیا ہے؟'' میری حیرت اب الجھن میں بدل گئی تھی۔

''وجدان!'' وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی'' تمہاری طرح میرے پاس تھرڈ آئی کی صلاحیت تو ہے نہیں کہ میں آنکھیں بند کر کے جہاں چاہوں پہنچ جاؤں البتہ......'' اس نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''البتہ، اپنا کام چلانے کے لیے میں سائنس کی ایک چھوٹی سی ایجاد کا سہارا لیتی ہوں۔''

''تم پہیلیوں میں کیوں بات کر رہی ہو؟'' میں نے کہا'' کھل کر کہو جو بھی کہنا چاہتی ہو......''

اس نے کہا' میرا اشارہ سیل فون کی طرف ہے۔''

''سیل فون!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔'' کیا تم یہ بتانا چاہ رہی ہو کہ تمہارے پاس کوئی سیل فون بھی موجود ہے؟''

''ہاں، میرے پرس میں ایک ننھا سا ٹرائی بینڈ جی ایس ایم سیل فون موجود ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی'' یہ سیل فون دراصل یوسف الظاہری کا ہے۔''

میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا پھر میرے

استفسار پر اس نے تفصیل بتائی کہ اس کے پاس یوسف الظاہری کا جو سیل فون تھا، اس کا کنکشن پوسٹ پیڈ تھا۔ یوسف الظاہری چونکہ ایک سیلانی شخص تھا اور مصر کے پڑوسی ممالک میں اس کا آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے اس نے یو کے کے علاوہ اسرائیل، اردن، لبنان اور شام وغیرہ کی رومنگ بھی حاصل کر رکھی تھی۔ ہیرالڈ تھامس نے لندن سے روانہ ہوتے وقت یہ سیل فون اسے دیتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ وہ اس سفر کی اہم رپورٹس اس تک پہنچاتی رہے گی خاص طور پر مشن کے حوالے سے اہم خبریں اور اس دوران میں صوفیہ یہ سب کچھ کرتی بھی رہی تھی حتیٰ کہ اس نے تھوڑی دیر پہلے ہیرالڈ تھامس کو میرے مشن کی کامیابی سے مطلع کر کے آئندہ کے لیے بھی ہدایات لے لی تھیں۔ صوفیہ بہت ہی گہری لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا، وہ دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی ہو گی لیکن اس کے اسٹیٹ منٹ کے کئی پوائنٹ مجھے ہضم نہیں ہو رہے تھے اس لیے اپنی ذہنی الجھن کو میں نے استفسار کا جامہ پہنانا ضروری سمجھا۔

''تم تو چھپی رستم نکلیں۔ کمال ہے، لگ بھگ دو ہفتے اس سفر میں تم میرے ساتھ رہی ہو اور مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ تم کسی سیل فون کا استعمال کر رہی ہو۔ بھئی واہ، تم تو بہت باصلاحیت ہو۔''

اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا'' میں دراصل سیل فون کو استعمال کرنے کے لیے زیادہ تر واش روم وغیرہ کا سہارا لیتی رہی ہوں۔ پانی والا نل کھول کر دھیمے لہجے میں بہ آسانی بات کی جا سکتی ہے۔ واش روم سے باہر موجود کوئی شخص تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اندر کوئی سیلولر رابطے میں آیا ہوا ہے۔''

''اوہ......!'' میں حیرت بھری نظر سے اسے دیکھتا رہ گیا پھر پوچھا'' ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ سولہ سترہ دن تک تم نے ایک ہی بیٹری سے کیسے کام چلا لیا۔ میں نے تمہیں سیل فون کو چارج کرتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھا۔ اب یہ نہ کہنا کہ تم واش روم میں مجھ سے چھپا کر کسی ذریعے سے اپنا سیل فون چارج کرتی رہی ہو!''

''نہیں کہوں گی...... تم نے منع کر دیا ہے نا اس لیے نہیں کہوں گی۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی'' لیکن تمہارے سوال کا جواب دینا بھی ضروری ہے'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''دراصل، لندن سے روانہ ہوتے وقت میں اس سیل فون کی چار چارجڈ بیٹریز اپنے ساتھ لے کر آئی تھی جو ہر وقت فون کے ساتھ میرے پرس میں موجود رہی ہیں۔ ان میں سے ابھی تک میں نے صرف دو بیٹریز استعمال کی ہیں، تیسری لوڈ ہے، چوتھی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ اس میں اس وقت کتنا چارج موجود ہوگا۔ ویسے میں نے نہایت ہی محتاط انداز میں سیل فون کو استعمال کیا ہے...... اور اب تو اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ہیرالڈ تھامس کے خاص بندے سے ملنے والی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے، میں تم لوگوں سے پہلے ہی لندن پہنچ جاؤں۔''

اس نے تفصیل کے ساتھ ساری بات بتائی تو میری ذہنی الجھن رفع ہوگئی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا'' میں یہ تو نہیں پوچھوں گا کہ تم نے مجھے اپنے پاس سیل فون کی موجودگی سے آگاہ کیوں نہیں کیا کیونکہ میرے اس سوال کا تمہارے پاس گھڑا گھڑایا جواب بھی ہوگا۔''

''تم بالکل ٹھیک سمجھ رہے ہو وجدان!'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی'' اس سلسلے میں ہیرالڈ تھامس نے مجھے سختی سے منع کر رکھا تھا۔''

''میرا اندازہ بھی یہی ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تم میری مجبوری کو سمجھ سکتے ہو وجدان!'' وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

''بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا'' تم کسی قسم کے احساس میں مبتلا ہونے کے بجائے مجھے بتاؤ کہ ہیرالڈ تھامس نے آئندہ کے لیے تمہیں کیا ہدایات دی ہیں؟''

اس نے بتایا'' میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی اپارٹمنٹ سے نکلوں گی۔ ریڈیو کیب میں بھی تمہارے ساتھ ہی بیٹھوں گی۔ ہیرالڈ تھامس نے مجھے بتایا ہے کہ تل ابیب سے باکی روڈ اگر یروشلم جائیں تو آبی آذر کے علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ ابی آذر سے تھوڑا پہلے بیت زرقا کا علاقہ واقع ہے۔ مجھے بیت زرقا تک جانا ہوگا۔ بیت زرقا میں ون تھری نائن اریل اسٹریٹ پر مجھے اتار کر تم لوگ آگے بڑھ جانا۔''

''ایک سو انتالیس اریل اسٹریٹ پر کون رہتا ہے؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''مسٹر جوزف!'' صوفیہ نے جواب دیا'' ہیرالڈ تھامس نے مجھے جوزف سے ملنے کو کہا ہے۔''

''ٹھیک ہے صوفیہ......!'' میں نے مطمئن انداز میں کہا'' ہم تمہیں مسٹر جوزف کی رہائش پر ڈراپ کر دیں گے۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر صوفیہ نے ساحل سے کہا" اب تم واش روم میں جا کر لباس تبدیل کرلو۔ تمہارے چہرے کی فائنل ٹچنگ چینج کے بعد ہوگی۔"

ساحل نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا تو میں نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ میرا منتخب کیا ہوا ایک لباس اٹھا کر واش روم میں گھس گئی۔

صوفیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا" تھوڑی دیر کے بعد ہم بچھڑ جائیں گے۔ وعدہ کرو' اگر میں تم لوگوں سے پہلے لندن پہنچ گئی تو تم وہاں مجھ سے ایک بھرپور ملاقات کرو گے۔"

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے بھرپور ملاقات کی ہامی بھرلی حالاں کہ میرا اندازہ یہ تھا کہ جب تک ہم لندن سے تبت کے لیے روانہ نہیں ہوجاتے' ہیرالڈ تھامس صوفیہ کو لندن میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔

" اور اگر تمہیں وہاں پہنچنے میں دیر ہوجائے تو میرے لیے کیا حکم ہے؟"

" تم اتنے سیدھے کب سے ہوگئے؟" اس نے حیرت سے میری آنکھوں میں دیکھا" کسی کا حکم ماننا تو شاید تمہاری سرشت میں ہی نہیں ہے۔"

" ایسا نہ کہو صوفیہ......" میں نے شاکی لہجے میں کہا" ماہ جبینوں کی تو ہر بات کو میں حکم سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو کبھی آزما کر دیکھ لینا۔"

ہمارے درمیان وہ گفتگو انتہائی دھیمے لہجے میں ہو رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا، یہ باتیں ساحل کے کانوں تک پہنچیں اسی لیے بے حد محتاط تھا۔

صوفیہ نے کہا" تم آزمانے کا موقع فراہم کرو گے تو آزما بھی لوں گی۔"

" تمہیں کس قسم کا موقع درکار ہے؟" میں نے پوچھا۔

میں اس وقت صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے قریب آگئی پھر واش روم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ اس کے لہجے میں معنی خیزی تھی۔

" موقع تو یہ بھی مناسب ہے!"

" کیا کہہ رہی ہو؟" میں بوکھلا گیا" تم جانتی ہو' ساحل سے میرا کیا رشتہ ہے!"

" اسے کیا پتا چلے گا" وہ بے پروائی سے بولی۔

" صوفیہ' اگر اس نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔" میں بدک کر ایک طرف ہوگیا۔

" شادی ابھی ہوئی نہیں" وہ میرے تعاقب میں آگے سرک آئی" اور تم نے شوہروں کی طرح ڈرنا شروع کردیا ہے۔ کیا مجھے وداعی نہیں دو گے، یونہی روکھے سوکھے رخصت کردو گے۔" وہ لمحے بھر کو رکی پھر بڑے اعتماد سے بولی" ساحل پانچ منٹ سے پہلے واش روم سے باہر نہیں آئے گی، میں تم سے صرف یہی پانچ منٹ تو مانگ رہی ہوں۔ کیا تم میری یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کرسکتے؟" بات ختم کرتے ہی وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے یوں محسوس ہوا' کوئی لب دم شخص میرے سامنے اپنی زندگی کی آخری خواہش بیان کر رہا ہو اور بڑے حسرت بھرے انداز میں ملتجی ہو کہ میں اسے صرف ایک گھونٹ پانی پلا دوں۔ وہ ترلبوں کے ساتھ زندگی کی آخری سانس لینا چاہتا ہے۔

میں نے صوفیہ کی فرمائش کے سامنے مزاحمت ترک کرکے اس کی خواہش پوری کردی۔ وہ ایک گھونٹ کی تمنائی تھی' میں نے ضرورت کے سمندر سے اس کی طلب کو شکم سیر کردیا۔ جب ساحل لباس تبدیل کرکے واش روم سے نکلی تو میں ریڈیو کیب والوں کو فون کر رہا تھا۔

مختصر گفتگو کے بعد میں نے ان سے معاملہ طے کرلیا۔ انہوں نے بتایا کہ میری ضرورت کے عین مطابق' ایک ریڈیو کیب ٹھیک ڈھائی بجے شالوم اسٹریٹ پر واقع پوسٹ آفس کے سامنے پہنچ جائے گی۔ میں نے دانستہ کیب کو بہائی گارڈن اپارٹمنٹ پر نہیں بلایا تھا۔ مشن کے آخری مرحلے پر احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دینا ٹھیک نہیں تھا۔

جب تک میں ریڈیو کیب والوں سے معاملہ کرتا' صوفیہ نے دوبارہ ساحل کے چہرے پر کام شروع کردیا تھا۔ ٹھیک دو بج کر پانچ منٹ پر صوفیہ نے ساحل کو فارغ کردیا۔ صوفیہ کی محنت نے ساحل کو ہوبہو صوفیہ بنا دیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

" وجدان! تم اپنی دوست کو اچھی طرح گھما پھرا کر چیک کرلو۔ کوئی کمی یہ کسر نظر آئے تو ابھی بتادو۔ بعد میں مجھ سے کوئی شکوہ نہ کرنا!"

آخری جملہ اس نے بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا تھا۔ میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس جملے کی معنی آفرینی پر بیٹھا غور کرتا رہتا۔ میں نے ساحل پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پھر صوفیہ کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔

" الس اوکے!"

" اب پانچ منٹ میں بھی لوں گی" صوفیہ نے کہا۔

" تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

" میں اپنے حلیے میں تھوڑی سی عارضی تبدیلی لانا چاہتی ہوں۔"

" تمہیں اس کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

" کیا دو دو صوفیہ کو ساتھ لے کر بلڈنگ سے نکلو گے؟" وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

" اوہ!" میں نے بے ساختہ اپنے سر کو تھامتے ہوئے کہا۔

ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ پتا نہیں' اس طرف میرا دھیان کیوں نہیں گیا تھا۔ صوفیہ نے ساحل کو اپنا ہم شکل بنا دیا تھا۔ واقعی' اگر میں ایک جیسی شکل وصورت کی دو لڑکیوں کو پہلوؤں میں رکھ کر باہر نکلتا تو دیکھنے والی ہر آنکھ میں ایک سنسنی خیز تعجب انگڑائی لے کر بیدار ہوجاتا۔

دو بج کر بیس منٹ پر ہم ہر کام سے فارغ ہوچکے تھے۔ ہم نے باہمی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دو بج کر پچیس منٹ کے بعد ہم' ایک ایک منٹ کے وقفے سے اس اپارٹمنٹ سے نکلیں گے اور اپارٹمنٹس بلڈنگ سے باہر آنے کے بعد ایک ساتھ مل کر شالوم اسٹریٹ کی جانب بڑھ جائیں گے جہاں میں نے ریڈیو کیب کو پہنچنے کے لیے کہا تھا۔

ہمارے پاس' اس حساب سے پانچ منٹ کا وقت تھا' یعنی دو بیس سے دو پچیس تک کے پانچ منٹ۔ اچانک مجھے ایک شرارت سوجھی اور میں ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اپنے ارادے کے بارے میں صوفیہ اور ساحل کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔

میں نے ریسیور اٹھا کر" ون ڈبل زیرو" ڈائل کیا اور دوسری جانب سے کسی کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلی گھنٹی پر ہی کال ریسیو کرلی گئی۔" ون ڈبل زیرو" ایمرجنسی پولیس ہیلپ کا نمبر تھا۔ رابطہ ہونے پر میں نے نہایت ہی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

" میں سلوان بول رہا ہوں۔ میرا ایک ساتھی بیگن بنگلا نمبر ڈی...... ون ٹو تھری میں کام کرتا ہے۔ اس نے ابھی ابھی فون کرکے مجھے بتایا ہے کہ وہاں ایک سنگین واردات ہوگئی ہے۔ وہ پولیس کو مطلع کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ آپ فرصت میں بنگلا نمبر ڈی...... ایک سو تیس میں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

دوسری طرف سے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا گیا" آپ چند سیکنڈ کے لیے فون بند کردیں۔"

میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

اگلے ہی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور خاموش رہا۔ ''مسٹر سلوان!'' میری سماعت سے وہی آواز ٹکرائی جس نے چند سیکنڈ پہلے مجھے فون بند کرنے کو کہا تھا۔ وہ مستفسر ہوا۔ ''بنگلا نمبر ڈی...... ون ٹوکٹی تھری کس علاقے میں واقع ہے؟''

میں نے اس پوش رہائشی علاقے کا نام بتا دیا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دے کر آیا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد اس نے پوچھا۔

''اس بنگلے میں کون رہتا ہے؟''

''جنرل بائرن!'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ!'' اس کی تاسف سے بھری ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی ''آپ نے اپنے ساتھی کا کیا نام بتایا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا ''بیگن......!''

''بیگن ہمیں فون کرنے کی پوزیشن میں کیوں نہیں ہے؟''

''یہ تو بنگلے پر پہنچ کر آپ اسی سے پوچھیں۔'' میں نے روکھے انداز میں کہا۔

''آپ اپنا ایڈریس نوٹ کرائیں۔''

میں نے فوراً دہرایا ''اپارٹمنٹ نمبر ستائیس...... سی بہائی گارڈن اپارٹمنٹس شالوم اسٹریٹ۔''

دوسری جانب ''کھٹک'' سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں نے مسکرا کر صوفیہ اور ساحل کی طرف دیکھا پھر فون پر ''ون زیرو ون'' ملانے لگا ''ایک سو ایک'' نمبر ایمرجنسی میڈیکل ایڈ کے لیے مخصوص تھا۔ دوسری ہی گھنٹی پر فون اٹینڈ کر لیا گیا۔ ایک بھاری بھرکم آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''ہیلو!''

میں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا ''میں بنگلا نمبر ڈی...... ون ٹوکٹی تھری سے بول رہا ہوں۔ یہاں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ دو تین ایمبولینس بھی درکار ہیں۔ آپ لوگ فوراً یہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔''

''آپ کون ہیں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

میں نے بتایا ''میں جنرل بائرن کا ایک ملازم بیگن بات کر رہا ہوں۔''

''ذرا یہ بھی بتا دیں، بنگلا نمبر ڈی...... ون ٹو تھری کہاں ہے؟''

میں نے ربی والے رہائشی علاقے کا نام بتایا۔

''ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

دراصل جنرل بائرن کا نام بہت کام دکھا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا' یہ نام سنتے ہی دوسری طرف موجود شخص انتہائی مؤدب اور سنجیدہ ہو جاتا۔ میں نہیں جانتا تھا' یہ جنرل بائرن کس توپ شے کا نام ہے۔ مجھ تک یہ نام فلوس کے ذریعے پہنچا تھا۔ جب میں ربی والے بنگلے پر پہنچا تو گیٹ پر متعین سیکیورٹی گارڈز سے میں نے ڈرامائی گفتگو کی تھی۔ میں ان سے کسی میڈم شارلٹ کا پتا پوچھ رہا تھا اور انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ میڈم شارلٹ اور کرنل دایان کا بنگلا نمبر بی...... ایک سو بتیس دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں ہے۔ میں نے ربی والے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ یہاں کون رہتا ہے؟ میرے اس سوال کے جواب میں فلوس نامی سیکیورٹی گارڈ نے بڑی رعونت سے بتایا تھا' یہ جنرل بائرن کا بنگلا ہے۔ یہی فلوس اپنے آں جہانی ساتھی جم کے ساتھ اس وقت انٹا غفیلی کیفیت میں پڑا تھا۔

تیسرا فون میں نے فائر ڈیپارٹمنٹ کو کیا' ''ون زیرو ٹو'' ڈائل کرتے ہی متعلقہ ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ ہو گیا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اپنا تعارف کرایا پھر ربی والے بنگلے کا نمبر اور محل وقوع بتانے کے بعد کہا۔

''یہاں پر آتشزدگی کا ایک بہت بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ آپ اپنے فائر فائٹرز کی ٹیم کو جلد از جلد ادھر بھیج دیں۔''

میں اس ٹیلی فونک ''تعمیر کاری'' سے فارغ ہوا تو صوفیہ نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا ''وجدان! یہ تم کس چکر میں پڑ گئے ہو؟''

''چکر......؟'' میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں چکر...... یہ ایک ایسا گھن چکر ہے جس میں گھن نہیں' صرف گیہوں پستا ہے اور ایسا پستا ہے کہ کیا کوئی بادام پستہ بھی پستا ہوگا!'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ربی موشے ہائمن کسی گھن سے کم تو نہیں۔ دیکھ لو اس کے آس پاس پایا جانے والا گیہوں تو پس چکا اور وہ مردود ابھی تک زندہ سلامت ہے اور میں چاہتا ہوں' وہ اپنی طبعی زندگی گزار کر طبعی موت ہی مرے اسی لیے...... اسی لیے میں نے اسرائیل کے تین انتہائی ایمرجنسی نمبرز پر فون کر کے کچھ ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کی جا سکے اور مجھے یقین ہے' اسے بچا لیا جائے گا۔''

میں نے اپارٹمنٹ پر آنے کے بعد صوفیہ کو ان تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا جو ربی والی بنگلے پر پیش آ چکے تھے۔ وہ چند لمحات تک کھوجتی ہوئی نگاہ سے مجھے دیکھتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ایک بات پوچھوں وجدان؟''

''ایک چھوڑ دس باتیں پوچھ لو'' میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا' ''پتا نہیں' زندگی میں پھر کبھی مل بیٹھنے کا موقع ملے یا نہ ملے!''

''دس نہیں' صرف ایک بات پوچھوں گی'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی' ''یہ شرط یہ کہ تم بالکل درست جواب دو!''

''ہاں پوچھو' میں ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا۔''

اس نے پوچھا' ''ربی موشے ہائمن تمہارا دشمن نمبر ایک رہا ہے' پھر تم نے اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟''

یہ ایک ایسا اہم سوال تھا کہ جس کے لیے میرے ذہن میں بہت سے جوابات موجود تھے لیکن وہ تمام جوابات میں ہر ایک کو نہیں دے سکتا تھا۔ صوفیہ سے میں چونکہ جواب دینے کا وعدہ کر چکا تھا اس لیے اس کی تسلی کی خاطر کر دیا۔

''ربی کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے لہٰذا اس کی سزا کو بھی مختصر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتا تو اس کی مشکل آسان ہو جاتی۔ وہ ایک دفعہ مر کر زندگی کے غموں سے آزادی حاصل کر لیتا اور یہی میں نہیں چاہتا ہوں۔''

میں نے سانس لینے کے لیے لمحے بھر کا توقف کیا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا' ''میری یہ خواہش ہے کہ ربی موشے ہائمن اپنی طبعی عمر تک زندہ رہے اور اس طرح زندہ رہے کہ اپنے زندہ رہنے پر شرمندہ رہے۔ میں اسے پچھتاوے' پشیمانی' شرمندگی اور ندامت کی زندگی گزارتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور میں نے اپنی خواہش پوری کرنے کا بڑا کامل بندوبست کر دیا ہے۔ میں نے اسے ایک ایسے روحانی عذاب میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ ہر رات سونے سے قبل یہ دعا مانگے گا کہ یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہو لیکن اگلی صبح وہ پھر جی اٹھے گا...... یعنی زندہ بیدار ہوگا اور دن بھر میرے دیے ہوئے زخموں کو چاٹتا رہے گا۔ وہ ہر روز مرے گا اور ہر روز جیئے گا۔ میں اسے قسط وار مارنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے' ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا!''

میری بات ختم ہوئی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ وہ ریڈیو کیب کے ڈرائیور کا فون تھا۔ اس نے بتایا کہ ہماری منگوائی ہوئی ریڈیو کیب پوسٹ آفس کے سامنے پہنچ چکی ہے۔ میں نے ان دونوں کو کیب کی آمد کے بارے میں بتایا' پھر صوفیہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے پوچھے ہوئے سوال کا جواب تو دے دیا تھا۔

پتا نہیں' میری اس وضاحت سے اس کی تسلی ہوئی یا نہیں' بہرحال اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ ہماری روانگی کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے صوفیہ اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''صوفیہ! پہلے تم اپارٹمنٹ سے نکلو گی پھر ساحل اور اس کے بعد میں۔ تم دونوں بلڈنگ سے باہر نکلنے کے بعد آپس میں مل جاؤ گی اور سبک قدمی سے اس ریڈیو کیب کی جانب بڑھو گی جو اس وقت شالوم اسٹریٹ پر پوسٹ آفس کے سامنے کھڑی ہے۔ ازاٹ کلیئر؟''

دونوں نے میرے سوال کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے کہا' ''تمہارے پیچھے میں سامان لے کر آ رہا ہوں۔ کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں'

جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہونے والی مقبول ترین کہانی

علی یار خان کی سرگزشت

قیمت فی حصہ: 60 روپے
ڈاک خرچ فی حصہ 23 روپے

مجاہد

کتابی صورت گیارہ حصوں میں تیار ہے

فلسطین کی جنگ آزادی میں شامل ایک پاکستانی جاں باز کی ناقابل فراموش جدوجہد

جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
جب خونِ جگر برفاب ہوا

مکمل سیٹ منگوانے پر قیمت 600 روپے ڈاک خرچ معاف

کتابیات پبلی کیشنز۔ کراچی

پوسٹ بکس 23 کراچی 74200
فون 021-5804300
kitabiat1970@yahoo.com
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈی ایچ اے مین کورنگی روڈ (اختر کالونی بس اسٹاپ کے سامنے)

پریشانی کا مشکل وقت ختم ہو چکا ہے۔ ہم اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں۔“

پھر ہم تینوں پروگرام کے مطابق‘ یکے بعد دیگرے اس اپارٹمنٹ سے نکل گئے!

☆☆☆

پندرہ مئی کی صبح بڑی روشن اور چمکیلی تھی!

میں بیدار ہوا تو ساحل کو جاگتے ہوئے پایا۔ وہ مجھ سے پہلے اٹھ چکی تھی۔ ہماری نظریں چار ہوئیں تو وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرادی۔ میں نے اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

ہم گزشتہ روز رات گئے لہاسا (تبت) پہنچے تھے لہٰذا نیند پوری کرنے کے لیے بہت ہی کم وقت مل سکا تھا اس کے باوجود بھی ہمارے ذہن مستعد اور بدن چاق و چوبند تھے شاید یہ اس خوشی کا نتیجہ تھا جو طویل جدائی کے بعد ملاپ کی صورت میں ہمیں حاصل ہوئی تھی۔

تل ابیب والے اپارٹمنٹ سے نکل کر ہم بہ خیریت ریڈیو کیب تک پہنچے تھے اور صوفیہ کو مسٹر جوزف کے پاس‘ اریل اسٹریٹ پر ڈراپ کرنے کے بعد تل ابیب سے یروشلم کی جانب روانہ ہو گئے تھے۔ بہ وقتِ رخصت صوفیہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی اور اس کی یہ جذباتیت ساحل سے چھپی نہیں رہی تھی لیکن نہایت ہی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساحل نے اس موقع پر کسی سخت یا معنی خیز ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا البتہ‘ بعد میں جب بھی اسے تنہائی میں مجھ سے بات کرنے کا موقع ملا‘ اس نے صوفیہ کے حوالے سے چھیڑ چھاڑ ضرور کی۔

صوفیہ نے الوداعی کلمات سرگوشیانہ انداز میں ادا کیے تھے اور اس کے آخری جملے میری یادداشت میں محفوظ ہو کر رہ گئے تھے۔ میں جب بھی صوفیہ اور اس کے ہمراہ گزارے ہوئے گنتی کے روز و شب کا تصور کرتا‘ یہ جملے میری سماعت میں گونجنے لگتے۔ اس نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا تھا۔

”وجدان! میں جانتی ہوں‘ تم سے رابطہ کرنا اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔ پتا نہیں‘ میں تمہیں یاد بھی رہتی ہوں کہ نہیں۔ یہ تو سراسر تم پر منحصر ہے کہ مجھ سے‘ تھرڈ آئی کے توسط سے رابطہ کرو یا نہ کرو۔ بہرحال‘ تبت‘ باقی دنیا سے لینڈ لائن رابطے میں نہیں تو کیا ہوا‘ میں ڈریم لینڈ میں تمہارا انتظار کروں گی۔“

ہم تل ابیب سے یروشلم پہنچے پھر یروشلم سے قاہرہ اور اس کے بعد قاہرہ سے لندن پہنچ گئے۔ لندن میں صوفیہ سے ملاقات نہ ہو سکی کیونکہ وہ ابھی تک اسرائیل سے نہیں نکلی تھی۔ میرا اندازہ بھی یہی تھا۔ ہیرالڈ تھامس جیسا دانا و بینا شخص صوفیہ کو اس وقت تک لندن آنے کی اجازت نہ دیتا جب تک ہم وہاں سے روانہ نہ ہو جاتے اور......اب ہم تبت پہنچ چکے تھے۔

میں کم و بیش بائیس دن تبت سے باہر کی دنیا میں گزار کر آیا تھا لیکن یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی کہیں نہ گیا ہوں۔ تبت کی فضا میں پتا نہیں‘ ایسی کیا بات تھی کہ یہاں کا سب کچھ بھلا اور اپنا اپنا سا لگتا تھا۔ میں اس جنت نظیر خطے پر سانس لے کر بڑی فرحت اور آسودگی محسوس کرتا ہوں اور اب تو ان انبساط بھرے لطیف احساسات میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا‘ کیونکہ میرے وجود کا کھویا ہوا حصہ مجھے مل چکا تھا‘ میری ذات کی گویا تکمیل ہو گئی تھی۔ ساحل کے بغیر میں خود کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔ اسے پا کر میرا ادھورا پن اور تشنگی دور ہو گئی تھی۔ وصل کا نشاط وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو کبھی ہجر کی آگ میں جلے ہوں‘ فراق کے صحرا میں جھلسے ہوں اور جدائی کی لمبی سیاہ راتیں جنہوں نے آنکھوں میں گزاری ہوں!

ہم بیدار ہونے کے بعد ابھی فریش بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے رات کو سونے سے پہلے دروازہ بھیڑ دیا تھا‘ کنڈی لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اس وقت مجھے صرف اور صرف نیند کے بارے میں سوجھ رہا تھا۔ میں پہلے اپنی نیند پوری کرتا پھر کسی اور معاملے کی طرف توجہ دیتا یہی حال ساحل کا بھی تھا۔ وہ تو بستر پر گرتے ہی سو گئی تھی۔

میں نے بستر پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی ”آجاؤ...... دروازہ کھلا ہے!“

اگلے ہی لمحے‘ مجھے اس دروازے میں چمن سیان کی صورت دکھائی دی۔ چمن سیان ایک طرح سے چنگ فو کے دستِ راست کی حیثیت رکھتا تھا۔ امید کی جا رہی تھی کہ جو کھانگ ٹیمپل کا آئندہ چیف لاما اسی کو منتخب کیا جائے گا۔ جب میں لہاسا سے لندن جا رہا تھا تو چمن سیان‘ لی یان کے ساتھ مجھے گانگر ائرپورٹ تک چھوڑنے آیا تھا۔ گزشتہ رات بھی چمن سیان ہی نے ہمیں ائرپورٹ سے لے کر جو کھانگ ٹیمپل تک پہنچایا تھا لیکن اس مرتبہ لی یان اس کے ہمراہ نہیں تھی۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی لیکن اس وقت تفصیلی بات چیت کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا‘ آئندہ روز لی یان کی بھی خیر خبر لوں گا۔

لی یان بڑی بولڈ لڑکی تھی۔ شریکِ حیات کی ابدی جدائی کے بعد انسان عموماً ٹوٹ کر رہ جاتا ہے لیکن لی یان اپنے شوہر کے انتقال کے بعد پہلے سے زیادہ ہمت والی بن گئی تھی۔ اس کا شمار بھی میری جاں نثار ساتھیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا ساتھ کوئی برسوں پر محیط نہیں تھا لیکن ہم جب تک ساتھ رہے‘ لی یان نے زندگی کے ہر محاذ پر‘ قدم سے قدم اور شانے سے شانہ جوڑ کر میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ میں لی یان کے جذبات اور خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔

چمن سیان نے باری باری ہم دونوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا جیسے اپنی نظر کی مدد سے ہمارا ایکس رے کر رہا ہو۔ ہمیں پوری طرح اپنی جانب متوجہ پایا تو اس نے خفیف سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”اٹھ گئے ہو تو جلدی سے فریش بھی ہو جاؤ۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں ناشتا لے کر آ جاؤں گا۔ اس کے بعد بھی بہت سے ضروری کام ہیں۔“

رات میں چمن سیان سے لی یان کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی وہ مجھے یاد آ گئی پھر استفسار میں‘ میں نے دیر نہ لگائی۔

”ہم اٹھ گئے ہیں تو تیار ہونے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے چمن سیان“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا ”تم بے دھڑک ہو کر ناشتا لینے چلے جاؤ اور جاتے جاتے یہ بھی بتاتے جاؤ‘ لی یان کا کیا حال ہے؟“

اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے متغیر ہو گیا۔ میں سمجھنے سے قاصر رہا کہ لی یان کے ذکر پر‘ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات کیوں نمودار ہوئے تھے۔ وہ جو پہلے خفیف انداز میں زیرِ لب مسکرا رہا تھا، یک دم سنجیدگی کا نمونہ بن گیا۔ قبل اس کے کہ میں اس سلسلے میں اس سے کوئی مزید استفسار کرتا‘ اس نے دو ٹوک جملہ بول کر میرے کسی سوال کی راہ مسدود کر دی۔

”لی یان کی تم فکر نہ کرو‘ وہ ٹھیک ہے مناسب موقع پر اس سے تمہاری ملاقات کرا دی جائے گی...... ناشتے کے بعد تمہیں چنگ فو رن پوشی کے پاس جانا ہے......تم دونوں کو!“

”اوہ!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اس دوران میں چمن سیان اپنی سنجیدہ صورت کے ساتھ غائب ہو گیا۔

چمن سیان نے چنگ فو کا ذکر کیا تو چیف لاما میرے تصور میں ابھر آیا۔ اس کے ساتھ ہی چنگ فو سے ہونے والی پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔ اس ملاقات کے لیے بھی چمن سیان ہی مجھے ایک مخصوص کمرے میں لے کر گیا تھا اور آج بھی یہ فریضہ اسی کو ادا کرنا تھا۔ چنگ فو نے پہلی ملاقات میں ایک بڑی عجیب بات کی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا تھا...... وجدان! ہماری صرف تین ملاقاتیں ہونی ہیں۔ ایک ملاقات اس وقت ہو رہی ہے‘ دوسری ملاقات ٹھیک دس دن کے بعد ہوگی اور تیسری ملاقات کا دار و مدار صرف اور صرف تمہاری کارکردگی پر ہے کیونکہ اس آخری ملاقات میں تم اکیلے نہیں ہو گے بلکہ تمہارے ساتھ وہ بھی ہوگی جس کے حصول کی خاطر تم نے اپنی زندگی کو سپردِ عذاب کر رکھا ہے۔

چنگ فو کے فرمان کے عین مطابق ہماری دو ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ دوسری ملاقات خاصی طویل رہی تھی اور یہ ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں لہاسا سے لندن روانہ ہونے والا تھا اور آج تیسری اور آخری ملاقات ہونے والی تھی۔ لفظ ”آخری“ کافی دنوں سے میری یادداشت میں کسی آہنی میخ کے مانند ٹھنکا ہوا تھا۔ اس کا سیدھا اور آسان مطلب تو یہی تھا کہ اس ملاقات کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی ایک اپنی زندگی کو خیرباد کہہ دے گا۔

اس حوالے سے ذرا محفوظ انداز میں یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ اس تیسری ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے سے ہزاروں میل کے فاصلے پر چلے جائیں گے لیکن ایسا سوچنا

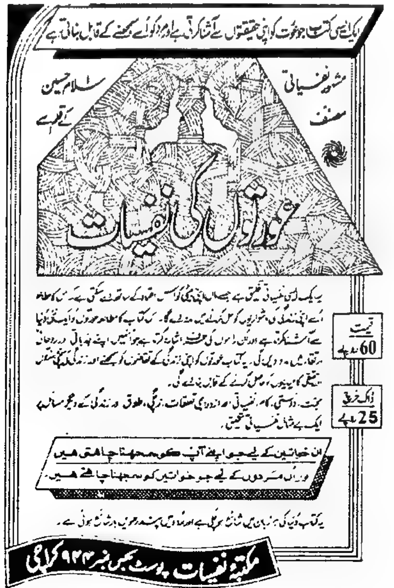

ایک کمزور دلیل کے سوا کچھ نہ ہوتا کیونکہ انسان ایک دوسرے سے چاہے کتنی بھی دوری پر کیوں نہ چلا جائے، اگر زندہ رہے تو کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی ہے!

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تو چن سیان ہمیں لینے کے لیے آ گیا۔ وہ پہلے بھی دو مرتبہ مجھے چنگ فو سے ملوانے لے جا چکا تھا لہٰذا مطمئن انداز میں ہم اس کے ساتھ ہو لیے۔ وہ ہمیں مختلف راہ داریوں میں گھماتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں ان راہ داریوں سے اب اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ ہم اس وقت ننگے پاؤں تھے۔ جوکھانگ ٹیمپل کے مختلف کمروں اور حصوں سے گزرتے ہوئے بالآخر ہم اس مخصوص کمرے کے سامنے پہنچ گئے جہاں اس ٹیمپل کے چیف لاما چنگ فورن پوشی سے ہماری ملاقات ہونے والی تھی۔

ہمارے قدم رکے تو میں نے سوالیہ نظر سے چن سیان کی طرف دیکھا۔ وہ گمبھیر لہجے میں میں بولا ''اندر چلے جاؤ...... رن پوشی آنے ہی والے ہیں۔''

میں نے بہ آہستگی دروازہ کھولا' پھر یکے بعد دیگرے میں اور ساحل اس کمرے میں داخل ہو گئے۔

میں دو مرتبہ پہلے بھی اس کمرے میں آ چکا تھا لیکن ساحل کے لیے یہ پہلا اتفاق تھا۔ وہ دس بائی دس کا ایک مختصر سا کمرا تھا۔ میں وہاں موجود ہر شے سے اچھی طرح واقف تھا۔ کمرے کی دیواریں اور چھت زرد رنگ کی تھیں۔ کمرے کے بعض حصوں میں لکڑی کا خوب صورت کام بھی ہوا تھا اور چھت سے فرش تک دو موٹے منقش چوبی ستون بھی بڑی شانِ بے نیازی سے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ کمرے کے فرش پر بچھے ہوئے قالین کا رنگ بھی دیواروں اور چھت کی طرح زرد ہی تھا۔ اس بار مجھے اس چھوٹے سے کمرے میں ایک تبدیلی دکھائی دی۔

پہلے دو دفعہ جب مجھے اس کمرے میں آنے کا اتفاق ہوا تھا تو میں نے فرش پر یاک کی اون سے تیار کردہ چٹائیاں رکھی دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک چٹائی کا رنگ نیلا اور دوسری کا سفید تھا۔ چنگ فو سے ملاقات کے وقت اسی کا اشارہ پا کر میں سفید چٹائی پر بیٹھا تھا اور وہ خود نیلی چٹائی پر براجمان ہو گیا تھا لیکن آج اس مختصر سے کمرے میں ایک کے بجائے دو سفید چٹائیاں بچھی نظر آ رہی تھیں جن میں سے ایک یقیناً ساحل کے لیے بچھائی گئی تھی۔

ہم بیٹھے نہیں بلکہ کھڑے ہو کر رن پوشی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ چند لمحات کے بعد متاثر کن شخصیت کا مالک چنگ فورن پوشی اس کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مسکراتا ہوا سیدھا ہماری طرف آیا۔ ہم دونوں نے سر کی ہلکی اثباتی جنبشوں سے اسے تعظیم دی۔ اس نے آشیرباد والے انداز میں ہمارے سروں پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا پھر سفید چٹائیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہی پُرسکون لہجے میں بولا۔

''بیٹھ جاؤ!''

ہم دونوں باادب' بالملاحظہ بیٹھ گئے۔

گفتگو کا آغاز اسی کی طرف سے ہوا، ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے کہا ''وجدان! سب سے پہلے میں تمہیں اس مشن کی کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ تم نے ایک ناممکن کام کر دکھایا ہے۔''

''میری کامیابی آپ کے تعاون اور نگرانی کی رہین منت ہے میرے محترم!'' میں نے معتدل انداز میں کہا ''اگر میں آپ کی ہدایات کو فراموش کر دیتا تو شاید وہ نتائج برآمد نہ ہوتے جو کامیابی کا لازمی جزو تھے۔ میں نے تو صرف آپ کے اشاروں پر عمل کیا ہے۔''

''تم ایک سعادت مند نوجوان ہو'' وہ دھیمے لہجے میں بولا ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم نے میری ہدایت کو یاد رکھا۔''

میں نے کہا ''میرے محترم! میں اس مشن کے آخری مرحلے پر تھوڑا جذباتی ہو گیا تھا لہٰذا میرے ہاتھوں ......''

''اس ذکر کی کوئی اہمیت نہیں'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا ''تم نے جو پرفارمنس دی ہے وہ کافی سے کہیں بڑھ کر ہے۔ تبت میں قیام کرو گے تو رفتہ رفتہ تمہارے دماغ کی گرمی جاتی رہے گی۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا نا، تمہارے اندر جو آتش فشاں پک رہا ہے، اسے تبت کی فضاؤں ہی میں قرار آئے گا۔''

اس گفتگو کے دوران میں وہ گہری نظر سے ہم دونوں کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ میں نے برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا۔ ''میرے محترم! میں نے ربی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس سے آپ مطمئن تو ہیں نا؟''

''ہاں' میں بالکل مطمئن ہوں'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا ''موت دکھا کر بیماری پر راضی کرنا اور مارنے کے بجائے ڈرا کر بھگانا عقل مندی کے زمرے میں آتا ہے۔ تم نے جو کچھ بھی کیا' اچھا ہی کیا ہے۔ اگر اس شخص میں ذرا سی بھی معقولیت ہوئی تو وہ تمہارے اور تمہاری قوم کے بارے میں دشمنوں والے انداز میں نہیں سوچے گا۔''

میں نے ابھی تک رن پوشی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں ربی

والے بنگلے پر کون کون سے کارنامے انجام دے کر آ رہا ہوں اس کے باوجود بھی وہ وہاں پر میری کارکردگی کو سراہ رہا تھا' اس کا ایک ہی مطلب تھا' وہ میرے بارے میں پل پل کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے اسرائیل والے میرے مشن کو اپنی کسی خفیہ صلاحیت سے مانیٹر کیا تھا۔

ہمارے درمیان چند لمحات تک خاموشی چھائی رہی پھر چنگ فو براہِ راست ساحل سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھنے لگا ''بیٹی! تم خوش تو ہو نا؟''

''جی ہاں' میں بہت خوش ہوں'' وہ گردن جھکائے جھکائے دھیمے لہجے میں بولی۔

''تم نے منزل مراد پانے کے لیے بہت تکالیف اٹھائی ہیں۔'' چنگ فو نے کہا ''بہرحال' لارڈ بدھا کی مہربانی سے تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اب تم دونوں کو ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں نے تمہاری شادی کے مکمل انتظامات کر دیے ہیں لیکن بس' ایک چھوٹی سی رکاوٹ حائل ہے جسے تم دونوں مل کر دور کر سکتے ہو!''

وہ ڈرامائی انداز میں خاموش ہوا تو ہم دونوں نے اضطراری انداز میں چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں سوال کرنے سے باز نہ آیا۔

''میرے محترم! آپ کس رکاوٹ کا تذکرہ کر رہے ہیں؟''

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بڑی گہری نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں تذبذب کا شکار ہو گیا۔ پتا نہیں' اس نے کون سا انکشاف کرنے کے لیے وہ گمبھیر انداز اپنایا تھا۔ جب وہ بولا تو معاملہ صاف ہو گیا۔

''تم دونوں میرے لیے' میرے بچوں کی طرح ہو۔'' وہ نہایت ہی سنجیدگی سے بولا ''میرے نزدیک شادی' خوشی کا نام ہے۔ میں تمہیں شادی کے بعد خوش و خرم اور کامیاب دیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ چنانچہ' میرے خیال میں ایک کامیاب اور مثالی شادی کے لیے تم دونوں کا ہم مذہب ہونا ضروری ہے۔''

''اوہ!'' بے ساختہ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

ساحل نے تشویش بھری نظر سے میری طرف دیکھا تاہم منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کے کچھ نہ بولنے کے باوجود بھی میں سمجھ گیا کہ اس وقت اس کے ذہن میں کون سی قیامت برپا تھی۔ چنگ فو کی بات اگرچہ ہر لحاظ سے معقول تھی لیکن اس معقول بات نے میرے ذہن کو بھی بری طرح

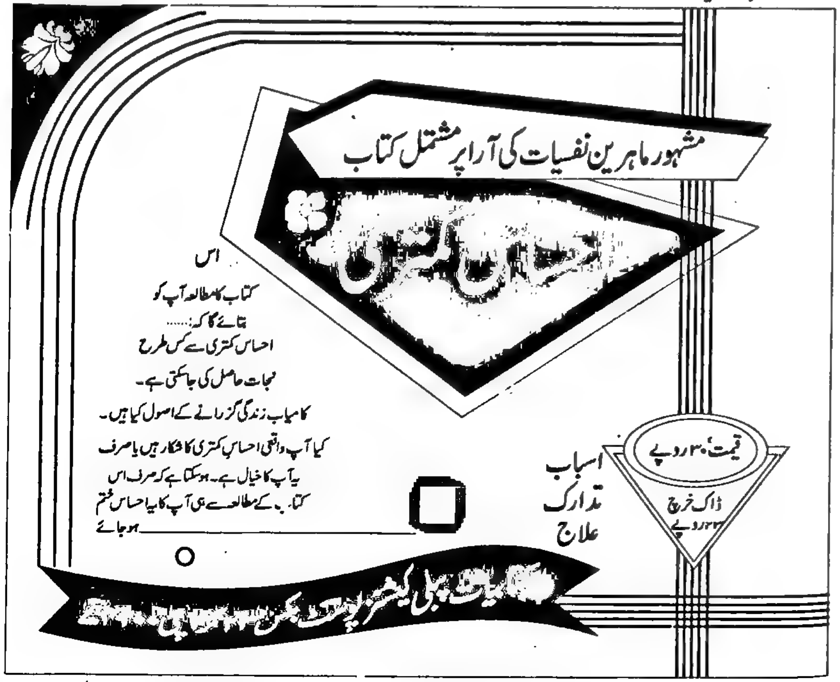

الجھا کر رکھ دیا تھا۔ یہ تو کسی بھی صورت ممکن نہیں تھا کہ میں اپنا مذہب تبدیل کر لیتا۔ اس دوران میں چنگ فو مسلسل سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کے چہروں کو ٹٹول رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میری سوچ پڑھ رہا ہو۔ میں نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

وہ بہ یک وقت ہم دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے مستفسر ہوا ''وجدان! بتاؤ' کیا تم ساحل کو پانے کے لیے بدھ ازم میں آ رہے ہو؟'' پھر وہ ساحل کی جانب متوجہ ہوا ''بیٹی! کیا تم اس بندھن کو اٹوٹ بنانے کے لیے مسلمان ہونے کو تیار ہو؟''

میں نے بھی سوالیہ نظر سے ساحل کی طرف دیکھا۔ میں نے تو ابھی تک چنگ فو کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا لیکن اس سلسلے میں' ساحل نے ایک لمحے کی تاخیر کو بھی گناہِ عظیم تصور کیا اور اضطراری لہجے میں بولی۔

''میرے محترم! آپ مذہب کی تبدیلی کے سلسلے میں وجدان سے کوئی سوال نہ کریں۔ میں اپنا فیصلہ سنا رہی ہوں۔ میں اس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہوں۔ جب میں نے وجدان کی خواہش پر اپنا نام دھنو سے بدل کر ساحل رکھ لیا ہے تو میں مذہب تبدیل کرنے کی قربانی بھی دے سکتی ہوں۔''

میرے سینے سے ایک آسودہ اور اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔ ساحل نے اپنا اٹل فیصلہ سنا کر مجھے ایک بہت بڑی آزمائش سے' دوچار ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ واقعی مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی تھی۔

رن پوشی نے گمبھیر لہجے میں کہا ''عورت' مرد کی بہ نسبت اپنے اندر کہیں زیادہ قربانی کا جذبہ رکھتی ہے۔ بیٹی! تمہارے فیصلے نے مجھے خوش کر دیا۔ میں یہ بات ہر تعلق سے بالاتر ہو کر بالکل غیر جانب دارانہ انداز میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے' تمہیں زندگی میں کبھی اپنے اس فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا۔ تم ہمیشہ شاد آباد اور خوش و خرم رہو گی' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''وجدان! تم ایک خوش قسمت نوجوان ہو۔ مجھے امید ہے، تم ساحل کی قربانی کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھو گے۔ اس نے تمہاری خاطر جتنا بڑا فیصلہ کیا ہے' تم اس کی لاج رکھو گے!''

''میں ساحل کو خوش رکھنے اور آپ کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے اپنی جان کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں ......'' ان لمحات میں' میں بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔

''میں جانتا ہوں'' رن پوشی نے بامعنی انداز میں گردن ہلائی ''اور پچھلے کچھ عرصے سے دیکھ بھی رہا ہوں کہ تم نے ساحل کے حصول کی خاطر کس طرح اپنی جان کو جوکھم میں ڈال رکھا ہے۔ میں تمہارے ایک ایک لفظ کی سچائی کو مانتا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ تم پر اعتماد کرتے ہوئے میں نے تمہیں تبت کے داماد کا اعزاز عطا کیا ہے۔ وجدان! یہ کوئی معمولی بات نہیں ......!''

''جی میرے محترم! مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''ایک دلچسپ بات بتاؤں!'' وہ پُراسرار انداز میں ہم دونوں سے مستفسر ہوا۔

ہم کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگے۔

وہ بولا ''ساحل نے مذہب کی تبدیلی کے سلسلے میں اپنا فیصلہ تو ابھی سنایا ہے لیکن مجھے اس بات کا پہلے سے یقین تھا اس لیے میں نے اس حوالے سے بھی بندوبست کر رکھا ہے۔''

وہ ایک لمحے کو متوقف ہو کر ہمارے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ جب ہم نے اس سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا تو اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

''میں نے تم دونوں کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی ایک مسلمان عالمِ دین کو لہاسا بلا لیا ہے۔ مذکورہ عالم کا نام عبد الکریم ہے۔ وہ کینٹن سے یہاں آیا ہے۔ ساحل اس کے ہاتھوں نہ صرف اسلام قبول کرے گی بلکہ وہی تم دونوں کو رشتۂ ازدواج میں بھی منسلک کرے گا۔ عبد الکریم تمہارا نکاح خواں بھی ہو گا۔'' وہ ایک لمحے کے توقف سے اضافہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''میں تم دونوں کی خوشی کی خاطر جتنا بڑا قدم اٹھا رہا ہوں اس کے لیے مجھے بعض لوگوں کی مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے لیکن میری قوم مجھ پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں' میرا ہر فیصلہ' چاہے کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، وہ بدھ ازم کے فائدے کے لیے ہوتا ہے۔ میں آج سے کئی سال بعد کے بارے میں سوچتا ہوں۔ تم دونوں کا نکاح اسی دو منزلہ عمارت میں ہو گا۔ شادی کے بعد جہاں تمہیں قیام کرنا ہے۔ چمن سیان تمہیں اس عمارت کا وزٹ کرا چکا ہے۔ یہ سادہ سی تقریب چمن سیان کی زیرِ نگرانی ہو گی۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا بے ساختہ میری زبان سے پھسل گیا ''میرے محترم! کیا آپ ہماری شادی کی

تقریب اٹینڈ نہیں کریں گے؟''

ایک حوالے سے میں مسلسل تشویش میں مبتلا تھا۔ چنگ فو نے پہلی ملاقات ہی میں مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ ہمارے درمیان صرف تین ملاقاتیں ہونی ہیں اور آج تیسری ملاقات ہو رہی تھی۔ میری چھٹی حس بار بار مجھے خبردار کر رہی تھی کہ میں چنگ فو رن پوشی کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ اسی تحریک کے سبب میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے یہ سوال پوچھ لیا تھا۔

چنگ فو نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ایک طرح کا فرار تھا جو میری تشویش کو مہمیز کر رہا تھا۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو چنگ فو ہم سے چھپانا چاہ رہا تھا۔ میں اپنے سوال کا جواب آنے کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ بہ دستور آنکھیں بند رکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا۔

''میں نے تم لوگوں کی شادی کے لیے چار روز بعد کی تاریخ یعنی انیس مئی مقرر کی ہے۔ اس دوران میں تم دونوں مل کر اپنے گھر کو سنوارنے سجانے کا کام کرو۔ میں نے اس سلسلے میں چمن سیان کو خصوصی ہدایات دے دی ہیں۔ وہ تم لوگوں کی بھرپور مدد کرے گا۔ نکاح کے بعد مولانا عبد الکریم واپس کینٹن چلا جائے گا۔''

کینٹن (CANTON) کا نام کسی زمانے میں ''گوانگ چو'' ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک مشہور و معروف اور قدیم شہر ہے۔ گوانگ چو (GUANG ZHOU) کو چین کے جنوبی صوبے گوانگ دانگ (GUANG DONG) کا صدر مقام ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ صوبہ گوانگ دانگ کا شہر گوانگ چو یعنی کینٹن ہانگ کانگ سے متصل ہے۔

ہانگ کانگ سے کینٹن تک جانے کے لیے بڑی آسانی سے ویزا مل جاتا ہے۔ ہانگ کانگ کے معروف شہر کولون کے ریلوے اسٹیشن سے روزانہ چار ٹائمز (ٹرینیں) کینٹن کے لیے روانہ ہوتی ہیں جو محض تین گھنٹے کے سفر کے بعد کولون ریلوے اسٹیشن سے کینٹن ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دیتی ہیں۔ چین میں داخل ہونے کا یہ سب سے معروف اور آسان زمینی راستہ ہے۔ کینٹن کے بارے میں یہ ساری تفصیل بتانے کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابی وقاصؓ کا روضۂ مبارک اسی شہر میں واقع ہے۔ آپ کو کبھی ہانگ کانگ جانے کا موقع ملے تو صحابیِ رسول کے روضۂ مبارک کی زیارت کا شرف ضرور حاصل کریں۔

میں انہی خیالات میں گم تھا کہ چنگ فو کی ٹھہری ہوئی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں اور براہِ راست میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''وجدان! تم شادی کے بعد مستقل رہائش کہاں اختیار کرنا چاہو گے؟''

یہ سوال سن کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تبت میں میرے لیے ایسا سیٹ اپ بنایا جا رہا تھا کہ جیسے اب مجھے یہیں کا ہو کر رہنا ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چنگ فو نے جس دو منزلہ عمارت کو سنوارنے سجانے کی بات کی تھی۔ میں چمن سیان کی راہنمائی میں اسے دیکھ چکا تھا۔ نور بلنگ کا پیلس یعنی سمر پیلس کے قریب اور دریائے کائے چو کے کنارے واقع اس دو منزلہ عمارت کے بارے میں بتاتے ہوئے چمن سیان نے کہا تھا کہ وہ میرے لیے مخصوص کر دی گئی ہے۔ اس عمارت کی بالائی منزل میری رہائش کے لیے مختص تھی جب کہ زیریں پر مجھے مختلف باطنی اور ظاہرہ علوم فنون کی تعلیم دینا تھی۔ ایک طرح سے یہ زیریں منزل ایک تربیت گاہ ہوتی جہاں میں داخلی اور خارجی قوتوں کی بیداری کے لیے وہاں آنے والے طالب علموں کی راہ نمائی کرتا۔ اس سلسلے میں چمن سیان نے بڑے اعتماد سے کہا تھا ......وجدان! اپنے مشن سے کامیاب لوٹنے کے بعد جب تم اس تربیت گاہ کا انتظام سنبھالو گے تو تمہیں اپنے کام کا آغاز صرف ایک اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے کرنا ہو گا۔ پھر اس نے مجھے مذکورہ اسٹوڈنٹ سے ملوا بھی دیا تھا۔ چار سالہ سانگ فو کو وہاں دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ امریکی ریاست واشنگٹن کے شہر سیٹل میں' ڈاکٹر مونگ ریفو شے کے بڑے' محترم سانگ فو نے اپنے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی، وہ یہاں پوری ہو گئی تھی۔ میں آواگون کے نظریے پر تو یقین نہیں رکھتا لیکن سانگ فو کی پیش گوئی کے نتیجے نے مجھے حد درجہ حیرت زدہ ضرور کر دیا تھا۔

مجھے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر چنگ فو نے کہا ''وجدان! تم اپنے ذہن پر زیادہ زور نہ دو۔ میں جانتا ہوں' تم ہوا کے مانند ہو۔ کسی ایک جگہ رک سکتے ہو اور نہ ہی تمہیں کہیں باندھ کر رکھا جا سکتا ہے۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہیں مستقل طور پر تبت میں سیٹل ہونے کے لیے کہوں گا۔ یہ میری خواہش ہے کہ تم یہاں رہ کر اعلیٰ خدمات انجام دیتے رہو لیکن مجھے اس بات کا بھی ادراک ہے کہ میری یہ خواہش پوری نہیں ہو سکے گی۔ بہت سی باتیں ناممکن ہوتی ہیں لیکن

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سلسلے میں کوشش کو ترک کر کے' ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ یہ ایسا ہی ہوگا کہ اگر ہمیں کسی مریض کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی زندگی میں چند دن باقی بچے ہیں تو ہم اس کے علاج سے ہاتھ کھینچ لیں۔ یہ کسی بھی طور انسانی اور اخلاقی رویہ نہیں ہوگا'' وہ لمحے بھر کر سانس لینے کی خاطر متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے تمہیں مستقل طور پر تبت میں روکنے کا مکمل بندوبست کر دیا ہے، گویا میرے اختیار میں جو کچھ تھا' وہ فرض میں نے نبھا دیا۔ باقی سب کچھ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ فیصلے کا حق بہرحال تم ہی کو ہے۔''

میں نے نہایت ہی مضبوط لہجے میں کہہ دیا'' میں شادی کے بعد مستقل طور پر اپنے وطن پاکستان میں سیٹل ہونے کا ارادہ رکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے' میں تمہیں اس سے روکوں گا نہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا لیکن تمہیں میری ایک بات ماننا ہوگی۔ یہ میں تمہاری بھلائی اور فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔''

''کون سی بات میرے محترم؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولا'' میں چاہتا ہوں' شادی کے بعد تم پورے نوے دن تک یہاں ضرور قیام کرو۔ مجھے امید ہے، تین ماہ کی یہ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی تمہارا یہاں دل لگ جائے گا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر تم دنیا کے کسی بھی خطے میں جا کر بودوباش اختیار کرنے کے لیے آزاد ہو گے!''

''ٹھیک ہے میرے محترم!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا'' میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں، آپ نے نوے دن ہی کی شرط کیوں عائد کی ہے؟''

''یہ ایک ایسی مدت ہے جس میں تمہارے اوپر ایک نہایت ہی خاص کام کیا جائے گا۔ میں نے اس سلسلے میں چن سیان کو بڑی وضاحت سے سمجھا دیا ہے۔''

وہ ''کل'' کی ہر بات کو اس انداز میں بیان کر رہا تھا کہ جیسے ''آج'' اس کی زندگی کا آخری دن ہو۔ میں کوئی سوال کیے بغیر خاموش نظر سے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا اور مجھ سے استفسار کیا۔

''وجدان! اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''کم و بیش تیئس سال!'' میں نے جواب دیا۔

''اور ساحل کی کتنی عمر ہے؟'' اس نے اپنے سوال کو تھوڑا دراز کیا۔

میں نے بتایا'' ساحل مجھ سے دو سال چھوٹی ہے۔ جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تو اس وقت یہ اٹھارہ اور میں بیس سال کا تھا اور اس بات کو اب لگ بھگ تین سال گزر چکے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے' ساحل کی عمر اس وقت اکیس سال ہے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولا پھر براہِ راست ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''بیٹی! تم اب جا کر آرام کرو۔ میں وجدان سے کچھ دوسری باتیں کروں گا۔''

ساحل کوئی تامل ظاہر کیے بغیر خاموشی سے اٹھی اور چنگ فو کو تنظیم دیتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا' دروازے کے باہر چن سیان پوری طرح مستعد ہوگا۔ وہ ساحل کو اس کمرے میں پہنچا دے گا جہاں ہم نے گزشتہ رات گزاری تھی۔ میں یہ بھی محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ چنگ فو نے کسی خاص مقصد کی خاطر ساحل کو رخصت کیا تھا۔ یقیناً اب وہ مجھ سے کوئی ایسی بات کرنے والا تھا جو ساحل کی موجودگی میں کرنا وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ نہایت ہی مستحکم اور تاثیر انگیز لہجے میں بولا'' وجدان! بعض انتہائی نازک مواقع پر تمہیں اپنی ایک محرومی کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ تم سوچتے ہو' تھرڈ آئی کی طرح تمہارا تھرڈ ایر بیدار کیوں نہیں! تم تیسری آنکھ کے توسط سے جس ماحول میں پہنچتے ہو' وہاں کی آوازیں تمہیں سنائی نہیں دیتیں کیونکہ تمہارا تیسرا کان کام نہیں کرتا۔ سیٹل میں سانگ فو نے تمہیں بتایا تھا کہ باطنی کان کی صلاحیت تمہیں حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی تمہیں اس سلسلے میں کسی قسم کی عملی کوشش کرنا چاہیے ورنہ کوئی فائدہ حاصل کرنے کے بجائے الٹا نقصان اٹھا لو گے۔ میں بھی سانگ فو کے خیال سے صدفی صد متفق ہوں۔ ہر شے' ہر شخص کے لیے نہیں ہوتی لیکن میں نے تمہاری اس محرومی کو ایڈجسٹ کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں اضطراری نظر سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ پتا نہیں' وہ کون سے پُراسرار منصوبے کا انکشاف کرنے والا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ

اسی ''انکشاف'' کی وجہ سے اس نے ساحل کو وہاں سے ہٹایا تھا۔

وہ لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا'' وجدان! میں نے اپنی طرف سے تمہیں شادی کا ایک ان مول تحفہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے' یہ تحفہ تمہیں بے حد پسند آئے گا اور زندگی کی آخری سانس تک تمہارے ساتھ بھی رہے گا۔''

شادی کا تحفہ تو شادی کے موقع پر دیا جاتا ہے اور وہ ابھی دینے کا ارادہ ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی اس بات کے ڈانڈے بھی وہیں جا کر ملتے تھے کہ جوکھانگ ٹیمپل کے چیف لاما چنگ فورن پوشی کو میں آج آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔ میری شادی کے وقت وہ ہم میں موجود نہیں ہوگا اسی لیے تحفے والے معاملے کو قبل از وقت نمٹانے کی کوشش میں ہے۔

''اس تحفے کا نام ہے...... اسٹل ینگ!'' چنگ فو کی گمبھیر آواز میری سماعت سے ٹکرائی'' تبت میں نوے دن کے قیام کے دوران میں تمہیں مخصوص اور نایاب جڑی بوٹیوں کا عرق پلایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ چن سیان تمہیں یوگا کی ایک خاص الخاص مشق بھی باقاعدگی کے ساتھ کرائے گا۔ میں نے نوے دن کے اس کورس کی تفصیلات سے چن سیان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا ہے۔ یہ کورس تم اسی کی نگرانی اور راہنمائی میں کرو گے جس کے نتیجے میں تم اسٹل ینگ (STILL YOUNG) کا ٹائٹل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے، اس وقت تمہاری عمر تیئس سال ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا۔ اسٹاپ یور ایج کے اس پراسس میں تمہاری عمر آگے نہیں بڑھے گی۔ یہ تو ایک قدرتی عمل ہے' اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ تمہاری عمر کا ہندسہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا جائے گا مگر اسٹل ینگ کی رو سے تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک بالکل ایسے ہی رہو گے جیسے اس وقت نظر آ رہے ہو۔ تمہاری توانائیوں میں کبھی کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ آگے کی طرف بڑھتا ہوا عمر کا ہندسہ تمہاری جسمانی' ذہنی، جنسی اور روحانی صحت پر اثر انداز نہیں ہوگا!''

چنگ فو خاموش ہوا تو میں نے اپنے وجود کو ایک سنسنی خیز لپیٹ میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔ واقعی' چنگ فو کی طرف سے میرے لیے یہ ایک بے مثال اور انمول تحفہ ہوتا۔ ہر شخص ہمیشہ جوان اور صحت مند رہنا چاہتا ہے لیکن شاید ہی کسی کی یہ خواہش پوری ہوتی ہوگی۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ چن سیان کے دل میں اتر کر میں ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں ضرور معلوم کر لوں گا جن کا عرق وہ آئندہ تین ماہ تک مجھے پلانے والا تھا۔ باقی اس سلسلے میں' میں یوگا کی جو مشقیں کرنے والا تھا' وہ تو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ جاتیں۔ میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ 'اسٹل ینگ' کی ٹیکنالوجی ضرور حاصل کر کے رہوں گا۔

چنگ فو نے اچانک موضوع بدل دیا اور مجھ سے پوچھنے لگا'' وجدان! کیا لی یان سے بھی تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ بیٹھے بٹھائے اسے لی یان کا خیال کیوں آ گیا تھا۔ میں نے آج صبح چن سیان کی صورت دیکھتے ہی اس سے لی یان کے بارے میں استفسار کیا تھا اور اس نے میری توقع کے خلاف انتہائی روکھے پھیکے لہجے میں بتایا تھا کہ لی یان ٹھیک ہے اور مجھے اس کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں!

میں نے چنگ فو کے سوال کے جواب میں کہا'' میں نے ابھی تک لی یان کی شکل نہیں دیکھی۔ چن سیان نے بتایا ہے کہ وہ خیریت سے ہے۔''

''تم نے بالکل متعلقہ آدمی سے لی یان کے بارے میں

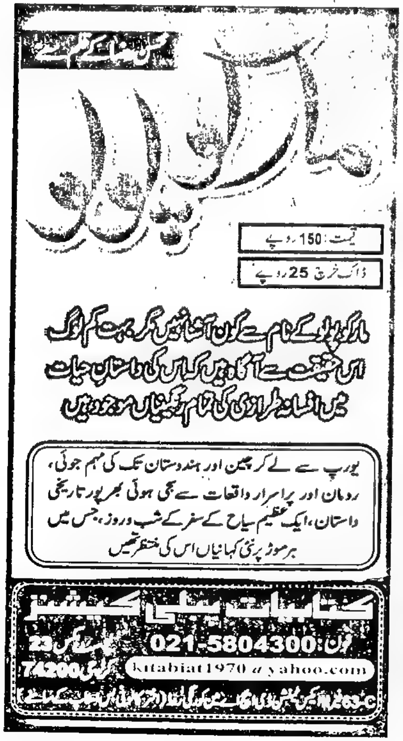

دریافت کیا ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا'' آئندہ بھی جب بھی تمہیں اس کے بارے میں کچھ جاننا ہو یا اس سے ملنا ہو تو تم چن سیان ہی سے رابطہ کرنا۔''

چنگ فو کی بات سن کر میں الجھ گیا۔ اس کا انداز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ پتا نہیں' وہ لی یان کے حوالے سے اس رویے کا مظاہرہ کیوں کر رہا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''محترم! لی یان کا چن سیان سے کیا تعلق ہے؟''

''بہت ہی گہرا تعلق ہے!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ ذرا وضاحت کر دیں میرے محترم!'' میں نے کہا۔

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا'' لی یان اب چن سیان کی بیوی ہے۔''

''کیا؟'' میں ایسے اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔

وہ ایک ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز بات کر رہا تھا۔ بیس بائیس دن پہلے میں لی یان کو یہاں چھوڑ کر لندن روانہ ہوا تھا۔ وہ ائرپورٹ پر مجھے چھوڑنے گئی تھی۔ رخصت کے لمحات میں وہ بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک یادگار معانقہ بھی کیا تھا۔ میں اب تک اس کے وجود کا ریشمیں لمس اپنے بدن پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ جانے کی خواہش مند تھی۔ اس کا کہنا تھا' میرے بنا یہاں اس کا جی نہیں لگے گا ...... پھر ...... پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔ لی یان کا جی تو جو کھاتمنگ ٹیمپل ہی میں نہیں لگ رہا تھا پھر چن سیان میں کس طرح لگ گیا۔ اس نے کیسے چن سیان سے شادی کر لی۔ میرے لیے یہ ایک انتہائی ناممکن بات تھی، میرا ذہن اسے کسی بھی طور قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ صبح لی یان کے ذکر پر چن سیان کا چہرہ کیوں متغیر ہوا تھا۔ اس نے میری زبان سے لی یان کا نام سنتے ہی زیرِ لب مسکراہٹ کو ترک کر کے اچانک گہری اور گمبھیر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

چنگ فو کے علاوہ اگر اور کوئی مجھے لی یان کی شادی کی خبر سناتا تو میں اس کی بات پر ہرگز ہرگز یقین نہ کرتا۔ ایک تو لی یان کی مجھ سے جذباتی وابستگی اس پر چن سیان کی عمر' ان حقائق کی روشنی میں اس بے جوڑ جوڑے کی شادی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ چن سیان اس وقت پینسٹھ کے پیٹے میں تھا اگرچہ صحت اور شکل صورت سے وہ کہیں سے بھی چالیس سے زیادہ کا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا' اس نے بھی 'اسٹل ینگ'' والا فارمولا آزما رکھا تھا یا نہیں؟

مجھے خیالات میں ڈوبا دیکھ کر چنگ فو نے استفسار کیا'' وجدان! کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا؟''

''آپ کی جگہ اگر یہ بات کسی اور شخص نے مجھ سے کہی ہوتی تو میں یقین کرنے کو تیار نہ ہوتا میرے محترم!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا'' لیکن میں آپ کی بات کو جھٹلا نہیں سکتا۔ آپ کہہ رہے ہیں تو یقیناً لی یان' چن سیان کی بیوی بن گئی ہوگی لیکن اگر آپ میرے ایک سوال کا جواب دینا پسند فرمائیں تو بہت سے معاملات پر میری تشفی ہو جائے گی!''

''ہاں' ہاں ...... پوچھو'' وہ شفقت بھرے لہجے میں بولا'' تمہارے ذہن میں جو بھی الجھن ہے اسے بیان کرو میں تمہاری تسلی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا'' کیا یہ شادی لی یان کی مرضی سے ہوئی ہے؟''

''کیا تمہاری شادی ساحل کی رضا مندی کے بغیر ہونے جا رہی ہے؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے مجھ سے استفسار کر لیا تو ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا کر رہ گیا لیکن اگلے ہی لمحے سنبھلتے ہوئے کہا'' میری اور ساحل کی بات تو بالکل مختلف ہے۔ ہم ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے کو......''

''یہ میرے سوال کا جواب نہیں'' وہ انتہائی نرمی سے قطع کلامی کرتے ہوئے بولا'' میں نے تم سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ آیا' ساحل کی خواہش جانے بغیر اس کی شادی تم سے کی جا رہی ہے؟''

''نہیں ......'' میں نے قطعیت سے کہا'' اس شادی میں ساحل کی مرضی اور رضامندی پوری طرح شامل ہے۔''

''بس' تو پھر جان لو کہ اس شادی کے لیے لی یان پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا'' تبت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں شادی لڑکی کی رضامندی حاصل کیے بغیر کی ہی نہیں جا سکتی۔ تمہاری سابق ساتھی لی یان نے بہ رضا و رغبت چن سیان سے شادی کی ہے اور اب ...... اس کا نام ''یان سیان'' ہے''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا'' تو اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا!''

''صرف نام ہی نہیں' بلکہ مذہب بھی'' چنگ فو نے ایک اور انکشاف کیا'' اب وہ بدھ مت میں داخل ہو چکی ہے جیسے

چند روز بعد ساحل تمہارا مذہب اختیار کرنے والی ہے!''

لی یان کرسچین تھی۔ میں نیوجرسی سے کھٹمنڈو تک اور پھر کھٹمنڈو سے لہاسا تک اسے مختلف زاویوں سے پڑھتا آیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا' عیسائیت کی طرف اس کا زیادہ رجحان نہیں تھا۔ اب اگر اس نے بدھ مت اختیار کر کے چن سیان سے شادی کر لی تھی تو یہ معما فوری طور پر میری سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔ بہر حال' ایک بات بالکل واضح نظر آ رہی تھی اور وہ یہ کہ اگر بدھ مت سے ایک فرد ساحل خارج ہونے والا تھا تو اس خروج سے پہلے ہی چنگ فو نے اس مذہب میں ایک فرد (لی یان) کو داخل بھی کر لیا تھا۔ یہ بڑی نپی تلی ڈیل تھی اور چنگ فو سے اس پر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ چنگ فو نے آمد و شد کے پلڑوں کو برابر کر کے اپنی قوم کا دل خوش کر دیا تھا۔

ان لمحات میں' پتا نہیں کیوں' بڑی شدت سے لی یان کو دیکھنے کے لیے دل مچل گیا۔ مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور وہ لی یان سے یان سیان بن گئی۔ میں نے اسے شان کی بیوی کی حیثیت سے دیکھا تھا پھر اس کی بیوگی کا جو عرصہ میری دوستی میں گزرا' میں اس کے ایک ایک ناقابلِ فراموش لمحے کو محسوس کر سکتا تھا۔ اب مجھے دیکھنا تھا' وہ چن سیان کی بیوی بن کر کیسی نظر آتی ہے؟

بے ساختہ میں نے چنگ فو سے پوچھا'' کیا لی یان ...... میرا مطلب ہے یان سیان میری شادی کی تقریب میں شرکت کرے گی؟''

''ضرور!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا'' چن سیان تو تمہاری شادی کا منتظمِ اعلیٰ ہوگا۔ اس کی بیوی یان سیان بھی ان انتظامات میں پوری طرح اپنے شوہر کا ہاتھ بٹائے گی۔ کئی مرتبہ تمہارا اس سے سامنا ہوگا' بات چیت بھی ہوگی اور ممکن ہے تنہائی میں ملنے کا بھی موقع مل جائے چنانچہ تم میری ایک نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھنا'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''جب بھی یان سیان سے تمہارا رابطہ ہو' ماضی میں جھانکنے اور گزرے دنوں کو یاد کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ تمہاری کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ چن سیان کی بیوی ہے ...... اور میرے بعد' چن سیان جوکھاتمنگ ٹیمپل کا سب سے زیادہ اہم شخص ہے۔ جو راز ہم تینوں کے درمیان ہے اسے کسی چوتھے تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ چیزیں جیسی نظر آتی ہیں، حقیقت میں ویسی نہیں ہوتیں۔ اگر ہم اشیا کی حقیقت تک پہنچ جائیں تو ہماری ذمے داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک طرح سے ہماری زبان پر قفل لگ جاتا ہے۔ اگر ہم کسی حماقت میں اس قفل کو توڑ ڈالیں تو پھر تباہی اور بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا وجدان؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں میرے محترم! میں نے عقیدت بھرے لہجے میں کہا'' انشاء اللہ'' آپ کو کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے احترام میں مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ وہ میری جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا'' مجھے تم سے یہی امید ہے میرے بچے۔ لارڈ بدھا تمہاری حفاظت کرے!''

وہ ان دعائیہ کلمات کے بعد میرے بالکل قریب آ گیا۔ اتنا قریب کہ ہمارے درمیان تین چار انچ سے زیادہ فاصلہ نہ رہا۔ اس نے بڑی شفقت سے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرے چہرے کو تھام لیا پھر میری پیشانی پر ایک بھرپور بوسہ ثبت کر دیا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی بوسہ نہ ہو' بلکہ توانائی کا بہتا ہوا دریا ہو۔ میں نے پیشانی کے راستے اپنے پورے وجود میں رنگ اور روشنی کے ایک سیلِ آب کو رواں دواں پایا۔ یہ کیفیت چند لمحات تک برقرار رہی پھر سب کچھ نارمل ہو گیا۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دقت پیش نہ آئی کہ چنگ فو نے کوئی نادیدہ خزانہ میرے سسٹم میں ڈاؤن لوڈ کر دیا

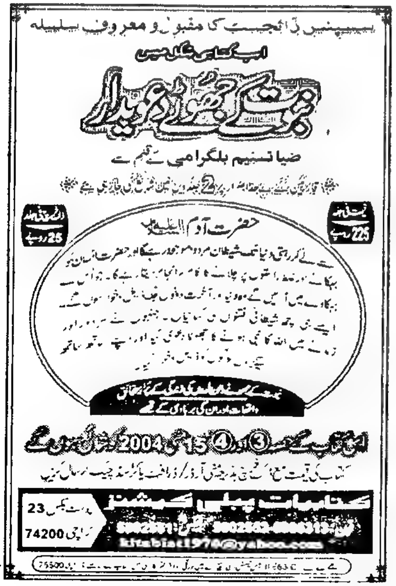

تھا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے الوداعی انداز میں مسکرایا اور بولا" میں اب جاؤں گا!"

میں نے اس سے ایک بھرپور مصافحہ کیا اور اس مصافحے کے اختتام پر میں نے پورے خلوص کے ساتھ اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔

چنگ فو نے میرا کندھا تھپتھپا کر تسلی دی پھر اس کمرے سے رخصت ہوگیا۔

یہ چنگ فورن پوشی سے میری تیسری ملاقات تھی۔

☆☆☆

سولہ مئی کی صبح بڑی اداس اور دل گرفتہ تھی!

چنگ فورن پوشی کی پیش گوئی پوری ہوگئی۔ اس نے پہلی ملاقات کے وقت مجھ سے کہا تھا کہ ہماری صرف تین ملاقاتیں ہیں۔ گزشتہ روز ہم نے تیسری ملاقات کرلی تھی اور...... یہ تیسری ملاقات بالآخر آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ کل والی اس تیسری ملاقات میں چنگ فو نے آخری جملہ یہ بولا تھا...... میں اب جاؤں گا!

اور وہ چلا گیا...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

اگلی صبح دستک کی تیز آواز سے ہماری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے بستر چھوڑا اور جلدی سے جا کر دروازہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے دروازے میں جوکھا تنگ ٹیمپل کے ایک سینئر مونک پر نگاہ پڑی۔ میں نے اس لاما کو چمن سیان کے بہت قریب دیکھا تھا۔ ایک طرح سے وہ چمن سیان کے نائب کی حیثیت رکھتا یعنی چمن سیان چنگ فو کا نائب تھا۔ اس سینئر مونک کا نام یولیان تھا۔

یولیان کا چہرہ سنجیدگی کے گہرے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے تشویش بھری سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے گمبھیر لہجے میں چنگ فو کے انتقال کی اطلاع دی اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کردی کہ ہم جلدی سے تیار ہوکر ٹیمپل کے مرکزی حصے میں پہنچ جائیں۔

میں نے یولیان سے پوچھا" چمن سیان کہاں ہے؟"

"وہ بہت مصروف ہیں۔" یولیان نے گہری سنجیدگی سے بولا" انہوں نے ہی مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے" پھر وہ مزید کوئی بات کیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

میری طرح ساحل بھی دستک کی تیز آواز پر بیدار ہوگئی تھی تاہم یولیان کی" اطلاع" اس تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ میں دروازے سے واپس پلٹا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

" کیا ہوا وجدان...... کون آیا تھا؟"

میں نے نہایت ہی تھکے ہوئے لہجے میں اسے بتایا" جو کھا تنگ ٹیمپل کی آبرو چنگ فورن پوشی رخصت ہوگیا!"

میرے الفاظ میں ایسی یاسیت اور افسردگی تھی کہ بات کی تہ تک پہنچنے میں اسے ذرا بھی مشکل پیش نہ آئی۔ اس کا چہرہ غم اور افسوس کی آماج گاہ بن گیا۔ ہم دونوں ہی، چنگ فو کی موت کی خبر سن کر دکھی اور ملول ہوگئے تھے۔ چنگ فو ہمارے لیے بہت کچھ تھا۔ ہم دونوں یتیم و یسیر تھے۔ ہم دونوں کی کہانی میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، خاص طور پر والدین سے محروم ہونے والے واقعات تو ایک دوسرے سے بہت ہی ملتے جلتے تھے۔ میرے والد محترم عابد علی اور والدہ ماجدہ شگفتہ کو سفاک قاتلوں نے جس طرح میری نگاہ کے سامنے موت کے گھاٹ اتارا تھا بالکل اسی طرح ساحل کی ماں بھیر جانی اور باپ تھونچی کو بھی بدھ نیل کنڈ والی عبادت گاہ میں درندہ صفت بھیڑیوں نے بے دردی سے ہلاک کر ڈالا تھا اور چنگ فو...... نے تو ہم دونوں ہی کو اپنے سایے میں لے لیا تھا۔ اس کی شفقت ہم دونوں پر نچھاور تھی۔ ہمیں ملانے اور ساری زندگی کے لیے ایک کرنے کے سلسلے میں اس شخص نے نہایت ہی اہم کردار ادا کیا تھا۔ مجھے تسلیم ہے...... اور یہ اقرار کرنے میں' میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ اگر چنگ فو کی خصوصی نظر مجھ پر مرکوز نہ ہوتی تو شاید میں اپنی منزل تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اسی کی کوشش نے ہم' عرصے سے بچھڑے ہوؤں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ ہمارا ملاپ صرف اور صرف اسی کا کارنامہ تھا اور اس سلسلے میں چنگ فورن پوشی نے ایک سچے اور ذمے دار سرپرست کا کردار ادا کیا تھا۔

زندگی اور موت کا کھیل بھی بڑا ہی عجیب اور نرالا ہے۔ زندگی موت کی امانت ہے اور موت اس امانت کو وصول کرنے کے لیے ہر لمحہ زندگی کے تعاقب میں رہتی ہے اور جیسے ہی وہ اسے دبوچنے میں کامیاب ہوجاتی ہے' زندگی کی حقیقتیں بدل کر رہ جاتی ہیں۔ الفاظ اپنے معنی اور انداز اپنے مفہوم تبدیل کرلیتے ہیں۔ چنگ فو نے اپنی زندگی میں ساحل کو بیٹی اور مجھے داماد بنا کر ہمارے دل خوشی اور شادمانی سے معمور کر دیے تھے لیکن اس کی زندگی کے خاتمے نے یہی دل بجھا دیے تھے۔ ہم دکھی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے سخت غم زدہ اور رنجور تھے۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے جوکھا تنگ ٹیمپل کا چیف لاما نہ چل بسا ہو' ہمارے سر سے سایہ اٹھ گیا ہو۔ ہم اسی لمحے یتیم ہوگئے ہوں!

وہ پورا دن ایک مخصوص افسردگی اور درماندگی میں

گزرا۔ کچھ کھانے پینے کو جی چاہا اور نہ ہی کسی اور بات میں دل لگا۔ رات گئے ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ جوکھا تنگ ٹیمپل کی ماتمی فضا نے ہمارے دلوں کو دن بھر اپنی گرفت میں جکڑے رکھا تھا۔ چنگ فو کے وصال پر ہر دل مغموم اور ہر آنکھ اشک بار تھی۔ انسان کی زندگی میں اس کا جو بھی مرتبہ اور درجہ ہوتا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے لیکن موت کے بعد اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مفید اور کارآمد انسانوں کی کمی ہمیشہ یاد آتی ہے اور ان کی یاد خون کے آنسو رونے پر مجبور کردیتی ہے۔ کامیاب انسان وہی ہے جس کی کمی کا خلا کبھی بھر نہ سکے۔ چنگ فو بھی ایک ایسا ہی عظیم انسان تھا۔

اس رات ہم ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکے۔ ساری رات چنگ فو کا ذکرِ خیر ہوتا رہا اور رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

اس ایک کمرے میں ہم دونوں کا قیام بھی چنگ فو کی خصوصی ہدایت کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک طرح کا بے پناہ اعتماد تھا جو وہ ہم دونوں پر کرتا تھا۔ شادی سے پہلے عموماً لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے سے دور کردیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں تو ان پر کڑی نگرانی بٹھائی جاتی ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنے اور بات کرنے تک کی اجازت نہیں ہوتی لیکن چنگ فو نے اس کے برعکس احکام صادر کیے تھے۔ وہ جدا کرنے والوں میں سے نہیں' بلکہ ملانے والوں میں سے تھا' ہم اس آزادی کا غلط استعمال نہیں کریں گے۔ ہماری ذات پر چنگ فو کا یہ اندھا اعتماد ہمارے لیے کسی گولڈ میڈل سے کم نہیں تھا۔

اسی دوران میں ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے ہجر و فراق میں بیتے ہوئے ایک ایک روز و شب کی تفصیل ایک دوسرے کو سنا ڈالی۔ جب پرانے قصے نمٹ گئے تو ساحل نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

" وجدان! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی!"

"کون سی بات؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"محترم چنگ فو نے اس روز مجھے رخصت کرنے کے بعد تم سے کافی دیر تک باتیں کی تھیں۔" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی" یقیناً وہ کوئی خاص باتیں ہی ہوں گی۔ اس بارے میں تم مجھے کچھ بتاؤ گے۔"

میں اس سوال کی توقع اس لمحے سے کرنے لگا تھا جب اس میٹنگ کے دوران میں چنگ فو نے ساحل کو مخاطب کرتے ہوئے براہِ راست کہا تھا...... بیٹی! تم اب جا کر آرام کرو۔ میں وجدان سے کچھ دوسری باتیں کروں گا۔ ساحل کے جانے کے بعد چنگ نے مجھ سے صرف دو اہم موضوعات پر گفتگو کی تھی یعنی لی یان کی چمن سیان سے شادی اور وہ تحفہ جو وہ مجھے دینا چاہتا تھا۔ سدا بہار جوانی کا فارمولا! میں "اسٹل ینگ" کے سلسلے میں ساحل کو فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ اس انمول تحفے کی "وصولیابی" میں ابھی پورے نوے دن باقی تھے البتہ' لی یان کی شادی کے بارے میں تفصیل بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس سے پہلے بھی ساحل لی یان کے حوالے سے کرید کرید کر مجھ سے بہت کچھ پوچھ چکی تھی۔ صرف ایک لی یان پر ہی کیا موقوف! ساحل سے بچھڑنے کے بعد اب تک جن جن لڑکیوں کی میری زندگی میں آمد و شد رہی تھی' وہ خالص بیویوں والے انداز میں ان کے بارے میں تفتیشی سوالات کرتی رہی اور میں نے بھی انتہائی محفوظ انداز میں اسے بڑے تسلی بخش جوابات دیے تھے۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

"زیادہ تر باتیں چمن سیان اور لی یان کے بارے میں ہوئی تھیں۔ چنگ فو نے پوری تفصیل سے مجھے بتایا کہ لی یان نے کس طرح مذہب تبدیل کرکے چمن سیان کی بیوی بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ وغیرہ......"

"اس کے علاوہ؟" اس نے معنی خیز سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"اس کے علاوہ چنگ فو نے ایک سسر ہونے کی حیثیت سے مجھے بڑی کڑی تڑی دی ہے کہ میں تمہارا بہت خیال رکھوں۔ تم اس کی بہت ہی لاڈلی بیٹی ہو۔ تمہارے پاؤں میں کبھی ایک کانٹا تک نہیں چبھنا چاہیے ورنہ وہ......!"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ پوچھ بیٹھی" ورنہ کیا وجدان؟"

ساحل کے اس سوال میں ایک خاص نوعیت کی شرارت چھپی ہوئی تھی۔

میں نے گہری سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا" ورنہ...... ورنہ...... ورنہ کے بعد تو اس نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا!"

"اور اس "ورنہ" کے جواب میں تم نے کیا کہا تھا؟" وہ شوخی سے مستفسر ہوئی۔

"میں کیا کہہ سکتا تھا" میں نے سادگی سے کہا" ظاہر ہے' میں نے چنگ فو کو یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں زندگی بھر تمہارا بہت زیادہ خیال رکھوں گا۔"

"اس کا مطلب ہے اگر تم میرا خیال رکھو گے تو یہ چنگ فو سے کیے ہوئے عہد کی ایفائی ہوگی؟" وہ شریر انداز میں میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم بات کو خواہ مخواہ کھینچ کر شمال سے جنوب میں پہنچانے کی کوشش کر رہی ہو!" میں نے قدرے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا "چنگ فو نے ہماری زندگی میں اتنا بڑا کردار ادا کیا ہے کہ اس کے ذکر کے بغیر ہماری شادی کا تذکرہ پھیکا اور ادھورا ہوگا ورنہ میں نے تمہیں محترم سانگ فو اور ڈاکٹر مونگ ریفو شے کے بارے میں بھی تفصیلاً بتایا ہے۔ یہ دونوں حضرات بھی تمہارے سچے خیر خواہ تھے اور مجھ پر حسب توفیق انہوں نے زور بھی دیا تھا کہ میں کبھی کسی دکھ اور تکلیف کو تمہارے نزدیک سے بھی نہ گزرنے دوں' حتیٰ کہ سانگ فو نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔ میں دھنو (ساحل) کے سرپرست کی حیثیت سے اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں" میں لمحے بھر کے لیے سانس لینے کو رکا پھر اضافہ کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

"یہ تمام لوگ تمہارے کتنے ہی ہمدرد اور بہی خواہ کیوں نہ ہوں' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ تمہارا خیال کس طرح رکھا جا سکتا ہے' یہ مجھ سے زیادہ بہتر اور کوئی نہیں جانتا...... اور مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں! تم میری محبوب ذمے داری ہو......اور مجھے ذمے داری نبھانا آتا ہے!"

"بس......!" وہ جذبات سے مغلوب آواز میں بولی "میں تمہاری زبان سے صرف یہی سننا چاہتی تھی۔"

☆☆☆

چنگ فو نے آں جہانی ہونے سے پہلے آخری ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ ساحل کو شرف بہ اسلام کرنے کے لیے اس نے کینٹن سے مولانا عبدالکریم کو بلا لیا تھا لیکن ابھی تک ان مولانا صاحب سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہی حضرت ہمارے نکاح خواہ بھی ہوتے۔ میں نے جب اس سلسلے میں نئے چیف لاما آف جوکھانگ ٹیمپل' جمن سیان سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ عبدالکریم صاحب سے انیس مئی کی صبح کو ملاقات ہوگی۔ سورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے' علی الصباح وہ ساحل کو دین اسلام میں داخل کریں گے پھر جب سورج جلوہ نما ہو جائے گا تو وہ ہمیں رشتۂ ازدواج میں منسلک کرنے کا فریضہ انجام دیں گے۔ جمن سیان ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ مولانا عبدالکریم تیرہ مئی کی شام کینٹن سے لہاسا پہنچ گئے تھے۔

چنگ فو سولہ مئی کی صبح اس دار فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ صرف چوبیس گھنٹے تک اس کی جدائی کا سوگ باقاعدہ منایا گیا۔ اس کے بعد زندگی کے معاملات معمول پر آ گئے۔ تاہم مذہبی حوالے سے مختلف نوعیت کی روحانی تقریبات روایت کے مطابق جاری رہیں لیکن ان کے سبب زندگی کے دوسرے امور متاثر نہیں ہو رہے تھے۔

سترہ مئی دوپہر کے بعد جمن سیان نے مجھے ساحل کے ہمراہ اس دو منزلہ عمارت کی طرف روانہ کر دیا جہاں ہماری شادی ہونا قرار پائی تھی۔ وہ خود ہمارے ساتھ نہ جا سکا تاہم اپنے دو آدمیوں کو اس نے ہماری مدد کے لیے ساتھ کر دیا۔ مجھے اور ساحل کو مل کر اس گھر کی مناسب تزئین و آرائش کرنا تھی تاکہ وہ گھر' شادی کا گھر نظر آئے۔ یہ چنگ فو کا حکم تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہماری شادی انتہائی سادگی سے مگر طریقے سلیقے سے ہو۔

وہ دو منزلہ عمارت دریائے "کائے چو" کے کنارے واقع تھی اور نوربلنگکا پیلس سے اس کا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ نوربلنگکا کو عام طور پر "سمر پیلس" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ محل دلائی لاما کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہر دور کا دلائی لاما موسم گرما اسی محل میں گزارتا تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے سے یہ محل' یہ شہر اور یہ ملک (تبت) دلائی لاما کے وجود سے محروم ہو چکا تھا۔ انیس سو انسٹھ میں اس سلسلے میں چودھواں دلائی لاما بہ حالت مجبوری جلاوطنی اختیار کر چکا تھا۔ چین نے نہ صرف یہ کہ لشکر کشی کر کے تبت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی بلکہ اس کا نام تبدیل کر کے اس جنت نظیر خطۂ ارض کو اپنے ایک صوبے کی حیثیت بھی دے دی۔ آج کل تبت نامی دنیا کی یہ چھت چین کے صوبے "سی زانگ" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ انقلابات ہیں زمانے کے! انیس سو ساٹھ کی ثقافتی یلغار نے تو تبت کی شکل صورت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔

میں ساحل کو سانگ فو سینئر اور سانگ فو جونیئر کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتا چکا تھا۔ وہ میرے اس چار سالہ ننھے سے اکلوتے شاگرد سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ مجھے یہ بھی پتا چلا' ننھے سانگ فو کو شہ بالا بنانے کا منصوبہ بھی ترتیب پا چکا ہے۔ ہم شام تک اس دو منزلہ عمارت میں موجود مختلف امور انجام دیتے رہے پھر واپس جوکھانگ ٹیمپل آ گئے۔

آیندہ روز یعنی اٹھارہ مئی کا سارا دن بھی اسی گھر میں گزرا جس کی بالائی منزل کا ایک کمرا ہماری شب زفاف کے لیے سجا دیا گیا تھا۔ یہ بڑی منتوں اور مرادوں والی رات تھی جو چند گھنٹوں کے فاصلے پر کھڑی ہماری راہ دیکھ رہی تھی۔

اس روز شام کے وقت' وہاں سے رخصت ہونے سے تھوڑی دیر پہلے لی یان سے تنہائی میں دو باتیں کرنے کا مجھے موقع مل گیا۔ اس گھر کی آرائش و زیبائش میں اس کا بڑا ہاتھ تھا لیکن یہ ایک اتفاق ہی تھا یا پھر جمن سیان کی کوئی حکمت عملی کہ ابھی تک ہمارا سامنا نہیں ہو سکا تھا۔ میں نے ہر احتیاط اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس سے پوچھ لیا۔

"لی یان! یہ تم نے کیا حماقت کر ڈالی؟"

اس وقت ساحل ننھے سانگ فو کے ساتھ زیریں منزل پر تھی۔ لی یان (موجودہ یان سیان) نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"کون سی حماقت؟"

"تم نے ایک بڈھے کی بیوی بننا کیسے قبول کر لیا اور وہ بھی اپنا مذہب تبدیل کر کے۔" میں نے قدرے خفگی آمیز لہجے میں کہا "تمہارے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ تمہیں تو ایک سے ایک جوان مل سکتا تھا!"

وہ میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بڑی رسان سے بولی "جہاں تک مذہب کی تبدیلی کا معاملہ ہے تو میں اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ ساحل بھی تو تمہاری خاطر مسلمان ہو رہی ہے" وہ ایک لمحے کو رکی تو میں اس کے چہرے سے جھلکتے ہوئے اعتماد کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اور جہاں تک جوان رشتوں کی حصولیابی کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں تمہاری بات سے اتفاق کرتی ہوں لیکن...... وہ ایک سے ایک جوان" اس نے میرے کہے ہوئے الفاظ کو بڑے معنی خیز انداز میں دہرایا "مجھے لے کر بہت دور بھی جا سکتا تھا۔ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ میں شادی کے بعد بھی لہاسا ہی میں رہ سکوں گی۔ میں جس بھی جوان مرد سے شادی کرتی اس کی خواہش کا بھی احترام کرنا پڑتا۔ وہ اگر مجھے تبت سے کہیں باہر لے جانا چاہتا تو مجھے یہ دھرتی چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑتا اور میں...... یہاں سے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی!"

اس کی وضاحت میرے کچھ بھی پلے نہ پڑی تو میں نے اصراری لہجے میں پوچھا "کیوں...... لی یان! تم زندگی بھر تبت ہی میں کیوں رہنا چاہتی ہو؟"

"تمہاری خاطر!" اس نے چٹانی لہجے میں جواب دیا۔

میں بوکھلا کر رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا "میری خاطر؟"

"ہاں وجدان! میں نے تمہارے نزدیک رہنے کے لیے ایک بوڑھے مونک سے شادی کا فیصلہ کیا ہے اور مجھے اس فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ میں جانتی ہوں' ساحل سے شادی کے بعد تم میرے لیے پرائے ہو جاؤ گے جیسے جمن سیان سے شادی کے بعد میں تمہارے لیے پرائی ہو گئی ہوں لیکن......" وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دوبارہ قدرے سنبھلے ہوئے گویا ہوئی۔

"لیکن میں نے تمہاری معیت میں زندگی کے جو شب و روز گزارے ہیں انہیں خوشگوار یادوں کے خانے میں سے کس طرح ڈیلیٹ کر سکتی ہوں۔ میری یادداشت میں خوشیوں کے لیے جو خانہ مختص ہے اس میں صرف اور صرف ایک ہی خوشی تو رکھی ہے اور وہ بھی تمہاری یاد کی صورت میں۔ ٹھیک ہے' میں تمہیں حاصل نہیں کر سکوں گی لیکن گاہے بہ گاہے تمہیں دیکھ تو سکتی ہوں۔ تمہاری صورت دیکھ لینا ہی میرے قرار کے لیے کافی ہوگا۔ میں اپنے شوہر جمن سیان کی وفادار ہوں اور ہمیشہ وفادار رہوں گی۔ وہ میرے جسم و جان کا مالک ہے لیکن میری بے چین روح کی پیاس صرف تمہاری دید سے بجھے گی۔ میں مہینے دو مہینے میں بھی تمہاری شکل دیکھ لوں گی تو جی اٹھوں گی، میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہی ہوں وجدان۔ اپنے دیدار کا حق تو تم مجھے دے ہی سکتے ہو!"

وہ بولتے بولتے اچانک رک گئی پھر لمحاتی توقف کے بعد گمبھیر لہجے میں بولی "وجدان! تم بہت سی پُراسرار قوتوں کے مالک ہو۔ میں تمہارے علم کو تسلیم کرتی ہوں۔ ہر علم اپنی جگہ مسلم ہے لیکن افسوس کہ ایسا کوئی علم دیکھنے یا سننے میں نہیں جو عورت کے دل میں جھانکنے کا وسیلہ بن سکے...... تم کچھ نہیں جانتے وجدان...... کچھ نہیں!"

بات ختم کرتے ہی وہ جانے کے لیے مڑی لیکن میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ "ٹھہر جاؤ لی یان! تم نے اپنی تو کہہ لی' تھوڑی میری بھی سن لو۔"

وہ رک گئی تاہم اس نے پلٹ کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا "ٹھیک ہے' میں جب تک یہاں ہوں، تمہاری یہ معصوم اور پاکیزہ سی خواہش پوری کرنے کی ضرور کوشش کروں گا لیکن تین ماہ کے بعد تو میں پاکستان جا رہا ہوں' پھر تمہارا کیا ہوگا؟ تم نے تو بتایا ہے......"

"یہ تمہاری خوش فہمی ہوگی کہ تم کبھی یہاں سے جا سکو گے!" وہ میری طرف دیکھے بغیر قطع کلامی کرتے ہوئے بولی۔

میں الجھ کر رہ گیا" تم کیا کہنا چاہ رہی ہو لی یان؟"

اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا" وجدان! میں نے کہا ہے نا، تم کچھ نہیں جانتے۔ ان لوگوں نے تمہارے لیے بڑا مضبوط انتظام کیا ہے۔ ساحل کی صورت میں ایک ایسا کردار تمہاری زندگی میں داخل کیا ہے کہ تم راضی خوشی اپنی ساری زندگی اسی سرزمین پر گزارنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے۔ چن سیان سے شادی کر کے میں نے کوئی حماقت نہیں کی وجدان! تمہیں اب تبت ہی میں رہنا ہے!"

"یہ تو آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا......!" میں نے تذبذب کے عالم میں کہا" قبل از وقت اتنے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

وہ مزید کوئی بات کیے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

اس روز جب ہم واپس جوکھانگ ٹیمپل پہنچے تو ساحل کو مجھ سے الگ کر دیا گیا، چن سیان نے مجھے بتایا کہ اب نکاح کے وقت ہی اس کی صورت دیکھ سکوں گا۔ میں نے پوچھا کہ آیا ساحل کو میری نظر کے سامنے مسلمان کیا جائے گا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا اور بتایا کہ یہ دونوں معاملات یکے بعد دیگرے طے پائیں گے۔ علی الصباح، مولانا عبدالکریم ساحل کو دائرۂ اسلام میں داخل کریں گے اور سورج طلوع ہوتے ہی ہمارا نکاح کر دیا جائے گا۔

تبت میں شادیاں عموماً صبح کے وقت انجام پاتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ دوپہر تک شادی کا کھانا لنچ کی صورت مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور سورج غروب ہونے سے پہلے لڑکی کو رخصت کر دیا جاتا ہے۔ ہماری شادی اگرچہ دو مسلمانوں کی شادی تھی لیکن اوقات کار میں کوئی تبدیلی کرنے یا وہاں کی روایات کو توڑنے کی کوشش نہیں کی گئی اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔

وہ رات میں نے اس کمرے میں تنہا گزاری جہاں پچھلی دو تین راتوں سے ساحل کے ساتھ قیام پذیر تھا۔ وہ رات میری زندگی کی ایک عجیب و غریب رات تھی۔ میں متضاد احساسات کا شکار تھا۔ میں نے خود کو بہ یک وقت خوشی اور افسوس کی کیفیت میں پایا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ میں نے اپنی جانِ تمنا کو پالیا تھا۔ میری زندگی مکمل ہونے والی تھی۔ ساحل کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا تھا۔ جب تک وہ مجھ سے دور رہی' مجھے یہی لگتا رہا جیسے میرے وجود کا ایک اہم جزو کہیں کھو گیا ہو۔ میری شخصیت اس کے بغیر نامکمل تھی۔

افسوس اور دکھ اس بات کا تھا کہ خوشی کے اتنے بڑے موقع پر کوئی اپنا میرے پاس نہیں تھا۔ ان لمحات میں ایک ایک تعلق دار مجھے ٹوٹ ٹوٹ کر یاد آیا۔ وہ بھی جو اس دنیا میں زندہ تھے اور وہ بھی جو اب کسی اور دنیا میں زندہ تھے۔ گزر جانے والوں میں امی ابو کی یاد نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔ ان کی یاد میں میری آنکھیں برسنے لگیں۔ میری ماں کی معصوم صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ یہ اس عظیم عورت کا چہرہ تھا جس نے تیئیس سال پہلے مجھے جنم دیا تھا۔ والد صاحب کی شکل بھی والدہ کے چہرے کے ساتھ ہی تصور کے پردے پر روشن تھی۔ میرا باپ دنیا کا مشفق ترین باپ تھا لیکن افسوس کہ دشمنی کی آگ نے اس دنیا میں میری آمد سے قبل ہی میرے والدین کے پاؤں میں بگولے باندھ دیے تھے۔ میں ابھی صرف دو ماہ کا تھا کہ انہیں بہ حالتِ مجبوری میری زندگی کی خاطر اپنا گاؤں موضع رکھاں والی چھوڑنا پڑا۔ یہ بڑی ہی دل خراش ہجرت تھی۔ وہ مجھے بچا کر' چھپتے چھپاتے کسی طرح پاکستان سے سنگاپور پہنچ گئے لیکن ماضی کی راکھ میں دبی ہوئی عداوت اور انتقام کی چنگاریاں ایک طویل عرصے کے بعد دوبارہ جاگ اٹھیں۔ جب میں بارہ سال کا ہوا تو درندہ صفت دشمنوں نے میری نگاہ کے سامنے میرے والدین کو انہی کے خون میں نہلا دیا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ماں باپ کے لاشے گرتے دیکھے لیکن میں اس وقت ان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ اس کے بعد میں نے عمر' طاقت اور تجربہ حاصل کر کے دشمنوں کے سارے قرضے ہزاروں فی صد سود کے ساتھ اتار دیے تھے۔ مجھے ذہنی اور قلبی طور پر یہ اطمینان حاصل تھا کہ میں نے اپنے والدین کی روحوں کو بے چین و بےقرار نہیں رہنے دیا تھا۔

میں لگ بھگ گیارہ سال سے والدین جیسی نعمت خداوندی سے محروم چلا آ رہا تھا لیکن اس موقع پر یہ محرومی کچھ زیادہ ہی ستا رہی تھی۔ اگر وہ دونوں زندہ ہوتے تو اپنا ایک ایک چاؤ پورا کرتے' ایک ایک ارمان نکالتے لیکن موت و حیات کا قدرت کا ایک اپنا نظام ہے۔ اس سے مفر ممکن نہیں!

☆☆☆

انیس مئی کی صبح ہمیں ایک دوسرے کی زندگی میں داخل ہونے کا شرعی حق حاصل ہو گیا۔ اب ساحل میری بیوی اور میں اس کا شوہر تھا۔ نکاح سے پہلے مولانا عبدالکریم نے ساحل کو مشرف بہ اسلام کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہماری خوش و خرم زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں بھی کیں۔ الغرض' ہماری شادی کے تمام تر مذہبی احکام اور فرائض بہ خیر و خوبی نہایت ہی خوش سلیقگی سے انجام پا گئے۔

وہ پورا دن مختلف قسم کے رسوم و رواج کی ادائی میں گزر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن شام میں بدلا اور شام رات میں ڈھل گئی پھر رات بھر کے لیے ہمیں دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر بالکل تنہا چھوڑ دیا گیا۔ ننھے سانگ فو کو بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ہماری ضرورت کی ہر شے کو سرِشام ہی وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔ اب ہم صحیح معنوں میں ایک ہو گئے تھے۔

حجلۂ عروسی میں رسمی گفتگو کے بعد ساحل ایک غیر متعلق موضوع لے بیٹھی۔ بڑی سنجیدگی سے پوچھنے لگی" وجدان! جب محترم چنگ فو نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ شادی کے بعد مستقل رہائش کہاں اختیار کرنا چاہو گے تو تم نے یہ کیوں کہا، تمہارا پاکستان میں سیٹل ہونے کا ارادہ ہے؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا" میں نے ایسا اس لیے کہا تھا کہ یہی میرے مستقبل کا پروگرام ہے۔ میں اپنے وطن میں رہنا پسند کروں گا۔"

"میرا خیال ہے' ہم یہیں رہ جاتے ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور لی یان کے کہے ہوئے الفاظ روشن ہو گئے ...... وجدان' تم کچھ نہیں جانتے۔ ان لوگوں نے تمہیں مستقل طور پر یہاں روکنے کا بڑا مضبوط انتظام کر رکھا ہے۔ تم راضی خوشی یہاں زندگی گزارنے پر تیار ہو جاؤ گے۔

"کیا سوچ رہے ہو وجدان؟" وہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔

میں نے کہا" مستقل یہاں قیام کرنا تو بڑا مشکل ہے۔ تمہیں پتا ہے' میں کسی ایک جگہ زیادہ عرصے تک ٹھہر نہیں سکتا" تھوڑے توقف کے بعد میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا" ویسے میں کم از کم تین ماہ تک تو یہاں رک ہی رہا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ اچھا خاصا قیام ہو گا!"

وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی" اب تمہاری اس سیلانی طبیعت کو قرار آ جانا چاہیے۔ تم گھر بار والے ہو گئے ہو۔ ایک جگہ رک کر تمہیں آیندہ زندگی کی پلاننگ کرنا چاہیے اور میرا خیال ہے' اس مقصد کے لیے تبت سے زیادہ اچھی جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔"

ساحل کے سنجیدہ اصرار کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ لی یان نے ہوا میں لٹھ نہیں گھمائی تھی۔ اس کی باتوں میں اچھا خاصا وزن محسوس ہونے لگا۔ میں ابھی تذبذب کا شکار ہی تھا کہ ساحل نے سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"وجدان! ہم دونوں کی زندگی تو جیسی تیسی گزر گئی اور آیندہ بھی گزرتی رہے گی۔ میں آنے والی نسلوں کے تحفظ کی خاطر یہاں مستقل قیام کی بات کر رہی ہوں۔ تبت میں ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے۔ یہاں زندگی بڑے امن و سکون سے بسر ہو گی!"

عورت ایک معاملے میں بڑی دور اندیش ہوتی ہے۔ ادھر شادی کنفرم ہوئی' ادھر اس نے آنے والی نسلوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ وہ بیوی بنتے ہی نانی دادی بننے کا خواب بننے بیٹھ جاتی ہے۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا" آنے والی نسلوں کے بارے میں' بعد میں بھی سوچا جا سکتا ہے۔ فی الحال' ہمیں پوری توجہ خود پر مرکوز رکھنا چاہیے۔ یہ مرادوں بھری رات زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ اسے مستقبل کی پلاننگ میں پڑ کر ضائع ہونے سے بچانا چاہیے۔"

وہ خاموش ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ چہرے پر ہلکی خفگی کے تاثرات بھی نمودار ہو گئے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ اسے میرا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے شانوں سے تھام لیا اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ناراض ہو گئی ہو؟"

"تمہیں میری ناراضی سے کیا!" وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولی" مجھے تو یہ مان تھا کہ تم میری بڑی سے بڑی بات کو بھی نہیں ٹالو گے مگر تم نے تو میری اس چھوٹی سی خواہش کو بھی ......" وہ دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔ پھر گردن جھکا کر اپنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

بیویاں' محبت کرنے والے شوہروں کو اور اولاد مشفق والدین کو ایسی ہی دل ربا اداؤں سے ایموشنل بلیک میل کرتے ہیں۔ ساحل نے اپنی چھوٹی سی خواہش والی بات اتنی معصومیت اور شکستہ دلی سے کہی تھی کہ میرا جگر کٹ کر رہ گیا۔ میں اسے دل و جان سے چاہتا تھا اور اس کے حصول کی خاطر اب تک خود کو سپردِ عذاب کر رکھا تھا۔ وہ میرے لیے کتنی اہم تھی اس "حقیقت" کے مقابلے میں اس کی "فرمائش" واقعی کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ وہ ہستی جس پر میں اپنی جان بھی نچھاور کر سکتا تھا' وہ مجھ سے ادنیٰ سی فرمائش کر رہی تھی۔

محبت جذبات کی سچائی اور پاکیزگی کا نام ہے اور پاکیزہ جذبات میں بے پناہ طاقت ہوتی ہے۔ یہ سراسر خدائی صفت ہے۔ میں ساحل سے سچی محبت کرتا تھا۔ اس الوہی جذبے نے مجھے اس کی بات ماننے کے لیے مجبور کر دیا۔ جب کہ اس کی فرمائش نما خواہش کوئی ناجائز بات بھی نہیں

تھی۔ اس نے میری زندگی میں داخل ہونے کے لیے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ اتنی بڑی قربانی تھی کہ میں اس کی بات سے انکار کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے مجھے سمندر سونپ کر بدلے میں مجھ سے ایک قطرے کا تقاضا کیا ہو! اسے خالی ہاتھ لوٹانا کم ظرفی اور بد اخلاقی کا مظاہرہ ہوتا۔

میں نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا ''ساحل! میں تمہارا مان نہیں ٹوٹنے دوں گا۔ تمہاری خوشی کی خاطر میں تمہاری فرمائش پوری کرنے کو تیار ہوں۔ اب مسکرا دو!''

وہ مسکرا دی اور اس کے ساتھ ہی اس نے بڑی ہوشیاری سے میرا ہاتھ کھینچ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور چالاکی سے بولی ''ایسے نہیں وجدان! تمہیں میری قسم کھانا ہوگی!''

میں نے کہا ''تمہاری جان کی قسم! میں وعدہ کرتا ہوں، اگر میرے اللہ نے چاہا تو میں تمہاری خوشی کے لیے تبت میں قیام پذیر رہوں گا۔ بس...... یا اور کچھ؟''

''تم اپنے ہر بیان کو مشروط کرنے سے باز نہیں آتے!'' وہ سر پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں کی طرف لاتے ہوئے شرارت بھرے لہجے میں بولی ''تم سے جیتنا بہت مشکل ہے۔''

میں نے اس کی کوشش میں مزاحم ہوئے بغیر کہا ''اس وقت تو ہر جیت تمہارے ہی کھاتے میں لکھی جا رہی ہے۔ آں جہانی چنگ فو نے تو مجھے محض ''تبت کا داماد'' کا ٹائٹل دیا تھا۔ تم اس ٹائٹل میں ''گھر'' ٹانکنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ اب اس ٹائٹل کو ''تبت کا گھر داماد'' پڑھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا'' میں لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا ''اور جہاں تک بات کو مشروط کرنے کا تعلق ہے تو ایک سچے مسلمان کو اپنے ہر معاملے میں اللہ کی مرضی کو ضرور شامل حال رکھنا چاہیے۔ بے شک! اس کی مرضی کے بغیر ایک معمولی سا پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا...... اور یہ مت بھولو کہ تم بھی ایک مسلمان ہو!''

''اوہ!'' ندامت آمیز لہجے میں بولی ''آئی ایم سوری وجدان!''

میں نے اسے مزید قریب کرتے ہوئے اس کی ''سوری'' کو قبول کر لیا۔ چند لمحات خوش گوار خاموشی میں گزرے پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہمارے درمیان کوئی تیسرا بھی موجود ہو۔ یک لخت میرا دھیان نیلگری کی طرف چلا گیا۔ اس نے آخری ملاقات میں بڑی سنگین اور رنگین دھمکیاں دی تھیں۔ پہلا خیال ذہن میں یہی آیا کہ کہیں وہ اپنی سنسنی خیز دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے تو نہیں چلی آئی! اس نے تل ابیب کے ''ہوٹل ٹاپ'' میں، میرے حصول میں ناکامیابی کے بعد بڑے زخمی لہجے میں کہا تھا ''تمہاری ثابت قدمی میں کسی اور کا ہاتھ ہے وجدان! لیکن یہ مددگار ہاتھ بھی کب تک رہے گا؟ میں تمہارے حصول سے دست بردار نہیں ہو سکتی۔ جو بھی عورت تمہاری تنہائی میں پہنچ کر حصول اور وصول کی حدود کو چھوئے گی، اس کے اندر تم مجھے پاؤ گے...... مجھے، نیلگری کو؟''

مددگار ہاتھ سے اس کا واضح مطلب، چنگ فو تھا...... اور واقعی وہ اب باقی نہیں رہا تھا، یہ بڑی تشویش ناک صورتِ حال تھی!

میں نے نیلگری کی موجودگی کو جانچنے کے لیے ساحل کو قریب سے قریب تر کر لیا حتیٰ کہ ہم دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر رہ گئے۔ ہماری سانسیں ایک دوسرے کے چہرے کو ٹکورنے لگیں۔ ان لمحات میں اگر نیلگری ہمارے درمیان موجود ہوتی تو اس کی قربت مجھ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی، میری قوتِ شامہ اس کے کندن بدن سے اٹھنے والی کچے آموں ایسی سوندھی سوندھی خوش بو سے بہ خوبی آشنا تھی۔ اس وقت میرے تمام تر محسوسات پوری طرح بیدار تھے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا، وہ میری تنہائی میں شامل نہیں۔ اس احساس کے ساتھ ہی میں نے نیلگری کے خیال کو وہم جانتے ہوئے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

بے ساختہ میری زبان سے نکلا ''جھوٹی کہیں کی......!''

''تم نے مجھے جھوٹی کیوں کہا؟'' ساحل کی مخمور سرگوشی میری سماعت سے ٹکرائی۔

''اس لیے......!''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے ہونٹوں پر قفل ڈال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا، اس کے بعد شروع ہونے والے سفر میں وہ سوال پوچھ پوچھ کر میری راہ کھوٹی کر دے۔ ان لمحات میں وہ مجھ سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہوئی۔ وہ میری آغوش میں سمٹ کر گویا بولنا بھول گئی تھی۔ اس بے زبان پناہ گزینی میں خود سپردگی پیش پیش تھی!

ساحل میری شریکِ حیات بن گئی تھی۔ اس شراکت داری کا پہلا قدم ہی اتنا سیدھا پڑا تھا کہ میں بڑے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا تھا...... میری محبت کا سفینہ اپنے ساحل سے جا لگا!

ختم شد

ہمیں کے ناول، ماہانہ ڈائجسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران ڈائجسٹ
0301-7283296

بیبل پبلک لائبریری